تفسیر مکی

جلد اول

استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ
حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ



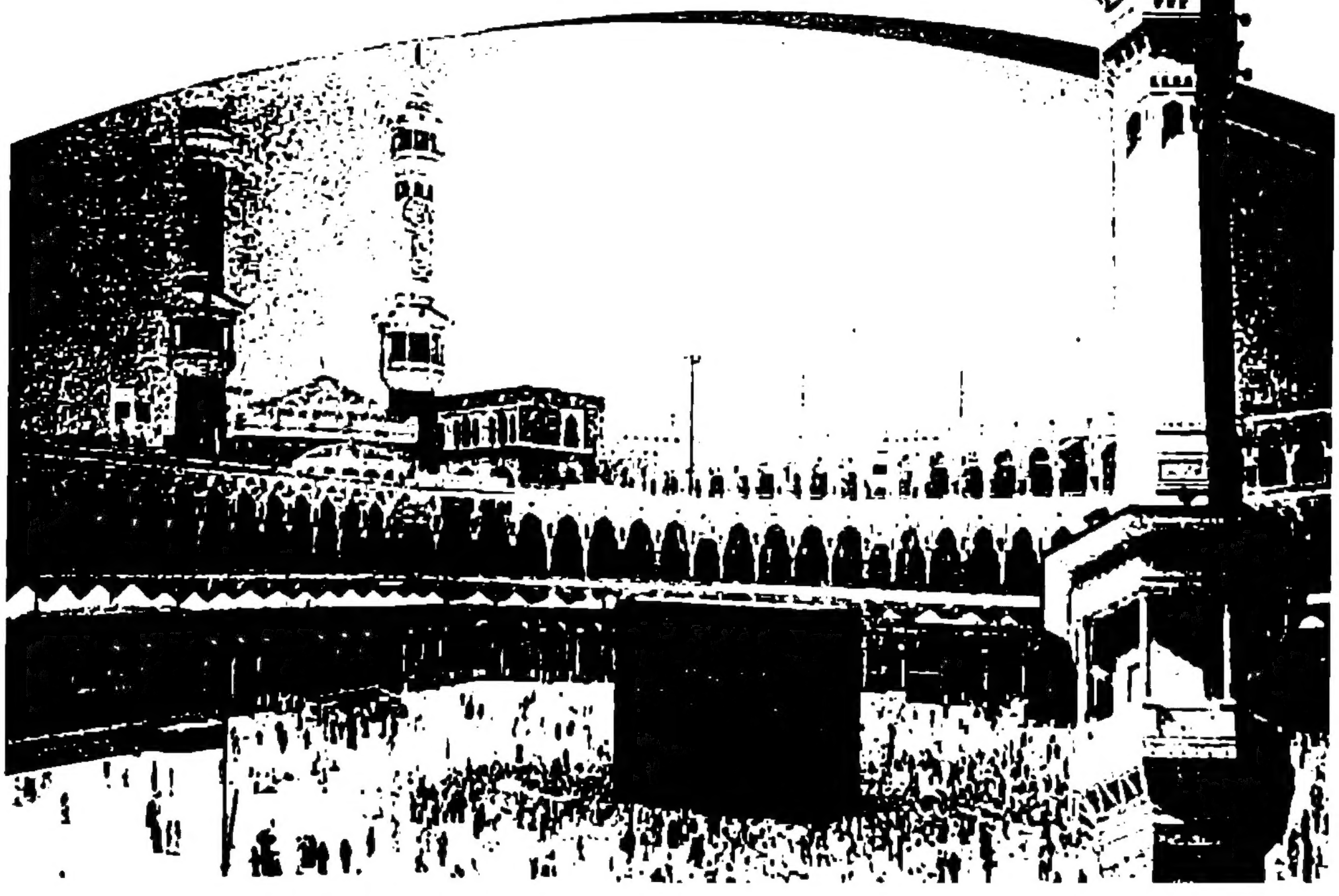
تفسیرِ مکّی

جلد 1

اُستاذُ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم

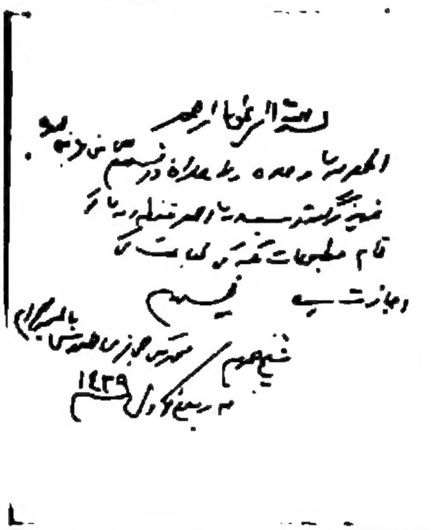
المُدرس بالمسجد الحرام بمكة المُكرمة

تحقیق و ترتیب | مولانا امداد اللہ انور
استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان



نام کتاب	تفسیر مکی جلد 1
صاحب خطبات	استاذ التفسیر والحدیث شیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ
تحقیق و ترتیب	مولانا امداد اللہ انور استاذ جامعہ دار العلوم ملتان
کمپوزنگ	دار التصنیف معہد الفقیر الاسلامی جھنگ
اشاعت اول	جنوری 2019ء
تعداد	1100

اجازت طباعت


بسم اللہ الرحمن الرحیم
[illegible]
تمام مطبوعات [illegible]
اجازت ہے
شیخ محمد [illegible]
۳ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

ناشر

مکتبۃ الفقیر

www.Tasawwuf.org

0300-9652292,03228669680
0335-7873390,03101702690
E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرستِ مضامین



- عرضِ ناشر 11

حالاتِ صاحبِ تفسیر 43

- نام ونسب 43
- والد ماجد کا تعارف 43
- اولاد 44
- ابتدائی تعلیم 45
- شادی 45

- اشتیاقِ علم — 45
- کیا آپ کی یہ ملازمت حکومت کی تعیین ہے؟ — 46
- اساتذہ — 46
- تبلیغی اسفار — 46
- دروس وخطبات کی اشاعت — 47
- پہلا حج — 47
- تلامذہ — 48
- مستقل عنوانات پر خطابات — 48
- محلِ حمزہ کا مدرسہ — 48
- فتنوں کی سرکوبی — 48
- رُباطِ مکی — 50
- معمولاتِ یومیہ — 50
- اولاد — 50

51 دروسِ تفسیرِ سورۂ فاتحہ

- سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ — 52
- سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ — 53
- تلاوت کے شروع میں "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ" پڑھنا — 53
- قرآن کی تلاوت سے پہلے تعوذ کیوں؟ — 53
- جواب — 54
- "اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ" کا معنی — 54

■ "اَعُوْذُ" کا معنی کیا ہے؟ 55
■ "تعوذ" میں چار چیزیں ہیں 55
■ درود میں تشبیہ کا مسئلہ 56
■ اشکال 57
■ "تعوذ" میں پانچ چیزوں کی تفصیل 57
■ "تعوذ" کو مقدم کیوں کیا؟ 58
■ "تعوذ" کا صیغہ مفرد کیوں؟ 59
■ شیطان کی معرفت 60
■ حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ 61
■ تنبیہ 61
■ شیطان کا معنی 62
■ "رَجِیْم" کا معنی 63
■ قرآن کو "مُرَجَّم" کہنا 63
■ علم کی اقسام 63
■ علوم نافعہ 63
■ شیطان کے سب کارنامے ناری ہیں 63
■ غزوہ بدر میں شیطان کی شرارت اور فرار 64
■ صوفیاء کا کلام 65
■ ایک پٹھان کی تقریر 65
■ بے نمازی کے کان میں شیطان کا پیشاب 66
■ جہنم میں دوزخیوں کا شیطان سے مباحثہ 66
■ شیطانی وساوس 67
■ شیطان سے پناہ کی وجہ 67
■ عجیب نکتہ! 68

فہرست مضامین

- شیطان کی بات اثر کیسے کرتی ہے؟ —— 69
- بعض دوسرے شیطانی شبہات —— 69
- امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر الزام —— 70
- شبہ کا جواب —— 70
- شہوات کے ذریعے گمراہی —— 72
- مال و دولت کے ذریعہ گمراہی —— 72
- جہادِ اقدامی کے خلاف شیطان کا دھوکہ —— 73
- مرتد کے لیے شیطانی شبہ —— 75
- جواب —— 75
- شیطان کو پیدا کیوں کیا؟ —— 76
- جواب —— 76
- ایک لطیفہ، ایک حکایت —— 76
- ایک مثال —— 77
- شیطان کے وجود پر اعتراض —— 77
- جوابات —— 77
- شیطان دکھانے کا لطیفہ —— 78
- "أَعُوذُ بِاللّٰهِ" سے شیطان کے بھاگنے کی وجہ —— 79
- "بِسْمِ اللّٰهِ" تمام علوم کا خلاصہ ہے —— 80
- "بِسْمِ اللّٰهِ" کا خلاصہ "ب" میں —— 81
- "ب" کا مطلب —— 81
- "ب" کے نقطے کا مطلب —— 81
- نقطہ بڑھانے یا گھٹانے سے فرق —— 81
- سنت کی اہمیت، بدعت کی مذمت —— 82
- "بِسْمِ اللّٰهِ" میں اللہ کے تین نام —— 82

■ "بِسْمِ اللّٰهِ" کے متعلق نحوی بحث ______ {82}
■ ہر کام کے شروع میں "بِسْمِ اللّٰهِ" پڑھیں ______ {82}
■ مخلوق میں اسم مؤثر نہیں، ذات مؤثر ہے ۔ ______ {83}
■ اللہ کی ذات میں اسم مؤثر ہے ______ {83}
■ دلیل ______ {84}
■ اللہ کے ناموں کی تعداد ______ {84}
■ اللہ تعالیٰ کے کمالات کی کوئی حد نہیں ______ {84}
■ اسمائے حسنیٰ میں شعبوں کی تقسیم ______ {85}
■ حلِ مشکلات کا طریقہ ______ {85}
■ "تَوَسُّل بِالْاَعْمَالِ" کی دلیل ______ {86}
■ "تَوَسُّل بِالذَّاتِ" اور اس کی دلیل ______ {88}
■ اللہ کے ناموں کا دعا میں استعمال ______ {89}
■ اسم اعظم سے دعا ______ {89}
■ دعا میں بے توجہی کا نقصان ______ {90}
■ ریاء کی عبادت ______ {90}
■ اللہ کا نام لینے سے نقصان ختم ______ {90}
■ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر کھانے کا واقعہ ______ {91}
■ خدا کی یاد کا فائدہ ______ {91}
■ ایک صحابی کی دعا ______ {92}
■ اسم اعظم کی برکت سے تخت حاضر ہو گیا ______ {93}
■ فہم قرآن کی شرائط ______ {94}
■ اللہ کی صفات ______ {94}
■ اللہ کی رحمت کی وسعت ______ {95}
■ غلبۂ رحمت کی ایک دلیل ______ {95}

فہرست مضامین

- سو سال کے گناہ بھی رحمتِ باری سے معاف ہو جاتے ہیں — [illegible]
- رحمت کے غالب ہونے کی ایک اور مثال — [illegible]
- "بِسْمِ اللّٰہِ" میں ایک عجیب نکتہ! — [illegible]
- اللہ کی رحمت سے شرک کے سوا ہر گناہ کی معافی ہے — [illegible]
- "بِسْمِ اللّٰہِ" سورۂ فاتحہ کا جز نہیں — 97
- "بِسْمِ اللّٰہِ" اس امت کی خصوصیت ہے — 97
- ہر نماز میں سورۂ فاتحہ ضروری ہے — 98
- خلاصۂ قرآن — 98
- ملحدین کا ایک اعتراض — 98
- جواب — 99
- دین کا خلاصہ تین چیزیں ہیں — 99
- خالق کی عظمت اور مخلوق پر شفقت کا نام ہی دین ہے — 99
- "بِسْمِ اللّٰہِ" کا خلاصہ "ب" میں ہے — 100
- نوافل سے قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے — 100
- اللہ والوں کی خوشی کا راز — 101
- حضرت ابراہیم علیہ السلام اور رضائے خداوندی — 101
- "ب" کے اور معانی — 102
- نکتہ — 102
- اپنی خودی کی نفی کر دو — 102
- عجیب نکتہ! — 103
- "بِسْمِ اللّٰہِ" کا حاصل — 103
- تین باتوں میں مغالطہ — 104
- اسلام کی راہِ اعتدال — 104
- صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذوقِ یقین — 105

- حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ — 105
- حاصلِ کلام — 106
- "بِسْمِ اللّٰہِ" کا سبق کیا ہے؟ — 106
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اللہ کا حکم ہے — 107
- فراخیٔ رزق کا وظیفہ — 107
- "بِسْمِ اللّٰہِ" میں دنیا و آخرت کی سب بھلائیاں ہیں — 108
- "تعوذ" اور "تسمیہ" کا مقصد — 108
- تنبیہ — 109
- اہلِ عرب پر اللہ کا خاص احسان — 109
- ہندوستان میں فہم قرآن کا ذوق — 109
- تفسیر فاتحہ کی ضرورت — 110
- نماز ہی دین کی اساس ہے — 110
- "نماز آنکھوں کی ٹھنڈک ہے" کی عجیب تشریح! — 110
- ایک بڑے پیر کو عید کی نماز بھی نہیں آتی تھی — 112
- جنازہ میں فاتحہ پڑھنے والوں کا رد — 113
- نماز کا ترجمہ ضرور سیکھیں — 114
- علم تکرار کرنے سے آتا ہے — 115
- اباجی کا شوقِ علم — 115
- صحیح نماز کی برکات — 116
- سورۂ فاتحہ پہلی سورت کیسے ہے؟ — 116
- جواب — 116
- سورۂ فاتحہ کے کئی نام ہیں — 116
- دو نور — 117
- سورۂ فاتحہ سے عذاب ٹل گیا — 117

فہرست مضامین

- سارا قرآن فاتحہ کی شرح ہے ــــــ 117
- سورۂ فاتحہ سے صحابہ ﷺ کا دم اور ہدیہ لینا ــــــ 117
- ہر بیماری سے شفایاب ہونے کے دو طریقے ــــــ 119
- سورۂ فاتحہ درخواست بھی ہے ــــــ 120
- فضیلتِ سورۂ فاتحہ ــــــ 122
- سورۃ الفاتحہ کے کچھ نام ــــــ 122
- آدابِ درخواست ــــــ 123
- سورۂ فاتحہ ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے ــــــ 123
- سورۂ فاتحہ میں بندے کا حصہ ــــــ 123
- جامع دعا ــــــ 124
- صراطِ مستقیم کی دعا مانگنے کی وجہ ــــــ 124
- مذاہب اربعہ حق ہیں ــــــ 125
- (1)......دین کی دعا مانگیں ــــــ 126
- حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا استغناء ــــــ 126
- ہمارے والد صاحب کا استغناء ــــــ 127
- ناجائز حیلہ ــــــ 127
- ایک چالاک شخص کا حیلہ ــــــ 128
- تصحیح معاملات ــــــ 128
- دار العلوم دیوبند میں احتیاط ــــــ 129
- حضرت بنوری رحمہ اللہ اور احتیاط ــــــ 129
- A.K بروہی اور ختمِ نبوت کا مقدمہ ــــــ 130
- مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی رحمہ اللہ کے متعلق غلط فہمی ــــــ 130
- علماء اور خدمتِ دین ــــــ 131
- (2)......دعا کا دوسرا فائدہ ــــــ 132

- اس دعا میں کیا طلب کیا گیا؟ ______ [illegible]
- مرزائیوں کا فریب ______ [illegible]
- فریب کا رد ______ [illegible]
- حضور ﷺ کی حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کو تسلی ______ [illegible]
- صالحین میں شمولیت ______ [illegible]
- شہید کو شہید کیوں کہتے ہیں؟ ______ [illegible]
- صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقامِ صدیقیت ______ 135
- علم کے مراتب ______ [illegible]
- "خَلق" اور "خُلق" کی وضاحت ______ 136
- فلاسفۂ یونان اور ہندوؤں کا نظریہ ______ [illegible]
- عالموں کی دھوکہ بازیاں ______ [illegible]
- یہودی کا اعتراض، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جواب ______ 137
- انسان میں کمالِ تخلیق ______ [illegible]
- جدید تہذیب کی ڈسی ہوئی عورتیں اور لڑکے ______ [illegible]
- نئی تہذیب کی بدحالی ______ [illegible]
- حضرت ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کی سادگی اور قناعت پسندی ______ [illegible]
- مولانا ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کی جرأت ______ [illegible]
- نہرو کی سادگی ______ [illegible]
- اللہ کی قدرت کا کمال ______ [illegible]
- حضور ﷺ کے اخلاقِ کاملہ ______ [illegible]
- ایک ہندو جوگی اور اولیاء کے دل کی حالت ______ [illegible]
- یہود و نصاریٰ کا نظریۂ اخلاق ______ [illegible]
- یہودی کا نظریہ ______ [illegible]
- یہودیوں کی تعداد کم کیوں ہے؟ ______ [illegible]

فہرست مضامین

- اسلام کے نزدیک انسان کی اصلاح ہو سکتی ہے ____ 145
- تخلیق انسانیت پر غور کرو ____ 146
- قرآن کے اعجاز پر کفار کی گواہی ____ 147
- انسان میں تین قوتیں ____ 148
- غصہ کی قوت ____ 148
- غصہ میں تین طاقتیں ____ 148
- غصہ میں اعتدال ____ 149
- حضرت علی ؓ کا اعتدال ____ 149
- حضرت عمر ؓ کا اعتدال ____ 150
- حضرت خالد بن ولید ؓ کا اعتدال ____ 150
- کفار کا فلسفۂ اخلاق ____ 151
- اخلاقِ اسلامی اور گروہ بندی ____ 151
- علماء کی ذمہ داری ____ 151
- صوفیاء کے ہاں اصلاح کا طریقہ ____ 152
- حقیقی انقلاب ____ 152
- روزہ سے اخلاق کا علاج ____ 152
- حضرت علی ؓ اور گمراہ لوگ ____ 153
- حضرت علی ؓ کی شان میں غلو ____ 153
- شیعہ سنی کا لطیفہ ____ 154
- ایک اور لطیفہ ____ 155
- تحریف کر کے گیارہویں کا ثبوت ____ 155
- مولوی سردار لائل پوری سے مناظرہ ____ 155
- الزامی جواب کی حیثیت ____ 156
- حضرت علی ؓ کی خلافت بلافصل قرآن میں نہیں ____ 156

- حلولی فرقہ کا رد ____ 157
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق عادلانہ رائے ____ 158
- والدین کے حق میں جہالت کی انتہاء ____ 158
- اعتدال کی مثال ____ 159
- گناہوں پر ناگواری ایمان کا حصہ ہے ____ 159
- افراط اور تفریط کی مثال ____ 160
- مصری عورتوں کا حسن ____ 160
- حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت ____ 160
- گناہ کا اثر ____ 160
- علم حاصل کرنے میں افراط و تفریط ____ 161
- مغرب کا ایک کمال، ایک زوال ____ 161
- چاند پر سب سے پہلے کتیا کو بھیجنا ____ 162
- افراط کی ایک مثال ____ 162
- اچھی بات ہر کسی سے لی جاسکتی ہے ____ 162
- روزوں سے شہوانی قوت میں تبدیلی ____ 163
- سورۂ فاتحہ کے کچھ نام ____ 164
- فلسفۂ یونان کا رد ____ 164
- مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا تجربہ ____ 165
- مولانا آزاد رحمہ اللہ کا جملہ ____ 165
- اسلام کا نظریہ ____ 165
- چالیس کے عدد میں حکمت ____ 167
- حضور ﷺ کی مجلس کا اثر ____ 168
- بچہ پر ماں باپ کا اثر ____ 168
- بچہ کی فطرت ____ 169

فہرست مضامین

- ایک عالم کا عبرتناک قصہ (169)
- یورپ میں دین داروں کی دین داری قابل رشک ہے (170)
- اولیاء اللہ کی صحبت کا اثر (171)
- میرے ایک دوست کا واقعہ (171)
- سابقہ مضامین کے بیان کا مقصد (172)
- مشورہ کی اہمیت (172)
- ہر کام اطمینان سے کرو (172)
- شفاعتِ کبریٰ میں حضور ﷺ کی حمد وثنا (173)
- اللہ تمام کمالات سے موصوف ہے (174)
- والدین کا نافرمان (174)
- کسی میت کے متعلق لوگوں کی اچھی یا بری گواہی (175)
- اپنی موت پر تم ہنسو اور لوگ روئیں (176)
- خدا کے خوف سے رونے والے (176)
- سب کو پالنے والا رب (176)
- جدید تعلیم یافتہ لوگ اور بوڑھے والدین (177)
- ایک دیہاتی کی عجیب دعا! (177)
- اصلاحِ اخلاق کے تین طریقے (178)
- (۱)......تلاوتِ کتاب (178)
- تلاوت اور قرامت کا ایک فرق (179)
- قرآن کی تلاوت کا اثر (180)
- (۲)......قرآن وحدیث کی تعلیم (180)
- (۳)......تزکیہ کے ذریعہ سے اصلاح (180)
- علماء اور صلحاء کے ذریعہ سے علاج (181)
- حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور مولانا ظہیر الحق رحمہ اللہ کا واقعہ (181)

- سنتوں اور نوافل کی اہمیت ___ 182
- فقہ حنفی کی خصوصیات ___ 182
- جلال الدین بخاری ؒ اور محبوب سبحانی ؒ کا واقعہ ___ 182
- قرآن وحدیث کے مخفی اشارات ___ 183
- روحانی معالج کا طریقہ اصلاح ___ 184
- حضرت لاہوری ؒ چالیس دن میں اصلاح کر دیتے تھے ___ 184
- سید عطاء اللہ بخاری ؒ کا واقعہ ___ 184
- اصلاح کے اہل حضرات ___ 185
- خدا کی ربوبیت عامہ ___ 186
- ایک ڈی سی کا لطیفہ ___ 187
- جنگ وجدال میں امن وامان کا حکم ___ 187
- سب پر رحم کا حکم ___ 188
- ایک گندی عورت کا قصہ ___ 188
- "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کا معنی ___ 189
- عدل وانصاف کا حکم ___ 189
- تواضع کا سبق ___ 190
- سلطان محمود اور ایاز کا واقعہ ___ 190
- قناعت واستغنی کا حکم ___ 190
- اپنے مولیٰ پر انحصار کا واقعہ ___ 191
- علوم نافعہ اور علوم ضارہ ___ 191
- علوم رحمانیہ کے فائدے ___ 191
- سیدھا راستہ کیا ہے؟ ___ 192
- ہدایت کا معنی ___ 192
- استقامت کا معنی ___ 193

فہرست مضامین

- ہدایت کا مفہوم ..... [illegible]
- جانوروں کی ہدایت کا مفہوم ..... [illegible]
- ہدایت کی اقسام ..... [illegible]
- ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ'' کا معنی ..... [illegible]
- نماز کا مقصد ..... [illegible]
- دو صغیر صحابہ رضی اللہ عنہم کا واقعہ ..... [illegible]
- عبادت کو استعانت سے مقدم کیوں کیا؟ ..... [illegible]
- ''نَعْبُدُ'' اور ''نَسْتَعِیْنُ'' کیوں فرمایا؟ ..... [illegible]
- ''عَبَدْنَا'' کیوں نہیں فرمایا؟ ..... [illegible]
- مانگنے والوں سے بھی زیادہ کب ملتا ہے؟ ..... [illegible]
- دعا کے آداب ..... [illegible]
- ایک اللہ والے کا واقعہ ..... [illegible]
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ عبدیت ..... [illegible]
- عبادت کا ایک طریق یہ ہے ..... [illegible]
- حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ..... [illegible]
- جنتیوں کے لیے سب سے بڑی نعمت ..... [illegible]
- سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ کے وزیر ایاز کا واقعہ ..... [illegible]
- ''اَلصِّرَاطَ'' کی قرأت ..... [illegible]
- بعض حروف کے مشکل مخارج ..... [illegible]
- دعا کی قبولیت کی شرائط ..... [illegible]
- ہدایت کے متعلق اشکال وجواب ..... [illegible]
- وسیلہ کی جائز اقسام ..... [illegible]
- وسیلہ کی ناجائز اقسام ..... [illegible]
- ہدایت اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں ..... [illegible]

- خاص الخاص ہدایت کا معنی — [illegible]
- ہدایت کی اقسام — [illegible]
- "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کی تفسیر اور معانی — [illegible]
- اسلام دین بھی ہے اور مذہب بھی — [illegible]
- جدید مسائل کا حل — [illegible]
- گھر کو شریعت کے مطابق چلائیں — [illegible]
- ایک عورت کا واقعہ — 217
- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جرأت — 218
- اسلام کے متعلق جدید لوگوں کا مزاج — 219
- اسلام پر پورا پورا عمل کرنے کا حکم ہے — 219
- چار اماموں کے مسلک پر اعتراض — 220
- جواب — 220
- ائمہ اربعہ اور محدثین کی ضرورت و اہمیت — 221
- ائمہ کا اصولِ اجتہاد — [illegible]
- مکمل دین کی اتباع لازم ہے — [illegible]
- ایک پیر کی جہالت — [illegible]
- حضور ﷺ کی طرف سے ایک بہترین مثال — [illegible]
- سیدھے راستہ کے لیے پانچ صفات — [illegible]
- جھگڑا کب ہوتا ہے؟ — [illegible]
- ایک یہودی سے مکالمہ — [illegible]
- یہودی کے اعتراضات اور ان کے جوابات — [illegible]
- یہودی کا دوسرا اعتراض اور اس کا جواب — [illegible]
- دینِ اسلام کی حدود — [illegible]
- "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کے دوسرے معانی — [illegible]

فہرست مضامین

- خلاصۂ بحث — [illegible]
- امام ابن جریر رحمہ اللہ کے نزدیک راجح قول — [illegible]
- ہدایت پانے کے بعد ہدایت مانگنے کا حکم کیوں ہے؟ — [illegible]
- حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کا واقعہ — [illegible]
- ''الْمَغْضُوْبِ'' کون اور ''الضَّآلِّیْنَ'' کون؟ — [illegible]
- عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا — [illegible]
- ''ض'' اور ''ظ'' کا مخرج — [illegible]
- ''ض'' پر جھگڑے — [illegible]
- فاتحہ میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی — [illegible]
- اللہ کی طرف مذموم چیز کی نسبت — [illegible]
- متشابہات کے ساتھ دھوکہ دینے والے فرقے — [illegible]
- فاتحہ کے بعد آمین — [illegible]
- فاتحہ کے بعد آمین کہنا مستحب ہے — [illegible]
- آمین کہنے میں فرشتوں کی موافقت — [illegible]
- آمین مل جانے کا مطلب کیا ہے — [illegible]
- آمین کا معنی — [illegible]
- امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے — [illegible]
- آمین آہستہ کہو — [illegible]
- یہودیوں کا مسلمانوں سے بغض — [illegible]
- آمین اس امت کی خصوصیت ہے — [illegible]
- امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کے دلائل — [illegible]
- نماز میں فاتحہ واجب ہے — [illegible]
- سورۂ فاتحہ کا اخلاق سے تعلق — [illegible]
- اللہ سب کو دیتا ہے — [illegible]

- اسرائیلی روایات کے متعلق حضور ﷺ کا فرمان [redacted]
- ایک اسرائیلی قصہ [redacted]
- امام ابوحنیفہ ؒ کا ایک شرابی سے حسن سلوک [redacted]
- امام احمد ؒ کی ایک ڈاکو کے لیے دعا [redacted]
- مرزائیوں کا ورد و لعنت [redacted]
- پورے دین کا خلاصہ دو چیزیں [redacted]
- میرا اپنے عہدیدار دوستوں سے رویہ [redacted]
- انگریزوں کے نزدیک پاکستانیوں کی نفسیات [redacted]
- انسان کی اصلاح کب ہوگی؟ [redacted]
- شفقت علی الخلق [redacted]
- ایک فاحشہ عورت کا واقعہ [redacted]
- ایک بلی پر ظلم کی وجہ سے جہنم کا فیصلہ [redacted]
- حضرت بایزید بسطامی ؒ کا واقعہ [redacted]
- حضرت جابر ؓ کی دعوت کا واقعہ [redacted]
- دودھ کا ایک پیالہ ستر صحابہ کو کافی ہوگیا [redacted]
- عطاء اللہ شاہ بخاری ؒ کی شفقت سے بھنگی مسلمان ہوگیا [redacted]
- کسی پر ظلم مت کرو [redacted]
- دوسروں کا بھی خیال رکھو [redacted]
- عادت نہیں جاتی......حکایت [redacted]
- ﴿الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کی تفسیر [redacted]
- سورۂ فاتحہ میں سات اخلاق [redacted]

سورۂ فاتحہ کی عرفانی تفسیر 253

- کتاب اللہ اور رجال اللہ 255
- حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کی کرامت معنوی 255
- نجومیوں وغیرہ کی تصدیق کرنا 256
- طاہر القادری کا لطیفہ 257
- ایک لاکھ ریال مانگنے والے کا فراڈ 256
- ایک ڈوبنے والے مولوی کا لطیفہ 257
- قل خوانی کا لطیفہ 258
- اولیاء کی تعریف قرآن سے 258
- اولیاء کو ماننے میں اعتدال 258
- مولانا غلام محمد دین پوری رحمہ اللہ نے کرامت کیوں نہ دکھائی؟ 259
- مولانا تاج محمود امروٹی رحمہ اللہ کی کرامت 259
- انگریز کا افسر اندھا ہو گیا 260
- روحانی سیر کے درمیان چار حجاب 261
- پہلا حجاب، غفلت 262
- دوسرا حجاب، جہل 262
- تیسرا حجاب، رسم 263
- فیشن کا زمانہ اور رسم و رواج 263
- چوتھا پردہ 264
- جھوٹی قسم میں قرآن اٹھانے والے کا واقعہ 264

■ کچھ دوسری قسموں کا خوف [illegible]

■ سورۂ فاتحہ سے غفلت کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟ [illegible]

■ جہالت کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟ 263

■ رسم و رواج کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟ [illegible]

■ غیر سے خوف کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟ 265

■ پردے ہٹنے کے بعد کا عمل 265

■ اللہ کی مخلوقات میں اللہ کی حکمتیں 266

■ سات کے عدد میں حکمتیں 267

■ سورۂ فاتحہ پر شبہات 267

■ شبہات کی مثال 267

■ پرانے شبہات 268

■ جوابات 269

■ اس جواب پر شبہ 270

■ جوابِ شبہ 271

■ مسیلمہ کذاب کی جھوٹی وحی 271

■ مرزا قادیانی کا فرشتہ ٹیچی ٹیچی 271

■ روافض کی تحریفِ قرآن 271

■ لوگوں کے دل اب قرآن کا اثر کیوں نہیں لیتے؟ 272

■ متاخرین اعدائے اسلام 272

■ اہلِ سنت کی اپنے اکابر سے غفلت 273

■ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ 273

■ میری تقاریر کا ایک نوجوان پر اثر 274

■ ہم پر قرآن کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟ 274

■ التابرتن کبھی نہیں بھر سکتا 274

فہرست مضامین

- کٹورے میں تیل لینے والے بچہ کا واقعہ ____ [illegible]
- میرے ایک شاگرد کا قصہ ____ [illegible]
- میرا درس دینے کا مقصد ____ [illegible]
- اعتراض کیا اللہ کسی اور اللہ کے نام سے قرآن شروع کرتا ہے؟ ____ 275
- پہلا جواب ____ 275
- دوسرا جواب ____ 276
- عیسائی این جی اوز اور مشنریز ____ 277
- قدیم کفار کے اعتراضات کا محور ____ 278
- حضور ﷺ پر شاعر ہونے کا الزام ____ 278
- شاعرانہ تخیلات کا واقعہ نمبر ۱ ____ 279
- واقعہ نمبر ۲ ____ 279
- واقعہ نمبر ۳ ____ 279
- کفار کا حضور ﷺ کو شاعر کہنے کی ایک وجہ ____ 280
- جادوگروں کی گندگیاں ____ 281
- قبر میں عام مردوں کی حالت ____ 281
- حضور ﷺ کو جادوگر کہنے کی وجہ ____ 281
- حضور ﷺ کو کاہن کہنے کی وجہ ____ 281
- مشرکین کے دوسرے شبہات ____ 282
- آج کا دور ____ 282
- ترتیب قرآنی پر اعتراض ____ 283
- مدنی سورتیں پہلے مکی بعد میں کیوں؟ ____ 284
- آج کل کے مسلمان کا حال ____ 284
- ترتیب قرآنی پر بہترین تفسیر ____ 286
- شبہات کا جواب دینے کی اہمیت ____ 286

- قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے پر شبہ — [redacted]
- جواب — [redacted]
- دوسرا جواب — [redacted]
- شبہ، اللہ کی اپنی زبان سے اپنی تعریف — [redacted]
- "رَحْمٰنِ وَرَحِیْمٍ" کا تکرار — [redacted]
- بعض کلام میں تکرار کا حسن — [redacted]
- کیا سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں؟ — [redacted]
- جواب — [redacted]
- رحمٰن ورحیم کی تقدیم وتاخیر کا سوال — [redacted]
- پہلا جواب — [redacted]
- دوسرا جواب — [redacted]
- تیسرا جواب — [redacted]
- ایک اور جواب — [redacted]
- عبادت پہلے اور مدد بعد میں کیوں؟ — [redacted]
- جواب نمبر 1 — [redacted]
- جواب نمبر 2 — [redacted]
- علامہ اقبال مرحوم کا استدلال — [redacted]
- جواب نمبر 3 — [redacted]
- کیا اللہ دنیا کا مالک نہیں؟ — [redacted]
- ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں سے ہمارا مطالبہ — [redacted]
- قرآن اور اہلِ سنت کی صداقت — [redacted]
- کفار کو چیلنج — [redacted]
- شاہ فیصل مرحوم کا مدبرانہ جواب — [redacted]
- ایک مسلمان وکیل کی عقلمندی — [redacted]

فہرست مضامین

- اسلام کا قانونِ قصاص — [illegible]
- حرام کا کاروبار بھی حرام ہے — [illegible]
- شراب کی مذمت — [illegible]
- ایک صاحب کا واقعہ — [illegible]
- تثلیث کے استدلال کا رد — [illegible]
- ایک سنی عالم کا شیعہ کو جواب — [illegible]
- تثلیث کا جواب — 308
- ہدایت پانے کے بعد ہدایت کی دعا کیوں؟ — [illegible]
- قرآن کی صداقت چودہ سوسال سے چیلنج کر رہی ہے — 309
- قرآن کی اخبارِ غیب — [illegible]
- قرآن میں جدید علوم کا کمال — [illegible]
- انڈے کے دو ٹکڑے ہونے پر اعتراض — 312
- جواب — [illegible]
- ایک نحوی اشکال — [illegible]
- جواب کی تمہید — [illegible]
- بدل اور مبدل منہ والے شبہ کا جواب — [illegible]
- کیا فاتحہ میں یہود و نصاریٰ کی دشمنی سکھائی گئی ہے؟ — [illegible]
- قرآن کی اہلِ کتاب سے رواداری — [illegible]
- ایک اعتراض اور اس کا بہترین جواب — [illegible]
- یہودیوں پر غضب کی ایک وجہ — [illegible]
- رومی سپر پاور کے حکمران ہرقل کا حضور ﷺ کے بارے میں نظریہ — [illegible]
- ایک اور جواب — [illegible]
- قرآن کی عظیم الشان سورت — 320
- سورۂ فاتحہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی — [illegible]

- پورا قرآن صراطِ مستقیم کا جواب ہے ____ [illegible]
- سورۂ فاتحہ کے اہم مضامین ____ [illegible]
- سورۂ فاتحہ کا خلاصہ "بِسْمِ اللّٰهِ" میں ____ 322
- "بِسْمِ اللّٰهِ" کا خلاصہ "ب" کے نقطہ میں ____ 322
- نماز میں فاتحہ واجب ہے ____ 322
- امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا مسئلہ ____ 323
- امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دلائل ____ 323
- امام کے کام مقتدی کے کام کیسے ہوئے؟ ____ 325
- شریعت میں ایک مسئلہ کے کئی درست احتمالات ____ 326
- پہلی مثال ____ 326
- دوسری مثال ____ 327
- ائمۂ فقہ کی تعظیم ____ 327
- بعض اسلامی کتابوں کی مقبولیت ____ 328
- بعض مقبول تراجم قرآن ____ 328
- ایک مراثی کا تفسیر لکھنے کا دعویٰ ____ 329
- قربانی پر جدید لوگوں کا اعتراض ____ 329
- اسلام پر جدید اعتراضات ____ 330
- سورۂ فاتحہ کے نام ____ 330
- سورۂ فاتحہ کے مضامین ____ 331
- زمانوں کے اعتبار سے سورۂ فاتحہ کی تقسیم ____ 331
- عبادت کا معنی اور اقسام ____ 332
- عبادت صرف خدا کی ہے ____ 332
- بندے کی صفت عبدیت کاملہ ____ 332
- قبروں کی تعظیم ____ 333

فہرست مضامین

- سجدہ صرف خدا کے لیے ____ 335
- بندے کو رب بنانے کی مثال اور چند قابل اصلاح امور ____ 336
- غیر سے مدد مانگنا کب شرک ہے؟ ____ 339
- معجزہ اور کرامات کے ذریعے غلط فہمی ____ 340
- غیر خدا کو قدرت و اختیار ____ 341
- نعرۂ حیدری ____ 342
- یا رسول اللہ کا نعرہ ____ 342
- تین نعرے اور تثلیث ____ 343
- مسئلہ الوہیت ____ 343
- سورۂ فاتحہ جامع دعا ہے ____ 344
- صراط مستقیم کی دعا ____ 344
- صراط کا معنی ____ 345
- ہدایت پر ہدایت طلب کرنے کا مطلب ____ 345
- حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ____ 346
- صراط مستقیم کا ایک اور معنی ____ 346
- قادیانیوں کا دھوکہ ____ 348
- انعام یافتہ حضرات ____ 349
- ایک علمی نکتہ ____ 350
- اللہ کی طرف اچھی چیز کی نسبت کرو ____ 350
- غضب اور ضلال کا اطلاق ____ 351
- غضب اور ضلالت کے مستحق ____ 352
- اللہ کا راستہ اور نیک حضرات قابل تقلید ہیں ____ 352
- کونسا فرقہ کامیاب ہوگا؟ ____ 353
- سب کے لیے ہدایت طلب کرو ____ 353

- مقبول دعا کا طریقہ 354
- وضاحت 356

357 دروسِ تفسیرِ ابنِ کثیر

- ''سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ'' 358
- سورۂ فاتحہ کی وجہ تسمیہ 359
- فاتحہ کا نام ''اُمُّ الْكِتَابِ'' کیوں؟ 359
- بعض علماء نے ''اُمُّ الْكِتَابِ'' نام پسند نہیں کیا 359
- کیا ''اُمُّ الْقُرْاٰنِ'' نام صحیح ہے؟ 360
- احرام کھولنے سے پہلے سر منڈانے کا مسئلہ 360
- بعض انفرادی اور اجتہادی مسائل 362
- اپنے اکابر کا احترام 363
- سورۂ فاتحہ کے مختلف نام 364
- سورۂ فاتحہ زہر میں بھی شفا ہے 365
- سورۂ فاتحہ دم بھی ہے 365
- کیا کیا چیز دم کر سکتے ہیں؟ 368
- لوگوں کو اسلام کے قریب کرنے کا ایک طریقہ 369
- اس زمانے کے لوگوں کا حال 369
- قوم کی قرآن سے بے وفائی 371
- سورہ ''أَسَاس''، ''وَافِيَة''، ''كَافِيَة'' 372
- یہ سورت مکی بھی ہے، مدنی بھی ہے 373

فہرست مضامین

- اختلاف صحابہ کی وجہ 373
- اکابر اور ائمہ کا ادب 374
- فاتحہ کا مکی ہونا راجح ہے 374
- فاتحہ کی آیات کی تعداد 375
- کیا بسم اللہ مستقل آیت ہے؟ 375
- سورۂ فاتحہ کے کلمات اور حروف 376
- فاتحہ کو ام الکتاب کیوں کہتے ہیں؟ 376
- مکہ کو "اُمّ القریٰ" کہنے کی وجہ 376
- کیا بسم اللہ فاتحہ کا جز ہے؟ 377
- "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي" کی بحث 377
- ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں فاتحہ کیوں نہیں لکھی گئی تھی؟ 378
- کتابتِ وحی 379
- سب سے پہلے اترنے والی سورت 380
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اہمیت 380
- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نماز باجماعت کی پابندی 381
- اس صحابی کو ایک خاص سورت کی تعلیم 382
- اس حدیث سے مستنبط مسائل 382
- امام اعمش رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا واقعہ 383
- وہ عظیم سورت یہ ہے 384
- امام ابن کثیر رحمہ اللہ کی طرف سے ایک علمی تنبیہ 384
- محمد بن جریر دو ہیں اور ان دونوں میں فرق 386
- امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے حوالے سے حدیث گھڑنے والا واعظ 386
- میری طرف غلط مسائل کی نسبت 387
- حدیث ابی رضی اللہ عنہ 388

- حدیث عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہ ____ 389
- کیا قرآن کا بعض حصہ بعض سے افضل ہے؟ ____ 390
- حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی فضیلت ____ 392
- حطیم اور حجر اسود پر بے ہنگم رش ____ 393
- سورۂ فاتحہ میں زہر کا دم ____ 393
- ڈسے ہوئے کے لیے عربی محاورہ ____ 394
- زبان سے برے کلمات ادا نہ کرو ____ 395
- سورۂ فاتحہ کا ایک خاص فرشتہ کے ذریعہ سے نزول ____ 395
- سارا قرآن نور ہے ____ 396
- قرآن، نبی اور مسلمان کے متعلق نور کا استعمال ____ 397
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اترنے والے دو نور ____ 397
- خاص فرشتے کے ذریعے فاتحہ کے اترنے کا مطلب ____ 397
- فاتحہ اور تلاوت قرآن کو نماز کا درجہ کیوں ملا؟ ____ 398
- فاتحہ کے زیادہ نام عظمت شان کی دلیل ہے ____ 399
- فاتحہ مضامین قرآن کا خلاصہ ہے ____ 399
- انسان کی زندگی کے تین دور ____ 399
- سورۂ فاتحہ آدھی اللہ کے لیے، آدھی بندہ کے لیے ____ 401
- والدین کی اولاد پر شفقت ____ 402
- اللہ کے تحت احکام کی مثال ____ 403
- عصمت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اترنے والی آیات کی حکمتیں ____ 403
- رحمن اور رحیم کی رحمت کے مفاہیم ____ 404
- ماں کی اور رب کی رحمت کی مثال ____ 405
- صراط مستقیم پر استقامت ____ 406
- ہدایت کے چار مراتب ____ 406

فہرست مضامین

- تلاوت سے پہلے تعوذ 108
- حضور ﷺ کے کفار پر احسانات 109
- ایک طوائف پر احسان 110
- تعوذ کا فائدہ 110
- تعوذ کب پڑھیں؟ 111
- پہلا قول 111
- دوسرا اور راجح قول 111
- تیسرا قول 111
- سورۂ فاتحہ کی فضیلت 112
- مسئلہ قرأت فاتحہ خلف الامام 112
- غیر اللہ کے نام کا صدقہ، چھترا 115
- شوافع کی دوسری دلیل 116
- سورۂ فاتحہ میں بندے کا حصہ 116
- قرأت خلف الامام 119
- بعض احادیث کا صحیح معنی 123
- امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر بعض نامناسب اعتراضات 125
- امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فقیہ نہیں تھے 126
- مؤذنین اور قرآن پڑھنے والوں کی خدمات 126
- لوگوں کی اسلام سے بیزاری 127
- قرأت فاتحہ کی بقایا بحث 127
- کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ 128
- جہری نمازوں میں فاتحہ امام کے پیچھے نہ پڑھے 130
- سری نمازوں میں بھی مقتدی پر فاتحہ نہیں ہے 131
- سونے سے پہلے فاتحہ اور سورۂ اخلاص کا فائدہ 131

- تلاوت قرآن سے پہلے تعوذ پڑھنا — [illegible]
- شیطان کی انسان سے دشمنی — [illegible]
- ہمارے ایک مجذوب کی مثال — [illegible]
- تلاوت کے بعد تعوذ پڑھنے کا فائدہ — [illegible]
- تلاوت سے پہلے تعوذ پڑھنا صحیح ہے — [illegible]
- رات کے وقت نماز میں تعوذ پڑھنا — 456
- تعوذ کے مختلف کلمات — 458
- نماز میں ثنا — [illegible]
- "هُمَزَةٌ" اور "لُمَزَةٌ" کا معنی — [illegible]
- ایمان پر موت کی حالتیں — [illegible]
- حضور ﷺ کی دعا — [illegible]
- شیطانی حملوں کے مختلف طریقے — [illegible]
- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے شیطان کو کیسے پکڑا؟ — [illegible]
- شیطان کے ستر ہزار جال — [illegible]
- غصہ دبانے کا عمل — [illegible]
- غصہ کی حالتیں اور علاج — [illegible]
- غصہ کرنا بڑی خطرناک چیز ہے! — [illegible]
- غصہ کا نبوی وظیفہ — [illegible]
- لاحول" کا مطلب اور فائدہ — [illegible]
- صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعض جھگڑے انسانی تقاضے سے ہوئے تھے — [illegible]
- حضور ﷺ کی دو بیویوں میں غصہ — [illegible]
- احناف کے نزدیک تعوذ واجب ہے — [illegible]
- ابن سیرین رحمہ اللہ کا مذہب — [illegible]
- واجب ہونے کی دلیل — [illegible]

فہرست مضامین

- نماز کو خراب کرنے والی تین چیزیں [redacted]
- لفظ شیطان کا اشتقاق [redacted]
- "رَجِیۡمٌ" کا معنی [redacted]
- بسم اللہ قرآن کا جز ہے [redacted]
- ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ کیوں؟ [redacted]
- ایک ضعیف روایت [redacted]
- نماز میں بسم اللہ کا حکم [redacted]
- بسم اللہ اسم اعظم ہے [redacted]
- اسم اعظم میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تحقیق [redacted]
- "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کی فضیلت [redacted]
- اسم اعظم کا فائدہ [redacted]
- دعا قبول ہونے کی ایک مقبول حالت [redacted]
- بسم اللہ سے رزق کی تنگی دور ہوتی ہے [redacted]
- انبیاء کرام علیہم السلام کا علم لدنی ہوتا ہے [redacted]
- قرآن کو کمانے اور کھانے کا ذریعہ بنانے کی مذمت [redacted]
- قرآن کی من مانی ترجمانی [redacted]
- تتمہ قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام [redacted]
- ابوجہل کی اونٹنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ [redacted]
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا تتمہ [redacted]
- حروف مقطعات کی تفسیریں [redacted]
- نحوی ترکیب [redacted]
- ہر کام "بِسْمِ اللّٰہِ" سے شروع کریں [redacted]
- اسم سے مراد مسمی ہے یا غیر مسمی [redacted]
- اللہ کا ذاتی نام [redacted]

- اللہ کے ناموں کی تعداد ____ [illegible]
- کسی کو قاضی الحاجات کہنا ____ [illegible]
- کسی کو مشکل کشا کہنا ____ [illegible]
- شرک کے وہم کی چیزوں سے بھی بچو ____ [illegible]
- ایک حدیث سے بہترین دلیل ____ [illegible]
- ضروری اصلاح ____ [illegible]
- بسم اللہ صرف دو پیغمبروں پر اتری ____ [illegible]
- خط لکھنے کا مسنون طریقہ ____ [illegible]
- بسم اللہ کے اترنے کی عظمت ____ [illegible]
- بسم اللہ کی برکت ____ [illegible]
- جہنم سے حفاظت کا عمل ____ [illegible]
- شیطان کو تکبر کرنے کا موقع نہ دو ____ [illegible]
- وضو میں بسم اللہ نہ پڑھنے کا نقصان ____ [illegible]
- حاکم کی اطاعت ____ [illegible]
- ایک صحابی رئیسِ لشکر کا واقعہ ____ [illegible]
- ائمہ مجتہدین کی خدمات کے فائدے ____ [illegible]
- قرآن و حدیث میں مشکلات اور ان کا حل ____ [illegible]
- صحبت سے قبل بسم اللہ کی فضیلت کی ایک حدیث کی تحقیق ____ [illegible]
- کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ ____ [illegible]
- کھانا کھانے کے بعد کی دعا ____ [illegible]
- خلافِ شرع دعوتوں کا حکم ____ [illegible]
- صحبت سے پہلے کی دعا ____ [illegible]
- خدا سے مانگنے کے لیے وسیلے پکڑنا ____ [illegible]
- میری جائیداد کے ایک مقدمہ کا واقعہ ____ [illegible]

فہرست مضامین

- خدا سب کی سنتا اور جانتا ہے [redacted]
- شرکیہ باتیں [redacted]
- صفتِ رحمت کا اطلاق [redacted]
- مسیلمہ کذاب کا جھوٹ اور شیعوں کا تقیہ [redacted]
- شیعوں کی گستاخیاں [redacted]
- مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ کا واقعہ [redacted]
- اختلاف اور فتنوں کا اصل سبب [redacted]
- درود کی جگہ انگوٹھے چومنا [redacted]
- اللہ کے ناموں پر عمل بھی مقصود ہے [redacted]
- اللہ کے ناموں سے مقصود [redacted]
- اللہ تعالیٰ سب کی سنتا ہے [redacted]
- دعا مانگنے کی صحیح حالت [redacted]
- اللہ کا ذاتی نام مشتق ہے یا غیر مشتق [redacted]
- ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ [redacted]
- رشتے نسب سے ہوتے ہیں یا صہر کے ہوتے ہیں؟ [redacted]
- قرآن میں دو خاص نور [redacted]
- سورۃ الفاتحہ کے بعض نام [redacted]
- تعوذ کی اقسام [redacted]
- شیطان سے پناہ کی ضرورت [redacted]
- نماز میں فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ آہستہ پڑھیں [redacted]
- سورۂ فاتحہ جامع دعا ہے [redacted]
- اکابر کی دعا میں عظمت [redacted]
- کسی جھوٹے فرقے نے اپنے معبود کا نام اللہ نہیں رکھا [redacted]
- کسی کو رب کہنا جائز نہیں [redacted]

- غیر اللہ کی تربیت کی حد ہے ____ [illegible]
- ایک علمی نکتہ ____ [illegible]
- رب تو سب کی تربیت کرتا ہے ____ [illegible]
- جانوروں کے بچوں کی سمجھداری ____ [illegible]
- پتھر میں رزق پہنچانے کا واقعہ ____ [illegible]
- مخلوقات اللہ کی عبادت کیسے کرتی ہیں؟ ____ [illegible]
- آسمانوں کے دروازے بغیر اجازت نہیں کھلتے ____ [illegible]
- کسی کو "رحمٰن" یا "رحیم" کہنا ____ [illegible]
- آج کے زمانے میں بڑے ہونے کی پہچان ____ [illegible]
- نام بدل دینا ____ [illegible]
- اللہ کی رحمت کا اندازہ ____ [illegible]
- ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ ____ [illegible]
- قیامت کی ضرورت ____ [illegible]
- قیامت میں سب اختیار اور ملک اللہ کا ____ [illegible]
- قیامت کے دن سب کے بدلے چکا دیے جائیں گے ____ [illegible]
- کسی کو رؤف، رحیم، سمیع و بصیر کہنا ____ [illegible]
- مسیلمہ کذاب کے دعوے ____ [illegible]
- مرزا قادیانی کے مختلف دعوے ____ [illegible]
- مسیلمہ کذاب کا انجام ____ [illegible]
- "بِسْمِ اللّٰهِ" میں "الرَّحْمٰنِ" اور "الرَّحِيْمِ" دو نام کیوں آئے؟ ____ [illegible]
- حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کا فائدہ ____ [illegible]
- شیعوں کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بغض ____ [illegible]
- ہماری قوم کی جہالت ____ [illegible]
- ہر آیت کو الگ الگ کر کے پڑھنا ____ [illegible]

فہرست مضامین

- ﴿اَلْحَمْدُ﴾ میں مختلف قراءتیں اور اعراب — [illegible]
- حمد وثنا کا مستحقِ حقیقی — [illegible]
- ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ﴾ جامع کلمۂ شکر — [illegible]
- مدح، حمد اور شکر میں فرق — [illegible]
- مختلف اکابرین کے نزدیک تسبیح، تحمید اور تکبیر کی فضیلت — [illegible]
- شکر نہ کرنے سے نعمت چھن جاتی ہے، واقعہ — [illegible]
- شکر کا معنی — [illegible]
- نعمتوں کا بے جا استعمال — [illegible]
- سکندر بادشاہ کا واقعہ — [illegible]
- حضور ﷺ کو مسکینی پسند تھی — [illegible]
- دنیا میں اپنے سے کم تر اور دین میں اپنے سے برتر کو دیکھو — [illegible]
- کمتر رکھنے میں حکمت — [illegible]
- ایک بزرگ اور بادشاہ کا واقعہ — [illegible]
- فضول خرچی کا ایک معیار — [illegible]
- ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کا ثواب — [illegible]
- تہجد کا مزہ — [illegible]
- باقیاتِ صالحات — [illegible]
- ایک عظیم کلمہ کا ثواب — [illegible]
- حضور ﷺ کی شفاعتِ کبریٰ اور شفاعتِ صغریٰ — [illegible]
- بدعتی حضور ﷺ کی شفاعت سے محروم ہوگا — [illegible]
- بدعتی کی عزت نہ کرو — [illegible]
- برائی کو روکنے کے تین طریقے — [illegible]
- چند بدعات کا رد — [illegible]
- کلمہ طیبہ اور الحمد کے فضائل — 519

- زبانی اقرار کے ساتھ دل سے اقرار بھی ایمان کے لیے شرط ہے [redacted]
- بعض علماء کے نزدیک ایمان کی تعریف [redacted]
- کلمہ طیبہ کے فضائل [redacted]
- ﴿رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [redacted]
- رب کا معنی [redacted]
- قائدِ اعظم اور خاتونِ اوّل کون؟ [redacted]
- بعض مخصوص القاب [redacted]
- ناجائز القاب [redacted]
- کیا لفظ "رَبّ" اسم اعظم ہے؟ [redacted]
- ﴿الْعٰلَمِیْنَ﴾ [redacted]
- کتنے ہزار جہان ہیں؟ [redacted]
- کتے کے جھوٹے برتن کے جراثیم میں شریعت کی خصوصیات [redacted]
- دین اسلام کی سائنس کی رو سے تصدیق [redacted]
- اسلام کی طاقت [redacted]
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مخاطب [redacted]
- انسان اور جنات ایمان لانے کے مکلف ہیں [redacted]
- کتنے ہزار عالم ہیں؟ [redacted]
- اللہ کی کرسی کی وسعت [redacted]
- عالم اللہ کے وجود کی دلیل ہے [redacted]
- ایک حکایت [redacted]
- ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے [redacted]
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے اور آخری نبی ہیں [redacted]
- ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ [redacted]
- حجاج بن یوسف کی اللہ سے امید [redacted]

فہرست مضامین

- اللہ سے ڈرنے اور امید رکھنے کی مقدار [redacted]
- تقویٰ کی حیثیت [redacted]
- ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ [redacted]
- آخرت پر ایمان کی ضرورت [redacted]
- نیکی کی توفیق اور محرومی کون دیتا ہے؟ [redacted]
- آدمی گناہ سے کب بچتا ہے؟ [redacted]
- ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کی قرأت [redacted]
- آخرت میں سب حکومت اللہ کی ہے [redacted]
- "مَالِكِ" کا معنی [redacted]
- قیامت کا دن کتنا لمبا ہوگا؟ [redacted]
- موت سے پہلے تیاری کرلو [redacted]
- ﴿إِيَّاكَ﴾ اور ﴿نَسْتَعِيْنُ﴾ کی قرأتیں [redacted]
- عبادت کا معنی [redacted]
- حضور ﷺ سے محبت ہے تو اتباعِ سنت کریں [redacted]
- بدعات سے محبت اور دعویٰ ایمانی [redacted]
- صرف اللہ کی عبادت کرنے کا معنی [redacted]
- دعا میں شرک [redacted]
- خدا ہماری سنتا نہیں اور ان کی موڑتا نہیں [redacted]
- محبت میں مبالغہ کا نقصان [redacted]
- کیا ولایت اور امامت کا درجہ نبوت سے زیادہ ہے؟ [redacted]
- اللہ سب کی سنتا ہے [redacted]
- کیا مقبول دعا کے لیے وسیلہ ضروری ہے؟ [redacted]
- دعا میں وسیلہ [redacted]
- انگوٹھے چومنے کا مسئلہ [redacted]

- سارے قرآن کا خلاصہ ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ﴾ والی آیت میں ہے [redacted]
- اللہ ہی عبادت کے لائق کیوں ہے؟ [redacted]
- پیروں کو رب بنانے کی مذمت [redacted]
- گیارہویں، عرس اور قبروں کا طواف [redacted]
- ماتحت الاسباب اور مافوق الاسباب مدد کا حکم [redacted]
- کفار مکہ اور موجودہ لوگوں کا نظریہ [redacted]
- معجزات اور کرامات کے ذریعہ دھوکہ [redacted]



عرضِ ناشر

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: 1 ...... بیت اللہ، 2 ...... کتاب اللہ، 3 ...... اہل اللہ۔

اور اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جاسکتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، رمضان ہو یا شوال، حج کا موسم ہو یا عمرے کا، حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کا درسِ قرآن مسجدِ حرام میں بلا ناغہ ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں دوسرے مشائخ کے دروس بھی ہوتے ہیں، تاہم جس کثرت سے اور ذوق شوق سے لوگ حضرت مکی مدظلہ کے درس میں شرکت کرتے ہیں، دوسرے دروس میں یہ کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ چنانچہ برِصغیر پاک و ہند، بلکہ پوری دنیا میں جہاں بھی اردو دان طبقہ حرم شریف میں آتا ہے، حضرت مکی مدظلہ کے درس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحیدِ خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت واحترام پر حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمالِ مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔

حضرتِ اقدس کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص وتقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر تفسیر "انوار الحرم" المعروف "تفسیر مکی" حضرت اقدس کے چند دروس کا مجموعہ ہے۔ جسے اس سے قبل اک اور ادارہ نے شائع کیا تھا اب اسے حضرت اقدس ہی کے حکم پر "مکتبۃ الفقیر" شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اللہ رب العزت اس کتاب اور "مکتبۃ الفقیر" دونوں کو شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین ﷺ

اجازت ہو تو آکر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہو گا

قارئینِ کرام! گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی، کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تا زیست اپنی رضا کے لیے یہ خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ہماری آخرت کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

دعاؤں کا طالب:
فقیر سیف اللہ احمد نقشبندی مجددی
مکتبۃ الفقیر



حالاتِ صاحبِ تفسیر

نام ونسب:

محمد مکی حجازی ولد مولانا خیر محمد صاحب اور ولد یار محمد صاحب رحمہ اللہ۔ ○

ولادت:

مکہ مکرمہ محلہ مسفلہ رباط نواب آف بہاولپور میں ہوئی۔ 1942ء ہے یا 1943ء ہے۔ کیونکہ اس وقت تو ریکارڈ نہیں تھا، نہ مجھے آج تک ملا۔

خاندان:

خاندانی طور پر ہم بلوچ فیملی سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارا آبائی وطن تحصیل علی پور ضلع مظفرگڑھ چاہ حقانی والا موضع عظمت پور ہے۔ اس کے بعد والد صاحب رحمہ اللہ جب مظاہر العلوم سہارنپور سے فارغ التحصیل ہو کر واپس آئے تو کچھ عرصہ یہاں رہے، یہاں زمینیں، بستی اور ہمارے گھر تھے جو دریا نے اپنی لپیٹ میں لے لیے، اس لیے انہوں نے ٹھل حمزہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں کے ایک سردار تھے سردار قادر خان مرحوم، ان کی دعوت پر وہ ٹھل حمزہ تشریف لے گئے اور پھر ٹھل حمزہ کو ہی اپنا مسکن بنا لیا۔ ٹھل حمزہ تحصیل لیاقت پور ضلع رحیم یار خان میں ہے۔

والد ماجد کا تعارف:

والد ماجد رحمہ اللہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انہوں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے چند دن پڑھا تھا، پھر

○..... چند سوالات حضرت کے ذاتی حالات کے متعلق احقر امداد اللہ انور نے پاکستان سے سعودی عرب بذریعہ موبائل فون حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی مدظلہ سے پوچھے تھے جو حضرت نے بیان فرمائے۔ ان کو انہی کی زبانی یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ (امداد اللہ انور)۔

طبیعت کی خرابی کی وجہ سے دار العلوم دیوبند چھوڑ کر مظاہر العلوم سہارنپور چلے گئے اور بہت ساری کتابیں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں اور سنن ابوداؤد حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے والد حضرت مولانا یحییٰ کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، جبکہ شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ ان کے ہم درس تھے۔ باقی علوم بھی آپ نے وہیں پڑھے تھے۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کا تعلق حضرت شیخ خلیفہ غلام محمد دین پوری رحمۃ اللہ علیہ سے تھا جو مجاہد بھی تھے اور اپنے زمانے کے اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ہر سال مکہ مکرمہ تشریف لاتے تھے، کبھی ایک سال قیام فرماتے، کبھی دو سال اور کبھی چھ ماہ، پھر پاکستان چلے جاتے تھے۔ مستقلاً وہ 1960ء میں ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے آئے اور اپنی تمام زندگی انہوں نے مکہ میں گذاری۔ 1974ء میں وفات پائی اور جنت المعلیٰ میں سیدنا حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے قریب دفن ہوئے۔

آپ آلِ سعود اور ملک عبد العزیز کے زمانے سے حرم شریف میں درس دیتے تھے، لیکن متواتر طور پر 1960ء سے لے کر 1974ء تک حرم میں درس دیا۔

اولاد:

میرے تقریباً دس بھائی پیدا ہوئے۔ پیدائش کے تقریباً ایک ماہ، دو ماہ، ایک سال یا دو سال کی عمر تک سب فوت ہو جاتے تھے۔ میں جب مکہ میں پیدا ہوا تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس وقت مکہ مکرمہ میں ہی تھے۔ حاجی سلطان مرحوم تھے جو والد صاحب کے خصوصی عقیدت مند بھی تھے، مرید بھی تھے اور والد صاحب کی صحبت کی وجہ سے ہی اللہ نے ان کی بہت اصلاح فرمائی، آج ان کی اولاد بھی مکہ مکرمہ میں ہے۔ ماشاء اللہ! قاری عبد المالک صاحب ان کی اولاد میں سے ہیں، جو مسجد خیاط میں ہیں اور ان کی باقی اولاد مکہ کی اکثر مساجد میں خدمات سرانجام دے رہی ہے۔

جب میں پیدا ہوا تو انہوں نے آ کر خبر دی کہ آپ کا بچہ پیدا ہوا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: ٹھیک ہے، اس کو نہلا دھلا کر کپڑے میں لپیٹ کر لے آؤ۔ حاجی سلطان صاحب مجھے لے گئے تو والد صاحب نے مجھے "عتبۃ الباب" یعنی حبشیوں کے دروازے کی چوکھٹ پر رکھ دیا اور کھڑے کھڑے دعا مانگی: اے اللہ! اگر میرے بچے

کی عمر تھوڑی ہے تو اس کو ابھی لے لیں، میں بہت صدمہ سہہ چکا ہوں یا پھر آپ اس کو عمر طویل بھی عطا فرمائیں، اس کو علیم وحلیم بھی بنائیں اور اس کو اپنے گھر کا خادم بنائیں کہ جب یہ بڑا ہو تو آپ کے گھر میں بیٹھ کر پڑھائے۔

یہ دعائیں انہوں نے اس وقت کیں۔ پھر خود ہی اٹھا کر طواف کرایا اور تحنیک کی۔

ابتدائی تعلیم:

میری ابتدائی تعلیم مکہ مکرمہ میں ہوئی، میں نے قرآن پاک یہیں حفظ کیا۔ مدرسہ عثمانیہ ہوتا تھا جو اس وقت حرم شریف کی بالکل دیوار کی اندرونی جانب میں تھا، میں نے وہیں قرآن پاک حفظ کیا، پھر چونکہ والد صاحب پاکستان آگئے تو میں بھی پاکستان آگیا اور والد صاحب سے ساری کتابیں پڑھتا رہا۔

جب کتابوں کی تکمیل ہوگئی تو حضرت نے مجھے مدرسہ حضرت گمانیہ حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب گمانوی رحمہ اللہ کی خدمت میں بھیج دیا، جو حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ اور وہاں استاذ محترم مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ سے میں نے منطق اور دیگر علوم پڑھے اور حضرت گمانوی رحمہ اللہ سے فقہ اور حدیث پڑھی۔ پھر واپس اپنے مدرسے میں آگئے۔

والد صاحب کا طریقہ کار یہ رہا کہ ہر سال جب نئے سال درسِ حدیث شروع ہوتا تھا تو مجھے بھی وہ اس میں بٹھا دیتے تھے۔ مجھے دورہ حدیث والا سال بھی تین چار مرتبہ پڑھنے کا موقع ملا۔

شادی:

میری شادی تھوڑی عمر میں میری حقیقی چچا زاد سے ہوئی۔ ان سے اللہ نے ایک بیٹی لکھی تھی جو فوت ہوگئی اور ایک بیٹا دیا جس کا نام محمد عارف ہے، جو عرفات میں حج کے موقع پر پیدا ہوا تھا۔

اشتیاقِ علم:

1972ء میں جب والد صاحب کے مستقلاً بلانے پر میں سعودی عرب آیا تو ملک فیصل مرحوم کا زمانہ تھا، میں نے ان کو حضرت مفتی محمود رحمہ اللہ کے واسطے سے درخواست دی تھی تو انہوں نے مجھے مستقلاً فیملی سمیت اقامہ عطا فرمایا، میں اس اقامہ ملکی پر مستقل طور پر مکہ میں آگیا۔

میں چونکہ 1972ء میں پہنچ گیا تھا تو والد صاحب رحمہ اللہ کی زندگی میں ہی میں نے ان کے مقام پر بیٹھ کر پڑھانا شروع کر دیا۔ اور دروس کی ترتیب ہمیشہ یہی رہی کہ فجر کی نماز کے بعد عربی میں اور مغرب سے عشا تک

اردو میں درس ہوتا تھا۔ اور یہی ترتیب آج تک الحمد للہ! چلی آرہی ہے کہ صبح کے بعد درسِ حدیث اور تفسیر، مغرب کے بعد درسِ تفسیر ہوتا ہے۔ اور موسمِ حج میں درس ختم ہوجاتے ہیں، وعظ وارشاد اور دعوت وتبلیغ وغیرہ شروع ہوجاتے ہیں۔

کیا آپ کی یہ ملازمت حکومت کی تعیین ہے؟

نہیں! یہ ملازمت نہیں ہوتی، بلکہ تقریباً اس زمانے میں اشرف الدین مسجد الحرام حضرت شیخ عبداللہ بن حمید بہت بڑے سعودی عالم بھی تھے اور رئیس اشرف الدین بھی اور رئیس مجلس القراء الاعلیٰ بھی بنے۔ ان کے حکم سے ہمیں پڑھانے کی اجازت ملی۔ یہ نوکری نہیں ہوتی تھی۔ پھر بعد میں نئے نظام کے تحت بادشاہ کی طرف سے تقرر ہوا تو اس میں بھی الحمد للہ! میرا نام رکھا گیا۔

شیخ عبداللہ بن حمید رحمہ اللہ کی سفارش پر ہی مجھے شاہ فہد کی حکومت کے زمانے میں سعودی جنبیت سے نوازا گیا۔ یعنی اس میں چونکہ رباعی نام لکھے جاتے ہیں، اس لیے انہوں نے میرے نام سے مخفف ''محمد'' لیا اور والد صاحب کے نام سے ''خیر'' لیا اور دادا کے نام سے ''محمد'' اور پھر ''محمد خیر محمد حجازی'' لقب ہوگیا۔ یہ میرا سعودی نام ہے۔ اور میرا پہلا نام ''محمد مکی حجازی'' ہے جس کو لوگ جانتے ہیں۔

اساتذہ:

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ، مولانا حبیب اللہ گمانوی رحمہ اللہ اور دیگر علماء...... جو حرم شریف میں بڑے بڑے علماء ہوتے تھے...... کی خدمت میں بھی کبھی کبھی استفادہ کرتے تھے اور دروس میں بیٹھ جاتے تھے۔ اور سندِ حدیث میں نے مولانا عبدالحق ہاشمی صاحب جو دار الحدیث کے مؤسس ہیں اور مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ سے بھی اجازتِ حدیث لی، مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ جو لکھنو کے تھے جن کا نام بڑا مشہور ہے، جنہوں نے معارف الحدیث اور دیگر کئی کتابیں لکھی ہیں، ان سے میں نے اجازتِ حدیث لی ہے۔ حرم شریف کے علاوہ میں مدرسہ صولتیہ میں بھی حدیث کا سبق پڑھاتا رہا ہوں۔

تبلیغی اسفار:

جہاں تک اسفار کا تعلق ہے تو...... الحمد للہ!...... میں نے ہندوستان کے متعدد سفر کیے، جو مختلف علاقوں میں تھے اور جہاں اللہ نے قبولیتِ تامہ عطا فرمائی۔ اسی طرح یورپ وانگلینڈ کا سفر میں ہر سال کرتا رہا، تقریباً دس

مرتبہ گیا۔اسی طرح میں نے امریکہ کا سفر بھی پانچ چھ بار کیا ہے۔اسی طرح ناروے اور ساؤتھ افریقہ کا بھی میں نے مکمل دورہ کیا ہے۔ہانگ کانگ میں بھی تقریباً پانچ چھ بار گیا ہوں۔ پہلے میں تقریباً ہر سال جاتا تھا۔ایک مرتبہ امام حرم الشیخ محمد السبیل کے ساتھ بھی میرا دورہ ہوا اور ایک امام حرم شیخ عمر سبیل کے ساتھ بھی میرا ہانگ کانگ کا دورہ ہوا۔

دروس وخطبات کی اشاعت:

چونکہ دروسِ حرم ریکارڈ ہوتے رہے، اسی سے اللہ نے یہ مہربانی کی کہ مختلف کتابیں بھی شائع ہونی شروع ہوگئیں:

- ...... ''دروسِ حرم'' کی چار جلدیں شائع ہوئیں۔
- ......اس کے بعد ''قصص الانبیاء'' دو جلدوں میں شائع ہوئی۔
- ...... ''منہاج المسلم'' بھی دو جلدوں میں شائع ہوئی۔
- ......اور ''خطباتِ مکی'' کے نام سے چار جلدیں شائع ہوئیں۔
- ...... ''اسلام میں عورت کا مقام'' بھی دو جلدوں میں شائع ہوئی۔
- ......اسی طرح ''ازواج النبی ﷺ'' ہے، وہ بھی شائع ہوگئی۔
- ......اور ''تفسیرِ مکی'' سورت فاتحہ پر پر میرے حرم کے دروس ہیں جن کو آپ نے ترتیب دیا ہے۔اور اس کے بعد ''تفسیرِ مکی'' کا ......ان شاءاللہ! ......مکمل قرآن پاک کا سلسلہ پیش کیا جائے گا۔

دعا کریں اللہ اس محنت کو اخلاص کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچائے اور تفسیر کو مکمل کرنے کے لیے وسائل بھی عطا فرمائے اور ہمیں ہمت بھی عطا فرمائے کہ ہم زیادہ سے زیادہ کام کرسکیں۔

پہلا حج:

پہلا حج بچپن میں کیا تھا، تقریباً سات آٹھ سال کی عمر میں۔ پھر اب ......الحمدللہ! ......1973ء سے ہر سال حج کرتا ہوں۔

تلامذہ:

تلامذہ میں عرب کے حضرات بھی ہیں، انڈونیشیا کے بھی، ملائشیا وغیرہ کے بھی ہیں جو مستقل طور پر حدیث اور تفسیر کی کتابوں کے دروس میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح برونائی کے بھی ہوتے ہیں، نائجیریا کے بھی ہوتے ہیں اور سوڈان کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں اور ہمارے درسوں میں آ کر شریک ہوتے ہیں۔

مستقل عنوانات پر خطابات:

ساری زندگی ہمارا بیان ہمیشہ توحید اور رد بدعات پر ہوتا ہے۔ تدریس میں بخاری شریف حرم میں پڑھائی اور سنن نسائی، سنن ابی داؤد بھی مجھے پڑھانے کا موقع ملا۔ اور تفاسیر میں مجھے تفسیر ابن کثیر، تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی اور تفسیر نسفی پڑھانے کا موقع ملا۔

شحل تمزو کا مدرسہ:

شحل تمزو کا مدرسہ حضرت والد صاحب نے بنایا تھا، ان کے زمانے میں بھی وہاں تین چار سو طالب علم پڑھتے تھے۔ پھر جب والد صاحب چھوڑ کر یہاں آ گئے تو میں وہاں اکیلا رہ گیا تو ہم نے بھی اس کو جاری رکھا۔ الحمد للہ! اب بھی وہ مدرسہ قائم و دائم ہے، اس میں دو اڑھائی سو طلبہ بھی ہیں اور اساتذہ بھی ہیں۔ شعبہ کتب بھی ہے اور ساتھ میں ہم نے دار الشفاء کے نام سے فری ڈسپنسری بھی بنائی ہے، جہاں مفت علاج ہوتا ہے، اور ایک ایمبولینس بھی رکھی ہے۔ جس مریض کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو اس کو کسی ہسپتال میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

فتنوں کی سرکوبی:

سب سے زیادہ فتنہ قادیانیت اور اس کے بعد فتنہ بدعات اور رافضیت کے خلاف میری تمام زندگی کا پیشہ ہے اور اس سے بے شمار لوگوں کو فائدہ ہوا ہے۔ اللہ نے اس کو پوری دنیا میں پہنچایا بھی ہے۔

اور اس کے بارے میں ایک رؤیا مبارکہ بھی ہے کہ ایک شخص نے کعبہ میں آ کر بتایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ حضور ﷺ تشریف فرما ہیں، خلفائے راشدین بھی تشریف فرما ہیں اور بھی بہت سارے علماء، صلحاء اور اولیاء کا مجمع ہے۔ ایک آدمی آپ کی ''سیرت النبی'' کا البم حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرتا ہے کہ یہ محمد مکی

حجازی ہے، جس نے آپ کی سیرت پر تقاریر جمع کی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! میں جانتا ہوں، اس کو پوری دنیا میں عام کردو۔ اس نے کہا: میں نے خواب دیکھنے کے بعد اپنی زندگی کا یہ مشن بنالیا ہے کہ سیرت النبی ﷺ کے البم بنابنا کر تقسیم کر رہا ہوں۔

یہ کراچی کے آدمی ہیں، کئی سال ہو گئے ہیں، انہوں نے اتنا کام کیا کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ پتا نہیں یہ خواب کے اثرات ہیں کہ مجھے اور کئی ساتھیوں نے بتایا کہ ہم مستقل کام کر رہے ہیں۔

اسی طرح نیویارک کے ایک اور شخص ہیں جن کا نام محمد شفاقت ہے وہ مجھے پچھلے سال ایک دعوت میں ملے تو ان سے تعارف ہوا۔ دوستوں نے مجھے بتایا کہ یہ شخص جو آپ سے آج ملنے آیا ہے آپ اس کو نہیں جانتے، لیکن یہ صرف امریکہ میں ایک لاکھ کی تعداد میں آپ کے سیرت النبی ﷺ کے اور دوسرے البم تقسیم کر چکا ہے۔ اس نے مشین لگائی ہے، خود ریکارڈ کرتا ہے اور خود تقسیم کرتا ہے۔

الحمدللہ! اس سے لوگوں کی اصلاح ہو رہی ہے اور لوگوں کو فائدہ ہو رہا ہے۔ الحمدللہ! دنیا کے کونے کونے سے فون آتے ہیں کہ ہم نے آپ کی سیرت النبی ﷺ کی کیسٹ سنی تو اللہ نے ہماری زندگی بدل دی۔ ایسے کئی واقعات ہیں۔

ہمارے بریلوی حضرات کی شرارت کی وجہ سے ایک مرتبہ میرا حرم میں درس بند ہوا تو حرمین کے مشائخ نے کہا: پاکستان کے بریلویوں کو تکلیف ہے، ہمیں تو کوئی تکلیف نہیں ہے، لہٰذا انہوں نے کہا: شیخ! اردو میں درس نہ دیں، بلکہ صرف عربی میں دیں۔ تو میں صبح بھی عربی میں درس دیتا تھا اور شام کو بھی عربی میں درس دیتا تھا۔ تقریباً کوئی چھ ماہ یہ مسئلہ چلا، اس کے بعد مولانا دوست محمد قریشی رحمہ اللہ کوٹ ادو والے میرے پاس آئے ہوئے تھے، وہ عمرے پر تشریف لائے تھے اور حج کا ارادہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا: آج ایک بزرگ بیٹھے تھے اور بڑے درد سے کہہ رہے تھے کہ یار! لوگوں کے عقیدے صحیح ہو رہے تھے، لوگ شرک و بدعات سے نکل رہے تھے، یہ کتنا بڑا ظلم کیا کہ اس اردو میں بیان کو بند کروا دیا ہے۔ وہ درد کا اظہار بھی کر رہے تھے اور دعا بھی کر رہے تھے۔ دوسرے دن جب صبح کا درس دے کر ہم واپس آرہے تھے تو مولانا صاحب نے مجھے بتایا کہ آج مجھے وہی بزرگ ملے تھے، میں بھی طواف کر کے آرہا تھا، وہ بھی طواف کر کے آرہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا: مکی صاحب کو میرا سلام بھی کہہ دینا اور کہنا کہ آج میں نے بھی جا کر اللہ تبارک وتعالیٰ کی خدمت میں درخواست کر دی ہے، ان شاء اللہ

آپ کا اردو والا درس بہت جلد شروع ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

اسی دن شام کو شیخ طٰہٰ عبدالواسع البرکاتی رحمۃ اللہ علیہ...... جو ہمارے حرم میں تمام مدرسین کے بڑے تھے...... نے مجھے بلایا۔ میں گیا، میں نے کہا: کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا: آپ نے اب شام کو اردو میں درس دینا ہے۔ میں نے کہا: حضرت! اب تو چھ ماہ گذر گئے، اب تو میرے پاس شام کو بھی عربی والے آتے ہیں، اردو والے تو آتے نہیں۔ انہوں نے کہا: آئیں یا نہ آئیں، لیکن آپ نے اردو میں درس دینا ہے، باقی میں آپ کو عشا کے بعد بتاؤں گا۔ خیر! میں نے اردو میں آغاز کیا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ آج ہم دفتر میں بیٹھے تھے کہ بادشاہ شاہ فہد نے خود فون کر کے پوچھا: مکی صاحب کا درس اردو میں کس نے بند کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہم نے نہیں کیا۔ وہ اپنی مرضی سے ایسا کر رہے ہوں گے۔ تو شاہ فہد نے کہا: ان کا درس اردو میں فوراً شروع کروائیں اور مجھے مطلع کریں۔ اس لیے ہم نے آپ سے کہا کہ آج ہی شروع کر دو۔

پھر اس بزرگ کو ہم سارے حرم میں ڈھونڈتے رہ گئے، لیکن وہ نہیں ملے۔

رُباطِ مکی:

اسی طرح مدینہ منورہ میں جو "رُباط" والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بنائی تھی...... الحمد للہ!...... وہ قائم و دائم رہی اور آج بھی قائم و دائم ہے۔

ایک مرتبہ علامہ ارشد کے بھائی ایڈیٹر کائنات ولی اللہ اوحد جو بہاولپور کے تھے وہ اسی رباط میں رہے۔ بعد میں انہوں نے اس پر بڑا فیوچر بھی لکھا تھا اور اس کے فوٹو بھی لیے تھے۔ لکھا تھا کہ یہاں جتنی بھی رباطیں بنائی گئیں ان میں سے نوابوں کی رباطیں تو ختم ہو گئیں، لیکن فقیر کی رباط ابھی تک قائم و دائم ہے، اور باقاعدہ لنگر بھی چل رہا ہے۔

معمولاتِ یومیہ:

معمولاتِ یومیہ یہی ہیں کہ صبح عربی میں درس ہوتا ہے، مغرب کے بعد اردو میں درس ہوتا ہے۔

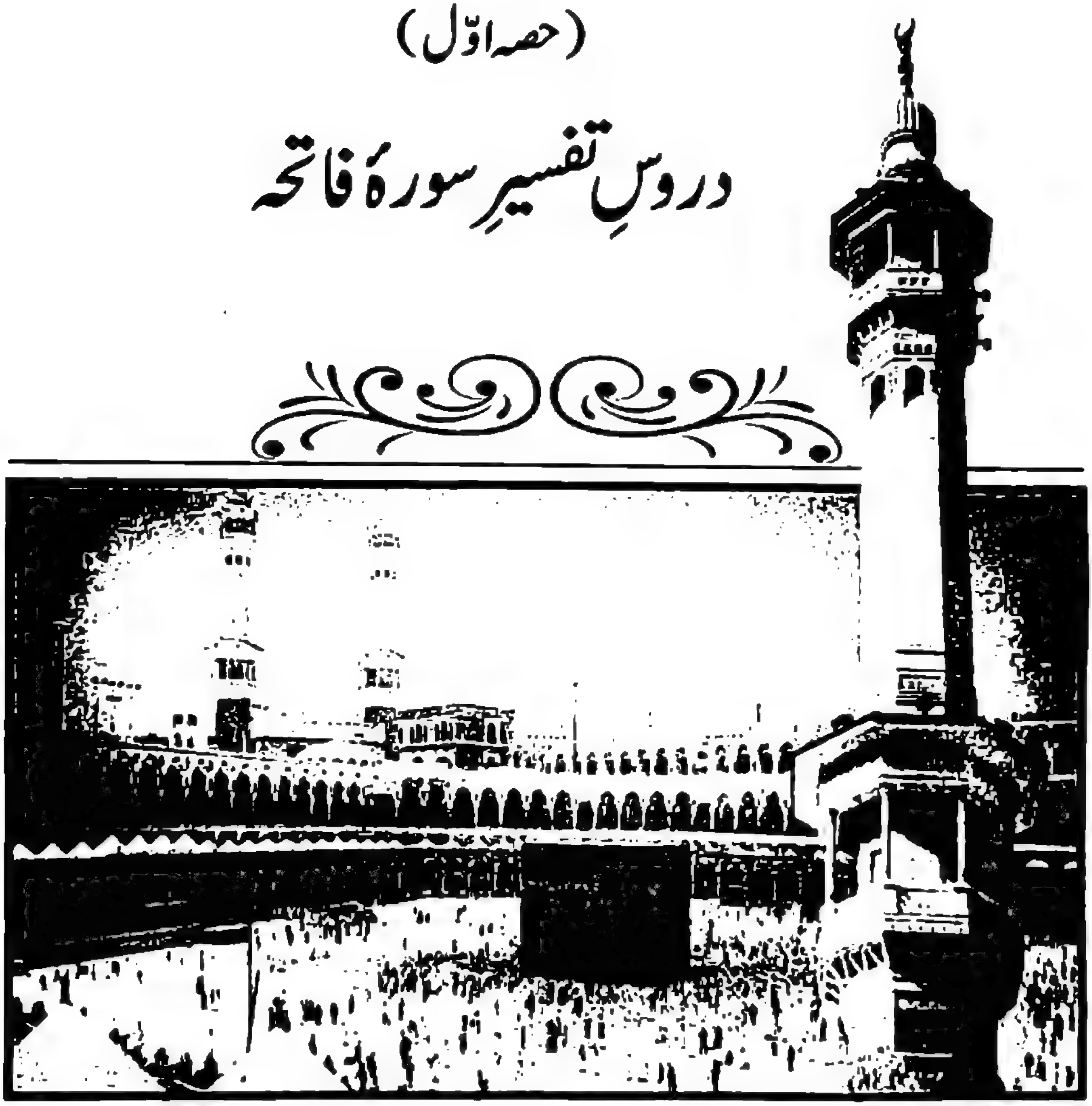
اولاد:

میرا ایک ہی بیٹا ہے محمد عارف۔ اس کو اللہ نے تین بیٹے دیے ہیں: ایک مصر میں ڈاکٹر ہے، ایک اور ڈاکٹر ہے جو ابھی امریکہ میں پڑھ رہا ہے اور ایک چھوٹا ہے وہ ابھی زیرِ تعلیم ہے۔

تفسیرِ انوارالحرم

(حصہ اوّل)

دروسِ تفسیرِ سورۂ فاتحہ



سُورَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ① الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ② مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ③ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ④ اِهْدِنَا
الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑤ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑦﴾

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا (ہے)۔ سب تعریفیں اللہ ہی کو لائق ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ جو مالک ہیں روز جزا کے۔ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں۔ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔ ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں۔''

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى عَبْدِهٖ وَرَسُوْلِهٖ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ. الْمُرْسَلِيْنَ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ وَحُجَّةً عَلَى الْعِبَادِ اَجْمَعِيْنَ وَعَلٰى اٰلِ بَيْتِهِ الْاَطْهَارِ وَاَصْحَابِهِ السَّادَةِ الْاَبْرَارِ وَاَزْوَاجِهٖ الطَّاهِرَاتِ الطَّيِّبَاتِ وَعَلٰى مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِهٖ وَسَارَ عَلٰى نَهْجِهٖ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنَ.

اَمَّابَعْدُ!

الحمدللہ! آج ہم اس مسجد میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر کی ابتداء کر رہے ہیں۔ اور ہر نماز کے اندر سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔

تلاوت کے شروع میں ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ'' پڑھنا:

قرآن پاک کی تعلیم کے بارے میں حکم ہے کہ جب بھی قرآن کو پڑھنے لگیں تو سب سے پہلے ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ○ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھیں۔ تعوذ کا معنی کیا ہے؟ تعوذ (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ) کا معنی یہ ہے کہ میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں شیطان مردود سے۔

قرآن کی تلاوت سے پہلے تعوذ کیوں؟

ہر چیز کی ابتداء میں ''بِسْمِ اللّٰهِ'' پڑھنے کا حکم ہے۔ فرمایا:

((كُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيهِ بِبِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ أَقْطَعُ)) [الجامع الصغیر، حدیث: ۶۲۸۴]

''ہر کام جو شان والا ہو، اس کو ''بِسْمِ اللهِ'' سے شروع نہ کیا جائے تو وہ بے برکت ہوتا ہے۔''

اسی لیے ہر کام میں ''بِسْمِ اللهِ'' پڑھنی چاہیے۔ پانی پئیں گے تو ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، کھانا کھائیں گے تو ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، کپڑا پہنیں گے تو ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، کسی گھر میں داخل ہوں گے تو ''بِسْمِ اللهِ وَلَجْنَا...''۔ غرض! ہر کام کے شروع میں ''بِسْمِ اللهِ'' کا حکم ہے۔ لیکن قرآن پاک کی تعلیم میں حکم یہ ہے کہ پہلے ''اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھیں گے۔ تو یہاں پہلے تعوذ کا حکم ہے۔ حالانکہ کسی اور کام کے شروع میں ہمیں تعوذ پڑھنے کا حکم نہیں ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب:

سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ حکم اللہ نے دیا ہے۔ اور مومن کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝﴾ [النحل: ۹۸]

''جب تم قرآن پاک کی تلاوت کرو تو تم اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑو۔''

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳، تَفْسِيْرُ الْإِسْتِعَاذَةِ وَ أَحْكَامُهَا]

''إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ'' کا معنی:

﴿إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ﴾ کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ جب تم قرآن پڑھ چکو تو ''اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھو، بلکہ اس کا معنی یہ ہے: ''إِذَا أَرَدْتَّ قِرَاءَةَ الْقُرْاٰنِ'' کہ جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو پہلے ''اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھو۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ﴾ [المائدۃ: ۶]

''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ دھو لو اور اپنے ہاتھ کہنیوں سمیت اور اپنے سر کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں سمیت دھوؤ۔''

یعنی "جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو۔" اس کا معنی یہ نہیں کہ جب نماز میں ہو تو صف کے اندر ہاتھ منہ دھونا شروع کر دو، بلکہ معنی یہ ہے کہ جب تم نماز کے ارادہ سے اٹھو تو پہلے وضو کرو، کیونکہ وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہاں معنی یہی ہے کہ جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو ﴿فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ یعنی اللہ کی پناہ پکڑو۔ کیونکہ اللہ کا حکم ہے: ﴿فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾۔ اور اسی لیے علامہ ابنِ جریر رحمہ اللہ اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کی ابتداء بھی "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" کے ساتھ کی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا کہ جب ہم قرآن کی تفسیر لکھ رہے ہیں اور قرآن پڑھنے کی ابتداء بھی "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ" کے ساتھ ہے، لہٰذا ہم تفسیر بھی اسی کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔ جبکہ باقی مفسرین نے اپنی تفسیر کی ابتداء "بِسْمِ اللّٰهِ" کے ساتھ کی ہے، کیونکہ جو بھی عظیم الشان کام ہو اس کی ابتداء "بِسْمِ اللّٰهِ" سے کرنی چاہیے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳، تَفْسِیْرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَ اَحْکَامُهَا]

"اَعُوْذُ" کا معنی کیا ہے؟

"اَعُوْذُ" کا معنی ہے: پناہ پکڑنا۔ اس کا مصدر "اَلْعَوْذُ" ہے۔ اس کے مقابلے میں لفظ "اَللَّوْذُ" ہے۔ اور ان دونوں میں فرق ہے:

- "اَلْعَوْذُ" کا معنی ہے "اَلْاِلْتِجَاءُ لِدَفْعِ الْمَضَرَّةِ" (اللہ سے التجاء کرنا کہ یا اللہ! ہمیں نقصان اور مصیبت سے بچا لیجیے)۔
- اور "اَللَّوْذُ" کا معنی ہوتا ہے: "اَلْاِلْتِجَاءُ لِجَلْبِ الْمَنْفَعَةِ" (اللہ سے دعا کرنا کہ یا اللہ! یہ نعمت مجھے حاصل ہو جائے)۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۵، تَفْسِیْرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَ اَحْکَامُهَا]

"تَعَوُّذ" میں چار چیزیں ہیں:

جہاں بھی لفظ "اَعُوْذُ" یا "تَعَوُّذ" آئے گا وہاں پانچ چیزیں ضروری ہیں، ان کے بغیر مسئلہ حل ہی نہیں ہوتا۔ 1 ...... ایک "اَلْاِسْتِعَاذَة" ہوتا ہے، 2 ...... ایک "مُسْتَعِیْذ" ہوتا ہے، 3 ...... ایک "مُسْتَعَاذ مِنْهُ"، 4 ...... ایک "مُسْتَعَاذ بِهٖ" 5 ...... اور ایک "مُسْتَعَاذ لَهٗ" ہوتا ہے۔ ان پانچ چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے بغیر "تَعَوُّذ" بنتا ہی نہیں۔

[تفسیر الرازی: ۱/ ۷۰، اَلْبَابُ الثَّانِي فِي الْمَبَاحِثِ الْعَقْلِيَّةِ...]

جیسے تشبیہ میں پانچ چیزیں ہوتی ہیں: تشبیہ، مشبہ، مشبہ بہ، وجہ تشبیہ اور آلہ تشبیہ۔ جب تک یہ پانچ چیزیں نہ ہوں تب تک تشبیہ ہی نہیں بنے گی۔ اس کی ایک مثال سمجھیں کہ "زَيْدٌ كَالْأَسَدِ" (زید ایسے ہے جیسے شیر)۔ اب اس میں زید کو شیر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، زید مشبہ ہے، جس کے ساتھ تشبیہ دے رہے ہیں وہ مشبہ بہ ہے، آلہ تشبیہ حرفِ کاف ہے اور وجہِ تشبیہ شجاعت اور بہادری ہے۔ کہ جس طرح شیر بہادر ہے اسی طرح زید بھی بہادر ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ حیوان ہے۔ جب تک یہ پانچ چیزیں نہیں ہوں گی تو تشبیہ مکمل نہیں ہوگی۔

درود میں تشبیہ کا مسئلہ:

اللہ کی شان! یہ تشبیہ کے مسائل بڑے مشکل ہیں۔ آپ روزانہ نماز کے اندر درود شریف پڑھتے ہیں:

"اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ، اللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ."

"اے اللہ! تو محمد ﷺ اور ان کی آل پر درود بھیج، جس طرح تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم علیہ السلام پر درود بھیجا۔ اے اللہ! تو محمد ﷺ اور ان کی آل پر برکت نازل فرما، جس طرح تو نے ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل پر برکت نازل فرمائی۔ بے شک تو تعریف والا، بزرگی والا ہے۔"

تو اب مشبہ حضور ﷺ ہیں اور مشبہ بہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور قاعدہ وضابطہ ہے کہ مشبہ بہ مشبہ سے افضل ہوتا ہے۔ تو اس کا معنی تو یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام افضل ہیں، حالانکہ حضور ﷺ تو سب سے افضل ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا اشکال ہے کہ حضور ﷺ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دے رہے ہیں، حالانکہ حضور ﷺ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے افضل ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے بھی افضل ہیں، حتیٰ کہ آپ ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [صحیح مسلم، حدیث: ۲۲۷۸، باب: تَفْضِيلِ نَبِيِّنَا ﷺ عَلَى جَمِيعِ...]

"میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا قیامت کے دن۔"

اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِيٍّ يَوْمَئِذٍ آدَمَ فَمَنْ سِوَاهُ إِلَّا تَحْتَ لِوَائِي.))

''قیامت کے دن ابا آدم علیہ السلام بھی میرے پرچم کے نیچے ہوں گے اور تمام انبیاء علیہم السلام بھی میرے پرچم کے نیچے ہوں گے۔'' [سنن الترمذی، حدیث: ۳۱۴۸، باب: وَمِنْ سُورَةِ بَنِي إِسْرَائِيلَ]

اشکال:

تو اب ''كَمَا صَلَّيْتَ'' کے اندر اشکال ہوتا ہے کہ تشبیہ تو افضل سے ہونی چاہیے؟

جواب 1

علماء نے اس مسئلہ پر چار چار سو صفحات کی کتابیں لکھی ہیں اور تین سو ساٹھ (360) جوابات دیے ہیں۔ آپ سب سے آسان اور بڑی بات یاد رکھیں کہ تشبیہ صرف صلوٰۃ (رحمتیں نازل کرنے) کے اندر ہے، تمام اوصاف کے اندر تشبیہ مراد نہیں ہے کہ جس طرح ان پر صلوٰۃ بھیجی ہے، آپ حضور ﷺ پر بھی صلوٰۃ (رحمتیں) بھیجیں۔

جواب 2

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ تشبیہ ہمیشہ افضل کے ساتھ نہیں ہوتی، بلکہ کبھی مفضول کے ساتھ بھی ہوتی ہے۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

﴿مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۖ﴾ [النور: ۳۵]

''اس کے نور کی مثال کچھ یوں ہے جیسے ایک طاق ہو جس میں چراغ رکھا ہو۔''

اب کہاں اللہ کا نور اور کہاں وہ دیا اور چراغ جو ایک طاقچے میں رکھا ہوا ہو!!؟ اس کا اللہ کے نور کے ساتھ تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ پھر بھی اللہ نے اپنے نور کو طاقچے کے چراغ کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

جواب 3

بعض علماء کہتے ہیں: یہاں کاف تشبیہ کے لیے نہیں ہے، کاف تعلیل کے لیے ہے۔ یعنی اے اللہ! آپ حضور ﷺ پر ویسے رحمت بھیجیں جس طرح آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر رحمت بھیجی۔

''تَعَوُّذ'' میں پانچ چیزوں کی تفصیل:

اسی طرح جہاں ''تَعَوُّذ'' ہوگا وہاں پانچ چیزیں ہوں گی: (۱)...... ''اَلْاِسْتِعَاذَة'' (پناہ مانگنا) (۲)......

''مُسْتَعِیْذ'' (پناہ مانگنے والا)، 3 ......''مُسْتَعَاذ بِہٖ'' (جس کے ساتھ پناہ پکڑی جائے)، 4 ......''مُسْتَعَاذ مِنْہُ'' (جس سے پناہ پکڑی جائے)، 5 ......اور ''مُسْتَعَاذ لَہٗ'' (جس کی وجہ سے پناہ پکڑی جائے)۔

تو جب ہم نے ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' پڑھا تو اس کا پڑھنا ''اَلْاِسْتِعَاذَۃ'' ہے، اس میں ''مُسْتَعِیْذ'' (پناہ پکڑنے والا) انسان ہے، ''مُسْتَعَاذ بِہٖ'' (جس کے ساتھ پناہ پکڑی جائے) اللہ تعالیٰ ہے، ''مُسْتَعَاذ مِنْہُ'' (جس سے پناہ پکڑی جائے) شیطان ہے اور ''مُسْتَعَاذ لَہٗ'' (جس کی وجہ سے پناہ پکڑی جائے) شیطان کی عداوت ہے۔ اس لیے جس وقت بھی ''تَعَوُّذ'' پڑھیں تو ذہن میں رکھیں کہ ہم پناہ پکڑ رہے ہیں ''بِاللّٰہِ'' اللہ کے نام کے ساتھ۔ کیونکہ پناہ اس وقت لی جاتی ہے جب دشمن طاقتور ہو، چونکہ شیطان قوی دشمن تھا تو ہم نے اس سے قوی تر یعنی اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑ لی۔ [تفسیر الرازی: ۱/ ۷۰، اَلْبَابُ الثَّانِي فِي الْمَبَاحِثِ الْعَقْلِيَّةِ...]

''تَعَوُّذ'' کو مقدم کیوں کیا؟

اب رہا ہمارا سابقہ اشکال کہ ''تَعَوُّذ'' کو مقدم کیوں کیا؟ وجہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہے دفعِ مضرت (نقصان کو دور کرنا) اور ایک ہے جلبِ منفعت (فائدہ حاصل کرنا)۔ یوں سمجھیں کہ ایک مریض آتا ہے تو پہلی چیز اس کی بیماری کو دور کرنا ہے۔ یہ دفعِ مضرت ہے۔ اب اس بیماری کے بعد کمزوری بھی ہے تو اس کی دوا بعد میں دیتے ہیں۔ اور بیماری کی دوا پہلے دیتے ہیں۔ تو دفعِ مضرت مقدم ہے جلبِ منفعت سے۔

اسی طرح ایک تاجر نے ایک لاکھ ریال کا مال لیا، تو سب سے پہلے وہ دفعِ مضرت کی کوشش کرے گا کہ میرا رأس المال تو محفوظ ہو، بعد میں سوچے گا کہ نفع آئے۔

اور کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ منفعت تو قلیل ہے، لیکن مضرت کثیر ہے۔ مثلاً: ایک آدمی دوکاندار کے پاس چار پانچ سو کا سامان لینے کے لیے آیا تو اس دوکاندار کو کسی نے آکر کہا کہ تمہارے گھر کو آگ لگ گئی ہے۔ تو اب وہ فوراً گھر کی طرف دوڑے گا، کیونکہ گاہک کو سامان دینے میں نفع کم ہے اور گھر کو آگ لگنے میں مضرتیں زیادہ ہیں۔ یہاں بھی پہلے مضرت کا علاج کیا جائے گا اور منفعت بعد میں حاصل کی جائے گی۔ تو قرآن میں بھی دفعِ مضرت مقدم ہے کہ پہلے ہم شیطان اور اس کے وساوس سے تو بچیں۔ جب ہم اس سے ہی نہیں بچیں گے تو ہمیں قرآن پاک نے حاصل ہی کیا ہوگا؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ''تَعَوُّذ'' کو ہر چیز سے مقدم کر دیا۔

''تَعَوُّذ'' کا صیغہ مفرد کیوں؟

''اَعُوْذُ'' کا صیغہ مفرد کیوں آیا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ پورے قرآن کے اندر، بلکہ آپ دیکھیں کہ اسی سورۂ فاتحہ کے اندر بھی دعا کے جتنے صیغے آئے ہیں وہ جمع کے ہیں۔ مثلاً:

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾[الفاتحہ:۴]

''(اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾[الفاتحہ:۵]

''ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔''

جواب:

علماء نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ شیطان کی مضرتیں اور وساوس اتنی زیادہ ہیں کہ ہر آدمی الگ الگ اس سے پناہ مانگے، کیونکہ اس کے مقابلے میں جماعت اور فرد کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

پہلی مثال:

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ ''اَعُوْذُ بِاللهِ'' میں جو پناہ پکڑی گئی ہے وہ اسمِ ذات کے ساتھ ہے، کیونکہ باقی اسماء مثلاً: ''اَلرَّحْمٰنُ''، ''اَلرَّحِیْمُ'' اسمائے صفات ہیں۔ اس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ دنیا میں قاعدہ ہے کہ ہر وہ چیز جس میں مضرت ہو اس میں تھوڑا سا نفع بھی ہوتا ہے۔ جیسے ایک زہر ہے، جس کا عربی میں نام ''سم الفار'' اور ہندی میں سنکھیا ہے۔ اور یہ اتنا شدید زہر ہے کہ اگر کوئی سوئی کے ناکہ کے برابر بھی اس کو کھالے تو فوراً مر جائے، لیکن پھر بھی بعض لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں۔ کئی ایسے بوڑھے بھی دیکھے تھے جن کی آنکھیں اور صحت اچھی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ سنکھیا زہر استعمال کرتے تھے، حالانکہ وہ زہر ہے۔

تو مطلب یہ ہے کہ یہ زہر جیسے نقصان دہ ہے ویسے ہی یہ صحت کے لیے، اعصاب کے لیے مفید بھی ہے اور انسان کی کمزوریوں کا علاج بھی ہے۔ جو اس کو استعمال کر کے ہضم کر گئے وہ ہر بیماری سے بچ گئے۔ میری یہ بات پڑھ کر کوئی اس کو استعمال نہ کرے، کیونکہ طبیب تو اس کے زہر کو ختم کرا کے اپنی نگرانی میں استعمال کراتے ہیں۔ اور ہم تو یہ معلوم بھی نہیں کر سکتے کہ یہ سنکھیا ہے یا نہیں؟ خالص ہے یا نہیں؟ انسانی استعمال کے لیے ہے یا نہیں؟ یہ بڑی

خطرناک چیز ہے۔ اللہ معاف کرے بعض لوگوں کو عادت بھی ہو جاتی ہے۔ میرے پڑوس میں دو بھائی تھے۔ ان کے سرخ چہرے تھے، حالانکہ غریب تھے، کپڑوں کو رنگ دیتے تھے، وہ سنکھیا کو منہ میں ڈال لیتے تھے، ہمارے سامنے توڑ توڑ کر کھاتے تھے، کہتے تھے: اب عادت پڑ گئی ہے۔ جیسے لوگ شراب کے عادی ہو جاتے ہیں، نشہ کے عادی ہو جاتے ہیں، سگریٹوں کے عادی ہو جاتے ہیں، نہ پینے والوں کے کمرے کے اندر سگریٹ پی لیں تو وہ آدمی کمرے میں تین دن داخل بھی نہ ہو سکے، کیونکہ اس کے اثرات تین دن تک رہتے ہیں، حالانکہ پینے والے کو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات پورے کمرے میں اتنا دھواں ہوتا ہے جیسے پرانے زمانے میں ریل کے انجن ہوتے تھے، ویسے پورا کمرہ معلوم ہوتا ہے۔

دوسری مثال:

اور اسی طرح سانپ کو دیکھیں کہ اللہ نے اس کے اندر کتنا زہر رکھا ہے! لیکن اللہ کی شان کہ اس کے سر میں منکا ہے وہ زہر کا تریاق، زہر کو توڑنے والا ہے اور انتہائی مفرح قلب، دل کو سکون دینے والی چیز ہے۔ اب یہ نہ کرنا کہ سانپ پکڑنے لگیں اور سانپ ڈس جائے اور آپ کہیں کہ مولانا کی صاحب نے کہا تھا۔ وہ سانپ کونسا ہے جس کے سر میں وہ منکا ہوتا ہے یہ ہمیں پتا نہیں ہے، کیونکہ سانپوں کی تو ہزاروں قسمیں ہیں۔

تیسری مثال:

اور دیکھیں! آگ جلا دیتی ہے، لیکن اگر آگ نہ ہو تو کھانا کیسے پکے؟ گاڑیاں کیسے چلیں؟ سردیوں کے اندر دن کیسے کٹیں؟ تو معلوم ہوا کہ ہر نقصان والی چیز کے اندر کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور ہے۔

شیطان کی مضرت:

لیکن شیطان منحوس بد بخت ایسا ہے کہ اس کے اندر مضرت ہی مضرت ہے، منفعت تو اس کے اندر ہے ہی نہیں۔ دنیا میں آپ کا کوئی دشمن ہوتا ہے تو آپ اس کی وجہ سے الرٹ ہو جاتے ہیں، ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ اس دشمن کا کوئی نہ کوئی تو فائدہ ہوا کہ آپ ہوشیار ہو گئے۔ اور آپ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ سے ذرا سی غفلت ہوئی تو نقصان کا خطرہ ہے۔ ہر دشمن کی دشمنی میں اور ہر ضرر والی چیز کے ضرر کے ساتھ منفعت بھی ہوتی ہے، لیکن ایک شیطان بد بخت ہے جس میں ضرر ہی ضرر ہے، فائدہ تو ہے ہی نہیں۔ اور شیطان کی مضرت کاملہ اور مطلقہ ہے کہ کامل بھی ہے اور ہر لحاظ

سے بھی ہے۔اس لیے ہم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اس سے پناہ پکڑتے ہیں۔

علماء فرماتے ہیں: ایک مضرت ثوبی ہے کہ کپڑے وغیرہ پھٹ گئے، ایک مضرت جسمی ہے کہ ٹانگ وغیرہ ٹوٹ گئی اور ایک مضرت روحی ہے اور روح ایمان ہے۔ اگر ایمان نہیں ہوگا تو بندہ مردہ ہوگا۔تو شیطان کی مضرت روح الروح ہے کہ وہ انسان کی ایمانیات پر حملہ کرتا ہے اور انسان کو جہنم کا حق دار بنا دیتا ہے۔اس لیے اتنے بڑے دشمن کے مقابلے میں ہمیں اللہ سے پناہ پکڑنی تھی، کیونکہ شیطان کے شر سے بچانے والی اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی اور چیز تھی ہی نہیں۔

حضرت عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا واقعہ:

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''تلبیسِ ابلیس'' (جس کے اندر انہوں نے شیطانی حملوں کے بارے میں لکھا ہے۔اس کو پڑھنا چاہیے۔اس کتاب) میں لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ رات کے وقت بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہے تھے کہ یکدم روشنی ہوگئی اور آواز آئی کہ اے عبدالقادر! ہم آپ سے خوش ہیں۔جاؤ ہم نے آپ سے تمام شریعت اور عبادت معاف کردی ہے۔ جب یہ آواز آئی تو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے فوراً کہا: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' تو شیطان بھاگا اور ظاہر بھی کر دیا کہ میں شیطان تھا۔تو عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے فرمایا: تم مجھے گمراہ کرنا چاہتے تھے؟ شیطان نے کہا کہ اس طریقے سے تو میں نے کئی عابدوں کی گردنیں توڑ ڈالیں، لیکن تم عالم بھی تھے، لہٰذا تمہارے علم نے تمہیں بچالیا۔تو عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' پڑھا اور فرمایا: بدبخت! مجھے میرے علم نے نہیں بچایا، میرے اللہ نے بچایا ہے۔تم مجھے دھوکا دے رہے ہو۔تو شیطان نے کہا: میرے پاس ستر ہزار نورانی جال ہیں، میں لوگوں کو ان میں پھنساتا ہوں۔عالم کو علم کی مار دیتا ہوں، عابد کو عبادت کی مار دیتا ہوں اور متقی کو تقویٰ کی مار دیتا ہوں، لیکن اللہ نے آپ کو بچانا تھا تو آپ میرے حملے سے بچ گئے ہیں۔

تنبیہ:

یہی وجہ ہے کہ ہمارے بعض لوگ صوفی بننا چاہتے ہیں اور بغیر کسی علم کے وہ عبادت و ریاضت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔تو صاف ظاہر ہے کہ اس کے اثرات تو ہوں گے۔ دیکھو! اگر آپ آگ کے ساتھ بیٹھو گے تو آپ کا جسم گرم ہوگا اور اگر آپ اے سی کے ساتھ بیٹھو گے تو آپ کا بدن ٹھنڈا ہوگا، اسی طرح جب آپ اہل اللہ کے ساتھ بیٹھیں گے تو اللہ

کے ذکر کی برکات تو آئیں گی، لیکن چونکہ علم نہیں ہوتا تو ایسے لوگوں کو شیطان ایک منٹ میں بھٹکا دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بجائے دین پر رہنے کے اسلام سے بھی نکل جاتا ہے۔ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو بالکل آسمان کے قریب پہنچ گئے اور وہ اڑنا شروع کر دیتے ہیں، پھر وہ بھٹک بھی سکتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے اللہ کی پناہ پکڑی۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ شیطان ہمیں دیکھ سکتا ہے اور ہم شیطان کو نہیں دیکھ سکتے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّهُ يَرَىٰكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ [الاعراف: ۲۷] (وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھ سکتے ہیں، لیکن تم ان کو نہیں دیکھ سکتے)۔ اب جو دشمن نظر نہ آئے وہ تو بڑا خطرناک ہوتا ہے، کیونکہ نظر آنے والے کے مقابلے میں ہم بھی کچھ کریں گے، اس کا مقابلہ کریں گے اور جو نظر نہیں آتا اس کے مقابلے میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اس لیے ہم نے اس تعوذ سے اس اللہ کی پناہ پکڑی جس کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۖ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ۝﴾ [الانعام: ۱۰۳] (نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں، اور وہ تمام نگاہوں کو پالیتا ہے۔ اس کی ذات اتنی ہی لطیف ہے، اور وہ اتنا ہی باخبر ہے)۔ لہٰذا ہم اللہ کی پناہ کے سوا اور کہیں بچ نہیں سکتے تھے، اس لیے پڑھا: ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ''۔

[تفسیر الرازی: ۱/ ۷۱، الْبَابُ الثَّانِي فِي الْمَبَاحِثِ الْعَقْلِيَّةِ]

شیطان کا معنی:

لفظِ شیطان کی لغوی تحقیق میں علماء کے دو قول ہیں:

1 ......بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے اندر نون اصلی نہیں ہے، یہ ''شَاطَ يَشِيطُ'' سے ہے۔ اس کا معنی ہے احتراق یعنی جلنا۔ اور شیطان بھی انسان کی دشمنی میں ہر وقت جل رہا ہے۔

2 ......اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ نون اصلی ہے تو مادہ ''شَطَنَ يَشْطُنُ'' ہوگا اور معنی ہوگا ''بُعْدَ'' یعنی دور ہوا۔ تو دور کس بات سے ہوا؟ ملاء اعلیٰ سے بھی دور، اللہ کی رحمت سے بھی دور اور انسان کی محبت سے بھی دور۔ اس لیے شیطان مردود کہلایا۔ اسی لیے اللہ نے شیطان کو حکم دیا:

﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ۝﴾ [الحجر: ۳۴، ۳۵]

''نکل جاؤ یہاں سے، قیامت تک تجھ پر میری لعنت ہے۔''

اور لعنت کا معنی ہے اللہ کی رحمت سے دور ہو جانا۔ جب اللہ کی رحمت سے دور ہوا تو باقی کیا بچا؟ اس لیے شیطان

کو مردود کہتے ہیں۔[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۵،تَفْسِیْرُ الْاِسْتِعَاذَۃِ وَ اَحْکَامُھَا]

"رَجِیْم" کا معنیٰ:

"رَجِیْم" "رَجْم" سے ہے، بروزن "فَعِیْلٌ" بمعنیٰ "مَفْعُوْلٌ" ہے۔ معنیٰ ہے پتھر مارا ہو، اور مراد ہے کہ مردود ہوا۔[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۵،تَفْسِیْرُ الْاِسْتِعَاذَۃِ وَ اَحْکَامُھَا]

قرآن کو "مُتَرَجَّم" کہنا:

ہمارے بعض بھائی ترجمہ والے قرآن کو غلطی سے "مُتَرَجَّم" کہہ دیتے ہیں تو "نَعُوْذُ بِاللّٰہِ" اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ وہ قرآن جس کو پتھر مارے گئے۔ اور یہ معنیٰ غلط ہے۔ لہٰذا آپ یوں کہو: "مُتَرْجَم" بغیر شد کے۔

علم کی اقسام:

علماء نے فرمایا: علوم دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک علومِ ضارہ اور دوسرے علومِ نافعہ ہوتے ہیں۔ اس کو یوں کہہ لو کہ بعض علوم رحمانی ہوتے ہیں اور بعض علوم شیطانی ہوتے ہیں۔ گانا بجانا، موسیقی اور ناچنا یہ بھی تو علم ہے، ہر کوئی اٹھ کر کھڑا ہو جائے اور اچھلنا شروع کر دے تو اس کو ناچنا تھوڑا ہی کہیں گے۔ اسی طرح علمِ نجوم، علمِ جفر یہ سارے علوم ہیں، لیکن علومِ ضارہ ہیں، علومِ نافعہ نہیں ہیں۔

علومِ نافعہ:

علوم نافعہ وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق آدمی کے دین سے ہو، ایمان سے ہو، عبادات سے ہو، اخلاق سے ہو، اس کی دنیاوی بھلائی سے ہو، آخرت کی بھلائی سے ہو اور وہ اسلام کے خلاف نہ ہو۔ یہ علومِ نافعہ ہیں۔ جتنے علومِ ضارہ ہیں ان سب کا پرنسپل ابلیس، یعنی شیطان ہے۔

شیطان کے سب کارنامے ناری ہیں:

علماء نے بڑی عجیب بات لکھی ہے کہ شیطان آگ سے بنا ہے، نار سے بنا ہے تو جتنے بھی علوم ضارہ ہیں، ناریہ ہیں وہ سب شیطان نے کافروں کو سکھائے ہیں۔ اس لیے تو علومِ ناریہ میں، ہائیڈروجن بم بنانے میں، میزائل بنانے میں کافر سب سے آگے ہیں، کیونکہ ان کا تعلق آگ سے ہے۔ وہ کافروں کو سکھاتا ہے، وہ ہمیں کیسے سکھائے

گا؟ کیونکہ اس کو پتا ہے کہ جب سے حضور ﷺ آئے ہیں اس وقت سے ہمیں (شیاطین کو) میزائل لگنے شروع ہو گئے۔ جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ جنات کا قول نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝﴾ [الجن:۹]

''اور یہ کہ ہم پہلے سن گن لینے کے لیے آسمان کی کچھ جگہوں پر جا بیٹھا کرتے تھے، لیکن اب جو کوئی سننا چاہتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ ایک شعلہ اس کی گھات میں لگا ہوا ہے۔''

یعنی جنوں نے جا کر شیطان سے کہا کہ آسمانوں پر سخت سیکورٹی ہو گئی ہے، اگر ہم قریب جانے کی کوشش کرتے ہیں تو شہابِ ثاقب سے ہمیں مارا جاتا ہے۔ اس شیطان نے کہا: اچھا! زمین میں کوئی بہت بڑا واقعہ ہو گیا ہے، جلدی سے جاؤ اور دیکھو کہ کیا ہوا ہے؟ حالانکہ ہم پہلے اوپر جاتے تھے اور ملائکہ کی باتیں سنتے تھے۔

ان شیاطین کے فضا میں ٹھکانے تھے۔ یہ کافر لوگ بھی کہتے ہیں کہ ہم نے بڑی ترقی کر لی ہے کہ ہم چاند پر پہنچ گئے ہیں، مریخ پر پہنچ گئے ہیں۔ اب تو نیا سیارہ بھی دریافت کر لیا ہے۔ حالانکہ جناب! انسان جنات سے بھی کمزور ہیں۔ وہ شیطان بھی کہتے ہیں کہ ہم نے بھی آسمانوں پر چوکیاں لگائی ہوئی تھیں۔ وہاں فرشتوں کی بات سنتے اور آ کر اپنے گروہ کو خبر دے دیتے کہ کل فلاں جگہ بارش ہو گی۔ ایک سچی خبر دیتے اور ساتھ دس جھوٹی خبریں بھی دے دیتے تھے۔ اگر کوئی بات غلط نکلتی تو پھر کہہ دیتے کہ شاید ہمارے سمجھنے میں کوئی بات رہ گئی ہو۔

اب جب وہ اوپر نہیں جا سکتے تو انہوں نے کہا:

﴿وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝﴾ [الجن:۱۰]

''اور یہ کہ ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ آیا زمین والوں سے کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کو راہِ راست دکھانے کا ارادہ فرمایا ہے۔ (جس کی وجہ سے ہمارا آسمان پر جانا بند کر دیا گیا ہے)۔''

غزوہ بدر میں شیطان کی شرارت اور فرار:

غزوہ بدر میں کفار ایک ہزار کا لشکر لے کر نکلے۔ ابلیس کو پتا تھا کہ ایک ہزار کے لشکر کا مقابلہ معمولی جماعت نہیں کر سکتی۔ تو اس موقع کو شیطان نے غنیمت سمجھا اور شیطان ایک سردار کی شکل میں (جس کا قبیلہ جنگجو تھا اور جس سے قریش کو ڈر لگتا تھا کہ اگر ہم مکہ سے نکلے تو وہ قبیلہ مکہ پر قابض ہو جائے گا۔ تو اسی شکل میں) آیا کہ تمہیں کوئی غم کرنے کی ضرورت نہیں، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں، تم مسلمانوں کو مٹا دو۔ اب ابوجہل مطمئن ہو گیا کہ ان کا

خطرہ بھی ٹل گیا ہے، بلکہ وہ ہمارے ساتھ بھی جانے کے لیے تیار ہیں۔

جب میدانِ بدر کے قریب آئے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام اور دوسرے فرشتے اترے تو چونکہ شیطان دیکھ سکتا ہے، اس لیے شیطان لعین اپنی سواری کو آہستہ آہستہ پیچھے کرنے لگا۔ ابوجہل نے کہا: کہاں جاتے ہو؟ آخر! ابوجہل نے شیطان کو پکڑ لیا تو اس وقت شیطان نے کہا:

﴿إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ﴾ [الانفال:۴۸]

''میں تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں لے سکتا، مجھے جو کچھ نظر آرہا ہے وہ تمہیں نظر نہیں آرہا۔ مجھے اللہ سے ڈر لگ رہا ہے۔''

میں تو ڈرتا ہوں، میں تو آگے نہیں جاتا۔ ابلیس کو بات سمجھ آگئی کہ اب ملائکہ آگئے ہیں، قریش کا بچنا مشکل ہے۔ ایک فرشتہ بھی آجاتا تو کافی تھا، لیکن اللہ نے تین ہزار فرشتے اتار دیے۔ اس لیے ابلیس لعین وہاں سے بھاگا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۳۲۴، الانفال: الآیۃ: ﴿وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ﴾]

صوفیاء کا کلام:

بعض علماء نے عجیب بات لکھی ہے کہ شیطان کے اندر تین عین تو موجود تھے، لیکن ایک عین موجود نہیں تھا اس لیے وہ مار کھا گیا...... یہ تصوف کی بات ہے، لیکن یاد رکھیں! صوفیاء کا کلام شریعت میں حجت نہیں ہوتا۔ جیسے ایک بہت بڑے صوفی بزرگ گزرے ہیں، انہوں نے ''أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' کو مقدم کرنے کی وجہ لکھی کہ ''أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' میں پہلا حرف ''الف'' ہے۔ اور ''الف'' حروفِ تہجی میں پہلے نمبر پر آتا ہے، ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں پہلا حرف ''باء'' ہے۔ اور ''باء'' ''الف'' کے بعد آتا ہے۔ ان کا اپنا انداز ہے۔

ایک پٹھان کی تقریر:

حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک پٹھان تقریر کر رہا تھا اور مجھے بس اس پر افسوس ہے کہ اس کا لہجہ پٹھانوں والا تھا، ورنہ اتنی اچھی تقریر آج تک کوئی کر ہی نہیں سکا۔ میں نے کہا: خان! کیا تقریر کی ہے؟ کاش! لہجے میں بھی تھوڑی نرمی ہوتی۔ شاہ جی فرماتے ہیں: کوئی اس کو مولوی مانے یا نہ مانے، میں تو اس کو مولوی مانتا ہوں۔ کیونکہ تقریر کے دوران اس سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ قادیانی نے نبوت کا جو دعویٰ کیا ہے، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو اس نے کہا: دیکھو! تم قرآن پڑھتے ہو، ''باء'' سے شروع کرتے ہو اور

''وَالنَّاسِ'' کی ''سین'' پر ختم کرتے ہو تو ''بس'' میرا نبی آ گیا، اب یہ کہاں سے آ گیا؟ شاہ جی فرماتے ہیں: جو تفصیل اس نے بیان کی ایسی تفصیل کسی کا باپ بھی بیان نہیں کر سکتا۔

بے نمازی کے کان میں شیطان کا پیشاب:

ابلیس لعین ہر گناہگار کو گناہ میں مبتلا کرنے کے بعد لعنت بھی بھیجتا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ جب صبح کی نماز کا وقت ہو تو شیطان آ کر تھپکیاں دیتا ہے کہ سو جاؤ۔ آنکھ کھل بھی جائے تو کہتے ہیں کہ ابھی تو بیس منٹ ہیں، دس منٹ ہیں تو آنکھ لگ سکتی ہے، پھر سلا دے گا۔ جب جماعت ہو جاتی ہے اور نماز کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو اس کے کان میں پیشاب کر کے چلا جاتا ہے۔ جو اللہ کو سجدہ نہ کرے وہ میرے پیشاب کا مستحق ہے۔ اس کا احساس ہمیں ہو یا نہ ہو، لیکن یہ ضرور ہے کہ انسان نماز سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

((ذُكِرَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ، فَقِيلَ: مَا زَالَ نَائِمًا حَتَّى أَصْبَحَ، مَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ، فَقَالَ: بَالَ الشَّيْطَانُ فِي أُذُنِهِ)) [بخاری، حدیث: ۱۱۴۴، باب: إذا نام ولم يصل بال....]

''حضور ﷺ کے پاس ایک شخص کا ذکر آیا تو کہا گیا کہ وہ سوتا رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور نماز کیلئے کھڑا نہ ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان نے اس کے کان میں پیشاب کر دیا ہے۔''

جہنم میں دوزخیوں کا شیطان سے مباحثہ:

اس لیے کہتے ہیں کہ جب جہنمی جہنم میں اس ابلیس شیطان کو دیکھیں گے تو جہنمی کہیں گے کہ اس کو تو خوار کرو، اسی نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ سارے اکٹھے ہو کر اس کو پکڑیں گے، وہ کہے گا کہ پہلے میری بات سنو، اس کے بعد جو مرضی آئے تم سزا دو۔ میرا قصور کیا ہے؟ میں نے تمہیں برائی کی طرف بلایا، جبکہ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر علیہم السلام بھیجے، انہوں نے تمہیں نیکی کی طرف بلایا، تم نے ان کی بات تو سنی نہیں، میری بات سنی۔ تم اپنے آپ کو ملامت کرو، مجھے کیوں ملامت کر رہے ہو؟ جیسے کسی شاعر نے کہا:

مجھے تعجب ہے اس انسان پر
کار بد خود کرے، لعنت کرے شیطان پر

تو شیطان کہے گا کہ میں نے تو تمہیں شر کا راستہ دکھایا تھا، لذت تو تم نے خود اٹھائی تھی، میں نے تو تمہیں شراب پینے کا

راستہ دکھایا تھا، میں نے تھوڑا کہا تھا کہ تم گناہ میں اتنے آگے بڑھ جاؤ کہ شیطان بھی پیچھے رہ جائے۔

شیطانی وساوس:

اس لیے علماء نے فرمایا: ''أَعُوذُ بِاللهِ'' پڑھنے میں یہ حکمت ہے کہ قرآن پڑھنے سے پہلے ہم اللہ کی پناہ میں آجائیں، تاکہ شیطان کے حملہ سے بچ جائیں۔ اب جب ہم نے ''أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھا تو ہم قوی ترین کی پناہ میں آگئے، اب شیطان کا حملہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳، تَفْسِيْرُ الْإِسْتِعَاذَةِ وَ أَحْكَامُهَا]

ورنہ تو وہ بد بخت ایسا ہے کہ دور رہ کر بھی وسوسہ ڈال دے۔ اور وسوسہ بھی کیسے ڈالتا ہے؟ دیکھو! حضرت آدم علیہ السلام کو وسوسہ کیسے ڈالا؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴾ [طٰہٰ: ۱۲۰]

''پھر شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ کہنے لگا: اے آدم! کیا میں تمھیں ایک ایسا درخت بتاؤں؟ جس سے ہمیشہ کی زندگی اور وہ بادشاہی حاصل ہو جاتی ہے جو کبھی پرانی نہیں پڑتی۔''

شیطان نے کہا: جنت عام مقام نہیں ہے، اگر تم نے اس کے اندر ہمیشہ رہنا ہے تو پھر تمھیں اس درخت کو کھانا ہوگا جس سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی ان کو جنت کے نام پر دھوکا دے رہا ہے۔ اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہے تو اس کو نماز سے دھوکا دے گا کہ دیکھو! تمھیں لوگ دیکھ رہے ہیں، تم نماز کو تھوڑا اور لمبا کرو۔ بندہ اس کے دام میں آگیا تو نماز برباد ہوگئی۔ اللہ پاک ہمیں شیطانی وساوس اور اس کے حملوں سے محفوظ فرمائے۔

شیطان سے پناہ کی وجہ:

اللہ نے ہمیں صرف شیطان سے پناہ مانگنے کا کیوں کہا ہے؟ حالانکہ دشمن تو اور بھی بہت ہیں۔ مسلمان کے لیے سارے کافر دشمن ہیں، چاہے وہ یہودی ہوں، عیسائی ہوں، چاہے وہ آپس میں دوست ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ﴾ [المائدۃ: ۵۱]

''اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو یار و مددگار نہ بناؤ۔ یہ خود ہی ایک دوسرے کے یار و مددگار ہیں۔''

انسان کی اپنی ذاتی دشمنیاں بھی ہوتی ہیں اور انسان کو ایذاء پہنچانے والے دوسرے جانور بھی ہیں۔ سانپ

ہیں، بچھو ہیں اور دوسری بلائیں بھی ہیں، لیکن صرف شیطان سے پناہ مانگنے کی وجہ کیا ہے؟ اس کو علماء کی اصطلاح کے اندر "سِرُّ التَّخْصِیْصِ" کہتے ہیں کہ اس کو خاص کرنے کا راز کیا ہے؟

علماء نے اس کی وجہ لکھی ہے کہ دنیا کے اندر انسان کے پاس تین چیزیں ہیں: مال، جان، ایمان۔ اگر جان کو کچھ نقصان آجائے تو مال کو اس پر قربان کر دینا چاہیے اور اگر ایمان کو کچھ نقصان آنے لگے تو مال، جان اور اولاد سب کچھ اس پر قربان کر دو، کیونکہ ایمان زیادہ قیمتی ہے اور شیطان ایمان پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ باقی دشمن جان اور مال پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ تو چونکہ اس کا نقصان زیادہ ہے، اس لیے حکم فرمایا: "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھو، کیونکہ اگر شیطان نے ایمان کو ختم کر دیا تو کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ اور شیطان تو کھلا دشمن ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ [یوسف:۵]

"البتہ شیطان انسان کا صریح (واضح اور کھلا) دشمن ہے۔"

اس نے کہا تھا کہ میں ان کے دائیں سے، بائیں سے، آگے سے اور پیچھے سے غرض ہر طرف سے حملہ کروں گا تو پھر آپ اکثر لوگوں کو ایمان والا نہیں پائیں گے۔

عجیب نکتہ!

بعض بزرگوں نے عجیب نکتہ بیان کیا ہے کہ شیطان نے چار جانبوں کا نام لیا، لیکن دو جانبوں کا نام نہیں لیا، یعنی اس نے اوپر اور نیچے کی جانب کا نام نہیں لیا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ ضروری تو نہیں ہے کہ ساری جانبوں کا ذکر کیا جاتا، جیسے قرآن میں ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ [البقرة:۱۱۵]

"اور اللہ ہی کی ہے مشرق اور مغرب۔ سو جس طرف تم منہ کرو، وہاں ہی اللہ متوجہ ہے۔"

مشرق اور مغرب کا رب اللہ ہے تو کیا شمال اور جنوب کا مالک کوئی اور ہے؟ تو جیسے وہاں مقصد یہ ہے کہ تمام جانب کا مالک اللہ ہے اسی طرح یہاں بھی تمام جہات مراد ہیں کہ شیطان نے کہا کہ میں اس کی آنکھوں سے بھی گناہ کرواؤں گا، اس کی زبان سے بھی، اس کی شرمگاہ سے بھی اور اس کے ہاتھوں سے بھی گناہ کرواؤں گا۔ میں اس کے پورے بدن کو ہر طرف سے حملے میں جکڑوں گا۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ نے اس کو ہمت ہی نہیں دی کہ وہ اوپر اور نیچے کا کہتا، وگرنہ تو کوئی بھی اس کے حملے سے نہ بچ سکتا۔ مثلاً: اگر بہت بڑا گڑھا کھدا ہوا ہو تو جتنا بڑے سے بڑا جوان ہو وہ گرے گا اور ہلاک ہوگا۔ اور اوپر کی طاقت اس لیے نہیں دی کہ کیونکہ ساری رحمتیں اوپر سے آتی ہیں۔

شیطان کی بات اثر کیسے کرتی ہے؟

شیطان کی بات اثر کیسے کرتی ہے؟ کہ وہ ہمیں گمراہ کرتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس کے سب سے بڑے دو طریقے ہیں: (۱)......ایک تو یہ شبہات کے ساتھ گمراہ کرتا ہے۔ (۲)......دوسرا شہوات کے ساتھ گمراہ کرتا ہے۔ شبہ بالنسبت، شبہ بالمنتسب، شبہ بالدلالت ہوں گے۔ سب سے پہلے تو یہ شبہ ڈالے گا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے، یہ تو بندوں کا کلام ہے۔ ﴿إِنْ هَٰذَآ إِلَّآ أَسَٰطِيرُ ٱلْأَوَّلِينَ﴾ [الانعام:۲۵] (یہ کچھ نہیں، مگر پہلے لوگوں کی قصے کہانیاں ہیں)۔ یہ سیکھتے ہیں اور ہمیں سنا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی سنا سکتے ہیں۔ اب یہ اصل میں شبہ ڈال رہا ہے۔

بعض دوسرے شیطانی شبہات:

اسی طرح بہت سارے شیطانی شبہات ہوتے ہیں۔ مثلاً:

(پہلا شبہ) اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو اس میں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اللہ ایک حکم دیتے ہیں پھر اس کو توڑ دیتے ہیں؟ کیا اللہ کو پہلے پتا نہیں ہوتا؟ انسانوں سے تو غلطی ہو سکتی ہے اور وہ اپنے قوانین بدل سکتے ہیں، لہٰذا یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔ لیکن مسلمانوں نے کہا: نہیں! نہیں! یہ تو اللہ کا کلام ہے۔

(دوسرا شبہ) جب شیطان کا یہ وار نہ چلا تو شیطان کہتا ہے کہ تم جو حدیث پڑھتے ہو یہ تو اڑھائی سو سال بعد لکھی گئی ہے۔ اتنے عرصے میں لوگوں کو کوئی بات کیسے یاد رہی؟ گویا! انکارِ حدیث کا فتنہ انہی شبہات سے پیدا ہوا۔ (ان دونوں شبہات کے جوابات ہماری کتاب "اسلام پر کفار کے اعتراض" میں دیکھیں۔ انور) وہ کہتا ہے کہ دیکھو! حدیث میں آیا ہے: ((لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ))[1] (حائضہ عورت کی نماز دوپٹہ کے بغیر ہوتی ہی نہیں)۔ دیکھو! یہ حدیث رسول ﷺ ہے کہ اگر عورت حیض والی ہو تو وہ سر پر دوپٹہ رکھ کر نماز پڑھ لے۔ ادھر

[1] [سنن أبي داود، حديث: ٦٤١، باب: المرأة تصلي بغير...]

آپ کہتے ہیں کہ حیض والی عورت نماز نہیں پڑھ سکتی۔ اب شیطان نے شبہ ڈال دیا۔ حالانکہ یہاں حائض کا معنی بالغ ہے، حیض والی عورت نہیں ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ جو عورت بالغہ ہے اس کی نماز دوپٹہ کے بغیر نہیں ہوگی اور اگر چھوٹی ہے تو اس کی ہوجائے گی۔

(تیسرا شبہ) اور اسی طرح وہ یہ شبہ ڈالتا ہے کہ قرآن میں ہے: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۖ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ﴾ [البقرة:۲۲۲] (آپ سے حیض والی عورتوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ فرمادیجیے کہ وہ گندگی ہے، ان سے دور رہو، جب تک کہ وہ پاک نہ ہوں)۔

شیطان شبہ ڈالتا ہے کہ حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُبَاشِرُنِي وَأَنَا حَائِضٌ))[1] (حضور ﷺ مجھ سے مباشرت فرماتے تھے اور میں حیض والی ہوتی تھی)۔ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ قریب بھی نہ جاؤ اور حضور ﷺ مباشرت فرماتے تھے۔ تو مسلمان کہتا ہے کہ اتنی شان والے نبی ﷺ کے بارے میں کیسے کہوں کہ وہ حیض والی حالت میں مباشرت کرتے تھے؟ (حالانکہ یہاں مباشرت کا معنی جماع نہیں ہے، صرف ساتھ سونے کے معنی میں ہے۔) یہ دشمن کی چال ہے۔ جب آدمی دشمنی پر آجائے تو اس کو ہر خوبی بھی عیب لگتی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر الزام:

ایک آدمی نے حرم کے اندر مجھے ایک خط لکھا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے امام ابویوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کو اس وقت تک سامنے نہیں بٹھایا جب تک کہ ان کی ڈاڑھیاں نہیں آگئیں۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو لڑکوں کا شوق تھا...... نَعُوْذُ بِاللّٰهِ ثُمَّ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ!...... کتنے بڑے امام اور فقیہ پر بہتان ہے؟ حالانکہ وہ حضور ﷺ کے فرمان پر عمل کر رہے تھے کہ جیسے غیر محرم پر نظر کرنا حرام ہے اسی طرح وہ لڑکے جن کی ڈاڑھیاں نہیں نکلی ہیں ان کو بھی بری نظر سے دیکھنا حرام ہے۔ تو امام صاحب رحمہ اللہ کے تقویٰ کا یہ عمل ہے، لیکن الٹی سمجھ والا اپنا بغض نکالتا ہے۔

شبہ کا جواب:

اسی طرح شیطان نے شبہ ڈالا کہ حضور ﷺ نے حیض کی حالت میں مباشرت کی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ

[1] [بخاری، رقم: ۳۰۲، باب، غسل المعتكف]

جس طرح لفظ مباشرت جماع کے لیے آتا ہے اسی طرح ''اِلْتِقَاءُ الْبُشْرَۃِ بِالْبُشْرَۃِ '' (بندے کا بندے کے ساتھ ملنا۔اس) کو بھی مباشرت کہا جاتا ہے۔ تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقصد یہ تھا کہ اسلام یہودیت والا مذہب نہیں کہ جب عورت کو حیض آئے تو اس کو گھر سے نکال دو، الگ کرہ دو، کھانا الگ، برتن الگ ہر چیز الگ، کیونکہ وہ پلید ہو چکی ہے۔ بلکہ اسلام نے کہا: میاں بیوی ایک بستر کے اندر سو سکتے ہیں، ان کے بدن بدن سے مل جائیں تو کوئی گناہ نہیں، لیکن مجامعت حرام ہے، مطلقاً ''لِقَاءُ الْبُشْرَۃِ '' حرام نہیں ہے۔

کئی دفعہ لفظ تو ایک ہوتا ہے، لیکن اس کے معانی کئی ہوتے ہیں۔ جیسے ''عَیْنٌ'' چشمہ کو کہتے ہیں جو زمین سے پھوٹے، سورج کو بھی کہتے ہیں اور گھٹنے کی ہڈی کو بھی ''عَیْنٌ'' کہتے ہیں۔ اب ہم کیسے سمجھیں کہ لفظ ''عَیْنٌ'' کا کون سا معنی مراد ہے؟ اس لیے سیاق وسباق کو دیکھ کر ترجمہ کرنا ہوگا۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا فَالْتَقَی الْمَآءُ عَلٰۤی اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴾[القمر:۱۲] (اور ہم نے زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا۔ اور اس طرح (دونوں قسم کا) سارا پانی اس کام کے لیے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا)۔ یہاں ''عُیُوْنٌ'' ''عَیْنٌ'' کی جمع ہے بمعنی چشمہ۔ اگر کہیں ''تَجَسَّسَ الْعَیْنُ'' (عین نے جاسوسی کی) ہو تو اس کا معنی ہوگا جاسوس نے جاسوسی کی۔ اور اگر کہیں ''اِنْکَسَرَتِ الْعَیْنُ'' (عین ٹوٹ گئی) ہو تو اس سے گھٹنے کی ہڈی مراد ہے۔ اس لیے سیاق وسباق کو دیکھ کر ترجمہ کرنا ہوگا۔ خدا کی شان کہ کبھی عبارت بھی ایک ہوتی ہے اور لفظ بھی ایک ہوتا ہے، صرف لحن بدل جانے سے معنی بدل جاتا ہے۔ جیسے ''کیا بات ہے'' ایک لفظ ہے، لیکن جب آپ اس کی ادائیگی کریں گے تو انداز کے مختلف ہونے سے معنی مختلف ہو جائے گا۔ مثلاً کسی کو کہیں: ''کیا بات ہے؟'' (عام سوالیہ انداز سے) تو اس کا معنی اور ہے، ''کیا بات ہے؟'' (تیز غصے سے) تو اس کا معنی اور ہے، ''کیا بات ہے!'' (تعریف کرنے اور تعجب کے انداز میں) تو اس کا معنی اور ہے۔ تو انداز کے بدلنے سے معنی بدل گیا۔

اس لیے حدیثِ رسول ﷺ کو سمجھنا علماء کا کام تھا، صحابہ کی فہم چاہیے تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کو تورات دکھا رہے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عمر! کیا کر رہے ہو، دیکھتے نہیں ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب حضور ﷺ کے چہرے کو دیکھا کہ غصے سے سرخ ہو رہا ہے (چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منانہ بھی جانتے تھے) تو انہوں نے فوراً کہا: ''رَضِیْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَ بِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا وَ رَسُوْلًا'' (ہم اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ

کے نبی ہونے پر راضی ہیں) تو حضور ﷺ نے فرمایا: تم قرآن کے ہوتے ہوئے تورات پڑھ رہے ہو؟ آج اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو میری اتباع کرتے۔ اس لیے یاد رکھیں! شیطان اس قسم کے شبہات ڈال کر گمراہ کرتا ہے۔ [مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۱۹۳، باب: الاِعْتِصَامِ بِالْکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ...]

شہوات کے ذریعے گمراہی:

اور دوسرا وہ شہوات کے ذریعے گمراہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک آدمی کو پیاس لگی ہے، اس نے سوچا کہ یہ پانی پینا کیسا ہے؟ (حلال ہے یا حرام؟) تو شیطان کہتا ہے: پیاس بجھاؤ، کسی سے کیا پوچھتے ہو؟ ہر آدمی جوانی کی حالت میں کہتا ہے کہ فیشن کروں اور میرے ساتھ پریاں ہوں، میں ان کے ساتھ اڑتا پھروں۔ شیطان کہتا ہے کہ اپنی خواہشات کو پورا کرو، کیونکہ اگر یہ چیزیں گناہ تھیں تو اللہ نے بنائی ہی کیوں ہیں؟ اگر حسن و جمال کو دیکھنا منع ہوتا تو اللہ اسے پیدا ہی نہ کرتا۔

مال و دولت کے ذریعہ گمراہی:

امام غزالی رحمہ اللہ نے "ذَنْبُ الْغُرُوْرِ" (کتاب) میں شیطان کے گمراہ کرنے کے اور ذرائع بھی لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک "تَغْرِیْرٌ بِالدُّنْیَا، تَغْرِیْرٌ بِصِفَاتِ اللّٰہِ" ہے۔

"تَغْرِیْرٌ بِالدُّنْیَا" یہ ہے کہ شیطان کہتا ہے کہ دیکھو! تمہارے پاس دس ہزار ریال آگئے ہیں تو مولوی کہتے ہیں کہ ہر سال زکوۃ نکالو تو اتنے ریال، پیسے تو کم ہو جائیں گے، دس سال کے بعد اتنے ریال پیسے ہو جائیں گے، اتنے کم ہو جائیں گے اور اگر یہی ریال اور پیسہ بینک کے اندر ڈال دو تو بعض بینک والے سات فیصد دیتے ہیں، بعض بارہ فیصد دیتے ہیں اور بعض اس سے بھی زیادہ دیتے ہیں تو تمہیں ہر سال پندرہ ہزار یا بیس ہزار ملتا رہے گا اور اصل پیسہ بھی محفوظ رہے گا۔ تو یہ "تَغْرِیْرٌ بِالدُّنْیَا" ہے۔

دوسرا وہ یہ کہتا ہے کہ پوری دنیا کا اصول ہے کہ نقد ادھار سے بہتر ہے اور یہ مولویوں والی بات تو ادھار پر ہے، جبکہ ہمارے ہاں تو نقد ہے۔ رشوت لو تو نقد پیسہ ملتا ہے، دو نمبری کرو تو نقد پیسہ ملتا ہے...... ہمارے ہاں ایک افسر تھا وہ مدعی سے بھی پیسے لیتا تھا اور مدعی علیہ سے بھی لیتا تھا۔ اس سے کسی نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ پیسے میں کسی کے پاس امانت رکھوا دیتا ہوں، تاکہ جس کے حق میں فیصلہ کروں تو اس سے لیتا ہوں اور دوسرے کو واپس کر دیتا ہوں،

تاکہ کہیں کہ امانت دار افسر ہے...... شیطان نے کہا کہ مولوی تو کہتے ہیں کہ مرو گے تو حوریں ملیں گی۔ لیکن جب مرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو حوریں کہاں سے آئیں گی؟ یہ سب دھوکہ ہے، اس لیے انہی پریوں سے فائدہ اٹھالو، یہ مولوی تو تمہیں ان حوروں سے بھی محروم کر دیں گے۔ اس کو "تَغْرِيْرٌ بِالدُّنْيَا" (دنیا کے ذریعہ سے دھوکہ دینا) کہتے ہیں۔

اور شیطان کہتا ہے: آخرت میں زیادہ ملے گا اس کا پتا نہیں، لیکن تم اس تھوڑے سے تو فائدہ اٹھاؤ۔ پھر تو کسان بھی کاشتکاری بند کر دے، کیونکہ وہ بھی تو چھ مہینے کی امید پر بیٹھا ہوتا ہے۔ ایک آدمی باغ لگا رہا ہے، اس پر محنت کر رہا ہے، پانچ سات سال کے بعد اس پر پھل آنا شروع ہوگا تو اب وہ کہے کہ یہ بے وقوفی والی بات ہے۔ تو یہ شیطان کا دھوکہ ہے۔ اگر منافع کثیر اور وہ بھی ہمیشہ رہنے والا ہو تو اس کے مقابلے میں دنیا کے تھوڑے سے نقصان کو برداشت کر لیا جاتا ہے۔

اور ایک ہے "تَغْرِيْرٌ بِصِفَاتِ اللّٰهِ" کہ بندے کو شیطان دھوکہ دیتا ہے کہ دیکھو! اللہ "رَحْمٰنٌ، رَحِيْمٌ، سَتَّارُ الْعُيُوْبِ" اور "غَفَّارُ الذُّنُوْبِ" ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو دنیا کے اندر خوب کھاؤ پیو اور آخر میں توبہ کر لینا، اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے۔ تو اللہ کی صفاتِ رحمت سے بندے کو گمراہ کرتا ہے اور بندے کو اللہ کی صفاتِ جلال اور قہر کی طرف جانے ہی نہیں دیتا کہ اللہ "عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ" بھی ہیں، "سَرِيْعُ الْحِسَابِ" بھی ہیں اور قرآن کریم میں ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ﴾ [البروج:۱۲] (بے شک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے) بھی ہے۔ اس لیے بڑے سے بڑا ڈاکو، زانی، شرابی کیوں نہ ہو جب آپ اس سے بات کریں گے تو وہ کہے گا کہ اللہ بخشنے والا ہے، اللہ ہماری بھی سنتا ہے۔ اس کی زبان پر فوراً یہی آئے گا۔ یہ بھی شیطانی دھوکہ ہے۔

جہادِ اقدامی کے خلاف شیطان کا دھوکہ:

اسی طرح شیطان کے اور شبہات بھی ہیں، حتیٰ کہ جدید دنیا کے اندر مسلمانوں کا اچھا خاصہ پڑھا لکھا طبقہ بھی اس میں پڑا ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام میں جہادِ دفاعی تو ہے، لیکن اقدامی اور ابتدائی جہاد نہیں ہے۔ (اگر ابتدائی جہاد کو مان لیں تو یورپ والے ناراض ہو جائیں گے) کوئی اگر تم پر ظلم کرے یا تمہارے ملک پر حملہ کرے تو تم دفاع کرو، لیکن یہ نہیں کہ ابتداء کر کے کافروں سے لڑو۔ دیکھو! حضور ﷺ مدینہ گئے تو ان لوگوں کو جہاد کرنے کی اجازت ملی جن پر ظلم کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ﴾ [البقرۃ:۱۹۱]

(اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس اس وقت تک لڑائی نہ کرو جب تک وہ خود اس میں تم سے لڑائی شروع نہ کریں)۔

حالانکہ یاد رکھو! اسلام کے اندر ابتدائی جہاد بھی ہے۔ کافروں سے کبھی بھی نہ ڈرو، کیونکہ حق حق ہے اور باطل باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکم دیا:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ [التوبۃ:۲۹]

''لڑو ان لوگوں سے جو یقین نہیں رکھتے اللہ پر اور نہ پچھلے (آخرت کے) دن پر۔''

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ﴾ [التوبۃ:۱۲۳]

''[اے ایمان والو!] ان کافروں سے لڑو جو تم سے قریب ہیں۔ اور ہونا یہ چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں۔''

اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کی صفت ہی یہی بیان کی:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح:۲۹]

''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں (اور) آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحم دل ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن کے اندر حکم ہی یہی دیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ [الممتحنۃ:۱]

''اے ایمان والو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست مت بناؤ۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ﴾ [فاطر:۶]

''یقین جانو کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، اس لیے اس کو دشمن ہی سمجھتے رہو۔''

ان ساری آیات کا آپ انکار کرو گے؟ قرآن صحتِ بدن کا بھی محافظ ہے اور صحتِ ایمان کا بھی محافظ ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ اسلام کا مادہ ''سلامتی'' ہے، ایمان کا مادہ ''امن'' ہے۔ اس لیے اسلام صحتِ ابدان، صحتِ اجسام اور صحتِ ارواح کا محافظ ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب حضور ﷺ نے شاہانِ عجم کو خط لکھے تو ان کے اندر ان کو خطاب فرمایا: ((أَسْلِمْ

تَسْلَمْ))[1] (اسلام لے آؤ ہر چیز سے محفوظ ہو جاؤ گے)۔

اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی مسلمان ہو جائے تو اس کی جان و مال، عزت و آبرو تم پر حرام ہیں۔ اگر کسی آدمی کو خدانہ خواستہ کوئی زخم ہو جائے اور وہ زخم بڑھ رہا ہو، سرطان ہو رہا ہو، کینسر ہو رہا ہو تو جو اچھا ڈاکٹر اور حکیم ہوگا وہ فوراً کہے گا کہ اس کو کاٹو کہ اس عضو کے بغیر بندہ زندہ تو رہے گا۔ اگر اس زخم کو چھوڑ دیں تو زہر پورے بدن کے اندر سرایت کر جائے گا۔ اسلام کے اندر جہاد بھی آپریشن ہے۔ یہ نہیں کہ تم میرا آپریشن کرو گے تو میں تمہارا آپریشن کروں گا۔ یہ کوئی عقل والی بات تو نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کے حکم کو تبدیل کر دینا یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے۔

مرتد کے لیے شیطانی شبہ:

جیسے ایک آدمی مرتد ہو گیا، اسلام سے ہٹ گیا تو شیطان کہتا ہے: ٹھیک ہے، شخصی آزادی ہے، مذہبی آزادی ہے، یہ اس کا حق ہے۔ اور اسلام کہتا ہے: ((مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ))[2] (جو اپنا دین تبدیل کرے گا کہ اسلام سے ہٹ گیا تو اس کو قتل کر دو)۔ لہٰذا شیطان کہتا ہے کہ یہ مذہبی آزادی کے خلاف ہے۔

جواب:

اب اس کا جواب سمجھیں کہ جتنے بھی احکامات ہیں وہ دو قسم پر ہیں: ایک امورِ تشریعی ہیں اور ایک امورِ تکوینی ہیں۔

امورِ تکوینی جیسے کسی کا پیدا ہونا، مرنا اس کے اندر سب برابر ہیں۔ اللہ نے آسمان کو حکم دیا تو وہ بن گیا، اللہ تعالیٰ آسمان کو حکم دیں گے کہ پھٹ جا تو وہ پھٹ جائے گا۔ یہ سارے تکوینی امور ہیں۔

امورِ تشریعی سے مراد اوامر، نواہی، حلال اور حرام یہ ساری چیزیں ہیں۔ یہ صرف مومن کے لیے ہوتے ہیں، کافر کے لیے نہیں ہوتے۔ اب اگر کسی نے اسلام قبول کر لیا تو اب اس پر احکام لاگو ہوں گے اور اگر وہ اسلام کو چھوڑ کر نکل رہا ہے تو گویا وہ باغی ہے اور باغی کی سزا تو ہر قانون میں قتل ہے۔ اسلام نے یہ تو کبھی نہیں کہا کہ کافر مسلمان نہیں ہوتا تو اس کو قتل کر دو، کیونکہ: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ [البقرۃ:٢٥٦] (دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے)۔

کبھی کبھی جب وہ دین کی اصل میں شبہات ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو پھر وہ دین کے لانے والے میں شبہ ڈالتا ہے کہ بات تو ٹھیک ہے، لیکن لانے والا ٹھیک نہیں۔ اس لیے مخالف لوگ انبیاء علیہم السلام کو مجنون اور دیوانے

[1] [الصحیح البخاری، حدیث: ٧، كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ؟]
[2] [الصحیح البخاری، رقم: ٣٠١٧، باب: لَا يُعَذَّبُ بِعَذَابِ اللهِ]

کہتے تھے۔ اسی طرح جب انبیاء ﷺ کے بعد علمائے دین حق لائیں گے تو ان کے بارے میں بھی شبہ ڈالے گا کہ بات تو ٹھیک ہے، لیکن یہ وہابی ہیں، ہیں تو یہ سنی، لیکن متعصب قسم کے سنی ہیں، یہ انبیاء ﷺ کے گستاخ ہیں اور یہ اولیاء اللہ کے گستاخ ہیں۔ یہ اس شیطان کے حملوں کے طریقے ہیں۔ اس لیے ہم اس سے پناہ پکڑیں۔

شیطان کو پیدا کیوں کیا؟

خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ اس بدبخت کو پیدا ہی نہ کرتا یا جب اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا تھا تو اس کو ختم کردیتے۔

جواب:

شیطان کا وجود بھی ضروری ہے، کیونکہ اللہ نے یہ دنیا بنائی ہے، یہ دار الامتحان ہے۔ اور امتحان تب ہوگا جب دن ہو اور رات ہو، کذب ہو اور صدق ہو۔ اگر سارے سچے ہوں تو پھر امتحان کس چیز کا؟ امتحان تو اس وقت ہوگا جب حق کا باطل سے مقابلہ ہوگا، نور کا ظلمت سے مقابلہ ہوگا۔ شیطان ہوگا تو مقابلہ ہوگا، اگر شیطان کا وجود ہی نہ ہو تو پھر مقابلہ کس بات کا؟ مثال کے طور پر: ایک آدمی ہے اس کو اللہ نے قوتِ مردمی سے محروم رکھا ہے۔ اب اگر وہ دعویٰ کرے کہ ساری رات خوبصورت عورت میرے کمرے میں رہی اور ہم اکیلے تھے، لیکن مجال ہے کہ میں نے اس کو چھیڑا ہو۔ تو یہ بہادری تو نہ ہوئی، ثواب تو تب ہے کہ قوت ہے، لیکن پھر بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔

اصول ہے کہ دشمن جتنا قوی ہوگا آدمی اتنی زیادہ محنت کرے گا۔ بعض ملک ہیں ان کی بڑے ملک سے ٹکر ہے۔ اس نے دیکھا کہ دشمن مضبوط ہے، اس کے مقابلے کی تیاری کرے گا اور اگر چھوٹا سا ملک ہے تو پھر تیاری نہیں کرے گا کہ اس کو تو ایک پھونک ماریں تو ختم ہو جائے گا، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اس لیے دشمن کا ہونا قوت کا ذریعہ ہے۔ شیطان ہے تو مومن مقابلہ کرے گا کہ میرا دشمن بڑا قوی ہے، ہر وقت اس کے مقابلہ کی تیاری کروں اور اللہ کی پناہ پکڑوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ پر غالب آ جائے۔

ایک لطیفہ، ایک حکایت:

بعض علماء نے کہا کہ بعض اوقات ایک چیز کو انفرادی طور پر دیکھا جائے تو وہ شر ہوتی ہے، لیکن اجتماعی طور پر دیکھا جائے تو وہ خیر ہوتی ہے۔ مثلاً: کسی محبوب کے چہرے پر تل کا سیاہ نشان ہو تو بڑا خوبصورت لگتا ہے، لیکن اگر

اس کو علیحدہ کر کے دیکھو تو وہ ایک داغ ہے اور جب داغ کو پورے بدن کے سامنے رکھ کر دیکھا گیا تو اس پر شاعر نے بخارا اور سمرقند بھی قربان کر دیا۔ شاعر عامر نے کہہ دیا تھا کہ میں اپنے محبوب کے تل کے بدلے سمرقند اور بخارا کو بھی قربان کر دوں۔ تیمور لنگ نے اس شاعر کو بلوایا کہ ان شہروں کو بناتے صدیاں گزر گئی ہیں اور تم نے ان شہروں کو اپنے محبوب کے تل کے بدلے قربان بھی کر دیا ہے؟ شاعر نے کہا کہ جناب! اسی لیے تو بھوکے پھر رہے ہیں، روٹیوں کے محتاج ہیں۔ کیونکہ اتنے بڑے بڑے ملک قربان کر دیتے ہیں۔ تو بادشاہ نے ہنس کر ٹال دیا۔ تو وہ عتاب سے بچ گیا۔

ایک مثال:

جیسے مالی کے پاس بڑی سی قینچی ہوتی ہے جس سے وہ شاخ کو کاٹتا ہے، ادھر سے ادھر کاٹتا ہے۔ کوئی دیکھے گا تو کہے گا کہ بے وقوف آدمی ہے کہ اس نے محنت کی، باغ لگایا اور جب شاخیں تیار ہو گئیں، یہ بڑی قینچی کو لے کر آیا اور کاٹنا شروع کر دیا۔ ہماری نظر اس بڑے پودے پر ہوتی ہے، لیکن مالی کی نظر باغ پر ہوتی ہے، ہماری نظر موجودہ زمانے پر ہوگی، لیکن مالی کی نظر آنے والے زمانہ پر بھی ہوگی کہ اگر میں نہیں کاٹوں گا تو پودا خراب ہوگا، اگر کاٹوں گا تو شاخیں بڑھیں گی۔ تو جس کی نظر پوری چیز پر ہوتی ہے تو وہ خیر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور اگر انفرادی ضرورت ہو تو وہ چیز شر بن جاتی ہے۔

شیطان کے وجود پر اعتراض:

بڑے بڑے اسکالرز یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن شروع تو "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" سے ہوا، یہ بتاؤ کہ شیطان ہے کہاں؟ اس کے وجود کی دلیل کیا ہے؟ ہمیں تو شیطان کہیں نہیں ملا، ہمیں تو نظر ہی نہیں آیا، ہم نے زمین کا چپہ چپہ ڈھونڈ ڈالا ہے، ہم نے ستاروں پر کمندیں ڈال دی ہیں، ہم چاند پر پہنچ گئے، مریخ پر پَر تول رہے ہیں، ہم نے زمین کے گرد چکر لگا لیے ہیں، ہمارے پاس اتنے وسائل ہیں، ہم اس ملک پر سیٹلائٹ کھڑی کر کے اس کے ایک ایک گھر کی سوئی تک دیکھ لیتے ہیں، لیکن ہمیں شیطان نہیں ملا تو دلیل کیا ہے کہ شیطان کا وجود ہے؟

جوابات:

اللہ نے فرمایا کہ شیطان جن ہے۔ اور جنوں کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

﴿إِنَّهُ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ [الاعراف:۲۷]

''وہ اور اس کا جتھہ تمہیں وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔''

اللہ کے قرآن میں یہ بات ہے کہ جن ہیں، شیطان ہیں، لیکن ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ملائکہ ہیں، اگر وہ اپنی شکل میں ہوں تو ہم نہیں دیکھ سکتے، انسان کی شکل میں ہوں تو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ جن کبھی بلی بن جاتے ہیں، کبھی بکری بن جاتے ہیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں، لیکن جب اپنی اصل شکل میں ہوں تو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے علماء کے پاس کتنے جن پڑھتے تھے۔ طلباء کے ساتھ بھی رہے اور کسی طالب علم کو پتا بھی نہیں چلا کہ یہ جن ہے، حالانکہ اکٹھے کھا رہا ہے، پی رہا ہے، سو رہا ہے، کھیل رہا ہے اور طلباء کو پتا ہی نہیں کہ یہ جن ہے۔ جب کبھی یہ بات ظاہر ہوئی تو پتا چلا کہ یہ جن تھا۔

اس لیے یاد رکھیں! ہمارا ایمان قرآن پر اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان پر ہے۔ حضور ﷺ جنوں کے پاس تشریف لے گئے اور حضور ﷺ نے جنوں کو خطاب فرمایا، جن مسلمان ہوئے اور جنوں نے قرآن سنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ① يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ﴾ [الجن:۱، ۲] (اے پیغمبر!) کہہ دو: میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنات کی ایک جماعت نے (قرآن) غور سے سنا، اور (اپنی قوم سے جا کر) کہا: ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے! جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں)۔ باقاعدہ قرآن کے اندر ایک سورت کا نام بھی ''سورۃ الجن'' رکھا۔

ہمارا ایمان ہے کہ اگر ایک آدمی کا نفس زکیہ ہے، یعنی متقی اور پرہیز گار ہے، وہ اکیلے کمرے کے اندر بیٹھا ہے، اس کے دل کے اندر گناہ کا خیال آرہا ہے۔ یہ گناہ یا تو اس کا نفس اس کے دل میں ڈالے، لیکن اس کا نفس زکیہ ہے، کیونکہ نفس امارہ تو ہے نہیں، یا پھر کوئی دوسرا بندہ خیال ڈالے، حالانکہ وہاں تو وہ اکیلا ہے۔ اب مطلب یہ ہے کہ کوئی تیسری چیز ہے جو غیر محسوس ہے اور وسوسہ ڈال رہی ہے تو وہ غیر محسوس چیز شیطان ہی تو ہے۔

شیطان دکھانے کا لطیفہ:

بعض دفعہ بڑی عمر کے اندر بندے کا دماغ ہل جاتا ہے۔ تو ایک بڑی عمر کے آدمی تھے، وہ شیطان کے منکر ہو گئے تھے کہ شیطان کا وجود ہی نہیں ہے۔ ایک طالب علم کچھ شرارتی تھا۔ وہ ایک شیشہ لے آیا تو جب اس نے کہا کہ مجھے دکھاؤ شیطان کہاں ہے؟ تو طالب علم نے شیشہ سامنے کر دیا کہ دیکھ لو۔ وہ ہوشیار تھا، اس نے کہا کہ میں اس

شیطان کا نہیں کہہ رہا، بلکہ مجھے آدم علیہ السلام کے وقت والا شیطان دکھاؤ، یہ تو چودھویں صدی کا شیطان ہے۔ تو طالب علم بھی ہوشیار تھا، اس نے کہا کہ آپ نسل دیکھتے جائیں، ہوسکتا ہے کہ نسل وہاں تک جا ملے۔

ضروری نہیں ہوتا کہ جو چیز ہمیں نظر نہ آئے ہم اس کا انکار کر دیں۔ ہمیں تو روح بھی نظر نہیں آتی، ہمیں تو گلاب کی خوشبو بھی نظر نہیں آتی تو کیا اس کا انکار کر دیں گے؟ کہ ہمیں نظر ہی نہیں آتی تو اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ آپ ڈاکٹر حضرات ہیں، بہت ساری چیزیں آنکھوں سے نظر نہیں آتیں، لیکن جب مائیکرو اسکوپ یعنی خورد بین کے نیچے لاتے ہیں تو وہ نظر آ جاتی ہیں۔ اگر وہ آلات نہ ہوں تو وہ چیزیں نظر نہیں آتیں۔ اس لیے اللہ نے ہمیں پہلے بتلا دیا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے جو غیر محسوس ہے اور نظر بھی نہیں آتا۔

''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' سے شیطان کے بھاگنے کی وجہ:

''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' میں آخر ایسی کیا تاثیر ہے کہ یہ پڑھیں تو شیطان بھاگ جاتا ہے، اتنا بڑا دشمن صرف اس سے بھاگ جاتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟

''تَعَوُّذ'' (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ) کا خاصہ ہی یہی ہے کہ شیطان بھاگ جائے۔ اس کی مثال سمجھیں! ملیریا کب ہوتا ہے؟ جب موسم خزاں ہو، موسم بہار میں ملیریا نہیں ہوگا۔ اور جب موسم خزاں ہو تو گرمی ہوگی اور دوا بھی وہ دے رہے ہیں جس میں خشکی ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا: ''تَعَوُّذ'' (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ) کا خاصہ ہی یہی ہے کہ شیطان بھاگ جاتا ہے۔ یوں سمجھیں! دو بچے لڑ رہے ہیں: ایک کی عمر آٹھ سال اور ایک کی عمر پندرہ سال ہے۔ پندرہ سال والا آٹھ سال والے کو مار رہا ہے، کیونکہ وہ بڑا ہے۔ اب چھوٹا چیختا ہے اور اس کا باپ بھاگ کر آتا ہے تو بڑا لڑکا بھاگ جاتا ہے، کیونکہ اس کو پتا ہے کہ اب یہ مجھے مارے گا، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ بھاگ جاؤں۔ اور میں نے جو مارنا تھا مار لیا، یہی بہت ہے۔ اسی طرح جو آدمی ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' پڑھتا ہے تو وہ دعا کر رہا ہے کہ ہم قوی (اللہ) کی پناہ میں آ جائیں اور اللہ کی ذات تو شیطان سے بھی قوی ہے، تو شیطان بھاگتا ہے، کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ یہ بندہ اللہ کی پناہ میں آ گیا ہے۔ اور اللہ کا قاعدہ ہے: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۵۲] (تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا)۔

ایک آدمی حج پر جا رہا ہو، تم اس سے کہو کہ حاجی صاحب! ہمیں بھی یاد رکھنا۔ تو کیا مطلب کہ تسبیح لے تمہارا نام لینا شروع کر دے؟ نہیں، بلکہ معنی یہ ہوتا ہے کہ ہمارے لیے کعبہ میں دعا کرنا، مدینہ شریف میں دعا کرنا۔ تو اللہ کے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں تجھے نفع دوں گا۔ تو جب آدمی ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' پڑھتا ہے تو یہ بھی یاد کرتا ہے۔ اب اللہ

تعالیٰ ہمیں کیا فائدہ پہنچاتے ہیں؟ ہمیں دشمن کے شر سے بچا لیتے ہیں۔

علماء نے کہا کہ عقل کا بھی یہی قاعدہ ہے کہ جب دشمن قوی ہو تو پناہ بھی قوی کی ہو، تب بچ سکیں گے، وگرنہ نہیں بچ سکیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ شیطان ہمیں نظر نہیں آتا، غیر محسوس ہے، اس لیے شیطان بڑا خطرناک ہے۔ اب ہم اس کی پناہ میں چلے جائیں جس کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ یعنی جب ہم اللہ کی پناہ میں چلے گئے تو اللہ کو تو جن بھی نہیں دیکھ سکتے اور وہ سب کو دیکھ سکتا ہے۔ اس لیے جب ہم "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھیں گے تو اس "تَعَوُّذْ" کا خاصہ یہ ہے کہ ہم اللہ کی پناہ میں آجائیں گے، اللہ کی حفاظت میں آجائیں گے۔ اور اس کلمہ کا اثر یہ ہوگا کہ شیطان دور ہو جائے گا۔

سابقہ مضامین کا تعلق "تَعَوُّذْ" سے تھا اور اس کے اندر علماء کے جو اقوال، توجیہات اور حِکَم تھیں وہ...... اَلْحَمْدُ لِلّٰہ!...... ہم نے پڑھی ہیں۔ اور اب ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کے متعلق کچھ بیان کریں گے۔ کیونکہ آپ جب بھی قرآن کی تلاوت کریں گے تو سب سے پہلے تعوذ ہوگا، اس کے بعد تسمیہ یعنی ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہوگا۔ اسی طرح نماز کی ہر رکعت میں آپ سورۂ فاتحہ سے پہلے تسمیہ پڑھیں گے۔

"بِسْمِ اللّٰهِ" تمام علوم کا خلاصہ ہے:

سب سے پہلے تو یہ سمجھیں کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ قرآن کی مختصر آیت ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اللہ نے تمام علوم کا دریا قرآن کو بنایا ہے تو قرآن پاک علوم اولین و آخرین کا مجموعہ ہے۔ اولین و آخرین سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے اور بعد میں جتنی کتابیں آئی ہیں، جو اللہ نے علوم اتارے ہیں ان سب علوم کا جامع اللہ کا قرآن ہے۔ یوں سمجھیں کہ موتی تو ہر کتاب کے اندر تھے، لیکن ان سب موتیوں کو قرآن میں پرو دیا گیا ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ تمام اولین و آخرین کے علوم کا جامع قرآن ہے اور پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے۔ اسی لیے سورۂ فاتحہ کی شان ہے کہ وہ ہر نماز میں اور ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ اور اسی سورۂ فاتحہ کو اللہ نے ﴿سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ﴾ (بار بار پڑھی جانے والی سات آیات) اور ﴿وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾ [الحجر: ۸۷] فرمایا۔ تو سارے علوم دینیہ کا خلاصہ قرآن میں ہے، قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں ہے۔

[نزہۃ المجالس ومنتخب النفائس: ۱/ ۱۲۰]

"بِسْمِ اللّٰہِ" کا خلاصہ "ب" میں:

بعض علماء تو اپنے ذوق کے مطابق ترقی کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ساری "بِسْمِ اللّٰہِ" کا خلاصہ صرف "ب" میں ہے۔ اور بعض علماء نے اور زیادہ ترقی کی، ان کا اپنا ذوق اور اپنے خیالات ہیں، کوئی شریعت کا حکم نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس "ب" کا خلاصہ اس نقطہ میں ہے جو "ب" کے نیچے ہے۔ [نزہۃ المجالس ومنتخب النفائس: ۱/ ۱۲۰]

"ب" کا مطلب:

"ب" کا ایک معنی تو یہ ہے کہ "ب" "اِسْتِعَانَتْ" کے لیے ہوتی ہے، لیکن یہاں اصل یہ ہے کہ "اِلْصَاق" کے لیے ہے۔ یعنی ایک بندے کا اللہ سے تعلق جڑ جائے۔ اسی لیے تو قرآن آیا ہے، اسی لیے تو انبیاء علیہم السلام آئے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ہمیں کوئی فیکٹریاں لگانے کا طریقہ بتانے کے لیے یا زراعت سکھانے کے لیے تو نہیں آئے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [الذاریات: ۵۶] (اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں)۔ اور اس عبادت کا طریقہ کون بتائے گا؟ انبیاء علیہم السلام اور اللہ کی کتابیں۔ اور عبادت کا مقصد یہ ہے کہ عبد اور معبود کے درمیان ایک تعلق ہو جائے، کیونکہ جب وہ تعلق ہو گیا تو سب کچھ آ گیا۔ لہٰذا ساری ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا خلاصہ "ب" میں آ گیا۔

"ب" کے نقطے کا مطلب:

اور نقطے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک ایسی چیز ہے جو تفرد یعنی ایک ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ تو نقطہ دلالت کر رہا ہے کہ اللہ کی ذات "وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ" ہے۔

نقطہ بڑھانے یا گھٹانے سے فرق:

خدا کی قدرت کہ اس نقطہ کے بارے میں، اس صفر کے بارے میں علماء نے اپنے ذوق کے مطابق بڑی عجیب بات لکھی ہے کہ یہ جو نقطہ ہے، صفر ہے۔ اگر اس کے ساتھ (بائیں طرف) ایک لگا دیں تو یہ دس بن جائے گا۔ آگے صفریں بڑھاتے جائیں تو سو بن جائے گا، ہزار بن جائے گا اور اسی طرح بڑھتا جائے گا، لیکن اگر یہی بہت سی صفریں ایک کے ادھر (بائیں طرف) لگا دیں تو کچھ بھی نہیں بنے گا۔

سنت کی اہمیت، بدعت کی مذمت:

اسی لیے فرمایا کہ اگر ہمارے اعمال قرآن وسنت کے مطابق ہیں تو بڑھتے جائیں گے اور اگر قرآن وسنت کے خلاف ہیں تو گویا کہ وہ پہلی صفریں ہیں جن کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ لہٰذا بدعات کے اندر عمل جتنا ہی مزین کیوں نہ ہو، خوبصورت کیوں نہ ہو، لیکن قرآن وحدیث سے، اجماع سے اور خیر القرون سے ثابت نہیں ہے تو وہ بدعت ہے اور بدعت مردود ہے۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ایک چھوٹی سی آیت ہے، لیکن اس کی بڑی عظمت اور شان ہے۔

''بِسْمِ اللّٰهِ'' میں اللہ کے تین نام:

''بِسْمِ اللّٰهِ'' میں اللہ کے تین نام ہیں: ایک ''اَللّٰه''، ایک ''اَلرَّحْمٰنُ'' اور ایک ''اَلرَّحِيْمُ'' ہے۔

''بِسْمِ اللّٰهِ'' کے متعلق نحوی بحث:

علماء قواعد کے نزدیک ''بِسْمِ اللّٰهِ'' میں ''ب'' حرفِ جار ہے اور یہ جار مجرور کس کے متعلق ہیں؟ اس کے بارے میں لمبی تقریریں ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ فعلِ مقدر ''أَقْرَأُ'' اور ''أَشْرَعُ'' کے متعلق ہیں۔ اور فعل بھی مؤخر ہے، مقدم نہیں ہے۔ ''بِسْمِ اللّٰهِ أَقْرَأُ''، ''بِسْمِ اللّٰهِ أَشْرَعُ''۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۸ ت فَصْلٌ: فِيْ فَضْلِهَا (اَلْبَسْمَلَةِ)]

ہر کام کے شروع میں ''بِسْمِ اللّٰهِ'' پڑھیں:

ایک روایت مبارکہ ہے (بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے اندر ایک راوی ضعیف ہے، لیکن اس کے متابعات موجود ہیں اور جب کسی روایت کے متابعات موجود ہوں تو وہ روایت حسن کے درجہ میں پہنچ جاتی ہے۔) کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ أَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ أَقْطَعُ)) [الجامع الصغیر، حدیث: ۶۲۸۴]

''ہر وہ کام جو شان والا ہو، اس کو ''بِسْمِ اللّٰهِ'' سے شروع نہ کیا جائے تو وہ بے برکت ہوتا ہے۔''

اسی لیے ہمیں ہر چیز میں حکم ہے کہ ہم اس کو ''بِسْمِ اللّٰهِ'' سے شروع کریں۔ اس لیے علماء فرماتے ہیں: ''بِسْمِ اللّٰهِ

أَشْرَعُ" یعنی کھانا شروع کرتا ہوں، لکھنا شروع کرتا ہوں، پینا شروع کرتا ہوں، حتیٰ کہ جب اللہ کے گھر میں داخل ہوں تو پڑھیں:

((بِسْمِ اللّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ))

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۷۷۱، باب: الدُّعَاءِ عِنْدَ دُخُوْلِ الْمَسْجِدِ]

اسی طرح جب مسجد سے نکلیں تو یہ پڑھیں:

((بِسْمِ اللّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ ، وَافْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ فَضْلِكَ))

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۷۷۱، باب: الدُّعَاءِ عِنْدَ دُخُوْلِ الْمَسْجِدِ]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو بہت بڑی عظمتوں سے نوازا ہے۔

مخلوق میں اسم مؤثر نہیں، ذات مؤثر ہے:

دوسرا لفظ "اِسْم" ہے۔ یہ مفرد ہے۔ اس کی جمع "اَسْمَاءٌ" ہے۔ یاد رکھیں! خالق اور مخلوق میں، عابد اور معبود میں کتنا بڑا فرق ہے کہ مخلوق میں صرف نام مؤثر نہیں ہوتا۔ اگر ایک آدمی کو صدر یا وزیر اعظم سے کام پڑ جائے اور وہ ایک تسبیح لے کر اس کا نام لینا شروع کر دے: صدر صاحب! صدر صاحب! صدر صاحب! تو کام بن جائے گا؟ نہیں۔ کیونکہ مخلوق میں اسم مؤثر نہیں ہوتا، ذات مؤثر ہوتی ہے۔ اس کے پاس جائیں تو کچھ کام کر دے گا، ورنہ نہیں ہوگا۔

اللہ کی ذات میں اسم مؤثر ہے:

یہ اللہ کی شان ہے کہ اسم ہی مؤثر ہے۔ یعنی ذات تک تو ہماری رسائی ہی نہیں، ہم اس کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ﴾ [الانعام: ۱۰۳] (نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں)۔

دیکھیں! جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی: ﴿رَبِّ أَرِنِيْٓ أَنْظُرْ إِلَيْكَ ﴾ (میرے پروردگار! مجھے دیدار کرا دیجیے کہ میں آپ کو دیکھ لوں۔ اے اللہ! جیسے مجھے کلام سے نوازا ہے، اسی طرح مجھے دیدار سے بھی نواز دیں۔ ﴿قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ ﴿وَلٰكِنِ انْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ﴾ البتہ پہاڑ کی طرف نظر اٹھاؤ، اس کے بعد اگر وہ اپنی جگہ برقرار رہا تو تم مجھے دیکھ لو گے۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ﴾ [الاعراف: ۱۴۳] (پھر جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اس کو

ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے)۔ اس لیے اللہ کی شان ہے کہ وہاں اسم ہی مؤثر ہے۔

دلیل:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ [الاعراف:۱۸۰] اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں، سو ان ناموں سے اللہ ہی کو پکارا کرو، کیونکہ ذات تک رسائی مشکل ہے۔

اللہ کے ناموں کی تعداد:

اس لیے حدیث مبارکہ میں آتا ہے:

((إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ اسْمًا مِائَةً إِلَّا وَاحِدًا، مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ))

''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، یعنی ایک کم سو، جو شخص ان کو یاد کرے وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

[صحیح البخاری، حدیث:۷۳۹۲، باب: إِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ اسْمٍ إِلَّا وَاحِدًا]

اور ایک روایت میں ہے:

((مَنْ حَفِظَهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ)) [صحیح مسلم، حدیث:۲۶۷۷، باب فِي أَسْمَاءِ اللّٰهِ تَعَالٰى...]

تو اللہ کے ننانوے نام صحیح احادیث مبارکہ میں ہیں۔ علماء نے اللہ کے ناموں پر کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً: ''اَلْاَسْنٰى فِي الْاَسْمَاءِ الْحُسْنٰى'' بعض نے ایک ہزار نام لکھے ہیں اور بعض نے تین ہزار نام لکھے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے کمالات کی کوئی حد نہیں:

اور بعض نے کہا کہ جیسے اللہ تعالیٰ کے کلمات ہیں جن کی کوئی حد نہیں، اسی طرح اللہ کے کمالات کی بھی کوئی حد نہیں اور اسماء کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾

[الكهف:۱۰۹]

''(اے پیغمبر (ﷺ)! لوگوں سے) کہہ دو: اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر روشنائی بن جائے تو میرے رب کی باتیں ختم نہیں ہوں گی کہ اس سے پہلے سمندر خشک ہو چکا ہوگا۔ چاہے اس سمندر کی کمی پوری کرنے کے لیے ہم ویسا ہی ایک اور سمندر کیوں نہ لے آئیں۔''

لہٰذا جیسے کمالاتِ ربی کی کوئی حد نہیں، اسی طرح اسماءِ ربی کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ صحیح احادیث کے اندر ہمیں صرف ننانوے نام ملے ہیں۔

اسمائے حسنیٰ میں شعبوں کی تقسیم:

بعض علماء نے ایک اور بات لکھی ہے۔ (یہ مسئلہ نہیں، یہ ذوق اور سمجھانے کے لیے ہے۔ انہوں نے کہا:) جیسے دنیا کے اندر مختلف محکمے ہوتے ہیں اور ان کے نام ہوتے ہیں، اسی طرح کائنات کے نظام کو چلانے کے لیے جتنے دوائر ہیں ان کے نام اسماء میں ہیں۔ مثلاً:

''رَزَّاقٌ'' رزق سے ہے تو رزق کا معاملہ اسی کے ذمے ہے۔ تو گویا! جتنے رزق کے مسائل ہیں وہ اسم ''رَزَّاقٌ'' کے تابع ہیں۔ اور فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ [الذاریات:۵۸] (اللہ خود ہی سب کو رزق پہنچانے والا، نہایت قوت والا ہے)۔

اور پھر ان اسماء کے احکامات کے مطابق اللہ نے ملائکہ کی ڈیوٹیاں رکھی ہیں۔ فرمایا: ﴿فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا﴾ [النازعات:۵] (پھر جو حکم ملتا ہے اس (کو پورا کرنے) کا انتظام کرتے ہیں)۔

اسی طرح دیکھیں! جتنے رحمت کے شعبے ہیں وہ ''اَلرَّحْمٰنُ'' اور ''اَلرَّحِیْمُ'' کے تابع ہیں، مجرمین کو سزا دینے کا شعبہ ہے تو وہ ''اَلْمُنْتَقِمُ''، ''اَلْجَبَّارُ''، ''اَلْقَهَّارُ'' اور ''اَلْعَزِیْزُ'' کے تابع ہے۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے اسماء کے اندر تاثیر رکھی ہے۔

حلِ مشکلات کا طریقہ:

بعض علماء کہتے ہیں کہ بندے کو جس قسم کی مشکل ہو اسی جیسے اسم سے مانگنا شروع کر دے تو اللہ اس کا مسئلہ حل کر دیں گے۔ مثلاً:

- ...اگر رزق کی تنگی ہے تو ''یَا رَزَّاقُ، یَا رَزَّاقُ!'' پڑھے۔
- ...اور اگر گھر کے اندر جھگڑے ہیں، ناچاقیاں ہیں تو لطف و کرم ''یَا لَطِیْفُ!'' کے اندر ہے۔ تو ''یَا لَطِیْفُ!، یَا لَطِیْفُ!'' پڑھے۔
- ...میاں بیوی میں جھگڑا ہو گیا، محبت نہیں رہی یا ایک کو نفرت ہے تو ''یَا وَدُوْدُ!، یَا وَدُوْدُ!'' پڑھ کر دعا مانگے تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

اس لیے اللہ کے اسماء کے اندر بھی ایک تاثیر ہے۔ ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ [الاعراف:۱۸۰] اس لیے ہمیں حکم دیا گیا کہ کبھی دعا مانگنی ہو تو اسماء اللہ کے ذریعے سے مانگو۔

اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ اللہ نے "تَوَسُّل بِالْاَسْمَاء" کا حکم دیا تھا، "تَوَسُّل بِالْاَمْوَاتِ" کا حکم تو نہیں دیا تھا۔ اس لیے توسل یا تو اعمال صالحہ سے ہوگا جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

"تَوَسُّل بِالْاَعْمَالِ" کی دلیل:

تین آدمی تھے، بارش شدید آ گئی، آندھی طوفان چل پڑا، وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے ایک غار کے اندر گھس گئے۔ خدا کی شان کہ ہوا اتنی تیز چل رہی تھی کہ پتھر گرا اور غار کا دروازہ بند ہو گیا۔ اب انہوں نے کہا کہ عجیب بات ہے کہ ہم تو جان بچانے کے لیے بھاگے تھے کہ طوفان سے اور بارش سے بچ جائیں، اب اور مسئلہ آ گیا کہ اتنی بڑی چٹان آ گئی کہ ہم سب مل کر بھی اس کو نہیں ہٹا سکتے، ہم تو ایسے ہی مر جائیں گے۔ کب تک آدمی بغیر خوراک اور پانی کے زندہ رہے گا؟ جب بہت زیادہ پریشان ہوئے تو کہنے لگے کہ اور تو کوئی حل نہیں ہے، ایک ہی حل ہے کہ اللہ ہمیں اپنی قدرت کے ساتھ اس قید خانہ سے نکال دے۔ ایسا کرو کہ اگر زندگی کے اندر کوئی اچھا عمل کیا ہے تو اس کو یاد کرو اور ہر آدمی اپنے اس عمل صالح کے ذریعے دعا مانگے۔

ان میں سے ایک آدمی نے کہا: یا اللہ! میرے دل کی کیفیات تو جانتا ہے، احوال بھی تیرے سامنے ہیں کہ میری زندگی میں ایک لڑکی تھی جس سے مجھے محبت تھی، عشق تھا، میں اس پر اس قدر فدا ہو چکا تھا کہ میرا اس کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہو گیا، میں اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ لڑکی بالکل میرے قریب نہیں آتی تھی، میں جتنے حیلے آزما سکتا تھا آزمائے، لیکن لڑکی نے بالکل توجہ نہیں کی۔ (بعض لڑکیاں باحیاء ہوتی ہیں) کچھ عرصہ گزرنے کے بعد میں مایوس ہو گیا، لیکن اس کی محبت میرے دل سے نہیں نکلی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میری ساری جائیداد لگ جائے، لیکن لڑکی کو حاصل کر لوں۔

کیونکہ عشق عشق ہے۔ عشق کے اندر تو عقل کا کام نہیں ہوتا۔ اسی لیے بعض لوگ کہتے ہیں عشق کے اندر تین لفظ ہیں "عین"، "شین"، "قاف"۔ انہوں نے کہا جب عشق ہوتا ہے تو "عین" سے عقل ختم ہو جاتی ہے، "شین" سے شرم ختم ہو جاتی ہے اور "قاف" سے قرار ختم ہو جاتا ہے۔ جو ایسا ہو تو سمجھ لو کہ عاشق ہے۔ چودھویں صدی کا عاشق نہ ہو۔ چودھویں صدی کے عاشق کو دو دن تھانے کے اندر بند کر دو تو عشق بھول جاتا ہے۔ ان کے پاس عشق نکالنے کے آلات ہوتے ہیں۔

یہ تو سچے عشق کی بات ہے، جو کیا نہیں جاتا، بلکہ ہو جاتا ہے۔

تو اس آدمی نے کہا کہ میں ایک دن بیٹھا ہوا تھا کہ وہی لڑکی جس کے لیے میں سرگردان تھا میرے پاس آگئی اور مجھے کہا: بات سنو! تم جانتے ہو نا! کہ تم نے مجھے حاصل کرنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے ہیں، لیکن میں نے انکار کیا، اب میں اتنی مجبور ہوں کہ میری ماں بستر پر مر رہی ہے، مجھے اتنے پیسوں کی ضرورت ہے، اتنے پیسے مجھے دے دے اور تیری جو تمنا ہے اس کو پورا کرنے کے لیے میں تیار ہوں، میں مجبور ہوں۔ میرے تو دل کی مراد بر آئی۔ میں نے اس کو پیسے دیے تو اس نے کہا کہ ابھی تو میری ماں بستر مرگ پر ہے، لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں تیرے پاس آؤں گی۔ میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ پیسے لے کر چلی گئی اور اپنی ماں کا علاج کیا۔ اس کی ماں بچ گئی۔

کئی دنوں کے بعد تنہائی کے وقت وہ آگئی اور کہا کہ دیکھو! میں نے وعدہ جو کیا تھا، لہٰذا میں آگئی ہوں۔ بہر حال اب میں آپ کے حوالے ہوں، اب جو آپ چاہیں مجھ سے فائدہ اٹھائیں۔ میں جب اس کو کمرے میں لے گیا اور اس کے لیے بڑا انتظام کیا تھا۔ جب میں نے اس کو بستر پر بٹھایا تو وہ رونے لگی، میں نے کہا: روتی کیوں ہو؟ میں نے کوئی زبردستی تھوڑی کی ہے؟ پکڑ کر تو نہیں لایا؟ تم نے خود مجھ سے سودا کیا ہے۔ اس نے کہا: بات تو ٹھیک ہے، لیکن میں اس پر رو رہی ہوں کہ اللہ کو شاید یہی منظور تھا کہ عصمت تار تار ہونی تھی۔ بجائے اس کے کہ کسی کا میرے ساتھ نکاح ہوتا اور حلال طریقے سے میں اس کے سپرد ہوتی تو میرے دل میں اللہ کا خوف آگیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اٹھو! اس نے کہا: کیا بات ہے؟ میں نے کہا: جو کچھ میں نے تمہیں دیا تھا وہ بھی میں نے تجھے اللہ کے لیے معاف کیا اور مزید پیسے بھی لے جاؤ۔ آج کے بعد میں تم پر کبھی بری نظر بھی نہیں ڈالوں گا۔ یا اللہ! اگر واقعی! تیرے ڈر سے میں نے اپنے آپ کو گناہ سے بچایا تھا اور یہ عمل تیری رضا کے لیے کیا تھا تو یہ غار کھل جائے۔ تو تھوڑا سا غار کھل گیا، لیکن اتنا کھلا کہ نکل نہیں سکتے تھے۔

اب دوسرے بندے نے کہا: یا اللہ! تو جانتا ہے کہ میں روزانہ شام کو جب مال مویشی لے کر گھر آتا تھا تو ان کا دودھ نکالتا تھا، پھر دودھ کو صاف کرتا تھا، پھر اس دودھ کو گرم کرتا تھا اور جب تک والد اور والدہ کو دودھ نہ پلاتا تب تک نہ بچوں کو دیتا اور نہ خود پیتا تھا...... سب سے پہلے والدین کا حق ہے، جنھوں نے ہمیں پالا ہے، پوسا ہے، پلایا ہے، بچپن سے بچے کی دیکھ بھال کرتے ہیں، جب وہ غوں غاں کرتا ہے تب سے اس کی ہر فرمائش پوری کرتے ہیں۔ علماء نے عجیب بات لکھی ہے کہ انسان کہتا ہے کہ میں سب سے اچھا ہوں، لیکن اولاد کے بارے میں یہ تمنا ہوتی ہے کہ مجھ سے بھی

اچھی بنے اور نام کمائے۔ وگرنہ کسی دوسرے کے لیے آدمی نہیں چاہتا کہ مجھ سے اچھا بنے، اولاد کے مقابلے میں انسان اپنے آپ کو بھی مٹا دیتا ہے کہ وہ ترقی کرے...... اس دوسرے آدمی نے کہا کہ رضائے والدین کے لیے میں اپنے بچوں کو بھی اس وقت تک دودھ نہیں دیتا تھا جب تک کہ والدین نہ پی لیتے۔ تو ان کا بڑھاپا تھا، میں ان کو ایک ایک دودھ کا گلاس دے کر سلا دیتا تھا۔ ایک دن میں دیر سے آیا تو دونوں سوئے ہوئے تھے تو میں کھڑا ہو گیا کہ ان کو دودھ پلا دوں گا، پھر دوسرے کام کروں گا، لیکن کھڑے کھڑے ساری رات گزر گئی۔ صبح کو اذانوں کے وقت آنکھ کھلی تو میں نے ان کو دودھ پلایا۔ یا اللہ! اگر اس عمل میں تیری رضا تھی تو ہم سے اس مصیبت کو ختم کر دے۔ تو چٹان تھوڑی سی ہٹ گئی، لیکن ابھی اس سے نکل نہیں سکتے تھے۔

تیسرے آدمی نے کہا کہ میں نے اپنے پاس ایک آدمی کو مزدور رکھا تو اس نے اس وقت مزدوری نہیں لی۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس کے پانچ چھ ماہ کے پیسے میرے پاس جمع ہو گئے، لیکن وہ اللہ کا بندہ غائب ہو گیا۔ اب میں مزدوری کس کو دوں؟ تو میرے مولیٰ! تو جانتا ہے کہ میں نے اس کے پیسے سے کچھ مال خریدا، کچھ بکریاں خریدیں اور کاشت کے اندر کچھ حصہ ڈالا اور اس پر تین چار سال گزر گئے۔ اس کے بعد وہ بندہ واپس آیا اور کہا کہ میں نے مزدوری لینی تھی وہ دے دو۔ مہربانی کرو۔ میں نے کہا: میں نے تمہیں پہچان لیا ہے اور تمہارا فلاں نام ہے۔ میں نے کہا: یہ بکریاں بھی تمہاری ہیں، یہ پیسے بھی تمہارے ہیں اور فلاں فلاں چیز بھی تمہاری ہے۔ اس نے کہا: مذاق نہ کرو۔ میں نے کہا: مذاق نہیں ہے، تم جو پیسہ چھوڑ گئے تھے میں نے کام کے اندر لگا دیا۔ اللہ نے اس کے اندر برکت دی تو یہ تیرا نصیب ہے۔ تو میں نے سب کچھ اس کو دے دیا۔ وہ دعائیں کرتا ہوا گیا۔ کتنا خوش ہو گیا ہوگا؟ کہ آیا تو تنخواہ کے لیے تھا، لیکن کافی مال لے کر جا رہا تھا۔ اے اللہ! اگر میں نے یہ سب کچھ تیری رضا کے لیے کیا تھا تو اس غار سے پتھر کو ہٹا دے۔ تو اس غار کا منہ کھل گیا اور وہ تینوں باہر آ گئے۔

''تَوَسُّل بِالْاَعْمَالِ الصَّالِحَةِ'' کا کوئی منکر نہیں ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۳۴۶۵، باب: حَدِیثِ الغَارِ]

''تَوَسُّل بِالذَّاتِ'' اور اس کی دلیل:

اور ایک ہے ''تَوَسُّل بِالذَّاتِ'' کہ کسی اللہ والے کے پاس جا کر کہیں کہ ہمارے لیے دعا کریں۔ یہ جائز ہے۔ جب بھی کوئی مشکل ہو، بندہ کسی اہل اللہ کے پاس جا کر کہتا ہے کہ دعا کریں تو جائز ہے۔ جیسا کہ امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ

کے دور میں قحط پڑ گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو استسقاء کے لیے ساتھ لے گئے اور ساتھ یہ الفاظ کہے: یا اللہ! جب تک سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تھے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے تھے اور آپ دعا فرماتے تھے تو بارشیں آجاتی تھیں، اب ہم حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو لے آئے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں، ان کی برکت سے ہم پر رحم کر۔ یہ توسل بالذات ہے۔ اس کے اندر کسی قسم کا کوئی جھگڑا نہیں۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۰۱۰، باب: سُؤَالِ النَّاسِ الإِمَامَ الاِسْتِسْقَاءَ...]

ایک ہے آدمی کے فوت ہو جانے کے بعد اس سے دعا کرانا اس سے علماء نے منع فرمایا ہے کہ اس سے آدمی اس کو ''مستقل بالذات'' مؤثر سمجھ لیتا ہے۔ اگر اس کو مؤثر بالذات نہ بھی سمجھتا ہو تب بھی معصیت کر رہا ہے، ایک ایسا عمل کر رہا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے۔

اللہ کے ناموں کا دعا میں استعمال:

اسی طرح ''تَوَسُّل بِالْأَسْمَاء'' ہے۔ اس کے اندر بھی کسی کا کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جیسے: ''یَارَحْمٰنُ! یَا رَحِیْمُ! یَا جَبَّارُ! یَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ! یَا أَکْرَمَ الْأَکْرَمِیْنَ! یَا أَجْوَدَ الْأَجْوَدِیْنَ! یَا حَیُّ! یَا قَیُّوْمُ! یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِکْرَامِ!''

اسمِ اعظم سے دعا:

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ایسا ہے جو اسمِ اعظم ہے، جس کے وسیلے سے مانگا جائے تو دعا قبول ہوتی ہے۔ [سنن أبی داود، حدیث: ۱۴۹۵، باب: الدُّعاء]

صحیح حدیث مبارک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ، فَإِنَّهُ لَمْ يَدْعُ بِهَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ فِي شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا اسْتَجَابَ اللّٰهُ لَهُ)) [سنن الترمذی: حدیث: ۳۵۰۵]

''لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ. (تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تیری ذات پاک ہے۔ میں ہی ظلم کرنے والوں میں سے ہوں)۔ کوئی مسلمان اسے پڑھ کر دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی دعا قبول فرمائیں گے۔''

اسی لیے علماء فرماتے ہیں: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کے اندر پہلے ''اِسْم'' آیا ہے، یہاں مسمّی کی بجائے ''اِسْم'' کے اندر بھی تاثیر ہے۔ اور جیسے جیسے اللہ کے اسماء ہیں ویسے ویسے اللہ نے ان کے اندر تاثیر رکھی ہے، لیکن

شرط یہ ہے کہ اخلاص ہو اور اللہ کا نام لے کر دعا مانگنے والا ہو۔ اگر آپ سارے نام لیتے جائیں، لیکن دل کے اندر سے آواز نہیں نکل رہی، قلب غافل سے مانگ رہے ہو تو نہ مانگنا بہتر ہے۔

دعا میں بے توجہی کا نقصان:

بعض علماء نے اس کی مثال دی کہ کسی کو ڈاکٹر صاحب کے پاس کچھ کام ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب سامنے ہوں اور اس کا منہ دوسری طرف ہو اور ڈاکٹر صاحب سے دوائی مانگ رہے ہوں۔ اگر ڈاکٹر ہمت والا ہوگا تو اسی وقت تھپڑ مار کر باہر نکال دے گا اور اگر ڈاکٹر بہت ڈھیلا ڈھالا بھی ہوگا تو کہے گا: کیوں میرا وقت ضائع کر رہے ہیں؟ آپ تشریف لے جائیں۔ تو اسی طرح آدمی خدا سے مانگ رہا ہو اور دل بتوں میں اٹکا ہوا ہو تو کیا دعا قبول ہوگی؟

ریاء کی عبادت:

جیسے کسی شاعر نے کہا:

بزمیں چوں سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد
کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

''جب میں زمین پر سجدہ کرتا ہوں تو زمین چیختی ہے کہ اے بندے! تو ریا، دکھلاوے کے سجدے کے ساتھ مجھے خراب کر رہا ہے۔''

لوگوں کو دکھانے کے لیے لمبے لمبے سجدے کرتا ہے کہ جناب پہنچا ہوا بزرگ ہے، ایک گھنٹے میں دو رکعت پڑھی ہیں۔ اگر گھر میں ہو تو فرض بھی نہیں پڑھتا۔

اللہ کا نام لینے سے نقصان ختم:

اس لیے سمجھیں کہ اسمائے حسنیٰ کے اندر عجیب تاثیر ہے! حتیٰ کہ ایک دعا میں بہت ہی عجیب تاثیر ہے!! ''بِسْمِ اللهِ الَّذِي لاَ يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ''[1] (اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں کہ جس کے نام کی برکت سے زمین و آسمان کی کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی اور وہی سننے والا جاننے والا ہے)۔ اس ''بِسْمِ اللهِ'' میں بھی وہی اسم ہے اس کے پڑھنے سے آپ کو کوئی چیز نقصان نہیں دے گی۔

[1] سنن أبي داود، حديث: ٥٠٨٨، باب ما يقول إذا أصبح

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر کھانے کا واقعہ:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب جنگِ روم ہوئی اور مسلمانوں کو فتح ہوگئی تو روم کے کچھ جرنیل قیدی ہوگئے۔ اس دور کے اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس محلات تو تھے نہیں تو ان کے قیدیوں کو اپنے خیمے میں رکھا۔ ایک رومی جرنل نے کہا: خالد! بات سنو! ہم متحارب دشمن ہیں۔ آپ ہمارے دشمن اور ہم آپ کے دشمن ہیں۔ ہم نے جنگیں لڑی ہیں، آپ کو فتح ہوئی۔ اور جنگوں کے اندر تو فتح وشکست ہوتی رہتی ہے...... جیسے عربی کا مقولہ ہے: ''اَلْحَرْبُ سِجَالٌ بَيْنَنَا'' (جنگ تو یہ ہے کہ کبھی اس نے کھینچ لیا اور کبھی اس نے کھینچ لیا)...... تو اس رومی نے کہا کہ مجھے آپ کا جنگی طریقہ کار بہت پسند آیا! میں بہادر دشمن کی قدر کرتا ہوں۔ آپ نے روم فتح کرلیا ہے اور ہمارے لوگ تمہارے قیدی ہیں، تمہاری خدمت کریں گے۔ ہمارے لوگوں کے پاس ایک خاص قسم کا زہر ہوتا ہے آج تک اس کے ذائقہ کا پتا نہیں چل سکا، آدمی فوراً مرجاتا ہے۔ وہ دشمن کے کھانے یا پینے کی چیزوں میں ڈال دیتے ہیں تو زبان کو لگنے کی دیر ہے، بندہ زندہ نہیں بچتا، لہٰذا کبھی بھی ان کے ہاتھ سے کھانا نہیں کھانا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ مسکرائے اور فرمایا: کیا وہ زہر تمہارے پاس بھی ہے؟ اس نے کہا: ہاں! وہ زہر میرے پاس ہے۔ فرمایا: دکھاؤ! وہ کیسا ہوتا ہے؟ تو اس رومی جرنیل نے اپنی انگوٹھی کے اندر خانہ بنایا ہوا تھا اس میں زہر تھا، تاکہ اگر قید ہوجائیں تو ختم ہوجائیں گے اور راز نہیں کھلے گا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے وہ زہر لے کر پانی میں ڈالا اور تین دفعہ پڑھا:

''بِاسْمِ اللهِ رَبِّ الْأَرْضِ وَالسَّمَاءِ، بِاسْمِ اللهِ الَّذِي لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ دَاءٌ''

اور وہ زہریلا پانی پی لیا تو آپ کو کچھ بھی نہیں ہوا۔

[معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم، حدیث: ۲۳۹۴، خَالِدُ بْنُ الْوَلِيدِ الْمَخْزُومِيُّ...]

اللہ کے اسماء میں اتنی تاثیر ہے۔ شرط یہ ہے کہ پڑھنے والا مخلص ہو، صدقِ مقال ہو اور اکلِ حلال ہو پھر اللہ کے نام کی لذت دیکھیں کہ کتنی لذت ہے؟

خدا کی یاد کا فائدہ:

علماء نے فرمایا کہ ''اسم'' کے اندر فائدہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ﴾ [البقرۃ: ۱۵۲]

"تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔"

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ:

- "اذْكُرُونِي فِي الرَّخَاءِ أَذْكُرْكُمْ فِي الْبَلَاءِ" (میرے بندے! تو خوشی اور فراخی میں مجھے یاد کر، میں تمہی تنگ دستی میں تجھے یاد کروں گا)۔
- "اذْكُرُونِي بِالْإِجَابَةِ أَذْكُرْكُمْ بِالْإِحْسَانِ" (جب تمہیں کوئی حاجت پیش آئے تو تم مجھ سے دعا کرو تو میں بھی تمہاری دعائیں قبول کر کے تمہاری مشکل حل کر دوں گا)۔

[تفسیر الرازی: ۱/ ۱۲۴، البقرۃ: الآیۃ: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ]

ایک صحابی کی دعا:

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ﴾ [الانعام: ۱۷]

"اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو خود اس کے سوا اسے دور کرنے والا کوئی نہیں۔"

حضور ﷺ نے ایک صحابی کو دیکھا جو یوں دعا مانگ رہے تھے:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ أَنِّي أَشْهَدُ أَنَّكَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ.

"اے اللہ میں تجھ سے اس وسیلے سے مانگتا ہوں کہ میں نے گواہی دی ہے کہ تو اللہ ہے، تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ تو تنہا اور بے نیاز ہے۔ جو نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی اس کے برابر ہے۔"

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس نے اللہ سے اسم اعظم کے وسیلے سے دعا کی ہے۔ اگر اس کے وسیلے سے دعا کی جائے تو قبول کی جاتی ہے اور اگر کچھ مانگا جائے تو عطاء کیا جاتا ہے۔ (کیونکہ اللہ کے اسماء آ گئے، صفات آ گئیں)۔

[الترمذی، حدیث: ۳۴۷۵، باب جَامِعِ الدَّعَوَاتِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ]

اسی لیے جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو خط لکھا تو اس کی ابتداء یوں تھی:

﴿إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ۞﴾ [النمل: ۳۰]

''یہ سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے اور اس میں یہ (مضمون) ہے (اول) بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔''
انبیاء علیہم السلام کے خطوط کی ابتداء بھی اسی اسم مبارک سے ہے۔

اسمِ اعظم کی برکت سے تخت حاضر ہو گیا:

اسی طرح جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ساتھیوں پر نظر ڈال کر فرمایا تھا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَیُّكُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ۝۳۸﴾ [النمل:۳۸] (اے اہل دربار! تم میں سے کون ہے جو اس عورت کا تخت ان کے تابع دار بن کر آنے سے پہلے ہی میرے پاس لے آئے؟) ﴿قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّیْ عَلَیْهِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ۝۳۹﴾ [النمل:۳۹] (ایک قوی ہیکل جن نے کہا: آپ اپنی جگہ سے اٹھے بھی نہ ہوں گے کہ میں اس سے پہلے ہی اسے آپ کے پاس لے آؤں گا، اور یقین رکھیے کہ میں اس کام کی پوری طاقت رکھتا ہوں (اور) امانت دار بھی ہوں)۔ آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ؕ﴾ [النمل:۴۰] (جس کے پاس کتاب کا علم تھا، وہ بول اٹھا: میں آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے ہی اسے آپ کے پاس لے آ سکتا ہوں)۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ ''عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ'' سے مراد اسم اعظم ہے۔

[تفسیر روح المعانی:۱۰/۱۹۸، النمل: الآیۃ: قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ]

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا سکھلائی:

((أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَأَعُوْذُ بِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ))

''اے اللہ! میں آپ کی رضامندی کی پناہ چاہتا ہوں۔ آپ کی ناراضگی سے اور آپ کے درگزر کی پناہ چاہتا ہوں آپ کی سزا سے۔'' [ابوداود، حدیث: ۸۷۹، باب: فِي الدُّعَاءِ فِي الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ]

اس لیے یاد رکھیں! ساری دنیا میں اس کی ذات کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اللہ کے اسماء کے اندر برکت اور تاثیر ہے اس اسم کو پکارنے سے اللہ تعالیٰ ہمارے مشاغل اور مسائل کو حل فرما دیتے ہیں۔

اس لیے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ میں پہلے ''اِسْمِ'' آیا، پھر ''اللّٰہِ'' آیا، پھر ''الرَّحْمٰنِ'' آیا اور پھر ''الرَّحِیْمِ'' آیا ہے۔

فہمِ قرآن کی شرائط:

قرآن کو سمجھنے کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان پوری طرح متوجہ ہو، جگہ پاک ہو اور دل و دماغ کو پاک رکھے، کیونکہ ہمیشہ یاد رکھیں! پاک چیز پاک برتن میں ٹھہرتی ہے۔ دودھ کتنا پاک ہوتا ہے، لیکن گندے برتن کے اندر ڈالو تو دودھ خراب ہو جائے گا، کیونکہ وہ گندی جگہ رہ ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح اللہ کا قرآن پاک ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے دل ریا سے اور شہرت سے پاک ہوں۔

اس لیے بعض علماء نے لکھا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ قرآن کا علم دیں یا حدیث کا علم دیں وہ کسی بڑے آدمی کو اپنے سے بڑا سمجھے تو اس نے قرآن کی توہین کی ہے، کیونکہ وہ ہی بڑا ہے۔ اگر وہ دوسرا شخص بڑا ہوتا تو اللہ اس کے دل میں قرآن کو رکھتے۔

اللہ کی صفات:

ترتیب دیکھیں! پہلے ''اللہ''، پھر صفت ''الرَّحْمٰنِ''، پھر ''الرَّحِیْمِ'' ہے۔ دیکھیں! جب پہلے کوئی نہیں تھا صرف ''اللہ'' تھا۔ فرمایا: ''هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ.'' اور پھر جب کچھ نہیں ہوگا صرف اس کی ذات ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾﴾ [الرحمٰن: ۲۶، ۲۷]

''اس زمین میں جو کوئی ہے، فنا ہونے والا ہے۔ اور (صرف) تمہارے پروردگار کی جلال والی، فضل و کرم والی ذات باقی رہے گی۔''

اس لیے علماء نے فرمایا: وہ اوّل جس سے پہلے کچھ نہیں، وہ آخر جس کے بعد کچھ نہیں۔ سب کچھ فانی ہے اور وہ باقی ہے۔ ''هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ'' دائم ہے، جس پر کبھی فنا نہیں آئے گی، وہ صرف اللہ کی ذات ہے۔ اسی طرح ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں غور کریں۔ سب سے پہلے اللہ، کیونکہ جب کچھ نہیں تھا تو اللہ تھا۔ اسی نے عالم دنیا بنایا، اب عالم دنیا کے ساتھ تعلق کی صفت ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہے۔ اور ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا تعلق عالم آخرت کے ساتھ ہے، کیونکہ قیامت میں رحمت والی صفت صرف مومنوں کے ساتھ ہوگی۔ تو اسی ترتیب سے لائے۔ سب پہلے ''اللہ''، پھر صفت ''الرَّحْمٰنِ'' دنیا میں، اس کے بعد پھر آخرت آئے گی تو صفت ''الرَّحِيْمِ'' لائے۔

بعض علماء فرماتے ہیں: ''الرَّحْمٰنِ'' اور ''الرَّحِيْمِ'' صفتِ مشبہ کا وزن ہے، لیکن یہ صفتِ مشبہ نہیں ہے، بلکہ یہ

مبالغہ کا صیغہ ہے کہ بہت رحمت کرنے والا، سب سے زیادہ رحمت کرنے والا۔

اللہ کی رحمت کی وسعت:

اور خدا کی رحمت کا تو یہ عالم ہے کہ فرمایا:

((إِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي)) [صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۵۳، بابُ قَوْلِهِ تَعَالَى: وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا...]

''میری رحمت میرے غضب پر سبقت کر گئی۔''

اور ایک روایت میں ہے: ''إِنَّ رَحْمَتِي غَلَبَتْ غَضَبِي''[1] (میری رحمت میرے غضب پر غالب ہو گئی۔) اس لیے علماء نے فرمایا ہے کہ اللہ نے رحمت کے سو درجے بنائے ہیں، صرف ایک درجہ اللہ نے انسانوں میں بانٹا اور قیامت کے دن اللہ اس ایک کو ملا کر سو فیصد رحمت کا اظہار فرمائیں گے۔

غلبۂ رحمت کی ایک دلیل:

اسی طرح جہاں صفتِ جلال کا ذکر کیا وہاں اللہ نے رحمت کو بھی ذکر کیا۔ فرمایا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ: ۵] (وہ بڑی رحمت والا عرش پر قائم ہے)۔ حالانکہ کہنا چاہیے تھا: ''اَلْعَزِيْزُ''، ''اَلْجَبَّارُ''، ''اَلْقَهَّارُ''، لیکن رحمت کی صفت غالب ہے اس لیے ''الرَّحْمٰنُ'' فرمایا۔

عرش کے نیچے لوح پر لکھا ہوا ہے: ''إِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي'' (میری رحمت میرے غضب پر سبقت کر گئی)۔ اس کو عرش کے نیچے رکھا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۵۳، بابُ قَوْلِهِ تَعَالَى: وَلَقَدْ سَبَقَتْ...]

اس لیے علماء نے فرمایا: چاہے تشریعیات ہوں یا تکوینیات ہوں، وہاں صفت رحمت غالب ہے۔ تکوینیات سے مراد کھانا، پینا اور مرنا وغیرہ ہیں۔ یعنی اس دنیا کے اندر چاہے مسلمان ہیں یا کافر ہیں اس دنیا کے دستر خوان سے سب کھا رہے ہیں۔ تو تکوینیات کے اندر بھی رحمت کا غلبہ ہے کہ ہر کوئی کھا رہا ہے۔

سو سال کے گناہ بھی رحمتِ باری سے معاف ہو جاتے ہیں:

اسی طرح تشریعی امور کہ یہ حلال ہے، حرام ہے، یہ جائز ہے، ناجائز ہے۔ ایک آدمی سو سال گناہ کرے، شراب پیئے، زنا کرے، جھوٹ بولے اور پھر توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر کافر ہے اور

[1] [البخاری، حدیث: ۳۱۹۴، بابُ مَا جَاءَ فِي قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: وَهُوَ الَّذِي...]

مسلمان ہو جائے تو اس کے گناہ بھی معاف فرما دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ پہلے شرک کرتا ہے، قبروں کو پوجتا ہے، آگ کو، چاند کو پوجتا رہا ہے، لیکن جب دل سے ایک دفعہ پڑھ لیا: ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ'' تو اسلام میں آگیا اور سارے گناہ معاف ہو گئے۔

مومن ہے تو اس کے بارے میں فرمایا:

﴿مَن جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُۥ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ [الانعام:۱۶۰]

''جو شخص کوئی نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے اس جیسی دس نیکیوں کا ثواب ہے۔''

اگر تم نیکی کا کام کرو گے تو تمہیں دس گنا ثواب دوں گا اور اگر غلطی کرو گے تو تمہارا ایک گناہ لکھوں گا۔ تو اللہ کی رحمت غالب ہے اللہ کے غضب پر۔

رحمت کے غالب ہونے کی ایک اور مثال:

اسی طرح مثلاً: ایک آدمی نے ارادہ کیا کہ صبح کی نماز حرم میں پڑھیں گے، لیکن نہیں پڑھ سکا۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: نیکی لکھ لو۔ میرے بندے نے نیت تو کی تھی۔ فرشتے عرض کرتے ہیں: اس نے یہ کام تو کیا ہی نہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس نے ارادہ تو کیا تھا۔ اسی طرح جب بندہ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ فرماتے ہیں کہ مت لکھو! جب تک کہ برائی نہ کرے۔ برائی کا ارادہ کیا پھر چھوڑ دیا تو پھر بھی (اللہ فرماتے ہیں:) نیکی لکھ دو کہ میرے ڈر سے چھوڑ دیا۔ وجہ کیا ہے؟ کہ رحمت غالب ہے۔

اور کبھی نیکی کو بڑھا دیتے ہیں۔ مسجدِ حرام کے اندر نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کا ہے۔ وجہ کیا ہے؟ کہ رحمت غالب ہے۔

''بِسْمِ اللّٰهِ'' میں ایک عجیب نکتہ!

جب ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھو تو غور کرو کہ اس کے اندر اسمِ ذاتی اور اسمِ جلال ایک ہے، صفاتِ رحمت دو کا ذکر ہے اور صفات کے صیغے بھی مبالغہ کے ہیں، تاکہ واضح ہو کہ میرے بندے تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ تو پڑھ، میرے ساتھ تعلق تو جوڑ۔ بندہ کہتا ہے کہ میں گندہ ہوں تو اللہ فرماتے ہیں: میں تو ''رَحْمٰنِ'' ہوں، ''رَحِيْمِ'' ہوں۔

اللہ کی رحمت سے شرک کے سوا ہر گناہ کی معافی ہے:

صحیح حدیث مبارکہ میں ہے کہ اے میرے بندے! تو قیامت کے دن میرے پاس آئے ساری زمین تیرے گناہوں سے بھر جائے، لیکن تو میرے ساتھ شریک نہ کرے تو میں تیرے سارے گناہ معاف فرما دوں گا۔ وجہ کیا ہے؟ کہ رحمت غالب ہے۔ اس لیے پہلی پہلی آیات کے اندر رحمت ہے۔

''بِسْمِ اللّٰهِ'' سورۂ فاتحہ کا جز نہیں:

اس بات میں سارے علماء کا اتفاق ہے کہ ''سورۂ نمل'' کی آیت: ﴿إِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ قرآن کا جزء ہے۔ سورۂ فاتحہ سے پہلے جو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہے وہ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے یا نہیں اس میں ائمہ کا اختلاف ہے:

امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے ساتھ کچھ ائمہ کرام ہیں، وہ فرماتے ہیں: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ سورۂ فاتحہ کا جزء ہے۔ اس لیے جہاں وہ سورۂ فاتحہ کو جہراً پڑھتے ہیں وہاں ''بِسْمِ اللّٰهِ'' کو بھی جہراً پڑھتے ہیں۔ باقی ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ'' مستقل آیت ہے، لیکن سورۂ فاتحہ کا جز نہیں ہے۔ اس لیے وہ سورۂ فاتحہ کو تو جہراً پڑھتے ہیں، ''تعوذ'' اور ''تسمیہ'' کو جہراً نہیں پڑھتے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۶، تَفْسِيْرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَ أَحْكَامُهَا]

''بِسْمِ اللّٰهِ'' اس امت کی خصوصیت ہے:

اللہ تعالیٰ نے جتنی آسمانی کتابیں اتاری ہیں ان سب کی ابتداء ''بِسْمِ اللّٰهِ'' سے کی ہے، لیکن یہ نہیں کہ بعینہٖ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کے الفاظ تھے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس طرح میری امت پر اللہ کے دیگر احسانات ہیں ان میں ایک احسان یہ ہے کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ صرف ہمیں ملی ہے اور کسی کو نہیں ملی۔

علمائے کرام نے ان دونوں باتوں کو جمع کیا ہے کہ جتنی بھی آسمانی کتابیں اتری ہیں وہ اللہ کے نام سے اتری ہیں، لیکن ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ صرف امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب صلح حدیبیہ ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ لکھی تو سہیل بن عمرو نے کہا کہ ہم نہیں مانتے، تم ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' لکھو۔ لہٰذا اللہ کے نام سے شروع کرنا یہ پہلے سے چلا آ رہا ہے، اور جتنی کتب سماویہ ہیں: تورات، زبور اور

انجیل سب کی ابتداء اللہ کے نام سے ہوئی ہے۔

ہر نماز میں سورۂ فاتحہ ضروری ہے:

اسی لیے علماء نے فرمایا کہ سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے، اسی لیے سورۂ فاتحہ بار بار پڑھی جاتی ہے۔ چاہے فرض ہے، واجب ہے، سنت ہے، نوافل ہیں، تہجد ہے، اشراق ہے اور اوابین ہیں سب کے اندر سورۂ فاتحہ پڑھی جائے گی، بلکہ نماز ہی ادا نہیں ہوتی جب تک سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے۔ حدیث مبارک میں ہے:

((لَا صَلَاةَ إِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) [المعجم الاوسط حدیث: ۲۲۶۲]

''سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔''

اگر جماعت میں ہے اور امام نے پڑھی تو مقتدی کی طرف سے ہوگئی، کیونکہ وہ بھی اسی کی اقتداء میں ہے، لہٰذا نماز کے اندر سورۂ فاتحہ تو آ گئی۔

خلاصۂ قرآن:

سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے، ساری سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں ہے، ساری ''بِسْمِ اللّٰهِ'' کا خلاصہ ''ب'' میں ہے، ''ب'' کا خلاصہ اس کے نقطے میں ہے اور نقطہ میں توحید ہے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ چھوٹی سی آیت کتنی بڑی اکسیر کا درجہ رکھتی ہے!! اللہ پاک مجھے اور آپ کو سمجھنے اور سمجھانے کی توفیق دے۔ [نزہۃ المجالس ومنتخب النفائس: ۱/ ۱۲۰]

ملحدین کا ایک اعتراض:

اس پر بعض اعدائے دین نے اعتراض کیا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ قرآن کے جو تیس پارے ہیں ان کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں آ جائے اور پھر پوری سورت کا خلاصہ ''بِسْمِ اللّٰهِ'' میں آ جائے؟ کیونکہ اسلام کے دشمنوں کو انتظار ہوتا ہے کہ اعتراض کرنے کا کوئی موقع ملے، اس لیے وہ سلمان رشدی جیسوں کو لیتے ہیں (کیونکہ یہ ان کے اندر کا آدمی ہے) کہ شاید یہ ہمیں کچھ ایسی باتیں بتلائے کہ ہم مسلمانوں پر اعتراض کر سکیں۔ اس لیے انہوں نے علماء کی بات پر اعتراض کیا کہ یہ بات اصول کے خلاف ہے کہ بہت بڑی چیز بہت چھوٹی چیز کے اندر کیسے آ سکتی ہے، کثیر قلیل میں کیسے آ سکتا ہے؟

جواب:

جواب سمجھیں کہ بعض چیزیں حسی ہیں اور بعض معنوی ہیں۔ معنوی چیز کو حسی چیز پر قیاس کرنا غلط ہے۔ آپ دیکھیں! کھجور کی گٹھلی کتنی چھوٹی سی ہوتی ہے؟ اس کو جب زمین میں دفن کرتے ہیں تو اسی سے ایک کونپل نکلتی ہے، پھر اس سے ایک تناور درخت بنتا ہے اور اس پر کھجوریں لگتی ہیں تو گویا اس چھوٹی سی گٹھلی کے اندر اس تناور درخت کا مادہ سمایا ہوا تھا تو وہ درخت نکلا۔ یہ تو مشاہدہ ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ایک اور تشبیہ دی ہے کہ ایک چھوٹی سی آنکھ ہے، اس کی پتلی کتنی چھوٹی سی ہے!! لیکن جب اسی سے ہم آسمان پر نظر ڈالتے ہیں، سورج پر نظر ڈالتے ہیں، چاند پر نظر ڈالتے ہیں اور کسی بلڈنگ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ تو نہیں ہوتا کہ وہ ہمیں اتنی نظر آئے جتنی یہ پتلی ہے۔ تو اتنی بڑی چیز کا اتنی چھوٹی سی چیز کے اندر آنا کثیر کا قلیل میں سمانا ہے۔

جب یہ ہو سکتا ہے تو یہ کون سی عجیب بات ہے کہ پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں نہ آئے؟

دین کا خلاصہ تین چیزیں ہیں:

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ بطور مثال فرماتے تھے کہ اللہ کا دین سیکھنا ہو یا سکھلانا ہو تو نیت کی بات ہے۔ نیت انسان کی درست ہو تو سیکھنا اور سکھلانا آسان ہے۔ اس کی مثال دیتے تھے کہ بالفرض والمحال اگر میں پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں، میرا ایک پاؤں پلیٹ فارم پر ہو اور دوسرا ٹرین پر ہو، ٹرین نے چلنا شروع کر دیا ہو اور مجھے کوئی کہے کہ مجھے دین سکھا دو تو دین اتنی دیر میں بھی سمجھایا جا سکتا ہے۔ فرمایا: دین کے اندر تین چیزیں ہیں: عبادت خدا کی ہو، اطاعت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ہو اور خدمت اللہ کی مخلوق کی ہو۔ ان تین چیزوں کا نام دین ہے۔

خالق کی عظمت اور مخلوق پر شفقت کا نام ہی دین ہے:

عرب علماء نے اس کو اور بھی مختصر کر دیا ہے کہ اصل دین کا خلاصہ دو چیزوں میں منحصر ہے: "عَظْمَةُ الْخَالِقِ" اور "شَفْقَةٌ عَلَى الْخَلْقِ" کہ دل میں خالق کی عظمت ہو اور مخلوق کی شفقت ہو اس چیز کا نام دین ہے۔ کیونکہ جب آپ کے دل میں بادشاہ کی عظمت ہے اور وہ آپ کو بلائے تو آپ سارے کام چھوڑ کر اس کی طرف جائیں گے۔ جس کی جتنی عظمت ہوگی، اس کے کام میں اتنی ہی تعمیل ہوگی۔ اگر اللہ کی عظمت دل میں بیٹھ جائے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ

پکارنے والا پکارے "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ"، "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" اور ہم نہ جائیں؟ تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی عظمت ہمارے دلوں میں صحیح طرح بیٹھی ہی نہیں ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے۔ اگر اللہ کی عظمت دل میں ہوتی تو ہم حرام کے قریب کیسے جاتے؟ اولیاء جو ذکر اور مشقتیں کراتے ہیں وہ اس لیے کہ اللہ کی عظمت دل میں بیٹھ جائے۔ اور جب اللہ کی عظمت دل میں یقین کی شکل میں آجاتی ہے تو نافرمانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری بات کہ اللہ کی مخلوق پر شفقت ہوگی تو کسی گرتے ہوئے اور کسی بیمار کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ کسی مسکین کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ اب آپ کو جذبہ آئے گا، آپ زکوٰۃ بھی دیں گے، صدقہ بھی دیں گے، خیرات بھی دیں گے، ہمسائے کے حقوق بھی ادا کریں گے، مریض کی عیادت بھی کریں گے اور اگر فوت ہوا تو اس کے جنازے میں بھی شریک ہوں گے، کیونکہ یہ اللہ کی مخلوق پر شفقت ہے۔

اس لیے یاد رکھیں! کثیر قلیل میں سما سکتا ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں ہے۔

"بِسْمِ اللّٰهِ" کا خلاصہ "ب" میں ہے:

پھر علماء نے فرمایا کہ ساری ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا خلاصہ "ب" میں ہے، حالانکہ وہ ایک حرف ہے۔ تو فرمایا کہ "ب" کا معنیٰ "اِلْصَاق" ہوتا ہے کہ کسی چیز کے ساتھ ملانا۔ یا "ب" "مُصَاحَبَتْ" کے لیے یا "اِسْتِعَانَتْ" کے لیے استعمال ہوتی ہے یا "ب" "تَبَرُّكْ" کے لیے استعمال ہوتی ہے تو "ب" کا اصل معنیٰ "اِتِّصَالْ" و "اِلْصَاقْ" ہے کہ مخلوق کو خالق کے ساتھ جوڑ دینا، ملا دینا۔ اسی کا نام تو دین ہے۔

نوافل سے قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے:

اسی لیے حضور ﷺ کی حدیث ہے کہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرا بندہ میری عبادت کرتے، نوافل پڑھتے ہوئے میرے اتنا قریب آجاتا ہے کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ وہی سنتا ہے جو میں سنوانا چاہتا ہوں، وہ وہی دیکھتا ہے جو میں دکھلانا چاہتا ہوں، وہ وہیں چلتا ہے جہاں میں چلانا چاہتا ہوں، وہ وہی پکڑتا ہے جو میں پکڑانا چاہتا ہوں اور وہ وہی چھوڑتا

ہے جو میں چھڑانا چاہتا ہوں۔

[صحیح البخاری، حدیث:۶۵۰۲، باب التواضع]

اللہ والوں کی خوشی کا راز:

جیسے کسی اللہ والے کو کسی نے کہا کہ مجھے آپ کو دیکھتے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا ہے میں نے آپ کو پریشان نہیں دیکھا۔ جب بھی دیکھتا ہوں تو آپ خوش بیٹھے ہوتے ہیں، خوشی ہی خوشی ہے، غم آپ کے قریب ہی نہیں آیا۔ کوئی ہمیں بھی وظیفہ بتائیں۔ حضرت نے فرمایا: جب دنیا کا سارا کام میری منشاء کے مطابق ہو رہا ہے تو مجھے کیا غم ہے؟ مجھے غم تو تب ہوتا ہے کہ جب میں کسی کام کا کہتا کہ یہ کام کرو اور وہ نہ کرتا۔ جب سب کچھ میری رضا کے مطابق ہو رہا ہے تو پھر میں کیوں غم کروں؟ مرید نے کہا کہ سب کچھ اللہ کی رضا کے مطابق ہوتا ہے، آپ کی کیا رضا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہم نے اپنی رضا کو اللہ کی رضا میں فنا کر دیا ہے۔ میری اپنی رضا تو ہے ہی نہیں، میری رضا وہی ہے جو اس کی رضا ہے۔ اور جو اس نے کیا اس پر میں راضی ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور رضائے خداوندی:

اسی لیے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا جا رہا تھا اور آپ کی مدد کے لیے آپ کی خدمت میں فرشتے آئے تو آپ علیہ السلام نے مدد لینے سے انکار کر دیا۔ آخر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا: ہمیں بھی اللہ نے بھیجا ہے، ہم اللہ کے حکم کے بغیر کیسے آ سکتے ہیں؟ لیکن اگر آپ ہم سے مدد نہیں لیتے تو کم از کم اللہ سے دعا کر لیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خود ہی بچا لیں۔ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا: جبرائیل! ایک بات بتاؤ۔ انہوں نے کہا: فرمائیں۔ فرمایا: جو سارا کچھ ہو رہا ہے، اللہ جانتے ہیں یا نہیں؟ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا: اللہ کو سب پتا ہے، اس کو ذرہ ذرہ کا علم ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: جب اللہ کو پتا ہے اور وہ جلانے پر راضی ہے تو ہم جلنے پر راضی ہیں۔ کنڈی تو اس کے دروازے کی کھٹکھٹائی جاتی ہے جس کو پتا نہ ہو کہ دروازے پر دوست کھڑا ہے یا دشمن کھڑا ہے؟ جس کو سارا پتا ہو تو دروازہ کھٹکھٹانے کا کیا فائدہ ہے؟

[شعب الایمان، حدیث:۱۰۴۵، الرجاءُ مِنَ اللہِ تعالیٰ، التبصرۃ لابن الجوزی:۱/۱۲۱]

جب بندہ اپنی رضا کو اللہ کی رضا میں داخل کر دیتا ہے تو بندے کا مقام یہ ہوتا ہے۔ بعض بزرگوں کی بعض باتیں

ایسی ہی ہوتی ہیں جو دوسرے لوگوں کو سمجھ نہیں آتیں۔ ان کے کلام کے اندر بھی کئی باتیں ہوتی ہیں۔

''ب'' کے اور معانی:

اس لیے علماء نے فرمایا کہ ''ب'' کا ایک معنیٰ ''اِسْتِعَانَتْ'' ہے۔ یعنی ہر کام اللہ کی مدد سے ہوگا، کوئی کام بھی اللہ کی مدد کے بغیر نہیں ہوگا، اگر ''ب'' کا معنیٰ ''مُصَاحَبَت'' لیں تو کوئی کام اس کی صحبت اور مصاحبت کے بغیر نہیں ہوسکتا، اگر ''ب'' کا معنیٰ ''تَبَرُّكْ'' لیں تو اللہ کے نام کے علاوہ تبرک کس سے پکڑا جاسکتا ہے؟ اور اگر ''اِلْصَاق'' کا معنیٰ مراد لیں تو یہ ''اِرْتِبَاطٌ بَيْنَ الْخَالِقِ وَالْمَخْلُوْقِ'' ہے کہ بندے کو خالق سے جوڑنے والی ہے۔ جب بندے کا خدا سے تعلق ہوجائے تو پھر کسی کی ضرورت ہی نہیں۔ جیسے آپ کا بڑے ڈاکٹر سے تعلق ہو تو آپ چھوٹے ڈاکٹروں کو پوچھتے ہی نہیں ہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام بھی اسی لیے آئے کہ مخلوق اپنے خالق سے جڑ جائے۔ اسی لیے ہر حال میں اس کی اطاعت ہونی چاہیے۔ بعض علماء اور آگے بڑھ گئے اور انہوں نے فرمایا: ''ب'' کا خلاصہ اس کے نقطے میں ہے جو ''ب'' کے نیچے ہے۔

نکتہ:

کسی نے شبلی رحمہ اللہ سے پوچھا: ''أَأَنْتَ شِبْلِيٌّ؟'' (کیا آپ شبلی ہیں؟) تو فرمایا: نہیں، میں وہ نقطہ ہوں جو اس کے نیچے ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''ب'' کے نقطے میں سارے قرآن کا خلاصہ کیسے ہے؟ تو علماء نے فرمایا کہ یہی ایک نقطہ ہے جو ایک پر دلالت کر رہا ہے اور وہ ایک اللہ ہے۔ جب ہمیں یہ سبق حاصل ہوگیا تو گویا! پورے قرآن کا خلاصہ اس سے مل گیا۔ کیونکہ سارے انبیاء علیہم السلام توحید کے لیے ہی آئے ہیں۔

اپنی خودی کی نفی کردو:

بعض علماء اور اولیاء نے اس کو دوسری طرح سمجھایا ہے کہ نقطہ صفر ہے کہ اپنے آپ کو یہ سمجھو کہ میں کچھ نہیں۔ اگر میں کچھ بنوں گا تو اللہ کی استعانت اور مدد سے بنوں گا۔ اس کی مدد، اتصال اور ارتباط کے بغیر میں کچھ نہیں، میں ضعیف اور مجہول انسان ہوں، اس کی مدد کے بغیر میری کیا حیثیت ہے؟ جب اللہ کی مدد اور استعانت آئے گی تو بندے کو مقام ملے گا۔ کہیں مقامِ نبوت ملا، کہیں مقامِ رسالت ملا، کہیں مقامِ صدیقیت ملا، کہیں مقامِ صالحیت

ملا، کہیں مقامِ شہادت ملا اور کہیں مقامِ عظمت وقرابت ملا۔ یہ کس کی مدد سے ملا؟ اللہ کی مدد سے ملا، ورنہ میں کچھ نہیں، میں تو صفر ہوں۔ اور صفر کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟

عجیب نکتہ!

اسی کے اندر علماء نے لکھا ہے کہ یہیں پر غور کرو تو ہمیں سنت اور بدعت بھی سمجھ میں آجائے گی۔ اس طرح کہ اگر بائیں طرف سے صفر لگاتے جاؤ تو اس کا معنی ایک ہی ہوگا۔ مثلاً: کمرہ نمبر 01 (ایک)۔ اس صفر کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ دائیں طرف لگی ہوتی تو اس کی کوئی حیثیت ہوتی۔ مثلاً: کمرہ نمبر 10۔ معلوم ہوا کہ اگر اپنے آپ کو اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ جوڑ لیا تو اللہ صفریں دائیں طرف لگائیں گے کہ پانچ نمازیں پڑھو گے تو ثواب پچاس نمازوں کا ہوگا، سات سو گنا بھی بڑھا دیں گے اور حرم میں آؤ گے تو لاکھ کا ثواب دیں گے۔ اور اگر تم بدعات میں آجاؤ گے تو نتیجہ صفر ہوگا۔ تو علماء نے فرمایا: اس ایک نقطہ کے اندر اللہ کی کتنی حکمتیں اور آیات ہیں۔

''بِسْمِ اللّٰہِ'' کا حاصل:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کے اندر چار چیزیں ہیں: ''بِسْمِ''، ''اَللّٰهِ''، ''اَلرَّحْمٰنِ'' اور ''اَلرَّحِيْمِ''۔ لفظ ''اِسْمِ'' سے اشارہ ہے کہ دنیا میں مخلوق کے اسم سے کچھ نہیں ملے گا۔ اگر ملے گا تو اس ذات سے ملے گا جس کا صرف نام لو تو بھی فائدہ ہوگا۔ اور جتنے اسماء ہیں وہ تمام محکموں کے نام ہیں۔ اگر ہمیں دشمن نے ستایا تو ہم نے کہا: ''یَا مُنْتَقِمُ''، ''یَا قَهَّارُ''۔ اگر ہم سے گناہ ہوگئے اور ہم لوگوں سے ڈر رہے ہیں کہ کہیں ہماری پردہ دری نہ ہو جائے تو پڑھتے ہیں: ''یَا سَتَّارُ''۔ اگر کسی مشکل میں پھنس گئے تو پڑھتے ہیں: ''حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ'' اور اگر کوئی غم ہے تو پڑھتے ہیں: ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ''۔ یہاں نام لینے سے بھی فائدہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح ''یَا حَيُّ! یَا قَيُّوْمُ! یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ! یَا لَطِيْفُ!'' ہیں۔ نام لینے میں بھی برکات ہیں۔

قرآن پاک میں ہے جو نص قطعی ہے اس کا تو کوئی انکار نہیں کرتا کہ ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ [البقرة:۱۵۲] (تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا) اللہ نے فرمایا: تم میرا نام ''یَا اَللّٰهُ! یَا رَحْمٰنُ!'' وغیرہ لے کر مجھے یاد کر رہے ہو تو میں بھی تمہارا ذکر کروں گا۔ اب اللہ کے ذکر کا معنی یہ تھوڑا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا نام لے لیں گے، بلکہ معنی یہ ہے کہ میں تمہیں نفع پہنچاؤں گا، فائدہ پہنچاؤں گا۔

تین باتوں میں مغالطہ:

تین چیزیں ہیں جن کے اندر لوگ بڑے الجھے ہوئے ہیں: ''تَعَطُّل''، ''تَسَبُّب'' اور ''تَوَكُّل''۔ ''تَعَطُّل'' کا معنی کیا ہوتا ہے؟ جیسے آپ کہتے ہیں کہ فلاں کو معطل کر دیا گیا، یعنی چھوڑ دیا گیا، ایک ہے ''تَسَبُّب'' اس کا معنی ہے اسباب اپنانا اور ''تَوَكُّل'' کا معنی ہے اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھنا۔

بعض صوفی ''تَعَطُّل'' کرتے ہیں کہ اللہ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں ان کو چھوڑ دو، لیکن اسلام نے اس سے منع کیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ)) [المصنف لابن أبي شيبہ: ۴/ ۲۵۳]

''اسلام میں رہبانیت (تَعَطُّل) نہیں ہے۔''

تو بعض لوگ بالکل ''تَعَطُّل'' میں آ گئے کہ اسباب سے بالکل فائدہ نہ اٹھاؤ۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اور بعض لوگوں نے ''تَسَبُّب'' کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ محنت کریں گے تو ہوگا، اس میں اللہ کا کیا دخل ہے؟ یہ تو ہماری محنت ہے، ہم نے ہل چلایا، بیج ڈالا اور کاشت کیا۔ تو آگے جا کر ان کے دو گروہ بن گئے: بعض سرمایہ دار بن گئے اور بعض سوشلسٹ بن گئے۔ تو وہ ''تَسَبُّب'' کے دھوکہ میں آ گئے۔

اسلام کی راہِ اعتدال:

اسلام ہمیں درمیان کا راستہ دکھاتا ہے کہ نہ ''تَعَطُّل'' کرو کہ سب کچھ چھوڑ دو، کوئی ضرورت نہیں کھانے کی، پینے کی۔ اس سے بھی منع ہے۔ نہ ''تَسَبُّب'' کو اختیار کرو کہ اسباب پر ساری زندگی ہے، اللہ کا دھیان کچھ نہیں۔ اللہ نے فرمایا: سبب بھی اختیار کرو، لیکن ''تَوَكُّل'' بھی اختیار کرو۔ استعانت اللہ کی ہوگی۔ اسی پر بزرگوں نے فرمایا کہ اپنے اونٹ کا گھٹنا بھی باندھ دو اور اللہ پر توکل کرو۔ اگر تمہارے پاس زراعت ہے، بالکل کرو، صنعت ہے، علم ہے، بالکل حاصل کرو، لیکن ہر چیز کے ساتھ مدد اللہ سے مانگو اور توکل اللہ تعالیٰ پر کرو۔

اس لیے حضور ﷺ نے اس ساری بات کو تین لفظوں میں سمجھا دیا، فرمایا:

((إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللهَ وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَإِذَا تَوَكَّلْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ))

''جب مانگو اللہ سے مانگو، جب مدد چاہو اللہ سے چاہو اور جب بھروسہ رکھو اللہ پر بھروسہ رکھو۔''

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۵۱۶]

جب مانگو تو اللہ سے مانگو، کیونکہ مانگنے والے سے کیا مانگنا؟ ایک آدمی بھیک مانگ رہا ہو اور اس سے جا کر بھیک مانگو تو یہ کوئی عقل کی بات ہے؟ بلکہ اس سے مانگو جو مانگنے والا نہیں ہے، بلکہ دینے والا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذوقِ یقین:

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا وفد آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی:

﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا﴾ [ہود: ٦]

"اور کوئی (رزق کھانے والا) جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے قرآن سنا اور خاموشی سے چلے گئے تو ان کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگنے آئے تھے۔ تو انہوں نے فرمایا: جب اللہ فرماتے ہیں کہ ہر جاندار کو ہم رزق دیتے ہیں تو پھر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیوں مانگوں؟

[الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۹/ ۷، ہود: الآیۃ: وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا]

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کی بادشاہت کے زمانہ میں ایک آدمی ان سے کچھ لینے کے لیے آیا تو بادشاہ (حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ) نے اعزاز و اکرام کیا اور اس کو خصوصی مہمان خانہ میں ٹھہرایا، کیونکہ وہ دوست تھا۔ تو اس کو بادشاہ نے اپنے ساتھ والا بیڈ روم دیا کہ میرا دوست ہے تو میں اس کا اعزاز کروں، اس کا اکرام کروں۔ جب تہجد کی گھڑی آئی تو اس کو کچھ آواز آئی اور اس نے کان لگائے تو بادشاہ کے کمرے سے آواز آرہی ہے، اس کا سر سجدے میں ہے اور وہ اللہ سے مانگ رہا ہے کہ یا اللہ! میرے ملک پر رحم فرما، یہ عطا فرما، رحمتیں عطا فرما اور رزق کی فراوانی عطا فرما۔ وہ بادشاہ کی دعائیں سنتا رہا۔ اس کے بعد اس نے بادشاہ کے پاس دو تین دن قیام کیا، پھر اس سے اجازت مانگی۔ بادشاہ نے کہا: تم میرے بے تکلف دوست ہو، اتنے عرصے سے تم آئے نہیں، اب آئے تھے تو کوئی کام تھا؟ اس نے کہا کہ آیا تو ایک کام کے لیے تھا، لیکن اب میرا کام ہوگیا۔ بادشاہ نے کہا: تم نے وہ کام بتایا ہی نہیں تو وہ کام کیسے ہوگیا؟ تو اس نے بتایا کہ میرے حالات خراب تھے، میں آپ سے کچھ مانگنے کے لیے آیا تھا، لیکن میں نے رات کو دیکھا کہ آپ خود بھی کسی اور سے مانگ رہے ہیں تو میں نے سوچا کہ میں بھی اسی سے کیوں نہ مانگوں جس سے بادشاہ مانگ رہا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ ہاں! دینے والا تو اللہ ہی ہے۔ تو اس نے کہا کہ میں بھی اسی

سے ہی لوں گا، مجھے آپ کے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔

حاصلِ کلام:

اس لیے یاد رکھیں! ہر چیز اللہ کے توکل سے حاصل کریں، اسی سے مسلمان اور کافر میں فرق ہے۔ موت مسلمان کے گھر میں بھی آتی ہے اور کافر کے گھر میں بھی، رزق مسلمان کو بھی ملتا ہے اور کافر کو بھی، غم مسلمانوں کو بھی آتا ہے اور کافروں کو بھی، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ مسلمان کو جب بھی مصیبت آتی تو وہ کہتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ﴾ [النساء:۷۹]

''(اے انسان!) تجھ کو جو کوئی خوشحالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ کی جانب سے ہے اور جو کوئی بدحالی پیش آوے وہ تیرے ہی سبب سے ہے۔''

جب راحت ملتی ہے تو کہتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ [النحل:۵۳] (اور تمہارے پاس جو کچھ بھی نعمت ہے وہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے)۔ موت آتی ہے تو کہتا ہے: اللہ کا فیصلہ ہے، اس کو کون ٹال سکتا ہے؟ وہ ان چیزوں کا تعلق اللہ سے جوڑے گا، لیکن کافر ان چیزوں کا تعلق اسباب کے ساتھ جوڑے گا۔

''بِسْمِ اللّٰهِ'' کا سبق کیا ہے؟

یاد رکھیں! ''بِسْمِ اللّٰهِ'' نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ ہر چیز اللہ کی مدد اور استعانت سے حاصل کرنی ہے۔ دیکھیں! چھوٹی سی آیت کے اندر کتنی بڑی اکسیر ہے۔ پانی پینے لگو تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھو، کھانا کھانے لگو تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھو، کپڑے پہننے لگو تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھو، مسجد میں قدم رکھنے لگو تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ یا ''بِسْمِ اللّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي ذُنُوْبِي، وَافْتَحْ لِي أَبْوَابَ فَضْلِكَ.'' پڑھو۔ تو ہمیں ہر وقت اس چھوٹی سی آیت سے یہ سبق مل رہا ہے کہ کھانا حاصل ہوا ہے تو اسی کی طرف سے، پینا حاصل ہوا ہے تو اسی کی طرف سے، صحت ہے تو اسی کی طرف سے اور طاقت ہے تو اسی کی طرف سے۔ ہر چیز اسی کی استعانت سے حاصل ہو رہی ہے۔

بعض علماء نے ایک اور بات بھی لکھی ہے، اگر چہ وہ حدیث میں نہیں ہے، لیکن بزرگوں کے تجربات ہیں۔ بعض لوگوں کے ذہنوں پر اتنا جماد ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ ہمیں یہ لفظ قرآن وحدیث کے اندر دکھاؤ۔

حضور ﷺ کا ارشاد اللہ کا حکم ہے:

جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک بی بی کو بھنوؤں کے چننے اور ان کو باریک کرنے سے منع فرمایا کہ اللہ کا حکم ہے تو وہ بی بی چلی گئی اور دو دن کے بعد آئی اور کہا کہ آپ تو صحابی ہیں، میں نے تو سارے قرآن کے اندر دیکھا، لیکن میں نے کہیں بھی نہیں پایا کہ بھنویں نہ بناؤ، کسی جگہ نہیں لکھا ہوا کہ بالوں کو لمبا نہ کرو، سنگھار نہ کرو۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: معلوم ہوتا ہے کہ تو نے تو قرآن پڑھا ہی نہیں۔ اس نے کہا: کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ آپ نے فرمایا: اگر پڑھا ہوتا تو سمجھ بھی آ گئی ہوتی، یہ بتاؤ ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾ [الحشر:۷] (اور رسول ﷺ تمہیں جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز (کے لینے) سے تمہیں روک دیں تم رک جایا کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تعالیٰ (مخالفت کرنے پر) سخت سزا دینے والا ہے۔) قرآن پاک میں ہے یا نہیں ہے؟ تو اس نے کہا کہ ہاں یہ قرآن پاک میں ہے۔

اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ [النساء:۸۰] (جو رسول کی اطاعت کرے، اس نے اللہ کی اطاعت کی)۔ کیا یہ قرآن میں ہے؟ اس نے کہا جی ہے۔

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾ [آل عمران:۱۳۲] (اور اللہ اور رسول کی بات مانو، تا کہ تم سے رحمت کا برتاؤ کیا جائے)۔ کیا یہ بھی قرآن میں ہے؟ اس نے کہا: جی ہے۔

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ [النساء:۵۹] (پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو تم اس امر کو اللہ تعالیٰ اور رسول کے حوالے کر دیا کرو)۔ اور کیا یہ بھی قرآن میں ہے؟ اس نے کہا: جی ہے۔

تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان چیزوں سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے تو گویا یہ قرآن میں ہے۔ تو اب اس عورت کو بات سمجھ آئی۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۴۸۸۶، باب: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ]

فراخیٔ رزق کا وظیفہ:

بہر حال بات ہو رہی تھی کہ بعض علماء نے فرمایا کہ اس آیت کے اندر اتنی تاثیر ہے کہ جس آدمی کے رزق میں تنگی

ہے، کاروبار میں تنگی ہے وہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کو جس قدر ہو سکے کثرت سے پڑھے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھتا رہے۔ یہ ایسی آیت ہے۔ جیسے اردو میں محاورہ ہے کہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا۔ یقینِ کامل ہو تو آپ ایک مہینہ کے اندر انقلاب دیکھیں گے۔ جس شخص نے اس کو یقین کے ساتھ پڑھا وہ ضرور برکت حاصل کرے گا۔

''بِسْمِ اللّٰهِ'' میں دنیا و آخرت کی سب بھلائیاں ہیں:

اس میں لفظ ''اللّٰه'' ہے۔ فرمایا: آپ پوری کائنات پر نظر ڈالیں تو وجودِ باری تعالیٰ پر نظر پڑے گی۔ اور جب وجودِ باری تعالیٰ پر نظر ڈالیں گے تو وجودِ کائنات کے بارے میں علم ہوگا۔ آگے صفت ''الرَّحْمٰنِ'' ہے کہ اس کی رحمت مسلمانوں پر بھی ہے اور کافروں پر بھی ہے۔ اس سے دنیاوی فوائد حاصل ہوں گے۔ اور جب ''الرَّحِيْمِ'' پر نظر ڈالیں گے تو سارے فوائدِ اخروی وہاں سے حاصل ہوں گے۔ اس لیے ان تین چیزوں کے اندر ساری چیزیں آگئیں: فوائدِ دنیاوی بھی آگئے اور فوائدِ اخروی بھی آگئے۔ اس کے بعد غور کریں کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں لفظ ''اللّٰه'' ایک ہے اور صفتِ رحمت کے دو لفظ ہیں۔ تو یہ اس بات کی دلیل ہوئی جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''إِنَّ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ'' (میری رحمت میرے غضب پر سبقت کرگئی)۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۵۳، بَابُ قَوْلِهٖ تَعَالٰى: وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا...]

''تعوذ'' اور ''تسمیہ'' کا مقصد:

اس درس کے اندر ہم نے اب تک دو چیزیں پڑھ لیں: ''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' اور ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ''۔ تو یاد رکھیں! ہر بندے کے اندر دو جذبے ہوتے ہیں: جذبۂ غضب اور جذبۂ محبت۔ اللہ نے ہمارے اندر جو غضب رکھا ہے تو اس کو نکالنے کے لیے کوئی راستہ ہوگا۔ جیسے قوتِ شہوانیہ رکھی تو اس کو نکالنے کا حل دیا کہ شادی کرلو۔ اگر ایک سے گزارہ نہیں ہے تو دو کرلو، تین کرلو، چار کرلو۔ اب قوتِ غضبیہ نکالنے کے لیے ہمیں ''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' سکھایا کہ تیرا غصہ تیری عداوت تین چیزوں سے ہو: شیطان سے بھی عداوت ہو، شیطان کے دوستوں سے بھی عداوت ہو اور شیطانی اعمال سے بھی عداوت ہو۔ یہ ہمیں تعوذ نے سبق دیا۔ اور ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کے اندر جذبہ محبت ہے۔ تو محبت کس سے ہو؟ فرمایا: ''رَحْمٰنِ'' سے، ''رَحْمٰنِ'' کے دوستوں سے محبت ہو تب جا کر تم مکمل انسان بنو گے۔ اس کے اندر اللہ نے ہمیں سبق دیے جو اخلاقی بھی ہیں، روحانی

بھی ہیں، سیاسی بھی ہیں، مادی بھی ہیں، دنیاوی بھی ہیں اور ان کے فوائد اخروی بھی ہیں۔

اس لیے حدیث مبارک کے اندر آیا کہ جس کام کو" بِسْمِ اللّٰهِ " سے شروع نہ کرو وہ کام بالکل ناقص ہوتا ہے۔ مکمل تب ہوگا جب ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کو پڑھو گے۔ جب کھانے پر ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کو پڑھا تو اس کھانے میں شیطان دخل نہیں دے سکتا، اس کھانے میں شریک نہیں ہوسکتا، حتیٰ کہ وہاں جتنے شیطان ہوتے ہیں ان کو کہا جاتا ہے کہ یہاں سے بھاگ جاؤ، یہاں سے تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اور جس چیز پر" بِسْمِ اللّٰهِ " نہیں پڑھی اس پر شیطان کا تصرف ہوگا۔ تو اللہ نے ہمیں یہ دو نعمتیں عطا فرمائی ہیں: ایک کا نام "تَعَوُّذ" اور دوسرے کا نام "تَسْمِيَة" ہے۔

تنبیہ:

گذشتہ مضامین میں تعوذ اور تسمیہ کے بارے میں چند مباحث، حکم اور تفصیلات پڑھیں اور آج سورۃ فاتحہ کے بارے میں پڑھیں گے۔ تاکہ اللہ کے قرآن کو سنتے ہوئے یا پڑھتے ہوئے جب اس کو سمجھیں گے تو قرآن دل میں اترے گا اور اثر کرے گا۔

اہلِ عرب پر اللہ کا خاص احسان:

عرب لوگوں پر اللہ کی نعمت ہے کہ ان کو لغت پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس کا مطلب جو واضح ہوتا ہے سمجھ لیتے ہیں، باریکیاں ان کو ان کے علماء سمجھاتے ہیں۔ جب قرآن پڑھا جارہا ہوتا ہے تو ان کو اس کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔

ہندوستان میں فہمِ قرآن کا ذوق:

جیسے ہندوستان میں اب...... ماشاء اللہ...... یہ سلسلہ شروع ہوچکا ہے کہ رمضان کے اندر امام تراویح کے اندر جتنا قرآن پڑھتے ہیں، اس کا خلاصہ بیان کرتے ہیں، تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ آج ہم نے کیا سنا ہے؟ اور تاکہ تراویح کا معنی بھی پورا ہوجائے۔

تراویح ترویحہ سے ہے۔ معنی ہے آرام وسکون۔ تو چار رکعت کے بعد اس کا خلاصہ بھی ہوجاتا ہے اور آرام بھی ہوجاتا ہے۔ مثلاً چار رکوع پڑھے، کیونکہ ہمارے ہاں ایک رکوع پر رکعت ہوجاتی ہے۔ اس لیے تو رکوع کو رکوع کہتے

ہیں، کیونکہ رکوع ہو جاتا ہے۔ تو وہ ان چار رکوع کا خلاصہ بیان کر دے۔ اس سے تفصیل سمجھ نہیں آئے گی، لیکن کچھ نہ کچھ تو سمجھ آ جائے گا، جو نہ سمجھنے سے کروڑ درجہ بہتر ہے۔

تفسیرِ فاتحہ کی ضرورت:

اس ضمن میں ہم نے سوچا کہ چونکہ سورۂ فاتحہ ہر رکعت کے اندر پڑھی جاتی ہے تو اس کا معنیٰ آ جائے، تاکہ ہماری نماز اچھی ہو جائے۔

نماز ہی دین کی اساس ہے:

عبادات میں نماز بنیادی چیز ہے۔ فرمانِ رسولِ عربی ہے:

((اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ)) [شعب الایمان، حدیث:۲۸۰۷]

''نماز دین کا ستون ہے۔''

اور کہا گیا ہے:

((مَنْ أَقَامَهَا فَقَدْ أَقَامَ الدِّيْنَ وَمَنْ هَدَمَهَا فَقَدْ هَدَمَ الدِّيْنَ))

''جس نے اس ستون کو مضبوطی سے پکڑ لیا گویا پورا دین کھڑا ہو گیا اور جس نے اس کو گرا دیا گویا اس نے پورے دین کو گرا دیا۔'' [عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، جز:۷، باب قَوْلِ اللہِ تَعَالٰی: مُنِيْبِيْنَ إِلَيْهِ]

اور یہ بھی کہا گیا ہے:

''اَلصَّلٰوۃُ صِلَةٌ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الرَّبِّ''

''نماز بندے اور رب کو جوڑنے والی ہے۔''

اگر نماز درست ہے تو اللہ سے تعلق بھی درست ہے، اگر رسی کمزور ہو تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تو اللہ سے تعلق اس وقت ہوگا جب نماز ہوگی، اگر نماز مضبوط نہیں ہوگی تو صلہ اور تعلق مضبوط نہیں ہوگا۔ اس لیے نماز کو معراج کہا گیا ہے۔

''نماز آنکھوں کی ٹھنڈک ہے'' کی عجیب تشریح!

ایک حدیث مبارک میں آتا ہے:

((وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوۃِ)) [سنن النسائی، حدیث:۳۹۴۰، باب: حُبُّ النِّسَاءِ]

''اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں بنائی گئی۔''

حضور ﷺ نے نماز کو راحت القلب نہیں فرمایا، راحتِ جان نہیں فرمایا، بلکہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا ہے۔ یہ لفظ کہنے کی کیا وجہ تھی؟ علماء نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ نماز میں احسان کا درجہ ہے کہ ((أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ)) (تم ایسے اللہ کی عبادت کرو کہ تم خدا کو دیکھ رہے رہو) تو دیکھنے کا تعلق آنکھوں سے ہوتا ہے۔ تو جس کو ایسی نماز نصیب ہو جائے تو آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ قرآن میں ہے:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ [القیامۃ: ۲۲،۲۳]

''بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝﴾ [المطففین: ۲۲،۲۳،۲۴]

''[قیامت کے دن] نیک لوگ بڑی آسائش میں ہوں گے۔ آرام دہ نشستوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے۔ ان کے چہروں پر نعمتوں میں رہنے سے جو رونق آئے گی، تم اسے صاف پہچان لو گے۔''

وجہ کیا ہے کہ جب اللہ کا دیدار ہوگا تو اس کے اثرات کیسے چہرے پر مرتب نہیں ہوں گے؟ اس لیے فرمایا:

﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝﴾ [المطففین: ۲۴]

''اے مخاطب! تو ان کے چہروں میں آسائش کی بشاشت پہچانے گا۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝﴾ [عبس: ۳۸]

''اس روز کتنے چہرے تو (ایمان کی وجہ سے) چمکتے دمکتے ہوں گے۔''

قیامت کے دن ایسے چہرے بھی ہوں گے جو کھلے ہوئے ہوں گے، ہنسنے والے ہوں گے اور خوشیاں ان کے چہروں پر ٹپک رہی ہوں گی۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

بہت ساری دینی جماعتوں کی آج بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کی نماز ٹھیک ہو جائے، کیونکہ اگر یہ ٹھیک ہو گئی تو پورا دین ٹھیک ہو گیا، پورے اعمال ٹھیک ہو گئے۔ اگر نماز ٹھیک ہو گئی تو اللہ سے بندے کا تعلق جڑ گیا اور

جب بندے کا اللہ سے تعلق جڑ جائے، جب مخلوق اپنے خالق سے جڑ جائے تو نماز ٹھیک ہوگی اور نماز تب ٹھیک ہوگی جب بندے کو پتا ہو کہ میں نماز میں کیا پڑھ رہا ہوں؟ نماز میں حلاوت اور کشش کیسے پیدا ہوگی؟ راحت کیسے پیدا ہوگی؟ ہم نماز پڑھتے ہیں، لیکن اس کو سمجھتے نہیں ہیں، محض الفاظ دہرا لیتے ہیں، لیکن ہمیں پتا نہیں ہوتا کہ کیا پڑھ رہے ہیں؟ اور نماز میں بعض ایسی غلطیاں کرتے ہیں جن سے نماز نہیں ہوتی۔ قرآن پاک کے بعض اعراب میں اگر غلطی ہو جائے تو نماز ختم ہو جاتی ہے، بلکہ بعض اعراب کی غلطی سے بندہ کافر ہو جاتا ہے۔ جیسے اسی سورۂ فاتحہ میں آپ پڑھتے ہیں:

﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ [الفاتحہ:٦]

''رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔''

''أَنْعَمْتَ'' میں ''تَ'' پر زبر ہے۔ اگر پیش پڑھ کر ''أَنْعَمْتُ'' پڑھ لیا تو معنی کیا ہوگا کہ جن پر میں نے انعام کیا ہے۔ تو نتیجہ کیا نکلے گا کہ بندہ کافر ہو جائے گا۔ کبھی ایک اعراب سے اور کبھی ایک حرف سے بھی معنی بدل جاتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا نماز میں دل نہیں لگتا۔ یاد رکھیں! نماز پڑھنا فرض ہے، چاہے دل لگے یا نہ لگے۔ باقی دل کیسے لگے گا؟ جوں جوں اصلاح ہوگی دل لگ جائے گا۔ اور اصلاح کیسے ہوگی؟ جب آپ قرآن پڑھیں گے اور آپ کو ہر ہر لفظ کا پتا ہو کہ اس کا معنی کیا ہے؟ دیکھیں! ہم ''اللّٰهُ أَكْبَرُ'' کہتے ہیں تو کتنے بھائی ہیں کہ جن کو اس کا معنی ہی نہیں آتا۔ اب ''أَكْبَرُ'' بظاہر اسم تفضیل کا صیغہ ہے کہ اللہ بہت بڑا ہے۔ تو کیا معنی ...... معاذ اللہ! ...... کوئی اور چھوٹا خدا بھی ہے؟

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ [المدثر:٣]

''اپنے رب کی بڑائی بیان کرو، اپنے رب کو بڑا سمجھو۔''

اب یہ کیسے ہوگا؟ جب بندے کو ''اللّٰهُ أَكْبَرُ'' کا معنی ہی نہ آتا ہو تو اس کا دل کیسے لگے گا؟ اب اس کو یہ بھی پتا نہیں کہ تسبیح ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ'' کا کیا معنی ہے؟ تسبیح اور تحمید میں کیا فرق ہے؟ ''تَبَارَكَ'' کا کیا معنی ہے؟ ''جَدُّكَ'' کا کیا معنی ہے؟ تو نماز کیسے اچھی ہوگی؟

ایک بڑے پیر کو عید کی نماز بھی نہیں آتی تھی:

ایک دفعہ عید کے موقع پر بہت بڑا اجتماع تھا۔ بریلوی بھی بہت تھے اور دیوبندی بھی بہت تھے اور دونوں کے

امام آ گئے۔ دونوں طرف کے لوگوں کی خواہش تھی کہ ہمارا امام نماز پڑھائے۔ اب اندیشہ پیدا ہو گیا کہ لوگ لڑ پڑیں گے۔ وہاں ایک پیر صاحب بھی آئے ہوئے تھے اور وہ بہت بڑے گدی نشین بھی ہیں۔ لوگوں نے سوچا کہ لڑائی سے بچنے کا کوئی نہ کوئی حل ہونا چاہیے۔ تو چند ایک نے کہا کہ مولوی صاحب! مہربانی کرو، یہاں خوشی کے دن خون خرابہ نہ ہو جائے، تم دونوں نماز نہ پڑھاؤ۔ جب یہ سید بھی ہے، پیر بھی ہے اور اصول بھی ہے کہ جب قریشی موجود ہو تو کوئی اور امام کیوں بنے؟ تو ان دونوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ تو پیر صاحب کے پاس گئے کہ اب اس فتنہ کا حل یہ ہے کہ آپ نماز عید پڑھا دیں۔ اس نے کہا: کوئی عالم پڑھا دے، میں مناسب نہیں سمجھتا...... وجہ یہ تھی اس کو نماز عید آتی ہی نہیں تھی...... اب بظاہر تو وہ تواضع کر رہے تھے، لیکن لوگوں نے ان کو کھڑا کر دیا...... نماز آئے گی تو پڑھائیں گے۔ اب اس غریب کو پتا نہیں تھا کہ نماز عید کی تکبیریں کتنی ہیں؟ اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ چھوڑنے ہیں یا باندھنے ہیں؟...... تو اب یہ ہوا کہ اللہ کی مہربانی سے اس نے چار تکبیروں سے نماز عید پڑھائی۔ اس نے سمجھا کہ جیسے جنازے کے اندر چار تکبیریں ہوتی ہیں ایسے ہی عید ہے۔

جنازہ میں فاتحہ پڑھنے والوں کا رد:

ایک آدمی مولوی صاحب کے پاس جنازہ پڑھ کر قریب آیا اور کہا کہ میں نے آپ کے ساتھ نماز جنازہ پڑھی ہے، آپ نے نماز کے اندر سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔ اس نے کہا: میں جاہل آدمی ہوں اور ابتداء ہی سے ہم نے جن آدمیوں سے دین سیکھا ہے خوش قسمتی سمجھو یا بدقسمتی سمجھو کہ انہوں نے ہمیں یہی سمجھایا ہے، اس لیے میں نہیں پڑھتا۔ اس نے کہا کہ یہ تو ٹھیک نہیں، کیونکہ جنازہ نماز ہے اور بڑی نماز میں چار رکعت ہوتی ہیں اور یہاں چار تکبیریں ہوتی ہیں اور نماز بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی۔ تو اس نے کہا: آپ ایک دفعہ کیوں فاتحہ پڑھتے ہیں؟ جب چار دفعہ تکبیریں ہیں تو فاتحہ بھی چار دفعہ پڑھا کریں۔ ہم تو آئندہ چار دفعہ پڑھیں گے۔ اس نے کہا کہ نہیں ایک دفعہ پڑھنی ہے۔ تو اس مولوی صاحب نے کہا: جب چار دفعہ نہیں تو پھر ایک دفعہ بھی نہیں، کیونکہ یہ نماز تو ہے نہیں، نماز تو بغیر رکوع وجود کے ہوتی نہیں ہے۔ اگر کوئی نماز بغیر رکوع وجود کے دکھا دیں تو پھر میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ تو اس کو صلوۃ کہا گیا ہے، وگرنہ ایک دعا ہے، تا کہ یہ اس کی بخشش کا ذریعہ بھی اور مانگنے والوں کی بخشش کا ذریعہ بھی بن جائے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ میت کی بخشش جنازہ پڑھنے والوں کی وجہ سے ہو جاتی ہے اور بعض میتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی نماز جنازہ پڑھنے والے ان میتوں کی وجہ سے بخشے جاتے ہیں۔

نماز کا ترجمہ ضرور سیکھیں:

بہر حال! میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم جو کچھ نماز میں پڑھتے ہیں ہمیں اس کا مطلب اور ترجمہ آ جائے۔ اور اس کا آسان حل یہ ہے کہ کوئی نماز مُترجَم نماز لے لیں۔ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ بعض حضرات نماز مُترّجَم کہہ دیتے ہیں۔ یہ غلط ہے، بلکہ نماز مُترجَم ہے۔ اگر جیم کے شد کے ساتھ پڑھیں تو معنی ہوگا کہ پتھر ماری ہوئی اور بغیر شد کے پڑھیں تو معنی ہوگا ترجمہ کی ہوئی۔ تو دیکھیں! چھوٹے سے فرق سے کتنا بڑا فرق پیدا ہو گیا۔

ویسے تو میرا عقیدہ ہے کہ جو اس کے دروازے پر آیا وہ واپس نہیں جائے گا۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے نماز سیکھنے کا حکم تو دیا ہے۔ لہٰذا مترجم نماز کی کتاب لیں اور جو نماز میں الفاظ پڑھے جاتے ہیں اس کے ترجمے کو بار بار دہرائیں۔ ایک دفعہ سے ترجمہ نہیں آئے گا۔ جہاں اشکال پیدا ہو، سمجھ نہ آئے تو اپنے علماء سے رجوع کر لیں کہ حضرت! میں نے ترجمہ لے کر یاد کر لیا ہے، لیکن یہ تھوڑا سا سمجھ نہیں آ رہا، سمجھا دیں۔

دوسرا علیحدگی کے اندر آپ نماز پڑھتے ہیں اور جو سورتیں یاد ہیں اکثر ان کو نماز میں دہراتے رہیں، ان کا ترجمہ بھی قرآن کی تفسیر میں دیکھیں اور بار بار دہرائیں، چاہے آپ کو پہلی دفعہ سمجھ آ جائے۔ جوں جوں ترجمہ دیکھو گے تو قرآن کا معجزہ دیکھنا کہ قرآن کی ایک حلاوت پیدا ہوگی، قرآن سینے میں اترنا شروع ہو جائے گا۔

میں نے اپنے والد صاحب رحمہ اللہ کو دیکھا کہ ۹۰ سال کی عمر میں قرآن کا ترجمہ لے کر بیٹھے ہوتے تھے۔ تو میں بھی اپنی جہالت سے ہنستا تھا کہ 80 سال جس بندے نے قرآن کی تفسیر پڑھائی ہو، اب قرآن کا ترجمہ لے کر بیٹھے ہوئے ہیں، جس نے کوئی تفسیر نہ چھوڑی ہو، مخطوطات بھی پڑھ ڈالے ہوں وہ ترجمہ والا قرآن لے کر ترجمہ دیکھ رہا ہے۔ تو مجھے اشکال پیدا ہوتا تھا تو میں سوچتا کہ اصل بات یہ ہے کہ ان کو اپنے استاد سے محبت بڑی تھی، کیونکہ وہ تفسیرِ عثمانی کا ترجمہ تھا، (اور علامہ عثمانی رحمہ اللہ میرے والد رحمہ اللہ کے استاد تھے۔) تاکہ میرے استاد کو ثواب پہنچے۔ تو میں نے ایک دفعہ پوچھ لیا کہ حضرت! اتنا عرصہ ہو گیا، کیا ابھی بھی آپ کو ضرورت ہے کہ آپ ترجمہ والے قرآن کو دیکھیں؟ کہنے لگے: بیٹا! اللہ کی شان ہے کہ اللہ نے ان کو اتنا علم دیا تھا کہ جو مسئلہ ساری تفسیروں سے حل نہیں ہوتا ان کے ترجمہ سے حل ہو جاتا ہے، لیکن تمہیں علم ہو تو ان کے ترجمہ سے فائدہ اٹھاؤ گے، جب تمہیں خود کچھ نہیں آتا کہ ''ہی'' اور ''بھی'' میں کیا فرق ہے؟ جب تمہیں علم ہو کہ مفعول مطلق کیا ہوتا ہے؟ مفعول مالم یسم فاعلہ کیا ہوتا ہے؟ بدل الکل، بدل البعض اور بدل الاشتمال کیا ہوتا ہے؟ مفعول معہ کیا ہوتا ہے؟ جب پتا ہوگا تو ترجمہ سے فائدہ اٹھاؤ

گے۔ یہ طوطے کی طرح ہوا کہ آپ اس کو زبان سکھادیں، وہ کہتا رہتا ہے: چوری، چوری۔ حالانکہ اس کو پتا نہیں ہوتا کہ چوری کس سے بنتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہم بھی لفظ پڑھتے ہیں، لیکن ان کا مطلب نہیں آتا۔ جس گھر میں نماز درست ہوجائے گی فساد ختم ہوجائے گا۔ تجربہ کرکے دیکھ لیں، لیکن شرط یہ ہے کہ بیگم کو نماز کا کہنے کی ہمت ہو۔ ایک آدھ دن روٹی نہ ملے تو صبر کرلینا۔ لیکن عورت بڑی سمجھدار ہوتی ہے روٹی پھینکے گی، دے گی تو نہیں، آپ کے گلے سے نکالے گی۔ آدھی کچی ہوگی اور آدھی پکی ہوگی۔

علم تکرار کرنے سے آتا ہے:

گھر والوں کی نمازیں درست کرو۔ اور اس کا طریقہ آسان ہے کہ مترجم نماز لے لیں۔ امامِ کعبہ کو دیکھتے ہو کہ کتنی دیر رکوع اور سجود کرتے ہیں، اتنی دیر لگاؤ۔ حالانکہ وہ جلدی کرتے ہیں، کیونکہ ان کے پیچھے مخلوق ہے، کوئی ضرورت والا ہے۔ نماز کے فرائض یاد کریں، پھر واجبات یاد کرائیں۔ ایک دن میں یاد نہ کرائیں۔

ہم والد صاحب کی خدمت کرتے تھے۔ اس وقت ہم نے دورہ حدیث کرلیا تھا تو والد صاحب کہتے کہ باب "سَمِعَ" سناؤ۔ ہم کہتے کہ عجیب بات ہے! ہم نے پڑھ لیا ہے اور یہ ہم سے پہلی کلاس کا باب سن رہے ہیں۔ پھر دوسرے دن پوچھتے: "يَعْلَمُ" کیا صیغہ ہے؟ "يُفْلِحُوْنَ" اور "يَفْلَحُوْنَ" میں کیا فرق ہے؟ اب ہم جواب دیتے تھے، لیکن دل میں سوچتے کہ ابھی تک ہمیں بچہ سمجھا ہوا ہے۔ اب آکر ہم پر راز کھلا کہ ان کی یہ محنتیں تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ یہ نالائق طالب علم ہیں، پڑھیں گے تو نہیں، ان سے یہ سنو، تا کہ اس کو دہراتے رہیں۔ تو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ پینتیس سال پہلے جو ہم نے پڑھا تھا وہ آج بھی...... الحمدللہ!...... یاد ہے۔

بَاء و تَاء و كَاف و لَام وَاوْ مُنْذُ، مُذْ، خَلَا
رُبَّ، حَاشَا، مِنْ، عَدَا، فِيْ، عَنْ، عَلٰى، حَتّٰى، اِلٰى

آج بھی شعر یاد ہے۔ حالانکہ قرآن تھوڑا ہے؟ بس کیا ہے کہ بار بار اساتذہ نے یاد کرواکے، رٹا لگواکے، گھول کر ذہن میں ڈال دیا ہے۔ نیند میں بھی کبھی "ضَرَبَ، يَضْرِبُ" یاد آجاتا ہے۔

ابا جی کا شوقِ علم:

میرے والد صاحب خود سناتے تھے کہ میں یہ باب پڑھ رہا تھا اور کتے نے کاٹا اور بوٹی نکال لی، خون بہتا رہا۔ جب مدرسہ میں آیا تو لڑکوں نے کہا کہ یہ آپ کو کیا ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے پتا ہی نہیں لگا۔ یہ شوق ہوتا تھا۔

صحیح نماز کی برکات:

اس طرح گھر میں نماز پڑھاؤ۔ جس دن تمہارے گھر نماز درست ہوگئی سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے، تمہارے گھر کے اندر برکات بھی ہوں گی، اللہ تعالیٰ رزق میں بھی برکتیں ڈالیں گے اور اولاد کی صحت وعمل میں بھی برکتیں ڈالیں گے۔ اور گھر میں جو تناؤ ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ذکر نہیں آیا، جب اللہ کا ذکر آیا تو پریشانی ختم ہوئی۔ میرے مدنی پاک ﷺ کو کوئی پریشانی آتی تو فوراً نماز پڑھتے۔ اللہ اکبر!

دیکھیں! آپ کا آئی جی سے رابطہ ہو، پھر تھانیدار آپ کو بلائے تو آپ کہتے ہیں: جاؤ جاؤ! میں نے آئی جی سے رابطہ کرلیا ہے۔ تو اسی طرح جب اللہ سے تعلق ہو گیا تو مخلوق کی کیا طاقت ہے کہ آپ اس سے ڈرتے پھریں۔

سورۂ فاتحہ پہلی سورت کیسے ہے؟

اب سمجھیں کہ سورۂ فاتحہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔ آپ کہیں گے کہ قرآن کی تو پہلی سورت ''سورۃ العلق'' ہے، اس کے بعد ''سورۃ المدثر'' ہے تو ''سورۂ فاتحہ'' پہلی سورت کیسے ہوئی؟

جواب:

صحابہ ﷺ کہتے ہیں کہ جو کامل سورت سب سے پہلے حضور ﷺ پر اتری وہ سورۂ فاتحہ ہے۔ سورۃ العلق کی تو اول اول چند آیات اتری ہیں، مکمل نہیں اتری تھی۔ اور نماز میں سب سے پہلے پڑھی جانے والی سورت بھی سورۂ فاتحہ ہے۔ اسی طرح دیکھیں! سورۂ فاتحہ جس طرح فاتحہ ہے وہاں اللہ نے اس کو ''اَلْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ'' بھی فرمایا ہے اور اس کا نام ''سَبْعَ مَثَانِیْ'' بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ﴿۸۷﴾﴾ [الحجر:۸۷]

''اور ہم نے تمہیں سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور عظمت والا قرآن عطا کیا ہے۔''

سورۂ فاتحہ کے کئی نام ہیں:

اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا: جس طرح اس سورت کا نام ''فَاتِحَةٌ'' ہے اسی طرح ''شَافِیَةٌ'' بھی ہے، ''رَافِعَةٌ'' بھی ہے، ''کَافِیَةٌ'' بھی ہے، ''کَنْزٌ'' بھی ہے اور ''اُمُّ الْمَسْئَلَةِ'' بھی ہے۔ سورۂ فاتحہ کے کئی نام ہیں جو

ہمیں روایات میں ملتے ہیں۔ تو سورۂ فاتحہ عظیم سورت ہے۔

دو نور:

صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے مجھے دو نور عطا فرمائے ہیں۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ وہ دو نور کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی آخری آیات۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۸۰۶، بَابُ فَضْلِ الْفَاتِحَةِ، وَخَوَاتِيمِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ]

سورۂ فاتحہ سے عذاب ٹل گیا:

اسی طرح حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی مقام پر اللہ کا عذاب نازل ہونے کا فیصلہ ہو گیا اور اس بستی میں ایک بچے نے فاتحہ شروع کی تو اللہ نے فرمایا: ملائکہ! اس بستی سے عذاب اٹھا لو، میں اس بستی پر عذاب نازل نہیں کرتا جہاں فاتحہ پڑھی جائے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی کو قبر میں عذاب ہو رہا تھا، اس کا بچہ مسجد میں گیا، مدرسہ میں گیا۔ جب اس نے پڑھنا شروع کیا: ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①'' اللہ نے فرمایا: اس بندے سے قبر میں عذاب ہٹا لو، مجھے حیا آتی ہے کہ اس کا بچہ فاتحہ پڑھے اور میں اس پر عذاب بھیجوں۔

یہ شان والی سورت ہے۔ اس کی عظمتوں کا اندازہ اسی کو ہو سکتا ہے جو اس کے معانی کو سمجھتا ہے۔

سارا قرآن فاتحہ کی شرح ہے:

بعض علماء نے فرمایا: غور کریں تو سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: غور کریں تو پورے قرآن کا متن سورۂ فاتحہ ہے، باقی سارے قرآن میں اللہ نے اسی سورت کی شرح بیان فرمائی ہے۔

سورۂ فاتحہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا دم اور ہدیہ لینا:

قرآن فرماتا ہے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴾ [الاسراء: ۸۲]

''اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں شفا اور رحمت ہے۔''

اگر قرآن روحانی بیماریوں کی شفا ہے تو جسمانی بیماری کیا حیثیت رکھتی ہے؟

صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا بستی سے گزر ہوا، انہوں نے ان بستی والوں سے کہا کہ ہم مسافر ہیں، مہمان ہیں۔ اور ان صحابہ نے بستی والوں سے مہمانی مانگی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے آ کر ایک طرف ڈیرہ لگا لیا۔ صحابہ کرام کی مقدس جماعت تھی کہ جو کچھ ہے اس پر گزارہ کریں۔ جب رات کا کافی حصہ گزرا تو بستی کے دو آدمی آئے جو بڑے پریشان تھے، انہوں نے کہا: "هَلْ مِنكُمْ كَاهِنٌ؟" (بھائی! کیا تم میں کوئی بندہ ہے جو منتر پڑھتا ہو؟) ہمارے سردار کو بچھو نے ڈنگ مار لیا ہے، وہ تڑپ رہا ہے اور کوئی دوائی نہیں، کوئی پڑھنے والا نہیں، ہم نے کہا کہ شاید تم میں کوئی پڑھنے والا ہو؟ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں دم کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا: آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ انہوں نے فرمایا: مہربانی کوئی نہیں، ہم عوض لیں گے، تیس بکریاں لوں گا۔ میں پڑھوں گا، تمہارا سردار ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارا سردار ٹھیک نہ ہو تو نہ دینا۔

(یہاں سے مولوی صاحبان مسئلہ نکالتے ہیں کہ سب سے حلال وہی ہے جو تعویذ کا پیسہ ملے، حالانکہ یہ تعویذ نہیں ہے، یہ تو سورۂ فاتحہ ہے۔ تعویذ میں اختلاف ہے کہ لکھ کر گلے میں ڈالا جائے یا نہیں؟ راجح یہی ہے کہ نہیں، پڑھ کر دم کرنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔) انہوں نے کہا: ہمیں منظور ہے۔ سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تو ان کا سردار ٹھیک ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے تیس بکریوں کا وعدہ کیا ہے۔ اس سردار نے کہا: بالکل دے دو۔ اب وہ صحابی آئے تو بڑے خوش کہ اللہ پاک نے ہمارے لیے کیسے اسباب پیدا فرما دیے کہ یہ دعوت نہیں کرتے تھے، اللہ نے ان سے ہمیں تیس بکریاں دلوائیں۔ اب ان کو کھاتے ہیں۔ کچھ صحابہ نے کہا: ٹھیک ہے، لیکن کچھ صحابہ جو زیادہ محتاط تھے انہوں نے کہا: ہم نہیں کھاتے۔ اس صحابی نے کہا: کیوں میں نے یہ کوئی چوری کی ہیں؟ انہوں نے کہا: ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں گے۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔

کچھ بکریاں ذبح کر کے انہوں نے کھا لیں اور کچھ ساتھ لے کر آئے اور سارا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے کیا پڑھا تھا؟ انہوں نے عرض کی: سورۂ فاتحہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ سورۂ فاتحہ پڑھنے سے بیمار ٹھیک ہو جائے گا؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا تھا کہ اس کا نام شافیہ ہے تو یہ شفا دینے والی ہے تو اسی بات کو سامنے رکھ کر میں نے اس کو پڑھ دیا تو اللہ نے اس کو ٹھیک کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے جو تم نے لیا ہے وہ تم پر حلال ہے، اگر تمہارے پاس کچھ ہو تو میرا حصہ بھی دے

دو۔ [الصحیح البخاری، حدیث: ۵۰۰۷، بابٌ: فَضْلِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ]

یہ حضور ﷺ نے ان کے اطمینانِ قلب کے لیے فرمایا، تاکہ صحابہ کے دل میں کسی قسم کی میل باقی نہ رہے کہ اگر اس میں شبہ ہوتا تو حضور ﷺ اس کے اندر کیسے حصہ ڈالتے؟ حضور ﷺ نے خود اس کو قبول فرمایا۔

ہر بیماری سے شفایاب ہونے کے دو طریقے:

میرا اپنا واقعہ ہے۔ اس کو پیری نہ بنانا، میں ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ بہر حال ایک آدمی جس کو میں جانتا نہیں تھا، اس نے مجھے خط لکھا کہ میں کینسر کا مریض ہوں اور آپ کا نام سنا ہے، میں آپ کو نہیں جانتا اور آپ مجھے نہیں جانتے۔ آپ مہربانی کریں! میرا فلاں افسر جو ہے وہ آپ کا نام بڑے ادب سے لیتا ہے۔ اس کو ایک خط بھیج دیں کہ اس بندے کو ایک مہینہ کی چھٹی دے دیں، اس لیے کہ چھٹی ملتی بہت مشکل ہے، کیونکہ میں بیماری کی وجہ سے بہت چھٹیاں لے چکا ہوں۔ اب میری تمنا ہے کہ میں عمرہ کرلوں۔ میں نے خط لکھ دیا کہ چلو! کسی غریب کا بھلا ہوتا ہے تو ٹھیک ہے۔ بعد میں میرے دماغ سے وہ بات نکل گئی۔ وہ بندہ آکر مجھے ملا، وہیل چیئر پر تھا، اس نے کہا کہ اللہ نے مہربانی کی ہے، مجھے چھٹی مل گئی ہے، چلو! عمرہ کرلوں، کسی وقت موت آجاتی ہے۔ یہ ایک تمنا تھی، حسرت تھی۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو ایک چیز بتاتا ہوں کہ جتنے دن آپ آئے ہو، اس پر عمل کرو۔ اس نے کہا کہ فرمائیں! میں نے کہا کہ زم زم پیو اس نیت کے ساتھ کہ یہ شفا ہے اور ڈول کے ساتھ نہیں، بلکہ کنویں پر جاکر وہاں کھڑے ہوکر اتنا پیو اتنا پیو کہ یقین ہو جائے کہ اس سے زیادہ پیوں گا تو باہر نکل پڑے گا۔ اور اس کو سر پر، بدن پر اور جہاں جہاں کینسر کے اثرات ہیں اس پر بھی ڈالو۔

اور دوسرا عمل ایک بزرگ نے لکھا تھا کہ اگر کوئی بندہ بڑے سے بڑے موذی مرض کے اندر مبتلا ہو، جس کا کوئی علاج نہ ہو تو فجر کی نماز میں دو رکعت سنت پڑھنے کے بعد، ابھی فرض نہ پڑھے ہوں، اس دوران اگر کوئی بندہ درود شریف پڑھنے کے بعد ۴۱ مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھے اس نیت سے کہ یہ شفا ہے۔ اور اس کے پڑھنے کے دو طریقے لکھے ہیں:

- ایک تو یہ کہ پہلے الگ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھیں، پھر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ آخر تک پڑھیں۔
- اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ'' کو سورۂ فاتحہ سے ملا کر پڑھیں اور ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کی

میم پر زیر پڑھ کر اس کو''اَلْحَمْدُ'' کی لام کے ساتھ ملا کر پڑھیں۔ مثلاً: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾

اور آخر میں''اٰمِیْن'' ضرور پڑھیں۔ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ جب ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑦﴾ امین پڑھیں تو مد پوری کھینچیں۔ پھر اس کے بعد درود شریف پڑھیں اور فرض کے بعد اس بیماری سے شفا کی دعا کریں۔ تو جتنی موذی بیماری ہو اور جس کا پوری دنیا میں علاج نہ ہو اس کو اگر آپ کر لیں تو...... اِنْ شَآءَ اللّٰهُ!...... شفا ہو گی۔ میں نے ان کو بتایا۔

پھر مجھے بات بھول گئی۔ میں کوئی پیر تو نہیں۔ میرے دماغ میں تھا کہ یہ قرآن ہے، اس کے شفا ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر بزرگوں نے لکھا ہے تو ٹھیک لکھا ہو گا۔

ایک مہینہ کے بعد وہ بندہ ملا۔ جب پہلے ملا تھا تو وہیل چیئر پر تھا، اب وہ مجھے چلتے ہوئے ملا، کہنے لگا: اللہ کا شکر ہے کہ اب میں تین چار طواف چل کر کرتا ہوں، میرا وزن بھی بڑھ رہا ہے اور میری طبیعت بھی بحال ہو رہی ہے۔ واپس گیا اور دوبارہ چیک اپ کرایا تو ڈاکٹروں نے کہا کہ تمہیں تو کینسر ہے ہی نہیں، تمہاری پہلی رپورٹ غلط ہے یا تم بندے اور ہو۔ اس نے کہا: میں بندہ وہی ہوں۔ تو انہوں نے کہا: پھر کینسر کا علاج کیسے ہو گیا؟ اس نے کہا کہ یہ علاج مکہ میں ہوتا ہے، یہاں تو نہیں ہوتا اور میرا علاج تو وہیں ہوا ہے۔ باقی تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ اللہ کے قرآن کا اور اس سورت کے شفا ہونے کا ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ یقین ہو۔

سب سے پہلی سورت نماز میں پڑھی جانے والی فاتحہ ہے اور ام المسئلہ یعنی سب سے بہترین دعا اور سوال بھی فاتحہ ہے۔

سورۂ فاتحہ درخواست بھی ہے:

مثلاً: آپ کو کوئی پریشانی ہو تو آپ درخواست لکھیں تو ایک ہو گا درخواست لکھنے والا اور ایک وہ ہو گا جس کو درخواست لکھی جائے، یعنی مکتوب الیہ۔ پھر درخواست کسی خاص محکمے کی طرف لکھیں گے۔ اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو محکمہ صحت والوں کو لکھیں گے اور اگر آپ ماسٹر ہیں تو ایجوکیشن میں لکھیں گے۔ اور چوتھی چیز کہ درخواست لکھنے والا اپنا بھی کچھ تعارف کراتا ہے کہ آپ کا فرمانبردار، آپ کا نیازمند، آپ کا چاہنے والا، آپ کا دعا گو فلاں۔ اس کے بعد اپنا کام لکھتا ہے کہ میرا کام کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں ہوں گی تب درخواست مکمل ہو گی۔

اب دیکھیں! سورۂ فاتحہ مسئلہ ہے اور لکھنے والا گویا پڑھنے والا ہے، چاہے لکھ کر درخواست کریں چاہے زبانی سوال کریں۔ اور کس کو لکھے گا؟ اللہ کی ذات کو۔ تو اب کون کون سے محکمے کو متوجہ کرتا ہے؟ تو علماء نے فرمایا کہ اگر دیکھا جائے تو اللہ کی ایک ایک صفت محکمہ کا تصور ہے۔ سب سے بڑی چیز کہ اس کے اندر اسم ''اللہ'' آگیا اس کے لیے ضرورت ہے طاقت کی کہ طاقت ہوگی تو ملک بنائے گا۔ تو وہ کون ہے؟ اللہ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ [البقرة:١٦٥]

''تمام تر طاقت اللہ ہی کو حاصل ہے۔''

تو تمام مخلوق کو پیدا کرنے والا اللہ ہے۔

دوسری صفت ربوبیت ہے، اس کے بعد رحمتِ عامہ اور اس کے بعد رحمتِ تامہ کہ پوری کامل رحمت، جیسے ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ میں آگئی۔ اب یہ دیکھا کہ اس کو پکار رہے ہیں تو کچھ اپنا بھی تو تعارف کرائیں تو ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝٤﴾ کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور کسی سے مدد مانگتے ہی نہیں اور کسی کی طرف توجہ کرتے ہی نہیں، نہ کسی کو مدد دینے کے قابل تصور کرتے ہیں اور نہ عبادت کے لائق تصور کرتے ہیں۔ معبود بھی آپ ہی کی ذات ہے اور مدد کرنے والی بھی آپ ہی کی ذات ہے۔ تو یہ سارا کچھ کہنے کے بعد ہم نے درخواست کی: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝٥﴾ کہ یا اللہ! ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔ اب صراطِ مستقیم کن کا راستہ ہے؟ فرمایا: ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ''الَّذِينَ أَنْعَمْتَ'' میں کون تھے؟ تو اس کا جواب دوسری آیت میں ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۝٦٩﴾ [النساء:٦٩]

''اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے: یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔''

تو اس میں ہمیں یہ بھی سمجھ آگئی کہ پہلے اسم جلالہ (اللہ) ہے، جو پیدا کرنے والا ہے۔ اور پیدا کرنے کے بعد باقی رکھتا ہے۔ اب گھر کو رکھنا ہے تو صفتِ ربوبیت ہے، پھر فوائدِ دنیاوی ہیں تو وہ صفتِ رحمٰن سے تقاضہ مل رہا ہے اور پھر فوائد اخروی ہیں تو وہ صفتِ رحیمیت سے ہمیں سبق مل رہا ہے۔ اور پھر اس کے انصاف پر یقین ہے: ﴿مٰلِكِ

يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٤﴾﴾ پھر اپنے تعلق کا اقرار ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿٥﴾﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد کہ اس کے خالق ہونے کا اقرار، اس کی صفتِ ربوبیت کا اقرار، اس کی رحمتِ عامہ کا اقرار، اس کے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٤﴾﴾ ہونے کا اقرار، اس کے معبود ہونے کا اقرار اور اس کی نصرت فرمانے اور نفع نقصان کے مالک ہونے کا اقرار۔ پھر ہم نے درخواست کی صراطِ مستقیم کی اور مستقیم کون سا راستہ ہے؟ جس پر تیرے انعام والے لوگ چلے ہیں۔ وہ کون ہیں؟ ''اَلنَّبِيِّيْنَ''، ''اَلصِّدِّيْقِيْنَ''، ''اَلشُّهَدَاءِ'' اور ''اَلصّٰلِحِيْنَ'' تو اس میں ہمیں سمجھ آیا کہ اے اللہ! ہم اس وقت آپ سے دنیاوی بھلائی نہیں مانگ رہے، ہم آخرت کی بھلائی مانگ رہے ہیں، کیونکہ ﴿الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ جتنے لوگ ہیں وہ دینی لوگ ہیں، دنیاوی لوگ نہیں ہیں۔ ہم یہ نہیں مانگ رہے کہ ہم فیکٹری لگالیں، مل لگالیں یا اتنے پیسے مل جائیں یا بینک بیلنس اور بڑھ جائے، بلکہ ہم تجھ سے اخروی فائدہ مانگنا چاہتے ہیں، اس پٹری پر آنا چاہتے ہیں جو ہمیں سیدھا جنت کی طرف لے آئے۔

اب دیکھیں! سورۂ فاتحہ کا نام ''أُمُّ الْمَسْئَلَةِ'' بھی ہے کہ سب سے بہتر سوال اور سب سے بہتر دعا کرنا اور مانگنے کا طریقہ صرف سورۂ فاتحہ میں ہے۔ اس سے جامع کوئی دعا اور طریقۂ سوال نہیں ہوسکتا۔ اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ سب سے جامع، مانع، کامل اور مکمل دعاء سورۂ فاتحہ ہے۔ اسی سے ہمیں معلوم ہوا کہ جس سے ہم نے مانگنا ہو اس کی پہلے حمد وثنا بیان کی جاتی ہے، اس کی قدرتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے، پھر اس کے انصاف پر یقین رکھا جاتا ہے اور پھر اس کی صفات کو جوش دلایا جاتا ہے، تاکہ رحمت جوش میں آئے اور ہم اپنا سوال لے کر کامیاب ہوجائیں۔ اسی لیے اللہ نے یہ سورۂ فاتحہ ایسی نعمت عطا فرمائی ہے جس کا کوئی مقابلہ نہیں۔

فضیلتِ سورۂ فاتحہ:

سابقہ مضامین کے اندر عرض کیا تھا کہ سورۂ فاتحہ عظیم سورت ہے۔ ترتیب قرآن کے اعتبار سے اور نماز میں بھی پہلے پڑھی جانے والی سورت ہے۔ اسی طرح سب سے پہلے کامل سورت جو اتری وہ سورۂ فاتحہ ہے۔

سورۃ الفاتحہ کے کچھ نام:

اسی طرح عرض کیا تھا کہ یہ ''فَاتِحَةٌ'' بھی ہے، ''شَافِيَةٌ'' بھی ہے، ''رَافِعَةٌ'' بھی ہے، ''كَافِيَةٌ'' بھی ہے،

''کنز'' بھی ہے اور ''أُمُّ الْمَسْئَلَةِ'' بھی ہے۔

آدابِ درخواست:

اس کی مثال عرض کی تھی کہ جب آدمی درخواست لکھتا ہے تو ایک کاتب ہوتا ہے اور مکتوب الیہ ہوتا ہے کہ درخواست لکھنے والا اور جس کی طرف درخواست لکھی گئی ہے۔ اور پھر یہ درخواست کس محکمے سے تعلق رکھتی ہے؟ اور چوتھی بات کہ بندہ درخواست وصول کرنے والے کو اپنا تعارف کراتا ہے کہ میں کون ہوں؟ اسی طرح جس کو درخواست لکھتا ہے اس کے منصب کا بھی خیال رکھتا ہے۔

سورۂ فاتحہ ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے:

پھر بنیادی چیز کہ درخواست کا مقصد کیا ہے؟ اس کے لیے علماء نے فرمایا کہ سب سے جامع اور افضل دعا سورۂ فاتحہ ہے۔ اس لیے دیکھیں! یہ ہر نماز میں ہے، چاہے فرض نماز ہے، واجب ہے، سنت ہے، نفل ہے، تہجد ہے، اشراق ہے یا صلوٰۃ التسبیح ہے۔ سب میں پڑھی جاتی ہے، ﴿سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ﴾ ہے۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ کاتب سے مراد نماز پڑھنے والا اور مکتوب الیہ اللہ ہے اور اس کے مناصب بیان کردیے کہ سارے محامد اللہ کے ہیں اور تمام جہان کا پالنے والا اللہ ہے۔ اس کی صفت رحمانیت اور رحیمیت بیان کرتے ہیں۔ پھر اپنا تعارف ہے کہ ہم کون ہیں؟ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ہم تیرے عبد اور تیری عبادت کرنے والے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگنے والے ہیں۔

اس کے بعد اپنا مقصد بیان کرتا ہے کہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت عطا فرما۔ سیدھی راہ سے مراد ان لوگوں کی راہ جن پر تیرا انعام ہے، نہ کہ وہ جن پر تیرا غضب ہے اور نہ وہ جو بھٹکے ہوئے ہیں۔ تو مثبت اور منفی دونوں اعتبار سے ہماری دعا ہوگئی۔ تو اس سے بڑی کوئی جامع دعا ہوسکتی ہے؟

سورۂ فاتحہ میں بندے کا حصہ:

اسی لیے صحیح حدیث ہے کہ جب آدمی کہتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (سب تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جو مربی ہیں تمام عالمین کے۔) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''حَمِدَنِيْ عَبْدِيْ'' (میرے بندے نے میری حمد و تعریف بیان کی)

اور جب بندہ پڑھتا ہے: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝﴾ (جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں) اللہ کی صفت بیان کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "أَثْنَى عَلَيَّ عَبْدِي" (میرے بندے نے میری ثنا بیان کی) میری صفات رحمانیت اور رحیمیت کا تذکرہ کیا۔

اور جب بندہ کہتا ہے: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ (جو روزِ جزا کا مالک ہے) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "مَجَّدَنِي عَبْدِي" (میرے بندے نے میری تقدیس بیان کی)

اسی طرح جب بندہ کہتا ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ میرے اور بندے کے درمیان ہے کہ وہ عبد ہے اور میں معبود ہوں، وہ مدد مانگنے والا اور میں مدد کرنے والا ہوں۔

بندہ کہتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ (ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ خالص میرے بندے کے لیے ہے۔ "وَلِعَبْدِيْ مَاسَئَلَ" (میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے مانگا ہے میں نے اس کو دے دیا ہے)

[صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، باب: وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ]

جامع دعا:

یہ اتنی بڑی جامع دعا ہے کہ اس میں حمد بھی ہے، ثنا بھی ہے، تمجید بھی ہے، اقرارِ صفات اور رحمتِ عامہ بھی ہے اور اقرارِ رحمتِ خاصہ بھی ہے اور اپنی عبدیت کا اعتراف بھی ہے اور اس کے نفع ونقصان کے مالک ہونے کا اقرار بھی، اس اس کی مالکیت اور عدالت پر بھی ایمان ہے۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ اسی کی ذات ہے اور پھر اس سے راستہ مانگا ہے۔

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾

[الفاتحۃ: ۱ تا ۷]

یا اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم عطا فرما۔

صراطِ مستقیم کی دعا مانگنے کی وجہ:

یاد رکھیں! صراطِ مستقیم کی دعا کیوں مانگی ہے؟ "صِرَاطَ الْمُوَحِّدِيْنَ" کی دعا کیوں نہیں مانگی؟ اس پر علماء کرام

نے لکھا ہے کہ ہم نے صراطِ مستقیم کی دعا مانگی ہے، جس کا معنی سیدھا راستہ ہے کہ ایک کے مقابلہ میں زیادہ راستے ہیں۔ اس لیے ضروری نہیں ہوتا کہ ہر تعدد صحیح نہ ہو۔

مذاہب اربعہ حق ہیں:

اس لیے یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ تعددِ مذاہب کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ چار مذاہب کہاں سے آگئے ہیں؟ کیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے؟ لوگوں کے دماغوں میں یہ شبہ ڈالا جارہا ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم خود موجود ہیں تو کسی مسلک کی اور کسی دوسرے سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ ضرورت تو تب پیش آتی ہے جب وہ موجود نہ ہوں، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے تو لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھتے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بھی چند ایک سے پوچھتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزاروں صحابہ ہیں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو بھیجا، اسی طرح بڑے بڑے صحابہ ہیں جن کا فتویٰ چلتا تھا۔ علامہ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ۱۴۹ (ایک سو انچاس) صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں اور ۱۴۹ میں سے زیادہ تر وہ ہیں جنہوں نے ایک دو سے زیادہ فتوے نہیں دیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت بھی یہ بات نہیں تھی کہ جس کی مرضی میں جو آئے وہ کرلے۔ وہ مخصوص صحابہ رضی اللہ عنہم سے رجوع کرتے تھے۔

یہ دھوکہ دینے والی بات ہے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ چار امام موجود تھے؟ پھر تو بخاری و مسلم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھیں تو یہ کس پر عمل کرتے ہیں؟ یہ تو بے وقوفوں والا سوال ہے۔ بھائی! اس وقت صحاح ستہ تو نہیں تھیں، لیکن احادیث تو موجود تھیں، ان کو صحاح ستہ میں جمع کیا گیا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ مسائل موجود تھے، لیکن ان کا تفقہ کے اعتبار سے ان چار اماموں نے استنباط کیا ہے کہ انہوں نے ان احادیث کو سمجھ کر امت کے لیے موتی نکال دیے۔ لہٰذا تعدد کا ہونا گمراہی کی دلیل تو نہیں ہے۔

آپ نے بڑے بڑے شہروں میں دیکھا ہوگا کہ سڑکیں منتخب ہوتی ہیں کہ اس پر لوکل بس چلے گی، اس پر کوئی اور بس نہیں آسکتی، کیونکہ اور گاڑیاں آئیں گی تو ٹریفک رک جائے گی اور جو لوکل بس پر جانے والے ہیں ان کو دیر ہوجائے گی۔

اور دوسرا ٹریک ہے، اس پر بجلی والی گاڑیاں چل رہی ہیں۔ اور ایک ٹریک ہے، اس پر عام گاڑیاں چل رہی

ہیں اور ساتھ ایک فٹ پاتھ ہے اس پر لوگ پیدل جا رہے ہیں۔ سڑک تو ایک ہی ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ چار لائنیں کیسے بنائیں؟ حالانکہ سڑک تو ایک ہے۔ تو عقلمند کہے گا کہ بس پر بیٹھو تو ادھر آؤ، پیدل چلو تو ادھر چلو۔ یہ سارے رستے تو اسی منزل پر جا رہے ہیں۔

اسی طرح چاروں ائمہ کے راستے مختلف ہیں، لیکن منزل ایک ہے۔ اور وہ چاروں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں داخل ہوں گے۔ اس لیے یہاں "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" لائے۔ اور "الْمُسْتَقِيمَ" کی ضد "الْاِعْوِجَاجُ" ہے کہ یا اللہ! ہمیں اس راستے کی ہدایت عطا فرما جو بالکل سیدھا ہو، اس میں ٹیڑھا پن نہ ہو۔ اگر ٹیڑھا پن آ گیا تو پھر آدمی گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ دعا کی۔

اس کا بدل آگے آ گیا:

﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ [الفاتحہ: ۶]

"رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔"

(1)......دین کی دعا مانگیں:

اس بدل سے دو فائدے ہو گئے:

ایک فائدہ یہ کہ یا اللہ! جو ہم دعا کر رہے ہیں:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝﴾ [الفاتحہ: ۵]

"ہمیں سیدھے (دین کے) راستے کی ہدایت عطا فرما۔"

دنیا تو عقل سے بھی کما لیں گے، آپ سے دین کے راستے کو مانگ رہے ہیں۔ کیونکہ "مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ" کون لوگ ہیں؟ انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ ہیں۔ ان کا راستہ دولت تو نہیں ہوتا، ان کا راستہ تو دین ہوتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ دینی دعا مانگی ہے، دنیاوی دعا نہیں مانگی۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا استغناء:

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے زمانہ میں ان کے ایک مرید نے ان کی خدمت میں کچھ اشرفیاں پیش کیں۔ حضرت نے فرمایا: فقیر کو ضرورت نہیں ہے۔ تو اس نے کہا کہ آپ کو ضرورت نہیں، لیکن مدرسہ کو تو ضرورت ہے۔

آپ نے فرمایا: مدرسہ کو ضرورت ہے اور مدرسہ تو آپ نے بھی دیکھا ہوا ہے، اس کے لیے میرے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے؟ مدرسہ میں چلے جائیں اور وہاں جمع کرا دیں۔ یہ تمہاری ملک ہے، تم ہی جمع کراؤ، میری ملک نہیں ہے۔ تو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے وہ پیسے نہ لیے تو وہ مرید بھی کوئی پکا عاشق تھا۔ جب حضرت نماز پڑھانے کے لیے گئے تو اس نے وہ اشرفیاں حضرت کے جوتے کے اندر رکھ دیں، حضرت کے پیچھے نماز پڑھی اور جب حضرت نے سلام پھیرا تو وہ بھی سلام پھیر کر چلا گیا۔ حضرت جب نماز پڑھ کر باہر نکلے تو چونکہ سنت یہ ہے کہ جوتا پہننے سے پہلے اس کو تھوڑا سا ہلایا جائے کہ اگر خدانخواستہ اس میں کوئی بچھو ہے، موذی کیڑا ہے تو نکل جائے۔ حضرت نے جب جوتا ہلایا تو وہ ساری اشرفیاں چھن چھن کر باہر نکل پڑیں۔ حضرت کھڑے ہو گئے اور فرمایا: اے بھائی! یہ دنیا بھی عجیب چیز ہے!! جو اس سے بھاگتا ہے یہ اس کے پاؤں پڑتی ہے اور جو اس کے پیچھے بھاگتا ہے اس کو بھگاتی رہتی ہے۔

[ارواحِ ثلاثہ یعنی حکایاتِ اولیاء، ص: ۲۰۹، ۲۱۰]

ہمارے والد صاحب کا استغناء:

میں نے اپنے والد صاحب کو دیکھا کہ ایک آدمی نے نوٹوں کی گڈی جس میں سو سو والے نوٹ تھے آپ کی خدمت میں پیش کی تو آپ نے فرمایا: کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ زکوۃ کے پیسے ہیں۔ فرمایا: میں تو زکوۃ کا مستحق نہیں، میں زمیندار آدمی ہوں، خود زکوۃ دیتا ہوں۔ اس نے کہا: میں جانتا ہوں، لیکن آپ لوگوں کو جانتے ہیں، طلبہ کو جانتے ہیں، آپ ان کو تقسیم فرما دیں۔ والد صاحب نے لے کر پھینک دیے اور فرمایا: پورے حرم میں تمہاری ڈیوٹی کرنے والا میں ہی تمہیں نظر آیا ہوں؟ تمہاری زکوۃ ہے، تم خود ہی جا کر تقسیم کرو، یہ میری ذمہ داری تو نہیں ہے۔

تو اللہ والے لوگ اتنی احتیاط کرتے ہیں۔ اور آج کل تو احتیاط کا دور بھی ختم ہو گیا ہے، آج کل مولوی ایک منٹ میں صدقہ کو زکوۃ بنا دیں اور زکوۃ کو صدقہ بنا دیں۔

ناجائز حیلہ:

میں نے سنا ہے، دیکھا تو نہیں کہ ہمارے علاقے میں بھی ایک مولوی تھا، وہ زکوۃ نکالتا تھا، اور زکوۃ کے جو پیسے بنتے تھے اس کو پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر گندم کی بوری میں رکھ دیتا تھا۔ ایک غریب آدمی کو بلوایا اور کہا کہ بابا! یہ جو کچھ ہے سب تمہارا ہے، تم لے جاؤ۔ اب ایک بوڑھا آدمی کہتا کہ اڑھائی من کی بوری میں کیسے لے جاؤں؟ میں سواری کا بندوبست کرتا ہوں۔ تو وہ کہتا کہ ہاں! تم جاؤ، سواری کا بندوبست کرو، میری جان چھڑاؤ، بس اس کے

اندر جو کچھ ہے میں نے زکوۃ میں دیا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ جب وہ جانے لگا تو اس کو بلایا کہ ادھر آنا دیکھو! آج کل گندم کا کیا بھاؤ ہے؟ اس نے کہا: سو روپے۔ تو اڑھائی من کے کتنے ہوئے؟ اڑھائی سو ہوئے۔ تو اس نے کہا: بابا! تین سو لو اور یہ گندم مجھے بیچ دو، کہاں سے سواری لاؤ گے اور اٹھاتے پھرو گے؟ پریشانی ہوگی، تکلیف ہوگی۔ وہ غریب سوچتا کہ چلو اٹھانے کا جھگڑا تو ختم ہوا۔ اس سے تین سو کی گندم خرید کر پھر گھر رکھ لی، اب حلال ہوگیا۔ میں نے زکوۃ بھی ادا کردی ہے۔ اب تو میں نے اس کو خریدا ہے۔ آج کل تو لوگ اس طرح بھی کرتے ہیں۔

ایک چالاک شخص کا حیلہ:

میں نے ایک پڑھے لکھے آدمی کو دیکھا کہ وہ ہم مولویوں کا بھی استاذ نکلا۔ اس کا لاکھوں کا اکاؤنٹ تھا۔ اس نے مسئلہ سمجھ رکھا تھا کہ زکوۃ تب آتی ہے جب مال پر سال گزر جائے۔ مثال کے طور پر: اس پر زکوۃ آتی تو وہ یوں کرتا کہ چیک کاٹ کر سارے پیسے بیوی کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتا۔ اس وقت ان پیسوں پر سال بھی نہیں گزرا ہوتا تھا اور جب بیوی کے پاس گیارہ مہینے پورے ہونے لگتے تو وہ خاوند کو دے دیتی۔ لیکن پہلے والے لوگ ان باتوں سے ڈرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ رزقِ حلال نصیب فرمائے۔ تھوڑا ہو، لیکن حلال ہو، اس میں کوئی آمیزش نہ ہو تو اسی میں خیر ہے، اسی میں برکتیں ہیں اور اسی میں رحمتیں ہیں۔

تصحیح معاملات:

سچی بات تو یہ ہے کہ اس دور میں کوئی دنیادار رزقِ حلال کماتا ہے اور حرام سے بچتا ہے تو وہ ولی اللہ ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ))

''سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''

[سنن الترمذی، حدیث: ۱۲۰۹، باب: مَا جَاءَ فِي التُّجَّارِ...]

یہ درجہ دیانت داری کی وجہ سے ملا۔ تہجد پڑھ لینا بڑی آسان بات ہے، اشراق پڑھ لینا بڑی آسان بات ہے، کعبۃ اللہ کا طواف کر لینا بڑی آسان بات ہے اور دو دو گھنٹوں کی لچھے دار تقریریں کر لینا بڑی آسان بات ہے، لیکن دین معاملات کا نام بھی ہے تو حلال کھانا بڑا مشکل کام ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں احتیاط:

غالباً حضرت مدنی رحمہ اللہ کے دور میں (واللہ اعلم) مدرسے کو تعمیرات کے ضمن میں پانچ کروڑ کی ضرورت تھی، انہوں نے اشتہار لکھایا اخبار میں دیا (واللہ اعلم) بہرحال! ایک سیٹھ نے ایک کروڑ کا چیک کاٹا اور خط لکھا کہ باقی چار کروڑ بھی میں دوں گا، آپ کسی سے نہ مانگیں، لیکن میری شرط یہ ہے کہ آپ جو مدرسہ بنوائیں تو کسی آرکیٹیکٹ کو بلوائیں، نقشہ بنوائیں۔ مہتمم مدرسہ نے جب وہ چیک دیکھا اور وہ خط پڑھا تو فرمایا کہ جس نے بھیجا ہے اس کو واپس کر دیا جائے۔ ہے کوئی مائی کا لعل جو ایک کروڑ واپس کر دے؟ جب پیسے واپس گئے تو سیٹھ گھبرا گیا، وہ دوڑا دوڑا آیا اور کہا کہ میں نے کیا خطا کی؟ فرمایا: تم نے پیسے دینے کے ساتھ ساتھ اپنی شرطیں بھی لکھ دیں۔ جب تمہاری شرط باقی ہے تو اس چیک میں ابھی تمہارا حق باقی ہے، جب تمہاری ملک سے نکلا ہی نہیں تو ہم تمہارا پیسہ کیوں ضائع کریں؟ آپ لکھتے کہ میری رائے یہ ہے، پھر مدرسہ جانے اور مدرسہ کا کام جانے۔

حضرت بنوری رحمہ اللہ اور احتیاط:

مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ جنہوں نے ترمذی شریف کی شرح بھی لکھی ہے۔ کراچی کے بہت بڑے بزرگ اور محدث گزرے ہیں۔ اللہ ان کی قبر پر کروڑہا رحمتیں نازل فرمائے۔ اصل تو آپ افغانستان کے تھے۔ بہت تیز بولتے تھے۔ میں حضرت کی خدمت میں رہا ہوں۔ میرے استاذ تو نہیں، لیکن ادباً اور احتراماً میرے استاذ تھے اور بڑے ہی شفیق تھے۔ میں جب مدرسے میں ہوتا تو باقاعدہ مدرسہ میں اعلان کیا جاتا کہ مکی صاحب میرا ذاتی مہمان ہے، مدرسہ کا مہمان نہیں، لہٰذا ان کے کھانے کے پیسے میری تنخواہ سے کاٹے جائیں، مدرسے سے نہیں۔ ان کے زمانے میں یہ احتیاط ہوتی تھی۔ اب اگر مدرسے میں نہ ٹھہرتے پھر بھی ناراض ہوتے۔ ہمارا بھی طالب علمی کا زمانہ تھا، ہم نے بھی طریقے بنائے ہوئے تھے کہ جب بھی آتے تو ہم بڑے ادب کے ساتھ جا کر ملتے اور حضرت ہمیں کمرہ الاٹ فرما دیتے۔ اس میں ہم اپنا اٹیچی کیس رکھ دیتے، کچھ ایک دو کپڑے لٹکا دیتے۔ اس کے بعد سارا دن دوستوں سے گپ شپ لگاتے رہتے۔ جب فارغ ہوتے تو شام کو آ کر سو جاتے۔ اور حضرت کبھی طلبہ سے پوچھتے تو ان کو طلبہ بتاتے کہ مکی صاحب کا سامان تو ادھر ہی ہے۔ حضرت فرماتے: پھر ادھر ہی ہوں گے۔ ادھر مکی صاحب تو دوستوں کے ساتھ گپیں لگا رہے ہیں۔

بہر حال! کسی نے آ کر حضرت کو دس لاکھ روپے کا چیک دیا۔ حضرت نے فرمایا: کیا ہے؟ کہا: صدقہ کی مد میں مدرسہ کے لیے ہے۔ حضرت نے فرمایا: ہمارے مدرسہ کا بجٹ پورا ہو گیا ہے۔ اس نے کہا: حضرت! اگر آپ کے مدرسہ کا بجٹ پورا ہو گیا ہے تو آپ جس مدرسہ کو مستحق سمجھتے ہیں اس میں بھجوا دیجیے گا۔ فرمایا: یہ میرا کام نہیں ہے، یہ تمہاری ڈیوٹی ہے کہ مستحق کو تلاش کرو۔ وہ آدمی کہنے لگا: حضرت! ایسے لوگ بہت کم آتے ہیں جو دس دس لاکھ روپے پیش کریں، آپ اس کو ٹھکرا رہے ہیں۔ حضرت صاحب جلال میں آ گئے اور فرمایا: ایسے مولوی بھی بہت کم ملیں گے جو دس لاکھ روپے پھینک دیں، اٹھو اور مدرسہ سے نکل جاؤ، تیرے جیسے کئی سیٹھ میں نے دیکھے ہوئے ہیں۔ وہ بے چارہ پریشان کہ یہ کیسا مولوی ہے؟ یہ استغناء ہے۔

A.K بروہی اور ختمِ نبوت کا مقدمہ:

قادیانیت کے خلاف ختمِ نبوت کا مقدمہ تھا، A.K بروہی کو وکیل رکھنا تھا اور اس کی فیس بیس لاکھ روپے سے بھی زیادہ تھی۔ A.K بروہی حضرت کی مسجد میں کبھی کبھی جمعہ کے لیے آتے تھے۔ اب ختمِ نبوت والوں نے سوچا کہ اتنا پیسہ کہاں سے لائیں؟ لہٰذا وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضرت! اگر آپ مہربانی کر دیں اور اس سے بات کریں تو شاید وہ کچھ رعایت کر دے۔

A.K بروہی جمعہ کی نماز کے بعد حضرت سے مل کر ہی جاتے تھے۔ حضرت کو آ کر سلام کیا تو حضرت نے فرمایا کہ اچھا ہوا کہ تم آ گئے ہو، یہ بتاؤ کہ جنت لینا چاہتے ہو یا بیس لاکھ لینا چاہتے ہو؟ اس نے کہا: حضرت! میں ایسا کچا سودا تو نہیں کرتا کہ جنت کو بیس لاکھ کے لیے چھوڑ دوں۔ میں خود وکیل آدمی ہوں، گھاٹے کا سودا میں کبھی نہیں کرتا، مجھے تو جنت چاہیے۔ تو حضرت نے فرمایا: تم یہ ختمِ نبوت کا مقدمہ خود لڑو، جب تم حضور ﷺ کی عزت کے لیے مقدمہ لڑو گے تو کیا حضور ﷺ تمہارے لیے شفاعت نہیں کریں گے؟ اس نے کہا: بالکل میں یہ مقدمہ لڑوں گا، اپنے کرایہ سے جاؤں گا اور اپنے خرچے پر ہوٹل میں رہوں گا اور یہ کیس لڑوں گا۔ آج ہم ان لوگوں کے قصے تو بیان کرتے ہیں، لیکن اب ایسے لوگ نصیب نہیں ہوتے۔

مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق غلط فہمی:

یورپ ہو، ہانگ کانگ ہو وہاں جلسہ عصر کو ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ مسلمان دور سے آتے ہیں، دو دو گھنٹے، تین تین

گھنٹے کی ڈرائیو ہوتی ہے۔ لوگوں نے واپس بھی تو جانا ہوتا ہے۔ ہانگ کانگ میں ایک جلسے کے بعد ہم سمندر کے کنارے بیٹھے تھے۔ مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی صاحب بھی تھے، قاری محمد طیب قاسمی بھی تھے، دکتور سید عنایت اللہ صاحب بھی تھے، عدنان بھی تھے۔ مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی صاحب مجھے پکڑ کر باہر لے گئے۔ میں نے کہا: مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا: شوق کی کیا بات ہے؟ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ میں نے کہا: یہ سمندر کا کنارہ ہے، مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ فاروقی صاحب نے فوراً کہا کہ میں سویٹر نکال کر دیتا ہوں۔ اسی دوران بیٹھے بیٹھے پتا نہیں مجھے کیا سوجھی؟ (اللہ مجھے معاف کرے اور ان کے درجات بلند کرے) میں نے کہا: فاروقی صاحب! مجھے آپ سے ایک گلہ ہے۔ کہنے لگے: کیا گلہ ہے؟ میں نے کہا: میں تو جانتا نہیں ہوں، لیکن بہت سارے لوگوں نے شکایت کی ہے کہ آپ لوگوں کے پاس چندہ آتا ہے اور آپ کے پاس کوئی حساب کتاب نہیں ہے۔ پتا نہیں جائز خرچ ہوتے ہیں یا ناجائز خرچ ہوتے ہیں؟ میں نے سنا ہے کہ آپ نے ان پیسوں سے زمین لے لی ہے، جائیداد بنا لی ہے، حالانکہ لوگ آپ کو پیسے دین کے لیے دیتے ہیں۔ تو مجھے کہا کہ مکی صاحب! جس آدمی کو اپنی زندگی کے ایک منٹ کا بھی پتا نہ ہو، جو زندگی کو ہتھیلی پر لے کر پھرتا ہو کہ نا جانے کہاں سے گولی آئے گی؟ تو وہ پیسے کھا کر کیا کرے گا؟ یہ بالکل ہم پر الزام ہے، میرا بھائی سعودی عرب میں دمام کے علاقہ میں ملازمت کرتا ہے، اس بے چارے نے اپنے پیسوں کے ساتھ زمین خریدی ہے اور اس کے نام کے ساتھ بھی فاروقی لگ جاتا ہے تو میں کیا کروں؟ ورنہ میں نے چندے سے ایسی حرکت نہیں کی۔

علماء اور خدمتِ دین:

اس لیے جو ہم نے دعا مانگی اس کا تعلق دین سے تھا، دنیا سے نہیں تھا۔ دنیا تو فانی ہے۔ بعض لوگ مولویوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ جو لوگ قرآن پڑھا سکتے ہیں، حدیث پڑھا سکتے ہیں، فقہ، منطق اور فلسفہ پڑھا سکتے ہیں، کیا وہ دوکان پر بیٹھ کر پیسہ نہیں کما سکتے؟ کیا ان کی عقل کم ہے؟ پھر ان کی نوکری چوبیس گھنٹے کی ہے، گرمی ہے، سردی ہے، مسجد میں آنا ہے، نماز پڑھنی ہے، پڑھانی ہے۔ تم تو کہتے ہو کہ آج سر بھاری لگ رہا ہے، تھوڑا ریسٹ کر لوں، لیکن مولوی بے چارے نے تو ہر حال میں مسجد میں جانا ہے، اذان دینی ہے، نماز پڑھانی ہے۔ اور اگر مدرسہ ہے تو صبح شام بیٹھے ہیں۔ اگر اعتراض کی نظر سے نہ دیکھیں تو جو چوبیس گھنٹے بیٹھے ہیں اس کے بھی تو کچھ حقوق ہوں گے؟ اس دعا سے ہمارا ایک مقصد متعین ہو گیا کہ ہماری دعا دین کے لیے ہے، دنیا کے لیے نہیں ہے۔

(2)......دعا کا دوسرا فائدہ:

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اشتباہ ہی نہیں رہا کہ ہمیں انعام یافتہ لوگوں کے راستے پر چلا۔ اور انعام یافتہ انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ ہیں۔ اب وجودِ انعام دوامِ انعام کو مستلزم نہیں ہوتا۔ (یہ تھوڑا سا مشکل مسئلہ ہے، لیکن تھوڑی سی کوشش کریں گے تو سمجھ میں آجائے گا) آج اگر کسی پر انعام ہے تو ضروری نہیں ہے کہ اس پر یہ انعام ہمیشہ رہے۔ جیسے حدیث رسول ﷺ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِي كَافِرًا'' (ایک ایسا وقت آجائے گا کہ) صبح کو بندہ مسلمان ہوگا اور شام کو کافر ہوگا)۔ یعنی وہ انعام دوام کا نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کافر ہوجائے۔ تو ہم نے انعام کی دعا مانگی تھی۔ وجودِ انعام دوامِ انعام کو مستلزم نہیں ہوتا۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۱۱۸، باب: الحَثُّ عَلَى الْمُبَادَرَةِ بِالْأَعْمَالِ...]

اس دعا میں کیا طلب کیا گیا؟

تو آگے فرمادیا:

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝﴾ [فاتحہ: ۷]

''نہ (رستہ) ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو (رستہ سے) گم ہوگئے (گمراہ ہوگئے)۔''

اصل میں ان ''مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ'' کی طرف اشارہ ہے کہ ان ''مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ'' پر نہ تیرا غضب نازل ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے، بلکہ ہمیشہ آخر وقت تک انعام والے رہے۔ ہم ان کا راستہ تجھ سے مانگتے ہیں۔ لہٰذا دعا اثباتاً بھی آئی اور نفیاً بھی آئی۔ اثبات کیا کہ ''مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ'' لوگوں کا راستہ دکھا اور نفی یہ کہ نہ ان پر تیرا غضب ہے اور نہ وہ گم کردہ راہ ہیں۔ ہم ان لوگوں کا راستہ مانگ رہے ہیں۔

مرزائیوں کا فریب:

یاد رکھیں! مرزا قادیانی اور اس کے پیروکار لوگوں کو یہاں دھوکہ دیتے ہیں کہ دیکھو! ہر نماز میں بندے پڑھتے ہیں:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ [فاتحہ: ۵،۶]

اور ''مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ'' کون لوگ ہیں؟ ان کے بارے میں قرآن میں ہے:

﴿مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾ [النساء: ۶۹]

مرزا کہتا ہے: جب بندہ اطاعت کر کے، عبادت کر کے صالحین میں شمار ہو سکتا ہے، صدیقین میں شامل ہو سکتا ہے اور شہداء میں شامل ہو سکتا ہے تو نبیوں میں شامل کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس لیے وہ کہتا ہے کہ دیکھو! نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ لوگوں کو اس طرح گمراہ کرتے ہیں۔

فریب کا ردّ:

یاد رکھو! یہاں معیت کا سوال ہے، عینیت کا سوال نہیں ہے۔ عینیت کا مطلب یہ ہے کہ گویا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ مجھے نبی بنا دو۔ (نعوذ باللہ!) اور ایک مطلب یہ ہے کہ مجھے ان کا ساتھ نصیب فرما دیں۔

حضور ﷺ کی حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کو تسلی:

جیسے حضور ﷺ کے خادم حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ ہیں۔ ایک دن حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور ان کا چہرہ غم سے اترا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے پوچھا: تجھے کیا ہوا؟ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ جانتے ہیں کہ مجھے آپ کے ساتھ کتنی محبت ہے؟ جب میں گھر میں ہوتا ہوں اور آپ کے دیدار کا جذبہ آتا ہے تو دوڑ کر آ جاتا ہوں، لیکن چند دنوں سے میں سوچ رہا ہوں کہ دنیا میں جب مجھے تڑپ ہوتی ہے تو میں آپ کی زیارت کر لیتا ہوں، لیکن میرے آقا! جب آپ جنت میں جائیں گے، آپ کا درجہ تو سب سے اونچا ہوگا اور ہمارا درجہ آپ سے نیچے ہوگا تو وہاں اگر میں آپ کو نہیں دیکھوں گا تو میری زندگی کیسے گزرے گی؟ میرے لیے تو جنت میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ جس جنت میں حضور ﷺ کا دیدار نہ ملے ایسی جنت کا کیا فائدہ؟ تو ان کی اس بات پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾﴾ [النساء:٦٩]

''اور جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے تو وہ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے: انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ۔ اور وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں۔''

[المعجم الاوسط، حدیث: ۴۷۷]

اور حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۶۱۶۸، باب، علامة حب اللہ عز وجل]

''بندہ جس کے ساتھ محبت کرتا ہے اللہ اس کے ساتھ اس کو ملائیں گے۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ ان کو بھی قیامت کے معیت نصیب ہوگی۔تو یہاں بھی معیت کی دعا ہے۔

اگر کوئی اطاعت سے نبی بن سکتا ہے تو صحابہ سے زیادہ اطاعت کرنے والا کون ہے؟ جن کی اطاعت اور ایمان کا اللہ خود گواہ ہے۔ پھر تو صحابہ بھی نبی بن جاتے، نہ کہ تیرھویں صدی میں مغل خاندان میں پیدا ہونے والا عرضی نویس غلام احمد قادیانی نبی بن جائے، جس نے ابتداء ہی جھوٹے کام سے کی۔ اپنی کتابوں میں کیسے کیسے جھوٹ بولے، کیسے کیسے جھوٹے دعوے کیے، جو خود اس کی تحریروں کی روشنی میں جھوٹے نکلے۔ دیکھیں! عرضی نویس کبھی سچ لکھتے ہیں؟ طلاق نامہ لکھواؤ تو تین طلاقیں لکھ دیتے ہیں، دینے والا چاہے ایک دے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے پیسے لیے ہیں، کام تو پکا کریں۔ ایک طلاق سے تو رجوع ہو جائے گا۔

صالحین میں شمولیت:

اولیاء نے بڑی عجیب بات کہی ہے کہ اللہ کا حکم ہے نماز، روزہ، زکوۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ جب میں صحیح اعتقاد رکھتے ہوئے ان پر چلوں گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی رحمت سے مجھے جنت دیں گے۔ تو صالحین میں آ گیا۔ فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [النحل: ۹۷]

''جس شخص نے بھی مومن ہونے کی حالت میں نیک عمل کیا ہوگا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے، اور ایسے لوگوں کو ان کے بہترین اعمال کے مطابق ان کا اجر ضرور عطا کریں گے۔''

جو آدمی اعتقاداً نیک کام کرے گا تو وہ صالحین میں آ جائے گا اور اللہ اپنی رحمت سے اس کو جنت عطا فرمائیں گے۔

شہید کو شہید کیوں کہتے ہیں؟

اور ایک ہے مشاہدہ اور پکی بات، جیسے ایک آدمی ٹیپ ریکارڈ پر ریکارڈ کر رہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں تو یہ مشاہدہ ہے۔ اور یہ شہداء کا درجہ ہے۔ اس لیے شہید کو شہید کہتے ہیں کہ اللہ اس کو سارے مدارج دکھا دیتے ہیں۔ ان کی

ارواح جنت کے اندر سیریں کر رہی ہوتی ہیں۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ وہ اپنی جان قربان کر کے اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ کا دین حق ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقامِ صدیقیت:

اب مشاہدہ سے یقین بڑھ جائے تو یہ صدیقیت کا مقام ہے۔ ایک بات یاد رکھیں! تمام صحابہ رضی اللہ عنہم صدیق ہیں، صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو صدیق اکبر ہیں۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم صدیق، عادل ہیں اور معیارِ حق ہیں۔ جیسے دیکھیں! ہمارے علاقہ میں دریائے سندھ ہے۔ وہ اوپر سے آتا ہے اور پہلے اٹک میں آتا ہے، پھر چلتے چلتے سندھ کے علاقہ میں آتا ہے۔ جب اٹک میں پانی نہ پہنچے تو سندھ میں کیسے آئے گا؟ تو اگر اللہ کا دین صحابہ میں ہی نہیں پہنچا تو پھر آگے کیسے پہنچے گا؟ اس لیے یاد رکھیں! صحابہ رضی اللہ عنہم معیارِ حق اور ایمان کا نمونہ ہیں، اسلام کا ماڈل ہیں۔ اللہ نے فرمایا: ﴿اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ [البقرۃ:۱۳] (تم بھی اسی طرح ایمان لے آؤ جیسے دوسرے لوگ (صحابہ رضی اللہ عنہم) ایمان لائے ہیں)۔

علم کے مراتب:

صدیقیت سے بلند مقام نبوت کا ہے۔ اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ ایک علم ہوتا ہے اور ایک یقین ہوتا ہے۔ اور ایک علم الیقین ہوتا ہے اور ایک حق الیقین ہوتا ہے۔ یہ مدارج ہیں۔

جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا:

﴿رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰي وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ﴾ [البقرۃ:۲۶۰]

''میرے پروردگار! مجھے دکھایئے کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ اللہ نے کہا: کیا تمہیں یقین نہیں؟ کہنے لگے: یقین کیوں نہ ہوتا؟ مگر (یہ خواہش اس لیے کی ہے) تاکہ میرے دل کو پورا اطمینان حاصل ہو جائے۔''

یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس سورت میں ایسی جامع دعا آگئی کہ ''مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ'' کے اندر سارے درجات آگئے ہیں کہ ان لوگوں کی معیت نصیب ہوگی، لیکن معیت ان کی اس وقت نصیب ہوگی جب ان جیسی شکل وصورت اور عبادات ہوں گی۔

"خَلق" اور "خُلق" کی وضاحت:

ایک ہے "خَلق" اور ایک ہے "خُلق"۔ "خَلق" انسان کی ظاہری صفات کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا، ظاہری صورت ہوگئی کہ کسی کو لمبا بنایا، کسی کو درمیانہ بنایا، کسی کو چھوٹا بنایا، کسی کو گورا بنایا، کسی کو خوبصورت بنایا اور کسی کو بدصورت بنایا۔ یہ "خَلق" ہے۔ اور جو مخفی صفات ہیں وہ "خُلق" ہے۔ اب "خَلق" کو بدلنا تو ہمارے بس میں نہیں کہ ایک آدمی کا لمبا قد ہے، اس کو چھوٹا کیسے کریں گے؟ چھوٹا قد ہو تو اس کو لمبا کیسے کریں گے؟ بدصورت ہے تو لاکھ کریمیں لگوائیں وہ وہی رہے گا۔ گورا ہے تو گورا ہی رہے گا، کالا ہے تو کالا ہی رہے گا۔ اس کی تبدیلی تو ہمارے بس میں نہیں ہے۔

فلاسفۂ یونان اور ہندوؤں کا نظریہ:

"خُلق" (صفاتِ مخفیہ) کی تبدیلی ممکن ہے یا نہیں؟ یونان کے فلاسفہ، افلاطون، بقراط اور بڑے بڑے فلسفی تو کہتے ہیں کہ اخلاق بھی تبدیل نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کے ہاں محاورہ ہے کہ اگر تم سن لو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے یہ تو مان لو، لیکن اگر سنو کہ فلاں بندے کی عادت تبدیل ہوگئی تو یہ نہ مانو۔ اور کچھ فلاسفہ ایسے ہیں جو کہتے ہیں: تبدیلی ممکن ہے، لیکن اس پر مشقت بڑی ہے کہ اس بندے کو لوگوں سے الگ رکھیں، کھانا پینا چھوڑ دے، شہوانیت چھوڑ دے، نفس کو سزا دے، ایک ٹانگ پر کھڑا رہے، رگڑے لگیں گے تو پھر شاید کچھ تبدیلی ہوگی۔ اس لیے جو ہندو مت، بدھ مت اور برہمن وغیرہ ہیں یہ سارے اسی فلسفے کے مارے ہوئے ہیں کہ سر منڈا کر پھریں گے، گوشت نہیں کھائیں گے، جوگی بنے پھرتے ہیں، دودھ نہیں پیتے، بس تھوڑا سا پرشاد بنے گا وہ کھالیں گے۔ وہ اسی چکر میں ہیں کہ اخلاق کو ٹھیک کرنے کے لیے محنت ضروری ہے۔

عاملوں کی دھوکہ بازیاں:

ایک آدمی نے مجھے کہا کہ ایک پیر صاحب ہیں۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہیں تو خدا کی قدرت ہے کہ ایسی روشنی پیدا ہوتی ہے کہ بالکل مکہ مدینہ دکھا دیتے ہیں۔ میں نے کہا: اس کے اندر کوئی پیری والی بات نہیں ہے۔ تم آنکھیں بند کرو، میں تمہاری آنکھوں پر زور دیتا ہوں، دیکھو! روشنی نظر آتی ہے یا نہیں؟ بس پھر ایک تصور دے دوں۔ کہا کہ ایک مرتبہ مجھے عمل دیا کہ قبرستان میں جا کر ایک ٹانگ پر پڑھنا اور ڈراؤنی آوازیں آئیں گی، لیکن ڈرنا نہیں ہے، پھر جن تابع

ہو جائیں گے۔ تو بس ایسے ہوا کہ دنیا گھومنے لگ گئی۔ میں نے کہا کہ تم ابھی ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جاؤ، ابھی دنیا گھومنے لگ جائے گی۔ آدمی جب ایک ٹانگ پر کھڑا ہو، قبرستان میں ہو اور رات بھی اندھیری ہو تو ڈراؤنے خیالات نہیں آئیں گے تو اور کیا آئے گا؟ اس میں پیری مریدی کی کیا بات ہے؟

یہودی کا اعتراض، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جواب:

علماء نے فرمایا: دو عالَم ہیں: ایک عالَمِ اصغر اور ایک عالَمِ اکبر۔ گویا! انسان ایک پورا عالم ہے۔ یعنی جو چیزیں پورے عالم میں موجود ہیں وہ انسان میں بھی موجود ہیں۔ جیسے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اقوال و آثار کے اندر بات آتی ہے کہ ان کے پاس ایک یہودی آیا اور آکر پوچھا: ہم نے آپ کا قرآن سنا ہے، اس میں ہے کہ جنت میں چار نہریں ہوں گی۔ اللہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے کہ شراب کی بھی نہر ہوگی، دودھ کی بھی نہر ہوگی اور پانی کی بھی نہر ہوگی۔ اور یہ بھی آپ کی کتابوں میں موجود ہے کہ ان تمام کا منبع تحت العرش ہے۔ اور اسی طرح بعض روایات کے اندر آتا ہے کہ دنیا کے اندر بھی جو چار نہریں ہیں: جیحون، سیحون، نیل اور فرات۔ ان کے بارے میں بھی آتا کہ ان کا اصل بھی جنت ہے۔ بہر حال اس یہودی نے کہا کہ ان چاروں کا مرکز ایک ہے کہ عرش کے نیچے سے نکل رہی ہیں تو آگے جا کر یہ مختلف کیسے بن گئیں؟ ایک دودھ کی نہر بن گئی، ایک شہد کی، ایک شراب کی اور ایک پانی کی کیسے بن گئی؟ حالانکہ منبع ایک ہے اور چار چیزیں تو مختلف ہیں؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: دیکھو! تم انسان ہو۔ کبھی تمہارے کان سے بھی پانی بہتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! اور تمہاری ناک سے؟ اس نے کہا: ہاں اور آپ نے کہا: گلے سے؟ اس نے کہا: ہاں پانی آتا ہے۔ اور آنکھوں سے؟ اس نے کہا: ہاں پانی نکلتا ہے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان سب کا منبع ایک دماغ ہے تو ان کے ذائقے مختلف اور جدا جدا ہیں۔ اگر اللہ نے تیرے اندر چار نہریں مختلف ذائقے کی چلا دی ہیں تو کیا وہ جنت کے اندر یہ چار نہریں چلانے پر قادر نہیں ہے؟

انسان میں کمالِ تخلیق:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝﴾ [الانفطار: ۷]

''جس نے تجھے (انسان) بنایا، پھر تیرے اعضا کو درست کیا اور پھر تجھے (مناسب) اعتدال پر بنایا۔''

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝﴾ [التین: ۴]

''ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔''

دیکھو! جتنا بڑا جانور ہو وہ گردن جھکا کر پانی پیے گا، لیکن انسان کی گردن کو اللہ نے بنایا کہ یہ صرف میرے آگے جھکنے کے لیے ہے۔ بڑے سے بڑے جانور ہیں، لیکن وہ حسب منشا اپنا کھانا بنا کر نہیں کھا سکتے۔ شیر کو دیکھو! بندے کا گوشت کھالے گا، جانور کا کھالے گا، لیکن یہ نہیں کرسکتا کہ وہ بریانی بنائے یا اس کے مختلف قسم کے پیکٹ بنائے۔ یہ شرف صرف انسان کو ملا ہے۔ جب تک سی سی نہ ہو اس وقت تک انسان کو کھانا کھانے میں مزہ نہیں آتا۔ میں ایک مرتبہ ہندوستان میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا تو وہاں یورپین لڑکیاں بھی کھانا کھا رہی تھیں۔ ان کی ناک سے ایسے پانی بہہ رہا تھا جیسے نل سے پانی بہتا ہے، چقندر کی طرح سرخ ہو رہی ہیں، لیکن مزہ آرہا ہے، کھا رہی ہیں۔ میں نے کہا: یہ کس عذاب میں مبتلا ہو گئی ہیں؟ انہوں نے کبھی ایسا کھانا نہیں کھایا ہوگا، کیونکہ وہاں ابلا ہوا کھانا کھاتے ہیں کہ صحت صحیح رہتی ہے۔ اس لیے جوڑوں کا درد انہی کو ہوتا ہے، سب سے زیادہ موٹے وہی ہوتے ہیں اور بے حیائی بھی ان میں سب سے زیادہ ہے۔ ویسے تندرست ہیں اور دنیا کی بزدل ترین قوم بھی یہی ہے۔ تاریخ میں بھی ایسے بزدل نہیں دیکھے ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بڑا خوبصورت پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ۝﴾ [واقعہ: ۵۷]

''ہم نے تمہیں (اوّل بار) پیدا کیا ہے (جس کو تم بھی تسلیم کرتے ہو) پھر تم تصدیق کیوں نہیں کرتے؟''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ أَسْرَهُمْ ۚ﴾ [الدھر: ۲۸]

''ہم ہی نے ان کو پیدا کیا ہے اور ہم ہی نے ان کے جوڑ بند مضبوط کیے۔''

یہ جوڑ کیسے مضبوط بنائے کہ سو سال گزر جائیں پھر بھی اپنی جگہ کھڑا ہے۔ اگر لوہے کا لگائیں تو وہ بھی ٹوٹ جائے۔ اگر چلنے سے پاؤں گھستے ہوتے تو ہم گھٹنوں تک گھس چکے ہوتے اور اگر بیٹھنے سے آدمی کی جلد گھستی ہوتی تو پتا نہیں آدمی کہاں تک پہنچ چکے ہوتے۔ بڑے سے بڑے پل گھس جاتے ہیں۔ کہتے ہیں: اب اس کا متبادل

بنائیں، اب یہ استعمال کے قابل نہیں رہے۔ لیکن اللہ نے جتنی تیری عمر رکھی ہے اور تیری جو چیز بنائی اتنی عمر تک ہے یہ تم خود خراب کر دیتے ہو، اس کا غلط استعمال کرتے ہو۔ ایک گاڑی ہو، اس کو دو سو میل پر بھگانا شروع کر دو تو جلدی ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اگر اس کو صحیح طرح استعمال کریں گے تو وہ دس سال نکال لے گی۔ تو اللہ نے ہمیں جو دماغ دیا ہے، آنکھیں دی ہیں، عقل دی ہے، پاؤں دیے اور اعصاب دیے ہیں اگر ان کو غلط استعمال کیا تو خراب ہو جائیں گے۔ تو یہ نظامِ تخلیق ''خَلق'' سے ہے، اس میں تبدیلی نہیں آسکتی۔

جدید تہذیب کی ڈسی ہوئی عورتیں اور لڑکے:

ایک حدیث مبارکہ میں ہے:

((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَعَنَ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ مُبْتَغِيَاتٍ لِلْحُسْنِ مُغَيِّرَاتٍ خَلْقَ اللَّهِ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۷۸۲]

''نبی اکرم ﷺ نے گودنے (جسم پر سوئی سے نشانات لگا کر سرمہ وغیرہ لگانے) والی، گدوانے والی اور (پلکوں کے) بالوں کو اکھیڑ کر زینت و حسن حاصل کرنے والیوں پر لعنت بھیجی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیز کو بدلتی ہیں۔''

اور بعض عورتیں دانتوں میں فاصلہ رکھتی ہیں، تا کہ حسن معلوم ہو۔ بعض لوگ اس میں ہیرے رکھوا دیتے ہیں، تا کہ چمکتے ہوئے معلوم ہوں۔ بالوں سے بال جوڑ دو اس پر بھی اللہ کے رسول نے لعنت کی ہے۔ جو اللہ نے بال دیے ہیں ...... بڑے ہیں یا چھوٹے ہیں...... اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔

نئی تہذیب کی بدحالی:

اور آج کل بالوں کو کٹوا کر بوائے کٹ بنا دینا، تا کہ معلوم ہو کہ لڑکا ہے۔ اور سب سے ماڈرن وہ سمجھے جاتے ہیں جو پینٹ پہنے ہوئے ہوں اور وہ پھٹی ہوئی ایسے جیسے کسی کتے نے پھاڑا ہوا ہے۔ اگر وہ صحیح سالم ہو تو بوائے تو بن رہا ہے۔ اللہ نے ان کو ایسا لباس نصیب کیا ہے۔ پہلے تو ہم سنتے تھے کہ گھڑیاں واٹر پروف ہوتی ہیں اب تو پینٹ بھی واٹر پروف ہے۔ دو سال تک اندر پیشاب کرتے رہو، سارا اندر رہے گا۔ نہ دھلنے کی ضرورت اور نہ صفائی کی ضرورت ہے۔ وہ چوس لیتی ہے۔ دیکھو! انگریز کو اللہ نے کیسا لباس پہنایا ہے؟ یہ مستقل اللہ کا ایک عذاب ہے۔ ہمارے ہاں مثل ہے کہ اس سونے کو آگ لگاؤ جو کان پھاڑ دے کہ سونا اتنا بھاری نہ پہنو۔ تو ایسے کپڑے کو بھی آگ

لگاؤ۔ ایسا کپڑا ہو جس میں بندہ بندہ نظر آئے، نہ کہ بندر نظر آئے۔

آپ تو وہ کپڑا پہنیں گے جس میں کسی مائیکل جیکسن کا نام ہو، کسی ماڈرن لڑکی کا نام ہو، تاکہ بنیان دیکھ کر بندہ اندازہ لگالے کہ جناب کا شجرہ نسب کیا ہے؟ یہ تہذیب نہیں ہے۔ اکبرالہ آبادی نے کہا تھا:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

یہ کوئی تہذیب نہیں۔ اصل تہذیب محمد مصطفیٰ ﷺ کی ہے۔ لباس تو وہ ہوتا ہے جو تجھے ستر دینے والا اور راحت دینے والا بنے۔ اگر وہ عذاب دینے والا ہے اور تیرے اعضا کو کھولنے والا ہے تو وہ اچھا لباس نہیں ہے۔ آپ میری باتوں میں نہ آیا کریں، آپ تو مجھے دقیانوسی اور ملاں ہی سمجھتے ہوں گے۔ آپ خود دیکھیں کہ ٹائٹ پینٹ پہن کر نماز پڑھو اور ایک شیشہ رکھو اور غور کرو، آپ کیسے نظر آتے ہیں؟ آپ کے پیچھے جو صف نماز پڑھ رہی ہے اس کو آپ کیا کیا دکھا رہے ہیں؟...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ...... اللہ ہمیں معاف فرمائے۔ ہم اتنے بگڑ گئے کہ ہم نہ لباس میں ہیں، نہ معاشرت میں ہیں، نہ کھانے میں اور نہ پینے میں۔ بدترین قسم کا پیزا ہو، ہمارا نوجوان شوق سے کھائے گا، کیونکہ اس کا نام پیزا ہے۔ اس میں گندی قسم کی مچھلی ہو اور اس میں پندرہ سال پہلے کی چیز پڑی ہوئی ہو، کھاتے ہوئے ہوا آرہی ہو، پھر بھی کھائے گا۔ اور اس کو لینے کے لیے لائنیں لگی ہوتی ہیں۔ اس برگر میں ہوتا کیا ہے؟ اگر اس کو گھر میں بنائیں تو اس پر اتنے پیسے بھی خرچ نہ ہوں۔

کبھی آپ نے گھر میں کہا ہے کہ یہ کھانا چھوڑ دو اور ہمیں وہ کھانا بنا کر دو جو حضور ﷺ نے کھایا ہو۔ جو بڑے بڑے عاشق ہیں، بتائیں کہ حضور ﷺ نے خوشی کے موقع پر جو ہریسہ کھایا وہ کیا تھا؟ وہ گوشت کس طرح پکایا جاتا تھا؟ حضور ﷺ نے روٹی اور لبن کس طرح استعمال کیا ہے؟ کبھی آپ نے حضور ﷺ کی تہذیب کے بارے میں تحقیق ہی نہیں کی ہوگی۔ جو عاشق رسول ہوتے تھے تو جو شام کی روٹی بچتی تھی اس کو کپڑے میں لپیٹ دیتے اور صبح کو کھاتے کہ اس روٹی کا زمانہ حضور ﷺ کے قریب ہے۔ ان کے عشق کا یہ عالم تھا۔

حضرت ہزاروی رحمہ اللہ کی سادگی اور قناعت پسندی:

میں نے حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ کو دیکھا جو کئی مرتبہ پاکستان کی اسمبلی کے ممبر بنے۔ کوئی روکھا سوکھا مولوی نہیں تھا، نیشنل اسمبلی کے ممبر بنے، بڑے بڑے نوابوں کو شکست دی۔ ان کو دیکھا کہ سوکھی روٹی کو چائے

میں ڈبو ڈبو کر کھا رہے ہیں۔ میں نے کہا: حضرت! یہ کیا کر رہے ہیں؟ میں ناشتہ بنواتا ہوں۔ فرمایا: میں نے یہ راستہ میں خریدی تھی، بچ گئی تو تھیلے میں رکھ لی تھی اور سوچا کہ دوسرا ناشتہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ چائے منگالی ہے، بڑا اچھا لطف دے رہی ہے، آپ بھی میرے ساتھ کھالیں۔

مولانا ہزاروی رحمہ اللہ کی جرأت:

اور یہ اتنے دلیر تھے کہ اپنے وقت کا ڈکٹیٹر اور اقتدار کی سب سے بڑی کرسی پر بیٹھنے والا آدمی شراب پی رہا تھا تو مولانا نے پوچھا کہ یہ کیا پی رہے ہو؟ اس نے مولانا کو چڑانے کے لیے یا بات بدلنے کے لیے کہا کہ میں شیرنی کا دودھ پی رہا ہوں۔ تو مولانا نے کہا: نہیں تم سورنی کا پیشاب پی رہے ہو، جس کو اللہ نے حرام کیا ہو، وہ شیرنی کا دودھ نہیں ہوسکتا اور اللہ نے اس کو خنزیر کے گوشت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ جرأت والے لوگ تھے، لیکن چائے کے ساتھ خشک روٹی کھا رہے ہیں۔ اس سے ان کی عظمتوں میں کوئی فرق نہیں آیا، ان کی شان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

نہرو کی سادگی:

چلو! آپ نہرو کو تو مانتے ہوں گے؟ کیونکہ بڑا پولیٹکل مائنڈ گزرا ہے اور پرائم منسٹر رہا ہے۔ نہرو کے طالب علمی کے دور میں اس کے کپڑے اٹلی اور پیرس میں ڈیزائن ہوتے تھے۔ اتنا بڑا آدمی تھا۔ جب لیڈر بن گیا تو کھدر کا پائجامہ، کرتا اور کھدر کی ٹوپی تھی۔ صحافیوں نے پوچھا: مسٹر نہرو! یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ اس نے کہا: پہلے ہم کپڑوں سے پہچانے جاتے تھے اور اب کپڑے ہم سے پہچانے جاتے ہیں۔ اب مجھے وہ کپڑے پہننے کی کیا ضرورت ہے؟

اللہ کی قدرت کا کمال:

ہمیں اسلام کہتا ہے کہ تم اپنے آپ کو ایسا جوہر اور موتی بناؤ کہ یہ ہیرا کیا چیز ہے؟ ہم نے تمہیں خوبصورت پیدا کیا اور تمہارا پورا پورا بنایا کہ ہر انگوٹھے کی ل لکیروں کے نقوش مختلف ہیں۔ اس لیے آج دنیا چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ انگوٹھا لگواؤ۔ اللہ کے قرآن میں تو چودہ سو سال پہلے آگیا:

﴿بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝﴾ [القیامۃ: ۴]

”ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کی پوریوں تک درست کردیں۔“

ان کے خطوط ایک دوسرے کے ساتھ نہیں ملتے ہیں۔ جو خدا اس پر قادر ہے وہ تمہارے مرنے کے بعد دوبارہ

بنانے پر بھی قادر ہے۔ یہ ''خَلق'' ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

حضور ﷺ کے اخلاقِ کاملہ:

اور ایک ہے ''خُلق'' اس کا معنی عادات، اعمال اور افعال ہے۔ جیسے اللہ نے میرے مدنی ﷺ کی تعریف میں فرمایا: ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ④﴾ [القلم:۴] (اور بے شک آپ اخلاق (حسنہ) کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں۔'' اس آیت کے اندر ''عَلٰى'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو استعلاء کے لیے آتا ہے، ''ب'' اور ''فِی'' کا لفظ استعمال نہیں فرمایا۔ جس کا معنی ہے: اے میرے مدنی! آپ خلقِ عظیم پر مستوی ہیں۔ گویا! خلقِ عظیم آپ کی سواری بن گئے، آپ کے تابع بن گئے۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) [سنن البیہقی، حدیث ۲۰۵۷۱]

''اللہ نے مجھے اس لیے بھیجا کہ مکارم اخلاق کو پورا کروں۔''

کیا انسانی اخلاق میں تبدیلی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اس میں فلسفی لوگ کہتے ہیں کہ ''خَلق'' تبدیل نہیں ہوتا۔ اور وہ ایک حدیث سے بھی استدلال کر لیتے ہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ جب تم سن لو کہ فلاں جگہ سے پہاڑ ہٹ گیا ہے تو اس کو مان لو اور جب تم سنو کہ فلاں بندے کی عادت بدل گئی ہے تو نہ مانو۔[1] اس لیے فلسفی لوگ کہتے ہیں کہ بندے کی جو عادات ہیں وہ تبدیل نہیں ہوتیں۔

ایک ہندو جوگی اور اولیاء کے دل کی حالت:

اسی طرح وہ ایک واقعہ لکھتے ہیں، ہمارے ہی دور کی بات ہے، میں نے بھی سنا کہ ایک ہندو جوگی تھا، وہ دین پور شریف (ضلع رحیم یار خان) میں آیا اور خلیفہ غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ...... جو اپنے دور کے بہت بڑے بزرگ اور مجاہد تھے، جہاں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی جاتے تھے، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی جاتے تھے۔ اتنے بڑے آدمی تھے...... تو وہ ہندو ان کی خدمت میں کچھ دن رہا۔ پھر ایک دن حضرت سے ملا کہ میں کچھ دن آپ کے لنگر میں رہا ہوں، آپ کی بڑی مہربانی، باوجود اس کے کہ میں ہندو ہوں، کافر ہوں، لیکن یہاں مجھے کسی نے چھیڑا نہیں کہ تم ہندو ہو کر ہمارے پاس کیسے آ گئے؟ تو اب مجھے اجازت دیں میں جا رہا ہوں۔ تو حضرت نے فرمایا: کیوں آئے تھے؟ اور کیسے جا رہے ہو؟ اس نے کہا: اصل بات یہ

[1] [مسند احمد بن حنبل، حدیث:۲۷۴۹۹]

ہے کہ میں اللہ والے کی تلاش میں ہوں، لیکن وہ مجھے ملتا نہیں، جہاں بھی میں سنتا ہوں کہ اللہ والا ہے، بزرگ ہے، پیر ہے، شیخ ہے، میں وہاں پہنچ جاتا ہوں، لیکن میں جب وہاں توجہ کر کے دیکھتا ہوں تو ان کے دل میں سیاہ داغ دیکھتا ہوں۔ جب ان کے دل کالے ہیں تو میرا دل کیسے صاف کریں گے؟ میں تو کوئی ایسا اللہ والا تلاش کر رہا ہوں جس کا دل منور ہو، اس لیے میں ان سے بغیر ملے چلا جاتا ہوں۔

حضرت نے فرمایا: تم یہاں بھی آئے ہو، ہمارا دل بھی دیکھا؟ اس نے کہا: حضرت! میں نے غور کیا ہے، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ آج تک میں نے اتنے بڑے پیروں، بزرگوں کو بھی دیکھا، ان کے دل میں بڑا داغ ہے، آپ کے دل میں بھی داغ ہے، لیکن چھوٹا سا ہے۔ اگر نہ ہوتا تو میں آپ کے پاس رہ جاتا۔ تو حضرت نے فرمایا: تم نے یہ مقام کیسے حاصل کر لیا ہے؟ اس نے کہا: نفس کی مخالفت سے کہ نفس چاہتا ہے کہ دودھ پیوں تو میں کہتا ہوں کہ نہیں نہیں دودھ نہیں پلانا، پانی پر گزارہ کرو۔ بازار میں جا رہا ہوں تو گوشت کی عمدہ خوشبوئیں آتی ہیں، دل کہتا ہے کہ کھالوں، لیکن میں کہتا ہوں: خبردار! دال پر گزارہ کرو۔ بیٹھے بیٹھے خیال آتا ہے کہ کھانا کھاؤں، لیکن میں کہتا ہوں: نہیں تجھے بھوکا ماروں گا۔ جو اندر سے دل چاہتا ہے، اس کی مخالفت کرتا ہوں تب اس مقام پر پہنچا ہوں کہ اندر کی بصیرت روشن ہوگئی۔ تو حضرت دین پوری ؒ نے فرمایا: اب اپنے نفس پر غور کرو کہ کیا تمہارا نفس مسلمان ہونا چاہتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت نے فرمایا: اس نفس کی مخالفت کرو، ورنہ تمہارا یہ مقام آج ختم ہو جائے گا، کیونکہ یہ مقام تمہیں مخالفتِ نفس سے ملا ہے۔ اس نے کہا: آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ آپ نے کلمہ پڑھایا اور وہ مسلمان ہو گیا۔

اس کے بعد آپ نے اس کو کہا کہ اب اپنے نفس کے چکر میں نہ رہنا، اب تم نے اللہ کے احکامات کو ماننا ہے۔ اور آپ نے فرمایا کہ اب مراقبہ کر کے فقیر کا دل دیکھو تو وہ پھر مراقبہ میں بیٹھ گیا۔ اور اس نے کہا: حضرت! اب آپ کا دل تو بالکل روشن ہے۔ فرمایا: پہلے بھی داغ نہیں تھا، اور جہاں جہاں تم نے مراقبہ کیا اور داغ نظر آیا تو وہ تمہارے کفر کا عکس پڑتا تھا، کیونکہ جو چیز شیشے کے سامنے رکھو گے تو وہی نظر آئے گی۔

یہود و نصاریٰ کا نظریۂ اخلاق:

بہر حال میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ کہتے ہیں: اخلاق میں تبدیلی ناممکن ہے، ہاں! اگر نفس کو مشقت میں ڈالو تو تبدیلی ممکن ہے۔

باقی یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ اخلاق میں تبدیلی تو آسکتی ہے، لیکن ہمیں اس کے درست کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھانسی پر چڑھ گئے اور وہ ہمارا کفارہ ادا کر گئے، لہٰذا ہم جہنم میں جائیں گے ہی نہیں۔ اس لیے دیکھیں کہ یورپ والوں کے ہاں حلال، حرام، نکاح اور زنا کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ اس کو حقوقِ انسانی، آزادی اور مساوات کہتے ہیں۔ اس چکر میں آکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی پر چڑھا دیا اور اپنے سارے گناہ معاف کرا ڈالے کہ اب مزے کریں۔

یہودی کا نظریہ:

یہودیوں نے کہا کہ ہم نے جہنم میں جانا ہی نہیں ہے، ہم نے تو صرف جنت میں جانا ہے، حتیٰ کہ وہ کہتے تھے: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ [المائدۃ:۱۸] (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں)۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ تم سب اللہ کے بیٹے کیسے ہو گئے؟ کہتے ہیں: بیٹے حضرت عزیر علیہ السلام تھے ہم تو اس کے دوست ہیں تو ہم بھی بیٹے ہوئے۔ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے محبوب ہوئے تو ہم اللہ کے محبوب بن گئے۔ اور بیٹا اچھا ہو یا برا ہو کوئی آدمی اپنے بیٹے کو آگ میں تو نہیں ڈالتا۔

اور ان کے بعض سنجیدہ آدمیوں نے کہا کہ شاید ہم اتنی دیر کے لیے جہنم میں چلے جائیں جتنی دیر کے لیے ہمارے بڑوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ [البقرۃ:۸۰] (اور یہودیوں نے کہا: ہمیں گنتی کے چند دنوں کے علاوہ آگ ہرگز نہیں چھوئے گی) یعنی چند دن عذاب ہوگا۔

جب ان کا یہ عقیدہ ہے تو ان کو اخلاق بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو جنت کے ٹھیکیدار ہیں۔ اسی لیے یہودیت کا ایک مطمحِ نظر ہے کہ ماسوا یہودیوں کے کوئی انسان ہے ہی نہیں اور باقی سارے حیوان اور نیچی قومیں ہیں، ان کو انسان کہنا ہی نہیں چاہیے۔ اسی لیے کوئی ہندو بنے بن سکتا ہے، عیسائی بنے بن سکتا ہے، سکھ بنے بن سکتا ہے، لیکن یہودی نہیں بن سکتا۔

یہودیوں کی تعداد کم کیوں ہے؟

وہ صرف اس کو یہودی مانیں گے جس کی ماں یہودی ہو، وہ دو نمبر کا بھی یہودی نہیں مانتے۔ اس لیے وہ قوم پورے عالم سے ٹکرا رہی ہے کہ ہماری تعداد بھی تھوڑی ہے اور پورے عالم کو ہم نے کنٹرول کرنا ہے۔ ہمارے مقابلہ میں کون ہے؟ ان کو اس چیز نے آکر اخلاقیات سے محروم کر دیا کہ مسلمانوں کو قتل کر دو، بلڈوزر چلا دو، فلسطین

کے ان نہتے مسلمانوں پر بن برسادو، حالانکہ ان کے پاس کچھ نہیں، وہ نہتے ہیں، ان کے پاس صرف غلیل اور پتھر ہیں، کیونکہ ان کے دماغ میں ایک بات ہے کہ ہم جنتی ہیں، ہمیں اخلاق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے تمام عالم کا نظریہ اس وجہ سے بھٹکا ہے۔

اسلام کے نزدیک انسان کی اصلاح ہوسکتی ہے:

لیکن اسلام کہتا ہے کہ اخلاق میں تبدیلی ہوسکتی ہے جس کو اصلاح اور تزکیہ کہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی بگڑا سے بگڑا انسان توبہ کرلے تو اس کی اصلاح ہوجاتی ہے، اس کے اخلاق سیئہ کو اخلاق حسنہ سے بدلا جاسکتا ہے۔ اگر ایک آدمی بے نمازی ہے تو نمازی بن سکتا ہے۔ ایک آدمی حرام کھاتا ہے تو اصلاح ہوسکتی ہے کہ وہ حرام کھانے سے بچ جائے۔ ایک آدمی چوری کا عادی ہے تو اصلاح ہوسکتی ہے کہ وہ چوری کی بجائے امین بن جائے۔

اور اسی طرح اگر آپ اس بات کو منطقی اور عقلی اعتبار سے دیکھیں تو بھی انسان کی اصلاح ہوسکتی ہے، کیونکہ انسان کے اندر تین طرح کی قوتیں ہیں: (۱)..... قوتِ حیوانیہ یا قوتِ شہوانیہ، (۲)..... قوتِ غضبیہ اور (۳)..... قوتِ عقلیہ۔ یہ تین معروف قوتیں ہیں۔ ویسے تو اللہ نے انسان میں بہت ساری قوتیں رکھی ہیں: قوتِ فکریہ، قوتِ علیہ اور قوتِ نظریہ ہے۔ اللہ نے انسان کو بہت ساری نعمتوں سے نوازا ہے۔ شرط یہ ہے کہ انسان تو بنے۔ اگر انسان اپنے آپ کو انسان ہی نہ بنائے تو کیا حاصل ہوگا؟ اس لیے آپ نے پہلی پہلی وحی پر غور کیا کہ اللہ نے فرمایا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝١ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝٢ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝٣ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝٤ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝٥﴾ [العلق: ۱ تا ۵]

''اے پیغمبر ﷺ آپ پر (جو) قرآن (نازل ہوا کرے گا) اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے (یعنی جب پڑھیے تو ''بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کہہ کر پڑھیے)۔ جس نے مخلوقات کو پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ آپ قرآن پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے (جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور ایسا ہے) جس نے (لکھے پڑھوں کو) قلم سے تعلیم دی۔ اور عموماً انسان کو (دوسرے ذرائع سے) ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔''

خدا کی قسم! اگر ان پانچ آیتوں پر غور کرو تو انسان کی دنیا بدل جائے۔ ہمیں سب سے پہلا حکم ملا: ''اِقْرَاْ'' تو جس قوم کو سب سے پہلے پڑھنے کا حکم دیا پھر بھی وہ قوم اس حکم پر عمل نہ کرکے جاہل ہے۔ اتنی بدقسمت ہے۔

اب بھی اگر آپ کسی ملک میں جائیں امریکہ، پیرس اور فرانس جائیں، ان کے لڑکے لڑکیاں کسی جگہ بیٹھے ہیں،

کوئی نہ کوئی میگزین، کوئی نہ کوئی اخبار، لٹریچر کھول کر پڑھ رہے ہیں اور ہمارا اچھے سے اچھا اور معزز آدمی ائیر ہوسٹس کے بدن پر غور کرتا رہتا ہے کہ متناسب ہے یا نہیں اور بدصورت ہو تو بے چارے منہ گندا کر کے بیٹھ جاتے ہیں کہ یہ اچھی نہیں ہے۔ جب یہ حال ہے تو ہم کیا ترقی کریں گے؟ لوگ کہتے ہیں کہ مقابلہ کریں گے۔ اللہ کے بندے تم کوکا کولا نہیں بنا سکتے تو تم جنگ لڑو گے؟ کوئی عقل کرو۔ تم برگر ان کے کھاتے ہو، پیزا ان کا کھاتے ہو، کوکا کولا اور پیپسی ان کی پیتے ہو، تم کپڑے ان کے پہنتے ہو، کہاں کا جہاد اور کس چیز کا جہاد کرو گے؟ جہاد علم سے ہوگا، ظلم سے نہیں ہوگا۔ یہ لڑنا مرنا، دہشت گردی یہ جہاد ہے؟ علم کا مقابلہ علم سے کریں، جہل سے نہ کریں۔ اس لیے پہلا پہلا حکم ہے ''اِقْرَأْ'' کہ پڑھو۔

تخلیقِ انسانیت پر غور کرو:

اور دوسری صفت ربوبیت کہ جس نے تجھے پیدا کیا۔ اب تخلیق کس نے کی ہے؟ کافروں نے تحقیق کرتے کرتے جینز ڈھونڈ نکالے، تیرے مادے کہ اندر جو جرثومات ہیں اس پر جو لکھا گیا ہے اس کو پڑھ لیا ہے، لیکن کیا تم نے بھی تخلیقِ انسانی پر غور کیا ہے؟ حالانکہ مسلمان کو پہلا حکم ہی یہی ملا تھا کہ پڑھو۔ تم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ ''عَلَق'' کیا ہے؟ انسان کی تخلیق کا مادہ کیا ہے؟ تم نے کبھی غور کیا ہی نہیں۔ حالانکہ حکم ہی یہی ملا تھا کہ تم پیدائش پر غور کرو۔ اور یہ تمہیں کہاں سے ملے؟ سیکھنے سے ملے۔

﴿الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴﴾ [العلق:۴]

''جس نے قلم کے ذریعے سے سکھلایا۔''

اور آگے فرمایا:

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵﴾ [العلق:۵]

''جس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

لیکن اگر آپ سیکھنا نہ چاہیں، آپ قلم کی بجائے ہاکی شروع کر دیں، قلم کی بجائے آپ فٹ بال شروع کر دیں تو علم کیسے آئے گا؟ دیکھو! ظالموں کی کیسی سازش ہے کہ ایک کمپنی کے اشتہار کے لیے پچاس پچاس ملین ڈالر ایک فٹ بالر کی قیمت ہے۔ تو بے وقوف کہے گا کہ کیوں پڑھوں؟ فٹ بال کیوں نہ کھیلوں؟ اگر میرا نام آگیا تو میں بھی اس

طرح کمالوں گا۔ ہمارے لوگ بھی ان کا لباس بناتے ہیں اور ان کی شکلیں بناتے ہیں، کیونکہ ان کے دماغ کے اندر بٹھایا ہی یہی گیا ہے۔ حالانکہ اللہ نے فرمایا کہ تخلیقِ انسانی پر غور کرو۔

قرآن کے اعجاز پر کفار کی گواہی:

کائینز کا ایک ڈاکٹر دنیا کا بڑا ڈاکٹر ہے، جو مسلمان ہو گیا ہے اور باقاعدہ اس کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس نے کہا کہ میں نے جب لفظ ''عَلَق'' پر غور کیا تو میں نے سوچا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کائینز کے اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں کہ چودہ سو سال پہلے انہوں نے بتلا دیا کہ وہ نطفہ پہلے ایک جونک کی شکل اختیار کرتا ہے۔ میں نے اسی مبحث پر کئی پی ایچ ڈی کر ڈالے، لیکن جب میں نے ''عَلَق''، ''مُضۡغَة''، ''کَسَوۡنَا الۡعِظَامَ لَحۡمًا'' پر غور کیا تو میں نے سوچا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ یا تو بہت بڑے ڈاکٹر تھے یا پھر اللہ کے سچے نبی ﷺ تھے۔ جبکہ ان کے زمانے میں نہ کوئی میڈیکل یونیورسٹی تھی اور نہ ہی کوئی وسائل تھے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچے نبی ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ نے ان کو بتلایا، وگرنہ ان کو ان باریکیوں کا کیا پتا تھا کہ وہ نطفہ کیا ہوتا ہے؟ کہاں ہوتا ہے اور کیسا ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِیۡ قَرَارٍ مَّكِیۡنٍ ۝﴾ [المومنون: ۱۳]

''پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا جو کہ (ایک مدت معینہ تک) ایک محفوظ مقام (رحم) میں رہا۔''

اور اسی طرح فرمایا کہ جب آدمی جنابت میں ہو تو سارے بدن کا غسل کرے، کیونکہ سارے بدن میں گردش کرتا ہے۔ اس لیے آپ دیکھیں کہ میاں بیوی ملنے کے بعد ہٹ جاتے ہیں تو تھک جاتے ہیں کہ سارے بدن پر اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ اس لیے سارے بدن پر غسل رکھا، تاکہ فریش ہو جائیں۔ ہم نے قرآن پر غور نہیں کیا، وگرنہ اللہ نے تو فرما دیا ہے:

﴿الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۝﴾ [العلق: ۴]

﴿فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۳۹]

''تم خدا تعالیٰ کی یاد اس طریق سے کرو کہ جو تمہیں سکھلایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔''

﴿وَیَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝﴾ [النحل: ۸]

''اور ایسی ایسی چیزیں بناتا ہے جن کی تمہیں خبر بھی نہیں۔''

لیکن ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔

انسان میں تین قوتیں:

اسلام کہتا ہے کہ انسان کے اندر مذکورہ بالا تین قوتیں ہیں۔ اب اگر غور کریں تو ان تینوں قوتوں کی تین تین صورتیں بنیں گی: افراط ہوگا، تفریط ہوگی یا اعتدال ہوگا۔ یہ یاد رکھنا! تا کہ سمجھ میں آجائے۔

افراط کا معنی ہے حد سے بڑھ جانا، تفریط کا معنی ہے حد سے نیچے گر جانا اور اعتدال کا معنی ہے کہ نہ کمی اور نہ زیادتی۔

غصہ کی قوت:

قوتِ غضبیہ کا افراط یہ ہے: ''صَرْفُهَا فِيْ مَا لَا يَنْبَغِيْ '' (قوت کو نامناسب جگہ میں استعمال کرنا)۔ آدمی قوتِ غضب کو ایسی جگہ استعمال کرے جہاں استعمال نہ کرنا بہتر ہو اور جہاں قوتِ غضبیہ کو استعمال کرنا بہتر ہو وہاں استعمال نہ کرے۔ اس لیے امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مَنِ اسْتُغْضِبَ وَلَمْ يَغْضَبْ فَهُوَ جِدَارٌ.''

''جس آدمی کو غصہ دلایا جائے اور اس کو غصہ نہ آئے تو وہ دیوار ہے (وہ بندہ تو نہ ہوا)۔''

اور فرمایا:

''قَالَ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللهُ: مَنِ اسْتُغْضِبَ وَلَمْ يَغْضَبْ فَهُوَ حِمَارٌ.''

''جس آدمی کو غصہ دلایا جائے اور وہ غصہ نہ کر سکے تو وہ گدھا ہے۔''

[احیاء العلوم: ۲/۱۸۵، كِتَابُ آدَابِ الْأُلْفَةِ وَالْأُخُوَّةِ...]

اس کے اندر غصہ ہی نہیں یا پھر اس کو وہاں استعمال کر رہا ہے جہاں استعمال کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ جیسے باپ سے لڑ رہا ہے، غصہ کر رہا ہے، ماں کی بے عزتی کر رہا ہے یا بہن کی بے عزتی کر رہا ہے۔ اور ہمارے بچے بھی عام طور پر کہہ دیتے ہیں کہ غصہ سے پاگل ہو رہا تھا۔ حالانکہ غصہ میں کوئی پاگل نہیں ہوتا، یہ غصہ بڑا سمجھدار ہوتا ہے۔

غصہ میں تین طلاقیں:

جیسے آدمی آجاتے ہیں کہ میں نے غصہ میں تین طلاقیں دے دیں۔ میں کہتا ہوں کہ کام پکا ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں:

غصے میں طلاق دی تھی۔ میں کہتا ہوں: بھلا! کوئی محبت میں بھی طلاق دیتا ہے؟ پوری دنیا کے اندر کوئی ایسا آدمی تلاش کر کے لاؤ جو اپنی بیوی کو یہ کہے کہ آج مجھے آپ کے حسن پر اتنا پیار آ رہا ہے کہ میں آج آپ کو ہدیہ طلاق دیتا ہوں۔ کوئی ایک مثال مجھے دو۔

غصہ میں اعتدال:

ایک بچہ آٹھ سال کا ہے اور دوسرا دس سال کا دونوں لڑ رہے ہیں، بڑا لڑکا غصہ میں مار رہا ہے تو چھوٹے بچے نے شور مچایا کہ ابو، ابو! جب ابو آ گئے تو دس سال والا بھاگ گیا۔ تو غصہ عقل والا ہے یا پاگل ہے؟ اگر وہ غصہ میں پاگل تھا تو پھر کھڑا رہتا۔ حالانکہ پہلے مار رہا تھا، لیکن جب اس کا ابو آ گیا تو اس کو پتا ہے کہ یہ مجھے طمانچہ مارے گا تو میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کبھی آپ کو بڑے پر غصہ آیا؟ غصہ نیچے والے پر آتا ہے، جس کی وجہ سے تنخواہ ملتی ہے اگر وہ سر کھا جائے تب بھی آپ خاموشی سے کھڑے رہیں گے، کوئی بڑا افسر آ جائے اور آپ کو ڈانٹنا شروع کر دے تو آپ کو غصہ نہیں آئے گا، بلکہ آپ چہرے پر تکلف کر کے مسکراہٹ بھی لے آئیں گے۔ چاہے دل میں کہہ رہے ہوں کہ بڑا بدتمیز ہے، لیکن کیا کریں سینئر ہے۔ تو یہ قوتِ غضبیہ ہے۔

اب اسلام کیا چاہتا ہے؟ اسلام نہ افراط چاہتا ہے اور نہ تفریط چاہتا ہے، اسلام اعتدال کا قائل ہے کہ اگر غصے کو اس کے محل میں استعمال کرو گے تو یہ شجاعت ہے۔ مثلاً: آپ کھڑے ہوں اور کوئی خنزیر آپ کو مارنے کے لیے بھاگتا ہوا آئے تو کیا آپ اس کو کہیں گے کہ آئیے! آئیے! ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ!'' تو یہ عقل ہوگی یا بے وقوفی ہوگی؟ لیکن اگر آپ تلوار یا بندوق لے کر ڈٹ جائیں گے تو یہ شجاعت ہوگی۔ اگر غصہ کو اس کے محل میں استعمال نہیں کریں گے تو یہ بزدلی کہلائے گی۔ مطلب یہ ہوا کہ نہ حد سے بڑھیں اور نہ بالکل ختم کر دیں۔ ازالہ کی بجائے امالہ کر دیں۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ گھر کے اندر ڈنڈا لٹکتا رہے، لیکن مارو نہیں، بلکہ اس کو پتا چلے کہ اس کو کسی وقت غصہ آ سکتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ جناب فارغ ہیں، پھر بیگم کی چپل اور آپ کا سر ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اعتدال:

اس لیے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ میدان میں مرحب پہلوان کے مقابلہ میں اترے اور مرحب نے کہا:

قَدْ عَلِمَتْ خَيْبَرُ أَنِّي مَرْحَبٌ
شَاكِي السِّلَاحِ بَطَلٌ مُجَرَّبٌ

''پورا خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں۔ اسلحہ پوش، بہادر اور تجربہ کار ہوں۔''

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

أَنَا الَّذِي سَمَّتْنِي أُمِّي حَيْدَرَهْ
كَلَيْثِ غَابَاتٍ كَرِيهِ الْمَنْظَرَهْ

''میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے اس شیر کی طرح جو جنگلوں میں ڈراؤنی صورت ہوتا ہے۔'' [صحیح مسلم، حدیث: ۱۸۰۷، باب: غَزْوَةِ ذِي قَرَدٍ وَغَيْرِهَا]

یہ مبارزت ہوتی تھی کہ مرحب کے چیلنج کا مقابلہ کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اعتدال:

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ہے کہ تلوار لے کر نبی ﷺ کو قتل کرنے کے لیے جا رہے تھے، لیکن جب مسلمان ہو گئے تو وہی غصہ کیسے اعتدال پر آیا کہ عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ)! یہ بتائیں کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں اور کافر جھوٹے نہیں ہیں؟ تو پھر ہم کیوں ایسی کمزوری دکھائیں کہ ہم اپنی عبادات اور نمازیں چھپ کر پڑھیں؟ حمزہ اٹھو! یا رسول اللہ (ﷺ)! ایک طرف حمزہ ہوگا اور ایک طرف عمر ہوگا، آپ درمیان میں ہوں گے۔ آج دیکھتے ہیں کہ قریش کیسے ہمارا مقابلہ کرتے ہیں؟ اب غضب ہے، لیکن اعتدال میں آگیا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح: ۲۹]

''اور جو لوگ آپ کے صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا اعتدال:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سیف اللہ، اللہ کی تلوار ہیں۔ جس نے دنیا کی بڑی بڑی جنگجو قوموں کے چھکے چھڑا دیے، اسلامی زندگی میں کسی مسلمان کو تھپڑ بھی نہیں مارا۔ جس نے قیصر و کسریٰ کو للکارا، ان کے تخت پاؤں کے نیچے روند ڈالے، ساٹھ آدمیوں کو لے کر ساٹھ ہزار پر حملہ کر دیا۔ وہاں غضب کا یہ عالم اور آپس میں رحمت کا یہ عالم ہے کہ کبھی مسلمان کو تھپڑ بھی نہیں مارا۔ یہ ہے قوتِ غضبیہ کا اعتدال۔

کفار کا فلسفۂ اخلاق:

اور ایک ہے "خُلق" یعنی صفات معنویہ کہ کس آدمی کا حسنِ معاشرت ہے، اخلاق ہے، حسنِ معاملہ ہے۔ یونانی فلسفہ اور ان کے تابع بدھ مت، ہندو ہو گئے، وہ اس طرف گئے ہیں کہ ان کے اندر تبدیلی نہیں ہو سکتی، مگر مشقت کے ساتھ۔ اس لیے وہ لوگوں کو رہبانیت میں لے گئے کہ پہاڑوں میں رہو، شادی نہ کرو، گوشت نہ کھاؤ، دنیا سے کٹ جاؤ، سر سے بال منڈوا دو، اپنی جوانی کو بالکل ملیامیٹ کر دو۔ کبھی ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں اور کبھی دریا میں کھڑے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ان مشقتوں کے بعد تو ممکن ہے کہ آدمی کے اخلاق کی اصلاح ہو جائے، وگرنہ ممکن نہیں۔

اخلاقِ اسلامی اور گروہ بندی:

لیکن اسلام کہتا ہے کہ اخلاق کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے بھیجا ہی اسی لیے ہے کہ میں مکارم اخلاق کا منتہیٰ امت تک پہنچا دوں۔ [سنن البیہقی، حدیث ۲۰۵۷۱]۔ اب اخلاق کی اصلاح کیسے ہو گی؟ ایک جماعت ہے جس کو علماء کہا جاتا ہے اور ایک دوسری جماعت ہے جس کو صوفیاء کہا جاتا ہے۔ علماء میں بھی بعض بھٹک گئے وہ علماء سوء کہلائے اور جو حق پر رہے وہ علماء حق کہلائے۔ اسی طرح صوفیاء میں بھی بعض حق پر رہے اور حقیقتاً صوفی ہیں، صفاء والے ہیں، متبع سنت مصطفیٰ ﷺ ہیں، ان کا کوئی عمل شریعت اور سنت کے خلاف نہیں ہوتا۔ ان میں بھی بعض گمراہ ہو گئے، فرقہ حلولیہ بن گئے اور بعض جھوٹے صوفی بن گئے۔ بعض لوگوں نے اپنی شکل صوفیوں والی بنا کر اپنے آپ کو صوفی بنا دیا، حالانکہ وہ جانتے ہی نہیں کہ تصوف کیا چیز ہے؟

علماء کی ذمہ داری:

ان دو گروہوں کے پاس اصلاح ہو گی۔ علماء سے تعظیمِ شریعت ہو گی اور صوفیاء سے اصلاحِ باطن ہو گا کہ ان سے رذائل اخلاق ختم کر کے ان سے اچھے اخلاق پیدا کرے۔ اب اس کی تربیت کا انداز کیا ہو گا؟ جیسے علماء اپنے مبتدی طلبہ کو پہلے قواعد پڑھائیں گے، صرف پڑھائیں گے، نحو پڑھائیں گے، اس کو معانی پڑھائیں گے، اس کو کچھ اصول پڑھائیں گے پھر اصول تفسیر پڑھائیں گے، اس کو کچھ فقہ کی کتابیں پڑھائیں گے، پھر ابتدائی حدیث کی کتابیں پڑھائیں گے اور پھر اصول تفسیر پڑھائیں گے۔ آہستہ آہستہ اس کو اوپر لے جائیں گے، تاکہ وہ ہر چیز سمجھتا جائے اور وہ علم کے دروازے سے داخل ہو، اوپر سے چھلانگ لگا کر نہ آئے۔ بہت سے لوگوں کی بات ٹھیک ہوتی ہے، لیکن

آئے ہوئے اوپر سے ہیں۔ ان کی بنیاد نہیں ہوتی، اس لیے وہ علم کو سمجھ نہیں پاتے۔

صوفیاء کے ہاں اصلاح کا طریقہ:

اور صوفیا کا کام ہوتا ہے کہ اس میں دیکھیں کہ کیا بری عادتیں ہیں؟ جھوٹ بولنے کی عادت ہے، زنا کی عادت ہے، شرابی ہے، منشیات میں گھرا ہوا ہے، یہ رشوت کھاتا ہے اور یہ غیبت کرتا ہے۔ اب اس کی بیماریوں کو دیکھ کر اس کا علاج تجویز کرتے ہیں کہ اس کا علاج ذکر سے ہوگا، اس کا علاج تہجد سے ہوگا، اس کا علاج اکلِ حلال سے ہوگا، اس کا علاج اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھ کر دوسرے آدمی سے ملنے نہ دینے سے ہوگا۔ تو پھر اس کی اصلاح کرتے ہیں۔ جب اصلاح ہوجاتی ہے تو وہی لوگ ہوتے ہیں جو کل...... نعوذ باللہ...... بگڑے ہوئے تھے، صالح بن جاتے ہیں۔

حقیقی انقلاب:

اسی لیے کسی نے لکھا ہے کہ انقلاب تو فرانس کا بھی آیا ہے، رشیا کا بھی آیا ہے، بڑے بڑے انقلاب دنیا میں آئے، لیکن وہ انقلاب معاشی اور اقتصادی طور پر تھے۔ صحیح انقلاب لانے والی ذات سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جن کی وجہ سے عقیدے میں بھی انقلاب آیا کہ جو مشرک تھے وہ موحد بن گئے اور جو بتوں کے پجاری تھے وہ اللہ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْكَ لَهٗ کی توحید کے داعی بن گئے۔ اور اخلاق میں بھی تبدیلی آئی کہ جو اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے وہ دوسروں کی بچیوں پر بھی رحم کرنے والے بن گئے، جو ظالم تھے وہ رحم دل بن گئے، جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ زکوۃ دینے والے بن گئے، جو تنگ نظر تھے وہ وسیع القلب بن گئے اور جو کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے وہ اپنے آپ کو بھوکا رکھ کر دوسروں کو دینے والے بن گئے۔ یہ انقلاب سر سے لے کر پاؤں تک تھا۔ اس لیے علمائے اسلام کہتے ہیں کہ اخلاق کے اندر تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔

روزہ سے اخلاق کا علاج:

حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے مدنی! آپ اپنی امت کو بتلا دیں:

((اَلصَّوْمُ لِيْ وَأَنَا أُجْزِيْ بِهٖ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۹۲، باب: ذِکْرِ النَّبِيِّ ﷺ وَرِوَايَتِهٖ عَنْ رَبِّهٖ]

''روزہ میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ میں دوں گا۔''

ہر عمل کا بدلہ اللہ ہی دیں گے، لیکن روزے کو کیوں خاص کیا گیا؟ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ بندوں میں سرائر ہیں

کہ اگر آدمی ایک دن نماز پڑھے اور دو دن نہ پڑھے تو لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ یہ نماز نہیں پڑھتا، لیکن روزہ ایسی عبادت ہے کہ بیوی کو بھی پتا نہیں چلتا کہ اس نے سحری کھائی ہے اس کو روزہ ہے اور اگر گھر والے کہیں چلے جائیں تو کوئی چیز کھا لیتا ہے، پھر ہونٹوں پر کپڑا لگایا کہ پتا لگے کہ حضرت روزے کے ساتھ بیٹھے ہیں، شام کو افطاری کے وقت جہاں اچھی چیزیں ہوں وہیں آ کر حضرت بیٹھتے ہیں۔

تو وجہ یہ ہے کہ اللہ نے جو ہمارے اندر قوات رکھی تھیں، بعض قوات ملکیہ تھیں اور بعض قوات شہوانیہ تھیں۔ روزہ رکھنے سے ہماری قوات ملکیہ ابھر جائیں اور قوات شہوانیہ کمزور ہو جائیں۔ اس لیے اسلام کہتا ہے کہ کسی چیز کا ازالہ نہ کرو، بلکہ امالہ کرو۔ مثلاً: بڑی بڑی تین قوتیں اللہ نے بندے میں رکھی ہیں: قوتِ شہوانیہ، قوتِ غضبیہ اور قوتِ عقلیہ۔ ان تینوں قوتوں میں تین حالتیں ہیں: ایک افراط، دوسری تفریط اور تیسری اعتدال۔ افراط کا معنی ہے حد سے بڑھ جانا، تفریط کا معنی ہے حد سے گھٹ جانا اور اعتدال کا معنی ان دونوں کے درمیان رہنا۔ اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں، تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور گمراہ لوگ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرے بارے میں دو جماعتیں ہلاک و برباد ہو جائیں گی: بعض تیری محبت کے اندر اتنے بڑھ جائیں گے کہ وہ بھی پٹڑی سے اتر کر ہلاک ہو جائیں گے اور بعض تیرے بغض میں اتنے بڑھ جائیں گے کہ وہ بھی پٹڑی سے اتر کر ہلاک ہو جائیں گے۔ [کنز العمال، حدیث: ۳۶۵۹۶، خصائص أمير المؤمنين علي رضي الله عنه]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں غلو:

شیعانِ علی محبت کے اندر اتنے بڑھ گئے کہ اپنے عقیدے کا جزء بنا لیا، حتیٰ کہ اگر وہ طواف بھی کر رہے ہوں گے تو کہہ رہے ہوں گے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ مُحَمَّدًا نَبِیًّا وَجَعَلَ عَلِیًّا إِمَامًا'' (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اور علی رضی اللہ عنہ کو امام بنایا)۔ اور کسی کا نام نہیں لیں گے، کیونکہ ان کے نزدیک امامت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ میں ہے اور کسی میں نہیں، کیونکہ اس چیز کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

یہ لوگ اور زیادہ آگے بڑھ گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ امام ہیں اور قرآن میں امامت کی دعا سکھلائی گئی ہے:

﴿وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ [الفرقان:۷۴] (اور ہمیں متقیوں کا امام بنا دے)۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ انبیاء سے بھی اونچے ہو گئے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اصل درجہ تو امامت کا ہے، نبوت کا بھی اپنا مقام ہے، لیکن نبوت امامت سے کم ہے، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اللہ نے امام بنایا اور وہ منصوص امام ہیں۔

اور یہ الگ بات ہے کہ ان کے پاس نہ اس کی نص ہے، نہ کوئی حدیث متواتر ہے، بلکہ یہ ان کا ایک دعویٰ ہے جو بلا دلیل ہے، اس لیے وہ کبھی کبھی اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے قرآن میں تحریف کرنے پر آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں: ﴿وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ [مریم:۵۷] (اور ہم نے ان کو (کمالات میں) بلند رتبہ تک پہنچایا)۔ یہاں "مَكَانًا عَلِيًّا" سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ تو اللہ کے قرآن میں تحریف کر دی۔

اور کہتے ہیں کہ قرآن میں ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً﴾ [المجادلۃ:۱۲] (اے ایمان والو! جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہو تو اپنی اس تنہائی کی بات سے پہلے کچھ صدقہ کر دیا کرو)۔ اس پر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمل کیا ہے اور کسی نے عمل نہیں کیا، لہٰذا مقامِ امامت کے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ حق دار ہیں اور کوئی نہیں ہے۔

شیعہ سنی کا لطیفہ:

مثل مشہور ہے کہ دو مولوی جھگڑ رہے تھے: ایک اہلِ سنت والجماعت سے تھا اور دوسرا اہلِ تشیع تھا۔ اس نے کہا کہ اللہ کے بندے! تم شیعہ پتا نہیں کب سے پیدا ہوئے ہو؟ اس نے کہا کہ شیعہ سب سے پہلے ہیں۔ قرآن میں ہے: ﴿وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ﴾ [الصّٰفّٰت:۸۳] کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی شیعہ تھے...... نعوذ باللہ!...... بھلا! اس سے بڑی قرآن میں کوئی تحریف ہے؟

مولوی صاحب سمجھدار تھے، انہوں نے کہا کہ ہاں! حضرت ابراہیم علیہ السلام شیعہ تھے، جب باپ کے گھر میں تھے۔ ﴿اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ [الصّٰفّٰت:۸۴] جب بت خانہ چھوڑا تب تو وہ اہلِ سنت بنے۔ اب اس نے بھی اسی طرح کا جواب دیا۔

حالانکہ دونوں اللہ کے قرآن کو بدل رہے ہیں، کیونکہ غلط بات غلط ہے، چاہے شیعہ کرے یا سنی کرے۔ اگر ہم ہر جگہ شیعہ کے لفظ سے شیعہ مراد لیں تو قرآن میں یہ بھی تو ہے، اللہ فرماتے ہیں: ﴿اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا﴾ [الانعام:۶۵] کہ ایک عذاب یہ بھی ہے کہ میں تمہیں شیعہ بنا دوں گا۔ پھر تو...... نعوذ باللہ!...... ہم قرآن میں تحریف کرتے جائیں۔

ایک اور لطیفہ:

یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایک طرف شیعہ کا مناظر تھا اور دوسری طرف اہلِ سنت کا مناظر تھا۔ میں نے دونوں کو دیکھا ہوا تھا، اب دونوں مر گئے ہیں۔ شیعہ مناظر نے جوش میں آکر مولوی صاحب سے کہا کہ سنی اور سور میں کیا فرق ہے؟ اس نے کہا کہ اتنا فرق ہے جو تمہارے اور میرے درمیان ہے، کیونکہ میں تو سنی ہوں اور باقی تم ہو۔ میرے سنی ہونے میں تو کوئی شک نہیں ہے۔

تحریف کر کے گیارہویں کا ثبوت:

تو میرے بھائی! یہ الزامی باتیں ہیں، دلائل نہیں اور نہ اس کو علم کہا جا سکتا ہے۔ ایک مولوی صاحب سے کسی نے کہا کہ یہ جو ہم گیارہویں شریف کرتے ہیں اس کا قرآن وحدیث میں کوئی ثبوت ہے؟ اس نے کہا: قرآن میں ہے: ﴿أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا﴾ [یوسف: ۴] (گیارہ ستارے) ''أَحَدَ عَشَرَ'' کیا ہوتا ہے؟ اس نے کہا گیارہ ہوتا ہے۔ تو بس گیارہویں ثابت ہوگئی۔

اس گیارہویں نے عقیدے کو برباد کر ڈالا اور گیارہویں نے دنیا کو برباد کر ڈالا۔ اور خدا کی قدرت کہ حج میں بھی گیارہویں کا دن آتا ہے۔ اس میں کنکریاں مارتے ہو یا نہیں؟ ان باتوں کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ باتیں دلیل نہیں ہوتیں۔

مولوی سردار لائل پوری سے مناظرہ:

مولوی سردار بریلوی مسلک کے تھے، ان سے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کا مناظرہ ہو رہا تھا۔ جب یہ لوگ مناظرے کے لیے آئے تو یہ طے تھا کہ دس منٹ یہ بولے گا اور دس منٹ وہ بولے گا۔ سب سے پہلے سردار احمد نے تقریر کی اور آخر میں طنز کیا کہ مجھے افسوس ہے کہ میرا اس آدمی سے مناظرہ ہے جو عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے۔ بس میں مجبور ہو گیا، وگرنہ میں اس سے مناظرہ نہ کرتا۔ تو خیر! اس نے دس منٹ پورے کر لیے۔ اب جب مولانا نعمانی رحمہ اللہ کی باری آئی تو انہوں نے کہا: حضرات! بات یہ ہے کہ میری بھی بدقسمتی ہے کہ میں دنیا کے بہت بڑے بدبخت سے مناظرہ کر رہا ہوں۔ دیکھو! مرزا نے نبوت کا دعویٰ کیا، لیکن وہ غلام احمد ہی رہا، (کیونکہ اس کا نام غلام احمد تھا) لیکن یہ کون ہے جو سردار احمد (احمد کا سردار) بن گیا۔ بس اس پر نعرے لگ گئے اور وہ بھاگ گیا اور شکست کھا گیا۔

الزامی جواب کی حیثیت:

کہنے کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے کی زبان کو بند کرنے کے لیے یہ الزامی جواب ہوتے ہیں، جبکہ حق وہ ہے جس کے ساتھ قرآن سے، حدیث سے، اجماع امت سے، قیاسِ شرعی سے یا اقوالِ فقہاء سے دلیل ہو۔ لیکن ایسی باتیں کہنا اللہ کے قرآن کو بدلنے اور اس میں تحریفات کرنے والی بات ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل قرآن میں نہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا امام ہونا نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں ہے اور نہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب خلافت کا مسئلہ آیا تو انصارِ مدینہ نے کہا کہ خلیفہ ہم میں سے ہوگا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث پڑھی:

((اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ)) [مسند أبي داود الطيالسي، حديث: ٢٢٤٧]

''امراء (خلفاء) قریش میں سے ہوں گے۔''

کیونکہ قریش کے خون میں حکومت ہے، وہ صدیوں سے سردار چلے آرہے ہیں، مدینہ والے زراعت پیشہ تو ہیں، لیکن انہوں نے کبھی حکومت نہیں کی۔ تو جب یہ حدیث سامنے آئی تو فوراً انصارِ مدینہ نے کہا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تو اب ہم خلافت کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے قرآن کی آیت موجود تھی، اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے فرمانِ رسول موجود تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو کہتے کہ خدا کے بندو! کس بات پر جھگڑ رہے ہو؟ جب اللہ نے مجھے خلیفہ بنایا تو بات ختم ہوگئی۔ تو کون قرآن کا انکار کرتا؟ لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دلیل نہ دی، اہلِ بیت نے دلیل نہ دی تو تم کیسے قرآن کی آیت کو بدل رہے ہو؟ کوئی عقل والا آدمی اس کو نہیں مانتا۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ان کے بارے میں دو جماعتیں ہو جائیں گی: محبت میں پڑنے والے جو حد سے بڑھ جائیں گے اور بغض دشمنی رکھنے والے جو شان گھٹا دیں گے۔ اس لیے بعض نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا بنا لیا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں پیدا ہو گئے تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود پکڑا اور ان سے پوچھا: تم میرے بارے میں کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: تم خدا ہو۔ آپ نے فرمایا: اللہ سے ڈرو، میں اللہ کا بندہ ہوں، ابو طالب کا بیٹا ہوں، دامادِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ مجھے خدا بنا رہے ہو؟ انہوں نے کہا: آپ کچھ کہہ لیں، یہ تو ظاہری پردہ ہے،

وگرنہ آپ خدا ہیں۔

حلولی فرقہ کارد:

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا مان رہے تھے، نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مان رہے تھے، یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا مان رہے تھے اور ہمارے لوگوں نے ترقی کی اور کہا: سارے ہی خدا ہیں۔

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

میرا ایک دور کا رشتہ دار تھا۔ راستے میں ملا، کہنے لگا: کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کہا: جمعہ پڑھانا ہے۔ اس نے کہا: آپ بھی جمعہ پڑھتے ہیں، آپ ہی تو خدا ہیں ناں! آپ کو عبادت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے کہا: تمہارے جیسا کافر تو ابوجہل بھی نہیں تھا۔ ان کا فرقہ ہے۔ شعر میں بھی ہے:

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

خدا کو دل میں بند کر کے بٹھایا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں دو علاقے ہیں: ایک کوٹ مٹھن اور ایک چاچڑاں۔ کوٹ مٹھن میں خواجہ غلام فرید رحمہ اللہ گزرے ہیں، ادھر دریا ہے، اس کے پار چاچڑاں شریف ہے، اس میں بھی بڑے بزرگ تھے۔ مولوی احمد یار وجد میں آ کر کہتا ہے:

چاچڑ وانگ مدینہ ڈسے تے کوٹ مٹھن بیت اللہ
ظاہر دے وچ پیر فریدن باطن دے وچ اللہ

''چاچڑ مدینہ کی طرح نظر آتا ہے اور کوٹ مٹھن بیت اللہ کی طرح نظر آتا ہے۔ ظاہر میں تو پیر فرید ہے، لیکن باطن اور اندر سے یہ خود خدا ہے۔''

اسی طرح ایک پڑھے لکھے آدمی نے لکھا ہے:

کارِ عالم کا مدبر بھی ہے، مختار بھی ہے عبد القادر
مخدوم بھی ہے، مطاع بھی ہے عبد القادر

''سارے عالم کا مدبر عبدالقادر ہے اور میرا بھی عبدالقادر ہے۔''

اصل تو عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ ہیں۔ تو یہ افراط ہے۔ اسی طرح کسی اور نے کہا ہے:

ساڈا عبد القادر قادر ہے
سانوں ہور قادر دی لوڑ نہیں
سانوں بغداد دیاں گلیاں کافی نے
سانوں ہور بہشتاں دی لوڑ نہیں

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دوسرا فرقہ میری دشمنی میں بڑھ جائے گا۔ وہ خوارج ہیں جن کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمان ہی نہیں...... معاذ اللہ!...... تو وہ اس طرح برباد ہو گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق عادلانہ رائے:

اعتدال میں کون ہیں؟ وہ ہیں اہلِ السنت والجماعت۔ انہوں نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ دامادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، "بَطَلٌ مِّنْ بَطَلِ الْإِسْلَام" ہیں، سب سے زیادہ فیصلے کرنے والے ہیں اور ابی الحسن والحسین ہیں۔ یہ انہوں نے مقام دیا۔ انہوں نے نہ امام بنایا، نہ نبی بنایا اور نہ ہی خدا بنایا، وہی مرتبہ دیا جو اللہ نے دیا تھا۔ تو یہ اعتدال ہے۔

والدین کے حق میں جہالت کی انتہاء:

اب سمجھیں! ایک ہے قوتِ غضبیہ میں افراط کہ ٹالنے کی جگہ ہو، مگر غصہ کر ڈالے، والد کو مارنا شروع کر دے۔ تو یہ قوتِ غضبیہ کا افراط ہے۔

میرے پاس شکایت آئی کہ ایک آدمی نے اپنے باپ کو مارا ہے۔ میں اس وقت پاکستان میں تھا، میں نے آدمی بھیجا کہ اس کو پکڑ کر لے آؤ۔ جب اس کو پکڑ کر لے آئے تو اس کا دوسرا بھائی ساتھ تھا۔ اس کو پتا تھا کہ کسی صاحب نے پکڑوایا ہے، وہ ٹھیک ٹھاک سزا دیں گے۔ تو اس نے سوچا کہ میں بھی پہنچ جاؤں، تاکہ کچھ سزا سے بچ جائے۔ وہ میرے پاس آیا اور آ کر کہنے لگا: آپ نے واقعی! ٹھیک بلایا ہے، میرے بھائی کی غلطی ہے، میں نے اس بدبخت کو سمجھایا تھا کہ اگر بابا کو مارنا ہے تو دو چار جوتے مار دو۔...... دیکھو! کیسے سمجھدار بیٹے ہیں!!...... میں نے کہا: میں سمجھا کہ ایک آدمی کی غلطی ہے، لیکن چھوٹے میاں چھوٹے میاں اور بڑے میاں سبحان اللہ!۔ میں نے ان دونوں کو

لٹکا دیا اور جو بلوچ کرتے ہیں ان کے ساتھ کیا۔

بہر حال یہ ہے قوتِ غضبیہ کا غلط استعمال کہ اس کا حد سے بڑھ جانا اور بے محل غصہ دکھانا۔ اور اس کی تفریط کیا ہے کہ جہاں غصہ دکھانا ہے وہاں غصہ نہیں دکھا رہا۔ کافر مقابلہ میں کھڑا ہے، وہ قرآن کے خلاف بکواس کر رہا ہے، حضور ﷺ سے دشمنی کر رہا ہے، صحابہ سے دشمنی کر رہا ہے اور یہ ہنس رہا ہے، یہ کہتا ہے کہ بس دعا کریں، ٹھیک ہو جائے گا۔ تو یہ تفریط ہے۔ دعا تو اس کو لگے گی جس کا برتن صاف ہوگا۔ اگر خراب برتن میں دودھ ڈالو گے تو وہ خراب ہی ہوگا۔

اعتدال کی مثال:

اور اعتدال یہ ہے کہ جہاں ضرورت ہو استعمال کرے اور جہاں ضرورت نہ ہو استعمال نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح: ۲۹] اللہ نے حضور ﷺ کے صحابہ کی صفت بیان کی کہ کافروں کے مقابلہ میں چٹان بن جاتے ہیں اور شجاعت دکھاتے ہیں، لیکن آپس میں مہربان بن جاتے ہیں اور رحم دلی دکھاتے ہیں۔ یہ ہے اعتدال۔

گناہوں پر ناگواری ایمان کا حصہ ہے:

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ نے ایک بستی کے بارے میں حکم دیا کہ اس پر عذاب نازل کر دو۔ ملائکہ نے عرض کیا: یا اللہ! آپ تو علام الغیوب ہیں، وہاں آپ کا ایک ایسا بندہ موجود ہے جس نے ایک لحظہ کے لیے بھی آپ کی نافرمانی نہیں کی، اس پر بھی عذاب نازل کر دیں؟ اللہ نے فرمایا: پھر بھی ساری بستی کو تباہ کر دو، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کبھی اس نے بستی والوں کو گناہوں سے روکا نہیں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ تو اپنی فکر کر، دوسروں کو چھوڑ۔ تو پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو ختم ہو جائے گا۔ اور یہ بھی افراط اور تفریط کی ایک قسم ہے۔ اگر کوئی آدمی شرابی ہے، گلی کے اندر آ کر دنگا کرتا ہے، اگر کوئی روکے تو کہتے ہیں: فاسق آدمی ہے، چھوڑیں کیوں خوامخواہ ایک آدمی کو اپنا دشمن بناتے ہو؟ تو نتیجہ کیا نکلا کہ آج مافیا غالب آ گیا اور شریف مظلوم ہے۔ یہ تفریط ہے، جبن ہے اور بزدلی ہے۔ وگرنہ آپ یقین کریں کہ کتنا بڑا ڈاکو کیوں نہ ہو اگر سارا محلہ اٹھ کھڑا ہو جائے تو کیا کرے گا؟ یہ تو نہیں کر سکتا کہ ایک آدمی ہزاروں کا مقابلہ کر سکے۔ اگر سارا محلہ فیصلہ کر لے کہ اس کو نہیں چھپانا تو کون سی طاقت ہے جو ڈاکو کو چھپائے؟

افراط اور تفریط کی مثال:

قوتِ شہوانیہ اور اس میں افراط کیا ہے؟ ''صَرْفُهَا فِیْ مَا لَا یَنْبَغِیْ'' (قوت کو نامناسب جگہ میں استعمال کرنا) کہ اللہ نے جس چیز کو حرام کیا ہے کہ سارا دن گندی عورتوں کے پیچھے پھرتا ہے، چکلوں میں پھرتا ہے اور چوبیس گھنٹے اسی میں ہے۔ یہ افراط کہ اس نے اپنی قوت شہوانیہ کو حد سے نکالا ہوا ہے۔ اور جہاں حق ہے وہاں بھی استعمال نہیں کرتا۔ اللہ نے بیوی کو حلال رکھا، لیکن وہ بیوی کے پاس بھی نہیں جاتا کہ مجھے عبادت سے فراغت نہیں ہے۔ تو یہ بھی تفریط ہے۔ ایک آدمی نے کہا کہ میں جارہا تھا تو بیوی نے کہا کہ دین کے نام پر مجھے طلاق دے دو۔ میں نے طلاق دے دی۔ میں نے کہا: تم نے دین اچھا سمجھا ہے۔ یہ ہے افراط وتفریط۔ اب اس کا اعتدال کیا ہے کہ حلال میں استعمال کرے اور حرام سے بچے۔ اگر قوت شہوانیہ کو ختم کر دیں تو اس میں کچھ نہیں ہے۔

مصری عورتوں کا حسن:

ایسے ہی تو امام شافعی رحمہ اللہ نے نہیں لکھ دیا کہ جس نے مصر میں شادی نہیں کی اس نے عورت سے شادی ہی نہیں کی۔ اللہ نے ہر مٹی کے اندر خصوصیتیں رکھی ہیں، کسی میں وفا ہے اور کسی میں جفا ہے۔ کسی کے اندر صرف حسن اور کسی کے اندر اللہ نے دین رکھا ہے۔ یہ تو اللہ کی تقسیم ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت:

بہر حال عفت یہ ہے کہ امرأۃ العزیز وقت کے حاکم کی بیوی ہو، مصر کا حسن و جمال ہو، وہ عورت خوبصورت ہو، خود داعی ہو، تمام انتظام بھی ہو، اپنے شکار کو گھیر کر خود اپنے پاس دعوت دے اور پھر پیغمبر علیہ السلام کہیں: معاذ اللہ! تو یہ ہے مقامِ عفت۔ اللہ نے پیغمبروں کو عام انسانوں سے کئی گنا زیادہ طاقت دی ہوتی ہے۔ تو یہ کمال ہے۔

گناہ کا اثر:

علماء نے لکھا ہے کہ اگر آدمی کی کسی غیر محرم پر نظر پڑے اور وہ اپنی آنکھوں کو کنٹرول کر لیتا ہے تو...... ان شاء اللہ!...... اللہ تعالیٰ اس کے دل میں نور پیدا کر دیں گے۔ ہماری تباہی اس لیے ہوتی ہے کہ قرآن پڑھایا، تفسیر پڑھائی۔ سامنے سے ایک عورت گزری تو ساری نیکی گئی۔ کیونکہ برائی جلدی اثر کرتی ہے، اب لاکھ خوشبوئیں لگائیں، لیکن باہر ایک گٹر لیک ہو جائے تو سارے محلے میں بدبو پھیل جائے گی۔ آپ خدانخواستہ ایک من دودھ کے

اندر چار قطرے پیشاب کے ڈالیں تو وہ ایک من پر غالب آجائیں گے، حالانکہ دودھ زیادہ ہے۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے نوجوان بچے کسی غلط لڑکے کی صحبت میں چلے جائیں تو وہ دو دن میں برباد ہوجاتے ہیں۔ اگر ان کو ٹھیک کرنا ہو تو ان پر بڑی محنت لگے، کم از کم چھ مہینے لگیں گے تب جاکر اصلاح ہوگی۔

علم حاصل کرنے میں افراط و تفریط:

قوتِ شہوانیہ میں اعتدال یہ ہے کہ جن چیزوں میں اللہ نے حلال کیا ہے اس میں استعمال کرنا اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے رک جانا، یہ اعتدال ہے۔

اسی طرح قوتِ عقلیہ کے اندر افراط کیا ہے؟ علومِ ضارّہ کا حاصل کرنا، وہ علوم جو بندے کو نقصان دینے والے ہیں وہ اسی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ جادو سیکھ رہا ہے، علم نجوم سیکھ رہا ہے کہ مریخ کیا ہوتا ہے؟ سرطان کیا ہوتا ہے؟ جدی کیا ہوتا ہے؟ وغیرہ، وغیرہ۔ ماشاء اللہ! جو پہلے پڑھے ہیں وہ کون سا آسمان پر پہنچ گئے؟

اور بعض آدمی اس بات میں پڑ جاتے ہیں کہ ایسا تعویذ لکھیں کہ ساری دنیا تابع ہوجائے۔ بعض لوگ جن تابع کرتے ہیں۔ بعض ذہین طالب علم جن تابع کرتے کرتے خود جن بن گئے، عقل سے بھی گئے۔ کتنے لوگ ہیں جو عملیات کے چکر میں پڑ کے اپنے گھر والوں کو برباد کر بیٹھے، اپنی اولاد کو برباد کر بیٹھے۔ تو علومِ ضارّہ کا حاصل کرنا یہ قوتِ عقلیہ کا افراط ہے۔ اور تفریط یہ ہے کہ علم حاصل ہی نہیں کرتا کہ چھوڑو، علم حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اصل تو انسان کی ترقی اللہ سے ملنے میں ہے۔ اور اللہ سے ملنے کا طریقہ عشق مجازی ہے۔ پہلے کسی لڑکے سے عشق ہوگا، لڑکی سے عشق ہوگا تو میرا مرشد پٹڑی بدلے گا تو ہم عشق حقیقی میں چلے جائیں گے، نہ عبادات، نہ روزہ۔ یہ تفریط ہے۔

قوتِ عقلیہ میں اعتدال یہ ہے کہ علومِ نافعہ کو حاصل کریں اور علومِ ضارّہ سے بچیں۔

مغرب کا ایک کمال، ایک زوال:

یورپ کے پاس دو کمال ہیں: ایک ان کے پاس صنعت کاری ہے اور ایک حرام کاری ہے اور دونوں میں وہ انتہاء کو پہنچ گئے ہیں۔ وہاں میرے خیال میں برائی کا آخری اسٹیج ہی نہیں جو انہوں نے نہ دیکھا ہو۔ آپ حیران ہوں گے کہ انہوں نے اپنے ملک میں کتے کو بہت بڑا ایوارڈ دیا ہے، کیونکہ اس نے ایک بچی کی جان بچائی ہے۔ یہ ہمارا

ہیرو ہے۔ باقاعدہ اس کے گلے میں ایوارڈ ڈالا گیا، اس کی فلمیں بنائی گئیں۔

چاند پر سب سے پہلے کتیا کو بھیجنا:

آپ کو یاد ہوگا کہ جب چاند پر خلائی گاڑی بھیجی گئی تو سب سے پہلی سواری اس میں کتیا تھی۔ قاضی احسان مرحوم (میں نے بھی ان کی تقریر سنی ہے) اس زمانہ میں زندہ تھے۔ انہوں نے کہا: اگر چاند پر کوئی مخلوق ہے تو جب ہماری نمائندہ اترے گی تو وہ کہیں گے کہ نیچے سب اسی کی جنس کے لوگ رہتے ہیں۔ یورپ والوں نے بڑی ترقی کی ہے۔ اور اگر کسی کو اوپر بھیجا بھی ہے تو کتیا کو بھیجا ہے۔

اگر یورپ اور کفار کے ملکوں میں اگر ۱۰۰ انسان مرجائیں تو ان کی کوئی خبر نہیں ہوگی اور اگر ایک کتا مرجائے تو پورے چینل چیخ پڑتے ہیں۔ اگر ایک کتا بھی کار سے ٹکرا کر مرجائے تو سمجھو کہ عذاب آ گیا۔ یہ قوتِ عقلیہ میں افراط ہے کہ حیوان کو بھی انسان کے اوپر لے گئے۔ بعض لوگ تو اپنی جائیداد، کروڑوں ڈالر اپنے جانوروں کے لیے وقف کر کے جاتے ہیں، باقاعدہ کتوں کے لیے ڈاکٹر ہیں، لباس ہیں، خوراک ہے، اب تو کتوں کے لیے ہوٹل بھی ہیں۔ اگر میری ان باتوں میں آپ شک میں پڑ رہے ہوں تو کینیڈا کے بارے میں پڑھیں کہ وہ کتوں کے معاملے میں کتنے آگے چلے گئے ہیں۔

یورپ نے صنعت کاری اور حرام کاری میں ترقی کی ہے تو ہمارا کام یہ ہے کہ ہم صنعت کاری کو تو حاصل کریں، لیکن حرام کاری کو حاصل نہ کریں۔ یہ اعتدال ہے۔ یہ نہ ہو کہ ہم صنعت ان سے لے رہے ہوں تو بے حیائی بھی ان سے لے لیں۔ یا یہ کہیں کہ صنعت بھی حاصل نہ کرو، کیونکہ وہ گندے لوگ ہیں۔ یہ بھی اعتدال کے خلاف اور تفریط ہے۔

افراط کی ایک مثال:

ایک آدمی مجھے کہنے لگا کہ میں اتنی احتیاط کرتا ہوں کہ تمباکو والا پان حدودِ حرم میں نہیں کھاتا۔ میں نے کہا کہ آپ حرم میں حمام، بیت الخلاء استعمال کرتے ہو؟ یہ نئے نئے صوفی ہوتے ہیں جن کا ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے اور کوئی خواب آیا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ ہمارا خدا سے فاصلہ تھوڑا سا رہ گیا ہے۔ یہ افراط ہے۔

اچھی بات ہر کسی سے لی جا سکتی ہے:

قوتِ عقلیہ میں اعتدال یہ ہوا کہ حکمت یعنی علوم نافعہ حاصل کرو اور علوم ضارہ سے بچو۔ حکمت مؤمن کی گمشدہ

چیز ہے، جہاں سے بھی ملے لے لو۔ اس لیے فرمایا:

"لَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلٰی مَا قَالَ" [مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح: ۱/ ۳۰۰]

"یہ نہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے، بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔"

اگر بات صحیح ہے تو لے لو ورنہ چھوڑ دو۔

اسلام ہمیں ان تینوں قوتوں میں اعتدال سکھاتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [البقرۃ: ۱۴۳]

"اور ہم نے تمہیں ایک ایسی جماعت بنا دیا ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے، تاکہ تم (مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو۔"

تو اس ساری بات کو بتلانے کا مقصد یہ ہے کہ علماء نے فرمایا کہ اگر کسی مسئلے کو سو فیصد پھیلایا جائے تو سننے والے کو بچاس فیصد تو یاد رہے گا اور اگر اس کو بتاؤ ہی پانچ فیصد تو اس کو سب کچھ بھول جائے گا۔ تو اتنی لمبی چوڑی تمہید اس لیے باندھی کہ معلوم ہو جائے کہ اخلاق میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

روزوں سے شہوانی قوت میں تبدیلی:

حضور ﷺ نے فرمایا:

((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۵۰۶۵، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ...]

"اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو نکاح کی طاقت رکھے وہ شادی کر لے اور جس میں طاقت نہ ہو وہ روزے رکھے، روزہ اس کو خصی کر دیتا ہے (شہوت کم کر دیتا ہے)۔"

تم میں سے جس کو اللہ نے صحت دی، جوانی دی اور پیسہ دیا ہے وہ نکاح کرے اور اگر تمہارے پاس خرچ وغیرہ کی طاقت نہیں ہے تو تم روزہ رکھو، کیونکہ تمہارے لیے روزہ ڈھال بن جائے گا۔

ہمارے ہاں رواج ہے کہ یہ پڑھ لے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے پھر شادی کریں گے۔ یعنی ہماری نظر اس کی اقتصادیات پر ہے، اس کی اخلاقیات پر نظر نہیں ہے۔ چاہے پڑھتے پڑھتے اس کا کچھ بھی نہ رہے۔ جن لوگوں کے مقدر میں علم ہے وہ شادی کے بعد بھی پڑھتے ہیں اور جن لوگوں کے مقدر میں علم نہیں ہے وہ شادی سے پہلے بھی

نہیں پڑھتے، بلکہ بعض لوگوں کے لیے بیویاں معاون بن جاتی ہیں۔ تو خاوند بھی گناہ سے بچ گیا، بیوی بھی گناہ سے بچ گئی اور بیوی ذہن بنا رہی ہے کہ کچھ پڑھو گے تو کچھ پہچان ہوگی۔ تو وہ ترقی کر جاتے ہیں۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہارے پاس پیسہ نہیں، طاقت نہیں تو روزے رکھو، کیونکہ روزہ سے قواتِ شہوانیہ دب جائیں گی اور قواتِ ملکیہ ابھر آئیں گی۔ کیونکہ کھانا نہ کھانا فرشتوں کی صفت ہے، شادی نہ کرنا فرشتوں کی صفت ہے۔ جب ہم روزہ رکھ رہے ہوں گے تو وہ صفات غالب آ رہی ہوں گی۔ تو اس کا مطلب ہوا کہ اخلاق میں تبدیلی آتی ہے۔

تو اتنی بڑی تمہید باندھی، حالانکہ ہم سورۂ فاتحہ کے بارے میں پڑھ رہے ہیں۔ روایت میں آتا ہے:

((تَخَلَّقُوْا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ)) [احیاء العلوم: ۴/۳۶، بیانُ أنَّ المُستحِقَّ لِلمحبّةِ هُوَ اللّٰهُ...]

''اللہ کی صفات سے سبق حاصل کرو۔''

اب جب ہم پڑھتے ہیں:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ [الفاتحہ: ۱]

''سب تعریفیں اللہ ہی کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے۔''

تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ معبود ہے۔ اس سے ہمیں خلق اوّل کا سبق ملا کہ میرے اللہ کی ذات کے لیے تمام محامد ہیں، میرے اللہ کی ذات تمام عیبوں سے پاک ہے۔ تو سبق ملا کہ جب تیرا رب محمود ہے تو تُو بھی وہ کام کر جس سے تو بھی محمود بنے، مذموم نہ بنے۔

سورۂ فاتحہ کے کچھ نام:

گزشتہ مضامین میں تعوذ، تسمیہ اور سورۂ فاتحہ کے بارے میں کچھ باتیں ہم نے پڑھیں۔ سورۂ فاتحہ کے معروضات میں بیان کیا تھا کہ سورۂ فاتحہ عظیم سورت ہے۔ سورۂ فاتحہ کے انوار و برکات کے بارے میں بہت ساری احادیث میں اس کی فضیلتوں کا ذکر ہے۔ اس لیے اس کے متعدد نام آئے ہیں: شافیہ بھی ہے، وافیہ بھی ہے، کافیہ بھی ہے اور سورۃ المسئلہ بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ درسِ سابق میں بیان کیا تھا کہ کیا اخلاقِ انسانی میں تبدیلی ممکن ہے یا نہیں؟

فلسفۂ یونان کا رد:

فلاسفۂ یونان کے نزدیک جس طرح ''خَلق'' میں تبدیلی نہیں ہو سکتی اس طرح ''خُلق'' میں بھی تبدیلی نہیں

ہو سکتی۔ ان کے ہاں ایک مشہور محاورہ ہے کہ اگر آپ نے سنا ہو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو مان لو، لیکن اگر یہ سنو کہ فلاں بندے نے اپنی عادت بدل لی ہے تو نہ مانو۔ اس لیے بعض لوگوں کو گندی عادتیں ہیں، مثلاً: سگریٹ کی عادت ہے، پان کی عادت ہے۔ حالانکہ یہ معمولی سی چیزیں ہیں، قوت ارادی سے ختم ہو سکتی ہیں، لیکن جب عادت ہو جائے تو بندہ مجبور ہو جاتا ہے۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا تجربہ:

حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہمارے بعض لوگ جو سگریٹ اور نسوار کے عادی تھے یا چائے پینے کے عادی تھے، ان کی وجہ سے ہماری تحریکیں فیل ہو گئیں کہ وہ ایک دو دن بعد حکومت سے معافی مانگنے لگ جاتے تھے۔ جب کارکن جھک جائے تو تحریکیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ کسی چیز کو عادت نہ بنائیں۔ چائے حلال ہے، ٹھیک ہے، اس کو پی لیں، لیکن اس کو اپنے اوپر اتنا مسلط نہ کر دیں کہ نہ ملے تو آدمی پاگلوں کی طرح بھاگ رہا ہو۔

مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کا جملہ:

مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ عجیب جملہ لکھا ہے: ''دامن اگر بھیگتا ہے تو بھیگ جانے دیجیے، لیکن ہاتھوں میں استادم رہے کہ جب چاہا نچوڑ دیا۔'' کہ انسان ہے اس سے خطا ہوتی ہے، لیکن جب چاہو اس کو معاف کر دو، نچوڑ دو۔ ان فلاسفہ یونان میں سے متاخرین میں ایک گروہ پیدا ہوا جو کہتا ہے کہ عادات بدل سکتی ہیں، لیکن اس کے لیے بہت محنت کرنے پڑے گی۔ جب بدن کو مشقتوں میں ڈالیں گے تب جا کر عادت بدلے گی۔ اسی بات کو جوگیوں نے، بدھ مت نے اور فلسفیوں نے لیا ہے۔ یہ اسی فلسفے کا اثر ہے کہ سر منڈا لیں گے، گوشت نہیں کھائیں گے، شادیاں نہیں کریں گے، قبرستانوں میں بیٹھیں گے یا چلہ کشی کریں گے۔ یہ اپنے نفس کو مار رہے ہیں۔ پھر کہیں جا کر اصلاح ہو گی۔

اسلام کا نظریہ:

بہر حال اسلام کے اندر یہ باتیں نہیں ہیں، اسلام کے اندر نہ کہانت ہے، نہ ترکِ دنیا ہے، نہ ترکِ معاشرت ہے، بلکہ اسلام کہتا ہے کہ دین کا کام بھی کرو اور دنیا کا کام بھی کرو۔ اور نبی ﷺ نے فرمایا:

((فَإِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))

[صحیح البخاری، حدیث:۱۹۷۵، باب: حَقِّ الجِسْمِ فِي الصَّوْمِ]

''تمہارے بدن کا تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے، تمہارے گھر والوں کا تم پر حق ہے اور تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے۔''

اور اسلام کیا کہتا ہے؟ اسلام کہتا ہے:

((فَأَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ)) [صحیح بخاری، حدیث:۱۹۶۸، باب: مَنْ أَقْسَمَ عَلَى أَخِيهِ...]

''ہر مستحق کا حق ادا کر۔''

((إِنَّ اللهَ يُحِبُّ أَنْ يَرَى أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَى عَبْدِهِ))

''اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھیں۔''

[سنن الترمذی، حدیث:۲۸۱۹، باب: مَا جَاءَ إِنَّ اللهَ تَعَالَى يُحِبُّ أَنْ يَرَى...]

حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کے کپڑے پرانے اور بوسیدہ ہیں تو حضور ﷺ نے پوچھا: کیا تمہارے پاس مال ہے؟ اس نے کہا:

((أَعْطَانِي اللهُ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ كُلِّ الْمَالِ مِنَ الْإِبِلِ وَالْغَنَمِ))

''میرے پاس ہر قسم کا مال ہے: اونٹ بکریاں وغیرہ''

حضور ﷺ نے فرمایا:

((فَلْيُرَ أَثَرُ نِعْمَةِ اللهِ عَلَيْكَ)) [سنن ابی داود، حدیث:۴۰۶۳، مسند احمد، حدیث:۱۷۲۳۱، واللفظ لہ]

خدا تعالیٰ نے تجھے اتنی ساری نعمتیں دی ہیں۔ اس کا اثر تو تیرے بدن پر نظر نہیں آرہا۔ تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے، اچھا کپڑا پہنو، صاف ستھرے رہو۔

یہ ہمیں دین نہیں سکھاتا کہ کوئی دو مہینے تک غسل نہ کرے، اگر نماز پڑھے تو ساتھ والے بھی بدبو سے بھاگ جائیں۔ اور یہ تصوف اور بزرگی نہیں ہے کہ آدمی گندا رہے، تاکہ لوگ سمجھیں کہ بڑا فقیر آدمی ہے، صوفی ہے۔ صوفی اس کو کہتے ہیں کہ جس کا دل شرک، بدعات اور منکرات سے صاف ہو۔ صفائے قلب سے صوفی بنتا ہے۔

اب اسلام کہتا ہے کہ ''خُلق'' کی بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کے لیے صحبت ہے، تربیت ہے۔ کسی شاعر نے کہا:

صحبتِ صالح ترا صالح کند
صحبتِ طالع ترا طالع کند
''نیکوں کی صحبت تجھے نیک بنادے گی اور بروں کی صحبت تجھے برا بنادے گی۔''

جیسے حدیث میں آتا ہے کہ کوئی آدمی مدینہ میں جا کر اس طرح چالیس نمازیں پڑھے کہ اس کی تکبیرِ اولیٰ بھی فوت نہ ہو تو اللہ اس کو نفاق سے اور عذاب سے بری فرمادیتے ہیں۔ یہ حدیث ضعیف ہے، لیکن فضائلِ اعمال میں محدثین اس کو قبول فرمالیتے ہیں۔

چالیس کے عدد میں حکمت:

اور تبلیغی جماعت والے حضرات بھی ہر آدمی کے لیے کوشش کرتے ہیں کہ ہر آدمی چالیس دن لگائے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کو علماء نے لکھا ہے کہ اس کے اندر حکمتیں ہیں۔ بزرگ اگر کوئی بات کرتے ہیں تو ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہوتی ہے۔

۞......بزرگ فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر بلایا تو وہاں چالیس راتیں بٹھایا۔ قرآن مجید میں فرمایا: ﴿فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِينَ لَيْلَةً ۚ﴾ [الاعراف:۱۴۲] (سو ان کے پروردگار کا وقت پوری چالیس شب ہو گیا)۔ پینتیس (۳۵) راتیں کیوں نہیں بٹھایا، اکتالیس (۴۱) راتیں کیوں نہیں بٹھایا؟ تو مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر کوئی حکمت تھی کہ اللہ نے ان کو چالیس راتیں بٹھایا۔

۞......اور اللہ نے ہر نبی کو نبوت چالیس (۴۰) سال کی عمر کے بعد دی ہے، پینتالیس (۴۵) سال کے بعد کیوں نہیں دی؟

۞......اسی طرح انسان کے نشوونما کے رک جانے کا جو مقام ہے اس کے بارے میں فرمایا: ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِينَ سَنَةً ۙ﴾ [الاحقاف:۱۵] (یہاں تک کہ جب وہ اپنی جوانی کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس برس کو پہنچتا ہے......) یہاں بھی ۴۰ کا عدد ہے۔

۞......اسی طرح انسان پہلے ''نُطْفَة'' ہوتا ہے، پھر ''عَلَقَة''، پھر ''مُضْغَة'' اور پھر ''كَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا'' ہے۔ اس کا فرق چالیس چالیس دن بعد ہے کہ ہر چالیس دن کے بعد تغیر آتا ہے۔

۞......اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ جو آدمی چالیس احادیث یاد کرلے وہ علماء میں لکھا جائے گا۔ تو وہاں بھی

''اَرْبَعِیْنَ'' چالیس کا لفظ ہے۔

❁......اسی طرح بڑے بڑے محدثین نے ''اَرْبَعِیْنَ'' لکھیں۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اور بڑے بڑے علماء نے ''اَرْبَعِیْنَ'' کو لکھا ہے۔

❁......اسی طرح جماعت والے بھی کہتے ہیں کہ چالیس دن لگاؤ، کیونکہ جب ہم چالیس دن ماحول سے کٹ جائیں گے، اس کو دوسری جگہ لے جا کر نماز اور تہجد پڑھائیں گے تو تغیر آئے گا، تبدیلیاں آئیں گی اور اس کے اخلاق تبدیل ہوں گے۔ اس لیے علماء اسلام فرماتے ہیں کہ اخلاق کی تبدیلی ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا اثر:

مقامِ نبوت اتنا بلند تھا کہ پہلے جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرتے تو ایک ہی دم ساری منزلیں طے ہو جاتیں اور ایک منٹ میں انقلاب آ جاتا تھا۔

ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر کلمہ پڑھا اور کہا: یا رسول اللہ! جب تک میں نے کلمہ نہیں پڑھا تھا، سب سے زیادہ مجھے آپ کی ذات سے بغض تھا اور اب مجھے آپ سب سے زیادہ محبوب ہو گئے ہیں، سب سے زیادہ بغض آپ کے شہر سے تھا اور اب مجھے سب سے زیادہ پیارا آپ کا شہر ہو گیا ہے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۴۳۷۲، باب: وَفْدِ بَنِي حَنِيفَةَ ، وَحَدِيثِ ثُمَامَةَ بْنِ أُثَالٍ]

یہ کیسے انقلاب آ گیا؟ کیونکہ وہ مقامِ نبوت تھا کہ اللہ نے آپ کی ذات، بات اور ملاقات میں اتنی برکات رکھی تھیں کہ ایک منٹ میں تبدیلی آ جاتی تھی۔ لہٰذا بندے کے اخلاق میں آہستہ آہستہ تبدیلی آتی ہے۔ وہ اخلاق حسنہ بھی ہو سکتے ہیں اور اخلاقِ سیئہ بھی ہو سکتے ہیں۔

بچہ پر ماں باپ کا اثر:

اس لیے جو پرانے اطباء گزرے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو بچہ دودھ پیتا ہے وہ بات نہیں کر سکتا، چل نہیں سکتا، جھگڑا نہیں کر سکتا، لیکن اس کے سامنے بھی ماں باپ جھگڑا نہ کریں، گناہ نہ کریں، کوئی بری حرکت اور گناہ نہ کریں۔ کیونکہ بچہ نہ سمجھ ہے، لیکن جو اس کا ذہنی کمپیوٹر ہے، اس کے اندر ساری حرکات فیڈ ہو رہی ہیں، وہ بڑا ہو کر ان حرکات کے اثر کو لیتا ہے۔

بچہ کی فطرت:

اس لیے حدیث شریف ہے:

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ))

''ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۸۵، باب: مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُشْرِكِيْنَ]

یعنی اگر بچہ پیدا ہوا اس کو پہاڑوں پر چھوڑ دیں، جنگل میں چھوڑ دیں، اس کو کوئی بندہ بھی نہ ملے اور کوئی بندہ بھی اس کو نہ سمجھائے تو وہ وہیں توحید کو سمجھ لے گا، کیونکہ وہ دینِ فطرت پر پیدا ہوا ہے۔

اگر ماں باپ یہودی ہیں تو وہ بچے کو یہودیت کی طرف لے جاتے ہیں، اگر ماں باپ عیسائی ہیں تو بچے کو عیسائیت کی طرف لے جاتے ہیں، ماں باپ مجوسی (آگ پرست) ہیں تو وہ بچے کو مجوسیت کی طرف لے جاتے ہیں اور اگر مسلمان ہیں تو وہ بچے کو مسلمانیت کی طرف لے جاتے ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اخلاق ان میں اثر کرتے ہیں۔

ایک عالم کا عبرتناک قصہ:

ہمارے ملک میں ایک عالم تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ امریکہ چلے گئے تو ان کے ایک دوست بیس پچیس سال کے بعد امریکہ کی اسی اسٹیٹ میں گئے جہاں وہ عالم رہتے تھے۔ ان کے پاس ان کا ایڈریس تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اتفاق سے آ گیا ہوں تو ان سے مل لوں۔ وہاں جب ان کے گھر پہنچے اور ان کے دروازے پر کال بیل دی تو اندر سے ایک لڑکی نکلی جو منی اسکرٹ میں تھی اور بالکل لباس ایسا پہنا ہوا تھا کہ لباس بھی اس سے شرما رہا تھا۔ بے چارے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ فلاں مولانا صاحب سے ملنے آیا ہوں وہ گھر پر ہیں؟ تو اس نے کہا: ہاں ہیں، آپ کون ہیں؟ انہوں نے اپنے بارے میں بتایا اور کہا کہ ان کو اطلاع کر دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے مجھے اندر بلا لیا۔ جب میں اندر گیا تو یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ بڑا عظیم کتب خانہ ہے، مولوی صاحب کلین شیو ہیں اور سوٹ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور بڑے تپاک سے ملے تو میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: جس ماحول میں رہتا ہوں اس کے اثرات تو یہی ہونے تھے۔ جب تک تمہارے ساتھ تھا تو سنت کے مطابق لباس، داڑھی اور پگڑی تھی۔ جب یہاں آ گئے تو اس نے بھی تو اثر کرنا تھا۔ اس نے پوچھا کہ یہ بچی کون تھی؟ انہوں نے کہا کہ یہ میری بیٹی تھی۔ کہا: اس لباس میں؟ اس نے کہا: جب یہاں آئے تو سوچا تھا کہ اس طرح کے کاموں کے اندر تو ایسے ہوتا

ہے۔اس کے بعد وہ بندہ وہاں سے چلا آیا۔

وہ کہتا ہے کہ جب پانچ سال کے بعد میں دوبارہ گیا اور ٹیلی فون کیا تو انہوں نے بتلایا کہ وہ مولانا تو فوت ہو گئے ہیں۔ میں ان کی بیگم اور بچوں کو ملنے کے لیے گیا اور میں نے کہا کہ مولوی صاحب کہاں دفن ہیں؟ اگر ان کی قبر قریب ہے تو میں جا کر دعا مانگ لوں۔ انہوں نے کہا: یہاں ایک عیسائیوں کا قبرستان ہے اس میں دفن ہیں۔ میں نے کہا کہ عیسائیوں کے قبرستان میں کیوں؟ تو انہوں نے کہا کہ بچیاں بوائے فرینڈ کے ساتھ پکنک منانے گئی ہوئی تھیں اور میں گھر میں اکیلی تھی تو میں نے مردوں کو دفنانے والوں کو ٹیلی فون کر دیا تھا، انہوں نے عیسائیوں کے طریقے پر عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

یہ صحبت کا اثر ہو گیا کہ ایک عالمِ دین ہے، لیکن صحبت کی وجہ سے یک لخت تبدیل ہو گیا۔

یورپ میں دین داروں کی دین داری قابلِ رشک ہے:

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ یورپ، فرانس اور برطانیہ وغیرہ میں دین پر قائم ہیں ان کا مقام اللہ کے ہاں کتنا بلند ہو گا!! جہاں شیطانیت بے حیائی کی آخری حد کو پہنچ گئی ہو۔ آپ لوگ حرم کے بیٹھے ہوئے ڈش پر فلمیں دیکھیں اور وہ لوگ یورپ کے اندر رہتے ہوئے رات کو تہجد پڑھ رہے ہوں تو کمال تو ان کا ہے۔

یورپ کے اندر میں نے کئی مدارس کو جا کر دیکھا ہے۔ ہمیں شرم آتی ہے کہ وہ بچے کتنے دین پر ہیں اور ہم کتنے دین پر ہیں۔ ہر بچے کی پگڑی سنت کے مطابق ہے۔ اور مجال ہے کہ کوئی بچہ سنت نہ پڑھتا ہو اور کوئی بچی پردے کے ساتھ نہ ہو۔ وہاں میرے ایک دوست بچیوں کو لے کر آئے، تا کہ وہ بچیوں کو کہہ سکیں کہ جن کی تم کیسٹیں سنتی ہو وہ تمہیں ملنے کے لیے آئے ہیں۔ میں جب وہاں گیا تو دیکھا کہ ساری بچیوں نے اسکاف باندھے ہوئے ہیں اور ایسے ایسے دینی سوالات پوچھے کہ جو میرے خیال میں مولوی کو بھی نہیں آتے ہوں گے۔ تو وہاں سات سال کی بچیوں کو دین کے ساتھ اتنا تعلق تھا۔

اور یہاں مکہ اور مدینہ میں ہماری بچی میک اپ کر کے، سنگھار کر کے اور موبائل ہاتھ میں لے کر گانے سن رہی ہے۔ اور ایسے چل رہی ہے جیسے مال روڈ پر سیر کر رہی ہو۔ ان لوگوں کو اللہ کے کعبہ میں لے آنے والا بھی گنہگار ہے اور آنے والا بھی گنہگار ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسی عورتیں زانیہ کے حکم میں آتی ہیں جو فیشن سنگھار کر کے اور پرفیوم

چھڑکے ہوئے ہو کہ جہاں سے گزرے تو یادگار کے طور پر اپنی خوشبوئیں چھوڑ جائے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ جب حضور ﷺ نے فرمادیا ہے کہ یہ زانیہ کے حکم میں ہے تو اس کو غسل کرنا چاہیے اور توبہ کرنی چاہیے۔

اولیاء اللہ کی صحبت کا اثر:

یہ اخلاق کی تبدیلی، تربیت اور اصلاح سے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ [التوبۃ:۱۱۹]

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور (عمل میں) سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔''

تم صادقین کی صحبت اختیار کرو کہ اللہ نے ان کی آنکھوں میں ایسا اثر رکھا ہے۔

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

ان کی نظرِ کیمیا ایسی ہوتی ہے کہ آدمی بیٹھے بیٹھے تبدیل ہو جاتا ہے۔

میرے ایک دوست کا واقعہ:

میرا ایک بہت اچھا دوست تھا۔ فوت ہو گیا۔ اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔ وہ بہت ست تھا، نماز نہیں پڑھتا تھا۔ میں نے زور لگایا تو وہ کبھی پڑھ لیتا اور کبھی غائب ہو جاتا۔ اب اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ یہ مولوی ہے، مجھے معاف نہیں کرے گا۔ جب نماز کا وقت آتا تو وہ غائب ہو جاتا تھا۔

ایک دفعہ اتفاق سے ایسے ہوا کہ میں کراچی آیا اور وہ بھی میرے ساتھ کراچی آ گیا اور وہاں بنوری ٹاؤن جو بڑا مدرسہ ہے (اللہ تمام مدرسوں کو قائم و دائم رکھے۔ آمین) وہیں میں ٹھہرتا تھا، وگرنہ حضرت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ مہتمم مدرسہ ناراض ہو جاتے تھے کہ آپ میرے پاس نہیں ٹھہرتے۔ ہم وہاں ٹھہرے اور میرے دوست کو علیحدہ کمرہ دیا گیا۔ جب میں صبح کی نماز کے لیے گیا اور سنتیں پڑھ کر سلام پھیرا تو میرا دوست جو نماز نہیں پڑھتا تھا وہ صفِ اوّل میں بیٹھا تھا۔ میں نے کہا کہ آج تو کمال ہو گیا کہ جو آدمی سورج نکلنے سے پہلے بیڈ سے اٹھتا نہیں تھا، ٹانگوں کو گھسیٹ کر اٹھاتے تھے، آج یہ صفِ اوّل میں بیٹھا ہے، یہ تو عجیب بات ہے!!

خیر! نماز پڑھ کر جب واپس آئے تو ناشتہ آیا ہوا تھا۔ (حضرت کو پتا تھا کہ میں ناشتہ نہیں کرتا، چائے کی پیالی اور

رس وغیرہ کھاتا ہوں اور یہی معمول ساری زندگی رہا) میں نے اس کو بلوالیا اور اس سے پوچھا: آج آپ نماز کے لیے اتنی جلدی کیسے اٹھ گئے؟ اس نے کہا: کی صاحب! جلدی کہاں اٹھا! آپ کی وجہ سے یہاں پھنس گیا ہوں، ایک آدمی تہجد کے وقت آیا اور پوچھا کہ آپ کو تہجد کے لیے پانی چاہیے؟ لوٹا بھر کر رکھ دوں؟ تھوڑی دیر کے بعد دوسرا آدمی آیا اور اس نے کہا: حضرت! میں نے پانی باہر رکھ دیا ہے، پندرہ منٹ کے بعد ایک اور آدمی آیا، اس نے کہا: میں نے تولیہ بھی لٹکا دیا ہے اور چوتھا آدمی آیا اور کہا: میں نے باہر چپل بھی رکھ دیے ہیں، تاکہ آپ کے بوٹ خراب نہ ہوں۔ میں نے سوچا کہ یہ مولوی تو سونے ہی نہیں دیتے تو بہتر ہے کہ اٹھ کر دو رکعت نماز ہی پڑھ لوں اور مسجد میں چلا جاؤں۔ میں نے صرف صفِ اوّل میں نماز ہی نہیں پڑھی، بلکہ تہجد بھی پڑھ لی ہے۔

اصول یہ ہے کہ حالات اور ماحول انسان کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح خاندانی اثرات سے بھی تبدیلی آتی ہے۔ اس لیے اہلِ اسلام اس بات کے قائل ہیں کہ ''خُلق'' میں تبدیلی ممکن ہے۔

سابقہ مضامین کے بیان کا مقصد:

اس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ ہمیں کیا سبق دیتی ہے؟ علماء نے فرمایا: اگر سورۂ فاتحہ میں غور کیا جائے تو سب سے بڑا درسِ اخلاق ہے۔

مشورہ کی اہمیت:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو بھی پابند کیا اور فرمایا: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ [آلِ عمران:۱۵۹] (اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجیے۔ پھر جب آپ رائے پختہ کرلیں تو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجیے)۔ میرے مدنی پاک! جب بھی آپ کوئی فیصلہ کرنا چاہیں، جب بھی آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو صحابہ سے مشورہ کریں۔

اسی طرح اللہ نے فرمایا: ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ [الشوریٰ:۳۸] (اور ان کا ہر کام (جس میں بالتعیین نص نہ ہو) آپس کے مشورے سے ہوتا ہے)۔

ہر کام اطمینان سے کرو:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو تعلیم دی:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ [السجدة:۴]

''اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو اور اس مخلوق کو جو ان دونوں کے درمیان میں ہے چھ روز میں پیدا کیا۔''
حالانکہ اللہ کو تو چھ دنوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [یٰس:۸۲]

''جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا معمول تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے۔''
وہاں تو صرف حکم دینے کی ضرورت ہے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ لیکن چھ دن لگائے، تاکہ بندوں کو تعلیم ملے کہ ہر کام آرام آرام سے کیا جائے۔

شفاعتِ کبریٰ میں حضور ﷺ کی حمد وثنا:

علمائے محققین فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کے اندر یہ سبق ملا کہ تمام حمد وثنا کے لائق صرف اللہ ہے۔ اسی لیے دعا سکھائی گئی:

((اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهٗ وَلَكَ الْمُلْكُ كُلُّهٗ بِيَدِكَ الْخَيْرُ كُلُّهٗ اِلَيْكَ يَرْجِعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ))

''اے اللہ! تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں، تمام حکومتیں تیرے لیے ہیں، ہر طرح کی خیر تیرے ہاتھ میں ہے اور سارے معاملات تیری ہی طرف لوٹتے ہیں۔'' [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۲۳۳۵۵]

حضور ﷺ نے فرمایا: جب قیامت کا دن ہوگا تو تمام امتیں میرے پاس شفاعتِ کبریٰ کے لیے آئیں گی۔ اور جب میں شفاعت کے لیے بڑھوں گا تو اللہ مجھے حمد سکھلائیں گے۔ کیونکہ اللہ جب دینے پر آتے ہیں تو حمد بھی خود سکھلا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ [البقرة:۳۷]

''بعد ازاں حاصل کر لیے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پر (یعنی توبہ قبول کر لی)۔''
دنیا کے اندر بھی اگر کوئی افسر مہربان ہو تو وہ بھی کہتا ہے کہ اس طرح لکھ کر لاؤ، ہم تیرا کام کر دیں گے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اس حمد وثنا کے ساتھ عرش کے نیچے سجدہ کروں گا۔ اس کے بعد اللہ سے شفاعت کی

درخواست کروں گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

((یَا مُحَمَّدُ! ارْفَعْ رَأْسَكَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ وَسَلْ تُعْطَهْ))

''اے (ہمارے محبوب) محمد! اپنا سر اٹھایئے اور سفارش کیجئے آپ ﷺ کی سفارش مقبول ہوگی اور مانگیے، آپ کو دیا جائے گا۔'' [صحیح البخاری، حدیث: ۳۳۴۰، باب: قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰی: إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلٰی قَوْمِهِ]

اللہ تمام کمالات سے موصوف ہے:

سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا معبود اللہ ہے جو ہر عیب سے پاک ہے، تمام تعریفیں اسی کے لائق ہیں۔ اس لیے علماء نے معبود کی شان کے بارے میں کہا:

''أَنَّهٗ مُتَّصِفٌ بِصِفَاتِ الْجَمَالِ وَالْكَمَالِ وَالْجَلَالِ وَأَنَّهٗ مُنَزَّهٌ عَنْ سَائِرِ الْعِجْزِ وَالنُّقْصِ وَالْإِخْتِلَالِ''

''اللہ کی شان یہ ہے کہ تمام صفاتِ جمال اور صفاتِ کمال اس کے لائق ہیں اور صفاتِ عجز ونقص اور ہر اس صفت سے جو اس کی شان کو زیبا نہیں اس سے پاک ہے۔''

دیکھو! اللہ اولاد سے کیوں پاک ہے؟ کیونکہ اولاد کا ہونا عجز کی علامت ہے۔ اس لیے حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا مانگی:

﴿فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝﴾ [مریم: ۵، ۶]

''آپ خاص اپنے پاس سے مجھے ایک ایسا وارث عطا کر دیجیے جو میرا بھی وارث ہو اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے بھی میراث پائے۔ اور یا رب! اسے ایسا بنایئے جو (خود آپ کا) پسندیدہ ہو۔''

والدین کا نافرمان:

اسی لیے جب اولاد نافرمان ہو جائے تو بندے کے لیے موت ہے۔ یا بیٹا بیوی کے چکر میں آ کر ماں کو بھول جائے تو ان ماؤں سے پوچھو کہ ان پر کیا گزرتی ہے؟ بیٹا بیگم کو لے کر بڑا خوش ہے اور ماں بیٹے کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ترس رہی ہے۔ ہاں! ایسے آدمی کو اولاد ایسی ملے گی جو اس سے بھی زیادہ نافرمان ہوگی اور اس کو دنیا میں ہی نافرمانی کی سزا ملے گی۔ جلدی بھگتے یا دیر سے بھگتے وہ یہ سزا ضرور بھگتے گا۔ اس کو تاریخ میں لکھ کر رکھ لیں کہ آپ جو والدین کے ساتھ کر رہے ہیں اس کا ڈبل آپ کو بھگتنا پڑے گا۔ اگر آپ نے والدین کو چھوڑا ہے تو آپ کی اولاد

آپ کو چھوڑے گی بھی سہی اور توڑ کے بھی رکھ دے گی۔ پھر اس دن یاد آئے گا کہ ہم نے والدین کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اس پر اللہ معافی نہیں دیں گے، کیونکہ جنہوں نے اس کو تخلیق کے مراحل سے گزرا ہے، جو ان کا نافرمان ہے اس کی سزا ضرور دیں گے۔

اللہ کے بعد نبی کا مقام ہے، لیکن اللہ نے کئی جگہوں پر اپنے ذکر کے بعد والدین کا ذکر کر دیا۔ فرمایا:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [النساء:۳۶]

''اور تم اللہ تعالی کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔''

اور ایک جگہ فرمایا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [الاسراء:۲۳]

''اور تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو اور تم (اپنے) ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو۔''

دیکھیں! اللہ کے بعد والدین کا ذکر آیا ہے۔

تو سورۂ فاتحہ سے ہمیں یہ اخلاقی سبق ملا کہ ہم بھی وہ کام کریں جس سے ہم محمود بنیں، مذموم نہ بنیں۔

کسی میت کے متعلق لوگوں کی اچھی یا بری گواہی:

ایک آدمی فوت ہوا تو حضور ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: وہ اچھا آدمی تھا۔ دوسرا آدمی آیا، اس نے کہا: اچھا آدمی تھا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''وَجَبَتْ'' (واجب ہوگئی) صحابہ ﷢ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ''مَا وَجَبَتْ؟'' (کیا واجب ہوگئی؟) حضور ﷺ نے فرمایا: جب اللہ کی مخلوق اس کی اچھائی کی گواہی دے رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے بھی اس کے لیے اچھا فیصلہ کرنا ہے۔ اسی طرح اگر بندے کسی کے بارے میں کہیں کہ بڑا ظالم، جابر اور بڑا ڈاکو تھا تو سمجھ لیں کہ اس کے لیے جہنم کا فیصلہ ہوگیا، کیونکہ یہ بندے اللہ کے گواہ ہیں۔

[صحیح بخاری، حدیث:۱۳۶۷، باب: ثَنَاءِ النَّاسِ عَلَى الْمَيِّتِ]

اس لیے روایت میں آتا ہے کہ جس کے جنازے میں بندے زیادہ ہوں تو یہ دلیل ہے کہ اس کی مغفرت

ہو جائے گی۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۹۴۷، باب: مَنْ صَلّٰی عَلَيْهِ مِائَةٌ شُفِّعُوا فِيهِ]

اپنی موت پر تم ہنسو اور لوگ روئیں:

بلکہ بعض بزرگوں نے فرمایا کہ جب تو پیدا ہوا تھا تو تُو رو رہا تھا اور سارے ہنس رہے تھے۔ اب اگر مرنے کا وقت آئے تو تم اگر مرد ہو تو انتقام لو کہ تم مسکرا رہے ہو اور دنیا تمہارے لیے رو رہی ہو۔ تمہارے لب پر مسکراہٹ ہو اور تم ہنس رہے ہو اور دنیا رو رہی ہو کہ کیسا اچھا بندہ چلا گیا۔ کتنے اچھے آدمی سے ہم محروم ہو گئے۔ اس لیے اولیاء اللہ اور صوفیاء نے بڑی عجیب بات کہی کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو نہ بول سکتا ہے، نہ بھاگ سکتا ہے اور نہ مانگ سکتا ہے تو اللہ نے اس کو سب سے پہلے رونا سکھا دیا کہ تم رونا شروع کر دو، پھر دیکھو میں تمہارے لیے سارے گھر کو فکر مند کر دیتا ہوں۔ ماں بھاگ رہی ہے، نانی بھاگ رہی ہے، بھائی بھاگ رہا ہے، باپ چیخ رہا ہے کہ بچہ رو رہا ہے، دیکھتے نہیں ہو؟ تو اللہ نے رونا سکھلا دیا جس سے اس کے سارے مسائل حل ہو گئے۔ تو یہی اللہ سکھانا چاہتے ہیں کہ جب اللہ کے آگے رونا سیکھ جاؤ تو تیرے آخرت کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

خدا کے خوف سے رونے والے:

جو آنکھ رات کی تاریکیوں میں اور تنہائیوں میں اللہ کے خوف سے روتی ہے اللہ اس کو جہنم سے پانچ سو سال کے فاصلے پر دور کر دیتے ہیں۔ اس لیے بعض اولیاء اللہ جب روتے تھے تو وہی آنسو اپنے چہرے پر مل لیتے تھے کہ اسی سے اللہ نے جہنم کو دور کرنا ہے۔ جب یہ آنسو میرے منہ پر ہوں گے اللہ اس کو جہنم سے دور کر دیں گے۔

تو پہلا سبق "اَلْخَلْقُ الْاَوَّلُ" یہ ہے کہ ہم اچھے بنیں، برے نہ بنیں، اپنے اندر صفاتِ حمیدہ پیدا کریں اور صفات ذمیمہ سے بچیں۔

سب کو پالنے والا رب:

اور دوسری صفت "رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" ہے، سب کو پالنے والا۔ انسان تو انسان چرند، پرند اور درندے سب کو پالنے والا اللہ ہے۔ جب ہم پیٹ میں تھے تو پالنے والا اللہ، "جَنِيْن" تھے تو پالنے والا اللہ، "صَبِی" بنے تو پالنے والا اللہ اور پھر جوانی میں آئے تو پالنے والا اللہ۔

جدید تعلیم یافتہ لوگ اور بوڑھے والدین:

اور جب بڑھاپے میں چلے گئے، پھر اگر اولاد زیادہ پڑھی لکھی ہوئی تو کسی اولڈ ہاؤس میں پھینک آئیں گے۔ اگر جاہل ہوئی تو روٹی وغیرہ دے دیں گے۔ میں یورپ کے اندر جا کر کہتا ہوں کہ اگر تمہیں دنیا کی کوئی پرانی چیز ملے تو تم اس کو دس گنا مہنگا خرید لیتے ہو، لیکن باپ پرانا ہو تو اس کو اولڈ ہاؤس میں پھینک دیتے ہو۔ وہ بھی تو بوڑھا ہو گیا، پرانا ہو رہا ہے اس کی قدر کرو۔ لیکن اس کو اولڈ ہاؤس پھینک آئیں گے کہ سارا وقت کھانستا رہتا ہے، ڈسٹرب کرتا رہتا ہے۔ عید وغیرہ پر جا کر کارڈ دے دیں گے یا کبھی کبھی وہاں جا کر پوچھ لیں گے اور اگر مر گئے تو کمپنی کو ٹیلی فون کریں گے کہ ابا جان کو دفنا دو، پیمنٹ ہم کر دیں گے، ہمارے پاس تو ٹائم نہیں ہے۔

اللہ پاک فرماتے ہیں: میری ربوبیت پر نظر ڈالو! اپنے اندر وہ صفت پیدا کرو، میں تجھے پالنے والا ہوں تو بھی پالنے والا بن، کسی کو مارنے والا نہ بن۔

ایک دیہاتی کی عجیب دعا!

دعا وہ ہوتی ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ مسجع مقفّیٰ کلام کا نام دعا نہیں ہے۔ ایک اعرابی مست بیٹھا دعا کر رہا تھا:

❁...... ''یا اللّٰہ! خَلَقْتَنِیْ مَجَّانًا'' (اے اللہ میاں! آپ نے مجھے مفت ہی پیدا کیا ہے (کیونکہ والدین کے پیسے لگے ہوں تو لگے ہوں، میرے تو نہیں لگے)۔

❁...... ''وَرَزَقْتَنِیْ مَجَّانًا'' (اور مجھے رزق بھی مفت دیا ہے (کیونکہ جب میں چھوٹا تھا تو میں کمانے کے قابل تو نہیں تھا پھر بھی آپ نے رزق دیا تھا)۔

❁...... ''فَاَدْخِلْنِی الْجَنَّۃَ مَجَّانًا'' (تو جنت بھی مفت میں عطا فرما دے)۔

یہ دعا دل سے نکل رہی تھی۔ اور جو دعا دل سے نکلتی ہے، اثر کرتی ہے۔

ہمارے ہاں کندیاں شریف ایک علاقہ ہے، وہاں بڑے بڑے بزرگ گزرے ہیں اور اب بھی خواجہ خان محمد صاحب رئیس ختم نبوت ہیں، جو ہمارے بزرگوں کے مقام پر ہیں۔ (بوقتِ تحریر وفات پا چکے ہیں۔ اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین) وہاں سے ایک آدمی آیا۔ اس وقت یہ کاریں اور موٹریں نہیں تھیں۔ یہ اونٹ اور زیادہ سے زیادہ کسی کو گدھا مل گیا۔ اس کے پاس پیسے زیادہ نہیں تھے، اس نے گدھا کرایہ پر لیا اور اس پر

حج کیا۔ جب حج سے فارغ ہوگیا اور طوافِ زیارت کے لیے ملتزم پر آیا تو پنجابی کے اندر کہا کہ اے اللہ! ہمارے ہاں رواج ہے کہ بڑے سے بڑا مجرم ہو، اس کے سر پر استرا پھروا کر گدھے پر بٹھا دیتے ہیں تو پھر اس کو علاقے والے معاف کر دیتے ہیں۔ اے اللہ! میں نے بھی سر منڈوا دیا ہے اور گدھے پر بھی بیٹھ گیا ہوں۔ اب تو معاف نہ کرے تو تیری مرضی ہے۔

یہ ہے اصل دعا جو دل سے نکلے، دل کی تڑپ اور اخلاص سے ہو۔ اس لیے اللہ نے فرمادیا: تم اپنے اندر وہ صفتیں پیدا کرو جو ہم تمہیں تعلیم فاتحہ میں پڑھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی اپنے قرآن کے سمجھنے کی اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

اصلاحِ اخلاق کے تین طریقے:

اسی لیے اللہ نے انبیاء اور رسل بھیجے کہ وہ تلاوتِ کتاب سے اور تزکیہ سے ہماری اصلاح کریں۔ تو اسلام اس بات کا قائل ہوا کہ انسان کے اخلاق کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس اخلاق کی اصلاح ان تین طریقوں سے ہوگی جو اللہ کے قرآن میں ہیں:

1 ......تلاوتِ کتاب:

قرآن کو پڑھنے سے اخلاق کی اصلاح ہوتی ہے۔ جب آدمی قرآن پڑھ رہا ہوتا ہے تو گویا کہ وہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ جیسے ہم حدیث مبارک پڑھتے ہیں تو ہم حضور ﷺ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ جس گھر میں ترمذی شریف موجود ہو تو گویا کہ اللہ کے نبی ﷺ اس کے گھر میں موجود ہیں۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ بہت بڑے مفسرِ قرآن ہیں۔ جب وہ تلاوت کے لیے قرآن کھولتے تھے تو فرماتے: ”هٰذَا كَلَامُ رَبِّي“ (یہ میرے رب کا کلام ہے) میں اپنے رب سے ہم کلام ہو رہا ہوں تو ان پر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ [بحر الفوائد، ص: ۱۷۳]

دیکھیں! قرآن میں کیا ہے؟

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ﴾ [البقرة: ۲۱]

”اے لوگو!“

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ [البقرۃ:۱۱۲]

''اے ایمان والو!''

تو اللہ تعالیٰ ہمیں خطاب فرما رہے ہیں۔

انسان کی اصلاح کا ایک بڑا ذریعہ تلاوتِ قرآن ہے۔ اور ہماری زبان میں اس کے لیے دو لفظ زیادہ استعمال ہوتے ہیں: تلاوت اور قرأت۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے، یعنی پڑھنا۔ اس لیے قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ [القیٰمۃ:۱۶]

''(اے پیغمبر! وحی قرآن کے اختتام سے پہلے) آپ اپنی زبان نہ ہلایا کیجیے، تاکہ آپ اس کو جلدی یاد کرلیں۔''

جب ہم قرآن پڑھیں تو اس کی اتباع کریں۔ یہاں بھی لفظ قرأت ہے۔ اسی لیے قرآن کو قرآن کہتے ہیں۔

اور دوسرا لفظ تلاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾ [البقرۃ:۱۲۱]

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توریت و انجیل) دی بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت (اس طرح) کرتے رہیں جس طرح کہ تلاوت کا حق ہے۔''

اللہ نے حضور ﷺ کا وظیفہ بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ﴾ [الجمعۃ:۲]

''وہی ہے جس نے (عرب کے) ان پڑھ لوگوں میں ان ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔''

یعنی نبی ﷺ اللہ کے قرآن پاک کو پڑھیں اور دوسروں کو سنائیں۔ تو دونوں لفظوں کا معنی ایک ہی ہوا۔

تلاوت اور قراءت کا ایک فرق:

بعض علماء فرماتے ہیں کہ ان دونوں لفظوں میں بڑا لطیف فرق ہے۔ مثلاً: آپ کہتے ہیں: ''قَرَأْتُ الْقُرْاٰنَ''، ''قَرَأْتُ الْحَدِیْثَ'' اور ''قَرَأْتُ الْجَرِیْدَةَ'' (میں نے قرآن پڑھا، میں نے حدیث پڑھی اور میں نے اخبار پڑھا) یہ تو ٹھیک ہے، لیکن آپ کبھی ''تَلَوْتُ الْجَرِیْدَةَ'' (میں نے اخبار کی تلاوت کی، میگزین کی تلاوت کی) نہیں کہہ سکتے۔

کیونکہ تلاوت اس چیز کے پڑھنے کو کہتے ہیں جس کے پڑھنے پر ثواب مرتب ہو۔ اگر آپ غلط میگزین پڑھنے شروع کر دیں تو گناہ ہوگا، منٹو کے افسانے پڑھنے شروع کر دیں تو آپ گنہگار ہوں گے۔ لہٰذا لفظ قراءت عام ہو گیا اور لفظ تلاوت خاص ہے، کیونکہ اللہ کے قرآن کے ایک حرف پڑھنے پر کم از کم دس نیکیاں ملتی ہیں۔

قرآن کی تلاوت کا اثر:

تو اخلاق کی اصلاح تلاوت سے ہوگی۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ انسان چاہے حافظِ قرآن بھی ہو چوبیس گھنٹوں میں ایک دفعہ ضرور قرآن کو دیکھ کر پڑھے، چاہے جتنا پڑھے، کیونکہ قرآن کے دیکھنے میں بھی اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ تین چیزیں ہیں جن کے دیکھنے سے بھی اللہ کی رحمت ہوتی ہے: قرآن کو دیکھنے سے، اللہ کے کعبہ پر نظر ڈالنے سے اور اپنے والدین کے چہرے کو ادب اور احترام کے ساتھ دیکھنے سے بھی اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ [کنز العمال، حدیث ۴۳۴۹۴]

2 ......قرآن وحدیث کی تعلیم:

دوسری چیز جس سے اخلاق درست ہوں گے کہ قرآن پاک کی تعلیم ہے، کیونکہ قرآن پاک ہمیں بتائے گا کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ ادا کرو اور حج کرو۔ قرآن بتائے گا کہ یہ شرک ہے، یہ توحید ہے، یہ حلال ہے، یہ حرام ہے اور یہ حدود اللہ ہیں۔ جب قرآن کی تعلیم آئے گی تو اخلاق بھی درست ہوں گے۔

اور حکمت کا معنی ہوتا ہے دانائی کی باتیں، مراد حضور ﷺ کی سنتیں ہیں۔ جب حدیث پڑھیں گے تو اس سے معلوم ہوگا کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا اور یوں عمل کیا، اس سے منع فرمایا اور اس کا حکم فرمایا۔ اس سے بھی ہمارے اخلاق کی اصلاح ہوگی۔

3 ......تزکیہ کے ذریعہ سے اصلاح:

تیسری چیز جس سے اخلاق کی اصلاح ہوگی وہ تزکیہ ہے کہ ان کے اندر کو مانجھنا، تصفیہ باطن کرنا۔

یہ تزکیہ کیسے ہوگا؟ تو یاد رکھیں! حضور ﷺ کے زمانہ میں حضور ﷺ کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اور کلمہ پڑھتے ہی اتنی فیضِ نظر ہوتی تھی کہ جو ڈاکو تھے، قاتل تھے وہ ﴿رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ کی تصویر بن گئے، جو اپنی بیٹیوں کو

زندہ دفن کر دینے والے تھے وہ دوسروں کی بیٹیوں کے بھی رکھوالے بن گئے اور جوڈا کے مارنے پر فخر محسوس کرتے تھے وہ لوگوں کے مال کی حفاظت کرنے لگ گئے۔

علماء اور صلحاء کے ذریعہ سے علاج:

جیسے جیسے ہم حضور ﷺ کے زمانہ سے دور ہوتے گئے اور چودہ سو سال پیچھے آگئے تو ہمارا تزکیہ کیسے ہوگا؟ اس سلسلہ میں ایک تو علماء ہیں اور دوسرے صوفیاء ہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت کے متبع ہوں۔ وہ ہمارا علاج کرتے ہیں، اس سے ہماری اصلاح ہوگی۔

جس طرح ڈاکٹر مریض کے مرض کی کیفیات دیکھنے کے بعد علاج کرتا ہے۔ اچھا ڈاکٹر مریض کو بھی دیکھتا ہے، مرض کو بھی دیکھتا ہے اور اس کے علاج کو بھی دیکھتا ہے۔ اسی لیے ان کی خوراک تقسیم ہوتی ہے۔ چھوٹوں کے لیے ایک گولی اور بڑوں کے لیے دو گولیاں ہوتی ہیں۔ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ اس دوائی کی کیا طاقت ہے؟ اور آگے لینے والے کی عمر کا کیا تقاضا ہے؟ اسی طرح روحانی معالج علماء اور صوفیاء کو بھی ہماری بیماری کا پتا ہوتا ہے کہ یہ آدمی بہت اچھا ہے، لیکن جھوٹ بولنے کی بیماری میں مبتلا ہے، یہ آدمی بہت اچھا ہے، لیکن نماز میں سستی کرتا ہے۔ ان کا اپنا طریقہ ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور مولانا ظہیر الحق رحمہ اللہ کا واقعہ:

مجھے ایک ذمہ دار آدمی نے بتایا کہ مولانا ظہیر الحق صاحب دین پوری رحمہ اللہ...... جو حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کے نواسے تھے اور حضرت مولانا غلام محمد رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے انہوں...... نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کو دو یا تین مسواک ہدیہ میں بھیجے۔ اور ایک آدمی جو سہارنپور جا رہا تھا اس کو وہ مسواک دیے تو وہ آدمی سوچنے لگ گیا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ بہت اونچے آدمی ہیں، ان کا بڑا مقام ہے، حضرت نے کوئی ہدیہ بھیجنا تھا تو کوئی قیمتی چیز بھیجتے، کیا یہ مسواک ان کو وہاں سے نہیں ملتے ہوں گے؟ لیکن حضرت کی بات تھی، اس لیے وہ لے کر چلا گیا۔

جب وہاں جا کر اس نے وہ ہدیہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو پیش کیا تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ بہت خوش ہوئے اور بڑی دعائیں دیں۔ پھر اپنے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا: تمہیں پتا کہ خلیفہ صاحب نے مجھے مسواک کیوں بھیجے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں تو نہیں پتا۔ فرمایا: وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ مستحبات کا خیال رکھو، ان کو نہ چھوڑا کرو۔ کیونکہ

قاعدہ یہ ہے کہ اگر مستحبات چھوڑو گے تو اللہ نوافل سے محروم کردیں گے، جب نوافل میں کوتاہی کرو گے تو اللہ سنتوں سے محروم کردیں گے اور جب سنتوں سے کوتاہی کرو گے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ فرضوں سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

سنتوں اور نوافل کی اہمیت:

آج کل ہمارے نوجوان بڑے سوچ سمجھ کر کہتے ہیں کہ چھوڑو کیا نفل پڑھنے ہیں!؟ شیطان آپ کو پہلے سنتوں سے محروم کرے گا، پھر آہستہ آہستہ باقی حصے سے بھی محروم کردے گا، بالآخر معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا کہ فرائض بھی ختم ہو جائیں گے۔ لیکن دوسرے حضرات سوچیں گے کہ مسجد میں آگئے ہیں، اذان نہیں ہوئی تو چلو! دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ لیں۔ اگر ظہر کے فرائض سے پہلے وقت ہے تو سنتیں پڑھ لیں گے، پھر فرائض کے بعد سنت اور نوافل بھی پڑھ لیں گے۔ کیونکہ جو فرائض کے اندر کمی کوتاہی ہوگی وہ ان سے پوری ہو جائے گی اور اگر ہم یہ سب کچھ چھوڑیں گے تو فرائض کو کس چیز سے پورا کریں گے؟

فقہ حنفی کی خصوصیات:

اسی لیے جہاں عبادات اور نوافل کا تعلق ہوگا وہاں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کثرت پر زور دیں گے اور جہاں حلال وحرام کا مسئلہ آئے گا تو وہاں قلت پر زور دیں گے۔ یہ فقیہ کا تفقہ ہے۔

ایک آدمی آٹھ رکعت تراویح پڑھتا ہے ہم اس کو منع نہیں کرتے، لیکن جس حدیث میں گیارہ رکعتیں ہیں یا تیرہ رکعتیں ہیں ان پر تو عمل رہ گیا اور جب بیس پر عمل کیا تو اس سے آٹھ والی پر بھی عمل ہوگیا۔ گیارہ والی پر بھی عمل ہوگیا، تیرہ والی پر بھی عمل ہوگیا اور رمضان کے مہینے میں تو ویسے زیادہ سے زیادہ عبادت کی جائے۔ تو جہاں زیادتی مقصود ہو تو امام صاحب نے اس پر زور دیا۔ اگر اس نے آٹھ والی روایت پر عمل کیا تو باقی احادیث کے بارے میں کیا کرے گا؟ اور اگر قیامت کے دن کہا گیا کہ بیس تراویح وغیرہ میں صحابہ کا اجماع برحق تھا تو کیا جواب دے گا؟ کمی کہاں سے پوری کرے گا؟

جلال الدین بخاری رحمہ اللہ اور محبوب سبحانی رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت جلال الدین بخاری رحمہ اللہ اوچ شریف میں (جہاں بہت اولیاء اللہ کا اجتماع رہا ہے) موجود تھے اور محبوب سبحانی وہاں بعد میں آئے...... اور ادب یہ ہے کہ اگر کوئی بیٹھا ہو تو اس کے ساتھ بیٹھنے سے پہلے اجازت لی

جائے تو...... حضرت محبوب سبحانی ؒ نے حضرت جلال الدین ؒ کو پیغام بھیجا کہ فقیر چلتے چلتے اس مقام پر آ گیا اور یہاں آپ مجھ سے پہلے موجود ہیں تو کیا مجھے اجازت ہے کہ میں اوچ میں رہ جاؤں؟ حضرت جلال الدین ؒ کو جب پیغام ملا تو مسکرائے اور خادم کو کہا کہ ایک پیالے میں دودھ لے آؤ۔ وہ دودھ لے آیا تو فرمایا کہ اس کو کسی ٹرے میں ادب کے ساتھ حضرت محبوب سبحانی کی خدمت میں پیش کر آؤ۔ مرید نے سمجھا کہ وہ مہمان ہیں اور دودھ افضل چیز ہے، اس لیے بھیج رہے ہیں۔ وہ لبالب پیالہ بھرا ہوا حضرت سبحانی ؒ کی خدمت میں لایا۔ حضرت نے جب دیکھا تو وہ بھی مسکرائے۔ اور اس وقت حضرت محبوب سبحانی ؒ کے ہاتھ میں ایک پھول تھا تو اس سے ایک پھول کی پتی نوچی اور اس کو دودھ میں ڈال کر واپس بھیج دیا...... میرے جیسے لوگ کیا سمجھتے؟ یہ کہ دودھ کے بارے میں تو شریعت میں ہے کہ واپس نہیں کرنا چاہیے اور انہوں نے واپس بھیج دیا۔ سنت کی خلاف ورزی کی ہے۔ اور پھر اوپر گلاب کی پتی کیوں رکھ دی......؟

جب وہ خادم حضرت جلال الدین ؒ کی خدمت میں واپس آیا تو آپ نے وہ دودھ بھی اور ساتھ روٹی کے کچھ ٹکڑے بھی بھجوا دیے۔ حضرت محبوب سبحانی ؒ نے فرمایا کہ الحمدللہ! اجازت مل گئی ہے۔ کچھ خشک مولوی جن کا کام ہی اعتراض کرنا ہوتا ہے۔ اللہ ان کو ہدایت دے۔ انہوں نے کہا: کیسے اجازت مل گئی؟ ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ انہوں نے فرمایا: میں نے درخواست بھیجی تھی کہ مجھے اوچ میں رہنے کی اجازت عطا فرما دیں، حضرت نے دودھ کا پیالہ بھیج کر اشارہ فرما دیا کہ یہاں پہلے ہی اللہ والوں سے میدان بھرا ہوا ہے، کسی اور کی گنجائش ہی نہیں ہے، آپ کسی اور جگہ تشریف لے جائیں۔ تو میں نے دودھ کے اوپر پھول کی پتی ڈال کر گزارش کی کہ جس طرح اس پتی نے گزارہ کر لیا میں بھی گزارہ کر لوں گا۔ اس کے بعد حضرت نے روٹی کے ٹکڑے بھیجے کہ اب آپ ہمارے مہمان ہو، روٹی کھا لو۔ آپ کو یہاں رہنے کی اجازت ہے۔ آپ میں اتنی صلاحیت ہے کہ ان اللہ والوں کے ہوتے ہوئے رہ لیں گے۔ اب آپس میں جو اشارات تھے ان کو کون سمجھے گا؟ جاہل کہے گا کہ دیکھو! یہ بھی کوئی بات ہے؟ کیا یہ قرآن میں لکھا ہوا ہے؟ ان باتوں کا کوئی علاج نہیں ہے، صرف یہ ہے کہ اللہ ہدایت عطا فرمائے۔

قرآن وحدیث کے مخفی اشارات:

اسی طرح آپ آگے جائیں تو اشارات قرآن وحدیث میں بھی آپ کو ملیں گے۔

جیسے حضور ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو فرمایا کہ میرے بعد سب سے پہلے اس کی وفات ہوگی اور وہ

میرے پاس آئے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن فرماتی ہیں کہ ہم نے ہاتھوں کی پیمائش کرنی شروع کردی کہ کس کا ہاتھ لمبا ہے؟ تو حضرت سودا رضی اللہ عنہا کا ہاتھ لمبا تھا۔ لیکن جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا فوت ہوئیں تو سمجھ آیا کہ "أَطْوَلُكُنَّ يَدًا" سے سخاوت مراد ہے۔ وہ ام المساکین تھیں، اس لیے اللہ ان کی وفات کا وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رکھا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۱۴۲۰، باب: فَضْلِ صَدَقَةِ الشَّحِيحِ الصَّحِيحِ]

روحانی معالج کا طریقۂ اصلاح:

تزکیہ کا معنی ہوتا ہے پاک کرنا۔ روحانی معالج علماء اور صوفیاء لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں۔ مثلاً: وہ کہیں گے کہ آپ روزانہ پانچ پارے پڑھا کریں، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کی اصلاح تلاوتِ قرآن سے ہوگی۔ پھر جب ان کو لگے گا کہ یہ ٹھیک نہیں ہو رہا تو کہیں گے کہ آپ نے آٹھ رکعت تہجد پڑھنی ہے اور ہر رکعت میں مثلاً چار رکوع پڑھنے ہیں۔ کیونکہ وہ رات کا وقت ہوگا، رحمت کی گھڑی ہوگی، اللہ کی رحمت آئے گی اور اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ اور بعض لوگوں کو کہتے ہیں کہ کثرت سے روزے رکھو۔ بہر حال! مقصد یہ ہے کہ یہ وہ طریقے ہیں جن سے اخلاق کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

حضرت لاہوری رحمہ اللہ چالیس دن میں اصلاح کر دیتے تھے:

حضرت لاہوری رحمہ اللہ کے بارے میں سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ بھائی! اگر کسی کی اصلاح مقصود ہو اور لوگ کہتے ہوں کہ یہ ٹھیک نہیں ہوگا تو میں کہوں گا کہ میرے پاس آجاؤ اور چالیس دن لنگر میں رہو، مشترکہ کھانا کھاؤ گے، جو کپڑے دوں گا وہ پہنو گے، جو کہوں گا وہ کرو گے اور پھر چالیس دن کے بعد دیکھیں کہ تمہاری اصلاح ہوئی یا نہیں؟ بڑے بڑے ڈاکو، ظالم، قاتل حضرت کی خدمت میں گئے اور جب واپس آئے تو ایسا انقلاب آیا کہ داڑھی بھی رکھ لی، سنت کے مطابق لباس بھی پہن لیا اور نمازی بھی بن گئے۔

سید عطاء اللہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ بڑے ہنس مکھ آدمی تھے۔ ان کی خدمت میں سب لوگ آتے تھے، ڈاکٹر بھی ہوتے، مریض بھی ہوتے، شاعر بھی ہوتے، کمیونسٹ بھی ہوتے، اولیاء اللہ بھی ہوتے، بڑے بڑے صنعتکار بھی ہوتے، بیوروکریسی کے اونچے اونچے ستون بھی ہوتے اور فقیر بھی ہوتے۔ سب لوگ آتے تھے اور سمجھتے تھے کہ شاہ

جی مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

ایک دفعہ شاہ جی ﷫ کی خدمت میں کمیونسٹ اور دہریہ قسم کا آفیسر آیا...... چونکہ یہ انگریزی سکول کے پڑھے ہوئے ہوتے ہیں، ان کو اسلام کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہوتا۔ بس یہی سمجھتے ہیں کہ باپ دادا مسلمان تھے تو ہم بھی مسلمان ہیں...... وہ شاہ جی کو کہنے لگا کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں، آپ ساری رات تقریریں کرتے ہیں، مصیبتیں برداشت کرتے ہیں، اس کا فائدہ کیا ہے؟ آپ اتنی محنت کر رہے ہیں، لوگوں میں کون سی تبدیلی آگئی ہے؟ جرائم، ڈکیتیاں، قتل و غارت گری اسی طرح ہے اور اسی طرح جھوٹ، شراب، فحاشی اور عریانی ہے تو آپ کی تقریروں کا کیا فائدہ ہے؟ آپ آرام کریں میں آپ کو کسی ٹھنڈے علاقے میں بھجواتا ہوں...... اس آدمی کا اصل مقصد اپنی بڑائی بیان کرنا اور لوگوں کو بتانا تھا کہ ان مولویوں کا کیا فائدہ ہے؟ ان کو تو بولنے کی عادت ہے......

حضرت شاہ جی ﷫ نے فرمایا: ہاں بیٹے! ٹھیک کہتے ہو، میرا جو رات لاہور موچی دروازے پر جلسہ تھا اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال کہ کتنا مجمع ہوگا؟ اس نے کہا: آج کی اخبارات میں ایک لاکھ آدمیوں کا ذکر ہے، گورنمنٹ کا اعداد و شمار دس ہزار ہے اور میری رائے میں بیس پچیس ہزار حقیقی مجمع تھا۔ باقی اخبار والوں کی بات بھی سچی نہیں اور ہمارے رپورٹروں کی بات بھی سچی نہیں ہے۔ شاہ جی نے فرمایا: چلو! تمہاری بات مانتے ہیں کہ پچیس ہزار آدمی تھے۔ یہ بتاؤ کہ جلسہ کب شروع ہوا؟ اس نے کہا: عشاء کے بعد۔ شاہ جی ﷫ نے فرمایا: ختم کب ہوا؟ اس نے کہا: صبح کی نماز کے وقت ختم ہوا۔ شاہ جی نے فرمایا کہ پچیس ہزار آدمیوں کو آٹھ گھنٹے کے لیے گناہ سے روک لیا، یہ تھوڑا کام ہے؟ سگریٹ والوں کو سگریٹ سے روکا، حقہ والوں کو حقہ سے روکا، جھوٹ بولنے والے کو جھوٹ سے اور غیبت والے کو غیبت سے روکا اور دھوکہ دینے والوں دھوکہ دینے سے روکا، کیا یہ کم فائدہ ہے؟ اگر پورے ملک کے علماء کے جلسوں کو دیکھو تو وہ کروڑوں آدمیوں کو گناہوں سے روک رہے ہیں، وہ کام کر رہے ہیں، لیکن تمہاری فورسز کیا کر رہی ہیں؟ اس بے چارے کو سمجھ آگئی کہ بات تو ٹھیک ہے۔

اصلاح کے اہل حضرات:

یاد رکھیں! اہل اسلام کے ہاں اخلاق کی اصلاح ہوتی ہے، لیکن اس کے طریقے ہوتے ہیں۔ اور سب سے اہم ترین طریقہ یہی ہوتا ہے کہ نماز پڑھنا، تلاوت قرآن کرنا، حدیث پاک کی تلاوت کرنا، اہل اللہ، علماء حقہ اور وہ

صوفیاء جو قرآن وسنت کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہوں ان کی صحبت اختیار کرنا۔ یہ ہماری باتیں نہیں، یہ ساری قرآن کی سورۂ فاتحہ کی باتیں ہیں۔

قرآن کہتا ہے:

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ [الفاتحہ:٦]

''اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' کون لوگ ہیں؟ کیا وہ ہیں جنہوں نے آئی سی ایس کیا ہو؟ یا پی ایچ ڈی کا امتحان دیا ہو؟ یا ڈاکٹر ہوں؟ نہیں، بلکہ ''اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' وہ لوگ ہیں جن کا تذکرہ تفصیل سے قرآن پاک میں دوسری جگہ کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء:٦٩]

''اور جو شخص اللہ اور رسول ﷺ کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صلحاء رحمہم اللہ اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔''

تو ان حضرات سے اخلاق کی اصلاح ہوگی، وگرنہ کیسے اصلاح ہو سکتی ہے؟

خدا کی ربوبیتِ عامہ:

علماء مفسرین نے فرمایا کہ جب ہم سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرتے ہیں تو ہمیں اخلاق کا سبق دیا جاتا ہے۔ اسی لیے آتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے اخلاق جیسا اپنا خلق بناؤ۔ اب یہ کیسے ہوگا؟ اس کو سمجھیں۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ سے یہ اخلاقی سبق ملا کہ ایسے کام کریں جو محمود ہوں اور مذموم نہ ہوں۔ ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے دوسرا اخلاقی سبق ملا کہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کو پالنے والا ہے۔ یہ نہیں کہ صرف مسلمانوں کو دیا اور کافر کو نہ دیا، مسلمان کے گھر میں بارش ہو اور کافر کے گھر میں بارش نہ ہو، بلکہ ان کے ہاں بارش زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے ہاں تین چیزیں مشہور ہیں کہ بیگم، ورک اور موسم کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔ جب دفتر سے گھر آتے ہیں تو پتا نہیں ہوتا کہ بیوی بھی گھر میں ہوگی یا نہیں ہوگی؟ اور موسم کا یہ حال ہے کہ کسی بھی وقت بارش ہونے لگ جاتی ہے۔ رہا کام اور کچھ نہیں تو جوتے پالش کرنے لگ جائیں تو روٹی مل ہی جاتی ہے۔

ایک ڈی سی کا لطیفہ:

ایک آدمی مدت بعد پاکستان آیا۔ اس کے گھر والے کسی جگہ رشتہ لینے کے لیے گئے، پینٹ، شرٹ اور عمدہ بیگ ہاتھ میں ہے اور قیمتی گھڑی ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہاں کرتے کیا ہو؟ اس نے کہا کہ میں وہاں ڈی سی ہوں۔ ان کو بڑی خوشی ہوئی، کیونکہ ہمارے ہاں تو ڈی سی ضلع کا بڑا افسر ہوتا ہے۔ تو اس نے کہا کہ تصدیق کرلو، یہ میرے پاس پاسپورٹ ہے، کاغذات پاس ہیں، ان پر بھی ڈی سی لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے لڑکی کا رشتہ دے دیا۔ جب وہاں گیا تو وہاں پتا چلا کہ یہ تو ہوٹل میں برتن دھوتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ میں ڈی سی ہوں۔ اس نے کہا کہ میں نے کہا تھا: میں ڈی سی (ڈش کلینر) برتن دھونے والا ہوں۔ اگر تم نے ڈپٹی کمشنر سمجھا ہے تو یہ تمہاری بے وقوفی ہے، میں نے تو کوئی جھوٹ نہیں بولا۔

جنگ و جدال میں امن و امان کا حکم:

اس لیے میرے عزیزو! ''رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سب سے ہمدردی رکھیں، چاہے کافر ہے، ہندو ہے، یہودی ہے۔ یہ مخلوق ہیں، ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ان پر ظلم کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک تقابل اور حرب آتا ہے۔ وہاں جو احکام شریعت کے ہوں گے اس کے مطابق چلیں گے۔

اسی لیے جب حضور ﷺ نے مکہ فتح کیا اور دس ہزار کا لشکر حضور ﷺ کے ساتھ ہے تو صحابہ نے کہا ''لَا قُرَيْشَ بَعْدَ الْيَوْمِ'' (آج کے بعد قریش کا بچہ بھی نہیں رہے گا) انہوں نے جو ہمارے اوپر ظلم کیے تھے ہم بھی گن گن کر بدلے لیں گے۔ جب حضور ﷺ مکہ کے قریب آئے اور اپنی فوج کو ترتیب دیا تو فرمایا: میرے صحابہ!

((مَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِي سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ))

''جو ابوسفیان کی حویلی میں چلا جائے اس کو امان ہے۔''

((وَمَنْ أَلْقَى السِّلَاحَ فَهُوَ آمِنٌ))

''اور جو ہتھیار پھینک دے اس کو بھی امان ہے۔''

((وَمَنْ أَغْلَقَ بَابَهُ فَهُوَ آمِنٌ))

''جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے اس کو بھی امان ہے۔''

((وَمَنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَهُوَ آمِنٌ))

''اور جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے اس کو بھی امان ہے۔''

[صحیح مسلم، حدیث: ۱۷۸۰، سنن ابی داؤد، حدیث: ۳۰۲۲، باب: مَا جَاءَ فِي خَبَرِ مَكَّةَ]

بوڑھے کو، بچے کو اور عورت کو بھی امان ہے۔ اسی طرح اللہ بھی ہمیں سبق دیتا ہے کہ تم بھی سب کے ساتھ بھلائی کرو، خیر خواہی کرو۔

سب پر رحم کا حکم:

اس لیے اسلام میں ہے کہ اگر تم گوشت زیادہ نہیں پکا سکتے تو شوربہ تو زیادہ بنا سکتے ہو، شوربے کا پیالہ ہمسائے کو بھیج دو کہ وہ بھوکا تو نہ رہے۔ تمہارے اندر بھی ربوبیت والا مادہ ہو۔ اس لیے اسلام کہتا ہے کہ اگر فروٹ کھائے ہیں تو اس کے چھلکے دروازے کے پاس نہ پھینکو، کیونکہ کوئی غریب گزرے گا، اس کو خوشبو آئے گی اور وہ سمجھے گا کہ اس گھر میں آم کھائے جا رہے ہیں اور ہمارے گھر میں تو سوکھی روٹی بھی نہیں ہے۔ تو اس کی جو ٹھنڈی سانس نکلے گی وہ تمہارے لیے نقصان کا باعث نہ بن جائے۔ اگر اس کو فروٹ نہیں کھلا سکتے تو اس کو دکھ تو نہ دو۔

تیسرا خلق ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے مہربان نہایت رحیم ہیں۔ اس کو ''شَفَقَةٌ عَلَى الْخَلْقِ'' کہتے ہیں کہ جب اللہ کی صفت سے لو گے تو یاد رکھو! شریعت کا اصول ہے ''مَنْ رَحِمَ رُحِمَ'' کہ رحم کرو گے تو تم پر رحم کیا جائے گا۔ اس لیے فرمایا گیا:

((مَنْ لَا يَرْحَمُ مَنْ فِي الْأَرْضِ لَا يَرْحَمُهُ مَنْ فِي السَّمَاءِ)) [المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۲۴۹۷]

''جو زمین والوں پر رحم نہیں کرتا تو آسمان والا اس پر رحم نہیں کرتا۔''

یہ ''شَفَقَةٌ عَلَى الْخَلْقِ'' ہے کہ غیروں پر رحم کرنا۔ اس کے اندر یہ فرق نہیں ہے کہ کس پر رحم کیا ہے۔

ایک گندی عورت کا قصہ:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک فاحشہ عورت کسی صحراء سے گزر رہی تھی تو اس کے اندر پھنس گئی، اس کو پیاس لگی تو اس نے دیکھا کہ ایک کچا کنواں ہے۔ اس کے اندر پانی تو ہے، لیکن نکالنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ اس نے اپنے پاؤں سے جوتا نکالا اور دوپٹہ کو رسی بنایا کہ اس سے گھونٹ گھونٹ پانی آئے گا تو اس سے جان بچے گی۔

اور اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے تڑپ رہا ہے تو اس نے پہلے کتے کو پانی پلایا، پھر پانی نکالا اور خود پیا۔ کتے کو ہوش آیا اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے کتے پر رحم کرنے سے اس کے سارے گناہ معاف کر دیے، حالانکہ اس نے صرف کتے پر رحم کیا تھا۔ اس کو ''شَفَقَةٌ عَلَى الْخَلْقِ'' کہتے ہیں۔ [مسند البزار، حدیث: ۸۷۲۵]

''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کا معنی:

''الرَّحْمٰنِ'' بڑا مہربان اور ''الرَّحِيْمِ'' نہایت رحم والا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ بعض نے کہا کہ ''الرَّحْمٰنِ'' کا تعلق دنیا سے ہے کہ کافر اور مسلمان دونوں پر اللہ کا رحم ہے اور ''الرَّحِيْمِ'' کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے کہ صرف مسلمانوں پر رحمت ہو گی۔

عدل وانصاف کا حکم:

اس کے بعد فرمایا: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ (قیامت کے دن کا مالک ہے) اس سے یہ سبق ملا کہ اپنے اندر عدل وانصاف پیدا کرو، کیونکہ اللہ عدل والے ہیں، ظلم سے پاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ [النساء: ۴۰]

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے۔''

اللہ تعالیٰ نقصان اور تمام عیبوں سے پاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝﴾ [الرحمٰن: ۹]

''اور انصاف (اور حق رسانی) کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول کو مت گھٹاؤ۔''

تول ہو تو عدل کے ساتھ، پیمائش ہو تو عدل کے ساتھ، اگر کبھی گواہ بن جاؤ اور گواہی دو تو عدل کے ساتھ، کبھی جج بن جاؤ اور فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ ہو، حاکم بن جاؤ تو عدل ہو، بڑے بن جاؤ تو عدل ہو، اگر اللہ نے دو بیٹے اور چار بیٹیاں دی ہیں تو عدل ہو اور اگر دو بیویاں ہوں تو عدل ہو، کیونکہ ہم نے عادل کے دربار میں جانا ہے۔ تو ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ سے ہمیں عدل وانصاف کا سبق ملا ہے کہ معاملات میں عدل وانصاف قائم کریں۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے باٹ اور ہوں اور دینے کے لیے اور ہوں۔ کھانے کے دانت اور ہوں اور دکھانے کے اور ہوں۔ اسلام اس بات کا سبق نہیں دیتا۔

تواضع کا سبق:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ سے ہمیں تواضع کا سبق ملا کہ اے اللہ! ہم تیرے بندے ہیں، تو خالق ہے، تو مالک ہے اور تو رازق ہے، ہم تیرے مملوک ہیں۔ بھلا غلام کی بھی کوئی حیثیت ہوتی ہے؟ نماز، حج، اور طواف تواضع ہیں کہ اللہ نے حکم دیا ہے ہم کر رہے ہیں، کنکریاں مار رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں تو یہ تواضع ہے۔ غلام کا معنی ہی یہ ہوتا ہے کہ جو مالک کا حکم ہو اس پر عمل کرے۔

سلطان محمود اور ایاز کا واقعہ:

بڑا مشہور واقعہ ہے کہ محمود بادشاہ ایاز غلام کو بہت پسند کرتے تھے تو لوگ جلتے تھے کہ وہ اس ملازم کو ہم پر کیوں ترجیح دیتا ہے؟ تو ایک دن بادشاہ نے تمام دوستوں کو بلوایا اور کہا کہ ہر آدمی ایک ایک چیز اٹھالے، لیکن شور نہ کرے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ بادشاہ کا کمرہ تھا، کسی نے قیمتی جام اٹھالیا، کسی نے قیمتی قالین اٹھالیا، کسی نے قیمتی پینٹنگ اٹھالی۔ سب سے نے اٹھالیا، لیکن ایاز خاموش کونے میں کھڑا ہے۔ جب سب نے لے لیا تو ایاز سے پوچھا کہ تم چپ کیوں کھڑے ہو؟ تمہیں اس کمرے سے جو چیز چاہیے وہ لے لو۔ اس نے کہا: مجھے صرف آپ کا قرب چاہیے، آپ کی ذات کے ساتھ رہنا چاہیے اور کچھ نہیں چاہیے۔ تو بادشاہ نے کہا: دیکھو! کسی کو جام عزیز تھا اور کسی کو قالین عزیز تھا، ایاز کو تو میں عزیز ہوں۔ اس لیے ایاز مجھے پیارا لگتا ہے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تو ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں ہمیں تو ضع کا سبق ملا۔

قناعت و استغنیٰ کا حکم:

﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝﴾ میں ہمیں قناعت کا سبق ملا کہ تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، تیرے سوا اور کوئی مددگار ہے ہی نہیں۔ ''إِيَّاكَ'' مقدم ہے تو حصر کا معنی ہو گیا کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

ہمارے ایک بزرگ عالم فرماتے تھے کہ مسئلہ صرف ''ہی'' اور ''بھی'' میں ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کی بیوی کہے کہ میں تیری بھی ہوں۔ اور کبھی کبھی ذائقہ بدلنے کے لیے غیر کے پاس جائے تو پھر بندہ بے غیرت بنے گا۔ اسی لیے بیوی کو یوں کہنا چاہیے کہ میں تیری ہی ہوں۔ اسی لیے ہم یوں کہتے ہیں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ تو اس کے اندر قناعت آگئی۔ خدا کی قدرت ہے کہ جب قناعت آجائے تو آدمی غنی ہو جاتا ہے

اور اگر طمع آجائے تو آدمی فقیر رہتا ہے۔

اپنے مولیٰ پر انحصار کا واقعہ:

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمارے دور میں اتنا قحط پڑا کہ لوگ پرانے چمڑے ابال کر پانی پی لیتے تھے۔ میرا ایک آدمی پر گزر ہوا تو وہ بیٹھا ہنس رہا تھا، مسکرا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ لوگ قحط کی وجہ سے مر رہے ہیں اور تو بیٹھا مسکرا رہا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے آقا کے گودام غلے سے بھرے ہوئے ہیں، وہ مجھ پر مہربان ہے اور میری ضروریات کو بخوبی پورا کرتا ہے تو مجھے کیا فکر ہے؟ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے سوچا کہ اس بندے کو اپنے دنیا کے مالک پر کتنا ناز ہے! تو جس کے پاس ﴿خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ہیں۔ اگر اس کے ساتھ تعلق جڑ جائے تو بندے کو کیا پریشانی ہوگی؟

تو ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ سے ہمیں سبق ملا کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور کسی کے دروازے پر نہیں جاتے۔

علومِ نافعہ اور علومِ ضارّہ:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ سے ہمیں یہ سبق ملا کہ ہمیں راستہ ملے تو علم وحکمت والا، سیدھا راستہ۔ اگر گمراہ علم ملا تو ہم گمراہ ہو جائیں گے۔ وگرنہ گانا، موسیقی اور ناچنا بھی تو علم ہے، جادو بھی علم ہے، یہ بھی سارے علوم ہیں۔ لیکن ایک علومِ ضارّہ ہیں، ایک علومِ نافعہ ہیں، ایک علومِ ضالّہ ہیں، ایک علوم ہدایت والے ہیں، ایک علوم رحمانیت والے ہیں اور ایک علوم شیطانیت والے ہیں۔ جیسے یورپ ہے، سارے جدید علوم ان کے پاس ہیں۔ اب ہم ان سے علومِ نافعہ حاصل کرنے کے بعد اس کا استعمال کیسے کر رہے ہیں؟ اس سے ہمیں یہی سبق ملا ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ کہ یا اللہ! ہمیں علم وحکمت عطا فرما، ہمیں صراطِ مستقیم عطا فرما۔

علومِ رحمانیہ کے فائدے:

علماء نے بڑی عجیب بات لکھی ہے کہ اگر علومِ رحمانیہ ہوں تو اس سے انسان کی روح اور بدن دونوں کو فائدہ ہوتا ہے، اللہ اس کے دل میں نور پیدا کر دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۷۱، باب: مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا...]

''اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ﴾ [الزمر:۲۲]

''سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام (کے قبول کرنے) کے لیے کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کے (عطا کیے ہوئے) نور پر ہے۔''

اور اگر علوم شیطانیہ ہوں تو جسم و جان کو تو فائدہ پہنچے گا، لیکن روح و ایمان کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اس لیے آپ یورپ کو دیکھیں کہ ان کے جسم و جان کو تو فائدہ ہے، لیکن روح کا یہ عالم ہے کہ ہر بیس منٹ کے بعد ایک عورت کی عصمت کو تار تار کیا جاتا ہے۔

سیدھا راستہ کیا ہے؟

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝﴾ کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ اب تو میرا بندہ بن گیا ہے، مانگ جو کچھ مجھ سے مانگتا ہے۔ تو بندہ مانگتا ہے اور کہتا ہے:

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝﴾

[الفاتحہ:۵، ۶، ۷]

''ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما، ان لوگوں کے راستے کی ہدایت عطا فرما جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں۔''

اور وہ کون لوگ ہیں؟ ان کا اللہ نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۝﴾ [النساء:۶۹]

''اور جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے تو وہ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ۔ اور وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں۔''

ہدایت کا معنی:

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝﴾ میں تین چیزیں ہیں: ہدایت، صراط اور مستقیم۔ ہدایت کا معنی ہوتا ہے کہ

کمالِ مہربانی سے کسی کی منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کر دینا۔ مثلاً: کسی نے پوچھا کہ صفا و مروہ کدھر ہیں؟ تو آپ نے کہا کہ ادھر آئیں، وہاں حجر اسود کے سامنے سبز رنگ کی بتی جل رہی ہے، اس بتی کے سیدھ میں چلے جائیں، وہاں ایک اونچی جگہ آجائے گی وہ صفا ہے۔ اور صفا سے جب سیدھا چلیں گے تو پھر ایک اونچی سی جگہ آجائے گی، وہ مروہ ہے۔ آپ نے صفا سے سعی شروع کرنی ہے اور مروہ پر ختم کرنی ہے۔ یہ ایک چکر بنے گا۔ پھر آپ سر منڈوالیں اور پھر احرام کھول دیں تو آپ کا عمرہ پورا ہو گیا۔ وہ آدمی کہتا ہے کہ آپ کی مہربانی۔ یہ ہدایت ہے۔

استقامت کا معنی:

''صراط'' کا معنی ہے راستہ اور مستقیم کا معنی ہے سیدھا۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ بڑا قد و قامت والا آدمی ہے، سیدھا آدمی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بڑا استقامت والا بندہ ہے۔ جہاں کھڑا ہو جائے وہاں کھڑا ہو جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ [فصلت: ۳۰]

''جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر (اس پر) مستقیم رہے تو ان پر فرشتے اتریں گے۔''

اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میری عبادت کرو تو ''فَاسْتَقِمْ'' اسی پر قائم رہو۔ تو اسی سے صراطِ مستقیم نکلا ہے۔

ہدایت کا مفہوم:

ہدایت کا مفہوم یہ ہے کہ اصلی ہدایت دینے والے اللہ ہیں۔ جس کو ہدایت عامہ کہتے ہیں کہ ہر چیز کو اس کے حالات کے مطابق سمجھا دیا کہ سورج اپنے کام میں ہے، چاند اپنے کام میں ہے، ستارے اپنے کام میں ہیں اور چرند پرند اپنے کام میں ہیں، ہر چیز اپنے کام میں ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝١ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝٢ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝٣﴾ [الاعلیٰ: ۱، ۲، ۳]

''اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کرو جس کی شان سب سے اونچی ہے، جس نے سب کچھ پیدا کیا اور ٹھیک ٹھیک بنایا اور جس نے ایک خاص انداز دیا، پھر راہ بتلائی۔''

اس نے ہر چیز کو ہدایت بخشی ہے۔ کانوں کا اپنا کام ہے، آنکھ کا اپنا کام ہے، ناک کا اپنا کام ہے اور زبان کا اپنا

کام ہے۔ان سب پر عقل کو عَلَم بنا دیا ہے۔

جانوروں کی ہدایت کا مفہوم:

اسی طرح پرندے ہیں کہ جب صبح ہوگی تو اڑ کر کھانے کے لیے جا رہے ہوتے ہیں، شام ہوگی تو اپنے اپنے گھونسلے میں لوٹ رہے ہوتے ہیں۔محال ہے کہ چڑیا اپنے گھونسلے کو چھوڑ کر دوسری چڑیا کے گھونسلے میں چلی جائے۔اس کو یہ ہدایت اللہ نے دی ہے۔اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ ۖ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٤١﴾﴾ [النور:۴۱]

''(اے میرے مدنی پاک!) کیا تجھ کو معلوم نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں اور (بالخصوص) پرندے جو پر پھیلائے ہوئے (اُڑتے پھرتے) ہیں۔سب کو اپنی اپنی دعا اور اپنی تسبیح معلوم ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے۔''

ہدایت کی اقسام:

اس لیے علماء نے فرمایا کہ جمادات،حیوانات اور نباتات سب کو ہدایت عامہ ہے۔بعض کا شعور اتنا کمزور درجہ کا ہوتا ہے کہ ہم کہتے ہیں: یہ بے جان ہے۔

ہدایت کی دوسری قسم یہ ہے کہ جو چیزیں عقل اور شعور رکھنے والی ہیں خاص منزل کی طرف ان کی رہنمائی کرنا۔وہ انسان اور جنات تھے،اس لیے ان کو مکلف بنایا اور ان کو ہدایت دینے کے لیے پیغمبر بھیجے اور کتابیں بھیجیں۔یہ ہدایت پہلی ہدایت سے خاص ہے۔

تیسری ہدایت اخص الخاص ہے،جس کو توفیق بھی کہتے ہیں کہ انسان ہدایت والے بھی ہیں،لیکن ان کو اس ہدایت کے ذریعہ منزل مقصود تک پہنچا دینا،اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبوں تک پہنچا دینا۔اس کو اللہ کے نبی بھی مانگتے ہیں اور اللہ کے ولی بھی مانگتے ہیں۔

آپ نے پڑھا ہوگا کہ جب حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مکہ فتح ہونے کی خوشخبری دی تو اللہ نے یوں فرمایا:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ﴿١﴾﴾ [الفتح:۱] (اے پیغمبر!) یقین جانو! ہم نے تمہیں کھلی ہوئی فتح عطا کر دی ہے۔

اور آگے ارشاد فرمایا: ﴿لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ [الفتح:۲] (تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمائے اور آپ پر اپنے احسانات کی تکمیل کردے اور آپ کو سیدھے رستہ پر لے چلے)۔

حالانکہ حضور ﷺ تو ہدایت پر ہیں، سراپائے ہدایت ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مراتب بہت ہیں جن پر ترقی ہوتی ہے۔

''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نُوَحِّدُ وَنَخَافُ'' ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تیری ہی توحید کا اعتراف کرتے ہیں، تیرے غضب سے ڈرتے ہیں اور تیری رحمت کی امید کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب! تیرے سوا نہ کسی سے ڈرتے ہیں جو تجھ سے ڈرنے والا مقام ہے اور نہ کسی سے رحمت کی امید کرتے ہیں جو تجھ سے امید کی جاتی ہے۔

''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' کا معنی:

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بظاہر تو ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کا معنی یہ ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے اندر یہ بھی اعتراف ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں، کیونکہ تیری طرح کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ یعنی ہم تیری توحید کے قائل ہیں۔ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تجھ ہی سے ڈرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں۔ کیونکہ ایمان کا معنی بھی یہی ہوتا ہے کہ ہر بندہ اللہ کی رحمت پر کامل یقین رکھے اور اللہ کے عذاب سے ڈر بھی پورا رکھے۔ یہ ایمانِ کامل ہے۔ جب ہم نے ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہا تو گویا ہم نے اسی ایمان کامل کا اعتراف کیا۔ اسی ایک لفظ میں پورے ایمان کی تشریح آگئی۔ کیونکہ عبادت کا معنی ہوتا ہے کامل تذلل، کامل عاجزی، کامل بندگی، انتہائی پستی اور ذلت کا اعتراف کرنا۔ آدمی جب اللہ کے سامنے کھڑا ہو تو انتہائی عاجزی کے ساتھ کھڑا ہو کہ میں تیرا عاجز اور حقیر بندہ ہوں۔ پھر انسان جھکتا ہے۔ اور اللہ نے اس کا چہرہ سب سے زیادہ عزت والا بنایا ہے، اس کو وہ مٹی کے اندر ملا دیتا ہے۔ اس کا نام عبادت ہے۔ اور اس عبادت کا جذبہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دل میں اللہ کی کامل عظمت پیدا ہو جائے۔ جب تک خدا کی عظمت دل میں پیدا نہیں ہوگی اس وقت تک اللہ کے سامنے جھکنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر دل میں اللہ کی عظمت نہیں ہے پھر تو ایک رسمی نماز ہوگی، پتا نہیں ہوگا کہ میں نے کیا پڑھا؟ سجدے میں کیا کہا، ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' کا کیا ترجمہ ہے اور ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى'' کا کیا معنی ہے؟

نماز کا مقصد:

نماز کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ دل میں اللہ کی عظمت پیدا ہو جائے۔ جب نماز شروع کرتے ہیں تو پڑھتے ہیں: ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' (اللہ سب سے بڑا ہے) دل میں عظمت ہوگی تو اقرار ہوگا۔ حضور ﷺ پر پہلی کے بعد جو وحی نازل ہوئی اور جو حکم آیا وہ یہ تھا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَاَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③﴾[المدثر:۱،۲،۳]

''اے کپڑے میں لپٹنے والے! اٹھیں اور ڈرائیں اور اپنے رب کو بڑا بنائیں۔''

ایک ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ اصل معنی پہلا ہے۔ اللہ کی بڑائی کے اعتراف کا معنی یہ ہے کہ انبیاء ﷺ سے بھی بڑا ہے، اولیاء سے بھی بڑا ہے اور دنیا میں جتنی طاقتیں ہیں ان سب سے بڑا ہے۔ آج ہمارا کیا یہ ایمان ہے؟ اگر ایمان ہوتا تو کیا کافروں سے ڈرتے رہتے؟ ہمارے ملک کے اندر عدالت میں انگریز کا قانون چلتا ہے۔ ہم کہتے ہیں: ''اللہ اکبر'' لیکن ہماری پارلیمنٹ کا نظام کافروں کا ہے۔ تو وہاں بھی اللہ بڑا نہ ہوا۔ وہی کافروں کا قانون، نظام اور ایکٹ ہے۔ ہمارے گھروں کے اندر کفر کے تمام کام موجود ہیں تو اللہ بڑا کیسے ہوا؟ ''اللہ اکبر'' کو ہم نے نہیں مانا۔

اگر کوئی کہے کہ ہم استاذ کا بڑا احترام کرتے ہیں، ہمارے استاذ بڑے ہیں۔ اور استاذ فرمائیں کہ کل فلاں وقت آ جانا۔ اور تم کہو کہ اس وقت میں نہیں آ سکتا۔ استاذ کہیں کہ اس کے دو گھنٹے بعد آ جانا تو تم کہو کہ اس وقت بھی میں نہیں آ سکتا، وہ فرمائیں: اس کے دو گھنٹے بعد آ جانا۔ تم کہو: وہ جی! میرے سونے کا وقت ہے۔ شام کو آ جانا، جی! میں شام کو مصروف ہوں۔ کیا یہ استاذ کا احترام ہے؟

اللہ پاک تو ہر زبان جانتے ہیں۔ لغتِ قرآن لغتِ عربی ہے۔ کیا وہ انگریزی بولتے تھے؟ آپ انگریزی ضرور پڑھیں، ہم اس سے منع نہیں کرتے، لیکن انگریزی زبان کو بڑا نہ بناؤ۔ حضور ﷺ خود صحابہ کو بھیجتے تھے کہ یہودیوں کی زبان کو سیکھو۔

دو سفیر صحابہ رضی اللہ عنہم کا واقعہ:

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور کی بات ہے کہ دو صحابی بادشاہ کے دربار میں سفیر بن کر گئے۔ مسلمانوں کے سفیر

پہلی دفعہ آرہے تھے، اس لیے بادشاہ نے حکم دیا کہ راستوں پر قالین بچھائیں، شامیانے لگائیں اور دربار کو سجائیں، تاکہ جب مسلمان آئیں تو ان پر اثر پڑے۔ وہ دونوں سفیر صحابی تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ دونوں کپڑے پہنے ہوئے ہیں، بورے کا قمیص، شلوار اور اسی کی ٹوپی ہے۔ تلوار پر کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ اس کے رکھنے کے لیے چیز نہیں ہے، نیزہ ہاتھ میں ہے، لیکن اس کی اوپر کی لکڑی بھی ٹوٹی ہوئی ہے اور کمزور اونٹوں پر بیٹھے ہوئے ہیں جو چلنے سے بھی معذور ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا تو کہا کہ یہ سفیر ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ جب دربار میں چلے تو نیزوں اور اونٹوں کے ساتھ قالینوں پر چلے۔ جب دربار میں گئے تو انہوں نے کہا:

"اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى"

"سلامتی اس پر ہو جس نے ہدایت کی اتباع کی۔"

سجدہ نہ کیا، جھکے نہیں۔ کہا کہ ہم نے اللہ کو بڑا مانا ہوا ہے جو عرش پر ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے فرمایا: "اَسْلِمْ تَسْلِمْ" کلمہ پڑھ لو سلامتی پا جاؤ گے، ہمارے بھائی بن جاؤ گے۔ بادشاہ نے کہا: اگر کلمہ نہ پڑھوں تو......؟ انہوں نے کہا: جزیہ ادا کرو، ہم تمہاری جان، مال، عزت اور آبرو کی حفاظت کریں گے۔ بادشاہ نے کہا: اگر یہ بھی نہ مانوں تو......؟ انہوں نے کہا: پھر ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار میدان میں فیصلہ کرے گی۔ بادشاہ غصے کے اندر آ گیا اور حکم دیا کہ ایک ٹوکرے میں مٹی بھر کر ان کو دے دو۔ یہ لے جائیں اور جا کر اپنے بادشاہ کو دیں۔ یعنی میں تمہارے منہ میں مٹی بھرتا ہوں۔ انہوں نے صحابہ کے سر پر مٹی رکھ دی۔ صحابہ نے فرمایا: الحمد للہ! حکومت ہمیشہ زمین پر کی جاتی ہے، تم نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ملک کی مٹی دی ہے، تم انتظار کرو کل ہمارا یہاں پر پرچم لہرائے گا۔ بادشاہ نے کہا: عجیب قوم ہے! یہ تو سمجھ میں بھی نہیں آتے۔ بادشاہ نے کہا: ہمارے درمیان میں دریا ہے اور مسلمانوں کی فوجیں دریا سے اُس طرف ہیں، کوئی پل وغیرہ نہیں ہے۔ یہ تو دریا بھی عبور نہیں کر سکتے، ہم سے کیسے لڑیں گے؟ ابھی صبح کی نماز بھی نہیں ہوئی تھی کہ دریا عبور کر کے فوج نے چڑھائی کر دی۔

جو اللہ کو بڑا مان لیتا ہے تو دریا تو اس کا غلام ہے، جبکہ ہم تو زبانی کلامی "اللہ اکبر" کہتے ہیں۔ اگر "اللہ اکبر" بھی کہیں اور "یا علی" کا نعرہ بھی لگائیں، "یا دستگیر" کا نعرہ بھی لگائیں، معین الدین چشتی کو بلائیں تو "اللہ اکبر" کا ترجمہ یہ تو نہیں ہے۔

جب اللہ بڑا ہے تو ہر جگہ قانون اور حکم اسی کا چلے گا۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [المائدۃ:۴۴]

''اور جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [المائدۃ:۴۵]

''اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ لوگ ظالم ہیں۔''

وہ ظالم ہیں کہ بندوں کا قانون چلاتے ہیں، بندوں کے خالق کا قانون نہیں چلاتے۔ بڑا ماننے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہر جگہ اسی کی بات چلے۔ یہ مطلب نہیں کہ صرف زبان سے ''اللہ اکبر'' کہہ دیا اور نماز پڑھ لی، لیکن فیصلے انگریزوں کے قانون کے مطابق کیے، اپنے اوپر غیروں کو بڑا مان لیا۔ یہ بڑائی نہیں ہے۔

اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کا معنی ہے: ''اِيَّاكَ نُوَحِّدُ وَ نَخَافُ وَ نَرْجُوْكَ يَا رَبَّنَا! وَلَا غَيْرَكَ'' کہ ہم تیری وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں، تجھ سے ڈرتے ہیں، تجھ سے امید کرتے ہیں، تیرے سوا ہمیں کسی کا بھی ڈر نہیں ہے اور نہ ہم تیرے سوا کسی سے امید رکھتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۲۶، الفاتحۃ: الآیۃ: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ]

عبادت کو استعانت سے مقدم کیوں کیا؟

﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ اللہ نے حکم دیا ہے کہ عبادت بھی میرے لیے ہے اور ہر کام میں مدد بھی مجھ سے پکڑو۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ مقدم ہے اور ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ موخر ہے، کیونکہ استعانت پکڑنے کا اصل وسیلہ عبادت ہے، اس لیے کہ عبادت اور اعمالِ صالحہ ہی اللہ تک پہنچنے کا حیلہ اور وسیلہ بنتے ہیں۔ تو عبادت اہم تھی، اس لیے اس کو مقدم کیا کہ جب تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو مدد اور کس سے مانگیں؟ جب ہم نے سب کو ٹھوکر مار کر ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کا اقرار کیا تو اے اللہ! اب مدد بھی تجھ سے ہی مانگتے ہیں، تو ہی ہماری مدد کرنے والا ہے۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ زیادہ اہم تھا، اس لیے اس کو مقدم کیا۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۲۶، الفاتحۃ: الآیۃ: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ]

دنیا کے اندر بھی دیکھ لو کہ ایک آدمی دنیا سے کنارہ کر کے ایک وڈیرے کے دروازے پر بیٹھ جائے کہ اب میں کہاں جاؤں؟ اب آپ نے ہی میری مدد کرنی ہے۔ کوئی دیوی دیوتا کے آگے جھکتا ہے، ابوجہل لات وعزیٰ کی پوجا

کرتا ہے۔ جب ہم نے اقرارِ توحید کیا تو ہم نے کہا: لات وعزیٰ کو باہر پھینک دو۔ کوئی سورج کو پوجتا ہے، ہم نے کہا اس وقت نماز ہی نہ پڑھو، تاکہ کسی کو سورج کی پوجا کا شبہ ہی نہ پڑے۔ کسی نے چاند تاروں کی اور کسی نے جنوں کی عبادت کی ہے۔ ہم نے کہا پڑھو:

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ①﴾ [الناس:١]

''کہو: میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے پروردگار کی۔''

سارے جنات بھاگ جائیں گے۔ جب ہم نے ساری انسانیت سے ناطہ توڑ لیا ہے اور رب سے جوڑ لیا ہے تو اب مدد بھی اللہ سے مانگیں گے۔

اللہ نے قرآن میں خود مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک غلام ہو، لیکن اس کا مالک ایک ہے اور ایسا غلام ہے جس کے دو مالک ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ جو ایک کا نوکر ہے وہ زیادہ بہتر ہے یا وہ جو دو کا نوکر ہے وہ زیادہ بہتر ہے؟ جو دو کا نوکر ہے اسے ایک کہے گا: ادھر آؤ اور دوسرا کہے گا ادھر آؤ۔ ایک آقا نے کام بھیجا اور دیر ہوگئی تو دوسرے نے جوتے مارے۔ جو دو میں تقسیم ہوگا اس کو دونوں طرف سے جوتے پڑیں گے اور جو ایک کا ہوگا اس پر مالک راضی رہے گا۔

اس لیے جو لوگ اللہ کے غیر کے آگے جھکتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ انہوں نے دس خدا بنا رکھے ہوں۔ بچہ دینے کے لیے فلاں بزرگ ہے، نفع دینے کے لیے فلاں بزرگ ہے اور تکلیفیں رفع کرنے کے لیے فلاں بزرگ ہے۔ اللہ نے فرمایا: اس پر غور کرلو کہ بندہ ایک کو معبود بنالے تو بہتر ہوتا ہے یا دس کو معبود بنالے وہ بہتر ہوتا ہے؟ ایک دنیوی مثال سے سمجھا دیا۔ فرمایا:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ㉙﴾ [الزمر:٢٩]

''اللہ نے ایک مثال یہ دی ہے کہ ایک (غلام) شخص ہے جس کی ملکیت میں کئی لوگ شریک ہیں، جن کے درمیان آپس میں کھینچا تانی بھی ہے اور دوسرا (غلام) شخص وہ ہے جو پورے کا پورا ایک ہی آدمی کی ملکیت ہے۔ کیا ان دونوں کی حالت ایک جیسی ہو سکتی ہے؟ الحمد للہ (اس مثال سے بات بالکل واضح ہوگئی) لیکن ان میں سے اکثر لوگ

سمجھتے نہیں۔"

مثال دے کر سمجھا دیا۔ دنیا کے اندر بھی یہی ہے کہ آدمی کا جب کسی سے تعلق ہو اور دکھ آ جائے تو کہتا ہے کہ فلاں مدد کر دے گا اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کی فلاں کے ساتھ بھی دوستی ہے اور وہ اس کی مدد کرے گا۔ تو دونوں اس کی مدد نہیں کرتے ہیں اور وہ مصیبت میں پڑ جاتا ہے۔ اس لیے جب آدمی کا ایک اللہ کے ساتھ تعلق نہ جڑے تو مدد کیسے آئے گی؟ ہم کہتے ہیں کہ اللہ بھی مدد کرے اور کافر بھی مدد کریں۔ اے اللہ! ہم تجھ سے بھی ڈرتے ہیں، لیکن تجھ سے زیادہ کافروں سے ڈرتے ہیں۔ اے اللہ! ہم تجھے اللہ اکبر مانتے ہیں، لیکن ان کو بھی سپر پاور مانتے ہیں۔ بھلا! یہ مسلمان ہے؟ اللہ ہمیں ہدایت دے۔ اگر ہم اللہ کی عظمت کو سمجھ لیں تو پوری دنیا ہمارے دروازے پر ہوگی۔

اقبال نے فرمایا تھا:

؎ اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج
اور پہچانے تو ہیں تیرے گواہ دارا وجم

یہاں سعودی عرب میں ایک صحرائے اعظم ہے۔ پہاڑ ہیں یا ریت ہے، کوئی دریا اور جنگلات نہیں ہیں۔ لیکن جب انہوں نے "اللہ اکبر" کو مان لیا تو اب تمہیں بھی روٹی یہی بھیجتے ہیں۔ فرمایا: ہم زمین کو حکم دیں گے کہ تمہیں خزانہ دے۔ اس کو حکم دیں گے کہ اگائے، آسمان پانی برسائے۔ اور ہم ظاہر و باطن سے اتنا مالا مال کر دیں گے کہ دنیا تمہارے دروازے کی غلام ہو جائے گی، کیونکہ تم نے مجھے "اللہ اکبر" مان لیا ہے۔ ہمارے ہاں "اللہ اکبر" نہیں ہے، وگرنہ تو کافر کا قانون چل بھی نہیں سکتا ہے۔

"نَعْبُدُ" اور "نَسْتَعِيْنُ" کیوں فرمایا؟

﴿نَعْبُدُ﴾ اور ﴿نَسْتَعِيْنُ﴾ کہا گیا ہے، "اَعْبُدُ" اور "اَسْتَعِيْنُ" کیوں نہیں کہا گیا؟ اس لیے کہ یہ تمام بندوں کی طرف سے اقرار ہے۔ اگر بندہ جماعت میں ہے یا اکیلا نماز پڑھ رہا ہے تو وہ کہہ رہا ہے کہ میں بھی اور میرے سارے ایمان والے بھائی سب تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

یا تو "نون" عظمت کے لیے ہے، لیکن بعض علماء نے فرمایا کہ یہ مقام ایسا نہیں ہے کہ بندہ اپنی عظمت کا اعتراف کرے۔ اللہ نے فرمایا: میرے بندے! جب تو میری عبادت کے لیے کھڑا ہے تو اب تو شان والا بن گیا

ہے، عظمت والا بن گیا ہے۔ ''مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ'' (جو بندہ اللہ کا بندہ بن جاتا ہے تو اللہ اس کا بن جاتا ہے) اس لیے اگر نون کو تعظیم کے لیے کہیں تو جائز ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۶، الفاتحۃ: الآیۃ: اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ]

''عَبَدْنَا'' کیوں نہیں فرمایا؟

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہا ''عَبَدْنَا'' کیوں نہیں کہا؟ بعض علماء نے فرمایا کہ ''نَعْبُدُ'' میں تعظیم ہے کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ اگر ''عَبَدْنَا'' (ہم نے تیری عبادت کی) کہتے تو اس میں بڑائی کا اظہار ہوتا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۶، الفاتحۃ: الآیۃ: اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ]

عبادت اتنا عظیم مقام ہے کہ جو اس میں لگتا ہے وہ اللہ کا عبد بن جاتا ہے۔ ایک اور بندہ ہے جو کہے کہ میں فلاح بادشاہ کا ملازم ہوں اور ایک ہے کہ بادشاہ کہے کہ فلاں میرا خاص ملازم ہے۔ تو اس کی شان زیادہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا﴾ [مریم: ۳۰] (میں اللہ کا خاص بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب (انجیل) دی اور مجھے اپنا نبی بنایا)۔

اور میرے مدنی ﷺ کے بارے میں اللہ نے فرمایا: ﴿وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا﴾ [الجن: ۱۹] (اور جب خدا کا (خاص) بندہ خدا کی عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو یہ (کافر) لوگ اس بندہ پر بھیڑ لگانے کو کھڑے ہوجاتے ہیں۔''

اس لیے جب بندہ عبادت میں ہوتا ہے تو اس کو اللہ کے ساتھ بندگی کی نسبت ہوجاتی ہے۔ اس لیے حکم ہے کہ سجدہ میں دعائیں مانگا کرو، کیونکہ جب انسان سجدے میں ہوتا ہے تو اللہ کے قریب ہوتا ہے اور اس کی دعائیں جلدی قبول ہوتی ہیں۔

مانگنے والوں سے بھی زیادہ کب ملتا ہے؟

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے ذکر نے بندے کو اتنا مشغول کردیا ہے کہ وہ میرے ذکر میں لگا ہے اس کو مجھ سے دعا مانگنے کا بھی وقت نہیں ملا۔ تو اللہ فرماتے ہیں کہ میں اس کو مانگنے والوں سے بھی زیادہ بہتر عطا فرمادیتا ہوں۔ [سنن الترمذی، حدیث ۲۹۲۶]

اس لیے امام ابوحنیفہ ﷫ فرماتے ہیں کہ جب اکیلے فرض نماز پڑھیں تو ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' اور ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى'' کو بڑھالیں اور اگر نفل نماز ہو تو تسبیح بھی کہیں اور وہ دعائیں بھی مانگیں جو قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔ اگر قرآن کی دعا ہے تو اس کو بطورِ دعا پڑھیں گے، بطورِ تلاوت نہیں پڑھیں گے۔ کیونکہ قرآن سجدے میں پڑھنا جائز نہیں ہے، رکوع میں پڑھنا جائز نہیں ہے۔ قرآن امام بن کر آیا ہے، عظمت ومقام رکھتا ہے۔

دعا کے آداب:

جب انسان اپنی عاجزی کا اقرار کرتا ہے کہ اے اللہ! میں اپنی پستی کو پہنچ گیا ہوں اور تیرے دروازے پر گر گیا ہوں تو اللہ پاک کی رحمت جوش میں آتی ہے۔ اب جب بندہ مانگتا ہے تو دعا جلدی منظور ہو جاتی ہے۔ جب دل غافل ہو تو اس وقت دعا نہ مانگا کریں۔ اگر دل لگ نہیں رہا تو چپ کر کے جلدی سے ختم کر دیں۔ دعا مانگنے کا وقت وہ ہوتا ہے کہ جب اللہ سے تیرا دل جڑ جائے، دعا مانگتے ہوئے لطف آرہا ہو اور زبان پر اور سے اور الفاظ آرہے ہوں، پھر زبان پر عاجزی ہو، بدن پر کپکپی ہو اور آنسو بہہ رہے ہوں۔ یہ گھڑی مل جائے تو مانگنے کی جلدی کیا کرو، کیونکہ یہ رحمت کی گھڑی ہوتی ہے اور اس وقت دعا قبول ہو رہی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ دعا مانگنے کی توفیق دیتے ہیں۔ اگر وہ مانگنے نہ دے تو ہم کیسے دعا مانگ سکتے ہیں؟

ایک اللہ والے کا واقعہ:

ایک اللہ والے تھے ان پر کوئی مصیبت آگئی تو لوگ ان کے پاس تعزیت کے لیے گئے، جبکہ حضرت بڑے خوش بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں نے کہا: آپ پر مصیبت آئی ہے اور آپ بڑے خوش بیٹھے ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ مصیبت اسی لیے تو بھیجی ہے کہ میں ان کو یاد کرنے میں کوتاہی کر رہا تھا۔

حضور ﷺ کا مقامِ عبدیت:

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی ﷺ کو جو لقب عطا فرمایا وہ ''عبد'' ہے۔ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝﴾ [الکھف:١]

''تمام خوبیاں اس اللہ کے لیے ثابت ہیں جس نے اپنے (خاص) بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں ذرا بھی کجی اور خامی نہیں رکھی۔''

یہ کتنی شان والی بات تھی اور یہاں بھی لفظ ''عبد'' آیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا﴾ [الجن:۱۹]

''جب میرا عبد (محمد مصطفیٰ ﷺ) کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔''

اور ایک اور جگہ فرمایا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا﴾ [الاسراء:۱]

''وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندہ (محمد ﷺ) کو شب کے وقت لے گئی۔''

یہاں بھی لفظ عبد ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو حکم دیا کہ جب آپ پر غم آ جائیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ عبد بنیں، میری عبادت کریں۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ﴾ [الحجر:۹۷]

''اور ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کر رہے ہیں، اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں۔''

کبھی آپ کو شاعر کہتے ہیں اور کبھی جادوگر کہتے ہیں۔ ہمیں پتا ہے کہ آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور ایک جگہ فرمایا:

﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ [الحجر:۹۹]

''اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے، یہاں تک کہ آپ کو موت آ جائے۔''

جب میرے عبد بن جاؤ گے تو تم سے ساری مصیبتیں اور پریشانیاں رفع ہو جائیں گی۔

عبادت کا ایک طریق یہ ہے:

علامہ رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ بندہ عبادت اس لیے کرتا ہے کہ مجھے ثواب ہو یا اس لیے عبادت کرتا ہے کہ مجھے عذاب نہ ہو۔ یہ مقام بھی ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ یہ تو ایک غرض ہے۔ اصل عبادت یہ ہے کہ اپنے اللہ کو حاصل کرنے کے لیے اور اللہ تک پہنچنے کے لیے عبادت کرے، جو کمالِ صفات سے متصف ہے۔ اگر ثواب حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھی یا جہنم سے بچنے کے لیے نماز پڑھی تو گویا تیری نماز ہی نہیں ہوئی ہے۔

بہر حال یہ صوفیاء کا قول ہے اور صوفیاء کے جتنے اقوال ہیں وہ شریعت کے مقابلے میں حجت نہیں ہیں، کیونکہ ان

کا اپنا ذوق ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذوق اور استغراق میں ایک بات کہہ دیتے ہیں، لیکن وہ شریعت میں حجت نہیں ہوتی۔ شریعت میں یہ ہے کہ انسان اللہ کی عبادت کرے اور ثواب کی نیت رکھے اور جہنم سے پناہ مانگے۔ اگر جہنم سے بچنا ضروری نہ ہوتا تو ہمیں حضور ﷺ اس سے بچنے کی دعائیں نہ سکھلاتے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

اصل بات یہ ہے کہ ان کا مقام بہت بلند ہوتا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک بچہ آیا۔ وہ نوجوان بچہ تھا۔ میں اس کے سامنے بڑا شرمندہ ہوا۔ اس نے پوچھا کیا حال ہے؟ میں نے کہا: الحمد للہ! اللہ کا شکر ہے، مل جاتا ہے تو شکر کرتے ہیں اور اگر نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں۔ وہ لڑکا ہنس پڑا۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کیوں ہنس رہے ہو؟ اس نے کہا: ''نَعُوْذُ بِاللّٰہِ!'' ہمارے علاقے کے کتے بھی اسی طرح کرتے ہیں، ان کو دے دو تو کھا لیتے ہیں، اگر نہ دو تو مالک کے دروازے پر پڑے رہتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ تو مجھ سے بھی آگے ہے۔ میں نے کہا: جو تمہارے علاقے کے بزرگ ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟ اس نے کہا: اگر مل جائے تو دوسروں کو کھلا دیتے ہیں اور نہ ملے تو خوش بیٹھے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں: اس سے مجھے اس کا مقام معلوم ہوا۔

جنتیوں کے لیے سب سے بڑی نعمت:

بہر حال! نماز اس لیے پڑھو کہ اللہ راضی ہو جائے، جب اللہ راضی ہوں گے تو خود بخود جنت ملے گی اور جہنم سے نجات ہوگی۔ اس لیے حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب لوگ جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ فرمائیں گے مانگو، مانگو کیا مانگتے ہو؟ تو وہ عرض کریں گے: یا اللہ! اور بھی کوئی چیز رہ گئی ہے جو ہم مانگیں؟ آپ نے تو ہمیں اتنی نعمتیں دی ہیں جن کو ہماری آنکھوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا اور ہمارے دل و دماغ کے اندر بھی کبھی نہیں آئی تھیں۔ اب کون سی نعمت ہے جو ہم مانگیں؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں تمہیں آج ایسی نعمت دیتا ہوں جو تمہیں پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ جنت والے حیران ہو جائیں گے کہ وہ کون سی نعمت ہے؟ اللہ فرمائیں گے:

((أُحِلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِي فَلَا أَسْخَطُ بَعْدَهُ أَبَدًا))

''آج میں تمہیں اپنی رضا دیتا ہوں جس کے بعد تم پر ناراضگی کبھی نہیں آئے گی۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۵۱۸، باب: كَلَامِ الرَّبِّ مَعَ أَهْلِ الْجَنَّةِ]

اس لیے رضا والا مقام جنت سے بھی بڑھ گیا۔ اس لیے صوفیاء کے اقوال کا بھی یہ مقصد ہے کہ اصل عبادت صرف اللہ کے لیے ہو۔

سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ کے وزیر ایاز کا واقعہ:

جیسے ایک مثال ہے کہ ایاز غلام کو بادشاہ بڑا محبوب رکھتے تھے۔ لوگوں نے کہا: یہ کالا غلام ہے، بادشاہ کیوں اس پر دیوانہ ہو گیا ہے؟ ایک دن بادشاہ نے حکم دیا کہ ہمارے اس کمرے کے اندر جو چیزیں پڑی ہوئی ہیں جس کا جو جی چاہے ہر آدمی ایک ایک چیز اٹھالے۔ کسی نے قیمتی جام اٹھالیا، کسی نے قیمتی قالین اٹھالیا، کسی نے قیمتی موتی اٹھالیا اور کسی نے کرسی اٹھالی، لیکن ایاز کونے میں خاموش کھڑا ہے۔ بادشاہ نے ایاز سے پوچھا: تم چپ کیوں کھڑے ہو؟ سارے لوگوں نے چیزیں لے لی ہیں، تمہیں اس کمرے سے جو چیز چاہیے وہ لے لو۔ اس نے کہا: مجھے صرف آپ پسند ہیں، مجھے صرف آپ کا قرب چاہیے۔ آپ مجھے مل جائیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ تو بادشاہ نے باقی وزیروں سے کہا: دیکھو! اب تم نے سمجھ لیا ہے؟ کسی کو جام عزیز تھا اور کسی کو قالین عزیز تھا۔ تمہیں چیزیں پسند ہیں، ایاز کو تو میں عزیز اور پسند ہوں۔ اس لیے ایاز مجھے پیارا لگتا ہے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس کی نظر ان چیزوں پر نہیں تھی، بلکہ مجھ پر تھی۔ اس لیے جس کو اللہ کی رضا حاصل ہو جائے اس کو دوسری چیزوں کی کیا پرواہ ہے۔

ایک اعرابی نے کہا تھا: مجھے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا مرتبہ نہیں چاہیے، مجھے جنت چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہی تو جنت ہے جس کے لیے محنت اور کوشش کی جاتی ہے۔ اللہ ہر کلمہ پڑھنے والے مسلمان کو جنت نصیب فرمائے۔

''اَلصِّرَاط'' کی قرأت:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ [الفاتحۃ: ۵]

اکثر قراء نے اس کو صاد کے ساتھ پڑھا ہے، لیکن قنبل رحمۃ اللہ علیہ اور اویس رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سین کے ساتھ پڑھا ہے۔

جیسے: ﴿اِهْدِنَا السِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ [الفاتحۃ: ۵]

اور بعض قراء (جیسے: خلف عن حمزۃ) نے سین کو زاء کے ساتھ ملا کر پڑھا ہے: ﴿اِهْدِنَا الزِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ [الفاتحۃ: ۵]

لیکن جمہور ائمہ کے نزدیک جو مشہور قرأت ہے وہ صاد کے ساتھ ہی ہے: ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝﴾ [الفاتحہ:۵]

علامہ فراء رحمہ اللہ نے باقی قراءات کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ بنو عذرہ اور بنو کلب کی لغت بھی، وہ اس کو زاء کے ساتھ پڑھتے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۲۶، الفاتحہ، الآیۃ: اِهۡدِنَا الزِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ]

علماء نے فرمایا: قراءات ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں الفاظ بھی بدل جاتے ہیں، جیسا کہ قرآن مقدس میں ''نُنۡشِزُهَا'' کو ''نُنۡشِرُهَا'' بھی پڑھا گیا ہے، کبھی الفاظ نہیں بدلے جاتے ہیں، لیکن پڑھنے والے کے لحن سے ''سین'' سمجھا جاتا ہے، حالانکہ وہ ہوتا ''صاد'' ہے۔

بعض حروف کے مشکل مخارج:

جیسے ''ضاد'' اور ''ظاء'' میں فرق کرنا قاریوں کا کام ہے، عام آدمی فرق نہیں کر سکتا۔ اور بعض لوگ غلطی کرتے ہیں، وہ ''ضاد'' کو ''دال'' پڑھ دیتے ہیں، حالانکہ معنی بدل جاتا ہے اور آدمی کفر تک چلا جاتا ہے۔ ''اَلضَّآلِّيۡنَ'' کا معنی ہے گمراہ ہونے والے اور ''اَلدَّآلِّيۡنَ'' کا معنی ہے دلالت کرنے والے۔ اس لحاظ سے آسمان اور زمین کا فرق پڑ گیا اور آدمی کفر کے کناروں تک چلا گیا۔

بعض لوگ ایک حرف پڑھتے ہیں، لیکن معلوم دوسرا حرف ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ''وَذَرۡنِيۡ وَالۡمُكَذِّبِيۡنَ'' کو جب پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ ''وَجَزۡنِيۡ وَالۡمُكَذِّبِيۡنَ'' پڑھ رہے ہیں۔ وہ بے چارے ادا نہیں کر سکتے۔ بعض لوگ بالکل لفظ ہی الٹ دیتے ہیں۔ جہاں ''جیم'' آجائے وہاں ''گاف'' لگا دیتے ہیں۔ ''حَاجَةً'' کی بجائے ''حَاگَةً'' پڑھیں گے۔ بہر حال یہ قرأت کے بارے میں آ گیا۔

دعا کی قبولیت کی شرائط:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دعا کے مقبول ہونے کے لیے شرط ہے:

1 ...... پہلے حمد و ثنا بیان کرے، پھر اپنی بندگی، عاجزی اور اپنی ذلت کا اعتراف کرے۔

2 ...... اس کے بعد پروردگار عالم سے دعا کرے۔

اس طریقہ سے اللہ دعا قبول فرماتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری دعائیں قبول ہو جاتی ہیں یا جو مانگتے ہو وہ تو نہیں ملا، لیکن

اللہ کسی مصیبت کو ٹال دیتے ہیں یا قیامت کے دن کے لیے اس کو ذخیرہ بنادیا کہ جب میرا بندہ آئے گا وہ محتاج ہوگا، اس وقت اس کو نعمتیں عطا کردوں گا۔ تو دعا کسی حال میں خالی نہیں گئی۔

دنیا میں دعا جلد قبول ہوجائے اس کے لیے یہ شرائط ہیں:

1 ...... آدمی پاک ہو ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی، کفر سے بھی پاک، شرک سے بھی پاک اور بدعات وغیبت سے پاک ہو۔ غسل کرنے میں دیر لگے گی، لیکن دل سے توبہ کرنے سے اللہ اس کے باطن کو فوراً پاک فرمادیتے ہیں۔

2 ...... دوسرا قبلہ کی طرف متوجہ ہو۔

3 ...... تیسری بات جب دعا کرے تو پہلے اللہ کی حمد وثنا کرے اور اللہ کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ دعا مانگے اور جو بھی اللہ کے اسماء یاد ہوں ان سے خدا کو پکارے۔

4 ...... چوتھی بات کہ غافل دل کے ساتھ دعا نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ دعا اللہ سے مانگ رہا ہے، لیکن دل اور فکر کسی دوسری جگہ اٹکی ہوئی ہے۔

5 ...... پانچویں بات کہ ایسی دعا مانگے جو ہمیں حضور ﷺ نے سکھلائی ہے۔

6 ...... کوئی دعا شریعت کے خلاف نہ مانگے، مثلاً: یوں نہ کہے کہ فلاں شخص کا مال ہلاک کردے اور مجھے دے دے۔

7 ...... رونے کی کوشش کرے۔ اگر رونا نہ آئے تو رونے کی شکل بنالیں۔

8 ...... اللہ کی تعریف کریں۔

9 ...... پھر حضور ﷺ پر درود شریف پڑھیں۔

10 ...... اور جب دعا ختم کریں تو بھی حضور ﷺ پر درود شریف پڑھیں۔

کیونکہ درود شریف کی برکت سے دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔ یہ طریقہ سب سے زیادہ اثر کرنے والا ہے۔

کبھی انسان تعریف کرتا رہتا ہے، لیکن مانگتا کچھ بھی نہیں ہے، مگر تعریف وثنا کے اندر بھی سب کچھ آگیا۔ جب ''یَا رَحِیْمُ'' کہا تو اس کے اندر رحمت کی دعا آگئی، جب ''یَا رَزَّاقُ'' کہا تو رزق کی دعا آگئی کہ جب تو رزاق ہے تو اپنے خزانہ غیب سے رزق عطا فرما۔ جیسے کسی شاعر نے کہا تھا:

أأذكُرُ حَاجَتِي أَمْ قَدْ كَفَانِي حَيَاءُ
كَفَاهُ مِنْ تَعَرُّفِهِ الثَّنَاءُ

''کیا میں آپ کے سامنے اپنی حاجت کو رکھوں؟ مجھے آپ کے سامنے اپنی حاجت پیش کرنے سے حیا آتی ہے۔آپ کے لیے اپنی حاجت پیش کرنے کے بجائے آپ کی ثنا ہی کافی ہے۔''

ہدایت کے متعلق اشکال وجواب:

ہدایت کا معنی کیا ہے؟ یہ سمجھنا ضروری ہے، وگرنہ قرآن میں کئی جگہ تعارض لگتا ہے۔ مثلاً: حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ نے ہدایت کرنے والا بنا کر بھیجا، یعنی آپ ہادی ہیں۔اسی طرح حضور ﷺ نے حضرت امیر معاویہ ﷺ کے بارے میں دعا فرمائی:

((اللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا)) [سنن الترمذی، حدیث: ۳۸۴۲، بَابُ مَنَاقِبِ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ...]

''یا اللہ! اس کو ہدایت کرنے والا اور ہدایت یافتہ بنا۔''

دوسری جگہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾ [القصص: ۵۶]

''آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدیت کر دیتا ہے۔''

تو ایک جگہ ہدات کرنے کا حکم ہے اور دوسری جگہ یہ ہے کہ آپ ہدایت نہیں کر سکتے۔ جب ایسے تعارض آتے ہیں تو پریشانی ہوتی ہے۔

ہدایت کا معنی ہے کمال مہربانی سے کسی کی منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کرنا۔ پھر اس ہدایت کے درجات ہیں: ہدایت عامہ، ہدایت خاصہ اور خاص الخاص ہدایت۔

وسیلہ کی جائز اقسام:

جب ہدایت کے معانی پڑھ لیے تو اب ایک خاص مسئلہ پڑھیں کہ وسیلہ جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں نے وسیلہ کا یہ معنی سمجھ لیا ہے کہ وسیلے کے بغیر ہمارا اللہ سے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔اس لیے انبیاء علیہم السلام، صلحاء اور شہداء رحمہم اللہ کے وسیلے سے دعا مانگتے ہیں اور آگے بڑھے تو پیروں کے وسیلے سے دعا مانگتے ہیں۔جب ان لوگوں سے آپ کہیں کہ وسیلے کا حکم

تو کہیں نہیں ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وسیلے سے ہی تو سب کچھ ملا ہے۔ اگر ہمیں قرآن ملا، ہدایت ملی، نماز ملی اور دین ملا، یہ ہمیں انبیاء علیہم السلام کے وسیلے سے ملا ہے تو ان کے بغیر کام کیسے ہوگا؟ اس کے اندر ایسا غلو آ گیا ہے کہ لوگ کفر وشرک کی حد سے آگے نکل گئے۔ اس لیے اس مسئلے کو ٹھنڈے دل سے سمجھیں۔

یاد رکھیں! ایک ہے ماتحت الاسباب وسیلہ پکڑنا اور ایک ہے مافوق الاسباب وسیلہ پکڑنا۔ آدمی پانی پیتا ہے تو یہ سبب ہے کہ اس سے پیاس بجھ جاتی ہے، کھانا کھانے سے بھوک ختم ہو جاتی ہے، آرام کرنے سے تھکن دور ہو جاتی ہے اور دوا سے بیماری ختم ہو جاتی ہے۔ یہ سارے اسباب ہیں، اس کو ماتحت الاسباب کہتے ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کا وسیلہ پکڑنا، اس سے شریعت منع نہیں کرتی۔ مثلاً: میں کہوں کہ مجھے تکلیف ہے، ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ میں نے آپ کو وسیلہ بنایا، آپ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے، ڈاکٹر نے مجھے دوا دی۔ تو یہ ماتحت الاسباب ہیں۔ یہ اسباب ہیں، ان کے اندر وسیلہ جائز ہے۔

مافوق الاسباب یہ ہے کہ ایک ایسا کام آ گیا کہ اسباب کی حد تک ہم اسے نہیں کر سکتے۔ مثلاً: ایک آدمی کے بارے میں ڈاکٹروں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کو کینسر ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اب اسباب ختم ہو گئے اور علاج ختم ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اسباب تو ختم ہیں، لیکن اللہ تو قادر ہے۔ ہمارا عقیدہ وایمان ہے کہ اللہ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں فرمائی جس کی دوا نہ ہو، ہر بیماری کی دوا موجود ہے۔ فرمایا:

((مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ دَاءً إِلَّا أَنْزَلَ لَهُ دَوَاءً)) [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۳۴۳۸ بَابُ: مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ دَاءً إِلَّا...]

''اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری پیدا نہیں کی مگر اس کی دوا بھی پیدا کی ہے۔''

یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم اس دوا کو نہ ڈھونڈ سکیں۔

جب مافوق الاسباب مسئلہ پیش آ جائے تو اپنے اعمالِ صالحہ کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے کے اندر بھی کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ جیسے صحیح حدیث کے اندر غار والوں کا قصہ ہے۔ انہوں نے اپنے اعمالِ صالحہ سے وسیلہ پکڑا۔ یہ جائز ہے۔

اسی طرح مافوق الاسباب مسئلہ ہے۔ اگر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو ان کے پاس جائیں یا اللہ والوں کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ ہماری مدد کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں بچا لے۔ تو یہ جائز ہے۔

وسیلہ کی ناجائز اقسام:

اب رہا یہ مسئلہ کہ کہاں پر وسیلہ جائز نہیں ہوتا۔ اللہ کا ولی زندہ ہے یا فوت ہو چکا ہے اور کوئی بندہ یہ سمجھ کر ان کا وسیلہ پکڑ رہا ہے کہ جس بندے کو میں وسیلہ بنا رہا ہوں اس کی اتنی طاقت ہے اور یہ اتنا مختار ہے کہ اس کی بات رد ہی نہیں ہوسکتی۔ تو یہ شرک ہے۔ اور یہی وہ شرک تھا جو ابوجہل اور ابولہب کرتے تھے۔

اللہ معاف فرمائے ہمارے ملک میں ایک بزرگ کی خانقاہ ہے، اس کے ساتھ ایک قبر خالی رکھی ہوئی ہے کہ ایک پیر صاحب زندہ ہیں، ان کی انتظار ہے۔ جن بزرگوں کی خانقاہ ہے ان کا لقب قیوم ہے۔ یہ ایک باقاعدہ فرقہ ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں چار قیوم پیدا ہوئے اور پانچویں میں جھگڑا ہے۔ اور ان کی باقاعدہ کتاب "اَلرَّوْضَۃُ الْقَیُّوْمِیَّۃُ" ہے، جس کے اندر انہوں نے لکھا ہے کہ قیوم کے درجے ہیں۔ مثلاً پیر ہے، دستگیر ہے، پھر قطب ہے، پھر غوث ہے، پھر ابدال ہے اور آخری درجہ قیوم ہے۔ اور اس میں لکھا ہے کہ جو اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو زمین و آسمان، سورج اور چاند کی حرکت بلکہ عرش و کرسی جس پر اللہ کی ذات مستوی ہے، معاذ اللہ! اس قیوم کے سائے میں ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ بارش کا کوئی قطرہ اور درخت کا کوئی پتہ بھی قیوم کی مرضی کے بغیر نہیں گر سکتا۔ اور ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ساری دنیا میں جو دعائیں مانگی جارہی ہیں وہ پہلے اس قیوم کے سامنے پیش ہوتی ہیں۔ اگر قیوم منظور کرے تو دعا اوپر چلی جاتی ہے، وگرنہ قبول نہیں ہوتی۔ میں کسی پر کوئی جھوٹی تہمت نہیں لگا رہا۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو وہ کتاب بھی پڑھا سکتا ہوں۔ اور اس حرم میں اس علاقہ کے لوگ بھی موجود ہیں، ان کی گواہی بھی دلا سکتا ہوں۔

جب انسان کا یہ عقیدہ ہو جائے تو اس سے بڑا کفر و شرک بھی دنیا میں ہوگا؟ یہ وسیلہ پکڑنا اور استعانت کرنا شرک ہے، اس میں کسی کو کوئی شبہ بھی نہیں ہے۔ ایک مطلق ہدایت کے درمیان واسطہ سمجھنا، مثلاً: آپ کے گھر میں ایک پنکھا لگا ہوا ہے بجلی کی ٹیوب لائٹیں لگی ہوئی ہیں، بلب لگے ہوئے ہیں، پنکھا ہوا دے رہا ہے یا بلب روشنی دے رہا ہے تو یہ خود ہوا اور روشنی نہیں دے رہے، بلکہ ان کے پیچھے تار کے ذریعے بجلی سے تعلق ہے۔ اگر وہ تعلق نہ رہے تو ان کی ہوا اور روشنی ختم ہو جائے گی۔ اب اگر کوئی اس کو یوں کہے کہ پنکھا خود ہی کرنٹ کے بغیر ہوا دیتا ہے تو یہ جہالت ہے۔ اصل میں روشنی اور ہوا اس وقت آئی جب اس میں کرنٹ آیا۔

ہدایت اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں:

اسی طرح کوئی یہ کہے کہ جب سب کچھ کرنٹ کرتا تو میں پنکھا اور لائٹ توڑ دوں تو یہ غلط بات ہے، کیونکہ اگر پنکھا

اور بلب نہیں ہوگا تو لائٹ کس کے اندر آئے گی؟ تمہارے اندر تو کرنٹ نہیں آسکتا۔ اس لیے یہ عقیدہ رکھیں کہ سب چیزوں کا مالک خدا ہے، اس نے ہماری ہدایت کے لیے پیغمبر بھیجے ہیں، ہدایت دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے ہدایت دینے کے لیے کتابیں بھیجیں، پیغمبر بھیجے اور علماء بھیجے اور ان کو ہماری ہدایت کا ذریعہ بنا دیا۔

ہدایت جو بمنزلہ توفیق کے ہے، وہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جیسے پنکھے کا کام ہے پھرنا، لیکن طاقت اس کرنٹ میں ہے۔ اگر آپ ایک اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کا بلب لگاتے ہیں، لیکن وہ فیوز ہوتا ہے اور نہیں چلتا، پھر آپ ماہرین کو بلاتے ہیں تو وہ کہیں گے کہ اس میں کرنٹ کا کوئی قصور نہیں ہے، آپ نے جو بلب لگایا ہے وہ فیوز ہے۔ انبیاء ﷤ چاہے کتنے بڑے آئے ہوں، اگر ہمارے دل کا بلب فیوز ہو گیا ہو تو روشنی کہاں سے آئے گی؟ ابوجہل کا بلب فیوز ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ﴾[البقرۃ:۷]

''اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔''

جب اللہ نے مہر لگا دی تو اس کے اندر نور کیسے جائے گا؟

اب سمجھیں کہ ہدایت کے لیے اللہ نے انبیاء ﷤ بھیجے، ہدایت ان کے ذریعے ملی، لیکن ہدایت دینے والا اللہ ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ جب ہدایت دینے والا اللہ ہے تو ہم انبیاء ﷤ کا انکار کر دیں، صحابہ کا انکار کر دیں، علماء کا انکار کر دیں یا ائمہ اور فقہاء کا انکار کر دیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ آدمی اپنے گھر سے اے سی بھی نکال دے، پنکھا بھی نکال دے، بجلیاں بھی اکھاڑ دے اور اب کہے کہ پیچھے پاور ہے، روشنی خود بخود آجائے گی یا ٹھنڈک خود بخود آجائے گی۔ تو لوگ کہیں گے کہ یہ پاگل ہے۔

ایک ہدایت یہ ہوئی کہ کمالِ مہربانی سے منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کرنا اور ایک یہ ہے کہ کمالِ مہربانی سے منزلِ مقصود تک پہنچا دینا۔ یاد رکھیں! راستہ دکھانا انبیاء ﷤، علماء، اولیاء، صلحاء، واعظین، مرشدین اور مبلغین ﷭ کے ذمہ ہے اور اس کو جنت میں پہنچا دینا اللہ کے ذمہ ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾[القصص:۵۶]

''آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدیت کر دیتا ہے۔''

جب ابو طالب مسلمان نہ ہوئے اور حضور ﷺ پریشان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ اے میرے مدنی (ﷺ)! ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، آپ کے ذمہ ہے کہ آپ ہدایت پہنچا دیں۔

﴿فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ﴾ [الرعد:٤٠]

''پس آپ کے ذمہ تو صرف (احکام) کا پہنچا دینا ہے اور حساب کرنا تو ہمارا کام ہے۔''

آپ کے ذمہ بات پہنچانا اور راستہ دکھانا تھا، ایمان دینا اور جنت تک پہنچانا میرے ذمہ ہے، آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس لیے جب جنتی جنت میں داخل ہوں گے تو کہیں گے:

﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ [الاعراف:٤٣]

''اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ہمیں توفیق دی اور جنت میں داخل کیا۔ اگر اللہ ہمیں یہ توفیق نہ بخشتے تو ہم کبھی جنت میں داخل نہ ہو سکتے۔''

جب ہم ہدایت کو اس مفہوم میں لیں گے تو ہمارے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ اس لیے جہاں حکم ہے کہ ہدایت کریں اس کا معنی ہے کہ راستہ دکھائیں اور جہاں ہے کہ آپ ہدایت نہیں کر سکتے اس کا معنی یہ ہے کہ آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔

خاص الخاص ہدایت کا معنی:

ہدایت خاص الخاص کے درجات بلند ہیں۔ اس لیے ہر وقت حکم ہے کہ بندہ چاہے کتنا مومن بن جائے، عابد بن جائے یا نبوت کے درجہ پر ہو، ہر وقت کہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾

اللہ پاک نے فرمایا: جو لوگ مجھ سے ہدایت مانگتے ہیں ہم ان کی ہدایت کو اور بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ میرے مدنی ﷺ سراپائے ہدایت ہیں، ہادی بن کر آئے، لیکن اس کے باوجود اللہ نے فرمایا:

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ﴾ [الفتح:٢،١]

''(اے پیغمبر (ﷺ)!) یقین جانو! ہم نے تمہیں کھلی ہوئی فتح عطا کر دی ہے، تا کہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی تمام کوتاہیوں کو معاف کر دے اور تا کہ اپنی نعمت تم پر مکمل کر دے اور تمہیں سیدھے راستے پر لے چلے۔''

ہدایت کی اقسام:

بعض علماء نے فرمایا کہ طلب ہدایت کا معنی ''اِثْبَاتٌ عَلَى الْهِدَايَةِ'' ہوتا ہے، ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کا معنی ''ثَبِّتْنَا عَلَى الْهِدَايَةِ'' ہوتا ہے کہ یا اللہ! ہمیں اس ہدایت پر ثابت قدم رکھنا، تاکہ ہم موت تک ہدایت پر رہیں۔

علامہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہدایت کا معنی ارشاد اور توفیق بھی ہے۔

کبھی کبھی ہدایت متعدی بنفسہ ہوتی ہے۔ جیسے یہاں ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' ہے۔ یہاں معنی ارشاد اور دلالت ہے۔ اور کبھی ہدایت متعدی باللام ہوتی ہے، جیسے اہلِ جنت قیامت میں کہیں گے: ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۣ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ [الاعراف: ۴۳] (یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمیں اس کی توفیق بخشی اور اس قابل بنایا کہ ہم تیری جنت میں آسکیں)۔

ہدایتِ عامہ، ہدایتِ خاصہ اور ہدایتِ خاص الخاص کو علماء نے دوسرے طریقے سے بھی سمجھایا ہے کہ ایک انابت ہوتی ہے، دوسری ہدایت، تیسری استقامت اور چوتھی شیخ ربط علی القلب ہوتی ہے۔

❁......﴿وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ﴾ [الزمر: ۵۴] (اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جاؤ)۔ یہ انابت کا مرتبہ ہے۔

❁......دوسرا درجہ ہدایت کا اور تیسرا درجہ استقامت کا ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ [حم السجدۃ: ۳۰] (جنہوں نے اپنے رب کی ربوبیت کا اقرار کیا پھر اس پر ڈٹ گئے)۔

❁......اور اس سے بھی اوپر ایک درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا﴾ [الکہف: ۱۴] (اور ہم نے ان کے دل خوب مضبوط کر دیے تھے اس وقت جب وہ اٹھے)۔ جن پر ہم راضی ہوتے ہیں ان کے دلوں کو اپنی قدرت کے ہاتھ سے تھام لیتے ہیں۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں راز کھول دیتی کہ میرا بیٹا ہے، یا بہن راز کھول دیتی کہ میرا بھائی ہے تو کیا ہوتا؟ لیکن اللہ فرماتے ہیں: ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا۔ اسی طرح اصحابِ کہف کے بارے میں آیا ہے۔

یہ مرتبہ اللہ کے اولیاء کا ہوتا ہے کہ ان کو اللہ پاک ایک خصوصی مرتبہ و مقام عطا فرماتے ہیں کہ اگر ایسا کوئی مرحلہ آئے تو قدرت خود تھام لیتی ہے، کیونکہ ان کے قلوب اللہ کی قدرت میں ہیں۔ اس لیے ان کو مشکل میں پھنسنے سے خود بچا لیتے ہیں۔ اس لیے سب سے افضل، اجمع اور اکمل دعا سورۂ فاتحہ ہے۔

"الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کی تفسیر اور معانی:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میں "الصِّرَاطَ" موصوف ہے اور "الْمُسْتَقِيْمَ" صفت ہے، یعنی سیدھا راستہ۔ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے کیا مراد ہے؟ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس پر مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس کا معنی کھلا راستہ ہے، جس میں ٹیڑھا پن اور کجی نہ ہو۔ لغت کی تمام کتابوں میں دیکھیں اور شعرائے عرب کے کلام میں بھی "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کا یہ معنی ہے کہ ایسا راستہ ہے جس میں ٹیڑھا پن نہ ہو۔

عرب لوگوں نے لفظ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کو استعارہ کے طور پر قول اور عمل میں استعمال کیا ہے کہ قول سیدھا ہو، عمل سیدھا ہو۔

مفسرین سلف اور خلف کا لفظ "صِرَاطَ" کی عبارت کے بارے میں اختلاف ہے، اگرچہ یہ اختلاف لفظی ہے۔ کیونکہ تمام اقوال کا مرجع یہ ہے کہ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کا معنی یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چلے۔ بعض علمائے سلف نے فرمایا: "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے مراد کتاب اللہ، قرآن مجید ہے۔ یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہے۔

فضائل قرآن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت موجود ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن اللہ کی مضبوط رسی، اللہ کا ذکرِ عظیم اور صراطِ مستقیم ہے۔ جو اللہ کے قرآن کو پکڑ لے گا وہ اللہ تک پہنچ جائے گا۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۹۰۶] اور موقوفاً بھی ایک روایت ہے۔

حضرت منصور رحمہ اللہ نے ابو وائل سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے مراد اللہ کا قرآن ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اسلام مراد ہے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آ کر عرض کیا: "قُلْ يَا مُحَمَّدُ! اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" پڑھیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں الہام فرما دے، ہمیں ایسا راستہ بتا دے جو ہدایت کرنے والا ہے۔ اور وہ راستہ اللہ کا دین ہے جس میں کوئی کجی اور ٹیڑھا پن نہیں ہے۔

حضرت میمون بن مہران رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کے بارے میں نقل

فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: اس سے اسلام مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن محمد بن عقیل رحمہ اللہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل فرماتے ہیں کہ "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" سے اسلام مراد ہے۔ اور اسلام میں اتنی وسعت ہے کہ آسمان اور زمین سے بھی زیادہ وسعت رکھنے والا ہے۔ حضرت ابن حنفیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" سے دینِ اسلام مراد ہے۔ کیونکہ دینِ اسلام ایسا دین ہے کہ اس کے ماسوا بندوں سے اللہ تعالیٰ اور کوئی طریقہ قبول نہیں کریں گے۔

جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران:۱۹]

"بے شک (معتبر) دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔"

اور فرمایا:

﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾

[آل عمران:۸۵]

"اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس سے مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔"

"الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" سے اگر اسلام مراد ہے تو وہ بھی سیدھا راستہ ہے اور اگر اس سے قرآن مراد ہے تو وہ بھی سیدھا راستہ ہے۔ یہ سارے تفسیری اقوال ہیں جو ہمیں سمجھانے کے لیے ہیں، تاکہ بات سمجھ میں آجائے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۷، الفاتحہ، الآیۃ: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ]

اسلام دین بھی ہے اور مذہب بھی:

مذہب عبادات کے مجموعے کا نام ہے، یعنی نماز، روزہ، حج، زکوۃ، خیرات، صدقات، عمرہ کر لینا اور حج کر لینا، یہ مذہب ہے۔ لوگوں نے آج اسلام کو بطور مذہب تو قبول کیا ہے، لیکن بطور دین قبول نہیں کیا ہے۔ بس یہی سمجھ لیا کہ اسلام ایک مذہب (عبادات کا مجموعہ) ہے اور ہم جتنے مسلمان ہیں مذہب اسلام پر ہیں۔ اسی لیے آج جتنا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے ان کو یہ مغالطہ ہے، وہ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک اللہ کے ساتھ ذاتی معاملہ ہے۔ کوئی نماز پڑھتا ہے تو ٹھیک، کوئی نہیں پڑھتا تو بھی ٹھیک ہے۔ ہمیں نماز کے لیے کہنے والے لوگ کون ہوتے ہیں؟ کوئی آدمی حج کرتا

ہے تو اچھی بات ہے، اگر حج نہیں کرتا تو ہمیں کہنے والے کون ہیں کہ حج کرو۔ حالانکہ پورے قرآن پاک میں دیکھیں تو کہیں مذہب کا لفظ نہیں آیا، بلکہ دین کا لفظ آیا ہے۔

دین سر سے لے کر پاؤں تک تمام معاملات کو کہتے ہیں۔ چاہے معاشی ہوں، معاشرتی ہوں، سیاسی ہوں، شخصی ہوں، اجتماعی ہوں، بین الاقوامی ہوں یا بین الملکتی ہوں سب پر اللہ کے دین کو حاوی کر کے نافذ کریں تو دین اسلام نافذ ہوتا ہے۔

کہتے ہیں: نماز پڑھیں۔ ہم نماز سے نہیں روکتے، یہ تو کافر ملکوں میں بھی ہے، بلکہ وہ جمعہ اور عیدین بھی پڑھتے ہیں۔ اپنے اسلام کے مطابق عید الفطر، عید الاضحیٰ مناتے ہیں۔ میرے بھائی اس کا معنی دینِ اسلام نہیں ہے، بلکہ دین اس کو کہتے ہیں کہ اوپر سے لے کر نیچے تک صرف اللہ کا حکم چلے۔

جدید مسائل کا حل:

تمام دنیا اللہ کی مخلوق ہے۔ اللہ جسے امیر بناتے ہیں، خلیفہ بناتے ہیں یا بادشاہ بناتے ہیں تو وہ مسلمانوں کا امیر المؤمنین ہوتا ہے، اللہ کے احکامات کو نافذ کرنے والا ہوتا ہے۔ خود کوئی قانون بنانے والا نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کے قانون کو چلانے والا ہوتا ہے۔ اگر کوئی جدید مسئلہ پیدا ہو جائے جس کا قرآن وسنت میں، آثار صحابہ میں کوئی واضح راستہ نہ ملے تو ان لوگوں کو جو قرآن وسنت کے عالم ہوں گے ان کو بتلائے گا کہ اس مسئلہ کا قرآن وسنت اور اقوالِ صحابہ سے کوئی حل نکالو۔

جیسے بے بی ٹیوب ایسا مسئلہ ہے جو حضور ﷺ کے زمانہ میں موجود نہیں تھا، کسی انسان کا دل نکال کر دوسرے انسان میں لگا دینا یہ حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا۔ اور اسی طرح کسی کے دل کے وال بند ہو جائیں تو یہ وال پلاسٹک کے بھی مل جاتے ہیں یا خنزیر کے بھی مل جاتے ہیں۔ آدمی کی جو رگیں ہیں ان کو عروقِ شعریہ کہتے ہیں جو بال کے برابر ہیں کہ دل کا وال کام نہیں کر رہا کہ اس کے اندر کوئی ہوا آگئی ہے یا کوئی چربی آگئی ہے۔ اس کو صاف کر لیں گے یا اس رگ کو بدلنا پڑے گا کہ وہ خراب ہوگئی ہے۔ خنزیر والا وال سستا ہے اور پلاسٹک والا مہنگا ہے۔ اگر ہم انسان کے دل میں خنزیر کا وال لگائیں تو کیا وہ نماز روزہ ادا کر سکے گا؟ یہ نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

اسی طرح ایک آدمی نے مرنے کے وقت وصیت کی کہ میں جب مرنے لگوں تو میری آنکھیں نکال کر کسی کو دے دیں۔ یہ مسئلہ حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھا، یہ نیا مسئلہ ہے کہ جب میں مر جاؤں گا پھر میری آنکھ رہے یا نہ

رہے کیا فرق پڑتا ہے؟ چلو! میری آنکھوں سے کسی کو فائدہ ہو جائے گا۔ اب معلوم کرنا ہے کہ آنکھیں انسان کی ملک ہیں یا اللہ کی امانت ہیں؟ اگر ملک ہیں تو انسان ان میں تصرف کر سکتا ہے یا نہیں کر سکتا؟ اور اگر امانت ہے تو اس کے اندر خیانت کیسے ہوگی؟ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے صرف وہ لوگ کافی نہیں ہیں جنہوں نے قرآن کبھی نہیں پڑھا اور جنہیں ابھی تک غسل کے فرائض کا بھی پتا نہیں ہے۔

مثلاً: آپ کے کسی ڈیم کو خطرہ پیدا ہو جائے اور ٹیکنیکل فالٹ آ جائے تو اس کے لیے آپ نے کبھی مولویوں کو نہیں بلایا کہ منگلا ڈیم کو ہم کیسے ٹھیک کریں؟ کیونکہ یہ مولویوں کا کام نہیں ہے۔ اسی طرح کسی جگہ ایک بیمار آدمی ہے اور اس کی حالت غیر ہے تو آپ کسی مولوی کو نہیں بلاتے، کیونکہ یہ ڈاکٹر کا کام ہے۔ ہاں! البتہ دعا کا کہہ دیتے ہیں۔ جیسے بیمار کے لیے ڈاکٹروں کی ضرورت ہے اور ڈیم کے لیے انجینئر کی ضرورت ہے، اسی طرح اللہ کے دین کے لیے قرآن وحدیث والوں کی ضرورت ہے۔ ورنہ آپ جب بھی مسئلہ حل کریں گے وہ غلط ہوگا اور آپ اس میں ٹھوکر کھائیں گے۔

گھر کو شریعت کے مطابق چلائیں:

اس لیے دین کا معنی یہ ہوتا ہے کہ ہم تمام امور اور تمام معاملات کے اندر دینِ اسلام کے مطابق چلیں، حتیٰ کہ گھر کے معاملات میں بھی دینِ اسلام کو دیکھیں۔

ایک عورت کا واقعہ:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں ایک رات گشت کر رہے تھے کہ ایک مکان کی چھت سے ایک عورت کے شعر پڑھنے کی آواز آئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رک کر سننے لگے۔ وہ عورت کہہ رہی تھی: آج چاندنی رات ہے اور میں اکیلی سوئی ہوئی ہوں اور میرا دوست اور خاوند قریب نہیں ہے۔ کاش! وہ میرے قریب ہوتا تو ہم بھی کھیل رہے ہوتے۔ آج اگر مجھے اللہ کا خوف نہ ہوتا تو اس چار پائی کی چولیں ہل رہی ہوتیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پتا کرایا کہ یہ کس کا گھر ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ فلاں عورت کا گھر ہے اور اس کا خاوند جہاد کرنے کے لیے گیا ہوا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سیدھے اپنی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گھر والی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے بیٹی! مجھے ایک مسئلہ تو بتاؤ کہ ایک عورت خاوند کے بغیر زیادہ سے زیادہ کتنی مدت صبر کر سکتی ہے؟ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پہلے تو شرمائیں اور اس کے بعد فرمایا کہ آپ نے قرآن میں نہیں پڑھا ہے؟

انہوں نے فرمایا: قرآن میں تو اس بارے میں کہیں بھی نہیں لکھا ہوا۔ حضرت حفصہ ﷞ نے کہا: جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس عورت کی عدت قرآن نے چار ماہ دس دن مقرر فرمائی ہے۔ اس کے بعد وہ عورت دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے۔ آخر اس کے اندر کوئی تو حکمت ہو گی۔ اس لیے عورت کو چار یا چھ ماہ سے زیادہ دور نہیں رہنا چاہیے۔

تو حضرت عمر ﷛ نے حکم جاری فرمایا کہ کوئی سپاہی یا فوجی چھ ماہ سے زیادہ باہر نہ رہے۔ اب ان کی نظر اللہ کے قرآن پر تھی تو بیٹی نے اللہ کے قرآن کے ذریعہ بتایا تو وہ حکم نافذ ہو گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۶۹، البقرۃ: آیت: وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ]

حضرت ابو بکر ﷛ کی جرأت:

حضرت ابو بکر ﷛ کے زمانہ میں زکوۃ کا انکار ہوا۔ اب حضرت ابو بکر ﷛ بھی کہہ سکتے تھے کہ یہ پرسنل معاملہ ہے۔ کوئی زکوۃ دے یا نہ دے اس کی مرضی ہے، لیکن حضرت ابو بکر ﷛ کھڑے ہو گئے اور فرمایا: جو شخص زکوۃ سے انکار کرے گا میں اس سے قتال کروں گا۔ زکوۃ تو بڑی چیز ہے اگر کوئی زکوۃ میں ایک رسی بھی دیتا تھا، اب اگر اس سے بھی کوئی انکار کرے گا تو میں اس سے بھی جنگ کروں گا۔

حضرت عمر ﷛ جیسے آدمی بھی کہنے لگے: کیا آپ مسلمانوں سے، اہلِ قبلہ سے لڑیں گے؟ حضرت ابو بکر ﷛ غصہ میں آگئے اور غصہ سے اپنا ہاتھ حضرت عمر ﷛ کے سینہ پر مارا اور فرمایا:

((أَجَبَّارٌ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَخَوَّارٌ فِي الْإِسْلَامِ؟)) [مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۶۹۲۵]

"عمر! تمہیں کیا ہو گیا ہے کفر کے زمانہ میں بڑے بہادر بنتے تھے اور اسلام میں اتنے کمزور ہو گئے ہو؟"

حضرت عمر ﷛ دیوار کے ساتھ بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد روتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیق ﷛ کے پاس گئے کہ اے ابو بکر! تجھ پر کروڑوں رحمتیں ہوں! مجھے مسئلہ سمجھ آگیا ہے۔ اگر آج ایک زکوۃ کا انکار کرے گا پھر نماز کا انکار کرے گا۔ اور ایک قربانی کا انکار کرے گا اور کوئی سود کے حرام ہونے کا انکار کرے گا کہ سود کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ تم نے اچھا کیا ہے اور میں سب سے پہلے آپ کے ساتھ مل کر تلوار لے کر لڑوں گا۔

اسی طرح جس نے ختمِ نبوت کا انکار کیا حضرت ابو بکر ﷛ نے اس سے بھی جہاد کیا اور جس نے قرآن کا انکار کیا اس سے بھی جہاد کیا۔ ہم پورے کے پورے دین کو تمام معاملات میں حاوی مان لیں، پھر ہم کہیں کہ مسلمان ہیں۔ صرف نماز پڑھ لی اور فیصلے کافر کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق ہوتے ہوں، کیا یہی مسلمانیت ہے......!؟

اسلام کے متعلق جدید لوگوں کا مزاج:

کسی دوسرے ملک کے اندر چلے جائیں اور وہاں جا کر عیسائیوں سے پوچھیں تو وہ بھی کہیں گے کہ ہم عیسائی ہیں۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تمہیں اپنی کتاب یاد ہے؟ کہیں گے کہ یاد نہیں ہے۔ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی شراب پی تھی؟ کہیں گے کہ نہیں۔ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فحاشی کو اتنا عام کیا تھا؟ تو جواب دیں گے نہیں۔ ہمارا بھی یہی حال ہے کہ شراب، سود کھاتے رہیں اور زکوۃ سے بچنے کے لیے فارم دے دیں کہ ہم شیعہ ہیں، عشر نہ دیں، اپنی بیٹیوں کا رشتہ نہ کریں تب بھی ہم مسلمان ہیں۔ یہ کونسا اسلام ہے؟ جدید طبقہ کہتا ہے: چھوڑو! ہم سب انسان ہیں۔ ٹھیک ہے، ہم مانتے ہیں۔ اسی طرح جانور بھی سب ایک ہیں، لیکن ان میں فرق ہے۔ ہم گدھے اور گھوڑے کو ایک نہیں مانتے، کتا اور بلی ایک چیز نہیں ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ سب چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں، حلال و حرام کے چکر میں نہ پڑو۔ اگر اسی طرح کی دلیل کافی ہے پھر تو پانی بھی اللہ نے پیدا کیا ہے اور پیشاب بھی اللہ نے پیدا کیا ہے۔ ان دونوں کو بھی برابر سمجھ لیں۔

اسلام پر پورا پورا عمل کرنے کا حکم ہے:

اسی وجہ سے سارے مفسرین ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (یا اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا) کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ اس سے مراد کتاب اللہ (قرآن مجید) ہے یا اس سے مراد اسلام ہے۔ اگر اس کے مطابق چل رہے ہیں تو صراطِ مستقیم پر ہیں اور اگر اس سے ہٹ رہے ہیں تو پھر صراطِ مستقیم پر نہیں ہیں، لہٰذا ہم دینِ اسلام کے سب تقاضے بطورِ دین کے قبول کریں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾ [البقرۃ:۲۰۸]

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔''

اور کہیں ارشاد فرمایا:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران:۱۰۳]

''اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ (باہم سب) متفق (بھی) رہو اور (باہم) نا اتفاقی مت کرو۔''

اور کہیں ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ﴾

[الانعام: ۱۵۳]

"اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تمہیں اس (اللہ) کی راہ سے جدا کر دیں گی۔"

اور کہیں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ﴾ [یوسف: ۱۰۸]

"آپ فرما دیجیے کہ یہ میرا طریق ہے۔ میں (لوگوں کو) خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں، میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی۔"

اے میرے مدنی پاک! ان کو بتا دیں کہ جس راستہ پر میں چل رہا ہوں یہی سیدھا راستہ ہے، جس میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں ہے۔ اگر اس کو چھوڑ دو گے تو بھٹک جاؤ گے۔

چار اماموں کے مسلک پر اعتراض:

بعض لوگ اس پر گمراہ ہو جاتے ہیں کہ جب راستہ ایک ہے تو چار اماموں کا کیا مطلب ہے؟ یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے یا پیدا کر دیا جاتا ہے۔ شبہ پیدا ہونے کی وجہ جہالت ہوتی ہے یا جان بوجھ کر شرارت مقصود ہوتی ہے کہ کوئی نہ کوئی نئی بات لوگوں کے ذہنوں میں ڈالو، تاکہ یہ لوگ پریشان ہو جائیں۔

جواب:

میرے مدنی پاک ﷺ نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات فرما دی ہے۔ اگر اسی حدیث کو سمجھ لیں تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ پہلی امتیں بہتر (۷۲) فرقوں میں تقسیم ہوئیں اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہوگی۔ اور تمام کے تمام فرقے جہنم میں جائیں گے، مگر ایک فرقہ ناجی (بچنے والا) اور جنت میں جانے والا ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا: وہ ایک فرقہ کون سا ہوگا؟ فرمایا: صرف وہ فرقہ جنتی ہوگا جو میرے اور میرے صحابہ کے راستے پر ہوگا۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۶۴۱، باب: مَا جَاءَ فِي افْتِرَاقِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ]

اگر حضور ﷺ فرما دیتے کہ جو میرے راستے پر چلے گا وہ ناجی ہوگا۔ تو یہ بھی کافی تھا، لیکن فرمایا: وہ راستہ جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم تو لاکھوں ہیں۔ اگر لاکھوں صحابہ کی بات مانیں تو ایک راستہ تو نہیں رہے گا۔ آپ لاکھوں میں نہ جائیں اور یوں سمجھیں کہ خلفاء چار ہیں۔ کوئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے راستے پر آ گیا، کوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے راستے پر آ گیا، کوئی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے راستے پر آ گیا اور کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے راستے پر آ گیا۔ تو یہ چار راستے ہو گئے۔ اور آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ چاروں حضور ﷺ کے راستے پر رہے ہیں۔

ائمہ اربعہ اور محدثین کی ضرورت و اہمیت:

اسی طرح سمجھ لیں کہ ان چار اماموں کا بھی وہی طریقہ ہے جو حضور ﷺ کا ہے۔ جس نے ان میں سے کسی کے قول کو لیا وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے تابع ہوگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ائمہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ حالانکہ ان سے پہلے بھی لوگ اسلام پر چل رہے تھے۔

جب حضور ﷺ موجود تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو کوئی مشکل پیش آتی تھی تو وہ حضور ﷺ سے پوچھ لیتے تھے کہ ہمارا یہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا، اس کو حل فرما دیں۔ حضور ﷺ کے زمانہ کے بعد حضور ﷺ کے ساتھ رہنے والی جماعت اور تربیت پانے والی جماعت موجود تھی۔ کوئی مشکل پیش آتی تو لوگ ان کے پاس چلے جاتے تھے۔ جب ہم حضور ﷺ کے زمانہ سے دور ہوتے گئے، تابعین کا دور آ گیا۔ اب علماء کو فکر ہوئی کہ حضور ﷺ کا زمانہ بھی گزر گیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ بھی گزر گیا ہے اور ہم حضور ﷺ کے زمانہ سے بھی دور ہوتے جا رہے ہیں۔ کل کو کوئی آنے والا اپنی نئی نئی باتیں نکالے گا، اب ہم محنت کر کے ان مسائل کو جمع کر دیں، تاکہ قیامت تک آنے والی امت کو تکلیف نہ ہو۔ اس وجہ سے یہ امام پیدا ہوئے۔

جب امام پیدا ہوئے تو انہوں نے کوئی نئی حدیث تو بنائی نہیں، بلکہ قرآن و حدیث میں جو احکام تھے کہ یہ فرض، سنت، نفل، مستحب نصِ قطعی سے ثابت ہے، اجتہادِ رسول ﷺ ہے یا رائے مبارک ہے۔ انہوں نے اس حدیث مبارک کے ذخیرہ کو جمع کیا۔ اب حدیث پاک کے لیے ضرورت تھی کہ جتنا حدیث کا سلسلہ جاری ہے اس میں کوئی جھوٹا تو نہیں ہے، کوئی خارجی، ناصبی تو نہیں ہے؟ تو اس طرح اسماء الرجال کے ماہرین پیدا ہوئے، انہوں نے جرح و تعدیل کا کام کیا ہے۔ جیسے یحییٰ بن معین رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام ترمذی رحمہ اللہ انہوں نے اس پر کتابیں لکھیں۔

جن لوگوں کو مسائل سے غرض تھی انہوں نے فقہی طرز پر احادیث کے ذخیرہ کو سامنے رکھا۔ وہ فقہاء کہلائے۔

اب یہ اتنا کام کر چکے ہیں کہ نہ کوئی آیت چھوڑی اور نہ کوئی حدیث چھوڑی، لہٰذا اب ان کے بعد کسی اور امام کی ضرورت نہیں ہے۔

ائمہ کا اصولِ اجتہاد:

ائمہ نے اصول قائم کیا کہ مسئلہ پہلے قرآن سے لیں گے، پھر سنتِ رسول اللہ ﷺ سے، پھر اجماع جس پر صحابہ اکٹھے ہو جائیں اور اس کے بعد قیاس ہوگا جو کتاب وسنت کی روشنی میں ہو۔ جو چیز کتاب وسنت سے ٹکرائے گی وہ خود بخود پاش پاش ہو جائے گی۔ جیسے آئین کے اندر کچھ بنیادی اصول ہیں اور ان کی ترمیمات ہیں۔ جو ترمیم اصول سے ٹکرائے گی وہ خود بخود ختم ہو جائے گی۔ یہی بات پورے اسلام کے فلسفے میں ہے کہ کوئی بات کتاب اللہ سے ٹکرا جائے یا سنت رسول اللہ ﷺ سے ٹکرا جائے وہ قول ختم ہو جائے گا۔ اصل بات اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی رہے گی۔

مکمل دین کی اتباع لازم ہے:

دین اللہ نے اتارا، قرآن اللہ نے اتارا، میرے مدنی ﷺ کے سینے میں قرآن اللہ نے محفوظ کیا، پڑھایا جبرائیل علیہ السلام نے، حضور ﷺ نے عمل کر کے دکھایا اور صحابہ کو نمونہ بنا کر پیش کیا اور پھر اس کو ائمہ محدثین، فقہاء نے منضبط کیا۔ جب تک ہم دین کو اس معنی میں دین نہ سمجھیں گے اس وقت تک گاڑی نہیں چلے گی۔ وگرنہ ہم نام کے مسلمان ہوں گے، کام کے مسلمان نہیں ہوں گے۔ جیسے علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
پر کچھ یہ بھی تو بتاؤ کہ مسلمان بھی ہو؟

علامہ اقبال نے یہی رونا رویا تھا کہ ویسے تو تم سید بھی ہو، افغانی ہو اور مرزا بھی ہو، ہم نے یہ مان لیا، لیکن یہ تو بتاؤ کہ مسلمان بھی ہو؟ ایک آدمی سر پر ٹوپی رکھ لے اور نماز بھی پڑھے اور سارا دن سود کا کاروبار بھی کرے، سود کو حلال کہے تو یہ اسلام نہیں ہے۔ جس چیز کو اللہ نے حرام قرار دیا اس کو کوئی حلال کہے تو وہ کافر ہے۔ حضور ﷺ نے یہ کوئی حکم اور فتویٰ نہیں دیا تھا کہ شہد حرام ہے، بلکہ حضور ﷺ نے اپنے اوپر حرام قرار دیا کہ میں آئندہ نہیں پیوں گا۔ اللہ کے حلال کو حرام نہیں کہا، لیکن اللہ نے قرآن نازل فرما دیا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾ [التحریم: ۱]

(اے نبی! جس چیز کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے آپ (قسم کھا کر) اس کو (اپنے اوپر) کیوں حرام فرماتے ہیں؟)۔ اگر اللہ کے نبی ﷺ حلال کو حرام نہیں کر سکتے تو تو کون ہے جو چودہ سو سال بعد حرام کو حلال کہے گا؟ یہ علیحدہ بات ہے کہ حلال کو حلال کہو اور حرام کو حرام کہو، اس میں مشکلات ہیں۔ تو ان لوگوں کو بلانا پڑے گا جو قرآن وحدیث کا علم رکھتے ہیں۔ پھر پتا چلے گا کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے؟

ایک پیر کی جہالت:

جیسے ایک واقعہ ہے کہ ایک آدمی کسی پیر کے پاس بیعت ہونے کے لیے آیا۔ ایک دن رہا اور شام کو کہا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ، مجھے اجازت دیں۔ پیر صاحب نے پوچھا: کیسے آئے تھے؟ کہا: ارادہ تو یہ تھا کہ آپ کو پیر بناؤں، لیکن اب نہیں بناتا۔ انہوں نے کہا: کیا بات ہے؟ کہا: جب آپ عصر کی نماز کے لیے مسجد کی طرف آرہے تھے تو آپ نے بایاں پاؤں مسجد میں پہلے رکھا اور دایاں پاؤں بعد میں رکھا۔ جو آدمی خدا کے گھر میں داخل ہونا نہیں جانتا تو آگے خدا کی باتیں کیا جانتا ہوگا؟ اس لیے دعا مانگتے ہیں: ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ''۔

حضور ﷺ کی طرف سے ایک بہترین مثال:

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا.......))

اللہ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک صراط مستقیم ہے جس کی دونوں جانب دیواریں ہیں، ان دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں، دروازوں پر پردے لٹک رہے ہیں اور راستے کے مرکزی دروازے پر ایک داعی کھڑا کہہ رہا ہے: لوگو! سب کے سب اس میں داخل ہو جاؤ، دائیں بائیں منتشر نہ ہو اور ایک داعی راستے کے بیچ میں پکار رہا ہے۔ جب کوئی شخص ان میں سے کوئی دروازہ کھولنا چاہتا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے کہ اسے مت کھولنا، اس لیے کہ اگر تم نے اسے کھول لیا تو اس میں داخل ہو جاؤ گے۔ صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے، دیوار سے مراد حدود اللہ ہیں، کھلے ہوئے دروازے محارم ہیں اور راستے کے مرکزی دروازے پر جو داعی ہے، وہ قرآن کریم ہے اور راستے کے عین بیچ میں جو داعی ہے، وہ ہر مسلمان کے دل میں اللہ کا ایک واعظ ہے۔ (جسے ضمیر کہتے ہیں، جس کو اللہ نے ہر مسلمان کے دل میں ڈرانے والا رکھا ہے کہ یہ گناہ ہے، حرام ہے، یہ ہلاکت وجہنم کا راستہ ہے اس کی طرف نہ جاؤ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صراطِ مستقیم سے اسلام مراد ہے)۔

[کنز العمال، حدیث:۹۲۱، اَلْبَابُ الثَّانِي: فِي الْاِعْتِصَامِ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ]

سیدھے راستہ کے لیے پانچ صفات:

علامہ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن وحدیث کو سامنے رکھ کر ارشاد فرمایا کہ اگر کسی راستے میں پانچ صفات ہوں گی تو وہ صراطِ مستقیم کہلائے گا۔ اگر اس میں پانچ صفات نہ ہوں تو صراطِ مستقیم نہیں کہلائے گا۔

- ......ان میں سے پہلی صفت یہ ہے کہ سیدھا راستہ ہو۔
- ......دوسری صفت یہ ہے کہ سب سے قریب ترین راستہ ہو۔
- ......تیسری صفت یہ کہ وہ راستہ کشادہ اور کھلا ہو۔
- ......چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ راستہ ''مُوْصِلٌ اِلَى الْمَطْلُوْبِ'' (منزل تک پہنچانے والا) ہو۔
- ......اور پانچویں صفت کہ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہو۔

اور وہ راستہ یہ ہے: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ (ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں)۔

جھگڑا کب ہوتا ہے؟

غور سے سمجھیں کہ چاہے مسلمانوں کے اوپر کتنے ہی بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے الزام لگائے جائیں اور مسلمانوں کے احوال غلط انداز سے پیش کیے جائیں، لیکن جھوٹ جھوٹ ہوتا ہے، حق حق ہوتا ہے۔ جھگڑا ہمیشہ وہی کرتا ہے جو نہ ماننے والا ہو اور جو ماننے والا ہو وہ کبھی جھگڑا نہیں کرتا۔ مثلاً: آپ کسی سے کہیں کہ آپ میرے ساتھ مدینہ منورہ چلیں اور وہ کہہ دے کہ ٹھیک ہے چلتے ہیں تو کوئی جھگڑا نہیں ہوگا۔

ہمارے دین کا نام ایمان اور اسلام ہے کہ جس کے اندر امن وسلامتی ہے۔ ہم موسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں، ہم عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں تو ہم یہودیوں اور عسائیوں کے ساتھ کیسے جھگڑا کریں گے؟ شرارت تو یہودی اور عیسائی کریں گے جو میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے۔ اسی طرح ملنگ صحابہ رضی اللہ عنہم کو نہ ماننے والے ہیں، اہلِ سنت

تو اہلِ بیت کو مانتے ہیں، وہ کیسے جھگڑا کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ کوئی ہمارے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لے تو ہم ان کو مانتے ہیں کہ وہ خلیفہ راشد ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ہیں، اہلِ بیت کے سردار ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور کاتب الوحی ہیں۔ ہم انہیں "سَابِقُوْنَ فِی الْاِیْمَانِ" میں سے مانتے ہیں اور "بَطَلٌ مِّنْ اَبْطَالِ الْاِسْلَامِ" مانتے ہیں تو پھر ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام پر کیسے جھگڑا کر سکتے ہیں؟ جھگڑا تو اس وقت ہوگا جس وقت ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام لیں اور وہ انہیں گالی دیں، جب ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام لیں اور وہ انہیں گالیاں دیں اور ہم قرآن پیش کریں تو وہ کہیں کہ یہ شرابیوں کا جمع کردہ قرآن ہے اور وہ کہیں کہ ہم نہیں مانتے۔ تو جھگڑا وہ کرے گا جو اسلام پر نہیں ہوگا۔ جو اسلام اور صراطِ مستقیم پر ہوگا، اس کو جھگڑالو کہنے والے اپنے ایمان کی خیر منائیں۔ وہ کیسے جھگڑالو ہو سکتے ہیں؟ اس لیے جب ہم صراطِ مستقیم (اسلام) پر ہیں تو اللہ کا شکر ہے۔

ایک یہودی سے مکالمہ:

ایک دفعہ میں یہودیوں کی ایک مارکیٹ میں گیا۔ اس مارکیٹ کا مالک یہودی تھا۔ اور مجھے وہاں سے کچھ سامان لینا تھا۔ اس یہودی کو کسی نے کہا کہ یہ مسلمانوں کا مولوی ہے۔ اس نے مجھے بلایا کہ میرے ساتھ چائے پئیں۔ میں نے کہا کہ میں ان کو جانتا تو نہیں ہوں، لیکن اگر انہوں نے ملنا ہے تو ضرور ملیں گے۔

یہودی کے اعتراضات اور ان کے جوابات:

اس نے بڑی تکریم وعزت کی اور اس کے بعد اس نے یہی مسئلہ چھیڑ دیا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کا جھگڑا ہے اور یہودی بہت قلیل ہیں، جبکہ مسلمان بہت ہیں، پھر ہم سے لڑائیاں اور جھگڑا کرنا اچھی بات تو نہیں ہے۔ آپ اپنے لوگوں کو سمجھائیں۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ کے پاس ایک ملازم ایمان دار ہے اور ایک بے ایمان ہے، آپ کو کونسا ملازم اچھا لگے گا؟ کہنے لگا: ایمان دار ہی اچھا لگے گا۔ میں نے کہا کہ مسلمان ایماندار ہیں اور یہودی بے ایمان ہیں۔ اس نے کہا: کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا: ہم تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی مانتے ہیں اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مانتے ہیں، اس لے ہم ایمان دار ہیں۔ اور تم مدنی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے، اس لیے تم لوگ بے ایمان ہوئے۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بغیر فرشتے کے واسطے کے اللہ تعالیٰ سے کلام فرمایا اور تورات اللہ کی کتاب ہے۔

اس نے کہا ٹھیک ہے کہ ہم آپ کے نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں مانتے؛ لیکن اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو مانتے ہیں۔ میں نے کہا: تم تو کہتے ہو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا، تم تو اپنے نبی کو قاتل کہتے ہو، لہٰذا

تم بے ایمان ہو۔ اسی طرح میں نے کہا کہ تمہارے اور مشرکین میں کیا فرق ہے کہ مشرکین بھی اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور تم بھی اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہو؟ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہو۔ مشرکین بھی میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں اور آپ بھی دشمن ہیں، مشرکین نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قتل کی سازشیں کیں اور آپ کے قبیلہ بنونضیر نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود بلایا اور اپنے قلعہ کی دیوار کے نیچے ایک جگہ بنائی اور اوپر ایک بندہ چھپا دیا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں بیٹھیں تو اوپر سے پتھر گرا کر شہید کر دو۔ مشرکین مکہ نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بڑی بڑی سازشیں کیں اور ان کو مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور تم لوگوں نے بھی سازشیں کیں اور عبد اللہ بن ابی تمہارا سب سے بڑا سازشی تھا۔ کعب بن اشرف سب سے بڑا سازشی تھا، لیکن اس کے باوجود ہمارا دین کتنا انصاف و امن والا ہے کہ تمہیں آج بھی اہلِ کتاب کے نام سے یاد کرتا ہے کہ اے اہلِ کتاب! تم تو پڑھے لکھے ہو، تم تو میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو مانو۔ اب آپ بتائیں کہ آپ اسلام کے دشمن ہیں یا اسلام آپ کا دشمن ہے......؟

یہودی کا دوسرا اعتراض اور اس کا جواب:

پھر اس نے کہا: یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ آپ ہماری لڑکی سے نکاح کریں اور ہم آپ کی لڑکی سے نکاح نہ کریں۔

میں نے کہا: یہ تو پہلے والی بات ہوئی کہ آپ کی لڑکی تو ایمان دار سے شادی کرے گی ہم بے ایمان کو کیسے لڑکی دیں؟

جب اس نے دیکھا کہ اس کے دوسرے ملازم بھی کھڑے ہیں، کہیں وہ متاثر نہ ہو جائیں تو اس نے کہا: اچھا جی! پھر ملاقات کریں گے۔

دین اسلام کی حدود:

دنیا کے اندر ٹریفک والے اگر کوئی نشان مقرر کر دیں تو اس کو کوئی نہیں توڑتا، لیکن جو نشان اللہ نے میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر لگا دیے ہیں کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے، اس پر کوئی غور نہیں کرتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا کہ نکاح حلال ہے اور زنا حرام ہے۔ تجارت حلال ہے اور سود حرام ہے۔ گائے، بکری، بھیڑ وغیرہ حلال ہیں اور خنزیر، کتا اور چیر پھاڑ کر کھانے والے جانور حرام ہیں۔ اب ان نشانات کو جو توڑتا ہے، ان کو کچھ نہیں سمجھتا اور ان کو روزانہ توڑتا ہے پھر وہ عاشقِ رسول بھی رہے، مسلمان اور مومن بھی بنا رہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ جس نے ان حدود کو توڑا وہ فاسق ہے، وہ ظالم ہے اور وہ حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے ہے۔

"اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کے دوسرے معانی:

حضرت مجاہد ﷫ فرماتے ہیں: "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" سے مراد ہے کہ حق کا راستہ دکھا اور اس پر چلا کر ہمیں منزلِ مقصود جنت تک پہنچا۔ علامہ ابنِ کثیر ﷫ نے لکھا کہ "اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کا ترجمہ اگر حق سے بھی کریں تو ٹھیک ہے۔ اور اس کے اندر کوئی تعارض واختلاف بھی نہیں ہے۔

"اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کے اندر ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد محمد مصطفیٰ ﷺ، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر ﷠ ہیں۔ راوی فرماتے ہیں کہ ابوالعالیہ نے جب یہ ترجمہ کیا تو ہم نے آکر حضرت حسن سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ابوالعالیہ نے سچی بات کہی ہے، بلکہ انہوں نے یہ قول بیان کر کے مسلمانوں کو ہدایت ونصیحت بھی کی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۷، ۲۸، الفاتحہ، الآیۃ: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ]

خلاصۂ بحث:

علامہ ابنِ کثیر ﷫ فرماتے ہیں: اگر غور کریں تو یہ سارے کے سارے اقوال درست اور ایک دوسرے کو لازم ہیں، کیونکہ جس نے حضرت ابوبکر وعمر ﷠ کی اتباع کی تو اس نے حضور ﷺ کی اتباع کی، جس نے حضور ﷺ کی اتباع کی تو اس نے حق کی اتباع کی، جس نے حق کی اتباع کی تو اس نے اسلام کی اتباع کی، جس نے اسلام کی اتباع کی تو اس نے قرآن کی اتباع کی، جس نے قرآن کی اتباع کی جو اللہ کی کتاب اور اللہ کی مضبوط رسی ہے، جس کے پکڑنے کا حکم ہے اور یہی سیدھا راستہ ہے جس پر چلنے کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: میرے اور میرے خلفاء راشدین کے راستے کو لازم پکڑو۔ اور داڑھوں کے ساتھ اس پر جم کر رہو، کیونکہ اس کے بغیر کوئی نجات کا راستہ نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کے ضمن میں جو اقوال پڑھے ہیں سارے درست ہیں۔ اور ایک دوسرے کی تصدیق کر رہے ہیں۔

حضرت عبد اللہ ﷛ فرماتے ہیں: "اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" سے وہ راستہ مراد ہے جس پر ہمیں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے چھوڑا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۸، الفاتحہ، الآیۃ: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ]

امام ابنِ جریر ﷫ کے نزدیک راجح قول:

علامہ ابنِ جریر ﷫ فرماتے ہیں: اس آیت میں زیادہ راجح قول یہ ہے کہ یا اللہ! ہمیں اپنے اس پاک راستے پر

رہنے کی توفیق عطا فرما جو تو نے اپنے پاک بندوں کے لیے پسند فرمایا اور جن کو انعام عطا فرمایا۔ اور انعام والے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ اور جن کو اس راستے پر چلنے کی توفیق ملی گویا اس کو اسلام پر چلنے کی توفیق ملی اور جس کو اسلام پر چلنے کی توفیق ملی اس کو تمام انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کی توفیق ملی۔ اللہ کے قرآن کو مضبوطی سے تھام لینا، جن باتوں کا حکم دیا ہے ان پر چلنا، جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے ان سے رک جانا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء (ابوبکر وعمر، عثمان وعلی رضی اللہ عنہم کے راستے پر چلنا ہی صراط مستقیم ہے۔ اس لیے علامہ ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۸، الفاتحہ، الآیۃ: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ]

ہدایت پانے کے بعد ہدایت مانگنے کا حکم کیوں ہے؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مؤمن ہدایت پر ہے تو ہر نماز میں اور ہر وقت یہ ہدایت کیوں مانگتا ہے؟ اور جو چیز موجود ہو اس کا مانگنا تحصیل حاصل ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے جواب دیا ہے کہ اگر بندوں کو اس کی ضرورت نہ ہوتی تو اللہ صبح شام بندوں کو اس کی ہدایت بھی نہ کرتے اور اس کا حکم بھی نہ دیتے، لیکن چونکہ بندہ اپنے کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہے اور بندہ ہر گھڑی اس کا محتاج ہے کہ اللہ اس کو ہدایت پر رکھے، تاکہ اس کو صراط مستقیم اور زیادہ سے زیادہ روشنی حاصل ہو اور اسی پر ہمیشہ قائم رہے۔ اس لیے اللہ نے حکم دیا کہ تم ہر وقت دعا مانگا کرو کہ اے اللہ! ہمیں ہدایت عطا فرما، اس پر ثابت قدم فرما اور اسی پر موت عطا فرما۔ نیک بخت لوگ وہ ہوتے ہیں جن کو اللہ سے مانگنے کی توفیق مل جائے۔ اور اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ جو بندہ پریشان ہوگا اور مجھ کو پکارے گا تو میں اس کی دعا قبول کروں گا۔ اب بندہ ہر نماز میں مانگتا ہے کہ اے اللہ! میں ہدایت کا محتاج ہوں، مجھے ثابت قدم رکھ، میں کہیں بھٹک نہ جاؤں۔ اور جیسے اللہ نے ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ [النساء: ۱۳۶]

''اے ایمان والو! ایمان لے آؤ اللہ پر اور رسول اللہ پر۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان والو! ایمان پر ثابت قدم رہو۔ یہ تحصیل حاصل نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں ہمیشہ اسلام پر ثابت قدم رکھ۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝﴾

[آل عمران: ۸]

''اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کیجیے بعد اس کے کہ آپ ہمیں ہدایت کر چکے ہیں اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت (خاصہ) عطا فرمائیے۔ بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمانے والے ہیں۔''

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۸، الفاتحۃ، الآیۃ: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ]

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ﴾

تفسیر:

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ یا اللہ! (ان لوگوں کے راستے پر چلا) جن پر تو نے اپنا انعام کیا کہ ان کو عبادت اور اطاعت کی توفیق دی۔ اور ان لوگوں میں ملائکہ، انبیاء کرام علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ بھی داخل ہیں۔ اس لیے یہی قول راجح ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۸، الفاتحۃ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾

تفسیر:

یا اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جو عبادت اور اطاعت والے ہیں، جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر کو لینے والے اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نواہی کو چھوڑنے والے ہیں، ان لوگوں کے راستہ پر نہ چلا جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور وہ لوگ جن کے ارادے بگڑ گئے۔ انہوں نے حق کو پہچانا، لیکن حق سے ہٹ گئے۔ اور ان لوگوں کے راستہ پر نہ چلا جو گمراہ ہوئے، وہ لوگ جنہوں نے اپنے راستہ کو گم کر دیا، جو گمراہی کے اندر سرگردان ہیں اور جو لوگ حق کی طرف ہدایت نہیں پا رہے ہیں۔ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔

بعض نے کہا: ''غَيْرِ'' استثناء کے لیے ہے کہ ان کے راستے پر چلا جن پر تیرا انعام ہوا، نہ کہ ان لوگوں کے راستہ پر جو گمراہ ہیں۔ علامہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علماء کے نزدیک پہلا قول راجح ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا: ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کا ''لَا'' زائدہ ہے۔ اب عبارت یوں ہوگی: ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَالضَّآلِّيْنَ'' کہ یا اللہ! ان لوگوں کا راستہ نہ دکھا جن پر تو نے غضب نازل کیا اور جو گمراہ ہوئے۔ راجح قول

پہلا ہے۔

جو آدمی علم رکھے، لیکن عمل کو چھوڑ دے وہ غضب کا مستحق ہوتا ہے اور جس آدمی کے پاس علم نہیں ہے وہ گمراہ ہوتا ہے۔ ان کے لیے ضلال کا لفظ آیا ہے۔ چاہے یہود ہیں، چاہے نصاریٰ ہیں وہ گمراہ بھی ہیں اور ان پر اللہ کا غضب بھی ہے، لیکن یہود پر اللہ کی طرف سے غضب کا اطلاق زیادہ کیا گیا ہے اور نصرانیوں کے بارے میں ضلال کی صفت زیادہ آئی ہے۔ اس کی تائید میں آیات و آثار موجود ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۹، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کا واقعہ:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک حدیث بیان فرمائی ہے کہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک گھڑ سوار دستہ آیا اور انہوں نے میری پھوپھی کو اور ہمارے لوگوں کو پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ میری پھوپھی نے عرض کیا: یارسول اللہ! آنے والا دور ہو گیا اور میں اولاد سے کٹ گئی اور میں بوڑھی ہوں، مجھے پکڑ کر لے آئے ہیں اور میری خدمت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ جیسے اللہ نے آپ پر احسان کیا ہے، آپ مجھ پر احسان کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تیری خدمت کرنے والا کون ہے؟ تو اس نے کہا: عدی بن حاتم ہے۔ فرمایا: اچھا! تم اس کا ذکر کر رہی ہو جو اللہ اور اس کے رسول سے بھاگ گیا، یعنی اسلام نہیں لے آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو۔ کہتی ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹ کر آئے تو دیکھا کہ آپ کے ساتھ ایک آدمی ہیں، پھر معلوم ہوا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم کوئی سواری بھی مانگ لو۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری کے بارے میں عرض کیا تو آپ نے سواری عطا فرما دی۔

حضرت عدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر میری پھوپھی میرے پاس آئی، اس نے کہا کہ تم عجیب آدمی ہو! تم ایسے آدمی ہو کہ ایسا کام کیا جو کبھی تمہارے باپ دادا کا نہیں تھا کہ ہمیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ کہتے ہیں: انہوں نے مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور مہربانی کا ذکر فرمایا، میں نے سوچا یہ قیصر و کسریٰ تو معلوم نہیں ہوتا، یہ تو اللہ کے نبی معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ بادشاہ ہر کسی کے ساتھ مہربانی اور احسان نہیں کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے ساتھ احسان فرمادیا ہے۔

فرماتے ہیں: میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں کس چیز نے "لا إله

إِلَّا اللّٰہُ'' سے بھگا دیا ہے؟ اللہ کے سوا بھی کوئی معبود برحق اور اللہ سے بڑا بھی کوئی ہے؟ تو میں اسلام لے آیا۔ میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کا چہرہ مبارک خوشی سے کھل اٹھا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۹، الفاتحۃ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ]

''اَلْمَغْضُوْبِ'' کون اور ''الضَّآلِّیْنَ'' کون؟

ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ وادی قریٰ میں ہیں اور گھوڑے پر سوار ہیں، بنی قین کے ایک آدمی نے سوال کیا کہ یہ ''اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ'' اور ''الضَّآلِّیْنَ'' کون لوگ ہیں؟ تو حضور ﷺ نے یہود کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: یہ ''اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ'' ہیں اور ''الضَّآلِّیْنَ'' سے مراد نصاریٰ ہیں۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں دیکھا ہے، سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ''اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ'' سے مراد یہود ہیں اور ''الضَّآلِّیْنَ'' سے مراد نصاریٰ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ﴾ [البقرۃ: ۹۰] (چنانچہ یہ (اپنی اس جلن کی وجہ سے) غضب بالائے غضب لے کر لوٹے ہیں)۔ اس سے مراد بھی یہی یہودی ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۹، الفاتحۃ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ]

عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا:

عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں شام کی طرف نکلا اور میرے ساتھ ایک جماعت تھی۔ ہم ڈھونڈ رہے تھے کہ ہمیں صحیح دین مل جائے اور ہم اسے تسلیم کریں۔ جب ہم یہودیوں سے ملے تو انہوں نے کہا: اگر ہمارے دین میں داخل ہونا چاہتے ہو تو پھر کچھ اللہ کا غضب برداشت کرنا پڑے گا۔ یعنی وہ خود بھی جانتے تھے کہ وہ ''اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ'' ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم تو اللہ کے غضب سے فرار اختیار کر رہے ہیں اور تم کہتے ہو کہ اللہ کے غضب کو لو۔ پھر ہم نصرانیوں کے پاس گئے، انہوں نے کہا: اگر تم ہمارے دین میں داخل ہونا چاہتے ہو تو اللہ کی ناراضگی کا کچھ حصہ تم پر بھی آئے گا۔ ہم نے کہا: ہم تو یہ طاقت نہیں رکھتے کہ اللہ کا غضب اور ناراضگی مول لیں۔ میں دونوں باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ہٹ گیا اور نہ میں یہودیوں میں ملا، نہ میں نصرانیوں میں ملا اور نہ میں بت پرستوں میں ملا، لیکن میرے ساتھ جو ساتھی تھے وہ نصرانی بن گئے۔ اور انہیں میں سے ورقہ بن نوفل تھا وہ بھی نصرانی ہو گیا اور اس نے نصاریٰ کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جب میرے آقا ﷺ کو نبوت ملی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کو

لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں تو اس نے پہچان لیا کہ آپ سچے نبی ہیں۔ اس نے حضور ﷺ کا کلمہ پڑھ لیا اور وہ مسلمان ہو گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ]

''ض'' اور ''ظ'' کا مخرج:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وَلَا الضَّآلِّیْنَ'' میں ''ض'' اور ''ظ'' دونوں قریب ہیں کہ دونوں مجہورہ، مطبقہ اور رخوہ ہیں اور دونوں کے مخارج قریب ہیں۔ ''ضاد'' کا مخرج زبان کی کروٹ ڈاڑھ کو لگے اور ''ظاء'' کا مخرج زبان کا کونہ اوپر تالو کو لگے۔ دونوں کا مخرج طرف اللسان ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے صحیح معنی کے اندر ''ضاد'' کہہ لیا یا ''ظاء'' کہہ لیا تو اس کے اندر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ]

''ض'' پر جھگڑے:

اور ہمارے ہاں اسی پر جھگڑے ہیں۔ لاکھوں لوگ مر گئے۔ اگر کوئی بندہ ''وَلَا الدَّآلِّیْنَ'' پڑھے تو لوگ کہتے ہیں: یہ عاشق رسول ہے۔ اور اگر کوئی ''وَلَا الضَّآلِّیْنَ'' پڑھے تو کہتے ہیں: دیکھو! یہ وہابی ہے۔ حالانکہ بے چارے نہ قرأت کو جانتے ہیں اور نہ علماء کے اقوال کو جانتے ہیں۔ بس ایسے ہی لوگوں کو ایک راستے پر لگا دیا گیا ہے۔ اللہ پاک فتنوں سے بچائے اور ہدایت عطا فرمائے۔

فاتحہ میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ غور کریں کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیات ہیں۔ جن میں اللہ کی حمد، تمجید اور ثناء ہے، اللہ کے اسماءِ حسنیٰ ہیں، صفاتِ علیا ہیں، ذکرِ معاد ہے اور بندوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ جب بھی تضرع اور سوال کریں تو اللہ کی طرف کریں، اللہ کے سوا سب سے براءت اختیار کریں، اللہ کی خالص عبادت کریں، اللہ کی توحید اور الوہیت کا اقرار کریں اور تنزیہ بیان کریں۔

اور بندوں کو دعا سکھلائی کہ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ'' مانگتے رہیں، تاکہ قیامت کے دن جو پل صراط پر چلنا ہوگا وہ اللہ آسان فرمادیں گے اور تمہیں اپنی جنتوں میں پہنچادیں گے اور تمہیں انبیاء علیہم السلام، صدیقین اور

شہداء رحمہم اللہ کی معیت نصیب کریں گے۔

تو اس سورت کے اندر ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی ہے۔ ترغیب اس طرح کہ ایسے اعمال اختیار کرو جو اعمالِ صالحہ ہوں، تاکہ تم قیامت میں ان لوگوں کے ساتھ اٹھو جن کے اعمالِ صالحہ ہوں اور جن پر اللہ کا انعام ہوتا ہے۔ اور اس کے اندر ترہیب بھی ہے کہ باطل لوگوں سے بچو، تاکہ قیامت کے دن تم گمراہ لوگوں کے ساتھ نہ اٹھو۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰، الفاتحۃ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

اللہ کی طرف مذموم چیز کی نسبت:

﴿الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ فرمایا، فاعل کو ذکر نہیں کیا گیا، حالانکہ ﴿اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں فاعل کا ذکر ہے۔ یہ اللہ کی کمالِ رحمت کی طرف اشارہ ہے کہ جب رحمت کا ذکر آیا تو اللہ کے نام کو ذکر کیا گیا اور جب غضب کا ذکر آیا تو نام ظاہر نہیں کیا۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ [المجادلۃ: ۱۴]

''کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں فرمائی جو ایسے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں جن پر اللہ نے غضب کیا ہے؟''

غضب کرنے والے، عذاب دینے والے اور رحمت کرنے والے بھی اللہ ہیں۔

اسی طرح ضلال کی نسبت گمراہ لوگوں کی طرف ہے، حالانکہ گمراہ کرنے والی بھی اللہ کی ذات ہے، لیکن ادب کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ظاہراً بری چیزوں کی نسبت اللہ کی طرف نہ کی جائے۔ اسی لیے قرآن میں ہے:

﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا﴾ [الکہف: ۱۷]

''جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو وہ بے راہ کر دیں تو آپ اس کے لیے کوئی مددگار، راہ بتانے والا نہ پاویں گے۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۚ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ [الاعراف: ۱۸۶]

''جس کو اللہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور ایسے لوگوں کو اللہ (بے یار و مددگار) چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ضلال بھی اللہ کی طرف سے ہے اور ہدایت بھی اللہ کی طرف سے ہے، لیکن عام طور پر ہدایت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور ضلال کی نسبت بندے کی طرف کردی جاتی ہے، کیونکہ ادب کا تقاضا بھی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

متشابہات کے ساتھ دھوکہ دینے والے فرقے:

فرقہ قدریہ کی طرح نہیں کہ وہ کہتے ہیں: بندے خود مختار ہیں، بندہ اپنے افعال پر خود قادر ہے، اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ وہ قرآن کے متشابہات کو سامنے رکھ کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اور یہی اہلِ ضلال کا حال ہے۔

اسی لیے حدیث شریف میں ہے کہ جب دیکھو کہ ایسے لوگ آرہے ہیں جو متشابہات میں پڑ رہے ہیں تو ان سے بچو۔ یہ وہی لوگ ہیں جو لوگوں کو گمراہ کردیں گے۔ وہ متشابہات کے پیچھے اس لیے پڑتے ہیں کہ لوگوں کو گمراہ کریں اور اس کی خود ہی تفسیر کریں۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الحمد للہ! اللہ کے قرآن کے اندر کسی گمراہ اور بدعت والے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور حق باطل کو علیحدہ کرنے والا ہے۔ قرآن گمراہی کو مٹانے والا ہے، اس کے اندر کوئی تناقض اور اختلاف نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

فاتحہ کے بعد آمین:

کوئی مسلمان سورۂ فاتحہ کو پڑھے تو مستحب ہے کہ اس کے آخر میں آمین پڑھے۔ اور اس کا معنی ہے ’’اَللّٰهُمَّ اسْتَجِبْ‘‘ اے اللہ! ہماری دعا قبول فرما۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ...]

فاتحہ کے بعد آمین کہنا مستحب ہے:

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! اتنا جلدی آمین نہ کہیں کہ ہم آمین نہ کہہ سکیں۔ یعنی آپ ایسا آمین کہیں کہ ہم بھی آپ کے ساتھ مل جائیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا منظور ہوگی تو ہماری دعا بھی منظور ہوجائے گی۔ [سنن أبي داود، حدیث: ۹۳۷، بابُ التَّأمِينِ وَرَاءَ الإِمَامِ]

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ اس کو ’’آمِّين‘‘ پڑھتے تھے کہ میم پر تشدید پڑھتے تھے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

آمین کہنے میں فرشتوں کی موافقت:

علامہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ آمین کہنا اس کے لیے مستحب ہے جو نماز سے خارج ہو۔ اگر خود نماز پڑھے تو اس کے لیے تاکید ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، تاکہ اگر اس کی آمین ملائکہ کی آمین کے ساتھ مل گئی تو اللہ تعالیٰ اس کے پہلے گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۰۲، باب: التأمین]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ]

جب تم نماز میں آمین کہتے ہو تو آسمان میں ملائکہ بھی کہتے ہیں آمین۔ اگر تمہاری آمین ملائکہ کی آمین کے ساتھ مل گئی تو تمہاری دعا منظور ہو جائے گی۔

آمین مل جانے کا مطلب کیا ہے:

بعض نے کہا: فرشتوں کے ساتھ آمین ملنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے بھی آمین کہا اور انہوں نے بھی کہا دونوں کی آمین ایک وقت میں مل گئی۔ بعض نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے وہ اخلاص کے ساتھ کہتے ہیں، اگر تم نے بھی اسی طرح اخلاص کے ساتھ کہا تو تمہاری آمین کے ساتھ فرشتوں کی آمین مل گی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ]

آمین کا معنیٰ:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! آمین کا معنیٰ کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رَبِّ افْعَلْ'' کہ یا اللہ! جو ہم نے مانگا ہے وہ ہمیں عطا فرما دے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے فرمایا: آمین کا معنیٰ یہ ہے کہ یا اللہ! اسی طرح کر جس طرح ہم دعا کر رہے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا: اس کا معنیٰ یہ ہے کہ یا اللہ! ہماری دعاؤں کو نامراد نہ کرنا، ہمیں خالی نہ لوٹانا۔ اور اکثر علماء نے فرمایا: اس کا معنیٰ ہے ''اَللّٰھُمَّ اسْتَجِبْ لَنَا'' یا اللہ! ہماری دعا کو منظور فرما۔

بہرحال! اس کے اندر کوئی شبہ نہیں ہے کہ آدمی پر مستحب ہے کہ آمین کہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ]

امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے:

علامہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ خود شافعی المسلک ہیں، لیکن انہوں نے بھی "یُسْتَحَبُّ" فرمایا کہ مستحب ہے۔ چونکہ شافعی المسلک ہیں، اس لیے آمین کو زور سے کہنے کی حدیث کو ثابت کر رہے ہیں، لیکن ان کو یہ خیال نہیں ہے کہ اس سے مسئلۂ سورۂ فاتحہ کے بارے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ثابت ہو رہا ہے۔ صحیح بخاری شریف کے اندر حدیث آگئی۔ فرمایا:

((إِذَا قَالَ الْإِمَامُ: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ فَقُولُوا: آمِينَ))

"جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہے تو تمہارا وظیفہ یہ ہے کہ تم آمین کہو۔" [صحیح البخاری، حدیث: ۷۸۲، باب: جَهْرِ الْمَأْمُومِ بِالتَّأْمِينِ]

تو ہمارے ذمہ آمین کہنا ہے، ہمارے ذمہ فاتحہ پڑھنا نہیں ہے، وگرنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ جب امام سورۂ فاتحہ پڑھے تو تم بھی فاتحہ پڑھو۔

آمین آہستہ کہو:

جیسے حدیث میں ہے کہ جب مؤذن اذان دے تو جیسے وہ کہے ویسے تم بھی کہو۔ آمین کا معنی آپ نے پڑھا کہ اے اللہ! ہماری دعا کو قبول فرما، ہماری دعا کو نامراد نہ کرنا۔

اب ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا اتنا قصور ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ آمین آہستہ آواز سے کہو۔ حالانکہ قرآن کے اندر بھی آہستہ آواز سے دعا مانگنے کا حکم ہے۔ فرمایا:

﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾ [الاعراف: ۵۵]

"تم اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ چپکے چپکے پکارا کرو۔"

کیونکہ تم ایسے خدا سے مانگ رہے ہو جو آہستہ سے بھی سننے والا ہے۔ اس لیے زور لگانے کی ضرورت نہیں۔ ابتداء میں چونکہ شوکتِ اسلام کو ظاہر کرنا مقصود تھا، اس لیے آمین اونچی کہی جاتی تھی۔

حضرت بلال بن یسار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آمین اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ لیکن یہ حدیث مرفوع نہیں ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام آمین نہ کہے، کیونکہ اس کے ذمہ یہ ہے کہ وہ ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ پڑھے گا اور آمین کہنے کا حکم مقتدی کو ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ بھی یہ حکم حدیث سے لے رہے ہیں۔ ویسے ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ ''إِذَا أَمَّنَ الْإِمَامُ فَأَمِّنُوْا''۞ (جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو)۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب امام آمین کہنا بھول جائے تو مقتدی زور سے آمین کہیں۔ امام کو یاد دلا دیں کہ آپ بھول رہے ہیں اور اگر امام زور سے آمین کہہ دے تو مناسب یہ ہے کہ مقتدی نہ کہے، کیونکہ امام کا کہنا سب کی طرف سے کافی ہے۔ اور یہی مذہب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے اور یہی روایت امام مالک رحمہ اللہ سے بھی ہے کہ یہ ذکر ہے اور جیسے نماز کے اندر جتنے ذکر ہیں وہ خاموشی سے کیے جاتے ہیں، کوئی زور سے ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' اور ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى'' نہیں کہتا۔ تو آمین بھی ذکر ہے اس لیے اس کو آہستہ آواز سے کہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ زور سے کہے اور دوسرا قول امام مالک رحمہ اللہ والا ہے کہ بالکل نہ کہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر مسجد چھوٹی ہو تو زور سے آمین نہ کہیں، کیونکہ جو امام کا قرآن سن رہے ہیں وہ کافی ہے۔ اگر مسجد بڑی ہے تو زور سے کہیں، تاکہ پیچھے والوں کو بھی پتا لگے کہ ہم نماز میں کہاں تک پہنچے ہیں۔ اور یہی بات امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

یہودیوں کا مسلمانوں سے بغض:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہود ہم سے تین وجہ سے حسد کرتے ہیں:

- ......ایک جمعہ کی وجہ سے کہ اللہ نے مسلمانوں کو جمعہ کا دن عطا فرمایا اور وہ اس سے محروم ہیں۔
- ......دوسری وجہ یہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ ہے۔
- ......اور تیسری بات کہ ہمیں امام کے پیچھے آمین کہنا ملا ہے۔ [مسند احمد بن حنبل رحمہ اللہ، حدیث: ۲۵۰۲۹]

ایک حدیث پاک میں ہے کہ یہود تم پر دو وجہ سے بغض رکھتے ہیں: ایک آمین اور دوسرا اسلام کی وجہ سے۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۸۵۶، بَابُ: الْجَهْرِ بِآمِيْنَ]

۞......[الصحیح البخاری، رقم: ۷۸۰]

آمین اس امت کی خصوصیت ہے:

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ نے مجھے آمین نماز میں بھی عطا فرمائی اور دعا میں بھی عطا فرمائی ہے۔ مجھ سے پہلے یہ کلمہ کسی کو نہیں ملا۔

امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کے دلائل:

ہاں! جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے رہے تو ان کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا﴾ [یونس:۸۹]

''تم دونوں کی دعا قبول کرلی گئی ہے۔''

حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا مانگ رہے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہہ رہے تھے۔ لہٰذا جو آمین کہے گا تو وہ بھی دعا میں شریک ہو گیا۔ یعنی ایک نے فاتحہ پڑھی اور دوسرے نے آمین کہی تو دونوں برابر ہو گئے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا ہے کہ مقتدی فاتحہ نہ پڑھے کہ جب وہ آمین کہے گا تو گویا اس نے فاتحہ پڑھ لی۔

اور حدیث پاک میں ہے کہ امام کا پڑھنا مقتدی کے پڑھنے کو کافی ہے۔ مقتدی کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

[سنن ابن ماجہ، حدیث:۸۵۰]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان ساری احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب امام جہری نمازوں کے اندر ہو تو مقتدی فاتحہ نہ پڑھیں اور چپ چاپ کھڑے رہیں، کیونکہ امام کا پڑھنا کافی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱، ۳۲، الفاتحہ، الآیۃ: صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ]

نماز میں فاتحہ واجب ہے:

کوئی اور سورت آپ کو نہیں ملے گی جس کے بارے میں حکم ہو کہ ہر نماز میں پڑھی جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض ائمہ کے نزدیک مقتدی کو نہیں پڑھنی چاہیے اور بعض ائمہ کے نزدیک مقتدی کو پڑھنی چاہیے۔ جہری نماز میں بھی سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور سری نمازوں میں بھی سورت فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ نماز اہم عبادت ہے، نماز مومن کی معراج ہے اور نماز بندے اور رب کے درمیان ربط ہے۔ تو نماز میں فاتحہ پڑھنی ضروری ہے اور دوسری سورت تو

بدل سکتے ہیں، لیکن سورۂ فاتحہ نہیں بدل سکتے۔ یعنی اگر آپ نماز پڑھ رہے ہیں تو پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھ لیں، دوسری رکعت میں کوئی دوسری سورت پڑھ لیں، تیسری رکعت میں کوئی اور سورت پڑھ لیں اور چوتھی رکعت میں کوئی اور سورت پڑھ لیں۔ قرآن مجید میں یہی حکم ہے۔ فرمایا:

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ﴾ [المزمل:٢٠]

"تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو۔"

جہاں سے آسانی ہو، لیکن فاتحہ کو نہیں بدل سکتے۔ آخر فاتحہ میں ضرور کوئی حکمت ہے کہ ہر مسلمان کو پابند بنا دیا کہ نماز میں فاتحہ پڑھیں، بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ افضل اور جامع دعا فاتحہ ہے۔

سورۂ فاتحہ کا اخلاق سے تعلق:

وہ علماء جن کا اللہ کے قرآن سے تعلق ہے۔ جن کو موتیوں کی پہچان ہے انہوں نے کہا کہ اللہ نے ہمیں اس میں اخلاق کی تعلیم دی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس سورت میں اصلاحِ معاشرہ بھی ہے۔

پہلا سبق اور خلقِ اوّل یہ تھا کہ اللہ محمود ہے، وہ ہر صفتِ کمال و جمال سے متصف ہے اور ہر وہ صفت جو اس کی شان کے لائق نہ ہو، اس سے پاک ہے۔ یعنی ہر حال میں محمود ہے۔ تو اس سے ہمیں یہ سبق ملتا تھا کہ ہم وہ کام کریں جس سے ہم اچھے اور محمود بنیں، برے نہ بنیں، کیونکہ ہمارا تعلق رب سے ہے، ہم ربانی ہیں، ہم مسلمان ہیں۔ تو ہمارے اخلاق کا بھی وہی عالم ہونا چاہیے، اگرچہ ہم رب کا مقابلہ اور تشابہ نہیں کر سکتے، لیکن اللہ کی صفات کو سمجھانا اور سمجھنا ہے کہ ہم نے ہر وہ کام کرنا ہے جو باعثِ مدح و تعریف ہو تو محمود بنیں گے۔ صاف ظاہر ہے جب محمود بنیں گے تو معاشرے کی خود بخود اصلاح ہوگی۔ تو اس طرح اس سورت کا اصلاحِ معاشرہ سے تعلق ہے۔

اللہ سب کو دیتا ہے:

دوسرا خلق ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ تھا۔ "رَبُّ الْمُسْلِمِيْنَ"، "رَبُّ الْمُتَّقِيْنَ" یا "رَبُّ الْمُؤْمِنِيْنَ" نہیں فرمایا، بلکہ "رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" فرمایا کہ سب مخلوق کا رب ہے۔ یعنی میرے رب کی ربوبیت عامہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ انسانوں کو رزق دیتا ہے، اسی طرح حیوانوں کو بھی رزق دیتا ہے اور پرندوں کو بھی رزق دیتا ہے۔ جیسے مسلمان کو رزق دیتا ہے تو کافر کو بھی رزق دیتا ہے، جیسے متقی کو رزق دیتا ہے تو فاسق اور فاجر کو بھی رزق دیتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ نمازی کو تو رزق ملے اور بے

نمازی کو رزق نہ ملے، کیونکہ وہ رب العلمین ہے اس کے ہاں سب مخلوق ہے۔ ہاں! آخرت میں انعام صرف مومنوں کے لیے ہے، لیکن دنیا میں سب کے لیے ہے۔ اسرائیلی روایات میں ایک واقعہ ہے۔

اسرائیلی روایات کے متعلق حضور ﷺ کا فرمان:

اسرائیلی روایات کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''لَا نُصَدِّقُ وَلَا نُكَذِّبُ'' (نہ ہم تصدیق کریں گے اور نہ ہم تکذیب کریں گے۔) اس لیے اگر قرآن وحدیث کے مطابق ہیں تو لے لیں گے، وگرنہ چھوڑ دیں گے۔

ایک اسرائیلی قصہ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ! آپ رب العالمین ہیں، رزاق ہیں، ساری دنیا کو رزق دینے والے ہیں۔ اگر تھوڑی سی مہربانی فرما کر مجھے ایک بستی کا رزق دینے والا بنا دیں تو آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ اللہ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ اب اللہ نے تمام نعمتیں بھی مہیا فرما دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ دیکھو! اس میں کتنے مرد، عورتیں، بچے، یتیم اور مسکین ہیں؟ کتنے روزگار اور کتنے بے روزگار ہیں؟ سارے کوائف بن گئے۔ اس کے بعد یہ بھی معلوم کر لیا کہ کون غنی ہے؟ اور کون غریب ہے؟ جو غنی ہے اس کو تو ضرورت نہیں ہے، لیکن جو بیوہ، مسکین، یتیم اور معذور ہے ان سے بھی پوچھ لیا کہ تم اپنا اپنا پسندیدہ لکھوا دو۔ تو ہر آدمی نے اپنی پسند لکھوا دی۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر آدمی کو راشن بھجوا دیا۔ لوگ بڑے خوش کہ گھر میں بیٹھے بٹھائے راشن مل گیا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام رات کو گشت کے لیے نکلے تو آپ کو پتا چلا کہ ایک آدمی منشیات کا عادی ہے۔ نشہ پینے کے بعد وہ آؤٹ ہو جاتا ہے اور گھر کی چھت پر بیٹھ کر گالیاں دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام گزرے تو وہ اسی طرح شور کر رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بلایا اور سختی کے ساتھ ڈانٹا کہ خبردار! اگر تم نے پھر منشیات استعمال کیں اور ایسی حرکتیں کیں تو پھر تمہیں سزا ملے گی۔ اس آدمی نے کہا: اچھا جی! آئندہ نہیں کروں گا۔ لیکن ایسے لوگ باز نہیں آتے۔ وہ دوبارہ اسی طرح کرنے لگ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکایت ملی تو اس کو بلوایا اور منع کیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر وہی کام کرنے لگ گیا۔ آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس کا راشن پانی بند کر دو۔

کئی دنوں کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر گشت کے لیے نکلے کہ کسی کو تکلیف تو نہیں ہے؟ جب اس کے گھر کے قریب آئے تو دیکھا کہ وہ بڑا چیخ چیخ کر رو رہا ہے اور فریادیں کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کی آواز اور فریادوں کو سن کر

کھڑے ہو گئے۔ وہ کہہ رہا تھا: اے اللہ! معلوم ہوتا ہے کہ یہ رزق تو نے کسی اور کو دے دیا ہے، یہ نشہ تو میرے باپ دادا بھی کرتے تھے، لیکن ہمارا رزق تو کبھی بند نہیں ہوا تھا، اب رزق بند کر دیا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تو نے رازق کسی انسان کو بنا دیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام گھبرا گئے۔

آگے آئے تو دیکھا کہ ایک بچہ رو رہا ہے، چیخ رہا ہے، ماں چپ کرانے کی کوشش کرتی ہے، لیکن بچہ چپ نہیں کر رہا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دروازہ کھٹکھٹایا اور پوچھا: بچہ کیوں رو رہا ہے؟ اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! میں اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کر چکی ہوں، میرے سینے میں دودھ نہیں ہے اور بچہ دودھ مانگتا ہے اور کسی کا دودھ قبول نہیں کرتا۔ تو موسیٰ علیہ السلام آئے اور دو رکعت پڑھ کر سجدے میں گر گئے اور کہا: اے مولا! یہ صفتِ رزاقیت تیری ہی شان ہے، بندہ کسی کا رازق نہیں بن سکتا ہے۔ میں کھانا تو پہنچا دوں، لیکن سینے میں دودھ کون لائے گا؟ اور اگر میں غصے میں آکر کسی گنہگار کا راشن بند کر دوں تو گنہگار کہاں جائیں گے؟ یہ صفتِ رزّاقیت تجھے ہی زیبا ہے۔ اے اللہ! تو کسی کا رزق بڑھا رہا ہے یا کسی کا رزق گھٹا رہا ہے تو اس کے اندر تیری حکمتیں ہیں۔

اس خلقِ ثانی "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" سے ہمیں یہ سبق ملا کہ جس طرح تیرے رب کی ربوبیت سب کے لیے ہے، تیری ہمدردی بھی سب کے ساتھ ہو۔ چاہے فاسق فاجر ہے، ہندو ہے، سکھ ہے، تیرا کوئی بھی ہمسایہ ہے محتاج ہے تو اس کی مدد کر۔ ایک ہے محبتِ اسلامی وہ الگ بات ہے، لیکن بحیثیتِ انسان سب کے ساتھ مہربانی کرنی ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ایک شرابی سے حسنِ سلوک:

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں واقعہ لکھا ہے کہ ان کے گھر کے قریب ایک نشہ باز رہتا تھا۔ وہ رات کو بھنگ اور بوٹی وغیرہ پی کر بڑے بڑے لطیفے اور غزلیں پڑھا کرتا تھا اور جب غصہ میں آجاتا تو گالیاں بھی دیتا تھا۔ وہ ایک شعر عربی میں ہمیشہ پڑھتا تھا کہ اس علاقے کے لوگوں نے میری قدر نہیں کی اور اپنے ایک نوجوان کو ضائع کر دیا۔

ایک دن امام صاحب آئے اور پوچھا کہ ہمارا ایک ہمسایہ تھا، اس کی رات کو آواز نہیں آئی۔ پتا تو کریں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ تو لوگوں نے کہا کہ اس نے نشہ پی کر کسی آدمی کو مارا تو پولیس والے اس کو پکڑ کر لے گئے۔ امام صاحب رحمہ اللہ اپنا درس موخر کر کے بہ نفسِ نفیس تھانہ میں تشریف لے گئے۔ تھانے والوں نے دیکھا کہ امام اعظم رحمہ اللہ اتنا بڑا آدمی ہے!! ان کا تھانے میں کیا کام ہے؟ عملے والے بھی سارے مسلمان تھے، امام صاحب کو جانتے تھے۔

انہوں نے پوچھا کہ حضرت! کیسے تشریف لائے؟ امام صاحب نے فرمایا: تم ہمارا ایک بندہ پکڑ کر لے آئے ہو۔ انہوں نے کہا: ہم آپ کا بندہ کیسے پکڑ سکتے ہیں؟ فرمایا: فلاں آدمی کو پکڑ کر لے آئے ہو۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو نشئی آدمی ہے، نشہ پی کر لوگوں کو مارتا ہے، گالیاں دیتا ہے، بلکہ ہم نے سنا ہے کہ وہ آپ کو بھی گالیاں دیتا ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ وہ گالیاں دیتا ہے یا نہیں دیتا، تم اس بات کو چھوڑو، وہ میرا ہمسایہ ہے۔ عرب کا محاورہ ہے کہ ہمسایہ ہمسایہ ہوتا ہے، چاہے ظالم بھی کیوں نہ ہو۔ تھانے والوں نے اس کو چھوڑا تو امام صاحب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: تم کہتے ہو کہ ہم نے تمہیں ضائع کر دیا، ہم تو تمہیں ضائع نہیں کیا، بلکہ تیرا خیال رکھا ہے۔ اس نے کہا: اگر خیال رکھا ہے تو پکا خیال رکھو اور مجھے ہمیشہ کے لیے مدرسہ میں رکھ لو۔ اگر امام صاحب میرے لیے چل کر آسکتے ہیں اور میں اب بھی گناہ کروں تو مجھ سے زیادہ بھی کوئی بدنصیب ہو سکتا ہے؟

امام احمد رحمہ اللہ کی ایک ڈاکو کے لیے دعا:

جیسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اکثر اپنی دعاؤں میں فرماتے: ''رَحِمَ اللّٰہُ اَبَا الْھَیْثَمِ'' (اللہ ابوالہیثم پر رحم فرمائے)۔ یہ ابوالہیثم اس علاقہ کا سب سے بڑا ڈاکو تھا۔ کچھ دنوں تک لوگ چپ رہے، لیکن جب امام صاحب کی دعا متواتر جاری رہی تو لوگوں نے عرض کیا: حضرت! آپ وقت کے امام اور مقتداء ہیں، جب آپ دعا میں ایک ڈاکو کے لیے دعا کرتے ہیں تو لوگ عجیب محسوس کرتے ہیں کہ ایک دو دفعہ دعا کرتے، لیکن کسی کے لیے مستقل دعا کر رہے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی خاص ہمدردی ہے۔ امام صاحب نے فرمایا: ہاں مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ کیونکہ جب مسئلہ خلقِ قرآن پر حکومت نے مجھے کوڑے مارے، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالیں اور جیل کی طرف لے گئے۔ حالانکہ زندگی بھر میں نے جیل نہیں دیکھی تھی اور کبھی تکلیفیں برداشت نہیں کی تھیں۔ تو جب میں جیل کے اندر داخل ہو رہا تھا تو دیکھا کہ ایک بڑا خوبصورت نوجوان ہے، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ پولیس کا ایک دستہ ساتھ ہے، لیکن وہ دبدبے اور غرور سے چلتے ہوئے آرہا ہے اور چہرے پر مسکراہٹ ہے۔ میں چونکہ پہلی دفعہ جیل جا رہا تھا اس لیے میرے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ جب وہ میرے قریب آیا تو اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور کہا:

''أَأَنْتَ اَحْمَدُ ابْنُ حَنْبَلٍ؟''

''کیا احمد بن حنبل تم ہو؟''

میں نے کہا: ہاں۔ تو وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور کہا: امام صاحب! میں ڈاکو ہوں، ڈاکے مارتا ہوں، لیکن پھر بھی کس طرح جیل میں جا رہا ہوں!! اور تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے جا رہے ہو اور کانپ رہے ہو؟ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کہتے تھے کہ مجھے اس کے اس کلام نے پہاڑ بنا دیا۔ پھر مجھے تکلیفیں دی گئیں، لیکن میں نے اُف نہیں کی۔ اس نے مجھے بہادری سکھائی تھی۔ اس لیے میں اس کے لیے رحمت کی دعا کر رہا ہوں۔

اللہ کی رحمت بے حد و بے انتہا ہے۔ جب اس کی رحمت برستی ہے تو صرف انبیاء علیہم السلام، اولیاء رحمہم اللہ اور مسلمانوں کے گھر میں نہیں برستی، بلکہ سب پر برستی ہے۔ اس لیے ہمیں سبق ملتا ہے کہ ہر کسی سے ہمدردی اور مہربانی کا سلوک کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر گوشت تھوڑا ہے تو تم شوربہ تو بڑھا سکتے ہو۔ ہمسائے کے گھر میں دے دو گے تو وہ اس سے روٹی کھا لے گا۔[1]

آگے سبق ملا: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔) کہ اللہ بھی ہر ایک پر رحمت کرتے ہیں، تم بھی اپنے اندر صفتِ رحمت کا جذبہ پیدا کرو۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا: ''لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يَكُوْنَ لَعَّانًا'' (مومن کی یہ صفت ہی نہیں ہے کہ ایک دوسرے پر لعنت کرے)۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۰۱۹، باب: مَا جَاءَ فِي اللَّعْنِ وَالطَّعْنِ]

مرزائیوں کا درودِ لعنت:

مرزا غلام احمد قادیانی جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا جب غصہ میں آکر ہمارے علماء کے خلاف کتاب لکھی۔ ان علماء کے نام لکھے جو اس سے مناظرہ اور تقابل کرتے تھے۔ اس کے بعد اس نے نیچے لعنت لعنت لکھنا شروع کیا۔ ایک ہزار دفعہ یہ لفظ کتاب پر لکھا ہے۔ اسی لیے ہمارے قاضی احسان صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ قادیانیوں کا جو درود ہزارہ ہے وہ لعنت لعنت ہے۔ مؤمن تو لعنت کرنے والا، فحش بکنے والا بن ہی نہیں سکتا۔ جس آدمی نے ایک ہزار دفعہ لعنت لکھی ہو وہ نبی کیسے بن گیا؟ وہ تو مسلمان اور مؤمن ہی نہیں بن سکتا۔

پورے دین کا خلاصہ دو چیزیں:

علمائے عرب نے فرمایا ہے کہ اگر پورے دین کا خلاصہ نکالا جائے تو دو چیزیں ہیں:

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۲۶۲۵، باب: الوَصِيَّةِ بِالْجَارِ]

1 ......عَظْمَةُ الْخَالِقِ.

2 ......شَفْقَةٌ عَلَى الْخَلْقِ.

اللہ کی عظمت دل میں پیدا ہو جائے اور مخلوق پر شفقت دل میں پیدا ہو جائے۔ دیکھیں! خدا کی عظمت کہ آگر آپ کو وزیرِ اعظم کا یا گورنر کا خط ملے تو آپ کو پوری رات نیند نہیں آئے گی۔ بار بار اس کو کھول کر پڑھے گا کہ یار بادشاہ نے مجھے خط لکھا ہے۔ بادشاہ کی دل میں عظمت ہے۔

میرا اپنے عہدیدار دوستوں سے رویہ:

چند دن پہلے میرے پاس ایک آدمی آیا اور کہا کہ آپ کے پاس فلاں آدمی کا فون آیا ہے۔ میں نے کہا: یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جو ہمارے دوست ہیں، اس وقت یہ کچھ نہیں تھے اور پھر ہمیں نہ اس کے اقتدار سے کچھ لینا ہے اور نہ دینا ہے، بلکہ مجھے تو ایک بری مرض ہے کہ اگر میرا کوئی دوست اقتدار کی کرسی پر چڑھے تو میں اس کو ملنا چھوڑ دیتا ہوں۔ لوگ تو کہتے رہتے ہیں کہ یہی تو اس سے کچھ لینے کا وقت ہے، اس وقت آپ اس کو ملتے ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ میری کم عقلی سمجھ لیں، کمزوری سمجھ لیں یا نفسیاتی تاثر سمجھ لیں، میری طبیعت ہی نہیں مانتی۔

انگریزوں کے نزدیک پاکستانیوں کی نفسیات:

انگریز بڑا دانا دشمن ہے۔ اس نے کتابوں میں لکھا ہے کہ جب اس نے ہندوستان پر حکومت کی تو اس میں ایک تجزیہ کیا کہ یہ جو سندھ کے لوگ ہیں ان کو ذرا سختی سے دبا کر رکھو۔ اگر کام ہو تو گدھے بن جاتے ہیں اور جب کام نکل جائے تو پھر کسی کے باپ بھی نہیں بنتے۔ ان کی مٹی کے اندر یہ خاصیت ہے۔

اس لیے حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اللہ نے مجھے وہ سخن دیا ہے کہ اگر قرآن پڑھوں تو ستارے بھی زمین پر آجائیں، دریا کی موجوں کو قرآن سناتا تو ان کی روانی تھم جاتی، لیکن اللہ نے مجھے پنجاب میں پیدا کیا ہے کہ یہ ایسی مخلوق ہے جو ڈنڈے والے کے آگے بھاگتی ہے اور دولت والے کے پیچھے بھاگتی ہے۔ اور انگریز نے کہا: قبائلی پٹھان کو پیسے دو، وگرنہ یہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ چونکہ پٹھان کی کمزوری پیسہ ہوتی ہے۔ بڑا تہجد گزار ہوگا، لیکن اسمگلنگ کرے گا، نشہ بیچے گا۔ بڑی داڑھی ہوگی، لیکن پیسے کے معاملہ میں لازمی کمزور ہوگا۔ یہ ایک فطری بات ہے۔

اور بلوچ قوم میں نہ پیسہ کام آئے گا، نہ یہ دبانے سے دبے گی اور نہ ہی جھکے گی۔ ان کو صرف ''خان صاحب''

کہہ دو، یہ اسی پر خوش رہیں گے۔ جب یہ آئیں تو کرسی سے کھڑے ہو جاؤ، ان کی گاڑی کا دروازہ کھولو۔ یہ انسان کے اندر کمزوریاں ہوتی ہیں۔ میرے قریبی دوست مجھے کہتے ہیں کہ جب آپ آتے ہیں تو وہ آفیسر آپ کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے کام نہیں کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ میں کیا کروں کہ میری مجبوری ہے۔ کیونکہ جب ایک دوست اقتدار کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے تو میرا اس سے ملنے کو دل نہیں کرتا۔

انسان کی اصلاح کب ہوگی؟

بہر حال! کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اصلاح کب ہوگی؟ جب تم مہربانی اور انتہائی شفقت کرنے والے بن جاؤ گے تو پھر معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا۔ سختی سے کبھی معاشرہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ آپ بیوی پر سختی کریں باغی ہو جائے گی، بچوں پر سختی کریں باغی ہو جائیں گے، بھائیوں پر سختی کریں باغی ہو جائیں، لیکن جب آپ ان پر شفقت اور مہربانی کریں گے تو یہ شفقت اور مہربانی ان کو ٹھیک کر دے گی۔ تو ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' سے سبق ملا کہ اللہ کی عظمت اور مخلوق پر شفقت ہو۔

پانچ دفعہ اللہ کی طرف سے بلاوا آئے ''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ''، ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ'' اور انسان نہ جائے تو اس کا مطلب ہوا کہ اللہ کی عظمت دل میں نہیں ہے۔ اگر وزیرِ اعظم بلوائے، پرائم منسٹر بلوائے تو رات کو بھی بھاگتے ہوئے جائیں گے، کیونکہ ان کی عظمت دل میں ہے، لیکن جب اللہ کا بلاوا آئے اور انسان نہ آئیں تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ اللہ کی عظمت ان کے دل میں نہیں ہے۔

شفقت علی الخلق:

شفقت علی الخلق کا معنی یہ ہے کہ آپ کسی کو تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتے۔

ایک فاحشہ عورت کا واقعہ:

صحیح احادیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک فاحشہ عورت کہیں جا رہی تھی۔ اسے پیاس لگی تو قریب ایک کنواں تھا، لیکن اس کے اندر ڈول نہیں تھا۔ اس کو یہ سوجھا کہ میرے پاس جوتے ہیں، ان کو دوپٹہ کے ساتھ باندھ کر لٹکا دوں، تا کہ کچھ نہ کچھ تو پانی آئے گا اور جان بچ جائے گی۔ اس طرح اس نے پانی نکالا اور دیکھا کہ پاس ایک کتا تڑپ رہا ہے۔ تو اس نے وہ پانی اپنے منہ میں نہ ڈالا، بلکہ کتے کے منہ میں ڈال دیا تو کتا فوراً ہوش میں آ گیا، پھر اور

پانی ڈالا تو کتا اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کی جان بچ گئی۔ اس کے بعد اس فاحشہ عورت نے خود پانی پیا۔ تو اللہ نے فرمایا: تو نے میری مخلوق پر رحم کیا ہے، میں نے تم پر رحم کیا اور تیرے گناہ معاف کر دیے۔ [مسند البزار، حدیث: ۸۷۲۵]

ایک بلی پر ظلم کی وجہ سے جہنم کا فیصلہ:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے جہنم کے اندر ایک عورت دکھائی گئی کہ اس نے ایک بلی کو رسی سے باندھ دیا تھا۔ نہ اس کو چھوڑتی تھی کہ وہ چل پھر کر کھا لے اور نہ اس کو پانی اور خوراک دیتی تھی۔ وہ تڑپتی تڑپتی مر گئی۔ اللہ نے اس بلی کی وجہ سے اس کو جہنم میں ڈال دیا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۳۶۴، باب: فَضْلِ سَقْيِ الْمَاءِ]

اگر آپ کے دل میں یہ بات آجائے تو پھر معاشرہ کیسے بگڑے گا؟ اس لیے محاورہ ہے:

"اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ."

"انسان احسان کا غلام ہوتا ہے۔"

شریف انسان پر آپ احسان کر دیں وہ کبھی بھی نہیں بھولے گا۔ اس لیے مشہور ہے کہ جو برے ہوتے ہیں وہ بکرے بھی بھول جاتے ہیں اور شریف کو بوٹی بھی یاد رہتی ہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملا کہ تم احسان کرنا اور مہربانی کرنا سیکھو اور اپنی خواہشات کو دبا کر دوسرے پر شفقت کرو۔

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بلخ بخارئ سے ایک نوجوان میرے پاس آیا۔ مجھے اس کے سامنے اس کی بات سے اتنی شرمندگی ہوئی کہ اتنی شرمندگی اور کسی کے سامنے نہیں ہوئی۔ اس سے میں نے پوچھا: کیسے آئے ہو؟ اس نے کہا: آپ کا نام سنا تو ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ۔ اس نے کہا: آپ لوگوں کا کیا حال ہے؟ کیسی گزر بسر ہو رہی ہے؟ میں نے کہا: اللہ کا شکر ہے اگر اللہ دیتے ہیں تو شکر کرتے ہیں، نہیں تو صبر کرتے ہیں۔ وہ نوجوان ہنس پڑا۔ میں نے پوچھا: تم ہنستے کیوں ہو؟ اس نے کہا: ہمارے علاقے میں جانوروں کا بھی یہی حال ہے۔ چارہ ڈال دو تو کھا لیتے ہیں، نہیں تو بھاگتے نہیں ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا: تمہارے علاقے کے بزرگوں کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: اگر مل جائے تو دوسرے کو دے دیتے

ہیں اور اگر نہ ملے تو شکر کرتے ہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی دعوت کا واقعہ:

صحیح احادیث میں روایت موجود ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اپنے گھر آ کر پوچھتے ہیں کہ تمہارے پاس کچھ ہے؟ تو بیوی نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے آٹا بھی ہے، گوشت بھی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کتنے آدمیوں کو کافی ہو جائے گا؟ اس نے کہا: چار یا پانچ آدمیوں کو کافی ہو جائے گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر بھوک کا اثر دیکھا ہے۔ بیوی نے کہا: جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دے دو کہ تین، چار آدمیوں کا کھانا ہے، آپ تین یا چار آدمیوں کو ساتھ لائیں، لیکن اس سے زیادہ نہ ہوں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر عرض کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا:

((هَلُمُّوا إِلَى دَعْوَةِ جَابِرٍ))

"سب کام چھوڑ کر سب لوگ جابر کی دعوت کی طرف چلو۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حیران اور پریشان تھا کہ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو بلا لیا ہے تو کھانا کیسے پورا ہوگا؟ میں دوڑا دوڑا گھر آیا اور بیوی کو بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب صحابہ کو بلا کر لا رہے ہیں۔ بیوی نے پوچھا: کیا تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تھا؟ میں نے کہا: ہاں! بتا دیا تھا۔ تو اس نے کہا: پھر اللہ جانے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جانیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی شدت جوع کے باوجود اکیلا کھانا پسند نہیں فرمایا اور سب کو بلا لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ تھا کہ سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۴۱۰۱، باب: غَزْوَةِ الْخَنْدَقِ وَهِيَ الأَحْزَابُ]

دودھ کا ایک پیالہ ستر صحابہ کو کافی ہو گیا:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شدتِ جوع اور بھوک سے یہ عالم تھا کہ میں بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا اور میرا ضمیر بھی گوارا نہیں کرتا تھا کہ کسی کو کہوں کہ مجھے بھوک ہے اور مجھے کھانا کھلائیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ گزرے تو میں نے ایک بہانہ کیا کہ حضرت! میں نے آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا ہے۔ فرمایا: کیا ہے؟ میں نے پوچھا، انہوں نے بتایا اور چلے گئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا مقصد تو یہ تھا کہ میری حالت کو دیکھ کر سمجھ جائیں گے کہ بھوکا

ہے، کھانا کھلادیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی گزر گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم گزرے اور میں نے مسئلہ پوچھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسئلے کا مجھے علم ہے، تم میرے ساتھ آجاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اپنے گھر لے گئے تو وہاں ایک دودھ کا پیالہ رکھا تھا۔ فرمایا: اے ابو ہریرہ! سارے اصحابِ صفہ کو بلا کر لے آؤ۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا، میں کیسے انکار کرسکتا تھا؟ اصحابِ صفہ کبھی ساٹھ (۶۰) ہوتے اور کبھی ستر (۷۰) ہوتے تھے۔ میں ان سب کو بلا کر لے آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پیالہ مجھے پکڑا دیا اور فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے پلانا شروع کرو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی صحابی دودھ کو منہ لگاتا تو میں دیکھتا کہ دودھ تو ابھی گیا، پھر میرا کیا بنے گا؟ پہلے ایک نے دودھ پیا، پھر دوسرے اور پھر تیسرے نے پیا۔ اس طرح سارے اصحابِ صفہ نے پی لیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یا آبَا هُرَيْرَةَ!'' اے ابو ہریرہ! اب تم بھی پی لو۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۵۲، باب: كَيْفَ كَانَ عَيْشُ النَّبِيِّ ﷺ ...]

اس میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سبق دیا کہ صرف ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو دودھ نہیں دیا، بلکہ فرمایا: سب اصحابِ صفہ کو لے آؤ۔ جب سب سارے آگئے تب بھی فرمایا: پہلے دوسروں کو پلاؤ پھر خود پینا۔ یہ اسلامی تعلیمات ہیں، لیکن افسوس! آج ہم نے اسلام کو بدنام کر دیا ہے، آج ہم نے اپنے اعمال اور اخلاق میں وہ بلندی ختم کر دی ہے۔

عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کی شفقت سے بھنگی مسلمان ہو گیا:

پرانے دور میں فلش نہیں ہوتے تھے، باہر گلی میں چھوٹی نالیوں کے اندر لوگ گندگی ڈال دیتے تھے۔ صبح کو جمعدار آتے اور ان کے پاس پانی کے مشکیزے ہوتے تھے۔ وہ پانی ڈالتے تھے اور اس گندگی کو بہا دیتے تھے۔

حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے لیے ناشتہ آیا ہوا تھا تو ایک جمعدار...... جس کو لوگ بھنگی بھی کہتے ہیں...... وہ صفائی کر رہا تھا۔ شاہ جی رحمہ اللہ نے اس کو بلایا اور فرمایا: جھاڑو پھینک دو اور ہاتھ دھو لو۔ اس نے کہا: حضرت! کیا کر رہے ہیں؟ میں جمعدار ہوں اور ادھر امیرِ شریعت ہیں، جن کے بیان میں اللہ نے جادو رکھ دیا تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ((اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا))[1] کا عملی نمونہ تھے، جن کے پاس پانچ پانچ اور دس لاکھ کا مجمع ہوتا تھا، عشاء کے بعد تقریر شروع کرتے اور صبح تک تقریر کرتے رہتے تھے اور مجمع بھی بیٹھا رہتا تھا۔ جب شاہ جی رحمہ اللہ نے اس کو اپنے ساتھ کھانے کے لیے بٹھایا تو وہ بے چارہ پریشان ہو۔ وہ کبھی تصور

[1]...... [صحیح البخاری، رقم: ۵۱۴۶]

بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اتنا بڑا آدمی اسے اپنے ساتھ بٹھائے گا۔ حضرت شاہ جی رحمہ اللہ اس کے آگے کھانا رکھ رہے ہیں اور اس کو بھائی بھائی کہہ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں اور کچھ لوگ ناک بھوں چڑھا رہے ہیں۔ یہ سید ہیں، آلِ رسول ہیں، اتنے بڑے ہیں اور بھنگی کو ساتھ بٹھایا ہوا ہے۔ جب اس نے روٹی کھالی تو فرمایا: اب تم جا کر اپنا کام کرو۔ وہ چلا گیا۔ جب دوسرے دن جلسہ ختم ہوگیا اور شاہ جی تانگے پر بیٹھ کر سڑک پر آئے۔ لوگ الوداع کر رہے ہیں تو وہ بندہ بھی ایک کنارے کے ساتھ کھڑا ہے۔ جب موقع ملا تو آگے آیا اور کہا: شاہ جی! مجھے اسلام سمجھ آگیا ہے۔ میں اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لایا ہوں، آپ ہمیں کلمہ پڑھا دیں۔ لاکھ تقریریں کرو، لیکن کسی کو اس طرح اسلام سمجھ نہیں آتا۔

اس لیے اللہ ہمیں سورۂ فاتحہ میں یہی سبق دے رہے ہیں کہ ہمارے اندر شفقت علی الخلق پیدا ہو جائے اور اللہ کی مخلوق سے محبت ہو جائے۔ اس لیے علماء فرماتے ہیں: گناہ سے نفرت کرو، لیکن گنہگار سے نفرت نہ کرو۔ وہ تمہاری شفقت اور ہمدردی کا محتاج ہے۔

کسی پر ظلم مت کرو:

آگے فرمایا:

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ [الفاتحہ: ۳]

''جو روزِ جزا کا مالک ہے۔''

''يَوْمِ الدِّيْنِ'' سے مراد ''جزاءُ يَوْمِ الدِّيْنِ'' ہے کہ بدلے کے دن اور قیامت کے دن اتنا عدل وانصاف ہوگا کہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ﴾ [النساء: ۴۰]

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے۔''

اللہ ظلم سے پاک ہے۔ تو ہمیں سبق ملتا ہے کہ اگر تم میرے ماننے والے ہو تو عدل کرو، کسی کے اوپر ظلم نہ کرو۔ اگر ہم نے تمہیں جج بنایا تو صحیح فیصلہ کرو۔ ہم نے تمہیں عالم اور مولوی بنایا ہے تو صحیح فیصلہ کرو، کیونکہ ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' کے دربار میں تم نے جانا ہے۔ اور اس کی صفت عدل ہے، تم بھی انصاف کرو۔

دوسروں کا بھی خیال رکھو:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے ہی بندے ہیں) اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ اپنی بندگی اور عاجزی کا اعتراف کرو، اپنی تواضع کا اعتراف کرو۔ جب تم لوگوں کو سمجھ آجائے گا کہ تم بھی بندے ہو اور وہ بھی بندے ہیں تو معاشرے کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ لیکن اگر تیرے کتے بھی کیک کھاتے ہوں اور ہمسائے کے بچے بھوکے سوتے ہوں، تیرے کتوں کو تو دودھ ملتا ہو اور ہمسائے کے بچے کو ٹھنڈا پانی بھی نہ ملتا ہو اور کتوں کو بڑے اعلیٰ صابن سے نہلایا جاتا ہو اور غریب کے پاس نہانے کے لیے صابن بھی نہ ہو تو اصلاحِ معاشرہ کیسے ہوگا؟ اصلاحِ معاشرہ تو تب ہوگا جب تمہارے اندر عدل آئے گا، انصاف آئے گا اور شفقت آئے گی۔ جب تمہارے اندر تواضع آئے گی اور اپنے آپ کو بندہ سمجھو گے کہ میں بندہ ہوں، کمزور ہوں، میں عابد ہوں تُو معبود ہے، میں ساجد ہوں تو مسجود ہے، تو میرا خالق ہے میں تیری مخلوق ہوں اور تو میرا مالک ہے میں تیرا مملوک ہوں تو جب یہ تواضع پیدا ہوگی تو اسی سے معاشرے کے اندر اصلاح آئے گی اور فساد نہیں ہوگا۔

عادت نہیں جاتی......حکایت:

حکایت ہے کہ راستے میں جو فقیر خیمے لگا کر بیٹھے رہتے ہیں اور پھر مانگتے رہتے ہیں۔ کبھی یہاں ہوتے ہیں اور کبھی وہاں ہوتے ہیں۔ ان کا کام صرف مانگنا ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے، فقیر ہیں، لیکن کچھ بھی ہو جائے آخر غیرت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ ایک فقیر کی بیوی کو کچھ بری عادتیں پڑ گئیں تو ایک دن اس نے اپنے بیوی کو بڑا سمجھایا کہ مجھے تیرے بارے میں شکایت ملی ہے کہ تم پٹڑی سے اتر چکی ہو اور تم فلاں بندے سے ملتی ہو، اس سے بات کرتی ہو اور فلاں سے بھی۔ میں کافی دنوں سے تمہارے کریکٹر پر نظر رکھ رہا ہوں۔ جب اس نے پیار سے بیٹھ کر سمجھایا تو اس کی بیوی بڑی سمجھدار تھی، اس نے کہا: آج ہم فیصلہ کرتے ہیں۔ اس نے کہا: کیا؟ عورت نے کہا: تم بھیک مانگنا چھوڑ دو، میں یہ برائی چھوڑ دیتی ہوں لیکن میں بھی مزدوری کروں گی، تم بھی مزدوری کرنا۔ مجھے سلائی کڑھائی کا کام آتا ہے، ہماری اولاد تو ہے نہیں، بس گزارا ہو جائے گا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، میں بھیک نہیں مانگوں گا۔ عورت نے کہا: آج کے بعد میں بھی گناہ نہیں کروں گی۔ جب چار دن گزرے تو اس مرد نے اپنے کندھے پر گدڑی اٹھائی، عورت نے پوچھا: کہاں جارہے ہو؟ اس نے کہا: میں تو اپنے پرانے دھندے پر جارہا ہوں، اب تیری مرضی کہ گناہ کر یا نہ کر،

میں بھیک مانگنا نہیں چھوڑ سکتا۔ عورت نے کہا: جب تم یہ عادت نہیں چھوڑ سکتے تو صاف ظاہر ہے میں بھی اپنی عادت کو نہیں چھوڑ سکتی۔

جن لوگوں کو مانگنے کی عادت ہوتی ہے ان کی ساری زندگی مانگتے ہی گزرتی ہے۔ اور جس کو یقین ہو جاتا ہے کہ میرا اللہ ہی مجھے دے گا۔ جتنا دیتا ہے اس پر قناعت کرتا ہے۔ اور دعا مانگتا ہے:

"رَبِّ قَنِّعْنِي بِمَا رَزَقْتَنِي وَبَارِكْ لِي فِي مَا أَعْطَيْتَنِي"

"اے رب! جو کچھ آپ نے مجھے دیا ہے اس پر مجھے قناعت عطا فرما اور جو کچھ مجھے دیا ہے اس میں برکت عطا فرما۔"

ان کو پھر کسی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

﴿الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کی تفسیر:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ سے مراد علم و حکمت ہے۔ اگر صحیح علم نہیں ہوگا تو سیدھا راستہ کیسے ملے گا؟ انسان کی کامیابی تب ہوگی جب حکمت ہوگی۔ اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ علم دو قسم پر ہے: ایک دنیاوی علم ہے اور دوسرا دینی علم۔ دنیاوی علم سے جسم بنتا ہے، جان بنتی ہے اور مال بنتا ہے، لیکن دین کے علم سے روح کو ترقی ہوتی ہے، اللہ راضی ہوتا ہے۔ جب دین مل گیا تو دنیا اس کے تابع ہے، خود بخود اس کے پیچھے آئے گی۔ اس لیے ہمیں سبق ملا کہ علم و حکمت حاصل کریں، لیکن علم و حکمت بھی ان لوگوں کا ہو جو انعام والے اور ہدایت یافتہ تھے، ان لوگوں کی علم و حکمت نہ ہو جو گمراہ تھے۔ اس لیے فرمایا:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾

سورۂ فاتحہ میں سات اخلاق:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں سورۂ فاتحہ کے اندر سات اخلاق سکھلائے اور ان سات اخلاق کو ہم اپنے اوپر لاگو کر لیں تو پورے معاشرے کی اصلاح ہو جائے، فساد اور بگاڑ ختم ہو جائیں گے۔ اس لیے قرآن میں ہے:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ

صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝

[حم السجدۃ: ۳۳،۳۴،۳۵]

''اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو (لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے اور خود (بھی) نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اور نیکی بدی برابر نہیں ہوتی، (بلکہ ہر ایک کا اثر جدا ہے تو اب) آپ نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیا کریں، پھر یکا یک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جاوے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے۔ اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل (مزاج) ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے۔''

برائی کو اچھائی سے روکنا اور گالی کے بدلے دعائیں دینا یہ ہر کسی کا کام نہیں ہے، نصیب والوں کو یہ بات ملتی ہے۔ جب بھی ہم سورۂ فاتحہ کی تلاوت کریں تو اس کی ساری صفات پر غور کریں۔ اس کے معبود ہونے پر غور کریں، اس کی ربوبیتِ عامہ پر غور کریں، اس کے عادل ہونے پر غور کریں اور اس کے ہدایت دینے والا، صراطِ مستقیم پر چلانے والا ہونے پر غور کریں گے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ صرف ہماری اصلاح ہی نہیں، بلکہ پورے عالم کی اصلاح ہوگی۔ کیونکہ حضور ﷺ سارے عالم کے نبی ہیں، صرف کسی عرب کے لیے، کسی قوم کے لیے، صرف کسی بستی کے لیے نہیں بھیجے گئے۔

سورۂ فاتحہ کی عرفانی تفسیر

اب ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر پڑھیں گے جس کو علماء اور اولیاء اللہ کی اصطلاح میں تفسیر عرفانی کہتے ہیں۔ اولیاء اللہ جن کا تعلق تصوف سے ہے۔ (جس پر علامہ ابن قیم رحمہ اللہ اور علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے سیر حاصل بحث کی ہے) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جیسے پہلے لکھا تھا کہ اصل قوتِ غضبیہ اور عقلیہ میں اعتدال ہے۔ اگر افراط اور تفریط ہوگی تو ہم راستے سے ہٹ جائیں گے۔

اسی طرح تصوف ہے۔ اگر وہ اللہ کے فرمان کے مطابق تزکیہ باطن ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے احسان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ))

''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت (اس خشوع اور خلوص سے) کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر (یہ حالت حاصل) نہ ہو کہ تم اس کو دیکھتے ہو تو (یہ خیال رہے کہ) وہ تمہیں دیکھتا ہے۔''

[صحیح البخاری، رقم: ٥٠، بَابُ سُؤَالِ جِبْرِيلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الإِيمَانِ...]

تو وہ تصوف اگر قرآن وسنت کے مطابق ہے تو ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں، اولیاء اللہ کا اکرام کرتے ہیں اور اولیاء کے بارے میں وہی عقیدہ رکھتے ہیں جو اللہ کے قرآن میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں ہے:

﴿أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [یونس: ٦٢]

''یاد رکھو کہ جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

ولی وہ ہوتا ہے:

﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾ [یونس: ۶۳]

''یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیے رہے۔''

یہ جو افراط و تفریط آ گیا ہے کہ بعض لوگوں نے اس کو فرقہ باطنیہ کے تابع کر دیا۔ اور بعض لوگوں نے شریعت کو صرف اتنی اہمیت دی جیسے پھل کے اوپر کا چھلکا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا: اصل بات تو وہ ہے جو اندر ہے۔ یہ مولوی شریعت کی بات کرتے ہیں، ان کو طریقت کا کیا پتا ہے؟ انہوں نے طریقت اور شریعت کو تقابل میں کھڑا کر دیا، اس لیے یہ تو خلافِ قرآن و سنت ہے۔

کتاب اللہ اور رجال اللہ:

اسی سورۂ فاتحہ سے ہمیں ایک سبق ملتا ہے کہ کیسے لوگ بھٹک گئے؟ اور افراط و تفریط میں پڑ گئے۔ بعض لوگوں نے کتاب اللہ کو تو اپنایا کہ ہمارا اللہ پر، اس کے رسول ﷺ پر اور اس کی کتاب پر ایمان ہے، لیکن رجال اللہ کا انکار کر دیا کہ بس کتاب اللہ ہے، ہمیں رجال اللہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور بعض لوگوں نے رجال اللہ کے ساتھ تو تعلق رکھ لیا، لیکن کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ تو یہ دونوں افراط و تفریط میں پڑ گئے۔

اعتدال یہ ہے کہ ہم رجال اللہ کو بھی پکڑیں، کیونکہ اللہ نے قرآن میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [التوبۃ: ۱۱۹]

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔''

اور ہم کتاب اللہ کو بھی لیں گے کہ ''حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ'' (ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔) اور رجال اللہ کو کتاب اللہ کی روشنی میں دیکھیں گے۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کی کرامت معنوی:

جیسے ایک واقعہ ہے کہ ایک آدمی حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کی خدمت میں گئے۔ اور پانچ دن رہ کر آئے اور کہا کہ مجھے اجازت دیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کیسے آئے تھے؟ اور کیوں جا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ میں نے سنا تھا کہ آپ بڑے شیخ ہیں، دل چاہا کہ آپ کی بیعت ہو جاؤں اور مرید بن جاؤں۔ اب میرا مرید ہونے کو دل نہیں کرتا،

---

[1] صحیح البخاری، حدیث: ۴۴۳۲، باب: مرض النبی ﷺ ووفاتہ

کیونکہ میں اتنے دن رہا ہوں اور میں نے آپ کی نہ کوئی کرامت دیکھی اور نہ کوئی بزرگی دیکھی۔ فرمایا: ٹھیک ہے بھائی! بس ایک بات بتاؤ اگر چہ بیعت نہ ہو، ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ تم اتنے دن ہمارے لنگر میں رہے ہو، اتنے عرصہ میں تم نے ہمارا کوئی قول یا فعل خلافِ سنت بھی دیکھا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت نے فرمایا: فقیر کی تو یہی کرامت ہے۔ ہمارے پاس اور کوئی کرامت نہیں ہے۔ [خطباتِ حکیم الامت: ۲/۱۳۶، ۱۴۷]

تو ہم نے بھی رجال اللہ کو دیکھنا ہے کہ اس کا ہر عمل کتاب وسنت کے مطابق ہے تو وہ ولی اللہ ہے، ضروری نہیں کہ کوئی کرامت ظاہر ہو۔ اور اگر ایک آدمی پانی پر چل رہا ہے، آگ میں چل رہا ہے، ہوا میں اڑ رہا ہے اور حاضرات کے علوم جانتا ہے، لیکن اس کا عمل کتاب وسنت کے مطابق نہیں ہے۔ وہ ہمیں لاکھ خارقِ عادت باتیں دکھائے ہم اس کو دجال تو کہیں گے، لیکن ولی اللہ نہیں کہیں گے۔

نجومیوں وغیرہ کی تصدیق کرنا:

آج کل لوگوں نے علمِ نجوم، علمِ جفر اور علمِ اعداد اور ہاتھوں کی لکیروں سے ایسے چیزیں حاصل کر رکھی ہیں کہ لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ حالانکہ حضور ﷺ کی حدیث مبارک ہے:

((مَنْ أَتَى عَرَّافاً أَوْ كَاهِناً فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ ﷺ))

''جو شخص کسی کاہن یا نجومی کے پاس جائے اور اس کی باتوں کی تصدیق کرے تو گویا اس نے محمد ﷺ پر نازل ہونے والی شریعت سے کفر (انکار) کیا۔'' [المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث: ۱۵]

اس لیے یاد رکھیں! اصل چیز اتباعِ سنت ہے، وگرنہ شعبدے تو ہر کوئی دکھا سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے ایسے چکر بنائے ہوئے ہیں کہ اللہ بچائے۔

ایک پیر صاحب تھے...... پتا نہیں کہ اب وہ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں...... انہوں نے اپنے خلفاء کو سمجھایا ہوا تھا کہ جو لوگ صبح میرے پاس آئیں ان کی لسٹ بناؤ اور دیکھو کتنے ہیں جن کی اولاد نہیں، کتنے ہیں جو خود بیمار ہیں اور کتنے ہیں جن کا بچہ بیمار ہے اور نوکری ڈھونڈنے والے کتنے ہیں؟ اور ان کو سمجھا رکھا تھا کہ اگر اولاد والے ہوں تو ان کو فلاں گیٹ سے بھیجنا۔ اور جو بیماری والے ہوں ان کو دو نمبر گیٹ سے بھیجنا۔ اب جوں ہی آدمی ایک گیٹ سے آتا تو وہ کہتا: اچھا تم بچہ مانگنے آگئے ہو۔ وہ آکر پاؤں پڑ جاتا کہ حضرت کو تو پتا چل گیا ہے کہ میں تو بیٹے کے لیے آیا ہوں۔

تو وہ کہتا ہے کہ اب تو میں آپ کا دروازہ نہیں چھوڑتا۔ حالانکہ سب فراڈ ہے۔

طاہر القادری کا لطیفہ:

آپ حیران ہوں گے کہ ایک آدمی بہت تعلیم یافتہ ہے، میرا ملنے والا ہے، اس نے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اس نے اپنی تقریر میں خواب بیان کیا کہ میرے پاس حضور ﷺ تشریف لائے تو آپ ان علاقے والوں پر یعنی پاکستان، ہندوستان والوں پر ناراض تھے۔ میں روتا رہا اور منتیں کرتا رہا۔ بڑی مشکل سے حضور ﷺ راضی ہوئے اور فرمایا: اب اگر میں آؤں گا تو صرف تمہارے ادارے میں آؤں گا۔ میرے آنے جانے کی ٹکٹ کا انتظام تم کرو گے۔ لوگ اتنے جاہل ہیں کہ بہت سے لوگوں نے ٹکٹیں پیش کیں کہ حضور ﷺ اس ٹکٹ سے آجائیں۔ اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟

ایک لاکھ ریال مانگنے والے کا فراڈ:

یہاں مکہ مکرمہ کی بات ہے کہ ایک آدمی میرے پاس آیا اور کہا کہ آپ سے ملنا ہے اور بات کرنی ہے۔ میں نے کہا: فرمایئے! اس نے کہا: نہیں! علیحدگی میں بتاؤں گا۔ میں نے کہا: وہاں علیحدہ بیٹھ جاتے ہیں اور کیا علیحدگی ہوگی؟ میں کوئی وی آئی پی لوگوں میں سے ہوں کہ ہمارے کوئی قاعدے اور ضابطے ہوں؟ بہر حال! وہ مجھے ملا اور کہا کہ مجھے خواب میں حضور ﷺ نے حکم دیا ہے کہ میں آپ کے پاس جاؤں اور آپ مجھے ایک لاکھ ریال دے دیں۔ میں نے کہا: ریال تو میں نے دینے ہیں، مجھے کیوں نہیں کہا؟ تمہیں کیوں کہا ہے؟ آپ ایسا کریں کہ پھر حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کریں کہ حضور ﷺ مجھے فرمائیں تو میں کپڑے بیچ کر بھی ایک لاکھ ریال دینے کے لیے تیار ہوں۔ وہ پھر واپس نہیں آیا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ جھوٹا تھا۔

ایک ڈوبنے والے مولوی کا لطیفہ:

دوسری بات یہ ہے کہ مولوی کسی سے لے سکتا ہے، دے نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ تو قیامت کی علامت ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ایک مولوی ڈوب رہا تھا اور کنارے پر دیہاتی کھڑا تھا، اس نے کہا: مولوی صاحب! ہاتھ دیں، ہاتھ دیں۔ لیکن وہ ہاتھ نہیں دے رہا تھا۔ دوسرا عقل مند بندہ گزرا، اس نے کہا کہ کہو مولوی صاحب! ہاتھ لیں۔ مولوی ڈوب جائے گا، لیکن ہاتھ نہیں دے گا۔ اس نے کہا: مولوی صاحب! ہاتھ لیں۔ تو اس نے ہاتھ دے دیا۔ جس بندہ نے پیدا ہونے کے بعد لینا سیکھا ہو وہ دینے کو کیسے جانے گا؟

قل خوانی کا لطیفہ:

اس لیے میں ہمیشہ اپنے دوستوں کو کہتا ہوں کہ میری باتوں میں نہ آئیں اور دیانتداری سے بتائیں کہ جہاں جہاں آپ کا گھر ہے، کسی مولوی نے اپنے باپ کے مرنے کے بعد اپنے گھر قل خوانی پر بلوایا ہے؟ یا سات جمعراتیں کی ہیں؟ یا چالیسواں کیا ہے؟ کیونکہ اس کو پتا ہے کہ یہ حرام ہے تو وہ اپنے پیسے حرام کیوں کرے؟ تمہیں تو حکم دے گا، لیکن خود کبھی نہیں کرے گا۔

اولیاء کی تعریف قرآن سے:

اس لیے یاد رکھیں! اولیاء کی تعریف قرآن نے خود بیان کر دی ہے۔ فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾ [یونس: ۶۳]

''یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقوی اختیار کیے رہے۔''

جو ایمان والے اور اللہ سے ڈرنے والے ہیں، جن کے دلوں میں اللہ کی عظمت اور ہیبت ہے وہ اولیاء اللہ ہیں۔ جن کا ہر قدم سنت کے مطابق اٹھتا ہے، جن کے ایک ہاتھ میں کتاب اللہ ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں سنتِ رسول اللہ ﷺ ہوتی ہے۔ اس کے خلاف ہم کوئی بات سوچ ہی نہیں سکتے۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے راستے کو چھوڑ کر چلے گا وہ ولی اللہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ شیطان، دجال اور شعبدہ باز تو ہو سکتا ہے، لیکن اللہ کا ولی نہیں ہو سکتا۔

اولیاء کو ماننے میں اعتدال:

سورۂ فاتحہ نے ہمیں سبق دیا تھا:

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾

''ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تیرا انعام ہے۔''

اور وہ کون لوگ ہیں؟ وہ انبیاء کرام ﷺ، صدیقین، شہداء اور صالحین ﷭ ہیں۔ جنہوں نے کتاب اللہ پر سختی کی اور رجال اللہ کو چھوڑ دیا وہ بھی پٹڑی سے اتر گئے اور جنہوں نے رجال اللہ کو سب کچھ سمجھ لیا اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا وہ بھی پٹڑی سے اتر گئے۔ اعتدال یہ ہے کہ کتاب اللہ پر بھی ایمان ہو، سنت رسول اللہ ﷺ پر بھی ایمان ہو اور اولیاء

اللہ پر بھی اعتماد ہو۔ لیکن ان کی ولایت کا امتحان کتاب وسنت کی روشنی میں ہوگا۔ اگر وہ کتاب وسنت پر عمل کر رہا ہے تو وہ اللہ کا ولی ہے، چاہے اس کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو یا نہ ہو۔ کتنے بڑے اولیاء اللہ ہیں! ان کے ہاتھ پر کرامت ظاہر نہیں ہوئی۔

مولانا غلام محمد دین پوری رحمہ اللہ نے کرامت کیوں نہ دکھائی؟

حضرت مولانا غلام محمد دین پوری رحمہ اللہ جو بہت بڑے مجاہد اور اللہ والے تھے۔ والد صاحب اکثر ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔ انگریزوں نے انہیں قید کرلیا۔ (کیونکہ صاف ظاہر ہے جو مسلمان ہوگا، اللہ والا ہوگا وہ انگریز کا خیر خواہ تو نہیں ہوگا) انگریز انہیں دین پور سے سکھر تک کا سفر پیدل لے گئے جو تقریباً سو میل بنتا ہے۔ مقصد ان کو تکلیف پہنچانا تھا اور جب جیل میں لے گئے تو ان کو سی کلاس میں رکھا۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ ہماری ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا: حضرت! آپ بڑے شیخ ہیں، کچھ کریں۔ اگر حضرت تاج محمود امروٹی رحمہ اللہ ہوتے تو کسی کرامت کا اظہار ہوتا۔ آپ کو پیدل لے گئے اور سی کلاس میں رکھا، آپ نے تو کوئی بزرگی نہیں دکھائی؟

حضرت امروٹی رحمہ اللہ کی طبیعت میں بڑا جلال تھا۔ جلدی غصہ میں آجاتے اور اللہ سے دعا کرتے تو اللہ ان کی دعاؤں کو سچا بھی کر دیتا۔ اس لیے والد صاحب رحمہ اللہ نے ان کا ذکر کیا کہ اگر وہ ہوتے تو وہ انگریزوں کے خلاف ضرور میدان میں آجاتے۔ فرمایا: فقیرو! ولی کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ خالی مٹکے کی طرح آوازیں نکالتا رہے، بلکہ اللہ کے فیصلے پر صابر اور راضی رہے۔ بعض لوگ جلدی میں آ کر کچھ دکھا دیتے ہیں، وہ برتن خالی ہوتا ہے۔ برتن بھرا ہوا ہو تو آواز نہیں آتی۔ وہ اللہ کے فیصلے پر صابر و شاکر رہتا ہے کہ اگر اللہ کو یہی منظور تھا تو ہم بھی اسی پر راضی ہیں۔ اور کہنے لگے: تم اس بات پر کیوں غور نہیں کرتے کہ اس جیل میں جو عادی مجرم تھے اللہ نے ان کو نمازی بنا دیا اور کتنے لوگوں نے داڑھی رکھی اور کتنے لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کو قبول کیا اور کتنے لوگوں کو رہائی ملی۔ اللہ نے شاید مجھے اسی کام کے لیے جیل میں رکھنا ہو۔ تو اللہ نے کام لے لیا۔

مولانا تاج محمود امروٹی رحمہ اللہ کی کرامت:

حضرت امروٹی رحمہ اللہ کے بارے میں سنا ہے کہ بہت بڑے موحد اور مجاہد تھے۔ ان کے لنگر میں ایک نوجوان رہتا تھا اور کام کرتا تھا۔ انگریز کا دور تھا۔ ہندو اور انگریز کی بڑی طاقت تھی۔ ایک ہندو بدبخت نے تقریر میں

حضور ﷺ کے خلاف نازیبا الفاظ کہے، گستاخی کی۔ یہ نوجوان وہاں گیا ہوا تھا، جذبات میں آیا اور اس کو مار دیا۔ ہندو پنڈت مر گیا۔ ان کی حکومت تھی۔ اس پر مقدمہ کرایا اور نوجوان کو قید کر دیا۔ خدا کی قدرت کہ وہ ماں باپ کا اکلوتا تھا اور اس کی ماں لنگر کی روٹی پکاتی تھی۔ وہ سندھ کے علاقے کی بوڑھی عورت تھی۔ ہر پانچ دس دن کے بعد جب حضرت نماز پڑھ کر نکلتے تو وہ حضرت کے بارے میں بڑی بے وقوفی کی باتیں نکالتی کہ آپ نے میرے بیٹے کو پھنسوایا ہے، آپ پیر بنے پھرتے ہو، آپ کو ان میں سے کوئی اور نہیں ملا تھا۔ حضرت رحمہ اللہ فرماتے: مجھے پتا نہیں کہ تمہارے بیٹے نے کیا کیا ہے؟ پھر میں نے تیرے بیٹے کو کیسے مروادیا ہے؟ ہم نے وکیل کر رکھے ہیں۔ معاملہ چلتا رہا۔ اللہ کی قدرت اور شان ہے کہ وہ مقدمہ کورٹ سے بھی سزا ہو گیا، سیشن کورٹ سے بھی سزا ہو گیا اور پھر اس کی ہائی کورٹ میں اپیل ہوگئی۔ وہ بوڑھی روزانہ روتی کہ حضرت کچھ تو کریں۔ حضرت فرماتے کہ وکیل کھڑے کیے ہوئے ہیں، اپیلیں کرا رہے ہیں۔ وہ کہتی: نہیں آپ تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ جا کر کوشش کریں۔

حضرت سکھر ہائی کورٹ تشریف لے گئے۔ اور جو اس کا لان تھا اس میں جا کر بیٹھ گئے۔ حضرت گھٹنوں پر کپڑا ڈال کر تسبیح پڑھتے رہتے تھے۔ ہندوؤں کے بڑے وکیل تھے اور اس نوجوان کی طرف سے عام سا وکیل تھا۔ بہر حال جب بحث ہوگئی تو اس ہائی کورٹ کے جج نے فیصلہ محفوظ کر لیا کہ آرام کے وقفہ کے بعد فیصلہ سنایا جائے گا۔ حضرت اور ان کے ساتھ تین چار اور آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ آدمی کی پگڑی ہو اور داڑھی ہو تو آدمی دور سے پہچانا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے وکلاء آئے کہ سنا ہے آج مسلمانوں کا پیر بھی آیا ہوا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ آج پیر صاحب کیا کرتے ہیں؟ طنز کرنے لگے کہ پیر صاحب اور زور کی تسبیح پڑھیں، تاکہ آج مرید کو جلدی سزائے موت ہو۔ حضرت نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا: میری فریاد عرش پر پہنچ گئی ہے۔ اتنی دیر میں فیصلہ ہوا کہ ملزم باعزت بری ہے۔ سارے وکیل جج کے پاس گئے کہ یہ کیسا فیصلہ کیا؟ جج نے کہا: مجھے پتا نہیں کہ کس طاقت نے یہ کرایا؟ اب میں یہ فیصلہ واپس نہیں لیتا، میں تو سزائے موت لکھ کر آیا تھا۔ اب جو فیصلہ سنایا ہے میں اس پر قائم ہوں۔

انگریز کا افسر اندھا ہو گیا:

حضرت مولانا تاج محمود امروٹی رحمہ اللہ کا ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ان کے علاقہ کی مسجد تھی، انگریز وہاں سے بہت بڑی نہر گزارنا چاہتے تھے۔ حضرت نے فرمایا: یہ مسجد نہیں ٹوٹے گی۔ انگریزوں نے کہا: ہم مسجد کو توڑیں گے، ہمیں

کیا ضرورت ہے کہ نہر کو اوپر سے لائیں؟ ہم آپ کو دوسری مسجد بنادیں گے۔ حضرت امروٹی ﷫ نے فرمایا: نہیں اللہ کا گھر نہیں ٹوٹے گا۔ (یہ تاریخی واقعہ ہے ابھی بھی وہ مسجد اس بڑی نہر کے درمیان میں کھڑی ہے) انگریزوں کا دور تھا۔ وہ کیسے برداشت کرتے؟ انہوں نے آرڈر جاری کیے کہ اس مسجد کو شہید کردو اور جو راستے میں آئے اس کو بھی ماردو۔ تو اس علاقہ کا جو کلکٹر تھا اس نے کہا: پہلے ایک دفعہ بات کرنے دو۔ وہ کلکٹر آیا، حضرت ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا: آپ اہلِ علم سیدھے سادھے لوگ ہیں، آپ کے یہ دو تین ہزار مرید ہیں، آپ ان کو کیوں مروانا چاہتے ہیں؟ ہم آپ کو متبادل کسی جگہ مسجد بنادیں گے اور آپ اس کو ہماری کمزوری نہ سمجھیں کہ آپ کے پاس چل کے آئے ہیں۔ تو حضرت نے فرمایا: تمہارے پاس تو ایک فائر کرنے والی بندوق ہے، میرے پاس تو دس فائر کرنے والی طاقت ہے، تم میرے ساتھ لڑنے آئے ہو؟ اس نے کہا: آپ لڑیں گے کیسے؟ آپ نے فرمایا: اندھے ہو جاؤ تو اسی وقت اس کی دونوں آنکھیں ختم ہو گئیں۔ وہ پاؤں پڑ گیا کہ آپ مہربانی کریں، میں جانوں اور گورنمنٹ جانے۔ آپ کی مسجد نہیں گرے گی۔ آپ نے فرمایا: اچھا! اللہ سے دعا کروں گا کہ اللہ تیری آنکھیں واپس لوٹا دے۔

چوتھی چیز راستہ بھی ہو۔ اگر راستہ نہ ہو تو کس پر چلے گا؟ پانچویں چیز ہے کہ راستہ سے انحراف بھی نہ کرے۔ اگر راستہ سے انحراف کرے گا تو منزل پر کیسے پہنچے گا؟ اولیاء اللہ نے اس کو مثال سے سمجھا دیا کہ جس طرح انسانی جسم کے لیے ایک سیر ہے اور اس طرح کی ایک روحانی سیر اور سفر ہے کہ اس کا اللہ سے تعلق جڑ جائے۔ اس کو تو کوئی جانتا ہی نہیں، وہ تو امرِ ربی ہے کہ کیسے سفر کرتی ہے؟ اور کیسے منزل پر پہنچتی ہے؟

روحانی سیر کے درمیان چار حجاب:

اس کے بارے میں وہ ایک مثال دیتے ہیں کہ اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ یہ ہے کہ جو درمیان میں حجابات ہیں وہ ہٹ جائیں۔ جیسے ایک خیمہ ہے، آپ نے اس کے پردے گرادیے تو اندھیرا ہو گیا، حالانکہ باہر سورج چمک رہا ہو۔ اگر آپ نے حجاب اٹھادیے تو روشنی آنی شروع ہو گئی۔ اگر خیمے کے سارے حجاب اٹھادیے تو پوری طرح سورج کی روشنی اندر آئے گی۔ اسی طرح انسان کی کیفیت ہے کہ جب تک حجاب نہیں ہٹتے اس وقت تک انسان کو بھی ذات وصفات کی روشنی نہیں ملتی، جیسا کہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ﴾[البقرۃ:۲۵۷]

''اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے ان کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (یا بچا کر) نور (اسلام) کی طرف لاتا ہے۔''

وہ نورِ ایمان کی روشنی اس وقت ملے گی جب پردے ہٹیں گے۔

﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ﴾[الزمر:۲۲]

''بھلا کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے، جس کے نتیجے میں وہ اپنے پروردگار کی عطا کی ہوئی رشنی میں آ چکا ہے، (سنگ دلوں کے برابر ہو سکتا ہے؟)''

جب ہمارے اوپر پردے ہیں تو وہ روشنی اندر کیسے آئے گی؟ وہ پردے اور حجابات مشہور چار ہیں۔

پہلا حجاب، غفلت:

ایک غفلت کا حجاب ہے، جو اللہ کی ذات وصفات کو نہیں سمجھتے۔ اسی لیے اللہ نے قرآن میں کافروں کی مثال دیتے ہوئے فرمایا:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ١٧٩؁﴾[الاعراف:۱۷۹]

''جن کے دل ایسے ہیں جن سے نہیں سمجھتے اور جن کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے نہیں دیکھتے اور جن کے کان ایسے ہیں جن سے نہیں سنتے۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ یہ لوگ زیادہ بے راہ ہیں۔ یہ لوگ غافل ہیں۔''

یہ حجابِ غفلت ہے۔ جب انسان دنیا کے ناز ونعم میں پڑا ہوا ہے تو وہ دوسری طرف سے غافل ہے تو اس کو منزل کیسے ملے گی؟ نورِ ایمان کی روشنی کیسے ملی گی؟

دوسرا حجاب، جہل:

جہالت بھی بہت بڑا حجاب ہے۔ مثلاً: آپ سڑک پر جا رہے تھے۔ اس پر بہت ہی قیمتی ڈائمنڈ پڑا تھا، لیکن آپ کو اس کی پہچان نہیں تھی۔ تو آپ اس کو چھوڑ کر چلے جائیں گے کہ یہ تو پتھر کا ٹکڑا ہے؟ اگر آپ کو پتا ہوگا تو آپ اس کو حفاظت سے اٹھائیں گے، ڈاکوؤں سے بچائیں گے۔ جب جہالت کا پردہ ہٹے گا پھر آپ اس چیز کو حاصل کرنے کی

کوشش کریں گے۔

تیسرا حجاب، رسم:

جیسے شادی و بیاہ کی رسمیں، بچے کی پیدائش کی رسمیں، برتھ ڈے، بزرگوں کی برسی، شادی سالگرہ، نیو ائیر نائٹ، فلاں فلاں خوشی ہے۔ یہ ساری رسومات بھی پردہ ہیں۔ کیونکہ رسم کہتے ہیں قوانین مروجہ کو اور انسان قوانینِ الٰہیہ کے تابع ہے۔ جب ہم قوانین مروجہ میں الجھ گئے تو قوانین الٰہیہ سے خود بخود پردہ ہو جائے گا۔ آج بڑے سے بڑا نمازی ہو، صفِ اُولیٰ کے اندر نماز پڑھتا ہو، لیکن جب شادی کا موقع آجائے تو وہ بھی رسموں میں پڑ جاتا ہے۔ وہ کہے گا: مولوی صاحب! ایک ہی بیٹا ہے، برادری نہیں مانتی۔ اب شریعت ختم ہو جائے گی۔ یہ جو حدیث پر چلنے والے ہیں چار چار لاکھ کا شادی گھر کرایہ پر لیتے ہیں، کیا یہ بھی حدیث میں حکم ہے؟ بلکہ بعض اوقات تو گانے والیاں بھی آتی ہیں۔

فیشن کا زمانہ اور رسم و رواج:

ایک اخبار میں پڑھ رہا تھا کہ دلہن کے میک اپ پر چار لاکھ لگائے گئے، لیکن دلہن پھر بھی مطمئن نہیں ہے، کیا یہ بھی سنت میں شامل ہے؟ تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی نعمتوں کا اظہار ہے۔ پھر جب کوئی دوسرا اظہار کرتا ہے تو کیوں چڑتے ہو؟ کیا قرآن و حدیث پر عمل صرف نماز اور روزہ کے لیے ہے؟ کوئی ہے جو بتائے کہ حضور ﷺ نے پردے لٹکائے ہوں؟ ڈرائنگ روم میں کارپٹ بچھایا ہو؟ کیا یہ سنت کے مطابق ہے؟ ہم کہتے ہیں: یہ عمل سنت ہے، لیکن جب ہماری عورتوں کا مسئلہ آتا ہے تو سنتیں رہ جاتی ہیں۔ مثلاً: اگر آپ کا بیٹا یا بیٹی ہے، آپ چاہتے ہیں کہ میرے رشتہ داروں میں شادی ہو اور عورت چاہتی ہے اس کے رشتہ داروں میں ہو۔ شرط لگالیں شادی وہاں ہوگی جہاں عورت چاہے گی۔ اگر وہاں شادی ہوگئی جہاں آپ چاہتے ہیں تو آپ کو جینے نہیں دے گی، نہ رشتہ داروں کو جینے دے گی اور نہ بہو کو جینے دے گی۔ کبھی سنیں گے کہ چولہا پھٹ گیا اور کبھی برنر کو بند کرنا بھول گئی تو آگ لگ گئی اور کبھی سنیں گے کہ چھت سے پاؤں پھسلا اور گر گئی۔ خود ساس کا پاؤں نہیں پھسلتا، نوے (۹۰) سالہ بوڑھی بیٹھی ہے۔

یہ ساری صرف باتیں ہیں، شریعت پر چلنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ فرمایا:

﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾ [سبا: ۱۳]

"اور میرے بندوں میں کم لوگ ہیں جو شکر گزار ہوں۔"

یہ حجاب رسوم ہے، جس کی وجہ سے احکامِ الٰہیہ سے ہٹ جاتے ہیں تو درمیان میں پردہ آجاتا ہے۔

چوتھا پردہ:

چوتھا پردہ ہے: "حِجَابُ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ" (اللہ کے سوا غیر سے ڈر اور امید ہو) حالانکہ ایمان کا معنی تھا کہ اللہ سے ڈر اور اللہ سے امید ہو۔ لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے غیر سے امید اور ڈر زیادہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سائیں! فکر نہ کریں، یہ کام میرے مرشد کر دیں گے۔ حضرت کا بڑا کرم ہے۔ اگر میں نے پیر کی جھوٹی قسم کھائی تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ اللہ کی جتنی قسمیں کھالے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جھوٹی قسم میں قرآن اٹھانے والے کا واقعہ:

واقعہ مشہور ہے کہ ایک تھانیدار کے پاس فیصلہ آگیا تو تھانیدار نے ملزم کو کہا کہ تم قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر، قرآن اٹھا کر قسم اٹھاؤ گے کہ تم بے گناہ ہو۔ اس نے کہا: مجھے پہلے قرآن دکھاؤ، تھانیدار نے قرآن منگوایا۔ ملزم نے کہا: یہ ایک کیا میں تو گیارہ بھی اٹھا سکتا ہوں۔ تھانیدار سمجھدار تھا کہ یہ تو وزن دیکھ رہا ہے۔ تھانیدار نے کہا: قرآن رحل کے ساتھ اٹھانا ہوگا۔ اس ملزم نے کہا: رحل دکھاؤ۔ تھانیدار نے کہا: اس کو لے جاؤ اور جو کنوئیں پر رہٹ چل رہا ہے وہ دکھاؤ۔ اس نے کہا: یہ تو میں نہیں اٹھا سکتا، میں تو مر جاؤں گا، بہتر ہے کہ میں چوری کا اعتراف کر لیتا ہوں۔ تو جب یہ عالم ہو تو ان لوگوں کو کیسے بات سمجھائی جائے؟

کچھ دوسری قسموں کا خوف:

سندھیوں کو کہا کہ خدا کی قسم اٹھاؤ تو قسم اٹھالیں گے اور جب کہا جائے کہ آنکھوں پر ہاتھ رکھو تو آنکھوں پر ہاتھ نہیں رکھیں گے۔ بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھاؤ تو یوں قسم نہیں اٹھائیں گے۔ اس دکان پر قسم اٹھالو۔ نہیں یہ روزی کا اڈا ہے، میں کیوں قسم اٹھالوں؟ چلو! تم اپنے مرشد کی قسم کھالو۔ نہیں اگر میں نے جھوٹی قسم کھالی تو میرا خاندان تباہ ہو جائے گا۔ غیر اللہ سے ڈر رہے ہیں اور امید بھی غیر سے ہے۔ اس لیے فرمایا: جب تک یہ حجابات ہیں انسان ایمان کی روشنی کو حاصل ہی نہیں کر سکتا۔

سورۂ فاتحہ سے غفلت کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟

یہ بات سمجھیں کہ یہ ساری باتیں سورۂ فاتحہ سے کیسے سمجھ آتی ہیں؟ جب ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' پڑھتے ہیں تو اس سے حجاب غفلت ختم ہو گیا کہ ساری تعریفیں اور محامد اللہ کے لیے ہیں۔ اللہ کی ذات محمود ہے، بندہ حامد ہے۔ وہ مسجود ہے، بندہ ساجد ہے۔ وہ معبود ہے، بندہ عابد ہے۔ اس کو پتا چل گیا کہ ساری مدح وثنا اللہ کے لیے ہے، اب غفلت سے جاگ گیا۔

جہالت کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟

دوسرا پردہ جہالت کا ہے۔ وہ اس طرح ہٹے گا کہ اللہ کی ذات وصفات کا علم ہو اور احکام وافعال کا علم ہو۔ جب ''رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' پڑھا تو اس کے اندر ربوبیت عامہ ہے کہ وہ تمام جہانوں کا رب ہے، سب کو پالنے والا ہے۔ پھر ''اَلرَّحْمٰنِ'' کہا تو اس سے رحمت عامہ کا پتا لگا کہ اللہ کی رحمت دنیا میں اپنوں کے لیے بھی ہے، بے گانوں کے لیے بھی ہے، ماننے والوں کے لیے بھی ہے اور شرک کرنے والوں کے لیے بھی ہے۔ ''اَلرَّحِیْمِ'' سے رحمتِ خاصہ کا پتا چلا کہ آخرت میں اس کی رحمت صرف ایمان والوں کے لیے ہے۔ ''اَلرَّحْمٰنُ فِی الدُّنْیَا وَالرَّحِیْمُ فِی الْاٰخِرَۃِ'' (رحمٰن دنیا میں اور رحیم آخرت میں)۔ اس کی رحمت عامہ اور خاصہ کا علم ہوا۔

''مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' سے اس کی صفتِ عدل کا علم ہوا۔ فیصلہ کرنے والا اللہ ہے، سزا و جزا کا مالک اللہ ہے۔ تو اس سے ہماری جہالت کے پردے ہٹ گئے۔

رسم ورواج کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟

جب ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ'' پڑھا تو اس سے رسم ورواج کا پردہ بھی ہٹ گیا کہ ہم تو وہی کریں گے جو تیری رضا ہوگی، تیری ہی عبادت ہوگی اور تجھ ہی سے مانگنا ہوگا۔ اس سے رسم ورواج والا پردہ ختم ہو گیا۔

غیر سے خوف کا پردہ کیسے دور ہوتا ہے؟

باقی اللہ کے سوا غیر سے ڈرنا اور امید رکھنے کا پردہ ''وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ'' سے ختم ہو گیا۔ تجھ سے مدد مانگتے ہیں، تو ہی ہماری امیدوں کا مرکز ومحور ہے۔ ہمارے خوف کا مرکز بھی اللہ ہے۔ اس سے ہم اللہ سے جڑ گئے۔ اب سارے پردے ہٹ گئے، روشنی آنی شروع ہو گئی تو اللہ نے ہمیں سکھایا کہ مانگو:

﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝﴾ [الفاتحہ: ۵]

''یا اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت فرما دے۔''

پردے ہٹنے کے بعد کا عمل:

اب ہمیں صراطِ مستقیم مل گئی، اب اس پر ہمیشہ رہنے کے لیے سکھایا: ﴿صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ﴾ صحبتِ صالحین اختیار کرلو۔ ﴿غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۝﴾ [الفاتحہ: ۷] یعنی مردودین کا راستہ چھوڑ دو۔ اب حصولِ منزل آسان ہو جائے گا کہ: ''أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ ''[1] (تم نماز میں ایسی عبادت کرو کہ تم اللہ دیکھ رہے ہو۔ اگر اس مرتبہ پر نہ پہنچو تو کم از کم اس مرتبہ پر پہنچو کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے)۔

سورۂ فاتحہ کا تعلق بھی نماز سے ہے۔

((وَجُعِلَ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ)) [سنن النسائی، حدیث: ۳۹۳۹، باب: حُبّ النِّسَاءِ]

''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔''

اس سے ہمیں یہ سبق ملا کہ جب سارے حجاب ہٹ جائیں گے تو ہم ''عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ'' (اللہ کے نور پر) ہوں گے۔ اور وہ نور اللہ کا قرآن ہے۔ جب نور میں آگئے تو اندھیروں سے بھی بچ گئے، ٹھوکروں سے بھی بچ گئے، نماز میں گرنے سے بچ گئے اور جہنم کے گڑھے میں گرنے سے بھی بچ گئے۔

علماء نے سورۂ فاتحہ کی کئی طرح سے تفسیریں لکھی ہیں، تاکہ آپ کے دماغ میں اللہ کی عظمت بیٹھ جائے۔ جب آپ کے دماغ میں سورۂ فاتحہ کی ساری باتیں ہوں گی تو آپ کے پڑھنے میں لذت ہوگی۔

اللہ کی مخلوقات میں اللہ کی حکمتیں:

علماء نے فرمایا ہے کہ اللہ نے آسمان بھی سات بنائے ہیں۔ یاد رکھیں! ہمیں اعداد سے عقیدت نہیں۔ بعض لوگ ۷ (سات) کے عدد کو اچھا سمجھتے ہیں اور ۱۳ (تیرہ) کے عدد کو منحوس سمجھتے ہیں۔ یا بعض ایام کو منحوس سمجھتے ہیں یا بعض مہینوں کو منحوس سمجھتے ہیں۔ الحمد للہ! مسلمان ان عقیدوں سے بری اور دور ہیں۔ لیکن حکمتیں ضرور ہوتی ہے۔ دیکھیں! مچھلی کے گوشت کے اپنے منافع ہیں اور بکری کے گوشت کے اپنے منافع ہیں۔ ہر ایک میں اللہ نے اپنی

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۵۰، باب: سُؤَالِ جِبْرِيْلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الْإِيْمَانِ وَالْإِسْلَامِ وَالْإِحْسَانِ]

نعمتیں رکھی ہیں۔

سات کے عدد میں حکمتیں:

اسی طرح بعض علماء نے فرمایا کہ یہ عجیب اللہ کی حکمتیں ہیں کہ اللہ نے آسمان بھی سات بنائے ہیں، زمینیں بھی سات بنائی ہیں، اپنے گھر کے طواف کے چکر بھی سات بنائے ہیں، صفا و مروہ کے درمیان دوڑانے کے چکر بھی سات بنائے ہیں اور سورۂ فاتحہ کی آیات بھی سات ہیں۔ یہ اللہ کی عظیم حکمت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس میں اسرارِ ربانیہ ہیں۔ جس طرح سورۂ فاتحہ کی آیات سات ہیں اسی طرح انسان سجدہ بھی سات اعضاء سے کرتا ہے: دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے، دونوں پاؤں زمین پر اور چہرہ زمین پر ہوگا تو سجدہ مکمل ہوگا۔ حدیث پاک میں بھی آتا ہے:

((أُمِرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَسْجُدَ عَلَى سَبْعَةِ أَعْضَاءٍ))

[صحیح البخاری، حدیث: ۸۰۹، بَابُ: السُّجُودِ عَلَى سَبْعَةِ أَعْظُمٍ]

اسی طرح جہنم کے سات دروازے ہیں۔ فرمایا: ﴿لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ﴾[1]۔ اسی لیے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر سجدے میں دونوں پاؤں اٹھائے رکھیں اور سجدے میں بالکل پاؤں زمین پر نہ لگیں تو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، کیونکہ سجدہ فرض ہے۔ اگر فرض رہ جائے تو نماز رہ جائے گی۔ اور کچھ دیر کے لیے پاؤں اٹھالینا، مکروہ ہے۔ یہ عام مسئلہ ہے، کوئی اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ اچھے خاصے نمازی کو بھی اس کا احساس نہیں ہے۔ اللہ کی کوئی حکمتیں ہیں کہ سات کو ترجیح دی ہے۔

سورۂ فاتحہ پر شبہات:

شبہات دو قسم کے ہیں: شبہاتِ متقدمین جو شروع دور کے لوگوں کے شبہات ہیں اور دوسرے شبہات متاخرین جو اسی دور میں پیدا کیے گئے ہیں۔ شبہات کا مقصد لوگوں کو گمراہ کرنا ہوتا ہے۔

شبہات کی مثال:

جیسے میاں بیوی کی اچھی زندگی گزر رہی تھی۔ اتفاق سے بیوی فلیٹ کی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی اور سامنے فلیٹ میں سے کوئی عورت آگئی، اس سے باتیں کیں۔ اور خاوند کے دل میں شبہ آگیا کہ کسی مرد سے باتیں کر رہی تھی۔

[1] ۔۔۔[الحجر: ۴۴]

آپ کو جب شبہ ہوگا تو اس کے ایک ایک قدم پر آپ کو اعتراض ہوگا۔ یہ قاعدہ اور ضابطہ ہے۔ جیسے کسی نے کہا تھا:

؎ تعصب کی نگاہوں میں نہ یوسف بھی حسیں ٹھہرے
محبت کی نگاہوں میں تو زنگی ماہ جبیں ٹھہرے

جب عداوت کی نظروں سے کسی کو دیکھیں گے تو اس کے ایک ایک قدم پر شبہ کریں گے۔ جیسے آپ کو شبہ پڑ جائے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے تو اگر کوئی گاڑی آ رہی ہو تو کہیں گے: ہاں یہ بھی تعاقب کر رہا ہے، حالانکہ اس کے فرشتوں کو بھی یہ بات معلوم نہیں ہوگی۔ دو آدمی ہٹ کر بات کریں گے تو آپ شک کریں گے: ضرور میرے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔

دشمنوں کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ شبہ ڈال دو۔ اور قرآن میں شبہات پرانے دور کے بھی ہیں اور نئے دور کے بھی ہیں۔ حضور ﷺ کے زمانے میں جب قرآن نازل ہوا تو کفار نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ کسی جادوگر کا کلام ہے۔ اس کی یہ دلیل دیتے کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ یہ بھی اللہ کی شان ہے کہ جو علوم ضارہ وشیطانیہ ہیں ان کا اثر بڑا جلدی ہوتا ہے۔ ویسے بھی دیکھ لیں کہ کتنا اچھے سے اچھا عطر لگائیں اس کی خوشبو کہاں تک ہوگی؟ لیکن اگر خدا نخواستہ کسی گٹر کا پائپ لیک ہو جائے تو میلوں تک بدبو ہوتی ہے۔ بدبو خوشبو کی نسبت زیادہ پھیلتی ہے۔

آپ ایک من دودھ کا مٹکا رکھ لیں، لیکن ایک چھٹانک پیشاب ڈال دیں۔ تو ایک چھٹانک سارے دودھ کو لے ڈوبے گا۔ تو اسی لیے جب شیطان شبہ ڈالتا ہے تو انسان بھٹکنا شروع ہو جاتا ہے۔

پرانے شبہات:

تو شروع میں کافروں نے کہا کہ یہ کلام ساحر ہے، کیونکہ اس سے اثر ہوتا ہے، لہٰذا یہ سحر ہے۔ اور ایک شبہ یہ ڈالا گیا کہ اللہ کے نبی ﷺ کاہن ہیں، قرآن کہانت ہے۔ کاہن وہ ہوتے تھے جو غاروں میں رہتے تھے اور قبل از وقت غیب کی خبریں دیتے تھے۔ ایک آدھ خبر سچی ہوتی تھی اور نوے جھوٹی خبریں ہوتی تھیں۔ جنات فرشتوں سے خبریں چرا کر ان کاہنوں کو آ کر بتاتے تھے۔ اور وہ ریاضت کرتے کرتے اس مقام پر ہو جاتے تھے کہ جنات ان کے تابع ہو جاتے تھے۔ اور جو شیاطین الجن والانس ہیں ان کا مقصد بھی حضور ﷺ کی امت کو گمراہ کرنا ہے۔ اس لیے وہ بھی ان کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں۔ اس لیے جو لوگ جنات کا کام کرتے ہیں یا ساحر ہیں ان سب کا پلیدی تعلق ہوتا ہے۔ کیونکہ جتنا ناپاک رہے گا اتنا اس کا جادو اثر کرے گا، کیونکہ شیطان ناپاک لوگوں کے ساتھ رہتا ہے،

پاک لوگوں کے ساتھ نہیں رہتا۔ آپ جب ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ '' کہتے ہیں تو شیطان آپ کے پاس کیسے آئے گا؟

بعض لوگوں نے کہا کہ ایک آدمی سے حضور ﷺ سیکھتے ہیں۔ اس کے بعد ہمیں سنا دیتے ہیں کہ خدا نے اتارا ہے۔

اور ایک شبہ ان کا یہ تھا کہ حضور ﷺ خود قرآن بناتے ہیں۔ اور یہ بھی شبہ ڈالا کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے، اگر ہم چاہیں تو ایسا کلام کہہ سکتے ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝﴾

[الانفال:۳۱]

''اور جب ان کے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ (بس) ہم نے سن لیا، اگر ہم چاہیں تو اس جیسی باتیں ہم بھی کہہ لائیں۔ یہ (قرآن) اور کچھ نہیں، صرف پچھلے لوگوں کے افسانے ہیں۔''

جیسے الف لیلٰی کی کہانی ہے۔ بہت ساری کہانیاں ہیں، جن کو لوگ شوق سے پڑھتے ہیں کہ پڑھتے ہوئے سو جائیں گے۔

جوابات:

یہ پرانے دور کے شبہات ہیں جن کے شبہ کا اللہ نے جواب دیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ [الحاقۃ:۴۱]

''اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں (بلکہ اللہ کا کلام ہے،) مگر تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔''

﴿وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ [الحاقۃ:۴۲]

''اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے تم بہت کم سمجھتے ہو۔''

﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ [یٰس:۶۹]

''اور ہم نے آپ کو شاعری کا علم نہیں دیا اور وہ آپ کے شایان ہی نہیں وہ تو محض (ہمیں جگانے کے لیے) نصیحت اور ایک آسمانی کتاب ہے جو احکام کو ظاہر کرنے والی ہے۔''

﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝﴾ [حٰم السجدۃ:۴۲]

''علم وحکمت والی اور حمد وثنا کی مستحق ذات کا کلام ہے جو اس نے اتارا ہے۔''

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ [الشعراء: ۱۹۳]

''اس کو امانت دار فرشتہ (جبرائیل) لے کر آیا ہے۔''

﴿عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ﴾ [الشعراء: ۱۹۴]

''آپ کے دل پر اتارا ہے، تاکہ آپ لوگوں کو ڈر سنائیں۔''

﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ﴾ [الشعراء: ۱۹۴]

''ایسی عربی زبان میں اترا ہے جو پیغام کو واضح کر دینے والی ہے۔''

﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ [یوسف: ۲]

''ہم نے اس کو ایسا قرآن بنا کر اتارا ہے جو عربی زبان میں ہے، تاکہ تم سمجھ سکو۔''

اور کہیں فرمایا:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾ [الطارق: ۱۳، ۱۴]

''یہ قرآن (حق و باطل میں) ایک فیصلہ کر دینے والا کلام ہے اور یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔''

اللہ نے فرمایا: یہ قرآن کھلی ہوئی بات ہے، اس کا کھلا فیصلہ ہے، یہ......نعوذ باللہ...... بے قیمت اور بے وزن بات نہیں ہے۔ پھر فرمایا:

﴿وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ﴾ [الزخرف: ۴۴]

''اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وحی تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے ایک نیک نامی کا ذریعہ ہے۔''

اس میں آپ کی بھی شان ہے اور آپ کی قوم کی بھی شان ہے کہ ہم نے ان کی زبان میں قرآن اتارا ہے۔ اللہ نے ان کی ایک ایک بات کا جواب دیا ہے۔

اس جواب پر شبہ:

ایک شبہ ہوتا تھا کہ ہم تو مان لیں، لیکن کافر جن کا قرآن پر ایمان ہی نہ ہو، جبرائیل پر ایمان ہی نہ ہو، جنت، آخرت پر ایمان نہ ہو وہ ان جوابات کو کیسے مانے گا؟

جوابِ شبہ:

اللہ نے فرمایا: ہم نے اپنے نبی ﷺ کو فرما دیا تھا کہ ان کو چیلنج کریں:

﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ [البقرة: ٢٣]

''تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ۔ اور اگر سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو۔''

جب تم ایک سورت بھی نہیں بنا سکتے۔ ساری دنیا کا عاجز ہو جانا اور اللہ کے قرآن کا مقابلہ نہ کر سکنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضور ﷺ سچے ہیں اور قرآن اللہ کی کتاب ہے۔

مسیلمہ کذاب کی جھوٹی وحی:

مسیلمہ کذاب نے حضور ﷺ کے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ جب اس نے یہ دعویٰ کیا تو اس کو اس کے ساتھیوں اور دوستوں نے کہا کہ تم نے نبوت کا دعویٰ تو کر دیا ہے۔ اللہ کے نبی پر وحی آتی ہے تو کیا تمہارے اوپر بھی کوئی وحی آتی ہے؟ تا کہ ہم بھی لوگوں کو بتا سکیں۔ اس نے ایک دن اپنے سارے ساتھیوں کو جمع کیا کہ آج تازہ تازہ وحی آئی ہے، پھر تم میری نبوت پر اعتراض نہ کرنا۔ اللہ نے مجھ پر بھی قرآن اتارا ہے: ''اَلْفِيلُ مَا الْفِيلُ؟ وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْفِيلُ؟ لَهٗ ذَنَبٌ وَبِيلٌ'' ساتھیوں نے کہا کسی اور کو نہ سنانا، جوتے مار مار کر گنجا کر دیں گے۔

مرزا قادیانی کا فرشتہ ٹیچی ٹیچی:

مرزا غلام احمد قادیانی نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو اس سے بھی لوگوں نے کہا کہ آپ پر بھی وحی آتی ہے؟ اس نے کہا: ہاں! مجھ پر بھی وحی آتی ہے، لیکن وہ وحی تشریعی تو نہیں وہ صرف حضور ﷺ پر آتی تھی۔ میں ظلی نبی ہوں، سایہ والا نبی ہوں۔ لوگوں نے کہا: چلو تشریعی وحی تو نہ آتی ہو، لیکن غیر تشریعی وحی تو لاتے ہوں گے۔ اس نے کہا: میرے پاس جو فرشتہ وحی لاتا ہے اس کا نام ٹیچی ٹیچی ہے۔ مرزا کی بات تو سچی ہے، کیونکہ وہ خود نبی بھی انگریزی تھا تو فرشتہ بھی انگریزی آئے گا۔ بہر حال اس طرح کے دعوے کرتے رہے، لیکن قرآن کے مقابلے میں کسی کا دعویٰ نہ چل سکا۔

روافض کی تحریفِ قرآن:

روافض نے قرآن بدلا ہے۔ ترجمہ مقبول اردو میں شیعوں کا مشہور ترجمہ ہے۔ ان کو پڑھنے سے پہلے مہربانی کیا کریں کہ ساتھ صحیح ترجمہ بھی رکھا کریں۔ ورنہ جس کو پتا ہی نہ ہو وہ تو گمراہ ہو جائے گا۔ کسی بات کا سلیس ہونا الگ

بات ہے اور اللہ کے قرآن کا لفظ بہ لفظ ترجمہ الگ بات ہے۔ بڑے بڑے شاعر اور بڑی بڑی ادیبہ عوتیں جن کے آپ مرثیے پڑھ کر حیران ہو جائیں، جن کے مدحیہ اور ہجویہ کلام پڑھ کر حیران ہو جائیں۔ آج بھی عربی ادب کا سرمایہ زمانہ جاہلیت کے اشعار ہیں۔ کسی لفظ پر بحث ہو جائے اور اس کو ڈھونڈنا ہو تو جاہلیت کے شعراء کے کلام میں اس لفظ کو ڈھونڈا جائے گا کہ اس لفظ کو کیسے استعمال کیا ہے؟

بہر حال ان کے شبہات پر زور لگانے کے باوجود اللہ نے ان شبہات کو ختم فرما دیا۔

یہ پہلے لوگوں کے شبہات تھے جو لوگوں کے دلوں میں ڈالے جاتے تھے کہ نبی ﷺ کے پاس نہ جانا، کیونکہ وہ جادوگر ہے کہ جو بھی اس کے قریب جاتا ہے اور قرآن سنتا ہے فوراً اس کا ہو جاتا ہے۔

لوگوں کے دل اب قرآن کا اثر کیوں نہیں لیتے؟

قرآن میں وہی تاثیر آج بھی ہے، لیکن ہم پڑھ کر ٹھیک نہیں ہوتے، کیونکہ ہمارے دل، زبانیں اور افکار گندے ہیں، ہمارے نوجوان ایسے ہیں کہ پڑھ قرآن رہے ہوں گے، لیکن ان کے تصور میں فلمیں ہوں گی۔ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ رہا ہے، لیکن رات بیٹھ کر جو فلم دیکھی تھی اس کا منظر سامنے آرہا ہے کہ کتنی خوبصورت تھی!! اس لیے اثر نہیں ہے۔

متأخرین اعدائے اسلام:

متأخرین اعدائے اسلام جن میں سب سے بڑے تو یہودی ہیں، اس کے بعد نصاریٰ ہیں، اس کے بعد شیعہ ہیں، اس کے بعد ہندو، بدھ مت ہیں اور آتش پرست ہیں۔ یہ اسلام دشمنی میں ایک ہیں۔ حالانکہ آپ قرآن پڑھ کر دیکھیں، ان کی تاریخیں دیکھیں، یہ دو ضدیں ہیں۔ جیسے رات اور دن اکٹھے نہیں ہو سکتے اسی طرح یہود و نصاریٰ کا کبھی بھی عقیدہ مشترک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عیسائیوں کے نزدیک بی بی مریم مقدس ہیں اور یہودیوں کے نزدیک (نعوذ باللہ!) فاسقہ اور گنہگار ہیں اور ان کے بیٹے بھی حلال نہیں ہیں:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ﴾

[البقرۃ: ۱۱۳]

"اور یہود کہتے ہیں: تمہارے پاس کوئی حجت نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں: تمہارے پاس کوئی حجت نہیں۔"

لیکن تاریخ میں دیکھ لیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو مارنے کے لیے یہ دونوں اکٹھے ہیں۔ انہوں نے قرآن پر اور

خاص طور پر سورۂ فاتحہ پر شبہات کیے ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کریں گے، تاکہ اللہ اسے ہماری ہدایت کا بھی ذریعہ بنائے اور ہم دشمنوں کے حملے سے بھی محفوظ رہیں اور باخبر ہوں۔ کیونکہ جب آدمی کو پتا ہو کہ میرے دشمن کے پاس فلاں اسلحہ ہے تو آدمی چاہے کمزور ہو، لیکن اپنے بچنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرے گا۔ اور اگر پتا ہی نہ ہو اور دشمن حملہ کردے تو پھر آپ کیا کریں گے؟ آپ کو حرم کے اندر کوئی شیعہ اور رافضی مل جائے اور وہ آپ سے ایک سوال کرے تو آپ اس کا جواب بھی نہیں دے سکیں گے، کیونکہ آپ کو وقت ہی نہیں۔ آدمی فرصت کے وقت اخبار پڑھتا ہے، ڈائجسٹ پڑھتا ہے، میگزین پڑھتا ہے یا جو زیادہ مہذب آدمی ہیں وہ گھر میں فلم دیکھ لیتے ہیں۔

اہلِ سنت کی اپنے اکابر سے غفلت:

شیعوں کے نزدیک بارہ امام ہیں۔ ان کو اپنے اماموں کے نام یاد ہیں، ان کا شجرہ بھی یاد ہے۔ جبکہ ہمارے اہلِ سنت والجماعت کو چار خلفاء میں سے نہ کسی کا شجرہ آتا ہے اور نہ کسی کا نام آتا ہے۔ اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہوگی کہ ہمیں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام ہی نہیں آتا اور یہ بھی پتا نہیں ہے کہ صدیق لقب ہے یا نام ہے؟ اور یہ صدیق لقب قبل الاسلام ہے یا بعد الاسلام ہے؟ اور صدیق لقب علی السموات ہے یا علی الارض ہے؟ کچھ پتا نہیں ہے۔ اگر نام صدیق ہے تو قرآن کہتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ﴾ [الحدید:۱۹]

”اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔“

اہلِ سنت کا ان باتوں پر غور ہے ہی نہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کو کون پڑھے گا اور یاد کرے گا؟

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ:

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی کی! ہم کہتے کہتے مرجائیں گے یا سنتے سنتے مرجائیں گے، ہمارا ثواب تو کہیں نہیں گیا، لیکن بات جہاں تھی وہیں کی وہیں رہ گئی۔

پنجاب کے علاقے میں میری تقریر تھی کافی رش تھا۔ تقریر کے بعد جہاں میری جائے رہائش تھی پیدل جارہا تھا۔ راستے میں چند پنجابی تبصرہ کررہے تھے کہ مولوی قرآن تو اچھا پڑھتا ہے، تقریر بھی اچھی کرتا ہے، لیکن ہے وہابی۔

اب اس کا کیا علاج ہے؟

میری تقاریر کا ایک نوجوان پر اثر:

حج کے دنوں کا واقعہ ہے کہ مجھے ایک نوجوان ملا جو خوبصورت تھا اور داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے بڑی عقیدت اور محبت سے آ کر ملا اور کہا کہ مجھے پتا تھا کہ آپ فلاں کیمپ میں ہوتے ہیں، اس لیے میں یہاں آیا ہوں، تا کہ بطور خاص آپ کے ساتھ حج کروں۔ میں نے آپ کی کیسٹ سے زندگی بدلی ہے۔ میں انگریزوں کے ملک میں رہنے والا آدمی ہوں۔ ساری زندگی انگریزی پڑھی۔ وہ وکیل تھا۔ اور وہاں کے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ میں مقدمات لڑنے والا آدمی تھا۔

ہم پر قرآن کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟

یورپ والوں پر تو اثر ہو گیا، لیکن مکہ والوں پر اثر نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ برتن صاف ہوگا تو دودھ صحیح رہے گا۔ دودھ کا کوئی قصور نہیں ہے، وہ تو تھنوں سے فلٹر ہو کر نکلا ہے۔ اور ایسے لطیف ذرائع ہیں کہ وہاں انسانی عقل بھی نہیں پہنچ سکتی۔ بہر حال! مقصد یہ ہے کہ آپ کو اثر تب ہوگا جب آپ کو یہ بات سمجھ آئے گی یا سمجھنے کے لیے تھوڑی سی محنت اور غور کریں گے۔

الٹا برتن کبھی نہیں بھر سکتا:

اس کی مثال جیسے مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ ختم نبوت کے لیڈروں میں گزرے ہیں۔ متقی، پرہیزگار تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ اگر ایک آدمی پانی کی ٹونٹی بڑے زور سے کھولے، لیکن گلاس اوندھا کر کے رکھ دے تو گلاس کتنی دیر میں بھر جائے گا؟ صاف بات ہے کہ الٹا گلاس کبھی بھی نہیں بھرے گا۔ اگر برتن کو سیدھا کر کے رکھو گے تو دو سیکنڈ میں بھر جائے گا۔ وجہ یہی ہے کہ ہمارے برتن سیدھے نہیں ہیں۔ جب تک ہم اپنے دل کا رخ قرآن کی طرف موڑیں گے نہیں، تب تک اللہ کا قرآن سمجھ نہیں آئے گا۔ قرآن بادشاہوں کے بادشاہ کا کلام ہے، نہ اس بادشاہ کو ہماری ضرورت ہے اور نہ اس کے کلام کو ہماری ضرورت ہے۔

کٹورے میں تیل لینے والے بچہ کا واقعہ:

اسی طرح ایک اور مثال دیتے تھے کہ ہندوستان، بنگلہ دیش میں پیتل کے بنے ہوئے برتن ہوتے تھے جس کو کٹورا کہا جاتا تھا۔ اس کے نیچے بھی تھوڑی سی جگہ بنی ہوتی تھی، تا کہ نیچے رکھا جائے۔ بڑے خوبصورت برتن ہوتے

ہیں۔اس زمانے میں ایک ماں نے بچے کو پیسے دیے کہ بیٹا! جاکر تیل لے آؤ۔وہ دکاندار کے پاس گیا کہ چار پیسے کا تیل کٹورے میں ڈال دو۔اس زمانہ میں چار پیسوں کی بھی بڑی اہمیت ہوتی تھی اور دوکاندار بھی اچھے لوگ تھے۔ دھوکہ دینا توان کے دماغوں میں بھی نہیں تھا۔

میرے ایک شاگرد کا قصہ:

اتفاق سے ایک دفعہ میں گزر رہا تھا، مجھے کپڑا لینے کا شوق ہوگیا۔میں نے دیکھا کہ دوکاندار میرا شاگرد ہے، میں بڑا خوش ہوگیا اور دوکان میں چلا گیا۔میں نے دوکان پر بیٹھ کر اس سے پہلی بات یہی کی کہ میں مفت نہیں لوں گا، کیونکہ اس وقت تو دے دیتے ہیں اور پیٹھ پیچھے کہتے ہیں: چلو ایک بلا تو ٹلی۔یہ ہماری بیماری کا صدقہ ہوگیا۔

ایک دفعہ ایک مولوی کے پاس کوئی بچہ مکھن کا بھرا ہوا پیالہ لایا۔تو مولوی صاحب نے کہا: خیر تو ہے؟ اس بچے نے کہا کہ اس کے اندر کتا منہ مار گیا تھا تو اماں نے کہا: مولوی صاحب کو دے آؤ۔

میرے اس شاگرد نے کہا: ٹھیک ہے۔میں نے اسے کہا: مجھے صحیح ریٹ پر اور صحیح کپڑا دو، تاکہ تمہارا نقصان نہ ہو اور مجھے یہ فائدہ ہوگا کہ مجھے چیز صحیح مل گئی اور صحیح ریٹ پر مل گئی۔میں نے کپڑا پسند کیا۔اس نے کہا کہ یہ میری قیمتِ خرید ہے۔میں نے کہا: ٹھیک ہے، آپ مجھے اس کی رسید نہ دکھائیں، آپ تو ماشاء اللہ حرم میں تفسیر پڑھنے آتے ہیں، مجھے آپ پر اعتماد ہے۔اس نے کپڑا دے دیا۔اتفاق سے مجھے خیال آگیا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔میں نے راستہ میں ایک دوکاندار کو کپڑا دکھایا کہ یہ کتنے کا ہوگا؟ اس نے رعایت سے دس ریال لگائے اور شاگرد نے پندرہ ریال لگائے اور نفع بھی نہیں لیا۔

بہر حال! اس زمانہ میں یہ دوکاندار نہیں ہوتے تھے۔اس دوکاندار نے اس کو تیل دیا اور کہا کہ بچے تیرا تیل کچھ بچ گیا ہے تو بچے نے اس برتن کو الٹا کر کے کہا کہ ادھر ڈال دو۔جب بچہ تیل گھر لایا تو ماں نے کہا کہ چار پیسے کا اتنا کم تیل ہے؟ اس نے کہا: نہیں کچھ تیل ادھر بھی ہے۔تو اس کو بھی الٹا دیا۔تو اگر ہمارا حال بھی یہی ہو تو درس کا اثر خدا جانے کیا ہوگا؟

میرا درس دینے کا مقصد:

میں ابھی مدینہ سے سفر کر کے مکہ پہنچا ہوں۔لیکن آپ کا درس نہیں چھوڑا کہ آپ لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔تم دیکھ لو

کتنے ڈاکٹر ہو، اگر اپنے ساتھ ایک ایک آدمی اور لاؤ گے تو کتنے ہو جاؤ گے؟ لیکن بیٹے، بیٹی کی شادی میں پکڑ کر لے جائیں گے، اللہ کے قرآن کے لیے نہیں لے جائیں گے۔ اس نیت سے آپ کو درس دیتا ہوں کہ اللہ نے یہ پورے عالم میں تبلیغ کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے۔ ساؤتھ افریقہ کا مسلم ریڈیو ایک سال سے ان کیسٹوں کو نشر کر رہا ہے۔ اسی طرح کوئی ڈیڑھ سال سے اور کوئی دو سال سے۔ اسی لیے میں نے کہا کہ یورپ والوں کو ہدایت ہو رہی ہے، لیکن مکہ والے محروم ہیں۔ وہ لڑکا اب بہت گہرائی میں جا رہا ہے۔ میں اس کے ذمہ کام لگایا ہے کہ اسلام پر جو یورپ والوں کے اعتراضات ہیں وہ تم مجھے اکٹھے کر کے دو۔ آج کل تو انٹرنیٹ کا دور ہے۔ ایک منٹ میں اکٹھے ہو جائیں گے۔ مقصد ہے کہ ان اعتراضات کے جوابات پر غور کریں۔

اعتراض: کیا اللہ کسی اور اللہ کے نام سے قرآن شروع کرتا ہے؟

جیسے جدید اعتراضات میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن میں ہے: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١﴾ اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو اللہ کہہ رہا ہے کہ شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جب یہ اللہ کلام ہے تو اللہ کسی اور اللہ کے نام سے شروع کر رہا ہے۔ دیکھیں! ان ظالموں نے کیسے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں شبہ ڈال دیا ہے؟

پہلا جواب:

اس کے دو جواب ہیں: ایک تو علمی جواب ہے کہ کبھی کلام متکلم کی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی کلام متکلم کا ہوتا ہے، لیکن مقصود دوسرے کی ترجمانی کرنی ہوتی ہے۔ یعنی کلام اللہ کر رہے ہیں، لیکن بندے کو سکھا رہے ہیں کہ تم یوں کہو۔ جیسے آپ اردو محاورے میں کہتے ہیں کہ کمال ہے، آپ نے میرے منہ کی بات لے لی، آپ نے میرے منہ سے لفظ لے لیے۔ یہ بات تو میں آپ کو کہنے ہی والا تھا۔ تو علماء نے کہا: عرب کے اندر اور تمام دنیا کے ادیبوں میں یہ اسلوب ہے کہ جو کچھ اس نے کہا، میں نے سمجھا کہ یہ بھی میرے دل میں ہے۔ یہ کلام اللہ کا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تعلیم و ہدایت کے لیے فرما رہے ہیں کہ تم ایسے پڑھو: ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ''۔

دوسرا جواب:

دوسرا جواب یہ دیا کہ ایک ہے ترتیب نزولی اور ایک ہے ترتیب قرأت کہ سب سے پہلے جو آپ پر وحی اتری وہ ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱﴾ [العلق:۱]

''پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ پیدا کیا۔''

تو پہلا حکم ''اِقْرَاْ'' ہے کہ پڑھو۔ اب ہر مرتبہ اور ہر لفظ کے ساتھ تو استاذ نہیں کہتا کہ پڑھو۔ اسی ''اِقْرَاْ'' کے تابع سارا قرآن ہے کہ پڑھو۔ تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ اور ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ اسی ''اِقْرَاْ'' کے تابع ہے۔ تو اب کوئی شبہ نہ رہا۔ اس لیے حکم دیا گیا تھا، تاکہ آئندہ زمانہ میں کوئی دشمن اس کو لے کر اعتراض نہ کر سکے۔ اب الحمدللہ! اس پر کوئی شبہ اور اعتراض نہ رہا۔

دنیا کے اندر جتنے بھی باطل فرقے پیدا ہوئے ان کے پاس دلائل نہیں ہوتے، کیونکہ وہ حق پر نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک آدمی رات کے وقت کہے: یہ دن ہے تو اس کے پاس کیا دلائل ہوں گے؟ حق بات تو اتنی سچی ہوتی ہے کہ جب حق بات آتی ہے تو باطل خود مٹ جاتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝۸۱﴾ [الاسراء:۸۱]

''اور کہو: حق آن پہنچا، اور باطل مٹ گیا، اور یقیناً باطل مٹنے ہی والا ہے۔''

باطل فرقوں کے پاس دلائل تو ہوتے نہیں تو وہ اپنی طرف سے لوگوں کے ذہنوں میں شکوک، شبہات، ظنیات اور وہم ڈالتے ہیں کہ اگرچہ حق ختم نہ ہو، لیکن ہل تو جائے۔

عیسائی این جی اوز اور مشنریز:

عیسائی اور یہودی مشنریوں کے جو داعی ہیں وہ اپنی دعوت و تبلیغ کے لیے مختلف ملکوں میں آتے ہیں، کیونکہ ان کے اقتدار کا دور ہے۔ اس لیے ان کا ایک بجٹ ہوتا ہے۔ پھر وہ آ کر اس بجٹ سے ویلفیئر کے کام کرتے ہیں۔ مثلاً: ہسپتال بنا دیے، سرائے بنا دیں، کوئی لنگر لگوا دیا یا کوئی حادثہ ہو گیا تو وہاں مدد کے لیے پہنچ گئے اور اپنے مشنری سکول بنوا دیے۔ ان کی ایک سالانہ رپورٹ ہوتی ہے۔ تو ان کے ایک بڑے پوپ نے کہا کہ ہم نے آپ پر کروڑوں کا بجٹ خرچ کیا ہے، آپ بتائیں کہ کتنے لوگوں نے مذہب عیسائیت کو قبول کیا ہے؟ تو ایک پادری نے رپورٹ دی کہ میں نے فلاں ملک میں فلاں مقام پر کام کیا ہے۔ اس نے کہا کہ عیسائی تو ایک بھی نہیں بنا، لیکن مسلمان بھی کوئی نہیں رہا۔ ان کی سیرت، تمدن، لباس، ثقافت، کلچر اور ان کا ماحول اپنا بنا دیا ہے۔ اتنی محنت کو اگر آپ کہتے کہ میں نے کچھ نہیں کیا تو پھر میں کیا کرتا؟

آپ مشنری سکولوں میں دیکھیں! مسلمانوں کے بچے وہاں پڑھتے ہیں۔ عیسائیت کا ترانہ ہوگا، تثلیث کا نشان ہوگا۔ بچے کو بھی نہیں کہیں گے کہ تو عیسائی ہو جا، بچہ ان سے متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ پرائمری سے کالج تک ان کے پاس پڑھتا آ رہا ہے۔ تو ان اعدائے اسلام کا کام یہی ہے کہ وہ مسلمان کو شبہات میں ڈالتے ہیں تو وہ مسلمان ہل جاتا ہے اور اللہ رحمت فرمائے آخر میں بھٹکنا شروع ہو جاتا ہے۔

قدیم کفار کے اعتراضات کا محور:

جب شروع میں قرآن اترا تو اس وقت حضور ﷺ کے مقابلہ میں مشرکین مکہ تھے جو جاہل لوگ تھے، اُمی تھے، ان کے پاس آپ ﷺ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا، کوئی کتاب بھی نہیں اتری تھی۔ کیونکہ حضور ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقریباً چھ سو سال کا عرصہ ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ امی تھے تو ان کے شبہات بھی تو ان کی عقلی سطح کے مطابق اور اسی قسم کے ہوں گے۔ اس لیے وہ کبھی یہودیوں کے پاس جاتے تھے کہ تم ہمیں سوال بتاؤ کہ ہم حضور ﷺ سے کیا پوچھیں اور وہ نہ بتا سکیں۔ پھر ہم مسلمانوں کو کہہ سکیں گے کہ یہ لاجواب ہو گئے ہیں اور کبھی کبھی عقل کے مطابق کہہ دیتے تھے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے، یہ تو کسی شاعر کا تخیلاتی کلام ہے۔

حضور ﷺ پر شاعر ہونے کا الزام:

لیکن یاد رکھیں! شاعر سے مراد موجودہ دور کا شاعر نہیں ہے۔ عرب ان پڑھ ضرور تھے، لیکن زبردست ادیب تھے اور ان کا زبردست حافظہ تھا۔ کھڑے کھڑے سینکڑوں اشعار پڑھ لیتے تھے۔ ایک بدوی بھی کھڑے کھڑے کئی اشعار پڑھ دیتا تھا۔ حضور ﷺ کے سامنے شعرائے عرب کا کلام پیش کیا۔ حضور ﷺ خود شعر نہیں کہتے تھے۔ شعر کہنا کوئی شان والی بات نہیں ہوتی۔ حضور ﷺ نے کبھی خود شعر کہا ہی نہیں ہے۔ ہاں! حضور ﷺ کا کلام نہایت فصیح و بلیغ تھا، آپ کو جوامع الکلم دیے گئے تھے۔ اس لیے کبھی کبھی حضور ﷺ مرصع، مسجع کلام فرماتے تھے۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا:

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ

أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۹۳۰، باب: مَنْ صَفَّ أَصْحَابَهُ عِنْدَ الْهَزِيمَةِ]

یہ شعر نہیں ہے۔ اس میں قوافی ہوتے ہیں، اس کے اوزان ہوتے ہیں۔ اس کے اشعار کے وزن کو آپس میں ملایا جاتا ہے۔ تکلفاً اشعار بنائے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ حضور ﷺ کی انگلی مبارک میں چوٹ لگی تو حضور ﷺ نے فرمایا:

هَلْ أَنْتِ إِلَّا إِصْبَعٌ دَمِيْتِ
وَفِيْ سَبِيْلِ اللهِ مَا لَقِيْتِ

"تم ایک انگلی ہی تو ہو اور یہ چوٹ بھی تمہیں اللہ کے راستے میں لگی ہے۔"

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۱۴۶، باب: مَا يَجُوْزُ مِنَ الشِّعْرِ وَالرَّجَزِ]

یہ شعر نہیں ہوتا، لیکن ان مشرکین نے حضور ﷺ کو شاعر اس لیے کہا کہ جیسے شعراء اپنے خیالات میں ایسی ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اسی طرح ان کے نزدیک ...... نعوذ باللہ! ...... گویا کہ حضور ﷺ نے بھی حقیقت سے ہٹ کر کوئی بات کہہ دی ہے۔

شاعرانہ تخیلات کا واقعہ نمبر ۱:

جیسے متنبی نے اپنے ممدوح بادشاہ کی بہادری کی اور اس کے گھوڑوں کی جو تعریفیں کی ہیں کہ میرا بادشاہ جب گھوڑے پر بیٹھ کر دشمنوں پر حملہ کرتا ہے تو گھوڑے کے پاؤں سے مٹی اُڑتی ہے۔ وہ ایسے بن جاتی ہے جیسے سڑک بن جائے کہ اتنی اس میں طاقت ہے۔ اگر وہ چاہے تو اس میں بھی گھوڑا دوڑا سکتا ہے۔ یہ مبالغہ ہے۔

واقعہ نمبر ۲:

جیسے حافظ شیرازی کو بادشاہ نے بلایا اور کہا: میں نے تو اپنے خزانے بخارا اور سمرقند کو آباد کرنے کے لیے لگا دیے اور تم کیسے آدمی ہو کہ تم نے اپنے محبوب کے ایک تل پر بخارا و سمرقند کو صدقہ کر دیا ہے؟ اس نے کہا: بادشاہ! ناراض کیوں ہوتے ہیں؟ اسی سخاوت ہی کی وجہ سے آج میں بھیک مانگ رہا ہوں۔ بادشاہ ہنس پڑا اور ناراضگی کا قصہ ختم ہو گیا۔ مقصد یہ ہے کہ یہ شاعرانہ تخیل تھا۔

واقعہ نمبر ۳:

ایک شاعر کو بادشاہ نے گھوڑا دے دیا اور دو دن کے بعد گھوڑا بھوکا مر گیا۔ اب اس نے سوچا کہ بادشاہ کو پتا لگے

گا تو بادشاہ تو سزا دے گا کہ اس گھوڑے کا خیال نہیں رکھا اور وہ مر گیا۔ بادشاہ نازک مزاج ہوتے ہیں۔ وہ شاعر کچھ دن کے بعد بادشاہ کی مجلس میں خود آ گیا کہ بجائے اس کے کہ دشمن خبر پہنچائے میں خود ہی بتا دوں۔ بادشاہ کو بھی یاد آ گیا تو اس نے پوچھا کہ گھوڑے کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: جناب! آپ نے ایسا تیز گھوڑا دیا اور وہ اتنا تیز تھا کہ اس دنیا سے ہی نکل گیا۔ اتنے تیز گھوڑے کو کیسے سنبھالتا؟ بادشاہ سمجھ گیا کہ وہ مر گیا ہے۔ یہ شاعرانہ تخیل ہے۔

کفار کا حضور ﷺ کو شاعر کہنے کی ایک وجہ:

مشرکین بھی حضور ﷺ کو شاعر کہتے تھے، کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ پوری دنیا پر میرا دین غالب ہوگا، قیصر و کسریٰ کو مٹا ڈالیں گے، تمام جزائرِ عرب پر اسلام کا غلبہ ہوگا اور اسلام ہی سلامتی و امن کا ذریعہ ہوگا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ کوئی عورت سونے کے زیورات سے لدی ہوئی مکہ سے صنعاء تک جائے گی تو کوئی اس کو چھیڑ نہیں سکے گا۔ اس لیے وہ کہتے تھے کہ شاعرانہ تخیل ہے، ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قیصر و کسریٰ ان لوگوں کے ہاتھوں فتح ہو جائیں جن کے پاس کھانے کو کچھ نہیں اور نہ فوج ہے، نہ قوت ہے اور نہ طاقت ہے؟ یہ مکہ میں نہیں رہ سکتے اور یہ روم کو فتح کر لیں گے؟ اس لیے وہ شاعر کہتے تھے، ورنہ حضور ﷺ نے شعر کبھی نہیں کہے تھے۔ اور کبھی وہ حضور ﷺ کو ساحر (جادوگر) کہہ دیتے۔ حالانکہ جادوگر کہاں اور محمد رسول اللہ ﷺ کہاں......!!؟

جادوگروں کی گندگیاں:

جادوگر تو غلیظ جگہوں پر ہوگا، ناپاک اور گندا ہوگا۔ اس کے کمرے میں جائیں تو بدبو آ رہی ہوگی اور اس کے بدن سے بھی بدبو اٹھے گی۔ کیونکہ جادو اس وقت چلتا ہے جب غلیظ جگہ ہو۔ وہ مسجد میں تھوڑا آئے گا، کیونکہ جادوگروں کا تعلق شیاطین کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب حمام میں جائیں تو پہلے پناہ مانگیں:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۱۴۲]

''اے اللہ! میں ناپاک چیزوں اور ناپاکیوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

کیونکہ یہاں آ کر شیاطین شرارت کرتے ہیں۔ اس لیے جو جادوگر ہوگا ایک تو اس کے چہرے پر لعنت برس رہی ہوگی اور دوسرا وہ کبھی پاک نہیں ہوگا۔ (انڈیا اور پاکستان میں یہ لوگ ہوتے ہیں۔ اور بنگال کا جادو ویسے بھی مشہور ہے) حتیٰ کہ اپنے جادو کو زور دینے کے لیے بعض لوگ خنزیر کی ہڈی لے کر انگوٹھیوں میں چڑھوا لیتے ہیں، تاکہ نجس

العین چیز ہر وقت میرے ساتھ رہے۔

حالانکہ حضور ﷺ صاف ستھری جگہ پر رہنے والے تھے۔ خوشبو پسند تھی اور خود آپ ﷺ کے پسینے میں بھی خوشبو تھی۔ حالانکہ پسینہ میں بدبو ہوتی ہے۔ جیسے آپ اپنے پسینے کو سونگھیں کہ کتنی بدبو ہوتی ہے؟ اسی سے آپ اپنے قیمتی ہونے کا اندازہ لگالیں۔

قبر میں عام مردوں کی حالت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"مَا بَالُ مَنْ أَوَّلُهُ نُطْفَةٌ مُذِرَةٌ وَ آخِرُهُ جِيفَةٌ" [شعب الایمان، حدیث:۸۴۱۱]

"یہ کیسا انسان ہے جس کی ابتداء ایک بدبودار پانی سے ہے اور جس نے مرنے کے بعد بھی ایک بدبودار لاش بن جانا ہے۔"

آپ کبھی قبرستانوں سے گزریں۔ اتنی ہوا ہوتی ہے کہ آدمی برداشت بھی نہیں کرسکتا۔ اس لیے ڈاکٹر لوگ جو قبر کشائی کر کے پوسٹ مارٹم کرتے ہیں ان سے پوچھیں کہ کیا حال ہوتا ہے؟ ہاں! بعض لوگوں کی لاشوں کو اللہ نے محفوظ رکھا ہوتا ہے۔ اب بھی شہید ہونے والوں کی لاش سے اور اہل اللہ کی لاش سے خوشبوئیں آتی ہیں۔

حضور ﷺ کو جادوگر کہنے کی وجہ:

وہ حضور ﷺ کو ساحر اس لیے کہتے تھے کہ جس طرح جادو فوراً اثر کرتا ہے اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی نظر بھی فوراً اثر کرتی ہے کہ جو آپ کی زبان سے قرآن سنتا ہے اس پر اثر ہوجاتا ہے اور وہ مسلمان ہوجاتا ہے۔ اس لیے وہ کہتے تھے کہ حضور ﷺ جادوگر ہیں۔ اللہ نے قرآن میں ان لوگوں کی تردید کی ہے۔ فرمایا:

﴿وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾﴾

[الحاقۃ:۴۱،۴۲]

"اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے، (مگر) تم تھوڑا ہی ایمان لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے، (مگر) تم تھوڑا ہی سبق لیتے ہو۔"

حضور ﷺ کو کاہن کہنے کی وجہ:

حضور ﷺ کو کاہن اس لیے کہتے تھے کہ جس طرح کاہن غیب کی خبریں دیتے تھے حضور ﷺ بھی غیب کی

خبریں دیتے ہیں کہ کبھی حضرت نوح علیہ السلام کی، کبھی حضرت صالح علیہ السلام کی، کبھی جنت کی اور کبھی مصر کے فرعون کی بات بتاتے ہیں۔ یہ تو غیب کی خبریں ہیں۔ اس لیے وہ حضور ﷺ کو کاہن کہتے تھے۔

مشرکین کے دوسرے شبہات:

شبہات مشرکین بھی ڈالتے تھے جتنی ان کی عقل تھی۔ کبھی کہتے:

﴿لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ [الانفال: ۳۱]

''اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس جیسی کلام پڑھ سکتے ہیں۔ یہ تو پرانے زمانے کے قصہ کہانیاں ہیں، اللہ کا کلام نہیں ہے۔''

اور کبھی شبہ ڈالتے کہ محمد (ﷺ) ''مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ'' (سکھائے ہوئے اور دیوانے) ہیں۔ اور کبھی کہہ دیتے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں، بلکہ حضور ﷺ نے خود بنایا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی شبہات نہیں تھے۔ اللہ نے ان کے ایک ایک شبہ کا جواب دیا ہے۔

آج کا دور:

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں علم اتنی ترقی کر چکا ہے کہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو باقی ہو۔ سائنسی علوم، صناعات، اختراعات ہیں اور آج کل آپ کمپیوٹر کو دیکھ رہے ہیں۔ اب لگتا ہے کہ فصل پک چکی ہے یا پک رہی ہے، اب کٹنے کی دیر ہے۔ چھوٹا سا موبائل ہے، اس میں کیمرہ بھی ہے، اس میں آپ سارے جہان کی معلومات ڈال لیں۔ کوئی تار بھی نہیں ہے۔ اور جو نمبر ڈائل کرتے ہیں بات اسی سے کرواتا ہے اور کسی سے نہیں کرواتا۔ چھوٹی سی مائیکروفلم کے اندر تیس تیس جلد کی کتابیں آگئیں۔ دس دس کمروں کی جو لائبریریاں بنی ہوئی تھیں ان کو دو چار سی ڈیز میں فیڈ کر دیا گیا ہے۔

مجھے ایک دوست نے امریکہ سے پام ہدیہ بھیجا۔ میرا تو اس سے کوئی کام نہیں تھا، لیکن اتفاق کہ میری ڈسٹرک کا ایک دوست آیا ہوا تھا۔ میں نے کہا: چلو کسی بہانے اس کو ہدیہ بھیج دوں۔ تو بعد میں اس نے ٹیلی فون کیا اور کہا کہ کلی صاحب! آپ نے تو میری جان چھڑوادی ہے۔ میں نے کہا: کیسے؟ اس نے کہا: میرے جتنے مقدمات تھے میں نے سارے فیڈ کر دیے ہیں۔ اب مجھے فائلیں اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، بس یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کونسا مقدمہ ہے؟ اس کا عنوان کیا تھا؟ اور اعتراض کیا تھا؟ میں نے ان سب کو اس میں فیڈ کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں مقدمہ تیار

ہو جاتا ہے۔ آپ نے میرے اوپر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اب تو اس سے بھی آگے کی چیزیں آ گئی ہیں۔ اس لیے شبہات واعتراضات بھی اسی قسم کے آئیں گے۔ اصولی بات ہے کہ جب آدمی کے پاس جدید علوم ہوں گے تو اس کی روشنی میں بیٹھ کر اعتراض کرے گا۔ اور یہ اعتراضات اس وقت سے شروع ہو گئے تھے جب سے یہ علم شروع ہوا۔

ترتیب قرآنی پر اعتراض:

سب سے پہلے یہ شبہ ڈالا کہ اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو اس میں ترتیب کیوں نہیں ہے؟ حالانکہ مسلمان کہتے ہیں کہ ان کا رب بھولتا بھی نہیں ہے۔ تو یہ کیا ہے؟ کلام ہو رہا تھا قیامت کا اور درمیان میں بات رسالت کی آ گئی، بات ہو رہی ہے توحید کی اور درمیان میں رسالت کا ذکر آ گیا۔ پورے قرآن میں ترتیب ہی نہیں ہے۔

فرمایا: ﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝﴾ [القیامۃ: ۱،۲] (میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے)۔ پڑھتے جائیں۔ آگے آتا ہے: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝﴾ [القیامۃ: ۱۶] (اے پیغمبر!) آپ اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے، تاکہ آپ اس کو جلدی لیں)۔ میرے مدنی! آپ خاموش رہیں، جب جبرائیل قرآن پڑھے تو آپ زبان کو حرکت نہ دیں، آپ غم نہ کریں کہ آپ کو بھول جائے گا۔ ہم یہ قرآن جمع کر کے آپ کے سینے میں محفوظ کر دیں گے، ہم سمجھا دیں گے۔ پھر دوبارہ قیامت کا ذکر شروع ہو گیا۔ فرمایا: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝﴾ [القیامۃ: ۲۰،۲۱] (اے منکرو!) ہرگز ایسا نہیں، بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھتے ہو)۔

انہوں نے کہا کہ یہ کیسے اللہ کا کلام ہے کہ پہلے بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد میں بھی قیامت کا ذکر ہے اور درمیان میں ہے کہ: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝﴾ (اپنی زبان مبارک کو حرکت نہ دیں)۔

اسی طرح قرآن میں ہے: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۝﴾ [الاعلیٰ: ۱ تا ۵] (اے پیغمبر!) آپ (اور جو مومن آپ کے ساتھ ہیں) اپنے پروردگار عالیشان کے نام کی تسبیح کیجیے جس نے (ہر شے) کو بنایا، پھر (اس کو) ٹھیک بنایا۔ اور جس نے تجویز کیا، پھر راہ بتلائی۔ اور جس نے (زمین سے) چارہ نکالا، پھر اس کو سیاہ کوڑا کر دیا)۔ یہ اللہ کی صفتوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ لیکن آگے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝﴾

[الاعلیٰ: ۶، ۷] (ہم آپ کو ایسا یاد کرائیں گے کہ آپ نہیں بھولیں گے، مگر ہم چاہیں تو بھلوا سکتے ہیں)۔ یعنی اس کی تلاوت بھی منسوخ کر سکتے ہیں اور اس کا حکم بھی منسوخ کر سکتے ہیں۔ ہم چاہیں تو حکم منسوخ کر دیں اور تلاوت باقی رکھ دیں۔ ہم چاہیں تو تلاوت منسوخ کرے حکم باقی رکھ دیں۔ ہماری تو قدرت ہے۔

اللہ کی صفات کا ذکر ہو رہا تھا اور درمیان میں یہ بات آ گئی۔ تو شبہ ڈالتے ہیں کہ جب قرآن میں ترتیب ہی نہیں تو یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔

مدنی سورتیں پہلے مکی بعد میں کیوں؟

دوسرا انہوں نے کہا کہ ایک ترتیبِ نزولی ہے اور دوسری ترتیبِ قرأت ہے جس کو بعض علماء کی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ ایک ترتیب نزولی ہے اور ایک ترتیبِ رسولی ہے۔ تو شبہ ڈالتے ہیں کہ جب اللہ کا قرآن اترتا ہے تو وہ: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱﴾ [العلق: ۱] (پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ پیدا کیا) سے شروع ہوتا ہے، لیکن جب ہم قرآن پڑھتے ہیں تو جو سورتیں مکی ہیں وہ آخری پاروں میں اور جو بعد میں مدنی سورتیں اتری ہیں وہ پہلے ہیں۔ سورۂ بقرہ، انعام، مائدہ اور انفال یہ سب مدنی سورتیں ہیں اور پہلے ہیں، جبکہ: ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝۱﴾ [الاعلیٰ: ۱] (اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کرو جس کی شان سب سے اونچی ہے)۔ ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝۱﴾ [النبأ: ۱] (یہ (کافر) لوگ کس چیز کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں؟) یہ مکی سورتیں ہیں اور بعد میں ہیں۔

تو نعوذ باللہ! دشمنوں نے یہ بھی اعتراض کیا، تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں، دماغ میں یہ بیٹھ جائے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے۔

آج کل کے مسلمان کا حال:

آج کل اپنے پڑھے لکھے لوگوں کو بات کرو تو وہ بھی ایسے شبہات ڈالتے ہیں کہ مولوی کی بات بس سن لیا کرو، یہ کوئی قرآن تھوڑا ہے، قرآن میں کس جگہ لکھا ہے کہ داڑھی رکھو؟ بس یہ مولوی کہتے رہتے ہیں۔ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ عورت اس قسم کا پردہ کر کے باہر نکلے؟ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ خوشی نہ مناؤ، بسنت نہ مناؤ، ویلنٹائن ڈے مناؤ، یا نیو ایئر نہ مناؤ؟ یہ قرآن کی کس آیت میں لکھا ہے؟ ان مولویوں کو چھوڑو۔ یہ تو خوشی بھی نہیں کرنے دیتے،

انجوائے بھی نہیں کرنے دیتے۔ یہ تو حقوقِ انسانی ہیں۔ یہ مولوی ہماری آزادی پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، ان کی کوئی بات نہیں ماننا۔ انہوں نے اپنا ایک حلقہ بنایا ہوا ہے کہ وہ لوگوں کو کہیں۔ اور اگر آپ کا عرس کا دل کرتا ہے تو ٹھیک ہے، نیو ائیر منائیں ٹھیک ہے، اگر ہماری بیٹیوں نے ڈانس کیا تو ٹھیک ہے، لوگ خوش ہوتے ہیں، ان کو جدید حسن ملا۔ تھرکتے ہوئے اعضا ملے، شاعری کرتا ہوا انگ انگ نظر آیا۔ لوگ خوش ہو گئے۔ اللہ نے حسن چھپا کر رکھنے کے لیے تھوڑی دیا ہے، اگر کوئی لڑکی خوبصورت ہے تو اس کو پلیٹ فارم پر لے آئیں۔ یہ شبہات مسلمانوں کے اندر آج بھی ہیں۔ وہ آدمی اپنے آپ کو بہت بڑا مسلمان سمجھتا ہے جو اپنے گھر میں قرآن پڑھوا لے یا آیت کریمہ ایک لاکھ دفعہ پڑھوا دے یا سال میں ایک دفعہ مولوی کو کچھ پیسے دے کر میلاد کی جھنڈیاں لگوا دے۔ وہ کہتا ہے کہ تم میرے اسلام کے بارے میں سوال کرتے ہو، میں تو ہر سال میلاد مناتا ہوں اور دیگیں پکواتا ہوں اور اتنے مسکینوں کو کھانا دیتا ہوں۔ اگر میں نماز نہیں پڑھتا تو کیا ہو گیا؟

یہ اللہ کے ساتھ میرا ذاتی معاملہ ہے، اس میں مولوی کہاں کا ٹھیکیدار ہے؟ اگر ہم نمازیں پڑھیں گے تو اس میں اللہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے تو ہم نمازیں پڑھ کر کیا کریں گے؟ اگر ہم نمازیں نہ پڑھیں تو کونسا اللہ کا نقصان ہو جائے گا؟ ویسے ہم مسلمان ہیں، میلاد مناتے ہیں، بائیس رجب کو امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے کونڈے پکاتے ہیں اور ستائیس رجب کو معراج شریف کا حلوہ پکواتے ہیں، اگر بندہ مر جائے تو قل شریف اور سات جمعراتیں اور چہلم کراتے ہیں۔ اس سے بڑی اسلام کی اور کیا دلیل ہوگی؟

یہ شبہات بھی لوگوں کے دماغوں میں ڈالے گئے ہیں اور ان کی وجہ سے مسلمان اسلام سے دور ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو رسومات کا مجموعہ بنا دیا کہ اگر یہ رسومات ہیں تو مسلمان ہے۔ جیسے شیعہ کہتے ہیں کہ بس حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت کی محبت دل میں ہو، اسی سے نجات ملتی ہے۔ اگر زیادہ پکا مومن بننا ہے تو یکم محرم سے دس محرم تک گھر میں چارپائیاں الٹی کر دو، کپڑے سیاہ پہنو، ماتم کرو، جلوسوں میں شرکت کرو، سبیلیں لگا دو، بس جنت کے دروازے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوں گے، جتنے لوگوں کے گلے میں زنجیریں ہوں گی ان سب کو جنت میں بھیج دیں گے اور جتنے نمازی داڑھی والے ہوں گے ان کو نکال دیں گے، کیونکہ اکٹھے تو نہیں ہو سکتے۔ یہ دشمن مسلمانوں کے دلوں میں شبہات ڈال رہے ہیں۔

ترتیبِ قرآنی پر بہترین تفسیر:

الحمد اللہ! علماء حقہ پر اللہ تعالیٰ کروڑوں رحمتیں فرمائے اور جو زندہ ہیں اللہ ان سے دین کا کام لے۔ انہوں نے حالات کے پیشِ نظر ہر چیلنج اور حالات کا مقابلہ کیا۔ علامہ بقائی نے پوری تفسیر قرآن لکھی ''نَظْمُ الدُّرَرِ فِي رَبْطِ الْآيَاتِ وَالسُّوَرِ'' نظامیہ میں اسلامیہ یونیورسٹی نے یہ شائع کرائی تھی، کتاب نایاب ہوگئی اور پوری دنیا میں ختم ہوگئی۔ (اب بیروت سے بار بار چھپ رہی ہے) میں حیدر آباد دکن ایک لائبریری میں گیا تو لائبریرین اچھا نکلا اور اس نے کہا: آپ غم نہ کریں، اس کی طباعت دوبارہ ہو رہی ہے اور میں آپ کو ایک قدیم نسخہ دے دیتا ہوں۔ اس تفسیر میں آیات کا آیات کے ساتھ تعلق اور سورت کا سورت کے ساتھ تعلق، اوّل آیت کا آخر سورت کے ساتھ تعلق بیان کر کے اعتراضات کرنے والوں کا منہ بند کر دیا کہ سارے قرآن کا آپس میں ربط ہے۔

شبہات کا جواب دینے کی اہمیت:

ہوسکتا ہے بعض لوگوں کے ذہن میں ہو کہ اس سب کی ضرورت ہے، حضور ﷺ کے زمانہ میں تو یہ نہیں تھا۔ بھائی! اس وقت تو یہ مسئلہ نہیں تھا۔ قادیانیت کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ صحابہ ؓ کو تو ان سے واسطہ پڑا ہی نہیں۔ خدا نہ کرے اگر آپ کے سامنے کوئی رافضی، کوئی قادیانی آ کر اعتراض کرے تو کیا جواب دیں گے؟ یہاں کے نوجوان نے تو ایسے ملک میں آنکھ کھولی ہے جو دین اسلام پر چلنے والا ملک ہے، جس میں شریعت کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ہے ان کا تو کسی باطل فرقے سے واسطہ ہی نہیں پڑا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کے جو اپنے حق میں دلائل ہیں اور اسلام پر اعتراضات ہیں، جس آدمی کو ان سے واسطہ ہی نہیں پڑا اس کو اس بارے میں کوئی علم ہی نہیں ہے تو وہ ان کے شبہات کا کیا جواب دے گا؟

قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے پر شبہ:

اس میں پہلا اعتراض یہ ہے کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' (شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے) یہ اللہ کا کلام ہے یا بندے کا کلام ہے؟! اگر اللہ کا کلام ہے تو اللہ کسی اور اللہ کے نام سے شروع کر رہا ہے۔ اگر بندے کا کلام ہے تو قرآن ہی نہ رہا، خدا کا کلام ہی نہ رہا۔

عرفان

حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ بہت بڑے مفسر قرآن تھے۔ جب آپ قلات میں تھے تو خان آف قلات کو قلات میں اسلام کا قانون نافذ کرنا پڑا۔ انہوں نے علوم قرآن پر جو لکھا ہے کاش! اس کو کوئی پڑھنے والا اور سمجھنے والا ہوتا۔ ہم تو طالب علم ہیں، ان کی دس فیصد بات سمجھ لیں تو غنیمت ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: دنیا میں جتنی بڑی کلامیں گزری ہیں، اس میں کلام کی نسبت کبھی متکلم کی طرف ہوتی ہے اور کبھی کلام کی نسبت غیر متکلم کی طرف ہوتی ہے۔ یہ بھی بلاغت کا ایک انداز ہے تو قرآن بھی کمالِ بلاغت ہے کہ کلام اللہ کا ہے اور مضمون بندے کا ہے کہ میرے بندے تمہارے لیے میں نے یہ کلام کیا ہے، لیکن مضمون تیرا ہے۔

آسان لفظوں میں یوں سمجھیں کہ آپ نے اپنے بیٹے کو کسی یونیورسٹی میں داخلہ دلانا ہے۔ آپ اپلی کیشنز لگاتے ہیں، شہادت لگاتے ہیں، امتحان کے نتائج لگاتے ہیں اور کریکٹر سرٹیفکیٹ لگا کر پرنسپل صاحب کے پاس تشریف لے جاتے ہیں۔ پرنسپل آپ کا دوست ہو تو وہ فائل دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ درخواست میں آپ نے کیا لکھا ہے؟ آپ کا بچہ تو داخل ہی نہیں ہوگا، آپ کو تو درخواست لکھنی ہی نہیں آتی؟ پھر وہ خود درخواست لکھوا دیتا ہے۔ جب وہ درخواست خود لکھوا رہا ہے تو پھر درخواست قبول کیوں نہیں ہوگی؟ جب کسی مقدمے میں جج نے رعایت دینی ہو تو وہ وکیل کی جرح خود سکھلا دیتا ہے کہ فلاں کتاب کا فلاں صفحہ اسٹڈی کر کے آنا۔

یہی اللہ پاک کی رحمت ہے کہ اللہ انسانوں کو آخرت کی کامیابی سکھلا رہے ہیں۔ اس کی مثال جیسے اللہ نے فرمایا کہ ہم آدم سے ناراض ہوئے اور جب راضی ہوئے تو: ﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ [البقرۃ: ۳۷] (بعد ازاں حاصل کر لیے آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ ان پر توجہ فرمائی (یعنی توبہ قبول کر لی)۔ تو ان کے دل میں دعائیہ کلمات ڈال دیے کہ ان کلمات سے معافی مانگو، ہم معاف کر دیں گے۔

اور جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب قیامت والے دن سارے لوگ میدانِ حشر میں اکٹھے ہو کر انبیاء علیہم السلام کے پاس جائیں گے۔ وہ جواب دے دیں گے تو سارے میرے پاس آئیں گے تو میں کہوں گا: ((أَنَا لَهَا)) (شفاعت کے تو اللہ نے مجھے چن رکھا ہے) پھر میں عرش کے پاس آؤں گا، اللہ پاک مجھے اپنی ایسی تعریفیں سکھلائیں

گے جو میں اب نہیں جانتا۔ تو پھر اس دعا کے قبول ہونے میں کیا دیر لگے گی؟ اس لیے فرمایا: ((ثُمَّ أَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا)) (میں سجدے میں گر جاؤں گا) اور ان محامد کو بیان کروں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ''يَا مُحَمَّدُ! ارْفَعْ رَأْسَكَ'' (اے محمد! تم اپنا سر اٹھا لو)۔ آپ کی درخواست قبول ہو گئی۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۵۱۰، باب: كَلَامِ الرَّبِّ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ...]

اسی طرح یہاں بھی کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ مضمون بندے کا ہے اور پڑھانے اور سکھانے والا خدا ہے۔ جب مضمون بندے کا ہے تو بندہ کہتا ہے: ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' (شروع اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں)۔

دوسرا جواب:

بعض علماء نے اس کا دوسرا جواب دیا ہے کہ سب سے پہلے جو حضور ﷺ پر قرآن اترا وہ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ﴾ تھا کہ میرا مدنی! اس رب کا نام لے کر پڑھیں جس نے پیدا کیا۔ جب اللہ ایک مرتبہ ''اِقْرَاْ'' کا حکم دے چکے ہیں تو وہ حکم یہاں بھی ہے۔ ''اِقْرَاْ'' ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' اب یہ ضروری تو نہیں کہ اللہ ہر آیت کے شروع میں ''اِقْرَاْ'' فرمائیں۔ تو یہ بندے کو حکم ہے۔ (یہ جواب پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے۔ انور)

حضور ﷺ نے اسم اعظم کے بارے میں بتایا کہ قرآن پاک میں ایک آیت ہے جو بندہ اس کو پڑھ کر دعا مانگتا ہے تو اس کی دعا کو قبول فرماتے ہیں۔ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الانبیاء: ۸۷] (آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ (سب نقائص) سے پاک ہیں۔ میں بے شک قصوروار ہوں)۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۵۰۵]

اب بتائیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کی زبان کون سی تھی؟ وہ عربی تو نہیں تھے۔ پہلے انبیاء علیہم السلام کی زبان عبرانی تھی یا سریانی وغیرہ تھی۔ جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے:

''أَوَّلُ مَنْ تَكَلَّمَ بِالْعَرَبِيَّةِ مِنْ وُلْدِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِسْمَاعِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ.''

''حضرت اسماعیل علیہ السلام پہلے نبی ہیں جنہوں نے عربی زبان بولی۔'' [الجامع لاحکام القرآن، جز: ۱]

تو حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی زبان میں جو فریاد کی تھی اس کو اللہ نے اپنی کلام میں نقل فرما دیا، اس کے اندر اسم

اعظم بھی رکھ دیا اور ساتھ یہ بھی فرمادیا:

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾[الانبیاء:۸۸]

''سو ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو اس گھٹن سے نجات دی اور ہم اسی طرح (اور) ایمان والوں کو (بھی کرب وبلا سے) نجات دیا کرتے ہیں۔''

اسی طرح جب ایمان والے میری طرف توجہ کریں گے تو میں ان کو بھی غم سے نکالوں گا۔اس لیے یہ ساری باتیں میرے اللہ کی طرف سے ہیں۔تعوذ،تسمیہ یا سورۂ فاتحہ جو بھی ہو اب اس پر اعتراض کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔یہ تو کمالِ رحمت ہے کہ خود سکھلا رہے ہیں اور اس پر خود ثواب دے رہے ہیں۔

شبہ،اللہ کی اپنی زبان سے اپنی تعریف:

انہوں نے ایک شبہ یہ ڈالا ہے کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ''(شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے) اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو...... معاذ اللہ!...... اللہ کسی اور اللہ کے نام سے شروع کر رہے ہیں۔اور پھر یہ شبہ بھی ڈالتے ہیں کہ اگر یہ اللہ کا کلام ہے پھر تو یہ اپنی تعریف ہے۔

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ کلام بلیغ میں کبھی تو کلام متکلم کی اپنی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی کلام دوسرے کی طرف سے ہوتا ہے اور مضمون متکلم کا ہوتا ہے۔جیسے مثال دی تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے دعا سکھلا دی۔اور دنیاوی بھی ایک مثال دی تھی کہ آپ کسی آفیسر کے پاس کوئی کام ہو وہ آفیسر اگر مہربان ہو تو کہہ دیتا ہے کہ آپ نے درخواست صحیح نہیں لکھی۔آپ نیا کاغذ لیں،میں لکھوا دیتا ہوں۔ایک جواب تو یہ ہو گیا کہ اللہ اپنی طرف سے بندوں کو یہ مضمون سکھلا رہے ہیں۔

دوسرا جواب تھا کہ سب سے پہلی وحی ''اِقْرَاْ'' اتری۔تو وہ ''اِقْرَاْ'' ہر جگہ لگے گا۔اس سے اعتراض ختم ہو گیا۔

''رَحْمٰن ورَحِیْم '' کا تکرار:

دوسرا شبہ یہ ہے کہ ایک لفظ کا تکرار بلاغت کے خلاف ہوتا ہے۔''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' میں بھی ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' ہے۔اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو اس میں تکرار کیوں ہے؟ یہ تو فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک لفظ کو ایک ہی مقصد کے لیے دوبارہ لایا جائے تو وہ بلاغت کے خلاف ہے۔سورۂ

رحمٰن میں ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ اکیس (۲۱) دفعہ آیا ہے۔ تو یہ تکرار بلاغت کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ یہ ہر نعمت کے بعد علیحدہ آیا ہے۔ جب اس سے پہلے نعمت الگ ہے تو تکرار نہیں ہے۔ اسی طرح کلامِ عرب میں دیکھیں:

عَلَیَّ تُمُنّیٰ نِعْمَۃٍ مِنْ کَمْ ـــہ

کَمْ کَمْ کَمْ

''تم نے مجھ پر کتنے احسانات کیے ہیں!! کن کن احسانات کو میں گنوں!!!''

اس کو بلاغت کے خلاف نہیں، بلکہ حسن سمجھا جا رہا ہے کہ تیری کتنی نعمتیں ہیں، میں ان کو شمار ہی نہیں کر سکتا۔ یہ ''کَمْ'' کا تکرار نہیں ہے۔

''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' طلب فیوض کے لیے ہے کہ اے اللہ! میں تیرے نام سے شروع کر رہا ہوں، مہربانی فرما کر اپنا فیض عطا فرما، رحمتیں نازل فرما۔ اور جب سورۂ فاتحہ میں ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' ہے وہ دلیلِ محمودیت ہے کہ تمام حمد اللہ کے لیے ہے جو رب العالمین ہے، بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ جب دونوں جگہ میں ان کا مقصد الگ ہے تو قرآن میں تکرار کیسے ہوا؟

بعض کلام میں تکرار کا حسن:

یہ تو کلام میں بلاغت ہے کہ ایک لفظ کو ایک جگہ لگاؤ تو وہ حسن بن جائے۔ جیسے اُمی لفظ ہے۔ کسی آدمی کو امی کہو، یہ تو شکایت ہے، لیکن اپنے نبی ﷺ کے بارے میں فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ [الاعراف: ۱۵۷] (جو لوگ کہ ایسے رسول (ﷺ) یعنی نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں)۔ اللہ نے فرمایا میرا نبی امی۔ اگر دوسروں کو امی کہیں تو مذمت ہے، لیکن میرے مدنی پاک ﷺ کے ساتھ لگے تو حسن ہے، مدح ہے کہ وہ نبی جو کسی سے نہیں پڑھے، ساری دنیا کو پڑھانے آگئے ہیں۔

اس لیے کسی نے کہا تھا:

تو نے کانٹوں کو چھوا گلستاں کر دیا

کہ وہ لفظ جو ساری دنیا کے ساتھ لگاؤ تو وہ ذم اور شکایت بنتا ہے، لیکن میرے نبی ﷺ کے ساتھ لگتا ہے تو وہ مدح اور تعریف بن جاتی ہے۔

ہندوستان میں ایک شاعر گزرے ہیں، غالباً وہ جگر مراد آبادی مرحوم ہیں۔ وہ ایک جگہ سے گزر رہے تھے۔ ایک عورت دوسرے بالا خانہ میں کھڑی تھی اور لمبے قد کی تھی۔ اب ایک عورت لمبی ہو اور دوسری منزل پر کھڑی ہو اور جگہ بھی گندی ہو تو کہتے ہیں:

طولِ شبِ فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے

جدائی کی رات تو بڑی اور لمبی ہوتی ہے۔ وصال کی رات چاہے کتنی بڑی ہو، لیکن چھوٹی ہوتی ہے۔ کسی کا لمبا ہونا شکایت تھی۔ تو وہ بھی اس بازار کی عورت تھی۔ اس نے سلام کیا اور پوچھا: آپ کیا فرما رہے ہیں؟ تو انہوں نے کہا:

وہ زلف جو تیرے رخسار پر پڑی ہے

اب اس کی تعریف ہوگئی۔ ایک ہی کلام کو مذمت سے مدح کی طرف لے آئے۔ یہ ایک شاعرانہ فصاحت وبلاغت ہوتی ہے۔ اور قرآن تو وہ کلام ہے جس کے مقابلے میں ادیب اور شعراء جواب دے گئے۔

ایک بہت بڑے شاعر مسلمان ہوگئے۔ ایک دن صحابہ ﷺ نے کہا کہ ہمیں اپنے شعر سناؤ۔ اس نے کہا: جب سے قرآن پڑھا ہے شعر کہنا ہی چھوڑ دیے ہیں۔ ہم اس کے آگے بول ہی نہیں سکتے۔

اس لیے یاد رکھیں! لفظ ایک ہے، لیکن الگ الگ مقصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے، لہٰذا یہ بلاغت کے خلاف نہیں ہے۔

کیا سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں؟

تیسرا شبہ ان کا یہ ہے کہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں سے "اَلْحَمْدُ" کے اندر الف لام کا استعمال ہوا ہے۔ اور الف لام کا استعمال چار چیزوں کے لیے ہوتا ہے: جنس کے لیے، استغراق کے لیے، عہدِ ذہنی کے لیے یا عہدِ خارجی کے لیے۔ اور یہاں الف لام کا استعمال جنس کے لیے ہوگا یا استغراق کے لیے ہوگا۔ یعنی جنسِ حمد اللہ کے لیے ہے یا حمد کی تمام جزئیات اور اقسام اللہ کے لیے ہیں کہ تمام محامد اس کے لیے ہیں اور ساری کائنات اس کی تعریف کر رہی ہے۔ تو قرآن کا دعویٰ ہے کہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور یہ پہلا دعویٰ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ہے۔

اب وہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں تو اسی قرآن میں حضور ﷺ کی تعریفیں بھی ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ "بَشِیْر" ہیں، "نَذِیْر" ہیں، "مُنِیْر" ہیں اور "عَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" ہیں۔ اور اسی طرح

قرآن پاک میں کتنے پیغمبروں کی تعریفیں ہیں؟ کہیں ان کے صبر کی تعریف ہے اور کہیں ان کے "صَادِقُ الْوَعْدِ" ہونے کی تعریف ہے۔ اور ادھر آپ کہتے ہیں: تمام محامد اور حمد کی تمام جزئیات اللہ کے لیے ہیں اور یہاں آپ غیر کی تعریف کر رہے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کی تعریف ہے۔ اور تو اور دنیا میں عمارتوں کی بھی تعریف ہے کہ کیا تاج محل بنایا ہے!! کس طرح دریا کے کنارے پر بنایا ہے! باذوق آدمی چاندنی رات میں جا کر اس کے منظر کو دیکھے تو حیران ہو جاتا ہے۔ ذوق نہ ہو تو پھر کیا سمجھ آئے گی؟ ساری تعمیر سرخ پتھروں سے ہے اور انداز ایسے ہے جیسے سرخ گلاب کا پھول ہو۔

ایک عمارت دبئی کے اندر ہے، اس کو برجِ عرب کہتے ہیں۔ یہ ایک ہوٹل ہے، لیکن چونکہ ہمارے مسلمان ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کرتے ابھی تک ہم اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں۔ اس ہوٹل کا یہ عالم ہے کہ اس کے ایک کمرے کا کرایہ چوبیس گھنٹے کا پندرہ ہزار ڈالر ہے اور ایک سو درہم تو اس کے دیکھنے کی ٹکٹ ہے۔ بنانے والا (عیسائی) اتنا شاطر تھا کہ آپ ہوائی جہاز پر بیٹھے ہوں تو آپ کو اس میں تثلیث نظر آئے گی۔ اس نے جو کرنا تھا کر گیا، لیکن ہمارے لوگوں کی سوچ ہی نہیں پہنچی۔ سنا ہے کہ اب کچھ لوگوں نے بات اٹھائی ہے۔ واللہ اعلم!

اسی طرح ہندو آرکیٹیکچر ہوگا اس کو اگر اور کہیں موقع نہ ملے تو مناروں پر جیسے چاند تارا لگایا جا سکتا ہے۔ جب وہ چاند تارا لگائے گا تو ایک ڈنڈی کھڑی کر دے گا، تاکہ ترشول کا نشان بنے۔ وہ اپنی مار جاتا ہے، لیکن مسلمان نہیں سمجھتا۔ مندر کا پجاری جاگتا ہے اور مسجد کا نمازی سوتا ہے۔ انہوں نے ہمارے ہر مقام پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ اب مسلمانوں کا کلچر تبدیل کر دیا ہے۔ مسلمان عورتیں تلک لگاتی ہیں، مسلمان عورتیں ساڑھی باندھتی ہیں اور جیولری پہنتی ہیں۔ اسی طرح کے نام رکھتی ہیں۔

مجھے ایک اچھے خاصے مسلمان گھرانے کے آدمی نے کہا کہ میرا والد فوت ہوا تو میرے بیٹے نے کہا کہ جب گرینڈ پاپا کو آگ دیں گے تو آگ میں لگاؤں گا۔ کیونکہ وہ فلمیں دیکھ رہا ہے کہ مُردوں کو جلایا جاتا ہے۔ وہ جو دیکھے گا اس کے پردہ اسکرین پر وہی نقش ہوگا۔

بہر حال وہ اعتراض کرتے ہیں کہ تم مسلمان کہتے ہو کہ ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ اس کی بھی تعریف ہے اور اس کی بھی تعریف ہے۔

جواب:

یاد رکھیں! اس کا علماء نے جواب دیا کہ ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، لیکن جہاں مصنوعات کی تعریفیں ہوتی ہیں دراصل صانع کی تعریف ہوتی ہے۔ مثلاً: کسی خطاط کا قطعہ یا آیت کا ٹکڑا لکھا ہوا ہو، جیسے صادقین گزرے ہیں اور حضرت نفیس الحسینی رحمہ اللہ گزرے ہیں، جب ان کی نقش کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں سبحان اللہ! یہ دراصل نقش کی تعریف نہیں ہے، بلکہ نقاش کی تعریف ہو رہی ہے۔ جب آپ زمین پر نظر ڈالیں گے اور آسمانوں پر نظر ڈالیں گے تو ان میں نشانیاں نظر آئیں گی۔ فرمایا:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾

[آل عمران:۱۹۰]

''بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے بارے بارے آنے جانے میں ان عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔''

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [آل عمران:۱۹۱]

''وہ لوگ اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے بھی، بیٹھے بھی اور لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں:) اے ہمارے پروردگار! آپ نے اس کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا، ہم آپ کو منزہ سمجھتے ہیں۔ سو ہمیں عذابِ دوزخ سے بچا لیجیے۔''

جب حضور ﷺ کی تعریف کریں گے کہ وہ سید الاولین والآخرین ہیں، عظمتوں والے ہیں، امام الانبیاء والمرسلین ہیں، رحمۃ للعالمین ہیں۔ اور جب ان کو پیدا کرنے والا اللہ ہے تو حضور ﷺ کی تعریف اصل میں اللہ کی تعریف ہے۔ تمام محامد تو اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اللہ کے علاوہ کسی مخلوق کی تعریف کریں تو وہ بھی دراصل بنانے والے خالق کی تعریف ہے۔ جیسے ایک عربی شاعر نے کہا:

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهٗ اٰيَةٌ
تَدُلُّ عَلٰى أَنَّهٗ وَاحِدٌ

[المحاضرات فی اللغۃ والادب، ص:۳۹]

"ہر ایک چیز میں اس کی نشانیاں ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ واقعی ایک ہے۔"

اور جیسے اردو شاعر نے کہا:

ہر مرغباں تیری تسبیح پڑھ رہا ہے
ہر غنچۂ سحر سے سنتا ہوں نام تیرا

ہر چیز تیری حمد اور تسبیح کر رہی ہے۔ پرندے چہچہا رہے ہیں، کلیاں چٹک رہی ہیں، پھول کھل رہے ہیں اور سمندر کی لہریں ہیں۔ اگر غور کرو تو ہر چیز میں تیری تسبیح اور تحمید ہے، ہر چیز میں تیرا نام ہے۔ اس لیے کہا:

ہر غنچۂ سحر سے سنتا ہوں نام تیرا

میں تو ہر جگہ سے تیرا ہی نام سنتا ہوں۔ تو کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اس اعتراض کی کوئی حیثیت نہیں رہی، کیونکہ واقعی! تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔

رحمٰن ورحیم کی تقدیم وتاخیر کا سوال:

ان کا ایک اور شبہ یہ ہے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" اور سورۂ فاتحہ میں "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" آیا ہے۔ "الرَّحْمٰنِ" کا وزن "فَعْلَانٌ" ہے اور "الرَّحِیْمِ" کا وزن "فَعِیْلٌ" ہے۔ "رَحْمٰنِ" میں پانچ حروف ہیں اور "رَحِیْمِ" میں چار حروف ہیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ پہلے ادنیٰ کو ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ "تَرَقِّی مِنَ الْاَدْنٰی اِلَی الْاَعْلٰی" ہو۔ تو "الرَّحِیْمِ" کا ذکر پہلے ہوتا اور "الرَّحْمٰنِ" کا ذکر بعد میں ہوتا، لیکن دونوں جگہ "الرَّحْمٰنِ" کا ذکر پہلے اور "الرَّحِیْمِ" کا ذکر بعد میں ہے۔ تو یہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف تنزلی ہے۔ آدمی نیچے سے اوپر تو جاتا ہے اوپر سے نیچے تو نہیں آتا۔

پہلا جواب:

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس کو محسوسات میں آپ نہ لے جائیں، کیونکہ اس کو محسوسات کے ساتھ تشبیہ دینا کوئی عقل کی بات نہیں ہے۔

دوسرا جواب:

دوسرا جواب یہ ہے کہ کلام میں جیسے "تَرَقِّی مِنَ الْاَدْنٰی اِلَی الْاَعْلٰی" ہوتی ہے اسی طرح "تَنَزُّل مِنَ الْاَعْلٰی اِلٰی

الْاَدْنٰی'' بھی ہوتی ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿فَاَمَّاۤ اِنۡ کَانَ مِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ ﴿۸۸﴾ فَرَوۡحٌ وَّ رَیۡحَانٌ ۬ۙ وَّ جَنَّتُ نَعِیۡمٍ ﴿۸۹﴾ وَ اَمَّاۤ اِنۡ کَانَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ لَّکَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ ﴿۹۱﴾﴾ [الواقعۃ:۸۸ تا ۹۱]

''پھر (جب قیامت واقع ہوگی تو) جو شخص مقربین میں سے ہوگا اس کے لئے تو راحت ہے اور (فراغت کی) غذائیں ہیں اور آرام کی جنت ہے۔ اور جو شخص داہنے والوں میں سے ہوگا تو اس سے کہا جائے گا کہ تیرے لیے امن و امان ہے کہ تو داہنے ہاتھ والوں میں سے ہے۔''

دیکھیں! پہلے مقربین کا بیان ہے، حالانکہ وہ سب سے اعلیٰ ہیں، پھر اصحاب یمین اور پھر اصحاب شمال ہیں۔ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف آرہے ہیں۔

تیسرا جواب:

بعض علماء نے اس کا جواب دیا کہ ''الرَّحْمٰنِ'' میں واقعی! مبالغہ ہے، لیکن ابلغیت ''مِنْ حَیْثُ الْکَمِّ'' بھی ہوتی ہے اور ''مِنْ حَیْثُ الْکَیْفِ'' بھی ہوتی ہے۔ مثلاً: ایک جگہ دس موتی رکھے ہیں اور دوسری جگہ ایک موتی رکھا ہے۔ کیت کے اعتبار سے دس زیادہ ہیں۔ اور کیفیت یہ ہے کہ دس موتی ایک لاکھ کے ہیں اور یہ ایک موتی دو لاکھ کا ہے۔ تو کیفیت میں ایک موتی بڑھ گیا۔ اللہ کرے بات سمجھ آجائے۔

جیسے ایک فلسفی نے اپنے شاگردوں کو بٹھا کر شیشہ کا ایک مرتبان رکھا اور ربڑ کی چھوٹی گیندیں اس میں ڈالتا گیا، جب وہ بالکل بھر گیا تو شاگردوں سے پوچھا: کیا یہ مرتبان بھر گیا ہے؟ شاگردوں نے کہا: جی ہاں! بھر گیا ہے، اس کے اندر تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اب اس فلسفی نے گندم کے دانے اٹھا کر اس میں ڈال دیے۔ خالی جگہوں میں دانے چلے گئے تو اس نے کہا: اب بتاؤ کہ بھر گیا ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ اب تو بالکل بھر گیا ہے، جو خالی جگہ نظر آرہی تھی آپ نے اس میں گندم کے دانے بھر دیے ہیں۔ اس نے تھوڑی دیر کے بعد ریت کی پڑیا اٹھائی اور ریت بھر دی۔ ریت بھی اندر چلی گئی۔ اس نے کہا: اب بتاؤ؟ انہوں نے کہا کہ اب تو بالکل بھر گیا ہے۔ اس نے کہا: کتنی دفعہ اس کو بھروگے؟ ہر دفعہ کہتے ہو کہ بھر گیا ہے۔ وہ کافی پی رہا تھا اس نے وہ اس میں انڈیل دی، وہ کافی اس ریت کو پی گئی، شاگردوں سے پوچھا: اب بتاؤ؟ انہوں نے کہا کہ بات تو ٹھیک ہے کہ کافی بھی اندر چلی گئی۔ اس نے کہا: میں نے تمہیں یہی سمجھانا تھا کہ اگر تم نے پہلے سے دماغ کے اندر ریت بھر دی ہے تو باقی چیزیں کیسے آئیں

گی؟ اگر تم اس دماغ کے اندر گندی باتیں سٹور کرتے رہو گے تو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ اچھی باتوں کے لیے جگہ ہی نہیں رہے گی۔

اس لیے یاد رکھیں! جب تک آپ تعصب کی عینک کو نہیں اتاریں گے اس وقت تک سمجھ نہیں آئے گا۔ اچھے مسلمان نہیں بنتے، لیکن اچھے انسان بننے کی نیت تو کریں اور پھر دیکھیں کہ تمہیں قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ آپ دنیا میں اللہ کی نعمتیں دیکھیں باعتبار کمیت کے زیادہ ہیں کہ اللہ کی رحمتیں سب پر ہو رہی ہیں، مسلمانوں پر بھی اور کافروں پر بھی۔ بارش سب پر برستی ہے۔ اس لیے "الرَّحْمٰنِ" کو پہلے لایا گیا۔

اور قیامت کے دن اس کی نعمتیں عدد کے اعتبار سے، کمیت کے اعتبار سے کم ہو جائیں گی، کیونکہ دنیا کے اندر سب پر تھیں اور آخرت میں صرف مسلمانوں پر ہوں گی۔ مثلاً: دنیا کے اندر دو لاکھ آدمی تھے، ایک لاکھ کافر اور ایک لاکھ مسلمان۔ دنیا کے اندر ایک لاکھ کافر بھی اللہ کی نعمتیں کھا رہا ہے۔ لیکن جنت میں صرف ایک لاکھ مسلمان ہوں گے، کافر تو جنت میں نہیں ہوگا۔ اس لیے وہاں عدد کے اعتبار سے نعمتیں کم ہو جائیں گی اور کیفیت کے اعتبار سے آخرت میں نعمتیں بڑھ جائیں گی۔ وہ تو ایسی نعمتیں ہیں جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے سنا نہیں اور کسی کے دل و دماغ سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہاں بھی عورتیں ہوں گی، لیکن حور عین ہوں گی، وہاں بھی مکان ہوں گے، لیکن سونے چاندی کے مکان ہوں گے اور وہاں بھی شراب ہوگی، لیکن شرابِ طہور ہوگی، وہاں بھی نہریں ہوں گی، لیکن سلسبیل ہوگی، نہرِ کوثر ہوگی۔ اس لیے اللہ نے "الرَّحِيْمِ" کی صفت کو موخر رکھا ہے۔

ایک اور جواب:

دنیا پہلے ہے اور آخرت بعد میں ہے۔ تو جو چیز پہلے تھی اس کو پہلے ذکر کیا اور جو چیز بعد میں تھی اس کو بعد میں ذکر کیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"۔

عبادت پہلے اور مدد بعد میں کیوں؟

سورۂ فاتحہ پر ایک اعتراض یہ کرتے ہیں کہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ (اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں) میں عبادت پہلے ہے اور مدد بعد میں ہے، حالانکہ مدد پہلے ہوتی ہے اور عبادت بعد میں ہوتی ہے۔ جیسے وضو پہلے اور نماز بعد میں ہے۔

جواب نمبر 1:

بعض علماء نے یہ جواب دیا کہ کہیں کہیں بلیغ کلام میں فواصل کی رعایت کی جاتی ہے۔فواصل کا معنی ہے کہ پہلے تھا۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝٤﴾

[الفاتحہ:۱تا۴]

تو''يَوْمِ الدِّيْنِ''اور''نَسْتَعِيْنُ''فواصل آپس میں مل رہے ہیں اور حسن وجمال پیدا ہورہا ہے۔اگر''اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ وَ اِيَّاكَ نَعْبُدُ''ہوتا تو فاصلہ نہ ملتا۔اس لیے رعایتِ فواصل کے طور پر''نَعْبُدُ''مقدم ہے اور ''نَسْتَعِيْنُ''مؤخر ہے۔

جواب نمبر 2:

اصل جواب جو محققین نے دیا ہے وہ زیادہ قوی ہے کہ ایک توحید تشریعی ہے اور ایک توحیدِ تکوینی ہے۔تشریعی توحید کا معنی یہ ہے کہ تمام عبادت اللہ کے لیے ہے۔یہی دعوت دینے کے لیے سارے نبی آئے ہیں۔اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾[ھود:۵۰]

''اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف ان کے بھائی (حضرت) ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا:اے میری قوم!تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو،اس کے سوا کوئی تمہارا معبود ہونے کے قابل نہیں۔''

﴿وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾[ھود:۶۱]

''اور ہم نے (قوم) ثمود کے پاس ان کے بھائی حضرت صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا:اے میری قوم!تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو،اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں۔''

﴿وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ﴾[ھود:۸۴]

''اور ہم نے مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا،انہوں نے (اہل مدین سے) فرمایا کہ اے میری قوم!تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (بننے کے قابل) نہیں۔''

اب دیکھیں کہ ہر پیغمبر علیہ السلام نے یہ دعوت دی کہ اللہ کی عبادت کرو،جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔یہ توحید

تشریعی ہے۔ اور توحیدِ تکوینی یہ ہے کہ جب ہر چیز کو دیکھتے ہیں تو ہر چیز گواہی دیتی ہے کہ مجھے اللہ نے بنایا ہے کسی اور نے نہیں بنایا۔ مثلاً: بڑے سے بڑے خدا کے منکر سے بھی اگر آپ پوچھیں کہ آسمان کو کس نے بنایا ہے؟ تو اس کے پاس اور کوئی جواب نہیں ہوگا۔

علامہ اقبال مرحوم کا استدلال:

علامہ اقبال مرحوم کسی کمیونسٹ ملک میں گئے۔ فرماتے ہیں: میں ہوٹل کے باہر لان میں ٹہل رہا تھا۔ میرا مترجم کمیونسٹ تھا، میں نے اس سے پوچھا کہ یہ ہوٹل کس نے بنایا؟ اس نے کہا: ہم نے بنایا ہے۔ میں نے کہا: یہ خوبصورت لان؟ اس نے کہا: ہم نے لگایا ہے۔ تم مسلمان ہر بات میں اللہ کو لے آتے ہو۔ میں نے ایک پھول توڑا اور اس سے پوچھا کہ اس میں خوشبو کس نے ڈالی ہے؟ وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔ تو علامہ اقبال نے کہا کہ تمہاری ایک ہی زمین میں سینکڑوں قسم کے پھول لگے ہوئے ہیں۔ زمین ایک، پانی ایک، لیکن سب کا رنگ الگ ہے، خوشبو الگ ہے۔ یہ خوشبو کس نے ڈالی ہے؟ اس مترجم نے کہا: ایسے ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا: ایسے کیسے ہوتا ہے؟ اگر زمین کے اثرات اور پانی کے اثرات ہوں تو ایک جیسے ہوں، لیکن یہ الگ الگ ہیں۔ گلاب کی اپنی خوشبو ہے، چنبیلی کی اپنی خوشبو ہے، نرگس کی اپنی خوشبو ہے، رات کی رانی کی اپنی خوشبو ہے اور چنبہ کی اپنی خوشبو ہے۔ اس لیے یہ بھی توحید ہے کہ جب ہر چیز پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا خدا ہے۔ لیکن توحید تشریعی توحید تکوینی سے ہمیشہ مقدم ہوتی ہے۔ لہٰذا ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں تشریعی توحید ہے اور وہ مقدم ہے۔

جواب نمبر 3:

بعض علماء نے اس کا جواب دیا ہے کہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) میں ایک قسم کا دعویٰ کر رہا ہے۔ خالق کے سامنے دعویٰ کیا تو فوراً عاجزی کا اظہار کیا کہ ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) کہ جو ہم عبادت کرتے ہیں اس میں تیری ہی مدد ہے۔ اگر تیری مدد نہ ہو تو ہم نماز اور عبادت ہی نہیں کر سکتے۔ اس لیے ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کے بعد ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ آیا ہے۔

کیا اللہ دنیا کا مالک نہیں؟

ان کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (اللہ قیامت کے دن کے مالک ہیں) تو کیا اللہ دنیا کے

مالک نہیں ہیں؟ جبکہ قرآن کہتا ہے:

﴿فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى﴾[النجم:۲۵]

''سو خدا ہی کے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا۔''

علماء نے جواب دیا کہ دنیا کا مالک بھی اللہ ہے، حکم بھی اللہ کا ہے اور ملک بھی اللہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَعَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾[المائدۃ:۱۲۰]

''اللہ ہی کی ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور ان چیزوں کی جو ان میں موجود ہیں۔ اور وہ ہر شے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔''

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا﴾[النساء:۱۲۶]

''اور اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو احاطہ فرمائے ہوئے ہیں۔''

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَعَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ﴾[الملک:۱]

''بڑی شان ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ساری بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

ہر چیز کا مالک اللہ ہے، لیکن دنیا میں اللہ نے انسان کو مجازی طور پر ملک دیا ہوا ہے کہ اس زمین کا، مکان کا مالک میں ہوں۔ باقاعدہ مالک اور کرایہ دار کا نام لکھا ہوا ہوتا ہے۔ مجازاً تو یہاں مالک کہا جاتا ہے، لیکن حقیقۃً تو ہر چیز اللہ کی ملک ہے۔ جبکہ قیامت کا دن ایسا ہوگا کہ جس دن ساری مجازی ملکیتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔ اس لیے کون دعویٰ کرے گا؟ قرآن میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ﴾

''آج کس کی ملکیت ہے؟''

مفسرین نے لکھا ہے کہ سینکڑوں سال گزر جائیں گے، لیکن کوئی جواب نہیں دے گا تو اللہ تعالیٰ خود جواب دیں

گے۔ارشادفرمائیں گے:

﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾[غافر:۱۶]

''بس اللہ ہی کی ہوگی جو یکتا (اور) غالب ہے۔''

اس دن سارے بادشاہوں کی بادشاہتیں بھی ختم ہوگئیں، ملک بھی ختم ہوگیا۔اس لیے فرمادیا:

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾[الفاتحہ:۳]

''جو مالک ہیں روزِ جزا کے۔''

اس روزِ جزا کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔کوئی دعویٰ کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔سب عاجزی کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ایک جگہ ارشادفرمایا:

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾

[النبا:۳۸]

''جس دن ساری روحیں اور فرشتے قطاریں بنا کر کھڑے ہوں گے، اس دن سوائے اس شخص کے کوئی نہیں بول سکے گا جسے خدائے رحمٰن نے اجازت دی ہوگی۔اور وہ بات بھی ٹھیک ٹھیک کہے گا۔''

قیامت کے دن کسی کی کوئی ملکیت نہیں ہوگی صرف اسی کا ملک ہوگا۔اس لیے اللہ نے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ فرمایا۔

ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں سے ہمارا مطالبہ:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی بڑی شان رکھی ہے کہ ایک عجمی بچہ جس کو عربی کی سمجھ ہی نہیں ہوتی وہ قرآن پاک ''اَلْحَمْدُ'' سے ''وَالنَّاسِ'' تک زبانی یاد کرلیتا ہے۔ہم ہندوؤں سے کہتے ہیں کہ تمہارے اتنے وید ہیں، تم الف سے یا تک ہمیں زبانی سنادو۔سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ سنادیں۔اور آج موجودہ دور میں انگریز ترقی پر ہے طاقت، قوت کے اعتبار سے، علم کے اعتبار سے، اقتصادی اعتبار سے اور جدید علوم کے اعتبار سے، ہم ان کو کہتے ہیں: جس کو تم اپنی کتاب کہتے ہو ہمیں زبانی سنادو۔ایک عیسائی پیدا کرو جس کو اناجیل اربعہ یاد ہوں۔ایک یہودی پیدا کرو جس کو تورات یاد ہو۔حالانکہ یہودی بڑے عبادت گزار ہیں۔اپنے مذہب کے اعتبار سے حلال پر بڑا زور ہے، پاکیزگی پر بڑا زور ہے، لیکن کوئی ایک تورات کا حافظ نہیں ہے۔

قرآن اور اہلِ سنت کی صداقت:

قرآن پاک کی اس سے بڑی صداقت کیا ہوسکتی ہے کہ عربی کا اتنا عظیم کلام ہو اور عجمی لڑکا ہو جس کو ایک لفظ کا ترجمہ نہیں آتا، ''اَلْحَمْدُ'' سے ''وَالنَّاس'' تک تراویح میں کھڑا ہو کر زبانی سنا دیتا ہے۔ اتنے بڑے چیلنج کے بعد دشمن نہ مقابلہ کر سکا اور نہ قرآن حفظ کر سکا۔ خدا کی شان کہ مسلمانوں میں بھی وہ فرقے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن پھر روافض بن گئے، شیعہ بن گئے، دین کو چھوڑ دیا شیعہ کہلائے یا روافض کہلائے۔ ان کی آگے جتنی بھی قسمیں ہیں۔ ان میں جو لوگ صحیح معنی میں خلفاء راشدین کے منکر ہیں یا خلفاء راشدین پر تبرا کرتے ہیں ان میں آج تک ایک بھی حافظ قرآن پیدا نہیں ہوا۔ انڈو پاک اور بنگلہ دیش غریب ملک ہیں۔ ان کے دیہات میں چلے جائیں، جہاں پرائمری سکول بھی نہ ہو، لیکن وہاں کوئی نہ کوئی حافظ موجود ہوگا۔ قرآن کی سچائی پر اس سے بڑی کون سی دلیل ہو سکتی ہے؟

اتنے بڑے ممالک جنہوں نے مریخ پر کمندیں ڈال لیں اور فضاؤں کو مسخر کر لیا، خلاؤں میں مرکز قائم کر لیے، پوری دنیا کو کنٹرول کرنے کے لیے اپنے سیارات فضاؤں میں چھوڑ دیے۔

کفار کو چیلنج:

آج بھی ہم ان کو چیلنج کرتے ہیں کہ قرآن نے ہمیں آدم علیہ السلام کی خبر دی ہے، وہ لوگ اس کی تردید کر دکھائیں۔ قرآن نے خبر دی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا، وہ ثابت کریں کہ طوفان نہیں آیا۔ قرآن نے خبر دی کہ قومِ عاد اس طرح تھی اور اللہ نے اس پر عذاب بھیجا تھا، وہ اس کی تردید کریں کہ پوری دنیا میں قوم عاد کہیں بھی نہیں تھی اور اللہ نے اس پر عذاب نہیں بھیجا۔ قرآن نے ہمیں فرعون کے بارے میں بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام سے اس کا مقابلہ ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام سمندر سے خیریت سے گزر گئے اور فرعون لشکر سمیت غرق ہو گیا۔ اگر غلط ہے تو تردید کریں۔ اسی طرح قرآن ہمیں خبر دیتا ہے کہ ابرہہ ہاتھی لے کر آیا تھا۔ کسی ایک واقعہ اور خبر کی تردید کرو۔ حالانکہ خبر دینے والا ''اَلنَّبِيُّ الْأُمِّيّ'' ہے۔ نہ ٹیلی فون ہے، نہ مواصلات ہے نہ کالج ہے۔

اللہ کے قرآن نے جو احکام بتلائے ہیں کسی ایک حکم کو جھٹلاؤ کہ یہ درست نہیں ہے۔

شاہ فیصل مرحوم کا مدبرانہ جواب:

شاہ فیصل مرحوم...... اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے...... بڑے مدبر ومفکر تھے۔ ایک کافر ملک میں ان کا دورہ ہوا تو وہاں تمام عالم کے نمائندے اکٹھے تھے۔ انہوں نے شاہ فیصل مرحوم سے کہا: آپ کے ہاں سزائیں بڑی سخت ہیں کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اس کو زیادہ سے زیادہ سزا یہ ہو کہ اس کو جیل بھیج دو یا اس پر جرمانہ کر دو، یہ نہیں کہ اس کے ہاتھ ہی کاٹ دو۔ یہ تو سخت سزا ہے۔ وہ سنتے رہے، اپنی باری پر کھڑے ہوئے اور کہا: میرے ملک کے دس سال کے اعداد وشمار دیکھ لو اور اپنی ایک سٹیٹ کے ایک سال کے اعداد وشمار دیکھو۔ جرائم آپ کے پاس زیادہ ہیں یا میرے پاس زیادہ ہیں؟ ایک ہاتھ کو نہ دیکھیں، بلکہ پورے ملک کے امن وامان کو دیکھیں۔ آپ ایک شاخ کو کٹتا ہوا دیکھ رہے ہیں، باغ کی حفاظت کو نہیں دیکھ رہے؟ اور اس شاخ کا حسن قائم رہے۔ جب ہاتھ اتنا لمبا ہو جائے کہ دوسرے کی جیب یا گھر میں داخل ہونے لگے تو اس کو چھوٹا کرنا ہوگا۔ ان کے ایک ملک میں چھ گھنٹے کے لیے بجلی بند ہوئی تو ہزاروں کی تعداد میں جرائم ہوئے۔

اپنے آپ کو مہذب اور تعلیم یافتہ ملک کہنے والے اور ہمیں جٹ، بیک ورڈ کہنے والے ان کے ہاں جرائم کی یہ حالت ہے کہ ایک سال میں کم سے کم تین لاکھ کنواری لڑکیاں حاملہ ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض شہروں میں آپ اپنی گاڑی میں بھی محفوظ نہیں ہیں، بلکہ باقاعدہ اس کے دروازوں کو لاک کرنا پڑتا ہے کہ لڑکی زبردستی اندر آکر بیٹھ جائے گی۔ آپ اس کو کہیں بھی سہی کہ میں اس لائن کا آدمی نہیں ہوں۔ وہ کہے گی: میں یہاں بیٹھی ہوں، میرا ٹائم ویسٹ ہوا ہے، مجھے اس کے پیسے دو۔ یہ مہذب ملک کی حالت ہے۔ جیب کے اندر ہر وقت پیسے ہوں۔ اگر راستے میں غنڈہ آگیا اور پیسے نہ ہوئے تو وہ مار دے گا کہ جیب کے اندر پیسے بھی نہیں رکھتے؟ اگر ان سے کسی جگہ کا پتا پوچھو تو وہ کہے گا کہ مجھے راستہ بتانے کے پیسے دو۔

ہم پوری دنیائے کفر، یہودیت، عیسائیت، نصرانیت اور ہندومت ہر مذہب کو چیلنج کرتے ہیں کہ آؤ قرآن میں جو احکام دیے گئے ہیں ان کو جھٹلاؤ کہ یہ ٹھیک نہیں ہیں۔ حدیث اٹھا کر دیکھ لیں یا فقہ کی کتاب البیوع اٹھا کر دیکھ لیں۔ آج بھی معاملات میں قانون دان اسی چیز کا محتاج ہے جو حضور ﷺ نے بتائے ہیں۔ آپ کے پاس بھی اپنے ملکوں کے اسٹام موجود ہوں گے ان پر لکھا ہوتا ہے: ''من کہ مقرر مسمی فلاں بن فلاں بہ ہوش وحواس خمسہ بلا

اجبار واکراہ بقصدِ مقر (اقرار کرتا ہوں)......اور بروئے گواہان اقرار کرتا ہوں، تاکہ بوقت سند کام آئے۔'' آج تک ان الفاظ کے بدل نہیں لائے ہیں، دنیا کا بڑے سے بڑا بیرسٹر اس کو مانتا ہے۔

جب ہسپانیہ پر مسلمانوں کی حکومت تھی تو جو آج اپنے آپ کو عقلمند کہتے ہیں ان کی یہ حالت تھی کہ ان کے لوگ مسلمانوں کے پاس پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ مسلمانوں کی لائبریریوں کا یہ عالم تھا کہ ہلاکو خان نے جب بغداد کو تباہ کیا، دریائے دجلہ میں اتنی کتابیں ڈالی گئیں کہ تین دن تک دریائے دجلہ کا پانی سیاہ ہو کر بہتا رہا۔ یہ تاریخ کی بات ہے۔ اس کا کوئی ملک انکار نہیں کرسکتا۔

آج بھی پورے میڈیکل کی بنیاد ابن سینا کے قوانین پر ہے۔ وہ ابنِ سینا کون تھا؟ ابو حیان، الرازی، ابنِ رشد، ابنِ نفیس داؤ دانطا کی کون تھے؟

ایک مسلمان وکیل کی عقلمندی:

جس کے پاس طاقت ہو وہ جو کہے وہی بات سچ ہے۔ حالانکہ ان کا عالم یہ تھا کہ برطانیہ کے دور میں ایک آدمی کو سزائے موت ہوگئی۔ اس کا وکیل سر سید احمد کا بیٹا یا کوئی عزیز تھا اور وہ خاموش رہا۔ ہوتا یہ ہے کہ اس ملزم کو کوٹھری میں بند کردیا جاتا ہے۔ پھر وقت مقررہ پر جلاد بھی آتا ہے، مجسٹریٹ بھی آتا ہے، پولیس والے بھی آتے ہیں، اس کو غسل دیا جاتا ہے، سخت نگرانی میں اس کو پھانسی گھاٹ پر لاتے ہیں۔ پھر اس کے گلے میں رسہ ڈالا جاتا ہے۔ اور مجسٹریٹ حکم پڑھ کر سناتا ہے۔ اس کی بعد اشارہ کرتا ہے اور جلاد لیور کو گھماتا ہے۔ جب اس آدمی کے گلے میں رسہ ڈالا گیا اور مجسٹریٹ اس کے جرائم سنا رہا تھا کہ اس نے فلاں فلاں شخص کو قتل کیا وغیرہ۔ اس کے بعد جب وہ اشارہ کرنے لگا تو وکیل نے کہا: ایک منٹ اشارہ مت کرنا، میں تمہارے خلاف قتل کا مقدمہ کردوں گا، کیونکہ قانون میں لکھا ہوا ہے کہ پھانسی پر لٹکایا جائے، یہ تو نہیں لکھا ہوا کہ لٹکا کر مارا جائے؟ اگر اس کو موت آگئی تو میں تین سو دو کا مقدمہ تم پر درج کروں گا اور اسی پھٹے پر تم کو آنا ہوگا۔ مجسٹریٹ اور سپرنڈنٹ مل گئے۔ قانون کی کتابوں میں دیکھتے ہیں تو اس میں ہائن کا لفظ ہے، کال ٹیکس کا لفظ ہی نہیں ہے۔ انہوں نے پھانسی روک دی اور سپریم کورٹ تک بات گئی تو انہوں نے کہا کہ وکیل کی بات ٹھیک ہے۔ کیونکہ ہمارے قانون میں یہ لفظ نہیں لکھے ہوئے کہ اس وقت تک پھانسی پر لٹکایا جائے جب تک کہ موت آجائے۔ لٹکانا الگ بات ہے اور موت تک لٹکانا الگ بات ہے۔ پھر انہوں نے قانون کے اندر تبدیلی کی اور پھانسی کے وقت ایک ڈاکٹر بھی کھڑا ہوتا ہے جو اس کی موت کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ

عقلمند کا قانون ہے۔

اسلام کا قانونِ قصاص:

قرآن میں ہے:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [البقرة:۱۷۹]

''اور اے عقل رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی (کا سامان ہے) امید ہے کہ تم (اس کی خلاف ورزی سے) بچو گے۔''

اگر قاتل سے بدلہ نہیں لو گے تو ساری دنیا قاتل بن جائے گی، ساری دنیا میں فساد پھیل جائے گا۔ اور بدلہ لینے کا اختیار مقتول کے ورثا کو دیا گیا ہے۔ اگر قتل عمد ہے اور مقتول کے ورثاء قصاص چاہتے ہیں تو قصاص ہوگا اور اگر معاف کرنا چاہتے ہیں تو معافی ہوگی۔ قتل خطا میں اس سے قصاص نہیں لیں گے کہ گاڑی ٹکرا گئی اور بندہ مر گیا۔ اگرچہ مقتول کے ورثا دیت لے لیں یا اس کو معاف کر دیں تب بھی قتل خطا کے ملزم کو اسلام کہتا ہے کہ دو مہینے کے روزے بھی رکھو، تاکہ تمہارے اندر کی بھی پاکی ہو۔ اسلام کا جامع قانون ہے دنیا کی کوئی طاقت ایسا قانون نہیں بنا سکتی۔ قرآن نے بوقت نزول چیلنج کیا اور اس کے بعد بھی چیلنج کیا اور آج بھی وہ چیلنج موجود ہے کہ قرآن کے مقابلہ میں قرآن بنا کر دکھاؤ۔ یہ نہیں کر سکتے ہو تو اس کے کسی حکم کو جھٹلا دو۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتے ہو تو اپنی کتاب بچے کو یاد کرا کر وہ بچہ ہمارے سامنے لے آؤ۔

حرام کا کاروبار بھی حرام ہے:

چودہ سو سال پہلے ''اَلنَّبِيُّ الْأُمِّيُّ'' نے فرمایا کہ میرے اللہ کا حکم ہے شراب حرام ہے۔ اسی دور میں ایک صحابی آ گئے۔ کہنے لگے: مجھے پتا نہیں تھا کہ شراب حرام ہو گئی۔ میں نے اپنے پیسوں اور یتیموں کے پیسوں کے ساتھ فلاں ملک جا کر بیچنے کے لیے شراب لے آیا ہوں۔ اس صحابی نے کہا: یا رسول اللہ! اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کو کسی کافر ملک میں بیچ آتا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

((ثَمَنُ الْخَمْرِ حَرَامٌ.)) [مسند احمد بن حنبل، حدیث:۳۲۲۵]

''شراب کا پیسہ بھی حرام ہے۔''

جب یہ چیز بری ہے تو کافر کے لیے بھی بری ہے، لہٰذا اسلام کافر کے لیے کیوں اجازت دے؟

شراب کی مذمت:

ہمارے مسلمان ملک غیر ملکیوں کے لیے، سفارت کاروں کے لیے شراب کی اجازت دیتے ہیں۔ کہتے ہیں: یہ رواداری ہے، مہمان کی مہمان نوازی ہے۔ حالانکہ یہی چیز ان غیر ملکیوں کے لیے بھی تجارت کا باعث بنتی ہے کہ ان کے چوکیدار شراب بیچتے ہیں۔

چین نے اپنے ایک علاقے میں شراب پر پابندی لگا دی۔ وہاں غیر ملکی سفیر آئے تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو اجازت دو، کیونکہ شراب ہماری جزوِ حیات ہے۔ انہوں نے کہا: تم ایسے آدمی بھیجو جو شراب نہ پیتے ہوں، وگرنہ ہمیں تمہارے آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بالآخر انہوں نے ایسے آدمی تلاش کیے جو ڈرنک نہیں کرتے تھے۔

ہمارے لوگ کہتے ہیں: ہم مانتے ہیں شراب حرام ہے، لیکن اتنی شراب جو عقل کو آؤٹ کر دے، وہ ماں اور بیٹی میں تمیز نہ کر سکے، بیوی اور بہن میں تمیز نہ کر سکے۔ لیکن ہم شراب پیتے ہیں، ہماری عقل آؤٹ نہیں ہوتی، بلکہ ہم اور تیز ہو جاتے ہیں۔

حضور ﷺ نے چودہ سو سال پہلے فرمادیا:

((اَلْمُسْكِرُ قَلِيْلُهٗ وَكَثِيْرُهٗ حَرَامٌ.)) [سنن النسائی، حدیث:۵۶۹۸]

''جو مشروب نشہ کرے اس کا ایک قطرہ بھی حرام ہے اور ایک گیلن بھی حرام ہے۔''

اب وہ اعتراض کرتے ہیں کہ عربی کی تمام لغات کی کتابوں میں دیکھیں کہ ''خمر'' اسے کہتے ہیں جو انگوروں سے نکالا جائے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جو خمر انگور سے نکالا جاتا ہے وہ حرام ہے۔ ہم وہ پیتے ہیں جو مالٹا، سیب اور گندم سے نکالا جائے، جو ان کیکر کے درخت کی لکڑیوں سے نکالا جائے۔ جبکہ اس نبی امی ﷺ نے اسی وقت فیصلہ فرمادیا کہ ((كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ))[1] (ہر نشہ والی چیز حرام ہے) وہ چاہے انگور سے نکالو چاہے کسی چیز سے بھی نکالو۔ اور فرمادیا: ''قَلِيْلُهٗ وَكَثِيْرُهٗ حَرَامٌ'' (تھوڑی ہو تب بھی حرام ہے اور زیادہ ہو تب بھی حرام ہے) اور نشہ کا فیصلہ فرمادیا کہ جس نے کبھی زندگی میں پیا ہی نہ ہو وہ پیے تو اس کو نشہ آنے لگے، لیکن مسلمان جب کافر کی نقل کرتا ہے تو کافر اس کی جوتیوں کو بھی نہیں پہنچتا ہے۔

[1]......[الصحیح البخاری، رقم:۶۱۲۴]

لطیفہ ہے کہ خان صاحب ایک دعوت میں آئے تو اس نے میز بان سے پوچھا کہ کھانا داتا ہے یا خیرات ہے؟ میز بان نے کہا: خان صاحب! کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے کہا: کھانا ہے یا خیرات ہے؟ میز بان نے کہا: قورمہ، کوفتہ ہے، روغنی نان ہیں۔ اس نے کہا: اس کو چھوڑو اور یہ بتاؤ وہسکی بھی ہے یا نہیں؟ اس نے کہا: وہسکی تو نہیں ہے۔ تو خان صاحب نے کہا تو یوں بولو خیرات ہے۔ کالی ذریت کھانا اس کو سمجھتی ہے جس میں شراب ہو۔ حالانکہ اللہ معاف کرے جو اصل انگریز ہے وہ بھی وہسکی نہیں پیتا اس کو پتا ہے یہ ہاٹ ڈرنک ہے۔ شیطان کو ہمارے علاقوں میں کھلی چھٹی ہے، بلکہ وہ صبح ہاتھ باندھ کر آتا ہے اور کہتا ہے: سرکار! میرے لیے آج کیا حکم ہے؟ بیوی کو ماں بنا دیتے ہیں۔

ایک صاحب کا واقعہ:

ایک صاحب یہاں بغیر پاسپورٹ کے رو رہے تھے۔ میں نے کسی سے کہا کہ اس کو اپنے ملک بھیج دو۔ تو اس صاحب نے بتایا کہ مجھے بحری جہاز سے بھیج رہے تھے تو میں نے ان سے کہا کہ میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ؟ انہوں نے کہا: مل جائے گا۔ وہ پاسپورٹ اکٹھے کر کے دفتر میں پاس کرانے کے لیے لے گیا۔ اس نے مجھے میرے پاسپورٹ کی علامت بتائی اور پھر مجھے وہ پاسپورٹ پکڑا دیا کہ یہ ٹکٹ اور پاسپورٹ آپ کا ہے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرا خروج بھی ہو گیا اور جہاز میں بھی سوار ہو گیا۔ دو تین دن کے بعد خیال آیا کہ اس کو کھولوں۔ جب کھولا تو وہ ایک عورت کا پاسپورٹ تھا۔ اور ساتھ ایک پرچی لکھی ہوئی تھی کہ یہ پاسپورٹ عورت کا ہے۔ جب جہاز کراچی ساحل پر جا لگے تو اس کو سمندر میں پھینک دینا، کسی افسر کے ہاتھ نہ لگیں۔ افسروں کو کہہ دینا کہ میرا ہاتھ کانپا اور وہ سمندر میں گر گیا ہے، کسی سے نکلوا دو۔ کون سمندر میں جاتا؟ یہ ہدایت نامہ بھی لکھ دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے نفلوں پر زور دیا کہ اللہ میرا پردہ رکھنا۔ لوگ دیکھیں گے کہ اتنی بڑی داڑھی ہے اور عورت کے پاسپورٹ پر سفر کر رہا ہے۔

تین راتیں جہاز میں اتنی نفلیں پڑھیں کہ اتنی مکہ میں بھی نہیں پڑھیں۔ اللہ نے میری عزت رکھی کہ جب جہاز ساحل پر لگتا ہے تو قلی جہاز پر سامان لینے کے لیے اوپر آ جاتے ہیں۔ میرے علاقے کا ایک قلی تھا میں نے اس کو بتایا تو اس نے کہا: پاسپورٹ ٹکٹ مجھے دو۔ یہاں کے حالات کو میں جانتا ہوں۔ کہہ دینا غلطی سے میں دوسرے کا لے آیا ہوں، مجھے کیا پتا کہ میرا کدھر ہے؟ وہ کہتے ہیں: میں اس وقت تک ڈرتا رہا جب تک اس علاقے سے نکل نہیں گیا۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ نقالی اور دھوکہ کے اندر اتنے بڑھے ہوئے ہیں۔

تثلیث کے استدلال کا رد:

بعض لوگ این جی اوز کے بہانے ہماری تربیت کرنے کے لیے آتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ ۝﴾ [الحجر: ۹]

''ہم نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ (اور نگہبان) ہیں۔''

یہ ''إِنَّا''، ''نَحْنُ'' اور ''نَزَّلْنَا'' جمع ہے اور جمع کا اطلاق کم سے کم تین پر ہوتا ہے، لہٰذا ہمارا عقیدہ تثلیث صحیح ہوا۔ ان کو یہ کہنا چاہیے کہ جب تم قرآن کو مانتے ہی نہیں ہو تو اس کے جمع، مفرد سے کیسے دلیل پکڑ رہے ہو؟

ایک سنی عالم کا شیعہ کو جواب:

ایک دفعہ شیعہ اور اہلِ سنت کے آدمی کے درمیان مناظرہ ہو رہا تھا۔ شیعہ مناظر نے بخاری شریف سے روایت پیش کی کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اپنے باپ کی میراث کا حصہ طلب کیا، یعنی باغ فدک مانگا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہ دیا تو ''غَضِبَتْ فَاطِمَةُ'' (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اتنی ناراض ہوگئیں کہ مرنے تک آپ رضی اللہ عنہ سے بات بھی نہیں کی) اس نے کہا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ناراض ہونا اور موت تک بات نہ کرنا اور ایک بیٹی کو باپ کی میراث سے محروم کر دینا یہ صحاح میں ہے اور اہلِ سنت کی کتابوں میں ہے: ''فَمَنْ أَغْضَبَهَا أَغْضَبَنِي'' (لہٰذا جس نے فاطمہ کو ناراض کیا اس نے مجھ محمد مصطفیٰ کو ناراض کیا) جس نے محمد مصطفیٰ کو ناراض کیا اس نے خدا کو ناراض کیا اور جس نے خدا کو ناراض کیا اس کا انجام تو ٹھیک نہ رہا۔

اہلِ سنت والجماعت کے آدمی نے جواب دیا: پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس میراث کی درخواست لے کر گئیں؟ اس نے کہا: ہاں تمہاری کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ عالم نے کہا: کیا تم یہ بات تسلیم کرتے ہو کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں اور ان سے باغ فدک کا مطالبہ کیا تھا؟ اس نے کہا: ہم تسلیم کرتے ہیں۔ سنی نے کہا کہ دیکھو! دو لاکھ کا مجمع بیٹھا ہوا ہے، یہ بتاؤ کہ درخواست دینے کے لیے آدمی کس کے پاس جاتا ہے؟ جس کے پاس اتھارٹی ہو، اس کے پاس جاتا ہے۔ پہلے اس کی عدالت کو عدالت تسلیم کرے گا تو درخوست دے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مانتی تھیں تب ہی تو درخواست دی۔ پہلے اس مسئلہ کو حل کرو پھر بعد کا مسئلہ حل کریں گے۔ اگر ان کو خلیفہ تسلیم نہیں کیا تھا تو حضرت

خالد رضی اللہ عنہ کے پاس جاتیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس جاتیں یا کسی اور صحابی کے پاس چلی جاتیں، لیکن ان کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جانے کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم کیا۔ تو پہلے تم اقرار کرو کہ جیسے بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مانا، کیا تم مانتے ہو؟ اگر تم نہیں مانتے تو تم بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مخالف ہو، ہم تو مخالف نہیں ہیں۔

تثلیث کا جواب:

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جب تمہارا قرآن پر ایمان ہی نہیں ہے تو تم جمع مفرد کے صیغوں کو دلیل کیسے بنا رہے ہو؟ دلیل تو وہ دی جاتی ہے جس کو بندہ خود بھی مانتا ہو اور اس کا مخالف بھی مانتا ہو۔ اگر تم کہتے ہو کہ بطور استشہاد کے دلیل نکل رہی ہے تو پھر قرآن کی دوسری بات بھی مانو، کیونکہ قرآن تو یہ بھی کہتا ہے:

﴿وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٣﴾﴾ [البقرۃ: ۱۶۳]

''اور تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں جو سب پر مہربان، بہت مہربان ہے۔''

اور اسی طرح قرآن نے تو یہ بھی کہا ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ﴿١﴾ اللَّهُ الصَّمَدُ ﴿٢﴾ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ﴿٣﴾ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ﴿٤﴾﴾

[الاخلاص: ۱ تا ۴]

''آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے: بات یہ ہے کہ اللہ ہر لحاظ سے ایک ہے۔ اللہ ہی ایسا ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں۔''

پھر تو اس کو بھی مانو۔ یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ جہاں سے تمہیں فائدہ نظر آئے اس کو مان لو اور باقی کو چھوڑ دو۔

ہدایت پانے کے بعد ہدایت کی دعا کیوں؟

ان کا ایک شبہ یہ بھی ہے کہ سورۂ فاتحہ میں ہے:

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿٥﴾﴾ [الفاتحہ: ۵]

''اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔''

اب مسلمان نماز میں بھی پڑھ رہا ہے۔ اگر یہ مسلمان ہدایت پر نہیں ہے تو پھر نماز کیسے پڑھ رہا ہے؟ اگر ہدایت

یافتہ ہے اور پھر دعا مانگے تو یہ تحصیلِ حاصل ہے۔ یہ انہوں نے اپنی عقل کے اعتبار سے بہت بڑا اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ وہ یہ نہیں کہتے کہ ایک بہت بڑا تاجر ہے، اس نے ایک لاکھ روپیہ کمالیا اور ایک لاکھ روپیہ کمانا چاہتا ہے تو وہ بھی تو تحصیلِ حاصل ہے۔ تمہیں ہدایت کے اندر کیسے تحصیلِ حاصل نظر آ گیا؟

قرآن کی صداقت چودہ سو سال سے چیلنج کر رہی ہے:

الحمدللہ! قرآن اللہ کی جامع، مانع اور مکمل کتاب ہے۔ یہ دستورِ اسلام اور دستورِ حیات ہے۔ قیامت تک محفوظ ہے۔ اس میں ایک حرف کی بھی زیادتی اور کمی نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اٹھالیا ہے۔ آج دنیا کے اندر پرانی مذہبی کوئی کتاب نہیں بچی، کیونکہ اللہ نے ان کی ذمہ داری کا اعلان نہیں فرمایا۔

دشمنانِ اسلام جب قرآن کی فصاحت و بلاغت کا کوئی توڑ پیش نہ کر سکے اور نہ اس کے اعجاز کا کوئی توڑ پیش کر سکے۔ ہزار چیلنجوں کے باوجود اس کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی سورت بھی نہ بنا سکے۔ اس کے بعد بھی جوں جوں علم بڑھتا گیا، کیونکہ ہر چیز نے انتہاء کو پہنچنا ہے۔ اب دنیا کی فصل روز بروز پکتی جارہی ہے، اس کے کٹنے کا وقت قریب آرہا ہے۔ علم بڑھتا گیا، ایسی نئی نئی ایجادات آگئیں کہ آدمی حیران ہوتا ہے۔ اس سب کے باوجود کوئی بھی قرآن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جیسے چودہ سو سال پہلے مشرکین قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکے اب حالانکہ پورا میڈیا مسلمانوں کو بدنام کر رہا ہے۔ جہاں کوئی حادثہ ہو تو مسلمان کا نام ہوتا ہے۔ اِن سے دس مرجائیں تو بڑی بات ہے اور اگر اُن سے دس لاکھ مرجائیں تو کوئی بات نہیں ہے۔ کسی نے کہا تھا:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

کوئی واقعہ ہو جائے اور اس کا پسِ منظر ابھی سامنے بھی نہ آیا ہو تو نام مسلمانوں کا ہو جاتا ہے۔ جو قومیں مسلمانوں کے اس قدر خلاف ہیں تو کیا وہ اسلام کا توڑ کرنے کی کوشش نہیں کرتی ہوں گی؟ جو قوم ایک دوائی بنانے پر دو دو ارب ڈالر خرچ کر دیتی ہیں، بیس بیس سال اس میں لگے رہتے ہیں، کیا انہوں نے اس کے توڑ کی کوشش نہیں کی ہوگی؟ ہمارے نامور لوگوں کو اسی لیے تو خریدا ہے۔ مرزا قادیانی ہو گیا، سلمان رشدی ہو گیا، تسلیمہ نسرین ہو گئی کہ یہ لوگ کوئی حل نکالیں گے۔ ان کو بڑے مفسرِ قرآن اور سکالر بنا کر پیش کیا، ان سے رجم کا، قصاص کا انکار کرایا کہ یہ سزائیں وحشی اور جاہلانہ ہیں اور یہ دورِ جاہلیت کی باتیں ہیں۔ اس کے باوجود پوری دنیا قرآن کی کسی بات کو چیلنج

نہیں کر سکی۔

جیسے گزشتہ درس میں میں نے بیان کیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے پکڑا، کنویں میں ڈالے گئے، مصر کے بازاروں میں بیچے گئے، امرأۃ العزیز اور عزیز نے مل کر خریدا اور کچھ حالات پیش آئے اور جیل میں بھیجے گئے، پھر تخت پر آئے۔ یہ تو مصر کا واقعہ ہے، نینوا کا واقعہ ہے، جہاں آج ان کی مکار قوم آباد ہے۔ اگر یہ واقعہ غلط تھا تو اس واقعہ کو چیلنج کر دیتے۔

قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ فرعون نے قتل کا آرڈر دیا ہوا تھا۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں بات ڈالی کہ ان کو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دو، دریا اس کو کنارے پر پہنچائے گا اور کنارہ بھی وہ جو فرعون کے گھر میں تھا۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دودھ پینا بند کر دیا کہ کسی کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ یہودی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں وہ کہہ دیں کہ یہ غلط واقعہ ہے۔ اس کو چیلنج کر کے دکھا دیں۔

اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ لکڑی کو دریا میں مارو تو راستے بن جائیں گے۔ لکڑی ماری گئی تو پانی جم گیا اور راستے بن گئے۔ وہ گزر گئے اور فرعون غرق ہو گیا۔ اور دریا نے اس کی لاش کو باہر پھینک دیا اور وہ قیامت تک کے لیے عبرت بن گیا ہے۔ اسی بات کو چیلنج کر دیں کہ کوئی فرعون غرق نہیں ہوا یا کوئی راستے نہیں بنے، بلکہ لاس اینجلس میں وہ اس منظر کو خود دکھاتے ہیں۔ وہ شہر جسے گندا شہر کہا جاتا ہے وہاں گناہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو سپر طاقتیں تھیں: روم اور فارس۔ روم کا بادشاہ ہرقل تھا، اس کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک ملا تو اس کو چوما اور صحابہ کو بلا کر باتیں پوچھیں۔ کہا کہ جو کچھ ہے سب سچ ہے، جہاں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں اگر میں وہاں ہوتا تو ان کے قدم مبارک کو دھوتا۔

قرآن کی اخبارِ غیب:

اس سے بھی عجیب بات دیکھیں کہ مکی زندگی میں قرآن پاک نے مستقبل میں پیش آنے والے ایک واقعہ کی پیشین گوئی کی اور فرمایا:

﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ﴾

[الروم:۲، ۳، ۴]

''اہل روم ایک قریب کے موقع میں مغلوب ہو گئے۔ اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب تین سال سے لے

کرنو سال تک کے اندر اندر غالب آجاویں گے۔''

ان کو شکست ہوگئی ہے اور مستقبل کی بھی خبر دے دی کہ کچھ عرصہ کے بعد رومی پھر غالب آجائیں گے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔

ساری دنیا عاجز آگئی۔ نہ قرآن کی مثل قرآن بنا سکے اور نہ سورت اور نہ اللہ کے قرآن کے اعجاز کے اعتبار سے، نحو کے اعتبار سے، فصاحت کے اعتبار سے، بلاغت کے اعتبار سے اور معانی کے اعتبار سے اس میں کوئی عیب نکال سے۔ اللہ بے عیب ہے تو اس کا کلام بھی بے عیب ہے۔ اللہ کی ذات نقصان سے پاک ہے تو اس کا کلام بھی نقصان سے پاک ہے۔

قرآن میں جدید علوم کا کمال:

ساری دنیا کے بڑے بڑے علماء نے زور لگالیا، لیکن انہوں نے کہا: جو کچھ قرآن میں ہے وہ سچ ہے۔ قرآن نے جو دریاؤں کا نقشہ کھینچا ہے، سمندروں کا نقشہ کھینچا ہے نیوی کے جو بڑے بڑے ایڈمرل گزرے ہیں انہوں نے کہا: اتنی اچھی اچھی معلومات تو ہمیں کہیں نہیں ملیں۔

قرآن نے جب زراعت کے بارے میں بتایا ہے تو بڑے بڑے ایگری کلچر کے پی ایچ ڈی ماننے پر تیار ہوگئے کہ قرآن صحیح کہہ رہا ہے۔ قرآن نے ہمیں میزائل اور ایٹم بم کے بارے میں بتایا تو ساری دنیا نے غور کیا کہ کوئی پتھر تھا کہ اسے ہاتھیوں پر پھینکا جائے اور وہ پتھر ان کو ہلاک کر کے رکھ دے۔ اور وہ ''كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ'' (کھائے ہوئے بھس کی طرح) ہوگئے۔ جیسے کوئی جانور جب گھاس کھالیتا ہے تو باقی گھاس میں پاؤں مار مار کر اس کو رگڑ دیتا ہے۔ اور قرآن ہی نے بتایا کہ جب جنات اوپر قرآن سننے کے لیے جاتے ہیں تو: ''فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ'' (ایک جھپکتا ہوا ستارہ جو روشنی کی طرح لگتا ہے، ان کے پیچھے آتا ہے)۔

قرآن میں ہے کہ سب سے پہلے کشتی حضرت نوح علیہ السلام نے بنائی اور سب سے پہلے نجاری کا کام حضرت نوح علیہ السلام نے کیا۔ آج دنیا الٹ جائے، لیکن کشتی کی شکل وہی رہے گی، اگرچہ آپ اس کو جہاز میں تبدیل کرلیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اللہ نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو ان کے ایک بہت بڑے تخت کو لے کر اڑتی تھی۔ اسی لیے علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

؎ خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

"مجھے انگریز کی علمی اور مادی ترقی حیران نہیں کر سکی، کیونکہ میری آنکھ میں مدینے کی مٹی کا سرمہ ہے۔" اور جس میں حضور ﷺ کو ماننے والا ہوں۔ یہ میرے لیے کیا چیزیں ہیں؟ یہ انگریز تو ابھی چاند پر پہنچ رہا ہے۔ اور جس نبی ﷺ کو میں مانتا ہوں اس نے انگلی سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا تھا۔ اور یہ اب وہاں کی تصویریں اور مٹی لا رہے ہیں اور تحقیق کر رہے ہیں کہ اگر وہاں رہیں گے تو پانی کا کیسے بندوبست کریں گے؟ جبکہ اللہ کے نبی ﷺ نے بغیر کسی خلائی اسٹیشن کے، بغیر کسی اسباب کے سرزمین مکہ میں چاند سے دور کھڑے ہو کر اشارہ کیا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور سارے مکہ والوں کو حضور ﷺ نے فرمایا: "فَاشْهَدُوْا" (گواہ ہو جاؤ۔) ایک دو آدمیوں نے نہیں دیکھا، ساری دنیا نے دیکھا تھا۔

چاند کے دو ٹکڑے ہونے پر اعتراض:

اس واقعہ پر لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر چاند دو ٹکڑے ہوتا تو دوسرے ملک بھی تو اس کا مشاہدہ کرتے قرآن اور قرآن کے ماننے والوں کے علاوہ تو کسی نے یہ واقعہ ذکر نہیں کیا ہے۔

جواب:

پہلا جواب یہ ہے کہ کیا اس وقت اتنے وسائل تھے کہ سب کو ٹیلی فون ہو جاتے اور وہ موبائل پر بتا دیتے کہ اٹھو اور دیکھ لو، چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ دوسری یہ بات کہ ہر ملک کے اوقات مختلف ہیں، لہٰذا ضروری تو نہیں کہ جس وقت چاند کا واقعہ ہوا ہے ہر جگہ رات ہو۔ سب سے بڑا جواب یہ ہے کہ آپ ہندوستان کی تاریخِ فرشتہ اٹھا کر دیکھیں اس میں ہے کہ گوالیار کے راجہ نے بیان کیا ہے کہ میں فلاں تاریخ، فلاں مہینہ اور فلاں سال محل کے اوپر بیٹھا ہوا تھا اور میں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ ہندو راجہ تھا، مسلمانوں کا دوست نہیں تھا۔ کیونکہ ہندو اور یہودی کے خون میں اسلام کی دشمنی ہے۔ آپ ان کے ساتھ جتنی ہمدردی کر لیں یہ کبھی بھی آپ کے دوست نہیں بنیں گے۔ کہیں گے یہ موسلا ہے۔

جب غیر مسلم ان چیلنجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو کہتے ہیں: چلو ان میں شکوک وشبہات ڈال دو۔ تو ان شبہات

میں سے کافی شبہات ہم نے بیان کیے اور ان کے جوابات بھی دے دیے۔

ایک نحوی اشکال:

تیسرا شبہ ہے"صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ "بدل ہے اور مبدل منہ"الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ "ہے۔مبدل منہ کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ یوں کہہ دیتے"اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ "یہ قواعد کے اعتبار سے اعتراض ہے۔اوران کو سمجھ بھی وہی سکتا ہے جس کو قواعد کے ساتھ دلچسپی ہو۔

جواب کی تمہید:

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ہدایت کے درجات ہیں، جیسے تقویٰ کے درجات ہیں:

- ......تقویٰ کا پہلا درجہ یہ ہے کہ کفر سے بچے، یعنی کلمہ پڑھے اور شرک سے بچے۔
- ......دوسرا درجہ یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں سے بچے۔
- ......تیسرا درجہ یہ ہے کہ صغیرہ گناہوں سے بھی بچے۔
- ......اور آخری درجہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا دل کے اندر اور کسی کا خیال نہ آنے دے۔اب اگر آدمی کو ایک درجہ حاصل ہے تو دوسرا درجہ تو مانگتے ہیں۔

اسی طرح علماء نے فرمایا ہدایت کے مراتب اور درجات ہیں کہ ایک درجے سے دوسرے درجے پر جاتا ہے، اس کے بعد اور درجے پر اور پھر اور درجے پر اور ہدایت کا معنی بھی اللہ کی معرفت اور اس کی صفات کی معرفت ہے۔مثلاً: اگر ایک تاجر ہے، اس نے لاکھ کما لیا ہے۔اب وہ دوسرا لاکھ کمانے کے لیے بزنس کرتا ہے۔اب اس کو تو کوئی بندہ بھی بے وقوف نہیں کہتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ صراطِ مستقیم سے مراد دین ہے، مقصد منزل پر پہنچنا ہے۔ہم کسی سے اپنی منزل کے بارے میں پوچھیں وہ ہمیں راستہ بتادے۔ہم صرف اس راستہ کو دیکھتے ہیں تو کیا منزل پر پہنچ جائیں گے؟ اس وقت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اس پر نہ چلیں۔اسی طرح جو آدمی نماز پڑھ رہا ہے وہ ابھی منزل تک تو نہیں پہنچا ہے۔

علماء اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہدایت کا ایک معنی ہوتا ہے:"اِرَاءَةُ الطَّرِيْقِ "اور ایک معنی ہوتا ہے "اِيْصَالُ اِلَى الْمَطْلُوْبِ"۔

''اِزَائَۃُ الطَّرِیْقِ'' کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے کوئی پوچھتا ہے کہ فلاں ڈاکٹر کہاں رہتا ہے؟ آپ اس کو بتائیں کہ سیدھی رہداری چلیں، پھر مڑ کر فلاں کمرہ نمبر میں جائیں، وہ ڈاکٹر صاحب آپ کو وہاں ملیں گے۔ راستہ دکھانا اور اشارہ بھی کر دینا اس کو''اِرَائَۃُ الطَّرِیْقِ'' کہتے ہیں۔ تو یہ بھی ہدایت ہے۔

اور ایک ہدایت''اِیْصَالٌ اِلَی الْمَطْلُوْبِ'' ہے کہ میں نے پوچھا: فلاں ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔ تو اس آدمی نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گیا کہ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ'' ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کے مہمان ہیں۔ تو یہ بھی ہدایت ہے۔

ایک آدمی نے راستہ دکھایا ہے اور دوسرے نے منزل پر پہنچایا ہے۔ اس لیے آدمی نماز میں دعا مانگتا ہے ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ''(یا اللہ! ہمیں منزل مقصود پر پہنچا) قرآن پاک میں آتا ہے کہ جب جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے تو کہیں گے:

﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾[الاعراف:۴۳]

''تمام تر شکر اللہ کا ہے، جس نے ہمیں اس منزل تک پہنچایا، اگر اللہ ہمیں نہ پہنچاتا تو ہم کبھی منزل تک نہ پہنچتے۔''

بعض علماء نے فرمایا:''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کا معنی یہ ہوتا ہے''اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْنَا عَلَى الْهِدَايَةِ''(اے اللہ! ہمیں ہدایت پر ثابت قدم رکھ) آج ہم پڑھ رہے ہیں کل بھٹک نہ جائیں اور گمراہ نہ ہو جائیں۔ کتنے نمازی لوگ تھے جو بھٹک گئے، نمازیں چھوڑ گئے اور کتنے فاسق فاجر تھے جو نمازی بن گئے۔ اس لیے آدمی دعا مانگتا رہے: ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ''۔

بدل اور مبدل منہ والے شبہ کا جواب:

اب رہا یہ شبہ کہ بدل اور مبدل منہ دونوں کا ذکر کیوں کیا؟ تا کہ منعمین کا پتا چلے کہ جن پر اللہ نے انعام کیا ہے وہ نبیین علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ ہیں۔ ہمیں راستے کا تو پتا لگ گیا، لیکن ہمیں اس راستہ پر چلانے والا تو کوئی ہوگا۔ اگر اس راستے پر چلانے والا اور سڑک عبور کرانے والا نہ ملتا تو کامیابی کیسے ملتی؟ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ اگر تم نے کامیابی حاصل کرنی ہے تو ان لوگوں کی معیت حاصل کرو۔ نبیین کا زمانہ تو گزر گیا، اب صدیقین، شہداء اور صالحین کی صحبت اختیار کرو۔

اسی کے ضمن میں اس اعتراض کا جواب بھی ہو گیا کہ حضور ﷺ کو اللہ نے ہادی بنا کر بھیجا ہے اور اللہ نے قرآن میں یہ بھی فرمادیا ہے:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ﴾ [القصص:٥٦]

''آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدیت کر دیتا ہے۔''

ابوطالب کے پاس حضور ﷺ تشریف لائے اور کوشش کی کہ کلمہ پڑھ لیں۔ فرمایا:

((قُلْ كَلِمَةً أُحَاجُّ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللهِ)) [تفسیر البیضاوی، تحت: سورۃ الانفال]

''ایک مرتبہ کلمہ پڑھ لیں، تاکہ مجھے اللہ کے سامنے کیس پیش کرنے کا موقع تو ملے۔''

چچا کہتے ہیں: میں جانتا ہوں کہ تم سچے ہو، میں چاہتا ہوں کہ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دوں، لیکن میں عار سے ڈرتا ہوں کہ ساری برادری کہے گی کہ ابوطالب موت اور قبر سے ڈر گیا، اس لیے میں اس عار کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا۔

((أَنَا عَلَى مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ)) [المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث:٣٢٩١]

''میں عبدالمطلب کی ملت پر ہوں۔''

حضور ﷺ بہت غمگین تھے کہ یہ میرا چچا میرا محسن ہے۔ ہر دکھ سکھ میں حضور ﷺ کا ساتھ دینے والا بھی جہنم میں جائے گا، کیونکہ کلمہ نہیں پڑھا۔ تو اللہ نے فرمایا:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ﴾ [القصص:٥٦]

''آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدیت کر دیتا ہے۔''

اے میرے نبی! راستہ دکھانا تو آپ کا کام ہے، لیکن منزلِ مقصود پر پہنچانا اور اس کی توفیق آپ کا کام نہیں ہے۔ اس سے ہمیں ہدایت کا معنی اور مفہوم سمجھ میں آگیا کہ ایک ہے راستہ دکھانا اور اللہ نے سارے انبیاء علیہم السلام اسی لیے بھیجے کہ وہ لوگوں کو راستہ دکھائیں، لیکن منزلِ مقصود پر پہنچانا اللہ کا کام ہے۔

کیا فاتحہ میں یہود و نصاریٰ کی دشمنی سکھائی گئی ہے؟

وہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾
[الفاتحہ:۵،۶،۷]

''ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما، ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں۔''

یہ عجیب بات ہوئی کہ جن پر انعام ہو گیا، صاف ظاہر ہے کہ ان پر ناراضگی نہیں ہوگی۔ یہ دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ کیوں ذکر کیں؟ اور وہ کہتے ہیں کہ روایات میں آتا ہے کہ ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ '' سے مراد یہود ہیں اور ''وَلَا الضَّآلِّيْنَ '' سے مراد نصاریٰ ہیں۔ اس لیے یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ تمہارے مسلمانوں کے بچوں کو شروع ہی سے ہمارے خلاف یہ سبق دیا جاتا ہے تو پھر ہماری اور تمہاری صلح کیسے ہو؟

قرآن کی اہلِ کتاب سے رواداری:

یہ بھی اسلام پر بہتان ہے۔ کیا ان کی نظر ان آیتوں پر نہیں ہے جو اہلِ کتاب کی تعریف میں ہیں؟ قرآن میں ہے:

﴿وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ﴾ [آل عمران:۷۵]

''اہل کتاب میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس دولت کا ایک ڈھیر بھی امانت کے طور پر رکھوا دو تو وہ تمہیں واپس کر دیں گے۔''

وہ امانت پر قائم رہیں گے، خیانت نہیں کریں گے۔ اسی طرح جو صحیح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے ہیں قرآن نے ان کی تعریف کی ہے:

﴿قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝﴾ [آل عمران:۵۲]

''حواریوں نے کہا: ہم اللہ (کے دین) کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لا چکے ہیں، اور آپ گواہ رہیے کہ ہم فرمانبردار ہیں۔''

یہ آیتیں ان کو نظر نہیں آتیں اور ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ '' والی آیت نظر آتی ہے۔ اسی طرح قرآن میں ہے کہ مسلمانوں کے دشمن یہود بھی ہیں اور نصاریٰ بھی ہیں، لیکن زیادہ عداوت یہود کو ہے۔ فرمایا:

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا

﴿الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾[المائدۃ:۸۲]

''تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے آپ ان یہود اور مشرکین کو پائیں گے اور ان میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے میں زیادہ قریب ان لوگوں کو پائیں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ ان میں بہت سے علم دوست عالم ہیں اور بہت سے تارکِ دنیا درویش ہیں اور اس سبب سے بھی ہے کہ یہ لوگ متکبر نہیں ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نصاریٰ مسلمانوں سے محبت کرنے والے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے علماء، قسیسین اور راہب ہیں اور تکبر نہیں کرتے اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑتے ہیں۔ قرآن اہلِ کتاب کی تعریف بھی کر رہا ہے۔ یہ ان کو نظر نہیں آتا۔

کاش! امتِ محمدیہ ﷺ میں کوئی ایک آدمی ایسا ہوتا جو کفار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا، لیکن ہم مجموعی طور پر اتنے کمزور ہو چکے ہیں جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

قرآن تو کہتا ہے کہ اہلِ کتاب کا ذبیحہ بھی حلال ہے، ان سے نکاح بھی جائز ہے، لیکن یہود پر غضب اس لیے ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کہنا نہ مانا۔ اور اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴾[الاعراف:۱۶۶]

''یعنی جس کام سے ان کو منع کیا گیا تھا جب وہ اس میں حد سے نکل گئے تو ہم نے ان کو (براوقہر) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ۔''

ایک اعتراض اور اس کا بہترین جواب:

ایک دفعہ میڈیا والوں نے ٹیلی فون کر کے پوچھا کہ کیا آپ اس حدیث کو مانتے ہیں کہ جس پتھر کے پیچھے کوئی یہودی چھپنے کی کوشش کرے گا وہ پتھر پکارے گا:

((يَا مُسْلِمُ! هٰذَا يَهُودِيٌّ وَرَائِي فَاقْتُلْهُ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۲۹۲۶، باب: قِتَالِ الْيَهُوْدِ]

''اے مسلم! یہ میرے پیچھے یہودی ہے اسے قتل کر ڈال۔''

میں نے کہا: ہاں! یہ حدیث ہے۔ انہوں نے کہا: جب یہ حال ہے تو مسلمانوں کے ساتھ صلح کیسے ہو سکتی ہے؟

میں نے کہا: یہ واقعہ کس وقت ہوگا؟ یہ اس وقت ہوگا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر اتریں گے۔ اب تم نصرانیوں پر اعتراض کرو کہ تمہارا نبی ہمیں مروائے گا، لیکن ان کے ساتھ تو تم ملے ہو، ہم نے تو تمہیں مدینہ میں بھی پناہ دی، خیبر میں بھی پناہ دی اور ہمارے نبی ﷺ کا سب سے پہلے جو معاہدہ ہوا جسے میثاقِ مدینہ کہتے ہیں یہودیوں کے ساتھ ہوا ہے۔ اگر ہمارے نبی ﷺ کے دل میں بغض ہوتا تو وہ اتنی اہمیت کیوں دیتے؟ جب میڈیا والے نے یہ سنا تو وہ چونکا۔ میں نے کہا: یہ چیزیں ہیں، لیکن آپ کو نظر نہیں آئیں گی، کیونکہ آپ کو صرف وہ چیز نظر آتی ہے جس سے مسلمان کو بدنام کرنا ہو، الزام لگانا ہو اور جہاں مذہبی دہشت گرد ثابت کرنا ہو۔

یہودیوں پر غضب کی ایک وجہ:

اسی طرح ان پر غضب اس لیے ہوا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: چلو! جہاد کے لیے چلتے ہیں تو انہوں نے انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝۲۲﴾

[المائدۃ:۲۲]

"کہنے لگے: اے موسیٰ! وہاں تو بڑے بڑے زبردست آدمی ہیں اور ہم تو وہاں ہرگز قدم نہ رکھیں گے جب تک کہ وہ وہاں سے نکل نہ جاویں۔ ہاں! اگر وہ وہاں سے کہیں اور چلے جائیں تو ہم بے شک جانے کو تیار ہیں۔"

اسی طرح تم وادی تیہ کے اندر اپنے نبی کے زمانہ میں بھٹکتے رہے۔ تم میں سے جو بھی اسلام لایا، اسلام نے اس کو سینے سے لگایا ہے۔ حضور ﷺ نے یہود سے یہ کہا کہ ایک آدمی قتل ہوگیا ہے، اس کی دیت کے لیے ہم چندہ کر رہے ہیں اور تم لوگ بھی ہمارے حلیف ہو چندہ دو۔ یہودیوں نے کہا: ٹھیک ہے، آپ تشریف لے آئیں۔ جتنا آپ فرمائیں گے اتنا ہم چندہ دیں گے۔ ادھر حضور ﷺ کو دعوت دے رہے ہیں اور دوسری طرف اپنے ایک آدمی کو قلعہ پر بٹھا کر بڑے بڑے پتھر دے رہے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کو دیوار کے ساتھ بٹھا دیں گے۔ تم اوپر سے پتھر پھینک دینا۔ تو حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ یہودیوں کے اس مذموم پروگرام سے آگاہ کر دیا اور آپ ان کے شر سے محفوظ ہوگئے۔

بہر حال! پہلی بات تو یہ ہے کہ صرف یہود و نصاریٰ مراد نہیں ہیں، بلکہ ذکر جزء کا ہے اور مراد کل مخالفین اور گمراہ فرقے ہیں۔ دوسری بات اگر مان بھی لیں تب بھی یہ صرف مثال کے طور پر بیان فرمایا ہے۔

آدمی کی چار حالتیں ہوتی ہیں:

1 ......اعتقاد بھی صحیح ہو اور عمل بھی صحیح ہو۔

2 ......اعتقاد بھی غلط ہو اور عمل بھی غلط ہو۔

3 ......اعتقاد صحیح ہو اور عمل غلط ہو۔

4 ......اعتقاد غلط ہو اور عمل صحیح ہو۔

کوئی بندہ ان چار حالتوں میں سے ایک میں لازمی طور ہوگا، اس کے علاوہ پانچویں صورت نہیں بن سکتی۔

خدا کی شان کہ ''غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ'' دونوں میں فسادِ عقیدہ بھی ہے اور فسادِ عمل بھی ہے، لیکن جن کا فسادِ عقیدہ ہے ان پر اللہ کا غضب آ گیا اور جو گمراہ ہیں، عمل میں گڑبڑ ہے وہ نصاریٰ ہوں گے۔ اس لیے دیکھیں! حضور ﷺ کی زندگی میں یہود سے جنگ ہوئی ہے، لیکن نصاریٰ سے کبھی جنگ نہیں ہوئی۔

رومی سپر پاور کے حکمران ہرقل کا حضور ﷺ کے بارے میں نظریہ:

ہرقل عیسائیوں کی سپر پاور تھی۔ ان کے بارے میں سنا کہ وہ حملہ کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہم خود جائیں گے۔ آپ گئے لیکن وہ مقابلے کے لیے نہیں آئے۔ اس ہرقل نے اپنے قریبی لوگوں سے کہا کہ وہ اللہ کا نبی ہے اور اللہ کے نبی سے ہم جنگ جیت ہی نہیں سکتے۔ اس لیے عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم لڑنے کے لیے نہ جائیں۔

نصاریٰ نجران کا وفد عبدالمسیح کی قیادت میں آیا تھا جس میں ساٹھ یا ستر آدمی تھے۔ حضور ﷺ نے ان کو مباہلہ کی دعوت دے دی۔ جب سارے عیسائی مشورہ کے لیے اکٹھے ہوئے تو انہوں نے کہا: یہ اللہ کا سچا نبی ہے، صلح کر لو۔ جو کچھ مانگتے ہیں دے دو، لیکن مباہلہ یعنی ان کے مقابلہ میں ہلاکت کی دعا نہ کرنا۔ اس لیے اللہ نے فسادِ عقیدہ والوں کا بھی ذکر کر دیا اور فسادِ عمل والوں کا بھی ذکر کر دیا۔

ایک اور جواب:

بعض علماء نے بڑی اچھی بات کی ہے کہ مسلمانوں میں ہندو بننے کا اتنا خطرہ نہیں ہے۔ خطرہ تھا تو صرف یہودیت اور نصرانیت سے تھا۔ آج بھی مسلمانوں کو دیکھو کہ عقیدے میں جو تشکیکات ہیں وہ سب یہودیوں کے عمل کا اثر

ہے۔ اور عمل کے اعتبار سے مسلمان جتنا بگڑا ہوا ہے، شکل وصورت کے اعتبار سے کھانے اور پہننے کے اعتبار سے وہ سارا نصاریٰ کا اثر ہے۔ آج مسلمان میں وہی نفاق ہے جو یہودی میں ہے۔ جیسے یہودی کہتے ہیں کہ ہمیں تو عذاب ہی نہیں ہوگا اور کبھی کہتے ہیں: جتنے دن ہمارے بڑوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی اتنے دن عذاب ہوگا۔ جیسے وہ متذبذب ہیں اسی طرح مسلمان بھی متذبذب ہیں۔ کبھی کہتے ہیں ''یا اللہ!'' اور کبھی کہتے ہیں ''یا داتا!''۔

اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ حضور ﷺ کی امت گمراہ ہوگی اور ان فتنوں میں مبتلا ہوگی۔ اس لیے فرمادیا کہ یوں دعا کیا کرو: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ [الفاتحہ:۵، ۶، ۷]۔ آمین۔

قرآن کی عظیم الشان سورت:

سورۂ فاتحہ ایسی بابرکت سورت ہے کہ جس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہ تورات میں اتری، نہ انجیل میں اتری اور نہ زبور میں اتری۔ تقریباً سوا چار سو کتابیں اللہ نے قرآن سے پہلے اتاریں۔ ان تمام کتابوں میں سے افضل اللہ کا قرآن ہے، پھر قرآن کی اعظم اور شان والی سورتوں میں سے سورۂ فاتحہ ہے۔ اسی لیے ائمہ کرام کے نزدیک اس سورت کے شانِ نزول کے بارے میں اختلاف ہے۔

سورۂ فاتحہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی:

بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ سورت مدنی ہے، ہجرت کے بعد اتری ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اور راجح قول بھی یہی ہے کہ سورۂ فاتحہ مکی ہے، ہجرت سے پہلے اور ابتدائے زمانۂ بعثت میں اتری ہے کہ جس زمانہ میں سورۂ علق کی پانچ آیتیں اور سورۂ مدثر کی کچھ آیات نازل ہوئی تھیں اسی زمانہ میں سورۂ فاتحہ پوری کی پوری اتری تھی۔ کیونکہ قرآن اپنی تفسیر خود بیان کرتا ہے۔

اور سورۂ فاتحہ کی سات آیات ہیں اور اس کا نام ''سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ'' بھی ہے۔ اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝﴾ [الحجر:۸۷]

''اور ہم نے تمہیں ''سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ'' (سات ایسی آیتیں جو بار بار پڑھی جانے والی ہیں) دے رکھی ہیں اور عظمت والا قرآن عطا کیا ہے۔''

یہ آیت مکہ میں اتری ہے۔ اگر سورۂ فاتحہ اس سے پہلے اتری ہو تب جا کر یہ معنی بنے گا۔

پورا قرآن صراطِ مستقیم کا جواب ہے:

علماء نے فرمایا کہ انسان نے سورۂ فاتحہ کے اندر اللہ تعالیٰ کی پہلے حمد و ثنا بیان کی، پھر اللہ کے سامنے دعا کی درخواست کی تو آگے ''الٓمّٓ'' سے ''وَالنَّاسِ'' تک اس دعا کا نتیجہ ہے کہ تم نے صراطِ مستقیم کی دعا کی ہے۔ تو میں قرآن کو اتار رہا ہوں، قرآن کو مضبوطی سے تھام لو گے تو صراطِ مستقیم کو پہنچ جاؤ گے۔ اسی لیے قرآن نے فرمایا:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران: ۱۰۳]

''اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔''

اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

((وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۹۰۶، باب: ما جاء فی فضل القرآن]

''قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے۔''

اور اسی لیے فرمایا: جو لوگ قرآن کی پناہ میں آگئے وہ نجات پا گئے اور جو قرآن سے اعراض کر گئے وہ ہلاک و برباد ہو گئے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ میں اللہ نے جو ہمیں سوال سکھایا تھا پورا قرآن اسی سوال کا جواب ہے۔

سورۂ فاتحہ کے اہم مضامین:

بعض علماء نے فرمایا: اگر تدبر و تفکر اور غور کریں تو پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے، کیونکہ قرآن کے اہم مضامین: توحید، رسالت اور مسئلۂ معاد ہیں، جن کو ایمان بالثلاثیات کہتے ہیں کہ ان تین پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اگر ایک چیز کے اندر بھی کمی آجائے تو آدمی مومن ہی نہیں رہتا۔ توحید کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں وحدانیت کا قائل ہونا۔ مسئلہ معاد کا یہ معنی ہے کہ مرنے کے بعد اٹھنا ہے، حشر ہے، نشر ہے، حساب کتاب ہے، جنت ہے اور جہنم ہے۔ پورے قرآن میں یہ تین اہم مسائل ہیں، باقی سارا قرآن اس پر دلیل ہے۔

سورۂ فاتحہ کے اندر بھی غور کریں تو تینوں مسئلے آجاتے ہیں۔ سب سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا ہے، اللہ کی ذات و صفات کا اقرار ہے، اس کے بعد اسی کی خالص عبادت اور خالص اسی سے مدد مانگنے کا اعتراف ہے۔ اسی کے اندر مسئلہ الوہیت و

وحدانیت اپنے تمام اجزاء کے ساتھ آ گیا ہے۔ اس کے بعد ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ میں مسئلۂ معاد کا ذکر ہے۔ پھر ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں اللہ کے انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ کا ذکر ہے، گویا نبوت و رسالت کا ذکر ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا: کسی نے پورے قرآن کا خلاصہ دیکھنا ہو تو وہ سورۂ فاتحہ کو دیکھے۔

سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ''بِسْمِ اللّٰهِ'' میں:

اور بعض علماء اور آگے بڑھے اور انہوں نے کہا: پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے اور پوری سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں ہے، کیونکہ اس میں ہے کہ تیرے نام کے ساتھ مدد اور استعانت پکڑتے ہیں۔ اسی کا نام ہمیں سکھایا جا رہا ہے جس نے قرآن اتارا، انبیاء علیہم السلام بھیجے، آخرت کے بارے میں بتایا۔ تو اصل مسئلہ تو خدا کی اعانت، استعانت و مدد ہے۔ اس لیے سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں آ گیا۔

''بِسْمِ اللّٰهِ'' کا خلاصہ ''ب'' کے نقطہ میں:

بعض علماء اس سے بھی آگے بڑھے، انہوں نے کہا: پوری ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کا خلاصہ ایک نقطہ میں ہے کہ ساری دنیا اسی کے دروازے پر گھومتی پھرے گی، ساری مخلوق اسی کی محتاج ہے جو ''اَحَدٌ'' ہے، ''اَلصَّمَدُ'' ہے، ''لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ'' ہے، جس کا نام ''بِسْمِ اللّٰهِ'' میں موجود ہے، جس کا کوئی تثنیہ اور جمع نہیں آیا۔ اس لیے دیکھا جائے تو ساری ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کا خلاصہ ایک نقطہ میں آ گیا۔

حضور ﷺ نے فرمایا: جو مجھے عظیم سورتیں دی گئی ہیں وہ سورۂ فاتحہ اور خواتیم سورۂ بقرۃ ہیں۔ یعنی ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ...﴾ سے آخر تک۔ اس کے آخر میں بھی ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بندے کا کام مانگنا ہے، دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔

نماز میں فاتحہ واجب ہے:

سورۂ فاتحہ کی فضیلت کے بارے میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ اسی لیے علماء اس بات پر متفق ہو گئے کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، کیونکہ حضور ﷺ کی واضح اور صریح حدیث موجود ہے کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اس لیے ائمہ کرام رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اگر نماز میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی تو نماز نہیں ہوگی، لیکن بعض ائمہ کرام رحمہم اللہ نے

فرمایا کہ اگر سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی، لیکن کہیں سے بھی قرآن پڑھ لیا نماز تو ہو جائے گی، لیکن ایسے کرنا نہیں چاہیے۔
ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے:

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ [المزمل:۲۰]

''تم لوگوں سے جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو۔''

امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا مسئلہ:

یہ علیحدہ مسئلہ ہے، اس کا اوپر والے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ اس مسئلہ کے بارے میں امام شافعی ﷫ فرماتے ہیں کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، کیونکہ حدیث مبارک ہے:

((لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) [البخاری، حدیث:۷۵٦ باب: وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ لِلْإِمَامِ...]

''جس نے فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔''

چاہے مقتدی ہے یا امام، نماز جہری ہے یا سری ہے، سب کو فاتحہ پڑھنی ہوگی، کیونکہ حدیث کے لفظ عام ہیں، کسی قسم کی کوئی قید نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل ﷫ فرماتے ہیں: اگر نماز جہری ہے (جس میں امام فاتحہ اور سورت زور سے پڑھتا ہے) اس میں مقتدی نہ پڑھے، کیونکہ مقتدی کے ذمہ سننا ہے، پڑھنا نہیں ہے، البتہ سری نمازوں میں (جن میں امام فاتحہ اور سورت آہستہ آواز سے پڑھتا ہے) امام اور مقتدی دونوں سورۂ فاتحہ پڑھیں۔ اگر جہری نمازوں میں مقتدی امام سے اتنا دور ہے کہ امام کی قراءت نہیں سن رہا تو پھر مقتدی فاتحہ پڑھ سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ ﷫ فرماتے ہیں کہ امام بھی فاتحہ پڑھے گا اور تنہا نمازی بھی فاتحہ پڑھے گا، لیکن مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھے گا۔ تو اختلاف صرف اقتدا کی صورت میں ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے کھڑا ہے تو فاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے؟

امام ابوحنیفہ ﷫ کے دلائل:

امام ابوحنیفہ ﷫ کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے:

﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ [الاعراف:۲۰۴]

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو (تمہارا کام یہ ہے) اس کو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو، تاکہ تم پر رحمت ہو۔''

تو اللہ کی رحمت دونوں چیزوں (چپ رہنے اور سننے) سے مشروط ہے۔ اور قاعدہ ہے: ''إِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوطُ'' (جب شرط ختم ہو جائے تو مشروط خود بخود ختم ہو جائے گا۔) مثلاً: آپ کہتے ہو کہ اگر تم میرے پاس آؤ گے تو میں تمہارا احترام کروں گا اور اگر تم نہیں آؤ گے تو تمہارا احترام نہیں ہوگا۔ تو لہٰذا تم اللہ کی رحمت میں تب شامل ہو گے جب تم سنو بھی سہی اور چپ بھی رہو۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جتنی احادیث کی کتابیں ہیں ان میں ''کِتَابُ الصَّلٰوۃِ'' کا باب کھولو، اس میں نماز کی فضیلت ہے اور ایک منفرد کو نماز سکھائی ہے۔ اور ایک باب ہے جس میں امام کو نماز سکھائی ہے اور ایک باب ہے اس میں اس نمازی کی نماز سکھائی ہے جو امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو۔ مسلم کے اندر حدیث موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز سکھلا رہے ہیں۔ یہ کھلی بات ہے کہ ''لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ'' کے اندر مقتدی کا لفظ نہیں ہے اور نہ ہی امام کا لفظ ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ جمعہ کے خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، نماز کے بارے میں نازل نہیں ہوئی۔ یعنی جب خطبہ پڑھا جائے تو چپ رہو اور اس کو سنو۔

علامہ بیہقی رحمہ اللہ اور علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس لیے آپ اس بات پر غور کریں کہ اگر خطبہ کے وقت خطبہ کو سننا اور چپ رہنا ضروری ہے اس میں بھی اللہ کا قرآن اور حدیث کا بیان ہوتا ہے۔ جب اس کو سننا ضروری ہے تو امام کے پیچھے نماز کے اندر قرآن کو سننا اور زیادہ ضروری ہے۔

اور امام صاحب کی دوسری دلیل یہ حدیث ہے:

''مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ'' [ابن ماجہ، حدیث: ۸۵۰، باب: إِذَا قَرَأَ الْإِمَامُ فَأَنْصِتُوا]

''جس آدمی کا امام ہو تو امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔''

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سکھاتے ہوئے فرمایا:

((فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا...)) [صحیح مسلم، حدیث: ۴۰۴]

''جب امام اللہ اکبر کہے تم بھی اللہ اکبر کہو۔''

یہاں امام کا وظیفہ بھی بتا رہے ہیں اور مقتدی کا وظیفہ بھی بتا رہے ہیں۔ مقتدی کو سکھلایا، فرمایا:

((وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا))

''جب وہ پڑھے تو تم خاموش رہو۔''

اور یہاں پر یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ حضور ﷺ نے سورۂ فاتحہ کے بارے میں تو نہیں فرمایا کہ جب امام پڑھے تو تم خاموش رہو۔ تو واضح فرما دیا:

((وَإِذَا قَالَ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ فَقُوْلُوْا آمِيْنَ)) [صحیح مسلم، حدیث:۴۰۴]

''جب امام ''وَلَا الضَّالِّيْنَ'' کہے تو تم آمین کہو۔''

اتنی بڑی وضاحت کے بعد کوئی شبہ نہ رہا کہ فاتحہ امام کے ذمہ ہے، مقتدی فاتحہ نہیں پڑھے گا اور جب امام ''وَلَا الضَّالِّيْنَ'' کہے گا اس وقت مقتدی آمین کہے گا۔''

حضور ﷺ نے دونوں کے کام بھی تقسیم کر دیے کہ مقتدی کا کام یہ ہے اور امام کا کام یہ ہے۔ اس طرح امام صاحب نے قرآن کی آیت پر بھی عمل کیا کہ جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور چپ رہو اور حدیث پر بھی عمل کیا کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اکیلا ہے تو فاتحہ پڑھے، امام ہے تو فاتحہ پڑھے اور مقتدی فاتحہ نہ پڑھے، کیونکہ امام نے اپنی طرف سے اور مقتدی کی طرف سے فاتحہ پڑھی ہے۔ لہٰذا نماز فاتحہ کے بغیر تو نہ ہوئی۔ ہاں! اگر امام فاتحہ نہ پڑھتا تو پھر نماز بغیر فاتحہ کے ہوتی۔

اور حدیث پر بھی عمل ہو گیا کہ جس کا امام ہو تو امام کی قراءت مقتدی کے لیے کافی ہے۔ اور صحیح مسلم شریف کی حدیث پر بھی عمل ہو گیا کہ جب امام پڑھے تو تم چپ رہو۔ اس لیے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقتدی کا وظیفہ خاموش رہنا ہے، کیونکہ امام ضامن ہے۔ اگر اس نے ثنا پڑھی ہم نے بھی پڑھی، قراءت اس نے کی ہم نے بھی کی، رکوع اس نے بھی کیا ہم نے بھی کیا، سجدہ اس نے بھی کیا اور ہم نے بھی کیا، التحیات اس نے بھی پڑھی ہم نے بھی پڑھی اور سلام اس نے بھی پھیرا اور ہم نے پھیرا، پھر امام نے ہمارا کون سا بوجھ اٹھایا؟ اور کس چیز کا وہ قائم مقام بنا؟ صرف یہی قراءت ہے۔

امام کے کام مقتدی کے کام کیسے ہوئے؟

عقلی دلیل یہ ہے کہ حرم کے اندر امام کعبہ کے پیچھے بیس لاکھ آدمی نماز پڑھ رہا ہے۔ امام سے کوئی غلطی ہو گئی اور امام کو سجدہ سہو کرنا پڑا تو مقتدی بھی سجدہ کریں گے، حالانکہ غلطی اس کی ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ امام کی غلطی

کو اپنی غلطی بناتے ہو، لیکن اس کے قرآن کو اپنا قرآن نہیں بناتے، امام کا وضو ٹوٹ گیا تو اس کی نماز ٹوٹ گئی تو ہماری نماز بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

سورۂ فاتحہ اللہ کے سامنے سوال کرنا ہے۔ سوال کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ جب سوال اجتماعی ہو تو ایک بولے گا اور باقی سب خاموش کھڑے رہیں گے۔ دنیا کے بادشاہوں کے کچھ آداب ہیں تو اللہ کے دربار میں بھی آداب ہیں کہ ایک آدمی کے رکوع پر رکوع سجود پر سجود کریں گے کہ یا اللہ! جو یہ کر رہا ہے، ہمارا بھی یہ مقصد ہے۔

کتاب وسنت، خلفاء راشدین اور بڑے بڑے صحابہ کے عمل کی روشنی میں دیکھیں تو ان سب کے ہاں بھی یہی ہے کہ اگر امام ہے تو اس کا پڑھنا مقتدی کے لیے کافی ہے۔

اتنے دلائل کے باوجود ہم تمام ائمہ کو برحق کہتے ہیں، کیونکہ ان کا مقصد بھی حضور ﷺ کے فرمان کو سمجھنا تھا۔ اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں کرے۔

شریعت میں ایک مسئلہ کے کئی درست احتمالات

پہلی مثال:

کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ ایک فرمان ہوتا ہے اور اس کو سمجھنے والے دو آدمی ہوتے ہیں اور دونوں مختلف سمجھتے ہیں۔ جیسے حضور ﷺ نے حکم فرمایا:

((لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۹۴۶، باب: صلاۃ الطالب...]

"میرے تمام صحابہ عصر کی نماز بنو قریظہ میں پڑھیں۔"

صحابہ کو نماز کا وقت راستے میں ہو گیا تو دو جماعتیں ہو گئیں: ایک نے کہا کہ جلدی سے عصر کی نماز پڑھ لو، لیکن دوسروں نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا تھا کہ عصر کی نماز بنو قریظہ میں پڑھنا۔ اس لیے جب تک ہم بنو قریظہ میں نہیں پہنچیں گے نماز نہیں پڑھیں گے۔ پہلے گروہ نے کہ کہ حضور ﷺ کا مقصد اور منشا یہ تھا کہ جلدی کرو، یہ نہیں کہ نماز کا وقت ہو جائے تو نماز نہ پڑھنا۔ اللہ نے قرآن میں نماز کے اوقات متعین کر دیے ہیں۔ اگر بنو قریظہ میں جاتے جاتے ہوئے نماز کا وقت ختم ہو جائے تو ہم کیسے نماز پڑھیں گے؟ تو آدھے صحابہ نے راستہ میں نماز پڑھی اور آدھے صحابہ نے بنو قریظہ میں جا کر نماز پڑھی۔ حضور ﷺ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو حضور ﷺ نے

فرمایا: تم دونوں نے ٹھیک کیا۔

دیکھو! دونوں نے علیحدہ علیحدہ سمجھا، لیکن دونوں کی نیت میں اخلاص تھا اور دونوں کی سمجھ درست تھی تو حضور ﷺ نے دونوں کو سچا فرمایا۔

دوسری مثال:

غزوۂ بدر کے موقع پر حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا۔ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ اگرچہ کافر و مشرک ہیں، لیکن آپ کے رشتہ دار ہیں۔ آپ ان پر احسان کریں، یہ احسان کا بدلہ ضرور دیں گے۔ حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا تو انہوں نے عرض کیا کہ میری رائے یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تلوار دیں کہ وہ اپنے چچا کے بیٹے کی گردن پر تلوار رکھیں اور میں اپنے رشتہ داروں کی گردن پر رکھتا ہوں۔ جب انہوں نے کلمہ نہیں پڑھا، آپ کی رسالت کو نہیں مانا اور توحید کو نہیں مانا تو ان سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ اللہ نے ہمیں دشمن باندھ کر دیا ہوا ہے، آج ہی اس کو جڑ سے اکھیڑ دیں۔

دونوں کی رائے مختلف ہے، حالانکہ دونوں حضور ﷺ کے فرمانبردار ہیں۔

ائمۂ فقہ کی تعظیم:

اسی طرح یہ ہماری جہالت ہے کہ ائمہ کے مسائل کو، اختلاف کو سمجھ نہیں سکتے۔ دو کتابیں پڑھ کر ہم مولوی بن گئے۔ یہ ہماری کم عقلی ہے۔ اللہ نے جنہیں مقامِ امامت، تفقہ فی الدین عطا فرمایا اور ان کا زمانہ بھی حضور ﷺ کے زمانہ کے قریب ہے۔ ان کا تمام مقصود اتباعِ محمد مصطفیٰ ﷺ تھا۔ اگر ان کا کہیں سمجھنے اور بعض الفاظ کی تحقیق میں اختلاف ہو گیا ہم ان کے اختلاف کو بدنیتی پر محمول نہیں کریں گے، بلکہ یہ کہیں گے:

"اَلْمُجْتَهِدُ قَدْ يُخْطِئُ وَقَدْ يُصِيبُ"

"ہر مجتہد غلطی بھی کرتا ہے اور صواب کو بھی پہنچتا ہے۔"

کیونکہ میرے نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ اگر مجتہد غلطی بھی کرتا ہے تو اللہ اس کو ایک ثواب دیتے ہیں اور اگر وہ صواب کو پہنچ جائے تو اللہ اس کو دوہرا اجر دیتے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی کے بارے میں دل میں برا خیال اور گمان نہ ہو۔ اللہ نے اس سے منع فرما دیا ہے۔ قرآن میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا﴾

[الاحزاب:۵۸]

''اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان کے کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچاتے ہیں، انہوں نے بہتان طرازی اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے اوپر لاد لیا ہے۔''

اس لیے وہ عذاب کے لیے تیار رہیں۔ جب اللہ کسی سے ناراض ہوتا ہے تو وہ شخص کسی اللہ والے کی غیبت میں لگ جاتا ہے اور جو اس کے دوستوں کے خلاف ہو جائے اس سے اللہ خود جنگ فرماتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ تمام ائمہ کی تعظیم کریں۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ اگر کوئی ایک ایسی بات کہہ دے جس میں ننانوے فیصد کفر کا احتمال ہو اور ایک فیصد ایمان ہو سکتا ہو تو اس کو کافر نہ کہو، کیونکہ ہو سکتا ہے اس کی مراد وہی ایک فیصد ہو، ننانوے فیصد اس کے ذہن میں بھی نہ ہو۔ اسلام نے ہمیں بڑی احتیاط کی تاکید کی ہے۔

بہرحال! فاتحہ عظیم سورت ہے۔ قاعدہ ہے کہ جس کے جتنے نام زیادہ ہوں اتنی وہ چیز عظیم ہوتی ہے۔ اور سورۂ فاتحہ کے بھی کئی نام ہیں۔ جیسے صحیح احادیث میں اللہ کے ننانوے نام ہیں اور بعض کتابوں میں ہزار اور بعض میں تین ہزار نام بھی ہیں۔

بعض اسلامی کتابوں کی مقبولیت:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''اَلْاَسْنٰی فِیْ اَسْمَاءِ اللّٰہِ الْحُسْنٰی'' کتاب لکھی ہے۔ اس میں اللہ کے ناموں کو جمع فرمایا ہے۔ وہ محدث بھی تھے، مفسر بھی تھے، فقیہ بھی تھے اور اللہ نے ان کے اخلاص کو اتنا قبول فرمایا ہے کہ حنبلیوں، حنفیوں اور مالکیوں کے مدارس میں بھی اس کو پڑھایا جا رہا ہے اور شافعیوں کے ہاں تو ویسے بھی پڑھی جاتی ہے، کیونکہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ شافعی تھے۔

اسی طرح اللہ پاک نے بخاری شریف کو اتنا مقبول فرمایا کہ تمام ممالک میں اس کو پڑھا جاتا ہے۔ عام آدمی بھی جانتا ہے۔ کوئی بات آ جائے تو کہتا ہے کہ اچھا یہ بخاری شریف میں ہے؟ اصل اخلاص کی بات ہے۔

بعض مقبول تراجمِ قرآن:

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے دو بیٹوں: شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر دونوں حضرات نے قرآن مجید کا ایسا ترجمہ لکھا کہ شاہ عبد القادر نے چالیس سال میں قرآن پاک کا ترجمہ مسجد میں لکھا اور مسجد سے باہر نہیں گئے۔ اتنے

اخلاص اور پاکبازی سے جس آدمی نے ترجمہ لکھا ہو تو کتنا وہ مقبول ہوگا؟ وہ پرانے زمانے کی اردو ہے، جو مشکل ہے۔اس لیے علماء نے ترجمہ کو کچھ سہل بنانے کی کوشش کی ہے۔حضرت شاہ ولی اللہ ﷫ کے خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک پیدا ہوا۔ یہ اللہ کی طرف سے مقبولیت ہے۔

حضرت شیخ الہند ﷫ کا ترجمہ ہے، جس میں حضرت شاہ عبد القادر ﷫ مذکور کے ترجمہ کی تسہیل وتجدید کی گئی ہے، جو مالٹا کے قید خانہ میں بیٹھ کر لکھا تھا۔حالانکہ ان کے پاس دیگر کوئی مراجع نہیں تھے، لیکن آج بھی بڑے بڑے علماء ترجمہ میں الجھ جائیں تو وہی ترجمہ اٹھا کر دیکھتے ہیں۔اسی کے اندر مسئلہ موجود ہوتا ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ انسان علم اور سمجھ بھی رکھتا ہو۔اگر وہ فاعل، مفعول، معروف اور مجہول میں بھی فرق نہ کر سکے تو وہ ترجمہ کیا سمجھے گا؟

ایک مراثی کا تفسیر لکھنے کا دعویٰ:

آج یہ دور آ گیا ہے کہ میں اگلے دن اخبار میں پڑھ رہا تھا کہ کوئی گانے والا، غالباً جس کا نام عنایت حسین بھٹی ہے، جو نام سے بھی شیعہ لگتا ہے اور ملنگ قسم کا ہے۔شیعہ ہی ہوگا۔اس نے کہا کہ میں بھی قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہا ہوں۔اللہ معاف کرے! اگر یہ گانے والے اور مراثی تفسیر لکھنے بیٹھ جائیں تو اس سے زیادہ کیا ظلم ہو سکتا ہے؟ اس لیے دعا کریں! اللہ ایسے لوگوں کو ہدایت دے اور صحیح عقیدہ اور علماء کی صحبت نصیب فرمائے۔حضور ﷺ نے فرمایا: کوئی اپنی مرضی سے قرآن میں کوئی کلمہ کہہ دے تو وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالے۔قرآن پاک کے اندر تو ابو بکر و عمر ﷠ یہ نہیں کہتے کہ ہماری رائے یہ ہے، وہ تو کہتے ہیں: ''سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ، هٰكَذَا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم.'' حضور ﷺ نے یوں فرمایا، مجھے پڑھایا، سکھایا۔قرآن ایسی چیز نہیں جس میں تم اپنی رائے اور فکر چلاتے رہو، کیونکہ جب عقل سے کام لیں گے تو ٹھوکریں کھائیں گے۔

قربانی پر جدید لوگوں کا اعتراض:

جیسے بہت سے لوگوں نے کہہ دیا کہ قربانی کا کیا فائدہ ہے کہ اربوں روپیہ ضائع کر دیا جائے، اتنا پیسہ فقیروں اور مسکینوں کو دے دو۔پہلے تو ہر آدمی گوشت نہیں کھاتا تھا، اب تو ہر آدمی گوشت کھاتا ہے۔تو قربانی کا کیا فائدہ؟ اور جن کے ذہنوں میں ہے کہ اللہ نے حکم دیا ہے: ﴿هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدۃ:۹۵] (کعبہ پہنچا کر قربان کیا جائے)۔

اگر حاجی متمتع یا قارن ہو تو اس کو قربانی دینی ہوگی۔حضور ﷺ نے فرمایا: ''سُنَّةُ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ

السَّلَامُ'' (تمہارے ابا ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے)۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۳۱۲۷]

انسان کے اندر جان اور روح ہے۔ جان کے صدقے تو ساری زندگی کرتے رہتے ہیں، لیکن قربانی یہ روح دار چیز ہے، یہ روح کے لیے قربانی دے رہے ہیں تو اس کا بدل غیر ذی روح چیز نہیں بن سکتی۔ ہاں اگر پیسوں کے اندر تم روح ڈال دو تو پھر ٹھیک ہے۔ لیکن جو دین کی سمجھ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر خون بہانا مقصود نہ ہوتا تو پھر حضور ﷺ بھی حکم دے دیتے کہ تم اونٹ ذبح نہ کرو، بلکہ پیسے دے دو۔ اس میں ہمارا اعتراف ہوتا ہے کہ اللہ! اگر آپ حکم کرتے تو ہم اپنی گردن بھی کٹا دیتے، لیکن آپ نے جانور کے ذبح کا حکم دیا ہے وہ ہم کر رہے ہیں۔

اسلام پر جدید اعتراضات:

اگر ہر کام عقل سے ہو تو ایک کہے گا کہ قربانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، دوسرا کہے گا کہ حج کی کیا ضرورت ہے؟ گرمیوں میں دھکا کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور ایک کہے کہ ہوا ایک جگہ سے خارج ہوگئی اور بندہ سارا وضو کرے اس کو عقل نہیں مانتی۔ اور یہ کہے کہ آدمی ساری زندگی بہن پالتا ہے، جب بڑی ہو جائے تو خود نکاح کیوں نہ کرے؟ دوسرے کو کیوں دے دے؟ جب عقل میں آؤ گے تو تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ کیونکہ اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ سے نہ کوئی عقل میں بڑا ہے، نہ کوئی علم میں بڑا ہے۔ اس لیے ہمیں قرآن اس وقت سمجھ میں آئے گا جب ہم قرآن کو قرآن وسنت کی روشنی میں سمجھیں گے۔

سورۂ فاتحہ کے نام:

سورۂ فاتحہ کے کئی نام ہیں: ایک نام ''اُمُّ الْكِتَابِ'' ہے۔ ''اُمٌّ'' ماں کو کہتے ہیں۔ جس طرح ماں اولاد کی اصل ہوتی ہے، اسی طرح سورۂ فاتحہ بھی پورے قرآن کا خلاصہ ہے۔ دوسرا نام ''فَاتِحَةُ الْكِتَابِ'' ہے، کیونکہ اللہ کا قرآن اس سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا نام ''اُمُّ الْقُرْاٰنِ'' بھی ہے، گویا قرآن کی چھوٹی سورت فاتحہ ہے۔ ایک نام ''اَلسَّبْعُ الْمَثَانِيْ'' بھی ہے۔ ''مَثَانِيْ'' کا معنی مکرر اور بار بار ہے اور ''سَبْعٌ'' کا معنی سات ہے۔ اس کو بھی بار بار پڑھا جاتا ہے۔ خدا کی قدرت کہ اس کی آیتیں بھی سات ہیں، جنت کے دروازے بھی سات ہیں، سجدہ بھی سات اعضا پر ہوتا ہے، ہفتے کے دن بھی سات ہیں، زمینیں بھی سات ہیں، طواف کے چکر بھی سات ہیں، صفا مروہ کے چکر بھی سات ہیں اور سورۂ فاتحہ کی آیتیں بھی سات ہیں۔ اس کی حکمتیں اللہ ہی جانتا ہے۔ اس کا شریعت اور مسئلہ سے

کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر اللہ چاہتے تو اس کو کم اور زیادہ بھی کر سکتے تھے۔ تو معلوم ہوا کہ اس کے اندر حکمتیں ضرور ہیں۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ ''مَثَانِيْ'' کا معنیٰ ہے بار بار، کیونکہ یہ سورت ایک دفعہ مکہ میں نازل ہوئی اور ایک دفعہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ دو دفعہ نازل ہوئی ہے۔ اور اس کو نماز میں بھی بار بار یعنی ہر رکعت میں پڑھا جاتا ہے، اس لیے اس کو ''مَثَانِيْ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا نام ''وَافِيَةٌ'' بھی ہے، ''كَافِيَةٌ'' بھی ہے اور ''شِفَاءٌ'' بھی ہے۔

سورۂ فاتحہ کے مضامین:

سورۂ فاتحہ کی پہلی تین آیات میں حمد وثنا ہے، آخری تین آیات میں خالص دعا ہے اور درمیانی آیت میں من وجہ حمد وثنا ہے اور من وجہ دعا ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں، یعنی تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ یہ حمد وثنا ہے۔ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ یہ دعا ہے۔

زمانوں کے اعتبار سے سورۂ فاتحہ کی تقسیم:

زمانے تین ہیں: ماضی جو زمانہ گزر گیا ہے، حال جس زمانہ میں ہم موجود ہیں اور مستقبل آنے والے زمانے کو کہتے ہیں۔

جب ہم نے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کہا تو اس سے ہم نے اقرار کیا کہ اے اللہ! ہم آپ ہی کی حمد وثنا بیان کرتے ہیں، کیونکہ آپ نے ہمیں عدم سے وجود بخشا ہے اور آپ ہی ''رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' ہیں۔ یہ زمانہ کے ساتھ متعلق ہے۔ اور ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (بے حد مہربان نہایت رحم والا) اس کا تعلق زمانۂ حال کے ساتھ ہے کہ ہماری ہر ضرورت کو پورا فرمایا، ہر حال میں ہماری مدد فرمائی۔ مستقبل کے اندر ہم اللہ سے مدد مانگ رہے ہیں کہ جس طرح تو نے زمانۂ ماضی وحال میں ہماری مدد فرمائی ہے اسی طرح آپ ہم پر مستقبل کے اندر بھی رحم فرمائیں۔

جب آپ اس بات پر غور کریں گے کہ ہمیں عدم سے وجود میں لانے والے اور ہماری تربیت فرمانے والے اللہ ہی ہیں، ہماری ہر حال میں مدد فرمانے والے بھی جب اللہ ہی ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ عبادت کے لائق بھی صرف اللہ ہی ہیں۔

عبادت کا معنی اور اقسام:

عبادت کا معنی یہ ہے کہ کسی کی غایت تعظیم اور کمالِ محبت میں آ کر اظہار بندگی اور عاجزی کرنا۔ اگر کوئی ڈنڈے سے کرائے تو اس کو عبادت نہیں کہیں گے۔ یعنی اس ذات سے کمالِ محبت بھی ہو اور انتہائی تعظیم بھی ہو تو اس وقت اس کے آگے جھکنا، عاجزی، تذلل سے اور اس کی تعظیم اور اس کی عظمت کا اعتراف یہ عبادت کی قبولیت ہے۔ عبادت صرف نماز ہی نہیں، بلکہ روزہ ہے، حج ہے، زکوۃ ہے، اللہ کا ذکر ہے، تلاوتِ کلامِ پاک ہے، اللہ کے اوامر پر چلنا اور نواہی سے رکنا ہے۔ یہ تمام چیزیں عبادت ہیں۔

جب نماز عبادت ہے تو اس کے تمام ارکان رکوع، سجود، ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا بھی عبادت ہے۔ حمد وثنا بیان کرنا بھی عبادت ہے، اس کا ذکر کرنا بھی عبادت ہے۔ جیسے کعبۃ اللہ کا طواف کرنا عبادت ہے، کیونکہ اللہ کا حکم ہے، ورنہ کعبۃ اللہ تو پتھروں کا مکان ہے۔ نہ سونا ہے، نہ چاندی ہے، بلکہ بڑے بڑے پتھر ہیں۔ وہ بھی بے ترتیب، کوئی درمیانہ، کوئی بڑا اور کوئی چھوٹا ہے۔ اس کا طواف کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ نے اس کو اپنا گھر قرار دیا ہے۔ اس لیے ہم اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔

عبادت صرف خدا کی ہے:

''اِیَّاکَ'' کو ''نَعْبُدُ'' پر مقدم کیا ہے۔ کیونکہ اگر ''نَعْبُدُ اِیَّاکَ'' ہوتا تو معنی ہوتا کہ ہم تیری بھی عبادت کرتے ہیں مطلب ہوتا کہ غیروں کی بھی کرتے ہیں، لیکن جب ''اِیَّاکَ'' کو مقدم کر دیا تو معنی ہوا کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ مثلاً: آپ کی بیوی کہے گی کہ میں تیری ہی بیوی ہوں۔ یوں نہیں کہے گی کہ میں تیری بھی بیوی ہوں۔ اگر وہ تیرے ساتھ کسی اور کو شریک کرے تو شریف بیوی نہیں کہلا سکتی اور مرد بھی باغیرت نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح جب آدمی اللہ کی عبادت میں شریک کرے کہ تیری بھی عبادت کرتے ہیں اور تیرے سوا کبھی کبھی قبر کو سجدہ کر لیتے، ہمیشہ ہم تیری نذر و نیاز کرتے ہیں، لیکن کبھی کبھی نذر و نیاز حسین بھی کر لیتے ہیں، ہمیشہ تیرے نام کی منت مانتے ہیں، لیکن کبھی کبھی پیروں کے نام پر بھی منت مان لیتے ہیں۔ یہ شرک ہے۔

بندے کی صفت عبدیتِ کاملہ:

تو اصل یہ ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کسی کو شریک نہیں کرتے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے:

﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ [ھود:۱۲۳]

''اے محمد (ﷺ)! آپ اسی کی عبادت کیجیے اور اسی پر بھروسہ رکھیے۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا﴾ [النساء:۳۶]

''اور اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔''

بندے کی سب سے بڑی صفت عبدیت ہے۔ جب بندہ عبدِ کامل بن جائے یہی اس کا اصل مقام ہے۔ اس لیے اللہ نے معراج والی آیت میں فرمایا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ [الاسراء:۱]

''پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی۔''

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ⑩﴾ [النجم:۱۰]

''اس طرح اللہ کو اپنے بندے پر جو وحی نازل فرمانی تھی، وہ نازل فرمائی۔''

اور اور ایک دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ⑲﴾ [الجن:۱۹]

''اور جب خدا کا (خاص) بندہ خدا کی عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو یہ (کافر) لوگ اس بندہ پر بھیڑ لگانے کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۣ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ㉚﴾ [مریم:۳۰]

''میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ [الفرقان:۶۳]

''اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔''

اور اسی طرح فرمایا:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾[الزمر:۵۳]

''آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے (کفر و شرک کر کے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو۔''

اصل مقام یہ ہے کہ اس کا عبد بن جائے کہ خالص اللہ کے لیے عبادت ہو۔ فرمایا:

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾[البینۃ:۵]

''حالانکہ ان لوگوں کو (کتب سابقہ میں) یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اسی طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لیے خالص رکھیں۔''

ذرے کے برابر بھی اس میں کسی کو شریک نہ کریں۔ اور وہ عبادت یہ ہے کہ کمالِ محبت اور غایتِ تعظیم دل کے اندر آ جائے۔ جب کسی کی محبت اور عظمت ہو تو آدمی اس کا احترام کرتا ہے۔ استاذ آ جاتا ہے تو اس کا احترام کرتا ہے، والد آ جاتا ہے تو اس کا احترام کرتا ہے، کوئی بزرگ آ جائے تو اس کا احترام کرتا ہے اور اگر کوئی اللہ کا ولی آ جائے تو بندہ اس کا احترام کرتا ہے۔ اور جب اللہ کی ذات کے ساتھ تعلق جڑے تو اللہ کی عظمت دل میں کتنی ہوگی؟ تو اس کی ظاہری صورت یہی ہے کہ ہم ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور اس کی حمد و ثنا بیان کر رہے ہوتے ہیں اور پھر شیطان مردود کے شر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اور پھر اللہ کے نام سے مدد مانگتے ہیں، اس کے بعد حمد کا اعتراف کرتے ہیں پھر اس کی صفات کا اقرار کرتے ہیں۔ پھر اقرار کرتے ہیں کہ مالک تو ہے اور بدلہ دینے والا بھی تو ہے۔ اس کے بعد اقرار کرتے ہیں کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اس لیے یاد رکھیں! عبادت صرف اللہ کی ہوگی۔ دعا بھی عبادت ہے، حمد و ثنا بھی عبادت ہے، رکوع بھی عبادت ہے، سجدہ بھی عبادت ہے، کسی کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا بھی عبادت ہے، کسی کے سامنے خشوع و خضوع کے ساتھ گر جانا بھی عبادت ہے، اعتکاف بیٹھنا بھی عبادت ہے، طواف کرنا بھی عبادت، اللہ کے نام پر قربانی کرنا بھی عبادت اور نذر و نیاز بھی عبادت ہے۔ اب یہ ساری چیزیں کس کے نام پر ہوں گی؟ اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی کسی کو شامل کرو گے تو شرک ہوگا۔ مثلاً: اگر کسی اور کی نماز پڑھو گے تو شرک ہوگا اور اگر طواف کعبہ کی بجائے قبر کا طواف کرو گے تو شرک ہوگا۔

قبروں کی تعظیم:

بعض ہمارے مولوی بھائی لوگوں کو مغالطہ میں ڈال دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ بات ٹھیک ہے کہ عبادت صرف اللہ کے لیے ہے۔ اگر ہم کسی بزرگ کے مزار پر جاتے ہیں، گلے میں کپڑا ڈالتے ہیں اور دروازے میں داخل ہوتے ہوئے، اپنے آپ کو جھکا لیتے ہیں اور پھر چوکھٹ کو چوم لیتے ہیں، قبر کے تعویذ کو چومتے ہیں، طواف کرتے ہیں یا ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو کر دعا مانگتے ہیں اور الٹے پاؤں واپس آتے ہیں یہ تو تعظیم ہے عبادت نہیں، عبادت تو صرف اللہ کے لیے ہے، تعظیم تو ہم بزرگوں کی بھی کر سکتے ہیں، سجدہ کر سکتے ہیں۔ عبادت والا سجدہ اور ہے اور تعظیم والا سجدہ اور ہے۔ لہٰذا عبادت والے سجدے کو ہم بھی کفر کہتے ہیں۔ جب یہ مغالطہ دیتے ہیں تو لوگ مغالطے میں پڑ جاتے ہیں۔

سجدہ صرف خدا کے لیے:

ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جمع ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! جب ہم دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ جب بادشاہ کے دربار میں جاتے ہیں تو پہلے جھکتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں اور پھر ہاتھ باندھ کر بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور اس وقت تک سر نہیں اٹھاتے جب تک بادشاہ ان کو اجازت نہ دے۔ آپ تو ہمارے دین و دنیا کے بادشاہ ہیں، آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم بھی جب آپ کے دربار میں داخل ہوں تو آپ کو سجدہ کریں، تعظیم بجالائیں اور آپ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔ آپ ہمیں اجازت دیں۔ سوال کرنے والے صحابہ ہیں اور پوچھ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رہے ہیں۔ اب آپ بتائیں کہ صحابہ جو پوچھ رہے تھے تعظیم کے لیے پوچھ رہے تھے یا عبادت کے لیے پوچھ رہے تھے؟ کیا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرنا چاہتے تھے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار! اگر میں کسی کو اللہ کے سوا سجدے کی اجازت دیتا یا حکم دیتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

[سنن أبي داود، حديث: ۲۱۴۰، باب: فِي حَقِّ الزَّوْجِ عَلَى الْمَرْأَةِ، سنن الدارمي، حديث: ۱۵۱۵]

اگر بیوی کو بھی حکم ہوتا تو تعظیم کے لیے ہوتا نا کہ عبادت کے لیے ہوتا۔ لیکن اللہ نے حکم دیا ہے:

﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾

[حم السجدة: ۳۷]

"نہ سورج کو سجدہ کرو، نہ چاند کو (نہ بلند چیزوں اور چمکنے والی چیزوں کو سجدہ کرو) اور سجدہ اس اللہ کو کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اگر واقعی تمہیں اسی کی عبادت کرنی ہے۔"

دیکھو! حکم ہے کہ سورج نکلے تو نماز نہ پڑھو، سورج سر پر آجائے تو سجدہ نہ کرو، جب ڈوب رہا ہو تو نماز نہ پڑھو۔ کیونکہ ان اوقات میں سورج کے پجاری سورج کی عبادت کرتے ہیں۔ اگر ہم نماز پڑھیں بھی سہی تو اللہ کے لیے پڑھیں گے، ہمیں سورج سے کیا واسطہ؟ لیکن منع فرما دیا، کیونکہ اگر ہم نماز پڑھ رہے ہوں تو نہ جاننے والا یہ کہے گا کہ سورج کے پجاری ہیں۔ اب جو آدمی کعبہ کے آگے بھی سجدے کرے اور قبر کے آگے بھی سجدے کرے قبر تو بالکل سامنے ہوتی ہے تو وہ کیسے جائز ہے؟

دیکھو! تمام پانچ نمازوں میں رکوع اور سجدہ ہے۔ جب جنازہ پڑھتے ہیں تو رکوع اور سجدہ نہیں ہے۔ کیونکہ سامنے میت رکھی ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ اسی کو سجدہ کر رہے ہیں۔ اللہ نے فرما دیا: بس کھڑے کھڑے دعا کر دو، میں قبول کر لوں گا، تاکہ کسی کو شبہ اور شک بھی نہ پڑے۔ اب اللہ کے ولی کا جنازہ سامنے رکھا ہو تو رکوع اور سجدے کا حکم نہیں ہے، لیکن جب وہی ولی قبر میں چلا جاتا ہے تو قبر کو سجدہ کرنا جائز ہو جائے گا؟ اسی لیے فرمایا:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝﴾ [الفاتحہ:۴]

"(اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔"

بندے کو رب بنانے کی مثال اور چند قابلِ اصلاح امور:

قرآن کی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [التوبہ:۳۱]

"انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ (پیروں) کو رب بنا رکھا ہے۔"

"اَحْبَارٌ" "حِبْرٌ" کی جمع ہے، عالم کے معنی میں ہے۔ اور "رُهْبَانٌ" "رَاهِبٌ" کی جمع ہے بمعنی عبادت گزار، یعنی پیر جو گوشہ نشین ہوتے تھے، پہاڑوں میں چلے جاتے تھے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ پہلے عیسائی تھے پھر مسلمان ہوئے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! قرآن کہتا ہے کہ لوگوں نے اپنے پیروں اور مولویوں کو رب بنا لیا ہے، جبکہ ہم نے تو ان کو کبھی بھی رب

نہیں بنایا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اے عدی! ایک بات بتاؤ کہ جن چیزوں کو اللہ نے حلال کر دیا ہے اور تمہارے ان مولویوں نے اور پیروں نے ان کو حرام کر دیا اور جن چیزوں سے منع کیا اور انہوں نے کہا اس چیز کو کرو۔ تو تم نے مولویوں کی بات مانی یا نہیں مانی؟ مثلاً: اللہ فرماتے ہیں کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار نہ کرو۔ انہوں نے اپنے پادریوں سے مسئلہ پوچھا کہ سخت حکم ہے، لیکن اس دن مچھلی بھی بہت ہوتی ہے۔ اب ہم کیا کریں؟ تو پادریوں نے کہا کہ چھوٹے چھوٹے نالے بنا کر حوض بنا لو پھر پانی ادھر چھوڑ کر حوض بند کر لو اور اتوار والے دن اس مچھلی کو پکڑ لیا کرو۔ حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہاں یہ بات تو تھی کہ جب وہ کہتے تھے کہ یہ کرو تو ہم کرتے تھے اور جب کہتے کہ یہ نہ کرو تو ہم نہیں کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ حق تو صرف میرے رب کا ہے۔ جب اس کے مقابلے میں یہ حق کسی بندے کو دے دیا تو گویا تم نے اس کو رب بنا لیا۔

[السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث: ۲۰۳۵۰]

سارے قرآن مجید کو ٹھنڈے دماغ سے پڑھ لو، پورے قرآن میں دیکھیں: اللہ نے کسی جگہ گیارہویں کرنے کا حکم دیا ہے؟ عرس کا؟ تیجہ کا حکم دیا ہے؟ سات جمعراتیں، قل خوانیاں اور چالیسواں کرنے کا حکم دیا ہے؟ محرم کے دس دن سیاہ کپڑے پہننے کا اور چارپائیاں الٹی کرنے کا حکم دیا ہے؟ نذر و نیاز، جلوس نکالنے کا کوئی حکم دیا ہے؟ تو جن مولویوں کا کہنا مان کر ہم یہ کر رہے ہیں اور خدا کے حکم پر نہیں چل رہے تو مطلب ہوا کہ ہم ان مولویوں کو رب بنا رہے ہیں۔ اسی طرح صحابہ گزرے ہیں، اہل بیت گزرے ہیں کوئی بتلا دے کہ ان میں سے کسی نے حضور ﷺ کے روضے کا طواف کیا ہے؟ کیا ان کے دل میں حضور ﷺ کی عظمت نہیں تھی، ہمارے دل میں عظمت ہے؟ ہم اگر جالیاں چومیں تو تعظیم ہے اور اگر انہوں نے جالی نہیں چومی تو انہوں نے تعظیم نہیں کی؟ کیا ان کے دل میں حضور ﷺ کی محبت نہیں تھی؟ ان سب صحابہ کو مسئلہ سمجھ نہیں آیا؟ اور چودہ سو سال بعد والے لوگوں نے جو مسئلہ نکالا وہ صحیح ہے؟

تمام صحابہ نے زکوٰۃ بھی دی ہے، صدقات بھی کیے ہیں، اللہ کے راستے میں جان اور مال سب کچھ لٹا دیا ہے، کیا انہوں نے کسی نبی، کسی فرشتے کی نذر و نیاز مانی تھی؟ اللہ کے گھر میں اعتکاف بیٹھنا عبادت ہے، لوگ قبر پر ۹ راتیں اعتکاف بیٹھتے ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اپنے بچے کی لٹ اس وقت کٹوائیں گے جب سائیں کے مزار پر جائیں گے۔ قبر پر جا کر بچے کی لٹ کٹانے کا کیا مطلب؟ یہی کہ پیر دیکھ رہا ہے کہ میرا مرید بچے کو لے کر آیا ہے۔

اللہ ہدایت دے۔

﴿اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ﴾ (تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔) یعنی دنیاوی امور ہیں یا اخروی امور ہیں، جسمانی امور ہیں یا روحانی امور ہیں مدد اللہ سے مانگتے ہیں۔ یاد رکھیں امداد اس سے مانگی جاتی ہے جو دینے کے قابل ہو اور ہماری بولی بھی سمجھتا ہو۔ آپ عربی کو کہیں کہ پانی دو تو وہ کہے گا کہ کیا بات ہے؟ اس کو تو بات سمجھ ہی نہیں آئے گی۔

مثل مشہور ہے کہ ہمارے علاقے کے کچھ لوگ حج کرنے کے سلسلے آئے۔ اس وقت پانی نہیں ہوتا تھا، پانی بیچنے والے کندھے پر سقہ (مشک) لٹکا کر بیچتے تھے۔ تو ان میں سے ایک نے آکر کہا: ''حَاجِيْ مِيَاهٌ'' اس قافلے میں عورتیں بھی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو ایک حاجی مر گیا ہے۔ دوسرے نے آواز لگائی تو انہوں نے کہا: لو دوسرا حاجی بھی مر گیا، تیسرے نے آواز لگائی تو انہوں نے کہا کہ حاجی مر رہے ہیں۔ یہاں تو بلا پڑ گئی ہے۔ اس لیے جب آدمی زبان نہ سمجھے تو کیا اس سے مدد مانگے گا؟

لیکن اب آپ کعبہ میں ہیں، ذہن بالکل خالی کر دیں۔ سمجھیں کہ عربی والا عربی میں دعا مانگ رہا ہے، سندھی سندھی زبان میں مانگ رہا ہے، انگریزی بولنے والا انگریزی زبان میں مانگ رہا ہے۔ افریقین افریقی زبان میں مانگ رہا ہے۔ مختلف زبانوں میں اس عقیدے کے ساتھ اللہ سے مانگ رہے ہیں کہ اللہ سمجھتا بھی ہے اور مدد کرنے پر قادر بھی ہے۔ اگر تمہارا پیر سندھی ہے اور اس سے پشتو میں جا کر مانگو گے تو وہ کہے گا: پیر سے کیا بکواس کرتا ہے؟ جب وہ دنیا میں پشتو نہیں سمجھتا تو قبر میں کیسے پشتو سمجھنے لگ گیا؟ اور جن کا پیر سرحد والا ہو، زندہ بھی ہو اور کوئی سندھی میں جا کر مانگے تو کیا وہ سمجھ لے گا؟ اور اگر پیر پنجاب کا ہے اور آپ اس سے انگریزی میں مانگیں گے تو کیا وہ سمجھ لے گا؟ جب ایک زندہ پیر دو زبانیں جانتا ہے چار نہیں جانتا یا چار جانتا ہے، آٹھ زبانیں نہیں جانتا تو جب وہ قبر میں چلا جاتا ہے پھر وہ ساری زبانیں کیسے سمجھ لیتا ہے؟ پھر ہماری مدد کے قابل کیسے ہو جاتا ہے؟ مثلاً: اگر ہمارا پیر بزرگ ہے، عالم ہے، لیکن غریب آدمی ہے۔ اب سارے اس کے پاس اکٹھے ہو کر چلے جائیں کہ ہمیں سو سو ریال دو۔ جب اس کے پاس ہے ہی نہیں تو وہ کیسے دے سکتا ہے؟ اس لیے اس سے مانگا جائے جس کے پاس آسمانوں اور زمینوں کے خزانے ہیں، جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے، جو ہر زبان سمجھ سکتا ہے اور سب کو دے سکتا ہے۔ ساری کائنات کی مرادیں اور آرزوئیں پوری کر دے تو ایک روپے کے برابر بھی کمی نہ ہو۔

غیر سے مدد مانگنا کب شرک ہے؟

یاد رکھیں! ایک ہے مادی اسباب کے تحت مدد طلب کرنا۔ جیسے کوئی آدمی کہے: یار! مجھے تھوڑا سا راستہ دے دے، میں چلنے میں دشواری محسوس کر رہا ہوں۔ میرے پاس کتاب نہیں ہے، کتاب دے دیں، یا کتاب سمجھ نہیں آرہی آپ سمجھا دیں۔ یہ مادی اسباب ہیں۔ مادی اسباب کے اندر اللہ کے پیغمبر کے پاس یا اللہ کے ولی کے پاس جانا کہ آپ ہمارے لیے دعا کر دیں۔ تو یہ جائز ہے۔

مدد مانگنا دو طریقے سے شرک بنتا ہے:

اللہ کے سوا کسی کو مختار کل اور متصرف مانتے ہوئے اس سے مدد مانگے۔ یا یہ کہے کہ قادر مطلق خدا ہے، رازق بھی خدا ہے، متصرف فی الامور بھی خدا ہے، لیکن اللہ نے ان کو بھی مختار بنا دیا ہے، یعنی اللہ نے ان کو بھی اختیار دے دیا ہے۔ یہ بھی شرک ہے۔ یہی وہ شرک تھا جو مکہ کے مشرک کرتے تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم شرک کیوں کرتے ہو؟ تو وہ یوں نہیں کہتے تھے کہ یہ ہمارے خدا ہیں، بلکہ کہتے:

﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [یونس:۱۸]

''یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔''

یہ سفارش کرتے ہیں اور ہمارا کام ہو جاتا ہے۔

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر:۳]

''ہم تو ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔''

اسی لیے جب وہ تلبیہ پڑھتے تو کہتے تھے:

''لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ''

''اے اللہ! تیرا کوئی شریک نہیں، مگر وہ جس کو تو نے خود شریک بنایا ہے۔ اور اس کا مالک بھی تو ہے وہ تیرے مالک نہیں ہیں۔''

اب اس عقیدے کے ساتھ کسی بزرگ کے مزار پر جانا، کسی اللہ والے کی دربار پر جانا یا آستانے پر جانا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ اصل تو اللہ ہے، لیکن اللہ نے ان کو بھی کچھ نہ کچھ اختیار دے دیا ہے۔ اور یہ اسی اختیار دیے ہوئے

میں سے ہمیں دے دیتے ہیں تو یہ بھی شرک ہے۔

معجزہ اور کرامات کے ذریعہ سے غلط فہمی:

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں معجزات اور کرامات سے دھوکہ لگتا ہے کہ ایک پیغمبر کے ہاتھ نے چاند کے دو ٹکڑے کیسے کر دیے؟ دریا بہہ رہا ہے اور ایک اللہ کا ولی فوج لے کر گزر گیا تو کہتے ہیں: اگر اللہ کے ولیوں کے ہاتھ میں اختیار نہ ہوتا تو پانی کے اوپر سے کیسے گزر جاتے؟ معلوم ہوا کہ اللہ نے ان کو اختیار دیا ہوا ہے۔ یہاں جا کر آدمی عقیدے سے بھٹک جاتا ہے۔

یاد رکھو! معجزہ اللہ کے نبی کے ہاتھ سے اور کرامت ولی کے ہاتھ پر اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک اللہ نہ چاہیں۔ اللہ چاہتے ہیں تو ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ چاہے تو حضور ﷺ کے ہاتھ سے چاند دو ٹکڑے ہو جائے اور اگر اللہ نہ چاہے تو حضور ﷺ کے دو دندان مبارک شہید ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتے تو جن کی انگلیوں سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا اسی انگلی سے زمین پر کافر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ ایک دفعہ آپ نے پیالے میں ہاتھ رکھا تو پندرہ سو آدمیوں نے پانی پی لیا۔ اور اگر اللہ نے حضور ﷺ کے ہاتھ پر معجزہ نہ دکھایا تو حضور ﷺ کئی کئی دن فاقے سے رہے۔ بھوک کی تکلیف بھی برداشت کرنی پڑی۔ معجزہ اور کرامت میں لوگوں کو دھوکہ اور مغالطہ لگ جاتا ہے۔
معجزہ اور کرامت تب ظاہر ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ دکھانا چاہتے ہیں۔ نہ معجزہ نبی کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے اور نہ کرامت ولی کے اپنے اختیار میں ہوتی ہے۔ مکہ والے سارے آگئے کہ آپ ہمیں یہ معجزہ دکھائیں اور یہ معجزہ دکھائیں۔ اللہ نے فرمایا ان کو جواب دے دیں:

﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا﴾ [الاسراء: ۹۳]

''اے کافرو! اللہ کی ذات پاک ہے، میں تو ایک بشر ہوں اور اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں۔''
تمام پیغمبروں نے کہہ دیا:

﴿وَمَا كَانَ لَنَا أَن نَّأْتِيَكُم بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ [ابراہیم: ۱۱]

''اور یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر تمہیں کوئی معجزہ لا دکھائیں۔''
اے کافرو! ہمارے اپنے ہاتھ میں معجزات نہیں ہیں کہ تمہیں دکھلا دیں اور تمہارے مطالبے پورے کر دیں۔ اگر

اللہ چاہے گا تو دکھلا دے گا اور اگر نہیں چاہے گا تو نہیں دکھلائے گا۔ اللہ چاہتا ہے تو میدانِ بدر میں فرشتوں کو اتار کر کافروں کو ٹکڑے ٹکڑے کروا دیتا ہے۔ اللہ نہ چاہے تو احد میں فرشتے بھی نہیں اترے اور میرے مدنی ﷺ کے ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔

غیرِ خدا کو قدرت واختیار:

اس لیے یاد رکھیں! اللہ کے سوا کسی کو قادر مطلق، رازق اور متصرف مان کر مدد مانگے تب بھی شرک ہے اور اگر یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ نے ان کو اختیار دے دیا ہے، جو چاہیں کریں، لہٰذا ہم ان سے مدد مانگیں۔ تو یہ بھی کفر اور شرک ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے نام پر ان کے ایک مرید نے شعر لکھا ہے:

ع ذی تصرف بھی ہے، ماذون بھی ہے، مختار بھی ہے
اور کارِ عالم کا مدبر بھی ہے عبد القادر

اس کو تصرف کا بھی اختیار ہے، اس کو اللہ نے اجازت دی ہوئی ہے اور اس کو اختیار ہے۔ تمام عالم کا نظام وہی چلا رہا ہے۔ اور آگے کہتا ہے:

بندہ قادر کا بھی ہے قادر عبد القادر

(شاعر کا نام بھی عبدالقادر تھا) کہتا ہے کہ بندہ بھی قادر ہے اور خدا بھی قادر ہے۔ یعنی عبدالقادر قادر ہے۔ اسی سے ان مسلمانوں کے عقیدوں کو دیکھ لیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب گمراہیاں آدمی کے سر پر چڑھ جاتی ہیں تو آدمی حق کا راستہ نہیں دیکھ سکتا۔ حالانکہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا مسلک حنبلی ہے جو یہاں کے رہنے والوں کا مسلک ہے۔ یہاں کے لوگوں کو وہابی اور نجدی کہتے ہیں۔ اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کو پیرانِ پیر اور مختار کل کہتے ہیں۔ وہ بڑے موحد اور اہلِ سنت والجماعت کے اتنے بڑے عالم تھے کہ باطل فرقے آج تک ان کے نام سے چڑتے ہیں۔ جتنا انہوں نے صحابہ کی عظمت کے بارے میں کام کیا ہے کسی اور نے نہیں کیا۔ لیکن شیطان بدلے لیتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی حق والا موجود ہو تو لوگوں کو گمراہ کرتا ہے کہ یہ وہابی ہے، نجدی ہے۔ لوگوں کو مروا دیتا ہے اور بھٹکا دیتا ہے اور جب وہ اللہ کا ولی فوت ہو جاتا ہے تو اس کی قبر پر شرک کرواتا ہے۔ زندگی میں بھی بدلہ لیتا ہے اور مرنے کے بعد بھی ان سے بدلہ لیتا ہے۔

نعرۂ حیدری:

تو قرآن نے ہمیں سبق دیا: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ (صرف تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (اور صرف تجھ سے ہی ہم مدد مانگتے ہیں۔) لیکن جو" یا علی مشکل کشا" کہتے ہیں اور پہلوان جب کشتی لڑتے ہیں تو" نعرۂ حیدری" لگاتے ہیں تو اس سے ان کا عقیدہ ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سن رہے ہیں۔ لگتا ہے ان کا تعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اتنا ہے، لیکن انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نہیں سنی۔ کیا وہ اپنے بیٹے سے ناراض تھے؟ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نہیں سن رہے تو نعرہ لگانے والا بے وقوف ہے۔ اگر صرف سن رہے ہیں تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہے کہ سنیں تو سہی، لیکن مدد نہ کرسکیں تو کیا فائدہ؟ اب پہلوانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پکارا۔ اب ایک ہار گیا اور دوسرا جیت گیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک سے راضی تھے اور دوسرے سے ناراض تھے۔ اور ایک دن کے اندر کتنے نعرے لگتے ہیں۔ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان تمام جگہوں پر پہنچ گئے؟ حالانکہ یہ صفت تو اللہ کی ہے۔ اس سے بڑا بھی کوئی شرک ہوگا؟

یا رسول اللہ کا نعرہ:

جب ہم" یا اللہ!" کہتے ہیں تو ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ نے اس کو سنا ہے اور سمجھا ہے اور مدد کرنے پر بھی قادر ہے۔ اور اگر" یا رسول اللہ!" ہر جگہ سے کہتے ہیں تو کیا عقیدہ ہوتا ہے؟ اگر یہ عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر بات سنتے اور ہر بولی سمجھتے ہیں اور ہماری مدد کو بھی آسکتے ہیں اور مدد دینے پر بھی قادر ہیں۔ تو پہلے عقیدے اور اس میں تو کوئی فرق نہیں ہے۔ ٹھنڈے دل سے پڑھو اور غور کرو۔

عوام کہتے کہ وہابی کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے بھی چڑ ہے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے چڑ ہوتی تو پھر اذان وغیرہ میں" أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" نہ کہتے، جمعہ کے خطبہ میں آیت ﴿إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ﴾ [الاحزاب:٥٦] پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ پڑھتے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے چڑ ہوتی تو نماز میں" أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" بھی نہ کہتے، درود بھی نہ پڑھتے۔ لیکن معلوم ہوا کہ نام سے چڑ نہیں، بلکہ شرک سے چڑ ہے کہ" یا" حرف ندا تھا، اس سے اللہ کو پکارنا تھا، لیکن جب نبی علیہ السلام کے نام کے ساتھ لگا لیا تو وہ تجھے شرک سے بچانے کے لیے چیخ رہا ہے۔ اگر کوئی آج کہے کہ میرا یہ عقیدہ نہیں ہے اور تو ڈر رہا ہے، لیکن آئندہ آنے والی نسلیں جب دیواروں پر لکھا ہوا دیکھیں گی:" یَا اَللّٰهُ!"،" یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!" تو وہ سمجھیں گی کہ یہ کوئی برابر کے ہیں، اگر

مسجد میں ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' ہوتا تو کوئی اعتراض نہ کر سکتا، ایک جگہ ''اللّٰہُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' اور دوسری جگہ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ'' لکھا ہو تو کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

تین نعرے اور تثلیث:

پہلے تو ''یَا اَللّٰہُ!''، ''یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!'' تھا اور اب ملنگوں نے ایک تیسرے نعرے ''یَا عَلِیُّ!'' کا اضافہ کر دیا ہے۔ اور یاد رکھیں! عیسائیوں کے خدا بھی تین ہیں۔ تو یہ عقیدہ تثلیث ہوگا۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ ان تین میں ایک خدا ہے، بلکہ ایک گروہ ان سے بھی آگے بڑھ گیا، انہوں نے دیکھا کہ اللہ کے ساتھ بھی ''یا''، محمد ﷺ کے ساتھ بھی ''یا'' اور علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ''یا'' لگ گیا تو ہمارے پیر کے ساتھ بھی ''یا'' لگاؤ۔ یا غوثِ اعظم، یا معین الدین چشتی مدد کن۔ اگر یہ شرک نہیں ہے تو شرک اور کیا بلا ہے؟ اس لیے جب ہم سورۂ فاتحہ میں ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ پڑھ رہے ہیں تو اس سے ہمیں سبق مل رہا ہے کہ (اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ انبیاء، ملائکہ اور اولیاء اللہ کس کی عبادت کرتے ہیں؟ کس کے سامنے رکوع اور سجدہ کرتے ہیں؟

حضور ﷺ نے اپنی امت کے لیے تین لفظوں میں مسئلہ حل کر دیا، فرمایا:

((إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۵۱۶]

''جب سوال کرو اللہ سے کرو، جب مدد طلب کرو تو اللہ سے طلب کرو۔''

لہٰذا ہمیں جو مدنی پاک ﷺ نے فرمادیا ہم اس پر عمل کریں گے۔

مسئلہ الوہیت:

انسان جب ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ پڑھتا ہے تو اس سے اقرار کرتا ہے کہ تمام محامد اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے، ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ سے اس کی صفات کا اقرار کرتا ہے۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ قیامت کے دن کے مالک ہیں۔

انہی تین آیات کے اندر مسئلہ الوہیت آ گیا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ جب ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کہا تو اقرار کیا کہ تمام جہانوں کا رب اللہ ہے۔ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ سے اللہ کی صفات کا اقرار اور کافروں سے اعراض ہے جنہوں نے کہا تھا: ہم نہیں جانتے ''مَا الرَّحْمٰنُ، مَا الرَّحِيْمُ؟'' (رحمٰن اور رحیم کون ہیں؟) کافر صفاتِ خداوندی کے

منکر تھے۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سے آخرت، معاد کا اقرار کر لیا کہ ایک دن ایسا آئے گا جس میں جزا و سزا ہو گی۔
﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ سے ہم نے اقرار کیا کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تیری عبادت کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ عبادت کی جتنی اقسام ہیں وہ صرف اللہ کے لیے ہوں گی اور کسی کے لیے نہیں ہوں گی۔ نماز کے ارکان: تلاوت، رکوع و سجود اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا بھی عبادت ہے، نذر و نیاز، منت عبادت ہے، دعا مانگنا عبادت ہے۔ یہ تمام عبادات صرف اللہ کے لیے ہوں گی، اللہ کے علاوہ کسی غیر کے لیے نہیں ہوں گی۔ ﴿إِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ سے ہم نے اقرار کیا کہ تیری ہی عبادت کریں گے۔ ساری دنیا سے رشتہ توڑ کر تجھ سے تعلق جوڑ لیا تو مدد بھی تجھ ہی سے مانگیں گے اور کسی سے نہیں مانگیں گے۔

سورۂ فاتحہ جامع دعا ہے:

اس کے بعد آخری تین آیات خالص دعا ہیں۔ حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ میرے اور میرے بندوں کے درمیان آدھی آدھی ہے۔ جب بندہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔ اسی طرح چلتے چلتے جب بندہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری حمد و ثنا کے بعد مجھ سے سوال کیا ہے، ''وَ لِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ'' (میرے بندے نے مجھ سے جو مانگا ہے، میں دوں گا)۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، باب: وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ...]

صراطِ مستقیم کی دعا:

ان آخری تین آیات میں ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ جامع دعا ہے۔ ہدایت کہتے ہیں کمالِ مہربانی سے کسی کو راستہ دکھانا۔ کبھی ہدایت ''إِلٰى'' کے ساتھ متعدی ہوتی ہے تو معنی رہنمائی ہوتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے: ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [الشوریٰ: ۵۲] (اے میرے پیارے نبی (ﷺ)! آپ لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں)۔

اور اگر ہدایت لام کے ساتھ متعدی ہو تو معنی ہوتا ہے منزلِ مقصود تک پہنچانا۔ جیسے جنت میں جانے کے بعد مومنین کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ [الاعراف: ۴۳] (اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے ہم کو اس (مقام) تک پہنچایا اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ

پہنچاتے)۔یہاں ہدایت لام کے ساتھ متعدی ہے۔

اور اگر ہدایت اپنی ذات کے ساتھ متعدی ہو تو معنی ہوتا ہے کہ راستہ دکھلا اور چلا اور منزل مقصود پر پہنچا۔یعنی اس وقت تینوں معنی آجاتے ہیں۔سورۂ فاتحہ میں بھی ہدایت اپنی ذات کے ساتھ متعدی ہے۔

صراط کا معنی:

ہم نے اللہ سے دعا کی کہ ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما۔صراط کا معنی راستہ ہوتا ہے، سبیل اور طریق کا معنی بھی راستہ ہے۔

علامہ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صراط کا لفظ وہاں آئے گا جہاں پانچ صفات پائی جائیں گی:

- ......صراط کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ راستہ سیدھا ہو۔
- ......دوسری صفت یہ ہے کہ وہ راستہ ''مُوْصِلْ اِلَی الْمَطْلُوْبِ'' (منزل تک پہنچانے والا ہو)۔
- ......تیسری صفت یہ ہے کہ وہ راستہ وسیع اور کشادہ بھی ہو۔
- ......چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ راستہ سب سے زیادہ قریب بھی ہو۔
- ......اور پانچویں صفت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہ ہو۔

جب یہ پانچ صفات پائی جائیں گی تو وہاں لفظ صراط آئے گا۔اس لیے ہم نے بھی دعا مانگی:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾[الفاتحہ:۵]

''یا اللہ! ہمیں سیدھی راہ دکھلا دے۔''

ایسا راستہ جو تیری رضا اور جنت تک پہنچانے والی ہے جو راستہ وسیع اور کشادہ ہے اور جو راستہ جلدی سے جنت تک پہنچانے والا ہے اور ایسا راستہ جس میں کوئی کجی اور ٹیڑھا پن نہیں، بلکہ سیدھا راستہ ہے۔

ہدایت پر ہدایت طلب کرنے کا مطلب:

سوال ہوتا ہے کہ جب بندہ ہدایت پر ہے تو پھر ہدایت مانگنے کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ جب ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے تو وہ ہدایت یافتہ ہے۔اب دوبارہ وہ ہدایت کیوں مانگ رہا ہے؟

علماء نے فرمایا ہے کہ ایک ہدایت عامہ ہے، ایک ہدایت خاصہ ہے اور ایک ہدایت خاص الخاص ہے۔ہدایت

عامہ اللہ نے ہر مخلوق کو عطا فرمائی ہے کہ ہر جانور کو بتا دیا کہ تمہارا کھانا کیا ہے؟ تمہارا گھر کس طرف ہے؟ ہر چرند پرند کو ہدایت کر دی ہے، جو سارا دن اڑ کر اپنا رزق تلاش کرتا ہے اور شام کو واپس اپنے گھونسلے میں لوٹ آتا ہے۔ اسی طرح کسی جانور کا بچہ ہوتا ہے تو وہ اپنی ماں کی طرف جاتا ہے اور کسی کی طرف نہیں جاتا۔ یہ ہدایت عامہ ہے۔

ہدایت خاصہ وہ ہے کہ جو مکلفین کے لیے ہے، یعنی جو ذو العقول ہیں: انسان اور جن ہیں۔ اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے پیغمبر بھیجے اور کتابیں اتاریں۔

ہدایت خاص الخاص یہ ہے کہ بندے سے بھلائی ہی کا کام ہوتا ہے۔ اور اس کی ہر وقت فکر آخرت کی طرف ہو جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ بہت بڑے اللہ والے گزرے ہیں۔ وہ جا رہے تھے، راستے میں ایک بدو اونٹ پر سوار ملا۔ بدو نے ان سے پوچھا: تم کون ہو؟ انہوں نے فرمایا: میرا نام ابراہیم ہے۔ پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ فرمایا: "قَاصِدٌ اِلٰی بَیْتِ اللّٰہِ" میں اللہ کے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ اعرابی ہنس پڑا اور کہا کہ تمہارے پاس نہ کوئی سواری ہے اور نہ کوئی زادِ راہ ہے اور یہ اتنا مشقت والا راستہ ہے۔ تو حضرت ابراہیم رحمہ اللہ نے فوراً جواب دیا: اے اعرابی! میرے پاس جو سواریاں ہیں وہ تمہیں نظر نہیں آتیں؟ بدو نے کہا: کون سی سواری ہے؟ فرمایا: اگر میرے اوپر کوئی بلا اور مشقت آتی ہے تو میں صبر کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں۔ اگر مجھے کوئی مصیبت پہنچ جاتی ہے تو رضا بر قضا کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں۔ اور اگر میری طبیعت کسی گناہ پر آمادہ ہوتی ہے تو میں دیکھتا ہوں کتنی زندگی گزر گئی ہے اور کتنی زندگی باقی ہے؟ جب اتنی سواریاں میرے پاس ہیں تو میرے بھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اعرابی نے جب یہ بات سنی تو اس نے کہا: تم ہی صراطِ مستقیم پر ہو، میں ہی بھولا ہوں۔ اصل سواری تو تیرے پاس ہے۔

صراطِ مستقیم کا ایک اور معنی:

اس لیے علماء نے فرمایا: ہدایت کا ایک خاص مرتبہ ہوتا ہے، جس میں آدمی ہر وقت مانگتا رہتا ہے اور تلاش کرتا رہتا ہے۔ صراطِ مستقیم سے مراد افراط اور تفریط کے درمیان کا راستہ ہے۔ افراط کا معنی ہے کسی چیز کو حد سے بڑھا دینا اور تفریط کسی چیز کو حد سے گھٹا دینا۔ افراط و تفریط عقیدے کے اندر بھی ہے، اعمال کے اندر بھی ہے، قوتِ غضبیہ کے

اندر بھی ہے اور قوتِ شہوانیہ کے اندر بھی ہے۔ عقیدے کے اندر افراط یہ ہے کہ لوگ خدا کو مانتے آئے اور ہر چیز کی نسبت اس کی طرف کردی، حتیٰ کہ اس کا بیٹا بھی بنا دیا۔ یہ افراط ہے۔ اور بعض لوگ خود خدا کا انکار کر بیٹھے اور خود اخدا بن بیٹھے۔ جیسے فرعون نے دعویٰ کر دیا۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا:

﴿فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ ﴾ [النازعات:۲۴]

''(فرعون نے) کہا: میں تمہارا اعلیٰ درجے کا پروردگار ہوں۔''

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگا:

﴿لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ ﴾ [الشعراء:۲۹]

''اگر تم میرے سوا کوئی اور معبود تجویز کرو گے تو تم کو جیل خانہ بھیج دوں گا۔''

جب آدمی صراطِ مستقیم مانگتا ہے تو معنی ہوتا ہے کہ اے اللہ! ہمیں عقیدہ کے اندر بھی عدل والا راستہ عطا فرما۔ اب دیکھیں! بعض لوگوں نے اللہ کے ولیوں کو اتنا بڑھایا کہ خدا کی منزلت پر لے گئے۔ کہنے لگے کہ اللہ نے تمام اختیارات ان کو عطا کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے لقب بنا دیے کسی کو غوث اعظم بنا دیا، کسی کو قطب صمدانی بنا دیا اور کسی کو لامکانی بنا دیا اور اتنا بڑھا دیا کہ ان کو زبدۃ الانبیاء (انبیاء کا مکھن) بنا دیا۔ یہ میرا پیر ہے۔ انبیاء ان کے مقابلے میں کمتر نہیں بن گئے۔ اس سے بڑی گستاخی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم نے حضور ﷺ کے چہرے کو دیکھنا ہو تو اپنے مرشد کے چہرے کو دیکھ لو۔ اور بعض لوگ اس سے بھی آگے بڑھے کہ تم خدا کا دیدار نہیں کر سکتے، لیکن اگر تم خدا کا دیدار کرنا چاہتے ہو تو اپنے مرشد کے اندر خدا کا دیدار کر لو۔ بعض لوگوں نے ان کو اتنا بڑھایا کہ حاجت روا اور مشکل کشا بنا دیا۔ بعض لوگوں نے انہی کو اپنی اولاد اور نفع و نقصان کا مالک بنا دیا۔ بعض لوگ بالکل اولیاء کا انکار کر بیٹھے اور ان کی شان میں بے ادبی کے ایسے الفاظ کہہ بیٹھے کہ حد سے بڑھ گئے۔ تو ہم نے مانگا: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴾ [الفاتحہ:۵] (یا اللہ! ہمیں سیدھا راستہ، درمیانہ راستہ عطا فرما)۔ نہ ہم افراط میں پڑ جائیں اور نہ ہم تفریط میں پڑ جائیں۔

اسی لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''يَهْلِكُ فِيَّ رَجُلَانِ مُحِبٌّ مُفْرِطٌ وَمُبْغِضٌ مُفْرِطٌ'' [مسند احمد، حدیث:۱۳۷۶]

''میرے بارے میں دو قسم کے آدمی ہلاک و برباد ہو جائیں گی: ایک قسم میری محبت میں بڑھ جائے گی اور ایک قسم میرے بغض میں بڑھ جائے گی۔''

ایک جماعت مجھے حاجت روا اور مشکل کشا بنا ڈالے گی اور ایک جماعت میری صحابیت کا بھی انکار کر دے گی۔ اس لیے مسلمان مانگتا ہے یا اللہ! اعتدال کے راستے پر رکھ۔ مجھے عقیدے کے اندر بھی اعتدال عطا فرما اور عمل کے اندر بھی مجھے اعتدال عطا فرما۔

اللہ نے مومن کی یہی صفت بیان فرمائی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ [الفرقان:٦٧]

''اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ ان کا طریقہ اس (افراط وتفریط) کے درمیان اعتدال کا طریقہ ہے۔''

جو صحیح ایمان والے ہیں وہ اگر خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور اتنا بخل بھی نہیں کرتے کہ جائز کاموں میں بھی خرچ نہ کریں، بلکہ درمیانی راستہ نکالتے ہیں۔

فرمایا: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کیونکہ کبھی راستہ سیدھا بھی ہوتا ہے، کشادہ بھی ہوتا ہے، لیکن اکیلا آدمی گھبراتا ہے۔ اس لیے کہا: ہمیں ان لوگوں کا راستہ عطا فرما جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔ اور وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء:٦٩]

''اور جو شخص اللہ اور رسول ﷺ کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء، اور صلحاء رحمہم اللہ اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے کہ ''مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ'' وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا: انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء، اور صلحاء رحمہم اللہ ہیں۔ اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق اور دوست ہیں۔

قادیانیوں کا دھوکہ:

اگر بندہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا ہے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا۔

تو اس آیت سے بعض جاہلوں مثلاً: قادیانیوں نے مسئلہ نکالا کہ جس طرح بندہ مرتبۂ شہادت پر پہنچ جاتا ہے، ولی بن جاتا ہے، صدیق بن جاتا ہے اسی طرح وہ نبی بھی بن جاتا ہے۔ اس لیے وہ لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اتنی اطاعت کی ہے کہ وہ مرتبۂ نبوت پر پہنچ گیا۔ ''نَعُوْذُ بِاللّٰہِ ثُمَّ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' حالانکہ یہ اللہ کے قرآن کی کھلی تحریف ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ (جو شخص اللہ کی اطاعت کرے اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے) ﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ [النساء:٦٩] (تو یہ لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا۔) اب ساتھ ہونے کا یہ معنی تو نہیں ہوتا کہ جو نبی کے ساتھ ہو وہ نبی بن جائے۔ جس طرح ہم دعا کرتے ہیں: ﴿وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ﴾ (اے اللہ! ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ وفات عطا فرما) اس کا یہ معنی تو نہیں ہوتا کہ جہاں نیک آدمی مر رہا ہو تو ہمیں بھی مار دے۔ بلکہ معنی یہ ہوتا ہے کہ ہمیں قیامت کے دن ان کی معیت نصیب ہو جائے، ان کی رفاقت نصیب ہو جائے۔ اگر یہی ترجمہ کریں کہ آدمی نبی کی اطاعت کرنے سے نبی بن جاتے ہوں تو معاذ اللہ! خدا کی اطاعت کرنے سے خدا بن جاتا ہے؟ اگر یہی معنی ہو تو ہم اطاعت کرتے کرتے فرشتے بھی بن سکتے ہیں۔ حالانکہ کوئی انسان فرشتہ نہیں بن سکتا۔ لہٰذا یہ ان کی جہالت ہے، ضلال ہے۔

انعام یافتہ حضرات:

تو مسلمان نے دعا مانگی: یا اللہ! ہمیں سیدھا راستہ عطا فرما۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے اپنا انعام کیا۔ وہ کون لوگ ہیں جن پر تو نے اپنا انعام کیا؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کو آپ نے بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا تو ذبح کرنے پر تیار ہو گئے۔ ان کو آرے کے نیچے رکھ کر دو ٹکڑے کر دیا گیا تو انہوں نے زبان سے اُف بھی نہیں کیا۔ میرے اللہ! جب آپ نے ان سے کہا تو انہوں نے اپنا سب کچھ چھوڑ کر اپنی بیوی بچوں کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ دیا۔ یا اللہ! ہمیں بھی ان کے راستے پر چلا اور ان جیسا صبر عطا فرما اور ان جیسی اطاعت عطا فرما۔ ہمیں بھی ان جیسا قربانی کا جذبہ عطا فرما۔ اس لیے مانگا:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ [الفاتحہ:٦،٥]

اس کے اندر انعام کی نسبت سیدھی اللہ کی طرف کی گئی ہے۔

ایک علمی نکتہ:

اور جب غضب کا ذکر آیا تو ﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ﴾ فرمایا: "أَنْتَ غَضِبْتَ عَلَیْهِمْ" نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مقام نعمت ہوتا ہے تو فاعل کی شان ظاہر کرنا ہوتی ہے اور اس کی تکریم ہوتی ہے، تا کہ جن لوگوں پر انعام ہوا ہے ان کی شان ظاہر ہو جائے۔

اللہ کی طرف اچھی چیز کی نسبت کرو:

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ قاعدہ ادب یہی ہے کہ جب کسی نعمت اور رحمت کی بات ہو تو اس کی نسبت اللہ کی طرف کرے۔ اور جب کوئی ایسی بات ہو جو اللہ کی شان کے لائق نہ ہو تو بندہ اس کی نسبت اپنے نفس کی طرف کرے۔ جیسے قرآن میں آیا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

﴿الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۝۷۸﴾ [الشعراء: ۷۸]

"[وہ ذات] جس نے مجھے پیدا کیا ہے، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔"

﴿وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۝۷۹﴾ [الشعراء: ۷۹]

"اور جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔"

اور آگے فرمایا:

﴿وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۝۸۰﴾ [الشعراء: ۸۰]

"اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔"

حالانکہ بیماری دینے والا بھی اللہ ہے اور شفا دینے والا بھی اللہ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جب بیمار کرتے ہیں تو شفا دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیماری کی نسبت اپنی طرف کردی۔ سورۂ جن میں آیا ہے:

﴿وَّاَنَّا لَا نَدْرِیْۤ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ﴾

"اور یہ کہ ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ آیا زمین والوں سے کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے......"

یہاں فاعل کا اظہار نہیں کیا گیا، لیکن آگے فرمایا:

﴿اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝۱۰﴾ [الجن: ۱۰]

''یا ان کے پروردگار نے ان کو راہِ راست دکھانے کا ارادہ فرمایا ہے۔''

جب رحمت کا ذکر آیا تو اللہ کا نام لیا گیا ہے، لیکن شر کے بیان میں اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے قصے میں ہے کہ جب انہوں نے کشتی کو توڑا تو فرمایا:

﴿فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا﴾ [الکہف:۷۹]

''میں نے چاہا کہ اس میں کوئی عیب پیدا کر دوں۔''

اور جب رحمت کا ذکر آیا تو فرمایا:

﴿فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا﴾ [الکہف:۸۲]

''اس لیے آپ کے پروردگار نے یہ چاہا کہ یہ دونوں لڑکے اپنی جوانی کی عمر کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔''

دیکھیں! جب رحمت کی بات ہوتی ہے تو نسبت رب کی طرف کی جاتی ہے اور جب ایسی بات ہوتی ہے جس میں شر ہو تو اس کی نسبت نفس کی طرف ہوتی ہے۔

اسی طرح دیکھیں! قرآن مجید میں ہے:

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ﴾ [البقرۃ:۱۸۷]

''تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے کہ روزوں کی رات میں تم اپنی بیویوں سے بے تکلف صحبت کرو۔''

''أَحَلَّ اللهُ لَكُمْ'' نہیں فرمایا، کیونکہ اس بات کی نسبت اللہ کی طرف زیبا نہیں تھا۔ لیکن جہاں تجارت کی بات آئی تو فرمایا:

﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ [البقرۃ:۲۷۵]

''حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔''

غضب اور ضلال کا اطلاق:

اس لیے یہاں سورۂ فاتحہ کے اندر ''أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' فرمایا۔ انعام کی نسبت اللہ کی طرف ہے۔ قرآن کی بلاغت دیکھیں کہ انعام کی ضد غضب ہے تو آگے غضب کا ذکر ہے۔

غضب سے کیا مراد ہے؟ بعض احادیث کے اندر آیا ہے کہ ﴿الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے مراد یہود ہیں اور

﴿اَلضَّآلِّیْنَ﴾ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ لیکن یاد رکھیں اس کا یہ معنیٰ نہیں ہوتا کہ صرف یہود ﴿اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ﴾ ہیں اور صرف عیسائی ﴿اَلضَّآلِّیْنَ﴾ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ﴿اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ﴾ میں کوئی کامل مکمل قوم ہے تو وہ یہود ہے۔ ورنہ یہ لفظ عام ہے قیامت تک یہود و نصاریٰ کو بھی شامل ہے اور ان کی صفات رکھنے والوں کو بھی شامل ہے۔

غضب اور ضلالت کے مستحق:

﴿اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ﴾ سے مراد ایسی قوم ہے جس کو علم ہو، لیکن ہوائے نفسانی کا شکار ہو کر راستے سے ہٹ جائے وہ اللہ کے غضب کی مستحق ہوتی ہے۔ اور ﴿اَلضَّآلِّیْنَ﴾ سے مراد جو علم نہ رکھتے ہوں اور راستے سے بھٹک گئے ہوں۔ اس لیے لکھا ہے کہ امت محمدیہ ﷺ کا جب کوئی مولوی اور عالم بھٹکے گا تو ﴿اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ﴾ میں شامل ہوگا اور جب کوئی صوفی، عابد اور زاہد لوگ بھٹکیں گے تو وہ ﴿اَلضَّآلِّیْنَ﴾ میں جا پڑیں گے کہ بجائے اللہ کی عبادت کے اپنی عبادت شروع کرا دیں گے، بجائے اللہ کی بندگی کے وہ خود مختار بن بیٹھیں گے، حاجت روا بن بیٹھیں گے اور خود مشکل کشائی کا نعرہ لگائیں گے۔

اللہ کا راستہ اور نیک حضرات قابلِ تقلید ہیں:

اللہ پاک نے سورۂ فاتحہ کے اندر ہمیں جامع دعا سکھلائی ہے۔ اور اللہ پاک نے صراط کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ فرمایا:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ [الانعام: ۱۵۳]

"یہ میرا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا اس کے پیچھے چلو۔"

اور صراط کی نسبت ایمان والے لوگوں کی طرف بھی فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾ [الفاتحۃ: ۶]

"رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔"

خلاصہ کے طور پر دو چیزیں یاد رکھ لیں کہ ایک ہے کتاب اللہ اور دوسرے ہیں رجال اللہ۔ ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑ لو تو منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔ بعض لوگوں نے کتاب اللہ کو تو پکڑ لیا، لیکن رجال اللہ کو چھوڑ دیا اور بعض لوگوں نے رجال اللہ کا دامن پکڑ لیا، لیکن کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں راستے سے بھٹک گئے۔ کیونکہ اگر صرف کتاب اللہ کافی

ہوتی تو اللہ اپنے انبیاء علیہم کو کیوں بھیجتے؟ صرف کتاب نازل فرماتے۔ اور دوسرے گروہ نے رجال اللہ کو پکڑ لیا کہ میرا پیر کامل ہے، قلندر ہے، وہ درجہ قیوم کو پہنچ گیا ہے، میرے مرشد کی نظر سے لوگ ولی بنتے ہیں، وہ جس کو گالیاں دے تو وہ تباہ ہو جاتا ہے، وہ جدھر اشارہ کر دے اس کا کام ہو جاتا ہے۔ انہوں نے رجال کو پکڑا اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا تو بھٹک گئے۔ راستے پر وہ رہے جنہوں نے کتاب اللہ کو بھی پکڑا اور اللہ کے بندوں سے بھی اپنا تعلق جوڑ لیا۔ انہوں نے رجال اللہ کو کتاب اللہ کی روشنی میں دیکھا کہ یہ خود قرآن وسنت پر عامل ہے یا نہیں؟

کونسا فرقہ کامیاب ہوگا؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے، ایمان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اصحاب رسول اللہ ہیں۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صدیقیت کا قائل نہ ہو وہ بھی ایمان پر نہیں ہوگا۔ کیونکہ ''مُنعَمْ عَلَیْہِمْ'' میں صدیقین بھی ہیں۔ اور صدیق کا درجہ پہلا ہے۔ جو صدیق کا منکر ہوگا وہ صدیقین کا منکر ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت تہتر گروہوں میں بٹ جائے گی۔ (یاد رکھیں! تہتر گروہوں سے مراد بڑے بڑے گروہ ہیں۔) فرمایا:

((كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً))

''تمام کے تمام فرقے جہنم میں جائیں گے، لیکن ایک فرقہ جنت میں جائے گا۔''

صحابہ نے پوچھا کونسا فرقہ جنت میں جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۶۴۱، باب: مَا جَاءَ فِي افْتِرَاقِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ]

''وہ فرقہ جنت میں جائے گا جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہوگا۔''

سب کے لیے ہدایت طلب کرو:

علماء نے فرمایا ہے کہ ''اِهْدِنَا'' جمع کا صیغہ لائے ہیں، مفرد کا نہیں لائے۔ کیونکہ جب کہا کہ تمام محامد تیرے لیے ہیں، ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) جمع کا صیغہ ہے۔ جب عبادت کرنے اور مدد مانگنے میں جمع کا صیغہ ہے تو ہدایت میں بھی جمع کا صیغہ ہے کہ یا اللہ! ہم سب کو

ہدایت عطا فرما۔

اور بعض علماء نے فرمایا: اس کے اندر یہ حکمت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ایسی زبان سے دعا مانگا کرو جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! دنیا کے اندر کون ایسا بندہ ہو سکتا ہے جس نے غلطی نہ کی ہو؟ اللہ کے نبی تو معصوم ہو سکتے ہیں، لیکن اور تو کوئی معصوم نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دوسروں کے لیے دعا مانگا کرو اور وہ تمہارے لیے دعا مانگا کرے۔ آپ کا دامن اور زبان تو میرے لیے پاک ہے۔ آپ جب میرے لیے دعا کر رہے ہیں اور زبان میرے لیے پاک ہے۔ اس لیے تم سب کے لیے دعا کیا کرو۔

مقبول دعا کا طریقہ:

فرمایا: جب انسان سب کے لیے دعا کرتا ہے تو اللہ کی رحمت زیادہ شامل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ہمیں دعا کے اندر حکم دیا گیا کہ اوّل و آخر درود پڑھیں اور درمیان میں اپنی دعا رکھیں۔ کیونکہ ہماری دعا ایسی ہے کہ قبول ہو یا نہ ہو، لیکن درود تو ضرور قبول ہوگا۔ جب دعا کا اوّل اور آخر قبول ہوگا تو درمیان کی دعا بھی اللہ کی رحمت سے ضرور قبول ہو جائے گی۔ اس لیے ہمیں ہر جگہ ایسی دعائیں سکھلائی گئیں جو ہم صرف اپنے لیے نہ مانگیں، بلکہ عالم اسلام کے لیے مانگیں۔ مثلاً:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾﴾ [البقرة:۲۰۱]

"اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔"

((اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا ، وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا ، وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا ، وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا ، اللّٰهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الْإِسْلَامِ ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الْإِيمَانِ))

[سنن ابی داود، حدیث:۳۲۰۱، باب: الدُّعَاءِ لِلْمَيِّتِ]

"اے اللہ! ہمارے زندوں و مردوں، حاضر و غائب، چھوٹوں و بڑوں اور مردوں اور عورتوں کی بخشش فرما۔ اے اللہ! ہم میں سے جسے زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھ اور جسے موت دے اسے ایمان پر موت دے۔"

اسی طرح یہاں بھی ہمیں جامع دعا سکھلائی گئی:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۶﴾﴾

[الفاتحہ:۵تا۷]

''ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔ ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں۔''

اور آخر میں آمین آیا ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا ہے کہ آمین سورۂ فاتحہ کا حصہ نہیں ہے۔ لیکن سنت اور مستحب عمل یہی ہے کہ جب آدمی سورۂ فاتحہ پڑھے تو آمین کہے۔ اور اس سے یہ بھی سبق ملا کہ آدمی جب بھی دعا کرے تو پہلے آدمی اللہ کی حمد و ثنا کرے، درود پڑھے، پھر اپنی بندگی کا اعتراف کرے، اپنی عاجزی کا اظہار کرے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے۔

اسی طرح یہ بھی سبق ملا کہ جب ہم دعائیں مانگیں تو ان کے اندر اخلاص پیدا کریں۔ اور سب سے عظیم دعا سورۂ فاتحہ ہے۔

وضاحت

یہاں تک حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی ﷾ کے ان دروس کا اختتام ہو رہا ہے جو آپ ﷾ نے مسجد مستشفیٰ مکہ مکرمہ میں ارشاد فرمائے تھے۔ اب آگے حضرت ﷾ کے ان دروس کا آغاز ہو رہا ہے جو آپ مسجد حرام کعبہ شریف میں درسِ تفسیر ابنِ کثیر کے طور پر بیان فرماتے ہیں۔

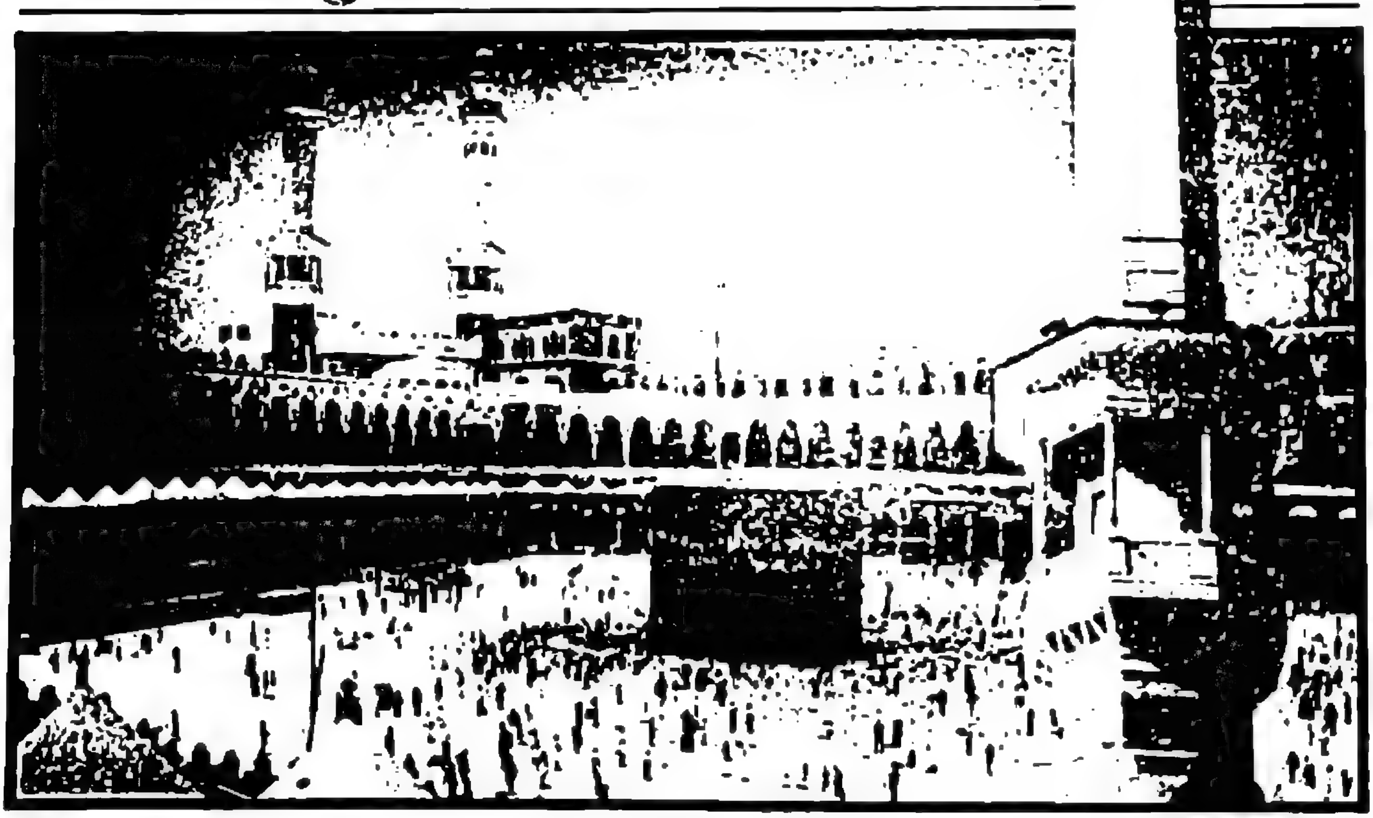
ان دونوں کا تعلق چونکہ سورۂ فاتحہ سے ہے اس لیے ان کو یکجا کیا گیا ہے۔ چونکہ ہر ایک درس میں مستقل طور پر بہترین علمی تفاسیر، نکات، مسائل اور فضائل موجود ہیں اس لیے ان دونوں کو اس ایک جلد میں شامل کر دیا گیا ہے۔

تفسیر کے اس حصے میں زیادہ تر عبارات تفسیر ابنِ کثیر سے لی گئی ہیں، اس لیے ان کا حوالہ بھی درج نہیں کیا گیا۔ اور باقی کتب کی عبارات کم ہیں، اس لیے بعض دوسری عبارات کے حوالے درج کیے گئے ہیں۔

تفسیرِ انوار الحرم

(حصہ دوم)

دروسِ تفسیرِ ابنِ کثیر



"سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ"

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ① الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ②﴾

"تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہان کا پروردگار ہے۔ بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔"

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ③ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ④﴾

"روزِ جزا کا مالک ہے۔ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد چاہتے ہیں۔"

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑤ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾

"ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام فرمایا۔"

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑦﴾ [الفاتحہ: ۱ تا ۷]

"جن پر نہ تو تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔"

[redacted]

سورۂ فاتحہ کی وجہ تسمیہ:

مفسر ابنِ کثیر رحمہ اللہ فاتحہ الکتاب کے بارے میں، سورۃ الفاتحہ کے فضائل کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ مکی ہے، یعنی قبلِ ہجرت نازل ہوئی۔ اس کی سات آیتیں ہیں۔ فاتحہ کو فاتحہ اس لیے کہتے ہیں کہ ابتدائے کتاب کے اندر اول شئی فاتحہ ہے اور اسی کے ساتھ نمازوں کی ابتداء بھی ہوتی ہے۔ نمازوں کی ابتداء میں بھی فاتحہ ہے، قرآن کی ابتداء میں بھی فاتحہ ہے۔ اسی لیے اس کا نام فاتحہ ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

فاتحہ کا نام ''اُمُّ الْكِتَابِ'' کیوں؟

اور اسی فاتحہ کا نام ''اُمُّ الْكِتَابِ'' بھی ہے۔ ''اُمُّ الْكِتَابِ'' کا معنی ایسی کتاب جس کے اندر ساری کتابوں کا علم جمع ہو، جیسے ماں اصل ہوتی ہے، یعنی وہ اصل کتاب ''اُمُّ الْكِتَابِ'' ہے۔ اسی لیے اس فاتحہ کا نام بھی ''اُمُّ الْكِتَابِ'' ہے۔ جیسے آپ نے الحمد اللہ! خلاصۂ درس میں پڑھا ہے کہ سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے، لہٰذا ایک نام اس کا ''اُمُّ الْكِتَابِ'' بھی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

بعض علماء نے ''اُمُّ الْكِتَابِ'' نام پسند نہیں کیا:

اب مفسر ابنِ سیرین رحمہ اللہ اور حسن بصری رحمہ اللہ کے بارے میں فرماتے ہیں: ''كَرِهَا تَسْمِيَتَهَا بِذَالِكَ'' (ان دونوں حضرات نے ''اُمُّ الْكِتَابِ'' نام رکھنے کو ناپسند کیا ہے)۔ کیونکہ ابنِ سیرین رحمہ اللہ اور حسن بصری رحمہ اللہ کی

رائے میں "اُمُّ الْکِتَابِ" "لوحِ محفوظ" ہے، جس کے اندر ساری چیزیں ہیں، تمام دنیا کے علوم اللہ نے اس کے اندر محفوظ فرما دیے ہیں۔ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں دراصل "اُمُّ الْکِتَابِ" "آیاتِ محکمات" کا لقب ہے۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

کیا "اُمُّ الْقُرْاٰنِ" نام صحیح ہے؟

اور اسی طرح ان کے نزدیک "اُمُّ الْقُرْاٰنِ" نام رکھنا بھی جائز نہیں، بلکہ مکروہ ہے۔ اب مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سنن الترمذی میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث نقل کی ہے اور سنداً بھی اس کی توثیق فرمائی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ پوری سورۂ فاتحہ "اُمُّ الْقُرْاٰنِ" بھی ہے، "اُمُّ الْکِتَابِ" بھی ہے اور اس کا لقب "سَبْعَ مَثَانِیْ" بھی ہے۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۱۲۴، سنن أبی داود، حدیث: ۱۴۵۷، باب: فاتحۃ الکتاب]

اور اسی سورت کا نام "حمد" بھی ہے، "صَلٰوۃ" بھی ہے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات (حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ) کو یہ حدیث نہیں پہنچی۔ ان کو وہ احادیث پہنچی ہیں جن میں "اُمُّ الْکِتَابِ" وغیرہ لوحِ محفوظ اور آیاتِ محکمات کو کہا گیا ہے۔ اگر ان کو وہ حدیث مبارکہ پہنچ جاتی جو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بسندِ صحیح "عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ" نقل فرمائی ہے تو وہ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہ فرماتے اور یہ نہ کہتے کہ اس سورت کا نام "اُمُّ الْکِتَابِ" رکھنا مکروہ ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

احرام کھولنے سے پہلے سر منڈانے کا مسئلہ:

تو اصل وجہ یہی ہوتی ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ظاہر حدیث پر نظر ڈال لی کہ ایک حدیث مبارک آئی کہ نماز فاتحہ کے بغیر نہیں ہوتی، باقی چیزیں ان کی نظر مبارک سے نہ گزریں۔ اس لیے یہ نہیں ہوا کہ...... نعوذ باللہ!...... انہوں نے نہیں سمجھا یا عمداً انہوں نے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا۔ اب دیکھیں! جیسے بالوں کے معاملے میں تینوں امام ایک طرف ہیں اور اکیلے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف ہیں۔ یعنی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور علماء محدثین اس طرف گئے ہیں کہ اگر آدمی عمرہ کرے یا حج کرے تو پورے سر پر استرا

پھروائے یا اگر بال کٹوانا چاہتا ہے تو وہ اتنے بال کٹوائے کہ کم از کم یہ معلوم ہو کہ سر کے چوتھے حصے کے بال کٹ گئے ہیں۔ لیکن امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہیں، اگر کسی نے دو بال کاٹ لیے، تین بال کاٹ لیے تو کافی ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ تین بالوں کو پکڑ کر یوں کھینچ دے تب بھی عمرے سے فارغ ہو گیا۔ ان تین بالوں کے سرے کسی چیز سے کاٹ ڈالے تب بھی وہ کہتے ہیں کہ عمرے سے فارغ ہو گیا۔ اب ائمہ ثلاثہ اس مسئلے میں ان کے خلاف ہیں۔ جہاں تین ائمہ کا فہم اور علم پہنچے گا وہاں ایک کا علم تو نہیں پہنچے گا؟ لیکن اس کے باوجود ہم کہتے ہیں "رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْهِ" اللہ ان پر رحمت فرمائے کہ ان کے اجتہاد مبارک میں یہ بات آگئی کہ قرآن کہتا ہے:

﴿مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ﴾ [الفتح: ۲۷]

"سروں کو منڈوانے والے اور سروں کو کتروانے والے۔"

وہ فرماتے ہیں: جب تین بال کاٹے تو کٹوانے والوں میں شامل تو ہو گیا۔

بہر حال قرآن کریم کے اس لفظ ﴿مُقَصِّرِيْنَ﴾ میں وہ آ گیا، اگر تین بال بھی نہ کٹواتا تو ﴿مُقَصِّرِيْنَ﴾ میں نہ آتا۔ جب تین بال کٹوا لیے تو ﴿مُقَصِّرِيْنَ﴾ کی صف میں شامل ہو گیا۔ جب شامل ہو گیا تو احرام سے نکل گیا۔ باقی ائمہ فرماتے ہیں: بھئی! ﴿مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ﴾ (سروں پر استرا پھروانا) حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ تھوڑا استرا یہاں پھیر و اور باقی نہ پھیرو، یا ایک طرف پھیرو اور باقی نہ پھیرو۔ کیونکہ یہ مثلہ ہے۔ جیسے کسی مردے کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا حرام ہے، اسی طرح اپنے سر میں بالوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا کہ ایک طرف سے کاٹ لیے جائیں اور دوسری طرف کے بال چھوڑ دیے جائیں اس طرح کرنا حرام ہے۔ یہ مثلہ ہے۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ حضور ﷺ نے کیا کیا؟ تین بال کاٹے یا استرا پھروایا؟ حضور ﷺ نے سارے سر پر استرا پھروایا ہے۔ اور جب سارے سر مبارک پر استرا پھروایا تو ائمہ نے فرمایا کہ پھر قینچی بھی تو سارے سر پر پھرنی چاہیے۔ تین بالوں پر کیوں کھڑی ہو جائے؟ اگر استرا سارے سر پر پھرتا ہے تو پھر قینچی بھی سارے سر پر پھرے۔ اور حضور ﷺ کا اپنا عمل اس آیت کی تفسیر ہے کہ اللہ نے جب حکم دیا کہ عمرے والے سر منڈوائیں تو حضور پاک ﷺ نے اپنے سارے بال سر سے اتروائے اور پھر وہ بال مبارک صحابہ رضی اللہ عنہم میں تقسیم بھی ہوئے اور اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر بھی حضور پاک ﷺ نے استرا پھروایا، اسی طرح صحابہ نے بھی استرا پھروایا۔ اور جن جن صحابہ سے بال کٹوانا ثابت ہے ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں ملتا جس نے تین بال کٹوائے ہوں۔ تو اس لیے اب ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک پورے سر

کے بال کاٹے جاتے ہیں۔

اور مشکل یہ ہے کہ لوگوں کو یہ مسئلہ بڑا آسان لگتا ہے کہ بال بھی نہیں کاٹنے پڑتے، فیشن میں بھی فرق نہیں آتا اور آدمی جلدی فارغ بھی ہو جاتا ہے اور عمرہ بھی ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی امام شافعی رحمہ اللہ کے قول پر عمل کر رہا ہے۔ دراصل کھڑے کھڑے وہاں پر قینچی لے کر آدمی جاتا ہے، تین بال کٹوا کر گھر آجاتا ہے، حالانکہ یہ نہیں سمجھتا کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک میرا احرام نہیں کھلا اور ابھی میاں بیوی کا ملنا حرام ہے، کیونکہ جب تک میں اپنے بال نہ کٹوالوں اس وقت تک میں احرام میں ہوں۔ کیونکہ ائمہ ثلاثہ اور جمہور ایک طرف ہیں، جمہور محدثین ایک طرف ہیں کہ یا بالوں پر استرا پھرواؤ یا بال زیادہ بڑے ہوں تو اتنے کٹواؤ کہ بالوں کا چوتھا حصہ کٹ جائے، ورنہ احرام نہیں کھلے گا اور اس پر دم پڑ جائے گا۔

بعض انفرادی اور اجتہادی مسائل:

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! بعض اوقات ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے اجتہاد ہوتے تھے، جیسا کہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اجتہاد مبارک تھا۔ بی بی صاحبہ فرماتی تھیں کہ مسئلہ یہ ہے کہ آدمی اگر کسی کا دودھ پی لے تو وہ ماں بیٹا بن جاتے ہیں، اس کی بیٹیاں اور بیٹے اس کے بھائی بہن بن جاتے ہیں۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، لیکن ان کی بہن بی بی اسماء رضی اللہ عنہا کی اولاد تھی۔ تو بی بی صاحبہ اگر کسی قریبی رشتے دار کے بارے میں چاہتیں کہ وہ میرے گھر میں، میرے سامنے آجائے اور مجھے پردہ نہ کرنا پڑے تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا بی بی اسماء رضی اللہ عنہا سے فرماتیں کہ تم ان کو دودھ پلا دو تو وہ اس کو دودھ پلا دیتیں، اس طرح وہ ان کی بہن کا رضاعی بیٹا اور ان کا رضاعی بھانجا ہو جاتا، لہٰذا بی بی صاحبہ پھر ان سے پردہ نہیں فرماتی تھیں۔

اب یہ بی بی صاحبہ کا تفرد ہے۔ اس مسئلہ میں تمام صحابہ، تمام ائمہ مخالف ہیں کہ دودھ کا اثر اس وقت ہوتا ہے جب دودھ پینے کی عمر ہو۔ دودھ پینے کی عمر ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ (پورے دو سال) ہے۔ یعنی بچہ پیدا ہونے کے بعد دو سال تک دودھ پیتا ہے۔ ایک قول مبارک میں اڑھائی سال تک بھی ہے۔ اگر بچے نے پیدا ہونے کے بعد دو سال کی عمر میں یا اڑھائی سال کی عمر میں کسی عورت کا دودھ پیا ہو اور صرف پستانوں کو منہ نہ لگایا ہو، بلکہ وہ دودھ اس کے پیٹ میں داخل بھی ہوا ہو تو پھر یہ اس کا رضاعی بیٹا کہلائے گا۔ اگر عمر اڑھائی سال سے گزر گئی اور تین سال، چار سال ہو گئی، اب لاکھ دودھ پیتا رہے، لیکن اب بیٹا نہیں بنے گا، کیونکہ اس کے دودھ پینے کی عمر ختم ہو گئی ہے۔ اس لحاظ

سے اب بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اس مسئلہ میں تفرد تھا اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کا اپنا ایک اجتہاد ہے۔ فرماتی تھیں کہ دودھ پینے سے بیٹا بن جاتا ہے، بڑا ہو تب بھی ٹھیک ہے، چھوٹا ہو تب بھی ٹھیک ہے۔ تو قرآن کی دوسری آیت پر بی بی صاحبہ نے نظر نہ ڈالی:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ [البقرۃ:۲۳۳]

''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں، یہ مدت ان کے لیے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہیں۔''

اور ایک قول یہ بھی ہے جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اڑھائی سال۔ وہ اس لیے کہ مدتِ حمل میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات چھ مہینے کا بچہ صحیح پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ حمل کے بعد چھ مہینے کا بچہ بھی صحیح پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ حمل کے چھ مہینے کے بعد بچہ پیدا ہو تو وہ زندہ رہ سکتا ہے، خدا کی قدرت ہے کہ آٹھ مہینے کا زندہ نہیں رہ سکتا اور پانچ کا بھی زندہ نہیں رہتا، چھ ماہ کا بچہ زندہ رہ سکتا ہے۔ ایسے کئی واقعات ہیں کہ چھ ماہ کے بچے ہوئے اور ٹھیک ٹھاک رہے۔

اب اگر حمل کے چھ مہینے ہو جائیں اور اس کے بعد پھر مدتِ رضاعت کو دیکھا جائے تو ﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ [الاحقاف:۱۵] (اور اس کو اٹھائے رکھنے اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہوتی ہے) دو سال میں چوبیس مہینے اور چھ مہینے یہ آ گئے، اڑھائی سال بن گئے۔ (اور یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ یہ آیت مذکورہ ان کے ضرور سامنے ہوگی، مگر وہ ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ کے الفاظ کو کم سے کم کامل مدت دو سال قرار دیتی ہوں اور زیادہ مدتِ رضاعت کی تحدید کی ان کے نزدیک کوئی حد نہ ہو۔ الور) اس لیے علماء نے اس میں دو قول لکھے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوتا کہ جی فلاں کو یہ مسئلہ سمجھ نہیں آیا، فلاں کو کیوں آیا؟ آج بھی یہ مسئلہ ہے کہ سو طالب علم پڑھتا ہے اور ایک کو سمجھ نہیں آیا۔ یا ایک آدمی کو جلدی سمجھ آ گیا یا آدمی کی فہم دور رس تھی، وہ مسئلے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ یا ایک آدمی نے مسئلہ سمجھا، لیکن اس کی باریکیاں نہیں سمجھ سکا تو کسی کا گلہ نہیں ہوتا اور کسی کا اعتراض نہیں ہوتا۔

اپنے اکابر کا احترام:

لیکن فرق اتنا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے امام شافعی رحمہ اللہ کی فقہ پڑھی ہے تو لازمی بات ہے کہ وہ امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں اور جن لوگوں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی فقہ پڑھی ہے تو وہ اپنے امام کے قول کو ترجیح

دیتے ہیں۔ اس طریقے سے امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔ آدمی نے جس استاذ سے علم حاصل کیا ہو اس استاذ کا احترام زیادہ کرتا ہے، لیکن دوسرے علماء کا انکار نہیں کرتا کہ اور دنیا میں عالم کوئی نہیں۔ دنیا میں لاکھوں عالم ہوتے ہیں، لیکن ہم نے جن سے علم پڑھا ہے ہم پر ان کا احسان زیادہ ہے، ہم پر ان کا فضل اور ان کا کرم زیادہ ہے۔ جن کی کتابوں کو دیکھ کر ہم نے دین سیکھا ہے ان کی بات کو مقدم سمجھیں گے، ان کی تحقیق کو زیادہ افضل جانیں گے اور اولیٰ سمجھیں گے، لیکن دوسروں کو بلا وجہ غلط نہیں کہیں گے۔

سورۂ فاتحہ کے مختلف نام:

- ......لہٰذا حدیث پاک میں یہ بات واضح ہوگئی کہ سورۂ فاتحہ کا نام "فَاتِحَةٌ" بھی ہے۔
- ......"أُمُّ الْكِتَابِ" بھی ہے۔
- ......"أُمُّ الْقُرْآنِ" بھی ہے۔
- ......"سَبْعُ الْمَثَانِيْ" بھی ہے، کیونکہ اس سورت کی سات آیات ہیں۔ اور یہ سورت بعض ائمہ کے نزدیک "نُزِلَتْ مَرَّتَيْنِ مَرَّةً بِمَكَّةَ وَ مَرَّةً بِالْمَدِيْنَةِ الْمُنَوَّرَةِ" (دو مرتبہ نازل ہوئی ہے: ایک مرتبہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے۔) اور بعض علماء نے فرمایا کہ "مَثَانِيْ" کا معنی ہوتا تکرار۔ تکرار کا معنی یہ ہے کہ ہر نماز میں اس کو پڑھا جاتا ہے اور بار بار اس کو پڑھا جاتا ہے، اس لیے اس کا نام "سَبْعُ الْمَثَانِيْ" بھی ہے۔
- ......اور اس کا نام "حَمْد" بھی ہے، کیونکہ اس میں اللہ کی حمد و ثنا ہے۔
- ......اور اس کا نام "اَلصَّلٰوةُ" بھی ہے، کیونکہ ہر نماز کے اندر یہ پڑھی جاتی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: "لِقَوْلِهٖ ﷺ عَنْ رَبِّهٖ:" حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کا قول نقل فرماتے ہیں:

((قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ، وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ، فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ...الخ))

[صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، باب: وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ...]

"فاتحہ میرے اور بندے کے درمیان تقسیم ہے۔ جب بندہ کہتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہاں میرے بندے نے میری حمد بیان کی، جب بندہ کہتا ہے: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری صفات کا اقرار و اعتراف کیا ہے، میری تعریف کی ہے۔ جب بندہ کہتا ہے: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "مَجَّدَنِيْ عَبْدِيْ" (میرے بندے نے میری بزرگی اور میری بڑائی کا اقرار کیا

ہے،اس نے اعتراف کیا ہے کہ میں روزِ جزا کا مالک ہوں۔) جب بندہ کہتا ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (تیری ہی عبادت کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگیں گے۔) اللہ فرماتے ہیں: یہ میرے بندے کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد سوال آ گیا: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (ہمیں صراطِ مستقیم عطا فرما۔) اس لیے فرمایا: یہ سورت میرے اور بندے کے درمیان آدھی آدھی ہے۔ وہ صرف میری عبادت کرے گا تو قبول کروں گا، مجھ سے مدد مانگے گا تو میں اس کی مدد کروں گا اور مجھ سے سیدھا راستہ مانگے گا تو میں اس کو ہدایت دوں گا۔

یہاں امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے مکمل حدیث نقل نہیں کی، صرف ایک ٹکڑا نقل کیا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

سورۂ فاتحہ زہر میں بھی شفا ہے:

''فَسُمِّيَتِ الْفَاتِحَةُ صَلَاةً؛ لِأَنَّهَا شَرْطٌ فِيهَا''

''سورۂ فاتحہ کا نام صلوۃ بھی ہے، اس لیے کہ یہ نماز میں شرط ہے۔''

''وَيُقَالُ لَهَا الشِّفَاءُ لِمَا رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ مَرْفُوعًا''

''اس سورت کا نام سورۃ الشفا بھی ہے۔''

دارمی نے فضائل القرآن میں ایک حدیث مبارک لکھی ہے۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فِي فَاتِحَةِ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِنْ كُلِّ دَاءٍ'' (سورۂ فاتحہ ہر بیماری کی شفا ہے)۔ کوئی زہر بھی اثر کر رہا ہو، فاتحہ پڑھ کر پلاؤ، ان شاء اللہ! شفا حاصل ہو گی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

سورۂ فاتحہ دم بھی ہے:

''وَيُقَالُ لَهَا الرُّقْيَةُ لِحَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ فِي الصَّحِيحِ حِينَ رَقَى بِهَا الرَّجُلَ السَّلِيمَ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: وَمَا يُدْرِيكَ أَنَّهَا رُقْيَةٌ؟'' [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

''اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے اس کو ''اَلرُّقْيَةُ'' کہا جاتا ہے۔ جب انہوں نے سورت فاتحہ کے ذریعے سے ایک آدمی کو دم کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ ''اَلرُّقْيَةُ'' ہے؟''

''اَلرُّقْيَةُ'' جیسے اردو زبان میں منتر کا لفظ بولتے ہیں۔ جو کسی بیماری کے لیے دعا پڑھی جائے اس کا نام عربی میں

"اَلرُّقْیَۃُ" ہے۔

مفسر ؒ نے اس کو تفصیلاً نقل نہیں کیا۔ واقعہ یوں ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت کہیں جا رہی تھی، راستے میں ایک بستی آئی، وہیں رات پڑ گئی...... قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسافر ہے تو وہ بستی والوں سے کھانا لے سکتا ہے۔ یعنی یہ بھیک مانگنا نہیں ہوگا، بلکہ یہ ہر مسلمان کا ایک دوسرے پر حق ہے، ہر مسافر کا گھر والے پر یہ حق ہے...... تو صحابہ ؓ نے بستی والوں کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ ہم مسافر ہیں، آپ ہمارے کھانے کا انتظام کریں۔ بستی والوں نے کہا: ہمارے پاس کوئی کھانا نہیں ہے۔ صحابہ ؓ خاموش ہو گئے کہ کوئی کھانا نہ دے تو آدمی زبردستی تو نہیں لے سکتا۔

رات کا کچھ وقت گزرا تو بستی والے کچھ لوگ بھاگتے بھاگتے آ گئے اور کہنے لگے: ہمارے سردار کو بچھو نے ڈس لیا ہے، وہ بڑی شدید تکلیف میں مبتلا ہے، تم لوگوں میں سے کوئی ایسا آدمی ہے جس کو کوئی دعا آتی ہو؟ کوئی رقیہ آتا ہو تو وہ پڑھ دے؟ اور اس کو شفا ہو جائے۔ ایک صحابی نے کہا: مجھے آتا تو ہے، میں پڑھ بھی سکتا ہوں، لیکن پڑھتا نہیں ہوں۔ تم لوگوں نے ہماری عزت نہیں کی، ہم تمہاری عزت کیوں کریں؟ ہم مسافر تھے، ہم نے کھانا مانگا، تم لوگوں نے احترام نہیں کیا اور ہمارا حق بھی نہیں دیا، ہم کیوں پڑھیں؟ اس نے کہا: مہربانی کرو، معاف کر دو۔ اب تو آدمی کو غرض پڑ گئی تھی۔ انہوں نے کہا: میں ایک شرط پر پڑھوں گا کہ تم تیس بکریاں مجھے دو۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، ہم دیں گے۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، تم مجھے اپنا وہ مریض دکھاؤ۔ مریض کے پاس آئے، صحابی نے کچھ پڑھا اور اللہ کی مہربانی سے شفا ہو گئی۔

اللہ کا قرآن ہو، صحابہ ؓ کی زبان ہو۔ یعنی زبان بھی پاک اور قرآن بھی پاک ہو تو شفا ہونے میں دیر لگتی ہے؟ آج مشکل مسئلہ یہ ہے کہ قرآن پاک ہے، لیکن ہماری زبانیں ناپاک ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کی خدمت میں ایک آدمی آیا، اس نے کہا: حضرت عمر ؓ پہلے فاتحہ پڑھتے تھے، آیۃ الکرسی پڑھتے تھے تو شفا ہو جاتی تھی، آپ پڑھتے ہیں تو اتنا فائدہ نہیں ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ نے فرمایا: بھئی! قرآن تو وہی ہے، لیکن میں عمر ؓ والی زبان کہاں سے لے آؤں؟ حالانکہ یہ حضرت عمر ؓ کے بیٹے ہیں اور اپنے وقت کی بات کر رہے ہیں، ہم تو چودہ سو سال اور پیچھے آ گئے ہیں، ہمارے ایمان تو اور بھی کمزور ہو گئے ہیں، ہماری تو عقل اور حرام ہو گئی، لباس ہی حرام کے ہو گئے، ہمارے کھانے مشتبہ ہو گئے، ہماری زبان پر غیبت آ گئی، جھوٹ آ گیا اور مختلف مشاغل آ گئے، اس لیے ہماری زبان سے قرآن کا اثر نہیں ہوتا۔ تو اصل میں ہماری زبان ہی کا قصور ہوتا ہے، ورنہ اللہ کا قرآن تو

قرآن ہے۔

توصحابی نے پڑھا، پھونک ماری اور وہ ایک منٹ میں ٹھیک ہوگیا۔ انہوں نے کہا: تیس بکریاں دے دو۔ بکریاں لے لیں۔ اب بعض صحابہ نے کہا: اللہ نے کھانا دیا ہے تو دو چار بکرے کاٹو اور کھاتے ہیں۔ بعض صحابہ نے کہا: تم کھاؤ، ہم تو نہیں کھاتے، کیونکہ اس نے قرآن پڑھ کر یہ اجرت لی ہے، بکریاں لی ہیں، زبردستی لے آیا ہے۔ اس نے پہلے طے کیا تھا کہ تیس بکریاں دو گے تو میں پڑھوں گا۔ یہ کوئی ہدیہ بھی نہیں بنتا۔ اس لیے ہم تو نہیں کھاتے جب تک حضور ﷺ کی خدمت میں نہ چلے جائیں۔ بہر حال کچھ صحابہ نے اس میں سے کھایا اور کچھ نے زیادہ احتیاط فرمائی اور نہ کھایا۔

حضور ﷺ کی خدمت میں آئے، آ کر عرض کیا کہ حضور! ایسے ایسے واقعہ ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا! یہ بتاؤ تم نے کیا پڑھا تھا؟ صحابی نے عرض کی: حضور! میں نے فاتحہ پڑھی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں پتا تھا کہ اگر زہر والے آدمی پر فاتحہ پڑھی جائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے؟ اس نے کہا: میں نے آپ سے سنا تھا کہ یہ سورت رقیہ بھی ہے، سورۃ الشفا بھی ہے۔ تو وہ نام میرے دماغ میں تھا، اس کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے پڑھ دیا اور اللہ نے شفا عطا فرمادی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا! ان بکریوں کا کچھ گوشت تمہارے پاس باقی ہے؟ کہا: جی ہاں! گوشت ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: میرے لیے بھی لے آؤ، مجھے بھی کھلاؤ۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۵۷۳۶، باب: الرُّقَی بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ]

یعنی حضور ﷺ نے یہ اس لیے فرمایا کہ ان کی تسلی ہو جائے کہ یہ خالص حلال ہے۔ اگر اس میں کروڑواں حصہ بھی شبہ ہوتا تو میرے مدنی پاک ﷺ کبھی نہ کھاتے۔ اس وجہ سے بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر ہم کسی کو صلوات پڑھتے ہیں، دعا پڑھتے ہیں تو اس پر پیسے لینا جائز ہے، کیونکہ یہ حدیث مبارکہ میں موجود ہے۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو صحابہ کو حضور ﷺ منع فرما دیتے۔ جب صحابہ کو منع نہیں فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جائز ہے۔ بہر حال سورۃ فاتحہ شفا ہے۔ بعض علماء نے اس سے بھی استدلال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴾ [الاسراء: ۸۲]

''اور ہم وہ قرآن نازل کر رہے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت کا سامان ہے۔''

علماء نے فرمایا: جب اللہ کا قرآن روحانی بیماریوں کے لیے شفا ہے تو جسمانی بیماری تو کوئی چیز ہی نہیں ہوتی۔

اصل تو روحانی بیماری ہے نا! شرک جیسی بیماری، حسد جیسی بیماری، غیبت جیسی بیماری اور بدعت جیسی بیماری۔ جب قرآن ان بیماریوں کو توڑ پھوڑ کر فنا کر دیتا ہے اور بندے کو ٹھیک مسلمان بنا دیتا ہے تو یہ جسمانی بیماریاں تو معمولی چیز ہیں۔ اس لیے انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے اس میں شفار کھی ہے اور اسی لیے یہ بھی ثابت ہے۔

کیا کیا چیز دم کر سکتے ہیں؟

''مُعَوِّذَتَیْن'' کا پڑھنا بھی ثابت ہے، سورۃ البقرۃ کی آخری تین آیات کا پڑھنا بھی ثابت ہے اور ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾، ﴿قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ﴾، ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ کا پڑھنا بھی ثابت ہے۔ بس اب یاد رکھو! احتیاط کیا ہے؟ اس میں علماء کی فہم علیحدہ ہو گئی۔

بعض علماء نے فرمایا: جس جس آیت کی حضور ﷺ نے بیماری کے لیے، سحر کے لیے، جنات کے لیے اور جادو کے لیے پڑھنے کی اجازت فرمائی ہے بس اسی کو پڑھا جائے۔ بس اب وہی سمجھ کی بات آگئی۔ انہوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾، ﴿قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ﴾، ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾۔ یہ سورتیں پڑھا کرو اور بدن پر دم بھی کیا کرو۔ اسی طرح آیت الکرسی کے بارے میں بھی حضور ﷺ نے فرمایا ہے اور سورت فاتحہ کے بارے میں بھی حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔ اب بعض ائمہ، بعض محدثین اور بعض علماء صرف انہی تک محدود ہو گئے ہیں۔

اور بعض علماء نے فرمایا ہے: اگر ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ بھی قرآن ہے، ﴿قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ﴾ بھی قرآن ہے، ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ بھی قرآن ہے، ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ بھی قرآن ہے، آیت الکرسی بھی قرآن ہے اور سورۂ فاتحہ بھی قرآن ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ قرآن جہاں سے بھی پڑھو سارا قرآن پڑھنا جائز ہو گیا۔ جب ایک حصہ پڑھنا جائز ہے تو دوسرا کیوں ناجائز ہے؟ تو مقصد یہ ہوا کہ قرآن کا پڑھنا جائز ہے۔ اس لیے بعض علماء ایسا کرتے تھے کہ کوئی بیمار آ گیا تو جو آیت اس کے مطابق ہوتی تھی وہ پڑھ دیتے یا اس کو بتلا دیتے کہ جاؤ یہ آیت پڑھا کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے حال پر رحم فرما دیں گے۔ یعنی کوئی درد والا آدمی آیا اس کی مناسبت سے وظیفہ بتا دیا۔ جیسے اگلے دن کسی نے لکھا کہ اگر کسی کو بخار آ گیا اور اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مناسبت والی آیت پڑھ لی کہ آگ ٹھنڈی ہوئی ہے تو بخار کی آگ بھی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب قرآن پاک کی بعض سورتوں کے پڑھنے کا حکم حدیث میں موجود ہے تو گویا حدیث میں اصل تو آ گئی۔ جب اصل آ گئی تو باقی آیات ہم

مناسبت سے پڑھیں گے تو ٹھیک ہے۔

بعض نے فرمایا کہ نہیں ہم تو احتیاط کریں گے کہ حضور ﷺ نے جو فرمایا اور جتنا فرمایا اتنا تو پڑھیں گے اور جو نہیں فرمایا وہ ہم نہیں پڑھیں گے۔

بس ایک فہم کا اختلاف ہے، ورنہ ان دونوں کے اندر کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے آپ کہہ سکیں کہ انہوں نے بڑی غلطی کی ہے، یا وہ بڑی غلطیوں میں مبتلا ہیں۔

لوگوں کو اسلام کے قریب کرنے کا ایک طریقہ:

اصل میں مشکلات یہ ہوتی ہیں کہ بعض اوقات اہلِ حق لوگوں کو اہلِ باطل سے چھڑانے کے لیے معاملات میں نرمی برتتے ہیں۔ اور بعد میں آنے والے پھر اس کے اندر غلط چیزیں داخل کر دیتے ہیں۔ جیسے آج سے دو سو تین سو سال قبل جو علماء اہل اللہ عرب سے عجم کے اندر تشریف لے گئے اور ان کو عجم میں جا کر ہندوؤں کا مقابلہ، سکھوں کا مقابلہ، بدھ مت کا مقابلہ، سورج پرستوں کا مقابلہ اور آتش پرستوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہاں لوگ مختلف مصیبتوں میں گھرے ہوئے تھے اور غلط قسم کے پادریوں اور پنڈتوں کے پاس جاتے تھے تو انہوں نے ان کو وہاں سے نکالنے کے لیے کچھ راستے بنائے کہ کسی طرح لوگ ہمارے قریب تو آئیں۔ جب قریب آئیں گے تو ہم ان کو حق بات بھی سمجھا دیں گے۔ وہ تو الحمدللہ! کامیاب رہے، انہوں نے لاکھوں لوگوں کو کفر سے اسلام میں داخل کیا۔

اس زمانے کے لوگوں کا حال:

لیکن بعد والوں میں یہ چیز نہ رہی، انہوں نے اصل بات دین والی خدمت تو چھوڑ دی اور صرف بدعات میں رہ گئے کہ انہوں نے کہا: بس سب کچھ ٹھیک ہے، یہ قوالی ہو جاتی ہے، یہ گانا بجانا بھی ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ تعویذ تھوک کے حساب سے لکھ کر رکھ لیے اور یہ تعویذ بھی چل رہے ہیں اور کہیں دھاگے چل رہے ہیں اور کہیں جناب انگوٹھیاں ہیں وہ چل رہی ہیں اور کہیں کڑے چل رہے ہیں۔ اصل میں پھر یہ ایک پیٹ پالنے کا مسئلہ بن گیا، کیونکہ وہ علم تو ختم ہو گیا، وہ فضل تو ختم ہو گیا اور اہلِ حق چلے گئے۔ اب جو اہلِ ہوئی تھے ان کے سامنے تو صرف دولت تھی، ان کے سامنے نہ دین تھا، نہ اللہ کی اطاعت تھی اور نہ سنتِ رسول اللہ ﷺ تھی، لہٰذا وہ لوگ پھر گمراہیوں میں ڈوبتے چلے گئے۔ اب آپ مزارات پر جائیں تو کہیں چھلے بکتے ہیں کہ جی ہاتھ میں ہیں تو بواسیر ختم

ہو جاتی ہے تو پھر خوامخواہ ڈاکٹر، آپریشن کا جھگڑا ہی ختم۔ آسان مسئلہ ہے۔

اچھا! اس کے مقابلے میں انگریزوں نے بھی ایک چین نکال دی۔ انہوں نے کہا: مسلمانوں کے پیر بنا رہے تھا تو ہم بھی بنا دیں۔ انہوں نے بھی ایک چین نکال دی ہے۔ کوئی میگنٹ قسم کی چیز ہے کہ وہ ہاتھ میں پہن لو تمہاری بیماریاں ختم ہو جائیں گی۔ انہوں نے کہا: ان کے پیر کر رہے ہیں تو ہم کوئی کم پیر ہیں؟ یہ تو بڑا بزنس ہے۔

اگر میں ویسے ہی کہوں کہ مجھ سے یہ انگوٹھی لے لو تو مجھ سے کوئی پانچ ریال میں بھی نہیں لے گا۔ اور اگر میں کہوں یہ تو جناب رات داتا دربار سے مجھے ملی ہے تو آپ دو لاکھ میں بھی خرید لیں گے۔ بس دماغ میں ایک بات ڈالنی ہے کہ میں رات کو وہاں گیا تھا، میں نے وہاں جا کر اعتکاف کیا، مراقبہ کیا، میں وہاں بیٹھا رہا اور مجھے حضرت نے حکم دیا کہ فلاں جگہ تمہارے لیے انگوٹھی پڑی ہے وہ اٹھا لو۔ تو میں نے جا کر اٹھا لی، یہ وہ انگوٹھی ہے۔ ابھی کئی پاگل خریدنے والے نکل آئیں گے۔ کہیں گے: سبحان اللہ! کیا بات ہے! مہربانی کرو حضرت! یہ انگوٹھی دو لاکھ میں مجھے دے دو۔ حالانکہ ہے بالکل جھوٹ۔

تو اس طرح پھر یہ سارے کاروبار بن گئے۔ کہیں دھاگے بک رہے ہیں، کہیں ٹوپیاں بک رہی ہیں، کہیں گلے میں ڈالنے والے پھندے بک رہے ہیں اور کہیں جناب رسیوں میں گرہیں لگی ہوئی ہیں وہ بک رہی ہیں، وہ گلے میں ڈال رہے ہیں۔ کہیں بڑے، بڑے پتھر بک رہے ہیں، کہیں لوہے کے بید بک رہے ہیں۔ یہ سب پیٹ پالنے کا ذریعہ ہیں، ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ وجہ کیا ہے؟ وہ اللہ والے چلے گئے اور ہم جیسے غلط لوگ رہ گئے اور ہم نے ان کی دین والی خدمت ختم کر دی اور جو روٹی والا مسئلہ تھا وہ ہم نے ان کے نام سے حل کر لیا۔ ہم نے کہا: دین کا کام تم کر گئے، اب قیامت تک تمہارے نام سے روٹیاں ہم کھاتے رہیں گے۔ تم زندہ ہوتے تو ہم تمہیں بھی بیچ دیتے، لیکن خدا کی قدرت ہے کہ ہم تمہارے بعد پیدا ہوئے۔ یہ اتفاق ہے۔ اگر وہ اللہ کے ولی زندہ ہوتے تو یہ ان کا بھی سودا کر دیتے۔ سچی بات ہے، بھئی! خدا کے بندو! ایمان سے کہو! دیکھو حضور ﷺ کی پگڑی مبارک کی زیارت کے پیسے۔ اللہ کے نبی کی پگڑی بیچتے ہو؟ مجھے سمجھاؤ، حضور ﷺ کے بال مبارک ہیں، ان کی زیارت کے پیسے؟ بھئی! اللہ نے تو کعبے کی زیارت کے بھی پیسے نہیں رکھے۔ تم جہاز کا کرایہ بھرتے ہو، کعبے کے تو کوئی پیسے نہیں، یہ تو تم ہوائی جہاز میں بیٹھتے ہو۔ احرام باندھا ہوا ہوتا ہے، مزے سے سواری کرتے ہو۔ مزے سے سفر کرتے ہو، تمہارے آنے جانے اور سفر کے کرائے ہیں۔ کعبہ دیکھنے کے لیے الحمد للہ! تم سے کوئی پیسے نہیں مانگ رہا۔

یاد رکھو! ان اولیاء اللہ کا کوئی قصور نہیں۔ اللہ ان کی قبروں پر کروڑہا رحمتیں نازل فرمائے، اللہ ان کے درجات بلند فرمائے، اللہ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے اور اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ یہ جو بعد میں نسل آئی ہے انہوں نے بگاڑ پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے۔ چونکہ خدا کی قدرت ہے کہ بعض بزرگوں کی اپنی اولاد کوئی نہیں تھی۔ اولاد تھی تو اولاد اچھی نہ بنی۔ اس طرح جو لوگ قابض ہوتے گئے وہ اپنی مرضی کرتے رہے۔ اب کسی مزار پر کوئی بدعت والا قابض ہے تو پورا مزار بدعت کا گھر بنا ہوا ہے۔ کسی مزار پر یہ ملنگ آ گئے ہیں تو وہاں بس بھنگ ہے، چرس ہے یا افیون ہے اور وہاں جناب ننگ دھڑنگ لوگ پڑے ہیں اور سب پہنچے ہوئے مانے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں: اللہ کو پہنچے ہوئے ہیں۔

قوم کی قرآن سے بے وفائی:

میں نے کہا: اچھی بات ہے جو عقل والا ہو اس کو تم یورپ بھیج دیتے ہو اور جو پاگل ہو جائے اسے اللہ کے ساتھ ملا دیتے ہو۔ یعنی اگر تمہارا کوئی اچھا لڑکا پیدا ہو، ذہین ہو، بڑا انٹیلجنٹ بیٹا ہو تو اس کو تو کورس کرانے کے لیے تم یورپ بھیج دیتے ہو اور جو بالکل پاگل ہو جائے اور کپڑے اتار کر سڑک پر کھڑا ہو جائے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کو مل گیا ہے۔ ...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ...... دعا کرو اللہ ہمیں عقل دے، اللہ ہمیں ہدایت دے۔ ایمان سے کہو! اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ اندھے حافظ ہوتے ہیں۔ آنکھوں والے کیوں نہیں ہوتے؟ وجہ یہ ہے کہ جو لڑکا اندھا ہو، چلو جی! مسجدوں میں ڈالو، قرآن شریف پڑھے گا، اور تو کسی کام کا ہے نہیں، بے چارہ اندھا ہے، کیا کریں؟ چلو حافظ بن جائے گا، روٹی شوٹی تو کھاتا رہے گا۔ یعنی جو اندھا ہے، بے کار ہے وہ قرآن کے لیے، جو لنگڑا ہے وہ قرآن کے لیے، جس کا ہاتھ نہیں ہے وہ قرآن کے لیے اور جو سارے خاندان میں نالائق، غبی اور کند ذہن ہے وہ قرآن کے لیے ہے۔

شکر کرو کہ علماء نے تمہارے بے کار پرزوں کو کارآور بنا دیا کہ آج پوری دنیا میں قرآن زندہ ہے، ورنہ تم نے قرآن سے کوئی وفا نہیں کی۔ تم نے تو ہمیں وہ لڑکا دیا ہے جو نالائق ہو، جو ذہین لڑکا ہوگا وہ Kips (کپس) کالج میں پڑھے گا۔ برٹش سکولوں میں پڑھے گا، اس کے بعد پھر باہر جائے گا، پھر آکسفورڈ میں پڑھے گا، وہ یہاں مسجد میں تھوڑا پڑھے گا؟ اس کا مسجد کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ مسجد کے لیے تو تم نے وہ دیا ہے جو بے کار، بالکل نل بٹہ نل ہو، زیرو جمع زیرو نتیجہ زیرو۔ (0=0+0) تم نے وہ بھیجا، لیکن ہم نے اسے بھی حافظ بنا دیا۔ الحمد للہ! اس کے سینے میں

بھی قرآن کی امانت رکھ دی کہ آج جب تراویح کا وقت آتا ہے تو تم آنکھوں والے پیچھے کھڑے ہوتے ہو، وہ اندھا آگے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ جس سے کام لے لے اس کی مرضی۔ اللہ تعالیٰ جس سے چاہیں، جو چاہیں اور جب چاہیں کام لے لیں۔

سورۃ"أَسَاس"، "وَافِيَة"، "كَافِيَة":

اس کے بعد مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

❁......"وَرَوَى الشَّعْبِيُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ سَمَّاهَا أَسَاسَ الْقُرْآنِ" (امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سورت کا نام اساس القرآن رکھا ہے)۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن کی اساس اور بنیاد ہے: "وَأَسَاسُهَا بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" (اور پھر سورۂ فاتحہ کی بنیاد ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہے)۔

❁......"وَسَمَّاهَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ بِالْوَاقِيَةِ" (حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ فاتحہ کا نام واقیہ رکھا ہے)۔ اور واقیہ کا معنی ہے: حفاظت کرنے والی، بچانے والی۔

❁......"وَسَمَّاهَا يَحْيٰى بْنُ أَبِيْ كَثِيْرِ الْكَافِيَةَ" (اور یحییٰ بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا نام سورۃ کافیہ رکھا ہے)۔

یہ سورت ایسی ہے کہ یہ سورت سب چیزوں کے لیے کافی ہے، لیکن اگر یہ سورت نہ ہو، باقی سب کچھ ہو تو کافی نہیں ہے، لہٰذا انہوں نے کہا کہ یہ کافیہ ہے "كَمَا جَاءَ فِيْ بَعْضِ الْأَحَادِيْثِ الْمُرْسَلَةِ" (جیسا کہ بعض مرسل احادیث میں آیا ہے) یعنی سورت فاتحہ تو باقی کا عوض بن سکتی ہے، لیکن فاتحہ کا عوض کوئی نہیں بن سکتا۔ یعنی اتنی شان والی سورت ہے۔ اگر نماز میں فاتحہ ہو، باقی کوئی آیت نہ بھی پڑھی جائے تو گزارہ ہو سکتا ہے، لیکن سارا قرآن پڑھیں اور فاتحہ نہ پڑھیں پھر گزارہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مطلق قراءت نماز میں فرض ہے اور سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔

❁......اسی طرح فرمایا: "وَيُقَالُ لَهَا سُوْرَةُ الصَّلَاةِ وَالْكَنْزِ ذَكَرَهُمَا الزَّمَخْشَرِيُّ فِيْ كَشَّافِهِ" (علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب کشاف میں فرماتے ہیں: اس کا نام صلوۃ بھی ہے اور کنز بھی ہے)۔ کنز کا معنی خزانہ ہے۔ یہ بھی اللہ کی رحمتوں کا خزانہ ہے، علوم کا خزانہ ہے اور معارف کا خزانہ ہے۔

کشاف تفسیر تو بہت اعلیٰ ہے، لیکن علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ کا تھوڑا سا رجحان معتزلہ کی طرف تھا۔ اب تو فوت ہو گئے، جو فوت ہو جائے اس کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟ بہر حال بحیثیتِ تفسیر تو انہوں نے بڑی محنت کی ہے، قواعد بیان کیے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۸، سورۃ الفاتحہ]

یہ سورت مکی بھی ہے، مدنی بھی ہے:

"وَهِيَ مَكِّيَّةٌ قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ وَقَتَادَةُ وَأَبُو الْعَالِيَةِ"

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ تینوں فرماتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے (یعنی ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے)۔"

"وَقِيلَ مَدَنِيَّةٌ قَالَهُ أَبُو هُرَيْرَةَ وَمُجَاهِدٌ وَعَطَاءُ بْنُ يَسَارٍ وَالزُّهْرِيُّ"

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت عطاء رحمہ اللہ اور حضرت زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مدنی سورت ہے۔"

چار صحابہ رضی اللہ عنہم کہہ رہے ہیں کہ مکی ہے اور چار صحابہ رضی اللہ عنہم کہہ رہے ہیں کہ مدنی ہے۔ اس کو صحابہ رضی اللہ عنہم کا اختلاف نہیں کہیں گے، یہ اختلاف نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ جن صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہجرت سے پہلے مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے کا موقع ملا انہوں نے کہا: مکیہ ہے اور جن لوگوں نے مدینہ میں پہلی دفعہ سنی، اس سے پہلے انہوں نے سنی ہی نہیں، اس سے پہلے ان کے ذہن میں بھی یہ سورت نہیں آئی، جب انہوں نے مدینہ منورہ میں سنی تو انہوں نے کہا: یہ سورت مدینہ میں اتری ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

اختلافِ صحابہ کی وجہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں پڑھ رہے ہیں تو اس قسم کے اختلاف پیدا ہوئے کہ ایک کو وہ حکم پہلے پہنچ گیا ہے اور دوسرے کو وہ حکم پہلے نہیں پہنچا۔ اور وہ ویڈیو، ٹیلی فون کا دور تو نہیں تھا کہ تصویر بھی سامنے دیکھ لو۔ اب ایک صحابی نے ایک بات مکہ میں سنی اور یمن تشریف لے گئے، جہاد کرتے کرتے وہیں شہید ہو گئے، بعض صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک علم سیکھا اور پھر دین پھیلاتے پھیلاتے تاشقند اور بخارا پہنچ گئے۔ اب وہ غریب بیچارے واپس ہی نہیں آئے کہ انہیں پتا ہو کہ کوئی نیا حکم آیا ہے۔ بعض لوگ مدینہ منورہ سے نکلے اور کوفہ چلے گئے، بعض لوگ دمشق چلے گئے، بعض لوگ شام چلے گئے اور بحرین چلے گئے۔ دین پھیلاتے گئے، واپس مڑنے کا اتفاق ہی نہیں بنا اور پھر کوئی اتصال کا ذریعہ بھی نہیں تھا کہ پوچھ لیں: اس حکم کے بعد کوئی اور حکم تو نہیں آیا؟ تو جہاں جہاں انہوں نے جو بات پہنچائی انہیں علاقوں میں وہی بات چلتی گئی، پھیلتی گئی۔ ان کے شاگردوں کو تو وہی بات ملی۔ ان کے شاگردوں میں جو امام بنے ان کو بھی وہی بات ملی۔ اس میں ان کا قصور نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں...... نعوذ باللہ...... ان کی کوئی بددیانتی

ہوتی ہے۔ اللہ ان کی قبروں پہ کروڑوں رحمتیں فرمادے۔

اب دیکھیں کہ صحابہ میں اختلاف ہوگیا، اس لیے کہتے ہیں "وَيُقَالُ نُزِلَتْ مَرَّتَيْنِ مَرَّةً بِمَكَّةَ وَمَرَّةً بِالْمَدِيْنَةِ." (دومرتبہ نازل ہوئی، ایک دفعہ مکہ میں اور ایک دفعہ مدینہ منورہ میں۔) اچھا! دونوں طرف صحابہ ہیں: ایک طرف ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں اور ایک طرف ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ ہم ان دونوں کو غلط کیسے کہیں؟ پھر ایسی باتیں کیوں ہوتی ہیں؟ بعض علماء نے کہا ممکن ہے کہ دو دفعہ اللہ نے اتاری ہو: ایک دفعہ مکے میں اور ایک دفعہ مدینے میں۔ صحابہ تو دونوں طرف کے سچے ہیں، ان میں سے کوئی غلط نہیں کہتا۔

اکابر اور ائمہ کا ادب:

جب کسی بڑے آدمی کی بات ہو تو ہمیشہ بات کہنے کا ادب ہوتا ہے، انداز ہوتا۔ جیسے کسی نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ بڑے ہو یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہیں؟ انہوں نے کہا: بڑے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن پیدا میں پہلے ہوا تھا۔ کتنے ادب سے بات کی!! یہ نہیں کہا کہ میں بڑا ہوں، حالانکہ عمر میں بڑے تھے۔ اب بات بھی کہہ دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب بھی برقرار رکھا۔

تو اس لیے جن لوگوں کے اندر علم ہوتا ہے وہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا کوئی ایسا فرمان مبارک سنیں جو بظاہر اچھا نہ لگ رہا ہو تو وہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب میں نہیں سمجھ رہا...... اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں فرمائے...... میں تو بڑے ادب سے نام لوں گا اور کسی علم والے کی گستاخی کا مرتکب نہیں ہوں گا۔ اور بعض جو بے ادب ہو جاتے ہیں کہتے ہیں: او چھوڑو جی! کیا ہے، وہ بھی بندے تھے اور ہم بھی بندے ہیں۔ بندے تو تم ہو اس میں کوئی شک نہیں ہے، بندے تو سب ہیں، لیکن بندوں میں بھی تو فرق ہے۔ اگر بندوں میں فرق نہ کروگے تو پھر اسی سے تو زندیقی آتی ہے۔

گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

اللہ کے انبیاء علیہم السلام بھی بندے ہیں، لیکن ان کا مقام ان کے ساتھ ہے۔

فاتحہ کا مکی ہونا راجح ہے:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وَالْأَوَّلُ أَشْبَهُ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ﴾ الخ (پہلا قول زیادہ صحیح ہے کہ یہ سورت مکی ہے، ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ

الْمَثَانِيْ﴾ [الحجر:۸۷] اور یہ آیت مکی ہے)۔

ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ آدھی سورت مکہ میں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی اور آدھی ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی۔ لیکن یہ قول بالکل غریب ہے، ضعیف ہے، قابلِ حجت ہی نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

فاتحہ کی آیات کی تعداد:

اس کی سات آیات ہیں، اس میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔

- ..... "وَقَالَ عَمْرُو بْنُ عُبَيْدٍ ثَمَانٍ" (حضرت عمرو بن عبید رحمہ اللہ نے کہا کہ آٹھ آیات ہیں)۔
- ..... "وَقَالَ حُسَيْنُ الْجُعْفِيُّ سِتَّةٌ" (حضرت حسین الجعفی رحمہ اللہ کہتے کہ چھ آیات ہیں)۔

یہ اقوال شاذ ہیں۔ چھ والا بھی شاذ ہے، آٹھ والا بھی شاذ ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ سات آیات ہیں۔ بہر حال سورت فاتحہ اتنی ہی ہے، مگر تقطیع اور شمار آیات میں اختلاف ہو گیا ہے، مثلاً:

- ..... کسی نے کہا: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ الگ آیت ہے اور ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۝﴾ الگ آیت ہے۔
- ..... کسی نے کہا: یہ ساری آخر تک ایک ہی آیت ہے۔
- ..... کسی نے کہا: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۝﴾ سے آخر تک ایک ہی آیت ہے۔ تو اس نے کہا: یہ چھ آیات ہیں۔
- ..... اور کسی نے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کو ایک آیت اور ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۝﴾ الگ آیت شمار کی ہے۔ اس طرح سے آٹھ آیات شمار کی ہیں۔

لیکن راجح قول یہ ہے کہ یہ سات آیات ہیں۔ اس لیے سمجھا کریں۔ اختلافات کی وجہ اس طرح کی ہوتی ہے، اقوال بھی اسی لیے پیدا ہو جاتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

کیا بسم اللہ مستقل آیت ہے؟

"وَإِنَّمَا اخْتَلَفُوْا فِي الْبَسْمَلَةِ هَلْ هِيَ آيَةٌ مُسْتَقِلَّةٌ مِنْ أَوَّلِهَا؟ كَمَا هُوَ عِنْدَ جُمْهُوْرِ قُرَّاءِ الْكُوْفَةِ وَقَوْلُ جَمَاعَةٍ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَخَلْقٍ مِنَ الْخَلَفِ أَوْ بَعْضُ آيَةٍ أَوْ لَا تُعَدُّ مِنْ أَوَّلِهَا بِالْكُلِّيَّةِ؟ كَمَا هُوَ

قَوْلُ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مِنَ الْقُرَّاءِ وَالْفُقَهَاءِ."

"اب اختلاف اس بات میں ہے کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ مستقل آیت ہے یا نہیں؟ جمہور قراء کوفہ رحمہم اللہ، صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ یہ مستقل آیت ہے۔ یا یہ کہ آیت کا بعض حصہ ہے یا بالکل آیت ہی نہیں۔ جیسا کہ مدینہ کے قراء اور فقہاء رحمہم اللہ کا قول ہے۔) مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاں "بسم اللہ" کی بحث آئے گی وہیں جا کر اس کی بحث کروں گا۔"

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، سورۃ الفاتحہ]

سورۂ فاتحہ کے کلمات اور حروف:

علماء نے لکھا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے پچیس کلمات ہیں اور ایک سو تیرہ حروف ہیں۔

فاتحہ کو ام الکتاب کیوں کہتے ہیں؟

امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب التفسیر میں لکھا ہے کہ اس کو "أُمُّ الْكِتَابِ" اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے کتاب شروع ہوئی ہے اور اسی سے نماز شروع ہوتی ہے۔ بعض نے کہا "أُمُّ الْكِتَابِ" اس لیے کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں جتنے مضامین ہیں یہ سب کو مشتمل ہے اور یہ ان سب کا خلاصہ ہے۔ علامہ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عربوں کی یہ عادت ہے کہ کوئی چیز ایسی ہو جو آگے جانے والی ہو اور اس کے پیچھے توابع ہوں تو اس کو "أُمٌّ" کہتے ہیں۔ تو گویا! سارے قرآن کا یہ خلاصہ ہے۔ اور یہ جلد جہاں جا کے دماغ اکٹھا ہوتا ہے اسے "أُمُّ الرَّأْسِ" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جو لشکر میں فوج کا جھنڈا ہوتا ہے اسے بھی "أُمٌّ" کہتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸، ۹، سورۃ الفاتحہ]

مکہ کو "أُمُّ الْقُرٰى" کہنے کی وجہ:

اور مکہ کا نام بھی "أُمُّ الْقُرٰى" ہے، کیونکہ سب سے پہلی جگہ یہی ہے۔ اور بعض علماء نے کہا اس لیے اس کا نام "أُمُّ الْقُرٰى" ہے، کیونکہ زمین کو یہاں سے بچھایا گیا۔

"وَيُقَالُ لَهَا أَيْضًا الْفَاتِحَةُ؛ لِأَنَّهَا تُفْتَتَحُ بِهَا الْقِرَاءَةُ وَافْتَتَحَتِ الصَّحَابَةُ بِهَا كِتَابَةَ الْمُصْحَفِ."

"اس سورت کا نام فاتحہ بھی ہے، کیونکہ نماز میں قراءت کی ابتداء اسی سے کی جاتی ہے اور صحابہ نے بھی اسی سے قرآن لکھنے کی ابتدا کی۔"

اور اس کا نام "مثانی" بھی ہے، کیونکہ یہ نماز کی ہر رکعت میں بار بار پڑھی جاتی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹، سورۃ الفاتحہ]

کیا بسم اللہ فاتحہ کا جز ہے؟

"وَقَالَ الحَافِظُ أَبُو بَكْرٍ أَحْمَدُ بْنُ مُوسٰى بْنِ مَرْدُوَيْهِ فِيْ تَفْسِيْرِهٖ حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ زِيَادٍ...... عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: (الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ) سَبْعُ آيَاتٍ "بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" إِحْدَاهُنَّ وَهِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ، وَهِيَ أُمُّ الْكِتَابِ وَ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ..."

اب مفسر رحمہ اللہ سورۂ فاتحہ کے اسماء کے بارے میں ذکر فرما رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حافظ ابو بکر رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ سورت سات آیات پر مشتمل ہے اور اس میں ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ بھی ایک آیت ہے۔ جیسا کہ خلاصۂ درس میں الحمد للہ! آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس میں ائمہ رحمہم اللہ کا اختلاف ہے کہ کیا بسم اللہ اس سورت کا جز ہے یا جز نہیں، بلکہ ایک مستقل آیت ہے جو فصل ما بین السُّوَر کے لیے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے؟ تو اس لیے بعض ائمہ اس کے جز ہونے کے قائل ہیں۔ جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول ہے۔ اور بعض ائمہ فرماتے ہیں اصل میں جو سورۃ النمل میں ہے وہ تو قرآن کی اس سورت کا جز ہے، لیکن سورت النمل کے سوا جہاں بھی ہے وہ فصل کے لیے ہے، آیت مستقلہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس لیے اتاری ہے کہ ہر سورت کے درمیان فصل کے لیے لکھ دی جائے، تاکہ سورتوں کے علیحدہ ہونے کی وضاحت ہو سکے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ" اسی سورت کا نام ہے، "أُمُّ الْكِتَابِ" بھی اسی کا نام ہے اور "فَاتِحَةُ الْكِتَابِ" بھی اسی کا نام ہے۔ اور دار قطنی نے بھی اسی طرح کی ایک روایت نقل فرمائی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹، سورۃ الفاتحہ]

"سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ" کی بحث:

"وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ عَنْ عَلِيٍّ وَابْنِ عَبَّاسٍ وَأَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُمْ فَسَّرُوا قَوْلَهٗ تَعَالٰى سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِيْ بِالْفَاتِحَةِ وَأَنَّ الْبَسْمَلَةَ هِيَ الْآيَةُ السَّابِعَةُ مِنْهَا."

اب بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت علی، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہ تفسیر نقل فرمائی ہے کہ انہوں نے

فرمایا: ﴿سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ﴾ فاتحہ کا نام ہے اور ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ سورۂ فاتحہ کی ایک ساتویں آیت ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مفصل بحث ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کی تفسیر میں ذکر کروں گا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹، سورۃ الفاتحہ]

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں فاتحہ کیوں نہیں لکھی گئی تھی؟

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَقَدْ رَوَى الْأَعْمَشُ عَنْ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: قِيلَ لِابْنِ مَسْعُودٍ: لِمَ لَمْ تَكْتُبِ الْفَاتِحَةَ فِي مُصْحَفِكَ؟ فَقَالَ: لَوْ كَتَبْتُهَا لَكَتَبْتُهَا فِي أَوَّلِ كُلِّ سُورَةٍ."

"امام اعمش رحمہ اللہ نے حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے قرآن پاک میں سورۂ فاتحہ کیوں نہیں لکھتے؟...... کیونکہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جو مصحف (قرآن) اپنے پڑھنے کے لیے لکھا ہوا تھا اس میں فاتحہ کو شامل نہیں فرمایا تھا...... انہوں نے جواب میں فرمایا: اگر میں فاتحہ کو لکھتا تو ہر سورت کے اوّل میں لکھتا (کیونکہ اسی سے قرآن کا افتتاح ہوتا ہے)۔"

"قَالَ أَبُو بَكْرِ بْنِ أَبِي دَاوُدَ يَعْنِي حَيْثُ يُقْرَأُ فِي الصَّلَاةِ" (حضرت ابوبکر بن ابو داود رحمہ اللہ فرماتے ہیں چونکہ یہ نمازوں میں پڑھی جاتی ہے۔) لہٰذا اس کے بھول جانے کا کوئی خطرہ نہیں، لکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی لکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرآن پاک کو محفوظ کر دیا جائے اور قرآن پاک کی جو سورت رات دن ہزاروں دفعہ پڑھی جائے اور ہر مسلمان اسے پڑھ رہا ہے تو اس کے بھول جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لیے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف مبارک میں اس کو نہیں لکھا تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹، سورۃ الفاتحہ]

اور دراصل یہی وجہ تھی کہ معوذتین بھی نہیں تھیں۔ معوذتین ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ①﴾ [الفلق: ۱] اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ①﴾ [الناس: ۱] کو کہتے ہیں۔ یہ جو منکرین صحابہ روافض اور شیعہ ہیں یہ اسی وجہ سے انکار کرتے ہیں اور بہانہ بناتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سورت فاتحہ کو اور معوذتین کو قرآن نہیں مانتے تھے۔ یہ بات فقط تعصب، عناد کی وجہ سے ہے اور مسلمانوں کے دل میں شبہ ڈالنے کے لیے ہے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں کتابت کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ورنہ جن لوگوں نے ساری زندگی قرآن کی حفاظت میں گزار دی اور جن کے ایمان کا سب سے بڑا گواہ خود قرآن ہو وہ کیسے انکار کر سکتے ہیں؟ ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [البقرۃ:۵]

''اور یہ لوگ پورے کامیاب ہیں۔''

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا﴾ [الانفال:۴]

''یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں مومن ہیں۔''

اور...... ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ﴾ [الحجرات:۷] (ایسے ہی لوگ ہیں جو ٹھیک ٹھیک راستے پر آ چکے ہیں)۔

کتابتِ وحی:

آپ اندازہ فرمائیں! جب میرے آقا، خاتم الانبیاء، سردار الانبیاء ﷺ پیدا ہوئے ہیں تو سارے مکہ میں چار، پانچ آدمی لکھنے والے تھے۔ حضور ﷺ پر جب وحی آتی تھی تو وحی لکھنے والے کون کون تھے؟ ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، لیکن ان کی کتابتِ وحی پر ڈیوٹی نہیں تھی۔ ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کاتب الوحی تھے۔ پھر جب مکہ فتح ہوگیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی کاتب الوحی بنے۔ اسی طریقے سے حضرت زید رضی اللہ عنہ یعنی چند ایک صحابہ تھے جو لکھنے والے تھے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ)) [بخاری، حدیث:۱۹۱۳، باب: قول النبي ﷺ: لا نكتب...]

''ہم امی امت (کے لوگ) ہیں، نہ ہم لکھتے ہیں اور نہ ہم حساب کرتے ہیں۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ﴾ [الشوریٰ:۵۲]

''تمہیں اس سے پہلے نہ یہ معلوم تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے؟''

اے نبی! آپ کو کتاب اور ایمان کی تفاصیل کا اس وقت تک علم نہ ہوا جب تک ہم نے آپ پر وحی نہ اتاری۔ بہر حال اس زمانے میں لکھنے والے بھی نہ تھے۔

اور دوسری بات کہ لکھنے کی چیزیں قلم، دوات، سیاہی اور کاغذ وغیرہ بھی ناپید چیزیں تھیں، یعنی بالکل قلیل اور نادر چیزیں تھیں۔ کبھی لکڑیوں پر لکھا جاتا تھا، کبھی چمڑے پر لکھا جاتا تھا اور کبھی پتھر کو صاف کر کے اس پر لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح بعض دفعہ دیواروں پر یاد کے طور پر لکھ دیا، کیونکہ کوئی اور چیز میسر نہ تھی۔ تو وضاحت آ گئی کہ اگر انہوں نے

نہیں لکھا تو اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مقصد لکھنے کا کیا ہے کہ قرآن محفوظ ہو جائے۔ اور جس کو ایک دن میں پڑھنے والے کروڑوں مسلمان ہوں تو اس کی حفاظت نہ ہونے کا کوئی شبہ ہی نہیں۔ اور اسی طرح تمام صحابہ کرام صبح وشام ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ①﴾ اور ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ①﴾ پڑھ کر اپنے بدن پر اور اپنے بچوں کے بدن پر دم کیا کرتے تھے، لہٰذا اس کے بھول جانے کا کوئی خطرہ ہی نہیں۔ ورنہ...... نعوذ باللہ!...... یہ بات نہیں کہ وہ ان سورتوں کو قرآن نہیں مانتے تھے۔

اسی طرح یہ شیعہ لوگ قراءت کے اختلاف سے بھی دھوکہ دیتے ہیں اور قرآن کی قراءتوں کو بھی نہیں مانتے۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت عطا فرمائے اور قرآن پاک پر صحیح ایمان نصیب فرمائے۔ اللہ تعالیٰ صحیح ایمان کی دولت سے مالا مال فرمائے۔

سب سے پہلے اترنے والی سورت:

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک قول ہے کہ سب سے پہلے سورت فاتحہ اتری ہے، لیکن ایک صحیح روایت میں ہے کہ سب سے پہلے سورۂ مدثر نازل ہوئی اور ایک صحیح حدیث مبارکہ یہ بھی ہے کہ سب سے پہلے سورۃ العلق نازل ہوئی ہے۔ بہر حال! یاد رکھیں! سب سے پہلے سورت العلق کی چند آیات نازل ہوئیں، اس کے بعد وحی بند ہوگئی، تقریباً تین سال وحی بند رہی۔ پھر جب وحی آنا شروع ہوئی تو سورۃ المدثر کی چند آیات نازل ہوئیں، پوری سورت نہیں نازل ہوئی۔ اس کے بعد پھر سورت فاتحہ پوری نازل ہوئی۔ اس لیے جنہوں نے کہا جو سب سے پہلے پوری سورت نازل ہوئی وہ سورۂ فاتحہ ہے۔ سورۂ مدثر اور سورۂ علق کی چند آیات اتری تھیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹، سورۃ الفاتحہ]

حضور ﷺ کی اطاعت کی اہمیت:

"ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ الْفَاتِحَةِ" اب مفسر رحمہ اللہ سورۃ الفاتحہ کے فضائل میں منقول احادیث بیان فرما رہے ہیں۔ فرمایا:

((قَالَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلَ رَحِمَهُ اللَّهُ فِي مُسْنَدِهِ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ عَنْ شُعْبَةَ قَالَ حَدَّثَنِي خُبَيْبُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ حَفْصِ بْنِ عَاصِمٍ عَنْ أَبِي سَعِيدِ بْنِ الْمُعَلَّى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ أُصَلِّي فَدَعَانِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَلَمْ أُجِبْهُ حَتَّى صَلَّيْتُ فَأَتَيْتُهُ فَقَالَ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَأْتِيَنِي قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي

كُنْتُ أُصَلِّيْ قَالَ أَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ﴾)) [مسند احمد، رقم:۱۷۸۵۱]

''امام احمد بن حنبل ﷫ روایت فرماتے ہیں کہ ابو سعید بن المعلی ؓ فرماتے ہیں: میں نماز پڑھ رہا تھا، حضور ﷺ نے مجھے آواز دی، بلایا۔ میں چونکہ نماز میں تھا، لہٰذا میں نے جواب بھی نہ دیا اور جانے میں جلدی بھی نہ کی۔ جب میں نے نماز پڑھ لی تو فوراً آقا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جو تمہیں بلایا تھا تم کیوں نہیں آئے؟ میں نے کہا: میں نماز میں مشغول تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندے! تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ﴾[1] (جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا بلاوا آجائے تو جس حال میں بھی ہو، فوراً حاضری دو۔) تو تمہارا فرض تھا کہ نماز ہی توڑ دیتے، پہلے میرے پاس آتے۔''

تو اس صحابی ؓ کو اس مسئلہ کا علم نہیں تھا کہ اگر اللہ کے پیغمبر ﷺ بلائیں تو نماز بھی توڑ دینی چاہیے۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۹، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِيْ فَضْلِ الْفَاتِحَةِ]

صحابہ کرام ؓ کی نماز باجماعت کی پابندی:

یہ نماز بھی فرض نہیں پڑھ رہے تھے، اس لیے کہ فرض نماز تو صحابہ کرام جماعت کے ساتھ ہی پڑھتے تھے، علیحدہ پڑھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ صحابہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مسلمان کبھی بغیر جماعت کے بھی نماز پڑھتا ہے۔ وہ تو فرماتے ہیں: ہمارے ہاں یہ رواج تھا کہ جب ہم دیکھتے کہ ایک آدمی آج جماعت میں نہیں آیا تو ہم سمجھتے تھے کہ بیمار ہے یا منافق ہے، کیونکہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ مسلمان آدمی ہو، اذان سنتا ہو، مساجد بھی ہوں اور نماز جا کر جماعت کے ساتھ ادا نہ کرے۔ تو صحابہ ؓ سے تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یعنی نماز کا ایسا اہتمام ہوتا تھا۔ اگر کبھی صحابہ ؓ کو دیر ہو جاتی اور کوئی جماعت کا آدمی نہ ملتا تو گھر میں تشریف لے جاتے اور اپنے بیوی بچوں کو پیچھے کھڑا کر کے خود امام بن جاتے تھے، تاکہ جماعت کی فضیلت مل جائے، جماعت کی فضیلت سے ہم محروم نہ ہو جائیں۔

تو صحابی ؓ چونکہ نماز میں تھے اور حکم یہ تھا کہ حضور ﷺ جیسے بلائیں فوراً حاضر ہو جائیں، کیونکہ اللہ کے

[1] ..... [الانفال:۲۴]

پیغمبر ﷺ جب بھی بلائیں گے تو کسی دین کے کام ہی کے لیے بلائیں گے۔ تو اس نماز پڑھنے کا اور نماز سکھلانے کا فریضہ کس نے ادا کیا؟ حضور ﷺ نے۔ تو صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں نماز کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا، مجھے علم نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اچھا! کوئی بات نہیں۔ ہدایت بھی فرما دی۔

اس صحابی کو ایک خاص سورت کی تعلیم:

((ثُمَّ قَالَ لِي لَأُعَلِّمَنَّكَ سُورَةً هِيَ أَعْظَمُ السُّوَرِ فِي الْقُرْآنِ قَبْلَ أَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِي فَلَمَّا أَرَادَ أَنْ يَخْرُجَ قُلْتُ لَهُ أَلَمْ تَقُلْ لَأُعَلِّمَنَّكَ سُورَةً هِيَ أَعْظَمُ سُورَةٍ فِي الْقُرْآنِ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ الَّذِي أُوتِيتُهُ، وَهٰكَذَا رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ))

[مسند احمد، حدیث: ۱۵۱۷۸، صحیح البخاری، حدیث: ۴۴۷۴]

پھر مجھ سے فرمایا: میں تمہیں ایک ایسی سورت سکھلاؤں گا جو قرآن میں سب سے بڑی شان والی سورت ہے۔ پھر حضور ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ یعنی آپ ﷺ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ سے تھام لیا...... یہ تقرب کا، محبت کا کنایہ ہوتا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں نا! جیسے آدمی اپنے محبوب کے ساتھ چلے تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تو میرے آقا محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ کمال تھا کہ آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایسے پیش آتے تھے جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کی اولاد ہیں۔ حضور ﷺ آ کر بیٹھتے تو صحابہ میں گھل مل جاتے، اکٹھے کھانا کھاتے، اکٹھے پانی پیتے۔ آپ ﷺ بیٹھے ہوتے تو کبھی اپنی ٹانگ مبارک، ران مبارک صحابی رضی اللہ عنہ کے اوپر رکھ دیتے اور کبھی صحابی کی ران پر سر مبارک رکھ کر سو جاتے۔ اتنے بے تکلف تھے۔ اصل میں تو یہ آپ ﷺ کی رحمت تھی، آپ ﷺ کی شفقت تھی اور امت کو آپ ﷺ کا سبق تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ ایسے حسنِ خلق کے ساتھ پیش آؤ، اخلاقِ جمیلہ کے ساتھ پیش آؤ...... تو صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا: مسجد سے نکلنے سے پہلے پہلے تمہیں ایک ایسی سورت بتلاؤں گا کہ جس کی شان بہت بڑی ہے۔ پھر حضور ﷺ چلتے آئے، چلتے آئے جب مسجد سے نکلنے کے قریب آ گئے تو میں نے عرض کیا: حضور! آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کو ایک سورت سکھلاؤں گا۔ ابھی تک تو آپ نے مجھے سورت مبارکہ نہیں سکھلائی۔

اس حدیث سے مستنبط مسائل:

اس ایک حدیث سے ائمہ نے کتنے کتنے مسئلے نکالے کہ آدمی نماز میں ہو اور رسول اللہ ﷺ بلائیں تو آدمی کیا

کرے؟ اسی طرح یہ مسئلہ بھی نکالا کہ آدمی اپنا ہاتھ چھوٹے بندے کے ہاتھ میں دے سکتا ہے، کیونکہ حضور ﷺ کی شان کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ اور اسی طرح محدثین نے یہ مسئلہ بھی نکالا کہ حضور ﷺ نے پڑھانے کا، ایک علم سکھانے کا وعدہ فرمایا، لیکن دیر کر دی، جلدی نہیں سکھلایا، تا کہ سیکھنے والے کو شوق رہے اور انتظار رہے اور وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائے پھر حضور ﷺ اس کو تعلیم ارشاد فرمائیں۔ تو محدثین کا یہ کام ہے، ائمہ کرام کا یہ کام ہے کہ جب وہ احادیث مبارکہ کو پڑھتے ہیں تو ان سے مسائل نکالتے ہیں۔

امام اعمش رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا واقعہ:

کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اپنے استاذ امام اعمش رحمہ اللہ کی خدمت میں تھے اور حدیث مبارک کا درس ہو رہا تھا۔ جب درس ختم ہو گیا تو استاذ نے آپ سے ایک مسئلہ پوچھا تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جواب دے دیا اور امام اعمش رحمہ اللہ مطمئن ہو گئے اور بہت خوش ہوئے کہ میرے شاگرد نے بہت اچھا جواب دیا۔ لیکن آپ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آپ نے یہ مسئلہ ہمیں کس دلیل سے بتایا ہے؟ امام صاحب رحمہ اللہ نے جواب دیا: حضرت! آپ نے جو ہمیں پڑھایا ہے اسی سے نکالا ہے۔ آپ نے فلاں دن ہمیں جو فلاں حدیث رسول ﷺ پڑھائی تھی، یہ مسئلہ اس حدیث سے نکلتا ہے۔ تو حضرت بڑے خوش ہوئے اور فرمایا کہ بھئی! اصل بات یہ ہے کہ ہماری (محدثین کی) مثال ایسے ہے جیسے دواخانہ ہوتا ہے۔ دواخانے میں یہ ہوتا ہے کہ دوائیں جمع کر لیں اور نام لکھ کر ان کو ترتیب سے رکھ دیا اور تم لوگ حکیم ہو کہ دوا نکالتے ہو کہ یہ دوا کس کام لگے گی؟ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم احادیث کو جمع کر کے، محفوظ کر کے رکھ لیں، اب آگے احادیث کا استعمال کرنا فقہاء کا کام ہے۔ اس لیے امام اعمش رحمہ اللہ نے فرمایا:

”يَا مَعْشَرَ الْفُقَهَاءِ! أَنْتُمُ الْأَطِبَّاءُ وَنَحْنُ الصَّيَادِلَةُ“ [جامع بیان العلم وفضلہ: ۲/۲۵۷]

”اے فقہا کی جماعت! تم طبیب ہو اور ہم تو پنساری ہیں۔“

اصل عالم تو تم ہو۔ جیسے طبیب کا کام ہوتا ہے کہ وہ مرض کی تشخیص کرے کہ مرض سردی سے ہے یا گرمی سے ہے؟ یہ بیماری بلڈ پریشر ہائی ہونے کی وجہ سے ہے یا لو ہونے کی وجہ سے ہے؟ یہ بیماری جراثیم کی وجہ سے ہے، یہ بیماری متعدی ہے، فلاں دوا کام کرے گی اور فلاں دوا کام نہیں کرے گی۔ یہ کام فقہاء کرام کا ہے کہ کونسی حدیث سے کونسا مسئلہ نکلتا ہے۔

اس لیے فرماتے ہیں: محدثین نے یہ مسئلہ نکالا کہ حضور پاک ﷺ نے سائل کو انتظار کروایا، تاکہ علم سیکھنے کے لیے اس کا شوق ذوق زیادہ سے زیادہ ہو جائے۔ شوق ہوگا تو بات سمجھے گا۔ اگر طالب علم کو شوق نہ ہو، وہ بس یہی سمجھے کہ استاذ کا ڈر ہے، کیا کروں؟ استاذ نے کہا ہے: پڑھنے آؤ! آجاؤں گا، لیکن جب اپنا دلی اشتیاق ہوگا تب فائدہ ہوگا۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں میں تمہیں بتلاتا ہوں۔ اسی طرح ایک اور مسئلہ بھی نکالا کہ اگر کوئی آدمی مسئلہ پوچھے اور استاذ فرمادے کہ میں مسئلہ بتاؤں گا۔ پھر مسئلہ بتانے میں دیر کردے تو یہ بھی اس کو حق ہے، اس طرح بھی وہ کرسکتا ہے۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا تھا اور پھر بتلانے میں دیر کردی۔

وہ عظیم سورت یہ ہے:

جب حضور ﷺ باہر نکلنے لگے تو صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے یاد دلایا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! ٹھیک ہے، تم نے یاد دلادیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ الَّذِيْ أُوْتِيْتُهٗ))

''یہ سورت فاتحہ ہے، یہ سبعا من المثانی بھی ہے اور قرآن عظیم بھی ہے۔''

[مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۱۷۸۵۱]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کی طرف سے ایک علمی تنبیہ:

''وَقَدْ وَقَعَ فِي الْمُوَطَّأِ لِلْإِمَامِ مَالِكِ بْنِ أَنَسٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ مَا يَنْبَغِي التَّنْبِيْهُ عَلَيْهِ فَإِنَّهُ رَوَاهُ مَالِكٌ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ يَعْقُوْبَ الْحُرَقِيِّ أَنَّ أَبَا سَعِيْدٍ مَوْلٰى عَامِرِ بْنِ كُرَيْزٍ ...... فَأَبُوْ سَعِيْدٍ هٰذَا لَيْسَ بِأَبِيْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُعَلّٰى كَمَا اعْتَقَدَهُ ابْنُ الْأَثِيْرِ فِيْ جَامِعِ الْأُصُوْلِ وَمَنْ تَبِعَهٗ فَإِنَّ ابْنَ الْمُعَلّٰى صَحَابِيٌّ أَنْصَارِيٌّ وَهٰذَا تَابِعِيٌّ مِنْ مَوَالِيْ خُزَاعَةَ،.......''

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ موطا امام مالک میں ابوسعید مولیٰ عامر بن کریز کی روایت ہے (اس سند کے اندر جو ابا سعید مولیٰ عامر بن کریز ہیں، یہ صحابی نہیں ہیں، بلکہ تابعی ہیں۔ یہ خبر دے رہے ہیں) کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نماز پڑھ رہا تھا اور حضور ﷺ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھا اور حضور ﷺ کا ارادہ تھا کہ مسجد سے باہر تشریف لے جائیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم مسجد سے باہر نہ نکلو اور ایک ایسی سورت سیکھ لو کہ اللہ نے انجیل میں بھی نہیں اتاری، تورات میں بھی نہیں اتاری، زبور میں بھی نہیں اتاری اور اس جیسے سورت

قرآن میں بھی دوسری نہیں ہے۔ اس کے بعد ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا: آہستہ چلوں، کہیں ایسا نہ ہو مسجد سے نکل جاؤں اور وہ سورت سیکھنی رہ جائے۔ اس لیے میں اپنے آپ ذرا آہستہ کر لیا، تاکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مجھے وہ سورت سکھلا دیں۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے پوچھا: وہ کونسی سورت ہے جس کا آپ نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا؟ فرمایا: نماز شروع کرتے ہوئے کیسے قراءت کرتے ہو؟ میں نے پڑھنا شروع کیا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ پھر میں جب سورت کے آخر تک پہنچا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابی! یہی وہ سورت ہے جس کا نام سبع المثانی بھی ہے اور قرآن عظیم کی یہی وہ سورت ہے جو سب سے اعظم شان والی سورت ہے، جو اللہ نے مجھے عطا فرمائی ہے۔

اب مفسر فرماتے ہیں:

"فَأَبُو سَعِيْدٍ هٰذَا لَيْسَ بِأَبِي سَعِيْدِ بْنِ الْمُعَلّٰى كَمَا اعْتَقَدَهُ ابْنُ الْأَثِيْرِ فِي جَامِعِ الْأُصُوْلِ وَمَنْ تَبِعَهُ."

"جیسے ابن الاثیر رحمہ اللہ اور اس کے ماننے والے اس دھوکے میں لگ گئے کہ انہوں نے ابو سعید کو ابی سعید المعلی بنا دیا، حالانکہ ان کو غلط فہمی لگی ہے، دھوکہ لگا ہے۔"

فرمایا:

"فَإِنَّ ابْنَ الْمُعَلّٰى صَحَابِيٌّ أَنْصَارِيٌّ وَهٰذَا تَابِعِيٌّ مِنْ مَوَالِي خُزَاعَةَ"

"یاد رکھنا! ابو سعید بن المعلی رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، انصاری ہیں اور ابھی جن کا ذکر ہو رہا ہے یہ تابعی ہیں، صحابی نہیں ہیں۔"

انہوں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی نہیں کی، بلکہ یہ غلام ہیں۔ بعض آدمیوں کو ابو سعید کے نام سے مغالطہ لگ جاتا ہے۔ اس لیے مفسر رحمہ اللہ نے کہا کہ ضروری تھا کہ میں تنبیہ کر دوں اور وہ سند بھی ساتھ ذکر کر دوں، تاکہ لوگ مغالطے میں نہ رہیں۔ آگے فرمایا:

"وَذَاكَ الْحَدِيْثُ مُتَّصِلٌ صَحِيْحٌ وَهٰذَا ظَاهِرُهُ مُنْقَطِعٌ إِنْ لَمْ يَكُنْ سَمِعَهُ أَبُوْسَعِيْدٍ هٰذَا مِنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ."

ابی سعید المعلی رضی اللہ عنہ کی حدیث متصل ہے، کیونکہ صحابی رضی اللہ عنہ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اور ابو سعید نے اگر خود حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا تو یہ حدیث منقطع ہے۔

"فَإِنْ كَانَ قَدْ سَمِعَهُ مِنْهُ فَهُوَ عَلٰى شَرْطِ مُسْلِمٍ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ."

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو سعید نے اگر خود حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے سنا ہے پھر تو امام مسلم کی شرط کے

مطابق اس حدیث مبارک کو ہم لے لیں گے۔ اگر انہوں نے ابی ابن کعب سے نہیں سنا پھر تو منقطع ہے، اس کے اندر انقطاع ہے۔

اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ بعض اوقات نام سے بڑا دھوکہ لگتا ہے۔ نام چونکہ ملتا جلتا ہے، ابی سعید بن المعلی اور ان کی کنیت بھی ابی سعید تھی۔ تو ابن الاثیر رحمہ اللہ جیسے آدمی کو دھوکہ لگ گیا اس نے کہا ایک ہیں، حالانکہ ابی سعید بن المعلی صحابی ہیں اور یہ تابعی ہیں۔ کہاں تابعی اور کہاں صحابی۔ کیوں تابعی کا درجہ کتنا اوپر ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن صحابی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم کتنے بلند مرتبے تک پہنچ جائیں نبی علیہ السلام کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور جیسے تمام انبیاء علیہم السلام کروڑوں شان والے میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے اللہ نے ان کو اپنی اپنی شان عطا فرمائی ہے۔ جیسے میں نے عرض کیا تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۰۹، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ الْفَاتِحَةِ]

محمد بن جریر دو ہیں اور ان دونوں میں فرق:

ابوجعفر محمد بن جریر الطبری اس سے بھی لوگوں کو بڑے مغالطے لگے ہیں، کیونکہ بدقسمتی یہ ہے کہ وہ آدمی دو ہیں اور خدا کی قدرت کہ دونوں کا نام محمد ہے، دونوں کے باپ کا نام جریر ہے، دونوں کی کنیت بھی ابوجعفر ہے اور دونوں طبرستان کے ہیں، طبری کہلاتے ہیں۔ یہ مشکل اس لیے ہوگئی کہ جب ابوجعفر محمد بن جریر الطبری کا نام آتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو شیعہ تھا، حالانکہ یہ مفسر قرآن ہیں، جن کا نام محمد بن جریر بن یزید الطبری رحمہ اللہ ہے اور یہ شیعہ نہیں ہیں، بلکہ پکے سنی ہیں۔ جبکہ محمد بن جریر بن رستم الطبری رافضی شیعہ ہے۔

یہ جو فرقہ، ملنگوں کا ٹولہ ہے، یہ اس معاملہ میں بڑا تیز ہے۔ انہوں نے جو کام کرنا ہو تو پچاس پچاس سال چھپے رہیں گے، بالکل پکے سنی بن جائیں گے، بڑے بڑے عالم بن جائیں گے، بڑی بڑی جماعتوں کے امیر بن جائیں گے، پھر چالیس پچاس سال بعد اندر سے اپنا بغض نکالیں گے اور لوگوں کے دماغ میں یہی ہوگا کہ یہ تو ہمارا عالم ہے۔ کہیں گے کہ چالیس سال سے ہم نے دیکھا کہ ہماری مسجد کا امام ہے۔ یہ تو اپنا مسئلہ سچا کرنے کے لیے چالیس پچاس سال چھپے رہتے ہیں۔ اور دوسرا یہ کرتے ہیں جس راوی کی روایات چل رہی ہوں اس نام کے فرضی نام پیدا کر دیتے ہیں یعنی اس نام سے اور آدمی پیدا کر دیا اور اس سے روایتیں نقل کر دیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے حوالے سے حدیث گھڑنے والا واعظ:

اما احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے کسی ایک مسجد میں نماز پڑھی، نماز کے بعد ایک واعظ کھڑا ہو گیا اور

کہنے لگا کہ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے مجھے یہ حدیث بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں عبد الرزاق نے حدیث بیان کی، انہوں نے حضرت معمر رحمہ اللہ سے، انہوں نے حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يُخْلَقُ مِنْ كُلِّ كَلِمَةٍ مِنْهَا طَائِرٌ مِنْقَارُهُ مِنْ ذَهَبٍ وَرِيْشُهُ مَرْجَانٌ" (جس نے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہا تو اس کے ہر کلمہ کے بدلے میں ایک پرندہ پیدا کیا جاتا ہے جس کی چونچ سونے کی اور پر مرجان کے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس بیس ورقے کا قصہ گھڑ کر سنا ڈالا، پس دونوں امام ایک دوسرے کو تعجب سے دیکھنے لگے، اور ایک نے دوسرے سے معلوم کیا کہ تم نے یہ روایت بیان کی ہے؟ لیکن ہر ایک نے کہا کہ یہ روایت تو میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں سنی۔ جب وہ اپنے وعظ سے فارغ ہوا تو لوگوں سے ہدایا حاصل کیے اور مزید حاصل کرنے کی امید میں بیٹھا تھا، حضرت یحییٰ بن معین نے اس کو ہاتھ سے اشارہ کر کے بلایا، وہ یہ خیال کر کے آ گیا کہ کوئی ہدیہ ملے گا۔ جب آیا تو حضرت ابن معین نے اس سے پوچھا کہ یہ روایت تجھے کس نے بیان کی؟ اس نے جواب دیا کہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے۔ تو ابن معین رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں یحییٰ بن معین ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہیں، یہ حدیث تو ہم نے کبھی نہیں سنی۔ پس اگر تجھے جھوٹ بولنا تھا تو کسی اور پر بولتا، اس واعظ نے کہا کہ تم یحییٰ بن معین ہو؟ آپ نے جواب دیا: جی ہاں! اس واعظ نے کہا کہ میں سنا کرتا تھا کہ یحییٰ بن معین بے وقوف ہے، آج مجھے اس کا یقین ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیسے معلوم ہوا کہ میں احمق ہوں؟ اس واعظ نے کہا: کیونکہ تمہاری بات سے لگتا ہے گویا تمہارے علاوہ دنیا میں کوئی یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل ہے ہی نہیں، میں نے سترہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے حدیثیں لکھی ہیں، اس پر امام احمد نے اپنی آستین سے اپنا چہرہ چھپا دیا اور کہا کہ اسے جانے دو۔ وہ واعظ وہاں سے ان دونوں کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔) [جامع الاصول فی احادیث الرسول للجزری، ج:۱]

میری طرف غلط مسائل کی نسبت:

اب حج کے دنوں میں ایسا بھی ہوتا ہے...... اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے...... ہر سال ایسا ہوتا ہے کوئی ایک دفعہ کی بات نہیں ہے، کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے لوگ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ مولوی مکی نے یوں کہا ہے۔ اچھا ایک دفعہ ایک صاحب نے کسی مسئلہ کے بارے میں کہا یہ مسئلہ یوں ہے اور ہم نے خود مولوی مکی صاحب سے سنا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ مولوی مکی کو جانتے بھی ہیں؟ کہا: ہاں جی! بالکل اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں نے کہا: اچھا میں کون ہوں؟

کہا: پتا نہیں۔ او خدا کے بندے! تم اچھی طرح جانتے بھی ہو اور میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں، تمہیں پتا بھی نہیں۔ کہتے بھی ہو: مسئلہ میں نے بتایا ہے۔ مسئلہ بھی غلط بیان کر رہے ہو اور میری گردن پر ڈال رہے ہو؟ خدا کا خوف کرو۔ آدمی کو مسئلہ بیان کرنے میں بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔ اچھا! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دور کھڑا ہے اور بات سمجھی نہیں، آدھی آواز کان میں پہنچی اور آدھی نہیں پہنچی۔ کبھی یہ ہوتا ہے اس غریب نے آدھا مسئلہ سنا، آدھا نہیں سنا تھک گیا، پیشاب کی ضرورت پیش آگئی، وضو کے لیے دوڑ گیا، رش زیادہ پڑ گیا غریب کو دھکا لگا وہ آگے چلا گیا۔ بات سنی نہیں، لیکن کہہ دیا: مولوی کسی نے کہا ہے۔ خوامخواہ کے لیے میرے گلے میں رسی ڈال دی۔ ایسا نہ کیا کریں، ہمیشہ بڑی احتیاط کیا کریں۔ اب دیکھیں! بڑے بڑے محدثین کو ٹھوکر لگ گئی۔ جبکہ ابو سعید اور ہیں اور ابو سعید المعلی اور آدمی ہیں۔ یہ صحابی ہیں اور وہ تابعی ہیں۔ کتنا بڑا فرق ہے؟ اس کی روایت منقطع ہے، جبکہ ان کی روایت بسندِ صحیح متصل ہے۔ لیکن غلط فہمی ہو گئی۔

حدیثِ ابی رضی اللہ عنہ:

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ، وَهُوَ يُصَلِّي فَقَالَ: يَا أُبَيُّ!...))

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابی! انہوں نے دیکھا تو سہی، لیکن جواب نہ دیا۔ پھر حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے یہ کیا کہ نماز میں ذرا تخفیف کر دی، پھر آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: میں نے جب تمہیں بلایا تھا تو تم نے مجھے جواب کیوں نہیں دیا؟ یا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی کہ جب اللہ کا نبی بلائے تو فوراً جاؤ، جس حالت میں بھی تم ہو۔ انہوں نے کہا: حضور! میں آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم محبوب رکھتے ہو کہ تمہیں ایسی سورت بتلاؤں جو تورات، انجیل اور زبور میں بھی نازل نہیں ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ میں اس مسجد سے نہیں نکلوں گا، مگر تمہیں وہ پڑھا دوں گا۔ اب صحابی کہتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دروازے سے نکل جائیں اور مجھے نہ پڑھا سکیں، کیونکہ وعدہ تھا کہ دروازے سے نکلنے سے پہلے تمہیں سکھلا دوں گا۔ وہاں تک اگر بات ہی ختم نہ ہو اور باہر چلے جائیں اور میں علم سے محروم رہ جاؤں تو اسی لیے میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ جب دروازے کے قریب پہنچے تو میں نے کہا: حضور! وہ کونسی سورت مبارکہ ہے جس کا آپ نے وعدہ فرمایا

تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نماز میں کونسی سورت شروع کرتے ہو؟ میں نے کہا: فاتحہ۔ فرمایا: مجھے اس ذات پاک (اللہ) کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! اس جیسے سورت پہلے کسی کتاب میں بھی نہیں اتری۔

[سنن الترمذی،حدیث:۲۸۷۵،باب،ما جاء في فضل فاتحة...]

"وَرَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْ قُتَيْبَةَ عَنِ الدَّرَاوَرْدِيِّ عَنِ الْعَلَاءِ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَذَكَرَهُ وَعِنْدَهُ: إِنَّهَا مِنَ السَّبْعِ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنِ الْعَظِيمِ الَّذِي أُعْطِيتُهُ ثُمَّ قَالَ: هٰذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ."

اللہ نے فرمایا: "وَهِيَ مَقْسُومَةٌ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي." "یہ سورت میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم ہے۔" "هٰذَا لَفْظُ النَّسَائِيِّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ حَدِيثٌ حَسَنٌ غَرِيبٌ" اصل میں "وَهِيَ مَقْسُومَةٌ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي" کی وجہ سے غرابت آگئی ہے، ورنہ یہ حدیث علیحدہ صحیح ہے اور وہ حدیث علیحدہ صحیح ہے۔ یعنی ایک حدیث میں اس ٹکڑے کے زیادہ ہونے کی وجہ سے اس میں غرابت پائی گئی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۰، ذکر ما ورد في فضل الفاتحة]

حدیثِ عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہ:

((عَنِ ابْنِ جَابِرٍ قَالَ: انْتَهَيْتُ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَقَدْ أَهْرَاقَ الْمَاءَ، فَقُلْتُ: السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ، فَقُلْتُ: السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ ...... ثُمَّ قَالَ: أَلَا أُخْبِرُكَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ جَابِرٍ! بِخَيْرِ سُورَةٍ فِي الْقُرْآنِ؟ قُلْتُ: بَلَى يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: اقْرَأْ: ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ حَتّٰى تَخْتِمَهَا.)) [مسند احمد بن حنبل،حدیث:۱۷۵۹۷]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں گیا اور حضور پاک ﷺ ابھی پانی ڈال کر تشریف لا رہے تھے، یعنی آپ پیشاب کرنے کے بعد تشریف لا رہے تھے (حالانکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ یوں بھی کہہ سکتے تھے: "بَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ" (حضور ﷺ نے پیشاب کیا) لیکن انہوں نے ایسا نہیں کہا۔ یہ ادب کا تقاضا ہے۔ لہٰذا حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یوں بات کی کہ آپ ﷺ نے پانی انڈیلا اور تشریف لائے) تو میں نے کہا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ!" آپ ﷺ نے جواب نہ دیا۔ میں نے پھر سلام کیا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ!" آپ نے جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر کہا: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ!" آپ نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ کہتے ہیں:

میں آپ کے ساتھ چلتا آیا، حضور ﷺ میرے آگے آگے چل رہے تھے اور میں پیچھے پیچھے چل رہا تھا، حتیٰ کہ اپنی منزل، اپنے گھر مبارک میں تشریف لے گئے اور میں مسجد میں داخل ہوا اور مسجد میں بڑا غمگین اور اداس ہو کر بیٹھ گیا کہ حضور ﷺ نے مجھے سلام کا جواب نہیں دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ ناراض ہیں کہ میں نے تین دفعہ سلام کیا اور تینوں دفعہ میرے سرکار ﷺ نے جواب عطا نہیں فرمایا۔ اس لیے میں بڑا غمگین ہو کر بیٹھ گیا۔

کہتے ہیں کہ میں ابھی بیٹھا تھا کہ آقا ﷺ وضو فرما کر تشریف لے آئے اور فرمایا: "عَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ، وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ"۔ میں نے تین دفعہ سلام کیا تھا، اس لیے حضور ﷺ نے بھی تین دفعہ جواب دیا۔ اور میں نے تو صرف "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ!" کہا تھا، لیکن حضور ﷺ نے "وَرَحْمَةُ اللهِ" کا بھی اضافہ فرما دیا۔ یہ ہے حسنِ کرم، یہ ہے تعلیم نبوت اور یہ ہے اللہ کے پاک پیغمبر ﷺ کی شان کہ آپ ﷺ کو اپنے غلاموں کا بھی اتنا خیال ہے کہ ان کا دل میں ملال ہوگا کہ میں نے جواب نہیں دیا، اس لیے تین دفعہ جواب ارشاد فرمایا۔ پھر صرف جواب نہیں، بلکہ تعلیم دی اور فرمایا:

((أَلَا! أُخْبِرُكَ يَا عَبْدَ اللهِ بْنَ جَابِرٍ! بِخَيْرِ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْآنِ؟ قُلْتُ: بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللهِ! قَالَ: اقْرَأْ ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ حَتّٰى تَخْتِمَهَا))

"کیا میں تمہیں سب سے افضل سورت نہ پڑھاؤں؟ میں نے کہا: حضور! بالکل پڑھائیں۔ فرمایا: سورت فاتحہ آخر تک پڑھو۔"

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جناب! یہ سند بڑی اچھی سند ہے۔ اور اس کے اندر جو ابن عقیل راوی ہے اس کو بڑے بڑے محدثین نے لیا ہے۔ "وَعَبْدُ اللهِ بْنُ جَابِرٍ هٰذَا الصَّحَابِيُّ ذَكَرَ ابْنُ الْجَوْزِيِّ أَنَّهُ هُوَ الْعَبْدِيُّ وَاللهُ أَعْلَمُ" اور عبد اللہ بن جابر رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، ان کے بارے میں ابن جوزی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ وہ عبدی قبیلے میں سے تھے۔ "وَيُقَالُ إِنَّهُ عَبْدُ اللهِ بْنُ جَابِرٍ الْأَنْصَارِيُّ الْبَيَاضِيُّ" اور بعض نے کہا کہ وہ بیاضی قبیلے میں سے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰، ذکر ما ورد فی فضل الفاتحۃ]

کیا قرآن کا بعض حصہ بعض سے افضل ہے؟

اب مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کی ایک آیت یا سورت کسی دوسرے حصے سے افضل ہے یا نہیں؟ یہ بڑا اختلافی مسئلہ ہے کہ اگر سورت فاتحہ افضل ہے، آیۃ الکرسی افضل ہے تو باقی مفضول ہو گئیں، حالانکہ ہے تو سارا اللہ کا

کلام۔ بعض نے کہا کہ اللہ جسے چاہے شان عطا فرمادے۔ جیسے ہیں تو سارے اللہ کے بندے، لیکن میرے مدنی ﷺ جیسا بندہ کہاں پیدا ہوگا؟ ہیں تو سارے اللہ کے بندے، اللہ کے نبی بھی اللہ کے بندے ہوتے ہیں، لیکن اللہ نے جس کو اپنا خاص بندہ بنالیا اور پھر سید البشر، سید الاولین والآخرین، افضل البشر، خیر البشر اور امام الانبیاء والمرسلین کا مرتبہ عطا فرمایا، اس کا مقابلہ کون کرے؟ اس لیے قرآن بھی سارا اللہ کا کلام ہے، لیکن اللہ جس کے بارے میں چاہیں دوسرے سے افضل بنادیں۔ جیسے اللہ کے سارے رسول علیہم السلام شان والے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ﴾ [البقرة: ۲۵۳]

''ہم نے اپنے رسولوں کو بھی ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔''

جو شان حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ کے دیگر رسول ہیں۔ اور اسی طرح قرآن میں بھی ہے کہ یہ سورت دوسری سورت سے افضل ہے، یہ سورت اس سے اعلیٰ ہے۔

اور انہوں نے اسی سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سب سے اعظم سورت، سب سے افضل سورت اور ایسی سورت جو پہلے کسی کتاب میں نازل نہیں ہوئی وہ سورت فاتحہ ہے۔ اور اسی لیے مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَذَهَبَتْ طَائِفَةٌ أُخْرٰى إِلٰى أَنَّهُ لَا تَفَاضُلَ فِي ذٰلِكَ؛ لِأَنَّ الْجَمِيعَ كَلَامُ اللّٰهِ.''

''اور ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ سارے کا سارا اللہ کا کلام ہے۔ ایک دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔''

باعتبارِ ثواب کے اللہ جس کو چاہیں زیادہ شان عطا فرمادیں، کیونکہ علماء نے کہا: اگر ہم یہ کہیں کہ یہ افضل ہے تو دوسرے کے بارے میں...... نعوذ باللہ!...... خیال کیا جائے گا کہ شاید یہ افضل نہیں ہے۔ تو ایسا نہ ہو کہ اللہ کے کلام کے بارے میں...... نعوذ باللہ!...... بے ادبی ہو جائے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ الْفَاتِحَةِ]

حالانکہ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک کی شان بیان کرنے سے دوسرے کی شان میں کمی نہیں آتی۔ مثلاً: جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی شان بیان کی جائے تو یہ معنی نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان ہی نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان بیان کی جائے تو یہ معنی نہیں ہوتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان ہی نہیں ہے، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان بیان کی جائے تو یہ معنی نہیں ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان ہی نہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان بیان کی جائے تو یہ معنی نہیں ہوتا کہ باقی صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان ہی نہیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی فضیلت:

اللہ نے مختلف فضیلتیں رکھی ہیں۔ مثلاً: بعض چیزیں اللہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ میں رکھی ہیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ میں نہیں رکھیں، حالانکہ دونوں بھائی ہیں، ایک ہی ماں باپ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی صلب بھی ایک ہے، بطن بھی ایک ہے، لیکن اللہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو علیحدہ طبیعت عطا فرمائی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو علیحدہ طبیعت عطا فرمائی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرمایا:

((إِنَّ ابْنِي هٰذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ))

[صحیح البخاری، رقم: ۲۷۰۴، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ لِلْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ...]

''میرا یہ بیٹا سردار ہے، ایک دن میرا یہ بیٹا اتنا بڑا سردار بنے گا کہ ایک وقت آئے گا کہ اللہ ان کی وجہ سے مسلمانوں کی دو لڑتی جماعتوں کو بچالے گا۔''

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی پوری بھی ہوگئی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان جو جنگیں تھیں، لڑائیاں تھیں اور اختلافات تھے، ان میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صلح کرلی اور مسلمان خون خرابے سے بچ گئے، حالانکہ ان جنگوں میں ہزارہا صحابہ شہید ہوچکے تھے۔ اگر ان جنگوں کو جاری رکھا جاتا تو اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور کتنا خون بہتا؟ لیکن حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کمالِ دانشمندی کا فیصلہ کیا کہ صلح فرمالی، جھگڑا ختم ہوگیا اور اسلام کی قوت بھی مجتمع ہوگئی۔ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں پھر بڑی بڑی فتوحات ہوئیں، کیونکہ آپس کی لڑائی کی وجہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ ادھر ہی مشغول رہے اور ایک ملک بھی فتح نہ ہوسکا۔ وہ تو آپس کے فسادات ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے، دوسرے ملکوں میں فوج کیسے بھیجتے؟ آپس میں جب آدمی مصروف ہوجائے تو دشمن سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور دشمن کی سب سے بڑی سازش یہی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑادو۔ یہ آپس میں لڑتے رہیں اور ہم اطمینان سے بیٹھیں۔ ان کو بھی پتا ہے کہ جب مسلمانوں نے آپس میں لڑنا چھوڑ دیا اور یہ اکٹھے ہوگئے تو ہماری خیر نہیں ہے۔

یہودیوں کا ایک بہت بڑا لیڈر گزرا ہے۔ بدبخت فوت ہوگیا ہے۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ بھئی! تم لوگوں کو یہ بھی خوف ہے کہ کبھی مسلمان تم پر غالب آجائیں گے؟ ابھی تو تمہارے پاس دولت بھی بہت ہے، طاقت بھی بہت ہے۔ اس نے کہا: ہاں جس دن مسلمانوں نے لائن لگا کر یعنی ترتیب سے کام شروع کیا، مثلاً دروازے میں ترتیب

سے داخل ہونا ہے، ترتیب سے نکلنا ہے۔ یعنی جس دن ڈسپلن میں آگئے اس دن ہمیں مار ڈالیں گے۔ اس نے کہا: ابھی تو مسلمان منتشر ہیں، کعبے میں داخل ہوتے ہیں تو لڑ لڑ کر ایک دوسرے کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔

حطیم اور حجرِ اسود پر بے ہنگم رش:

میزابِ رحمت کے نیچے پانی بہتے ہوئے دیکھا نہیں کہ کسی کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے، کوئی گرا ہوا ہے، عورتیں گری ہوئی ہیں۔ پانی اوپر سے گر رہا ہے، عورتوں کا بدن نظر آ رہا ہے، دھکے دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میزابِ رحمت سے پانی حاصل کر رہے ہیں۔ رحمت حاصل کر رہے ہو خود تو زحمت بن رہے ہو، مسلمان کا کوئی پتا ہے؟ کعبہ شریف کا دروازہ کھول دو ابھی تماشا دیکھنا۔ یعنی نہ کعبے کا ادب، نہ اللہ کے گھر کا ادب احترام۔ بھئی! اللہ موقع دے تو ادب کے ساتھ داخل ہو جاؤ، نہ موقع ملے تو حطیم میں نماز پڑھ لو۔ حطیم بھی کعبے کے اندر کا حصہ ہے۔ اگر اندر جانے کا شوق ہے تو جو ثواب اندر ہے وہی ثواب باہر (حطیم میں) ہے۔ جب تمہارا دل کرے حطیم میں جا کر نماز پڑھ لو۔ گویا! تم نے کعبے کے اندر نماز پڑھ لی۔ اب یہ کون سا طریقہ ہے کہ شوق تو ہو کہ کعبے کے اندر جاؤں اور بے ادبی کر کے اندر جائے، اس جانے کا کیا فائدہ؟ یا شوق تو ہو کہ میں حجرِ اسود کو بوسہ دوں اور چار عورتوں کو دھکا مارے اور کسی کو ٹکر مارے، کسی کو ہاتھ لگائے اس کے بعد ثواب سے زیادہ تو گناہ ہو گیا۔ جب اللہ نے فرمایا اشارہ کر دو بوسہ کے برابر ہے۔ جو ثواب بوسہ لینے کا ہے وہی اشارہ کرنے کا ہے۔ تو بلاوجہ بے ادبی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

مسلمانوں میں جب اتفاق واتحاد ہو جائے گا تو وہ دن کفر کا آخری دن ہوگا۔ اس لیے انہوں نے ایسا کیا ہوا ہے کہ ہمیں ادب کے نام پر، محبت کے نام پر تقسیم کر دیا، لڑا دیا اور تفرقہ ڈال دیا کہ مسلمان کبھی "اِعْتِصَامُ بِحَبْلِ اللّٰہِ" نہ کر سکیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران: ۱۰۳]

"اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔"

سورۂ فاتحہ میں زہر کا دم:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"نَقَلَهُ الْقُرْطُبِيُّ عَنِ الْأَشْعَرِيِّ...... عَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: كُنَّا فِي مَسِيرٍ لَنَا......ذَكَرْنَاهُ لِلنَّبِيِّ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: وَمَا كَانَ يُدْرِيهِ أَنَّهَا رُقْيَةٌ اقْسِمُوا وَاضْرِبُوا لِي بِسَهْمٍ" [صحیح البخاری، حدیث:۵۰۰۷،باب فضل فاتحۃ الکتاب]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سفر کے اندر تھے، ایک جگہ ہم ٹھہرے۔ایک لڑکی آئی، اس نے کہا: ہمارے قبیلے کے سردار کو کسی زہریلی چیز نے کاٹ لیا ہے اور ہماری جماعت غائب ہے، یعنی مرد نہیں ہے۔ تمہارے اندر کوئی پڑھنے والا ہو، کوئی منتر جانتا ہو تو آئے اور پڑھے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ رقیہ پڑھتا ہے۔ اس نے جاکر پڑھا، وہ ٹھیک ہو گیا۔ انہوں نے ہمیں دودھ بھی پلایا اور تیس بکریاں بھی دیں۔ جب وہ واپس آ گیا تو ہم نے کہا: ماشاء اللہ! تم تو کچھ پڑھنا جانتے تھے، تمہیں تو کوئی کلام آتی تھی۔ اس نے کہا: مجھے تو کوئی کلام نہیں آتی تھی، میں نے تو بس سورت فاتحہ پڑھی ہے اور اللہ نے شفا عطا فرما دی ہے۔ اس نے کہا: آپ کچھ نہ کرو، بکریاں بھی رہنے دو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاکر پوچھیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دیکھو بھائی! اس نے فاتحہ پڑھی ہے، اس کو کیسے پتا چلا کہ یہ منتر ہے؟ اس نے فاتحہ پڑھی، اللہ کا قرآن پڑھا، اللہ نے شفا دے دی کوئی بات نہیں۔ اچھا وہ بکریاں تمہارے پاس ہیں تو ان کے اندر میرا بھی حصہ رکھو۔ تاکہ صحابہ کو تسلی ہو جائے کہ یہ حلال ہے۔ اور بعض روایات میں آتا ہے کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ خود پڑھنے والے تھے۔

ڈسے ہوئے کے لیے عربی محاورہ:

اصل میں ہوتا یہ ہے کہ جس کو سانپ کاٹے، بچھو ڈس لے تو کہتے ہیں: "لَدِيغٌ، لَدَغَتْهُ الْحَيَّةُ" لیکن عربی یہ بھی کہتے ہیں: "سَلِيمٌ سَلِيمٌ" یعنی خیر ہے، خیر ہے۔ جیسے کسی بیمار کو کہتے ہیں: "سَلَامًا سَلَامًا" یعنی ٹھیک ہے، خیریت ہے، خیریت ہے۔ تاکہ ایسا کلمہ زبان سے نکالا جائے جو باعثِ خیر ہو۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کسی کی عیادت کے لیے جاؤ تو بیمار سے کہو: امید ہے جی کہ آپ رات کو ضرور مر جائیں گے۔ یہ کوئی عیادت تو نہ ہوئی۔ بس جی آپ کی حالت خراب ہے، آخری وقت نظر آتا ہے، ویسے میں دعا تو کر رہا ہوں، لیکن آپ کی امید لگتی نہیں ہے۔ یہ کوئی عیادت نہیں ہوتی۔ عیادت کا معنی ہوتا ہے کہ کوئی اچھا کلمہ منہ سے نکالو کہ اللہ سلامتی عطا فرمائیں گے، خیریت ہے۔ اللہ نے جو تکلیف دی ہے یہ آپ کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گی۔ "لَا بَأْسَ طَهُورٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ" اللہ پاک تمہارے گناہوں کو اس بیماری کے ذریعے دھو ڈالیں گے۔ فکر کیوں کر رہے ہو؟ مسلمان کو تو ہر حال میں فائدہ ہے، تم تو ایسے ہو جیسے سونے کو کٹھالیوں میں ڈالا جاتا ہے، تاکہ صاف ہو جائے۔ اللہ پاک کبھی کبھی اپنے پیارے بندوں کو بھی

تکلیف دے دیتے ہیں، تا کہ دکھ آئے، یہ روئیں، تضرع کریں اور میں ان کے گناہوں کو دھوڈالوں اور میں ان کو معاف کر کے اور زیادہ اونچا کردوں۔ لہٰذا اس موقع پر اگرچہ ''لَدِیْغٌ'' ہی کہنا چاہیے تھا، لیکن ''سَلِیْمٌ سَلِیْمٌ'' اس لیے کہتے ہیں، تا کہ اچھا تفاؤل کیا جائے اور زبان سے اچھا کلمہ نکالا جائے۔

زبان سے برے کلمات ادا نہ کرو:

خدا کی قدرت ہے! بعض اوقات آدمی کے منہ سے غلط جملہ نکل جاتا ہے اور وہی اس کی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔ میں ایک دن اخبار میں پڑھ رہا تھا کہ ایک عورت اپنی بچی سے جب ناراض ہوتی تو کہتی کہ خدا کرے تو جل جائے، مرجائے، تو مجھے تنگ کرتی ہے۔ انجام یہ ہوا کہ وہ لڑکی جل گئی اور پھر وہی عورت رو رہی ہے، پیٹ رہی ہے کہ ہائے ہائے! میری بچی جل گئی ہے۔ تم نے خود تو اسے بددعا دے کر اسے جلا ڈالا، اب چیخ رہی ہو؟ اس لیے حکم ہوتا ہے کہ منہ سے گندا لفظ نہ نکالو، جب بھی بات کرو تو اچھی بات کرو۔ لوگ اپنے بچوں کو خود بددعا دیتے ہیں کہ خدا تجھ پر لعنت کرے، خدا تجھے ہلاک کردے، خدا تجھے اندھا کرے اور خدا تجھے ذلیل کرے۔ اور جب وہ ذلیل ہوتے ہیں تو یہ خود ذلیل ہوجاتے ہیں۔ اس لیے کبھی بھی ایسی گندی زبان استعمال نہ کریں۔ جب بھی بات کریں تو زبان سے اچھا لفظ نکالیں۔ اللہ آپ کو اور مجھے صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سورۂ فاتحہ کا ایک خاص فرشتہ کے ذریعہ سے نزول:

اب مفسر رحمہ اللہ سورۂ فاتحہ کے بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور سورتِ فاتحہ کی فضیلت کے بارے میں حدیث مبارکہ ذکر فرما رہے ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ سورت مبارکہ دو دفعہ نازل ہوئی ہے: ایک دفعہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور ایک دفعہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے، لیکن راجح قول مبارک یہ ہے کہ یہ سورت ایک ہی دفعہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام اس سورت کو لے کر اترے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ سورت فاتحہ حضرت جبرائیل علیہ السلام لے کر نہیں آئے، بلکہ فاتحہ کے لیے اللہ کا ایک خاص فرشتہ نازل ہوا جو میرے پاک نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سورت فاتحہ لے کر آیا۔ جیسا کہ اس حدیث میں بھی آتا ہے:

''رَوٰى مُسْلِمٌ فِيْ صَحِيْحِهٖ وَالنَّسَائِيُّ فِيْ سُنَنِهٖ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي الْأَحْوَصِ عَنْ عَمَّارِ بْنِ رُزَيْقٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عِيْسٰى عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَيْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعِنْدَهٗ

جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَام إِذْ سَمِعَ نَقِيْضًا فَوْقَهُ فَرَفَعَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَام بَصَرَهُ إِلَى السَّمَاءِ فَقَالَ هٰذَا بَابٌ قَدْ فُتِحَ مِنَ السَّمَاءِ، مَا فُتِحَ قَطُّ. قَالَ: فَنَزَلَ مِنْهُ مَلَكٌ فَأَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: أَبْشِرْ بِنُوْرَيْنِ أُوْتِيْتَهُمَا لَمْ يُؤْتَهُمَا نَبِيٌّ قَبْلَكَ: فَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَخَوَاتِيْمِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ، لَمْ تَقْرَأْ حَرْفًا مِنْهُمَا إِلَّا أُعْطِيْتَهُ. وَهٰذَا لَفْظُ النِّسَائِيِّ.''

حضور ﷺ تشریف فرما تھے اور جبرائیل علیہ السلام بھی آپ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جبرائیل علیہ السلام نے ایک آواز سنی ''فَرَفَعَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَصَرَهُ إِلَى السَّمَاءِ'' تو انہوں نے اپنی نظر آسمان کی طرف کی، اس کے بعد انہوں نے عرض کیا: آقا! ''هٰذَا بَابٌ قَدْ فُتِحَ مِنَ السَّمَاءِ مَا فُتِحَ قَطُّ'' (آج آسمان کے دروازوں میں سے ایک ایسا دروازہ کھلا ہے جو کبھی نہیں کھلا) اور اللہ کا ایک فرشتہ اتر رہا ہے جو پہلے کبھی نہیں اترا۔ ابھی یہ حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کر رہے تھے کہ ایک فرشتہ اترا اور اس نے آ کر کہا: مجھے اللہ نے ایسے دو نور دے کر بھیجا ہے اور ایسے دو نور آپ کے پاس لایا ہوں کہ آپ سے پہلے کسی نبی کو یہ دو نور نہیں ملے ہیں۔ وہ دو نور کیا ہیں؟ فرمایا: ''فَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَخَوَاتِيْمِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ'' اس نے کہا: حضور! سورۂ فاتحہ بھی ہے اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات بھی ہیں جن پر سورت ختم ہوتی ہے۔ یہ بھی نور ہیں۔

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَإِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۗ﴾ [البقرة:٢٨٤]

''جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے، اور جو باتیں تمہارے دلوں میں ہیں، خواہ تم ان کو ظاہر کر دیا چھپاؤ، اللہ تم سے ان کا حساب لے گا۔''

اس آیت سے لے کر سورت کے آخر تک۔

[صحیح مسلم، حدیث:٨٠٦، باب: فَضْلِ الْفَاتِحَةِ... سنن النسائی، حدیث:٩١٢، فضل فَاتِحَةِ الْكِتَابِ]

اسی سے یہ بھی سمجھ لیں کہ ستاروں کا بھی ایک نور ہے، چاند کا بھی ایک نور ہے، لیکن جب سورج کا نور آتا ہے تو باقی سب نور ماند پڑ جاتے ہیں۔ جب سورج اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہے اس وقت آپ لاکھ قمقمے جلائیں ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

سارا قرآن نور ہے:

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا پورا قرآن نور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾ [النساء:۱۷۴]

''اور ہم نے آپ کی طرف کھلا نور اتارا ہے۔''

اور ایک جگہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ﴾ [الاعراف:۱۵۷]

اے میرے بندو! میں نے مدنی پاک ﷺ کے ساتھ جو نور یعنی قرآن اتارا اس کی پیروی کیا کرو۔

قرآن، نبی اور مسلمان کے متعلق نور کا استعمال:

نور سے مراد نورِ ہدایت ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ جہاں لفظ نور آجائے آدمی یہ سمجھنا شروع کردے کہ نور ہے۔ جیسے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں لفظ نور آیا تو یہ معنی نہیں کہ وہ بشر نہیں ہیں یا وہ اولادِ آدم نہیں ہیں، مراد نورِ نبوت ہے۔ قرآن کے بارے میں جہاں لفظ نور آئے وہاں مراد نورِ ہدایت ہے اور مسلمان کے بارے میں جہاں لفظ نور آئے گا وہاں مراد نورِ ایمان ہے۔ سمجھا کریں! تاکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں صحیح عقیدے کی سمجھ اور اس میں استقامت نصیب فرمائے۔

حضور ﷺ پر اترنے والے دو نور:

تو میرے مدنی محمد مصطفیٰ ﷺ کو یہ دو نور ملے: ایک سورۃ الفاتحہ اور دوسرا خواتیم سورۃ البقرۃ۔ اسی لیے بعض علماء کرام نے اس حدیث مبارک کو سامنے رکھ کر یہ فرمایا کہ فاتحہ خاص فرشتہ لے کر آیا، یعنی جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے یہ فاتحہ نہیں اتری۔

خاص فرشتے کے ذریعے فاتحہ کے اترنے کا مطلب:

لیکن یاد رکھو! جمہور کا راجح قول یہ ہے کہ قرآن پاک کو لے کر اترنے والے جبرائیل امین علیہ السلام ہیں۔ اللہ نے وضاحت فرمادی۔ قرآن میں فرمایا:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۙ عَلٰي قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۙ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۙ﴾

[الشعراء:۱۹۳تا۱۹۵]

''اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ (اے پیغمبر!) تمہارے قلب پر اترا ہے، تاکہ تم ان (پیغمبروں) میں شامل

ہو جاؤ جو لوگوں کو خبردار کرتے ہیں۔ ایسی عربی زبان میں اترا ہے جو پیغام کو واضح کر دینے والی ہے۔"

اللہ نے فرمایا: قرآن لے کر اترنے والا روح الامین ہے۔ روح حضرت جبرائیل علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور امین کا معنی ہے امانت والا، اللہ کی وحی کی حفاظت کرنے والا، اللہ کی وحی کو صحیح معنوں میں پہنچانے والا۔ تو سارے کا سارا قرآن جو لے کر اترا ہے وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ اب دوسرے فرشتے کے اترنے کا معنی یہ ہے کہ وہ فاتحہ کے بارے میں خصوصی فضیلت بیان کرنے کے بارے میں اترا، یعنی فاتحہ کا خصوصی ثواب بیان کرنے کے لیے اترا، فاتحہ کے خصوصی نور ہونے کی شان بیان کرنے کے لیے اترا اور یہ اترنے کا واقعہ بھی مدینہ منورہ کا ہے۔ اور سورت فاتحہ کا نزول تو مکے میں ہو چکا ہے، لہٰذا جبرائیل علیہ السلام اس کو لے کر اترے اور دوبارہ مدینہ منورہ میں اللہ نے خاص دروازہ کھول کر ایک خاص فرشتے کے ذریعے اپنے پاک پیغمبر علیہ السلام کو مطلع فرمایا۔ اب دونوں حدیثیں بھی جمع ہو گئیں اور کسی روایت میں اختلاف نہ رہا۔

فاتحہ اور تلاوت قرآن کو نماز کا درجہ کیوں ملا؟

اسی لیے اللہ نے اس سورت کو بڑی عظمت دی ہے۔ جیسے حدیث مبارک میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ بِنِصْفَيْنِ فَنِصْفُهَا لِيْ وَنِصْفُهَا لِعَبْدِيْ.)) [صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، بَابُ وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ...]

"نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی تقسیم ہے۔ آدھی میرے لیے ہے اور آدھی میرے بندے کے لیے ہے۔"

یہاں لفظ "الصَّلَاة" ہے اور مراد فاتحہ ہے۔ فاتحہ کو اللہ نے نماز بھی فرمایا ہے، حدیث میں اس کا نام نماز بھی آیا ہے۔ تو یہ بھی فاتحہ کی اتنی بڑی عظمت ہے کہ لفظ فاتحہ کو نماز کے لفظ سے یاد کیا گیا۔ جیسے نماز کو قرأت کے لفظ سے یاد کیا گیا۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿١١٠﴾﴾ [الاسراء: ۱۱۰]

"میرے مدنی! نہ تو قرآن کی قرأت بہت زور سے کریں اور نہ بالکل آہستہ کریں کہ کوئی سن نہ سکے، بلکہ درمیانی اعتدال کا راستہ اختیار فرمائیں۔"

یہاں بھی لفظ ''صَلَاۃ'' ہے اور مراد قرأت قرآن ہے۔ یعنی ''وَلَا تَجْهَرْ بِقِرَاءَتِكَ'' اپنے قرآن کے پڑھنے کو نہ زیادہ زور سے پڑھیے اور نہ آہستہ پڑھیے۔ لفظ ''صَلَاۃ'' ہے مراد قرأت ہے۔ یہاں لفظ صلوۃ ہے اور مراد فاتحہ ہے۔ جیسے اللہ نے نماز کو بھی قرآن فرمایا: ﴿إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾ [الاسراء:۷۸] (بے شک صبح کی نماز (فرشتوں کے) حاضر ہونے کا وقت ہے۔) ﴿قُرْآنَ الْفَجْرِ﴾ سے مراد نماز فجر، صبح کی نماز ہے کہ یہ ایسا وقت ہے جس میں اللہ کے ملائکہ حاضر ہوتے ہیں، لہٰذا یہ بھی اس سورت کی شان ہے کہ اس سورت کو لفظ ''صَلَاۃ'' کے ساتھ تعبیر کیا گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۱، سورۃ الفاتحۃ، الکلام علی ما یتعلق بھذا...]

فاتحہ کے زیادہ نام عظمت شان کی دلیل ہے:

احادیث میں اس سورت کے بہت سارے نام آئے ہیں۔ اس سورت کا نام فاتحہ بھی آیا ہے، ''أُمُّ الْكِتَابِ'' بھی آیا ہے، ''أُمُّ الْقُرْآنِ'' بھی آیا ہے، ''سَبْعُ الْمَثَانِي'' بھی آیا ہے، ''وَافِيَةٌ'' بھی آیا ہے، ''وَاقِعَةٌ'' بھی آیا ہے، ''شَافِيَةٌ'' بھی آیا ہے اور اس سورت کا نام ''صَلوٰةٌ'' بھی آیا ہے۔ تو احادیث میں اس سورت کے اتنے اسماء مبارکہ بیان ہوئے ہیں۔ اور جتنے نام زیادہ ہوں اتنی شان زیادہ ثابت ہوتی ہے۔ جیسے اللہ کے ننانوے نام ہیں، میرے مدنی پاک ﷺ کے کئی نام ہیں۔ اسی طریقے سے سورۂ فاتحہ کے بھی کئی اسماء مبارکہ ہیں۔

فاتحہ مضامینِ قرآن کا خلاصہ ہے:

اور پھر یاد رکھیں! علماء نے فرمایا: سارے قرآن پر نظر ڈالو سارے قرآن کا خلاصہ سورت فاتحہ ہے۔ یعنی سارے قرآن کا خلاصہ اللہ نے سورۂ فاتحہ میں بیان کر دیا ہے۔ سارے قرآن میں تین مسئلے ہیں: ❶ ...... مسئلہ الوہیت، ❷ ...... مسئلہ نبوت و رسالت ❸ ...... اور مسئلہ آخرت۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں مسئلے سورۂ فاتحہ میں بیان کر دیے ہیں۔ تو گویا سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں ہے۔

انسان کی زندگی کے تین دور:

اسی طرح علماء نے فرمایا: آدمی پر زندگی کے تین دور آئیں گے:

ایک دور وہ ہے جب وہ عدم میں تھا اللہ نے اس کو وجود بخشا۔ یعنی ہم تھے ہی نہیں، پیدا ہونے سے پہلے ہم کہاں تھے؟ اسی لیے قرآن کہتا ہے:

﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ①﴾ [الدھر:۱]

''تم پر ایک ایسا وقت بھی گزرا کہ جب تم کچھ بھی نہیں تھے۔''

کوئی تیرا نام ونشان ہی نہیں تھا، تیرا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اللہ ہمیں عدم سے وجود میں لے آئے کہ ہم کچھ نہیں تھے اوراس کے بعد والدین پیدا ہوئے، پھر والدین کے اصلاب کے اندر ایک پانی رکھا گیا، پھر اصلاب سے پانی گرا، پھر اس پانی کو ایک خاص مقام میں محفوظ رکھا گیا اور پھر اس کی حفاظت کے بعد اسی کے اندر تصویر وتخلیق کے سارے مراحل طے ہوئے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ⑤ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ⑥ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ⑦﴾

[الطارق:۵،۶،۷]

''اب انسان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اسے کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ اسے ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔''

اب پانی کہاں جمع ہوا؟ قرآن کہتا ہے: ﴿فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ㉑﴾ [المرسلات:۲۱] (ایک ٹھہرنے والی جگہ میں ہم نے اس پانی کو ٹھہرا دیا) ﴿اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ㉒﴾ [المرسلات:۲۲] (ایک مدت معلوم تک)۔ اور ایک جگہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ﴾ [آل عمران:۶] (وہی ہے جو ماؤں کے پیٹ میں جس طرح چاہتا ہے تمہاری صورتیں بناتا ہے۔) پھر تصویر اور تخلیق کے مراحل طے ہوئے اور پھر حضرت انسان دنیا میں تشریف لے آئے۔

تو یاد رکھو! ایک ہمارا دورِ عدم تھا، پھر ایک دور وہ تھا جس میں اللہ ہمیں عدم سے وجود میں لے آئے۔ پیدا ہونے کے بعد پہلے بچپن آیا، پھر جوانی آئی، پھر بڑھاپا آیا، پھر شیخوخت آئی، پھر ہرم اور پھر موت آ گئی۔ اور دوسرا دور وجود میں آنے کے بعد مرنے کا دور ہو گیا۔ یہ دو دور ہو گئے۔ پھر ایک اصلی دور آئے گا قبر سے اٹھنے کے بعد، جس کو عالم آخرت کہتے ہیں۔ ایک عدم سے وجود میں آنے کا دور تھا، ایک وجود میں آ کر مرنے تک بھی دار دنیا کا دور تھا اور پھر مرنے کے بعد آخرت کا دور ہے۔ یہ تین دور ہو گئے۔ تو ان تینوں ادوار پر اللہ نے سورۂ فاتحہ میں روشنی ڈال دی کہ جب شروع کیا تو کہاں سے شروع کیا؟ فرمایا: ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' اس میں لفظِ اللہ یعنی اسمِ جلالت آیا ہے، جو الوہیت پر دلالت کرتا ہے۔ اور ساری کائنات کو پیدا کرنے والا اور عدم سے نکالنے والا اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰي عَلَي الْعَرْشِ﴾ [السجدة: ۴]

''اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو اور اس مخلوق کو جو ان دونوں کے درمیان میں ہے چھ روز میں پیدا کیا اور پھر تخت قائم ہوا۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝﴾ [النمل: ۶۰]

''بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور تمہارے لیے آسمان سے پانی اتارا؟ پھر ہم نے اس پانی سے بارونق باغ اگائے، تمہارے بس میں نہیں تھا کہ تم ان کے درختوں کو اگا سکتے۔ کیا (پھر بھی تم کہتے ہو کہ) اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ نہیں! بلکہ ان لوگوں نے راستے سے منہ موڑ رکھا ہے۔''

اس لیے فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ [یٰس: ۷۷]

''کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا، سو وہ اعتراض کرنے لگا۔''

تو ہمیں عدم سے نکالنے والا کون ہے؟ اللہ ہے۔ تو اب الوہیت کا ذکر اس میں آ گیا۔ اب جب ہم وجود میں آ گئے تو ہمیں اس کی رحمت کی ضرورت تھی تو ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کا دور آ گیا اور پھر جب آخرت آئے گی تو ہمیں فیصلے کی ضرورت تھی کہ حق کا فیصلہ ہو تو ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ کا ذکر آ گیا۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ گویا تینوں ادوار کو شامل ہونے والی ساری کی ساری نعمتیں سورۂ فاتحہ کے اندر آ گئیں۔

سورۂ فاتحہ آدھی اللہ کے لیے، آدھی بندہ کے لیے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ، وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ))

[صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، باب: وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ......]

''سورۂ فاتحہ میرے اور میرے بندے کے درمیان میں تقسیم ہے، آدھی میرے لیے، آدھی میرے بندے کے

لیے۔ اور میرے بندے نے جو مانگا اس کو ملے گا۔"

علماء نے فرمایا: اب غور کرو! اللہ کے لیے بھی تقریباً پانچ صفتوں کا ذکر ہے اور بندے کے بارے میں بھی پانچ چیزوں کا ذکر ہے۔ پوری سورۂ فاتحہ کے اندر غور کریں تو پانچ چیزوں کا ذکر آئے گا: پہلی صفت آنے گی الوہیت، دوسری صفت رحمانیت، تیسری صفت رحیمیت، چوتھی صفت ربوبیت اور پانچویں صفت مالکیت۔ یہ ساری چیزیں سورۂ فاتحہ کے اندر موجود ہیں۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ میں الوہیت آگئی، ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں ربوبیت آگئی، ﴿الرَّحْمٰنِ﴾ میں رحمانیت آگئی، ﴿الرَّحِيْمِ﴾ میں رحیمیت آگئی اور ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ میں مالکیت آگئی۔ اور پھر آگے فرمایا: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ (ہم اسی کی ہی عبادت کرتے ہیں۔) اس میں بندے کے لیے عبادت آگئی، بندے کے لیے عبودیت آگئی، ﴿وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ میں استعانت آگئی، ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ میں طلب ہدایت آگئی اور اسی طریقے سے ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں نعمت آگئی اور ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ میں غضب اور گمراہی سے پناہ آگئی۔ تو پانچ چیزیں اللہ کی صفات میں ذکر کی گئیں اور پانچ کا تعلق بندوں کے ساتھ ہے۔ اللہ ہمیں قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ کی صفات میں سے پہلی صفت الوہیت آئی تو بندے کی صفات میں سے پہلی صفت عبادت اور عبودیت آگئی۔ یعنی جب ہم نے اقرار کرلیا کہ الٰہ اور رب وہی ہے تو یہ بات بھی سمجھ گئے کہ عبادت کے لائق بھی وہی ہے۔ اور ہم نے اعتراف کرلیا کہ الوہیت اسی کی صفت ہے اور ساری دنیا، سارے عالم، ساری مخلوق کی حقیقی ربوبیت اسی کے لیے ہے، باقی دنیا کی ربوبیت عارضی ہوتی ہے۔

والدین کی اولاد پر شفقت:

ویسے تو ہمیں ماں باپ نے بھی پالا ہے، ہماری خدمت ماں باپ نے بھی کی ہے۔ قرآن نے ہمیں دعا سکھلائی ہے:

﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝﴾ [الاسراء: ۲۴]

"یا اللہ! ہمارے والدین پر رحم فرما جیسے انہوں نے ہماری تربیت کی جبکہ ہم چھوٹے تھے۔"

لیکن ہمارے والدین کی تربیت دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ کی محتاج ہے، کیونکہ اللہ نے ان کو بنایا، اللہ نے ان کے اندر رحم کا مادہ ڈالا اور اللہ نے ان کو اپنے بچے سنبھالنے کی تعلیم عطا فرمائی۔ تمام والدین اپنے بچوں کو پالیں گے، دوسرے بچوں سے ان کا کیا تعلق؟ لیکن اللہ رب العزت کی ربوبیت اتنی عام ہے کہ جس مخلوق پر نظر ڈالو گے تو

سب کو پالنے والا اللہ ہے۔تو مدد اسی سے مانگیں، مدد کے قابل اور کون ہو سکتا ہے؟ جب پالنے والا وہ ہو، ہمیں عدم سے نکالنے والا وہ ہو تو پھر ہماری مدد کرنے والا بھی وہی ہو سکتا ہے اور کوئی مدد کے قابل نہیں ہو سکتا۔

ویسے اگر آپ غور کریں! بندہ کتنا عاجز ہوتا ہے!! بچہ پیدا ہوا، اپنے گھر کے اندر ہے، دروازہ بند ہے، فلیٹ بند ہے، چھوٹا سا بچہ ہے اور بے چارہ کھڑا بھی نہیں ہو سکتا، گھٹنوں پر گھسٹ رہا ہے اور پھر رہا ہے اس وقت نہ تو باہر سے اس کی کوئی مدد کرنے والا ہے، نہ خود کھڑے ہو کر کچھ کرنے والا ہے، نہ دروازہ کھول کر نکلنے کے قابل ہے، نہ دوڑنے کے قابل ہے، اب اس وقت سوائے اس مربی کے اور سوائے ماں باپ کے اور کوئی تربیت کرنے والا نہیں ہے۔ تو اسی طرح اگر آپ نظر ڈالیں کہ بندہ جب ہر لحاظ سے عاجز ہے، اس کی تربیت کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے، تو ان کی تربیت عارضی ہے اور اللہ کی تربیت حقیقی ہے، اس کی تربیت ساری دنیا، سارے عالم پر محیط ہے۔

اللہ کے سخت احکام کی مثال:

اور آگے ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ آ گیا۔ یاد رکھیں! علماء نے فرمایا: ﴿الرَّحْمٰنِ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اس کی رحمت عام ہے، بے حد مہربان ہے۔ علماء نے فرمایا کہ اس کو مجموعِ رحمت ظاہراً بھی، باطناً بھی، صورۃً بھی اور معناً بھی ہوتی ہے۔ اچھا! کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ظاہراً تو رحمت نہیں، لیکن باطناً رحمت ہے۔ کیا معنی ہم مریض کو دوائی پلا رہے ہیں اور ہاورڈ کونین ہے اور کونین اتنی تلخ ہے کہ اگر زبان کو لگائیں تو بے چارے کے چودہ طبق روشن ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے کہ بہت کڑوی ہے۔ آپ کہتے ہیں: نہیں جی! ضرور پینی ہو گی، بھائی! یہ تمہارا علاج ہے۔ وہ کہتا ہے: جی! بڑی سخت کڑوی دوا ہے۔ وہ کہتا ہے: ناک بند کر لو، آنکھیں بند کر لو۔ ایک دفعہ کسی طریقے سے اندر چلی جائے، بعد میں ہم تمہیں میٹھی چیز کھلا دیں گے، تمہیں شکر دے دیں گے، تمہیں اور کوئی حلوہ دیں گے اور تمہیں کوئی لڈو کھلا دیں گے لیکن دوائی ضرور پئیں۔ بظاہر تو کڑوی ہے، لیکن اندر جانے کے بعد رحمت ہے۔ تو بظاہر بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں۔

عصمتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اترنے والی آیات کی حکمتیں:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ﴾ [النور:11]

''تم اس بات کو اپنے لیے برا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے لیے بہتر ہی بہتر ہے۔''

میرے مدنی! آپ کی بیوی پر دشمنوں نے، یہودیوں نے جو تہمت لگائی ہے اس سے آپ کو بظاہر بڑی تکلیف ہو رہی ہے، حرمِ رسول اللہ پر تہمت لگی، حضور ﷺ پاک کی عزت وعصمت پر تہمت لگی، اللہ نے فرمایا: اس کو آپ برا نہ سمجھیں، بظاہر یہ بری ہے، لیکن اس کے اندر بڑی حکمتیں ہیں۔ اگر یہ تہمتیں نہ لگتیں تو ہم قرآن کیوں نازل کرتے؟ اگر یہ تہمت نہ لگتی تو ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گواہ کیوں بنتے؟ اگر یہ تہمت نہ لگتی تو ہم عرش سے قرآن اُتار کر بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کی عظمت میں اتنا بڑا اضافہ کیوں کرتے کہ قیامت تک پڑھا جائے گا۔ بظاہر تو یہ شر نظر آیا، لیکن باطن میں بڑی حکمت ہے۔ اور یہ واضح ہو گیا کہ کون ماؤں پر تہمت لگانے والے ہوتے ہیں؟ اور کون ماؤں کی صفائی دینے والے ہوتے ہیں؟ کون ایسے ہوتے ہیں جو ماؤں پر اعتراض کریں اور امہات المومنین سے دشمنی رکھیں؟ اور کون ہیں جو امہات المومنین پر اپنی جانیں قربان کر دیں؟

تو اللہ نے فرمایا: بظاہر تو شر نظر آیا کہ تہمت لگی، میرے مدنی پاک ﷺ کو تکلیف ہوئی، بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا بیمار ہو گئیں، ان کو اللہ کے نبی کا گھر چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے گھر آنا پڑا اور بستر سے لگ گئیں، چلنے پھرنے کے قابل نہ رہیں اور چہ مگوئیاں شروع ہوئیں اور چند دنوں کے لیے یہودیوں کو اور منافق ٹولے کو بڑی خوشیاں ملیں، بڑی فرحت ملی اور بڑے بڑے اکڑ اکڑ کر چلتے تھے کہ دیکھا نبی کی بیوی کا یہ حال ہے۔ لیکن جب اللہ نے قرآن اتارا تو ان کا منہ کالا ہو گیا اور مدنی پاک ﷺ کی عصمت کے رکھوالے نے ہمیشہ کے لیے حضور ﷺ کی عصمت کے چاند کو بدرِ کامل بنا دیا اور اتنی بڑی عظمت ملی کہ ساری دنیا کے بارے میں بات کرو تو اس کے کفر و اسلام میں شک ہو سکتا ہے، کفر و اسلام میں دو رائے ہو سکتی ہیں، لیکن بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو تہمت لگائے اس کے کفر میں دوسری بات ہی کوئی نہیں۔ یعنی اس کے کافر ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں، کیونکہ وہ تو قرآن کا منکر ہو گیا اور جو قرآن کا منکر ہو اس کے کافر ہونے میں شک نہیں ہوتا۔

رحمٰن اور رحیم کی رحمت کے مفاہیم:

دنیا میں جو رحمتیں ہیں بعض اوقات ہمیں معلوم ہوتا ہے جی ہمیں بخار ہے، بڑی تکلیف ہے، لیکن ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ اس بخار کی وجہ سے اللہ ہمیں گناہوں سے پاک کرے گا، لیکن رحیم ایسی رحمت ہے جو اندر سے بھی رحمت ہو گی اور باہر سے بھی رحمت ہو گی، صورۃً بھی رحمت ہو گی اور معناً بھی رحمت ہو گی اور ظاہراً بھی رُحمت ہو گی اور باطناً بھی رحمت ہو گی، تو اس لیے رحمٰن کی رحمت میں تو دوست دشمن سب شامل ہیں، لیکن رحیم کی رحمت میں قیامت والے

دن صرف مومن شامل ہوں گے، کیونکہ اندر باہر جو رحمت ہے، ظاہراً باطناً جو رحمت ہے اس کے حق دار قیامت والے دن صرف مومنین کاملین ہوں گے، کافر کسی رحمت کا مستحق نہیں ہوگا، البتہ دنیا میں سب کے لیے رحمت ہے۔ آپ بھی دنیا میں رہتے ہیں اور ہم بھی رہتے ہیں، آپ بھی دنیا میں رہتے ہیں اور کافر بھی دنیا میں رہتا ہے، آپ کی بھی اولاد ہوتی ہے اور کافروں کی بھی اولاد ہوتی ہے، آپ کو بھی ٹھنڈی ہوا لگتی ہے۔ اور پھر اس سے بڑی رحمت اور کیا ہے؟ آج توبہ کرلیں تو جنت کے حق دار بن جائیں گے۔ ان کے لیے بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ تو شانِ رحمت بھی آگئی اور شانِ رحیمیت بھی آگئی۔ ''رَحمٰنٌ'' ''فَعْلَانٌ'' کے وزن پر ہے، مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے نہایت مہربان۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۱ فصل: فِی فَضْلِهَا (اَلْبَسْمَلَة)]

ماں کی اور رب کی رحمت کی مثال:

اور پھر میرے مدنی پاک سرکارِ دو عالم ﷺ پر کروڑوں صلوٰۃ وسلام ہوں۔ آپ نے ایک دن عجیب مثال دی! اگر کوئی سمجھنے والا ہو تو میرے مدنی ﷺ کے ایک ایک فرمان کے اندر ایسے موتی ہیں، ایسی حکمتیں ہیں، ایسی ہدایتیں ہیں اور ایسے راستے ہیں کہ آدمی کبھی ناکام ہو ہی نہیں سکتا۔

حضور ﷺ نے ایک دن دیکھا کہ ایک عورت جنگ کے بعد اپنے بچے کو ڈھونڈ رہی ہے، بچہ نہیں مل رہا، جنگ میں گم ہوگیا، بے چاری رو رہی ہے۔ جو بچہ آئے اس کو پکڑ لیتی ہے، اس کو سینے سے چمٹا لیتی ہے، پھر دیکھتی ہے اور کہتی ہے کہ میرا بچہ تو نہیں ہے، پھر بے چاری بھاگ پڑتی ہے، آخر اپنا بچہ اسے مل گیا، سینے سے چمٹا لیا اور بوسے دے رہی ہے اور چوم رہی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میرے صحابہ! کتنی محنت کے بعد جب اس عورت کو اس کا بچہ ملا ہے، کتنی شیفتگی اور والہانہ طریقے سے محبت میں دیوانہ ہو کر اس کو چوم رہی ہے، کیا یہ عورت اپنے اس بچے کو اپنے ہاتھ سے آگ میں ڈالے گی؟ صحابہ نے عرض کیا: حضور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ماں اپنے بچے کو آگ میں ڈالے؟ فرمایا: اللہ تو اس سے بھی زیادہ رحم والے ہیں۔ وہ اپنے بندوں کو آگ میں کیسے ڈالیں گے؟

اللہ تو آگ میں نہیں ڈالنا چاہتے، اللہ تبارک وتعالیٰ تو ہمیں جہنم سے چھڑانا چاہتے ہیں، لیکن تم اپنے آپ کو زبردستی گراؤ، اس کی رحمت سے نکال کر تو یہ علیحدہ بات ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲﴾ اور اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ دنیا میں ہم نے اچھا کیا، برا کیا، کوئی بدلہ بھی تو ہو، فیصلہ بھی تو ہو، اس لیے فرمایا: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳﴾

قیامت کے دن کا مالک کون؟ قیامت کے دن کا مالک بھی میرا اللہ ہے۔ اور پھر اس دن فیصلہ ہوگا اور اس کے بعد یہ ساری صفتیں اللہ کی طرف آگئیں۔

صراطِ مستقیم پر استقامت:

جب مالک وہ ہے، رب وہ ہے تو مدد کے قابل بھی وہ ہے۔ اور جب رب بھی تو ہے، مالک بھی تو ہے، رحمٰن بھی تو ہے، رحیم بھی تو ہے تو میرا اللہ! ہم راستہ کس سے مانگیں؟ جب ایسا رب مل جائے، ایسا رحمٰن مل جائے، ایسا رحیم مل جائے تو پھر راستہ کی ہدایت اسی سے مانگنی ہے۔ اسی لیے انسان کہتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (میرا اللہ! مجھے سیدھا راستہ عطا فرما۔) ایسا راستہ نہیں کہ جس راستہ پر ایک دن تو چلوں اور دوسرے دن بھٹک جاؤں۔ راستہ بھی سیدھا اور اس پر استقامت بھی نصیب فرما۔ کیونکہ آپ نے خود ارشاد فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ [حم السجدة:۳۰]

"جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر (اس پر) مستقیم رہے ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم اندیشہ نہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت (کے ملنے) پر خوش رہو جس کا تم سے (پیغمبروں کی معرفت) وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔"

ہدایت کے چار مراتب:

اسی لیے علماء نے فرمایا: ہدایت کے تین مراحل ہوتے ہیں: 1 ...... پہلا انابت ہوتا ہے، 2 ...... پھر ہدایت ہوتا ہے 3 ...... اور پھر استقامت ہوتا ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا: چار مراحل ہوتے ہیں: 1 ...... ایک انابت ہوتا ہے، 2 ...... ایک ہدایت ہوتا ہے، 3 ...... ایک استقامت ہوتا ہے 4 ...... اور ایک ربط علی القلب ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے:

﴿وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ﴾ [الزمر:۵۴]

"اور تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو۔"

یہ انابت ہے۔ اس کے بعد بندہ مانگتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھلا۔) یہ ہدایت ہے۔ اب جناب! جب ہدایت بھی نصیب ہوگئی، اس کے بعد استقامت کا مرحلہ آئے گا۔ اللہ

نے فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا﴾ (جو میری ربوبیت اور الوہیت کا اقرار بھی کرتے ہیں اور اس پر ثابت قدم بھی رہتے ہیں۔) ثابت قدم رہنے کا کیا مطلب؟ عالم ارواح میں کس چیز کا اقرار کیا تھا؟ ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ﴾ (اور پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا: کیوں نہیں؟) پھر میرے بندے اس پر جمے ہوئے ہیں، ثابت قدم ہیں، توحید کے عقیدے پر پہاڑ کی طرح کھڑے ہیں۔ کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ غیر سے مدد مانگیں، کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ غیر کو سجدہ کریں، کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ غیر کو حاجت روا اور مشکل کشا مانیں، کبھی وہ غیر کی نذر نیاز مانیں، کبھی وہ غیر کو پکاریں اور کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ غیر کے آگے آئیں اور انہیں کے سامنے جھک جائیں۔ وہ تو مانتے ہی مجھے ہیں، تو اس پر قائم ہیں۔ فرمایا: پھر اس سے بھی آگے کی سٹیج ہے کہ جب میرے بندے انابت کا مرحلہ بھی طے کر گئے، ہدایت کا مرحلہ بھی طے کر گئے، استقامت کا مرحلہ بھی طے کر گئے تو اللہ فرماتے ہیں: ہم ان کے دلوں کو اپنے ہاتھوں سے مضبوط کر دیتے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَن نَّدْعُوَ مِن دُونِهِ إِلَٰهًا ۖ لَّقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا﴾ [الکھف: ۱۴]

"اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیے، جبکہ وہ (دین میں) پختہ ہو کر کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم تو اس کو چھوڑ کر اور معبود کی عبادت نہ کریں گے، کیونکہ اس صورت میں ہم نے یقیناً بڑی بے جا بات کہی۔"

﴿إِن كَادَتْ لَتُبْدِي بِهِ لَوْلَا أَن رَّبَطْنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا﴾ [القصص: ۱۰]

"قریب تھا کہ وہ یہ سارا راز کھول دیتیں، اگر ہم نے ان کے دل کو سنبھالا نہ ہوتا۔"

فرمایا: دیکھا نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی اماں اور موسیٰ علیہ السلام کی بہن تو راز کھول دیتیں، لیکن ہم نے ان کے دلوں کو گرہ لگا دی کہ صبر کرو، راز نہ کھلے، ہم موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کریں گے۔ جب رحمٰن بھی وہ ہے اور رحیم بھی وہ ہے تو ہم ہدایت کا راستہ کس سے مانگیں؟ اللہ تعالیٰ سے مانگیں۔

علماء نے فرمایا کہ اس پر ایک نظر ڈالو! انسان جب تیاری کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنی جگہ متعین کرتا ہے۔ جب آپ سفر کریں گے تو ارادہ کریں گے کہ کہاں جانا ہے؟ آپ کہیں گے: جی مدینہ منورہ...... ان شاء اللہ!......، پھر فیصلہ کرتے ہیں کہ اب مدینہ شریف جانا ہے تو کتنے دن رہیں گے؟ کم از کم آٹھ دن۔ تو اچھا بھائی! آٹھ دن کھانا

پینا، سامان اور کپڑے وغیرہ سب ساتھ رکھ لو۔ اچھا بھائی! سرمہ، برش اور کنگھا وغیرہ بھی ساتھ رکھ دو، سامان تیار ہو گیا۔ اب ہم نے جانا ہے تو کون سا راستہ اختیار کریں؟ جی یہ سڑک بالکل سیدھی ہے، سیدھا مدینہ شریف جائے گی۔ اب کیا کریں؟ سواری کا بھی فیصلہ بھی کریں کہ بہترین گاڑی ہے، ایئر کنڈیشنر بھی ہے اور سیٹیں بھی آرام دہ ہیں، اسی پر بیٹھ جائیں۔ یہ بھی فیصلہ ہو گیا۔

اسی طرح اب دیکھیں! ساری تیاری ہو رہی ہے۔ پہلے اللہ کی حمد وثنا ہو رہی ہے، اس کی تمجید بیان ہو رہی ہے، اس کی الوہیت کا اقرار ہو رہا ہے، اس کی ربوبیت کا اقرار ہو رہا ہے، اس کی رحمانیت کا اقرار ہو رہا ہے، اس کی رحیمیت کا اقرار ہو رہا ہے، اس کی مالکیت کا اقرار ہو رہا ہے، پھر اپنی بندگی کا اقرار ہو رہا ہے اور اسی سے مدد مانگی جا رہی ہے۔ منزل ہماری جنت ہے، پھر اس کے لیے ہم راستہ پوچھ رہے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ (صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما) اور پھر راستے میں ضرورت ہوتی ہے کہ کس کے ساتھ سفر کیا جائے؟ کیونکہ ساتھی اچھا ہوگا تو سفر میں آرام ہوگا۔ تو اب کس کا راستہ پوچھ رہے ہیں؟ کہا: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ (اللہ ہمیں ان کے ساتھ چلانا جو تیرے انعام والے بندے ہیں) میرے اللہ! جو تیرے خاص بندے ہیں۔ پھر ان کے بارے میں فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝﴾

[النساء:٦٩]

”جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیا، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں!“

اب سواری بھی مل گئی، سفر بھی مل گیا اور ساتھ بھی مل گیا، اب ڈر ہوتا ہے کہ ساتھی تو ہمیں بہت اچھے مل گئے، لیکن آگے راستے میں کوئی ڈاکو ڈاکہ ڈال کر ہمیں لوٹ نہ لے، ہمیں راستے سے ہٹا نہ دے۔ اس لیے دعا مانگی: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ (اللہ! جن پر تیرا غضب ہے ان سے بھی بچانا اور جو گم کردہ راہ ہیں ان سے بھی بچانا) وہ ڈاکو ہوتے ہیں مال کے اور یہ ڈاکو ہیں ایمان کے۔ مال چلا جائے تو بندہ جی لیتا ہے، لیکن ایمان چلا جائے تو پھر بندہ کہاں جائے؟

تلاوت سے پہلے تعوذ:

اس لیے علماء نے فرمایا: سورۂ فاتحہ پر نظر ڈالیں! جس طرز سے بھی نظر ڈالیں گے اسی طریقے کے اندر اس میں

حکمتوں کا دریا ہے۔ ایسا دریا ہے جس کے موتی نہ آج تک ختم ہو سکے ہیں اور نہ قیامت تک ختم ہو سکیں گے۔ اور پھر اللہ پاک نے فرمایا: میرا مدنی ﷺ! جب سورۂ فاتحہ کو شروع کریں تو سب سے پہلے میری پناہ میں آئیں۔ ''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھ کر شیطان سے میری پناہ پکڑیں۔

سارے قرآن میں نظر ڈالو! دشمنوں کے بارے میں سارے قرآن میں تین آیتیں ملتی ہیں، جن کا مفہوم یہ ہے اللہ نے فرمایا: میرا مدنی!

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ [الاعراف: ۱۹۹]

''اگر دشمن مخالفت کریں ناں! دشمن اگر آپ کو ستائیں تو آپ معاف کریں، آپ چھوڑیں اور دشمنوں سے اعراض کرلیں اور منہ پھیرلیں (یہ بھی دشمن کا علاج ہے)۔''

دشمن اگر دشمنی کرتا ہے تو معاف کردو اور تم اس سے ہٹ جاؤ۔ اگر وہ ضد کرے کہ میں نے یہیں بیٹھنا ہے تو آپ کہہ دیں کہ آپ بیٹھ جائیں، میں ادھر بیٹھ جاتا ہوں۔ بات ختم ہوگئی، معاملہ حل ہوگیا۔ اور اس کے بعد دشمن کا دوسرا علاج بیان فرمایا کہ دشمن کے ساتھ احسان کرو۔ اللہ نے فرمایا:

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾ [حم السجدۃ: ۳۴]

''تم بدی کا دفاع ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی، وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا ہو جائے گا جیسے وہ (تمہارا) جگری دوست ہو۔''

وہ برائی کرے تو تم احسان کرو، وہ برائی کرے تو تم بھلائی کرو، وہ تمہیں گالیاں دے تو تم اس کو دعائیں دو، وہ تمہیں گالیاں دے تو تم شام کو اس کے گھر کھانا لے کر کھڑے ہو، وہ تمہارے لیے دشمنیاں ڈھونڈ رہا ہے تو تم اس کے لیے بھلائیاں تلاش کرو اور تیرے اور اس کے درمیان دشمنی ہے تو تم احسان کی مار دو تو ہو سکتا ہے کہ وہ تیرا گہرا دوست بن جائے کیونکہ دنیا میں احسان سے زیادہ کوئی مار نہیں ہے۔ اگر تم اپنے دشمن کو مارنا چاہتے ہو اور اس کو اپنا دوست بنانا چاہتے ہو تو تم اس کے ساتھ احسان کرو اور اس کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔

حضور ﷺ کے کفار پر احسانات:

۱۔ دیکھا نہیں کہ حضور ﷺ کو مکے والوں نے اتنا تنگ کیا کہ میرے مدنی ﷺ ہجرت کر رہے ہیں، لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں: علی! یہ میرے پاس مکہ والوں کی امانتیں ہیں، تم رات رہ جاؤ، بعد میں ہجرت کرلینا اور ہر

کسی کی امانت اس کے گھر پہنچا دینا۔

ایک طوائف پر احسان:

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک طوائف، زانیہ، فاحشہ یعنی جھنڈے لگا کر گناہ کرنے والی عورت ایک دن مکہ سے مدینہ آ گئی۔ حضور ﷺ کے سامنے آئی تو آپ ﷺ نے پوچھا: تو ادھر کیسے آ گئی؟ کہنے لگی: حضور! کیا کریں؟ مکے کے جتنے سردار تھے وہ تو آپ نے بدر میں مار ڈالے، ہمارے پاس تو کھانے کو روٹی نہیں رہی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اس کی بھی مدد کرو، ہمارے دروازے پر آئی ہے تو اس کو بھی دے دو، ہمارے دروازے سے کوئی خالی نہ جائے۔ انہی چیزوں نے تو ان کو مسلمان کیا، انہی چیزوں نے تو گنہگاروں کو متقی بنایا اور جو فاسق و فاجر تھے ان کو تقویٰ کے اعلیٰ مرتبوں پر پہنچا دیا۔ دشمن کا ایک علاج ہے اعراض کرنا اور ایک علاج ہے اس پر احسان کرنا کہ وہ ظلم کرے تو احسان کرو، وہ گالیاں دے تو تم دعا کرو۔

تعوذ کا فائدہ:

اور دشمن کا ایک علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝﴾ [الاعراف:۲۰۰]

میرا مدنی! اگر شیطان حملہ کرے تو اس کا علاج یہ ہے کہ پھر تم میری پناہ پکڑ لو، کیونکہ علماء نے فرمایا کہ وہ دشمن تو نظر آنے والا تھا اس کا علاج تو ممکن تھا۔ شیطان ایسا دشمن ہے جو نظر آنے والا نہیں ہے۔ اس کا علاج کوئی نہیں تھا۔ تو فوراً ہم اللہ کی پناہ میں آ جائیں۔ اچھا! پھر یاد رکھو! جو انسانوں میں دشمن ہے وہ دشمنی کرے۔ مثلاً ہمیں قتل کر ڈالے ہم شہید ہو گئے تو ہمیں کونسا نقصان ہو گیا ہے؟ یعنی دنیا میں اگر انسان دشمن ہے، کوئی مخالف ہے، اس نے ہمیں بے گناہ مار ڈالا، ہمیں قتل کر دیا، ہم تو شہید ہوں گے ناں! وہ ظالم بنا، قاتل بنا، ہمارا تو مرتبہ بلند ہو گیا۔ اور اسی طرح اگر وہ ہم پر غالب آ گیا، ہم جناب مغلوب ہو گئے، تب بھی ہمیں اجر اور ثواب ملا۔ لیکن اگر یہ شیطان دشمن کسی کو مار ڈالے وہ تو جہنمی ہو گیا۔ انسانوں کے دشمن کا مارا ہوا شہید بن جاتا ہے، لیکن شیطانی دشمنی سے مارا ہوا اللہ کی رحمت سے ہمیشہ کے لیے مردود بن جاتا ہے۔ وہ دشمن ہمیں مارے تو ہمیں اجر ملتا ہے اور اس دشمن کی مار اگر ہم قبول کر لیں اور اس کے آگے مغلوب ہو جائیں اور شیطان ہم پر غالب آ جائے پھر تو جہنم ہی جہنم ہے۔ تو یہ اتنا خطرناک دشمن ہے۔

اس کے لیے اللہ نے اپنے پاک پیغمبر ﷺ کو تعلیم دی کہ جب فاتحہ شروع کرو یا قرآن کی کوئی اور سورت شروع کرو تو پہلے "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھو۔ بعض احادیث میں دوسرے کلمات بھی ثابت ہیں۔ مثلاً: "أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" لیکن جو قرآن میں تعلیم دی گئی ہے وہ "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" ہی ہے۔ اور اس کے بعد "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھیں۔

تعوذ کب پڑھیں؟

اب رہی یہ بات کہ تعوذ کب پڑھنا چاہیے؟ تلاوت کے شروع میں یا تلاوت کرنے کے بعد؟ اس معاملے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

پہلا قول:

بعض علماء نے فرمایا: جب تلاوت مکمل کر لیں تو اس وقت تعوذ پڑھیں، کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ [النحل:۹۸]

اس آیت میں فا ہے۔ اور فا تعقیب کے لیے ہوتی ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ جب تم قرأتِ قرآن کر چکو تو پھر اللہ کی پناہ پکڑو۔ لہٰذا تلاوتِ قرآن کے بعد تعوذ پڑھنی چاہیے۔

دوسرا اور راجح قول:

راجح قول یہ ہے کہ قرآن پڑھنے سے پہلے تعوذ پڑھنی چاہیے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تم قرآن پاک پڑھنے کا ارادہ کرو تو تعوذ پڑھا کرو۔ جیسے وضو کے بارے میں فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ﴾ [المائدۃ:۶]

"جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو وضو کرو۔"

اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ نماز کے بعد وضو کرو؟ معنی یہ ہوتا ہے کہ جب ارادہ کرو نماز کا تو وضو کرو۔ اسی طرح یہ معنی بھی ہوگا کہ جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو تعوذ پڑھو۔

تیسرا قول:

بعض علماء نے دونوں کو جمع کر دیا، انہوں نے کہا: تلاوت شروع کرنے سے پہلے بھی تعوذ پڑھو اور جب تلاوت

مکمل کرلو تو پھر بھی تعوذ پڑھو، تاکہ اول وآخر دونوں میں اللہ کی پناہ میں آجائیں۔ تو اس لیے بعض علماء نے ان دونوں اقوال کو جمع فرمادیا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳ ملخصاً الاستعاذة واحکامها]

اور اس کے بعد ہم ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' پڑھیں۔ تو پہلے تعوذ کے ذریعہ سے ہم اللہ کی پناہ میں آگئے اور پھر جب ہم نے تسمیہ پڑھی تو اللہ کی رحمت میں آگئے۔ پہلے ہم اللہ کی پناہ میں آئے، جب ہم نے اللہ سے مدد مانگی تو پھر اللہ کی رحمت میں آگئے۔ تو جو اللہ کی پناہ اور اللہ کی رحمت میں آجائے تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

سورۂ فاتحہ کی فضیلت:

جب اللہ کی پناہ میں آگئے اور اللہ کی رحمت میں آگئے تو اب جناب ہم سورۂ فاتحہ میں آگئے۔ اس لیے علماء نے فرمایا: ویسے تو سارا قرآن شان والا ہے، اللہ کا سارا کلام شان والا ہے، لیکن سورۂ فاتحہ اتنی شان والی سورت ہے اور اتنی عظمت والی سورت ہے کہ یہ قرآن کا نور ہے، سورت فاتحہ حفاظت اور نگہداشت کرنے والی ہے اور ہمیں ظاہری اور باطنی امراض سے شفا دینے والی ہے۔

مسئلہ قرأتِ فاتحہ خلف الامام:

اسی لیے بعض حدیثوں میں اتنی بڑی فضیلت آئی کہ کوئی نماز نہیں جب تک کہ فاتحہ نہ پڑھی جائے۔ اب اس کے اندر بھی مسئلہ سمجھ لیں! بعض علماء کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ کوئی نماز بھی ہو جب تک سورۂ فاتحہ نہیں پڑھیں گے نماز ہوگی ہی نہیں۔ مثلاً: سارا قرآن پڑھ لے، لیکن فاتحہ نہ پڑھے تو نماز نہیں ہوگی۔ بعض ائمہ کرام امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے اور اسی طرح علمائے اہلِ حدیث کا مسلک ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرآن میں سے جہاں سے پڑھ لے نماز ہوجائے گی۔ باقی ائمہ فرماتے ہیں: نماز نہیں ہوتی، اس لیے کہ اللہ نے فرمایا:

((قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ)) [صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، باب وُجُوبِ قِرَاءَةِ ...]

اس حدیث میں فاتحہ ہی کو نماز کہا گیا ہے۔ تو گویا جب فاتحہ نہیں ہوگی تو لازماً نماز بھی نہیں ہوگی۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے:

((لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۷۵۶، باب وجوب القراءة...]

فاتحہ کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے جب تک فاتحہ نہیں پڑھے گا نماز ہو ہی نہیں سکتی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرآن نے یہ بھی کہا ہے:

﴿فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ [المزمل: ۲۰]

''جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے تم لوگ پڑھ لیا کرو۔''

اور اسی طرح صحیح مسلم میں ایک حدیث موجود ہے کہ جب ایک صحابی نے نماز میں غلطی کی اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نماز پڑھنا سکھلایا تو اس میں فرمایا:

((ثُمَّ اقْرَأْ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۷۵۷، باب وجوب القراءة للإمام...]

''جو کچھ تمہیں قرآن سے آتا ہو پڑھ لیا کرو۔''

اصل میں دیکھو تو جھگڑا ہے ہی نہیں، تھوڑی سی سمجھنے والی بات ہے۔ یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مثلاً ایک آدمی کو سورۂ فاتحہ نہیں آتی، قرآن کی دوسری دو تین آیات یاد ہیں، کیا اس کی نماز ہو جائے گی؟ کہتے ہیں کہ نماز ہو جائے گی۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کرے، بلکہ اگر اس نے ایسا کیا تو نماز ہو جائے گی۔ باقی ائمہ فرماتے ہیں کہ نماز نہیں ہوگی۔ تو نماز کے متعلق مسئلہ پیدا ہو گیا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر آپ اکیلے ہیں تو فاتحہ پڑھیں گے اور ہر رکعت میں پڑھیں گے، اگر آپ امام ہیں تب بھی آپ فاتحہ پڑھیں گے۔ امام اور منفرد میں کوئی جھگڑا ہے ہی نہیں، کسی امام کا اختلاف ہے ہی نہیں، سب کہتے ہیں کہ فاتحہ پڑھے۔ اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ امام موجود ہو اور ہم اس کے پیچھے نماز پڑھیں۔ ہم مقتدی ہیں تو اب ہم کیا کریں؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر امام موجود ہے، چاہے جہری نماز ہے چاہے سری نماز ہے، یعنی پانچوں نمازوں میں امام بھی پڑھے اور مقتدی بھی ضرور پڑھے۔ ان کے نزدیک مقتدی کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر امام موجود ہے تو مقتدی کے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، امام کا پڑھنا مقتدی کے لیے کافی ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن نمازوں میں امام زور زور سے پڑھ رہا ہے اور تم قرآن سن رہے ہوں تو پھر فاتحہ نہ پڑھو، اگر ایسی نماز ہے جس میں تم امام کی قرأت نہیں سن رہے تو پھر تم فاتحہ پڑھ سکتے ہو۔

بہر حال! ان تمام ائمہ نے احادیث سے استدلال کیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں فرمائے۔ لمبی بحثوں میں پڑنا یہ علماء کا کام ہوتا ہے۔ ایک تو موٹی سی بات ہے، یہ عقیدہ رکھ لیں کہ تمام ائمہ برحق ہیں اور سب نے حدیثوں کو پکڑا ہے۔ جنہوں نے کہا کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی انہوں نے کہا حدیث ہے:

((لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۷۵۶، باب: وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ....]

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: نہیں مقتدی نہ پڑھے۔ اس لیے نہ پڑھے کہ قرآن کہتا ہے:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ [الاعراف: ۲۰۴]

''جب قرآن پڑھا جائے تو تم قرآن سنو اور خاموش رہو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

سنو کا مقصد یہی ہے کہ ہم نہ پڑھیں اور دوسرا یہ کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاں جہاں حکم ہے کہ نماز فاتحہ کے بغیر نہیں ہوتی وہاں مطلقاً بات ہے۔ اور جہاں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے کی تعلیم دی ہے، امام کے بھی فرائض بتلائے ہیں اور مقتدی کے بھی فرائض بتلائے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امام ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہے تم بھی ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہو، جب امام رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، جب امام سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو، جب امام سلام پھیرے تو تم بھی سلام پھیرو۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب امام ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہے تو تم ''اٰمِيْنَ'' کہو اور جب امام پڑھے تو تم چپ کرو۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو مسئلہ سمجھا دیا کہ امام کے ذمے کیا کام ہے اور ہمارے ذمے کیا کام ہے کہ جب امام پڑھے تو ہمارے ذمہ کیا ہے ہم چپ کریں اور جب ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہے ہم سن رہے ہیں تو ہم آمین کہیں۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ امام کے پیچھے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چونکہ امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ خود امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک پر ہیں، اس لیے انہوں نے وہ حدیث مبارک بھی نقل کی ہے۔ حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مبارکہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر نماز میں فاتحہ نہ ہو تو نماز ناقص ہے، خداج، نامکمل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: حضور! اگر ہم امام کے پیچھے ہوں؟ (سب سے پہلے یہ سمجھیں کہ صحابہ کے دور میں بھی ایسی بات تھی کہ امام کے پیچھے نہیں پڑھتے تھے، ورنہ اگر ہر کوئی امام کے پیچھے پڑھتا ہوتا تو پھر صحابی کو پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ پوچھنا تو تب ہوتا ہے جب نہ پڑھنے والے ہوں۔ اگر سارے پڑھنے والے ہوتے تو سوال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟) تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عجیب آدمی ہو ''اِقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ'' تم فاتحہ پڑھا کرو، لیکن جی میں پڑھا کرو۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، باب: وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ....]

تو جی میں پڑھنا ہمیں بتلا دو ہم حاضر ہیں کہ جی میں کیسے پڑھا جاتا ہے؟ معنی یہ ہے کہ تدبر کیا کرو، کیونکہ پڑھا تو زبان سے جاتا ہے۔ جب زبان سے نہیں پڑھا جائے گا، زبان نہیں ہلائیں گے، جی میں اور دل میں پڑھیں گے تو دل میں تو تدبر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ [محمد:۲۴]

''بھلا کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے! یا دلوں پر وہ تالے پڑے ہوئے ہیں جو دلوں پر پڑا کرتے ہیں؟''

انہوں نے کہا: دیکھو! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کتنی سختی فرما رہے ہیں کہ ''اِقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ'' امام کے پیچھے بھی پڑھا کرو۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دیکھو! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کیا فرما رہے ہیں کہ نفس میں پڑھا کرو۔ امام پڑھ رہا ہے اور تم ایک ایک لفظ پر غور کر رہے ہو۔ اگر جی میں پڑھنے کا کوئی اور طریقہ ہو تو ہمیں سمجھا دو۔

بہر حال! تمام ائمہ برحق ہیں۔ اللہ ان سب کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ ان سب کا مقصد کیا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی نہ کسی حدیث تک پہنچنا، اتباعِ کتاب اللہ اور اتباعِ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا مقصد تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اور اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں قرآن وسنت کی اتباع نصیب فرمائے۔ آمین۔

غیر اللہ کے نام کا صدقہ، چھترا:

اگر کوئی آدمی اللہ کے واسطے خیرات کرے تو بالکل ٹھیک ہے۔ روزانہ اللہ کے نام پر خیرات کرے کہ یا اللہ! تیرے نام پر، تیری رضا کے لیے خیرات کر رہا ہوں، اس کا بدلہ، اجر وثواب تو مجھے عطا فرما۔ روزانہ خیرات کریں کوئی منع نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ خیرات میں غیروں کو شامل نہ کیا کرو۔ خیال کرنا! اگر چھوٹا بچہ کہہ دے کہ ابا جان! یہ بکری کا بچہ مجھے بڑا پسند ہے، یہ آپ مجھے دے دیں۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں یہ پیر کا بکرا ہے۔ یہاں آ کر شرک آ گیا، پیر کے نام پر پکا ہو گیا، بیٹے کو بھی نہیں دے رہا۔ سمجھ آ گئی اندر کوئی بلا ہے۔ جیسے کفار کہا کرتے تھے: ﴿هَٰذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا﴾ [الانعام:۱۳۶] (اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا حصہ ہے اور یہ اس کے شریکوں کا حصہ ہے) یہاں شرک آ جاتا ہے۔ اللہ کی بکری ہے تو سارے بچے لے جائیں، لیکن ایک پیر کے نام کا ہے تو اللہ کے غیر کا نام آ گیا۔ اس سے بچا کرو۔ ورنہ کون کہتا ہے کہ خیرات نہ کرو۔

اللہ کے بندے! اگر آدمی اپنی بیوی سے ملاقات کرے، ہمبستری کرے اور ابھی غسل نہ کیا ہو تو کھانا پینا جائز ہے۔ بہتر یہ ہے کہ نہ کھائے، لیکن اگر مجبوری ہو تو استنجا کرلے، پھر وضو کر لے۔ وضو کرنے کے بعد (جیسے اب رمضان شریف ہے) میاں بیوی لیٹ گئے، سحری کا وقت جا رہا ہے، اب اگر غسل کرے تو سحری نہیں کر سکتا۔ تو اس کے لیے اجازت ہے کہ جلدی جلدی استنجا کرلے اور وضو کر کے کھالے۔

شوافع کی دوسری دلیل:

((وَلِمُسْلِمٍ نَحْوُهُ حَدِيثٌ آخِرُ قَالَ مُسْلِمٌ وَحَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ الْحَنْظَلِيُّ أَخْبَرَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ عَنِ الْعَلَاءِ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ صَلَّى صَلَاةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ ثَلَاثًا غَيْرُ تَمَامٍ. فَقِيلَ لِأَبِي هُرَيْرَةَ: إِنَّا نَكُونُ وَرَاءَ الْإِمَامِ؟ فَقَالَ: اقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ؛ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: قَالَ اللهُ تَعَالَى: قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ، وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ، فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾، قَالَ اللهُ تَعَالَى: حَمِدَنِي عَبْدِي، وَإِذَا قَالَ: ﴿الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾، قَالَ اللهُ تَعَالَى: أَثْنَى عَلَيَّ عَبْدِي....))

[صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، باب: وجوب قراءۃ الفاتحۃ...]

اب مفسر رحمہ اللہ ایک اور حدیث مبارکہ نقل فرما رہے ہیں جس کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت فرمایا ہے۔ اور یہ حدیث مبارک بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص نماز پڑھے اور اس میں فاتحہ نہ پڑھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ''فَهِيَ خِدَاجٌ'' فرمایا۔ اب ''خِدَاجٌ'' کا کیا معنی ہوتا ہے؟ ناقص اور غیر تمام، یعنی وہ نماز پوری نہیں ہوئی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: ہم جب امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو پھر کیا کریں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر تم اپنے جی میں پڑھ لیا کرو۔ اس میں یہ بھی استدلال فرما رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فاتحہ کو ''أُمُّ الْقُرْآنِ'' بھی فرمایا ہے۔ یعنی جیسے اس کا نام فاتحہ ہے، اسی طرح اس کا نام ''أُمُّ الْقُرْآنِ'' بھی ہے۔

سورۂ فاتحہ میں بندے کا حصہ:

اس لیے کہ میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ'' اب مفسر رحمہ اللہ نے استدلال کیا کہ سورۂ فاتحہ کو صلوٰۃ بھی کہا گیا ہے، کیونکہ یہاں صلوٰۃ سے مراد نماز نہیں، فاتحہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صلوٰۃ یعنی فاتحہ میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔

انہوں نے فرمایا: جب فاتحہ کو نماز کہا گیا ہے تو اگر تم امام کے پیچھے بھی ہو تو پھر اپنے جی میں پڑھ لو، کیونکہ حدیث میں آتا ہے جب بندہ کہتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ تو اللہ فرماتے ہیں: ''حَمِدَنِي عَبْدِي'' (میرے بندے نے میری حمد بیان کی) اور جب بندہ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ کہتا ہے تو اللہ فرماتے ہیں: ''أَثْنَى عَلَيَّ عَبْدِي'' (میرے بندے نے میری تعریف اور میری ثنا بیان کی) اور جب بندہ کہتا ہے: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ جب اس نے اعتراف کیا کہ مالک جزاء اللہ ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''مَجَّدَنِي عَبْدِي'' (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، میرے مجد کا اقرار کیا) اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اللہ ایک مرتبہ فرماتے ہیں: ''فَوَّضَ إِلَيَّ عَبْدِي'' (میرے بندے نے اپنے آپ کو مجھے سونپ دیا) کہ تو ہی مالک ہے، تیرا منشا ہے جو چاہیں کریں، مالک جو آپ ہیں۔ جب بندہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ (تیری ہی خاص عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) کہتا ہے تو اللہ فرماتے ہیں: ''هٰذَا بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ.'' (یہ میرے اور بندے کے درمیان مشترک ہے اور میرے بندے نے جو چاہا میں اس کو دوں گا، جو مانگا اس کو ملا) جب بندے نے اعتراف کیا کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو بندہ عابد بنا اور میں معبود بنا اور جب بندے نے اقرار کیا کہ تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں، اب میں مدد دینے والا اور بندہ مدد مانگنے والا بنا تو جب میرا بندہ مجھ سے مانگ رہا ہے تو میں اس کو دوں گا۔ اب جب بندے نے ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ کہا، یہ خالص دعا ہے نا! تو اللہ فرماتے ہیں ''هٰذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ.'' (یہ حصہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو چاہا میں اس کو دوں گا۔) بندہ مجھ سے مانگ رہا ہے کہ مجھے صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما اور ایسے لوگوں کا راستہ نصیب فرما جن پر تیرا انعام ہے، ان لوگوں کے راستے سے بچا جن پر تیرا غضب ہے اور جو گمراہ ہیں۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵، بَابُ وُجُوبِ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ...]

اور اس کے بعد مفسر رحمہ اللہ ان احادیث سے فاتحہ کا مسئلہ بیان نہیں کر رہے کہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھی جائے یا نہ پڑھی جائے، بلکہ سورۂ فاتحہ کے اسماء پر استدلال فرما رہے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کے اسماء میں ''أُمُّ الْكِتَابِ'' بھی آیا ہے، ''صَلٰوةٌ'' بھی آیا ہے۔ کیونکہ بعض حضرات نے اس کا انکار کیا تھا، اس لیے اس پر حدیثیں ذکر فرما رہے ہیں۔ باقی فاتحہ کا جو مسئلہ ہے وہ تو مشہور و معروف ہے۔ اور تمام ائمہ کرام کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں، ادلہ ہیں،

۱.....[صحیح المسلم، رقم: ۳۹۵]

روایات، احادیث ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ اور ان شاء اللہ جب وہ مقام آئے گا تو وہ بھی ذکر فرمائیں گے۔

''اَلْکَلَامُ عَلٰی مَا یَتَعَلَّقُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ مِمَّا یَخْتَصُّ بِالْفَاتِحَةِ مِنْ وُجُوْهٍ''

اب بیان فرماتے ہیں کہ ان احادیث میں بعض چیزیں فاتحہ کی خصوصیات بنتی ہیں۔ ''(أَحَدُهَا) أَنَّهُ قَدْ أُطْلِقَ فِيْهِ لَفْظُ الصَّلَاةِ'' (سب سے پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ فاتحہ کو نماز کہا گیا ہے۔) گویا کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں۔ ویسے الحمد للہ! کوئی نماز ایسی نہیں جو فاتحہ کے بغیر ہو۔ فاتحہ کے بغیر نماز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ جب آپ اکیلے ہوں گے تب بھی فاتحہ ہے، اگر آپ امام ہیں تب بھی سورت فاتحہ ہے، اگر آپ مقتدی ہیں تب بھی امام تو نماز میں فاتحہ پڑھے گا۔ تو فاتحہ موجود ہے۔ اب اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ امام بھی پڑھے اور مقتدی بھی پڑھے یا مقتدی خاموش رہے، لیکن نماز تو کوئی ایسی نہیں جو فاتحہ کے بغیر ہو، ہر نماز کے اندر الحمد للہ! سورۂ فاتحہ موجود ہے۔ اس لیے اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فاتحہ کو نماز کہا گیا ہے، حالانکہ لفظ صلوۃ سے مراد قرأت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا ۝﴾ [الاسراء:۱۱۰]

''اور تم اپنی نماز نہ بہت اونچی آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے، بلکہ ان دونوں کے درمیان (معتدل) راستہ اختیار کرو۔''

تو ''صَلٰوۃٌ'' سے مراد قرأت ہے کہ زور سے قرأت نہ کریں، بلکہ درمیانی آواز سے قرأت کریں۔ فرمایا: ''أَيْ بِقِرَاءَتِكَ كَمَا جَاءَ مُصَرَّحًا بِهِ فِي الصَّحِيحِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ......'' اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں ''قَسَمْتُ الصَّلَاةَ'' کا لفظ آیا ہے اور آگے جو تقسیم بیان کی گئی ہے وہ فاتحہ کی کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فاتحہ کو ''الصَّلَاةَ'' (نماز) کہا گیا ہے جو اس کی عظمتِ شان پر دلالت کرتی ہے۔ اور نماز کے اندر سب سے بڑا رکن بھی فاتحہ ہے، کیونکہ ہر نماز میں فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور پھر اس پر عبادت اور نماز کا اطلاق کیا جا رہا ہے، حالانکہ یہ تو نماز کا جز ہے، نماز میں اور بھی تو ارکان ہیں، لیکن اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے۔ اس سے فاتحہ کی عظمتِ شان واضح ہوتی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝﴾ [الاسراء:۷۸]

''اور صبح کی نماز بھی بے شک صبح کی نماز (فرشتوں کے) حاضر ہونے کا وقت ہے۔''

''وَالْمُرَادُ صَلَاةُ الْفَجْرِ كَمَا جَاءَ مُصَرَّحًا بِهٖ فِي الصَّحِيحَيْنِ: أَنَّهَا تَشْهَدُهٗ مَلَائِكَةُ اللَّيْلِ وَمَلَائِكَةُ النَّهَارِ''

اب قرآن فجر سے فجر کی نماز مراد ہے۔ صحیحین کے اندر صحیح حدیث صراحتاً موجود ہے کہ فجر کی نماز کا وقت ایسا رحمت کا وقت ہے کہ جو دن کے فرشتے ڈیوٹی پر آتے ہیں وہ بھی اتر چکے ہوتے ہیں اور رات والے چڑھنے کے لیے تیار کھڑے ہوتے ہیں، دونوں قسم کے ملائکہ مل جاتے ہیں۔

[صحیح البخاری، حدیث:۶۴۸، باب: فَضْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ فِي جَمَاعَةٍ]

تو ملائکہ کے حاضر ہونے کا وقت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کا وقت ہے۔ صبح کی نماز جس کو نصیب ہو جائے وہ سمجھ لے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

قرأت خلف الامام:

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''فَدَلَّ هٰذَا كُلُّهٗ عَلٰى أَنَّهٗ لَا بُدَّ مِنَ الْقِرَاءَةِ فِي الصَّلَاةِ وَهُوَ اِتِّفَاقٌ مِّنَ الْعُلَمَاءِ''

اب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نماز میں قرأت یعنی قرآن کا پڑھنا ضروری ہے۔ یہ تو اتفاق ہے، اس کے اندر تو کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے۔

''وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوا فِي مَسْأَلَةٍ نَذْكُرُهَا فِي الْوَجْهِ الثَّانِي. وَذٰلِكَ أَنَّهٗ هَلْ يَتَعَيَّنُ لِلْقِرَاءَةِ فِي الصَّلَاةِ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ أَمْ تُجْزِئُ هِيَ أَوْ غَيْرُهَا؟''

لیکن اختلاف اس بات میں ہے کہ اگر ایک آدمی فاتحہ نہ پڑھے، یعنی فاتحہ کے بغیر کسی اور جگہ سے قرآن پڑھ لے تو کیا نماز ہو جائے گی؟ ''عَلٰى قَوْلَيْنِ مَشْهُوْرَيْنِ'' اس بارے میں دو قول بڑے مشہور ہیں۔ بعض ائمہ کہتے ہیں کہ نماز نہیں ہوگی، ''فَعِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ وَمَنْ وَافَقَهٗ مِنْ أَصْحَابِهٖ وَغَيْرِهِمْ. أَنَّهَا لَا تَتَعَيَّنُ بَلْ مَهْمَا قَرَأَ مِنَ الْقُرْآنِ أَجْزَأَهٗ فِي الصَّلَاةِ'' لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور جو لوگ ان کے موافق ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کہیں سے بھی پڑھ لیں نماز ہو جائے گی۔

مثلاً: ایک آدمی نے فاتحہ نہیں پڑھی، قرآن کی کوئی اور سورت پڑھ لی تو کیا نماز ہو گئی یا باطل ہے کہ دوبارہ

پڑھے؟ وہ صرف یہ فرماتے ہیں کہ ہو جاتی ہے، اس کو دوبارہ نماز نہیں پڑھنی پڑے گی۔ یہ نہیں کہتے کہ لوگ ایسا کریں۔ بات کو سمجھا کریں۔ جیسا کہ اگر ایک آدمی کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکے تو اس کے لیے حکم ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھ لے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ ہمیشہ بیٹھ کر ہی پڑھے۔ اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے مقابلہ میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کو آدھا ثواب ملتا ہے۔ ایک آدمی جب کھڑے ہو کر پڑھے گا تو پورا ثواب ہے، بیٹھ کر پڑھے گا تو آدھا ثواب ہے۔ اگر کوئی عذر ہے، مجبوری ہے تو بیٹھ کر بھی پڑھ سکتا ہے۔ یہ مراد نہیں ہوتا کہ ضرور بیٹھ کر ہی پڑھا کرے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا قرآن پاک کا کہیں سے بھی پڑھنا کافی ہو جائے گا یا نہیں؟ اس سے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ساتھی فرماتے ہیں کہ نماز ہو جائے گی۔ وَاحْتَجُّوْا بِعُمُوْمِ قَوْلِهٖ تَعَالٰی ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ اور وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جو کچھ تمہیں قرآن میں سے آتا ہو پڑھ لیا کرو۔

"وَبِمَا ثَبَتَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرَيْرَةَ فِي قِصَّةِ الْمُسِيْءِ فِي صَلَاتِهٖ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی الله علیہ وسلم قَالَ لَهٗ إِذَا قُمْتَ إِلَى الصَّلَاةِ فَكَبِّرْ ثُمَّ اقْرَأْ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ."

اور جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی موجود ہے اس شخص کے قصے میں جو نماز میں غلطی کرتا تھا۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ تو تکبیر کہو اور جو تمہیں قرآن یاد ہو وہ پڑھ لیا کرو۔ "قَالُوْا فَأَمَرَهٗ بِقِرَاءَةِ مَا تَيَسَّرَ وَلَمْ يُعَيِّنْ لَهُ الْفَاتِحَةَ وَلَا غَيْرَهَا فَدَلَّ عَلٰى مَا قُلْنَا." احناف کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو تمہیں آسانی سے یاد ہو پڑھ لیا کرو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فاتحہ یا اس کے علاوہ کوئی سورت متعین نہیں فرمائی، لہٰذا ہماری بات ثابت ہوگئی۔ ان کا استدلال اسی سے ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱، ۱۲، اَلْكَلَامُ عَلٰى مَا يَتَعَلَّقُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ]

اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ یاد رکھیں! تمام ائمہ متبع قرآن وسنت ہیں۔ اب دیکھیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول بھی نقل فرما رہے ہیں، لیکن امام صاحب یہ نہیں کہتے کہ میری بات یہ ہے، بلکہ امام صاحب نے اس آیت اور اس حدیث مبارک سے استدلال پکڑا جو بخاری میں بھی ہے اور مسلم میں بھی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان کا مستدل بھی قرآن اور حدیث سے ہوتا ہے۔

باقی فرق یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ائمہ کی فہم میں اختلاف ہوتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک امام کو ایک حدیث

ملی اور ایک امام کو دوسری حدیث ملی تو اس وجہ سے جس کو جو ملی گئی اسی پر قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ امام شافعی ﷫ جیسے امام جب مصر میں تشریف لے آئے اور وہاں آکر مطالعہ زیادہ وسیع ہوا تو آپ نے اپنے بہت سے اقوال کو چھوڑ دیا۔ اس لیے کتابوں میں اکثر امام شافعی ﷫ کے دو قول ہوتے ہیں: ایک ''قولِ قدیم'' کہلاتا ہے اور ایک ''قولِ جدید'' کہلاتا ہے۔ ان کا قولِ قدیم مصر میں آنے سے قبل کا ہے اور قولِ جدید مصر آنے کے بعد کا ہے۔

اسی طرح احناف ﷭ کی کتابوں میں دیکھیں کہ امام ابو یوسف ﷫، امام محمد بن حسن الشیبانی ﷫ اور امام زفر ﷫ سب امام ابوحنیفہ ﷫ کے شاگرد ہیں، لیکن ان کو بعد میں علوم کی وسعت کے ساتھ علوم کا ذخیرہ ملا تو انہوں نے اپنے استاذ کا قول چھوڑ کر کئی مسائل میں رجوع کر لیا، اس لیے کہ ان کا مقصد اتباعِ کتاب وسنت ہوتا ہے۔ اب فرق یہ ہوتا ہے کہ ہم کہتے ہیں: یہ کھلی چھٹی ہر آدمی کو نہ دی جائے۔ اگر ہر آدمی کے ہاتھ میں استرا پکڑا دیا جائے تو پھر اللہ رحمت فرمائے کس کا ناک کان سلامت رہے گا؟ یہ اختیار صرف ان کو دو جو علماء ہیں، جن کے پاس اتنا علم ہے اور اتنے دلائل ہیں، کیونکہ قرآن نے بھی ہمیں یہی حکم دیا ہے۔ فرمایا:

﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ۴۳]

''اگر تمہیں علم نہیں تو (دوسرے) اہل علم سے پوچھو۔''

اور ان کے مقابلے میں تو ہم بالکل جاہل ہیں۔ اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے کہ کہاں ان کا تقویٰ، ان کی پرہیز گاری، ان کی عظمت اور کہاں ہم لوگوں کا حال؟ تو اس لیے ہمیشہ ان کو احترام کی نظر سے دیکھا جائے اور ان کے بارے میں حسنِ ظن رکھا جائے۔ جمیع ائمہ محدثین، جمیع ائمہ فقہاء کی کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان پر کروڑوں رحمتیں فرمائے۔ کیا ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم ایک مسئلہ غلط بیان کریں اور قیامت تک ہم پر عذاب آتا رہے؟ ان کو کوئی فائدہ تھا، کوئی لالچ تھی، کوئی پیسہ تھا، کوئی دولت تھی، کوئی زمین تھی، کوئی جائیداد تھی، کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی طرف سے تحقیق کی اور محنت کی کہ ہم امتِ رسول اللہ ﷺ کے لیے دین کو واضح کر دیں۔ انسان ہے کسی جگہ خطا ہو گئی، کہیں سہو ہو گیا، ایک بات پہنچی ایک نہیں پہنچی، اسی طریقے سے اب احکامات میں مثلاً نماز ہے، حضور ﷺ کی زندگی میں ابھی نماز فرض نہیں تھی، آپ پہلے بھی نماز پڑھتے تھے۔

حضور ﷺ جب معراج پر تشریف لے گئے تو تمام انبیاء ﷩ کے امام بنے۔ آپ ﷺ نے تو دو رکعت نماز

وہاں بھی پڑھائی اور اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام نماز پڑھتے تھے۔ پھر جب سورت ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱﴾ نازل ہوئی تو اس کے بعد تین سال وحی نازل نہیں ہوئی، تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے، اس وقت تو سورت فاتحہ اتری بھی نہیں تھی۔ آخر اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کیا پڑھتے تھے؟ اس لیے ہمیشہ بڑے ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ دماغ میں کہوں گا کہ سیاہ اتفاق سے ہوگیا، سیاہ نہیں ہے، اصل میں سنہری ہے تو اس ذہن کے ساتھ اگر وہ چلے گا تو پھر حق پر نہیں پہنچے گا۔ حق پر پہنچنے کا معنی یہ ہوتا ہے کہ دماغ کو کھلا رکھ لے کہ اللہ کے احکام ہیں۔

اچھا! اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم پوری زندگی امام رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس نمازیں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے پیچھے پڑھیں، ایک نماز حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھی اور اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بھی نمازیں پڑھیں۔ کسی صحیح حدیث مبارک میں یہ بات نہیں ملتی کہ ان نمازوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھی ہو۔ جب آپ مقتدی ہیں تو آپ نے کیا کیا؟ اور اسی طرح کسی صحیح حدیث میں یہ الفاظ نہیں ملیں گے مثلاً: یہ کہ مقتدی کے لیے یہ حکم ہے، ایک عام فتویٰ ہے کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، اس کے بغیر نماز ناتمام ہے، اس کے بغیر نماز ناقص ہے، لیکن یہ حکم مقتدی کے لیے ہے، منفرد کے لیے ہے، امام کے لیے ہے، بغیر جماعت کے لیے ہے؟ اب اس کے لیے سارے ذخیرے کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ تو ''کِتَابُ الصَّلٰوۃِ'' کھول کر آپ ساری احادیث پڑھنا شروع کردیں، پھر انصاف کے ساتھ دیکھیں کہ آپ فیصلہ کیا کرتے ہیں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ سب کی نمازیں قبول ومنظور فرمائے، سب کی حاضری قبول ومنظور فرمائے، سب کی تحقیقوں پر ان کو قیامت تک اجر عطا فرمائے۔ اب آپ اسی سے اندازہ لگائیں کہ یہ خود شافعی المسلک ہیں، لیکن پہلا قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا نقل کیا ہے۔ اپنے امام کا قول دوسرے نمبر پر ذکر فرمایا۔ سمجھتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردوں کے بھی شاگرد ہیں، لہٰذا استاذ کا مرتبہ استاذ کا مرتبہ ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے ان کو حق دیا، ان کا قول پہلے نقل فرمایا اور اپنے امام کا قول بعد میں نقل فرمایا۔

اس لیے فرماتے ہیں: ''وَالْقَوْلُ الثَّانِي: أَنَّهُ تَتَعَيَّنُ قِرَاءَةُ الْفَاتِحَةِ فِي الصَّلَاةِ وَلَا تُجْزِئُ الصَّلَاةُ بِدُوْنِهَا'' باقی حضرات فرماتے ہیں کہ فاتحہ ضروری ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوگی۔ ''وَهُوَ قَوْلُ بَقِيَّةِ الْأَئِمَّةِ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ وَأَصْحَابُهُمْ وَجُمْهُوْرُ الْعُلَمَاءِ'' امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، ان کے

اصحاب اور جمہور علماء رحمہم اللہ کی رائے یہی ہے۔

''وَاحْتَجُّوا عَلَى ذَلِكَ بِهَذَا الْحَدِيثِ الْمَذْكُورِ حَيْثُ قَالَ صَلَوَاتُ اللهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ: مَنْ صَلَّى صَلَاةً لَمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ وَالْخِدَاجُ هُوَ النَّاقِصُ كَمَا فُسِّرَ بِهِ فِي الْحَدِيثِ غَيْرُ تَمَامٍ وَاحْتَجُّوا أَيْضًا بِمَا ثَبَتَ فِي الصَّحِيحَيْنِ مِنْ حَدِيثِ الزُّهْرِيِّ عَنْ مَحْمُودِ بْنِ الرَّبِيعِ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ، وَفِي صَحِيحِ ابْنِ خُزَيْمَةَ وَابْنِ حِبَّانَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تُجْزِئُ صَلَاةٌ لَا يُقْرَأُ فِيهَا بِأُمِّ القرآن. وَالْأَحَادِيثُ فِي هَذَا الْبَابِ كَثِيرَةٌ وَوَجْهُ الْمُنَاظَرَةِ هَاهُنَا يَطُولُ ذِكْرُهُ وَقَدْ أَشَرْنَا إِلَى مَأْخَذِهِمْ فِي ذَلِكَ رَحِمَهُمُ اللهُ.'' [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲، الكلام على ما يتعلق بهذا الحديث]

''ان حضرات نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص نماز پڑھے اور اس میں فاتحہ نہ پڑھے تو یہ نماز ناقص ہوگی، یعنی تمام نہیں ہوگی۔ اور اس کے بعد فرماتے ہیں: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اس شخص کی نماز نہیں ہے جو فاتحہ نہ پڑھے۔ اسی طرح ابن خزیمہ اور ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل فرمائی ہے کہ اس کی نماز پوری نہیں ہوگی جو فاتحہ نہ پڑھے۔ (مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ) اس باب میں بہت سی احادیث ہیں، لیکن مناظرانہ انداز میں بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اللہ تعالیٰ سب پر رحمتیں نازل فرمائے۔ ان کے پاس یہ احادیث ہیں اور احناف کے پاس قرآن پاک کی آیت مبارکہ ہے اور صحیح بخاری و مسلم کی حدیث مبارکہ ہے۔ آپ اسی سے اندازہ فرمالیں کہ احناف کی دلیل قرآن کی آیت اور وہ حدیث ہے جو ہم نے ابھی پڑھی ہے، جس کو امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، لیکن دوسرے مذاہب کے دلائل میں ابن حبان، ابن خزیمہ اور باقی لوگوں کا حوالہ دیا۔ تو جب تمہاری باری آتی ہے تو دوسری کتابوں کی روایات کو بخاری اور مسلم پر ترجیح دیتے ہو؟ اگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بخاری اور مسلم کی حدیثوں پر عمل کریں تب بھی ناراضگی ہو تو اس کا کوئی علاج ہے؟

بعض احادیث کا صحیح معنی:

اسی لیے تو میں نے عرض کیا کہ ان کی یہ وقتِ نظر ہے۔ جیسے عصر کے بعد نماز ہے، فجر کے بعد نماز ہے۔ اب جو نماز سے روکنے والی حدیثیں ہیں کہ فجر کے بعد نماز نہ پڑھو جب تک سورج نہ نکلے، عصر کے بعد نماز نہ پڑھو جب تک

سورج غروب نہ ہو جائے۔ بخاری و مسلم کی حدیثیں ہیں اور جن احادیث میں اجازت کی گنجائش ہے اس پائے کی احادیث مبارکہ نہیں ہیں۔ جن میں اجازت ہے ایک تو عبد مناف کو حکم ہے کہ حضور ﷺ نے حکم دیا کہ لوگوں کو منع نہ کرو، جب نماز پڑھیں پڑھنے دو، جب طواف کریں کرنے دو، جب چاہیں جس وقت ان کا جی چاہے نماز پڑھیں یا طواف کریں۔ اب یہ دیانت داری کی بات ہے، آپ محلے کے ایک امام یا چوکیدار کو حکم دیں مسجد بند نہ کیا کرو، لوگ جب چاہیں انہیں نماز پڑھنے دیا کرو، ان کو کیوں روکتے ہو؟ تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے کہ جب چاہیں فجر والی ظہر کو پڑھ لیں، ظہر والی عصر کو پڑھ لیں۔ معنی ہوتا ہے جی مسجد بند نہ کیا کرو، اس میں اوقات کی اجازت تو نہیں۔

وہاں بھی حضور ﷺ نے عبد مناف کو فرمایا تھا، کیونکہ عبد مناف کا معاملہ یہ تھا کہ جس کو چاہا آنے دیا، جس کو چاہا روک دیا اور جس کو چاہا طواف کرنے دیا۔ جیسے حضور ﷺ حدیبیہ میں موجود ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکے میں آ گئے، قریشِ مکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہتے ہیں: تم احرام باندھے ہوئے ہو، تم تو طواف کر لو، عمرہ بھی کر لو۔ تمہارے تو بڑے احسان ہیں ہم پر، لیکن ہم حضور ﷺ کو نہیں کرنے دیتے۔ انہوں نے کہا: حضور ﷺ نہیں کریں گے تو میں بھی نہیں کروں گا، میں بھی بغیر عمرے کے واپس چلا جاؤں گا۔ جب میرے آقا نہ کریں میں کیسے کروں؟ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہر وقت میں اجازت ہے۔ جہاں وقت بتایا وہاں فرمایا: ''لَا صَلَاةَ بَعْدَ الْفَجْرِ'' فجر کے بعد نماز نہ پڑھو۔) اتنا کھلا لفظ جیسے ''لَا صَلَاةَ إِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ'' ہے۔ یہاں تو یہ کہتے ہو کہ سب کے لیے یہ اثر کر رہا ہے وہاں اثر نہیں کر رہا؟ وہاں ''لا'' کی تلوار نہیں چل رہی؟ یہاں ''لا'' تلوار کا کام دیتا ہے۔ اور اس حدیث مبارک میں تلوار کا کام نہیں دیتا؟ وہاں تو کھلے لفظوں میں نفی آ رہی ہے، فجر کے بعد نہیں جب تک سورج نہ نکلے، عصر کے بعد نہیں جب تک سورج نہ ڈوبے، یعنی حضور ﷺ عصر کا نام لے رہے ہیں اور پھر سورج ڈوبنے کا نام لے رہے ہیں، ادھر فجر کا نام لے رہے ہیں، سورج نکلنے کا نام لے رہے ہیں اور جہاں فرما رہے ہیں: نہ روکو، وہاں وقت کا نام نہیں لے رہے۔ جب چاہیں نماز پڑھیں۔ اس لیے جمیع ائمہ کا ماخذ کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنا مذہب واضح کر دیا۔ ہمارا کام کتاب اللہ کی اتباع ہے، ہمارے مراجع سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے، اصحابِ رسول اللہ ہیں، بلکہ یہاں تک بھی انہوں نے فرمادیا کہ اگر کل کوئی اتنا بڑا عالم آ جائے جس کو تحقیق ہو جائے کہ میرا کوئی قول حضور ﷺ کے فرمان کے خلاف ہے یا صرف میری تحقیق ہے، لیکن حضور ﷺ کی حدیث مبارک مل جائے تو حضور ﷺ کی حدیث کو لو، میرے قول کی کیا حیثیت ہے؟

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر بعض نامناسب اعتراضات:

اس کے باوجود بھی اگر ہم معاف نہ کریں، گالیاں دیں، ان پر تہمتیں لگائیں، ان کی شان میں کوتاہیاں کریں، ان کے عیب ڈھونڈیں، ان کے نسب پر بحث کریں، ان کی قومیت پر بحث کریں، عمل پر بحث کریں اور اس بات پر بحث کریں کہ انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی، پھر تو کوئی بندہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے بھی کوئی کتاب نہیں لکھی، اس کا کیا جواب دیں گے؟ کیا کتاب کے نہ لکھنے سے حضور ﷺ کی شان میں کوئی کمی آجائے گی؟ ساری دنیا کی کتابیں تو حضور ﷺ کے فرمان سے لکھی جارہی ہیں، ساری دنیا کو جو علم پہنچ رہا ہے، جو فیض پہنچ رہا ہے وہ میرے مدنی پاک ﷺ سے ہی تو پہنچ رہا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کے ایک ایک لفظ سے تو کتابیں لکھی گئیں، حضور ﷺ کے ایک ایک فرمان اور ایک ایک حدیث پر کتابیں لکھی گئیں اور قیامت تک لکھی جائیں گی وہ سارا فرمان تو محمد عربی ﷺ کا ہے۔ تو اگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے غلام اور شاگرد آپ کی علمی تحقیقات پر کتابیں لکھتے رہے ہیں تو وہ کتابیں کس کی شمار ہوں گی؟

اس ساری بحث کا مقصد یہ ہے کہ کسی کے بارے میں دل میں برا خیال نہ آئے، بدظنی نہ رکھو، بدگمانی نہ رکھو اور اللہ والوں کے ساتھ عداوت نہ رکھو۔ جو آدمی اللہ والوں سے عداوت رکھتا ہے اور ان کی شان میں کوتاہی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی پکڑ آئے گی۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا﴾ [الاحزاب:۵۸]

''اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان کے کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچاتے ہیں تو انہوں نے بہتان طرازی اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے اوپر لاد لیا ہے۔''

اسی طرح حدیث قدسی میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

((مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ)) [صحیح البخاری، حدیث:۶۵۰۲، بابُ التواضُع]

''جو میرے دوستوں کے ساتھ دشمنی کرے اس سے میں جنگ کا اعلان کر دیتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ جنگ کرے۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں سب ائمہ کا ادب نصیب فرمائے۔ وہ بڑے لوگ تھے، بڑی شان تھی۔ اگر امام بخاری رحمہ اللہ بات کریں تو ان کو زیب دیتا ہے، ان کی شان ہے، ان کا مقام ہے اور ان کی عظمتیں ہیں۔ امام مسلم رحمہ اللہ بات کریں، ان کی شان ہے۔ اللہ نے اتنا بڑا علم عطا فرمایا ہے۔ اللہ پاک ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک امام بخاری رحمہ اللہ فقیہ نہیں تھے:

امام ترمذی رحمہ اللہ بات کریں تو ان کو زیب دیتا ہے۔ اگرچہ امام ترمذی رحمہ اللہ امام بخاری رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، امام بخاری رحمہ اللہ کا اتنا بڑا مقام ہے۔ اس کے باوجود ساری ترمذی دیکھ لیں! جہاں حدیث کا مسئلہ آیا، نقد و جرح کا مسئلہ آیا اور سند کا مسئلہ آیا تو امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنے استاذ محمد بن اسماعیل سے پوچھا: اس حدیث کے بارے میں، سند کے بارے میں آپ کا کیا فرمان ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے، یہ حدیث غلط ہے، یہ حدیث ضعیف ہے، یہ راوی ثقہ ہے، یہ راوی ضعیف ہے، یہ راوی قابلِ حجت ہے، یہ راوی قابلِ حجت نہیں ہے۔ اور جہاں کوئی فقہ کا مسئلہ آیا تو اپنے استاذ امام بخاری رحمہ اللہ کا ایک قول بھی نقل نہیں کیا، کیونکہ امام ترمذی رحمہ اللہ سمجھتے تھے کہ امام بخاری رحمہ اللہ حدیث میں مقام رکھتے ہیں۔ تفقہ اور فقہ علیحدہ چیز ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہر آدمی کا ایک فن ہے، اللہ نے ان کو حدیث میں امام بنایا ہے، ایک آدمی تفسیر میں مقام رکھتا ہے، حدیث میں اتنا قابل نہیں ہوتا، ایک آدمی کو اللہ نے حدیث میں اتنا اونچا مقام دیا ہوتا ہے، لیکن تفسیرِ قرآن میں اتنا مقام نہیں ہوتا۔

مؤذنین اور قرآن پڑھنے والوں کی خدمات:

میں تو یہ کہتا ہوں آج کا جو مولوی دیہات کی مسجد میں چار بچے لے پڑھا رہا ہے اس کے لیے بھی دعا کرو کہ وہ دین کا نام تو لے رہا ہے۔ وہ چاہے کسی جماعت سے بھی تعلق رکھتا ہو، مسجد میں بیٹھا ہے، بھیک مانگ کر کھانا کھا رہا ہے، بچے جاتے ہیں، بستیوں سے ایک ایک روٹی لے کر آتے ہیں، پھر بھی وہ پڑا ہوا ہے، صبح کی نماز پڑھ کر چار پانچ بچے بچیاں لے کر بیٹھا ہے، ظہر تک اللہ کا قرآن پڑھا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں: ان کے لیے بھی دعا کرو۔ یہی لوگ ہیں جن کی وجہ سے دین باقی ہے، یہی لوگ ہیں جو دین کی جوگ جگائے ہوئے ہیں۔ بستیوں میں اللہ کے قرآن کی آواز گونج رہی ہے، اللہ کے قرآن کی خدمت ہو رہی ہے، کسی انداز میں بھی کر رہا ہے، وہ آدمی کیسا بھی ہو، اگر وہ قرآن پڑھا رہا ہے، ایک حدیث کا ترجمہ بتا رہا ہے اور کچھ بھی نہیں، ایک آدمی کھڑا اذان دے رہا ہے تو اس کے لیے بھی دعا کرو۔ اللہ کا نام پانچ وقت بلند کر کے لوگوں کو جگا رہا ہے۔ اگر ہم اس میں کیڑے نکالنے شروع کر دیں گے تو پھر کیسے کام ہوگا؟

اگر ہم ہر مؤذن کو دیکھیں اور کہیں یار بلال رضی اللہ عنہ جیسا نہیں لگتا۔ پھر تو کام ہو گیا۔ ان شاء اللہ پھر تو کسی مسجد میں

بلال رضی اللہ عنہ کے جوتوں کے برابر بھی کوئی نہیں ہے۔ اگر ہر مؤذن کے بارے میں ہم یہی سوچ سوچیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نظر آئے، ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نظر آئے اور عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نظر آئے، یہ تو بڑا مشکل اور ناممکن ہے۔ وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دور تھا، گزر گیا۔ اللہ تعالیٰ اس دور پر بھی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے، ان صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

لوگوں کی اسلام سے بیزاری:

اب تو جو کچھ باقی ہے اسی پر شکر کرو، کیونکہ اب تو دنیا قرآن کی منکر ہے، حدیثوں کی منکر ہے۔ اب تو دنیا کھلم کھلا اعلان کرتی ہے کہ اسلام ایک مذہب ہے، انسان کا پرسنل معاملہ ہے، ذاتی معاملہ ہے، وہ اپنے گھر میں عبادات کرتا رہے۔ اسلام کا کیا تعلق کہ ہم اس کو قانون میں لے آئیں، دستور میں لے آئیں، آئین میں لے آئیں یا نظامِ حکومت کے طور پر تسلیم کریں؟ وہ کہتے ہیں کہ نہیں اسلام تو ہر ایک کا ذاتی مسئلہ ہے، پرسنل معاملہ ہے، نماز پڑھے نہ پڑھے، روزہ رکھتا ہے تو رکھے، نہیں رکھتا تو نہ رکھے۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے، پسند نہ پسند ہے۔ جیسے کوئی آدمی منہ دھو لیتا ہے اور کوئی آدمی نہیں دھوتا، بعض لوگ استنجا کر لیتے ہیں اور بعض لوگ صرف کاغذ استعمال کرتے ہیں۔ یہ ذاتی مسئلے ہیں۔

اب تو دنیا اس دور میں چلی گئی کہ اسلام اور قرآن کو دین ماننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ وہ اسلام کو مذہب مانتے ہیں، دین نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک مذہب ہے۔ مذہب عبادات کے مجموعہ کا نام ہے کہ نماز پڑھا کرو، روزہ رکھا کرو، حج کیا کرو، زکوۃ دیا کرو، خیرات کیا کرو، اچھے کام کیا کرو اور برے کاموں سے بچا کرو۔ بس بات ختم ہوگئی۔ وہ کہتے ہیں: یہ تو پرسنل معاملہ ہے۔ اسلام مذہب ہے، دین نہیں ہے۔

جب دنیا دین کا مکمل انکار کرنے کے لیے آ چکی ہو اور اس دور میں بھی کوئی دین کا نام لے رہا ہو تو بڑی غنیمت ہے۔ اگر پھر بھی ہم کیڑے نکالیں گے، لوگوں کو لڑائیں گے، لوگوں کو برائیوں پر ابھاریں گے اور انتشار ڈالیں گے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ لوگ اسلام سے اور زیادہ بدظن ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسلام کی طرف جوڑنے کی توفیق دے اور توڑنے سے بچائے۔ اللہ تعالیٰ اس رسی کو مضبوطی سے تھامنے کی توفیق دے اور ہمیں کتاب وسنت کی صحیح اتباع نصیب فرمائے۔

قرأتِ فاتحہ کی بقایا بحث:

پھر اس کے بعد فرماتے ہیں:

''ثُمَّ إِنَّ مَذْهَبَ الشَّافِعِيِّ وَجَمَاعَةٍ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ أَنَّهُ تَجِبُ قِرَاءَتُهَا فِي كُلِّ رَكْعَةٍ وَقَالَ آخَرُونَ: إِنَّمَا تَجِبُ قِرَاءَتُهَا فِي مُعْظَمِ الرَّكَعَاتِ.''

''امام شافعی رحمہ اللہ اور اہل علم کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ ہر رکعت میں فاتحہ ضروری ہے۔ اور باقی ائمہ فرماتے ہیں: ایک میں پڑھ لی اور ایک میں نہ پڑھی تو کوئی حرج نہیں۔''

''وَقَالَ الْحَسَنُ وَأَكْثَرُ الْبَصْرِيِّينَ: إِنَّمَا تَجِبُ قِرَاءَتُهَا فِي رَكْعَةٍ وَاحِدَةٍ مِنَ الصَّلَوَاتِ أَخْذًا بِمُطْلَقِ الْحَدِيثِ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ.''

حضرت حسن بصری اور بصرے والے حضرات رحمہم اللہ فرماتے ہیں: ایک رکعت میں بھی پڑھ لی تب بھی نماز ہوگئی، کیونکہ حدیث میں تو مطلق آیا ہے کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ ہر رکعت کی قید نہیں ہے کہ ہر رکعت میں ضروری ہے۔

''وَقَالَ أَبُو حَنِيفَةَ وَأَصْحَابُهُ وَالثَّوْرِيُّ وَالْأَوْزَاعِيُّ: لَا تَتَعَيَّنُ قِرَاءَتُهَا، بَلْ لَوْ قَرَأَ بِغَيْرِهَا أَجْزَأَهُ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ وَاللهُ أَعْلَمُ.''

''امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، ان کے ساتھی، امام ثوری رحمہ اللہ اور امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سورت فاتحہ متعین نہیں ہے، بلکہ اگر اس کے علاوہ کوئی اور سورت پڑھے گا تب بھی کافی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قرآن میں سے جو آسان ہو پڑھ لیا کرو۔)

''وَقَدْ رَوَى ابْنُ مَاجَهْ مِنْ حَدِيثِ أَبِي سُفْيَانَ السَّعْدِيِّ عَنْ أَبِي نَضْرَةَ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ مَرْفُوعًا: لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ بِالْحَمْدِ وَسُورَةٍ فِي فَرِيضَةٍ أَوْ غَيْرِهَا. وَفِي صِحَّةِ هَذَا نَظَرٌ وَمَوْضِعُ تَحْرِيرِ هَذَا كُلِّهِ فِي كِتَابِ الْأَحْكَامِ الْكَبِيرِ وَاللهُ أَعْلَمُ.''

اب کہتے ہیں کہ ایک حدیث میں آتا ہے جس کو امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ جو شخص ہر رکعت میں حمد نہ پڑھے اور سورت نہ پڑھے چاہے وہ فرض نماز ہو یا نفل ہو تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ لیکن مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی صحت پر مجھے اعتراض ہے۔ یعنی حدیث صحیح نہیں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۲ الکلام علی ما یتعلق بهذا الحدیث]

کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟

''والوجه الثالث: هَلْ تَجِبُ قِرَاءَةُ الْفَاتِحَةِ عَلَى الْمَأْمُومِ؟''

اب تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ مقتدی پڑھے یا نہ پڑھے؟ ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ مطلقاً قرآن کی کوئی آیت پڑھے یا سورۂ فاتحہ پڑھے، ایک مسئلہ یہ تھا کہ فاتحہ ہر رکعت میں پڑھے یا ایک رکعت میں پڑھے یا تین رکعتوں میں پڑھ لے تو کافی ہو جائے گی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ مقتدی پڑھے یا نہ پڑھے؟ فرماتے ہیں: ''فِيهِ ثَلَاثَةُ أَقْوَالٍ لِلْعُلَمَاءِ'' اس میں علماء کے تین اقوال ہیں:

1 ...... ''أَحَدُهَا أَنَّهُ تَجِبُ عَلَيْهِ قِرَاءَتُهَا كَمَا تَجِبُ عَلَى إِمَامِهِ لِعُمُومِ الْأَحَادِيثِ الْمُتَقَدِّمَةِ'' ایک قول تو یہ ہے کہ مقتدی پر بھی قرأت واجب ہے جیسے امام پر واجب ہے۔ اس لیے کہ جو حدیثیں ہم پڑھ چکے ہیں وہ عام ہیں۔

2 ...... ''وَالثَّانِي لَا تَجِبُ عَلَى الْمَأْمُومِ قِرَاءَةٌ بِالْكُلِّيَّةِ لَا الْفَاتِحَةُ وَلَا غَيْرُهَا وَلَا فِي الصَّلَاةِ الْجَهْرِيَّةِ وَلَا السِّرِّيَّةِ، لِمَا رَوَاهُ الْإِمَامُ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ فِي مُسْنَدِهِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ وَلَكِنْ فِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ . وَرَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ وَهْبِ بْنِ كَيْسَانَ عَنْ جَابِرٍ مِنْ كَلَامِهِ، وَقَدْ رُوِيَ هَذَا الْحَدِيثُ مِنْ طُرُقٍ وَلَا يَصِحُّ شَيْءٌ مِنْهَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللهُ أَعْلَمُ'' دوسرا قول یہ ہے کہ مقتدی پر فاتحہ پڑھنا واجب ہی نہیں ہے چاہے نماز جہری ہو یا سری ہو۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ جس شخص کا امام ہے تو امام کا پڑھنا اس کا پڑھنا ہے۔ لیکن مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد کے اندر کمزوری ہے، ضعف پایا جاتا ہے۔ طرق تو اور بھی ہیں، لیکن کوئی طریق صحیح نہیں ہے۔ اگر طریق صحیح نہ ہوں اور متعدد طرق ہوں تو حدیث حسن اور صحیح کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ (جبکہ یہ حدیث صحیح سند کے ساتھ امام ترمذی رحمہ اللہ کے استاذ امام احمد بن منیع رحمہ اللہ کی مسند میں مروی ہے۔ امداد اللہ)

اور دوسری بات یہ کہ فقط یہی حدیث ہو تو پھر تو بات ٹھیک ہے، پھر تو حدیث کمزور اور ضعیف ہے۔ لیکن حدیث ضعیف بھی ہو اور طرق بھی متعدد ہوں، اس کا اصل بھی صحیح حدیث میں موجود ہو تو پھر کیا حکم دیں گے؟ امام صاحب تو فرماتے ہیں کہ قرآن میں ہے: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ [الاعراف: ۲۰۴] (اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو کان لگا کر سنو، اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحمت ہو۔) ایک تو قرآن کی یہ آیت ہے اور دوسرا مسلم شریف میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی کو سکھلایا اور فرمایا: جب امام تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہو، جب وہ پڑھے تو تم چپ رہو۔ اسی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہے تو تم آمین کہو۔ تو اس حدیث میں واضح ہو گیا کہ نماز میں

مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے، بلکہ صرف جہری نمازوں میں آمین کہے۔

جہری نمازوں میں فاتحہ امام کے پیچھے نہ پڑھے:

3 ...... ''وَالْقَوْلُ الثَّالِثُ أَنَّهُ تَجِبُ الْقِرَاءَةُ عَلَى الْمَأْمُومِ فِي السِّرِّيَّةِ لِمَا تَقَدَّمَ وَلَا يَجِبُ ذٰلِكَ فِي الْجَهْرِيَّةِ لِمَا ثَبَتَ فِي صَحِيحِ مُسْلِمٍ'' جو سری نمازیں ہیں ان میں تو فاتحہ پڑھے، لیکن جو جہری نمازیں ہیں ان میں نہ پڑھے۔ یعنی فجر، مغرب اور عشاء میں تو نہ پڑھے۔ ظہر اور عصر سری نمازیں ہیں ان میں پڑھے۔ یہ حکم مسلم شریف کی حدیث سے ثابت ہے۔

اب صحیح مسلم کی حدیث نقل فرما رہے ہیں۔ فرمایا:

''عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا... وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا.'' [صحیح مسلم، رقم: ۴۰۴، بَابُ: التَّشَهُّدِ فِي الصَّلَاةِ]

''حضور ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ تم اس کی اقتداء اور پیروی کرو کہ جب وہ اللہ اکبر کہے تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم چپ رہو۔''

''وَقَدْ صَحَّحَهُ مُسْلِمُ بْنُ الْحَجَّاجِ أَيْضًا'' امام مسلم رحمہ اللہ اس کو صحیح حدیث کہا ہے۔ ''فَدَلَّ هٰذَانِ الْحَدِيثَانِ عَلَى صِحَّةِ هٰذَا الْقَوْلِ'' یہ دو حدیثیں تو اس قول کی صحت پر دلالت کر رہی ہیں کہ بھائی! جہری نماز (فجر، مغرب اور عشاء) میں مقتدی نہ پڑھے۔ چلو تین میں تو ہمارے ساتھ آ گئے نا! پانچ نمازوں میں تین زیادہ ہیں یا کم ہیں؟ تو ان تین کے لیے انہوں نے بھی مان لیا کہ صحیح حدیثیں موجود ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: ''وَهُوَ قَوْلٌ قَدِيمٌ لِلشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللّٰهُ: وَرِوَايَةٌ عَنِ الْإِمَامِ أَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ'' امام شافعی رحمہ اللہ بھی پہلے یہی کہتے تھے کہ جہری نمازوں میں مقتدی کو قرأت نہیں کرنی چاہیے۔ وہ بھی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے قول پر تھے۔

''وَالْغَرَضُ مِنْ ذِكْرِ هٰذِهِ الْمَسَائِلِ هَاهُنَا بَيَانُ اخْتِصَاصِ سُورَةِ الْفَاتِحَةِ بِأَحْكَامٍ لَا تَتَعَلَّقُ بِغَيْرِهَا مِنَ السُّوَرِ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.''

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لیے ذکر کیا ہے کہ فاتحہ کی بڑی شان ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کوئی غلط ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲، اَلْكَلَامُ عَلَى مَا يَتَعَلَّقُ بِهٰذَا الْحَدِيثِ]

سری نمازوں میں بھی مقتدی پر فاتحہ نہیں ہے:

اب دیکھیں نا! مسلم شریف کی دو حدیثیں اور قرآن کی آیت۔ تو جہری میں تو جھگڑا ہی ختم ہو گیا۔ باقی زیادہ سے زیادہ سری نمازوں کا مسئلہ رہے گا۔ اس بارے میں بھی ان کے پاس وہی عمومِ حدیث ہے، مقتدی کا لفظ اس میں نہیں ہے۔ اس سب کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ تمام امام حق پر ہیں۔ اللہ ان پر رحمت فرمائے۔ ہم ان کی شان میں گستاخی نہیں کر سکتے۔ اللہ ہمیں قیامت تک محفوظ رکھے۔ ہم تو اپنے استاذ کی بے ادبی نہیں کر سکتے تو امام کی بے ادبی کیسے کریں گے؟ ہم نے جس سے ایک سبق پڑھا ہو، دو سبق پڑھے ہوں ہم تو اب بھی اپنے ملک میں جاتے ہیں تو جن جن استاذوں سے میں نے پڑھا ہے...... الحمدللہ!...... ان کی زیارت کے لیے، ان کی ملاقات کے لیے اور ان سے دعائیں حاصل کرنے کے لیے سینکڑوں میل سفر کر کے جاتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔ جو آدمی اپنے بڑے بھائی کو بھی گالی نہ دے سکے وہ اپنے باپ کو کب گالی دے گا؟ جو آدمی اپنے عام علماء کی توہین نہ کر سکے وہ صحابہ کے بارے میں کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ اب اگر ہمارے دلوں میں شان کم ہوتی جائے گی تو پھر آہستہ آہستہ خدا جانے بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچے گی؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح راستے پر قائم رکھے۔

سونے سے پہلے فاتحہ اور سورۂ اخلاص کا فائدہ:

''وَقَالَ الْحَافِظُ أَبُو بَكْرٍ الْبَزَّارُ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعِيدٍ الْجَوْهَرِيُّ حَدَّثَنَا غَسَّانُ بْنُ عُبَيْدٍ عَنْ أَبِي عِمْرَانَ الْجَوْنِيِّ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا وَضَعْتَ جَنْبَكَ عَلَى الْفِرَاشِ وَقَرَأْتَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَقُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ فَقَدْ أَمِنْتَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا الْمَوْتَ''

[مسند البزار، حدیث: ۷۳۹۳]

''حضرت ابوبکر بن بزاز رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم رات کو سونے کے لیے بستر پر لیٹو۔ اگر اس وقت سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھ لو تو اللہ کی رحمت سے ہر چیز سے امان میں آجاؤ گے ماسوائے موت کے۔''

یعنی موت تو نہیں ٹل سکتی، باقی ہر چیز سے تمہاری حفاظت ہو جائے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں ہر پریشانی سے، ہر تکلیف سے، ہر حادثے سے، ہر جادو سے اور موت کے سوا ہر چیز سے محفوظ فرما دیں گے۔ تو کتنی بڑی نعمت ہے؟ لہٰذا سوتے وقت کونسا مشکل ہے کہ آدمی سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھ لے۔ دو منٹ نہیں لگتے۔

تلاوتِ قرآن سے پہلے تعوذ پڑھنا:

اب مفسر ﷫ فرماتے ہیں:

"قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ. وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ وَقَالَ تَعَالَى: ﴿ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ. وَقُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونِ﴾ وَقَالَ تَعَالَى: ﴿ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ. وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ. وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ فَهٰذِهِ ثَلَاثُ آيَاتٍ لَيْسَ لَهُنَّ رَابِعَةٌ فِي مَعْنَاهَا وهو أن اللّٰه تَعَالَى يَأْمُرُ بِمُصَانَعَةِ الْعَدُوِّ الْإِنْسِيِّ وَالْإِحْسَانِ إِلَيْهِ لِيَرُدَّهُ عَنْهُ طَبْعُهُ الطَّيِّبُ الْأَصْلِ إِلَى الْمُوَادَّةِ وَالْمُصَافَاةِ، وَيَأْمُرُ بِالِاسْتِعَاذَةِ بِهِ مِنَ الْعَدُوِّ الشَّيْطَانِيِّ لَا مَحَالَةَ إِذْ لَا يَقْبَلُ مُصَانَعَةً وَلَا إِحْسَانًا وَلَا يَبْتَغِي غَيْرَ هَلَاكِ ابْنِ آدَمَ لِشِدَّةِ الْعَدَاوَةِ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَبِيهِ آدَمَ مِنْ قَبْلُ كَمَا قَالَ تَعَالَى: ﴿يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ﴾"

ایک تو انسانوں میں سے دشمن ہوتا ہے اور دوسرا جنوں میں سے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان آیات میں حکم دیا ہے کہ انسانوں میں سے جو دشمن ہے اس کے ساتھ بہتر سلوک کرو، اس کے ساتھ احسان کرو، اس کی برائی کا بدلہ بھلائی سے دو اور اس کی گالیوں کا بدلہ دعاؤں سے دو، تا کہ وہ راضی ہو جائے اور آہستہ آہستہ تمہارے اور اس کے درمیان مودت قائم ہو جائے۔

شیطان کی انسان سے دشمنی:

اور جب شیطان دشمن کا معاملہ آجائے تو پھر میری پناہ میں آجاؤ، کیونکہ بندے تو کسی احسان سے راضی ہو سکتے ہیں، شیطان تو احسان سے راضی نہیں ہو سکتا!

ہمارے ایک زمیندار (پتا نہیں مر گئے ہیں یا زندہ ہیں؟) ایک مثال دیتے تھے۔ مثال بڑی فٹ آتی تھی۔ کہتے تھے کہ خنزیر نے تمہارے سلام کا جواب تو نہیں دینا، تمہیں اٹھا کر ٹکڑے کر دینا ہے۔ مثال بڑی اچھی تھی۔ شیطان پر تم جو بھی احسان کرو اس کو احسان سے کیا مطلب ہے؟ اس کو تو عداوت ہے، وہ تمہیں ہلاک کرنا چاہتا ہے، وہ تمہیں

برباد کرنا چاہتا ہے۔ نہ اس کو تمہارے مال کی ضرورت ہے، نہ احسان کی ضرورت ہے اور نہ تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے، کیونکہ وہ تو قیامت تک ملعون ہوگیا ہے۔ تمہاری دعاؤں سے وہ کیوں راضی ہوگا؟ تمہاری اچھائیوں سے وہ کیوں راضی ہوگا؟ بابا آدم علیہ السلام سے دشمنی ختم نہیں ہوئی اور جب تک اللہ پاک اس کو موت نہیں دیں گے یہ دشمنی چل رہی ہے۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ بھی فرمایا:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا﴾

[الاعراف:۲۷]

''اے اولادِ آدم! تمہیں شیطان کسی دھوکے میں نہ ڈال دے جیسے تمہارے والدین کو اس نے جنت سے نکلوادیا تھا۔ ایسی حالت سے کہ ان کا لباس بھی ان سے اتروادیا، تاکہ ان کو ان کا پردہ کا بدن دکھلائی دینے لگے۔''

اور فرمایا:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۶﴾

[فاطر:۶]

''شیطان تمہارا دشمن ہے۔ دشمن کو دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنی جماعت کی طرف بلاتا ہے، تاکہ وہ بھی جہنمی بنے۔''

کیونکہ اس کو تو پتا کہ میں نے تو جہنم میں جانا ہے۔ اب وہ اپنی برادری اکٹھی کر رہا ہے، تاکہ وہ بھی جہنم میں جائے۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۱۲، ۱۳، تفسیر الاستعاذۃ واحکامہا]

ہمارے ایک مجذوب کی مثال:

ویسے ہمارا ایک فقیر تھا، طالب علم تھا، بے چارہ سیدھا سادھا مجذوب آدمی تھا۔ وہ پڑھتا تھا۔ کبھی کبھی کہتا تھا: کہ صاحب! ساری رونق تو جہنم میں ہوگی، گانے والے ادھر ہوں گے، بجانے والے سارے ادھر ہوں گے، ادھر تو تم سب مولوی وغیرہ تسبیح والے ہوں گے، کوئی ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے ہوگا، کسی نے پگڑی باندھی ہوئی ہوگی، رونق وغیرہ تو سب ادھر ہوگی، سارے رونق میلے ادھر ہوں گے۔ آپ لوگ جنت میں سارے داڑھیوں والے مولوی چپ چپاتے کوئی قصہ نہیں، کوئی قوالی نہیں، کوئی مجرا نہیں، کوئی گانا نہیں، کچھ نہیں، زیادہ سے زیادہ تم لوگوں کو شوق چڑھے گا تو تم لوگ قرآن پڑھ لو گے بس!! کیونکہ اللہ نے فرمایا شیطان اپنی پارٹی کو لے جارہا ہے کہ میں جہنم میں اکیلا تو نہ رہوں، وہ بھی تو اپنی پارٹی بنارہا ہے۔

﴿أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۚ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا ۝﴾ [الکہف:۵۰]

''لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم شیطان اور اس کی ذریت کو میرے سوا دوست بناتے ہو؟ اور وہ تمہارا دشمن ہے۔ (اللہ تعالیٰ کا) کتنا برا متبادل ہے جو ظالموں کو ملا ہے۔''

''وَقَدْ أَقْسَمَ لِلْوَالِدِ آدَمَ علیہ السلام أَنَّهُ لَهُ لَمِنَ النَّاصِحِينَ وَكَذَبَ فَكَيْفَ مُعَامَلَتُهُ لَنَا وَقَدْ قَالَ: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝﴾''

اتنا تو فرق کرو کہ ابا آدم علیہ السلام کے سامنے اس نے خیر خواہی کی قسمیں کھائیں اور جھوٹ بولا، قسم کھا کر بھی جھوٹ بولا اور انہیں جنت سے نکلوایا اور تمہارے سامنے تو اس نے تمہاری خیر خواہی کی قسم بھی نہیں کھائی، بلکہ کھل کر اور قسم کھا کر کہا: میں تمہیں گمراہ کروں گا۔ پھر اس کی عداوت کا کیا عالم ہوگا؟ وہاں تو خیر خواہی کی قسمیں کھائی تھیں اور یہاں گمراہ کرنے کی قسمیں کھا رہا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝﴾ [ص:۸۲]

''شیطان نے کہا: اے ربِّ کریم! مجھے تیری عزت اور جلال کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔''

﴿إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝﴾ [ص:۸۳]

''مگر جو بندے خالص تیرے بندے ہیں ان پر میرا زور نہیں چلے گا۔''

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝﴾ [النحل:۹۸،۹۹]

''میرا مدنی! جب آپ قرآن پڑھنے کا ارادہ کریں تو پہلے ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھ لیا کریں، کیونکہ جب آپ میری پناہ میں آجائیں گے یقیناً اس کا کوئی غلبہ، کوئی طاقت اور کوئی قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر (دل سے) بھروسہ رکھتے ہیں۔''

﴿إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ ۝﴾ [النحل:۱۰۰]

''اس کا غلبہ ان لوگوں پر ہے جو شیطان سے دوستی بناتے ہیں اور جو شرک کرتے ہیں۔''

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳ تفسیر الاستعاذۃ و احکامھا]

تلاوت کے بعد تعوذ پڑھنے کا فائدہ:

"قَالَتْ طَائِفَةٌ مِنَ الْقُرَّاءِ وَغَيْرِهِمْ: نَتَعَوَّذُ بَعْدَ الْقِرَاءَةِ وَاعْتَمَدُوا عَلَى ظَاهِرِ سِيَاقِ الْآيَةِ، وَلِدَفْعِ الْإِعْجَابِ بَعْدَ فَرَاغِ الْعِبَادَةِ."

قراء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ جب قرآن کی تلاوت کر لے، قرآن پڑھ لے تو تعوذ بعد میں پڑھے، کیونکہ ظاہر آیت کا یہی حکم ہے۔ ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ﴾ [النحل:۹۸] (جب تم قرآن کی تلاوت کر چکو تو تعوذ پڑھو) اور اس لیے بھی کہ قرآن پڑھنے کے بعد دل میں کوئی عجب وتکبر بھی پیدا نہ ہو کہ میں دس پارے پڑھے ہیں، جی میں بڑا قرآن پڑھنے والا ہوں۔ تو تعوذ پڑھ لے گا تو شیطان کے ان وسوسوں سے، ریا سے اور تکبر سے بچ جائے گا۔

مشہور قاری حضرت حمزہ رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں۔ مفسر فرماتے ہیں:

"وَمِمَّنْ ذَهَبَ إِلَى ذٰلِكَ حَمْزَةُ فِيمَا نَقَلَهُ عَنْهُ ابْنُ قلوقا وَأَبُو حَاتِمٍ السِّجِسْتَانِيُّ، حَكَى ذٰلِكَ أَبُو الْقَاسِمِ يُوسُفُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ جُبَارَةَ الْهُذَلِيُّ الْمَغْرِبِيُّ فِي كِتَابِهِ الْكَامِلِ وَرُوِيَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَيْضًا وَهُوَ غَرِيبٌ. وَنَقَلَهُ مُحَمَّدُ بْنُ عُمَرَ الرَّازِيُّ فِي تَفْسِيرِهِ عَنِ ابْنِ سِيرِينَ فِي رِوَايَةٍ عَنْهُ قَالَ: وَهُوَ قَوْلُ إِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيِّ وَدَاوُدَ بْنِ عَلِيٍّ الْأَصْبَهَانِيِّ الظَّاهِرِيِّ. وَحَكَى الْقُرْطُبِيُّ عَنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ الْعَرَبِيِّ عَنِ الْمَجْمُوعَةِ عَنْ مَالِكٍ رَحِمَهُ اللهُ: أَنَّ الْقَارِئَ يَتَعَوَّذُ بَعْدَ الْفَاتِحَةِ، وَاسْتَغْرَبَهُ ابْنُ الْعَرَبِيِّ."

انہوں نے کہا: فاتحہ پڑھ کر پھر پڑھے۔ "وَحَكَى قَوْلًا ثَالِثًا وَهُوَ الِاسْتِعَاذَةُ أَوَّلًا وَآخِرًا جَمْعًا بَيْنَ الدَّلِيلَيْنِ. نَقَلَهُ الرَّازِيُّ." بعض لوگوں نے کہا کہ تعوذ پہلے بھی پڑھے اور جب قرآن مکمل کرے تب بھی پڑھے۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۱۳، تَفْسِيرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَأَحْكَامُهَا]

تلاوت سے پہلے تعوذ پڑھنا صحیح ہے:

اور جمہور کا قول یہ ہے کہ قرآن پڑھنے سے پہلے پڑھے، تا کہ وساوس سے بچے "وَمَعْنَى الْآيَةِ عِنْدَهُمْ ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾ أَيْ إِذَا أَرَدْتَ القراءة" جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو۔ "كَقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ﴾ أَيْ إِذَا أَرَدْتُمُ الْقِيَامَ" جب تم

نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو وضو کرو۔ ''وَالدَّلِيلُ عَلَى ذٰلِكَ الْأَحَادِيثُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِذٰلِكَ. '' اور اس پر دلیل احادیث مبارکہ ہیں۔ بہر حال! جمہور کا قول یہ ہے کہ قرآن شروع کرنے سے پہلے تعوذ، پھر تسمیہ پڑھیں اور پھر قرآن پاک کی تلاوت کریں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳ تَفْسِيرُ الْإِسْتِعَاذَةِ وَأَحْكَامُهَا]

رات کے وقت نماز میں تعوذ پڑھنا:

''قَالَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ بن أَنَسٍ حَدَّثَنَا جَعْفَرُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ عَلِيِّ بْنِ عَلِيٍّ الرِّفَاعِيِّ الْيَشْكُرِيِّ عَنْ أَبِي الْمُتَوَكِّلِ النَّاجِي عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَاسْتَفْتَحَ صَلَاتَهُ وَكَبَّرَ قَالَ: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ، وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ، وَيَقُولُ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ثَلَاثًا، ثُمَّ يَقُولُ: أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ. وَقَدْ رَوَاهُ أَهْلُ السُّنَنِ الْأَرْبَعَةِ مِنْ رِوَايَةِ جَعْفَرِ بْنِ سُلَيْمَانَ عَنْ عَلِيِّ بْنِ عَلِيٍّ وَهُوَ الرِّفَاعِيُّ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: هُوَ أَشْهَرُ شَيْءٍ فِي هٰذَا الْبَابِ، وَقَدْ فُسِّرَ الْهَمْزُ بِالْمُوتَةِ وَهِيَ الْخَنْقُ، وَالنَّفْخُ بِالْكِبْرِ وَالنَّفْثُ بِالشِّعْرِ. كَمَا رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ مِنْ حَدِيثِ شُعْبَةَ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ عَنْ عَاصِمٍ الْعَنَزِيِّ عَنْ نَافِعِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ الْمُطْعِمِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ قَالَ: اللّٰهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا ثَلَاثًا، الْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيرًا ثَلَاثًا، سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ثَلَاثًا، اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ.''

اب مفسر رحمہ اللہ استعاذہ کے بارے میں احکام نقل فرما رہے ہیں کہ ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ'' کس وقت وقت پڑھیں؟

ایک قول تو یہ ہے کہ تلاوت ختم کرنے کے بعد پڑھیں۔ انہوں نے ظاہر آیت کو لے لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ (جب تم قرأتِ قرآن، تلاوتِ قرآن کر چکو تو اللہ کی پناہ پکڑو۔) تو اس لیے بعض ائمہ کا قول یہ ہوا کہ جب آدمی تلاوت کر لے تو آخر میں ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ'' پڑھے، تاکہ شیطان قرآن کی تلاوت کی وجہ سے اس کو تکبر میں، ریا میں اور شہرت طلبی میں مبتلا نہ کر دے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ جب قرآن شروع کرے تب بھی ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ'' پڑھے اور جب ختم کرے تب بھی ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ'' پڑھے، تاکہ پہلے بھی اللہ کی پناہ میں آ جائے اور بعد میں

بھی اللہ کی پناہ میں آجائے۔

اب یہ تین قول آگئے، لیکن راجح قول جمہور کے نزدیک یہ ہے "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" پہلے پڑھیں۔ یہ سب کے نزدیک زیادہ راجح قول ہے۔

اسی پر مفسر رحمہ اللہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی نقل کردہ حدیث مبارکہ کا ذکر فرما رہے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور نماز شروع فرماتے ہوئے تکبیر کہتے تو "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ، وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ." تین دفعہ پڑھتے اور پھر "أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ." پڑھتے۔ [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۱۱۴۷۳]

معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فاتحہ پڑھنے سے پہلے پہلے "أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" پڑھتے تھے۔ اس سے مفسر رحمہ اللہ کا استدلال یہ ہے کہ قرآن پڑھنے سے پہلے تعوذ پڑھنا چاہیے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳ تَفْسِيْرُ الْإِسْتِعَاذَةِ وَأَحْكَامُهَا]

ایک بات یہ بھی یاد رکھیں کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع فرماتے تو تکبیر کے بعد یہ کلمات پڑھتے تھے:

﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ ... قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝﴾

[شعب الایمان، حدیث: ۲۸۶۴]

"میں اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا سب سے یکسو ہو کر اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں...... آپ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز، میری ساری عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے، جو مالک ہے سارے جہان کا اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور مجھ کو اس کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں۔"

اور اسی طرح یہ بھی آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "اللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ، كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اللّٰهُمَّ نَقِّنِي مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ

وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ'' بھی پڑھا ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۴، باب: مَا يَقُولُ بَعْدَ التَّكْبِيرِ]

تعوذ کے مختلف کلمات:

تو یاد رکھیں! اصل بات یہ ہے کہ مختلف اوقات میں، مختلف نمازوں میں حضور پاک ﷺ کا کلام مبارک ہے۔ تو بعض روایات میں یہ بھی موجود ہے کہ کبھی آپ نے یہ پڑھا، کبھی آپ نے یہ پڑھا۔ جیسے کبھی تو آپ ﷺ نے ''أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ'' پڑھا اور کبھی ''أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ'' پڑھا۔ اور بعض روایتوں میں تو ''أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ'' بھی ملتا ہے۔ اس لیے یہ تعارض نہیں ہوتا اور پھر یہ رات کی نماز ہے، تہجد کی نماز ہے اور نوافل کے اندر بڑی وسعت ہوتی ہے۔ نوافل کے اندر آدمی ''اللهُ أَكْبَرُ كَبِيْرًا وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَ سُبْحَانَ اللهِ بُكْرَةً وَّأَصِيْلًا'' اسی طرح ''اللهُ أَكْبَرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ'' بھی پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح ''اللهُ أَكْبَرُ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ'' جو بھی پڑھ رہا ہے، ٹھیک ہے، کیونکہ نفل کے اندر بڑی وسعت ہوتی ہے اور حضور ﷺ کا مختلف اوقات مبارکہ میں یہ پڑھنا ثابت ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳، تَفْسِيرُ الْإِسْتِعَاذَةِ وَأَحْكَامُهَا]

نماز میں ثنا:

بعض ائمہ کرام نے جیسے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب نے ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ'' ہی کو زیادہ افضل جانتے تھے، یعنی زیادہ افضل اور اولیٰ یہ ہے۔ نماز میں پڑھنے کے لیے یہی معروف ثنا پڑھے۔ اب جناب! حضور ﷺ نے شیطان مردود کے فتنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی پناہ پکڑی ہے، جو سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔

''هُمَزَةٌ'' اور ''لُمَزَةٌ'' کا معنی:

''مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ'' اور اسی کو اہل السنن الاربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

''هَمْزٌ'' کا ایک معنی ''خَنْقٌ'' ہوتا ہے۔ اور ''خَنْقٌ'' کا معنی یہ ہے کہ کسی کا گلا گھونٹ کر مار ڈالنا۔ یعنی کسی کو

ایسی موت دینا کہ گلا ہی بند ہو جائے کہ زبان پر کلمہ شریف بھی نہیں آ رہا ہے۔

ایمان پر موت کی حالتیں:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اہل اللہ کی بھی زبان بند ہو جاتی ہے، لیکن ان کا معاملہ تو اللہ کے ساتھ ہے نا! ان کے دل میں کلمہ ہے اور اس سے پہلے وہ اللہ کا ذکر کرتے رہے، ان کی موت ایمان پر آئی، یہ تو اللہ جانتا ہے، ہم تو اس کی گواہی نہیں دے سکتے۔ ہم ان کے ظاہری حالات کے مطابق کہیں گے: الحمد اللہ! آدمی صالح تھا، پوری زندگی دین پر گزری۔ خدا خاتمہ اچھا کر دے اور اللہ پاک جنت نصیب کر دے۔ کیونکہ ہم تو ظاہر جانتے ہیں، باطن کے معاملات اللہ کے سپرد ہیں، لیکن ایک آدمی کا موت کے وقت ہم کلمہ بھی سن لیں کہ وہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھ رہا ہو اور لوگوں کو گواہ بنا رہا ہو کہ تم بھی گواہ بن جاؤ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" اور موت آ جائے تو ہم کہیں گے: سبحان اللہ! حضور ﷺ نے فرمایا: "مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" جس کا آخری کلمہ اللہ کی توحید کا کلمہ ہو تو سمجھو کہ جنت میں داخل ہو گیا۔ یعنی جب اللہ نے خاتمہ اچھا کر دیا "خِتَامُهُ مِسْكٌ" ہو گیا تو اگلی منزلیں خود بخود آسان ہو جائیں گی۔ [سنن أبي داود، حديث: ۳۱۱۶، باب: في التلقين]

حضور ﷺ کی دعا:

اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا: میرے اللہ! مجھے اس کے ایسے حملے سے بچانا کہ وہ ہماری گردن گھونٹ ڈالے اور ہم اللہ کے ذکر سے محروم ہو جائیں، یا میرا اللہ! اس کے کبر کے حملے سے بچانا اور اس کے شر کے حملے سے بچانا۔

شیطانی حملوں کے مختلف طریقے:

شیطان کے حملے مختلف طریقے کے ہوتے ہیں۔ اہلِ علم کو گمراہ کرنے کے لیے اس کے الگ طریقے ہیں، اہلِ عبادت کو گمراہ کرنے کے لیے الگ طریقے ہیں اور جہلاء کو گمراہ کرنے کے الگ طریقے ہیں، حتیٰ کہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی قدرت سے بعض اہل اللہ کے ایسے حالات فرمائے کہ شیطان ان کے سامنے آ گیا، کیونکہ شیطان مختلف شکلوں میں سامنے آ سکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے شیطان کو کیسے پکڑا؟

جیسے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے شیطان کو پکڑ بھی لیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جب صدقہ کی کھجوروں پر پہرہ دیتے تھے

اور شیطان شرارت کرنے کے لیے آتا تھا تو آپ ﷜ نے آخر پکڑ لیا۔ اس نے کہا: آپ مجھے چھوڑ دو تو تمہیں ایک ایسا کلام سکھا دیتا ہوں کہ آئندہ کوئی جن تیرے قریب ہی نہیں آئے گا۔ تو اس نے قرآن پاک کی آیات اور آیت الکرسی کی تعلیم دی۔ صبح کو جب حضرت ابو ہریرہ ﷜ نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: وہی تو شیطان تھا، لیکن...... کبھی جھوٹا بندہ بھی سچ بول لیتا ہے۔ وہ تھا تو جھوٹا، لیکن تمہیں جو بات کہہ گیا بات ٹھیک ہے۔ [صحيح البخاري، حديث: ٢٣١١، باب: إذا وكّل رجلًا فترك الوكيل...]

شیطان کے ستر ہزار جال:

بہر حال شیطان نے کہا: میں عابد لوگوں کو گمراہی میں ڈالنے کے لیے ستر ہزار نورانی جال استعمال کرتا ہوں۔ یعنی وہ جال بظاہر نور کے ہوتے ہیں اور روشن خیال آدمی ان میں ایسے الجھ جاتا ہے کہ اس کو نور دین سمجھتے ہوئے گمراہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ بدعات میں الجھ گئے، کیونکہ شیطان نے مزین کر دیا کہ یہ بدعت نہیں ہے، یہ تو دین ہے۔ اس کو دین بنا کر ان کے دماغوں میں بٹھا دیا ہے۔ اب آدمی لاکھ زور لگا تا رہے، دین کو کیسے چھوڑیں گے؟ ان بے چاروں نے تو یہی سمجھا ہوا ہے کہ یہ دین ہے۔ اسی طریقے سے وہ آدمی کو گمراہ کرنے کے لیے مختلف حیلے اور بہانے استعمال کرتا ہے۔ تو حضور ﷺ نے "أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ" سے پناہ پکڑی۔

اب اسی کے مطابق مفسر ﷫ فرماتے ہیں کہ ایک دوسری حدیث میں بھی آیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

"كَمَا رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهَ مِنْ حَدِيثِ شُعْبَةَ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ عَنْ عَاصِمٍ الْعَنَزِيِّ عَنْ نَافِعِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ الْمُطْعِمِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ قَالَ: اللهُ أَكْبَرُ كَبِيرًا ثَلَاثًا، الْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيرًا ثَلَاثًا، سُبْحَانَ اللهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ثَلَاثًا، اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ. قَالَ عَمْرٌو: هَمْزُهُ الْمُوتَةُ وَنَفْخُهُ الْكِبْرُ وَنَفْثُهُ الشِّعْرُ، وَقَالَ ابْنُ مَاجَهَ: حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْمُنْذِرِ حَدَّثَنَا ابْنُ فُضَيْلٍ حَدَّثَنَا عَطَاءُ بْنُ السَّائِبِ عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ السُّلَمِيِّ عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ وَهَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ قَالَ: هَمْزُهُ الموتة وَنَفْخُهُ الْكِبْرُ وَنَفْثُهُ الشِّعْرُ. وَقَالَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ: حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ يُوسُفَ، حَدَّثَنَا شَرِيكٌ عَنْ يَعْلَى بْنِ عَطَاءٍ عَنْ رَجُلٍ حَدَّثَهُ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا أُمَامَةَ الْبَاهِلِيَّ يَقُولُ: كَانَ

رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ كَبَّرَ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، وَسُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ: أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ. وَقَالَ الْحَافِظُ أَبُو يَعْلَى أَحْمَدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ الْمُثَنَّى الْمَوْصِلِيُّ فِي مُسْنَدِهِ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ بْنِ أَبَانٍ الكوفي، حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ هَاشِمِ بْنِ الْبَرِيدِ عَنْ يَزِيدَ بْنِ زِيَادٍ عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي لَيْلَى عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: تَلَاحَى رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَمَزَّعَ أَنْفُ أَحَدِهِمَا غَضَبًا فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي لَأَعْلَمُ شَيْئًا لَوْ قَالَهُ لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ: أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ"

دوسری حدیث نافع بن جبیر بن المطعم رضی اللہ عنہ سے آتی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳، تَفْسِيرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَأَحْكَامُهَا]

غصہ دبانے کا عمل:

"وَقَالَ الْحَافِظُ أَبُو يَعْلَى أَحْمَدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ الْمُثَنَّى الْمَوْصِلِيُّ فِي مُسْنَدِهِ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ بْنِ أَبَانٍ الكوفي، حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ هَاشِمِ بْنِ الْبَرِيدِ عَنْ يَزِيدَ بْنِ زِيَادٍ عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي لَيْلَى عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: تَلَاحَى رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَصَدَّعَ أَنْفُ أَحَدِهِمَا غَضَبًا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنِّي لَأَعْلَمُ شَيْئًا لَوْ قَالَهُ لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ: أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ." [الاحادیث المختارۃ، حدیث: ۱۲۳۶]

حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں: دو آدمیوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب جھگڑا کیا، آپس میں کسی بات پر جھگڑ پڑے، غصے میں آدمی کی ناک سرخ ہوگئی، پھول گئی، جیسے ناک پھٹ رہی ہو...... آپ نے دیکھا ہے کہ جب آدمی کو غصہ آتا ہے اس کی آنکھیں سرخ ہوتی ہیں اور نتھنے پھڑک رہے ہوتے ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس کی حالت کو دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ایک ایسی چیز کا پتا ہے اگر یہ پڑھ لے تو غصہ چلا جائے گا۔ اور وہ چیز ہے "أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" یعنی فوراً اللہ کی پناہ میں آجائے، کیونکہ اللہ معاف فرمائے! انسان غصے کی حالت میں حدود سے نکل جاتا ہے۔ غصے کے عالم میں انسان کی زبان سے ایسے ایسے الفاظ صادر ہوتے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ اللہ معاف فرمائے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ پڑھ لیتا اور اللہ کی پناہ میں آجاتا تو

شیطان کے فتنے سے بچ جاتا، کیونکہ غصے میں یہ بھی طریقہ ہے کہ اور غصہ دلایا، حتیٰ کہ آدمی پھر کفر بکنا شروع کر دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ آدمی غصے میں پہلے اسے گالی دیتا ہے، پھر اس کے باپ کو گالی دیتا ہے، پھر اس کے مرشد کو گالی دیتا ہے، پھر اس کے استاد کو گالی دیتا ہے، پھر اس کے دین کو گالی دیتا ہے، پھر اس کے ایمان کو گالی دیتا ہے اور اس کے مذہب کو گالی دیتا ہے۔ انسان حدودِ کفر میں داخل ہو گیا۔

غصہ کی حالتیں اور علاج:

تو اگر آدمی غصہ کے وقت "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" پڑھ لے تو شیطان کے حملے سے بچ گیا۔ جب شیطان کے حملے سے بچ گیا تو الحمد للہ! ۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا: اگر غصہ بہت زیادہ ہو اور آدمی کھڑا ہو تو بیٹھ جائے۔ اور فرمایا: بہت زیادہ غصہ آیا ہے اور بیٹھا ہے تو لیٹ جائے اور اس سے بھی غصہ نہیں اتر رہا تو "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھ کر وضو کر لے تو غصہ چلا جائے گا۔ [سنن أبي داود، حدیث: ۴۷۸۲، حدیث: ۴۷۸۳، باب: مَا يُقَالُ عِنْدَ الْغَضَبِ]

غصہ کرنا بڑی خطرناک چیز ہے!

غصہ کرنا بھی بڑی بری چیز ہے۔ اس لیے ایک حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں آئے، انہوں نے عرض کیا: "أَوْصِنِيْ" مجھے آپ نصیحت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "لَاتَغْضَبْ" غصہ نہ کیا کرو۔ اس نے دوبارہ عرض کیا: حضور! مزید کوئی نصیحت فرمائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بس غصہ نہ کیا کرو۔ اس نے دوبارہ عرض کیا: حضور! مزید کوئی نصیحت فرمائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بس غصہ نہ کیا کرو۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۱۱۶، باب: الحَذَرِ مِنَ الغَضَبِ]

اللہ پاک معاف فرمائے۔ غصہ ایسی چیز ہے۔ دیکھا نہیں کہ لوگ آجاتے ہیں کہ جی گھر میں لڑائی ہو گئی اور میں نے بیوی کو طلاق دے دی، گھر میں لڑائی ہو گئی اور میں نے بیٹے کو عاق کر دیا، گھر میں لڑائی ہو گئی اور میں نے گھر والوں کو گھر سے نکال دیا۔ تو یہ ساری چیزیں غصے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور خدا کی قدرت ہے کہ غصہ ایک آگ ہے اور شیطان بھی آگ ہے۔ جب دو آگیں مل جائیں تو پھر آدمی پھٹے گا نہیں تو اور کیا ہوگا؟ غصے میں آگ ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں! ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے بدن سے چنگاریاں نکل رہی ہیں اور بال کھڑے ہو رہے ہیں اور آدمی سرخ ہو رہا ہے اور بدن سارا گرم ہو گیا ہے۔ اور شیطان بھی آگ ہے۔ کیونکہ ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ [الكهف:۵۰]

(شیطان تو اصل جن ہے) اور جن آگ سے بنی ہوئی مخلوق ہے۔ اس لیے آپ نے فرمایا: اگر یہ کلمہ پڑھ لیتا تو یہ غصہ چلا جاتا۔

''وَكَذَا رَوَاهُ النَّسَائِيُّ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ'' امام نسائی رحمہ اللہ کی کتاب ''(عمل) الیوم واللیلۃ'' اس کے اندر انہوں نے...... ماشاء اللہ!...... بڑی عجیب دعائیں لکھی ہیں۔

غصہ کا نبوی وظیفہ:

((عَنْ يُوسُفَ بْنِ عِيسَى الْمَرْوَزِيِّ عَنِ الْفَضْلِ بْنِ مُوسَى عَنْ يَزِيدَ بْنِ زِيَادِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ، بِهِ. وَقَدْ رَوَى هَذَا الْحَدِيثَ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ عَنْ زَائِدَةَ، وَأَبُو دَاوُدَ عَنْ يُوسُفَ بْنِ مُوسَى عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ الْحَمِيدِ، وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ فِي ''الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ'' عَنْ بُنْدَارٍ عَنِ ابْنِ مَهْدِيٍّ عَنِ الثَّوْرِيِّ، وَالنَّسَائِيُّ أَيْضًا مِنْ حَدِيثِ زَائِدَةَ بْنِ قُدَامَةَ ثَلَاثَتُهُمْ عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي لَيْلَى عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: اسْتَبَّ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ))

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو آدمی لڑ پڑے''

((فَغَضِبَ أَحَدُهُمَا غَضَبًا شَدِيدًا حَتَّى يُخَيَّلَ إِلَيَّ أَنَّ أَحَدَهُمَا يَتَمَزَّعُ أَنْفُهُ مِنْ شِدَّةِ غَضَبِهِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: إِنِّي لَأَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ مِنَ الْغَضَبِ))

''ایک آدمی کو بہت زیادہ غصہ آیا، مجھے تو محسوس ہوا کہ اس کا ناک غصے سے پھٹ پڑے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ایسی چیز آتی ہے کہ اگر یہ پڑھ لے تو اس کا غصہ چلا جائے گا۔''

اس نے پوچھا: وہ کیا کلمہ مبارک ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. قَالَ: فَجَعَلَ مُعَاذٌ يَأْمُرُهُ فَأَبَى وَجَعَلَ يَزْدَادُ غَضَبًا.))

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ایک جھگڑنے والے کو فرمایا: ''اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ'' پڑھو تو وہ اور زیادہ غصے میں آنے لگا۔ پڑھے تو فائدہ ہو۔

[سنن أبي داود، حديث: ٤٧٨٠، باب: ما يقال عند الغضب]

''وَهَذَا لَفْظُ أَبِي دَاوُدَ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: مُرْسَلٌ، يَعْنِي أَنَّ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ أَبِي لَيْلَى لَمْ يَلْقَ مُعَاذَ بْنَ

جَبَلٍ فَإِنَّهُ مَاتَ قَبْلَ سَنَةِ عِشْرِينَ. قُلْتُ: وَقَدْ يَكُونُ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ أَبِي لَيْلَى سَمِعَهُ مِنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ كَمَا تَقَدَّمَ وَبَلَّغَهُ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ فَإِنَّ هَذِهِ الْقِصَّةَ شَهِدَهَا غَيْرُ وَاحِدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ.''

''لَاحَوْلَ'' کا مطلب اور فائدہ:

ہمارے ہاں بھی بڑا رواج ہے کہ جب کوئی آدمی ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ'' کہتا ہے تو دوسرا کہتا ہے: اچھا آپ نے مجھے شیطان سمجھا ہے؟ خدا کے بندے! ''لَاحَوْلَ'' پڑھنے کا مطلب یہ نہیں کہ صرف شیطان پر پڑھا جاتا ہے، ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' تو ایک ایسا کلمہ ہے جنت کے خزانوں میں سے خزانہ ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شیطان سے بچنے کی ہماری کوئی طاقت نہیں، نیک کام کرنے کی ہماری کوئی قوت نہیں، سب تیرے ہاتھ میں ہے، تو ہی بلند ہے، تو ہی عظیم ہے اور میں اپنے عجز کا اعتراف کرتا ہوں کہ میرے پاس کیا ہے؟ ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' مشکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کوئی صحیح بات قبول بھی نہیں کرتا۔ اس لیے اس بندے نے بھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی بات کو قبول نہیں کیا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت مرسل ہے، لیکن متعدد طریقوں سے موجود ہے اور بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ روایت کی ہے۔ بات ٹھیک ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا سماع حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نہ ہو، لیکن انہیں یہ حدیث مبارک حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے پہنچی ہو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۳، تَفْسِيرُ الْإِسْتِعَاذَةِ وَأَحْكَامُهَا]

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعض جھگڑے انسانی تقاضے سے ہوئے تھے:

''قَالَ الْبُخَارِيُّ: حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ، حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ عَدِيِّ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَالَ سُلَيْمَانُ بْنُ صرد رضی اللہ عنہ: اسْتَبَّ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ عِنْدَهُ جُلُوسٌ، فَأَحَدُهُمَا يَسُبُّ صَاحِبَهُ مُغْضَبًا قَدِ احْمَرَّ وَجْهُهُ''

''حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھگڑا کیا، وہ آپس میں ایک دوسرے کو گالی دے رہے تھے۔ ایک آدمی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔''

''فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنِّي لَأَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ لَوْ قَالَ: أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ

الشَّيطَانِ الرَّجِيْمِ"

"حضور ﷺ نے فرمایا: مجھے ایک کلمہ آتا ہے"أَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيطَانِ الرَّجِيْمِ "اگر یہ پڑھ لے تو غصہ چلا جائے گا۔"

"فَقَالُوْا لِلرَّجُلِ أَلَا تَسْمَعُ مَا يَقُوْلُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: إِنِّي لَسْتُ بِمَجْنُوْنٍ. وَقَدْ رَوَاهُ أَيْضًا مَعَ مُسْلِمٍ وَأَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ مِنْ طُرُقٍ مُتَعَدِّدَةٍ عَنِ الْأَعْمَشِ بِهِ." [صحیح البخاری، حدیث:٦١١٥، بابُ:الحَذَرِ مِنَ الغَضَبِ]

"لوگوں نے اس آدمی سے کہا: بھائی! تم سن نہیں رہے جو حضور ﷺ فرما رہے ہیں؟ اس آدمی نے کہا: میں کوئی پاگل ہوں؟"

یہ غصے کی بات ہوتی ہے۔ یاد رکھیں اصحابہ رضی اللہ عنہم بھی انسان تھے۔ اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ تو انسان غصے میں آجاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپس میں غصے ہو گئے، جھگڑا ہو گیا۔ اسی طریقے سے ایک دفعہ حضور ﷺ بھی جلال میں آگئے۔ تو یہ بشری تقاضا ہے۔ اس لیے ایسی باتوں سے آدمی یہ مطلب نہ نکالے کہ حضور ﷺ کے سامنے گالیاں دے رہے تھے۔

تو یہ ایک تقاضائے انسانیت ہے، تقاضائے بشریت ہے اور فطری تقاضا ہے۔ انسانوں میں جھگڑے بھی ہوتے ہیں، انسانوں میں محبت بھی ہوتی ہے اور انسانوں میں اختلاف بھی ہوتے ہیں۔ کبھی بڑے بڑے لوگ بھی غصے میں آ کر ایسی بات زبان سے نکالتے ہیں جو ان کی شان کے مطابق نہیں ہوتی، کیونکہ آخر بشر ہیں، انسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو چکا۔ یہ ان کے احوالِ حقیقیہ ہوتے ہیں، لیکن دشمن انہی باتوں کو...... نعوذ باللہ! ...... تہمت بناتے ہیں کہ حضور ﷺ کے سامنے گالیاں دے رہے ہیں اور پھر حضور ﷺ کا فرمان قبول نہ کیا اور کہا کہ میں کوئی مجنون ہوں، میں کوئی دیوانہ ہوں؟ تو یہ بات نہیں، یہ تو بشری تقاضا ہے۔

حضور ﷺ کی دو بیویوں میں غصہ:

حضور ﷺ اپنی ایک بیوی کے گھر تشریف فرما تھے تو دوسری بی بی نے ایک پیالے میں ہدیہ بھیجا تو جس کے گھر میں آپ ﷺ موجود تھے اس بی بی صاحبہ کو جو غصہ آیا تو انہوں نے پیالے کو ایسا ہاتھ مارا کہ پیالہ ہی ٹوٹ گیا۔ بیویوں کے اندر یہ بات ہوتی ہے کہ حضور ﷺ میرے گھر میں ہیں تو تم کیوں ہدیہ بھیج رہی ہو؟ تاکہ میری بجائے حضور ﷺ تیرا ذکر بھی کریں اور تیرا فکر بھی کریں؟ انہوں نے گوارا نہ کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "غَارَتْ أُمُّكُمْ" (تمہاری ماں کو غصہ آ گیا)۔ اور حضور پاک ﷺ نے گھر سے پیالہ اٹھایا اور فرمایا: پیالے کے بدلے میں

پیالہ لے جاؤ۔ اور اس پیالے سے جو طعام گرا تھا حضور ﷺ نے اس طعام کو اٹھا کر رکھ دیا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۵۲۲۵، بَابُ الغَيْرَةِ]

تو یہ بشری تقاضا ہے۔ بشری تقاضا انبیاء علیہم السلام کے اندر بھی موجود ہے۔ ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ تو ایسی باتوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یا اللہ کے نیک بندوں کے بارے میں سوئے ظن اور بدگمانی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔

"وَقَدْ جَاءَ فِي الْإِسْتِعَاذَةِ أَحَادِيثُ كَثِيرَةٌ يَطُولُ ذِكْرُهَا هَاهُنَا وَمَوْطِنُهَا كِتَابُ الْأَذْكَارِ وَفَضَائِلِ الْأَعْمَالِ وَاللهُ أَعْلَمُ."

تعوذ کے بارے میں میرے آقا محمد مصطفیٰ ﷺ کی بہت ساری حدیثیں موجود ہیں۔ اگر دیکھنا چاہو تو کتاب الاذکار اور فضائل الاعمال کی کتابوں کے اندر دیکھو۔ کیونکہ یہ تفسیرِ قرآن ہے۔ اس میں تو مفسرین بطورِ استدلال صرف چند حدیثیں ذکر کر دیتے ہیں، لہٰذا یہاں موقع نہیں ہے کہ استعاذہ کے بارے میں ساری حدیثیں جمع کرتے جائیں۔

"وَقَدْ رُوِيَ أَنَّ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَوَّلَ مَا نَزَلَ بِالْقُرْآنِ عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَهُ بِالْإِسْتِعَاذَةِ كَمَا قَالَ الْإِمَامُ أَبُو جَعْفَرِ بْنُ جَرِيرٍ: حَدَّثَنَا أَبُو كُرَيْبٍ، حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ سَعِيدٍ، حَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ عِمَارَةَ، حَدَّثَنَا أَبُورَوْقٍ عَنِ الضَّحَّاكِ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: أَوَّلُ مَا نَزَلَ جِبْرِيلُ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ! اسْتَعِذْ قَالَ: أَسْتَعِيذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ثُمَّ قَالَ: قُلْ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ثُمَّ قَالَ: اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ قَالَ عَبْدُ اللهِ: وَهِيَ أَوَّلُ سُورَةٍ أَنْزَلَهَا اللهُ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلِسَانِ جِبْرِيلَ. وَهَذَا الْأَثَرُ غَرِيبٌ وَإِنَّمَا ذَكَرْنَاهُ لِيُعْرَفَ فَإِنَّ فِي إِسْنَادِهِ ضَعْفًا وَانْقِطَاعًا وَاللهُ أَعْلَمُ."

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام سب سے پہلے جب قرآن لے کر اترے تو سب سے پہلے استعاذہ حضور ﷺ کو پڑھایا۔ جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ جب جبرائیل علیہ السلام آئے تو انہوں نے حضور ﷺ سے کہا: آپ پناہ پکڑیں۔ آپ ﷺ نے پڑھا: "أَسْتَعِيذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" پھر جبرائیل علیہ السلام نے کہا: حضور! "بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ" پڑھیں۔ آپ ﷺ نے "بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ" پڑھا، پھر جبرائیل علیہ السلام کہا کہ اب ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ

عَلَقٍ ﴿۲﴾﴾ [العلق:۱،۲] پڑھیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے روایت تو ذکر کردی، تاکہ آپ لوگوں کو پتا چل جائے کہ یہ بات بھی کہی گئی، لیکن اس کی سند ضعیف ہے، اس کے اندر انقطاع ہے اور قابلِ حجت نہیں ہے۔

احناف کے نزدیک تعوذ واجب ہے:

شوافع کے نزدیک تلاوت سے پہلے تعوذ پڑھنا واجب نہیں ہے۔

''وَجُمْهُورُ الْعُلَمَاءِ عَلَى أَنَّ الِاسْتِعَاذَةَ مُسْتَحَبَّةٌ لَيْسَتْ بِمُتَحَتِّمَةٍ يَأْثَمُ تَارِكُهَا'' جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ'' کا پڑھنا مستحب ہے، واجب نہیں، محتم نہیں، بلکہ مستحب ہے کہ آدمی پہلے ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ'' پڑھے۔

''وَحَكَى الرَّازِي عَنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِي رَبَاحٍ وُجُوبَهَا فِي الصَّلَاةِ وَخَارِجِهَا كُلَّمَا أَرَادَ الْقِرَاءَةَ''

امام رازی رحمہ اللہ اور عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ﴿۹۸﴾﴾ [النحل:۹۸] میں امر وجوب کے لیے ہے۔ چاہے نماز میں بھی ہو تب بھی تعوذ کا پڑھنا واجب ہے اور نماز کے علاوہ بھی جب قرآن پڑھے تو تعوذ پڑھنا واجب ہے۔

ابن سیرین رحمہ اللہ کا مذہب:

''وَقَالَ ابْنُ سِيرِينَ: إِذَا تَعَوَّذَ مَرَّةً وَاحِدَةً فِي عُمْرِهِ فَقَدْ كَفَى فِي إِسْقَاطِ الْوُجُوبِ''

ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس آدمی نے زندگی میں ایک دفعہ تعوذ پڑھ لیا تو واجب پر عمل ہوگیا جو اللہ نے حکم دیا ہے۔ تو ہم نے ایک دفعہ تو پڑھ لیا، لہٰذا وجوب تو ختم ہوگیا۔ اس لیے جمہور فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے سے پہلے...... خواہ نماز میں ہو یا خارج نماز ہو...... تعوذ پڑھنا مستحب ہے۔

واجب ہونے کی دلیل:

''وَاحْتَجَّ الرَّازِيُّ لِعَطَاءٍ بِظَاهِرِ الْآيَةِ (فَاسْتَعِذْ) وَهُوَ أَمْرٌ ظَاهِرُهُ الْوُجُوبُ وَبِمُوَاظَبَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْهَا وَلِأَنَّهَا تَدْرَأُ شَرَّ الشَّيْطَانِ وَمَا لَا يَتِمُّ الْوَاجِبُ إِلَّا بِهِ فَهُوَ وَاجِبٌ وَلِأَنَّ الِاسْتِعَاذَةَ أَحْوَطُ وَهُوَ أَحَدُ مَسَالِكِ الْوُجُوبِ وَقَالَ بَعْضُهُمْ: كَانَتْ وَاجِبَةً عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دُونَ

أُمَّتِهِ، وَحُكِيَ عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ لَا يَتَعَوَّذُ فِي الْمَكْتُوبَةِ وَيَتَعَوَّذُ لِقِيَامِ رَمَضَانَ فِي أَوَّلِ لَيْلَةٍ مِنْهُ۔"

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن حضرات نے کہا کہ تعوذ واجب ہے وہ فرماتے ہیں کہ قرآن میں ہے: ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝﴾ [النحل: ۹۸] یہ امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر مواظبت فرمانا یعنی ہمیشہ پڑھنا بھی وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اور پھر اس سے شیطان کو دفع کیا جاتا ہے۔ اور شیطان کو دفع کرنا بھی تو واجب ہے کہ آدمی اس کے فتنے سے بچے۔ اور جب یہ واجب ہے تو اس کے دفع کے لیے پڑھنا بھی واجب ہے۔ اس لیے انہوں نے فرمایا کہ واجب ہے۔ لیکن بعض علماء نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو واجب تھا، لیکن امت کے لیے واجب نہیں، امت کے لیے مستحب ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ فرض نمازوں میں تو تعوذ نہیں پڑھتے تھے، لیکن جب رمضان میں تراویح پڑھتے تو پہلی رات تو پڑھ لیتے تھے، بعد میں نہیں پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بس ایک دفعہ پڑھ لیا ہے تو کافی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۴، تَفْسِيرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَأَحْكَامُهَا]

"[مَسْأَلَةٌ] وَقَالَ الشَّافِعِيُّ فِي "الْإِمْلَاءِ": يَجْهَرُ بِالتَّعَوُّذِ وَإِنْ أَسَرَّ فَلَا يَضُرُّ، وَقَالَ فِي "الْأُمِّ" بِالتَّخْيِيرِ، لِأَنَّهُ أَسَرَّ ابْنُ عُمَرَ وَجَهَرَ أَبُو هُرَيْرَةَ"

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب نماز میں پڑھے یا ویسے پڑھے تو زور سے پڑھے، لیکن اگر کسی نے آہستہ بھی پڑھا تو نقصان اور گناہ نہیں۔ اور کتاب "الام" کے اندر ان کا دوسرا قول یہ بھی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: اس کا اختیار ہے کہ زور سے پڑھے یا آہستہ پڑھے، یہ اس کی مرضی ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما آہستہ پڑھتے تھے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ زور سے پڑھتے تھے۔

"وَاخْتَلَفَ قَوْلُ الشَّافِعِيِّ فِيمَا عَدَا الرَّكْعَةِ الْأُولَى هَلْ يُسْتَحَبُّ التَّعَوُّذُ فِيهَا عَلَى قَوْلَيْنِ وَرَجَّحَ عَدَمَ الْاِسْتِحْبَابِ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ"

پہلی رکعت کے علاوہ دوسری رکعتوں میں تعوذ پڑھنے کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ کے اقوال میں اختلاف ہے کہ صرف پہلی رکعت میں پڑھے یا دوسری رکعتوں میں بھی پڑھے؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔ راجح قول یہ ہے کہ صرف پہلی رکعت میں پڑھنا مستحب ہے، باقی رکعتوں میں پڑھنا مستحب نہیں ہے۔

"فَإِذَا قَالَ الْمُسْتَعِيذُ: أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ كَفَى ذَلِكَ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ وَأَبِي حَنِيفَةَ وَزَادَ

بَعْضُهُمْ: أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ''

''وَقَالَ آخَرُونَ بَلْ يَقُولُ: أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، قَالَ الثَّوْرِيُّ وَالْأَوْزَاعِيُّ، وَحُكِيَ عَنْ بَعْضِهِمْ أَنَّهُ يَقُولُ: أَسْتَعِيذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، لِمُطَابَقَةِ أَمْرِ الْآيَةِ وَلِحَدِيثِ الضَّحَّاكِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ الْمَذْكُورِ، وَالْأَحَادِيثُ الصَّحِيحَةُ كَمَا تَقَدَّمَ أَوْلَى بِالْاِتِّبَاعِ مِنْ هَذَا وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.''

بعض نے کہا ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ'' پڑھے، لیکن مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہی حدیثیں صحیح ہیں۔

دیکھیں! صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما آہستہ پڑھتے تھے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ زور سے پڑھتے تھے، لیکن کوئی جھگڑا، کوئی اختلاف نہیں۔ یہ تو ہماری بدقسمتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اختلاف سے بچائے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۴، تَفْسِيرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَأَحْكَامُهَا]

اب دیکھیں! کسی آدمی نے آمین آہستہ کہہ دیا، کسی نے زور سے کہہ دیا، ٹھیک ہے، کوئی لڑنے والی تو بات ہی نہیں۔ اور یہ اختلاف بھی اَولویت اور غیر اولویت میں ہے۔ یعنی بعض ائمہ کے نزدیک زور سے کہنا اولیٰ ہے اور بعض کے نزدیک آہستہ کہنا اولیٰ ہے۔

اب جو لوگ آمین زور سے کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد گونج جاتی تھی۔ اس لیے ہم زور سے کہیں گے تو گونجے گی۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بھائی! اصل مسئلہ دیکھو کہ فاتحہ اور آمین دعا ہے اور قرآن کا حکم ہے: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ [الاعراف: ۹۵] (دعا آہستہ مانگو) اور حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ③﴾ [مریم: ۳] (حضرت زکریا علیہ السلام نے جب دعا مانگی تو خفیہ طریقے سے اپنے رب کو پکارا)۔ اب دونوں کے پاس دلیل ہے، یعنی آمین کہنے کا منکر تو کوئی نہیں، آمین سب کہہ رہے ہیں، کچھ حضرات زور سے کہہ رہے ہیں اور کچھ حضرات آہستہ کہہ رہے ہیں۔

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے تعوذ زور سے پڑھا اور بعض نے آہستہ پڑھا۔ اس لیے یہ جھگڑے والی بات ہوئی ہی نہیں۔

یہ جھگڑا کیوں پیدا ہوتا ہے؟ جب جہل آجائے تو پھر جھگڑا ہوگا۔ علم ہوتا نہیں ہے، آدمی اپنی بات پر اڑ جاتا ہے اور دوسرے کو غلط کہتا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس بھی حدیث ہے اور اس کے پاس بھی حدیث ہے۔ اللہ تعالیٰ سب

پر رحمتیں نازل فرمائے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جڑنے کی توفیق دے، مسلمانوں کے دلوں کو جوڑ دے اور ٹوٹنے سے بچائے۔ ہمارے بعض بزرگوں کا جملہ ہے کہ دعا کرو اللہ جوڑ پیدا کرے۔ یعنی اللہ دلوں کو جوڑ دے اور آپس میں محبت و پیار پیدا کر دے۔

انڈیا کے ہائی کورٹ میں ایک انگریز جج تھا۔ اس کے پاس آمین کا جھگڑا آگیا کہ بعض نے کہا: تم آمین زور سے کیوں کہتے ہو؟ اور اس پر ایک دوسرے کے سر پھاڑ ڈالے۔ بالآخر مقدمہ ہائی کورٹ جا پہنچا۔ جج نے دونوں کا مقدمہ سن کر فیصلہ لکھا کہ میں ان دونوں مولویوں کو سزا دے رہا ہوں، کیونکہ آہستہ آمین بھی ان کے دین میں ثابت ہے اور زور سے آمین بھی ان کے دین میں ثابت ہے، لیکن شر والی آمین کہیں ثابت نہیں ہے، لہٰذا دونوں کو سزا دو، تاکہ آئندہ جھگڑا نہ کریں۔ اس لیے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں لڑنے اور اختلاف کرنے سے بچائے، کیونکہ اس کا فائدہ دشمن کو ہوگا۔ مسجدیں ویران ہوں گی تو شیطان خوش ہوگا اور کافر خوش ہوگا کہ دیکھو! مسلمان کیسے لڑ رہے ہیں!! اللہ تعالیٰ ہمیں ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو وسعتِ قلب کے ساتھ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آگے فرمایا:

''[مَسْأَلَةٌ] ثُمَّ الِاسْتِعَاذَةُ فِي الصَّلَاةِ إِنَّمَا هِيَ لِلتِّلَاوَةِ وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ وَمُحَمَّدٍ. وَقَالَ أَبُو يُوسُفَ: بَلْ لِلصَّلَاةِ''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: استعاذہ نماز کے اندر تلاوت کے لیے پڑھتے ہیں، امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ نماز کا جز ہے، اس لیے مقتدی بھی تعوذ پڑھے۔ ان دونوں قولوں کے درمیان فرق سمجھیں کہ جب تم نے تلاوت کرنی ہے کہ اکیلے نماز پڑھ رہے ہو تو اس وقت تعوذ پڑھو، لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مقتدی تعوذ نہیں پڑھے گا، بلکہ صرف ثنا پڑھے گا، وہ تلاوت نہیں کر رہا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ نماز کا حصہ ہے، لہٰذا مقتدی جیسے ثنا پڑھتا ہے اسی طرح تعوذ بھی پڑھے گا۔ اس لیے فرمایا: ''وَقَالَ أَبُو يُوسُفَ: بَلْ لِلصَّلَاةِ'' استعاذہ پڑھنا نماز کا حصہ ہے۔ اس قول کے مطابق ماموم (مقتدی) بھی تعوذ پڑھے گا۔ چاہے تلاوت کر رہا ہے یا تلاوت نہیں کر رہا۔ اسی طرح عید کی نماز میں بھی، تکبیرِ تحریمہ کہنے کے بعد بھی اور تکبیراتِ عید سے پہلے بھی تعوذ پڑھے گا۔ جمہور کہتے ہیں کہ تکبیرات کے بعد استعاذہ پڑھے گا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ تعوذ کے لطائف و فضائل بیان کرتے ہیں کہ یہ ہمارے منہ کو پاک کرنے والا ہے۔ رفث

کہتے ہیں جس کے اندر شہوت ہو۔ قرآن میں آتا ہے کہ جب احرام باندھ لو تو رفث نہ ہو، شہوت انگیز باتیں نہ ہوں، حتیٰ کہ اپنی بیوی سے بھی ایسی باتیں نہ کرو جس سے شہوانیت ٹپکے۔ اس لیے جب ہمارے منہ سے لغو اور شہوت انگیز باتیں نکلتی ہیں تو منہ گندا ہو جاتا ہے۔ آدمی جب تعوذ پڑھتا ہے، اللہ کی پناہ میں آتا ہے تو اس کا منہ پاک ہو کر اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اب تلاوتِ قرآن پاک کرے۔ کیونکہ ایک ظاہری پاکی ہے وہ وضو سے حاصل ہو گئی اور ایک باطنی پاکی ہے وہ استعاذہ سے حاصل ہوتی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۵، تَفْسِيْرُ الْإِسْتِعَاذَةِ وَأَحْكَامُهَا]

ایک بزرگ کی عمر ۸۰ سال تھی۔ ایک بڑھیا ان کے پاس مسئلہ پوچھنے کے لیے آئی۔ خادم نے آکر بتایا تو بزرگوں نے فرمایا: اسے اندر آنے دو اور تم لوگ بھی اندر بیٹھو۔ بزرگوں نے جب اس بڑھیا کو مسئلہ بتا کر رخصت کر دیا تو خدام نے پوچھا: حضرت! آپ کی عمر ۸۰ سال ہو گئی اور وہ عورت آپ سے بھی زیادہ بوڑھی تھی۔ کیا آپ کو کوئی خوف تھا کہ ہمیں بیٹھنے کا حکم فرمایا تھا؟ فرمایا: شیطان کسی وقت بھی حرکت دے سکتا ہے اور دل کے اندر برا خیال آ سکتا ہے۔ دشمن کو ایسا موقع دینا ہی نہیں چاہیے۔ ان بزرگوں کے دل کے اندر خوف تھا کہ کہیں شیطان ہمیں گناہ میں مبتلا نہ کر دے۔

اس لیے حدیث شریف کے اندر ہے کہ آدمی ساری عمر نیکیاں کرتا ہے اور جنت کے قریب ہو جاتا ہے، لیکن آخری وقت کوئی ایسا کلمہ منہ سے نکل جاتا ہے کہ جس سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی ساری زندگی شیطانیت اور کفر پر رہتا ہے، لیکن آخری وقت توبہ اور کلمہ نصیب ہو گیا تو وہ جنت میں چلا گیا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۵۹۴، بَابٌ: فِي الْقَدَرِ]

اس لیے آدمی اللہ کی پناہ میں آئے اور عاجزی کا اظہار کرے کہ یا اللہ! میں کمزور ہوں اور دشمن چالاک ہے اور نظر بھی نہیں آتا کہ میں اس کو دفع کر سکوں اور نہ میں اس کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ صرف وہی اس کو دفع کر سکتا ہے، جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔ یا اللہ! یہ تو ایسا دشمن ہے جو نہ تو محبت کی بات سے راضی ہوتا ہے اور نہ ہدیہ لے کر خوش ہوتا ہے۔ دشمن سے معافی مانگو تو وہ راضی ہو جاتا ہے، لیکن یہ راضی نہیں ہوتا۔ یا اللہ! آپ ہی اس کو دفع کر سکتے ہیں۔

اللہ پاک قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا ۝﴾ [الاسراء: ۶۵]

”میرے خاص بندوں پر تیرا ذرا قابو نہ چلے گا اور آپ کا رب کافی کارساز ہے۔“

یعنی شیطان اتنا بڑا لعین ہے کہ یہ اللہ کے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمہم اللہ پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چوکتا۔ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں، ان پر اللہ کی طرف سے پہرہ رہتا ہے۔ ایک دفعہ ایک بچھو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈنگ مارا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بچھو بڑا شیطان ہے، نہ نبی کا خیال کرتا ہے اور نہ ولی کا خیال کرتا ہے۔ اس لیے آدمی کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ فلاں بڑا بچھو ہے، یعنی کسی کا خیال نہیں رکھتا۔

''وَقَدْ نَزَلَتِ الْمَلَائِكَةُ لِمُقَاتَلَةِ الْعَدُوِّ الْبَشَرِيِّ فَمَنْ قَتَلَهُ الْعَدُوُّ الظَّاهِرُ الْبَشَرِيُّ كَانَ شَهِيْدًا''

ظاہری دشمن کے مقابلے میں اللہ نے فرشتوں کو اتارا جنہوں نے آکر کافروں کو مارا۔ انسان اگر کافر کے ہاتھ سے مارا جائے تو شہید ہو جاتا ہے، لیکن جس کو شیطان نے مارا وہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا، وہ فتنوں اور گناہوں میں پڑ گیا، کیونکہ شیطان تو انسان کو دیکھتا ہے، لیکن انسان شیطان کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے ہم بھی اس ذات کی پناہ میں آجائیں جس کو شیطان نہیں دیکھ سکتا۔

استعاذہ کا معنی ہوتا ہے ''اَلْاِلْتِجَاءُ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى'' اللہ کی پناہ پکڑنا کہ اے اللہ! ہمیں ہر شر والے کے شر سے بچا۔ عیاذہ ہوتا ہے شر سے بچنا، اللہ کی پناہ میں آنا۔ اور اس کے مقابلے میں لیاذہ ہوتا ہے۔ اس کا معنی خیر مانگنا۔ جیسے متنبی شاعر نے کہا:

يَا مَنْ أَلُوذُ بِهِ فِيمَا أُؤَمِّلُهُ
وَمَنْ أَعُوذُ بِهِ مِمَّنْ أُحَاذِرُهُ
لَا يَجْبُرُ النَّاسُ عَظْمًا أَنْتَ كَاسِرُهُ
وَلَا يَهِيضُونَ عَظْماً أَنْتَ جَابِرُهُ

''میں اس ذات سے خیر مانگتا ہوں جس کے ساتھ میں امیدیں رکھتا ہوں اور میں اس ذات سے پناہ پکڑتا ہوں جس سے میں ڈرتا ہوں۔ میرے اللہ! جس ہڈی کو تو توڑ ڈالے اسے کون بنائے؟ اور جس کو تو جوڑے اس کو کون توڑ سکتا ہے؟''

تو ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' کا معنی یہ ہے کہ میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں، تاکہ شیطان مجھے دین کے معاملے میں نقصان نہ پہنچائے اور دنیا کے معاملے میں بھی نقصان نہ پہنچائے، یا جس چیز کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے اس سے نہ روک دے۔ اللہ نے مجھے نماز کا حکم دیا ہے، شیطان وسوسہ ڈال کر روک نہ دے۔ یا وہ کام جن کے کرنے سے اللہ نے منع کیا ہے شیطان مجھے اس کے اندر نہ ڈال دے، کیونکہ شیطان کو انسان سے صرف اللہ تعالیٰ

ہی روک سکتے ہیں۔ اس لیے اللہ نے حکم دیا ہے کہ بندوں کے اندر اگر کوئی تیرا دشمن ہے تو صبر کر، وہ برا کرے تو اچھا کر، تا کہ اس کا شر کبھی نہ کبھی رک جائے۔ فرمایا:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ إِنَّهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾﴾ [الاعراف:۱۹۹،۲۰۰]

''(اے پیغمبر!) درگزر کا رویہ اپناؤ، اور (لوگوں کو) نیکی کا حکم دو، اور جاہلوں کی طرف دھیان نہ دو۔ اور اگر کبھی شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی کچوکا لگ جائے تو اللہ کی پناہ مانگ لو۔ یقیناً وہ ہر بات سننے والا، ہر چیز جاننے والا ہے۔''

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾﴾ [المومنون:۹۶]

''آپ ان کی بدی کے بدلے میں ایسا برتاؤ کر دیجیے جو بہت ہی اچھا (اور نرم) ہو۔ ہم خوب جانتے ہیں جو جو کچھ یہ (آپ کی نسبت) کہا کرتے ہیں۔''

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾﴾ [حم السجدة:۳۴]

''اور نیکی بدی برابر نہیں ہوتی (بلکہ ہر ایک کا اثر جدا ہے تو اب) آپ (مع اتباع) نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیجیے، پھر یکا یک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جاوے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے۔''

ان تین آیات کے اندر اللہ نے فرمایا: انسان سے بچنا ہو تو صبر کرو، برائی کا بدلہ اچھائی سے دو، لیکن شیطان کسی اچھائی کو قبول کرتا ہی نہیں۔ اگر شیطان تیرا دشمن ہے تو اللہ کی پناہ پکڑ، کیونکہ شیطان تیرا ایسا دشمن ہے جس پر رشوت بھی اثر نہیں کرتی، تیرا مال بھی اثر نہیں کرتا۔ تو کوئی اچھا کام کرے تو وہ بھی اثر نہیں کرتا، کیونکہ اس کی اصل ہی شریر ہے، اس پر نیکی کیا اثر کرے گی؟ اس لیے اس کے فتنے سے بچنے کا یہی حل ہے کہ انسان فوراً اس کی پناہ میں آ جائے۔ اور اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا، مگر وہ جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔

اہلِ لغت علماء فرماتے ہیں: لفظ شیطان ''شَطَنَ'' سے مشتق ہے جس کا معنی بعد ہے کہ خیر سے دور ہو گیا۔ اس طرح اپنے فسق کی وجہ سے انسان سے بھی دور ہے اور اس کے ہر اچھے کام سے بھی دور ہے۔ اور بعض نے کہا: شیطان ''شَاطَ'' سے مشتق ہے۔ آگ سے پیدا ہوا۔ بعض علماء فرماتے ہیں: دونوں معنی صحیح ہیں۔ عربی کا ایک شعر ہے:

أَيُّمَا شَاطِنٍ عَصَاهُ عَكَاهُ
ثُمَّ يُلْقَى فِي السِّجْنِ وَالْأَغْلَالِ

''کوئی شیطان اگر انکار کرتا تو سلیمان علیہ السلام اس کو زنجیریں ڈال کر قید میں ڈال دیتے تھے۔''

تو معلوم ہوا کہ شیطان ''شَطَنَ'' سے مشتق ہے۔

امام سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محاورات عرب کے اندر بھی جب کوئی برا کام کرے تو ''تَشَيْطَنَ فُلَانٌ'' کہتے ہیں۔ اسی لیے جو بھی سرکش ہو جائے جن ہو یا انسان ہو یا حیوان ہو اس کو بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ شیطان ہے۔ انسان سرکش ہو جائے تو کہتے ہیں کہ یہ تو بڑا شیطان ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ [الانعام: ۱۱۲]

''اور اسی طرح ہم نے ہر (پچھلے) نبی کے لیے کوئی نہ کوئی دشمن پیدا کیا تھا، یعنی انسانوں اور جنات میں سے شیطان قسم کے لوگ۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوذر! انسان کے شیطانوں کے شر سے اور جن کے شیطانوں کے شر سے پناہ پکڑا کرو۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں ہوتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۵، تَفْسِيْرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَاَحْكَامُهَا]

نماز کو خراب کرنے والی تین چیزیں:

اسی طرح مسلم شریف میں بھی ایک حدیث آتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز کو تین چیزیں توڑ ڈالتی ہیں: عورت گزرے تو وہ بھی نماز کو توڑ ڈالتی ہے، گدھا گزرے تو وہ بھی نماز کو توڑ ڈالتا ہے اور سیاہ کتا گزرے تو وہ بھی نماز کو توڑ ڈالتا ہے۔ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! یہ کالے کتے اور سفید کتے میں کیا فرق ہے؟ حالانکہ کتا تو کتا ہوتا ہے۔ سرخ بھی کتا ہے اور کالا بھی کتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرق ہے کہ کالا کتا شیطان ہوتا ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۵۱۰، باب: قَدْرِ مَا يَسْتُرُ الْمُصَلِّيَ]

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ نماز اس لیے ٹوٹتی ہے کہ جب انسان کی توجہ اور دل اللہ سے کسی دوسری چیز میں مبتلا ہو جائے تو نماز ختم ہو گئی۔ نماز یا تو ٹوٹے

کی شرارت کی وجہ سے، گدھا بھی شرارت میں مشہور ہے۔ وہ آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا اور شور کرنے لگے گا تو آپ کی نماز تو ختم ہو گئی۔ کتا اور وہ بھی سیاہ رنگ کا بڑا شیطان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو آوازیں لگانی شروع کر دے یا حملے کا ارادہ کر دے تو آپ کی نماز ٹوٹ گئی۔ اور عورت کے فتنۂ جمال میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے کہ عورت گزری اور یہ اس کو دیکھ رہا ہے تو نماز ختم ہو گئی۔ بہر حال یہ پہلے کے مسائل ہیں، حکم یہ ہے کہ اگر عورت گزر جائے تو نماز کا خشوع ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ ایک حدیث میں موجود ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں آگے سوئی ہوئی ہوتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے۔[1] لہٰذا اوپر والا حکم ابتدائی حکم تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ نماز ختم نہیں ہوتی، بلکہ خشوع اور خضوع ٹوٹ جاتا ہے کہ انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، عورت کا خیال آیا تو توجہ ہٹ گئی اور انسان کا وہ خشوع اور خضوع قائم نہ رہا۔ نماز ہو جاتی ہے، وگرنہ حج کے موقع کتنی عورتیں ہوتی ہیں۔ میں نے کئی دفعہ ان سے بچنے کی کوشش کی ہے، حتیٰ کہ بیت اللہ کے قریب بھی جا کر کھڑا ہوا تب بھی کوئی عورت آ کر آگے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اللہ ہدایت عطا فرمائے۔ جن لوگوں کے ساتھ عورتیں ہوتی ہیں وہ ان کو سمجھائیں کہ جب اذان ہو جائے تو واپس آ جائیں، لوگوں کی نمازیں خراب نہ کریں، ان کے خشوع اور خضوع کو نہ توڑیں اور آگے نماز نہ پڑھیں۔ حالانکہ منتظم تو زور لگاتے ہیں کہ باہر نکلو، لیکن کوئی نہ کوئی اندر رہ جاتی ہے اور بعض عورتیں تو مردوں کے کپڑوں میں ہوتی ہیں، ان کو پہچان ہی نہیں سکتے کہ کون ہیں؟ جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو بعد میں پتا چلتا ہے کہ یہ تو عورت ہے۔

لفظ شیطان کا اشتقاق:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ شیطان ''شَطَنَ'' سے مشتق ہے ''شَاطَ'' سے نہیں، اس پر وہ دلائل بیان کرتے ہیں۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک گھوڑے پر سوار کیا گیا، وہ اچھلنے کودنے لگا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو مارتے کہ یہ آرام کرے، لیکن وہ اور زیادہ ناچنا شروع کر دیتا، حتیٰ کہ آپ اس سے اتر آئے اور فرمایا کہ بڑا شیطان جانور ہے۔ میں اس سے اترا تو میں نے اپنے خیالات کو بدلا ہوا پایا۔ یعنی اس شیطان کا اتنا اثر ہوا کہ میری طبیعت کے خیالات بھی الجھ گئے۔

[تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۳/۸۲۲، مسیر عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ الی الشام]

---

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۵۱۳، باب: التَّطَوُّعِ خَلْفَ الْمَرْأَةِ]

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خچر پر شیطان کا اطلاق کیا۔ اس لیے مفسر رحمہ اللہ استدلال کر رہے ہیں کہ ہر چیز "كُلُّ مَنْ تَمَرَّدَ مِنْ جِنِّيٍّ وَإِنْسِيٍّ وَحَيَوَانٍ شَيْطَانًا." (ہر سرکش چاہے وہ انسان میں سے سرکش ہو یا جنات میں سے کوئی سرکش جن ہو یا حیوانات میں سے کوئی سرکش حیوان ہو تو اس پر بھی شیطان کا اطلاق آتا ہے) کہتے ہیں: بڑا شیطان جانور ہے، یہ انسان نہیں، شیطان ہے۔ اور جن پر تو شیطان کا اطلاق ہے ہی، کیونکہ اصل میں ابلیس جن تھا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۵ تَفْسِيْرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَاَحْكَامُهَا]

"رَجِيْمٌ" کا معنی:

"رَجِيْمٌ" کا معنی ہوتا ہے مردود، چھوڑا ہوا، اللہ کی رحمت سے دھتکارا ہوا۔ اس لیے وہ آدمی جو کھانا چھوڑ دے اس کو انگریزی میں ڈائٹنگ کہتے ہیں اور عربی میں "رَجِيْمٌ" کہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی کھانا چھوڑ دیتا ہے۔

"رَجِيْمٌ" کا وزن "فَعِيْلٌ" ہے، لیکن معنی مفعول کا ہے۔ جیسے کہتے ہیں "قَتِيْلٌ" بمعنی "مَقْتُوْلٌ" تو یہ بھی مفعول کے معنی میں ہے کہ شیطان کو ہر بہتری سے دفع کر دیا گیا ہے۔ جیسے اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾ [الملک: ۵]

"ہم نے آسمانِ دنیا کو چاند ستاروں کے ساتھ زینت دی اور ہم نے ان کو شیطانوں کو دفع کرنے کے لیے بنایا۔"

اور فرمایا:

﴿وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ﴾ [الصّٰفّٰت: ۷]

"اور اللہ نے ان کو حفاظت کا ذریعہ بنایا ہر سرکش شیطان سے۔"

تاکہ نہ سن سکیں ملأ اعلیٰ کی باتیں اور ہر طرف سے ان کو مارا اور دھتکارا جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی بات اچک لے تو اس کے پیچھے بھی شہاب ثاقب لگ جاتا ہے۔ اور فرمایا:

﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ﴾ [الحجر: ۱۶]

"اور ہم نے آسمان میں بہت سے برج بنائے ہیں اور اس کو دیکھنے والوں کے لیے سجاوٹ عطا کی ہے۔"

"بُرُوْجٌ" کہتے قصورِ عالیہ، بڑی بڑی بلڈنگیں۔ جیسے مکہ کے اندر بڑی بڑی بلڈنگ کا نام برج رکھتے ہیں، اسی پر مفسرین فرماتے ہیں کہ آسمان کے اندر بارہ برج ہیں۔ ہم نے ان کو دیکھنے والوں کے لیے زینت بنایا۔ تو "رَجِيْمٌ" کا ایک معنی ہو گیا "مَرْجُوْمٌ" دھتکارا ہوا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ''رَجِیْمٌ'' ''رَاجِمٌ'' کے معنی میں ہے، ''فَعِیْلٌ'' ''فَاعِلٌ'' کے معنی میں ہے۔ ''رَاجِمٌ'' کا معنی ہے لوگوں کو وسوسوں اور مکر کے ساتھ مارنے والا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پہلا قول راجح اور مشہور ہے۔ محاوراتِ عرب میں بھی اس کا عام استعمال ہے۔ ''قَتِیْلٌ'' بمعنی ''مَقْتُوْلٌ'' اور ''جَرِیْحٌ'' بمعنی ''مَجْرُوْحٌ'' ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۶، تَفْسِیْرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَاَحْکَامُهَا]

بسم اللہ قرآن کا جز ہے:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کو بسم اللہ سے شروع کیا۔ اس بات کے اندر تو اتفاق ہے کہ آیت ﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ [النمل: ۳۰] قرآن کا جز ہے، لیکن سورتوں کی ابتداء میں جو بسم اللہ ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: ہر سورت کے ساتھ ایک آیت ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مستقل آیت ہے اور یہ ہر سورت کے درمیان فصل (فاصلہ) کے لیے لکھی جاتی ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سلفاً وخلفاً جو پہلے علماء گزرے ہیں ان کے بہت زیادہ اقوال ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۶، تَفْسِیْرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَاَحْکَامُهَا]

ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ کیوں؟

سنن ابی داؤد کے اندر صحیح سند کے ساتھ ایک صحیح حدیث ہے:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَعْرِفُ فَصْلَ السُّوْرَةِ حَتّٰى تَنَزَّلَ عَلَيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ))

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتے تھے کہ دو سورتوں کے درمیان فصل کرنے کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ (سارا قرآن اللہ کا کلام ہے۔ ایک سورت کو دوسری سورت سے علیحدہ کیسے کیا جائے؟) تو اللہ نے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' نازل کی۔''

[سنن ابی داؤد، حدیث: ۷۸۸، بَابُ مَنْ جَهَرَ بِهَا]

اب ایک سورت ختم ہوگئی تو دوسری سورت کو شروع کرنے سے پہلے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' آگئی۔ تو سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرۃ اور سورۂ آلِ عمران کے درمیان فرق آگیا۔ اس حدیث سے ہمیں معلوم ہوا کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ

الرَّحِیم'' سورتوں کے درمیان فصل کے لیے اتری ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۶، تَفْسِیْرُ الْإِسْتِعَاذَةِ وَأَحْكَامُهَا]

ایک ضعیف روایت:

((عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ الْبَسْمَلَةَ فِي أَوَّلِ الْفَاتِحَةِ فِي الصَّلَاةِ وَعَدَّهَا آيَةً))

''بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے نماز کے دوران سورۂ فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ پڑھی اور آپ ﷺ نے اس کو ایک آیت شمار فرمایا۔ (یعنی یہ بھی ایک آیت ہے)۔''

[السنن الكبرى، حدیث: ۲۳۸۵، بَابُ: الدَّلِيلِ عَلَى أَنَّ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ آيَةٌ...]

یہ روایت ضعیف ہے، کیونکہ اس کے اندر ایک راوی عمر بن ہارون بلخی ضعیف ہے۔

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ بسم اللہ ہر سورت کا حصہ ہے، لیکن سورت براءت کا حصہ نہیں ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن زبیر رضی اللہ عنہما، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اور تابعین میں سے حضرت طاؤس رحمہ اللہ، سعید بن جبیر رحمہ اللہ، مکحول رحمہ اللہ، زہری رحمہ اللہ، عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ بھی ان کے ساتھ ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ کسی اور سورت کی آیت تو نہیں، لیکن فاتحہ کی آیت ہے۔ یہ قول ضعیف ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، ان کے اصحاب اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہ تو یہ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی اور سورت کی آیت ہے، بلکہ یہ مستقل آیت ہے۔ اور یہ آیت مستقلاً اللہ نے اس لیے نازل فرمائی، تاکہ سورتوں کے درمیان میں فصل ہو سکے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۶، تَفْسِیْرُ الْإِسْتِعَاذَةِ وَأَحْكَامُهَا]

نماز میں بسم اللہ کا حکم:

اب رہا یہ مسئلہ کہ بسم اللہ کو نماز میں زور سے پڑھیں یا آہستہ پڑھیں؟ اس کے اندر بھی وہی اختلاف ہے کہ جو اس کو فاتحہ کی آیت سمجھتے ہیں ان کے ہاں اس کو جہر (زور) کے ساتھ پڑھا جائے گا اور جو اس کو فاتحہ کی آیت نہیں سمجھتے وہ اس کو آہستہ پڑھیں گے۔ بہرحال راجح قول یہ ہے اور صحیح احادیث میں بھی یہی ملتا ہے کہ حضور ﷺ بسم اللہ کو زور سے نہیں پڑھتے تھے۔

ایک بات یادرکھیں کہ آہستہ پڑھنے والوں کے پاس بھی دلائل ہیں اور زور سے پڑھنے والوں کے پاس بھی دلائل ہیں۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ اولیٰ اور افضل کیا ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک افضل یہ ہے کہ زور سے پڑھو، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ آہستہ پڑھو۔ وگرنہ پڑھتے تو سب ہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ میں سے حضرت ابن عباس، ابوہریرہ، ابن عمر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم بسم اللہ کو زور سے پڑھتے تھے۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ خلفائے راشدین بھی زور سے پڑھتے تھے، لیکن یہ روایت ضعیف ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی اور بسم اللہ زور سے پڑھی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: میں تمہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز پڑھا رہا ہوں۔

[سنن النسائی، حدیث: ۹۰۵، قراءۃ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام ترمذی رحمہ اللہ اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے تو "بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھتے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کی سند مضبوط نہیں ہے۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۵، باب: مَنْ رَأَى الْجَهْرَ بِ {بِسْمِ اللهِ...}]

صحیح بخاری کے اندر روایت ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کیسی تھی؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ((كَانَ يَمُدُّ مَدًّا)) "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت مد کے ساتھ تھی۔"

[صحیح البخاری، حدیث: ۵۰۴۵، باب: مَدِّ الْقِرَاءَةِ]

یہ پڑھنے کا طریقہ بتارہے ہیں۔ نماز کے بارے میں پوچھا ہی نہیں گیا تھا۔ چونکہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ شافعی تھے، اس لیے سارے تابعین کے نام بتائے کہ فلاں صحابی اور تابعی زور سے پڑھتے تھے۔ اصول یہ ہے کہ جس امام سے پڑھا ہوگا اس کے قول کو ترجیح دیں گے۔ اس لیے ان کے حق میں یہاں پورا صفحہ لکھا ہے۔ بہرحال آگے جا کر انصاف کریں گے اور دوسرے قول کو نقل کریں گے۔

مستدرک حاکم اور ابوداؤد کے اندر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرأت کو روک روک کر پڑھتے تھے۔ مثلاً ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾، ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ②﴾ یعنی علیحدہ علیحدہ پڑھتے تھے۔

مستدرک کے اندر ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں نماز پڑھائی اور بسم اللہ نہ پڑھی۔ وہاں جو مہاجر صحابہ تھے انہوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے بسم اللہ کیوں نہیں پڑھی؟

[المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث:۸۵۱]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ جو احادیث اور آثار بیان کیے ہیں یہ ہمارے مسلک کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

باقی ان احادیث پر معارضہ کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس کے اندر یہ بحث ہے۔ یہ اس کی تفصیل کا مقام نہیں ہے، یہ بحث آگے آئے گی۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ بسم اللہ کو نماز کے اندر زور سے نہ پڑھا جائے۔ خلفائے اربعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ زور سے بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔

اب خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی بات کتنی مضبوط ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں خلفاء رضی اللہ عنہم، عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ، صحابہ کی بہت بڑی تعداد اور تابعین کی جماعت بھی بسم اللہ زور سے نہیں پڑھتے تھے۔ (یہاں پر امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان حضرات کے نام نہیں لیے اور صرف ''وَطَوَائِفَ مِنْ سَلَفِ التَّابِعِيْنَ وَالْخَلَفِ'' کہہ دیا ہے)۔ ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام ثوری رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بسم اللہ پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ نہ زور سے پڑھے، نہ آہستہ پڑھے۔ زندگی میں ایک مرتبہ پڑھ لی تو کافی ہے۔

اسی سے اندازہ لگالیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی بات کبھی بھی نہیں لیتے تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم سے حکم لیا ہے۔ لیکن چونکہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ خود شافعی المسلک ہیں، اس لیے ان کے لیے تو پورا صفحہ نقل کر دیا اور جمہور ائمہ رحمہم اللہ جو خلاف ہیں ان کی آخر میں دو تین سطریں نقل فرمادیں۔ انصاف تو کر دیا کہ بات ذکر فرمادی۔

اگر دیانت داری سے غور کریں تو...... الحمد للہ ثم الحمد للہ!...... امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جس قول کو بھی لیا ہے اگر اس قول کی تحقیق میں لگ جائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صحیح اتباع ان کی تھی کہ انہوں نے سب سے پہلے قرآن پاک کو لیا۔ اگر قرآن میں وہ مسئلہ نہیں ملا تو حدیث پاک کے دروازے پر آئے، اگر وہاں نہیں ملا تو صحابہ کے دروازے پر آئے۔ اور صحابہ میں سے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو اول درجہ دیا۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں مسئلہ نہیں ملا تو عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا، ان میں نہیں ملا تو اصحاب بدر رضی اللہ عنہم کو دیکھا، اصحاب حدیبیہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا پھر عام صحابہ رضی اللہ عنہم

کے اقوال پر نظر ڈالی۔ اتنی باریک بینی سے وہ قول لیتے ہیں، تاکہ حضور ﷺ کی کوئی حدیث مبارک رہ نہ جائے اور آپ کے تمام فرامین پر عمل ہو جائے۔

صحیح مسلم کے اندر ہے کہ جب حضور ﷺ نماز شروع کرتے تو ''اللّٰهُ اَكْبَرُ'' کہہ کر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ پڑھتے تھے۔

ترمذی کے اندر یہ روایت موجود ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی۔ کوئی بسم اللہ زور سے نہیں پڑھتا تھا، بلکہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ سے پڑھا کرتے تھے۔ اور مسلم شریف کے اندر یہ الفاظ بھی ہیں کہ بسم اللہ نہ اوّل میں ہے اور نہ آخر میں ہے۔

[سنن الترمذی، حدیث:۲۴۶، باب: فِي افْتِتَاحِ الْقِرَاءَةِ بِـ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ...، صحیح مسلم، حدیث:۳۹۹]

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے اس مسئلہ میں تمام ائمہ کے ماخذ نقل کر دیے ہیں۔

آخر میں اس بات پر آ گئے اتنی بات تو ٹھیک ہے کہ جو زور سے بسم اللہ پڑھے اس کی نماز بھی ہو جاتی ہے، کوئی آہستہ بھی پڑھ لے تو اس کی نماز خراب نہیں ہوتی۔ شکر ہے کہ اتنا تو ہو گیا کہ نماز ہو جاتی ہے۔

بہر حال! حضور ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عمل سے ثابت ہے کہ وہ زور سے بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ اللہ سب پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۶، ۱۷، تَفْسِيْرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَاَحْكَامُهَا]

بسم اللہ اسمِ اعظم ہے:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کی نسبت سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بڑے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اور فرمایا کہ اللہ کا جو اسمِ اعظم ہے اس کے اندر اتنا قریب ہے جیسے کسی کی آنکھ کے اندر سفیدی اور سیاہی ایک دوسرے کے قریب ہے۔ ایک تو اس کے اندر اسمِ ذات اللہ آ گیا اور ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' صفات آ گئیں۔ [المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث:۲۰۲۷]

اسمِ اعظم میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تحقیق:

امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تحقیق یہی ہے کہ اسمِ اعظم لفظ اللہ ہے۔ اور یہ اسم اصل اور موصوف ہے اور باقی

جتنے اسماء ہیں اسی کی صفتیں آئی ہیں۔ اور آپ قرآن میں جہاں بھی نظر ڈالیں گے تو آپ کو یہی نظر آئے گا۔ جیسے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿٢٢﴾﴾ [الحشر:۲۲]

''وہ اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ چھپی اور کھلی ہر بات کو جاننے والا ہے، وہی ہے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے۔''

اور اسی طرح فرمایا:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾ [الحشر:۲۳]

''وہ اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، جو بادشاہ ہے، تقدس کا مالک ہے، سلامتی دینے والا ہے، امن بخشنے والا ہے، سب کا نگہبان ہے، بڑے اقتدار والا ہے، ہر خرابی کی اصلاح کرنے والا ہے اور بڑائی کا مالک ہے۔ پاک ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔''

سب اللہ کی صفات آرہی ہیں۔ اسی طرح کتابوں میں ہے کہ ایک بہت بڑے اللہ والے گزرے ہیں، ان کی وفات ہوگئی۔ ان کے کسی شاگرد یا معتقد نے انہیں خواب میں دیکھا (سچے لوگوں کے خواب بھی سچے اور پاک ہوتے ہیں) کہ وہ...... ماشاء اللہ...... جنت کے بڑے اعلیٰ کمروں اور اعلیٰ لباس میں ہیں۔ انہوں نے پوچھا: حضرت! کیا معاملہ ہوا؟ انہوں نے فرمایا: میرے اللہ نے مجھے بخش دیا ہے۔

''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کی فضیلت:

تمام علماء اور صوفیاء اسی لفظ اللہ پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ)) [سنن الترمذی، حدیث:۲۶۳۸، باب: ما جاء فِیمَنْ یَمُوتُ ...]

اور اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ: اَللّٰهُ، اَللّٰهُ))

''قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ دنیا میں کوئی اللہ اللہ کہنے والا باقی رہے گا۔''

[صحیح مسلم، حدیث:۱۴۸، باب: ذَهَابِ الْإِيمَانِ آخِرِ الزَّمَانِ]

تو یہ اسم اعظم ہے۔

اسمِ اعظم کا فائدہ:

اور اسمِ اعظم کی یہ شان ہوتی ہے کہ "إِذَا دُعِيَ بِهِ اسْتَجَابَ." "(جب اس کے ساتھ دعا مانگی جائے تو وہ دعا فوراً منظور ہو جاتی ہے) اس لیے آدمی کوشش کرے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس اسم اور لفظ کے ساتھ دعا مانگا کرے۔ لیکن جتنا اخلاص ہوگا اور جتنی دل سے دعا نکلے گی اتنا اثر ہوگا۔

دعا قبول ہونے کی ایک مقبول حالت:

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضرت! میں بڑا پریشان ہوں، مجھ پر ایک مصیبت آگئی ہے۔ آپ میرے لیے دعا کریں۔ انہوں نے فرمایا: عجیب آدمی ہو! تم خود جاؤ اور دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ میں مصیبت والوں کی دعا جلدی سنتا ہوں۔ تو تمہارے ساتھ تو اللہ کا وعدہ ہے، میرے ساتھ تو اللہ کا وعدہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ﴾ [النمل:٦٢]

"بھلا وہ کون ہے کہ جب کوئی بے قرار اسے پکارتا ہے تو وہ اس کی دعا قبول کرتا ہے اور تکلیف دور کر دیتا ہے۔"

اللہ کے سوا کوئی مشکل کو حل کرنے والا نہیں ہے۔ اس لیے پریشانی میں جب بھی آدمی کے دل سے دعا نکلتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرماتے ہیں۔ اور یاد رکھیں! کبھی کبھی اس لیے مصیبت آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ میرا بندہ پریشان ہو اور مجھ سے مانگے، ذرا روئے، تاکہ میں اس کی وجہ سے اس کے درجات بھی بلند کر دوں اور اس کی باقی آرزوئیں بھی پوری کر دوں۔

بسم اللہ سے رزق کی تنگی دور ہوتی ہے:

مجھ سے بھی بعض بزرگ اور دوست پوچھتے ہیں کہ ہمارے رزق میں تنگی اور تکلیف ہے تو وہ بھی یہی آیت پڑھا کریں۔ جتنا اللہ تعالیٰ توفیق دیں کوئی پابندی نہیں ہے۔ جس وقت چاہیں پڑھیں، دن کو پڑھیں، رات کو پڑھیں، چلتے ہوئے پڑھیں، بیٹھے ہوئے پڑھیں، طواف میں پڑھیں، لیکن چھوڑیں نہیں۔ اگر سو دفعہ پڑھنا شروع کر رہے ہوں تو سو دفعہ پڑھنا ہے۔ ان شاء اللہ چند دنوں میں اللہ تعالیٰ انقلاب پیدا کر دیں گے، سب غربت پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ اور اس کو یقینِ کامل کے ساتھ پڑھیں، کیونکہ اسی کے ساتھ اللہ نے قرآن کو کھولا اور شروع کیا ہے،

اسی سے خطوط اور ہر کار خیر کھلتی ہے اور اسی سے خطبہ شروع ہوتا ہے۔تو یہ اللہ کے اسماء ہیں۔اور اللہ نے حکم دیا ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾[الاعراف:۱۸۰]

''اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں،لہٰذا اسے انہی ناموں سے پکارو۔''

میں تمہاری پکار کو سنتا ہوں۔کچھ لوگ حساب وغیرہ کرتے ہیں،لیکن میں حساب وغیرہ کا قائل نہیں ہوں۔یہ مخلفین علماء کی تحقیقات ہیں۔اس کا قرآن وحدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔بس آپ اس کو ہر وقت پڑھیں تو چند دنوں کے اندر اس کے اثرات دیکھیں گے۔اللہ کی رحمت سے اس عمل کے ذریعے بہت جلدی انقلاب آتا ہے،لیکن پڑھنے والا کچھ یقین بھی رکھتا ہو۔اگر اس کے اپنے اندر یقین نہ ہو تو اس کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کا علم لدنی ہوتا ہے:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام نے اپنے بیٹے کو ایک معلم کے پاس چھوڑا اور کہا کہ بچے کو پڑھائیں۔استاذ نے کہا: بسم اللہ پڑھو۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: بسم اللہ کا کیا مطلب ہے؟ استاذ نے کہا: مجھے تو مطلب نہیں آتا۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم اچھے استاذ ہو کہ تمہیں بسم اللہ کا مطلب ہی نہیں آتا تو مجھے کیا پڑھاؤ گے؟ اب اس استاذ کو کیا پتا تھا کہ یہ نبی ہیں۔اور نبیوں کو تو اللہ تعالیٰ خود علم دیتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۷،فَصْلٌ فِیْ فَضْلِهَا (الْبَسْمَلَة)]

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام،حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم دیکھیں کہ زندگی میں کبھی کسی مدرسے میں گئے اور نہ ہی کبھی کسی استاذ کے پاس بیٹھے،لیکن پورے عالم کو اور ان لوگوں کو پڑھا دیا جو امی تھے۔اور ان کو ایسا پڑھایا کہ ان کو پورے عالم کا نظام سمجھا دیا،پوری دنیا کی باریک سے باریک باتیں پڑھا دیں اور سمجھا دیں۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾[الکہف:۶۵]

''ہم نے ان کو اپنی طرف سے علم دیا ہے۔''

تو ان کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟

قرآن کو کمانے اور کھانے کا ذریعہ بنانے کی مذمت:

یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم قرآن کے اندر غور نہ کریں۔یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بعض لوگوں نے قرآن کو تعویذ بنا کر

اپنی روٹی کا سہارا بنا دیا، بعض لوگوں نے مردے پر پڑھ کر روٹی کمانے کا ذریعہ بنالیا اور بعض لوگوں نے قرآن کو چادر کے اندر رکھ کر نیچے سے لوگوں کو گزار کر حفظ وامان کا ذریعہ بنا دیا، لیکن قرآن جو پیغام لے کر آیا تھا اس پر کسی نے عمل نہ کیا، اس کو کسی نے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔

قرآن کی من مانی ترجمانی:

بعض لوگوں نے اگر کوشش بھی کی تو اردو کے تراجم سے اور سطحی علوم سے علم حاصل کیا، وارثانِ علم سے علم کو حاصل نہ کیا۔ یہ بھی بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ وگرنہ دیکھیں! کوئی آدمی کسی کو انجینئر نہیں مانتا، ڈاکٹر نہیں مانتا۔ ہر انگریزی جاننے والا ڈاکٹر، انجینئر یا کمپیوٹر کا ماہر نہیں بن جاتا۔ اسی طرح دیگر علوم مثلاً طبعیات اور بینکنگ کا ماہر نہیں بن جاتا، بلکہ ان کے علیحدہ علیحدہ شعبے ہیں۔ تو ہر عربی جاننے والا یا اردو جاننے والا قرآن کا ماہر کیسے بن سکتا ہے؟ اس لیے یہ غلط فہمی ہے کہ دنیاوی علوم کے لیے تو استاذ کی ضرورت سمجھیں اور قرآن کے لیے صرف اردو پڑھیں اور جو مرضی آئے ترجمہ کرتے پھریں اور اپنی مرضی کے مسائل نکالتے پھریں اور اپنی اپنی تعبیرات کرتے پھریں اور جدھر مرضی آئے موڑتے رہو اور جو فائدہ پہنچائے اس کی طرف ترجمہ کرلو۔ یاد رکھو! قرآن اس وقت سمجھ آئے گا جب وارثانِ علم کے دروازے پر جا کر قرآن سمجھا جائے۔

تتمہ قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

اس روایت کے اندر اس واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن ایک اور روایت کے اندر تفصیل ہے۔ اگرچہ یہ اسرائیلی روایت ہے۔

اس لیے دیکھیں! پہلے دن استاذ نے کہا: بسم اللہ پڑھو۔ تو انہوں نے پوچھا: بسم اللہ کیا ہوتی ہے؟ استاذ نے کہا: تم بسم اللہ کا معنی جانتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں میں تو جانتا ہوں۔ تو استاذ نے کہا: تم مجھے بتلاؤ۔ انہوں نے فرمایا: تم میری جگہ پر آؤ، میں تمہاری جگہ پر آتا ہوں۔ استاذ تم بنے بیٹھے ہو تو میں کیوں سمجھاؤں؟ نبی کسی کے پیچھے تھوڑا بیٹھتا ہے؟ نبی تو امام ہوتا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۷، فصل فی فضلھا (البسملۃ)]

ابوجہل کی اونٹنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ:

ایک واقعہ ہے۔ اگرچہ روایت ضعیف ہے، لیکن کوئی عقیدے کی بات نہیں ہے کہ جس میں آدمی درایت اور

صحت کی کوشش کرے۔

حضور ﷺ بچپن میں ایک راستے سے آ رہے تھے تو گم ہو گئے۔ ابو جہل نے دیکھا کہ حضور ﷺ جنگل میں اکیلے ہیں تو اس نے اپنی اونٹنی کو بٹھا دیا اور کہا: "تَعَالَ یَا مُحَمَّدُ!" آئیں میں آپ کو گھر پہنچا دوں۔ ابو جہل کہتا ہے کہ میں نے محمد (ﷺ) کو پیچھے بٹھایا تو میری اونٹنی چلے ہی نا۔ میں حیران ہو گیا کہ میری اونٹنی اتنی قیمتی ہے اور چلے نہیں۔ (اس زمانے میں اس اونٹنی کی نکیل سونے کی تھی اور اس کا ہار بھی۔ جب ابو جہل بدر میں قتل ہوا تو وہی اونٹنی حضور ﷺ کو ملی اور حضور ﷺ نے اس اونٹنی کو حجۃ الوداع پر ذبح کیا۔ اس وقت بھی ابو جہل کے وارثوں نے بڑی کوشش کی کہ حضور ﷺ اس اونٹنی کے بدلے سو اونٹنیاں لے لیں، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں یہ اب ذبح ہو گی۔) میں نے سوچا تو کچھ سمجھ نہ آیا۔ اگر اس کو ماروں گا تو دوڑ پڑے گی اور بچہ گر پڑے گا۔ تو میں نے بچے کو آگے بٹھایا تو اونٹنی چل پڑی۔ اللہ کے نبی ﷺ پیچھے آنے کے لیے تو آتے ہی نہیں، وہ تو ہمیشہ آگے اور امام ہوتے ہیں۔ اور میرے مدنی ﷺ تو امام الانبیاء ہیں۔ اللہ کے کروڑوں صلوۃ و سلام ہوں میرے مدنی محمد ﷺ پر۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا تتمہ:

بہرحال حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بسم اللہ کا مطلب بتایا: "اَلْبَاءُ بَهَاءُ اللّٰهِ" "ب" سے مراد اللہ تعالیٰ کا "بہا" یعنی بلندی ہے، "وَالسِّینُ سَنَاؤُهُ" "س" سے اللہ کی سمو اور بلندی کی طرف اشارہ ہے، "وَالْمِیمُ مَمْلَکَتُهُ" "م" سے مراد اس کی مملکت یعنی بادشاہی ہے، "اللہ" سے اشارہ ہے کہ وہی الٰہ ہے اور کوئی الٰہ نہیں ہے، "رحمٰن" کہتے ہیں دنیا اور آخرت میں رحم کرنے والے کو اور "رحیم" کہتے ہیں۔ آخرت میں کرم و رحم کرنے والے کو۔

یہ پرانی روایت ہے۔ اب بھی بعض لوگوں نے قرآن کی تفسیر کے اندر ایسے ایسے رموز اور نکات نکالے ہیں، لیکن ہماری شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ہماری تفسیر وہی ہے جس کو محمد مصطفیٰ ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۷، فَصْلٌ فِیْ فَضْلِهَا (الْبَسْمَلَةِ)]

حروف مقطعات کی تفسیریں:

لوگ جب نئی بات سنتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اصل اصول سوچو کہ قرآن میرے اللہ کا ہے اور حضور ﷺ پر اتارا گیا ہے، حضور ﷺ کے بغیر ہم قرآن سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور جو چیزیں ہمیں حضور ﷺ نے

سمجھائی ہیں انہیں پر ہمارا عمل ہے، ورنہ بڑے بڑے لوگوں نے لکھا ہے۔ مثلاً ''الٓمٓ'' میں ''الف'' سے مراد اللہ ہے، ''لام'' سے مراد جبرائیل ہے اور ''میم'' سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اسی طرح ''حٰمٓ'' میں ''حاء'' سے حنان کی طرف اشارہ ہے، ''میم'' سے اللہ کے اسم منان کی طرف اشارہ ہے۔ بعض لوگوں نے یہ تفسیریں کی ہیں، لیکن ایسی تفسیروں کی اور تعیین کی کیا ضرورت ہے؟ جب میرے مدنی پاک ﷺ نے ایسے نہیں کیا تو ہم کرنے والے کون ہیں؟ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملنگوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے بھی ایک تفسیر گھڑی کہ ''کٓھٰیٰعٓصٓ'' میں ''کاف'' سے مراد کربلا، ''ہاء'' اور ''یاء'' سے ہلاکتِ یزید مراد ہے، ''عین'' سے عطشِ حسین اور ''صاد'' سے صبرِ حسین مراد ہے۔ اسی طرح سے ہم نے ان کو موقع دیا ہے۔ اگر ہم قرآن کے اندر ایسے جوڑ لگا سکتے ہیں تو دشمن کو بھی موقع ملتا ہے وہ ایسے جوڑ کیوں نہ لگائے؟ اگر آپ (اہلِ بدعت) اذان سے پہلے اور اذان کے بعد ڈیڑھ گھنٹے کا صلوۃ وسلام پڑھ سکتے ہیں تو کیا ان کو حق نہیں ہے کہ وہ اذان کے اندر ایک ٹکڑا لگالیں۔ اس طرح تو دین کا سارا مزاق بن جائے گا، بچوں کا کھیل بن جائے گا۔ جس کی مرضی آئے گی قرآن سے کھیلتا رہے گا، قرآن کو توڑتا رہے گا اور قرآن کے اندر اپنی من مانیاں اور تعبیرات کرتا رہے گا۔ اللہ سے دعا کریں کہ اللہ سب کو ہدایت دے۔ اس لیے کبھی قرآن سے تجاوز نہ کریں۔ قرآن خود وضاحت کرے گا یا زبانِ مصطفیٰ بیان کرے گی یا صحابہ بیان فرمائیں گے۔ اللہ نے میرے مدنی ﷺ کو بھیجا ہی اس لیے ہے۔ فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ﴾ [آل عمران: ۱۶۴]

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں پاک صاف بنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔''

میرا مدنی! لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنا دو اور کتاب وحکمت کی تعلیم بھی دے دو۔ پھر...... نعوذ باللہ!...... یہ مطلب ہوگا کہ حضور ﷺ ہم سے تعلیم چھپا گئے، کچھ مسئلے رکھ گئے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ اسلامی ممالک میں قرآن پاک نافذ فرمائے، سنتِ رسول نافذ فرمائے اور ان پر اسی طرح عمل کرنے کی توفیق دے جیسے اصحابِ رسول اللہ ﷺ اور ائمہ محدثین ؒ اور ائمہ فقہاء ؒ نے عمل کیا۔ آج بھی اللہ کے قرآن کے مقابلے میں ہماری عقل اور آراء کوئی قیمت نہیں رکھتیں۔

نحوی ترکیب:

اب ایک اور مسئلہ کہ باء حرف جر ہے۔ یہ کس کے متعلق ہے؟ بعض حضرات نے کہا کہ یہ جملہ اسمیہ ہے اور شروع میں مبتداء محذوف ہے اور وہ ہے: "اِبْتِدَائِیْ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ " بعض نے کہا: جملہ فعلیہ ہے اور فعل مقدر ہے: "اَبْدَءُ"، "اَشْرَعُ" یا "اَقْرَءُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ "۔ علماءِ نحو کے نزدیک یہ دو طرح کی تراکیب ہیں اور یہ دونوں صحیح ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۸، فَصْلٌ فِیْ فَضْلِھَا (اَلْبَسْمَلَۃِ)]

ہر کام "بِسْمِ اللّٰهِ" سے شروع کریں:

جو کام بھی کرو کھڑا ہونا، بیٹھنا، کھانا، پینا، وضو کرنا اور نماز پڑھنا، ہر کام سے پہلے اللہ کا نام لیں، کیونکہ اللہ کے نام سے برکت بھی ہوگی، مدد بھی ہوگی اور اللہ کے نام سے وہ عمل قبول بھی ہوگا۔

اس لیے حدیث مبارک میں آتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور سب سے پہلے جو پیغام لے کر آئے وہ "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ " تھا۔ حضور ﷺ نے اس کو پڑھا، پھر جبرائیل علیہ السلام نے پڑھایا "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ " حضور ﷺ نے اس کو پڑھا۔ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا: اب اللہ کا نام لے کر ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱﴾ [العلق:۱] پڑھیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۴، اَلْکَلَامُ عَلٰی مَا یَتَعَلَّقُ بِھٰذَا الْخَبِیْثِ]

لہٰذا پڑھیں تو اللہ کے نام سے، بیٹھیں تو اللہ کے نام سے اور اٹھیں تو اللہ کے نام سے۔ ہر کام کی ابتداء بسم اللہ سے کریں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۹۱﴾ [آل عمران:۱۹۰]

جو میرے مومن بندے ہیں ان کی صفت یہ ہے کہ کھڑے ہیں میرا ذکر ہے، بیٹھے ہیں تو میرا ذکر ہے، لیٹے ہیں تو میرا ذکر ہے اور اگر آسمانوں پر نظر پڑے تو میرا ذکر ہے، زمینوں پر نظر پڑے تو میرا ذکر ہے: یا اللہ! تو نے کیسا آسمان بنایا! کیسی زمینیں بنائیں! سبحان تیری قدرت ہے!! اور یہ سارا کارخانہ قدرت تو نے بے فائدہ تو نہیں بنایا ہے، لازماً اس کا حساب و کتاب ہوگا، جزاء و سزا ہوگی۔ میرے اللہ! اپنی رحمت کے ساتھ ہمیں اپنی جہنم سے بچالے۔

مومن بندے کی صفت بھی یہی ہے کہ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ وضو ہے تب بھی، وضو نہیں ہے تب بھی، گھر کو جا رہا ہے تب بھی، گھر سے آ رہا ہے تب بھی ذکر کرتے ہوئے آئے جائے۔ اگر بیٹھا ہوا ہے تب بھی غور کر رہا ہے کہ میرے اللہ نے اتنا بڑا کارخانہ بنا دیا ہے۔ شمس و قمر ہیں، زمینیں ہیں اور مخلوقات ہیں ان کو بے فائدہ تو نہیں بنایا۔ بہر حال ان کے اندر اس کی ضرور کوئی حکمتیں ہیں۔ لازمی بات ہے کہ اس کے اندر کوئی جزا و سزا ہو، کوئی فیصلے کا دن ہو۔

اسم سے مراد مسمیٰ ہے یا غیر مسمیٰ:

اسم سے مراد مسمیٰ ہے، ذات کا نام ہے یا غیر مسمیٰ مراد ہے؟ اس میں تین اقوال ہیں:

1 ...... پہلا قول یہ ہے کہ اسم سے مراد مسمیٰ ہے۔ یہ ابوعبیدہ رحمہ اللہ اور سیبویہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔

2 ...... دوسرا قول یہ ہے کہ اسم غیر مسمیٰ ہے اور نفس تسمیہ ہے۔

3 ...... تیسرا قول جو راجح ہے وہ یہ کہ اسم مسمیٰ بھی نہیں اور تسمیہ بھی نہیں ہے۔

اگر اسم سے مراد لفظ ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں، جو ہماری صوت (آواز) سے نکل رہا ہے تو واضح بات یہ ہے کہ یہ غیر مسمیٰ ہے۔ اگر اسم سے مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہے تو بات ہی واضح ہے۔ لہٰذا اشکالات، الجھنوں اور باریکیوں میں ہمیں پڑنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ورنہ اس پر فرقِ ضالہ نے بڑی بڑی بحثیں کی ہیں اور لوگوں کو انہیں تحقیقات میں الجھا دیا ہے۔ اس لیے انسان فرق ضالہ سے احتراز کرے اور جس پر قرآن و سنت کی تحقیق ہے اس پر اپنے آپ کو قائم و دائم رکھے۔

فرقِ ضالہ نے اس پر بڑے بڑے دلائل دیے کہ کبھی کبھی اسم ہوتا ہے، لیکن چیز نہیں ہوتی۔ جیسے معدوم اسم تو ہے، لیکن کوئی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح کبھی ایک چیز کے کئی نام ہوتے ہیں، کبھی نام ایک ہوتا ہے، لیکن جن چیزوں کا نام ہے وہ بہت ہیں۔ جیسے ''نار'' اگر یہ عین مسمیٰ ہے تو جب ہم نام لیں تو ہماری زبان جل جائے۔ اسی طرح برف کا نام لیں تو زبان ٹھنڈی ہو جائے کہ اسم کا نام لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسم اور ہے اور مسمیٰ اس کا غیر ہے۔ جیسے قرآن پاک کے اندر اللہ پاک نے فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ [الاعراف:۱۸۰]

''اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، لہٰذا اسے انہی ناموں سے پکارو۔''

اور حدیث پاک میں آیا ہے:

((إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اِسْمًا)) [صحیح البخاری، حدیث: ۷۳۹۲، باب: إِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ اسْمٍ إِلَّا وَاحِدًا]

''اللہ کے ننانوے نام ہیں۔''

اب اللہ کی ذات ایک ہے، لیکن اسماء متعدد ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ①﴾ [العلق: ۱]

''پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ پیدا کیا۔''

یہاں اسم کی اضافت رب کی طرف ہے۔ اضافت مغایرت چاہتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ یعنی ''فَادْعُوْهُ بِاَسْمَائِهٖ'' اس سے معلوم ہوا کہ اسم اور مسمّٰی کے درمیان مغایرت ہوتی ہے۔ اور بعض نے کہا کہ اسم عینِ مسمّٰی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ⑦⑧﴾ [الرحمٰن: ۷۸]

''بڑا بابرکت نام ہے تمہارے پروردگار کا جو عظمت والا بھی ہے، کرم والا بھی۔''

اللہ کی ذات مبارک ہے اور اسم کی تعظیم کے لیے اس تبارک کو استعمال کیا گیا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اگر کسی کی بیوی کا نام زینب ہو اور اس نے کہا کہ زینب کو طلاق ہے تو اس کو طلاق ہو جائے گی۔ اگر زینب ایک چیز ہے اور نام دوسری چیز ہے اور اصل مسمّٰی غیر ہے تو پھر طلاق نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے نتیجہ یہ ہوا کہ اسم اور مسمّٰی ایک چیز ہوتی ہے۔ مفسر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ ذات جو اس اسم کے ساتھ مسمّٰی ہے اس کو طلاق ہو گئی۔ بعض نے کہا: اسم تسمیہ کی مدد کے لیے آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی اسم کا غیر ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مختار یہ ہے کہ اسم مسمّٰی کا بھی غیر ہے اور تسمیہ کا بھی غیر ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۸، فَصْلٌ فِيْ فَضْلِهَا (الْبَسْمَلَةِ)]

اللہ کا ذاتی نام:

اللہ اسمِ جلالہ اور اللہ کا نام ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ لفظ اللہ اسمِ اعظم ہے، کیونکہ قرآن میں اللہ کے جتنے نام آئے ہیں وہ صفات ہیں اور لفظ اللہ موصوف ہے۔ معلوم ہوا کہ اسمِ اعظم لفظ اللہ ہے۔ جیسے قرآن پاک میں آتا ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ②②﴾ [الحشر: ۲۲]

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؀﴾[الحشر:۲۳]

﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؀﴾[الحشر:۲۴]

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾[الاسراء:۱۱۰]

''اللہ کو لفظ اللہ سے پکارو یا لفظ رحمٰن سے پکارو، اللہ کے سب نام اچھے اچھے ہیں۔''

اللہ کے ناموں کی تعداد:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ ایک کم ایک سو، جو انہیں یاد کرلے جنتی ہے۔ (یاد کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ یاد کرلے گا تو جنتی ہوگا، بلکہ یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو یاد کر کے ان کے مقتضاء پر عمل کرے۔ پھر جنت ملے گی)۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۳۹۲، باب: إِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ اسْمٍ إِلَّا وَاحِدًا]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض روایات میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے سے کم اور بعض میں زیادہ منقول ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پانچ ہزار نام ہیں۔ ایک ہزار تو قرآن شریف اور صحیح حدیث میں ہیں اور ایک ہزار توراۃ میں اور ایک ہزار انجیل میں اور ایک ہزار زبور میں اور ایک ہزار لوحِ محفوظ میں ہیں۔ بہرحال صحیح احادیث میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۹، فَصْلٌ فِيْ فَضْلِهَا (الْبَسْمَلَةِ)]

کسی کو قاضی الحاجات کہنا:

بعض اسماء صفاتی ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ لحاظ ہونا چاہیے۔ جیسے ''قَاضِي الْحَاجَاتِ'' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، لیکن ہمارے لوگ جہالت اور اندھی تقلید کی وجہ سے کہتے ہیں کہ ہمارے حضرت قَاضِي الْحَاجَاتِ ہیں۔...... نعوذ باللہ!...... وہ صفت جس کا اللہ پر اطلاق ہو اس کا کسی بندے کے لیے استعمال کرنا، پیر اور پیغمبر پر استعمال اور اللہ کے کسی فرشتے پر استعمال کرنا اس سے شرک کا شائبہ ہوتا ہے۔

کسی کو مشکل کشا کہنا:

مثلاً مشکل کشا، یہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ بھی اللہ کی صفت ہے، کیونکہ جب کسی کو کوئی مشکل پیش آئے تو اللہ کے سوا کوئی اس کو حل نہیں کرسکتا۔ قرآن میں ہے:

﴿وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ﴾ [الانعام:۱۷]

''اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو خود اس کے سوا اسے دور کرنے والا کوئی نہیں۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ [التغابن:۱۱]

''کوئی مصیبت اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی۔''

اور اسی طرح ایک اور جگہ پر فرمایا:

﴿قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا﴾ [التوبۃ:۵۱]

''ہمیں ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچتی جب تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نہ لکھے۔''

اور کبھی کوئی مصیبت نہیں کھلتی جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ نہ کھولے۔ اب ہم کسی کو مشکل کشا مانیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ صفت جو اللہ کی تھی وہ غیر کے لیے ثابت کر رہے ہیں۔ اور یہی چیزیں انسانوں کو شرک تک لے جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو محفوظ فرمائے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صحیح لکھنے کی توفیق دے، وگرنہ لوگ وہ کتاب لے آتے ہیں کہ فلاں عالم نے اپنے استاذ کو یوں لکھا تھا۔ بھائی! وہ تو عالم تھے، انہوں نے تو بطور مجاز کہہ دیا ہوگا۔ جیسے آدمی کہتا ہے کہ یہ دوا اتنی اچھی تھی کہ میں کھاتا گیا اور میری بیماری چلی گئی۔ اب وہ مجازاً کہہ رہا ہے، ورنہ بیماری ہمیشہ اللہ کے حکم سے جاتی ہے، لیکن جب ہم ان لفظوں کو عام کریں گے اور عامۃ الناس میں آئیں گے تو پھر شرک ہی پھیلے گا۔ بہرحال وہ کہیں گے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مشکل کشا ہیں، حاجت روا ہیں۔ تو انہوں نے کہا: جب حضرت علی رضی اللہ عنہ مشکل کشا ہیں، حاجت روا ہیں پھر تو اللہ کے ولی بھی حاجت روا ہیں، مشکل کشا اور قاضی الحاجات ہیں، بلکہ بعض بزرگوں کے لقب ''قَاضِي الْحَاجَاتِ'' لکھے گئے۔ اللہ تعالیٰ اس سے مسلمانوں کو محفوظ فرمائے اور اللہ پاک ہدایت عطا فرمائیں۔

شرک کے وہم کی چیزوں سے بھی بچو:

پاکپتن شریف میں بہت بڑے اللہ والے ہیں۔ اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ اللہ تعالیٰ تمام اولیاء کی قبروں کو نور سے بھر دے، ان کی قبروں پر رحمتوں کی بارش برسادے۔ لیکن جو بعد میں لوگ آتے ہیں ان میں مصیبت ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: اللہ، پھر آگے ہے محمد ﷺ، پھر آگے ہیں چار یار، یہ ایک پلڑا ہو گیا۔ اور اگلے پلڑے میں ہیں بابا فرید۔ اب جاہل آدمی جب دیکھے گا تو کیا سمجھے گا؟ لکھنے والوں کی اگرچہ نیت اچھی ہو۔ انہوں نے شاید یہ تاثر دیا ہو کہ ہم اللہ کو بھی مانتے ہیں، حضور ﷺ کو بھی مانتے ہیں، چار یاروں کو بھی مانتے ہیں اور بطورِ مرشد بابا فرید گنج شکر کو بھی مانتے ہیں۔ لیکن جب عام جاہل پڑھتا ہے تو سوچتا ہے کہ ایک طرف تو سارے آگئے اور ایک طرف اکیلا بزرگ کھڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کے برابر اس کا وزن ہے۔ اس لیے جاہل آدمی شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جہاں پر ایسی چیزوں کا وہم پڑتا ہو آدمی کو چاہیے کہ اس سے بچے۔

ایک حدیث سے بہترین دلیل:

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ہمیں ''یا محمد'' نہیں لکھنے دیتے۔ بھائی! آپ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ'' لکھیں مجال ہے کہ کوئی آپ کو منع کرے، آپ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ'' لکھیں مجال ہے کہ آپ کو کوئی منع کرے۔ یہ (سعودی عرب والے) سخت موحد ہیں کہ اللہ لکھا ہے اور محمد لکھا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا: ''مَا شَاءَ اللہُ وَشِئْتَ'' (جو اللہ چاہیں اور آپ چاہیں) تو حضور ﷺ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا:

((أَجَعَلْتَنِيْ لِلّٰہِ عَدْلًا؟ قُلْ: مَا شَاءَ اللہُ وَحْدَہٗ)) [السنن الکبریٰ للنسائی، حدیث:۱۰۷۵۹]

''تم نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا؟ یوں کہو جو اللہ تنہا چاہے۔''

میرا چاہنا تو اللہ کے تابع ہے۔ اتنی بات پر حضور ﷺ صحابی کو روک رہے ہیں۔ صحابی سے کوئی شرک کا ڈر نہیں تھا۔ صرف اس لیے منع کیا کہ میرے بعد آنے والی امت شرک میں مبتلا نہ ہو جائے۔

ضروری اصلاح:

اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ یا حرفِ ندا ہے۔ اس کے ساتھ پکارا جاتا ہے۔ جب تم لکھو گے ''یَا اَللہُ!'' اور

دوسری طرف "یا محمدﷺ!" تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس طرح اللہ کو پکارنا جائز ہے اسی طرح حضور ﷺ کو پکارنا جائز ہے۔ تو شرک کی طرف آ گئے۔ پھر آگے بڑھے "یَا غَوْثِ اَعْظَمْ" شیعہ کہیں گے "یَا عَلِیُّ" اور لوگ آئیں گے: یا پیر یا دستگیر اب بات چلی گئی۔ اور انسان عقیدہ حقہ کی پٹڑی سے اترتا چلا گیا۔ جب ٹرین پٹڑی سے اتر جائے تو تباہی ہی تباہی ہے۔

لوگ کہتے ہیں: وہابی ہے اس لیے "یا محمد" دیکھ کر جل گیا ہے۔ اگر وہ جلتا ہے تو وہابیوں کی اذان اور نماز میں "أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ "أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" سے تو بغض نہیں، مگر تیرے شرک سے بغض ہے، تیری کفر والی عادات سے بغض ہے۔ انہی سے بچانا چاہتے ہیں۔ جو تیرے خیر خواہ ہیں تو نے انہی کو اپنا دشمن بنایا ہوا ہے۔ اللہ ہمیں صحیح عقیدوں کی سمجھ عطا فرمائے۔

بسم اللہ صرف دو پیغمبروں پر اتری:

مفسر رحمہ اللہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے فضائل میں جو احادیث مبارکہ ہیں وہ ذکر فرما رہے ہیں۔ ابن مردویہ نے ابن بریدہ سے، انہوں نے اپنے والد حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" مجھ پر اتری ہے۔ مجھ سے پہلے کسی اور پیغمبر پر نہیں اتری ماسوائے حضرت سلیمان علیہ السلام کے۔

یعنی یہ آیت حضرت سلیمان علیہ السلام پر اتری یا یہ آیت اللہ نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ کیونکہ سورۃ النمل کے اندر موجود ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو خط لکھا تھا تو اس میں ابتداء "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے کی تھی۔ فرمایا:

﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٣٠﴾﴾ [النمل: ٣٠]

"وہ سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے اور اس میں یہ (مضمون) ہے (اول) "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"۔"

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۷، فَصْلٌ فِيْ فَضْلِهَا (الْبَسْمَلَةُ)]

خط لکھنے کا مسنون طریقہ:

اسی سے علماء نے ایک مسئلہ نکالا ہے۔ اور اس کے اندر غفلت بھی ہوتی ہے۔ جب بھی آدمی خط لکھے تو پہلے اپنا نام

لکھے اور اس کے ساتھ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے ابتداء کرے۔ لیکن ہمارے ہاں رواج یہ ہے کہ اوپر اس کا نام لکھتے ہیں جس کی طرف خط بھیجتے ہیں اور اپنا نام آخر میں جا کر لکھتے ہیں۔ یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ اپنا نام پہلے ہو اور ابتداء بسم اللہ سے ہو اور آخر میں والسلام کہہ دیا جائے۔ آج کل جو رواج ہے کہ لوگ پیڈ چھپوا لیتے ہیں، اس سے بھی کام چل جاتا ہے، کیونکہ اوپر آدمی کا اپنا نام موجود ہوتا ہے۔ یہ بھی سنت کے مطابق طریقہ ہو جاتا ہے۔

بسم اللہ کے اترنے کی عظمت:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ نے یہ آیت اتاری تو بادل مشرق کی طرف سے ہٹ گئے، یعنی مطلع صاف ہو گیا اور ہوائیں تھم گئیں، دریاؤں کی روانی رک گئی، جانوروں نے بھی اپنے کان جھکا لیے بات سننے کے لیے اور آسمانوں سے شیاطین کو رجم کیا گیا، مارا گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۷، فصل فِيْ فَضْلِهَا (البَسْمَلَة)]

بسم اللہ کی برکت:

اور اللہ تعالیٰ نے حلف اٹھایا کہ مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم ہے کہ کسی چیز میں بھی میرا یہ نام لیا جائے گا تو میں اس میں برکت ڈال دوں گا۔ اسی لیے حکم ہے کہ ہر کام کی ابتداء "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے کریں۔ وضو کر رہے ہیں، کھانا کھا رہے ہیں، پانی پی رہے ہیں، حتیٰ کہ اگر میاں بیوی مل رہے ہیں تو اپنے کپڑے اتارنے سے پہلے "بِاسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا" پڑھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو یہ پڑھ لیں گے اگر اللہ نے ان کے مقدر میں اولاد لکھی ہے تو وہ اولاد صالح ہوگی، نافرمان نہیں ہوگی۔ اور جس بات کی اللہ قسم کھا لیں اس پر مسلمان کا ایمان ہونا چاہیے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۱۴۱، بَابُ التَّسْمِيَةِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ وَعِنْدَ الوِقَاعِ]

جہنم سے حفاظت کا عمل:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جہنم کے ۱۹ داروغوں سے جو بچنا چاہے وہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھا کرے، کیونکہ اس کے حروف بھی ۱۹ ہیں اور جو فرشتے جہنم پر متعین ہیں ان کی تعداد بھی ۱۹ ہے۔ ہر حرف ہر فرشتے سے بچاؤ بن جائے گا۔ جب آدمی اس کی پکڑ سے بچ گیا تو معنی یہ ہوا کہ جہنم سے بچ گیا۔ اسے ابن

عطیہ رحمہ اللہ اور قرطبی رحمہ اللہ نے بھی بیان کیا ہے۔

ابن عطیہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کو کہ جہنم پر جو فرشتے مقرر ہیں ان فرشتوں کی تعداد بھی ۱۹ ہے، اسی طرح بسم اللہ میں بھی ۱۹ حروف ہیں۔ یہ انہوں نے اس مناسبت سے کہا کہ حضور ﷺ کی ایک حدیث موجود ہے کہ ایک دفعہ جب "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کے جواب میں ایک صحابی نے "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ" پڑھا تھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے ۳۰ سے اوپر فرشتوں کو دیکھا کہ وہ جلدی کر رہے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں یہ کلمات لے کر اللہ کی خدمت میں جاؤں۔[1] چونکہ اس میں بھی ۳۰ سے اوپر حروف بنتے ہیں اور اتنے ہی فرشتے اترے۔ اس لیے اس حدیث مبارکہ سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول مبارک کی تقویت ہوتی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۸،۱۷ فَصْلٌ فِیْ فَضْلِهَا (الْبَسْمَلَةِ)]

ویسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں اور بڑے فقہاء صحابہ میں سے ہیں۔ اور صحابہ کی یہ شان ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں کہتے جب تک کہ انہیں حضور ﷺ کے کسی فرمان مبارک سے تائید نہ ملے۔ اگر وہ کبھی مسائل کے اندر اجتہاد بھی کرتے ہیں تو وہ بھی قرآن وسنت کی روشنی میں ہوتا ہے۔

شیطان کو تکبر کرنے کا موقع نہ دو:

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ایک حدیث مبارک نقل کی ہے حضرت ابو تمامہ کہتے کہ ایک صحابی حضور ﷺ کے ساتھ سواری پر بیٹھے تھے، اونٹنی کو جھٹکا لگا، حضور ﷺ گرنے لگے، صحابی نے کہا: اللہ شیطان کو ہلاک کرے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم یوں نہ کہو۔ اس سے شیطان بڑا اپھنتا ہے کہ میں اپنی قوت سے ان کو گرا رہا تھا۔ جب ایسا موقع آجائے تو بسم اللہ یعنی اللہ کا نام لیا کرو۔ جب تم اللہ کا نام لیتے ہو تو وہ ایسے ہو جاتا جیسے مکھی ہو۔ [مسند احمد، حدیث: ۲۰۵۹۲، سنن ابی داؤد، حدیث: ۴۹۸۲]

وہ کہتا ہے باوجود اس کے کہ ان کو تکلیف پہنچی ہے، پھر بھی وہ میری طرف سے نہیں سمجھتے، بلکہ اللہ کی طرف سے سمجھتے ہیں کہ نفع ہے کہ نقصان اللہ کی طرف سے ہے، گرتا ہے یا چڑھتا ہے تو اللہ کی طرف سے ہے۔

وضو میں بسم اللہ نہ پڑھنے کا نقصان:

اسی طرح امام احمد رحمہ اللہ کی روایت میں بھی موجود ہے اور ترمذی رحمہ اللہ کی روایت میں بھی ہے کہ حضور ﷺ نے

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۷۹۹، باب: فَضْلِ "اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ"]

فرمایا:

((وَلَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَّمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللهِ تَعَالٰى عَلَيْهِ))

''جو شخص وضو کے وقت بسم اللہ نہ پڑھے گویا اس کا وضو ہی نہیں ہے۔''

[مسند احمد، حدیث: ۹۴۱۸، ترمذی: ۲۵، باب: فِي التَّسْمِيَةِ عِنْدَ الْوُضُوْءِ]

اس لیے یاد رکھیں! ''لا'' کا استعمال کبھی فضیلت کی نفی کے لیے ہوتا ہے۔ ایک آدمی نے وضو کے وقت بسم اللہ نہیں پڑھی تو اس کا وضو ہو جاتا ہے، لیکن اس وضو سے جو برکات اور کمالات حاصل ہونے تھے وہ حاصل نہیں ہوں گے۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ ''لا'' کا استعمال کبھی نفی جنس کے لیے ہوتا ہے اور کبھی نفیِ کمال کے لیے ہوتا ہے۔

حاکم کی اطاعت:

اور بعض علماء تو فرماتے ہیں کہ وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھنا واجب کے درجہ میں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اللہ کی اطاعت کریں، اللہ کے رسول کی اطاعت کریں اور اولوالامر کی اطاعت کریں۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت غیر مشروط اطاعت ہے۔ اولی الامر سے مراد حاکم اور ولی الامر گھر کا بڑا ہے۔ اسی طرح سفر میں ایک امیر بنایا جاتا ہے تو وہ ولی الامر ہے۔ اس کے حکم کی بھی اطاعت کریں گے، لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی حکم اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر ہمارا کوئی حاکم یا امیر ہمیں کوئی ایسا حکم دیتا ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول کے خلاف ہے تو اس کی اطاعت نہیں ہوگی۔ اسی طرح خاوند اپنی بیوی کو جو بھی حکم کرے اس کی اطاعت کرے، لیکن خاوند ایسا حکم دیتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف ہے تو پھر بیوی پر اطاعت واجب نہیں ہے۔

ایک صحابی رئیسِ لشکر کا واقعہ:

جیسے ایک حدیث مبارک ہے کہ حضور ﷺ نے ایک صحابی کو امیر بنا کر بھیجا۔ اس صحابی کی طبیعت میں بڑا جلال اور غصہ تھا، چھوٹی چھوٹی بات پر ناراض ہو جاتے تھے۔ وہ کسی بات پر اپنے نوجوانوں پر ناراض ہو گئے اور انہوں نے ایک گڑھا تیار کرنے کا حکم دیا۔ گڑھا تیار ہو گیا۔ لکڑیوں کا حکم دیا تو لکڑیاں بھی آ گئیں۔ حکم دیا کہ آگ جلاؤ۔ آگ بھی جلالی۔ اب انہوں نے کہا: میں حکم دیتا ہوں کہ سب اس آگ میں کود جاؤ۔ صحابہ نے کہا: ہم نے آپ کے

کہنے پر گڑھا کھودا ہے، لکڑیاں بھی لائے ہیں، آگ بھی جلائی ہے۔ اسی آگ سے بچنے کے لیے تو ہم نے محمد عربی ﷺ کا کلمہ پڑھا ہے اور تم ہمیں پھر آگ کے اندر کودنے کا حکم دیتے ہو؟ یہ حکم نہیں مانتے۔ جب آگ ٹھنڈی ہوئی تو ان کا غصہ بھی ختم ہو گیا۔ جب واپس حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اچھا کیا۔ اگر تم خدانخواستہ آگ میں چلے جاتے تو قیامت تک اسی آگ میں جلتے رہتے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۴۳۴۰، باب: سَرِيَّةِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ حُذَافَةَ السَّهْمِيِّ...]

کیونکہ وہ خودکشی تھی اور وہ حرام موت ہے۔ اس لیے تم نے بہت اچھا کیا کہ تم نے ایسے حاکم کی اطاعت نہیں کی جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف ہو۔

ائمہ مجتہدین کی خدمات کے فائدے:

حضور ﷺ کے زمانہ میں ان مسئلوں کے اندر کوئی تکلیف نہیں تھی، کیونکہ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو صحابہ رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے پاس حاضر ہو کر عرض کرتے کہ آپ کا یہ حکم مشورہ کے طور پر ہے یا اجتہاد مبارک ہے۔ حضور ﷺ کے زمانہ کے گزر جانے کے بعد امت کے لیے مشکلات آنے والی تھیں کہ ہم کیسے فیصلہ کریں کہ یہ حکم ضروری تھا، مشورہ تھا، اجتہاد تھا یا رائے تھی؟ اس لیے اللہ نے ان ائمہ اربعہ کو پیدا کیا۔ اللہ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ انہوں نے پھر قرآن وحدیث کے ذخیرہ کو جمع کیا، اسماء الرجال پر نظر ڈالی اور پھر ہمیں سمجھایا کہ یہ حکم وجوب کے لیے ہے، یہ حکم استحباب کے لیے ہے، یہ سنت موکدہ ہے، غیر موکدہ ہے، یہ فرضِ کفایہ ہے یا یہ فرضِ عین ہے۔ انہوں نے ان احکامات کے اندر حضور ﷺ کے قول وعمل کو سامنے رکھ کر ہمارے لیے ایک آسانی پیدا کر دی۔ اگر وہ ہمارے لیے حل پیدا نہ کرتے تو ہم تباہ ہو جاتے۔

قرآن وحدیث میں مشکلات اور ان کا حل:

اب دیکھیں! قرآن نے ہمیں حکم دیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝٩﴾ [الجمعۃ: ۹]

”اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید وفروخت چھوڑ دو۔ یہ

یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔''

''فَاسْعَوْا'' امر کا صیغہ ہے۔ اور اس کے بعد آگے فرمایا:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ [الجمعۃ: ۱۰]

''پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔''

اب ہم کیسے فیصلہ کریں کہ دونوں امر وجوب کے لیے ہیں؟ اس طرح تو اذان کے بعد مسجد میں آنا بھی واجب ہوتا اور جمعہ کے بعد مسجد سے نکلنا اور تجارت کرنا واجب ہوتا۔

بعض احادیث میں تو یہ بھی ہے کہ جب آدمی ایک نماز پڑھ لے، مثلاً: مغرب کی نماز پڑھ لی اور اب عشاء کی نماز کی انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کے بارے میں لکھ دو کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے۔ فرشتے کہتے ہیں: یا اللہ! وہ تو بیٹھا ہوا ہے، نماز تو نہیں پڑھ رہا؟ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز کے لیے ہی تو بیٹھا ہوا ہے، اس لیے سارا وقت نماز پڑھنے کا لکھ دو۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۷، باب: فضل صلاۃ الجماعۃ]

اب اگر کوئی جمعہ کے بعد اس حدیث کے مطابق بیٹھنا چاہے کہ میں عصر تک بیٹھا رہوں۔ اور ادھر قرآن پاک میں ہے کہ جمعہ کے بعد باہر نکلو۔ تو کیا کرے گا؟ اس لیے علماء نے تحقیق کر کے فرمایا کہ پہلا امر وجوب کے لیے ہے اور دوسرا امر اباحت کے لیے ہے کہ اب جمعہ ہو گیا تو آپ جا کر کام کریں تو یہ جائز ہے۔ اللہ آپ کے رزق میں برکت دیں گے۔ لیکن اگر کام نہیں ہے اور آدمی حرم کے اندر آیا ہوا ہے کہ میں جمعہ کا دن حرم میں گزاروں تو وہ جمعہ کی نماز کے بعد بیٹھ جائے یا طواف میں لگ جائے، عبادت میں لگ جائے تو کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اللہ کے حکم کا مخالف نہیں ہوگا۔ الحمد للہ! علماء نے اتنی تحقیقات کی ہیں کہ چودہ سو سال گزر گئے ہیں، دنیا کے کسی مسئلے کے بارے میں پریشان ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور انہوں نے مسائل کے ایسے ایسے دروازے کھولے ہیں کہ کوئی بھی نیا مسئلہ آ رہا ہے تو اس کا حل ان کے پاس موجود ہے۔

اس لیے علماء کرام اللہ کے اس حکم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وضو کے اوّل میں بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ ہر کام کے اندر واجب ہے، صرف وضو کے اندر ہی واجب نہیں ہے۔ اور اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک جماعت اس طرف ہے کہ جب جانور ذبح کرنے لگے تو بسم

اللہ پڑھے۔ بعض کہتے ہیں کہ شروع میں بسم اللہ پڑھنی واجب ہے اور بعض فرماتے ہیں: مطلقاً واجب ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۸، فَصْلٌ فِیْ فَضْلِهَا (اَلْبَسْمَلَةِ)]

صحبت سے قبل بسم اللہ کی فضیلت کی ایک حدیث کی تحقیق:

امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کے اندر بسم اللہ کی تفسیر میں کئی فضیلتیں لکھی ہیں۔ ان کے اندر ایک یہ ہے کہ جب آدمی اپنی بیوی سے مجامعت کرنا چاہتا ہے تو بسم اللہ پڑھے تو اس سے جو اولاد پیدا ہوگی اور جب تک وہ سانس لے گی فرشتے اس کی نیکیاں لکھیں گے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے اس حدیث کی بہت سی معتبر کتابوں میں تلاش کیا، لیکن مجھے یہ حدیث کہیں نہیں ملی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۸، فَصْلٌ فِیْ فَضْلِهَا (اَلْبَسْمَلَةِ)]

کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ:

صحیح مسلم شریف کے اندر حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو فرمایا کہ جب کھانا کھانے لگو تو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" پڑھو اور دائیں ہاتھ سے کھایا کرو اور اپنے سامنے سے کھایا کرو۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۵۳۷۶، باب: التَّسْمِيَةِ عَلَى الطَّعَامِ]

اصول یہ ہے کہ جب آدمی کھانا شروع کرنے سے پہلے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" پڑھتا ہے تو شیطان بھاگ جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی کھانا شروع کرنے سے پہلے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" پڑھتا ہے تو شیطان کے چیلے جنات کہتے ہیں کہ بھاگو! یہاں کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔ اور جس دسترخوان پر "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" نہ پڑھی جائے تو وہ کہتے ہیں کہ آؤ، بیٹھ جاؤ (یہ ساری اپنی برادری ہے۔) یہاں ہم سب مل کر کھائیں گے۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۰۱۸، باب: آدَابُ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ]

اس لیے ضروری ہے کہ آدمی کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھے۔

کھانا کھانے کے بعد کی دعا:

اور کھانا کھانے کے بعد "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" پڑھے یا:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَطْعَمَنَا، وَسَقَانَا، وَجَعَلَنَا مُسْلِمِيْنَ))

[سنن الترمذی، حدیث: ۳۴۵۷، باب: مَا يَقُوْلُ إِذَا فَرَغَ مِنَ الطَّعَامِ]

اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

((أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَطْعَمَنَا، وَسَقَانَا، وَكَسَانَا مِنَ الْعُرٰى وَاٰوَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِيْنَ))

ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور ہمیں کپڑا پہنایا اور جس نے ہمیں پناہ دی۔ اس کا ہم شکرادا کرتے ہیں جس نے ہمیں مسلمانوں کی صف میں بنایا۔ یہ کہنے سے اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں برکتیں عطا فرماتے ہیں۔

خلافِ شرع دعوتوں کا حکم:

آج جتنے بڑے آدمی کی دعوت ہوتی ہے وہ اتنی ہی اسلام کے خلاف ہوتی ہے۔ کھڑے ہو کر کھائیں گے، پلیٹیں ہاتھوں میں لے کر کھائیں گے۔ اللہ معاف فرمائے! نہ خدا کا نام ہے، نہ رسولِ خدا ﷺ کا نام ہے اور نہ کسی کو ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' یاد ہے اور نہ کھانے کے بعد کی دعا پڑھتے ہیں اور بائیں ہاتھ سے کھاتے ہیں، کیونکہ انگریز کی سنت بائیں ہاتھ سے کھانا ہے اور حضور ﷺ کی سنت دائیں ہاتھ سے کھانا ہے۔

اسی لیے ایسی دعوتوں میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ خاص طور پر اہلِ علم اور علماء حضرات جن کی لوگ اتباع کرتے ہیں۔ امام مسجد ہے، عالم ہے، خطیب ہے۔ اللہ نے اس کو عزت دی ہے۔ ایسی منکرات والی دعوت میں نہ جائے۔ اگر کبھی جانا بھی پڑ جائے تو ان پر جبر کریں کہ سنت طریقہ اختیار کریں۔ وقتی طور پر وہ لوگ ناراض ضرور ہوں گے۔ اگر ہم لوگ خوشامد کر کے بیٹھے رہیں گے تو تبدیلی کیسے آئے گی؟ کہتے ہیں کہ اتنا بڑا گناہ تو نہیں ہوگا، لیکن یہ گناہ بنتے بنتے کہاں تک چلا جائے گا؟ اس لیے ایسے منکرات سے اعراض کریں۔ اگر جائیں تو ان کو سنت طریقہ بتلائیں کہ ہم مسلمان ہیں، کلمہ پڑھنے والے ہیں، کھانا نیچے بیٹھ کر کھاؤ۔ حضور ﷺ نے اوپر بیٹھ کر، ٹیک لگا کر کھانے سے منع فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ٹیک لگا کر کھانا متکبرین کی علامت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کھانے کے وقت عاجزی کے ساتھ بیٹھیں۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں یہ نعمتیں عطا نہ کرتے تو ہم کہاں سے لاتے؟ اور اگر اللہ تعالیٰ ہمیں یہ نعمت تو دیں، لیکن کھانے کی توفیق نہ دیں۔ اگر کھا بھی لیں، لیکن ہضم کرنے کی توفیق نہ دیں کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو زہر بنا دیں تو ہم کیا کریں گے؟

اس لیے عاجزی اور تواضع کے ساتھ اللہ کی ان نعمتوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ اور جہاں جائیں وہاں سنت کا پرچار کریں۔ اگر ایک سنت بھی زندہ ہو جائے تو کئی رحمتیں حاصل ہوتی ہیں۔

صحبت سے پہلے کی دعا:

بعض علماء فرماتے ہیں کہ ہر کام کی ابتداء میں بسم اللہ واجب ہے۔ جیسا کہ صحیحین کی روایت میں ہے:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ قَالَ: بِاسْمِ اللّٰهِ، اللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا)) [صحیح بخاری، حدیث: ۳۲۸۸، باب: مَا يَقُولُ إِذَا أَتَى أَهْلَهُ، مسلم، حدیث: ۱۴۳۴، واللفظ لمسلم]

”جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے مجامعت کا ارادہ کرے تو اس کو چاہیے کہ پہلے ”اللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا“ پڑھ لے۔“

اگر عربی عبارت نہ آئے تو اردو میں کہہ لے: اے اللہ! ہم دونوں کو شیطان کے حملہ سے بچا، شیطان کو ہم سے دور کر دے۔ اور اگر تو ہمیں اولاد دے تو اس کو بھی شیطان کے حملہ سے محفوظ فرما۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر اللہ نے اولاد مقدر کی ہے تو پھر اس دعا کی برکت سے شیطان اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، کیونکہ وہ اللہ کی پناہ میں آجاتا ہے۔

دیکھو! کتنی آسان اور بڑی چیز ہے کہ میاں بیوی ملنے سے پہلے یہ دعا پڑھ لیں تو آگے جو اولاد ہوگی وہ شیطان کے حملہ سے محفوظ ہو جائے گی۔ وہ نافرمانی سے، بے حیائی سے، بے دینی سے اور تمام خرافات سے محفوظ ہو جائے گی۔ لیکن آج کل مسلمان اتنا گر گیا ہے کہ اس عمل کو چادر کے بغیر کھلم کھلا عمل میں لاتا ہے جس کو شیطان دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اور اگر اس عمل سے امید ہو جائے تو شیطانی اثرات کا پورا پورا اثر موجود ہوتا ہے۔ اس جنس کے معاملے میں اب شیطان کو بھگانے کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ شیطان خود شرماتا ہوگا۔ اور انسان سے خود سیکھتا ہوگا کہ مجھے کوئی طریقے بتاؤ کہ میں لوگوں کو بتاؤں۔

خدا سے مانگنے کے لیے وسیلے پکڑنا:

اللہ پاک سے ہی مانگنا چاہیے۔ اگر اللہ سے نہ مانگیں تو اللہ ناراض ہوتے ہیں، لیکن ہم بندوں سے مانگتے ہیں۔ ڈھونڈ رہے ہیں کہ کس کے ذریعے مانگیں؟ بلکہ یہاں تک کہتے ہیں: ان کو کیا پتا ہے بادشاہ کو ملنا ہو تو وزیر کے پاس جانا پڑتا ہے۔ اور وزیر کو ملنے سے پہلے اس کے سیکرٹری کے پاس جانا پڑتا ہے۔ سپاہی سے اجازت لیتا ہے، اندر جاتا ہے اور پھر پرچی بھیجتا ہے۔ بغیر واسطہ اور وسیلہ کے کوئی کام نہیں چلتا۔ یہ مثالیں دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے

بندے یہ نہیں جانتے کہ یہ اللہ کی مثال دے رہے ہیں اور اللہ کی کوئی مثال نہیں ہے۔ جو اللہ کو بادشاہ کے ساتھ مثال دے وہ تو مسلمان ہی نہیں ہے۔ اس کی صفت ہے ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ:۱۱] (اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے) جب اس کی کوئی مثل ہی نہیں تو پھر کہنا کہ بادشاہ کے پاس بغیر واسطے کے نہیں جا سکتے، مکان پر بغیر سیڑھیوں کے نہیں چڑھ سکتے تو خدا تک اس کے پیاروں کے بغیر کیسے جا سکتے ہیں؟ اس مثال کے دینے سے پہلے اپنے ایمان کو تو دیکھو! بھلا اس کی کوئی مثال بھی ہو سکتی ہے؟ وہ تو مثل سے پاک ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مالک کی بندوں کے ساتھ مثال دینا صحیح نہیں ہے۔ بندے تو سفارش اس لیے ڈھونڈتے ہیں کہ کیا پتا وہ مہربانی کرے یا نہ کرے۔ بعض اوقات ایک آدمی کا ٹھیک ٹھاک مقدمہ ہوتا ہے، وہ حق پر بھی ہے، مدعی بھی ہے، سچا بھی ہے اور دلائل بھی ہیں، لیکن پھر بھی وہ روتا رہتا ہے۔

میری جائیداد کے ایک مقدمہ کا واقعہ:

میرا اپنا ایک جائیداد کا معاملہ تھا۔ میرے ایک دوست ہیں، اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے میرے پاس آنا تھا اور نہیں آئے؟ میں نے کہا: میں آیا تو تھا، لیکن جان بوجھ کر آپ کو نہیں ملا۔ انہوں نے کہا: کیوں؟ میں نے کہا: آپ بہت بڑے عہدے پر ہیں، میں آپ کے پاس آؤں اور آ کر کہوں کہ سفارش کریں تو اچھی بات نہیں لگتی تھی۔ اور جس کو آپ کہیں گے وہ بھی عدالت کے اہم عہدے پر ہے۔ مجھے عدالت کے معاملہ میں سفارش کرنا یا کرانا اچھا نہیں لگا۔ آپ کی مہربانی کہ آپ نے پوچھ لیا ہے۔ انہوں نے کہا: کلی صاحب! آپ نے بات سمجھی نہیں ہے۔ الحمد للہ! آپ حق پر ہیں۔ بعض اوقات افسر اتنا مصروف ہوتا ہے کہ وہ کیس پڑھتا ہی نہیں ہے اور فیصلہ کر دیتا ہے۔ حق والا ہمیشہ روتا رہ جاتا ہے۔ تو سفارش کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کے معاملے کو اچھی طرح دیکھ لیں گے تو حق واضح ہو جائے گا۔ یہ سفارش نہیں، بلکہ توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے۔

خدا سب کی سنتا اور جانتا ہے:

یہ خطرہ تو بندے سے ہو سکتا ہے، خدا کے ہاں کوئی ڈر ہے کہ وہ معاملہ کو نہیں دیکھیں گے یا ان کو کسی بات کا پتا نہیں ہے؟ حالانکہ اللہ تو فرما رہے ہیں مجھ سے مانگو۔

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ [الاعراف:۱۸۰]

''اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، لہٰذا اسے انہی ناموں سے پکارو۔''

میرا ایک نام نہیں کئی، نام ہیں، مانگو۔ اور میں تمہاری شہ رگ کے بھی زیادہ قریب ہوں۔ تم مانگو، میں تمہاری دعائیں سنتا ہوں۔ اور پھر فرماتے ہیں: نہ مانگو تو میں ناراض ہو جاتا ہوں۔ اس خدا کے لیے ضرورت ہے کہ ہم وسیلے اور واسطے اور ذرائع ڈھونڈیں؟ تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان خدا کو بھول جاتا ہے اور وسیلہ میں ہی گم ہو جاتا ہے۔

شرکیہ باتیں:

کہتا ہے خدا نے سارے اختیارات انبیاء علیہم السلام کو دے دیے، انبیاء علیہم السلام نے سارے اختیارات اولیاء کو دے دیے اور اولیاء اللہ نے اپنے اختیارات جو آگے پیر اور خلفاء تھے ان کو تقسیم کر دیے، یعنی اللہ تعالیٰ ...... نعوذ باللہ! ...... اب فارغ ہیں ...... إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ...... دعا کیا کرو کہ اللہ مسلمانوں کو صحیح عقیدہ عطا فرمائے۔ باقاعدہ شعر لکھا ہے:

؎ خدا کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے؟
مجھے جو کچھ لینا ہے میں لے لوں گا محمد ﷺ سے

اس لیے اس نے آگے لکھا ہے کہ تم نے خدا سے مانگنا ہے تو مانگو، میں تو عبد القادر سے ہی مانگوں گا۔

کیونکہ ماذون بھی ہے، مالک بھی ہے، مختار بھی ہے
کار عالم کا مدبر بھی ہے عبد القادر

آگے کہتا ہے: بندے چڑتے ہیں تو چڑیں:

بندہ عبد القادر کا بھی ہے قادر

میرا تو قادر بھی یہی ہے۔ یہ وہابیوں کو چڑا رہا ہے، جہنم کا راستہ بنا رہا ہے، حالانکہ ہر چیز پر قادر اللہ ہے۔ خدا کی قدرت کہ پیر صاحب کا نام عبد القادر ہے وہ تو عبد ہیں، لیکن یہ ان کو قادر بنا رہا ہے اور متصرف فی الامور بنا رہا ہے۔

پھر کہتا ہے: قرآن میں ہے:

﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝۵﴾ [النازعات:۵]

''جن کاموں کی اللہ ان کو تدبیر دیتے ہیں، حکم دیتے ہیں وہ فرشتے اس کام کی تدبیر کرتے ہیں۔''

یاد رکھیں! اللہ کی شان یہ ہے کہ میرا بندہ مجھ سے نہ مانگے تو میں ناراض ہو جاتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر رحمت کا

کمال ہے کہ روزانہ اللہ عرش سے آسمانِ دنیا پر اجلال فرماتے ہیں، جیسے ان کی شان کو زیبا ہے۔ پھر فرماتے ہیں: کوئی مانگنے والا ہے میں اس کو دوں؟ اس لیے تہجد کے وقت مانگنے کا حکم ہے کہ وہ رحمت کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت ندا آتی ہے: کون ہے رزق مانگنے والا؟ کون ہے اولاد مانگنے والا؟ کون ہے اپنی حاجات مانگنے والا؟ میں اس کی حاجتیں پوری کروں۔ اس لیے اللہ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ نہ مانگو تو میرا رب ناراض ہو جاتا ہے۔ اس لیے بعض شعراء نے فرمایا:

؎ اَللّٰهُ يَغْضِبُ اِنْ تَرَكْتَ سُؤَالَهُ

وَبَنِيْ آدَمَ حِيْنَ يُسْأَلُ يَغْضِبُ

[غرر الخصائص الواضحۃ، ص: ۳۷۲]

”اللہ ناراض ہوتے ہیں جب تو مانگنا چھوڑے اور بنی آدم ناراض ہوتے ہیں جب تو مانگنا شروع کرے۔“

صفتِ رحمت کا اطلاق:

رحمٰن سب کے لیے ہے اور رحیم مومنوں کے لیے ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا: رحمٰن کے اندر رحیم کی بنسبت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے، کیونکہ وہ تمام مخلوق کو شامل ہے اور رحیم صرف مومنوں کے ساتھ خاص ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رحمٰن کا اطلاق دنیا اور آخرت کے لیے ہوتا ہے اور رحیم کا اطلاق صرف آخرت کے لیے ہے۔ جیسے اللہ کسی دوسرے کا نام نہیں ہے، اسی طرح رحمٰن بھی کسی اور کا نام نہیں رکھا گیا ہے۔

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾ [الاسراء: ۱۱۰]

”کہہ دو: چاہے تم اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو، جس نام سے بھی (اللہ کو) پکارو گے (ایک ہی بات ہے) کیونکہ تمام بہترین نام اسی کے ہیں۔“

مسیلمہ کذاب کا جھوٹ اور شیعوں کا تقیہ:

مسیلمہ کذاب نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو اس نے اپنا نام رحمٰن الیمامہ رکھ لیا۔ اس نے جھوٹا نام رکھا۔ اللہ نے اس کو قیامت تک جھوٹ کی ایسی چادر پہنا دی کہ ہر کوئی اس کو کذاب کہتا ہے، وہ اس کا لقب بن گیا۔ اور دنیا کے اندر ضرب المثل بن گئی کہ تو کوئی مسیلمہ ہے کہ اتنا بڑا جھوٹ بول رہا ہے؟ اس لیے یاد رکھیں! جو آدمی اللہ کی کسی نعمت کا انکار کرے اللہ اس نعمت سے اس کو محروم کر دیتے ہیں۔ دیکھیں! پوری امت میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کتنی

بڑی شان اور نعمت ہے۔ جن لوگوں نے صدیق کی صداقت کا انکار کیا ان کا مذہب بھی جھوٹ پر آ گیا۔ ملنگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صداقت کا انکار کیا تو ان کے دین کی بنیاد ہی تقیہ اور جھوٹ ہے۔ ظاہر کچھ ہو، اندر کچھ ہو۔ وہ کہتے ہیں: اگر ہمارے دین کے دس حصے کیے جائیں تو نو حصے تکیے میں چھپے ہوئے ہیں۔ تقیہ کا معنیٰ ہوتا ہے کہ سچ کو چھپاؤ اور جھوٹ کو ظاہر کرو۔

جیسے کہتے ہیں کسی سنی کا جنازہ ہو تو شامل ہو جاؤ، تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جنازہ نہیں پڑھتا، لیکن جنازے کی دعا میں یہ کہو کہ اے اللہ! اس کو جہنم میں بھیج۔ کذب ان کے دین کی بنیاد بن گیا، کیونکہ صدیق کی صداقت کا انکار کر بیٹھے، عدالتِ فاروق کا انکار کر بیٹھے، عثمان کی حیا کا انکار کر بیٹھے کہ ان میں حیا ہے ہی نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم کا انکار کر بیٹھے کہ ان میں علم ہے ہی نہیں، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مصالحت کا انکار کر بیٹھے، اس لیے صلح کا جذبہ ہی نہیں ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حقیقی جذبہ کا انکار کر بیٹھے، اس لیے محض زبانی دعوے ہیں۔

سلمان رشدی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا۔ اللہ کی اس پر لعنت ہو، اللہ اس کو دنیا و آخرت میں ذلیل کریں اور ضرور کریں گے۔ کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ جس نے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے وہ نہیں بچ سکا، اس پر اللہ کا عذاب ضرور آئے گا۔ لوگوں سے کہیں گے کہ بالکل ضرور اتحاد ہونا چاہیے۔

شیعوں کی گستاخیاں:

لیکن ہمارے قانون میں لکھا ہے کہ ماسوا شیعہ کے اور کوئی عہدے دار نہیں بن سکتا۔ نفرت تو تم پیدا کر رہے ہو۔ اگر ایک آدمی صحابہ کو گالی دے گا تو دوسرا اس پر ضرور مشتعل ہوگا۔ اگر گالی دینا بند کر دو تو اشتعال خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اگر کوئی آدمی میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے تو کیا ہم چپ ہو جائیں گے؟ وہ بڑا بے غیرت مسلمان ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں توہین سنے اور پھر چپ ہو جائے۔ اگر وہ توہین کرنے والی زبان چپ ہو جائے تو ہم خواہ مخواہ جوش میں آئیں گے؟ اسی پر غور کریں کہ جھگڑے کی بنیاد کیا ہے؟

مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ پنجابی زبان میں بڑی اچھی مثال دیتے تھے: کسی افسر نے کہا کہ آپ مولوی لوگ ہیں، کبھی قادیانیوں کے پیچھے ہیں اور کبھی شیعہ کے پیچھے ہیں۔ مولویوں کو تو کوئی بلا پڑ گئی ہے، ہر وقت کوئی نہ کوئی

فتنہ برپا کیے رہتے ہو، تم ہی لوگ ساری دنیا کو لڑا رہے ہو۔ کبھی اس سے جھگڑا ہے اور کبھی اس سے جھگڑا ہے۔

حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ نے بڑی پیاری بات فرمائی کہ بھائی اگزارش یہ ہے کہ بستیوں میں جہاں کوئی انتظام نہ ہو تو باری باری ہر کوئی پہرہ دیتا ہے، پہرے دار پھرتے رہتے ہیں، جہاں کہیں کتے وغیرہ بھونکیں تو وہ بستی والوں کو جگاتے رہتے ہیں کہ خبردار، خبردار! کتے بھونک رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کوئی چور ہے۔ وہ چوکیدار جو دو روپے تنخواہ لیتا ہے وہ کہیں کوئی شور سنے گا تو جگائے گا یا نہیں جگائے گا؟ ہم جو محمد مدنی ﷺ کے نام پر کھا رہے ہیں۔ جہاں کہیں کوئی کتا بھونکے گا تو ہم شور مچائیں گے۔ فرمایا: بھونکنا تم بند کرا دو ہم چپ ہو جائیں گے۔ ہم تو دین کے نام پر روٹی کھاتے ہیں۔ لوگ ہماری عزت کرتے ہیں، کیا ہمارا قد بڑا ہے؟ یا ہم زیادہ خوبصورت ہیں؟ نہیں، بلکہ عزت اس لیے کرتے ہیں کہ قرآن پڑھاتا ہے اور مدنی ﷺ کا نام لیتا ہے۔ ہم تو دینِ رسول ﷺ کے سپاہی ہیں۔ اگر کوئی اہلِ بیت کو بھونکے گا، ہم چیخیں گے، صحابہ کو بھونکے گا ہم چیخیں گے۔ ہماری تو ڈیوٹی ہی یہی ہے کہ ہم شور مچائیں گے، لوگوں کو خبردار کریں گے کہ لوگ تمہارے ایمان پر ڈاکہ نہ ڈال لیں۔ ان آوازوں کو بند تم کر دو، پھر تم مولوی کو دیکھو گے کہ وہ چپ کر کے گھر میں قرآن پڑھائے گا۔

اختلاف اور فتنوں کا اصل سبب:

اصل بات دیکھیں کہ فتنہ کس وجہ سے پیدا ہوا؟ وگرنہ ایسے ہو گیا جیسے کسی نے میٹھے کی لکیر لگائی اور اس پر مکھی آ کر بیٹھی تو کسی نے اس کو ڈنڈا مار دیا۔ وہ کہنے لگے کہ میں نے تو میٹھے کی لکیر لگائی تھی، میں نے سوٹا نہیں مارا تھا۔ اصل بات ان کی ہے جو میٹھے کی لکیر لگا رہے ہیں۔ کوئی آدمی اہلِ بیت اور اصحابِ رسول کی شان کے خلاف لفظ نہ بولے، آپ ﷺ کی رسالت، ختمِ نبوت اور جامعیت کے خلاف بات نہ کرے، کوئی آدمی اللہ کی توحید کے خلاف بات نہ کرے، لیکن اگر کوئی آدمی قبر کا طواف کرے گا تو مسلمان کو غیرت آئے گی۔ اگر وہ روکے گا تو کہتے ہیں کہ وہابی ہے، ہمارے بزرگوں کی توہین کرتا ہے۔ جب تم میرے خدا کے کعبے کے برابر کعبہ بناڈالو اور میرے مدنی ﷺ کے روضے کے برابر روضہ بناڈالو تو کون مسلمان نہیں چیخے گا؟

نہ تم صدمے ہمیں دیتے ، نہ ہم فریاد یوں کرتے
نہ کھلتے راز سربستہ ، نہ یوں رسوائیاں ہوتیں

اگر تم ہمیں نہ ستاؤ تو ہم کیسے بات کریں گے؟ ادھر خانہ کعبہ میں کہتے ہو: یا اللہ! اور پھر کہتے ہو: یا علی! ادھر کہتے

ہو: یا رحمٰن اور ادھر کہتے ہو: یا داتا! یا بابا فرید گنج شکر! ۔ تو ہمیں چیخنے پر کس نے مجبور کیا؟ یہاں اللہ کا سجدہ کر رہے ہو تو کہہ رہے ہو: "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى" اور وہاں قبر پر سجدہ کر رہے تو کہہ رہے ہو: حضرت! میں تمہاری قبر پر پڑا ہوں۔ توحید والا بندہ چیخے گا کہ ایک طرف تم دعویٰ کر رہے ہو کہ ہم محمد مدنی ﷺ کے غلام ہیں اور اس طرف تم کام وہ کر رہے ہو جو نہ مدنی پاک ﷺ نے کیے، نہ خلفاء ؓ نے کیے اور نہ اہل بیت ؓ نے کیے۔ تم نام مدینے کا لے رہے ہو اور جا الٹ رہے ہو۔ تو راستے کے اندر جو کھڑا ہے وہ کہے گا کہ مدینے کا یہ راستہ نہیں ہے۔ تم نام سنت کا لو اور انگوٹھے چومو گے تو میں چیخوں گا۔ اور تم کہو گے کہ وہابی ہے۔ اب اس بات کا علاج کس کے پاس ہے؟ اللہ تعالیٰ عقل عطا فرمائے۔

درود کی جگہ انگوٹھے چومنا:

قرآن فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ [الاحزاب:۵۶]

"اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود بھیجو اور خوب سلام بھیجا کرو۔"

کیا "صَلُّوا" کا معنی انگوٹھا ہے؟ جب یہ معنی نہیں ہے تو انگوٹھا کہاں سے آ گیا؟ اللہ فرماتے ہیں: تم میرے مدنی پاک ﷺ پر درود بھیجو۔ اور میرے مدنی پاک ﷺ فرماتے ہیں: جو مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجے اللہ اس پر دس مرتبہ رحمتیں فرماتے ہیں۔[1] یہ نہیں فرمایا کہ جو ایک دفعہ انگوٹھا چومے اللہ اس پر دس دفعہ رحمت فرمائے گا۔ اللہ کے لیے حق اور باطل کو پہچانیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

((الْبَخِيلُ الَّذِي مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ)) [سنن الترمذی، حدیث:۳۵۴۶]

"سب سے بڑا بخیل وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔"

یہ نہیں فرمایا کہ جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ انگوٹھے نہ چومے تو وہ بہت بڑا وہابی ہے۔

ایک آدمی خانہ کعبہ کے سامنے نماز پڑھ رہا ہو، لیکن خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کی ہوئی ہو تو تم کیا کہو گے؟ یہی کہ اس کو پکڑ کو

[1] ...... [صحیح مسلم، حدیث:۴۰۸، بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ بَعْدَ التَّشَهُّدِ]

سیدھا کرو۔ اگر وہ سیدھا کھڑا ہوتا تو کیا تم شور کرتے؟ اصل بات یہ ہے کہ جب تم سیدھے چل پڑو گے تو کسی کو شور کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر میں تمہارا دشمن ہوں تو خاموش رہوں گا اور اگر تمہارا خیر خواہ ہوں تو شور کروں گا۔

اللہ کے ناموں پر عمل بھی مقصود ہے:

صحیحین کی حدیث مبارکہ میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اِسْمًا مِائَةً إِلَّا وَاحِدًا، مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ))

''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو یاد کرلے گا جنت میں داخل ہوگا۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۳۹۲، باب: إِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ اسْمٍ إِلَّا وَاحِدًا، صحیح مسلم، حدیث: ۲۶۷۷]

بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''مَنْ أَحْصَاهَا'' کا معنی یہ ہے کہ جس نے ان کو گنا یعنی جس نے ان کو پڑھا۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''مَنْ أَحْصَاهَا'' کا معنی یہ ہے کہ جس نے ان کو یاد کیا۔ اصل ترجمہ یہ ہے کہ نام بھی یاد کرے اور اس پر عمل بھی کرے۔ اگر نام تو یاد ہیں، لیکن عمل نہیں ہے تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔

ایک آدمی پورا قرآن یاد کرلے، لیکن قرآن پاک کی کسی آیت پر عمل نہ کرے تو لازمی بات ہے کہ قیامت کے دن معرضین (اعراض کرنے والوں) میں سے اٹھایا جائے گا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا قرآن اس کے گریبان کو پکڑے گا اور اللہ سے آکر شکایت کرے گا۔ جیسے صحیح احادیث میں حضور ﷺ نے فرمایا: قرآن بندے کی گردن میں حائل ہوگا، آکر کہے گا: اے میرے پروردگار! اس بندے اور میرے درمیان فیصلہ کریں۔ اس نے مجھے دنیا میں چھوڑ رکھا تھا۔ صرف یاد کرنا مقصود نہیں ہوتا۔

اللہ کے ناموں سے مقصود:

بلکہ مقصود یہ ہے کہ مثلاً ''اللہ'' ہے۔ اس کا معنی توحیدِ الوہیت ہے۔ اگر توحید نہ ہو تو اللہ اللہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اسی طرح ''اَلرَّحْمٰن'' ''نہایت رحمت والا، جس کی رحمت عام ہے، مومن اور کافر سب کو شامل ہے، دنیا اور آخرت کو شامل ہے اور انسان وحیوان کو شامل ہے۔ جب اس کی رحمت عامہ کو سمجھے، لیکن اس کا شکر ادا نہ کرے تو کیا فائدہ ہوا؟

اور اسی طرح ''اَلسَّمِيْعُ''، ''اَلْبَصِيْرُ''، ''اَلْخَبِيْرُ'' اور ''عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ'' بھی پڑھ رہا ہے اور اس کے بعد

غیروں کو بھی پکار رہا ہے۔ تو "اَلسَّمِیْعُ"، پر کیا عقیدہ ہوا؟ سننے والا تو صرف اللہ ہے، باقیوں کا سننا عارضی اور ایک حد تک سننا ہے۔ اسی طرح "اَلْبَصِیْرُ" پڑھ رہا ہے کہ میرا اللہ دیکھنے والا ہے، لیکن پھر گناہ بھی کر رہا ہے۔ تو اللہ کے دیکھنے پر کیا یقین ہوا؟ اسی طرح "اَلْخَبِیْرُ" کہتا ہے کہ اللہ جاننے والا ہے، لیکن بری بری باتیں کر رہا ہے، برے برے خیالات عمداً بنا رہا ہے اور یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ اللہ "عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ" ہے۔ یہ تو لفظی بات ہوئی، ان اسماء پر ان کا ایمانِ حقیقی نہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ سب کی سنتا ہے:

یہی وجہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ اسمائے حسنیٰ کے ساتھ دعا مانگتے ہیں، لیکن دعا قبول نہیں ہوتی ہے۔ بھائی! جب اسمائے حسنیٰ پر ایمان ہی نہ ہو، صحیح یقین ہی نہ ہو تو دعا کیسے منظور ہوگی؟ ایک ہے مطلقاً فریاد کا سننا، وہ تو کافروں اور جانوروں کی بھی اللہ سنتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نمازِ استسقاء کے لیے جا رہے تھے۔ جب ایک چیونٹی پر گزرے تو راستے ہی میں آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ واپس آجاؤ، بارش ہو جائے گی۔ لوگوں نے کہا: ہم نے تو ابھی نمازِ استسقاء بھی نہیں پڑھی اور دعا بھی نہیں مانگی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: میں نے ایک چیونٹی کو دیکھا کہ وہ پاؤں اوپر کیے ہوئے ہے اور اللہ سے دعا مانگ رہی ہے:

"اَللّٰهُمَّ لَا تُعَذِّبْنَا بِذُنُوْبِ عِبَادِكَ" [مرقاة المفاتيح: ۷/ ۲۶۸۲، باب: ما يحل أكله وما يحرم]

"اے اللہ! بندے گناہ کرتے ہیں، ان کی وجہ سے ہمیں برباد نہ کر۔"

دعا مانگنے کی صحیح حالت:

مانگنے کے لیے تو جانور، کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض بھی مانگتے ہیں۔ مانگنے کے لیے کافر بھی مانگتا ہے، لیکن مومن کے مانگنے اور ان کے مانگنے میں فرق ہی نہ ہو تو کیا فائدہ ہوگا؟ اصل بات یہ ہے کہ مومن ایمان کامل کے ساتھ دعا مانگے کہ اس کا توحیدِ الوہیت پر ایمان ہو، الٰہ کے معنیٰ کو سمجھ رہا ہو، رحمٰن کی صفت کو سمجھ رہا ہو، رحیم کی صفت کو سمجھ رہا ہو اور پھر زبان سے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" نکلے، "يَا اَللّٰهُ!" "يَا رَحْمٰنُ" "يَا رَحِيْمُ" نکلے، جب اللہ کے اسماء پڑھے تو اس خشیت طاری ہو، تضرع طاری ہو، طبیعت کے اندر اضطراب اور تڑپ ہو تو پھر دیکھیں کہ

دعا منظور ہوگی۔

اللہ کا ذاتی نام مشتق ہے یا غیر مشتق:

بعض حضرات نے کہا: اللہ کے پانچ ہزار اسماء ہیں، لیکن لفظ ''اَللّٰہُ'' ایسا اسم ہے کہ یہ کسی غیر کا نام نہیں رکھا گیا۔ لفظ ''اَللّٰہُ'' کا کوئی مشتق منہ نہیں ہے کہ جس سے یہ مشتق ہو۔

بعض نے کہا: یہ اسمِ جامد ہے۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ، امام خطابی رحمہ اللہ، امام الحرمین اور امام غزالی رحمہم اللہ وغیرہ نے فرمایا: الف لام لفظ ''اَللّٰہُ'' کے اندر لازم ہیں۔ اور یہ ایسا نام ہے کہ تمام نام اس کی صفات بن کر آئے ہیں۔ اور معبودِ برحق کے سوا اور کسی پر لفظ ''اَللّٰہُ'' کا اطلاق نہیں کیا گیا۔ اگر آپ ''یَا اَللّٰہُ'' کہیں گے تو لازماً الف لام کا اظہار ہوگا۔ ''اَلرَّحْمٰنُ'' کے اندر بھی الف لام ہے، لیکن جب شروع میں حرفِ ندا لگائیں گے تو ''یَا رَحْمٰنُ'' کہیں گے، یہاں پر الف لام نہیں پڑھیں گے، کیونکہ یہاں الف لام لازم نہیں ہے۔

بعض نے کہا کہ لفظ ''اَللّٰہُ'' مشتق ہے۔ وہ رؤبہ بن العجاج شاعر کے قول سے دلیل پکڑتے ہیں:

لِلّٰهِ دَرُّ الْغَانِيَاتِ الْمُدَّهِ
سَبَّحْنَ وَاسْتَرْجَعْنَ مِنْ تَأَلُّهِيْ

''اَللّٰہُ'' ''اِلٰہٌ'' سے مشتق ہے۔ اس شعر میں ''تَأَلُّہٌ'' مصدر ہے۔

❁..... امام سیبویہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصلی کلمہ ''لَاہٌ'' تھا۔ الف لام داخل ہوا تو ''اَللّٰہُ'' بن گیا۔ جیسے ''اَلنَّاسُ'' اصل میں ناس تھا۔ الف لام داخل ہوا تو ''اَلنَّاسُ'' بن گیا۔

❁..... علامہ فراء رحمہ اللہ اور کسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی اصل ''اَلْاِلٰہُ'' ہے۔ ہمزہ کو گرا دیا اور لام کو لام میں مدغم کر دیا تو ''اَللّٰہُ'' ہوگیا۔

❁..... بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ ''وَلَہٌ'' سے مشتق ہے، معنی ہے مضطرب ہونا۔ جیسا کہ جب آدمی کا دماغ چل جائے، عورت کسی کی محبت میں آ کر اپنا دماغ کھو بیٹھے تو اس کو عربی میں ''وَلَہٌ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح بندے جب اللہ کی صفات کو دیکھتے ہیں تو حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔

❁..... بعض کہتے ہیں کہ ''وِلَاہٌ'' تھا۔ واو کو ہمزہ میں بدل دیا تو ''اِلٰہٌ'' بن گیا، جیسے ''وِشَاحٌ'' کی واو کو ہمزہ سے بدل دیا تو ''اِشَاحٌ'' بن گیا۔

۞......اور بعض نے کہا: ''اَلِهَ يَأْلَهُ اَلِهْتُ فُلَانًا اَیْ سَكَنْتُ فُلَانًا'' یہ ''اَلِهْتُ'' سے مشتق ہے۔ معنی ہے ''اَسْكَنْتُ اِلَيْهِ'' میں نے فلاں کا سہارا پکڑا یا سکون پکڑا۔ ''وَالْعُقُوْلُ لَاتَسْكُنُ اِلَّا عَلٰى ذِكْرِهٖ'' عقل کو سکون اللہ کے ذکر میں ملتا ہے۔ ''وَ الْاَرْوَاحُ لَا تَرُوْحُ اِلَّا بِمَعْرِفَتِهٖ'' اور روح کو خوشی اس وقت ملتی ہے جب اللہ کی ذات کی معرفت حاصل ہو جائے۔

کیونکہ اسی کی ذات کامل ہے اس کے سوا کوئی کامل نہیں ہے، اس کے اندر کوئی نقص نہیں ہے۔ باقی جتنے دنیا میں صاحب کمال ہیں ان میں کوئی نہ کوئی نقص ہے۔ ایک آدمی کامل ہے، لیکن دوسرے کے اعتبار سے ہے۔ ہر کسی کے اندر نقص ہے۔ بڑے سے بڑا عالم ہو، لیکن پہلے جاہل تھا۔ بڑے سے بڑا عالم ہو، لیکن کسی کا شاگرد تھا۔ بڑے سے بڑا کتاب سمجھنے والا ہو، لیکن کتاب لکھنے والا اس سے زیادہ ہو گیا۔ اللہ کی ذات ہے جس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اس لیے قرآن میں آتا ہے:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىٕنُّ الْقُلُوْبُ﴾[الرعد:۲۸]

''یاد رکھو کہ صرف اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔''

۞......بعض نے فرمایا ''لَاهَ يَلُوْهُ'' سے مشتق ہے۔ جیسے جانور کا بچہ اپنی ماں کی طرف دوڑتا ہے، اللہ کی تمام مخلوق بھی اللہ کی طرف دوڑتی ہے۔

۞......بعض نے کہا: ''اَلِهَ الرَّجُلُ'' سے مشتق ہے۔ جب کوئی مصیبت آئے اور بندہ پریشان ہو جائے، تمام مخلوق کو نقصان سے پناہ دینے والی اللہ کی ذات ہے۔ ﴿وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ﴾[المومنون:۸۸] (وہ سب کو پناہ دیتا ہے اس کو کسی کی پناہ کی ضرورت نہیں) اور وہی نعمت دینے والے ہیں۔

﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾[النحل:۵۳]

''اور تمہیں جو نعمت بھی حاصل ہوتی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔''

﴿وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾[الانعام:۱۴]

''اللہ پاک تمام مخلوق کو کھانا دینے والے ہیں اور خود کھانے سے پاک ہیں۔''

﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾[النساء:۷۸]

''ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔''

وہ ہر چیز کو ایجاد فرمانے والے ہیں۔

۞......علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظ ''اَللّٰہُ'' کسی سے مشتق نہیں ہے۔ یہ اسم جامد ہے۔ اگر ہم اشتقاق مانیں گے تو اس معنی کے اندر اور بھی شریک ہوں گے۔ اور باقی جتنے بھی اسماء ہیں وہ اس کی صفات بن کر آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ اسم مشتق نہیں ہے۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجھے اس پر اعتراض ہے کہ علامہ رازی نے لکھا ہے کہ لفظ ''اَللّٰہُ'' عربی زبان کا لفظ بھی نہیں ہے، بلکہ یہ عبرانی لفظ ہے۔ لیکن یہ ضعیف قول ہے۔ اور اس کے بعد علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مخلوقات دو قسم کی ہیں: ایک قسم وہ مخلوق ہے جو دریا کے کنارے پر ہے اور دوسری قسم کی مخلوقات وہ ہیں جو اندھیرے میں ہیں، جنگلات کے اندر پڑھے ہوئے ہیں۔ گویا کہ انہوں نے اپنے عقل اور ارواح کھو ڈالے ہیں۔ اور جو اس ساحل کو پانے والے ہیں گویا کہ وہ اللہ کے اس نور کے میدان میں آ گئے۔ انہوں نے وحدانیت اور فردانیت کو سمجھ لیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ تمام مخلوق اللہ کی مضطرب ہے، تضرع کرنے والی ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ ان پر اللہ کی رحمت ہوئی اور وہ توحید کے راز کو پا گئے۔ اور بعض ڈھونڈتے رہے ڈھونڈتے رہے، لیکن وہ توحید تک پہنچ بھی نہیں پائے۔ وگرنہ اللہ کی تلاش سب کو ہے۔ اسی طرح ہندو، بدھ مت ہیں، عیسائی ہیں اور یہودی ہیں، اصل میں وہ خدا کی تلاش میں ہیں۔ ہم ان کو مومن نہیں کہیں گے، کیونکہ انہوں نے کلمہ نہیں پڑھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہیں کیا۔ لیکن تلاش ہے، وہ کہتے ہیں کہ کوئی گاڈ ہے، کوئی دیوتا ہے، کوئی داتا ہے، کوئی رام ہے اپنی اپنی عقلوں میں سوچ رہے ہیں، لیکن گمراہ ہو رہے ہیں، منزل پر پہنچ نہیں پائے۔ اس لیے کہا کہ یہ لفظ ایسا ہے کہ ہر آدمی اس کی طرف مضطر ہے اور اس کی طرف دوڑ رہا ہے۔

بعض حضرات نے کہا ''اَللّٰہُ'' علو سے ہے کہ صفت علو اس کے لیے ہے۔ وہ سب سے اوپر ہے، اس کے اوپر کوئی نہیں ہے۔

۞......بعض نے کہا: ''اَلَہَ الرَّجُلُ'' سے ہے ''اِذَا تَعَبَّدَ'' جب آدمی عبادت میں کھو جائے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ﴾

[الاعراف: ۱۲۷]

''اور قوم فرعون کے سرداروں نے کہا کہ کیا آپ موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم کو یوں ہی رہنے دیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے پھریں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو ترک کیے رہیں۔''

''باء'' پر بھی بحث ہو چکی ہے، ''اسم'' پر بھی بحث ہو چکی ہے اور لفظ ''اللہ'' پر بھی بحث ہو چکی ہے۔ آگے اللہ کی صفات ''اَلرَّحْمٰنُ'' اور ''اَلرَّحِیْمُ'' کا بیان ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۹، ۲۰، فصل فی فضلها (البسملة)]

﴿اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ﴾

یہ دونوں رحمت سے مشتق ہیں اور ان کے اندر مبالغہ پایا جاتا ہے۔ کہا: اللہ بہت رحمت والا، نہایت ہی مہربان ہے۔ ''اَلرَّحْمٰنُ'' کے اندر ''اَلرَّحِیْمُ'' سے بھی زیادہ مبالغہ ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ دونوں بھی غیر مشتق ہیں، اسم جامد ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ لفظ ''اَلرَّحْمٰنِ'' عبرانی ہے، عربی لفظ نہیں ہے۔ اور ''اَلرَّحِیْمُ'' عربی کا لفظ ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ مشتق ہے۔ ان کا استدلال وہ حدیث قدسی ہے جو امام ترمذی رحمہ اللہ نے نقل فرمائی ہے:

((فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: قَالَ اللّٰهُ: أَنَا اللّٰهُ، وَأَنَا الرَّحْمٰنُ، خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَهَا مِنَ اسْمِي، فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ، وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّهُ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۱۹۰۷، باب: ما جاء في قطيعة الرحم]

''اللہ فرماتے ہیں: میری صفت الرحمن ہے اور میں نے اس رحم کو پیدا کیا ہے۔ یہ صلہ رحمی اور رشتہ داری اس کا اشتقاق بھی رحمت سے ہے۔ جو اپنے رشتہ داروں کو ملانے کی کوشش کرے گا میں بھی اپنی رحمت سے اس کو ملا دوں گا اور جو کاٹنے کی کوشش کرے گا میں اس کو اپنی رحمت سے جدا کر دوں گا۔''

اس لیے حکم ہے کہ انسان رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔ وہ رشتہ دار والد کی طرف سے ہو یا والدہ کی طرف سے ہوں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۰، فصل فی فضلها (البسملة)]

رشتے نسب سے ہوتے ہیں یا صہر کے ہوتے ہیں؟

رشتہ یا تو باپ سے چلتا ہے یا جہاں شادی ہوئی، ماں کے خاندان سے یا بیوی کے رشتے دار۔ ان سب سے

قرابت ہوتی ہے۔ بعض زیادہ قریب ہوتے ہیں اور بعض بعید ہوتے ہیں۔ اس لیے ذوی الانساب ہوتے ہیں، ذوی الارحام ہوتے ہیں، ذوی الاصول کہلاتے ہیں، ذوی الفروع کہلاتے ہیں اور عصبات کہلاتے ہیں۔ ان کے بارے میں حکم یہی ہے کہ ان کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔ صلہ رحمی کا معنی یہ ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ ان کو پناہ دینا، ان کی مدد کرنا، ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونا، ان کی مصیبتوں میں شریک ہونا، ان کی خوشیوں میں شریک ہونا اور اگر آپس میں رشتہ داریاں ہوں تو رشتے داریاں نبھانا، تاکہ رشتے جڑے رہیں، خاندان جڑے رہیں اور ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ تعلق قائم رہے۔ اس لیے فرمایا: اس حدیث کے اندر اللہ نے رحمن کا خود ہی اشتقاق بیان فرما دیا ہے۔ اس لیے جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ رحمن اور رحیم مشتق نام ہیں۔

عرب کے لوگ رحمن کے نام سے انکار کرتے تھے۔ ان کو پتا ہی نہیں تھا کہ یہ اللہ کا نام ہے۔ وہ کہتے تھے کہ محمد ﷺ خود کبھی اللہ کو مانتے ہیں اور کبھی رحمن کو مانتے ہیں۔ نعوذ باللہ! خود دو خدا ماننے لگ گئے۔ وہ جاہل تھے، انکار کرنے لگ گئے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کی اصل ذات ایک ہی ہے، باقی اس کی صفات ہیں۔ ایک چیز کے اندر کئی صفتیں ہوتی ہیں۔ بعض دنیا کی چیزوں میں دیکھ لیں کہ ایک آدمی کے اندر علم کی صفت بھی ہوتی ہے، جمال کی صفت بھی ہوتی ہے، سخاوت کی صفت بھی ہوتی ہے۔ ایک آدمی کے بارے میں آپ کہیں کہ بڑا سخی ہے۔ اگر وہ عالم ہے تو آپ اس کے علم کا انکار تو نہیں کر رہے۔ تو انہوں نے جہل کی وجہ سے رحمن کا انکار کیا۔

قرآن میں دو خاص نور:

سورۂ فاتحہ باعتبار قرآت کے بھی پہلی سورت ہے اور باعتبار نزولِ سورت کاملہ کے بھی پہلی سورت ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے ''سُوْرَةُ الْعَلَقِ'' اور ''سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ'' کی کچھ کچھ آیات تو اتر چکی تھیں، مگر پوری سورت کوئی بھی نہیں اتری تھی۔ اور اگرچہ قرآن تو سارا نور ہے، کیونکہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾ [النساء: ۱۷۴]

''اور ہم نے آپ کی طرف نورِ مبین بھیجا۔''

لیکن سورۂ فاتحہ اور خواتیم سورۃ البقرہ کے بارے میں فرمایا: اللہ نے خاص فرشتہ نازل فرمایا جو کبھی زمین پر نہیں اترا تھا۔ اس نے آکر مجھے بشارت دی کہ اللہ نے آپ کو دو نور عطا فرمائے ہیں: ایک سورۂ فاتحہ ہے اور ایک سورۂ بقرہ ہے۔

سورۃ الفاتحہ کے بعض نام:

اس سورۃ الفاتحہ کو سبع مثانی بھی کہا گیا ہے، کیونکہ یہ سورت بار بار دہرائی جاتی ہے۔ اس کو سورۃ شافیہ بھی کہا گیا ہے، کیونکہ اللہ نے اس میں شفا رکھی ہے۔ اس کا نام ام الکتاب بھی ہے کہ یہ سارے قرآن کا خلاصہ ہے۔ قرآن مقدس میں جن مضامین پر اللہ کا کلام ہے ان سب کا اگر خلاصہ نکالا جائے تو سورۃ الفاتحہ ہے۔

تعوذ کی اقسام:

جمہور کی رائے یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت سے پہلے انسان تعوذ ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ'' پڑھے اور ایک روایت میں ہے ''أَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ'' پڑھے اور ایک روایت میں ہے کہ ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ'' پڑھے۔ یہ تمام قسم کے تعوذ احادیث میں ثابت ہیں۔

مصاحفِ عثمانی (جن کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے نقل کرا کے پوری دنیا میں بھجوایا تھا ان) کے اندر ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' ہے۔ اس کا مختصر لفظی ترجمہ یہ ہے کہ یا اللہ! میں آپ کی پناہ میں آتا ہوں شیطان مردود کے فتنہ، مکر، وساوس اور حملوں سے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۳، تَفْسِيْرُ الْاِسْتِعَاذَةِ وَاَحْكَامُهَا]

شیطان سے پناہ کی ضرورت:

ایک ہمارا انسانوں میں سے ظاہری دشمن ہے اور ایک جنات میں سے باطنی دشمن ہے۔ ظاہری دشمن کا علاج یہ ہے کہ اخلاق کے ساتھ معاملہ کریں کہ وہ گالیاں دے تو آپ اس کو دعا دیں، وہ رشتہ توڑنا چاہے تو آپ جوڑنے کی کوشش کریں۔ حسنِ اخلاق، حسنِ معاشرت اور مدارات سے اس کو آدمی قائل کر لیتا ہے، لیکن جن اور شیطان ایسا دشمن ہے جو ہمیں نظر بھی نہیں آتا اور ہمارے پاس اس کا کوئی توڑ بھی نہیں ہے ماسوا اس کے کہ ہم اس ذات کی پناہ پکڑ لیں جس کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جنات بھی نہیں دیکھ سکتے اور انسان بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ﴾ [الانعام: ۱۰۳]

''دنیا کے اندر کوئی آنکھ اس کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی۔''

جب ہم نے ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھا تو ہم اللہ کی پناہ میں آ گئے۔

نماز میں فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ آہستہ پڑھیں:

اگر نماز میں ہے تو پہلے تعوذ اور تسمیہ پڑھے گا، لیکن آگے اگر سورت شروع کرے تو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" تو پڑھے گا، لیکن تعوذ نہیں پڑھے گا۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" زور سے پڑھی جائے، چاہے نماز ہو یا خارجِ نماز ہو، کیونکہ ان کے نزدیک یہ سورۂ فاتحہ کا حصہ ہے۔ چونکہ سورت فاتحہ بھی جہراً پڑھی جاتی ہے اس لیے امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک "بِسْمِ اللّٰهِ" کو بھی جہراً پڑھا جائے گا۔ باقی ائمہ اور جمہور رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ "بِسْمِ اللّٰهِ" پڑھی جائے، لیکن سراً اور آہستہ پڑھی جائے، اسے جہراً نہیں پڑھا جائے گا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا یہی معمول تھا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بھی نمازیں پڑھیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بھی نمازیں پڑھیں، حضرت عمر، عثمان وعلی رضی اللہ عنہم کے پیچھے بھی نمازیں پڑھیں۔ جب وہ نماز شروع کرتے تو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے شروع کرتے تھے۔ یعنی "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ" اور "بِسْمِ اللّٰهِ" کو آہستہ پڑھتے تھے۔

[صحیح مسلم، تحت باب حُجَّةِ مَنْ قَالَ لَا يُجْهَرُ بِالْبَسْمَلَةِ]

سورۂ فاتحہ جامع دعا ہے:

سورۂ فاتحہ کی پہلی تین آیات کے اندر حمد وثنا ہے اور آخری تین آیات میں دعا ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ اس سے جامع دعا اور کوئی نہیں ہو سکتی جو اللہ نے اپنے بندوں کو خود سکھائی ہے، کیونکہ یہ رحمتِ خداوندی کا قاعدہ ہے کہ جب اللہ اپنے بندوں سے راضی ہوتے ہیں تو مانگنا بھی خود سکھلا دیتے ہیں۔ اسی طرح جب اللہ اپنے بندوں پر رحمت فرماتے ہیں تو دعا مانگنے کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ کبھی آدمی دعا مانگ رہا ہوتا ہے، لیکن اس میں دل نہیں لگ رہا ہوتا۔ کبھی زبان سے الفاظ صحیح معنوں میں ادا ہی نہیں ہو رہے ہوتے، کبھی دعا مانگتا ہے، لیکن جو مانگنا چاہتا ہے وہ اسے یاد ہی نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب کچھ میرے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا:

﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ ﴾[سبا:۱۳]

"اے آلِ داؤد! میرا شکر ادا کرو۔"

حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا: اے اللہ! میں تیرا شکر کیسے ادا کروں؟ شکر کرنے کی توفیق، شکر ادا کرنے والی زبان بھی آپ عطا فرماتے ہیں اور شکر ادا کرنے والے الفاظ بھی آپ سکھلاتے ہیں، میں کس کس نعمت کا شکر ادا کروں؟ تو اللہ نے فرمایا:

((اَلْاٰنَ شَكَرْتَنِيْ يَا دَاوٗدُ)) [تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۵۵۶، ابراہیم، الآیۃ: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا]

"اے میرے پیغمبر داؤد! اب تو نے میرا شکر ادا کیا ہے۔"

بندہ جب اپنے عجز کا اقرار کرتا ہے تو اللہ کی رحمت آتی ہے۔

علماء نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ اتنی جامع، کامل اور مکمل دعا ہے کہ اگر آدمی کو اور دعا نہ آئے اور اسی سے دعا کرلے تو ساری دنیا اور آخرت کی نعمتیں اس کو مل جاتی ہیں، کیونکہ پہلی تین آیات میں حمد وثنا سکھلائی گئی ہے اور آخری تین آیات میں دعا سکھلائی گئی ہے۔ اور درمیانی آیت میں من وجہ دعا ہے اور من وجہ ذکر وعبادت ہے۔ اس سے سبق ملا کہ جب بھی انسان دعا کرنا چاہے تو سب سے پہلے "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" پڑھے، اس کے بعد اللہ کی حمد وثنا بیان کرے، پھر اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور ربوبیت کا اقرار کرے، پھر اپنی عبودیت اور بندگی کا اقرار کرے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگے۔ اور جو دعا مانگے اس کا زیادہ تر تعلق آخرت کی نعمتوں سے ہو، کیونکہ دنیا فانی ہے اور اس کی نعمتیں بھی فانی ہیں۔

اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم لوگ زمزم بھی پیتے ہیں تو دنیا کا تصور ہوتا ہے کہ بیماری چلی جائے، شفا مل جائے۔

اکابر کی دعا میں عظمت:

اگرچہ یہ جائز ہے، لیکن جن کی نظر آخرت کی نعمتوں پر ہوتی تھی وہ یوں دعا مانگتے تھے جیسے حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ، جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بھی استاذ ہیں اور محدث جلیل ہیں۔ انہوں نے جب زمزم پیا تو دعا مانگی: اے اللہ! تیرے دروازے پر کھڑا ہوں اور تیرے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی حدیث ہے۔ زمزم کا پانی جس غرض کے لیے پیا جائے وہی غرض پوری ہوتی ہے۔ یا اللہ! میں یہ دعا مانگتا ہوں کہ مجھے قیامت کے دن کی پیاس اور گرمی سے بچالینا۔

ان کی نظروں میں یہ دنیا آنی اور جانی شے ہے، ان کی نظر آخرت پر تھی۔

کسی جھوٹے فرقے نے اپنے معبود کا نام اللہ نہیں رکھا:

خدا کی شان ہے کہ دنیا میں کئی فرقے پیدا ہوئے۔ کسی نے اپنے جھوٹے معبود کا نام اللہ نہیں رکھا ہے۔ کسی نے لات رکھا، عزیٰ رکھا، منات رکھ لیا، کسی نے بھگوان اور کسی نے رام رکھ لیا، کسی نے دیوی، دیوتا، کسی نے کرشنا رکھ لیا، کسی نے بدھا رکھ لیا، لیکن لفظ اللہ نہیں رکھا۔ کافروں کی جرأت نہیں ہوئی کہ جھوٹے معبود کا نام اللہ رکھ لیں۔

اس لفظ کا کوئی تثنیہ بھی نہیں ہے اور جمع بھی نہیں ہے۔ اللہ کی صفت تو ''اَحَدٌ'' ہے، ''اَلصَّمَدُ'' ہے اور ''لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ'' ہے۔

کسی کو رب کہنا جائز نہیں:

''رَبٌّ'' کہتے ہیں ایسی تربیت کرنے والا جیسے جیسے حالات ہوں، حتیٰ کہ کمال تک پہنچادے۔ یہ صفت صرف اللہ کی ہے۔ ''رَبٌّ'' کا لفظ اللہ کے علاوہ کسی کے ساتھ بغیر اضافت کے نہیں لگایا جاتا ہے۔ کسی اور کو رب تو نہیں کہہ سکتے، ہاں ''رَبُّ الدَّارِ'' کہہ سکتے ہیں، اس گھر کا یہ مالک ہے۔ بغیر اضافت کے ''رَبٌّ'' کا اطلاق صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر ہوگا۔

غیر اللہ کی تربیت کی حد ہے:

تربیت تو ماں باپ بھی کرتے ہیں۔ جیسے قرآن مقدس میں ارشاد فرمایا:

﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ [الاسراء: ۲۴]

''اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحمت فرمایئے جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا اور میری پرورش کی ہے۔''

تربیت ماں باپ بھی کرتے ہیں، استاذ بھی کرتے ہیں اور کہیں کام سیکھنے کے لیے جائیں وہ بھی تربیت کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تربیتوں کی ایک حد ہے۔ ماں باپ تربیت کرتے ہیں، جب آپ بڑے ہوجائیں گے تو ضرورت نہیں ہے۔ استاد تربیت کرے گا، ہر دور گزرتا جائے گا، لیکن یہ رب کی صفت ہے۔ جب ہم ماں کے بطن میں تھے اس وقت سے تربیت کرتے ہیں اور مرنے تک کرتے ہیں۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو چل نہیں سکتا، بول نہیں سکتا اور مانگ نہیں سکتا، اللہ نے بچے کو رونا سکھلا دیا کہ تم روؤ تو دیکھو سارا گھر تمہارے لیے بھاگتا پھرے گا۔

ایک علمی نکتہ:

علماء نے لکھا ہے کہ جب تم پیدا ہوتے ہو تو رو رہے ہوتے ہو اور عالم ہنس رہا ہوتا ہے۔ اب جب موت کا وقت آئے تو تم ہنس رہے ہو اور دنیا رو رہی ہو کہ تمہیں جنت کی خوشخبری مل رہی ہو، جنت کے فرشتے تمہیں لینے کے لیے آئے ہوئے ہوں، اس لیے تم ہنس رہے ہو اور لوگ رہے ہو۔ اور لوگ رو رہے ہوں کہ کتنا اخلاق والا اور اچھا آدمی تھا، کتنا ایمان، احسان اور فیض والا تھا اور کتنے لوگوں کو نفع پہنچانے والا تھا۔

رب تو سب کی تربیت کرتا ہے:

پھر جب تھوڑا سا وقت گزرا تو اللہ نے پاؤں پر گھسٹنے کی تربیت دی، پھر اماں، ابا کہنے کی تربیت دی، پھر پاؤں پر چلنے کی تربیت دی اور پھر تم بڑے ہوتے گئے اور ہر دور میں اللہ تعالیٰ کی تربیتیں تمہارے ساتھ رہیں۔ "اَلْعَالَمِیْنَ" ہر جنس کو ایک عالم کہا جاتا ہے۔ عالم نباتات، عالم حیوانات وغیرہ اور خدا جانے اس خلا کے اندر کتنے عالم ہیں!؟ علماء نے لکھا ہے کہ چالیس ہزار عالم ہیں۔

ایک روایت میں ہے جس کو قرطبی رحمہ اللہ اور رازی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ اسی ہزار عالم ہیں اور ہر عالم کے لیے احکامات علیحدہ ہیں۔

جدید سائنس نے مریخ اور چاند پر آبادیوں کے آثار ڈھونڈے ہیں، لیکن ان آبادیوں کا اللہ نے کیا نظام رکھا ہے اور ان پر کونسی مخلوقات ہیں؟ ابھی تک یہ ہمارے سامنے نہیں آیا ہے۔ جیسے ہم دنیا کے اندر ہوا اور پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، لیکن ان پر جو مخلوق ہے ہوسکتا ہے ان کو اس آکسیجن کی ضرورت بھی نہ پڑتی ہو، کیونکہ اللہ نے ہر جگہ اپنی مخلوق علیحدہ پیدا فرمائی ہے۔ بعض مخلوق ایسی ہے جو خشکی کے اندر ہوتی ہے اور کوئی سمندر کے اندر ہوتی ہے اور بعض مخلوقات ہواؤں اور فضاؤں میں معلق ہیں۔ اس لیے فرمایا: ان تمام عالم کو تربیت دینے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

جانوروں کے بچوں کی سمجھداری:

ایک مرغی کا بچہ جب پیدا ہوتا ہے اور پہلے دن کا ہو، اگر وہ بلی کی آواز سنتا ہے یا بلی کو دیکھتا ہے تو فوراً ماں کے پروں کے نیچے چھپ جاتا ہے۔ اس کو یہ تربیت اور یہ سبق کس نے پڑھایا ہے؟

ایک جانور کے بچے کو دیکھ لیں، آپ کے پاس دو سو گائے ہیں اور ان کی تازہ ولادت ہوئی ہے۔ دو سو بچے بھی ساتھ ہیں، ہر بچہ اپنی ماں کے پاس جاتا ہے، حالانکہ سب کا رنگ، شکل، قد وقامت اور دودھ کا ذائقہ ایک ہے، لیکن سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ جانور کا بچہ اپنی ماں کو چھوڑ کر کسی دوسری گائے کو چمٹ جائے۔ یہ تربیت دینے والا اللہ ہے۔

چلو! تم ان کو تربیت دو گے جو نفع دینے والی ہیں، لیکن جو نقصان دینے والی ہیں ان کو تربیت دینے والا کون ہے؟ جس کے تم قریب بھی نہیں بھٹک سکتے۔ اور ایک ایسی مخلوق جو تمہارے سامنے آئے تو تم ڈر جاؤ۔ مثلاً: جن ہیں، اگر ان کو دیکھنے کا حوصلہ رکھ لیں تو پھر ان کو پکڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے۔ ان کا رب بھی اللہ ہے۔

پتھر میں رزق پہنچانے کا واقعہ:

ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک پتھر کو توڑا اور وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ دیکھا کہ اس کے درمیان میں ایک کیڑا بیٹھا ہوا ہے اور اس کے منہ میں ایک سبز پتہ پڑا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا: اے اللہ! یہ تیری کمال تربیت ہے کہ ایک پتھر ملا ہوا ہے، اس کے اندر تازہ غذا کا پہنچانا تیرا کام ہے۔ اسی طرح بعض جانور گوشت کھاتے ہیں، سارا دن باغ میں پھرتے رہیں گے، لیکن سبزہ نہیں کھائیں گے۔ اور بعض جانور سبزہ کھاتے ہیں، گوشت نہیں کھاتے، بعض پرندے صرف مچھلی کھاتے ہیں۔ تو ان تمام کو تربیت دینا، مخرج اور مدخل سمجھانا، یہ اللہ کی صفت ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ (تمام تعریفوں کا حقدار بھی اللہ ہے جو سب کا رب ہے)۔

مخلوقات اللہ کی عبادت کیسے کرتی ہیں؟

قرآن میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ [الاسراء: ۴۴]

''کوئی چیز ایسی نہیں ہے مگر وہ اپنے رب کی حمد و ثنا کرتی رہتی ہے، لیکن تم لوگ ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔''

بعض زبان سے حمد کرتی ہیں اور بعض حال سے حمد کرتی ہیں، یعنی ان کا وجود اللہ کی ذات پر دلالت کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح درخت، پہاڑ، جانور ہر چیز کی ایک عبادت اور تسبیح ہے۔ اس کا اندازہ یوں لگائیں کہ جیسے درخت سیدھے کھڑے ہونے والے ہیں وہ قیام میں ہیں، اسی طرح جو جانور چار پاؤں پر چل رہے ہیں وہ حالتِ رکوع میں ہیں، اسی طرح بعض جانور سینے پر چلتے ہیں، گویا وہ ہر وقت سجدہ کی حالت میں ہیں اور پہاڑ ہر وقت تشہد میں

بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے انسان کو جامع عبادت کا طریقہ سکھلایا ہے۔ اس میں قیام بھی ہے، رکوع، سجود اور تشہد بھی ہے اور ذکر اللہ بھی ہے۔ اللہ نے فرمایا: جب تیری ان ساری چیزوں پر نظر پڑے گی تو تم بھی کہو گے: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝۱﴾۔

آسمانوں کے دروازے بغیر اجازت نہیں کھلتے:

اور وہ عالم جو ہم نے ابھی نہیں دیکھے ہیں۔ اگر چہ ہم نے ترقی کی ہے، چاند پر پہنچ گئے ہیں، ابھی تو وہ دور دراز کے علاقے بھی باقی ہیں جن کی روشنی بھی زمین تک نہیں آئی ہے۔ اور اگر پہنچے بھی ہیں تو یہ وہ سیارے ہیں جو آسمانوں سے نیچے ہیں، کیونکہ آسمان کے دروازے اللہ کے حکم کے بغیر کسی کے لیے بھی نہیں کھولے جاتے۔ جب مدنی پاک ﷺ معراج کے لیے تشریف لے گئے تو ان کے لیے بھی دروازے کھلوائے جاتے تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام آواز دیتے اور اندر سے پوچھا جاتا تھا کہ کون ہے؟ تو جبرائیل علیہ السلام جواب دیتے کہ میں جبرائیل ہوں۔ دوسرا سوال ہوتا تھا: ''مَنْ مَّعَكَ؟'' تمہارے ساتھ کون ہیں؟ تو جبرائیل علیہ السلام جواب دیتے تھے: محمد رسول اللہ۔ اور تیسرا سوال کیا ان کو معراج کا دعوت نامہ پہنچایا گیا؟ تو جبرائیل علیہ السلام جواب دیتے کہ ہاں۔ پھر ان کے لیے دروازہ کھلتا اور میرے مدنی پاک ﷺ اور پر تشریف لے جاتے تھے۔ تو وہ عالم جن تک ہماری رسائی بھی نہیں ہے ان سب کو تربیت دینے والا اللہ ہے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۸۸۷، بابُ: المِعْرَاجِ]

کسی کو ''رحمٰن'' یا ''رَحِیم'' کہنا:

''رحمٰن'' اور ''رَحِیم'' صرف اللہ کے نام ہیں۔ آج عبد الرحمٰن، عطاء الرحمٰن اور فضل الرحمٰن نام رکھ لیتے ہیں اور ان کو رحمٰن صاحب پکارتے ہیں۔ یہ غلط ہے اور آدمی کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

آج کے زمانے میں بڑے ہونے کی پہچان:

اس لیے پورا نام پکاریں۔ اصل مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگوں نے عقائد بھی بدل ڈالے، اپنی صورتیں اور عادات بھی بدل ڈالیں، حتیٰ کہ اپنے نام بھی بدل ڈالے۔ آج بڑا آدمی اس کو کہا جاتا ہے جس کے سر سے پاؤں تک اسلام کی جھلک نظر نہ آئے، جس کا نام بھی اسلامی نہ ہو، جس کی کوٹھی میں کبھی نماز نہ پڑھی گئی ہو، قرآن کی تلاوت نہ ہوئی ہو، جس کے بچے انگریزی بولتے ہوں اور انگریزی بود و باش ہو۔ اور اگر اس کے گھر کے قریب کوئی مسجد نظر آئے

اور وہ قرآن پڑھتا ہوا نظر آجائے اور وہ بوڑھا ہو، ہاتھ کے اندر تسبیح بھی ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ چھوڑو یہ مولوی ہو گیا ہے۔ ابھی تو ہماری جوانی ہے، ہم تو کھا پی لیں۔

نام بدل دینا:

نام بدلنا یہ انگریزوں کی عادت ہے، وہ ہمیشہ آدھے نام کے ساتھ پکارتے ہیں۔ اگر کسی کا نام اکرم ہے تو اس کو ''اکو'' کہیں گے۔ ہمارے لوگ بھی ان کی اتباع کرتے کرتے اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے نام بھی بدل ڈالے ہیں۔ یہ ابتلا تو گناہ ہے، لیکن جب جان بوجھ کر ایسے کرے تو کفر اور شرک تک پہنچ جاتا ہے۔

اللہ کی رحمت کا اندازہ:

''اَلرَّحْمٰن'' اور ''اَلرَّحِیْم'' دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں، یعنی عام رحمت والا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ نے سو رحمتیں پیدا فرمائیں: ان میں سے ایک رحمت پوری دنیا پر تقسیم کی ہے۔ دنیا کے اندر جتنی محبت پائی جاتی ہے یہ صرف ایک رحمت کا اثر ہے۔ اور ننانوے رحمتیں اللہ نے اپنے پاس رکھی ہیں۔ قیامت والے دن پوری سو رحمتوں کا اظہار فرمائیں گے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ قیامت کے دن اللہ کی رحمت کا کیا عالم ہوگا!؟ [صحیح البخاری، حدیث: ۶۰۰۰، باب: جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ]

اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ اللہ نے عرش کے نیچے ایک حوض پر لکھ دیا ہے:

''إِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي'' [صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۲۲، باب: وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ]

''میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔''

اسی سے رحمت کا اندازہ لگائیں کہ ساری زندگی کفر و شرک میں گزری، لیکن اللہ فرماتے ہیں کہ تم توبہ کرو، میں توبہ قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ساری زندگی گناہوں میں گزری، اللہ کے در پر سر ڈالا تو اللہ نے سارے گناہ معاف کر دیے۔ اور پھر حکم دے دیتے ہیں کہ میرے بندے نے توبہ کر لی ہے، اب اسے پچھلے گناہوں کا طعنہ بھی نہ دو۔ فرمایا:

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ)) [سنن ابن ماجہ، رقم: ۴۲۵۰]

''گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔''

جب آدمی گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے تو ہم اس کے گناہ ختم کر دیتے ہیں، بلکہ قرآن مجید میں ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا، جن لوگوں نے قتل کیا اور جن لوگوں نے زنا کیے، لیکن انہوں نے توبہ کر لی اور ایمان لا کر اللہ کے دروازے پر آگئے، ان کے گناہوں کے بدلے میں نیکیاں لکھ دو۔

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳﴾

قیامت کی ضرورت:

﴿يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سے مراد یوم قیامت ہے، کیونکہ اللہ نے ہمیں دنیا میں بے کار نہیں بھیجا۔ کوئی دن ایسا تو ہو جس میں اللہ تعالیٰ ماننے والوں پر انعام فرمائیں اور نہ ماننے والوں کو سزا دیں۔

قیامت میں سب اختیار اور ملک اللہ کا:

اللہ صرف ''يَوْمَ الْجَزَاءِ'' یا ''يَوْمَ الْقِيَامَةِ'' کے مالک ہی نہیں، بلکہ دنیا کے بھی مالک ہیں۔ دنیا کے اندر کوئی نہ کوئی عارضی ملک کا دعویٰ کرتا ہے اور اللہ نے بھی اس کو عزت بخشی ہے۔ لیکن قیامت کے دن نہ کوئی ظاہری مالک ہوگا، نہ کوئی باطنی مالک ہوگا، نہ کوئی صورۃً مالک ہوگا اور نہ کوئی معناً مالک ہوگا، صرف اللہ ہی مالک ہوں گے۔ اس لیے قرآن میں فرمایا:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝۱۶﴾[غافر:۱۶]

''آج کے روز کس کی حکومت ہوگی؟ بس اللہ ہی کی ہوگی جو یکتا (اور) غالب ہے۔''

اس لیے فرمایا:

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳﴾

اس دن ہر آدمی اپنی نفسا نفسی میں مبتلا ہوگا۔

قیامت کے دن سب کے بدلے چکا دیے جائیں گے:

قیامت کے دن اللہ فیصلے فرمائیں گے۔ فرمایا کہ ایک اندھا ہے اور ایک دیکھنے والا ہے، کیا برابر ہو سکتے ہیں؟ ایک مومن ہے اور ایک کافر ہے، کیا برابر ہو سکتے ہیں؟ جب یہ برابر نہیں ہو سکتے تو میں ان کو قیامت کے دن کیسے برابر کروں

گا؟ میں ایمان والوں کو ان کے ایمان کے مطابق بدلہ دوں گا، کفر والوں کو ان کے کفر کے مطابق سزا دوں گا اور شرک والوں کو ان کے شرک کے مطابق سزا دوں گا۔

کسی کو رؤف، رحیم، سمیع و بصیر کہنا:

جیسے کسی کا نام اللہ نہیں رکھا جا سکتا، اسی طرح اللہ کے سوا کسی کا نام ''رحمٰن'' بھی نہیں ہے، جبکہ ''رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ'' اللہ کے سوا قرآن میں حضور ﷺ کی بھی صفت آئی ہے۔ اللہ کی بعض صفات ایسی ہیں کہ جن کا اللہ کے سوا کسی پر اطلاق جائز نہیں اور بعض صفات ایسی ہیں جن کا اللہ کے ماسوا پر اطلاق جائز ہے۔ جیسے آپ کسی کو ''رَحْمٰن''، ''خَالِقٌ'' اور ''رَازِقٌ'' نہیں کہہ سکتے، لیکن کسی کو ''رَحِيْم''، ''سَمِيْعٌ'' اور ''بَصِيْرٌ'' کی صفت سے موصوف کر سکتے ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝٢﴾ [القیامۃ: ۲]

''ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفے سے اس طرح پیدا کیا کہ اسے آزمائیں۔ پھر اسے ایسا بنایا کہ وہ سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے۔''

لہٰذا رحمٰن ان صفات میں سے ہے جس کا اطلاق اللہ کے ماسوا پر جائز نہیں ہے۔

مسیلمہ کذاب کے دعوے:

جب اللہ ناراض ہوتے ہیں تو عقل چھن جاتی ہے۔ مسیلمہ کذاب نے جہالت کی اور اپنا نام رحمٰن رکھا۔ اب مسیلمہ کذاب نے دعویٰ تو نبوت کا کیا، لیکن رحمٰن نام رکھ کر خدا بھی بن بیٹھا۔ اس لیے اس کی صفت ایسی مشہور ہوئی کہ اب کوئی بھی نام لے تو مسیلمہ کذاب کہے گا۔

مرزا قادیانی کے مختلف دعوے:

مرزا قادیانی لعنۃ اللہ علیہ کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی مجدد بن بیٹھا، کبھی مجتہد بن گیا اور ترقی کر کے مسیح موعود بن گیا۔ اور کبھی یہ کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ مجھے حمل ٹھہر گیا ہے۔ لکھا کہ مجھے کشف ہوا کہ میں عورت ہوں اور اللہ نے مجھ پر اپنی قوت کا اظہار کیا ہے۔ معاذ اللہ! یہ کسی نبی کی بات ہو سکتی ہے یا کسی لعنتی کی بات ہوتی ہے؟ بدقسمتی کہ بڑی بڑی ڈگریوں والے اس کے دھوکے میں ہیں، کیونکہ باطل فرقے پڑھانے میں بڑی امداد کرتے ہیں، ان کو اعلیٰ عہدوں

پر پہنچاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مرزا پاگل ہے، لیکن اپنے عہدوں کو بچانے کے لیے لگے رہتے ہیں۔

مسیلمہ کذاب کا انجام:

اور مسیلمہ کذاب کی حکومت بھی ایسی ہے کہ حضور ﷺ کی طرف پیغام بھیجا کہ اگر اپنی وفات کے بعد مجھے خلیفہ بنا دیں تو میری نبوت کا دعویٰ ختم ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میرے ہاتھ میں جو لکڑی ہے یہ بھی کسی بے ایمان کو نہیں دے سکتا۔

تو اس نے رحمٰن نام رکھنے کی جرأت کی تو اللہ نے اس کو کذاب کی صفت کے ساتھ متصف کیا اور وہ اسی کفر میں مر گیا۔ دعا کریں اللہ پاک اپنی رحمت سے ہمیں صراطِ مستقیم پر رکھیں، وگرنہ آدمی کتنا بھی پڑھا ہوا کیوں نہ ہو، بھٹکتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

"بِسْمِ اللّٰهِ" میں "الرَّحْمٰنِ" اور "الرَّحِيْمِ" دو نام کیوں آئے؟

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ "الرَّحْمٰنِ" کے اندر زیادہ عموم ہے تو پھر "الرَّحِيْمِ" کی صفت ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ علماء نے فرمایا کہ اگر صرف "الرَّحْمٰنِ" ذکر فرماتے تو جاہلوں کے دماغ میں آسکتا تھا کہ "اللّٰهِ" سے اور ذات مراد ہے اور "الرَّحْمٰنِ" سے کوئی دوسری ذات مراد ہے۔ اس لیے جب حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" لکھوایا تو کافروں نے کہا: ہم تو "الرَّحْمٰنِ" کو مانتے ہی نہیں ہیں۔ اس لیے جب دونوں صفات آگئیں تو اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کا فائدہ:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی۔ دنیا کی تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس زمانے میں صحابہ اور تابعین موجود تھے۔ انہوں نے اس صلح کو پڑھا اور سنا۔ اسی صلح کی وجہ سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کوفہ چھوڑ کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ اس صلح کو ساری دنیا نے دیکھا اور سنا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے صلح میں کمال کر دیا کہ انہوں نے ایک سفید کاغذ پر اپنی مہر لگا کر صحابہ کے ذریعے سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا کہ میں صلح چاہتا ہوں۔ آپ اس کاغذ پر جو شرطیں لکھ دیں مجھے منظور ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صلح فرمالی اور خطبہ پڑھا۔ اس دور میں جو لوگ فتنہ پیدا کرنا چاہتے تھے انہوں نے بڑی سخت باتیں بھی

کیں، لیکن آپ نے فرمایا: میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی مسلمان کا خون گرے، قتلِ عام ہو اور اس طرح مسلمان ایک دوسرے کو کاٹتے رہیں۔ میں چاہتا ہوں امن، استقرار ہو، مسلمانوں کی قوت متحد ہو اور مسلمان کافروں کا مقابلہ کر سکیں۔

ہمارے ملنگوں کو ان کی صلح پسند نہ آئی۔ ان کی ''جلاء العیون'' ایک مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ اس طرح صلح ہوئی تھی جس طرح حضور ﷺ کی صلح حدیبیہ میں ہوئی تھی۔ وہ مسلمانوں کو کافر بنا رہے ہیں، حالانکہ حضور ﷺ نے بشارت دی تھی کہ یہ میرا بیٹا حسن سردار بنے گا اور میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے اس بیٹے کی برکت سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے بڑے جھگڑے میں صلح کرائے گا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۲۷۰۴، بَابُ: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ لِلْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ...]

اس حدیث میں حضور ﷺ نے دونوں جماعتوں کو مسلمان فرمایا ہے۔ ملنگوں نے اپنا بغض نکالنے کے لیے یہ کہہ دیا کہ یہ صلح حدیبیہ کی طرح صلح تھی۔

شیعوں کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بغض:

آج بھی جب ماہِ محرم آتا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نام لیا جائے گا، لیکن حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا نام مر مر کر لیں گے۔ کبھی انہوں نے یومِ حسن رضی اللہ عنہ نہیں منایا، نہ ان کا جلوس نکالتے ہیں اور نہ چہلم مناتے ہیں، کیونکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی تھی۔ آج چودہ سو سال کے بعد ان کو اعتراض ہو رہا ہے، جبکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بیٹے ہیں۔ جب یہ بڑے بیٹے کو نہیں مانتے تو یہ چھوٹے بیٹے کو کیسے مانتے ہیں؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی صلح چاہتے تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے راستے میں ان کو شہید کر دیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: میرا راستہ چھوڑ دو، میں خود جا کر یزید سے بات کرتا ہوں۔

اگر ملنگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کی اولاد سے محبت ہے اور اسی لیے ان کے بیٹوں کے نام لیتے ہیں تو پھر ان کی بیٹیوں کے نام بھی لیں۔ اس لیے نام نہیں لیتے کہ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا داماد ماننا پڑے گا۔

ہماری قوم کی جہالت:

ہماری قوم اتنی سادی ہے کہ اگر مدینہ سے کوئی آدمی خط لکھ دے کہ فلاں بزرگ کو یہ خواب آیا ہے۔ اگر تم نے اس خط کو سو دفعہ چھپوا کر تقسیم نہ کیا تو تمہاری اولاد مر جائے گی۔ تو وہ اس خط کو چھپوار ہے ہیں۔ یہ بڑی جاہل قوم ہے۔ اگر پیر نماز نہ پڑھے تو کہتے ہیں کہ مرشد ہیں، یہ تو اللہ تک پہنچے ہوئے ہیں۔ پیر ایسا بد بخت ہے کہ اس کو کھانے کی ضرورت ہے، نماز کی ضرورت نہیں ہے، روزہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ان کو کہا جائے کہ سنا ہے تمہارے مرشد بھنگ پیتے ہیں!؟ تو کہتے ہیں کہ یہ راز ہیں...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ...... دعا کریں کہ اللہ ان کو ہدایت نصیب فرمائیں۔

کینہ، بغض اور منافقت یہودیوں کے پاس ہیں۔ مشرکین نے تو سیدھا اسلام کا انکار کر دیا تھا کہ ہم اسلام کو نہیں مانتے۔ حضور ﷺ کو سچا اور امین بھی مانتے تھے، لیکن آپ ﷺ کو رسول نہیں مانتے تھے۔ حضور ﷺ کو قتل کرنے کے ارادے سے ساری رات گھر کے باہر کھڑے رہے، اندر نہیں گئے کہ گھر کے اندر عورتیں ہوتی ہیں۔ حضور ﷺ جب باہر نکلے تو دیکھا کہ مشرکین کھڑے ہیں تو حضور ﷺ نے "شَاهَتِ الْوُجُوْهُ" پڑھ کر ان پر مٹی پھینکی، جو محاصرہ کرنے والے سب مشرکین کی آنکھوں میں پہنچی اور آپ آگے تشریف لے گئے۔

ہمارے ہاں منافقت ہے کہ خانہ کعبہ کے ساتھ ٹھہرے ہیں تو کہہ رہے ہیں: یا اللہ! تو مہربانی فرما اور جب داتا دربار کے ساتھ کھڑے ہیں تو کہہ رہے ہیں: اے داتا! تو رحم فرما۔ سب کو راضی کر رہے ہیں کہ اللہ بھی راضی ہو جائے اور پیر بھی راضی ہو جائے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے۔

ہر آیت کو الگ الگ کر کے پڑھنا:

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب حضور ﷺ قرآن پڑھتے تو آیات کو علیحدہ کر کے پڑھتے تھے۔ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾، ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾، ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ②﴾، ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ③﴾ [الخ]

بعض قراء نے اس طرح پڑھا ہے اور بعض قراء نے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ میم کو لام کے ساتھ ملا کر، یعنی ایک آیت کے طور پر پڑھا ہے۔ بہر حال دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

﴿اَلْحَمْدُ﴾ میں مختلف قراءتیں اور اعراب:

﴿اَلْحَمْدُ﴾ قراء سبعہ کے ہاں اس کی قراءت دال کے پیش (ضمہ) کے ساتھ ہے۔ تو "اَلْحَمْدُ" مبتداء ہے اور لفظ "اَللّٰہ" خبر بن جائے گا۔

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ اور روبہ بن العجاج رحمہ اللہ نے ﴿اَلْحَمْدَ﴾ دال کے زبر کے ساتھ فرمایا ہے۔ تو ﴿اَلْحَمْدُ﴾ مفعول ہوگا اور فعل مقدر مانیں گے۔

ایک قرأت کے اندر دال کا بھی پیش ہے اور لام کا بھی پیش ہے۔ اگر چہ اس کے شواہد موجود ہیں، لیکن یہ قرأت شاذ ہے۔ بعض لوگوں نے ﴿اَلْحَمْدِ﴾ زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن جمہور کی قرأت راجح ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۲، الفاتحۃ: الآیۃ: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ...]

حمد وثنا کا مستحقِ حقیقی:

ابو جعفر ابنِ جریر نے اس کا معنیٰ "اَلشُّکْرُ لِلّٰہِ" کیا ہے۔ تمام شکر خالصا اللہ کے لیے ہیں، ان دوسروں کے لیے نہیں ہیں جن کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی ہے۔ تمام مخلوق کو اللہ نے پیدا فرمایا ہے۔ اور اللہ کے سوا کوئی مخلوق کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ پیدا کرنے کے بعد ایسے اعضا اور جوارح عطا فرمائے کہ وہ اللہ کا شکر اطاعت وعبادت کر سکیں، رزق کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ یہ سارا اللہ کا انعام ہے۔ اگر اللہ ہمیں پیدا نہ کرتے تو ہمارے پاس کون سی طاقت تھی کہ ہم دعویٰ اور مطالبہ کر سکتے کہ ہمیں کیوں نہیں پیدا کیا گیا؟ اس لیے تمام حمد وثنا اور شکر اللہ کے لیے ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۲، الفاتحۃ: الآیۃ: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ...]

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ﴾ جامع کلمۂ شکر:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ﴾ یہ ایسی تعریف ہے جس کو اللہ نے اپنی ذات کے لیے خود بیان فرمایا ہے اور ہمیں بھی حکم دیا کہ جب میں تعریف کر رہا ہوں تو تمہارا بھی فرض ہے کہ میری تعریفیں کرو۔

بعض مفسرین نے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے ساتھ حمد وثنا ہے۔ جو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ﴾ کہے گا تو گویا اس نے اللہ کی ذات وصفات کی تعریف کی ہے اور جس نے "شُکْرٌ لِلّٰہِ" کہا اس نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا ہے۔ حضرت عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دونوں تعریفیں برابر ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ ہر شکر کرنے والے کے لیے کلمۂ شکر ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۲، الفاتحۃ: الآیۃ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ...]

مدح، حمد اور شکر میں فرق:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حمد کا معنی شکر کرنا، اس پر مجھے اعتراض ہے۔ متاخرین نے لکھا ہے کہ شکر زبان کے ساتھ، دل اور اعضاء کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ مفسرین نے فرمایا: ایک وجہ سے وہ عام ہے اور ایک وجہ سے خاص ہے۔ حمد شکر سے عام ہے، کیونکہ وہ صفاتِ لازمہ اور متعدیہ پر ہوتی ہے۔ جیسے کہتے ہیں: ہم نے اس کی تعریف کی اس کے شہسوار ہونے کی، ہم نے اس کی سخاوت کی تعریف کی۔ یہ خاص ہے، کیونکہ یہ زبان سے ہے۔ اور شکر عام ہے کہ قول، فعل اور دل کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

اسماعیل بن حماد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حمد ذم کی نقیض اور ضد ہے، جیسے کہتے ہیں: ''حَمِدْتُ الرَّجُلَ أَحْمَدُهُ حَمْدًا وَمَحْمَدَةً فَهُوَ حَمِيْدٌ وَمَحْمُوْدٌ'' تحمید حمد سے ابلغ ہے اور حمد شکر سے ابلغ ہے۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ شکر کہتے ہیں کہ کسی کی اس بات پر تعریف کرنا کہ اس نے انعام کیا ہے۔

مدح حمد سے بھی عام ہے، کیونکہ مدح زندہ اور مردہ کی، نباتات اور جمادات کی بھی کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ طعام کتنا اچھا ہے! یہ پتھر کتنا اچھا ہے! مکان کتنا اچھا ہے! اور مدح احسان سے پہلے بھی ہوتی ہے اور احسان کے بعد بھی ہوتی ہے۔ ان صفات پر بھی ہوتی ہے جو متعدی ہوں اور ان صفات پر بھی ہوتی ہے جو متعدی نہ ہوں اور ان صفات پر بھی جو لازم ہوں۔

مختلف اکابرین کے نزدیک تسبیح، تحمید اور تکبیر کی فضیلت:

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ'' اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بیان کرنا ہے کہ وہ تمام صفاتِ نقصان سے پاک ہے، ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' اس کی الوہیت کا اقرار ہے، لیکن ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کا کیا معنی ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' ایسا کلمہ ہے جو اللہ نے اپنے لیے پسند فرمالیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے فرمایا: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ'' یہ تو ہم نے سمجھ لیا، لیکن ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' سے کیا مراد ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ ایسا کلمہ ہے جو اللہ نے اپنی ذات کے لیے محبوب فرمالیا، اللہ کو پسند ہے کہ یہ کلمہ کہا جائے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ کلمہ شکر ہے۔ جب بندہ "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہتا ہے تو اللہ فرماتے ہیں: "شَكَرَنِي عَبْدِي" "میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا۔ اس لیے ہر نعمت پر "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہیں۔ پانی پئیں، کھانا کھائیں "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" پڑھیں، حتیٰ کہ جب بیت الخلاء سے نکلیں تو "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" پڑھیں۔ جتنی زیادہ حمد ہوگی اتنی اللہ کی نعمتیں ہوں گی۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" اللہ کا شکر اور اس کی نعمتوں کا اقرار ہے۔ حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے فرمایا: "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" اللہ کی رضا ہے۔ حضرت شعبہ رحمہ اللہ سے ایک روایت اس طرح کی بھی ہے کہ جب بندہ "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہتا ہے تو اللہ فرماتے ہیں کہ تو نے میرا شکر ادا کیا، بلکہ زیادہ شکر ادا کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: افضل ذکر "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ہے اور افضل شکر "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا کہ یہ حدیث ایک طریق سے درجہ حسن کو پہنچتی ہے اور دوسرے طرق سے اس میں غرابت ہے۔

جب آدمی کو نعمت حاصل ہو اور وہ "الْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہے تو اللہ اس کو اور زیادہ نعمتیں عطا فرماتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۲، الآیۃ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ... ذِكْرُ أَقْوَالِ السَّلَفِ فِي...]

شکر نہ کرنے سے نعمت چھن جاتی ہے، واقعہ:

ایک اسرائیلی روایت ہے کہ اللہ کا ایک محبوب بندہ تھا۔ اللہ نے اس کو بڑی نعمتیں عطا فرمائی تھیں۔ رزق، مال، اولاد اور اطمینان دیا تھا۔ اس نے ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا: آپ اللہ کے نبی ہیں۔ اللہ نے مجھے اتنی نعمتیں دی ہیں کہ اب دل بھر گیا ہے، اب کسی اور نعمت کی مجھے تمنا نہیں رہی، بس یہی نعمتیں مجھے کافی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے عرض کیا: جب آپ کا بندہ راضی ہوگیا ہے تو اس پر نعمتوں کی بس فرمادیں، مزید نعمتیں نہ دیں۔ اللہ نے فرمایا: میرے بندے سے کہو کہ میرا شکر کرنا چھوڑ دے تو میں بھی نعمتیں دینا چھوڑ دوں گا۔

اس کی دلیل قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۝﴾ [ابراہیم: ۷]

"اگر تم نے واقعی شکر ادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا، اور اگر تم نے ناشکری کی تو یقین جانو، میرا عذاب بڑا سخت ہے۔"

شکر کا معنی:

شکر کرنے کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ زبان سے کہہ دیا کہ یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ یہ تو استہزاء ہے اور اللہ کے

عذاب کو دعوت دینا ہے کہ آدمی گناہ بھی کرتا رہے اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" بھی کہتا رہے۔ احکام کی خلاف ورزی کرے یا حرام کی دولت ہاتھ آئے، چوری کرے اور ڈاکہ مارے اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہے یہ کفر ہے۔

شکر کا معنی یہ ہوتا ہے کہ جو نعمتیں اللہ نے ہمیں دی ہیں وہ اللہ کی اطاعت میں لگیں۔ اللہ نے آنکھیں دی ہیں یا دماغ دیا تو اللہ کی نعمتوں کے بارے میں سوچیں۔ زبان دی ہے اس سے قرآن حدیث، اچھا کلمہ وعظ و نصیحت اور تبلیغ ہو، وگرنہ خاموش رہے۔ ہر عضو کو اللہ کی اطاعت میں لگانا شکر ہے۔ پھر زبان سے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہے تو اس کا مزہ ہے۔

نعمتوں کا بے جا استعمال:

ایک آدمی معصیت کرے اور پھر کہے کہ اللہ کا شکر ہے۔ گھر کے اندر فحاشی، عریانی ہے اور کہے الحمد للہ! اللہ نے ہمیں بڑی نعمتیں دی ہوئی ہیں۔ یہ شکر نہیں ہے، بلکہ ناشکری ہے۔ اللہ نے اس لیے تو نعمتیں نہیں دی تھیں کہ تم ناشکری اور نافرمانی میں خرچ کرو۔

علماء نے فرمایا ہے کہ آدمی گناہ کرے اور پھر کوئی نعمت مل جائے، مثلاً: جوا کھیل رہا ہے، گھوڑوں کی ریس پر پیسے لگائے ہوئے ہیں اور اس کو پیسے مل گئے تو سمجھو اللہ کا عذاب آنے والا ہے، کیونکہ یہ استدراج ہوتا ہے، آخری مہلت ہوتی ہے کہ اچھی طرح گناہ میں ڈوب جائے اور پھر میں اس کو عذاب میں پکڑوں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑪﴾ [یونس:۱۱]

"اے میرے مدنی! جن کو امید نہیں ہماری ملاقات کی ہم انہیں ان کی طغیانی اور سرکشی میں چھوڑ دیتے ہیں۔"

﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ⑫﴾ [البروج:۱۲]

"جب ہم ان کو پکڑیں گے تو ہماری پکڑ بڑی سخت ہے۔"

اصل حمد اللہ پر ایمان لانا ہے، اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا ہے۔ ایک آدمی اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تو وہ اللہ کا شکر کیسے ادا کرے گا؟ جب ایک آدمی کا حضور ﷺ کی نبوت اور رسالت پر ایمان نہیں ہے تو وہ کیسے شکر گزار ہوگا؟ قرآن میں اللہ نے شاکر کے مقابلے میں کافر کو رکھا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③﴾ [الدھر:۳]

''ہم نے واضح کر کے راستہ دکھا دیا ہے۔ اب مومن ہوں گے یا کافر ہوں گے۔''

دوسرا شکر یہ ہے کہ اپنے اعضا کو اللہ کے حکم میں لگا دے۔ آپ ایک ملازم رکھتے ہیں، اس کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ کار کی صفائی کرے، انجن وغیرہ چیک کرے۔ آپ نے گاڑی سٹارٹ کی، موبل آئل نہیں تھا تو انجن جل گیا۔ آپ اس سے پوچھیں کہ تم کیا کرتے رہتے ہو؟ اگر وہ کہے کہ میں سارا دن آپ کا شکریہ ادا کرتا رہتا ہوں کہ میرا مالک بہت اچھا ہے، شریف ہے۔ آپ کہیں گے کہ میں نے تو تیرے ذمہ یہ کام لگایا تھا، تعریف کرنے کا نہیں کہا تھا۔ میری تو گاڑی تباہ ہو گئی ہے۔ ایسے نوکر کو کوئی بھی قبول نہیں کرے گا۔

اللہ بھی فرماتے ہیں کہ جب میں نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعضا میرا شکر نہیں کر رہے، بلکہ کفر کر رہے ہیں۔ میں نے تمہیں آنکھیں دیں کہ اس سے صراطِ مستقیم دیکھو اور تم عورتوں کو دیکھتے ہو، میں نے پیشانی دی تھی کہ مجھے سجدہ کرنا ہے اور تم قبروں کو سجدہ کرتے ہو، زبان دی تھی کہ مجھے پکارنا ہے اور تم غیروں کو پکار رہے ہو، میں نے تمہیں پاؤں دیے تھے کہ میرے راستے پر چلنا، لیکن تم زنا، ڈاکے اور چوری کے راستے پر چل رہے ہو اور میں نے ہاتھ دیے تھے کہ میری بندگی کرنا اور تم اس سے لوگوں کو مارنے پر زور لگا رہے ہو۔ جس چیز کو جس مقصد کے لیے بنایا جائے اگر اس میں استعمال نہ کیا جائے تو یہ ظلم ہے۔ عینک اس لیے بنائی کہ اس کو آنکھوں پر لگائیں، باریک حروف موٹے نظر آئیں۔ اگر کوئی اس کو پاؤں میں لگائے تو یہ ظلم ہے۔ جوتے کو سر پر رکھیں اور پاؤں میں نہ پہنیں تو یہ بھی ظلم ہے۔

سکندر بادشاہ کا واقعہ:

سکندر بادشاہ نے ایک ملک فتح کیا۔ وہاں ایک آدمی کو سویا ہوا دیکھا۔ اس کو غصہ آیا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ بہت ہی غافل آدمی ہے۔ بادشاہ نے اس کو پاؤں کی ٹھوکر مار کر کہا: اٹھو میں نے ملک فتح کر لیا ہے اور تم سوئے ہوئے ہو؟ وہ اٹھا اور اس نے کہا کہ ملک کو فتح کرنا تو بادشاہوں کا کام ہے، لیکن ٹھوکریں مارنا گدھوں کا کام ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ملک گدھوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔

لوگوں نے یہی سمجھا ہوا ہے کہ رشوت اور حرام کھا کر کوٹھی پر لکھ دو:

''هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ''

تو وہ حرام حلال ہو جائے گا۔ سود پر پیسے اکٹھے کر کے مسجد بنا لو اور اس پر لکھ دو:

﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾

یہ شکر نہیں ہے۔ فقہاء کا فتویٰ ہے کہ جو حرام پیسہ خرچ کر کے ثواب کی نیت کر لے تو وہ کفر تک جا پہنچتا ہے۔ اللہ حلال پر ثواب دیتے ہیں حرام پر نہیں۔

حضور ﷺ کو مسکینی پسند تھی:

حضور ﷺ کے پاس ایک فرشتہ آیا اور عرض کیا کہ اللہ فرماتے ہیں کہ چاہے آپ ملک وحکومت کو پسند کریں، چاہے فقر و مسکینی کو۔ تو چونکہ اس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام ساتھ بیٹھے تھے۔ آپ نے ان سے مشورہ مانگا تو جبرائیل نے اشارہ کیا کہ تواضع کو اختیار فرمائیں۔ تو حضور نے اس فرشتے سے فرمایا کہ میں مسکینی پسند کرتا ہوں۔ (تاکہ جو مل جائے اس پر شکر کروں اور اگر نہ ملے تو اللہ سے مانگا کروں)۔

دنیا میں اپنے سے کم تر اور دین میں اپنے سے برتر کو دیکھو:

حکم دیا گیا کہ اپنے کم حیثیت والوں کے پاس جاؤ، زیادہ حیثیت والوں کے پاس نہ جاؤ، کیونکہ اگر بڑی حیثیت والوں کے پاس جاؤ گے تو ناشکری پیدا ہوگی اور کم حیثیت والوں کے پاس جاؤ گے شکر پیدا ہوگا۔ آنکھوں والے ہو تو اندھے پر نظر ڈالو، اگر تندرست ہو تو بیمار پر نظر ڈالو، اگر قوی ہو تو کمزور پر نظر ڈالو، امیر ہو تو غریب پر نظر ڈالو اور اگر خوبصورت ہو تو بدصورت پر نظر ڈالو، تاکہ اللہ کا شکر کرو۔

اس لیے فرمایا کہ اگر کسی اندھے کو، لنگڑے کو یا بیمار کو دیکھو تو یہ دعا پڑھو:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ عَافَانِيْ مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهٖ وَفَضَّلَنِيْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلًا))

[سنن الترمذی، حدیث: ۳۴۳۱، باب: مَا يَقُوْلُ إِذَا رَأَى مُبْتَلًى]

"یا اللہ! تیرا کروڑ کروڑ شکر ہے کہ تو نے مجھے اس بیماری سے بچا لیا ہے جس میں اس بندے کو مبتلا کیا ہے۔ تیرا کروڑ شکر ہے کہ لاکھوں بندوں سے اچھا بنایا ہے۔"

اگر تمہارے گھر میں روٹی پک رہی ہے تو اس گھر میں نظر ڈالو جہاں دھواں بھی نہیں اٹھتا، تمہارے گھر میں پھل ہیں تو اس گھر میں نظر ڈالو جس گھر میں سوکھی روٹی بھی نصیب نہیں ہے۔ بستر پر سوتے ہو تو ان پر نظر ڈالو جو فٹ پاتھ

پر سوتے ہیں، پھر اللہ کا شکر پیدا ہوگا۔ اور اگر اپنے سے بڑے پر نظر ڈالو گے تو کفرانِ نعمت پیدا ہوگی۔

کمتر رکھنے میں حکمت:

یہ اللہ کی تقسیم ہے کہ ایک آدمی کو علم کی دولت دیتے ہیں، مال و دولت نہیں دیتے۔ ایک آدمی کو علم و مال کی دولت دیتے ہیں، حسن و جمال کی دولت نہیں دیتے اور ایک آدمی کو حسن و جمال کی دولت دیتے ہیں، علم اور مال کی دولت نہیں دیتے۔ یہ میرے اللہ کا نظام ہے اور اسی نظام سے دنیا قائم ہے۔ اگر سارے امیر بن جائیں تو مزدوری کون کرے گا؟ مکان کون بنائے گا؟ تم غریب کے ہاتھوں کے محتاج ہو اور وہ تمہارے پیسے کا محتاج ہے۔ صرف اللہ کی ذات غنی ہے، جس کو کوئی احتیاج نہیں ہے۔

آدمی کتنا امیر یا بڑا آدمی کیوں نہ ہو جائے، لیکن روزانہ اپنے پیشاب، پائخانہ پر بیٹھتا ہے، اپنے ہاتھ سے استنجا کرتا ہے۔ پھر غرور اور تکبر کا کوئی حق نہیں ہے۔

ایک بزرگ اور بادشاہ کا واقعہ:

مثل مشہور ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک بزرگ کو ناراض ہو کر کہا کہ میرے ملک سے نکل جاؤ۔ اس بزرگ نے ایک مصلیٰ اٹھایا اور لوٹے کو ہاتھ میں لے کر چلے گئے۔ اتفاق سے بادشاہ کو درد شروع ہو گیا۔ بادشاہ کی والدہ سمجھدار تھی، انہوں نے کہا: آپ نے اللہ والے کا دل دکھایا ہے، لگتا ہے اس کی بددعا لگ گئی ہے۔ بادشاہ کی والدہ ان بزرگ کی خدمت میں دوڑی آئیں کہ حضرت! معاف فرما دیں۔ حاسدین غلط باتیں پہنچا دیتے ہیں، ان سے بھی غلط آرڈر ہو گیا۔ بزرگ نے فرمایا: اس کو ایک شرط پر معاف کریں گے۔ اس نے ہمیں اپنے ملک سے نکالا، شرط یہ ہے کہ وہ آدھا ملک ہمیں لکھ دیں، ہم دعا کریں گے اس کا پیشاب جاری ہو جائے گا۔ بادشاہ نے کہا: سارا لکھ لیں، میں مر جاؤں گا تو ملک کا کیا کروں گا؟ بادشاہ نے پروانہ لکھ کر دے دیا۔ بزرگ نے فرمایا: تمہارے ملک کی یہی قیمت تھی۔ توبہ کرو، ملک اللہ کا ہے۔

اصل شکر یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگ جاؤ۔ تم وضو کر رہے ہو، یہ شکر ہے۔ حلال کی کوشش کر رہے ہو، گھر میں بیٹھے لوگوں کو اسلام کی باتیں بتا رہے ہو، یہ شکر ہے۔ میاں بیوی ملیں تو عبادت کا ثواب ہے، اگر غیر سے ملیں تو کوڑے کا حکم ہے۔

فضول خرچی کا ایک معیار:

ایک آدمی نے اللہ والے سے آ کر پوچھا کہ اللہ فرماتے ہیں: فضول خرچی نہ کرو۔ کتنا میں خرچ کروں تو ٹھیک ہے، وگرنہ فضول خرچی ہوگی؟ آپ نے فرمایا: اگر احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کے راستے میں خرچ کر دو تو یہ کوئی فضول خرچی نہیں ہے۔ اگر ایک پیسہ بھی حرام میں خرچ کرو گے تو یہ فضول خرچی ہوگی۔

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کا ثواب:

حضور ﷺ نے فرمایا: یہ دنیا ساری بندے کے ایک ہاتھ میں ہو اور دوسرے ہاتھ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' ہو تو ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' والا ہاتھ زیادہ بھاری ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دنیا کی نعمتیں بھی اللہ نے دیں اور حمد کرنے کی توفیق بھی اللہ نے دی ہے، لیکن ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' والی نعمت زیادہ ہے، اس کا ثواب کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یاد رکھو! کہنا آسان ہے۔ اثر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آدمی کا دین اسلام سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔

تہجد کا مزہ:

بادشاہ نے ایک بزرگ کو لکھا کہ فلاں اسٹیٹ ساری کی ساری آپ کو دے رہے ہیں، تا کہ آپ کے لنگر کے کام آئے۔ انہوں نے لکھا: جب سے ہمیں تہجد کا ملک ملا ہے، ہمیں تمہارے اس ملک کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

باقیاتِ صالحات:

اس لیے جب ہم نے نعمت پر ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہا تو اس کا ثواب آخرت میں بھی ملے گا اور آخرت کی نعمتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ دنیا کی نعمتیں چاہے کتنی زیادہ ہوں، لیکن ایک دن ختم ہو جائیں گی۔ اس لیے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝﴾ [الکہف: ۴۶]

''مال اور اولاد دنیا کی زینت اور رونق ہے۔ باقی رہنے والے نیک اعمال ہیں جو اللہ کے ہاں باقی ہوں گے۔''

ایک عظیم کلمہ کا ثواب:

ابن ماجہ کی روایت ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے ان کو یہ حدیث بیان کی کہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ کہتا ہے:

((یَا رَبِّ! لَکَ الْحَمْدُ کَمَا یَنْبَغِیْ لِجَلَالِ وَجْھِکَ وَلِعَظِیْمِ سُلْطَانِکَ))

''یا اللہ! آپ ہی کے لئے تمام تعریفیں ہیں جو آپ کی بزرگ ذات اور عظیم سلطنت کے شایانِ شان ہے۔ میں تیری حمد بیان نہیں کرسکتا۔''

لکھنے والے فرشتوں کے لیے مشکل پڑگئی کہ ہم اس کا کتنا ثواب لکھیں؟ وہ اللہ پاک سے رجوع کرتے ہیں: یا اللہ! تیرے بندے نے آج ایسا کلمہ زبان سے کہا ہے، ہم اس کی کیا جزا لکھیں؟ اللہ جانتے ہیں، لیکن پوچھتے ہیں: میرے بندے نے کیا کہا تھا؟ وہ عرض کرتے ہیں: اس نے یہ کلمہ کہا تھا:

((یَا رَبِّ! لَکَ الْحَمْدُ کَمَا یَنْبَغِیْ لِجَلَالِ وَجْھِکَ وَلِعَظِیْمِ سُلْطَانِکَ))

اللہ نے فرمایا: جس طرح میرے بندے نے کہا ہے اسی طرح لکھ دو، اس کا بدلہ تم نہیں جانتے، میں خود قیامت کے دن اس کا بدلہ دوں گا۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۳۸۰۱، باب: فضل الحامدین]

صحیح حدیث میں ہے کہ جب امام نے کہا: ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' تو ایک مقتدی نے کہا:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُبَارَکًا فِیْہِ مُبَارَکًا عَلَیْہِ، کَمَا یُحِبُّ رَبُّنَا وَیَرْضٰی''

حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ تیس سے بھی کچھ اوپر فرشتے ہیں جو دوڑ رہے ہیں کہ یہ کلمے ہم اللہ کی طرف لے جائیں۔ [سنن ابی داود، حدیث: ۷۷۳، باب: ما یُسْتَفْتَحُ بِہٖ...]

حضور ﷺ کی شفاعتِ کبریٰ اور شفاعتِ صغریٰ:

جب ساری مخلوق تمام انبیاء سے خالی لوٹ کر حضور ﷺ کے پاس آئے گی کہ آپ ان کی شفاعت کریں تو حضور ﷺ فرمائیں گے: ''أَنَا لَهَا أَنَا لَهَا'' نہ گھبراؤ، اللہ نے اس کام کے لیے مجھے چن لیا ہے۔ پھر میں آؤں گا اور اللہ اس وقت مجھے اپنی حمد سکھلائیں گے جو میں اس وقت نہیں جانتا۔ پھر میں عرش کے پاس جا کر دو رکعت پڑھوں گا اور سر سجدہ میں ڈالوں گا اور وہی حمد کروں گا۔ تو حکم ہوگا: میرے مدنی! اپنا سر اٹھالو، جو تم نے درخواست کی ہم نے منظور کر لی ہے۔ یہ شفاعت کبریٰ ہوگی جس کے بعد ساری امتوں کی پیشی شروع ہوجائے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ساروں کو جہنم سے چھٹی مل جائے گی۔ یہ شفاعت بعد میں ہوگی جب سارے گنہگار جہنم میں ڈال دیے جائیں گے، پھر حضور ﷺ سفارش کریں گے۔ ان کو جہنم سے نکالیں گے جو صحیح عقیدہ پر ہوں گے اور جو کفر و شرک پر مر گئے، بدعات کے اندر الجھ گئے تو حضور ﷺ کبھی کسی بدعتی کے لیے سفارش کرنا قبول نہیں کریں گے۔

بدعتی حضور ﷺ کی شفاعت سے محروم ہوگا:

صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ کچھ لوگ حوضِ کوثر کے پاس آ رہے ہوں گے، فرشتے ان کو دھکا دے رہے ہوں گے۔ حضور ﷺ فرمائیں گے: ان کو چھوڑ دو! یہ تو میرے امتی ہیں، میرے دوست ہیں، ان کو آنے دو۔ فرشتے عرض کریں گے: آپ کو علم نہیں ہے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیسی کیسی بدعتیں دین میں گھڑ لی تھیں۔ حضور ﷺ فرمائیں گے:

((سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ بَدَّلَ بَعْدِيْ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۶۵۸۴، باب: فِي الحَوْضِ]

ان کو میری نظروں سے دور کر دو جنہوں نے میرے بعد دین کو بدل دیا۔

بدعتی کی عزت نہ کرو:

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ أَعَانَ عَلَى هَدْمِ الْإِسْلَامِ)) [شعب الایمان، حدیث: ۹۰۱۸]

"جو کسی بدعتی مولوی، بدعتی پیر کی عزت کرے، خوشامد کرے گویا اس نے اللہ کے دین کو گرانے میں اس کی مدد کی ہے۔"

کیونکہ جب تم ان کی عزت کرو گے تو وہ بدعت کے اوپر جم جائیں گے اور پکے ہوں گے۔ جب تک تم کھڑے ہو کر ان کی بدعت کا انکار نہیں کرو گے، سنت کا پرچار نہیں کرو گے کیسے اصلاح ہوگی؟ اس لیے کم از کم ان کی مجلسوں سے اظہارِ براءت کرو۔

برائی کو روکنے کے تین طریقے:

کیونکہ ہمیں حکم ہے کہ اگر تمہارے پاس طاقت ہے تو برائی کو ہاتھ سے مٹاؤ، اگر طاقت نہیں تو زبان سے مٹاؤ اور اگر حق کہنے کی طاقت نہیں ہے تو کم از کم دل میں اس کو برا سمجھ کر ان سے دور تو ہو جاؤ۔ انہوں نے اللہ کے دین کا حلیہ اور نقشہ بگاڑ دیا ہے۔

چند بدعات کا رد:

بحیثیت ایک مسلمان اور کلمہ گو آپ سوچیں کہ میرے مدنی پاک ﷺ مدینہ میں دین لائے، مکہ میں دین لائے

اور ساری دنیا میں اس کو پھیلایا۔ کیا صرف یہی دین تھا کہ عرس کریں گے، ساتویں اور چالیسویں کریں گے؟ کیا یہی دین تھا؟ ٹھنڈے دل سے ان باتوں کو سوچیں! اگر یہ سارے کام کرنا دین میں شامل ہے تو کیا حضور ﷺ نے ان کو کیا؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم، اصحابِ بدر اور اصحابِ حدیبیہ رضی اللہ عنہم نے دین کا یہ نقشہ ہمیں نہیں دکھایا تو اب یہ دین کیسے بن گیا ہے؟ اگر انہوں نے یہ سارا کچھ کیا ہے تو دین ہے۔ پھر تو کوئی جھگڑا نہیں ہے۔

حضور ﷺ کی محبوب بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ان کی وفات کے بعد بھی پوری زندگی حضور ﷺ ان کو نہیں بھولے، حتیٰ کہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا حسرت کرتی تھیں۔ حضور ﷺ غصہ میں آ گئے کہ اے عائشہ! کیا باتیں کرتی ہو!! تم میرے گھر میں اس وقت آئیں جب دین پھیل چکا تھا اور خدیجہ (رضی اللہ عنہا) اس وقت آ گئیں جب میرا اللہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ میں اس بیوی کو بھول سکتا ہوں؟

کیا حضور ﷺ نے بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قل اور چار جمعراتیں کی تھیں؟ اگر کی ہیں تو ہمیں دکھلا دو۔ ہمارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر آج اللہ چاہیں اور حضور ﷺ کے صحابہ کو زندہ کر دیں اور اللہ اس پر قادر ہیں اور وہ ہمیں دیکھیں تو وہ کہیں گے کہ یہ سب کچھ ہیں، لیکن مسلمان نہیں ہیں، کیونکہ مسلمان تو وہ ہوتا ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کا نمونہ بنے۔ اب جن لوگوں میں اسلام رہ گیا ہے تو صرف نماز اور مسواک کی حد تک ہے، لیکن گھروں کے اندر کیا ہے؟ کچھ پتا نہیں ہے۔

کلمہ طیبہ اور الحمد کے فضائل:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک جماعت کا قول نقل کیا ہے کہ ایک کلمہ مبارک "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" اور دوسرا کلمہ مبارک ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ①﴾ ہے۔ احادیث مبارکہ میں "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کے بڑے فضائل موجود ہیں۔ ایک حدیث مبارکہ میں فرمایا:

((مَنْ قَالَ: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" دَخَلَ الْجَنَّةَ))

"جس نے "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" پڑھا وہ جنت میں داخل ہوگا۔"

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۶۳۸، باب: مَا جَاءَ فِیْمَنْ یَمُوْتُ وَھُوَ...]

ایک اور حدیث مبارکہ میں فرمایا:

((مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ" دَخَلَ الْجَنَّةَ))

"جس کا آخری کلام "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ" ہو گیا وہ جنت میں داخل ہو گا۔"

[سنن ابی داؤد، حدیث: ۳۱۱۶، باب: فِي التَّلْقِينِ]

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١﴾ افضل ہے، کیونکہ اس میں معنی توحید بھی ہے اور معنی حمد بھی ہے اور کلمہ طیبہ میں توحید کا معنی ہے، حمد کا معنی نہیں ہے۔

علماء اس کا جواب دیتے ہیں کہ ایک ذکر تو وہ ہے جو دعائے ماثورہ میں ہے، مثلاً: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، سُبْحَانَ اللهِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ"۔ اور دوسرا ذکر وہ کلمات ہیں جو اللہ کے قرآن میں آئے ہیں، مثلاً: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١﴾ یہ قرآنی آیت دوسرے اذکار سے افضل ہے۔ چونکہ یہ اللہ کا قرآن ہے، اس معنی کے اعتبار سے یہ افضل ہے۔ اور باقی ماثورہ دعاؤں میں سے "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ" افضل ہے۔

زبانی اقرار کے ساتھ دل سے اقرار بھی ایمان کے لیے شرط ہے:

بعض علماء نے فرمایا: کلمہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ" افضل ہے، کیونکہ اس کے اندر توحید ہے جو ایمان اور کفر کے درمیان فرق ہے۔ بندہ مومن اس وقت کہلائے گا جب دل سے بھی ایمان ہو، زبان سے بھی اقرار ہو اور جوارح اور ارکان اس کی تصدیق کر رہے ہوں تو ایمان مکمل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر: ایک آدمی زبان سے کلمہ پڑھتا ہے، لیکن دل میں ایمان نہیں ہے وہ منافق ہے۔ اور اگر دل کے اندر تو تصدیق ہے کہ اسلام سچا مذہب ہے۔ جیسے بڑے بڑے انگریز مؤرخ گزرے ہیں اور اب بھی ہیں، جنہوں نے اسلام کی سچائی پر اور حضور ﷺ کی عظمت پر کتابیں لکھی ہیں۔ ابھی ایک نئی کتاب آئی ہے جس میں ایک سو ہیروز کا ذکر ہے۔ ان سب میں ٹاپ اور اعلیٰ درجہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو دیا ہے۔ وہ اسلام کا معترف ہے، لیکن زبان سے کلمہ شہادت نہیں پڑھتا ہے، لہٰذا ہم اس کو مسلمان نہیں کہیں گے۔

بعض علماء کے نزدیک ایمان کی تعریف:

اگر دل میں بھی کلمہ ہے اور زبان سے اقرار بھی ہے، لیکن ہمارے اعضا اور ارکان اس کی عملی تصدیق نہیں کرتے تو یہ بھی اسلام نہیں ہے۔ ہم نے تو پھر طوطے کی طرح پڑھا ہے۔ اس لیے علماء نے ایمان کی تعریف کی ہے:

"تَصْدِيقٌ بِالْقَلْبِ، اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِالْاَرْكَانِ"

"دل سے تصدیق، زبان سے اس کلمہ کا اقرار اور پورا بدن اس کلمہ کی شہادت دے۔"

جیسے آپ نے کلمہ پڑھا اور غیر کے آگے نہیں جھکتے تو آپ کا پورا بدن توحید کی گواہی دے رہا ہے۔ اور "يَا اَللّٰهُ! يَا رَحْمٰنُ! يَا رَحِيْمُ!" کے سوا کسی کو نہیں پکار رہے ہیں تو آپ کی زبان توحید کی گواہی دے رہی ہے۔ اور اسی طرح آپ کے ہاتھ پاؤں حضور ﷺ کے حکم پر چل رہے ہیں۔ تو یہ سارا بدن ایمان کی تصدیق کر رہا ہے۔ اس لیے افضل ذکر "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ))

"اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس وقت تک جہاد کروں جب تک لوگ اللہ کی توحید کو نہ مان لیں۔"

حضور نے فرمایا: جن لوگوں نے کلمہ پڑھ لیا تو ان کا خون بھی محفوظ، عزت بھی محفوظ اور مال بھی محفوظ۔ اب ان کے ساتھ کسی قسم کا قتال نہیں کریں گے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۳۹۲، باب: فَضْلِ اسْتِقْبَالِ الْقِبْلَةِ]

کلمہ طیبہ کے فضائل:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سب سے افضل کلمہ جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء نے کہا وہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ" ہے۔

اور اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے۔ فرمایا:

((أَفْضَلُ الذِّكْرِ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" وَأَفْضَلُ الدُّعَاءِ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ"))

"سب سے افضل ذکر "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" ہے اور سب سے افضل دعا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" ہے۔"

[سنن الترمذی، حدیث: ۳۳۸۳، باب: مَا جَاءَ أَنَّ دَعْوَةَ الْمُسْلِمِ...]

اس لیے علماء نے فرمایا: کلمہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" افضل ہے۔ پہلے مومن بنے گا تو دعا کرے گا۔ اور علماء، اولیاء اور صوفیاء اس کلمہ پر زور دیتے ہیں۔ اس کو پورے غور و فکر کے ساتھ پڑھے اور اس انداز سے پڑھے کہ اس کے بدن پر بھی اثر ظاہر ہو اور یہ معلوم ہو کہ جو بھی سانس نکلتا ہے اس کے اثر سے نکل رہا ہے۔ اصل دین کلمہ ہے، باقی اس دین تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔

علماء فرماتے ہیں کہ کلمہ کے اندر ''لَا اِلٰهَ'' سے تمام معبودانِ باطلہ کی نفی کرے اور ''اِلَّا اللّٰهُ'' سے اللہ کی معبودیت کا اثبات کرے اور یقین کرے کہ یہی چیز میرے اندر اثر کر گئی ہے۔ اصل دل ہے۔ جب وہ ٹھیک ہو گیا تو سارا بدن ٹھیک ہو جائے گا اور جب وہ بگڑ گیا تو سارا بدن خود بخود بگڑ جائے گا۔

اور یہ کلمہ شیطان کو بھگانے کا سب سے بڑا علاج ہے۔ اس لیے کوشش کریں کہ اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے ہوئے، گھر جاتے ہوئے، گھر سے واپس آتے ہوئے اور کاروبار میں، ہر مقام پر ان اوراد کو اپنا حرزِ جان بنالیں۔ قاعدہ ضابطہ ہے کہ جب ایک چیز آپ کی زبان پر چڑھ گئی تو موت کے وقت آپ کی زبان پر وہی چیز آئے گی۔ اللہ معاف کرے بعض لوگوں کو گالی کی عادت ہوتی ہے تو کبھی کبھی وہ اپنے بزرگوں کو بھی گالی دے دیتے ہیں، حالانکہ ان کا گالی کا ارادہ نہیں ہوتا ہے، لیکن چونکہ زبان پر عادت بن چکی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی کی زبان پر ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ''، ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ''، ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' یا ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'' چڑھ جائے تو موت کے وقت بھی زبان پر یہی کلمہ جاری ہوگا۔ سمجھ لیں کہ جنت کا راستہ آسان ہو گیا، کیونکہ پہلی منزل قبر ہے۔ اگر اس پر پاؤں جم گئے تو...... ان شاء اللہ...... آگے بھی ہم چڑھ جائیں گے۔ اگر پہلی سیڑھی پر ہی پاؤں پھسل گئے تو بات ختم ہو گئی۔ اس لیے ان کلمات کو وردِ جان اور حرزِ جان بنالیں۔

﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

رب کا معنی:

رب کا معنی ہے سب کا مالک اور ساری مخلوق میں تصرف کرنے والا۔ رب کا معنی سید بھی ہے، بمعنی سردار۔ ہم عجم میں مشہور ہے کہ سید قوم ہے، حالانکہ سید قوم نہیں ہے۔ عربی میں اس کا معنی ہوتا ہے سردار۔ عربی کے اندر کسی مصنف کا نام لکھیں تو اس پر ''اَلسَّيِّدُ فُلَانٌ'' لکھا ہوا ہوتا ہے کہ فلاں محترم، مکرم۔

جیسے حضور ﷺ نے فرمایا:

((سَيِّدُ الشُّهَدَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَمْزَةُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ)) [المعجم الاوسط، حدیث: ۴۰۷۹]

''حضرت حمزہ بن عبد المطلب ؓ قیامت کے دن شہیدوں کے سردار ہوں گے۔''

اسی طرح فرمایا:

((اَلْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ))

''حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما جنتی نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔''

[ترمذی، حدیث:۳۷۶۸، باب: مَنَاقِبِ أَبِي مُحَمَّدٍ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ...]

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ، وَأَبُوكِ سَيِّدُ كُهُولِ الْعَرَبِ، وَعَلِيٌّ سَيِّدُ شَبَابِ الْعَرَبِ))

[فضائل الصحابہ لاحمد بن حنبل رحمہ اللہ، حدیث:۵۹۹]

''میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور مجھے اس پر کوئی فخر نہیں ہے، اور (اے عائشہ!) تیرا باپ عرب کے ادھیڑ عمر لوگوں کا سردار ہے اور علی عرب کے نوجوانوں کا سردار ہے۔''

اور اسی طرح فرمایا:

((هَذَا سَيِّدُ كُهُولِ أَهْلِ الْجَنَّةِ مِنَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ، إِلَّا النَّبِيِّينَ وَالْمُرْسَلِينَ))

''یہ (ابوبکر رضی اللہ عنہ) انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کے علاوہ جنت کے ادھیڑ عمر لوگوں کا سردار ہے۔''

[السنۃ لابن ابی عاصم، حدیث:۱۴۲۰]

اصل اور بڑا قبیلہ قریش ہے۔ قریش کے آگے کئی شاخیں ہیں۔ بنی ہاشم میں جو پیدا ہوئے وہ افضل ہوئے۔ اس لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم قریشی بھی ہیں اور ہاشمی بھی ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [صحیح مسلم، حدیث:۲۲۷۸]

''قیامت کے دن میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا۔''

تمام مخلوق کے سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سید الانبیاء والمرسلین، تمام نبیوں اور رسولوں کے سردار ہیں۔ سید الاولین والآخرین تمام پہلے والے انسان اور قیامت تک آنے والوں کے سردار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

قائدِ اعظم اور خاتونِ اوّل کون؟

ہمارے ہاں غلط رواج ہے۔ جیسے ہم ہر کسی کو قائد، بلکہ قائدِ اعظم کہہ دیتے ہیں۔ اگر کوئی یہ بات سمجھائے تو کہتے ہیں: یہ اس پارٹی کا مخالف ہے۔ حالانکہ وہ اس پارٹی کا مخالف یا اس کی خدمات سے انکار نہیں کر رہا ہوتا۔ قائدِ

اعظم کا لقب صرف حضور ﷺ کے لیے ہے۔ اسی طرح خاتونِ اوّل سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ انگریزوں نے ہمارے ساتھ ہر قسم کی جنگ لڑی ہے: فکری جنگ، سیاسی جنگ، اقتصادی جنگ، معاشی جنگ اور حربی جنگ، غرض یہ کہ ہر طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ انگریزوں کا جو بادشاہ یا صدر ہوتا تھا اس کی بیوی کو فرسٹ لیڈی کہتے تھے۔ اس سے ہم نے خاتونِ اوّل کا ترجمہ لیا۔ اسلام میں خاتونِ اوّل صرف سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ہم بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی خاتونِ اوّل نہیں کہتے۔ یہ کسی کی توہین نہیں ہے، بلکہ اسلامی اعزاز ہیں۔ ان کو استعمال کرنے میں ہم احتیاط کریں۔ جیسے ہمارے ہاں کوئی فاسق، شرابی یا زانی ہے، اس کو سید کہہ دیتے ہیں۔ اس لفظ کو اتنا عام کر دیا کہ اس کی عظمت کم کر ڈالی ہے۔ حالانکہ سید کا اطلاق حضور ﷺ پر اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم پر اور ان لوگوں پر ہوتا تھا جو دین کے سردار تھے۔ انسان عمل سے سید بنتا ہے، ورنہ تو حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی سید ہوا اور اللہ فرماتے ہیں: وہ جہنمی ہے۔ اور ابولہب حضور ﷺ کا چچا ہے، رشتہ داری ہے، اس کو بھی سید کہنا پڑے گا۔

حضرت مولانا عبدالستار تونسوی رحمہ اللہ بیان میں فرماتے ہیں کہ شکر کرو ابولہب مر گیا۔ اگر وہ زندہ ہوتا اور ہمارے علاقے میں آجاتا تو اس کو بھی ہدیہ اور نذر دیتے کہ حضور ﷺ کا رشتہ دار ہے...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ......

بعض مخصوص القاب:

وہ لقب جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ لگائے جائیں ان کو غیر کے ساتھ نہیں لگانا چاہیے۔ جیسے ''عَلَيْهِ السَّلَامُ'' انبیاء علیہم السلام کے لیے ہے، ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ'' صحابہ کے لیے ہے اور ''رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ'' اولیاء اللہ کے لیے ہے۔ اب اگر ہم کسی اللہ کے ولی کو ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ'' کہہ دیں تو جائز ہے، لیکن چونکہ یہ لقب صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے مشہور ہے تو آنے والی نسلوں کو دھوکہ لگ سکتا ہے کہ شاید یہ بھی صحابی ہیں، اگر کسی کو علیہ السلام کہیں تو منع تو نہیں ہے، ایک دوسرے کو بھی روزانہ ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کہتے ہی رہتے ہیں۔ یا کہتے ہیں کہ فلاں آدمی نے آپ کو سلام دیے ہیں تو ''وَعَلَيْهِ السَّلَامُ'' کہتے دیتے ہیں۔ تو ٹھیک بات ہے، لیکن ''عَلَيْهِ السَّلَامُ'' اللہ کے نبیوں کے نام کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اگر ہم اس کو کسی اور نام کے ساتھ لکھیں گے تو آنے والی نسل سمجھے گی کہ شاید یہ بھی کوئی نبی گزرے ہیں، حالانکہ وہ اللہ کے نبی نہیں ہوں گے۔

اسی طرح ''قَائِدُ الْغُرِّ الْمُحَجَّلِيْنَ، عَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ، رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ'' حضور ﷺ کا لقب ہے۔ اب کوئی

آدمی حضور ﷺ کے نام کے علاوہ کسی اور کے نام کے ساتھ لکھے تو حضور ﷺ کی توہین ہے۔

ناجائز القاب:

ہمارے ہاں بزرگوں کے مزار پر جو چادر ڈالتے ہیں اس پر لکھا ہوا ہوتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾

جب ہم نے اس اللہ کے ولی کو وہ خطاب دیا جو حضور ﷺ کے لیے خاص ہے تو ہم اس بزرگ کی تعریف کر رہے ہیں یا اللہ کے نبی ﷺ کی توہین کر رہے ہیں؟ اس کو ٹھنڈے دل سے سوچیں، اختلافات اور جھگڑوں میں نہ پڑیں۔ جب حج اور عمرہ کے لیے آتے ہیں، اس وقت ان کے ذہنوں میں ڈال دیتے ہیں کہ خیال کرنا وہاں وہابی ہیں، ان کے پیچھے نماز نہ پڑھنا، کیونکہ وہ گستاخ ہیں، حضور ﷺ کو نہیں مانتے، نبی ﷺ کو نہیں مانتے۔ حالانکہ اس غریب کو یہ بھی پتا نہیں ہوتا کہ وہابی کیا ہے؟ مدینہ کے حرم کو تعمیر کر رہے ہیں اور جو چیز اس کے لیے بنا رہے ہیں وہ صرف وہاں لگے اور کہیں نہیں لگے گی۔ کیا ان کو حضور ﷺ سے محبت نہیں ہے؟ اس کا کوئی علاج نہیں، صرف اللہ ہی ہدایت عطا فرمائے۔

ہمارے وطن والے ایسے ہیں کہ اگر ایک بزرگ کا عرس کریں تو چندہ لیتے ہیں۔ یہ تو عاشق ہیں اور ایک وہ ہیں جو اپنا سب کچھ مدنی پاک ﷺ کے دربار پر لٹا رہے ہیں، وہ وہابی ہیں۔

کیا لفظ ''رَبّ'' اسم اعظم ہے؟

بعض علماء نے لکھا ہے کہ لفظ ''رَبّ'' اسم اعظم ہے۔ اسمِ اعظم اس کو نصیب ہوتا ہے جس سے اللہ راضی ہوتا ہے، جس کا اکلِ حلال اور صدقِ مقال ہو، لباس پاک ہو، زندگی میں حرام اندر نہ جائے اور زندگی میں غیر شرعی قدم نہ اٹھائے۔

﴿الْعٰلَمِيْنَ﴾

کتنے ہزار جہان ہیں؟

﴿الْعٰلَمِيْنَ﴾ جمع ہے، اس کی مفرد ''عَالَمٌ'' ہے۔ اللہ کے سوا جو کچھ ہے سب ''عَالَمٌ'' ہے۔ لفظِ ''عَالَمٌ'' ایسا ہے

کہ اس کا مفرد نہیں ہے۔ ''عَوَالِمُ'' کہا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے کہ اللہ نے مخلوقات کی جتنی قسمیں بنائی ہیں جو خشکی پر ہیں اور سمندروں میں ہیں، اسی طرح صدی کے اندر جو ایک نسل گزر جاتی ہے اس پر بھی عالم کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ مشرق سے مغرب تک عالم ہے۔ اسی طرح چالیس ہزار اور عالم ہیں۔ ہم نے ان کو دیکھا نہیں ہے، ہم نے تو ایک عالم کو بھی نہیں دیکھا۔ بلکہ بعض علماء نے فرمایا: اسی ہزار دوسرے عالم ہیں۔ جدید علوم والے کہہ رہے ہیں کہ زمین اور آسمان کے درمیان خلا ہے۔ خدا جانے اس کے اندر کتنے عالم ہیں؟ سیارات اور بروج ہیں، ان کے اندر کتنے عالم ہیں؟ اور ان کے اندر رہنے والی مخلوق کے لیے کیا تقاضے ہیں؟ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جتنا ہمارا علم بڑھے گا اتنا ہمارا اللہ سے تعلق بڑھتا جائے گا۔

کتے کے جھوٹے برتن کے جراثیم میں شریعت کی خصوصیات:

حضور ﷺ نے فرمایا: کتا برتن میں منہ ڈالے تو اس کو سات مرتبہ دھوئیں اور ایک مرتبہ مٹی سے دھوئیں۔ جدید تحقیق نے بھی اعتراف کر لیا ہے کہ کتے کے منہ کے جراثیم مٹی سے مرتے ہیں، آگ میں بھی جلاؤ تو نہیں مرتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی بیوی سے غیر فطری فعل نہ کرے، کوئی عورت کسی جانور سے ایسا فعل نہ کرے، کوئی مرد کسی جانور سے ایسا فعل نہ کرے۔ آج ایڈز کے نتائج سامنے ہیں کہ افریقہ کے کالے لوگوں سے زیادتیاں کی گئیں اور وہ بیماریاں پھیلیں تو پوری دنیا پر ایڈز پھیل گیا، کیونکہ وہ جنگلی تھے، ان کو پتا نہیں تھا کہ کیا عورتیں ہیں اور کیا مرد ہیں اور کیا جانور ہیں۔ اب یہ وبائیں پھیلتی پھیلتی اس مقام تک پہنچ گئی ہیں کہ جو بڑے بڑے ایڈوانس ملک ہیں ان میں آدمی اپنی بیوی سے ملتے ہوئے بھی ڈرتا ہے کہ اگر اس کو بیماری لگی ہوئی ہوگی تو میں کیا کروں گا؟ اگر حضور ﷺ کے حکم پر عمل کرتے کہ مائیں اپنے بچوں کو خود دودھ پلائیں۔ جدید تحقیق یہی ہے کہ جو مائیں اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلاتیں ان کو سینے کا کینسر ہو جاتا ہے۔

دین اسلام کی سائنس کی رو سے تصدیق:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ رات کو خالی معدہ نہ سوئیں، کچھ نہ کچھ کھا کر سوئیں، کھانے کے بعد کوئی میٹھی چیز کھا لیں، تاکہ کھانے کی اشتہا پیدا ہو اور معدہ اپنی حرکت شروع کر دے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: دن کو دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑا سا لیٹ جائیں۔ آج دنیا نئی نئی تحقیق کرتی جائے گی اور ہمارا ایمان بڑھتا جائے گا۔ ہم کہیں گے:

''صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ'' حضور ﷺ نے سچ فرمایا تھا۔

سنن ابی داؤد شریف میں ایک حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: میری امت پر ایک وقت آرہا ہے کہ پہلے پانی پر جھگڑا ہوگا، پھر اسلام اور صلیب کی لڑائی ہوگی اور ایسی لڑائی ہوگی کہ باقی لڑائیوں کو دنیا بھول جائے گی۔

[سنن أبي داود، حديث: ٤٢٩٢، باب: ما يذكر من ملاحم الروم]

ہمارا ایمان اور یقین ہے کہ ان شاء اللہ فتح اسلام کی ہوگی۔ اور بالکل یہی حالات بن رہے ہیں کہ ایک طرف اسلام ہے اور ایک طرف صلیب ہے۔ باقی جو چھوٹے چھوٹے فرقے تھے وہ ختم ہو گئے ہیں۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ ختم ہو گئے ہیں۔ پوری دنیا پر نظر ڈالیں صرف عیسائیت اور اسلام ہے۔

اسلام کی طاقت:

علامہ اقبال رحمہ اللہ نے کہا تھا:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

بس اسلام کی طرف ہمارے ایک قدم پلٹنے کی دیر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب میرا بندہ میری طرف ایک قدم آتا ہے تو میں دس قدم آتا ہوں۔ بس تم میری طرف آؤ تو سہی! اگر مسلمان سرکس کے شیر بن جائیں تو ان کا اپنا قصور ہے۔ جس دن اس کو یاد آجائے کہ میں جنگل کا شیر ہوں تو سارے سرکس والے بھاگ جائیں گے۔ مسلمان بھی بھولا ہوا ہے کہ میں کیا ہوں؟ جس دن اس کو یاد آگیا کہ میری للکار سے دریائے دجلہ کانپ جاتا تھا، سمندر ٹھہر جاتے تھے، ان پر صحابہ اپنے گھوڑے دوڑاتے تھے۔ جس دن اسلام یاد آگیا اسی دن اسلام کی عظمت لوٹ آئے گی۔

حضور ﷺ کی بعثت کے مخاطب:

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ روایت ہے کہ عالمین سے مراد انسان اور جن ہیں۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے قرآن کی اس آیت ﴿لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝١﴾ [الفرقان:١] (تاکہ وہ دنیا جہان کے لوگوں کو خبردار کردے) سے اس بات کا استدلال کیا ہے کہ آپ انسانوں اور جنوں کے نبی ہیں۔ یعنی انسانوں کا بھی ایک عالم ہے اور جنوں کا بھی ایک عالم ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں: عالم اس مخلوق کو کہتے ہیں جو عقل والی ہے۔ انسان، جن، فرشتے اور شیطان عقل والے

ہیں۔ یہ عالم ہے۔ جانوروں کو عالم نہیں کہیں گے، کیونکہ ان کے پاس شعور تو ہوتا ہے، لیکن عقل نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کے پاس کوئی نہیں بھیجا جاتا۔ ایک قول یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کے اندر روح حرکت کرتی ہے یہ بھی عالم ہے۔ اور بعض نے فرمایا: ہر صنف کی نوع ایک عالم ہے۔ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے مروان بن حکم کے حوالے سے لکھا ہے کہ اللہ نے ۱۷۰۰۰ (سترہ ہزار) عالم پیدا فرمائے۔ آسمان والے اور زمین والے ایک عالم ہیں اور باقی جتنے عالم ہیں ان کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ راجح قول یہ ہے کہ عالمین سے مراد عالم الجن اور عالم الانسان ہے، کیونکہ اللہ نے حضور ﷺ کو عالمین کی طرف نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اور قرآن میں بھی ہے:

﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ﴾ [الانعام: ۱۳۰]

اگر اس کے علاوہ بھی کوئی عالم ہو تو اس کو اللہ جانتا ہے۔ واللہ اعلم۔

انسان اور جنات ایمان لانے کے مکلف ہیں:

ملائکہ عالم کے اندر داخل نہیں ہیں، کیونکہ وہ ایمان کے مکلف ہی نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے، ان کے اندر نافرمانی اور شہوت کا مادہ ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۝۶﴾ [التحریم: ۶]

''جو اللہ کے کسی حکم میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔''

بعض فرشتوں کے ذمہ ہے کہ وہ یہ تسبیح ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فرشتوں نے کہا:

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ﴾ [البقرۃ: ۳۰]

''حالانکہ ہم آپ کی تسبیح اور حمد و تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔''

اور بعض فرشتوں کی ڈیوٹی آسمانوں اور زمینوں میں پھرنا ہے۔ اللہ کے احکامات کی تنفیذ کرنے والے، بعض ہواؤں پر اور بعض بادلوں پر موکل ہیں، بعض دریاؤں پر اور ارحام الامہات پر موکل ہیں۔ کراماً کاتبین ہیں، حاملینِ عرش ہیں، جہنم کے فرشتے ہیں اور رحمت کے فرشتے ہیں۔ وہ صرف اور صرف حکم کے بندے ہیں۔

مشہور عالم الجن والانس ہیں۔ انہی کے پاس اللہ نے اپنے پیغمبر اور نبی بھیجے اور انہیں کو اللہ نے اپنی عبادت کا مکلف بنایا، انہیں کے اندر اللہ نے خیر اور شر کی صفات رکھیں۔ پھر ان کو خیر اور شر کے سمجھنے کی توفیق بھی عطا فرمادی

اور پھر ان کو اختیار بھی دیا کہ چاہیں تو خیر اختیار کریں اور اگر چاہیں تو شر اختیار کریں۔ اسی کے مطابق جزا اور سزا کا فیصلہ ہوگا۔

مفسرین نے فرمایا کہ ﴿لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ [الفرقان:۱] سے مراد بھی انسان اور جن ہیں۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ نے گورے اور کالے کی طرف مبعوث فرمایا ہے، اللہ نے مجھے انسانوں اور جنوں کے لیے نبی بنایا ہے۔ آپ کے بعد نہ نبوت ہے، نہ رسالت ہے اور نہ شریعت ہے۔ سورت رحمٰن کے اندر بھی اسی کی تائید ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ﴾ [الرحمٰن:۳۳]

''اے انسانوں اور جنات کے گروہ! اگر تم میں یہ بل بوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حدود سے پار نکل سکو تو پار نکل جاؤ، تم زبردست طاقت کے بغیر پار نہیں ہو سکو گے۔''

یہاں بھی اللہ نے جن اور انسان دونوں کو خطاب فرمایا ہے۔ اس لیے راجح قول یہ ہے کہ عالمین سے مراد عالم الجن والانس ہیں۔

کتنے ہزار عالم ہیں؟

علامہ رازی ﷫ نے ابو العالیہ سے ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کی تفسیر میں یہ قول نقل فرمایا ہے کہ ''اَلْاِنْسُ عَالَمٌ وَالْجِنُّ عَالَمٌ'' (انسان ایک عالم ہے اور جن ایک عالم ہے) اور اس کے سوا ۱۸۰۰۰ (اٹھارہ ہزار) عالم ہیں یا ۱۴۰۰۰ (چودہ ہزار) عالم ہیں۔ اور جو ملائکہ زمین پر ہیں وہ ایک عالم ہیں۔ اور زمین کے ہر کونے میں ۳۵۰۰ (تین ہزار پانچ سو) عالم ہیں۔ ان سب کو اللہ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ اللہ کے ہاں کئی عالم ہو سکتے ہیں، لیکن اس بات کی صحت تک پہنچنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم اس کو صحیح کہہ سکیں۔

﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے ایک ہزار امت مراد ہے۔ اور چھ سو امت دریاؤں کے اندر ہے اور چار سو خشکی کے اندر ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن مسیب ﷫ سے بھی نقل کیا گیا ہے۔ اور ایک مرفوع روایت میں بھی ہے۔

حافظ ابو لیلی رحمہ اللہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جراد (ٹڈی) نظر نہ آئی تو آپ پریشان ہو گئے۔ ایک آدمی کو یمن، دوسرے کو شام اور تیسرے کو عراق کی طرف بھیجا کہ جا کر دیکھو کہ وہاں جراد ہے یا ختم ہو گئی ہے؟ جو آدمی یمن کی طرف گیا تھا وہ واپسی پر مٹھی بھر ٹڈیاں بھی پکڑ کر لے آیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ڈال دیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ اکبر!۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کیوں گھبرا گئے تھے؟ انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے ایک ہزار امت پیدا کی ہے، جن میں سے چھ سو بحر (پانی) میں اور چار سو خشکی میں ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو امت ہلاک ہوگی وہ ٹڈی ہے۔ اس ٹڈی کا ختم ہونا قیامت کے قریب آنے کی دلیل ہے۔ جب یہ علامت پوری ہو جائے گی تو باقی علامات اس طرح پوری ہوں گی جس طرح کسی ہار کا دھاگہ ٹوٹ جائے تو موتی ایک دوسرے کے پیچھے گرتے ہیں۔ اس لیے میں گھبرا گیا تھا کہ ٹڈی نظر نہیں آ رہی۔ [شعب الایمان، حدیث: ۹۶۵۹]

اس روایت کے اندر بھی ایک راوی ضعیف ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: جس طرح انسان ایک امت اور جن ایک امت ہیں، اسی طرح جانور بھی ایک ایک امت ہیں، اللہ کی مخلوق ہیں۔ اور ایسی ایسی مخلوقات ہیں جن کا آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا اور نہ شمار کر سکتا ہے۔ اللہ کے سوا اللہ کی مخلوق کو اور کون جان سکتا ہے؟

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے بھی ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ اللہ نے ایک ہزار عالم پیدا فرمائے ہیں: چھ سو دریا کے اندر ہیں اور چار سو خشکی کے اندر ہیں۔ حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا فرمائے ہیں دنیا تو صرف ایک عالم ہے باقی تو اللہ ہی جانتے ہیں۔ حضرت کعب احبار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے جتنے عالم پیدا فرمائے ہیں ان کا حقیقی عدد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

ابھی تک جدید علم بھی چاند تک پہنچا ہے جو زمین سے قریب ترین ہے، ورنہ اس کے علاوہ مریخ، مشتری، عطارد اور زحل بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ ۣالْكَوَاكِبِ ۝۶﴾ [الصّٰفّٰت:۶]

"بے شک ہم نے نزدیک والے آسمان کو ستاروں کی شکل میں ایک سجاوٹ عطا کی ہے۔"

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ﴾ [الحجر:١٦]

''اور ہم نے آسمان میں بہت سے برج بنائے ہیں اور اس کو دیکھنے والوں کے لیے سجاوٹ عطا کی ہے۔''

ان جمیع عوالم کا اللہ کو ہی علم ہو سکتا ہے۔ ان کواکب اور سیارات پر کتنے عالم ہیں؟ اللہ ہی جانتا ہے۔ چاند کا طول وعرض ہماری زمین سے بھی بڑا ہے۔ اسی طرح دوسرے سیارات چاند سے بھی کئی ہزار گنا بڑے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر:١/ ٢٣، ٢٤، الفاتحہ:الآیۃ:١]

اللہ کی کرسی کی وسعت:

صحیح احادیث میں ہے کہ اگر ہم ان سات زمینوں اور سات آسمانوں کو پھیلا دیں تو اللہ کی کرسی کے سامنے ان کی حیثیت ایسے ہو گی جیسے جنگل میں ایک حلقہ پڑا ہوا ہو۔

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾ [البقرۃ:٢٥٥]

''اس کی کرسی نے سارے آسمانوں اور زمین کو گھیرا ہوا ہے۔''

اور عرش کے مقابلے میں کرسی ایسی ہے جیسے جنگل میں ایک کڑا پڑا ہوا ہو۔ جب اتنا بڑا عرش اور کرسی ہے تو عوالم کتنے بڑے ہوں گے؟ ''لَا يَعْلَمُهُ إِلَّا اللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى'' بہر حال اس بارے میں مفسرین کے سارے اقوال ذکر کر دیے گئے ہیں۔

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے چالیس ہزار عالم پیدا فرمائے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ مشرق سے لے کر مغرب تک ساری مخلوق ایک عالم ہے۔ حضرت زجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عالم کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے سوا جتنا کچھ ہے سب عالم ہے۔ یہی قول راجح ہے۔

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ إِن كُنتُم مُّوقِنِينَ﴾ [الشعراء:٢٣، ٢٤]

''فرعون نے کہا: اور یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ (کون ہیں؟) موسیٰ علیہ السلام نے کہا: وہ سارے آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا پروردگار ہے جو ان کے درمیان پائی جاتی ہیں، اگر تم کو واقعی یقین کرنا ہو۔''

[تفسیر ابن کثیر:١/ ٢٣، ٢٤، الفاتحہ:الآیۃ:١]

عالم اللہ کے وجود کی دلیل ہے:

عالم کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ یہ علامت سے مشتق ہے اور عالم کے اندر ہر چیز اس پر دلالت کر رہی ہے کہ کوئی پیدا کرنے والا موجود ہے، مجھے کوئی بنانے والا ہے۔ اور وہ ایک ہے جو جب چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ فرمایا:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ ءَالِهَةٌ إِلَّا ٱللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الانبیاء: ۲۲]

''اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا دوسرے خدا ہوتے تو زمین و آسمان میں فساد برپا ہو جاتا۔''

ایک حکایت:

اس لیے ایک مثال مشہور ہے کہ ایک بدو جنگل میں رہتا تھا۔ وہاں سے ایک عالم گزرا۔ اس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا: میں مسلمان ہوں۔ اس نے کہا: تم خدا کو مانتے ہو؟ اس نے کہا: میں خدا کو مانتا ہوں، وہ وحدہ لاشریک ہے۔ عالم نے کہا: تم نے اپنے خدا کو کیسے پہچانا اور کہاں کہاں تم نے پڑھا ہے؟ بدو نے کہا: توحید کے مسئلے میں کسی کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟ دیکھو! یہ اونٹ کا گوبر پڑا ہے، یہ بتلا رہا ہے کہ یہاں سے اونٹ گزرا ہے، اگر گائے کا گوبر پڑا ہے تو وہ بتلا رہا ہے کہ یہاں گائے ہے، پاؤں کے نشانات دیکھو تو وہ بھی بتلا رہے ہیں کہ یہاں سے آدمی گزرا ہے۔ تو کیا یہ ساری مخلوق خدا پر دلالت نہیں کر رہی؟ یہ آسمان اور زمین پیدا کرنے والے کے بغیر بن گئے؟ اللہ پاک نے عقیدہ توحید ہر ایک کی فطرت میں رکھ دیا ہے، آگے لوگ اس کو مسخ کر دیتے ہیں۔ ایک صاف کاغذ پر صحیح پرنٹ آئے گا۔

ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے:

اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ، أَوْ يُنَصِّرَانِهِ، أَوْ يُمَجِّسَانِهِ))

''ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ماں باپ اگر یہودی ہیں تو اس کو یہودی بنا ڈالتے ہیں یا نصرانی بنا ڈالتے ہیں یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۸۵، باب: مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ]

اگر مشرک ہیں تو مشرک بنا ڈالتے ہیں۔ وہ اس فطرت کو بھول جاتا ہے۔ ورنہ ہر بندہ اپنے خدا کو پہچانتا ہے۔ ہر چیز کے اندر ایک نشانی ہے کہ وہ وحدہ لاشریک لہ ہے۔ اسی طرح یہ اس بات پر بھی دلالت کر رہی ہے کہ وہ ایک ہے، کیونکہ اگر دو ہوتے تو ایک کہتا کہ رات ہو اور دوسرا کہتا کہ دن ہو۔ یہ ایک نظام چل رہا ہے۔ وقت پر سورت نکلتا ہے، غروب ہوتا ہے، وقت پر تارے نکلتے اور غائب ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی ایک کا نظام چل رہا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ ایک وحدانیت لے کر آئے تھے کہ ہر آدمی حکمِ الٰہی کے تابع ہوگا۔ بندہ اللہ کے حکم کو نافذ کرنے والا ہے، ٹھکرانے والا نہیں بن سکتا۔ ہم انسانوں کے بنائے ہوئے جو نظام ہیں یہ بہلاوے ہیں۔ ہر سال کے اندر ان میں ردوبدل اور تماشے بنتے رہتے ہیں۔ ایک نظامِ الٰہی ہے جو ازل سے ابد تک چلے گا، جس میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے ہمیں حلال اور حرام کے بارے میں بتلا دیا ہے۔ قیامت تک حلال حرام نہیں ہوسکتا اور حرام حلال نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ ہم نے آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا۔ اس لیے جو انبیاء علیہم السلام آئے، انہوں نے احکامِ ربی کو چلایا ہے، نافذ کر کے دکھایا ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتے۔ فرمایا:

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۞ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۞﴾ [النجم: ۳،۴]

''میرے مدنی ﷺ تو اپنی زبان بھی نہیں ہلاتے جب تک ہم وحی نہیں کرتے۔''

حضور ﷺ سب کے لیے اور آخری نبی ہیں:

بہرحال ﴿الْعَالَمِينَ﴾ کے بارے میں معروف بات یہ ہے کہ ﴿الْعَالَمِينَ﴾ سے مراد جن اور انس ہیں۔ حضور ﷺ تمام دنیا کے انسانوں کے بھی نبی ہیں اور تمام دنیا کے جنات کے بھی نبی ہیں۔ اور تمام دنیا کی مخلوق امت محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک امت ماننے والی ہے اور ایک امت انکار کرنے والی ہے۔ جیسے ایک باپ کے دو بیٹے ہوں: ایک فرمانبردار اور ایک نافرمان ہے۔ لیکن دونوں اس کے بیٹے ہیں۔ یہ ساری حضور ﷺ کی امت ہے، کیونکہ حضور ﷺ سب کے لیے آخری نبی ہیں، آپ ﷺ کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک امتِ اجابت ہے اور ایک امتِ دعوت ہے۔

﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ﴾

علامہ قرطبی ﷫ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے پہلے فرمایا: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ﴾، اس کے بعد صفات آئیں ﴿رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾، ﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ﴾۔ پہلی صفت کے اندر ترہیب ہے اور ان صفات میں ترغیب ہے۔ جیسے قرآن میں دوسرے مقامات پر یہی ترتیب ہے۔

﴿نَبِّئۡ عِبَادِيۡۤ اَنِّيۡۤ اَنَا الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ﴾ [الحجر:۴۹]

''میرے بندوں کو بتا دو کہ میں ہی بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہوں۔''

اور آگے فرمایا:

﴿وَاَنَّ عَذَابِيۡ هُوَ الۡعَذَابُ الۡاَ لِيۡمُ﴾ [الحجر:۵۰]

''اور یہ بھی بتا دو کہ میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے۔''

اور ایک جگہ فرمایا:

﴿اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيۡعُ الۡعِقَابِ ۖۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ﴾ [الاعراف:۱۶۷]

''بے شک تمہارا رب جلد ہی سزا دینے والا بھی ہے اور یقیناً وہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان بھی ہے۔''

اس آیت میں ترہیب بھی ہے اور ترغیب بھی ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث پاک ہے:

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْعُقُوبَةِ، مَا طَمِعَ بِجَنَّتِهِ أَحَدٌ، وَلَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الرَّحْمَةِ، مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهِ أَحَدٌ)) [صحیح مسلم، حدیث:۲۷۵۵، بَابٌ: فِي سِعَةِ رَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى...]

''حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مومن کو پتا ہو کہ اللہ کے ہاں کتنا عذاب ہے، کتنی عقوبت ہے تو ڈر کے مارے جنت کی امید بھی نہ کر سکے اور اگر کافر کو پتا چل جائے کہ اللہ کی کتنی رحمتیں ہیں تو وہ کبھی جنت سے مایوس نہ ہو۔''

اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی رحمت بھی اتنی بڑی ہے اور اس کی سزا بھی اتنی بڑی ہے۔ اس لیے مومن کو چاہیے کہ وہ ''بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ'' رہے۔

حجاج بن یوسف کی اللہ سے امید:

تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ حجاج بن یوسف کی موت کے وقت جو لوگ موجود تھے ان سے ایک بزرگ نے پوچھا کہ جب حجاج مرنے لگا تو اس کا حال کیا تھا؟ ایک آدمی نے کہا کہ میں اس وقت موجود تھا اور اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

''يَا رَبِّ! أَنْتَ أَنْتَ وَأَنَا أَنَا، أَنْتَ الْعَوَّادُ إِلَى الْمَغْفِرَةِ وَأَنَا الْعَوَّادُ إِلَى الذُّنُوْبِ''

''میرا اللہ! تو تو ہے اور میں میں ہوں۔ تو بار بار مغفرت کی طرف لوٹنے والا ہے اور میں بار بار گناہوں کی طرف جانے والا ہوں۔''

اب تیری شان ہے کہ معاف فرمادے۔ میں تو مر گیا، لیکن تیری رحمت تو باقی ہے۔ بزرگ حیران ہوئے اور فرمایا: شاید اللہ معاف ہی کر دے۔ اس کو اللہ سے اتنی امید ہے۔

اللہ سے ڈرنے اور امید رکھنے کی مقدار:

امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا جملہ ارشاد فرمایا جس کے اندر ایمان کی صحیح کیفیت کا بیان آ گیا ہے۔ فرمایا: اگر قیامت کے دن اعلان ہو جائے کہ تمام آدمی جنت میں جائیں گے اور صرف ایک آدمی جہنم میں جائے گا، میں ڈرتا ہوں کہ وہ ایک آدمی میں نہ ہوں۔ اور اگر اعلان ہو جائے کہ سارے جہنم میں جائیں گے اور صرف ایک آدمی جنت میں جائے گا، میں امید کرتا ہوں کہ وہ ایک آدمی میں ہوں گا۔ یعنی اللہ کی رحمت پر امید ہو تو ایسی ہو اور اللہ کے عذاب سے ڈر ہو تو ایسا ہو۔ [كنز العمال، حديث: ٣٥٩١٥، خَوْفُهُ (عُمَرَ) رضي الله عنه]

تقویٰ کی حیثیت:

کسی نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اللہ فرماتے ہیں کہ تقویٰ اختیار کرو۔ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہارا کبھی ایسے جنگل سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے کہ جس میں چھوٹا سا راستہ ہو اور اس پر کانٹے ہوں اور وہ ہو بھی ٹیڑھا تو اس پر آپ کیسے چلتے ہو؟ اس نے کہا: حضرت! میں نظر نیچی کر لوں گا، کپڑے اونچے کر لوں گا اور اپنا وزن برقرار رکھوں گا کہ کہیں ادھر ادھر نہ گر جاؤں۔ فرمایا: یہی تقویٰ ہے کہ گناہوں سے، حرام سے بچتے ہوئے سیدھے نکل جاؤ، اسی کا نام تقویٰ ہے۔ ادھر لذتیں بلائیں گی، ادھر خواہشات بلائیں گی، ادھر حرام بلا رہا ہے اور دنیا کی

زینتیں بلا رہی ہیں اور ادھر قبر، حشر اور آخرت ہے اور تم بچ بچ کر چل رہے ہو تو یہ تقویٰ ہے۔

[التذكرة في الوعظ للقرشي، ص ١٢٧]

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾

آخرت پر ایمان کی ضرورت:

اس کے اندر آخرت کا بیان ہے۔ جس کا آخرت پر ایمان نہیں اس کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر بھی ایمان نہیں ہے، کیونکہ آخرت کی خبر ہمیں حضور ﷺ نے دی ہے۔ اور آخرت پر ایمان نہیں ہوگا تو اللہ کے عدل پر ایمان نہیں ہوگا کہ اللہ نے ایسی دنیا پیدا فرمادی ہے کہ کافر مزے کر رہے ہیں اور مومن پریشان ہیں۔

علماء نے فرمایا ہے کہ اللہ نے اپنے قرآن میں جو قانون بیان فرمائے ہیں ان پر چلنے کے لیے کسی پولیس کی ضرورت نہیں ہے، کسی سیکورٹی فورسز کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ آخرت پر ایمان آجائے۔ جس کا آخرت پر ایمان نہ ہو اس پر لاکھ پہرے لگا دو وہ گناہ کرے گا۔

نیکی کی توفیق اور محرومی کون دیتا ہے؟

ایک آدمی اے سی کمرے کے اندر سو رہا ہے اور اس کے نیچے چادریں بچھی پڑی ہیں، وہ ٹھیک چار بجے اٹھ جاتا ہے، وضو کرتا ہے اور مصلے پر کھڑا ہو کر رو رہا ہے۔ اس کو کس نے اٹھایا ہے؟ اس کو آخرت کی فکر لگی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک آدمی حرم کے دروازے پر کھڑے ہو کر کپڑے بیچ رہا ہے یا ٹوپی بیچ رہا ہے، کوئی عطر بیچ رہا ہے۔ جیسے ہی اذان ہوتی ہے وہ چھپ جاتا ہے۔ اس کو کس نے بھگایا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ جس کا آخرت پر ایمان پورا ہو جائے وہ گناہ کرتا ہی نہیں ہے۔

آدمی گناہ سے کب بچتا ہے؟

حضرت یوسف علیہ السلام پر کتنے ڈورے ڈالے گئے؟ زلیخا نے انتہا کردی تھی۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام ایک غلام ہیں، نوکر ہیں، اس کی کتنی طاقت ہوتی ہے؟ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے ایک ہی لفظ نکلا: معاذ اللہ! میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ تم جو کہہ رہی ہو میرا اللہ دیکھ رہا ہے۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ایک چوکیدار سے جتنا ڈرتے ہیں اتنا

اللہ سے نہیں ڈرتے۔ زبان سے کہہ دیتے ہیں کہ اللہ کو سب پتا ہے، اللہ غفور رحیم ہے۔ اللہ تو غفور رحیم ہے، لیکن تم نے شیطان رجیم ضروری بننا ہے؟ اس کا تو حکم ہے کہ ایمان والے بنو، میرے مدنی ﷺ کے نمونہ پر چلو۔ اس لیے یاد رکھنے کی بات ہے کہ جتنا آخرت پر یقین کامل ہوتا چلا جائے گا اتنا ایمان کامل ہوتا چلا جائے گا۔

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کی قرأت:

حضرت مطرف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضور ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کا بیٹا یزید بن معاویہ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پڑھتے تھے۔ سب سے پہلے مروان نے آ کر ﴿مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پڑھا۔ مروان نے غلطی کی ہے، لیکن علامہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ صحیح ہے، کیونکہ یہ بھی ایک قرأت ہے اور مروان کو یہ پتا تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۴، الفاتحۃ: الآیۃ: ۴]

آخرت میں سب حکومت اللہ کی ہے:

﴿مٰلِكِ﴾ ملک سے ہے کہ یہ ساری مخلوق اللہ کی ملک میں ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝﴾ [مریم: ۴۰]

''یقین جانو کہ زمین اور اس پر سارے رہنے والوں کے وارث ہم ہی ہوں گے اور ہماری طرف ہی ان سب کو لوٹایا جائے گا۔''

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝﴾ [الناس: ۱، ۲، ۳]

''کہو: میں پناہ مانگتا ہوں سب لوگوں کے پروردگار کی، سب لوگوں کے بادشاہ کی اور سب لوگوں کے معبود کی۔''

''مَالِك'' ''مِلْك'' سے بھی ہے اور ''مُلْك'' سے بھی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝﴾ [غافر: ۱۶]

''کس کی بادشاہی ہے آج؟ (جواب ایک ہی ہوگا:) صرف اللہ کی جو واحد و قہار ہے۔''

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ ۝﴾ [الملک: ۱]

''بڑی شان ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ساری بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ﴾ [آل عمران: ۲۶]

''کہو کہ اے اللہ! اے اقتدار کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے اقتدار بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے۔''

﴿قَوْلُهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ۚ﴾ [الانعام: ۷۳]

''اس کا قول برحق ہے۔ اور جس دن صورت پھونکا جائے گا اس دن بادشاہی اسی کی ہوگی۔''

﴿اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ۨ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۚ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا﴾ [الفرقان: ۲۶]

''اس دن صحیح معنی میں بادشاہی خدائے رحمن کی ہوگی۔ اور وہ دن کافروں پر بہت سخت ہوگا۔''

قیامت کے دن ملک اللہ کا ہے۔ اب بھی ملک اللہ کا ہے، لیکن عارضی طور پر کوئی کہتا ہے کہ یہ فلاں کا ملک ہے۔ قیامت کے دن یہ کہنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ کون دعویٰ کرے گا؟ اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔

''مَالِكِ'' کا معنیٰ:

''مَالِكِ'' کی اضافت ''يَوْمِ الدِّيْنِ'' کی طرف کی گئی ہے کہ اس دن صرف وہی مالک ہوگا۔ اس دن اللہ کے حکم کے بغیر کوئی بول بھی نہیں سکتا۔ فرمایا:

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۗ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾

[النبا: ۳۸]

''جس دن ساری روحیں اور فرشتے قطاریں بنا کر کھڑے ہوں گے، اس دن سوائے اس کے کوئی نہیں بول سکے گا جسے خدائے رحمن نے اجازت دی ہو۔ اور وہ بات بھی ٹھیک کہے گا۔''

﴿وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا﴾ [طٰہٰ: ۱۰۸]

''اور خدائے رحمن کے آگے تمام آوازیں دب کر رہ جائیں گی، چنانچہ تمہیں پاؤں کی سرسراہٹ کے سوا کچھ سنائی نہیں دے گا۔''

سب آوازیں اللہ کے احکام کے لیے بجھ گئیں، خاموش ہو گئیں، بالکل ہلکی آواز ہو گئی۔ اور قیامت کے دن بدبخت لوگ بھی ہوں گے اور کامیاب لوگ بھی ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس دن کوئی بطور حکم بھی مالک نہیں ہوگا۔

علامہ ابن جریر رحمہ اللہ نے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کا ایک معنی یہ بھی کیا ہے کہ قیامت کو قائم کرنے والا، کیونکہ یہ اسی کی

طاقت ہے۔لیکن یہ قول ضعیف ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دونوں قول صحیح ہیں۔ پہلا قول راجح ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کے مالک ہیں۔

قیامت کا دن کتنا لمبا ہوگا؟

قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا، لیکن اللہ کے نیک بندوں پر ایسے گزرے گا جیسے ایک نماز پڑھنے کی دیر ہوتی ہے۔ایک روایت میں ہے کہ جیسے عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت ہے۔وجہ یہ ہے کہ جب مصیبت ہو تو رات بڑی ہو جاتی ہے اور جب خوشی ہو تو وقت کا پتا ہی نہیں چلتا۔

صحیحین کے اندر روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ سب سے خراب آدمی وہ ہے جو اپنے آپ کو مالک الاملاک بادشاہوں کا بادشاہ کہتا ہے۔ کیونکہ یہ صرف اللہ کی ذات ہے اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔

[صحیح البخاری: حدیث: ۶۲۰۶ ،باب:أَبْغَضُ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللهِ، صحیح مسلم، حدیث: ۲۱۴۳]

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھ میں زمینوں کو لپیٹ دیں گے اور آسمانوں کو لپیٹ کر فرمائیں گے: ''أَنَا الْمَلِكُ'' میں ہی بادشاہ ہوں (زمینوں کے بادشاہ کہاں گئے؟) ''أَيْنَ الْجَبَّارُونَ؟'' دنیا میں فساد اور جبر کرنے والے کہاں گئے؟ ''أَيْنَ الْمُتَكَبِّرُونَ؟'' زمین میں تکبر کرنے والے کہاں گئے؟

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۷۸۸]

علماء نے فرمایا کہ کسی دوسرے کو مجازاً مَلِک کہہ سکتے ہیں، حقیقی مَلِک تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔قرآن میں ہے:

﴿إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا﴾ [المائدۃ: ۲۰]

''جب اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تمہیں صاحب ملک (حکمران) بنایا۔''

اللہ پاک نے بندوں اور طالوت کو ملک کہا۔قصہ موسیٰ وخضر علیہما السلام میں بھی کہا کہ ایک بادشاہ آنے والا ہے۔تو ملک کا اطلاق کسی پر مجازاً جائز ہے۔

موت سے پہلے تیاری کرلو:

صحیحین کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے امت کے کچھ لوگ اللہ کی

راہ میں (جہاد کرنے کے لیے) اس دریا میں سوار ہوں گے، ان کی حالت تخت نشین بادشاہوں کی طرح ہوگی۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۲۸۷۷، بَابُ غَزْوِ الْمَرْأَةِ فِي الْبَحْرِ، صحیح مسلم، حدیث: ۱۹۱۲]

ایک حدیث پاک میں آتا ہے کہ عقل والا وہ ہے جو موت کے بعد پیش آنے والے حالات کی تیاری موت سے پہلے کرلے۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۵۹]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''حَاسِبُوا أَنْفُسَكُمْ قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوا'' [سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۵۹]

''اپنے نفسوں کا حساب اس دن سے پہلے پہلے کرلو جس دن تمہارا حساب کیا جائے گا۔''

تم اپنے اعمال کا وزن کرلو اس دن سے پہلے جس دن تمہارے اعمال کا وزن کیا جائے گا اور اس پیشی کے لیے تیار ہو جاؤ جو تمہارے رب قدیر کے سامنے ہوگی، جس کے سامنے تمہاری کوئی چھوٹی بڑی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ لہٰذا اب تم اپنا محاسبہ کرلو اور اپنے اعمال کے ساتھ تیاری کرلو۔ اللہ ہم سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔

﴿إِيَّاكَ﴾ اور ﴿نَسْتَعِينُ﴾ کی قراءتیں:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝۴﴾ قراء سبعہ اور جمہور علماء نے اس کو یا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ عمرو بن فائد نے اس کو تخفیف کے ساتھ ﴿إِيَاكَ﴾ پڑھا ہے۔ لیکن یہ قراءت شاذہ ہے۔ اور بعض نے اس کو ﴿أَيَّاكَ﴾ پڑھا ہے، بعض نے ﴿هِيَّاكَ﴾ پڑھا ہے۔ جیسے آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اللہ نے قرآن کو سات قراءتوں میں نازل فرمایا ہے۔ جو بھی پڑھی جائے صحیح ہوتی ہے، لیکن بعض قراءات ایک دوسرے سے زیادہ مشہور ہوتی ہیں۔ پہلے نون کے زبر کے ساتھ ﴿نَسْتَعِينُ﴾ راجح قراءت ہے۔ یحییٰ بن وثاب اور اعمش نے نون کے کسرہ کے ساتھ ﴿نِسْتَعِينُ﴾ پڑھا ہے، لیکن یہ قراءت مشہور نہیں ہے۔

عبادت کا معنی:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ عبادت کا لغوی معنی ذلت ہے کہ ایسا راستہ جس کو چل چل کر سیدھا کر دیا گیا ہو، پرانا کر دیا گیا ہو۔ ''بَعِيرٌ مُعَبَّدٌ أَيْ مُذَلَّلٌ'' اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک اونٹ کو کام میں لگا لگا کر ہلاک کر دیا گیا ہو۔

شریعت کے اندر عبادت اس کو کہتے ہیں جس میں کمال محبت اور کمال خوف دونوں جمع ہو جائیں۔ کیونکہ کوئی بندہ

کسی ذات کی عبادت کر ہی نہیں سکتا جب تک اس کے بارے میں کمالِ محبت پیدا نہ ہو، وگرنہ آپ عاجزی اور تذلل پیدا کریں گے، نہ خشوع اور خضوع پیدا کریں گے۔ اگر ایک چیز ہے اور دوسری چیز نہیں ہے تو عبادت میں لذت پیدا نہیں ہوگی۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ [البقرة:١٦٥]

"اور لوگوں میں کچھ وہ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اس کی خدائی میں اس طرح شریک قرار دیتے ہیں کہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ کی محبت (رکھنی چاہئے)۔ اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔"

اور اس کے بعد محبت کا درجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ سے محبت ہو، کیونکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ))

[صحیح البخاری، حدیث:١٥، باب: حُبُّ الرَّسُوْلِ ﷺ مِنَ الْإِيْمَانِ]

"تم میں سے کوئی آدمی مومن نہیں بن سکتا جب تک میں اس کے نزدیک ماں باپ سے، اولاد سے اور ساری دنیا سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔"

حضور ﷺ سے محبت ہے تو اتباعِ سنت کریں:

محبوب کا معنی اور مطلب یہ نہیں کہ صرف زبانی کلامی اعتراف ہو۔ جیسے اس معنی کے اندر پڑھے لکھے لوگ بھی مغالطے میں پڑے ہوئے ہیں۔ دعویٰ محبت کا ہے، لیکن عمل آپ ﷺ کی سنت کے خلاف ہے۔ آدمی جس سے محبت کرتا ہے اس جیسی شکل بناتا ہے اور اس جیسا لباس پہنتا ہے۔ اگر ہمیں حضور ﷺ سے محبت ہے تو داڑھی سے کیوں ضد ہے؟ حضور ﷺ نے زندگی میں کبھی جماعت کی نماز نہیں چھوڑی۔ اگر ہمیں حضور ﷺ سے محبت ہے تو ہم جماعت میں حاضر کیوں نہیں ہوتے؟ زبان سے دعویٰ کچھ ہو اور اندر کچھ ہو اور عمل کچھ کرے اس کا نام منافقت ہے کہ جس کے دو رنگ ہوں۔ جب ایمان والوں سے ملا تو کہا: ہم تو پکے مومن ہیں۔ میرے دادا بھی شب بیدار اور تہجد گزار تھے اور میرے ابا جان ہر سال حج کرتے تھے۔

بدعات سے محبت اور دعویٰ ایمانی:

ایک میں کہ کبھی مسجد میں نہیں گیا ہوں۔ میرے لیے دعا فرمایا کریں۔ مجھے آج تک اس مسلمان کی سمجھ نہیں آئی ہے۔ ہم قانونی مسلمان ضرور ہیں، لیکن حقیقی مسلمان نہیں ہیں۔ اور جو پکا مسلمان ہے وہ کہتا ہے: میں ہر سال میلاد مناتا ہوں، دس محرم کو باقاعدہ مجلس کرتا ہوں، سبیل لگاتا ہوں اور گیارہویں شریف مناتا ہوں...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ......

قرآن اگر ہاتھ سے گر جائے تو صدقہ کرے گا، خیرات کرے گا، اُٹھ کر قرآن کو چومے گا، خوشبو لگائے گا اور پریشان ہوگا، کہے گا کہ میرے لیے کیا سزا ہے؟ مجھ سے بڑی بے ادبی ہوگئی ہے اور جو قرآن کے اندر احکامات ہیں ان کو نہیں ماننا۔ یہ کیسا ایمان ہے؟ فاتحہ خوانی پر لڑتے لڑتے مر گئے کہ اس کے بغیر نماز ہوتی ہے یا نہیں، لیکن قبروں پر سجدہ جاری ہے۔ جبکہ فاتحہ کا سبق یہ ہے ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝﴾ اس میں غیر کی عبادت نہیں ہو سکتی۔

صرف اللہ کی عبادت کرنے کا معنی:

﴿اِیَّاکَ﴾ مقدم ہے، حصر کا فائدہ دے رہا ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ یہ معنی نہیں ہے کہ تیری بھی عبادت کرتے ہیں۔ تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ دوسری جگہ اس کا معنی بیان فرمایا:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ۝﴾ [الزمر:۲]

"(اے پیغمبر!) بے شک یہ کتاب ہم نے تم پر برحق نازل کی ہے، اس لیے اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ بندگی خالص اسی کے لیے ہو۔"

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا﴾ [النساء:۳۶]

"اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔"

نماز عبادت ہے، رکوع عبادت ہے، سجدہ عبادت ہے، دعا، ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، عاجزی، تذلل اختیار کرنا عبادت ہے اور یہ صرف اللہ کا حق ہے۔

دعا میں شرک:

ایک عبادت نداء اور پکارنا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم بزرگوں کی عبادت نہیں کرتے، صرف دعا کرتے

ہیں۔ جبکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((الدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۳۳۷۱]

''دعا عبادت کا مغز ہے۔''

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۝﴾

[غافر: ٦٠]

''اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ تکبر کی بنا پر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔''

یہاں لفظِ عبادت سے دعا مراد ہے۔ اس لیے حرفِ یا کے ساتھ غیر اللہ کو پکارنا مثلاً: کوئی کہتا ہے: یا رسول اللہ!، یا نبی اللہ!، یا ابراہیم خلیل اللہ!، یا جبرائیل!، یا میکائیل!، یا اسرائیل!، یا آدم!، یا نوح!، یا پیر!، یا دستگیر!۔ یہ شرک ہے، کیونکہ صرف اللہ کو پکارنا چاہیے۔

حضور ﷺ نے بھی اللہ کو پکارا ہے۔ آدم علیہ السلام نے بھی اللہ کو پکارا ہے۔ آپ خانہ کعبہ میں رکن یمانی کے پاس جو دعائیں پڑھ رہے ہیں یہ وہی دعائیں ہیں جو قرآن میں اللہ کے نبیوں نے مانگی ہیں، میرے مدنی پاک ﷺ نے مانگی ہیں۔ ان دعاؤں میں یعنی قرآن وحدیث میں کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں ہے کہ اے ابراہیم! اے جبرائیل! مہربانی کر، یا داتا! یا دستگیر! یا پیر! ہماری مدد فرما۔

خدا ہماری سنتا نہیں اور ان کی موڑتا نہیں:

ان کا فلسفہ یہ ہے کہ ہم تو ان بندوں تک نہیں پہنچے تو خدا تک کیسے پہنچیں گے؟ ہم گناہ گار ہیں، ہماری گندی زبانیں ہیں ہم اللہ سے کیسے مانگیں؟ یہ اللہ کے پیارے ہیں ان کی بات خدا کبھی نہیں موڑ سکتا اور معاذ اللہ ہماری بات تو اللہ سنتا ہی نہیں ہے۔ یہ ان کا عقیدہ ہے۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ اور ہر مسلمان کو کفر وشرک سے بچائے۔ (آمین)

محبت میں مبالغہ کا نقصان:

محبت کا معنی یہ نہیں کہ ہم شرک کریں اور حد سے تجاوز کریں۔ کوئی آدمی اپنی بیوی سے محبت کرتے کرتے ماں بنا

لے تو وہ بیوی اس پر حرام ہو جائے گی۔ اسی طرح کوئی آدمی ولی سے محبت کرتے ہوئے اس کو نبی بنا دے اور نبی سے محبت کرتے ہوئے اس کو خدا بنا دے۔

کیا ولایت اور امامت کا درجہ نبوت سے زیادہ ہے؟

بلکہ ان کا عقیدہ بن گیا کہ ولایت کا درجہ نبوت سے بھی اونچا ہے۔ پہلے ملنگوں نے عقیدہ بنایا تھا کہ امامت کا درجہ نبوت سے بھی زیادہ ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ نے معاذ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی ہے۔ پہلے ملنگوں کا یہ عقیدہ تھا تو ہمارے لوگوں نے کہا کہ ہم کیوں پیچھے رہ جائیں تم تو امامت کی بات کرتے ہو ہم کہتے ہیں کہ ولایت کا درجہ نبوت سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ نبی تو نبی ہے لیکن دعا کر رہا ہے:

﴿رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِينَ﴾ [الشعراء: ۸۳]

''میرے رب! مجھے حکمت عطا فرما، اور مجھے عباد صالحین میں شامل فرما۔''

اور عباد صالحین ولی ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ولایت کا مرتبہ بلند ہے۔ یہ جہالت ہے اور جہالت بری بلا ہے۔ اللہ ہدایت عطا فرمائے۔

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کے اندر سارا مسئلہ ہے ﴿إِيَّاكَ﴾ پہلے ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ یہ حصر ہے بمعنیٰ بند کر دینا اب عبادت صرف اللہ کے لیے بند ہو گئی۔ حضور ﷺ نے اس کی تفسیر میں فرمایا:

((إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ))

''جب تو سوال کرے تو اللہ سے سوال کر، اللہ سے مانگ۔''

((وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۵۱۶]

''جب مدد پکڑو تو اللہ کے ساتھ مدد پکڑو۔''

یہ جملے اگر سمجھ لو تو ساری زندگی شرک سے بچ جاؤ گے۔

اللہ سب کی سنتا ہے:

کہتے ہیں کہ اللہ پاک تو فوق العرش ہیں، وہ ہماری کیسے سنیں گے؟ تو اللہ نے فرمایا:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ

يَرْشُدُوْنَ﴾[البقرة:١٨٦]

''اور (اے پیغمبر) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجیے:) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں۔ لہٰذا وہ بھی میری بات دل سے قبول کریں، اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ راہ راست پر آ جائیں۔''

اللہ فرمارہے ہیں میں قریب ہوں کیونکہ اس کا علم ہر شی کو محیط ہے۔ تو معیت علمی کے اعتبار سے اللہ پاک ہر چیز کے قریب ہیں۔ اس کی شان عالی ہے۔

بلکہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر نزولِ اجلال فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں: ((هَلْ مِنْ سَائِلٍ يُعْطَى؟)) (ہے کوئی مانگنے والا جس کا میں سوال پورا کروں؟) [مسلم، رقم:٧٥٨]

کیا مقبول دعا کے لیے وسیلہ ضروری ہے؟

اللہ پاک فرمارہے ہیں کہ ہے کوئی مانگنے والا؟ اور ہمارے لوگ کہتے ہیں کہ خدا سنتا ہی نہیں کہتے ہیں کہ اللہ سے بات کرنے کے لیے کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت ہے جیسے دنیا کے بادشاہ کے پاس جانے کے لیے واسطے کی ضرورت پڑتی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بادشاہ کے ساتھ تشبیہ دینا کفر ہے۔ کیونکہ فرمایا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾[الشوریٰ:١١]

''اس کی تو کوئی مثل ہی نہیں ہے۔''

یہ مثال دینے سے انسان ایمان سے بھی نکل جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بادشاہ انسان ہیں کبھی راضی ہیں اور کبھی ناراض ہیں کبھی سنتے ہیں کبھی نہیں۔ جبکہ وہ کریم ذات کہہ رہی ہے کہ مجھ سے مانگو اگر مجھ سے نہیں مانگو گے تو میں ناراض ہو جاتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جب بندہ توبہ کرتا ہے تو میرے اللہ خوش ہوتے ہیں کہ دیکھو ملائکہ میرے بندے نے آج پہچان لیا ہے کہ اس کا بھی کوئی رب ہے۔ اگر کوئی آدمی ستر سال بھی گناہ کر کے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بھی معاف فرما دیتے ہیں۔ وہ اتنا ارحم الراحمین ہے تو وہاں سیڑھیاں لگانے کی کیا ضرورت ہے؟

کسی کو قاضی الحاجات یا کافی المہمات سمجھنا، مشکل کشا سمجھنا، سیڑھیاں پکڑنا یہ سب چیزیں کفر و شرک کی حد میں آجاتی ہیں۔ اللہ پاک ہر مسلمان کو کفر و شرک سے بچائے۔ پورے دین کا خلاصہ نکالو تو ان دو جملوں میں ہے کہ عبادت بھی اللہ کی ہو اور مدد بھی اس سے مانگی جائے۔ حضور ﷺ ساری ساری رات نماز کے اندر گزارتے تھے۔ پاؤں پر ورم آجاتے تھے۔ حضور ﷺ تو اللہ کی نماز پڑھیں اور ہم لوگوں کی نماز پڑھیں۔

انبیاء علیہم السلام روتے رہے ہیں، حتیٰ کہ روتے روتے حضرت نوح علیہ السلام کا لقب بھی نوح پڑ گیا۔ یاد رکھیں! نبی نبی ہوتا ہے اور ولی ولی ہوتا ہے۔ لاکھ ولی ایک پیغمبر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور سارے نبی میرے پیارے مدنی ﷺ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قرآن میں کسی جگہ حضور ﷺ نے اپنے ابا ابراہیم علیہ السلام کو پکارا ہو یا اللہ کو ان کا واسطہ دیا ہو، حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اور جتنے بزرگ گزرے ہیں۔ اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ ان کی زندگیاں دیکھ لیں۔ کہیں یہ بات نہیں ملے گی۔

دعا میں وسیلہ:

ہمارے بھائیوں نے بس ایک روایت دیکھی ہوئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے یوں اوپر دیکھا تھا، عرش کے پائے پر حضور ﷺ کا نام لکھا ہوا تھا تو حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ! یہ کس کا نام لکھا ہوا ہے؟ اللہ نے فرمایا یہ میرا محبوب ہے، حبیب ہے اور آخری نبی ہے تو حضرت آدم علیہ السلام نے حضور ﷺ کا واسطہ دیا تو اللہ نے دعا قبول فرمائی۔ لیکن وہ ہمیں یہ بات صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں دکھائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے حضرت آدم علیہ السلام کو خود سکھلایا کہ تم ان کلمات کے ذریعہ مانگو تو ہم تمہاری دعا قبول کریں گے۔ فرمایا:

﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ [البقرۃ:۳۷]

''اللہ نے اپنی طرف سے ان کے دل میں کلمات ڈالے کہ ان کلمات سے مانگو تو میں راضی ہوں گا۔''

وہ کلمات یہ تھے:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا٘ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [الاعراف:۲۳]

''اے ہمارے پروردگار! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گزرے ہیں، اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ

کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔"

حضرت آدم علیہ السلام کا پیدا ہونا اور فرشتوں کو سجدہ کرنا بھی قرآن میں موجود ہے، شیطان کا انکار کرنا، حضرت آدم وحوا علیہما السلام کا جنت میں داخل ہونا، ان کو درخت سے روکا جانا، ان کا درخت کو کھانا، ان کے کپڑوں کا اتر جانا اور ان کو جنت سے اتار کر دنیا میں بھیجنا بھی قرآن میں موجود ہے۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام نے میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ پکڑا تھا تو وہ قرآن میں موجود کیوں نہیں ہے؟

ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو تو قرآن میں ذکر کر دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو مٹی سے پیدا فرمایا۔ وغیرہ ان سب کو اللہ نے ذکر کیا لیکن جو اصل مسئلہ واسطہ تھا اس کو اللہ نے بیان نہیں کیا۔ اچھا اگر قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ذکر فرما دیتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں وضو سکھلا دیا، مسح کرنا سکھلا دیا، لیکن یہ مسئلہ نہیں سکھلایا۔ خدا کے لیے اس پر غور کریں۔

قرآن کی اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ﴾

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرو۔"

کیا یہاں پیچھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے؟ بلکہ پیچھے تقویٰ کا ذکر ہے کہ اللہ سے تقویٰ کے ساتھ وسیلہ پکڑو، اپنے اعمالِ صالحہ کو وسیلہ بناؤ۔ ہم معاذ اللہ اللہ کے قرآن میں بلاوجہ تحریف کر دیں؟ آگے ارشاد فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ﴾

"اور اس کے راستے میں جہاد کرو۔"

اگر ہمیں واسطے کا حکم دیا جا رہا تھا تو پھر محنت کے حکم کی کیا ضرورت تھی؟ اور فرمایا:

﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝﴾ [المائدۃ:٣٥]

"شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔"

اللہ چاہے تو تمہیں کامیاب کر دے اور چاہے تو ناکام کر دے۔

انگوٹھے چومنے کا مسئلہ:

لیکن آج ہم رواج کے اندر اتنے پھنس گئے ہیں کہ چاہے ان کو قرآن سناؤ، حدیث سناؤ مانتے نہیں ہیں۔ پورا

قرآن سنتے ہیں، لیکن جب حضور ﷺ کا نام آئے تو انگوٹھے چومنے لگ جاتے ہیں۔ بھائی! ہاتھ اپنا چومتے ہو اور احسان حضور ﷺ پر کر رہے ہو؟ روٹی تم کھاؤ اور فائدہ مجھے پہنچے؟ آج تک یہ مسئلہ میری عقل کے اندر نہیں بیٹھا۔ تمہارے ہاں کوئی پیر آ جائے تو اس کے ہاتھ چومتے ہو یا اپنے ہاتھ چومتے ہو؟

سارے قرآن کا خلاصہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ والی آیت میں ہے:

علامہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سارے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے اور ساری سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ ہے۔ عبادت بھی تیری ہے اور مدد بھی تجھ سے مانگیں گے۔ جب ہم ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہتے ہیں تو ہم شرک سے بری ہو جاتے ہیں اور جب ہم ﴿وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ کہتے ہیں تو ہم اس میں اعتراف کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہم عاجز ہیں، ہم تیری مدد پکڑیں گے۔ تیرے سوا کوئی مدد کرنے والا نہیں ہے، تیرے سوا کوئی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہے، تیرے سوا کوئی حاجت روا اور مشکل کشا نہیں ہے، تیرے سوا کوئی نذر و نیاز اور استغاثہ کا مالک نہیں ہے اور تیرے سوا کسی کی منت نہیں ہے، ہم نے عبادت بھی تیری کرنی ہے اور مدد بھی تجھ سے مانگنی ہے۔ اب سیدھے راستے پر آ گئے۔

اللہ ہی عبادت کے لائق کیوں ہے؟

زمانہ تین قسم پر ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ ماضی زمانہ گزرا ہوا، حال موجودہ زمانہ اور مستقبل آئندہ زمانہ ہے۔ جب ہم نے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ کہا تو ہم نے اقرار کیا کہ ماضی میں ہم عدم تھے تو اس سے تو نے ہی وجود بخشا اور تو ہی ہمارا رب ہے۔ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ بہت مہربان، نہایت رحم والا اللہ کہ جس نے ہماری ہر ضرورت کو پورا فرمایا، اللہ نے ہماری ہر حال میں مدد فرمائی اور ہمیں نعمتیں عطا فرمائیں۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ کے اندر استقبال والا معنیٰ ہے کہ یا اللہ! ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں کہ جیسے تو نے ماضی اور حال میں ہماری مدد فرمائی ہے ایسی ہی آنے والے زمانہ میں اور آخرت میں بھی ہماری مدد فرمانا۔

اسی طرح جب آپ غور کریں گے کہ ہمیں عدم سے وجود میں لانے والا اللہ ہے، ہمیں پیدا کرنے والے، ہماری تربیت کرنے والے، ہم پر رحم کرنے والے اور مہربانی کرنے والے اللہ ہیں تو عقلی تقاضا یہ ہے کہ عبادت کے لائق بھی صرف اسی کی ذات ہے۔

پیروں کو رب بنانے کی مذمت:

قرآن پاک کی آیت مبارکہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [التوبۃ:۳۱]

''بعض لوگوں نے اپنے مولویوں کو اور پیروں کو اللہ کے سوا خدا بنالیا ہے۔''

''اَحْبَار'' ''حَبْرٌ'' کی جمع ہے بمعنیٰ عالم اور ''رُهْبَان'' ''رَاهِبٌ'' کی جمع ہے۔ وہ لوگ جو گوشہ نشین ہوتے ہیں، پہاڑوں میں چلے جاتے ہیں۔ ان کو عیسائی مذہب میں راہب کہتے ہیں۔ ''اَرْبَاب'' ''رَبٌّ'' کی جمع ہے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ پہلے عیسائی تھے، پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! قرآن میں ہے کہ لوگوں نے اپنے مولوی، راہب اور پنڈت کو رب بنالیا جبکہ ہم نے تو کبھی رب نہیں بنایا تھا۔ (ہم نے پیر کو پیر کہا ہے، کبھی رب نہیں کہا ہے۔) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عدی! جن چیزوں کو اللہ نے حلال کیا، لیکن تمہارے مولویوں اور پیروں نے ان کو حرام کر دیا تو تم نے ان مولویوں کی بات مان لی یا نہیں مانی؟ انہوں نے کہا کہ مانی تھی۔ اور جن چیزوں کے بارے میں حکم دیا کہ ان کو کرو اور انہوں نے کہا کہ ان کو نہ کرو اور جن چیزوں کے بارے میں اللہ فرمایا کہ ان کو نہ کرو انہوں نے کہا کہ اس کو کرو۔ تو تم نے ان کی بات کو مانا یا نہ مانا؟ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہفتہ والے دن شکار نہ کرو تو پادریوں سے پوچھا کہ یہ بڑا مشکل حکم ہے اس دن مچھلی بھی بہت ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح کرو کہ چھوٹے چھوٹے نالے بنا کر آگے حوض بنالو جب مچھلی ان میں آجائے تو اس کو بند کر دیا کرو اور دوسرے دن پکڑ لیا کرو۔ لوگوں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ حضرت حاتم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بات ایسے ہی تھی وہ جس کے بارے میں ہمیں کہتے تھے کہ کرو، ہم اس کو کرتے تھے اور جس کے بارے میں کہتے تھے کہ نہ کرو تو ہم نہ کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ حق تو رب کا ہے۔ جب اس کے مقابلے میں یہ حق کسی بندے کو دے دیا تو گویا تم نے اس کو رب بنالیا۔ [السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث: ۲۰۳۵۰]

گیارھویں، عرس اور قبروں کا طواف:

سارے قرآن مجید کو آپ ٹھنڈے دل سے پڑھ لیں اللہ یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جگہ گیارھویں کرنے کا حکم دیا ہے، عرس شریف کا حکم دیا ہے؟ جب یہ حکم قرآن میں نہیں تو ہم جن مولویوں کے حکم پر چل رہے ہیں تو گویا ہم ان کو

رب بنا رہے ہیں۔ اللہ نے قرآن پاک کے اندر فرمایا کہ میرے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں ہے۔ تو انہوں نے کہا وہ سجدہ الگ ہے یہ سجدہ تعظیمی ہے کعبہ والا طواف عبادت کا ہے اور قبر والا طواف تعظیم کا ہے۔

ماتحت الاسباب اور مافوق الاسباب مدد کا حکم:

﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝﴾ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ مدد اس سے مانگی جاتی ہے جو ہماری بولی بھی جانتا ہو اور جو ہماری بولی ہی نہ جانتا ہو اگر اس سے مدد مانگتے رہیں تو وہ کہے گا کہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیا جب وہ مر جائے تو قبر میں جانے کے بعد تمام زبانیں سمجھنے لگ جاتا ہے؟ کسی سے دنیاوی اسباب کے اعتبار سے مدد مانگنا مثلاً میں کسی کو کہوں کہ مجھے چلنے میں تکلیف ہو رہی ہے ذرا تھوڑا سا سہارا تو دو یہ جائز ہے۔ ایک ہے کسی کو متصرف، مختار کل مانتے ہوئے اس سے مدد مانگنا یہ شرک ہے یا یہ عقیدہ رکھے کہ قادر مطلق خدا ہے رازق خدا ہے، متصرف فی الامور بھی خدا ہے، لیکن اللہ نے ان کو بھی مختار بنا دیا ہے۔ اب ہم ان سے مانگیں گے۔ یہ شرک ہے۔

کفار مکہ اور موجودہ لوگوں کا نظریہ:

جب مشرکین سے پوچھا جاتا تھا کہ تم بتوں کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ تو وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ ہمارے خدا ہیں، بلکہ وہ کہتے تھے:

﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ [یونس:۱۸]

''یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ جس سے ہمارا کام ہو جاتا ہے۔''

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ﴾ [الزمر:۳]

''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔''

اس لیے جب وہ تلبیہ پڑھتے تھے تو کہتے تھے:

''لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ، تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ.''

''اللہ! تیرا کوئی شریک نہیں ہے، مگر جس کو تو نے خود اپنا شریک بنایا ہے۔ اس کا مالک بھی تو ہے اور وہ تیرا مالک نہیں ہے۔''

ان کا عقیدہ بھی یہی تھا۔ اب اسی عقیدہ کے ساتھ کسی بزرگ کے مزار پر جانا، کسی اللہ والے کی قبر پر جانا، ان کے آستان پر جانا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ اصل تو اللہ ہے، لیکن اللہ نے ان کو بھی کچھ نہ کچھ اختیار دے دیا ہے۔ اور اسی

اختیار دیے ہوئے میں سے ہمیں دے دیتے ہیں یہ بھی شرک ہے۔

معجزات اور کرامات کے ذریعہ دھوکہ:

معجزات اور کرامات سے دھوکہ دیتے ہیں۔ جیسے حضور ﷺ نے چاند کو دو ٹکڑے فرمایا تو کہتے ہیں اگر اختیار نہ ہوتا تو چاند کو دو ٹکڑے کیسے فرماتے؟

پانی کا دریا بہہ رہا ہے اللہ کا ولی پوری فوج لے کر اس پر گزر گیا لوگوں نے کہا اگر اختیار نہ ہوتا تو دریا پر سے کیسے گزرتے؟ معلوم ہوا کہ اللہ نے ان کو اختیارات دے دیے ہیں۔ تو ان معجزات اور کرامات سے آدمی کو دھوکہ دیا جاتا ہے۔

یاد رکھیں! اللہ کے حکم کے بغیر معجزہ نبی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہو سکتا اور کرامت اللہ کے ولی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اللہ چاہتے ہیں تو دکھلا دیتے ہیں او اگر اللہ نہیں چاہتے ہیں تو نہیں دکھلاتے۔ اگر اللہ چاہتے ہیں تو حضور ﷺ کی انگلی مبارک سے چاند دو ٹکڑے ہو جائے اور اگر اللہ نہیں چاہتے ہیں تو حضور ﷺ کے دو دندان مبارک شہید بھی ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے پیالہ کے اندر اپنا ہاتھ مبارک رکھا تو پندرہ سو آدمیوں نے اس سے پانی پی لیا۔ کبھی نہ دکھلایا تو حضور ﷺ کئی کئی دن فاقہ سے رہے۔

معجزہ و کرامت برحق ہے، لیکن تب ظاہر ہوتے ہیں جب اللہ تعالیٰ دکھلانا چاہتے ہیں نہ معجزہ نبی کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے اور نہ کرامت ولی کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مکہ والے آپ کے پاس آ گئے کہ آپ ہمیں یہ معجزہ دکھائیں اور یہ معجزہ دکھائیں تو اللہ نے فرمایا:

﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا﴾ [الاسراء: ۹۳]

''میرے مدنی! آپ ان کو جواب دیں کہ اے کافرو، معجزہ مانگنے والو! میرے رب کی ذات پاک ہے میں تو ایک بشر ہوں اور اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک رسول ہوں۔ معجزات ہمارے ہاتھ میں نہیں ہیں۔''

تمام پیغمبروں نے کہہ دیا:

﴿وَمَا كَانَ لَنَا أَن نَّأْتِيَكُم بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ [ابراہیم: ۱۱]

"اے کافرو! معجزہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر تمہارے مطالبے پورے کر دیں۔"

اس لیے کسی کو قادر مطلق، خالق، مالک سمجھ کر مدد مانگنا بھی شرک ہے اور یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ نے ان کو اختیار دے دیا ہے یہ بھی شرک ہے۔

تفسیرِ مکی

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: بیت اللہ، کتاب اللہ اور اہل اللہ۔ اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے۔ جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درس قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا محمد مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحید خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں، وہاں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کی عقیدت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے۔ بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمال مہارت سے سامعین کو راہ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکر آخرت، اخلاص و تقویٰ، اخلاق حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ زیر نظر تفسیر "انوار الحرم" المعروف "تفسیر مکی" حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس کا مجموعہ ہے۔

مکتبۃ الفقیر
223 سنت پورہ فیصل آباد
☎ [illegible]
[illegible]

تفسیرِ مکی

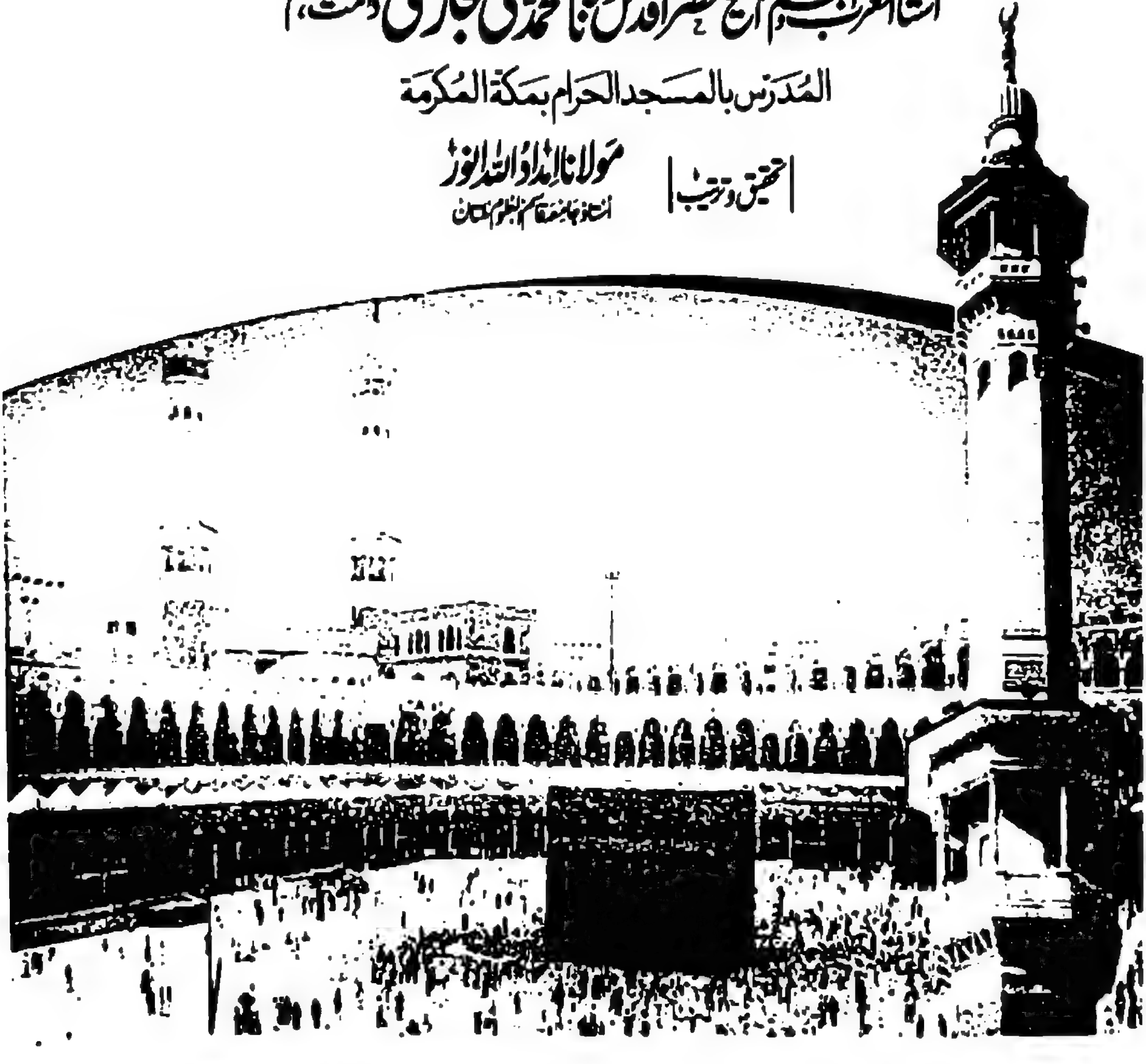
جلد 2

استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم

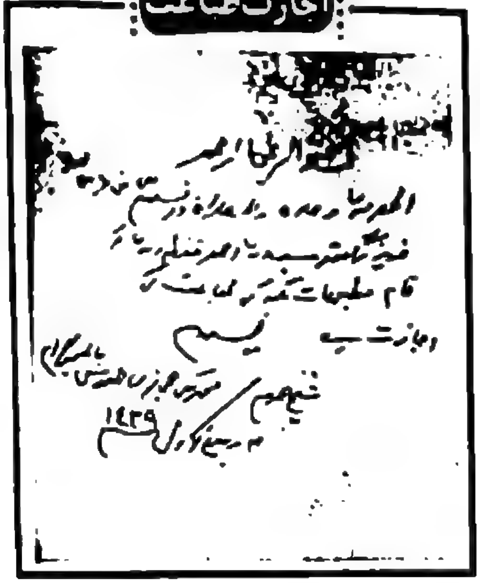
المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

تحقیق و ترتیب | مولانا امداد اللہ انور

استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان



اجازت طباعت



نام کتاب — تفسیر مکی جلد 2

صاحب خطبات — فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

تحقیق و ترتیب — مولانا امداد اللہ انور
استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان

کمپوزنگ — ادارہ تصنیف مکتبۃ الفقیر الاسلامی جھنگ

اشاعت اول — فروری 2019ء

تعداد — 1100

ناشر

مکتبۃ الفقیر

www.Tasawwuf.org
0300-9652292,03228669680
0335-7873390,03101702690
E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین



- پیش لفظ ____ 29

تفسیر سورۃ البقرۃ 31

- مکی مدنی سورتوں کی پہچان کا ضابطہ ____ [illegible]
- سورۂ بقرہ کے بنیادی مضامین ____ [illegible]
- سورۂ بقرہ میں بعض مکی آیات ____ [illegible]
- "بقرۃ" نام کیوں؟ ____ [illegible]
- سورۂ بقرہ میں احکام کی تعداد ____ [illegible]

فہرست مضامین

- سورۂ بقرہ کی بعض آیات کے فضائل و خواص ـــــ 32
- سورۂ بقرہ کے نام ـــــ 33
- ربط سورت ـــــ 33
- حکایت ـــــ 34
- اتباعِ سنت کی مثال...... حکایت ـــــ 34
- کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنا ـــــ 35
- الٓمّٓ ـــــ 35
- حروفِ مقطعات ـــــ 35
- حروفِ مقطعات کا معنی معلوم نہیں تو نزول کا کیا فائدہ؟ ـــــ 36
- امام محمد رحمہ اللہ کا جواب ـــــ 37
- اصحاب کہف اور جنات کا علاج ـــــ 37
- ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ ـــــ 37
- کتاب اللہ کی حفاظت ـــــ 37
- سورۂ بقرہ کے فضائل ـــــ 38
- گھر میں سورۂ بقرہ پڑھنے کی برکت ـــــ 38
- ضعیف روایت کی بعض اقسام ـــــ 39
- نبی ﷺ کے گھر کی عظمت ـــــ 39
- حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی عظمت ـــــ 39
- گھر سے شیطان کے نکل جانے کے بعد گناہ کیوں؟ ـــــ 40
- ہمارے پڑھنے میں اثر کیوں نہیں؟ ـــــ 41
- حضرت لاہوری رحمہ اللہ اور قرآن میں لذت ـــــ 41
- مشتبہ کمائی سے حضرت لاہوری رحمہ اللہ کی احتیاط ـــــ 42
- گناہوں سے حفاظت کا ایک طریقہ ـــــ 43
- اہلِ قرآن سب سے مقدم ہیں ـــــ 43

- سب سے پہلے آدمی کی نماز دیکھو! — [illegible]
- ملازم کے لیے خصوصیات — [illegible]
- فرشتے اتر کر اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سن رہے تھے — [illegible]
- سورۂ بقرہ کی تلاوت کا ثواب — [illegible]
- قیامت کے دن اعمال کو صورتیں دے دی جائیں گی — [illegible]
- حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا انجام — [illegible]
- قرآن کی شفاعت — 49
- ایک صحابی کا خواب — [illegible]
- سورۂ بقرہ اور آل عمران نفاق سے بچاتی ہیں — 50
- قانتین میں شمار — 50
- سورۂ بقرہ کی بعض خصوصیات وغیرہ — [illegible]
- حروفِ مقطعات — [illegible]
- واقعات — [illegible]
- ﴿الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ میں اشارہ بعید کا استعمال — [illegible]
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یہودی مدینہ میں کیوں ٹھہرے؟ — [illegible]
- اس کتاب میں کوئی شک نہیں — [illegible]
- عجیب واقعہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق — [illegible]
- کتاب کا ایک معنی — [illegible]
- تفسیر — [illegible]
- کتاب اللہ اور کلام اللہ میں فرق — [illegible]
- لفظ "قرآن" کا استعمال بعض اور کل قرآن پر درست ہے — [illegible]
- اشارہ بعید لانے کی وجہ — [illegible]
- الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ — [illegible]
- شک سے پاک کتاب — [illegible]

فہرست مضامین

- ہندؤوں کی کتابوں اور عیسائیوں کی بائبل میں غلط باتیں [redacted]
- تفسیر [redacted]
- قرآن کی سچائی اور علوم [redacted]
- لاریب کتاب [redacted]
- قرآن کا نزول صرف آپ ﷺ پر ہی ہوا [redacted]
- ہدایت کے درجات [redacted]
- قرآن سے وابستگی کی وجہ سے عرب میں برکات [redacted]
- تقویٰ کا معیار [redacted]
- حکایت [redacted]
- "الکتاب" سے مراد [redacted]
- اولیاء کرام کی قبروں پر جانا [redacted]
- حضور ﷺ کے مقابلہ میں کفار کا اتحاد [redacted]
- مسلمانوں کی حالت زار [redacted]
- "ریب" کا معنی [redacted]
- کفار کا قرآن کو اللہ کا کلام ماننا حکایت [redacted]
- قرآن کا اعجاز [redacted]
- قرآن کی سچائی کا ایک واقعہ [redacted]
- ایک گانے والے کا اسلام لانا [redacted]
- شہد کی مکھی کا کمال [redacted]
- واقعہ معراج سے قرآن کی تصدیق [redacted]
- "لاریب" پر وقف بھی کرسکتے ہیں [redacted]
- ہدایت متقین کے ساتھ خاص ہے [redacted]
- ہدایت کا معنی نور بھی ہے [redacted]
- قرآن اور نبی ﷺ کے نور ہونے کا مطلب [redacted]

- متقین کی صفات 95
- مباح کاموں سے بچنا 96
- حضور ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تقویٰ کے واقعات 96
- ایک عورت کا واقعہ 97
- حرام کے پیسوں سے حج 98
- متقین کو روز قیامت خدا تعالیٰ کا دیدار ہوگا 98
- دیدار خداوندی حق ہے 98
- تقویٰ کے بعد نیک بیوی بڑی نعمت ہے 99
- متقین کی صفات 100
- ایمان کی تعریف 100
- ایمان کا نمونہ 101
- بعض ایمانیات کا منکر بھی مسلمان نہیں 101
- بعض کفریہ باتیں 102
- حضور ﷺ وہی حکم دیتے ہیں جو اللہ کا حکم ہوتا ہے 103
- ابو جہل کا دل سے حضور ﷺ کو ماننا اور زبان سے انکار کرنا 104
- ایمان اور اسلام میں فرق 105
- ایمان اعمال صالحہ کا حصہ ہے یا نہیں؟ 106
- حضور ﷺ کے احکام کا انکار کفر ہے 108
- منافق کا قصہ 108
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دشمن 109
- انکار حدیث کفر ہے 110
- عبادات کامل ایمان کے لیے ضروری ہیں 110
- اجمالی ایمان کا ذکر 111
- غیب کی تعریف 111

فہرست مضامین

- غیب اور غائب میں فرق ______ [illegible]
- واقعہ معراج پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایمان ______ [illegible]
- ایک دیہاتی کا حضور ﷺ پر ایمان لانے کا عجیب واقعہ! ______ [illegible]
- دین کی کچھ اشیاء پر ایمان لانے کا حکم ______ [illegible]
- ایمان کا جزء کفر سے بیزاری ______ [illegible]
- امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک نماز چھوڑنے والے کا حکم ______ [illegible]
- اقامت صلوٰۃ کا معنی ______ [illegible]
- کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر نہیں ہے ______ [illegible]
- ایمان کے معانی ______ [illegible]
- نکات و فرق ______ [illegible]
- لفظ "ایمان" جامع کلمہ ہے ______ [illegible]
- اصل عالم کون؟ ______ [illegible]
- صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان! ______ [illegible]
- ایمان بالغیب کا ایک اور معنی ______ [illegible]
- غیب کیا ہے؟ ______ [illegible]
- اس امت کی فضیلت ______ [illegible]
- نماز کے اوقات کے لیے امامت جبرئیل علیہ السلام ______ [illegible]
- ادنیٰ اعلیٰ کو نماز پڑھا سکتا ہے ______ [illegible]
- نماز کی اہمیت ______ [illegible]
- عمل کثیر سے نماز خراب ہو جاتی ہے ______ [illegible]
- نماز میں ادب سے کھڑا ہونا ______ [illegible]
- تمام نمازیں اللہ کی ہیں ______ [illegible]
- ہر نماز کو الگ الگ مقرر کرنے کی وجہ ______ [illegible]
- پچاس کی بجائے پانچ نمازیں ______ [illegible]

- حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نماز [redacted]
- زبان سے نماز کی نیت کب کرے؟ [redacted]
- نماز کے کچھ آداب [redacted]
- قرآن سراپا ہدایت ہے [redacted]
- تفسیر [redacted]
- انفاق سے کیا مراد ہے؟ [redacted]
- زکوٰۃ کی فرضیت [redacted]
- منکرین زکوٰۃ سے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی جنگ [redacted]
- کسی ایک بھی فرض کا انکار کفر ہے [redacted]
- تجارت حلال، سود حرام ہے [redacted]
- بینک کا سود [redacted]
- ایک قادیانی کا دھوکہ [redacted]
- تفسیر [redacted]
- نیکی کے کاموں میں فضول خرچی نہیں ہوتی [redacted]
- صدقہ خیرات میں اللہ کی رضا جوئی [redacted]
- نفلی صدقات کا ثواب [redacted]
- زکوٰۃ اور صدقات واجبہ [redacted]
- آیت میں نفقات سے مراد [redacted]
- دولت سے بیزاری کا فائدہ [redacted]
- اسلام کی بنیاد پانچ چیزیں ہیں [redacted]
- اسلام میں افراد کا وزن ہے [redacted]
- آسمانی کتابوں پر ایمان [redacted]
- تورات اور قرآن میں مسئلہ رجم کا بیان [redacted]
- نسخ احکام پر اعتراض و جواب [redacted]

فہرست مضامین

- کتاب اللہ اور کلام اللہ میں فرق [redacted]
- "نزّلنا" اور "انزلنا" میں فرق [redacted]
- مسئلہ ختم نبوت کا ثبوت [redacted]
- تفسیر [redacted]
- تورات وانجیل اب محرف ہو چکی ہیں [redacted]
- ایک شبہ کا ازالہ [redacted]
- ایک نحوی نکتہ [redacted]
- صرف ماننے والے اور مان کر عمل کرنے والے برابر نہیں ہیں [redacted]
- مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کے تفسیری علوم [redacted]
- حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی سیاسی تدابیر [redacted]
- کامیابی کا معنی [redacted]
- خوف اور انذار میں فرق [redacted]
- ائمہ مجتہدین کے درمیان فروعی اختلاف [redacted]
- موجودہ اختلافات [redacted]
- خاتم النبیین کا صحیح معنی کیا ہے؟ [redacted]
- عیسائیوں کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ [redacted]
- ہرقل کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنا [redacted]
- کفار کو بھی تبلیغ کا فائدہ نہیں ہوگا [redacted]
- تفسیر [redacted]
- قرآن پڑھنے سے امید وخوف [redacted]
- ایمان نہ لانے کی خبر کی توجیہ [redacted]
- ترکیب آیت [redacted]
- کیا آدمی اپنے اختیار سے کفر اختیار کرتا ہے [redacted]
- انسان کے اندر علم حاصل کرنے کی قوتیں [redacted]

- مہر کیسے لگتی ہے؟ [redacted]
- نظیر [redacted]
- قرآن کا ترجمہ کرنے کے اہل کون؟ [redacted]
- دلوں کا پھیرنا اللہ کے اختیار میں ہے [redacted]
- دل کا سیاہ ہونا [redacted]
- دلوں اور کانوں پر مہر لگنے کا معنی [redacted]
- کفر کی معافی ہے منافقت کی نہیں [redacted]
- جعلی پیر [redacted]
- حالاتِ حاضرہ [redacted]
- ان آیات کے نزول کے وقت مدینہ کے معروضی حالات [redacted]
- عملی منافق اور ملحد [redacted]
- منافقین کی بخشش نہیں ہوگی [redacted]
- اعمالِ صالحہ میں مسلمان کی حالت میں فرق [redacted]
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ منافق کا جنازہ نہیں پڑھتے تھے [redacted]
- "مَن" کا استعمال [redacted]
- ایمانیات [redacted]
- ایمان ہو تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسا! [redacted]
- نفاق کا معنی [redacted]
- منافقین کی ایک وجہِ عداوت [redacted]
- حدودِ حرم کی تعظیم [redacted]
- اسلام اچھا مذہب ہے، مگر مسلمان بے عمل ہیں [redacted]
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حضور ﷺ سے محبت [redacted]
- ان آیات کے اصل مصداق [redacted]
- ایمان میں مضبوطی کی حکایت [redacted]

فہرست مضامین

- صحابہ رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلاف [redacted]
- یہ منافق ایمان نہیں لائیں گے [redacted]
- صحابہ کے حق میں احتیاط [redacted]
- اہل جہالت کا دھوکہ [redacted]
- منافق اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے [redacted]
- منافقین کا دھوکہ [redacted]
- مسلمان کا جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہنا [redacted]
- واقعہ [redacted]
- تقیہ اور دھوکہ کی مثال [redacted]
- توریہ کلام [redacted]
- منافق کے مقابلہ میں مومن کی صفات [redacted]
- مسلمان دھوکہ نہیں دے سکتا......واقعہ [redacted]
- واقعہ [redacted]
- مسلمانوں کی قلبی حالت کی تبدیلی کی کیفیت [redacted]
- کفار کے سامنے اسلام منوانے کی ایک رکاوٹ [redacted]
- تفسیر آیت [redacted]
- اگر ساری دنیا نافرمان ہو جائے تو خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی [redacted]
- منافقین کے لیے دردناک عذاب ہے [redacted]
- انسانی اعضاء کا دینی حق [redacted]
- عذاب قبر کی مثال [redacted]
- مرض کا معنی [redacted]
- "یَکْذِبُوْنَ" میں دو قراءتیں [redacted]
- مدینہ کے قبرستان سے منافقین کو نکال دیا جائے گا [redacted]
- قاضی اپنے علم کے مطابق فیصلہ نہ کرے [redacted]

- مگر نفاق کا گناہ بھی مٹا دیتا ہے ____ [illegible]
- آدمی کی جان و مال کب محفوظ ہوتا ہے؟ ____ [illegible]
- جو حضور ﷺ کے زمانہ میں "منافق" تھا اب اس کا نام "زندیق" ہے ____ [illegible]
- منافقوں کی ایک چال ____ [illegible]
- منافقین کے قتل کا حکم کیوں نہ دیا؟ ____ [illegible]
- منافق کے مقابلے میں مومن کی صفت ____ [illegible]
- وحی کا دروازہ بند ہو گیا ____ [illegible]
- منافق کی پہچان ایک دروازہ بند ہو گیا ____ [illegible]
- تاویلات کے ذریعہ حرام کو حلال قرار دینا ____ [illegible]
- دین کے مسائل کا مذاق اڑانے والے ____ [illegible]
- فساد کی دو قسمیں ____ [illegible]
- ملعون عورت ____ [illegible]
- بدعقیدہ صحیح العقیدہ کو فسادی کہتے ہیں ____ [illegible]
- جھگڑا فساد نہ ماننے سے ہوتا ہے ____ [illegible]
- جہاد کے احکام کیوں جاری کیے گئے؟ ____ [illegible]
- منافقین کے دعویٰ کا رد ____ [illegible]
- قرآن کے مقاصد کو سمجھنے کی ضرورت ____ [illegible]
- امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک تارک نماز مسلمان نہیں ہے ____ [illegible]
- قیامت کب آئے گی؟ ____ [illegible]
- کافری اعتقادی کافر ہے ____ [illegible]
- اہل بدعت اور اہل ضلال ____ [illegible]
- امام ابو داؤد رحمہ اللہ کی اتباعِ سنت ____ [illegible]
- صرف موافق سنت عمل قبول ہے ____ [illegible]
- مسواک کے فائدے ____ [illegible]

فہرست مضامین

- اعمال میں اخلاص [redacted]
- عمل سنت کے مطابق ہو [redacted]
- کافر کافروں کے دوست ہیں [redacted]
- انبیاء ﷩ کی میراث علم ہے، جائیداد نہیں [redacted]
- حضرت سلیمان علیہ السلام اور ہدہد کا واقعہ [redacted]
- انبیاء ﷩ کی میراث نہیں ہوتی [redacted]
- ایمان وہی قبول ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان کی طرح ہو [redacted]
- تہتر فرقے [redacted]
- صحابہ رضی اللہ عنہم کی عزت وحرمت [redacted]
- صحابہ رضی اللہ عنہم کی ضرورت [redacted]
- جنت میں سب سے زیادہ حضور ﷺ کی امت ہوگی [redacted]
- عجیب حکایت! [redacted]
- صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا کہنے کا طریقہ [redacted]
- صحابہ رضی اللہ عنہم کو پہلی گالی کس نے دی؟ [redacted]
- صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایمان پر پختگی کی مثال [redacted]
- ابوجہل کی بہو کا ایمان [redacted]
- صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی دینے کا جواب سب سے پہلے اللہ نے دیا [redacted]
- شیطان رمضان میں انسان کو کیسے گمراہ کرتے ہیں؟ [redacted]
- شیطان ابوجہل کے ساتھ جنگ بدر میں [redacted]
- ایک کامل ولی کی شیطان سے احتیاط [redacted]
- شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیطان [redacted]
- گمراہ کرنے کے لیے شیطان کی آوازیں [redacted]
- دنیا اور آخرت کا نظام الگ الگ ہے [redacted]
- صحیح پیر کی پہچان کا طریقہ [redacted]

- اللہ کی طرف مذاق وغیرہ کی نسبت ______ 290
- منافقوں کی سرکشی اور ان کا انجام ______ 293
- گمراہی خریدنے کا معنی ______ 293
- مسئلہ تقدیر کو سمجھنے کے لیے آسان مثال ______ 296
- گمراہی خریدنے کا مطلب ______ 297
- ایک صحابی کا ایمان پر جان دینا ______ 297
- ایک بہادر صحابی کا واقعہ ______ 298
- اس امت کا عظیم ثواب ______ 299
- حضور ﷺ کی امت جنت میں پہلے داخل ہوگی ______ 300
- حرمین میں انسان کے عقائد و اعمال کی اصلاح ______ 301
- منافقین کا انجام ______ 301
- مسئلہ نور و بشر کی توضیح ______ 302
- نور ایمان کیا ہے؟ ______ 303
- قرآن کے نور ہونے کا معنی ______ 304
- حضور ﷺ کے نور ہونے کا معنی ______ 305
- نور اور ضیاء میں فرق ______ 308
- منافقین کی مثال آگ کی روشنی سے کیوں دی؟ ______ 309
- امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی چاند کی روشنی میں تصنیف ______ [illegible]
- منافقین کے لیے اس مثال کا مطلب ______ [illegible]
- ابولہب کے نام کی مناسبت ______ [illegible]
- اندھے گونگے اور بہرے کی مثال کیوں دی گئی؟ ______ 312
- منافقوں کی نظر صرف دنیا پر ہے ______ [illegible]
- حجاج اور ایک مجوسی ______ [illegible]
- منافقین کو قیامت کے دن نور کی تلاش ______ [illegible]

فہرست مضامین

- منافق کون سے اندھیروں میں ہیں؟ [redacted]
- ایمان کے نور سے کیا نظر آتا ہے؟ [redacted]
- منافق کی حالت [redacted]
- منافقین کے لیے دوسری مثال [redacted]
- مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ کا واقعہ [redacted]
- بڑوں کی شان اور بڑوں کے لیے طرزِ تخاطب [redacted]
- اصلاحِ عقیدہ [redacted]
- بارش کی ہولناکیاں [redacted]
- معراج کی سواری کا نام براق کیوں؟ [redacted]
- بعض علاماتِ قیامت کا بیان [redacted]
- دجال کا فتنہ [redacted]
- علامات سے چیزوں کی پہچان [redacted]
- اسلام بطور دین و مذہب [redacted]
- صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت [redacted]
- مسلمانوں کی بے بسی [redacted]
- منافق کی تین علامات [redacted]
- منافقوں کی اقسام [redacted]
- کفار کی تہذیب اور حضور ﷺ کی سنت [redacted]
- "صَیِّب" کا معنیٰ [redacted]
- منافق ہر وقت خوف میں رہتا ہے [redacted]
- بجلی کا آنکھوں کو اچکنے کا معنیٰ [redacted]
- اخلاص اور ریا میں فرق [redacted]
- پیر کے نام ایصالِ ثواب [redacted]
- رسوم اور بدعات کی حقیقت [redacted]

- بزرگوں کے ایام اور عرس منانا [redacted]
- محنت کی کمائی والے کھانے میں برکت [redacted]
- حرام کھانے کی نحوست [redacted]
- کافروں کی جہالت اندھیرا ہی اندھیرا ہے [redacted]
- خالص منافق کی علامات [redacted]
- چار قسم کے دل [redacted]
- حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد [redacted]
- اللہ کا شریک بنانا [redacted]
- منافقین کو تنبیہ [redacted]
- عبادت صرف اللہ کے لیے [redacted]
- عبادت اور سجدہ صرف اللہ کے لیے [redacted]
- اگر سجدہ غیر اللہ کو جائز ہوتا.....؟ [redacted]
- حضور ﷺ کی ختم نبوت [redacted]
- غیر اللہ کو پکارنا [redacted]
- اللہ کے مستحق عبادت ہونے کی دوسری دلیل [redacted]
- محتاج مستحق عبادت نہیں ہو سکتا [redacted]
- توحید کے دلائل کی اقسام [redacted]
- قرآن پاک میں غور کا طرز [redacted]
- فقاہت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا عجیب واقعہ! [redacted]
- اکابر کا اختلاف علم کی بنیاد پر تھا [redacted]
- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے باہمی تعلقات [redacted]
- مسلمانوں کے باہمی جھگڑے [redacted]
- خوارج کا اہل بیت رضی اللہ عنہم سے تعصب [redacted]
- مذہبی تعصب [redacted]

فہرست مضامین

- نفاذ اسلام میں ایک رکاوٹ یہ ہے [redacted]
- اسلام میں رواداری [redacted]
- سب سے بڑا گناہ [redacted]
- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی کا خواب [redacted]
- افسوسناک واقعہ! [redacted]
- ہدایت حاصل کرنے کا ایک طریقہ [redacted]
- لوگوں کی قسم کھانا [redacted]
- سب کام خدا کی طرف سے ہوتے ہیں [redacted]
- حضرت یحییٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والے پانچ احکام [redacted]
- امت، جماعت اور اتحاد کا حکم [redacted]
- اسلام میں ہجرت کا حکم [redacted]
- اسلام میں جہاد کا حکم [redacted]
- اہل سنت والجماعت کے عقائد کی پابندی [redacted]
- دنیا اور آخرت میں دیدار خداوندی کا مسئلہ [redacted]
- معراج نبوی ﷺ میں غلو [redacted]
- کیا معراج میں حضور ﷺ نے اللہ کی زیارت کی تھی؟ [redacted]
- صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف کے موقع پر ہمارا فریضہ [redacted]
- مسئلہ سماع موتی [redacted]
- مسئلہ رؤیت باری تعالیٰ [redacted]
- واقعات امام مالک رحمہ اللہ [redacted]
- امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی عجیب حکایت! [redacted]
- ائمہ اسلام کے مختلف کارنامے [redacted]
- تفسیر ابن کثیر کی اہمیت [redacted]
- امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اللہ کے وجود کی دلیل [redacted]

- انسان کے تکبر پر حضرت علی ؓ کا تعجب ا [redacted]
- حضرت علی ؓ نے رب کو کیسے پہچانا؟ [redacted]
- امام احمد ؒ کی دلیل وحدانیت خداوندی [redacted]
- عام علماء کی طرف سے مثال [redacted]
- سورۂ کوثر کا اعجاز [redacted]
- قرآن کے تین اہم مسائل [redacted]
- حضور ﷺ کو نبی اور خاتم الانبیاء ماننا ایمان کے لیے شرط ہے [redacted]
- بعض وہ مسائل جو عقل سے سمجھ نہیں آسکتے [redacted]
- مسئلۂ رسالت [redacted]
- مسئلۂ تحریف [redacted]
- حضرت سلیمان ؑ کے متعلق واقعہ [redacted]
- حضرت ایوب ؑ کا واقعہ [redacted]
- مسیلمہ کذاب کا دعوائے نبوت [redacted]
- واقعہ مرزا قادیانی [redacted]
- حضور ﷺ کی نبوت و رسالت و عبدیت [redacted]
- حضرت ابن عباس ؓ کی فضیلت [redacted]
- حضرت ابوہریرہ ؓ کی کثرت روایت حدیث [redacted]
- حضرت علی ؓ کا حافظہ [redacted]
- تدوین حدیث کی تاخیر پر اعتراض و جواب [redacted]
- شہداء کا معنی مددگار [redacted]
- گمراہی کا اصل سبب [redacted]
- عجیب واقعہ [redacted]
- قرآن جیسی کتاب بنانے کا چیلنج [redacted]
- ایک مسلمان کا دنیا کے بڑے عیسائی پادری سے مناظرہ [redacted]

فہرست مضامین

- جمع وحفاظت قرآن [redacted]
- شاہ فہد کی خدمات قرآن [redacted]
- صحابہ ؓ پر تبرا کرنے والا حفظ قرآن سے محروم [redacted]
- ایک قاری صاحب کا واقعہ [redacted]
- "مِنْ مِثْلِهٖ" کی تفسیر [redacted]
- قرآن کی پکی خبریں [redacted]
- قرآن کی صداقت [redacted]
- قرآن کی صداقت اور جامعیت [redacted]
- عرضی نویسوں کا خاوندوں پر ظلم [redacted]
- قرآن کی خوبیاں [redacted]
- اعجاز قرآنی کی طرف قرآنی اشارات [redacted]
- قرآن کا کفار کو چیلنج [redacted]
- وقود کا معنی [redacted]
- فرق [redacted]
- فرقہ معتزلہ کا نظریہ [redacted]
- بعض قبروں سے خوشبو [redacted]
- جہنم کے عذاب والے پتھر [redacted]
- حضور اکرم ﷺ کو معلم اور مجنون کہنے کی وجہ [redacted]
- قرآن کریم کے اوصاف [redacted]
- ایک انگریز مؤرخ کے نزدیک حضور اکرم ﷺ کی شخصیت [redacted]
- مختصر تفسیر [redacted]
- تکبر کا علاج [redacted]
- قرآن کی صفت "مثانی" [redacted]
- جنت کے پھل [redacted]

- پاک ندیاں [redacted]
- حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کی بیوی [redacted]
- ربط آیات [redacted]
- استاذ کے ادب کا عجیب واقعہ [redacted]
- ایک سردار کا عالی شان محل [redacted]
- ایمان والوں کی مثال [redacted]
- قرآن میں تمثیل کا طرز بیان [redacted]
- ایک حکیم صاحب کا واقعہ قرآن کی جامعیت [redacted]
- قرآن میں ریاضی کے مسائل [redacted]
- شاہ جیؒ اور انگریز کا واقعہ [redacted]
- شاہ جیؒ کی ایک تقریر [redacted]
- مچھر کی مثال پر کفار کا اعتراض [redacted]
- قرآن میں مکھی کی مثال بیان کرنے کی وجہ [redacted]
- ﴿مَا بَعُوضَةً﴾ کی پہلی تفسیر [redacted]
- ﴿مَا بَعُوضَةً﴾ کی دوسری تفسیر [redacted]
- حضرت حسان بن ثابتؓ کی نبی ﷺ کی شان میں مدح کرنا [redacted]
- طبلہ کے ساتھ قوالی اور نعت [redacted]
- ﴿فَمَا فَوْقَهَا﴾ کی پہلی تفسیر [redacted]
- ﴿فَمَا فَوْقَهَا﴾ کی دوسری تفسیر [redacted]
- قرآن کے احکام پر عمل کرنا مشکل نہیں [redacted]
- حضرت عمر فاروقؓ کا واقعہ [redacted]
- سود کے خلاف قرآن کا مطالبہ [redacted]
- جدید حرام کاروبار [redacted]
- دوسری شادی [redacted]

فہرست مضامین

- فرشتوں کی کثرتِ تسبیح [redacted]
- فاسق کا لغوی معنیٰ [redacted]
- اصل اہل قرآن کون لوگ ہیں؟ [redacted]
- گمراہ فرقوں کا ہتھیار [redacted]
- مالک بن نویرہ کے قتل کا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر اعتراض اور جواب [redacted]
- بعض فرقِ ضالہ کے نظریات [redacted]
- ﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا﴾ کا مصداق کون ہے؟ [redacted]
- عہد و میثاق میں فرق [redacted]
- خوارج کی وجہ تسمیہ [redacted]
- یہودیوں میں چوہے کی صفات [redacted]
- پانچ چیزوں کو حرم میں بھی قتل کرنے کا حکم [redacted]
- تفسیر [redacted]
- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ [redacted]
- عہد توڑنے سے کیا مراد ہے؟ [redacted]
- منافقین کی نشانیاں [redacted]
- شاہ جی رحمہ اللہ کی تقریر اور ایک شخص کا تجربہ [redacted]
- منافقین کی دوسری نشانیاں [redacted]
- تفسیر [redacted]
- آیات کا آپس میں ارتباط [redacted]
- اللہ تعالیٰ کے متعلق کفارِ مکہ کا نظریہ [redacted]
- کفر کی لغوی تفسیر [redacted]
- بیٹی بیٹا دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے [redacted]
- موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ [redacted]
- عذابِ قبر برحق ہے [redacted]

- آیات کا ربط [redacted]
- اللہ تعالیٰ نعمتوں کا تذکرہ کیوں فرماتے ہیں؟ [redacted]
- اشیاء میں اصل حلت ہے یا حرمت؟ [redacted]
- ایک بادشاہ کی بیماری کا واقعہ [redacted]
- تفسیر [redacted]
- قیامت کا علم صرف اللہ کو ہے [redacted]
- زمین والوں کی طرح آسمان میں بھی کعبہ ہے [redacted]
- سب سے زیادہ علم والے کون؟ [redacted]
- عذاب قبر برحق ہے [redacted]
- ہر چیز کا علم صرف اللہ کو ہے [redacted]
- مخلوقات کی پیدائش کی ترتیب [redacted]
- کاما بھی کر گھوڑی [redacted]
- ترتیب تخلیق کے متعلق حدیث [redacted]
- آیات کا ربط [redacted]
- مسائل شریعت مشورے سے طے نہیں ہو سکتے، ان کی تنفیذ ہو سکتی ہے [redacted]
- دور نبوی میں ایک عورت کے ساتھ واقعہ اور آپ ﷺ کا فیصلہ [redacted]
- خلیفۃ اللہ فی الأرض [redacted]
- خلفائے راشدین [redacted]
- خلیفہ کا اصل معنی و مطلب [redacted]
- تخلیق آدم کی ضرورت کیوں پڑی؟ [redacted]
- آدم علیہ السلام کو زمین پر خلیفہ مقرر کرنے کی حکمت [redacted]
- خلیفہ کا معنی [redacted]
- آیات میں ربط [redacted]
- نکات [redacted]

فہرست مضامین

[illegible]

- اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے بندوں کے متعلق سوال [redacted]
- بازار میں جانے کی دعا اور اس کی فضیلت [redacted]
- ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے بارے میں وعید [redacted]
- جب تم اللہ کی نافرمانی کرو گے تو مخلوق بھی تمہاری نافرمانی کرے گی [redacted]
- تمہارے اعمال کے مطابق تمہارے حکمران آئیں گے [redacted]
- اللہ کو چھوڑ کر دنیا کے اسباب کے پیچھے کیوں لگ گئے؟ [redacted]
- آیات کا آپس میں ربط [redacted]
- مشورہ کے اہل لوگ [redacted]
- کیا فرشتے عالم الغیب ہیں؟ [redacted]
- نادانی کی ایک مثال [redacted]
- انسان اشرف المخلوقات کیوں ہے؟ [redacted]
- امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی فقاہت [redacted]
- بدھ کے دن نور پیدا کیا گیا [redacted]
- تعلیمی کتاب کو بدھ کے دن شروع کرنا [redacted]
- شادی بیاہ میں مسلمانوں میں ہندوانہ رسم و رواج [redacted]
- امام باقر رحمہ اللہ کی طرف منسوب ایک روایت [redacted]
- ہاروت اور ماروت کا من گھڑت قصہ [redacted]
- اسرائیلی روایات اور ان کی تردید [redacted]
- دیندار لوگوں کی کیا صفات ہونی چاہئیں؟ [redacted]
- امام مالک رحمہ اللہ کا بادشاہ کے بچوں کو گھر پر نہ پڑھانے کا واقعہ [redacted]
- حضرت لاہوری رحمہ اللہ کا صدر ایوب کے بیٹے کا نکاح پڑھانے کا واقعہ [redacted]
- سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ [redacted]
- اصل تفسیر کی طرف عود [redacted]
- اللہ کی تسبیح کے کلمات [redacted]

- سفر کی ایک دعا اور اس کی اہمیت 582
- مخلوق میں خلیفۃ اللہ کا قیام ضروری ہے 583
- اسلام میں خلیفہ کا انتخاب 584
- مسلمانوں کے خلیفہ کے لیے چند شرائط 586
- خلیفہ کے لیے معصوم ہونے کی شرط درست نہیں 586
- اگر بادشاہ سے گناہ صادر ہو جائے تو معزول کر دیا جائے؟ 587
- حکومت کے خلاف بغاوت نہ کریں 588
- حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدے کے بعد اسماء کی تعلیم دینے کی وجہ 590
- کسی کی عظمت اس کے علم کے بعد آجاتی ہے 591
- سجدہ ملائکہ پہلے اور تعلیم بعد میں دو جہ مناسبت کیا ہے؟ 592
- قرآن میں قراءتوں کا اختلاف 594
- حضرت آدم علیہ السلام کا علم 594
- حدیث شفاعت کا بیان 595
- فرشتوں کا اللہ کے سامنے عاجزی اور ضعف کا اعتراف 598
- صحابہ کرام کا "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" کہنے میں کیا حکمت تھی؟ 599
- حضرت درخواستی رحمۃ اللہ علیہ کے حافظے کے واقعات 599
- تین ماہ میں ایک بچے کا قرآن یاد کرنا 601
- تفسیر 603
- آیات کا ربط 605
- ازواج مطہرات کے لیے پردے کا حکم 607
- سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیم میں فرق 608
- تفسیر 610
- یہودی عورت کے چوری کرنے اور سفارش کرنے کا واقعہ ..... [illegible]
- حمات اعمال کا دار و مدار نیک خاتمے پر ہے ..... [illegible]

فہرست مضامین

- سجدہ نہ کرنے سے ابلیس کافر کیسے ہو گیا؟ [illegible]
- ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کی دوسری وجہ [illegible]
- حجر اسود کئی بار بادشاہ لے گئے [illegible]
- حضور ﷺ کو سابقہ انبیاء علیہم السلام پر بہت سی چیزوں میں فضیلت دی گئی [illegible]
- آدم و موسیٰ علیہ السلام کا مناظرہ [illegible]
- تخلیق آدم علیہ السلام [illegible]
- سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی بیماری بتلا دینا معجزہ رسول ﷺ ہے [illegible]
- عجوہ کھجور کی برکات اور فوائد [illegible]
- شہد سے شوگر کے علاج کا واقعہ [illegible]
- حضرت مدنی رحمہ اللہ کا اپنے شیخ کے ساتھ ادب کا واقعہ [illegible]
- انسان جلد باز کیوں ہے؟ [illegible]
- گزشتہ باتوں پر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تنقید [illegible]
- لڑکی کے جمال کو دیکھ کر محبت کرنے والے کا واقعہ [illegible]
- تخلیق آدم علیہ السلام کے وقت مٹی کی پناہ [illegible]
- لوگوں کی رنگت مختلف ہونے کی وجہ [illegible]
- غیر مسلم کا اسلام کی تعریف لکھنے کا مقصد [illegible]
- مرزا قادیانی اور حکیم نور دین بھیروی [illegible]
- ابلیس کا تعارف [illegible]
- دجال مکہ میں [illegible]
- مرزا قادیانی مسلمانوں میں [illegible]
- ابلیس فرشتوں میں [illegible]
- انسان کو سجدہ جائز نہیں [illegible]
- حاکم وقت کی اطاعت [illegible]
- یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کو تھا یا آدم قبلہ تھے؟ [illegible]

- متکبر جنت میں نہیں جائے گا ---- [redacted]
- ﴿وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ کا کیا معنی ہے؟ ---- [redacted]
- امت کا معنی ---- [redacted]
- بے پیر کی پہچان ---- [redacted]
- اصل ولایت کمال اتباع سنت ﷺ ہے ---- [redacted]
- ابن صیاد کا ذکر جس پر دجال کا شبہ ہوتا تھا ---- [redacted]
- نوٹ ---- [redacted]



عرضِ ناشر

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: 1 ...... بیت اللہ، 2 ...... کتاب اللہ، 3 ...... اہل اللہ۔

اور اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جاسکتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، رمضان ہو یا شوال، حج کا موسم ہو یا عمرے کا، حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کا درسِ قرآن مسجدِ حرام میں بلا ناغہ ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں دوسرے مشائخ کے دروس بھی ہوتے ہیں، تاہم جس کثرت سے اور ذوق شوق سے لوگ حضرت مکی مدظلہ کے درس میں شرکت کرتے ہیں، دوسرے دروس میں یہ کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ چنانچہ برِصغیر پاک و ہند، بلکہ پوری دنیا میں جہاں بھی اردو دان طبقہ حرم شریف میں آتا ہے، حضرت مکی مدظلہ کے درس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحیدِ خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمالِ مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔

حضرتِ اقدس کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص وتقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

تفسیر انوار الحرم (جلد دوم)

زیرِ نظر تفسیر ''انوار الحرم'' المعروف ''تفسیرِ مکی'' حضرتِ اقدس کے چند دروس کا مجموعہ ہے۔ جسے اس سے قبل اک اور ادارہ نے شائع کیا تھا اب اسے حضرت اقدس ہی کے حکم پر ''مکتبة الفقیر'' شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اللہ رب العزت اس کتاب اور ''مکتبة الفقیر'' دونوں کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین بحرمة سید المرسلین ﷺ

اجازت ہو تو آ کر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہو گا

قارئینِ کرام! گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی، کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تا زیست اپنی رضا کے لیے یہ خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ہماری آخرت کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

دعاؤں کا طالب:
فقیر سیف اللہ احمد نقشبندی مجددی
مکتبة الفقیر

تفسیر سورۃ البقرۃ

رُكُوعَاتُهَا ۴۰	سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ	آيَاتُهَا ۲۸۶

سورۃ البقرۃ مدینہ میں اتری، اس میں ۲۸۶ آیات ہیں اور ۴۰ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ کے نام سے شروع جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

الٓمّٓ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ②

الٓمّٓ۔ اس کتاب میں (جس کو حضور ﷺ پڑھتے ہیں) کوئی شک نہیں (خدا کے فرمانبردار) ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔

مکی مدنی سورتوں کی پہچان کا ضابطہ:

سورۃ البقرۃ ان سورتوں میں سے ہے جو "سُوَرِ مدنیہ" کہلاتی ہیں۔ یعنی حضور پاک ﷺ کی ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔ جمہور کے نزدیک یہی قول راجح ہے کہ جو سورتیں ہجرت سے قبل نازل ہوئی ہیں وہ "مکی سورتیں" کہلاتی ہیں اور جو سورتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں وہ "مدنی سورتیں" کہلاتی ہیں۔ [الدر المنثور للسیوطی: ۶/ ۴۴۵، علوم القرآن، ص: ۶۰]

سورۂ بقرہ کے بنیادی مضامین:

سورۃ البقرۃ میں جو بنیادی مضمون ہیں وہ اثباتِ توحید، اثباتِ رسالت، اثباتِ معاد اور ان کے علاوہ دوسرے معاملات بھی ہیں، عبادات بھی اور ایمان کے بارے میں اجمالی طور پر بھی اور تفصیلی طور پر بھی تذکرہ ہے۔

سورۂ بقرہ میں بعض مکی آیات:

سورۂ بقرہ حضور ﷺ کی ہجرت کے فوراً بعد نازل ہوئی، لیکن اس کی چند آیات مبارکہ ایسی بھی ہیں جو ہجرت کے بعد مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہیں۔ جب میرے آقا ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ تشریف لے آئے تو اس وقت بعض آیات نازل ہوئیں، حتیٰ کہ اس سورت مبارکہ کی آیت ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۸۱] منیٰ میں نازل ہوئی اور حضور ﷺ اس کے بعد ۸۰ دن یا ۹۰ دن زندہ رہے۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۳۵، البقرۃ]

"بقرۃ" نام کیوں؟

اس سورت کا نام "سورۃ البقرۃ" ہے۔ یاد رکھیں کہ سورت کے اندر جو قصہ اور واقعہ ذکر کیا گیا ہو اکثر اسی کی نسبت سے اس سورت کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔

سورۂ بقرہ میں احکام کی تعداد:

ایک ہزار اوامر ہیں۔ "امر" کہتے ہیں کہ اللہ نے جو حکم دیا ہے کہ یہ کام کرو۔ اور ایک ہزار منہیات ہیں اور حکمتوں میں سے بھی ایک ہزار حکمتیں ہیں اور قصص اور اخبار میں سے بھی ایک ہزار قصص و اخبار ہیں۔ بڑا حسنِ اتفاق ہے۔ اس لیے حکم آیا، حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

"جس شخص نے سورۂ بقرہ کو پڑھا، اس کو سمجھا اور اس کو یاد کیا، اس کے لیے رحمت و برکت ہے اور جس نے چھوڑا اس کے لیے حسرت اور بدنصیبی ہے۔" [صحیح مسلم، حدیث:۸۰۴، باب: فَضْلِ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ]

اس سورت مبارکہ کی عظمت کا اس سے اندازہ کریں کہ حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سورت کو بارہ سال میں پڑھا ہے اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے آٹھ سال میں سیکھا ہے۔

[تفسیر القرطبی:۱/۵۲، سورۃ البقرۃ، تحت: الْكَلَامُ فِي نُزُوْلِهَا وَفَضْلِهَا وَمَا جَاءَ فِيْهَا]

سورۂ بقرہ کی بعض آیات کے فضائل و خواص:

احادیث مبارکہ میں سورۂ بقرہ کی بڑی بڑی فضیلتیں آئی ہیں کہ اس کے پڑھنے والے پر اہلِ باطل کبھی قابو نہیں پا سکیں گے۔ [صحیح المسلم، حدیث:۸۰۴، باب: فَضْلِ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ وَسُوْرَةِ الْبَقَرَةِ]

علامہ قرطبی نے لکھا کہ اہلِ باطل سے مراد جادوگر اور ساحر ہیں[1] کہ جو آدمی سورۂ بقرہ کو پڑھتا ہوگا اور خصوصی طور پر اس کی ابتدائی چار آیتیں اور اسی طرح اس کی درمیانی آیات یعنی آیۃ الکرسی اور آیۃ الکرسی کے بعد والی دو آیات کہ ان کو بھی ساتھ پڑھا جائے۔ یعنی ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۵۶] تک اور سورت کی آخری تین آیات ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۸۴ تا ۲۸۶] تک پڑھی جائیں تو سبحان اللہ، وگرنہ سورت کی آخری دو آیات کو روزانہ رات کو پڑھ لیا جائے۔ [تفسیر القرطبی:۱/ ۵۲ سورۃ البقرۃ، تحت: الکلام في نزولها وفضلها وما جاء فيها]

سورۂ بقرہ کے نام:

حدیث مبارکہ میں ہے کہ اس سورت کا نام "سِنَامُ الْقُرْآن" ہے یعنی قرآن مجید میں سورۂ بقرہ اونٹ کی کوہان کی طرح بلند مقام رکھتی ہے۔ [سنن الترمذي، حدیث: ۲۸۷۸، باب: ما جاء في فضل سورة البقرة]

ایک اور حدیث میں ہے کہ یہ سورۃ "سِنَامُ الْقُرْآن" اور "ذِرْوَةُ الْقُرْآن" ہے۔
[المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۵۱۱]

ربط سورت:

سورۂ فاتحہ میں اللہ کی حمد وثناء، ربوبیت اور اللہ کی تمجید، پھر اثباتِ صفات اور پھر اثباتِ معاد اور پھر اقرار عبودیت، پھر اقرار طلب استعانت اور سب سے آخر میں دعا تھی:

[1]...... [تفسیر القرطبی:۱/ ۵۲ سورۃ البقرۃ، تحت: الکلام في نزولها وفضلها وما جاء فيها]

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾

[الفاتحۃ:۵،۷]

اللہ سے ہم نے دعا مانگی کہ ہمیں سیدھی راہ دکھلا دیجیے اور راہ ان لوگوں کی جن پر آپ نے انعام فرمایا، نہ ان کی جن پر آپ نے غضب کیا اور نہ ان کی جو گمراہ ہوئے۔ اور اس کے بعد ہم نے کہا ''آمین'' کہ اے اللہ! ہماری یہ دعا قبول و منظور فرما۔

فرمایا کہ صراط مستقیم کی جو تم نے دعا مانگی تھی میں نے منظور فرمالی اور اگر اس کا جواب ڈھونڈنا ہے تو سورۂ بقرہ پڑھو۔ [تفسیر روح المعانی:۱/۸۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

حکایت:

ہمارے ہاں بلوچ قوم کے اندر ایک عجیب رسم و رواج ہے! اور آج تک ہے کہ مثلاً اگر کوئی قتل ہو جائے اور اس قتل کا کسی فرد پر، کسی گروہ پر یا کسی جماعت پر الزام لگ جائے اور وہ کہیں کہ ہم بے گناہ ہیں اور مدعی کہیں کہ انہوں نے ہی قتل کرایا ہے تو پھر یہ آگ جلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر چلو۔ اگر آپ بے گناہ ہیں تو آپ کو آگ نہیں جلائے گی اور اگر آپ گناہ گار ہیں تو آپ جلیں گے۔ اور وہ چلتے ہیں تو بے گناہ کو کچھ نہیں ہوتا۔

اتباعِ سنت کی مثال......حکایت:

جب ایک دفعہ اللہ نے مسلمانوں کو عظمت بخشی اور قیصر و کسریٰ کے علاقے فتح ہو گئے، قیصر روم کا علاقہ فتح ہو گیا تو جو صحابی مسلمانوں کے امیر اور انچارج تھے جب ان کی خدمت میں کھانا لایا گیا تو حضرت نے اپنے ہاتھ سے کھانا شروع کیا اور کھانے کے دوران آپ کے ہاتھوں سے گوشت کا ایک ٹکڑا گر گیا تو حضرت نے اٹھایا اور صاف کیا اور کھالیا۔ تو جو بادشاہوں کے غلام کھڑے تھے انہوں نے کہا: ''یہ آپ نے کیا کر دیا؟ آپ ایک متمدن ملک میں آگئے ہیں اور یہاں پر یہ بہت بڑا عیب ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ سے چیز کھائے، آپ نے چمچ بھی استعمال نہیں کیا، آپ نے چھری، کانٹا بھی استعمال نہیں کیا اور پھر اتنا چھوٹا سا ٹکڑا گر گیا تو اس کو ختم کریں اور جانے دیں۔ یہاں بڑی بے عزتی کی بات ہے اور توہین آمیز بات ہے کہ آدمی اس کو اٹھائے اور جھاڑے، پھر اس کو کھالے۔ تو وہ صحابی بہت غصہ میں آگئے اور فرمایا:

''ءَ أَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيْبِيْ لِهٰؤُلَاءِ الْحَمْقٰى؟'' [ملفوظات حکیم الامت:۲/۲۲۲، ملفوظ:۳۱۲]

''کیا ان احمق لوگوں کی وجہ سے میں اپنے پیارے نبی ﷺ کی سنت کو چھوڑ دوں؟''

کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنا:

سائنس اس تحقیق کو پہنچی ہے کہ انگلیوں کا چاٹنا صحت کے لیے کتنا مفید ہے۔اب انہوں نے اتفاق کرلیا ہے کہ جو لوگ کھانے کے بعد اس طرح کا عمل کرتے ہیں ان کے معدہ کے اندر کبھی کینسر پیدا نہیں ہوگا اور کبھی السر نہیں ہوگا۔

الٓمٓ

حروفِ مقطعات:

اس سورۂ بقرہ کی ابتداء حروفِ مقطعات سے کی گئی ہے۔اور حروفِ مقطعات کا معنی ہے کہ علیحدہ علیحدہ حرف۔ آپ قرآن کو ملا کر پڑھتے ہیں ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ①﴾ [الفاتحۃ:۱] یہاں آپ نے 'الف' کو، 'لام' کو، 'حاء' کو، 'میم' کو اور 'دال' کو ملا دیا۔اور الٓمٓ علیحدہ علیحدہ ہیں، جیسے فرمایا: حٰمٓ یا جیسے: قٓ یا الٓمٓصٓ ۔یہ حروفِ مقطعات ہیں۔

یہ مقطعات کیا ہیں؟

❁......بعض علماء فرماتے ہیں کہ ان سورتوں کے اندر جو مضمون ہوتا ہے ان کا خلاصہ ان الفاظ کے اندر چھپا ہوتا ہے یعنی اس سورت کے اندر جو مضامین توحید و رسالت، معاد، معاملات، عبادات اور معاشیات کے آرہے ہیں تو ان کا خلاصہ پہلے لفظوں کے اندر موجود ہے۔چونکہ ہر آدمی اس باریک بات کو نہیں سمجھ سکتا اس لیے فرمایا: وہاں تک صرف علماء کی رسائی ہوتی ہے، عام آدمی کی رسائی نہیں ہوتی۔

❁......اور بعض علماء نے فرمایا: سُوَر (سورتوں) کے جو نام ہیں ان حروف سے ان سورتوں کے ناموں کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

❁......اور بعض علماء نے فرمایا: اللہ کے جتنے نام ہیں مثلاً: کہیں آیا ''الف'' تو اس سے مراد ''اللہ'' ہوگیا اور کہیں آیا ''میم'' تو اس سے اس کی صفتِ ''منان'' کی طرف اشارہ ہے۔کہیں آیا ہے ''الٓرٰ'' تو اس سے رحمان اور رحیم کی صفت طرف اشارہ ہے۔اور کہیں آیا ''حٰمٓ'' تو انہوں نے کہا ''حاء'' سے حمید کی صفت کی طرف اشارہ ہے اور ''میم'' سے مجید کی صفت کی طرف اشارہ ہے۔تو اللہ کے جتنے اسماء ہیں ان کی طرف اشارہ ان حروف میں ملتا ہے۔

❁......لیکن یاد رکھیں! جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم، جمہور تابعین اور جمہور مفسرین رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ حروفِ مقطعات اَسرار

ہیں، راز ہیں، اللہ کے سوا ان کا علم کسی کو نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۵، ۳۶، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: الٓمٓ]

......اور بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو ان حروف کا علم دیا، لیکن انہیں آگے تبلیغ اور بیان کرنے کا حکم نہیں تھا، جیسا کہ حضور ﷺ کو منافقینِ مدینہ کے نام بتلائے گئے، لیکن حکم یہ تھا کہ آپ اس کو زیادہ نہیں کھولیں گے۔ آپ نے صرف ایک صحابی حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو بتلائے۔

حروفِ مقطعات کا معنی معلوم نہیں تو نزول کا کیا فائدہ؟

سوال: حروفِ مقطعات کا ترجمہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تو اس کا قرآن میں نزول کا کیا فائدہ ہوا؟

جواب: یہ دراصل ان کا جہل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً: میں اگر کتاب لکھوں اور ان میں کچھ حروف ایسے لکھ دوں جن کا کوئی مطلب نہ ہو تو یہ واقعی بے فائدہ بات ہے، لیکن اللہ کے کلام کا فائدہ ہے کہ جب ہم پڑھیں گے تو ہمیں ہر حرف پر ایک نیکی مل رہی ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ جب قرآن کا ایک حرف پڑھا جائے تو دس نیکیاں نصیب ہوتی ہیں۔ پھر میرے پاک نبی ﷺ نے مثال بتلائی: ''الٓمٓ'' کو یہ نہ کہو کہ ''الٓمٓ'' ایک حرف ہے، بلکہ ''أَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيمٌ حَرْفٌ'' کہ ''الف'' علیحدہ حرف ہے، ''لام'' علیحدہ حرف ہے اور ''میم'' علیحدہ حرف ہے۔ جس نے ''الٓمٓ'' پڑھا تو اس کی تیس نیکیاں ہو گئیں۔ تو اس کے اندر فائدہ ہے۔ لہٰذا اللہ کا کلام بے فائدہ کیسے ہوا؟ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۹۱۰، باب: مَا جَاءَ فِيمَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنَ الْقُرْآنِ...]

ایک بات یاد رکھو کہ ایمان بالغیب کی کتنی بڑی اہمیت ہے۔ اگر میں کسی شے کو چھپائے رکھوں آپ کہیں: یہ کیا ہے؟ میں کہوں کہ عینک ہے۔ آپ اس کو مان لیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ میری بات پر ایمان لا رہے ہیں اور میری بات پر یقین کر رہے ہیں۔ تو اس کی اہمیت ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے قرآن میں کچھ ایسے حروف بھی رکھ دیے ہیں کہ جن پر ایمان بالغیب ہی ہو کہ اس کو بس اللہ جانتا ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔

دوسرا اس کے اندر بہت بڑا معجزہ ہے۔ اللہ نے فرمایا: قرآن عربی، نبی بھی عربی، پڑھنے والے بھی عربی، لیکن جو میں نے نہیں سمجھانا چاہا اس کو کوئی نہیں سمجھ سکا۔ اس لیے جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم، علماء، جمہور مفسرین اور تابعین رحمہم اللہ کا راجح قول یہی ہے کہ جب آدمی حروفِ مقطعات پڑھے تو اس کے ذہن میں یہی رہے کہ اس کا حقیقی معنی اللہ جانتا ہے۔

بعض متاخرین علماء رحمہم اللہ نے اس کے کچھ جوابات بھی دیے ہیں کہ ''الف'' سے مراد اللہ ہے، ''لام'' سے مراد جبرئیل ہے اور ''میم'' سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یعنی قرآن کو اللہ بھیجنے والا ہے، جبرئیل علیہ السلام لانے والے

اور جس پر قرآن اتارا گیا وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

[تفسیر الرازی: ۲/ ۲۵۲، سورۃ البقرۃ، فصل: هَلِ الْمُرَادُ مِنَ الْفَوَاتِحِ مَعْلُوْمٌ؟]

امام محمد رحمہ اللہ کا جواب:

امام محمد رحمہ اللہ کو لوگوں نے عقلی سوال کے ذریعے سے پھنسانے کی کوشش کی کہ دنیا کا وسط اور سینٹر یعنی مرکزی نقطہ کہاں ہے؟......اب یہ کتابوں میں تو نہیں ہے، آپ رحمہ اللہ نے عقل سے جواب دیا۔ لمبا چوڑا واقعہ ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ تشریف لائے، دیکھا کہ آج بادشاہوں کا بھی موڈ بگڑا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا: ''امام صاحب! گزارش یہ ہے کہ ہم آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس کا عقل سے جواب دیں۔'' کیونکہ وہ سوالات عقل سے کیے گئے ہیں۔ فرمایا: ''بتلائیں۔'' بادشاہ نے کہا: ''پوری دنیا کا سینٹر اور مرکز کہاں ہے؟'' امام محمد رحمہ اللہ ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ کوئی عام آدمی تو نہیں تھے......ان کے ہاتھ میں عصا تھا، انہوں نے وہیں دائرہ کھینچا اور درمیان میں عصا رکھ کر فرمایا: ''یہ ہے۔'' بادشاہ نے کہا: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا: ''پیمائش کرالیں۔ اگر یہ جگہ نہ نکلے، یا غلط نکلے تو آپ مجھے سزا دیں۔'' اب پوری دنیا کی کون پیمائش کرائے......؟

اصحابِ کہف اور جنات کا علاج:

اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اصحابِ کہف کا قصہ آیا کہ کچھ نوجوان توحید والے تھے۔ اب ان کے نام نہ قرآن نے بیان کیے اور نہ حضور ﷺ نے بیان کیے، کیونکہ مقصود ایک واقعہ سنانا ہے۔ اب اس میں نام معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن لوگوں نے نام ڈھونڈ نکالے۔ کسی نے کہا: ان کے کتے کا نام ''مکسلمینا'' تھا یا ''کالمینا'' تھا۔ انہوں نے نام ڈھونڈے تو دوسروں نے کہا کہ ان ناموں میں اتنی برکت ہے کہ کسی کو جن پکڑے ہوئے ہو تو یہ نام لکھ کر اس کو دکھلا دو جن بھاگ جاتا ہے۔ سارا قرآن دکھا دو جن نہیں بھاگتا۔ خدا سے ڈرو! ہم کہاں جا رہے ہیں......؟

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ ۚ

کتاب اللہ کی حفاظت:

''ذٰلِكَ'' حالانکہ اشارہ بعید کے لیے ہوتا ہے اور قرآن تو قریب ہوتا ہے، لیکن اللہ نے فرمایا جو تم نے دعا مانگی

تھی ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ [الفاتحہ:۵]، اگر وہ ڈھونڈنی ہے تو وہ اس کتاب میں ملے گی۔

اور ”ذٰلِكَ الْكِتٰبُ“ اور وہ کتاب اتنی شان والی ہے! اللہ کا کلام ہے، لوحِ محفوظ کے اندر ہے، آسمانِ دنیا کے اندر بیت العزت کے اندر محفوظ ہے۔ یعنی پہلے اس کو اللہ نے لوحِ محفوظ میں محفوظ کیا، پھر اس کو بیت العزت میں محفوظ کیا، پھر اس کو محمد مدنی ﷺ کے سینے میں محفوظ کیا اور پھر صدرِ مؤمنین میں ہے۔ اس کتاب کی چونکہ شان اتنی بڑی ہے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ [الفاتحہ:۵]

”ایک ایسی کتاب جس میں کوئی شک نہیں۔“

[روح المعانی:۱/۱۰۸، سورۃ البقرۃ:الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ]

سورۂ بقرہ کے فضائل:

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے حضور ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سورۂ بقرہ کوہان ہے، اونچائی ہے۔ [مسند أحمد، احمد بن حنبل، حدیث:۲۰۳۰۰]

جیسے کوہان اعلیٰ چیز ہوتی ہے۔ ویسے تو اللہ کا سارا قرآن اعلیٰ ہے، اللہ کا کلام ہے، لیکن اس میں بعض سورتیں ایسی ہیں جن کو اللہ نے خصوصی فضیلت عطا فرمائی ہے۔

گھر میں سورۂ بقرہ پڑھنے کی برکت:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ”اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ۔“ یعنی جس طرح قبروں میں جانے کے بعد تکلیف ختم ہوگئی، عبادت ختم ہوگئی، ہر چیز ختم ہوگئی۔ اپنے گھروں کے اندر قرآن پڑھا کرو۔ فرمایا: ”جس گھر میں سورۃ البقرۃ پڑھی جاتی ہے اس گھر میں شیطان داخل نہیں ہوتا۔“ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

”حَسَنٌ صَحِيحٌ.“ [سنن الترمذي، حديث:۲۸۷۷، باب: مَا جَاءَ فِي فَضْلِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ...]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس گھر کے اندر سورۂ بقرہ پڑھی جائے شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے۔“ [تفسیر ابن کثیر:۱/۳۲، سُورَةُ الْبَقَرَةِ: ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِهَا]

ضعیف روایت کی بعض اقسام:

اگر کسی راوی کے ضعیف ہونے کے بارے میں تمام علمائے جرح وتعدیل متفق ہوں تو اس کی حدیث قابل قبول نہیں۔ اور اگر بعض نے اس راوی کی توثیق کی ہو اور بعض نے انکار کیا ہو تو وہ قابل قبول ہے، کیونکہ اس کے ضعف میں سارے علماء متفق نہیں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جس گھر میں سورۃ البقرۃ پڑھی جائے شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔'' [سنن الدارمی، حدیث: ۳۳۱۸، باب: فِي فَضْلِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں تمہیں ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ آدمی اپنی ٹانگ کے اوپر ٹانگ رکھ کر بے پروا ہو کر بیٹھا رہے اور وہ سورۃ البقرۃ کی تلاوت نہ کرے۔ خبردار! سورۃ البقرۃ کی تلاوت کیا کرو، کیونکہ شیطان اس گھر سے دور بھاگتا ہے جس گھر کے اندر یہ پڑھی جاتی ہے۔ اور سب سے حقیر گھر وہ ہوتا ہے جس میں اللہ کا قرآن اور سورۃ البقرۃ نہ پڑھی جائے۔

[السنن الکبریٰ، حدیث: ۱۰۷۳۳، ذِكْرُ مَا يُجِيرُ مِنَ الْجِنِّ وَالشَّيَاطِينِ]

نبی علیہ السلام کے گھر کی عظمت:

یعنی گھر باعتبار بلڈنگ کے بڑا نہیں ہوتا، گھر تو باعتبار اللہ کی رحمت کے بڑا ہوتا ہے۔ جس گھر میں اللہ کے فرشتے اترتے ہوں، اللہ کے ملائکہ آتے ہوں۔ اب دیکھیں کہ ساری دنیا میں اگر چھوٹے گھر تھے تو میرے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تھے۔ یعنی ایک ایک کوٹھا (کمرہ) بنا ہوا اور آگے صحن اور دروازے بھی نہیں تھے، پردے کے لیے ٹاٹ لگے ہوئے تھے، لیکن اگر ساری دنیا کی بلڈنگیں اور محلات بھی اکٹھے کریں تو اس ایک کوٹھے کی قیمت نہیں بن سکتے جس میں محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مقابلہ کر سکتے ہیں......؟؟ جہاں اللہ کا نبی رہتا ہو، جہاں اللہ کی وحی آتی ہو، جہاں ازواج مطہرات رہتی ہوں اور جہاں چوبیس گھنٹے اللہ کا ذکر ہوتا ہو اصلی گھر تو وہی ہوتا ہے۔ بلکہ اللہ نے فرمایا:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿١٣﴾﴾ [الحجرات: ۱۳]

''اللہ کے ہاں بڑا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔''

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی عظمت:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ......جن کی ابھی روایت پڑھی ہے......ایک دفعہ مدینہ منورہ کے باغ کے اندر کھجور پر

چڑھ رہے تھے۔ایک صحابی نے دیکھا کہ ان کی پنڈلیاں بڑی باریک ہیں تو وہ ہنسنے لگا کہ دیکھو! کتنی باریک پنڈلیاں ہیں!! حضور ﷺ غصہ میں آگئے، فرمایا: ”تمہیں پتہ ہے!؟ اگر قیامت کے دن ساری دنیا کو ایک طرف رکھا جائے اور دوسری طرف عبداللہ بن مسعود کی پنڈلیاں تو عبداللہ بن مسعود کی پنڈلیوں کا وزن بھاری ہو جائے گا۔“ یعنی اس کو اللہ نے اتنی شان عطا فرمائی ہے۔ ظاہر کی طرف نہ جاؤ۔ [دلائل النبوۃ: ۳۹۹/۲]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”جس شخص نے سورۂ بقرہ کی دس آیات رات میں پڑھیں اس کے گھر کے اندر شیطان داخل نہیں ہوگا۔ اور فرمایا کہ چار آیتیں اوّل سورۃ البقرہ سے، آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں اور تین آیتیں آخر سورۃ البقرہ کی۔ یہ مجموعی دس آیتیں بن جائیں گی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے قریب بھی شیطان نہیں جائے گا اور اس کے اہل کے قریب بھی شیطان نہیں جائے گا اور نہ اس کو کوئی ایسی چیز پیش آئے گی جو اس کو بری لگے، یعنی اللہ تعالیٰ اس کو جادو سے اور شیطان سے محفوظ رکھیں گے۔

[شعب الایمان، حدیث: ۲۱۸۸، ابن کثیر: ۳۲/۱، ۳۳ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ: ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِيْ فَضْلِهَا]

اب دیکھیں کہ جب شیطان قریب ہی نہ آئے، گھر کے اندر داخل بھی نہ ہو اور شیطان اہل وعیال کے قریب بھی نہ بھٹکے تو آدمی مسائل سے بچ گیا، کید و مکر سے بچ گیا۔

فرمایا کہ یہ آیتیں کسی دیوانے پر بھی پڑھی جائیں جس کو جنون کا دورہ پڑھ گیا ہو تو وہ بھی اُٹھ کر بیٹھ جائے گا، وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور پاک ﷺ فرماتے ہیں کہ ہر ایک چیز کی سنام ہے اور قرآن کی سنام سورۃ البقرہ ہے۔ جس گھر کے اندر پڑھی جائے تو تین رات تک شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوگا اور اگر دن کو پڑھی جائے تو تین دن تک شیطان داخل نہیں ہوگا۔

[المعجم الکبیر، حدیث: ۵۸۶۴، تفسیر ابن کثیر: ۳۳/۱ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ: ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِيْ فَضْلِهَا]

گھر سے شیطان کے نکل جانے کے بعد گناہ کیوں؟

اس لیے یاد رکھیں کہ بعض لوگ اشکال کرتے رہتے ہیں کہ جب شیطان نکل گیا، جب گھر میں سورۃ البقرہ پڑھی گئی، پھر بھی ہمارے گھر میں گناہ ہوتا ہے، ہمارے گھر میں برائی ہوتی ہے، پھر بھی ہمارے گھر میں منکرات ہوتے ہیں۔ اس لیے بات سمجھیں کہ شیطان کا چلا جانا علیحدہ بات ہے، اور جو اثر ہم پر پہلے کر چکا ہے وہ باقی رہتا ہے۔

ایک آدمی انجیکشن لگوائے، سوئی نکل جائے، درد تو رہے گا۔ تو شیطان اتنے عرصے سے ہمارے ساتھ دوستی بنا چکا ہے، اثرات تو رہتے ہیں۔ اسی طرح شیاطین الجن کے شیاطین الانس بھی ہیں، وگرنہ حقیقت کے اندر یہ بات ہوتی ہے کہ...... اللہ معاف فرمائے!!

ایک شخص نے واقعہ لکھا ہے کہ اس کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی تو اس دن اس علاقہ میں کوئی بزرگ، کوئی عالم آئے ہوئے تھے تو انہوں نے کہا کہ اس بچی کی تحنیک اس بزرگ سے کرالیں، اچھی بات ہے کہ بزرگ اور صالح بندہ ہے۔ تو وہ اس بچی کو لائے، تحنیک ہوگئی اور دعا بھی کردی۔ وہ بچی جب بڑی ہوئی تو اچھی نہ نکلی، اس کا کردار اچھا نہیں تھا۔ ایک دفعہ جب سب گھر والے اکٹھے ہوئے تو کہنے لگے کہ فلاں بزرگ اور اتنے بڑے عالم سے ہم نے تحنیک بھی کروائی، لیکن لڑکی خراب نکلی تو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہاں ایک سمجھدار آدمی موجود تھے، انہوں نے کہا کہ شکر کرو ان کی دعا کی وجہ سے اتنی رکی ہوئی ہے۔ اگر وہ نہ کرتے تو پتہ نہیں کہاں پہنچ گئی ہوتی!؟

اس لیے سورۃ البقرۃ پڑھنے سے شیطان کے اثرات سے ہم بچ جاتے ہیں۔ اگر نہ پڑھی جاتی تو خدا جانے ہمیں کیا کیا پیش آتا!؟ اس لیے قرآن کریم کو ہمیشہ بڑے یقین کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

ہمارے پڑھنے میں اثر کیوں نہیں؟

آج ہمارے پڑھنے میں وہ اثرات کیوں نہیں ہوتے؟ حالانکہ قرآن وہی ہے، مگر ہماری زبان وہ نہیں ہے۔ آج قرآن پاک وہی ہے، لیکن صحابہ کرام کی وہ زبانیں کہاں سے لائیں؟ اور وہ اللہ کے پاک پیغمبر کی زبان مبارک ہم کہاں سے لائیں؟ تابعین اور محدثین کی زبان مبارک ہم کہاں سے لائیں؟ جن کی زبان سے کبھی جھوٹ نہیں نکلتا تھا، جن کے منہ کے اندر کبھی ایک لقمہ حرام کا نہیں جاتا تھا، جنہوں نے کبھی زندگی میں حرام کا کپڑا نہیں پہنا تھا، جو زندگی میں کبھی مشتبہ چیز کے قریب نہیں گئے تھے، جن کی نظریں کبھی حرام پر نہیں اٹھی تھیں، جن کے قدم کبھی حرام پر روانہ نہیں ہوئے تھے، جن کے ہاتھوں نے کبھی گناہ کا کام نہیں کیا تھا اور اگر کبھی ہو گیا تو فوراً بے چین ہو گئے اور چاہتے کہ فوراً ہمیں دنیا میں سزا مل جائے، تا کہ ہم پاک ہو جائیں، ایسے لوگ قرآن پڑھتے تھے۔

حضرت لاہوری رحمہ اللہ اور قرآن میں لذت:

آج ہماری زبانیں آلودہ ہیں، ہمارے دماغ آلودہ ہیں، ہمارے قلب و فکر آلودہ ہیں اور پھر سب سے بڑی بات

یہ ہے کہ آج نہ کھانا حلال ہے اور نہ صدقِ مقال ہے۔ حضرت لاہوری رحمہ اللہ...... اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے...... وہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ کہتے ہیں کہ عبادت میں لذت نہیں ملتی۔ فرماتے کہ ہم نے عبادت تو اللہ کے حکم کے لیے کرنی ہے۔ لذت ملے تو الحمدللہ، نہ ملے تو ہم نے لذت کے لیے تو نہیں کرنی، ہم نے اللہ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ لیکن وہ فرمایا کرتے تھے: الحمدللہ! آج بھی اگر فقیر کے پاس کوئی آدمی آئے اور ایک مہینہ میرے پاس قیام کرے اور کھانا میرے لنگر سے کھائے اور لباس جو میں دوں وہی پہنے اور جو میں ہدایت کروں اس پر عمل کرے تو ایک مہینہ میں اس کی زندگی میں انقلاب آ جائے گا، پھر دیکھے گا کہ اس کو عبادت میں لذت ملتی ہے کہ نہیں......!؟

مشتبہ کینوں سے حضرت لاہوری رحمہ اللہ کی احتیاط:

ایک دفعہ حضرت کے ایک تعلق والے تھے اور بہت ہی اچھے آدمی تھے، انہوں نے سردیوں کے موسم میں حضرت کی خدمت میں مالٹے یا کینوؤں کے دو ٹوکرے پیش کیے...... اور حضرت جانتے تھے کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے...... آپ نے ہدیہ قبول فرمالیا اور دوسرے دن اس نے محبت سے پوچھا آپ کو ہمارے کینوں پسند آئے؟ میں چن کر لے آیا تھا، خالص اپنے باغ کے ہیں اور بڑے میٹھے ہیں۔ تو حضرت نے فرمایا کہ میں نے نہیں کھائے تھے، طلبہ کو بھیج دیے تھے...... ان شاء اللہ...... اچھے ہوں گے۔ تو اس کو بڑا احساس ہوا کہ حضرت نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ حضرت نے نہ کھائے ہوں۔ میں جب بھی کوئی چیز لے آتا ہوں اور حضرت کو پیش کرتا ہوں تو لے لیتے ہیں تو آج آپ نے طلبہ کو بھجوا دیے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے اپنے استعمال کے لیے خود تو قبول نہیں فرمائے۔ تو وہ سمجھدار تھا اس کو شبہ پڑا تو وہ گھر آیا، مزدوروں اور ملازموں سے پوچھا کہ تم لوگوں نے کوئی حرکت تو نہیں کی؟ انہوں نے کہا کہ کوئی حرکت نہیں کی۔ ایک دو مہینے پانی نہیں تھا تو ہم نے ساتھ والے کا پانی چوری کاٹ کر لگالیا تھا اس کی اجازت کے بغیر۔ ہم واٹر کورس کو کاٹ کر پانی لگا لیتے تھے اور صبح کو اس کے پانی کو چالو کر دیتے تھے، اس کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ تو اس نے کہا: شاید اس لیے اللہ نے انہیں محفوظ رکھا ہے کہ ہم اللہ کے بھی نہیں بنے، اپنے بھی نہیں بنے اور شیطان کے بھی نہیں بنے۔ اتنے الجھ کر رہ گئے ہیں:

﴿مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰی هٰۤؤُلَآءِ وَلَاۤ اِلٰی هٰۤؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا۝﴾

[النساء: ۱۴۳]

نہ اِدھر کے رہے اور نہ اُدھر کے رہے۔ نماز بھی پڑھ لی اور فلم بھی دیکھ لی، حضور ﷺ کے روضہ پر جا کر سلام بھی پڑھ آیا اور شیو بھی کرالی، تہجد میں کھڑے ہو گئے، حجرِ اسود سے بھی سینہ لگا لیا اور سگریٹ بھی پی لی اور سود بھی کھا لیا۔ اس لیے ہم درمیان میں بھٹکے ہوئے لوگ ہیں، نہ تیتر ہیں اور نہ بٹیر ہیں۔ اِدھر قرآن کی تلاوت بھی ہو رہی ہے اور اُدھر گانا بھی سن رہا ہے۔ مرضی آئی تو ریڈیو کا بٹن کھول دیا اور قاری عبد الباسط کی تلاوت سن لی اور سبحان اللہ کہہ رہا جھوم رہا ہے اور تھوڑی دیر گزری تو گانے میں جھوم رہا ہے۔ سبحان اللہ!! گانے میں بھی مزہ آ رہا ہے۔ یہ مسلمان ہے۔ آدمی اس مسلمان کا کیا کرے؟ یعنی جو آدمی خالص نہ بنے اس کا کیا کیا جائے......!؟

گناہوں سے حفاظت کا ایک طریقہ:

آپ چالیس دن گناہوں سے توبہ کرلیں اور پورے چالیس دن اپنی نظر کو، اپنے ہاتھ کو اور اپنی زبان کو بچائیں، حلال کمائیں، حلال کھائیں اور حلال پہنیں، پھر دیکھو کہ انقلاب آتا ہے یا نہیں آتا؟

اہلِ قرآن سب سے مقدم ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے ایک جماعت اور فوج بھیجی، جن میں صحابہ میں سے بہت سارے لوگ تھے۔ حضور پاک ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ تم نے کتنا قرآن یاد کیا؟ کون سی سورت یاد کی ہے؟...... ان میں ایک بالکل نوجوان آدمی تھا، جو باقی سب سے باعتبار سن کے کم عمر تھا ...... آپ نے پوچھا:

((مَا مَعَكَ؟ يَا فُلَانُ!))

''اے فلاں! تمہارے پاس اللہ کے قرآن میں سے کون سی سورتیں ہیں؟''

اس نے کہا: فلاں سورت بھی یاد ہے اور فلاں سورت بھی یاد ہے اور سورۂ بقرہ بھی یاد ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا سورۂ بقرہ تمہیں یاد ہے؟'' اس نے کہا: ''حضور! مجھے سورۂ بقرہ یاد ہے۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ساری فوج کا امیر بھی میں تمہیں بناتا ہوں۔'' [سنن الترمذي، حديث: ٢٨٧٦، باب: ما جاء في فضل سورة البقرة]

سب سے پہلے آدمی کی نماز دیکھو!

حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام لوگوں کو اور تمام گورنروں کو بحیثیت ایک خلیفہ کے

سب سے پہلی یادداشت لکھی کہ جب تمہیں کوئی آدمی ملازم رکھنا ہو تو سب سے پہلے اس کی نماز کا پتہ کرو کہ نماز کیسی پڑھتا ہے؟

ملازم کے لیے خصوصیات:

اگر تم کسی کو ملازم رکھو تو دو چیزوں کو دیکھو! جو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہی تھیں:

﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (یوسف:۵۵)

"یوسف علیہ السلام نے کہا کہ تم مجھے اپنے خزانے پر رکھ لو، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور سمجھنے والا بھی ہوں۔"

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کو امیر بنا دو، کیونکہ اس کو سورۂ بقرہ یاد ہے۔ اس جماعت کا جو بڑا سردار تھا اس نے کہا:

"وَاللّٰهِ! مَا مَنَعَنِيْ أَنْ أَتَعَلَّمَ سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ إِلَّا إِنِّيْ خَشِيْتُ أَنْ لَا أَقُوْمَ بِهَا"

"خدا کی قسم! مجھے سورۂ بقرہ یاد کرنے سے کسی چیز نے نہیں روکا، لیکن میں نے اس ڈر سے سورۂ بقرہ کو یاد نہیں کیا کہ یاد کر کے پھر اس پر عمل نہ کروں تو کیسا ہوگا؟"

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۸۷۶، باب: مَا جَاءَ فِي فَضْلِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ]

فرشتے اتر کر اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سن رہے تھے:

حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رات کو کھڑے ہوئے سورۂ بقرہ کی تلاوت کر رہا تھا اور میرا گھوڑا بھی ساتھ بندھا ہوا تھا اور چھوٹا بچہ بھی ساتھ سویا ہوا تھا۔ فرماتے ہیں کہ میں جب قرآن پڑھوں تو گھوڑا اچھلنے لگ جائے اور میں چپ کروں تو گھوڑا بھی ٹھہر جائے۔ مجھے یاد آیا کہ میرا بیٹا یحییٰ سویا ہوا ہے، ایسا نہ ہو کہ گھوڑا اپنے پاؤں سے اسے کوئی نقصان پہنچا دے۔ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جب میں نے قراءت ختم کی تو آسمانوں کی طرف دیکھا اور جب میں نے صبح حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر واقعہ سنایا کہ میں سورۂ بقرہ پڑھ رہا تھا۔ جب میں قرآن پڑھتا تھا تو گھوڑا اچھلنا، کودنا اور ڈرنا شروع کر دیتا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم پڑھتے رہتے۔ عرض کیا: یارسول اللہ! میں بچے کے بارے میں ڈر گیا، کیونکہ جانور ہے کہ چھوٹے بچے کو نقصان نہ پہنچا دے۔ اس کے بعد میں نے آسمانوں کی طرف دیکھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بدلی کا ٹکڑا ہے، اس کے اندر دیے روشن ہیں، اس کے بعد وہ دور ہوتے چلے گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((وَتَدْرِیْ مَاذَاكَ؟))

''تمہیں پتہ ہے کہ وہ کیا بدلی تھی؟ اور کیا مصابیح تھے؟''

میں نے عرض کیا: حضور مجھے پتہ نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((تِلْكَ الْمَلَآئِكَةُ دَنَتْ لِصَوْتِكَ))

جب تو اللہ کا قرآن پڑھ رہا تھا تو اللہ کے فرشتے تیرا قرآن سننے کے لیے آئے ہوئے تھے وہ اللہ کے فرشتے تھے۔ اور جب تو نے قرآن ختم کیا تو وہ آسمان کی طرف چلے گئے اور اگر تم پڑھتے رہتے اور صبح ہو جاتی تو تم دیکھتے کہ وہ کھڑے ہوتے، ان میں سے کوئی چھپ نہ سکتا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۵۰۱۸، باب: نُزُولِ السَّکِینَۃِ وَالْمَلَائِکَۃِ عِنْدَ قِرَاءَۃِ...]

بہر حال قرآن شریف جہاں پڑھا جاتا ہے وہاں اللہ کی رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں اور وہ بھی آ کر قرآن سنتے ہیں۔

اس طرح کا واقعہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی پیش آ چکا۔

جریر بن حازم کہتے ہیں کہ انہوں نے شیخ المدینہ سے سنا کہ حضور ﷺ سے کہا گیا کہ جو رات گزری ہے، حضرت ثابت بن قیس بن شماس کی حویلی میں ایسے معلوم ہوتا تھا کہ وہاں شمعیں اور شعائیں جل رہی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''معلوم ہوتا ہے کہ اس نے رات سورۂ بقرہ پڑھی تھی۔'' جب ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''ہاں! میں نے سورۃ البقرہ کی تلاوت کی تھی۔'' [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۳، سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ: ذِکْرُ مَا وَرَدَ فِیْ فَضْلِهَا]

سورۂ بقرہ کی تلاوت کا ثواب:

امام احمد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن بریدہ رحمہ اللہ اپنے باپ بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

((قَالَ: کُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَسَمِعْتُهُ یَقُوْلُ: ''تَعَلَّمُوْا سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ؛ فَإِنَّ أَخْذَهَا بَرَكَةٌ وَتَرْكَهَا حَسْرَةٌ وَلَا تَسْتَطِیْعُهَا الْبَطَلَةُ.'' قَالَ: ثُمَّ سَكَتَ سَاعَةً ثُمَّ قَالَ: ''تَعَلَّمُوْا سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ وَآلَ عِمْرَانَ؛ فَإِنَّهُمَا الزَّهْرَاوَانِ یُظِلَّانِ صَاحِبَهُمَا كَأَنَّهُمَا غَمَامَتَانِ أَوْ غَیَایَتَانِ أَوْ فِرْقَانِ مِنْ طَیْرٍ صَوَآفَّ، وَإِنَّ الْقُرْآنَ یَلْقَى صَاحِبَهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ حِیْنَ یَنْشَقُّ عَنْهُ قَبْرُهُ كَالرَّجُلِ الشَّاحِبِ، فَیَقُوْلُ لَهُ:'' هَلْ

تَعْرِفُنِي؟" فَيَقُولُ: مَا أَعْرِفُكَ. فَيَقُولُ: "أَنَا صَاحِبُكَ الْقُرْآنُ الَّذِي أَظْمَأْتُكَ فِي الْهَوَاجِرِ وَأَسْهَرْتُ لَيْلَكَ، وَإِنَّ كُلَّ تَاجِرٍ مِنْ وَرَاءِ تِجَارَتِهِ، وَإِنَّكَ الْيَوْمَ مِنْ وَرَاءِ كُلِّ تِجَارَةٍ فَيُعْطَى الْمُلْكَ بِيَمِينِهِ، وَالْخُلْدَ بِشِمَالِهِ، وَيُوضَعُ عَلَى رَأْسِهِ تَاجُ الْوَقَارِ، وَيُكْسَى وَالِدَاهُ حُلَّتَيْنِ، لَا يَقُومُ لَهُمَا أَهْلُ الدُّنْيَا فَيَقُولَانِ: بِمَ كُسِينَا هَذَا؟ فَيُقَالُ: بِأَخْذِ وَلَدِكُمَا الْقُرْآنَ. ثُمَّ يُقَالُ: "اقْرَأْ وَاصْعَدْ فِي دَرَجِ الْجَنَّةِ وَغُرَفِهَا، فَهُوَ فِي صُعُودٍ مَا دَامَ يَقْرَأُ هَذًّا كَانَ أَوْ تَرْتِيلًا.))

[مسند أحمد: ٢٢٩٥٠، تفسير ابن كثير: ١/ ٣٣، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِهَا مَعَ آلِ عِمْرَانَ]

"فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی خدمت بیٹھا ہوا تھا، میں نے سنا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سورۂ بقرہ سیکھو۔ سورۂ بقرہ کو پڑھنا اور محفوظ کرنا باعثِ برکت ہے اور اس کو چھوڑ دینا بڑی ندامت ہے اور اہلِ باطل سورۂ بقرہ پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ سورۂ بقرہ اور آلِ عمران پڑھا کرو، کیونکہ یہ ایسا سبزہ ہے اور ایسے درخت اور شاخیں ہیں کہ جو اپنے پڑھنے والوں پر قیامت کے دن سایہ کریں گی۔ اور سایہ بھی ایسا ہوگا کہ گویا دو بدلیوں کے ٹکڑے ہیں یا درخت یا اڑنے والے پرندے۔ اگر پرندوں کی ایک جماعت پر کھول کر کھڑی ہو جائے تو وہ بھی سایہ کر دیتی ہے تو یہ دو سورتیں قیامت کی گرمی کے دن اپنے پڑھنے والوں کے اوپر سایہ بن جائیں گی اور قرآن اپنے پڑھنے والوں کو قیامت کے دن ایک نوجوان انسان کی شکل میں نظر آئے گا۔ (یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت والے دن اعمال کو اَشکال عطا فرمائیں گے، جو اچھے عمل ہیں وہ اچھی صورت میں آجائیں گے اور اگر برے عمل ہیں تو وہ سانپ، بچھوؤں اور بلاؤں کی شکل میں آجائیں گے اور اس کے بعد) وہ کہے گا: اے آدمی! تو نے مجھے پہچانا کہ میں کون ہوں؟ تو وہ جواب دے گا: میں نے تجھے نہیں پہچانا۔ وہ کہے گا: میں ہی تمہارا وہ ساتھی قرآن ہوں جس کو تو نے دنیا میں اپنا ساتھی بنالیا تھا، میری وجہ سے تو گرمیوں کے اندر پیاسا تھا (یعنی میری وجہ سے تم نے روزے رکھے، تم نے تلاوت کی اور تم نے قرآن پڑھا) اور راتوں کو جاگتا رہا (تو نے رات کو تہجد میں اللہ کا قرآن پڑھا) اور تاجر اپنی تجارت کے پیچھے ہوتا ہے (یعنی جو آدمی تجارت کرتا ہے وہ اپنے مال کا حساب بھی کرتا ہے کہ کتنا فائدہ ہوا؟) آج تمہاری بھی کامیابی کا دن ہے۔ اب جناب اللہ کے فرشتے دائیں طرف آئیں گے اور اللہ کی جنت اس کے بائیں طرف ہوگی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کے سر پر عزت والا تاج رکھیں گے (جیسے دنیا کے اندر بادشاہ تاج پہنتے تھے، قیامت کے دن قرآن پڑھنے والوں کے سروں پر تاج رکھا جائے گا، کیونکہ اللہ کے ہاں عزت والے لوگ وہی ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں)

اس کے سر پر عزت کا اور وقار کا تاج رکھا جائے گا، اس کے والدین کو قیامت والے دن جنت کے ایسے جوڑے پہنائے جائیں گے کہ ساری دنیا والے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ والدین پوچھیں گے کہ ہمیں یہ لباس کیوں پہنائے جا رہے ہیں؟ تو ملائکہ جواب دیں گے: تم نے اپنے بچوں کو جو قرآن پڑھایا تھا اس کا صلہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں آج عطا فرما رہے ہیں۔ اللہ فرمائیں گے کہ حافظِ قرآن! تم قرآن پڑھتے جاؤ اور اپنے مدارج پر چڑھتے بھی جاؤ۔ جہاں تمہارا قرآن ختم ہوگا وہیں تمہارے درجات ختم ہوں گے۔"

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے سنا، فرمایا کہ اے لوگو! قرآن پڑھا کرو، کیونکہ قرآن اپنے پڑھنے والوں کی قیامت کے دن شفاعت کرے گا۔

[مسند أحمد، حدیث: ۲۲۱۴۶، حدیث أبي أمامة الباهلي]

رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

((رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ)) [تفسیر روح المعانی، سورۃ: فاطر، آیۃ: ۲۹]

"ایسے بھی میری امت میں قرآن پڑھنے والے آئیں گے جو قرآن پڑھ رہے ہوں گے اور اللہ کا قرآن ان کو لعنت کر رہا ہوگا۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: "میری امت میں ایک ایسی جماعت بھی آئے گی کہ زبانوں پر قرآن ہوگا، حلق سے نیچے بھی نہیں ہوگا (یعنی صرف زبان پر قرآن ہے اور عمل کوئی نہیں ہے اور نہ ہی عقیدہ صحیح ہے)۔"

[صحیح البخاري، حدیث: ۶۹۳۱، باب: قَتْلِ الخَوَارِجِ وَالمُلْحِدِينَ]

قیامت کے دن اعمال کو صورتیں دے دی جائیں گی:

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((يُؤْتَى بِالْقُرْآنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَهْلِهِ الَّذِينَ كَانُوا يَعْمَلُونَ))

"قیامت والے دن اللہ کا قرآن بھی لایا جائے گا اور اس پر جو عمل کرنے والے لوگ ہیں وہ بھی لائے جائیں گے۔"

[صحیح مسلم، حدیث: ۸۰۵، باب فَضْلِ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ]

اصل میں یہ ہوتا ہے کہ اعمال صالحہ کو بدل دیا جائے گا اور صحائف پیش ہوں گے۔ اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ اعمال صالحہ کسی شکل میں آئیں۔ ان تمام احادیث مبارکہ کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس عمل کو ایک شکل عطا فرمائیں گے،

جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ جب آدمی قبر کے اندر ہوگا، ایک بڑی خوبصورت شکل کا انسان آئے گا تو وہ کہے گا کہ آپ کون ہیں؟ تو وہ کہے گا: میں تمہارا وہ عمل ہوں جو تم نے دنیا میں کیا تھا۔ فرمایا کہ میں تمہیں تسلی اور اطمینان دینے کے لیے آرہا ہوں کہ تم اطمینان کرو...... ان شاء اللہ...... اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تمہیں نجات ہوگی۔

اسی طرح بعض علماء نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ ان اعمال کو ایک جوہر کی شکل دے دیں گے، ان کا وزن کیا جائے گا اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر قادر ہیں جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا انجام:

جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں حدیث صحیح میں (بخاری شریف میں) واقعہ مذکور ہے کہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جب دیکھیں گے کہ ان کے والد آزر کو فرشتے لیے ہوئے جہنم کی طرف جارہے ہیں تو وہ اللہ کے آگے درخواست کریں گے کہ اے میرے پروردگار عالم! آپ کا تو وعدہ ہے: ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ [التحریم:۸] کہ ہم قیامت والے دن اپنے انبیاء کو رسوا نہیں کریں گے۔ میرے اللہ! اس سے بڑی میری کیا رسوائی ہو سکتی ہے؟ میرا باپ ہو اور جہنم میں ڈالا جارہا ہو؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ''اے ابراہیم! نیچے دیکھ!'' ابراہیم علیہ السلام نیچے دیکھیں گے اور جب سر اٹھائیں گے تو ان کے والد کی شکل تبدیل ہو جائے گی اور ان کو بجو کی شکل میں بدل دیا جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہمارے فیصلے نہیں بدلتے۔ جو آدمی کفر پر مر گیا اسے تو جہنم میں جانا ہے، لیکن اب ہم نے اس کی شکل بدل دی ہے، اب کسی کو پتہ نہیں لگے گا کہ وہ کون ہے؟ لہٰذا ہم نے انبیاء علیہم السلام کی عظمت کو بھی بحال کر دیا اور اپنا فیصلہ قدرت کا بھی نہیں بدلا، کیونکہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝﴾ [النساء:۴۸] اللہ کا فیصلہ ہے کہ جو کفر اور شرک پر مر گیا اس کی کبھی بخشش نہیں ہوگی اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اور آزر کا کفر اور شرک قرآن مقدس میں ثابت ہے، وہ کفر اور شرک پر مر گئے، حتیٰ کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب دعا مانگی تو اللہ نے منع فرما دیا کہ جب تک کافر زندہ ہو تو دعا کی جا سکتی ہے کہ اللہ اس کو ایمان نصیب فرما دے، اللہ اس کو ہدایت نصیب کر دے، لیکن اگر اس کی موت کفر پر ہو جائے تو دعا کا فائدہ ہی کوئی نہیں ہے ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝﴾

[التوبہ: ۱۱۴] ابراہیم علیہ السلام ایک خاص وقت تک دعائیں مانگتے رہے۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ آذر اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بری ہو گئے، لیکن وہ شفقت قیامت میں بھی عود کر آئے گی۔ آخر اللہ کے پیغمبر ہیں اور خلیل ہیں۔ جب آذر کو اس حالت میں دیکھیں گے تو پھر درخواست کریں گے، لیکن اللہ ان کی شکل بدل ڈالے گا۔

قرآن کی شفاعت:

اس لیے علماء نے فرمایا کہ اب قرآن پاک آئے گا، اللہ پاک چاہیں گے تو اس کو ایک خاص شکل عطا فرمائیں گے، وگرنہ قرآن کے آنے کا کیا مطلب ہے؟ قرآن تو اللہ کا کلام ہے، جو اللہ نے خود کلام فرمایا اور خود جبرئیل علیہ السلام کو پڑھایا اور پھر جبرئیل علیہ السلام نے آ کر میرے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرآن لایا جائے گا۔

قیامت کے دن اپنے پروردگار کے دربار میں ان لوگوں شفاعت کرے گا جو اس کو پڑھتے ہوں گے، حتیٰ کہ ایک حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ سورت مبارک آ کر اللہ کے آگے عرض کرے گی: یا اللہ! میں قرآن کی سورت ہوں؟ اللہ فرمائیں گے: بالکل۔ وہ عرض کرے گی: اے اللہ! میں آپ کے قرآن کی سورت ہوں۔ آپ میرے پڑھنے والے کو جہنم میں نہ بھیجیں، اس کو نجات دے دیں۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی شفاعت کو قبول فرمالیں گے۔ اس طرح سے قرآن بھی شفاعت کرے گا، اللہ کے قرآن کی سورتیں بھی شفاعت کریں گی اور حافظِ قرآن بھی شفاعت کرے گا۔

ایک صحابی کا خواب:

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ایک بھائی نے خواب میں دیکھا کہ لوگ جا رہے ہیں۔ ایک ایسی پہاڑی ہے جو بڑی سخت ہے اور ایک بڑی لمبی گھاٹی ہے اور اس کا عبور کرنا بڑا مشکل ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر دو درخت ہیں، دونوں بڑے سائے والے ہیں۔ وہاں سے آواز آتی ہے کہ تم میں کوئی سورۃ البقرۃ پڑھنے والا ہے؟ سورۂ آلِ عمران پڑھنے والا ہے؟ تو ایک آدمی نے کہا کہ ہاں! میں پڑھنے والا ہوں۔ تو دونوں درختوں کی شاخیں جھکتی آئیں، جھکتی آئیں اور اس کو پکڑا اور گھاٹی پار کرا دی۔ تو انہوں نے کہا کہ دیکھ رہے ہو؟ تو معنی یہ تھا کہ جہنم کی بہت بڑی گھاٹی ہے، لیکن جب کوئی اللہ کا قرآن اور سورۃ البقرہ کا پڑھنے والا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نجات عطا فرما دیتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۴، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِهَا مَعَ آلِ عِمْرَانَ]

سورۂ بقرہ اور آلِ عمران نفاق سے بچاتی ہیں:

حدیث مبارکہ میں ہے کہ جو آدمی صبح کو سورۂ بقرہ اور آلِ عمران پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کو شام تک نفاق سے بچائیں گے اور جو شام کو پڑھے گا اللہ تعالیٰ صبح تک اس کو نفاق سے بچائیں گے۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ اس سورت کو روزانہ پڑھا کرتے تھے، سورۃ البقرۃ بھی اور آلِ عمران بھی۔ قرآن کا جو حصہ پڑھا کرتے تھے وہ علیحدہ تلاوت کرتے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۴، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِهَا مَعَ آلِ عِمْرَانَ]

قانتین میں شمار:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس آدمی نے اس کو رات کو پڑھا اللہ تعالیٰ اس کو ان لوگوں میں لکھیں گے جو قانتین ہیں، یعنی راتوں کو جاگنے والے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۴، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِهَا مَعَ آلِ عِمْرَانَ]

سورۂ بقرہ کی بعض خصوصیات وغیرہ:

1 ...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات سورتیں مجھے تورات کے بدلے میں ملیں اور جن سورتوں میں دو سو آیتیں ہیں وہ انجیل کے بدلے میں ملیں اور مجھے مثانی زبور کتاب کے بدلے میں ملی اور اللہ تعالیٰ نے مفصل سورتیں مجھے زیادہ عطا فرمائیں، یعنی جو پہلے انبیاء کو نہیں ملیں۔ [المعجم الکبیر، حدیث: ۱۸۷]

2 ......اور فرمایا کہ جس نے یہ سات سورتیں یاد کرلیں وہ عالم ہے، یعنی سورۂ بقرہ، آلِ عمران، مائدہ اور نساء وغیرہ۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۵، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ السَّبْعِ الطِّوَلِ]

3 ......حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا اور ان کا امیر ایک بچے کو بنا دیا جس کو سورۃ البقرۃ یاد تھی۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۸۷۶، باب: مَا جَاءَ فِي فَضْلِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ]

4 ......سورۂ بقرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہجرت کے بعد سب سے پہلے نازل ہوئی اور آخر میں ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۸۱] صرف یہ آیت منیٰ میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد میرے مدنی پاک اسی (۸۰) دن یا نوے (۹۰) دن زندہ رہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۵، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ السَّبْعِ الطِّوَلِ]

5 ......سورۃ البقرۃ ایسے ہے جیسے خیمہ ہو۔

6 ......بعض علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کے اندر ایک ہزار خبر ہے، ایک ہزار امر ہے اور ایک ہزار نہی ہے۔

7 ......اور جن لوگوں نے آیات گنی ہیں وہ کہتے ہیں اس میں دو سو چھیاسی (۲۸۶) آیات ہیں اور اس کے اندر جو کلمات ہیں وہ چھ ہزار دو سو اکیس (۶۲۲۱) اور اگر اس کے حروف گنے جائیں تو پچیس ہزار پانچ سو (۲۵۵۰۰) حروف ہیں۔

8 ......حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور سب علماء اور ائمہ نے یہی کہا کہ سورۃ البقرۃ مدنی ہے، ہجرت کے فوراً بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۵، ذِکْرُ مَا وَرَدَ فِی فَضْلِ السَّبْعِ الطِّوَلِ]

9 ......ایک روایت میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یوں نہ کہو "سورۃ البقرۃ"، "سورۃ آلِ عمران"، بلکہ کہو کہ وہ سورت جس میں بقرہ کا قصہ ہے، جس میں آلِ عمران کا قصہ ہے۔ [شعب الایمان، حدیث: ۲۲۲۶]

لیکن یہ روایت غریب ہے، اس کا مرفوع ہونا صحیح نہیں ہے۔ اس کے اندر ضعیف راوی ہے، جس کی روایت سے حجت نہیں پکڑی جاسکتی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۵، ذِکْرُ مَا وَرَدَ فِی فَضْلِ السَّبْعِ الطِّوَلِ]

10 ......صحیحین میں ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ منیٰ میں تشریف لے آئے، جہاں جمرہ (کنکری) مارتے ہیں۔ اس کے بطن میں دائیں طرف کھڑے ہوئے اور کعبہ کے بائیں طرف کھڑے ہوئے اور فرمایا: "یہی وہ جگہ ہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ سورۃ البقرۃ نازل ہوئی۔" [صحیح البخاری، حدیث: ۱۷۴۹، بَابُ: مَنْ رَمٰی جَمْرَۃَ الْعَقَبَۃِ...]

11 ......حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ جنگ میں صحابہ میں کمزوری آرہی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((یَا أَصْحَابَ سُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ!)) [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۵، ایضاً، مسند أبی یعلی، حدیث: ۳۶۰۶]

"اے سورت بقرہ والو!"

شاید یہ یومِ حنین کا قصہ ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ صحابہ کو بلائیں "یَا أَھْلَ الشَّجَرَۃِ! یَا أَھْلَ بَیْعَۃِ الرِّضْوَانِ! یَا أَصْحَابَ سُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ!" حضور صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اس وجہ سے ان کو طاقت ملے گی۔ جب ان کے کانوں میں آواز پڑی تو ہر طرف سے صحابہ واپس لوٹے اور کفار پر ٹوٹ پڑے۔

12 ......جب مسیلمہ کذاب سے یمامہ کے موقع پر جنگ ہوئی وہاں بھی صحابہ کو بلایا گیا: "یَا أَصْحَابَ سُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ! یَا أَصْحَابَ سُوْرَۃِ الْبَقَرَۃِ!" [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۵، ایضاً، مصنف عبد الرزاق، حدیث: ۹۴۶۵]

یعنی اتنی شان والی سورت ہے کہ اس کا نام لینے سے صحابہ رضی اللہ عنہم میں طاقت اور قوت آجاتی تھی۔ مسیلمہ کذاب کا لشکر زیادہ تھا، کیونکہ وہ ستر ہزار (۷۰۰۰۰) کا لشکر لے کر آیا تھا تو مسلمانوں کے پاؤں اکھڑنے لگے تو مسلمان ایک دوسرے کو پکارتے تھے: ''يَا أَصْحَابَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ! يَا أَصْحَابَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ!'' یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو ہمت، طاقت اور فتح عطا فرمائی۔ مسیلمہ کذاب مارا گیا اور اس کی بہت سی فوج بھی ماری گئی اور کافی لوگ اسلام بھی لے آئے۔

حروفِ مقطعات:

حروفِ مقطعات کے بارے میں اختلاف ہے:

❁ ...... بعض علماء نے فرمایا: اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ وہ اس کی تفسیر بیان نہیں کرتے۔ خلفائے راشدین اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہی قول تھا کہ اس کی کوئی تفسیر نہیں، بس اللہ جانتا ہے۔ حضرت ابو عامر الشعبی، سفیان الثوری، ربیع بن خثیم اور ابن ابی حاتم نے بھی کہا ہے کہ اس کی تفسیر بس اللہ ہی جانتے ہیں۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۶، البقرۃ: الآیۃ: الٓمٓ]

بعض علماء نے اس کی تفسیر بیان کی، لیکن اس کے معنی کے اندر اختلاف کیا:

❁ ...... حضرت عبدالرحمٰن بن زید، علامہ ابو القاسم محمد زمخشری اور علامہ سیبویہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ سورتوں کے اسماء ہیں، جیسے ''الٓمٓ تَنْزِيْلُ السَّجْدَة'' تو گویا یہ ''الٓمٓ'' سورت کا نام ہے۔ اور یہ روایت صحیحین میں بھی ہے۔ اس کے بعد مجاہد نے فرمایا: ''الٓمٓ'' ''حٰمٓ'' ''الٓمٓصٓ'' ''صٓ'' گویا یہ چابیاں ہیں کہ اللہ نے ان سے قرآن کی سورتوں کو کھولا اور بیان فرمایا۔ یا یہ قرآن کے ناموں میں سے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت کا نام ہے۔ عام بات بھی یہی ہے کہ اگر کوئی کہے کہ میں نے ''الٓمٓصٓ'' پڑھی ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس نے سورۃ الاعراف پڑھی ہے۔

❁ ...... بعض علماء نے فرمایا ہے کہ ''الٓمٓ'' یا سورتوں کے شروع میں جو حروفِ مقطعات ہیں اللہ کے ناموں میں سے نام ہیں۔ یعنی ''الف'' سے اللہ مراد ہے، ''حاء'' سے حنان مراد ہے اور ''میم'' سے مجید مراد ہے، یا ''حاء'' سے حمید مراد ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ''الٓمٓ'' اللہ کا اسم اعظم ہے۔

❁ ...... ایک قول یہ ہے کہ یہ قسم ہے، جس سے اللہ نے قسم کھائی ہے اور یہ اللہ کے اسماء میں سے ہے۔

۞......بعض نے کہا: یہ مخفف ہے ''أَنَا اللّٰهُ أَعْلَمُ'' کا۔

۞......بعض نے فرمایا کہ یہ حروفِ ہجا ہیں، جیسے الف، با، تا، ثا، اسی طرح اللہ کے اسماء مبارک میں سے یہ حروف لیے گئے ہیں۔

۞......بعض نے فرمایا کہ حروفِ تہجی کے انتیس (۲۹) حروف میں سے یہ تین حروف ہیں۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ انتیس حروف، قاعدہ کے ہر حرف پر غور کریں تو اللہ کے اسماء میں سے کسی نہ کسی اسم کی وہ ابتداء ہے یا تو حروف کی ابتداء اللہ کے اسماء سے ہے یا اللہ کی نعمتوں سے ہے۔ اللہ نے جتنی نعمتیں ہم پر فرمائی ہیں ان کا ذکر اسی میں آ جاتا ہے۔

۞ ......بعض نے کہا کہ اس سے قوموں کی مدتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ فلاں قوم کی اتنی مدت ہوگی اور فلاں قوم کی اتنی مدت ہوگی۔ تو یہ حروف کنایات ہیں۔ ان کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے قوموں کی مدتیں اور راز چھپا دیے، مثلاً قومِ عاد کتنا عرصہ زندہ رہے گی؟ ان کے حروف میں حرف لیں گے اس کے عدد نکالیں گے تو اس کا سنہ نکل آئے گا...... حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے فرمایا کہ آدمی اللہ کے ناموں پر بھی یقین رکھے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے رزق اور نعمتوں میں زندہ ہو تو کتنی تعجب کی بات ہے کہ اللہ کے ساتھ کفر بھی کرے۔ انہوں نے فرمایا کہ ''الف'' اللہ کا مفتاح ہے، ''لام'' اللہ کے نام لطیف کا مفتاح ہے اور اسی طرح ''میم'' اللہ کے اسم مجید کا مفتاح ہے۔ ''الف'' سے اللہ کی نعمتیں اور ''لام'' سے اللہ کا لطف اور ''میم'' سے اللہ کا مجد مراد ہے...... انہوں نے فرمایا کہ جہاں صرف ''الف'' ہو تو ایک سال، ''لام'' ہو تو تین سال، ''میم'' ہو تو چالیس سال ہیں۔ یا ''الف'' سے مراد اللہ ہے، ''لام'' سے مراد لطیف ہے اور میم سے مراد مجید ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۶، البقرۃ: الآیۃ: الٓمّٓ]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب اقوال جمع کیے گئے، پھر تمام علماء نے اپنے اقوال کی توفیق یعنی ملانے کی کوشش کی۔ اگر غور کریں تو ان کے اندر کوئی جھگڑا یا تعارض نہیں ہے، جمع کرنا ممکن ہے۔ ان سے سورتوں کی افتتاح بھی کی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر حرف اللہ کے نام اور اللہ کی صفات پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ اللہ نے بعض سورتوں کی ابتداء کی ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ﴾ [سورۃ الحدید: ۱] ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ﴾ [سورۃ الجمعۃ: ۱] ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ [سورۃ الکہف: ۱]۔ یہ سارے قول جمع ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اگر پہلا حرف مثلاً: اللہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے تو اس میں کوئی تعرض کی بات نہیں ہے۔ یا ان حروف سے مراد مدت ہو کہ الف

سے مراد ایک سال، لام سے تیس اور میم سے چالیس تو اکہتر ہو گیا۔ اور اسی طرح ان سورتوں میں جن میں قوموں کے احوال ہیں کہ فلاں قوم سو سال رہی، فلاں قوم دو سال رہی، فلاں قوم چار سال رہی اور فلاں قوم ہزار سال رہی تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کبھی ایک حرف ہوتا ہے، لیکن اس کا اطلاق کئی معنوں پر ہوتا ہے، جیسے لفظِ ''اُمَّۃٌ'' ایک لفظ ہے، قرآن میں ہے: ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ﴾ [الزخرف: ۲۲] تو یہاں امت بمعنی دین اور طریقہ ہے۔ اور کبھی لفظ ''اُمَّۃٌ'' بولا جاتا ہے اور مراد ہوتا ہے کہ اللہ کا فرمانبردار بندہ، جیسے قرآن میں ہے: ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [النحل: ۱۲۰]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۶، البقرۃ: الآیۃ: الٓمٓ]

تو اس لیے ایک لفظ کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے جیسے لفظِ ''عَیْنٌ'' عربی کا لفظ ہے۔ اس کا معنی آنکھ بھی ہے، چشمہ بھی جو جاری ہو اور اسی طرح جاسوس پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، اسی طرح ''عَیْنٌ'' نمونہ کو بھی کہتے ہیں، اسی طرح گھٹنے کی ہڈی کو بھی ''عَیْنٌ'' کہتے ہیں، سورج کو بھی ''عَیْنٌ'' کہتے ہیں۔

......اس لیے ہم استعمال کے اندر گئے، جہاں محاورہ آئے گا ''عَیْنٌ طَلَعَتْ'' کہ ''عَیْنٌ'' نکل آیا، یعنی سورج نکل آیا۔

......اگر کہیں محاورہ میں آئے گا: ''عَیْنٌ انکَسَرَتْ'' کہ ''عَیْن'' ٹوٹ گئی، یہاں گھٹنے کی ہڈی مراد ہے کہ وہ ٹوٹ گئی۔

......اگر ہو گا ''عَیْنٌ جَرَتْ'' کہ ''عَیْن'' چل پڑی تو اس سے مراد یہ ہے کہ چشمہ بہہ پڑا۔

......اگر ہو ''عَیْنٌ أَبْصَرَتْ'' کہ ''عَیْن'' نے دیکھا تو یہاں آنکھ مراد ہے۔

......اسی طرح ''عَیْنٌ اطَّلَعَتْ'' تو یہاں جاسوس مراد ہے کہ اس کو اطلاع مل گئی۔

تو اس لیے ایک لفظ کا اطلاق کئی چیزوں پر ہو سکتا ہے۔ لیکن ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک ہے مجموعہ حرف عین کہ یہ عین، یا اور نون کا مجموعہ ہے۔ امۃ الف، میم اور ہا کا مجموعہ ہے۔ یہ تو مجموعۂ حرف ہے اور یہاں تو ایک حرف ہے، بحث ہو رہی ہے الف، لام اور میم۔ تو یہ علیحدہ مسئلہ ہے اور وہ علیحدہ مسئلہ ہے۔ یہ بات یہاں نہیں، کیونکہ کسی مجموعی حرف کا چند معنوں میں استعمال ہونا وہ علیحدہ چیز ہے، لفظِ ''اُمَّۃٌ'' ایک جامع کلمہ ہے، لیکن یہاں تو حرف میں بحث ہو رہی ہے اور کلمہ میں تو بحث ہی نہیں ہو رہی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۶، ۳۷، البقرۃ: الآیۃ: الٓمٓ]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بڑی دقیق بحث ہے اور تفسیر کا مقام ہی نہیں کہ ہم اس بحث میں پڑیں کہ

مجموعہ کا حمل ایک ہے یا نہیں۔ "أُمَّةً" کا لفظ کئی معانی پر دلالت کر رہا ہے۔ اس کا ہم سیاق کلام دیکھیں گے کہ اس سے پہلے جو کلام آرہا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ ایک حرف کسی خاص معنی کے لیے نہیں ہو سکتا۔ مثلاً: ایک حرف الف ہے، اس سے مراد دوسری جگہ کہیں کہ اس سے سال مراد ہے۔ اس کے لیے ہمارے پاس دلیل کون سی ہو؟ وہاں تو ہم دلیل رکھتے ہیں: ﴿إِنَّ إِبْرٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيفًا ۖ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (النحل: ۱۲۰) کہ پیچھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر موجود ہے۔ یہاں ہمارے پاس کون سا قرینہ ہے؟ ہم کون سا معنی مراد لیں؟ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اس کے اندر کوئی جمع تطبیق نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے عرب کے شعراء سے حجت پکڑی ہے، لیکن وہاں تو سیاق دلالت کر رہا ہے کہ یہ معنی مراد ہے۔ شاعر نے کہا:

فَقُلْتُ لَهَا قِفِيْ فَقَالَتْ قَافْ
لَا تَحْسَبِيْ أَنَّا نَسِيْنَا الْإِيْجَافْ

"ہم نے کہا کہ ٹھہرو تو اس نے کہا ٹھہر گئی اور تو گمان نہ کر کہ ہم ایجاف کو بھول گئے ہیں۔"

وہاں سیاق سے معلوم ہو رہا ہے کہ ہم نے کہا کہ ٹھہرو تو اس نے کہا "قَافْ" ٹھہر گئی یعنی "وَقَفْتُ" کہ میں ٹھہر گئی۔

مَا لِلظَّلِيمِ عَالَ كَيْفَ لَا يَا
يَنْقَدُّ عَنْهُ جِلْدُهُ إِذَا يَا

یہاں تو سیاقِ کلام ہی نہیں، کیونکہ سورت کے شروع میں آ گیا "الٓمٓ"۔ پہلے تو کوئی کلام ہی نہیں ہے تو "میم"، اس سے کیا اشارہ لے سکتے ہیں؟ بہر حال سارے اقوال نقل ہو گئے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۷، البقرۃ: الآیۃ: الٓمٓ]

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک حدیث پاک سے استدلال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ أَعَانَ عَلٰى قَتْلِ مُؤْمِنٍ بِشَطْرِ كَلِمَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ مَكْتُوبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ: آيِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ))

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۲۶۲۰، باب: التَّغْلِيظُ فِي قَتْلِ مُسْلِمٍ ظُلْمًا]

"اگر کسی بندے نے کسی مسلمان کے قتل کرنے میں مدد کی، چاہے آدھے کلمہ کے ساتھ، تو وہ اللہ سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا "اللہ کی رحمت سے ناامید"......"

وہ قیامت کے دن قاتل ہی ٹھہرایا جائے گا، یعنی اس نے تو کہنا تھا "اُقْتُلْ" کہ اس کو قتل کرو، لیکن اس نے کہا

''أُقِ'' یعنی اشارہ کیا چاہے آدھا کلمہ اس کے منہ سے نکلا ہے...... اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں...... وہ اس میں پکڑا جائے گا اور روزِ قیامت اس کو قاتل شمار کیا جائے گا۔

※......اور خصیف رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ''فَوَاتِحُ السُّوَر '' تمام کے تمام وضع کردہ حروف ہجاء ہی ہیں، بس انہی سے سورتوں کی ابتداء کی گئی ہے۔

وہ حروف ہجاء جو سورتوں کے شروع میں استعمال ہوئے ہیں ان میں سے اگر مکرر حروف کو گرا دیں تو چودہ حروف بنتے ہیں: ''ا ل ھ م ص ر ك ي ع ط س ح ق ن''۔ اگر ان کو جمع کرو تو ''نَصٌّ، حَكِيْمٌ، قَاطِعٌ، لَهٗ، سِرٌّ'' والا جملہ بن جاتا ہے اور یہ حروف کل حروفِ تہجی کا نصف ہیں یعنی کل حروفِ تہجی ۲۸ ہیں اور ان میں سے ۱۴ استعمال ہوئے ہیں جو نصف ہیں۔ بہر حال کلامِ عرب میں ایسے استعمال ہوتے تھے۔

واقعات:

مشہور ہے کہ ایک بزرگ کی خدمت میں کوئی آدمی آیا اور بڑا عرصہ خدمت کرتا رہا۔ اس کے بعد خدمت کا خلاصہ یہ نکلا کہ جب اس کو موقع ملا تو کہا کہ آپ مہربانی کریں! میں اتنے عرصے سے جو پڑا ہوا ہوں، آپ مجھے سونا بنانے کا نسخہ سکھلائیے...... بزرگوں کی خدمت میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اور آپ کو بھی اور سب کو ہدایت دے اور اخلاص عطا فرمائے۔

یہ ابھی دو تین دن کا واقعہ ہے کہ میں حجرِ اسود کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے عشاء کی نماز پڑھی، نفل پڑھے اور بیٹھا رہا۔ اب کوئی آدمی ساتھ بیٹھا ہوا ہو تو لازمی بات ہے کہ بندے کو شرم آتی ہے کہ کہیں ریا نہ ہو جائے کہ یہ دکھلاوے کے لیے نہ پڑھ رہا ہو۔ اصول یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی آدمی وظیفہ میں مشغول ہوتا ہے تو آپ دور چلے جائیں۔ جب فارغ ہو تو آپ اس کو مل لیں۔ خیر! بہر حال وہ فارغ ہونے کے بعد ملا۔ میں نے کہا: ''السلام علیکم! کیا کوئی کام ہے؟'' کہا: ''ہاں جی! کام ہے۔'' میں نے کہا: ''کیا کام ہے؟'' کہا کہ آپ مجھے سونے کا نسخہ بتلا دیں۔ میں نے کہا: ''شریف آدمی! اللہ کے کعبہ کے اندر بیٹھا ہوں، اس کعبہ پر بھی اس کا یقین نہ ہوا اور آدمی نسخے بناتا پھرے، اس سے بڑا بے ایمان بھی کوئی ہوگا......!؟ یعنی جس کو اللہ کے گھر میں بھی اللہ کے رزق پر یقین نہیں ہے، خدا کے دروازے پر بیٹھنے سے بڑا بھی کوئی نسخہ ہے......!؟

ایک زمیندار کے دروازے پر ایک میراثی اور ایک نائی ہوتا ہے وہ ان کو نہیں بھولتا تو ہم تو خدا کے دروازے پر

پڑے ہیں تو خدا ہم کو رزق نہیں دے گا؟ وہ بے چارے دیکھتے ہیں کہ ان کی گٹھڑیاں روزانہ نئی ہوتی ہیں، کپڑے نئے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ ہمیں کہاں کہاں سے بھیجتا ہے؟ اب بھیجنے والے...... الحمدللہ...... ہزاروں ہوں اور پہننے والا ایک ہو تو وہ روز نئی چیز استعمال کرے گا...... اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے...... ہمیں پتہ نہیں ہوتا، ہم سے پورے نہیں ہوتے، ہم اُٹھا اُٹھا کر...... الحمدللہ...... لوگوں کو دیتے رہتے ہیں...... تو لوگوں نے سمجھا کہ شاید یہ سونا بناتے ہیں۔کوئی کہتے ہیں شاید ہوٹلوں کا کاروبار کرتے ہیں۔اب اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے، سوائے اس کے کہ ہم ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھیں۔اس کے علاوہ تو ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ ہمارا یہ تو ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رزق کا مطلق وعدہ ہے ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ [ھود:٦] ہر زمین پر چلنے والی چیز کا رزّاق میرا رب ہے۔﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ [الذاریات:٥٨]۔

ایک وعدہ مکہ والوں سے ہے اور وہ خاص وعدہ ہے: ﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ﴾ [قریش:٣] کہ تم اس گھر کے رب کی عبادت کرو ﴿الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ڏ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾ [قریش:٤] میں ان کی بھوک کو بھی دور کر دوں گا اور ان کے خوف کو بھی دور کر دوں گا اور ان کو امن بھی نصیب کر دوں گا اور ان کو رزق بھی نصیب کروں گا۔تو ہمارے ساتھ تو اللہ تعالیٰ کے دو وعدے ہیں تو ہم کیسے بھوکے رہ سکتے ہیں؟

......یعنی ایک اللہ کا مطلق رزق والا وعدہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔

......ایک مکہ میں رہیں، اللہ کی عبادت کریں اور اللہ کی توحید کا پرچار کریں۔

تو میں نے آپ کو مثال دی ہے کہ زمیندار اپنے میراثی کو نہیں بھولتا اور ہم خدا کا نام لے رہے ہیں اور اس کی توحید کے علمبردار ہیں تو وہ مالک ہمیں کیسے فراموش کر دے گا؟ وہ تو ارحم الراحمین ہے۔اس لیے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کتنی بڑی بات کہی تھی!!! انہوں نے فرمایا کہ اے میرے رب! اے اللہ! تو نے مجھ پر اس وقت کرم کیا جب میں نے مانگا بھی نہیں اور مجھے فرصت بھی نہیں تھی اور تو نے مہربانی کی...... یعنی جب میں پیدا نہیں ہوا تھا، کیا اپنے پیدا ہونے کے لیے میں نے دعا مانگی تھی؟ یا مجھے پیدا ہونے کی ضرورت تھی؟ اگر میں پیدا نہ ہوتا تو کون سا کام دنیا میں رہ جاتا؟...... تو اس وقت بھی تو نے کرم کیا اور مجھے ماں کا دودھ بخشا، ماں کے پیٹ میں رکھا اور مجھ پر مہربانی کی اور مجھے زندہ سلامت نکالا، پھر عقل دی۔اب میں اپنے گناہوں پر تیری معافی کا محتاج ہوں تو کیا اب تو کرم نہیں کرے گا؟ یہ ناممکن بات ہے، یہ تو ہمارا یقین نہیں ہے۔جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ یقین ہو تو مٹی بھی سونا بن جاتی ہے، اللہ

کے ساتھ یقین ہو تو زبان کے ساتھ کلمہ نکلتا ہے اور میرا مالک اپنی رحمتیں فرما دیتا ہے۔ اور اگر خدا کے دروازے پر رہنے کے بعد آدمی کا ایمان، ایقان اور یقین درست نہ ہو تو اللہ ہدایت دے اور کوئی مرکزِ ہدایت ہمیں نظر ہی نہیں آتا...... تو وہ آدمی بڑا ناراض ہو کر چلا گیا۔ اس نے شاید سمجھا کہ مولوی صاحب نے کعبہ میں جھوٹ بولا کہ مجھے سونا بنانا نہیں سکھلایا، وگرنہ تو میں اس کا نام بھی نہیں جانتا۔

تو وہ آدمی جو بزرگ کی خدمت کرتے رہے تھے ان سے بزرگوں نے کہا کہ "کُلٌّ سِرٌّ"۔ ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جیسا کہ ہے "نَصٌّ، حَكِيْمٌ، قَاطِعٌ، لَهٗ، سِرٌّ" تو ان چودہ حروفِ معجمات کو جمع کیا جو غیر مکرر ہیں۔ تو ان بزرگوں نے فرمایا "کُلٌّ سِرٌّ"۔ انہوں نے فرمایا کہ بھائی! دنیا کے اندر چار علم ہیں: 1 ...... کیمیا۔ 2 ...... لیمیا۔ 3 ...... سیمیا۔ 4 ...... اور ریمیا۔ لوگ تو صرف کیمیا کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں سونا بنانے کے لیے، وگرنہ اور علم اس سے بہت بڑے بڑے ہیں۔ سونا بنانا تو معمولی سی بات ہے، کوئی چیز ہی نہیں۔ تو کیمیا، لیمیا، سیمیا اور ریمیا، یہ چار علم ہیں، ان کو جمع کرو تو "کُلٌّ سِرٌّ" بن گیا۔ تو معنی یہ ہے کہ یہ سب اللہ کے راز ہیں۔ اللہ چاہتے ہیں تو کسی پر کھول دیتے ہیں اور کسی پر نہیں کھولتے۔ اگر چاہا تو خضر علیہ السلام پر کھول دیا اور اگر نہیں چاہا تو موسیٰ علیہ السلام کے لیے نہیں کھولا۔ حالانکہ حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت میں بھی اختلاف ہے، کیا وہ نبی بھی تھے یا نہیں تھے؟ لیکن موسیٰ علیہ السلام کی رسالت میں تو کوئی جھگڑا بھی نہیں ہے۔ تو اللہ نے بعض علوم کو خضر علیہ السلام پر کھول دیا، لیکن موسیٰ علیہ السلام پر نہیں کھولا۔ بعض علوم کو اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر کھول دیا اور داؤد علیہ السلام پر نہیں کھولا۔ تو یہ اللہ کے راز ہوتے ہیں، اَسرار ہوتے ہیں۔

❁...... ظاہر ہے کہ اگر کلام جملہ کی صورت میں ہو تو تم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر میں کلام حروف کی صورت میں اتاروں تو بھی تم مقابلہ نہیں کر سکتے، ورنہ یہی تو حروف ہیں جو تم رات دن اپنی زبان میں استعمال کرتے ہو، تم بھی ان حروف سے کوئی علیحدہ چیز بنا کر لے آؤ۔ اس قول کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔

❁...... علامہ زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس لیے اللہ نے سارے حروف اکٹھے نہیں رکھ دیے، بلکہ کہیں تین آئے، کہیں دو آئے اور کہیں ایک آیا، یا مختلف سورتوں میں، تاکہ جب سورت اترے تو کافروں کو چیلنج کرے کہ آؤ مقابلہ کرو، ہمارے مقابلہ میں کلام بنا کر لے آؤ۔ اس لیے "صٓ"، "نٓ" اور "قٓ" ایک ایک حرف ہیں۔ اور کہیں دو حرف ہیں: "طٰسٓ"، "حٰمٓ"، "طٰهٰ"۔ اور کہیں تین حروف ہیں: "الٓمّٓ"، "الٓرٰ"۔ کہیں چار حروف ہیں: "الٓمّٓصٓ"۔ کہیں پانچ حروف ہیں: "كٓهٰيٰعٓصٓ"، "حٰمٓ عٓسٓقٓ"۔ کیونکہ کافروں کے کلام میں بھی کہیں کہیں ایک

حرف، کہیں دو حرف اور کہیں تین یا چار یا پانچ ہوتے ہیں۔ تو اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بھی انہی سے مرکب کر کے اپنا کلام بھیجا ہے تو مقابلہ کرو۔

خدا کی قدرت ہے انتیس ۲۹ سورتوں کے اندر یہ مقطعات ہیں۔ فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ [البقرۃ:۱]

﴿الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝﴾ [آل عمران:۱،۲]

﴿الٓمّٓصٓ ۝ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [الاعراف:۱،۲]

﴿الٓرٰ ۣ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝﴾ [ابراہیم:۱]

﴿الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ [السجدۃ:۲]

﴿حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝﴾ [الاحقاف:۲]

﴿طٰسٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝﴾ [الشعراء:۱،۲]

﴿كٓهٰيٰعٓصٓ ۝ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝﴾ [مریم:۱،۲]

یعنی اللہ نے حروف بھی وہیں لگائے جہاں قرآن نے تحدی کی کہ اللہ نے قرآن اتارا، اللہ نے اپنی کتاب آپ کی طرف بھیجی۔

قرآن کی ان آیات پر غور کریں تو ان لوگوں کا قول قوی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کے قرآن کا اعجاز ہے بس......!

اور جن لوگوں نے یہ کہا کہ اس سے مراد مدت، اعداد اور سن ہیں اور ان سے حوادث اور نوازل کی معلومات ہو جاتی ہیں، مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ ان سے خطا ہوئی اور انہوں نے ایسے مسئلہ میں دخل دیا ہے جس میں دخل دینے کا حق بھی نہیں پہنچتا۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۳۸، البقرۃ: الآیۃ: الٓمّٓ]

واقعہ:

ابو یاسر بن اخطب یہودیوں کی ایک جماعت کے ساتھ حضور ﷺ کے پاس سے گزرا تو حضور ﷺ یہ پڑھ رہے تھے:

﴿الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ [البقرۃ:۱:۱]

وہ اپنے بھائی کے پاس آیا اور کہا کہ آج میں نے سنا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ یہ آیت مبارک پڑھ رہے تھے۔ کہا کہ تم نے یہ خود سنا؟ اس نے کہا: ''جی ہاں'' تو وہ اس جماعت کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں آیا۔ انہوں نے کہا: ''حضور! آج ہمیں پتہ چلا ہے کہ آج آپ نے یہ آیت پڑھی ہے: ﴿الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ [البقرۃ:۱:۱]؟'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! میں نے پڑھا۔'' انہوں نے کہا: ''یہ کلام جبرئیل علیہ السلام لایا ہے اللہ کی طرف سے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں!'' اب اس نے کہا: ''حضور! پہلے جتنے انبیاء پر کتاب اتری تھی ان کے اندر تو ایسے حروف مقطعات نہیں ملتے، لیکن اللہ نے کلام آپ پر اتارا ہے اس میں یہ ملتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اسلام اور دین کی مدت اکہتر (۷۱) سال ہے کہ ''الف'' سے ایک، ''لام'' سے تیس اور ''میم'' سے چالیس ہے۔'' تو کہنے لگا کہ اس دین میں ہم کیسے داخل ہوں جو ستر سال کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اس نے کہا: ''یہ اکہتر (۷۱) بنتے ہیں۔ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی حروف اترے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''الٓرٰ''۔ کہنے لگا: ''یہ تو اور زیادہ مدت لمبی ہوگئی۔ ''الف'' ایک، ''لام'' تیس اور ''راء'' دو سو ہو گئے۔'' جب حضور ﷺ نے سارے پڑھے تو کہنے لگے کہ اب ہم گھبرا گئے ہیں کہ پتہ نہیں آپ کو زیادہ مدت ملی ہے یا کم ملی ہے؟ سمجھ نہیں آرہا ہے، یعنی جب تھوڑی تھی تو نخرے کر رہا تھا۔ اس کے بعد کہنے لگا کہ اٹھو چلو یہاں سے۔ اس کے بھائی نے کہا: ''گھبراتے کیوں ہو؟ ہو سکتا ہے کہ اللہ نے ان کی امت کو سات سو چار سال (۷۰۴) مدت دی ہو، لیکن یہ جھوٹ ہے، ہم تو...... الحمد للہ......اب پندرھویں صدی میں جا رہے ہیں اللہ کی رحمت سے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۸، البقرۃ: الآیۃ: الٓمّٓ]

﴿الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ میں اشارہ بعید کا استعمال:

''ذٰلِكَ'' اشارہ ہے اس کتاب کی طرف ''لَا رَيْبَ فِيْهِ'' جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں۔ پہلی صفت ''لَا رَيْبَ فِيْهِ'' ہے کہ جس میں کوئی شبہ نہیں۔ اور دوسری صفت یہ ہے کہ ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لیے۔ ''ذٰلِكَ'' اسم اشارہ بعید کے لیے ہے۔ کوئی چیز قریب ہو تو کہا جاتا ہے ''هٰذَا الرَّجُلُ'' اور بعید ہو تو ''ذٰلِكَ الرَّجُلُ''

علمائے قواعد کہتے ہیں ''هٰذَا'' قریب کے لیے اور ''ذَاكَ'' متوسط کے لیے اور ''ذَالِكَ'' بعید کے لیے ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا: ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ''۔ یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جب کتاب موجود ہے تو دور کا اشارہ کیوں لایا

گیا؟ اللہ نے ''هٰذَا الْكِتٰبُ'' کیوں نہیں فرمایا؟ اس اشکال کے متعدد جوابات دیے گئے ہیں:

1 ...... ذَالِكَ، هٰذا کے معنی میں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہتے ہیں، جیسے: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا﴾ [الاسراء:۹]

وہاں اللہ نے فرمایا ''اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ'' یہاں آ گیا ''هٰذَا''، حالانکہ سارا قرآن تو مراد نہیں، بلکہ جتنا اتر چکا وہ مراد ہے تو یہاں ''ذَالِكَ'' آنا چاہیے، لیکن ''هٰذَا'' استعمال ہوا۔ تو کہیں اللہ نے قرآن میں فرمایا: ''هٰذَا الْكِتَاب'' اور جب جن حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو انہوں نے کہا تھا: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ﴾ [الاسراء:۹] اور کہا تھا: ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا﴾ [الجن:۱] اس لیے ''ذَالِكَ'' اور ''هٰذَا'' ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْهِ]

2 ...... ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ'' کہ سورۂ فاتحہ تو مکہ میں نازل ہوئی تھی اور سورۂ بقرہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تو ان دونوں کے درمیان نزول میں کافی بعد آ گیا۔ اسی فاتحہ میں ہم نے مانگا تھا: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ [الفاتحہ:۵] اس دعا کو اللہ نے منظور فرما کر قرآن عطا فرمایا کہ صراطِ مستقیم کیا ہے؟ میرا قرآن ہے۔ اسی طرف اشارہ ہے ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ'' میں۔ وہ جو تم نے سورۂ فاتحہ میں دعا مانگی تھی، اس اعتبار سے ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ'' کہنا درست ہے۔

[تفسیر روح المعانی: ۱/۸۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ]

3 ...... ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ'' سے پہلے ''الٓمّٓ'' ہے۔ یہ ایک کلام ہو گیا اور گزر گیا تو اب اس کے بعد ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ﴾ آیا۔ ''ذٰلِكَ'' سے اسی سورت کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ حضور ﷺ پر اتار رہے ہیں، اسی لیے ''ذٰلِكَ'' اشارہ بعید لایا گیا، کیونکہ پہلا کلام ختم ہو گیا، اب اس کلام اور اسی سورت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

4 ...... قرآن باعتبارِ ظاہر کے اور باعتبارِ سور کے تو قریب ہے، لیکن جو اس میں اَسرار و رموز، حکم، مضامین اور معانی ہیں وہ تو اتنے چھپے ہوئے ہیں کہ عام آدمی تو کیا علماء بھی وہاں بڑی مشکل سے پہنچتے ہیں۔ وہ تو ایک بحرِ بے کنار ہے کہ چودہ سو سال گزر گئے، لیکن آج تک دنیا اس کتاب کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ یعنی اپنے تو اپنے رہ گئے، دشمنوں نے بھی اعتراف کیا، نہ ایسی کوئی کتاب آئی ہے اور نہ آئندہ کوئی ایسی کتاب اتر سکتی ہے۔ اس لیے ''ذٰلِكَ'' اسمِ اشارہ بعید کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ [تفسیر الرازي: ۲/۲۵۹، تحت: قَوْلُهٗ تَعَالٰی: ذٰلِکَ الْکِتَابُ]

5 ...... اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قرآن کو لوحِ محفوظ میں رکھا: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾

[البروج: ۲۱، ۲۲]، ساتویں آسمان پر ہے: ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا﴾ [الزخرف: ۴] ہمارے پاس ام الکتاب ہے، اس کے اندر قرآن پاک ہے۔ تو اب لوحِ محفوظ تک کوئی پہنچ نہیں سکتا۔ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دکھانا چاہیں تو اور بات ہے۔ قرآن لوحِ محفوظ میں اترا، پھر اس کے بعد بیت العزت میں آسمانِ دنیا پر اتارا گیا اور پھر بیت العزت سے تیئس (۲۳) سال کی مدت میں حضور ﷺ پر اتارا گیا۔ تو ''ذٰلِكَ'' سے اس کتاب کی طرف اشارہ ہے جو لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔ اس لیے اسمِ اشارہ بعید استعمال کیا گیا ہے۔

[تفسیر الرازی: ۲/۲۵۹، تحت: قَوْلُهٗ تَعَالٰی: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ]

...... مدینہ منورہ میں مقابلہ یہود کے ساتھ تھا اور تورات میں آپ ﷺ کی صفات وصورت بیان کی گئی تھی۔ تو اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اسم اشارہ بعید کا استعمال کیا گیا ہے۔

[روح المعانی: ۱/۸۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

حضور ﷺ سے پہلے یہودی مدینہ میں کیوں ٹھہرے؟

چونکہ مدینہ منورہ میں یہودی آباد تھے، ان کے بڑے بڑے قبیلے تھے: بنونظیر، بنوقینقاع۔ اسی طرح ان کا سردار کعب بن اشرف تھا۔ اور یہ یاد رکھیں کہ یہ مدینہ منورہ میں کب آباد ہوئے؟ مدینہ منورہ ان کا وطن نہیں ہے، جیسا کہ یہودیوں نے اپنا موجودہ نقشہ بنایا ہوا ہے کہ مدینہ ہمارا علاقہ ہے، ہمارا ملک ہے۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اصل میں ان کی تاریخ کیا بتلاتی ہے؟ ان کی تاریخ یہ ہے کہ جب تُبّع آیا جو یمن کا بادشاہ گزرا ہے...... اور کئی تُبّع گزرے ہیں، جیسے مصر کے بادشاہوں کو ''فرعون'' کا لقب ملتا تھا، اسی طرح روم کے بادشاہوں کو ''ہرقل'' کا لقب ملتا تھا، یمن کے بادشاہوں کو ''تُبّع'' کا لقب ملتا تھا...... تو وہ تُبّع جس نے سب سے پہلے اللہ کے کعبہ پر غلاف چڑھایا تھا اس کے پاس یہودی شام سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئے اس انتظار میں کہ اپنی کتابوں میں پڑھ چکے تھے کہ اب زمانہ قریب ہے کہ نبی پیدا ہوگا، جس کا نام ''محمد (رسول اللہ ﷺ)'' ہوگا...... کیونکہ میرے پاک نبی ﷺ کی نشانیاں تورات میں بھی تھیں، انجیل میں بھی تھیں اور زبور وصحائف میں بھی تھیں۔ کوئی پیغمبر اور اللہ کا نبی ایسا نہیں گزرا جس نے آنے والے نبی کی بشارت نہ دی ہو کہ ایک نبی پیدا ہوں گے۔ تاکہ دنیا انتظار میں رہے کہ آنے والا آ رہا ہے۔ اور پھر جتنے پیغمبر آئے تو جانے کے لیے، میرے مدنی کو اللہ نے ایسی نبوت دی، آئے تو چھا جانے کے لیے۔ یہ قیامت تک کے لیے نبوت محمد عربی ﷺ کو دی...... تو یہ یہودی وہاں سے ہجرت کر کے اپنا ملک چھوڑ کر

آ گئے۔ یہ مدینہ ان کا ملک نہیں ہے۔ یہ ابتداء سے بھی غدار ہیں اور آج تک بھی غدار ہیں۔ تو یہ تبع کے پاس ہجرت کر کے آئے۔

ان کے بڑے بڑے مثلاً: کعب بن اشرف، مالک بن سیف یہ انتظار کر رہے تھے کہ وہ نبی پیدا ہوں گے...... کیونکہ انہوں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ ایک آخری نبی پیدا ہوگا، نام اس کا محمد (ﷺ) ہوگا، مکہ میں پیدا ہوں گے اور ان کی ہجرت کا مقام مدینہ منورہ ہوگا۔ تو یہ مدینہ میں آکر آباد ہو گئے، تاکہ حضور ﷺ آئیں تو ان پر ہم ایمان لائیں گے۔ ایمان لانے کے بعد ہمیں طاقت ملے گی۔ اور اس نبی کے پیدا ہونے سے پہلے ہم اس مقام پر موجود ہوں گے تو اس پر ایمان لائیں گے۔ اصل میں یہ اس لیے یہاں آئے تھے...... لیکن جب آقا سرکار مدینہ ﷺ کی پیدائش ہوئی تو پہلے نبوت کا جو سلسلہ چلا آ رہا تھا وہ بنی اسرائیل میں تھا، کیونکہ جتنے پیغمبر آ رہے تھے وہ بنی اسرائیل میں آ رہے تھے۔ سارے نبیوں کی آپ شان دیکھ لیں! حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، پھر ان کے بھائی، اسی طرح سارا سلسلہ نبوت بنی اسرائیل میں تھا۔ اللہ نے اپنے کلام میں فرمایا کہ بنو اسرائیل کو ہم نے کتنی بڑی فضیلت دی کہ ان کو ہم نے دنیا میں سب سے افضل بنایا اور فرمایا:

﴿إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا ۖ وَآتَاكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ۝﴾ [المائدة: ۲۰]

''تم میں انبیاء پیدا کیے، نبی پیدا کیے، تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں ایسی نعمتیں دیں کہ تم سے پہلے کسی انسان اور جن کو نہیں دیں۔''

تو یہ اس زمانہ میں اسی انتظار میں رہے۔ اب مدنی کی پیدائش ہوئی تو آپ بنی اسرائیل کی بجائے ولدِ اسماعیل میں پیدا ہوئے...... حالانکہ اسماعیل اور اسحاق بھائی ہیں۔ یہ تو بغض ہے۔ جیسے آج کل ہمارے ہاں بغض ہے، وگرنہ مہاجر اور انصار کیا ہیں؟ بھائی ہیں اور ہر مسلمان بھائی ہے، لیکن اللہ رحمت کرے! بھائیوں میں اتنی عداوتیں ہیں کہ اتنی غیروں میں بھی نہیں ہیں...... تو ان کے دل میں بغض آیا کہ ہائے آج نبوت ولد اسماعیل کی طرف منتقل ہوگئی!! بنو اسرائیل کو محروم کر دیا گیا...... اور یہ بھی ان کو پتہ تھا کہ حضور ﷺ خاتم الانبیاء ہیں، کیونکہ وہ میرے مدنی پاک کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو جانتے ہیں۔ یہ مثال ہے کہ آدمی اپنی اولاد کو نہیں بھولتا، دس ہوں، پانچ ہوں، اندھیرے میں بھی بات سنے گا تو کہے گا فلاں بیٹا بول رہا ہے، چل کے آ رہا ہے تو کہے گا کہ معلوم ہوتا ہے کہ میرا بیٹا آ رہا ہے، کھانسی آ جائے تو پتہ چلے گا کہ کھانسی تو میرا بیٹا کر رہا ہے۔ اتنا یقین ہوتا ہے...... تو ان کو یقین تھا کہ

سچے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ خاتم الانبیاء، حبیب الکبریاء ہیں، لیکن جب حضور ﷺ آ گئے تو بغض آ گیا۔ جب بغض آ گیا یہ تو سب سے بڑے دشمن محمد ﷺ کے بنے۔ اور یہ قوم ابتداء ہی سے لالچی تھی: ﴿وَيَشْتَرُونَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا ﴾ (البقرۃ: ۱۷۴)

"اللہ کی آیات بدل ڈالتے تھے پیسے لینے کے لیے۔"

اندازہ کریں! تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں! آج بھی انجیل کے اندر یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ یہودیوں سے صرف تیس درہم لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑوا دیا۔ رشوت بھی صرف تیس روپے تھے۔ آج کے اعتبار سے پانچ سو یا ہزار بن جائے گا۔ یعنی ابتداء سے ان کی یہ عادت تھی کہ پیسے لیتے تھے اور آیات کو بدل ڈالتے تھے۔ اللہ رحمت کرے! آج بھی اگر انجیل پر نظر ڈالیں، تورات پر نظر ڈالیں تو آپ حیران ہو جائیں گے! آج بھی ایسی باتیں ان میں موجود ہیں کہ ان کو ایک شریف انسان پڑھ نہیں سکتا۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ لوط علیہ السلام اپنی بیٹیوں سے زنا کرتے تھے...... نعوذ باللہ!...... اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ یہ اللہ کی کتاب ہو سکتی ہے......؟؟ جس میں ایسی باتیں لکھی ہوئی ہوں۔ جہاں یہ لکھا ہوا ہو کہ انبیاء علیہم السلام کا اپنی بیٹیوں نے ناجائز تعلق تھا، جہاں کواکب اور اصنام پرستی لکھی ہو۔ خدا کی شان دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیسی عظمت والی چیز عطا فرمائی ہے!!

اس کتاب میں کوئی شک نہیں:

تو مالک بن یوسف نے آپ ﷺ کی مخالفت شروع کی اور شکوک وشبہات ڈالنے شروع کیے، حضور ﷺ کے بارے میں سیرت بدلنی شروع کی، پیغمبر کے بارے میں صورت بدلنی شروع کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں سورۃ البقرۃ اتار کر فرمایا: ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ [البقرۃ: ۱] یہودیو! تم بڑے عالم بنتے ہو اور اپنے علم پر ناز کرتے ہو تو بتلاؤ کہ "الٓمّٓ" کا ترجمہ کیا ہے؟...... کون جانے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ نہ بتلائے۔ اور فرمایا جس کتاب اور جس نبی کے بارے میں تم شبہات پیدا کرتے ہو تو "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ" یہ کتاب تو ایسی شان والی ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

عجیب واقعہ! حضور ﷺ کی تصدیق:

روایت میں آتا ہے کہ ایک دن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ...... جو یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے، جنہیں حافظِ تورات کا لقب تھا اور جن کو تورات یاد تھی...... ان سے پوچھا کہ عبداللہ بن

سلام! اب تو تم اسلام میں آ گئے، تم نے کلمہ پڑھ لیا، لیکن اب تم یہ بتلاؤ کہ کلمہ پڑھنے سے پہلے تمہیں حضور ﷺ کے بارے میں کوئی شبہ تھا یا کوئی شک تھا کہ آپ ﷺ سچے نبی ہیں؟ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! ہمیں اپنی اولاد میں تو شک ہو سکتا ہے، لیکن حضور محمد ﷺ کی صداقت میں کوئی شک نہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا مطلب؟'' کہنے لگا: ''اے عمر! اپنی اولادوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ ایک عورت کی گواہی ہوتی ہے کہ وہ کہتی ہے کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کون عورت کی گارنٹی دے سکتا ہے؟ اور تو ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ یہ سو فیصد ہمارا بیٹا ہے اور ہماری بیوی نے کوئی غلطی نہیں کی۔ خدا جانے نہ کی ہو یا کی بھی ہو، لیکن کیا ثبوت ہے؟ لیکن اللہ کے نبی ﷺ کے بارے میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں، کیونکہ وہاں تو ایک ایک وضاحت، ایک ایک علامت اور ایک ایک چیز لکھی ہوئی تھی کہ میرے نبی کا نام لکھا ہوا ہے، نسب لکھا ہوا ہے، میرے نبی ﷺ کا خاندان لکھا ہوا ہے، میرے نبی کا جائے مولد لکھا ہوا ہے، میرے نبی کی عادات لکھی ہوئی ہیں، میرے نبی کی صفات لکھی ہوئی ہیں، میرے مدنی کی صورت لکھی ہوئی ہے اور میرے نبی کا مقامِ ہجرت لکھا ہوا ہے۔ اور یہ تفاصیل کہ پھر میرے مدنی کے یار لکھے ہوئے ہیں، خلفائے اربعہ لکھے ہوئے ہیں، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما لکھے ہوئے ہیں، اصحابِ رسول لکھے ہوئے ہیں اور ان کی نشانیاں لکھی ہوئی ہیں۔ [روح المعانی: ۲/ ۵۲، البقرۃ: الآیۃ: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ]

جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب قسطنطنیہ فتح فرما لیا تو ایک بوڑھا سا پادری آیا اور اس نے آ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک کاغذ رکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمانے لگے: ''عمر اور عمر کے بیٹے کا یہ مال نہیں ہے۔'' صحابہ حیران ہو گئے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں......!؟ تو فرمایا کہ بڑے پرانے دور کی بات ہے، ابھی ہم کفر کے زمانے میں تھے اور میں شام تجارت کے لیے گیا۔ تجارت کر کے ہم واپس آ رہے تھے تو مجھے شام میں اپنا کچھ سامان بھول گیا، میں قافلے کو چھوڑ کر واپس اپنا سامان لینے کے لیے گیا۔ اتنی دیر میں قافلہ نکل گیا اور قافلہ مجھے نہ ملا۔ میرے پاس نہ زادِ راہ تھا اور نہ سامان تھا اور سارا قافلہ میں تھا، تجارت کا مال سب قافلہ میں تھا۔ میں تھکا ہارا ایک گرجا کے سائے کے نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گزری کہ ایک پادری آ گیا۔ اس نے پوچھا: کیا بات ہے؟ کون ہو؟ میں نے کہا: ''مسافر ہوں۔'' اس نے کہا: ''یہاں کیوں بیٹھے ہو؟'' میں نے کہا کہ بھول گیا ہوں، قافلہ سے بچھڑ گیا ہوں۔ تو اس نے کہا: ''چلو اندر چلو۔'' مجھے اپنے گرجا میں لے گیا اور اس کا دروازہ بند کر دیا۔

اندر مٹی کا ایک ڈھیر پڑا تھا، ایک پھاوڑا لوہے کا پڑا تھا۔ مجھے کہا: ''پھاوڑا اٹھا لو اور یہ مٹی کا ڈھیر یہاں سے اٹھا

کر وہاں رکھو۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ یہ کہہ کر چلا گیا اور دروازہ بند کر گیا۔ اور عمارت اتنی مضبوط تھی کہ میں نہ دروازہ توڑ سکتا تھا، نہ میں باہر نکل سکتا تھا۔ اب میں حیران پریشان! میں کیوں مٹی اٹھاؤں؟ میں کوئی مزدور ہوں؟ میں کوئی اس کا نوکر ہوں؟ میں چپ کر کے بیٹھ گیا تو وہ، تین یا چار گھنٹے کے بعد وہ دوبارہ آیا اور آ کر دیکھا کہ میں ٹیک لگا کر سویا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اٹھایا اور کہا: ''تم نے کام کیوں نہیں کیا؟'' میں نے کہا کہ میں کوئی تمہارا نوکر ہوں کہ کام کروں؟ اس نے مجھے پھاوڑا مارنے کی کوشش کی تو میں نے اس سے پھاوڑا لے کر اسے ختم کر دیا...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ لگا ہو تو کفر مر جاتا ہے۔ تو اس پادری کی کیا طاقت تھی......؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ضرب تو لوگ آج تک برداشت نہ کر سکے، چودہ سو سال گزر گئے، لوگ آج بھی نام سنتے ہیں تو خوف زدہ ہو کر چیختے ہیں......

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اب دو باتیں ہو گئیں: ایک بھولا ہوا مسافر۔ دوسرا اس سے ایک بندہ مر گیا۔ ملک پرایا، علاقہ پرایا۔ میں وہاں سے بھاگا۔ میں دروازہ تو کھول سکتا تھا، چابی موجود تھی۔ دروازہ کھول کر میں بھاگا بھاگا سفر کرتا رہا، بھٹکتا رہا، پھرتا رہا، کہیں کوئی جائے پناہ ملے۔ پھر تھک ہار کر ایک جگہ محفوظ مقام میں جا کر بیٹھ گیا، تا کہ وہاں رات گزار سکوں۔ دن ہو گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

فرماتے ہیں کہ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک اور پادری آ گیا۔ میں نے سوچا کہ ابھی ایک سے جان چھوٹی تھی، اب دوسرا آ گیا۔ اس نے آ کر پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ میں نے کہا: ''مسافر ہوں، مکہ کا رہنے والا ہوں، راستہ بھول گیا ہوں اور قافلہ سے بچھڑ گیا ہوں۔'' اس نے کہا کہ اچھا آئیں! آپ میرے ساتھ چلیں۔ وہ مجھے اندر لے گیا اور روشنی کی اور غور سے میرے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا، پھر پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا: ''عمر'' تو کہا: ''باپ کا نام کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''خطاب'' تو پوچھا: قبیلہ کون سا ہے؟ میں نے کہا: ''قریش'' تو کہا: ''پیدا کہاں ہوئے؟'' میں نے کہا: ''مکہ میں۔'' پوچھا: کام کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا: ''کچھ نہیں، تجارت کرتے ہیں۔ کبھی یمن آ گئے اور کبھی شام آ گئے۔'' اس نے کہا: ''اچھا ٹھیک ہے۔'' اس نے مجھے رات کو رکھا اور کھانا کھلایا اور میری بڑی خدمت کی اور بڑی عزت کی اور بڑا احترام کیا۔ اور مجھ سے پوچھا کہ آپ کا قافلہ کس راستہ سے نکلا تھا؟ میں نے کہا: ''فلاں راستے سے۔'' اس نے کہا: ''میں بڑے تیز رفتار گھوڑے مہیا کرتا ہوں اور اپنے ملازمین آپ کے ساتھ کر دیتا ہوں۔ چونکہ قافلہ جماعت کی وجہ سے آہستہ چلے گا، گھوڑے دوڑیں گے اور وہ آپ کو جلدی پہنچا دیں گے، لیکن ایک کاغذ ہے، مہربانی کر کے یہ جو میرا گرجا ہے اور اس کا علاقہ ہے، مجھے پرچہ پر لکھ دیں کہ جب

آپ بادشاہ بنیں گے تو یہ علاقہ مجھ سے نہیں چھینا جائے گا اور نہ مجھ سے ٹیکس لیا جائے گا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم عجیب آدمی ہو! میں ایک عرب آدمی ہوں، مکہ میں پیدا ہوا، قریش کا ایک عام آدمی ہوں، مجھے تو مکہ میں بھی سردار بن جانے کی امید نہیں اور تم مجھے یہاں قسطنطنیہ کا بادشاہ بنا رہے ہو۔ اس نے کہا: ''عمر! بات سنو! اگر تم بادشاہ نہیں بنو گے تو میں اس کاغذ کا کیا کرلوں گا؟ اور اگر تم بن گئے تو تمہیں لکھ کر دینے میں کیا حرج ہے؟ بادشاہ تو ملک کے ملک دے دیتے ہیں، میں تو تم سے گرجا مانگ رہا ہوں اور گرجے کے ساتھ والی زمین کہ اس کا کوئی جزیہ مجھ سے نہ لیا جائے، کوئی خراج اور عشر نہ لیا جائے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ہنستا رہا اور میں نے کہا: ''جو مرضی آئے تم لکھو، میں دستخط کردیتا ہوں۔'' میں نے سوچا! کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ ٹھیک بات کر رہا ہے، میں نے کون سا بادشاہ بننا ہے؟ وہ پرچہ لکھ کر لے آیا، میں نے اس پر دستخط کر دیے۔ اور اس سے پوچھا کہ تم یہ باتیں کیوں کر رہے ہو؟ اس نے کہا: ''میں ایسے بات نہیں کر رہا، اس وقت پوری روئے زمین پر مجھ سے بڑھ کر تورات کا کوئی عالم نہیں ہے، میں سب سے بڑا تورات اور انجیل کا عالم ہوں اور میں نے ان کتابوں میں جو نشانیاں پڑھی ہیں وہ تمہارے اوپر صادق آتی ہیں کہ ایک نبی پیدا ہوں گے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، تم اس کے خلیفہ بنو گے اور یہ سارا ملک تمہارے نیچے ہوگا، تم اس کو فتح کرو گے، یہاں اس کے دین کا جھنڈا گاڑو گے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں وہاں سے ہنستا ہوا چلا آیا، نہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی تصور تھا اور نہ کوئی خیال تھا، میں وہ بات بھول گیا۔ آج وہی بوڑھا، وہی لکھا ہوا میرے سامنے لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ آج تو آپ بادشاہ ہیں۔ تو میں نے کہا کہ یہ عمر اور عمر کے بیٹے کی جائیداد نہیں ہے۔ میں بادشاہ نہیں ہوں، میں خلیفہ ہوں، اللہ کے حکم کو چلانے والا ہوں، میں اللہ کے حکم میں کوئی تجاوز نہیں کرسکتا۔ جو اسلام فیصلہ کرے گا وہی ہوگا۔ عمر کیا کرے گا؟ اس میں تو اللہ کا دین چلے گا، جو عمر کا حکم ہوگا۔

تو اس طرح یہود پہچانتے تھے۔ صرف میرے مدنی پاک کو نہیں، بلکہ ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کو بھی پہچانتے تھے۔ ان کی علامات کو بھی پہچانتے تھے، مگر بدبخت ایمان نہیں لاتے تھے۔ وہ تقریر کرتا تھا کہ کوئی اللہ کا کلام نہیں، یہ وہ نبی ہی نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ردّ میں فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ [البقرۃ:۱]

''الْكِتَاب'' قرآن کا نام ہے۔ ''الْكِتَاب'' پر الف لام ہے، جیسے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝﴾ [الکھف:۱] تو ''الْكِتَاب'' پر الف لام لگانے سے ایک طاقت اور شان

پیدا ہوئی کہ کتاب ہے تو قرآن ہی ہے۔ قرآن کو کتاب اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا مادہ 'ک' 'ت' اور 'ب' ہے۔ اس مادہ کا معنی ہوتا ہے جمع کرنا۔ آپ لکھتے ہیں کہ کاتب نے کتابت کی، مختلف چیزوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ اس لیے فوج کے لشکر کو "کَتِیبَة" کہتے ہیں، کیونکہ اس میں کوئی فوجی کدھر کا اور کوئی فوجی کدھر کا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب حروف آئیں گے تو کلمات بنیں گے اور جب کلمات جمع کریں گے تو آیات اور آیات کو جمع کریں گے تو سورتیں بنیں گی اور سور کو جمع کریں گے تو کتاب بنے گی۔ اس لیے فرمایا "ذٰلِكَ الْكِتَابُ"، کیونکہ قرآن میں بھی مختلف سورتیں اور آیات جمع ہیں۔

[روح المعانی:۱/۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

دوسری جگہ قرآن میں ہے جب جبرئیل علیہ السلام پڑھتے تھے تو حضور پاک ﷺ بھی ساتھ ساتھ قرآن پڑھتے تھے، تاکہ قرآن بھول نہ جائے تو اللہ نے فرمایا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾﴾ [القیامۃ:۱۶تا۱۹]

یہاں تھوڑی جمع شدہ کا نام قرآن ہوگیا، نام تو کتاب بھی ہو سکتا تھا، جیسے: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ﴾ [ابراہیم:۱] لیکن یہاں فرمایا: "الْكِتٰبُ"۔ ایک جگہ نکرہ ہے اور ایک جگہ معرفہ ہے۔ معرف باللام کبھی تفخیم کے لیے ہوتا ہے، یعنی کسی چیز کی شان بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے، جیسے: "رَجُلٌ عَظِيْمٌ"، "رَجُلٌ كَرِيْمٌ"، اسی طرح کتاب کیسی شان والی کتاب!! اور کبھی کبھی الف لام لگا دیتے ہیں، تاکہ پتہ چلے کہ ہم کون سی کتاب کی بات کر رہے ہیں؟ وہ کتاب قرآن ہے۔ آپ نے فاتحہ میں جو مانگا تھا: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿٥﴾﴾ [الفاتحہ:۵] وہی ہے جو ہم نے آپ کو دیا ہے۔

کتاب کا ایک معنی:

کبھی کبھی کتاب کا معنی ہوگا فرض کیا گیا۔ مادہ "كُتِبَ" ہوگا، جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ﴾ [البقرۃ:۱۷۸]

جیسے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ [البقرۃ:۱۸۳]

لفظ کتاب کا ہے، لیکن معنی فرض ہے۔ فرض کیا ہم نے آپ لوگوں پر روزہ اور ہم نے فرض کیا آپ لوگوں پر قصاص۔ اگر کوئی قتل ہو جائے تو قاتل سے قصاص لیا جائے تو یہاں بمعنی فرض کے ہے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ [البقرۃ: ۱۸۰]

اللہ نے فرمایا: ہم نے تم فرض کر دیا ہے کہ جب موت قریب آئے تو وصیت تیار رکھو۔

دو گواہوں کے ساتھ وصیت کرو، تاکہ بعد میں جھگڑے نہ ہوتے رہیں، خاندان نہ لڑتا رہے، بلا وجہ آپس میں سر پھٹول نہ ہوتی رہے۔ تم وصیت لکھ ڈالو اور دو گواہ بھی بنا ڈالو، تاکہ بعد میں کسی قسم کی بات نہ ہو۔ تو ایسی کتاب جس میں اللہ نے فرائض بیان کیے اپنے حکم بیان کیے تو اب اللہ تعالیٰ کے احکام وفرائض یا نص کتاب یا قرآن اس کا ہر حکم قطعی بھی ہے اور یقینی بھی ہے۔ اللہ کے قرآن کا جو بھی حکم ہوگا وہ قطعی ہوگا، یقینی ہوگا، یعنی وہ ظنی نہیں ہوگا، یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ اس میں ذرہ سا بھی ظن پایا جائے، بلکہ اس میں قطعیت ہوگی اور یقین ہوگا کہ بالکل اللہ کا حکم ہے۔ اس لیے آگیا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾، ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ﴾، ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ یہاں ﴿كُتِبَ﴾ فرض کے معنی میں آگیا۔ تو اللہ کا ہر حکم قطعی اور یقینی ہوتا ہے، اس میں ذرہ برابر کوئی ظن اور گمان اور کوئی شبہ نہیں ہوتا، اس لیے فرمایا: "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ" [تفسیر الرازي: ۲/۲۶۰، البقرۃ: تحت: مَدلُولُ لَفظِ کتاب']

اور قرآن کا نام "قرآن" بھی آیا اور "الکتاب" بھی آیا اور اسی طرح قرآن کا نام "الفرقان" بھی آیا، "ذکر" بھی آیا، "شفاء" بھی آیا، "حدیٰ" بھی آیا، "مبشراً ونذیراً" بھی آیا اور اسی طرح قرآن کا نام ﴿إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝﴾ [الطارق: ۱۳، ۱۴] بھی آیا، اسی طرح قرآن کا نام آیا: ﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۝ فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ ۝ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝﴾ [الواقعۃ: ۷۷ تا ۷۹]، اسی طرح قرآن کا نام "مثانی" بھی آیا، اللہ نے فرمایا: ہم نے آپ کو ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۝﴾ [الحجر: ۸۷] دیا۔ اسی طرح قرآن کا نام "حدیث" بھی آیا ہے: ﴿اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا﴾ [الزمر: ۲۳] اور کہیں فرمایا: "﴿فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ۝﴾ [المرسلات: ۵۰] تو کہیں فرمایا "مَوْعِظَۃ" اور کہیں "ذکر" فرمایا۔

[تفسیر الرازی: ۲/ ۲۶۰ تا ۲۶۴، البقرۃ: تحت: مَدلُول لَفظ کتاب']

تفسیر:

تو یاد رکھو! قرآن کے بھی کئی نام ہیں: قرآن...... ذکر...... کریم...... قول فصل...... موعظۃ...... حدیٰ...... اور

رحمۃ۔ان میں سے ''الکتاب'' بھی ہے، اس لیے یہاں فرمایا: ''اَلْکِتَاب''۔ یہی کتاب ایسی ہے جو اصل کتاب کہلانے کی مستحق ہے، اس لیے اس کو معرف باللام لائے۔

کتاب اللہ اور کلام اللہ میں فرق:

یادرکھو! قرآن سے پہلے جتنی کتابیں اتریں ہیں وہ ''کتاب اللہ'' تو تھیں، لیکن ''کلام اللہ'' نہیں تھیں۔ اللہ نے تقریباً چار ساڑھے چار سو کتابیں اتاری ہیں، ان میں معروف چند کتابیں ہیں۔ جو معروف ہیں وہ: تورات، زبور، انجیل، صحائفِ ابراہیم اور صحائفِ موسیٰ، ورنہ کتابیں زیادہ ہیں۔ وہ ساری ''کتاب اللہ'' تھیں، لیکن ''کلام اللہ'' نہیں تھیں۔ یہ شرف صرف قران کو ملا ہے کہ قران ''کلام اللہ'' بھی ہے اور ''کتاب اللہ'' بھی ہے۔ کتاب کا معنی ہے لکھا ہوا، جیسے آپ کے پاس کوئی خط آئے، کوئی پوچھے تو کہیں گے کہ خط لکھا ہوا آیا ہے۔ کلام کہتے ہیں کہ جو بولا جائے۔ خط پڑھیں گے تو کہیں گے کہ اس نے خط لکھا ہے، یہ نہیں کہیں گے کہ اس نے بات کی ہے۔ کوئی آدمی پوچھے گا تو آپ کہیں گے کہ فلاں آدمی نے کہا، وہ کہے گا بات کی، تو آپ کہیں گے کہ بات تو نہیں کی، لیکن خط لکھا ہے۔ اسی طرح باقی جتنی کتابیں ہیں وہ لکھی ہوئی کتابیں اللہ نے اپنے پیغمبروں کو دے دیں، لکھی ہوئی تورات دے دی، لکھی ہوئی انجیل دے دی، لکھی ہوئی زبور دے دی، لکھا ہوا صحیفہ دے دیا۔ وہ ''کتاب اللہ'' تو بن گئے، لیکن ''کلام اللہ'' نہ بنے۔ کلام اللہ صرف قرآن ہے جس کو اللہ نے خود کلام کیا، خود جبرئیل علیہ السلام پر پڑھا اور جبرئیل علیہ السلام کو پڑھایا۔ پھر جبرئیل علیہ السلام نے آکر میرے مدنی محمد رسول اللہ ﷺ کو سنایا تو قرآن کو ''کتاب اللہ'' بھی کہیں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پہلی کتابیں آج تک محفوظ نہیں ہیں، چونکہ وہ ''کتاب اللہ'' تو تھیں، لیکن ''کلام اللہ'' نہیں تھیں۔ تو قرآن قیامت تک محفوظ ہے، کیونکہ اللہ کی ذات حی اور قیوم ہے تو اس کا کلام کیسے ختم ہوگا؟ جیسے اس کی ذات کو فنا نہیں آئے گی، اسی طرح اس کے کلام کو بھی فنا نہیں آئے گی۔ اس کا کلام بھی قیامت تک محفوظ اور باقی رہے گا یہ شرف اسی کو ملا ہے۔ اس لیے فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۱]

تو اس لیے اس کو معرف باللام لایا گیا کہ ہم نے جو آپ کے اوپر اتاری ہے ''الکتاب'' ہے۔

لفظِ ''قرآن'' کا استعمال بعض اور کل قرآن پر درست ہے:

اسی طرح مسئلہ سمجھ لیں کہ اگر قرآن کی صرف ایک سورت ہو تو بھی ہم اس کو قرآن کہیں گے، دو سورتیں ہوں تب

بھی ہم کہیں گے قرآن، دو آیتیں ہوں تو بھی ہم کہیں گے قرآن۔ یعنی قرآن کا اطلاق جیسے ساری کتاب پر ہوتا ہے اسی طرح تھوڑے سے حصہ پر بھی اس کا اطلاق ہوگا۔ جیسے اس آیت میں ہے:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ [الاعراف: ۲۰۴]

"جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور چپ رہو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔"

یہ نہیں کہ جب سارا قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور جب تھوڑا پڑھا جائے تو نہ سنو۔ چاہے تھوڑا بھی پڑھو تو اس کے لیے لفظِ "قرآن" آیا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جب جنات نے قرآن سنا تھا تو کہا:

﴿فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا﴾ [الجن: ۱]

"کہنے لگے کہ ہم تو عجیب قرآن سنا ہے!!"

حالانکہ حضور ﷺ نے سارا قرآن تو نہیں پڑھا تھا، صرف ایک سورت پڑھی تھی۔ جزء پر بھی قرآن کا اطلاق ہوتا ہے، اسی لیے آتا ہے کہ جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو میرے ماننے والے سجدے میں گر جاتے ہیں اور جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو ان کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ پورا قرآن تو ہر وقت کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! جیسے قرآن کا اطلاق کامل قرآن پر ہے، اسی طرح اس کے جزء پر بھی قرآن کا اطلاق ہے، اسی طرح لفظِ "کتاب" ہے۔ [روح المعانی: ۱/۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ]

اشارہ بعید لانے کی وجہ:

7 ...... اللہ نے حضور ﷺ سے سورۂ مزمل میں وعدہ کیا تھا:

﴿إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا﴾ [المزمل: ۵]

اب وہ وعدہ پورا ہونا شروع ہوا، اسی کی طرف اللہ نے اشارہ کیا کہ یہ وہ قول ہے۔ اس لیے اشارہ بعید لایا گیا "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ"۔ [روح المعانی: ۱/۸۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ]

الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ

شک سے پاک کتاب:

اس کتاب کی دو صفات ذکر کی گئی ہیں:

1 ......"اَلْکِتَاب" کی پہلی صفت "لَا رَیْبَ فِیْہِ" ہے۔

اور "اَلْکِتَاب" سے مراد قرآن ہے۔ "رَیْبَ" ،رَابَ یَرِیْبُ سے ہے، کسی چیز کے بارے میں شک ہو، جیسے قرآن مقدس میں آتا ہے: ﴿رَیْبَ الْمَنُوْنِ﴾ [الطور:٣٠]

اسی طرح محاوراتِ عرب میں مشتمل حدیث میں ہے:

((دَعْ مَا يُرِيْبُكَ إِلَى مَا لَا يُرِيْبُكَ.))

[سنن الترمذي، حديث:٢٥١٨، سنن النسائي، حديث:٥٧١١، اَلْحَثُّ عَلَى تَرْكِ الشُّبُهَاتِ]

"ان چیزوں کو تم چھوڑ دو جن میں شک پڑ جائے، ادھر آ جاؤ جن میں شک نہ ہو۔"

یعنی اگر آپ کے دل میں بلاوجہ شک ہو رہا ہے کہ پتہ نہیں حلال ہے یا حرام ہے؟ تو ان کو چھوڑ کر پکی بات کی طرف آ جاؤ۔ تو قرآن کی پہلی صفت آئی ہے کہ جس میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں، یعنی قرآن کا ہر حکم قطعی بھی ہے، یقینی بھی ہے اور اس کے اندر کسی قسم کا کوئی شک اور شبہ نہیں ہے۔

ہمیشہ شک وشبہ کی دو وجوہ ہوتی ہیں:

1 ......ایک تو اس چیز کے اندر کوئی ایسی بات ہے جس کی وجہ سے شک پڑ رہا ہے۔

2 ......یا یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن اس پڑھنے والے کے دماغ وفہم کے اندر نقص ہے جس کی وجہ سے وہ قرآن کو سمجھ نہیں پا رہا، وہ ایک حقیقت کو سمجھ نہیں رہا۔

سوال:

لوگ کہتے ہیں کہ کافر یہود ونصاریٰ اور ہندو وغیرہ قرآن کو نہیں مانتے تو اللہ تعالیٰ نے کیسے کہہ دیا کہ اس میں کوئی شک نہیں؟ ان لوگوں کو شک ہوا تو اس لیے انہوں نے نہیں مانا۔

جواب:

تو اس کی اصل وجہ سمجھیں کہ جو لوگ شک کر رہے ہیں ان کے فہم کے اندر تو نقص ہے، لیکن قرآن کے اندر کوئی شبہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے باقاعدہ چار مقام پر چیلنج کیا ہے:

1 ......ایک جگہ فرمایا:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ﴾ [البقرۃ:۲۳]

2 ......دوسری جگہ فرمایا:

﴿قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا﴾ [الاسراء:۸۸]

3 ......تیسری جگہ فرمایا:

﴿قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ﴾ [ھود:۱۳]

تو اب وہ دس سورتیں بھی بنا کر نہ لا سکے۔ پھر اللہ نے فرمایا: آپ ان کو پھر چیلنج کریں کہ اگر دس سورتیں بھی نہیں بنا سکتے تو ﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ﴾ چلو تم قرآن کے مقابلے میں ایک سورت بنا کر لے آؤ ﴿وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ [البقرۃ:۲۳] اور اللہ کے سوا اپنے تمام مدد کرنے والوں کو بلاؤ، ان کو پکارو کہ قرآن کے مقابلہ میں ایک سورت بنا کر دکھائیں؟ ﴿فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا﴾ [البقرۃ:۲۴] نہ زمانہ ماضی میں کوئی بنا سکا اور نہ قیامت تک کوئی قرآن کا مقابلہ کر سکے گا۔ ایک سورت بھی نہیں بنا سکتے تو یہاں تک تین چیلنج دیے۔

4 ......فرمایا:

﴿فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ﴾ [الطور:۳۴]

اگر تم ایک سورت نہیں بنا سکے تو ایک آیت بنا کر لے آؤ۔ چلو قرآن کے مقابلہ میں ایک آیت اور ایک بات لے آؤ، ایک چیز کا تم مقابلہ کرو، اگر تمہیں شک ہے کہ یہ نبی ﷺ خود بناتے ہیں، کیونکہ آپ عربی ہیں اور کبھی تم کہتے ہو کہ یہ سیکھتا ہے اور پرانی کتابوں سے قصہ کہانیاں بنا بنا کر ہمیں سناتا ہے تو تم مقابلہ نہ کر سکے۔

[تفسیر الرازي:۲/۲۶۶، البقرۃ: تحت: تفسیر قولہ تعالیٰ: لا ریب فیہ]

اس زمانہ میں کوئی مقابلہ نہ کر سکے اور آج ہم پندرھویں صدی میں جا رہے ہیں، آج تک قرآن کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکا۔

آپ اندازہ کریں کہ ہم تو مسلمان ہیں، لیکن جو کافر ہے ایڈورڈ گبن انگلستان کا بہت بڑا مؤرخ گزرا۔ اس نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ محمد (ﷺ) ایک ایسی کتاب لے کر آئے ہیں جو تمام شکوک وشبہات سے محفوظ ہے، دنیا کی کوئی کتاب قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور حضور ﷺ ایسی کتاب لائے ہیں جس کے اندر ایسی قطعی اور یقینی باتیں ہیں کہ جو سورج طلوع ہوتا ہے وہ غروب بھی ہوتا ہے اور ہر غروب ہونے والی چیز فانی ہوتی ہے اور ہر فانی چیز زائل ہوتی ہے اور ہر زوال پذیر معدوم ہوتی ہے۔ جو معدوم ہوتی ہو وہ کیسے کسی کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ اور دنیا کی ساری کتابوں میں اوہام پرستی ہے۔ تورات اور انجیل کی طرف دیکھیں تثلیث کا عقیدہ منسوب کیا ہوا ہے کہ خدا تین ہیں۔ یہ کوئی عقل کی بات ہے......!!؟

ہندوؤں کی کتابوں اور عیسائیوں کی بائبل میں غلط باتیں:

اور تورات اور انجیل کے اندر اب تک یہ لکھا ہوا ہے کہ انبیاء گناہ کرتے تھے...... نعوذ باللہ...... یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کا اپنی بیٹیوں کے ساتھ ناجائز تعلق تھا۔ ایسی کتابیں اللہ کی طرف منسوب ہو سکتی ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے......!؟؟ اور ادھر قرآن میں دیکھیں کہ اگر کہیں نکاح کی بات کی ہے، کہیں اگر میاں بیوی کے تعلق کی بات کی ہے، کہیں زوجیت کے حقوق کی بات کی ہے تو ایسی جامع اور کامل بات کی ہے اور ایسی مکمل بات کی ہے کہ جسے ایک مرد بھی پڑھ سکتا ہے اور ایک کنواری بچی بھی بیٹھ کر پڑھ سکتی ہے، ایک نوجوان بھی پڑھ سکتا ہے۔ دوست بھی پڑھ سکتا ہے اور دشمن بھی پڑھ سکتا ہے۔ یعنی اس لفظ کے اندر کوئی ایسی بات نہیں جس میں ثقل پایا جائے، یا عظمت کے لحاظ سے کمزوری ہو۔ یہ صفت اگر ملی ہے تو صرف قرآن پاک کو ملی ہے۔ اگر آپ وید اٹھا کر دیکھ لیں اور ہندوؤں کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں! ایسی ایسی باتیں آپ کو ملیں گی انسان ان کو پڑھ ہی نہیں سکتا ہے، حالانکہ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ وید بھی آسمانی کتابیں ہیں اور ان کے دعویٰ کے مطابق اور بھی آسمانی کتابیں ہیں اور ان میں انسانی مرد اور عورت کے اعضا تناسل کی پوجا کے بارے میں لکھا ہے۔ بھلا! یہ خدا کی کتاب ہو سکتی ہے؟ دنیا کی کسی کتاب کا آپ مطالعہ کریں، وید اٹھا کر دیکھ لیں اور آج دنیا میں جو چار اناجیل موجود ہیں: 1 انجیل متی ہے، 2 انجیل لوقا ہے، 3 انجیل یوحنا ہے 4 اور انجیل مرقس ہے۔ جتنی اناجیل ہیں اور تورات ہے۔ دنیا میں زبور کے نسخے بھی

موجود ہیں: زبور نمبر ۱، نمبر ۲، نمبر ۳ یوں کر کے ایک سو پچاس سبق اس کے ہیں، لیکن وہ محرف اور مبدل ہو چکے ہیں۔ ایک شریف آدمی ان کو پڑھ نہیں سکتا ہے۔ ان سے مقابلہ کیا جائے تو وہ تو پڑھنے کے قابل بھی نہیں ہیں کہ شرافت والا انسان ان کو اپنی زبان پر لے آئے۔ (تفصیل کے لیے کتاب ''تحفۃ الہند'' اور احقر امداد اللہ انور کی کتاب ''دفاع اسلام'' یعنی اسلام پر کفار کے اعتراضات اور ان کے جواب کو ملاحظہ کریں) ایک اللہ کا قرآن ہے کہ آج تک دنیا اس کا مقابلہ نہیں کر سکی۔

تفسیر:

قرآن پر جتنے شکوک وشبہات اور اعتراضات دشمنوں نے کیے ہیں، اللہ نے ان کا باقاعدہ جواب دیا ہے۔

❁......کافروں نے کہا تھا کہ حضور ﷺ شاعر ہیں، قرآن نے جواب دیا:

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ۝﴾ [الحاقۃ: ۴۱]

❁......کافروں نے حضور ﷺ کو کاہن کہا تو قرآن نے جواب دیا:

﴿وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝﴾ [الحاقۃ: ۴۲]

کہ کاہن تو اوٹ پٹانگ بات کرتے ہیں کبھی کوئی بات سچی ہوئی اور سینکڑوں باتیں جھوٹی ہوگئیں، لیکن قرآن نے جو بات کی ہے وہ ڈنکے کی چوٹ پر کی ہے۔ آج تک دنیا کی کوئی طاقت اس کے سچ کو نہیں جھٹلا سکی ہے۔

قرآن کی سچائی اور علوم:

اگر آپ قرآن کے اعجاز پر نظر ڈالیں تو قرآن مقدس نے تو ایسی باتیں فرمائی ہیں کہ پندرہ سو سال گزرنے کے بعد جدید علوم اور جدید تحقیقات اور نئی دنیا کے پڑھے لکھے سکالرز اور ریسرچ کرنے والے لوگ اعتراف کر رہے ہیں کہ جو قرآن پندرہ سو سال پہلے ایک نبی امی ﷺ نے (سرزمین عرب میں جہاں کوئی ادارہ نہ تھا) جو تعلیم بخشی تھی وہ کامل تھی اور ہماری تعلیم ناقص ہے۔

لاریب کتاب:

اللہ نے فرمایا: قرآن میں شبہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اب دیکھیں اَنفسِ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اللہ ہر شبہ سے، نقص سے اور صفاتِ نقصان سے پاک ہے تو اس کا کلام بھی پاک ہے۔ اب یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ قرآن تو اللہ کا

کلام ہے، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ نبی تک پہنچتے پہنچتے کوئی تبدیلی ہو گئی ہو؟ جیسے:...... اللہ معاف فرمائے...... بد باطن لوگ ہیں۔ ان کا عقیدہ بھی یہی ہے...... اللہ ہدایت دے......

اب اللہ نے قرآن میں سند بھی بیان کر دی کہ اس کو کس نے اتارا ہے؟ فرمایا: ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ [الواقعۃ: ۸۰] اور فرمایا: ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ۝﴾ [فصلت: ۴۲] اور فرمایا: ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ﴾ [القدر: ۱]۔ فرمایا: ﴿اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ﴾ [البقرۃ: ۹۹]۔ اور فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ [الحجر: ۹] اتارنے والا خدا ہے جو پاک ہے۔

اور اس کے بعد لانے والا کون ہے؟ فرمایا:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۝﴾ [الشعراء: ۱۹۳]

''اس قرآن کو لے کر اترنے والا الروح ہے۔''

روح حضرت جبرئیل علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور آگے اللہ نے ایسی صفات بیان نہیں کی کہ وہ طاقت والا ہے عظمت والا ہے، بلکہ فرمایا ﴿الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ ایسے فرشتے نے اتارا جس کا لقب روح ہے اور وہ فرشتہ امانت والا ہے، جس میں خیانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس فرشتے نے راستہ میں کوئی رد و بدل کیا ہو۔

اس لیے قرآن بار بار کہتا ہے:

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝﴾ [البقرۃ: ۴۴]

''کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟''

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۝﴾ [محمد: ۲۴]

''تم قرآن میں ڈوب کر تدبر نہیں کرتے ہو؟ غور و فکر نہیں کرتے ہو؟ کیا اللہ نے تمہارے دلوں پر تالے لگا ڈالے ہیں؟''

اس لیے ہمیں حکم ہے کہ ہم قرآن پاک کو سمجھیں، اس لیے آیا ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۝﴾ [الشعراء: ۱۹۳] یہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا نام موجود ہے: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ﴾ [البقرۃ: ۹۷] جبرئیل علیہ السلام کا نام موجود ہے، لیکن یہاں لقب آیا ہے اور وہ بھی روح آیا۔ قرآن میں دوسری جگہ ہے: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا﴾ [النبا: ۳۸] جبرئیل علیہ السلام ایک صف میں ہوں گے اور ملائکہ ایک صف میں ہوں گے۔ یہاں لقب روح آیا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں:

ایک وجہ یہ ہے کہ جیسے روح لطیف چیز ہے، اسی طرح اللہ کے ملائکہ اور فرشتے بھی لطیف اور نورانی مخلوق ہیں۔

اس میں کوئی شک کرے کہ جبرئیل علیہ السلام کو قرآن لاتے ہوئے نہیں دیکھا ہے تو اللہ نے فرمایا: کیا تم نے اپنی روح دیکھا ہے جو تمہارے اندر موجود ہے؟ تو کیا تمہارے نہ دیکھنے سے روح ختم ہو جاتی ہے؟ کیا تمہارے انکار کرنے سے روح نہیں ہوگی؟ تو وہ روح جو تمہارے جسم میں داخل ہے اور ایک ایک عضو میں سرایت کیے ہوئے ہے تمہیں تو وہ روح نظر نہیں آئی تو تم اس روح کو کیسے دیکھ سکتے ہو؟ اتارنے والا پاک ہے اور لانے والا بھی پاک ہے۔

اور اتارا کس پر؟ تو فرمایا:

﴿عَلٰی قَلْبِکَ﴾ [الشعراء: ۱۹۴]

آپ کے دل پر کہ جسم میں افضل مقام دل ہے۔ حضور ﷺ سراپا افضل، لیکن آپ کا دل افضل سے بھی افضل ہے۔ چونکہ اللہ کا قرآن افضل ہے، لانے والا فرشتوں میں افضل ہے اور اس کا مستقر آسمانوں میں لوح محفوظ افضل ہے، آسمان دنیا میں بیت العزت افضل ہے، زمین میں بھی جو سب سے افضل جگہ نظر آئی وہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا دل ہے۔

تو اب حضور ﷺ سے لے کر اللہ تک سند ایسی جڑ گئی کہ ان کے درمیان میں کوئی بدباطن تو شبہ کرے، لیکن ایمان والا شبہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲،۱]

اللہ کا قرآن ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی بدباطن خود شبہات بنا تا رہے تو یہ اس کی عقل کی خرابی ہوگی۔

قرآن کا نزول صرف آپ ﷺ پر ہی ہوا:

جیسے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن تو اصل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اترا تھا۔ ان کے عقیدہ کے اندر یہ بات ہے کہ جبرئیل علیہ السلام بھول کر محمد عربی ﷺ پر اترے۔ اور جھوٹے کا حافظہ تو ہوتا نہیں ہے۔ جھوٹے آدمی کا کیا حافظہ ہوگا......؟ وہ صبح کو کوئی بات کرے گا تو شام کو اسی کا الٹ کر دے گا۔ سچی بات اگر آپ بیس سال بعد بھی پوچھیں تو سچا آدمی سیدھی بات کرے گا۔ اور جھوٹ بولنے والا آدمی دو دن پہلے جو آپ سے بات کہے گا چار دن کے بعد وہی بات نہیں کہہ سکتا، ضرور اس میں ہیر پھیر کرے گا۔

ان لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ قرآن تو ایک دن میں اترا نہیں، قرآن تیئس (۲۳) سال کی مدت میں اترا ہے اور

تیئس (۲۳) سال اللہ کا فرشتہ بھولتا چلا گیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی نہ کہا کہ فرشتہ تو میرے پاس آ نہیں رہا۔ تیئس (۲۳) سال گزر گئے وہ تو کہیں اور چلا جاتا ہے۔ کوئی ایک دن یا ایک دفعہ کی بات ہوتی تو عقل مان لیتی لیکن تیئس (۲۳) سال کی مدت ہے۔ اچھا آپ قرآن دیکھیں کہ کتنی جگہوں پر اترا؟ مکہ میں اترا، غار حرا میں اترا، منیٰ میں اترا، حدیبیہ میں اترا، عرفات میں اترا، خیبر میں اترا، اور حنین میں اترا اور کون کون سی جگہ ہے جہاں اللہ کا قرآن نہیں اترا؟ کیا ہر جگہ وہ بھولتا رہا؟

لطف کی بات یہ ہے کہ جب قرآن اترنا شروع ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر سات سال تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال تھی۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ جوان ہوئے تو قرآن تقریباً پورا ہو گیا تھا۔ خدا کی قدرت ہے کہ ادھر شباب کمال ہوا اور ادھر قرآن پورا ہو چکا۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ آیا تو قرآن پہلے جمع ہو چکا، کیونکہ قرآن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع ہو گیا تھا۔ پھر چودہ سو سال گزر گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو کبھی اعتراض نہیں کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان مبارک سے تو کوئی قول ثابت نہیں، اگر جبرئیل علیہ السلام نے ......نعوذ باللہ!...... امانت پوری نہ اتاری تو جس نبی پر اتاری گئی تو ان کی امانت میں بھی شک پڑ گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہہ دیتے کہ میرے پاس کیوں آئے ہو؟ علی کے پاس جاؤ، تم تو بھول کر میرے پاس آ گئے ہو۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ اس قسم کے جو کم عقل لوگ ہوتے ہیں یا اپنے بغضِ باطن کی بنا پر باتیں بناتے پھریں، ان کی تو زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔ اب ایک آدمی ایسا ہو جو یہ کہے کہ کعبہ شریف یہاں نہیں ہے، تو آپ کیا کر لیں گے؟ جیسے کوئی اگر مجنون کسی عقل والے کو کہے کہ یہ پاگل ہے، کیونکہ جو پاگل ہوتا ہے وہ سب کو کہتا ہے کہ یہ پاگل ہے، حالانکہ پاگل وہ خود ہوتا ہے۔ تو قرآن نے دعویٰ کر دیا کہ قرآن میں کوئی شبہ نہیں اور نہ لانے والے میں شبہ ہے اور نہ جس کے سینے میں اتارا گیا اس میں شبہ ہے، نہ جنہوں نے قرآن جمع کیا ان کی صداقت میں کوئی شبہ ہے۔ اس لیے فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲،۱]

لہٰذا قرآن میں جو عقیدہ کا بیان ہے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے، لہٰذا قرآن نے جو اعمال بتلائے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے اور پھر قرآن نے جو ہمیں عبادات سکھلائی ہیں اس کے اندر کوئی شبہ نہیں ہے، قرآن میں جو معاملات کا بیان ہے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے، قرآن میں قصص اور اخبارات کا بیان یعنی پہلے نبیوں کے قصوں کا بیان ہے۔

آپ نے دیکھا نہیں ہے کہ یہودیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتحان کے لیے پوچھا تھا کہ وہ چند نوجوان جو غار میں

چھپے تھے، ان کا کیا قصہ ہے؟ اور ایک بادشاہ کا کیا قصہ ہے کہ جہاں تک سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے وہاں تک پہنچا اور جہاں تک غروب ہوتا ہے وہاں تک پہنچا، وہ کون تھا؟ اور روح کے بارے میں بتلائیں کہ روح کیا ہوتی ہے؟ جب قرآن نازل ہوا تو یہود جرات نہ کرسکے کہ یہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔ جب حضور ﷺ نے ان کو اصحابِ کہف کا قصہ بیان کر دیا، جب حضور ﷺ نے ذوالقرنین کا قصہ بیان کر دیا اور حضور پاک ﷺ نے جب روح کے بارے میں اللہ کا فرمان سنا دیا تو اس پر بس نہ کی، بلکہ اسی سورت میں اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اور خضر علیہ السلام کا قصہ بھی سنا دیا۔ پھر کوئی ماں کا لال اعتراض کی جرات نہ کر سکا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو اس لیے قرآن نے باقاعدہ دعویٰ کیا ہے۔ یہ پہلی صفت کا بیان تھا۔ [تفسیر الرازي: ۲۱/۳۹۱، الاسراء، الآية: وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ]

ہدایت کے درجات:

2 ......دوسری صفت ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ [البقرة: ۲]

قرآن سراپا ہدایت ہے اور ہدایت کرنے والا ہے ان لوگوں کو جو ڈرنے والے ہیں۔ ہدایت کے کئی مراحل ہیں، کیونکہ ضرر بھی مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی ضرر عقیدہ میں آتا ہے، کبھی ضرر اقوال میں آتا ہے، کبھی ضرر افعال میں آتا ہے، کبھی ضرر ہمارے جسم کو پہنچتا ہے اور کبھی ضرر ہماری روح کو پہنچتا ہے۔ اور پتہ نہیں کہ کل کیا کیا ضرر آئیں گے؟ اللہ نے فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ جیسے ضرر کی کوئی حد نہیں، اسی طرح ہدایت کے بھی درجات ہیں۔ پھر اللہ نے سب مخلوق کو ہدایت دی۔ یہ ہدایت عامہ ہے۔ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ [الفاتحہ: ۵] کے اندر ساری تفصیل گزر چکی ہے۔

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ سے ہدایت کا آخری درجہ ہدایت خاص الخاص مراد ہے۔ یہ ان کو نصیب ہوتا ہے جو متقی ہیں، اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔

تقویٰ کے تین مدارج ہیں:

1 ......پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی کفر سے نکل کر اسلام میں آجائے۔ یہ ہے تقویٰ، یعنی شرک وکفر سے بچنا اور اسلام کو قبول کرنا۔ یہ تقویٰ کی پہلی منزل ہے۔

2 ......تقویٰ کا دوسرا درجہ ہے: ''اِتِّقَاءٌ عَنِ الْمَعَاصِيْ'' کہ کبائر سے بچے، جو بڑے بڑے گناہ ہیں ان سے بچے، جیسے: شراب پینا، کسی انسان کو قتل کو کر دینا، زنا کرنا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، فساد فی الارض، پاکدامنوں پر

تہمت لگانا، چغلی کرنا اور صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنا۔ یعنی اگر کبھی صغیرہ گناہ ہو جائے تو اس پر ڈٹا نہ رہے، کیونکہ صغیرہ گناہ پر اگر آدمی اصرار کرے تو کبیرہ بن جاتا ہے۔ مثلاً: ایک گناہ ہے، اس کو کر دو تو صغیرہ ہے، لیکن اگر تم اس کو بار بار کرتے رہو تو وہ کبیرہ بن جاتا ہے۔ اس لیے اب تقویٰ کا درجہ ہوا کہ پہلے شرک سے بچ گیا، پھر گناہوں سے بچ گیا اور چھوٹے گناہوں پر اصرار نہیں کرتا کہ کبھی چھوٹا گناہ ہو گیا تو فوری طور پر وضو کیا، نماز پڑھی، عبادت کر لی، تاکہ گناہ فوراً دھل جائے اور اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((يَا عَائِشَةُ! إِيَّاكِ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوبِ)) [سنن الدارمی، حدیث: ۲۷۶۸، باب: فِي الْمُحَقَّرَاتِ]

"عائشہ! خبردار! خیال رکھنا! چھوٹے گناہوں سے بچنا۔"

جب بھی آگ جلائی جاتی ہے تو چھوٹی چھوٹی لکڑیوں سے جلائی جاتی ہے۔ یہی چھوٹے چھوٹے گناہ بڑے بن کر آدمی کو برباد کر دیتے ہیں۔

قرآن سے وابستگی کی وجہ سے عرب میں برکات:

جن کے کھانے پینے کا یہ عالم تھا کہ حاجیوں کا انتظار کرتے تھے کہ جب جہاز آئے گا تو حاجیوں سے ہم چاول خرید لیں گے اور گندم، تیل، گھی اور دالیں لے لیں گے۔ ہمارا سارا سال گزر جائے گا۔ پھر اگلے سال حاجی آ جائیں گے۔ یعنی جن کی معیشت کا یہ عالم تھا، جن کے پاس کوئی سڑک نہیں تھی، مدینہ منورہ جاتے تو آٹھ دن لگ جاتے تھے اور جاتے جاتے آدمی کے جوڑ ہل جاتے تھے، بڑے پہاڑ کی سڑک ہے اور کبھی بارش ہو گئی تو مہینہ کو راتوں کو بیٹھے رہتے تھے، مہینہ مہینہ تک قافلے مدینہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے، پانی رکے تو وہاں سے گزریں۔ بدامنی کا یہ عالم تھا کہ آٹھ آنے کے لیے بندوں کو گولی مار دی اور پیسے نہیں نکلتے تھے تو کہتے تھے کہ میری کمپنی کو نقصان ہو گیا، جو مر گیا اس کا کوئی غم نہیں، بس میری گولی کا نقصان ہو گیا۔ اندازہ کریں کہ پھر اللہ نے ان پر رحمت کی تو اس کی وجہ کیا تھی کہ جب یہاں کے مؤسسین نے اللہ کے قرآن کو سینے سے لگایا اور انہوں نے انگریزوں کو کھل کر کہہ دیا: ہم آپ کی ہر بات مان لیں گے، آپ سے ہر کنٹیکٹ کر لیں گے، لیکن ہم اپنے ملک میں قرآن اللہ کا مانیں گے اور اس کے رسول کا فرمان چلائیں گے۔ اللہ پاک نے فرمایا: اچھا! تم نے قرآن کو سینے سے لگا لیا، ہم زمین کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے خزانے تمہارے اوپر کھولے۔ ساری دنیا اللہ کی محتاج ہے۔ آپ جدھر نظر ڈالیں، پہاڑوں میں چلے جائیں، آپ کو مدرسہ ملے گا، آپ کو ہسپتال ملیں گے، آپ کو جنگل کے خیمہ میں اے سی چلا کر سویا ہوا ملے گا، وہیں جنریٹر لگایا ہوا

ہے، وہیں بجلی چل رہی ہے، یعنی اونٹ چرانے کے لیے گاڑیاں رکھی ہوئی ہیں جو ہمارے ہاں منسٹر کو نہیں ملتیں۔ جن کے اونٹ زیادہ ہوتے ہیں ان کو جنگل میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اب شام کو اکٹھا کرنا ہے تو کیسے کریں؟ تو جیپوں میں جا رہے ہیں۔ جو ہمارے ہیں بیچارو بڑے انسان کا سمبل بن گیا وہ یہاں اونٹ چرانے کے کام آتی ہے، وہ کوئی یہاں اعزاز والی گاڑی نہیں سمجھی جاتی۔ وہ تو اونٹ چرانے کے لیے گاڑی ہے، جس میں بیٹھ کر اونٹ پکڑ کر لے آئے، مال بھر لیا۔ وجہ کیا ہے؟ کہ صرف اللہ کے قرآن کے ساتھ تعلق ہے، اللہ کے رسول پر ایمان ہے۔ دعا کریں! اللہ تعالیٰ اسی طرح قرآن وسنت کے نظام کو قیامت تک قائم ودائم رکھے اور ہر مفتن کے فتنہ سے قیامت تک محفوظ رکھے اور ہر مفسد کے فساد سے محفوظ رکھے۔ تو یہ قرآن کا وعدہ ہے! اپنے ملک میں تجربہ کرلو۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے امیر المؤمنین! کیا آپ کبھی ایسے راستے سے گزرے ہیں جو راستہ بڑا خطرناک ہو اور کانٹے دار جھاڑیاں اور ادھر ادھر بڑے گڑھے ہوں اور راستے میں کیچڑ بھی ہو؟ جب آپ وہاں سے گزریں گے تو کیسے گزریں گے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں اپنے کپڑے اوپر کرلوں گا اور انہیں کس لوں گا اور نظر راستے پر جمالوں گا، پاؤں جما جما کر اور بچا بچا کر رکھوں گا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہی تو تقویٰ ہے۔'' [التذکرۃ في الوعظ للقرشي، ص۱۲۷]

(۳)......تقویٰ کا تیسرا درجہ: سو دل میں کسی کا بھی خیال نہ آئے، بس اللہ سے لو لگائی اور کسی کی طرف رجوع نہیں ہوتا۔

تقویٰ کا معیار:

اس کو قرآن نے کہا ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِۦ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ﴾ [آل عمران:۱۰۲]

اللہ سے ڈرو جیسی اس کی شان ہے اس کے مطابق ڈرنا۔ اور وہ ڈرنا ہے کیا؟ کہ اب دل میں کسی غیر کا خیال ہی نہیں ہے۔ نفع ہوتا ہے تو الحمدللہ!......نقصان ہوتا ہے تو الحمدللہ!......

حکایت:

ایک اللہ والے بیٹھے ہوئے تھے، انہیں اطلاع ملی کہ حضرت! آپ کا فلاں عزیز فوت ہوگیا ہے۔ فرمایا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ!''۔ تھوڑی دیر کے بعد اطلاع ملی کہ اللہ نے آپ کے فلاں عزیز کے گھر میں بچہ دیا ہے تو کہا:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ!''...... میرے جیسا کوئی جاہل مرید بھی بیٹھا ہوا تھا...... اس نے کہا: ''عجیب بات ہے کہ کوئی فوت ہو تو آپ خوش ہیں کوئی پیدا ہو تو آپ خوش ہیں۔ حالانکہ خوشی خوشی ہوتی ہے، غمی غمی ہوتی ہے۔ آپ کو موت کی خبر ملی تو آپ نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ!''۔ بچہ ہونے کی خبر ملی تو آپ نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ!''۔ یہ عجیب بات ہوئی!! انہوں نے کہا: ''میں نے تو اس بات پر نہیں کہا تھا۔ جب مجھے موت کی خبر ملی تو میں نے اپنے دل پر غور کیا کہ تمہیں تو کوئی گڑ بڑ نہیں ہوئی۔ دیکھا تو دل اپنے مقام پر ٹھیک ہے تو میں نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ!'' کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے میرے دل کو ہدایت پر رکھا ہے، یہ نہیں بہکا۔ جب خوشی کی خبر ملی تو میں نے اپنے دل کو ٹٹولا، کہیں خوشی میں آ کر حدود سے تو نہیں نکلتا؟ لیکن وہ اپنی حالت پر تھا تو میں نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ!''۔ میں تو اس پر اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ موت وحیات تو ہوتی رہتی ہے۔ کوئی پیدا ہوگا، کوئی مر جائے گا۔ تم اُدھر سوچتے رہے اور میں ادھر سوچتا رہا۔

یہ تقویٰ کا مقام ہوتا ہے کہ جب آدمی کا دل اپنے رب کے کفر اور شرک سے توبہ کر لے اور پھر اللہ کے سوا ہر کسی سے تعلق توڑ لے اور ایک اللہ کا بن جائے۔ تو وہ تقویٰ کا آخری درجہ ہے۔ تو اللہ نے فرمایا کہ جیسے جیسے تمہارے اندر تقویٰ کا درجہ ہوگا ویسے ویسے ہدایت ملے گی۔ جتنا تیرے اندر مقام تقویٰ ہوگا اتنا حصہ ہدایت کا قرآن سے ملے گا۔ جن کے اندر بالکل تقویٰ نہیں، کافر ہیں، مشرک ہیں، ان کو بالکل ہدایت نہیں ملتی اور جو مسلمان تو ہیں، لیکن گناہوں سے نہیں بچتے، انہیں کچھ نہ کچھ ہدایت ملتی ہے اور جو اصل ہدایت ہے اور مقام ہدایت ہے، وہ ان کو ملے گا جو تقویٰ کے آخری درجہ پر ہوں گے۔ یعنی جس طرح ہدایت کے تین درجے ہیں، اسی طرح تقویٰ کے بھی تین درجے ہیں۔

''اَلْكِتَاب'' سے مراد:

کتاب سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اس سے مراد قرآن ہے۔ بعض علماء نے مثلاً: ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک قول پیش کیا ہے کہ ''اَلْكِتَاب'' کے اندر الف لام جنس کے لیے ہے، اس سے مراد تورات، زبور، انجیل اور ساری وہ کتابیں ہیں جو گزر چکی ہیں۔ تو ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قَدْ أَبْعَدَ النُّجْعَةَ''۔ یہ عرب کا محاورہ ہے کہ اس نے اپنی اونٹنی کو دور بٹھایا۔ مقصد یہ ہے کہ دور کی کوڑی لے آیا۔ ایسی بات جس کو محاورۂ عرب میں کہتے ہیں کہ فلاں آدمی نے ہم سے اونٹنی علیحدہ کر لی اور دور جا کر بٹھائی، اس نے ایسی بات کی اس کو علم ہی نہ ہو۔ بلاوجہ تکلف میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے کہ ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ﴾ بات قرآن کی کر رہے ہیں اور اشارہ تورات، انجیل کی طرف چلا گیا۔ اس لیے مفسر رحمہ اللہ نے اس قول کی تردید فرمائی ہے، بتلا دیا کہ ''اَلْكِتَاب'' سے مراد قرآن ہے، جو اللہ نے اپنے

پاک نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اتارا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

اور اسی قرآن کو "اَلْكِتَاب" کے نام سے اللہ نے کئی مقام پر ذکر فرمایا، جیسے فرمایا:

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ [آل عمران: ۳]

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ①﴾ [الکہف: ۱]

"اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ" اس لیے "اَلْكِتَاب" قرآن کا نام ہے۔ "اَلْكِتَاب" "اَلْقُرْآن"، "اَلْمَثَانِي"، "اَلشِّفَاء"، "ذِكْر"، "نُوْر" وغیرہ یہ سارے قرآن کے اسماء ہیں۔ تو "اَلْكِتَاب" سے مراد قرآن ہے۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایسا تکلف کیا کہ جس کا علم نہیں ہے۔

اگر قرآن میں ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو کیا چودہ سو سال سے کافروں نے معاف کر دیا ہوتا؟ کوئی بات نکال کر نہ لے آتے؟ دیکھیں! تمام کفر آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں، لیکن مسلمانوں کے خلاف سب اکٹھے ہیں۔ یہود و نصاریٰ اور نصاریٰ کے فرقے اور یہودیوں کے فرقے ہیں اور ہندو ہیں اور ہندوؤں کے کتنے فرقے ہیں، برہمن ہیں، وشوا پریدش ہیں اور وہ ایک دوسرے کو اتنا بڑا دشمن سمجھتے ہیں! یعنی جو برہمن ہیں ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر وید کی تعلیم کا حقدار ہے تو برہمن ہے، یعنی شودر وغیرہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کتاب کو پڑھ سکیں یا سن سکیں۔ اگر کوئی آدمی ان کو سنا دے تو کہتے ہیں کہ سیسہ پگھلا کر ان کے کان میں ڈالو کہ ان کے کان میں ہمارا وید کیوں گیا ہے؟ یعنی دشمنی کی انتہا دیکھ لیں! اگر برتن کو بھی ہاتھ لگا لیں تو کہیں گے کہ یہ پلید ہو گیا ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کا مقابلہ آ جائے تو تمام ملت کفر ایک ہو جاتی ہے "اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ"۔ پھر یہودی بھی اکٹھے ہوں گے، نصرانی بھی اکٹھے ہوں گے، پھر تمام کفر اکٹھے ہو جائیں گے، پھر ان کو پتہ ہے کہ اصل مقابل ہمارا اسلام ہے، باقی تو دنیا میں کوئی مذہب ہے نہیں، ان کا تو کوئی وجود ہی نہیں۔ اس لیے علماء فرماتے ہیں:

((اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ)) [تفسیر المنار: ۶/ ۳۴۶]

کفر ایک ملت ہے، چاہے وہ شرق میں ہو یا غرب میں ہو، چاہے شمال میں ہو یا جنوب میں ہو۔ اسی طریقہ سے اللہ نے ہمیں قرآن میں بتلا دیا کہ کفار جو ہیں "اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ" یعنی وہ جتنے آپس میں لڑ پڑیں، لیکن جب اسلام کا مقابلہ آئے گا تو دوست بن جائیں گے۔ دیکھیں کہ میرے نبی خاتم الانبیاء حبیب الکبریاء سیدنا محمد ﷺ کا جب

مقابلہ ہوا، مکہ کے مشرکین میں کتنے قبائل تھے! بنو ثقیف علیحدہ ہیں، بنو ہذیل علیحدہ ہیں، بنو کلاب علیحدہ ہیں، بنو زہرہ علیحدہ ہیں، بنو لؤی علیحدہ ہیں، پھر سب قبائل کا خدا بھی علیحدہ ہے، طائف والوں کا خدا علیحدہ، بنو قریش کا خدا علیحدہ، تین سو ساٹھ بت جو رکھے ہوئے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ مختلف قبائل کے خدا تھے، جو خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے ہر کسی کا خدا علیحدہ تھا۔

اولیاء کرام کی قبروں پر جانا:

جیسے ہم سے ہر کسی کا کام علیحدہ ہے، ہم نے بھی تقسیم کیا ہوا ہے کہ بیٹا لینا ہے تو سیہون شریف جائیں گے قلندر کی دربار پر اور اگر بیماریاں درست کرانی ہیں تو بابا فرید گنج شکر کی دربار پر جائیں گے اور اگر کوئی ترقی اور ملازمت اور اقتدار پر جاتا ہے تو پہلے داتا صاحب کی مزار پر چادر چڑھا کر حاضری دے کر پھر کام شروع کریں گے، پھر ووٹ لے کر لڑیں گے، کیونکہ حضرت ووٹ کی بڑی مدد فرماتے ہیں...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ...... دعا کریں اللہ مسلمانوں کو ہدایت عطا فرمائے۔ ان تمام اولیاء کی درباروں پر جا کر عبرت حاصل کرو کہ میرا مولیٰ! جو ساری زندگی تیری عبادتیں کرتے رہے، جو اتنے پیارے تھے وہ بھی مٹی میں چلے گئے اور ہم نے بھی اسی مٹی میں آنا ہے۔ ان کی قبروں پر جانے کا مقصد یہ تھا کہ عبرت پکڑو اور ان کی زندگیوں سے سبق لو۔ آخر کوئی تو وجہ ہے کہ وہ لوگ فوت ہو گئے، لیکن آج بھی دنیا ان کے لیے دعائیں کر رہی ہے۔ تو ہم بھی آج ایسا عمل کریں کہ ہمارے مرنے کے بعد بھی کوئی ہمیں یاد کرے۔ ان کی قبروں پر جانے کا یہ مقصد تھا کہ دعا کریں کہ یا اللہ! ان کی قبروں کو اپنی رحمت کے ساتھ بھر دے۔ جب ہم اللہ کے اولیاء کے لیے دعائیں مانگیں گے تو اللہ کی رحمت ہم پر برسے گی کہ یہ بندہ گناہ گار ہو کر میرے ولی کے لیے دعا کر رہا ہے تو میں ارحم الراحمین ہوں تو اس کو کیوں نہ عطا کروں؟ تو یہ مقصد تو نہیں تھا کہ ہم وہاں جا کر فریادیں کریں، نذریں چڑھائیں اور استغاثے کریں اور جا کر طواف کریں اور بچے مانگیں اور الٹے پاؤں چلیں۔ یہ تو...... نَعُوْذُ بِاللّٰہِ!...... ایسے ہو گیا کہ جو شرک کی اعلیٰ سے اعلیٰ قسم ہو وہ یہاں ہو گی۔

تو بہر حال مقصد یہ تھا کہ ان قبائل کے خدا الگ تھے، طائف والوں کا خدا الگ ہے۔ آپ پڑھ چکیں ہیں کہ ابرہہ نے کعبۃ اللہ پر چڑھائی کی تو بنو ثقیف نے ان کو کہہ دیا کہ ہمارے خدا کو نہ چھیڑو، ہم تمہارا راستہ نہیں روکتے، جاؤ کعبہ گرانا ہے تو گرا دو، ہمیں کعبہ سے کیا ہمدردی......؟ ہمیں قریش سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، ان پر حملہ کرنا چاہتے ہو تو لاکھ کرو، لیکن ہمارے مقدر کو نہ گرانا، ہمارے یہاں آ کر ہمارے خدا کو نہ چھیڑنا۔ ابرہہ نے کہا: ٹھیک

ہے، میں بھی نہیں چھیڑتا، میں تو کعبہ کو گرانے کے لیے جارہا ہوں۔

حضور ﷺ کے مقابلہ میں کفار کا اتحاد:

لیکن جب میرے مدنی پاک ﷺ کے مقابلے کا وقت آیا تو سب اکٹھے ہو گئے۔ یہود کے تین قبائل تھے: 1 ......بنونضیر 2 ......بنوقریظہ 3 ......اور بنوقینقاع، جو مدینہ میں آباد تھے اور تینوں کی دشمنیاں تھیں۔ سب کے سردار علیحدہ تھے، لیکن حضور ﷺ کا مقابلہ آیا تو اکٹھے ہو گئے۔ یعنی جب حضور ﷺ نے مدینہ پاک میں خندق کھودی مدینہ پاک کی حفاظت کے لیے تو وجہ یہ تھی کہ تمام احزاب اکٹھے ہو گئے، مدینہ والے بھی اکٹھے ہو گئے اور مکہ والے بھی اکٹھے ہو گئے۔ تو اب حضور ﷺ نے فرمایا: ''اب ہم ان تمام قوتوں کا مقابلہ کیسے کریں گے؟'' تو حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''حضور! ہمارے فارس میں جنگ کا طریقہ یہ ہے کہ دشمن کو روکنے کے لیے ہم خندق کھودتے ہیں، کیونکہ دشمن اس خندق کو عبور نہیں کرسکتا۔ کیسے عبور کرے گا؟ ہم اس کو تیروں کی بوچھاڑ میں رکھ لیں گے۔ اگر کوئی گھوڑے سے کودے گا دو ہزار اکٹھے تو نہیں کودیں گے۔'' یہ تجویز آپ ﷺ کو بڑی پسند آئی تو آپ نے خود مدینہ کے گرد خندق کھودی۔ مسلمانوں کی حفاظت کی وجہ یہ تھی کہ کفر مل گیا تھا، اس لیے جب اسلام کے خلاف کوئی بات ہو گی تو کفر متحد ہو جائے گا۔

مسلمانوں کی حالتِ زار:

اور بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمان اکٹھا نہیں ہوتا...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ...... اللہ مسلمانوں کے حال پر رحم فرمائے۔ مسلمان کا یہ عالم ہے کہ اگر ساتھ گھر میں آگ لگی ہے تو پوچھا جائے تو کہے گا کہ میرا گھر محفوظ ہے۔ اگر کسی کا بیٹا اغوا ہو جائے تو کہتے ہیں کہ یہ ہوتا رہتا ہے۔ جب اپنا بیٹا اغوا ہو تو چیختا ہے، پھر رونا شروع کرتا ہے، اس کو دوسروں کے بیٹے کا درد نہیں ہوتا۔ کافروں کو دیکھو کہ ان کا کہیں ایک آدمی بھی مر جائے تو پورا ملک کھڑا ہو جائے گا، ایک مسلمان کا خون اتنا سستا ہے کہ جہاں بہادو، جہاں کوئی مسلمان مر جائے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ وجہ کیا ہے؟ کہ آج اسلام کا صرف نام باقی رہ گیا ہے اور مسلمان ایک قانونی مسلمان ہے، ایک رسمی مسلمان ہے کہ ہمارے پاسپورٹ میں، ایڈنٹی کارڈ میں لکھا ہوا ہے کہ ہم مسلمان ہیں، وگرنہ آج ہم مسلمانوں کے اندر نہ اسلام والا عقیدہ ہے، نہ اسلام والے اخلاق ہیں، نہ اسلام والا کردار ہے، نہ وہ عمل ہے اور نہ وہ افعال ہیں۔ صرف ایک نام ہے۔

آپ اندازہ کریں! اگر چند لڑکے تاریخ اٹھا کر دیکھیں کہ اپنی فریاد کافروں کے ذریعہ سندھ سے عرب لکھ کر بھیجیں تو عرب سے محمد بن قاسم اُٹھا اور کفر کو مارتا ہوا ملک فتح کر ڈالے کہ مسلمان لڑکیوں کی عزت پر حملہ کیوں کیا گیا؟ اور آج کون سا ملک ہے جہاں مسلمان بیٹیوں کی عزت پامال نہیں کی جاتی؟ جہاں اب اجتماعی آبرو ریزی کی جاتی ہے اور اس کے بعد ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے، انہیں زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ مسلمان پھر بھی زندہ ہے، ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ جب تک کوئی ہماری بیٹی کو نہ جلائے ہمیں تکلیف ہی نہیں ہوتی۔ یہ ہماری بے حسی کی وجہ ہے کہ ہم بس اسلام کے نام لیوا ہیں، ورنہ اب ہمارے اندر بات باقی نہیں رہی۔

''رَیْبٌ'' کا معنی:

اور ''رَیب'' کبھی حاجت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ''قَضَيْنَا مِنْ تِهَامَةَ كُلَّ رَيْبٍ'' (تہامہ میں آئے تو ہم نے ہر حاجت پوری کر لی۔) یہاں حاجت کے معنی میں ہے تو ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲] میں ''رَیب'' کا کیا معنی ہوگا؟ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہاں ''رَیب'' شک کے معنی میں ہے۔

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''رَیب'' کا معنی شک ہے، مجھے اس میں کسی کا اختلاف نہیں ملا اور قرآن مجید کی دیگر آیات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں ''رَیب'' بمعنی شک ہے۔ جیسے: ﴿الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ [السجدۃ:۱،۲]

اور بعض نے فرمایا ہے کہ ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ بظاہر تو خبر ہے کہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں، لیکن کبھی صیغہ خبر کا ہوتا ہے اور مراد ''نہی'' ہوتی ہے۔ اب یہ ہوگا ''لَا تَرْتَابُوْا'' کہ اس میں شک نہ کرو۔ یہ اللہ کا قرآن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب بھی کسی نے غور کیا تو اس کو ماننا پڑا کہ یہ اللہ کا قرآن ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

کفار کا قرآن کو اللہ کا کلام ماننا: حکایت:

کفار نے دار الندوہ مسجد الحرام کے اندر بیٹھ کر اپنی میٹنگ کی اور غور کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام پڑھتے ہیں یہ کیا ہے؟ کسی نے کہا: پتہ نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ جادو ہے۔ کسی نے کہا: یہ جادو نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہانت کی قسم ہے کہ کاہن لوگ بھی ایسی باتیں کرتے ہیں، مسجع قسم کی عبارتیں پڑھتے اور بناتے ہیں اور ایک دوسری کے ساتھ ملاتے

ہیں۔ تو ولید بن مغیرہ...... جوان کا بڑا دانا اور بہت مالدار آدمی تھا...... اس نے کہا کہ ایسا کرو کہ تم جانتے ہو کہ میں علم و عقل والا ہوں اور میں سحر اور غیر سحر میں فرق کر سکتا ہوں۔ تم یہاں بیٹھو، میں ابھی محمد (ﷺ) کی خدمت میں جاتا ہوں، ان سے جا کر کلام سنتا ہوں اور واپس آ کر تم کو بتاتا ہوں کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔

حضور ﷺ مسجد الحرام میں بیٹھے تھے۔ ولید بن مغیرہ آ گیا، آ کر سلام کیا اور کہا: یا ابن عمی! (کیونکہ رشتہ داری تو سب کے ساتھ تھی) اے بھتیجے! میں تیرے پاس آیا ہوں، جو تم قرآن سناتے ہو وہ کیا ہے؟ ہمیں سیدھی بات تو بتلا۔ فرمایا: یہ تو اللہ کا کلام ہے۔ اس نے کہا: چلو مجھے کچھ سنائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہی تو میں چاہتا ہوں تو ولید بن مغیرہ بیٹھ گیا تو حضور ﷺ نے پہلے اللہ کی حمد و ثنا کی اور پھر قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔ سورۂ غافر کی آپ نے تلاوت فرمائی۔ ابھی آپ چار آیتوں پر پہنچے اور جب حضور ﷺ نے پڑھا: ﴿إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ﴾ [غافر: ۷] تو اس نے کہا: بس کریں! آگے میں سن ہی نہیں سکتا۔ اور ولید وہاں سے ڈرا اور تھر تھر کانپتا ہوا سیدھا گھر چلا گیا۔ یہ ولید بن مغیرہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا باپ ہے۔ دیکھیں! بیٹا ''بطل الاسلام'' ہے اور باپ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

وہ گھر چلا گیا اور ابو جہل پریشان کہ ولید کو حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا، ولید کہاں گیا؟ انہوں نے دیکھا تو کہا: یہاں تو نہیں ہے۔ تو ابو جہل کہنے لگا اور بات سنو!؟ معلوم ہوتا ہے کہ ولید بھی گیا، اس نے بھی قرآن سن لیا، وہ بھی مسلمان ہو گیا۔ اس نے ہماری طرف آنا تھا، ہماری طرف نہیں آیا تو کدھر چلا گیا؟ ٹھہرو! میں جاتا ہوں اور میں اس کو دوبارہ بھڑکاتا ہوں۔ ابو جہل اس کے گھر کے دروازہ پر پہنچا اور اس کو بلایا کہ معلوم ہوتا ہے تمہارے اوپر بھی محمد (ﷺ) کا اثر ہو گیا، تم بھی حکومت کا ارادہ رکھتے ہو، اس لیے محمد سے مل رہے ہو۔ اس کو غصہ آ گیا کہ میں کوئی غریب ہوں کہ حضور کے ساتھ اس لیے ملوں؟...... حالانکہ ابو جہل کا مقصود اس کو چڑانا تھا...... اس نے کہا: سنو! جو حضور پڑھتے ہیں وہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے اور نہ یہ جادو ہے۔ اور کہا: ''إِنَّ فِيهَا حَلَاوَةً'' کہ قرآن میں ایک حلاوت ہے، اس کلام میں ایک مٹھاس ہے اور پھر اس کلام کے اندر ایک جڑ ہے اور اس کلام کا اوپر معلوم ہوتا ہے کہ صبر سے لدا ہوا ہے اور اس کے اندر ایک تر و تازگی معلوم ہوتی ہے کہ ابھی یہ قرآن اترا ہے تو یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ محمد (ﷺ) کی بات ٹھیک ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اگر غور کرنے پر آئیں تو دشمنوں کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ [دلائل النبوۃ: ۲/۱۹۹، باب: اعتراف مشرکی قریش بما في کتاب اللہ]

قرآن کا اعجاز:

حضور ﷺ کے زمانہ میں عرب شعراء جب قصیدے لکھتے تھے تو کعبہ پر لگا دیتے تھے کہ کوئی ہمارا مقابلہ کرنے والا ہو تو جواب لکھ کر کعبہ پر لٹکائے؟ اس کو کہتے تھے ''سَبْعَةٌ مُعَلَّقَةٌ'' اب بھی یہ کتابیں ملتی ہیں...... اب بھی عرب کا ایک ملک ہے، وہاں کسی نے شادی کرنی ہو تو وہ اشتہار دیتا ہے کہ جس لڑکی کو معلقات یاد ہوں وہ اپنا نام ظاہر کرے، میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے قرآن حفظ کیا جاتا ہے، وہاں لڑکیاں ''سَبْعَةٌ مُعَلَّقَةٌ'' کو حفظ کرتی ہیں اور پھر وہ گھر میں جھنڈا باندھ دیتی ہیں کہ اس گھر میں وہ لڑکی موجود ہے تو ایسے کئی گھروں میں جھنڈے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہاں جا کر رشتہ مانگتے ہیں۔ حالانکہ ''سَبْعَةٌ مُعَلَّقَةٌ'' کیا ہے؟ شاعروں کا کلام ہے، غلط قسم کی اس کے اندر کئی باتیں ہیں، تمام باتیں عشق اور شاعری کی ہیں، کیونکہ ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ﴾ [الشعراء: ۲۲۴]۔ ہاں! ایک یہ ہے کہ طالب علم ادب پڑھنے کے لیے اس کو پڑھے، لیکن اس کے اندر تو کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس کو پڑھا جائے کہ جو لڑکی اس کو یاد کرے اس پر فخر کرے۔ فخر تو وہ کرے جس کو قرآن حفظ ہو......

بہر حال ایک آدمی کو سوجھی تو اس نے قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۞ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۞ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۞﴾ [سورۃ الکوثر] لکھ کر کعبہ پر لٹکا دی۔ اب جو شاعر آئے اور غور کرے تو کہے کہ اس کا کیا مقابلہ کریں؟ جتنے شعراء تھے عاجز آ گئے۔ آخر ایک شاعر تھا، عقل والا تھا، اس نے لکھ دیا: ''وَاللّٰهِ! لَيْسَ هٰذَا مِنْ كَلَامِ الْبَشَرِ'' (اللہ کی قسم! یہ بندے کا کلام ہی نہیں ہے) تو ہم مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں......؟

قرآن کی سچائی کا ایک واقعہ:

اندازہ کریں کہ چودھویں صدی کی بات ہے یورپ میں عیسائیوں کا...... جو سب سے بڑا پادری ہے...... اس کے ساتھ احمد دیدات کا مناظرہ ہوا۔ تو ہمارے مناظر نے کہا: ''پہلے بات سنو! باقی جھگڑے بعد میں کریں گے کہ میں تمہیں بائبل کا ایک صفحہ بتاتا ہوں کہ فلاں صفحہ تم اس مجمع کے سامنے پڑھ دو، کہیں عبارت میں ادھر ادھر ہیر پھیر نہ کرنا، پوری عبارت پڑھ دو تو میں تمہیں کہوں گا کہ تم جیت گئے۔'' اب جناب اس نے کہا: ''کیوں یہ ضروری ہے کہ میں پڑھوں؟'' اس نے کہا: ''ہاں بھائی! اللہ کا کلام جو ہے، اس کو پڑھو۔ مجھے تم کہہ دو میں قرآن پڑھتا ہوں۔ جب تمہارے پاس اللہ کی کتاب ہے تو تم پڑھتے ہوئے کیوں شرماتے ہو؟ تم ڈرتے ہو یا تمہیں شرم آتی ہے؟'' آخر اس

سے کہا مجھے پتہ ہے کہ تم زہر کا پیالہ پی لو گے، لیکن تم اس کو نہیں پڑھ سکو گے، کیونکہ تمہیں پتہ ہے کہ اس کے اندر اتنی گندی باتیں بھری ہوئی ہیں تو یہ خدا کا کلام کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اس کی جرات نہ ہوئی کہ اس بائبل کا ایک ورق بھی پڑھ سکتا۔ لیکن قرآن چودہ سو سال ہو گئے ہیں، جہاں مرضی آئے آج بھی چیلنج کر کے اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ یعنی قرآن کو ہر طرح سے آزمایا گیا ہے۔

ایک گانے والے کا اسلام لانا:

قریب ہی زمانہ میں ایک بہت بڑا مغنی اور موسیقار ہے، اس نے اسلام قبول کیا ہے۔ اس نے اسلام کیوں قبول کیا؟ اس نے کہا کہ میرے اللہ نے اتنا علم دیا ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنے منہ سے آواز نکالے تو میں اس کی ایک سر بنا لیتا ہوں، تو میں نے قرآن پر ریسرچ کی اور سارے قرآن پر ریسرچ کرنے کے بعد میرے سامنے ایک جگہ ایسی آئی کہ مجھے علم موسیقی کے اعتبار سے شبہ پڑا۔

جیسے رکانہ پہلوان نے حضور ﷺ سے ملاقات کی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اسلام لے آؤ'' تو اس نے کہا: ''حضور! میں پہلوان آدمی ہوں، مجھے پتہ نہیں ہے کہ آپ سچے ہیں۔ میرے پاس تو ایک آزمائش ہے کہ میرے پاس طاقت ہے، آپ میرے ساتھ کشتی کریں۔ اگر آپ مجھے گرا دیں تو میں سمجھ جاؤں گا کہ آپ نبی ہیں۔ مجھے طاقت کے بغیر کوئی گرا نہیں سکتا۔ میں تو کشتی کے ذریعہ امتحان لوں گا، کیونکہ میرے پاس طاقت ہے۔ اگر آپ مجھے گرا دیں تو میں سمجھ جاؤں گا کہ یہ کوئی اور طاقت ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''ٹھیک ہے! میں کشتی لڑتا ہوں۔'' حضور ﷺ نے رکانہ سے باقاعدہ کشتی لڑی اور جب رکانہ گر گیا تو اس نے کہا: ''حضور! ایک دفعہ اور، پتہ نہیں میں کیسے گر گیا؟'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم پھر لڑ لو۔'' اب نبی کا مقابلہ کون کرے؟ تو حضور ﷺ نے پھر پکڑا اور گرا دیا تو اس نے کہا: ''ایک دفعہ پھر لڑتے ہیں۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''ٹھیک ہے، اٹھو!'' تو ایک دفعہ اور گرا دیا تو اس نے کہا: ''میں کلمہ پڑھتا ہوں۔ آپ واقعی اللہ کے نبی ہیں۔'' میں نے اپنی طرز پر امتحان لینا ہے۔

پہلوان اپنی نظر سے سوچے گا، موسیقی والا اپنی نظر سے سوچے گا اور علمِ ہندسہ والا اپنی نظر سے سوچے گا۔

[الخصائص الکبری ۱/۲۱۲، باب: الآیۃ فی مصارعتہ صلی اللہ علیہ وسلم رکانۃ]

شہد کی مکھی کا کمال:

یعنی دنیا کے آج جتنی آرکیٹیکٹ ہیں ان کو بلائیں اور ان کے سامنے رکھیں کہ اللہ نے جو قرآن میں نحل شہد کا نقشہ

کھینچا ہے ﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ﴾ [النحل:٦٨] اللہ نے فرمایا کہ ہم نے سمجھایا ہے شہد کی مکھی کو کہ پہاڑوں میں اور درختوں پر اپنا چھتہ کیسے بناتا ہے؟ اور شہد کی مکھی جو اپنا چھتہ بناتی ہے ہر خانہ مسدس ہے اور ایک خانہ کا دوسرے سے فرق ہو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟ تمام دنیا کے انجینئر لے کر آئیں، اس کے مقابلہ میں آ کر بنا دیں جو ایک مکھی نے بنایا، کیوں نہیں بنا سکتے؟ کیونکہ اس کو سکھلانے والے نے جو سکھلایا ہے۔ اس کے اندر مکھی کا کمال تو نہیں ہے، اصل کمال تو اس ذات کا ہے جس نے اس کو سکھلایا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ ریاضی دان ہوتے ہیں، انہوں نے قرآن کو حساب سے سمجھا۔ انہوں نے کہا کہ ضرب، جمع اور تقسیم، تو اس چکر میں انہوں نے کہا کہ قرآن تو کہتا ہے ﴿وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا﴾ [الکہف:٢٥] قرآن میں ہے کہ اصحابِ کہف غار میں تین سو سال اور زیادہ نو سال رہے، تو یہ کیا مطلب ہوا؟ اور صرف یہ بھی نہیں کہا: ''ثَلٰثَ مِائَةٍ وَّتِسْعًا'' بلکہ فرمایا: ﴿ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا﴾ تو انہوں نے حساب لگایا کہ قمری سال کے دن کتنے بنتے ہیں اور شمسی سال کے دن کتنے بنتے ہیں؟ قمری حساب میں ہر سو سال پر تین سال بڑھ جاتے ہیں، اس لئے تین سو سال شمسی پر قمری حساب سے نو سال مزید ہو گئے۔ اب انہوں نے حساب سے پرکھا۔

اور اسی طرح قرآن میں ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ:٢٦١] سات کو سو سے ضرب دو تو سات سو ہو جائے گا۔ اس میں تو ضرب کا قاعدہ بھی موجود ہے، کیونکہ جو حساب دان اور ریاضیات کے ماہر تھے انہوں نے قرآن مقدس کو حساب کی نظروں میں جانچا۔

علمِ موسیقی والے نے علمِ موسیقی کے ذریعہ قرآن کو جانچا۔ اور کہتا ہے کہ ایک آیت پر آ کر میں پھنس گیا، وہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تو میں ایک عالم کی خدمت میں گیا اور ان سے عرض کی کہ ایک آیت مجھے سمجھ نہیں آ رہی...... وہ آواز اور لحن جو اس کا فن ہے وہ نہیں بن رہا...... انہوں نے پوچھا: کون سی آیت ہے؟ کہا: ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ [الغاشیۃ:٢٢] یہ بات نہیں بن رہی۔ تو انہوں نے کہا: ''آپ مجھے بتاؤ کہ ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ تم اس کو سین کے ساتھ پڑھتے ہو یا صاد کے ساتھ پڑھتے ہو؟ اس نے کہا: ''جی! میں تو صاد کے ساتھ پڑھ رہا ہوں۔'' فرمایا: ''یہی تو غلطی ہے، اس کو سین کے ساتھ پڑھو۔'' وہ کہتا ہے کہ جب میں نے اس کو

سین کے ساتھ پڑھا تو جو میری آواز تھی فوراً بن گئی۔ تو میں نے کہا کہ اب مجھے کلمہ بھی پڑھا دو۔ مجھے سمجھ آ گیا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے...... یہ اللہ کا کلام ہے۔

واقعہ معراج سے قرآن کی تصدیق:

یعنی قرآن مقدس کو جس طرح بھی دشمنوں نے آزمایا ہے اور جس طرح بھی انہوں نے امتحان لیا ہے، مثلاً: اللہ کے قرآن نے خبر دے دی کہ میرے نبی کو معراج ہوا ہے۔ اب جب خبر آ گئی تو کافروں نے یوں آزمایا کہ سب اکٹھے ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں آ گئے اور کہنے لگے کہ آپ معراج پر تشریف لے گے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! تو انہوں نے پوچھا کہ کہاں تشریف لے گئے؟ تو آپ نے فرمایا: مسجد حرام سے مسجد اقصی تک گیا۔ تو انہوں نے کہا: آپ ایسا کریں! یہ بتلائیں کہ ہمارا ایک قافلہ شام کی طرف گیا تھا تو کیا وہ قافلہ بھی آپ کو راستہ میں ملا تھا؟ جب شام گئے تھے تو کیا اس قافلہ کو دیکھا تھا؟ تو اس طرح وہ امتحان لینے کے لیے آ گئے کہ جب آپ خبر دے رہے ہیں کہ اللہ نے آپ کو اسراء اور معراج کرایا ہے تو قافلہ والے ملے تھے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ”قافلہ ہمیں ملا تھا، بلکہ جب وہ قافلہ آ جائے تو تم ان سے پوچھنا کہ میری سواری جب گزری تو ان کی ایک اونٹنی ڈر گئی اور وہ دوڑی تو اس کا سوار گر گیا اور اس کا بازو ٹوٹ گیا تو وہ تمہارے سامنے ٹوٹے ہوئے بازو والا آ جائے گا۔“ انہوں نے کہا: ”عجیب بات ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ فرمایا: ”جب آ جائیں تو پوچھ لینا۔“ پھر ان بدبختوں نے پوچھا کہ وہ ہمارا قافلہ کب پہنچے گا؟...... او بدبختو! قافلہ تمہارا ہے، حضور کو بتانے کا کیا تعلق ہے؟ یعنی کیا حضور ﷺ اس لیے گئے تھے کہ تمہارے قافلہ والوں کے پروگرام گنتے رہیں کہ کب پہنچے گا؟...... لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ فلاں دن جب سورج نکلے گا تو قافلہ مکہ میں پہنچے گا۔ اب جناب اسی دن وہ سارے پہاڑ پر بیٹھے ہوئے ہیں کہ سورج نکلے تو دیکھیں۔ اب جوں ہی سورج نکلا تو قافلہ نظر آیا۔ جب قافلہ پہنچا تو ان سے پوچھا کہ تمہارا کوئی آدمی گرا تو نہیں؟ تو اس نے کہا: پتہ نہیں، کوئی اتنی تیز رفتار چیز گزری کہ اونٹنی ڈر گئی اور میں گرا اور میرا بازو ٹوٹ گیا۔ تو ان دشمنوں نے قرآن کو یوں آزمایا۔

[تفسیر الالوسی: ۸/۷، الاسراء: الآیۃ: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا]

”لَا رَیْبَ“ پر وقف بھی کر سکتے ہیں:

ایک قراءت یوں ہے: ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ﴾ یعنی اس کتاب کے اندر کوئی شک نہیں ہے۔

اور بعض قراء نے ﴿الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ﴾ کہ ﴿لَا رَيْبَ ۛ﴾ پر وقف کر دیا ہے کہ اللہ کا قرآن ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ اور قرآن میں کیا ہے؟ ﴿فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴾ اس میں ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لیے، لیکن ﴿لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ یوں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے۔

جب ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ پر وقف کریں گے تو ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴾ قرآن کی صفت بنے گی۔ اور اگر ریب پر وقف کریں تو معنی ہوگا کہ اس میں ہدایت ہے لیکن اس کو سراپا ہدایت کہنا زیادہ ابلغ، واضح اور زیادہ اولیٰ ہے۔

''هُدًى'' یا تو مرفوع ہے صفت کے اعتبار سے یا اس پر نصب پڑھی گئی ہے باعتبار حال کے کہ اللہ نے فرمایا کہ قرآن ہدایت ہے، لیکن ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں، جو تقویٰ اختیار کرنے والے ہیں۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝﴾ [فصلت: ۴۴]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۹، البقرۃ: تحت الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

ہدایت متقین کے ساتھ خاص ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن ہدایت ہے متقین کے لیے، قرآن ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لیے۔ تو متقین کے ساتھ ہدایت کو خاص کیوں کیا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن تو سراپا ہدایت ہے، لیکن اس ہدایت سے نفع وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ حضور ﷺ سے سوال کیا، پوچھا:

((يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِبْنُ جَدْعَانَ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ يَصِلُ الرَّحِمَ وَ يُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ))

انہوں نے عرض کیا: حضور! ابن جدعان ہمارے قبائل میں گزرا ہے، یعنی قریش میں وہ بڑا اچھا آدمی تھا، صلہ رحمی کرتا تھا، غریبوں کو کھانے کھلاتا تھا اور یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں کی خبر گیری کرتا تھا، ''فَهَلْ ذَاكَ نَافِعُهٗ؟'' کیا یہ چیز اس کو قیامت میں فائدہ پہنچائے گی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ''نہیں!'' تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: کیوں فائدہ نہیں دے گی؟ فرمایا: ''وہ کبھی ایمان لایا ہی نہیں اور اس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یا اللہ! میری مغفرت فرما دے اور قیامت والے دن سے نجات عطا فرما۔'' اس کا تو قیامت پر ایمان ہی نہیں۔ جو ایمان ہی نہ لایا، جس نے آخرت

کی بھلائی مانگی ہی نہ ہو اور آخرت پر یقین ہی نہ ہو تو اس کو آخرت کی بھلائی کیوں ملے گی؟

[صحیح مسلم، حدیث:۳۶۵، بابُ الدَّلِیلِ عَلٰی أَنَّ مَنْ مَاتَ عَلَى الْکُفْرِ...]

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! ہدایت اس کو کیوں ملے جو ہدایت لینا ہی نہ چاہے۔ مثلاً: ایک آدمی بیمار ہے اور مریض ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جا کر دوائی لیتا ہے۔ ڈاکٹر بہت سمجھ دار ہے۔ نسخہ بھی اس نے بہت اچھا لکھا ہے، لیکن مریض دوا استعمال ہی نہیں کرتا۔ تو اب نہ دوا کا قصور ہے اور نہ ڈاکٹر کے نسخہ کا قصور ہے۔ قصور اس کا ہے جو اس کے حکم پر چل کر اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہا۔ اس لیے خداوند قدوس نے قرآن مقدس میں متعدد دفعہ یہ بات فرمائی ہے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ [الاسراء:۸۲]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ہی قرآن اترا انہوں نے انکار کیا، پھر قرآن اترا پھر انکار کیا تو ان کا نقصان بڑھ گیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس سے مومنوں کو فائدہ ہوگا، کیونکہ اصل میں تو قرآن فی نفسہٖ سراپا ہدایت ہے، لیکن "لَا يَنَالُهٗ إِلَّا الْأَبْرَارُ"۔ (ہدایت کو نہیں پہنچتے مگر جو پاک لوگ ہیں) جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ﴾ یہاں تمام لوگوں کو خطاب ہے ﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ [یونس:۵۷] تو قرآن ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی ہے، لیکن مومنین کے لیے، جو علاج کرانا چاہیں۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۳۹، البقرۃ:الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

ہدایت کا معنی نور بھی ہے:

حضرت ابن عباس، حضرت مرۃ الہمدانی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور اسی طرح حضور ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کا معنی ہے "نُوْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ" کہ قرآن متقین کے لیے روشنی ہے، اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے، اللہ سے تقویٰ کرنے والوں کے لیے۔ تو قرآن متقین کے لیے نور ہے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۳۹، البقرۃ:الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

قرآن اور نبی ﷺ کے نور ہونے کا مطلب:

اللہ ہدایت فرمائے کہ بعض لوگ غلط فہمیوں میں پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کے بارے میں آ گیا کہ قرآن نور ہے، اسی طرح حضور ﷺ کے بارے میں آیا کہ نور ہیں۔ وہ اس جھگڑے میں پڑ گئے کہ انبیاء علیہم السلام نور ہیں، بشر نہیں ہیں۔ قرآن نے بھی کہا ہے کہ نور۔ اصل مراد یہ ہوتی ہے، اللہ کے بندو! سمجھا کرو! اللہ نے قرآن کو بھی نور فرمایا ہے،

اللہ نے پاک پیغمبر ﷺ کو بھی نور فرمایا ہے۔ نور کا معنی کیا ہوتا ہے؟ نورِ ہدایت، نورِ نبوت اور نورِ ایمان۔ تو نور اس لیے کہا جاتا ہے کہ آدمی اندھیرے میں بھٹکتا ہے، اندھیرے میں چلے جاؤ تو کبھی پاؤں ادھر پڑے گا اور کبھی اُدھر پڑے گا اور کبھی غار میں پڑے گا، کبھی کانٹوں پر پڑے گا۔ اور اگر روشنی ہوگی تو دیکھ کر چل رہا ہے۔ تو قرآن نور ہے، وہ کھول دیتا ہے کہ یہ توحید ہے اور یہ شرک ہے، یہ سنت ہے اور یہ بدعت ہے، یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے اور یہ کام کرنے والے ہیں اور یہ کام نہ کرنے والے ہیں۔ اس لیے اس کو نور کہا گیا کہ جیسے روشنی میں چلنے والا آدمی ٹھوکروں سے بچ جاتا ہے، اسی طرح قرآن و سنت پر عمل کرنے والا آدمی بدعت سے بچ جاتا ہے۔ اور جس نے میرے مدنی پاک ﷺ کا دامن پکڑ لیا، حضور ﷺ کی سنت پر چل پڑا تو گویا وہ بھی ایک نور میں آ گیا، ایک روشنی میں آ گیا۔ اس لیے اللہ نے مؤمن کو بھی فرمایا کہ ایمان ایک نور ہے:

﴿اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾

''اللہ مومنوں کے دوست ہیں۔ وہ ان کو اندھیروں سے نکالتے ہیں نور کی طرف۔''

کفر اندھیرا ہے اور ایمان نور ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۵۷]

''اور جو کافر ہیں وہ شیاطین کے دوست ہیں (اور شیاطین کیا کرتے ہیں) کہ لوگوں کو نور (ایمان) سے نکال کر اندھیروں میں ڈالتے ہیں۔ یہ سب جہنم والے ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ قرآن بھی نور ہے، ایمان بھی نور ہے اور انبیاء ﷩ کو بھی اللہ نے فرمایا کہ نور ہیں۔ اسی طرح اللہ نے نورِ بصارت بھی دیا ہے، اسی طرح نورِ بصیرت بھی دیا ہے۔ تو اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ جنس بھی نور ہو جائے اور جنسِ بشریت کا انکار کر دیا جائے۔

حضرت سفیان ثوری ﷫ نے حضرت حسن بصری ﷫ سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ متقی اس کو کہتے ہیں:

''اِتَّقَوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ'' جو اللہ نے ان پر حرام کیا وہ اس سے بچ گئے۔

''وَأَدَّوْا مَا فَرَضَ عَلَيْهِمْ'' اور ان چیزوں کو ادا کیا جو اللہ نے ان کے اوپر فرض کر دیا ہے۔

یہ تقویٰ کا دوسرا درجہ ہے۔ تقویٰ کا پہلا درجہ تھا کہ کفر اور شرک سے بچ جانا اور دوسرا درجہ ہے کہ کبائر سے بچ جانا

اور صغائر پر اصرار نہ کرنا۔

حضرت ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھ سے امام اعمش رحمہ اللہ نے پوچھا کہ متقین کا کیا معنی ہے؟ میں نے ان کو بتلایا اور کہا کہ تم کلبی رحمہ اللہ سے جا کر پوچھو کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ جب میں ان کی خدمت میں آیا تو انہوں نے فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ [النجم:٣٢]

متقی ان کو کہتے ہیں جو کبیرہ گناہوں سے بچنے والا ہو۔ جب انسان کبائر سے بچنا شروع کر دے تو اللہ اس کو چھوٹے گناہوں سے بھی بچا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پھر میں امام اعمش رحمہ اللہ کے پاس آیا۔ میں نے کہا: حضرت کلبی رحمہ اللہ نے یہ فرمایا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ یہی بات ٹھیک ہے۔

[تفسیر ابن کثیر:١/٣٩، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

متقین کی صفات:

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا:

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾

اب متقین کی کیا تعریف ہے؟ تو حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: قرآن نے خود تعریف بیان کر دی:

﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ [البقرۃ:٣]

جن کے اندر یہ صفات ہوتی ہیں وہ متقی ہیں:

1. ......غیب پر ایمان لانے والے،
2. ......نمازوں کو قائم کرنے والے،
3. ......اور جو اللہ نے انہیں رزق دیا ہے اسے اللہ کے راستہ پر خرچ کرنے والے۔

یہی تو متقین کی صفت ہے۔ قرآن نے خود بیان کر دی۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لفظِ ''متقین'' ان تمام اقوال کو شامل ہے، یعنی شرک سے بچنے والے، گناہوں سے ڈرنے والے، کبائر سے بچنے والے، حرام سے بچنے والے، اللہ کے عذاب سے ڈرنے والے، رب سے امید رکھنے والے، غیب پر ایمان لانے والے، نمازیں قائم کرنے والے اور اللہ نے جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ

کرنے والے۔ یہی ساری صفتیں متقین کی ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

مباح کاموں سے بچنا:

امام ترمذی نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ أَنْ يَكُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتّٰى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهٖ...))

''بندہ متقین کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ مباح کاموں کو نہ چھوڑ دے۔''

یعنی ایک مباح کام ہے کہ اگر کر لیں تو کوئی حرج نہیں ہے، تو وہ اس سے بھی بچ رہا ہے کہ میں ایسے کام سے بھی بچوں کہ اس کے کرنے میں کچھ حرج ہو، یعنی جو ایک بالکل مشتبہ چیز سے بھی بچ رہا ہے۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۵۱]

اور اس لیے تقویٰ کا آخری درجہ یہ ہے کہ دل اللہ کے سوا سب سے غافل ہو جائے، کوئی ذرا سی چیز میں شبہ آیا ہے اس سے بھی بچ جائے، یہ تقویٰ کا آخری درجہ ہے کہ کفر و شرک سے بھی بچ گیا، کبائر سے بھی بچ گیا اور وہ تمام چیزیں جن میں تھوڑا سا بھی خدشہ ہے تو ان سے بچ گیا کہ خطرہ تو ہے کہ ایسا کام کیوں کریں؟ ممکن ہے کہ اس میں خیر نہ ہو اور میں ناجائز کے اندر پڑ جاؤں۔ یہ اعلیٰ درجہ ہے جو انبیاء ﷩ کو نصیب ہوتا ہے، صدیقین، شہداء اور صالحین کو نصیب ہوتا ہے۔

حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تقویٰ کے واقعات:

آپ نے پڑھا نہیں کہ حضور ﷺ تشریف لا رہے ہیں، آپ ﷺ کو بے انتہاء بھوک کی پریشانی ہے۔ راستہ کے اندر ایک کھجور کا دانہ پڑا ہوا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اٹھا بھی لیا اور فرمایا: بڑی شدید حاجت ہے اور مجھے بڑی شدید بھوک لگی ہوئی ہے، لیکن خدا جانے ایہ صدقہ کا ہو، زکوٰۃ کا ہو، لہٰذا میں نہیں کھاتا۔ یہ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ اور اعلیٰ مقام ہوتا ہے۔

اس لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ کا غلام آپ کے لیے شام کو پیالے میں دودھ لاتا تھا، رکھ دیتا تھا اور حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ رات کو تشریف لاتے تو اس کو نوش فرماتے تھے۔ ایک دن آپ تشریف لائے تو دودھ موجود تھا، اس کو نوش فرمایا، لیکن دودھ زیادہ تھا۔ غلام سے پوچھا کہ آج میرا دودھ زیادہ ہے؟ انہوں نے کہا: ''حضرت! اصل وجہ یہ ہے کہ آج میں خرید کر نہیں لایا، پرانے دور میں...... جب میں کافر تھا تو...... اس

وقت قبیلہ کے کچھ لوگ تھے، ان کو کسی بچھو نے کاٹ لیا تھا۔ میں زمانہ جاہلیت میں کوئی منتر پڑھتا تھا۔ میں نے اس کا علاج کیا تھا اور منتر پڑھا تھا تو وہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اور وہ آج اتفاق سے مجھے مل گئے تو ان کے پاس بکریوں کا ریوڑ تھا، انہوں نے مجھے دودھ پلایا اور دیا کہ لے جاؤ اپنے سردار کو بھی پلا دینا۔ تو وہ دودھ میں لے آیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حلق کے اندر انگلیاں ماریں اور قے کی کوشش کی۔ روایت میں آتا ہے کہ ان کے غلام کہتے ہیں کہ مجھے ڈر ہو گیا کہ اسی کے اندر حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فوت نہ ہو جائیں۔ اتنی تکلیف کے ساتھ آپ نے اپنے معدہ کو خالی کیا۔ اور کہا کہ اے میرے اللہ! میرے بس میں صرف اتنا تھا، اس کے علاوہ میری رگوں میں اس کا اثر ہو تو مجھے خود معاف فرما دینا۔ حالانکہ کیا تھا؟ کوئی حرام تو نہیں تھا؟ اگر نوکر لے آیا تھا، اس کو کہیں سے بھی ملے، اس کے لیے ہدیہ تھا۔ اب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو غلام نے دیا ہے، کوئی حرام تو نہیں ہے، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی احتیاط تھی کہ اس نے زمانہ جاہلیت میں جو منتر پڑھے تھے، پتہ نہیں وہ منتر شرکیہ ہوں، وہ کفر والے ہوں، اسلام اور قرآن کے خلاف ہوں تو ان چیزوں پر اس کو معاوضہ ملا۔ یہ معاوضہ حرام ہو تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے پیٹ میں حرام چلا جائے۔ یہ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ ہے۔ [صحيح البخاري، حديث: ۳۸۴۲، باب: أَيَّامِ الْجَاهِلِيَّةِ]

آپ دیکھیں کہ ...... خدا نہ کرے! ...... ایک آدمی چوری کرتا ہے ...... ہمیں تو پتہ نہیں ہے ...... اس نے کہا: ''حضرت! یہ تسبیح میں آپ کے لیے ہدیہ لایا ہوں۔'' مجھے کیا پتہ چوری کرتا ہے یا کیا کرتا ہے؟ اب میرے لیے تو وہ شرعاً حرام نہیں ہے، اس لیے کہ اگر اس نے مجھے کہا کہ یہ آپ کے لیے ہدیہ ہے اور مجھے علم نہیں ہے اور یہ حکم بھی نہیں ہے کہ یہ تحقیق کروں کہ کہاں سے کما کر لایا ہے؟ لیکن جو متقی لوگ ہیں، جیسے دیکھیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو برا اثر محسوس ہوا تو فوراً قے کر دی کہ میرے بدن میں کوئی ایسی چیز نہ جائے جس کے اندر ذرا سا بھی اشتباہ پایا جائے۔ یہ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ ہے۔

ایک عورت کا واقعہ:

ایک عورت سے زنا کا کام ہو گیا، کسی کو علم نہیں ہے، کوئی مدعی نہیں ہے اور کسی نے نہیں دیکھا، لیکن خود آئی کہ یا رسول اللہ! میں نے زنا کیا ہے اور میں حاملہ ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کو لے جاؤ اور اپنے گھر میں رکھو۔ جب یہ بچہ پیدا ہو جائے، فارغ ہو جائے اور نفاس کی مدت گزر جائے تو اس کو لے آنا۔'' جب نفاس کی مدت گزری تو وہ عورت پھر آ گئی کہ یا رسول اللہ! مجھے پاک کر دیں ...... دنیا میں پتھر کھانے منظور ہیں، جہنم کی آگ منظور

نہیں...... صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جب ہم اس عورت کو لے گئے تو اس کو کہا کہ کپڑے اپنے اوپر باندھ لو، کہیں پتھر لگنے سے پردہ نہ کھل جائے۔ تو اس کو پتھر مار مار کر مار دیا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جنازہ پڑھایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعتراض بھی کیا: یارسول اللہ! رجم ہوئی، زنا کیا اور اسی سزا میں ماری گئی، آپ نے جنازہ کیوں پڑھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمر! تمہیں پتہ نہیں ہے کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر مدینہ کے ستر گناہگاروں پر تقسیم کروں تو سب کو جنت میں لے جائے۔'' [صحیح مسلم، حدیث: ۱۶۹۶، باب: مَنِ اعْتَرَفَ عَلَى نَفْسِهِ بِالزِّنٰى]

حرام کے پیسوں سے حج:

حدیث کے اندر ہے کہ اگر تیرا کھانا پینا حرام سے ہے اور تیرا پیسہ حرام سے ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زور زور سے کہے گا: ''یا رب! یارب! یارب!''...... أَنّٰى يُسْتَجَابُ لَهُ؟...... کہاں سے دعا منظور ہو؟ [صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۱۵، باب: قَبُولِ الصَّدَقَةِ مِنَ الْكَسْبِ الطَّيِّبِ]

اس لیے حدیث میں آیا ہے کہ جب حرام پیسے سے حج کریں گے تو کہا جائے گا: ''لَا لَبَّيْكَ وَ لَا سَعْدَيْكَ'' جاؤ! ہمیں تمہارے حج کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم نے حج تمہارے منہ پر مار دیا ہے۔ [مسند البزار، حدیث: ۸۶۳۸]

متقین کو روزِ قیامت خدا تعالیٰ کا دیدار ہوگا:

ابوحمزہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابی وائل رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک آدمی آیا، اس کا نام ابوعفیف تھا، تو اس کو شقیق بن سلمہ نے کہا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی کوئی بات ہمیں سنائیں۔ انہوں نے کہا: ''ہاں! سناتا ہوں۔ میں نے ان سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ قیامت میں ایک بہت بڑے چٹیل میدان میں سب جمع کیے جائیں گے تو پکارنے والا فرشتہ اللہ کے حکم سے پکارے گا: ''أَيْنَ الْمُتَّقُونَ؟'' کہاں وہ لوگ جو متقین ہیں، اللہ سے ڈرنے والے؟ وہ اللہ کے سامنے آئیں گے تو اللہ تعالیٰ بغیر حجاب کے ان کو اپنا دیدار کرائیں گے اور کوئی پردہ بھی حائل نہیں ہوگا۔ [شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة: ۳/۵۵۲، حدیث: ۸۶۴]

دیدارِ خداوندی حق ہے:

ایک دن میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے، چودھویں کا چاند نکلا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم کو اس چودھویں کے چاند کے دیکھنے میں کوئی شک ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ''حضور! چودھویں کے چاند میں کسی کو شک

ہوسکتا ہے؟" پہلی کے چاند میں تو شک ہوسکتا ہے کہ کسی کو نظر آئے اور کسی کو نظر نہ آئے، لیکن جب چودھویں کا چاند کامل مکمل سامنے کھڑا ہو تو سارے دیکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ قیامت والے دن تم اپنے پروردگار کی زیارت کرو گے اور پروردگار کی زیارت میں تمہیں کوئی شک نہیں ہوگا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۳۶، بابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالَى: وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ]

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ بعض شان والے بندوں کو ہر مہینے زیارت نصیب ہوگی، بعض شان والوں کو ہفتے میں زیارت نصیب ہوگی، بعض لوگوں کو روزانہ اللہ کا دیدار نصیب ہوگا اور بعض لوگ ایسے شان والے ہوں گے جن کو اجازت ہوگی کہ جب چاہیں اپنے پروردگار کی زیارت کریں۔

تو فرمایا کہ منادی ندا کرے گا کہ متقین کہاں ہیں؟ جب وہ سامنے آئیں گے تو اللہ ان کو زیارت کرائیں گے اور کوئی پردہ حائل نہیں ہوگا۔ تو میں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ایسے متقی جن کو اللہ کا دیدار ہوگا وہ کون ہیں؟ مُتَّقُوْن کی تعریف کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: "متقی وہ لوگ ہیں جو شرک سے بچ گئے، جو اللہ کے سوا ہر چیز کی عبادت سے بچ گئے، اَصنام کی عبادت سے بچ گئے اور جنہوں نے اپنی عبادت خالص اللہ کے لیے کر لی کہ عبادت اللہ کے سوا کسی کی نہیں کریں گے، یہ لوگ اپنے پروردگار کے دیدار کے بعد جنت میں چلے جائیں گے۔

[شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة: ۳/ ۵۵۲، حدیث: ۸۶۴]

تقویٰ کے بعد نیک بیوی بڑی نعمت ہے:

حدیث مبارک میں آیا ہے: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "سب سے بہتر چیز جس سے بندہ فائدہ اٹھا کر جنت میں جاتا ہے وہ تقویٰ ہے، اس کے بعد نیک بیوی ہے۔ جب خاوند نظر ڈالے تو خوش ہو جائے، جب خاوند حکم کرے تو وہ فرمانبرداری کرے، اگر خاوند کوئی قسم کھا بیٹھے تو بیوی سچا کر دکھلائے (مثلاً: خاوند کہے: خدا کی قسم! میری بیوی نے گناہ نہیں کیا تو بیوی نے بھی سچ کر دکھلایا) اور اگر خاوند غائب ہو جائے تو اپنے نفس کی بھی اور خاوند کے مال کی بھی حفاظت کرنے والی ہو۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۱۸۵۷، بابُ أَفْضَلِ النِّسَاءِ]

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

جو غیب کی تصدیق کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

سورۃ البقرۃ کی اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

❁......''اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ'' جولوگ ایمان لاتے ہیں بن دیکھے،

❁......''وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ'' اور قائم کرتے ہیں نماز کو،

❁......''وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ'' اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے کچھ حصہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں۔

اب متقین کی صفات کا بیان ہے۔ پہلے تو مطلقاً ذکر کیا تھا کہ اللہ سے ڈرنے والے اور اب ان کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔

متقین کی صفات:

﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾[البقرة:٣]

اس آیت مبارکہ کے اندر تین صفات کا ذکر آیا ہے:

1 ......پہلی صفت ہے: ایمان بالغیب۔ جب تک یہ باتیں ذہن نشین نہ ہوں قرآن وسنت کو سمجھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ پہلی صفت ہے: ایمان بالغیب۔

2 ......دوسری صفت ہے: اقامۃ الصلوات۔

3 ......اور تیسری صفت ہے: انفاق کہ اللہ نے جو مال دیا ہے اس سے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا۔

ایمان کی تعریف:

ایمان اور اسلام دو لفظ ہیں۔ ایمان کا معنی لغت کے اعتبار سے تصدیق کرنا، یعنی کسی شخص کی لائی ہوئی بات پر اعتماد کرتے ہوئے تصدیق کرنا۔ یہ لغوی معنی ہے۔ اور شریعت کے اعتبار سے معنی یہ ہے: ''اَلتَّصْدِيْقُ بِجَمِيْعِ مَا جَآءَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ﷺ)'' کہ اللہ کے رسول ﷺ جو لائے ہیں ان پر اعتماد بھروسہ کرتے ہوئے اس پر ایمان لانا، اس کی تصدیق کرنا۔ محسوسات کو محسوس کر کے، جیسے کسی چیز کا رنگ دیکھ کر یا اس کے وجود کو محسوس کر کے ماننے تو یہ ایمان نہیں ہے۔ ایمان یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی کے اعتماد و بھروسہ پر جو وہ کہے اس کو مان لیں، تب ایمان ہے۔ ہمارے حواس میں وہ چیز حاصل نہ ہو۔ اگر حواس سے ہم اس چیز کو معلوم کر رہے ہیں تو اس کو ایمان نہیں کہتے۔

''يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ'' میں اجمال ہے اور آگے ''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ'' کے اندر تفصیل ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ قرآن اپنی تفسیر خود کرتا ہے۔ قرآن میں ایک جگہ اجمال ہوگا اور دوسری جگہ تفصیل ہوگی، ایک جگہ ابہام ہوگا، اس کو دوسری

جگہ اللہ کھول دے گا تو "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ" میں ایمان کی تفصیل آرہی ہے کہ اللہ کے نبی بھی اور مؤمن بھی ایمان لائے، حالانکہ اللہ کو ہم نے نہیں دیکھا اور اللہ کے فرشتوں اور اتاری ہوئی کتابوں اور رسولوں کو ہم نے نہیں دیکھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اگرچہ حضور ﷺ کو دیکھا تھا، لیکن نزولِ وحی کی کیفیات، فرشتے اور جنت وجہنم وغیرہ کو نہیں دیکھا تھا۔

ایمان کا نمونہ:

ملحد اور زندیق اس کو کہتے ہیں کہ لفظ تو قرآن کے مانتا ہے، لفظ تو اسلام کے مانتا ہے، لیکن اس کی تشریح اپنی طرف سے کرتا ہے، اس تشریح کو نہیں مانتا جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بیان فرماتے ہیں۔ اب دیکھیں! ہم نے دن رات میں کتنی نمازیں پڑھنی ہیں؟ پانچ پڑھنی ہیں۔ ان پانچ نمازوں کا پڑھنا، ان پانچ نمازوں کا وقت، ان پانچ نمازوں کا طریقہ، ان پانچ نمازوں کے فرائض، ان کے وجوب، ان کے ارکان، ان کے واجبات اور ان کے مستحبات کس نے سمجھائے ہیں؟ حضور ﷺ نے سمجھائے ہیں۔ اب اگر کوئی آدمی کہے کہ فجر کی نماز پڑھنی ہے، لیکن جب چاہیں گے پڑھ لیں گے۔ یا جیسے بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ پانچ نمازیں دس دن کی اکٹھی پڑھتے ہیں۔ یا نمازیں اکٹھی، لیکن اس طرح نہیں مان رہے جس طرح ہمیں محمد پاک ﷺ نے سمجھایا تو یہ ایمان نہیں ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو نماز پڑھتے ہیں۔ بھائی! تم لاکھ نماز پڑھو، لیکن جب اللہ نے فرمایا کہ نماز کا نمونہ میرا مدنی پاک ہے۔ جب اللہ نے فرمادیا کہ ایمان کا نمونہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں تو اس لیے جب تک ہم ان کے نمونہ پر نہیں اتریں گے تو ایمان والے نہیں۔ لہٰذا ایمان کی موٹی بات یاد رکھیں۔

بعض ایمانیات کا منکر بھی مسلمان نہیں:

حضور ﷺ پر اعتماد، بھروسہ اور یقین کرتے ہوئے جو چیز حضور ﷺ لائے ہیں ان کو ماننے کا نام ایمان ہے۔ اگر دس باتیں مانے اور ایک بات نہ مانے تو تب بھی ایمان نہیں ہوگا، اس لیے کہ اللہ نے خود فرمایا:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ﴾[البقرۃ:۸۵]

اللہ نے فرمایا: یہودیوں کی طرح تم اللہ کی کتاب کی کچھ باتیں تو مانتے ہو اور کچھ باتوں کا انکار کرتے ہو۔ اللہ نے فرمایا: جو ایسا کرتے ہیں:

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ [البقرة:۱۱۴]

بعض کتاب پر ایمان ہو اور بعض پر نہ ہو اور وہ یہ ہے کہ ایک آدمی کہے: میرا اللہ پر ایمان ہے، رسول پر ایمان ہے، قرآن پر ایمان ہے اور شریعتِ رسول پر ایمان ہے، لیکن سود والا مسئلہ سمجھ نہیں آ رہا، اس کے بغیر ہمارا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ تو اب کیا نتیجہ نکلا کہ ساری باتیں مان لیں، لیکن ایک بات نہیں مانی تو کیا ہوگا؟ خود ہی فیصلہ کر لیں۔

بعض کفریہ باتیں:

لوگ کہتے ہیں کہ مولویوں کو کافر بنانے کی عادت ہے۔ لوگ بڑا الزام لگاتے ہیں کہ ان کا کام ہی یہی ہے کہ وہ کافر ہے اور یہ کافر ہے۔ یہ مولوی کافر بناتے نہیں ہیں، بلکہ کافر بتلاتے ہیں۔ بات سمجھا کریں! کافر بنانا علیحدہ بات ہے اور بتلانا علیحدہ بات۔ مولوی کی کہاں طاقت ہے کہ کسی کو کافر بنا دے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ کسی کو مسلمان بنا سکتا ہے اور نہ کسی کو کافر بنا سکتا ہے۔ مولوی کا کام یہ ہے کہ وہ کفر کے بارے میں بتلاتا ہے کہ بھائی! جو ختمِ نبوت کا منکر ہے وہ کافر ہوگا۔ وہ بتلا تا رہا ہے اور وہ جواب جہاں جہاں پایا جائے وہ خود کافر بنتا رہے۔ مولوی نے تو اس کو کافر نہیں بنایا، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مولوی اس کو کافر بنائے۔ مولوی نہ کسی کو کافر بناتا ہے اور نہ بنا سکتا ہے، ویسے لوگ ناراض ہوتے ہیں۔ اب اللہ کا قرآن یہ کہتا ہے کہ ایک حکم کو ماننے اور ایک حکم کو نہ مانے تب بھی کافر ہے، مسلمان نہیں۔ مسلمان کب بنے گا؟ جب ساری شریعت...... جو میرے مدنی سرکار لائے ہیں...... تمام شریعت پر ایمان لے آئے۔ اور ایمان بھی کیسے لے آئے کہ بس ٹھیک ہے! اللہ رسول کا فرمان ٹھیک ہے۔ ویسے حضرت گزارہ نہیں ہو سکتا، ویسے بینکنگ کے بغیر ملک نہیں چل سکتا، لیکن اگر آپ سے مولوی کہتے ہیں کہ اللہ و رسول کہتے ہیں: حرام ہے تو ٹھیک ہے، حرام ہو پھر بھی یہ مومن نہیں ہے، حالانکہ وہ مان تو رہا ہے، لیکن جبر سے اور اکراہ سے، زبردستی اور ڈر سے کہ لوگ مجھے کافر کہنا نہ شروع کر دیں، لہٰذا میں کہہ دوں کہ ٹھیک ہے کہ سود ہے تو حرام، لیکن گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے فرمایا: نہیں تم مومن تب بنو گے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ [النساء:۶۵]

اللہ نے فرمایا: میرے مدنی! مجھے تیرے رب کی قسم! ہرگز لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک تیرے حکم کو نہ مانیں۔ حکم بھی ایسا کہ پھر دل میں تنگی بھی نہ ہو، پھر دل میں انقباض بھی نہ ہو، بس تیرا حکم ہے اور "اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا"

اسی میں بھلائی اور بہتری ہے۔ یہ کتنا بڑا جہل اور دھوکہ ہے کہ میرے پاک نبی ﷺ نے جب اسلام کا اعلان فرمایا، اپنی زندگی میں مدینہ منورہ سے اور اس کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دور، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا دور، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا دور گزرا، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور گزرا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا دور گزرا...... ایمان سے کہیں! اس دور میں کسی جگہ اور کسی ملک اور کسی کونہ میں اسلام تھا، انہوں نے کوئی سود کا کاروبار کیا تھا؟ اس وقت اسلام نے ترقی کی ہے یا تنزلی کی ہے؟ انہوں نے بائیس لاکھ مربع میل پر اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے، وہ ملک کیسے چلتے رہے؟ اُس دور میں آخر تجارت کیسے ہوتی رہی؟ نقل وحمل کیسے ہوتی رہی؟ اس وقت بھی دنیا میں مال آتے تھے، یعنی یمن، شام آتے تھے، تجارت کے معاملات تھے، پھر اسلام پھیلتا چلا گیا، قیصر کو رگڑ ڈالا، ادھر دریائے نیل سے نکلتا ہوا ہسپانیہ تک پہنچا، ادھر چین تک صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے، تو اُس دور میں اسلام بغیر ان محرمات کے چل سکتا ہے؟ جی ہاں! اب بھی چل سکتا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس وقت تو چل سکتا تھا اور اب نہیں چل سکتا؟ اللہ کا نبی جو وضو کرنا سکھلاتا ہے، ناک میں پانی ڈالنا سکھلاتا ہے، جو ہمیں استنجاء کرنا سکھلاتا ہے، جو ہمیں مسواک کرنا سکھلاتا ہے، کیا کوئی ایک ایسی چیز کو ہمیں بغیر سکھلائے ہوئے چلے گئے جس پر پوری دنیا کا دارومدار ہے؟ تو اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ ایمان کا معنی یہ ہے: ''اَلتَّصْدِیْقُ بِمَا جَآءَ بِهِ الرَّسُوْلُ '' کہ میرا مدنی جو چیز لائے وہ سب اللہ کا فرمان ہے، سب کا ماننا ضروری ہے۔

حضور ﷺ وہی حکم دیتے ہیں جو اللہ کا حکم ہوتا ہے:

اس لیے سیدنا امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر کروڑوں سلام اور کروڑوں رحمتیں ہوں، کتنا بڑا عبقری اور ذہین انسان تھا! کتنا دور اندیش تھا کہ حضور ﷺ کے منبر پر کھڑے ہوئے فرمایا: ''یَاۤاَیُّهَا النَّاسُ!'' اے لوگو! خبردار ایک وقت آئے گا لوگ کہیں گے کہ آیت الرجم تم قرآن میں نہیں پاتے ہیں۔ خبردار! ''رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَرَجَمَ اَبُوْبَكْرٍ وَرَجَمْنَا'' میرے مدنی ﷺ نے خود رجم کی، ابوبکر نے خود رجم کی اور ہم بھی رجم کرتے ہیں۔ اور اللہ کے نبی اللہ کے حکم کے بغیر کوئی بات کہہ ہی نہیں سکتے۔ خیال کرنا! ایسے ملحد اور زندیق نہ پیدا ہو جائیں جو فرق کر دیں کہ ہم اللہ کا حکم مانتے ہیں اور رسول اللہ کا حکم نہیں مانتے۔ اگر مجھے ڈر نہ ہوتا کہ بعض باطل فرقے اور بعض گمراہ فرقے عمر پر الزام لگا دیں گے کہ اس نے قرآن میں زیادتی کی ہے، مجھے خدا کی قسم ہے! تو میں قرآن کے حاشیہ پر وہ حکم لکھ دیتا جو اللہ نے اپنے نبی کو دیا تھا:

((اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوهُمَا اَلْبَتَّةَ نَكَالًا مِنَ اللّٰهِ))

[صحیح البخاری، حدیث:۶۸۲۹، سنن ابن ماجہ، حدیث:۲۵۵۳، باب: الرجم]

(یہ آیت منسوخ التلاوۃ اور باقی الحکم ہے) کہ اگر کوئی شادی شدہ مرد یا عورت زنا کریں تو رجم کیا جائے۔ یہ حکم میں قرآن پر لکھ دیتا، لیکن بعض گمراہ فرقے آئیں گے، وہ کہیں گے کہ عمر نے اللہ کے قرآن میں اضافہ کیا ہے، اس لیے میں نہیں لکھتا، لیکن خبردار رہنا! یاد رکھنا! ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ [النجم: ۴،۳] کہ میرا مدنی تو وحی کے سوا بولتا نہیں ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ [الحشر: ۷] جس کام کا میرا رسول حکم دے اس کو پکڑ لو اور جس کام سے روکے اس سے رک جاؤ۔ جب حضور ﷺ نے رجم کا حکم دیا ہے تو انکار کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اگر اللہ نے میرے مدنی کو رجم کا حکم نہیں دیا تھا اور حضور ﷺ نے رجم کا حکم دے دیا پھر تو حضور ﷺ ان کے قتل کے مرتکب ہوں گے۔

ابوجہل کا دل سے حضور ﷺ کو ماننا اور زبان سے انکار کرنا:

ابوجہل کعبۃ اللہ کا طواف کر رہا تھا۔ اس کا ایک دوست آیا ہوا تھا، وہ اس کو طواف کرا رہا تھا...... کعبہ شریف کا طواف ابوجہل بھی کرتا تھا، طواف کر لینے سے کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم طواف کرتے ہیں، ہم نمازیں پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، تہجد پڑھتے ہیں اور ایک ٹانگ پر کھڑے ہوئے ساری رات وظیفہ پڑھتے ہیں، ہم کیسے مشرک ہیں؟ ابوجہل بڑے طواف کرتا تھا...... وہ طواف کر رہا تھا تو اس کا ایک دوست بھی ساتھ تھا۔ تو اس نے پوچھا کہ ابوجہل! دیکھو! میری اور تمہاری دوستی ہے، آج تم مجھے ایک سیدھی بات بتاؤ۔ اس نے کہا: ''کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''میں نے سنا ہے کہ مکہ میں ایک نبی پیدا ہوئے ہیں، جن کا نام محمد رسول اللہ (ﷺ) ہے، تم اس کو جانتے ہو؟'' اس نے کہا: بالکل۔ اس نے کہا: ''کمال کرتے ہو! محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں، ہمارے رشتہ دار ہیں، بالکل جانتے ہیں، بنو ہاشم کے خاندان سے ہیں، اعلیٰ خاندان سے ہیں۔'' اچھا یہ بتاؤ کہ وہ جو کہہ رہا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اللہ کا نبی ہوں، میرے اوپر اللہ کا قرآن اترا ہے، وحی اتری ہے، اس بات میں وہ سچا ہے یا جھوٹا ہے؟ ابوجہل نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور اس نے کہا کہ تم دوست ہو، تمہارے ساتھ جھوٹ نہیں بولتا...... یعنی کعبہ کا طواف کرتے ہوئے جھوٹ بولتے ہوئے ابوجہل کو بھی شرم آئی تھی، آج مسلمان کو شرم آتی ہے؟ مسلمان کعبہ کا طواف کرتے ہوئے حاجی کی جیب کاٹ لیتا ہے۔ عمرہ والے رو رہے ہوتے ہیں کہ کسی کا

پاسپورٹ غائب، کسی کا ٹکٹ غائب اور کسی کے پیسے غائب۔ کیا یہاں یہودی جیب کاٹنے کے لیے آتا ہے؟ یا نصرانی آتا ہے؟ یا ہندو لعنتی آتا ہے؟...... تو اس نے کہا: ''وہ جو کہتا ہے سچ کہتا ہے، جو اپنی رسالت نبوت کا کہہ رہے ہیں۔'' اس نے کہا: ''تم عجیب بات کر رہے ہو'' ''لَبِثْتُ فِيْنَا سِنِيْنَ'' ۔ کہنے لگا ہمارے اندر حضور کے چالیس سال گزرے ہیں، اس ذات نے کبھی کسی بندے پر جھوٹ نہیں بولا تو رب پر کیسے جھوٹ بولے گا کہ میرے خدا نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے......!؟ اتنا بڑا جھوٹ تو ناممکن ہے۔ تو اس دوست نے کہا: ''پھر تم مان کیوں نہیں لیتے؟ یعنی جب بات سچی ہے۔'' تو اس نے کہا: ''برادری کا جھگڑا ہے۔''

ماننے کا نام ایمان ہو گیا، اسلام کا معنی ہے اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کرنا، استسلام یعنی اپنے آپ کو اسلام کے سپرد کر دینا۔

ایمان اور اسلام میں فرق:

اس لیے قرآن نے ایک مقام میں ایمان اور اسلام کا فرق کیا ہے کہ ایمان کا معنی ہے ماننا اور اسلام کا معنی ہے اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کرنا اور اقرار کرنا۔ اس لیے اس لغوی معنی کے اعتبار سے قرآن نے ایک جگہ فرق کیا ہے اللہ نے فرمایا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾

[الحجرات: ۱۴]

میرے مدنی! یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ان سے کہو: تم ایمان تو نہیں لائے، بلکہ یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں، اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ﴾ [النساء: ۱۴۵]

فرمایا: منافقین جہنم کے سب سے نیچے والے طبقہ میں ہوں گے، کیونکہ زبان سے اقرار کرتے ہیں، لیکن اندر سے نہیں۔

اب ایک آدمی کے دل کے اندر تو ہے، لیکن زبان سے اقرار نہیں ہے تو بھی ایمان نہ بنا۔

﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ﴾ [البقرة: ۱۴۶]

﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ﴾ [النمل: ۱۴]

یہودی جانتے تھے کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) سچے نبی ہیں، لیکن زبان سے اقرار نہیں کرتے تھے، اس لیے آپ زیادہ جھگڑوں میں نہ پڑیں۔

سلف صالحین کی جو تعریف ہے وہی جامع ہے۔ بات سمجھ لو کہ ایک گونگا ہے، زبان سے اقرار نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ تو مجبور ہے، اس لیے ایمان کی جامع تعریف یہ ہے:

"اَلْإِيْمَانُ تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ وَإِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِالْأَرْكَانِ."

"دل میں بھی تصدیق ہو اور زبان سے بھی اقرار ہو اور پھر سارا بدن اس اقرار کی گواہی دے۔"

ایمان اعمالِ صالحہ کا حصہ ہے یا نہیں؟

باقی جو علماء کے اندر اختلاف ہے کہ جزء مانتے ہیں یا نہیں مانتے؟ وہ علمی مسئلے ہیں۔ حالانکہ بات سب کی ایک ہے، صوری نزاع ہے، حقیقی نزاع ہے ہی نہیں۔ اصل نزاع تو فرقِ باطلہ سے ہے، جو معتزلہ، کرامیہ، قدریہ اور جبریہ ہیں۔ اور پھر فرقِ ضالہ سے نزاع ہے جو خوارج ہیں، روافض ہیں، جو راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ حالانکہ سب کے نزدیک ایمان کی جامع تعریف کیا ہوئی؟ تصدیق بالقلب۔ تصدیق کا محل دل ہے۔ جیسے نیت کا مقام دل ہے، اسی طرح تصدیق کا مقام دل ہے۔ اصل ایمان کی جڑ اور بنیاد وہ تصدیق ہے جو دل میں ہے۔ اور اقرار باللسان زبان سے اقرار ہے: "شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ"۔ اچھا! اب تصدیق بھی ہو، اقرار باللسان بھی ہو اور ہاتھ پاؤں سارا بدن گواہی بھی دے۔ یہ ایمان ہے۔ آپ دیکھیں کہ آپ کو بخار ہے تو ڈاکٹر کہے گا: یہ بخار ایسے نہیں ہے، کوئی اندر انفیکشن ہے۔ وہ کہے گا: اس کا گلا چیک کرو، جی اس کا گلا ٹھیک ہے۔ ناک چیک کرو، ناک ٹھیک۔ پیٹ چیک کرو، اس نے کہا: ہاں! پیٹ کے اندر ذرا گڑبڑ ہے۔ تو اس نے کہا کہ آنتوں کے اندر انفیکشن ہے، اس کی وجہ سے بخار ہوا ہے۔ تو یہ بتلانے کا ذریعہ ہے کہ اس کے اندر کوئی گڑبڑ ہے۔ بخار کا اثر بدن پر آجائے اور ایمان کا اثر بدن پر نہ ہو تو یہ عجیب ایمان ہوا!! لیکن ہیں ہم مسلمان، اگرچہ نہ ہماری شکل سے ایمان نظر آئے، نہ ہماری عقل سے ایمان نظر آئے، نہ ہمارے لباس سے ایمان نظر آئے، نہ ہمارے کردار میں ایمان نظر آئے، نہ ہماری سیرت میں ایمان نظر آئے، نہ صورت میں ایمان نظر آئے اور نہ ہمارے کردار میں ایمان نظر آئے، بلکہ اگر ہمارے دس آدمی انگریزوں میں چھوڑ دیں تو انگریز نظر آئیں، ہندوؤں میں چھوڑ دیں تو ہندو نظر آئیں، سکھوں میں چھوڑ دیں تو سکھ نظر آئیں، نصرانیوں میں چھوڑ دیں تو نصرانی نظر آئیں اور گانے بجانے والوں میں چھوڑ دیں تو آپ

کو بالکل ایسے نظر آئیں۔ یہ ایمان تو نہ ہوا۔ ایمان تو تب ہوگا جب دل میں تصدیق ہو، زبان پر اقرار ہو اور عمل بالارکان (بالاعضاء) ہو۔ کیا معنی؟ کہ اگر آپ نماز پڑھتے ہیں تو ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں یا نہیں ہلاتے؟ آپ وضو کریں گے اور اس کے بعد نماز میں رکوع اور سجدوں میں جائیں گے تو پورا بدن تصدیق کر رہا ہے، بلکہ ایمان ہے، کیونکہ پورا بدن اطاعت میں لگا ہوا ہے۔ اور اگر اطاعت کا اظہار ہمارا بدن نہیں کر رہا، ہمارے ارکان اور جوارح نہیں کر رہے، ہاں! فرق صرف اتنا ہے کہ بعض خاص خاص اعمال ہیں، جن کے بارے میں محدثین نے کہا کہ ان کا منکر کافر ہو جاتا ہے، ورنہ وہ کہتے ہیں کہ ایمان میں کمال پیدا نہیں ہوتا۔ بعض عمل ایسے ہیں جن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمادیا، مثلاً: حضور ﷺ نے فرمادیا:

"جو ایک نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔" [المعجم الاوسط، حدیث: ۳۳۴۸]

اس لیے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فتویٰ دیا کہ جو شخص ایک فرض نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے، کوئی عذر اور بیماری نہیں، کوئی تکلیف اور مجبوری نہیں تو وہ کافر ہو گیا، ایمان سے خارج ہو گیا اور اس کا نکاح بھی ختم ہو گیا۔ اور فرماتے ہیں کہ اگر اسی حالت میں مر گیا تو اس کا جنازہ نہ پڑھا جائے اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں بھی دفن نہ کیا جائے۔ کیونکہ دیکھو کہ قرآن آپ لوگوں کو کیا کہہ رہا ہے ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ [البقرۃ: ۳] ایمان بالغیب کے بعد دوسری صفت نماز کی آئی ہے۔ جب ہمارے ہاں وہ صفت ہی نظر نہ آئے تو کیسا ایمان ہے؟ اور میرے مدنی ﷺ نے بھی فرمادیا:

((اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ، مَنْ أَقَامَهَا أَقَامَ الدِّيْنَ وَمَنْ هَدَمَهَا هَدَمَ الدِّيْنَ))

"نماز دین کا ستون ہے۔ جس نے نماز کو قائم رکھا اس نے دین کو قائم رکھا اور جس نے اس کو گرایا اس نے دین محمد مصطفیٰ ﷺ کو ختم کر دیا۔" [تفسیر الشعراوی: ۱۲۵۸]

اور فرمایا:

((بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۶۲۰، باب، ما جاء في ترك الصلاة]

"مسلمان بندے اور کفر کے درمیان فرق نماز کے چھوڑنے کا ہے۔

تو ((بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ)) کیا ہے؟ فرمایا: ((تَرْكُ الصَّلَاةِ)) کہ نماز کا چھوڑنا ہے۔

اور فرمایا:

((اَلصَّلٰوۃُ صِلَۃٌ بَیْنَ الْعَبْدِ وَرَبِّہٖ.)) [التفسیر الوسیط للوسطی، ج:۱:۱]

"بندے اور اس کے رب کے درمیان جو تعلق اور رسی ہے وہ نماز ہے۔ (جب نہیں تو اللہ سے تعلق ختم ہو گیا)۔"

حضور ﷺ کے احکام کا انکار کفر ہے:

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے کہ ہم اس پر کیسے ایمان لائیں؟ فرمایا: ایمان تب مکمل ہوگا جب میرے حکم پر بھی اور میرے مدنی کے حکم پر بھی اسی طرح کاربند ہوگے۔ یہ تحقیق ہمارے ذمہ ہوگی کہ کیا یہ حکم واقعی اللہ کے رسول کا ہے یا نہیں؟ اس میں تو تحقیق ہو سکتی ہے، لیکن جب یہ تحقیق ہو جائے کہ یہ اللہ کے رسول کا حکم ہے، اب اس کا انکار کفر ہے۔

منافق کا قصہ:

جیسا کہ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ایک منافق اور یہودی کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ یہودی کہتا تھا کہ ہم فیصلہ محمد (رسول اللہ ﷺ) سے کرائیں گے اور منافق کہتا تھا کہ ایسا کرتے ہیں، حضور ﷺ بڑے مصروف ہیں اور آپ کے پاس بڑا کام ہے، ہم حضور ﷺ کے پاس فیصلہ کے لیے نہیں جاتے، بلکہ کسی اور سردار سے فیصلہ کرواتے ہیں۔ یہودی نے کہا: "عجیب بات ہے! تم نبی کا کلمہ پڑھتے ہوئے کہتے ہو کہ ہمارے نبی ہیں اور میں تو یہودی ہوں، میں آپ ﷺ کو نہیں مانتا، لیکن مجھے آپ ﷺ کا فیصلہ منظور ہے۔ بہر حال یہودی کو پتہ تھا کہ میں حق پر ہوں اور مدنی حق کا فیصلہ کریں گے۔ وہ کبھی یہ سوچ نہیں سکیں گے کہ اِدھر مؤمن ہے، ایمان والا ہے اور اُدھر یہودی ہے۔ جب عدل ہوگا تو عدل میں برابری ہوگی، اس میں ذرہ کے برابر بھی فرق نہیں ہوگا۔ وہاں نہ مذہب کی رعایت کی جائے گی اور نہ قومیت کی رعایت کی جائے گی۔ اور نہ وہاں لسانیت کی رعایت کی جائے گی اور نہ صوبائیت کی رعایت کی جائے گی۔

﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ﴾ [النساء:۵۸]

انصاف کے ترازو میں فیصلہ تولا جائے گا۔ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے، حضور ﷺ نے مقدمہ سنا تو آپ نے یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا، کیونکہ یہودی کا حق تھا۔ اور منافق...... جو اوپر سے کلمہ پڑھتا تھا، اندر سے ایمان نہیں تھا...... اس نے کہا: "اچھا ایسا کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس چلتے ہیں...... کیونکہ منافق کو یہ خیال تھا کہ

حضرت عمر ؓ بڑا سخت آدمی ہے، کفر کے ساتھ اس کی بنتی نہیں ہے، خاص طور پر حضرت عمر ؓ کو یہودیوں سے بغض اور دشمنی ہے اور میرا مدعی یہودی ہے، یقیناً حضرت عمر ؓ میری رعایت کریں گے۔ حضرت عمر ؓ کی خدمت میں آئے اور آکر واقعہ پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ تم دونوں ٹھہرو! میں ابھی فیصلہ کی کتاب لے کر آتا ہوں۔ حضرت عمر ؓ گھر میں گئے اور تلوار لے کر آئے اور تلوار مار کر منافق کی گردن کو اڑا دیا۔ اس کے بعد پورے مدینہ میں شور ہوگیا کہ حضرت عمر ؓ نے کلمہ پڑھنے والے کو مار دیا کیونکہ منافق ظاہراً کلمہ پڑھتا تھا، ظاہراً تو نمازیں بھی پڑھتا تھا۔ حضور ﷺ کی خدمت میں معاملہ آیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((أَقَتَلْتَ رَجُلًا؟ يَا عُمَرُ!))[تفسیر ابن کثیر:۲/۳۴۸]

''اے عمر! تو نے ایک ایسے آدمی کو مار ڈالا جو کلمہ پڑھتا تھا: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ''؟

حضرت عمر ؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! جو آپ کا فیصلہ قبول نہ کرے، عمر کے پاس تلوار ہے، میں اور دوسری باتیں جانتا ہی نہیں، میرے نزدیک دو اور دو چار ہوتے ہیں۔

حضرت عمر ؓ کے دشمن:

یہی وجہ ہے کہ آج چودہ سو سال گزر گئے، لیکن حضرت عمر ؓ کو دشمن معاف نہیں کرتے۔ کیونکہ حضرت عمر ؓ کے ہاں کفر کے متعلق ذرہ لچک نہیں تھی۔ انہوں نے کہا: ''حضور! اس نے آپ کے فیصلہ کا انکار کیا، میں نے اس کو مار ڈالا ہے۔ میری گردن حاضر ہے، اس کو اڑا دیں۔ بہرحال میرے جذبات کا فیصلہ یہ ہے، میرے ضمیر کا فیصلہ یہ ہے کہ جو میرے مدنی پاک کا فیصلہ نہ مانے وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ابھی یہ بحث ہو رہی تھی کہ اللہ نے قرآن اتارا کہ میرے مدنی! ہم نے آسمان سے عمر کا فیصلہ قبول کرلیا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾[النساء:٦٥]

''ہرگز وہ مومن نہیں ہوسکتے مجھے تیرے رب کی قسم ہے! اے محمد مصطفیٰ! کہ جن کا فیصلہ آپ فرمائیں اور وہ آپ کے فیصلہ کو تسلیم نہ کریں، میں تیرے رب کی یعنی اپنی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ مؤمن نہیں ہے۔ (اور عمر نے جو فیصلہ کیا درست کیا ہے)۔''

[تفسیر ابن کثیر:۱/ ۵۲، النساء: الآیۃ: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ]

انکارِ حدیث کفر ہے:

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ اگر ایک آدمی کہے کہ قرآن کی بات تو ہم مان لیتے ہیں، لیکن حدیث میں تو بہت ساری باتیں ہیں...... ان احادیث کی بات جو ہم تک پہنچی ہے...... پتہ نہیں کہ صحیح ہو یا نہ ہو؟ جو بات حدیث متواتر صحیح سے ثابت ہو جائے گی اس پر بھی ہم اسی طرح ایمان لائیں گے جس طرح اللہ کے قرآن پر ہم ایمان لاتے ہیں، کیونکہ حدیث مبارک دراصل تشریح، تفسیر اور بیان ہے اللہ کے قرآن کا، جو اللہ نے اپنے محمد مصطفیٰ ﷺ پر اتارا ہے۔

اسی طرح یاد رکھو! اگر دل میں ایمان ہے اور زبان پر اقرار نہیں، تب بھی وہ مسلمان نہیں ہے۔ یعنی دل میں مانتا ہے کہ اسلام تو بڑا اچھا دین ہے اور حضور ﷺ کی ذات بھی بڑی مبارک ہے، لیکن کلمہ نہیں پڑھتا تو اس وقت تک وہ مؤمن نہیں کہلائے گا جب تک زبان سے اقرار نہ کر لے۔ اور ایک آدمی زبان سے تو کلمہ پڑھتا ہے، لیکن دل میں ایمان نہیں تو پھر بھی ایمان نہیں ہوگا۔

اور اس کی جامع تعریف محدثین اور سلف صالحین نے فرمائی ہے۔ اس کو یاد کر لیں کہ ایمان کا معنی کیا ہے؟ ''تَصۡدِیۡقٌ بِالۡقَلۡبِ'' کہ دل میں پکی تصدیق ہو، ''اِقۡرَارٌ بِاللِّسَانِ'' کہ زبان پر کلمہ شہادت ''أَشۡهَدُ أَنۡ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوۡلُ اللّٰهِ'' کا اقرار ہو۔

عبادات کامل ایمان کے لیے ضروری ہیں:

اور پھر ''عَمَلٌ بِالۡأَرۡكَانِ''۔ جو اللہ نے ہمیں اعضا دیے ہیں یہ بھی گواہی دیں کہ ہم نے واقعی اسلام قبول کیا ہے، مثلاً: آپ نے ایک درخت لگایا ہے۔ اب ایک سال گزر گیا، دوسرا سال گزر گیا۔ نہ شگوفے نکلتے ہیں، نہ اس پر پتے لگتے ہیں اور نہ وہ سبز ہو رہا ہے، سوکھتا ہی جا رہا ہے، کھڑا ہے، لیکن ابھی گرا نہیں ہے تو آپ کہیں گے: اس کی جڑ زمین میں صحیح نہیں لگی، یہ صحیح خوراک نہیں لے رہا۔ تو جب تک دل میں تصدیق نہیں ہوگی تب تک ایمان نہیں ہوگا۔ اگر اقرار اور اعتراف نہیں ہوگا تب بھی ایمان نہیں ہوگا اور اگر دونوں چیزیں ہیں، لیکن کوئی پھل نہیں لگ رہا، ہمارے اعضا پر ایمان اسلام کی کوئی شکل نظر نہیں آ رہی تو پھر بھی ایمان نہیں ہوگا۔ بلکہ ایمان یہ ہے کہ دل میں تصدیق ہو، زبان پر اقرار ہو اور اقرار کے ساتھ عمل ہو، پھر جا کر ایمان کی دولت مکمل ہوگی۔

اسی طرح اگر دور سے ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے تو دور سے آپ کو نظر آئے گا کہ یہ مسلمان ہے کہ کعبہ کی طرف

کھڑا ہے، رکوع بھی کر رہا ہے، سجدہ بھی کر رہا ہے۔ آپ اس کو نہیں جانتے لیکن اس کو دور سے دیکھنے کے بعد فوراً فیصلہ کریں گے کہ یہ مسلمان ہے۔ ایک آدمی بھگوان کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہے، آپ فیصلہ کرلیں گے کہ ہندو ہے۔ اگر سورج کی طرف منہ کر کے کھڑا ہے تو آپ فیصلہ کرلیں گے کہ یہ کواکب کا پوجنے والا ہے۔ آگ جلا کر آگ پر کھڑا ہے، آپ فیصلہ کرلیں گے کہ یہ آتش پرست ہے۔ اس لیے اگر مؤمن کے بدن سے کوئی ایمان کی چنگاری بھڑکتی ہوئی نظر نہیں آتی، کوئی علامت نظر نہیں آتی، نہ اس کی صورت میں اسلام نظر آتا ہے، نہ اس کی سیرت میں اسلام نظر آتا ہے، صرف زبانی کہہ دینا کہ چھوڑو! ہم بھی مسلمان ہیں۔ یہ قانونی مسئلہ تو ہے کہ کلمہ پڑھ رہا ہے، اس کو ہم مسلمان کہیں گے، لیکن حقیقی معنوں میں یہ مؤمن نہیں ہے۔ اس لیے ایمان یہ ہوا کہ دل میں تصدیق، زبان پر اقرار اور ارکان پر عمل کرنا۔

"اَلْإِيْمَانُ: التَّصْدِيْقُ بِالْقَلْبِ وَالْإِقْرَارُ بِاللِّسَانِ وَالْعَمَلُ بِالْأَرْكَانِ."

ایک ایمان کی حقیقت کا مرتبہ اطمینانِ نفس ہے۔ یہ ایمان کا اونچا مرتبہ ہے ﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ﴾ (الفجر:۲۷) قرآن نے اس کو نفس مطمئنہ کا درجہ دیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ أَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ))

[شرح السنۃ ۱/ ۲۱۳، مشکوۃ:۱۶۷]

"تم مؤمن نہیں بن سکتے جب تک تم اپنی تمام خواہشات کو میرے تابع نہ کر دو۔"

جب یہ مرتبہ آجاتا ہے کہ اپنی تمام خواہشات کو نبی پاک ﷺ کے تابع کر دے تو پھر نفسِ مطمئنہ حاصل ہوتا ہے۔ اپنی خوشی یا غمی، دکھ سکھ، غرض ہر قول و عمل حضور ﷺ کے تابع ہو۔

اجمالی ایمان کا ذکر:

"يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" ایمان کا معنی یہ ہے حضور ﷺ کی ذات جو کچھ اللہ کی طرف سے لائی اس کا ماننا بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے۔ محسوسات، مبصرات یا مشاہدات کو ماننے کا نام ایمان نہیں ہے، بلکہ حضور ﷺ کے فرمانے پر اللہ کے رسول کی بات ماننا ایمان ہے "يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" میں ایمان کا اجمال ہے۔

غیب کی تعریف:

جو چیز جمیع حواس خمسہ کے ساتھ بھی ہمیں معلوم نہ ہو سکے وہ غیب ہیں۔ اگر حواسِ خمسہ سے معلوم کرلیں تو وہ غیب

نہیں ہوتا۔ حواسِ خمسہ جہاں کام نہ کریں وہ چیز غیب ہے، جیسے: وحی کا اترنا، وجودِ باری تعالیٰ، وجودِ ملائکہ اور جنت و جہنم وغیرہ، یہ سب حواس سے معلوم نہیں ہو سکتے، ان کا علم صرف رسول اللہ ﷺ کے بتانے سے ہی ہو سکتا ہے۔

غیب اور غائب میں فرق:

غیب اور غائب میں فرق ہے:

- ......غائب وہ ہے جو نہ تجھے دیکھے اور نہ تو اسے دیکھے۔
- ......غیب وہ ہوتا جو ہمیں تو نظر نہ آئے، لیکن وہ تمہیں دیکھ لے تو کوئی حرج نہیں۔

لہٰذا غائب اور غیب میں بڑا لطیف فرق ہے۔ جیسے ہم ملائکہ کو نہیں دیکھ سکتے، لیکن ملائکہ تو ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ ہم اللہ کو نہیں دیکھ سکتے، لیکن اللہ پاک تو ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح جنات کو ہم نہیں دیکھ سکتے، لیکن جنات تو ہمیں دیکھ رہے ہیں، لیکن ہم سے غیب ہیں۔ تو اس لیے اللہ تعالیٰ پر غیب کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن غائب کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ پاک تو موجود ہے اپنے علم کے ساتھ، اس کا علم ہر ہر ذرہ کو محیط ہے۔

غیب کا مالک اللہ ہے، اس لیے قرآن کا فیصلہ سنیں، اللہ نے فرمایا:

﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝﴾ [النمل:٦٥]

"میرا مدنی! کوئی نہیں جانتا آسمانوں اور زمینوں میں غیب کو مگر اللہ۔ اور آگے فرمایا: میرا مدنی پاک! آپ امت کو سمجھائیں! جو قبر پر کھڑے ہو کر مدد مانگ رہے ہیں، قبروں والوں کو پکار رہے ہیں، یا ان بتوں کو پکار رہے ہیں، ان کو تو خود پتہ نہیں ہے کہ یہ قبروں سے کب اٹھیں گے؟ جب ان کو اپنا پتہ نہیں ہے تو تمہارا حال انہوں نے کیسے جان لیا ہے؟ ﴿وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝﴾ ان کو تو یہ شعور بھی نہیں، خبر بھی نہیں ہے کہ ہم نے کب اٹھنا ہے؟

واقعہ معراج پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایمان:

حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایمان لائے۔ جب آپ ﷺ معراج سے واپس آئے، ابھی تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس حضور ﷺ خود بھی نہیں آئے، بلکہ ابوجہل اپنی کمپنی کو لے کر آ گیا، کہنے لگا: "اے ابوبکر! اب تو ہماری بات مان لو! ہم نہ کہتے تھے...... معاذ اللہ!...... حضور دیوانے ہیں؟ ہم نہ کہتے تھے...... نعوذ باللہ...... اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ۔" ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "کیا بات ہے؟" انہوں نے کہا: "اب تو بات ہی کھل گئی، حضور (ﷺ)

فرماتے ہیں کہ میں رات مسجد اقصیٰ گیا تھا۔ پھر مسجد اقصیٰ سے آسمانوں پر بھی گیا اور جنت میں بھی گیا، ساری سیر کر کے واپس مکہ میں آ گئے۔ اب دیکھو بھلا یہ عقل والی بات ہے؟ مانی جاسکتی ہے؟ کئی مہینوں اور سالوں کا سفر اور پانچ سو سال کا سفر اور حضور ﷺ نے رات رات میں کر لیا؟'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ان جھگڑوں کو چھوڑو! یہ بتاؤ! جو تم کہہ رہے ہو وہ تم نے حضور ﷺ سے سنا؟ حضور ﷺ نے خود فرمایا؟'' انہوں نے کہا: ''ہاں ہاں!'' تو فرمایا: ''میرا ایمان ہے، انہوں نے سچ کہا ہے۔'' ...... تو یہ ایمان ہے کہ دیکھا نہیں ہے، سمجھ میں آنے والی بات بھی نہیں ہے اور حواسِ خمسہ سے معلوم ہونے والی بات بھی نہیں ہے...... انہوں نے کہا: جب حضور ﷺ نے فرمادیا تو بات ہی ختم ہوئی۔ اس کے بعد چوں چرا کرنے کی کیا بات ہے؟ حضور ﷺ نے فرمادیا، بس سرِ تسلیم خم ہے، اب ہم نے گردن جھکا دی ہے۔ [روح المعانی، الاسراء: الآیۃ: سُبْحٰنَ الَّذِي أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ]

ایک دیہاتی کا حضور ﷺ پر ایمان لانے کا عجیب واقعہ!

حدیث میں آتا ہے کہ میرے آقا ﷺ قافلہ کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔ ایک لاغر اونٹنی ہے اور اس پر ایک بدو بیٹھا ہوا ہے، وہ بے چارہ بھی لاغر ہے۔ اس نے اشارہ کیا تو حضور ﷺ نے قافلہ روک لیا۔ اس نے کہا: ''قافلہ والو! مہربانی کرو اور مجھے مدینہ پاک کا راستہ بتادو۔'' حضور ﷺ نے اندازہ لگا لیا اور پوچھا: کیوں بھائی! کیوں مدینہ کا راستہ پوچھتے ہو؟ اس نے کہا: ''میں نے سنا ہے کہ وہاں اللہ کا نبی آیا ہے، محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، ان کی خدمت میں جانا چاہتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''...... الحمد للہ! ...... میں ہی اللہ کا نبی ہوں، میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں، جن کو تم ڈھونڈنے جارہے ہو۔'' تو وہ بالکل بدو ہے، دیہات میں رہنے والا ہے، اَن پڑھ ہے، لیکن اس نے بات کتنی پیاری کی کہا: ''عَلِّمْنِي مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ'' حضور! مجھے سکھلا دیں، پڑھا دیں جیسے آپ کو اللہ نے پڑھایا ہے۔''

حضور ﷺ نے ایمان پڑھانا شروع فرمادیا، وہ خاموش ہو کر سنتا رہتا ہے۔ حضور ﷺ نے ساری شرطیں ختم کرلیں:

((آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ.))

جب حضور ﷺ نے اپنی بات مکمل فرمائی تو اس نے کہا: ''قَدْ أَقْرَرْتُ بِذٰلِكَ'' جو کچھ آپ نے پڑھایا میں

اقرار کرتا ہوں۔ صحابہ ؓ کہتے ہیں: ''قَدْ أَقْرَرْتُ بِذٰلِكَ'' ابھی اس نے کاف پورا ادا نہیں کیا تھا کہ اونٹنی کا پاؤں کسی غار میں گیا تو وہ بے چارہ گرا اور گردن ٹوٹ گئی۔ حضور ﷺ اپنی اونٹنی سے اتر آئے اور اس کے سر کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا...... اتنا بڑا نصیب!!...... اور فرمایا:

((عَمِلَ قَلِيلًا وَأُجِرَ كَثِيرًا.))

دیکھو! تمہارا ساتھی کتنا خوش نصیب ہے کہ کام تو تھوڑا کیا، لیکن بڑا اجر لے گیا کہ ابھی اقرار کیا اور ابھی موت آ گئی۔ جنتوں میں پہنچ گیا اور محمد عربی ﷺ کی گود میں آ گیا۔ اور جنازہ پڑھنے والا خاتم الانبیاء سید الاولین و الآخرین شفیع المذنبین حضور ﷺ نے فرمایا: جبرئیل مجھے ابھی بتلا رہے ہیں کہ کئی دن ہو گئے فاقہ کے ساتھ گزارہ کر کے بے چارہ کئی دن سے مجھے ڈھونڈ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ملا دیا۔

[مسند أحمد، حدیث:۱۹۱۵۸]

دین کی کچھ اشیاء پر ایمان لانے کا حکم:

حضور ﷺ کی لائی ہوئی تمام چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر کوئی بعض پر ایمان لائے اور بعض پر ایمان نہ لائے تو اس کو مؤمن نہیں کہتے۔ اگر ایک آدمی ایمان کی باتوں میں متردد ہے، متشکک ہے، اس کو کہیں گے کہ کفر کے قریب چلا گیا، اس کو کافر نہیں کہیں گے، لیکن جب وہ انکار کر دے تو کافر ہو جائے گا۔

ایمان کا جزء کفر سے بیزاری:

ایمان لانے کے بعد کفر سے بھی براءت کا اظہار کرے۔ ایمان صرف یہی نہیں کہ ایمان لے آؤ، بلکہ ایمان لانے کے بعد کفر سے براءت کا اعلان کرے:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرٰهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ ۚ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ۡ﴾ [الممتحنة:۴]

اللہ نے فرمایا: آپ ﷺ کے لیے اور آپ کی امت کے لیے کیا بہترین نمونہ ہے ابراہیم علیہ السلام کا کہ انہوں نے اور ایمان والوں نے کافر قوم سے کہا:

﴿إِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ﴾

[الممتحنة:۴]

اے کافرو! سن لو! ہم تم سے بھی اور تمہارے خداؤں سے بھی بے زار ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کی طرح آپ کفر سے بے زاری کا اعلان کرو۔ یہ نہیں کہ میں مؤمن ہوں اور کافروں سے یاری پکی ہے اور دلوں کے تعلقات بھی پکے اور ہر بات پر کفر پر بھروسہ بھی ہے اور ہے مؤمن......!!!

﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝۱ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝۳ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝۵ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝۶﴾ [سورۃ الکافرون]

فرمایا: جتنا بھی کفر ہے اور گمراہ فرقے ہیں ان سب سے ڈنکے کی چوٹ سے براءت کا اعلان کرنا پڑے گا کہ جو قرآن کا منکر ہے ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں، جو حضور ﷺ کا منکر ہے ان سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہیں، جو اللہ کے اوامر و نہی اور احکام کا منکر ہے ان سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہیں، باقاعدہ ان سے براءت کا اظہار کرو۔ جب تک ان سے براءت کا اظہار نہیں کرو گے اس وقت تک ایمان پکا نہیں ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ آپ کہیں کہ سب کو ہم راضی کرلیں کہ اگر آپ کبھی مندر میں جائیں تو گھنٹے کھنکھنانے شروع کردیں اور اگر آپ کبھی کافروں کی قبروں پر جائیں تو وہاں بھی چادریں چڑھانا شروع کردیں۔ وہاں تم نے کس ایمان سے چڑھائیں اور یہاں کس ایمان سے چڑھائیں؟ اور یہ ایمان تو نہ ہوا، بلکہ......نعوذ باللہ!......تماشہ ہوا کہ اگر ہمیں صحابہ کا دشمن کوئی مل گیا تو کہا: کوئی بات نہیں، آخر ان سے ملیں گے جلیں گے تو بات سمجھ آئے گی، حضرت! بالکل دوری بھی تو بہتر نہیں ہے، آخر ان سے ہمیں تعلقات تو رکھنے پڑیں گے۔

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک نماز چھوڑنے والے کا حکم:

﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ اگر مؤمن ہے تو نماز کو قائم کرے گا اور نماز قائم نہ کرے تو سمجھو کہ مؤمن نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے تو کافر ہوجاتا ہے اور اس کا نکاح بھی ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد اگر اولاد پیدا ہوگی تو وہ ولد الزنا ہوگی۔ اگر خاوند نمازی ہے اور عورت بے نمازی ہے تب بھی نکاح ختم ہوگیا ہے۔ اگر مرجائے تو اس کا جنازہ بھی نہ پڑھیں اور اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن بھی نہ کریں۔ کیونکہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے ایمان کے ساتھ پہلی چیز ہی نماز بیان کی ہے۔ تو جب اقامت الصلوۃ کی صفت نہیں آرہی تو ایمان کدھر گیا؟

اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ جِهَارًا.)) [المعجم الاوسط، رقم: ۳۳۴۸]

"جو شخص ایک نماز بھی جان بوجھ کر چھوڑے تو کافر ہو گیا۔"

[شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة، حدیث: ۱۵۲۰]

کیونکہ نماز "اَلصَّلٰوةُ صِلَةٌ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الرَّبِّ." "اللہ اور بندے کے درمیان سلسلہ ہے جو نماز جوڑے ہوئے ہے۔ اگر نماز چھوڑ دی تو اللہ سے سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جب اللہ سے تعلق ٹوٹ گیا تو پھر ایمان کہاں رہے گا؟

اقامتِ صلوٰۃ کا معنیٰ:

نماز قائم کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ نماز کو تمام فرائض وسنتوں کے ساتھ ٹھیک پورا پورا ادا کرنا۔ جہاں اللہ نے تعریف میں ذکر کیا وہاں ذکر "اقامت" کا ملتا ہے اور جہاں مذمت میں ذکر کیا وہاں لفظ "مصلین" کا ملتا ہے۔ فرمایا:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝﴾ [الماعون: ۴،۵]

اور فرمایا:

﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝﴾ [القیامة: ۳۱،۳۲]

اور جہاں مدح ہے، فرمایا:

﴿وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ﴾ [النساء: ۱۶۲]

﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ [البقرة: ۳]

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ [الاسراء: ۷۸]

"اَقِمِ الصَّلٰوةَ" وہاں پر لفظ اقامت ہے۔ اقامت کا معنیٰ ہے کہ نمازوں کو اس کے تمام حقوق کے ساتھ ادا کرنا، یعنی شرائط وارکان اور فرائض وواجبات کے ساتھ ادا کرنا۔

"مُتَّقِيْنَ" کی تیسری صفت یہ ہے کہ جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا۔

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ [البقرة: ۳]

حضرت ابوجعفر الرازی رحمہ اللہ نے حضرت علاء بن المسیب رحمہ اللہ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایمان نام ہے تصدیق کا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۰، البقرۃ: ۳، آیہ: الذین یؤمنون بالغیب]

اور تصدیق کا معنی ہوتا ہے ماننا اور علم کا معنی ہوتا ہے جاننا۔ جیسے علم و معرفت حاصل ہو تو وہ ہوتا ہے جاننا اور ایمان کا معنی یہ ہے کہ صرف جان نہیں، بلکہ مان بھی لیا جائے۔

کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر نہیں ہے:

معتزلہ کے فرقوں نے البتہ ایمان کی تعریف میں تمام والجماعت کی مخالفت کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا اور وہ ایمان سے نکل جاتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں دوسرا فرقہ ہے، وہ کہتا ہے کہ مرتکب کبیرہ گناہ کرتا بھی رہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ایمان موجود ہے، لہٰذا کوئی کبیرہ گناہ اس کو نقصان نہیں دے گا۔ تو انہوں نے بعض آیات مبارکہ اور بعض احادیث مبارکہ میں اپنی پسند کے مطابق تاویلات کر ڈالی ہیں۔

جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' دَخَلَ الْجَنَّةَ.))

''جو شخص ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہے گا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔''

صحابی نے سوال کیا: ''وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ؟'' اگرچہ وہ زانی ہو، چور ہو تب بھی وہ جنت میں جائے گا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ'' اگرچہ وہ زانی ہو، چور ہو تب بھی وہ جنت میں جائے گا۔ اس نے پھر پوچھا، پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ))

حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑے ناراض بھی ہوئے اور فرمایا: ''عَلٰى رَغْمِ اَنْفِ اَبِيْ ذَرٍّ'' ابوذر! تم بار بار جو پوچھ رہے ہو وہ جنت میں جائے گا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۵۸۲۷، باب: الثیاب البیض]

تو اب اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ زنا کرتا رہے۔ مقصد بیان کرنے کا یہ ہوتا ہے کہ جیسے کوئی آدمی کہے کہ بیمار ہوں تو آپ پوچھتے ہیں: کیا بیماری ہے؟ آپ کہیں: خیر ہے، کچھ نہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ نزلہ زکام کوئی بیماری نہیں ہوتی، نزلہ زکام بیماری ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ مجھے ٹی بی ہو گیا، یا کہتا ہے کہ کینسر ہو گیا ہے، یا کہتا ہے

کہ ڈاکٹروں نے تحقیق کی ہے کہ تمہارے دل کے دو وال کام نہیں کر رہے، تو بہت خطرناک بات تھی۔ تو کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جب ایمان میں داخل ہو گیا تو وہ کفر سے تو نکل آیا، باقی گناہ کفر کے مقابلے میں تو چھوٹے ہیں۔ یہ مقصد نہیں تھا کہ جو زنا کرتا ہے تو کرتا رہے، جو چوری کرتا ہے تو کرتا رہے، کیونکہ زنا پر باقاعدہ حد (سزا) آئی ہے۔

اسی پاک پیغمبر ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

((لَا يَزْنِي الزَّانِي حِينَ يَزْنِي فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۶۸۰۹، باب: إثم الزناة]

''جب زانی زنا کرتا ہے تو ایمان نکل جاتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى إِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا﴾ [الاسراء: ۳۲]

اسی طرح ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر کہنے لگا کہ حضور! میں زنا کے معاملہ میں بڑا مجبور ہوں، مجھے زنا کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم یہ قبول کرو گے کہ کوئی آدمی تمہاری والدہ کے ساتھ ایسا کام کرے؟ یا تمہاری بہن کے ساتھ ایسا کام کرے؟ یا تمہاری بیٹی کے ساتھ ایسا کام کرے؟'' اس نے کہا: نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم بھی جس پر نظر ڈالتے ہو وہ بھی تو کسی کی بہن ہے، کسی کی بیٹی ہے، یا کسی کی ماں ہے۔'' [مجمع الزوائد، حدیث ۵۴۳، باب: في أدب العالِم]

اس لیے ہمیشہ بیان سے مقصود سمجھانا ہوتا ہے کہ جہاں ایمان کا پہلو بیان کیا جا رہا تھا وہاں بیان یہ ہوا کہ چاہے زانی ہے، یا چور ہے، یا گناہگار ہے، لیکن کافر تو نہیں، کفر کے مقابلہ میں تو یہ بیماریاں چھوٹی ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ یہ بیماری ہی نہیں، یا یہ گناہ ہی نہیں۔ تو اس وجہ سے معتزلہ اہل سنت والجماعت کے خلاف ہوئے۔ بعض نے کہہ دیا کہ مرتکب کبیرہ جنت میں داخل ہی نہیں ہوگا، وہ کہتے ہیں کہ قرآن فرما دیا:

﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۳]

﴿وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ [الشعراء: ۹۰]

اللہ کا قرآن فرماتا ہے کہ جنت ہم نے متقین کے لیے تیار کی ہے۔ اور جنت قیامت والے دن قریب کر دی جائے گی متقین کے لیے۔

جب جنت متقی کے لیے ہے تو جس نے زنا کیا وہ متقی نہیں، بلکہ وہ تو فاسق ہو گیا۔ جس نے چوری کی وہ متقی نہیں،

بلکہ فاسق ہو گیا۔ جب وہ فاسق ہو گیا تو وہ جنت میں کیسے جائے گا؟ حالانکہ یہ بات بھی غلط ہے۔ آپ نے پڑھا ہے جس طرح تقویٰ کے مدارج ہیں:

- ...... پہلا درجہ یہ ہے کہ کفر و شرک سے بچ جائے۔ جو آدمی کفر و شرک سے بچ گیا وہ بھی متقین میں شامل ہو گیا۔
- ...... متقین کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ کفر و شرک سے بھی بچ جائے اور کبائر سے بھی بچ جائے اور صغائر پر اصرار نہ کرے۔ وہ بھی تقویٰ کا ایک اعلیٰ درجہ ہے۔
- ...... اور اس کے بعد تقویٰ کا درجہ ہے: ﴿يَاۤيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ۝﴾ [آل عمران: ۱۰۲] وہ ایسا درجہ ہے کہ دل میں اللہ کے سوا کوئی علاقہ بھی باقی نہ رہے، سب چیزوں سے تعلق ختم ہو جائے ماسوا اللہ تبارک و تعالیٰ کے۔

جب اس نے کلمہ پڑھا تو آدمی متقین کی صف میں داخل ہو گیا تو وہ جنت کا حق دار بن گیا۔ اس لیے قرآن پاک فرماتا ہے کہ قیامت والے دن جب کافر دیکھیں گے کہ مومنوں کی شفاعت ہو رہی ہے، انبیاء بھی شفاعت کر رہے ہیں، ملائکہ بھی شفاعت کر رہے ہیں، حافظ قرآن بھی شفاعت کر رہے ہیں، اللہ کے قرآن کی سورتیں بھی شفاعت کر رہی ہیں اور پھر اللہ کے سارے اولیاء بھی شفاعت کر رہے ہیں تو اب کافر کہیں گے:

﴿فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِيۡنَ۝ وَلَا صَدِيۡقٍ حَمِيۡمٍ۝﴾ [الشعراء: ۱۰۰، ۱۰۱]

”ہائے ہمارا تو کوئی سفارشی بھی نہیں ہے اور نہ ہی آج ہمارا کوئی دوست اور ہمدم ہے۔“

”حَمِيۡمٍ“ کہتے ہیں وہ جو خاص قریبی تعلق والا ہو۔ اس لیے علماء نے فرمایا:

”شَافِعِيۡنَ“ جمع کا صیغہ آیا ہے، ”صَدِيۡقٍ“ مفرد کا۔ چونکہ دنیا میں سفارشی تو بڑے پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن صدیق بہت قلیل ہوتا ہے۔ اس لیے صدیق کا لفظ افراد کے ساتھ لایا گیا۔

اور اس کے بعد کہیں گے:

﴿فَلَوۡ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ۝﴾ [الشعراء: ۱۰۲]

”کاش! ہمیں دنیا میں جانے کا پھر ایک دفعہ موقع ملے، ہم بھی ایمان والوں میں سے ہو جائیں گے۔“

اب مطلب یہ ہوا کہ جو گناہگار ہیں تو شفاعت بھی ان کی ہو گی، جو گناہگار ہی نہیں اس کو شفاعت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ تو بغیر شفاعت کے اوّل دفعہ میں جنت میں چلے جائیں گے۔ شفاعت کی ضرورت ان کو پڑے گی جو

ایمان دار ہیں، لیکن گناہ گار بھی ہیں۔ ایمان دار ہیں، لیکن خطار کار بھی ہیں۔ ایمان دار ہے، لیکن کبائر بھی ذمہ لگے ہوئے ہیں، جہنم کا پروانہ مل گیا ہے۔ ان کو ضرورت ہے کہ کوئی ان کی شفاعت کرے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

((أَنَا أَشْفَعُ فَأَشْفَعُ فَأَشْفَعُ... حَتّٰى يُقَالَ لِيْ: هَلْ رَضِيْتَ؟ يَا مُحَمَّدُ!، أَقُوْلُ: رَضِيْتُ يَا رَبِّ! رَضِيْتُ يَا رَبِّ! رَضِيْتُ يَا رَبِّ!))

آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک دفعہ شفاعت نہیں کروں گا، بلکہ شفاعت کروں گا، پھر شفاعت کروں گا، پھر شفاعت کروں۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اتنی بار اللہ کے آگے شفاعت کروں گا، یہاں تک کہ مجھے کہا جائے گا کہ اے محمد ﷺ آپ راضی ہو گئے یا کہ نہیں؟ تو میں کہوں گا: ''اے پروردگار عالم! میں راضی ہو گیا، میں راضی ہو گیا، میں راضی ہو گیا۔'' [مسند احمد، حدیث:۲۸۰۶]

اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

''كُنَّا نَعُدُّ أَهْلَ الْبَيْتِ أَرْجٰى آيَةً فِيْ كِتَابِ اللهِ.''

ہم اہل بیت سب سے زیادہ امید والی آیت قرآن میں یہ سمجھتے ہیں: ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝۵﴾ [الضحیٰ:۵] اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ میرے مدنی مصطفیٰ ﷺ! ہم آپ کو آخرت میں اتنا دیں گے، اتنا دیں گے کہ ہم آپ کو راضی کر دیں گے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ یہ آیت بڑی امید دلانے والی آیت ہے، کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ حضور ﷺ اتنے کریم ہیں، اتنے مہربان ہیں اور اتنے رحمۃ للعالمین ہیں! آپ ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک آپ کی امت سے کوئی ایک بھی جہنم میں پڑا ہوا ہو۔ [التوحید لابن خزیمہ: ۲/ ۶۷۳]

اس لیے فرمایا کہ شفاعت تو گناہ گاروں کی ہوگی۔ اس لیے عقیدۂ اہل سنت والجماعت بڑا جامع عقیدہ ہے کہ ایمان دل کی تصدیق ہے، اس کے بعد زبان سے اقرار ہے اور اس کے بعد ہمارے اعضاء اس اقرار پر گواہی دیتے ہیں کہ ہم صحیح معنوں میں اللہ پر ایمان لا چکے ہیں، اللہ کی کتابوں پر ایمان لا چکے ہیں۔

ایمان کے معانی:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایمان کا ترجمہ تصدیق سے فرمایا ہے۔

حضرت زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایمان عمل کا نام ہے۔

حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یُؤْمِنُوْنَ" کا معنی ہے "یَخْشَوْنَ" کہ وہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اور جو اللہ سے ڈرے گا تو لازمی بات ہے کہ وہ فرمانبرداری کرے گا۔

اصل میں یہ سب صورتاً اختلاف ہے، وگرنہ اہل سنت والجماعت متفق ہیں...... ماشاء اللہ!...... کوئی جھگڑا نہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۰، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

نکات وفرق:

حضرت ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اولیٰ اور راجح ترجمہ یہ ہے کہ مومنین کی صفت ایمان بالغیب ہوگی باعتبار قول کے بھی، باعتبار اعتقاد کے بھی اور باعتبار عمل کے بھی۔ اس کے اندر تینوں چیزیں آگئیں: اعتقاد بھی آگیا، قول بھی آگیا اور عمل بھی آگیا۔ جیسا کہ سلف صالحین نے فرمایا: "اَلْإِيْمَانُ تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ وَإِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِالْأَرْكَانِ۔"

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۰، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خشیت اللہ یعنی اللہ سے ڈرنا یہ ایمان کے اندر داخل ہے کہ جب ہم نے تصدیق کی ہے اور جو کلمہ ہم نے کہا ہے عمل بھی اس کی گواہی دے، یعنی ہم نے کلمہ پڑھا ہے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" (کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ اور محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔) تو جب ہم نے یہ کلمہ پڑھا تو ہمارا عمل بھی اس کی تصدیق کرے۔ جب اللہ کے سوا کوئی عبادت لائق ہی نہیں تو غیر کی عبادت کا کیا معنی ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم نے جو قول واقرار کیا تھا، تمہارا عمل اس کی تصدیق نہیں کر رہا۔ اقرار تو یہ تھا کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں اور عبادت تو تم غیروں کی کر رہے ہو کہ نذر ونیاز، استغاثہ ہے، قربانی ہے، پکارنا ہے، رکوع ہے، سجدہ ہے اور مانگنا ہے، یہ سب عبادت ہے، اللہ کے سوا کسی غیر کے لیے جائز نہیں۔

آپ دیکھیں کہ نماز پڑھ رہے ہیں تو کس کے لیے؟ اللہ کے لیے، طواف کر رہے ہیں تو کس کے لیے؟ اللہ کے لیے، اگر ملتزم پر آکر مانگ رہے ہیں تو کس سے مانگیں؟ اللہ سے۔ اور حج والے دنوں میں منیٰ میں قربانی کرتے ہیں تو اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں۔ نماز، رکوع، سجدہ کرنا، پکارنا اور ہاتھ اٹھا کر مانگنا دعا بھی عبادت ہے، نذر ونیاز، دنبے جانور ذبح کرنا، یہ سب عبادت ہے، یہ ساری چیزیں اللہ کے لیے تھیں۔ جب ہم غیر کے لیے کریں گے تو گویا ہم نے جو اقرار کیا تھا ہمارا عمل اس کے خلاف جا رہا ہے۔ یعنی ہم کہہ تو رہے ہیں کہ ہم مدینہ شریف جا رہے ہیں، لیکن

ہم نے سڑک جدہ والی لی ہوئی ہے۔ او بھائی مدینہ شریف تو ادھر ہے۔ تو کہا کہ نہیں جی! ہم تو مدینہ شریف جا رہے ہیں۔ مدینہ شریف جانا تب ہے جب تمہاری نیت بھی وہیں جانے کی ہو، تمہاری سڑک بھی مدینہ والی ہو، رخ بھی مدینہ کی طرف ہو، پھر تو تمہاری منزل کٹے گی۔ بس والا چھ گھنٹے میں پہنچ جائے گا اور پیدل والا دو چار دن میں پہنچ جائے گا، لیکن پہنچ جائے گا، کیونکہ سڑک مل گئی، راستہ مل گیا۔ اس لیے جو اعلیٰ درجات والے ہوں گے وہ جنت میں جلدی پہنچ جائیں گے اور جو دوسرے درجہ والے ہوں گے وہ ذرہ لیٹ پہنچیں گے اور تیسرے درجہ والے ان کے بعد پہنچے اور ہم جیسے گناہ گار لیٹ پہنچے، لیکن پہنچ تو گئے، لیکن جو آدمی کہے کہ مدینہ جا رہا ہوں، جبکہ سڑک الٹی ہے تو وہ الٹا مدینہ سے دور تو ہو رہا ہے، وہ مدینہ کے قریب نہیں ہو رہا۔ وہ جتنا سفر کر رہا ہے مدینہ منورہ سے دور ہوتا جائے گا۔

اسی طرح سمجھیں کہ جو آدمی اللہ اور اس کے رسول کے فرمان پر چل رہا ہے وہ اللہ کے قریب ہو رہا ہے، اللہ کے پیغمبر کے بھی قریب ہو رہا ہے۔ اور جو اللہ اور اللہ کے رسول کا نام لیتا ہے، لیکن اس کا عمل حضور ﷺ کی سنت کے مطابق نہیں ملتا، حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق نہیں ملتا اور حضور ﷺ کے احکام کے مطابق نہیں ملتا تو وہ اتنا ہی سنت سے دور ہو رہا ہے اور اللہ سے دور ہو رہا ہے۔ لاکھ دعویٰ کرتا رہے کہ میں حضور ﷺ کو چاہتا ہوں تو یہ دعویٰ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک عمل اس دعویٰ کی تصدیق نہ کر دے۔ مثلاً: آپ میرے ساتھ وعدہ کریں کہ آپ میرے گھر میں آئیں گے۔ یہ آپ نے مجھے قول اور اقرار دیا اور آپ نہیں آئے تو آپ نے اس وعدہ کو نہیں نبھایا، بلکہ خلاف کیا۔ یعنی قول کچھ تھا اور عمل کچھ تھا۔ یہ منافق کی تو صورت ہے، ایمان والے کی نہیں ہوتی۔

منافق یہ کرتے تھے کہ کہتے کچھ تھے اور عمل کچھ ہوتا تھا۔ ظاہر میں آ کر حضور ﷺ کے بڑے عاشق بنتے تھے، اندر دشمنی ہے۔ ظاہر میں آ کر حضور ﷺ کے ہاتھ چوم رہے ہیں اور حضور ﷺ کے ساتھ بیٹھ رہے ہیں، بڑے صدقے کر رہے ہیں اور اندر بغض بھرا ہوا ہے۔ تو اس لیے اگر دل میں تصدیق ہے تب زبان پر اقرار آئے، اگر دل میں تصدیق نہیں تو اقرار کا فائدہ کوئی نہیں۔ اگر اقرار آئے گا اور دل میں تصدیق نہیں تو اقرار کا فائدہ کوئی نہیں ہے۔ اگر اقرار آیا تو اقرار کے سچے ہونے کے لیے عمل کے ساتھ گواہی دے گا کہ ہم نے جو قول و اقرار کیا ہے میں اس کو نبھا رہا ہوں۔

آپ دیکھیں کہ کسی آدمی سے آپ نے قرضہ لینا ہو اور وہ آپ کو نہ دے تو آپ کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے لاکھ ریال دینا ہے تو کم از کم کچھ دینا شروع کرو تو میں سمجھوں کہ تم دینے والے ہو۔ جو تم نے وعدہ کیا ہے اس پر کچھ عمل تو

کرو، کچھ پریکٹیکل طور پر تم ثابت کرو کہ تم قرضہ کی ادائیگی کرنا چاہتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ آپ کا قرضہ بالکل پکا۔ بھائی! پھر دے دو۔ جناب! ابھی نہیں ہے، تو تم کہو گے کہ اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے دینا ہی نہیں چاہتے ہو۔ اس لیے آدمی اگر اپنی زبان سے اللہ کی توحید کا دعویٰ کرے اور عشقِ نبی کا دعوی کرے اور عمل میں بدعت ہو، عمل کے اندر سنت کی مخالفت ہو، عمل کے اندر غیر اللہ کی شرکت ہو تو مطلب یہ ہوا کہ عمل اس کے قول کی تصدیق نہیں کر رہا۔ اسی بات کو سمجھیں! اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو اور مجھے بھی اس کی سمجھ دیں۔

لفظِ ''ایمان'' جامع کلمہ ہے:

لفظِ ''ایمان'' جامع کلمہ ہے۔ اللہ پر ایمان لانا، اللہ کی کتابوں پر ایمان لانا، اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا اور جو کچھ آپ نے اقرار کیا ہے اس کو بالفعل یعنی کر کے دکھانا۔ ایمان کا معنی لغت کے اعتبار سے تصدیق ہے، جیسے قرآن پاک میں بھی یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے ''يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ'' تو یہاں صرف تصدیق کے معنی میں آیا ہے اور جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ سے کہا تھا:

﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ۝﴾ [یوسف: ۱۷]

''ابا جان! آپ ہماری تصدیق نہیں کریں گے، آپ ہماری بات نہیں مانیں گے۔ اگرچہ ہم سچے ہیں۔''

تو لفظِ ''ایمان'' محض تصدیق کے معنی میں آرہا ہے۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [العصر: ۳]

اب اس آیت کے اندر اللہ نے ایمان اور عمل صالح کو اکٹھا بیان کیا ہے۔ اگر تم نے ایمان کا لغت کے اعتبار سے معنی دیکھنا ہو تو وہ صرف تصدیقِ قلبی کا نام ہے، لیکن اگر ایمان کا شرعاً معنی مراد لیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ تصدیق بھی ہو، اقرار بھی ہو اور عمل بھی ہو۔ یہ تینوں چیزیں ہوں۔ علامہ ابن کثیر نے اہل سنت والجماعت کے قول کو ذکر کیا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۰، البقرة: الآية: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم مانتے تو ہیں کہ اللہ ہمارے رب اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے نبی، خاتم الانبیاء، امام الانبیاء اور رحمۃ للعالمین ہیں، لیکن یہ دیکھیں کہ عمل بھی گواہی دے رہا ہے یا نہیں؟ اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا عمل بھی اس کی گواہی دیتا ہو۔ ایک آدمی کہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتا ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ نماز پڑھو اور وہ نماز نہیں پڑھتا ہے تو کیا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتا ہے؟ اگر مانتا تو ان کے فرمان کی تعمیل کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ

میں حضور ﷺ کا پکا عاشق ہوں...... سبحان اللہ!...... جی ہماری زندگی ہی عشق نبی ﷺ کا نام ہے اور صورت وہ جو نبی ﷺ کے خلاف ہے، لباس نبی پاک ﷺ کے خلاف ہے۔ کہتا ہے کہ روضہ پر قربان جاؤں ...... سبحان اللہ!...... حضور ﷺ کا روضہ دیکھتے ہوئے سینہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے، لیکن جب ہاتھ پھیرتے ہیں تو داڑھی پر کچھ نہیں لگتا۔ یہ عجیب سینہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے!! یہ تو نفاق ہے کہ بندہ دعویٰ محبت کا کرے اور عمل اس کے خلاف کرے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو تھوڑا سا ایک تولہ کا بوجھ جو نبی ﷺ کے لیے نہیں اُٹھاتا وہ دو من کا بوجھ اٹھالے گا؟ ہم داڑھی پر اس لیے نہیں زور دیتے کہ داڑھی آپ رکھیں گے اور فائدہ ہمیں ہوگا، یا داڑھی آپ منڈائیں گے تو اس کی وجہ سے مجھے پکڑا جائے گا؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آدمی یہ ایک تولہ وزن حضور ﷺ کی محبت میں برداشت نہیں کر سکتا تو کون من کا وزن برداشت کرے گا؟ ایک آدمی اپنی شکل بھی حضور ﷺ کے مطابق بنانے کے لیے تیار نہیں ہے تو محبت کا دعویٰ کتنا بڑا جھوٹ ہے......؟!!!

آپ نے دیکھا نہیں ہے کہ لوگ لیلیٰ مجنوں کے قصے سناتے ہیں کہ ایک کتا آیا تو اس نے اس کے قدم چوم لیے تو لوگوں نے کہا کہ تم پاگل ہو گئے ہو؟ اس نے کہا: ''میں کتے کے قدم تھوڑا چوم رہا ہوں؟ یہ ان گلیوں سے آیا ہے جہاں لیلیٰ رہتی ہے۔ تو وہ کتے سے پیار کر رہا ہے اور تم محمد مدنی ﷺ کی داڑھی سے پیار نہیں کرتے اور ہو تم نبی ﷺ کے عاشق۔ یہ کونسا عشق ہے؟ یہ عشق کی کون سی قسم ہے؟ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں! اللہ ہمیں صحابہ والا عشق نصیب کرے، اللہ پاک ہمیں اہلِ بیت والا عشق نصیب کرے اور اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اولیاء اللہ والا عشق نصیب کرے۔ ہم صحیح معنوں میں غلام محمد بن جائیں، اللہ ہمیں حضور ﷺ کے قدم قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمادے۔ تب عشق ہوتا ہے کہ عشق کا اثر بھی تو ظاہر ہونا چاہیے۔

اکثر ائمہ: امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ ایمان اس چیز کا نام ہے کہ دل میں تصدیق ہو، زبان پر اقرار ہو اور بدن اس اقرار اور قول کی گواہی دینے والے ہوں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۰، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ ایمان میں زیادتی بھی ہوتی ہے اور ایمان میں نقصان بھی ہوتا ہے۔ یہ صوری اختلاف ہے، اس میں جھگڑا کوئی نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں نفسِ ایمان میں زیادتی ہوتی ہے، بعض کہتے ہیں کہ ایمان کا جو پھل ہوتا ہے اس میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے۔ بات ایک ہے۔ بعض نے کہا: درخت تو ایک ہے، لیکن کسی کو

پھل ایک من لگ گیا، کسی کو ڈیڑھ من لگ گیا، کسی پر دو من لگ گیا اور کسی پر چار من لگ گیا۔ تو پھل زیادہ لگ گیا، درخت وہی ہے۔ بعض نے کہا: درخت مضبوط ہوگا تو پھل کو برداشت کرے گا۔ اگر درخت ہی کمزور ہو تو پھل کا متحمل کیسے ہوسکتا ہے؟ تو لہٰذا ان اختلافات میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اہل سنت والجماعت کا مذہب یہی ہے اور اسی پر اجماع ہے۔ اللہ نے فرمادیا:

﴿وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُهُۥ زَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا﴾[الانفال:۲]

''اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور ترقی دیتی ہیں۔''

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ ایمان کا معنی ہے ڈرنا۔ اگر اللہ سے نہیں ڈرتا تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا ایمان بھی نہیں ہوگا۔ تو اللہ کا ڈر بھی ہونا چاہیے۔

﴿ٱلَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِٱلْغَيْبِ﴾[الانبیاء:۴۹]

''جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں۔''

﴿مَّنْ خَشِىَ ٱلرَّحْمَٰنَ بِٱلْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ﴿٣٣﴾﴾[ق:۳۳]

''جو پروردگار عالم رحمٰن سے بن دیکھے ڈر گیا اور وہ اپنا دل لے آیا جھکنے والا اطاعت کرنے والا وہ بندہ کامیاب ہوگا۔''

اصل عالم کون؟

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر آپ دیکھیں! تو دل کے اندر ڈر کا پیدا ہونا علم اور ایمان کا خلاصہ ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى ٱللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ ٱلْعُلَمَٰٓؤُا۟﴾[فاطر:۲۸]

اللہ سے کون ڈرتے ہیں؟ جو علم والے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۴۱، البقرۃ: الآیۃ: ٱلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِٱلْغَيْبِ]

اس لیے علماء نے فرمایا کہ عالم اس کو نہیں کہتے جس نے پی ایچ ڈی کرلیا ہو، عالم اس کو نہیں کہتے جس نے ڈبل ایم اے کرلیا ہو اور عالم اس کو نہیں کہتے جس نے بڑی سٹڈی کرکے پوری دنیا کی کتابیں پڑھ ڈالی ہوں، بلکہ عالم کا علم دیکھنا ہے تو اس کی خشیت کا اندازہ لگاؤ۔ جتنا اللہ سے ڈرنے والا ہے اتنا بڑا عالم ہے۔ اگر اللہ سے ڈرنے والا نہیں

تو اس کے علم کی کوئی حقیقت نہیں، کوئی فائدہ نہیں، بلکہ اس کی مثال ایسے ہو جائے گی ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا ۚ﴾ [الجمعۃ: ۵] اللہ نے فرمایا: جیسے اہلِ تورات کو ہم نے تورات کا علم دیا، لیکن ان کا نتیجہ ایسے نکلا جیسے گدھے پر کتابیں لاد دو۔ گدھے پر کتابیں لاد دو تو کیا گدھا پڑھ جائے گا؟ اس پر تو لکڑیوں کا بوجھ لاد دو یا کتابیں لاد دو تو برابر ہے اور گدھا تو گدھا رہے گا۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ جب کسی کو دیکھنا ہو کہ یہ عالم ہے تو اس کے عمل پر نظر ڈالو کہ وہ اللہ سے کتنا ڈرنے والا ہے؟

ہمارے ہاں عالم کہتے ہیں کہ جو زیادہ مطالعہ والا ہو، جو زیادہ پڑھا لکھا ہو، جس کے پاس بڑی بڑی ڈگریاں ہوں، نماز نہ پڑھتا ہو، روزہ نہ رکھتا ہو، سگار منہ میں رکھے، بخاری شریف کی حدیثیں بیان کرتا ہو، وہ بڑا عالم ہوتا ہے۔ تو شریعت میں اس کو عالم نہیں کہتے، بلکہ اس کو سب سے بڑا جاہل کہا جاتا ہے۔ عالم وہ ہوتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہو۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان!

اب دیکھیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کوئی بڑی بڑی ڈگریاں حاصل نہیں کیں، لیکن جس مرتبہ پر صحابہ رضی اللہ عنہم پہنچے، اس مرتبہ پر کوئی مومن پہنچ سکتا ہے؟ اس زمانہ میں کوئی یونیورسٹی نہیں، کوئی کالج نہیں، کوئی کورس نہیں، کوئی ڈگریاں نہیں۔ بعض صحابہ نے دو حدیثیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنیں، ان کو سینے سے لگا لیا اور ان پر چل پڑے۔ بعض صحابہ نے صرف تین حدیثیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں اور بعض صحابہ کی ایک ایک حدیث ہے، لیکن صحابہ اس مرتبہ پر پہنچے کہ میرے اللہ نے عرش سے گواہی دی کہ میرا مدنی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم! میں صحابہ سے راضی ہو گیا ہوں، ان کے دلوں کو بھی میں نے دیکھ لیا ہے ﴿أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۚ﴾ [الحجرات: ۳] ان کے دلوں کو میں نے مانجھ دیا ہے اور ان کو اچھی طرح کسوٹی پر رکھ کر پرکھ لیا ہے اور یہ تیرے صحابہ خالص ایمان والے ہیں۔ اور کہیں فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ﴾ [الانفال: ۴]

اور کہیں فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۚ أَلَآ إِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾ [المجادلۃ: ۲۲]

اور کہیں فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [البقرۃ:۵]

کہیں فرمایا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [الفتح:۱۸]

اور کہیں فرمایا:

﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ [المائدۃ:۱۱۹]

ان کے پاس تو کوئی ڈگری نہیں تھی، بلکہ بعض صحابہ تو غسل کے ترجے بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ تو معنی پوچھنے کے لیے امہات المومنین کی دروازے پر آجاتے تھے۔...... بلکہ میرے نبی پاک ﷺ نے اتنی بڑی مثال دی ہے! حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کھجود کے درخت پر چڑھ رہے تھے۔ ان کی پنڈلیاں بڑی بارک تھیں وہ نظر آرہی تھیں۔ ایک صحابی نے دیکھا تو ان کو ہنسی آگئی کہ دیکھو! کتنی باریک باریک پنڈلیاں ہیں!! ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے بچے کی پنڈلی ہو۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا کہہ رہے ہو عبداللہ بن مسعود کی پنڈلیوں کو دیکھ رہے ہو؟ فرمایا: ''مجھے اللہ کی قسم ہے کہ اگر قیامت والے دن میزان میں عبداللہ بن مسعود کی پنڈلیاں ہوں اور سارے زمین و آسمان دوسرے پلڑے میں ہوں تو ان کی پنڈلیوں کا وزن بھاری ہو جائے گا۔'' [دلائل النبوۃ: ۳۹۹/۴]

آپ اندازہ فرمائیں! میرے اس صحابی کی اتنی بڑی شان ہے!! اس سے اندازہ اور یقین فرمائیں کہ اصل عالم وہ ہوتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہو، عالم وہ نہیں ہوتا کہ جمعہ پڑھانا ہو تو وگ لگالے، ایک گاؤن لگالیا اور جب باہر نکلے تو اس کو اتار دیا۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں فرمایا:

﴿الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا﴾ [الجمعۃ:۵]

یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے:

﴿يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِن بَعْدِ مَوَاضِعِهِ﴾ [المائدۃ:۴۱]

یہ وہی لوگ ہیں:

﴿وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ [البقرۃ:۱۷۴]

یہ وہی لوگ ہیں:

﴿لَيَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾[التوبہ:۳۴]

عالم وہ ہوتا ہے جس کے قدم قدم میں خشیت ہو، جس کے قدم قدم میں اتباع ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فوت ہوئے، تاریخ میں موجود ہے کہ ان کے جنازہ کو دیکھ کر نوے ہزار (۹۰۰۰۰) کافروں نے کلمہ پڑھ لیا۔ اور آج ہمارا مولوی کافر بنا تو سکتا ہے، لیکن مسلمان نہیں بنا سکتا۔ میرے خیال میں مسلمان آج تک ایک بھی نہیں بنا، پتہ نہیں کوئی بن گیا ہو اور ہمیں نہ بتایا ہو تو علیحدہ بات ہے، وگرنہ ہمیں دیکھ کر جو کچھ اس کے اندر پہلا ایمان ہے وہ بھی بھاگ جائے گا۔ وہ کہے گا: جب مولویوں کا یہ حال ہے، اس کے گھر میں فلمیں چلتی ہیں، اس کی بیٹیاں پردہ نہیں کرتیں، ان کی لڑکیاں اسکرٹس پہنتی ہیں، ان کی لڑکیاں کالجوں میں پھرتی ہیں، مخلوط ماحول میں تعلیم حاصل کرتی ہیں، مولویوں کے گھر میں نہ زکوٰۃ کا حساب اور نہ صدقات کا حساب ہے، یہ تو صرف ہمیں سنانے کے لیے مولوی بن کر بیٹھے جاتے ہیں۔ کچھ دوستوں کو کہتا ہوں کہ دیکھو! انگریز نے بھی کبھی آپ کو خط لکھا ہے کہ آپ اپنی لڑکی کو اسکرٹ پہناؤ۔ آپ میں سے کسی کو انگریز کا خط ملا ہو تو مجھے بھی بھیج دینا، میں فوٹو کاپی کرا کر شائع کر دوں گا۔ یا کسی نے اس کو لکھا ہے کہ تم بلاؤز پہناؤ یا تم اپنی لڑکی کے بال کٹواؤ۔ وہ اپنی لڑکی کو ننگا کر کے مارکیٹ میں لے آیا ہے، کسی نے نہیں کہا: ''اس نے پریکٹیکل اپنی لڑکی کو پیش کیا ہے۔'' تم نے دیکھ دیکھ کر اپنی لڑکیوں کو بھی اس رنگ میں رنگ دیا ہے۔ ہم نے لوگوں کو پردے کا کہا ہے، لیکن نمونہ بن کر پیش نہیں کیا۔ ہم اگر نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ پردہ کوئی کھا نہیں جائے گا، پردے میں تعلیم بھی ہو سکتی ہے، علم بھی ہو سکتا ہے، پردے میں کالج میں بھی جا سکتی ہے، پردے میں آپ اپنے کاروبارِ زندگی بھی سرانجام دے سکتے ہیں۔ اسلام نے تو پردہ تیری عزت کے لیے رکھا ہے، تیری عصمت کے لیے رکھا ہے۔ اسلام نے پردہ تمہیں قید بنانے کے لیے تو نہیں رکھا، اسلام نے تو یہ رکھا ہے کہ آپ دیکھیں کہ جو انگوٹھی بازار میں ایک ریال کی ملتی ہے تو آپ کبھی فکر نہیں کریں گے، لیکن اگر یہ ڈائمنڈ کی ہو تو آپ اس کو تجوریوں میں رکھ کر اس کو تالے لگائیں گے۔ اسلام نے تو عورت کو ایک قیمتی جوہر قرار دیا ہے۔ اب اس کی جس طرح چاہو حفاظت کرو، لیکن ہم نے چونکہ یہ باتیں زبانی کلامی تو کی ہیں، لیکن شام کو جب ہم نے دیکھا کہ مولوی صاحب خود اپنی بیگم کو لے کر سیر کر رہے ہیں تو آپ نے کہا: اگر مولوی کی بیگم باہر نکل سکتی ہے تو میری بیگم کوئی مجرم ہے؟ وہ نکل سکتی ہے۔ اگر مولوی کے گھر میں وی سی آر پر فلمیں لگ سکتی ہیں تو ہمارے گھر میں بھی لگ سکتی ہیں۔

یہ فرق ہے کہ اصل عالم وہ ہوتا ہے جس کو اللہ کا ڈر ہو۔ جب اللہ کا ڈر ہوگا تو غلط کام کرے گا ہی نہیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے فرمایا:

﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [فاطر:۲۸]

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ﴾ [ق:۳۳]

ایمان بالغیب کا ایک اور معنی:

بعض علماء کے نزدیک ''يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ'' کا معنی ہے کہ جیسے ظاہر میں تصدیق کرتے ہیں اسی طرح غیب میں بھی تصدیق کریں۔ یہ نہیں کہ مؤمنوں کے سامنے تو تصدیق کریں، جب واپس جائیں تو مکر جائیں۔

نکات:

بلکہ ''يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ كَمَا يُؤْمِنُوْنَ بِالشَّهَادَةِ'' جیسے لوگوں کے سامنے کہتے ہیں کہ ہم ایمان والے ہیں اسی طرح جب گھر میں بھی ہوں تو کہیں کہ ایمان والے ہیں، علیحدہ ہوں تو ایمان والے ہیں۔ یہ نہیں کہ لوگوں کے سامنے حاجی بن جائیں، عمرہ والے بن جائیں اور لوگوں کے سامنے متقی پرہیزگار بن جائیں اور جب علیحدہ ہوں تو...... اللہ معاف کریں!...... دنیا کا وہ فعل کریں جو کافر بھی نہیں کرتے ہیں۔

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ﴾

[البقرۃ:۱۴]

اللہ نے فرمایا کہ جو منافق لوگ ہیں جب وہ مؤمنوں کے ساتھ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم کیوں فکر کرتے ہو؟ ہم تو مسلمان کے ساتھ ٹھٹھہ مخول کر رہے ہیں۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم کوئی مسلمان نہیں ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۱، البقرۃ: الآیۃ: اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ آج ہمارا حال یہی تو نہیں ہے۔ یعنی اگر ہمیں بھی کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اسلام کا دشمن ہو، جیسے وہ بات کرے ہم راضی ہوں۔ ہمیں اگر یہودی کی دوستی مل جائے ہم راضی ہیں، ہندو کی دوستی مل جائے ہم راضی ہیں، نصرانی کی مل جائے ہم راضی ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اسلام بڑا عدل والا ہے، اسلام کے اندر بڑی وسعت ہے اور اسلام میں بڑی رواداری ہے، آپ سے ہمارا کیا جھگڑا ہے؟ آپ سے ہمارا کیا اختلاف ہے؟

اسلام تو ایک عالمی مذہب ہے اور سب کو اپنی پناہ میں لینے والا ہے۔ تم بھی ہمارے بھائی ہو، تم بھی ہمارے دوست ہو۔ اور اسی طرح اگر کسی جگہ جائیں اور وہاں بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہوگا کہ ہم تو اہل بیت کے غلام ہیں، ہم تو حضرت حسین ﷺ کو ماننے والے ہیں، ہم تو اہل بیت کو اپنا مقتدا اور پیشوا مانتے ہیں۔ اور دوسری جگہ جائیں، اگر وہاں اہل سنت والجماعت کا زور ہے تو کہتے ہیں کہ ہم پکے سنی ہیں۔ اور جہاں توحید والے ہوں تو کہیں گے: ہم تو بڑے پکے موحد ہیں۔

خیر! یہ تو عام بات ہے، یعنی جدھر جائیں ان کے ساتھ راضی ہو جانا۔ یہ منافق کا کام ہے کہ جو ملے اس کے ساتھ راضی ہو جائے۔ آج کل کہتے ہیں کہ یہ آدم سوشل ہے، بڑے مزاج کا آدمی ہے۔ دیکھو جی! اس کو جس محفل میں بٹھا دو سب راضی ہیں۔ مانا ہے کہ ایمان کے لحاظ سے بالکل بے غیرت ہے۔ اگر سب راضی ہوتے تو میرے مدنی مصطفیٰ ﷺ پر نہ راضی ہو جاتے......؟ کیا حضور ﷺ پر سب راضی ہو گئے؟ حضور ﷺ جب اسلام لے کر، دین لے کر اور قرآن لے کر مکہ میں آئے تو کیا خیال ہے مکہ والے سارے آپ کے ساتھ ہو گئے؟ تو جب میرے پاک نبی رحمتِ دو جہاں ﷺ پر سارا جہاں راضی نہیں ہوا تو تم پر کیسے راضی ہو گیا؟ مطلب یہ ہوا کہ وہ راضی نہیں ہوئے۔

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ﴾ [البقرۃ:۱۲۰]

''یہود اور نصاریٰ تم سے کبھی راضی نہیں ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو۔''

اگر وہ تم سے راضی ہیں تو مطلب یہ ہے کہ تم ان کی کوئی اتباع کر رہے ہو۔ اگر تم ان کی اتباع نہ کرتے تو قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ ہرگز تم سے راضی نہ ہوں گے۔ اس لیے فرمایا: ''يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ كَمَا يُؤْمِنُوْنَ بِالشَّهَادَةِ'' ایسا نہ کرو کہ:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ①﴾ [المنافقون:۱]

اللہ نے فرمایا: میرے پاک نبی! جب آپ کے پاس ان منافقین کی جماعت آتی ہے اور آ کر کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، حالانکہ اللہ تو جانتا ہے کہ آپ میرے رسول ہیں، لیکن یہ جھوٹے ہیں اور جھوٹی گواہی دے رہے ہیں۔

اس لیے فرمایا: جب لوگوں سے چھپے ہوں تب بھی ایمان پر اور اگر نہ چھپے ہوں تب بھی ایمان پر اور اللہ سے ڈرنے

والے اپنے گھر کے اندر ہوں تب بھی اللہ سے ڈرنے والے۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ جو ظاہر میں ہے وہی اندر ہے اور جو اندر ہے وہ ظاہر میں ہے۔ ان کے اندر نفاق ہوتا ہی نہیں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۴۱، البقرۃ: الآیۃ: اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

غیب کیا ہے؟

غیب وہ ہوتا ہے جس کا علم ہمیں حواسِ خمسہ سے نہ ہو سکے۔ اللہ نے ہمیں حواسِ خمسہ دیے ہیں۔ بعض چیزیں ہم سن کر حاصل کرتے ہیں، بعض چیزیں ہم دیکھ کر حاصل کرتے ہیں، بعض چیزیں ہم چکھ کر حاصل کرتے اور ہیں، بعض چیزیں ہم سونگھ کر حاصل کرتے ہیں۔ مثال: پانی ٹھنڈا ہے یا گرم تو ہاتھ لگا کر دیکھتے ہیں، یعنی چھو کر دیکھتے ہیں۔ کعبہ کے غلاف کا رنگ سیاہ ہے یا سرخ، دیکھ کر ہم نے فیصلہ کر لیا۔ یہ خوشبو جو آ رہی ہے کون سی ہے؟ سونگھ کر معلوم کر لیا۔ غیب وہ ہے جہاں حواسِ خمسہ سارے زور لگائیں پتہ نہیں چلتا، نہیں معلوم ہو سکتا۔ وہ غیب ہے۔ ایسے غیب کا علم صرف خاصۂ خدا ہے، اللہ کے سوا کسی کو علمِ غیب نہیں ہوتا۔ اور جو چیزیں اللہ کے نبی ﷺ نے اللہ کے حکم سے ہمیں بتلائیں۔ ہم غیب پر ایمان لائے، ہم نے اللہ کو نہیں دیکھا، لیکن ہمارا ایمان ہے۔ ہم نے جنت کو نہیں دیکھا، لیکن ہمارا ایمان ہے۔ ہم نے ملائکہ کو نہیں دیکھا ہے، ہم نے جنات کو نہیں دیکھا ہے، ہم نے عذابِ قبر کو نہیں دیکھا ہے، لیکن چونکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے، اس لیے ہمارا ایمان ہے۔ یہ چیزیں ہم اپنے حواسِ خمسہ سے معلوم نہیں کر سکتے کہ جنت کہاں ہے؟ کیسے ہے؟ اور جہنم کہاں ہے؟ اسی طرح اللہ کے ملائکہ حق ہیں، لیکن ملائکہ کو کیسے دیکھیں؟ نہ ان کو آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں، نہ ان کو چھو سکتے ہیں اور نہ ہم ان کو معلوم کر سکتے ہیں، لیکن جب حضور ﷺ نے فرما دیا تو ہم نے مان لیا کہ ملائکہ برحق ہیں۔ تمام اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے "اَلْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ" جنت بھی حق ہے، نار بھی حق ہے، عذابِ قبر بھی حق ہے۔ اب عذابِ قبر ہمیں نظر نہیں آتا۔ اس قبر کو کھولو پھر بھی ہمیں نظر نہیں آتا۔ ایک کے ساتھ دوسری قبر ہے، بظاہر ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ نیک آدمی کی قبر کیسے کھلے گی؟ قبر کیسے وسیع ہو جائے گی؟ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ جس پر راضی ہوتے ہیں اس کی قبر کو وسیع کر دیا جاتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جو حضور ﷺ فرما رہے ہیں وہ برحق ہے۔ وہ عالمِ برزخ ہے اور وہ عالمِ غیب ہے۔ عالمِ دنیا اور عالمِ برزخ الگ الگ ہیں اور آخرت الگ عالم ہے۔

یوں سمجھ لیں جیسا کہ آپ زمین پر ہیں تو یہاں کچھ حالات علیحدہ ہیں، ہوائی جہاز پر بیٹھیں اور جب دس ہزار کی

بلندی پر چلے جائیں تو احوال الگ ہیں، جب تیس ہزار فٹ کی بلندی پر چلے جائیں تو وہاں احوال الگ ہیں اور اگر ایک لاکھ فٹ کی بلندی پر مثلاً نکل جائیں، وہاں آکسیجن کے احوال اور ہر چیز کے احوال بدل جاتے ہیں۔ جو چیزیں ہمیں سمجھ نہیں آرہیں وہاں جا کر سمجھ آجاتی ہیں۔

اسی طرح دیکھیں کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ اگر ہوائی جہاز پر سفر کریں اور مشرق کی طرف جا رہے ہوں تو سورج بڑی جلدی نکلے گا اور اگر سفر مغرب کی طرف ہے اور غروب بھی مغرب کی طرف ہے تو دیر سے غروب ہوگا اور اگر آپ واپس آرہے ہیں تو سورج بڑی جلدی ڈوبے گا۔ سورج مغرب کی طرف جا رہا ہے، آپ مشرق کی طرف جا رہے ہیں تو لازمی بات ہے رفتار میں فرق آجائے گا اور ٹائم میں بھی فرق آجائے گا، لہٰذا جو دنیا کے حالات ہیں وہ الگ ہیں، قبر کے حالات الگ ہیں۔

آپ دیکھیں کہ ماں کے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے۔ پہلے ایک پانی کا بلبلہ ہے، پھر ایک بچہ بن گیا، ہاتھ پاؤں بن گئے، ٹانگیں بن گئیں اور سر بن گیا۔ جتنا بچہ بڑا ہوتا ہے اتنا اللہ رحم کو پھیلا دیتے ہیں۔ اب حالانکہ کوئی تصور کر سکتا ہے کہ اتنی چھوٹی سی چیز اتنی پھیل جائے؟ اور بچہ بڑے آرام سے اندر ہے۔ ایک دن بھی نہیں، نو مہینے تک پیٹ میں رہے۔ تو اللہ پاک بھی قبر کو پھیلا دیں گے اور ہمیں نظر نہ آئے تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ وہ دنیا ہی الگ ہے، وہ علم غیب ہے۔ اور ہمیں حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق ایمان لانا ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: غیب کے بارے میں علماء کے بڑے اقوال ہیں، لیکن تمام کے تمام اقوال متفق ہیں اور سب صحیح ہیں۔ اللہ پاک سے دعا کریں! اللہ پاک ہمیں صحیح ایمان نصیب فرمائے، اللہ ایمان پر قائم رکھے، اللہ ایمان پر موت عطا فرمائے، حضور ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے اور قیامت والے دن بھی ہمیں حضور ﷺ کا قرب نصیب فرمائے۔

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳﴾ [البقرۃ: ۳]

مسئلہ علم غیب:

مثال کے طور پر: میرے جیب میں کیا ہے؟ آپ کو پتہ نہیں ہے۔ اگر میں آپ کو بتا دوں پھر غیب نہیں رہا۔ تو اللہ نے جب اپنے انبیاء پر وحی بھیج دی، ان کے دلوں میں اللہ نے القا فرما دیا، یا اپنے کسی ولی کے دل میں ایک بات

ڈال دی اور انہوں بتلادی تو وہ غیب نہیں ہے۔ غیب تب تھا جب تک غیب والے نے خبر نہیں دی تھی، اس لیے قرآن فرماتا ہے کہ انبیاء کو اخبار عن الغیب، انباء عن الغیب اور اطلاع علی الغیب ہوتی ہے۔ قرآن نے کسی جگہ نہیں کہا کہ انبیاء کو علم غیب ہے، لیکن اللہ غیب پر مطلع فرمادیتے ہیں، غیب کی اللہ خبر دے دیتے ہیں، غیب کی خبروں سے اللہ ان کو آگاہ کردیتے ہیں۔ اگر غیب کا یہ معنی یاد رہے تو سارے جھگڑے ختم ہوجاتے ہیں۔ اب ایک آدمی نے کسی مشین کے ذریعے سے معلومات کرلیں، یہ غیب نہیں ہے۔ کسی نے کمپیوٹر کے ذریعہ سے ہمیں معلومات فراہم کردیں تو غیب نہیں ہے۔ کس نے رسد کے ذریعہ سے، دوربین کے ذریعہ سے ہوا کی رفتار کا اندازہ بتلادیا تو یہ غیب نہیں ہے۔ کسی نے قانکوں کے بارے میں خبر دی تو یہ غیب نہیں۔ کسی نے تمھیں شمس وقمر کے جریان کا حساب لگا کر ان کے گرہن کے بارے میں خبر دے دی تو یہ غیب نہیں ہے، کیونکہ یہ ہم حساب کررہے ہیں۔ جو چیزیں ہمیں حساب سے معلوم ہوجائیں، عقل سے معلوم ہوجائیں اور کسی کے بتلانے سے معلوم ہوجائیں وہ غیب ہوتا ہی نہیں۔ غیب وہ ہوتا ہے جہاں یہ سارے اعضاء بےکار ہوجائیں۔ اب جتنی عقل دوڑائیں......؟ اللہ کو دیکھ سکتے ہیں؟ نہ اللہ کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ اللہ کو عقل کے ذریعہ سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ کی تو ہم صفات دیکھتے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا، مخلوق کو پیدا فرمایا۔ یہ دلالت کررہے ہیں کہ ان کا پیدا کرنے والا کوئی ہے، لیکن اللہ کی ذات کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اسی لیے فرعون بدبخت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا:

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ [الشعراء:٢٣]

تم یہ بتلاؤ کہ تمہارا رب کیا ہے؟ کس چیز سے بنا ہوا ہے؟ کس دھات سے بنا ہوا ہے؟ کیا چیز ہے؟......سونا ہے؟ چاندی ہے؟ اب موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا﴾ [مریم:٦٥]

فرمایا: اے جاہلو رب کے بارے میں کیسے بتا سکتا ہوں؟ میرا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے۔

﴿قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ ﴾ [الشعراء:٢٦]

جو تمہارا بھی رب ہے، جو تمہارے باپ دادا کا بھی رب ہے، جو ان کو پیدا کرنے والا ہے۔ فرعون! تم تو اب رب بنے ہو، تمہارے پیدا ہونے سے پہلے رب کون تھا؟ تمہارے باپ کو کس نے پیدا کیا؟ تمہارے دادا کو کس نے پیدا

کیا؟ تو اللہ کی قدرتوں اور صفات کو دیکھ کر ہم ایمان لائے، لیکن اللہ کی ذات کو تو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہمارا اللہ موجود ہے اور عرش پر مستوی ہے، جیسے اس کی شان کو زیب دیتا ہے، لیکن ان کی ذات میں کوئی بحث کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ایمان بالغیب ہے۔ ہم نے خدا کو بن دیکھے مان لیا، حواسِ خمسہ اور عقل تو وہاں پہنچ ہی نہیں سکتے۔

ایک ذریعہ تھا کہ اگر ہم دیکھ لیتے تو اپنے خدا کو پہچان لیتے تو وہ ذریعہ بھی ختم ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

﴿رَبِّ أَرِنِيٓ أَنظُرۡ إِلَيۡكَ﴾ [الاعراف: ۱۴۳]

اے میرے پروردگار! جیسے مجھ سے کلام فرمایا، مجھے اپنی زیارت بھی نصیب فرما دے۔

﴿قَالَ لَن تَرَىٰنِي وَلَٰكِنِ ٱنظُرۡ إِلَى ٱلۡجَبَلِ﴾ [الاعراف: ۱۴۳]

اللہ نے فرمایا: تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے ہو۔ چلو تمہاری خواہش ہے دیکھنے کی تو پہاڑ کی طرف نظر ڈالو اور اس کے بعد پھر سوچنا کہ تم مجھے دیکھ سکتے ہو یا نہیں دیکھ سکتے؟

﴿فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُۥ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهُۥ دَكّٗا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقٗا﴾ [الاعراف: ۱۴۳]

اللہ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔ اب جناب ہوش آیا تو عرض کیا: ''سُبۡحَٰنَكَ'' تیری ذات پاک ہے، واقعی! ہم نہیں دیکھ سکتے، ہماری طاقت نہیں ہے کہ ہم برداشت کر سکیں۔ کتنا بڑا پہاڑ!! ایک تجلی برداشت نہیں کر سکا، ایک عاجز انسان پروردگار کی تجلی کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ ﴿تُبۡتُ إِلَيۡكَ﴾ جو کچھ میں نے سوال کیا مجھے معاف فرما دیں۔ تو اللہ کو دیکھنے کی طاقت بھی نہیں ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کو چھو بھی نہیں سکتے تو عقل خدا تک کیسے پہنچ سکتی ہے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو اب ہم نے مانا کہ ہمارا ایک خدا ہے، اس کی ذات برحق ہے اور اس کی صفات برحق ہیں۔ وہ خالق ہے، رازق ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے، ستار ہے، جبار ہے، قہار ہے اور فعال لما یرید ہے۔ اس کا نام ایمان بالغیب ہے۔

اللہ کے فرشتوں پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ اب اللہ کے فرشتوں کو بھی ہم نہیں دیکھ سکتے، ان کو اصلی شکل میں تو ہم دیکھ نہیں سکتے، اگر وہ انسان کی شکل میں آئیں تو پھر ہم فرق نہیں کر سکتے۔ ہمیں کیا پتہ کہ انسان ہے یا فرشتہ ہے؟ جیسے حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما نے آ کر ادھر اُدھر سے پکڑ لیا اور ان کو کہا کہ جاؤ ہمارے لیے کھجوریں لے آؤ۔ انہوں نے سمجھا حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے۔ حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ ان کو کھلانے کے لیے کھجوریں لاتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ٹھہرو ٹھہرو! یہ تو جبرئیل علیہ السلام

ہے، دحیہ کلبی تو نہیں ہے۔ تو اب اگر انسان کی شکل میں ہوں تو ہم جان نہیں سکتے۔ اگر وہ اپنی شکل میں آئیں تو ہم دیکھ نہیں سکتے، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ ملائکہ موجود ہیں، ملائکہ کراما کاتبین ہیں، قرآن کی مجالس پر سایہ کر کے کھڑے ہیں، ملائکۃ اللیل ہیں، ملائکۃ النہار ہیں، ملائکۃ الرحمۃ ہیں، ملائکہ العذاب ہیں، حملۃ العرش اور حملۃ الکرسی ہیں۔ ہمارا ایمان ہے۔ تو یہ ایمان بالغیب ہے۔ ہم نہ ملائکہ کو سمجھ سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ انہیں چھو سکتے ہیں اور نہ انہیں ہم مل سکتے ہیں۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے آمنہ کے لال! ہم یوں تلوار کا اشارہ کرتے ہیں، ابھی ہماری تلوار کافر تک نہیں پہنچتی، لیکن اس کی گردن پہلے کٹ جاتی ہے، یہ کیا بات ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جب تلوار چلا رہے ہوتے ہو تو ملائکہ بھی تلوار چلا رہے ہوتے ہیں، ان کی تلوار تم سے پہلے کام کر جاتی ہے۔ تو اب صحابہ کو ملائکہ نظر نہیں آرہے، سمجھ نہیں آرہے، سامنے دشمنوں کی گردنیں کٹ رہی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تو ملائکہ پر ایمان ہے۔ ایمان بالغیب ہے۔ اللہ کی کتابوں پر ایمان، اللہ کے رسولوں پر ایمان ہے کہ کتابوں کا اترنا بھی ہم نے نہیں دیکھا اور وحی کا آنا بھی ہم نے نہیں دیکھا۔ تو یہ بھی ایمان بالغیب ہے۔

اور اسی طرح وملائکتہ و کتبہ و رسلہ، اسی طرح موت کے بارے میں والبعث بعد الموت کہ مرنے کے بعد ہم نے اٹھنا ہے اور یہ ہم نے نہیں دیکھا ''وَجَنَّتُهٗ وَ نَارُهٗ وَ لِقَآئُهٗ'' اللہ کی جنت کو بھی ہم نے نہیں دیکھا، جہنم کو بھی ہم نے نہیں دیکھا اور قیامت والے دن اللہ کے ساتھ لقا ہوگا وہ بھی ہم نے نہیں دیکھا۔ تو یہ ایمان بالغیب ہے کہ وہ چیزیں ہیں جو حواس خمسہ سے معلوم نہ ہوسکیں ان پر ایمان لے آنا، یہ ایمان بالغیب ہے۔

اور اس کا بہت بڑا مقام اور بہت بڑا مرتبہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نصیب فرمادے۔ یہ کوئی عام چیز تو نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت حق ہے۔ اب کافر اپنی عقل دوڑاتے پھر رہے ہیں کہ جنت کہاں ہے اور کدھر ہے؟ اور جہنم کدھر ہے؟ ہم نے کہا کہ تمہیں ملے یا نہ ملے، تمہاری عقل ناقص ہو سکتی ہے، تمہاری معلومات ناقص ہو سکتی ہیں، ہمارے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان غلط نہیں ہو سکتا۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ میں جنت کے اندر گیا ہوں تو بات ختم ہوگئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جنت کی سیر کی ہے، بات ختم ہوگئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے جہنم دکھائی گئی اور اس میں میں نے دیکھا کہ بعض لوگوں کو جہنم کی لگامیں چڑھا چڑھا کر لے جایا جا رہا ہے تو میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: ''یہ وہ مولوی ہیں جو حق کا کلمہ نہیں کہتے تھے، لوگوں کو گمراہ

کرتے تھے۔" حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ انگارے کھا رہے ہیں۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: "یہ یتیموں کا مال کھانے والے ہیں۔" حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جہنم دیکھی ہے، لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ جہنم حق ہے اور جنت حق ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے جبرئیل علیہ السلام کو اس کی اصل شکل میں دیکھا ہے۔ لہٰذا ہمارا ایمان ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: مجھے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بیت المقدس میں ملے ہیں، پھر آسمانوں پر بھی ملے ہیں، ہمارا ایمان ہے۔ اب یہ باتیں ہم عقل سے یا حواسِ خمسہ سے تو معلوم نہیں کر سکتے تو اس کا نام ایمان بالغیب ہے۔ اس لیے فرمایا کہ متقین لوگ وہ لوگ ہیں ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ جو ایمان لاتے ہیں بن دیکھے ان چیزوں پر جہاں ان کے حواسِ خمسہ کی رسائی نہیں ہوتی۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت مرۃ الہمدانی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غیب وہ چیزیں ہیں جو غائب ہیں، بندے ان کو نہیں دیکھ سکتے، ان پر ایمان لانے کا نام غیب ہے۔ کوئی جنت کا مسئلہ ہے، یا جہنم کا مسئلہ ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۱، البقرۃ: الآیۃ: اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ]

اس لیے یاد رکھیں کہ غیب خاصۂ خدا ہے، اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں۔ یہ عقیدہ رکھیں۔ اور بعض ہمارے لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں، یا خدا بہتر جانے کہ خود مسئلہ نہیں سمجھتے۔ اللہ پاک رحمت فرمائیں! وہ کہتے ہیں کہ عالم الغیب ہونا خدا کی شان ہی نہیں ہوسکتی، عالم الغیب تو ہوتا ہی نہیں ہے، اس لیے انہوں نے قرآن کا ترجمہ لکھا اور جہاں لفظ "نبی" آیا "یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ" [الاحزاب: ۱] تو ترجمہ کیا کہ "اے غیب کی خبر دینے والے!" کہا کہ نبی کا معنی ہی یہی ہوتا ہے کہ جو غیب کی خبر دیتا ہو۔ تو انہوں نے کہا کہ اللہ کے آگے تو ہر چیز موجود ہے، اللہ کے آگے جب کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں تو غیب کیسے ہوئی؟ غیب تو وہ ہوتا ہے کہ جو ہمارے آگے چھپی ہوئی ہو، ہم دیکھ نہیں سکتے، تو یہ صفت نبی کی ہو سکتی ہے، ولی کی ہوسکتی ہے۔ اللہ کے آگے تو کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔

حالانکہ "غیب" کا ترجمہ یہ نہیں کہ اللہ کے آگے نہیں، بلکہ "غیب" اس کو کہتے ہیں کہ جو چیزیں مخلوق سے چھپی ہوئی ہیں وہ غائب ہیں "مَا غَابَ عَنِ الْعِبَادِ" کہ اللہ کے آگے تو کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بھی فرمایا:

﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ﴾ [الانعام: ۷۳]

اللہ کی صفت کیا ہے؟ کہ غیب کے علم والے، چھپی ہوئی اور ظاہر چیزوں کے جاننے والے۔ یعنی چھپی ہوئی جو تم سے چھپی ہوئی ہیں ان کے جاننے والے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے آگے چھپی ہوئی ہوں تو وہ غیب والے بنیں گے۔ جو چیزیں مخلوق سے چھپی ہوئی ہیں ان کو بھی جاننے والا ہے، ہمارے اس دل کے اندر کوئی چیز ہے ہم سے بھی چھپی ہوئی، لیکن اس کو جاننے والا اللہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو چیزیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ پاک سے لے آئے ہم نے نہیں دیکھا، لیکن ہمارا ایمان ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ غیب کا معنی قرآن ہے، کیونکہ جب قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تو ہم نے نہیں دیکھا، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ جو شخص بھی اللہ پر ایمان لایا تو وہ غیب پر ایمان لایا، کیونکہ اللہ کو تو ہم نے دیکھا نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۱، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

اس امت کی فضیلت:

(حدیث) حضرت عبدالرحمن بن یزید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا ذکر آ گیا کہ صحابہ کی کیا شان ہے؟ صحابہ کی کیا عظمت ہے؟ اور صحابہ کن کاموں میں ہم سے سبقت لے گئے؟ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جہاں تک ہمارے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا تعلق ہے جن لوگوں نے دیکھا ہے تو دیکھا ہے، آپ کا وجود بھی دلالت ہے کہ آپ سچے ہیں، لیکن اصل بات تو ان کی ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، ان چیزوں پر جن کو انہوں نے دیکھا نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بڑی بات ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ دیکھیں گے تو دلیل ہے کہ آپ سچے نبی ہیں۔ اس لیے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اصل بات تو ان لوگوں کی ہے جو بن دیکھے ایمان لائے۔ فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۝١ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٢ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۱، البقرۃ: الآیۃ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

اس کا یہ مطلب نہ ہوا کہ بعد والے لوگ افضل ہیں، بلکہ انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم ہیں، عشرہ مبشرہ ہیں رضی اللہ عنہم، پھر جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ ساری دنیا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یہ صحابہ کی شان ہے، تاکہ دوسروں میں بھی ایمان کا جذبہ پیدا ہو کہ تم ٹھیک کہتے ہو صحابہ کی بڑی شان ہے، لیکن ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کو دیکھا نہیں ہے، کمال تو تمہارا ہے کہ تم بن دیکھے ایمان لے آئے۔ وہ ایک دوسرے کی تفخیم کر رہے تھے، وگرنہ جو حضور ﷺ کو ایک نظر دیکھے، دنیا کا کوئی بندہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس آدمی نے ایک منٹ کے لیے بھی میرے نبی ﷺ کو ایمان کے ساتھ دیکھا ہے تو وہ اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے کہ ساری دنیا کے اولیاء اللہ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے صحابہ ؓ کا مقام اولیٰ و اعلیٰ ہے۔ صحابہ ؓ بھی تو غیب پر ایمان لائے، انہوں نے بھی تو وحی اترتے نہیں دیکھی، ان کو بھی تو کیفیتِ رسالت کا علم نہیں تھا، ان کو بھی تو اللہ تعالیٰ کی رؤیت نہیں ہوئی، ان کو بھی تو ملائکہ کی رؤیت نہیں ہوئی، ان کو بھی تو جنت اور نار کی رؤیت نہیں ہوئی، ان کا بھی تو ایمان بالغیب ہے تو اس لیے حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ کہتے ہیں کہ ہم نے عبداللہ بن مسعود ؓ سے درخواست کی کہ جو آپ نے حدیث حضور ﷺ سے سنی ہو ہم کو سناؤ۔ انہوں نے کہا: بہت اچھا! میں تمہیں بہت اعلیٰ حدیث سناتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ ہم حضور ﷺ کی خدمت میں تھے، سفر میں تھے یا غزوہ میں اور ہم نے رسول پاک ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! آپ یہ بتائیں کہ صحابہ سے بھی کوئی افضل ہے؟ ہم لوگ آپ پر ایمان لائے، آپ کے ساتھ مل کر کفار سے جہاد کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں! ایسے لوگ بھی آئیں گے جن کی ایسی شان ہوگی، جنہوں نے مجھے دیکھا بھی نہیں ہوگا اور مجھ پر ایمان لے آئیں گے۔ حضور ﷺ نے بعد میں آنے والوں کی فضیلت بیان کی ہے۔

حضرت صالح بن جبیر ؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو جمعہ الانصاری ؓ بیت المقدس میں تشریف لے آئے وہاں نماز پڑھنے کے لیے...... کیونکہ مسجدِ حرام اور مسجد نبوی ایسی مسجدیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی فضیلت عطا فرمائی ہے۔ یعنی اگر کوئی مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھے تو پانچ سو نمازوں کے برابر ثواب ہے اور مدینہ پاک کی مسجد نبوی میں نماز پڑھے تو ایک نماز ہزار نمازوں کے برابر ہے اور اگر کوئی مسجد حرام میں نماز پڑھے تو ایک نماز ایک لاکھ کے برابر ہے۔...... تو فرماتے ہیں کہ وہ صحابی تشریف لے آئے کہ بیت المقدس کی مسجد میں نماز ادا کریں اور جب انہوں نے نماز ادا کی تو اس دن ہمارے ساتھ رجاء بن حیوۃ ؓ بھی تھے۔ جب ابو جمعہ نماز پڑھ کر جانے لگے ہم ان کے ساتھ نکلے، تا کہ ان کی پیروی کریں اور ان کو عزت کے ساتھ رخصت کریں۔...... تو یہاں سے علماء نے مسئلہ نکالا کہ اگر کوئی عالم آئے، کوئی شان والا آئے اور اللہ کا صالح بندہ آئے تو اس کی تکریم کرنا، اس کو پہنچانا، ساتھ جا کر سواری پر بٹھانا، یہ بھی سنتِ محمد رسول اللہ ﷺ ہے۔...... جب ہم ان کو چھوڑنے کے لیے روانہ ہوئے

تو انہوں نے کہا کہ ٹھہرو کہ تم لوگوں نے میرا استقبال کیا، پھر مجھے چھوڑنے کے لیے چلے ہو تو تمہارے لیے انعام ضروری ہے، لیکن میرے پاس کیا انعام ہے......

"أُحَدِّثُكُمْ بِحَدِيثٍ سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ"

میں تمہیں انعام دیتا ہوں، میں تمہارا حق ادا کرتا ہوں، میں تمہیں محمد مصطفیٰ ﷺ کی حدیث سناتا ہوں۔

"قُلْنَا: هَاتِ رَحِمَكَ اللّٰهُ!"

ہم نے کہا کہ ہم کو جلدی سناؤ اللہ پاک تم پر رحم کرے۔

یہ تو بڑا انعام ہے کہ ہمیں حضور ﷺ کی کوئی بات پہنچ جائے۔ اصل میں ایمان والوں کے لیے ہدیہ ہی قرآن اور حدیث ہے جو ایمان والا اور مسلمان ہے۔ اور جس کے دل میں ایمان نہ ہو، اسلام نہ ہو وہ تو کہے گا کہ کوئی گانا اچھا لے آؤ، کوئی کیسٹ اچھی لے آؤ، فلم اچھی لے آؤ۔ تو یہ اپنا اپنا تعلق ہے۔ جن کا تعلق جن سے جڑا ہے۔ اگر رحمٰن سے جڑا ہے تو رحمٰن کے بندوں کی باتیں اچھی لگیں گی اور اگر شیطان سے جڑا ہے تو شیطان کے بندوں کی باتیں پیاری لگیں گی، تعلق کی بات ہے، جس سے تیرا تعلق بن گیا۔ رحمٰن سے تعلق ہے تو رحمٰن کے بندے، یعنی اللہ کے انبیاء علیہم السلام اور رسول اللہ ﷺ کے اولیاء، علمائے حق کی باتیں تمہیں پسند آئیں گی، تمہیں پیاری بھی لگیں گی اور تم بار بار بھی سنو گے۔ اور اگر تعلق شیطان سے جڑ گیا ہے تو لازمی بات ہے کہ کبھی گانے سنو گے، کبھی فحش فلمیں دیکھو گے، کبھی کیسٹ سنو گے اور کبھی رقص دیکھو گے۔ یہ تعلق کی بات ہے۔

جس طرح سائکالوجسٹ یعنی ماہر نفسیات ہوتے ہیں، جو نفسیاتی علاج کرتے ہیں اسی طرح علما بھی لوگوں کی دینی نفسیات کو پہنچاتے ہیں۔ جیسا کہ ایک ڈاکٹر تھے، میں نے ان سے کہا کہ ایک لڑکا ایسے ایسے ہے تو اس کے بارے میں بتائیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر گھر میں کیسٹ ہے تو وہ کیسا ہے؟ اس نے کتابیں کون سی پڑھیں ہیں؟ اس سے ہم اندازہ لگالیں گے کہ اس کا ذہن کدھر جارہا ہے؟ ہمیں اندازہ ہوجائے گا کہ وہ ذہنی طور پر کس عشق میں مبتلا ہے، کس بیماری میں مبتلا ہے، کس عذاب میں پڑا ہے؟ کیونکہ اس کے دماغ کا جن چیزوں سے تعلق ہے وہ ظاہر ہوگا۔ اس لیے اصولی بات ہے کہ اگر آپ گھر میں بیٹھے ہیں اور قرآن کی آواز آرہی ہے، کار میں بیٹھے ہیں اور قرآن شریف لگا ہوا ہے، کیسٹ دیکھی تو قاری عبدالباسط کی ہے، یہ فلاں عالم اور فلاں عالم کی ہے تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ اس کا تعلق اللہ والوں کے ساتھ ہے۔ اور اگر آپ وہاں جائیں اور وہاں قوالیاں ہوں، فلمیں ہوں اور گانے

ہوں تو اندازہ لگالیں گے کہ اس کا تعلق کن کے ساتھ ہے۔ یہ تو فوری فیصلہ ہے ایک منٹ میں ہوسکتا ہے اس سے آپ اپنے بچوں کا اور اپنے دوستوں کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کا رجحان کدھر جا رہا ہے اللہ کی طرف ہے یا شیطان کی طرف ہے۔

اس لیے انہوں نے کہا کہ جلدی ہمیں حدیث سناؤ تو انہوں نے فرمایا کہ ہم بھی حضور ﷺ کے ساتھ تھے اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے:

((قُلْنَا يَا رَسُولَ اللهِ! هَلْ مِنْ قَوْمٍ أَعْظَمُ مِنَّا أَجْرًا؟))

''ہمارے علاوہ بھی کوئی قوم ہوگی جس کو زیادہ ثواب ملے گا؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری کیا بات ہے! تم نے تو میری زیارت کر لی، میں تمہارے پاس وحی لاتا ہوں۔ اصل مرتبہ تو ان لوگوں کا ہوگا جن کو یہ قرآن پہنچے گا، نہ انہوں نے مجھے دیکھا، نہ قرآن کو دیکھا، پھر ایمان لائیں گے، اس کے بعد اس پر عمل بھی کریں گے۔ تو ان کو اللہ تعالیٰ دہرا اجر عطا فرمائیں گے۔

[مجمع الزوائد، حدیث: ١٦٦٩٢، بَابُ: مَا جَاءَ فِيمَنْ آمَنَ بِالنَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم وَلَمْ يَرَهُ]

علمائے حدیث کا اس بارے میں اختلاف ہے، میں نے شرح بخاری کے اندر اس حدیث پر مفصل بحث کر دی ہے۔ یعنی یہ لوگ باعتبار ایک وجہ کے افضل ہوں گے، من حیث المجموع افضل نہیں ہوں گے، من حیث المجموع صحابہ افضل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کی کوئی ایک چیز زیادہ ہوتی ہے، مثلاً: حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ نے حسن کی صفت عطا فرمائی، حضرت ایوب علیہ السلام کو اللہ نے صبر کی صفت عطا فرمائی، موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے اپنے ساتھ کلام کی صفت عطا فرمائی، لیکن جب جمیع صفات کو اکٹھا کریں گے تو سب سے افضل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد اگر تابعین آئیں، ان کے اندر بھی بعض بڑی بڑی صفتیں ہوں گی، سب سے بڑی صفت ہے کہ بن دیکھے محمد عربی ﷺ پر ایمان لائے، بن دیکھے اللہ کی وحی پر ایمان لائے، لیکن جب ساری صفات کو ہم جمع کریں گے تو افضل اصحاب رسول رضی اللہ عنہم بنیں گے، کیونکہ وہ بھی ملائکہ پر بن دیکھے ایمان لائے، جہنم پر بن دیکھے ایمان لائے، جنت پر بن دیکھے ایمان لائے تو وہ ایمان بالغیب میں بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے، پھر حضور ﷺ کی صحبت بھی مل گئی، لہٰذا اس وجہ سے تو ہمیں ثواب زیادہ ملا، لیکن مجموعی وجہ سے سب سے اعلیٰ درجہ اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کا بنے گا۔

روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ ؓ سے سوال کیا: تم یہ بتاؤ! ''أَيُّ الْخَلْقِ أَعْجَبُ إِلَيْكُمْ إِيمَانًا؟'' ساری مخلوق میں تمہیں ایمان کن کا پسند ہے؟ صحابہ ؓ نے سوچ کر کہا کہ فرشتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ملائکہ کی کون سی بڑی بات ہے!؟ اللہ کے قریب رہتے ہیں۔ وہ ایمان لے کر نہیں آئیں گے تو کون لائے گا؟ یہ تو کوئی بڑی بہادری نہیں ہے۔ صحابہ ؓ نے کہا: ''اَلنَّبِيُّوْنَ'' کہ حضور! سب سے زیادہ ایمان کا مرتبہ تو نبیوں کا ہوسکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نبی کیوں ایمان نہ لاتے؟ ان پر تو براہ راست اللہ کی وحی آرہی ہے۔ ان کا ایمان لانا تو آسان ہے کہ ڈائرکٹ اللہ کے ساتھ تعلق ہے۔ ہم نے کہا: ''حضور! ہم آپ پر ایمان لے آئے اور آپ کی اتباع کی۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! تم بھی کیوں ایمان نہ لاتے؟ تم نے محمد رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے۔ تم نے جب حضور ﷺ کو دیکھ لیا تو بات ختم ہوگئی۔ حضور ﷺ کو دیکھنا کوئی چھوٹی سی بات ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا: حضور! آپ بتائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہوں گے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ ان کو تو صرف قرآن پہنچے گا، کتابیں پہنچیں گی، انہوں نے مجھے بھی نہیں دیکھا، کوئی چیز بھی نہیں دیکھی، لیکن پھر بھی وہ ایمان لائیں گے اور عمل کریں گے۔ وہ سب سے زیادہ اللہ کو پسند ہیں۔''

[دلائل النبوۃ: ۶/۵۳۸، تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۲، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

یہ ٹھیک ہے، سب جزوی فضیلت ہوتی ہے، کلی نہیں۔ جیسے حضرت عثمان ؓ میں حیا کی صفت زیادہ تھی، حضرت علی ؓ میں قضا کی صفت زیادہ تھی، حضرت عمر ؓ کے اندر شجاعت کی اور عدالت کی اور کفر سے لڑائی کی صفت زیادہ تھی اور حضرت صدیق ؓ میں صدق کی صفت زیادہ تھی، لیکن جب ساری صفات کو جمع کریں گے تو سب سے افضل میرے مدنی محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ حضور ﷺ کے بعد سیدنا ابو بکر ؓ، پھر سیدنا عمر ؓ، پھر سیدنا عثمان ؓ، پھر سیدنا علی ؓ پھر عشرہ مبشرہ، اصحاب بدر، اصحاب حدیبیہ، پھر سارے صحابہ ؓ، پھر تابعین پھر تبع تابعین ؒ اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مجموعی صفات کا ذکر ہے۔

اس حدیث کے اندر ایک راوی مغیرہ بن قیس البصری ٹھیک نہیں کہ اس کا اعتبار نہیں ہے، کیونکہ وہ منکر الحدیث ہے، لیکن اس حدیث کو ابو یعلی نے بھی ذکر کیا ہے، ابن مردویہ نے بھی اپنی تفسیر میں اس کو ذکر کیا ہے۔ اس کے اندر ضعف تو پایا جاتا ہے، لیکن جب بہت سارے طرق جمع ہو جائیں تو ضعیف بات مضبوط ہو جاتی ہے۔ اور ایک روایت حضرت انس بن مالک ؓ سے ہے جو حضور ﷺ کے خادم ہیں۔ ان سے اس کے ہم معنی مرفوعاً روایت کی

گئی ہے۔

ایک حدیث میں جعفر بن محمود اپنی دادی (بدیلہ بنت اسلم) سے روایت کی ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں نے بنی حارث میں پڑھی اور ہم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہے تھے...... کیونکہ مسلمان پہلے مسجد اقصیٰ کی طرف نماز پڑھتے تھے...... چنانچہ ہم دو رکعتیں پڑھ چکے تھے۔ ایک آدمی آیا، اس نے اسی حالت میں خبر دی کہ حضور پاک ﷺ نے مسجد اقصیٰ سے مسجد حرام کی طرف منہ موڑ لیا ہے تو اسی نماز میں ہم مڑ گئے۔ تو مردوں کی جگہ عورتیں آگئیں اور عورتوں کی جگہ مرد آگئے، کیونکہ مرد پہلے آگے تھے اور عورتیں پیچھے تھیں۔ جب کعبہ بدل گیا تو ہماری جگہ پر مرد آگئے اور ہم مردوں کی جگہ پر آگئیں پھر عورتیں پیچھے ہو گئیں۔...... یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ آگے ہو گئیں، یہ خیال رکھنا! کیونکہ عورت فرض نماز میں آگے ہو تو بعض ائمہ کے نزدیک نماز بالکل فاسد ہو جاتی ہے، گو بعض ائمہ کہتے ہیں کہ نماز ہو جاتی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ ایسا کرو، وہ بھی کہتے ہیں کہ اگر عورتیں آگے آگئیں تو نماز ہو جائے گی۔ یہ علیحدہ بات ہے، وگرنہ حکم ہے کہ پہلے مردوں کی صفیں بنائیں۔ جب مردوں کی صفیں پوری ہو جائیں تو بچوں کی صفیں بنائیں۔ جب ان کی صفیں پوری ہو جائیں تو پھر عورتوں کی صفیں بنائیں۔ تو بی بی صاحبہ کہتی ہیں کہ جب ہم نے کعبۃ اللہ کی خبر سنی تو کعبہ کی طرف مڑ گئے۔ حضور ﷺ کو ہماری خبر پہنچی، حضور ﷺ نے فرمایا:

((أُولٰٓئِكَ قَوۡمٌ اٰمَنُوۡا بِالۡغَیۡبِ))

یہی لوگ ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

انہوں نے دیکھا بھی نہیں، ان کو پتہ بھی نہیں۔ ان کو حکم پہنچا تو فوراً تبدیل ہوئے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۲، البقرۃ: الآیۃ: اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ]

ایمان بالغیب کا معنیٰ ہی یہی ہے کہ بن دیکھے اپنے نبی پر اعتماد کرتے ہوئے بات کو مان لینا۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ واقعی حضور ﷺ نے یہ خبر دی ہے؟ یہ تحقیق ہمارے ذمہ ہوگی۔ جب یہ پتہ چل جائے کہ یہ فرمانِ نبی ﷺ ہے تو بس ہمارا کام یہ ہے کہ ہم گردن جھکائیں۔ کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ کا فرمان آگیا، بس بات ہی ختم ہو گئی۔ اور اسی طرح جتنے ائمہ کرام ہیں، یاد رکھو! وہ سب بھی محمد مصطفیٰ ﷺ کے غلام ہیں، اللہ کے نبی ﷺ کے تابع ہیں، اللہ کے نبی ﷺ کے فرمانبردار ہیں اور اللہ کے نبی ﷺ کے احکام کو کھول کر بیان کرنے والے ہیں۔ دعا کریں اللہ ہمیں صحیح معنوں میں ایمان بالغیب نصیب فرمائے، حضور ﷺ کی محبت نصیب فرمائے، صحابہ اور اہل بیت کی محبت

نصیب فرمائے، اولیاء اللہ کی محبت نصیب فرمائے اور اپنے صالح بندوں سے ہمارا تعلق بنائے، اسی پر ہمیں موت آئے اور جنت میں ہمیں اکٹھا فرمائے۔

نماز کے اوقات کے لیے امامتِ جبرئیل علیہ السلام:

﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ﴾

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي)) [صحیح البخاری، حدیث: ۶۳۱، باب: الأذانِ لِلْمُسَافِرِ، إِذَا كَانُوا جَمَاعَةً]

اللہ کے پاک پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ تم نمازیں ایسے ادا کرو جیسے میں ادا کرتا ہوں، میں پڑھتا ہوں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو قرآن میں بھی بتلایا، فرمایا:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتٰبًا مَّوْقُوتًا﴾ [النساء: ۱۰۳]

اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر نماز فرض کر دی ہے اور ان کے اوقات کی تعیین کر دی ہے۔

اب ان اوقات کا قرآن نے کہیں خود بھی ذکر کیا ہے:

﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَىٰ غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ [الاسراء: ۷۸، ۷۹]

اللہ تعالیٰ نے کہیں نماز کے اوقات کی تفصیل بھی بیان فرما دی۔ اب دیکھیں کہ نبی علیہ السلام بھی عربی، قرآن بھی عربی، نماز اتنی اہم چیز ہے کہ اللہ نے جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا، جبرئیل علیہ السلام نے آکر امامت کرائی۔ حالانکہ اندازہ فرمائیں کہ حضور ﷺ تو امام الانبیاء ہیں، لیکن چونکہ نماز کی تعلیم دینی مقصود تھی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اللہ نے بھیجا، جا کر نماز کے اوقات اور نماز کا طریقہ صرف زبانی نہ سمجھاؤ، بلکہ تم امام بنو اور میرا مدنی مقتدی بنے۔ یعنی نماز کتنی اہم چیز ہے! تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو دس نمازیں پڑھائیں: پانچ نمازیں اول وقت میں اور پانچ نمازیں آخری وقت میں، کیونکہ ہر نماز کا ایک وقتِ اول ہے اور ایک آخرِ وقت ہے۔ جیسے صبح کی نماز ہے تو طلوعِ فجر سے، صبح صادق سے وقت شروع ہو گیا اور سورج کے نکلنے کے وقت ختم ہوگا۔ اگر سورج نے نکلنا شروع کر دیا تو وقت ختم ہو گیا۔ اسی طریقہ سے ظہر کا وقت ہے، عصر کا وقت ہے، مغرب کا وقت ہے اور عشا کا وقت ہے۔ پانچ

نمازیں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اوّل وقت میں پڑھائیں اور پانچ نمازیں آخر وقت میں۔ پھر حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کر دیا کہ حضور! ان دو وقتوں کے درمیان میں نماز کا وقت ہے، اپنی امت کو سمجھائیں۔

ادنیٰ اعلیٰ کو نماز پڑھا سکتا ہے:

اور اسی سے ائمہ اور محدثین نے مسئلہ نکالا کہ اگر کوئی آدمی شان میں کم ہو تو وہ شان والے کا امام بھی بن سکتا ہے، حالانکہ شان میں زیادہ حضور ﷺ ہیں، جبرئیل علیہ السلام تو آپ کے خادم ہیں، جبرئیل علیہ السلام تو آپ کے دروازے پر حاضر ہونے والے ہیں، جبرئیل علیہ السلام تو بغیر اذن کے گھر میں داخل بھی نہیں ہو سکتے، لیکن امام بن سکتے ہیں تو معلوم ہوا کہ مفضول بھی کبھی فاضل کا امام بن سکتا ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ کے امام حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی بنے ہیں، اسی طرح سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی امام بنے ہیں، لہٰذا اس میں بھی امت کے لیے تعلیم ہوتی ہے۔ کبھی امام باعتبار علم اور مرتبہ کے کم ہوتا ہے، لیکن اقتداء کرنے والوں میں اس سے بڑے بڑے عالم ہوتے ہیں، نماز ٹھیک ہو جاتی ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھی۔ اور اسی سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ نماز کی کتنی بڑی اہمیت ہے کہ جبرئیل علیہ السلام خود نماز پڑھانے کے لیے آئے ہیں اور حضور ﷺ ان کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں۔

نماز کی اہمیت:

اسی طرح علماء نے لکھا ہے، اس بات پر غور کریں! شریعت کے جتنے احکامات ہیں، یعنی اللہ پاک نے قرآن پاک میں جتنے احکامات بھیجے ہیں، روزے کے بارے میں، زکوٰۃ کے بارے میں، جہاد کے بارے میں، نکاح وطلاق کے بارے میں، ارث میراث کے بارے میں، تجارت کے بارے میں، معاملات کے بارے میں، عبادات کے بارے میں، امانات کے بارے میں اور اخبار اور قصص انبیاء والمرسلین ہیں، لیکن تمام احکام جبرئیل علیہ السلام لے کر آئیں ہیں۔ حج فرض قرآن میں ہوا، لیکن جبرئیل علیہ السلام لایا ہے، روزہ رمضان کا فرض ہوا، لیکن جبرئیل علیہ السلام لایا ہے۔ اسی طرح جہاد کا حکم نازل ہوا، جبرئیل علیہ السلام لایا ہے۔ اسی طرح نکاح وطلاق بیعت کے حکم آئے، جبرئیل علیہ السلام لائے ہیں۔ ایک نماز اتنی بڑی چیز ہے کہ جس کا حکم جبرئیل علیہ السلام نہیں لائے، بلکہ خود محمد عربی ﷺ لائے ہیں۔ نماز جب فرض ہوئی ہے تو معراج کی رات میں اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو خود حکم دیا۔ تو نماز اتنی اہم چیز ہے۔ اسی سے آپ اندازہ فرمائیں کہ تمام

عباداتِ بدنیہ میں اور حقوق اللہ میں اس کی اتنی اہمیت ہے کہ سب سے پہلی چیز نماز ہے۔

اور اسی طرح فرمایا کہ قیامت والے دن عبادات بدنیہ میں سے جس کا سب سے پہلے سوال کیا جائے گا وہ نماز کے بارے میں ہوگا۔ اور یہ بھی حدیث مبارک میں آیا کہ جو نماز کے سوال میں پاس ہوگیا آئندہ بھی سمجھو کہ پاس ہوگیا، لیکن جو نماز کے امتحان میں فیل ہوگیا باقی میں بھی فیل ہوگیا۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۴۱۳، باب: مَا جَاءَ أَنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ...]

اس لیے فرمایا: ''إِقَامَةُ الصَّلٰوةِ، إِقَامَةُ الصَّلٰوةِ''

میرے پاک نبی ﷺ نے فرمایا:

((اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ)) [شعب الایمان، حدیث: ۲۵۵۰، باب: الصَّلاۃ]

''نماز دین کا ستون ہے۔''

اگر ستون گرادو تو عمارت خود بخود گر جائے گی۔ عمود کہتے ہیں جس پر خیمہ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر اس میں عمود نکال دیں تو خیمہ نیچے آجائے گا۔ جس بندے کے اندر نماز نہیں تو گویا دین ختم ہو چکا ہے۔

اس طریقہ سے حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

((اَلصَّلٰوةُ صِلَةٌ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الرَّبِّ))

بندے اور رب کے درمیان میں ایک صلہ ہے، سلسلہ ہے اور ایک کڑی ہے جس نے عبد کو رب سے جوڑا ہوا ہے۔ اگر یہ کڑی ٹوٹ گئی تو گویا بندے کا تعلق اللہ سے ٹوٹ گیا۔ جب اللہ سے تعلق ٹوٹ گیا تو انسان کے پاس باقی کیا بچ گیا؟

اور اسی طرح حدیث مبارکہ کے اندر آیا کہ نماز مؤمن کی معراج ہے، یعنی عروج کی حد ہے۔

[روح البیان: ۶/ ۳۵، الحج: الآیۃ: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا]

((أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهٗ يَرَاكَ))

حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم نماز کو ایسے ادا کرو گویا کہ تم اپنے خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر وہ پہلا مرتبہ حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم یہ یقین ہو کہ مجھے میرا رب دیکھ رہا ہے۔ [صحیح البخاری، حدیث ۴۹، باب: الْإِيْمَانِ]

اس لیے قرآن نے کہا ہے:

﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ﴾ [المؤمنون:۲]

خشوع، تواضع اور عاجزی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ اور عین نماز میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ان کا قلب بھی اور قالب بھی، دل بھی اور جسم بھی عبادت کے اندر متوجہ ہوں اور اِدھر اُدھر، یمین، شمال، جنوب، لہولعب ان چیزوں سے احتراز کرتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے: ایک آدمی نے نماز پڑھتے ہوئے ایک دو دفعہ داڑھی کو کھجایا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اگر اس کے دل کے اندر خشوع ہوتا تو بدن کے اندر بھی خشوع ہوتا۔'' کیونکہ سارا نظام دل سے چل رہا ہے۔ اگر دل میں اللہ کا ڈر آجائے تو آپ دیکھتے نہیں کہ آنسو بہہ رہے ہیں؟ آدمی رونا شروع کردیتا ہے، تھر تھر کانپ رہا ہے، کیونکہ دل میں اللہ کا ڈر داخل ہو گیا ہے تو اس کا پورے بدن پر اثر ہوتا ہے۔ تو اگر نماز ہمارے دلوں کے اندر داخل ہو جائے اور خشوع داخل ہو جائے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نماز کے اندر چاہا تو کھیل بھی لیا، کبھی آگے ہوئے، کبھی پیچھے ہو گئے، کبھی جیب میں ہاتھ ڈال کر چیز بھی نکال لی، کبھی گھڑی پر ٹائم دیکھنا شروع کردیا اور کبھی بلاوجہ اپنا رومال ٹھیک کرنا شروع کردیا۔ یہ نماز کے خلاف ہے۔

عملِ کثیر سے نماز خراب ہو جاتی ہے:

یہ عمل کثیر ہے اور عمل کثیر کے اندر علماء کا اختلاف ہے کہ بعض ائمہ کے نزدیک عملِ کثیر نماز میں جائز ہے۔ کیا معنی؟ کہ اگر ضرورت پڑ جائے تو جائز ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ عمداً کرو، وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ تم بلاوجہ بغیر ضرورت عمل کثیر کرتے رہو۔ عملِ کثیر کی تعریف کیا ہوتی ہے کہ دونوں ہاتھ کام میں لگ جائیں یا دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ نماز میں معلوم نہیں ہوتا، اگر نماز میں ہوتا تو ایسا کام نہ کرتا۔

بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ عمل کثیر سے بھی نماز ہو جاتی ہے۔ جب کوئی حاجت ہے، کوئی مجبوری ہے اور کوئی ضرورت درپیش آ گئی ہے۔ وہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور بی بی عائشہ گھر سے باہر تھیں۔ انہوں نے کنڈی کھٹکھٹائی تو حضور ﷺ نے چند قدم آگے چل کر کنڈی کھول کر، پھر چند قدم پیچھے گئے۔ اس حدیث مبارک سے انہوں نے استدلال کیا ہے۔ تو اصل میں پہلے یہ دیکھیں کہ وہ گھر کا دروازہ جہت قبلہ میں تھا۔ اگر گھر کا دروازہ قبلہ کی طرف نہ ہوا اور آدمی کا سینہ ہی قبلہ سے پھر جائے تو پھر تو نماز ہی ختم ہو گئی۔ وہ تو سب ائمہ کے نزدیک ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ میرے پاک نبی ﷺ کبھی فرض نماز گھر نہیں پڑھتے

تھے، حضور ﷺ نفل نماز پڑھ رہے تھے۔ اور جب نفل نماز ہو تو اس کے اندر بڑا توسع ہوتا ہے بہ نسبت فرض نماز پڑھنے کے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ بڑی اہم ضرورت ہے کہ ام المومنین گھر سے باہر کھڑی ہے، ضرورت درپیش آگئی ہے۔ تو اس لیے اگر کوئی ضرورت ہے، کوئی حاجت ہے تو وہاں ان کے نزدیک اجازت ہے اور بغیر ضرورت کے جیسے کہ آج کل...... اللہ رحمت کرے...... بعض آدمی نماز پڑھتے پڑھتے ٹوپی اتار کر پھینک دیتے ہیں اور بعض آدمی بلاوجہ اپنے رومال بناتے رہیں گے، بعض بلاوجہ اِدھر دیکھ لیں گے اور کبھی اُدھر دیکھ لیں گے۔ یہ تو بلاضرورت ہے اور یہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔

نماز میں ادب سے کھڑا ہونا:

جب آدمی اس مقام پر کھڑا ہو کہ "كَأَنَّكَ تَرَاهُ" اپنے خدا کو دیکھ رہے ہیں تو جب خدا کو دیکھنا نصیب ہو جائے تو ادھر ادھر نظر ہٹ نہیں سکتی۔ اگر خدا کو دیکھنا نصیب نہ ہو اور یہ یقین ہو جائے کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے۔ آپ ہائی کوٹ میں کھڑے ہوں تو آپ جج کے سامنے ہلتے ہی نہیں، جب گارڈ آف آنر ہو رہا ہوتا ہے آپ مجسٹریٹ کے آگے ہلتے ہی نہیں کہ جیسے لکڑی کے بنے ہوئے بندے ہیں، معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے اندر جان بھی ہے۔ تو اب اگر بندوں کے سامنے اتنا خشوع ہے تو نمازوں میں اللہ کے سامنے ہمارا کتنا خشوع ہونا چاہیے؟ اس لیے فرمایا: "وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ" [البقرة:۳] کہ مؤمنوں کی صفت یہ ہے کہ جو نمازوں کو قائم کرتے ہیں۔ نماز کو قائم کرنے کے یہ معنی نہیں ہے کہ سویا رہے اور جب آنکھ کھلی تو نماز پڑھ لی، یا آدمی اپنے کام کے اندر لگا ہوا ہے اور لگا ہوا ہے، اب دیکھا کہ ظہر کا وقت بالکل جا رہا ہے، پانچ منٹ باقی ہیں تو "اللّٰهُ أَكْبَرُ" کہہ کر نماز کو سر سے اتار لو، تو یہ "اقامة الصلوة" نہیں ہے۔ "اقامة الصلوة" یہ ہے کہ ارکان و شروط کے ساتھ نماز ادا کرنا۔ اگر آدمی کا وضو نہ ہو اور وہ نماز پڑھ لے، بلاوجہ قبلہ کی طرف توجہ نہ کرے تو یہ تمام چیزیں ضروری ہیں، ان کے بغیر نماز نہیں ہوگی۔ نماز تب ہوگی جب سارے شروط، ارکان اور فرائض کے ساتھ ادا کریں۔

تمام نمازیں اللہ کی ہیں:

خدا کی شان ہے کہ دیکھیں! اللہ نے نماز کے بعد سنتیں رکھی ہیں کہ ہر نماز کے بعد سنتیں ہیں اور پھر نفل ہے اور واجبات ہیں، حالانکہ فرض نماز بھی اللہ کے لیے ہے اور نفل والی نماز بھی اللہ کے لیے۔ یہ بھی لوگوں کو غلط فہمی ہے،

سمجھتے ہیں کہ شاید سنت حضور ﷺ کی نماز ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ فرض تو اللہ کے ہیں اور سنت حضور ﷺ کی اور نفل پیر کے لیے ہے۔ آخر سب کو راضی کرنا ہے ناں! یاد رکھنا! نفل بھی نماز ہے، سنت بھی نماز ہے، واجب بھی نماز ہے اور فرض بھی نماز ہے۔ اور تمام نمازیں اللہ کے لیے ہیں۔ فرمایا:

﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ [الانعام: ۱۶۲]

اللہ نے فرمایا: میرے مدنی! آپ فرمادیں کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ سنت نبی ﷺ کے لیے، یا نفل کسی اور کے لیے ہے۔ سنت کا معنی ہوتا ہے طریقہ، یعنی وہ طریقہ جو ہمیں حضور ﷺ نے بتلایا کہ عشاء کے بعد دو سنتیں پڑھنی ہیں، یہ بتلایا حضور ﷺ نے ہے۔ نفل کا معنی ہے کہ یہ زائد عبادت ہے، نافلہ ہے کہ اگر ہم پڑھ لیں گے تو اللہ ہمیں ثواب عطا فرمائیں گے، نہیں پڑھیں گے تو ہم گناہ گار نہیں ہوں گے۔ وگرنہ نماز ساری کی ساری اللہ کے لیے۔ فرائض، واجبات، سنت اور نوافل سب اللہ کے لیے ہیں۔

ہر نماز کو الگ الگ مقرر کرنے کی وجہ:

اب اللہ نے فرمایا کہ فرض پڑھو۔ اب ہم نے عشا کے چار رکعت فرض پڑھ لیے، بات ختم ہوگئی، پھر دو سنتیں علیحدہ رکھی گئیں، پھر تین وتر علیحدہ رکھے گئے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر اللہ پاک چاہتے تو فرمادیتے کہ فرض چھ رکعت پڑھو، لو پھر دو رکعت علیحدہ سنتیں اور تین رکعت وتر۔ پانچ رکعت یہ اور چار فرض تو نو (۹) ہوگئے۔ تو ایسے فرمادیتے کہ نو (۹) رکعت پڑھو تو ان کو علیحدہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ علماء نے لکھا ہے کہ یہ اللہ کا اپنے بندوں پر رحم ہے، اللہ ارحم الراحمین ہیں، یہ ان کا رحم ہے۔ میری نماز جیسا کہ پڑھنی چاہیے کوئی پڑھ سکتا ہی نہیں، اس کا حق ادا کر سکتا ہی نہیں۔ اب اس کے لیے اور تھوڑی سی سنتیں رکھ دو، واجبات اور نفل رکھ دو۔ اللہ فرمائیں گے جو فرضوں میں کمی ہے ان کو سنتوں سے پوری کرو اور سنتوں میں جو کمی ہے وہ نوافل سے پوری کرو، تاکہ میرے بندے کی نماز صحیح ہوجائے۔ اگر اس کے اندر کوئی خشوع میں کمی آگئی، خضوع میں کمی آگئی اور کوئی ادائیگی میں کمی آگئی تو بعد میں جو ہم نے سنتیں پڑھی ہیں، ان کو ڈال کر برابر کیا جائے گا۔ تو یہ اللہ کی اپنے بندوں پر خصوصی رحمتیں ہیں۔ اس لیے جو اللہ والے ہوتے ہیں وہ اسی لیے محنت کرتے ہیں کہ تہجد بھی نہ جائے، اشراق بھی نہ جائے، ضحیٰ بھی نہ جائے، اوابین بھی نہ جائے، تحیۃ الوضو بھی نہ جائے اور تحیۃ المسجد بھی نہ جائے، تاکہ ہماری نوافل اتنی زیادہ ہوجائیں کہ فرضوں کی کمی اللہ کی رحمت سے پوری ہوجائے۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں نماز اتنی اہم چیز ہے کہ اس کی کمی کے لیے باقی

ساری نمازیں رکھیں، تا کہ بندے کی نماز صحیح ہو جائے۔

پچاس کی بجائے پانچ نمازیں:

اور اس کے بعد اندازہ فرمائیں کہ نمازیں جب فرض ہوئیں تو ابتداء پچاس نمازیں فرض ہوئیں، پھر پچاس نمازوں میں سے حضور پاک ﷺ کے بار بار معافی مانگنے سے پانچ پانچ کم ہوئیں، حتیٰ کہ پانچ باقی بچیں۔ اللہ نے فرمایا: میرے مدنی محمد ﷺ! اب پانچ نمازیں رہیں گی ﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ [ق:۲۹] اللہ کا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ آپ کی امت پڑھے گی پانچ اور لکھیں گے ہم پچاس۔ ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ [الانعام:۱۶۰]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نماز:

بہر حال آپ نماز کا اندازہ فرمائیں کہ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہیں اور صفیں درست فرما رہے ہیں اور دشمن صفوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے موقع حاصل کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر خنجر کے ساتھ حملہ کیا۔ اور خنجر اتنے زور سے مارا کہ سیدنا امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کا پورا پیٹ مبارک کھول دیا، آنتیں باہر آگئیں، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ...... جو پیچھے کھڑے ہوئے تھے...... ان کو اشارہ کیا کہ آپ مصلیٰ پر آجائیں۔ تو فوراً حضرت نے وہاں کپڑا باندھ لیا اور نماز ادا کی۔ اس سے آپ نماز کی اہمیت کا اندازہ لگائیں اور صبر کا عالم دیکھیں کہ جو صحابہ پیچھے صفوں میں کھڑے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمیں پتہ ہی نہیں لگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہو رہے ہیں یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ ہو گیا ہے، یعنی پوری مسجد میں کوئی شور ہوا ہی نہیں۔ اور ہمارا خشوع بھی آپ کو یاد ہے کہ لوگ جمعہ کی نماز پڑھ رہے تھے، اچانک پانی کا ایک پائپ پھٹ گیا تو ساری مخلوق مزے سے بھاگ کر نکل گئی اور کچھ لوگ راستے میں مر گئے۔ یہ تو حرم میں نماز پڑھنے والوں کا خشوع ہے۔ اور جو ہمارے ملک میں پڑھتے ہوں گے وہ آپ خود اندازہ کر لیں۔ ایک دفعہ نماز پڑھ رہے تھے۔ زمزم کے پانی کے ڈول ہوتے ہیں، ایک کو دوسرے کے اوپر سٹاک کر دیتے ہیں کہ بعد میں بھر بھر کر ہر جگہ رکھیں گے، وہ گرا تو پلاسٹک کے ڈول تھے تو اتنی آواز پیدا ہوئی، لوگوں نے نماز چھوڑ دی اور یہ گئے اور وہ گئے...... إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ...... یہ مسلمانوں کی نماز ہے۔ ذرا آپ اندازہ کریں! اللہ پاک ہمارے حال پر رحم فرمائیں! نماز تو یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہمیں پتہ ہی نہیں لگا، صرف

ہمیں شبہ ہوا کہ آواز کچھ بدلی ہوئی ہے۔ آواز بھی تو ملتی تھی، حضرت عبداللہ بھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے، باپ بیٹے کی آواز بھی مل رہی تھی۔ جب نماز ختم ہوئی تو پھر یہ پتہ چلا کہ...... اللہ اکبر!...... اتنی بڑی بات ہوگئی، سیدنا امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوگیا ہے اور وہ کافی زخمی ہوگئے۔ بہرحال قاتل کو پکڑ لیا گیا، لیکن نماز کا اتنا بڑا مسئلہ تھا۔ [صحیح ابن حبان، حدیث: ۶۹۱۷]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں تمام گورنرز کو یہ آرڈر جاری کیے تھے کہ جس آدمی کو نوکری دینی ہو، ملازمت دینی ہو اور عہدہ دینا ہو سب سے پہلے اس کی نماز کی تحقیق کرو۔ اگر وہ نماز کے اندر پورا ہے تو اس کو نوکری دے دو۔ اگر وہ نماز کے اندر پورا نہیں ہے تو جو اللہ کا چور ہے وہ تمہارا امین کیسے بن سکتا ہے؟ جو اللہ کی عبادت میں چوری کرتا ہے تو وہ تمہارے مال کا کیسے امین بن سکتا ہے؟ یہ تو ایک اصول تھا۔

[موطا مالک، حدیث: ۶، باب: وقوت الصلاۃ]

یاد رکھیں! میں اللہ کے کعبہ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آج اگر اسلامی ملکوں میں صرف اسی چیز کا فیصلہ کرلیں تو اللہ کی رحمت سے نوے پرسنٹ بیماریاں ختم ہوجائیں گی۔ ہم ڈگری دیکھتے ہیں، لیکن نماز نہیں دیکھتے، اس کا ایمان اور اسلام نہیں دیکھتے۔ ہم اس کی دولت کو دیکھتے ہیں، لیکن اس کے ایمان اور اسلام کو نہیں دیکھتے۔ تو جب وہ کرسی پر آئے گا تو وہ سارے کام کرے گا، لیکن ایک اللہ والا کام نہیں کرے گا۔ اس لیے حکم تھا کہ سب سے پہلے اس کی نماز دیکھو کہ وہ نماز کیسے پڑھتا ہے؟ اگر نماز خشوع سے پڑھتا ہے اور نماز صحیح وقت پر پڑھتا ہے تو اعتماد کرو۔

پھر لوگ مثال دیتے ہیں کہ حضرت! ہم نے کئی نمازی دیکھے ہیں، ان کا اندر نہ پوچھو۔ ہم نے دیکھا ہے کہ صف اوّل میں نماز پڑھتے ہیں، لیکن پھر بھی ایسے ہیں۔ اصل میں بات کیا ہے کہ ایک لاکھ نمازیوں میں اگر دس چور ہیں تو اس کی مثال دیتے ہیں۔ بھائی! اگر تم نے پرسنٹیج نکالنی ہے تو یوں نکالو کہ ایک سو نمازی لے لو اور ایک سو بے نمازی لے لو۔ پھر ان کی دو سال کے لیے آزمائش کرو۔ پھر دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اب یہ نہیں کہ سارے حرم کے نمازیوں میں چار آدمی ڈھونڈ لو کہ فلاں آدمی غلط ہے۔ اور بے نمازی لاکھوں کی تعداد میں ہوں تو ان پر نظر نہ پڑے۔ یہ کوئی عدل و انصاف تو نہیں ہے۔ انصاف تب ہوگا جب برابر کا عدد آئے۔ ایک ہزار اِدھر سے ہوں اور ایک ہزار اُدھر سے ہوں، ایک لاکھ اِدھر سے ہوں اور ایک لاکھ اُدھر سے ہوں۔ پھر دیکھیں کہ نمازیوں کا پلڑا...... ان شاء اللہ!...... ہر معاملہ میں بھاری ہوگا۔

زبان سے نماز کی نیت کب کرے؟

اور اس میں یہ بات بھی یاد رکھ لیں کہ ہمارے ملکوں میں جب...... ماشاء اللہ!......نماز پڑھتے ہیں تو نیت ہی اتنی لمبی کرتے ہیں کہ امام فاتحہ پڑھ لیتا ہے اور وہ ابھی نیت کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں ایک رواج ہے۔ چار رکعت نماز عشا فرض اللہ تعالیٰ کے لیے، منہ طرف قبلہ شریف اور پیچھے اس امام کے''اللہ اکبر''۔ اتنے امام فاتحہ کے بعد سورت پر پہنچ گیا۔ ایسے موقع میں ایسی نیت کا استحضار دل میں کر کے فوراً امام کی اقتداء میں چلے جانا چاہیے۔ نیت میں نماز کی تعیین فرض ہے، مگر زبان سے کہنا ضروری نہیں۔ ہاں! جس کو وہم وغیرہ کی وجہ سے دل میں نیت کا ثبات نہ ہو تو وہ وہم سے بچنے کے لیے زبان سے کہہ لے، ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نیت کا مقام دل میں ہوتا ہے کہ اب ہم عشا کی نماز کے لیے رکے ہوئے ہیں، یہی نیت کافی ہے بس!''اللہ اکبر''۔

نماز کے کچھ آداب:

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ بعض لوگ یونہی''اللہ اکبر'' کہہ دیتے ہیں۔ نماز تو ہو جائے گی، لیکن افضل طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں کعبہ کی طرف ہوں اور کان کے برابر ہوں اور پھر''اللہ اکبر'' کہے۔ انگوٹھے کانوں کی لو کے برابر تک آ جائیں۔ یہ ضروری ہے۔ اب سینہ پر ہاتھ باندھنا بھی حدیث میں ہے، ناف پر ہاتھ باندھنا بھی حدیث مبارک میں ہے اور ناف سے نیچے باندھنا بھی حدیث مبارکہ میں ہے جو مستدرک، ابن ابی شیبہ میں باقاعدہ مذکور ہے۔ اور قیام کے اندر نظر سجدے والی جگہ پر رہے اور امام سے کبھی سبقت نہ کریں۔ ابھی امام نے''اللہ اکبر'' نہیں کہا اور ہم اس سے پہلے''اللہ اکبر'' کہہ دیں تو ہماری نماز نہیں ہوگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب امام تکبیر کہے تو تب تم تکبیر کہو، جب وہ رکوع کرے تب تم رکوع کرو، جب وہ سجدہ کرے تب تم سجدہ کرو اور جب وہ سلام پھیرے تب تم سلام پھیرو۔ امام کے پیچھے چلنا ہے، امام کی اقتداء کرنی ہے اور امام کی اتباع کرنی ہے۔ یہ نہیں کہ ہم امام سے سبقت کر جائیں۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۳۴، باب: إيجاب التكبير.....]

اگر کوئی سبقت کرے تو اتنی وعید ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی امام سے پہلے رکوع سے سر اٹھائے اللہ اس کے چہرے کو گدھے کا چہرہ بنا دے۔ اتنی سخت وعید آئی ہے!!

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۹۱، باب: إثم من رفع رأسه قبل الإمام]

فرمایا: پھر تمہارا امام بنایا کیوں گیا ہے؟ ''إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ'' اس لیے کہ تم اس کی پوری پوری اقتداء کرو۔ تو یہ نماز میں خصوصی خیال کیا کرو۔

اور ہمارے لوگ بڑی زیادتی کرتے ہیں کہ جب امام ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کہے گا تو ابھی امام کا ''وَرَحْمَةُ اللهِ'' بھی پورا نہیں ہو گا اور یہ حجراسود پر پہنچ جائیں گے۔ یہ بھی بالکل خلاف ہے۔ جب تک امام مکمل سلام نہ پھیرے تو تم بھی سلام نہ پھیرو، حتیٰ کہ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ امام دونوں طرف سلام پھیرے اب مقتدی بعد میں سلام کہے، تاکہ سبقت کا خوف ختم ہو جائے، ورنہ ایک طرف سلام پھیرنے سے بھی نماز پوری ہو جاتی ہے، لیکن احتیاط اسی کے اندر ہے کہ اب کوئی غفلت کر ہی نہیں سکے گا، اس لیے کہ اب امام نے دونوں طرف سلام پھیر لیا ہے۔

اسی طرح نماز کے اندر یاد رکھیں کہ بعض ہمارے بھائی نماز پڑھتے ہیں ''اللہ اکبر...... اللہ اکبر'' فوراً نماز نہیں ہوتی، یہ پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے۔ کیونکہ امام الانبیاء امام المتقین سید الاولین والآخرین شفیع المذنبین ﷺ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صحابی نے آ کر نماز پڑھی۔ نماز پڑھ کر آیا اور حضور ﷺ کو سلام کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اِرْجِعْ فَصَلِّ، فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ))

''جا کر پھر نماز پڑھو، تم نے گویا نماز پڑھی ہی نہیں ہے۔''

وہ گیا اور اس نے پھر نماز پڑھی اور دوبارہ آیا تو حضور ﷺ فرمایا:

((اِرْجِعْ فَصَلِّ، فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ))

دوبارہ نماز پڑھو۔ آگے ''لَمْ'' نافیہ ہے کہ بالکل تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ اس نے پھر نماز پڑھی اور پھر آیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ دوبارہ نماز پڑھو۔ اس کو تنبیہ فرمائی۔ مقصد یہ تھا کہ پہلی دفعہ سمجھ جائے گا، دوسری دفعہ سمجھ جائے گا اور تیسری دفعہ سمجھ جائے گا، لیکن وہ اللہ کا بندہ ہمارا بھائی تھا۔ چوتھی دفعہ اس نے کہا: حضور! مجھے تو اسی طرح آتی ہے اور تو مجھے نہیں آتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندے! ایسے نماز نہیں ہوتی۔ جب رکوع کرو ''حَتّٰى تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا'' رکوع میں پورا بدن ٹیڑھا ہو اور پشت سیدھی ہو اور اطمینان ہو جائے اور پھر جب سجدہ کرو تو اطمینان سے کرو۔ (یعنی حضور ﷺ نے اس کو نماز کے فرائض اور واجبات سکھائے)۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۵۷، باب: وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ لِلْإِمَامِ...]

کیا معنی ہے کہ جب رکوع میں جاؤ تو کم سے کم درجہ ہے کہ ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' تین دفعہ پڑھیں، وگرنہ

پانچ دفعہ، سات دفعہ، گیارہ دفعہ، اگر اکیلے ہوں جتنا زیادہ پڑھیں۔ تو بہر حال جو ہمارے حضرات اللہ اکبر...... اللہ اکبر کرتے رہتے ہیں اور تین دفعہ بھی ایسا پڑھتے ہیں کہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے ایک دفعہ بھی پڑھا ہے کہ نہیں پڑھا۔ یہ بات غلط ہے۔ ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' آرام سے ادا کریں اور پتہ ہو کہ آپ اپنے منہ سے کیا لفظ نکال رہے ہیں، جلدی میں نہ پڑھیں۔ پتہ لگے کہ میں اپنے رب کی تسبیح بیان کر رہا ہوں، جو اعلیٰ ہے، جس کی صفت اعلیٰ ہے، سب سے بلند ہے اور سب سے برتر ہے۔ تو اس لفظ کا ہمیں پتہ تو چلے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟ اس لیے نماز کے اندر ہمیشہ خصوصی خیال رکھا کریں۔ اسی طرح یاد رکھیں کہ نماز کو ہمیشہ جماعت کے ساتھ ادا کریں۔ جو نماز جماعت کے ساتھ ادا نہ کرے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک بکری ریوڑھ سے علیحدہ ہو جائے۔ تو جب بھی کوئی بھیڑیا حملہ کرے گا تو سب سے پہلے علیحدہ بکری پر حملہ کرے گا۔ فرمایا:

((مَنْ شَذَّ شُذَّ إِلَى النَّارِ.)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۱۶۷، باب: مَا جَاءَ فِي لُزُومِ الْجَمَاعَةِ]

''جو علیحدہ ہوا گویا جہنم میں جا پڑا۔''

فرمایا:

((فَإِنَّ يَدَ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ.)) [سنن النسائی، حدیث: ۴۰۲۰، قَتْلُ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ]

''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے۔''

اور فرمایا کہ جو عمداً جماعت کو چھوڑے گویا اس نے نماز نہیں پڑھی۔

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۷۹۳، باب: التَّغْلِيظِ فِي التَّخَلُّفِ عَنِ الْجَمَاعَةِ]

اور اسی طرح نماز مسجدوں میں ادا کرو، جماعت کے ساتھ ادا کرو اور وقت پر ادا کرو۔ یعنی اتنا حکم ہے کہ آپ مسجد میں آئے اور جماعت ہو گئی اور جماعت آپ کو نہیں ملی تو آپ نے ادھر ادھر دیکھا اور بھی کوئی ساتھ نہیں ملا تو حکم ہے کہ آدمی گھر لوٹ جائے اور اپنے بیوی بچوں کو پیچھے کھڑا کر کے خود امام بن جائے، تاکہ جماعت سے محروم نہ ہو جائے، یعنی جماعت اتنی ضروری ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جب مرضی آئے اور جہاں مرضی آئے وہاں کھڑے ہو کر اکیلے پڑھ لو۔

اسی جماعت میں برکتیں ہیں، اسی کے اندر رحمتیں ہیں۔ اسلام دین وحدت ہے، اسلام کے اندر اتفاق اور یونٹی اور آپس میں ملنے کا سبق ہے۔ تو جماعت کی اہمیت اور مسجد کی اہمیت دو باتیں یاد رکھیں۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ نماز کسی حال میں معاف نہیں ہے سفر میں بھی معاف نہیں ہے اور گھر میں بھی معاف نہیں ہے۔ حتیٰ کہ حالتِ جنگ میں جب گولیوں کی بوچھاڑ چل رہی ہو اور تیر و تفنگ ٹکرا رہے ہوں، اس وقت بھی نماز معاف نہیں ہے۔ وہاں بھی حکم ہے کہ وہاں صلوۃ الخوف ادا کی جائے، وہاں بھی ہر شکل میں نماز پڑھی جائے گی۔ اسی طرح یاد رکھیں! میری بعض بہنیں اپنی ماہواری کے دنوں میں پاک ہو گئیں، مثلاً: عصر کو، لیکن اس نے کہا کہ چلو چھوڑو! اب مغرب کے بعد غسل کروں گی۔ یہ ظلم ہے اور بہت بڑا گناہ ہے۔ جب عصر کو پاک ہو گئی تو فوراً غسل کر کے نماز ادا کرتی۔ یہ نہیں کہ اپنے غسل کو اور دو نمازوں کو بلاوجہ مؤخر کر دے۔ اس لیے ہمیشہ ان چیزوں کا لحاظ رکھیں۔

اسی طرح اگر کسی نے ایک نماز عمداً چھوڑ دی، یعنی کوئی عذر نہیں، نہ بیماری ہے، نہ کچھ، لیکن دوستوں میں بیٹھا ہوا ہے، گپیں لگا رہا ہے۔ بھائی! نماز کا ٹائم ہے۔ او جی! ٹھیک ہے، پڑھ لیں گے۔ نماز نہ پڑھی تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن القیم اور بڑے بڑے مقابلہ کے جو علماء اور ائمہ گزرے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ جو ایک نماز چھوڑ دے وہ کافر ہو جاتا ہے، چاہے مرد ہو یا عورت۔ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کا نکاح بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جب کافر ہو گیا تو نکاح ختم ہو گیا، کیونکہ نکاح تو مسلمان کا ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر عورت نے نماز نہ پڑھی تو تب بھی نکاح ٹوٹ گیا۔ مرد نے عمداً نماز چھوڑ دی تب بھی نکاح ختم ہو گیا۔ وہ فرماتے ہیں: اگر اس کے بعد توبہ نہیں کی اور رجوع نہیں کیا تو اس کے بعد اولاد زنا سے پیدا ہو گی۔ اسی حالت میں مر جائے تو اس پر جنازہ بھی نہ پڑھو اور مسلمانوں کے قبرستان میں بھی اس کو دفن نہ کرو۔ (یہ حنبلیوں کا مذہب ہے۔ ہمارا احناف کا مذہب یہ ہے کہ وہ کافر نہیں ہوتا، سخت گناہگار ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو جیل میں ڈالا جائے جب تک توبہ نہ کرے۔ مگر نکاح بھی نہیں ٹوٹتا اور وہ مسلمان ہے، مگر عمل کافروں والا کیا ہے۔ بہر حال! نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں ہے۔ امداد اللہ انور) اندازہ فرمائیں کہ ایک نماز چھوڑنے کا یہ عذاب ہے اور میرے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں لوگوں کو حکم دوں کہ نماز پڑھو اور اقامت کا حکم دوں کہ تکبیر کہو، پھر دیکھوں کہ جو لوگ جماعت میں نہیں ہیں ان کے گھروں کو میں لکڑیاں جمع کرا کر اپنے ہاتھوں سے آگ لگا دوں۔ تو جن گھروں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جلا ڈالیں گے کیا وہ سبز ہو جائیں گے؟ یعنی جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۶۴۴، باب: وجوب صلاة الجماعة]

اسی لیے صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص جماعت میں نہ ہوتا تو ہم اندازہ کر لیتے تھے کہ وہ منافق ہے یا

ہم اندازہ کر لیتے تھے کہ وہ بیمار ہے، وگرنہ یہ ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہو اور جماعت میں حاضر نہ ہو......؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اور جس جگہ نماز نہ ہو اس کے بارے میں بھی حدیث پاک موجود ہے۔ حضور ﷺ سفر میں آ رہے اور آپ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ تم نگرانی کرو، ہم تھکے ہوئے ہیں، شاید نیند آ جائے۔ تو تم نگرانی کے لیے بیٹھو، تا کہ ہماری نماز ضائع نہ ہو جائے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اونٹ کا پالان رکھ کر اس پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا کہ جب صبح صادق ہوگی تو میں فوراً اٹھا دوں گا۔ فرماتے ہیں: اللہ کی شان ہے کہ مجھے بھی نیند آ گئی اور خدا کی شان ہے کہ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم تھکے ہوئے تھے ان کو بھی نیند آ گئی اور میرے محمد عربی ﷺ کو بھی نیند آ گئی۔ اور سب سے پہلے میرے آقا ﷺ کی آنکھ کھلی تو سورج نکل چکا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بلال کو فوراً بلاؤ۔ بلال رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اچھی نگرانی کی ہے! انہوں نے عرض کیا: حضور! جس اللہ نے آپ کو سلا دیا اس نے مجھے بھی سلا دیا۔ اگر اللہ کا نبی سو گیا تو میں بھی سو گیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا جلدی کرو! اس وادی سے نکلو۔ اس وادی میں شیطان ہے، اس لیے ہماری نماز رہ گئی۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۶۸۰، باب: قَضَاءِ الصَّلَاةِ الْفَائِتَةِ]

تو جس گھر میں نماز نہ ہو تو سمجھو اس میں شیطان رہتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مسلمان کا گھر ہو اور نماز نہ ہو، یہ نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کی مسجدیں ہوں اور نماز نہ ہو اور یہ نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کا محلہ ہو اور نماز نہ ہو۔ نماز اتنی بڑی چیز ہے کہ حضور ﷺ جب جنگ کا حکم دیتے تھے اور اپنے صحابہ کو فرماتے تھے کہ صبح کے وقت میں شب خون نہ مارا کرو، انتظار کیا کرو۔ اگر بستی سے اذان کی آواز آ جائے تو اس بستی پر حملہ نہ کرنا، اگر آذان کی آواز نہ آئے تو پھر حملہ کر دینا۔ یعنی ایک مسلمان بھی اگر اذان دے دے تو پوری بستی بچ گئی۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۱۵۴۹]

تو اذان اور نماز علامتِ ایمان ہیں اور ان کا ترک کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ ہمیں إِقَامَةِ صَلٰوة نصیب فرمائے۔ خلاصۂ درس یہ ہوا کہ متقین کی پہلی صفت ایمان ہے اور دوسری صفت اقامۃ صلوۃ ہے۔ اندازہ کریں کہ اقامۃ صلوۃ اتنا ساتھ لگا ہوا ہے کہ اگر اقامۃ الصلوۃ نہیں تو گویا ایمان ہی نہیں۔ یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ ایمان ہو اور اقامۃ الصلوۃ نہ ہو۔ اس لیے فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۳]

قرآن سراپا ہدایت ہے:

آپ ابتداء میں پڑھ چکے ہیں کہ ایک جامع لفظ آ گیا ''اَلْمُتَّقِیْنَ'' کا۔ اور یہ قرآن مقدس کا اسلوب بیان ہے کہ ایک جگہ پر اجمالی طور پر بات فرماتے ہیں تو دوسری جگہ اس کی تفصیل بیان فرما دیتے ہیں۔ وہاں تو ایک جامع مانع مکمل ایک لفظ استعمال فرمایا گیا کہ قرآن سراپا ہدایت ہے، کن کے لیے؟ جو متقین ہیں۔ متقین کا لفظی معنی ہوتا ہے کہ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ چونکہ ڈرنا ہی اللہ تعالیٰ کی ہر فرمانبرداری کی بنیاد ہے۔ اب متقین کی تفصیل میں اللہ تبارک وتعالیٰ بیان فرما رہے ہیں کہ متقین کون ہیں؟ ان کو کیسے پہچانیں اتنے بڑے معاشرے کے اندر؟ تو پہلی صفت ان کی یہ ذکر کی گئی کہ ﴿الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ اور دوسری صفت اقامۃ الصلوۃ تھی۔

تفسیر:

تیسری صفت: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ﴾ ''مِمَّا'' اصل میں ''مِنْ مَا'' تھا۔ ادغام کر دیا جائے تو پڑھا جاتا ہے ''مِمَّا''۔ تو ''مِنْ'' ''تبعیض کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہم نے ان کو رزق دیا ہے اس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں۔ تبعیض کا معنی ہوتا ہے بعض۔ اور پھر فرمایا: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ کہ مؤمنین کی صفت یہ ہے کہ جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، کیونکہ رزق دینے والے اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں۔ اس میں سے بھی اللہ نے سارا نہیں مانگا کہ جو ہم نے آپ کو دیا ہے وہ سارے کا سارا آپ لٹا دیں۔ صاف بات ہے کہ ایمان بھی اللہ اور اللہ کے رسول پر لائے تو اب اقامۃ الصلوۃ یعنی عبادت بھی اللہ کی کرتے ہیں اور خرچ بھی اللہ کے راستے میں، اللہ کی فرمانبرداری میں کرتے ہیں، لیکن ''مِمَّا'' یعنی تھوڑا سا۔ اسی طرح مؤمنوں کی صفات میں ذکر کیا گیا ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ [الفرقان: ٦٧]

''ایمان والے لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے، فضول خرچی نہیں کرتے اور اللہ کی راستوں کو اختیار کرتے ہیں۔''

اور اسی طرح صفت آئی:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ [آل عمران: ٩٢]

اللہ نے فرمایا کہ نیکی کیا ہے؟ یہ کہ تم اللہ کے راستے میں وہ چیز خرچ کرو جو تمہیں محبوب ہے۔

اسی طرح فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً﴾ [البقرۃ:۲۷۴]

مؤمنوں کی صفت یہ ہے کہ دن ہو یا رات ہو، ظاہر ہو یا چھپے ہوئے ہو، ہر جگہ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرتے ہیں۔

اسی قرآن مقدس میں کئی مقامات میں فرمایا:

﴿وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ [المنافقون:۱۰]

اللہ نے فرمایا: تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو جو اللہ نے تمہیں رزق عطا فرمایا ہے۔ اس میں سے بھی کچھ تم اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ انفاق فی طاعۃ اللہ مؤمنوں کی صفت ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے راستہ میں خرچ کر رہا ہے تو وہ متقین میں سے ہے اور اگر شیطان کے راستے میں خرچ کر رہا ہے تو فاسقین اور مسرفین میں سے ہے۔ انعامات میں اللہ نے ہمیں نشانیاں دکھلائیں۔

اگر ہم کافر پر نظر ڈالیں گے، یہودی ہے، نصرانی ہے، ہندو ہے، وثنی ہے، سکھ ہے، بدھ مت ہے، ہم دیکھیں گے کہ بڑا پڑھا لکھا ہے، لیکن اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں تو پہلی صفت ہی ختم ہوگئی۔ پہلی صفت ایمان والی پائی گئی تو ہم دیکھیں گے کہ اِقَامَةُ الصَّلٰوةِ، يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ جو نمازوں کو قائم کرتے ہیں۔ اگر نماز قائم نہیں کر رہا تو سمجھیں گے کہ یہ بھی متقین میں سے نہیں بن رہا۔ اور تیسری صفت ہے ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ [البقرۃ:۳] اور خرچ کرتے ہیں جو ہم نے ان کو دیا ہوا ہے۔ اگر وہ اللہ کی اطاعت میں اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا تو ہم سمجھیں گے کہ یہ متقین کی صفت سے متصف نہیں ہوا۔ اس لیے اللہ نے صفات بیان فرمائیں۔

انفاق سے کیا مراد ہے؟

اب خرچ کرنے سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد زکوٰۃ ہے، کیونکہ یہ معاملہ ایمان کی صفتوں میں آ رہا ہے تو ایمان میں صرف زکوٰۃ فرض ہے باقی تو صدقات ہیں۔ اصل چیز تو زکوٰۃ ہے کہ جہاں بھی نماز کا حکم آیا ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ [النساء:۷۷] جہاں جہاں مؤمنوں کی صفت دیکھیں گے ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ﴾ [المؤمنون:۴] زکوٰۃ اور نماز کو اکٹھا ذکر کیا گیا۔ [ابن کثیر: ۱/۴۲، البقرۃ: الآیۃ: وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ]

زکوٰۃ کی فرضیت:

یہی وجہ ہے کہ خاتم الانبیاء ﷺ کی وفات ہوئی تو لوگوں نے زکوٰۃ سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم زکوٰۃ نہیں دیتے، حالانکہ وہ نماز بھی پڑھتے تھے اور اسلام کا اقرار، کلمہ، نماز، روزہ، ہر چیز کرتے تھے، لیکن صرف زکوٰۃ کا انکار کر دیا اور اللہ کے قرآن میں ایسی تاویل کی جو قرآنی آیات کے مخالف ہے اور حدیث رسول پاک ﷺ کے بھی مخالف ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا: وہ انسان ملحد اور زندیق ہوتا ہے کہ جو اللہ کے قرآن کے الفاظ کو اس کے معنی کے بجائے اپنے مطابق تاویل کرے کہ قرآن کا لفظ تو مان رہا ہے، لیکن اس کا ترجمہ اپنی منشا سے کر رہا ہے، اس کی تفسیر اپنی منشا سے بیان کر رہا ہے تو وہ ملحد اور زندیق ہوتا ہے۔ اس کی مثال کہ قرآن نے ہمیں حکم دیا زکوٰۃ کا، اللہ کے نبی ﷺ کو حکم ملا تھا:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۗ﴾

[التوبۃ: ۱۰۳]

میرے نبی! آپ مؤمنوں کے مال سے صدقہ واجبہ یعنی زکوٰۃ وصول کریں، تاکہ ان کے اموال بھی پاک ہو جائیں، ان کے دل بھی پاک ہو جائیں۔ پھر ان کے لیے دعا بھی کیا کریں کہ اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آپ کی دعا ان کے لیے باعثِ رحمت اور باعثِ سکون ہوگی۔

منکرینِ زکوٰۃ سے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی جنگ:

تو انہوں نے کہا کہ جب حضور ﷺ کی وفات ہو گئی تو ہمیں اب حضور ﷺ کی دعا ملتی نہیں تو ہم زکوٰۃ کیوں دیں؟ زکوٰۃ تو خاص حکم ہے۔ تو انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے بہت بڑا چیلنج ہو گیا، یعنی آپ کے لیے مسندِ خلافتِ رسول ﷺ پر بیٹھنے کے بعد سب سے بڑا چیلنج مسیلمہ کذاب تھا اور سب سے بڑا چیلنج منکرینِ زکوٰۃ تھا۔ انہوں نے کہا: ہم زکوٰۃ نہیں دیتے۔ سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجوں کو منظم کیا اور مسیلمہ کذاب سے بھی جہاد کیا، حالانکہ مسیلمہ الکذاب کا ستر ہزار کا لشکر تھا، اس سے سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ نے جنگ لڑی اور اللہ نے فتح دی، فتنہ ارتداد کو آپ نے ختم کیا اور جھوٹے نبی کا آپ نے ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دیا۔

اور جب مسئلہ منکرینِ زکوٰۃ کا پیدا ہو گیا تو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حکم جاری فرمایا کہ مسلمانو! یاد رکھو کہ جو

آدمی زکوٰۃ دینے سے انکار کرے گا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا، میں اس کے ساتھ جنگ لڑوں گا۔ وہ مسلمان نہیں ہے، وہ کافر ہے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمادیا تو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جیسے ذہین آدمی فرماتے ہیں کہ میں بھی حیران ہوگیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور عرض کیا: ''تَقْتُلُ اَهْلَ الْقِبْلَةِ؟'' قبلہ والوں سے لڑو گے جو مسلمان ہیں، کلمہ پڑھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں؟

کسی ایک بھی فرض کا انکار کفر ہے:

اسی سے مسائل سمجھ لیا کریں۔ آج کل ہمیں دھوکہ ہورہا ہے کہ ہم تو پکے مسلمان ہیں، ایک سود والا مسئلہ نہیں مانتے، باقی تو ہم پکے ہیں۔ یاد رکھیں کہ ایک مسئلہ کا انکار پوری شریعت کے انکار کے برابر ہے۔ اگر ایک آدمی پورے قرآن کا انکار کرے تب بھی کافر ہے اور اگر ایک آیت کا انکار کرے تب بھی کافر ہے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' سے ''وَالنَّاس'' تک انکار کرے، اسی طرح سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر میرے آقا سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک نبی علیہ السلام کا انکار کرے تب بھی کافر ہے اور اگر ایک لاکھ چوبیس ہزار کا انکار کرے تب بھی کافر ہے۔ جیسے اللہ کے تمام نبیوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح قرآن پاک کے تمام احکامات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور ایمان بھی ایسا کہ دل میں کوئی تنگی بھی نہ رہے اور کوئی کرکری بھی نہ رہے، گھبراہٹ بھی نہ رہے، بلکہ انشراحِ صدر کے ساتھ کہے ''اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' اللہ کا حکم ہے اور ہمارا ایمان ہے اور اس میں خیر ہے۔ بہت لمبی چوڑی بحثوں اور باریکیوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

تجارت حلال، سود حرام ہے:

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ [البقرة:۲۷۵]

اللہ نے بیع تجارت کو حلال کیا اور ربوا کو حرام کیا۔ بیع بھی عربی کا لفظ ہے اور ربوا بھی عربی کا لفظ ہے۔ اب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نکتہ بیان فرمادیا کہ ہر وہ قرض جو نفع کو کھینچے وہ ربوا ہے۔ ایک موٹی سی بات بتلادی کہ آپ نے کسی کو قرض دیا ایک ہزار اور کہا کہ مجھے ایک ہزار بیس دینا تو قرض سے زیادہ کا نفع حاصل کرنا ربوا میں آگیا۔

اسی طرح علماء نے لکھا ہے کہ مثلاً: آپ سے کسی نے دس ہزار ریال قرض لیا ہے، آپ نے قرضہ دے دیا۔ آپ سڑک پر کھڑے تھے، وہ آدمی اپنی گاڑی میں گزرا۔ اس نے کہا کہ آئیں جناب! آپ نے جہاں جانا ہو میں آپ

کو وہاں پہنچا دوں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر وہ قرضہ لینے سے پہلے بھی پہنچایا کرتا تھا پھر تو بیٹھ جائے، وگرنہ بیٹھے گا تو یہ بھی ربوا ہے کہ آپ نے قرضہ دینے کے بعد اس سے فائدہ حاصل کیا۔ اور میرے مدنی ﷺ کا فرمان ہے:

((كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفِعَةً فَهُوَ رِبٰوا)) [کنز العمال، حدیث: ۱۵۵۱۶]

"قرض پر جو فائدہ حاصل کیا جائے وہ ربوا ہے۔"

اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (حنفی تو سارے بنتے ہیں کہ حنفی ہے اور سنی ہے اور ڈیڑھ ڈیڑھ گز لمبے القاب ہیں) نے ایک آدمی کو قرضہ دیا اور قرضہ لینے کے لیے گئے تو اس وقت شدید گرمی کا وقت تھا۔ اس کے دروازے پر کنڈی کھٹکھٹائی اور ہٹ کر دھوپ میں کھڑے ہو گئے اور دس منٹ یا پانچ منٹ یا خدا جانے کچھ دیر بعد گھر والا اپنے گھر سے باہر آیا۔ دیکھا کہ امام صاحب کھڑے ہیں تو دوڑا اور بھاگا اور کہا کہ حضرت! آپ کوئی آدمی بھیج دیتے، کوئی شاگرد بھیج دیتے، آپ خود میرے دروازے پر آ گئے عین گرمی میں اور پھر دھوپ میں کھڑے ہیں، آپ دروازے کے سائے کے نیچے کھڑے ہو جاتے۔ فرمایا: "میں نے آپ سے قرضہ لینا ہے۔ اگر میں تمہارے گھر کا سایہ استعمال کروں تو قیامت والے دن مجھے خدا نہ پکڑ لے کہ میں نے نفع اٹھایا۔ تو دیوار کے سایہ سے بھی نفع اٹھانے سے میں ڈرتا ہوں کہ خدا پکڑ نہ لے۔"

اس لیے فقہا کرام نے لکھا ہے کہ جن عمارتوں میں، جن بلڈنگوں میں سود کا کاروبار ہوتا ہو اس کے سائے کے نیچے بیٹھنا بھی درست نہیں ہے، کیونکہ آپ حرام کی چیز کا سایہ سر پر رکھ رہے ہیں۔ اتنا بچنے کا حکم دیا ہے۔

بینک کا سود:

اور ہم کہیں کہ جناب! حضور ﷺ کے زمانہ کا ربوا اور تھا۔ وہ جناب ساہوکار ربوا دیتا تھا غریب کو لوٹنے کے لیے۔ اب تو ربوا دونوں طرف ہے، غریب بھی دیتا ہے اور امیر بھی دیتا ہے۔ غریب بھی اگر بینک میں پیسے رکھے تو اسے بھی ربوا ملتا ہے، یہ تو جناب جانبین سے ہے۔ حالانکہ یہ ڈبل ربوا ہے۔ پہلے ایک طرف سے یہ گناہ ہوتا تھا اور اب وہی گناہ دو طرف سے شروع ہو گیا، لیکن وہ کہتے ہیں کہ نہیں جناب! وہ ربوا اور تھا۔ اور اللہ فرماتے ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۰]

تم دو گنا، چار گنا اور دس گنا...... جیسا زمانہ جاہلیت میں لیتے تھے...... وہ نہ لو، البتہ چار پرسنٹ، سات پرسنٹ

اور دس پرسنٹ تو بڑی معمولی سی بات ہے۔ آخر دیکھو جی! بینک بھی تو چلانے ہیں، کوئی سروس چارج ہمیں بھی تو لینا ہوگا، وگرنہ یہ بینکنگ کا سسٹم کیسے چلائیں گے؟ ان تاویلات کا معنی تو یہ ہوا کہ جیسے آج کوئی آدمی کہہ دے کہ قرآن میں اللہ نے جس خنزیر کو حرام کیا ہے وہ اس زمانہ میں تھا، اب ہمارا خنزیر تو صاف ستھرا ہے۔ کتا بھی وہی حرام ہے جو حضور ﷺ کے زمانہ میں تھا، اب تو کتا کاروں میں بیٹھتا ہے، اس کا منہ چوما جاتا ہے اور اس کو نہلایا جاتا ہے، شیمپو لگایا جاتا ہے۔ وہ غلیظ کتے تھے جو گلیوں میں پڑے رہتے تھے، وہ حرام تھے۔ پھر تو اس طرح پوری شریعت بدل گئی۔

اس لیے دیکھیں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نظر کہاں پڑی؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آ کر کہا: امیر المومنین! آپ کیا کر رہے ہیں؟ وہ نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور کعبہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور حضور ﷺ آمنہ کے لال کا فرمان ہے:

((مَنْ صَلّٰى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَأَكَلَ ذَبِيحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ.))

"جو آدمی ہماری نماز کی طرح نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور ہمارے ذبح شدہ جانور کو کھائے تو وہ ہم میں سے ہے ہماری جماعت میں سے ہے۔"

[صحيح البخاري، حديث: ٣٩١، باب: فَضْلِ اسْتِقْبَالِ الْقِبْلَةِ]

تو یہ لوگ نماز بھی پڑھتے ہیں، قبلہ کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں اور ذبیحہ بھی کھاتے ہیں اور پھر آپ ان کے قتال کا حکم دے رہے ہیں کہ میں ان کے ساتھ لڑوں گا؟ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جوش میں آئے اور جلال آ گیا۔ آپ نے غصہ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سینے میں ہاتھ مارا اور فرمایا:

"أَجَبَّارٌ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَ خَوَّارٌ فِي الْإِسْلَامِ؟"

"عمر! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کفر کے زمانہ میں تو تو بڑا بہادر بنا پھرتا تھا اور اسلام کے بعد تو اتنا کمزور ہو گیا ہے؟"

جاؤ! میرے راستہ سے ہٹ جاؤ۔ اگر کوئی ایک رسی بھی زکوٰۃ میں دیا کرتے تھے، اگر اس رسی کو بھی روک لیا تو میں اس کے لیے جہاد کروں گا۔ حالانکہ رسی کوئی زکوٰۃ نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تھوڑا سا بھی انکار کیا، معمولی سی زکوٰۃ بنتی تھی وہ بھی نہیں دی تو میں قتال کروں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ڈر گیا اور میں ہٹ کر آ کر مسجد نبوی میں بیٹھ گیا اور میں سوچنے لگ گیا۔ کہتے ہیں:

"وَاللّٰهِ مَا هُوَ إِلَّا أَنْ قَدْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، فَعَرَفْتُ أَنَّهُ الْحَقُّ"

تھوڑی دیر گزری، اللہ نے میرا سینہ بھی کھول دیا جیسے اللہ نے ابوبکر کا سینہ کھولا اور میں نے جان لیا کہ یہی حق ہے۔[صحیح البخاری، حدیث:۱۳۹۹، باب: وُجُوبِ الزَّكَاةِ، مشکاۃ المصابیح، باب: مَنَاقِبِ أَبِي بَكْرٍ]

اور میں دوڑا اور کہا: ابوبکر! تجھے مبارک ہو! مجھے سمجھ آگئی ہے۔ تم حکم کرو، عمر تیرا سپاہی بن کر لڑے گا۔ بات سمجھ آگئی، تمہاری بات سچی ہے۔ کیونکہ آج اگر کوئی زکوۃ سے انکار کرے اور ہم چپ کر جائیں تو کل نماز کا انکار کر دے گا، ایک جماعت قربانی کا انکار کر دے گی، ایک جماعت حج کا انکار کر دے گی۔ یہ جی! گرمیوں کے زمانہ میں خواہ مخواہ پیسے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پچاس پچاس ہزار جمع کرو، مسکینوں کو دے دو، غریبوں کو دے دو، جو ہسپتال میں بیمار پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس پیسے نہیں ہیں اور تم حج کے لیے جا رہے ہو، کون سی عقلمندی والی بات ہے؟ اس طرح دین کا انکار ہوتا چلا جائے گا۔ اور یہ باتیں وہ کرتے ہیں جنہوں نے کبھی مریضوں کو دس روپے بھی نہیں دیے۔ مقصد صرف اسلام دشمنی ہوتا ہے۔

ایک قادیانی کا دھوکہ:

اصل میں بات سمجھ تب آتی ہے جب ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ جیسے کسی دور میں ایک قادیانی یہاں آ گیا، بڑی لمبی بات ہے۔ بہر حال پکڑا گیا۔ پولیس کے سامنے جب بات ہوئی تو اس سے پوچھا گیا کہ تم قادیانی ہو؟...... وہ سمجھدار تھا...... اس نے کہا: نہیں میں مسلمان ہوں۔ انہوں نے کہا: یہ مولوی لوگ ہیں، ان کو ہمارے ساتھ کوئی غصہ ہوتا ہے۔ جس پر بھی ناراض ہوتے ہیں کہہ دیتے ہیں کہ قادیانی ہے۔ قادیانی تو کافر ہوتا ہے، میں تو مسلمان ہوں۔ مجھے مقامِ ابراہیم سے نماز پڑھتے ہوئے انہوں نے پکڑا ہے، میں نماز پڑھ رہا تھا۔ یہ قرآن شریف کی حمائل میرے گلے میں ہے، حج کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اگر میں قبلہ کو قبلہ نہ مانتا تو میں حج کرنے کے لیے کیوں آتا؟ اب کون سی بات رہ گئی ہے میرے مسلمان نہ ہونے میں؟ تو پولیس والا یہاں کا تھا، اس کو کیا پتہ کہ یہ لوگ کیسے منطقی ہوتے ہیں؟ تو وہ حیران ہو گیا!! اس نے کہا کہ مولوی صاحبان! کیا آپ لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ آپ مسلمان کو پکڑ کر لے آئے ہو۔ ہم نے کہا کہ یہ بظاہر شریف آدمی ہے، مگر قادیانی ہے۔ اس نے کہا: یہ کلمہ پڑھ رہا ہے، اس کے گلے میں قرآن ہے اور تم نے نماز پڑھتے ہوئے تو اس کو پکڑا ہے۔ ہم نے کہا کہ آپ لمبی چوڑی بحث میں نہ جائیے، یہ تو آپ کو ان کی منطق سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ہم اس کے ملک کے بندے ہیں، ہمیں وہاں کا پتہ ہے۔ آپ اس سے یہ پوچھو کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں تمہارا کیا اعتقاد ہے؟ آپ اس سے قرآن شریف نہ سنیں، نہ آپ اس

سے حدیث سنیں اور نہ کعبہ شریف کے فضائل سنیں۔ دو لفظی بات ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو تم کیا سمجھتے ہو؟ اس نے پوچھا کہ بتلاؤ۔ تو اس نے کہا کہ وہ تو نبی تھا۔ بس بات نکل آئی۔ اس پولیس آفسر نے کہا کہ مولوی صاحب! اب تم فارغ ہو، مجھے مسئلہ سمجھ آ گیا ہے۔ اس نے پکڑ کر اس کو مارا کہ تم بے ایمان کافر، تم قرآن گلے میں کیسے ڈالے کھڑے ہو؟ تم ہمارے قرآن والے نبی کو تو مانتے ہی نہیں تو پھر تمہیں کیا حق ہے کہ تم قرآن کو گلے میں لٹکاؤ اور دھوکہ دو؟ یا تو تم اس قرآن والے نبی کو مانو اور اسی قرآن میں لکھا ہوا ہے: خاتم النبیین۔ اب تم یہاں بہانے کرتے پھرو کہ خاتم کا معنی مہر ہوتا ہے اور حضور ﷺ نے مہر لگا دی ہے اور جسے مہر لگا دیں گے وہ نبی بن جائے گا۔ اللہ کے نبی ﷺ کی اطاعت کرنے سے آدمی صدیق بن جاتا ہے تو نبی کیوں نہیں بن جاتا؟ تو ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ [النساء:۶۹] تو پھر اطاعت کرنے سے ...... معاذ اللہ...... آدمی خدا بھی بن جائے۔ یہ تو عجیب منطق ہوئی کہ پورے دین کو الٹ ڈالیں۔ اس لیے علما نے فرمایا: ﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ سے مراد زکوۃ ہے۔

تفسیر:

زکوۃ فرض ہے، اس کا انکار کفر ہے اور نہ دینا یا تساہل کرنا فسق ہے۔ اور بعض علماء کے نزدیک ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ عام ہے، اس سے مراد زکوۃ بھی ہے اور صدقۂ فطر، صدقہ واجب، ماں باپ کا خرچ بھی، بیوی بچوں کا خرچ اور مسلمان پر کسی اہم ضرورت میں خرچ کرنا، سب شامل ہے۔

[ابن کثیر:۱/ ۴۲، البقرۃ: الآیۃ: وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ]

نیکی کے کاموں میں فضول خرچی نہیں ہوتی:

(واقعہ) حضرت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو اس زمانہ میں ایک لاکھ درہم بھیجے۔ حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے پاس پیسے پہنچے تو آپ نے یوں خیرات کرنا شروع کیے کہ اس کو دے دو، اس کو بھیج دو۔ اور ایک دو دنوں کے اندر وہ سب کے سب ختم ہو گئے۔ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ ہم نے جو ایک لاکھ درہم بھیجے تھے وہ تو ایک دو دن میں ہی ختم ہو گئے تو انہوں نے حضرت کو خط لکھا:

"لَا خَيْرَ فِي الْإِسْرَافِ"

"مال کو لٹانا کوئی بھلائی کی بات نہیں ہوتی کہ آدمی بالکل لٹا دے۔"

حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو جب خط ملا تو اسی خط پر لکھ دیا:

"لَا إِسْرَافَ فِي الْخَيْرِ وَالسَّلَامِ"

"خیر کے کاموں میں فضول خرچی نہیں ہوتی (فضول خرچی ہوتی ہے برے کاموں میں)۔"

فضول خرچی کا معنی یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ کی معصیت اور نافرمانی میں خرچ کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ...... جو اللہ کے ولی گزرے ہیں...... وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں ایک کروڑ بھی خرچ کرو تو اسراف نہیں ہے اور حرام میں ایک پیسہ بھی خرچ کرو تو اسراف ہے۔

صدقہ خیرات میں اللہ کی رضا جوئی:

اور اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ ہمارے دیے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب خرچ کرتے ہیں تو مقصد صرف میری رضا ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات ذکر کیے:

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝﴾ [الدھر:۸،۹]

"مسکینوں کو کھلاتے ہیں، یتیموں کو کھلاتے ہیں، قیدیوں کو کھلاتے ہیں اور ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم جو تم کو کھلا رہے ہیں اللہ کی رضا کے لیے ہے اور کوئی مقصد نہیں، کوئی اپنی حمد وثنا نہیں۔"

اسی طرح انفاق کے بارے میں میرے آقا سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک ہے:

((أَنْفِقْ بِلَالًا وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلَالًا.))

بلال خرچ کرو اللہ کے راستہ میں، جو ہمارا عرش والا مالک ہے، اس سے رحمت کی امید رکھو، غم نہ کرو کہ ہم بھوکے مرجائیں گے، غم نہ کرو اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرو۔

[مجمع الزوائد، حدیث:۶۹۹ ۳، باب: فِي الْإِدِّخَارِ]

اور اسی طرح میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ہر دن جب سورج نکلتا ہے، آسمانوں سے اللہ کے دو فرشتے اترتے ہیں، ان کی ڈیوٹی صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ شام تک دعا کرتے رہتے ہیں، ایک کہتا ہے:

((اَللّٰهُمَّ! أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَيَقُوْلُ الْآخَرُ: أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا))

"اے اللہ! جو تیرے راستہ میں خرچ کر رہا ہے اس کو اور زیادہ عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے: جو بخل کر رہا ہے اس کا پہلا

مال بھی ہلاک و برباد کر دے (اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا خرچ کرو)۔"

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۴۴۲، باب: قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى، فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَاتَّقٰى]

اور اسی طرح قرآن نے فرمایا:

﴿وَمَآ أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ [سبا: ۳۹]

جو تم خرچ کرتے ہو میرے راستہ میں، اللہ کا فیصلہ ہے "فَهُوَ يُخْلِفُهٗ" وہ اس کا بدل دیں گے۔ جب اللہ وعدہ کر لیں کہ بدلہ دیں گے تو کیا اللہ کے وعدے میں کوئی شک ہے؟ ایک بادشاہ کو بھی آپ کوئی ہدیہ پیش کریں تو وہ بھی اچھا بدلہ دے گا، اپنی شان کے مطابق بدلہ دے گا۔ اور جو خزائن السماوات والارض کا مالک ہے، اس کے راستہ میں جب خرچ کریں گے تو وہ بھی اپنی شان کے مطابق بدلہ دے گا۔

اور آقائے نامدار خاتم الانبیاء ﷺ کی طبیعت میں بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے کتنی پیاری حدیث بیان کی! صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا تو فرمایا کہ میرے مدنی ﷺ اتنے سخی تھے کہ خاص طور پر آپ کی سخاوت رمضان کے مہینہ میں دیکھنے کے قابل ہوتی تھی، میرے مدنی ﷺ اتنے سخی تھے جیسے تیز ہوا چلتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تیز ہوا چلتی ہے تو دوست کو اور دشمن کو، اپنے کو اور پرائے کو سب کو لگتی ہے۔ تو میرے مدنی ﷺ کی خیرات بھی اپنا، پرایا، دوست اور دشمن سب کے لیے عام ہوتی تھی۔

[صحیح البخاری، حدیث: ٦، كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ؟]

اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے خادم تھے اور حضور ﷺ کے حکم پر خرچ کرتے تھے۔ ایک دفعہ قرضہ اتنا زیادہ ہو گیا کہ آپ بازار میں جا رہے تھے تو ایک یہودی دکاندار تھا، اس نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا کہ بلال! کیا بات ہے؟ اتنا عرصہ تم مال لیتے رہے ہو اور پیسے نہیں دیتے ہو۔ خبردار! اگر تم نے مجھے کل تک پیسے ادا نہ کیے تو تیرے گلے میں کپڑا ڈال کر مدینہ کے بازار میں تجھے بیچ دوں گا اور میں تمہارا سودا کروں گا اور اپنے پیسے کاٹ لوں گا اور جو تمہیں خریدے گا تم اس کے غلام بن جاؤ گے۔ تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ گھبرائے ہوئے اور ڈرے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! مجھے آج یہودی نے پکڑ لیا، قرضہ ہو گیا ہے اور پیسے نہیں ہیں اور آپ کے خزانے میں بھی نہیں ہیں کہ میں ادا کر دوں، اس لیے میں بڑا پریشان ہوں، وہ مجھے کل بیچ دے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: پھر تم نے کوئی حل سوچا ہے؟ پیسے تو میرے پاس بھی نہیں۔ اس نے کہا کہ حضور!

ایک حل میں نے سوچا ہے کہ آپ اگر اجازت دیں تو میں مدینہ شریف سے بھاگ جاتا ہوں، میں دور کہیں بستی میں چلا جاؤں گا۔ جب اللہ آپ کو پیسے دے دیں، جب آپ قرضہ اتار دیں گے اور مجھے خبر ملے گی تو میں واپس آ جاؤں گا۔ اس وقت تک میں دور رہوں گا، چھپ جاؤں گا وہ مجھے کہاں پکڑے گا؟ حضور ﷺ مسکرا دیے اور فرمایا: ٹھیک ہے، اچھا تم اپنے گھر جاؤ۔

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صبح کا وقت تھا، حضور ﷺ کا خادم پہنچا کہ حضور ﷺ بلا رہے ہیں۔ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: مسجد نبوی کے دروازے پر دو اونٹنیاں مال سے لدی ہوئی بیٹھی ہیں، وہ مال اتار لو اور اس سے قرضہ اتارو۔ جو بچے اس کو خیرات کر دو۔ یہ تھا انفاق فی سبیل اللہ۔

تیس ہزار درہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں آئے اور آپ روزے سے تھیں۔ ایک دن میں آپ نے سارا اللہ کے راستے میں تقسیم کر دیا۔ اور جب افطار کا وقت آیا تو ایک سوکھی روٹی کا ٹکڑا اور ایک پانی کا گلاس تھا۔ تو آپ کی خادمہ نے عرض کیا: یا ام المومنین! اگر ہمیں بھی کوئی دو تین درہم دے دیتیں تو ہمارے گھر میں ایک دن تو اچھا کھانا پک جاتا؟ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم نے یاد ہی نہیں کرایا۔ اگر یاد کراتی تو میں دے دیتی۔ اس لیے فرمایا کہ یہ بھی متقین کی صفت میں سے ہے اللہ کے راستے میں خرچ کرنا۔ فرمایا:

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ [البقرة:۳]

نفلی صدقات کا ثواب:

یاد رکھو! جو تم خرچ کرتے ہو اس کے دس گنا کا تم سے پکا وعدہ ہے۔ فرمایا:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾

ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں دیں گے اور اللہ تیرے اخلاص کے مطابق راضی ہو جائیں تو "سَبْعَ مِائَةِ ضِعْفٍ" سات سو گنا بھی بڑھا دیں۔ اور اگر حرم میں ہو تو ایک کا لاکھ گنا بڑھا دیں۔ اس لیے حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: حج زیادہ کیا کرو، بار بار عمرے کیا کرو۔ بار بار عمرہ کرنا دو چیزوں کو مٹا دیتا ہے:

1 ......ایک فقر کو اور غربی کو مٹا دیتا ہے۔ 2 ......اور ایک گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

[مسند أحمد بن حنبل، حديث: ۱۵۶۹۴]

زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضور پاک ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کا اپنے اہل و عیال کا خرچہ ادا کرنا ہے اس کی حیثیت کے مطابق۔ تو اس آیت میں زکوٰۃ کے نازل ہونے سے پہلے کا حکم ہے۔ جب زکوٰۃ آگئی تو وہ فرض ہوگئی۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نفقات کا معنی ہے کہ ایسے خیرات کے کام کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کی جائے، یعنی اللہ کے راستہ میں خیرات کرنا، قربانی کرنا، صدقہ کرنا۔ اللہ کا تقرب تلاش کرنا اور اس کے بعد اس میں جدوجہد کرنا، حتیٰ کہ اس کے بعد فرائض کی آیت نازل ہوگئی:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ﴾ [التوبۃ:٦٠]

جب یہ حکم آیا تو اصل یہی زکوٰۃ کا ہے، باقی سب صدقاتِ نافلہ ہیں، یعنی زکوٰۃ فرض ہے اور اسی طرح اہل و عیال کا خرچہ انسان پر واجب ہے۔ اگر والدین مسکین ہیں تو والدین کا خرچہ اولاد پر شرعاً واجب ہے۔ اور صدقہ فطر جو رمضان کے بعد ادا کرتے ہیں اور اسی طرح صاحبِ نصاب کا قربانی کرنا وہ بھی ضروری ہے۔ تو یہ ساری چیزیں ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ﴾ میں آگئیں۔ [ابن کثیر: ۱/۴۲، البقرۃ: الآیۃ: وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ]

آیت میں نفقات سے مراد:

حضرت ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ آیت زکوٰۃ کے حکم کو بھی شامل ہے اور صدقات کے حکم کو بھی شامل ہے، جمیع نفقات کو شامل ہے۔ یہ سب سے زیادہ راجح قول ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے ذمہ لگا دیا ہے کہ وہ فرائض بھی ادا کریں، واجبات بھی ادا کریں اور نفلی صدقات بھی ادا کریں، چاہے زکوٰۃ ہو یا ان لوگوں کا نفقہ جو آدمی کے ذمہ واجب ہے، جیسے بیوی بچوں کا نفقہ، یا بعض رشتہ دار غریب ہیں، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک عام ارشاد فرمایا: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ﴾

[ابن کثیر: ۱/ ۴۲، البقرۃ: الآیۃ: وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ]

دولت سے بیزاری کا فائدہ:

ایک آدمی نے آکر حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی خدمت میں اس زمانے کی سونے کی اشرفیاں پیش کیں۔

حضرت نے فرمایا کہ مجھے تو ضرورت نہیں ہے تو اس نے کہا کہ آپ طلباء میں، مسکینوں میں اور مدرسہ میں غریب طلبا میں خرچ کر دیں۔ فرمایا کہ یہ سونا ہے، میں اس کو بیچنے جاؤں، پھر اس کے پیسے لے کر آؤں، طلباء پر خرچ کروں تو اللہ نے تمہیں بھی عقل دی ہے اور دماغ دیا ہے، کوئی اندھے نہیں ہو، معذور نہیں ہو، تم خود لا کر طلباء پر خرچ کر دو۔ اب وہ بے چارہ خاموش ہو گیا، لیکن تھا وہ بھی پکا اور ضدی مرید تھا۔ جب حضرت نماز پڑھنے کے لیے گئے تو اس نے حضرت کے جوتے کے اندر رکھ دیے۔ حضرت نماز پڑھ کر جب واپس آئے تو شریعت کا حکم ہے کہ جب مسجد سے نکلتا ہو اور جوتا پہننا ہو تو پہلے جوتے کو ہلا لو، تا کہ کوئی اس کے اندر کیڑا مکوڑا، کوئی ایذا دینے والی چیز نہ بیٹھی ہو۔ جب حضرت نے سنت کے مطابق اس کو ہلایا تو جناب سونے کی گنیاں (اشرفیاں) باہر آ گئیں۔ حضرت مسکرائے اور فرمایا کہ جو لوگ اس کے پیچھے بھاگتے ہیں یہ ملتی نہیں اور جو لوگ ان کو چھوڑ کر اللہ کے بن جاتے ہیں تو جوتوں میں پڑتی ہیں۔

تو فرمایا: بھائی! ان کو اٹھا لو، مجھے ضرورت نہیں ہے۔ [ارواحِ ثلاثہ یعنی حکایاتِ اولیاء، ص: ۲۱۰]

اسلام کی بنیاد پانچ چیزیں:

(حدیث) میرے آقا ﷺ نے فرمایا: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزیں ہیں:

- ......سب سے پہلے ''شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ
- ......''وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ'' اور نمازوں کا قائم کرنا،
- ......زکوٰۃ کا ادا کرنا،
- ......اللہ کے گھر کا حج ادا کرنا،
- ......رمضان کا روزہ رکھنا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۸، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ]

اس کے بارے میں بہت ساری احادیث ہیں جو فضیلت نماز میں آئی ہیں۔

اسلام میں اَفراد کا وزن ہے:

نماز...... اسلام اور کفر کا بنیادی فرق ہے۔ اسلام میں چیز کا وزن ہے اور کفر میں عدد ہے۔ کفر میں آدمی گنے جاتے ہیں اور اسلام میں تولے جاتے ہیں۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ ساری دنیا ایک طرف اور حضرت محمد رسول ﷺ ایک طرف، لیکن کافر کہیں گے کہ نہیں! بلکہ سب کا ووٹ برابر ہے، یعنی کافروں کے زمانہ میں کوئی نبی بھی ووٹ

ڈالے تو ایک ووٹ شمار ہوگا، کیونکہ ان کے نزدیک تو ووٹ برابر ہے۔ یہ بڑی عقل والی قوم ہے اور بڑے سمجھدار لوگ ہیں کہ ان کے نزدیک عالم بھی برابر ہے اور جاہل بھی برابر ہے، کافر بھی برابر ہے اور مسلمان بھی برابر ہے، شہید بھی برابر ہے اور مردہ بھی برابر ہے، بہت بڑا لیڈر بھی برابر ہے اور گھٹیا سے گھٹیا آدمی بھی برابر ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں! وزن کرو کہ اللہ کے نبی ﷺ کے بعد ساری مخلوق میں جو مرتبہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ملا ہے اور کسی کو نہیں ملا، ان کے بعد عثمان و علی رضی اللہ عنہما کو جو مرتبہ ملا ہے وہ کسی کو نہیں ملا، ان کے بعد جو مرتبہ عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کو ملا ہے کسی کو نہیں ملا ہے اور ان کے بعد اصحابِ بدر رضی اللہ عنہم کو جو مرتبہ ملا ہے وہ کسی کو نہیں ملا۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم سونے کا پہاڑ خیرات کرو اور میرا صحابی ایک مٹھی بھر جو خیرات کرے تو تم اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۶۷۳] سونے کے پہاڑ کو بھی دیکھ لو اور ایک مٹھی بھر جو کو بھی دیکھ لو تو آج کے حساب سے چار آنے بھی نہیں بنیں گے۔ یعنی اگر صحابی چار آنے خیرات کرے اور تم جبل اُحد کے برابر سونا خیرات کرو...... یعنی کھرب ہا ڈالر بن جائیں گے...... اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، کیونکہ اس میں جو اخلاص کا وزن ہے وہ تیرے اخلاص کا نہیں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

اور وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے جو (قرآن) آپ کی طرف اترا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے اترا (تورات وغیرہ) اور وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

آسمانی کتابوں پر ایمان:

متقین کی صفات بیان کی جارہی ہیں ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ [البقرۃ: ۲، ۳] ان کی پہلی صفت تھی ایمان بالغیب، دوسری صفت آئی اقامۃ الصلوۃ اور تیسری صفت تھی الانفاق فی طاعۃ اللہ۔ اب اس آیت میں فرمایا کہ وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو اللہ نے آپ پر اتاری ہے، یعنی قرآن مقدس اور اسی طرح ان کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے جو کتابیں حضور پاک ﷺ سے پہلے انبیاء پر اللہ نے نازل فرمائیں۔ یوں سمجھیں کہ اگر کوئی کتب منزل من اللہ سابقہ کا انکار کرے تو وہ مؤمن نہیں ہوگا، کیونکہ وہ کتابیں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف انبیاء پر مختلف اوقات میں اتاریں۔ ان میں معروف اور مشہور کتابیں: تورات، انجیل، زبور، صحائفِ ابراہیم اور صحفِ موسیٰ ہیں، لیکن کتابیں سابقہ انبیاء پر

بہت زیادہ اتری ہیں، حتیٰ کہ بعض روایات میں ان کی تعداد سینکڑوں میں آئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر نازل فرمائیں ہیں، کیونکہ اگر صرف رسولوں کی تعداد دیکھی جائے تو انبیاء کی تعداد تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور ان میں جو رسول ہیں ان کی تعداد تقریباً تین سو تیرہ ہے، یعنی اصحابِ بدر کی تعداد کے مطابق ہے۔

جب اتنی تعداد میں رسول اور لاکھ سے زائد انبیاء ہیں تو یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ کتابیں بہت اتاری گئیں، ان میں سے صرف چند مشہور ہیں۔ جیسے قرآن مقدس میں بعض ملائکہ کا نام آیا ہے جو معروف ومشہور ہیں۔ ان کا اللہ نے قرآن پاک میں ذکر فرمادیا ہے۔ اس میں جبرئیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام، جہنم کے فرشتے مالک اور بادلوں کے فرشتے رعد کا نام آیا اور دیگر ملائکہ کی تعداد تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ان کی تعداد کتنی ہے؟ ملائکۃ السموات ہیں، ملائکۃ الارض ہیں اور حملۃ العرش ہیں، اسی طرح ملائکۃ الرحمۃ ہیں، ملائکۃ العذاب ہیں۔ ان کی حقیقی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

تو بہرحال بعض علماء نے ساڑھے تین سو اور بعض نے ساڑھے چار سو کا بھی قول نقل کیا ہے کہ اتنی کتابیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اتاری ہیں اور وہ تمام کتابیں برحق ہیں۔ جیسے اللہ کے قرآن پر ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ کا کلام بھی ہے اور اللہ کی کتاب بھی ہے، اسی طرح ان سابقہ کتابوں پر جو کتابیں اللہ تعالیٰ نے واقعتاً اپنے انبیاء علیہم السلام پر اتاری ہیں ان پر بھی ہمارا ایمان ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ وتمام کتب منزل من اللہ برحق ہیں، اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی ہیں۔ جیسے کہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان ضروری ہے۔ اگر ایک آدمی کسی ایک نبی کا بھی انکار کرے تو گویا وہ سارے انبیاء کا انکار کر رہا ہے، اسی طرح کوئی ایک رسول کا انکار کرے تو گویا کہ وہ سارے رسولوں کا انکار کر رہا ہے۔ تو بعینہٖ اسی طرح اگر کوئی آدمی کتب سماویہ منزل من اللہ میں سے ایک کا انکار کرے تو گویا کہ وہ اللہ کے قرآن کا بھی منکر ہے کہ اللہ کا قرآن ان کتابوں کی تصدیق کر رہا ہے۔ اللہ کا قرآن ہی ہمیں خبر دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء علیہم السلام پر بھی کتابیں اتاری ہیں تو اگر کوئی ان کا انکار کرے تو گویا وہ اللہ کے قرآن کا انکار ہوا۔ اسی طرح جب ان انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہمیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے تو اگر کوئی آدمی کسی ایک پیغمبر کا انکار کر دے تو گویا اس نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا، کیونکہ جب خبر دینے والے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ آپ کی خبر سچی ہے تو ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ جیسے ہم تمام انبیاء علیہم السلام پر اجمالاً ایمان لائیں گے کہ تمام اللہ کے نبی برحق ہیں اور اسی طرح تمام سابقہ اللہ کی

اتاری ہوئی کتابیں برحق ہیں، لیکن ہم چونکہ حضور پاک ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے والے ہیں تو ہمارے لیے واجب العمل اور واجب الاتباع شریعت محمد ﷺ کی ہے۔ یعنی ہم موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول اور اللہ کا نبی مانیں گے، تورات کو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب مانیں گے، لیکن تورات کے احکام ہمارے لیے ضروری نہیں ہیں، کیونکہ جب قرآن آ گیا تو ساری شریعتیں ختم ہوگئیں۔ ہاں! یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض احکام ایسے ہیں کو تورات میں بھی موجود تھے اور اللہ نے ان کو حضور ﷺ کے زمانہ میں باقی رکھا جیسا کہ رجم کا معاملہ ہے۔ رجم کا معاملہ تورات میں بھی موجود تھا، یعنی خدا نہ کرے! اگر کسی شادی شدہ مرد اور عورت نے زنا کیا، اس نے اقرار کرلیا، یا چار گواہوں نے دیکھا اور ثابت ہوگیا تو اس کی سزا رجم ہے۔ اور رجم کا معنی یہ ہے کہ ان کو پتھر مار مار کر مار دیا جائے گا۔ تو یہ سزا شریعت محمدی ﷺ میں بھی موجود ہے اور بعینہٖ یہی سزا تورات میں بھی موجود ہے۔

تورات اور قرآن میں مسئلہ رجم کا بیان:

حضور ﷺ کے زمانہ میں یہودیوں کا ایک مقدمہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا۔ اصل میں یہودیوں نے یہ سوچا تھا کہ شاید اسلام میں کوئی گنجائش ہوگی، اسلام میں کچھ نرمی ہوگی، کیونکہ اسلام عالمی دین ہے اور پھر اس کے لانے والے بھی رحمۃ للعالمین ہیں تو شاید اس معاملہ میں ہم یہ کہہ دیں گے کہ فیصلہ تو ہم نے اللہ کے نبی سے کرایا ہے اور ہمیں فائدہ ہو جائے گا۔ حضور ﷺ کے پاس جب وہ مقدمہ آیا تو آپ ﷺ نے پوچھا: تمہارے نبی کی شریعت میں اس معاملے کے بارے میں کیا حکم ہے؟...... تو اب انہوں نے بات کو چھپانے کی کوشش کی، کیونکہ وہ اصل میں چاہتے تھے کہ ہمارے آدمی سزا سے بچ جائیں...... انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں تو ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی ایسا گناہ ہو جائے تو ہم اس کے چہرے پر سیاہی مل لیتے ہیں اور ان کو بازاروں میں پھرا لیتے ہیں اور ان کو کچھ بید تعزیر کے طور پر مار دیے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔ حضور ﷺ نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر فرمایا: "أَعْطُوْنِي الْكِتَابَ" تم اپنی تورات لے آؤ جو تمہارے پاس موجود ہے۔ وگرنہ اس میں بھی وہ کافی ردو بدل کر چکے تھے۔ تو جب تورات کو لے کر آئے اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ فلاں جگہ کھولیں تو جب اس جگہ کو کھولا تو وہ یہودی عمداً اس آیت پر ہاتھ رکھ رہا تھا، تاکہ وہ آیت رجم نظر نہ آئے، لیکن حضور ﷺ کو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ خبر دے چکے تھے اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جو علمائے تورات تھے، جو تورات کے بہت بڑے عالم اور تورات کے بہت بڑے حافظ سمجھے جاتے تھے۔ تو حضور ﷺ نے عبداللہ

بن سلام ﷛ کے مشورہ سے دکھانے والے کو کہا: "اِرْفَعْ يَدَكَ" کہ اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔ جب اس نے ہاتھ اٹھایا تو آیت رجم موجود تھی۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۶۸۱۹، بَابُ الرَّجْمِ فِي البَلَاطِ]

بہرحال میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ رجم کا حکم تورات میں بھی موجود تھا اور اللہ کے قرآن میں بھی موجود ہے۔ تو ان احکامات پر تو ہم بالکل عمل پیرا ہوں گے، لیکن جن کا ذکر اللہ کے قرآن میں نہیں آیا تو ان پر ہم اجمالاً ایمان لائیں گے کہ اللہ کی کتابیں سب کی سب برحق ہیں، لیکن ہم تابع ہوں گے شریعتِ محمد رسول اللہ ﷺ کے۔ حضور ﷺ پر اللہ کے کروڑوں صلوۃ وسلام ہوں۔

نسخ احکام پر اعتراض وجواب:

اب بعض مستشرقین یعنی یہودی، نصرانی اور اسی طریقہ سے اعداء اسلام مسلمانوں کو پریشان کرنے کے لیے اور ان کے دل ودماغ میں شکوک وشبہات ڈالنے کے لیے ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ اگر اللہ کی اتاری ہوئی شریعت برحق ہے اور اللہ تعالیٰ "عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُور" ہیں اور اللہ تعالیٰ "علام الغیوب" ہیں تو پھر یہ کیا وجہ ہوئی کہ پہلے ایک شریعت آئی، ایک کتاب آئی، پھر اس کو منسوخ کر دیا گیا۔ پھر اس کے بعد ایک کتاب آئی، اس کے بعد اور کتاب آئی اور اس کے بعد اور کتاب آئی اور احکام بدلتے چلے گئے۔ جو تورات میں تھے وہ انجیل میں نہیں ہیں، جو انجیل میں تھے وہ تورات میں نہیں ہیں اور جو زبور داؤد میں تھے وہ ان دونوں کتابوں میں نہیں ہیں۔ تو اس تغیر اور تبدل کی کیا ضرورت تھی؟ اگر تبدل اور تغیر کی ضرورت تھی تو...... نعوذ باللہ...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کو کچھ چیزیں بھول گئیں کہ پہلے یہ نازل نہیں کیا، بعد میں اس کو نازل کیا، یا...... نعوذ باللہ...... آپ کے خدا سے غلطی ہوگئی۔ پہلے اس کو پتہ نہیں تھا کہ یہ آرڈر کب تک چلے گا اور کچھ عرصہ کے بعد یہ ناقابل عمل ہوگا کہ اس کو تبدیل کرنا پڑا۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ جب اللہ ایک ہے اوّل سے آخر تک تو یہ ساری دنیا کی ہدایت کا ذریعہ بن جاتا تو بار بار کتابوں کا تبدیل کرنا اور بار بار احکام کا تبدیل کرنا یہ عجیب بات ہے۔

(جواب) یہ محض اعتراضات ہوتے ہیں اور یہ صرف مسلمانوں کے دل ودماغ میں شکوک ڈالنے کے لیے ہے اور ان سے خاص طور پر وہ نوجوان زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو ابتداء میں سکولوں میں پڑھتے ہیں اور بعد میں کالجوں میں پڑھتے ہیں اور پھر یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں۔ اور ان میں جو پیسے والے لوگ ہیں باہر کے ملکوں کی کفار کی یونیورسٹیوں میں جا کر تعلیم حاصل کرتے ہیں تو ایسی باتیں سن کر وہ گھبرا جاتے ہیں، حالانکہ یہ بات یاد رکھیں کہ نسخ کا

یہ معنی نہیں ہوتا کہ پہلا حکم غلط ہو۔ نسخ کا مطلقاً معنی تبدیلی حکم ہے، یعنی پہلے ایک حکم تھا، اب اس حکم کو تبدیل کر کے دوسرا حکم دے دیا گیا۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہوتی ہے کہ جیسے جیسے نشوونما ہوگی اسی طرح اس میں تبدیلی عین فطرت ہوتی ہے۔ مثلاً: ایک بچہ پیدا ہوا، اس کی غذا دودھ ہوتی ہے اور جیسے جیسے وہ بڑا ہوگا تو اس کی غذا میں تبدیلی آئے گی، پھر جب دو سال کا ہو جائے گا تو پھر اور تبدیلی آجائے گی، پھر جب شباب پر پہنچ جائے گا تو اور تبدیلی آئے گی اور پھر جب بڑھاپا شروع ہوگا تو غذا تبدیل ہونا شروع ہو جائے گی۔ تو اب دنیا کا کوئی عقلمند انسان یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد جو ہمیں غذا ملی ہے ساری زندگی وہی غذا دی جاتی، تبدیل کیوں ہوگئی؟ تو یہ ایک جہالت والی بات ہے۔ جیسے ایک بچے کی نشوونما ہوتی گئی اور تقاضے بڑھتے گئے اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں اس کے لیے تبدیل فرماتے گئے۔

بعینہٖ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک مرض کے لیے ایک ڈاکٹر دوائی تجویز کرتا ہے۔ پہلے اس کو تسہیل دیتا ہے، پھر اس کو ایسی دوائیاں دیتا ہے کہ جس سے معدہ میں تقویت آئے اور اس کا نظامِ ہضم مضبوط ہو جائے۔ تو اب اگر کوئی اعتراض کرے کہ ڈاکٹر نے پہلا نسخہ بدل ڈالا تو کیا ڈاکٹر پاگل تھا؟ دراصل اعتراض کرنے والا پاگل ہوگا، کیونکہ جیسے جیسے بیمار کی طبیعت بدلتی گئی ویسے ویسے نسخے تبدیل ہوتے گئے۔ یہ نہیں تھا کہ پہلا نسخہ ہی غلط تھا۔ وہ اپنی جگہ ٹھیک تھا، لیکن جب طبیعت کے اندر تغیر اور تبدل آگیا تو اب اس کے تقاضے کے مطابق اس نسخہ میں تبدیلی کر دی گئی۔ اب حضرت آدم علیہ السلام کے بعد جب پہلی پہلی شریعت آئی تو حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت کا زمانہ تھا۔ تو اس زمانہ میں اس وقت کی ضروریات اور اس وقت کے تقاضے اور اس وقت کے حالات مختلف تھے اور حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں اور تھے۔ (حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے آئے ہیں) اسی طرح آہستہ آہستہ چلتے آئیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تقاضے اور تھے، پھر عیسیٰ کے زمانہ میں تقاضے اور تھے۔ پھر میرے آقا ﷺ کا زمانہ آیا تو اس میں حالات اور تغیر پر آگئے۔ تو جیسے جیسے انسانوں کی بہتری تھی، بندوں کی بھلائی تھی، اسی طرح اللہ نے اپنے احکامات جاری فرما دیے۔ دیکھیں کہ جو آپ کے والدین میں قوت تھی وہ آپ میں نہیں، ان کے والدین میں جو قوت، تحمل اور برداشت تھی وہ آپ کے والدین میں نہیں ہے اور اب جو آپ کے اندر ہے وہ آپ کی اولاد میں نہیں ہے۔ اور آگے جو اولادیں آئیں گی اور کمزور تر آئیں گی۔ اس لیے اللہ کے تمام کے تمام احکام برحق اور صحیح ہیں، حالات اور اپنے اپنے وقت کے مطابق ان کی ضرورت تھی اور وہ بالکل صحیح تھے اور منطبق تھے۔ جیسے جیسے

بندوں میں تغیر آتے گئے ان کے مطابق اللہ نے اپنی رحمت سے اپنے احکامات میں تبدیلی فرمائی۔

باقی رہا کہ ایک کتاب ہوتی تو اس کو بھی سمجھ لیں کہ ایک قسم کے مسائل وہ ہوتے ہیں جن کو اصولی مسائل کہا جاتا ہے اور ایک قسم کے مسائل وہ ہوتے ہیں جن کو فروعی مسائل کہا جاتا ہے۔ اصول کے جتنے مسائل ہیں وہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک ان میں کوئی فرق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو مسئلہ توحید کا حکم حضرت آدم علیہ السلام کو دیا وہی حکم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی دیا۔ اب حضور ﷺ کو بھی حکم ہے کہ اللہ سے مانگیں، اللہ ہی دینے والے ہیں اور اللہ ہی مغفرت فرمانے والے ہیں اور یہی حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [الاعراف: ۲۳]، یہی نوح نے کہا: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ﴾ اور یہ دعا میرے مدنی مصطفیٰ ﷺ نے مانگی۔

اسی سے آپ اندازہ لگائیں کہ جو اصول دین کے مسائل ہیں مثلاً: توحید کا مسئلہ ہے، نبوت اور رسالت کا مسئلہ ہے اور اسی طرح آخرت کا مسئلہ ہے، ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں، ان میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں، ان میں کسی قسم کا کوئی تعارض نہیں ہے۔ البتہ جو فروعی مسائل ہیں ان میں جیسا کہ میں نے ابھی مثال دے کر عرض کیا تھا کہ وہ عین فطرت کے مطابق ہیں، عین حالات کے مطابق ہیں، جو حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے بتائے، جو حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ نے بتلائے اور جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بتائے۔

جیسے آپ نے قرآن مقدس میں پڑھا ہے کہ جب جنوں نے میرے آقا ﷺ کی زبان مبارک سے اللہ کا کلام مبارک سنا تھا، جس کے بارے میں قرآن مقدس میں پورا واقعہ موجود ہے کہ کوئی جنوں کی جماعت گزری اور حضور ﷺ تلاوت فرما رہے تھے۔ انہوں نے سنا تو کہا:

﴿يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى﴾ [الاحقاف: ۳۰]

"اے ہماری قوم! ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو پہلے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے سنی تھی۔"

اور آج محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے سنی ہے، ان کو سمجھ آ گئی، حالانکہ وہ جن تھے، وہ انسانوں سے زیادہ عقل نہیں رکھتے، کیونکہ اشرف المخلوقات انسان ہے۔ انسان کو اللہ نے بہت بڑی عقل عطا فرمائی جنات تو ان کے تابع ہوتے ہیں، لیکن ان جنات نے قرآن سننے کے بعد فوراً یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ اسی طرح کا کلام ہے جو موسیٰ علیہ السلام سنایا کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے فوراً کہا:

﴿يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾

[الاحقاف:۳۰،۳۱]

جنات کو بھی سمجھ آ گئی کہ یہ وہی بات ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے بتائی تھی۔

اسی سے آپ اندازہ لگائیں کہ سب سے پہلی وحی جو ہمارے آقا ﷺ پر اتری اور حضور ﷺ نے جا کر ورقہ بن نوفل کو بتایا کہ ایسے ایسے واقعہ ہوا۔ایک خوبصورت چہرے والا آدمی آیا اور اس نے نماز میں آ کر مجھے حکم دیا کہ پڑھو:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝﴾[العلق:۱]

جب ورقہ بن نوفل نے سنا تو فوراً پہنچ گیا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترا کرتا تھا۔اب دیکھیں کہ ورقہ بن نوفل کو کسی نے جا کر پٹی نہیں پڑھائی تھی اور جنات کو کسی نے جا کر پٹی نہیں پڑھائی تھی کہ تم تصدیق کرو،لیکن انہوں نے حالات کو دیکھ کر اور ان آیات کو سن کر،احکامات پر نظر ڈال کر فوراً اندازہ لگالیا کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اسی طرح فرشتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی اترا کرتا تھا۔

تو اس لیے یہ کہنا کہ کتاب ایک ہونی چاہیے تو یہ بات غلط ہے۔اصلاً کتاب ایک ہے،اس میں تمام احکام اصولیہ ایک ہی ہیں۔اگر اس میں کوئی تغیر اور تبدل آیا ہے تو وہ صرف اتنا ہے جو فروعی مسائل اور فروعی احکامات میں آیا۔اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں پر یہ ذمہ داری رکھی ہے کہ وہ تمام انبیاء علیہم السلام پر بھی ایمان لے آئیں اور تمام انبیاء علیہم السلام پر جو اللہ نے کتابیں نازل فرمائیں ہیں ان پر بھی ایمان لے آئیں۔

اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ اسلام کتنا وسیع مذہب ہے کہ سب کو ماننے کا حکم دے رہا ہے کہ قرآن تمام انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کر رہا ہے اور اللہ کا قرآن تمام کتب کی تصدیق کر رہا ہے۔سوال تو یہ ہے کہ اختلاف کی بات تو تب ہو جب اللہ کا قرآن تردید کر رہا ہو۔تو تمام کتب سماویہ تمام کتب منزل من اللہ کی تصدیق کرتا ہے۔

کتاب اللہ اور کلام اللہ میں فرق:

اور اسی سے یہ اندازہ بھی فرمالیں کہ جتنی کتابیں اتری ہیں ان میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اللہ کی کتب ہیں،لیکن ان کو کلام اللہ کا درجہ نہیں ملا۔وہ سب کتاب اللہ تھیں،لیکن کلام اللہ نہیں تھیں۔کلام اللہ کا کیا معنی ہے......؟ایک ہے متکلم کلام کرے اور ایک ہے کہ آپ کو کتاب بھیجے۔جیسے آپ یہ کہیں کہ آج فلاں آدمی نے مجھے یہ کہا ہے کہ آپ پوچھیں

کہ آپ سے ملاقات ہوئی ہے؟ تو آپ کہیں کہ ملاقات نہیں ہوئی، لیکن اس نے خط میں مجھے یہ کہا ہے۔ تو خط میں لکھتا گو اس کا کلام ہے، لیکن اس کو کتاب کہا جاتا ہے، کلام نہیں کہا جاتا۔ تو موسیٰ علیہ السلام کو تورات ملی تو ان کو پوری کی پوری کتاب الواح پر لکھی ہوئی اللہ نے عطا فرمائی تو وہ کتاب اللہ تو بن گئی، لیکن تورات پڑھ کر موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے نہیں سنائی، اس لیے وہ کلام اللہ نہیں کہلا سکتی۔ اسی طرح انجیل ہے، اسی طرح زبور ہے اور اسی طرح صحائف ہیں اور سابقہ کتابیں ہیں۔ ان سب کو کتاب اللہ ہونے کا شرف تو حاصل ہے، لیکن اللہ کا کلام ہونے کا مقام ان کو نہیں ملا۔ یہ صرف قرآن مقدس کو حاصل ہے کہ یہ کتاب اللہ بھی ہے اور کلام اللہ بھی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پورا قرآن جبرئیل علیہ السلام اور جبرئیل علیہ السلام نے اللہ کے حکم کے مطابق حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر پڑھا ہے۔ تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب کا اعزاز ہے کہ اللہ نے خود کلام فرمایا، پھر جبرئیل علیہ السلام نے آکر خود حضور ﷺ کے پاس باقاعدہ ایک ایک آیت پڑھی، اللہ نے آپ کے سینہ مبارک میں اس کو جما دیا۔ یہ شرف صرف قرآن کو ملا، تورات و انجیل کو نہیں ملا۔

''نَزَّلْنَا'' اور ''اَنْزَلْنَا'' میں فرق:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾ [البقرة:۴]

اور ایک لفظ آپ نے قرآن میں بار بار پڑھا ہے کہ کہیں تو آتا ہے: ﴿اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ اور کہیں آتا ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾ [النساء:۱۷۴] اور کہیں آیا: ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [الاعراف:۱۵۷] یعنی ''اَنْزَلَ يُنْزِلُ'' کے باب میں۔

اور کہیں قرآن میں آیا ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [الحجر:۹] اور کہیں آیا: ﴿اَنْزَلْنَا﴾ اور کہیں آیا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ [القدر:۱] تو یہاں بھی ﴿اَنْزَلْنَا﴾ ہے۔ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ [البقرة:۱۸۵] اور اس میں آیا: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ [البقرة:۴]۔

تو معنی ہوتا ہے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا، کیونکہ علوم وقواعد کے اندر یہ قاعدہ ہے کہ ''كُلَّمَا زَادَ فِي الْبِنَاءِ زَادَ فِي الْمَعْنٰى'' جتنی چیز بناء میں زیادہ ہوگی تو معنی میں زیادہ ہو جائے گی۔ یعنی ایک دفعہ اس کے اوپر زبر ہے اور ایک دفعہ اس کے اوپر شد لگ گئی ہے، جیسے ایک ''قَتَلَ'' اور ایک ''قَتَّلَ''۔ تو ''اَنْزَلْنَا'' کا معنی یہ ہے کہ پورا پورا قرآن

اتار دیا جائے اور ''نَزَّلْنَا'' کا معنی ہے کہ تھوڑا تھوڑا قرآن اتارا جائے۔ تو یہ دونوں باتیں قرآن میں موجود ہیں:

❁......اللہ نے لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر ایک دفعہ پورا قرآن اتار دیا اور بیت العزت میں آکر محفوظ کر دیا۔

❁......اور پھر بیت العزت سے تیس سال کے اندر تھوڑا تھوڑا حضور پاک ﷺ پر اترتا رہا۔

مسئلہ ختم نبوت کا ثبوت:

اور اسی آیت مبارکہ سے ختم نبوت کا مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اللہ نے فرمایا: ﴿بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾ (جو اتارا ہم نے آپ کی طرف اور جو اتارا ہم نے آپ سے پہلے۔) اگر آپ کے بعد کوئی نبی ہوتا تو یہ بھی ہوتا کہ آپ کے بعد جو اتارا۔ جب بعد کا ذکر نہیں ہے اور صرف دو چیزوں کا ذکر ہے: جو ہم نے کتاب آپ پر اتاری یا آپ سے پہلے اتاری۔ آپ کے بعد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا یہ مسئلہ بھی ہمیں سمجھ آگیا کہ حضور ﷺ خاتم الانبیا ہیں، اس لیے ''لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ لَا مَعْصُوْمَ بَعْدَهُ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدَهُ وَلَا شَرِيْعَةَ بَعْدَ شَرِيْعَتِهِ وَلَا كِتَابَ بَعْدَ كِتَابِهِ'' یہ اللہ کا حکم ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بعد میں دعویٰ کرے کہ...... نعوذ باللہ!...... میں بھی نبی ہوں اور مجھ پر بھی فرشتہ اترتا ہے، جیسا کہ مسیلمۃ الکذاب نے دعویٰ کیا، اسود عنسی نے دعویٰ کیا، اسی طرح مسیلمہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی نے دعویٰ کیا کہ مجھ پر بھی وحی آتی ہے، مجھ پر بھی فرشتہ اترتا ہے اور پھر اس نے فرشتوں کے نام بھی عجیب رکھ دیے۔ کہتا ہے کہ ایک ٹیچی فرشتہ ہے، وہ مجھ پر اترا کرتا ہے۔ تو بہر حال یہ جھوٹا دعویٰ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اتارنے کے بعد کسی کتاب کے اتارنے کا ذکر ہی نہیں کیا، بلکہ یہ فرما دیا ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۗ﴾ [الاحزاب: ۴۰]

تو اس لیے یہاں بھی ارشاد ہوا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾ [البقرۃ: ۴]

اور ایمان کے بارے میں پڑھ چکے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی فرما دیا:

''يُصَدِّقُوْنَ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ''

''ایمان لاتے ہیں یعنی تصدیق کرتے ہیں جو اتارا ہم نے آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے بھی۔''

[ابن کثیر: ۱/ ۴۳، البقرۃ، الآیۃ: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ]

تفسیر:

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ﴾ [البقرۃ:۴]

"اور وہ آخرت پر یقین کرنے والے ہیں۔"

تو اب اس کے اندر ایک بات قابل غور ہے کہ ﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا تذکرہ گزر چکا ہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ﴾ [البقرۃ:۳]

جس میں ایمان بالغیب، اقامت صلوۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر تھا، اس آیت سے بھی وہی مراد ہیں۔ وہ ایمان لاتے ہیں جو ہم نے اتارا آپ کی طرف۔ یا اس سے مراد کوئی اور لوگ ہیں، اس کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد کے مفسرین کرام رحمہم اللہ کے کچھ اقوال منقول ہیں۔ جو صفتیں ہم نے پہلے پڑھی ہیں یہ بھی انہی کی صفتیں ہیں اور اس کو کہا جاتا ہے عَطْفُ الصِّفَاتِ عَلَی الصِّفَاتِ۔ جیسے ایک آدمی کے بارے میں کہیں کہ فلاں شخص نمازی بھی ہے، روزہ دار بھی ہے، حاجی بھی ہے، زکوۃ ادا کرنے والا بھی ہے، غریبوں پر بھی رحم کرتا ہے اور بڑے خلق والا ہے۔ تو اب یہ ساری اسی کی صفتیں ذکر کی جا رہی ہیں۔ صفتوں کا عطف صفتوں پر آرہا ہے۔

1 ......تو ایک قول تو یہی ہے کہ وہی لوگ مراد ہیں جو غیب پر ایمان لانے والے ہیں، نماز قائم کرنے والے ہیں، اللہ کے راستے میں خرچ کرنے والے اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اتارا گیا اس پر ایمان لانے والے ہیں، جو آپ سے پہلے کتابیں اتاری گئیں ان کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

2 ......اس بارے میں دو قول اور ہیں کہ پہلے میں خطاب اہل عرب کو تھا اور دوسرے سے مراد اہل کتاب ہیں۔

کیونکہ ہم لوگ تو پہلی کتابوں کو اجمالی طور پر مانیں گے تو گویا دونوں شریعتوں پر عمل کیا، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو لوگ غلط عقیدے پر تھے ان کا تو ذکر ہی نہیں ہے، جو صحیح معنوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتے تھے، انجیل کو اللہ کی کتاب مانتے تھے اور انجیل پر عمل کرتے تھے، انہوں نے گویا انجیل پر بھی عمل کیا اور قرآن پاک پر بھی عمل کیا، کئی نصرانی اسلام لے لائے۔ اسی طرح یہود میں جو لوگ صحیح معنوں میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، ان کی کتاب تورات پر ایمان رکھتے تھے اور پھر جب ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ملا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہ وہ پہلے تورات کے عالم تھے، پھر قرآن کے بھی عالم بن گئے۔

اس لیے قرآن نے دوسری جگہ فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ﴾ [القصص: ۵۴]

''ان کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ ثواب عطا فرمادیں گے۔''

یعنی ایک پہلے نبی پر ایمان لانے اور اس کی کتاب پر عمل کرنے کا اور ایک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور اس کی کتاب پر عمل کرنے کا۔

6 ......علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پہلے بھی مومنون العرب ہیں اور آخر میں بھی مومنون العرب ہیں اور یہ عطف الصفات علی الصفات ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

ان آیات سے یہ معلوم ہوا کہ جیسے اللہ تعالیٰ کے قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طریقہ سے سابقہ کتب منزل من اللہ پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔

تورات وانجیل اب محرف ہو چکی ہیں:

لیکن ان پر ہم ایمان اس طرح لائیں گے کہ جو کتاب اللہ نے اتاری تھی بس اس پر ہمارا ایمان ہے، اب تو وہ تبدیل ہوگئی ہیں۔ دنیا میں چار انجیل موجود ہیں، اسی طرح تورات کے اندر ردو بدل ہو گیا، یعنی اس کے الفاظ بھی بدل ڈالے گئے اور اس کے معانی بھی بدل ڈالے گئے۔ ہمارا ایمان صرف ان پر ہو گا جو اللہ نے اتاری تھیں۔

ایک شبہ کا ازالہ:

اسی طرح بعض لوگ فریب دیتے ہیں کہ جب ﴿وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ﴾ پر ایمان ضروری ہے تو پھر تو یہودی و نصرانی بھی جنت میں جائیں گے، کیونکہ ﴿وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ﴾ پر ان کا ایمان موجود ہے۔ یہ ایک فریب ہے، کیونکہ ﴿وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ﴾ اس سے پہلے ﴿بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ﴾ ہے۔ جب وہ حضور ﷺ پر اتری ہوئی کتاب پر ایمان نہیں لائے تو گویا کہ وہ اپنی کتاب پر بھی ایمان نہیں لائے، اس لیے کہ اگر ان کا تورات وانجیل پر ایمان ہوتا تو اسی تورات وانجیل کے اندر لکھا ہوا ہے کہ ایک نبی ہوں گے جن کا نام محمد (ﷺ) ہو گا۔

اس میں تو لکھا ہوا ہے ''مَوْلُوْدٌ بِمَكَّةَ'' مکہ میں پیدا ہوں گے، مدینہ کی طرف ہجرت فرمائیں گے، صدقہ کا مال نہیں کھائیں گے، ہدیہ قبول فرمائیں گے، آپ اپنی موٹی پنڈلی پر چادر باندھیں گے، آپ وضو فرمانے والے ہوں

گے اور آپ اوقاتِ صلوۃ کا بڑا خیال رکھنے والے ہوں گے۔ تو یہ ساری نشانیاں موجود ہیں اور پھر قرآن نے باقاعدہ اس بات کی تصدیق کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سارے انبیاء علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان کرتے آئے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری بعثت کے بعد جو مجھ پر ایمان نہیں لائے گا...... چاہے وہ یہودی ہے، یا نصرانی ہے...... وہ کفر پر مرے گا، اس کا خاتمہ کفر پر ہوگا۔ وہ اس وقت تک مؤمن نہیں کہلائے گا جب تک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ نہیں پڑھے گا۔

ایک نحوی نکتہ:

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ [البقرۃ:۴] "يُؤْمِنُ" میں جملہ فعلیہ آ گیا ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ [البقرۃ:۴]۔ جملہ فعلیہ تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے اور جملہ اسمیہ استمرار اور دوام پر دلالت کرتا ہے تو ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ کا معنی ہوگا کہ جو بھی اللہ کا قرآن اترا وہ ایمان لائے، پھر اترا ایمان لائے، پھر اترا پھر ایمان لائے، یعنی جب تک آیات نازل ہوتی گئیں ایمان لاتے گئے، تصدیق کرتے گئے۔ اور آخرت پر ایسا یقین ہے کہ یہ نہیں کہ ہو اور مٹ جائے، بلکہ دائمی اور استمرار ہے کہ آخرت پر ان کا ایمان، آخرت پر ان کا یقین کامل بھی ہے اور دائمی بھی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کبھی کبھی تو مانیں اور کبھی کبھی نہ مانیں، متذبذب ہو جائیں، یا شبہات میں پڑ جائیں۔ اس لیے فرمایا: ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ [البقرۃ:۴]

صرف ماننے والے اور مان کر عمل کرنے والے برابر نہیں ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صرف آخرت کا مان لینا کافی نہیں ہے، اس لیے کہ جو شخص ہر وقت آخرت کی تیاری میں لگا ہوا ہے، عبادات و اعمال کی پابندی کرتا ہے اور گناہوں سے بچتا ہے اس کو آخرت پر یقین ہے، اس کو پتہ ہے کہ دنیا میری عارضی منزل ہے۔ اس لیے اگر دنیا میں کبھی گناہ ہو جاتا ہے تو فوراً توبہ استغفار کرتا ہے۔ اور جو شخص گناہوں کی پرواہ نہیں کرتا اور عبادات کو عمل میں نہیں لاتا اس کا آخرت پر یقین نہیں ہے۔ اگر یقین ہوتا تو وہ اس طرح آخرت، قہر و حشر کے عذاب سے غافل نہ ہوتا۔

آپ نے فرمایا کہ کیا باتیں کرتے ہو؟ اللہ کے فرشتے نے صور پر منہ رکھا ہوا ہے اور نظریں اٹھائی ہوئی ہیں کہ کب حکم ہوتا ہے اور پھونک ماروں۔ تو میں کپڑے پہننے میں کیوں اپنا وقت ضائع کروں۔ تو یہ اب عین الیقین والی

بات ہے، گویا حضور ﷺ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اس مرتبہ کو یقین پہنچ گیا ہے، فرشتہ تو پھونک مارنے کے لیے تیار کھڑا ہے اور تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ⑤

''یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب تھے۔''

اس آیت مبارکہ میں ''أُولَٰئِكَ'' کا تعلق سابقہ آیات مبارکہ سے ہے۔ سورۃ البقرۃ کی ابتداء میں گزرا تھا ﴿ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ②﴾ [البقرۃ: ۲] کہ یہ کتاب ہے جو اللہ نے اتاری ہے حضور ﷺ پر یعنی قرآن مقدس اس میں کوئی ریب کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ لیکن ہدایت ان کو ہوتی ہے جو ڈرنے والے ہیں۔ پھر ان ڈرنے والوں کی صفات ذکر کی گئی ہیں۔

جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں اب ان کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ''أُولَٰئِكَ'' یعنی ''اَلْمُتَّصِفُوْنَ بِهٰذِهِ الصِّفَاتِ الْمَذْكُوْرَةِ بِالْاٰيَاتِ الْمَذْكُوْرَةِ'' جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں وہی لوگ ہدایت پر ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ⑤﴾ (البقرۃ: ۵)

اور جن کی صفتیں آپ پڑھ چکیں ہیں یہی لوگ جو فلاح پانے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کو دنیا اور آخرت کی فلاح ملنے والی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنی مخلوقات پیدا فرمائی ہیں ان میں سے جو اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار ہیں، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں ان کے لیے فلاح ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے انکار کیا، اللہ کے پیغمبروں کی تکذیب کی اور اللہ کے احکامات سے روگردانی کی ان کے لیے حرمان ہے، خسران ہے ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ﴾ وہ دنیا میں بھی نقصان میں رہے اور آخرت میں بھی نقصان میں رہیں گے۔

یہاں اللہ نے دو دفعہ ''أُولَٰئِكَ'' فرمایا، اس لیے ہدایت پر بھی وہی ہیں۔ کافروں کے بارے میں ایک جگہ آیا ہے:

﴿أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ⑰﴾ (الاعراف: ۱۷۹)

تو غفلت اور ان کو جو انعام کے ساتھ تشبیہ دی گئی وہ ایک چیز ہے اور یہاں عطف کے ساتھ لایا گیا تو یہاں یہ واضح کیا گیا کہ ہدایت علیحدہ مرتبہ ہے اور اس کے بعد جو اس پر نتیجہ مرتب ہو رہا ہے وہ علیحدہ مرتب ہے۔ اور مفسرین کے نزدیک مکرر اس لیے لایا گیا کہ انہی کے اندر اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور فلاح کو بند کر دیا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ علی استعلاء کے لیے ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے ''فُلَانٌ عَلَى الْحَقِّ...... فُلَانٌ عَلَى

الْبَاطِلِ '' تو علی استعلاء کے لیے ہے۔ تو جو لوگ ان صفات کے ساتھ موصوف ہیں گویا کہ وہ ہدایت کے اوپر مستعلی ہو چکے ہیں۔ ایک ہوتا ہے کہ ہدایت ان پر ہو اور ایک ہے کہ انسان خود ہدایت پر مستعلی ہو جائے، اس لیے قرآن مقدس کی آیات میں اگر دیکھا جائے تو مراتب ہیں:

- ...... پہلا مرتبہ انابت کا آتا ہے ﴿وَأَنِيبُوٓا إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُۥ﴾ (الزمر: ۵۴)۔
- ...... اس کے بعد ہدایت کا مرتبہ آتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جس کو چاہتے ہیں ہدایت نصیب فرما دیتے ہیں۔
- ...... اور ہدایت کے بعد استقامت کا مرتبہ ہے کہ ہدایت بھی نصیب ہو جائے اور پھر آدمی اس پر جما رہے، اس پر مستقیم ہو اور پھر متزلزل نہ ہو، اس کے اقدام میں کوئی لغزش نہ آئے تو وہ استقامت کا مرتبہ ہے۔
- ...... اور بعض علماء نے فرمایا کہ اس سے بھی ایک اعلیٰ مرتبہ ہے کہ ﴿وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾ (الکہف: ۱۴) کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں پر اپنی قدرت کاملہ سے جیسے اس کی شان کو زیبا ہے اس کو مضبوط کر دیتے ہیں اور اس کو تھام لیتے ہیں کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کے دلوں کو تھام لیں تو پھر وہاں کسی قسم کا خدشہ باقی نہیں رہتا۔

تو اس لیے فرمایا کہ جن لوگوں کی یہ صفات ہیں گویا کہ وہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور '' هُدًى '' کا معنیٰ '' هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ '' میں گزر چکا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کے تفسیری علوم:

علامہ سندھی رحمہ اللہ نے جب ہجرت کے زمانہ میں حرم مکہ میں پناہ لی ہوئی تھی اور آپ مکہ شریف میں رہتے تھے اور تقریباً بیس سال کی مدت یا اس سے کم یا زیادہ یہاں گزاری تو پہاڑ پر آپ نے ایک چھوٹا سا گھر لیا ہوا تھا اور اسی میں رہتے تھے۔ اور اتنا بڑا عالم، اللہ نے جس کو قرآن کا اور حدیث کا بڑا علم عطا فرمایا تھا کہ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، یعنی ان کو تفسیر قرآن سے بڑا تعلق تھا۔ والد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس وقت ہماری جوانی تھی اور صحت تھی اور والد صاحب خود بھی مدرس تھے۔ فرماتے ہیں کہ سورۃ التحریم سے لے کر آخر قرآن تک ہم نے ان سے تفسیر پڑھی ہے۔ جب ان کے پاس پڑھنے کے لیے جاتے تھے تو تمام تفسیریں جو اس وقت میسر آتی تھیں ان کا ہم مطالعہ کرتے تھے کہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت پر یہ لکھا ہے، ابن جریر رحمہ اللہ نے اس پر یہ لکھا ہے، قرطبی رحمہ اللہ نے اس پر یہ لکھا ہے، معالم التنزیل میں اس پر یہ لکھا ہے، جلالین رحمہ اللہ نے اس پر یہ لکھا ہے اور بیضاوی رحمہ اللہ نے اس پر یہ لکھا ہے۔ تو تمام تفاسیر کو دیکھنے کے بعد ہم حضرت کے پاس تیار ہو کر پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔ تو جب

حضرت تفسیر شروع کرتے تو معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان تمام تفاسیر کے علاوہ اللہ نے ان کو علم عطا فرمایا ہے کہ ہمیں وہ بات کسی کتاب میں میسر ہی نہیں آتی تھی، کسی تفسیر میں ہمیں وہ بات ملتی ہی نہیں تھی جو حضرت ہمیں سبق میں پڑھاتے تھے، ایسے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی الہامی تقریر ہے۔ حضرت بیٹھے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے دل ودماغ میں کوئی بات ڈال رہے ہیں اور وہ بیان کر رہے ہیں، کیونکہ وہ بات تو تفسیروں میں ملتی ہی نہیں تھی۔ فرماتے تھے کہ میں نے ایک دن جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضرت! آپ پہاڑ پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ہم دو چار آدمی آپ کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں، اگر آپ اللہ کے حرم میں مسجد الحرام میں درس دینا شروع کر دیں تو ہزاروں لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ اب پہاڑ پر چڑھ کر کون پڑھنے کے لیے آئے گا؟ کوئی ایک دو یا تین یا چار آئیں گے جن کو تفسیر پڑھنے کا شوق ہے۔ اگر آپ حرم میں ہوں گے، درس ہوگا، ہزاروں آدمی سنیں گے اور سینکڑوں طلبہ استفادہ کریں گے اور آپ کے علوم سے فائدہ اٹھائیں گے۔ تو فرماتے ہیں کہ حضرت غصہ میں آگئے اور فرمانے لگے: تم عجیب بات کرتے ہو!! اب تو پڑھنے والے بھی مر گئے اور پڑھانے والے بھی مر گئے۔ ہم نے تو اپنی زندگی گزارنے کے لیے بس یہاں پناہ لی ہوئی ہے، اللہ کے دروازے پر پڑے ہوئے ہیں اور زندگی کے دن ہیں جو ہم پورے کر رہے ہیں۔ کیا انہی لوگوں کو پڑھاؤں جو صبح کو پڑھتے ہیں اور شام کو منافقت کرتے ہیں؟ میں ان لوگوں کے پڑھانے کے لیے باقی رہ گیا ہوں؟

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی سیاسی تدابیر:

فرمایا: ہم ابھی طالب علم تھے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ نے حکم فرما دیا کہ تم نے فلاں ملک میں جانا ہے۔ اس کے بعد ہمیں ادب سے ڈر کر یہ پوچھنے کی جرات ہی نہیں ہوئی کہ حضرت کیوں جانا ہے؟ مجھے جو حکم مل رہا ہے کہ آپ فلاں ملک چلے جائیں، نہ ہوائی جہاز ہے اور نہ بحری جہاز ہے اور نہ ریل گاڑیاں ہیں اور نہ ٹکٹیں ہیں، پیدل جانا پڑے گا، کوئی کرایہ بھی ملے گا یا نہیں ملے گا۔ اور پھر جائیں گے تو کیوں جائیں گے؟ میں وہاں کیا کروں گا؟ فرماتے تھے کہ اساتذہ کا اتنا ادب تھا کہ جب شیخ نے حکم دے دیا کہ تم نے جانا ہے تو بس جانا ہے۔ یہ ہمیں پوچھنے کی جرات ہی نہیں ہوئی کہ ہم نے کیوں جانا ہے؟ حضرت! وہاں جانے کا کوئی مقصد ہے؟ تو وہ چل پڑے کہ استاد نے جب فلاں ملک جانے کا حکم دیا ہے، جو مقصد ہوگا اس کی اطلاع پہنچائیں گے۔ اس کے بعد ہم چل پڑے اور چھ مہینے پیدل سفر کرنے کے بعد منزل مقصود پر پہنچے تو وہیں آدمی انتظار میں تھا کہ حضرت کا یہ حکم ہے اور تم نے یہ

یہ کرنا ہے۔ تو وہ اطلاع ہمیں چھ مہینے پیدل چلنے کے بعد ملی تو اس کے اندر بھی حکمتیں تھیں کہ اگر حضرت بتلا دیتے کہ تم نے یہ یہ کام کرنا ہے اور ہم پکڑے جاتے تو راز نکل جاتا۔ تو اس لیے ہمیں تو بتایا نہیں اور بھیج دیا اور ہم نے جو کرنا تھا وہ دوسرے راستہ سے وہاں پہنچا دیا، تا کہ اگر خدانخواستہ انگریز پکڑ بھی لے تو ان کو تو کوئی پتہ نہیں ہوگا کہ میں کیوں جا رہا ہوں؟ وہ مار بھی ڈالیں گے تو بات تو نہیں نکلے گی۔ تو فرمایا کہ اس زمانہ میں وہ استاذ پڑھانے والے تھے اور ہم پڑھنے والے تھے اور اب نہ پڑھانے والے رہ گئے اور نہ پڑھنے والے رہ گئے۔ اور وہی لوگ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہیں۔

کامیابی کا معنی:

کامیاب کا کیا معنی ہے؟ ہم اس کو کامیاب سمجھتے ہیں جس کے پاس دولت اور دنیا کی تمام آسائشیں ہوں۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا کہ جو تم کھا رہے ہو وہ گویا ختم ہو گیا اور جو تم پہن رہے ہو وہ بوسیدہ ہو گیا۔ فرمایا: جو تم اللہ کے راستے میں دیتے ہو وہی تمہارا محفوظ ہو رہا ہے، وہی قیامت میں تمہارے کام آئے گا۔

[صحیح مسلم، حدیث:۲۹۵۸، کِتَابُ الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ]

اور جو وقت تم نے دوستوں میں گزار دیا وہ ضائع ہو گیا، جو سونے میں گزار دیا وہ بھی ضائع ہو گیا اور جو تم نے اپنی دنیا کمانے میں گزار دیا وہ بھی ضائع ہو گیا۔ تو اصل فلاح کیا ہے کہ جو وقت اللہ کے راستے میں آئے۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (البقرة:۵)

"یہی لوگ دنیا میں بھی کامیاب ہیں اور آخرت میں بھی کامیاب ہیں۔"

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ﴾ وہ اللہ کی طرف سے ایک نور پر اور ایک روشنی پر ہوتے ہیں، استقامت پر ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس پر جمے رہتے ہیں۔

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اَلْمُفْلِحُوْنَ" کا معنی کامیابی ہے۔ یعنی ان کو وہ مل گیا جو وہ چاہتے تھے اور جس شر سے بچنا چاہتے تھے اس سے بچ گئے۔ اور یہی کامیابی ہے کہ مؤمن چاہتا ہے کہ اللہ کی رضا مل جائے اور شیطان کے شر سے بچ جائے۔ جب اس نے اپنے اندر یہ صفات پیدا کر لیں تو اس نے مقصود حاصل کر لیا۔ جب

مقصود حاصل کر لیا تو کامیاب ہو گیا۔

علامہ ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ ﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ کا اشارہ مؤمنین اہل الکتاب کی طرف ہے، جو اہل کتاب میں سے ایمان لائے جن کی صفت اللہ نے قرآن میں بیان کی: ﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ﴾ (البقرۃ: ۴) جیسا کہ آپ پہلے اس کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ مؤمنین عرب کی طرف اشارہ ہے، دوسرا قول کہ مؤمنین اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ﴾ یہ ماقبل سے منقطع ہوگا اور مبتدا ہوگا اور اس کی خبر ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ہوگی۔ ﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ (البقرۃ: ۳) علیحدہ ہے۔ اصل قول یہی ہے کہ یہ سب کے لیے ہے، چاہے وہ مؤمن عرب کے ہوں یا وہ مؤمن اہل کتاب کے ہوں، جیسا کہ سدی نے ابی مالک سے، انہوں نے ابی صالح سے، انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور اسی طرح اصحاب رسول رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں فریقوں کو، یعنی مؤمن عرب اور مؤمن اہل کتاب کو ﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ میں جمع کر دیا ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ پہلی جو صفتیں ہیں مؤمن اہل عرب یا مؤمن اہل کتاب کے لیے علیحدہ خاص نہیں، بلکہ تمام مؤمنین کے لیے ہیں کہ جیسے اہل کتاب اپنے پیغمبر علیہ السلام پر بھی ایمان لائے اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے، تو ہم بھی اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ایمان لائے اور پہلی کتابوں پر بھی ایمان لائے۔ لہٰذا یہ صفت عام ہے اور تمام مؤمنین کے لیے آئی ہے ﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ یہ نہیں ہے کہ یہ جملہ صرف اہل کتاب کے لیے ہو اور مؤمنین اہل عرب کے لیے نہیں ہے۔

[ابن کثیر: ۱/ ۴۴، الآیۃ: أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

"یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! إِنَّا نَقْرَءُ مِنَ الْقُرْآنِ فَنَرْجُوْا"

ہم قرآن پڑھتے ہیں تو ہمیں امید ہو جاتی ہے کہ ہم بھی جنت میں جائیں گے، ہم بھی کامیاب ہوں گے، یعنی جب آیات رحمت پڑھتے ہیں تو ہمیں امیدیں لگ جاتی ہیں۔

''وَ نَقْرَءُ مِنَ الْقُرْآنِ فَنَكَادُ أَنْ نَيْأَسَ''

اور ہم قرآن پڑھتے ہیں اور قریب ہوتا ہے کہ ہم بالکل ناامید ہو جائیں۔ جب ہم آیاتِ عذاب اور آیاتِ وعید پڑھتے ہیں تو ہم گھبرا جاتے ہیں کہ پتہ نہیں کہ ہمارا کیا ہوگا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں اور جہنم والے کون ہیں؟ جب صحابہ نے پوچھا کہ حضور ہمیں بتلائیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: سورۃ البقرۃ پڑھو ﴿الٓمٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ ...... وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞﴾ [البقرۃ:۱تا۵] حضور ﷺ نے فرمایا کہ جن میں یہ صفتیں پائی جائیں وہ جنت والے ہیں: جو غیب پر ایمان لائیں، نمازیں قائم کریں، اللہ کے راستے میں خرچ کریں اور جو اللہ پاک نے اپنے پیغمبر پر اتارا ہے اس پر ایمان لائیں اور جو پہلے پیغمبروں پر کتابیں اتاری گئیں ان سب پر بھی ایمان لے آئیں تو یہی لوگ ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں اور یہی لوگ اہل جنت ہیں۔ اور اس کے بعد فرمایا: اس کے آگے پڑھو۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞﴾
[البقرۃ:۶،۷]

ان آیات میں فرمایا: ''هٰؤُلَاءِ أَهْلُ النَّارِ'' یہی لوگ ہیں جو جہنم والے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! دعا فرمائیں کہ اللہ پاک ہمیں اہل جنت میں سے بنائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ سے لے کر ﴿عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ تک اہل نار ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا: کیا ہم ان میں سے نہیں ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! یہی بات ہے آپ لوگ اہل جنت ہیں۔

[ابن کثیر: ۱/ ۴۴، ۴۵، الآیۃ: اُولٰٓئِكَ عَلٰي هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ...]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞

''بے شک جو لوگ کافر ہو گئے ان کے لیے برابر ہے چاہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞

''اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا (دائمی) عذاب ہے۔''

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝۶﴾ [البقرۃ:۶]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "كَفَرُوْا" کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے حق کو چھپا دیا۔ اصل میں کفر کا معنی ہوتا ہے چھپانا، اسی مادہ سے مکفرات بھی استعمال ہوتا ہے۔ تو کفر کا معنی ہے حق کو چھپا دینا، حق پر پردہ ڈال دینا اور حق کو نہ ماننا اور انکار کرنے کا معنی بھی یہی ہے، حق کا انکار کر دینا، حق کو چھپا دینا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے "سَتَرُوْا" اور فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ ان کی موت کفر پر ہوگی۔ "سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ إِنْذَارُكَ وَ عَدَمُهُ إِنَّهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِمَا جِئْتَ بِهٖ" ان کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، یہ ہرگز اس چیز پر ایمان نہیں لائیں گے جو آپ لائے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے۔ "سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ" ان کے لیے برابر ہے، آپ کے لیے برابر نہیں ہے، کیونکہ آپ کو تو ڈرانے کا ثواب ملے گا۔ یہاں بھی لفظ آیا ہے ﴿سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝۶﴾ [البقرۃ:۶] اور سورۂ یٰسین میں بھی آیا ہے ﴿وَسَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝۱۰﴾ [یٰس:۱۰]

خوف اور انذار میں فرق:

قرآن مجید میں انبیاء کے تذکرہ کے ساتھ اِنذار کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسے: ﴿ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ (البقرۃ:۶)، اسی طرح ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا۝۴۵﴾ (الاحزاب:۴۵) کہ اللہ نے پاک پیغمبر ﷺ کو "بَشِیْرٌ" مومنین کو خوشخبری سنانے والا "نَذِیْرٌ" منکرین کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ تو "نَذِیْرٌ" "أَنْذَرَ یُنْذِرُ" کا معنی ہوتا ہے ڈرانا اور اسی طرح عربی کے اندر ایک اور لفظ استعمال ہوتا ہے "تَخْوِیْفٌ" خوف سے۔ اس کا معنی بھی ہوتا ہے ڈرانا، لیکن تخویف اور انذار میں ایک بڑا لطیف فرق ہے۔ ایک ہوتا ہے کسی کو خوفناک کر دینا، کسی کو خوف دلانا، کسی کو ڈرانا۔ اور ایک ہوتا ہے انذار، وہ ڈرانا ایسے ہے جیسے آپ کسی دشمن کو بھی دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے تو اس میں آپ کو خوف آئے گا، آپ سانپ کو دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے، اسی لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ جو آپ کے ہاتھ میں ہے اس کو زمین پر ڈالو۔ جب انہوں نے ڈالا تو وہ سانپ بن گیا تو اب موسیٰ علیہ السلام ڈر کے مارے دوڑے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿خُذْهَا وَلَا تَخَفْ﴾ [طٰہٰ:۲۱]

یہاں لفظ خوف ہے۔ اللہ نے یہ نہیں فرمایا "خُذْهَا وَلَا تُنْذِرْ" کیونکہ وہ خوف عدو کی وجہ سے تھا۔ اور ایک

ہوتا ہے انذار اور یہ وہ ڈرانا ہوتا ہے جس میں رحمت اور مودت بھی شامل ہو، یعنی اس لیے ڈرا رہے ہیں، تا کہ آپ کا فائدہ ہو۔ باپ اپنے بیٹے کو ڈراتا ہے کہ یہ کام نہ کرو، استاذ اپنے شاگرد کو ڈراتا ہے کہ بھائی اتم غفلت نہ کیا کرو۔ اس میں ایک محبت بھی شامل ہوتی ہے۔ اصل میں اس کا فائدہ مطلوب ہوتا ہے کہ بیٹے کو نقصان نہ پہنچے، میرے شاگرد کو نقصان نہ ہو کہ وہ جاہل نہ رہ جائے۔

انبیاء ﷷ بھی جو ڈرانے کے لیے آتے ہیں اس ڈرانے کے پیچھے بھی ایک رحمت کا جذبہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ بے چارے جہنم میں نہ چلے جائیں، آگ میں نہ جل جائیں، یہ کافر بننے کے بعد دنیا اور آخرت کا نقصان نہ اٹھائیں۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ انبیاء ﷷ کو نذیر بنا کر بھیجتے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال ایسے ہے کہ جیسے کوئی اڑنے والے پرندے آگ میں گر رہے ہوں اور کوئی آدمی کپڑا لے کر ان کو ہٹا رہا ہو کہ آگ میں نہ جل جائیں تو اس سے اس کا مارنا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کے دل میں ان کو آگ سے بچانا مقصود ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہاری مثال بھی ایسی ہی ہے کہ تم جہنم میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمہیں کھینچ کھینچ کر نکال رہا ہوں۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۸۳، باب: الانتہاء عن المعاصی]

اس لیے انبیاء ﷷ کے لیے جہاں جہاں بھی قرآن میں لفظ آئے گا وہاں آئے گا نذیر۔ ﴿ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ﴾ (البقرۃ:۶)

علامہ ابن کثیر ﷫ فرماتے ہیں کہ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝﴾ (یونس:۹۶)

''بیشک جن لوگوں کے بارے میں تمہارے رب کی بات طے ہو چکی ہے (کہ وہ ایمان نہ لائیں گے یقیناً) وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

﴿وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۴۵)

''اور اگر آپ (ان) اہل کتاب کے سامنے (دنیا بھر کی) تمام دلیلیں پیش کر دیں تب بھی یہ (کبھی) آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں گے۔''

ان آیات سے مقصود یہ ہے کہ حضور ﷺ غمگین نہ ہوں۔ کیونکہ حضور ﷺ بڑے رؤف رحیم ہیں۔ جب کافر

اسلام نہیں لاتے تھے تو حضور ﷺ کو بڑا رنج ہوتا تھا، آپ ﷺ کے دل پر یہ بات گراں گزرتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے نبی! آپ غم نہ فرمائیں۔ جن کے مقدر میں ہم نے بدبختی لکھ دی ہے وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے اور جن کے ذمہ ہم نے ہدایت لکھ دی ہے وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں کافر سے مراد وہ ہے جو انکار کرے اس کا جو اللہ نے اتارا ہے، وہ کہتے رہیں کہ ہم ایمان لائے ان پر جو آپ سے پہلے کتابیں اتری ہیں۔

[ابن کثیر: ۱/ ۵۳، الآیۃ: أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ]

اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں آتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص میرے آنے کے بعد مجھ پر ایمان نہیں لے آتا وہ کافر ہے۔ یعنی وہ لاکھ دعویٰ کرتا پھرے کہ میں موسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہوں، عیسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہوں، لیکن اللہ نے قرآن میں حضور ﷺ کے بارے میں فرمایا کہ جو آپ پر ایمان نہیں لاتا وہ بھی کافر ہے۔

جس کی تفسیر خود قرآن میں موجود ہو، جس کی تفسیر فرمانِ رسول ﷺ میں موجود ہو، اس میں کسی اور تفسیر کی طرف نہیں جا سکتے۔ ایک وہ لفظ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے اس کا ترجمہ بیان نہیں فرمایا، اس میں تو دو باتیں ہو سکتی ہیں، لیکن جس آیت کا ترجمہ خود حضور ﷺ نے بیان فرما دیا اب اس کے اندر دو باتیں ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور وہ لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ دیکھو! ان کے اندر بھی تو اختلاف ہے۔

ائمہ مجتہدین کے درمیان فروعی اختلاف:

جب کسی ایک مسئلہ میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کچھ اور فرماتے ہوں، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کچھ اور فرماتے ہوں، امام شافعی رحمہ اللہ کچھ اور فرماتے ہوں اور امام مالک رحمہ اللہ کچھ اور فرماتے ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس مسئلہ کے قرآن وحدیث میں صراحتاً کوئی معنی متعین نہیں ہوا۔ یاد رکھیں کہ جو باتیں قرآن وحدیث میں صراحتاً بیان ہو چکی ہیں ان میں تمام ائمہ کرام کبھی بھی اختلاف نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر: نماز عشاء ہے، اس کی کتنی رکعت ہیں؟ چار ہیں۔ کبھی کسی امام نے یہ نہیں کہا کہ تین رکعتیں ہیں۔ اور مغرب کی نماز کی تین رکعت ہیں، کبھی کسی نے نہیں کہا کہ چار رکعتیں پڑھو۔ فجر کی نماز میں دو رکعتیں ہیں، کبھی کسی امام کا یہ قول نہیں ملے گا کہ تین رکعتیں پڑھیں۔ جو چیزیں نص قطعی سے یا احادیث متواترہ مشہورہ سے ثابت ہیں اور جو قطعی الثبوت ہیں، ان میں ائمہ کا کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔ ائمہ کا اختلاف کہاں ہوتا ہے؟ جہاں مسئلہ قرآن میں بھی نہیں ملا، حدیث رسول ﷺ میں بھی نہیں ملا

اور صحابہ سے بھی ہمیں کوئی چیز معلوم نہیں ہو رہی، اب مسئلہ میں اختلاف کی صورت آتی ہے۔ تو اب مجتہدین اجتہاد فرماتے ہیں، وہ بھی قرآن وسنت کی روشنی میں اجتہاد کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی پر صحابہ ﷢ کا بھی عمل تھا۔ جب ان کو کوئی قرآن وحدیث میں نہیں مل رہا ہوتا تھا تو کبھی سارے صحابہ بیٹھ کر ایک بات کا فیصلہ کرتے تھے اور انفرادی طور پر اس مسئلہ کو حل کرتے تھے۔

تو جہاں یہ بات ہوتی ہے کہ وہ احایث مبارکہ مل جاتی ہیں جن احادیث میں اختلاف ہوتا ہے تو وہاں مسائل میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے۔ مثلاً: ایک حدیث میں آیا کہ حضور پاک ﷺ ظہر کے نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے اور ایک حدیث مبارکہ میں آیا کہ حضور ﷺ چار رکعتیں پڑھتے تھے تو اب دونوں فرمانِ رسول ہیں، دونوں افعالِ رسول ہیں۔ تو بعض ائمہ نے دو رکعت والی حدیث کو لے لیا، ظہر سے پہلے بس دو رکعت سنت ہیں، اس کے علاوہ چار رکعت سنت نہیں ہیں، بعض ائمہ نے اس چار رکعت والی حدیث کو لے لیا۔ اب دونوں راستہ سے نہیں ہٹے، دونوں نے حدیث رسول ﷺ پر عمل کیا۔ تو اس لیے اگر کوئی مثال دیتا ہے کہ ائمہ میں اختلاف ہے تو جواب یہ ہے کہ ائمہ میں کبھی بھی اصول میں اختلاف نہیں ہوتا، قرآن وحدیث سے جو مسئلہ ثابت ہو جائے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اگر کہیں کوئی اختلاف ہوتا ہے تو اولی اور افضل اور غیر افضل کا ہوتا ہے۔ کسی امام کو حدیث مبارکہ پہنچی نہیں ہوتی یا کسی امام کو پہلی حدیث پہنچی ہے اور حدیث ناسخ نہیں پہنچی ہے، دوسرے امام کو وہ ناسخ حدیث پہنچ گئی۔ تو تمام ائمہ اربعہ برحق ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں فرمائے، انہوں نے جو دین کی خدمت کی ہے اللہ تعالیٰ اس کو اور زیادہ قبول فرمائیں اور ہمیں ان کا احترام اور ادب اور ان کے علم سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائیں۔

موجودہ اختلافات:

تو اس لیے ہمیشہ یاد رکھا کریں! یہ باطل فرقے بڑے دھوکے دیتے ہیں۔ دیکھو! ان میں تو آپس میں جھگڑا، ان میں تو آمین میں جھگڑا ہے، حالانکہ کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ آمین تو دونوں کہتے ہیں، جھگڑا تو زور سے کہنے یا آہستہ کہنے میں ہے۔ یہ بھی حدیث موجود ہے، وہ بھی قرآن کی آیت موجود ہے، حالانکہ آمین کا تو کوئی مخالف نہ ہوا، بس اختلاف یہ ہوا کہ آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ سے کہی جائے۔ بعض نے کہہ دیا کہ زور سے کہنے میں زیادہ ثواب ہے اور بعض نے کہا آمین چونکہ دعا ہے اور دعا جتنی آہستہ کی جائے اتنی اللہ کے ہاں قبول ہوتی ہے۔ تو اب

دونوں کا استنباط قرآن اور حدیث محمد مصطفیٰ ﷺ سے ہے۔

خاتم النبیین کا صحیح معنیٰ کیا ہے؟

لیکن جب لوگوں نے اللہ کے قرآن کے خلاف تاویل کی کہ قرآن نے کہا کہ خاتم النبیین، انہوں نے کہا کہ خاتم کا معنیٰ ہے مہر اور مہر کا معنیٰ یہ ہے کہ جب تک حضور ﷺ کی مہر لگتی جائے گی نبی بنتے چلے جائیں گے۔ تو اب انہوں نے یہ ترجمہ کیا، حالانکہ اگر مہر کا معنیٰ لیا جائے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تحریر ختم ہو تو وہاں مہر لگ گئی، جب لفافہ بند ہو تو وہاں مہر لگ گئی، اب نہ اندر کی چیز باہر آئے گی اور نہ باہر کی چیز اندر جائے گی۔ تو مہر بھی تو ختم کرنے والی ہوتی ہے۔ جب اللہ نے آپ کو ختم بنا دیا تو آپ پر آ کر نبوت ختم ہو گئی اور اس کا ترجمہ حضور ﷺ نے خود کر دیا:

((أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَلَا نَبِيَّ بَعْدِي.)) [الترمذی، حدیث:۲۲۱۹، باب: ما جاء لا تقوم الساعة حتی...]

''میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔''

فرمایا:

((أَنَا خَاتَمُ الْأَنْبِيَاءِ.)) [المستدرک علی الصحیحین، ۸۳۹۰، کتاب: الفتن والملاحم]

''میں انبیاء کے آخر میں آیا ہوں۔''

اور تم پر امت ختم ہو گئی۔ تمہارے بعد امت کوئی نہیں اور میرے بعد نبی کوئی نہیں۔ جب میرے مدنی پاک ﷺ نے اتنی واضح بات سمجھا دی تو اب اس میں کوئی تاویل کرے، کوئی تحریف کرے، کوئی اس میں تبدیلی کرے تو اس کے کفر میں کسی کو شک نہیں ہو گا۔ اس لیے فرمایا کہ جو اللہ نے قرآن اتارا اگر کوئی اس کا انکار کرے تو کفر ہے اور جو قرآن وحدیث میں میرے مدنی پاک ﷺ کا کھلا فرمان ہے، اس کے اندر اپنی طرف سے تحریف وتبدیلی کرے تو وہ بھی کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو کفر کے فتنوں سے بچائے اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مسلمانوں کو صراط مستقیم پر چلائے۔

آپ دیکھیں کہ دنیا کے اندر فتنوں کی یلغار ہے، دنیا میں فتنے اتنے پھیل گئے ہیں ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ [الروم: ۴۱] قادیانیت کا فتنہ ہے، کہیں آغا خانیت کا فتنہ ہے، کہیں خوارج اور نواصب کا فتنہ ہے، کہیں منکرین قرآن کا فتنہ ہے، کہیں منکرین حدیث کا فتنہ ہے، کہیں منکرین ائمہ ومحدثین کا فتنہ ہے اور کہیں تاویل وتحریف کرنے والوں کا فتنہ ہے۔ آج جو آدمی اسلام پر قائم

ودائم ہے اور مذہب اہل سنت والجماعت پر پکا ہے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے ہدایت میں رکھا ہے
وگرنہ میری کیا طاقت ہے، گمراہ ہونے میں کیا دیر لگتی ہے! کسی کو بگاڑنا بڑا آسان ہے، لیکن کسی کا سنوارنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ اگر آپ نے ایک بلڈنگ کو گرانا ہو تو کتنی دیر لگتی ہے؟ لیکن اگر آپ نے اس کو بنانا ہو تو سالہا سال لگتے ہیں۔ اگر آپ ایک آدمی کو نمازی بنانا چاہیں تو بڑی محنت کرنی پڑے گی، لیکن اگر بے نمازی بنانا چاہیں تو ایک منٹ بھی نہیں لگتا۔ کسی آدمی کو اگر بگاڑنا ہے تو بڑا آسان ہے، لیکن کسی آدمی کو سنوارنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

عیسائیوں کے پاس حضور ﷺ کی شبیہ:

ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سفر کیا اور ایک گرجا میں پہنچے۔ گرجا کا پادری ان کو اپنے ساتھ لے کر گیا اور ایک الماری کھولی۔ اس الماری کے اندر تصویریں لگی ہوئی تھیں ...... یہودیوں اور نصرانیوں کو تصویریں بنانے کا پرانا مرض ہے، ابھی آپ ان کے میوزیم کے اندر جائیں، بڑے بڑے عجائبات ہیں، ان کے اندر ممی اور تمثیلات بناتے ہیں کہ یہ بادشاہ گزرا اور یہ بادشاہ گزرا۔ ان کے پورے مجسمے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض سنگ مرمر پتھروں کے بنے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض دوسرے کسی مسالے کے بنے ہوتے ہیں۔ یعنی اپنے بڑوں کو یاد رکھنے کی، مجسمہ سازی کی بیماری ان میں آج بھی موجود ہے۔...... بہرحال اس پادری نے ایک الماری کھولی اور کہا کہ اس میں دیکھو! تمہارے وہ نبی جو مکہ میں پیدا ہوئے ہیں اس کی شکل ان میں کہیں ملتی ہے؟ انہوں نے کہا: اس میں تو نہیں ہے۔ اس نے سب سے آخری الماری کھولی، اس کو جب کھولا تو ہم نے کہا یہ محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم حیران ہو گئے! اسی طرح بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے بھی دیکھا تو انہوں نے پوچھا کہ تم نے یہ تصویر کیسے بنوائی ہے؟ اس نے کہا کہ ہماری کتابوں کے اندر ذکر موجود ہے، کتابوں کو سامنے رکھ کر تخیل کے ساتھ مصورین نے یہ تصویریں تیار کی ہیں۔ تو ہمیں یقین ہے کہ یہ آخری نبی ہیں۔

ہرقل کا حضور ﷺ کی تصدیق کرنا:

اور اسی طرح ہرقل ...... جو روم کا بادشاہ ہے ...... جب اس نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کے بارے میں پوچھا، ایک سوال کیا، دوسرا سوال کیا، تیسرا سوال کیا۔ جب سوال ختم ہوئے تو وہ کہنے لگے: خدا کی قسم! اگر میں اس جگہ ہوتا جہاں محمد مدنی (ﷺ) موجود ہیں، میں ان کے قدم دھو کر پی لیتا، یہ آخری نبی ہیں۔ تو وہ بھی نشانیاں پہچان کر سمجھ گیا اور اس یقین پر پہنچ گیا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں۔ اب بھی دنیا میں منصف قسم

کے مؤرخ گزرے ہیں یا موجود ہیں۔ انہوں نے کتابیں لکھی ہیں، چاہے وہ نصرانی ہیں، چاہے یہودی ہیں، لیکن ان کو بھی یہ بات ماننی پڑی ہے کہ دنیا میں سب سے افضل اور سب سے اکمل اور سب سے کامل ذات اگر کوئی آئی ہے تو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے۔

کفار کو کبھی تبلیغ کا فائدہ نہیں ہوگا:

تو اللہ نے فرمایا: میرا مدنی! ان کے پاس تیری نشانیاں موجود ہیں، ان کی کتابوں میں تیرا ذکر موجود اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے وعدہ موجود ہے، لیکن اس کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لائے تو ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، اس لیے کہ اتنی نشانیوں اور علامتوں کے بعد بھی یہ منکر ہو چکے ہیں۔

تفسیر:

ابوجعفر رازی رحمہ اللہ نے یہ لکھا ہے کہ یہ دو آیتیں ان دو لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کے مقابلے کے لیے اپنی اپنی کفر کی جماعتوں کی قیادت کی۔ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝۲۸﴾ [ابراہیم:۲۸]

''کیا آپ نہیں دیکھتے ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ کی نعمتوں کا جواب ناشکری سے دیا؟ اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں ڈال دیا۔''

وہ ہلاکت کا گھر کون سا ہے؟ ﴿جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا﴾ وہ جہنم جو ان کو جلائے گی۔

[ابن کثیر:۱/۴۵،الآیۃ: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ...]

پتہ نہیں میری عبادت منظور ہی نہ ہو، پتہ نہیں میرا عمرہ قبول ہی نہ ہو، پتہ نہیں میری نمازیں قبول ہی نہ ہوں، پتہ نہیں میرے اندر خطا ہو جائے اور اللہ پکڑ لے اور رحمت کی امید بھی رہے کہ اگر میں اتنا گندا ہوتا تو اللہ اپنے گھر میں تو نہ آنے دیتا، بہرحال اگر بلا لیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ میرا رب راضی ہے۔ کوئی اپنے گھر میں تب ہی بلاتا ہے جب راضی ہو اور جب ناراض ہو تو کوئی اپنے گھر میں آنے دیتا ہے؟ ایک بندہ بھی ناراض ہو تو کہتا ہے: میرے گھر میں نہیں آنا۔ ایک بھائی بھی ناراض ہو تو کہتا ہے کہ میرے گھر میں تیرا داخلہ بند ہے۔ ایک افسر بھی ناراض ہو تو کہتا

ہے کہ ضلع سے نکل جاؤ۔ ضلع بدر کر دیتے ہیں، کبھی کبھی تو ڈویژن بدر کر دیتے ہیں اور کبھی ملک بدر کر دیتے ہیں۔ ائیر پورٹ سے اترو تو باہر نہیں نکلنے دیتے کہ تمہارا تو اس ملک میں ہی داخلہ بند ہے۔ جب اللہ کسی کو بلا کر اپنے گھر میں داخل کر دے، اللہ اپنے محمد عربی ﷺ کے شہر مدینہ منورہ میں حاضری کی توفیق دے دے، مسجد نبوی میں حاضری کی توفیق دے دے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ راضی ہے تو اپنے شہر میں داخل ہونے دیا ہے، لیکن ہماری غلطیاں ہیں کہ پھر بھی ہم ٹھیک نہ ہوں۔ اگر ہم قریب آنے کے بعد بھی اپنے رب کو راضی نہ کر سکیں اس نے تو ہمیں اندر آنے دیا، اس نے تو ہمیں اپنے گھر آنے کی توفیق دے دی، اب اس کی نعمتوں سے ہم نے کیسے فائدہ اٹھانا ہے؟ دیکھیں کہ بادشاہ جب کسی کو بلوائے تو اب اس کو چاہیے کہ دیکھے کہ میں نے بیٹھنا کیسے ہے؟ میں نے بات کیسی کرنی ہے؟ بادشاہ کسی کے آگے کھانا رکھ دے تو اس کا کام ہے کہ دیکھے کہ میں نے کیا کھانا ہے اور کیا نہیں کھانا؟ میں کوئی ایسی حرکت نہ کروں کہ بدتمیز کہلوایا جاؤں، ایسی غلطی نہ کروں کہ مجھے محروم کر دیا جائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے تو ہمیں اپنے گھر میں بلا لیا، اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے اندر تبدیلی لائیں، اپنی صورت کے اندر تبدیلی لائیں، اپنی سیرت کے اندر تبدیلی لائیں اور اپنے کردار کے اندر تبدیلی لائیں، تا کہ ہم حضور پاک ﷺ کو راضی کرنے والے بن جائیں۔ حضور ﷺ کی سنت کے مطابق چلنے والے بن جائیں۔

قرآن پڑھنے سے امید وخوف:

ایک حدیث کے اندر آتا ہے:

((قِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّا نَقْرَءُ مِنَ الْقُرْآنِ فَنَرْجُوا وَ نَقْرَءُ فَنَكَادُ أَنْ نَيْأَسَ))

صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم قرآن پڑھتے ہیں تو امیدیں لگ جاتی ہیں اور پھر قرآن پڑھتے ہیں تو ہم مایوس ہو جاتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: آؤ میں تمہیں بتلاؤں! فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝﴾ [البقرة:٦]

یہ لوگ جہنمی ہیں، کیا تم ان میں سے ہو؟ کہا: "لَسْنَا مِنْهُمْ" ہم ایسے تو نہیں ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم بالکل ایسے نہیں ہو، یہ تو کافروں کی صفت ہے۔

[ابن کثیر: ١/ ٤٥، الآیۃ: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ...]

ایمان نہ لانے کی خبر کی توجیہ:

''لَا يُؤْمِنُوْنَ'' کیوں آیا؟ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلے جملہ کی تاکید کر رہا ہے، وگرنہ بات تو پہلے آگئی کہ ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔ فرمایا ''لَا يُؤْمِنُوْنَ'' یہ جملہ پہلے جملہ کے تاکید کے لیے آیا ہے۔

[ابن کثیر: ۱/ ۴۵، الآیۃ: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ...]

اصل بات یہ ہوتی ہے...... اللہ رحمت فرمائے!...... آدمی کے ٹھیک ہونے کی ایک سٹیج ہوتی ہے، دیکھیں! مثلاً: ایک جسمانی بیماری ہے، آدمی علاج کرا رہا ہے، کرا رہا ہے۔ اب ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھا، انہوں نے تحقیق کی کہ یہ کینسر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ آپ علاج کرائیں یا نہ کرائیں یہ بچ تو نہیں سکتا، بس اب اس کا علاج کرنا اور نہ کرنا برابر ہے۔ جو زندگی کے دن مقدر ہیں وہ پورے کرے گا، لیکن اس کو فائدہ نہیں ہوگا، بچ نہیں سکتا، اس کو گھر لے جائیں، تاکہ اپنے رشتہ داروں میں جا کر مرے۔ یہ جسمانی بیماریوں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح روحانی بیماریوں میں بھی ہوتا ہے۔ ایک آدمی زنا میں لگ گیا، شراب میں لگ گیا، ہیروئن میں لگ گیا، آپ علاج کر رہے ہیں، ہسپتالوں میں داخل کر رہے ہیں، علماء کے پاس لے جا رہے ہیں، اللہ کے اولیاء کے پاس لے کر جا رہے ہیں، لیکن وہ اور بگڑتا جا رہا ہے، آخر آپ نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں ہوسکتا، اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔

اسی طرح کافروں کی بھی ایک اسٹیج ہے۔ جب وہ اس مقام پر آگئے تو اللہ نے خود فرما دیا کہ ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، یہ نہیں ایمان لاتے۔ اس سے بڑی بدبختی کی آخر کون سی سٹیج ہوگی کہ جن کی عدمِ ہدایت کی خبر اللہ خود اپنے پیغمبر ﷺ کو دے دے؟ اور جو حضور ﷺ کے ڈرانے سے نہ ڈرے، وہ کسی اور کے ڈرانے سے کیا ڈرے گا؟ حضور پاک ﷺ کے کہنے سے جس نے کلمہ نہیں پڑھا وہ کسی مولوی کے کہنے سے کیا کلمہ پڑھے گا؟ اس لیے فرما دیا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۶]

ان کے لیے ڈر نہ ڈرانا برابر ہے، یہ کفر پر رہیں گے، یہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔

اسی لیے علماء نے لکھا کہ آپ خود اپنے دل کا امتحان کریں۔

ترکیب آیت:

''لَا يُؤْمِنُوْنَ'' پہلے جملے کی تاکید ہے۔ اور بعض نے فرمایا کہ یہ جملہ خبر بنے گا۔ ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' حرف

مشبہ بالفعل اور اس کا اسم آگے ''لَا يُؤْمِنُونَ'' اس کی خبر ہے کہ تحقیق جن لوگوں نے کفر کیا وہ اللہ کے علم میں کافر ہیں، ایمان نہیں لائیں گے۔ درمیان میں اپنے نبی ﷺ کی تسلی کے لیے فرما دیا:

﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ [البقرة:٦]

اس ترکیب میں یہ جملہ معترضہ بنے گا۔ اصل جملہ ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا يُؤْمِنُوْنَ'' تھا۔ اس صورت میں ''لَا يُؤْمِنُوْنَ'' خبر بنے گا اور پہلی صورت میں ''لَا يُؤْمِنُوْنَ'' جملہ مؤکدہ بنے گا۔

[ابن کثیر: ۱/ ۴۵، الآیة: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ...]

کیا آدمی اپنے اختیار سے کفر اختیار کرتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس کی ان آیات مبارکہ میں ارشاد فرمایا:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾

[البقرة:۷]

''مہر کر دی اللہ نے ان کے دلوں پر، ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور انکے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

یعنی جو کافر اور مشرک ہیں اور اللہ کے علم میں جنہوں نے کفر پر مرنا ہے اللہ نے ان کے دلوں پر، ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔ کیونکہ ہر چیز اللہ کے علم میں ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ پیدا ہونے کے وقت ہی اللہ مہر کر دیں۔ اگر پیدائش کے وقت اللہ مہر کر دیں تو پھر اس کو ہدایت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر اس کو سزا دینا عدل کے مطابق نہیں ہوگا۔ اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ پیدا کرنے سے پہلے بھی اور پیدا کرنے کے بعد بھی ہر چیز چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے تو وہ پہلے اس بارے میں خبر عطا فرما دیتے ہیں اور عام پڑھنے والے کو دھوکہ لگتا ہے کہ اللہ نے کافر ہونا اس کو مقدر میں ہی لکھ دیا تو اس کا کیا قصور ہے؟...... نعوذ باللہ!...... اس کے مقدر میں ہی زنا لکھا ہوا تھا، وگرنہ اس کا کیا گناہ ہے؟ یہ بات غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر بندے کو دین فطرت پر پیدا فرماتے ہیں۔ قرآن میں فرمایا:

﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ﴾ [الروم:۳۰]

''اللہ کی بنائی ہوئی اس فطرت پر چلو جس پر اس نے تمام لوگوں کو پیدا کیا ہے۔''

اور حضور ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ))

''ہر پیدا ہونے والا بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۸۵، باب: مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ]

ہر پیدا ہونے والا بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس کا دل صاف ہے اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس میں خیر شر، علم جہل اور اچھائی برائی ان کی تمیز، ادراک، عقل، شعور، حواسِ خمسہ، یہ سب عطا کرتے ہیں۔ یعنی انسان کو بلکہ ہر حیوان کو یہ سب عطا فرما دیتے ہیں۔ جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۝﴾ [الاعلیٰ: ۱ تا ۳]

''اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا اور ٹھیک انداز سے پیدا فرمایا اور پھر اللہ نے اس کو ہدایت بھی عطا فرمائی، اللہ نے اس کو سمجھ بوجھ تمیز بھی عطا فرمائی۔''

ان تمام ہدایات کے باوجود جب بندہ گمراہی پر چلتا ہے اور ظلمات میں الجھ جاتا ہے اور شرور کے اندر پھنس جاتا ہے اور پھر وہ بڑھتا بڑھتا اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اب اس کا ہدایت پر آنا مشکل ہوتا ہے تو پھر اللہ اس کے دل پر مہر کر دیتے ہیں اور وہ ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے ان گناہوں اور تکذیب اور انکار کی وجہ سے یہ واقعہ ہوتا ہے۔ اللہ پاک پہلے خبر دے دیتے ہیں تو لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اللہ میاں نے اس کو مسلمان کر دیا اور اس کو کافر کر دیا، اس کا کیا قصور ہے اور اس کی برائی کیا ہے؟ یہ تو اللہ کی مرضی ہے، اللہ قادر ہیں، وہ جس کو چاہیں ہدایت دے دیں، جس کو چاہے ہدایت نہ دیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ بھی فیصلہ ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۝﴾ [الاسراء: ۱۵]

''ہم کسی قوم پر عذاب نہیں بھیجتے جب تک اپنے پیغمبر بھیج کر حجت پوری نہ کر دیں۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے پھر نبی پیدا فرمائے، اللہ نے کتابیں نازل فرمائیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں عقل عطا فرمائی اور اللہ نے ہمیں حواسِ خمسہ عطا فرمائے، یعنی آج دنیا میں کون سا آدمی ہے جو حق اور باطل میں امتیاز نہیں کر سکتا، لیکن فرق اتنا ہوتا ہے کہ جو حق کی تلاش میں ہوتا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ حق کے راستے کھول دیتے ہیں اور جو گمراہی میں بڑھتا ہے اور انتہاء کو چھو لیتا ہے، پھر اللہ اسے اس کی گمراہی میں غرق کر دیتے ہیں، ان کے دلوں پر پردے لگ جاتے ہیں، مہریں لگ جاتی ہیں اور ہمیشہ کے لیے وہ ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں، ورنہ اللہ تبارک و تعالیٰ عدل والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے کبھی کسی بندے پر ظلم نہیں فرمایا۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۵۷]

''ہم نے ان کافروں پر ہرگز ظلم نہیں کیا، مگر انہوں نے اپنے نفسوں پر خود ظلم کیا ہے۔''

کہ وہ اپنے خالق کو بھول گئے، اپنے مالک کو بھول گئے اور اپنے پیدا کرنے والے کو بھول گئے۔ اور بندوں کو خدا بنالیا، مردوں اور زندوں کو حاجت روا بنالیا۔ کسی نے قبر کو خدا بنالیا، کسی نے درختوں کو خدا بنالیا، کسی نے چاند اور سورج کو خدا بنالیا اور کسی نے آگ کو خدا بنالیا، حالانکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ آگ بھی بندوں کے لیے ہے، یہ چاند سورج بھی بندوں کے لیے ہیں، یہ زمین بھی بندوں کے لیے ہے اور دریا بھی بندوں کے لیے ہیں، یہ تو سارے اللہ نے ہی ہماری خدمت کے لیے پیدا کیے ہیں۔ اگر ہم خادم کو مخدوم بنادیں، مملوک کو مالک بنادیں اور مخلوق کو خالق بنا دیں تو یہ ہماری جہالت ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف میں تو کوئی حرج نہیں آتا۔

انسان کے اندر علم حاصل کرنے کی قوتیں:

قرآن میں ان تین چیزوں کا ذکر زیادہ آتا ہے: ایک تو ہے دل، دوسری سمع اور تیسری بصر ہے۔ ان چیزوں کا اللہ نے قرآن مقدس میں زیادہ ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ بھی ایک قوت چکھنا۔ چکھنے سے بھی آپ معلوم کرتے ہیں کہ یہ میٹھا ہے یا کھٹا ہے، یہ دل اور نظر بھی نہیں بتاسکتی کہ یہ میٹھا ہے یا کھٹا ہے، جب تک کہ زبان پر نہ لگے۔ اسی طرح یہ گلاس اگر میرے سامنے ہے تو میں شکل سے، دل سے، اور کان سے یا آنکھ سے فیصلہ نہیں کرسکتا کہ یہ پانی ٹھنڈا ہے یا گرم ہے جب تک کہ میں اس کو ہاتھ نہ لگاؤں، لیکن یہ دو قوتیں چکھنے کی اور چھونے کی بڑی کند ذہن قوتیں ہیں، ان سے علم تو حاصل ہوتا ہے، لیکن ہیں بڑی بلید اور کند ذہن کہ جب تک ہم پکڑیں یا چکھیں ناں اس وقت تک کچھ بھی نہیں بتاتیں۔ پکڑنے کے بعد آپ بتاسکتے ہیں کہ یہ ٹھنڈا ہے یا گرم ہے، حالانکہ ان کے اندر جاننے کی طاقت ہے، لیکن اتنی کمزور طاقت کہ جب تک عقل نہ ہو یہ فائدہ نہیں دیتیں۔ ان سے طاقت ور سننے والی قوت ہے، اس سے علم حاصل ہوتا ہے اور دیکھنے سے علم حاصل ہوتا ہے اور پھر یہ ساری چیزیں دماغ میں آتی ہیں اور اصل چیز دل ہے، اس لیے اللہ نے ان تین چیزوں کا زیادہ ذکر کیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا﴾ [الاسراء: ۳۶]

قیامت کے دن کانوں کے بارے میں، دیکھنے کے بارے میں اور دل کے بارے میں سوال ہوگا۔ تو وہاں بھی ان تین چیزوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ [الاعراف:۱۷۹]

اللہ نے فرمایا: ان کافروں کے دل ہیں، لیکن سمجھتے نہیں۔ ان کی آنکھیں ہیں، لیکن دیکھتے نہیں۔ ان کے کان ہیں، لیکن سنتے نہیں۔ وہاں ان تین چیزوں (دل، کان اور آنکھوں) کا ذکر ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾ [ق:۳۷]

فرمایا: قرآن کے اندر بڑی نصیحت ہے، لیکن ان کے لیے جن کا دل ہے یا جو کان سے سنتے ہیں اور وہ حاضر ہوتے ہیں اور پوری توجہ سے قرآن کو سنتے ہیں، ان کے لیے قرآن بڑی نصیحت ہے۔

تو آپ سارے قرآن میں دیکھیں! زیادہ ذکر انہیں کا آئے گا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ [النحل:۱۰۸]

اور کہیں فرمایا:

﴿وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ﴾ [الانعام:۲۵]

اور کہیں فرمایا:

﴿وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ [النساء:۱۵۵]

کیونکہ جتنا ہمیں علم ملا ہے ہم نے اللہ کے بارے میں سنا ہے، اللہ کی صفات کو سنا ہے اور پھر اللہ کی صناعت کو دیکھا ہے تو اللہ پر ایمان لے آئے۔ سننے اور دیکھنے سے اللہ نے ہمیں اتنی بڑی نعمت عطا فرمائی۔ حضور پاک ﷺ کے بارے میں ہم نے سنا، ہم نے زیارت نہیں کی اور اسی طرح جنت جہنم اور انبیاء، جزا وسزا کے بارے میں بھی یہ ساری چیزیں ہم نے سنی ہیں، پھر ہمارے دل میں آئی ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے لیے ہدایت کا ذریعہ بنایا ہے، اسی لیے اکثر آیات میں اللہ نے سننے کو دیکھنے پر مقدم فرمایا ہے، جیسے ابھی آپ پڑھ رہے ہیں:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۚ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۷]

سننے والی قوتیں پہلے ہیں اور آنکھوں کا ذکر بعد میں ہے، قوتِ سامعہ کا ذکر پہلے ہے اور قوتِ باصرہ کا ذکر بعد میں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ قوتِ سامعہ سے ہوتا ہے، باصرہ سے بعد میں ہوتا ہے۔

مثلاً: آپ سوئے ہوئے ہیں، آپ نیند میں ہیں۔ اب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو سب سے پہلے آپ آواز سنیں گے۔ جب آپ رات کو سوتے ہیں تو الارم لگاتے ہیں کہ جب الارم کی گھنٹی بجے گی تو آپ پہلے سنیں گے اور اسی طرح اللہ نے اگر قرآن اتارا ہے تو میرے محمد مدنی مصطفیٰ ﷺ کے دل پر اترا ہے، فرمایا:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝﴾

[الشعراء:۱۹۳ تا ۱۹۵]

اسی لیے اللہ نے فرمایا:

﴿لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝﴾[الحج:۴۶]

''میرا مدنی! آنکھیں اندھی نہیں ہوتی، اصل اندھا تو وہ ہوتا ہے جو دل کا اندھا ہو۔''

لیکن اندھے وہ ہیں جو دلوں کے اندھے ہو جائیں۔ آنکھوں کا اندھا ہونا تو ایک عارضی چیز ہے، لیکن اصل اندھا وہ ہے جو دل کا اندھا ہو۔ اسی لیے فرمایا:

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا﴾[الحج:۴۶]

اور کہیں فرماتے ہیں:

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝﴾[الاعراف:۱۷۹]

ان کے دل ہیں، لیکن ان سے سمجھتے نہیں ہیں، ان سے سوچتے نہیں ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ سب سے اہم چیز انسانوں کا دل ہے۔ اور اسی پر قرآن ہے:

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ﴾[ق:۳۷]

اسی پر حدیث ہے:

((أَلَا! إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا! وَهِيَ الْقَلْبُ.)) [صحیح البخاری، حدیث:۵۲، باب: فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ]

''(فرمایا:) انسان کے بدن میں ایک ٹکڑا ایسا ہے وہ ٹھیک ہو جائے تو سارا بدن ٹھیک ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب

ہو جائے تو پورا بدن خراب ہو جاتا ہے خبردار وہ دل ہے۔"

اور اسی طرح دیکھ لیں اگر دل کو نکالیں آپ کے سارے اعضاء کاٹ ڈالیں تو آپ کو کوئی پتہ نہیں ہوگا۔ اگر دل کو سلا دیا جائے اور سارے اعضاء کو کاٹ دیا جائے تو دل کو کوئی احساس نہیں ہوگا۔ جب دل حرکت کرنی شروع کر دے گا تو اب بادشاہ دل ہے۔ اب جب انگلی میں درد ہوگا تو اس کو احساس ہوگا، پاؤں میں درد ہوگا تو احساس ہوگا، ناخن میں تکلیف ہوگی تو احساس ہوگا۔ یہ دل ایک قسم کا حاکم ہے، ایک قسم کا بادشاہ ہے اور باقی سارے اعضاء اس کے غلام ہیں۔ اس لیے علمائے اسلام فرماتے ہیں کہ اصل مرکزِ علم دل ہے۔ دل سے دماغ میں بات منتقل ہوتی ہے، پھر دماغ اس بادشاہ کا حکم چلاتا ہے سمع پر، بصر پر، ہاتھوں پر اور زبان پر۔

اب آپ دیکھیں کہ آپ بیٹھے ہوئے ہیں تو سب سے پہلے کوئی آواز آئے گی تو دماغ حکم دے دے گا کہ سنو! کیا ہو رہا ہے؟ اب دل میں آیا، اس نے دماغ کو آرڈر کیا، دماغ نے کان کو حکم دیا کہ سنو سنو! کیا ہو رہا ہے؟ اس نے کہا کہ کوئی جھگڑا ہو رہا ہے۔ اس نے کہا: اچھا سننے سے سمجھ لیا تو اس نے آنکھوں کو حکم دیا کہ تم دیکھو۔ تو اصل دل میں آئے گا تو دل دماغ کو آرڈر کرے گا اور دماغ پر ان غلاموں کو حکم دے گا کہ جلدی سے اپنی ڈیوٹی سنبھالو، جلدی سے سنو اور مجھے بتلاؤ کہ یہ کیا شر ہے؟ کیا شور ہے؟ کیا آواز ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟ تو اصل بات دل میں آتی ہے تو دل دماغ کو آرڈر کرتا ہے، دماغ قوتِ سامعہ کو، قوتِ باصرہ کو آڈر کرتا ہے۔ اگر اس سے بھی تسلی نہ ہو تو پاؤں کو حکم دیتا ہے کہ وہاں جا کر دیکھو کہ کیا ہو رہا ہے؟ تو پاؤں ادھر دوڑ پڑیں گے۔ ایسے کبھی بھی پاؤں نہیں دوڑیں گے جب تک دماغ حکم نہیں کرے گا کہ اس کو دھکا دو اور اس کو دور کرو، ایسا نہ ہو کہ تیرے اوپر گر جائے۔ دل سوچے گا ہاتھ پاؤں تب کام کریں گے۔

اسی سے ایک اور مسئلہ علماء نے لکھا ہے کہ جس جس کام کے لیے اللہ نے جو چیز پیدا کی ہے وہ اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، مثلاً: دماغ یہ نہیں کر سکتا کہ کان کو حکم دے کہ تم دیکھو، کان سے دیکھنے کا کام لے سکتا ہے، آنکھ سے سننے کا کام لے سکتا ہے اور ہاتھوں سے چلنے کا کام لے سکتا ہے۔ تو جب ہر چیز اپنے دائرے میں اپنا کام کر رہی ہے تو اسی لیے بندوں کو حکم ہے کہ جو تیرا دائرہ ہے اسی میں کام کرو۔ جب اس سے تم باہر نکلو گے تو پھر ناکامی ہی ناکامی ہوگی، پھر اس کے بعد فساد ہوگا، اس کے بعد جھگڑے ہوں گے اور اس کے بعد دنیا میں انتشار پھیلے گا۔

ان میں سب سے اہم دل ہے تو اللہ نے فرمایا:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ [البقرة: ۷]

اب دیکھیں! جب دل پر مہر لگ گئی، دل سوچ ہی نہیں رہا تو وہ دماغ کو احکامات ہی نہیں دے گا۔ جب دماغ کو احکامات نہیں دے گا تو دماغ آگے کانوں اور آنکھوں کو احکامات ہی نہیں دے گا۔ تو جب مہر کا عالم یہ ہے کہ دل پر بھی مہر لگ گئی، کانوں پر بھی مہر لگ گئی اور آنکھوں پر بھی پردے آگئے تو ہدایت کے ملنے کا امکان ہی ختم ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ کفار اور مشرکین اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرآن سنتے تھے، اللہ کے کعبہ کا طواف کرتے تھے، کعبۃ اللہ کے اندر داخل ہوتے تھے اور باقاعدہ احرام باندھتے تھے، بچہ پیدا ہوجاتا تو عقیقہ کرتے تھے، قربانی کرتے تھے، سارا کام کرتے تھے، لیکن اللہ کی توحید سمجھ نہ آئی۔

آج بھی آپ دنیا میں دیکھ لیں! کتنے مسلمان ہیں جو نمازیں بھی پڑھ رہے ہیں، رمضان شریف میں روزے بھی رکھ رہے ہیں، حج بھی کر رہے ہیں، زکوتیں بھی ادا کر رہے ہیں، خیراتیں بھی دے رہے ہیں، اور ساتھ ساتھ قبر پر سجدہ بھی کر رہے ہیں، حالانکہ یہ سارے کام کر رہے ہیں، دن میں پانچ دفعہ نماز پڑھتے ہیں، پانچ دفعہ اقرار کرتے ہیں ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ [الفاتحہ: ۴] اور پانچ دفعہ دن میں اللہ کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، لیکن پھر قبر پر بھی کھڑے ہیں۔ روزانہ نماز میں کھڑے ہیں ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ ۝﴾ [سورۃ الفاتحہ] روزانہ سیکھ رہے ہیں کہ ہم نے دعا کس سے مانگنی ہے؟ ہدایت ہم نے کس سے مانگنی ہے؟ ہمارا مالک کون ہے؟ یوم الدین کا مالک کون ہے؟ عبادت ہم نے کس کی کرنی ہے؟ مدد ہم نے کس سے مانگنی ہے؟ سب کچھ بھی کر رہے ہیں اور وہاں بھی بیٹھے ہوئے ہیں ''یَا شَیْخُ عَبْدُ الْقَادِرِ! شَیْئًا لِلّٰہِ، یَا مُعِیْنَ الدِّیْنِ اَجْمَیْرِیْ! مدد کن، مدد کن'' کے وظیفے بھی پڑھ رہے ہیں اور ہیں مسلمان۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اعضاء میں سے جب کوئی عضو غلط ہو جائے تو پھر اس کی بات سمجھ نہیں آتی۔ یوں سمجھ لیں کہ عینک ہے، اس کا شیشہ سفید ہے۔ میں اگر اس کو نظر پر چڑھا لوں تو اس کو ہر چیز اپنے اصلی رنگ میں نظر آئے گی۔ اگر اس کو سبز شیشہ لگا لیں تو آپ کو سبز نظر آئے گا، سرخ عینک لگا لیں تو آپ کو سرخ نظر آئے گا، سیاہ شیشہ لگا لیں تو آپ کو سیاہی نظر آئے گی۔ جب آنکھوں پر پردہ آجائے تو پھر قرآن صحیح معنوں میں نظر نہیں آتا، جب کانوں پر مہر لگ جائے تو حق کی بات اندر داخل ہی نہیں ہو سکتی اور جب دلوں کے اندر مہر لگ جائے تو اللہ کا قرآن سمجھ نہیں آتا۔ اس لیے دعا کریں

کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو مہر اور زنگ سے اور گناہوں کی سیاہی سے محفوظ رکھے۔

وگرنہ دیکھیں کہ مسلمان ہے، کعبۃ اللہ میں کھڑا ہے، اللہ کے گھر میں ہے۔ اب دیکھیں کہ کتنے لوگ ہیں سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں مانتے، حالانکہ مدینہ میں جاتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام پڑھنے کے بعد کس پر سلام پڑھا جاتا ہے؟ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اور اس کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر، لیکن وہ پھر بھی نہیں مانتے۔ یعنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں کو اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روزہ مبارک میں سلا دیا ہے، بھائی تمہاری قبر اگر کسی پیر کی قبر کے ساتھ بن جائے تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مہربانی کرنا اگر میری موت آئے تو مجھے بھی وہاں دفن کرنا، تاکہ میں قیامت میں اس پیر صاحب کے ساتھ ہوں گا تو مجھے نجات ہو جائے گی۔ یعنی پیر ایک قبرستان میں آ جائے تو وہ تو لاکھوں مردے بخشوا لیتا ہے، جو میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں سوئے ہوئے ہیں ان پر ایمان نہیں آ رہا، کیا وجہ ہے کہ دلوں پر مہریں لگ گئی ہیں، بات سمجھ میں نہیں آتی ہے، آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے، سامنے کھڑے ہیں، بات سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھا جاتا ہے یہ ان کی قبر مبارک نہیں ہے، بلکہ ان کا گھر مبارک ہے کہ یہاں بی بی صاحبہ کا گھر تھا، بی بی صاحبہ کی قبر مبارک جنت البقیع میں ہے، یعنی جو جنت البقیع میں ہے اس پر تو صلوٰۃ وسلام پڑھا جائے اور جو مدنی کے پہلو میں سویا ہوا ہے اس پر ......نعوذ باللہ!...... لعنت بھیجی جائے تو اس سے زیادہ کوئی اندھا ہو گا!؟ وجہ کیا ہے؟ وجہ وہی ہے کہ آنکھوں پر پردہ آ گیا، بات سمجھ نہیں آ رہی، حقیقت نظر نہیں آ رہی۔

بندے کو سچائی کی تلاش ہے، لیکن سچائی سمجھ ہی نہیں آ رہی۔ ان کو ضرورت ہے، وگرنہ وہ مدینہ میں کیوں آئیں؟ ضرورت تو ان کو بھی ہے، وہ بھی ہدایت کی تلاش میں ہیں، لیکن چونکہ آنکھوں پر پردہ ہے، وہ حقیقت کو دیکھ نہیں سکتے۔ جن کی آنکھوں پر پردہ نہیں ہے وہ جب مکہ میں آتا ہے، مدینہ میں آتا ہے، جتنا بڑا گناہ گار ہو، کتنا بڑا مشرک ہو اور جتنا غلط عقیدے والا ہو واپس جاتا ہے تو اس کا عقیدہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ یہ روضہ مبارک ہے اور حضرت امام الانبیاء، افضل الانبیاء، سید الاولین، رحمۃ للعالمین، خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک ہے، یہ نبی ہے خدا نہیں ہے، جس پر موت نہ آئے کہ خدا تو موت سے پاک ہے، خدا کی قبر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں کھڑے ہو کر کہتے ہیں ''اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!'' معلوم ہوا کہ ہم نے سلام بھیجنا ہے، ہم نے درود بھیجنا ہے اور ہم نے مانگنا نہیں، بلکہ مانگنا اللہ سے ہے۔ آگے چلتا ہے تو ابی بکر رضی اللہ عنہ نظر

آتا ہے، آگے چلتا ہے تو عمر رضی اللہ عنہ نظر آتا ہے، اس کو مسئلہ سمجھ آجاتا ہے کہ...... سبحان اللہ!...... یہ ایسے وزیر ہیں، ایسے شیخین ہیں کہ زندگی میں بھی ساتھ رہے اور موت میں بھی ساتھ رہے، قبر میں بھی ساتھ رہے اور حشر میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوں گے۔ اب اس نے سلام پڑھ لیا، رخ اس نے قبلہ کی طرف کر لیا اور ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مانگنا بھی شرک ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مانگنا بھی شرک ہے اور اللہ کے نبیوں سے مانگنا بھی شرک ہے۔ جب سلام پڑھتے ہو تو ادھر رخ کر لو، دعا مانگنی ہو تو پھر اللہ کی طرف رخ کر لو۔ تو اگر ہم اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں مانگ سکتے تو دوسروں سے کیسے مانگ سکتے ہیں؟ وزیروں سے کیسے مانگ سکتے ہیں؟ اب دیکھو کہ جب مکہ مدینہ سے جائے گا تو عقیدہ ٹھیک ہو گا کہ نہیں ہو گا؟

بالکل صاف عقیدہ ہو جائے گا کہ اچھا جن پر موت آتی ہے وہ بشر ہو سکتا ہے، انسان ہو سکتا ہے، اللہ کا نبی ہو سکتا ہے، وہ خدا نہیں ہو سکتا اور اسی طریقہ سے سیدنا ابوبکر و سیدنا عمر رضی اللہ عنہما خدانخواستہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے نہ ہوتے تو ان کے دامن میں نہ ہوتے، ان کے قدموں میں نہ ہوتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک میں نہ ہوتے۔ اور ہم کو تو جنت ملے گی اور وہ تو جنت میں سو رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا بَيْنَ بَيْتِيْ وَ مِنْبَرِيْ رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ.))

''میرے گھر سے لے کر میرے منبر تک جنت کا ٹکڑا ہے۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۱۹۵، باب: فَضْلِ مَا بَيْنَ الْقَبْرِ وَالْمِنْبَرِ]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں سلا دیا ہے، مسئلہ سمجھ آ گیا، پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر کے پاس آئے گا، پھر جنت البقیع میں آئے گا جہاں آل نبی ہیں، ازواج نبی ہیں، اصحاب رسول ہیں، امام دارالہجرۃ امام مالک رحمہ اللہ ہیں، سب قبروں میں سوئے ہوئے ہیں، مسئلہ سمجھ آجائے گا۔

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝﴾ [الرحمٰن: ۲۶، ۲۷]

یا اللہ! اگر ان پر فنا آ گئی ہے، صرف تیری ذات باقی ہے، جس پر کبھی فنا نہیں آئے گی۔ تو اگر اللہ دلوں کے پردے کھول دے تو سارا مسئلہ سمجھ آجاتا ہے اور اگر دلوں پر مہر لگ جائے تو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس کے باوجود بھی...... نَعُوْذُ بِاللّٰهِ! ثُمَّ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ! ثُمَّ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ!...... شیخین کو ماننے پر تیار نہیں۔ مکہ والے کعبہ شریف کا طواف کر رہے ہیں، طواف جب ختم ہو جاتا ہے تو پھر ''ہبل'' کے پاس آجاتے ہیں، پھر ''لات'' کے پاس آجاتے

ہیں، پھر بتوں کے پاس آ جاتے ہیں اور صفا و مروہ پر دوڑ رہے ہیں تو صفا پر بھی بت رکھا ہے اور مروہ پر بھی بت رکھا ہے۔ اسی طرح بعینہٖ جن لوگوں کی آنکھوں پر پردہ آ جاتا ہے وہ جب کعبہ میں آتے ہیں تو شرک کرتے ہیں، نکلتے ہیں تو شرک کرتے ہیں۔ جیسے آئے، اسی طرح خالی چلے گئے۔ مسئلہ سمجھ ہی نہیں آ رہا، لیکن جن کے لیے اللہ نے راہیں کھول دی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے لیے ہدایت کا راستہ آسان فرما دیتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷﴾ [البقرۃ:۷]

مہر کر دی ہے اللہ نے ان کے دلوں پر۔

مہر کیسے لگتی ہے؟

بعض علماء نے فرمایا کہ یہ مجاز ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ مہر ہمیں نظر آئے، بلکہ ان اعضاء سے جب فائدہ حاصل نہیں ہوا تو گویا کہ ان پر مہر لگی ہوئی ہے۔

لیکن محققین علماء نے لکھا ہے کہ حقیقتاً اللہ تبارک وتعالیٰ مہر لگا دیتے ہیں ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ﴾ ان کے دلوں پر بھی مہر ہوتی ہے، ان کے کانوں پر بھی مہر ہوتی ہے ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ ﴾ [الاعراف:۱۷۹] ان کی آنکھیں ہیں، لیکن دیکھتے نہیں۔ ان کے کان ہیں، لیکن سنتے نہیں۔ ''لَا يَفْقَهُوْنَ، لَا يَعْقِلُوْنَ'' ہدایت کی بات نہیں سمجھتے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے جو گناہ کیے ہیں، جو کفر کیا ہے اور جو شرک کیا ہے اس نے ان کو ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔ جب گھیر لیا ہے تو گویا گناہ اس پر چھا گئے، او پر اللہ نے مہر کر دی، [ابن کثیر:۱/۴۵] جیسا کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک نکتہ لگ جاتا ہے، جب دوسرا گناہ کرتا ہے تو دوسرا نکتہ لگ جاتا ہے، اسی طرح گناہوں سے سیاہ نکتے لگتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ دل سیاہ ہو جاتا ہے اور جب دل سیاہ ہو جائے پھر آدمی کو گناہ گناہ ہی نظر نہیں آتا۔

[سنن الترمذی، حدیث ۳۳۳۴ سورۃ: ویل للمطففین]

اللہ تعالیٰ ہمیں، آپ کو اور ہر مسلمان کو ایسے حال سے بچائے۔ (آمین)

تفسیر:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اَلْخَتْمُ عَلَى الْقَلْبِ وَالسَّمْعِ'' اللہ تعالیٰ

دلوں پر بھی اور کانوں پر بھی مہر فرما دیتے ہیں۔ رین طبع سے کم ہے۔ رین کے بعد طبع ہے اور طبع سے بھی زیادہ شدید أقفال ہے، جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس میں فرمایا:

﴿كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [المطففین: ۱۴]

رین کا معنی ہوتا ہے دلوں پر رین، میل، زنگ جم جانا۔ اور طبع کا معنی ہوتا ہے مہر لگ جانا۔ اور پھر فرمایا ﴿عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ [محمد: ۲۴] کہ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں؟ تو أقفال طبع سے بھی زیادہ شدید ہے۔

حضرت اعمش رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے ہمیں مثال کے طور پر سمجھایا، فرمایا کہ دیکھو! جیسے یہ ہاتھ ہے تو گویا یہ ہاتھ ایک دل ہے۔ دل جب گناہ کرتا ہے تو ایک انگلی بند ہو گئی، پھر جب گناہ کرتا ہے تو دوسری انگلی بند ہو گئی، پھر گناہ کیا اور بند ہو گئی، پھر گناہ کیا تو پوری مٹھی بند ہو گئی، اس پر مہر لگا دی گئی۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے مثال دے کر سمجھایا کہ جیسے ہاتھ کھلا ہوا ہے، اس کو آہستہ آہستہ بند کرتے چلے جائیں اور اس کے اوپر مہر لگا دیں تو دل کا عالم بھی یہی ہوتا ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو دل تھوڑا بند ہو گیا، اور گناہ کیا تو مزید بند ہو گیا، اور گناہ کیا تو مزید بند ہو گیا، اور گناہ کیا تو مزید بند ہو گیا، حتیٰ کہ پورا بند ہو گیا اور اوپر مہر لگ گئی۔ [ابن کثیر: ۱/ ۴۵، الآیۃ: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ]

حضرت مجاہد رحمہ اللہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ دراصل ایک ہی چیز ہے کہ رین کا معنی بھی وہی ہے: دلوں پر زنگ جم جانا، اور طبع کا معنی بھی وہی ہے یعنی اس کو رین بھی سمجھا جاتا ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے یہ ترجمہ بھی کیا ہے کہ ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ جب کافروں نے اپنے تکبر کی وجہ سے اعراض کیا، اور جب ان کو اللہ کی توحید کی دعوت دی گئی انہوں نے اس کو نہ سنا۔ اس کو بطور مثال کہہ دیا گیا کہ ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ گویا کہ ان کے دلوں پر مہریں ہیں، یعنی حقیقت میں ان کے دلوں پر مہر نہیں، بلکہ ان کے اعراض اور نہ سننے کو بطور مثال یا بطور تشبیہ کہہ دیا گیا۔ جیسے کہا جاتا ہے "إِنَّ فُلَانًا أَصَمَّ عَنْ ذٰلِكَ" کہ فلاں آدمی کو ہم ملنے گئے تو گونگا بن گیا، یعنی بولا نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ گونگا یا بہرہ ہوتا ہے، بلکہ ایک مثال دی جاتی ہے کہ فلاں کی بات سنی نہیں ہے۔ تو بعض علماء نے یہ ترجمہ بھی کیا ہے، لیکن مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات بالکل غلط ہے، کیونکہ جب اللہ نے قرآن میں ارشاد فرما دیا ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ اللہ نے خود مہر فرمائی ہے ان کے دلوں پر بھی، ان کے کانوں پر بھی، تو اس کا یہ ترجمہ کرنا کہ یہ مثال

ہے اور یہ تشبیہ ومجاز ہے، درست نہیں ہے۔ علامہ زمخشری نے پانچ وجوہات اس آیت کے ترجمہ میں نقل کی ہیں، لیکن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ سب ضعیف ہیں۔

اصل وجہ یہ ہے کہ وہ معتزلی ہے اور معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ مہر کر دینا کسی کے دل کو ہدایت سے بند کر دینا یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے، تو...... نعوذ باللہ...... یہ صفت قبیح ہے، اللہ تعالیٰ ہر قبح سے پاک ہیں، لہٰذا یہاں حقیقی معنی مراد نہیں لیتے، بلکہ مجازی معنی مراد لیتے ہیں۔ تو مفسر نے فرمایا کہ اس کے اعتزال کی وجہ یہ ہے، وگرنہ اگر وہ قرآن پر نظر دوڑاتا کہ ﴿فَلَمَّا زَاغُوٓا أَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِينَ﴾ [الصف:٥] کہ جب انہوں نے کجی اختیار کی تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی ٹیڑھا کر دیا ہے۔ اور فرمایا:

﴿وَنُقَلِّبُ أَفْـِٔدَتَهُمْ وَأَبْصٰرَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهٖٓ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِي طُغْيٰنِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ [الانعام:١١٠]

''جس طرح یہ لوگ پہلی بار (قرآن جیسے معجزے پر) ایمان نہیں لائے، ہم بھی (ان کی ضد کی پاداش میں) ان کے دلوں اور نگاہوں کا رخ پھیر دیتے ہیں، اور ان کو اس حالت میں چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں۔''

تو اللہ تعالیٰ کا ہر کام عدل ہے، اللہ تعالیٰ کا ہر کام احسن ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ تمام صفات نقصان سے پاک ہے۔ جب کافروں نے اس کی مخلوق ہونے کے باوجود اس کا انکار کیا تو اللہ نے ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾ (النبا:٢٦) اس کی سزا کے طور پر مہر فرما دی، لہٰذا بلاوجہ اللہ تعالیٰ کے کلامِ ظاہر کے ترجمہ کو چھوڑ کر بعید از کار تاویلات کا سہارا لینا اچھا نہیں ہوتا۔ [ابن کثیر: ١/٢٦، الآیۃ: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ]

اس لیے فرمایا: یہ حقیقت ہے کہ جب کافر کفر میں بڑھ جاتا ہے، جب مشرک شرک میں بڑھ جاتا ہے تو انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں آ جاتا ہے، اللہ کے قرآن کی تکذیب کرتا ہے، اللہ کے قرآن کو جھٹلاتا ہے، اللہ کے پیغمبروں کو جھٹلاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی سزا کے طور پر اس کے دل کو بند فرما دیتے ہیں۔

آپ دیکھیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام دنیا میں کیوں بھیجے گئے کہ لوگوں کو ہدایت دیں، لیکن جب حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کو ساڑھے نو سو سال تک دعوت دی، جب قوم والے ایمان نہ لائے، کفر میں بڑھتے گئے، بڑھتے گئے تو آخر اللہ کے نبی علیہ السلام نے بھی دعا کی:

﴿وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا﴾ [نوح:٢٦]

''اور کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے یا اللہ! اب دنیا پر کوئی کافر کا گھر بھی باقی نہ رہے۔''

﴿إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا﴾ [نوح: ۲۷]

یا اللہ! اگر یہ کافر زندہ رہے تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے ﴿وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا﴾ ان کی آنے والی نسلیں بھی نہیں پیدا ہوں گی، مگر فاجر یا کافر۔ کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام نے تو کئی نسلیں دیکھ لیں، دادا دیکھ لیا، پھر اس کی اولاد، پھر اس کی اولاد، پھر اس کی اولاد، آپ کی ایک ہزار پچاس سال عمر تھی۔ لہٰذا اللہ کے نبی جب ان کے ایمان سے مایوس ہو گئے تو اللہ سے ان کی ہلاکت کی دعا کی۔ اللہ تو "علیم بذات الصدور" ہیں، اللہ جانتے ہیں کہ یہ بندہ اب ہدایت کے قابل نہیں رہا، اب اس کے اندر ہدایت کی صلاحیت ہی نہیں رہی تو پھر وہ بھی ہمیشہ کے لیے مہر فرما دیتے ہیں:

﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ [البقرۃ: ۷]

تو قرآن مقدس کا ترجمہ وہ ہونا چاہیے جو اللہ پاک نے قرآن پاک میں خود بیان فرمایا اور ترجمہ ہمیشہ وہی ہونا چاہیے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

قرآن کا ترجمہ کرنے کے اہل کون؟

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ قرآن کا ترجمہ یا تفسیر ان لوگوں کو کرنا چاہیے جن کو اللہ کے قرآن کا بھی پورا پورا علم ہو، حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی پورا پورا علم ہو، آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی پورا پورا علم ہو، آثارِ تابعین کا بھی پورا پورا علم ہو اور اسی طرح ادب اور نحو کے قواعد اور اصول کا بھی پورا پورا علم ہو، ورنہ اللہ کے قرآن کی ایک ایسی تفسیر اور ایسا ترجمہ بیان کرنا جو تابعین سے ثابت نہ ہو، صحابہ سے ثابت نہ ہو یہ راستے سے بھٹک جانے والی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ باطنیہ راستے سے بھٹک گیا، جس نے اللہ کے قرآن کی تفسیروں کو بدل ڈالا اور کہا کہ یہ ظاہری تفسیر ہے اور ایک باطنی تفسیر علیحدہ ہے۔ جیسے اللہ نے بنی اسرائیل کو فرمایا تھا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ تو وہ کہتے ہیں کہ یہ گائے کا قصہ ایک اشارہ ہے، مراد یہ تھی کہ تم اپنے نفس کو ذبح کرو، اس کو گائے کے نام سے ذکر کیا گیا ہے، ورنہ گائے کے ذبح کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ اللہ کے قرآن کو چھوڑ دینا ہے۔ قرآن حضرت محمد رسول اللہ خاتم الانبیاء حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے اور اللہ نے جیسے قرآن اتارا ہے، اسی طرح قرآن کے جو معانی ہیں وہ اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خود پڑھا دیے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ قرآن لفظاً اور معناً صحابہ رضی اللہ عنہم کو پڑھا دیا، پھر اس کا عملی

نمونہ پیش کیا۔

مفسرین فرماتے ہیں اگر وہ فرقہ باطنیہ والے ان آیات کو دیکھ لیتے تو ایسی بات نہ کہتے اور ایسی تاویلیں نہ کرتے۔

دلوں کا پھیرنا اللہ کے اختیار میں ہے:

امام قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے مہر کردی ہے ان کے دلوں پر ﴿بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ [النساء: ۱۵۵] اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی ہے ان کے کفر کی وجہ سے۔ اور انہوں نے وہ حدیث مبارک بھی بیان کی ہے کہ دلوں کا پھیرنا بھی میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْ قَلْبٍ إِلَّا بَيْنَ أُصْبُعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ إِنْ شَاءَ أَقَامَهُ وَإِنْ شَاءَ أَزَاغَهُ.))

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۱۹۹، باب: فِيمَا أَنْكَرَتِ الْجَهْمِيَّةُ]

((اَلْقُلُوْبُ بَيْنَ أُصْبُعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ اللّٰهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ وَيُصَرِّفُهَا كَيْفَ يَشَاءُ.))

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۱۴۰، باب: مَا جَاءَ أَنَّ الْقُلُوبَ بَيْنَ أُصْبُعَيِ...]

''دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی انگلیوں کے اندر ہیں، وہ جس طرح چاہیں دلوں کو پھیر دیں (چاہیں تو ہدایت دے دیں، چاہیں تو گمراہی میں ڈال دیں)۔''

اسی لیے میرے آقا ﷺ دعا مانگتے تھے:

((يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ! ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ))

''ہمارے دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو دین پر ثابت فرمادے۔''

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۱۴۰، باب: مَا جَاءَ أَنَّ الْقُلُوبَ بَيْنَ أُصْبُعَيِ...]

تو جب دلوں کا پھیرنا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے تو ان پر مہر کرنا بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

[ابن کثیر: ۱/ ۳۶، الآیۃ: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ]

دل کا سیاہ ہونا:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک روایت بیان کی ہے کہ دنیا میں جو فتنے آتے ہیں ان کی مثال دیتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا:

((تُعْرَضُ الْفِتَنُ عَلَى الْقُلُوبِ كَالْحَصِيرِ عُودًا عُودًا، فَأَيُّ قَلْبٍ أُشْرِبَهَا نُكِتَ فِيهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ.)) [صحیح مسلم،حدیث:۲۳۱،بَابُ بَيَانِ أَنَّ الْإِسْلَامَ بَدَأَ غَرِيبًا...]

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک پر چھا ہوتا ہے۔ جیسے وہ ایک ایک پتا ہوتا ہے، بناتے جاتے ہیں تو مصلیٰ بن گیا، پر چھان بن گیا۔ کھجوروں کے گوشے لے لیتے ہیں، پھر اس کے پتوں سے یہ بناتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا کہ جو فتنے آتے ہیں وہ بھی ایک ایک کر حملہ آور ہوتے ہیں۔ تو جن کے دل نے ان کا اثر قبول کر لیا ان کے دل میں سیاہی بھرنی شروع ہو گئی اور جن کے دل نے ان کا اثر قبول نہیں کیا اس کو نہ لیا تو اس کے دل میں صفا اور نکتہ بیضاء پیدا ہو گیا۔

تو جن لوگوں کا دل اللہ صاف فرما دیتے ہیں ان کو فتنوں سے کچھ نہیں ہوتا، وہ فتنوں کے دوران بھی دین اسلام پر قائم رہتے ہیں۔ اور جن کے دل سیاہ ہو جاتے ہیں وہ ایسے ہو جاتے ہیں جیسے کوئی مٹی کا کوزہ (لوٹا) بالکل بند کر دیا جائے اور اس کے اوپر کوئی چیز لگا دی جائے کہ اب اس کے اندر کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی اور باہر بھی نہیں نکل سکتی۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ برائی کو برائی نہیں سمجھتے، بلکہ بھلائی کو برائی سمجھتے ہیں اور برائی کو بھلائی سمجھتے ہیں۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حق تفسیر وہی ہے جو حدیثِ رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا أَذْنَبَ ذَنْبًا كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فِي قَلْبِهِ))

جب مومن بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، پھر اگر توبہ کر لے تو وہ دھل جاتا ہے۔ اگر پھر گناہ کر لے تو پھر نقطہ لگ جاتا ہے، توبہ نہ کرے تو ہوتے ہوتے بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس کے گناہوں کی وجہ سے وہ سیاہی دلوں کے اوپر چھا جاتی ہے۔ تو اس لیے پھر اس کو عبادت میں لذت نہیں ملتی۔ (اور یہ سیاہی ظاہری نہیں ہوتی، بلکہ باطنی ہوتی ہے۔)

[السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث:۲۱۲۸۲]

دلوں اور کانوں پر مہر لگنے کا معنی:

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب گناہ بار بار دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں تو دلوں کو بند کر دیتے ہیں۔ اور جب دل بالکل بند ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر مہر لگ جاتی ہے۔ اور جب

مہر لگ جاتی ہے تو اب ایمان اس کے اندر داخل نہیں ہوسکتا اور کفر اندر سے باہر نکل نہیں سکتا۔ اسی کو اللہ نے بیان فرمایا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ۭ﴾ (البقرة: ۷)۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے برتن کو بند کر دینے کے بعد اوپر مہر لگا دیتے ہیں یا لفافہ کو بند کر کے اوپر مہر لگا دیتے ہیں۔ اب باہر کی کوئی چیز اندر نہیں جا سکتی اور اندر کی چیز باہر نہیں جا سکتی۔ اللہ نے جب کافروں کے دلوں پر مہر لگا دی تو اب ایمان اندر داخل نہیں ہوسکتا اور کفر باہر نہیں نکل سکتا۔

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ۭ﴾ یہاں وقف ہے۔ کیونکہ یہ جملہ پورا ہوگیا۔ ﴿وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ﴾ یہ جملہ تامہ علیحدہ ہے۔ کیونکہ مہر دلوں اور کانوں پر ہوتی ہے اور آنکھوں پر ''غِشَاوَةٌ'' یعنی پردہ ہوتا ہے۔ تو لہٰذا وقف تام ہو جائے گا۔ ''غِشَاوَةٌ'' کا معنی ہے پردہ، جیسا کہ حضرت سدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی یہی ترجمہ بیان فرمایا ہے ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ﴾ کہ ان کے دلوں پر مہر ہے، وہ اللہ کے قرآن کو سمجھتے نہیں ہیں۔ ان کے کانوں پر مہر ہے، وہ اللہ کے قرآن کی دعوت کو سنتے نہیں ہیں۔ ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، وہ سیدھا راستہ دیکھتے نہیں ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی ارشاد فرمایا کہ ان کے دلوں پر بھی مہر ہے، ان کے کانوں پر بھی مہر ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

[ابن کثیر: ۱/ ۴۶، الآية: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ]

کفر کی معافی ہے منافقت کی نہیں:

اسی لیے حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں جہاں کافروں کے لیے دعا کی، اللہ نے قبول فرمائی۔

سیدنا ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کافرہ تھیں تو ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں کہ میری والدہ کافرہ ہے اور آپ کی شان میں بڑی بے ادبی اور گستاخی کے ایسے الفاظ کہہ جاتی ہے جو میں برداشت نہیں کر سکتا، لیکن میں ماں کو مار بھی نہیں سکتا، اس کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ میری ماں ہے۔ اگر میں صبر کرتا ہوں تو آپ کی شان میں گستاخی ہوتی ہے برداشت کرتا ہوں تو برداشت نہیں ہوتا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کر دی۔ آپ نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ اهْدِ أُمَّ أَبِي هُرَيْرَةَ)) [مسلم، باب الفضائل ۱۵۸، مسند احمد، شرح السنة]

"یا اللہ! ابوھریرہ کی اماں کو ہدایت عطا فرما۔"

حضور ﷺ نے دعا فرمائی۔ سیدنا ابی ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی مجلس سے واپس اپنے گھر میں آیا تو میری والدہ غسل کر کے کپڑے پہن کر تیار بیٹھی تھیں۔ اور مجھے کہا: ابی ھریرہ! مجھے جلدی جلدی حضور ﷺ کے پاس لے چلو۔ میں نے کہا: عجیب بات ہے کہ حضور ﷺ کے پاس جا کر وہاں کوئی بے ادبی نہ کرے تو میں نے کہا: اماں جان! آپ نے وہاں کیا لینا ہے؟ انہوں نے کہا: باتیں نہ کرو اور مجھے جلدی جلدی وہاں لے چلو۔ بوڑھی ماں تھیں۔ فرماتے ہیں: میں ان کی لکڑی پکڑ کر ٹیک لگاتے لگاتے آہستہ آہستہ حضور ﷺ کی خدمت میں لے آیا۔ جب حضور ﷺ کی خدمت میں آئیں تو کہا کہ حضور! مجھے کلمہ پڑھا دیں، میں مسلمان ہوتی ہوں۔ تو حضور ﷺ نے کلمہ پڑھا دیا۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۹۱، بَابُ: مِنْ فَضَائِلِ أَبِي هُرَيْرَةَ الدَّوْسِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ]

بہر حال جب حضور ﷺ نے دعا مانگی تو فوراً قبول ہوگئی، لیکن منافق ایسے بد بخت ہیں کہ ان کے بارے میں اللہ نے پاک پیغمبر ﷺ کو فرمادیا کہ ان کا جنازہ نہ پڑھا کریں، ان کی قبروں پر نہ حاضر ہوا کریں، ان کے لیے دعا نہ کیا کریں۔ اگر آپ ان کے لیے ستر دفعہ بھی بخشش مانگیں گے تو بھی اللہ ان کو معاف نہیں کریں گے۔ تو نفاق اتنا شدید اور خطرناک فتنہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر مسلمان کو نفاق سے بچائے۔

جعلی پیر:

اللہ معاف فرمائے! ابھی ہم یورپ کے سفر میں تھے۔ وہاں لوگوں نے بتلایا کہ یہاں ایک دو پیر صاحبان ایسے آئے ہیں کہ پیر بن گئے۔ اب لوگ بے چارے ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں تو لوگوں نے تعویذ لینے شروع کیے اور دو دو سو اور چار چار سو آدمی ہر وقت دروازے پر کھڑا ہے۔ مکان بن گئے، بلڈنگیں بن گئیں، کاریں مل گئیں اور اس کے بعد جو بھی لڑکی گئی اس کی عزت محفوظ نہیں رہی۔ آخر...... نعوذ باللہ...... ایک دو لڑکیوں کا کیس ہوا، پکڑے گئے۔ حکومت نے پکڑا اور جیلوں میں پڑے ہیں۔ یعنی انجام یہ ہے کہ اب ظاہر کیا کیا اور اندر کیا کیا؟ اس کو نفاق عملی کہتے ہیں، یعنی عمل میں نفاق ہے، وگرنہ تو مسلمان ہیں، کلمہ تو پڑھتے ہیں۔

حالاتِ حاضرہ:

میں ایک دفعہ کسٹم میں آ رہا تھا تو جب سامان رکھا تو کسٹم کا جو آفیسر تھا وہ نوجوان لڑکا تھا، شاید کہیں دیکھا ہوگا۔ تو

وہ کہنے لگا کہ شیخ! آپ اس بیگ کا تالا کھول دیں اور اس کے بعد بند کر دیں۔ میں نے کہا کہ بھائی! آپ دیکھ لیں۔ اس نے کہا: مجھے شرم آتی ہے کہ آپ حرم میں پڑھاتے ہیں اور میں کئی دفعہ آپ کا درس سن چکا ہوں تو اب میں آپ کی تلاشی لوں، مجھے تو اچھا نہیں لگتا، لیکن اس نے کہا: حضرت! ہم کیا کریں؟ لوگ داڑھیوں میں ہیروئن چھپا کر لے آتے ہیں، ہم نے پکڑے ہیں، داڑھی کے اندر ہیروئن کی پڑیاں باندھی ہوئی ہیں اور کچھ عورتیں پکڑیں گئیں جن کو کیپسول کھلا دیے گئے کہ بعد میں پیٹ سے نکال لیں گے اور زیادہ ہو گئے۔ اور کوئی کیپسول پھٹ گیا تو وہ مرگئی۔ جب مرگئی تو کیپسول نکل آئے، کیا کوئی انسان داڑھی کا استعمال یوں کرے کہ لوگ سمجھیں کہ داڑھی والا ہے اور وہ اندر چور ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے!! اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام داڑھی والے بدنام ہو جاتے ہیں، تمام داڑھی والوں کی عزت دنیا میں ختم ہو جاتی ہے۔ ایک آدمی گندا عمل کرے گا، لیکن سارے ذلیل ہو جائیں گے۔ ایک مچھلی سارے جال کو گندا کر دیتی ہے، ایک پیشاب کا قطرہ پڑ جائے تو دو من دودھ حرام ہو جائے، ایک گندگی کہیں لگا دو سارے گھر میں بدبو ہو جائے گی۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ گناہ تو کوئی ایک کرتا ہے، بری حرکت تو ایک کرتا ہے، لیکن انجام یہ ہوتا ہے کہ ہر داڑھی والا ان کی نظر میں مشکوک ہو جاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے! کوئی لوگ ایسے آئے کہ ٹانگوں پر پلستر چڑھائے ہوئے ہیں، انہوں نے سمجھا کہ بے چارے کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے، لیکن اس نے پلستر کے نیچے نشہ باندھا ہوا ہے۔ اب اگر کوئی آئے تو اس کو ایکسرے مشین میں لے جاتے ہیں کہ پہلے ایکسرے کرو، کیونکہ وہ تنگ آ گئے ہیں۔ جب ہمارے حالات اور اعمال یہ ہوں تو پھر ہمارے عمل کے مطابق ہم سے نمٹا جائے گا، وگرنہ تو یہ ہوتا تھا کہ مسلمان کا چہرہ دیکھنے کے بعد کافر مسلمان ہو جاتے تھے، مسلمانوں کی ملاقات سے کافر مسلمان ہو جاتے تھے اور اب ہماری داڑھیاں دیکھنے کے بعد بھی اعتبار نہیں، حج پڑھنے کے بعد بھی اعتبار نہیں، حاجی بننے کے بعد بھی اعتبار نہیں اور نمازی بننے کے بعد بھی اعتبار نہیں۔ حرم کے اندر کتنے لوگ ہوتے ہیں جو بے چارے رو رہے ہوتے ہیں، کسی کا پاسپورٹ غائب ہے، کسی کا پرس غائب ہے اور کسی کے جوتے غائب ہیں۔ کوئی جن لے جاتے ہیں؟ یہودی لے جاتے ہیں؟ یا باہر سے کوئی کافر ہندو چوری کرنے کے لیے آتا ہے؟ مسلمان ہے، نماز پڑھنے کے لیے آیا، جوتا لے کر چلا گیا۔ پرانا جوتا ہو اس کو کبھی بھی نہیں اٹھاتے، نیا جوتا ہو۔ آپ "اللہ اکبر" کہیں گے اور ادھر جوتا ختم۔ اب اللہ کے حرم میں چوری کرنے کے لیے آیا ہوا ہو تو آدمی کیا کرے!؟ اس لیے اللہ

پاک سے دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں نفاقِ اعتقادی سے بھی بچائے اور نفاقِ عملی سے بھی بچائے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨﴾

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں (منافق ہیں) جو کہتے ہیں ہم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور وہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩﴾

وہ اللہ اور ایمان والوں سے دھوکہ بازی کرتے ہیں اور وہ دراصل کسی کو دھوکہ نہیں دیتے، مگر اپنے آپ کو اور وہ نہیں سوچتے۔

سورۂ بقرہ کی پہلی چار آیات خالص متقین کے لیے تھیں، جو اندر باہر سے سچے مومن ہوں، ان کی صفات کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے ذکر فرمایا۔ اور دوسری قسم ان کے مقابلہ میں پکے کافر، کھلے ہوئے کافر، اندر سے بھی کافر، باہر سے بھی کافر، یعنی زبانی طور پر بھی کفر اور باطنی طور پر بھی کفر۔ اب ان آیات میں ایک تیسری قسم کا ذکر ہے کہ جو لوگ ظاہر میں ایمان لاتے ہیں اور باطن کے اندر کفر کو چھپائے ہوئے ہیں، اس کو قرآن پاک کی اصطلاح میں منافق فرمایا گیا ہے۔ منافق کا معنی یہی ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر باطن کے خلاف ہو، اس کا فعل قول کے خلاف ہو، اس کی ظاہری وجاہت اس کے چھپے ہوئے کے خلاف ہو، اس کا نام نفاق ہے۔ اور منافق باعتبار جرم کے بھی زیادہ خطرناک ہے اور باعتبار ضرر کے بھی، یعنی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تیرہ آیات مبارکہ میں ان کے احوال کو کھول کر بیان فرمایا ہے۔ مومنین کی صفات میں چار آیتیں آئیں اور کافروں کے احوال میں صرف دو آیات آئیں، لیکن منافقین کے بارے میں تیرہ آیات ہیں، جو سورۃ البقرہ میں ہیں۔ اور اسی طرح مختلف سورتوں میں اللہ نے منافقین کے بارے میں بڑا کھول کھول کر بیان فرمایا ہے، جیسے ''سورۃ المنافقون'' میں منافقین کے احوال کو بیان کیا گیا ہے۔

ان آیات کے نزول کے وقت مدینہ کے معروضی حالات:

حضور ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لے آئے مدینہ میں دو بڑے قبیلے: اوس اور خزرج آباد تھے۔ یہ بہت بڑے قبیلے تھے، اللہ نے ان کو دولت اسلام سے مالا مال فرمادیا، وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہو گئے اور حضور ﷺ

کے جانثار اور فدائی بن گئے۔ ابھی میرے آقا حبیب کبریا ﷺ مکہ مکرمہ میں تھے کہ مدینہ منورہ سے تھوڑے تھوڑے لوگ آ کر حضور ﷺ کی بیعت فرماتے رہے اور اسلام قبول کرتے رہے تو سب سے پہلی بیعت ''بیعۃ العقبۃ'' ہے۔ منیٰ کے اندر جب آپ جاتے ہیں تو جہاں جمرۃ العقبۃ ہے...... اصل میں یہ ''العقبۃ'' اس وادی کا نام ہے، اس سے کچھ پہلے یعنی تقریباً چار سو یا پانچ سو قدم پہلے ایک جگہ ہے، جہاں سب سے پہلے مدینہ منورہ سے سات آدمی آئے اور حضور ﷺ تشریف لے گئے اور آپ نے جا کر ان کو اسلام سکھایا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ کوئی آدمی ہمیں عطا فرمائیں جو مدینہ منورہ میں رہ کر ہمیں قرآن کی تعلیم دے۔ حضور ﷺ نے ایک صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو اس ڈیوٹی پر بھیجا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ذمہ لگایا کہ آپ مدینہ منورہ جا کر ان مسلمانوں کو بھی قرآن پڑھائیں اور ان کے علاوہ کو دعوت اسلام دیں۔...... انہوں نے وہاں جا کر بڑی محنت کی اور ...... الحمد للہ!...... دوسرے سال میں سات کے بجائے ستر آدمی اسلام لانے کے لیئے حاضر ہوئے۔ تو اب ...... الحمد للہ!...... مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی کافی تعداد ہو گئی۔ ادھر جب مشرکین کا ظلم و جور بڑھ گیا، جب ظلم و طغیان حد سے نکل گیا تو حضور ﷺ نے صحابہ کو ہجرت کا حکم دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور پھر بعض لوگوں نے وہیں سے مدینہ کی طرف ہجرت کر لی اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے سیدھا مکہ مکرمہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ تو اب انصار نے جن کی آپس میں بہت بڑی دشمنیاں اور بہت بڑے جھگڑے تھے، لیکن اللہ نے ان کو اسلام کی دولت سے مالا مال کر دیا اور وہ آپس میں بھائی بھائی اور ''رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ'' کی تفسیر بن گئے اور انصار نے مہاجرین کو اپنا بھائی بنالیا اور اسلام مدینہ منورہ میں پوری قوت کے ساتھ جلوہ فگن ہوا اور اسلام کو اللہ نے غلبہ نصیب فرمادیا۔

تو اب کچھ قبائل ایسے تھے جن کا یہودیوں سے زیادہ تعلق تھا، کیونکہ یہود بھی مدینہ منورہ میں آباد تھے۔ بنو قریظہ اور بنو نضیر یہودیوں کے دو بڑے قبائل تھے۔ اور ان کے سردار کعب بن الاشرف اور عبد اللہ بن ابی، جد بن قیس تھے، تو ان لوگوں نے یہ دیکھا کہ اسلام اب قوت پکڑ گیا ہے، ایک طاقت بن گیا ہے تو انہوں نے یہ سوچا کہ ظاہری طور پر ہم مسلمان ہو جائیں، تا کہ ہماری جان مال بچ جائے۔ اگر مسلمان غالب آگئے تو ان کے ساتھ ہم ملے ہوئے ہوں گے، ہمیں فائدہ حاصل ہوگا، جان و مال بھی بچ جائیں گے، اموال غنیمت بھی حاصل ہوں گے اور جب یہ فتوحات کریں گے تو ان میں بھی ہماری شرکت ہو جائے گی۔ اور اگر مسلمان یہاں کمزور ہو گئے تو اندر ہم نے

کافروں سے کہا ہوا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ کھڑے ہیں۔ تو ان لوگوں نے اسلام کو، مسلمانوں کو اور حضور ﷺ کو اپنے علم کے مطابق دھوکہ میں مبتلا کیا اور آ کر اسلام کا اظہار کر دیا۔ مسجدوں میں آنے لگ گئے، نمازیں پڑھنے لگ گئے، حضور ﷺ کے قریب بیٹھنے لگ گئے اور کبھی کوئی سریہ یا غزوہ ہوا تو وہ بھی حضور ﷺ کے ساتھ چل پڑے۔ ظاہر وہ اسلام کرتے رہے، لیکن ان کے اندر کفر تھا، اسی طرح ان کو حضور ﷺ کے ساتھ دشمنی رہی اور اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کرتے تھے کہ مسلمانوں کے احوال معلوم کر کے کافروں کو پہنچا دیتے تھے، یہودیوں کو پہنچا دیتے تھے۔ اور جب یہودیوں کو ملتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم تو آپ کے مخلص ہیں، ہم تو اپنے دین پر قائم ہیں، ہم تو صرف مسلمانوں کے رعب سے اور ان کی دہشت سے ڈر کر اسلام کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اور جب بھی ان کو موقع ملا مسلمانوں کو ہر مقام پر نقصان پہنچانے کی پوری پوری کوشش کی۔

جیسا کہ قرآن مقدس میں بھی ایک مفصل واقعہ کا ذکر ہے۔ ایک دفعہ حضور پاک ﷺ ایک غزوہ میں تشریف لے گئے۔ واپسی پر آپ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا، ایک جگہ آپ نے اپنا قافلہ مبارک اُتارا...... ہوتا یہ تھا کہ راستہ میں صحرا کے اندر کچھ کنویں ہوتے تھے، وہاں کچھ عرصہ تک پانی رہ گیا اور کچھ عرصہ کے بعد پانی خشک ہو گیا۔ ایک کچے کنویں پر حضور ﷺ کے غلام، آپ کے خادم پانی بھرنے کے لیے آئے۔ وہاں عبداللہ بن ابی...... جو منافقوں کا سب سے بڑا سردار تھا...... اس کے نوکر اور ملازم بھی پانی بھرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ تو صحابہ نے کہا کہ سب سے پہلے حضور ﷺ کے پانی کے مشکیزے کو بھر لیں کہ صاف پانی حضور ﷺ کو ملے اس کے بعد صاحبین حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا پانی بھرا جائے گا اور اس کے بعد تمام صحابہ پانی بھر لیں ان کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے تو عبداللہ بن ابی کے ایک ملازم نے اس صحابی سے جھگڑا کیا ان کی آپس میں لڑائی ہوئی جب نوکر نے عبداللہ بن ابی کو بات سنائی تو اس نے فوراً اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور کہنے لگا: دیکھ لیا ہے مسلمان اب اتنی طاقت پکڑ گئے ہیں کہ ہمیں پانی بھی نہیں بھرنے دیتے؟ سب سے پہلے حضور ﷺ کا پانی بھرا جائے گا، اس کے بعد مہاجروں کا پانی بھرا جائے گا اور اس کے بعد ہم مدینہ والوں کا پانی بھرا جائے۔ یہ سب تم لوگوں کی کمزوری ہے کہ تم مدینہ والوں نے ان کا استقبال کیا، ان کو اپنے گھر پیش کیے اور ان کو اپنے باغات پیش کیے۔ ان لوگوں کو بغیر محنت کے دولت مل گئی، تمہاری دولت پر پلتے رہے اور آج تمہارے مقابلے پر کھڑے ہو گئے ہیں، لہٰذا یہاں بیٹھ کر حلف اٹھاؤ اور قسم اٹھاؤ:

﴿يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۚ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ

الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٨﴾ [المنافقون:٨]

"جب ہم مدینہ جائیں گے، ہم طاقت والے ہیں، یہ کمزور ہیں، ہم عزت والے ہیں، ان کو ہم مدینہ سے نکال دیں گے۔"
اور یہ بھی فیصلہ کرو:

﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۭ وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٧﴾﴾ [المنافقون:٧]

کہ حضور ﷺ کے صحابہ پر جو خرچہ کرتے ہو، ان کی امداد کرتے ہو اور جو ان کا مالی تعاون کرتے ہو وہ سب کچھ بند کردو۔ تو عبداللہ بن ابی نے یہ باتیں کیں اور اپنے اپنے قبیلہ کو اس بات پر آمادہ کرلیا۔ اور مدینہ منورہ جب پہنچے تو یہ بات حضور ﷺ تک بھی پہنچ گئی کہ عبداللہ بن ابی نے ایسی ایسی باتیں کی ہیں ﴿لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾ اس نے کہا: اقتصادی طور پر مسلمانوں کو نقصان پہنچاؤ۔

اور یہ یہود کی بہت پرانی پالیسی ہے کہ سب سے پہلے مسلمانوں کو اقتصادی طور پر کمزور کیا جائے۔ آج بھی آپ ہندوستان میں دیکھ لیں، ہندوؤں نے ان ان علاقوں میں اور ان ان مقامات پر حملہ کیا ہے جہاں مسلمانوں کی تجارت تھی، جہاں مسلمانوں کی فیکٹریاں تھیں، جہاں مسلمانوں کی انڈسٹریاں تھیں اور جہاں مسلمانوں کے پاس ایک اقتصادی قوت تھی۔ سب سے پہلے انہی کو جلایا گیا، انہی کو لوٹا گیا، تاکہ مسلمان اقتصادی طور پر کمزور ہوجائے۔ یہ یہود نے پہلا سبق پڑھا تھا اور انہی سے یہ سب ہندوؤں نے لیا ہے۔

ان لوگوں نے بھی پہلی پہلی بات یہی کی کہ ﴿لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ کے نبی کے ساتھیوں پر خرچ بند کردو، ان کی امداد بند کردو۔ جب تم امداد بند کردو گے تو یہ منتشر ہوجائیں گے، بکھر جائیں گے۔ آخر پیٹ پالنا ہے۔ کمانے کے لیے یا مزدوری کرنے کے لیے یہ مختلف علاقوں میں چلے جائیں گے۔ اللہ نے اسی جگہ فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [المنافقون:٧]

میرے مدنی! تمام آسمان اور زمین کے خزانوں کا میں مالک ہوں۔ یہ کہاں تک مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے؟ یہ منافق جاہل ہیں، یہ تو سمجھ نہیں پا رہے، آسمانوں کے خزانوں پر یہ پابندی لگا سکتے ہیں؟ زمینوں کے خزانوں کو یہ روک سکتے ہیں؟ اور یہ جو ایسی باتیں کر رہے ہیں ہم مدینہ سے نکال دیں گے، ان کو پتہ نہیں ہے کہ ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ

وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴿۸﴾ [المنافقون: ۸] اصل عزت کا مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، اصل عزت اللہ کے نبی کے لیے ہے اور اصل عزت پکے ایمان والوں کے لیے ہے، لیکن یہ منافق ہیں، ان باتوں کو سمجھتے نہیں۔ اور خدا کی شان یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی، جو رئیس المنافقین تھا، یعنی منافقوں کا سردار تھا اور اس کا بیٹا پکا مسلمان تھا، بالکل صحیح معنوں میں عاشقِ رسول تھا۔

جب حضور پاک ﷺ کو خبر ملی تو آپ نے عبداللہ بن ابی کو بلایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے ایسی بات کی ہے؟...... اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ جو آدمی زیادہ قسمیں کھائے تو سمجھ لو کہ منافقت کر رہا ہے، کیونکہ زیادہ قسمیں کھانا بھی جھوٹے بندے کی علامت ہوتی ہے۔ جو سچا آدمی ہے اس کو قسم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک آدمی سچ بولتا ہے، سچی بات کرتا ہے، اسے کہیں بھی تو کہے گا کہ میں قسم کیوں کھاؤں؟ میں تو سچی بات کہہ رہا ہوں، مجھے قسم کھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ اگر قسم کھائے گا تو کبھی کوئی مجبوری ہوگی، کوئی جھگڑا ہوگا، کبھی کوئی فیصلہ ہوگا، لیکن جو آدمی بات بات پر قسمیں کھائے اور اپنی ہر بات کو قسم سے شروع کرے، علماء نے لکھا ہے کہ یہ بھی علامت ہے اس کے جھوٹے ہونے کی کہ جب اس سے کسی قسم کا مطالبہ ہی نہیں کیا، لیکن وہ بلا وجہ کہہ رہا ہے کہ اللہ کی قسم ہے! مجھے خدا کی قسم ہے! مجھے اللہ کی قسم ہے! میں سچ کہہ رہا ہوں...... عبداللہ بن ابی نے حضور ﷺ کے سامنے آ کر قسمیں کھائیں "وَاللّٰهِ! یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!" اللہ کی قسم ہے! آقا! ہم نے یہ بات کبھی سوچی بھی نہیں ہے، بلا وجہ صحابی غلط رپورٹ پہنچا کر ہم کو لڑانا چاہتا ہے۔ حضور ﷺ نے ان کی ظاہری باتوں پر اعتبار فرمالیا اور اس کو کہا: ٹھیک ہے، تم نے نہیں کہا، اور بات ختم کر دی۔ اور قافلہ کو حکم دے دیا کہ قافلہ چلائیں۔ قافلہ چلتا رہا اور حضور پاک ﷺ نے قافلہ کو آرام بھی نہیں کرنے دیا۔

[تفسیر الرازی، الآیۃ: یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ...]

اس کی وجہ یہ تھی کہ قافلے والے چلتے رہیں اور چلتے چلتے اتنے تھک جائیں کہ ان کو آپس میں کوئی جھگڑے کا خیال پیدا نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ آپس میں لڑائی ہو جائے اور قتل عام ہو جائے اور اللہ کا رسول ﷺ بھی ان کے اندر موجود ہو۔

تو جب مدینہ کے اندر پہنچ گئے تو عبداللہ بن ابی اپنے گھر کی گلی کے اندر داخل ہونے لگا تو اس کے بیٹے نے تلوار نکال لی اور گلی کے دروازے پر کھڑا ہو گیا، اس نے کہا "وَاللّٰهِ! لَا يَدْخُلُ" خدا کی قسم ہے! میں تمہیں آج اپنے گھر

میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔ اس نے کہا: تم عجیب بات کرتے ہو! تم میرے بیٹے ہو، میں تمہارا باپ ہوں، تم ایسے بے ادبی کر رہے ہو؟ اس نے کہا: جو محمد عربی ﷺ کا بے ادب ہو اس سے باپ اور بیٹے کا کیا تعلق ہے؟ تم نے کہا ہے کہ ہم عزت والے ہیں اور...... نعوذ باللہ...... صحابہ ذلت والے ہیں۔ جب تک یہ کلمہ تم واپس نہ لو، اپنی زبان سے اقرار نہ کرو کہ میں ذلیل ہوں اور اللہ عزت والے ہیں پھر تو تم گھر میں داخل ہو سکتے ہو، ورنہ میری تلوار فیصلہ کرے گی۔ لوگوں نے سمجھایا۔ اس نے کہا: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں اللہ کے پیغمبر ﷺ کے بارے میں اور صحابہ ؓ کے بارے میں ایک لفظ سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اور کتابوں میں آتا ہے کہ عبداللہ بن ابی نے آخر کہا کہ ٹھیک! وہ عزت والے ہیں اور ہم ذلت والے ہیں۔ اس نے کہا: اب تم جا سکتے ہو، ذلیل بن کر رہ سکتے ہو، لیکن مسلمانوں سے عزیز بن کر نہیں رہ سکتے ہو، تم اپنی ذلت کا اعتراف کرو۔

[روح المعانی: الآیۃ: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ]

یہ وہ منافق تھے جنہوں نے اسلام کو بار بار نقصان پہنچایا۔ جنگِ احد کے موقع پر جب آپ ﷺ اپنے صحابہ کو لے کر کافروں کے مقابلے کے لیے نکلے، یہ بدبخت عبداللہ بن ابی چار سو آدمیوں کی جماعت کو لے کر پیچھے آ گیا۔ کہنے لگا کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں جاتے، مدینہ منورہ کے اندر رہ کر لڑنا چاہیے، مدینہ سے باہر جا کر ہم کیسے مقابلہ کر سکیں گے؟ اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی جماعت ٹوٹ جائے، وحدت ٹوٹ جائے۔ جب ایک ہزار کا لشکر جا رہا ہو، چار سو آدمی بھاگ جائے، باقیوں کے دل بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس وقت منافقوں کا کردار یہی تھا، کسی طرح مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جائے اور انہوں نے اتنی بڑی بڑی سازشیں کیں۔

ایک دفعہ میرے آقا خاتم الانبیاء حبیب کبریا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ یہودیوں کے علاقے میں، یہودیوں کا جہاں مسکن تھا، یہودیوں کا جہاں قلعہ تھا، ان کے مکانات تھے، ایک قتل کے معاملہ میں جھگڑا تھا، حضور ﷺ اس کا فیصلہ فرمانے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ علاقہ والے پیسہ اکٹھا کر کے دیت ادا کر دو، تا کہ یہ جھگڑا ختم ہو جائے تو اس ضمن میں میرے آقا ﷺ تشریف لے گئے۔ اور یہودیوں کو اطلاع دینے والے یہی منافق تھے کہ حضور ﷺ آ رہے ہیں۔ ان یہودیوں نے بظاہر یہ کیا کہ اپنے قلعہ کے نیچے دیوار کے نزدیک ایک جگہ بنائی اور وہاں بڑا اچھا انتظام کیا اور مسند بنائی کہ حضور ﷺ کو یہاں بٹھائیں گے، بظاہر تو انہوں نے استقبال کا انتظام کیا، لیکن ایک بدبخت کو اس قلعہ کی دیوار کے اوپر چھپا دیا کہ جب حضور (ﷺ) بیٹھ جائیں تو تم اوپر سے

پتھر گرا دو، تا کہ حضور (ﷺ) شہید ہو جائیں اور ہمارا جو جھگڑا ہے یہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ میرے آقا ﷺ تشریف لے جا رہے تھے، اللہ نے جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا اور اپنے پاک نبی ﷺ کو باخبر کر دیا کہ آپ کے دشمنوں نے یہ پروگرام بنایا ہے، آپ وہاں نہ جائیں۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُوْنَ كَرَجُلٍ وَاحِدٍ اَوْ كَمَا قَالَ ﷺ)) [صحیح مسلم، حدیث: ۲۵۸۶ باب: تَرَاحُمِ الْمُؤْمِنِيْنَ...]

مومن ایسے ہیں جیسے ایک جسد ہے، ایک قالب ہے، ایک بدن ہے۔ اگر انگلی میں تکلیف ہوئی تو پورے بدن کو تکلیف ہوگی۔ اگر مسلمان مشرق میں ہوگا تو مغرب کا مسلمان تڑپے گا۔ اگر مغرب میں مسلمان ہوگا تو مشرق کا مسلمان تڑپے گا۔ اور آج کیا عالم ہے کہ ڈیڑھ ارب مسلمان دنیا کے اندر موجود ہیں اور مسلمان مر رہے ہیں، کٹ رہے ہیں، جل رہے ہیں اور ہم ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' بھی نہیں پڑھ سکتے، ہم ان کے لیے دعائیں بھی نہیں مانگ سکتے اور ہم ان کے لیے کوئی غیرت ایمانی کا مظاہرہ بھی نہیں کر سکتے۔ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے کون ہیں؟ مسلمان ہیں۔ مسلمان مسلمان کے خلاف لڑتا ہے، مسلمان کو مسلمان کے خلاف لڑایا جاتا ہے۔ اسی طرح دیکھ لیں کہ آج جن مجاہدین نے چودہ سو سال پہلے کی تاریخ جہاد کو زندہ کر دیا تھا، آج دیکھیں کہ وہی مجاہدین آپس میں دست وگریبان ہیں، ایک دوسرے پر گولیاں چلا رہے ہیں اور ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔ وجہ کیا ہے کہ جب کفر نے دیکھا کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے تو انہوں نے منافق مسلمانوں کو خریدا اور اندر ڈال دیا۔ وہ منافق اب دونوں کو ملنے ہی نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان منافقین کے فتنوں سے محفوظ فرمائے۔ اللہ نے ان آیات مبارکہ میں منافقین کے احوال کو بڑا کھول کر بیان کیا ہے۔

اس کے بعد بات کو سمجھیں کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں جو منافق تھے وہ اعتقادی منافق تھے کہ زبان سے کہتے تھے ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۸] لیکن اللہ نے فرمایا: یہ زبانی کہہ رہے ہیں لیکن، اندر سے مسلمان نہیں ہیں۔

عملی منافق اور ملحد:

اور ایک ہوتا ہے عملی منافق کہ ظاہراً کلمہ بھی پڑھتا ہے، حضور ﷺ کو بھی مانتا ہے، آخرت کو بھی مانتا ہے اور

قیامت کو بھی مانتا ہے، لیکن اس کا عمل شریعت کے مخالف ہے۔ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، لیکن نماز نہیں پڑھتا، کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، لیکن روزہ نہیں رکھتا، کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، جہاد نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، حج نہیں کرتا، زکوۃ نہیں دیتا، شراب پیتا ہے، سود کھاتا ہے، غلط کام کرتا ہے، دعویٰ تو اسلام کا کرتا ہے، لیکن عمل کافروں اور فاجروں والے کر رہا ہے۔ اس کو عملی طور پر منافق کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک ملحد ہوتا ہے، ایک زندیق ہوتا ہے۔ ملحد وہ ہوتا ہے جو اللہ کے قرآن کے ظاہر کو تو مانتا ہے، لیکن اس کے ترجمہ کو ایسے بگاڑتا ہے کہ قرآن کی باقی آیات اور فرمانِ محمد ﷺ کے خلاف ہوتا ہے، اسی کو ملحد بھی کہا جاتا ہے اور اسی زندیق بھی کہا جاتا ہے، حتیٰ کہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جیسے حضور ﷺ کے زمانہ میں منافق ہوتے تھے، اب ہمارے زمانہ میں زندیق ہیں کہ ظاہراً قرآن پڑھتے ہیں، قرآن مانتے ہیں، لیکن قرآن کے ترجمہ کو بدل دیتے ہیں، ظاہراً اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اسلام کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہوتے، اسلام کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے۔ یہ عملی نفاق ہے۔ اور عملی نفاق آ جائے تو...... اللہ معاف کرے!...... آہستہ آہستہ آدمی منافقین کی صف میں چلا جاتا ہے۔

منافقین کی بخشش نہیں ہوگی:

اور منافقین کے بارے میں اللہ نے قرآن مقدس میں فرمایا:

﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا﴾ [النساء:۱۴۵]

منافق کو قیامت والے دن جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں رکھا جائے گا اور وہاں ان کو دردناک سزا دی جائے گی۔ اسی لیے جب حضور ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے لیے نماز جنازہ پڑھی اور اس کے لیے دعائے مغفرت کی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن نازل کر کے فرمادیا:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ أَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾
[التوبۃ:۸۴]

میرے محمد مدنی! اگر ان منافقوں کا کوئی مر جائے ان کا جنازہ بھی نہ پڑھیں اور ان کی قبر پر بھی کھڑے نہ ہوں، کیونکہ یہ اصل میں اللہ سے کفر کرنے والے ہیں، اللہ کے رسول کا انکار کرنے والے ہیں۔ باقی آپ اگر ان کے

لیے بخشش مانگتے ہیں تو فرمایا:

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾﴾ [التوبۃ:۸۰]

میرے نبی! آپ ان کے لیے بخشش مانگیں یا نہ مانگیں، چاہے ستر دفعہ بھی مانگیں، میں ان کو ہرگز نہیں بخشوں گا، کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو دین سے نکل گئے، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان سے نکل گئے، یہ وہ لوگ ہیں جو ہدایت سے نکل گئے، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اسلام کو، مسلمانوں کو، اللہ کے انبیاء کو اور اللہ کے رسولوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ تو نفاق اتنی خطرناک چیز تھی کہ صحابہ کرام نفاق سے بہت ڈرتے تھے۔

اعمالِ صالحہ میں مسلمان کی حالت میں فرق:

میرے پاک نبی ﷺ کے ایک صحابی ہیں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ، ایک دفعہ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے: ''نَافَقَ حَنْظَلَةُ'' حنظلہ تو...... نعوذ باللہ...... منافق ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تمھیں کیا ہو گیا؟ تم تو پکے مومن ہو، تم کیسے منافق ہو گئے؟ اس نے کہا: حضور! جب آپ کی مجلس میں بیٹھتے ہیں تو دل کی حالت اور ہوتی ہے، دل کے اندر نورِ ایمان ٹھاٹھیں مارتا ہے، دل روشن ہوتا ہے اور دل کے اندر ماسوائے اللہ اور اللہ کے رسول کے اور کوئی خیال نہیں رہتا، لیکن جب ہم اپنے گھر میں چلے جاتے ہیں، بیوی میں، بچوں میں، مال میں اور کاروبار میں تو وہاں جا کر وہ بات نہیں رہتی، وہاں جا کر وہ حالت نہیں رہتی، تو لہٰذا جب حالت بدل گئی کہ آپ کی مجلس میں کچھ ہوتی ہے اور گھر میں جانے کے بعد کچھ ہوتی ہے، لہٰذا یہی تو نفاق ہو گیا، یہی تو منافقت ہو گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! یہ بات نہیں ہے، بلکہ جو میری صحبت میں کیفیت ہوتی ہے اگر وہی کیفیت ہمیشہ تمھاری رہ جائے تو گلیوں میں اور بستروں پر اللہ کے فرشتے اتر کر تمھیں مصافحہ کرنے کے لیے آئیں۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۷۵۰، باب: فَضْلِ دَوَامِ الذِّكْرِ وَالْفِكْرِ فِي أُمُورِ الْآخِرَةِ]

مدینہ منورہ کے اندر جتنے بھی منافق تھے میرے اللہ نے اپنے پاک نبی حضرت محمد ﷺ کو ان منافقوں کے ناموں کی بھی خبر دے دی تھی، اللہ نے بتلا دیا کہ فلاں بن فلاں منافق ہے اور فلاں بن فلاں منافق ہے۔ اللہ نے باقاعدہ ان کے ناموں کی بھی خبر دے دی تھی۔ حضور ﷺ نے صرف ایک صحابی...... جن کا نام حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ تھا، جن کا لقب صاحبِ سرِ رسول اللہ ﷺ تھا۔ یعنی جو رازدارِ رسول پاک ﷺ تھا...... ان کو حضور ﷺ نے بتلا

دیا تھا کہ فلاں اور فلاں منافق ہیں، تا کہ اللہ نے مجھے جو بتلایا ہے میں آگے پہنچادوں، لیکن اس کو زیادہ کھولنے کی اللہ کی طرف سے اجازت نہیں تھی۔ اس لیے حکم تھا کہ جو منافق ہیں آپ جان گئے، ہم نے بتلا دیا، لیکن آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ جیسے اسلام کو غلبہ ملے گا، یہ اپنی موت خود مر جائیں گے، آپ ان کو سزا بھی نہ دیں۔ وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ ان منافقوں کو مدینہ میں سزا دیتے تو قتل و قتال ہوتا، کیونکہ وہ اسلام کے باغی تھے، وہ محمد عربی ﷺ کے باغی تھے اور اسلام ابھی نیا نیا پھیلا تھا، پوری دنیا میں ایک بات پھیل جاتی کہ حضور ﷺ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں، حضور ﷺ کلمہ پڑھنے والوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں تو اس لیے اللہ کی حکمت تھی۔ اللہ نے آپ کو باخبر کر دیا، لیکن سزا دینے کی اجازت نہ دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ منافق کا جنازہ نہیں پڑھتے تھے:

حضرت امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ جب حضور ﷺ کا زمانہ گزر گیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو اگر کسی آدمی کا جنازہ آتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑی دور بیٹھ کر دیکھتے کہ جنازہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ شریک ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اگر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جنازہ کے اندر ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شریک ہوتے، ان کو تسلی ہو جاتی کہ یہ منافق کا جنازہ نہیں ہے۔ اور اگر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی آہستہ آہستہ چلے جاتے کہ منافق کی نماز کیوں پڑھوں؟

''مَنْ'' کا استعمال:

''مَنْ'' کا استعمال مفرد میں بھی ہوتا ہے اور جمع میں بھی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ إِلَيْكَ﴾ [سورۃ محمد: ۱۶] میں ''مَنْ'' مفرد ہے۔ اور دوسری جگہ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ إِلَيْكَ﴾ [یونس: ۴۲] میں جمع کے لیے ہے۔ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ﴾ اور آگے ہے ﴿اٰمَنَّا﴾ تو یہاں جمع کا فائدہ دے رہا ہے۔

ایمانیات:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ [البقرۃ: ۸]

وہ کہتے کہ ہمارا ایمان ہے اللہ پر اور یوم آخرت پر۔ صرف اللہ پر اور آخرت پر ایمان لانے کا ذکر ہے تو اتنا ایمان تو کافی نہیں۔ اللہ پر ایمان، اللہ کے نبی پر ایمان، اللہ کے ملائکہ پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان اور اللہ کے

رسولوں پر ایمان بھی ضروری ہے۔ تو یہاں صرف دو چیزوں کا ذکر آیا ہے: ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی اوّل اور آخر کو ذکر کر دیتے ہیں اور درمیان کی ساری چیزیں خود بخود سمجھ آ جاتی ہیں، جیسے فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾[البقرۃ:۱۱۵]

مشرق بھی اللہ کے لیے ہے اور مغرب بھی اللہ کے لیے ہے۔ اب دیکھیں مشرق اور مغرب کے درمیان میں کتنی چیزیں ہیں، وہ بھی ساری اللہ کے لیے ہیں، تو لہٰذا ایک جانب مشرق کا ذکر آ گیا اور دوسری جانب مغرب کا ذکر آ گیا تو مراد یہ ہے کہ ساری کائنات اللہ کے لیے ہے۔ یا جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ میرا حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک ایمان ہے تو اس کا معنی بھی یہ ہے کہ میرا سب پر ایمان ہے۔ جب اللہ پر ایمان لائے گا تو اللہ کی کتابوں پر بھی ایمان لائے گا، اللہ کے فرشتوں پر بھی ایمان لائے گا، اللہ کے رسولوں پر بھی ایمان لائے گا۔ اور جب آخرت پر ایمان لائے گا تو اس کے لیے اعمالِ صالحہ کرے گا، گناہوں سے بھی بچے گا، منکرات سے بھی بچے گا اور فواحش سے بھی بچے گا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں اوّل اور آخر ایمانیات کا ذکر کر دیا۔

ایمان ہو تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسا!

حضرت بخاری رحمہ اللہ...... اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں فرمائیں اور جتنے علمائے حق فوت ہو گئے ہیں اللہ ان سب کی قبروں کو باغِ جنت بنا دیں، جتنے زندہ ہیں اللہ ان کی حفاظت فرمائیں اور ان کو صحت وعافیت کے ساتھ دین کی خدمت عطا فرمائیں۔...... حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری فرماتے تھے کہ بھائی سچی بات پوچھتے ہو تو یہ ہے کہ ایمان ہو تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہو۔ بڑی عجیب مثال دیتے تھے! فرماتے تھے کہ ایمان ہو تو صدیق کا ہو اور کفر ہو تو ابوجہل کا ہو، درمیان میں کچھ نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ صبح کو مسلمان اور شام کو ڈھیلا اور اگر شام کو پکا تو صبح ڈھیلا تو پھر یہ کیا اسلام ہوا؟ ذرہ ذرہ بات پر تو بھاگے، ذرا تکلیف آئی تو اسلام چھوڑ دیا، ذرا مصیبت آئی تو اسلام چھوڑ دیا، ذرا پریشانی آئی تو اسلام چھوڑ دیا تو یہ انتہائی طور پر منافقانہ عمل ہے۔ فرماتے تھے کہ دو ہی مقام ہے: یا تخت مقام ہو گا یا تختہ مقام ہو گا آزادی کا۔ جب آزادی ملتی ہے تو آدمی یا تو تخت پر ہو یا تختہ پر ہو کہ جان چھوٹ گئی۔

تو دیکھیں کہ ایمان ہو تو صدیق رضی اللہ عنہ کا ہو کہ جس نے دیکھا ہے تب بھی مان لیا، نہیں دیکھا تب بھی مان لیا۔ اور معراج کی رات میں موجود نہیں ہیں، حضور ﷺ کی زبان مبارک سے بھی نہیں سنا، ابوجہل کافروں کو لے کر آیا اور آ کر کہنے لگا: اے ابوبکر!

"هَلْ سَمِعْتَ مَا قَالَ صَاحِبُكَ؟"

"کیا تو نے سنا ہے کہ تیرا ساتھی کیا کہہ رہے ہیں؟"

آپ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ تیرے دوست کہتے ہیں کہ رات کو میں مسجد اقصیٰ گیا، سدرۃ المنتہیٰ پر گیا، جنت دیکھی، ساری سیر کی اور رات بھی ختم نہیں ہوئی کہ میں مکہ میں واپس آ گیا۔ یہاں زمین پر مہینوں کا سفر اور اوپر سالوں کا سفر اور رات میں طے ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابوجہل! تم ایک بات بتاؤ کہ جو تم بات کہہ رہے ہو یہ بات میرے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے؟ اس نے کہا: ہم ابھی سن کر آ رہے ہیں۔ فرمایا "صَدَقَ رَسُولُ اللهِ" اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو سچ فرمایا ہے۔ اگر جبرئیل علیہ السلام آسمانوں سے ایک منٹ میں آسکتا ہے تو کیا محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جا سکتے......!؟ یہ کون سی بڑی بات ہے۔

[المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث: ۴۴۰۷]

تو اس لیے فرماتے تھے کہ ایمان ہو تو صدیق جیسا ہو، کفر ہو تو ابوجہل کا ہو کہ سامنے کنکریاں ابوجہل کے ہاتھ میں ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتا ہے کہ اگر آپ بتا دیں کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے تو میں کلمہ پڑھتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عجیب آدمی ہو! یہ تو معمولی سوال ہے کہ میں یہ بتا دوں کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اچھا تو تم ایسا کرو کہ جو تیرے ہاتھ میں ہے وہ بتلا دے کہ میں کون ہوں؟ تو اس نے کہا: اچھا جی! تو کنکریوں نے کلمہ پڑھ لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب تو کلمہ پڑھ لو۔ اس نے کہا: جادو ہے، میں نہیں مانتا۔

تو بہرحال کفر بھی واضح ہے اور ایمان بھی واضح ہے، لیکن خطرناک وہ ہے جس کو اللہ نے فرمایا:

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ﴾ [البقرۃ:۹]

یا اپنے زعم میں اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور جو ایمان لائے ہیں ان کو دھوکہ دے رہے ہیں، جبکہ وہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ [آل عمران:۱۱۹] ہیں، ﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ﴾ [غافر:۱۹] ہیں، لیکن جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ دیا اس نے اللہ کو دھوکہ دیا، جس نے مسلمانوں کو دھوکہ دیا اس نے اللہ کو دھوکہ دیا، اس لیے اللہ کا نام عظمت کے لیے آیا۔ اور اللہ نے فرمایا: یہ بدبخت نہیں سمجھتے ﴿وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۹] یہ اللہ کو بھی دھوکہ نہیں دے سکتے، مومنوں کو بھی دھوکہ نہیں دے سکتے، اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ یہ تو سمجھ رہے ہیں کہ ہم بڑے کامیاب ہیں، شیطان بھی ہمارے ساتھ ہے اور کافر بھی

ہمارے ساتھ ہیں۔

نفاق کا معنی:

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نفاق کا معنی ہے "اِظْهَارُ الْخَيْرِ وَإِسْرَارُ الشَّرِّ" کہ آدمی ظاہر تو کرے خیر اور بھلائی، لیکن دل میں شر چھپا رکھا ہو۔ [ابن کثیر: ۱/۴۷، الآیۃ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ...]

ایک ادیب نے بھی بڑی عجیب مثال دی ہے! اس نے کہا کہ دنیا کا جو پیسہ ہے، نوٹ ہیں، یورو ہے، دنیا کی کوئی کرنسی ہے، یعنی دنیا کے اندر آج تک کوئی ایسی کرنسی نہیں چھپی جس کے دونوں طرف کا سورج ایک ہو اور اس کے بھی دو منہ ہوتے ہیں اور ایک طرف اور ہوتا ہے اور دوسری طرف اور ہوتا ہے، اس لیے اس نے کہا کہ یہ پیسہ بھی کسی کے پاس نہیں رہتا اور کسی کا یہ خیر خواہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ بھی ذُوْ وَجْهَيْنِ ہے، اس کے بھی دو رُخ ہوتے ہیں۔ اور اس لیے فرمایا کہ نفاق کے معنی ہی یہ ہے کہ "اِظْهَارُ الْخَيْرِ وَإِسْرَارُ الشَّرِّ" کہ خیر کو ظاہر کرے اور شر کو چھپا کر رکھے۔

علامہ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ منافق وہ ہوتا ہے کہ جس کا قول کچھ ہو اور فعل کچھ ہو، کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے، اس کا باطن کچھ ہے اور ظاہر کچھ ہے، اس کا داخل ہونے کا راستہ الگ ہے اور باہر نکلنے کا راستہ الگ ہے، یعنی جہاں موقع ملا ادھر نکل گیا اور اس کا حاضر ہونا الگ ہے اور غائب ہونا الگ ہے۔

یہودیوں میں سے جو ایمان لائے ان میں ایک عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا ہے۔ ویسے یہودیوں میں سے اور لوگ بھی مسلمان ہوئے ہیں: عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے چار ساتھی اور بھی ہیں: ایک کا نام اسد، دوسرے کا نام اسید، تیسرے کا نام ثعلبہ، چوتھے کا نام ابن یاسین اور پانچویں عبد اللہ بن سلام ہیں رضی اللہ عنہم۔ یہ لوگ یہود میں سے تھے اور اسلام لائے اور اللہ نے پھر ان کو خالص اسلام نصیب کر دیا، ظاہر اور باطن سے پکے مسلمان ہو گئے، اسی طرح ابن سوریہ اور دوسرے لوگ بھی اسلام لائے۔ بہت تھوڑے لوگ تھے یہود میں سے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔

منافقین کی ایک وجہ عداوت:

لیکن مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے اس وقت بھی نفاق نہیں تھا، کیونکہ مسلمانوں کے پاس کوئی طاقت نہیں تھی، کوئی قوت نہیں تھی، بلکہ مسلمانوں میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود

یہودیوں کے ساتھ معاہدے کیے، مشرکینِ عرب کے ساتھ معاہدے کیے، قبائل کے ساتھ معاہدے کیے، کیونکہ ابھی اسلام کو اتنی قوت اور طاقت نہیں ملی تھی۔ اسلام کے اندر سب سے پہلا غزوہ غزوۂ بدر ہے، اس غزوہ بدر الکبریٰ کے اندر اللہ نے اسلام کو عزت دی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور اسلام کو غلبہ نصیب ہوا۔ کفار کے ۷۰ سردار مارے گئے اور کفار کے ۷۰ آدمی قید ہو گئے۔

عبداللہ بن ابی بن سلول یہ آدمی مدینہ کے اندر بڑا سردار تھا اور قبیلہ خزرج کے ساتھ تعلق رکھتا تھا، یہ دونوں قبیلوں کا بڑا سمجھا جاتا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں ان قبائل والوں نے بھی اتفاق کر لیا تھا کہ مدینہ منورہ کی بادشاہی اس کو دے دیں گے، اس کو مدینہ منورہ کا بادشاہ بنا دیں گے، لیکن اللہ پاک کی قدرت کا نظارہ یہ ہوا کہ حضور پاک ﷺ تشریف لائے اور اسلام آیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم آئے تو وہ سب انصار اسلام کے اندر داخل ہو گئے اور عبداللہ بن سلول کی سرداری اور تاج والی بات رہ گئی۔

حدودِ حرم کی تعظیم:

واقعہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور اتنی بڑی شان والے ہیں! وہ جب عمرہ کرنے کے لیے یا حج کرنے کے لیے مکہ مکرمہ میں آتے تھے تو مسجد تنعیم ...... جہاں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نام سے مسجد بنی ہوئی ہے وہاں چونکہ حرم کی حد ختم ہوتی ہے...... تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رہنے کے لیے جو خیمے لگاتے تھے وہ حرم سے باہر لگاتے اور اپنی عبادت کے لیے جو خیمے لگاتے وہ حدِ حرم میں لگاتے تھے، یعنی آپ نماز کے لیے حرم میں آجاتے، عبادت کے لیے حرم کی حد میں آجاتے اور پھر کھانا کھانے کے لیے، رات رہنے کے لیے اپنے دوسرے خیموں میں چلے جاتے۔ تو صحابہ نے کہا کہ اتنی تکلیف ہوتی ہے۔ فرمایا: مجھے ڈر لگتا ہے کہ نوکر سے کوئی سخت بات کرلوں، مجھے ڈر لگتا ہے کہ گھر والوں سے حدودِ حرم کے اندر کوئی سخت لفظ کہہ دوں، اس لیے میں اپنی رہائش کو وہاں رکھتا ہوں اور اپنی عبادت کو اللہ کے حرم کے اندر رکھتا ہوں۔

اسلام اچھا مذہب ہے، مگر مسلمان بے عمل ہیں:

نیکسن کی بیٹی نے ایک کتاب لکھی ہے، اس کے اندر اس نے لکھا ہے کہ دنیا کے مذاہب میں سب سے اچھا مذہب اسلام ہے اور سب سے گندے لوگ مسلمان ہیں۔ ان کا مذہب سب سے اچھا ہے، اعلیٰ ہے، ایسا مذہب دنیا

میں دیکھا نہیں۔ میں نے یہودیت پڑھی، نصرانیت پڑھی، بدھ مت پڑھا ہے، ہندوازم پڑھا ہے، میں نے دنیا کے ہر مذہب کا مطالعہ کیا ہے، دنیا کے اندر اسلام سے اچھا مذہب کوئی نہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ سب سے گندے بھی مسلمان ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت:

اور دیکھیں کہ غیرت اور محبت یہ ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیبیہ میں بیٹھے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کعبہ میں کھڑے ہیں۔ مکہ کے مشرکین نے کہا: عثمان! تمہارے ہم پر احسان ہیں، تمہیں اجازت ہے کہ طواف کرلو، عمرہ کرلو اور صفا دوڑلو۔ انہوں کہا کہ یاد رکھو! محمد مدنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تک عمرہ نہیں کریں گے میں بھی نہیں کروں گا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ نہ کریں اور میں عمرہ کرلوں، صحابہ عمرہ نہ کریں اور میں عمرہ کرلوں۔ یہ ایمان تھا، یہ محبت تھی۔

ان آیات کے اصل مصداق:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جو قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے منافق تھے اور پھر جو لوگ ان کے طریقہ پر چلنے والے ہیں۔ اسی طرح اوس اور خزرج کے بارے میں ابو العالیہ، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے بھی فرمایا کہ ان آیات میں اللہ نے جن منافقین کو ذکر کیا ہے وہ مدینہ منورہ میں رہتے تھے اور قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے یا قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں تنبیہ کی کہ ان کے بارے میں قران میں تیرہ آیتیں نازل فرمائیں، اللہ نے سورۃ المنافقون نازل فرمائی، تاکہ مسلمان منافقوں کے دھوکہ میں نہ آئیں، ان کے ظاہری ایمان پر نہ جائیں، جھوٹی قسموں کا اعتبار نہ کریں اور کسی فساد کے اندر نہ پڑ جائیں۔ [ابن کثیر: ۱/۴۷، الآیۃ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ...]

اور اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پہلی امتیں بھی گمراہ ہوئی ہیں اور فرقوں میں بٹ گئی ہیں اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پہلی امتیں بہتر فرقوں مین بٹ گئیں اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی اور تہتر فرقوں میں تمام جہنمی ہوں گے، صرف ایک فرقہ نجات والا ہوگا اور وہی کامیاب ہوگا، وہی جنتی ہوگا۔ تو جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ اس کامیاب گروہ کی علامت کیا ہوگی؟ فرمایا:

((اَلَا! مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۶۴۱، بَابُ: مَا جَاءَ فِي افْتِرَاقِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ]

''جنہوں نے میرا طریقہ اور میرے صحابہ کا طریقہ پکڑ لیا وہ کامیاب ہیں۔''

ایمان میں مضبوطی کی حکایت:

ایک ضعیف مخلوق بی بی سمیہ رضی اللہ عنہا ایک کمزور عورت ہے اور مقابلہ پر کفر کی طاقت ہے۔ ابو جہل نے پورا زور لگا دیا کہ تم اسلام کو چھوڑ دو۔ بی بی صاحبہ نے کہا کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے کے بعد اور شہادتین کے اقرار کے بعد انکار کردوں۔ ابو جہل نے اسے مارا، اسے قتل کی دھمکی دی، لیکن بی بی صاحبہ اپنے ایمان پر اسی طرح جمی رہیں، حتیٰ کہ ابی جہل نے اتنا ظلم کیا کہ دو اونٹ بڑے سرکش قسم کے منگوائے اور بی بی صاحبہ کی ٹانگوں میں رسیاں باندھ کر ان اونٹوں سے باندھا گیا اور ان اونٹوں کو مختلف سمت دوڑایا گیا اور بی بی صاحبہ کے ٹکڑے ہو گئے۔ اور اس ظالم نے اپنے ہاتھ سے نیزہ مارا اور بی بی صاحبہ کا جسد دو ٹکڑے ہو گیا، لیکن زبان پر ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کی اسی طرح شہادت موجود تھی۔ یہ ایمان والے تھے، اس طرح کہ پہاڑ تو اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے، لیکن یہ مومن اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلاف:

اسلام کا پرچم پورے عرب سے نکل کر ایشیا تک اور پوری دنیا تک پھیل گیا۔ اب دشمنوں نے فیصلہ کیا کہ اسلام کو ہم مقابلہ سے نقصان نہیں پہنچا سکتے تو اب انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھا اور عبداللہ بن سبا نے جو یہودی النسل تھا اس نے جماعت پیدا کی۔ انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا، مسلمان بن گئے اور یہی لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا ذریعہ بنے۔ اور وہیں سے دیکھ لیں کہ جوں ہی جنگیں شروع ہوئیں، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو مدینۃ الرسول میں شہید کیا گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک شہر میں مظلوماً شہید کیا گیا، گھر میں بند کیا گیا، ان کا محاصرہ کیا گیا، ان کا پانی بند کیا گیا، ان کو حرم آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جس شخص نے پورے مدینہ والوں کو پانی پلایا تھا، آج خود پانی پینے کے لیے ترس رہا تھا، قرآن پڑھتے ہوئے شہید کیا گیا۔ قتل کرنے والے کون لوگ تھے؟ وہ جو ظاہراً مسلمان تھے۔ اور جوں ہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی، اس کے فوراً بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے والے وہی لوگ تھے جنہوں نے سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا۔ اور اس کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ ایک طرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حمایت کی اور دوسری طرف بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا...... جو حج اور عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ تشریف

فرماتھیں...... ان کو آ کر بھڑکایا گیا کہ عثمان رضی اللہ عنہ مظلوم شہید ہو گئے ہیں اور جن لوگوں نے شہید کیے ہیں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قریب ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلوں کا بدلہ نہیں لینا چاہتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بدگمان کیا گیا کہ اس وقت امت کو آپ کی ضرورت ہے، آپ تمام امت کی ماں ہیں۔ جب آپ بحیثیت ام المومنین کے، باعتبار رشتہ داری کے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ کریں گی تو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کا ساتھ دیں گے، کیونکہ وہ آپ کے بیٹے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے بدلہ لیں گے، ورنہ اس وقت تک ان کی کیا خلافت ہے کہ قاتلوں کو نہ پکڑا جائے؟ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل کہ جنہوں نے مدینہ منورہ میں ظلم کیا اور ان کو قتل کیا، انہوں نے ادھر بی بی صاحبہ کو اکسایا اور ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھڑکایا کہ بی بی صاحبہ ہزاروں کا لشکر لے کر تمہارے مقابلہ پر آ رہی ہیں کہ تمہیں خلافت سے ہٹا دیں۔ اگر آپ پورے اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں کہ لڑنے والے کون تھے؟ وہ جنہوں نے اسلام کا لباس پہنا ہوا تھا، جو کلمہ شریف پڑھتے تھے اور جو اپنے آپ کو پکا مسلمان کہتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں سے چلے اور حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے ابا جان سے عرض کیا: ابا جان! یہ دشمن ہے جو آپ کو بھی اور اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی لڑانا چاہتا ہے، یہ منافقین کا گروہ ہے، سازشی ٹولہ ہے، یہ یہودیت کے ایجنٹ ہیں، دشمنانِ اسلام ہیں، آپ اپنی اماں سے کیسے مقابلہ کریں گے؟ وہ تو آپ کی ماں ہیں، ام المومنین ہیں، مہربانی کریں! آپ اپنی فوجیں لے کر مقابلہ پر نہ جائیں، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ مجھ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اور اگر ایسی بات ہو جائے تو بحیثیت خلیفہ برحق کے، بحیثیت ایک خلیفہ راشد کے دفاع کرنا میرا حق ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ چلے۔ راستے میں دونوں لشکر آمنے سامنے ہو گئے: ایک طرف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ہیں اور ہزاروں کا لشکر ہے اور دوسری طرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا لشکر ہے۔ دونوں طرف صحابہ کا لشکر ہے۔ دونوں نے پڑاؤ کیا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے پیغام بھیجا کہ یا ام المومنین! میں یہ چاہتا ہوں کہ جھگڑے سے پہلے مل بیٹھیں، آپس میں ڈائیلاگ کر لیں، مذاکرات کر لیں، تاکہ خدا کرے کہ یہ بات کسی طرح طے ہو جائے۔ بی بی صاحبہ نے قبول کر لیا۔ درمیان میں خیمہ لگایا گیا، ماں بیٹے کی ملاقات ہوئی۔ پوچھا کہ اماں جان! آپ کیا چاہتی ہیں؟ فرمایا: میں تو کچھ نہیں چاہتی، صرف ایک مطالبہ ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے شریعت کے مطابق قصاص لیا جائے اور میں کچھ نہیں چاہتی۔ آپ خلیفہ برحق ہیں، آپ خلیفہ راشد ہیں، آپ دامادِ نبی ہیں، آپ سیدہ فاطمۃ الزہراء کے شوہر ہیں، آپ کاتب الوحی ہیں اور آپ وہ آدمی ہیں جن کے بارے میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا تھا کہ سب سے زیادہ

فیصلہ کرنے والے کون ہیں؟ علی ہیں۔ اور جس کو حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں یمن کی طرف امیر بنا کر بھیجا۔ اماں نے کہا: آپ میرے بیٹے ہیں، ہمیں نہ خلافت سے غرض ہے اور نہ اقتدار سے غرض ہے، نہ کرسی سے غرض ہے، ہمارا تو صرف ایک ہی مطالبہ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے نبی ﷺ کے حرم کی حرمت کو تہ و بالا کر ڈالا ہے، مدینہ کی بے حرمتی کی ہے، مظلوم سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ان کے گھر میں قرآن پڑھتے ہوئے قرآن مقدس پر شہید کیا، ان کی داڑھی مبارک کو پکڑا گیا، ان کی پسلیوں پر کودتے رہے، ان کا جنازہ رکھا رہا، ظالم ان کو دفن کرنے کی اجازت نہیں دے رہے، وہ لوگ آپ کے قریب ہیں، آپ پہلے ان سے قصاص لیں، ان کو قرآن کے مطابق سزا دیں، اس کے بعد آپ بیٹھیں، ہم تو آپ کے تابع ہیں۔ تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جب ساری بات سنی تو آپ نے فرمایا: اے ام المومنین! آپ اندازہ کریں اور بتلائیں کہ آپ کو مجھ سے کیا توقع ہے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں؟ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ صرف محسن اسلام نہیں ہیں، وہ تو ذاتی طور پر میرے محسن ہیں کہ جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا مرحلہ آیا تو میرے گھر میں ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ حضور ﷺ نے رشتہ منظور فرمالیا اور میں مسجد نبوی میں اداس بیٹھا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ گزرے، مجھے فرمایا: کیا بات ہے؟ آپ کیوں محزون بیٹھے ہیں؟ تو میں نے عرض کیا: حضور ﷺ نے اپنی لخت جگر کا رشتہ قبول فرمالیا ہے، لیکن میرے گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ دو اونٹنیاں پالی تھیں کہ میں ان پر لکڑیاں اٹھا کر پیسے اکٹھے کروں گا، لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے میری اونٹنیاں ذبح کر ڈالیں، اب میرے گھر میں کوئی چیز نہیں ہے، میں شادی کیسے کروں؟ تو حضرت عثمان نے مجھے سینے سے لگایا اور فرمایا: علی! کیوں گھبرا رہے ہو؟ شادی تیری ہوگی، دولت میری ہوگی۔ وہ تو مجھ پر ذاتی احسان کرنے والا ہے، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ تو وہ ہے "تَسْتَحْيِي مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ" جس سے اللہ کے فرشتے حیا کرتے ہیں، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ وہ ہے کہ ان کے استقبال کے لیے حضور ﷺ اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ تو وہ ہے جس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر اور کوئی بھی بیٹی باقی ہوتی تو میں عثمان کو دیتا، وہ بیٹیاں جس کے گھر میں محمد رسول اللہ ﷺ کی ہیں، جو ذو النورین ہے، جو ذی حیاء ہے، جو داماد محمد مصطفیٰ ﷺ ہے اور سب سے پہلے اسلام پر خرچ کرنے والا، جس نے تبوک کے موقع پر نو سو اونٹ، ایک سو گھوڑے اور چار ہزار دینار اس زمانہ میں پیش کیے، حضور ﷺ کے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیا، حضور ﷺ اپنے دامن میں ان پیسوں کو لے کر ہلاتے تھے اور چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا اور فرمایا: عثمان! "فَاعْمَلْ مَا شِئْتَ" عثمان! آج کے بعد تو جو چاہے کر، تیری بخشش کا محمد ذمہ دار ہے۔

فرمایا: اے اماں جان! کیا بات کر رہی ہیں؟ عثمان کو اگر علی نہیں پہچانتا تو کون پہچانے گا؟۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ آدمی جس نے حفاظتِ قرآن کے بارے میں خدمت کی۔ اللہ نے قرآن کی ایک ظاہری حفاظت کی، ایک قرآن کی باطنی حفاظت کی، ایک اللہ نے حفاظت قلب مصطفیٰ ﷺ میں کی، چوتھی مؤمنین کے سینوں میں حفاظت کی اور پانچویں حفاظت کی کہ قرآن کو جمع کر کے ایک کتاب کی شکل میں محفوظ کر دیا۔ یہ پانچویں حفاظت کا کام اللہ نے عثمان رضی اللہ عنہ سے لیا ہے، تو میں عثمان کو بھول سکتا ہوں؟ اماں نے فرمایا: پھر بات کیا ہے؟ تم اس کے قصاص کے بارے میں کیوں اتنی غفلت فرما رہے ہو؟ سیدنا علی...... کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ...... نے فرمایا: اماں جان! اصل مصیبت یہ ہے کہ جن ظالموں نے شورش ڈالی ہے، جن ظالموں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مہر کو غلط استعمال کیا ہے، جن ظالموں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پروانے کو تبدیل کیا ہے اور محمد بن ابی بکر کے خلاف اس کے قتل کرانے کا حکم نامہ جاری کرایا ہے، انہی ظالموں نے میری بیعت بھی کر لی ہے۔ اگر میں فوراً ان پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو میرا داخلی استحکام خطرے میں پڑ جائے گا اور میں نظام کو کنٹرول نہیں کر سکوں گا۔ آپ مجھے کچھ عرصہ کے لیے مہلت دے دیں، تا کہ میری حکومت مستحکم ہو جائے، میں اقتدار پر اچھی طرح تمکین حاصل کر لوں۔ اس کے بعد...... اللہ میرا گواہ ہے!...... آپ ام المومنین ہیں، سب سے پہلے علی کا ہاتھ عثمان کے قاتلوں کی گردنوں پر ہوگا۔ اماں جان مان گئیں، دونوں میں صلح ہوگئی، ماں اور بیٹا دونوں...... الحمد للہ!...... خوش ہو گئے۔ بی بی صاحبہ نے اتنا عرض کیا کہ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کی مرضی ہے، آپ مدینہ آنا چاہتی ہیں تو اَھْلًا وَّ سَھْلًا ، کیونکہ مدینہ منورہ آپ کا گھر ہے اور ہم چشم براہ ہیں اور میں آپ کے اونٹ کی مہار پکڑ کر آپ کو مدینہ لے جاؤں۔ اگر مناسب سمجھتی ہیں تو فی الحال بصرہ چلی جائیں، تا کہ دشمنوں کو شورش کا موقع نہ ملے اور وہ ہمیں مزید نہ لڑا سکیں، جب تک کہ میں اس معاملہ پر کنٹرول کر لوں۔

بات ختم ہوگئی، لیکن وہ ظالم وہ سبائی ٹولہ، یہودیت کے خود کاشتہ پودے، یہودیت کے ایجنٹ، جب ان کو یقین ہو گیا کہ ماں بیٹے میں بات ختم ہوگئی تو انہوں نے کہا کہ اب ہمیں تو قصاصِ عثمان میں قتل کیا جائے گا، انہوں نے فوراً چال چلی...... یہ ہیں وہ لوگ جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کو قتل کرتے ہیں، اسلام کا نام لے کر اسلام کے دشمن بنتے ہیں، قرآن کا نام لے کر حدیث کا انکار کرتے ہیں اور اسی طرح یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو حضور ﷺ کا نام لے کر اللہ کی توحید کا انکار کرتے ہیں، یہ اسلام کے نام پر دھوکہ دینے والے گروہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے فتنے سے محفوظ

رکھے...... اب دیکھیں کہ ایک طرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہ حمایت ہے اور دوسری طرف انہوں نے رات کو بیٹھ کر ایک فیصلہ کرلیا۔ وہ کوئی ساٹھ یا ستر آدمی تھے...... آپ اندازہ فرمائیں کہ صحابہ کا ہزاروں کا لشکر ہے اور منافقین اور وہ لوگ جو اسلام کے دشمن تھے، ان کی تعداد ساٹھ یا ستر کے درمیان تھی، لیکن آپ جانتے ہیں کہ جب آگ جلانی ہو تو ایک بچہ بھی جا کر بلڈنگ کو جلا سکتا ہے، لیکن اگر بلڈنگ بنانی ہو تو ہزاروں مزدور اور معمار چاہییں، میٹریل چاہیے، وقت چاہیے، لیکن اگر آگ لگانی ہو تو ایک تیلی پھینکنے سے ایک بڑی سے بڑی بلڈنگ جل جائے گی...... بہر حال ان لوگوں نے آپس میں فیصلہ کرلیا کہ رات کو جب خواب غفلت میں ہوں، سو جائیں...... کیونکہ اس وقت سب کو اطمینان ہو گیا، دونوں فریق مطمئن ہو گئے، دونوں کے دل صاف تھے، ان کے دلوں میں ایمان تھا، صداقت تھی...... لہٰذا مطمئن ہو کر سو گئے تو انہوں نے کہا کہ آدھے آدمی بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر میں چلے جائیں اور آدھے آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں چلے جائیں اور وہاں جا کر قتل عام شروع کر دیں اور شور یہ مچائیں کہ علی کی فوج آگئی اور جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں آئیں، وہ یہ شور مچائیں کہ بی بی عائشہ نے حملہ کر دیا۔

اندھیری رات تھی، ان ظالموں نے اس طرح اپنی جماعت کو تقسیم کر کے دونوں فوجوں میں حملہ کرایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو جاگتا گیا، سنتا گیا کہ حضرت علی نے حملہ کر دیا، بی بی عائشہ نے حملہ کر دیا۔ دونوں طرف سے صحابہ اٹھتے گئے، تلواریں پکڑتے گئے۔ دس ہزار اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہوئے، ایک دو، یا چار پانچ سو نہیں، دس ہزار اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہوئے اور دس ہزار وہ مومنین جنہوں نے ایمان میرے مدنی کی گود میں بیٹھ کر سیکھا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر جنہوں نے بیعت کی تھی، جنہوں نے قرآن اترتے دیکھا تھا، جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نمازیں پڑھیں تھیں، وہ ان منافقوں کے دھوکہ میں آگئے۔ آپ کی اور ہماری کیا طاقت ہے؟ آپ اور ہم جیسے کمزور مسلمانوں کا کیا حال ہو سکتا ہے؟

اس لیے میرے عزیز دیکھیں کہ اسلام کو نقصان ہمیشہ منافقین نے پہنچایا۔ ایک طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک جماعت پیدا کر لی کہ کمال کرتے ہو، حضرت علی تو خود دین سے ہٹ گیا ہے۔ اندازہ کریں! انہوں نے کہا: وہ کیسے؟ حضرت علی نے کہا کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی پر دوسری عورت سے شادی کر لی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کو دکھ پہنچایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی سے مشکیزے میں پانی بھرواتا رہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا چھ مہینے تک صاحب فراش رہیں اور اس نے رات کو دفن کر کے جنازہ پڑھ دیا کہ جو

بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تکلیفیں پہنچی تھیں کوئی راز ظاہر نہ ہو سکے۔ تو خوارج کا فتنہ پیدا کیا، جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا چین حرام کر دیا، ساری زندگی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے۔ یہ وہ فتنے ہیں جنہوں نے اسلام کو نقصان پہنچایا۔ یاد رکھیں کہ دشمن تو دشمن ہوتا ہے۔

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ، ختمِ نبوت کے بڑے عالم تھے۔ وہ ایک چھوٹی سی مثال دے کر سمجھایا کرتے تھے کہ بیٹا! اگر کوئی آدمی بازار کے اندر دودھ بیچ رہا ہو اور آدمی اس سے دودھ لینے کے لیے جائے کہ مجھے ایک کلو دودھ کی ضرورت ہے، لیکن دودھ والا کہے کہ ایک کلو دودھ تب دوں گا جب ایک پاؤ پانی بھی ساتھ خریدو۔ تو کوئی خریدے گا......؟ کوئی بھی نہیں خریدے گا، وہ کہے گا: پاگل ہو گیا ہے، پانی تو مفت مل رہا ہے، نل سے مل رہا ہے، پانی کے پیسے کیوں بھروں؟ اگر اسی پانی کو دودھ میں ملا دے تو مولوی مکی بھی خریدے گا اور بڑا عقل والا بھی خریدے گا، کیونکہ وہ پانی اب دودھ میں مل گیا ہے، نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس لیے کفر بھی اسلام کو دھوکہ نہیں دیتا، کفر بھی اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا، کفر بھی اسلام کے سامنے دیوار نہیں بن سکتا، لیکن جب اس کو اسلام کا لبادہ اوڑھا دیا جائے تو لوگ بے وقوف بن جاتے ہیں۔

آج آپ دیکھیں! ایمان سے بتلائیں کہ دنیا کے اندر جتنا شرک ہو رہا ہے وہ محبت کے پردے میں ہو رہا ہے، جو لوگ قبروں پر جھکتے ہیں، جو لوگ قبروں پر سجدے کرتے ہیں، قبروں پر منتیں مانتے، نذر و نیاز اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں، یہ کیا ہے؟ محبت کا پہلو ہے۔ اللہ کے اولیاء سے محبت کے پہلو میں شرک کرایا جا رہا ہے، اولیاء اللہ کی محبت کا رنگ چڑھایا گیا۔ جس شرک کو مٹانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے ہمیں وہیں لے جایا جا رہا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ اللہ کے اولیاء ہیں، ان کی تعظیم ضروری ہے، یہ اللہ کے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں، اللہ نے عظمت دی ہے، یہ رتبے والے بزرگ ہیں، یہ مرتبہ والے بزرگ ہیں، ان کی قبروں پر طواف کرو اور ان سے مانگو گے تو یہ آگے کہیں گے تو تمہاری فریاد پوری ہو جائے گی۔ انبیا سے محبت میں بدعات کی جا رہی ہیں اور بدعات کا نتیجہ شرک تک جاتا ہے۔

اسی طرح اولیاء میں دیکھیں کہ لوگوں نے قرآن کا دعویٰ کیا کہ ہم اہلِ قرآن ہیں، اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اتارا، ہم تو قرآن کو ماننے والے ہیں۔ اب دعویٰ قرآن کا کیا اور اندر کیا ہے کہ حدیثِ رسول کا انکار ہے کہ جب آپ کوئی حدیث پیش کریں گے تو وہ کہیں گے: چھوڑو! یہ تو بندوں کی باتیں ہیں، کوئی اللہ کی باتیں تو نہیں ہیں،

حدیث تو ایک انسان کا کلام ہے اور ایک انسان نے سنا ہے اور صدیوں تک ہم تک پہنچا ہے، اس کی کیا حفاظت ہوسکتی ہے......؟ اس کو چھوڑیں! اللہ نے کلام اتارا ہے، ہم صرف قرآن کے پابند ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ او پر لبادہ قرآن کا اوڑھا گیا اور انکارِ حدیث کا فتنہ نکلا۔ جب حدیث کا انکار ہو گیا تو نماز ختم، کیونکہ قرآن میں تو اتنا ہے کہ نماز پڑھو۔ اب کیسے پڑھو؟ یہ تو حدیثِ رسول بتلائے گی اور حدیث رسول کا تو انکار ہو گیا۔ قرآن کے اندر حکم ملا کہ زکوۃ دو، لیکن کتنی ادا کرو؟ سونے کی کتنی ہے؟ چاندی کی کتنی ہے؟ بکریوں کی کتنی ہے؟ گایوں کی کتنی ہے؟ اونٹوں کی کتنی ہے؟ زمین نہری کا عشر کتنا ہے؟ اور زمین جس پر بارشوں سے سبزہ اگتا ہے اس پر کتنا عشر ہے؟ یہ سب کچھ تو حدیث رسول اللہ ﷺ بتلائے گی۔ دعویٰ کیا اہلِ قرآن ہونے کا اور حدیثِ رسول اللہ کا انکار نکلا۔

اسی طرح محبتِ اہلِ بیت کا دعویٰ کیا کہ ہم اہلِ بیت کے غلام ہیں، ہم حضور ﷺ کی اولاد کے غلام ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلام ہیں، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے غلام ہیں، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے غلام ہیں، بی بی سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے غلام ہیں۔ اور نتیجہ کیا نکلا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی دشمنی اور رنگ چڑھا اہل بیت کی محبت کا۔ اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ دشمنی کہ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو میراث نہیں ملی تو ابوبکر نے ظلم کیا۔ دیکھو کہ حضور ﷺ کی بیٹیوں کو کرسی پر نہیں بیٹھنے دیا، خود مکہ والے بیٹھ گئے۔ دیکھو جی! بڑی زیادتی کی۔ تو نتیجہ یہ نکلا او پر پردہ جب محبتِ اہلِ بیت کا چڑھایا گیا اور اندر سے بغضِ صحابہ نکل آیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے منافقت کے پہلو کو بہت کھول کر بیان کیا، کیونکہ سب سے زیادہ نقصان دینے والے منافق ہی ہوتے ہیں۔

یہ منافق ایمان نہیں لائیں گے:

جب انہوں نے کہا تھا ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ [البقرۃ:۸] قرآن نے یہ نہیں کہا ''وَمَا اٰمَنُوْا'' یہ ایمان نہیں لائے، بلکہ قرآن نے فرمایا: ''وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ'' (نہیں ہیں وہ ایمان لانے والے۔) وجہ کیا ہے؟ کہ مبالغہ کا جملہ ہے اور پھر جملہ اسمیہ ہے۔ فرمایا کہ میں علام الغیوب ہوں، میں عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ میں سرائر کا اور ضمائر کا جاننے والا ہوں، مجھے ان کے دلوں کا پتہ ہے، مجھے ان کے مستقبل کا پتہ ہے، ان کے ماضی کا پتہ ہے، ان کے موت تک کے حالات کا پتہ ہے اور میں خود خدا گواہی دے رہا ہوں کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

صحابہ کے حق میں احتیاط:

جیسا کہ میرے نبی ﷺ نے فرمایا:

((اللہَ اللہَ فِي أَصْحَابِي، لَا تَتَّخِذُوهُمْ غَرَضًا بَعْدِي، فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّي أَحَبَّهُمْ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُمْ، وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِي، وَمَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللہَ وَمَنْ آذَى اللہَ فَيُوشِكُ أَنْ يَأْخُذَهُ)) [سنن الترمذی، حدیث:۳۸۶۲، باب: فِیمَنْ سَبَّ أَصْحَابَ النَّبِيِّ ﷺ]

میرے صحابہ کو برا نہ کہا کرو، میرے صحابہ سے جو محبت کرتا ہے گویا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور جو میرے صحابہ سے بغض رکھتا ہے گویا وہ مجھ سے بغض رکھتا ہے اور جو میرے صحابہ کو ایذا پہنچاتا ہے گویا اس نے مجھے ایذا پہنچائی، اور جو مجھے ایذا پہنچائے گویا اس نے اللہ کو ایذا پہنچانے کی کوشش کی اور جو اللہ کو ایذا پہنچانے کی کوشش کرے گا اللہ اس کو پکڑے گا۔

اہلِ جہالت کا دھوکہ:

ایک دوسری آیت میں فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللہَ وَرَسُولَهُ﴾ [الاحزاب:۵۷]

''جو آدمی اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچائے......''

وہاں رسول ﷺ کا ذکر ہے اور یہاں ﴿يُخٰدِعُوْنَ اللہَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [البقرۃ:۹] میں ایمان والوں کا ذکر ہے، رسول کا ذکر نہیں ہے، تا کہ مسئلہ سمجھ آجائے۔ کیونکہ بعض جاہل جب یہ آیتیں پڑھتے ہیں ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللہَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ [الاحزاب:۵۷] جس نے اللہ کو ایذا دی اس نے رسول کو ایذا دی، جس نے اللہ کی اطاعت کی اس نے رسول کی اطاعت کی۔ اور جس نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ تو وہ......نعوذ باللہ...... جہالت سے یا کم فہمی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ رسول خود خدا ہے، اس کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے، اس کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے اور اس کو ایذا پہنچانا خدا کو ایذا پہنچانے کے برابر ہے، تو معلوم ہوا کہ......نعوذ باللہ...... ظاہر میں نبی ہے اور اندر سے خدا ہے۔ اس لیے اللہ نے یہاں ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ فرما دیا، تا کہ کوئی آدمی غلط فہمی میں مبتلا نہ کر سکے، بلکہ معنی یہ ہے کہ اگر ایمان والے کو بھی نقصان پہنچا تو گویا کہ اللہ کو نقصان پہنچا رہے ہو۔ یہ نہیں۔

اللہ اللہ ہوتا ہے اور نبی نبی ہوتے ہیں اور ایمان والے ایمان والے ہوتے ہیں۔ اس لیے ﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ فرمایا۔

﴿وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۹]

اللہ نے فرمایا کہ حضور ﷺ یہ منافق سمجھتے ہیں کہ ہم مومن کو دھوکہ دے رہے ہیں، حالانکہ یہ کسی کو دھوکہ نہیں دے رہے، مگر اپنے آپ کو دھوکہ میں ڈال رہے ہیں، کیونکہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس طرح ہم دھوکہ دیں گے، لیکن اللہ تو ان کے راز کھول دے گا۔ آخر منافق تو کھل جاتا ہے۔ آپ نے دنیا میں دیکھا ہے کہ جو لوگ ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر سنائیں، جب دونوں پر بات واضح ہو جاتی ہے تو دونوں طرف سے لعنتی بن کر بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: اچھا! اس نے لڑایا؟ اور وہ بھی کہتا ہے کہ اسی نے لڑایا تھا۔ اللہ نے فرمایا کہ جب ہم کھول دیں گے ﴿مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝﴾ [النساء:۱۴۳] فرمایا: منافقوں کا حال یہ ہوگا کہ نہ ادھر کے رہیں گے اور نہ ادھر کے رہیں گے، کیونکہ جس کو اللہ گمراہ کرے اسے کوئی راستہ نہیں دکھا سکتا۔

منافق اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے:

منافق اپنی جہالت کی وجہ سے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جس طرح ہم بظاہر ایمان لا کر مومنوں کو دھوکہ دئے ہوئے ہیں، اسی طرح ہم اللہ کو ظاہری ایمان کا دھوکہ دے کر جنت میں چلے جائیں گے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۚ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝﴾
[المجادلۃ:۶]

اللہ پاک ان سب کو دوبارہ زندہ کریں گے۔

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ﴾ [المجادلۃ:۱۸]

اللہ کے آگے بھی جھوٹی قسمیں کھائیں گے۔ جیسے تمہارے آگے جھوٹی قسمیں کھاتے تھے، وہاں بھی جھوٹی قسم کھا کر یہ سمجھیں گے کہ ہم بچ جائیں گے۔ جیسے مدینہ منورہ میں وہ مسلمانوں کے سامنے جھوٹی قسم کھا کر بچ جاتے تھے تو یہاں بھی ہمارا کام چل جائے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ۚ﴾ [المجادلۃ:۱۸]

اور وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم اس طرح کسی نہ کسی چیز پر، کسی نہ کسی مقام پر ہیں، لیکن......:

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ﴾ [المجادلۃ: ۱۸]

''خبردار! یہ جھوٹے لوگ ہیں۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ کو کون دھوکہ دے سکتا ہے؟ دھوکہ تو اس کو ہو سکتا ہے جو جاننے والا نہ ہو، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ جو علام الغیوب ہیں، جو عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہیں، اس کے آگے دنیا کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔

لیکن منافقین یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے دھوکہ کا وبال انہی پر پڑے گا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کے کئی مقامات پر فرمایا ہے:

﴿وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۹]

اور کہیں فرمایا:

﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا﴾ [الطارق: ۱۵تا۱۷]

تو کہیں فرمایا:

﴿وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ [الانفال: ۳۰]

اس لیے فرماتے ہیں کہ اللہ نے اس آیت کے اندر ارشاد فرمایا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ فرمایا، ورنہ جب وہ آئے تھے تو پہلے دن ہی اللہ پاک واضح کر دیتے۔ جیسے کوئی کافر سرکشی میں پڑ جائے تو اللہ فرماتے ہیں: اس کو اس کی سرکشی میں چھوڑ دو:

﴿وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۱۵]

اس کو اپنے کفر کی اور فساد کی آخری حد تک جانے دو، تاکہ وہ اپنی گمراہی کے انجام کو پہنچ جائے۔

منافقین کا دھوکہ:

ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی سوال کرے کہ یہ جو منافق ہیں یہ اللہ اور مومنین کو کیسے دھوکہ دینے والے ہیں؟ یہ تو تقیہ کر رہے ہیں، اپنی اندر والی بات پر پردہ ڈال رہے ہیں۔ یعنی ایک ہوتا ہے کہ آدمی تقیہ کرے اور ایک ہے دوسرے کو دھوکہ میں ڈال دے، اسلام جو ظاہر کر رہا ہے تو یہ تقیہ ہے اور اندر کفر چھپا ہوا ہے، جیسا کہ روافض تقیہ

کو اپنا دین سمجھتے ہیں۔......نعوذ باللہ!......حتیٰ کہ انہوں ے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ جو تقیہ نہ کرتا ہو وہ مومن ہی نہیں ہے۔ انہوں نے کتابوں کے اندر لکھا ہے کہ اسلام کے اور دین کے نو جز تقیہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ یعنی ظاہر کچھ ہو اور باطن میں کچھ ہو۔ اس لیے انہوں نے اپنی کتابوں کے اندر لکھا ہے کہ کبھی اہل سنت والجماعت کے جنازے کے اندر شریک بھی ہونا پڑے تو ظاہری طور پر سنی کا جنازہ بھی پڑھ لیا کرو، یعنی جنازہ میں کھڑے ہو جاؤ، لیکن اس کے لیے دعائے مغفرت کرنے کی بجائے یہ دعا کرو کہ اے اللہ! اس پر لعنت کر، اس کو جہنم میں ڈال، اے اللہ! اس کو عذاب دے۔ لوگ سمجھیں گے کہ جنازے کی دعا مانگ رہا ہے، جنازہ پڑھ رہا ہے، حالانکہ وہ اندر یہ دعا کر رہا ہے۔

مفسر فرماتے ہیں کہ یہ خداع بھی ہے، دھوکہ بھی ہے کہ یہ لوگ دھوکہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم اپنا اسلام ظاہر کر کے مسلمانوں سے بھی بچ جائیں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نعمتیں بھی ہمیں ملیں گی۔

مفسر ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ اشکال ہو کہ منافقین تو تقیہ کر رہے تھے، کیونکہ انہوں نے اپنے اندر کی بات پر پردہ ڈالا ہوا تھا اور اپنا کفر چھپایا ہوا تھا، انہوں نے کسی کو دھوکہ تو نہیں دیا تھا؟ تو جواب یہ ہے کہ محاوراتِ عرب میں جو آدمی اپنی زبان سے جو اس کے دل کے اندر ہے اس کے خلاف کہے، تا کہ اس سے نجات پا جائے جس سے وہ ڈر رہا ہے، اس کو مخادع بھی کہتے ہیں۔ اس لیے ان کو یہاں بھی مخادع کہا گیا ہے۔ [ابن کثیر: ۱/ ۴۸، الآیۃ: یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا...]

مسلمان کا جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہنا:

ایک بات یاد رکھیں کہ قرآن میں آتا ہے:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰۶﴾ [النحل: ۱۰۶]

کبھی کسی مسلمان کو بھی یہ حالت پیش آجاتی ہے کہ وہ کافروں کے قبضہ میں آگیا، انہوں نے کہا: اگر زبان سے تم کفر کا اظہار کرو گے تو ہم چھوڑیں گے، وگرنہ نہیں چھوڑیں گے۔ تو وہاں جان بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اجازت دی ہے کہ اگر اس کا دل ایمان پر پکا ہے اور صرف بے چارے نے جان بچانے کے لیے ظاہری طور پر کلمۂ کفر کہہ دیا ہے تو اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرما دیں گے۔ اس کا اور اس کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ

اس آیت کو استعمال کر کے تقیہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس کے اندر تو ایمان تھا اور اس کے اندر تو کفر ہے ﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾[النحل:١٠٦] وہ اندر ایمان کو چھپا رہا ہے اور وہی تو نجات کا ذریعہ ہے۔ یہ تو اپنے اندر ایمان کو نہیں چھپا رہا ہے، یہ ایمان کو ظاہر کر رہے ہیں اور اندر کفر کو چھپا رہے ہیں۔ تو یہاں تو بالکل برعکس معاملہ ہے۔ [ابن کثیر: ١/ ١٤٨، الآیۃ: یخٰدعون اللہ والذین امنوا...]

واقعہ:

ایک صحابی قید ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کر لو غیر اللہ کے نام پر تم کوئی چیز ذبح کر دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ اس نے کہا: غیر اللہ کے نام پر میں کیا ذبح کروں؟ انہوں نے کہا: تمہارے پاس اور کچھ بھی نہیں ہے تو تم ایک مکھی پکڑ لو اور اس کو ذبح کر دو۔ بات تو صرف یہی ہے کہ اللہ کے نام کے سوا غیر کے نام پر ذبیحہ ہے۔ اس نے کہا: بات سنو! تم مجھے قتل کر دو، تم مجھے جلا دو، میں تو شرک نہیں کروں گا۔...... تو یہ بڑی عزیمت کا مقام ہے...... تو بے چارہ قتل ہو گیا، اللہ کے راہ میں شہید ہو گیا۔

واقعہ:

اسی طرح ایک صحابی قید ہو گئے۔ اور بادشاہ کافر تھا۔ اس نے اس صحابی سے کہا کہ اگر تم میری پیشانی پر بوسہ دے دو تو میں تمہیں رہا کر دوں گا، نہیں تو میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اس نے کہا: تم مجھے قتل کر سکتے ہو، لیکن کافر کی پیشانی پر میں بوسہ نہیں دوں گا۔ اس کے بعد بادشاہ نے کہا کہ تم ایسا کرو کہ جتنے مسلمان قید میں ہیں، اگر تم مجھے بوسہ دے دو، ان کو بھی میں چھوڑ دوں گا۔ اس نے کہا: میں بوسہ دیتا ہوں، باقی مسلمانوں کی اگر جان بچتی ہے، ان پر تو میں اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، میری وجہ سے تمام مسلمان بے چارے تو نہ مارے جائیں۔ اس لیے اس نے بوسہ دیا تو حضور ﷺ نے دونوں کو سراہا۔ فرمایا: جس نے جان دے دی، لیکن اس نے شرک کو گوارہ نہیں کیا، اس نے عزیمت پر عمل کیا اور جس آدمی نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو چھڑا لیا اس نے رخصت پر عمل کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تو دلوں کے بھید جاننے والے ہیں، اور اللہ تبارک وتعالیٰ جانتے ہیں کہ اس کے دل کے اندر کیا ہے۔

تقیہ اور دھوکہ کی مثال:

یہ مخادع اور منافق اور تقیہ باز جو ہوتے ہیں یہ تو اندر کفر چھپائے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے

دھوکہ دے رہے ہیں، اس لیے جب ان سے بات کرو تو کہیں گے: صحابہ کے دشمن کو تو ہم لعنتی سمجھتے ہیں۔ صحابہ کو جو گالی دیتا ہو اللہ اس پر قہر کرے، اللہ اس پر عذاب کرے۔ تو اب مسلمان سنی گھبرا جاتا ہے، کمال ہے وہ تو صحابہ کو مان رہے ہیں، وہ تو کہتے ہیں کہ صحابہ کا دشمن لعنتی ہے، لیکن ان کے نزدیک صحابہ صرف چار ہیں، باقی ان کے نزدیک صحابہ ہیں ہی نہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد تمام لوگ اسلام چھوڑ کر نکل گئے، صرف چار آدمی مسلمان باقی رہے۔ تو کوئی مسلمان نہیں رہا تو جب وہ صحابہ کا نام لیتے ہیں تو مراد چار صحابہ ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک سارے اصحاب رسول اللہ مراد نہیں ہوتے۔ تو یہ دھوکہ دینا ہے۔ اور ایک یہ ہوتا ہے کہ ایسی بات کی جائے کہ اس سے دو باتیں سمجھ آرہی ہوں مخاطب ایک معنیٰ سمجھ رہا ہو اور متکلم دوسرا معنیٰ مراد لے رہا ہو۔ اور جان بچ جائے۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ اس کو آپ منافقت نہیں کہیں گے۔ منافقت تو وہ ہوتی ہے کہ اندر کفر ہے اور ظاہر اسلام کر رہا ہے، اندر حضور ﷺ کا دشمن ہے اور باہر منافقت ظاہر کر رہا ہے اور اندر قرآن کا مخالف ہے اور ظاہراً قرآن کو چوم رہا ہے۔

توریہ کلام:

یہ توریہ ایک کلام ہوتا ہے جو ذومعنی ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہجرت کی رات میں جا رہا تھا اور میرے آگے حضور ﷺ جا رہے تھے اور راستہ میں اتفاق سے ایک آدمی نکل آیا تو اس نے مجھ سے پوچھا:

''مَنْ هٰذَا الرَّجُلُ؟ يَا أَبَابَكْرٍ!''

اے ابوبکر! یہ کون آدمی ہے جو تمہارے آگے جا رہا ہے؟ اب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اب میرے لیے بڑا مشکل مقام آگیا کہ اگر میں بتاتا ہوں کہ آپ اللہ کے نبی حضرت محمد ﷺ ہیں تو دشمن کو پتہ چل جائے گا کہ حضور ﷺ جا رہے ہیں۔ اور اگر میں نہیں بتاتا تو جھوٹ بنتا ہے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبان سے جھوٹ نکلنا بڑا مسئلہ ہے تو فوراً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دماغ میں اللہ نے ڈالا اور آپ نے فرمایا:

''هٰذَا رَجُلٌ يَهْدِيْنِي السَّبِيْلَ''

''یہ وہ انسان ہے جو مجھے راستہ دکھلاتا ہے۔''

اس پوچھنے والے نے یہ سمجھا کہ کوئی عام آدمی ہے جو اس کو راستہ بتلا رہا ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دل میں سمجھا کہ اللہ کے نبی ﷺ راستہ ہی دکھلانے کے لیے آئے ہیں، ہمیں صراط مستقیم دکھلا رہے ہیں۔ تو یہ

کلام کے اندر توریہ ہوتا ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث:۳۹۱۱، باب ہجرۃ النبی ﷺ...]

اس قسم کے کلام میں توریہ استعمال کرنا جائز ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنی بیگم کے ساتھ جب سفر فرمار ہے تھے تو راستہ میں ایک بڑا ظالم بادشاہ تھا۔ کوئی شادی شدہ مرد اگر گزرتا تو اس کی عورت کو چھین لیتا تھا اور...... نعوذ باللہ...... اس کی بے حرمتی کرتا تھا اور اگر عورت شادی شدہ نہ ہو، باپ بیٹی ہوں، یا بہن بھائی ہوں تو اس کو وہ نہیں چھیڑتا تھا، اس کا اپنا ایک مزاج تھا۔ تو حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السلام جب گزرے تو اس کے کارندوں نے آکر بی بی صاحبہ کو روک لیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اگر وہ ظالم بادشاہ تجھ سے پوچھے کہ تم کون ہو تو کہہ دینا کہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہن ہوں۔ حالانکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی تھیں، لیکن بہن سے مراد کیا تھا کہ بیوی چاہے بیوی ہو، لیکن باعتبار دین کے تو بہن ہوتی ہے، کیونکہ ہر کلمہ پڑھنے والا بھائی ہے۔ ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' [الحجرات:۱۰] یہ تو اس رشتہ کی وجہ سے بیوی بن گئی، کوئی بیٹی بن گئی، کوئی ماں بن گئی، وگرنہ بحیثیت ایک مسلمان کے سب بہن بھائی ہیں۔ تو اس وقت روئے زمین پر حضرت ابراہیم علیہ السلام مسلمان تھے یا بیوی کلمہ پڑھنے والی تھی اور کوئی آدمی ہی نہیں تھا۔ تو بی بی صاحبہ نے جا کر کہہ دیا۔ یہ بظاہر ایک صورت بنتی تھی، حقیقتاً ایک کذب تھا اور اللہ کے پیغمبر جھوٹ سے پاک ہوتے ہیں، اللہ کے پیغمبر گناہوں سے پاک ہوتے ہیں، اللہ انہیں اپنی رسالت کے لیے چن لیتے ہیں۔ تو اس لیے توریہ علیحدہ چیز ہے۔

ایک وقت پر اگر آدمی امتحان میں آجائے اور ایمان پر پکا ہے ﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ [النحل:۱۰۶] یہ علیحدہ چیز ہے، لیکن نفاق، خدع علیحدہ چیز ہے۔ ان کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں ہے، کیونکہ یہ شر چھپا کر خیر ظاہر کر رہے ہیں، کفر چھپا کر اسلام ظاہر کر رہے ہیں۔ منافقین اپنے کفر کی وجہ سے، اپنے شکوک کی وجہ سے اور اپنے نفاق کی وجہ سے اپنے نفسوں کے ساتھ بھی برائی کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بھی ناراض کر رہے ہیں۔

اور منافق کی دوسری علامت یہ ہے:

((اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ))

''جب وعدہ کرے گا تو اس کے خلاف کرے گا۔''

اور تیسری علامت یہ ہے:

((وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) [صحیح البخاری، حدیث:۳۳، باب: عَلَامَةِ الْمُنَافِقِ]

"جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔"

اور اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں آتا ہے:

((إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) [صحیح البخاری، حدیث:۲۴۵۹، باب: إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ]

یہ بھی منافق کی علامت ہے کہ جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ کرے، گندی گندی گالیاں دے اور فحش گالیاں دے تو یہ بھی نفاق کی علامت ہے۔ مسلمان کبھی زبان سے گالی نہیں دیتا۔

منافق کے مقابلہ میں مومن کی صفات:

(حدیث) حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيءِ))

[سنن الترمذی، حدیث:۱۹۷۷، باب مَا جَاءَ فِي اللَّعْنَةِ]

"مومن طعن کرنے والا کسی پر لعنت بھیجنے والا، فحش گوئی کرنے والا اور بدتمیزی کرنے والا نہیں ہوتا۔"

مومن فاحش نہیں ہوتا اور نہ فحش گو ہوتا ہے اور نہ فحش کو پسند کرتا ہے اور نہ وہ گرے ہوئے اخلاق کا آدمی ہوتا ہے کہ گری ہوئی باتیں کرے اور گری ہوئی حرکتیں کرے۔

اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَكُونُ الْمُؤْمِنُ لَعَّانًا)) [سنن الترمذی، حدیث:۲۰۱۹، باب: مَا جَاءَ فِي اللَّعْنِ وَالطَّعْنِ]

مومن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا کہ ہر بات میں اس پر لعنت کرے اور اُس پر لعنت کرے۔ یہ مومن کی صفت نہیں ہے کہ ان کی زبان پر لعنت کا ذکر ہو، زبان پر گالی ہو، ان کی زبان پر بری بری باتیں ہوں، یا وہ وعدہ خلافی کرے، یا وہ جھوٹ بولتا ہو۔ یہ تمام منافقوں کی صفات ہیں۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی حرکات میں، اپنی سکنات میں اور اپنے اعمال میں خود نظر ڈالے کہ میرے اندر کوئی منافق کی علامت تو نہیں آگئی؟ میرے اندر کوئی کفر کی علامت تو نہیں آگئی؟ میرے اندر کوئی ضلالت اور گمراہی کی علامت تو نہیں آگئی۔

مسلمان دھوکہ نہیں دے سکتا......واقعہ:

میرے والد صاحب رحمہ اللہ نے بھی سنایا اور میں نے بھی شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمہ اللہ کی کتابوں کے اندر

پڑھا ہے۔ پہلے دور کے اندر ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں، دارالعلوم دیوبند کے اندر بہت بڑے استاد تھے حافظ تھے اور نابینا تھے۔ اس زمانہ میں گھڑی وغیرہ ہوتی نہیں تھی، گھڑی کا رواج نہیں تھا، پوری دنیا میں کسی بڑے آدمی کے پاس ہوتی ہوگی۔ عام طور پر انہوں نے لکڑیاں اور لوہے کی کیلیں لگائی ہوئی ہوتی تھیں کہ اگر سایہ یہاں تک آجائے تو آٹھ بجے ہیں، یہاں تک آگیا ہے تو زوال آگیا، یہاں آگیا تو مثلِ اوّل ہوگئی اور یہاں آگیا تو مثلِ ثانی ہے۔ تو اس طرح مساجد میں لوہے کی کیلیں لگا کر اوقات کا حساب لگایا جاتا تھا۔ تو جب سایہ آتا تھا، مثلاً ۱۲ بجے کو سایہ آتا تھا تو سب بچوں کی چھٹی کر دیتے تھے۔ آپ کی نظر پہلے کمزور تھی تو وہ طالب تو بڑے شرارتی ہوتے ہیں تو وہ جا کر اس کیل کو آگے کر دیتے تھے، تاکہ جلدی سایہ پہنچ جائے۔ اور استاد کو کہتے: حضرت! سایہ پہنچ گیا، ۱۲ بج گئے، چھٹی کا وقت ہوگیا۔ وہ کہتے: اچھا بھائی! چھٹی کا وقت ہوگیا، چھٹی کرو۔ کبھی آدھا گھنٹہ، کبھی پون گھنٹہ اور کبھی ایک گھنٹہ پہلے لڑکے چھٹی کر کے بھاگ جاتے تھے۔ ایک دفعہ مسجد کے جو نمازی تھے انہوں نے کہا: حضرت! یہ لڑکے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں، آپ کی نظر کمزور ہے، وہ کیل کو نکال کر دوسری جگہ لگا دیتے ہیں اور آپ کو نظر آتا ہے کہ سایہ کیل پر آرہا ہے تو یہ بچے شرارت کرتے ہیں اور آپ غلط چھٹی دے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مسلمان کا بچہ جھوٹ بولتا ہو، یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہوگی، یہ اتنے بچے قرآن پڑھنے والے ہیں، یہ کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وجہ کیا تھی کہ جب انسان خود سچا ہو تو اس کو ہر آدمی سچا نظر آتا ہے۔ وہ یہ کبھی تصور ہی نہیں کر سکتا کہ مسلمان کا بچہ بھی جھوٹ بولے گا۔ مسلمان کے بچے کے زبان پر کبھی جھوٹ آسکتا ہے؟ انہوں نے کہا: میں تو نہیں مانتا۔ اتنے سادے اور عجیب تھے۔...... اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔...... یعنی جیسے آتا ہے "اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ کَرِیْمٌ"[1] مسلمان سادہ طبیعت ہوتا ہے کہ وہ ہر آدمی پر اعتبار کر لیتا ہے، ہر کسی کی بات کو ماننے والا ہوتا ہے، کسی کو جھٹلا نہیں سکتا۔

ایک دفعہ بچوں نے شرارت کی کہ آج استاد سے چھٹی لیں تو ایک بچہ آیا، اس نے کہا: آپ کی آنکھیں سرخ معلوم ہو رہی ہیں، آج خیر تو ہے؟ انہوں نے کہا: کوئی ایسی بات تو نہیں ہے۔ دوسرا لڑکا آیا، اس نے کہا: حضرت! محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کو بخار آرہا ہے۔ اس نے کہا: معلوم تو نہیں ہوتا۔ ایک تیسرا آیا، اس نے کہا: حضرت! محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کی طبیعت خراب ہے، آپ کو بخار ہو رہا ہے۔ جب چار پانچ لڑکوں نے یہ بات کی اور چھٹے نے کہا کہ آپ

[1] [سنن ابی داؤد، حدیث: ۴۷۹۰]

کی نظر تو بالکل جواب دے رہی ہے۔ تو بس آنکھ بند کر کے بیٹھ گئے اور بخار آ گیا اور لکڑی پکڑی ہوئی ہے کہ مجھے شاگردوں نے کہا ہے کہ میں اندھا ہو گیا ہوں، وہ جھوٹ بول نہیں سکتے۔ تو یہ ایمان والے لوگ ہوتے تھے، سیدھے سادھے لوگ ہوتے تھے۔ جس نے جو بات کہہ دی وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔

مفسر فرماتے ہیں: منافق کی مثال اس کشتی کی طرح ہے جدھر کی ہوا چلے اس طرف چل پڑے۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ
ان کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے، پھر اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ⑩
اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، کیونکہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔

سورۃ البقرۃ کی ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

یاد رکھیں!

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ.))

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۸۵، باب: مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ]

ہر پیدا ہونے والا بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ آگے پھر نتیجہ ہوتا ہے اگر اس کے والدین یہودی ہیں تو بچے کو یہودی بنا ڈالتے ہیں، نصرانی ہیں تو نصرانی بنا ڈالتے ہیں، مجوسی ہیں تو مجوسی بنا ڈالتے ہیں، مشرک ہیں، دہریہ ہیں تو وہ اس کو مشرک اور دہریہ بنا لیتے ہیں، کیونکہ اس ماحول کا اس پر رنگ چڑھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے نہ کسی کو ایمان کے لیے جبر کیا ہے کہ اس کو زبردستی مومن بنا دیں اور نہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو جبراً کافر بنا دیا ہے کہ وہ مومن بننا بھی چاہے تو اس کو کافر بنا دیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح فرما دیا:

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ⑭⑦﴾ [النساء: ۱۴۷]

اللہ نے فرما دیا کہ اے لوگو! تمہیں عذاب دے کر اللہ کو کیا فائدہ ہے؟ اگر تم اللہ کے شکر گزار بن جاؤ، اللہ پر ایمان لانے والے بن جاؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں کیوں عذاب دیں گے؟ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو ہلاک کرنے میں کوئی فائدہ تو نہیں ہے تو اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ ہر انسان کو دینِ فطرت پر پیدا فرماتے ہیں۔

واقعہ:

ایک جنگ کے موقع پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ ایک آدمی...... حالانکہ وہ آدمی حضور ﷺ کے غلاموں میں تھا...... جنگ میں بڑے زور و شور سے لڑ رہا ہے اور کافروں سے مقابلہ کر رہا ہے تو حضور ﷺ کے سامنے انہوں نے اس کی تعریف کی کہ فلاں آدمی نے آج جنگ کے اندر کمال کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ نے دکھلایا ہے کہ اس کے سر پر تو جہنم کی آگ جل رہی ہے۔ تو اب ظاہر دیکھنے والے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ کفر کے خلاف لڑ رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک پیغمبر ﷺ کو اطلاع فرما دی کہ اس کی موت ایمان پر نہیں ہوگی۔ اور چونکہ تمام اختیارات دینے کی طاقت اللہ کے پاس ہے تو انہوں نے ہمیں ایسا شتر بے مہار بھی نہیں بنا دیا کہ ہم اگر اپنی اختیار سے چاہیں تو موت بھی نہ آئے، ہم اپنے اختیار سے چاہیں تو مریں ہی ناں، ہم اپنے اختیار سے چاہیں تو بیماری نہ ہوں، ہم اپنے اختیار سے چاہیں تو ہمیں کبھی کوئی نقصان بھی نہ ہو، بلکہ ہمارے تمام اختیارات اللہ کی قدرت کے تابع ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں کی قلبی حالت کی تبدیلی کی کیفیت:

(حدیث) ایک دن حضرت حنظلہ آ رہے تھے اور رو رہے تھے۔ راستے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ملے، جو حضور ﷺ کے بعد امت میں سب سے افضل صحابی ہیں، ان سے پوچھا: اے حنظلہ! کیوں رو رہے ہو؟ اس نے کہا: ''نَافَقَ حَنْظَلَةُ'' اے ابوبکر! حنظلہ تو منافق ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے حنظلہ! کیا کہہ رہے ہو؟ تم تو بڑے سچے مومن ہو، تم کیسے منافق ہو گئے؟ اس نے کہا: دیکھو! منافق وہ ہوتا ہے جس کی حالتیں دو ہوں، یعنی ظاہر میں کچھ ہو اور باطن میں کچھ ہو۔ جب ہم حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھتے ہیں تو ہماری اور کیفیت ہوتی ہے، ہمارے دل کے اندر جو نور ایمان موجزن ہوتا ہے، اس سے شعاعیں پھوٹتی ہیں، لیکن جب ہم اپنے گھر میں آتے ہیں تو وہ کیفیت محسوس نہیں ہوتی، ہماری کیفیت بدل جاتی ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ کے سامنے ہماری اور حالت ہو، گھر کے اندر ہماری اور حالت ہو، پھر تو ہم منافق ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی گھبرا گئے۔ آپ نے فرمایا: حنظلہ! تم نے تو بڑی باریک بات کی ہے۔ یہ کیفیت تو میرے ساتھ بھی ہوتی ہے کہ جب ہم حضور ﷺ کی مجلس میں بیٹھتے ہیں، جب ہم آقا ﷺ کے پاس ہوتے ہیں تو ہماری کیفیت اور ہوتی ہے اور جب ہم اپنے گھروں

میں آجاتے ہیں اور اپنے معاملات میں مشغول ہو جاتے ہیں تو ہماری کیفیت تبدیل ہو جاتی ہے، تو چلو فوراً حضور ﷺ کی خدمت میں چلتے ہیں......اور یہ تو صحابہ کی شان تھی کہ انہیں جو بھی مشکل پیش آتی، فوراً آقا ﷺ کی خدمت میں پیش ہو گئے......

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے سامنے اپنی کیفیت بتائی تو حضور ﷺ مسکرائے اور فرمایا: اللہ کے بندو! تم مومن ہو...... الحمدللہ...... یہ کیفیت کا تبدیل ہونا......نعوذ باللہ......نفاق نہیں ہوتا۔ جب نبی علیہ السلام کی صحبت میں بیٹھے ہو تو اس کی اور کیفیت ہے، ''لَاشَكَّ فِيْ ذٰلِكَ'' صحبت کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اب دیکھیں کہ کوئی آدمی سورج کے زیادہ قریب ہو تو گرمی کا کتنا اثر ہوگا؟ جتنی دور ہوتا چلا جائے گا روشنی تو ہوگی، لیکن سورج کی حدت تو کم ہوتی چلی جائے گی۔ ایک آدمی عین اے، سی کے سامنے بیٹھ جائے تو فوراً آپ کے بدن کو ٹھنڈا کر دے گا، تھوڑا دور ہوں گے تو ٹھنڈک کم ہوگی۔......تو فرمایا: یہ نفاق نہیں ہوتا، میری مجلس میں جیسے تمہاری حالت ہوتی ہے اگر اسی طرح ہر وقت یہی حالت رہے تو آسمان کے فرشتے اتر کر تمہارے قدموں پر پر بچھا دیں گے۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۷۵۰، باب: فَضْلِ دَوَامِ الذِّكْرِ وَالْفِكْرِ فِي أُمُورِ الْآخِرَةِ]

یہ تو تبدیلی لازماً ہوگی کہ جب تم شمع نبوت کے سامنے بیٹھے ہوئے ہو گے، جب تم شارع کے سامنے بیٹھے ہوئے ہو گے اور جب تم اللہ کے پاک پیغمبر ﷺ کی صحبت میں بیٹھے ہوئے ہو گے تو اب کیفیتوں کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ تم گھر جاؤ گے تو لازماً اس میں تبدیلیاں آئیں گی، لازماً گھر میں بچوں میں مشغولیت آئے گی، بیوی کے مسائل آئیں گے، گھر کی پریشانیاں آئیں گی، حاجات پیش آئیں گی، تو کیفیت تبدیل ہوگی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ نفاق نہیں ہوتا۔

کفار کے سامنے اسلام نہ لانے کی ایک رکاوٹ:

(واقعہ) رمضان سے پہلے میرا یورپ کے اندر سفر تھا۔ ایک آدمی ملا، اس نے کہا کہ میں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے اور میں اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہوں، اسلام بڑا سچا مذہب ہے، لیکن اس نے کہا کہ جب میں مسلمانوں کو دیکھتا ہوں تو پھر رک جاتا ہوں۔ اس نے کہا: میں نے اسلام قبول کیا ہوا ہے۔ ذہنی طور پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو تمام دنیا کے مسائل کو حل کر سکتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسلام میں آجاؤں، اور میں ایسی جگہ نوکری کر رہا ہوں کہ میری پبلک ڈیلنگ ہے، میرے پاس عرب سے بھی مسلمان آتے ہیں، پوری دنیا

سے مسلمان آتے ہیں اور میرے سامنے سے گزرتے ہیں۔ جب میں ان مسلمانوں کے کردار پر نظر ڈالتا ہوں تو میں رک جاتا ہوں کہ بھائی! اگر یہی مسلمان ہیں تو شراب تو انگریز بھی پیتا ہے، انگریز بھی خنزیر کھاتا ہے اور یہ بھی خنزیر کھاتے ہیں، وہ بھی سوٹ پہنتا ہے اور یہ بھی سوٹ پہنتے ہیں، وہ بھی سودی کاروبار کرتا ہے اور یہ بھی سودی کاروبار کرتے ہیں، وہ بھی جوا کھیلتا ہے اور یہ بھی جوا کھیلتے ہیں، وہ بھی سٹے کا کاروبار کرتا ہے اور یہ بھی سٹے کا کاروبار کرتے ہیں، وہ ریس کورس میں جا کر بازی لگاتا ہے اور یہ بھی گھوڑوں پر جا کر بازی لگاتے ہیں، وہ بھی فلور پر آ کر ڈانس کرتا ہے اور یہ بھی غیر مسلم لڑکیوں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ڈانس کرتے ہیں اور وہ بھی اپنی لڑکیوں کو منی اسکرٹ پہنا کر بازاروں میں پھراتا ہے اور یہ بھی پھراتے ہیں، تو ان میں اور ان میں فرق کیا ہے؟ اس نے کہا کہ جب میں اس دوعملی کو دیکھتا ہوں تو میرے قدم رک جاتے ہیں۔

تفسیر آیت:

فرمایا: ان کے دلوں کے اندر بیماری ہے اور قاعدہ ہے کہ جب بیماری دل کے اندر پہنچ جائے تو آدمی ختم ہو جاتا ہے، ظاہری بیماری ہو، چاہے باطنی بیماری ہو۔

حدیث شریف میں ہے:

((أَلَا! إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا! وَهِيَ الْقَلْبُ.)) [صحیح البخاری، حدیث: ۵۲، بَابُ فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ]

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ بگڑے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ فرمایا: خبردار! وہ دل ہے۔ یعنی جب دل بگڑا تو سارا کچھ بگڑ گیا اور جب دل ٹھیک ہوا تو سارا کچھ ٹھیک ہو گیا۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ جو منافق ہیں، ان کی بیماری اب جلد میں نہیں ہے، بازو میں نہیں ہے، بلکہ دلوں کے اندر روگ لگ گیا ہے۔ فرمایا:

﴿فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ [البقرۃ: ۱۰]

"فِي" ظرفیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور بیماری دو قسم کی ہوتی ہے:

❁ ...... ایک ظاہری اور جسم کی بیماری ہے، جیسے کوئی چوٹ لگ جانا، بیمار ہونا، خارش وغیرہ ہونا۔

......اور دوسری روحانی بیاریاں ہیں: بغض، نفاق، جھوٹ اور شک کی بیماری ہے۔

﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ﴾ [البقرۃ:۱۰]

ہم نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا، کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب آدمی اللہ کے راستے میں آتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف صحیح معنوں کے اندر قدم بڑھاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بھی بڑھتی ہیں۔ جب آدمی کفر، انکار، شک اور تذبذب کا شکار ہوتا ہے تو اللہ اسی میں گمراہ کر دیتا ہے کہ اسی میں مرو۔

اگر ساری دنیا نافرمان ہو جائے تو خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی:

اگر ساری دنیا...... نعوذ باللہ...... کفر پر چلی جائے، ساری دنیا نفاق پر چلی جائے تو اللہ کا کیا نقصان ہوتا ہے......؟ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر ساری دنیا متقی بن جائے، اللہ کا فائدہ کوئی نہیں اور ساری دنیا کافر بن جائے، اللہ کا نقصان کوئی نہیں۔ اگر تم ایمان لاؤ گے تو تمہارا فائدہ ہے اور اگر تم کفر کرو گے تو تمہارا نقصان ہے۔ اللہ تو غنی ہے، اللہ تو بے پرواہ ہے۔ اللہ چاہیں تو آج ساری مخلوق کو ختم کر کے دوسری مخلوق پیدا فرما دیں، اللہ تعالیٰ چاہیں تو پوری کائنات کا نظام تبدیل کر دیں۔

منافقین کے لیے دردناک عذاب ہے:

حضرت ابن عباس اور ابن مسعود اور چند دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ اس مرض سے مراد شک ہے۔

[ابن کثیر: ۱/۴۸، الآیۃ: فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

یہ سب سے بڑی بیماری ہے کہ شک آیا اور آدمی تباہ ہو گیا۔ اگر یقین ہوتا تو پکا مومن بن جاتا۔ اور یہیں اللہ نے وضاحت بھی فرما دی ہے کہ ہم نے ان کا مرض کیوں بڑھایا؟

﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۢ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ⑩﴾ [البقرۃ:۱۰]

اور ان کے لیے دردناک عذاب کیوں ہے......؟ ﴿بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ⑩﴾ یہ عذاب اس لیے ہے کہ انہوں نے تکذیب کی۔ اللہ کسی کو ایسے عذاب نہیں دیتے۔ بغیر گناہوں کے، بغیر کفر کے اللہ اس کو جہنم میں ڈالے، ایسی بات نہیں ہے۔ وہ عذاب کیسا ہوگا......؟ جس کو اللہ خود دردناک فرما رہے ہیں اور پھر وہ عذابِ اخروی ہے، جہنم ہے اور عذابِ آخرت ہے، جس کے اندر کسی قسم کی تخفیف نہیں ہوگی۔

انسانی اعضاء کا دینی حق:

بعض علماء کرام کے نزدیک بیماری کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے جن اعضاء کو جن کاموں کے لیے پیدا فرمایا ہے اس کے خلاف استعمال کرنا بیماری ہے۔ اللہ نے ہمیں آنکھیں دی ہیں، تا کہ ہم اس سے دیکھ کر صراطِ مستقیم پر چلیں، ہم اس سے اللہ کی قدرت پر، اللہ کی آیات پر اور دانائی پر نظر ڈالیں اور اس کی توحید کو سمجھیں۔ اس نے ہمیں پاؤں دیے ہیں کہ اس کے راستے پر چلیں، اطاعت کے راستہ میں چلیں۔ اللہ نے ہمیں کان دیے ہیں کہ ہم ہدایت کی باتیں سنیں۔ تو اس طرح اللہ نے ہمیں جتنے اعضاء دیے ہیں وہ اپنی اطاعت کے لیے عطا فرمائے ہیں۔ جب ہم ان اعضاء کو ان کے حکم کے خلاف استعمال کرتے ہیں تو اس سے بڑی بیماری کیا ہو سکتی ہے؟

عذابِ قبر کی مثال:

آپ ﷺ قبروں سے گزر رہے تھے، فرمایا: ان دو قبر والوں پر اللہ کا عذاب ہو رہا ہے۔ جب حضور ﷺ نے اس عذابِ قبر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور حضور ﷺ نے فرمایا: اگر تم اللہ کے عذاب سے ڈر کر اپنے مردوں کو باہر نہ پھینک دیتے تو اللہ تمہیں بھی دکھلا دیتے، لیکن اللہ کی حکمت ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں سے اس بات کو چھپا لیا ہے۔ اب اس کی کیفیت کیسی ہوتی ہے؟ اب دیکھیں کہ دو آدمی ہیں، مثلاً: میاں بیوی ہیں، ایک ہی بستر پر لیٹے ہوئے ہیں۔ ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ میں باغوں میں پھر رہا ہوں اور دوسرا خواب دیکھ رہا ہے کہ مجھے کوڑے مارے جا رہے ہیں۔ اس آدمی کو اس کا پتہ نہیں ہے اور اس کو اس کا پتہ نہیں ہے۔ اگر الگ الگ خواب کے اندر، ایک مقام پر، ایک ہی بستر میں دو کیفیتوں کا اظہار ہو رہا ہے۔ ایک آدمی خوشی محسوس کر رہا ہے اور دوسرا عذاب محسوس کر رہا ہے تو ایک قبر میں اللہ عذاب دینے پر قادر نہیں ہیں......؟ اللہ کے آگے کیا مشکل ہے؟ لہٰذا جو مومن ہے وہ جب سنے گا تو کہے گا: ''اٰمَنَّا بِاللّٰهِ'' ہمارا اللہ پر ایمان ہے۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا:

﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۗ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۝﴾

[غافر:۴٦]

''کفار کو جہنم پر صبح اور شام پیش کیا جاتا ہے۔ قیامت والے دن ان کو سخت سے سخت عذاب میں ڈالا جائے گا۔''

اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے عذابِ قبر کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

معراج کی رات مجھے دکھلایا گیا زانی لوگوں کو کیا عذاب ہو رہا ہے؟ سود خوران کو کیا عذاب ہو رہا ہے؟ میری امت کے جو مولوی حق بات نہیں بیان کرتے ان کو کیا عذاب ہو رہا ہے؟ تو جب عذاب کو دیکھنے والے حضور پاک ﷺ ہیں تو ہمارا ایمان ہے کہ حضور ﷺ کی نظر بھی سچی ہے اور زبان بھی سچی ہے۔ جب مومن بات سنے گا تو کہے گا "اٰمَنَّا بِاللّٰہِ" اللہ پر بھی ہمارا ایمان ہے اور حضور ﷺ پر بھی ہمارا ایمان ہے، اس لیے اس کا ایمان بڑھتا چلا جائے گا۔ جب وہ قرآن سنے گا ﴿وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ [الانفال: ۲] اس کے ایمان میں اللہ پاک اور زیادتی فرما دیں گے۔ جب کافر سنے گا تو اس کا بغض اور عناد بڑھتا چلا جائے گا۔ جوں جوں قرآن نازل ہوگا، جوں جوں انکار کرے گا تو مرض بڑھتا چلا جائے گا۔

مرض کا معنی:

بعض علماء نے فرمایا کہ "مَرَضٌ" کا معنی یہ ہے کہ ان کے دلوں میں ریا کی بیماری داخل ہو گئی ہے، یعنی وہ دکھلاوے کے لیے کام کرتے ہیں اور اخلاص سے وہ خارج ہیں۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ "مَرَضًا" کا معنی نفاق ہے۔ نفاق ہی دل کی بیماری ہے۔

حضرت عبد الرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے دلوں کے اندر بیماری ہے۔ فرمایا: یہ بیماری وہ بیماری نہیں جو بدن کو لگتی ہے۔ بعض بیماریاں ہیں جن کا تعلق بدن سے ہوتا ہے، لیکن نفاق وہ بیماری ہے جس کا تعلق دین کے ساتھ ہے، یعنی ان کے دلوں میں اسلام کے بارے میں شک ہے تو چونکہ ان کے دلوں میں شک ہے تو وہ اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ [ابن کثیر: ۱/ ۴۸، الآیۃ: فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ]

جو لوگ ایمان لاتے ہیں اللہ پاک ان کے ایمان کو بڑھا دیتے ہیں اور ان کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور جو کافر اور منافق ہیں ان کا بغض اور عناد اور بڑھتا چلا جاتا ہے بسبب اس کے انکار کے اور کفر کے۔ چونکہ پہلے شر ہے تو اور شر بڑھ گیا، پہلے گمراہی ہے تو گمراہی اور بڑھ گئی۔

"یُکَذِّبُوْنَ" میں دو قراءتیں:

اور بعض قراء نے اس کو "یَکْذِبُوْنَ" بھی پڑھا ہے اور بعض نے تخفیف کے ساتھ "یُکَذِّبُوْنَ" بھی پڑھا ہے،

یعنی اس میں دو قراءتیں ہیں۔ اب مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں قراءتیں درست ہیں کہ منافق لوگ جھوٹے بھی ہیں اور جھٹلانے والے بھی ہیں۔ یہ خود بھی جھوٹ بول رہے ہیں کہ ظاہراً اسلام کو کرتے ہیں اور اندر کفر کو چھپاتے ہیں اور قرآن اور اللہ کے احکامات کو جھٹلانے والے بھی ہیں، لہٰذا دونوں قراءتیں درست ہیں۔

[ابن کثیر: ۱/۴۸، الآیۃ: فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

مدینہ کے قبرستان سے منافقین کو نکال دیا جائے گا:

ایک حدیث مبارک میں یہ بھی آتا ہے کہ قیامت کے قریب مدینہ منورہ میں ایک بڑا زلزلہ آئے گا۔ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ وہ اتنا بڑا بھونچال ہوگا، اتنا بڑا زلزلہ ہوگا کہ پورے مدینہ کی زمین لرز جائے گی۔ اور اس زلزلے کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ جتنے منافق لوگ وہاں مرے ہیں، جتنے بدعقیدہ لوگ وہاں مرے ہیں، ان کی قبریں انہیں مدینہ سے اٹھا کر باہر پھینک دیں گی، اللہ تعالیٰ مدینہ کو پاک صاف کر دیں گے۔ تاکہ جب قیامت والے دن میرے آقا ﷺ روضہ مبارک سے اٹھیں گے تو آپ جس جماعت کو ساتھ لے کر میدان حشر میں جائیں گے وہ پکے ایمان والوں کی جماعت ہوگی۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں جب اپنے روضہ مبارک سے اٹھوں گا تو میں جنت البقیع کے قبرستان پر تشریف لے جاؤں گا...... جو مدینہ کا قبرستان ہے...... اور پھر فرمایا کہ میں مکہ والوں کا انتظار کروں گا، مکہ والے بھی مدینہ پہنچ جائیں گے، جب مکہ والے آجائیں گے تو ان کو میں اپنے دائیں ہاتھ پر رکھ لوں گا اور مدینہ والوں کو اپنے بائیں ہاتھ پر رکھوں گا۔...... مکہ والے مہمان ہوں گے، سفر کر کے آئے ہوئے ہوں گے، اس لیے حضور ﷺ ان کی تکریم فرمائیں گے، ان کو اپنے دائیں ہاتھ پر رکھیں گے۔...... اور فرمایا کہ ان سب کو لے کر میں میدانِ حشر کی طرف بڑھوں گا۔ اس لیے مدینہ پاک کی خصوصیت ہے کہ وہاں اگر کوئی منافق مر گیا اور دفن ہو گیا، قربِ قیامت میں وہ وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ اب ہمیں تو پتہ نہیں ہے۔

قاضی اپنے علم کے مطابق فیصلہ نہ کرے:

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور قول بھی نقل کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے منافقوں کے عمل کے بارے میں (قتل وغیرہ کا) حکم نہ دیا اور باقی امت کو ایک مسئلہ سمجھا دیا کہ قاضی اپنے علم سے کبھی فیصلہ نہ کرے گا۔ قاضی اگر فیصلہ کرے گا تو گواہوں سے فیصلہ کرے گا۔ قاضی کو ایک قصہ کا علم ہے، اس کے مطابق فیصلہ جاری نہیں

کرے گا، گواہوں کا انتظار کرے گا۔ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو خبر عطا فرما دی، لیکن حضور ﷺ نے حکم جاری نہ فرمایا، تاکہ پوری امت کو یہ مسئلہ سمجھ آجائے کہ قاضی اپنے علم سے فیصلہ نہ کرے۔ اسی طرح قاضی اگر اپنے علم کے مطابق جانتا ہے کہ یہ قاتل ہے تو اگر شہادت نہ ملے تو وہ قتل کا فیصلہ نہیں کرے گا۔

[ابن کثیر: ۱/۴۸، الآیۃ: فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ]

کلمہ نفاق کا گناہ بھی مٹا دیتا ہے:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے منافقون کو اس لیے قتل نہ کیا کہ منافقین چاہے دل کے اندر کفر رکھتے تھے، لیکن زبان سے کہتے تھے "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" جو آدمی زبان سے کلمہ پڑھے تو پہلے گناہ جو ہیں اور پہلی خطا جو ہے معاف ہو جاتی ہے، لہٰذا جب وہ ظاہر سے اقرار کرتے تھے تو ان کے ظاہر کو مقدم رکھا گیا، اسی لیے اسلام ظاہر پر فیصلہ کرتا ہے۔ ایک آدمی کلمہ پڑھ رہا ہے، ہم کہیں گے کہ مسلمان ہے۔ اس کے دل کے اندر کیا ہے؟ یہ اللہ جانتے ہیں، ہم فیصلہ نہیں کر سکتے، کیونکہ ہم نے جو فیصلہ کرنا ہوتا ہے وہ ظاہر سے کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر میں وہ جب ہم سے کہتے ہیں "نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ" [المنافقون: ۱] ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

آدمی کی جان و مال کب محفوظ ہوتا ہے؟

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو صحیحین کے اندر موجود ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَإِذَا قَالُوْا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ))

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۹۹، باب: وجوب الزکاۃ؛ صحیح مسلم، حدیث: ۳۵، واللفظ لہ]

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال اور جہاد کروں اس وقت تک جب تک کہ وہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" نہ کہیں۔ جب وہ کلمہ پڑھ لیں، جب وہ اللہ کی وحدانیت کا اور میری رسالت کا اقرار کر لیں تو میری طرف سے ان کے اموال اور ان کا خون سب محفوظ ہو گئے۔ اب ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے کہ انہوں نے دل سے کلمہ پڑھا ہے

یا ظاہر سے کلمہ پڑھا ہے۔ [ابن کثیر: ۱/۴۹، الآیۃ: فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

جو حضور ﷺ کے زمانہ میں "منافق" تھا اب اس کا نام "زندیق" ہے:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو حضور ﷺ کے زمانہ میں "منافق" کہلاتا تھا وہ آج "زندیق" کہلاتا ہے۔ زندیق کے بارے میں کیا حکم ہے کہ اس کو قتل کیا جائے یا اس کو قید کر کے اس سے توبہ لی جائے یا اگر زندیق بار بار تکرار کرے تو اس کو قتل کیا جائے؟ مفسر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب الاحکام کے مسائل ہیں۔ آپ نے اگر اس کی تفاصیل دیکھنی ہے تو "کتاب الاحکام" میں دیکھیں۔ بہر حال! انہوں نے فرمایا کہ اس زمانہ میں جو منافق تھے، ظاہراً اسلام کا نام لیتے تھے، لیکن اندر کفر چھپا ہوا تھا، آج بھی وہ لوگ جو ظاہراً اسلام کا نام لیں، لیکن اللہ کے قرآن کا انکار کریں، اللہ کے نبی ﷺ کی سنت کا انکار کریں تو ان پر بھی زنادقہ کا حکم جاری کیا جائے گا۔

[ابن کثیر: ۱/۴۹، الآیۃ: فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

منافقوں کی ایک چال:

مفسر ﷺ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ ایک سفر میں تشریف لے جا رہے تھے تو منافقوں نے آپس میں مشورہ کیا، مثلاً ایک چڑھائی تھی اور اس کے بعد ایک بہت بڑا گڑھا تھا۔ منافقوں بدبختوں نے یہ مشورہ کیا کہ جب اس چڑھائی سے حضور ﷺ کی سواری اترے تو قریب جا کر حضور ﷺ کی سواری کو ڈرا دیا جائے، تاکہ سواری دوڑے اور گھاٹی میں گر جائے۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ اس طرح ہم حضور ﷺ کو شہید کر دیں۔ انہوں نے یہ پروگرام بنالیا کہ اس طرح پتہ بھی کسی کو نہیں چلے گا کہ اونٹنی تھی، بھاگ پڑی، جانور تھا، ڈر گیا۔ اس لحاظ سے ہماری بات بھی رہ جائے گی اور ہم حضور ﷺ کو نقصان بھی پہنچا دیں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کے پاس وحی بھیجی کہ میرے مدنی! فلاں فلاں آپ کے دشمن ہیں، ان لوگوں نے یہ پروگرام بنایا ہے، لہٰذا آپ ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔ حضور ﷺ کو اللہ نے محفوظ فرمالیا تو اس مشورہ کے اندر چودہ منافقوں کے نام، حضور ﷺ نے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو بتلائے۔ [ابن کثیر: ۱/۴۹، الآیۃ: فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

منافقین کے قتل کا حکم کیوں نہ دیا؟

مفسر فرماتے ہیں کہ ایک وجہ یوں بھی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے چونکہ حضور ﷺ کی ذاتی مخالفت کی تھی، اس

لیے حضور ﷺ نے ان سے بدلہ نہیں لیا۔ حضور ﷺ کا زندگی میں یہ عمل رہا ہے کہ اپنی ذات کے لیے میرے پاک نبی ﷺ نے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ حضور ﷺ کو اللہ نے رحمتِ دو جہاں بنا کر بھیجا۔ آپ کو جو بھی تکلیف پہنچی آپ نے معاف فرمادی۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ خیبر میں جب حضور ﷺ کو زہر دیا گیا، زہر کھلایا گیا، لیکن حضور ﷺ نے اپنی ذات کا بدلہ نہیں لیا، ان صحابہ کا بدلہ لیا جو صحابہ اس زہر سے شہید ہو گئے، ان کے بدلے میں حضور ﷺ نے قصاص کا حکم دے دیا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ وجہ بھی ہو کہ اعیانِ منافقین جن کی باقاعدہ تعیین کردی گئی تھی اور پھر چودہ افراد تھے ااور ان کے نام بھی معلوم تھے، اس لیے حضور ﷺ نے ان کے قتل کا حکم نہ دیا۔

[ابن کثیر: ۱/۶۹، الآیۃ: فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

منافق کے مقابلے میں مومن کی صفت:

((لَا يَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ لَعَّانًا)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۰۱۹، باب: مَا جَاءَ فِي اللَّعْنِ وَالطَّعْنِ]

مومن ہرگز ایسے نہیں ہوتا کہ لوگوں پر لعنتیں بھیجا کرے کہ فلاں لعنتی، فلاں لعنتی اور فلان لعنتی۔ یہ مومن کی صفت نہیں ہے:

((اَلْمُؤْمِنُ لَايَكُوْنُ فَاحِشًا وَلَا مُتَفَحِّشًا))

مومن ایسے نہیں ہوتا کہ زبان سے فحش بات نکالے، کبھی زبان سے گندی باتیں نکالے، غلیظ باتیں نکالے۔ یہ منافقوں کی علامات ہیں، یہ مومن کی علامت نہیں ہوسکتی۔ بلکہ مومن کی علامت تو یہ ہے:

﴿وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ [الفرقان: ۶۳]

اگر کبھی جاہلوں سے واسطہ پڑ جائے، غلط آدمی سے واسطہ پڑ جائے تو ان سے کنارہ کش ہو جائے، ان کو جواب بھی نہ دے۔

﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ [الفرقان: ۷۲]

اگر کبھی برائی یا برے لوگوں پر گزر ہو تو اپنا دامن بچاتے ہوئے نکل جائے۔ یہ مومن کی صفت ہے، اس لیے کوشش کریں کہ اللہ ہمیں منافقوں کی صفات سے بچائے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ۝۱۲

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں: ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ جان لو! وہی فساد پھیلانے والے ہیں، لیکن نہیں سمجھتے۔

وحی کا دروازہ بند ہو گیا:

جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی تو سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے رثاء کے بارے میں جو اور الفاظ کہے ہیں، وہاں سیدہ کے یہ الفاظ بھی احادیث میں موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا: "وَا اَبَتَاهُ!" اور ایک روایت میں ہے: "یَا اَبَتَاهُ! اَلْیَوْمُ انْقَطَعَ الْوَحْیُ" ہائے ابا جان! آپ کی جدائی سے اور بھی جدائی ہو گئی کہ وحی بھی ختم ہو گئی، کیونکہ جب آپ ہمارے اندر موجود تھے تو وحی اترتی تھی۔ اب آپ جب ہم سے چلے جا رہے ہیں، آپ کی وفات ہو گئی تو وحی بھی ہم سے منقطع ہو گئی، کیونکہ اب تو وحی نہیں اترے گی۔

منافق کی پہچان ایک دروازہ بند ہو گیا:

امام مالک رحمہ اللہ اور ان کے علاوہ دیگر ائمہ کرام فقہاء عظام اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں منافقوں کے معلوم کرنے کے دو طریقے تھے:

ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی علامات اور اپنی عادات سے پہچانے جاتے تھے کہ یہ منافق ہے، دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعہ سے بتا دیتے تھے کہ یہ منافق ہیں اور یہ فلاں سازش کر رہے ہیں۔ جیسا کہ چودہ منافقوں نے مل کر حضور ﷺ کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ پاک نے فوراً جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر اپنے پیغمبر ﷺ کو خبر دے دی۔ اسی طرح عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا تھا:

﴿لَىِٕنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِیْنَةِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ﴾ [المنافقون: ۸]

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے آ کر حضور ﷺ کو خبر دی۔ عبداللہ بن ابی کو حضور ﷺ نے بلایا، تم نے یہ باتیں کی ہیں؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے خدا کی قسم ہے! میں نے یہ باتیں نہیں کی ہیں۔ اب اللہ پاک نے وحی بھیج کر قرآن پاک میں خبر بھیج دی کہ آپ کے صحابی سچے ہیں، یہ منافق جھوٹے ہیں۔ انہوں نے مشورہ بھی کیا ہے اور

انہوں نے یہ لفظ بھی کہے ہیں کہ ہم مدینہ میں جانے کے بعد جو ہم عزت والے ہیں ذلت والوں کو نکال دیں گے۔ تو اس زمانہ میں وحی کا سلسلہ موجود تھا۔

حضور ﷺ کی وفات کے بعد علماء نے فرمایا: یا مسلمان ہیں یا کافر ہیں۔ یعنی اب تو آدمی یا تو مسلمان سمجھا جائے گا یا کافر سمجھا جائے گا۔ اس کی نفاق کی علامات سے تو ہم اس کو پہچانیں گے، وگرنہ یقینی فتویٰ نہیں ہوگا کہ یہ منافق ہے، البتہ قرآن کی اصطلاح میں ان پر ملحد کے لفظ کا اطلاق ہوگا۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا﴾ [حٰم السجدة: ۴۰]

''جو لوگ ہماری آیتوں کے بارے میں ٹیڑھا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے۔''

اللہ تعالیٰ کے قرآن کی آیات کے اندر ایسی ایسی تاویلاتِ فاسدہ کرتے ہیں کہ اللہ کے قرآن کے معانی و مفہوم و منشاء کو بدل ڈالتے ہیں۔ ان پر ملحد کا اطلاق ہوگا اور حدیث کی لغت میں ان پر زندیق کا اطلاق ہوگا۔ یعنی وہ بھی منافق ہیں جو اللہ کے دین اور اللہ کے احکام کو بظاہر تو کہیں کہ ہم مسلمان ہیں، ہم قرآن کو مانتے ہیں، لیکن قرآن کی آیات کا مفہوم بدل ڈالیں۔ آج کل بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ربوا (سود) علیحدہ چیز ہے اور سود علیحدہ چیز ہے۔ ربوا حضور ﷺ کے زمانہ میں تھا، وہ الگ ہے اور جو ہماری بینکنگ میں رائج ہے الگ ہے، تو یہ اللہ کے قرآن کی تحریف ہے۔ اللہ کے قرآن کی آیات کے اندر تاویلات کے ذریعہ قرآن کو بدلنا چاہتے ہیں۔

تاویلات کے ذریعہ حرام کو حلال قرار دینا:

اسی طرح جیسا کہ بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ قرآن پاک میں اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے مردہ جانور حرام کر دیا ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ﴾ [المائدة: ۳]

''تم پر حرام کیے گئے ہیں مردار، خون اور خنزیر کا گوشت۔''

وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا: گوشت حرام ہے، ہڈیاں تو حرام نہیں، بال تو حرام نہیں ہیں۔ اس لیے انہوں نے خنزیر کے بالوں سے دانتوں کے برش بنائے ہیں اور شیو کے لیے جو برش استعمال کرتے ہیں وہ بنائے ہیں، باقاعدہ لکھا ہے کہ یہ خنزیر کے بالوں کے بنائے ہوئے ہیں اور سب سے مہنگے وہی ہوتے ہیں اور مسلمان وہی استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ لوگوں نے ایک ذہن بنالیا ہے کہ گوشت ہی حرام ہے، کیونکہ قرآن نے فرمایا کہ اس کا گوشت حرام ہے،

یہ تو فرمایا ہی نہیں کہ اس کی ہڈیاں بھی حرام ہیں، اس کے بال بھی حرام ہیں۔ حالانکہ مفہوم قرآن یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بتلا رہے ہیں کہ یہ چیزیں حرام ہیں اور یہ چیزیں حرام ہیں۔ چونکہ عام طور پر گوشت کھایا جاتا ہے، اس لیے حکم آ گیا کہ گائے کا گوشت حلال ہے، بکری کا گوشت حلال ہے، لیکن خنزیر کا حرام ہے، کتے کا حرام ہے اور ہر ذی ناب کا گوشت حرام ہے۔ اب اس کی تفصیلات جو ملیں گی وہ ہمیں حدیث رسول ﷺ میں ملیں گی۔

یاد رکھیں! اس قسم کی جو لوگ اللہ کے قرآن میں تحریف کرتے ہیں وہ بھی منافق ہیں، ان کو قرآن کی اصطلاح میں ملحد کہا جائے گا اور احادیث کی اصطلاح میں انہیں زندیق کہا جائے گا کہ وہ اللہ کے قرآن کو بدل رہے ہیں، اللہ کے نبی ﷺ کے فرمان کو بدل رہے ہیں اور اپنی خواہشات کے مطابق اس کو معنی پہنا رہے ہیں۔

دین کے مسائل کا مذاق اڑانے والے:

ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا، بلکہ نماز کا استہزاء کرتا ہے۔ ایک آدمی داڑھی کا استہزاء کرتا ہے، داڑھی سنت انبیاء ہے۔ یہ صرف میرے مدنی پاک ﷺ کی سنت نہیں، بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اب اگر کوئی آدمی...... نعوذ باللہ...... داڑھی پر طنز کرے یا اعتراض کرے یا داڑھی والوں کا باعتبار داڑھی کے مذاق اڑائے یا محاورۃ کہہ دے کہ چھوڑو جی! یہ داڑھی والے تو جھوٹے ہوتے ہیں، حالانکہ ایک داڑھی والے کا الزام سارے داڑھی والوں پر تو نہیں لگ سکتا۔ جب وہ کوئی ایسا استہزائی کلمہ زبان سے نکالے اس پر بھی وہی اطلاق ہوگا، جیسے منافق استہزاء کرتے تھے۔ وہ دین کے بارے میں ایسی باتیں کرتے تھے کہ ان کا مقصود استہزاء ہوتا تھا۔ اب اس سے اندازہ ہوگا کہ یہ لاکھ کہتا رہے کہ میں مسلمان ہوں، لیکن منافق ہے۔ اگر یہ مسلمان ہوتا تو کبھی حضور ﷺ کی سنت کو مذاق نہ بناتا، کبھی حضور ﷺ کی سنت کو استہزاء کے طریقہ پر اختیار نہ کرتا۔ اس لیے اب علماء نے فرمایا کہ اب وہ علامات سے پہچانے جائیں گے کہ جو لوگ قرآن میں تحریف کر دیتے ہیں، احادیث رسول اللہ ﷺ میں تحریف کر دیتے ہیں یا ان کے معنوں کو ایسا تبدیل کر دیتے ہیں کہ اللہ کے قرآن کا مفہوم ہی تبدیل ہو جائے تو اس پر ملحد کا اطلاق بھی ہوگا اور زندیق کا اطلاق بھی ہوگا اور منافق کا اطلاق بھی ہوگا۔

فساد کی دو قسمیں:

﴿قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪﴾ [البقرۃ:۱۱]

''وہ کہتے ہیں: بالکل اصلاح کرنے والے ہم ہی ہیں۔''

''اِنَّمَا'' حصر کا کلمہ ہے کہ ہمارے اندر اصلاح ہی اصلاح ہے۔

فساد دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک فساد کو تو سب لوگ سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں۔ مثلاً: چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا فساد ہے، قتل کرنا اور خون ریزی کرنا فساد ہے، اس کو تو سب فساد سمجھتے ہیں، سب اس کو برا بھی جانتے ہیں اور سب اس کو روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اور جو اصل فساد ہے اس کے بارے میں کوئی توجہ ہی نہیں کرتا۔ اصل فساد یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دماغ میں اور عقیدہ میں فساد ڈال دیا جائے۔ اب وہ اللہ کی توحید کی جگہ شرک کرنا شروع کردے، سنت کی بجائے بدعت پر چلنا شروع کردے اور اللہ کے احکام کی تعمیل کی بجائے شیطانی احکام کی تعمیل شروع کردے۔ اصل فساد تو یہ ہے۔ اس فساد سے ہی یہ ظاہری فساد مرتب ہوتے ہیں۔ اگر اس اصل فساد کو ختم کردیا جائے تو ظاہری فساد خود بخود مٹ جاتے ہیں۔

ملعون عورت:

ایک مسئلہ ہمیشہ یاد رکھ لیں! حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو عورت ایسا تبرّج کرے کہ اس سے سنگھار، حسن اور جمال کا اظہار ہو، اور فرمایا: تعطرات ایسی خوشبو لگائے کہ لوگوں کو خوشبوئیں محسوس ہوں، ایسا زیور پہنے کہ لوگوں کو اس کی آواز آئے، ایسا چست لباس پہنے کہ بدن کا حجم نظر آئے، اتنا باریک لباس پہنے کہ بدن کا رنگ نظر آئے اور ایسا لباس پہنے کہ بال نظر آئیں ایسی عورت پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔

بدعقیدہ صحیح العقیدہ کو فسادی کہتے ہیں:

اور ہم منافقت اس لیے کرتے ہیں کہ ہم دونوں کو ملانا چاہتے ہیں اور آپ کھری بات کر کے دونوں کو لڑانا چاہتے ہیں، یعنی منافق الٹا یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اصلاح کرنے والے ہیں اور مسلمان فساد کرنے والے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ علماء نے فرمایا کہ آج بھی جتنے حق والے لوگ ہیں، حق کی جماعتیں ہیں، لوگ انہی کو کہتے ہیں کہ یہ فسادی ہیں۔ لوگ انہی کے بارے میں کہیں گے کہ یہ بڑے فسادی ہیں۔ مولوی جب سے آیا ہے، یہ پکا وہابی ہے، اس نے جھگڑا پھیلا دیا ہے، پہلے ہم سارے مزے سے رہتے تھے، ہم سارے قبروں پر جاتے تھے، نذر و نیاز دیتے تھے۔ یہ جب سے آیا ہے، نہ فاتحہ، نہ درود، نہ نذر و نیاز اور نہ اٹا نہ گھٹا، یہ تو مصیبت بن گیا، فسادی ہے۔ یہ جب سے آیا

ہے صحابہ کے نام پر لڑائی شروع کر دی ہے، حالانکہ فساد وہ ہوتا ہے جو اللہ کے حکم کے خلاف کر رہا ہو، وہ اللہ کے حکم کو جاری کرنا چاہتا ہے۔

اللہ جانتا ہے کہ فسادی کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون ہے؟ اسی لیے فرعون نے کہا تھا کہ میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ موسیٰ (علیہ السلام) میرے ملک میں فساد کرنے آیا ہے۔ اللہ کے نبی ہیں، ہارون علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، لیکن ہر فرعون اور ہر فرعون کا پیروکار حق والوں کو ہمیشہ کہے گا کہ وہ فساد کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے ملک میں دیکھا ہوگا کہ جب تبلیغ والے آجائیں تو کہتے ہیں کہ یہ بڑے فسادی ہیں، ان کو مسجد سے نکالو اور مسجد کو دھودو، کیونکہ یہ آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور ان کو اپنے جیسا بنا دیتے ہیں۔ ارے بھائی! اس کوڈاکو بنا دیتے ہیں یا نمازی بنا دیتے ہیں؟ بے دین بنا رہے ہیں یا دیندار بنا رہے ہیں؟ کسی بے داڑھی والے کو داڑھی والا بنا رہے ہیں یا سنت کو مٹا رہے ہیں؟ ہمیشہ یہ قاعدہ ہے کہ باطل حق والے کو کہے گا کہ یہ فسادی ہے، حالانکہ اصل فساد کرنے والا کون ہوتا ہے؟ جو باطل ہو۔ اللہ رحمت فرمائے۔ دعا کریں اللہ پورے عالم اسلام سے فتنہ اور فساد کو ختم کر فرما دے، اللہ تبارک وتعالیٰ پورے عالم اسلام میں امن وامان قائم فرما دے۔

جھگڑا، فساد نہ ماننے سے ہوتا ہے:

اس دفعہ جب میں سفر پر تھا تو مجھے ایک بہت بڑے ذمہ دار افسر نے کہا کہ یہ جو لوگ ہیں بڑے اچھے نوجوان ہیں اور بڑے نمازی بھی ہیں اور...... ماشاء اللہ...... ان کے چہروں پر داڑھیاں بھی ہیں اور سنت کے مطابق کپڑے بھی پہنتے ہیں، لیکن یہ بڑا جھگڑا ہے کہ صحابہ کے نام پر لڑائیاں اور فساد کرتے ہیں، یہ بڑے فسادی لوگ ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ حضرت! مجھے آپ ایک بات بتائیں کہ جھگڑا ماننے سے ہوتا ہے یا نہ ماننے سے ہوتا ہے؟ آپ تو...... ماشاء اللہ...... اتنے بڑے افسر ہیں اور اللہ نے آپ کو اقتدار دیا، ہم تو ملاں لوگ ہیں۔ اس نے کہا کیا مطلب؟ میں نے کہا: آپ مجھے کہتے ہیں کہ میرے اس کمرے سے باہر چلے جاؤ۔ میں نے آپ کی بات مان لی اور باہر چلا گیا۔ اب بتائیں کہ جھگڑا ہوگا؟ اس نے کہا: پھر جھگڑے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ جھگڑا تب ہوگا کہ جب تم مجھے کہو کہ کمرے سے باہر نکل جاؤ اور میں کہوں کہ نہیں نکلتا۔ تم کہتے ہو کہ میں دھکے مار کر نکالوں گا، میں کہتا ہوں نہیں نکلتا۔ تم کہو گے کہ آدمیوں کو بلاؤ اور اس کو باہر نکالو اور میں باہر نہیں نکل رہا، میں چمٹا ہوا ہوں۔ تو اب جھگڑا اور فساد ہوگا۔ تو فساد نہ ماننے سے ہوگا، ماننے سے کبھی نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ ہم تو صحابہ رضی اللہ عنہم

کے غلام، اہل بیت رضی اللہ عنہم کے بھی غلام، تو ہم کیسے جھگڑا کریں گے؟ جو ابو بکر رضی اللہ عنہ کا دشمن ہو، وہ ہمارا دشمن ہے۔ جس طرح کوئی شانِ صدیق رضی اللہ عنہ میں کوتاہی کرے وہ زندیق اور لعنتی ہے، اسی طرح اگر کوئی شانِ اہل بیت میں کوتاہی کرے وہ بھی زندیق اور لعنتی ہے۔ تو ہم ماننے والے ہیں، قرآن کو ماننے والے ہیں، اہل بیت کو ماننے والے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ماننے والے، بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ماننے والے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ماننے والے، اولادِ نبی کو ماننے والے، ان کے مرتبہ شہادت کو ماننے والے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حیدر کرار ماننے والے ہیں۔ جھگڑا تو وہ کرے گا جو صدیق رضی اللہ عنہ کو نہ مانے، جھگڑا تو وہ کرے گا جو عمر رضی اللہ عنہ کو نہ مانے، جو عثمان رضی اللہ عنہ کو نہ مانے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کو نہ مانے۔ اب آپ مجھے سمجھائیں کہ ماننے والا کیسے جھگڑا کر سکتا ہے؟ مجھے سمجھ نہیں آتی، تمہاری عقل کا ماتم کرنا چاہیے، اتنی بڑی کرسی کے بعد اللہ نے تمہیں عقل نہیں دی، باقی سب کچھ عطا فرما دیا ہے۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھو! کبھی ماننے والا جھگڑا ہی نہیں کرتا۔ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیا، کوئی جھگڑا ہے؟ جھگڑا تو وہ کرے گا جو کہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتا ہوں، لیکن ختمِ نبوت کو نہیں مانتا۔ اب جھگڑا آ گیا ہے۔ تو جھگڑا ماننے سے شروع ہوا کہ نہ ماننے سے شروع ہوا؟ جس نے مان لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے سردار ہیں تو جھگڑا ہو سکتا ہے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس نے کہا: یہ تو بات ٹھیک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی بھی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمت بھی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم نہیں ہوئی، بلکہ آپ کے بعد ایک مرزا بھی نبی ہے۔ تو اب جھگڑا ماننے والے نے کیا ہے یا نہ ماننے والے نے کیا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانا اس نے جھگڑا کیا ہے۔ ایک آدمی کو آپ کہیں کہ آؤ بھائی جی! نماز پڑھیں تو وہ کہے: ماشاء اللہ چلو چلیں، ہمیں بھی حرم میں نماز مل جائے، تو کوئی جھگڑا ہے؟ اور جب وہ کہے کہ میں نماز نہیں پڑھتا۔ اب ماننے والا جھگڑا کرے گا یا نہ ماننے والا جھگڑا کرے گا؟

کیا منافقین ماننے والے تھے؟ ظاہر میں اسلام ہے اور اندر اسلام نہیں ہے۔ اور مسلمان اندر باہر سے ماننے والے ہوتے ہیں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ تم فساد نہ کرو۔ اور فساد وہ کرتا ہے جو اللہ کے احکام کو نہ مانتا ہو، مثلاً: چوری

بھی فساد ہے، قتل کرنا، ڈاکہ مارنا بھی فساد ہے، ساری دنیا فنا ہو جائے اللہ کے نزدیک وہ معمولی بات ہے، لیکن ایک انسان کا قتل زیادہ شدید بات ہے۔ دعا کرو کہ اللہ مسلمانوں کو قتل سے، خون ریزیوں سے اور فساد سے محفوظ فرمادے۔ اللہ تعالیٰ تمام عالم اسلام میں امن، امان، استقرار، سکون اور عین امن والی وہ کیفیت پیدا فرمادے جو حضور ﷺ کے زمانہ میں تھی۔

جہاد کے احکام کیوں جاری کیے گئے؟

فساد کا ایک طریقہ علماء نے فرمایا کہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کے عقیدے میں شک ڈالتا پھرے، شبہات پیدا کرتا پھرے، نبی کریم ﷺ کی ذات کے بارے میں یا احکامِ اسلام کی مراد میں شک پیدا کرے۔ سب سے بڑے فسادی منافق ہوتے ہیں اور سب سے بڑا فسادی کافر ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ [الانفال:۳۹]

"اور (مسلمانو!) ان کافروں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور دین پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے۔"

کافروں کے خلاف قتال اور جہاد کرو، کیوں جہاد کریں؟ اب دیکھیں کہ اگر ایک انگلی خدا نہ کرے گندی ہو جائے، اس کو کینسر لگ جائے تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ انگلی کاٹ دو، ورنہ ہاتھ پورا گل جائے گا۔ انگلی کاٹنے سے باقی جسم کو بچانا ہوتا ہے۔ اگر کفر کے خلاف جہاد نہ کیا جائے تو پھر پوری دنیا میں کفر پھیل جائے گا۔ تو جیسے جسم کو بچانے کے لیے انگلی کا کاٹنا ضروری ہے، عالم اسلام کو بچانے کے لیے کفر کا کاٹنا ضروری ہے۔ اسی لیے پھر اللہ تعالیٰ نے جہاد کے احکام جاری فرمائے کہ اگر امت جہاد نہیں کرے گی تو کفر پھیلے گا۔ اور اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا: میری امت اس وقت تک عزت سے رہے گی جب تک جہاد پر کاربند رہے گی۔ جس دن میری امت نے جہاد کو چھوڑ دیا اور مال و دولت میں لگ گئی اس دن ذلیل ہو جائے گی۔ آج دیکھ لو! پوری دنیا میں مسلمان اربوں کی تعداد میں ہیں، یعنی اتنی بڑی تعداد ہے کہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن دلوں سے جذبۂ جہاد نکل گیا، جذبۂ ایمان ختم ہو گیا، صرف نام کے ہم مسلمان رہ گئے، انجام یہ ہے کہ آج ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ اصل فساد نفاق ہے، کفر ہے، لیکن یہ بدبخت ایسے ہیں کہ سمجھ ہی نہیں رہے۔

منافقین کے دعویٰ کا رد:

﴿أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ﴾ [البقرۃ:۱۲]

قاعدہ ہے کہ انکار جتنا سخت ہوگا جواب بھی اتنا سخت ہوگا۔ انہوں نے جملہ حصر کا بولا تھا کہ ﴿إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ⑪﴾ [البقرۃ:١١] اللہ نے اسی تاکید کے ساتھ رد کر کیا، خبردار: ﴿أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ⑫﴾ [البقرۃ:١٢] اوران کو شعور بھی نہیں کہ اصل فسادی تو خود ہیں، اصل فساد کرنے والے منافق ہیں۔ اس لیے مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں "وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ" سے مراد منافقین ہیں اور "لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ" "اس فساد سے مراد اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا، اللہ کی نافرمانی کرنا، یہ سب سے بڑا فساد ہے۔ [ابن کثیر: ١/٤٩، الآیۃ: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ]

سب لوگ مومن بن جائیں، موحد بن جائیں اور اللہ کے فرمانبردار بن جائیں تو سارے کے سارے فساد خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ جس گھر میں ایک لڑکا نافرمان ہو تو فساد ہوتا ہے، لیکن اگر اولاد فرمانبردار ہو، دس لڑکے بھی ہوں تو کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ ایک بیوی نافرمان ہو سارے گھر میں فتنہ ہوتا ہے۔ اگر میاں بیوی صلح پسند ہوں تو کوئی جھگڑا نہیں ہے۔

قرآن کے مقاصد کو سمجھنے کی ضرورت:

یاد رکھیں کہ آج قرآن مقدس کو ہمارے بھائی بہت پڑھا کرتے ہیں، بعض لوگ تو قرآن کو یہ سمجھتے ہیں کہ بس ٹھیک ہے، ایک مقدس کتاب ہے۔ اور بعض ہمارے طالب علم بھائی نحو کے اعتبار سے بڑی بحثیں پڑھیں گے، باعتبار صرف کے بحثیں پڑھیں گے اور باعتبار بلاغت کے بحثیں پڑھیں گے، ایک حرف پر بحثیں ہوتی ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ ہمارے مدارس میں ایک پارہ ایک استاذ پورا سال پورا نہیں کر سکتا، ایک ایک لفظ پر اسے تحقیق کرنی ہوتی ہے اور اپنے انداز سے قرآن کے معانی سمجھانا ہوتے ہیں۔ یہ کوششیں اپنی جگہ حق ہیں، لیکن خدا کے لیے کبھی قرآن کے بارے میں یہ بھی تو غور کریں کہ قرآن صرف اس لیے تو نہیں آیا تھا کہ ہم اسے مقدس کتاب سمجھ کر سینوں سے لگا لیں، کبھی اس کو سر پر رکھ کر قسم کھا لیں، کبھی ہم اس کو آنکھوں سے لگا لیں اور بوسے دے دیں اور کبھی ہم اس کو غلافوں میں لپیٹ کر اونچی جگہ پر رکھ دیں، تا کہ قرآن کا ادب ہو جائے، قرآن کا احترام ہو جائے، قرآن نیچی جگہ پر نہ ہو۔ قرآن ایک دعوت لے کر آیا تھا، قرآن سب سے بڑا انقلاب کا پروگرام لے آیا تھا، قرآن ہماری زندگیوں کو بدلنے کے لیے آیا تھا اور قرآن ہمارے اندر ایک تبدیلی لانے کے لیے آیا تھا۔ آپ جب قرآن پڑھیں تو قرآن کی دعوت کو سمجھیں کہ قرآن کہتا کیا ہے؟

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک تارکِ نماز مسلمان نہیں ہے:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ......اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔......، اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے، اسی طرح ابن القیم رحمہ اللہ نے اور اسی طرح بہت بڑے ائمہ کرام نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر کوئی آدمی ایک فرض نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے تو کافر ہو جاتا ہے۔آج کتنے لوگ ہیں جو عمرہ پر آئے ہیں اور حج کر کے جائیں گے، لیکن نمازیں غائب ہیں۔ایسے لوگوں کو حج پڑھنے کا ڈھیلے کے برابر بھی فائدہ نہیں ہوگا۔یہ بات نوٹ کر لیں اور یاد کر لیں۔پھر پانچ نمازیں وہ جماعت کے ساتھ نہیں پڑھتا تو کوئی پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ تو بعض ائمہ کے نزدیک مسلمان ہی نہیں رہا اور حج تو مسلمان ادا کرتا ہے۔

اس لیے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک نماز جان بوجھ کر ترک کر دے تو وہ کافر ہو جاتا ہے، اس کا نکاح ختم ہو جاتا ہے۔فرماتے ہیں کہ اگر مر جائے تو اس کا جنازہ نہ پڑھو، اگر مر جائے تو اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن بھی نہ کرو۔کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ.)) [الجامع الصغیر للسیوطی، حدیث:۸۵۸۷]

''جو نماز کو جان بوجھ کر چھوڑ دے وہ کافر ہو گیا۔''

باقی ائمہ اس کو فاسق اور فاجر کہتے ہیں، کافر نہیں کہتے، لیکن بہرحال اتنا بڑا امام!! اس کی تحقیق ایسی نہیں، ظاہر حدیث کے مطابق ہے۔

قیامت کب آئے گی؟

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ اچھے لوگ موجود ہیں۔یعنی جب تک دنیا میں ایک بھی آدمی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی کہ اللہ کے ذکر کی وجہ سے دنیا قائم ہے۔[سنن الترمذی، حدیث:۲۲۰۷]

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ قیامت اس وقت قائم ہوگی کہ جب لوگ برے ہو جائیں گے، دنیا میں برائی ہوگی اور جتنے اچھے لوگ ہیں ان کو اللہ اٹھا لیں گے۔زمین میں صرف وہ لوگ باقی ہوں گے جو برائی کرنے والے ہوں گے تو قیامت قائم ہو جائے گی۔

کافر ہی اعتقادی کافر ہے:

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب وہ برائی کا کام کرتے ہیں، جب وہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں تو ان کو کہا جاتا ہے کہ تم یہ نافرمانی نہ کرو، اللہ کی نافرمانی ہی فساد ہے۔ لیکن الٹا کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، ہم تو اچھے کام کرنے والے ہیں۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اس آیت والے لوگ ابھی نہیں آئے۔ یعنی اعتقادی منافق جو تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے، اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یا مومن ہوں گے یا کافر ہوں گے۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان کہ وہ زمین میں فساد کرنے والے ابھی نہیں آئے، اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافق نہیں تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے بعد ایسے لوگ آئیں گے کہ جو ان سے بھی زیادہ دنیا میں فساد برپا کریں گے، عقیدوں میں فساد ڈالیں گے، اعمال میں فساد ڈالیں گے۔ اگرچہ فساد مختلف قسم کے ہیں، لیکن اصل فساد یہ ہے کہ مسلمان کے عقیدے کو خراب کیا جائے، توحید کے بجائے شرک میں ڈالا جائے، ایمان کی بجائے کفر میں ڈالا جائے اور اللہ کی عبادت کی بجائے غیر اللہ کی فرمانبرداری میں ان کو ڈالا جائے۔ [ابن کثیر: ۱/۵۰، الآیۃ: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ]

اہلِ بدعت اور اہلِ ضلال:

جتنے بھی اہلِ ضلال، جتنے بھی گمراہ فرقے ہیں، یا جتنے اہلِ بدعت ہیں، ان سے یہ پوچھا جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں، ہم تو کوئی برائی کر ہی نہیں رہے، حالانکہ وہ بھلائی نہیں ہوتی۔ جو کام اللہ کے فرمان اور اللہ کے رسول کے فرمان کے خلاف ہو اس میں بھلا ہو ہی نہیں سکتا۔

اس لیے یاد رکھیں کہ سلف صالحین نے اور جمیع ائمہ محدثین وفقہاء رحمہم اللہ نے دو باتیں فرمائی ہیں۔ وہ اگر آدمی یاد کر لے تو اس سے دین میں بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ یاد رکھیں کہ اللہ کے ہاں کوئی عمل بڑا عمل ہو یا چھوٹا عمل ہو، جب تک اس کے اندر دو شرطیں نہ پائی جائیں اللہ کے ہاں قبول ہی نہیں ہوتا:

❁......سب سے پہلی شرط یہ ہے: "أَنْ يَكُونَ خَالِصًا" کہ وہ خالص اللہ کے لیے ہو، کسی اور کو اس میں شریک نہ کرے۔ اگر اللہ کے لیے خالص نہ کرے کہ اللہ کے لیے بھی ہو اور فلاں بزرگ کے لیے بھی ہو اور فلاں چیز کے

لیے بھی ہے تو اب شرک آ گیا، عمل خالص نہ رہا۔ اور جب تک عمل خالص نہ ہو اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا۔

۞......اور دوسری شرط کیا ہے؟ "أَنْ يَكُوْنَ صَوَابًا" صواب کا معنی کیا ہوتا ہے؟ "مُوَافِقًا لِشَرِيْعَةِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ" کہ وہ عمل جو آپ کر رہے ہیں سنت محمدی ﷺ سے اس کی اصل ملنی چاہیے۔ اس طرح ایک چھوٹے سے عمل سے بھی جنت ملتی ہے۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کی اتباعِ سنت:

آپ اندازہ فرمائیں کہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے محدثِ زمان تھے، ان کی معروف کتاب ہے "سنن ابی داؤد" اور صحاح ستہ کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ ایک دفعہ آپ دریا کے کنارے پر کھڑے تھے اور دریا سے ہٹ کر تھوڑا دور بادبانی جہاز کھڑا تھا، لیکن کنارے سے دور تھا، تو اس جہاز میں کھڑے ہوئے ایک آدمی کو چھینک آئی ......تو قاعدہ یہ ہے سنت کے مطابق کہ جس آدمی کو چھینک آئے وہ کہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" اور سننے والے کے لیے سنت ہے کہ وہ جواب میں کہے "يَرْحَمُكَ اللهُ" (اللہ تجھ پر رحم کرے) اور پھر وہ آدمی جواب میں کہے "يَهْدِيْنَا وَ يَهْدِيْكُمُ اللهُ" (ہمیں بھی اللہ ہدایت دے اور تمہیں بھی ہدایت دے)۔ اور یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے کہ چھینکنے والا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہے، کیونکہ دماغ کا تزکیہ ہو رہا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرے کہ اگر یہ تنفس رک جاتا تو پتہ نہیں کیا ہوتا؟ سننے والا اس کو جواب دے "يَرْحَمُكَ اللهُ" کہ تو نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے، اللہ تجھ پر رحم کرے۔ اب جب اس نے اس کو دعا دی ہے تو قاعدہ ہے کہ وہ تمہاری دعا کا جواب دے تو وہ بھی کہے "يَهْدِيْنَا وَ يَهْدِيْكُمُ اللهُ" (اللہ ہمیں بھی ہدایت دے اور تمہیں بھی ہدایت پر رکھے) تم نے مجھے دعا دی ہے، میں نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے۔ آپ بظاہر دیکھیں تو ایک چھوٹا سا عمل ہے، یعنی ایک آدمی کو چھینک آ گئی اور اس نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہہ دیا اور جواب میں "يَرْحَمُكَ اللهُ" کہنا بھی سنت ہے کہ اگر وہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" نہ کہے تم اسے "يَرْحَمُكَ اللهُ" نہ کہو، کیونکہ جب اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا تو لہٰذا تیری دعا کا وہ مستحق نہیں ہے۔

تو امام ابی داؤد رحمۃ اللہ علیہ کنارے پر کھڑے تھے تو ایک آدمی کو بڑے زور سے چھینک آتی ہے، اس کے بعد زور سے کہا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" تو امام صاحب نے تو سن لیا۔ اب امام صاحب نے سوچا کہ میں اس کو جواب دوں، "يَرْحَمُكَ اللهُ" کہوں تو وہ تو خدا جانے میرا جواب سنے گا یا نہیں سنے گا، تو سنت تو پوری نہیں ہوگی۔ انہوں نے ایک کشتی والے سے کہا کہ اگر تم مجھے اس جہاز تک لے جاؤ تو کتنے پیسے لوگے؟ اس نے کہا: میں تین درہم لوں گا۔ آپ کشتی میں بیٹھے

اور کشتی کو جہاز کے قریب لے گئے۔ جہاز پر سوار ہوئے اور اس آدمی کو جا کر ملے اور کہا ''یَرْحَمُكَ اللهُ''۔ لہٰذا حضور ﷺ کی سنت پوری فرمالی۔ ایک معمولی سی بات ہے تو اس نے بھی دعا کردی ''یَهْدِيْنَا وَ يَهْدِيْكُمُ اللهُ''۔ فرماتے ہیں کہ اس رات سوئے تو خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کہہ رہا ہے کہ اے ابوداؤد! تم نے تین درہم میں جنت خریدلی۔

حالانکہ آپ دیکھیں کہ کتنا بڑا محدث ہے، اس کے کتنے بڑے کام ہیں، کتنی بڑی خدمات ہیں، لیکن اللہ راضی ہوا تو حضور ﷺ کی ایک چھوٹی سی سنت پر راضی ہوگیا کہ تم نے میرے نبی ﷺ کی سنت کی اتباع کی ہے کہ تین درہم خرچ کیے، وقت خرچ کیا پھر فوراً پہنچے کہ یہ میرا مستحب عمل رہ نہ جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے انہیں خواب میں جنت کی بشارت سنوادی۔

صرف موافقِ سنت عمل قبول ہے:

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ عمل بڑا ہو یا عمل چھوٹا ہو، اگر وہ سنتِ رسول ﷺ کے مطابق ہے، حبیب پاک ﷺ کے طریقے کے مطابق ہے، مدنی سرکار ﷺ کے قول، فعل، عمل اور تقریر کے مطابق ہے تو وہ عمل اللہ کے ہاں مقبول ہوتا ہے اور اس پر بہت بڑا اجر و ثواب ملتا ہے۔ اور اگر عمل کتنا بڑا کیوں نہ ہو، لیکن سنتِ رسول ﷺ کے مطابق نہیں ہے تو وہ ایک ڈھیلے کے برابر نہیں ہوتا، نہ وہ آسمانوں کی طرف جاتا ہے، کیونکہ قاعدہ الٰہی ہے:

﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ﴾[فاطر:١٠]

اللہ کی طرف ان اعمال کو اٹھایا جاتا ہے جو اعمال صالحہ ہیں اور یہ کلمات اللہ کو محبوب ہیں، حالانکہ معمولی سی بات ہوتی ہے، لیکن اس کا اجر اتنا بڑا ہوتا ہے۔ وجہ کیا ہوتی ہے کہ وہ سنتِ رسول ﷺ کے مطابق ہوتا ہے۔

مسواک کے فائدے:

اب دیکھیں! مسواک کرنا معمولی سی بات ہے اور مسواک کرنے میں انسان کے اپنے کتنے فائدے ہیں کہ اس کا منہ صاف ہو رہا ہے، اس کے دانت صاف ہو رہے ہیں اور پھر جب غذا کھائے تو غذا صاف معدے کے اندر جائے گی، بیماریوں سے محفوظ رہے گا، کسی سے بات کرے گا تو منہ سے گندی ہوا نہیں آئے گی، ورنہ لوگ اسے اچھا نہیں

سمجھیں گے، لوگ اس سے نفرت کریں گے۔ اپنے ذاتی فائدے کے علاوہ یہ سنتِ رسول پاک ﷺ ہے۔
حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَلسِّوَاكُ مِطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ.)) [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۲۸۹، باب: السِّوَاكِ]

''مسواک کرنا یہ اپنے منہ کو صاف کرنے والا ہے اور رب کو راضی کرنے والا ہے۔''

محدثین نے لکھا ہے کہ اس مسواک والی سنت پر جو عمل کرتے ہیں ان کو ستر فائدے ملتے ہیں، ستر قسم کا ثواب ملتا ہے اور مسواک کرنے والے کو سب سے چھوٹا فائدہ یہ ملتا ہے کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے۔ یعنی آپ اندازہ کریں کہ مسواک کرنا کون سا مشکل عمل ہے۔ آدمی وضو سے پہلے مسواک کر لے۔ بعض حضرات تو نماز سے پہلے مسواک کرتے ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ہے ''مِسْوَاكٌ عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ'' تو انہوں نے اس حدیث مبارک سے لے لیا کہ ہر نماز سے پہلے بھی مسواک ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ معنیٰ مراد لیا کہ نماز سے مراد یہ ہے کہ جب نماز کی تیاری کرے، یعنی جب نماز کا وضو کرے، جب نماز کے لیے چلنا چاہے تو اس سے پہلے مسواک کرے۔ خیر! یہ تو ایک علمی بحث اور ایک علمی تحقیق ہے۔ اصل بات جو کرنی ہے وہ یہ ہے کہ مسواک ایک معمولی کام ہے، حتیٰ کہ اگر مسواک کی لکڑی نہیں ہے، کسی نے برش بھی کر لیا تو مسواک کے قائم مقام ہے۔ اور اگر کسی کے پاس برش بھی نہیں تھا، لکڑی بھی نہیں تھی، حدیث میں آتا ہے کہ انگلی پھیر لے، تاکہ اس کو مسواک کا ثواب مل جائے، سنت رسول پاک ﷺ ادا ہو جائے۔ تو ایک سنت پر عمل کرنے کا کتنا بڑا نتیجہ نکلا کہ خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ اور اس سے بڑی کوئی نیکی ہے......؟ انسان ساری محنت تو اسی لیے کر رہا ہے۔ حج اور عمرہ کیوں کر رہا ہے؟ مکہ اور مدینہ کیوں آیا کہ اللہ راضی ہو جائے اور خاتمہ اچھا ہو جائے، ہماری آخرت کا راستہ آسان ہو جائے اور ہماری اگلی منزل آسان ہو جائے۔ تو اب ایک سنت پر عمل کرنے کے لیے اتنا بڑا اللہ نے اجر عطا فرما دیا۔

اعمال میں اخلاص:

تمام اعمال کے اندر سب سے پہلی شرط یہ ہے ''أَنْ يَكُوْنَ خَالِصًا'' کہ وہ عمل بالکل اللہ کے لیے ہو اور کسی کے لیے نہ ہو، جیسا کہ حضور ﷺ جب بھی کوئی عمل کرتے تو فرماتے:

﴿إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا﴾ [الانعام: ۷۹]

اور میرے مدنی! اعلان فرما دو:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝﴾ [الانعام: ۱۶۳]

میری نمازیں اور میری عبادت بدنی اور میری عبادت مالی، میری قربانیاں، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے۔ اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ کہ اس کا کوئی شریک نہیں اور میں عمل خالص اللہ کے لیے کروں۔

اگر خالص نہیں ہوگا تو وہ عمل بھی مردود ہوگا۔ حدیث پاک میں آتا ہے: جس نے کسی عمل کے اندر کسی غیر کو شریک کرلیا، کسی غیر کی شرکت کا اشارہ کردیا، اللہ فرماتے ہیں "أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ" میرے بندے! مجھے کسی شریک کی ضرورت نہیں ہے اور مجھے نہ تیرے عمل کی ضرورت ہے، لے جاؤ اپنے عمل کو اور اسی شریک کو جا کر دے دو اور اس سے بدلہ لے لو۔

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۴۲۰۲، بَابُ: الرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ]

عمل سنت کے مطابق ہو:

اور عمل میں دوسری شرط یہ ہے "أَنْ يَكُونَ صَوَابًا" کہ عمل سنت رسول کے موافق ہو۔ دیکھو! قرآن عربی میں ہے اور قرآن عرب میں اترا ہے، مکہ میں نازل ہوا ہے۔ مکہ میں رہنے والے لوگ عرب تھے، عربی زبان جاننے والے تھے، لیکن اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے کتاب نازل کردی ہے، بس پڑھو اور عمل کرلو۔ بلکہ اللہ نے قرآن بھی بھیجا اور قرآن نازل کرنے سے پہلے کہ قرآن میرا ہے، لیکن پڑھ کر اس پر عمل کر کے نمونہ دکھانا وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا کام ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ عرس نہ کرو، چالیسواں نہ کرو، تین دن کے بعد قل خوانی نہ کرو، سات جمعراتیں نہ کرو، بھلا مولویوں کو کیا تکلیف ہے......؟ اُلٹا ان کو روٹی ملتی ہے، وہ کیوں منع کریں؟ منع کرنے کی وجہ کیا ہے؟ تیرا خرچ بھی ہو رہا ہے اور سنت کے مطابق نہیں ہے تو ڈھیلے کا ثواب بھی نہیں ہے، اس لیے کہ جب تک وہ عمل سنت کے مطابق نہیں ہوگا اس وقت تک اس کا ثواب نہیں ہوگا، اس کا فائدہ نہیں ہوگا اور اس کا نفع نہیں ہوگا۔ اب آپ اللہ کے گھر کا طواف کر رہے ہیں، اس کے سات چکر ہوتے ہیں اور حجرِ اسود سے شروع کرتے ہیں۔ اگر حجر اسود کے بجائے ہم رکنِ یمانی سے شروع کریں تو کیا طواف ہو جائے گا؟ بالکل نہیں، حالانکہ چکر تو بڑھ گیا ہے، چکر تو ہمارا زیادہ ہوگیا، حجرِ اسود چار قدم اور زیادہ ہے، لیکن چونکہ ہم نے اس جگہ سے شروع نہیں کیا جہاں سے محمد رسول

اللہ ﷺ نے شروع کیا تھا۔ فرمایا کہ یہ طواف قبول نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی حجرِ اسود کے اس کونے کی بجائے ایک قدم آگے نکل کر نیت کر لے، طواف بھی نہیں ہوگا۔ اللہ کے دروازے سے چکر کی نیت کرے اور دروازے پر آ کر چکر پورا کرے تب بھی طواف نہیں ہوگا۔ اگر طواف بغیر وضو کے کرے گا تب بھی طواف نہیں ہوگا، ناپاکی کی حالت میں کرے گا تب بھی طواف نہیں ہوگا۔ طواف اسی وقت ہوگا جب عین اس وقت کرے گا اور عین اس طریقہ پر کرے جس طرح حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ اب اگر آج کوئی آدمی یہ کہے کہ مجھے اپنے بزرگ نے کہا تھا کہ تم سات کے بجائے آٹھ چکر لگایا کرو تو طواف قبول نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ سنت رسول اللہ ﷺ کے مخالف ہوگیا ہے۔

اسی طرح اذان ہے، اسی طرح نماز ہے، اسی طرح عقیقہ ہے، اسی طرح صدقۂ فطر ہے اور اسی طرح قربانی ہے۔

ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں آیا...... حضور ﷺ کا صحابی ہے، غلام ہے...... اس نے کہا: یا رسول اللہ! آج عید کا دن ہے (قربانی کی عید کا دن تھا)۔ چونکہ عید کے دن لوگوں کو اور گھر والوں کو تمنا ہوتی ہے کہ گوشت آئے گا، بکرے کٹیں گے اور ہم گھر میں گوشت پکائیں گے۔ میں نے جلدی سے اپنا بکرا ذبح کر لیا، تاکہ میں اپنے گھر والوں کو جلدی سے گوشت دے سکوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: وہ گوشت ہے تمہارے گھر والوں کے کھانے کے لیے، لیکن قربانی نہیں ہوگی۔ اس نے کہا: حضور ﷺ قربانی ہے اور آج عید ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تک عید کی نماز نہ ہو جائے اس سے پہلے قربانی کا جانور ذبح نہیں کرنا۔ حالانکہ دن وہی ہے، قربانی کا دن ہے، لیکن چونکہ قربانی کا وقت شروع نہیں ہوا، حضور ﷺ نے فرمایا: وہ تمہارا گوشت ہے، لیکن قربانی تمہاری ادا نہیں ہوگی جب تک کہ عید کے بعد دوبارہ جانور ذبح نہ کرو۔ اس نے کہا: حضور! میرے پاس ایک دنبہ کا بچہ ہے، وہ چھ ماہ کا ہے، ایک سال کا نہیں ہے، لیکن بڑا ہے، موٹا تازہ ہے۔ اگر اس کو بیچوں تو اس کی قیمت بڑے دنبہ سے بھی زیادہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: چلو تم اس کو ذبح کر لو، لیکن آئندہ ایسا نہ کرنا۔ تم جا کر ذبح کر لو، وہ قیمتی چیز ہے۔ اللہ تمہاری قربانی قبول فرمائے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۵۵۶۱ باب: مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ أَعَادَ]

اب دیکھیں کہ فرق صرف اتنا ہو گیا کہ اس نے نماز سے پہلے ذبح کر لیا تو قربانی نہیں ہوئی۔ اگر رمضان کی عید ہے، ایک آدمی عید پڑھنے کے بعد صدقۂ فطر ادا کرے تو وہ سنت طریقہ پر ادا نہیں ہوگا، کیونکہ صدقۂ فطر ادا کرنے کا وقت نمازِ عید سے پہلے ہے کہ نمازِ عید پڑھنے کے لیے جائے تو راستے میں صدقۂ فطر کر دے، تاکہ غریب مسکین فائدہ

اٹھائیں۔کم از کم عید سے ایک دن پہلے کر دے۔اگر اس نے عید کی نماز پڑھ لی، اب یاد آیا کہ میں نے صدقۂ فطر ادا نہیں کیا تو اب حکم ہے کہ عید کی نماز کے بعد صدقۂ فطر کرے، مگر وہ ثواب نہیں ملے گا جو عید کی نماز سے پہلے ادا کرنے سے ملتا تھا۔اسی طرح آپ سارا سال مکہ میں بیٹھے رہیں، مگر آپ نو تاریخ کو عرفات میں نہ پہنچیں تو حج نہیں ہوگا۔

لہٰذا ہر عمل میں ایک قاعدہ یاد رکھ لیں تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے کہ ہر عمل اللہ کے لیے ہو اور خالص اللہ کے لیے ہو۔ ہمارے ہاں رواج ہے نذر و نیاز برائے حسین، پنجتن کی نیاز اور یہ نذر فلاں بزرگ کے نام کی۔ بھائی! جب تم ذبح اللہ کے لیے کر رہے ہو تو تم نیت کرو کہ اے اللہ! اس کا ثواب فلاں کو عطا فرما۔اب اگر تم نے نیت میں نام ہی دوسرے کا لگا دیا ہے تو قبول نہیں ہوگا۔اگر اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوا تو ثواب ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اپنے ہر عمل کو خالص اللہ کے لیے اور سنتِ رسول ﷺ کے مطابق ادا کرے۔اگر ایک آدمی سارا دن روزہ رکھے اور بھوکا رہے، لیکن سورج غروب ہونے سے دو منٹ پہلے پانی پی لے تو اس کا روزہ ختم ہے۔ایک آدمی بڑی محنت سے اہتمام کرے، لیکن جب طلوع فجر صادق ہوا اس نے پانی پی لیا تو اس کا روزہ نہیں ہوگا، کیونکہ اس نے اس وقت کا اہتمام نہیں کیا۔اب حضور پاک ﷺ نے ہمیں سمجھا دیا کہ اگر تیرے گھر میں بچہ پیدا ہو تو ساتویں دن اس کا عقیقہ کرو، اگر ساتویں دن نہ کر سکو تو پھر چودھویں دن کرو اور اگر چودھویں دن بھی نہ کر سکو تو پھر اکیسویں دن کرو۔اور اگر لڑکا ہے تو وہ دو بکرے یا دو دنبے، جو تمہیں اللہ نصیب کر دے اور اگر لڑکی ہے تو ایک بکرا یا ایک دنبہ ذبح کرو۔اسی طرح حکم دیا ہے کہ ساتویں دن عقیقہ بھی کرے اور بچے کے سر پر جو بال ہیں وہ اتاریں اور ان بالوں کا وزن کر لیں اور اتنی چاندی اللہ کے راستے میں خیرات کر دیں۔یہ مسنون عمل ہے۔اور یہ سارے اعمال ہمیں مدنی پاک ﷺ نے بتلائے ہیں، بلکہ آپ نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لیے باقاعدہ دنبے منگوا کر ذبح کروائے اور بی بی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو بھی حکم دیا کہ آپ بھی ساتھ کھڑی ہو جائیں، کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس اتنی مالی استطاعت نہیں تھی، وگرنہ عقیقہ کا حکم والد کے لیے ہے۔ بلکہ بعض احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ جن والدین نے اپنے بچوں کا عقیقہ نہیں کیا وہ بچے قیامت میں اپنے ماں باپ کی شفاعت بھی نہیں کریں گے۔اب ایک چیز میرے پاک نبی ﷺ نے ہمیں سمجھا دی ہے تو اگر مثال کے طور پر: یہ قل خوانیاں ہوتیں تو وہ بھی ہمیں حضور ﷺ سمجھا دیتے۔جس نبی علیہ السلام نے پیدا ہونے پر عقیقہ سمجھا دیا ہے، مرنے کے بعد یہ نہ سمجھا دیتے؟ ان کے آگے کون سی ایسی بات تھی جو حضور ﷺ چھوڑ دیتے......؟

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! ہر باطل فرقہ جو بھی کوئی کام کر رہا ہے، وہ یہ نہیں کہتے کہ ہم غلط کر رہے ہیں۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ زانی زنا سے توبہ کر سکتا ہے، شرابی شراب سے توبہ کر سکتا ہے، چور چوری سے توبہ کر سکتا ہے، ڈاکو ڈاکے سے توبہ کر سکتا ہے اور بدکردار بدکرداری سے توبہ کر سکتا ہے، لیکن بدعت میں پڑنے والوں کی توبہ کی امید بھی نہیں ہوتی۔ انہوں نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کرنے والا چور ہی چوری کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ ہے تو برا کام، لیکن معصیت میں پڑے ہوئے ہیں، بس دعا کریں اللہ ہدایت دے اور اللہ میری بری عادت چھڑوا دے۔ زانی زنا کو اچھا نہیں سمجھتا، شرابی جتنا بھی نشہ میں ہو جب نشہ اترے گا تو کہے گا کہ بس معصیت ہے، عذاب ہے۔ وہ ان گناہوں کو برا سمجھ رہا ہے تو کبھی نہ کبھی توبہ کی توفیق ہو جائے گی، لیکن بدعت کرنے والا تو بدعت کو نیکی سمجھ رہا ہے، وہ اس سے توبہ کیوں کرے گا؟ وہ تو سمجھ رہا ہے کہ میں اچھا کام کر رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ میں امام حسین (رضی اللہ عنہ) کا تعزیہ نکال رہا ہوں، میں امام حسین (رضی اللہ عنہ) کو راضی کر رہا ہوں، تو وہ کیسے توبہ کرے گا؟ ایک آدمی قبر پر پھولوں کی چادریں چڑھا رہا ہے، وہ کہے گا کہ میں تو اللہ والوں کی عزت کر رہا ہوں، تو وہ توبہ کیسے کرے گا؟ ایک آدمی قبر پر جا کر سجدہ کر رہا ہے، وہ کیسے توبہ کرے گا؟ وہ تو اس کام کو سمجھتا ہی اچھا ہے۔ جب کوئی کسی کام کو اچھا سمجھے تو وہ اس سے توبہ کیسے کرتا ہے؟

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ بدعت والے جو لوگ ہیں "لَا يُرْجٰى مِنْهُمُ التَّوْبَةُ" ان سے توبہ کی امید نہیں ہوتی، مگر وہ آدمی جس کو اللہ ہدایت کر دے، اس کے سینے کو کھول دے اور اس کے دل و دماغ میں سنت کی روشنی آجائے تو وہ توبہ کر لیتا ہے، ورنہ وہ بے چارہ تو اس عمل کو اچھا سمجھ رہا ہے، اس عمل کو وہ خیر سمجھ رہا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے فرمایا کہ جب ان کو کہا جاتا ہے ﴿لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ﴾ (تم زمین میں فساد مت پھیلاؤ) تو وہ کہتے ہیں ﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪﴾ [البقرۃ:۱۱] (ہم تو اچھا کام کر رہے ہیں) ہم تو لوگوں کو ملا رہے ہیں۔

کافر کافروں کے دوست ہیں:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی فساد ہے کہ مسلمان کافروں کو اپنا سمجھیں، جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ⑲﴾ [الجاثیۃ:۱۹]

کافر آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو زمین میں فساد اور فتنہ برپا ہو جائے گا،

کیونکہ کافر کافروں کا دوست ہوتا ہے، مومنوں کا دوست نہیں ہوسکتا۔ ایمان والوں کو چاہیے کہ کبھی کافروں کو دوست نہ بنائیں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو زمین میں فساد پیدا ہو جائے گا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ ۭ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَهَاۗءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ⑬ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّھُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑮

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جس طرح سب لوگ ایمان لائے۔ کہتے ہیں: کیا ہم ایمان لائیں جس طرح سے بے وقوف ایمان لائے؟ جان لو! وہی بے وقوف ہیں، لیکن نہیں جانتے۔ اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو ان سے مذاق کرتے ہیں۔ اللہ ان کو مذاق کی سزا دے گا اور ان کو ان کی سرکشی میں مہلت دے گا جس میں وہ سرگرداں رہیں گے۔

انبیاء علیہم السلام کی میراث علم ہے، جائیداد نہیں:

ایک بنیادی بات یاد رکھیں! ہر آدمی کی میراث دولت، دینار، درہم، باغ اور جائیداد ہے اور اللہ کے نبیوں کی میراث دولتِ دنیا نہیں ہوتی۔ اللہ کے نبیوں کا فیصلہ ہے۔ میرے پاک نبی ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّا مَعْشَرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُوْرِثُ، مَاتَرَكْنَاهُ فَهُوَ صَدَقَةٌ.)) [السنن الکبریٰ، حدیث:٦٣٠٩]

''جتنے ہم اللہ کے نبی گزرے ہیں ہمارا کوئی مال میراث نہیں ہوتی، بلکہ ہم جو چھوڑ دیں وہ خیرات صدقہ کر دیا جاتا ہے (ہماری میراث ہمارا علم ہے)۔''

اس لیے حدیث شریف کے اندر آیا ہے:

((اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ)) [سنن الترمذی، حدیث:٢٦٨٢، باب: ما جاء في فضل الفقه على العبادة]

''علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔''

اب اس وارث ہونے کا معنی یہ نہیں ہے کہ وہ انبیاء کی جائیداد تقسیم کرتے ہیں، جیسے بعض فرقے والے کہتے ہیں کہ نبی کی میراث تھی اور بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نہ ملی، ...... نعوذ باللہ...... صحابہ نے چھین لی، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چھین لی۔ پہلے تو میراث ثابت کرو، چھینا تو بعد میں جائے گا، پہلے یہ ثابت کریں۔ اگر میں کہوں کہ میری عینک ہے۔ پہلے عینک تو ہو پھر میں دعویٰ کروں کہ کسی نے میری عینک چھین لی ہے۔ اگر عینک ہی ثابت نہ ہو تو چھیننے کے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن میں جو ان کے مقصد کے لفظ آل جاتے ہیں ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ﴾ دیکھو! حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث بنے۔ دیکھو جی! ورثہ ثابت ہو گیا۔ خدا کے بندے! اگر ورثہ ثابت ہو گیا تو داؤد علیہ السلام کے ۱۹ بیٹے تھے، صرف سلیمان علیہ السلام کا ورثہ کیسے ثابت ہو گیا؟ حضرت! یہ تو اُلٹا ہماری دلیل ہے کہ ۱۸ بیٹوں کا قرآن نے ذکر نہیں کیا، صرف سلیمان علیہ السلام کا ذکر کیا ہے، کیونکہ تمام بیٹوں میں سے جو نبوت کی وراثت تھی، علم کی جو وراثت تھی وہ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملی اور کسی بیٹے کو نہیں ملی۔ اس لیے قرآن نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کا وارث سلیمان علیہ السلام ہے، کیونکہ جیسے داؤد علیہ السلام نبی تھے، سلیمان علیہ السلام نبی تھے۔ جیسے داؤد علیہ السلام کو اللہ نے علم عطا فرمایا تھا جانوروں کی زبانیں سمجھنے کا، لوہے کو ہاتھوں پر نرم فرما دیا، پرندوں کی بولی جان لینے کا، پہاڑوں کی تسبیحات کو سمجھ لینے کا، وہی علم اللہ نے سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ اس لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا:

﴿وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝﴾ [النمل:١٦]

خدا کا ہم پر کتنا بڑا احسان ہے کہ میں بھی اور میرے باپ کو بھی اللہ نے پرندوں کی زبانیں سکھا دیں کہ پرندہ جب بولتا ہے تو ہم سمجھ لیتے ہیں، پرندہ جب بات کرتا ہے تو ہم اس کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور جو وہ کہہ رہا ہوتا ہے ہم سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

[الجامع لاحکام القرآن: ۱۳/ ۱۶۴]

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ہد ہد کا واقعہ:

واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت سلیمان علیہ السلام گزر رہے تھے۔ ہد ہد ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھا ہوا جھوم رہا تھا اور نیچے ایک بچے نے پھنسانے کے لیے جال لگایا ہوا تھا کہ وہاں سے اڑے گا اور میں رسی کھینچوں گا اور اس کو پھنسا لوں گا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام وہاں سے گزرے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ تم تو بڑے چہچہا رہے ہو اور

نیچے تمہارے لیے جال لگا ہوا ہے؟ اس نے کہا: سلیمان! میں جانتا ہوں، مجھے پتہ ہے کہ جال لگا ہوا ہے، میں تو ویسے ہنس رہا ہوں کہ بچہ ہے، وہ مجھے نہیں پکڑ سکتا، میں جانتا ہوں کہ اس نے جال لگایا ہوا ہے۔ اب ہدہد اور حضرت سلیمان علیہ السلام باتیں کر رہے ہیں اور کوئی نہیں سمجھ رہا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے کام کے لیے چلے گئے۔ جب واپس تشریف لائے تو بچے نے ہدہد کو جال میں پکڑا ہوا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ہدہد! کیا ہو گیا کہ تم تو زمین کے نیچے پانی دیکھ کر بتلا دیتے ہو کہ پانی دور ہے یا قریب ہے؟ میٹھا ہے یا کڑوا ہے؟ مٹی کے نیچے تمہیں پانی نظر آ گیا، لیکن جال نظر نہیں آیا، میں نے تجھے خبردار بھی کیا تھا۔ اس نے کہا: اے سلیمان! "إِذَا نَزَلَ الْقَضَاءُ عَمِيَ الْبَصَرُ" (جب اللہ کی تقدیر آ جاتی ہے تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں) آنکھیں کام ہی نہیں کرتی ہیں تو میں کیا کرتا اللہ کی تقدیر غالب آ گئی اور اس نے مجھے پکڑ لیا۔ [الجامع لأحكام القرآن: ۱۶۵/۱۳]

جب قضا و قدر کا معاملہ ہوتا ہے تو کوئی چیز کام نہیں کرتی۔ آپ نے دیکھا ہے کہ گاڑیوں کے ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں۔ اللہ تمام مسلمانوں کو بچائے...... ڈرائیور بے چارے سے پوچھا تو اس نے کہا: خدا جانتا ہے، مجھے تو کچھ نظر ہی نہیں آیا، میں تو گاڑی بالکل ٹھیک چلا رہا تھا، روڈ پر جا رہا تھا، میرے سامنے سڑک بھی خالی تھی، آگے سے گاڑی آئی، مجھے تو نظر ہی نہیں آئی، مجھے تو اس وقت پتہ چلا جب گاڑیاں ٹکرا گئیں۔ کیونکہ جب تقدیر کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو سب تدبیریں وہاں الٹ ہو جاتی ہیں۔ تو نبیوں کی میراث علم ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی میراث نہیں ہوتی:

یہ ہمیشہ یاد رکھو! دولت اور دنیا میراث نہیں ہوتی اور یہ بھی اللہ کے نبیوں کی شان ہے۔ نبیوں کی میراث نہ ہونا یہ نبیوں کی شان ہے۔ اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امت پر احسان ہے۔ یہ مسئلہ یاد رکھ لیں! وجہ یہ ہے کہ اگر دولت انبیاء علیہم السلام کی میراث ہوتی، مثلاً: ایک آدمی بڑا دولت مند ہے، کروڑوں پتی ہے، لیکن اپنی اولاد پر خرچ نہیں کرتا، اولاد دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ خدا کرے مرے! سانپ بن کر بیٹھا ہوا۔ رشتہ دار دعائیں مانگتے ہیں کہ خدا کرے! جلدی مرے، مرتا ہی نہیں ہے کہ مرے اور جائیداد تقسیم ہو اور ہمیں ملے۔ اب اگر کوئی کسی نبی کے متعلق یہ کہہ دیتا کہ مرے اور ہمیں جائیداد ملے تو وہ ایمان ہی سے خارج ہو جاتا اور برباد ہو جاتا ہے۔ اس لیے اللہ نے انبیاء علیہم السلام کی امتوں پر احسان فرمایا کہ نبی کی جائیداد ہی نہیں رکھی، تا کہ امتی کے دل میں یہ خیال ہی پیدا نہ ہو سکے، کسی کے

دل میں گھٹیا خیال ہی نہ آسکے۔ اگر کہیں خیال آگیا تو بندہ برباد ہوگیا۔ نبی علیہ السلام کے بارے میں جو توہین کرے وہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہوگیا۔ اس لیے خدا نے اپنے نبیوں کو میراث دی ہی نہیں۔ فیصلہ کر دیا:

((إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا)) [الترمذی، رقم: ۲۶۸۲، باب: ما جاء في فضل الفقه ...]

((مَا تَرَكْنَاهُ فَهُوَ صَدَقَةٌ.)) [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۲۶۲۶۰]

ہم نے کوئی دینار و درہم وراثت میں نہیں چھوڑا۔ اگر ہم نے کوئی چھوڑا بھی ہے تو اللہ کے راستے میں تقسیم کر دو، تا کہ جھگڑے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو۔ لہٰذا اب نبی کی میراث علم بنا، اس لیے انبیاء علیہم السلام کے وارث علماء بنے۔ اس لیے سند چلتی ہے کہ عالم سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ نے یہ حدیث مبارک کس سے پڑھی ہے؟ اس نے کہا: میں نے اپنے والد سے پڑھی، انہوں نے حضرت شیخ خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ سے پڑھا تھا، انہوں نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ سے پڑھا تھا، انہوں نے فلاں بزرگ سے پڑھا تھا اور یہ سلسلہ چلتے چلتے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہے۔ اس کو عربی میں سند کہتے ہیں۔ تو قرآن اللہ نے اتارا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ہے۔

ایمان وہی قبول ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان کی طرح ہو:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل پوری کائنات کے لیے نمونہ ہے۔ اب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے امت کو دکھانے کے لیے اور دعوت دینے کے لیے کچھ نمونے بنائے ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہر صناع اور ماہر فن اپنے فن کا شاہکار پیش کرتا ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرکز علم میں جو عالم بنے ہیں وہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ﴿اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ (البقرۃ: ۱۳) لوگو! میرے ایمان کے ماڈل میرے صحابہ ہیں۔ ایمان لانا ہے تو پھر صحابہ کی طرح لے آؤ، ورنہ کوئی ایمان قبول نہیں ہے۔ ایمان لے آنا ہے تو ﴿اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ (البقرۃ: ۱۳) صحابہ کی طرح ایمان لے آؤ۔ ایک روایت کے اندر نام آئے کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور عثمان و علی رضی اللہ عنہما کی طرح ایمان لے آؤ۔ (الدر المنثور للسیوطی: ۱/ ۶۹) یہ ایمان کے نمونے ہیں۔ اگر ان کی طرح ایمان نہ لے آؤ، لاکھ کلمہ پڑھتے رہو، لاکھ تم اسلام کے دعوے کرتے رہو، تم منافق کہلاؤ گے، مومن نہیں کہلاؤ گے۔ اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں یہ بتلایا کہ میراث علم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے چلے گی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے پڑھا، جبرئیل علیہ السلام نے اللہ سے پڑھا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا۔ اور

حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جامع مانع کامل نبوت عطا کی ہے، جس پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اس لیے کئی مقامات پر نبی کریم ﷺ کی اطاعت کرنے اور آپ کے اسوۂ حسنہ کے اپنانے کا حکم دیا گیا ہے اور آپ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے مزید بات کو واضح فرما دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے جتنی امتیں گزری ہیں وہ بہتر فرقوں میں بٹ گئے۔ فرمایا کہ میری امت سب سے بڑی امت بھی ہے، لیکن آنے والے دور میں میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ اور فرمایا: "كُلُّهُمْ فِي النَّارِ" (تمام کے تمام فرقے جہنم میں ہوں گے) "إِلَّا مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِي" صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور اس فرقے کے لیے یہ کسوٹی ہے کہ وہ میرے راستے پر رہے اور جس پر میرے صحابہ ہیں۔ اب حضور ﷺ نے وضاحت فرما دی کہ میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ اور اس سے مراد بڑے بڑے فرقے ہیں، ورنہ دنیا میں سینکڑوں اور ہزاروں چھوٹے فرقے بن چکے ہیں۔ [سنن الترمذي، حديث: ٢٦٤١، باب: مَا جَاءَ فِي افْتِرَاقِ هَذِهِ الأُمَّةِ]

تہتر فرقے:

اس لیے میرے پاک نبی ﷺ کے فرمان کو یاد رکھیں کہ بعض معاندین اسلام اعتراض کرتے ہیں کہ دنیا میں تو ہزاروں فرقے ہیں اور حضور ﷺ نے تو فرمایا: تہتر فرقے ہوں گے۔ تو اصل معنی یہ ہوتا ہے کہ جیسے قریش ایک قبیلہ اور ایک قوم تھی اور اب آگے اس کی پھر کئی شاخیں تھیں۔ ایک شاخ ہے جو "بنو ہاشم" کہلاتی ہے، جس کے اندر ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے، حالانکہ قریش کی بڑی شاخیں ہیں، بڑے بڑے قبائل تھے، بنو وائل تھے، بنو کاب تھے، بنو ہاشم تھے، کئی شاخیں ہیں، لیکن ہر قوم قریش ہے۔ جیسے آج کل آپ کے ملکوں میں بھی کہ اوپر جا کر ایک ہی قوم ہیں، بلوچ ہیں، آگے جا کر ان کی سینکڑوں لڑیاں ہیں، منتہی ان کا وہی ایک بندہ ہے۔ اسی طرح دنیا کے اندر اور بڑی قومیں ہیں۔ ایک قوم ہوتی ہے، نیچے اس کی کئی لڑیاں پھیل جاتی ہیں۔ جتنے بڑے فرقے ہیں، جب ان کو ہم گنیں گے تو حضور ﷺ کے مطابق تہتر ہی ہوں گے، ہر فرقے کے نیچے چاہے سینکڑوں بن جائیں، کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان مبارک قیامت تک کے لیے سچا ہے، اس میں کسی قسم کی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی۔

تو اس طرح دوسری حدیث مبارک میں اور وضاحت آئی۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: میری امت میں سے صرف ایک فرقہ ناجیہ ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم حیران ہو گئے! اور انہوں نے سوال کیا:

((وَ مَنْ هِيَ؟ يَا رَسُوْلَ اللهِ!))

ایک فرقہ!! وہ کون لوگ ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي.)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۶۴۱، باب: مَا جَاءَ فِي افْتِرَاقِ هٰذِهِ...]

''جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم کی عزت وحرمت:

توجہ کریں کہ دشمنانِ دین، دشمنان اسلام نے، دشمنانِ قرآن نے اور دشمنانِ دین نبوی ﷺ نے سب سے زیادہ ہدف اور سب سے زیادہ جو تیر اندازی کی ہے وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے! بعض فرقے تو اتنے دشمن ہو گئے کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان کے بھی قائل نہیں ہیں، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ دشمن تو دشمن ہوتا ہے، مخالف تو مخالف ہوتا ہے، افسوس ان لوگوں پر ہے جنہوں نے دوست بن کر اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کا فرد کہلا کر صحابہ رضی اللہ عنہم کو معاف نہیں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر وہ آدمی مر گئے تو ان کے گناہ معاف فرمائے۔ اگر زندہ ہیں تو ان کو ہدایت عطا فرمائیں کہ ان لوگوں نے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو معاف نہ کیا، انہوں نے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم پر بحثیں لکھ دیں، حالانکہ وہ یہ بھول گئے۔ ایک مثال کی بات یاد رکھیں کہ ہمارے پاس مثلاً: ایک سونے کا ٹکڑا ہو اور میں وہ سنار کے پاس لے جاؤں کہ اس سونے کو ذرا چیک کرو کہ کھرا ہے یا کھوٹا ہے؟ وہ سنار سونے کو لے کر کسوٹی پر پرکھے گا تو اب فیصلہ کسوٹی کرے گی کہ سونا کھرا ہے یا کھوٹا ہے؟ یا سونا فیصلہ کرے گا کہ کسوٹی کھری ہے یا کھوٹی ہے؟ ہمیشہ اصول یاد رکھیں! اب سونا تو فیصلہ نہیں کرے گا، بلکہ سونے کو جس کسوٹی پر پرکھا جائے گا وہ فیصلہ کرے گی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان:

آیت میں ''النَّاسُ'' کا لفظ آیا اور سورۃ البقرۃ مدینہ منورہ میں اتری اور مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کا مقابلہ اہل کتاب سے تھا اور اہل کتاب یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم بڑے عالم ہیں اور ہمارے علماء اور احبار موجود ہیں اور ہم تورات وانجیل کے عامل اور عالم ہیں۔ تو پڑھے لکھے لوگوں کو دعوت دی کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ایمان تب قبول ہوگا جب تم ایمان لے آؤ جیسے لوگ ایمان لے آئے۔

اور جو لوگ سورۃ البقرۃ نازل ہونے کے وقت مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کے ساتھ تھے وہ کون تھے؟ کیا آپ اور ہم تھے؟ اسی لیے ایک روایت کے اندر آ گیا ''اٰمِنُوْا کَمَا اٰمَنَ النَّاسُ، اَیْ: اَبُوْبَکْرٍ وَ عُمَرُ وَ عُثْمَانُ وَ عَلِیٌّ'' [الدر المنثور للسیوطی: ۱/۶۹]

اسی طرح ایمان لے آؤ جس طرح ابو بکر، عمر، عثمان، علی اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم ایمان لے آئے ہیں۔ ہم تم ایمان کو ان کے ایمان کی کسوٹی پر پرکھیں گے۔ اگر ان جیسا ایمان ہے تو قبول ہے، ورنہ فضول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اتنا بڑا مرتبہ دیا۔

اور دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا﴾ [النساء: ۱۱۵]

''جو میرے رسول کے ساتھ جھگڑا کرے ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد اور ایمان والوں کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستہ پر چلے تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔''

تو اس وقت ایمان لانے والے کون تھے؟ اصحابِ رسول ﷺ تھے۔

اور اسی طرح ایک حدیث مبارک میں ہے: حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے صحابہ کی مثال ایسے ہے جیسے آسمان پر تارے، یعنی جس کو بھی پکڑ لو گے ہدایت پا جاؤ گے، جیسے آدمی روشنی دیکھ کر راستہ پا جاتا ہے۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۶۰۰۹، باب: مناقب الصحابۃ]

صحابہ رضی اللہ عنہم کی ضرورت:

خدا کی شان ہے کہ اگر اللہ قرآن نازل فرما دیتے تو ہمیں قرآن سمجھ نہ آتا، مثلاً: قرآن پاک کی آیت آئی، اس کے اندر روزے کے بارے میں ایک حکم آیا۔ اللہ نے حکم دیا: تم کھانا کھاؤ، پانی پیو اور اس وقت تک تم کو کھانے کی اور پینے کی اجازت ہے جب تک سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے علیحدہ نہ ہو جائے۔ ایک صحابی نے دو دھاگے خریدے: ایک سفید اور ایک سیاہ، اور اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔ اور سحری کے لیے جب بیدار ہوئے تو کھانا بھی کھاتے رہے اور پانی بھی پیتے رہے اور ان ڈوروں کو بھی غور کر کے دیکھتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ باہر فجر ہو گئی اور وہ کھا

رہے ہیں۔ اب جب باہر نکلے تو وہ حیران ہو گئے کہ نماز کا وقت ہو گیا تھا، صبح صادق کو نکلے ہوئے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور ﷺ سے مسئلہ پوچھا تو حضور ﷺ نے کہا کہ تم تو فجر کے بعد بھی کھاتے رہے ہو، تمہاری شکایت ہو گئی ہے۔ اس نے کہا: حضور ﷺ! میں نے تو بالکل قرآن پر عمل کیا ہے۔ اللہ نے فرمایا: جب سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے الگ ہو جائے۔ میں نے باقاعدہ دو ڈورے خرید کر تکیے کے نیچے رکھے اور باقاعدہ دیکھتا رہا، جب اس سیاہ اور سفید میں مجھے فرق نظر آنے لگے، وگرنہ تو پہلے دونوں سیاہ نظر آتے تھے، کیونکہ اندھیرا تھا تو آہستہ آہستہ سفید نظر آنے لگا تو میں نے کھانا بند کر دیا۔ حضور پاک ﷺ مسکرائے اور فرمایا: تمہارا تکیہ تو بڑا لمبا چوڑا ہے، اس کے نیچے سفید ڈورا بھی آ گیا اور کالا ڈورا بھی آ گیا۔ دونوں ڈورے تیرے تکیے کے نیچے آ گئے؟ اس نے کہا: حضور ﷺ! بالکل آ گئے، میں نے تکیے کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندے! سفید اور سیاہ ڈورے سے مراد دھاگہ نہیں، بلکہ اس سے اللہ نے سمجھایا ہے کہ ایک صبح کاذب ہوتی ہے اور ایک صبح صادق ہوتی ہے۔ پہلے ایک روشنی پھیلتی ہے، لیکن سیدھی چلی جاتی ہے، زمین پر پھیلتی نہیں۔ اس کے بعد جب صبح صادق ہوتی ہے تو وہ پھیلنا شروع کرتی ہے۔ تو ایک کو اللہ نے سیاہ ڈورے سے تشبیہ دی اور ایک کو اللہ نے سفید ڈورے سے تشبیہ دی۔ آگے "مِنَ" بیانیہ لگ گیا ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ اس کا تعلق فجر سے ہے۔ صبح صادق سے اور صبح کاذب سے ہے، تیرے دھاگے سے نہیں ہے۔ تو اگر حضور ﷺ مسئلہ نہ سمجھاتے تو صحابی عربی تھا، قرآن عربی تھا، قرآن مبارک کے لفظ عربی تھے، لیکن اس کو مسئلہ سمجھ نہیں آیا جب تک کہ اس کو میرے آقا ﷺ نے مسئلہ سمجھا نہیں دیا۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۴۵۰۹، باب قوله: وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمْ...]

جنت میں سب سے زیادہ حضور ﷺ کی امت ہو گی:

ایک دن حضور ﷺ نے فرمایا کہ سارے نبیوں کی امت ایک طرف ہو تو جنت میں چوتھا حصہ پوری مخلوق میں سے میری امت ہو گی۔ صحابہ ﷺ نے عرض کیا: صرف چوتھا حصہ؟ تو فرمایا: اچھا! اللہ سے دعا کرتا ہوں: أَنْ تَكُونَ نِصْفَ أَهْلِ الْجَنَّةِ" کہ تمام نبیوں کی امت کو اکٹھا کریں اور وہ آدھے ہوں گے اور آدھی جنت میں میری امت ہو گی۔ صحابہ اور بھی ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا! میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ دو تہائی جنت میں میری امت

ہوگی اور ایک تہائی میں ساری امتیں ہوں گی۔ تو سب سے زیادہ جنت میں امت محمد ﷺ کی ہوگی۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۳۳۴۸، باب: قصة يأجوج ومأجوج]

عجیب حکایت!

ایک بادشاہ کے ملک میں بڑے بڑے کاریگر لوگ رہتے تھے، روم کے تھے۔ ان رومیوں اور چینیوں میں جھگڑا ہوگیا۔ رومی کہیں کہ ہم زیادہ کاریگر ہیں اور چینی کہیں کہ ہم زیادہ کاریگر ہیں۔ ان کا جھگڑا چلتا چلتا بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے کہا: آپ کے ملک میں رہتے ہیں، ہم کاریگر ہیں، لیکن رومی جھگڑا کرتے ہیں کہ ہم زیادہ کاریگر ہیں اور چینی کہتے ہیں کہ ہم زیادہ کاریگر ہیں۔ بادشاہ نے کہا: اس کا بڑا آسان حل ہے۔ ہم ان کا امتحان کر لیتے ہیں۔ دونوں طرف کے کاریگروں کو بلاؤ۔ ان کو بلایا گیا تو اس نے کہا: دیکھو! یہ میرے محل کا ایک بڑا کمرہ ہے، اس کے درمیان میں ایک دیوار دے کر کمرے کو بند کردو: ایک حصہ میں تم رومی اپنا کمال دکھاؤ اور ایک حصہ میں چینی کاریگر کوئی چیز بنائیں اور اپنا کمال دکھائیں۔ تم دونوں جب اپنی چیزیں بنالو گے تو ہم درمیان سے دیوار نکال دیں گے، پھر آکر فیصلہ کریں گے کہ تمہارا کام اچھا ہے یا ان کا اچھا ہے؟ اور جس کا کام اچھا ہوگا اس کو ہم سرٹیفکیٹ دے دیں گے کہ وہ زیادہ قابل ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں منظور ہے۔

بادشاہ نے کمرے کو بند کرا دیا اور دروازے دونوں کے علیحدہ علیحدہ بنا دیے۔ اور پابندی لگادی کہ وہ ان کے کام کو نہ دیکھیں اور وہ ان کے کام کو نہ دیکھیں، اپنا اپنا کام کریں۔ اب چینیوں نے کمال کیا انہوں نے دیوار پر ایسے ایسے پھول بوٹے بنائے کہ دنیا کے نوادرات میں ایسا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے خوبصورت پھول بھی دیواروں پر بن سکتے ہیں۔ اور رومیوں نے کچھ نہیں بنایا، انہوں نے دیوار کو ایسا صاف کیا، میقل کیا اور اتنا چکا دیا کہ وہ بالکل شیشہ بن گئی کہ دیوار کے سامنے کھڑے ہوتے تو اپنی تصویر نظر آجاتی۔ انہوں نے کوئی پھول نہیں بنایا، کوئی پتی نہیں بنائی، کوئی رنگ نہیں لگایا، انہوں نے دیوار کی صفائی پر ایسے کام کیے۔ اور اس زمانے میں پتھروں کی دیواریں ہوتی تھیں۔ آپ نے جیسے حرم کے اندر پتھر لگے ہوئے دیکھے ہوں گے، اللہ تعالیٰ بنانے والوں کی خدمت کو قبول و منظور فرمائیں اور انہیں حرمین کی خدمت کی زیادہ توفیق عطا فرمائیں۔ کسی پتھر کے سامنے کھڑے ہوجائیں تو ایسے نظر آتا ہے جیسے شیشہ کے سامنے کھڑے ہوں۔ تو انہوں نے ایسی محنت کی کہ دیوار کو چکا دیا کہ اگر آدمی سامنے کھڑا ہو تو تصویر نظر آئے گی۔

ان دونوں نے جب کام ختم کر لیا تو بادشاہ کو اطلاع دی کہ جناب! ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔ بادشاہ نے کہا: ٹھیک ہے، فلاں دن ہم آئیں گے، اپنے وزیروں کو ساتھ لے کر ملاحظہ کریں گے۔ وقت مقررہ پر بادشاہ آ گیا۔ اس نے کہا: درمیان سے دیوار نکال دو۔ اب جب دیوار درمیان سے نکال دی تو انہوں نے جو اس دیوار پر کام کیا وہ سارے کا سارا اس دیوار پر بھی نظر آ رہا ہے۔ اب بادشاہ سامنے کھڑا ہوا حیران ہو رہا ہے کہ اب فیصلہ کیسے کریں؟ ادھر بھی وہی چیز بنی ہوئی ہے اور ادھر بھی وہی چیز بنی ہوئی ہے۔ جو پھول وہاں بنا ہوا ہے وہ اس دیوار پر بھی نظر آ رہا ہے، حالانکہ انہوں نے بنایا بھی کچھ نہیں ہے۔ دیکھنے کے بعد بادشاہ نے کہا کہ تم سب نے بڑا کمال کیا ہے، لیکن رومی تم سے نمبر لے گئے۔ انہوں نے کہا: وہ کیسے نمبر لے گئے؟ اس نے کہا: تمہارا بنا ہوا انہوں نے اپنی دیوار میں کھینچ لیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا کہنے کا طریقہ:

تو اصل بات دیوار کی صفائی کی تھی۔ جب تک ہمارے دل کی صفائی نہ ہو، صحابہ رضی اللہ عنہم ہمیں کیسے صاف نظر آئیں؟ اصل محنت ہم نے اپنے دل کے صاف کرنے پر کرنی تھی، ہم شروع ہو گئے صحابہ رضی اللہ عنہم کو صاف کرنے۔ ہم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی کوئی غلطی پکڑنی شروع کر دی۔ کسی نے جھگڑا شروع کر دیا، کبھی صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں بول پڑے وہ روایت کوئی ڈھونڈ کر لے آیا، کبھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بحیثیت ایک محبوبہ کے کوئی سخت بات کہہ دی کوئی وہ ڈھونڈ کر لے آیا، حالانکہ ہم نے ان کی باتیں نہیں ڈھونڈنی تھیں، بلکہ اپنے دل کو صاف کرنا تھا۔ جب ہمارا دل صیقل ہو جائے گا تو پھر ہمیں تصویر صاف نظر آئے گی، شان رسالت کی بھی، شان صحابہ کی بھی۔ اور اگر ہمارے دل میں کوئی داغ ہو گا تو وہ ہمارے دل میں ہو گا، جیسے شیشہ میں داغ ہوتا ہے تو دیکھنے والے کا اپنا چہرہ بگڑ جاتا ہے۔ شیشہ پر میل جما ہو تو دیکھنے والے کو چہرہ نظر نہیں آتا۔ اور شیشہ پر کوئی سیاہ نقطے لگا دے تو دیکھنے والے کو وہ نقطے نظر آتے ہیں۔ اصل میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا تو یہ مرتبہ ہے۔

ایک بات یاد رکھیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم معیارِ حق ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم معیارِ ایمان ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم مجسمۂ ایمان ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم نمونۂ ایمان ہیں۔ جب تک ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر نہیں چلیں گے نہ جنت ملے گی اور نہ آخرت میں کامیابی ملے گی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو پہلی گالی کس نے دی؟

دوسری بات یہ یاد رکھیں کہ سب سے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی دینے والے کون تھے؟ یہ بات اللہ کے قرآن سے سمجھیں اور یاد رکھیں کہ اس کے بعد آپ آنکھیں بند کر کے ایک عام بچے سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکے میں اسلام لائے ہیں، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مارنے والا اور ستانے والا امیہ کافر تھا۔ حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ایمان لائے، آپ نے جب آکر مسجد کعبہ میں خطبہ پڑھا تو ان کو مارنے والا ابوجہل اور اس کی کمپنی تھی اور اسی بی بی سمیہ رضی اللہ عنہا کو شہید کرنے والے کافر تھے۔ تو مکہ کے اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کے دشمن کافر تھے تو قرآن میں آتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جنہوں نے سب سے پہلے گالی دی ہے وہ یہودیوں نے دی ہے اور منافقین نے دی ہے۔ یہ قرآن کی بات ہے، کسی تاریخ کی بات نہیں اور نہ ہی عام کتاب کی بات ہے۔ اللہ کے قرآن سے پوچھیں:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ [البقرۃ: ۱۳]

منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا اور یہ یہودی تھا، باقی اس کی پارٹی تھی۔ جب ان منافقوں کو کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسا کہ صحابہ ایمان لائے ہیں تو ان منافقوں نے کہا: عجیب بات ہے کہ ہم ایمان لے آئیں جیسے یہ بے وقوف ایمان لے آئے ہیں۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو بے وقوفی کی پہلی گالی دینے والے یہودی اور منافق تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایمان پر پختگی کی مثال:

ایک صحابی مسلمان ہو گئے۔ ماں باپ کافر ہیں۔ ماں نے کہا: بیٹا! بات سنو! تم نبی کا دامن چھوڑ دو، نہیں تو میں کھانا بند کرتی ہوں، بھوک ہڑتال کر رہی ہوں۔ تم جب تک کفر کا کلمہ نہیں کہو گے میں مر جاؤں گی، لیکن کھانا نہیں کھاؤں گی۔ ایک دن گزر گیا، دو دن گزر گئے، تین دن گزر گئے، ماں کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ ایسا کرو! ماں کو خوش کرنے کے لیے اوپر سے کلمۂ کفر کہہ دو، تم اندر سے پکے مسلمان رہو۔ بیٹا آیا، اماں! بات سنو! تمہارا حکم میں کبھی نہیں ٹال سکتا۔ تم اگر حکم دو تو میں دریا میں کود سکتا ہوں، آگ میں کود سکتا ہوں اور میں شیروں سے لڑ سکتا ہوں، لیکن جہاں تک دین نبی کا تعلق ہے، میرے سامنے مر جاؤ، میں محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی نہیں کر سکتا۔

ابوجہل کی بہو کا ایمان:

بیوی کافر ہے، خاوند مسلمان ہو گیا۔ خاوند کافر ہے، بیوی مسلمان ہو گئی۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بھی اسلام نہیں لائے

تھے۔ ابوجہل کے بیٹے تھے، ان کی بیوی مسلمان ہوگئی۔ حضور ﷺ کے جوتے مبارک لے کر خاوند کو ڈھونڈنے کے لیے گئی، خاوند مل گیا۔ رات کا وقت تھا، کافی عرصہ سے میاں بیوی جدا تھے۔ خاوند بیوی کے قریب آنے لگا۔ اس نے کہا: عکرمہ! ٹھہرو! اب تیرا میرا کوئی رشتہ نہیں ہے، میں مسلمان ہوچکی ہوں اور تو کافر ہے۔ جب تک حضور ﷺ کا کلمہ نہیں پڑھے گا میں تیری بیوی نہیں ہوں، سابقہ رشتہ کی بنا پر میں تجھے ڈھونڈنے آئی ہوں، میں تمہیں اسلام کی دعوت دینے کے لیے آئی ہوں اور چونکہ تو حضور ﷺ کے سب سے بڑے دشمن کا بیٹا ہے تو حضور ﷺ سے تیرے لیے امان بھی لائی ہوں اور حضور ﷺ کی نشانیاں جوتے مبارک بھی میرے پاس ہیں۔ یہ نشانی ہے کہ تم ڈرو نہیں، امان مل جائے گی، لیکن مجھے ہاتھ مت لگاؤ، ابھی تم نے کلمہ نہیں پڑھا۔ تو اس مقام پر مسلمان پہنچ گئے تھے۔ [السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ۳/ ۲۸۳]

صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی دینے کا جواب سب سے پہلے اللہ نے دیا:

جب یہودیوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی دی تو سب سے پہلے گالی کا جواب اللہ نے دیا:

﴿اَلَآ اِنَّھُمۡ ھُمُ السُّفَھَآءُ﴾ [البقرۃ:]

اللہ نے اتنا مؤکد جواب دیا کہ خبردار! صحابہ کو بے وقوف کہنے والے اصل میں خود بے وقوف ہیں، ﴿وَلٰكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ﴾ یہ جاہل ہیں، یہ سمجھتے نہیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب یہ منافقین مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں دوستی اور اخلاص اور صفائی۔ وہ اس طرح سے مومنین کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں، دکھلاوا کر رہے ہیں، تاکہ مسلمانوں کو اگر عزت اور کامیابی حاصل ہو اور جنگ میں فتح ہو تو ہم بھی غنیمت کے مال میں شریک ہوجائیں، لیکن جب وہ اپنے سرداروں کے پاس جاتے ہیں..... تو "خَلَوۡا" کا معنی "اِنۡصَرَفُوۡا" کیا گیا ہے، کیونکہ یہ "اِلٰی" کے ساتھ متعدی ہے۔ اور بعض نے فرمایا: "اِلٰی" "مَعَ" کے معنی میں ہے۔ ﴿وَاِذَا خَلَوۡا اِلٰى شَيٰطِيۡنِهِمۡ ۙ﴾ (اور جب وہ علیحدہ ہوتے ہیں اپنے سرداروں کے ساتھ) اور پہلا معنی لیا جائے تو معنی ہوگا کہ جب جاتے ہیں اپنے سرداروں کے پاس تو یہی پہلا معنی زیادہ بہتر ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

﴿شَيٰطِيۡنِهِمۡ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: کفر کے بڑے بڑے سردار، یہودیوں کے بڑے بڑے پادری اور منافقوں کے سردار جب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس جاتے ہیں اور ان کے ساتھ وہی شیاطین بھی۔ شیطانوں سے مراد وہی یہود ہیں جو ان منافقوں کو کہتے تھے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرو۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب یہ اپنے ساتھیوں سے ملتے ہیں، یعنی منافقوں اور مشرکین سے۔

اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شیاطین سے مراد ان کے سردار ہیں۔ اور اسی کے مطابق ابو العالیہ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے تفسیر کی ہے۔

ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا: شیطان کا معنی سرکشی ہے، لہٰذا انسانوں میں سے جو سرکش ہیں وہ بھی شیطان اور جو جنوں میں سے سرکش ہیں وہ بھی شیاطین ہیں۔ جانوروں میں بھی جو سرکش ہو تو اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ کوئی حیوان نہیں، شیطان ہے۔ اور شیطان انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے کہ اے اللہ! ہمیں شیاطین انس وجن سے پناہ عطا فرما۔

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! انسانوں میں سے بھی شیطان ہوتے ہیں۔

[ابن کثیر: ۱/۵۱، الآیۃ: وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا]

علماء نے اور مفسرین نے لکھا ہے کہ احادیث میں آتا ہے کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا ہے تو شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۷۹، باب: فَضْلِ شَهْرِ رَمَضَانَ]

اور اسی طرح آتا ہے کہ جب اذان کی آواز ہو تو شیطان بھاگ جاتا ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۰۸، باب: فَضْلِ التَّأْذِينِ]

جس گھر میں اللہ کا قرآن پڑھا جاتا ہے، آیۃ الکرسی پڑھی جاتی ہے، سورۃ الملک پڑھی جاتی ہے اور دوسری سورتیں پڑھی جاتی ہیں تو شیطان بھاگ جاتا ہے۔ [سنن الدارمی، حدیث: ۳۴۱۸، باب: فِي فَضْلِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ]

شیطان رمضان میں انسان کو کیسے گمراہ کرتے ہیں؟

تو اب علماء فرماتے ہیں کہ اشکال یہ ہوتا ہے کہ شیطان تو رمضان کے مہینے میں باندھ دیے گئے یا شیطان تو بھاگ گیا، لیکن پھر آدمی گناہ کیوں کرتے ہیں؟ پھر غلطیاں کیوں کرتے ہیں؟ اور پھر آدمی برائیوں میں مبتلا کیوں

ہوتے ہیں؟ علماء نے اس کے دو جواب دیے ہیں: یہ پابندی آ گئی، لیکن انسانوں میں سے بھی شیطان موجود ہیں جو آدمیوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں۔

اور بعض علماء نے یہ بھی جواب دیا ہے کہ اگر آپ ایک جگہ آگ جلاتے ہیں۔ آگ بجھ جائے، لیکن داغ تو باقی ہوتا ہے۔ وہ شیطان جو آدمی کو گمراہ کرتا رہتا ہے، گیارہ مہینے کے اثرات بھی تو باقی ہوتے ہیں...... الا ماشاء اللہ...... (اصل جواب یہ ہے کہ سرکش شیطانوں کو باندھا جاتا ہے، چھوٹے چھوٹے شیطان تو کھلے ہوتے ہیں) اللہ جن کو صحیح توبہ نصیب فرمادے اللہ پاک ان شیطان کے فتنوں سے بچا لیتے ہیں۔ اس لیے حضور پاک ﷺ نے ہمیں دعا سکھائی کہ آدمی اللہ کی پناہ مانگے "نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَيَاطِيْنِ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ"۔

شیطان ابوجہل کے ساتھ جنگِ بدر میں:

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ جنگِ بدر کے موقع پر جب ابی جہل لعنۃ اللہ علیہ اپنی فوجیں لے کر جا رہا تھا تو شیطان نے ایک قبیلہ کے سردار کی شکل میں آ کر ابوجہل سے کہا کہ ویسے آپ کا اور ہمارا بڑا جھگڑا ہے، آپ کے اور ہمارے بڑے اختلافات ہیں، لیکن ہم بھی حضور (ﷺ) کے دشمن ہیں، اس مقابلہ کے اندر میں تمہارے ساتھ ہوں اور بالکل فکر نہ کرو، مسلمانوں کو ایسی شکست دیں گے کہ وہ ہمیشہ کے لیے یاد رکھیں گے۔ تو اب وہ سارے سفر میں ابوجہل کے ساتھ رہا، لیکن اس کو پتہ نہیں تھا کہ یہ کون ہے؟ اس کو سردار سمجھے ہوئے تھا۔ جب مقامِ بدر پر پہنچا تو اب وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ابوجہل نے کہا کہ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا: میں آ جاؤں گا اور مل جاؤں گا۔ ابوجہل نے کہا: اتنا دور سے تم ہمارے ساتھ آئے ہو، اب میدان میں پہنچ کر کیوں بزدلی دکھا رہے ہو؟ تو اس نے کہا: اصل بات یہ ہے کہ جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ وجہ کیا تھی کہ وہ اللہ کے ملائکہ کو دیکھ رہا تھا جو اللہ نے فرشتے اتارے ہوئے تھے، لیکن ابوجہل تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ [سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۶۶۳]

تو انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے، اس لیے قرآن میں آتا ہے:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۝﴾ [یوسف:۵]

شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور ایسا خطرناک دشمن ہے کہ بڑے سے بڑے صالح لوگ بھی شیطان سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

ایک کامل ولی کی شیطان سے احتیاط:

ایک بہت بڑے عالم محدث گزرے ہیں، ان کی خدمت میں ایک عورت مسئلہ پوچھنے کے لیے حاضر ہوئی۔ ان بزرگ کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور وہ بھی ستر سال کی بڑھیا تھی۔ انہوں نے کہا: حضرت! ایک عورت مسئلہ پوچھنا چاہتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ بھی بیٹھے رہو اور عورت کو بھی بلالو۔ انہوں نے کہا: پتہ نہیں عورت نے کوئی بات علیحدہ پوچھنی ہو اور شرم کے مارے وہ بے چاری ہمیں دیکھ کر وہ بات نہ پوچھ سکے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اکیلا کسی عورت سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت! آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ فرمایا کہ شیطان تو کسی وقت بھی گمراہ کر سکتا ہے۔

اس لیے شیطان کا فتنہ بڑا خطرناک ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی اللہ کی پناہ میں آجائے ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ'' جیسے ہم جنات کو نہیں دیکھ سکتے اسی طرح کوئی طاقت خدا کو نہیں دیکھ سکتی۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ اور شیطان:

حضرت عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے بارے میں ہے کہ ایک دفعہ آپ اکیلے عبادت میں مشغول تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ جس درخت کے نیچے عبادت کر رہے تھے اس پر ساری روشنی چھا گئی، حیران ہو گئے کہ پتہ نہیں یہ کیا روشنی ہے؟ تھوڑی دیر گزری تو اس روشنی سے آواز آئی: اے عبدالقادر! آج کے بعد میں نے تم پر ساری عبادت معاف کر دی ہے۔ تم نے اتنی میری عبادت کی ہے کہ آج کے بعد تم عبادت کرو یا نہ کرو سب تمہارے لیے معاف ہے۔ ......نعوذ باللہ...... روشنی ڈال کر خدا بن کر آواز دے رہا ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ تو بہت بڑے عالم تھے، اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں فرمائیں۔ انہوں نے فوراً پڑھا ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ'' وہ سمجھ گئے کہ یہ تو بدبخت شیطان ہے۔ اللہ نے نبی پر عبادت معاف نہیں کی تو میں کون ہوں کہ مجھ پر عبادت معاف ہو گئی؟ اللہ نے تو اپنے نبی کو حکم دیا:

﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ [الحجر: ۹۹]

میرے نبی محمد! میری عبادت کرو یہاں تک کہ تمہیں موت آئے۔ اس وقت تک جب اللہ کا نبی پابند ہے تو میں کون ہوں کہ مجھ پر اللہ نے عبادت معاف کر دی؟ تو یہ لازمی شیطان کا جھگڑا ہے، انہوں نے فوراً پڑھا ''اَعُوْذُ

بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ''اب شیطان بول پڑا، اس نے کہا: ہاں عبد القادر! تم عالم تھے، تمہیں علم نے بچالیا، ورنہ اس انداز میں تو میں نے کتنے پیروں کی گردنیں توڑ ڈالی ہیں؟ کتنے بڑے بڑے لوگوں کو میں نے گمراہ کر ڈالا ہے؟ لیکن تم عالم تھے، تمہیں علم بچا گیا۔ آپ نے فرمایا: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' اے بد بخت! تو مجھے پھر دھوکہ دے رہا ہے؟ بچانے والا خدا ہے، علم کیسے بچا سکتا ہے؟ علم اگر بچاتا تو سارے عالم بچ جاتے۔ اصل بچانے والا خدا ہے۔ تو مجھے علم کے ذریعہ سے گمراہ کر رہا ہے۔

اس لیے شیطان ایسے ایسے دھوکے دیتا ہے کہ بڑے بڑے مسلمان لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں۔

گمراہ کرنے کے لیے شیطان کی آوازیں:

آپ نے دیکھا ہے کہ بعض لوگ قبروں پر جا کر عبادت کرتے ہیں، ۹ راتیں بیٹھتے ہیں، چلے کاٹ رہے ہیں۔ تو کبھی شیطان دھوکہ دیتا ہے قبر کی آڑ میں اپنے آپ کو چھپا کر کہتا ہے کہ جاؤ! میں نے تمہاری مرادیں پوری کر دیں۔ اب آدمی کا عقیدہ بن گیا کہ میری مراد تو قبر والے نے پوری کی۔ اب اس کو تو پتہ نہیں ہے کہ آواز دینے والا کون ہے؟ وہ تو جنگل میں بیٹھا ہوا ہے۔ اب شیطان نے دھوکہ دے دیا۔ اگر اب اس کو ساری زندگی مولوی سمجھاتا رہے، وہ کہے گا: عجیب بات ہے! میں نے تو وہاں آواز سنی تھی، حضرت صاحب قبر سے باہر آ گئے تھے اور خود ملے تھے اور تم مجھے مسئلے بتا رہے ہو۔ لیکن اگر قرآن و حدیث پر نظر ہو تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر شہادت کا وقت آ گیا تو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم باہر نہیں آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لڑائی ہوئی، دس ہزار صحابہ شہید ہو گئے تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر آ کر فیصلہ نہیں فرمایا تو یہ کون ہے جس کے لیے کوئی باہر آ جائے؟ اللہ تبارک و تعالیٰ کا نظام ہے کہ عالمِ دنیا علیحدہ ہے، عالمِ برزخ علیحدہ ہے اور عالمِ آخرت علیحدہ ہے۔ عالمِ دنیا کا قانون قبر میں نہیں چلے گا اور قبر کا قانون عالم دنیا میں نہیں چلے گا آخرت کا قانون عالم دنیا اور عالم برزخ میں نہیں چلے گا ہر جگہ کا عالم بھی الگ ہے اور اللہ کے احکام بھی الگ ہیں زمینوں پر احکام علیحدہ ہیں آسمانوں پر احکام علیحدہ ہیں اور آخرت میں احکام علیحدہ ہیں۔

دنیا اور آخرت کا نظام الگ الگ ہے:

اب اندازہ فرمائیں کہ دنیا میں اگر ایک آدمی ایک نماز نہ پڑھے تو کافر بن جائے، لیکن جنت میں کوئی نماز نہیں

ہوگی، جنت میں کوئی روزہ نہیں ہوگا اور جنت میں کوئی عبادت نہیں ہوگی، کیونکہ جنت تو آرام کی جگہ ہے۔ وہاں کوئی عبادت کرے گا تو لذت کے لیے کرے گا، ورنہ اس پر پابندی کوئی نہیں ہوگی کہ ضرور عبادت کرو، ضرور نماز پڑھو، کیونکہ اللہ فرمائیں گے: تم دنیا میں پڑھ آئے ہو، اب تمہارے آرام کا وقت ہے:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـــًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ [الحاقۃ:۲۴]

تم نے دنیا میں روزے رکھ لیے اور تم نے بھوک برداشت کرلی اب یہاں کوئی روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب آخرت کے احکام بدل گئے، دنیا کے اندر سورج طلوع ہوتا ہے اور شام کو غروب ہوتا ہے، لیکن آخرت میں نہ سورج ہوگا اور نہ چاند ہوگا، نہ اس کا طلوع ہوگا اور نہ غروب ہوگا اور اس کے ایام آدمی خود آرام کے لیے مقرر کرے گا۔ وہاں تو ایسا موسم ہے کہ نہ سورج ہے اور نہ گرمی ہے اور نہ ظلمت ہے۔ اللہ نے قرآن مجید میں فرمادیا۔ آخرت کے احکام علیحدہ ہوتے ہیں، عالمِ برزخ کے احکام علیحدہ ہوتے ہیں اور عالمِ دنیا کے احکام علیحدہ ہوتے ہیں۔ یہ دھوکہ لگتا ہے جب آدمی عالمِ برزخ کو عالمِ دنیا میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، یا عالمِ آخرت کے قانون کو عالمِ دنیا میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

صحیح پیر کی پہچان کا طریقہ:

آسان فارمولا ہے کہ اپنے پیر پر نظر ڈالو۔ اگر اس کا ہر قول، عمل، فعل، صورت، سیرت اور کردار بالکل سنت رسول اللہ ﷺ کی تصویر ہے تو سمجھ لو کہ یہ پیر ہے۔ ہم نے دیکھنا ہے کہ ہمارا مرشد کیسے ہے؟ ہم ان کو قرآن وسنت کی روشنی میں پرکھیں گے، اس کو دیکھیں گے کہ نماز کا وقت آگیا ہے تو اس کی نماز کیسے ہے؟ اس کا وضو کیسے ہے؟ اس کی تہجد کیسے ہے؟ اگر غم کا وقت آگیا تو صبر کیسے ہے؟ خوشی کا وقت آگیا ہے تو خوشی کیسے ہے؟ لباس پہننے کا وقت آگیا تو لباس کیسا ہے؟ غسل کرنے کا وقت آگیا تو غسل کرنے کا انداز کیسے ہے؟ بات کرنے کا وقت آگیا ہے تو بات کرنے کا انداز کیا ہے؟ اگر اس کے ہر عمل میں تمہیں میرے مدنی پاک ﷺ کی سنت کی جھلک نظر آئے تو سمجھ لو کہ یہ ولی اللہ ہے اور اس کے غلام بن جاؤ۔ اور اگر آگ پر چلتا ہو اور دریا کے پانی پر بغیر کشتی چلتا ہو، ہواؤں میں اڑ کر دکھلادے، لیکن بے نماز ہے تو سمجھو کہ دجال ہے، شیطان ہے، پیر نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ پیر ہوتا تو یہ محمد ﷺ کا غلام ہوتا۔

اب تو انگریزوں نے بھی روبوٹ بنا دیے ہیں، مشین کا بندہ بنا دیا ہے۔ تیرے گھر کا سارا کام کرتا ہے، بٹن دبا دو کہ میری چائے بناؤ تو وہ چائے بنا رہا ہے۔ ایسے انتظام کر دیے ہیں کہ تاریں کوئی نہیں، ہزاروں میل کا فاصلہ ہے، ٹیلی فون اٹھاؤ اور بات کر لو۔ آپ بٹن دباؤ اور تصویریں دیکھ لو۔ تو کیا ہم ان کو پیر مان لیں گے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟ اس لیے کہ ہم نے پیر اس کو ماننا ہے جو محمد مصطفیٰ ﷺ کا غلام بن جائے۔

جیسا کہ بزرگوں نے ایک مثال لکھی ہے: ایک بندہ کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک دن رہنے کے بعد کہا کہ حضرت! مجھے اجازت دیں۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹا! کیسے آئے تھے؟ اس نے کہا: حضرت! میں نے آپ کا نام سنا تھا، بیعت ہونے کے لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ کا مرید بنوں گا، لیکن اب میں نے ارادہ بدل لیا ہے، میں مرید نہیں بنتا۔ آپ مجھے اجازت دے دیں اور میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ بزرگوں نے پوچھا کہ وجہ کیا ہے؟ اس نے کہا: آج آپ جب عصر کی نماز میں آئے تو آپ نے مسجد کے اندر بایاں پاؤں پہلے رکھا اور دایاں پاؤں بعد میں رکھا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ جو اللہ کے گھر میں آنے کا طریقہ نہ جانتا ہو مجھے اللہ کے گھر کیسے پہنچائے گا؟ آدمی اتنی چھوٹی سنت رسول ﷺ بھی نہیں جانتا کہ مسجد میں پہلے دایاں پاؤں رکھا جاتا ہے اور بعد میں بایاں پاؤں رکھا جاتا ہے۔ اور آپ نے پہلے بایاں پاؤں رکھا اور بعد میں دایاں پاؤں رکھا۔ آپ نے چونکہ سنت کی مخالفت کی ہے، لہٰذا میں آپ کی کبھی بیعت نہیں ہو سکتا۔

اللہ کی طرف مذاق وغیرہ کی نسبت:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرآن پاک میں اس طرح کے استہزاء کے جتنے بھی الفاظ ہیں یا "سُخْرِيًّا" کا لفظ آیا ہے یا خداع کا لفظ آتا ہے یا مکر کا لفظ آتا ہے اس کا معاملہ جواب وہی ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا: "اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ" اللہ نے ان کو توبیخ اور زجر کیا کہ اچھا اگر تم کر رہے ہو تو اللہ بھی تمہارے ساتھ کریں گے۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی آدمی کسی کو دھوکہ دے اور دوسرا اس پر کامیاب ہو جائے تو کہتا ہے: اچھا! میں نے بھی تمہیں دھوکہ دیا ہے۔ حالانکہ دھوکہ نہیں دیا ہوتا، بلکہ کامیابی کے لفظ کو دھوکہ سے تعبیر کر رہا ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس طرح کے جتنے الفاظ اللہ کے بارے میں ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا معنی اور ترجمہ وہی ہو جو اللہ کی شان کے لائق ہو۔ علماء نے فرمایا کہ یہ لفظ جب آئے گا تو مقابلہ

پر آئے گا۔ جب اللہ کی طرف مکر کی نسبت آئے گی تو مقابلہ پر آئے گی۔ اگر بندہ مکر کرے تو اللہ نے مکر اس کے مقابلہ پر کیا ہے تو استعمال جائز ہے۔

﴿وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ [الانفال:۳۰]

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ ۚ﴾ [النساء:۱۴۲]

لیکن اگر مقابلہ پر نہ ہو تو ہم مطلقاً اس لفظ کا استعمال نہیں کریں گے۔

بعض علماء نے یہاں بڑی نفیس تقریر فرمائی ہے! انہوں نے فرمایا: مکر ہے، خداع ہے یا استہزا ہے، اس کے اندر ایک صفت نقصان کی ہوتی ہے اور ایک صفت کمال کی ہوتی ہے۔ جب مقابلہ ہوگا تو اللہ کی صفت کمال ظاہر ہوگی۔ تمام کفار نے مل کر حضور ﷺ کے خلاف مکر کیا، لیکن اللہ نے ان کے مکر کا مقابلہ کیا۔ تو یہ اللہ کے لیے کمال کی صفت بن گئی۔ ساری دنیا کا مکر اکٹھا ہو جائے، لیکن وہاں مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تو سلف کا عقیدہ ہے کہ اللہ کی شان میں جتنے الفاظ حدیث پاک میں ہیں ان سب پر ایمان ہے، لیکن ان کا ترجمہ وہی ہوگا جو اللہ کی صفت و شان کے مطابق ہوگا۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ استہزاء کا معنی یہ ہے کہ اللہ ان کو جزا دیں گے ان کو اس استہزاء اور دھوکہ کرنے کی۔ اللہ نے اپنے بدلہ لینے کو اسی لفظ میں استعمال کیا، وگرنہ دونوں کی حقیقت میں بہت بڑا فرق ہے۔ جیسے ہے ﴿جَزٰۗؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ﴾ کہ برائی کا بدلہ برائی۔ حالانکہ برائی کا بدلہ جب اللہ دیں گے تو وہ بھلائی ہوگی۔

کبھی لفظ وہی استعمال کر لیا جاتا ہے اور مراد ہوتا ہے اس پر بدلہ دینا۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠﴾ [البقرۃ:۱۹۴]

اللہ نے فرمایا: جو تم پر زیادتی کرے تم بھی زیادتی کرو، حالانکہ جو اس نے زیادتی کی وہ ظلم ہے، ہم تو بدلہ لے رہے ہیں، ہم تو مظلوم ہیں، زیادتی نہیں کر رہے ہیں، لیکن لفظ وہی آ گیا ہے اور معنی کے اندر فرق ہے۔ [ابن کثیر:۱/۱۵۱، الآیۃ: اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ]

بعض مفسرین نے فرمایا کہ جیسے منافقین ظاہر میں ایمان لا کر دھوکہ دیتے ہیں اللہ نے بھی حکم دیا کہ ان کے ظاہری ایمان کے ساتھ معاملہ کرو۔ ظاہری معاملہ ہو رہا ہے، لیکن آخرت میں جہنم کی سزا ظاہراً تیار ہے۔ تو ان کو مسلمان سمجھا جا رہا ہے، وہ نمازیں بھی پڑھتے ہیں، ان کے جان اور مال بھی محفوظ ہیں، مالِ غنیمت میں سے بھی حصے لے رہے

ہیں، لیکن آخرت میں ان کے ساتھ معاملہ دوسرا کرنا ہے کہ ان کے لیے آگ تیار ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ جیسے منافقین استہزاء کرتے تھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ جیسے اس کی شان کو لائق ہے "یَسْتَهْزِئُ اللّٰهُ بِهِمْ" وہ ان کو عذاب دیں گے کہ ظاہر میں ایمان لانے کی وجہ سے بظاہر ان کو معافی ملی ہوئی ہے، لیکن اصل میں ان کے لیے عذاب تیار ہے "یَمُدُّهُمْ" ان کو مہلت دیتے ہیں، ان کو بڑھا دیتے ہیں سرکشی میں، تاکہ وہ اس میں ہمیشہ کے لیے گر جائیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهِ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۚ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝﴾

[المومنون: ۵۵، ۵۶]

جتنا مال بڑھے گا یہ گناہوں میں اتنا اور بڑھیں گے اور زیادہ سرکشی کریں گے اور زیادہ سے زیادہ عذاب کے مستحق ہوں گے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۚ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [القلم: ۴۴]

ہم ان کو سیڑھی سیڑھی چڑھا رہے ہیں ایسے طریقے سے کہ یہ جانتے نہیں ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں ہمارے پاس مال ہے، دولت ہے اور اولاد ہے، بس ہم کامیاب ہیں۔ حالانکہ یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ نے جو کافروں کو مہلت دے رکھی ہے یہ بھی ایک نظام ہے۔ اللہ کی اس میں کروڑوں حکمتیں ہیں کہ جوں جوں وہ گناہ کرتے ہیں اتنا دنیا کے اندر نعمتیں ملتی ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کامیاب ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ نعمت نہیں، بلکہ اللہ کا ایک عذاب ہے۔ انسان جب دولت میں غافل ہو جاتا ہے اور منہمک ہو جاتا ہے تو اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۚ حَتّٰى إِذَا فَرِحُوْا بِمَا أُوْتُوْا أَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

[الانعام: ۴۴، ۴۵]

حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کا سب سے راجح معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بطور مہلت ان کو ڈھیل دیتے ہیں، کیونکہ دنیا میں جو طاقتور ہو وہ اپنے مخالف کو ڈھیل دیتا ہے کہ چلو تم اور غلطی کرو اور غلطی کرو۔ اسے پتہ ہوتا ہے کہ جب چاہوں گا اس کی گردن توڑ دوں گا، کمزور تو فوراً گلے پڑ جاتا ہے۔ اور سب سے بڑی طاقت اللہ کے پاس ہے تو

اللہ بھی اپنے دشمنوں کو ڈھیل دیتے ہیں کہ اور زیادہ بڑھیں اور زیادہ بڑھیں، اپنی سرکشی کی انتہا کو پہنچ جائیں۔ جب وہ اپنے کبر اور سرکشی کی انتہاء کو پہنچ جاتے ہیں اور مدت پوری ہو جاتی ہے تو پھر اللہ کے عذاب ان کو پکڑ لیتے ہیں۔

[ابن کثیر: ۱/ ۵۲، الآیۃ: اللّٰہُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ]

منافقوں کی سرکشی اور اندھاپن:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک ﴿وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ﴾ کا معنی ہے کہ وہ اپنے کفر کے اندر اسی طرح پلٹے کھاتے رہیں گے۔ لغت عرب سے اندر ہے "عَمِهَ فُلَانٌ" کہ فلاں گمراہ ہو گیا، اندھا ہو گیا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ معنی کیا ہے کہ وہ اپنی گمراہیوں میں اوندھے ہو گئے ہیں، اپنے کفر کے اندر ایسے پھنس گئے ہیں کہ کفر گویا ان کے اوپر آ گیا ہے، ان کی پلیدی ان کے اوپر چڑھ گئی۔ اسی کفر کے اندر پریشان ہیں، حیران ہیں ان کو راستہ ہی نہیں مل رہا کہ کدھر سے نکلیں؟ کیونکہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر فرما دی۔

اور بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ایک لفظ ہوتا ہے "أَعْمٰی" کہ جو آنکھ سے اندھا ہو جائے اور ایک ہے "عَمِهَ" کہ جو دل کا اندھا ہو جائے۔ اور کبھی کبھی "أَعْمٰی" کا لفظ دل کے اندھے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ [الحج: ۴۶]

کیونکہ آنکھ کا اندھا کسی سے راستہ پوچھ لے گا، کسی کا ہاتھ پکڑ کر بھی چلا جائے گا، لیکن جب آدمی دل کا اندھا ہو جائے تو وہ ہدایت ہی نہیں اختیار کر سکتا۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾

یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو مول لیا، پھر ان کی تجارت نے ان کو نفع نہ دیا اور یہ ہدایت پانے والے نہ ہوئے۔

گمراہی خریدنے کا معنی:

"اِشْتِرَاء" کہتے ہیں کسی چیز کا رضامندی کے ساتھ خریدنا۔ سو اجب خریدا جائے اور رضامندی نہ ہو تو تجارت نہیں ہوتی۔ تجارت یعنی سودے کا لین دین رضامندی کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ [النساء:٢٩]

اگر تم تجارت کرتے ہو اور دونوں فریق راضی ہوں تو وہ جائز ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تجارت کرتے اور ہدایت خریدتے۔ اللہ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ [الصف:١٠]

اللہ پر ایمان لاؤ، اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ اصل تجارت تو وہ تھی، لیکن یہ منافق ایسے بدبخت ہیں، بجائے ہدایت خریدنے کے انہوں نے گمراہی کو خرید لیا ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ﴾ تو ان کی تجارت کامیاب نہیں ہوئی۔ ﴿وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝﴾ اور نہ وہ سیدھے راستے پر ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ نہیں کہ انہوں گمراہی پیسے دے کر خرید لی تھی، بلکہ معنی یہ ہے کہ آدمی جب کسی چیز میں رغبت کرتا ہے تو وہاں پیسہ خرچ کر کے ہی سودا خریدتا ہے اور یہ ایسے بدبخت ہیں کہ انہوں نے اپنی رغبت سے گمراہی کو اختیار کیا اور ہدایت کو چھوڑ دیا۔ یعنی ہدایت حاصل کرنے میں جو رغبت ہونی چاہیے تھی انہوں نے وہ رغبت ضلالت کے حاصل کرنے میں استعمال کی۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ [البقرة:١٦]

اور یہ بھی مسئلہ سمجھ آ گیا کہ ہر آدمی کو جو اللہ عذاب دیتے ہیں اس کے اپنے اختیار کے مطابق دیتے ہیں۔ یعنی ان کو چاہیے تھا کہ وہ ہدایت خریدتے، لیکن انہوں نے ہدایت نہ خریدی، بلکہ گمراہی خرید لی۔ ان کا گمراہی کو اختیار کرنا ان کے اپنے اختیار سے تھا، اسی پر اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دیں گے۔ جو آدمی بھی عمل کرتا ہے وہ اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ یہ لوگوں کا ایک دھوکہ ہوتا ہے کہ اللہ نے لکھا ہے تو جب لکھ دیا ہے تو ہم کیا کریں؟ یہ معنی نہیں ہوتا، کیونکہ تمام عواقب اللہ کے علم میں ہیں، کیا مطلب کہ میری پیدائش کے پہلے سے لے کر جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا اللہ کے علم میں تھا کہ میں کب پیدا ہوں گا؟ اور پیدا ہونے کے بعد کیا کروں گا؟ اور میری زندگی کس راستے پر گزرے گی؟ اور میری موت کس راستے پر آئے گی؟ اور میری صحت کہاں آئے گی؟ یہ سب چیزیں میرے اللہ کے علم میں ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے کمال علم کو ظاہر کرنے کے لیے سب کچھ لکھ دیا۔ یہ نہیں کہ اللہ نے جبر کیا ہو کہ تم ضرور کفر کرو، یہ معنی نہیں ہوتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو انبیاء علیہم السلام بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ قرآن اتارنے کی کیا ضرورت تھی؟

بس اللہ لکھ دیتے کہ اتنے بندے مسلمان اور اتنے بندے کافر ہوں گے، اتنے بندے یہودی اور اتنے بندے نصرانی ہوں گے اور اتنے بندے ہندو اور اتنے بندے مجوسی ہوں گے۔ جب ایک فیصلہ ہو جاتا تو نہ کسی کے بھیجنے کی ضرورت، نہ کتابوں کی ضرورت تھی، نہ امتحان دینے کی ضرورت، نہ یہ ہمیں حواسِ خمسہ دینے کی ضرورت اور نہ عقل دینے کی ضرورت۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ہر آدمی کو بتلا دیا کہ یہ سیدھا راستہ ہے۔ اس راستے پر کانٹے ہیں، اس راستے میں دوزخ ہے، آگے آگ جل رہی ہو تو آپ پاؤں کھینچ لیتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا آ رہی ہو تو ادھر آپ محسوس کرتے ہیں کہ آرام مل رہا ہے۔ نفع کی چیز ہو تو آپ خوش ہوتے ہیں اور نقصان کی چیز ہو تو آپ غمگین ہوتے ہیں۔ یہ سارے اللہ نے اپنے بندوں کو اختیار دیا ہے، چونکہ ہمارا یہ اختیار اللہ کا دیا ہوا ہے اور اللہ کے علم میں ہے، لہٰذا اللہ پاک نے اپنے کمالِ علم سے سب کچھ پہلے لکھ دیا کہ مخلوق پیدا ہوگی اور یہ کرے گی اور یہ کرے گی۔ اب جب ملائکہ لوحِ محفوظ پڑھتے ہیں، انہیں اطلاع ملتی ہے یا اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو خبر دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں: سبحان اللہ! یا اللہ! تیرے علم کا کمال ہے کہ سب کچھ پہلے لکھا ہوا ہے۔ جو تیرا لکھا ہوا ہے وہ حق ہے، وہ کبھی بدل نہیں سکتا۔ یہ معنی نہیں ہوتا کہ جو کچھ لکھا ہو ہمیں اللہ پاک نے جبری طور پر اس پر مجبور کر دیا ہے، وگرنہ انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کو بھیجنے کا کیا مطلب؟ جنت اور جہنم بنانے کا کیا مطلب؟ حساب کتاب بنانے کا کیا مطلب؟ اچھے عمل کرنے کا کیا مطلب؟ اور برے عمل کرنے کا کیا مطلب؟

لیکن اسی طرح ایک بات یاد رکھ لیں کہ ہم اتنے با اختیار شترِ بے مہار بھی نہیں ہیں کہ جو چاہیں اپنے منشا سے کریں۔ یہ ہمارا اختیار بھی اللہ کے اختیار کے تابع ہوتا ہے۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں تو پھر ہمارے اختیار کو ختم فرما دیں، ایک انسان کی کیا طاقت ہے؟

اس کی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی اچھی مثال دی کہ ایک دہریہ ان کی خدمت میں آیا، اس نے کہا: جناب! یہ مسئلہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا، اللہ نے کتنا ہمیں اختیار دیا ہے اور کتنا ہمیں اختیار نہیں دیا؟ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں اختیار دیا ہے اور دوسری طرف آپ کہتے ہیں کہ تمام اختیارات اللہ کے تابع ہیں تو اسارے اختیارات اللہ کے تابع ہو گئے تو یہ مسئلہ مجھے سمجھ نہیں آیا؟...... وہ آدمی کھڑا تھا...... حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بات ہے تو تم ایک پاؤں زمین سے اٹھاؤ۔ اس نے ایک پاؤں زمین سے اٹھا لیا اور ایک پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا: اب دوسرا اٹھاؤ۔ اس نے کہا: دوسرا تو میں نہیں اٹھا سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اتنا اختیار ہے اور اتنی بے اختیاری ہے کہ

ایک پاؤں اٹھانے کا تمہیں اختیار ہے اور دوسرا پاؤں اٹھانے کا تمہیں اختیار نہیں ہے۔ اتنا اللہ نے اختیار بھی دیا ہے اور اتنا مجبور بھی رکھا ہے۔ اس لیے جتنا تمہیں اختیار دیا ہے اسی پر جزا و سزا مرتب ہوتی ہے اور جس پر اللہ نے تمہیں مجبور کر دیا اس پر جزا اور سزا مرتب نہیں ہوتی۔

﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾[التوبۃ:۹۵]

جو تیرے ہاتھوں نے عمل کر کے آگے بھیجا اسی پر تجھے جزا ملے گی۔

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾

''جس نے اچھا عمل کیا چاہے مرد ہے یا عورت اور ایمان والا ہے......:''

﴿فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُوْنَ﴾[النحل:۹۷]

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۞ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾[الزلزال:۸،۷]

باقی لوگ مجبور ہو جاتے ہیں۔ او جی! تقدیر میں پھنس گئے۔ او جی! لکھا ہوا ہے۔ ہمیشہ یاد رکھو! اس کی مثال میں اپنے دوستوں کو سمجھانے کے لیے آسان دیتا ہوں، تا کہ مسئلہ سمجھ آ جائے۔

مسئلہ تقدیر کو سمجھنے کے لیے آسان مثال:

ہمارے گھروں میں مثلاً: ائیر کنڈیشنڈ لگے ہوتے ہیں، گاڑیوں میں اور موٹروں میں ائیر کنڈیشنڈ لگے ہوتے ہیں۔ تو وہاں باقاعدہ نیلا یا سبز نشان ہوتا ہے اور ایک سرخ نشان ہوتا ہے: ایک پر لکھ دیتے ہیں کول اور ایک پر لکھ دیتے ہیں ہارٹ۔ اگر آپ کو ٹھنڈک چاہیے تو اس بٹن کو اس جگہ پر رکھو اور اگر آپ سردی میں جا رہے ہیں تو اس بٹن کو دبا کر اس سرخ نشان پر لے آئیں تو آپ کو گرم ہوا ملے گی۔ اب دونوں چیزیں اس میں لکھی ہوئی ہیں اور دونوں طاقتیں اس کے اندر موجود ہیں: ٹھنڈک کرنے والی طاقت بھی اس کے اندر موجود ہے اور گرم کرنے والی طاقت بھی موجود ہے۔ ٹھنڈک کا نشان بھی لگا ہوا ہے اور گرم کا نشان بھی لگا ہوا ہے اور لکھا ہوا ہے۔ اب ایک آدمی عین گرمی میں جا رہا ہے گرم پر بٹن کھول دے یا ایک آدمی عین سردی کے زمانے میں ہے تو وہ جناب کول بٹن پر رکھ کر اس کو چلا دے۔ اور پھر کہے کہ لکھا ہوا نہ ہوتا تو میں غلطی نہ کرتا، غلطی تو تیری ہے جو تو نے بٹن کو غلط جگہ پر رکھا ہے، اس میں لکھنے والے کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اس نے تو دونوں نشان لگا دیے ہیں کہ یہاں بٹن رکھو گے تو ٹھنڈی ہوا آئے گی

اور یہاں رکھو گے تو گرم ہوا آئے گی۔ اب اگر وہ غلط موسم میں غلط استعمال کر رہا ہے تو اس کی سزا اس کے استعمال کرنے والے پر ہے، اس لکھنے والے پر تو نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو لکھا ہے وہ قانون مطلق ہے، انہوں نے ہماری استعداد کے مطابق اور جو ہم نے کرنا تھا ان کے علم میں ہے اس لیے انہوں نے اس کو پہلے لکھ دیا، ورنہ ہر آدمی کو اللہ نے اختیار دیا ہے کہ وہ آتا ہے اور انبیاء ﷺ کی باتیں سنتا ہے اور قرآن سنتا ہے اور اسلام لے آتا ہے۔ کتنے بے چارے لوگ ہیں جن کی ساری زندگی بدعت میں گزر جاتی ہے، ساری زندگی غیر اللہ کے پکارنے میں گزر جاتی ہے اور جب اللہ پاک سبب بنا دیتے ہیں، عمرے پر آجاتے ہیں، حج پر آجاتے ہیں، اللہ پاک کعبۃ اللہ کی زیارت نصیب کر دیتے ہیں، اللہ ان کو قرآن کا درس نصیب کر دیتے ہیں تو اللہ توبہ کی توفیق دے دیتے ہیں۔ واپس آجاتے ہیں تو ان کے عقیدے تبدیل ہو جاتے ہیں۔

گمراہی خریدنے کا مطلب:

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایمان لے آئے اور پھر کفر اختیار کیا، یعنی انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔

اللہ نے فرمایا کہ ہم نے قومِ ثمود کے لیے ہدایت کا انتظام کر دیا، لیکن ان بدبختوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔

تمام مفسرین کے اقوال کا خلاصہ یہ نکلا کہ منافق جتنے ہیں وہ ہدایت سے ہٹ گئے ہیں گمراہی کی طرف۔ گویا کہ ہدایت ایک پیسہ ہے، اس کو دے کر انہوں نے گمراہی کو لے لیا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کافروں اور منافقوں کے اندر بھی کوئی انواع اور اقسام ہیں: بعض تو ایسے ہیں کہ ایمان لائے اور پھر کافر بن گئے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ پہلے کفر کو چھپالیا اور صرف ایمان کو ظاہر کیا ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝١٦﴾ [البقرۃ:١٦] اللہ نے فرمایا: وہ اپنی اس بیع کے سودے میں گھاٹے میں پڑ گئے۔ ایک گھاٹا ہوتا ہے کہ آدمی نفع حاصل نہ کر سکے اور ایک یہ ہوتا ہے کہ نفع بھی نہ ملا اور اصل بھی برباد ہو گیا۔ تو یہ منافق تو ایسے گھاٹے میں پڑے ہیں نفع بھی برباد ہو گیا اور اصل بھی برباد ہو گیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/ ٥٢، البقرۃ، الآیۃ: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ]

ایک صحابی کا ایمان پر جان دینا:

اور مومن اپنی تجارت میں ایسا کامیاب ہوا جیسے ایک حدیث مبارک میں آتا ہے۔ آپ ﷺ کے ایک صحابی ہیں

جو اسلام کے معاملے میں ایمان پر اتنے پکے تھے کہ کافروں نے ان کو سولی پر لٹکایا، پھانسی پر لٹکایا تو اس سے پوچھا: تمہاری کوئی تمنا ہے؟ اس نے کہا: اگر تم چاہتے ہو اور مہلت دے سکتے ہو تو مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت دے دو۔ اس صحابی نے دو رکعت نماز پڑھی اور انہوں نے بہت لمبی نماز نہ پڑھی۔ انہوں نے کہا کہ میرا دل تو چاہتا تھا کہ میں بڑی لمبی نماز پڑھوں، کیونکہ آخری نماز ہے، لیکن میں نے اتنی لمبی نماز نہیں پڑھی، ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ میں قتل سے ڈر گیا ہوں۔ میں تو اللہ کے دین پر اپنی جان دے رہا ہوں، جتنے میرے بال ہیں اتنی دفعہ مجھے قتل کرتے رہو تو میں پھر بھی راضی ہوں، میں تو سودے پر راضی ہو گیا۔ اس لیے کھڑے ہو کر فرمایا: ''فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ!'' خدا کی قسم ہے! مجھے رب کعبہ کی قسم ہے! میں کامیاب ہو گیا ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے ایمان پر موت دی۔

اس لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ محنت تو تھوڑی کرتے ہیں، لیکن سودے میں نفع زیادہ لے جاتے ہیں۔ ہماری دنیا کی تجارت میں بھی بعض لوگ ٹیلی فون پر بیٹھے لاکھوں کما لیتے ہیں، بعض سالہا سال محنت کرتے ہیں، بے چارے دو روپے بھی نہیں کما سکتے تو اسی طرح دین و ایمان کے معاملے ہیں۔

ایک بہادر صحابی کا واقعہ:

ایک دفعہ میرے نبی خاتم الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی کافروں سے جنگ ہو رہی ہے اور بڑے زور کا معرکہ ہے اور فوجیں لڑ رہی ہیں حضور پاک ﷺ بیٹھے ہیں۔ ایک آدمی آیا، وہ کھجوریں کھا رہا تھا، حضور ﷺ کی خدمت میں آیا اور آ کر کہنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ! مجھے ایک تلوار دے دیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کے دشمنوں سے لڑوں اور آپ کی مدد کروں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم کون ہو؟ میں تو تمہیں نہیں جانتا۔ اس نے کہا: میں کافر ہوں، لیکن میرا دل کرتا ہے کہ آپ کی مدد کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''لَا أَسْتَعِينُ بِمُشْرِكٍ'' میں کسی مشرک کی مدد نہیں لیتا، مجھے کسی کافر مشرک کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جا کر کھڑا ہو گیا اور پھر کھجوریں کھانے لگ گیا۔ تھوڑی دیر گزری اور پھر آ گیا، اس نے کہا: حضور ﷺ! مجھے تلوار دیں، میں کافر ہوں یا مشرک ہوں، میں لڑتا تو آپ کے دشمنوں سے چاہتا ہوں، میں تو آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے کسی مشرک کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ پھر ہٹ گیا اور جا کر پھر کھجوریں کھانے لگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آ گیا، اس نے کہا کہ حضور ﷺ! کوئی اور راستہ یا طریقہ ہے کہ میں آپ کی مدد کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! بالکل آسان راستہ ہے، تم کلمہ پڑھ لو۔ اس نے کہا ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ'' میں نے کلمہ

پڑھ لیا ہے، اب مجھے تلوار دیں۔ تو تلوار لی اور میدان میں گھس گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ اس شخص کی بہادری اور بے جگری پر حیران رہ گئے کہ کون نوجوان بہادر ہماری صفوں کے اندر آ گیا ہے کہ دشمن کی صفیں الٹ ڈالیں اور شہید ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب پتہ لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((عَمِلَ قَلِيْلًا وَّأُجِرَ كَثِيْرًا))

اس آدمی نے عمل تھوڑا کیا کہ ابھی کلمہ پڑھا اور ابھی لڑا اور شہید ہو گیا، نہ نماز، نہ حج، نہ روزے، نہ زکوۃ اور نہ محنتیں اور مجاہدے اور نہ سفر اور تکلیفیں، کچھ بھی نہیں، بس ایک گھنٹہ لڑا اور اللہ کو منظور تھا، کافروں کو مارا اور خود بھی شہید ہو گیا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۲۸۰۸، باب: عَمَلٌ صَالِحٌ قَبْلَ الْقِتَالِ]

اور اس مرتبہ پر چلا گیا کہ ان کو مردہ بھی نہ کہو، وہ تو شہید ہو گیا اور اس مقام پر پہنچ گیا، اللہ نے فرمایا کہ میرے راستے میں جو گردن کٹائے تم انہیں مردہ نہ کہا کرو، وہ تو زندہ ہیں۔ تو اتنا بڑا مرتبہ ملا اور شہادت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ساتھ۔ ایک تو وہ بھی شہید ہے جو کشمیر میں شہید ہو جائے، بوسنیاں والے سربیوں کے خلاف لڑیں تو شہید ہیں، لیکن اس شہید کا کیا مرتبہ ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پرچم کے نیچے جنگ لڑی ہو! اس کا کون مقابلہ کر سکتا ہے! اور پھر اس شہید کا کیا مرتبہ ہو گا جس کا خود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ پڑھایا ہو گا۔

اس امت کا عظیم ثواب:

اسی طرح ایک حدیث مبارک میں آتا ہے کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دے کر سمجھایا کہ ایک آدمی ہے، اس کو اپنے مکان بنانے کے لیے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا کہ تم صبح کی نماز کے بعد سے لے کر ظہر تک کام کرو، میں تمہیں فی مزدور دس روپے دوں گا۔ انہوں نے قبول کر لیا اور فجر کی نماز سے لے کر ظہر تک کام کیا۔ اس نے دس دس روپے دے دیے۔ پھر وہ دوسرے مزدوروں کو لے آیا، انہیں کہا کہ تم ظہر سے لے کر عصر تک کام کرو تو میں تمہیں دس دس روپے دوں گا۔ اور مزدور آ گئے تو ان سے عصر تک کام کرایا اور دس دس روپے دے دیے، وہ بھی کام کر گئے۔ اس نے اور مزدوروں کو بلایا، مزدوری میں ان کو بیس روپے ملے اور ان مزدوروں کا ڈیڑھ گھنٹا بنا۔ پہلی اور دوسری قسم کے مزدوروں نے اعتراض کیا کہ ہمارے زیادہ گھنٹے بنتے ہیں، ہمیں تو ملے دس روپے۔ انہوں نے ظہر سے عصر تک کام کیا اور ان کے تین گھنٹے بنتے ہیں، ان کو بھی دس روپے ملے اور انہوں نے ڈیڑھ گھنٹہ کام کیا اور ان کو بیس روپے ملے۔

اس نے کہا: بات سنو کہ جب میں نے تم سے اتفاق کیا تھا کہ تم صبح کی نماز سے ظہر تک کام کرو تو میں دس روپے مزدوری دوں گا، تم نے قبول کیا تھا؟ انہوں نے کہا: ہاں! ہم نے قبول کیا تھا۔ کہا: میں نے تمہیں کوئی پونے دس روپے دیے یا پورے دس روپے دیے؟ انہوں نے کہا کہ پورے دس دیے۔ تو کہا: پھر تمہیں اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ تم نے خود مزدوری قبول کی، ٹائم تمہارے سامنے تھا، میں نے تمہیں پوری پوری مزدوری دے دی۔ انہوں نے ظہر سے عصر تک کیا، میں نے بھی پوری مزدوری دے دی اور اب ان کو اگر میں نے اپنی مرضی سے بیس روپے دے دیے اور کام ڈیڑھ گھنٹہ لیا ہے تو میں نے تمہارا کوئی حق نہیں کھایا۔ انہوں نے کہا کہ واقعی! حق تو نہیں کھایا۔ تو فرمایا کہ میری مرضی کسی کو زیادہ دے دوں اور کسی کو تھوڑا دے دوں۔

اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جتنی امتیں گزری ہیں ان سب سے بڑے فائدے میں میری امت رہی کہ کام تھوڑا کرے گی، لیکن ثواب زیادہ لے جائے گی کہ سب سے آخر میں آنے والی امت محمد مصطفیٰ ﷺ ہے اور پہلے زمانہ میں کسی کی عمر ہزار سال ہوتی تھی، کسی کی عمر نو سو سال ہوتی تھی، کسی کی عمر چار سو سال ہوتی تھی، کسی کی عمر دو سو سال ہوتی تھی اور حضور ﷺ کی امت کی عمر ساٹھ اور ستر کے درمیان ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں جو اسی پر پہنچ گئے یا نوے پر پہنچ گئے یا سو پر پہنچ گئے۔ تو اس نے فرمایا کہ سب سے تھوڑی عمر بھی میری امت کی ہے، لیکن سب سے زیادہ اجر بھی میری امت کو ملے گا اور سب سے پہلے جنت میں میری امت داخل ہوگی۔

[صحیح البخاری، حدیث:۲۲۶۸، باب: الإجارة إلى نصف النهار]

حضور ﷺ کی امت جنت میں پہلے داخل ہوگی:

اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

((نَحْنُ الآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ القِيَامَةِ.)) [صحیح البخاری، حدیث:۸۷۶، باب: فَرْضِ الجُمُعَةِ]

ہم سب سے اوّل بھی ہیں اور سب سے آخر بھی ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ حضور! اوّل کیسے ہیں؟ فرمایا: باعتبار جنت میں داخل ہونے کے میری امت سب سے پہلے ہوگی اور دنیا میں سب سے آخر میں آنے والی میری امت ہوگی۔

تو یہ تجارت کی کامیابی ہے کہ مومن کامیاب ہوگیا کہ تھوڑی محنت کی اور اجر زیادہ لے گیا اور منافق برباد ہوگیا۔

کہ اس نے ہدایت کے بجائے گمراہی کو خرید لیا اور ہمیشہ کے لیے برباد ہو گیا اور ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ﴾ [النساء: ۱۴۵] اور گھاٹا بھی ایسا ہوا کہ نفع بھی برباد ہو گیا اور اصل بھی برباد ہو گیا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾﴾ [البقرۃ: ۱۶]

حرمین میں انسان کے عقائد و اعمال کی اصلاح:

اس لیے علماء نے فرمایا کہ اگر اللہ حج یا عمرہ نصیب فرما دے، کعبۃ اللہ کی حاضری نصیب فرما دے، اللہ مدینہ منورہ کی حاضری نصیب فرما دے، اللہ منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کی حاضری نصیب فرما دے اور ان مقامات کو اللہ آنکھوں سے دکھا دے جہاں قرآن اترا، جہاں میرے محمد مدنی مصطفیٰ ﷺ پیدا ہوئے، جہاں میرے مدنی ﷺ نے توحید کا نعرہ بلند فرمایا، جہاں میرے مدنی ﷺ نے ہجرت فرمائی، جہاں میرے مدنی ﷺ کا روضہ مبارک بنا، جہاں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دفن ہوئے، جہاں حضور پاک ﷺ حج پر آئے، پھر بھی عقیدہ صحیح نہ ہو تو سمجھے کہ میں تجارت میں گھاٹے میں چلا گیا کہ تمام چیزیں اللہ نے دکھلا دیں، پھر آدمی مشرک کا مشرک رہے، پھر بھی آدمی قبر پرست رہے اور پھر بھی غلط عقائد رکھے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جائے کہ دائیں سوئے ہوئے ہیں، بائیں سوئے ہوئے ہیں، قدموں میں لیٹے ہوئے ہیں، عمر رضی اللہ عنہ کا ایمان سمجھ میں نہ آئے تو وہ سمجھے کہ میرا آنا گھاٹے میں ہو گیا، وقت بھی برباد، دولت بھی برباد، محنت بھی لگی، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ فائدہ تب ہوتا ہے کہ جب ان چیزوں کی برکات حاصل ہوں اور آدمی کا عقیدہ اور ایمان صحیح ہو جائے۔ دعا کریں! اللہ سب کے عقیدے صحیح فرما دے۔

منافقین کا انجام:

حضرت ابو قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ خدا کی قسم! آپ نے ان کو دیکھا کہ ہدایت سے نکل کر گمراہی میں چلے گئے، جماعت سے نکل کر علیحدہ ہو گئے، اسلام کی امن کی زندگی کی بجائے خوف میں آ گئے اور حضور ﷺ کے طریقوں کو چھوڑ کر گمراہی کے طریقوں پر چلے گئے۔ اس لیے فرمایا کہ اگر آدمی ایمان کی بجائے کفر میں چلا گیا تو گھاٹے میں آ گیا، اگر وہ ہدایت کی بجائے غلط راستے پر گیا تو وہ گھاٹے میں گیا، اگر حضور ﷺ کی سنت کی بجائے بدعت میں گیا تب بھی گھاٹے میں گیا اور اگر آدمی جماعتِ حقہ کو چھوڑ کر علیحدہ ہوا تب بھی آدمی گھاٹے میں گیا۔ اصل فائدہ وہ ہے جس کو اللہ نے ایمان بھی نصیب کیا اور اتباعِ محمد رسول اللہ ﷺ بھی نصیب

فرمائی۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ أَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب آگ نے اس کے آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی کو زائل کر دیا اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔ بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں۔ اب وہ نہیں لوٹیں گے۔

اس آیت میں مثال میں منافقین کو آگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ میں فرمایا:

﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ﴾ [العنکبوت: ۴۳]

مثال کے ذریعے بات بڑی آسانی سے سمجھ آجاتی ہے۔ اپنے کلام پاک میں بہت سے مقاموں پر مثالوں کا ذکر فرمایا ہے، تاکہ لوگوں پر بات واضح ہو جائے اور پورے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کی مثال دی نور کے ساتھ کہ ایمان نور ہے اور کفر و شرک کی مثال ہمیشہ ظلمت کے ساتھ دی ہے۔

مسئلۂ نور و بشر کی توضیح:

اسی طرح دوسری مثال یاد رکھیں کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے مومن کا ذکر کیا ہے اس کو زندہ کے ساتھ مثال دی ہے اور جہاں کفر کا ذکر آیا ہے اس کو مثال دی ہے مردہ کے ساتھ۔ تو اللہ تعالیٰ نے جو مثالیں قرآن پاک میں دی ہیں ان کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بعض اوقات ہمارے بعض حضرات...... خدا بہتر جانتا ہے کہ...... وہ اللہ کے قرآن کو سمجھے نہیں یا انہوں نے سمجھا ہے، لیکن بلا وجہ اپنی طرف اللہ کے قرآن میں تاویلات کر ڈالی ہیں۔ جہاں کہیں "نور" کا لفظ آ گیا انہوں نے نور کو اپنے معنوں میں لے لیا، جیسے آج تک دنیا کو اسی جھگڑے میں مبتلا کر دیا گیا کہ انبیاء ﷺ نور ہوتے ہیں یا بشر ہوتے ہیں؟ حالانکہ اللہ کے قرآن میں جب ان چیزوں کی وضاحت موجود ہے اور ان چیزوں کے بارے میں نصوصِ قطعیہ موجود ہیں تو جھگڑے میں پڑنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی اور اختلاف میں الجھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اختلاف تو وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی مسئلہ بیان نہ کیا گیا ہو، لیکن جب ایک مسئلے کو اللہ قرآن میں کھول کر بیان فرما دے تو پھر اس سے اختلاف کون کر سکتا ہے؟

نورِ ایمان کیا ہے؟

اب دیکھیں! جہاں اللہ نے ایمان کو نور سے تشبیہ دی ہے تو اب یہ معنی تو نہیں ہوتا کہ ایمان کا معنی نور ہے، یا ایمان کو تشبیہ دیں کہ اس کو نور سے پیدا کیا گیا ہے، بلکہ ایمان کا معنی نور ایک مثال ہے۔

جیسے اب دیکھیں کہ پورے حرم میں روشنی ہے، نور ہے تو اس نور کی وجہ سے ہمیں کعبہ شریف بھی نظر آرہا ہے، ہمیں میزابِ رحمت بھی نظر آرہا ہے اور ہم بڑی آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ رکنِ شامی کہاں ہے، رکنِ یمانی کہاں ہے، حجرِ اسود کہاں ہے، صفا مروہ کس جانب سے ہے، مقامِ ابراہیم کس جانب ہے، بئرِ زمزم کس جانب سے ہے، باب العمرہ کس جانب سے ہے، باب السلام کس جانب سے ہے، کیونکہ نور ہے، روشنی ہے، ہر بات ہمیں نظر آرہی ہے۔ اور اگر ہم اسی نور کو بجھا دیں اور اندھیرا چھا جائے تو جو آدمی مکہ میں رہنے والا ہے وہ بے چارہ اس میں داخل ہونے کے بعد فیصلہ نہیں کر سکے گا کہ خدا جانے میں کس جانب سے آگیا ہوں؟ اللہ جانے صفا مروہ ادھر ہے یا ادھر ہے؟ مقامِ ابراہیم اس جانب ہے یا اس جانب ہے؟ جیسے ایک آدمی اپنے گھر کے اندر موجود ہو اور بجلی چلی جائے، اندھیرا ہو جائے تو وہ گھبرا جاتا ہے، اس کو نظر نہیں آتا۔ وہ اٹھے گا تو بڑے آرام سے کہ کہیں میرا پاؤں غلط نہ پڑ جائے، میں اپنا پاؤں کہیں برتنوں میں نہ ڈال دوں، میں دروازے کی بجائے دیوار سے نہ ٹکرا جاؤں اور اگر فوراً لائٹ آجائے تو اسے ہر چیز نظر آتی ہے کہ یہ دروازہ ہے، یہ میرا بستر ہے، یہ دیوار ہے، ادھر جانے کا راستہ ہے اور ادھر جانے کا راستہ نہیں ہے۔

اصل میں یہ مثال دی گئی کہ ایمان نور ہے۔ جب آدمی کو اللہ ایمان نصیب فرما دیتے ہیں تو اس کو سمجھ آجاتا ہے کہ اللہ کی توحید کا کیا معنی ہے؟ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا کیا معنی ہے؟ اللہ کے رسولوں کی رسالت کا کیا معنی ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم کا کیا مرتبہ ہے؟ اہلِ بیت کا کیا احترام ہے؟ اولیاء اللہ کا کیا مرتبہ ہے؟ عبادت کس کو کہتے ہیں؟ عباداتِ بدنیہ کیا ہوتی ہیں؟ عباداتِ مالیہ کیا ہوتی ہے؟ اللہ کے فرائض کیا ہیں؟ کن چیزوں کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اور کن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے؟ تو گویا وہ روشنی میں آجاتا ہے۔ اور جب اس سے ایمان کی دولت چھین لی جاتی ہے یا اس کو ایمان نصیب نہیں ہوتا تو وہ اندھیروں میں بھٹک رہا ہے، کبھی چاند کو چمکتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کو خدا بنا بیٹھتا ہے، کبھی سورج کی روشنی کو سجدہ شروع کر دیتا ہے، کبھی دریاؤں کی موجیں اٹھتے ہوئے دیکھتا ہے تو گنگا اور جمنا کو اپنا خدا بنا لیتا ہے، کبھی سانپ میں اس کے زہر کی طاقت کو دیکھتا ہے تو اس کے آگے سجدے میں گر جاتا ہے، کبھی

درختوں کے آگے جھک جاتا ہے، کبھی پرندوں کے آگے جھک جاتا ہے، کبھی مردوں کے آگے جھک جاتا ہے، کبھی قبروں کے آگے جھک جاتا ہے، کسی بزرگ کی کوئی بات سنی کہ فلاں بزرگ بڑے صاحب کرامات تھے، اب ان کی قبروں پر سجدے میں پڑا ہوا ہے اور وہی عبادتیں سرانجام دے رہا ہے جو اللہ کے لیے تھیں۔ جس طرح اندھیرے میں بھٹکنے والا انسان صحیح راستے کا تعین نہیں کرسکتا، اسی طرح کفر وشرک کے اندھیروں میں بھٹکنے والا انسان بھی صحیح راستہ صراط مستقیم کا تعین نہیں کرسکتا۔ اس لیے مثال دی جاتی ہے کہ ایمان نور ہے اور کفر ظلمات ہے۔

اللہ نے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

[البقرة:۲۵۷]

اللہ مومنوں کا دوست ہے، اللہ مومنوں کا مددگار ہے اور ان کو کفر وظلمات کے اندھیروں سے نکال کر نور ایمان کی طرف لاتا ہے۔ اور کافروں کا دوست شیطان ہے اور وہ ان کو نور ایمان کے اجالے سے لے کر کفر اور ظلمات کے اندھیروں میں لے جاتا ہے۔

قرآن کے نور ہونے کا معنی:

تو اب دیکھیں کہ ایمان کو نور کہا گیا تو اسی طرح کفر کو ظلمات کہا گیا۔ میرے اللہ نے فرمایا: ہم نے حضرت محمد مدنی ﷺ پر جو قرآن اتارا ہے ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾ [النساء:۱۷۴] میرے مدنی! ہم نے آپ کی طرف کھلا ہوا نور بھیجا ہے۔ اب یہ معنی نہیں ہے کہ قرآن جنسِ نور سے پیدا ہوا ہے، کیونکہ کتاب کی جنس اور ہوتی ہے اور قرآن کی جنس اور ہے، تورات کی کوئی اور جنس تھی اور قرآن کی کوئی اور جنس ہے، تورات بھی اللہ کی کتاب ہے اور قرآن بھی اللہ کی کتاب ہے، لیکن اللہ نے فرمایا کہ میرا قرآن نور ہے، یعنی جو قرآن کو پڑھے گا اور حلال وحرام کو سمجھے گا، کفر اور ایمان کو سمجھے گا اور منافقین کے احوال کو سمجھے گا تو نور میں آجائے گا۔ اس لیے اللہ نے قرآن کو بھی نور فرمایا ہے۔ اسی لیے حکم دیا گیا ہے:

﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ﴾ [الاعراف:۱۵۷]

''اے لوگو! میری مدنی پاک کی اتباع کرو اور اس کے ساتھ جو ہم نے نور بھیجا ہے اس کی اتباع کرو (یعنی اللہ کا قرآن پاک)۔''

لیکن ہمارے بعض حضرات...... اللہ پاک رحم فرمائے...... ایک لفظ بھی مل جائے تو لوگوں کے عقیدوں کو برباد کر ڈالتے ہیں۔ قرآن پاک میں جو ایک جگہ آیت آگئی:

﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ﴾ [المائدۃ:۱۵]

''تحقیق اللہ نے تمہاری طرف نور بھیجا اور کتاب کھلی ہوئی بھیجی ہے۔''

حضور ﷺ کے نور ہونے کا معنی:

بعض مفسرین نے فرمادیا کہ نور سے مراد حضور پاک ﷺ کی ذات ہے تو اس لیے انہوں نے کہا کہ نبی تو نور سے پیدا ہوتے ہیں، بشر تو ہوتے ہی نہیں۔ تو بھائی! پھر قرآن بھی نور سے پیدا ہوتا ہے اور ایمان بھی نور سے پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اگر آپ کو سمجھ عطا فرمائے اصل میں اکثر مفسرین نے سمجھایا نور سے مراد بھی قران ہے اور کتاب مبین سے مراد بھی قرآن ہے۔ اگر ایک منٹ کے لیے مان لیا جائے بعض مفسرین کے قول کو کہ حضور پاک ﷺ کی ذات بھی نور ہے، تو کیا معنی ہے کہ جیسے قرآن نے روشنی پھیلائی ویسے میرے محمد مدنی ﷺ نے دنیا میں روشنی پھیلائی، لوگوں کو بتلادیا کہ یہ ایمان ہے اور یہ کفر ہے، یہ حلال اور یہ حرام ہے اور یہ جائز ہے اور یہ ناجائز ہے، بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراطِ مستقیم پر کھڑا کردیا ہے۔ اس سے مراد نبوت کی روشنی ہے، اس سے مراد اس علم کی روشنی ہے اور اس سے مراد ایمان کی روشنی ہے، وگرنہ یہاں اللہ نے بحث ہی نہیں کی ہے کہ میں نے نبی نور سے پیدا کیے ہیں یا میں نے انبیاء علیہم السلام کو خاک سے پیدا کیا ہے۔ یہ بحث جہاں جہاں بھی ذکر کی گئی وہاں اللہ نے واضح کردیا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا﴾ [یوسف:۱۰۹]

''اے میرے پاک نبی! ہم نے آپ سے پہلے نہیں بھیجے، مگر مرد نبی بھیجے ہیں۔''

یعنی بھیجا بھی انسان ہے اور انسانوں میں سے مرد کو نبی بنایا ہے، کسی عورت کو نبی نہیں بنایا۔ اور اس طرح فرمادیا کہ ہم نے جتنے نبی بھیجے ہیں وہ اولادِ آدم سے بھیجے ہیں۔ اسی طرح فرمادیا کہ آپ دنیا پر واضح کردیجیے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤى اِلَیَّ﴾ [الکھف:۱۱۰]

میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں، محمد بن عبداللہ ہوں، میرا باپ عبداللہ ہے اور میری ماں آمنہ ہے۔ میں بھی اپنے ماں کے بطن مبارک سے پیدا ہوا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی سے سرفراز فرمایا ہے۔

تو اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! جہاں جہاں مثالیں دی گئی ہیں وہاں ہمیں سمجھانا مقصود ہے۔ جیسے اللہ نے فرمایا: مومن زندہ ہے اور کافر مردہ ہے۔ تو کیا معنی ہے کہ آدمی مرنے کے بعد کوئی عمل نہیں کرسکتا، مرنے کے بعد وہ کہے گا کہ میں کلمہ پڑھتا ہوں۔ تو اس کا کیا فائدہ ہے؟ مرنے کے بعد کہے کہ میں نمازیں پڑھوں گا تو کیا فائدہ ہے؟ اب تو مر گیا، بات ختم ہوگئی۔ اگر زندہ ہے تو وہ توبہ بھی کرسکتا ہے، کفر و شرک سے بھی نکل سکتا ہے اور اللہ کو راضی بھی کرسکتا ہے۔ تو اللہ نے فرمایا کہ مومن کی مثال ایسے ہے جیسے زندہ ہو۔ زندہ آدمی تو پھر بھی کوئی نہ کوئی نفع حاصل کرسکتا ہے اور کافر کی مثال ایسے ہے جیسے مردہ ہو۔ جیسے مرنے کے بعد آدمی کو کوئی عمل نفع نہیں پہنچا سکتا، اسی طرح جب آدمی مر گیا تو اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کو والدین اور اولاد سے فائدہ پہنچتا ہے، اس کے لیے کوئی آدمی نفل پڑھے گا یا حج کرے گا تو اس کو فائدہ پہنچے گا، لیکن اب وہ خود بے چارہ نہ حج کرسکتا ہے، نہ نفل پڑھ سکتا ہے اور نہ وہ طواف کرسکتا ہے۔ تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے مثالیں عطا فرمائیں۔

اسی طرح جیسے فرمایا کہ کافروں کی مثال ایسے ہے جیسے ایک مردہ زمین ہو اور مسلمانوں کی مثال ایسے ہے جیسے ایک تروتازہ زمین ہو کہ اس میں جب پانی برستا ہے تو اس میں کھیتیاں اگتی ہیں، اس کے اندر سبزہ لگتا ہے، اس سے باغات نکلتے ہیں اور ایک بنجر شورزدہ زمین ہے، جب پانی گرتا ہے اس میں تو اور زیادہ کیچڑ کا باعث بنتا ہے، ہلاکت کا باعث بنتا ہے، کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ تو کیا معنی ہے کہ مومن کے ساتھ دلوں پر جب ہم قرآن کی بارش کرتے ہیں تو ان کے ایمان کو اور تازگی ملتی ہے، اس کا ایمان اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور کافر قرآن کا جوں جوں انکار کرتا ہے وہ جہنم کا زیادہ حقدار ہوتا چلا جاتا ہے۔

تو یہ تمام مثالیں دی گئیں کہ اللہ کے قرآن کو سمجھیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے دین و ایمان کو سمجھیں۔ جیسے کوئی محبت میں کہہ دے کہ سبحان اللہ کعبہ شریف نور ہے۔ اب اس کا معنی یہ تو نہیں کہ کعبہ نور سے بنا ہوا ہے۔ کعبہ تو پتھر سے بنا ہوا ہے، کعبہ اسی ایک کوٹھے مبارک کا نام ہے، اس کی تعمیر پہلے فرشتوں نے کی اور پھر حضرت آدم علیہ السلام نے کی اور اسی طرح پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی۔ اب کعبۃ اللہ پتھروں کا بنا ہوا ایک گھر ہے اور اس گھر میں یہ بھی نہیں...... نعوذ باللہ...... کہ اللہ تعالیٰ رہتے ہیں یا اس گھر کے اندر خدا کی رہائش ہے، بلکہ یہ محض ایک گھر ہے، اللہ نے نسبت

فرمادی کہ یہ میرا گھر ہے۔ کسی بندے کو اللہ فرمادیں کہ یہ میرا بندہ ہے تو اس کی شان اونچی ہو جاتی ہے، کسی گھر کو اللہ فرمادیں کہ یہ میرا گھر ہے تو اس کی شان اونچی ہو جاتی ہے، ورنہ تو تمام کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کا ہے۔

اللہ تعالیٰ ساری زمینوں کا مالک ہے، سارے آسمانوں کا مالک ہے، مکہ کا بھی مالک میرا اللہ ہے اور مدینہ کا مالک بھی میرا اللہ ہے، عرب کا مالک بھی اللہ ہے اور عجم کا مالک بھی اللہ ہے، لیکن اس مقام کو شرف مل گیا جس کی اللہ نے نسبت کردی کہ میرا گھر ہے۔ تو اب اس میں برکتیں بھی آگئیں، رحمتیں بھی آگئیں، اس کا دیکھنا بھی عبادت کا ذریعہ بن گیا۔ اس لیے حدیث میں آتا ہے کہ روزانہ ۱۲۰ رحمتیں نازل ہوتی ہیں: ساٹھ رحمتیں تو ان کو ملتی ہیں جو اللہ کے کعبہ کے طواف کے اندر مصروف ہوتے ہیں۔ اور فرمایا: ۴۰ رحمتیں ان کو ملتی ہیں جو نفل پڑھنے میں مصروف ہوتے ہیں یا نماز پڑھنے میں مصروف ہوتے ہیں اور ۲۰ رحمتیں صرف ان کو ملتی ہیں جو طواف بھی نہیں کر سکتے اور نفل بھی نہیں پڑھ سکتے، فرمایا: صرف میرے گھر کو دیکھتے رہیں ان پر بھی ۲۰ رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

[جامع الاحادیث للسیوطی، حدیث: ۲۷۱۰۸]

تو اب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک شرف بخش دیا ہے تو اس لیے آدمی محبت میں آکر کہتا ہے: سبحان اللہ! کعبہ شریف تو نور ہے۔ سبحان اللہ! مدینہ شرف تو ہماری آنکھوں کا نور ہے۔ یا جیسے آدمی اپنے باپ کو لکھ دیتا ہے: حضور پر نور! سبحان اللہ میرے والد میری آنکھوں کا نور ہیں۔ سبحان اللہ میری اولاد میری آنکھوں کے تارے ہیں۔ تو اب اولاد تارے نہیں بن جاتی، والد نور سے پیدا نہیں ہو جاتا، یہ نہیں ہو جاتا کہ کوئی مقام یا بزرگ نور بن جائے گا، بلکہ ایک تشبیہ ہے کہ جیسے نور ایک روشن ہونے والی چیز ہے۔ نور کا معنی ہوتا ہے خود بھی روشن ہو اور دوسروں کو بھی روشن کرنے والا ہو، یعنی روشنی پھیلے اور ہر چیز کو روشن کردے اس کو نور کہتے ہیں۔ اب جب اللہ کے نبی آئے تو نور ایمان پھیل گیا، نور نبوت کی روشنی آئی تو ظلمت مٹ گئے، اندھیرے چھٹ گئے، کفر اور شرک کو ختم کر دیا گیا، لات، ہبل اور منات کے جو پجاری تھے وہ اللہ کے دیوانے بن گئے، جو لوگ بتوں کے پروانے تھے وہ کعبہ کے پروانے بن گئے، جو لوگ حرام کھانے والے تھے وہ حلال کے عادی بن گئے، جو لوگ گناہ کرنے والے تھے وہ نیکیوں کے رسیا بن گئے، ان کی زندگیوں میں انقلاب آگیا، بھٹکے ہوؤں کو راستہ مل گیا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ یہ روشنیاں ہیں۔

اللہ کے قرآن کو سمجھیں کہ بعض اوقات آدمی محبت میں آکر ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ حدودِ ایمان سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو حدودِ ایمان میں رکھے۔ (آمین)

نور اور ضیاء میں فرق:

اللہ نے مثال بیان فرمائی کہ ان منافقوں کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص آگ جلائے۔ آگ کے اندر دو چیزیں ہوتی ہیں: ایک نور ہوتا ہے، یعنی جو خود بھی روشن ہو اور دوسروں کو بھی روشن کرنے والا ہو۔

اور ایک لفظ ضیاء ہے۔ ضیاء کا معنی ہوتا ہے ایسی روشنی جس میں حرارت ہو اور نور کہتے ہیں ایسی روشنی جو رحمت ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝﴾ [یونس:۵]

سورج ضیاء ہے، اس کی روشنی تیز ہے، اس کے اندر حدت ہے، زیادہ پھیلنے والی روشنی ہے، لیکن چاند کی روشنی میں رحمت ہے، اس کی روشنی میں وہ تیزی نہیں ہے۔ آپ چاندنی میں بیٹھیں گے تو لطف اندوز ہوں گے، کیونکہ چاندنی حدت پیدا نہیں کرتی ہے۔ جوں جوں سورج چڑھتا آئے گا اس طرح گرمی بڑھتی چلی جاتی ہے، اس لیے سورج کی روشنی کو ضیاء کہا گیا اور چاند کی روشنی کو نور کہا گیا۔

اور اسی لیے علماء نے فرمایا کہ نور اصل ہے، ضیاء اس سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی نور ہو گا تو اس سے روشنی آگے پھیلے گی، اگر نور ہی نہیں ہو گا تو ضیاء کہاں پھیلے گی؟ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾

[النور:۳۵]

”اللہ تمام آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال کچھ یوں ہے جیسے ایک طاق ہو جس میں چراغ رکھا ہو چراغ ایک شیشے میں ہو، شیشہ ایسا ہو جیسے ایک ستارا، موتی کی طرح چمکتا ہوا، وہ چراغ ایسے برکت والے درخت یعنی زیتون سے روشن کیا جائے جو نہ (صرف) مشرقی ہو نہ (صرف) مغربی ایسا لگتا ہو کہ اس کا تیل خود ہی روشنی دیدے گا۔ چاہے اسے آگ بھی نہ لگے، نور بالائے نور، اللہ اپنے نور تک جسے چاہتا ہے، پہنچا دیتا ہے، اور اللہ لوگوں کے

فائدے کے لیے تمثیلیں بیان کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

اپنی ذات کے ساتھ ضیاء کا لفظ استعمال نہیں فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں ہیں، بلکہ ساری کائنات اس کی محتاج ہے، اسی سے روشنی مانگنے والی ہے اور اسی سے ہدایت مانگنے والی ہے۔

منافقین کی مثال آگ کی روشنی سے کیوں دی؟

تو اب نار کے اندر دو چیزیں آگئیں:

1 ......ایک اس کے اندر روشنی ہوتی ہے۔ آگ جلائیں تو آگ سے بھی روشنی پیدا ہوتی ہے۔

2 ......دوسرا آگ کے اندر صفتِ احراق ہوتی ہے، یعنی ایک تو روشن کرنے والی صفت ہوتی ہے اور ایک جلانے والی صفت ہوتی ہے۔

اللہ نے فرمایا: ان منافقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی آگ کو روشن کرے اور جب آگ روشن ہو جائے اور جو اس کے اردگرد چیزیں ہیں ان کو روشن کرے تو اس روشنی میں وہ دیکھتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس روشنی کو بجھا دیا۔ جب روشنی کو بجھا دیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ﴿وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۷]

قرآن مجید جہاں کفر کے لیے ظلمت کا لفظ آئے گا تو وہاں ظلمات جمع کا صیغہ آئے گا، کیونکہ کفر ایک قسم کا نہیں ہوتا، بلکہ کفر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں: کوئی بتوں کا پجاری ہے، کوئی سورج کا پجاری ہے، کوئی تاروں کا پجاری ہے، کوئی قبروں کا پجاری ہے اور کوئی درختوں کا پجاری ہے، اس لیے فرمایا: ''ظُلُمٰتٌ''۔ اندھیرے بھی اتنے کہ تہہ در تہہ ہیں۔ ان کو ایسے اندھیروں میں چھوڑا کہ وہ نہیں دیکھ سکتے۔

ایک آدمی اگر پہلے ہی اندھیرے میں ہو تو پھر بھی کچھ نہ کچھ نظر آنے کی امید ہوتی ہے، لیکن روشنی کے بعد اندھیرا ہو جائے تو پھر کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کی چاند کی روشنی میں تصنیف:

امام بخاری رحمہ اللہ......جن کی کتاب ''صحیح البخاری'' پوری دنیا میں ایک عظیم کتاب ہے اور جس کو اللہ نے ایسا درجہ بخشا کہ قرآن کے بعد صحیح احادیث کا مجموعہ بخاری شریف ہے۔ انہوں نے بخاری شریف میں احادیث جمع کی ہیں......اور انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں ایک کتاب چاند کی روشنی میں لکھی، کیونکہ اور کوئی لائٹ میسر نہیں تھی۔

منافقین کے لیے اس مثال کا مطلب:

اس مثال کا مطلب یہ ہے کہ جب منافقوں نے ظاہری طور پر حضور ﷺ کے پاس کلمہ پڑھا: ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' اور کہنے لگے: ''نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ'' [المنافقون:۱] کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ تو گویا ایک روشنی میں وہ آ گئے، ان کو کلمہ پڑھنے کی روشنی ملی۔ لیکن چونکہ اندر کفر تھا، جب اللہ نے وہ نور ایمان کی روشنی بجھا دی تو وہ اسی طرح اندھیروں میں بھٹکتے رہے۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ مثال ان کے لیے نہیں ہے، کیونکہ وہ پہلے سے کافر تھے، وہ تو صرف دھوکہ دینے کے لیے آئے تھے، بلکہ یہ مثال ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے اور پھر مرتد ہو گئے، ان کے بارے میں قرآن مجید میں ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ [المنافقون:۳]

جب ایمان لائے تو انہیں ایمان کی روشنی ملی۔ پھر کفر کرنے کے بعد ایمان کی روشنی بجھ گئی، وہ اندھیروں کے اندر ہمیشہ کے لیے گمراہ بن گئے، لیکن اکثر مفسرین کرام کے نزدیک ان آیات کا تعلق منافقین کے ساتھ ہے۔ انہوں نے اگرچہ دھوکہ دینے کے لیے کلمہ پڑھا تھا، لیکن کلمہ کی روشنی تو ہے۔ تو اسی روشنی کی وجہ سے ان کی جانیں اور مال بچ گئے، وہ مال غنیمت میں شریک ہوتے رہے، مسلمانوں سے فائدہ اٹھاتے رہے، لیکن جب ان کا کفر کھل گیا تو ان کی مثال ایسے ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ﴿وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۷] وہ ایک ایسے اندھیرے میں آ گئے کہ بالکل دیکھ ہی نہیں سکتے۔ [ابن کثیر:۱/ ۵۳، الآیۃ: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا]

اللہ نے قرآن میں مثال دی ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ [البقرۃ:۱۷] ان کی مثال ایسے ہے جیسے کسی نے آگ جلائی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ منافقوں کا انجام آگ تھی، اس لیے مثال بھی آگ کے ساتھ دی گئی۔ اور پھر آگے اللہ نے فرمایا: ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ [البقرۃ:۱۷] یعنی اس آگ کی وجہ سے جو روشنی ہوئی تھی اللہ نے چھین لی۔ لیکن آگ کی دو صفتیں تھیں: ایک روشنی والی صفت تھی اور ایک جلانے والی صفت تھی۔ روشنی والی صفت تو اللہ نے چھین لی، لیکن جلانے والی صفت اللہ نے باقی رکھی کہ منافقوں کو وہی آگ جلائے گی۔

ابولہب کے نام کی مناسبت:

جیسا کہ میرے نبی سرکار ﷺ کے دشمن کی کنیت ابی لہب تھی، حالانکہ حضور ﷺ کا چچا ہے، حضور ﷺ کا قریبی عزیز ہے، لیکن اس کی اپنی برادری کے لوگ بھی اس کو ابولہب کہتے تھے۔ لہب کا معنی ہوتا ہے شعلہ، یعنی وہ اتنا خوبصورت تھا، اس کا رنگ اتنا گورا اور سرخ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ شعلہ چمک رہا ہے، لیکن اس کو ابوالنور نہیں کہا گیا، ابوضیاء نہیں کہا گیا اور اس کی کنیت کو ابوالقمر نہیں کہا گیا۔ قدرت خدا کی ہے کہ کنیت وہ آئی جو اس کو انجام نصیب ہونا تھا۔ کنیت ابولہب تھی اور قیامت میں بھی لہب (آگ کا شعلہ) ملے گا۔

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝١ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝٢ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٣ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝٤ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝٥﴾ [سورۃ اللھب]

اللہ نے فرمایا: جیسے کنیت ابولہب ہے تو نار بھی ذات لہب ہے۔ ہم نے اس کے لیے جہنم کی آگ بھڑکنے والی اور شعلوں والی تیار کر رکھی ہے۔ تو اس لیے کافروں کی تشبیہ نار کے ساتھ دی گئی۔

(حدیث) جیسے ایک روایت میں آتا ہے:

((اَلصَّلٰوةُ نُوْرٌ وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ.)) [صحیح مسلم، حدیث: ۲۲۳، باب: فضل الوضوء]

حضور ﷺ نے فرمایا: نماز نور ہے۔ تو نماز کو نور کیوں کہا گیا؟ کہ جیسے نور ہوگا، روشنی ہوگی تو منزل پر پہنچیں گے۔ جب آپ صحیح نمازی بنتے ہیں تو آپ اللہ کی طرف پہنچتے ہیں، کیونکہ نماز معراج مومن ہے۔

معراج کے لیے اسے راستہ چاہیے اور وہ راستہ اللہ کی عبادت اور نماز ہے۔ اس لیے فرمایا: ''اَلصَّبْرُ ضِيَاءٌ'' جو صبر کرنے والا ہے روشنی اس کے لیے اور زیادہ پھیلنے والی ہے۔ اب صبر کی تشبیہ ضیاء کے ساتھ دی گئی کہ صبر یا تو مصیبت کے وقت ہے تو جب مصیبت کا وقت ہوگا آدمی کو تکلیف تو ہوگی۔ جیسے ضیاء روشنی تو ہوتی ہے، لیکن حدت بھی ہوتی ہے۔ اس لیے صبر تو تب ہوگا جب کوئی تکلیف ہوگی، کوئی حدت اور گرمی ہوگی۔ اور نماز کو نور کے ساتھ تشبیہ دی ہے ''اَلصَّلٰوةُ نُوْرٌ وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ'' اسی طریقے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی مقامات پر فرمایا۔ اب دیکھیں کہ آگے فرمایا:

﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝١٨﴾ [البقرۃ:۱۸]

اندھے، گونگے اور بہرے کی مثال کیوں دی گئی؟

مطلب یہ ہے کہ اندھیرا ہے اور اندھا ہے وہ تو آواز سن لے گا کہ بھائی! ادھر نہ جانا، آگے کنواں ہے۔ تو وہ کنویں میں گرنے سے بچ جائے گا، وہیں بیٹھ جائے گا۔ لیکن اگر اندھا بھی ہو اور بہرہ بھی ہو تو وہ کیا سنے گا؟ اگر کوئی آدمی اندھا بھی ہے، بہرہ بھی ہے، لیکن بول سکتا ہے۔ وہ اگر اندھیرے میں آجائے، پکارے گا تو کوئی ہاتھ پکڑنے والا بھی آجائے گا لیکن اندھا بھی ہو، بہرہ بھی ہو اور گونگا بھی ہو، یعنی بول بھی نہ سکتا ہو اور پھر ہو بھی اندھیروں کے اندر تو اس کی ہلاکت میں کیا شبہ رہ جاتا ہے......؟ حالانکہ کافر سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے اور بولتا بھی ہے، بلکہ بعض کافر تو مسلمانوں سے بھی بولنے میں تیز ہیں، سننے میں زیادہ تیز ہیں اور دیکھنے میں بھی زیادہ تیز ہیں، لیکن اللہ نے مثال دی کہ وہ اندھے، بہرے اور گونگے ہیں۔ قرآن نے دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کردی۔ اللہ نے فرمایا:

﴿وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾[الاعراف:۱۷۹]

ان کی آنکھیں تو ہیں، لیکن یہ ہدایت والا راستہ نہیں دیکھ رہے۔ چاند پر پہنچ رہے ہیں، لیکن چاند کے خالق اور مالک کو نہیں پہچان رہے۔ یہ زمین کے طبقات میں تو بحثیں کر رہے ہیں، لیکن زمین کے خالق اور مالک کا انکار کر رہے ہیں۔

﴿وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ﴾[الاعراف:۱۷۹] ان کے کان بھی ہیں، لیکن یہ سنتے نہیں۔ یعنی بڑی دور کی باتیں سن لیتے ہیں، لیکن اللہ کا قرآن اور حق کی باتیں نہیں سن سکتے۔

اس لیے ایک بزرگ نے مثال دی کہ ''خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود چوں بیاید ہنوز خر باشد'' فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب گدھے پر مکہ تشریف لائے تو مکہ میں آنے کے بعد وہ گدھا کوئی ترقی تو نہیں کر گیا، وہ گدھا ہی رہا۔ جیسے وہ کتنے بدبخت ہیں جو مکہ میں آنے کے بعد بھی بے نماز ہیں، اللہ کے کعبے سے محروم ہیں، طواف کی دولت سے محروم ہیں، قرآن پڑھنے سے محروم ہیں، صحیح عقیدے سے محروم ہیں، اللہ کی توحید سے محروم ہیں، کتنے لوگ ہیں جو اللہ کے گھر میں آنے کے بعد اب بھی نماز نہیں پڑھتے، اللہ کے گھر میں آکر جماعت میں شرکت نہیں کرتے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے گھر میں آکر رہنا ان کو ایسے لگتا ہے جیسے کسی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ معاف

فرمائے! کتنے لوگ ہیں جو مدینہ منورہ کے گنبدِ خضراء کے سامنے کھڑے ہو کر کپڑا بیچ رہے ہیں اور نماز سے محروم ہیں، سگریٹ ہاتھ میں جلائی ہوئی ہے اور گالیاں بک رہے ہیں، اللہ کے نبی کے شہر میں اور مسجد نبوی میں رہتے ہوئے عبادت سے محروم ہیں، کتنے لوگ ہیں جو مکہ اور مدینہ کے دیکھنے کے باوجود واپس جانے کے بعد اسی طرح قبر کے سجدوں میں مشغول ہیں، اسی طرح قبر کے طواف میں مشغول ہیں، اسی طرح قبر پر نذر و نیاز اور چڑھاوے چڑھانے میں معروف ہیں۔

سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا روضہ دیکھنے کے باوجود ان کے دشمن ہیں، سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا مرتبہ دیکھنے کے باوجود بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے گستاخ ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے! آنکھیں ان کی بھی ہیں، کان ان کے بھی ہیں اور دل و دماغ ان کے بھی ہیں، لیکن جب حق راستہ نہ ملے تو وہ گویا دیکھنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ﴾ ان کی مثال ایسے ہے جیسے جانور، بلکہ فرمایا ﴿بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾ [الاعراف: ۱۷۹] غیر اللہ کو پوجنے والا، غیر اللہ کی عبادت کرنے والا وہ تو جانور سے بھی گیا گزرا ہے، کیونکہ جانور تو پھر بھی کبھی راستہ پر آجاتا ہے۔ آپ گھوڑی پر سوار ہو جائیں اور آپ اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیں تو گھوڑی خود بخود تمہیں راستے پر لے جائے گی۔ اگر آپ منزل بھول جائیں اور آپ گھوڑی پر سوار ہیں، لگام چھوڑ دیں تو گھوڑی منزل پر پہنچا دے گی اگر اس نے منزل دیکھی ہو۔ تو اسی طرح سب سے خسیس جانور کتا ہے۔ اس کتے کو لے کر آپ بیس میل دور جنگل میں چھوڑ آئیں، وہ دوسرے دن ان کے دروازے پر بیٹھا ہوگا۔ اسی طرح کتا اگر پاگل بھی ہو جائے تو اپنے مالک کو نہیں کاٹتا۔ اللہ نے فرمایا: جو مجھے چھوڑ کر غیروں کو سجدہ کرتے ہیں ان کی مثال کتے سے بھی بدتر ہے کہ کتا بھی اپنے مالک کو پہچانتا ہے، لیکن یہ خدا کو نہیں پہچانتے کہ کبھی مجھے رکوع کرتے ہیں اور کبھی غیروں کو رکوع کرتے ہیں کبھی مجھے سجدہ کرتے ہیں اور کبھی غیروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ میرے آگے بھی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور بندوں کے آگے بھی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھ سے بھی آکر ''یا اللہ! یا اللہ!'' کہہ کر مانگتے ہیں اور ''یا دستگیر!'' کے نعرے بھی لگاتے ہیں۔ فرمایا: یہ تو اپنے مالک کو بھی نہیں پہچان رہے، ان سے تو وہ خسیس جانور بہتر ہے جو اپنے مالک کو پہچانتا ہے۔

منافقوں کی نظر صرف دنیا پر ہے:

چاند اور سورج طلوع ہوں تو پوری دنیا میں روشنی ہوتی ہے، لیکن آپ اگر آگ جلائیں گے تو اس کی روشنی صرف

اس کے اردگرد ہوگی۔ اس لیے فرمایا ﴿فَلَمَّآ اَضَاۗءَتْ مَا حَوْلَهٗ﴾ [البقرۃ: ۱۷] یعنی جب اس نے اپنے اردگرد کو روشن کرلیا تو منافقوں کی نظر بھی صرف اردگرد پر ہے، پورے عالم پر نہیں ہے۔ ان کی نظر بڑی محدود ہے، وقتی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ ہم کلمہ پڑھ کر مسلمانوں کو دھوکہ دے دیں کہ مسلمانوں کو پتہ نہیں چلے گا، حالانکہ اگر ان کو پتہ چل جاتا کہ مسلمانوں کے نبی سے اللہ کی وحی کا تعلق ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں ہمارے نفاق کے بارے میں باخبر کر دے گا تو وہ کبھی ایسی حرکت نہ کرتے۔ اس میں یہ بھی اشارہ کیا گیا کہ وقتی طور پر ان کی اردگرد پر نظر ہے، لیکن جب ہم نے وہ روشنی چھین لی ﴿وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۝۱۷﴾ [البقرۃ: ۱۷] اور پھر ہم نے ان کو چھوڑا ایسے ظلمات میں کہ وہ دیکھ نہیں سکتے۔ ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۝۱۸﴾ [البقرۃ: ۱۸] وہ ایسے ہیں کہ صرف آنکھوں کے اندھے نہیں ہیں ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۝۴۶﴾ [الحج: ۴۶] بلکہ کافر ایسے اندھے ہیں کہ دلوں کے اندھے ہو گئے۔

حجاج اور ایک نجومی:

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ حجاج بن یوسف کے سامنے ایک نجومی لایا گیا۔ حجاج بن یوسف نے اس کا امتحان لینا چاہا اور کچھ کنکریاں منگوائیں اور ان کو گن کے اپنے ہاتھ میں بند کرلیا اور نجومی کو کہا کہ بتاؤ میرے ہاتھ میں کتنی کنکریاں ہیں؟ نجومی نے ضرب تقسیم کی اور اس کے بعد اس نے کہا کہ آپ کے ہاتھ میں بیس کنکریاں ہیں۔ اب حجاج بن یوسف نے کھولا اس نے بالکل صحیح بتلادیا۔ حجاج بڑا پریشان ہوا کہ یہ نجومی تو بڑا عجیب ہے!! اس نے تو بتلادیا کہ میرے ہاتھ میں بیس کنکریاں ہیں۔ حجاج نے اسے کہا کہ باہر جاؤ۔ جب وہ باہر چلا گیا تو حجاج نے کنکریوں کی ایک مٹھی بھر لی اور کہا کہ اس کو بلاؤ اور کہا کہ اب حساب کر کے بتلاؤ میرے ہاتھ میں کتنی کنکریاں ہیں؟ اس نے حساب کیا اور کہا کہ پچیس ہیں۔ حجاج نے کہا غلط ہے۔ اس نے پھر حساب کیا اور کہا بیس ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ بھی غلط ہیں تو اس نے پھر حساب کیا، کہا: اٹھارہ ہیں۔ حجاج نے کہا غلط ہے۔ نجومی نے کہا کہ اچھا حجاج! ایک بات بتاؤ کہ جو تمہارے ہاتھ میں ہیں، تمہیں بھی پتہ ہے کہ وہ کتنی ہیں؟ حجاج نے کہا کہ مجھے پتہ نہیں ہے۔ تو اس نے کہا کہ بس یہی بات ہے۔ پہلے جو تیرے ہاتھ میں تھیں وہ تم نے گن کر رکھی تھیں، میرے حساب میں وہ بات آگئی۔ ان کا تمہیں پتہ نہیں، یہ تو علم غیب ہے تو میں علم غیب کو کیسے بتلا سکتا ہوں؟ اس عدد کا چونکہ تمہیں علم تھا تو میں نے حساب سے وہ عدد

نکال لیا، لیکن اس کا تمہیں بھی علم نہیں ہے، اس کو اللہ کے سوا کوئی جان بھی نہیں سکتا ہے۔

اس لیے کبھی کسی عدد کا بتلا دینا وہ حساب سے بھی ہو سکتا ہے، کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہوتی۔ لوگوں نے آج کل اس کو کرامت سمجھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے پھونک ماری تو آنکھ نکل آئی۔ یہ تو جادوگر بھی کر سکتا ہے۔ اس نے کہا: ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ایسے عاشق ہیں کہ آگ پر چلتے ہیں۔ تو آگ پر چلنا کوئی ولایت ہے یا یہ جہنمیوں کی علامت ہے؟ آگ میں جہنمی جلیں گے یا مومن جلیں گے؟ اللہ تعالیٰ آگ سے مسلمانوں کو بچا لے، اللہ تعالیٰ جہنم کے انگاروں سے مسلمانوں کو بچا لے۔ وہ تو اللہ نے دنیا میں دکھلا دیا کہ اگر صحابہ کی دشمنی کرو گے تو دنیا میں بھی یہی ہے اور آخرت میں بھی یہی ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک فیصلہ فرما دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں جو جادوگر آئے تھے انہوں نے رسیوں کے سانپ بنا دیے تھے تو کیا وہ سارے بزرگ تھے؟ اصل جب بزرگی کا امتحان کرنا ہو تو اس کو سنت کی عینک سے دیکھو کہ وہ غلام مصطفیٰ ہے؟ اگر وہ سنت کا متوالا ہے تو ہمارا مرشد ہے، ہمارا پیر ہے، ہمارا بزرگ ہے اور ہمارا سردار اور ہمارے سروں کا تاج ہے۔ اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا مخالف ہے تو دجال تو ہو سکتا ہے، وہ گمراہ تو ہو سکتا ہے، مرشد نہیں ہو سکتا۔ مرشد کا معنی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں چلنے والا، سر سے لے کر پیروں تک کا نقشہ اتباع محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا متوالا ہو اور اسی کا راستہ بتاتا ہو۔

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ [البقرة:١٧]

یہ مثال ان منافقوں کی ہے جنہوں نے گمراہی کو محبوب رکھا ہدایت کو چھوڑ کر، یعنی اندھیرے کو محبوب رکھا روشنی کو چھوڑ کر اور سیدھے راستہ کو چھوڑ کر گمراہی کو محبوب رکھا۔ اس مثال میں یہ بات دلالت کرتی ہے کہ وہ ایمان لے آئے اور اس کے بعد کفر کیا۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے اور فرمایا کہ یہ تشبیہ بہت زبردست مناسب ہے، کیونکہ انہوں نے ایمان کے ساتھ نور کی روشنی حاصل کی، لیکن اپنے نفاق کی وجہ سے پھر اندھیرے میں آگئے۔ اب وہ ایک زبردست حیرت اور پریشانی میں ہیں۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا: فرق یہ ہوا کہ وہ ایمان تو لائے، کلمہ بھی پڑھا، لیکن نفاق اختیار کیا تو کلمہ کی وجہ سے جو روشنی ملی تھی وہ ختم ہوگئی۔ لیکن ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: انہوں نے تو کلمہ پڑھا ہی نہیں، وہ تو ایمان لائے ہی نہیں، کیونکہ قرآن مقدس میں یہ موجود ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾[البقرۃ:۸]

تو اللہ تعالیٰ نے یہ مثال بیان کی ہے ان کے کفر اور نفاق کے عالم میں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ اس بات میں دونوں قول جمع ہو جاتے ہیں۔ [ابن کثیر:۱/ ۵۳، الآیۃ: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا]

منافقین کو قیامت کے دن نور کی تلاش:

حدیث مبارک میں آیا ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ بعض لوگوں کا نور ایمان قیامت والے دن ایسے ہوگا کہ زمین سے لے کر آسمان تک نور کی شعائیں ہوں گی، بعض لوگوں کا نور ایسے اونچا ہوگا جیسے مسجد کے مینار اونچے ہیں، بعض لوگوں کا نور ایمان ایسے ہوگا جیسے کھجور کا درخت ہوتا ہے اور بعض لوگوں کا نور ایمان ان کے قد و قامت کے برابر ہوگا۔ اور ادنیٰ مومن جو کم درجے کا ایمان والا ہوگا اس کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کے آگے روشنی ہوگی۔ یعنی وہ بھی آہستہ آہستہ راستہ پکڑے گا۔ اور اسی روشنی میں آ کر وہ پل صراط سے گزریں گے، اور منافقین کو بھی وہاں نور ملے گا، لیکن وہ نور ایسے ہوگا کہ وہ مسلمانوں کی روشنی میں آنا چاہیں گے۔ وہ کہیں گے: ٹھہرو بھائی ٹھہرو!

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۚ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۚ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾

[الحدید:۱۳]

ہم تمہاری روشنی سے کچھ لینا چاہتے ہیں تو ان کو حکم ہوگا کہ تم پیچھے لوٹ جاؤ اور تم وہاں سے جا کر نور لے آؤ۔

مفسرین نے فرمایا کہ پیچھے لوٹنے کا معنی ہے کہ جو جگہ معین تھی، جہاں سے سب کو نور ملنا شروع ہوا تم بھی وہاں سے جا کر لے آؤ۔

اب مفسر فرماتے ہیں کہ کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ جماعت کا ذکر کر کے ان کو واحد سے تشبیہ دی جاتی ہے، جیسے فرمایا:

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ﴾[البقرۃ:۱۷]

ان کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص نے آگ جلائی۔ لہٰذا کبھی جماعت کو تشبیہ ایک سے بھی دے دی جاتی ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَإِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَىٰ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوكُم بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ أَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۚ أُولَٰئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿١٩﴾﴾ [الاحزاب:١٩]

منافق آپ کی طرف ایسے دیکھتے ہیں یعنی آنکھیں پھیرتے ہیں جیسے ایک مرنے والے کی آنکھیں پھری ہوئی ہیں کہ منافقوں کو ہر وقت خوف تھا کہ ابھی ہمارا راز کھل جائے گا...... ابھی ہمارا راز کھل جائے گا۔

اس آیت میں بھی ﴿يَنظُرُونَ إِلَيْكَ﴾ جمع کا صیغہ آیا، لیکن تشبیہ ایک سے ہے ﴿كَالَّذِي يُغْشَىٰ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ﴾

بعض علماء نے فرمایا "مَثَلُهُمْ" کا معنی ہے کہ ان کا قصہ ایسے ہے جیسے اس آگ والے کا قصہ اور آگ جلانے والا تو ایک ہوتا ہے۔

بعض نے فرمایا کہ آگ جلانے والا ایک ہوتا ہے، لیکن وہ ساری جماعت کے کام آتی ہے، اس لیے ایک سے تشبیہ دی گئی۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں "اَلَّذِیْ" "اَلَّذِیْنَ" کے معنی میں ہے، کیونکہ پہلے "مَثَلُهُمْ" ہے اور وہ جمع ہے، اس لیے آگے "اَلَّذِیْ" "اَلَّذِیْنَ" کے معنی میں ہے۔

ان آیات میں پہلے جمع کا صیغہ ہے پھر مفرد کا صیغہ ہے اور آگے پھر جمع کا صیغہ ہے: ﴿فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ﴾ مفرد ہے۔ ﴿ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ﴾ ﴿فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾﴾ جمع کا صیغہ ہے۔ [ابن کثیر: ١/ ٥٣، الآیۃ: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا]

منافق کون سے اندھیروں میں ہیں؟

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾﴾ [البقرة:١٨] جمع ہے۔ یہ کلام کی بلاغت اور فصاحت ہے۔ ﴿ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ﴾ [البقرة:١٧] اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ گیا اور وہ اندھیرے: کفر، نفاق اور شک کے اندھیرے ہیں۔ ﴿لَّا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾﴾ [البقرة:١٧] یعنی وہ خیر کے راستے کی طرف ہدایت نہیں پا سکتے۔ اور اس کے بعد حالت یہ ہے ﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾﴾ [البقرة:١٨] حضرت سدی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ قول نقل کیا ہے ﴿فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ﴾ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا کہ جب

حضور ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہود کے کچھ لوگ اسلام میں داخل ہو گئے، پھر انہوں نے منافقت اختیار کی۔ان کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی آدمی اندھیرے میں ہو ﴿اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ﴾ آگ روشن کرے ﴿فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ﴾ پھر اس آگ کی روشنی کے اندر اس کو واضح ہو جائے کہ یہاں کانٹا ہے، یہاں گندگی ہے۔اب اس نے جب دیکھ لیا اور پہلے وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کن چیزوں سے بچنا ہے اور کیسے جانا ہے کہ وہ آگ بجھ گئی۔تو اب اندھا ہو کر بیٹھ گیا کہ کیسے گزروں اور کس راستہ سے گزروں؟ تو یہ اس منافق کی مثال ہے جو پہلے شرک میں مبتلا تھا، پھر اسلام لے آیا، پھر اس نے پہچان لیا کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے؟ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ نور سے مراد ان کا ایمان ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایمان نور ہے۔

[ابن کثیر: ۱/ ۵۳، الآیۃ: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ...]

ایمان کے نور سے کیا نظر آتا ہے؟

نور کا معنی تھا کہ خود بھی روشن ہو اور اردگرد کو بھی روشن کر دے۔تو جن لوگوں کو اللہ نے نورِ ایمان سے منور کیا ہے ان کو پتہ ہے کہ ہم نے اللہ کی عبادت کرنی ہے، اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنا ہے، اولیاء اللہ کی کرامت اور ولایت کا اقرار کرنا ہے اور یہ چیزیں ہمارے لیے حلال ہیں اور یہ چیزیں ہمارے لیے حرام ہیں۔ان کے لیے اب روشنی ہو گئی۔

دیکھیں کہ انسان اپنی عقل سے تو کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا، کیونکہ عقل ناقص ہے۔اگر کوئی آدمی عقل سے فیصلہ کرتا تو اس کے لیے بھی بہن حلال ہوتی اور دوسرے کی لڑکی حرام ہوتی، کیونکہ وہ اس کا اپنا خون ہے، اپنے گھر میں پیدا ہوئی ہے، اپنے گھر میں جوان ہوئی ہے، اس کی شرافت کا اور اس کی پاکی کا اس کو پتہ ہے۔لیکن اسلام نے بہن سے نکاح کو حرام کیا اور دوسری عورت کو حلال کیا۔اب یہ چیزیں اس کو اسلام میں ہی سمجھ آ سکتی ہیں، یہ اس کو اپنی عقل اور فکر سے سمجھ نہیں آ سکتیں۔یہی ہوتی ہے کہ جب آدمی کو نورِ ایمان نصیب ہو جاتا ہے تو آدمی گمراہیوں سے اور اندھیروں سے بچ جاتا ہے۔جب نورِ ایمان چھن جاتا ہے تو اب وہ اندھیرے میں دھکے کھا رہا ہے، کبھی کچھ کر رہا ہے اور کبھی کچھ کر رہا ہے۔

دیکھیں! ایک آدمی عمرہ کرنے کے لیے آتا ہے۔اگر اس کو عمرہ کے مسائل کا پتہ ہو تو گویا وہ روشنی میں ہے۔

منافق کی حالت:

عطاء الخراسانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ منافق کی مثال ایسے ہے کہ جیسے ایک آدمی دیکھتا ہے اور پھر رک جاتا ہے، پھر

دیکھتا ہے اور پھر رک جاتا ہے۔ منافق کو بھی کبھی نظر آتا ہے کہ اسلام تو سچا ہے، ان کی بات تو ٹھیک ہے، اللہ کا نبی سچا ہے، لیکن پھر اس پر دل کا اندھا پن غالب آجاتا ہے تو جیسے آگ والے روشنی نظر آئی اور کبھی نظر نہ آئی۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نور سے مراد یہ ہے کہ جب انہوں نے کلمہ پڑھا "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" تو اب مسلمانوں کے ساتھ تمام معاملات میں شریک ہو گئے، لیکن جب مرے تو کفر پر مرے۔

حضرت سعید رحمہ اللہ نے ابوقتادہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اس طرح سے اس کا خون بھی بچ گیا اور مال بھی بچ گیا۔ مسلمانوں نے سمجھا کہ ہمارا مسلمان ہے۔ جب موت کا وقت آیا تو نور ایمان چھن گیا، کیونکہ ان کے دلوں میں کوئی ایمان کی حقیقت نہیں تھی۔ اندھیرے کا معنی ہے کہ اللہ نے ان کو عذاب میں ڈالا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے حق کو دیکھا تو ظلمت اور کفر سے نکل آئے اور کلمہ پڑھ لیا، لیکن اپنے نفاق کی وجہ سے انہی کفر کے اندھیروں میں آگئے اور ان کو ہدایت و حق کا راستہ نظر نہیں آتا۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اندھیرے سے مراد ان کا نفاق ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٰتٍ﴾ کا معنی یہ ہے کہ منافق جب مرتا ہے تو اس کے اعمال کا اندھیرا اور اس کے کفر و نفاق کا اندھیرا ہوتا ہے، کیونکہ اس کا کوئی اچھا عمل تو ہے ہی نہیں جو اس کے کام آسکے، یا اس کے کلمہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کی تصدیق کر سکے۔ تو فرمایا ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۸] وہ اسلام کی طرف لوٹ نہیں سکتے۔

اور حضرت ابوقتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ کہ اب نہ تو وہ توبہ کریں گے اور نہ اسلام کی طرف لوٹیں گے، بلکہ وہ کفر کے اندھیروں میں مر جائیں گے۔

[ابن کثیر: ۱/ ۵۴، الآیۃ: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا]

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِيٓ آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكٰفِرِينَ ﴿١٩﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَآ أَضَآءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ ۙ وَإِذَآ أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾

یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے بادل سے زور سے مینہ پڑ رہا ہو، اس میں اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی ہے۔ یہ کڑک کے مارے زور سے موت کے ڈر سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دیتے ہیں۔ اور اللہ کافروں کو گھیرنے والا ہے۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں اچک لے۔ جب وہ ان پر چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں بھی چھین لے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

منافقین کے لیے دوسری مثال:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں بھی ایک مثال ذکر فرمائی ہے جو منافقین کے احوال کے متعلق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں منافقین کے لیے دو مثالیں ذکر فرمائیں ..... کیونکہ مثال کے ذریعہ بات کا سمجھنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔...... ایک مثال کا تعلق نار سے ہے اور ایک مثال کا تعلق پانی سے ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک مثال کا تعلق زمین سے ہے اور ایک مثال کا تعلق آسمان سے ہے۔ پہلی مثال گزر چکی ہے، اب اللہ تعالیٰ دوسری مثال بیان فرمار ہے ہیں ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ﴾۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یا مثال اس بارش کی یا پانی کی جو آسمان سے ہے۔ "صَيِّبٍ" مطر کو، بارش کے پانی کو کہتے ہیں۔ اور "مِّنَ السَّمَآءِ" جو آسمان سے اترے۔ ﴿فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ﴾ اور پھر اس بارش میں اندھیرے بھی ہیں، اس بارش میں کڑک بھی ہے اور اس بارش میں بجلی کی چمک بھی ہے۔ ﴿يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِيٓ آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ﴾ انگلیوں کو کانوں میں ڈالتے ہیں اس کڑک کی وجہ سے، موت کے ڈر سے۔ ﴿وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكٰفِرِينَ ﴿١٩﴾﴾ اور اللہ تعالیٰ احاطہ فرمانے والے ہیں کافروں کا۔

اب اللہ تعالیٰ نے یہاں جو مثال دی ہے اس کا تعلق پانی کے ساتھ ہے۔ فرمایا ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ﴾ "أَوْ" کا استعمال شک کے لیے ہوتا ہے۔ تو یہاں کیا شک ہے کہ جس کی وجہ سے یہاں "أَوْ" کا استعمال کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے

کہ ''اَوْ'' کا استعمال ہمیشہ شک کے لیے نہیں ہوتا، کبھی کبھی ''اَوْ'' بمعنیٰ ''و'' ہوتا ہے۔ جیسا قرآن پاک میں آیا ہے ﴿مِنۢ بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ اٰبَآئِكُمْ﴾ [النور:٦١] تو مطلب یہ ہے کہ اپنے گھر سے یا باپ کے گھر سے تو وہاں بھی ''اَوْ'' بمعنیٰ ''و'' ہے، جیسے فرمایا ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ [البقرۃ:٧٤]۔ اور کبھی برابری کے لیے ہوتا ہے، جیسا کہ محاوراتِ عرب میں کہتے ہیں ''جَالِسِ الْحَسَنَ أَوِ ابْنَ سِيْرِيْنَ'' مطلب یہ ہے کہ حضرت حسن رحمہ اللہ کے درس میں بیٹھو یا ابن سیرین رحمہ اللہ کے درس میں بیٹھو، علم کا فائدہ برابر ملے گا۔ تو یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ﴾ یعنی چاہے پہلی مثال سے منافقوں کو تشبیہ دو یا اس مثال سے منافقوں کو تشبیہ دو، دونوں مثالوں میں سے جو چاہو منطبق کرلو۔

اور تشبیہ کبھی تشبیہ بالمفرد ہوتی ہے اور کبھی تشبیہ بالمرکب ہوتی ہے، یعنی کبھی تو آپ تشبیہ دیں گے ایک کے ساتھ، جیسے محاورات میں کہتے ہیں ''زَيْدٌ كَالْأَسَدِ'' (زید شیر کی طرح ہے) تو اب صرف شیر کی بہادری میں تشبیہ دی ہے کہ زید بہادر ہے، یہ معنیٰ نہیں ہے کہ اس کو شیر سے تشبیہ دی ہے تو اس تشبیہ سے یہ سمجھا جائے کہ وہ حیوان ہے، اس کی چار ٹانگیں ہیں اور یہ بھی لوگوں کو کھا جاتا ہے۔ تو یہ تشبیہ اس کی تمام صفات سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کی کسی ایک چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/٥٦، الآیۃ: أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ]

مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ کا واقعہ:

جیسے حضرت ہزاروی صاحب رحمہ اللہ ...... اللہ ان کی قبر پر رحمت فرمائے! پرانی بات ہے...... ایک جلسہ میں تشریف لے آئے...... ہمارے علاقوں میں پہلے تعارف کرانے کا رواج ہوتا ہے کہ کون صاحب تقریر کریں گے؟...... جس آدمی نے تعارف کرایا تو اس نے کہا کہ...... ماشاءاللہ...... اب آپ حضرات کے سامنے مجاہدِ ملت اور شیرِ سرحد ہزاروی صاحب تقریر فرمائیں گے۔ چنانچہ جب وہ سٹیج پر تقریر کے لیے تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ عجیب بات ہے کہ اس نے تعارف کرایا کہ مجاہدِ ملت۔ ملت کا مجاہد اور میں نے تو کبھی مکھی بھی نہیں ماری تو میں کیسے مجاہد بن گیا؟ مجاہد تو وہ ہوتا ہے جس نے کبھی جہاد کیا ہو۔ تو ایسے تشبیہ دینا اور بلاوجہ مجاہد بنا دینا، حالانکہ میں نے کبھی جہاد ہی نہیں کیا۔ ہاں! جہاد باللسان تو علیحدہ بات ہے۔ اور انہوں نے کہا کہ اس نے میری دوسری تعریف کی ہے کہ میں سرحد کا شیر ہوں۔ اللہ نے مجھے انسان بنایا ہے اور اس شریف آدمی نے مجھے حیوان بنا دیا، حالانکہ ایک حیوان کا

انسان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝﴾ [التین: ۴]

اللہ نے سب سے احسن طریق پر جس کو پیدا فرمایا وہ انسان کو پیدا کیا ہے اور پھر انسان ایک ایسی چیز ہے جو اشرف المخلوقات ہے اور اس سے نکال کر آدمی کسی کو جنگل کا شیر بنا دے تو مجھے سمجھ نہیں آیا کہ انہوں نے میری تعریف کی ہے یا انہوں نے میری شکایت کی ہے؟

بڑوں کی شان اور بڑوں کے لیے طرزِ تخاطب:

اس لیے ہمیشہ ایک حد ہونی چاہیے کہ جو حدود ہیں اور جو صفات ان میں منطبق ہوتی ہیں اتنی صفات کا اظہار کیا جائے۔ آپ سارے قرآن کو پڑھ لیں اور آپ ساری احادیث مبارکہ کا مطالعہ کر لیں، آپ حیران ہوں گے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پیغمبروں سے خطاب فرمایا، حضور ﷺ نے اپنے صحابہ سے خطاب فرمایا، صحابہ ؓ اپنے پاک پیغمبر، خاتم الانبیاء، حبیب کبریا ﷺ سے مخاطب ہوئے، حالانکہ تمام کائنات میں حضور ﷺ سے زیادہ شان والا نہ پیدا ہوا اور نہ پیدا ہوگا اور صحابہ آئے اور سلام کیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! فلاں حکم ہمیں بتلا دیں۔ اور نام کے ساتھ ندا کر رہے ہیں۔ اور اسی طرح صحابہ ؓ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں "مَاذَا رَأْيُكَ؟ يَا عُمَرُ!" (اے عمر! تمہاری اس بات میں کیا رائے ہے؟) عبداللہ! تمہاری اس بات میں کیا رائے ہے؟ "مَاذَا قَالَ عَبْدُاللهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ؟" (عبداللہ بن مسعود کی اس بات میں کیا رائے ہے؟) حالانکہ وہ اتنے بڑے شان والے لوگ ہیں کہ ساری دنیا کے اولیاء ایک پلڑے میں رکھ دیں اور میری مدنی کا کوئی ایک صحابی ایک پلڑے میں رکھ دیں تو ایک صحابی بھاری ہو جائے گا، ساری دنیا کے اولیاء مل کر بھی ایک صحابی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعود ؓ ایک کھجور پر چڑھنے لگے۔ میرے آقا سرکار مدینہ ﷺ بھی موجود تھے، صحابہ ؓ بھی موجود تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی پنڈلیاں مبارک بڑی پتلی تھیں۔ ایک صحابی نے جب دیکھا، اس کو پنڈلیاں نظر آئیں تو وہ ذرا مسکرا دیئے۔ حضور پاک ﷺ نے اس صحابی کو دیکھ کر فرمایا:

((تَعْجَبُوْنَ مِنْ دِقَّةِ سَاقَيْهِ!؟))

''اچھا عبداللہ بن مسعود کی پتلی پنڈلیاں دیکھ کر ہنس رہے ہو!!''
تمہیں پتہ ہے کہ یہ پنڈلی اگر قیامت والے دن ایک پلڑے میں رکھی جائے تو ساری دنیا سے بھاری ہو جائے۔
[دلائل النبوۃ: ۲/۲۹۹]

اتنا بڑی شان ہے اور اتنی بڑی عظمت ہے، لیکن القاب کی ایک حد ہے۔ یہی مصیبت اور مشکل ہے جب ہم لوگ حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے عقیدے برباد ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے! اب دیکھیں کہ نعرے آگئے، پہلے صرف اللہ کی عظمت کا نعرہ تھا، پھر حضور ﷺ کا نعرہ آگیا، اس کے بعد لوگوں نے پیر کا بھی نعرہ بنا لیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی نعرہ بن گیا۔ اگر وہی عظمت جو اللہ کی ہے اس کو غیر اللہ میں ثابت کیا جائے تو شرک ہے۔ اور شرک کا معنی یہی ہوتا ہے کہ جو صفات میرے اللہ کی ہیں اگر ان صفتوں کو کسی دوسرے میں عقیدہ کے طور پر رکھیں تو مشرک بن گیا۔ مثال کے طور پر: ہم اللہ اکبر سے، نعرہ تکبیر ہے اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں تو اس کے مقابلہ پر کوئی دوسرا نعرہ لے کر آئے، چاہے جبرئیل علیہ السلام کا لگالیں، یا میکائیل علیہ السلام کا لگالیں، چاہے اللہ کے رسول ﷺ کا لگالیں، چاہے دستگیر کا لگالیں، چاہے حضرت علی حیدر کرار رضی اللہ عنہ کا لگالیں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ قوم شرک میں مبتلا ہو جائے گی۔ اور ایک کافر جب یہ نعرے سنے گا تو وہ سمجھے گا کہ ان کے چار پانچ خدا ضرور ہیں، ایک ہوتا تو صرف اسی کا نام بلند کرتے۔ اب ایک کا نام بلند کیا، پھر دوسرے کا کیا، پھر تیسرے کا کیا، پھر چوتھے کا کیا ہے اور پھر پانچویں کا کیا ہے۔ اس کافر کو تو پتہ نہیں کہ یہ تو نعرے ہیں، وہ تو یہی سمجھے گا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ ''أَوْ'' بمعنی ''بَلْ'' ہوتا ہے۔ اور ''بَلْ'' کا استعمال اضراب انتقالی کے لیے ہوتا ہے کہ ایک مضمون سے آدمی دوسرے مضمون کی طرف منتقل ہو تو وہاں ''بَلْ'' کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ [البقرۃ:۱۷]

﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ﴾ [البقرۃ:۱۹]

''یا ان کی مثال جیسے بارش برسے آسمان سے۔''

[تفسیر الرازی: ۲/۷۱، الآیۃ: أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ]

علمی نکتہ:

بارش تو ہوتی ہی آسمانوں سے ہے تو اس لیے ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ﴾ کافی تھا یہاں ﴿مِنَ السَّمَاءِ﴾ کا لفظ کیوں بڑھایا

گیا؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو علماء نے جواب دیا ہے کہ اگر لفظ ہوتا ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ﴾ تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ایک جانب سے بارش ہو اور دوسری جانب سے بارش نہ ہو تو جب آسمان کی قید ساتھ لگا دی گئی تو گویا ایسی بارش ہے جس نے پورے افق کو چھپا لیا ہے، پورا آسمان چھلنی ہو کر برس رہا ہو۔ اب ایسی شدید بارش ہو تو اس کا کیا عالم ہوگا......؟

اور دوسری بات یہ ہے کہ بارش کی بھی انواع و اقسام ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ چاہتیں ہیں تو کبھی آسمانوں سے سیدھی بارش برساتے ہیں۔ اور جب پانی سیدھا آسمانوں سے برسے تو وہ کیسے شدید ہوگا؟ اس لیے فرمایا:

﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَٰتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ﴾ [البقرۃ:۱۹]

جب وہ پانی برستا ہے تو اس میں اندھیرے ہوتے ہیں۔ ایک تو کبھی رات کو بارش برسے تو رات کا بھی اندھیرا۔ "ظُلُمَاتٌ" جمع ہے۔

اصلاحِ عقیدہ:

جیسے اللہ نے حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَٰتِ أَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَٰنَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّٰلِمِينَ﴾ [الانبیاء:۸۷]

حضرت یونس علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ اس نے مجھے اندھیروں میں پکارا۔ تو اس نے کس کو پکارا؟ نبی کس کو پکارتے ہیں؟...... یا علی مشکل کشا! یا حیدر کرار! یا پیر دستگیر! یا آدم! یا نوح! نہیں پکارا، کیونکہ تم سے مسئلہ نہیں سیکھا ہوگا۔ تمہارے علاقے میں آتے تو تم سمجھا دیتے کہ پکارنا تو ان کو ہوتا ہے، آپ خوامخواہ اللہ کو پکار رہے ہیں...... نعوذ باللہ...... اللہ تو چھٹی پر ہیں، سارے اختیارات ان قلندروں کے پاس ہیں، سارے اختیارات ان پیروں کے پاس ہیں، سارے اختیارات ان بزرگوں کے پاس ہیں اور کچھ زندوں کے پاس ہیں اور کچھ مردوں کے پاس ہیں ...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... اور پھر کلمہ بھی پڑھتے ہیں، آیت کریمہ کے لکھ پڑھواتے ہیں کہ جی! آج ہم نے آیت کریمہ کا لاکھ پڑھوانا ہے۔ تم لاکھ پڑھاؤ، کروڑ پڑھاؤ، قبر پر سجدہ کر رہے ہو تو پڑھنے کا فائدہ کیا ہے؟ جب تم غیر اللہ کو پکار رہے ہو تو پھر آیت کریمہ کے ورد کا کیا فائدہ ہے؟ آیت کریمہ کا ورد کرتے تو تمہیں سبق ملتا کہ مدد کرنے کے قابل صرف اللہ ہے، پکارنے کے قابل صرف اللہ ہے، ندا صرف اللہ کو کی جاتی ہے، صرف اللہ سے مانگا جاتا ہے اور مصیبتوں سے نکالنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔ پھر تیرا آیت کریمہ

پڑھنے کا کوئی فائدہ بھی ہوتا کہ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ بھی پڑھتے رہو اور یا پیر دستگیر! مشکل کشا! یا جیلانی امدد فرما! بھی پڑھتے رہو تو آپ کا کریمہ پڑھنے کا فائدہ کیا ہے؟ پھر وہی عالم ہوگا جیسے منافق کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اللہ مسلمانوں کو صحیح عقیدے نصیب فرمادے، اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمادے۔

قرآن کو پڑھنے کا فائدہ یہ نہیں ہوتا کہ قرآن منتر ہے، یا اشلوک ہے پڑھ لیا، قرآن کو پڑھ لیا تو کوئی تعویذ کے کام آگیا، قرآن کو لے لیا تو قسم اٹھانے کے کام آگیا، یا قرآن کو لے کر مرد کے اوپر پھیر کر چار کپڑے دے کر جنت نصیب ہونے کا ذریعہ بن گیا، قرآن اس لیے تو نہیں آیا، قرآن تم نے اس لیے بنا رکھا ہے کہ بس اس کو غلافوں میں لپیٹ کر اوپر رکھ دو۔ قرآن کے ایک ایک حروف میں دعوت ہے، قرآن کے ایک ایک حرف میں موعظت ہے، قرآن کے ایک ایک حرف میں پکار ہے اور قرآن کے ایک ایک حرف میں تمہیں نجات دینے کے راستے ہیں، لیکن اللہ کے قرآن کو سمجھو اور سمجھ کر پڑھو کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ میری بات کو چھوڑو، میری بات غلط ہو سکتی ہے اور مولوی کی بات غلط ہو سکتی ہے، لیکن کلام اللہ یا فرمانِ محمد مصطفیٰ ﷺ تو کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔

تو اب دیکھیں کہ اللہ کا نبی ہے، کس کو پکار رہا ہے؟ ﴿فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ﴾ یعنی اس نے ندا کی اور اندھیروں میں اللہ تعالیٰ کو پکارا۔

بارش کی ہولناکیاں:

پھر جب برسات لگاتار شروع ہو جائے تو کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اس کا اپنا بھی ایک اندھیرا ہے، رعد بھی ہے (اور رعد بمعنی کڑک ہے) اور برق: بجلی کوندنے والی، چمکنے والی، جو اتنی تیزی سے چمکتی ہے کہ دنیا کی کوئی بجلی اس کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے؟ اب اس کے اندر: ایک اندھیرے ہوئے، دوسری چیز کڑک اور تیسری چیز بجلی کی چمک ہوگئی۔

معراج کی سواری کا نام براق کیوں؟

اور براق کو برق اسی وجہ سے کہا گیا ہے، جس پر میرے پاک نبی ﷺ اسراء پر تشریف لے گئے تھے۔ تو اس براق کو براق اس لیے کہا گیا کہ جیسے آپ بارش میں بجلی کو دیکھتے ہیں کہ کڑکتی ہے، کیسے چمک آئی اور کیسے روشنی آئی اور کوندی اور لپکی اور گزر گئی۔ اور یہ پتہ ہی نہیں کہ کہاں گئی؟ اس لیے آج نئی تحقیق یہ ہے کہ سب سے تیز رفتار روشنی

ہے، جو اسی ہزار میل ایک سیکنڈ میں طے کر لیتی ہے۔ تو اس براق کو بھی براق کہا گیا، اس کی بھی جہاں نظر پڑتی تھی وہیں قدم رکھتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اتنی سریع رفتار میرے آقا ﷺ کو سواری عطا فرمادی کہ منٹوں کا سفر پل بھر میں طے ہو گیا۔ اور پھر سواری کو بھی میرے پروردگار عالم نے ایسا بنا دیا کہ اگر آگے کوئی اونچائی آ جائے تو اس کی ٹانگیں اس کے مطابق چھوٹی ہو جائیں۔ اگر اسی طرح کوئی چڑھائی پیچھے آ جائے اس کی ٹانگیں اس کے مطابق منقبض ہو جائیں، تا کہ میرے مدنی کے توازن میں اور آرام میں کوئی فرق نہ آئے۔ اس لیے اس کو اسی لفظ سے تشبیہ دی گئی۔

تفسیر:

﴿يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ﴾ [البقرۃ:19] اور یہ ڈر کے مارے اس کڑک کے خوف سے اپنی انگلیوں کو کانوں میں دے ڈالتے ہیں "حَذَرَ الْمَوْتِ" موت سے بچنے کے لیے کہ کہیں ہم مر نہ جائیں۔ اس آواز سے اصل میں آدمی کانوں میں انگلی کا اگلا حصہ دیتا ہے، ساری انگلی تو نہیں دیتا، لیکن اللہ نے فرمایا: ایسے ڈرے ہوئے ہیں کہ اگلا حصہ نہیں، بلکہ پوری انگلیاں ڈر کے مارے ٹھونس رہے ہیں، لیکن اللہ نے فرمایا کہ یہ اتنے بڑے جاہل ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم کانوں کے اندر انگلیاں دیں گے تو موت سے بچ جائیں گے، حالانکہ ﴿وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ﴾ [البقرۃ:19] اللہ نے کافروں کا مکمل احاطہ کیا ہوا ہے کہ وہ جس وقت چاہیں، جب چاہیں عذاب دیں۔ یہ تو صرف اس کڑک سے بچ رہے ہیں، ان کو پتہ نہیں کہ اللہ نے ان کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے۔

تو اس آیت مبارکہ میں اللہ نے پانی سے تشبیہ دی ہے اور اسی سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ بارش کے بہت فائدے ہیں، لیکن جہاں فائدے ہیں وہاں اس میں اندھیرے بھی ہیں، وہاں اس میں کڑک بھی ہے، بجلی بھی ہے اور کبھی وہ بجلیاں گر بھی جاتی ہیں۔

تو اللہ نے فرمایا کہ ایمان و قرآن تو بارش ہے، لیکن اس میں کبھی کبھی تکلیفیں بھی آتی ہیں، لیکن مومن ان تکلیفوں پر صبر کرتا ہے اور کافر انہی تکلیفوں کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے اور پھر نفاق اختیار کر لیتا ہے۔ تو ان کو جیسے کلمہ پڑھنے سے ظاہری فائدے تو مل گئے کہ جان اور مال بچ گئے، مال غنیمت میں بھی شریک ہو گئے، جیسا کہ بارش میں فوائد اور منافع بھی ہیں، لیکن ان کے اندر مخاطر اور مہالک بھی ہیں۔ یہ کافر منافق جب ان کو بارش کی طرح ایمان کا فائدہ ہوتا ہے، مال غنیمت ملتا ہے تو کہتے ہیں: ہم مسلمان ہیں اور جب نماز کی پابندی آئے، روزے کی پابندی آئے اور جب جہاد کا حکم آئے تو اب مصیبت پڑتی ہے۔ اسلام کا فائدہ اٹھانے کے لیے یہ سب سے آگے ہیں، لیکن اسلام

میں جو احکامات ہیں کہ نماز روزے کی پابندی، حلال کی پابندی، حرام اور گناہوں سے بچنا، وہ ان کو مصیبت لگتا ہے۔ اس لیے یہ اسلام کو چھوڑ کر نفاق کی طرف بھاگتے ہیں اور ظاہری اسباب کی بنا پر سمجھتے ہیں ﴿يَجْعَلُوْنَ أَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ﴾ [البقرة:١٩] جیسے کوئی کان میں انگلیاں دے کر اس کڑک اور بجلی سے نہیں بچ سکتا اسی یہ بھی نفاق کر کے اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ ﴿وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴾ [البقرة:١٩]

﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [البقرة:٢٠]

فرمایا: وہ بجلی اتنی سخت ہے اور اس کی چمک اتنی زیادہ ہے کہ ان کی آنکھوں کو اچک لے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی سختی اور شدت کو بیان کیا اور پھر منافقین کی کیفیت کو بیان کیا کہ ادھر چمک اتنی سخت ہے اور ادھر ان کا یہ حال ہے ﴿كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ﴾ کہ جب وہ چمک آتی ہے، روشنی ہوتی ہے تو چل پڑتے ہیں، کیونکہ راستہ نظر آنے لگ جاتا ہے اور اس کے بعد جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو رک جاتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ ان کی قوتِ باصرہ اور قوتِ سامعہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں اور ان کے دلوں پر مہر کر دیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں، لیکن وہ ان کو ایک اور موقع دیتے ہیں۔ جب چلتے چلتے ان کا نفاق کھلے گا تو عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت بھی آجائے گا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ پہلی مثال اس سے زیادہ سخت تھی، یعنی وہ ان منافقین کے بارے میں تھی جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ [البقرة:١٧] نور ختم ہو گیا۔ اور یہاں فرمایا ﴿وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ﴾ [البقرة:٢٠] لیکن ابھی ختم نہیں کیا اور پہلی مثال میں تھا کہ اللہ نے ان کا نور بالکل زائل کر دیا۔ تو منافقین میں کئی گروہ تھے: بعض منافقین شدید، بعض ان سے اشد تھے، بعض کی حقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے فوراً کھول دی اور اسی وقت دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا اور بعض کو کچھ عرصہ کے لیے مہلت مل گئی اور کچھ عرصہ انہوں نے زندگی گزاری اور انجام کار ان کی دنیا اور آخرت میں رسوائی آئی۔

بعض علاماتِ قیامت کا بیان:

......حدیث مبارک میں آتا ہے کہ قیامت سے پہلے ایسا وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ ایک جانور کو نکالیں گے اور

اکثر روایات یہی ہیں کہ یہ اس زمانہ میں ہوگا جب عیسیٰ علیہ السلام ظاہر ہو چکے ہوں گے، چونکہ علامات قیامت بہت ہیں، لیکن کچھ علامات ان میں سے بڑی بڑی ہیں، جنہیں علامات کبریٰ کہا جاتا ہے۔

- ......ان نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکلے گا۔ اب روزانہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے، لیکن قیامت کے قریب اللہ اس کو حکم دیں گے کہ تم مغرب سے طلوع ہو جاؤ۔
- ......ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا کہ وہ ایک دیوار کے پیچھے بند ہیں، بالکل نکل آئیں گے۔
- ......اسی طرح دجال ظاہر ہوگا۔
- ......اور اسی طرح دخان یعنی ایک دھواں ہوگا۔
- ......اسی طرح تین مقام پر خسف آئے گا، یعنی ایسا زلزلہ ہوگا کہ پورے کے پورے شہر زمینوں میں دھنس جائیں گے: ایک جانب مشرق میں، ایک مغرب میں اور ایک جزیرۃ العرب میں۔ تو یہ بھی قیامت کی بڑی بڑی علامات سے ہے۔
- ......اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں سے نزول ہوگا۔
- ......اور اسی طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک جانور نکلے گا اور وہ جانور باتیں کرے گا، یعنی وہ جانور باقاعدہ کلام کرے گا [تفسیر ابن أبي حاتم، حدیث: ۱۵۵۲۷] اور بعض روایات میں آتا ہے کہ اس جانور کے پاس ایسی چیز بھی ہوگی کہ وہ آکر مومن کی پیشانی پر لگائے گا تو اس کا چہرہ روشن ہو جائے گا اور کافر کی پیشانی پر نقطہ لگائے گا تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا۔ اس وقت واضح ہو جائے گا کہ یہ مومن ہیں اور یہ کافر ہیں۔
- ......اسی طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آگ عدن سے نکلے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر وہ لوگوں کو ہانک کر یعنی چلا چلا کر میدانِ محشر کی طرف لے جائے گی۔ جہاں رات ہوگی، وہ آگ بھی رک جائے گی اور دن ہوگا وہ آگ پھر چلائے گی، حتیٰ کہ میدانِ محشر میں سب کو جمع کر دے گی۔ تو اس وقت تو ایک کیفیت آجائے گی کہ یہ مومن ہے اور یہ کافر ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۹۰۱، باب: فِي الْآيَاتِ الَّتِي تَكُونُ قَبْلَ السَّاعَةِ]

دجال کا فتنہ:

جیسا کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دجال ظاہر ہوگا۔ تو دجال کا بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے دعا سکھلائی کہ آدمی ہمیشہ دعا کرتا رہے نماز میں بھی سلام سے پہلے اور خارج نماز میں بھی:

((اللّٰهُمَّ! إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَفِتْنَةِ الْمَمَاتِ.)) [صحیح البخاری، حدیث: ۸۳۲، باب الدُّعاء قبل السّلام]

اور بعض روایات میں اور کچھ الفاظ مبارک زیادہ ہیں:

((اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ.)) [صحیح البخاری، حدیث: ۸۳۲، باب الدُّعاء قبل السّلام]

اور ایک روایت میں آتا ہے:

((وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ وَ قَهْرِ الرِّجَالِ)) [سنن أبي داود، حدیث: ۱۵۵۵، باب في الإستعاذة]

بہر حال حضور ﷺ نے فرمایا: دجال کے فتنہ سے پناہ مانگا کرو، کیونکہ وہ اتنا بڑا فتنہ ہوگا کہ لاکھوں لوگ گمراہی میں مبتلا ہو جائیں گے، لاکھوں لوگ دجال کی استدراجی قوتوں کو دیکھ کر گمراہ ہو جائیں گے، کیونکہ اس کو اللہ نے ایسی قوتیں دی ہوں گی کہ وہ زمینوں کو حکم دے گا کہ خزانے باہر نکالو تو وہ سونا چاندی باہر نکال دے گی، وہ نہروں کو حکم دے گا کہ چل پڑو تو وہ چل پڑیں گی اور وہ مردے کو حکم دے گا تو وہ کھڑا ہو جائے گا۔ لوگ جب ایسی چیزیں دیکھتے ہیں تو ایمان والے لوگ قابو رہتے ہیں، ورنہ ہر آدمی ایسے شعبدہ بازوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ دجال تو سب سے بڑا فتنہ ہے، جس سے ہمیں حضور ﷺ نے پناہ مانگنا سکھایا اور باقی تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی۔

حضور ﷺ نے فرمایا: اس دجال کی پیشانی پر اس کی دو آنکھیں کے درمیان ک، ف، ر لکھا ہوا ہوگا۔ یعنی کافر لکھا ہوا ہوگا، لیکن اس کو نہیں پڑھ سکے گا، مگر وہ جو ایمان والا ہے۔ جو ایمان والا ہے وہ خود دیکھ لے گا کہ یہ کافر ہے، ہم اس کی کیا باتیں مانیں؟ یہ تو خود دجال ہے۔ دجالی فتنہ سے بچنے کے لیے مومن تو پڑھ سکے گا، لیکن ہر آدمی نہیں پڑھ سکے گا۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۹۳۳، باب: ذکر الدّجّال وصفته]

علامات سے چیزوں کی پہچان:

تو اس لیے علماء نے فرمایا کہ اب ہم ہر چیز کو علامات سے پہچانیں گے۔ جیسے مسجد کا مینار دور سے نظر آئے تو ہم پہچان لیتے ہیں کہ یہ مسجد ہے اور اگر کسی مسجد پر مثال کے طور پر چار مینار بنے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ بھی ایک علامت ہوتی ہے کہ یہ اہل سنت والجماعت اور چار یاروں کو ماننے والے لوگ ہیں، کبھی کبھی مساجد پر ایک مینار کی علامت

ہوتی ہے کہ یہ موحد لوگ ہیں، اللہ کی توحید کے قائل ہیں۔ اسی طریقہ سے کسی جگہ محراب دیکھتے ہیں تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ عام کوٹھا نہیں، بلکہ یہ اللہ کا گھر ہے، مسجد ہے، ہم نے یہاں نماز پڑھنی ہے اور قبلہ کا رخ اسی طرف ہے۔

جیسا کہ کوئی آدمی تارہ دیکھ کر اندازہ لگا لیتا ہے کہ فجر کاذب ہے یا صبح صادق ہے۔ یا جیسے کوئی آدمی تارا دیکھ کر قطب کا فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں اس وقت شمال میں ہوں یا جنوب میں ہوں۔ اسی طرح ہم لوگوں کے اقوال کو، افعال کو اور کردار کو سامنے رکھ کر ایک اندازہ لگا سکیں گے کہ اس آدمی کے اعمال ایمان والوں کی طرح ہیں، اس آدمی کے اعمال کفر والوں کی طرح ہیں، اس آدمی کے اعمال منافقوں جیسے ہیں، اس آدمی کے اعمال زندیقوں جیسے ہیں اور اس آدمی کے اعمال ملحدوں جیسے ہیں۔ تو وہ اپنی اپنی نشانیوں سے اور علامات سے پہچانا جائے گا۔

دنیا میں کوئی ایسا آدمی ہے جو حضور ﷺ سے محبت کا دعویٰ نہ کرے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اچھا حضور ﷺ کے نام کو چومنا ہو تو چوم لے گا، اسی چومنے والے سے کہو کہ حضور مبارک ﷺ نے داڑھی مبارک بھی رکھی ہے تو وہ کہے گا: دعا کریں! بھائی! روٹی کے لیے کبھی تم نے دعا کرائی ہے کہ میں روٹی کھا لوں اور پانی پی لوں۔ تو جب حضور ﷺ کا نام چوم رہے ہو تو حضور ﷺ کی سنت مبارک پر استرہ پھیر کر گندی نالیوں میں بہا رہے ہو، تمہیں اللہ کا خوف نہیں آتا کہ اگر قیامت کے دن حضور ﷺ نے پوچھا: او میرے عشق کا دعویٰ کرنے والو! تم نے میری سنت کو گندی نالیوں میں بہایا، کس منہ سے میرے پاس شفاعت کے لیے آئے ہو؟ دفعہ ہو جاؤ مجھ سے۔ تو اس وقت ہمارے پاس کوئی جواب ہوگا؟ یعنی ایک سنتِ رسول رکھنی ہے تو بیوی ناراض ہوتی ہے، داڑھی رکھنی ہے تو لوگ سمجھیں گے کہ ملا بن گیا، داڑھی رکھ لوں گا تو لوگ سمجھیں گے کہ ساٹھ سال کا بوڑھا نظر آتا ہے اور اگر استرہ پھراؤں گا تو میں جوان نظر آؤں گا۔

یعنی آپ اندازہ فرمائیں کہ نفاق کس کو کہتے ہیں؟ آدمی دعویٰ تو کرے کہ...... سبحان اللہ...... جی اللہ نے اپنا گھر دکھا دیا اور جب نماز کے بعد جنازہ آتا ہے تو چھپ جاتا ہے کہ لوگ تو مر رہے ہیں، تمہیں اللہ نے گھر دکھا دیا ہے، تمہیں اللہ مکہ میں موت دے دے...... الحمد للہ...... ہمیں یہاں موت دے دے اور کیا چاہیے؟ دنیا میں ہم نے آخر ایک دن مرنا تو ہے۔ اگر ہم ایسی جگہ مر گئے جہاں غلط عقیدہ والے نے ہمارا جنازہ پڑھایا تو کیا فائدہ ہوگا؟ یہ کتنا ہمارا نصیب ہوگا کہ کعبہ کے سامنے ہمارا جنازہ رکھا ہو اور موحد نماز پڑھا رہا ہو، جس کا اللہ کی توحید کے ساتھ تعلق ہو، اللہ کی نبی ﷺ کی سنت کے ساتھ تعلق ہو، بدعت کے قریب جانے والا نہ ہو اور لاکھوں آدمی پیچھے کھڑے ہوں

((اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَ مَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا)) تو کیا اللہ ان سب مانگنے والوں کو ٹھکرا دیں گے؟ اتنے ہاتھ پھیلائے ہوئے جو رو رہے ہوں گے، کیا ان سب کو اللہ کہیں گے کہ بھاگ جاؤ؟

اسلام بطورِ دین و مذہب:

علماء نے کہا کہ آج وہی عالم ہو گیا ہے، یعنی آپ اسلام کے بڑے بڑے ملکوں میں چلے جائیں، اسلام کے ٹھیکیدار کے پاس چلے جائیں، وہ اسلام کو مذہب ماننے کے لیے تیار ہیں، لیکن دین ماننے کے لیے تیار نہیں۔

ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں! وہ اسلام کو مذہب مانتے ہیں کہ آپ نماز پڑھیں، آپ روزہ رکھیں، آپ مسجدیں بنوائیں، آپ تراویح پڑھیں، آپ عیدیں پڑھیں، آپ جمعہ پڑھیں اور آپ قرآن کے مدارس کھولیں اسی کا نام اسلام ہے۔ ہر ملک یہ کہے گا کہ اس سے بڑا اسلام اور کیا ہوتا ہے؟ ہم حاجیوں کو چڑھا رہے ہیں، نمازیں پڑھی جا رہی ہیں، مسجدیں آباد ہیں، یعنی اسلام کو مذہب تسلیم کیا ہے، لیکن دین ماننے کے لیے تیار نہیں۔ خدا کے بندے! مسجدیں تو کافروں کے ملک میں بھی ہیں، مسجدیں تو عیسائیوں کے ملک میں بھی ہیں اور مسجدیں تو یہودیوں کے ملک میں بھی ہیں، نمازیں تو وہاں بھی پڑھی جاتی ہیں، روزے تو وہاں بھی رکھے جاتے ہیں، عید کی نمازیں تو وہاں بھی پڑھی جاتی ہیں۔ اسلام کا معنی تو یہ ہے کہ تم قرآن و سنت کے قانون کو لاگو کر دو، اللہ کی حدود کو نافذ کر دو۔ اللہ نے جس چیز کو حلال فرمایا ہے حلال کہو اور جس کو حرام کہا ہے حرام کہہ دو، نفع نقصان کو بالکل نہ سوچو، وہ اللہ پر چھوڑ دو کہ اگر آج ہم نے سود نہ لیا تو اربوں ڈالر تباہ ہو جائیں گے، قرضے کہاں سے ادا کریں گے؟ اللہ نے فرمایا: یاد رکھو!

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٦﴾﴾ [الاعراف:٩٦]

اے بستی والو! ایمان لا کر میرے قانون کو چلاؤ، میں آسمان و زمین کے خزانے تم پر کھول دوں گا۔

دینے والا تو خدا ہے، بندے ہمیں کیسے دے سکتے ہیں؟ کیا بندے ہماری محنت مشقت پوری کر سکتے ہیں؟ اللہ کا وعدہ ہے کہ اگر بستی والے ایمان لائیں، اللہ سے ڈر کر اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہوں تو ہم آسمان اور زمین کے دروازے کھول دیں گے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت:

آپ نے دیکھا نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک ایک کھجور پر چوبیس چوبیس گھنٹے زندگی گزارنے والے، اصحاب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہ بوریا نشین جن کے پاس پہننے کے لیے کپڑا نہیں تھا، بوریوں کے جنہوں نے لباس بنائے ہوئے تھے، وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جن کے پاس بچھانے کے لیے بستر نہیں تھا، جن کے پاس چلنے کے لیے کاریں نہیں تھیں، مدینہ منورہ سے نکلے اور کسریٰ وقیصر کی دیواروں کو ہلا ڈالا اور چین اور اندلس تک اور دنیا کے کونے کونے تک اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے۔

مسلمانوں کی بے بسی:

آج ہم اتنی قوتوں کے بعد اتنے ذلیل ہو گئے ہیں کہ ہندو بھی مسلمانوں کی عصمتوں سے کھیلتا ہے اور ہماری غیرت کو کچھ بھی نہیں ہوتا، ہماری غیرتیں جاگتیں نہیں، بیداری نہیں ہوتیں۔ اس سے بڑی منافقت کیا ہوتی ہے کہ نام تو ہم اسلام کا لیں، دعویٰ تو ہم ایمان کا کریں، کم از کم اس بات کو تو یاد کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تو بہت مقدس زمانہ ہے، حجاج جیسے ظالم کا زمانہ ہو" ظَالِمُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ " جو امت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑا ظالم گزرا ہے، اس کی غیرت بھی اتنی زندہ تھی کہ سندھ سے چند لڑکیوں نے تاجر کے ذریعے حجاج کو ایک خط بھیجا: ہم مسلمان لڑکیاں ہیں اور راجہ داہر کے لڑکوں نے پکڑ کر ہماری بے عزتی کی ہے اور ہم ان کی قید میں ہیں۔ کیا مسلمان مر گیا ہے جو ہمیں ان کی قید سے چھڑائے؟ تو محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ اٹھا اور پورے ملک پر اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا۔ تو حجاج کے زمانہ میں بھی اتنی بات تھی اور ہم سب کچھ دیکھنے کے بعد بے حس ہیں اور بے ضمیر ہو چکے ہیں، غیرتیں ہماری ختم ہو چکی ہیں۔

؎ غیرت ہے نام جس کا گئی تیمور کے گھر سے

اس سے بڑی بے حمیتی کیا ہو سکتی ہے کہ ذرا روشنی آئی تو ہم چل پڑے، ذرا اسلام کا شور کرنا ہو تو ہم اسلام کے بڑے ٹھیکیدار ہیں، اتنے بڑے اسلام کے نام پر جلوس بھی نکال لیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد کے ہم بڑے بڑے جلوس بھی نکال لیں گے، بڑے بڑے بورڈ بھی لگا دیں گے، لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر کٹ مرنے کا نام آئے گا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر لاکھوں میں کوئی ایک نکلے گا جو اتباع سنت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کرنے والا ہوگا۔

منافق کی تین علامات:

اسی لیے میرے آقا ﷺ نے فرمایا:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ:))

منافق کی تین نشانیاں ہوتی ہیں۔تم اگر دیکھو تو ان نشانیوں سے پہچان لو۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ نشانیاں کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَ إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا أُتُمِنَ خَانَ)) [صحيح البخاري، حديث: ٣٣، باب: علامة المنافق]

اب پہلی نشانی پر غور کریں کہ "إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ" جب بات کرے گا تو جھوٹ بولے گا۔ یہ منافق کی علامت ہے۔ کیونکہ مسلمان کی زبان سے کبھی جھوٹ نہیں نکل سکتا، مسلمان کلمہ پڑھنے والا کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔

"وَ إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ" اور دوسری نشانی یہ ہے کہ جب وعدہ کرے تو خلاف کرے، وعدہ پورا نہ کرے۔ یہ منافق کی نشانی ہے۔

اور فرمایا: "وَإِذَا أُتُمِنَ خَانَ" اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ فرمایا: یہ بھی منافق کی نشانی ہے۔

اور اسی طرح حضور پاک ﷺ نے اور حدیث میں فرمایا:

((إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ))

"جب وہ کسی سے جھگڑا کرے تو گالی دے اور فحش کلام کرے۔"

تو فرمایا یہ بھی منافق کی علامت ہے۔ اب اسی باب میں ذرا ہم غور کریں کہ یہ ساری نشانیاں کہیں ہمارے اندر موجود تو نہیں؟

منافقوں کی اقسام:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ دو مثالیں بیان فرمائیں۔ چونکہ منافقوں کی کئی قسمیں تھیں، پہلی مثال ان منافقوں کی تھی جو نفاق پر بالکل پکے تھے، ظاہری کلمہ پڑھ رہے تھے، لیکن اندر کلمہ تھا ہی نہیں۔ اور یہ مثال ان لوگوں کی ہے کہ کبھی تو سوچتے ہیں کہ دین اسلام سچا ہے اور کبھی شک میں پڑ جاتے ہیں، یعنی کبھی دماغ میں سمجھتے ہیں

کرچ ہے، لیکن پھر شکوک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو یہ منافقوں کی دوسری قسم ہے۔

[ابن کثیر: ۱/۵۶، الآیۃ: اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ]

کفار کی تہذیب اور حضور ﷺ کی سنت:

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ میرے مدنی پاک ﷺ کے راز دار صحابی ہیں۔ جب کسریٰ کا علاقہ فتح ہو گیا، اللہ نے اسلام کو عزت دے دی، بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے کہ ایک لقمہ زمین پر گر گیا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے وہ لقمہ مٹی سے اٹھایا، اس کو صاف کیا اور کھا لیا۔ وہاں فارس کا ایک غلام جو قیدی تھا وہ موجود تھا، اس نے کہا کہ حضرت! میں ایک بات عرض کرتا ہوں اگر آپ ناراض نہ ہو جائیں! آپ نے فرمایا: بتاؤ! کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ یہ فارس کا علاقہ ہے، یہاں کی تہذیب کا تقاضہ ہے، اس کے اندر یہ بہت بڑی بات سمجھی جاتی ہے کہ ایک لقمہ مٹی پر گر گیا تو آدمی اٹھا کر کھا لے۔ گر گیا ہے تو گر گیا، پھینک دے، یہ بات بڑی بری سمجھی جاتی ہے، تو مہربانی کر کے آپ آئندہ ایسی بات نہ کریں۔ یہاں کے لوگ آپ کے بارے میں برا خیال کریں گے کہ یہ جنگلی لوگ ہیں، یہ دیہاتی لوگ ہیں، ان کو تو کھانے کا پتہ ہی نہیں کہ ایک لقمہ گر گیا تو کیا ہو گیا؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، آپ نے فرمایا کہ میں اپنے محمد پاک ﷺ کی سنت چھوڑ دوں ان احمقوں کے لیے؟ میرے مدنی کا حکم ہے: لقمہ گر جائے تو اٹھا لو۔ میں اپنے نبی کی بات مانوں یا ان لوگوں کی تہذیب کو خوش کروں؟

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ دوسرے منافقوں کی مثال ہے۔

"صَيِّب" کا معنی:

"صَيِّب" بارش کو کہتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث مبارک میں الفاظ ہیں، حضور ﷺ نے دعا مانگی: "اَللّٰهُمَّ! صَيِّبًا نَافِعًا" یا اللہ! ہمیں ایسی بارش عطا فرما جو نفع دینے والی اور رحمت فرمانے والی ہو، ایسی بارش نہ دینا جو باعثِ عذاب اور باعثِ ہلاکت ہو۔ اس لیے جب حضور پاک ﷺ دعا مانگتے تھے تو فرماتے تھے: "اَللّٰهُمَّ! صَيِّبًا نَافِعًا" اللہ ہمیں ایسے رحمت کا پانی عطا فرما اور عذاب والی بارش سے بچا لے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۰۳۲، باب: ما يُقَالُ إِذَا مَطَرَتْ]

منافق ہر وقت خوف میں رہتا ہے:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مشہور قول یہ ہے کہ "صَيِّب" بارش کو کہتے ہیں، بادل کو نہیں کہتے۔ اللہ نے بارش

اتاری اس عالم میں کہ اس میں اندھیرے ہیں۔ یہ دلوں کے اندر شک، کفر اور نفاق کا پڑ جانا سب سے بڑا اندھیرا ہے۔ اور کڑک سے مراد وہ چیز جو دلوں کو ڈرانے والی ہے۔ منافقین کی ہر وقت یہ حالت ہوتی کہ وہ خوف میں ہوتے ہیں اور ہر وقت گھبراہٹ میں ہوتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری بات کھل جائے اور ہم پکڑے جائیں۔ منافقوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کوئی بھی آواز آئے تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے خلاف ہے۔

بجلی کا آنکھوں کو اچکنے کا معنی:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ مثال اللہ نے دی ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لے، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ قرآن نازل کر کے ان منافقوں کے رازوں اور پردوں کو کھول دیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ نے جو مثال دی ہے کہ جب روشنی ہوتی ہے تو یہ چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو یہ رک جاتے ہیں، اس روشنی سے مراد یہ ہے کہ جب اسلام کو غلبہ ملتا ہے اور اسلام کو عزت ملتی ہے تو یہ فوراً آجاتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور اگر مسلمانوں پر کوئی مصیبت ٹوٹ گئی یا انہیں کوئی شکست ہو گئی یا کوئی نقصان ہو گیا تو کہتے ہیں کہ ہم کفر میں چلے جائیں تو بہتر ہے۔ جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪﴾ [الحج: 11]

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک قول یہ فرمایا کہ روشنی دیکھ کر چلنے کا معنی یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ حق کیا ہے؟ وہ جانتے ہیں کہ اللہ کے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق پر ہیں اور آپ کا دین اسلام حق ہے، لیکن جب کفر کی طرف جاتے ہیں تو اب متحیر پریشان ہیں۔ [ابن کثیر: 1/55، الآیۃ: اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ]

اخلاص اور ریا میں فرق:

مثلاً: ایک آدمی نے طواف کیا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اے اللہ! تو اس کا ثواب فلاں کو عطا فرمادے۔ طواف تو اس نے اللہ کے لیے کیا ہے۔ اور ایک ہے کہ اس عمل میں کسی دوسرے کو شریک بھی کر رہا ہے، کسی دوسرے کا حصہ بھی ڈال رہا ہے تو اب وہ عمل خالص نہیں رہا۔ مثلاً: ایک آدمی خیرات کرتا ہے، ایک بکرا لیا، ذبح کیا اور اللہ کے لیے تقسیم کر دیا اور دل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ثواب فلاں کو عطا فرمادے، لیکن ذبح کرنے کے وقت میں

نیت ہے یہ بکرا تو نذر ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی۔ اب اللہ کا نام بھی درمیان میں نہیں آرہا، نہ وہ اللہ کے لیے نیت کر رہا ہے۔

پیر کے نام ایصالِ ثواب:

یا اس کو یوں سمجھیں کہ مثال کے طور پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ بکرا ہم نے اپنے پیر کے نام پر وقف کر دیا ہے۔ اب اللہ کا نام نہ رہا، پیر کے نام پر آ گیا۔ مثال کے طور پر: بات کو سمجھیں! اس کو کہو کہ یہ بکرا کیا کرو گے؟ تو وہ کہے گا کہ میں اپنے پیر کی قبر پر جا کر ذبح کروں گا۔ اب اس سے پوچھو تو کہتا ہے: مقصد ہمارا یہ ہے کہ ہم پیر کو ثواب پہنچائیں۔ تو بھائی اگر ثواب پہنچانا ہے تو ایک عقل کی بات ہے، اللہ نے عقل دی ہے کہ ثواب دینے والا کون ہے؟ اللہ ہے۔ مثلاً: ہم نے ایک بکرا ذبح کیا، ہم اپنے بزرگ کو ثواب پہنچانا چاہتے ہیں تو ثواب کون پہنچائے گا؟ تو کیا اللہ نے کہیں حکم دیا ہے کہ قبر پر کرو گے تو ثواب پہنچاؤں گا؟ گھر میں کرو گے تو ثواب نہیں پہنچاؤں گا؟ یا تو اللہ نے کہیں یہ فیصلہ کیا ہو کہ اگر تم نے دنبہ قبر پر آ کر ذبح کیا تو پھر تو میں ثواب پہنچاؤں گا؟ کیونکہ وہاں قبر کے بزرگ قریب ہیں، گھر گیا تو بزرگ دور ہے تو ثواب پہنچانے میں تکلیف ہوگی۔ کوئی عقل کی بات کرو۔ تو صاف بات ہے کہ جب وہ قبر کی ضد کر رہا ہے تو وہ ثواب نہیں پہنچانا چاہتا، بلکہ وہ پیر کے نام پر ذبح کر رہا ہے اور جب اس کے نام پر ذبح کر رہا ہے تو ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ: ۱۷۳] جو چیز اللہ کے سوا کسی غیر کے نام پر ذبح کی جائے تو وہ حرام ہو جاتی ہے۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ یہ چھوٹے مسئلے ہوتے ہیں اور آدمی شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بھائی! تم نے خیرات کرنی ہے تو کسی جگہ بھی کر دو، اپنے ملک میں کر دو، عرب میں کر دو، عجم میں کر دو، مکہ میں کر دو اور مدینہ میں کر دو۔ اللہ پاک جانتے ہیں، اللہ سے دعا کر دو، اللہ پاک کی قدرت ہے، اپنی قدرت اور رضامندی سے ثواب عطا فرما دیں گے۔ اور پھر ہمیں اس ثواب کا بھی پتہ نہیں ہے کہ مقبول ہوگا؟ اجر ملے گا؟ تو اللہ ثواب دیں گے۔ خدا جانے وہ ہماری قربانی قبول ہی نہ ہو۔ تو جب قبول ہی نہ ہو تو اس کا ثواب بنا ہی نہیں تو بندے کو کیسے ملے گا؟ ثواب تو تب ملے گا کہ پہلے وہ اللہ کے دربار میں قبول ہو جائے، لیکن یہ ضد کرنا اور شرط کرنا کہ میں اس کو اسی پیر کے مزار پر ذبح کروں گا اور میں وہ دیگیں خیرات کروں گا، لیکن قبر پر جا کر خیرات کروں گا، اب یہ غیر اللہ کی شرکت آ رہی ہے۔ اس جگہ جا کر خیرات کرنے کا تمہارا کیا مقصد ہے؟ یعنی اگر دور خیرات کرو تو نہیں پہنچے گی اور اگر تم وہاں جا کر کرو گے تو تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم نے خود جا کر خیرات کا ثواب پہنچانا ہے، وہ تو اللہ نے پہنچانا ہے اور وہ قادر ہے۔ اور

جو ہم عمل کرتے ہیں فرشتے لے جا کر اللہ کی بارگاہ میں پہنچا دیتے ہیں۔ اگر عمل مقبول ہوتا ہے تو ثواب مرتب ہو جاتا ہے اور اگر عمل مقبول نہیں ہوتا تو ثواب مرتب نہیں ہوتا۔

اصل میں بعض لوگوں کے دماغ میں ایسے مسائل بیٹھے ہوئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ گزارش یہ ہے کہ یہ وہاں جو لوگ ہیں ان کو تو پیروں فقیروں کا قدر ہی نہیں ہے، ہم وہاں جا کر جو خیرات کرتے ہیں اس سے مقصد تو غیر والے کی عزت ہوتا ہے، وگرنہ ہم خیرات تو اللہ کے لیے کرتے ہیں۔ بھائی! حضور ﷺ کی مزار سے زیادہ عزت کسی اور مزار کی ہو سکتی ہے؟ تو یہ مسئلہ اڑھائی لاکھ صحابہ کو سمجھ نہیں آیا، چودہ سو سال بعد تمہیں سمجھ آیا ہے۔ اگر یہ بات کوئی تکریم والی تھی، کوئی ثواب والی تھی تو صحابہ رضی اللہ عنہم آکر حضور ﷺ کے مزار مبارک پر دنبے ذبح کرتے اور اونٹ ذبح کرتے۔

یاد رکھیں کہ جب تک حضرت علی رضی اللہ عنہ زندہ رہے ہر عید پر حضور ﷺ کی طرف سے قربانی کرتے تھے۔ فرمایا کہ مجھے میرے نبی ﷺ نے حکم دیا کہ جب تم قربانی کرو تو میری طرف سے بھی کر دیا کرنا تو میں اپنے حبیب ﷺ کی سنت پر عمل کر رہا ہوں۔ تو ساری زندگی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی قربانی نہیں چھوڑی۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۱۴۹۵، باب: مَا جَاءَ فِي الأُضْحِيَةِ عَنِ المَيِّتِ]

اگر قبر مبارک پر ذبح کرنا کوئی تکریم کا باعث ہوتا تو کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ چھوڑ دیتے؟ ان کو محبت و عظمت و تکریم کا پتہ نہیں چلا؟ اور بارہ سو سال کے بعد تمہیں پتہ چل گیا ہے؟ یہ وجہ کیا ہے؟ اللہ تبارک و تعالیٰ معاف فرمائے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو صراطِ مستقیم نصیب فرما دے۔ اس لیے شیطان نے کہا تھا کہ اللہ! میں تیرے بندوں کو دائیں بھی گمراہ کروں گا، بائیں بھی گمراہ کروں گا، آگے بھی گمراہ کروں گا اور پیچھے بھی گمراہ کروں گا۔ اور آپ دیکھیں گے کہ تیرے بندے تیرے ماننے والے نہیں بنیں گے، بلکہ تیرے ساتھ شرک کرنے والے بنیں گے۔

رسوم اور بدعات کی حقیقت:

تو اب اللہ نے حکم دیا تھا کہ قربانی کا جانور حرم میں ذبح ہوگا اور کسی جگہ ذبح نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کے ذمہ بکری ہے تو حرم میں ذبح ہوگی، اپنے ملک میں ایک لاکھ بکری ذبح کرو تو ادا نہیں ہوگی۔ اگر آپ پر دم پڑ گیا تو حدودِ حرم میں ذبح ہوگا، اگر حدودِ حرم سے باہر ذبح کرے گا تو وہ قبول نہیں ہوگا۔ تو شیطان نے قربانی میں شرک کرایا کہ اے اللہ! اگر تیری بکری تیرے گھر کے بغیر قبول نہیں ہوتی تو پیر کی بکری بھی قبر کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔ میں وہاں ذبح کراؤں، تو نے یہاں حکم دیا ہے۔ میں مقابلہ کراؤں گا۔ تو اپنے گھر کا طواف کروائے گا، میں قبروں کا طواف

کرواؤں گا۔ تو اپنا نعرہ لگوائے گا، میں غیر اللہ کا نعرہ لگواؤں گا۔ تو اپنا نعرہ لگوائے گا، میں اپنا نعرہ لگواؤں گا۔ تو کہے گا: میرے آگے سجدہ کرو، میں انہیں قبروں پر جھکوادوں گا۔ تو کہے گا: میرے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو، میں ان کو بندوں کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا کروں گا۔ مسلمان بے چارہ محبت میں مبتلا ہے۔ جہاں مرضی آئے اس کو لے جاؤ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بیان کرو تو رونا شروع کردے گا اور یزید کی شجاعت بیان کرو تو "سبحان اللہ" کہنا شروع کردے گا۔ اس قوم کا کیا علاج ہے ماسوائے اس کے کہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہدایت عطا فرمادے، اللہ تعالیٰ سینہ کھول دے اور ایمان کی سمجھ عطا فرمادے۔

ایک اصولی سی بات ہے: یہ دو کھلے ہوئے راستے ہیں، جس راستے پر کوئی چلنا ہے چلے: ایک راستہ سنت رسول اللہ ﷺ کا ہے اور ایک راستہ سنت الانبیاء والمرسلین کا ہے جس پر میرے پاک محمد مدنی ﷺ نے چل کر دکھایا۔ یعنی جب بچہ پیدا ہوا تو اذان سے لے کر جنازہ تک تمام مسئلے میرے پاک نبی ﷺ نے سمجھا دیے۔ ایمان سے بتلائیں! حضور پاک ﷺ جو دین لے کر آئے وہ مکمل تھا یا ناقص تھا؟ اگر دین مکمل ہے تو اب ہم کیا جوڑ لگا رہے ہیں؟ کیا دین پنکچر ہے؟ کوئی دین کے اندر شگوق پڑ گئے ہیں کہ ہم کبھی قلوں کا، کبھی جمعراتوں کا، کبھی تیجے کا اور کبھی گیارہویں کا جوڑ لگا رہے ہیں؟ بھائی! حضور پاک ﷺ نے تو بچہ پیدا ہونے کے بعد کان میں اذان دینے سے لے کر جنازہ تک کا مسئلہ بتا دیا، عقیقہ بتا دیا، اذان کا مسئلہ سمجھا دیا، سر کے بال منڈانے کا مسئلہ سمجھا دیا، بچہ کے ختنہ کرنے کا مسئلہ سمجھا دیا، بچے کے بالغ ہونے کے احکام سمجھا دیے، بچہ کے غسل کے مسئلے سمجھا دیے، بچہ دس سال کا ہو جائے تو مسئلہ سمجھا دیا، بالغ ہو گیا تو احکام سمجھا دیے، بڑھاپے کے مسئلے سمجھا دیے، موت آ گئی تو غسل کے مسئلے سمجھا دیے، کفن کے کپڑے کے مسئلے سمجھا دیے، قبر کا طریقہ سمجھا دیا اور جنازہ پڑھنا سمجھا دیا۔ اب اس کے بعد ساری باتیں: تیجہ شریف، قل شریف، سات جمعراتیں شریف، چالیسواں شریف اگر دین ہوتا تو میرے مدنی ﷺ یہ نہ سمجھا دیتے......؟؟

اور عمل کرنے کی دوسری شرط کیا ہے؟ صَوَابًا یعنی کہ وہ عمل سنت محمد مصطفی ﷺ کے موافق ہو۔ بھائی! اگر ایک مرغی ہے، اس کو ذبح کرو تو ہم کہتے ہیں کہ حلال ہے، گردن گھونٹ کر مار دو تو ہم کہتے ہیں حرام ہے، کوئی ڈنڈا مار کر مار دے تو ہم کہتے ہیں حرام ہے، وہ خود مر جائے تو ہم کہتے کہ حرام ہے، اس کو کرنٹ مار کر مار دیں تو ہم کہتے ہیں کہ حرام ہے، اس کو کسی مشین میں بٹھا کر کوئی ایسا ذریعہ بنائیں کہ خود سانس بند ہو جائے تو ہم کہتے ہیں کہ حرام ہے اور

گیس کرے میں چھوڑ دیں اور اس سے مرجائے تو ہم کہتے ہیں حرام ہے، کیونکہ میرے مدنی ﷺ نے جو طریقہ بتایا ہے اسی طریقہ پر عمل نہیں ہوا۔ ہم اتنی چھوٹی سی مرغی کو بھی حضور ﷺ کے طریقہ کے بغیر کھانے کو حرام سمجھتے ہیں، تو کوئی ہمیں اتنے گھٹے کھلائے تو ہم کیسے کھالیں؟ اور پھر کہتے ہیں کہ وہابی ہے۔ جو مرضی آئے کہتے رہو۔ ہم تو اتنی چھوٹی سی مرغی بھی ہضم نہیں کر سکتے جب تک سنت پر عمل نہ ہو، جب تک حضور ﷺ کا طریقہ نافذ نہ ہو۔ اور کوئی آدمی ہمیں کہے کہ دیکھیں! یہ تو شیرینی نہیں کھاتے، گیارہویں شریف نہیں کھاتے، یہ بڑے سخت وہابی لوگ ہیں، کسی کی ستائش شریف نہیں کھاتے اور یہ معراج شریف نہیں کھاتے۔ ہم تو اسی "شریف" میں رہ جائیں گے۔

بزرگوں کے ایام اور عرس منانا:

لاکھ سے زائد انبیاء علیہم السلام ہیں۔ جب حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے ان کا کیا قصور ہے کہ اس دن کا کیوں نہ احترام کریں؟ جو سارے نبیوں کا ابا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام جس نے کعبہ بنایا، تم حج پڑھنے آئے ہوئے ہو، ان کی ولادت کا دن کوئی شان والا نہیں ہے؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام جنہوں نے اتنی بڑی قربانی دی، جن کی قربانی کی یاد اللہ نے قیامت تک زندہ رکھ دی ہے، جن کی تم قربانیاں کر رہے ہو، جن کا تم زمزم پی رہے ہو، اس کی شان نہیں ہے کہ ہم اس کا یومِ ولادت منائیں؟ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی شان والے، حضور پاک ﷺ کے اڑھائی لاکھ صحابہ شان والے۔ اللہ نے فرمایا کہ تم دنوں کے چکر میں نہ پڑو، تم کعبہ کا طواف کرتے رہو، میرے ابراہیم کو ثواب مل رہا ہے، تم مقامِ ابراہیم پر نفل پڑھتے رہو، میرے ابراہیم کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ تم زمزم پیتے ہو، اسماعیل کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ تم صفا دوڑتے ہو تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اماں کا طریقہ یاد ہو رہا ہے۔

دن منانے کے لیے نہیں آئے۔ یہ ڈے منانا تو عیسائیوں کا کام ہے، مسلمانوں کا تو اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ مسلمان تو اس عمل کو زندہ رکھتا ہے جو عمل قیامت تک زندہ رہے۔ آدمی پانچ وقت نماز پڑھتا ہے، وہ معراج والے نبی کی معراج کا قائل ہے اور جو بے نماز ہے وہ معراج محمد مصطفیٰ ﷺ کا منکر ہے، کیونکہ حضور ﷺ کو پانچ وقت کی نمازیں معراج میں ملی تھیں۔ تو جو پانچ وقت نماز پڑھ رہا ہے وہ حضور ﷺ کی معراج کو زندہ رکھ رہا ہے اور جو کبھی نماز نہ پڑھے وہ کیسے معراج کو ماننے والا ہے؟ صرف معراج والے دن جھنڈی باندھ لی تو معراج منانے والے بن گئے...... إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ...... جو آدمی پانچ وقت کی نماز پڑھ کر حضور ﷺ کی معراج کو زندہ رکھے ہو تو وہابی ہے، وہ تو حضور ﷺ کا منکر ہے اور جو کبھی نماز نہ پڑھے اور کبھی مسجد کے قریب ہی نہ گیا ہو۔

پوچھیں: حضرت پیر صاحب نماز بھی پڑھی ہو تو وہ کہتا ہے کہ تم کمال کرتے ہو تم نماز پڑھو تو تم گناہگار ہو، لیکن پیر تو پہنچا ہوا ہے۔ پتہ نہیں کہاں پہنچا ہوا ہے؟ ہمیں تو آج تک سمجھ نہیں آیا کہ حضرت پہنچے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں پہنچے ہوئے ہیں؟ روٹی ہمارے پاس کھاتے ہیں، پہنچے ہوئے کہیں اور ہیں...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ......

دو باتیں یاد رکھنا کہ عمل تب قبول ہوگا کہ خالص بھی ہو اور سنت کے موافق بھی۔ اب ایک آدمی رات کو سونے کے لیے تو برش کرے، لیکن نماز سے پہلے اگر مسواک نہ کرے تو یہ سنت پر عمل نہیں ہے، کیونکہ رات کو برش تو اپنے دانتوں کو بچانے کے لیے کر رہا ہے۔

محنت کی کمائی والے کھانے میں برکت:

حضرت قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے ایک واقعہ لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک فقیر آدمی تھے اور روزانہ گھاس کاٹ کر جنگل سے لاتے تھے اور اس کو بازار میں بیچتے تھے۔ اس زمانہ میں تین پیسے کا گھاس بکتا تھا اور وہ اتنی لے آتے تھے کہ تین پیسہ میں وہ بک جائے تو ایک پیسہ گھر والوں کو دیتے تھے اور ایک پیسہ اپنی ضرورت پر خرچ کرتے اور ایک پیسہ رکھ دیتے، اکٹھا ہوتا رہا۔ جب چار پانچ چھ روپے بن جاتے تھے تو جتنے دیوبند کے بڑے عالم تھے، ان سب کو دعوت دیتے تھے کہ ہمارے پاس آج کھانا کھالیں۔ لکھا ہے کہ یقین فرمائیں! اس بزرگ کی اس دعوت کے لیے تمام بزرگ انتظار میں ہوتے تھے کہ کب ہماری دعوت کرتے ہیں؟ ہم ان کی دعوت کو کھانے کے لیے جائیں۔ ایک رات جو کھانا کھاتے تھے تو تین ماہ تک ہمیں اپنے ایمان میں تازگی محسوس ہوتی تھی، ہمیں عبادت میں لذت ملتی تھی اور ہم اس کھانے کی انتظار میں رہتے۔ اور اس کے گھاس کے خریدنے کے لیے لائن کھڑی رہتی تھی کہ کب موقع ملے تو گھاس خرید لیں؟ اور ان کی بھی عادت مبارک تھی کہ جو پہلے آجاتا اس کو گھاس دے دیتے تھے کہ بھائی! پہلے تم نے ہاتھ لگایا ہے تو پہلے تمہارا حق ہو گیا ہے۔ ساری زندگی اس طرح گزری۔ وجہ کیا تھی کہ محنت کر کے پیسہ کماتے تھے، ان کے پیسے میں برکت تھی۔ حلال پیسے میں نور تھا، حلال کے پیسے میں اخلاص تھا، حلال کے پیسہ میں تڑپ تھی اور حرام کے لاکھوں کھانے پکالیں نتیجہ یہ نکلے گا کہ نماز ختم۔

حرام کھانے کی نحوست:

آپ یقین فرمائیں کہ آپ کے ملک میں کبھی جائیں تو بڑا افسر یا زمیندار دعوت کر دے تو اس دن تہجد تو گئی۔ نہ کھاؤ

تو کہیں گے: مولوی بڑے متکبر ہیں۔ ہم تو ویسے بدنام ہیں کہ بلوچ آدمی سے اس کا دماغ خراب ہے۔ تو اگر کھالیں تو نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ کی رحمت سے جو دو نفلیں نصیب ہوتی ہیں وہ ختم۔ کبھی کبھی تو یہ بھی ڈر ہوتا ہے کہ فرض بھی نصیب ہوگا یا نہیں ہوگا!! وجہ کیا ہے کہ جب مال مشتبہ اندر چلا گیا تو عبادت کی توفیق گئی۔ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: حرام مال سے اگر حج کرو گے تو آواز آتی ہے:

((لَا لَبَّيْكَ وَلَا سَعْدَيْكَ، وَحَجُّكَ مَرْدُوْدٌ عَلَيْكَ)) [جمع الجوامع، حدیث:۴۷۲۹]

جاؤ تیری کوئی حاضری نہیں، ہم نے تیرا حج رد کر کے پھینک دیا ہے۔ دوڑ جاؤ! تم نے محنت کی ہے اور بے فائدہ کی ہے۔

کافروں کی جہالت اندھیرا ہی اندھیرا ہے:

اور بعض کافر ایسے ہیں کہ ان کا جہل بالکل ایسے ہے کہ خالص جہل ہے، اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ان کی مثال اللہ نے دی:

﴿أَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۚ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۚ إِذَآ أَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۚ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾ [النور:۴۰]

ان کافروں کی مثال ایسے ہے کہ اندھیرے اور اندھیرے بھی ایسے دریا میں اور دریا میں موج کے اوپر موج ہو۔ ایک رات کا اندھیرا، ایک موج کا اندھیرا اور پھر اوپر سے بادلوں کا اندھیرا۔ اتنا اندھیرا کہ اپنے ہاتھ کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تو کافروں کی مثال ایسے ہے۔ وہ تو کفر کے اندھیروں میں اتنے غرق ہو چکے ہیں کہ ان کو تو کوئی ذرے کے برابر بھی روشنی نہیں آسکتی۔

اور فرمایا کہ جن کے دلوں میں اللہ ایمان کا نور نہ پیدا کریں ان کو کہاں سے روشنی حاصل ہو سکتی ہے؟ اصل نور ایمان ہے۔ نورِ ایمان کی روشنی نہ ہو تو پھر اندھیرے ہی اندھیرے ہیں۔ مرضی آئی تو بتوں کے آگے جھک گئے، کبھی مرضی آئی تو جانوروں کے آگے جھک گئے، کبھی ایک پتھر خوبصورت نظر آیا تو پہلا خدا پھینک دیا اور دوسرے کو پوجنا شروع کر دیا اور بعض بعض کافر تو ایسے گزرے ہیں...... اللہ معاف فرمائے...... کہ وہ طعام یعنی کھانے اور مٹھائیوں کے بھی خدا بناتے تھے کہ مٹھائی کا بت بنا کر رکھ دیا، اس کی پوجا کرتے رہے اور جب پوجا سے فارغ ہوئے تو اس

خدا کو کھا گئے۔ اس سے بڑا اندھیرا اور ظلمات اور کیا ہو سکتی ہیں ؟ تو جب آدمی کفر اور شرک کے اندر جتلا ہو جاتا ہے تو پھر اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔

خالص منافق کی علامات:

صحیحین میں روایت ہے: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ....))

جس کے اندر یہ چار علامتیں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے..... یعنی عملی منافق ہے، کیونکہ اعتقادی منافق تو کافر ہے، اس کے کفر میں تو کوئی شبہ نہیں ہے..... اگر ایک علامت پائی جائے تو چوتھائی حصہ، اگر دو پائی جائیں تو آدھا منافق ہے، اگر تین پائی جائیں تو تین حصہ اور چار علامتیں پائی جائیں تو پورے کا پورا منافق ہو گیا۔ اور وہ علامتیں یہ ہیں:

1 ..... "إِذَا أُتُمِنَ خَانَ" اور جب امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

2 ..... "وَ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ" جب بات کرے تو جھوٹی کرے۔

3 ..... "وَ إِذَا عَاهَدَ غَدَرَ" اور جب عہد کرے تو دھوکہ دے۔

4 ..... "وَ إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ" اور جب لڑائی کرے تو گالیاں دے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۳۴، باب: علامة المنافق، صحیح مسلم، حدیث: ۱۵۸]

چار قسم کے دل:

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں: حضور پاک ﷺ نے فرمایا: دل کی چار قسمیں ہیں:

1 ..... ایک دل اجرد ہے کہ جس کے اندر دیا روشن ہوتا ہے۔

2 ..... دوسرا قلب ایسا ہے جس پر غلاف بندھا ہوا ہے۔

3 ..... تیسرا قلب الٹا ہے۔

4 ..... اور چوتھا قلب مصفح ہے کہ اس کے اندر ایمان بھی ہے اور نفاق بھی ہے۔

اور ان کی تفسیر بھی فرمادی کہ:

❁......قلب اجرد مومن کا دل ہے اور اس کے اندر اللہ نے نورِ ایمان رکھا ہے۔

❁......دوسری قسم وہ دل جس پر غلاف ہے وہ کافر کا دل ہے، جو بند ہے۔

❁......جو دل الٹا ہے اس کے اندر کوئی چیز جائے گی ہی نہیں، مثلاً: ایک گلاس کو اوندھا کر دیں تو اس کے اندر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں جائے گا اور اگر ہم سیدھا کر دیں تو ایک منٹ میں بھر جائے گا۔ تو منافق کا دل ایسے ہے جیسے اس کے اندر کوئی چیز داخل نہیں ہوتی ہے تو یہ اس منافق کا قلب ہے جو بالکل پکا منافق ہے۔

❁......اور قلب مصفّٰی کی مثال ایسے ہے کہ ایمان کی نشانیاں بھی ہیں اور نفاق کی نشانیاں بھی ہیں۔

[مسند أحمد بن حنبل، حدیث:۱۱۱۲۹]

اور میرے مدنی ﷺ نے فرمایا: مومن کے دل کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی سبزی کا بیج آپ ڈالیں، زمین بھی اچھی ہو، پانی بھی اچھا ہو تو شاخیں نکلیں گی۔ اور کافر کی مثال ایسے ہے جیسے زخم ہو، اس کے اندر پیپ ہوگی یا خون ہوگا۔ اگر ایمان والا مادہ غالب آ گیا تو نفاق کو ختم کر دے گا اور اگر خدانخواستہ نفاق والا مادہ غالب آ گیا تو ایمان کو ختم کر دے گا تو خالص منافق بن جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نفاق سے بچائیں۔ (آمین) [مسند أحمد بن حنبل، حدیث:۱۱۱۲۹]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد:

قرآن نے واضح فیصلہ فرما دیا:

﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿۱۱۴﴾﴾ [التوبۃ:۱۱۴]

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے استغفار مانگا، لیکن ایک وقت مقرر تک کہ جب تک وہ زندہ تھا۔ جب اس کی موت کفر پر آ گئی، پکی بات ہوگئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو ابراہیم علیہ السلام بری ہو گئے کہ اب بخشش مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہمارے بعض لوگ لوگوں کے عقیدوں کو خراب کرتے ہیں۔

قرآن کی اتنی آیات کے اندر تیرا باپ...... تیرا باپ کا لفظ ہے۔ تو چچا کا لفظ بھی آ سکتا تھا، قرآن کو بلاوجہ بدل ڈالنا یہ قرآن کی معنوی تحریف ہے۔ جب اللہ نے فرما دیا کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کا

اپنے باپ سے مناظرہ ہوا اور باپ نے کہا کہ میں آپ کو ماروں گا۔ انہوں نے کہا: اچھا میں چلا جاتا ہوں، لیکن میں آپ کے لیے بخشش مانگا کروں گا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بخشش مانگتے رہے، اللہ نے ان کو منع فرما دیا تو اس لیے اللہ کے قرآن کے اندر باپ کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ چچا کو باپ کہا جاتا ہے۔ چچا کو تو باپ کہا جاتا ہے، لیکن باپ کو چچا کبھی نہیں کہا جاتا۔

ایک بات ہمیشہ یاد رکھو! اگر کسی آدمی کا چچا ہے۔ چچا گویا کہ وہ باپ کے مرتبہ میں ہے، لیکن کوئی دنیا میں ایسا بے وقوف نہیں جو باپ کو چچا کہے۔ تو اللہ نے جب قرآن میں باپ کہہ دیا تو ہم اس کو چچا کیسے بنا سکتے ہیں؟ ہاں! یہ علیحدہ بات ہے کہ لفظ چچا کا استعمال ہوتا تو پھر ہم کہتے کہ چچا تھا، وہ بھی باپ کے برابر ہوتا ہے، لیکن جب قرآن کہے کہ باپ ہے، لیکن اس کی شرک پر موت ہو گئی تو اللہ نے معاف نہ کیا۔ اس لیے اصل کوشش یہ کیا کریں کہ شرک میں مبتلا نہ ہوں۔

اللہ کا شریک بنانا:

اور لوگوں نے ایک یہ سمجھ رکھا ہے کہ مشرک وہ ہوتا ہے جو بتوں کی پوجا کریں۔ یہ غلط فہمی ہے۔ بت کی پوجا کرے تو مشرک ہے، جبرئیل علیہ السلام کی پوجا کرے تو تب بھی مشرک ہے، اسرافیل کی پوجا کرے تب بھی مشرک ہے، ملائکہ کی پوجا کرے تب بھی مشرک ہے، انبیاء علیہم السلام کی پوجا کرے تب بھی مشرک ہے، انسانوں کی پوجا کرے تب بھی مشرک ہے اور اللہ کے سوا کسی غیر کی عبادت کرے، کسی غیر کو مشکل کشا سمجھے وہ بھی مشرک ہے۔

ایک بات یاد رکھیں! اس لیے یہ نہیں ہوتا کہ بتوں کو شریک کرے تو مشرک ہے اور زندوں کو خدا کا شریک کرے یا مردوں کو خدا کا شریک کرے تو مشرک نہیں ہے، انسان کو شریک کرے گا تو مشرک ہے، ملائکہ کو شریک کرے گا تو مشرک ہے، جنات کو شریک کرے گا تو مشرک ہے، مردے کو شریک کرے گا تو مشرک ہے اور زندوں کو شریک کرے گا تو مشرک ہے، کیونکہ اس کی شان ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴﴾ [سورۃ الاخلاص]

اس لیے فرمایا:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝۱۱۰﴾ [الکہف: ۱۱۰]

اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے، ''اَحَدًا'' کوئی بھی ہو۔ اور شریک کرنے کا معنی ہے مثلاً: دعا مانگ رہا ہے کہ یا اللہ! مہربانی فرما، میری مشکلات دور فرما دے۔ اور ساتھ ہی کہہ رہا ہے: یا علی! تو بھی مشکل کشائی فرما دے۔ تو اب دعا میں شریک کر رہا ہے۔ اسی کا نام شرک ہوتا ہے۔ لوگوں نے سمجھا یا کہ کافر ہندو مشرک ہوتا ہے، ہم تو جو مرضی آئے کرتے رہیں، ہم تو کلمہ پڑھتے ہیں۔ کلمہ پڑھنے کے بعد ہی بندہ مشرک بنتا ہے۔ جو آدمی خدا کو مانتے ہی ناں! وہ کیا مشرک بنے گا؟ وہ تو دہریہ ہے، خدا کا منکر ہے، وہ تو خدا کو مانتا ہی نہیں۔ مشرک کا معنی یہ ہوتا ہے کہ خدا کو بھی مانے اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک بھی کرے، اسی کو تو مشرک کہتے ہیں۔ اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا کیا کریں اور احتیاط کیا کریں کہ ہماری عبادت میں، ہماری دعا میں، ہماری نذر و نیاز میں، خیرات میں اور پکار میں شرک نہ آئے، کیونکہ مشرک کی بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، باقی آدمی کتنا بڑا گناہگار ہے وہ بھی تو بخشا جائے گا، اس کی بخشش کی امید ہو سکتی ہے، لیکن مشرک اور کافر کی بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

منافقین کو تنبیہ:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمادیا کہ اللہ پاک تو قادر ہیں۔ اس سے منافقین کو تنبیہ کی گئی کہ منافق اللہ کے غضب اور اللہ کی پکڑ سے ڈریں، اللہ پاک نے ان کا احاطہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی قوتِ باصرہ اور قوتِ سامعہ کو ختم کرنے پر قادر ہیں۔ کبھی فعیل فاعل کے معنی میں آتا ہے، جیسے قدیر بمعنی قادر اور علیم بمعنی عالم ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ مثال باعتبار جنس منافقین کے ہے، وگرنہ منافقین کے احوال مختلف ہوتے ہیں اور ان کی صفات بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جیسے سورۃ البراۃ کے اندر مثالیں بیان فرمائیں، فرمایا ''مِنْهُمْ'' ان میں سے بعض ایسے ہیں، کیونکہ ایک تو ہے مطلق منافق اور ایک ہے منافقین کے احوال اور ان کی صفات۔ ان کے احوال بڑے مختلف ہیں تو سورۂ براءت میں کئی چیزیں بیان کی گئیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو مثالیں ذکر فرمادیں، کیونکہ منافقوں کے احوال مختلف ہیں: بعض منافقوں کی حالت پر پہلی مثال منطبق ہوگی اور بعض منافقین کے احوال پر دوسری مثال مطابق ہوگی۔ [ابن کثیر: ۱/ ۵۶، الآیۃ: اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ]

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا، پھر اس سے قسم قسم کے پھل نکالے تمہارے کھانے کے لیے۔ پس تم کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ اور تم جانتے ہو۔

سورۃ البقرۃ کی ان آیات مبارکہ میں مسئلہ توحید اور اس کے دلائل کا ذکر ہے۔

ان دونوں آیات کا تعلق سابقہ آیات سے ہے، پہلے ۲۰ آیات ختم ہوگئیں تو اب اکیسویں اور بائیسویں آیت شروع ہورہی ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ [البقرۃ: ۲۱]

سب سے پہلا حکم دیا ہے: اے لوگو!...... یہ خطاب ان سب کو ہے جن کی قسمیں پیچھے گزر چکی ہیں: مومنوں، کافروں، منافقوں، متقین، فاسق اور فاجر سب کو خطاب ہے۔ یہ لفظ عام ہے۔ اس آیت میں قرآن کا پہلا پہلا حکم آرہا ہے اور پہلی پہلی نہی آرہی ہے۔ پہلا امر ہے ﴿اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ اور پہلی نہی ہے ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾

اللہ نے فرمایا: اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی۔ اگر مومنوں کی طرف خطاب متوجہ ہوگا تو معنی ہوگا کہ اے ایمان والو! جیسے تم ایمان کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کر رہے ہو اسی پر جمے رہو اور اسی پر قائم دائم رہو۔

گناہگار کی طرف متوجہ ہوگا تو معنی ہوگا ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ اے گناہگارو! گناہوں کو چھوڑ دو، نافرمانیوں کو چھوڑ دو اور اپنے رب کی عبادت کرو۔

کافروں کی طرف متوجہ ہو تو ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ کا معنی ہوگا: اے کافرو! غیر اللہ کی عبادت چھوڑ کر تم اپنے رب کی عبادت کرو۔

منافقوں کی طرف متوجہ ہوگا تو معنی ہوگا: اے منافقو! تم جو اندر کفر چھپائے ہوئے ہو اس کو نکال کر باہر پھینکو اور

تم اپنے رب کی سچی عبادت کرو۔

انتہا درجہ کی تعظیم، انتہا درجہ کی محبت اور انتہا درجہ کا تذلل اس کا نام عبادت ہے۔

[تفسیر روح البیان: ۱/ ۷۱، الآیۃ: یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ]

نکات:

قرآن نے اور کئی مقام پر بیان فرمادیا کہ سب سے بڑی محبت بھی اللہ کے ساتھ ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ﴾ [البقرۃ:۱۶۵] ایمان والے سب سے زیادہ محبت اللہ کے ساتھ کرتے ہیں اور اس کے بعد سب سے زیادہ تعظیم اللہ کی کرتے ہیں اور سب سے زیادہ عاجزی اور بندگی اللہ کے آگے ہو۔ اور ایک ہی بندے کو مطلق محبت ہے، یعنی باپ کو بیٹے سے بھی محبت ہے، بھائی سے بھی محبت ہے، دوستوں سے بھی محبت ہے، اپنے ہمسائے سے اور قبیلے سے بھی محبت ہے اور قوم برادری سے بھی محبت ہے۔ یہ مطلق محبت علیحدہ چیز ہے اور ایک غایت درجہ کی محبت ہے جس کی محبت کے مقابلہ پر اور کوئی محبت نہ آسکے، یعنی اگر ایک طرف اللہ کی محبت آجائے اور دوسری طرف قبیلہ ہے، بیٹا ہے، بیٹی ہے، بہن ہے، نفع ہے، تذلل ہے، عاجزی ہے اور بندگی ہے، وہ بھی صرف اللہ کے آگے ہوگی۔ اب دیکھیں کہ آدمی ہاتھ باندھ کر اپنے آپ کو عاجز بنا کر دربار میں کھڑا ہے، اب کھڑے کھڑے رکوع میں آگیا اور رکوع سے سیدھا کھڑا ہوگیا ''رَبَّنَا! وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَکًا کَمَا یُحِبُّنَا وَ یَرْضٰی'' کھڑا ہے اور پڑھ رہا ہے۔ اور اس کے بعد پھر اللہ اکبر کی بڑائی کا اقرار کرتے ہوئے، اب بالکل ذلت کی انتہا پر چلا گیا۔ جو اس کو اللہ نے چہرہ دیا تھا، جو اس کو بدن کا اعلیٰ حصہ دیا تھا اس کو مٹی میں ڈالے ہوئے ہے اور کہہ رہا ہے ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' اے اللہ! تیری بلندی اور تیرے علو کی کوئی حد نہیں ہے اور میری ذلت اور عاجزی کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں تیرے آگے بالکل گر گیا ہوں اور میں نے اپنے چہرے کو مٹی میں ڈال دیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے عجز و بندگی کا اظہار کر رہا ہے۔

عبادت صرف اللہ کے لیے:

اب جناب! اسی سے اندازہ کرلیں کہ رکوع عبادت ہے، سجدہ عبادت ہے، نماز عبادت ہے، طواف عبادت ہے، حج عبادت ہے، قربانی عبادت ہے، خیرات کرنا عبادت ہے، اسی طریقہ سے حجر اسود کو بوسہ دینا عبادت ہے،

مقامِ ابراہیم پر دو رکعت پڑھنا عبادت ہے، خیرات کرنا عبادت ہے اور دعا مانگنا عبادت ہے۔ عبادت ہم نے اللہ کی کرنی ہے۔ اچھا اب اگر کوئی آدمی رکوع کسی دوسرے کے آگے کرے، دوسرے کے آگے جھک کر کھڑا ہے، سردار کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہے، سردار کے پاؤں پر پڑا ہوا ہے، مرشد کے پاؤں پر سر رکھ کر گردن پر کپڑا ڈال کر پڑا ہوا ہے، قبر پر گردن پر کپڑا ڈال کر پہلے چوکھٹ پر سجدہ، پھر قبر پر سجدہ، پھر غلاف پر سجدہ اور پھر تعویذ پر سجدہ۔ عبادت کر رہا ہے اور اس کے بعد کھڑا ہو کر کہتا ہے: یا داتا! ہر مشکل کشا، حاجت روا۔ اے داتا! مہربانی فرما، اے قلندر! مہربانی فرما، اے علی ہجویری! مہربانی فرما، مشکل میں پھنس گیا ہوں، میری مشکلیں حل کر دے۔ یا معین الدین چشتی! مہربانی فرما، قلندر! مہربانی فرما۔ یہ کہہ رہا ہے۔ ایمان سے بتلائیں! کیا یہ اللہ کی عبادت کر رہا ہے؟ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے جو سمجھنے والا ہے۔ اگر سمجھ میں آ گیا تو سمجھیں کہ سارا دین سمجھ میں آ گیا۔ جب یہ سمجھ نہیں آیا تو سمجھو کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ایک موٹی سی بات یاد رکھ لیں! اگر عقیدۂ توحید اللہ نے دماغ میں اتار دیا اور ذرا غور کرو تو سمجھ آ سکتا ہے۔ جیسے اقبال نے کیا پیاری بات کی ہے کہتا ہے:

ؔ سمجھ میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے؟

نکتہ توحید سمجھ تو آ سکتا ہے، لیکن اگر تو نے اپنے دماغ کو ہی بت خانہ قرار دے دیا ہے۔ کسی آدمی کو اپنے وطن سے اتنی محبت ہے اس کو کہو کہ حج فرض ہے، کعبہ میں چلو تو کہتا ہے کہ میں وطن نہیں چھوڑ سکتا۔ جہاد فرض ہو گیا ہے، جہاد کے لیے نکلو تو کہتا ہے کہ میں اپنے وطن کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اب وطن کی محبت اللہ کی محبت سے بڑھ رہی ہے، اب وطن کی محبت اللہ کے فرائض کی محبت سے بڑھ رہی ہے، یہ بھی شرک ہو رہا ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ شرک صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک بت آگے کھڑا کر دو اور اس کو پوجو تو مشرک ہے۔ یہ لوگوں کو بڑی غلط فہمی ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ کافر وہ ہوتا ہے جو بتوں کا پجاری ہے، جو سورج کا پجاری ہے۔ کیا وہ مسلمان ہے؟ حالانکہ سورج کوئی بت ہوتا ہے؟ اچھا! آگ کا جو پجاری ہے وہ مسلمان ہے؟ آگ کس بت کا نام ہے آگ بھی تو کسی بت کا نام نہیں ہے۔ یہ بتائیں کہ کوئی گنگا کی پوجا کرے وہ مسلمان ہے، اگر گائے کی پوجا کرے تو وہ مسلمان ہے مسلمان نہیں ہے۔

اچھا جناب ایک آدمی جانوروں کی بھی پوجا نہیں کرتا، پانی کی بھی پوجا نہیں کرتا، چاند کی پوجا بھی نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرنے والا کافر ہے، جو عیسیٰ علیہ السلام سے مشکلات کا حل مانگے وہ کافر ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو

مشکل کشا سمجھے وہ کافر ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو حاجت روا سمجھے وہ کافر ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھے تو کافر ہے اور محمد مصطفیٰ ﷺ کو حاجت روا سمجھے تو مسلمان ہے؟ بھائی! عیسیٰ علیہ السلام بھی تو اللہ کا نبی ہے اور محمد مدنی مصطفیٰ ﷺ بھی اللہ کا نبی ہے۔ جب اللہ نے حکم دیا کہ میری عبادت کرو تو میرے مدنی پاک ﷺ نے اپنے رب کی عبادت کی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے رب کی عبادت کی، آدم سے لے کر ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں نے اللہ کی عبادت کی ہے۔ ان تمام انبیاء علیہم السلام نے اللہ کی عبادت کی ہے۔

عبادت اور سجدہ صرف اللہ کے لیے:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت! گزارش یہ ہے کہ ہم جو پیر کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ہم جو قبر پر سجدہ کرتے ہیں، یہ وہابی سمجھتے نہیں ہیں۔ عبادت والا سجدہ اللہ کے سوا غیر کو کرنا کفر ہے، ہم تو تعظیم وار سجدہ کرتے ہیں عبادت کے لیے نہیں ہے اور مثال یہ لے آتے ہیں کہ اگر ہر سجدہ کفر ہوتا تو پھر آدم کو بھی سجدہ جائز نہ ہوتا۔ جب سب سے پہلی اللہ کی نوری مخلوق ہے تو جب نور والے فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تو ہم بھی آدم علیہ السلام کی اولاد کو سجدہ کر رہے ہیں، ہم بھی تو آدم علیہ السلام کے بیٹے کو سجدہ کر رہے ہیں؟ وہ لوگوں کے دماغ کے اندر اس بات کو ڈالتے ہیں۔ حالانکہ وہ سجدہ اور ہے اور یہ سجدہ اور ہے۔ اس لیے کہ دیکھیں کہ یہ کس نے حکم دیا ہے کہ اپنے رب کی عبادت کرو؟ اللہ کا حکم ہے۔ تو جب آدم علیہ السلام کو ملائکہ نے سجدہ کیا تھا، اپنی عقل سے کیا تھا یا اللہ کے حکم سے کیا تھا؟ بات کو سمجھیں! بات کو یاد رکھیں! تمام ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا ہے، ہمارا ایمان ہے، قرآن میں موجود ہے، لیکن اپنی عقل سے کیا ہے؟ اپنی محبت سے کیا ہے؟ یا اللہ کے حکم سے کیا ہے؟ اللہ کے حکم سے کیا ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ﴾ [البقرۃ:۳۴]

''ہم نے حکم دیا ملائکہ کو کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔''

تو اللہ کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اگر آدم علیہ السلام کی تعظیم کے لیے اللہ کا حکم چاہیے تو قبر کی تعظیم کے لیے بھی اللہ کا حکم چاہیے۔ اگر کسی جگہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ میرے پیاروں کی قبروں کو اور روضوں کو سجدہ کیا کرو۔ تو ہم بھی حاضر ہیں، ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر اللہ کا حکم نہیں ہے تو پھر سجدہ نہیں ہو سکتا۔ وہاں تو اللہ کا حکم ہے۔

﴿فَسَجَدَ الْمَلَٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ﴾ [الحجر:۳۰]

اللہ کے حکم پر ملائکہ نے سجدہ کیا۔ اسی اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تم کسی غیر کو سجدہ نہ کرو۔

اگر سجدہ غیر اللہ کو جائز ہوتا......؟

ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابی نے میرے آقا ﷺ کے سامنے آکر سوال کیا اور ایک روایت میں ہے کہ سوال نہیں کیا، بلکہ حضور ﷺ کے سامنے سجدہ کیا تو حضور پاک ﷺ نے بلایا اور فرمایا: اللہ کے بندے! تم نے میرے سامنے یہ سجدہ کیوں کیا ہے؟ اس نے کہا: حضور! قیصر اور کسریٰ کے جو بادشاہ ہیں، جو روم کے بادشاہ ہیں اور جو فارس کے بادشاہ ہیں لوگ جب ان بادشاہوں کے دربار میں جاتے ہیں پہلے ہاتھ باندھ کر جھکتے ہیں، پھر بادشاہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، پھر اپنے بادشاہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اگر دنیا کے بادشاہ کو سجدہ کرنا وہ تعظیم سمجھتے ہیں تو آپ تو ہمارے دین کے بھی بادشاہ ہیں اور دنیا کے بھی بادشاہ ہیں آپ تو اللہ کے سب سے افضل رسول ہیں، لہٰذا ہم آپ کو سجدہ کیوں نہ کریں؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: خبردار! اللہ کی ذات کے سوا کسی غیر کو سجدہ جائز نہیں۔ اگر سجدے کی اجازت ہوتی تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، لیکن اللہ کے سوا کسی غیر کا سجدہ جائز نہیں۔ [سنن أبي داود، حديث: ۲۱۴۰ باب: في حق الزوج على المرأة، سنن الدارمي، حديث: ۱۵۱۵]

اب آپ ایمان سے بتلائیں کہ صحابی نے تعظیم کے سجدے کا پوچھا تھا یا عبادت کے سجدے کا پوچھا تھا؟ لوگ بادشاہ کو جو سجدہ کرتے ہیں تعظیم کے لیے کرتے ہیں یا عبادت کے لیے کرتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر سجدہ جائز ہوتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ خاوند کو سجدہ کرتی، اس کی تعظیم کرتی یا عبادت کرتی، لیکن تعظیمی سجدے کی بھی اجازت نہیں، کیونکہ اعلان ہوگیا:

﴿لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ﴾

[حٰمٓ السجدة: ۳۷]

اللہ نے فرمایا: نہ سورج کا سجدہ اور نہ چاند کا سجدہ۔ کیا معنی کہ جو چیزیں دن کو نظر آئیں ان کو بھی سجدہ نہیں اور جو چیزیں تمہیں رات کو نظر آئیں ان کا بھی سجدہ نہیں۔ جو چیزیں روشنی پھیلانے والی ہیں ان کا بھی سجدہ نہیں، جو چیزیں نور پھیلانے والی ہیں ان کا بھی سجدہ نہیں، جو چیزیں اونچی ہوں بلندی میں یا مرتبہ میں ان کا بھی سجدہ نہیں ہے۔ سجدہ ہے تو صرف اللہ کا اگر تم اس کی عبادت کرنے والے ہو۔

اور عبادت اللہ کے سوا کسی غیر کے لیے نہیں ہے، نہ کسی فرشتے کے لیے جائز ہے اور نہ کسی پیغمبر کے لیے جائز ہے، نہ کسی ولی کے لیے جائز ہے۔ ہم اولیاء کی تعظیم کریں گے، مگر جو شریعت کی حدود کے اندر ہے۔ ہم انبیاء علیہم السلام کی تعظیم کریں گے، مگر جو شریعت کی حدود کے اندر ہے اور ہم اپنے بزرگوں کی تعظیم کریں گے جو شریعت کی حدود کے اندر ہے اور جو چیز حدود شریعت سے باہر ہے وہ اسلام سے باہر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پہلی جو صفت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے:

﴿الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ [البقرۃ:۲۱]

”جس نے تجھے پیدا کیا اور تجھ سے پہلے والوں کو بھی پیدا کیا۔“

یعنی تیرے آباؤ اجداد، حتیٰ کہ جس نے آدم سے لے کر ساری مخلوق کو پیدا کیا۔

حضور ﷺ کی ختم نبوت:

یہاں فرمایا: جو تم سے پہلے گزرے ان کو بھی پیدا کیا، قرآن نے یہاں ”مِنْ بَعْدِكُمْ“ نہیں فرمایا، حالانکہ جو ہمارے بعد آئیں گے ان کو بھی اللہ پیدا کریں گے تو یہ اشارہ کر دیا کہ امت محمد مصطفیٰ ﷺ تم آخری امت ہو، تمہارے بعد اور کوئی امت نہیں اور تمہارے نبی کے بعد کوئی نبی نہیں۔

سورۂ بقرہ کی ابتداء میں ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ [البقرۃ:۴]

وہاں بھی یہ نہیں فرمایا کہ آپ کے بعد، کیونکہ آپ کے بعد کوئی کتاب اور دین نہیں، آپ کے بعد نبوت اور شریعت بند اور اب کوئی کتاب بھی نہیں آئے گی۔

﴿الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۱]

تم ڈرنے والے بن جاؤ پرہیزگار بن جاؤ۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مستحق صرف وہی ہے جو پیدا کرنے والا ہے، کیونکہ عبادت کے حکم کے بعد رب کی پہلی صفت ﴿الَّذِیْ خَلَقَكُمْ﴾ بیان کی گئی ہے۔ تو جو پیدا کرنے کے قابل نہیں، بلکہ خود مخلوق ہے وہ عبادت کے قابل نہیں ہو سکتا، وہ تو خود پیدا کیا ہوا ہے۔

غیر اللہ کو پکارنا:

تو جب یہ عبادت ہے تو کس کی عبادت ہوگی؟ اللہ کی ہوگی۔ اب کوئی غیر سے مانگ رہا ہے یا نذر مان رہا ہے: یا حسین! یا پنجتن پاک! یا فلاں! تو عطا کر دے، یا شیخ عبد القادر جیلانی! مہربانی فرما، یا فلاں! میرے حال پر رحم فرما۔ اب یہ کیا کہہ رہا ہے؟ عبادت تو اللہ کی ہوتی ہے۔ جب یہ غیر کی کر رہا ہے تو یہ شرک کر رہا ہے۔ کہتے ہیں: ''یا محمد'' لکھو تو وہابیوں کو آگ لگ جاتی ہے۔ ارے! اگر ان کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے آگ لگتی ہے تو ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' بھی نہ پڑھتے، اگر ان کو محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم سے آگ لگتی تو اذان میں ''أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' نہ کہتے۔ تو تکبیر میں بھی نہ کہتے۔ اگر ان کو نبی علیہ السلام کے نام سے جلن تھی تو نماز میں ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ'' نہ کہتے۔ اگر نبی علیہ السلام کے نام سے جلن تھی تو نماز والا درود بھی نہ پڑھتے۔ تو معلوم ہوا کہ ان کو جلن نبی علیہ السلام کے نام سے نہیں، بلکہ عقیدہ کی غلطی سے ہے۔ اللہ کے ساتھ بھی یا حرف نداء ہے اور نبی علیہ السلام کے ساتھ بھی ''یا محمد'' ہے، ''یا رسول اللہ'' ہے، یا علی! یا دستگیر! جب تو نے حرف ندا لگایا تو اللہ کو پکارنا تھا تو انہوں نے کہا کہ یہ پکارنے والا حرف ندا نہ لکھو، کہیں اللہ کی عبادت میں شرک نہ ہو جائے، کیونکہ دعا مانگنا پکارنا عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ کے لیے ہے، کسی غیر اللہ کے لیے نہیں ہے۔ اگر کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے دشمنی ہے تو کیا وہ مسلمان ہے؟ وہ تو مسلمان ہی نہیں ہو سکتا، وہ تو کافر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تو بڑی چیز ہے، اگر مدینہ سے بھی محبت نہیں ہے تو مسلمان نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر سے محبت نہیں ہے تو مسلمان نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے پیار، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اہل بیت سے پیار وہ تو ہمارا ایمان ہے، لیکن عبادت اللہ کی ہوگی اور پکارنا عبادت ہے اور ''یا'' کا حرف پکارنے کے لیے ہے۔

آپ دیکھیں! مثلاً: لوٹا لٹکا ہوا ہے یا کہیں پرندے اڑ رہے ہیں تو آپ کہیں گے کہ یہاں پانی ہوگا، کہیں آپ کو بجلی کی لائٹ نظر آئے تو آپ کہیں گے کہ کوئی بستی ہوگی، زیادہ اونچے مینار پر لائٹ نظر آئے تو آپ کہیں گے کہ مسجد ہوگی۔ تو حرف ندا بھی پکارنے کے لیے ہوتا ہے، جب وہ اللہ کے سوا کسی غیر کے ساتھ جڑے اب چاہے کہنے والا ممکن ہے عقیدہ نہ بھی ہو، لیکن ڈر پیدا ہو گیا کہ یہاں سے شرک کا راستہ نہ کھل جائے، اس لیے علماء نے کہا کہ اگر یا غیر اللہ کے ساتھ بھی لکھو تو کہیں شرک پیدا نہ ہو جائے۔ اگر لکھنا ہے تو لکھو ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' اگر لکھنا ہے تو جیسے قرآن میں ہے ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' [الفتح: ۲۹] صرف اتنا لکھو، مجال ہے کہ کوئی اعتراض کرے۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

اللہ کے مستحق عبادت ہونے کی دوسری دلیل:

اور دوسری صفت آئی:

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ﴾[البقرۃ:۲۲]

زمین کو بچھونا بنایا، سخت نہیں بنایا پتھر کی طرح کہ تم رہ نہ سکو اور پانی کی طرح نرم نہیں بنایا کہ تم دھنس نہ جاؤ اور آسمانوں کو چھت بنایا۔ اونچی چیز، اوپر چھت کی مثال میں ہے۔ زمین کو بچھانے والا اور آسمانوں کو بنانے والا اللہ ہے تو عبادت کے لائق بھی صرف وہ ہے، جس نے زمینوں اور آسمانوں کو بنایا۔

اگر کوئی یہ سمجھے کہ پھل تو میں نے خود پیدا کیے ہیں، کیونکہ ساری محنت میں نے خود کی ہے تو اللہ نے دوسری جگہ فرمایا:

﴿ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ۝﴾[الواقعہ:۶۴]

اور جو تم پانی لگا رہے ہو وہ پانی بھی اللہ نے پیدا کیا ہے اور زراعت کے تمام صلاحیتیں اور اسباب اللہ کے پیدا کردہ ہیں، لہٰذا اصل پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں:

﴿وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝﴾
[البقرۃ:۲۲]

جب یہ سب کرنے والا اللہ ہے، یہ پہلی نہی ہے کہ سب کچھ پیدا کرنے والا بھی اللہ ہے، تم جانتے ہو کہ روزی دینے والا بھی تیرا رب ہے تو پھر ان کو میرا مقابل کیسے بنا رہے ہو جس نے ایک مکھی بھی پیدا نہیں کی؟

محتاج مستحقِ عبادت نہیں ہوسکتا:

تم کعبہ شریف میں ہو، اللہ کے گھر میں ہو، وضو کے ساتھ کھڑے ہو، قیامت میں یوں نہ کہنا کہ ہمیں مسئلہ سمجھ نہیں آیا تھا۔ مانو تو تمہاری مرضی، نہ مانو تو تمہاری مرضی۔ پھر یہ نہ کہنا کہ اللہ کی توحید ہمیں سمجھ نہیں آئی تھی۔ مثلاً: میں مر گیا، میری قبر پر آکر تم عینک رکھ دو تو کیا میں آکر ہٹا دوں گا؟ تو اگر میں اتنا تھوڑا سا بوجھ اٹھانے پر قادر نہیں تو تمہاری مشکلیں ہٹانے پر کیسے قادر ہوں؟ تیری مصیبتوں کے دفع کرنے پر کیسے قادر ہوں؟ اسی لیے اللہ نے فرمایا:

﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا﴾

اللہ کے مقابل نہ بناؤ۔

﴿وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۲]

اللہ نے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ جو مر گئے اور جن کو تم کندھا دے کر دفنا آئے ہو، اب وہ کیسے حاجت روا بن گئے؟ وہ تمہارے مشکل کشا کیسے بن گئے؟ اس کو غسل تو نے دیا، اس کے جنازے کو کندھا تو نے دیا، جن کے لیے تو نے قبریں کھودیں، جن کو تو نے دفن کیا ان کے اوپر کمرے، محراب اور روضے تو نے بنا ڈالے ہیں، وہ کیسے مشکل کشا اور حاجت روا بن گئے؟ ان کے لیے سایہ بنانے والا تو ہے، ان کی قبریں کھودنے والا تو ہے، ان کو غسل دینے والا تو ہے اور ان کو دفن کرنے والا تو ہے، کیا اس کے بعد وہ حاجت روا بن جاتے ہیں؟ اس لیے اللہ نے فرمایا: تم جانتے ہو یہ بات یا نہیں جانتے، تمہیں پتہ نہیں ہے کہ تمہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ تیرے باپ کو کس نے پیدا کیا؟ اور تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ آسمان کس نے بنایا؟ یہ زمین کس نے بنائی ہے؟

اس لیے قرآن نے بار بار دعوت دی۔ اللہ پاک نے فرمایا:

﴿أَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ [النحل:۱۷]

وہ خدا جو پیدا کرنے والا ہے اور وہ جو کچھ پیدا نہیں کر سکتا کیا وہ برابر ہو سکتے ہیں؟

ایک پیدا کرنے والا ہے اور ایک کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتا، ایک پیدا کرنے والا خالق ہے اور ایک پیدا ہونے والا مخلوق ہے، ایک روزی کھانے والا مرزوق اور ایک روزی دینے والا رازق ہے اور قبر کا محتاج بندہ ہے اور غنی خدا ہے۔ اس لیے فرمایا: میرے بندے! تم سب جانتے ہو، پھر بھی تم میرے سامنے شرک کرتے ہو؟ اس لیے فرمایا:

﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۲]

توحید کے دلائل کی اقسام:

قرآن پاک میں جہاں توحید کا مسئلہ ذکر کیا گیا ہے وہاں توحید کے دلائل بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ ان میں غور کرو! سوچو! اور اس کے بعد ظاہر و باطن سے اللہ کی توحید کے عقیدے کو قبول کرو۔ اور وہ دلائل مختلف ہوتے ہیں، کبھی ان دلائل کا تعلق آسمانوں سے ہوتا ہے، کبھی ان دلائل کا تعلق زمینوں سے ہوتا ہے، کبھی ان دلائل کا تعلق نفس سے ہوتا

ہے اور کبھی ان دلائل کا تعلق آفاق اور کون سے ہوتا ہے۔

قرآن پاک کتابِ ہدایت وموعظت اور عبرت ہے کہ اس سے ہم ہدایت حاصل کریں۔ قرآن پاک نے ایسی بحثوں کی طرف توجہ ہی نہیں فرمائی کہ چاند کہاں ہے؟ آسمان کے اوپر ہے یا آسمان کے نیچے ہے؟ شمس کہاں ہے؟ نیچے ہے یا کہ اوپر ہے؟ کواکب اور نجوم مُعَلَّقَةٌ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ہیں یا آسمانوں کے اوپر ہیں۔

قرآن پاک میں غور کا طرز:

اللہ تعالیٰ تو ایک جامع اور مانع لفظ استعمال فرما دیتے ہیں، جیسے:

﴿الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً﴾ [البقرۃ:۲۲]

وہ ذات پاک جس نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا بنا دیا، وہ ذات پاک جس نے زمین کو تمہارے لیے جھولا بنا دیا، جس پر تم آرام کرتے ہو۔

بعض لوگوں نے اس سے بحثیں نکالی ہیں: جھولے کی حرکت یوں ہوتی ہے اور بعض نے کہا کہ جھولے کی حرکت یوں مستطیل ہوتی ہے یا ابحاث ایسی ہیں کہ ان سے کبھی کسی قوم کو ہدایت نہیں ملی اور نہ فائدہ ہوا ہے۔ اس لیے قرآن مقدس ایسی ایسی چیزوں کی طرف نظر ہی نہیں کرتا اور اسی طرح زمین اگر گول ہو تو اس کی سطح بھی ویسے پھیلتی جاتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے بار میں فرمایا کہ ان کو میخیں بنا دیا ﴿وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا﴾ [النباء:۷] تو اب میخ اگر دروازے میں لگائیں گے تو وہ چھوٹی ہوگی۔ اتنی بڑی زمین میں جب میخ گاڑی ہے تو وہ بھی تو اتنی بڑی ہوگی۔ پہاڑوں کی سطح اتنی ہوتی ہے کہ اس پر ہزاروں اور لاکھوں لوگ رہائش رکھ لیتے ہیں۔ تو اس لیے اگر زمین گول ہو تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اگر زمین پھیلی ہوئی ہے اور اس کا پھیلاؤ کس طرف ہے؟ ان ابحاث میں پڑنا قرآن کے موضوع سے خارج ہے۔ اگر ہدایت حاصل کرنی ہے تو مٹی کے ذرّے سے بھی حاصل کر سکتے ہیں اور اگر ہم نے ہدایت سے محروم ہونا ہے تو اتنی بڑی بحثیں کرنے والے آج تک اللہ کی توحید کا اقرار نہیں کر سکے۔ اس لیے قرآن مقدس میں اسی انداز میں غور کرنا چاہیے جیسا کہ قرآن اتارا گیا ہے۔ قرآن کیوں اتارا گیا ہے؟

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ [البقرۃ:۲]

﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝ يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ﴾ [الجن:۱،۲]

قرآن پاک ہماری ہدایت و موعظت کے لیے آیا ہے، قرآن پاک ہماری ظاہری و باطنی اصلاح اور تزکیہ کے لیے آیا ہے۔ قرآن مقدس کا یہ اسلوب ہی نہیں کہ وہ تاریخ کے قصے بیان کرے، قرآن پاک کا یہ اسلوب ہی نہیں ہے کہ جہاں ستاروں کا ذکر آجائے وہ فلکیات کی بحثوں میں الجھ جائے، قرآن پاک کا یہ موضوع ہی نہیں ہے کہ جہاں زمین کا ذکر آئے زمین کی ابحاث میں پڑ جائے۔

فقاہتِ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا عجیب واقعہ!

اسی لیے ایک بڑا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ...... اللہ پاک ان دونوں پر اور تمام ائمہ پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے...... کہ ایک آدمی نے حضرت سفیان رحمہ اللہ سے مسئلہ پوچھا، اس نے کہا: میں نے قسم کھائی ہے ''وَاللّٰہِ! لَا اٰکُلُ اللَّحْمَ'' (مجھے اللہ کی قسم! میں گوشت نہیں کھاؤں گا) میں نے قسم کھالی، لیکن انسان ہوں، آج میں نے مچھلی کھالی ہے تو اب میری قسم باقی ہے یا میری قسم ٹوٹ گئی؟ حضرت سفیان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تمہاری قسم ٹوٹ گئی ہے، تم کفارہ ادا کرو۔ اور قسم کا کفارہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا لگاتار تین روزے رکھے۔ اتفاق سے اس آدمی نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی رجوع کرلیا اور ان سے یہ مسئلہ پوچھا کہ میری قسم کا کیا بنے گا؟ انہوں نے فرمایا: تمہاری قسم نہیں ٹوٹی ہے، کفارہ بھی نہیں ہے۔ اب وہ غریب پریشانی میں مبتلا ہوگیا کہ ایک عالم کہتا ہے: تمہاری قسم ٹوٹ گئی ہے اور کفارہ ادا کرو اور ایک عالم فرماتے ہیں: تمہاری قسم نہیں ٹوٹی۔ میں کدھر جاؤں؟

وہ پھر حضرت سفیان رحمہ اللہ کی خدمت میں آگیا اور ان سے کہا: حضرت! عجیب بات ہے! آپ فرماتے ہیں کہ قسم ٹوٹ گئی اور کفارہ ادا کرو اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ قسم نہیں ٹوٹی۔ تو حضرت سفیان رحمہ اللہ غصہ میں آگئے، انہوں نے فرمایا: یہ عجیب بات ہے! یہ اپنی عقل سے ایک فتویٰ دے دیتے ہیں اور اللہ کے قرآن کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ قرآن نے نہیں فرمایا: ''لَحْمًا طَرِیًّا'' (النحل: ۱۴) کہ مچھلی کو اللہ کا قرآن کہتا ہے ''تروتازہ گوشت''۔ جب قرآن میں مچھلی پر ''لَحْمًا'' کا اطلاق آگیا ہے تو تم نے بھی قسم کھائی تھی کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا تو قسم ٹوٹ گئی، قرآن کے مطابق یہ لفظ موجود ہے اور امام ابوحنیفہ نے اللہ کے قرآن کے خلاف کیسے فتویٰ دے دیا؟

وہ آدمی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس آگیا اور کہا: آپ نے کہا کہ قسم نہیں ٹوٹی ہے اور حضرت سفیان نے فرمایا کہ قسم ٹوٹ گئی۔ اور میں پھر دوبارہ آگیا تو وہ ناراض بھی ہوگئے کہ امام ابوحنیفہ قرآن کی مخالفت کر رہا ہے۔ امام

صاحب نے پوچھا: میں نے قرآن کی مخالفت کیسے کر دی؟ انہوں نے کہا کہ قرآن پاک نے کہا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا﴾ [النحل:۱۴]

امام صاحب نے فرمایا: ایسا کرو کہ ابھی حضرت غصہ میں ہیں، ابھی تم کچھ نہ کہو۔ دو چار روز کے بعد تم واپس آ جانا، پھر مسئلے کا حل کریں گے۔

دو چار روز کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھیج دیا کہ حضرت سفیان سے پوچھو: میں نے قسم کھائی ہے کہ میں بستر پر نہیں سوؤں گا اور میں مٹی پر سو گیا تو میری قسم ٹوٹ گئی یا نہیں ٹوٹی؟ تو امام صاحب لازماً کہیں گے کہ نہیں ٹوٹی کہ تم نے تو قسم کھائی تھی بستر پر سونے کی اور تم تو مٹی پر سوئے ہو اور جب وہ کہیں کہ قسم نہیں ٹوٹی تو تم کہنا کہ تم قرآن کی مخالفت کرتے ہو، کیونکہ قرآن میں تو ہے:

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً﴾ [البقرۃ:۲۲]

زمین کو ہم نے تمہارے لیے بستر بنا دیا ہے۔

جب قرآن نے زمین کو بستر کہا ہے تو میری قسم کیسے نہیں ٹوٹی؟ تو وہ آدمی آیا اور امام صاحب سے آ کر مسئلہ پوچھا: میں نے قسم کھائی تھی کہ میں بستر پر نہیں سوؤں گا، لیکن آخر انسان ہوں، تھک گیا تو مٹی پر سو گیا، تو میری قسم ٹوٹ گئی یا نہیں ٹوٹی؟ انہوں نے فرمایا: تمہاری قسم نہیں ٹوٹی۔ بستر علیحدہ چیز ہے اور مٹی علیحدہ چیز ہے۔ اس نے کہا کہ قرآن نے تو مٹی کو بھی بستر کہا ہے:

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً﴾ [البقرۃ:۲۲]

تو پھر میری قسم ٹوٹنی چاہیے؟ تو فوراً امام صاحب کا خیال آیا اور فرمایا: ''رَحِمَ اللّٰهُ أَبَا حَنِيْفَةَ'' (اللہ ابوحنیفہ پر رحمت کرے) تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تمہاری عقل نہیں ہے، یہ انہوں نے تمہیں مسئلہ سمجھایا ہے اور انہوں نے مجھے سمجھانے کے لیے تمہیں بھیجا ہے۔ اللہ ان پر رحمت کرے، ان کی بات ٹھیک ہے۔ تمہاری قسم نہیں ٹوٹی، کیونکہ قسم کو دیکھنا پڑے گا کہ لوگوں میں کیا رواج ہے؟ لوگ چونکہ مچھلی اور گوشت میں فرق کرتے ہیں۔ نوکر کو پیسے دیں گے کہ مچھلی لے آؤ تو وہ گوشت لے کر آئے تو ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں گے کہ میں نے تو مچھلی کہا تھا، گوشت تو نہیں کہا تھا۔ اور کہے کہ گوشت لے آؤ اور وہ مچھلی لے آئے تب بھی جھگڑا کریں گے۔ لوگوں میں اور عرف عام کے اندر مچھلی

علیحدہ چیز سمجھی جاتی ہے اور گوشت علیحدہ سمجھا جاتا ہے۔ بستر علیحدہ سمجھا جاتا ہے اور مٹی علیحدہ سمجھی جاتی ہے۔ تو قسم کا معاملہ ہمیں عرف پر دیکھنا پڑے گا یہ نہیں کہ لغتوں کی بحث میں ہم پڑ جائیں۔

اکابر کا اختلاف علم کی بنیاد پر تھا:

لغت کے اعتبار پر لفظ کا اعتبار ہو سکتا ہے، لیکن پہلے زمانے میں اختلاف بھی اللہ کے لیے ہوتا تھا اور فیصلہ بھی اللہ کے لیے ہوتا تھا۔ اس لیے بڑے بڑے علماء میں اختلاف ہو گئے، لیکن کبھی کسی نے کسی کو گالی نہیں دی، کبھی کسی نے کسی کو برا نہیں کہا، کبھی کسی نے کسی کا حسب اور نسب نہیں جانچا اور کبھی کسی نے کسی کو طعنہ نہیں دیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا کہ وہ غلط کہتے ہیں، دلائل کا تقاضا یہ ہے۔ جب ان کو دلائل میں جواب مل گیا تو انہوں نے کہا کہ تحقیق ہو گئی، میں بھولا ہوا تھا۔ اللہ کی مہربانی ہوئی، مجھے دلائل مل گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان پر رحمت کرے کہ مجھے ایک سچی بات سمجھا دی۔ اب جو جھگڑے ہوتے ہیں دراصل جھگڑا ہمارا ذاتی ہوتا ہے اور ہم اس کو مذہب کے نام پر استعمال کرتے ہیں۔ اصل میں ہمارا ایک تعصب ہوتا ہے، کسی کی عزت کو دیکھ کر ہم جلیں گے، کسی کی عظمت کو دیکھ کر ہمیں حسد پیدا ہوتا ہے۔ اب ہم اگر اس کا ظاہری جھگڑا کریں گے کہ مجھے اس سے بڑی جلن ہے تو اس سے وہ خود بدنام ہوتا ہے تو وہ مذہب کو ڈھونڈے گا کہ فلاں غلط مسئلہ ڈھونڈتا ہے، فلاں معاملہ میں وہ قرآن کا مخالف ہے، فلاں معاملہ میں وہ حدیث کا مخالف ہے، اپنی ذاتی جھگڑوں کو ہم دین کا لبادہ اوڑھا دیتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ جھگڑے آج تک چلے آرہے ہیں۔ دین کا تو جھگڑا ہی نہیں ہے۔ دین کا اگر جھگڑا ہو تو دو عالم اکٹھے بیٹھ جائیں، فیصلہ کر لیں، لڑنے کی کوئی بات ہی نہیں ہے اگر کسی مسئلہ میں اختلاف واقع ہو بھی جائے۔

اب آپ دیکھیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں مسائل میں اختلاف ہو جاتے تھے، کتنے بڑے مسائل ہیں جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپس میں بڑا اختلاف ہے، لیکن اللہ ان سب پر کروڑوں رحمتیں فرمائے ان کا اسلوب ایسا تھا کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کبھی ایک دوسرے کی شان میں کوئی کمی کی ہو، کبھی ایک دوسرے کی شان میں کوئی کوتاہی کی ہو۔ ان کو مسئلہ پہنچا تو کہا کہ ہو سکتا ہے کہ مجھے حدیث مبارک نہ ملی ہو، چلو میں ان سے جا کر رجوع کر لیتا ہوں، پوچھ لیتا ہوں کہ بھائی! آپ نے جو فتویٰ دیا ہے تو یہ کس دلیل کی بنیاد پر دیا ہے؟ تمہارے پاس اس مسئلے کہ دلیل کیا ہے؟ کتنے مسئلے ہیں کہ جن میں بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپس میں اختلاف ہے؟ کتنے مسائل ہیں کہ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا آپس میں اختلاف ہے؟ کتنے بڑے مسائل ہیں

کہ جن میں اختلاف ہوگئے؟ آپ نے دیکھا نہیں کہ صحابہ ﷺ کی آپس میں جنگیں ہوگئیں؟ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آپس میں قتال ہوگیا، آپس میں جھگڑا ہوگیا اور نوبت اس مقام تک پہنچی کہ ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ شہید ہوگئے۔ یعنی سامنے جنگ ہو رہی ہے اور اب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ کو تیر لگا اور اونٹ زخمی ہوا اور بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہودج اونٹ سے گرا تو سب سے پہلے دوڑ کر پردے ڈالنے والے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور کہا کہ اماں جان! آپ نے مجھے بھی برباد کر دیا اور آپ بھی پریشان ہوئیں۔...... کیونکہ ماں ہے اور ماں بیٹے میں ایک بات ہوگئی۔ وہ ماں کے درجہ میں ہے اور وہ بیٹے کے درجہ میں ہے۔

اور دونوں کا یہ عالم تھا کہ ایک آدمی بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے قریب سے گزرا تو اس نے کہا: اے اماں عائشہ! تمہیں یاد ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ حجرے سے باہر نہ جانا؟ آج گھر سے باہر جانے کا نتیجہ مل گیا ہے اور دوسرا آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرا اور کہا: اے علی! قیامت کے دن حضور ﷺ نے پوچھ لیا کہ میری بیوی کا مقابلہ کیا تھا؟ تم نے اپنی ماں سے لڑائی لڑی تھی؟ تو کیا جواب دو گے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنی مہار موڑ لی دونوں رو رہے ہیں اور دشمنوں نے درمیان میں لڑائی کرا دی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب کے گناہ لڑائی کے بعد بھی معاف فرما دیے، ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ نہیں تھا، ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ ہو......!؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے باہمی تعلقات:

اب دیکھیں! سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے صلح فرمالی۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے کئی دفعہ ان کی طرف ہدیے بھیجے۔ ایک دفعہ اس زمانہ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو تیس ہزار درہم کا ہدیہ بھیجا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اسی دن خیرات کر دیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ جو ہدیہ بھیجا تھا وہ ختم ہوگیا تو حضرت نے ان کو خط لکھا کہ تم اللہ کے نبی کے نواسے ہو، محمد عربی ﷺ کے بیٹے ہو، تمہاری اتنی بڑی شان ہے اور میرے دل میں عظمت ہے، مہربانی کیا کرو "لَا خَيْرَ فِي الْإِسْرَافِ" اپنے مال کو ایسے لٹا دینے میں بھلائی نہیں ہوتی۔ اگر اللہ مال عطا فرمائے تو اس کو کچھ اپنے لیے اور نظم کے لیے بھی تو کچھ رکھو۔ یہ نہیں کہ جتنا آئے اس کو ایک دن میں لٹا دو اور دوسرے دن کے لیے بیٹھے رہو "لَا خَيْرَ فِي الْإِسْرَافِ" اسراف کرنا، مال کو بے تحاشا لٹا دینا اچھا نہیں ہوتا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خط ملا، آپ نے خط پڑھا تو اسی خط میں نیچے لکھا: "مِنَ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ إِلَى مُعَاوِيَةَ" اور ایک لفظ لکھا،

انہوں نے لکھا تھا ''لَا خَیْرَ فِی الْاِسْرَافِ'' تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے لکھا ''وَلَا اِسْرَافَ فِی الْخَیْرِ وَالسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ'' (بھلائی میں اسراف ہوتا ہی نہیں) اسراف تو تب ہوتا ہے جب میں پیسے کو ناجائز لٹا دیتا۔ اگر پیسے کو میں نے خیر میں لٹایا ہے تو اس میں کوئی اسراف نہیں ہوتا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو جب خط ملا تو آپ مسکرا اٹھے اور فرمایا کہ سید کے ہاتھ کون روکے گا؟ اور درہم ان کی خدمت میں بھیجو۔

ان کی آپس میں اتنی محبتیں ہیں، اتنا اتحاد ہے اور اتنا پیار ہے اور کیوں نہ پیار ہو!! حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے بیٹے ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا سگا بھائی ہے اور کاتب وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ان میں جو جھگڑے ہیں وہ دراصل سبائیت نے پیدا کیے، یہودیت کے ذہن نے پیدا کیے۔ انہوں نے در پردہ اپنے کچھ لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملا دیا اور کچھ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملا دیا، کچھ کو حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ ملایا اور کچھ کو کوفہ والوں کے ساتھ ملا دیا، کچھ نے خطوط لکھ کر بلوایا، ان کو آپس میں لڑوا کر شہید کر دیا، کچھ شہادت کے علمبردار بن گئے اور کچھ مخالفوں کے ساتھ مل گئے۔ اصل میں وہ یہودی تھا جو اس زمانے سے لے کر آج تک اسلام کے خلاف عمل پیرا ہے۔ آج تک دشمنی پھیلا رہا ہے، لیکن مسلمان سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کے باہمی جھگڑے:

ورنہ دنیا میں کون سے جھگڑے ہیں؟ دیکھیں! آج اگر آپ بحث کریں تو پوری دنیا میں کوئی آدمی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانتا ہو؟ یہ بتائیں کہ جو آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانے وہ مسلمان ہے؟ تو پھر یہ کیا جھگڑا ہے کہ کبھی صلوۃ وسلام پر جھگڑا، کبھی اذان پر جھگڑا اور کبھی ''یا رسول اللہ'' کے بورڈ لگانے پر جھگڑا۔ جب ہم سارے نبی علیہ السلام کو مانتے ہیں، کلمہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھتے ہیں، کہلاتے بھی اہل سنت والجماعت ہیں، سب کی فقہ بھی ایک ہے، کتاب اللہ بھی ایک ہے، ہر کسی کے مدرسہ میں صحاح ستہ بھی پڑھایا جاتا ہے اور ہر مدرسہ کا مولوی جب فتویٰ لکھے گا تو فتویٰ کی کتابیں بھی ایک ہیں، پھر جھگڑا کس بات کا ہے؟

چار عالم بٹھا دو، کیا حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان سے پہلے صلوۃ وسلام پڑھے ہیں؟ تو اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا، اگر نہیں پڑھے تو تم چھوڑ دو، لڑنے کی بات ہی کوئی نہیں ہے۔ اگر یہ دین ہوتا تو سب سے پہلے حضرت بلال رضی اللہ عنہ عمل کرتے،

کیونکہ حضور ﷺ کا مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہے۔اور اذان ایک مرتبہ نہیں، بلکہ دن میں پانچ مرتبہ ہوتی ہے اور حضور ﷺ کی نبوت کے بعد کی زندگی پچیس سال ہے۔پچیس سالوں میں ابتدائی دس سال مکہ کے انتہائی سخت حال تھے، بعد کے جو چودہ پندرہ سال ہیں اسلام کی عزت کے سال ہیں۔ان پندرہ سالوں میں کتنی اذانیں ہوئی ہوں گی؟ دن میں اگر پانچ اذانیں ہوں تو مہینہ میں ڈیڑھ سو اذانیں ہوئیں اور سال میں اٹھارہ سو اذانیں ہوگئیں اور پندرہ سال میں گن لیں کہ کتنی اذانیں ہوئیں؟ تو اتنے سال جو حضور ﷺ کے زمانے میں اذانیں ہوئیں ہیں، اگر صلوۃ وسلام پڑھا گیا اور بعد میں صلوۃ وسلام پڑھا گیا ہر اذان سے پہلے:

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَٰئِكَتَهُۥ يُصَلُّونَ عَلَى ٱلنَّبِيِّ ۚ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ صَلُّوا۟ عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا۟ تَسْلِيمًا ۝﴾ [الاحزاب:۵۶]

یہ آیت پڑھی گئی۔حضرت بلال، حضرت ابی محذورہ اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہم تین آدمی ہیں، جو حضور ﷺ کے زمانے میں موذن تھے۔اگر انہوں نے پڑھا ہے تو اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا اور اگر انہوں نے نہیں پڑھا ہے تو بدعت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اسلام میں جھگڑے ڈالنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اور اسی طریقہ پر "یارسول اللہ" کے لفظ پر جھگڑا ہے۔اگر سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں "یارسول اللہ" کے بورڈ لگوائے ہیں تو تم بھی لگوالو، اگر انہوں نے نہیں لگوائے تو تم ان سے زیادہ عاشق نہیں ہو۔سب سے زیادہ محبت کا دعویٰ تم کرو تو یہ جھوٹا دعویٰ ہوسکتا ہے، سچا دعویٰ ہو ہی نہیں سکتا، ان کے مقابلہ میں ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔اور ہمارا ایمان ہے کہ ساری دنیا کے اولیاء بھی اکٹھے کرو تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے قدم کے برابر بھی نہیں ہو سکتے، ہمارا ایمان ہے کہ ساری دنیا کے پیر اور بزرگ اکٹھا کریں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک پاؤں کے برابر بھی نہیں ہوسکتے اور ہمارا ایمان ہے کہ ساری دنیا کی محبت ایک طرف رکھیں اور صحابہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کی محبت ایک ترازو میں رکھیں، ان کی محبت کا پلڑا بھاری ہوجائے گا وران کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔تو یہ کہنا کہ قرآن میں تو نہیں ہے، حدیث میں تو نہیں ہے، ہم محبت کے لیے کرتے ہیں تو کیا محبت ان میں نہیں تھی......؟ کیا وہ اس محبت سے محروم تھے......؟ کیا ان کو محبت کا طریقہ نہیں آتا تھا......؟

خوارج کا اہل بیت رضی اللہ عنہم سے تعصب:

دین کے نام پر کوئی بات ہو تو ایک منٹ میں طے ہوجاتی ہے، کیونکہ اللہ کا قرآن موجود ہے، احادیث رسول

پاک ﷺ موجود ہیں۔ اب آپ اندازہ کریں کہ خارجی فتنہ جو سب سے بڑا فتنہ ہے اور سب سے گمراہ فرقہ نواصب کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے شر سے بچائے۔...... اللہ معاف فرمائے...... وہ اتنے بڑے ظالم تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اتنے بڑے دشمن تھے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مسلمان ماننے کے لیے بھی تیار نہیں اور ان لوگوں کی اس زمانہ میں دشمنی کا یہ عالم تھا کہ خوارج کی اگر کوئی خوبصورت لڑکی ہوتی اور لوگ رشتہ مانگنے کے لیے آتے کہ میں تیری لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں تو وہ لڑکی یہ کہتی کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کا سر کاٹ کر لے آؤ، تب میں تیرے ساتھ شادی کروں گی۔ یعنی ان کی دشمنی کا یہ عالم تھا!! بعض کا یہ عالم تھا آپس میں جنگیں لڑتے لڑتے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مجبور کر دیا، انہوں نے مدینہ شریف چھوڑ دیا۔ یہ سب خوارج کا فتنہ تھا۔

ایک آدمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ جن خوارج سے ہم لڑ رہے ہیں وہ کافر ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ کفر سے تو بھاگے ہوئے لوگ ہیں، ہم ان کو کافر کیسے کہیں؟ اس نے کہا کہ حضرت! یہ منافق ہیں؟ فرمایا: منافق بھی نہیں ہیں۔ منافقین کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

﴿وَلَا يَذْكُرُونَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [النساء: ۱۴۲]

''وہ اللہ کا ذکر تھوڑا کرتے ہیں۔''

اور یہ تو رات دن بدبخت قرآن پڑھتے ہیں، ان کو منافق ہم کیسے کہیں؟ تو اس نے کہا: حضرت! یہ کافر بھی نہیں ہیں، منافق بھی نہیں ہیں، پھر لڑائی کس بات کی ہے؟ آپ نے فرمایا: بھائی ہیں اور یہ ہمارے خلاف لڑ رہے ہیں، ہم بھی ان کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ بات اتنی ہے کہ جو باغی ہوگا ہم اس سے لڑیں گے، جو اللہ کے اسلام کے اندر نقصان ڈالے گا ہم اس سے لڑیں گے۔ تو اس حکم کے مطابق ہم لڑ رہے ہیں، اپنے قاتل ہیں، لڑنے والے ہیں۔ لیکن احتیاط اتنی ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ کافر ہو گئے، یہ نہیں فرمایا کہ منافق بن گئے، کہتے ہیں کہ ٹھیک ہیں، بھائی ہیں، کلمہ جو پڑھتے ہیں، باقی اس لیے لڑ رہے ہیں کہ ہر باغی سے لڑا جاتا ہے۔ اللہ کے قرآن کا حکم ہے:

﴿فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتّٰى تَفِيْءَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ﴾ [الحجرات: ۹]

اگر مسلمان امن سے رہ رہے ہیں اور کوئی آدمی فتنہ بغاوت اٹھاتا ہے تو اس کے ساتھ قتال کرنا ہوگا، اس نے ہمارے امن کو چھیڑا ہے اور ہم مجبور ہو گئے ہیں ان سے لڑنے کے لیے۔

مذہبی تعصب:

آج ہمارا تو یہ عالم ہے کہ جو آدمی انگوٹھے نہ چومے اس کو مسجد سے نکال دو، یہ تو اہل سنت بھی نہیں ہے۔ اب معصیت یہ بن گئی کہ ہر پارٹی کی پگڑی بھی الگ ہے۔ اگر ان کی پگڑی نہ پہنو تو ایمان سے خارج ہے...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ...... پھر اگر بات کرو تو کہتے ہیں کہ یہ تو جنت کا رنگ ہے، سبز رنگ تو جنتی رنگ ہے۔ سبز رنگ کا کیا صحابہ رضی اللہ عنہم کو پتہ نہیں تھا؟ تمہیں پتہ چلا ہے کہ یہ جنتی رنگ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کوئی جماعت بنائی سبز پگڑیاں پہننے والی یا سیاہ پگڑیاں پہننے والی؟ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سیاہ پگڑی پہنی یا سفید پگڑی پہننے والی جماعت بنائی؟ جب مکہ فتح کرنے کے لیے میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو آپ کے سر مبارک پر سیاہ پگڑی تھی، لیکن جب کسی ایک رنگ کو ہم پارٹی کا رنگ بنائیں گے تو وہ اسلام کے خلاف ایک فتنہ بن جائے گا۔ آپ سبز پہنیں یا سیاہ پہنیں یا سفید پہنیں، جو مرضی آئے پہنیں، تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کر دیا ہے، لیکن جب میں کہوں کہ میری پارٹی کا وہ رنگ ہے، جب وہ کرتہ ایسا پہنے، وگرنہ وہ میری پارٹی کا بھی نہیں۔ جب ہم مسائل پیدا کریں گے تو پھر دنیا میں جھگڑے پیدا ہوں گے، پھر دنیا میں تنافر پیدا ہوگا اور پھر دنیا کے اندر فرقہ بندی پیدا ہوگی۔ ہر فرقہ کا لباس اپنا، وردی اپنی، ہر فرقہ کا جھنڈا اپنا، پیڈ اپنا اور مونوگرام اپنا۔ کیا کر رہے ہو......؟ اسلام کو ٹکڑوں میں تقسیم کر رہے ہو؟...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ......

دعا کریں کہ اللہ سب کو ہدایت عطا فرما دے۔ اللہ کے کعبہ میں ہو، دعا کیا کرو کہ یا اللہ! سب کے سینے اپنے قرآن کے لیے کھول دے، سب کو توحید و سنت سمجھنے کی توفیق عطا فرما، سب لوگوں کو بدعات کے جنگلوں سے نکال دے اور سب لوگوں کو جھگڑوں اور فتنوں سے نکال دے۔

نفاذِ اسلام میں ایک رکاوٹ یہ ہے:

دیانتداری سے اللہ کے کعبہ میں بیٹھ کر کہتا ہوں کہ کئی دفعہ مجھ سے لوگوں نے پوچھا ہے کہ اسلام کا قانون نہیں بناتے؟ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں، فلاں نے وعدہ کیا، لیکن نہیں بنایا۔ تو میں کہتا ہوں کہ اسلام کا قانون تب تک نہیں بن سکتا جب تک تم اسلام کا نام لینے والے مولوی، اسلام کے نام پر روٹی کھانے والا مولوی، اسلام کے نام پر زکوتیں وصول کرنے والا مولوی، اسلام کے نام پر چندے مانگنے والا مولوی، اسلام کے نام پر مدرسے گزران

العلوم بنانے والا مولوی جب تک تم اکٹھے نہیں ہو گے، اسلام نہیں آئے گا۔ اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تم ہو۔ اسلام کے راستے میں جب تم اکٹھے ہوئے اور اجتماعی طاقت بنالی تو ایک ایسا آدمی جس کو ختم نبوت کے معنی بھی نہیں آتے تھے اس کو فیصلہ لکھنا پڑا کہ ختم نبوت حق ہے اور قادیانی غیر مسلم ہیں۔ تم نے اپنی طاقتوں کو متحد کیا تو قرار داد مقاصد پاس ہوگئی اور تم نے اپنے معاملات کو اکٹھا کیا تو گستاخ رسول کی سزا موت قرار دی گی۔ جب تم لڑو گے تو اسلام کے آگے سب سے بڑی رکاوٹ تم مولوی ہو۔ ہر مولوی اپنا ڈیڑھ اینٹ کا فتنہ بنانا چاہتا ہے۔ ایک آدمی کہتا ہے: نظام مصطفیٰ ﷺ ہو، ہر ایک کہتا ہے: نفاذ شریعت ہو، ہر ایک کہتا ہے: آئین شریعت ہو، مگر باہمی اتحاد نہیں ہوتا...... إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ......

قیامت کا دن ہوگا، اللہ کا دربار ہوگا، تم حضور ﷺ کے سامنے ہو گے۔ پھر پتہ چلے گا جب جواب دو گے کہ اسلام کے نام پر روٹیاں کھائیں، مسلمانوں کو لڑاتے رہے، مسجدوں کی چھتوں پر اسپیکر باندھ کر ایک دوسرے کو گالیاں دیتے رہے، بلاوجہ سر پھاڑتے رہے، اللہ کے کعبہ سے چھڑوا کر لوگوں کو قبروں کے طواف کراتے رہے اور خدا کے سجدے سے ہٹا کر غیروں کے دروازے پر گزارتے رہے۔ تم لوگوں نے یہ سب کچھ کیا ہے، ہمارے پاس تو دعاؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔

یاد رکھو کہ جب غرناطہ اور اسپین میں مسلمانوں کی عصمتوں کو لوٹا جا رہا تھا تو تم اس مسئلے میں مبتلا تھے کہ کوا حلال ہے یا حرام ہے؟ تم اپنی تاریخ اٹھا کر دیکھو کہ اسپین سے اسلام کو کس نے در بدر کیا ہے؟ جب تم اسلام کے نام پر ایک قوت بنو گے، کیا جھگڑا ہے تمہارا؟ کیا ہر پارٹی کا قرآن علیحدہ ہے؟ جھگڑا کیا ہے؟ تفرقہ کیا ہے؟ اندازہ فرمائیں کہ چودہ سو سال گزر گئے آج بھی اگر کوئی آدمی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو گالیاں دیتا ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کو گالی دیتا ہے، امام مالک رحمہ اللہ کو گالی دیتا ہے، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو گالی دیتا ہے اور فقہائے امت کو گالی دیتا ہے تو وہ اپنی عاقبت کو خراب کر رہا ہے، ورنہ دنیا کے اندر کروڑوں لوگ ہیں جو کہتے ہوں گے ''رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ'' اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

اسلام میں رواداری:

اس لیے اسلام ہمیں حکم دیتا ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران: ۱۰۳]

اسلام سلامتی کا مذہب ہے، ایمان امن کا مذہب ہے، اسلام ہمیں جوڑنے کے لیے آیا ہے، توڑنے کے لیے نہیں آیا، اسلام اوس اور خزرج کو ملانے کے لیے آیا ہے، جدا کرنے کے لیے نہیں آیا اور اسلام نے ہمیں وہ سبق دیا ہے کہ تم اپنے اوپر دوسرے کو ترجیح دے دو:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر: ۹]

خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلانے کا سبق اسلام نے دیا ہے، کسی کے منہ سے نوالہ چھیننے کا حکم نہیں دیا ہے۔ اسلام نے تو ہمیں اتنی رواداری بخشی ہے! میرے پاک نبی ﷺ کے سامنے ایک بدو نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم مارنے کے لیے اٹھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھہر جاؤ! کچھ نہ کہو! اس کو پیشاب کرنے دو۔ مسجد دھل سکتی ہے، لیکن یہ بیمار نہ ہو جائے۔ اگر اس آدمی کا پیشاب راستے سے کٹ گیا تو یہ بیمار ہو سکتا ہے۔ اگر مارو گے تو وہ بھاگتا رہے گا اور پیشاب کرتا رہے گا۔ [صحیح البخاري، حدیث: ٦٠٢٥، باب: الرِّفْقِ فِي الأَمْرِ كُلِّهِ]

وہ اللہ کے پیغمبر ﷺ جنھوں نے دشمنوں کو سینے سے لگایا، تم کلمہ تو ان کا پڑھتے ہو اور فتنے کھڑے کرتے ہو، کلمہ تم ان کا پڑھتے ہو اور مسجدوں میں سر پھٹول کرواتے ہو۔ شرم آنی چاہیے کہ جب کفار کے ملکوں میں تمھارے جھگڑوں کی وجہ سے انھیں مسجدوں میں کتے چھوڑنے پڑے تو آدمی کو ڈوب مرنا چاہیے۔ مسلمان کو چاہیے اتحاد، امن، سلامتی، رواداری، وسعتِ قلب، ایک دوسرے کی بات کو محبت اور تحمل سے برداشت کرنا اور دعوت دینا۔ اسلام نے تشدد کا حکم نہیں دیا۔ جو لوگ دین کے نام پر ایسی باتیں کرتے ہیں ان کے لیے بھی اللہ سے ہدایت کا سبق مانگیں، اللہ تبارک وتعالیٰ انھیں بھی ہدایت عطا فرمائے اور اللہ ان تمام کو اتحاد، اتفاق اور محبت نصیب فرمائے۔

سب سے بڑا گناہ:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

((أَيُّ الذَّنْبِ أَعْظَمُ عِنْدَ اللهِ؟ قَالَ: أَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ))

''اے اللہ کے رسول ﷺ! سب سے بڑا گناہ اللہ کے نزدیک کیا ہے؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کا شریک بناؤ، جس نے تمھیں پیدا کیا، تم اس کا مقابل بناؤ۔''

[صحیح البخاري، حدیث: ٤٤٧٧، باب قَوْلِهِ تَعَالَى: فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا]

جیسے تم اللہ کی تعظیم کرتے ہو، ویسے اس کے غیر کی تعظیم کرو اور جیسے تم اللہ کی عبادت کرتے ہو، غیر کی بھی تم عبادت کرو۔ یہ شریک بنانے کا معنی ہے۔ بعض لوگ شریک بنانے کا معنی سمجھتے ہیں کہ اگر دو خدا بنالے تو وہ شریک ہے، حالانکہ شریک دو خدا بنانے کا نام نہیں ہے، بلکہ شریک کا معنی یہ ہوتا ہے کہ رزق دینے والا اللہ ہے۔ اب اگر کوئی کسی اور سے رزق مانگے تو اللہ کا شریک بنالیا۔ خالق اللہ ہے، مالک اللہ ہے، بچے دینے والا اللہ ہے اور نفع ونقصان کا مالک اللہ ہے، اگر کوئی کسی غیر کو بھی نفع ونقصان کا مالک سمجھے تو گویا اللہ کے مقابلے میں شریک بنالیا۔ اس لیے فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ جس نے اس کو پیدا کیا یہ مخلوق ہو کر اللہ کا شریک بنا رہا ہے۔

اسی طرح حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے، فرمایا:

((أَتَدْرِيْ مَا حَقُّ اللهِ عَلٰى عِبَادِهٖ؟))

''اے معاذ! تم جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟''

اس صحابی نے عرض کیا: حضور ﷺ ارشاد فرمائیں! تو فرمایا:

((أَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا)) [صحیح البخاری، حدیث: ٦٥٠٠، باب: مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ...]

''اسی کی خالص عبادت کریں اور اس میں کسی کو شریک نہ کرو (اللہ نے تمھیں پیدا ہی اس لیے کیا ہے)۔''

اور دوسری حدیث پاک میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: مجھے یہ نہ کہا کرو کہ جیسے اللہ چاہے اور آپ چاہیں، کیونکہ اللہ کے ساتھ تم مجھے ملا رہے ہو، بلکہ اصل مشیت تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے کہ جو اللہ چاہیں گے وہی ہوگا۔ اور اس کے بعد آپ فرمائیں کہ آپ کی کیا خواہش ہے؟ اس لیے فرمایا کہ اتنا لفظ بھی نہ کہو۔

جیسا کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے اتنا کہہ دیا: اللہ جو چاہے اور جو آپ چاہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((أَجَعَلْتَنِيْ لِلّٰهِ عَدْلًا؟)) [مسند أحمد بن حنبل، حدیث: ٢٥٦١]

''کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا؟ (میں تو اللہ کا نبی ہوں)۔''

فرمایا: ایسا لفظ نہ کہا کرو، کیونکہ واؤ جمع کے لیے ہوتی ہے۔ جب تم واؤ کے ساتھ کہہ رہے ہو تو گویا اللہ کا شریک بنا رہے ہو، اس لیے حضور ﷺ نے منع فرمایا کہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بھی احتیاط کرو۔ تو اتنا شرک سے بچنا چاہیے۔

اسی لیے علماء ''یا محمد!''، ''یا رسول اللہ'' اور ''یا شیخ عبد القادر'' کہنے سے منع فرماتے ہیں۔ کیونکہ حرف ندا اللہ کی

ذات کے لیے ہے اور استغاثہ کی حقدار صرف اللہ کی ذات ہے۔ اب اگر وہی حرف تم نبی ﷺ کے ساتھ لگاؤ گے تو شرک کی ہوا آئے گی، جیسے حضور ﷺ نے واؤ لگانے سے منع کیا کہ واؤ لگانے میں شرک کا اندیشہ ہے۔

اسی لیے علماء نے حروف ندا لگانے سے منع کیا کہ وہاں بھی شرک کا اندیشہ ہے۔ اللہ تبارو تعالیٰ ہمیں اپنی ذات کی توحید کے مسئلے کی سمجھ عطا فرمائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی کا خواب:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت طفیل بن سنجرہ رضی اللہ عنہ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ماں کی طرف سے بھائی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک قوم پر گزرا، میں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم یہودی ہیں۔ میں نے ان کو کہا کہ یہودیو! تم بڑی اعلیٰ قوم تھے، اللہ نے تمہیں بڑی عزت بخشی، اللہ نے تمہیں اپنے زمانے میں سب سے افضل بنایا اور تمہارے اندر اللہ نے نبی بھیجے، لیکن افسوس ہے کہ تم نے حضرت عزیز علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنالیا۔ تم اگر عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا کر شرک نہ کرتے تو تم بڑی اعلیٰ قوم تھے۔ ان یہودیوں نے مجھے کہا کہ یہ بات ہے۔ قوم تو تمہاری بھی بڑی اعلیٰ ہے، لیکن تم لوگ بھی تو کہتے ہو ''مَا شَاءَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ مُحَمَّدٌ'' (جو اللہ چاہے اور جو نبی چاہے) اگر ہم نے عزیر علیہ السلام کو بیٹا بنالیا ہے تم بھی تو اپنے نبی کو اللہ کا شریک بنا رہے ہو۔ تو کہتے ہیں کہ میں چپ ہو گیا اور پھر میں آگے آیا اور میں نے ایک قوم کو دیکھا اور ان سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم نصرانی ہیں۔ میں نے کہا: تم بھی بڑی اونچی قوم ہو۔ کتنا اللہ نے تمہیں شرف بخشا ہے، لیکن افسوس ہے کہ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ تم مسلمان بھی تو بڑی اچھی قوم ہو، تم بھی تو ''مَا شَاءَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ مُحَمَّدٌ'' کہتے ہو۔ اگر ہم نے نبی کو خدا کا بیٹا بنایا ہے تو تم نے بھی تو نبی کو خدا کا شریک بنا دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ خواب میں نے دیکھا اور اس خواب کو میں نے بعد میں دوستوں سے ذکر کیا۔ پھر اس کے بعد میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: تم نے اس خواب کو میری بجائے اور لوگوں کو بھی بتلایا تھا؟ میں نے کہا: ہاں! یارسول اللہ! میں نے اور لوگوں کو بھی بتلایا ہے۔ آپ ﷺ نے خطبہ پڑھا، لوگوں کو جمع کیا، اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ طفیل نے ایک خواب دیکھا ہے اور میں بھی چاہتا تھا کہ تمہیں منع کروں۔ خبردار! آئندہ کوئی آدمی ایسا نہ کہے کہ ''جو اللہ چاہے اور جو نبی چاہے۔'' صرف یہ کہا کرو کہ جو اللہ چاہے۔

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ [التکویر:۲۹]

''تمہارا چاہنا کیا ہے؟ وہ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔''

تو صرف اللہ کی ذات جو چاہے گی۔ اور آج اللہ معاف کرے! ہم تو اتنی تباہیوں کے غار میں پڑ چکے ہیں کہ ان لوگوں نے تو خدا کا بیٹا بنایا تھا، ہم نے تو نبی کو خدا کا بیٹا بنا دیا ہے کہ ہم نے اللہ کے نبی ﷺ کو کہہ دیا کہ یہ تو صرف بشریت کا ایک لباس ہے، ورنہ تو اندر سے آپ خدا ہیں...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ...... یعنی اللہ معاف کرے کہ ایسے غلط عقیدے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہود و نصاریٰ سے بھی ہم گر گئے، یعنی انہوں نے خدا تو مانا، لیکن خدا کا بیٹا بنالیا اور ہم نے تو خدا کی بجائے نبی ﷺ کو خدا بنالیا اور اس کو برملا تقریروں میں کہتے ہیں، کتابوں میں لکھتے ہیں اور اشعار میں لکھتے ہیں۔ [مسند أحمد بن حنبل، حدیث: ۱۹۴]

افسوسناک واقعہ!

اور واقعہ لکھا ہے کہ معراج پر جب گئے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب میں آخری منزل پر پہنچا تو میں رک گیا اور حضور ﷺ اوپر چلے گئے۔ پھر جب میں نے دیکھا تو اوپر بھی آپ تھے اور نیچے بھی آپ تھے۔ قوم بیٹھی تھی، حضور ﷺ کا کیا سچا عاشق ہے......!! آگے سننے والے جاہل بیٹھے ہوتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ خود بھی ایمان سے نکل گیا ہے اور ہمیں بھی ایمان سے نکال رہا ہے۔ بھائی! اگر اوپر بھی آپ ہیں اور نیچے بھی آپ ہیں تو معراج تو ایک افسانہ اور ڈرامہ ہو گیا، معراج تو نہ ہوا۔ معراج تو تب بنے گا کہ جب خدا خدا ہو اور نبی نبی ہو۔ اگر نبی خود خدا ہے تو معراج کا کیا معنی؟ براق کا کیا معنی؟ جبرئیل علیہ السلام کے آنے کا کیا معنی؟ حضور ﷺ کے جانے کا کیا معنی؟ تو اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔ ہمارے لوگ بھی دعویٰ تو محبت کا کرتے ہیں، لیکن انجام شرک تک پہنچاتے ہیں۔ دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں حضور ﷺ سے بڑی محبت ہے۔ محبت کا معنی یہ نہیں ہے کہ آدمی ولی کو نبی بنا دے۔ کیا محبت کا معنی یہ ہوتا ہے کہ آدمی نبی کو خدا بنا دے؟ محبت کا معنی یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے تمام اختیارات چھین کر پیغمبروں کو دے۔ یہ نہیں ہوتا کہ انسان بیوی کو ماں کہہ دے، یہ کوئی محبت نہیں ہوتی۔ فرشتہ فرشتہ ہوگا، ولی ولی ہوگا، نبی نبی ہوگا، رسول رسول ہوگا اور خدا خدا ہوگا۔ اس کی الوہیت ہے اور اس کی ربوبیت ہے۔ جب تک یہ عقیدہ نہیں ہوگا نہ حج کا کوئی فائدہ ہے، نہ عمرے کا کوئی فائدہ ہے اور نہ نماز کا کوئی فائدہ ہے۔

ہدایت حاصل کرنے کا ایک طریقہ:

پس اللہ تعالیٰ سے سب سے پہلے مکہ میں آنے کے بعد دو رکعت صلوۃ الحاجۃ پڑھ کر دعا کیا کریں کہ یا اللہ! یہ گھر مرکزِ ہدایت ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں جبرئیل علیہ السلام سب سے پہلے وحی لے کر آئے اور یہ وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے حضور ﷺ نے دینِ اسلام کا اعلان فرمایا۔ اگر تو نے کرم فرما کر گناہ گاروں کو یہاں آنے کا موقع دیا ہے تو مہربانی فرما اور ہمیں صحیح عقیدہ بھی اپنی رحمت سے نصیب فرما دے۔ جب تم دعا کرو گے تو اللہ سینے کھول دے گا اور سمجھ آجائے گی۔ اگر تمہاری نیت ہی نہ ہو سمجھنے کی، تو چاہے لاکھ تقریریں کرتے رہیں، لاکھ قرآن پڑھتے رہیں۔ کتنے لوگ ہوتے ہیں، میت پر بیٹھے ہوتے ہیں اور جنازے نہیں پڑھتے۔ کتنے لوگ ہیں کہ مسجد کے ساتھ ان کا گھر ہے، لیکن مسجد میں قدم بھی نہیں رکھتے۔ کتنے لوگ ہوتے ہیں جو الف سے لے کر یا تک سارا قرآن پڑھ جاتے ہیں، لیکن ایک آیت پر بھی غور نہیں کرتے۔ کتنے لوگ ہوتے ہیں جو روزانہ درس سنتے ہیں، شام کو ویسے کے ویسے ہوتے ہیں۔ تو ان چیزوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے آدمی نیت کرے، اس کے بعد اللہ سے دعا مانگے اور اس کے بعد توجہ سے اللہ کے قرآن اور نبی ﷺ کی حدیث کو سمجھے۔ پھر دیکھیں کہ سینے کھل جائیں گے، اندھیرا چھٹ جائے گا، نورِ توحید داخل ہو جائے گا اور صحیح عقیدہ نصیب ہو جائے گا۔ تو حضور ﷺ نے منع فرمایا کہ آئندہ یہ نہ کہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ کی خدمت میں اتنا کہہ دیا:

((مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ شِئْتَ))

''جو اللہ چاہیں اور جو آپ چاہیں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا:

((أَجَعَلْتَ لِلّٰهِ نِدًّا؟))

''کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا؟''

خبردار! ایسا کبھی نہ کہنا، بلکہ تم یوں کہا کرو:

((مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ)) [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۷، مسند أحمد بن حنبل، حدیث: ۲۵۶۱]

''جو صرف اللہ چاہے۔''

بس یہ سارے حکم حضور ﷺ نے اس لیے دیے، تا کہ اللہ کی وحدانیت اور الوہیت کی حفاظت ہو اور اللہ کی

توحید کے معاملہ میں کسی قسم کی لچک پیدا نہ ہو جائے...... وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ......

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ اور فرمایا کہ شرک ایسی خفیہ بلا ہے، جیسا کہ اندھیرے کے اندر ایک پتھر کے اوپر سیاہ چیونٹی چل رہی ہو تو نظر نہیں آئے گی، اسی طرح بندہ شرک کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور بندے کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۷، الآیۃ: الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا]

لوگوں کی قسم کھانا:

جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ "مجھے اللہ کی قسم!"...... "تیری زندگی کی قسم!" تو اللہ کے ساتھ شریک کر رہا ہے۔ ادھر اللہ کی بھی قسم اٹھا رہا ہے اور ادھر تیری بھی قسم اٹھا رہا ہے۔ جیسے دیکھیں کہ ہمارے ہاں عام رواج ہے کہ اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں کہ مجھے بیٹے کی قسم ہے۔ قسم تو اللہ کی ہوتی ہے اور بیٹے کو اس میں شریک بنا رہے ہیں۔ بعض لوگ بیٹھے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اپنے پیر صاحب کے آستان کی قسم کھاتا ہوں، پیر کے پنڈے کی قسم کھاتا ہوں، یعنی پیر کا پنڈا خدا کے برابر بنا رہے ہیں، اس سے بڑا اور کوئی شرک ہو سکتا ہے؟ بعض آدمی کہہ دیتے ہیں کہ اللہ اور فلاں آدمی نہ ہوتا تو میں مر گیا ہوتا، یہ بھی شرک ہے، کیونکہ فلاں نے تمہیں تھوڑا بچایا ہے، اللہ نے تمہیں بچایا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ اگر آج کتے نہ بھونکتے تو چور ہمیں ڈھونڈ لیتے۔ تو کتوں نے تمہیں بچایا ہے، خدا نے نہیں بچایا۔ خدا کے بندے! یہ تو اسباب کی حد تک چیزیں ہیں، ان کو اتنی اہمیت نہ دو اور ایسے الفاظ ادا نہ کرو کہ شرک کا ذریعہ بن جائے۔ اسی طرح بعض آدمی کسی کو کہتے ہیں کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں برباد ہو گیا تھا، گویا نفع و نقصان کا مالک تمہیں بنا رہا ہے۔

سب کام خدا کی طرف سے ہوتے ہیں:

اور اسی طرح کہتا ہے: "مَا شَآءَ اللّٰہُ وَ شِئْتَ" (جو اللہ چاہے اور جو تو چاہے) اور اسی طرح کہے کہ میرے گھر میں بطخیں نہ ہوتیں اور شور نہ کرتیں تو چور ہمیں لوٹ لیتے۔ خدا کے بندے! مجھے بچانے والا بھی اللہ ہے اور تجھے پیدا کرنے والا بھی اللہ ہے۔ یعنی یہ چھوٹے چھوٹے کلمے ہیں، حالانکہ اس میں بندے کا مقصد بطخ کی عبادت کرنا نہیں ہوتا، لیکن چونکہ معمولی سا شرک کا شبہ ہو جاتا ہے اور ایمان جانے کا خطرہ ہوتا ہے تو ان سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ایسا کلمہ زبان پر بھی نہ لے آؤ جو شرک کے شک کا ذریعہ بن جائے، ورنہ کون ہے جو بطخ کو خدا کے برابر سمجھتا ہو؟ وگرنہ

دنیا میں کونسا ایسا آدمی ہے جو کسی بندے کو خدا سمجھتا ہو، لیکن شبہ جو پڑ رہا ہے، اس سے بھی میرے مدنی ﷺ نے روک دیا کہ خبردار! خیال کرو۔ وہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ جیسے پانی پیا، پیاس بجھ گئی تو "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہو کہ اللہ نے پیاس بجھائی ہے، پانی کا شکریہ نہیں۔ وہ اللہ جس نے پانی پیدا کیا اس کا شکر ادا کیا۔ تم نے کھانا کھایا اور بھوک مٹ گئی تو کیا کہتے ہو کہ روٹی تیرا شکریہ...... ؟ روٹی کو اٹھا کر چومنا شروع کر دو اور روٹی کو سر پر رکھ لو اور سجدہ شروع کر دو کہ روٹی نے ہماری بھوک ختم کر دی ہے۔ نہیں، بلکہ حکم ہے کہ کہو:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ أَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ جَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ.))

"اس ذات کا شکر ہے جس نے روٹی پیدا کی، ہمیں کھلایا، ہمیں پلایا، جس نے ہمیں کھانے کی توفیق دی، جس نے ہمیں مسلمان بنایا۔" [سنن الترمذی، حدیث: ۳۴۵۷، باب: مَا یَقُوْلُ إِذَا فَرَغَ مِنَ الطَّعَامِ]

اس لیے حکم ہے کہ جب کھانا شروع کرو تو "بِسْمِ اللّٰہِ" پڑھو کہ اے اللہ! تیرے نام کے ساتھ میں شروع کرتا ہوں، وگرنہ میری کیا طاقت ہے؟ میرے ہاتھ بھی قابل نہ رہیں تو میں کیا کروں گا؟ میں منہ تک گلاس لے جاؤں اور اندر داخل بھی نہ ہو تو میں کیا کر لوں گا؟ پانی اندر داخل ہو جائے، بیماری لگ جائے اور پیاس نہ بجھے تو میں کیا کروں گا؟ اس لیے میں تیرے نام سے شروع کر رہا ہوں اور تیرے شکر پر ختم کر رہا ہوں، حتیٰ کہ حکم ہے کہ آدمی اگر بیت الخلاء میں جاتا ہے، جب باہر آئے تو کہے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ أَذْهَبَ عَنِّی الْأَذٰی وَ عَافَانِیْ.))

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۳۰۱، باب: مَا یَقُوْلُ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ]

اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ میرے پیٹ سے گندی چیز دور کر دی۔ اگر یہ دور نہ ہوتی تو میں اسی میں مرجاتا۔ میں کیا طاقت رکھتا ہوں؟ یہ تو تیری ذات کا شکر ہے کہ تو نے بری چیز کو میرے پیٹ سے خارج کر دیا ہے۔ "غُفْرَانَكَ" مجھے معاف بھی کر دینا، جتنی دیر میں گندگی کے معاملے میں رہا، میں تیری عبادت نہیں کر سکا اور تیرا ذکر نہیں کر سکا۔

اس لیے ہمیں ہر جگہ یہ حکم دیا گیا، تاکہ کوئی بندہ شرک کے قریب ہی نہ جائے اور اس سے بچنے کی کوشش کرتے رہو، اللہ کے عدیل نہ بناؤ، اللہ کے شبیہ نہ بناؤ، اللہ کے شریک نہ بناؤ اور اللہ کی مثال نہ بناؤ۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اے یہود اور نصاریٰ! تم جانتے ہو کہ تورات میں لکھا ہے اور انجیل میں بھی لکھا

ہے کہ وہی الٰہ ہے "وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ" ہے۔ تم اس کے باوجود بھی اللہ کی توحید کا اقرار نہیں کرتے ہو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۸، الآیۃ: الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا]

حضرت یحییٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والے پانچ احکام:

حضرت حارث الاشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ أَمَرَ يَحْيَى بْنَ زَكَرِيَّا عليهما السلام بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ:))

اللہ پاک نے حضرت یحییٰ علیہ السلام...... جو حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ ان...... کو فرمایا کہ پانچ چیزوں کا میں حکم دیتا ہوں، ان پر خود بھی عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی حکم دو کہ ان پانچ چیزوں پر عمل کریں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو تبلیغ کرنے میں کچھ دیر ہوگئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے یحییٰ! اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے پانچ کلمات پر عمل کرنے کا اور بنی اسرئیل کو پہنچانے کا۔ اگر تم نہیں پہنچاتے ہو تو میں پہنچا دوں؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے عرض کیا: آپ مہربانی کریں، آپ نہ پہنچائیں، مجھ سے تاخیر ہوگئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ کا عذاب مجھ پر آجائے کہ دیر کیوں کردی؟ آپ نے پہنچایا اور میں نے نہ پہنچایا تو گویا کہ میں نے اللہ کے حکم کی تعمیل نہ کی۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ مجھے زمین میں دھنسا دے، تو میں ابھی پہنچاتا ہوں۔

بنی اسرئیل کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل بیت المقدس میں جمع ہوں۔ سب جمع ہوگئے، آپ اونچی جگہ پر بیٹھے، اللہ کی تعریف بیان کی، یعنی خطبہ پڑھا اور فرمایا کہ اللہ نے مجھے پانچ چیزوں کا حکم دیا ہے کہ میں خود بھی ان پر عمل کروں اور تمہیں بھی حکم دوں۔ ان پانچ چیزوں کو یاد کرلیں۔ فرمایا:

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ "وَاعْبُدُوا اللهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا" [النساء: ۳۶] عبادت خالص اللہ کی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی مثال سمجھو! ایک آدمی سونے اور چاندی خرچ کر کے غلام خریدے کہ میرے لیے کمائے گا۔ غلام کمائے اور جو آمدنی ہو وہ شام کو دوسرے آدمی کو جا کر دے دے، ایسا غلام کیا تم رکھو گے؟ پیسے تم بھرو، نوکر تمہارا ہو اور کمائی شام کو کسی دوسرے کو دے دے، کتنے دن ایسے نوکر کو رکھو گے؟ تو انہوں نے کہا کہ ایسے نوکر کو کوئی نہیں رکھے گا۔ اسی طرح پیدا تم کو اللہ نے کیا اور عبادت غیروں کی کرو تو پھر اللہ ایسے بندوں کو کب تک رکھیں گے؟ اللہ بھی پھر ایسے بندوں کو عذاب دیں گے۔

اور اس کے بعد فرمایا کہ دوسری بات یاد رکھو "أَمَرَ اللّٰہُ بِالصَّلٰوۃِ" کہ اللہ نے نماز کا حکم دیا ہے۔

تیسرا حکم فرمایا کہ روزے جو اللہ کی طرف سے ہیں ان کو صحیح معنوں میں ادا کریں۔

چوتھا حکم فرمایا کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔

اور پانچویں چیز کا حکم فرمایا کہ اللہ کا ذکر کریں۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۸۶۳، باب: ما جاء في مثل الصلاة...]

امت جماعت اور اتحاد کا حکم:

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں بھی اپنی امت کو پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں، جن کا اللہ نے مجھے حکم فرمایا ہے۔

1 ......سب سے پہلی چیز جو میرے آقا ﷺ نے فرمائی: "اَلْجَمَاعَۃُ" کہ جماعت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو، یعنی مسلمانوں کی جو جماعت ہے جماعت کو مضبوطی کے ساتھ تھامے اور ان سے باہر نکلنے کا تصور بھی نہ کرے۔ کیونکہ اللہ کی رحمت جماعت پر ہوتی ہے۔

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دن میں پانچ دفعہ مسجد میں اکٹھا ہونے کا حکم دیا ہے کہ ہم پانچ دفعہ روزانہ صبح میں، ظہر میں، عصر میں، مغرب میں اور عشا میں ایک امام صاحب کے پیچھے حاضر ہوں، تاکہ جماعت کا تصور قائم رہے، کیونکہ جب تک جماعت قائم ہے اللہ کی رحمت قائم ہے۔ جو لوگ مختلف مسائل پیدا کر کے اور فتنے پیدا کر کے ......اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے...... جماعت کو توڑنا چاہتے ہیں تو وہ اصل میں دین اسلام کو توڑنا چاہتے ہیں۔

2، 3 ......اور میرے آقا ﷺ نے فرمایا:

((اَلسَّمْعُ وَ الطَّاعَۃُ))

تمہارے لیے پابندی ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم اور اسی طرح اللہ اور رسول ﷺ کے بعد ان کے خلفاء اور جو مسلمان کا امیر بنائے، جس پر مسلمان اتفاق کر لیں ان کے حکم کو سنو اور اطاعت کرو۔

ہاں! یہ بات یاد رکھیں کہ دوسری حدیثوں میں آتا ہے کہ اگر کوئی امر اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی شریعت کے خلاف کرے تو اس کی اطاعت نہیں ہوگی [صحیح البخاری، حدیث: ۲۹۵۵] اس کی اطاعت ہم ہر اس حکم میں کریں گے جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق ہو، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کے خلاف بغاوت نہ ہو۔ یعنی ایک آدمی اگر مسلمانوں کا امیر بن جائے اور کہے کہ...... نعوذ باللہ...... نماز چھوڑ دو تو ہم اس کی اطاعت

نہیں کریں گے۔ کیونکہ اس کی اطاعت دراصل اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کے تابع ہے کہ جب تک وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کی پابندی کرے گا ہم اس کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ اگر مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہمیں پانچ وقت میں ایک امام کے پیچھے کھڑا کیا گیا تو اس کی کیا وجہ تھی؟ وگرنہ یہ بھی حکم ہو سکتا تھا کہ ہر آدمی اپنے اپنے گھر میں نماز پڑھ لے، ہر آدمی کو جہاں موقع ملے نماز پڑھ لے، لیکن حکم دیا گیا کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھو۔ اور جب جماعت کرو گے تو لازمی بات ہے کہ امام ہوگا۔ پھر امام کے لیے اللہ کے نبی ﷺ نے صاف اوصاف بتا دیے کہ تمہارا امام وہ بنے جو عالم ہو، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کا عالم ہو، وہ بنے جو قرآن کا قاری ہو، تاکہ اللہ کے قرآن کو صحیح معنوں میں ادا کر سکے۔ اسی طرح حضور پاک ﷺ نے فرمایا: مثلاً: اگر دو عالم ہیں، دونوں قاری ہیں تو اب کس کو امام بنائیں؟ فرمایا: جوان دو میں بڑی عمر کا ہو اس کو امام بناؤ، کیونکہ اس کی عمر زیادہ ہے، وہ زیادہ اکرام اور عزت کا مستحق ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۶۷۳]

تو اب ہمیں نماز میں کیا تعلیم ملے گی کہ جب امام کہے گا ''اَللّٰهُ اَکْبَرُ'' تو ہم بھی کہیں ''اَللّٰهُ اَکْبَرُ''۔ اب جب وہ رکوع میں جائے تو ہم سب رکوع میں جائیں گے، جب وہ سجدے میں جائے گا تو ہم سب سجدے میں جائیں گے اور جب وہ سلام پھیرے گا تو ہم سب سلام پھیریں گے، تاکہ مسلمانوں کو اتحاد اور اتفاق کی پانچ دفعہ ٹریننگ دی جائے، تاکہ وہ یہ تصور بھی نہ کر سکیں کہ ہم نے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف بھی کوئی کام کرنا ہے۔

اس لیے سب سے بڑی پابندی ہوتی ہے ''اَلسَّمْعُ وَ الطَّاعَةُ'' کہ اپنا امیر مسلمانوں کا بادشاہ ہے، مسلمانوں کا حاکم ہے۔ یا تم سفر میں جا رہے ہو، تم نے اپنا ایک امیر بنا لیا کہ حضور ﷺ کی سنت ہے۔ اگر تم سفر میں نکلو، دو آدمی ہوں، یا چار آدمی ہوں، یا دس آدمی ہوں تم میں سے جو تمہارا سمجھدار آدمی ہو اس کو امیر بنا لو اور پھر تم اس کے حکم پر چلو۔ ...... ان شاء اللہ...... سفر بھی آسان ہوگا، پریشانیاں بھی نہیں ہوں گی اور مصیبت بھی نہیں ہوگی۔ اگر ہر آدمی اپنی بات کرنی شروع کر دے تو اس سے اختلاف پیدا ہوگا، ہر آدمی اپنی رائے دینی شروع کر دے تو اس سے جھگڑے پیدا ہوں گے اور اس سے پریشانیاں پیدا ہوں گی، حتیٰ کہ میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ اگر بفرض محال ایک سیاہ فام غلام اور چھوٹے سر والا، یعنی کوئی بڑے دماغ والا بندہ بھی نہیں، لیکن اتفاق سے تمہارا امیر بن گیا اور تمہارا حاکم بن گیا تو اس کی سنو اور اطاعت کرو،[1] کیونکہ جب بغاوت کے جراثیم بڑھتے ہیں تو انجام تباہی اور

[1] [سنن ابی داود، حدیث: ۴۶۰۷]

ہلاکت ہوتا ہے اور اسلام پوری دنیا کو جوڑنے کے لیے آیا ہے، توڑنے کے لیے نہیں آیا۔

اس لیے آپ دیکھیں کہ حج مبارک ہے۔ اللہ نے ہر صاحبِ نصاب پر زندگی میں ایک دفعہ فرض کیا ہے۔ اب حج کا کیا مقصد ہے؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ پورے عالمِ اسلام کے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہوں۔ جب وہ آئیں تو ان کا ترانہ (لَبَّیْکَ) بھی ایک ہو، ان کا احرام بھی ایک ہو، ان کا کعبہ بھی ایک ہو، ان کا طواف بھی ایک ہو، ان کی سعی بین الصفا والمروۃ بھی ایک ہو، ان کی منیٰ میں حاضری بھی ایک ہو اور ان کی عرفات کے دن میں حاضری بھی ایک ہو، تاکہ ان کو اجتماعیت کا اور آپس میں اتحاد و اتفاق کا ایک عظیم سبق ملے، جس کو وہ سارا سال یاد رکھ سکیں، وگرنہ اللہ کو کیا ضرورت تھی کہ لوگ بے چارے آئیں اور تکلیفیں برداشت کریں۔ ایک آدمی آتا ہے، زبان نہیں سمجھتا اور مسافر ہوتا ہے، راستے نہیں سمجھتا کہ میں نے کہاں جانا ہے؟ حرم شریف کے کس دروازے سے نکلنا ہے؟ تو ان تکلیفوں کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے لیے وہ جذبہ ہے کہ ہمارا خدا بھی ایک ہے، ہمارا نبی بھی ایک ہے، قرآن بھی ایک ہے اور ہمارا قبلہ بھی ایک ہے تو تم ایک بن جاؤ۔

اور پھر یہ سمجھایا جائے کہ اللہ کے دین میں کسی گورے اور کالے کا فرق نہیں ہوتا، اللہ کے دین میں کسی عربی یا عجمی کا فرق نہیں ہوتا، اللہ کے دین میں کسی سید اور غیر سید کا فرق نہیں ہوتا اور اللہ کے دین میں کسی امیر اور غریب کا فرق نہیں ہوتا۔ اللہ کے کعبہ میں آ گئے تو ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ ایک ہی صف میں بادشاہ بھی کھڑا ہے اور غلام بھی کھڑا ہے، غریب بھی کھڑا ہے اور امیر بھی کھڑا ہے۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ ہمیں ایسے اتحاد کی توفیق نصیب فرما دے کہ مسلمانوں میں اتحاد کا جذبہ بیدار ہو۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا ، نہ کوئی بندہ نواز

اور یہ چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل...... یاد رکھیں!...... ان پر جو مولوی آپس میں ایک دوسرے کو لڑاتے ہیں، یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ دعا کریں اللہ انہیں بھی، ہمیں بھی اور سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ ہمیشہ یاد رکھیں کہ جو اہلِ حق ہیں ان کے اندر بنیادی مسائل میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ دنیا کے اندر کوئی امام یا مولوی نہیں کہے گا کہ فجر کی دو رکعتوں کی بجائے آپ تین رکعتیں پڑھیں، مغرب کی تین رکعتوں کی بجائے چار رکعتیں پڑھیں، کوئی یہ نہیں کہے گا کہ عشا کی چار رکعتوں کی بجائے چھ رکعتیں پڑھ لو۔ باقی جو چھوٹے مسائل ہیں وہ فروعی مسائل ہیں۔ اور ہمیشہ یاد

رکھو! فروعی مسائل کے اندر جو اختلاف ہوتا ہے وہ اعلیٰ وادنیٰ، افضل وغیر افضل کا ہوتا ہے۔ ایک امام کی تحقیق میں زور سے آمین کہنے میں زیادہ اجر ہے اور ایک امام کی تحقیق میں آہستہ آواز میں آمین کہنے میں زیادہ اجر ہے، حالانکہ دونوں کی تحقیق صرف افضل اور غیر افضل کی ہے۔ کوئی یہ نہیں کہے گا کہ جو زور سے کہے گا اس کی نماز نہیں ہوگی اور جو آہستہ کہے گا اس کی نماز نہیں ہوگی۔

ان کے پاس حدیث ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں آمین کہنے سے مسجد گونج جاتی تھی۔ [ابن ماجہ، حدیث: ۸۵۳] اور جو فرماتے ہیں کہ آہستہ کہو ان کے ہاں قرآن کی آیت ہے کہ اللہ فرماتے ہیں: دعا آہستہ مانگا کرو۔ آمین دعا ہے، ہمیں اس کو آہستہ کہنا چاہیے۔ تو یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ جس میں آدمی سر پھٹول کرے، لڑائیاں کرے، جھگڑے کرے، فساد کرے، ایک دوسرے کے ساتھ انتشار پھیلائے اور ایک دوسرے کو اسلام سے باہر نکالے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ مسلمانوں کو ایک ہی راستے پر متحد فرمادے۔

ذرا تصور کریں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے اسی کعبۃ اللہ میں جب میرے آقا ﷺ بیٹھے ہوتے تھے تو کبھی نظر ڈالیں کہ دائیں بائیں ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم بیٹھے ہیں، ادھر نظر ڈالو تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں، پیچھے نظر ڈالو تو بلال حبشی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں اور ادھر نظر ڈالو تو صہیب رومی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں۔ کوئی کہیں سے آیا، سب کو محمد مدنی ﷺ نے اپنے دامن میں لپیٹ لیا، اسلام تو ہمیں یہ سبق پڑھاتا ہے اور اسلام ہمیں مواساۃ کا حکم دیتا ہے۔ اسی طرح آپ حج پر آئے ہوئے ہیں، اپنے ایک آدمی کو بڑا بنالیں اور اس کی بات کو مانیں گے تو کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور کوئی جھگڑا اور پریشانی نہیں ہوگی۔ اگر ہر آدمی اپنی اپنی بات کرے گا تو لازمی بات ہے کہ جھگڑا ہوگا۔ اگر ایک آدمی بڑا ہوگا اور اس کو دین کے مسئلے آتے ہوں گے تو تم سب کے دین کا معاملہ اللہ آسان فرمادیں گے۔

اسلام میں ہجرت کا حکم:

اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے کہ اپنے امیر کی بات سنو، اس کی اطاعت کرو اور امیر کے حکم کے خلاف کبھی کوئی بات دماغ میں بھی نہ لاؤ۔

۵ ......اور اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا:

((وَالْهِجْرَةُ وَالْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ))

ہجرت کا معنی ہوتا ہے کہ اگر ہم ایک ایسے ملک میں ہوں جس میں ہم دینِ اسلام کے حکموں پر عمل نہیں کر سکتے، جیسے مکہ والوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مجبور کر دیا تھا کہ کھلی نماز نہیں پڑھی جا سکتی، اللہ کا قرآن نہیں پڑھا جا سکتا اور اللہ کی توحید کی تبلیغ نہیں کی جا سکتی تو پھر میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا کہ آپ مدینہ منورہ کے لیے ہجرت فرمائیں۔ آج بھی وہ حکم باقی ہے، یعنی آج بھی اگر کوئی مسلمان ایسے ملک میں ہے جہاں اللہ کے فرائض ادا نہیں کر سکتا تو اس کے لیے حکم ہے کہ وہ اس ملک کو چھوڑ کر ہجرت کرے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [النساء: ۱۰۰]

جو آدمی اللہ کے راستے میں ہجرت کرے گا اللہ اس کے لیے اور آسانیاں پیدا فرما دیں گے۔ اس لیے ایک ہجرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی تو وہ ہجرت فرض تھی، یعنی اگر کوئی ...... نعوذ باللہ...... ہجرت نہ کرتا، اس کے رشتے ناطے ختم کرنے کا حکم تھا۔ اب ہجرت ہمارے اوپر فرض نہیں ہے، لیکن اگر کوئی مسلمان ایسے حالات میں مبتلا ہو جن حالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام مبتلا تھے تو ان کے لیے پھر ہجرت کرنا ضروری ہو جائے گا۔

اور اسی طرح ہجرت کا لغوی معنی یہ ہوتا ہے: بدعات اور شرک کو چھوڑ دینا۔ ہجرت کا معنی ہوتا ہے چھوڑنا۔

اسلام میں جہاد کا حکم:

5 ......اور فرمایا ''وَالْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' (اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنا)۔ اور جہاد بھی کب ہوگا؟ جب مسلمانوں کا بادشاہ حکم کرے گا کہ اللہ کے راستے میں نکلو۔

جب تک مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ زندہ رہا اسلام عزت سے رہا اور جس دن سے مسلمانوں نے جہاد کے جذبے کو چھوڑ دیا اسی دن سے عالم اسلام ذلت کا شکار ہو گیا، لیکن یاد رکھو کہ جہاد کا معنی فساد نہیں ہوتا کہ تم اقتدار کے لیے چڑھائی کرو۔ یہ فساد ہے، جہاد نہیں ہوگا۔ تم مال و دولت چھیننے کے لیے لڑو تو یہ فساد ہے، جہاد نہیں۔ جہاد کا معنی ہوتا ہے اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اور اللہ کا دین پھیلانے کے لیے آدمی اللہ کے راستے میں نکلے۔ اور تب نکلے جب اس کا باقاعدہ امیر مقرر ہو، باقاعدہ خلیفۃ المسلمین اور امیر المؤمنین حکم کرے۔ اور اس کے لیے بھی پھر احکامات ہیں: اگر تم نے کسی کافر سے جہاد کرنا ہے تو پہلے ان کو اسلام کی دعوت دو کہ اے کافرو! اسلام قبول کر لو تو ہمارے بھائی بن جاؤ، اگر اسلام قبول نہیں کرتے ہو تو پھر اپنے آپ کو ہمارے تابع کر دو اور باقاعدہ جزیہ ادا کرو،

تا کہ تم ذلت کا شکار رہو، تم اپنے آپ کو اونچا نہ سمجھ سکو اور تم ہمارے ٹیکس گزار بن کر اپنی زندگی گزارو۔ اس کے بدلے میں ہم تمہاری جان، مال اور عزت کا تحفظ کریں گے اور اگر تمہیں یہ بات بھی قبول نہیں تو پھر میدان میں نکل کر ہم سے لڑو۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۱۵۹، باب: الجزیۃ...... سنن الترمذی، حدیث: ۱۵۴۸]

یعنی ان کو بھی دعوت دینے کا حکم ہے، حتیٰ کہ جب میرے آقا ﷺ جہاد پر اپنی فوجوں کو روانہ کرتے تو آپ ان کو حکم فرماتے کہ کسی بستی پر رات کو حملہ نہ کر دینا، انتظار کرنا صبح کی۔ اگر اذان کی آواز آ جائے تو پھر حملہ نہ کرنا، سمجھ لینا کہ وہاں مسلمان رہتے ہیں اور اگر اذان کی آواز نہ آئے تو ان کو مسلمان کہلانے کا بھی حق نہیں ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۹۴۳، باب: دُعَاءِ النَّبِيِّ ﷺ النَّاسَ إِلَى الإِسْلَامِ، سنن الترمذی، حدیث: ۱۵۴۹]

اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر جنگ چھڑ جائے تو کسی عورت پر حملہ نہ کرو، کسی بچہ پر حملہ نہ کرو، کسی بوڑھے پر حملہ نہ کرو اور کسی مذہب کے پادری پنڈت پر حملہ نہ کرو۔ وہاں اگر تلوار لے کر لڑ رہا ہو یا لڑا رہا ہو تو اس پر تم حملہ کر سکتے ہو۔ [سنن أبی داود، حدیث: ۲۶۱۴، باب: فِي دُعَاءِ الْمُشْرِكِينَ]

حضور ﷺ نے ہماری رہبری کے لیے ایک ایسی روشن اور چمکتی ہوئی شریعت دی ہے کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو اس کے اندر موجود نہ ہو۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ ہم مسئلہ کو سمجھنا چاہیں۔ اگر سمجھنے کی نیت نہ ہو اور صرف شور کرنے کی نیت ہو تو مسئلہ سمجھ نہیں سکتے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ ہمیں دین کی سمجھ عطا فرما دے، اللہ تبارک وتعالیٰ پھر ہمارے دلوں میں اسلام کی عظمت پیدا فرما دے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں ان پانچ چیزوں کا اپنی امت کو حکم دیتا ہوں۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۸۶۳، باب: مَا جَاءَ فِي مَثَلِ الصَّلَاةِ...]

اہل سنت والجماعت کے عقائد کی پابندی:

اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر کوئی آدمی بالشت کے برابر بھی جماعت سے نکل گیا...... جماعت سے مراد مسلمانوں کی جماعت ہے۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۸۶۳، باب: مَا جَاءَ فِي مَثَلِ الصَّلَاةِ...]

اب یہ نہ ہو کہ ہر آدمی اپنی اپنی پارٹی بنا لے کہ میری پارٹی سے نکل گیا تو اسلام سے نکل گیا، بلکہ جماعت سے مراد اہل سنۃ والجماعۃ ہے۔ ہر مسلمان کلمہ پڑھنے والا جو ہے وہ اہل سنت والجماعت ہے۔ اہل سنت کا معنی ہے کہ وہ طریق محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرنے والا ہے۔ ''والجماعۃ'' سے مراد صحابہ رضی اللہ عنہم کا دامن پکڑنے والا ہے۔

اگراس کے عمل میں سنت نہیں ہے تو وہ ''اہلِ سنت'' کہلانے کا حقدار نہیں ہے، اگراس کا صحابہ رضی اللہ عنہم پر ایمان نہیں ہے تو جماعت سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو تمام کلمہ پڑھنے والے جو قرآن اور سنت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ماننے والے اور اتباع کرنے والے ہیں وہ اہل سنت والجماعۃ ہیں۔ ساری دنیا کا مسلمان ایک جماعت ہے۔ مسلمان کہیں کلمہ پڑھتا ہے تو ایک جماعت ہے، چاہے وہ مشرق میں ہے، مغرب میں ہے، شمال میں ہے یا جنوب میں ہے، چاہے وہ کوئی زبان بولتا ہے، اگر وہ کلمہ پڑھ لیتا ہے ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ [الحجرات:١٠] اللہ نے فرمایا: مومن آپس میں بھائی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا 'کَالْجَسَدِ الْوَاحِدِ'' مومن ایسے ہے جیسے ایک جسم ہو۔ اگر بندے کے پاؤں میں تکلیف ہو تو سارے بدن میں تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو کہیں تکلیف ہو تو عالم اسلام کو تکلیف محسوس ہونی چاہیے اور اگر مسلمان کو کہیں خوشی ملے تو عالم اسلام کو خوشی ملنی چاہیے، کیونکہ مسلمان ایک ہے۔

اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دی کہ ایک بالشت کے برابر بھی جماعت سے نکلا تو گویا...... نعوذ باللہ...... اسلام سے نکل گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی سخت بات ارشاد فرمائی۔

اور اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی شخص کلمہ پڑھنے کے بعد جاہلیت کے نعرے بلند کرے...... جیسے جاہلیت میں لوگ قوم کے لیے لڑتے تھے کہ ہر قبیلہ اپنے قبیلہ کی مدد کرتا تھا، چاہے وہ قبیلہ ظالم کیوں نہ ہو۔ جیسے آج کل رواج ہے کہ بلوچ ہے تو بلوچوں کی مدد کرے گا، چاہے وہ ناحق کیوں نہ ہوں، یہ جاہلیت ہے۔ اسی طرح کوئی سندھی ہے تو سندھی کی مدد کرے گا، پنجابی ہے تو پنجابی کی مدد کرے گا اور پختون ہے تو پختونوں کی مدد کرے گا۔ تو یہ کفر کی علامات ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ جو حق پر ہو اس کی مدد کرو، چاہے وہ آدمی تمہاری قوم کا ہو یا برادری کا یا برادری کے مخالف کا ہو، لیکن اگر وہ حق کی بات کہہ رہا ہے تو اس کی تائید کرنی چاہیے...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی شخص نے دعویٰ جاہلیت کیا...... جیسا کہ پہلے عرب کے زمانے میں اوس اور خزرج کے قبیلے کا جھگڑا تھا۔ جو بھی اوسی ہے وہ خزرجی کا دشمن ہے اور جو خزرجی ہے وہ اوسی کا دشمن ہے۔ جب جھگڑا ہوتا تو ہر آدمی اپنے قبیلہ کو بلاتا کہ مقابلہ کے لیے نکلو، ہم نے لڑائی لڑنی ہے...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سب دعوے جاہلیت کے ہیں۔ ...... کوئی اگر قومیت کے لیے لڑتا ہے تو کفر کا دعویٰ ہے، کوئی نسب کا دعویٰ کرے تو یہ بھی کفر کا دعویٰ ہے اور کوئی وطن کا جھگڑا کرے تو یہ بھی کفر کا نعرہ ہے۔ اصل جھگڑا اسلام اور کفر ہے۔

مسلمان بنو یا کافر بنو اور ان کے درمیان کوئی راستہ نہیں......

اس لیے فرمایا کہ جس نے ایسے کیا اس نے اپنے آپ کو جہنم کا ایندھن بنایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ایسا آدمی چاہے نماز بھی پڑھے اور روزہ بھی رکھے تب بھی اسلام سے نکل گیا؟...... روزہ رکھنا اور نماز پڑھنا کیا ہے؟ جب وہ اسلام کی بنیاد پر عمل نہ کرے تو اس کو روزہ کیا فائدہ دے گا؟ ایک آدمی مثلاً کلمہ بھی پڑھے اور شرک بھی کرے، ایک آدمی اللہ کے کعبہ کا طواف بھی کرے اور قبروں کا طواف بھی کرے، ایک آدمی خدا کے کعبے کے سامنے آکر سجدہ بھی کرے اور غیر اللہ کا سجدہ بھی کرے اور ایک آدمی ملتزم پکڑ کر یا اللہ! یا رب العالمین! بھی کہے اور پھر یا دستگیر! کے نعرے بھی مارے تو ایسا آدمی لاکھ نمازیں پڑھتا ہے تو کیا فائدہ ہے؟ جب بنیاد ہی ختم ہوئی تو اس کے باقی اعمال تو کوئی فائدہ ہی نہیں پہنچاتے۔

[سنن الترمذیہم، حدیث: ۲۸۶۳، باب: ما جاء في مثل الصلاة...]

دنیا اور آخرت میں دیدارِ خداوندی کا مسئلہ:

مفسر فرماتے ہیں: یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ دنیا میں انسان اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی زیارت کر سکے، کیونکہ اگر دنیا میں زیارت ممکن ہوتی تو اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کو یہ نہ فرماتے ﴿لَنْ تَرٰىنِيْ﴾ لیکن دنیا میں دلائل قدرت اور صفاتِ باری کے ذریعے اللہ کو پہچانا جاسکتا ہے۔ اس لیے اسی آیت میں عبادت کا حکم دے کر قدرت کے دلائل ذکر کیے گئے ہیں۔ ﴿وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾ [الاعراف: ۱۴۳] اللہ پاک نے جب اس پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ ﴿فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الاعراف: ۱۴۳] اس کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام کو ہوش آیا تو کہا: یا اللہ! میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔ میں نے جو سوال کیا میں اس کا متحمل نہیں ہوسکتا، میری قوتِ برداشت نہیں ہے کہ میں آپ کی رؤیت برداشت کرسکوں۔ بس میں آپ پر ایمان لایا اور میں جو سوال کر بیٹھا مناسب نہیں تھا، جس کے میں لائق اور قابل نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے میں توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے آپ کی ذات پر ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس تجلی کا تحمل نہ کر سکے۔

ہاں البتہ ایک بات یاد رکھیں اور سمجھ لیں کہ دنیا میں کوئی انسان اللہ کی رؤیت کا متحمل نہیں ہوسکتا، لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ مومنین کو اپنی زیارت نصیب فرمائیں گے۔ دعا کریں کہ اللہ ہمیں بھی نصیب فرمائیں، اللہ پاک کسی کو

بھی محروم نہ فرمائیں۔ دنیا میں تو کوئی انسان رؤیت باری تعالیٰ کا متحمل نہیں ہوسکتا لیکن آخرت میں اللہ نے ایمان لانے والے بندوں کو جن کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہوگا اپنی رحمت سے اپنا دیدار کرائیں گے۔

صحیح حدیث مبارک ہے کہ ہمارے نبی ﷺ تشریف فرما تھے اور چودھویں کا چاند کھلا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ سے پوچھا: چودھویں کا چاند دیکھنے میں تمہیں کوئی شک وشبہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا: حضور ﷺ! چودھویں کا چاند میں کسی کو شبہ ہوسکتا ہے کہ ہمیں دھوکہ لگا ہو چاند کے مشابہ ہمیں کوئی اور چیز چمکتی ہوئی نظر آگئی ہو؟ چودھویں کا چاند تو اتنا واضح ہے کہ بوڑھا اور ضعیف نظر والا بھی دیکھ سکتا ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کی رحمت سے قیامت والے دن تم اپنے رب کا دیدار بھی کرو گے اور کوئی شک نہیں ہوگا، بالکل صحیح دیدار نصیب ہوگا، جیسا کہ تم آج شک نہیں کر رہے ہو۔ [صحيح البخاري، حديث: ٧٤٣٤، باب: قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ . . .]

یعنی اللہ ایسا کھلا دیدار نصیب فرمائیں گے، وگرنہ چاند کیا ہے؟ اللہ کی تو مثال ہی نہیں ہے۔ اللہ تو ہر مثال سے پاک ہے۔ یعنی ہمارے اِفہام کے لیے سمجھایا کہ جیسے اب چودھویں کا چاند دیکھنے میں کوئی شبہ نہیں، یعنی ہم واقعتاً چاند دیکھ رہے ہیں، اسی طرح قیامت میں اپنے رب کے دیدار میں کوئی شبہ نہیں ہوگا، بلکہ حقیقتاً اپنے رب کی زیارت نصیب ہوگی۔ حضور ﷺ نے بطورِ مثال سمجھایا۔

اور اسی طرح روایات مبارکہ میں یہ بھی آتا ہے کہ بعض خوش نصیب لوگ ایسے ہوں گے...... ان کے مدارج ہوں گے...... جن کو مہینہ میں ایک مرتبہ زیارت ہوگی، بعض لوگوں کو اللہ کا دیدار ہر ہفتے نصیب ہوگا، بعض لوگوں کو اللہ کا دیدار روزانہ نصیب ہوگا اور بعض لوگ ایسے ہوں گے جن کو ہر گھڑی اللہ کی رؤیت کی اجازت ہوگی۔ تو قیامت کے اندر تو یہ مراتب ہیں، لیکن دنیا کے اندر کوئی آنکھ اللہ کو نہیں دیکھ سکتی۔

معراجِ نبوی ﷺ میں غلو:

اس میں بھی اختلاف ہے کہ ہمارے نبی ﷺ نے بھی اللہ کی زیارت کی ہے یا نہیں کی؟ تو اس مسئلہ کے اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر بھی اختلاف ہے۔ ہمارے ہاں تو...... اللہ معاف فرمائے...... بعض لوگ ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں اللہ ان کو اور ہمیں بھی ہدایت نصیب فرمائے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب حضور ﷺ معراج پر گئے تو اللہ نے فرمایا اور قریب آجاؤ اور قریب آجاؤ اور فرمایا کہ تم جوتوں کے ساتھ میرے عرش پر آجاؤ۔ پھر اپنے عرش پر اپنے قریب بٹھایا، اللہ اور نبی مل گئے، جیسے بھنویں مل جاتی ہیں...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... اللہ ہدایت نصیب

فرمادے۔ یادرکھو کہ مخلوق مخلوق ہوتی ہے اور خالق خالق ہوتا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کی بہت بڑی شان ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل، تمام رسولوں سے افضل اور تمام کائنات کے بندوں سے افضل ہیں، لیکن خدا خدا ہوتا ہے اور نبی نبی ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ...... نعوذ باللہ...... گلے مل جاؤ اور جوتوں کے ساتھ عرش پر آ جاؤ۔ یہ کون سی عظمت کی نشانی بیان ہو رہی ہے......!!؟

کیا معراج میں حضور ﷺ نے اللہ کی زیارت کی تھی؟

اس میں اختلاف ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اللہ کی زیات کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول اسی طرف ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے پروردگار کی زیارت کی تھی۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے پروردگار کی زیارت نہیں کی۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی یہ مسئلہ اختلافی ہے، لہٰذا یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں! جس مسئلہ میں صحابہ کا اختلاف ہو تو کسی آدمی پر ملامت نہیں کی جائے گی، یعنی جو رؤیت کے قائل ہیں تو اللہ قادر ہے کہ اپنے نبی کو زیارت نصیب فرمادی ہو اور جو لوگ رؤیت کے قائل نہیں ہیں ان کی شان میں بھی ہم کوئی گستاخی نہیں کریں گے، ان کی شان میں بھی ہم کوئی ایسا لفظ نہیں کہیں گے جن سے ان کی شان میں کوئی کمی آئے کہ وہ بھی صحابہ ہیں حضور ﷺ کے۔

اور بعض علماء محققین نے اس کو یوں جمع کیا ہے، انہوں نے کہا: جو صحابہ رضی اللہ عنہم قائل ہیں کہ حضور ﷺ کو زیارت نہیں ہوئی، ان کا مطلب یہ بھی ہے کہ دنیا میں زیارت نہیں ہو سکتی اور جو قائل ہیں کہ زیارت ہوئی وہ بھی تو اس عالم میں نہیں ہوئی۔ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو معراج پر آسمانوں پر بلا لیا۔ تو دنیا میں تو زیارت کسی کو نہیں ہو سکتی، اگر وہاں رؤیت ہوئی ہے تو وہ دنیا تو نہیں تھی، نہ آپ زمین پر تھے اور نہ زمین کے احکامات آپ پر نافذ تھے۔ اللہ پاک نے معراج کے لیے اپنے حبیب ﷺ کو آسمانوں پر بلایا، حضور ﷺ کو خصوصی طور پر معراج کرایا گیا۔ آپ آسمانوں پر تشریف لے گئے، حضرت جبرئیل علیہ السلام کی بھی رؤیت ہوئی۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر رؤیت ہوئی بھی ہے تو دنیا والی بات اپنی جگہ پر سچی ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تھے، زمین پر کھڑے تھے، اس لیے ان کو رؤیت نہ ہو سکی، لیکن جب اللہ پاک اپنے نبی ﷺ کو آسمانوں پر بلالے تو وہاں معاملہ ہی علیحدہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں ہر مومن کو رؤیت نصیب فرمائیں گے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف کے موقع پر ہمارا فریضہ:

بہر حال ہمیشہ یاد رکھا کریں کہ جس مسئلہ کے اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اختلاف آجائے تو ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم دونوں کا احترام کریں گے، کیونکہ ہمیں پتہ ہے کہ ان کا اختلاف کسی ذاتی غرض کی بنیاد پر نہیں تھا، ان کا اختلاف مسئلہ کے فہم میں تھا۔ اگر کوئی خطا بھی ہوئی ہے تو وہ اجتہادی خطا تھی۔ انہوں نے اپنی طرف سے محنت کی کہ ہم حق پر پہنچ سکیں۔ مجتہد اگر خطا بھی کر دے تو اللہ اس کو ثواب عطا فرماتے ہیں۔ اسی لیے جو اہل علم ہیں، جن کو اللہ نے قرآن وسنت کے علم سے نوازا ہے وہ ایسے مسائل میں جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر اختلاف پایا جائے، کسی جانب کو برا بھلا نہ کہیں۔ ادھر بھی روایات موجود ہیں اور ادھر بھی روایات موجود ہیں۔ تو جن کو اللہ نے علم سے نوازا ہے تو وہ کہیں گے کہ اللہ سب پر رحمت فرمائے، لیکن ہم نے اپنے جن علماء سے پڑھا ہے اور جو روایت ہمیں ملی ہے ہم اس پر عمل کر رہے ہیں۔ جو عمل کر رہا ہے اس کے پاس بھی روایت موجود ہے۔

مسئلہ سماع موتی:

اب دیکھیں کہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بڑی عالمہ، امہات المؤمنین، حضور ﷺ نے بدر کے میدان میں کفار جب مار ڈالے، ان کو ایک کنویں کے اندر پھینک دیا گیا۔ حضور ﷺ کنویں پر تشریف لائے اور آپ ﷺ نے فرمایا: او مکہ کے کافرو!

((هَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا؟))

''کیا رب کا وعدہ آج پورا ہوا کہ نہیں پورا ہوا؟ (تم ذلیل ہو کر مارے گئے اور اللہ نے اپنے نبی کی مدد فرمائی)۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا آدمی بول پڑا کہ حضور! آپ کن کو سنا رہے ہیں؟ وہ تو مر گئے، ٹکڑے ہو گئے، ریزہ ریزہ ہو گئے، کنویں میں پھینک دیے گئے، آج تین دن گزر گئے وہ تو گل سڑ گئے ہوں گے، آپ ان کو سنا رہے ہیں؟

حضور ﷺ نے فرمایا وہ تم سے بھی زیادہ سن رہے ہیں۔ [صحيح البخاري، حديث: ٣٩٧٦، باب: قتل أبي جهل]

جب بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے یہ بات آئی تو انہوں نے کہا کہ میں یہ نہیں مانتی۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کا قرآن کہتا ہے: مردوں کو آپ سنا نہیں سکتے، تو وہاں کیسے سنا دیا؟ (دراصل اس مسئلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا رجوع ثابت ہے۔ تفصیل کے لیے مولانا سرفراز خان صاحب صفدری رحمہ اللہ کی کتابیں ''تسکین الصدور'' اور ''سماع موتی''

ملاحظہ فرمائیں۔ امداد اللہ انور)

لہٰذا بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سننے کی قائل ہیں، باقی جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم سننے کے قائل ہیں۔ جو صحابہ رضی اللہ عنہم سننے کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم تو خود بدر میں موجود تھے اور بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا تو مدینہ منورہ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے انہیں مخاطب کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بول پڑے، پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سن رہے ہیں، لہٰذا ہم سننے کی بات کو کیوں نہ مانیں؟

تو ہمیشہ یاد رکھیں کہ ایسے مسائل میں ایک مسئلہ وہ ہوتا ہے کہ جس میں نص قطعی آ گئی ہے، جو قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت ہے۔ اللہ کا قرآن ہے یا حدیثِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، متواتر اور مشہور ہے اور بالکل کھلی ہوئی ہے تو اس میں کبھی جھگڑا ہو ہی نہیں سکتا اور نہ ہی ان مسئلوں میں کبھی جھگڑا ہوتا ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ دو حدیثیں آ گئیں: ان دو حدیثوں کو سمجھنے کے لیے ایک صحابی نے یوں سمجھا اور ایک صحابی نے یوں سمجھایا۔ ایک صحابی نے اس حدیث کو لے لیا اور دوسرے صحابی نے اس حدیث کو لے لیا۔ تو ہم کہیں گے کہ اللہ سب کی قبروں پر رحمت کرے، سب ہدایت پر ہیں۔

دیہاتی زبان میں اس کی مثال یوں ہے کہ اگر میرے اندر ادب ہے اور میرے اندر علم ہے تو میں تیرے باپ کی توہین نہیں کروں گا، لیکن اپنے باپ کا جو حق ادا کروں گا اور عزت کروں گا اتنا مرتبہ تو میں تیرے باپ کو نہیں دے سکتا، لیکن مجھے یہ بھی حق نہیں پہنچتا کہ تیرے باپ کی شان میں کوتاہی کروں۔ اس لیے ہم لوگوں نے جن سے علم پڑھا ہے، ہم ان ائمہ کی بات کو زیادہ وزن دیں گے، لیکن دوسرے ائمہ کی شان میں گستاخی نہیں کریں گے، ان کی شان میں کوئی کمی اور بے ادبی نہیں کریں گے، بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ وہ بھی ائمہ ہیں اور سب نے دین کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں فرمائے۔ اس لیے آپ دیکھیں کہ ائمہ کے آپس میں اختلاف ہوئے، لیکن ادب نہیں چھوٹا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں آپس میں اختلاف ہوا، لیکن جب ان کا ذکر آیا تو کہا "رحمہ اللہ" اللہ رحمت فرمائے۔ بھائی اس نے یوں سمجھا ہے اور ہم نے یوں سمجھا ہے۔ آپس میں کبھی انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے۔

مسئلۂ رؤیتِ باری تعالیٰ:

مسئلہ چل رہا تھا رؤیت باری تعالیٰ کا کہ بعض لوگ قائل نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے زیارت کرائی ہے اور

بعض لوگ اس کے قائل ہیں کہ زیارت نصیب ہوئی۔ تو دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ دلائل رکھتی ہیں، لیکن آخرت میں رؤیت کے اندر کسی کا جھگڑا نہیں ہے۔ آخرت میں سب کو اللہ کی رحمت سے رؤیت نصیب ہوگی۔ اور اس کی وجہ یہ بھی سمجھیں کہ یہ دنیا بھی فانی ہے اور انسان بھی فانی ہے، ہماری آنکھیں بھی فانی ہیں، ہماری قوتِ سامعہ، باصرہ اور عاقلہ سب فانی ہیں، صرف اللہ کی ذات باقی ہے۔ تو گویا فانی باقی کو نہیں دیکھ سکتا، لیکن جب ہماری دوسری زندگی عالمِ آخرت کی ہوگی تو وہ ایسی زندگی ہوگی کہ اس کے بعد فنا کوئی نہیں، یعنی جب اللہ ہمیں دوبارہ قبروں سے اٹھائیں گے تو ہم ہمیشہ زندہ رہیں گے، مومن جنت میں ہمیشہ رہے گا اور کافر جہنم میں ہمیشہ رہے گا، کبھی ان پر موت نہیں آئے گی۔ تو وہ جب تخلیق کی جائے گی تو ہمیں بھی ہمیشہ کے لیے زندہ کیا جائے گا۔ جب ہمیں ہمیشہ رہنے کے لیے پیدا کیا جائے گا تو آنکھیں بھی ہمیشہ رہنے والی دی جائیں گی اور عقل بھی ہمیشہ رہنے والی دی جائے گی تو اس ذات کو جو ہمیشہ رہنے والی ہے، دیکھنے کے لیے کامل بنا دیا جائے گا۔ تو سمجھیں کہ ہم آخرت میں تو اللہ کی زیارت کر سکیں گے، لیکن دنیا میں اللہ کی رؤیت نہیں ہو سکتی۔

واقعاتِ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ:

مفسر لکھتے ہیں کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے جو قرآن مقدس کی تفسیر لکھی ہے اس میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ہارون الرشید بادشاہ گزرا ہے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کو آپ نے کیسے پہچانا؟ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام دار الہجرۃ ہیں، ان کی ساری زندگی مدینہ منورہ میں گزر گئی، بہت بڑے امام اور بہت بڑے عاشقِ رسول ہیں۔ ساری زندگی میں ایک دفعہ امام صاحب نے حج کے لیے سفر کیا۔ حج ختم ہوتے ہی فوراً مدینہ تشریف چلے گئے۔ لوگوں نے عرض کیا: حضرت! کچھ دن ٹھہر جائیں۔ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو طاقت رکھتا ہو کہ مدینہ منورہ میں مرے تو کوشش کرے کہ اس کی موت مدینہ میں آئے۔ تو میں ڈرتا ہوں کہ میں کہیں مدینہ کے باہر نہ مر جاؤں، اس لیے میں اپنا وقت باہر نہیں لگانا چاہتا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا زیادہ وقت مدینہ میں گزرے، تاکہ مدینہ منورہ کے اندر مجھے موت آئے۔ اتنے بڑے عاشقِ رسول تھے۔ اللہ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے لوگوں کی اتباع کی توفیق نصیب فرمائے۔

توہارون الرشید نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا: آپ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟ حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اِخۡتِلَافُ اللُّغَاتِ وَالۡأَصۡوَاتِ وَالنَّغۡمَاتِ'' میں غور کرتا ہوں کہ ہر بندے کی آواز علیحدہ ہے، زبان بھی علیحدہ ہے، لغت بھی علیحدہ ہے، پرندوں کی آواز بھی علیحدہ ہیں، اتنا اختلاف ہے کہ عرب کی آواز علیحدہ ہے، عجم کی آواز علیحدہ ہے، ہر بارہ میل کے بعد ویسے زبان میں تبدیلی آجاتی ہے تو اتنی بڑی زبانیں اور اتنی بولیاں اور پھر پرندوں کی اپنی اپنی بولیاں ہیں، کوئی کچھ بول رہا ہے اور کوئی کچھ بول رہا ہے، لیکن پرندے بھی بول رہے ہیں، ہمیں پتہ نہیں لگتا، لیکن وہ بول رہے ہوتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۸، تفسیر الرازی: ۲/ ۱۷۶]

جیسے واقعہ لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تشریف لے جارہے تھے۔ دیکھا تو ہدہد پرندہ ایک درخت پر بیٹھا ہے۔ ایک لڑکے نے اس کو پکڑنے کے لیے نیچے ایک جالی لگائی ہوئی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جب وہاں سے گزرے تو فرمایا کہ ہدہد! تو بڑے آرام سے اوپر بیٹھا ہے اور تمہارے نیچے بچے نے جال لگایا ہوا ہے۔ ہدہد نے کہا کہ اللہ کے پیغمبر! مجھے پتہ ہے کہ بچے نے جال لگایا ہوا ہے۔ میں تو ویسے اس کو چھیڑ رہا ہوں، یہ بچہ مجھے نہیں پکڑ سکتا، میں نے دیکھا ہے کہ جال لگایا ہوا ہے۔ خیر حضرت سلیمان علیہ السلام چلے گئے۔ جب واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ ہدہد لڑکے کی قید میں ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا: ہدہد! تمہیں کیا ہوگیا؟ زمین کے نیچے تو پانی دیکھ لیتے ہو اور تم کہتے تھے کہ میں جال بھی دیکھ چکا ہوں تو تم جال میں کیسے پھنس گئے؟ ہدہد نے کہا: جب اللہ تعالیٰ کی تقدیر نازل ہوتی ہے تو آنکھیں اندھی ہوجاتی ہیں۔ جب تقدیر آگئی تو آنکھیں کام نہیں کرتیں۔ تو وہ پرندہ ایسی حکمت کی باتیں بتارہا ہے، اللہ کی تقدیر بتلارہا ہے:

''إِذَا نَزَلَ الۡقَضَاءُ عَمِيَ الۡبَصَرُ'' [الجامع لاحکام القرآن: ۱۳/ ۱۶۵]

''جب اللہ کی تقدیر نازل ہوتی ہے تو آنکھیں اندھی ہوجاتی ہیں۔''

علماء نے باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بولیاں سمجھی ہیں کہ پرندہ کیا کہہ رہا ہے؟ کوا کیا کہہ رہا ہے؟ شاہین کیا کہہ رہا ہے؟ اور علماء نے یہ ساری چیزیں باقاعدہ کتابوں میں نقل کی ہیں اور بڑی مفصل کتابیں ہیں اور ان کے اندر بڑی مفصل ابحاث ہیں۔ اور اسی طرح ہمارے لوگوں نے بھی بنایا ہوا ہے کہ تیتر یہ کہتا ہے اور مرغ یہ کہتا ہے، مرغ اذان کہہ رہا ہے، تیتر سبحان اللہ! تیری قدرت کہہ رہا ہے۔ پتہ نہیں یہ بھی سلیمان بن رہے

ہیں۔ انہوں نے بھی تو زبانیں سمجھ لی ہیں، حالانکہ یہ علم اللہ نے اپنے نبی کو دیا تھا اور کسی نے کہا: یہ قمری حق باھو کہہ رہی ہے، پیر کا نعرہ لگا رہی ہے، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جب اللہ والے لوگ فوت ہو جاتے ہیں تو ان کے مزار شرک کے گڑھ بن جاتے ہیں، حالانکہ وہ تو توحید کا اتنا بڑا علمبر دار ہے، توحید کے مسئلے میں اتنا اونچا کلام ہے سنت کے مسئلہ میں، اتباع رسول ﷺ کے مسئلہ میں۔ اللہ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل کرے۔ اللہ والوں کا تو کوئی قصور نہیں ہے، اولیاء اللہ کا کیا قصور ہے؟ انہوں نے تو ساری زندگی اللہ کی توحید پھیلانے کے لیے جہاد کیا، دین پھیلانے کے لیے جہاد کیا، لیکن بدقسمتی سے یہ کیا ہے کہ:

ع زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

کہ اللہ والوں کی مسندوں پر جاہل آ گئے، ان مقامات پر وہ لوگ آ گئے جنہیں نماز کا پتہ نہیں، حلال و حرام کا پتہ نہیں، ان مراکز علم کو یعنی وہ مرکز علم ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کوٹ مٹھن ہمارے قریب ہے، بزرگوں کا مقام ہے۔ میرے والد صاحب فرماتے تھے کہ جب میں چھوٹا تھا تو وہاں بہت بڑا مدرسہ تھا اور میں نے وہاں تعلیم حاصل کی۔ وہاں پانچ سو، ہزار ہزار اور دو دو ہزار آدمی بیٹھ کر قرآن اور بخاری پڑھتا تھا، آج وہاں میلے ہیں، یا سرکسیں ہیں یا قوالیاں ہیں، جو بھی متولی حضرات ہیں اللہ ان کو ہدایت دے، وہ حق کو پہچانیں اور باطل سے بچنے کی کوشش کریں۔

بہر حال! حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے بڑا پیارا جواب دیا! انہوں نے فرمایا کہ بادشاہ سلامت! اتنی لغتیں جب مختلف ہیں تو ان لغتوں کا کوئی خالق تو ہے۔ تمام بندے جو اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں، اپنے اپنے رنگ بول رہے ہیں اور ہر پرندے کی آواز علیحدہ علیحدہ ہے۔ ایک ہی جنگل میں رہنے والے جانور ہیں، ان کی بولیاں آپس میں نہیں ملتیں۔ ایک ہی خطہ کے رہنے والے لوگ ہیں، ان کی بولیاں نہیں ملتیں۔

آپ لوگ دیکھیں کہ اللہ نے آپ کو کعبہ نصیب کیا...... الحمد للہ...... آپ طواف میں ملتزم پر کھڑے ہو کر ذرا غور کرو۔ بنگالی اپنی زبان میں لگا ہوا ہے، برمی اپنی زبان میں لگا ہوا ہے، حبشہ والا اپنی زبان میں لگا ہوا ہے اور سندھی، پنجابی، پختون، عربی اور عجمی سب اپنی اپنی زبانوں میں لگے ہوئے ہیں۔ تو ان سب بولیوں کو سمجھنے کے لیے کوئی ذات ہے جو ان سب کی بولیاں سمجھ رہی ہے، ان سب کی دعائیں سن رہا ہے اور جو ان سب کی پکار کو جاننے والا

ہے۔ تو حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے تو اپنے رب کو اسی طرح پہچانا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی عجیب حکایت!

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ایک دفعہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ زندیق قسم کے لوگ آئے، جو خدا کے منکر تھے۔ وہ امام صاحب سے مسئلہ وجود باری تعالیٰ پر بحث کرنے آئے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے چھوڑ دو، میں تو ایک بڑے مسئلے میں بڑا متفکر ہوں۔ تم میرے ساتھ کسی اور وقت میں بات کرنا۔ ایک عجیب مسئلہ پیش آ گیا! مجھے ایک آدمی نے خبر دی ہے کہ دریا کے اندر ایک کشتی سامان کی بھری ہوئی ہے اور اس میں ہر قسم کا سامانِ تجارت موجود ہے اور کشتی کا ملاح بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ خود کنارے پر آتی ہے اور سامان اتارتی ہے اور مال لادتی ہے اور پھر دوسرے کنارے پر چلی جاتی ہے۔ اتنا قیمتی سامان اس میں بھرا ہوا ہے۔ تو انہوں نے کہا: ابو حنیفہ! کیا کہہ رہے ہو؟ تم جو کہہ رہے ہو وہ عقل کی بات ہے کہ کشتی ادھر سے ادھر چلی جاتی ہے اور اس کو چلانے والا کوئی نہیں ہے۔ ادھر آتی ہے، سامان لے جاتی ہے اور ادھر سے سامان لے آتی ہے اور اس کشتی کو چلانے والا کوئی نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: بے وقوفو! جب ایک چھوٹی سی کشتی بغیر چلانے والے کے نہیں چل سکتی تو اتنا بڑا دنیا کا کارخانہ کیسے چل رہا ہے؟ تم عجیب جاہل آدمی ہو!! تو انہوں نے فوراً کہا کہ ہمیں کلمہ پڑھا دیں، ہم اسلام لاتے ہیں، ہمیں بات سمجھ آ گئی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۸، الآیۃ: الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا]

ائمہ اسلام کے مختلف کارنامے:

جو ائمہ کبار گزرے ہیں، چونکہ ائمہ کے مختلف میدان ہیں۔ بعض ائمہ نے اجتہادی کام کیے تو "مجتہدین" کہلائے، بعض ائمہ کرام نے حدیث پاک کی خدمت کی تو ان کو "محدثین" کہا گیا، اسی طرح بعض ائمہ نے قراءت کی خدمت کی تو ان کو "قراء" کہا گیا، اسی طرح جن حضرات نے فقہ کے اندر خدمت کی کہ قرآن وحدیث سے ان مسائل کو مستنبط کیا اور پھر ان مسائل کو مدون کر کے امت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قیامت تک کے لیے ذخیرہ چھوڑا تو ان کو "فقہاء" کہا جاتا ہے۔ اور ان میں چار امام ایسے ہیں جن کو اللہ نے شرف قبولیت سے نوازا ہے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے مقام رفیع عطا فرمایا ہے کہ انہی پر ہی مدار ہو گیا، حالانکہ بڑے بڑے علماء اور ائمہ بعد میں پیدا ہوئے لیکن فقہ میں سب ان کے حاشیہ نشین ہو گئے: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد

بن حنبل رحمہ اللہ۔ اللہ تعالیٰ ان ائمہ اربعہ اور جمیع ائمہ پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ ان تمام لوگوں نے اللہ کے دین، اللہ کا قرآن اور سنت محمد مصطفیٰ ﷺ کے اندر جو مسائل تھے، ان کے اندر جو احکام تھے ان کو علیحدہ علیحدہ مدوّن کر کے، جمع کر کے امت کی آسانی کے لیے قیامت تک کے لیے ایک ذخیرہ چھوڑ دیا۔

آپ اسی سے اندازا فرمائیں کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اتنا بڑا عظیم عالم اور علم کے اتنے بحر اور سمندر تھے، لیکن فقہی مسائل میں انہوں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے مسائل لیے ہیں۔

اصل میں یہ تھا کہ جہاں جہاں ان ائمہ کو کام کرنے کا موقع ملا، وہاں ان کی فقہ نے زیادہ رواج پکڑا۔ مثلاً: بعض علاقوں میں امام شافعی رحمہ اللہ کا دور رہا، لوگوں نے فقہ شافعی کو لیا، اسی سے انہوں نے مسائل کو سیکھا۔ اور بعض علاقے مثلاً: مدینہ منورہ، تو امام مالک رحمہ اللہ کی ساری زندگی مدینہ منورہ کے اندر گزری اور جنہوں نے سب سے پہلی کتاب حدیث کے اندر ''مؤطا امام مالک'' لکھی جو فن حدیث کے اندر ایک عظیم کتاب ہے تو ان لوگوں نے ان کی فقہ سے استفادہ کیا۔ اور اسی طرح جہاں جہاں امام اعظم رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد امام ابو یوسف علیہ السلام اور امام محمد رحمہ اللہ پہنچے تھے، ان لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ اور بعض علاقوں کے اندر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی فقہ سے استفادہ کیا۔

اس لیے اپنے ذہن کے اندر یہ بات رکھا کریں کہ جتنے ائمہ ہیں یہ سب علی الحق والھدیٰ ہیں، ہدایت پر ہیں اور رشد پر ہیں۔ اللہ ان کی تمام محنتوں کو قبول فرمائیں اور اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آدمی چاہے فقہی مسائل میں جزئیات میں کسی امام کے قول لیتا ہو، لیکن کسی دوسرے کی شان میں گستاخی نہیں کرنی چاہیے، نہ بے ادبی کرنی چاہیے اور نہ ان کی شان میں کوئی ایسا جملہ کہیں۔

ہمیشہ یاد رکھیں کہ ان ائمہ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی وہ کرتے ہیں جن کو اللہ نے علم سے محروم کیا ہے، جن کے سینے علم سے خالی ہیں اور جن کے دل بغض وحسد سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے ذمہ یہ ہو جاتا ہے کہ اللہ کے اولیاء کا گلہ کریں۔ جب اللہ کسی پر ناراض ہو جاتا ہے تو اپنے دوستوں کا اسے دشمن بنا دیتا ہے اور وہ ہر وقت ان کی تنقیص اور ان کی شان میں گستاخی کرتے رہتے ہیں، حالانکہ وہ سب کے سب برحق ہیں۔ آدمی مخالفت کرے تو ان فرقوں کی کرے جو گمراہ ہیں، جو قرآن وحدیث سے ہٹ گئے، جن فرقوں نے اللہ کے قرآن وحدیث کا انکار کیا اور جن فرقوں نے اللہ کے قرآن میں ایسی تاویلات کر ڈالیں جن سے دین کا مزاج بدل گیا وہ گمراہ فرقے ہیں۔ اور پھر دیکھیں کہ خدا کی قدرت ہے کہ ان ائمہ کا بھی آپس میں بڑا ربط ہے، جیسے امام شافعی رحمہ اللہ بڑے شان والے امام

ہیں، لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں کہ انہوں نے حضرت محمد بن الحسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا ہے۔ اور اسی طرح حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا مقام ہے، لیکن انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے لیا ہے۔ اب اسی سے اندازہ فرمائیں کہ ان لوگوں کا آپس میں کتنا اعتقاد و محبت واحترام تھا۔ اگر کوئی اختلافی مسئلہ ہے تو انہوں نے خلوصِ نیت کے ساتھ اختلاف کیا ہے، دین کو سمجھنے کے لیے اختلاف کیا ہے اور ہم نے دین کو مٹانے کے لیے اختلاف کیا ہے۔ تو ان کے اختلاف میں اور ہمارے اختلاف میں بڑا فرق ہے۔ ان میں اگر کوئی اختلاف ہوا تو فہم کا اختلاف ہے، یعنی ایک بات کو سمجھنے کا اختلاف ہے اور وہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی ہوتا تھا۔

جیسا کہ ایک دفعہ میرے آقا خاتم الانبیاء حبیب کبریا...... صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا...... جنگ احزاب سے فارغ ہوئے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے جنگ کے ہتھیار اتار دیے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور عرض کیا: آپ نے تو ہتھیار اتار دیے، جبکہ ہم نے تو ابھی نہیں اتارے، بنو قریظہ کی طرف چلیے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ خبردار! سب لوگ عصر کی نماز بنو قریظہ یہودیوں کے قبیلہ میں جا کر پڑھیں۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے خلاف جنگ کے لیے چل پڑے۔ عصر کی نماز کا وقت جانے لگا تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے راستہ میں نماز پڑھ لی اور بعض نے کہا کہ چونکہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے اس لیے ہم تو بنو قریظہ میں جا کر ہی پڑھیں گے۔ چنانچہ جب یہ سب فریق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس واپس حاضر ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے عرض کیا: ہمارا تو آپس میں اختلاف ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے نماز راستہ میں پڑھ لی اور انہوں نے کہا کہ نماز کا وقت مقرر ہے اور کچھ لوگوں نے آپ کے ظاہر حکم کو دیکھ کر نماز بنی قریظہ میں ادا کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم دونوں حق اور ہدایت پر ہو، مقصد تم دونوں کا میری تعمیل تھی، لہٰذا دونوں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

[مجمع الزوائد، حدیث: ۱۰۱۶۴، صحیح البخاری، حدیث: ۴۱۱۹، بَابُ مَرْجِعِ النَّبِيِّ ﷺ مِنَ....]

اس لیے دیکھیں کہ ہمارے ملکوں میں نماز آخر وقت میں پڑھی جاتی ہے اور اللہ کے حرمین نماز اوّل وقت میں پڑھی جاتی ہے۔ نماز کے دو وقت ہیں: ایک اوّل وقت اور ایک آخر وقت ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی رائے مبارک یہ ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو اوّل وقت میں ادا کرو، کیونکہ نہ جانے ہم بعد میں زندہ بھی ہوں گے کہ نہیں ہوں گے، ایک سانس نکلنے کی بھی ہمیں خبر نہیں ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردوں نے کہا کہ نماز آخر وقت میں پڑھے۔ لوگ دنیا کے معاملات میں الجھ گئے ہیں، اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ تو رہا نہیں کہ دین کی تڑپ

ہو۔ اگر ہم اوّل وقت میں پڑھیں گے تو کچھ لوگ جماعت سے رہ جائیں گے۔ اگر ہم کچھ دیر کریں گے تو کچھ نہ پڑھنے والے بھی جماعت میں مل جائیں گے۔ اور یہ دونوں وقت حدیث پاک میں موجود ہیں کہ اللہ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا۔ اسی کعبہ مکرمہ میں اللہ کے نبی ﷺ کے امام حضرت جبرئیل علیہ السلام بنے۔ پانچ نمازیں اوّل وقت میں پڑھائیں اور پانچ نمازیں آخر وقت میں پڑھائیں۔ تو اب جو اوّل وقت میں پڑھتے ہیں وہ بھی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے غلام ہیں اور جو حضرات آخر وقت میں پڑھتے ہیں وہ بھی محمد مصطفیٰ ﷺ کے متبع ہیں۔

[سنن أبي داود، حديث: ٣٩٣، بَابُ: فِي الْمَوَاقِيتِ]

جیسے ہمارے بعض لوگ اس وقت عصر پڑھتے ہیں جب سورج پیلا ہو جاتا ہے، سورج ڈوبنے کے قریب آجاتا ہے۔ انہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی، کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ کوئی آدمی بیٹھا رہے اتنی دیر کہ سورج پیلا ہو جائے، ڈوبنے لگے تو نماز پڑھے۔ فرمایا: یہ منافق کی نماز ہے کہ جب وقت نکلنے لگا تو گلے سے بوجھ اتار کر پھینک کر فارغ ہو گئے۔ [صحيح مسلم، حديث: ٦٢٢، بَابُ: اسْتِحْبَابِ التَّبْكِيرِ بِالْعَصْرِ]

عصر کا سلام پھیرا اور مغرب کی شروع ہوگئی، یا ظہر کے وقت میں بیٹھا رہے اور بیٹھا رہے اور تقریریں کرتا رہے اور خطبہ کو اور جمعہ کو اتنا لمبا کر دے کہ عصر کا اوّل وقت شروع ہو جائے اور وہ خطبہ پڑھ رہا ہو تو یہ آدمی سنت رسول ﷺ سے نکل گیا۔ اور جس نے اوّل وقت میں نماز پڑھی یا جس نے آخر وقت میں نماز پڑھی، جیسا کہ احادیث میں آیا ہے تو دونوں کو ہم کہیں گے کہ وہ متبع سنت محمد ﷺ ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہمیں تمام ائمہ محدثین، تمام ائمہ مجتہدین، تمام ائمہ فقہاء اور تمام علماء حقہ کی اتباع اور ان کا ادب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تفسیر ابن کثیر کی اہمیت:

اب دیکھیں کہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کتنا بڑا آدمی ہے، کتنا بڑا محقق عالم ہے، کتنا بڑا مفسرِ زمان گزرا ہے اور جس کی تفسیر کو اللہ نے یہ رنگ بخشا ہے کہ ہر مدرسہ میں پڑھی جاتی ہے۔ یعنی حنفی مدارس میں تفسیر ابن کثیر پڑھی جائے گی۔ شافعی مدارس ہیں تو خیر پڑھیں گے، کیونکہ آپ کا میلان بھی امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف ہوتا ہے، یعنی ہر فقہ والے اس تفسیر کو پڑھتے ہیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے پہلے اس آیت پر امام مالک رحمہ اللہ کی دلیل بیان کی، کیونکہ وہ باعتبار سن کے بڑے ہیں اور

باعتبار امام دار الہجرت ہونے کے اوران کے بعد اقرب زمان ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے، پھر ان کی دلیل نقل کی کہ انہوں نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ امام صاحب کے پاس جب زنادقہ آئے تو ان کو ایک کشتی کی مثال دے کر اللہ کی توحید کو سمجھایا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اللہ کے وجود کی دلیل:

امام شافعی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ اللہ کی توحید اور وحدانیت، اللہ کی الوہیت اور ربوبیت کو آپ نے کیسے پہچانا؟ آپ نے فرمایا کہ دیکھو! یہ توت کا ایک پتہ ہے۔ جب یہی پتہ ہرن کھاتا ہے تو اس سے کستوری بنتی ہے، بکری کھاتی ہے تو مینگنیاں کرتی ہے اور اگر یہی پتہ شہد کی مکھی کھاتی ہے تو شہد بنتا ہے تو یہ دلالت کرتا ہے کہ اس کو بنانے والی کوئی ذات ہے، جس نے ایک غذا سے اتنی مختلف چیزیں نکال دی ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۹، الآیۃ: اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا]

انسان کے تکبر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعجب!

حضرت علی نے ایک دن فرمایا کہ یہ دنیا والے سرمایہ دار جاگیر دار جو ہیں، مجھے تو ان پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کس بات پر ناز اور نخرہ کرتے ہیں اور تکبر کرتے ہیں؟ سب سے اعلیٰ کپڑا جو دنیا کے اندر سمجھا جاتا ہے وہ ریشم کا ہے۔ فرمایا: ریشم پر غور کرو تو ایک کیڑے کی گندگی سے بنتا ہے۔ تو ایک کیڑے کی گندگی سے نکلا ہوا کپڑا تم پہن کر فخر کرتے ہو، تم اس کی اصلیت پر تو غور کرو کہ اس کی اصلیت کیا ہے؟ اور فرمایا: سب سے اعلیٰ غذا شہد ہے اور اس پر بھی غور کرو تو وہ بھی ایک کیڑے سے نکلتا ہے، اس کو ''عسل'' کہا جاتا ہے کہ جو شہد کی مکھیوں سے نکلتا ہے۔ تو جو مکھیوں کا فضلہ ہے وہ تیری اعلیٰ غذا ہے اور جو ایک کیڑے مکوڑوں کا فضلہ ہے وہ تیرا اعلیٰ لباس ہے تو تم فخر کس بات پر کر رہے ہو؟ اور فرمایا کہ مرنے کے بعد تم خود کیڑے مکوڑوں کی غذا ہو تو تکبر کس بات پر کر رہے ہو؟ اکڑ کس بات پر کر رہے ہو؟ کبھی تم فرعون بن جاتے ہو، کبھی تم قارون بن جاتے ہو، کبھی تم نمرود بن جاتے ہو، غریبوں کی عصمتیں لوٹنے والے بن جاتے ہو اور غریبوں پر مظالم کرتے ہو۔ غور تو کرو! تمہاری حیثیت کیا ہے؟ اور فرمایا کہ آدمی اگر تھوڑا سا غور کرے کہ اللہ نے اپنا کیسا نظام بنا دیا کہ بڑے سے بڑا آدمی بادشاہ سے لے کر گدا تک، گدا سے لے کر شاہ تک، ہر آدمی کو چوبیس گھنٹے میں کم از کم ایک دفعہ اپنی گندگی پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ فرمایا: جو آدمی اپنی گندگی پر بیٹھنے والا ہو، جو آدمی اپنے ہاتھوں سے اپنی گندگی کو دھونے والا ہو، وہ خدائی کا دعویٰ کرے کہ میں بھی نفع ونقصان کا مالک ہوں، وہ

لوگوں سے کہے کہ میرے سجدے کرو، وہ لوگوں سے کہے کہ میرے پاؤں پڑو اور وہ لوگوں سے کہے کہ اپنے سر میرے پاؤں پر رکھو۔ اپنی گندگی پر بیٹھ کر اور ابھی ابھی اٹھ کر آرہا ہے تو جس کی یہ حیثیت ہو اس کو تو چاہیے کہ اپنی عاجزی کو پہچانے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رب کو کیسے پہچانا؟

تو اس انداز میں جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہچانا۔ ایک آدمی نے سوال کیا کہ اے علی! تم نے اپنے رب کی تقدیر کو کیسے پہچانا؟ حضرت علی نے جواب دیا:

"عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ"

فرمایا کہ میں نے اپنے رب کو پہچانا کہ جب میرے ارادے ٹوٹ جاتے ہیں، میں ارادے کرتا ہوں اور پروگرام بناتا ہوں، لیکن کوئی ایسی چیز آتی ہے جو ان کو توڑ چھوڑ دیتی ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ کوئی رب ہے جو ہماری ان تمام چیزوں پر قادر ہے، اسی کے فیصلے چلتے ہیں، ہماری تدبیریں کچھ نہیں کر سکتیں۔ تو اس لیے فرمایا کہ میں نے اپنے اللہ کو اپنے ارادے ٹوٹنے سے پہچان لیا، ورنہ اگر یہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ارادے کیوں ٹوٹتے؟

امام احمد رحمہ اللہ کی دلیل وحدانیتِ خداوندی:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک بہت عجیب قلعہ ہے، جس کا دروازہ بھی کوئی نہیں، کھڑکی بھی کوئی نہیں، ہر طرف سے بالکل بند ہے۔ باہر سے چاندی کی طرح چمکتا ہے اور اندر دیکھو تو ایسا رنگ ہے جیسے خالص سونے کا رنگ چڑھایا ہوا ہے۔ اسی حالت میں اس بند مکان کی ایک دیوار گرتی ہے تو ایک ایسی مخلوق نکل آئی جو دیکھنے والی، سننے والی تھی، بڑی پیاری تھی۔ حیران ہو کر لوگوں نے پوچھا: حضرت! ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مرغی کے انڈے پر غور کرو! باہر سے چاندی کی طرح چمکنے والا ہے، اندر سے سونے کی طرح چمکنے والا ہے، نہ دروازہ ہے، نہ کھڑکی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اندر بچہ پیدا کر دیتے ہیں۔ فرمایا: اس پر غور کرو تو تمہیں سمجھ آ جائے گا کہ کوئی ذات تو ہے جو یہ کام کر رہی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۹، الآیۃ: الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا]

عام علماء کی طرف سے مثال:

اور بعض علماء نے عجیب مثال دی ہے کہ مرغی کا بچہ پیدا ہونے کے بعد انسان کے بچے سے بھی زیادہ عقل والا

ہوتا ہے، حالانکہ انسان سب سے زیادہ عقل والا ہے، لیکن اس کو آہستہ آہستہ عقل آتی ہے۔ جیسا کہ چھوٹا بچہ اگر انسان کا ہو، اس کو آگ کے پاس چھوڑ دیں تو ہاتھ ڈال دے گا۔ اسے پتہ نہیں کہ میں نے آگ میں ہاتھ ڈالنا ہے یا نہیں؟ سامنے پانی بہہ رہا ہو، چلتے چلتے خود اس پانی میں گر جائے گا۔ اور مرغی کا ایک دن کا یا دو دن کا بچہ کیوں نہ ہو، بلی کو آتا ہوا دیکھے تو سیدھا ماں کے پروں میں بھاگے گا۔ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے یہاں حفاظت کا مقام ملے گا اور کسی جگہ نہیں ملے گا۔ انہوں نے فرمایا کہ اندازہ کریں! فوراً پیدا ہونے کے بعد ایک چھوٹا سا بچہ جو چوں چوں کر رہا ہے، دو دن کا تین دن کا پاؤں رکھنا مشکل ہے، لیکن جیسے بلی کو دیکھا دشمن کو پہچان گیا اور فوراً ماں کے پروں میں جا کر چھپ گیا۔ وہ جانتا ہے کہ بلی دشمن ہے، حالانکہ انسان کا بچہ بلی سے کھیل رہا ہوتا ہے اور سانپ سے بھی کھیل رہا ہوتا ہے۔ ایسے ہزاروں واقعات ہیں کہ وہ سانپوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے پائے گئے کہ سانپ بھی ان کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ حفاظت فرما دیتے ہیں۔ اور سانپ عام طور پر ڈستا نہیں ہے، کیونکہ جب تک اسے چھیڑا نہ جائے تو وہ نہیں چھیڑتا۔ لیکن مرغی کے بچے میں اتنی عقل پیدا کر دی، دیواریں بھی بند ہیں، خدا کی قدرت دیکھو کہ اس کو مرغی کے نیچے رکھو یا ایک معین درجہ کی ہیٹ پہنچاؤ تو بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور اسے اپنے پیٹ کے نیچے نہ رکھو تو بچہ پیدا نہیں ہوگا یا اسے ویسے توڑ کر پکا کر کھا لو تو تمہاری مرضی ہے۔ انتظار کر لو گے تو اور مرغیاں نکل آئیں گی اور پھر مرغی کے بطن سے ایک بند انڈے کو پیدا فرما دینا۔

سورۂ کوثر کا اعجاز:

ایک دن ایک عرب مسلمان کو خیال آیا کہ عرب کے بڑے بڑے شاعر قصیدے لکھ کر اللہ کے کعبہ پر لٹکا دیتے ہیں، چلو میں بھی اللہ کے قرآن کی ایک سورت لکھ کر لٹکا دیتا ہوں۔ اس نے قرآن کی سب سے چھوٹی سورت ﴿إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ② إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ③﴾ [سورۃ الکوثر] لکھ کر اللہ کے کعبہ پر لٹکا دی۔ اب بڑے بڑے شاعر آئے اور وہ دیکھ رہے ہیں۔ آخر تمام شاعروں کا جو بڑا شاعر تھا اس نے آکر جب پڑھا اور وہ مسلمان بھی نہیں تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تین آیات کے اندر اتنے بڑے دریا کو جمع فرما دیا ہے کہ ایک آیت مبارک میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی عظمت بیان فرما رہے ہیں کہ ہم نے تمہیں کوثر عطا فرمایا اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو حکم دے رہے ہیں کہ جب ہم نے اتنی بڑی شان والی اور عظمت والی کوثر عطا فرمائی ہے تو

عبودیت کا تقاضا ہے ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝٢﴾ کہ تم بھی اپنے رب کے لیے عبادت کرو، نماز پڑھو اور اللہ کے نام پر قربانی کرو۔ باقی جب تم عبادت بھی کرو گے، نمازیں بھی پڑھو گے، اللہ کی توحید اور اللہ کے نام پر قربانیاں بھی کرو گے تو لازماً تیرے دشمن بھی ہوں گے، جو تیری مخالفت بھی کریں گے۔ اللہ نے فرمایا: فکر نہ کرو ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝٣﴾ تیرا دشمن جو ہے، اس کو ہم ختم کر دیں گے اور اس کا ذکر دنیا میں باقی نہیں رہے گا۔ تو اب تین آیات کے اندر اتنے بڑے مضامین کو جمع کر دینا اس شاعر نے جب پڑھا تو اس نے نیچے لکھا: ''وَاللهِ! لَيْسَ هٰذَا مِنْ كَلَامِ الْبَشَرِ'' خدا کی قسم کھا کر میں کہتا ہوں کہ یہ کسی بندے کا کلام نہیں ہو سکتا کہ ایک آیت میں عظمت کی چوٹیوں پر بٹھا رہے ہیں، شانِ کوثر عطا فرما رہے ہیں، دوسری آیت کے اندر حکم دے کر اپنی بندگی اور عبودیت کو بڑھا رہے ہیں اور تیسری آیت کے اندر اپنے نبی کی حفاظت کا مژدہ سنا رہے ہیں کہ تمہارے دشمن کا ذکر ہم ختم کر دیں گے، لیکن تیرا ذکر قیامت تک باقی ہوگا۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُونِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ۝٢٣ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِينَ ۝٢٤

اور اگر تم شک میں ہو اس کلام کے متعلق جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو اس جیسی ایک سورت لاؤ اور اللہ کے سوا جو تمہارا مددگار ہو اس کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔ اگر ایسا نہ کر سکو اور کبھی کر بھی نہ سکو گے تو پھر اس آگ سے بچو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے تیار کی ہوئی ہے۔

قرآن کے تین اہم مسائل:

اللہ نے اس رکوع میں سب سے پہلے توحید کا مسئلہ بیان فرمایا۔ اور قرآن مقدس میں سب سے اہم مسائل تین ہیں:

- ...... ان میں سب سے پہلا توحید کا مسئلہ ہے۔
- ...... دوسرا نبوت و رسالت کا مسئلہ ہے۔
- ...... اور تیسرا مسئلہ قیامت کا ہے۔

سارے قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہ تین مسئلے واضح نظر آئیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ان تین مسئلوں پر

آدمی کو اپنے ایمان اور عقیدے کو صحیح کرنا چاہیے، کیونکہ اگر ان میں خدانخواستہ ذرا سی بھی غلطی ہو جائے تو آدمی ایمان سے نکل کر کفر میں چلا جاتا ہے۔ توحید کا مسئلہ تو گزشتہ آیات میں دلائل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔

حضور ﷺ کو نبی اور خاتم الانبیاء ماننا ایمان کے لیے شرط ہے:

نبوت و رسالت کے لیے حضور ﷺ نے ایک بڑی واضح مثال ارشاد فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جیسے ایک انسان ایک عمارت بناتا ہے اور اس میں ایک اینٹ کی جگہ باقی ہوتی ہے۔ جب وہ اینٹ لگ جائے تو وہ عمارت مکمل ہو گئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبوت و رسالت کی اس عظیم عمارت میں جو آخری جگہ باقی تھی اس میں اللہ نے اپنے آخری نبی محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا۔

[صحیح مسلم، حدیث:۲۲۸۶، بَابُ ذِكْرِ كَوْنِهِ صلى الله عليه وسلم خَاتَمَ النَّبِيِّينَ]

اور اسی طرح ہمارا ایمان ہے کہ حضور ﷺ کے آنے کے بعد اب اللہ نے نہ کوئی نیا نبی بھیجنا ہے، نہ ہی کوئی رسول بھیجنا ہے، نہ ہی کوئی نئی شریعت بھیجنی ہے اور نہ ہی کوئی نئی کتاب بھیجنی ہے۔ اب میرے مدنی پاک ﷺ کی نبوت بھی قیامت تک، رسالت بھی قیامت تک اور شریعت بھی قیامت تک ہے۔

اور اسی طرح یاد رکھیں کہ عام مغالطہ لگتا ہے تقابلِ ادیان کے بارے میں کہ جو آدمی اللہ پر ایمان رکھے، کسی نبی کو مانتا ہو اور آخرت کا مانتا ہو، چونکہ وہ جب اہل کتاب کے بارے میں قرآن مقدس میں ایسی باتیں پڑھتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ چلا جاتا ہے کہ چلو اللہ کو تو مانتے ہیں، اسی طرح وہ قیامت پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اسی طرح وہ ایک پیغمبر کو بھی مانتے ہیں، لیکن میرے پاک نبی ﷺ نے یہ مسئلہ بھی واضح فرما دیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری بعثت کے بعد اور میری نبوت و رسالت کے بعد جس آدمی کو بھی میری نبوت و رسالت کا پیغام پہنچا ہے، چاہے وہ بالواسطہ پہنچا ہو یا بلاواسطہ پہنچا ہو ''ثُمَّ لَا يُؤْمِنُ بِي'' اس کے بعد اگر وہ مجھ پر ایمان نہیں لے آیا تو وہ مسلمان نہیں ہوگا۔ [السنن الکبریٰ، حدیث:۸۹۹۵]

یعنی آج اگر کوئی آدمی صحیح معنوں کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے، انہیں اللہ کا نبی اور اللہ کا رسول مانے، اللہ کی توحید کو بھی صحیح طریقہ سے مانے اور قیامت و آخرت کو بھی صحیح طریقہ سے مانے، لیکن حضور ﷺ پر ایمان نہ لائے تو وہ مسلمان نہیں ہوگا، کیونکہ جب حضور ﷺ تشریف لے آئے تو سابقہ تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں، تمام کتابیں منسوخ ہو گئیں اور تمام احکامات معطل ہو گئے۔ اگر صرف قیامت تک جاری رہے گی تو شریعت

محمد مصطفیٰ ﷺ۔ اور اسی کو ذرا گہرے پہلو سے بھی دیکھا جائے کہ اگر آج کوئی آدمی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور میرے آقا ﷺ پر ایمان نہ لائے تو وہ دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان نہیں لے آیا، اس لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو باقاعدہ اعلان کیا تھا:

﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَٰبَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ إِنِّي رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنۢ بَعْدِي ٱسْمُهُۥٓ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَآءَهُم بِٱلْبَيِّنَٰتِ قَالُوا۟ هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝٦﴾ [الصف:٦]

میرے بعد ایک نبی آئیں گے جن کا نام احمد (محمد مصطفیٰ ہوگا اور محمد مجتبیٰ) ہوگا تو تم لوگ ان پر ایمان لے آنا۔

جب حضور ﷺ پر ایمان نہ لایا تو گویا عیسیٰ علیہ السلام کا بھی وہ منکر ہے۔

اسی طرح یہ بھی عقیدے کی بات سمجھ لیں کہ جو آدمی اللہ کے ایک نبی پر ایمان لے آئے تو اس کو سارے انبیاء پر ایمان لازم ہوتا ہے۔ اگر ایک پیغمبر کا انکار کرے تو گویا اس نے سارے انبیاء علیہم السلام کا انکار کر دیا۔ تو گویا اس نے اللہ کے مسئلۂ نبوت اور رسالت کا انکار کر دیا۔

بعض وہ مسائل جو عقل سے سمجھ نہیں آسکتے:

اور اسی طرح یہ بات بھی اپنے دماغوں میں رکھ لیں کہ اللہ نے ہمیں علم عطا فرمایا اور اللہ نے ہمیں عقل عطا فرمائی ہے، لیکن ہر عالم کے احوال علیحدہ ہوتے ہیں۔ جب تک آدمی اس بات کو پہلے نہ سمجھ لے تو ٹھوکریں کھاتا ہے۔ مثال کے طور پر: عالمِ ارواح ایک عالم ہے، جو گزر چکا ہے۔ اب عالمِ ارواح کے بارے میں ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا اللہ کے قرآن نے ہمیں سمجھا دیا ہے، کیونکہ اس عالم کا مشاہدہ کرنا، اس کو دیکھنا اور اس عالم کو سمجھنا تو صرف ان کے لیے ممکن تھا جن کو اللہ تعالیٰ نے دکھلا دیا اور جن کو اللہ نے سمجھا دیا۔ جیسے کہ بعض روایات مبارکہ میں آتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو بتلایا گیا کہ یہ روح مبارک فلاں پیغمبر کی ہے اور یہ روح مبارک فلاں پیغمبر کی ہے۔ اور اسی طرح عالمِ ارواح میں اللہ نے تمام ارواح سے ایک عہد لیا:

﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا۟ بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَآ ۛ أَن تَقُولُوا۟ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَٰفِلِينَ ۝﴾ [الاعراف:١٧٢]

کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا کہ آپ ہمارے رب ہیں، ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہی ہمارے رب ہیں، آپ ہی ہمارے مربی ہیں، آپ ہی ہمارے رازق ہیں اور آپ ہی ہمارے خالق ہیں۔ اس لفظ ''رب''

میں تمام صفات کا ذکر ضمناً آجاتا ہے، لیکن ہر آدمی کے لیے عالمِ ارواح کا مشاہدہ کرنا مشکل ہے۔

جیسے ہمارے اندر ایک روح ہے، لیکن ہم مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ کوئی کہے کہ ہمیں روح دکھلا دو، روح کیسے نکل جاتی ہے؟ بلکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس پر ہم ایمان لائیں گے اور مشاہدہ نہیں کر سکتے اور بعینہٖ اسی طرح جیسے ہوا ہمیں لگ رہی ہے، لیکن ہوا کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ اور اسی طرح ہم خواب دیکھتے ہیں اور خواب میں بڑے بڑے عجیب واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں، لیکن ہمیں اگر صبح اٹھنے کے بعد کوئی کہے کہ ان واقعات کو ہمارے سامنے حاضر کردو تو ہمارے بس میں نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہمیشہ یاد رکھیں کہ عالمِ ارواح کے اپنے واقعات ہوتے ہیں اور عالمِ دنیا کے علیحدہ اپنے واقعات ہوتے ہیں اور اس کے بعد عالمِ برزخ ہے اور عالمِ برزخ کے بعد عالمِ آخرت ہے۔ تو اگر کوئی آدمی کہے کہ ہمیں تو عذابِ قبر سمجھ نہیں آتا تو ایک طرف مسلمان کی قبر ہے تو ایک طرف کافر کی قبر ہے اور مسلمان کی قبر کے بارے میں آتا ہے کہ اللہ اسے کھول دیتے ہیں اور اللہ اس کو ۷۰ ہاتھ کے برابر وسیع فرما دیتے ہیں۔ تو اگر مسلمان کی قبر ۷۰ ہاتھ بڑھا دی جائے تو پھر وہ کافر کی قبر میں گھس جائے گا۔

تو اس طرح کے اس قسم کے اشکالات اس لیے کیے جاتے ہیں کہ اس عالم کو ہم نے دیکھا نہیں ہے۔ جب وہ عالم ہم دیکھ نہیں سکتے، وہ عالم ہم سے غیب میں ہے تو ان پر ہمیں ایمان بھی بالغیب لانا ہوگا۔ اس کی تحقیق میں ہم نہیں پڑ سکتے، کیونکہ ہم اس عالم میں گئے ہی نہیں۔

اس کی مثال جیسے بزرگوں نے دی ہے کہ ایک مینڈک جو ایک کنویں میں چار دیواری کے اندر رہتا ہے، لیکن ایک مینڈک دریاؤں کے کناروں پر ہوتا ہے اور ندیوں کے کنارے پر ہوتا ہے۔ اگر اس مینڈک کی آپس میں ملاقات کرا دیں اور وہ کنویں والے مینڈک کو کہے کہ میں جہاں رہتا ہوں، وہاں میلوں کے اندر پانی پھیلا ہوا ہے۔ وہاں میں چلتا رہتا ہوں، سیر کرتا رہتا ہوں۔ تو جو کنویں کا مینڈک ہے وہ یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتا، وہ کہے گا: سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، اتنا بڑا پانی کیسے ہو سکتا ہے؟ بس پانی تو اتنا ہے جس کے اندر میں رہ رہا ہوں، اس کے علاوہ بڑے دریا تو دنیا میں ہو نہیں سکتے۔ تو یہ اس لیے کہ اس نے وہ بڑا دریا دیکھا نہیں ہے۔

جیسا کہ اس کے بارے میں علماء نے فرمایا کہ ایک بچہ نو مہینے تک اپنی ماں کے بطن میں رہتا ہے، رحم کے پردوں میں رہتا ہے اور ان اندھیروں میں رہتا ہے۔ اگر اس کو کوئی فرشتہ اندر سمجھائے کہ باہر آؤ گے تو بڑی دنیا ہے،

کروڑوں میل لمبی ہے، جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو ہزاروں میل جہازوں پر سفر کرو گے، تو وہ کہے گا کہ دنیا تو یہی ہے جس کے اندر میں رہتا ہوں، اس سے بڑی دنیا کیسے ہوسکتی ہے؟ اتنی ہی دنیا ہوگی جس کے اندر اس وقت میں موجود ہوں، اس سے زیادہ بڑی دنیا کا وجود ہی نہیں ہوسکتا۔ لیکن جب وہ بچہ باہر آتا ہے، اس کے بعد آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے۔ جب وہ جوان ہوتا ہے، عالمِ دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ دنیا تو بہت بڑی ہے۔ اس لیے جو باتیں ہمیں سمجھ نہیں آتی ہیں تو مرنے کے بعد جب عالمِ برزخ میں ہمارا گزارا ہوگا پھر ہمیں عالمِ برزخ سمجھ آئے گا، کیونکہ وہ عالم ہم نے دیکھا ہی نہیں ہے۔ یہ ساری دنیا مشرق سے لے کر مغرب تک جب بھی نماز پڑھتی ہے تو ان کے دل کے اندر یہ نیت ہوتی ہے کہ اللہ کے کعبہ کی طرف ہمارا رخ ہے، لیکن انہوں نے کعبہ دیکھا نہیں، انہیں آپ جتنا سمجھاتے رہیں کہ کعبہ شریف کی ایسی عمارت ہے اور کعبہ شریف سرزمین مکہ کے اندر واقع ہے اور کعبہ شریف ایسے پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور ایک وادی مبارک ہے، گویا کہ ایک پیالہ رکھا ہوا ہو، کیونکہ تمام زمین میں سب سے نیچی زمین یہ ہے۔ اندازہ فرمائیں کہ مکہ کی زمینوں کا بھی اگر مطالعہ کیا جائے تو تمام اطراف اونچے ہیں اور کعبہ سب سے نیچی جگہ پر ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو جگہ سب سے نیچی تھی وہاں اپنا گھر بنا کر اس کو آسمانوں سے بھی اونچا کر دیا۔ جو جگہ سارے جہاں سے نیچی تھی اس کو اتنی عزت بخشی کہ ساری کائنات سے اس کو اونچا کر دیا۔ تو اس میں اشارہ کیا کہ آپ کی اونچائی اور نیچائی جگہ کے اوپر نیچے ہونے میں نہیں ہے، یا کسی کا قد بڑا ہو تو وہ بڑا آدمی بن جائے اور کسی کا قد چھوٹا ہو تو وہ چھوٹا آدمی کہلائے یہ نہیں ہوتا، بلکہ اللہ جسے عزت عطا فرما دیں۔ بعض اوقات چھوٹے قد کے لوگ ہوتے ہیں، لیکن ان کو اتنا اونچا نام دے دیتے ہیں اور اتنی اونچی شان دے دیتے ہیں کہ پوری دنیا میں ان کا نام ہوتا ہے اور بعض بڑے قد کے ہوتے ہیں، لوگ انہیں بے وقوف اور احمق کہتے ہیں، دیکھو! اتنا لمبا اونٹ کے برابر قد ہو گیا، ابھی پیشاب کرنا بھی نہیں سیکھا۔ لوگ اس کی بے وقوفی کے لیے ایک ضرب المثل بنا دیتے ہیں تو اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ کعبہ جب تک کسی حاجی نے اپنی آنکھ سے نہ دیکھا ہو۔

اب بھی اندازہ کر لیں! ہمارے اپنے بھائی اور طالب علم اور ہماری مولوی برادری کتابوں کے اندر کعبہ کے بارے میں پڑھتے بھی رہتے ہیں اور پڑھاتے بھی رہتے ہیں کہ طواف کے سات چکر ہیں اور حجر اسود سے طواف شروع ہوتا ہے اور حجر اسود پر آ کر ہی ایک چکر پورا ہوتا ہے اور رکن یمانی پر ہاتھ لگایا جاتا ہے، رکن عراقی اور رکن شامی پر ہاتھ نہیں لگایا جاتا ہے اور پھر وہ پڑھتے ہیں کہ دو رکعت مقامِ ابراہیم پر پڑھی جاتی ہیں اور ملتزم پر دعا مانگی

جاتی ہے، لیکن کتابوں میں پڑھنے کے بعد جب وہ خود کعبہ میں آ جائیں تو انہیں سمجھ نہیں آتی، کیونکہ کتابوں کا پڑھنا علیحدہ بات ہے۔

اب بھی ہمارے حاجی حضرات جو رمضان المبارک میں آئے یا شوال میں آئے وہ کتنے خوش نصیب ہیں جنہیں صحیح طواف کرنا آتا ہے۔ اور ایسے بھی ہیں جو ابھی تک طواف نہیں سیکھ سکے۔ کئی لوگ آ جاتے ہیں کہ طواف الوداع ہم نے کرنا ہے۔ وہ کیسے ہوتا ہے؟ اللہ کے بندے! جیسے طواف ہے ویسے طواف الوداع ہے، اس کے اندر کوئی فرق نہیں ہے۔ اب بھی ہمارے کئی حاجی یہ سمجھتے ہیں کہ طواف کے بعد زمزم نہ پیا تو طواف نہیں ہوگا۔ طواف کے بعد وہ دوڑتے ہیں اور زمزم پی رہے ہوتے ہیں کہ ہر طواف کے بعد زمزم پینا لازم ہے۔ اسی طریقہ سے اب بھی کتنے لوگ ہیں جنہیں یہ سمجھ نہیں ہے کہ ملتزم کس کو کہتے ہیں؟ اور مقامِ ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا مطلب ہے؟ پیچھے کھڑے ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس سے ٹکرا کر کھڑے ہو جائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ مقامِ ابراہیم کے آپ پیچھے ہوں، مقامِ ابراہیم آپ کے آگے ہو، پیچھے جہاں بھی آدمی کو جگہ ملے وہ بھی گویا کہ مقامِ ابراہیم کے پیچھے ہے۔ اور اسی طرح آپ آج عشا کے بعد طواف میں دیکھ لیں کہ اگر طواف کرتے ہوئے کوئی واقف مل جائے تو اس کو کہتے ہیں: ادھر آؤ! بات سنو! اس سے بات شروع کر دیں گے تو کعبہ سے رخ بھی بدل گیا، کعبہ سے سینے بھی بدل گیا، کعبہ کی طرف پیٹھ دے کر کھڑے باتیں کر رہے ہیں اور پھر اس کے بعد طواف میں چل پڑے۔ اس لیے ان کو یہاں آنے کے باوجود بھی سمجھ نہیں آئی، حالانکہ حج میں دو مہینے گزر گئے۔ اور آئے ہوئے کسی کو ڈیڑھ مہینہ گزر گیا، کسی کو مہینہ سے اوپر ہو گئے اور انہوں نے...... ماشاء اللہ!...... کئی طواف کر لیے، عمرہ کا طواف کر لیا، حج کے طواف کر لیے اور پھر کئی نفلی طواف کر لیے، لیکن اس کے باجود بھی وہ بے چارے بات کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ تو اس لیے جو عالم ہم نے دیکھا نہیں ہے تو اس کے بارے میں سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ جو لوگ فوت ہو گئے وہ واپس نہیں آئیں گے کہ ہمیں بتا سکیں اور جو لوگ فوت ہو گئے ہم ان کو جا کر قبروں میں مل نہیں سکتے کہ ان سے کوئی بات پوچھ سکیں کہ ہمیں بتلائیں کہ قبر کیا چیز ہے؟

تو اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ وہ عالمِ برزخ ہے اور عالمِ برزخ کے بعد عالمِ آخرت ہے۔ کوئی آدمی یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ یہ تارے ختم ہو جائیں گے، چاند بے نور ہو جائے گا، سورج بے نور ہو جائے گا، زمین بدل ڈالی جائے گی اور پہاڑ اڑا دیے جائیں گے تو ایک آدمی کی عقل حیران ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک پہاڑ میں اگر حاجیوں

کے لیے راستہ بنانا ہوتو کروڑوں ریال خرچ ہو جاتے ہیں اور اتنے بڑے پہاڑوں کو روئی کی طرح اڑا دیا جائے گا، یہ بالکل ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اڑ جائیں گے، یہ کیسے ہوگا؟ یہ اس لیے سوچ رہا ہے کہ اس کے سامنے وہ عالم نہیں ہے کہ جب اس نے وہ عالم دیکھا نہیں ہے تو اس کے لیے اس کو سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی کا ایمان بالغیب ہو۔ جب آدمی کا ایمان پکا ہو جائے گا جو ہمارے اللہ نے قرآن میں لکھا ہے وہ برحق ہے اور جو ہمارے آقا محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ بالکل حق ہے، ہمارے پاک نبی ﷺ کی زبان مبارک سے غلط بات نکل ہی نہیں سکتی، اللہ کے نبی ﷺ کوئی غلط بار فرما ہی نہیں سکتے، تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمیں مسائل کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ اب ہمارے آقا ﷺ نے فرمادیا کہ قیامت برحق ہے تو ہمارا اس پر ایمان ہے۔ ہمارے آقا ﷺ نے فرمادیا کہ عذابِ قبر برحق ہے تو ہمارا دین ہے، ہمارے آقا ﷺ نے فرمادیا کہ ہم قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو ہمارا ایمان ہے، ہمارے آقا ﷺ نے فرمادیا کہ ہم میدانِ حشر میں اللہ کے ہاں پیش ہوں گے، اعمال تقسیم ہوں گے، سزا اور جزا کے فیصلے ہوں گے اور ہم کو پل صراط سے گزارا جائے گا، جب اللہ کے نبی ﷺ نے فرمادیا تو ہمارا یہ ایمان ہے کہ حضور ﷺ کی زبان پاک ہے، اللہ کا نبی بھی پاک ہے، تو آپ کی زبان مبارک سے کبھی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی۔

مسئلۂ رسالت:

دوسرا اہم مسئلہ رسالت کا ہے۔ ان آیات میں اللہ نے اثبات کا مسئلہ بیان فرمایا۔ اور اثبات نبوت کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے وحی ثابت ہو، جو اللہ نے اتاری، اللہ نے اپنا کلام بھیجا ہے۔ اور حضور ﷺ کی صداقت اور حقانیت کی سب سے بڑی دلیل اللہ کا قرآن ہے کہ اللہ کا قرآن سچا ہے تو حضور ﷺ بھی سچے ہیں۔ جب قرآن کی صداقت اور حقانیت ثابت ہو جائے گی تو خود بخود حضور ﷺ کی نبوت اور رسالت ثابت ہو جائے گی۔ اللہ نے جو قرآن اتارا ہے اس کی سچائی کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ تمام دنیا کے مخالفین، منکرین، معارضین اور یہود ونصاریٰ کو اللہ نے قرآن میں تحدی اور چیلنج کیا کہ اگر تم قرآن کو نہیں مانتے اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ کسی انسان کا کلام ہے تو تم بھی تو عرب ہو، اس کے مقابلہ پر ایک سورت بنا کر لے آؤ۔ اور چودہ سو سال گزر گئے...... الحمد للہ ثم الحمد للہ...... نہ آج تک کوئی دشمن اسلام اللہ کے قرآن کے مقابلہ پر کتاب بنانے کی جرات نہ کر سکا۔

مسئلہ تحریف:

جیسا کہ بعض لوگوں نے اللہ کے قرآن کے اندر اس قسم کا ردّ و بدل کیا ہے، جیسے انہوں نے کہا:

﴿يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ﴾ [المائدة:٦٧]

انہوں نے اس کے اندر ایک جملہ بڑھا دیا:

﴿يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ... أَيْ فِي إِقَامَةِ عَلِيٍّ... وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ﴾

اللہ نے حکم دیا تھا کہ میرے پاک نبی! امامتِ علی کا اعلان کر دو اور ساری دنیا کو سمجھا دو۔ اگر آپ نے یہ بات نہ پہنچائی تو گویا آپ نے رسالت کا فریضہ ہی سرانجام نہیں دیا۔

انہوں نے ایک جملہ بڑھا دیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ ساری دنیا نے کہا کہ تم غلط کہہ رہے ہو، کیونکہ قرآن پاک تو نبی ﷺ کی زبان مبارک سے لے کر آج تک محفوظ ہے اور اتنا بڑا حکم کہ جس کو ادا نہ کرنے پر حضور ﷺ کی رسالت بھی خطرہ میں پڑ جائے حضور ﷺ نے وہ مسئلہ امت کو کیوں نہ سمجھایا؟ حضور ﷺ نے پوری قوم کے سامنے وہ مسئلہ کیوں نہ رکھا؟ جس پاک نبی ﷺ نے ہمیں وضو کرنا سکھلا دیا، جس نے ہمیں سر پر مسح کرنا سکھلا دیا، جس پاک نبی نے ہمیں غسل کرنا سکھلا دیا، جس پاک نبی نے ہمیں انگلیوں کے اندر خلال کرنا سکھلا دیا اور جس پاک نبی نے ہمیں اتنا مسئلہ بھی بتا دیا کہ اگر عورت کے ہاتھ پر آٹا لگ جائے اور وہ سوکھ جائے اور وہ وضو کرے تو اگر اس کے اندر پانی داخل نہ ہو تو وضو نہیں ہوگا، اتنے مسائل بھی حضور ﷺ نے سمجھا دیے کہ اگر بال گندھے ہوئے ہیں اور عورت نے غسل کرنا ہے تو اگر بالوں کی جڑوں تک پانی نہیں پہنچے گا تو غسل نہیں ہوگا۔ حضور ﷺ نے جب ہمیں اتنے چھوٹے سے چھوٹے اور اتنے باریک مسئلے بھی سکھلا دیے تو اتنا بڑا مسئلہ کہ جس کا معاملہ اللہ کے نبی کی رسالت کے متعلق تھا وہ اللہ کے نبی ﷺ کیسے چھپا سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے۔

اور پھر ان کو جھٹلانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خود اپنی زندگی بھی تو موجود ہے۔ حضور ﷺ کے بارے میں اعلان فرما دیتے کہ...... نعوذ باللہ...... نبی نے یہ مسئلہ چھپایا تھا اور یہ مسئلہ قرآن میں موجود ہے۔ انہوں نے بھی کوئی ایسی بات نہ فرمائی۔ اگر کوئی کہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ڈر گئے تھے، اس لیے انہوں نے یہ مسئلہ بیان نہیں کیا۔ تو جو آدمی خود ڈرنے والا ہو وہ مشکل کشا کیسے بن سکتا

ہے؟ پھر اس کے نعرے کیسے لگائے جا سکتے ہیں؟ اور پھر اگر وہ ڈرتے رہے تو اس دور تک جب تک حضرت عثمان زندہ تھے، پھر جب خود بادشاہ بن گئے، خلافت کے تخت پر متمکن ہو گئے اور پھر خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے ساتھ جنگیں لڑیں تو اس زمانے میں تو اعلان فرما دیتے کہ قرآن میں میری امامت کا مسئلہ تو کھلا ہوا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کو جھٹلا دیا۔

اور خدا کی شان! قرآن کا معجزہ ہے کہ چودہ سو سال گزر گئے ہیں اور صنعاء کے علاقے میں قرآن پاک کا ایک بہت پرانا نسخہ ملا ہے، انہوں نے اس کو ٹھیک کر کے اپنے عجائب گھر میں رکھ دیا ہے اور وہ قرآن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ یعنی وہ مصحف جس کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خود لکھا تھا۔ آپ اندازہ فرمائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتابت کرنے والے لوگ بہت کم تھے، ان میں ایک کاتب سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کاتب وحی تھے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی کاتب وحی تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی کاتب وحی تھے اور اسی طرح زید بن ثابت بھی کاتب وحی تھے۔ تو اب وہ نسخہ...... الحمد للہ...... ملا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے قلم مبارک سے لکھا ہوا ہے۔ اور اللہ تبارک تعالیٰ کی رحمت ہے کہ جب اس نسخے کو قرآن پاک سے ملایا گیا تو ایک زبر زیر میں بھی فرق نہیں ہے، یعنی ایک حرف میں بھی فرق نہیں ہے۔ تو اب تو خود یہ بات ثابت ہو گئی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی یہی قرآن تھا جو...... الحمد للہ...... ہم پڑھ رہے ہیں، ان کے پاس بھی یہی مصحف تھا جو ہمارے مطالعہ میں ہے۔ اگر وہاں کوئی لفظ ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کم از کم اپنے قران میں تو لکھ دیتے۔

بہر حال ایسی چیزیں دشمنانِ اسلام نے کی ہیں جو دراصل یہودیوں کی سازش ہیں، دراصل یہ یہودیت کا ایک فتنہ تھا۔ اور یہودیت کا ایک پروگرام تھا کہ اللہ کے قرآن میں شکوک وشبہات ڈالنے کے لیے کہ بعض حروف کو آگے کر دیا جائے اور بعض حروف کو پیچھے کر دیا جائے، کسی جگہ ''فِیْ'' بڑھا دیا جائے اور کسی جگہ ''عَلٰی'' بڑھا دیا جائے اور کسی ''إِلٰی'' بڑھا دیا جائے، تا کہ قرآن میں شک ڈالنے کے لیے ہم یہ حربے استعمال کر سکیں۔ یہ ان کے سب سے بڑے رہبر ہیں، ان کو انہوں نے استعمال کیا۔ اور اسی طرح انہوں نے احادیث رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر بھی ایسے جملے ڈالے، اسی طرح انہوں نے تفسیروں کے اندر بھی ایسی تحریف کی ہے، کلام اللہ کو معنوی طور پر بھی بدلنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق واقعہ:

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب ملکہ بلقیس کا تخت منگوایا تھا سبا کے ملک سے...... یہ بڑا لمبا واقعہ ہے...... اور جب بلقیس آ گئی تو لکھا ہے کہ انہوں نے چاہا کہ ہم بلقیس کا امتحان کریں، کیونکہ بعض لوگوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ بتلایا تھا کہ ملکہ بلقیس کی ماں جنی عورت تھی، یعنی وہ انسانوں میں سے نہیں تھی۔ اس کا باپ تو انسان تھا، لیکن اس کی ماں ایک جن عورت تھی، اس سے یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ تو اس کے اندر بھی وہ جنوں والی خصوصیات ہیں اور اس کے بدن پر بڑے بڑے بال ہیں جیسے جنوں پر ہوتے ہیں۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام چونکہ یہ ارادہ فرما چکے تھے کہ میں شادی کروں گا۔ انہوں نے لکھا کہ جیسے قرآن پاک میں آیا ہے کہ محل کے سامنے ایک بہت بڑا حوض تیار کیا گیا اور حوض کے اندر جو رنگ کیا گیا وہ پانی کے ساتھ ملتا ہوا تھا اور اس حوض کے اوپر جو شیشہ بچھایا گیا تو اس کا انداز بھی ایسا تھا کہ وہ پانی کے ساتھ مل جائے اور اوپر سے یہ معلوم ہو کہ کوئی چھت نہیں ہے، بلکہ پانی ہے۔ تو اتنا بڑا اہتمام کیا گیا اور اس کے بعد یہ بھی انہوں نے لکھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے محل کے سامنے ایک کرسی پر متمکن ہو گئے کہ چاہے مرد ہو یا عورت اگر پانی سامنے آئے تو فوراً اپنے کپڑے کو اونچا کرتا ہے کہ مجھے پانی نہ لگ جائے۔ حضرت سلیمان نے یہ سارا اس لیے کیا کہ اس سے ہمیں پتہ لگ جائے کہ وہ جنی ہے یا اس کا بدن صاف ہے؟ تو یہ ساری باتیں روایت کے اندر لکھی گئیں جو کہ سب یہودیوں کا ایک فتنہ ہے۔ اللہ کے قرآن کے اندر تحریف کرنے اور انبیاء علیہم السلام کی شان میں ایسے ایسے رکیک حملے کرنے کا منصوبہ ہے کہ اللہ کے پیغمبروں کی شان کے اندر کمی آ جائے کہ اللہ کا نبی ایک عورت کی پنڈلیاں دیکھنے کے لیے اتنا خرچ کر سکتا ہے۔ تو پھر آج کل کے خاکوں پر کیوں اعتراض کیا جائے؟ اللہ کے نبی پاک ہونے کے باوجود اور پھر وہ نبی جس کے جن تابع ہوں، وہ کسی جن سے کہہ کر پتہ نہیں کرا سکتے تھے کہ پتہ کراؤ کہ یہ عورت جنی ہے یا انسان ہے؟ ان کو کیا ضرورت ہو گئی کہ وہ اتنا بڑا حوض بنواتے اور حوض کے اوپر شیشہ بچھواتے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ بچھوایا گیا، قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس پیغمبر نے یہ انتظام فرما دیا کہ جب وہ آئے گی:

﴿قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۖ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَن سَاقَيْهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّن قَوَارِيرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ [النمل: ۴۴]

جب اس کو کہا گیا کہ چلو آگے داخل ہو جاؤ۔ اس نے سمجھا کہ یہ پانی ہے، کہیں میں پانی میں گر نہ جاؤں تو اس نے

اپنی پنڈلیوں کو کھولا۔ اس کو خبردار کیا گیا کہ اے ملکہ! یہ تو شیشہ ہے، پانی نہیں ہے کہ آپ ڈوب جائیں گی، آپ اس کے اوپر چل سکتی ہیں۔

یہ سارا قصہ قرآن میں موجود ہے، لیکن اس کو یہ رنگ دینا کہ یہ اللہ کے نبی نے اس لیے کیا تھا کہ بلقیس کی صرف پنڈلیاں دیکھ لے۔ یہ جو آگے جوڑ لگایا گیا یہ یہودی ذہن تھا کہ جنہوں نے اللہ کے پیغمبر کی شان کو گھٹانے کے لیے اور اللہ کے نبیوں پر بہتان باندھنے کے لیے ایسے ایسے واقعات کو ملا دیا۔ اس کو تحریفِ معنوی کہتے ہیں۔ ورنہ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا پیغمبر، جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [النمل:۱۵]

جن کو ہم نے خاص علم عطا فرمائے تھے، جن کو ایک پرندہ ہدہد رپورٹ لے کر دیتا تھا، اس پیغمبر کے لیے یہ مشکل تھا کہ اس ملکہ بلقیس کے بارے میں یہ تحقیق کر لیتے کہ یہ انسان کی بیٹی ہے یا جن کی بیٹی ہے؟ یا اس کے بدن پر بال ہیں یا اس کے بدن پر بال نہیں ہیں؟ اور پھر یہ قرآن پاک میں یا کسی صحیح روایت میں ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے شادی بھی کی ہو۔ تو یہ سارا قصہ دراصل کیوں بنایا گیا؟

اور اب سمجھیں کہ قرآن میں یہ واقعہ موجود کیوں ہے؟ قرآن تو کہتا ہے کہ ایسا بنایا گیا، شیشے کی چھت بھی ڈالی گئی اور یہ بھی قرآن کہتا ہے کہ اس نے پنڈلیوں سے کپڑے کو ہٹایا۔ تو یاد رکھیں! اس کی وجہ یہ تھی کہ ملکہ بلقیس سورج کی پوجاری تھی، یعنی وہ سورج کو خدا سمجھتی تھی، جیسا کہ قرآن میں موجود ہے۔ جب ہدہد نے رپورٹ کی تھی تو بتلایا:

﴿وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝﴾ [النمل:۲۴]

ہم نے دیکھا ہے اس کی ملکہ کو بھی اور اس کی قوم کو بھی کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر سورج کی پوجا کرتے ہیں۔

دراصل اللہ کے نبی نے ملکہ کو توحید کا سبق سکھانا تھا۔ اللہ کے پیغمبر نے ایسا انتظام کر دیا۔ اللہ کے نبی نے نیچے ایک بہت بڑا خوبصورت حوض بنوایا...... اور ایسے حوض بھی آج کل دنیا میں موجود ہوتے ہیں...... اور اس کے اوپر بڑا شیشہ بچھا دیا گیا۔ وجہ کیا تھی کہ اللہ کے پیغمبر ان کو توحید کا سبق دینا چاہتے تھے۔ یہ نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سامنے بیٹھے تھے اور وہ پنڈلیاں دیکھ رہے تھے۔ یہ بالکل جھوٹی بات ہے۔ اس کے ساتھ تو اس کو لے آنے والے

آپ کے وزراء اور جو تابع لوگ تھے وہ لا رہے تھے اور جب وہ وہاں آئی تو اس نے وہاں اس شیشہ کو نہ دیکھا اور اس کو پانی سمجھا تو اللہ کے نبی نے تنبیہ کی کہ تم نے جیسے سورج کو دیکھ کر اس کو خدا سمجھ لیا ہے، سورج خدا نہیں ہے، مظہرِ نورِ خدا تو ہے، یہ سورج دیکھ کر تم اس کے خالق کو پہچانو، یہ نہیں کہ سورج کی چمک میں دھوکہ کھا جاؤ۔ دیکھو! جیسے تم نے یہاں پانی کا دھوکہ کھالیا، حالانکہ شیشہ مظہر تو تھا کہ پانی کو دکھانے والا تو تھا، لیکن خود پانی نہیں تھا، تو جیسے تم نے یہاں دھوکہ کھایا ہے ویسے تم نے سورج کو خدا سمجھ کر دھوکہ کھایا ہے۔ سورج خدا نہیں ہے، بلکہ سورج کا خالق خدا ہے، خدا تو اس کو بنانے والا ہے۔ اب وہ بادشاہ تھی، ملکہ تھی، اس کو بھی چوٹ لگی تو اس کو مسئلہ سمجھ آیا تو اس نے فوراً کہا:

﴿قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَٰنَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَٰلَمِينَ﴾ [النمل:۴۴]

یا رب! میں اقرار کرتی ہوں کہ میں نے سورج کو خدا بنا کر اپنے اوپر ظلم کیا، واقعی میں بھٹک گئی تھی، واقعی میں تجھے نہ پہچان سکی کہ میں تیری صنعتوں میں الجھنے کے بعد اسی کو خدا بنا بیٹھی۔ اب میں اسلام قبول کرتی ہوں اور میں تیری توحید کا اقرار کرتی ہوں اور سلیمان علیہ السلام کی نبوت کا اقرار کرتی ہوں۔

وہ فوراً اسلام لے آئی، ورنہ اگر اس کی پنڈلیاں دیکھنے کے لیے انتظام کیا جاتا تو وہ متنفر ہو جاتی، چہ جائیکہ وہ اسلام لے آتی۔ وہ کہتی کہ اچھے پیغمبر ہیں، اچھے بادشاہ ہیں، جس نے میری پنڈلیاں کھلوانے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچوایا ہے...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... تو وہ فوراً اسلام کیوں لے آئی؟ اس کو سمجھ آگئی، کیونکہ بادشاہ تو اشاروں کی بات کو سمجھ جاتے ہیں، ان کے لیے اشارات کافی ہوتے ہیں۔ تو اس کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک ایسا انتظام فرما دیا کہ اس کا دماغ ہل گیا کہ جیسے میں نے یہاں ٹھوکر کھائی ہے، میں نے عقیدے میں بھی ٹھوکر کھائی ہے۔

بعض یہودیوں نے اللہ کے قرآن کی تفاسیر میں بھی اسی طرح کی تحریف کی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ:

اب دیکھیں! جیسا کہ مشہور قصہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے بدن میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ آپ نے بھی سنا ہوگا اور کیڑے جب گرتے تو آپ چن چن کر بدن پر رکھتے تھے اور اس کے بعد وہ کیڑے زبان تک پہنچ گئے، حالانکہ یہ ساری چیزیں اللہ کے قرآن میں تحریف کے برابر ہیں۔ قرآن مقدس نے تو صرف اتنا کہا ہے:

﴿وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾ [الانبیاء: ۸۳]

میرے اللہ! مجھے تکلیف ہے۔

اب وہ تکلیف کیا ہے؟ وہ میرے اللہ نے بتلائی ہی نہیں۔ اس کا معنی خود کیڑے بنالینا تو اس کی وجہ کیا تھی کہ پیغمبر کی شان میں اتنی کمی کردی جائے کہ اللہ کے نبیوں کو بھی..... نعوذ باللہ...... دنیا میں کیڑے پڑ جائیں تو بات کیا رہ گئی؟ اللہ اپنے انبیاء علیہم السلام کو ایسی کوئی تکلیف نہیں دیتے جس سے ان کی شان اور عظمت کے اندر فرق آجائے، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کے بدن کو بھی محفوظ رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کی شان کو بھی محفوظ رکھتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کے مقام کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔

مسیلمہ کذاب کا دعوائے نبوت:

اسی طرح عرب کے اندر ایک آدمی مسیلمہ کذاب گزرا ہے، اسی طرح ایک اسود عنسی گزرا ہے، یمن کے علاقہ میں رہنے والا تھا۔ اس نے میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ شان پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نصیب فرمائی کہ انہوں نے اپنی خلافت کے زمانے میں اس جھوٹے نبی کو قتل کردیا، اس سے جنگ لڑی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو فتح نصیب فرمائی۔ تو وہ مسیلمہ کذاب اس کو بھی خیال آیا کہ میں بھی تو کوئی کام کروں تو اس نے ایک دن اپنے سارے ساتھیوں کو بلوایا اور کہا کہ کیا بات ہے کہ اگر اللہ کے نبی حضرت محمد رسول اللہ پر جبرئیل علیہ السلام اترتا ہے تو میرے اوپر بھی فرشتہ اترتا ہے، میرے اوپر بھی وحی آتی ہے اور میرے اوپر بھی قرآن نازل ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، تم ہمیں اپنا قرآن سناؤ۔ تو اس زمانہ میں یہ آیت مبارک اتر چکی تھی

﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ① أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ② وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ③ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ④ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ⑤﴾ [سورۃ الفیل]

اب اس نے تحریف کی اور ایک نیا قرآن بنایا کہ:

"اَلْفِيْلُ وَمَا الْفِيْلُ؟ وَمَا اَدْرَاكَ مَالْفِيْلُ؟ ذَنَبُهُ قَصِيْرٌ، وَخُرْطُوْمُهُ طَوِيْلٌ"

انہوں نے جب یہ سنا تو اس کو کہا کہ بات سنو! ہم تو تجھے مانتے ہیں، لیکن اگر تو نے باہر یہ سنایا تو لوگ تجھے جوتے

ماریں گے۔ یہ اللہ کا قرآن ہے؟ یہ اگر کوئی سنے گا تو کہے گا کہ پاگل ہو گیا ہے؟ وہ تو تمہیں پاگل قرار دے دیں گے۔ بس تم اپنی اس وحی کو اپنی حد تک رکھو، آگے نہ بتانا۔

[اشارات الاعجاز فی مظان الایجاز:۱/۱۹۷]

واقعہ مرزا قادیانی:

اسی طرح جیسے تمہارے ہاں مرزا غلام احمد قادیانی علیہ اللعنۃ پیدا ہوا تو اس نے بھی بتایا کہ میرے اوپر بھی ایک فرشتہ اترتا ہے، اس کا نام ہے ''ٹیچی'' کیونکہ نبی انگریزی تو فرشتہ بھی انگریز اترے گا، فرشتہ ہندوستانی تو اتر نہیں سکتا، کیونکہ نبی بھی اس کو انگریزوں نے بنایا تھا اور فرشتہ بھی انہوں نے ہی بھیجا ہوگا کہ اس کا نام بھی ٹیچی ٹیچی ہے۔ اور یہ بات ہم اعتراض میں نہیں کہتے، بلکہ اس نے خود اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ میں نے انگریز سرکار کی حفاظت کے لیے اور انگریز سرکار کی اعانت کے لیے اتنی کتابیں لکھی ہیں کہ جس سے سینکڑوں الماریاں بھر سکتی ہیں۔

تو اس نے بھی ایک دفعہ اعلان کیا کہ میں ایک کتاب لکھوں گا جس کی پچاس جلدیں ہوں گی۔ میرے پاس وحی آئی ہے اور میرے پاس فرشتہ خبر لے کر آیا ہے کہ میں ایک کتاب لکھوں گا جس کی پچاس جلدیں ہوں گی اور وہ کتاب میری نبوت کی سچائی اور صداقت کی بڑی دلیل ہوگی۔ اب ایسا ہوا کہ اس بدبخت کو لکھنے کا موقع نہ ملا تو اس نے بڑی مشکل سے اور ادھر ادھر محنت کر کے اور لوگوں کو بٹھا کر پانچ جلدیں لکھ دیں۔ اور اب لوگوں نے ہر طرف سے مطالبہ شروع کیا کہ نبی تو جھوٹا ہوتا نہیں، یہ بدبخت جب کہتا ہے کہ وحی اتری ہے، میں پچاس جلدیں لکھوں گا اور اس نے ابھی تک پانچ جلدیں لکھی ہیں، اور بھی جلدیں لکھے۔ اب اس نے پانچ بڑی مشکل سے پوری کی تھیں تو اس نے کہا: ہاں! آج فرشتہ پھر اترا ہے اور اس نے کہا کہ تم اپنی امت کو بتلا دو کہ ظاہر میں تو یہ پانچ ہیں، لیکن ان کو پچاس سمجھیں۔ جیسے اللہ نے نبی کو پچاس نمازیں دی تھیں اور امت پانچ پڑھتی ہے، لیکن لکھی پچاس جاتی ہیں۔ تو گویا میں نے لکھی یہ پانچ جلدیں ہیں، لیکن اس کو پچاس سمجھ کر ایک صفر خود لگا دیا۔ جیسا کہ:

﴿مَن جَآءَ بِٱلۡحَسَنَةِ فَلَهُۥ عَشۡرُ أَمۡثَالِهَا﴾ [الانعام:۱۶۰]

تو اس طرح اس نے بھی اللہ کے قرآن میں تحریف کی۔

اور جیسے اعلیٰ حضرت نے بھی ترجمہ قرآن لکھا تو جہاں جہاں لفظ ''نبی'' آتا تو وہاں لکھ دیا: ''اے غیب کی خبر دینے والے!''۔ حالانکہ نبی کا معنی ہوتا ہے ''خبر دینے والا'' نبا خبر کو کہتے ہیں:

﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُونَ ۝١ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيمِ ۝٢﴾ [النبا:۲،۱]

اسی طرح:

﴿قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيمٌ ۝٦٧﴾ [ص:۶۷]

اسی طرح:

﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ﴾ [آل عمران:۴۴]

یہ انبا غیب ہیں۔ تو نبا کا معنی ہوتا ہے خبر دینے والا، لیکن وہ لکھتا کہ ”اے غیب کی خبر دینے والے“۔ تو غیب کا لفظ بڑھا کر معنوی تحریف کی، کیونکہ ہر آدمی پڑھنے والا وہ اس کو یہ سمجھے گا کہ ہر نبی عالم الغیب ہوتا ہے، لہٰذا قیامت تک ان کے عقیدے میں یہ بات بیٹھتی چلی جائے گی۔ یہ ایک تحریف ہوتی ہے۔ اسی طرح کعبۃ اللہ کے بارے میں فرمایا:

﴿رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ﴾ [ابراہیم:۳۷]

اللہ کے نبی حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام نے کہا کہ اے پروردگارِ عالم! میں نے اپنے بچوں کو ایک وادی میں جہاں زراعت نہیں ہوتی، جہاں آبادی نہیں اور جہاں باغات نہیں ہوتے وہاں تیرے حکم سے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

تو اس نے ترجمہ کیا کہ یا اللہ! میں اپنے بچوں کو ایک نالہ میں بٹھا کر جا رہا ہوں۔ وادی کا معنی نالہ بنا دیا، حالانکہ وادی کو آپ پہاڑوں کا دامن کہہ سکتے ہیں۔ جب قرآن میں کسی جگہ اللہ نے وادی کا ترجمہ نالا کے ساتھ نہیں کیا ہے تو ایسے تراجم کرنے سے مقصد کیا ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ دماغوں کے اندر غلط باتیں بیٹھ جائیں، لیکن بہر حال میرے ان سب مثالوں کے دینے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ ان تمام دشمنیوں کے باوجود آج بھی چودہ سو سال کے بعد اللہ کا قرآن اسی طرح تر و تازہ ہے، اسی طرح سرسبز ہے، اسی طرح شاداب ہے اور اسی طرح کامل و مکمل ہے جیسے میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا۔ اللہ کے کروڑوں صلوۃ و سلام ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت وعبدیت:

نبی کی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے اللہ نے یہاں کافروں کو خطاب کیا ہے کہ اے کافرینِ مکہ! اے کفارِ عالم! اگر تم لوگوں کو شبہ ہے اس کتاب میں جو ہم نے اپنے عبد پر اتاری ہے۔ جیسے اللہ کی صفت عبودیت ہے تو سب سے

بڑی صفت عبد ہوتا ہے۔ یہاں تمام کفار کو چیلنج کیا جا رہا تھا، لیکن اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے جو اتارا اپنے نور پر "مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی حَبِیْبِنَا...... یا...... مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی نُوْرِنَا، مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی نَبِیِّنَا" حالانکہ یہ ساری بات ٹھیک تھی، لیکن فرمایا ﴿مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا﴾ تاکہ لوگوں پر بھی یہ واضح ہو جائے کہ میرے نبی ﷺ میرے عبد (بندے) ہیں۔

اس لیے اللہ نے ہمیں ہر نماز میں یہ سبق پڑھایا کہ جب ہم فرض پڑھیں گے، سنتیں پڑھیں گے، وتر پڑھیں گے، تہجد پڑھیں گے اور نفل پڑھیں گے تو ہر نماز میں ہم اقرار کریں گے "أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" اس میں بھی عبد کو مقدم کیا اور رسول کو موخر کیا، حالانکہ اللہ یوں بھی فرما سکتے تھے کہ نماز میں یوں پڑھا کرو "وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُهٗ وَ عَبْدُهٗ" فرمایا کہ جو میرے مدنی کو عبد نہیں مانتا تو وہ ان کو رسول بھی نہیں مانتا۔ اس کو پہلے عبدیت کا اقرار کرنا پڑے گا کہ اللہ کا نبی عبد ہے۔ عبد بنے گا تو رسالت ملے گی، عبد بنے گا تو نبوت ملے گی، عبد بنے گا تو معراج ہوگا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①﴾ [الاسراء: ۱]

تو جب اللہ کا نبی عبد ہے تو ساری کائنات اللہ کے آگے عبد ہے۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ [الفرقان: ۶۳]

تو یہ عبد ہے اور وہ معبود ہے۔ عبد اور معبود میں اگر کوئی فرق نہ کر سکے تو اس سے بڑا جاہل دنیا میں کون ہو سکتا ہے؟ عبد عبد ہوتا ہے اور معبود معبود ہوتا ہے، مخلوق مخلوق ہوتی ہے اور خالق خالق ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ نے یہاں بھی ایک لفظ ذکر فرما کر واضح کر دیا کہ میرے نبی کی نبوت کو ماننا، لیکن خبردار! کہیں یہ نہ ہو کہ انہیں خدا بنا بیٹھو اور مقامِ بشریت و عبودیت سے باہر نکال بیٹھو۔

مخاطب اوّل اس کے کفار مکہ ہیں، کیونکہ قرآن جب نازل ہوا تو سامنے کفار مکہ تھے، اس لیے ان کو خطاب کیا جاتا تھا، ورنہ یہ خطاب قیامت تک عام ہے، لیکن...... الحمد للہ...... نہ حضور ﷺ کے زمانہ میں کوئی قرآن بنا سکا، نہ حضور ﷺ کے بعد کوئی بنا سکا، نہ آج تک کوئی قرآن کا مقابلہ کر سکا اور نہ قیامت تک کوئی قرآن کا مقابلہ کر سکے گا۔ تو جب قرآن کی صداقت واضح ہو گئی تو حضور ﷺ کی نبوت و رسالت واضح ہو گئی۔ تو اس آیت میں اللہ تبارک

و تعالیٰ اصل میں اثباتِ وحی فرما رہے ہیں، لیکن اس کے ضمن میں اثباتِ نبوت خود بخود ہو رہا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی فضیلت:

صحابہ کی مجلس قائم تھی، حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱﴾ [النصر:۱] کی تفسیر بیان کریں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تفسیر بیان کی کہ اللہ کی مدد آگئی اور اللہ نے اسلام کو فتوحاتِ عظیم سے سرشار فرمایا، حتیٰ کہ مکہ بھی فتح ہو گیا تو اللہ نے اسلام کو اتنی قوت اور طاقت دے دی ﴿وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲﴾ [النصر:۲] کہ اب تو فوجوں کی فوجیں اور جماعتوں کی جماعتیں اسلام میں داخل ہونے لگیں۔ پہلے تو ڈر ڈر کر کوئی ایک مسلمان ہوتا تھا، دو مسلمان ہوتے تھے یا چار آدمی مسلمان ہوتے تھے، لیکن جب اللہ نے اسلام کو غلبہ عطا فرما دیا اسلام کو، اللہ نے قوت عطا فرما دی تو فوجوں کی فوجیں اور جماعتوں کی جماعتیں اسلام میں داخل ہو رہی ہیں۔

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا:...... آپ ان کو فرمایا کرتے تھے ''یا غَوَّاصَ الْقُرْآنِ'' (اللہ کے قرآن میں غوطہ لگا کر ڈوب جانے والا اور موتیوں کو نکالنے والا) ''غَوَّاص'' عربی میں ان کو کہتے ہیں جو سمندر میں غوطہ خور ہوتے ہیں، یا بڑے بڑے کنوؤں کے اندر غوطہ خوری کرتے ہیں اور نیچے سے قیمتی چیزیں نکال کر لے آتے ہیں...... تو انہوں نے پوچھا کہ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: امیر المؤمنین! ایک اس کی ظاہری تفسیر ہے، جو صحابہ رضی اللہ عنہم نے بیان فرما دی ہے، لیکن اس کے اندر اشارہ ہے قریبِ وفاتِ رسول اللہ ﷺ کا۔ اس سورت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ محمد عربی ﷺ کی وفات کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا تھا اپنے دین اسلام کے لیے اور یہ بھی وعدہ فرمایا تھا کہ آپ کے دین کو باقی ادیان پر غالب کر دیں گے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۳۳﴾

[التوبۃ:۳۳]

اور اب اللہ کے نبی کا دین غالب آگیا اور عرب کے اہم مراکز مکہ اور مدینہ اسلام کے آگے سرنگوں ہو چکے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جب دین کا کام پورا ہو گیا تو اللہ کے نبی ﷺ کے جانے کے دن قریب آگئے۔ اس وجہ سے اس سورت مبارک میں یہ اشارہ ملا ہے۔ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: دیکھو! جس بات پر حضرت

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا دماغ پہنچا ہے اور کسی کا نہیں پہنچا۔ ان کے علم کی وجہ سے میں ان کی تکریم کرتا ہوں۔
[صحيح البخاري، حديث: ۴۲۹۴]

اسی لیے محدثین نے فرمایا ہے:

"رِوَايَةُ الْأَكَابِرِ مِنَ الْأَصَاغِرِ"

محدثین نے باقاعدہ اس پر بحث فرمائی ہے کہ ایسا بھی کبھی ہوتا ہے کہ ایک بڑی عمر والا آدمی ایک چھوٹی عمر والے سے علم حاصل کرتا ہے۔ یعنی کبھی بڑوں کو چھوٹوں کی شاگردی کرنی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں علم کے ساتھ عزت عطا فرما دیتے ہیں۔ تو یہ بہت بڑے مرتبہ والے صحابی ہیں۔

اور خصوصی طور پر قرآن پاک میں جہاں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول مل جائے طالب العلم یہ یاد رکھا کریں کہ بہت ساری تفسیروں میں کہہ دیا جاتا ہے "قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ" کہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے، حالانکہ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نہیں ہوتا۔ اصل بات یہ ہوتی ہے کہ اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور سند کے ساتھ یہ بات ثابت ہوجائے کہ یہ قول واقعی ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے، ان کے قول کی بہت بڑی عظمت ہے اور ان کا بہت بڑا مقام ہے۔ ایک تو انہوں نے علم تفسیر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا اور دوسرا انہوں نے وہ علم بچپن سے ہی حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور بچپن کی عمر میں بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کو آقا نامدار سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ملی ہے۔ تو جن کے لیے میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرما دیں تو ان کے علم کا پھر کون مقابلہ کر سکتا ہے......!؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی کثرتِ روایتِ حدیث:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رات دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتا تھا اور آپ کی حدیثوں کو یاد کرتا تھا، کیونکہ اور تو میرا کام نہیں تھا، نہ میرے پاس تجارت تھی، نہ دکان تھی اور نہ کاروبار تھا۔ میں نے اپنے پورے اوقات حفظِ حدیث کے لیے لگا دیے...... لیکن جب اتنی بڑی حدیثوں کا ذخیرہ آجائے تو ان کو یاد رکھنا بھی تو مشکل ہے...... اس لیے فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میری چادر پڑی ہوئی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے دعا فرمائی اور فرمایا: اس چادر کو لپیٹ کر اپنے ساتھ لگا لو۔ میں نے لپیٹ کر اپنے ساتھ لگائی تو اس دعا کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر جو بھی حدیث میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی وہ کبھی نہیں بھولی، پھر زندگی میں مجھے

حضور ﷺ کی حدیث فراموش نہیں ہوئی، ہمیشہ مجھے حدیث یاد رہی اور حضور ﷺ کی دعا لگ گئی۔

[صحیح البخاری، حدیث ۱۱۹، باب: حِفظِ العِلمِ]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حافظہ:

اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا بھی واقعہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ نے علم تو عطا فرمایا تھا، لیکن میں یاد نہیں رکھ سکتا تھا، میرا حافظہ نہیں تھا اور میں اس کو جلدی بھول جاتا تھا۔ حضور ﷺ سے میں نے عرض کیا تو آپ ﷺ نے مجھے ایک دعا سکھلائی۔ اور وہ دعا ترمذی اور مشکوۃ شریف کے اندر حدیث شریف میں موجود ہے۔ اور بعض لوگوں نے فضائلِ قرآن پر جو کتابیں لکھی ہیں اس کے اندر بھی اس دعا کا ذکر کر دیا ہے۔ اگر کوئی طالب علم یا کوئی آدمی اس دعا سے فائدہ حاصل کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ اس سے ضرور فائدہ حاصل کرے۔ فرماتے ہیں کہ مجھے حضور ﷺ نے ایک دعا سکھلا دی کہ جمعرات کو اس طریقے سے پڑھنا ہے۔ اس میں نماز پڑھنی ہوتی ہے، اس کے اندر قرآن پاک کی کچھ سورتیں ہیں، اس کے بعد بڑی لمبی دعا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دو جمعراتیں پڑھی تھیں، اس کے بعد مجھے اللہ نے ایسا حافظہ عطا فرما دیا کہ پھر میں کوئی بات زندگی میں بھولا ہی نہیں۔ یعنی جو بات بھی میں نے ایک دفعہ پڑھ لی یا ایک دفعہ میں نے دیکھ لیا اور سن لیا تو وہ مجھے ہمیشہ زندگی میں یاد رہی۔ (یہ دعا احقر امداد اللہ انور نے اپنی کتاب فضائل حفظ القرآن میں تفصیل سے درج کر دی ہے۔)

[سنن الترمذی، حدیث: ۳۵۷۰، باب: فِي دُعَاءِ الحِفظِ]

تدوین حدیث کی تاخیر پر اعتراض وجواب:

یہی وہ وجوہات ہیں جو آج مستشرقین اور اعدائے اسلام کو سمجھ نہیں آتیں۔ آج کل لوگ اپنے دماغ پر غور کرتے ہیں کہ جیسے ہمیں ایک بات دو مہینے، چار مہینے، دس دن، دو دن یا سال کے بعد بھول جاتی ہے۔ اس وجہ سے بعض دشمنانِ اسلام نے لوگوں کے دماغوں میں یہ بات اٹھانی شروع کر دی کہ بھائی! حضور ﷺ نے حدیث مبارک میں جو فرمایا تھا، وہ اڑھائی سو سال کے بعد تدوین حدیث کا کام شروع ہوا ہے، یعنی اڑھائی سو سال گزرنے کے بعد کتابوں میں احادیث جمع کی گئیں۔ تو یہ کہتے ہیں کہ دیکھو! اڑھائی سو سال تک ایک بات کیسے یاد رہے گی؟ ایک بات کیسے محفوظ رہے گی؟ لہٰذا...... نعوذ باللہ...... احادیث کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی عقل پر اس بات کو پرکھتے ہیں، کیونکہ ان کی زندگی شرابوں میں گزری ہے، معاصی اور گناہوں میں گزرتی ہے، ان کی زندگی

نافرمانیوں میں گزرتی ہے اور ان کی زندگی لہو و لعب میں گزرتی ہے، اس لیے وہ ان پاک نفوس کی باتوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ جنہوں نے زندگی میں کبھی گناہ نہ کیا ہو، کبھی نافرمانی کا کوئی عمل نہ کیا ہو اور کبھی حرام کا لقمہ اپنے جسم میں داخل ہی نہ کیا ہو تو ان کا مقابلہ کون کرسکتا ہے؟

اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ چار رکعت نفل پڑھنا یا تہجد کی آٹھ رکعت نفل پڑھنا مشکل نظر آتا ہے، لیکن کتنے لوگ ہیں جن کے بارے میں کتابوں میں یہ بات موجود ہے کہ ساری ساری رات ان کی مصلے پر گزر گئی، چالیس چالیس سال تک ان کو رات کا سونا نصیب نہیں ہوا۔ ایسے کتنے لوگ ہیں!! امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۶ سال کی عمر میں لاکھوں احادیث حفظ تھیں، یہ تو بہت بعد کے آدمی ہیں۔ اور اسی طرح سے اور بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں۔ اصل وجہ یہ تھی کہ اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو صحابہ تیار فرمائے تھے انہوں نے دین کو پورے عالم میں پہنچانا تھا، اس لیے اللہ نے ان کو میرے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چن لیا تھا۔ کسی کو اللہ نے حدیث کے علم کے لیے چن لیا، کسی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے علم کے لیے چن لیا، کسی کو فقہ اور قضا کے مسئلوں کے لیے چن لیا اور کسی کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کے معاملات کے لیے چن لیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے لوگ تھے، اللہ تعالیٰ کی ان پر رضا تھی۔

اور آج بھی یہ بات مشاہدے میں ہے، میں مثال کے طور پر ایک بات عرض کروں، تا کہ بات سمجھ آسکے، مثلاً: ایک آدمی نے پیدا ہونے کے بعد ساری زندگی زنا بھی نہیں کیا، ...... نعوذ باللہ ...... لواطت بھی نہیں کی، اور گناہ بھی نہیں کیا، اپنی جوانی کو غلط استعمال بھی نہیں کیا اور کسی قسم کی ناجائز حرکت نہیں کی تو بوڑھے ہونے تک اس کی قوت بحال ہوتی ہے۔ آخر ایک مرد کے لیے اللہ نے چار بیویاں حلال کی ہیں تو کیا اللہ بنانے والا نہیں جانتا کہ بندہ چار بیویوں کا حق ادا کرسکتا ہے یا نہیں کرسکتا؟ لیکن اگر ایک آدمی دس سال کی عمر سے ہی گناہ شروع کردے تو بیس سال کو ختم ہو جائے گا۔ تو وہ اپنی زندگی کو خود تباہ کر چکا ہے، ورنہ اس کی مشینری کا تو کوئی نقصان نہیں ہے جو اللہ نے بنائی ہے۔ تین آدمی اکٹھے گاڑیاں لیتے ہیں: ایک آدمی سال گاڑی چلاتا ہے اور گاڑی بالکل ٹھیک ہے۔ ایک آدمی چھ مہینے میں انجن وغیرہ توڑ پھوڑ کر ہلا دیتا ہے تو اب اس میں گاڑی کا تو کوئی قصور نہیں ہے، اس چلانے والے کا قصور ہے۔ اسی لیے جب ہم نے اپنے دماغوں کو شیطان کا گھر بنا لیا تو اس میں قرآن و حدیث سما ہی نہیں سکتا، قرآن و حدیث داخل ہی نہیں ہوسکتا، قرآن و حدیث ہمیں یاد ہی نہیں رہ سکتا اور ہمیں سمجھ ہی نہیں آسکتا اور پھر ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پر اعتراض کریں یا حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ پر یا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یا ائمہ مجتہدین پر یا ائمہ محدثین

پر۔ اللہ ہمیں ہدایت عطا فرمائیں۔ ایسے ہی مثلاً: حج پر دیکھیں کہ کتنے لوگ آئے ہوئے ہیں کہ جن کو چوبیس گھنٹے میں ایک طواف بھی نصیب نہیں ہوتا اور ایسے بھی...... ماشاء اللہ...... آئے ہوئے ہیں جن کو ایک دن کے اندر بیس بیس طواف پچاس پچاس طواف نصیب ہوتا ہے۔ تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتیں ہوتی ہیں۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین کرام اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کو پہلے نقل فرماتے ہیں۔ پھر ان کی عادت مبارکہ ہے کہ قولِ سدی نقل فرمائیں گے، قولِ مجاہد نقل فرمائیں گے، قولِ قتادہ نقل فرمائیں گے اور قولِ ضحاک نقل فرمائیں گے۔ یہ سب بہت بڑے بڑے مفسر گزرے ہیں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

شہداء کا معنی مددگار:

﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ﴾ [البقرۃ:۲۳]

تو شہداء شہید کی جمع ہے اور یہ لفظ گواہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ آیت میں شہداء سے کیا مراد ہے؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا معنی ''اَعْوَانُکُمْ'' ہے کہ تم اپنے مددگاروں کو بلاؤ، کیونکہ آدمی کے لیے جو گواہی دینے آتا ہے وہ اس کی مدد کر رہا ہے۔ مددگار نہ ہو تو گواہی دینے کے لیے کیسے آئے گا؟ اور ان کے ساتھ مل کر قرآن کا مقابلہ کرو۔ اور حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''شُهَدَاءَكُمْ'' کا معنی ہے کہ جو تمہارے شرکاء ہوں، یعنی قرآن کے اس انکار اور مقابلہ میں جو شریک ہوں، ان کو بلا کر سب مل کر اللہ کے قرآن کے مقابلہ پر زور لگاؤ۔

ایک قول انہوں نے یہ بھی ذکر فرمایا کہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ:۲۳]

اللہ کے سوا جو تمہارے اَعوان ہیں اور جو تمہارے شرکاء ہیں، ان سب کی مدد پکڑو اور اللہ کے قرآن کا مقابلہ کرو۔ یعنی جن کو تم نے خدا بنایا ہوا ہے، جن کو تم نے اپنا معبود، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہو اور جن کی تم نذر و نیاز چڑھاتے ہو، منتیں دیتے ہو، لات، عزیٰ، منات اور جو تین سو ساٹھ بت تم نے خدا کے گھر میں رکھے ہوئے ہیں، ان کو جو تم نے خدا بنایا ہوا ہے ان کی مدد لو اور ان سے بھی کہو کہ تمہاری مدد کریں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۹، الآیۃ وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا]

اب ایک اصولی بات یاد رکھیں کہ ایک لکڑی کا بت ہے یا پتھر کا بت ہے تو کیا وہ مدد کر سکتا ہے؟ اور بعض جن کے

پاس پیسے زیادہ ہوئے تو سونے کے بت بن گئے، چاندی کے بن گئے، پیتل کے بن گئے اور اسی طرح اور کسی دھات کے بن گئے، اور زیادہ پیسے آگئے زمرد اور یاقوت کے بت بنا دیے، ان کی آنکھوں میں ہیرے وغیرہ لگا دیے، بہرحال جو مرضی آئے کریں۔ بت پتھر کا ہو، لکڑی کا ہو، یا سونے چاندی کا ہو، یا کسی چیز کا کا ہو، تمہیں اللہ کے قرآن کے مقابلہ پر کوئی مدد دے سکتا ہے تو پھر یہ معنی تھا کہ تم اپنے ان خداؤں سے کہو کہ تمہاری مدد کریں تو وہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ بت ہے، ان کے اندر کوئی حس نہیں ہے، دیکھ نہیں سکتے، سن نہیں سکتے، بول نہیں سکتے، اگر ان کو دھوپ میں کھڑا کر دو تو سائے میں نہیں آسکتے اور سائے میں کھڑا کر دو تو دھوپ میں نہیں آسکتے اور کوئی مکھی اڑتی ہوئی ان کے خدا پر بیٹھ جائے تو وہ مکھی بھی نہیں اڑا سکتے ہیں۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ نہیں اڑا سکتے تو پھر کیا معنی ہے کہ تم ان سے مدد مانگو؟ اور اگر یہ سارے مجنون تھے اور پاگل تھے تو پھر اللہ نے ان کے پاس نبی کیوں بھیجا.....؟

گمراہی کا اصل سبب:

اس لیے مسئلہ سمجھیں! آج تک دنیا میں جتنی بت پرست قومیں پیدا ہوئی ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر اس دور کے ہندو تک جو بھی بتوں کی پوجا کرتا ہے یا سورج کی پوجا کرتا ہے یا آگ کی پوجا کرتا ہے یا سانپ کی پوجا کرتا ہے یا جانوروں کی پوجا کرتا ہے اس کو پتہ ہے کہ یہ خود کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ بات یاد رکھیں! وہ پاگل نہیں ہوتے۔ اب ایک آدمی اپنے ہاتھ سے ایک مورتی بناتا ہے، اپنے ہاتھ سے اسے گھڑتا ہے اور اس کو آکر مندر میں رکھ دیتا ہے تو پھر سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہتا ہے، وہ پاگل نہیں ہے کہ اس کو خود ہی بنایا ہے۔ اب بھی محرم الحرام کے مہینے میں یہ لوگ تعزیہ نکالتے ہیں، ان کو پتہ ہے کہ فلاں کاریگر نے یہ تعزیہ بنایا ہے اور اس پر ہم نے اتنے تار لگائے ہیں۔ جب ہاتھوں سے بنایا ہے تو پھر اس کے سامنے نذر و نیاز چڑھانا، اس پر مٹھائیاں ڈالنا، پیسے ڈالنا، پھر ان کو کندھوں پر اٹھانا، جلوسوں کی شکل میں لے جانا، سڑکوں پر رکھنا، ماتم کرنا، اس کے اردگرد کھڑے ہو کر رونا، پھر جناب اس کو قبرستان پہنچانا اور اس کو دفن کرنا۔ وہ پاگل تو نہیں ہو گئے؟ کیا لاکھوں آدمی جلوس پاگل ہو گئے ہیں کہ اپنے ہاتھ سے ہم نے بنایا ہے، یہ کیا نفع و نقصان دے سکتا ہے؟ اصل بات یاد رکھو کہ ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا روضہ مبارک ہے۔ یاد رکھیں اور اس مسئلے کو سمجھیں کہ ان کے عقیدے میں یہ ہوتا ہے کہ یہ ہم نے بنایا ہے، بالکل سچی بات ہے، لیکن کہتے ہیں کہ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا روضہ شریف ہے اور یہ جو ہم گھوڑا لے

آئے ہیں دلدل شریف ہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسے گھوڑے پر سوار تھے اس قسم کا ایک منظر بنایا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا گھوڑا جا رہا ہے، پانی لا رہا ہے، سبیل لا رہے ہیں، خون بہہ رہا ہے اور پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہو رہے ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا روضہ بن گیا ہے۔ جب ہم اس روضے کی، اس گھوڑے کی اور زری کی پوجا کریں گے، اس پر نذریں چڑھائیں گے، اس کے ارد گرد کھڑے ہو کر روئیں گے تو دراصل حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس عمل کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کے عقیدے میں یہ نہیں ہوتا کہ یہ تعزیہ ہمیں کوئی نفع دے گا یا یہ گھوڑا ہمیں کچھ دے رہا ہے۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ یہ گھوڑا سارا سال تانگے میں رہا اور آج ادھر لے آئے، اب وہ بچے کیسے دینے لگ گیا؟ اصل میں عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ وہ نقشہ ہے، یہ وہ کربلا کا منظر تازہ ہوگا۔ تو ہم روئیں گے، فریاد کریں گے، ہمیں وہ دکھ یاد آئے گا، وہ مصائب یاد آئیں گے اور وہ آلام پڑھیں گے۔ اور پھر ایسے آدمی ان کو مہیا کیے جاتے ہیں کہ جن کو سوز خوان کہا جاتا ہے، یعنی دردناک آواز کے ساتھ وہ مرثیے پڑھتے ہیں، تاکہ ہمیں وہ منظر یاد آئے اور ہم فریاد کریں۔ اور جب ہم ٹمیاں ڈالیں گے، رو رہے ہوں گے، مار رہے ہوں گے اور زخمی ہو رہے ہوں گے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ دیکھ رہے ہیں۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب ہماری اس قربانی کو دیکھیں گے کہ یہ تو میرے بڑے پکے عاشق ہیں، یہ تو بڑے محب ہیں، چودہ سو سال گزر گئے اور آج تک انہوں نے مجھے یاد رکھا ہوا ہے اور میرے لیے اپنے بدن زخمی کروا رہے ہیں اور خون نکل رہا ہے اور راکھ ڈال رہے ہیں اور لوہے کے کڑے پہنے ہوئے، اپنے آپ کو قیدی بنایا ہوا ہے، جیسے آلِ رسول علیہ السلام قید ہوئی تھی اور ان کو گرفتار کر کے لے جا رہے تھے، اسی طرح انہوں نے کڑے پہنے ہوئے ہیں، زنجیر گلے میں ڈالے ہوئے ہیں تو جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ دیکھیں گے تو وہ راضی ہو جائیں گے۔ وہ جب راضی ہو جائیں گے تو وہ نانے کو سفارش کریں گے، پھر نانا راضی ہو جائے گا۔ پھر جب نانا سائیں راضی ہو جائے گا تو وہ اللہ سے کہہ دیں گے تو ہمارا بیڑا پار ہو گیا۔ یاد رکھیں! ان کا اصل عقیدہ یہ ہوتا ہے۔

اسی طرح بت پرستوں کا عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ بت شکل ہے اس انسان کی جو اللہ کا بڑا پیارا تھا اور یہ بت شکل ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی اور یہ بت حضرت میکائیل علیہ السلام کی شکل ہے اور یہ بت ملک الموت کی شکل ہے اور یہ بت اس بارش والے فرشتے کی شکل ہے اور یہ بت برج کی شکل ہے۔ جب ہم اس بت کے سامنے منتیں کریں گے، بھجن کریں گے اور ان کے آگے فریاد پیش کریں گے تو یہ تو کچھ نہیں ہے، اصل میں تو یہ جس کی شکل ہے وہ خوش ہو رہا ہے۔ جب جبرئیل علیہ السلام خوش ہو جائے گا تو اللہ میاں سے ہماری سفارش کر دے گا تو ہمارا بیڑا پار ہو جائے گا۔ اصل

بات یہ ہوتی ہے۔اسی طرح ہمارا مسلمان اسی گردش میں ہے اور ہمارا نظریہ اسی طرح چلتا آرہا ہے۔

اب مثال کے طور پر دیکھیں کہ جب ایک آدمی نے بت کے سامنے کھڑے ہو کر عبادت کی، لات کے سامنے کھڑے ہو کر عبادت کی۔اب ''لات'' ایک بت کا نام تھا۔اصل میں وہ ایک انسان تھا ''کَانَ رَجُلًا صَالِحًا يَلُتُّ السَّوِيْقَ لِلْحُجَّاجِ'' ایک بڑا اچھا صالح بندہ تھا اور حاجیوں کو وہ ستو گھول گھول کر پلایا کرتا تھا۔اس زمانہ میں غربت تھی اور تو کوئی چیز ملتی نہیں تھی۔جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اس کی قبر پر عبادت شروع کر دی، اس کے نام کا بت بنا کر کھڑا کر دیا۔اسی طرح یغوث ہے، یعوق ہے اور نسر ہے، یہ سارے نیک آدمی تھے۔اب اللہ کے کعبہ میں آپ بیٹھے ہیں...... اللہ پاک ہمارا بیٹھنا، پڑھنا اور سننا قبول فرمالے...... اسی سے آپ اندازہ لگائیں کہ جس آدمی نے ایک بت بنایا ہے، مثال کے طور پر: حضرت جبرئیل علیہ السلام کی شکل اور وہ اس کی عبادت کر رہا ہے تو اس کا عقیدہ یہ ہے کہ میری اس عبادت کا علم جبرئیل علیہ السلام کو یا اس کے بزرگ کو ہے۔اب اللہ کے سوا اس کو علم الغیب ہو گیا تو جب ہم نے اس کو عالم الغیب مانا تو اللہ کے علم غیب والی صفت میں ان کو شریک کر لیا۔اسی طرح اگر ہندو شرک کر رہا ہے اور جو مسلمان غیر اللہ کی نذر نیاز چڑھا رہا ہے اس کا بھی تو عقیدہ ہے کہ میری نمازِ حسین...... جو دس محرم کو ہو گی...... حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو پتہ لگے گا۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ عالم الغیب ہوں گے تو پتہ چلے گا۔اگر عالم الغیب نہ ہوں تو ان کو کیا پتہ کہ ہم اپنے ملک میں رو رہے ہیں؟

واقعہ:

جیسا کہ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ انگریزوں کا ایک وائسرائے پنجاب میں آیا، وہ پنجاب کے علاقہ میں گورنر بن کر آیا۔اتفاق کی بات تھی کہ جس دن وہ ائیر پورٹ پر اترا دس محرم کا دن تھا۔اب انگریزوں کو تو محرم کا کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ دس محرم کیا ہے؟ وہ دس محرم کا دن تھا اور لوگ سیاہ کپڑے پہنے ہوئے اور سیاہ جھنڈے اٹھائے ہوئے رو رہے ہیں اور مار رہے ہیں اور ٹلیاں ڈال رہے ہیں اور ہر طرف رونے کی آواز ہے۔وہ جب اترا اس نے فوراً اپنے اے ڈی سی سے کہا کہ کیا وجہ ہے؟ کیا یہ لوگ میرے آنے کی وجہ سے ناراض ہیں؟ میں یہاں نہ آؤں؟...... اس کو کیا پتہ کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کے ہاں کیا رواج ہے؟...... تو کسی نے کہا کہ جناب! آپ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، آپ کا کوئی جھگڑا نہیں ہے، یہ محرم الحرام کی دس تاریخ ہے اور ان کے بہت بڑے ہیرو گزرے ہیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ، ان

کی شہادت کے بارے میں یہ ماتم کر رہے ہیں۔تو اس نے کہا: حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) جوان کے بڑے ہیرو تھے وہ کب شہید ہوئے ہیں؟ اس نے کہا کہ ان کو تقریباً بارہ سو سال گزر گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کہاں شہید ہوئے ہیں؟ تو کہا کہ کربلا میں شہید ہوئے ہیں۔اس نے کہا کہ پنجاب والوں کو ان کی آج اطلاع پہنچی ہے؟ اس نے کہا کہ ان کو اطلاع آج نہیں پہنچی، بلکہ یہ ہر سال ایسا کرتے ہیں۔اس نے کہا کہ اس قوم کا خدا حافظ ہے، یہ کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔ بارہ سو سال کے بعد پاگل ہیں یا مجنون ہوگئے ابھی تک اپنے ہیرو کو رو رہے ہیں جو قوم بارہ سو سال تک سیاہ کپڑے پہن کر اپنے ہیرو کا فخر کرنے کی بجائے ماتم کر رہی ہے، وہ قوم کبھی بھی اونچی نہیں ہوسکتی۔اس نے کہا: ان کو میں ٹھیک کرلوں گا۔اس قوم کو سمجھنے کے لیے پھر میں ہی کافی ہوں۔ یہ کوئی قوم ہے؟ اس ہیرو نے تو اچھا کام کیا، اس پر تو فخر کرو، خوشی مناؤ کہ وہ تو اللہ کے راستہ میں قربانی دے کر شہید ہوگئے۔

اور اللہ نے ہمیشہ کے لیے ان کے نام کو اونچا کردیا، قیامت تک ان کا نام زندہ رہے گا، چہ جائیکہ تم آج ماتم کرو اور ٹمیاں ڈالو۔تمہارے اس ماتم ڈالنے سے نہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خلافت مل جائے گی، نہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ دوبارہ تشریف لے آئیں گے اور نہ تمہارے اس رونے سے یزید کو پریشانی ہو رہی ہے۔تو ایسے ماتم کرنے کا کیا فائدہ جس کا کوئی فائدہ نہ ہو؟ جس سے تمہارے ہیرو کو نفع اور نہ تمہارے مخالف کو کوئی نقصان ہو۔

تو اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! اصل وجہ یہ ہے کہ وہ شرک والا عقیدہ کہ میں ''یا علی!'' کا نعرہ ماروں گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نعرہ سنیں گے تو سننے کے بعد میری مدد کریں گے۔ یہ وہ بنیادی مسئلہ ہے۔سنیں گے......؟ وہ تو السمیع العلیم اللہ کی صفت ہے۔اور میری مدد کریں گے......؟ اور مدد کرنے والا کون ہے؟ اور اگر وہ مدد کرنے پر قادر ہیں تو ﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [البقرۃ: ۲۰] کون ہے؟ تو یہ صرف نعرہ نہ رہا، بلکہ ہم نے اللہ کی توحید کا مسئلہ بھی ختم کردیا اور ہم مشرکین کی اس صف میں جا کر کھڑے ہوگئے جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

اس لیے اس عقیدہ کو ہمیشہ سمجھا کریں۔اللہ تعالیٰ ہر مسلمان پر رحمت فرمائے۔جب ہم ''یا پیرا'' اور ''یا دستگیر!'' کا نعرہ ماریں گے تو اس کا کیا معنی ہے؟ اس لیے علماء نے کہا کہ ''یا رسول اللہ!'' کا نعرہ نہ لگاؤ، کیونکہ حرف ندا پکار کے لیے ہوتا ہے اور پکار وہ سنتا ہے جو اَلْحَیُّ ہے، اَلدَّائِمُ ہے، اَلْبَاقِیْ ہے، عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ہے، اس کے سوا کوئی پکار نہیں سن سکتا، اور کوئی ہماری پکار کو نہیں سمجھ سکتا۔اللہ ہر مسلمان کو غلط عقیدوں سے محفوظ فرمائیں اور صحیح عقیدہ نصیب فرمائیں۔کسی کی شان بڑھانے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اللہ کے ولی کو نبی کی کرسی پر بٹھا دیا جائے اور نبی کو خدا کے

عرش پر بٹھا دیا جائے۔ یہ شان نہیں ہوتی، بلکہ یہ تو کفر ہو جاتا ہے۔ شان تو یہ ہے کہ اللہ کی الوہیت کا قائل ہو، محمد مدنی ﷺ کی نبوت کا اور رسالت کا قائل ہو، اولیاء اللہ کی ولایت اور کرامت کا قائل ہو اور یہ عقیدہ رکھے کہ سب سننے والا ثور (پکار) کو سننے والا، صفت منوتی (منت) کے لائق، قسم اٹھانے کے قابل، ہماری حاجات کو برلانے والا اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا صرف اللہ ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ تم اپنے عقیدے میں سمجھتے ہو کہ یہ تمہارے خدا تمہارے مددگار ہیں تو تم ان کی مدد لو۔

واقعہ:

اور آپ حیران ہوں گے کہ جس وقت میرے مدنی پاک ﷺ آئے تو یہ بت اس وقت بھی موجود تھے۔ ایک کا نام ایساف تھا اور ایک کا نام نائلہ تھا۔ یہ دو کافروں کے بت تھے۔ اب آپ اندازہ کریں کہ ایساف اور نائلہ ایک مرد اور ایک عورت تھی۔ ان لوگوں نے کیا کیا؟ ......نعوذ باللہ...... کعبۃ اللہ کے اندر داخل ہونے کا موقع ملا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے پرانے طلبگار تھے، ان کو اور کوئی جگہ میسر نہ آئی تو ان بدبختوں نے اللہ کے کعبہ میں زنا کیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ اللہ کا غضب آیا اور وہ دونوں اس وقت پتھر کے بت بن گئے۔ اللہ کو جلال آیا کہ اللہ کے کعبہ کی بے حرمتی ہوئی ہے تو اللہ نے انہیں پتھر کا بنا دیا۔ اور کافروں نے ان دونوں پتھروں کو اٹھایا، کعبہ سے نکالا اور کعبہ کے دروازے کے قریب رکھ دیا کہ تمام لوگ جو اللہ کے کعبہ کا طواف کے لیے آئیں وہ ان کو دیکھیں اور عبرت پکڑیں، تاکہ اللہ کے کعبہ میں آئندہ کوئی آدمی گناہ نہ کرے۔ وہ ان کو دیکھ کر عبرت پکڑتے رہے۔ پھر لوگوں کو تکلیف ہونے لگی کہ آگے دو بت رکھے ہوئے ہیں، پتھر پڑے ہوئے ہیں تو طواف میں رکاوٹ بنتی تھی۔ انہوں نے وہاں سے ہٹایا اور جہاں زمزم کا کنواں ہے اس جگہ پر ان کو رکھ دیا۔ پھر کچھ عرصہ گزر گیا تو لوگوں نے کہا: چھوڑو! یہاں کیا رکھنا؟ مقصد تو عبرت دلانا ہے کہ ان کو دیکھیں اور عبرت پکڑیں۔ ایک کو انہوں نے صفا پر رکھ دیا اور ایک کو انہوں نے مروہ پر رکھ دیا کہ بھائی! جو آدمی عمرہ کرنے کے لیے آئے گا، طواف کرے گا تو صفا مروہ بھی تو دوڑے گا۔ جب صفا مروہ دوڑے گا تو ان پتھروں کو دیکھ لے گا اور لوگوں سے پوچھے گا کہ یہ کیا پتھر ہیں؟ تو لوگ بتائیں گے کہ یہ وہ بدبخت ہیں جنہوں نے اللہ کے کعبہ میں زنا کیا تھا، اللہ نے ان کو پتھر بنا دیا۔

اب جناب! ایک صدی جب گزر گئی، وہ لوگ جب فوت ہوئے، ساٹھ ستر سال کا عرصہ بیت گیا۔ ایک نئی نسل پیدا ہوئی، شیطان نے دماغ میں ڈال دیا، اس نے کہا کہ یہ تو تمہارے خدا ہیں۔ ایک صفا پر ہے اور ایک مروہ پر

ہے۔اب صفا مروہ پر دوڑنا شروع کرو تو پہلے ان کو چوما چاٹا کرو، پھر دوڑا کرو۔اس کے بعد ان کی عبادت شروع ہوگئی اور وہ خدا بن گئے۔ حالانکہ صفا مروہ دوڑنا ثواب کا کام ہے، سنتِ امِ اسماعیل ہے، صفا و مروہ دوڑنا سنتِ انبیاء والمرسلین ہے، سنتِ محمد مصطفیٰ ﷺ ہے اور حتیٰ کہ تمام ائمہ کے نزدیک واجب ہے۔اگر کوئی چھوڑ دے تو اس کو دم دینا پڑتا ہے۔

پھر اللہ نے یوں فرمایا:

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾[البقرة:١٥٨]

یعنی دوڑنے والے پر گناہ نہیں ہوگا، وہ تو نیکی کا کام کر رہا ہے۔گناہ نہ ہونے کا کیا معنی ہے؟ چاہیے تو یہ تھا کہ یوں کہتے کہ جو صفا مروہ دوڑے گا اللہ اس کو ثواب دیں گے، یہ اجر دیں گے اور یہ مرتبہ دیں گے، لیکن قرآن کہتا ہے:

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾[البقرة:١٥٨]

وجہ یہ تھی کہ جب اسلام آیا تو حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ صفا مروہ دوڑیں۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم...... الحمد للہ...... توحید پر آگئے، شرک کو مٹا دیا اور بتوں کو ختم کر دیا۔یہ صفا مروہ پر تو ایساف اور نائلہ بت تھے، یہاں کافر دوڑا کرتے تھے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم دوڑیں تو ہم کسی بھی گناہ میں نہ پڑ جائیں۔اللہ نے فرمایا کہ میرا مدنی! ان ظالموں نے بت رکھے تھے، ان کا ان بتوں سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو میرے شعائر میں سے ہے، ان کے دوڑنے پر کوئی گناہ نہیں ہے۔تمہارے صحابہ تو میرے حکم پر دوڑ رہے ہیں۔اس لیے اس ڈر کو ختم کیا گیا ہے، کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم ڈر گئے کہ یہاں تو کافر بھی دوڑتے تھے، اگر ہم دوڑیں گے تو کہیں گناہ کا کام نہ ہو جائے، کہیں غلطی نہ ہو جائے۔تو اللہ نے ان کی پریشانیوں کو ختم کیا کہ:

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾[البقرة:١٥٨]

یاد رکھیں! اس طرح بت پرستی پھیلتی ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے۔کوئی ایک آدمی غلط راستہ نکال دیتا ہے اور پھر وہ پھیلتے پھیلتے جب صدیاں گزر جاتی ہیں تو وہاں ایک بات ایسی رواج پکڑ لیتی ہے کہ پھر اس کا ختم کرنا کسی کے بس میں نہیں رہتا۔ایسے آپ کے ملک میں بھی اور ہندوستان میں بھی اور دیگر ممالک میں بھی ہے۔آپ حیران ہوں گے کہ لاکھوں مزاریں بنی ہوئی ہیں، جہاں کسی کی قبر نہیں ہے۔یعنی جہاں کوئی اللہ والا دفن ہی نہیں ہے، بس کسی آدمی کے دماغ میں سمایا، اس نے آکر ایک جگہ ڈیرہ لگایا، ایک قبر بنالی اور اس پر ایک غلاف ڈال دیا اور خود

وہاں مجاور بن کر بیٹھ گیا، ایک پانی کا مٹکا رکھ دیا۔ آخر وہاں سے کوئی نہ کوئی آدمی بھی تو گزرے گا۔ ایک گزرا، دو گزرے۔ انہوں نے پوچھا: کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ یہاں اللہ کا ولی دفن ہے۔ اللہ کے بندے! یہاں دھوپ کے اندر تم اکیلے بیٹھے ہو؟ تو اس نے کہا: مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ یہاں ایک بزرگ دفن ہیں، بس اس کا خیال کرنا ہے۔ اب جناب! ایک سال گزرا، دو سال گزرے، چار سال گزرے۔ اب ضعیف الاعتقاد ہزاروں قسم کے لوگ ہوتے ہیں، کوئی گزرا، اس نے کہا کہ میرا بیٹا ہو جائے۔ اگر پیدا ہو گیا تو اس نے کہا کہ مجھے تو اس پیر نے بیٹا دیا۔ اب کسی نے دیکھا کہ یہ لوگ کیوں جا رہے ہیں؟ مرد ہیں، عورتیں ہیں تو انہوں نے کہا کہ فلاں آدمی کا بیٹا نہیں ہوتا تھا، اس نے اس مزار پر منت مانگی اس کو بیٹا ملا ہے، اس کی منت ادا کر رہے ہیں۔ تو اس نے کہا: اچھا میرے بھی بیٹا پیدا نہیں ہو رہا، میں بھی منت مانگتا ہوں۔ تو اس طرح وہ شرک کا اڈا بن جاتا ہے اور شرک کا گڑھ بن جاتا ہے اور بات بڑھتی رہتی ہے۔

کہتے ہیں کہ فلاں آدمی نے تعویذ دیا، تم خود تعویذ دینا کر دو، پھر دیکھو کہ دو سال بعد تمہارا اڈا بنتا ہے کہ نہیں بنتا؟ میں ایک مثال دیتا ہوں، مثلاً: آپ حج پڑھ کر جا رہے ہیں۔ آپ جا کر بس اعلان کر دیں کہ میں مکہ مدینہ گیا، مجھے وہاں سے حکم ہوا ہے کہ تعویذ لکھا کرو اور اخبار اکٹھے کر کے رکھ دو اور پھاڑ کر دیتے جاؤ۔ جب سو آدمی کو تم تعویذ دو گے تو کسی کو تو اللہ نے بیٹا دینا ہی دینا ہے۔ جس کا بیٹا پیدا ہو جائے وہ تیرا مرید اور جس کا نہ ہو وہ کہیں گے کہ یہ پیر بے ایمان ہے۔

عجیب واقعہ!

میرا اپنا دوست تھا، وہ فوت ہو گیا ہے، بہت بڑا پیر تھا۔ میں اس غریب کا نام نہیں لیتا، وہ فوت ہو گیا، فوت ہونے کے بعد مغفرت کی دعا کریں، اللہ ان کی قبر آسان کرے اور جب ہماری موت آ جائے تو اللہ ہماری قبر آسان کرے۔ کوئی فوت ہو جائے تو اس کی شان میں کبھی برا نہ کہو۔ تو وہ بہت بڑے پیر تھے اور میرے دوست تھے اور بہت بڑی گدی کے وہ جانشین تھے۔ اب اس دفعہ ان کا لڑکا بھی مجھے ملنے کے لیے آیا۔ بہر حال خاندانی روایات انہوں نے قائم رکھی ہوئی ہیں۔ میرا جلسہ تھا تو کسی نے کہا کہ فلاں مولوی صاحب کا بیٹا آیا ہوا ہے تو میں نے کہا کہ میرا جلسہ سننے کے لیے آیا ہے۔ میری تقریر سننے سے اس کو کیا فائدہ ہوگا؟ تو انہوں نے کہا کہ آپ کے پاس تو میرے باپ آئے تھے، اس لیے میں آیا ہوں۔ اور کسی نے مجھے یہ بھی کہا ہے کہ ان کے لڑکوں کے عقیدے بڑے

ٹھیک ہیں۔ بہر حال واللہ اعلم مجھے پہلی دفعہ ملے، تھوڑی دیر بات ہوئی۔ تقریر کر کے دوسری جگہ چلے گئے، اس سے زیادہ دیر نہ مل سکے۔

بہر حال میں ان کو ملنے کے لیے گیا تو سکول کا پچاس ساٹھ لڑکا بیٹھا تعویذ لکھ رہا ہے۔ میں نے پوچھا: پیر صاحب! یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے؟ لوگوں کو تعویذ دیتے ہو؟ اس نے کہا: مکی صاحب! روزانہ ہزار آدمی کو خود تعویذ لکھ کر دیں تو ہماری انگلیاں ٹوٹ جائیں گی۔ اتنے تعویذ لکھنے کا میرے پاس وقت نہیں ہے، میں مڈل سکول سے لڑکے بلا لیتا ہوں، دس روپے فی لڑکا دیتا ہوں۔ چھٹی کے دن یہ آجاتے ہیں، سارا دن یہ تعویذ لکھتے رہتے ہیں۔ تو ہزاروں لوگوں کے تعویذ بن جاتے ہیں۔ ان کو ہم محفوظ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ جو آدمی آیا وہ تعویذ امرت دھارا ہے، بیمار کا وہی تعویذ ہے، بچہ نہ ہو تو وہی تعویذ ہے، طلاق ہونی ہے تو وہی تعویذ ہے، اور لڑائی کرانی ہے تو وہی تعویذ ہے۔ میں نے کہا: خدا کے بندے! تم خدا کو کیا جواب دو گے؟ ایک تعویذ سارے کاموں کے لیے ہے۔ اس نے کہا: مکی صاحب! کام تو خدا کرتا ہے۔ یہ تو ہمارے رزق کا بہانہ ہے۔ اتنے لوگ ہم سے لے جاتے ہیں، کسی نہ کسی کا کام تو خدا نے کرنا ہوتا ہے۔ جن کا کام ہو جاتا ہے تو وہ اگلے سال نذر لے آتا ہے، کوئی بکری لے آتا ہے، کوئی گائے لے آتا ہے، کوئی گھوڑی لے آتا ہے، کوئی پیسے لے آتا ہے اور کوئی حلوہ بنا کر لے آتا ہے۔ کوئی آکر کہتا ہے کہ میرا کام نہیں ہوا تو اس کو کہتے ہیں کہ تیرا دماغ خراب ہوگا تو اپنا عقیدہ ٹھیک کر۔ اس نے کہا: ہمارا کیا بگڑتا ہے؟ ہمارا تو کام چل رہا ہے۔

اس لے ہمیشہ یاد رکھیں کہ اس طرح یہ سارے کاروبار پھیلے ہیں، ورنہ کوئی نفع ونقصان دینے والا نہیں، مگر اللہ ہے۔ اولیاء اللہ پر خود موت آگئی، جبکہ اللہ کے ولی ایسے گزرے ہیں کہ ان کا اپنا ایک بھی بیٹا نہیں ہے۔ جب وہ اپنے لیے اولاد خدا سے نہیں لے سکے تو ہمیں کہاں سے لے دیں گے؟ اس لیے ہمیشہ اپنے عقیدوں کا خیال رکھا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کے عقیدے کے درست کرے۔ اس لیے اولیاء اللہ کی قبروں پر جائیں تو ان کی قبروں پر جا کر دعا کریں کہ یا اللہ! یہ تیرا ولی تھا، تیرا عبد صالح تھا، اس کی قبر کو باغ جنت بنا۔ جب ہم اس کے لیے دعا کرتے ہیں تو مولا کی رحمت جوش میں آجاتی ہے کہ یہ ایک گناہگار بندہ ہو کر میرے بندے پر رحم کر رہا ہے تو میں ارحم الرحمین ہوں تو میں اس پر رحم کیوں نہ کروں؟ یہ نہیں ہوتا کہ اس قبر والے کی سفارش ہو گئی۔ قبر والے کی سفارش نہیں ہوتی، وہ کوئی نفع ونقصان نہیں پہنچاتا۔ اصل وجہ یہ ہوتی ہے ''مَنْ رَحِمَ رُحِمَ'' اللہ نے فرمایا: تم کسی پر رحم کرو، میں تم پر رحم کروں گا۔ فرمایا: تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ جب ہم قبرستان سے گزرتے

ہیں تو کہتے ہیں:

''السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُورِ، يَغْفِرُ اللهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا، وَنَحْنُ بِالأَثَرِ''

[سنن الترمذی حدیث: ۱۰۵۳، باب: مَا يَقُولُ الرَّجُلُ إِذَا دَخَلَ الْمَقَابِرَ]

''اے قبر والو! تم پر اللہ کی سلامتی ہو۔ اللہ ہماری بھی مغفرت کرے اور تمہاری بھی مغفرت کرے۔ تم ہم سے پہلے چلے گئے، ہم تم سے پیچھے آنے والے ہیں۔''

اور پھر ہم کہتے ہیں: اے اللہ! ان قبرستان والوں پر رحم فرما دے، اے اللہ! ان کی مغفرت فرما دے، یا اللہ! ان کی قبروں کو باغ جنت بنا دے، یا اللہ! اگر عذاب ہو رہا ہے تو رفع فرما دے اور اگر رحمتیں نازل ہو رہی ہیں تو اور زیادہ رحمتیں نازل فرما دے۔ تو اللہ کی رحمت جوش میں آتی ہے کہ یہ ضعیف گنہگار بندہ ان بندوں سے جو قبروں میں چلے گئے ان سے اس کو کوئی لالچ بھی نہیں، کوئی نفع بھی نہیں، کوئی نقصان بھی نہیں، کوئی رشتہ داری بھی نہیں، کوئی قرابت داری بھی نہیں، یہ ان کے لے مجھ سے دعائیں کر رہا ہے تو میں اس پر رحم کر دیتا ہوں۔ اپنے عقیدوں کو سمجھو! اللہ تبارک وتعالیٰ مسلمانوں پر رحم فرمائیں۔

قرآن جیسی کتاب بنانے کا چیلنج:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ''اَيِ اسْتَعِيْنُوْا بِاٰلِهَتِكُمْ'' تم اپنے خداؤں سے بھی مدد پکڑو۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شہداء کا معنی گواہ ہے، جیسے گواہ فیصلہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ۲۳] کہ تم بھی مکہ اور عرب کے بڑے بڑے فصیح اور ادیب لوگ فیصلہ کے لیے بلا لو، ان لوگوں کے اشعار سناؤ اور اللہ کا کلام بھی سناؤ، ان کو کہو کہ وہ فیصلہ کریں کہ یہ بندے کا کلام ہے یا اللہ کا کلام ہے؟ اور صرف اسی جگہ چیلنج نہیں کیا، بلکہ قرآن کی متعدد آیات میں یہ چیلنج کیا گیا ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جو یہ چیلنج دیا گیا ہے یہ صرف مکی زندگی میں نہیں دیا گیا، بلکہ مدنی زندگی میں بھی چیلنج اتارا، کیونکہ اگر صرف مکہ میں کیا جاتا تو مکہ میں رہنے والے لوگ شاعر ہونے کے باوجود، کوئی پڑھے لکھے اور صاحب کتاب لوگ نہیں تھے اور ان کا لقب بھی امی تھا۔ اور جب حضور ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں اہل کتاب مدینہ منورہ میں پہلے سے موجود تھے۔ ان کے پاس بڑے بڑے احبار تھے، رہبان

تھے، پادری اور علماء تھے۔ تو اللہ پاک نے مدنی سورت میں بھی آپ ﷺ کو چیلنج کا حکم دیا کہ اگر تمہیں شک وشبہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے یہ خود بنایا ہے تو تم بھی تو پڑھے لکھے ہو، تم بھی تو اہلِ کتاب ہو، تمہارے پاس بھی تو بڑے بڑے عالم اور رہبان موجود ہیں، ان کو کہو کہ اس کے مقابلہ پر ایک سورت یا ایک آیت بنا کر لے آئیں، تو اب جا کر تحدی کامل ہوئی۔ اگر صرف مکی زندگی میں چیلنج کیا جاتا تو دشمن یہ کہہ سکتا تھا کہ آپ نے تو چیلنج وہاں کیا جہاں اہلِ کتاب، احبار اور رہبان بھی نہیں تھے۔ وہ تو جاہلیت کی زندگی گزارنے والے لوگ تھے، ان کے پاس کوئی کتاب کا علم نہیں تھا، لیکن جب اللہ نے مکہ میں بھی چیلنج فرمادیا اور مدینہ میں بھی چیلنج فرمادیا تو اب قرآن کا اعجاز مکمل ہوگیا۔ نہ مکہ والے کوئی مقابلہ کرسکے اور نہ مدینے والے کوئی مقابلہ کرسکے۔ اور اسی طرح قیامت تک کوئی اللہ کے قرآن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ چودہ سو سال کے اندر دشمنوں نے اسلام کو مٹانے کے لیے کتنا ایڑی چوٹی کا زور لگادیا ہے۔ اگر ان کی جرات اور طاقت ہوتی تو وہ اللہ کے قرآن کے مقابلہ پر کوئی کتاب نہ پیش کردیتے؟

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۹، الآیۃ: وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا]

ایک مسلمان کا دنیا کے بڑے عیسائی پادری سے مناظرہ:

چند سالوں کی بات ہے کہ یورپ کے اندر عیسائی پادری کے ساتھ ہمارے دوست کا مناظرہ ہوا تو انہوں نے صرف ایک بات کی کہ باقی بحثیں آپ چھوڑ دیں! اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ بائبل اللہ کا کلام ہے اور انبیاء پر اتارا گیا ہے تو میں بائبل کا ایک صفحہ کھولتا ہوں اور اس پر آپ کو بتاتا ہوں کہ فلاں صفحہ پر آپ پڑھ کر لوگوں کو سنادیں۔ جب اللہ کی کتاب ہے اور تمہارے نبی کی کتاب ہے تو تم پڑھ کر سنانے میں کیا شرم ہوسکتی ہے؟ تم صرف ایک صفحہ اپنی قوم کو پڑھ کر سنادو تو میں مان لوں گا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اب جناب اس نے بڑی کوشش کی، لیکن عیسائی پادری نے کہا کہ میں زہر تو پی لوں گا، لیکن کتاب نہیں پڑھوں گا۔ کیونکہ اس کو پتہ تھا کہ اتنا بے ہودہ کلام جب لوگ سنیں گے تو مجھے جوتے ماریں گے۔ یہ اللہ کا کلام ہے!! یہ اللہ کا کلام کیسے ہوسکتا ہے!؟ جو اتنا بے ہودہ کلام ہے۔ اس کے اندر اتنی غلط باتیں لکھی ہوئی ہیں کہ کوک شاستر پڑھتے ہوئے اتنی شرم نہ آئے جتنا اس کو پڑھتے ہوئے شرم آئے۔ اس دوست نے بڑا زور لگایا اور کہا کہ دیکھو! میرے نبی ﷺ پر اللہ نے کلام اتارا۔ تم جہاں سے کہو میں اس کو پڑھنے کے لیے تیار ہوں۔ تو آپ بھی کم از کم اپنی کتاب کو لوگوں کے سامنے پڑھو تو سہی۔ باقی بحث تو بعد میں کریں گے کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے؟ پہلے کم از کم قوم کے سامنے تو اپنا دعویٰ تو پڑھو، لیکن اس نے پڑھنے کی جرات نہیں کی۔

جمع وحفاظتِ قرآن:

ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں! ایک ہے الزام لگانا۔ الزام لگا دینا تو بڑا آسان ہوتا ہے، یعنی اب بھی اگر ایک پاگل کھڑا ہو جائے اور کہے کہ یہ رات تو نہیں ہے، رات میں تو اندھیرا ہوتا ہے اور یہاں تو روشنی ہو رہی ہے۔ اس کو عقل والے سمجھائیں کہ بے وقوف آدمی! رات تو ہو چکی ہے اور یہ روشنی تو بلب کی ہے۔ اور وہ کہے کہ جناب! رات میں اندھیرا ہوتا ہے۔ جب اندھیرا نہیں تو رات بھی نہیں۔ تو اس کا تو کوئی علاج نہیں۔ اس طرح دنیا کے اندر کوئی آدمی اگر الزام لگاتا رہے، جیسا کہ بعض جہلاء نے اپنی کتابوں میں الزام لگائے کہ...... نعوذ باللہ...... یہ قرآن مکمل نہیں ہے، بلکہ...... نعوذ باللہ...... ناقص ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی جب وہ سامنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہ کتابیں جھوٹی ہیں اور قرآن سچا ہے۔ قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے، سامنے آنے کے بعد ان کو جرات نہیں ہوتی۔

اور جب انہوں نے قرآن مقدس کی تصدیق نہ کی تو جو لوگ قرآن کو جمع کرنے والے تھے، یعنی سیدنا ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ...... تو سب سے پہلے قرآن جمع کرنے کا کام سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے شروع ہوا۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ مشورہ دینے والے کون تھے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا: یا امیر المومنین! اللہ کے نبی کے بڑے بڑے قاری شہید ہو رہے ہیں، صرف ایک جنگِ یمامہ میں ۷۰ قاری شہید ہو گئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ صحابہ رضی اللہ عنہم اسی طرح شہید ہوتے رہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آیت یا کوئی سورت کسی کے سینے میں رہ جائے اور وہ کتاب میں نہ آسکے، لہٰذا آپ ایک کمیٹی بنا دیں، اللہ کے قرآن کو مابین الدفتین میں جمع کر دیں۔ حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے عمر! بات تو تمہاری ٹھیک ہے، لیکن اس کے اندر مجھے دو باتوں کا خطرہ ہے:

❁...... ایک بات تو یہ ہے کہ جب اللہ نے قرآن کی حفاظت کا کہا ہے تو مجھے یقین ہے کہ قرآن محفوظ رہے گا، چاہے ہم قرآن کو جمع کریں یا نہ کریں، قرآن دنیا سے مٹ نہیں سکتا، کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے اپنے ذمہ لے لی ہے، ہمارے ذمہ تو حفاظت نہیں ہے۔

❁...... اور دوسری بات یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوتا رہا، ۲۳ سال کی مدت میں اللہ کا قرآن اترا ہے، یعنی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو قرآن نازل ہونا شروع ہوا اور ۶۳ سال کی عمر میں میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو تقریباً ۲۳ سال تک اللہ کا قرآن نازل ہوتا رہا اور متفرق مقامات پر نازل ہوا اور متفرق جگہوں اور موقعوں میں نازل ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں حکم نہیں دیا کہ قرآن کو اکٹھا کر دو۔ جب

اللہ کے نبی ﷺ نے یہ کام نہیں کیا تو میں کیسے کروں؟ اس لیے مجھے تمہاری یہ بات سمجھ نہیں آتی، میں اس بات پر غور کروں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ میرا قدم حضور ﷺ کی سنت کے خلاف اٹھ جائے۔

حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے بار بار کہتے رہے اور میں بار بار ٹالتا رہا اور میں اللہ سے دعا کرتا رہا کہ یا اللہ! جو راستہ سیدھا ہو تو اس پر مجھے چلا دے۔ فرماتے ہیں:

''حَتَّى شَرَحَ اللَّهُ صَدْرِي لِلَّذِي شَرَحَ لَهُ صَدْرَ عُمَرَ''

''اللہ پاک نے میرا سینہ بھی کھول دیا جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ کا سینہ کھولا تھا۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۱۹۱، باب: يُسْتَحَبُّ لِلْكَاتِبِ أَنْ يَكُونَ أَمِينًا عَاقِلًا]

میں اس بات پر راضی ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات ٹھیک ہے۔ اللہ نے قرآن کو محفوظ رکھنا ہے، لیکن محفوظ رکھنے کے لیے دنیا میں اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو زندہ رکھنا ہے، زندہ رکھنے والا تو اللہ ہے، لیکن ہماری زندگی کے لیے پانی ضروری ہو گیا، روٹی ضروری ہو گئی، کھانا پینا، رہنا سہنا اور علاج یہ سارے اسباب ضروری ہو گئے۔ اس لیے اب اگر کہیں کہ اللہ نے ہمیں زندہ رکھنا ہے تو کھانا چھوڑ دیں اور پینا چھوڑ دیں کہ اللہ نے ہمیں زندہ رکھنا ہے اور ایک ایئر ٹائٹ روم کے اندر جا کر بند کر دیں اپنے آپ کو اور کہیں کہ بس اللہ نے ہمیں زندہ رکھنا ہے۔ تو یہ بھی شریعت کے خلاف ہے، کیونکہ جو اسباب اللہ نے پیدا فرمائے ان اسباب پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے دماغ میں بھی یہ بات آ گئی اور اللہ کو بھی یہی منظور تھا کہ میں نے قرآن کو محفوظ رکھنا ہے۔ قرآن کی حفاظت کا کام میں نے اصحابِ رسول سے لینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے قرآن کا محافظ بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو بنایا، قرآن کا جامع بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو بنایا، قرآن کا سب سے اوّل مخاطب صحابہ رضی اللہ عنہم کو بنایا اور اپنے قرآن کا سب سے اوّل عامل صحابہ رضی اللہ عنہم کو بنایا۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور اسی طرح چار آدمیوں کی کمیٹی بنا دی کہ تمام سورتیں جن کے پاس لکھی ہوئی ہیں وہ بھی جمع کرو اور جن کے پاس قرآن سینوں میں محفوظ ہے وہ بھی جمع شروع کیا گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں آ کر کام شروع ہوا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مکمل طور پر اپنے انتہائے عروج پر پہنچا، وگرنہ قرآن تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمع ہو گیا تھا، لیکن قراءت کا اختلاف باقی رہا کہ سات قراءتیں ہیں اور سات قراءتوں میں قرآن پڑھا جاتا ہے، جیسے آپ بھی پڑھتے ہیں ﴿وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرِهَا

وَمُرْسٰهَا﴾ [هود:۴۱] تو یہ قراءت ہوتی ہے۔ ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ﴾ [الروم: ۵۴] اور بعض پڑھیں گے ﴿مِنْ ضَعْفٍ﴾ تو یہ قراءت کا فرق ہوتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ اشکال پیدا ہونے لگا۔ لوگ پھر گھبرا گئے کہ کہیں اختلاف قراءت کی وجہ سے دشمن فائدہ نہ اٹھالے۔ انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو عرض کیا، انہوں نے کہا کہ ہر آدمی مختلف قراءت میں پڑھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا، مثلاً: اگر پاکستان میں پہنچا تو ایک قراءت میں، عرب میں پہنچا تو دوسری قراءت میں، افریقہ میں پہنچا تو تیسری قراءت میں، مغرب میں پہنچا تو چوتھی قراءت میں، یمن میں پہنچا تو پانچویں قراءت میں، شام میں پہنچا تو چھٹی قراءت میں اور کسی ملک میں پہنچا تو ساتویں قراءت میں۔ تو کل کو اس میں بھی جھگڑے ہو سکتے ہیں کہ کوئی یہ کہے کہ میری قراءت والا قرآن زیادہ صحیح ہے اور کوئی یہ کہے کہ میری قراءت والا قرآن زیادہ صحیح ہے۔ دشمنوں کو اس قراءت کے اختلاف کا موقع نہ ملے، لہٰذا آپ مہربانی کریں اور قرآن کو ایک قراءت (ایسی شکل میں تحریر کر دیں کہ حروف ایک سے ہوں، مگر تمام صحیح قراءتیں اس کی صورتِ خطی سے معلوم ہو رہی ہوں) میں جمع کر دیں۔

لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی میٹنگ بلائی اور مشورہ ہوا کہ قرآن کو کسی ایک قراءت پر جمع کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ وہ قراءت جس پر اللہ نے قرآن کو اتارا اور جس قراءت میں خود اپنی زبان پاک سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا...... شاید آپ کے علم نہ ہو، یہ شرف بھی ملا تو کس کو ملا؟ قرآن پاک تو جمع ہو گئے تھے تو یہ قرآن کس کے پاس ملا؟ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس ملا۔ اور بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کون ہیں؟ یہ بنتِ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں اور زوجہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور امہات المؤمنین ہیں...... ان کے پاس جو قرآن تھا وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منگوایا۔ یہ اسی قراءت پر تھا جس پر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا تھا۔ اسی قرآن کو سامنے رکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نسخے تیار کروائے۔ سات نسخے بنوائے گئے اور ان پر انہوں نے اپنی مہر لگائی۔

[البرہان فی علوم القرآن: ۱/ ۲۳۶-۲۴۰]

وہ مہر کون سی تھی؟ مہر وہ تھی جو ان کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی تھی، یعنی وہ مہر جو چلی آ رہی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ کے پاس، ان کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں وہ مہر انگوٹھی میں بنی ہوئی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ مدینہ مبارک میں (مسجد قباء کے پاس) ایک کنویں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ کنویں میں گر گئی۔ کنویں میں گرنے کے بعد حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ نے بے انتہاء کوشش کی اس کو تلاش کرانے کی، لیکن وہ نہ ملی اور اسی دن سے یہ اشارہ تھا کہ اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے امتحان کا دور شروع ہو گیا، لیکن ...... الحمد للہ ثم الحمد للہ ...... وہ مصحفِ عثمان رضی اللہ عنہ جو اصل میں مصحفِ حفصہ رضی اللہ عنہا ہے۔ [سنن أبي داود، حديث: ۴۲۱۵، باب ما جاء في اتخاذ الخاتم]

اس سے بھی آپ اندازہ فرمائیں کہ جو آدمی کسی اچھے کام کا کی ابتداء کرے، بادشاہ خادم الحرمین نے یہ قالین بچھایا ہے۔ اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ خادم الحرمین نے یہ حرم بنایا ہے۔ اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ یا یہ حرم بنایا یا نیا حرم بنایا تو جتنے لوگ قیامت تک نماز پڑھتے چلے جائیں گے ان کو ثواب ملتا رہے گا۔ تو اسی طرح قیامت تک جو قرآن پڑھے گا جہاں ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو ثواب جائے گا وہاں خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے لیے بھی لکھا جائے گا کہ انہی کے مصحف کو نقل بنایا گیا، اس پر ترتیب رکھی گئی تھی۔ تو اب قیامت تک جتنے بھی قرآن پڑھیں گے اللہ کی شان ہے کہ اس کا اجر اور اس کا ثواب اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو لکھا جائے گا اور اس کے بعد سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو لکھا جائے گا۔ تو اس مہر کے ساتھ وہ قرآن پوری دنیا میں تقسیم کر دیا گیا اور آج بھی وہ اپنی اسی اصلی حالت کے اندر موجود ہے اور پھر اللہ جس سے کام لے۔

شاہ فہد کی خدماتِ قرآن:

اللہ تعالیٰ خادم الحرمین کو جزائے خیر عطا فرمائیں کہ انہوں نے "مجمع الملک الفهد" مدینہ منورہ میں دنیا کا ایک بہت بڑا پریس قائم کیا۔ میں ہمیشہ بیٹھ کر سوچا کرتا ہوں کہ میرے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا بَنَى اللّٰهُ لَهُ مِثْلَهُ فِي الْجَنَّةِ))

"جو آدمی دنیا میں اللہ کا گھر بناتا ہے اللہ اس کو جنت میں گھر دیتا ہے۔"

[سنن الترمذي، حديث: ۳۱۸، باب: ما جاء في فضل بنيان المسجد]

میں کئی دفعہ سوچتا ہوں کہ یا اللہ! یہ تیری شان ہے! اگر موجودہ بادشاہ کو تو نے قیامت کے دن اتنے بڑے حرم اور مدینہ جتنا گھر دے دیا تو یہ وہاں بھی بادشاہ ہوں گے، کیونکہ جتنا گھر بنائیں گے اتنا دیں گے، بلکہ اللہ تو اس سے بڑا دیں گے، لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ اتنا بھی دے دیں تو یہ کوئی جنت میں چھوٹا گھر ہو گا!؟ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کی ایک ہنٹر کی جگہ اگر ساری دنیا کی قیمت لگائی جائے تو اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔

اور اسی طریقہ سے اللہ نے خادم الحرمین سے جو دوسرا کام لیا ہے، وہ یہ ہے کہ سات لاکھ قرآن ایک دن میں

چھاپ سکتے ہیں۔ یعنی پوری دنیا میں اس کے مقابلہ پر کوئی پریس نہیں ہے جو مدینہ منورہ کے اندر قائم ہوا اور اس میں انہوں نے پوری دنیا کے قراء کو بٹھایا، تمام دنیا کے علماء کو بٹھایا اور کہا کہ بعینہٖ اسی طریقہ پر جو مصحف عثمان رضی اللہ عنہ تھا اور جس طرح اور جس قراءت پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمع کیا تھا، اسی طرز پر قرآن چھاپا جائے، تا کہ قیامت تک محفوظ ہوجائے۔ اب...... الحمد للہ...... وہ قرآن حرمین میں ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا میں موجود ہے۔ اور اللہ کی شان ہے کہ حرم میں جو قرآن آپ دیکھتے ہیں اس میں جو کاغذ استعمال کیا ہوا ہے، یہ کاغذ پوری دنیا میں نہیں خرید سکتے، کیونکہ یہ خاص طور پر قرآن کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کاغذ کی صفت یہ ہے کہ ایک سو سال تک اس کی آب وتاب میں فرق نہیں آئے گا۔ اور پھر قرآن کے اوپر جو جلد بنائی گئی ہے اس کے لیے مور کا چمڑا استعمال ہوا ہے، جو دنیا میں نایاب چیز ہے۔ اور پھر اس قرآن کی جو جلد بندی کی گئی ہے اس کو جب جلد کرتے ہیں تو آٹھ ٹن وزن اس پر دیتے ہیں۔ الحمد للہ! اللہ نے مجھے یہ شرف بخشا کہ وہ مجھے لے گئے اور ایک ایک چیز مجھے سمجھائی اور بتلائی کہ یہ کیا مشین ہے اور یہ کیا مشین ہے؟ اور یہاں کیا کام ہوتا ہے؟ کتنی تصحیح ہوتی ہے؟ کتابت ہوتی ہے، کتنی طباعت ہوتی ہے؟ یعنی آپ اندازہ کریں کہ اس قرآن کو درمیان سے کھول دیں اور پوری طرح الٹ دیں تو کوئی کاغذ باہر نہیں نکلے گا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی بدبخت پھاڑ ڈالے۔ یہ تو بدبختی ہوئی، یوں تو لوہا بھی توڑا جا سکتا ہے، لیکن اس انداز میں اللہ کے قرآن کی خدمت کی اللہ ان کی محنت اور خدمت کو قبول فرمالیں اور اللہ ہمیں بھی قرآن پاک کی خدمت کرنے کی توفیق دیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم پر تبرا کرنے والا حفظِ قرآن سے محروم:

اب چودہ سو سال گزر گئے۔ اس کے باوجود بعض لوگ یہ باتیں اپنی کتابوں میں بغض باطن کی بنا پر تو لکھ دیں، لیکن سامنے آنے کے بعد جرات ان کو بھی نہ ہوئی، لیکن اللہ کے قرآن کے انکار کرنے پر اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغض کرنے پر اللہ نے ان کو ایک سزا دی کہ پوری دنیا میں دیکھ لیں کہ جو آدمی صحابہ رضی اللہ عنہم پر تبرا کرنے والا ہو، یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کو...... نعوذ باللہ...... برا بھلا کہنے والا ہو، ان میں ایک بھی حافظِ قرآن آپ کو نہیں ملے گا۔ اللہ نے ان کو سزا دی کہ ایک بھی حافظِ قرآن نہیں۔ پوری دنیا میں آپ سنیوں کی بستی میں چلے جائیں، جہاں بالکل میری طرح کے جاہل رہتے ہوں، وہاں بھی کوئی نہ کوئی اندھا کانا حافظ مصلی پڑھ رہا ہوگا اور ان کے امام بارے میں دیکھ لیں۔ کبھی قرآن کا ختم ثابت کردیں تو جو مرضی آئے مجھے سزا دیں کہ رمضان المبارک میں یا غیر رمضان المبارک میں کبھی

انہوں نے اپنے امام بارگاہوں میں قرآن کا ختم کیا ہو۔ وجہ کیا ہے کہ جب قرآن کے جمع کرنے والوں کا انکار کیا تو اللہ نے ان کے سینوں سے قرآن کو نکال دیا، اللہ نے وہ نعمت پھر ان کے سینوں میں رہنے ہی نہیں دی۔ اللہ نے فرمایا کہ تم اس قابل ہی نہیں ہو۔ قرآن تو اس کے سینے میں جمع ہوگا جو جمع کرنے والوں کا عاشق ہوگا اور جو جمع کرنے والوں کو ماننے والا ہوگا۔ تم تو جامعینِ قرآن کے منکر ہو تو تمہارے سینوں میں کیسے قرآن جمع ہوسکتا ہے؟ آپ دیکھ لیں کہ ان کا کوئی آدمی قرآن پڑھ رہا ہو۔ تو "اِنَّا اَنْزَلْنَا... وَالْعَصْرِ... قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ" ان کے علاوہ عموماً کوئی چوتھی سورت ان کو نہیں آتی۔ اور وہ بھی ایسے پڑھ رہا ہوتا ہے کہ اللہ معاف کرے جیسے پتھر مار رہا ہو۔ آپ کبھی ان کے ساتھ کھڑے ہو کر دیکھ لیں اور سن لیں۔ پانچ چھ نمازیں ان کی ایک منٹ میں ادا ہوجاتی ہیں، یعنی ان کو وقت کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نماز کے تابع نہیں، بلکہ نماز ان کے تابع ہے۔ تم تو نماز کے تابع ہو کہ عشا کا وقت ہوگا تو ہم عشاء پڑھیں گے اور فجر کا وقت آئے گا تو ہم فجر پڑھیں گے اور یہ ایسا کرتے ہیں کہ سارا دن کام کرنے کے بعد عشا کے وقت پانچوں نمازیں اکٹھی ادا کریں گے۔ اور اس کے بعد جب وہ نماز پڑھیں گے تو آپ دیکھ لیں۔ اگر ان سورتوں کے علاوہ کوئی سورت ان کو آتی ہو اور جس انداز میں وہ پڑھتے ہیں۔

ایک قاری صاحب کا واقعہ:

جیسے مثال مشہور ہے کہ ایک قاری کو مقابلہ کرنے کا شوق ہوگیا۔ اس نے کہا کہ مصر کے بڑے قاری ہیں تو میں قاریوں میں نہیں ہوں؟ میں بھی ان کا مقابلہ کروں گا...... حالانکہ اللہ کی شان ہے کہ اللہ نے مصر والوں کو قرآن پڑھنے کی نعمت سے نوازا ہے تو مقابلہ کا کیا معنی ہے؟ اب کوئی آدمی عربی سے کہے کہ میں مقابلہ کروں گا تو بھائی! اس کی تو زبان عربی ہے، ہم کیا مقابلہ کرسکتیں ہیں؟ ہم کتنے بڑے عالم بن جائیں ہمیں تو زبان ہی نہیں آتی۔ تو اول لغت ہی نہیں آتی جو یہاں ایک بچے کو آتی ہے۔ ہم تو ۲۰ سال پڑھتے پڑھتے اتنی بولی بھی نہیں سیکھ سکتے جو ان کا پانچ سال کا بچہ بولتا ہے، وہ اس کی مادری زبان ہے۔ جیسے ہم اردو بولتے ہیں، یہ نہیں بول سکتے، چاہے یہ ۲۰ سال بھی سیکھتے رہیں، نہیں بول سکتے۔ ہم سرائیکی بولیں گے، پنجابی بولیں گے، یہ نہیں بول سکتے، کیونکہ ان کے وطن کی زبان میں نہیں ہے...... بہر حال وہ قاری ایک مصری کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ میں فلاں ملک سے آیا ہوں اور میں نے آپ کو قرآن سنانا بھی ہے اور سننا بھی ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو کسی ضروری کام سے جا رہا ہوں تو آپ میرے گھر میں مہمان رہیں۔ واپس آنے کے بعد آپ کا قرآن بھی سنوں گا اور آپ کو قرآن بھی سناؤں گا۔ اللہ نے جو ہمیں

قرآن دیا ہے اسی لیے تو دیا ہے۔

اس کی ایک سات آٹھ سال کی بہن تھی اور اسے کہا کہ میں باہر جا رہا ہوں۔ آپ قاری صاحب کو ناشتہ بھی کروائیں، کھانا بھی کھلائیں اور اگر یہ چاہیں تو ان کا قرآن بھی سن لینا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ تو قاری صاحب نے سورۂ یوسف پڑھی۔ جب وہ مصری قاری آئے تو انہوں نے اپنی بہن کو بلایا تو اس نے کہا کہ مہمان تو چلا گیا اس کو میں نے ناشتہ کرا دیا۔ پوچھا کہ اس نے قرآن سنایا تھا؟ اس نے کہا: ہاں! سنایا تھا، سورۂ یوسف سنائی تھی۔ پوچھا کہ کیسے پڑھتا تھا؟ اس نے کہا کہ حضرت یوسف کو اتنا ان کے بھائیوں نے نہیں ستایا ہوگا جتنا اس حافظ نے ستایا ہے، اس کے بھائیوں نے اتنی تکلیف نہیں پہنچائی جتنی اس حضرت نے تکلیف پہنچائی۔

''مِنْ مِّثْلِهٖ'' کی تفسیر:

''مِنْ مِّثْلِهٖ'' سے کیا مراد ہے؟ اس میں دو قول ہیں:

1 ...... بعض علماء نے فرمایا ﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ﴾ یعنی ''مِثْلِ الْقُرْآنِ'' قرآن کے مثل کوئی آدمی مقابلہ کر کے ایک آیت بھی نہیں بنا سکتا۔

2 ...... اور بعض علماء نے دوسرا ترجمہ فرمایا ﴿مِن مِّثْلِهِ﴾ یعنی ''مِثْلِ مُحَمَّدٍ'' مطلب یہ کہ جیسے حضور ﷺ مکہ میں پیدا ہوئے اور آپ کا لقب ''النبی الامی'' ہے، یعنی مکہ میں پیدا ہوئے، جہاں مدرسہ اور یونیورسٹی کوئی نہیں، کسی استاذ کے پاس پڑھا نہیں، تو ایسا نبی امی جو قرآن پیش کر رہا ہے اس کے مقابلہ پر کوئی اور امی پیش کرے۔

لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس کی تشبیہ کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ تحدی قرآن کی ہو رہی ہے جو اللہ کا کلام ہے، کوئی اس کے مقابلہ پر اللہ کا قرآن بنا کر نہیں لا سکتا۔

اللہ نے انبیاء علیہم السلام کو جو بھی معجزہ دیا اس زمانے کے حال کے مطابق دیا: موسیٰ علیہ السلام کو عصا عطا فرمایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں حکمت اور طب کا بڑا زور تھا تو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو معجزے بھی ایسے ایسے عطا فرمائے کہ بڑے سے بڑا طبیب ان سے عاجز ہے، جیسے پیدائشی نابینا کو تندرست کر دینا اور حضور ﷺ کے زمانہ میں لوگ فصاحت میں بڑے مشہور تھے تو اللہ نے اپنے نبی کو معجزہ قرآن پاک دیا کہ تمام دنیا کے بلغاء اور ادباء حیران ہو گئے! آخر سب کو اقرار کرنا پڑا کہ یہ بندے کا کلام نہیں، بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ نے ان کو چیلنج کیا اور بار بار چیلنج

کیا، مکہ میں بھی اور مدینہ میں بھی۔ اور وہ حضور ﷺ سے بغض رکھنے کے باوجود سب کے سب عاجز آ گئے اور سب کے سب اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس لیے فرمایا:

﴿فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴾ [البقرۃ: ۲۴]

جیسے قرآن معجزہ ہے اسی طرح خبر دینا اور معجزہ ہے کہ اللہ پاک قرآن میں ایک ایسی پکی خبر دے رہے ہیں اور اللہ کا نبی بغیر کسی ڈر کے اور بغیر کسی خوف کے چیلنج کر رہا ہے کہ تم اب بھی مقابلہ کر سکتے ہو اور قیامت تک بھی مقابلہ نہیں کر سکتے ہو۔ دیکھو! صدیاں گزر گئیں، لیکن اللہ کے قرآن کا مقابلہ نہ ہو سکا۔ اس بات سے ثابت ہو گیا کہ قرآن پاک کا یہ دوسرا معجزہ ہے۔

قرآن کی سچی خبریں:

﴿فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴾ [البقرۃ: ۲۴]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے قرآن مقدس کی اس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ قرآن ہر لحاظ سے معجزہ ہے، اعجاز ہی اعجاز ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے الفاظ بھی محکم ہے اور اس کے معانی بھی محکم ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کلام پاک اتارا ہے وہ باعتبار الفاظ کے بھی محکم ہے اور باعتبار معانی کے بھی کہ اس کے معانی مفصل ہیں کہ اللہ نے خود کھول کر بیان فرما دیے اور قرآن پاک کے اندر خود اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی تفسیر فرما دی۔ مفسر فرماتے ہیں کہ الفاظ متصل ہیں اور معنی محکم ہیں یا اس کا عکس کہو یا جیسے بھی کہو تو خلاصہ یہ نکلے گا کہ اس کے الفاظ ہوں یا معنی ہوں وہ اتنے فصیح اور بلیغ ہیں کہ کوئی ان کا مماثل نہیں ہو سکتا، جس کا کوئی محاذی نہیں بن سکتا اور جس کا کوئی مقابل نہیں بن سکتا۔

اور پھر کلام مقدس میں قرآن پاک کا کتنا بڑا اعجاز ہے کہ اللہ نے قرآن پاک میں ایسے ماضی کے واقعات کے بارے میں خبر دی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا، حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان فرمائے، تو جتنی اللہ کے قرآن نے غیب کی خبریں دی ہیں وہ سب کی سب پکی اور حقیقت کے مطابق ہیں، دنیا کی کوئی طاقت ان کو نہیں جھٹلا سکی۔ اس لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے قرآن کے اندر تقریباً دس ہزار مغیبات کا ذکر فرمایا، یعنی دس ہزار ایسی خبریں دی ہیں جو غیب کی خبریں ہیں

ہوئی خبر کو جھٹلا سکے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا تو آج تک دنیا کو یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کو جھٹلا سکے کہ یہ بات غلط ہے اور یہ بات صحیح ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں خبر دی، اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں خبر دی۔ اور چلو وہ تو دور آسمانوں کی باتیں تھیں، اللہ پاک نے جو قومِ لوط کے بارے میں خبر دی، قومِ عاد کے بارے میں خبر دی، قومِ ثمود کے بارے میں خبر دی اور قومِ شعیب کے بارے میں خبر دی تو یہ وہ علاقے تھے جن پر عرب رات دن گزرتے تھے۔ اگر خدانخواستہ قرآن کی خبر کے اندر کوئی ذرا سی بات بھی غلط ہوتی تو دنیا میں شور اٹھا دیتے۔ اس لیے قرآن اس طرح بھی معجزہ ہے کہ اس میں جو خبر دی ہے وہ بالکل سچی ہے۔

اور اللہ نے قرآن کے اندر ہر بھلائی کا حکم دیا اور ہر برائی سے اللہ نے روکا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ﴾ [الانعام:۱۱۵]

اللہ تعالیٰ نے جو خبر دی ہے وہ سچی ہے اور جو اللہ نے حکم جاری فرمایا وہ بالکل عین عدل پر ہے۔

قرآن کی صداقت:

آج دیکھیں کہ چودہ سو سال گزر گئے قرآن پاک نے جو بھی حکم دیا ہے، مثلاً: شراب حرام ہے۔ ساری دنیا میں جتنی قومیں شراب کی عادی ہیں اور جن کے نزدیک ٹھیک ہے، اب چودہ سو سال بعد وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ شراب واقعی بری چیز ہے۔ قرآن نے خبر دی کہ خنزیر حرام ہے۔ جو لوگ خنزیر کو حرام نہیں سمجھتے تھے تو جدید تحقیق نے ثابت کر دیا ہے اور وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ خنزیر کا گوشت نہ کھاؤ، اس سے کینسر پیدا ہوتا ہے اور اس سے فلاں بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو جو اللہ نے حکم دیا ہے وہ عدل پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زنا کو حرام کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے کسی مرد سے بدفعلی اور لواطت کو حرام کر دیا۔ اسی طرح خاوند کا اپنی بیوی سے غلط راستہ استعمال کرنا حرام کر دیا۔ جو کافر لوگ قرآن کو نہیں مانتے تھے چودہ سو سال بعد اب وہ ایڈز کی بیماریوں میں پڑے ہیں۔ تو اب کہا کہ واقعی یہ بیماریاں اسی لیے پھیلی ہیں کہ میں نے غیر فطری طور پر معاملات کو سرانجام دیا ہے۔ اب مرد، مردوں کے ساتھ اور عورتوں جانوروں کے ساتھ، کتوں کے ساتھ اور بندروں کے ساتھ بدفعلی کرتے ہیں اور وہ جراثیم منتقل ہوتے ہیں۔ اب ایڈز اتنا خطرناک ہو گیا ہے کہ اتنا ایٹم بم بھی خطرناک نہیں۔ اب دنیا کہتی ہے کہ یہ بات ٹھیک ہے، اس کو تو بند

ہونا چاہیے۔

اس لیے آپ اندازہ فرمائیں کہ اسلام نے پردہ کا حکم دیا ہے، اسلام نے نکاح اور طلاق کا حکم دیا۔ تو جو معاشرے قرآن کو نہیں مانتے، یعنی کافر ہیں، یہودی ہیں، نصرانی ہیں، عیسائی ہیں اور مجوسی ہیں، اب وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جب تک نکاح کا عادلانہ قانون نافذ نہ کیا جائے اس وقت تک اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ بڑے بڑے قانون بنائے، لیکن سب فیل ہوگئے۔ کبھی انہوں نے طلاق عورت کے ہاتھ میں دے دی، کچھ ہفتہ بعد وہ قانون فیل ہوگیا تو انہوں نے طلاق دوبارہ مرد کے ہاتھ میں دے دی۔ لیکن وہ خرچہ بھرتا رہا، اب پھر ان کی پارلیمنٹ قانون بنارہی ہے کہ بڑی مصیبت ہے کہ ایک عورت کو طلاق ہوگئی، وہ دوسرے کی بیوی بن گئی، لیکن خرچہ پہلا خاوند بھرتا ہے تو اس کا کیا تعلق ہے؟ تو اس لیے قرآن پاک نے جو حکم دیا ہے اور جو خبر دی ہے وہ عین حق ہے، صدق ہے اور عدل ہے، جس کو آج تک دنیا چیلنج نہیں کرسکی اور نہ قیامت تک کوئی چیلنج کرسکتا ہے۔

قرآن کی صداقت اور جامعیت:

اس لیے مفسر فرماتے ہیں کہ اللہ کا کلام تمام سچا ہے، وہ عدل ہے اور ہدایت ہے۔ اللہ کے قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ بلاوجہ بڑھ چڑھ کر کسی کے بارے میں ناجائز بات یا جھوٹی بات کی جائے یا افترا باندھا جائے۔ جیسا کہ عرب میں بڑے بڑے فصیح لوگ گزرے ہیں، بڑے شعراء گزرے ہیں، ان کے کلام میں لازمی بات ہے، جب کسی کی تعریف کرنے پر آئے تو ایسی بے جا تعریف کردی کہ جس کو کوئی عقل بھی تسلیم نہ کرے اور کسی کو اگر بدنام کرنے پر آگئے اور کسی کو ذلیل کرنے پر آگئے تو اس کی ایسی ہجو کرڈالی کہ عقل بھی گوارا نہ کرے۔ اس لیے محاورات عرب میں ہے:

''إِنَّ أَعْذَبَ الشِّعْرِ أَكْذَبُهُ.'' [البلاغۃ العربیۃ:۱/۳۰]

''شعر تو سب سے میٹھا وہی ہوتا ہے جو جھوٹا ہو۔''

مثال مشہور ہے کہ جھوٹا قصہ بڑا میٹھا ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ بنایا جاتا ہے کہ بڑے بڑے شعراء جیسے متنبی اپنے ممدوح کی تعریف کررہے تھے کہ میرا ممدوح جب میدانِ جنگ میں گھوڑا دوڑاتا ہے تو جب گھوڑا دوڑتا ہے اور گھوڑے کے دوڑنے سے جو مٹی اڑتی ہے تو اس کے اوپر ایک ایسے سڑک بن جاتی ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اس پر گھوڑا دوڑا سکتا ہے۔ بھلا یہ کوئی عقل کی بات ہے......!؟ اندازہ فرمائیں! اتنی مدح کردینا کہ ایک بدصورت ہو تو

اس کے بارے میں کہا کہ چاند اس کا چہرہ دیکھ کر شرما جاتا ہے۔ شعری کلام کے اندر کذب ہوتا ہے، افتراء ہوتا ہے، جھوٹ ہوتا ہے، ناجائز مبالغہ ہوتا ہے، ناجائز اس کے اندر مدح ہوتی ہے اور ناجائز ہجو ہوتی ہے...... اللہ تبارک و تعالیٰ رحم فرمائے...... لیکن اللہ کے کلام کے اندر نہ کسی قسم کا غلو ہے اور نہ کسی قسم کا افتراء ہے، بلکہ عین حق، صدق، هدیٰ، عدل اور رحمت ہے، کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے۔

مفسر فرماتے ہیں کہ تم ایک لمبا چوڑا قصیدہ پڑھو تو اس کے اندر یا تو عورتوں کی تعریف ہوگی یا شراب کی تعریف ہوگی یا ایک شخص معین کی مدح ہوگی یا کسی گھوڑے کی یا اونٹنی کی یا جنگ کا واقعہ جو اچانک پیش آ گیا یا کوئی ایسی ڈراونی چیز ہوگی یا جنگلی جانور بھیڑیا وغیرہ کی تعریف ہوگی یا شاعر نے کسی چیز کا مشاہدہ کیا یا کسی خاص واقعہ کا مشاہدہ کیا تو اس کے بارے میں کوئی کلام لکھ دیا، جس سے کوئی فائدہ نہیں۔ عورتوں کے حسن کے بارے میں تعریف لکھ ڈالے گا، کبھی اس کے رخسار کی تعریف، کبھی اس کی زلفوں کی تعریف، کبھی اس کے قد و قامت کی تعریف اور کبھی کیا اور کبھی کیا ہے۔ جس سے یہ تو پتہ لگتا ہے کہ شاعر کلام پر قدرت رکھتا ہے، اس کے علاوہ تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یا کبھی کوئی چیز خفی ہوگی، باریک ہوگی تو اس کو ذکر کر دے گا۔ پھر اس کے قصیدے کے اندر دو چار بیت ایسے بھی ہوں گے جن کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ لیکن جب تم قرآن کا مطالعہ کرو گے تو قرآن پورے کا پورا فصاحت و بلاغت کی انتہاء پر پہنچا ہوا ہے۔ جو لوگ عربی کو سمجھنے والے ہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ کلام کی تعبیر کیسے کی جاتی ہے۔

اگر تم اللہ کے قرآن میں جو اخبار ہیں ان کو دیکھو گے کہ کیا بہترین حلاوت ہے! اور دیکھو گے کہ بعض خبریں کتنی مختصر ہیں، بعض خبریں کتنی فصیح و بلیغ ہیں اور بعض خبریں بار بار متکرر ہیں۔ ویسے دنیا کے کلام کے اندر ایک ایک چیز کو بار بار کہا جائے تو اس کی عزت ختم ہو جاتی ہے، لیکن قرآن پاک نے ایک ہی قصہ کو کئی سورتوں کے اندر بیان کیا ہے، لیکن جس سورت میں پڑھو گے پہلے سے زیادہ حلاوت اور لذت محسوس ہوگی۔ یہ اللہ کے قرآن کا کمال ہے کہ جتنا پڑھو گے کبھی بوسیدہ نہیں ہوگا اور جو علم والے ہیں ان کا کبھی قرآن سے پیٹ بھر نہیں سکتا۔ اور قرآن پاک میں جب تم وعید کی آیات کو پڑھو گے، جس کے اندر اللہ نے اپنے بندوں کو ڈرایا ہے تو وعید کا ایسا انداز ہے کہ بندے کے بال کھڑے ہو جائیں، پہاڑ بھی ہل جائیں اور جب وہ پہاڑوں کو ہلا ڈالے تو پھر تمہارا کیا گمان ہے ان دلوں کی طرف جو قرآن کو سمجھنے والے ہیں۔ اس لیے آپ قرآن پاک کی تاریخ اٹھا کر پڑھیں! لاکھوں لوگوں نے اللہ کا قرآن سنا، ایک آیت یا دو آیتوں پر پہنچے تو فوراً ایمان لے آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن کی چند آیات سنیں تو

رونے لگ گئے۔ اسی طریقے سے بہت سے لوگ ہیں ڈاکہ ڈالنے جارہے ہیں اور کانوں میں آواز پڑی:

﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ﴾ [الحدید:١٦]

فوراً توبہ کرلی۔ یہ اللہ کے قرآن کا کمال ہے۔ اخبار میں دیکھو تو صداقت ہے اور وعید میں دیکھو تو اللہ پہاڑوں کو بھی ہلاڈالے، چہ جائیکہ دلوں کا مسئلہ کیا ہے؟ اور اللہ نے قرآن میں جو وعدے بیان فرمائیں ہیں اور اپنے مومن بندوں کو جو خوشخبریاں دی ہیں اگر ان پر تم غور کرو کہ اللہ پاک نے جنت کا کیسے وعدہ فرمایا؟ جنت کا کیسے شوق دلایا؟ دارالسلام کا اللہ نے کیسے منظر بیان فرمایا؟ کہ کوئی نفس جانتا نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے لیے کیا کیا نعمتیں چھپا رکھی ہیں، جو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں گی۔ وہ ایسی نعمتیں ہیں۔ چونکہ ان کو بدلہ دیا جائے گا کہ جوانہوں نے دنیا کے اندر عمل کیا تھا تو فرمایا:

﴿يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِنْ ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ ۖ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۖ وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ [الزخرف:٧١]

مسلمانو! جنت کے اندر ایسی نعمتیں ہوں گی جو تیرے دل کی خواہش ہوں گی اور آنکھوں کو لذت ملے گی اور اس میں ہمیشہ رہو گے۔ کبھی اللہ قرآن میں ترہیب کرتے، یعنی ڈراتے ہیں کہ اے لوگو! تم کیا بے غم ہو گئے ہو کہ اللہ کا عذاب آئے اور تم زمین میں دھنس جاؤ اور کبھی فرماتے ہیں:

﴿أَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ﴾ [الملک:١٦]

''کیا تم بے غم ہو گئے اللہ اس عذاب سے کہ اگر وہ چاہے تو تمہیں زمین کے اندر دھنسا دے؟''

﴿أَمْ أَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ﴾ [الملک:١٧]

''یا تم بے غم ہو گئے ہو اس بات سے کہ اللہ تم پر کوئی سخت عذاب نازل فرمادے اور اس کے بعد تم جانو گے کہ اللہ کا ڈرانا کیسا ہے؟''

اور کبھی زجر آیا تو فرمایا: اگر ہم نے کسی کو پکڑا ہے تو اس کے گناہ کی وجہ سے پکڑا ہے۔ اور کہیں اللہ کا قرآن وعظ و نصیحت فرمارہا ہے:

﴿أَفَرَأَيْتَ إِنْ مَتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ۝ ثُمَّ جَاءَهُمْ مَا كَانُوا يُوعَدُونَ ۝ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يُمَتَّعُونَ﴾

[الشعراء:۲۰۵تا۲۰۷]

''(اللہ نے فرمایا کہ) تمہیں پتہ ہے کہ ان کو چاہے دنیا کے اندر جتنی مدت گزارنے کے لیے مل جائے، لیکن انجام یہ ہے کہ انہوں نے اس کی طرف لوٹ آنا ہے، جو ہم نے ان کے لیے تیار کر رکھا ہے اور جو دنیا میں انہوں نے فائدہ اٹھایا تھا وہ انہیں کیا فائدہ پہنچائیں گے؟''

فصاحت و بلاغت اور حلاوت کے جتنے عنوان ہیں، یعنی اللہ کے قرآن میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی ہے، ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی ہے، تحذیر بھی ہے اور تبشیر بھی ہے، اوامر بھی ہیں اور نواہی بھی ہیں اور زجر بھی ہے اور بشارات بھی ہیں۔ جس انداز میں ترغیب پر نظر ڈالو، ترہیب پر نظر ڈالو، انذار پر نظر ڈالو، تبشیر پر نظر ڈالو، مواعظ پر نظر ڈالو اور اوامر پر نظر ڈالو، جس حیثیت میں بھی اللہ کے قرآن پر نظر ڈالو گے یہ ماننا پڑے گا ''کُلُّهُمْ صِدْقٌ وَّ عَدْلٌ وَّ حَقٌّ وَّ هُدًی'' قرآن سب کا سب سچا ہے، سراپا عدل ہے، سراپا ہدایت ہے، سراپا نور ہے اور سراپا رحمت ہے۔ اب دنیا کا کوئی کلام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور جب تم قرآن کے اوامر پر نظر ڈالو گے کہ اللہ نے حکم دیا: نماز پڑھو، روزہ رکھو، حلال کھاؤ اور طیبات استعمال کرو تو تم دیکھو گے کہ اللہ کے ہر حکم کے اندر نفع ہی نفع ہے اور خیر ہی خیر ہے۔ اللہ پاک نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے وہ چیز بری ہے، اس کے اندر ذلت ہے اور دناءت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب قرآن میں آیا ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾، جب مومنوں کو خطاب آئے تو اپنے کانوں کو پورا متوجہ کر کہ اب آگے جو امر آ رہا ہے، اگر امر ہوگا تو سراپا خیر ہوگی اور اگر نہی ہوگی تو تمہیں کسی برائی سے روکا جا رہا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خطاب فرماتے ہیں۔ اسی اللہ نے فرمایا، قرآن میں تمہیں حکم دیتے ہیں ''یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ'' بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے تمہیں منع کرتے ہیں، پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتے ہیں اور خبیث چیزوں کو حرام کرتے ہیں اور جو تمہارا بوجھ ہے اس کو ہٹاتے ہیں۔ یعنی اللہ کے قرآن نے کہیں حکم دیا ہے تو وہ خیر ہے، معروف ہے اور جس چیز سے بھی منع کیا ہے تو لازمی طور پر وہ چیز تمہارے لیے ظاہر میں بھی نقصان والی ہے اور باطن میں بھی نقصان والی ہے۔ اس لحاظ وہ دنیا و آخرت میں نقصان والی چیزیں ہیں۔ اب سارے احکام دنیا میں واضح ہیں۔

اب عقل سلیم ہو کہ سارا قرآن پڑھ جاؤ، کوئی حکم بھی ایسا نہیں ہے کہ اللہ نے حکم دیا ہو اور وہ ہماری بہتری اور بھلائی کے لیے نہ ہو۔ اللہ نے جس چیز سے ہمیں روکا ہو مثلاً: اللہ نے حکم دیا کہ جانور ذبح کر کے کھاؤ، بغیر ذبح کے نہ

کھاؤ۔ حالانکہ کافر لوگوں کا اس پر کوئی ایمان نہیں، کرنٹ بجلی سے، مختلف چیزوں سے جانور کو مار دیتے ہیں۔ جانور آیا، اس کو بجلی کا کرنٹ لگا اور مر گیا۔ اب جو بڑے بڑے دنیا کے ڈاکٹر ہیں ان کی تحقیق کے بعد وہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مسلمانوں کا جو ذبح کا طریقہ ہے وہ بہتر ہے، اس لیے کہ جو اللہ نے دم مسفوح رکھا ہے، ذبح کرنے میں جو گندہ خون نکلتا ہے تو اب اس کے اندر مضرت نہیں رہتی اور اگر کرنٹ سے مار دیا جائے، ڈنڈے سے مار دیا جائے اور اوپر سے گرا دیا جائے تو خون اندر منجمد ہو جاتا ہے، جو بعد میں انسان کے لیے تباہی کا باعث بنتا ہے۔ چودہ سو سال پہلے میرے آقا خاتم الانبیاء حبیب کبریا محمد رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اگر برتن خراب ہے تو اسے تین دفعہ دھو ڈالو اور فرمایا: اگر کتا کسی برتن میں منہ مارے تو اس کو سات دفعہ دھوؤ، ایک دفعہ مٹی ڈال کر دھوؤ۔ آج چودہ سو سال کے بعد جدید علم نے اس تحقیق پر فیصلہ کیا ہے کہ کتے کے منہ کے اندر جو جرثومہ پایا جاتا ہے وہ دنیا کی کسی دوا سے نہیں مر سکتے، آگ میں ڈالو تو نہیں جل سکتے، ان کی موت صرف مٹی سے ہو سکتی ہے اور کسی چیز سے نہیں ہو سکتی، یعنی چودہ سو سال کے بعد سائنس اس مقام پر پہنچی جو آمنہ کے لال نے چودہ سو سال پہلے خبر دی تھی۔ میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا: اپنے ہاتھوں سے کھانا کھایا کرو اور کھانے کے بعد اپنی انگلیوں کو چاٹ لیا کرو اور صاف کر لیا کرو۔ اب انگریزوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مسلمان ہاتھ گندے کر لیتے ہیں، ہم چمچ سے کھاتے ہیں۔ ہاتھ کتنا صاف ہوتا ہے اور یہ انگلیوں سے اپنے ہاتھ خراب کر رہے ہیں، جراثیم منہ کے اندر جا رہے ہوں گے اور پتہ نہیں کیا کہا۔ اب چودہ سو سال کے بعد ان کے جتنے بڑے بورڈ ہیں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اللہ نے ان تین انگلیوں میں ایسے اینزائم رکھے ہیں کہ اگر ان کو چوس لیا جائے تو انسان کا نظام ہضم خراب نہیں ہوتا۔ اب دنیا اس بات پر آ گئی۔

اور جو چمچ سے یا چھری سے یا کانٹے سے کھاتے ہیں اب ان کو عقل آ گئی۔ ایک واقعہ لکھا ہے شاید حضرت تھانوی کا ہے یا کسی اور کا ہے کہ ایک دفعہ وہ ٹرین پر سفر کر رہے تھے۔ اسی ڈبہ میں ایک بڑا پڑھا لکھا جدید تعلیم یافتہ آدمی بھی سوار تھا۔ اتفاق سے کھانے کا ٹائم ہو گیا۔ انہوں نے بھی کھانا کھولا اور انہوں نے بھی کھانا کھولا۔ اس آدمی نے چھری کانٹے سے کھانا شروع کیا، مولوی آدمی نے اپنے ہاتھ سے کھانا شروع کیا تو اس نے بڑے گھٹیا اور طنز کے انداز میں کہا کہ دیکھو! کیوں بلاوجہ ہاتھ ڈال کر کھا رہے ہو؟ ایک چمچ لے لو۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے تو میرے محبوب ﷺ کا حکم یہی ہے، تمہیں تمہارے آقا کا حکم ہے، تم اس کی تعمیل کرو، ہم اپنے آقا ﷺ کی تعمیل کرتے ہیں۔ تمہیں اگر اپنے آقا کی سنت پیاری ہے تو ہمیں بھی اپنے آقا ﷺ کی سنت پیاری ہے، ہم تو نہیں چھوڑ سکتے۔ خیر!

وہ باتوں کے خیال میں ایسا کھویا کہ کانٹے سے کوئی چیز منہ میں ڈالنے کے لیے اٹھائی تو گاڑی نے ایک بریک ماری تو سیدھا حلق میں کانٹا لگا اور خون کا فوارہ پھوٹا۔ اللہ نے اسی وقت عذاب نازل کر دیا۔ اب وہ کہتا ہے کہ آپ نے بددعا کر دی۔ انہوں نے فرمایا: میں نے بددعا نہیں کی، تم نے محمد مدنی ﷺ کی سنت پر اعتراض کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس کی سزا دی ہے۔ میں کسی کے لیے کیوں بددعا کروں؟

اسی طرح آپ اندازہ فرمائیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ عورت اگر حیض کی حالت میں ہو تو میاں بیوی آپس میں نہ ملیں:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۲۲]

حالتِ حیض میں اپنی بیویوں کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں۔ لیکن کافروں نے، انگریزوں نے ان باتوں کا کوئی خیال نہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کو گولی کھلا دو، خون بند ہو جائے گا۔ آج انجام کیا پہنچا کہ وہ عورتیں جو اسلام پر عمل کرتی ہیں ان کو...... الحمد للہ...... کبھی کینسر نہیں ہوا اور جو ان چیزوں کا خیال نہیں کرتیں تو ان میں سے ۷۰ فیصد عورتیں کینسر میں مبتلا ہیں۔

اسلام نے حکم دیا:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ﴾ [البقرۃ:۲۳۳]

تمام مائیں اپنے بچوں کو خود دودھ پلائیں۔ عورت کے لیے ضروری ہے کہ اپنے بچے کو دو سال تک دودھ پلائے، لیکن انگریزوں نے مخالفت کی اور ماں کے دودھ کو روک کر بچوں کو ڈبے کے دودھ پر لگا دیا۔ آج پھر چودہ سو سال بعد اخبارات اور رسائل چیخ رہے ہیں کہ عورتیں اپنا دودھ پلائیں، بچے کے لیے سب سے بہتر ماں کا دودھ ہے اور جو عورتیں دودھ نہیں پلاتیں ان کے پستانوں میں کینسر ہو جاتا ہے۔ پھر یہ ایسی بیماری ہے کہ اس کا علاج بھی نہیں، یعنی اسلام نے یہ حکم ہمیں چودہ سو سال پہلے عطا فرمایا تھا۔

اسی طرح آپ دیکھ لیں کہ اسلام نے حکم دیا کہ اگر خاوند مر گیا تو عورت چار مہینے دس دن انتظار کرے۔ اب انگریزوں کو یہ باتیں کہاں سے سمجھ آ سکتی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ ایک آدمی مر گیا، بس ختم ہو گیا اور سیٹ خالی ہو گئی تو

دوسرا آدمی کرسی پر بیٹھ جائے۔ یہ کیا ضرورت ہے کہ خوامخواہ ایک عورت چار مہینے اور دس دن انتظار کرتی رہے، لیکن اس بات کو نہ سمجھ سکے کہ چار مہینے اور دس دن کا اسلام نے اس لیے حکم دیا تھا کہ خاوند مر گیا، ہوسکتا ہے کہ عورت کے پیٹ میں بچہ ہو تو چار مہینے دس دن کے بعد اس میں روح پھونک دی جاتی ہے، یعنی اگر حمل ہو تو پہلے مہینے میں حمل واضح نہیں ہوگا، دوسرے میں اور تیسرے میں بھی نہیں، لیکن جب چار مہینے گزر جائیں گے تو اب بچے کی حرکت شروع ہو جائے گی اور واضح ہو جائے گا کہ پیٹ میں بچہ ہے یا نہیں ہے۔ اگر پیٹ میں بچہ موجود ہے تو میرے نبی ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ))

جس کو اللہ اور آخرت پر یقین ہے، وہ ایسا ہرگز نہ کرے کہ کسی دوسرے کے پودے کو پانی ڈالتا رہے۔

[سنن الترمذي، حديث: ١١٣١، باب: مَا جَاءَ فِي الرَّجُلِ يَشْتَرِي الْجَارِيَةَ ...]

پودا تو کسی کا ہے اور یہ بلا وجہ پانی ڈالنے کی حرکت کیوں کرے؟ جب تک کہ عورت حمل سے فارغ نہ ہو جائے۔ جب حمل سے فارغ ہو جائے تو اب وہ دوسری جگہ نکاح کرے، کیونکہ پہلے حمل کا فیصلہ بھی ختم ہو گیا۔ اگر حمل ہوگا تو وضع حمل ہو جائے گا اور اگر حمل نہیں ہوگا تو چار مہینے دس دن گزر جانے سے عورت مکمل طور پر مطمئن ہو جائے گی کسی قسم کا کوئی اختلاف اور کسی قسم کا کوئی فساد دنیا میں پیش نہیں آئے گا۔

اسی طرح اسلام کا کوئی بھی حکم دیکھ لیں اسلام نے نکاح کا حکم دیا، تاکہ مرد اور عورت ایک عقد میں بندھ جائیں اور پھر فرمایا کہ تم یہ نکاح لذت نکالنے کے لیے نہ کرو، یہ نکاح اس لیے نہ کرو کہ چلو نکاح کروں گا۔ نکاح کا مقصد یہ ہے کہ اس میں توالد ہو، تناسل ہو، اس میں خطبہ پڑھنے والا خطبہ پڑھے، گواہ ہوں اور اعلان ہو، تاکہ کسی کی عزت پر کوئی آدمی غلط تہمت نہ لگا سکے۔

اور پھر حکم دیا کہ کبھی اپنی زبان سے طلاق کا لفظ نہ نکالو۔ اگر طلاق کا لفظ نکالو گے تو عورت حرام ہو جائے گی اور اس پر بھی کتنی رعایت کی کہ انسان ہے، اگر غصہ میں آ کر اس نے ایک دفعہ طلاق دی تو اس کو اسلام نے حق دیا ہے کہ تم رجوع کر سکتے ہو، دو آدمیوں کے سامنے کہہ دو کہ میں نے اپنی بیوی سے رجوع کر لیا تو بات ختم ہو گئی۔ اگر دو دفعہ طلاق دے بیٹھے پھر بھی اسلام نے اجازت دی کہ اگر مدت ختم ہو گئی تو تم دوسرا نکاح کر لو۔ اور اگر تین دفعہ طلاق دے تو عورت مغلظہ ہو گئی۔ حکم دیا کہ جب ایک دفعہ طلاق سے بیوی علیحدہ ہو سکتی تھی اور دو طلاقوں سے بیوی علیحدہ

ہوسکتی تھی تو تم نے بلاوجہ تین طلاقیں دی ہیں، اب اس خاوند کے پاس اس عورت کو کبھی نہیں آنا چاہیے جب تک کہ وہ عورت دوسری شادی نہ کرے، کیونکہ جس خاوند نے اس کی عزت نہیں کی، طلاقیں دے کر اس کو ذلیل کیا ہے، اس کے گھر میں واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پھر یہ بھی حکم دیا کہ اگر بیوی کو طلاق دینے کی نوبت بھی آجائے اور عورت حیض میں ہو تو طلاق نہ دو، عورت حاملہ ہو تو طلاق نہ دو۔ اگر طلاق دینی ہے تو حیض گزر جائے، عورت پاک ہو جائے اور میاں بیوی آپس میں لیٹ گئے تو اسلام کہتا ہے کہ پھر بھی طلاق نہ دو۔ پھر اگلے حیض میں ہو تو میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں۔ دور ہوتے ہیں تو نفرت بڑھتی رہے گی، لیکن جب عورت پاک ہوگئی تو ہوسکتا ہے کہ مل جائیں اور زیادہ مسئلہ نہ بڑھے۔ اس طرح اسلام نے کہا کہ اگر تم مل گئے ہو تو پتہ نہیں تیرا حمل ٹھہر گیا ہو تو تم طلاق نہ دو، بلکہ اگلے حیض کا انتظار کرو، حیض کے اندر بھی طلاق نہ دو، پھر پاک ہونے کا انتظار کرو۔ منشاء اسلام یہ ہے کہ صلح ہو جائے۔

اور ہمارے عقل والوں نے کیا قانون بنایا؟ جیسے تمہارے ملک کے اندر بھی ایک قانون ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے۔ دعا کرو کہ اللہ وہاں قرآن وسنت کا قانون نافذ کرے اور یہ بھی اللہ کے کعبہ میں سن لو اور پلے باندھ لو کہ جب تک تیرے ملک میں قرآن وسنت کا قانون نہیں بنایا جائے گا نہ تیرا ملک بچ سکتا ہے اور نہ امن ہوسکتا ہے۔ ایک بات پلے باندھ لو۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ اس بات کو جلدی سمجھ لو یا...... نعوذ باللہ...... اپنا ملک لٹوانے کے بعد سمجھو۔ عقل والا آدمی پہلے سمجھ لیتا ہے اور بے وقوف آدمی گھر جانے کے بعد سمجھتا ہے۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی بنیاد نکال دو تو وہ کیا بچے گی؟ اگر دیوار کی بنیاد نکال دو تو کیا دیوار رہ سکتی ہے؟ اگر ایک مکان کی نیچے سے بنیادیں کھود لو تو کیا دیوار رہے گی؟ ہمارے ملک کی بنیاد ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' تھی، اگر وہ بنیاد رکھو گے تو ملک رہے گا اور اگر ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' والی بنیاد نکال دو گے تو پوری دنیا کے قانون بناؤ تو کبھی وہ توڑ دے گا اور کبھی وہ توڑ دے گا۔ اسی طرح نتیجہ یہ نکلے گا اللہ وقت نہ دکھائے اور اللہ وہ وقت قیامت تک نہ لائے کہ پہلے آدھے سے محروم ہو چکے ہو، کہیں باقی بھی ختم نہ ہو جائے۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھو! امن ہوگا، سلامتی ہوگی، برکتیں ہوں گی اور رحمتیں ہوں گی جب اللہ کے قرآن اور سنت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مانو گے، جب اس کو نافذ کرو گے اور تسلیم کرو گے اور بہانے نہیں بناؤ گے کہ اگر اس طرح کریں گے تو یوں ہو جائے گا۔ اگر سود نہیں لیں گے تو قرضے کیسے ادا کریں گے؟ اور بینک کیسے چلیں گے؟ یہ اگر مگر نہیں۔ اسلام ہے کہ اللہ فرماتے ہیں کہ تم بیس پرسنٹ پر بیٹھے ہو اور میں زمین کے خزانے

کھول دوں گا، تم میرے قانون کو مانو تو سہی، تم عمل تو کرو، تم بیس پرسنٹ کے جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہو۔ اللہ فرماتے ہیں: میں تو قادر ہوں کہ پہاڑوں کو حکم دوں گا: سونا بن جاؤ، زمینوں کو حکم دوں گا: خزانے نکال دو، برسات کو حکم دوں گا: اب میرے بندوں نے کاشت کرنی ہے، برسنا شروع کردو۔ اب کپاس نکل آئی ہے، اب نہ برسو، کپاس تیار ہوجائے۔ فرمایا: یہ نظام تو میرے ہاتھ میں ہے، تمہارے ہاتھ میں تو نہیں ہے۔

عرضی نویسوں کا خاوندوں پر ظلم:

ہمارے ملک میں جو پڑھے لکھے عرضی نویس ہوتے ہیں، چاہے کوئی ایک طلاق دے وہ بدبخت تین لکھیں گے۔ اس کے پاس جب کوئی طلاق نامہ لکھوانے جائے گا تو وہ کہے گا کہ میں نے طلاق دے دی ہے، طلاق دے دی ہے، طلاق دے دی ہے۔ پھر آگے لکھے گا: اپنے نفس پر حرام کیا، اپنے نفس پر حرام کیا۔ بالکل پکا کام کرے گا، کیونکہ کہتا ہے کہ میں جو لکھنے کے بیس روپے لے رہا ہوں، اس کا کام تو پکا کروں۔ وہ کام کیا پکا کرے گا؟ وہ تو دونوں کو برباد کررہا ہے۔ تو اب یہ آپ کا قانون کہتا ہے کہ طلاق دینے کے بعد وہ ایک نوٹس چیئرمین یونین کونسل کو جاری کرے گا کہ میں نے اپنی بیوی مسماۃ فلاں کو طلاق دے دی ہے۔ طلاق نامہ لف ہذا ہے۔ مہربانی فرما کر اس پر قانونی کاروائی کی جائے۔ اب چیئرمین فریقین کو نوٹس جاری کریں گے: خاوند کو بھی نوٹس جاری کرے گا اور بیوی کو بھی نوٹس جاری کرے گا کہ تم فلاں دن میری کورٹ میں آکر پیش ہو اور اپنے ثالث مقرر کرو۔ دو ثالث مرد والے مقرر کریں اور دو ثالث عورت والے مقرر کریں۔ چار ثالث اب دونوں کی صلح کرائیں، کوشش کریں اور آپس میں جھگڑا ختم ہوجائے۔ اگر انہوں نے جھگڑا ختم کرلیا اور صلح ہوگئی تو وہ ثالث رپورٹ بھیجیں گے کہ جناب! زوج اور زوجہ میں مصالحت کرادی ہے، لہٰذا طلاق کو غیر مؤثر قرار دیا جائے۔ وہاں سے ایک سرٹیفکیٹ جاری ہوجائے گا کہ طلاق غیر مؤثر ہے، ان کی صلح ہوگئی ہے۔ اور اگر وہ رپورٹ دیں گے کہ صلح ہونا ممکن نہیں ہے، بڑی کوشش کی ہے، لیکن ہماری کوشش ناکام ہوگئی ہے۔ اس کے بعد چیئرمین صاحب نوٹس جاری کریں گے کہ طلاق پکی ہوگئی، مؤثر ہوگئی اور اب ان کی صلح کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یعنی آپ سب سے پہلے اس قانون پر غور کریں کہ جو شخص طلاق دے رہا ہے، اس اور اس کی بیوی کے درمیان چیئرمین کا کیا تعلق ہے؟ یہ تو میاں اور بیوی کا مسئلہ ہے۔ چیئرمین کی نہ بیٹی ہے اور نہ بیٹا ہے، اس کا کیا تعلق ہے؟ دوسری بات یہ سوچیں کہ طلاق پہلے ہوگئی اور صلح بعد میں ہوگئی، یعنی

پوری دنیا میں کوئی ایسا بے وقوف آدمی ہے کہ قانون تو نہ ہوا، بلکہ نشئی کا لوٹا ہو گیا۔
مثال مشہور ہے کہ ایک نشئی پیشاب کرنے کے لیے جائے اور لوٹا لے کر جائے تو اس لوٹے میں سوراخ تھے...... نشئی لوگ ان کا پیشاب بھی لمبا ہوتا ہے......تو جب تک پیشاب کرتا رہے، پانی بہہ جائے۔ اب وہ دیکھے کہ لوٹے میں کچھ نہیں، وہ دوبارہ جائے اور لوٹا بھر کر آئے اور پیشاب کرے، اتنے میں لوٹا ختم ہو جائے۔ تیسری مرتبہ جب وہ تنگ آیا تو اس نے لوٹے کو کہا کہ تم نے بڑا تنگ کیا ہے، تمہارا سوراخ تو میں بند نہیں کر سکتا، ہم پہلے استنجا کریں گے اور بعد میں پیشاب کریں گے، تم بہتے ہو تو بہتے رہو۔ یہ دنیا کا بے وقوف آدمی تھا۔ آپ نے دیکھا ہے کہ طلاق پہلے ہو جائے اور صلح بعد میں ہو۔ اصول یہ تھا کہ اگر آپ نے قانون بنانا بھی تھا اور اللہ کے قرآن کی بغاوت کرنی بھی تھی تو عقل کرتے کہ خاوند نوٹس دیتا کہ میں بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ یہ نہیں کہ میں نے طلاق دے دی ہے، بلکہ میں طلاق دینا چاہتا ہوں۔ اب چیئرمین ان کو روکتا کہ ان کو روکو، پہلے ان کی صلح کرائے۔ اب صلح نہ ہوتی تو ان کا طلاق کے ساتھ اور چیئرمین کا نافذ کر دینا ہوتا۔ یہ تو نہیں کہ میں نے طلاق دے دی ہے، نافذ کرو۔ اس کا طلاق کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اس لیے جتنے قانون اللہ کے قانون کے خلاف بنائے گئے، نہ وہ عقل کے مطابق ہیں۔ اور دو سال کے بعد یا چار سال کے بعد پارلیمنٹ کہتی ہے کہ یوں ترمیم کرو اور یہ ترمیم غلط ہو گئی، اس میں یوں ترمیم کرو۔ قرآن کا قانون ہے، چودہ سو سال گزر گئے، کوئی مائی کا لال ایک بھی کمزوری نہیں بیان کر سکتا۔ اس کے اندر لچک کی ضرورت نہیں، تبدیلی کی ضرورت نہیں، کسی اضافہ کی ضرورت نہیں اور کسی تنقیص کی ضرورت نہیں۔

قرآن کی خوبیاں:

اس لیے مفسر نے فرمایا کہ قرآن کو جس نظر سے بھی پڑھو گے فصاحت اور بلاغت ہی بلاغت ہے۔ اگر تم آخرت کی باتیں پڑھو گے اور وہاں کے جو حالات ہیں اور دوزخ کی باتیں پڑھو گے، اللہ نے جو وہاں دوستوں کے لیے نعمتوں کا ذکر کیا ہے، دشمنوں کے لیے جہنم کی انواع کا ذکر کیا ہے۔ اس کے اندر بشارت بھی ہے اور تنذیر بھی ہے، اچھے کام کی طرف وہ دعوت دیں گی اور برائی سے روکنے والی ہوں گی، دنیا سے بے رغبتی پیدا کریں گی اور آخرت کی رغبت پیدا کریں گی اور ایک ایسے طریقے پر تمہیں چلائیں گی اور وہ نعمتیں اور انذار اور ابشار تمہیں شریعت محمدی پر چلنے کا ذریعہ بنیں گی اور تمہارے دلوں سے شیطان مردود کی پلیدی ختم کریں گی۔
اس طرح صحیحین کے اندر روایت ہے کہ حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

پہلے جتنے انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں، اللہ پاک نے ان کو بھی نشانیاں اور معجزے دیے ہیں، جن پر اس وقت کے انسان ایمان لائے، لیکن جو مجھے اللہ نے وحی دی ہے، یہ ایک ایسا معجزہ ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ قیامت میں سب سے زیادہ میری امت ہوگی اور مجھے ماننے والے ہوں گے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۲۷۳، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ، صحیح مسلم، حدیث: ۲۳۹]

اس سے اشارہ ملتا ہے کہ اللہ نے جو کلام اللہ کا معجزہ دیا، اس سے پہلے پیغمبروں کو جتنے معجزے ملے ان کو یہ مقام نصیب نہیں ہوا، جتنا قرآن کو نصیب ہوا ہے۔ اسی طرح میرے آقا نامدار ﷺ کو اللہ نے آپ کی نبوت پر اور آپ کی صداقت پر ایسی نشانیاں دی ہیں اور وہ اتنی ہیں کہ اگر ان کو گنا جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو نہیں گن سکتی۔ متکلمین نے بہت بڑے بڑے کلام اور بہت بڑے بڑے دلائل دیے ہیں۔ بعض دلائل اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق ہیں اور بعض دلائل معتزلہ کے عقائد کے مطابق ہیں۔ مفسر فرماتے ہیں کہ معتزلہ یا ان غیروں کے طریقوں کو پکڑ کر ہمیں دفاع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر ہم بات ماننے کے طور پر اس طرح کریں اور مقصود اللہ کے قرآن کا اثبات ہو اور اللہ کے قرآن کا اعجاز ہو تو دنیا کا کوئی بشر اس کے مقابلہ کی طاقت ہی نہیں رکھتا۔

بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ بندے طاقت رکھتے تو تھے، لیکن کر نہیں سکے۔ انہیں کہیں گے کہ چلو تمہاری بات بھی مان لیں کہ طاقت رکھنے کے بعد بھی قرآن کا مقابلہ نہ کر سکنا یہ بھی تو قرآن کا معجزہ ہے، ورنہ اصول تو یہی ہے جو عقیدہ اہل والجماعت کا ہے: کوئی بندہ قرآن کے مطابق کلام بنانے کی طاقت ہی نہیں رکھتا، کیونکہ قرآن فی نفسہٖ معجز ہے۔ اگر برسبیلِ تنزل کہ ہم نیچے اتر آئیں اور تمہاری بات مان لیں کہ طاقت رکھتا ہے، لیکن دشمنی کے باوجود اور طاقت رکھنے کے باوجود مقابلہ نہ کر سکنا، پھر یہ بھی تو قرآن کا اعجاز ہے۔ مفسر فرماتا ہے کہ اگر ہم اس انداز میں بھی ہم دیکھیں گے اللہ کا قرآن سراپا معجز ہے۔ قیامت تک محفوظ ہے اور کوئی دنیا کی طاقت آج تک نہ مقابلہ کر سکی ہے اور نہ قیامت تک نہ کر سکے گی۔

اسی طرح فیضی نے، حریری نے...... یہ بھی اپنے اپنے دور میں فائق کلام تھے...... اس طرح روم اور یونان میں بڑے بڑے خطیب گزرے ہیں، جو کلام میں بڑے مایہ ناز لوگ سمجھے جاتے تھے، لیکن اگر کوئی عقل والا اور انصاف والا غور کرے تو صاف بات سمجھ آجائے گی کہ ان لوگوں نے تو سالہا سال استاذوں سے پڑھا، سالہا سال

تک تعلیم و تعلم کے مراحل طے کیے، علوم حاصل کیے، کتابیں پڑھتے پڑھتے ان کی زندگیاں گزر گئیں اور اس کے بعد اگر انہوں نے کوئی بات کہی ہے تو اپنے دور کے لوگوں نے اس کو اچھا سمجھا ہے۔ یہ تو کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا اس کلام سے جو ایسے ماحول میں اتارا گیا کہ نہ ماحول علمی ہے، نہ آگے لوگ علمی ہیں اور جس ذات پاک پر اتارا گیا نہ اس نے کبھی ایک دن مدرسہ میں پڑھا ہے۔

معجزہ کا معنی یہ ہوتا ہے کہ بغیر اسباب کے چیز ظاہر ہو۔ اگر اسباب کے ساتھ چیز کو ظاہر کیا جائے تو وہ معجزہ نہیں کہلاتا۔ مثال: آج اگر آپ یورپ کے کسی ملک کی آواز ریڈیو، ٹی وی کے ذریعے سن لیتے ہیں تو یہ کوئی معجزہ ہے؟ یہ تو اسباب ہیں کہ باقاعدہ اسٹیشن قائم کیے گئے ہیں، سیارات سے مدد لی گئی اور سیٹ بنائے گئے۔ یہ اسباب ہیں اور معجزہ تب ہوگا کہ جب یہ سارے ذرائع موجود نہیں تھے اور آمنہ کے لال ﷺ منیٰ میں خطبہ پڑھا رہے ہیں، ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ ؓ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے، ہر آدمی اپنے اپنے خیمے میں کپڑے ڈال کر جگہ بنا کر بیٹھا ہے اور فرماتے ہیں کہ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ حضور ﷺ ہمارے خیمے میں تقریر فرما رہے ہیں۔ معجزہ تو تب ہوگا جب وسائل اور اسباب نہ ہوں۔ اسباب کے ذریعے اور اسباب کے تحت اگر کوئی چیز معرضِ وجود میں آجائے تو اس کو معجزہ نہیں کہا جائے گا۔ آج اگر ہوائی جہاز آدمیوں کو لے کر اڑتے ہیں، آج ایسے بھی طیارے دنیا میں آگئے ہیں جو آواز سے بھی تیز رفتار ہیں یا آ رہے ہیں تو یہ کوئی معجزہ نہ ہوا۔ مشینیں ہیں، اسباب ہیں اور اس پر ارب ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں۔ معجزہ تو تب ہے کہ ایک تخت رکھا ہے، اللہ کے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا کو حکم دیتے ہیں کہ اس تخت کو اڑاؤ۔ تو ہمیشہ یاد رکھیں کہ معجزہ اس کو کہا جاتا ہے کہ بغیر اسباب ظاہری کے اللہ کی قدرت سے کسی نبی کے ہاتھ سے ایک چیز سامنے آئے اور وہ ایسی چیز ہو کہ دنیا اس کا توڑ نہ کر سکے اور نہ لا سکے ویسی چیز۔

اور اسی طرح کرامت ہوتی ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ ولی کے ہاتھ پر ایک امرِ خارق عادت ظاہر فرما دیں، بغیر ظاہری اسباب کے اللہ پیدا فرما دیں۔ حضرت عمر ؓ منبر رسول پر کھڑے ہیں اور صحابہ ؓ نہاوند میں جہاد میں کھڑے ہیں، مدینہ سے سینکڑوں میل دور لڑ رہے ہیں۔ حضرت عمر ؓ وہاں سے ایک آرڈر جاری کرتے ہیں اور ہوا اسے پہنچا دیتی ہے تو یہ کرامت ہوگی۔ اگر آپ نے وائرلس کے ذریعے، ٹیلی فون کے ذریعے اور فائبر لائنوں کے ذریعے کوئی پیغام پہنچا دیا تو یہ کرامت نہیں، یہ تو اسباب ہیں۔ اس لیے بعض لوگ اس دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ فیضی نے کہا۔ تو فیضی نے تو ایک کلام لکھا اور ایک کتاب بغیر نقطوں کے لکھ دی تو کون سا بڑا پہاڑ ہے؟ سعدی نے

فارسی میں کلام لکھا یا کالی داس نے سنسکرت میں یا ہومر نے یونانی میں لکھا اور اسی طرح اردو میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے، اپنے دور میں ابوالکلام پیدا ہوئے اور بہادر یار پیدا ہوئے، عطاء اللہ شاہ بخاری پیدا ہوئے، جو خطابت کے شہسوار تھے، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ کوئی کرامت تھی، کرامت تو تب ہوتی جب اسباب بھی نہ ہوتے۔ یہ معجزہ ہے کہ ماحول بھی موافق نہیں اور قوم بھی امی ہے اور میرے مدنی پاک ﷺ کا لقب بھی النبی الامی ہے کہ حضور ﷺ ابھی پیدا نہیں ہوئے، والد فوت ہو گئے۔ سات سال کی عمر ہے اور والدہ فوت ہو گئیں۔ کفالت آپ کے دادا نے کی، پھر ابی طالب نے کی۔ ایک دن بھی حضور ﷺ نے جا کر مدرسہ میں نہیں پڑھا، حضور ﷺ دور دراز کے کسی علمی ملکوں میں نہیں گئے اور جس شہر مکہ میں، بطحا میں، ام القریٰ میں آپ کا قیام ہے وہاں کوئی علم والا آدمی نہیں، کوئی احبار نہیں، کوئی رہبان نہیں اور کوئی اہل کتاب نہیں اور چالیس سال کی زندگی گزرنے کے بعد اللہ کا نبی غار حرا سے اور جبلِ نور کی چوٹی سے اترتے ہیں، ایک ایسا کلام پڑھ رہے ہیں کہ دنیا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تو معجزہ تو اس کو کہا جائے گا۔

اور دوسرا اندازہ لگائیں کہ اس کلام میں اتنا اثر ہے کہ جب حج کا زمانہ قریب آنے لگا تو کفار مکہ کے سارے سردار پریشان ہو گئے کہ اب جو لوگ حج کرنے کے لیے آئیں گے لازماً محمد عربی ﷺ کو ملیں گے اور حضور ﷺ کا کلام جب سنیں گے تو وہ مسلمان ہو جائیں گے تو ہم اس کا کیا توڑ کریں؟ سارے اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے۔ کسی نے کہا کہ ہم کہیں گے کہ یہ شاعر ہیں، جیسے شاعر لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن کا کلام بڑا عجیب ہوتا ہے! کسی نے کہا کہ ہم یہ کہہ دیں گے کہ کاہن ہیں کہ وہ بھی غیب کی خبریں دیتے ہیں، تیسرے نے کہا: نہیں نہیں! ہم یہ کہہ دیں گے کہ مجنون ہیں، ولید بن المغیرہ جو ان سب سے عمر رسیدہ تھا اور سب سے زیادہ سمجھدار تھا، وہ کھڑا ہو گیا، اس نے کہا: خبردار! کیا کہہ رہے ہو؟ تم جتنے بیٹھے ہو تم سب سے زیادہ شعر و شاعری کو میں سمجھنے والا ہوں، لیکن خدا کی قسم! محمد عربی ﷺ جو کلام پڑھتا ہے وہ اشعار نہیں ہیں۔ حالانکہ ولید بن مغیرہ دشمن ہے، کافر ہے، اس نے کہا: تم کہتے ہو کہ کاہن ہے، میں نے کاہنوں کو دیکھا ہوا ہے، ان کی اگر ایک خبر سچی ہوتی ہے تو دس جھوٹی ہوتی ہیں اور محمد عربی ﷺ کی ایک خبر بھی غلط نہیں ہے۔ اور تم کہتے ہو کہ مجنون ہے۔ دیوانہ بھی بھلا ایسی باتیں کرتا ہے کہ مکہ میں بیٹھ کر خبر دے کہ روم اور فارس کے درمیان لڑائیاں ہوں گی، پہلے روم کو شکست ہو گی اور فارس غالب آئے گا، پھر روم غالب آئے گا۔ ان کی تو ہر بات حرف بحرف سچی ہوتی ہے۔ ایسے آدمی کو...... نعوذ باللہ...... مجنون کہہ سکتے ہیں؟ اور اس

کے بعد اس نے کہا کہ یاد رکھو! میں نے قرآن خود اللہ کے نبی ﷺ کی زبان سے سنا ہے اور اس کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ ''وَاللهِ إِنَّ لِقَوْلِهِ لَحَلَاوَةً'' خدا کی قسم! قرآن میں ایک ایسی مٹھاس ہے جو دلوں کو کھینچ لیتی ہے ''وَإِنَّ فِيهِ تَرَاوَةً'' اس کے او پر ایک تر و تازگی ہے کہ جب قرآن سنو تو تازہ ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ پھر ہم لوگوں کو کیا کہیں؟ اس نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ جادوگر ہے، کیونکہ جادو کرنے والا جتنے لوگوں کو اپنے زیر اثر کر لیتا ہے، جادو کر کے غلام بنا لیتا ہے اور لوگوں کو ہپناٹائزم کر دیتا ہے، تم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ ساحر ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات ہماری نہیں چل سکتی۔ حالانکہ دشمن تھے تو اسی سے آپ اندازہ لگائیں۔

[سیرۃ ابن ہشام: ۱/۲۶۹، خَبَرُ الْوَلِيدِ بْنِ الْمُغِيرَةِ فِيمَا يَصِفُ بِهِ الْقُرْآنَ]

واقعہ:

حضرت ابی ذر رضی اللہ عنہ ان کے بھائی انیس رضی اللہ عنہ بہت بڑے شاعر تھے، انہوں نے مکہ کے اندر قرآن سنا تو بھائی یعنی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم نے کیا سنا ہے؟ انہوں نے کہا: خدا کی قسم! میں خود شاعر ہوں، ہر کلام کو سمجھنے والا ہوں، لیکن محمد عربی ﷺ جو کلام پڑھ رہے ہیں وہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۷۳، باب: مِنْ فَضَائِلِ أَبِي ذَرٍّ رضی اللہ عنہ]

اندازہ کریں کہ اتنی دشمنی کے باوجود کتابوں میں موجود ہے کہ ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریک، یہ تین آدمی رات کو چھپ چھپ کر جاتے تھے کہ محمد عربی ﷺ قرآن پڑھیں تو ہم سنیں۔ ابوجہل اور اخنس بن شریک جیسا دشمن اور ابوسفیان جنہوں نے کفر کے زمانے میں سب سے بڑی دشمنیاں کیں، یہ تینوں مختلف راستوں سے چھپ کر آتے کہ جب حضور ﷺ رات کو اٹھیں گے اور تہجد میں کھڑے ہو کر اللہ کا قرآن پڑھیں گے تو ہم سنیں گے۔ اور ایسے ایسے راستے سے آئے کہ کوئی ہمیں دیکھ بھی نہ لے۔ خدا کی شان یہ ہے کہ آئے تو اپنے اپنے راستے سے جب صبح قریب آئی لوٹنے لگے تو تینوں مل گئے۔ اس نے کہا: تم کدھر گئے تھے؟ اور اس نے کہا: تم کدھر گئے تھے؟ آخر ان کو ماننا پڑا کہ میں تو اللہ کے نبی کا قرآن سننے کے لیے گیا تھا۔ انہوں نے کہا: اس بات کو ظاہر نہ کرو۔ اگر مکہ والوں کو پتہ چل گیا تو ایک ہی رات میں سارے مسلمان ہو جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ یہ سردار تو خود رات کو جا کر قرآن سنتے ہیں اور ہمیں قرآن سننے سے روکتے ہیں۔ لیکن صبر نہ ہوسکا، دوسری رات چھپ کر آئے اور صبح کو پھر تینوں مل گئے اور انہوں نے کہا کہ ہم نے رات کو یہ فیصلہ کیا تھا، لیکن کلام ایسا ہے کہ دل کرتا ہے کہ سنتے رہیں۔ یعنی اندازہ کریں

کہ ابو جہل جیسا دشمن ہے۔ [السیرة النبویة: ۱/۳۳۴ بقصة استماع قریش الی قراءة النبی صلی اللہ علیہ وسلم]

نضر بن الحارث نے کلام سنا تو اس نے قرآن سننے کے بعد فوراً یہ کہا:

''وَاللّٰهِ! لَيْسَ هٰذَا مِنْ كَلَامِ الْبَشَرِ''

''یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔''

اس انداز میں بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ دشمنوں نے باوجود دشمنی کے اور اور باوجود اپنی فصاحت و بلاغت کے اقرار کیا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، کسی بندے کا کلام نہیں ہو سکتا۔

اور تاثیر کلام کا یہ عالم ہے کہ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ابھی کفر کے زمانہ میں تھا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھاتے ہوئے دیکھا اور نماز میں آپ سورۂ طور کی تلاوت فرما رہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سورۂ طور کی تلاوت کو ختم کیا تو کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! میرے دل میں قرآن اور اسلام داخل ہو چکا تھا۔

اس طرح تاثیر کا یہ عالم دیکھیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن سنا اور چند آیتیں سنیں تو فوراً پوچھا ''اَیْنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ؟'' اللہ کے نبی اب کہاں ہوں گے؟ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور فوراً اسلام میں داخل ہو گئے۔ [سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۳۴۳، إسلامُ عُمَرَ بنِ الخطابِ رضیَ اللهُ عنهُ]

اس طرح اللہ کے قرآن میں یہ بات موجود ہے اور آج بھی تم پڑھ سکتے ہو کہ سورۃ الجن پوری اتاری گئی۔ جب قرآن کو جنات نے سنا تو انہوں نے بھی کہا:

﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾ [الجن: ۱، ۲]

''ہم نے قرآن سنا ہے، بڑا عجیب کلام ہے! جو رشد اور ہدایت کی طرف بلانے والا ہے، اس لیے جب ہم نے قرآن سنا تو ایمان لے آئے۔''

دوسری جگہ بھی اللہ نے جنات کے بارے میں قرآن میں فرمایا کہ جب انہوں نے قرآن سنا تو کہنے لگے:

''اَنْصِتُوْا... اَنْصِتُوْا'' چپ کرو، چپ کرو، سنیں کیا پڑھ رہا ہے!؟

﴿فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ [الاحقاف: ۲۹، ۳۰]

جن واپس گئے اور کہا کہ اے قوم! ہم نے ایک ایسا کلام سنا ہے جو موسیٰ کی کتاب کی طرح ہے۔

اس لیے یہ اللہ کا قرآن معجزہ ہے کہ اس جیسا اثر کوئی کتاب آج تک پیدا نہ کر سکی۔

اور اسی طرح علماء نے لکھا کہ باعتبار اِخبار بھی قرآن معجزہ ہے، یعنی اللہ کے قرآن نے جتنی خبریں عطا فرمائی ہیں: حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ آیا، نوح علیہ السلام کا قصہ آیا، قومِ عاد قوم، ثمود اور قومِ سبا کا قصہ آیا، جتنے بھی واقعات کے بارے میں اللہ کے قرآن نے خبر دی آج چودہ سو سال گزر گئے دنیا کی کوئی طاقت اس کو جھٹلا نہ سکی۔

اسی طرح آپ اندازہ فرمائیں کہ اللہ کے قرآن خبر دی کہ چاند دو ٹکڑے ہوا۔ چلو مکہ والوں نے تو آنکھوں سے دیکھا۔ اب دشمنوں نے بڑے اعتراض کیے، لیکن اگر غور کیا جائے تو اللہ کے قرآن نے خبر دی: چاند دو ٹکڑے ہوگا تو لازمی بات ہے کہ چاند رات کو دو ٹکڑے ہوگا اور جب مکہ میں آدھی رات ہوگئی۔ یہ ضروری نہیں کہ پوری دنیا میں آدھی رات ہو، کہیں صبح ہو چکی ہوگی تو وہاں چاند نظر نہیں آسکتا، کہیں ابھی رات شروع بھی نہیں ہوگی تو وہاں بھی چاند نظر نہیں آسکتا اور کہیں اگر آدھی رات ہو چکی ہو تو کچھ لوگ سو چکے ہوں گے، کیونکہ ساری دنیا سرزمین عرب کی عادات تو نہیں رکھتی، جیسے آپ کے ملک ہیں کہ لوگ مغرب سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں اور عشا کے بعد سو جاتے ہیں، لیکن ان چیزوں کے باوجود دشمنوں نے شہادت دی، ''تاریخ فرشتہ'' جو ہند کی بڑی پرانی تاریخ ہے، اس کے اندر بھی موجود ہے کہ گوالیار ریاست کا ایک راجہ کہتا ہے کہ رات کو میں اپنے محل کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا، میں نے بھی چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا مشاہدہ کیا۔

اللہ کے قرآن نے جتنی بھی خبریں دی، حقیقت تھیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر دی، اصحاب الفیل کا واقعہ حضور ﷺ کی پیدائش سے پہلے گزر چکا تھا، حضور ﷺ نے وہ ہاتھیوں والا واقعہ دیکھا ہی نہیں، حضور ﷺ تو اسی سال پیدا ہوئے ہیں، لیکن قرآن نے جو خبر دی اس کا ایک ایک لفظ سچا ثابت ہوا کہ آج تک اسے نہ جھٹلایا جا سکا۔ تو قرآن اس اعتبار سے بھی معجزہ ہے۔

اور اسی طرح اللہ کا قرآن پڑھنے سے بوسیدہ یا پرانا نہیں ہوتا۔ دنیا کی کوئی کتاب ہے آپ اس کو کتنی دفعہ پڑھیں، پانچ دفعہ یا دس دفعہ اس کو پڑھ لیں گے، اس کے بعد آپ اکتا جائیں گے، اس کے بعد اس کو دیکھیں گے بھی نہیں، لیکن چودہ سو سال گزر گئے، رات اور دن اللہ کا قرآن پڑھا جاتا ہے اور ایسے بھی لوگ ہیں جو دو پارے، پانچ پارے، دس پارے روزانہ اور ایسے بھی لوگ ہیں جو سارا سارا قرآن ایک دن میں ختم کرتے ہیں، لیکن بار بار

پڑھ رہے ہیں، کبھی دل نہیں بھرتا۔

اور اسی طرح علماء نے فرمایا کہ قرآن باعتبار اس کے بھی معجزہ ہے کہ آج تک پوری دنیا کے لوگ ایک کتاب پیش نہیں کر سکے جس کتاب کو اتنے لوگوں نے سینوں میں محفوظ رکھا ہوا اور حفظ کیا ہو۔ اللہ کے قرآن کے علاوہ پوری دنیا کو آپ چیلنج کریں کوئی آدمی ایسا پیش کریں جس نے قرآن کے علاوہ کوئی کتاب یاد کی ہو۔ چلو ہندوؤں کا اپنا ایک مذہب ہے، وہ اپنے مذہب کے کسی وید کا کوئی حافظ دکھائیں۔ عیسائیوں کا بھی اپنا ایک مذہب ہے، وہ اپنی انجیل کا کوئی حافظ دنیا میں پیش کریں۔ یہودیت کا بھی اپنا ایک مذہب ہے، وہ اپنا ایک تورات کا حافظ پیش کریں۔ اسی طریقے سے بڑے بڑے زرتشت ہیں، مسیحی ہیں، یہودی ہیں، مجوسی ہیں، آتش پرست ہیں، بڑی بڑی قومیں ہیں اور دنیا میں موجود ہیں ان کے پاس وسائل بھی ہیں، دولت بھی ہے، علم بھی ہے اور بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے پی ایچ ڈی کرنے والے ان کے پاس لوگ ہیں، اپنی کتاب جس کو وہ مانتے ہیں اس کا ایک حافظ تو دنیا میں پیش کریں۔ تو قرآن باعتبار اس کے بھی معجزہ ہے کہ یہ قرآن اللہ کی واحد کتاب ہے، اللہ کا کلام ہے کہ جو ایک نہیں، ہزار نہیں، لاکھوں سینوں میں محفوظ ہے کہ جس ملک میں آپ چلے جائیں، جس علاقے میں آپ چلے جائیں، کوئی نہ کوئی اللہ کے قرآن کا حافظ آپ کو مل جائے گا۔

آپ حیران ہوں گے کہ کمیونزم نے ستر سال تک ظلم کر کے پوری رشیا (روس) کی زمین میں اذانیں بند کر دیں، مساجد کو تالے لگا دیے، قرآن مجید کا نسخہ اس ملک میں رکھنا اور گھروں میں پایا جانا ایک جرم تھا اور جس پر باقاعدہ سزا تھی۔ کوئی اذان نہیں کہہ سکتا تھا، کوئی نماز نہیں پڑھ سکتا تھا اور کوئی قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا، یعنی جب باہر کے لوگ روس کے اندر جاتے تھے تو جیسے ایک دفعہ علماء کا ایک وفد گیا۔ ایئر پورٹ پر نماز کا وقت ہو گیا تو ہمارے بھائی مولانا عبدالقادر آزاد صاحب ہیں، انہوں نے ان لوگوں سے کہا کہ ہماری تو نماز کا وقت ہو گیا ہے تو وہاں کا جو عالم استقبال کے لیے آیا ہوا تھا، بظاہر کپڑے بھی ہیں، لباس بھی ہے، داڑھی بھی ہے، اس نے علیحدہ آ کر کہا کہ آپ تو چلے جائیں گے، لیکن ہمارے لیے عذاب آ جائے گا، اس لیے مہربانی کریں، نماز کا اول وقت بھی ہے اور آخر وقت بھی ہے، آپ اپنے ہوٹل کے اندر لاک کر کے چپ کر کے پڑھ لیجیے گا، وگرنہ یہاں نماز پڑھنا مسئلہ ہے۔ ہم بظاہر مہمان سمجھتے ہوئے آپ کو انتظام کر دیں گے، لیکن پھر ہم پر عذاب مسلط ہو جائے گا کہ ہم لوگوں نے ایسے حالات پیدا کیے کہ آپ نے ایئر پورٹ پر نماز پڑھی۔ اذان بند، مساجد بند، اللہ کے قرآن کا کسی کے گھر کے اندر موجود

ہونے پر پابندی، لیکن ستر سال کے بعد جب کیمونزم کا سحر ٹوٹا، باطل کا جادو ٹوٹ گیا تو میرے اپنے ساتھی اور میرے والد صاحب کے شاگرد ہیں...... اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے...... وہ اس وقت وہاں اڑھائی سو مساجد کی بنیاد رکھ چکے ہیں۔ اللہ کی مہربانی سے وہ فرماتے ہیں کہ جب میں وہاں گیا تو لوگوں نے کہا کہ الحمد للہ ہمارے ہاں اب بھی قرآن کے حافظ موجود ہیں، یعنی اتنا اس کے مٹانے پر زور لگایا گیا، لیکن قرآن موجود ہو۔ جن کے پاس حکومت ہو، طاقت ہو، شوکت ہو، عیسائیت ہو، یہودیت اس وقت پورے عالم پر دندنا رہے ہیں، لیکن ایک تورات کا حافظ پیش نہیں کر سکتے، ایک انجیل کا حافظ پیش نہیں کر سکتے۔ ہندو کے پاس بے انتہا وقت اور دولت ہے، ایک وید کا حافظ پیش نہیں کر سکتے۔ اپنی کتابوں کا ایک حافظ پیش نہیں کر سکتے، کسی کو کچھ اشلوک یاد ہوں گے، کسی کو کچھ منتر یاد ہوں گے بس۔

اعجاز قرآنی کی طرف قرآنی اشارات:

اسی طرح اعجاز کلام پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی مقامات پر فرمایا ''عَرَبِيًّا'' اور کہیں فرمایا ''عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ'' کہ صرف عربی میں بھی نہیں، بلکہ عربی کھلی ہوئی۔ اور اسی طرح علماء نے فرمایا کہ قرآن بایں اعتبار بھی معجزہ ہے کہ باطل کو مٹانے والا ہے اور حق کو اٹھانے والا ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ قواعد کی نظر سے دیکھو تو قرآن معجزہ ہے، بلاغت کی نظر سے دیکھو تو قرآن معجزہ ہے، فصاحت کی نظر سے دیکھو تو قرآن معجزہ ہے، صداقت کی نظر سے دیکھو تو قرآن معجزہ ہے، حق و باطل کے درمیان تفریق کی نظر سے دیکھو تو قرآن معجزہ ہے اور علوم کی جامعیت کے بارے میں دیکھو تو قرآن معجزہ ہے۔ اور پھر اللہ نے قرآن میں جس مسئلہ کا جو حل پیش کیا ہے چودہ سو سال گزر گئے آج تک اس کی تکذیب نہیں ہو سکی، اس کے مقابلہ پر کوئی حل پیش نہیں ہو سکا۔ اسی سے اندازہ فرمائیں کہ میں نے خود اپنی نظر سے دیکھا کہ لوگ اتنی محنتیں کرنے کے بعد یہاں تک پہنچے کہ لوگوں نے ایٹم تلاش کیا، ایک ایٹم تباہی کا ذریعہ بن جائے...... اللہ ہر اسلام ملک کو محفوظ رکھے...... لیکن قرآن پاک نے اس کے بارے میں پہلے اشارہ کر دیا:

﴿وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝﴾

[الفیل: ۳تا۵]

ایک ذرے کے برابر پتھر اٹھایا ہوا ہے اور وہ اس پرندے کی چونچ میں ہے، ایک اس پنجہ میں ہے اور ایک اس پنجہ میں ہے۔ اور وہ ہاتھی کے اوپر اور سار بان کے سر پر ڈالتا ہے، جو ہاتھ کے اندر سے نکل کر زمین میں دھنس

جاتا ہے اور اس ہاتھی ختم کر دیتا ہے۔ اسی طرح آج دنیا سائنس میں ترقی کے بعد ایک نتیجے پر پہنچی ہے کہ یہ جتنے نباتات ہیں، پھل پیدا ہوتے ہیں، سبزیاں پیدا ہوتی ہیں اور انگور پیدا ہوتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کے دانے کیسے جڑے ہوئے ہیں؟ کبھی انار کو کھول کر دیکھیں کہ انار کے دانوں کی ترتیب کیسے ہے؟ اسی طرح مکئی کے دانوں کو دیکھ لیں اور کسی چیز کو دیکھ لیں تو انہوں نے آج چودہ سو سال گزر جانے کے بعد اور علم کی اتنی ترقی کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نباتات میں ایک مادہ ہوتا ہے جسے کلوروفل کہا جاتا ہے۔ وہ سبز رنگ کا ایک مادہ ہے، جو پھولوں کے اندر جو دانے ہوتے ہیں ان کو بنانے کا اور جوڑنے کا سبب ہوتا ہے۔ اور قرآن پاک نے پہلے بتا دیا:

﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ﴾ [الانعام:۹۹]

وہ ایک سبز مادہ جو ہم نے پیدا کیا ہے وہ دانوں کو جوڑتا ہے۔ تو قرآن پاک نے تو اس کی پہلی خبر دے دی۔ یہ تو چودہ سو سال کی تحقیقات کے بعد وہاں جا کر پہنچے ہیں۔ آج دنیا بڑا زور لگا رہی ہے کہ ہم چاند پر پہنچ گئے اور اللہ نے قرآن میں پہلے فرما دیا:

﴿وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ؀﴾ [الاعراف:۵۴]

جیسے زمین کو ہم نے تمہارے لیے تابع کر دیا ہے، ایسے تارے بھی ہم نے تمہارے لیے مسخر کر دیے۔ اللہ کے قرآن نے اس کے بارے میں پہلے خبر عطا فرما دی تو کسی بھی نظر سے جب دیکھا جائے تو لازماً ہمیں اس نتیجے پر پہنچنا ہوگا اور اقرار کرنا ہوگا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، کسی بندے کا کلام نہیں، کسی بشر کا کلام نہیں، بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے اور کلام برحق ہے۔

اور علماء نے فرمایا کہ قرآن کا یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ آج تک محفوظ ہے، قیامت تک بھی محفوظ رہے گا اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار اللہ ہے۔

قرآن کا کفار کو چیلنج:

حضور ﷺ کے زمانہ میں مسیلمۃ الکذاب نے اور اسود عنسی اور "ثَلَاثُوْنَ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ" نے قرآن کو

مٹانے کی کوشش کی، روافض کا فتنہ پیدا ہوا اور خوارج کا فتنہ پیدا ہوا۔ انہوں نے قرآن میں تحریف اور تبدیلی کی کوششیں کی، لیکن تمام کوششیں ناکام ہو گئیں، ان کو رسوا کر گئیں اور اللہ کا قرآن جیسے اترا تھا اور جیسے اس دن محفوظ تھا اسی طرح آج بھی محفوظ ہے اور اسی طرح قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اس لیے میرے اللہ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا کہ میرے مدنی! آپ ان کفار کو تحدی کریں اور چیلنج کریں، قرآن نے مکہ میں بھی چیلنج کیا اور قرآن نے مدینہ میں بھی چیلنج کیا۔ قرآن نے پہلے یہ چیلنج کیا کہ تم پورا قرآن نہیں بنا سکتے ہو تو چلو دس سورتیں بنا کر لے آؤ، پھر قرآن نے یہ چیلنج کیا کہ اگر تم دس سورتیں بھی نہیں بنا سکتے تو ایک سورت بنا کر لے آؤ، پھر قرآن نے انہیں یہ چیلنج کیا کہ اگر ایک سورت بھی نہیں بنا سکتے ہو تو ایک آیت بنا کر لے آؤ۔ قرآن نے ایک جگہ چیلنج نہیں دیا اور تمام چیلنج کرنے کے بعد اللہ نے ایک فیصلہ فرما دیا کہ میرے مدنی! آپ اعلان فرما دیں:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ [الاسراء: ۸۸]

میرے اللہ نے فرمایا کہ اگر سارے بندے اور سارے جن جمع ہو جائیں کہ قرآن کے مقابلہ پر بنا کر لے آئیں تو ہرگز مقابلہ کر کے نہیں آ سکتے، چاہے سب ایک دوسرے کی مدد کیوں نہ کریں، معاونت کیوں نہ کریں، لیکن اللہ کے قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

وقود کا معنی:

اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا کہ ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے تیار کر دی گئی ہے۔ ''وَقُوْدُ'' واؤ کے زبر کے ساتھ، مَایُلْقٰی فِی النَّارِ کہ جو آگ میں ڈالا جاتا ہے آگ کو بھڑکانے کے لیے، جیسے آگ میں لکڑیاں وغیرہ ڈالی جاتی ہیں، تاکہ آگ بھڑک جائے، اس کو ''وَقُوْدُ'' کہتے ہیں۔ اور جہنم کا ''وَقُوْدُ'' انسان اور پتھر ہوں گے، جیسے اللہ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ [الجن: ۱۵]

جو لوگ ظلم کرنے والے ہیں وہ جہنم کے لیے ایسے ہوں گے جیسے جہنم کی لکڑیاں۔

اور جیسے اللہ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ [الانبیاء:۹۸،۹۹]

فرق:

اور اسی سے ایک مسئلہ یہ بھی سمجھ لیں کہ جنت اور جہنم دونوں مخلوق ہیں اور دونوں اللہ پیدا فرما چکے ہیں، یعنی اس وقت جنت بھی موجود ہے اور جہنم بھی موجود ہے۔ اور اسی طرح عقیدہ اہل سنت والجماعت میں ہے کہ جنت آسمانوں میں بنائی گئی ہے، جیسے حدیث پاک میں اس کی تائید ہوتی ہے۔ میرے آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((فَاِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْاَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ)) [مشکاۃ المصابیح، حدیث:۳۷۸۷، کتاب الجہاد]

جب تم اللہ سے جنت کا سوال کرو اور جب اللہ سے جنت مانگو تو فردوس اعلیٰ مانگا کرو، کیونکہ وہ سب سے بڑی جنت ہے اور سب سے اعلیٰ جنت ہے، ورنہ اللہ کے ہاں تو کئی جنتیں ہیں: جنت النعیم ہے، جنت عدن ہے، جنت الخلد ہیں اور جنت الفردوس ہے وغیر وغیرہ۔

جنت الفردوس کے بارے میں علماء نے فرمایا ہے کہ ساتوں آسمان گویا کہ اس کی زمین ہے اور اللہ کا عرش معلّی گویا کہ اس کی سب سے نیچے ہے۔ اور بعض روایات میں یہ بھی اشارات ملتے ہیں کہ جہنم تو موجود ہے، لیکن اس میں مزید اضافات، یہ جو سمندر ہے، قیامت جب آئے گی تو اللہ شمس وقمر کو بھی اور نجوم سیارات سب کو آگ کی صورت میں بھڑکا دیں گے۔ پھر یہ پانی گرم ہو کر آگ بن جائے گا اور پھر نیچے جو جہنم موجود ہے اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے، لہٰذا سب کا سب جہنم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں اور ہر مسلمان کو پناہ دیں۔

فرقہ معتزلہ کا نظریہ:

لیکن فرقہ معتزلہ فرقہ ضالہ ہیں۔ ان کے عقیدے میں یہ ہے کہ بعض فرقہ معتزلہ کہتے ہیں: جہنم موجود نہیں ہے اور جنت موجود نہیں ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ قیامت میں پیدا فرمائیں گے۔ یعنی بعض معتزلہ کی جماعتوں کا یہ عقیدہ ہے اور بعض فرق معتزلہ کا بالکل ہی یہ عقیدہ ہے کہ جنت اور جہنم کا وجود ہی نہیں ہے۔ اسی لیے پھر وہ عذاب قبر کے منکر ہیں۔ کہتے ہیں کہ عذاب قبر نہیں ہوتا۔ بس انسان مرجاتا ہے اور مرنے کے بعد وہ مٹی میں مل جاتا ہے اور بات ختم ہوگئی۔ اگر وہ مومنین سے ہے تو اس کی روح اعلیٰ علیین میں چلی جاتی ہے اور کافر کی روح ہے تو وہ سجین میں چلا جاتی ہے۔

اس قبر کے اندر جب کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے تو عذاب کس کو ہوتا ہے؟ تو وہ عذاب قبر کے بھی منکر ہیں، لیکن عقیدہ اہل سنت والجماعت یاد رکھیں کہ عذاب قبر ہوتا ہے، مگر نظر نہیں آتا، اس لیے کہ اس کا تعلق عالم الغیب سے ہے۔ اور دنیا میں جتنی سزائیں مرتب ہوتی ہیں وہ بدن پر ہوتی ہیں۔ ہمیں نظر نہیں آتا، روح متاثر ہوتی ہے، یعنی اگر چور کا ہاتھ کاٹا جائے، کسی ڈاکو کی ٹانگ کاٹی جائے، کسی قاتل کی گردن کو کاٹ دیا جائے تو اب ظاہراً تلوار ہاتھ پر لگی، تلوار تو ٹانگ پر ماریں گے، تلوار گردن پر ماریں گے اور روح متاثر ہو رہی ہے اور روح ہمیں نظر نہیں آرہی، اسی طرح عذاب قبر کا حکم جسم کے ساتھ روح پر بھی مرتب ہوتا ہے، چاہے ہمیں جسم نظر آئے یا نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر ذرہ اپنی جگہ پر موجود ہوتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک دفعہ میت ہمارے سامنے رکھ دی جائے اس کو عذاب بھی ہو رہا ہو، لیکن ہمیں پتہ نہ ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے آگے یہ بھی مشکل نہیں ہے۔

جیسا کہ خواب کی کیفیات میں اللہ نے ہمیں دکھلایا ہے کہ بعض اوقات دو آدمی ایک کمرے میں سو رہے ہیں: ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ مجھے عذاب ہو رہا ہے اور ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ باغوں میں مزے کر رہا ہوں۔ مگر ہمیں تو کچھ بھی نظر نہیں آتا، نہ باغ نظر آتا ہے اور نہ عذاب نظر آتا ہے، حالانکہ جب وہ اٹھتا ہے تو اس خواب سے گھبرایا ہوا ہوتا ہے یا خوش ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ بھی ہوا ہے کہ خواب سے جب بیدار ہوئے تو زخم کے نشان بھی ان پر پائے گئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں نمونہ دکھلایا ہے کہ اگر زندگی میں تم جیتے جاگتے ایک کمرے میں سوئے ہوئے پتہ نہیں کر سکتے تو تم مردے کے عذاب کا کیسے پتہ کر سکتے ہو؟ میں اپنی قدرت سے عذاب دیتا ہوں، جیسے میری مرضی آئے۔ میرے علم کے اندر ہر چیز ہے، جنت اور جہنم ہر چیز تیار ہو چکی ہے۔

اسی طرح عقیدہ اہل والجماعت میں یہ ہے کہ جنت بھی موجود ہے اور جہنم بھی موجود ہے۔ جہنم کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

﴿أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۴]

''کافروں کے لیے تیار کر دی گئی ہے۔''

اور جنت کے لیے کہہ دیا گیا:

﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ [آل عمران:۱۳۳]

''متقین کے لیے تیار کر دی گئی ہے۔''

اور پھر سب سے بڑی شہادت ہمارے آقا سرکار مدینہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے کہ اللہ پاک نے مجھے معراج والی رات جنت کی سیر کرائی ہے اور میں نے جنت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا گھر دیکھا، میں نے حضرت امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا گھر دیکھا اور میں نے جنت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے چلنے کی آوازیں سنیں۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے جہنم میں ان لوگوں کو جو زنا کرتے ہیں عذاب ہوتا ہوا دکھلایا گیا، ان لوگوں کو جو سود کھاتے ہیں عذاب ہوتا ہوا دکھلایا گیا، ان لوگوں کو جو چغل خور ہوتے ہیں عذاب ہوتا ہوا دکھلایا گیا، ان لوگوں کو جو مولوی ہو کر حق نہیں کہتے عذاب ہوتا دکھلایا گیا۔ جب میرے آقا ﷺ خود بچشم ذات ملاحظہ فرما کر گواہی دے رہے ہیں، پھر اگر کوئی نہ مانے تو گویا اس کا نبوت پر ایمان نہ رہا۔ اور اسی طرح میرے آقا ﷺ نے یہ بھی گواہی فرمائی: ایک دفعہ حضور ﷺ گزر رہے تھے کہ راستے میں دو قبریں تھیں۔ حضور ﷺ رک گئے اور فرمایا:

((إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ))

ان دو قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے اور عذاب بھی ان کو ایسے گناہ میں ہو رہا ہے جن کو یہ بڑا نہیں سمجھتے تھے، یعنی یہ خیال کرتے تھے کہ یہ معمولی گناہ ہے، اس میں اللہ نے ان کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنے ایک صحابی کو حکم دیا کہ سامنے ایک کھجور کا درخت تھا کہ وہاں سے جا کر کھجور کی چھڑیاں لے کر آؤ۔ وہ کھجور کی چھڑیاں لے آئے، ہر ایک کو حضور ﷺ نے دو ٹکڑے کیا اور ایک اس قبر پر لگا دی اور ایک دوسری قبر پر لگا دی۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنے اللہ سے امید کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان چھڑیوں کے ذکر اللہ کرنے کی وجہ سے ان کے عذاب میں تخفیف فرما دیں گے۔ [صحيح البخاري، حديث: ٢١٨، باب: ما جاء في غسل البول]

حضور ﷺ نے جب اپنی آنکھوں سے عذاب ہوتا ہوا دیکھ لیا اور اس لیے میرے پاک نبی ﷺ نے فرمایا: جب عذاب قبر ہو رہا ہوتا ہے تو اس عذاب کو ہر چیز سنتی ہے، مگر انسان اور جن نہیں سنتے۔ یعنی جانور بھی سنتے ہیں، چرند اور پرند بھی سنتے ہیں، لیکن صرف اللہ نے انسانوں کو اور جنوں کو سننے سے بچا لیا ہے۔
[صحیح البخاری، حدیث: ١٣٧٤، باب: ما جاء في عذاب القبر]

فرمایا: وجہ یہ تھی کہ اگر انسان بھی عذاب کو سن لیتے تو کون اپنے باپ کو بھائی کو قبر میں جا کر دفن کرتا؟ اللہ تعالیٰ نے ایک راز رکھ لیا کہ انسانوں کو پتہ نہ لگے۔ اب آگے اگر عذاب ہے تب بھی ہمیں کوئی پتہ نہیں یا وہ جنت میں ہے تب

بھی ہمیں کوئی پتہ نہیں، لیکن کبھی کبھی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کو نمونے بھی دکھا دیتے ہیں، کبھی کبھی رحمت کے نمونے بھی دکھا دیتے ہیں۔ [سنن النسائي، حديث: ٢٠٥٨، عَذَابُ الْقَبْرِ]

بعض قبروں سے خوشبو:

جیسے امام بخاری ﷫ کے دفن کے بعد ان کی قبر سے کئی دن تک خوشبوئیں آتی رہیں اور اسی طرح حضرت احمد علی لاہوری ﷫ کی قبر سے بھی سنا ہے، میں نے تو نہیں دیکھا، لیکن سینکڑوں آدمیوں نے یہ بات بتائی ہے اور ایسے لوگوں نے بتائی جن سے جھوٹ کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ ان کی قبر سے بھی خوشبو آتی رہی۔ اور اسی طرح کے ایسے واقعات سینکڑوں ہو چکے ہیں کہ مدتوں کے بعد قبر کو کھولا گیا، لاش اندر بالکل صحیح سالم تھی، اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں آئی تھی اور باقاعدہ اس کو سینکڑوں ہزاروں آدمیوں نے دیکھا، یہ نہیں کہ ایک دو تین چار، بلکہ ہزاروں آدمیوں نے دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نمونے دکھلا دیتے ہیں کہ کوئی جاہل آدمی اعتراض نہ کر سکے۔

قبروں پر چھڑیاں اور پھول وغیرہ ڈالنا، لیکن یہ بھی یاد رکھیں کہ بعض ہمارے بھائیوں نے حضور ﷺ کا کھجور کی ٹہنی کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے قبر پر لگانے سے ایک مسئلہ نکالا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس لیے ہم محرم میں جاتے ہیں، وہاں قبروں پر مٹی نئی ڈال دیتے ہیں اور لیپا پوچا بھی کر دیتے ہیں۔ کوئی وہاں کھجور کے پتے ڈال دیتا ہے اور کوئی دال، کوئی وہاں پھول ڈال دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب حضور ﷺ نے ڈالا تھا تو یہ سنت ہوگئی ہے، اسی لیے ہم وہاں پھول چڑھاتے ہیں اور کھجور کی ٹہنیاں کاٹ ڈالتے ہیں تو وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ جب حضور ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ان قبروں پر ٹہنیاں لگائی ہیں تو پھر ہم کھجور کی ٹہنیاں کیوں نہ ڈالیں؟ تو یہ بالکل جہالت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے حال پر رحم فرمائیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے وہ ٹہنیاں کیوں لگائیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے دکھلایا ہے کہ ان قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے تو کیا تم اس لیے ڈالتے ہو کہ تمہیں بھی عذاب قبر دکھلایا گیا ہے کہ ان کو عذابِ قبر ہو رہا ہے؟ یعنی حضور ﷺ پر تو اللہ نے ایک بات کو کھول دیا اور اس عذاب کی تخفیف کے لیے میرے آقا ﷺ نے ایک عمل فرمایا، ہمیں کیا پتہ ہے...... نعوذ باللہ...... کہ عذاب ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا؟ اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ جو برکت میرے مدنی پاک ﷺ کے ہاتھوں میں ہو سکتی ہے وہ کسی بندے کے ہاتھ میں ہو سکتی ہے، جو حضور ﷺ کے ہاتھ مبارک میں ہے۔

اس سے ایسے استدلال کر کے لوگوں نے ایک رواج بنالیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ آج پھولوں کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں اور لاکھوں روپے کے پھول مزاروں پر بکتے ہیں، یعنی اب اگر روزانہ پھولوں کا حساب کریں تو اتنی رقم غریبوں میں خرچ کر دیں تو اس محلہ میں کوئی غریب بھی نہ رہے۔ اب تو ایک رواج بن گیا ہے۔ جتنے بڑے آدمی کی قبر ہوگی اتنی چادر بھی بڑی۔ اور پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ چادر چڑھانے والا مسلمان ہو، انگریز آئے تو وہ بھی آ کر قبر پر چادر چڑھائے گا اور مسلمان جائے تو وہ بھی کافروں سادھیوں کی قبر پر جا کر چادر چڑھائے گا...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ......

یہ تو بالکل ہندوؤں کی رسم تھی جس سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جس پر راضی ہوتے ہیں اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے تو چاہے تم اس کی قبر پر پھول چڑھاؤ یا نہ چڑھاؤ، وہ جنت کا ٹکڑا ہے اور جس پر اللہ ناراض ہوتے ہیں چاہے تم اس کی قبر پر لاکھوں پھول چڑھاؤ وہ جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہوتا ہے۔ اس لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد دو کیفیتیں ہوتی ہیں:

((إِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ.))

"یا تو اللہ تعالیٰ قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دیتے ہیں یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا بنا دیتے ہیں۔"

[سنن الترمذي، حديث: ٢٤٦٠]

اصل مدار یہ ہے کہ عقیدہ توحید صالح اور توحید خالص پر موت آئے۔ اگر موت آئی "مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کی موت کلمہ شہادت پر آ گئی تو "دَخَلَ الْجَنَّةَ" اللہ کی رحمت سے گویا وہ جنت میں داخل ہو گیا، یعنی پہلی منزل آسان ہو گئی تو آگے آسانی ہے کہ جب پہلے معافی دے دی تو اس کے بعد نہیں پکڑیں گے، لہٰذا یہ علامت ہے کہ آگے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر رحمت فرما دیں گے۔

[سنن أبي داود، حديث: ٣١١٦، باب: في التَّلْقِيْن]

اور اسی حدیث مبارک سے یہ بھی سمجھیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ نے ان پتھروں کو اس دن سے پیدا کیا جب اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور ان پتھروں کو آسمان دنیا پر رکھا گیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/ ٦١، البقرة، الآية: فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا]

اور اسی سے اس آیت کو بھی سمجھیں کہ جب حضرت لوط علیہ السلام کی بستیوں پر عذاب آیا اللہ نے فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ﴾ [هود: ٨٢]

حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم ملا کہ ان بستیوں کو اٹھا کر آسمانوں کی طرف لے آؤ۔ وہ جب آسمانوں پر لے گئے تو حکم ملا کہ ان کو اوندھا کر کے گرا دو۔

﴿وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ﴾

اور حکم دیا گیا کہ ان پر آگ میں پکے ہوئے پتھر اوپر سے برسائے جائیں، کیونکہ وہ جہنم کے پتھر آسمان دنیا پر رکھے ہوئے ہیں، لہٰذا ان پر بھی انہی میں سے برسائے گئے اور اسی سے علماء کرام نے استدلال فرمالیا، اس لیے یہ روایت صحیح ہے اور علی شرط الشیخین ہے، یعنی امام بخاری اور امام مسلم کی شرط کے مطابق ان کی سند ہے۔

جہنم کے عذاب والے پتھر:

حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور ایک جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ جہنم کے اندر وہ پتھر سیاہ رنگ کے ہوں گے جن سے جہنم والوں کو عذاب دیا جائے گا۔ وہ پتھر کبریت یعنی گندھک کے ہوں گے اور بدبو ایسی ہوگی جیسے کسی مردار جانور کی بدبو ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس دن آسمان وزمین کو پیدا کیا تھا اسی دن ان پتھروں کو بھی پیدا کیا تھا۔ یہ پتھر آسمان دنیا پر ہیں اور جہنم کے وہ پتھر اس دنیا کے پتھروں سے بڑے ہوں گے اور سخت بھی ہوں گے۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ جن پتھروں کی دنیا میں آج کافر عبادت کر رہے ہیں ان پتھروں کو اللہ جہنم میں ڈالیں گے، تاکہ کافروں کو زیادہ تکلیف ہو اور کافروں کے ساتھ ان کو عذاب دیا جائے گا۔ اور یہ دونوں روایتیں صحیح ہیں، یعنی ایک تو خاص اللہ نے جہنم کے لیے پتھر بنایا، جیسے بعض بھٹیاں کوئلے سے چلتی ہیں، بعض بھٹیاں گیس سے اور بعض بھٹیاں الیکٹرک سے چلتی ہیں۔ تو جہنم کی بھٹی کا اصل ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو اللہ نے تیار کیے ہیں اور یہ پتھر جن کو کفار نے خدا بنایا ہوا ہے اللہ ان کو اسی میں ڈال دیں گے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ اور علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، پتھروں سے تو دنیا میں بھی آگ حاصل کی جاتی ہے۔

مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ صرف یہ کہنا کہ جن پتھروں کی عبادت کی گئی صرف انہی کو ڈالا جائے گا، یہ بات صحیح نہیں، بلکہ اللہ نے وہ خاص پتھر تیار کیا ہے جس کو بھڑکایا بھی حجارہ کبریت (شاید گندھک کا پتھر مراد ہے) کے

ساتھ جائے گا۔ تو جو آگ اس پتھر سے بھڑکائی جائے وہ کتنی شدید ہوگی اور اس کی ڈگری کے اندر کتنی قوت بڑھ جائے گی!! پھر دنیا کے اندر بھی پتھروں سے آگ حاصل کرنا مشاہدہ ہے، جیسے جس یہ بھی پتھر ہوتا ہے، پھر اس کو آگ میں گرم کر کے بنایا جاتا ہے۔

اور اسی طرح کئی کافروں کے لیے وعید بیان کی ہے کہ ایسی جہنم ہے جس کا ایندھن پتھر اور انسان ہوں گے۔ تو جب اس آگ کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے تو اس کی لپیٹیں اور شعلے کیسے سخت ہوں گے!!! جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا﴾ [الاسراء:۹۷]

''جب بھی وہ آگ کچھ کمزور ہوگی تو اور بڑھا دی جائے گی۔''

اور اسی کو قرطبی رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے کہ اس کے شعلے زیادہ شدید ہوں، تاکہ وہ جہنم والوں کے لیے زیادہ سے زیادہ عذاب کا ذریعہ بنے۔

ایک حدیث پاک یہ بھی نقل کی گئی ہے:

((كُلُّ مُؤْذِي فِي النَّارِ)) [الجامع الصغیر للسیوطی، حدیث:۶۲۴۴]

''ہر ایذاء دینے والی چیز جہنم میں موجود ہوگی۔''

لیکن یہ حدیث صحیح نہیں ہے اور اس کی سند کا بھی کوئی حصہ موصول نہیں ہو سکا ہے۔

مفسرین نے فرمایا: اس کے دو ترجمے ہیں:

- ......ایک ترجمہ تو یہ ہوگا کہ جو ایذاء پہنچائے وہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔
- ......اور دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ ہر ایذاء دینے والی چیز جہنم میں ہوگی، تاکہ وہ اور زیادہ سے زیادہ عذاب کا سبب بنے۔

﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة:۲۴]

''اُعِدَّتْ'' کی ضمیر کے بارے میں بعض علماء نے فرمایا کہ یہ ضمیر جہنم کی طرف راجع ہے، یعنی وہ جہنم تیار کر دی گئی ہے۔

اور بعض نے فرمایا کہ ضمیر ''حِجَارَةُ'' کی طرف راجع ہے کہ وہ پتھر کافروں کے عذاب کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان دونوں قولوں کے اندر کوئی منافات نہیں ہے کہ جہنم بھی تیار ہے اور اس کا ایندھن بھی تیار ہے اور وہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو کافر ہیں اور جن کی موت کفر پر آئے گی۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۱، البقرۃ، آلایۃ: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا]

حضور اکرم ﷺ کو معلم اور مجنون کہنے کی وجہ:

جن مخالفین نے، کفار ومشرکین نے اور یہود ونصاریٰ نے مختلف الزام لگائے ان الزام کا خلاصہ یہ تھا کہ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے، بلکہ...... نعوذ باللہ...... اساطیر الاولین، پرانے قصے کہانیاں ہیں۔ اور بعض لوگوں نے کہا:...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ کہ حضور ﷺ کسی دوسرے سے سیکھتے ہیں اور ان سے سیکھنے کے بعد وہ لوگوں کو سنا دیتے ہیں اور ساتھ یہ بھی ہے کہ یہ دیوانہ اور مجنون بھی ہے۔

یعنی یہ دو الزام لگے اور اس الزام کا پس منظر بھی آپ یاد رکھیں۔ اصل وجہ یہ تھی کہ باہر کے دو نوجوان لڑکے تھے، اللہ نے ان کو ہدایت نصیب فرمادی اور وہ اسلام لے آئے اور وہ دور دراز کے کسی دوسرے ملکوں کے رہنے والے تھے اور دوسری زبانوں کے جاننے والے تھے اور بالکل نوجوان تھے اور دونوں بھائی تھے اور دونوں کو اللہ نے اسلام کی دولت سے مالا مال فرمادیا۔ تو حضور ﷺ ان سے زیادہ شفقت فرماتے تھے اور ان کی دلجوئی فرماتے کہ ایک تو پردیسی ہیں اور مسافر ہیں، دوسرے ملک کے رہنے والے ہیں، پھر اسلام بھی لے آئے تو اس وجہ سے کافروں نے ایک کہانی گھڑی کہ دراصل...... نعوذ باللہ...... حضور ﷺ ان سے سیکھ کر ہمیں سنا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کا قرآن ہے۔

اور دوسرا الزام یہ لگایا کہ...... نعوذ باللہ...... مجنون ہیں کہ اللہ کا نبی دیوانہ ہے۔ دیوانہ سے یہ مراد نہیں تھی جیسے کہتے ہیں کہ جس کی عقل نہ ہو، لیکن وہ مجنون اس معنی میں نہیں لیتے تھے، کیونکہ حضور ﷺ کو تو اللہ نے کمال عقل عطا فرمائی تھی، حضور ﷺ باعتبار صورت کے، باعتبار سیرت کے اور باعتبار جمال کے، صداقت کے، امانت کے اور دیانت کے دشمنوں کے سامنے بھی مسلم تھے، یعنی حضور ﷺ کی امانت اور دیانت کے مکہ کے کافر بھی قائل تھے۔ تو مجنون کہنے کا معنی یہ تھا کہ جب وہ اللہ کے قرآن کی خبر سنتے کہ حضور ﷺ نے تلاوت کی ﴿الٓمّٓ ① غُلِبَتِ الرُّوْمُ ②﴾ [الروم: ۱، ۲] تو جب وہ یہ خبریں سنتے کہ حضور ﷺ مکہ میں بیٹھ کر روم کی شکست کے بارے میں، فارس

کی فتح کے بارے میں اور پھر روم کی فتح کے بارے میں خبر عطا فرمارہے ہیں اور اسی طرح جب حضور ﷺ ان کو خبر دیتے کہ ایک ایسا وقت آئے گا کہ دین اسلام تمام ادیان پر غالب آجائے گا، تمام ادیان مٹ جائیں گے اور دین اسلام کو غلبہ نصیب ہوجائے گا اور اسی طرح جب وہ سنتے کہ آپ اپنے صحابہ سے فرماتے کہ صبر کرو اور قوت برداشت پیدا کرو، ایک ایسا وقت آئے گا کہ سرزمینِ حجاز سے لے کر صنعاء (یمن کے علاقہ تک) کوئی عورت اکیلے سفر کرے گی، ماسوائے اللہ کے خوف کے اس کو کسی دوسری چیز کا ڈر نہیں ہوگا، اسلام کی وجہ سے اتنا علاقائی امن پیدا ہوجائے گا۔ اسی طرح جب وہ کافر سنتے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سراقہ! میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں کہ ایک وقت آئے گا کہ کسریٰ بادشاہ کے ہاتھ کے کنگن تم پہنو گے۔ جب کافر یہ باتیں سنتے تو کہتے کہ یہ تو مجنون ہے کہ ان کے ساتھ چالیس پینتالیس آدمی مسلمان ہیں اور ان کا یہ بھی عالم ہے کہ وہ گھروں سے باہر نہیں نکل سکتے، ان کا بھی یہ عالم ہے کہ اکثر غلام ہیں اور کافروں کے ہاتھ میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان کو ایک وقت کا کھانا بھی نہیں ملتا اور ادھر کبھی کسریٰ کی خبر دیتے ہیں اور کبھی فارس کی اور کبھی روم کی خبر دیتے ہیں، ......نعوذ باللہ...... یہ دیوانگی ہے۔ جیسے کوئی مجذوب آدمی بیٹھ کر ایسی باتیں کہتا رہتا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تو ان کفار کا مجنون کہنے کا مقصد یہ تھا، وگرنہ وہ سارے کے سارے بے وقوف تو نہیں تھے کہ اللہ کے نبی کو جو اتنی عقل والا ہے، مجنون کہہ دیں؟ کیونکہ یہ باتیں ان کو سمجھ میں نہیں آتی تھیں کہ ایک یتیم مکہ میں اکیلا ہے اور چند افراد اس کے ساتھ ہیں اور وہ افراد بھی کوئی دولت والے نہیں ہیں، طاقت والے نہیں ہیں اور پھر حضور ﷺ خبر دے رہے ہیں کہ کہ پوری دنیا پر اسلام غالب آجائے گا۔ وہ تو ابھی مکہ میں غالب نہیں آیا تو پوری دنیا پر کیسے غالب آجائے گا؟ اس لیے وہ اس بہانے سے کہتے تھے کہ......نعوذ باللہ......مجنون ہیں۔

اور تیسرا الزام وہ حضور ﷺ پر یہ لگاتے تھے کہ جیسے کاہن لوگ ہوتے ہیں، غاروں میں پڑے ہوتے ہیں اور وہ بیٹھ بیٹھ کر کوئی خبر دیتے ہیں، اسی طرح حضور پاک ﷺ بھی خبر دیتے ہیں۔ یہ بھی کہانت ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی تصدیق کے لیے فرشتے کیوں نہیں اترتے......؟

بہر حال ان اعتراضات پر اگر دلائل عقل سے اور دلائل نقل سے کام لیا جاتا تو یہ کافر نہ مانتے، کیونکہ اگر اللہ فرشتے بھی اتار کر بھیج دیتا، وہ آکر کہتے کہ ان کو مانو، یہ سچا نبی ہے، تب بھی یہ نہ مانتے۔ کہتے کہ ہمیں کیا پتہ یہ فرشتہ بھی ہے یا نہیں؟ ہمیں کیا پتہ کہ یہ جن ہے یا فرشتہ ہے؟ اگر نہ ماننا ہو تو ہزار بہانے ہیں۔ اب اگر یہ فرشتہ اترتا ہے تو

لازمی بات ہے یا تو انسان کی شکل میں آتا یا وہ اپنی شکل میں آتا۔ اگر اپنی شکل میں آتا تو کوئی دیکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتا اور اگر انسان کی شکل میں آجاتا تو کہتے کہ ہمیں کیا پتہ یہ بھی تو بشری لباس پہن کر آگیا ہے، ہمیں تو پتہ نہیں کہ کون ہے؟ ہم اس کو جانتے نہیں ہیں تو اس کی بات کو کیسے مان لیں؟ تو میرے اللہ نے ایک ایسا انتظام فرما دیا کہ تحدی فرما دی کہ چلو تمہارے سارے الزام اپنی جگہ پر۔ ایسا کرو جب تمہارے کہنے کے مطابق یہ بھی ایک انسان کا کلام ہے تو تم بھی تو انسان ہو تو اس کے مقابلہ پر ایک سورت لے آؤ۔ یہ ایک ایسا جواب تھا کہ جس کا دشمنوں کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ کھلی بات ہے کہ دو اور دو چار ہیں اور دو اور دو پانچ کبھی نہیں ہو سکتے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا:

﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾

اس میں ''بِسُوْرَةٍ'' نکرہ ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ قرآن کی سورتیں تین حیثیت ہیں: بعض طوال، بعض اوساط اور بعض قصار۔ یعنی بالکل چھوٹی سورتیں۔ جیسے ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ①﴾ [الکوثر:۱] ﴿وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ②﴾ [العصر:۱،۲] بالکل چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں۔ تو مفسر فرماتے ہیں: یہ چیلنج صرف کسی بڑی سورت کے لیے نہیں تھا، بلکہ تمام قسم کی سورتوں کو شامل ہے۔ تمام دنیا زور لگانے کے باوجود ایک چھوٹی سی سورت کا بھی مقابلہ نہ کر سکے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۱، البقرۃ، آلایۃ: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا]

جیسا کہ تواریخ میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے سورۃ الکوثر لکھ کر اللہ کے کعبہ میں لٹکا دی...... پرانے دور میں یہ رواج تھا کہ بڑے بڑے شعراء اپنے اشعار اور قصائد لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیتے تھے۔ یہ چیلنج ہوتا تھا دوسرے شاعروں کے لیے کہ تم بھی اس جیسی کوئی بات لکھو...... تو ایک آدمی نے یہ سورت وہاں لٹکا دی اور چیلنج کیا شاعروں کو کہ تم بھی اس جیسی بات لکھو۔ اب بڑے بڑے شاعر آرہے ہیں، دیکھ رہے ہیں، غور کر رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اعتراف کیا:

''وَاللّٰهِ لَيْسَ هٰذَا مِنْ كَلَامِ الْبَشَرِ''

خدا کی قسم! یہ کلام کسی بندے کا نہیں ہو سکتا کہ ایک آیت میں خبر ہے، دوسری آیت میں امر ہے، تیسری آیت میں نہی ہے، چوتھی آیت کے اندر وعد ہے اور پانچویں آیت کے اندر وعید ہے۔ یہ تو اللہ کا کلام ہے جو حکم جاری کر رہا ہے۔

قرآن کریم کے اوصاف:

یعنی ایک آیت مبارکہ کا آپ مطالعہ کریں گے تو وہاں اللہ نے مومنوں کے لیے جنت کے وعدے فرمائے ہیں، جنت کی بشارات دی ہیں۔ اس کے بعد پھر کفار کے لیے وعید ہے تو اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے سابقہ امم کے واقعات اور قصص ہیں۔ اس کے بعد جب آگے پڑھیں گے تو امر ہے، نہی ہے، حکم دیا جارہا ہے کہ یہ کام کرو اور حکم دیا جارہا ہے کہ یہ کام نہ کرو۔ یہ شاعر کا کام تھوڑا ہے کہ وہ کسی کو حکم دیتا ہے کہ یوں کرو اور یوں نہ کرو، بلکہ شاعر تو توصیف اور مدح باندھتا ہے، لیکن جس کے اندر امر بھی ہو، نہی بھی ہو، وعد بھی ہو، احکام بھی ہوں، بیان بھی ہوں، قصص بھی ہوں، مسائل مہمہ بھی ہوں، توحید بھی ہو، نبوت بھی ہو اور قیامت بھی ہو تو اللہ کا کلام ہی یہ حکم دے سکتا ہے۔ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی پیدا ہو جائے کیا وہ کہہ سکتا ہے ﴿وَقِيلَ يَاأَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ﴾ [ھود:۴۴] زمین! اپنا پانی پی لو۔ بھلا کوئی شاعر زمین کو حکم جاری کر سکتا ہے کہ پانی اپنا واپس کر لو۔ اب یہ کوئی طاقت حکم دے رہی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ حکم دے دو، لیکن اگر آگے اس حکم کو ماننے والا نہ ہو تو حکم دینے کا کیا فائدہ؟ میں ایک بات کہوں اور آپ اس کو نہ مانیں تو میرے حکم کا کیا فائدہ؟ لیکن جب وہ اللہ حکم دیتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ تعمیل بھی ہو رہی ہے۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا جارہا ہے، اوپر سے حکم جاری ہوتا ہے:

﴿قُلْنَا يَانَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَى إِبْرَاهِيمَ ۝٦٩﴾ [الانبیاء:٦٩]

آگ کو آخر جو حکم دے رہا ہے وہ آگ کا مالک ہی دے سکتا ہے، ورنہ آگ کسی کا حکم مانتی ہے؟ آپ آگ کے سامنے ہاتھ باندھ کر اور منت کر کے دیکھ لیں، شاید آگ آپ کا کہنا مان لے کہ آج تو مہربانی کر اور ہمارے ہاتھ نہ جلا۔ اور پھر ہاتھ داخل کریں اور دیکھیں کہ ہاتھ جلتا ہے یا نہیں جلتا؟ تو یہ آخر کیا بات ہے کہ اتنی میلوں میں آگ ہے، ڈالنے والے بھی دشمن ہیں اور ایک آدمی بھی مدد کرنے والا نہیں ہے؟

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور ان لوگوں کو خوشخبری سنا دیجیے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے کہ ان کے لیے جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جب ان کو وہاں کا پھل کھانے کے لیے ملے گا تو کہیں گے: یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے ملا تھا۔ اور ان کو ملتے جلتے پھل دیے جائیں گے اور ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیات مبارکہ میں مومنین کے لیے بشارت کا ذکر فرمایا ہے۔ ان آیات کا سابقہ آیات سے ربط بڑا واضح ہے۔ گزشتہ آیات میں کفار کا ذکر تھا کہ ان کو قرآن کے مثل لانے کا چیلنج کیا گیا، پھر ان کو جہنم کی وعید سنائی تھی اور اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کا ذکر کیا ہے، کیونکہ ''تُعْرَفُ الْأَشْيَاءُ بِأَضْدَادِهَا'' جب ضدین کا ذکر کیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس لیے پورے قرآن میں جہاں کفار، مشرکین اور اہل جہنم کا ذکر آئے گا وہاں مومنین، متقین اور اہل جنت کا ذکر آئے گا۔ قرآن مجید میں جہاں بھی ایمان کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اعمالِ صالحہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ اسی آیت میں بھی ایسے ہے۔ اس سے اشارہ ہے کہ ایمان کے ساتھ نیک اعمال کرنا بھی بہت ضروری ہیں۔

ایک انگریز مؤرخ کے نزدیک حضور اکرم ﷺ کی شخصیت:

آپ اندازہ کریں کہ ابھی ایک انگریز نے کتاب لکھی ہے، بڑی بڑی شخصیات عالم کا اس نے ذکر کیا ہے۔ حالانکہ وہ عیسائی ہے، لیکن وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہلے نمبر پر نہیں لے آیا، بلکہ سب سے پہلے نمبر پر اس نے حضرت محمد ﷺ کا ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بڑی شان ہے الیکن دنیا میں وہ کامیاب نہ ہو سکے، کوئی انقلاب نہ لا سکے، بلکہ وہ تو خود اتنے مجبور ہو گئے کہ ان کو قتل کرنے کے لیے یہودیت نے گھیرا تنگ کیا تو اللہ نے آسمانوں میں اٹھا کر ان کی حفاظت کی۔ تو وہ دنیا میں اپنے مشن کو کامیاب نہ کر سکے۔ اور اس نے لکھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کتنی بڑی شان والے نبی کیوں نہ ہوں!! وہ تو بنی اسرائیل کے لیے بھیجے گئے، ان کی دعوت کوئی عالمی دعوت نہیں تھی

کہ پوری دنیا کو دعوت دیں، بلکہ وہ تو ایک محدود قوم کے لیے تھی۔ اسی طرح اس نے کہا کہ یہودیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان کا بڑا دعویٰ کرتی ہے، لیکن وہ بھی تو صرف بنی اسرائیل میں محدود تھے۔ اسی طرح زبور کے ماننے والے اپنی ایک نسل میں محدود ہیں۔ آج بھی یہودی اپنی نسل کے علاوہ کسی دوسرے کو اصلی یہودی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تو اس نے لکھا کہ جب ہم اس انداز پر نظر ڈالتے ہیں کہ جس کی دعوت بھی عالمی، جس کا دین بھی عالمی اور عالم انسان کی نجات کا پروگرام رکھتی ہے۔ اور اس نے کہا کہ میں جب نظر ڈالتا ہوں دنیا میں بڑے انقلاب آئے، لیکن کہیں معاشی انقلاب آیا، کسی جگہ زیادہ سے زیادہ نظریاتی انقلاب آیا تو سب سے بڑی انقلابی ذات پاک حضرت محمد ﷺ کی ہے، جس نے صرف معاشی نقطے پر انقلاب برپا نہیں کیا، بلکہ جس نے عقیدے میں انقلاب برپا کیا، سیرت میں انقلاب برپا کیا، صورت میں انقلاب برپا کیا اور جس نے پورے عالم امن کے لیے ایک چارٹر حجۃ الوداع کے خطبہ کے اندر موجود ہے دیا۔ اور جس نے عربی اور عجمی دونوں کو برابر مخاطب کیا اور جس کے ہاں یہ مقام تھا کہ ادھر بلال حبشی ہے اور ادھر حضرت عبدالرحمن بن عوف القرشی کی لڑکی ہے، اس سے شادی ہو رہی ہے۔ جس نے غلاموں کو اتنا اونچا کیا، جس نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کا رشتہ بی بی زینب رضی اللہ عنہا سے کیا، یعنی حضرت زید رضی اللہ عنہ غلام اور بی بی زینب رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی پھوپی زاد لڑکی، حضور ﷺ کی اتنی قریبی قرشی النسل، حضرت زید رضی اللہ عنہ کی حضور ﷺ نے اپنے قریبی رشتہ داروں میں شادی کی۔ اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں، ان کا رشتہ بھی حضور ﷺ نے قریشی النسل خاتون کے ساتھ کیا۔ اور اسی طرح حضور ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنا کر غلاموں کو اس طرح اونچا کیا۔ اور اسی طرح لونڈیوں کو جو قید ہو کر آئیں تو بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا کو اپنی بیوی بنا کر امہات المؤمنین بنا دیا، پوری دنیا کی ماں بن گئی۔ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی بیوی بن گئی۔ تو عیسائی مؤرخ اور انگریز مؤرخ نے کہا کہ میں نے جس پہلو پر نظر ڈالی اور جس انداز میں نظر ڈالی ہے مجھے پورے عالم میں تاریخ انسانیت میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی شخصیت نظر نہیں آئی۔ (لیکن کتاب کو لکھنے کے بعد وہ مسلمان ہو گیا یا نہیں معلوم نہیں ہوا۔)

مختصر تفسیر:

﴿أَنَّ لَهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ﴾ [البقرۃ:۲۵]

اللہ نے فرمایا: ان کو بشارت دے دیں کہ ان کے لیے ایسے باغ ہیں کہ جن کے دامن میں نہریں بہتی ہیں۔ ''تَحْتِ'' کا معنی نیچے ہوتا ہے۔ تو مفسرین کرام نے فرمایا کہ یہ معنی نہیں کہ مکان کے بالکل نیچے نہر ہو، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ جیسے لوگ دریاؤں کے کنارے پر محل بناتے ہیں، اسی طرح ان کے دامن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ حقیقتاً نیچے نہریں ہوں گی اور اوپر محل ہوں گے۔ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ آج اگر دنیا میں انسان نے سمندروں کے اندر ہوٹل اور گھر بنا لیے ہیں تو اللہ کے لیے کیا مشکل ہے کہ نیچے دریا بھی بہہ رہے ہوں اور اوپر محل بھی موجود ہوں؟ اس لیے فرمایا:

﴿أَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ۖ﴾ [البقرۃ:۲۵]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۲، البقرۃ: الآیۃ: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ]

اور علماء نے فرمایا: یہاں ''أَنَّ لَهُمْ'' میں لام ہے کہ تحقیق ان ہی کے لیے ہے جو مؤمن عمل صالح کرنے والے ہیں۔ لام کبھی ملک اور تملیک کا اشارہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا: گویا ہم ان جنتوں کا مؤمنوں کو مالک بنا دیں گے۔ اور فرمایا:

﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ﴾ [البقرۃ:۲۵]

اللہ نے فرمایا کہ جب کبھی ان کو رزق دیا جائے گا، پھلوں سے رزق دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے باغوں کا ذکر فرمایا، باغ کے بعد ثمرات کا ذکر فرمایا اور جہاں جہاں قرآن میں جنت کا ذکر آیا ہے زیادہ تر پھلوں کا ذکر آیا ہے۔ جنت میں تو بھوک پیاس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہاں تو لذت ہی لذت ہے، اس لیے پھلوں کا ذکر آیا ہے۔

﴿قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ﴾ [البقرۃ:۲۵]

جب ان کو پھل ملیں گے تو وہ کہیں گے کہ یہ تو ہم نے پہلے بھی کھایا ہے۔ اور ان کو پھل ایسے ملیں گے جو ایک دوسرے کے ہم شکل ہوں گے۔ اس میں دو قول ہیں:

1 ...... ایک قول تو یہ ہے کہ مثلاً: آج ہمیں پھل ملے، پھر دوسرے دن ہمیں پھل ملے تو شکل ایک ہوگی، اس لیے وہ فرشتوں سے کہیں گے یہ تو ہم نے کل بھی کھایا تھا اور آج پھر وہی لے آئے ہو؟

2 ...... اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہاں جب پھل ملیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو ہم دنیا میں کھا چکے ہیں، کیونکہ ان پھلوں

کی شکل دنیا کے پھلوں کی طرح ہوگی تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے: میرے بندو! یہ تمہارے مزید لطف وسرور کے لیے ہے، کیونکہ یہ بھی لطف وسرور ہے کہ چیز تو مشابہ ہو، لیکن لطف میں زمین وآسمان کا فرق ہو۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۲، ۶۳، البقرۃ: الآیۃ: وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَا لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَ لَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَ لَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ.)) [صحیح البخاری، حدیث: ۳۲۴۴، باب: ما فی صِفَةِ الْجَنَّةِ]

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لیے ایسی نعمتیں رکھی ہیں کہ کسی آنکھ نے نہیں دیکھیں، کسی کان نے نہیں سنیں اور کسی کے دل میں ان کا خیال تک بھی نہیں گزرا۔''

تکبر کا علاج:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے کہ تعجب کی بات ہے کہ انسان کس بات پر اکڑتا ہے؟ اور کس بات پر غرور کرتا ہے؟ فرمایا کہ تیرا سب سے بہتر کپڑا ایک کیڑے کا فضلہ ہے...... سب سے قیمتی کپڑا ریشم ہے اور وہ ایک کیڑے کا گند ہے...... اور تیرا پینے کا بہتر شراب ہے...... اور وہ بھی ایک کیڑے کی گندگی ہے، وہ ایک مکھی سے نکل رہا ہے...... اور فرمایا: تیری اپنی حالت یہ ہے کہ ایک دفعہ یا دو دفعہ اللہ نے مجبور کر دیا کہ بڑے ہو یا چھوٹے، اپنی گندگی پر جا کر بیٹھو گے، اپنے ہاتھوں سے گندگی کو صاف کرو گے...... چلو اب آپ مشین بھی لگا لو، کچھ بھی کر لو، لیکن اس گندگی پر جا کر بیٹھو گے تو سہی۔ تیرے اندر سے ہی گندگی نکلے گی، کسی اور کے اندر سے تو نہیں نکلے گی...... تو فرمایا کہ پتہ نہیں کس بات پر اکڑتا ہے؟ اور فرمایا نتیجہ تیرا یہ ہے کہ مرنے کے بعد تو اتنی بدبودار چیز ہے کہ کوئی گھر میں رکھنے پر تیار نہیں...... ایمان سے بتائیں کہ جب آدمی مر جائے تو اس کو کتنے دن گھر میں رکھو گے؟ کوئی کہتا ہے کہ سنت بھی یہ ہی ہے کہ جلدی اس کو دفن کرو، اس کو رکھنے کا کیا فائدہ ہے؟ اب بھی دفن کرنا اور رات کو بھی دفن کرنا، جلدی کرو۔ اگر دو چار دن رکھ لو تو انجام کیا ہوگا کہ وہاں بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ آپ نے دیکھا نہیں! بعض اوقات آدمی قتل ہو جاتے ہیں، پتہ بھی نہیں چلتا، لیکن اندر مکان سے اتنی بدبو اٹھتی ہے کہ کوئی گزر ہی نہیں سکتا...... تو فرمایا کہ تیرا انجام تو یہ ہے کہ زندگی میں تو نے گندگی اپنے پیٹ میں بھری ہوئی ہے اور لباس تیرا یہ ہے اور ماکولات ومشروبات

تیرے یہ ہیں اور تو تکبر کرتا ہے اور میں اور میں کہتا ہے۔

﴿وَلَهُمْ فِيْهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرة:۲۵]

اور مؤمن بندے جنہوں نے عمل صالح کیے ہیں ان کے لیے ہم نے بیویاں رکھی ہیں جو پاک ہیں، یعنی حیض و نفاس سے اور ہر گندگی سے پاک اور معنوی طور پر چغل خوری، بے وفائی، بے حیائی اور ہر برے عمل سے پاک ہوں گی۔

﴿وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرة:۲۵]

ہم جنت دے کر پھر نکال دیں، یہ شان کریمی کے خلاف ہے۔ کریم کسی کو نعمت دینے کے بعد چھین نہیں لیا کرتا۔ تو تم اس میں ہمیشہ رہو گے، لیکن یہ نعمتیں ان کو ملیں گی جو ایمان والے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/ ۶۳، البقرة: الآیہ: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ]

قرآن کی صفت "مَثَانِي":

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کو "مَثَانِي" کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن نے جب بھی ذکر کیا ہے تو دو چیزوں کا مقابل ذکر کیا ہے، یعنی اگر مومنین کا ذکر کیا ہے تو پھر کافروں کا بھی ذکر کیا ہے، جنت کا ذکر کیا ہے تو پھر جہنم کا بھی ذکر کیا ہے اور اشقیاء کا ذکر کیا تو پھر سعداء کا بھی ذکر آیا۔ تو جب دو چیزیں کا مقابل پر ذکر کیا جائے تو اس کا نام "مَثَانِي" ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سعداء وہ مؤمنین ہیں "اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَصَدَّقُوْا اِيْمَانَهُمْ بِالْاَعْمَالِ الصَّالِحَةِ" کہ اعمالِ صالحہ ان کے ایمان کی تصدیق اور تائید بھی کر رہے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کے اندر انسان نہروں کا تابع ہے، مثلاً: اگر ایک نہر بنانی ہو تو کروڑوں ڈالر وہاں خرچ ہوتے ہیں۔ نہروں سے آگے اس کی تقسیم کے انتظامات کرو، پلیں بناؤ، گیٹ لگاؤ، پانی نکالو، مگر وہاں جو نہریں ہیں مسلمان کے حکم کے تابع ہوں گی۔ مسلمان اشارہ کرے گا کہ اس باغ میں نہر ہو تو وہ ادھر آجائے گی، مسلمان اگر کسی اونچی جگہ پر ہے اور وہ پانی کو کہے تو وہ اوپر آجائے گا:

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ﴾ [فصلت:۳۱]

جو تمہاری طبیعت چاہے گی، جو انسان کے دل میں تمنا پیدا ہو گی اور جو تم اللہ سے جنت میں مانگو گے وہ اللہ تمہیں عطا فرما دے گا اور بغیر کسی مشقت کے، بغیر کسی تعب کے، بغیر کسی نصب کے اور بغیر کسی محنت کے حاصل ہو گا۔

اس لیے ایک صحیح حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اہل جنت جب جنت میں ہوں گے، مؤمن جنت کے باغوں میں بیٹھے ہوں گے تو ایک خوبصورت پرندہ اس باغ کے اوپر سے پرواز کر کے اڑ رہا ہے۔ اس کی نظر اچانک پڑے گی کہ...... ماشاء اللہ...... بڑا خوبصورت پرندہ ہے! اور اس کا گوشت بھی...... ماشاء اللہ...... بہت اعلیٰ ہو گا۔ وہ کہے گا: اللہ میاں! اس پرندے کے کباب آنے چاہئیں۔ تو کباب فوراً تیار ہو کر آ جائیں گے۔ وہاں تو مانگنے کی یا ارادہ کرنے کی دیر ہے۔ تم نے اللہ کے حکم پر جی کی تکلیفیں اٹھائی ہیں، اب تو تمہارے انعام کا زمانہ ہے تو وہاں جنت کے معاملات ہی نرالے ہوں گے۔ اس لیے میرے آقا ﷺ نے ایک لفظ فرمادیا:

((وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۳۲۴۴، باب: مَا فِي صِفَةِ الْجَنَّةِ]

کسی بشر کے دل و دماغ میں یہ تصور بھی نہیں آ سکتا کہ جنت کی نعمتیں کیسی ہوں گی؟ یعنی وہ تو ایسی ایسی چیزیں ہوں گی کہ ہمارے فکر میں بھی نہیں آ سکتیں۔

ایک بدو جنگل کے رہنے والے تھے، انہوں نے حضور ﷺ کو کہا: یا رسول اللہ! قیامت والے دن اونٹنیاں بھی ہوں گی؟...... جنگل والے لوگوں کو اونٹوں سے پیار ہوتا ہے...... آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل تم اونٹیوں کی تمنا کرو گے تو اونٹیاں بھی ملیں گی۔ اس نے کہا: وہاں اونٹنیاں گابھن بھی ہوں گی؟ بچے بھی پیدا ہوں گے؟...... کیونکہ جب اونٹنی گابھن ہو اور بچہ پیدا ہونے والا ہو تو بدو بڑا خوش ہوتا ہے کہ ابھی دودھ آئے گا، بچہ آئے گا اور اللہ پاک مجھے اونٹ دے دیں گے...... حضور ﷺ نے فرمایا: تم تمنا کرو گے تو اونٹنی اسی وقت گابھن ہو جائے، اسی وقت بچہ دے گی اور اسی وقت دودھ شروع ہو جائے گا۔

حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((أَنْهَارُ الْجَنَّةِ تَخْرُجُ مِنْ تَحْتِ تِلَالٍ أَوْ مِنْ تَحْتِ جِبَالِ الْمِسْكِ))

[صحیح ابن حبان، حدیث: ۷۴۰۸، باب: وَصْفُ الْجَنَّةِ وَأَهْلِهَا]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لفظ ''تِلَال'' فرمایا، یا لفظ ''جِبَال'' فرمایا۔ ''تِلَال'' ٹیلوں کو کہا جاتا ہے اور ''جِبَال'' پہاڑوں کو کہا جاتا ہے۔ فرمایا کہ وہ مشک کے پہاڑ ہوں گے جن کے نیچے سے اللہ تعالیٰ کی جنت کی

نہریں جاری ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ کی جنت میں کوئی ایک نہر تو نہیں ہوں گی، وہاں تو بڑی نہریں ہوں گی، جیسے نہرِ کوثر کا ذکر آیا، سلسبیل کا ذکر آیا، نہرِ حیوان کا ذکر آیا اور بڑی بڑی انہار کا ذکر آتا ہے۔

اور اسی طرح بعض روایات میں یہ بھی ذکر آیا ہے کہ دنیا کی چار نہروں کا اصل بھی جنت ہے، جیسے: سیحون، جیحون، نیل اور فرات۔ کہتے ہیں کہ ان کو جنت کے پانی سے جاری کیا گیا اور یا ان کا اصل سلسلہ اللہ کے علم میں ہے، وگرنہ جنت تو اعلیٰ ہے اور یہ زمین پر ہیں۔ تو بہرحال ایسی روایتیں بھی ملتیں ہیں کہ یہ چار نہریں جنت سے ہیں۔

[مسند البزار، حدیث:۸۱۹۹]

جنت کے پھل:

حضرت یحییٰ بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جیسے تم دنیا کے اندر گراسی گراؤنڈ بناتے ہو تو جنت کے اندر وہ زعفران کا ہوگا اور ان کے ٹیلے مشک کے بنے ہوئے ہوں گے اور جنت کے اندر نوجوان پھلوں کو اٹھا کر پھر رہے ہوں گے۔ جب جنتی ان کو بلائیں گے اور ان کو کہیں گے کہ یہ تو تم ابھی لائے تھے، اب وہ لڑکے کہیں گے کہ آپ کھائیں، ان کا رنگ ایک ہے، لیکن ذائقے مختلف ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ جنت کے اندر چیزیں شکل اور رنگ کے اندر ایک جیسی ہوں گی، لیکن ذائقے کے اندر مختلف ہوں گی۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنت کے پھل دنیا کے پھلوں جیسے ہوں گے، لیکن دنیا کے پھلوں کا جنت کے پھلوں سے کیا مقابلہ ہوسکتا ہے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یوں سمجھ لو کہ دنیا کی کوئی چیز جنت کے مشابہ نہیں ہوسکتی، صرف نام کی مشابہت ہوگی کہ یہاں بھی، یہاں بھی انہار اور وہاں بھی انہار، یہاں بھی انگور وہاں بھی انگور وغیرہ۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جنت میں مومنوں کی ایسی بیویاں عطا کریں گے جو حیض، بول و براز اور اولاد منی وغیرہ سے بھی پاک ہوں گی، کیونکہ ولادت بھی تکلیف ہے اور جنت کے اندر کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر تکلیف دینے والی چیز اور گناہوں سے بھی پاک ہوں گی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۳، البقرۃ: الآیۃ: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ]

پاک بیویاں:

حضرت عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ پاک ہوں گی، ان کو حیض بھی نہیں آئے گا۔ فرمایا کہ حضرت حواء کو بھی اس طرح بنایا گیا۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ﴿وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَهُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ﴾ [البقرۃ:۲۵] ''مُّطَهَّرَةٌ'' سے مراد حیض سے بھی پاک، بول و براز سے بھی پاک، اسی طرح ناک کی رینٹھ اور گلے کے بلغم سے بھی پاک ہوگی۔ اور یہ روایت غریب ہے کہ ایک محدث نے فرمایا کہ یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے، لیکن ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان کا یہ دعویٰ محلِ نظر ہے، یعنی یہ روایت اتنی نہیں ہے کہ اس کو شیخین کی شرط پر صحیح کہا جائے، کیونکہ عبدالرزاق بن عمر البزیلعی کے بارے میں حضرت ابن حبان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ اس قابل نہیں کہ اس سے حجت پکڑی جائے۔ تو جب اس روایت کی سند میں ایسا راوی موجود ہے تو علی شرط الشیخین یہ روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ مفسر فرماتے ہیں کہ بلکہ یہ حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہو سکتا ہے۔

ہر شخص کی دنیا کی بیوی کو جب اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائیں گے تو اس کو پاک کر دیں گے، اس کے اندر بھی یہ حیض، نفاس، گندی عادتیں اور گندی چیزیں نہیں ہوں گی، ورنہ یاد رکھو! اگر کسی آدمی پر ابتلاء ہے، یعنی اس کی بیوی بد خلق ہے، بس فاحشہ نہ ہو، بے حیاء نہ ہو، اللہ بچائے تو اس پر بھی آدمی صبر کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۳، البقرۃ: الآیۃ: وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحَٰتِ]

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمہ اللہ کی بیوی:

جیسے حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمہ اللہ بڑے اللہ کے ولی گزرے ہیں اور بے حد نفیس الطبع انسان تھے، یعنی طبیعت اتنی نفیس تھی، مثلاً: اگر کسی شاگرد نے گلاس کو ٹیڑھا کر کے رکھ دیا تو حضرت کی طبیعت خراب ہو جاتی کہ اس کو سیدھا کیوں نہیں رکھا؟ اس کو ٹیڑھا کیوں رکھا؟ طبیعت میں اتنی نفاست تھی، لیکن بیوی اتنی تیز زبان تھی۔ ایک پٹھان شاگرد تھا، حضرت نے اس کو فرمایا کہ میرے گھر سے جا کر فلاں چیز لے آؤ۔ وہ گلی میں گیا تو اس نے آواز دی۔ اندر بیوی چیخی: کون ہے؟ کیا چیختا ہے؟ اس نے کہا: حضرت نے بھیجا ہے، فلاں چیز مانگی ہے۔ اس نے کہا: تیرا حضرت ایسا اور تو ایسا۔ اتنی گالیاں دیں۔ اب جب وہ واپس آیا تو اس کے گال سرخ تھے۔ حضرت نے فرمایا:

کیا بات ہے؟ اس نے کہا: حضرت! آپ ہمارا پیر بھی ہے، مرشد بھی ہے، استاذ بھی ہے اور شیخ بھی ہے، لیکن گھر میں کیا مصیبت ہے؟ یہ تمہارا بیوی ہے؟ ہم کو اجازت دو ہم اس کا گردن ابھی اڑائے گا، یہ ہمارے شیخ کا گستاخی کرتا ہے؟ تو حضرت مسکرائے اور فرمایا: تم دیکھ رہے کہ جو مجھے اللہ نے مرتبہ دیا ہے وہ اسی وجہ سے تو دیا ہے۔ اس نے کہا: کیا مطلب ہے؟ فرمایا: وہ بد خلقی کرتی ہے، میں صبر کرتا ہوں اور اللہ پاک مجھے اس کا بدلہ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے اس کا انعام دے رہے ہیں کہ میری شان اتنی اونچی کر دی ہے۔ اسی امتحان کی وجہ سے تو اللہ نے مجھے کو عزت دی ہے۔ تم وہ عزت ختم کرنا چاہتے ہو؟ فرمایا: اللہ کے بندے! تم پانچ منٹ کے لیے گئے اور برداشت نہیں کر سکے اور میں نے تو ساری زندگی اس کے ساتھ گزار دی ہے تو اسی صبر پر مجھے اللہ پاک یہ بدلے مجھے دے رہے ہیں۔

[ارواحِ ثلثہ، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کی حکایات، ص: ۲۴، ۲۵]

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾

بے شک اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ کوئی مثال مچھر کی یا اس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے بیان کرے۔ پس جو مومن ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ مثال ٹھیک ہے، جو ان کے رب کی طرف سے اتری ہے۔ اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں: اللہ کا اس مثال سے کیا مطلب ہے؟ اللہ اس مثال سے بہت ساروں کو گمراہ کرتا اور اس سے بہت ساروں کو ہدایت دیتا ہے۔ اور اس مثال سے گمراہ نہیں کرتا، مگر نافرمانوں کو، جو اللہ کے معاہدے کو اس کے پختہ ہو جانے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اس چیز کو جس کو اللہ نے ملانے کا فرمایا ہے قطع کرتے ہیں اور ملک میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ نقصان پانے والے ہیں۔

ربطِ آیات:

ربطِ آیات کی طرف بعض علماء نے خصوصی توجہ فرمائی ہے، جیسا کہ علامہ بکائی رحمہ اللہ نے۔ ان کی ایک تفسیر ہے ”نَظْمُ الدُّرَرِ فِيْ رَبْطِ الْآيَاتِ وَ الْأَحْكَامِ السُّوَرِ“ یہ وہ بڑی نایاب کتاب تھی، بڑی مہربانی ہوئی کہ اسے

دوبارہ چھاپ دیا گیا ہے، اب بہر حال وہ مشکل ہے، لیکن مل جاتی ہے اور اس کا مخطوطہ یہاں حرم کا مکتبہ ہے وہاں موجود ہے اور مدینہ منورہ میں بھی اس کا مخطوطہ موجود ہے۔

ان سے پہلے اشقیاء کا ذکر آیا تھا، پھر سعداء کا ضمناً ذکر آیا تھا کہ جس نے انکار کیا اس کے لیے جہنم ہے اور جس نے اقرار کیا اس کے لیے جنت ہے۔ اب بات پھر اصل مضمون کی طرف لوٹ آئے کہ جو لوگ کافر تھے قرآن کا مقابلہ تو نہ کر سکے، اللہ کے قرآن پاک کے مقابلہ میں کوئی ایک سورت یا آیت بھی نہ بنا سکے تو قرآن مجید پر اعتراضات اور الزام لگانے شروع کر دیے کہ اگر قرآن اللہ کا کلام ہے تو اس میں کہیں مکھی کا ذکر ہے، کہیں مچھر کا ذکر ہے اور کہیں مکڑی کا ذکر ہے، تو یہ کیسے اللہ کا کلام ہو سکتا ہے؟ جس میں...... نعوذ باللہ...... ایسی حقیر چیزیں ذکر کی گئی ہوں۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے ان شبہات کا بھی ذکر فرمایا اور ان کا رد فرمایا۔

استاذ کے ادب کا عجیب واقعہ!

ایک مثل مشہور ہے کہ ایک بادشاہ کے بیٹے کو ایک استاذ پڑھاتے تھے تو اتفاقاً ایک دن بادشاہ نے اس استاذ گرامی سے کہا کہ...... ماشاء اللہ...... آپ استاذ ہیں، پڑھا رہے ہیں، علم بڑی عظیم نعمت ہے، لیکن اس کے لیے ظرف اور برتن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر نعمت قیمتی ہو تو برتن بھی اچھا ہونا چاہیے۔ یہ تو نہیں ہے کہ آپ اعلیٰ قسم کی نعمتیں بنائیں اور گندے برتن میں ڈال دیں اور کمزور برتن میں ڈال دیں۔ اٹھائیں تو ساری نعمت ختم ہو گئی۔ آپ عام آدمیوں کو جو پڑھا رہے ہو ذرا خیال کرو! اللہ نے بندے بھی ہر قسم کے پیدا فرمائے ہیں، اعلیٰ بھی ہیں، ادنیٰ بھی ہیں اور متوسط بھی ہیں۔ یہ ذرا چھوٹے قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور حقیر پیشوں کے اندر جو لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں، اگرچہ اللہ کی نظروں میں متقی کی قیمت ہے، لیکن دنیاوی اعتبار سے حسب ونسب میں تو فرق ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں کیا کروں؟ میں ایک معمولی آدمی ہوں، دین سکھاتا ہے، چاہے اچھا آدمی آ گیا یا برا آ گیا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، ویسے آپ کی مرضی ہے، میں نے نصیحت کر دی ہے۔

خیر مدت گزر گئی اور استاذ بھی بات بھول گیا، لیکن بادشاہ تو بادشاہ ہوتے ہیں۔ اللہ جن کو کرسی عطا فرماتے ہیں کوئی رحمت تو فرماتے ہیں عقل، کوئی چیز تو دیتے ہیں، ورنہ ہر کسی کو کیوں نہ مل جائے؟ تو ایک دن ایسا ہوا کہ ان کے سامنے حجام یا کسی اور قوم کا لڑکا پڑھتا تھا۔ اس کو بھی بادشاہ نے بلا لیا اور بادشاہ بڑے غصہ میں ہے اور استاذ

بے چارہ سامنے بیٹھا تھر تھر کانپ رہا ہے۔ اور اس نے اس کو بلا کر کہا: تمہارے استاذ نے آج ایسی حرکت کی ہے، ایسا گندا کام کیا ہے، مجھے اس کی رپورٹ ملی ہے۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کے شاگرد اس کو دس دس جوتے ماریں۔ جوتا لے آؤ اور استاذ کو دس جوتے مارو۔ وہ جوتا لینے کے لیے بھاگا۔ جوتا لے کر آنے لگا تو بادشاہ کا تو پہلے سے ایک پروگرام بنایا ہوا تھا تو جلدی سے وزیر نے کہا کہ عالم ہیں، مہربانی کریں، اس کو شاگردوں سے تو نہ مروائیں۔ اگر مارنا بھی ہے تو استاذ کے لیے خود سزا دیں۔ یہ تو بڑی ذلت ہے کہ ایک شاگرد اس کو مارنا شروع کر دے۔ بادشاہ نے کہا: ٹھیک ہے، اور کہا: رک جاؤ۔ اس لڑکے کو علیحدہ بھیج دیا، تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ میرے بیٹے کو بھی پتہ نہیں، جب آ کر منظر دیکھا تو حیران ہوا کہ استاذ کانپ رہا ہے اور سارے دربار میں سناٹا چھایا ہوا ہے، ڈر کے مارے کوئی سانس نہیں لے رہا اور بادشاہ کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے اور غیض و غضب میں ہے۔ بادشاہ نے بیٹے کو کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے استاذ نے کیا حرکت کی ہے؟ اس نے کہا: مجھے تو پتہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس نے ایسا ایک ذلیل کام کیا ہے کہ میں نے حکم دے دیا ہے کہ ہر شاگرد اپنے استاذ کو دس جوتے مارے۔ شاگرد نمبروار آ رہے ہیں اور جوتے مار رہے ہیں، تم بھی جوتا لے کر آؤ اور اپنے استاذ کو مارو۔ بادشاہ کا بیٹا کھڑا ہو گیا، اس نے کہا: اے بادشاہ! ایک تو آپ بادشاہ ہیں، آپ کے حکم کی تعمیل کرنا بڑا ضروری ہے۔ اور دوسرا آپ میرے باپ بھی ہیں، اپنے والد کے حکم کی تعمیل کرنا بھی بڑا ضروری ہے۔ اور سامنے بھی میرا استاذ ہے، میرا باپ ہے، جس نے مجھے دین پڑھایا ہے، میں آپ کا ہر حکم مان سکتا ہوں، لیکن جو چیز اللہ اور اس کے رسول کے حکم خلاف ہے تو میں مجبور ہوں، میں استاذ کی توہین نہیں کر سکتا۔ بادشاہ نے کہا جانتے ہو پھر اس کی سزا کیا ہے اگر آج تم نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو میں تجھے سزائے موت دے دوں گا اس نے کہا مجھے قبول ہے تو بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ اس کو لے جاؤ اور اس کا سر اڑا دو اس نے کہا ٹھیک ہے اڑا دو۔ زیادہ سے زیادہ مرنا ہے۔ کل بھی مرنا ہے اور آج بھی مرنا ہے۔ اگر اللہ نے میری موت اسی طرح لکھی ہے کہ میرا باپ مجھے جلاد سے مروائے گا تو اللہ کی مرضی ہے ''اٰمَنَّا بِاللّٰهِ'' میں اللہ کے حکم پر راضی ہوں، میں اپنے استاذ کی توہین نہیں کر سکتا۔ اتنے میں وزیر بول پڑے کہ مہربانی کریں کہ بچے کو معاف کر دیں، بچے نے کوئی غلطی نہیں کی۔ ادھر باپ ہے اور ادھر بھی باپ ہے۔ بادشاہ نے کہا: ٹھیک ہے، معاف کیا۔ اس کو لے جاؤ۔ بیٹا ایک طرف چلا گیا۔

بادشاہ نے ایک دم رخ بدلا اور کہا: مولوی صاحب! آئیں کرسی پر تشریف رکھیں۔ اس نے کہا: میں نے یہ سارا

ڈرامہ کیا تھا۔ دیکھا! جو کم ذات لڑکا تھا وہ مارنے کے لیے جوتا لے کر آ گیا۔ یہ تو ہم نے پکڑ لیا، وگرنہ وہ تو شروع ہو جاتا، لیکن جو بادشاہ کا بیٹا تھا، حسب والے کی اولاد تھا، اس نے کہا: میں پھانسی چڑھ جاؤں گا، اپنی گردن کٹوالوں گا، لیکن اپنے استاذ کی توہین نہیں کروں گا۔ آج تم کو یہ بات سمجھ آئی ہے۔ اس نے کہا: آج اچھی طرح سمجھ آ گیا ہے۔ مجھے پتہ نہیں تھا، میں نے سمجھا کہ آپ واقعی ناراض ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ میں نے ویسے ڈرامہ بنایا تھا، میں کوئی ناراض نہیں تھا، میں تو آپ کو ایک سبق دینا چاہتا تھا اور ایک تعلیم دینا چاہتا تھا کہ اللہ نے ضرور کچھ حکمتیں تو رکھی ہیں کہ حضور پاک ﷺ جو نسب کو مٹانے کے لیے آئے، انہوں نے بھی پابندی لگا دی کہ اگر میرے بعد خلیفہ بناؤ تو قریش کو بناؤ۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ والوں کو نہ بناؤ، حالانکہ مدینہ والوں نے سب سے زیادہ قربانیاں دیں، مکہ والوں نے نکالا اور مدینہ والوں نے گلے لگایا، مکہ والوں نے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ڈالے اور مدینہ والوں نے خدمتوں کے اور عظمتوں کے ریکارڈ قائم کر دیے، لیکن فرمایا:

((اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ)) [مسند أحمد بن حنبل، حديث:١٢٩٠٠]

میرے بعد تم خلیفہ جس کو بناؤ تمہاری مرضی، لیکن قریش میں سے بنانا، کیونکہ مدینہ والے لوگ زمینداری تو کر سکتے ہیں، باغبانی تو کر سکتے ہیں اور کھجوریں تو لگا سکتے ہیں، لیکن حکومت کرنا نہیں جانتے۔ اور مکہ والے سردار ہیں، وہ تو باپ دادے سے حکومتیں کرتے چلے آ رہے ہیں، ان کے خون میں سرداری رچی بسی ہوئی ہے۔ اسی لیے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے ایک دفعہ اپنی فارسی لغت میں کہا تھا:

سعدیا شیرازیا سبق مدہ کم ذات را
چوں عاقل شود گلہ کند استاد را

اس نے کہا: شیراز کے سعدی! خیال رکھنا، کسی کم ذات کو استاذ نہ بنا لینا۔ جب وہ ملاں بن جائے گا تو سب سے پہلے تیرا مقابلہ کرے گا۔

اور یہ ایک دفعہ کا واقعہ نہیں ہے، سینکڑوں مثالیں ہیں۔ اس قسم کے لوگ جب پڑھنے کے لیے اور بڑے بنے تو سب سے پہلے اپنے استاذ سے مقابلہ کیا، استاذ کے مقابلہ پر مسجد بنائی، استاذ کے مقابلہ پر جمعہ شروع کیا، استاذ کے مقابلہ پر درس شروع کیا اور استاذ کے مقابلہ پر باقاعدہ اپنا اڈہ لگایا۔ اور پھر لوگوں کو استاذ کے عیب گنوائے۔ تمہیں مولوی کی کا کیا پتہ ہے؟ اس کے پاس ہم بیس سال تک پڑھتے رہے، اس کے اندر یہ عیب ہے، یہ عیب ہے، تم لوگ

تو آتے تھے تقریر سن کر چلے جاتے تھے، ہم شاگرد تھے، اس کے قریب رہنے والے تھے، اس کے گناہ ہم سے پوچھو۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ جو کم عقل لوگ ہوتے ہیں، کم اصل لوگ ہوتے ہیں وہ ان حقیر چیزوں کو سوچتے ہیں اور اعتراض کرتے ہیں اور جو بنیادی لوگ ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بھائی! یہ تو سب سے بڑی چیز ہے۔ ایک آدمی عظیم محل بنوادے، اس میں بیت الخلا نہ ہو تو کیا آپ رہ سکتے ہیں؟

اس لیے ہمیشہ لازمی بات ہے کہ جب اعلیٰ چیز کا ذکر آئے گا، جب اعلیٰ چیز بنائیں گے تو اس کے لوازمات کے ساتھ ادنیٰ چیزیں بھی ضرور آئیں گی۔ اگر وہ ادنیٰ چیزیں نہ آئیں تو وہ اعلیٰ بھی مکمل نہیں ہو سکتی۔

ایک سردار کا عالی شان محل:

ہمارے اپنے ضلع میں بڑے مخدوم صاحب تھے...... اللہ ان کو معاف کرے، اللہ ان کی قبر پر رحمت فرمائیں...... بہت بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے اپنا محل بنایا تھا اور...... ماشاء اللہ...... اب بھی وہ محل ہے اور ان کے لڑکے اور پوتے بھی ہیں، ابھی تک ہم سے تعلق جوڑا ہوا ہے، بہت بڑے آدمی تھے، وہ پاکستان کی بہت بڑی شخصیت تھے...... انہوں نے اپنا محل بنایا اور چھ مربع میں باغ لگایا اور جب وہ محل بن گیا تو تمام دوستوں کو دعوت دی۔ اس میں ہماری بلوچ برادری کے سردار تھے، وہ فوت ہو گئے...... اللہ ان کی قبر پر رحمت فرمائے...... ڈی جی خان کے علاقہ سے تعلق تھا، بہت بڑے سردار تھے۔ مکان کی افتتاحی تقریب میں ان کو بھی دعوت تھی۔ سب لوگوں نے محل دیکھا، باغ دیکھا، سیر کی اور واپس آ کر سب نے مبارکباد دی کہ مبارک ہو...... ماشاء اللہ...... بڑا اعلیٰ محل ہے...... اور یہ اس دور کی بات ہے جب ہمارے ضلعوں میں پکے مکانات بڑے کم ہوتے تھے اور اس زمانے میں کوئی محل بنائے تو بڑی بات تھی...... وہ بلوچ سردار صاحب جو تھے وہ چپ تھے۔ اب مخدوم صاحب کے دل میں ایک تھوڑا سا کھٹکا سا پیدا ہوا کہ سردار صاحب نے بات نہیں کی اور سب نے مبارکباد دی، سب نے تعریف کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو یا تو میرا محل پسند نہیں آیا یا...... نعوذ باللہ...... حسد کا شکار ہو گیا ہے، اس کے دل میں بغض آ گیا ہے۔ تو اس نے پوچھا کہ آپ کو محل پسند آیا یا نہیں؟ مزید اس میں ترمیم کا ارادہ ہے۔ سردار صاحب نے: کہا: مخدوم صاحب! آپ سید ہیں، اولادِ رسول ہیں اور بہت بڑے لوگ ہیں اور ہم تو بہت سیدھے سادے بلوچ ہیں، دیہاتوں کی زندگی گزارنے والے ہیں، کیسے تیرے محل کی تعریف کروں کہ اندر جتنے حمام لگے ہوئے ہیں وہ

سارے انگریزی ہیں اور ان کا رخ قبلہ کی طرف ہے، میں کیسے تعریف کروں؟ تم سید ہو کر اور آلِ رسول ہو کر اپنے نبی کی سنت اور فرامین کا خیال نہ کرو تو میں تیرے محل کی تعریف کیسے کروں؟ مخدوم صاحب کو عقل آ گئی کہ بات بالکل ٹھیک ہے۔انہوں نے افتتاحی تقریب ختم کرنے کے بعد ملازمین کو حکم دیا کہ میں اس وقت تک اس محل میں داخل نہیں ہوں گا جب تک کہ یہ سارے حمام بدل نہ دیے جائیں۔تو جو سمجھدار لوگ ہوتے ہیں ان کی اپنی نظر ہوتی ہے۔

ایمان والوں کی مثال:

ایک ایمان والے کی نظر ہوتی ہے اور ایک کافر کی نظر ہوتی ہے۔دونوں کی نظر میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ ایمان والے کی جب نظر پڑے گی وہ اس انداز میں سوچے گا کہ اگر خاتم الانبیاء حبیب الکبریاء ﷺ ایک عورت کو حیض کے مسئلے نہ سمجھا دیتے، غسل کے مسئلے نہ سمجھا دیتے، نفاس کے مسائل نہ سمجھا دیتے اور پاک ہونے کا طریقہ نہ بتلا دیتے تو ساری زندگی عورت پاک ہی نہ ہوتی، ناپاک ہی رہتی۔نہ نماز ہوتی اور نہ دوسری عبادتیں ہوتیں، نہ اس کے اللہ کے ہاں کوئی نوافل فرائض قبول ہوتے۔یہ سمجھانا تو بڑا ضروری تھا۔اور ایک بدبخت آدمی کی نظر اس طرح پڑے گی اور وہ اس انداز میں سوچے گا کہ اللہ کے نبی اجنبی عورت کو فرما رہے ہیں کہ جب حیض سے پاک ہونے کے دن آ جائیں تو عورت کو کپاس لینی چاہیے، خوشبو لگانی چاہیے اور اس کو جسم کے اندر رکھنا چاہیے، پھر تسلی کرے کہ اس کپاس پر داغ تو نہیں لگا ہے، پھر اس کو غسل کرنا چاہیے اور اس کو سارے بال کھولنے چاہئیں، پانی کو اپنے بالوں کی جڑوں میں پہنچانا چاہیے، بدن کا کوئی ذرہ پانی کے بغیر نہ رہے۔دیکھو! اللہ کا نبی اجنبی عورت سے ایسی ننگی بات کرے! بھلا یہ بات کوئی آدمی اپنی بیٹی سے بھی کرتا ہے؟ یہ بات بھلا کوئی آدمی اپنی بہن سے بھی کرتا ہے؟ اللہ کے نبی غیر عورت سے کر رہے ہیں۔اس نظر سے سوچے گا تو یہ سوچنے والے کی سوچ کا قصور ہے، دیکھنے والے کی نظر کا قصور ہے، بتلانے والے کا مسئلہ میں تو کوئی قصور نہیں ہے، وہ تو بنیادی مسئلہ ہے۔دیکھیں! استنجاء ایک معمولی بات ہے، لیکن اگر استنجاء صحیح نہ ہو تو وضو صحیح ہوگا؟ اگر وضو صحیح نہ ہو تو نماز صحیح ہوگی؟ تو مسئلہ سارے کا سارا طہارت پر آ گیا، جو آپ کے نزدیک ایک معمولی بات ہے۔جو حقیر چیز ٹھیک ہوگی تو آگے آپ ٹھیک ہوں گے۔

قرآن میں تمثیل کا طرزِ بیان:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس میں جو مثالیں دی ہیں ان کے اندر حکم ہیں۔اور کبھی حقیر چیز کے بارے میں

اگر مثال دینی ہو تو کسی حقیر چیز سے دینی ہوگی۔ جیسے قرآن میں ایک طرف توحید کا بیان تھا اور جب اللہ کی توحید کی کمال قدرتوں کا بیان آیا اور اس کے مقابلہ پر غیر اللہ کا ذکر آیا اور بتوں کا ذکر آیا تو اللہ پاک نے فرمایا:

﴿وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ۚ﴾ [الحج: ۷۳]

ادھر شان والے کی قدرت دیکھو! وہ چاہے تو آسمانوں کو تباہ کردے یا چاہے تو زمینوں کو بدل ڈالے، اگر چاہے تو چاند سورج کو بے نور کردے، چاہے تو اس عالم دنیا کو فنا کر کے اور عالم پیدا فرمادے اور ادھر ان بتوں کو دیکھو! جن کو تم نے خدا بنایا ہوا ہے کہ اگر ان کے بدن پر مکھی بیٹھی ہو، عطر لگاؤ اور مکھی اس کو چوس لے تو یہ مکھی کو پکڑ کر عطر بھی واپس نہیں لے سکتے۔

ایک حکیم صاحب کا واقعہ قرآن کی جامعت:

جیسے ایک حکیم تھا، اس کے دماغ میں ایک بھوت سمایا۔ وہ ایک عالم کے پاس آکر کہنے لگا کہ قرآن میں اللہ نے ہر مسئلہ بیان فرمایا؟ انہوں نے کہا: ہاں! اللہ نے ہر مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ اس نے کہا: میں بڑا حکیم اور طبیب ہوں، ساری زندگی کتابیں پڑھتا رہا۔ طب اور حکمت کے بارے میں تو قرآن میں کوئی بیان نہیں ہے۔ انہوں نے کہا: تم نے پھر قرآن پڑھا اور سمجھا نہیں کہ قرآن نے تو ایک قاعدہ بتلادیا ہے:

﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾﴾ [الاعراف: ۳۱]

اللہ نے فرمادیا کہ کھاؤ اور پیو، لیکن زیادتی نہ کرو۔ جب کھانا اعتدال میں ہوگا اور پینا اعتدال میں ہوگا تو نہ بیمار ہوگا اور نہ تمہاری اس کو ضرورت پڑے گی۔ تو اللہ نے ایک قاعدہ کلیہ بیان کردیا ہے تو یہ چیز قرآن کے اندر موجود ہے۔

قرآن میں ریاضی کے مسائل:

اسی طرح ایک ریاضی دان کا دماغ خراب ہوا، اس نے کہا کہ قرآن میں ہر مسئلہ موجود ہے لیکن ریاضیات اور حساب کا کوئی مسئلہ موجود نہیں ہے۔ بزرگوں نے کہا: تم نے پھر قرآن کو پڑھا نہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا:

﴿حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦١﴾﴾

[البقرۃ: ۲۶۱]

جب ہم کھیت پیدا کرتے ہیں تو ہر دانے کے ساتھ خوشے لگاتے ہیں، اور ہر خوشے میں ۱۰۰ (سو) دانے ہوتے

ہیں تو ۱۰۰ (سو) کو جب ۷ (سات) سے ضرب دو تو کتنا بنے گا؟ ۷۰۰ (سات سو) بنے گا تو کیا قرآن میں حساب کا مسئلہ موجود نہیں ہے؟ تم کیسے کہتے ہو کہ قرآن میں ریاضیات کا مسئلہ موجود نہیں ہے؟ کیا قرآن نے نہیں فرمایا:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ﴾ [الانعام:۱۶۰]

ایک کے دس۔ اور اسی طرح قرآن نے فرمایا:

﴿اِلٰی سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ﴾

ایک برابر سات سو کے۔ انہوں نے کہا: تم دیکھتے آؤ، قرآن میں جہاں جہاں تمہیں دیکھنا ہے، جمع بھی تمہیں ملے گی، ضرب بھی ملے گی اور نفی بھی ملے گی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ﴾ [البقرۃ:۲۶]

فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ استحیاء نہیں فرماتے ہیں ایک مثل بیان کرنے سے، مثل مچھر کی ہو یا اس سے بڑی، لیکن مچھر سے بڑی کا معنی یہ نہیں کہ اس سے بڑا، بلکہ معنی یہ ہے کہ جیسے مچھر حقیر ہے، اس سے بڑی اور حقارت میں زیادہ ہے۔

واقعات:

نمرود کا جب دماغ خراب ہو گیا تو اللہ نے اس کے علاج کے لیے ایک مچھر کو حکم دیا کہ خدا بنا بیٹھا ہے، ذرا اس کو ٹھیک کرو۔ وہ آرام سے محل کی چھت پر بیٹھا ہوا ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھا رہا ہے۔ اللہ نے حکم دیا تو مچھر ناک میں گھسا اور سیدھا دماغ میں چڑھ گیا۔ دماغ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اندر بیٹھ کر وہ پاؤں سے حرکت کرے تو اس کے دماغ کے اندر درد کی ٹیسیں اٹھیں۔ اس زمانے کے جو بڑے بڑے معالج تھے ان کو بلایا گیا، مختلف چیزیں دی گئیں۔ اگر وہ ایسی چیزیں دے دیں کہ بے ہوش پڑا رہے، ہوش آتا تو مچھر بھی چھیڑ دیتا، اب پھر چیخنا شروع کر دے۔ ہاں! اللہ پاک نے تو ہر چیز سمجھائی ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہم سمجھتے نہیں۔ بڑے بڑے بزرگوں کو آپ نے دیکھا ہوگا اور اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ معذور ہو جاتے ہیں کہ کوئی نابینا ہو گیا اور کسی کو پیشاب کی بیماری لگ گئی، کبھی کسی کی ٹانگیں جواب دے گئیں، کبھی کسی پر فالج گر گیا، وجہ کیا ہوتی ہے کہ خدا اپنے جلوے دکھلاتا ہے کہ جن کو تم مختار سمجھتے ہو کہ یہ جو چاہیں کر دیں، دیکھو! ان کا اپنا حال کیا ہے؟ مجھے خود یاد ہے۔

شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ اور انگریز کا واقعہ:

حضرت شاہ جی بخاری رحمۃ اللہ علیہ جن کو اللہ نے اتنی اعلیٰ زبان دی تھی، خطابت دی تھی، فصاحت دی تھی، بلاغت دی تھی اور لحن دیا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی عظمت دی تھی کہ قرآن پڑھتے تھے تو ایسے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی قرآن اتر رہا ہے۔ ایسے کئی واقعات ہیں کہ آپ جیل میں ہیں اور سپریڈنٹ جیل وہ انگریز ہے اور آپ نے تہجد کے وقت قرآن پڑھنا شروع کیا وہ کافر ہے اور روتا ہوا آیا اور آنسو بہا رہا ہے اور کہتا ہے: شاہ جی! بس کریں، زیادہ نہیں برداشت کر سکتا۔ خدا کے لیے آپ پڑھنا بند کریں، ورنہ میں مر جاؤں گا۔ کافر چیخیں مار مار کر رو رہا ہے۔

شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تقریر:

لاکھوں کے مجمع میں خطاب فرمایا اور حال کیا ہوتا تھا کہ عشا کے بعد جلسہ شروع ہوتا تھا اور صبح کی اذان ہوگئی، یعنی سحری ہوگئی اور لوگوں پر سحر ٹوٹ گیا۔ اچھا بھائی! السلام علیکم اور تقریر ختم ہوگئی۔ لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلا۔ ایک ڈاکٹر ہیں ظفر حیات ان کا نام ہے، جواب بھی موجود ہیں، ملتان کے بہت بڑے ڈاکٹروں میں سے ہیں، بہت بڑے پروفیسر اور ڈاکٹروں کے استاذ ہیں۔ خود ہمیں بتایا کہ بچپن میں ایم بی بی ایس کا امتحان دے رہا تھا، کالج کے اسٹوڈنٹ تھے۔ کہنے لگے: ہم لاہور سے گزرے تو دیکھا کہ تقریر ہو رہی ہے۔ پوچھا: کون ہیں؟ تو بتایا کہ شاہ جی تقریر کر رہے ہیں۔ تو ہم چار پانچ نوجوان اکٹھے پڑھنے کے لیے جا رہے تھے کہ رات کو کسی پارک میں بیٹھ کر پرچے کی تیاری کریں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا چلو دو چار منٹ سن لیتے ہیں۔ بخاری صاحب کا نام تو سنا ہوا ہے، چلو ان کو پانچ دس منٹ کے لیے سن لیں، پھر نکل جائیں گے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم آئے تو دیکھا کہ اتنا بڑا مجمع تھا کہ پیر دھرنے کی جگہ نہیں تھی، ہم باہر سڑک پر کھڑے ہوگئے اور شاہ جی تقریر کر رہے تھے۔ یوں ہم پر شاہ جی کی تقریر کا جادو ہوا کہ اذان ہوگئی اور حضرت نے تقریر ختم کی۔ ہم نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ ہم تو مارے گئے، ہم نے تو پرچہ پڑھا ہی نہیں ہے۔ امتحان کیسے دیں گے؟ ہم تو تیاری کے لیے آئے تھے اور ساڑھے پانچ گھنٹے ہم تقریر سنتے رہے، پتہ ہی نہیں لگا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا تو دماغ خراب ہوگیا کہ ہم امتحان کیا دیں گے؟ اب نماز پڑھ کر گھر جائیں گے اور کپڑے پہنیں گے تو اتنی دیر میں تو کالج کھل جائے گا۔ وہ کہتے ہیں: ہمیں اور تو کچھ نہ سوجھی تو ہم نے وہیں نماز پڑھی اور شاہ جی مجمع سے نکلنے لگے تو ہم نے شاہ جی کو پکڑ لیا کہ آپ کی تقریر کا لوگوں کو جو فائدہ ہوا سو ہوا،

لیکن ہمارا تو ستیا ناس ہو گیا کہ ہم کالج کے اسٹوڈنٹ ہیں اور آج ہمارا پرچہ ہے اور ہم دومنٹ تقریر سننے کے لیے آئے تھے اور پوری رات ہماری غائب ہو گئی، آپ نے اچھا ہم پر جادو کر دیا۔ آج ہمارا پرچہ بھی بڑا مشکل ہے۔ تو شاہ جی نے داڑھی مبارک پر ہاتھ مارا اور مسکرا کر میری پشت پر ہاتھ مارا اور کہنے لگے: ہم اللہ سے دعا کریں گے، اس پرچے میں تم فیل نہیں ہو گے۔ آگے تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ تو فرماتے ہیں: اسی پرچے کے اندر ہم نے سب سے زیادہ نمبر لیے۔

اتنے عظیم خطیب تھے! شاہ جی سے میری ملاقات میں جب خود ان کو آخری عمر میں ملنے کے لیے گیا مجھے آج بھی یاد ہے کہ انہوں نے ایک شعر پڑھا:

؎ ایک شمع تھی تو آخر شب کو بجھ گئی
اور حیرت کے ساتھ کون گزارے تمام رات

کہنے لگے: مولوی جی! جب تک یہ زبان کتیا بولتی تھی، زمانہ پیچھے بھاگتا تھا۔ اس نے بولنا چھوڑ دیا تو لوگوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔ اکیلے زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ شخص اکیلا، گھر میں ملنے والا کوئی نہیں۔ تو یہ اللہ کا امتحان ہوتا ہے کہ تم شاید غرور کا شکار نہ ہو جاؤ، ہم چاہیں تو زمانے کو پیچھے لگا دیں اور اگر ہم چاہیں تو کوئی تمہیں پوچھے بھی نہ، کوئی تمہیں سلام بھی نہ کرے اور کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے۔ یہ تو سارا میرے ہاتھ میں ہے۔

مچھر کی مثال پر کفار کا اعتراض:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت سدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے ان آیات مبارکہ کی تفسیر بیان کی کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس کے اندر یہ دو مثالیں ذکر فرمائیں:

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ﴾ [البقرة:١٧]

اور......

﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ﴾ [البقرة:١٩]

تو جب یہ مثالیں دی گئیں اور سورۃ البقرۃ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بعد الہجرت نازل ہوئی تو اب منافقوں کے پاس اور

تو کوئی چارا تھا نہیں، قرآن کا مقابلہ تو نہ مشرکین مکہ کر سکے اور نہ مدینے والے منافقین و یہود کر سکے تو جھوٹے اور بے ہودہ اعتراضات پر آ گئے کہ اللہ کی شان بڑی بلند ہے، اللہ تو شہنشاہوں کا شہنشاہ ہیں اور بڑے لوگ بھی ایسی ایسی چھوٹی چیزوں کی مثالیں نہیں دیتے۔ یہ اللہ کا کلام ہوتا تو اس کے اندر یہ چھوٹی مثالیں کیوں آتیں؟ تو اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی۔

حضرت عبدالرزاق رحمہ اللہ نے حضرت معمر رحمہ اللہ سے، انہوں نے حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے یہ تفسیر نقل فرمائی کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں عنکبوت کا ذکر فرمایا کہ:

﴿إِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝﴾ [العنکبوت:۴۱]

مکھی کا ذکر آیا تھا، مشرکین کہنے لگے کہ دیکھو! مکھی، مچھر اور مکڑی کا اللہ کے کلام سے کیا تعلق ہے کہ ان کا ذکر آئے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ﴾ [البقرۃ:۲۶]

ان اقوال میں دراصل کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے جو یہ بات ارشاد فرمائی ہے وہ اپنی جگہ درست ہے کہ جب منافقوں نے ان دو مثالوں پر اعتراض کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے جو تفسیر بیان فرمائی وہ اپنی جگہ درست ہے، کیونکہ مشرکین مکہ کو بھی یہ واقعہ پیش آ گیا تھا کہ ان کے معبودوں کی مثال مکڑی سے دی گئی تھی۔ اب دیگر لوگوں نے بھی اعتراض کیا کہ اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو مکھی وغیرہ تو گندی چیزیں ہیں، حقیر چیزیں ہیں، ان کا ذکر اللہ نے کیوں کیا؟

حضرت سعید قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے "إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ" کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حق کے بیان سے حیا نہیں فرماتے۔ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ذکر فرما دیتے ہیں۔ اللہ پاک نے جب اپنی کتاب میں مکھی اور عنکبوت کا ذکر فرمایا تو مشرکین اور کافر کہنے لگے:

"مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ مِنْ ذِكْرِ هٰذَا؟"

"ان چیزوں کے ذکر کرنے سے اللہ نے کیا ارادہ فرمایا؟"

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ﴾ [البقرۃ:۲۶]

پہلی روایت میں جو "عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ قَتَادَةَ" والی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ذباب اور عنکبوت کا ذکر کیا تو فرمایا "قَالَ الْمُشْرِكُوْنَ" "مشرکین تو مکہ میں رہتے تھے، مدینے میں نہیں تھے، ان کی اس روایت سے یہ بات معلوم ہوتی تھی کہ شاید یہ آیت مبارک مکہ میں نازل ہوئی، حالانکہ یہ آیت مکہ میں نازل نہیں ہوئی ہے۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوسری روایت "عَنْ سَعِيْدٍ عَنْ قَتَادَةَ" والی زیادہ راجح ہے اور تنزیل کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ یہ آیات مبارک مدنیہ ہیں...... وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ...... [تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۴، البقرۃ: الآیۃ: إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا]

قرآن میں مکھی کی مثال بیان کرنے کی وجوہ:

اسی طرح حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے "عَنْ مُجَاهِدٍ عَنْ قَتَادَةَ" سے دوسرا قول نقل کیا ہے جو حضرت سعید رحمہ اللہ نے حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بھی اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت ابو جعفر رازی رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس کے اندر مکھی کی مثال ذکر فرما دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مثال دینے سے کئی چیزیں مراد ہوتی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی مثال اس لیے مثال دی کہ وہ مثال دنیا والوں کے عین مطابق ہوتی ہے۔ آپ مکھی کو دیکھیں کہ اس کی بھی عادت ہے کہ کہیں ذرا میٹھا لگا ہوا ہوگا، دوڑی آئے گی۔ آپ لاکھ دفعہ ماریں پھر بھی اسی جگہ آئے گی۔ اور مکھی کی یہ صفت ہے کہ جب تک بھوکی رہے یہ زندہ رہتی ہے اور اگر اس کو پیٹ بھر کر غذا مل جائے اور یہ اچھی طرح موٹی تازی ہو جائے تو مر جاتی ہے۔ اسی طرح دنیا والوں کی مثال ہے کہ بھوکے ہیں تو دوڑ رہے ہیں، جب ساری چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے عذاب میں پکڑ لیا۔ تو اس وجہ سے بھی ان چیزوں کی مثال دی ہے۔ جیسے فرماتے ہیں:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۚ حَتّٰى إِذَا فَرِحُوْا بِمَا أُوْتُوْا أَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝﴾ [الانعام:۴۴]

جب ان لوگوں نے اس کو بھلا ڈالا جن سے ہم نے اپنے پیغمبر بھیج کر ان کو ڈرایا تھا تو نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے بھی دنیا میں ان پر نعمتوں کے دروازے کھول دیے اور وہ ان نعمتوں میں پڑ گئے اور ہر چیز کو بھول گئے تو اللہ کا عذاب آ گیا۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ اس چیز سے آدمی کو بڑا ڈرنا چاہیے۔ کبھی ہوتا ہے کہ آدمی گناہ کرتا ہے، لیکن کوئی نہ کوئی نعمت مل جاتی ہے، گناہ کیا کوئی پیسے مل گئے، گناہ کیا کوئی اور نعمت مل گئی تو یہ بڑی خطرناک علامت ہوتی ہے، کیونکہ اس طرح اللہ کافروں کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں کہ جتنا وہ کفر میں بڑھتے جائیں گے ان کو اور نعمتیں دیتے چلے جائیں گے اور ڈھیل دیتے چلے جائیں گے۔ جب وہ انتہا پر پہنچیں گے تو یکلخت اللہ کا عذاب آکر ان کو پکڑ لے گا۔ ہم جاہل لوگ ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ کافروں کو پچاس سال گزر گئے، سو سال گزر گئے، عذاب نہیں آیا۔ یہ تو پچاس سال اور سو سال ہمارے لیے بڑی مدت ہے، اللہ کی نظروں میں تو پوری دنیا کی مدت کچھ نہیں ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی نظر میں پوری دنیا کے ہزاروں سال ایک لمحہ کے برابر بھی نہیں، اس لیے وہاں کا نظام علیحدہ ہوتا ہے۔ مکھی کی بھی یہ عادت ہے کہ جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے اور موٹی تازی ہو جاتی ہے تو مر جاتی ہے اور بھوکی رہے تو دوڑتی رہتی ہے، بعینہٖ کفار کی یہی مثال ہے۔ اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مقدس میں ایسی باتیں اور ایسی مثالیں بیان فرمائیں۔ مفسرین کے درمیان سبب نزول کے اندر اختلاف کی وجہ بن گئی۔

ایک قول تو یہ تھا کہ جب اللہ نے یہ مثالیں بیان کیں تو مشرکوں نے اعتراضات کیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی حقیر چیزوں کا ذکر کیوں کیا ہے؟ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ جب یہ آیت اتری تو منافقین مدینہ نے اعتراض کیا کہ اللہ کی شان بلند و بالا ہے کہ ان مکھیوں کا اور مچھروں کا ذکر فرمائیں۔ اور بعض نے فرمایا کہ یہ سورت اس وجہ سے نازل ہوئی جیسے مکھی موٹی تازی ہو کر مر جاتی ہے، اسی طرح کفار بھی دولت میں آکر خدا کو بھول جاتے ہیں تو اللہ کا عذاب آجاتا ہے۔ اس وجہ سے اختلاف ہوا کہ یہ مشرکوں کے بارے میں نازل ہوئی یا منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی یا ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو دنیا میں غفلتوں کے اندر مبتلا ہیں۔

مفسر فرماتے ہیں: اصل بات وہ پہلا قول ہے جو تم نے پڑھا ہے، وہ زیادہ راجح ہے، کیونکہ مقصد یہ تھا کہ مشرکین جب مقابلہ کر سکیں تو یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جب آدمی کسی دلیل کا توڑ نہ کر سکے تو اس کے اندر وہ شبہات پیدا کرتا ہے، تاکہ اپنی پارٹی کو یقین دلا سکے کہ ہاں ہم بھی کوئی بات کر رہے ہیں تو ان کے رد میں اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اللہ تعالیٰ استحیاء نہیں فرماتے، اللہ تبارک و تعالیٰ اس چیز کو برا نہیں سمجھتے، وہ چاہے کسی بڑی چیز کی مثال دیں یا کسی چھوٹی چیز کی مثال دیں، کسی صغیر کی مثال دیں یا کسی عظیم کی مثال دیں اور کسی حقیر کی مثال دیں، اللہ تبارک و تعالیٰ کی مرضی ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان ہے اور ان کے کلام کے اندر حکم ہیں۔ جہاں بڑی چیزوں کی ضرورت ہے

وہاں مثالیں بھی بڑی آئیں اور جہاں ادنیٰ چیزوں کی ضرورت ہے وہاں مثالیں بھی ادنیٰ آئیں۔ ہر قسم کی اللہ تبارک وتعالیٰ نے مثالیں دی ہیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ [البقرۃ:۲۶]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۴، البقرۃ: الآیۃ: إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا]

﴿مَا بَعُوضَةً﴾ کی پہلی تفسیر:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض کے نزدیک "مَا" تقلیل کے لیے ہے، یعنی مچھر اور اس سے بھی حقیر چیز اور "بَعُوضَةً" زبر کے ساتھ منصوب ہے، یہ بدل ہے۔ جیسے کہتے ہیں "لَأَضْرِبَنَّ ضَرْبًا مَا" میں تمھیں ماروں گا مارنا تھوڑا سا۔ تو تھوڑی چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، یا اس کو نکرہ موصوفہ بنا دیں "بَعُوضَةً"

﴿مَا بَعُوضَةً﴾ کی دوسری تفسیر:

اور ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "مَا" موصولہ ہے اور "بَعُوضَةً" معرب ہے "مَا" کے اعراب کے ساتھ۔ جو وہاں اعراب ہوگا اس پر بھی وہی اعراب ہوگا۔ وہاں چونکہ نصب تھی یہاں بھی نصب ہوگی۔ اور وہ فرماتے ہیں: کلامِ عرب میں یہ بات مشہور ہے کہ "مَا" اور "مَنْ" کا جو صلہ ہوگا جو ان کا اعراب آئے گا ان کے صلہ کا اعراب بھی وہی ہوگا، کیونکہ کبھی "مَا" اور "مَنْ" کو معرفہ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے اعراب کے مطابق صلہ چلے گا۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۴، البقرۃ: الآیۃ: إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا]

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی نبی علیہ السلام کی شان میں مدح کرنا:

جیسے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے شعر کہا۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ زمانہ جاہلیت میں بھی بہت بڑے شاعر تھے اور بادشاہوں کی تعریف میں اشعار کہتے تھے تو ان کو بادشاہوں کی طرف سے ہدایا ملتے تھے۔ خدا کی شان ہے کہ ان کو اسلام نصیب فرما دیا تو جو شاعرِ جاہلیت تھے وہ شاعرِ نبوت بن گئے۔ یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی مدح فرمانے والے ہیں اور یہ ان شعراء میں سے ہیں کہ مسجد الحرام میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے منبر رکھوایا اور منبر پر کھڑے ہو کر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے شعر پڑھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نیچے بیٹھے ہیں اور حسان رضی اللہ عنہ منبر پر کھڑے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرما رہے ہیں:

((اَللّٰهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۴۵۳، باب الشعر فی المسجد]

یا اللہ! جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے اس کے دل میں مضامین ڈال دے۔ یہ تیرے کافروں کو، تیرے دشمنوں کو کیسا جواب دے رہا ہے!!

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کافروں کا ایک بڑا شاعر تھا، اس نے میرے آقا ﷺ کی ہجو کی تو حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ آئے، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ مجھے اجازت دیں کہ میں ان کو جواب دوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: حسان بڑی مشکل ہے، کیسے جواب دو گے؟ چونکہ وہ دشمنی کرنے والے ہیں، وہ رشتہ دار ہیں، خاندان ہمارا ایک ہے، قبیلہ ہمارا ایک ہے تو جب تم قریش کی مذمت کرو گے تو اس میں ...... نعوذ باللہ...... میری مذمت بھی تو ہو جائے گی تو اس لیے میں مناسب نہیں سمجھتا۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! مجھے اجازت تو دیں، میں آپ کی شان مبارک کو ایسے بیان کروں گا جیسے بال آٹے سے نکالا جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اجازت ہے۔ پھر جب حسان رضی اللہ عنہ نے اشعار پڑھے تو حضور ﷺ کو اتنی خوشی ہوئی کہ آپ نے بڑی دعائیں دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((فَإِنَّهُ أَشَدُّ عَلَيْهِمْ مِنْ رَشْقِ النَّبْلِ)) [المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۳۵۸۲]

حسان کے اشعار دشمن کو اتنا زخمی کرتے ہیں جتنا تیر بھی زخمی نہیں کرتا۔

اور یہ بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ ایک طرف سے حضور ﷺ کے رشتہ دار بھی بنتے ہیں۔ بہر حال اس کا عام ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔

ویسے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ہم زلف ہیں، یعنی حضور ﷺ کی جو بیوی حضرت ماریہ قبطیہ تھیں تو اس کی بہن سیرین ہے تو وہ سیرین حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی ہے، یعنی ایک بہن حضور ﷺ کی بیوی تھیں اور دوسری حضرت حسان بن ثابت کی بیوی تھیں۔ جن لوگوں نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف تہمت لگائی تھی تو اس تہمت لگانے والوں میں بھی یہ بے چارے شریک ہو گئے، ان پر بھی بڑی سزا ہوئی اور بعد میں یہ بڑے روتے تھے۔ پھر ایک دفعہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر آئے اور کہا: اماں جان! مجھے معاف کر دیں۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اے حسان! تم نے میرے آقا اور میرے سرکار کی اتنی تعریف اور شان بیان کی، ان کی وجہ سے میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ تمہارے لیے یہی دنیا کی سزا کافی ہے جو تمہیں دنیا میں مل گئی ہے،

آگے میں نے تمہیں معاف کر دیا۔

دنیا میں ان کو حدِ قذف کی سزا ملی اور دوسرا یہ کہ نابینا ہو گئے تو بڑی تکلیف ہوئی۔ تو پھر آپ معافی مانگنے کے لیے آئے اور اس وقت بھی بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں قصیدہ لکھ کر آئے۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اب تو تم قصیدہ لکھ لائے ہو، اس وقت تو تم بھی تہمت لگانے والوں میں شریک ہو گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ بی بی! میں غلطی کر گیا، انسان ہوں، مجھے معاف کر دیں۔

طبلہ کے ساتھ قوالی اور نعت:

اس وجہ سے علماء نے یہ استدلال بھی نکالا ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت پڑھی جائے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی قصیدہ پڑھا جائے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی مدح پڑھی جائے تو ٹھیک ہے، سنت ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پڑھتے تھے، حضرت حسان رضی اللہ عنہ پڑھتے تھے، حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ پڑھتے تھے، بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصیدے کہے ہیں اور حضرت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قصیدے فرمائے ہیں۔ تو جھگڑا ان میں نہیں ہے، بلکہ جھگڑا اس میں ہے کہ جو ہم نے قوالی کی طرز بنالی ہے، اس میں طبلے بھی ہیں، ڈھولک بھی ہے، تنبور بھی ہیں، ہارمونیم بھی ہے اور سرمنڈل بھی، پتہ نہیں موسیقی کی کیا بلائیں ہوتی ہیں؟ یہ چیزیں ہیں۔ ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باجے گاجے کی جتنی چیزیں ہیں یہ شیطان کے آلات ہیں۔ تو ان کو استعمال کر کے کہنا کہ ہم حضور کی قوالی اور حضور کی مدح بیان کر رہے ہیں۔ تو مدح بیان کرنے کے لیے طریقہ وہی اختیار کریں جو سنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، یعنی یوں مثال سمجھیں! جیسے آج کل لوگ جھومر ڈالتے ہیں، ڈانس کرتے ہیں اور بھنگڑے ڈالتے ہیں۔ اب کوئی آدمی ایسا کرے کہ...... نعوذ باللہ...... کپڑے ٹھیک نہ پہنے ہوئے ہوں، بازاروں میں بھنگڑے ڈالے اور کہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیان کر رہا ہوں۔ یہ شانِ نبی نہیں ہوگی، بلکہ یہ توہین نبی ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اتنی بلند و بالا ہے کہ اس کو اسی انداز میں پیش کیا جائے جو سنت ہے۔

اسی طرح علماء یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ بعض نعت خواں نعتیں فلمی گانوں کی طرز میں پڑھتے ہیں، فلمی گانوں کی طرز پر ایک نعت لکھ دی جاتی ہے، پھر اس کی دھن پر نقل کر دی جاتی ہیں، جیسے فلمی گانا گایا جا رہا ہے۔ اس لیے علماء اس کو بھی منع کرتے ہیں کہ ہم پڑھ تو نعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم رہے ہیں اور نقل ان شیطانی گانوں کے ساتھ دے رہے

ہیں، جو شیطان کے بنائے ہوئے ہیں اور شیطانی امور میں استعمال ہوتے ہیں تو یہ غلط ہے۔ اسی لیے حکم ہے
اذان میں آواز بناتے چلے جانا منع ہے، بغیر تصنع اور بغیر تکلف کے اذان کہو۔ اسی طرح کوئی قاری اللہ کا قرآن پڑھے اور تصنع کرے اور بناوٹ کرے کہ اپنی آواز کو بنا رہا ہے کہ مد لمبی کرنی تھی تو چھوٹی کر دی، یا چھوٹی کرنی تھی تو لمبی کر دی، تاکہ میرا سانس نہ ٹوٹے، میرے زیر و بم میں فرق نہ آئے۔ تو ایسے پڑھنا ناجائز ہے۔

اسی طرح یاد رکھیں کہ حضور ﷺ کی نعت پڑھنا محبت کی علامت ہے۔ سب کو اللہ نصیب کرے۔ حضور ﷺ کی شان میں قصیدہ پڑھنا سنت ہے، عملِ صحابہ ہے، حضور اکرم ﷺ کی شان میں نعت پڑھیں اور حضور ﷺ کی شان میں قصیدے لکھیں، لیکن ان میں یہ بھی خیال کرنا ہوگا کہ کوئی لفظ بھی ایسا نہ آئے جو عقیدے کے خلاف ہو، ان باتوں کا خیال رکھنا ہوگا، کیونکہ ایک جنگ میں فتح ہوئی، بچیاں حضور ﷺ کے گھر میں خوشیاں منا رہی تھیں۔ جو گھر میں ٹین یا ڈبے پڑے ہوتے ہیں ان کو بجا رہی ہیں اور خوشیاں منا رہی ہیں۔ حضور ﷺ کے گھر آنے لگیں تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی آئے، وہ روکنے لگے تو فرمایا کہ چھوڑو ان کو خوشی کرنے دو۔ بچیاں ہیں بے چاریاں خوش ہو رہی ہیں۔ تو ان بچیوں نے اس کے اندر ایک شعر کہہ دیا:

؎ وَفِينَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِي غَدٍ

''ہمارے پاس ایسا نبی ہے جو کل کی خبر بھی جانتا ہے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: غیب کی باتوں کا علم اللہ کو ہے، مجھے نہیں ہے۔ یہ بات چھوڑ دو۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۴۰۰۱]

تو آدمی اگر نعت پڑھ رہا ہے اور کفر کر رہا ہے اس کو روکا جائے۔ تو کہیں گے کہ دیکھو! وہابی نعت کے بھی مخالف ہیں۔ وہ نعت کے مخالف نہیں ہوتے، وہ تو تمہارے کلام کفر کے مخالف ہوتے ہیں، وہ شرکیہ کلام کے مخالف ہوتے ہیں اور وہ سنتِ رسول ﷺ کی اتباع کرتے ہیں کہ جیسے حضور ﷺ نے دیکھا کہ غلط مصرعے میں لوگ غلط عقیدہ سمجھ جائیں گے۔ میرے سامنے یہ شعر پڑھا گیا ہے، اگر میں چپ رہا تو دوسروں کے لیے تو سند بن جائے گی کہ اگر غلط ہوتا تو حضور ﷺ منع کرتے، لیکن حضور ﷺ نے فوراً منع کر دیا، حالانکہ نابالغ بچیاں ہیں، وہ ڈبے وغیرہ لے کر حضور ﷺ کے استقبال میں خوشیاں منا رہی ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ شعر نہ کہو، مجھے کل کا پتہ نہیں ہے۔ اگر پتہ ہوتا تو میرے صحابہ احد میں شکست کیوں کھاتے؟ اگر مجھے کل کا پتہ ہوتا تو مجھے کبھی تکلیف پیش نہ آتی،

اگر مجھے کل کا پتہ ہوتا تو میرے صحابہ کو کبھی دکھ نہ ہوتا۔

﴿وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ۚ﴾ [الاعراف:۱۸۸]

''اگر میں غیب کا جاننے والا ہوتا تو تمام بھلائیوں کی چیزیں سمیٹ لیتا اور کبھی مجھے کوئی برائی نہ پہنچتی۔''

﴿إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ [الاعراف:۱۸۸]

اللہ نے مجھے ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا ہے، عالم الغیب تو بنا کر نہیں بھیجا ہے۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! اگر مدح ہے، قصیدہ ہے اور نعت ہے، اس میں کوئی کفر و شرک والا لفظ بھی نہیں ہے اور ساتھ باجے گانے ہامونیم اور فلمی طرزیں بھی نہیں ہیں تو ان کا پڑھنا بھی درست ہے اور سننا بھی درست ہے۔ آدمی پڑھے اور بار بار پڑھے اور ہر وقت پڑھے، کیونکہ کبھی کبھی شعر طبیعت پر ایسا اثر کرتا ہے کہ کلام اتنا اثر نہیں کرتا تو یہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر ہیں۔ خدا کی شان ہے!! ویسے طبعاً کمزور دل آدمی تھے کہ جنگ وغیرہ ہوتی تو بڑے ڈر جاتے تھے۔ بعض آدمی کمزور طبع ہوتا ہے، لیکن خدا کی قدرت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے حسان! تم نے جو جہاد کیا ہے وہ کسی اور نے نہیں کیا۔ لوگوں نے تیر چلائے اور تلواریں چلائیں، ہمارے شیروں نے کافروں کے سینے چھلنی کر ڈالے، کیونکہ جو تم ایک دفعہ قصیدہ پڑھ دیتے ہو پوری دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور کافر مرتے رہتے ہیں اور اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے۔ تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر، مدح خواں اور نعت خواں تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زلف تھے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے رشتہ داری بھی ہے، بی بی ماریہ رضی اللہ عنہا کی حقیقی بہن بی بی سیرین رضی اللہ عنہا حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔

جیسے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا شعر ہے:

يَكْفِي بِنَا فَضْلًا عَلَى مَنْ غَيْرِنَا
حُبُّ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ إِيَّانَا

''یہی ایک فضیلت ہمارے لیے کافی ہے اور کسی فضیلت کی ہمیں ضرورت ہی نہیں ہے کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ملی اور تمہیں نہیں ملی۔''

ابن کثیر رحمہ اللہ نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے شعر سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ ''مَا'' اور ''مَنْ'' کے صلہ کا

اعراب موصولہ والا ہوتا ہے اور اسی اعراب کے تابع ہوتا ہے۔ اور بعض علمائے نحو کہتے ہیں "بَعُوْضَةٌ" منصوب ہے، لیکن بدل نہیں، بلکہ حرف جار محذوف ہے، اصل کلام تھا: "اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَیْنَ بَعُوْضَةٍ اِلٰی مَا فَوْقَهَا" اسی کو کسائی اور فراء نے ترجیح دی ہے۔ یہ دونوں نحو کے بڑے امام ہیں۔ اور ضحاک اور ابراہیم بن عبلہ رحمہ اللہ نے اس کو "بَعُوْضَةٌ" پڑھا۔ اگر ہم رفع پڑھیں گے "بَعُوْضَةٌ" تو اس کا معنی یہ ہے کہ "تاء" یہ "یاء" کا صلہ ہے اور محذوف ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ اَحْسَنَ﴾ [الانعام:۱۵۴]

"اَحْسَنَ" زبر کے ساتھ ہے، اصل میں مرفوع ہے۔ یہاں "هُوَ" محذوف ہے ﴿تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ هُوَ اَحْسَنَ﴾

علامہ سیبویہ رحمہ اللہ جو نحو کے بڑے امام ہیں، وہ فرماتے ہیں: جیسے محاورات میں کہتے ہیں "مَا أَنَا بِالَّذِیْ قَائِلٌ لَكَ شَيْئًا" اصل میں "بِالَّذِیْ هُوَ قَائِلٌ لَكَ شَيْئًا" ہے، اسی طرح یہاں بھی ہے۔

﴿فَمَا فَوْقَهَا﴾ کی پہلی تفسیر:

"فَمَا فَوْقَهَا" کے اندر بھی دو قول ہیں: جیسے محاورات عرب میں کسی کے بخل کے بارے میں کہے کہ فلاں آدمی بڑا بخیل ہے، بڑا بخیل ہے۔ اور سننے والا کہے "نَعَمْ! نَعَمْ! وَفَوْقَكَ ذٰلِكَ" تم کہہ رہے، وگرنہ اس سے بھی بڑا ہے، یعنی اس سے زیادہ بخیل اور زیادہ حقیر ہے۔

کبھی کبھی "فَوْقَ" کا لفظ اصغر اور حقیر کے لیے استعمال ہوتا ہے اور آیت اس معنی میں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/ ۶۴، البقرۃ: الآیۃ: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا]

جیسا کہ حدیث میں ہے:

((لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ))

[سنن الترمذی، حدیث:۲۳۲۰، باب: مَا جَاءَ فِي هَوَانِ الدُّنْيَا عَلَى اللّٰهِ]

"اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی مچھر کے پر کے برابر بھی کوئی اہمیت ہوتی تو اللہ کافروں کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا۔"

اپنے دشمن کو کون پانی دیتا ہے؟ لیکن اللہ کے نزدیک دنیا ذلیل چیز ہے، لہٰذا دشمنوں کو ملتی ہے اور اپنوں کو کم ملتی ہے۔

﴿فَمَا فَوْقَهَا﴾ کی دوسری تفسیر:

اور بعض نے کہا "فَمَا فَوْقَهَا" سے مراد اس سے بڑا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مچھر سے زیادہ اور کون سی چھوٹی چیز ہوگی؟ یہ قول قتادہ بن دعامہ رحمہ اللہ کا ہے اور اس قول کو ابن جریر رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۴، البقرۃ: الآیۃ: إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا]

مسلم شریف میں روایت ہے، جسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُشَاكُ بِشَوْكَةٍ فَمَا فَوْقَهَا إِلَّا كُتِبَتْ لَهُ بِهَا دَرَجَةٌ، وَمُحِيَتْ عَنْهُ بِهَا خَطِيئَةٌ))

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۵۷۲، باب: ثَوَابِ الْمُؤْمِنِ فِيمَا يُصِيبُهُ ...]

"کوئی مسلمان ایسا نہیں کہ اس کو کانٹا لگے یا اس سے بھی زیادہ کوئی تکلیف پہنچے، مگر اللہ اس کے درجات بلند کر دیتے ہیں اور اس کے گناہ مٹا دیتے ہیں۔"

اب اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس بات کو حقیر نہیں سمجھتے کہ وہ چھوٹی چیز کی مثال بیان کرے یا بڑی کی مثال بیان کرے۔ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے پیدا کرنے کے اندر کسی قسم کی کوئی استحیا نہیں فرمایا تو جب اللہ نے مکھی اور مچھر کو پیدا فرمایا تو پیدا کرنے میں اس کی قدرت کو کوئی استحیا نہیں۔ تو مثال دینے میں کیا استحیا ہو سکتی ہے؟

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾﴾ [البقرۃ: ۲۶]

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے اس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ﴾ کہ جو لوگ ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور یہ اللہ کی طرف سے ہے اور حضور ﷺ پر وحی اتار دی گئی ہے۔

اور حضرت ابو العالیہ فرماتے ہیں ﴿فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ﴾ يَعْنِي هَٰذَا الْمَثَلَ" یعنی یہ مثال دینا حق ہے اور اللہ کی طرف سے ہے۔

﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ﴾ [البقرة:۲۶]

اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کیا کیا منشا ہے ایسی مثالیں بیان کرنے سے؟

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۵، البقرة: الآیة: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا]

قرآن کے احکام پر عمل کرنا مشکل نہیں:

آپ دیکھیں کہ تیرہ تیرہ سال تک مدارس میں بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے اور اتنے مباحث پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً: قرآن کا ایک پارہ، اس کی تفسیر پورے سال پڑھائی جاتی ہے، کیونکہ اس میں تمام علوم سے بحث ہوتی ہے، ان علوم اور مباحث کا نتیجہ کیا ہے؟ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو کبھی یہ بحثیں پڑھائیں؟ حضور ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو کبھی ان مباحث سے روشناس کرایا؟ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب، بڑے بڑے قراء قرآن، اتنے بڑے مفسرین عظام اور پھر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم جو حقیقی معنوں میں قرآن میں ڈوب جاتے تھے اور جو حقیقی معنوں میں قرآن کو سمجھا کرتے تھے، انہوں نے اپنے آپ کو ان مباحث میں نہیں الجھایا۔ انہوں نے قرآن کی دعوت کو سمجھا کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن ہم سے چاہتا کیا ہے؟ قرآن نازل کرنے کا منشا کیا ہے؟ اور قرآن کا مطالبہ کیا ہے؟ جس دن سے قوم نے اس کو چھوڑا ہے، اسی دن سے قومیں بھٹک گئی ہیں، ذلیل ہو گئی ہیں اور آج تک ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہیں۔

اب آپ دیکھیں کہ اسلامی ملکوں کے اندر بھی اسلام کے آئین کو نافذ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ان مباحث میں پڑے ہوئے ہیں کہ رجم کا حکم قرآن میں ہے یا نہیں؟ ان بحثوں میں پڑنے کا انجام یہ نکلا کہ امت اللہ کے قانون کو توڑ بیٹھی اور اللہ کے قانون کے خلاف فیصلے کرتی رہی اور نتیجہ یہ نکلا کہ ظاہراً مسلمان اور باطناً کافروں سے بھی بدتر ہیں۔ جو قرآن کا منکر ہے وہ تو کافر ہے اور ایک جو قرآن کو ماننے کے باوجود بھی قرآن کے قانون کو نہیں مانتا وہ تو اس کافر سے بھی زیادہ بدتر ہے۔

﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝﴾ [المائدة: ۴۴]

قرآن جو ہم نے اتارا ہے اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے ان کے کفر میں کوئی شبہ ہے؟ ابھی تک ہم اسی بحث میں پڑے ہوئے ہیں کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے تو کہاں سے کاٹا جائے؟ صرف اس کی انگلیاں کاٹی جائیں یا اس کا

ہاتھ یہاں سے کاٹا جائے یا وہاں سے کاٹا جائے یا کندھے سے کاٹا جائے؟ انہی مباحث میں الجھ گئے اور جو اللہ کے قرآن کا حکم تھا ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ [المائدۃ: ۳۸] اس قانون سے محروم ہو گئے۔ ان مباحث عقلیہ میں پڑنے کے بعد قوم اسی الجھن میں پڑی ہوئی ہے اور رات دن بحثوں میں پڑی ہوئی ہے، حالانکہ موٹی سی بات ہے کہ ایمان والے کو یہ دیکھنا تھا کہ جس پاک نبی ﷺ پر اللہ نے یہ قرآن اتارا ہے ان کی زندگی میں ہاتھ کاٹا گیا یا نہیں کاٹا گیا؟ اور ہاتھ کاٹا گیا تو کہاں سے کاٹا گیا؟ تو بات ختم ہو گئی۔ اور اس کے بعد کسی بحث میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں، کسی پیچیدگی میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اب ان مباحث میں آ گئے کہ ہاتھ اگر کاٹ دیا گیا ہے تو چور کو تو سزا مل گئی تو کیا یہ ہاتھ چور کو واپس کر دیا جائے گا یا حکومت کی ملکیت ہو گا۔ اگر ہم چور کو واپس کر دیں گے تو وہ پلاسٹک سرجری کروا لے گا تو اسی طرح لگ جائے گا جس طرح وہ پہلے لگا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں تو سرجری نہیں تھی تو ان مباحث سے کیا تعلق ہے؟ حدیثوں میں موجود ہے کہ ہاتھ کاٹا گیا اور عبرت کے لیے لٹکا دیا گیا اور جس کا ہاتھ کاٹا گیا اس کو جلا کر خون بند کر دیا گیا۔ جب وہ زخم جل جائے تو وہاں پلاسٹک سرجری ریپیڈ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جب اس ہاتھ کو تین چار دن کے لیے لٹکا دیا گیا، تاکہ قوم اس سے عبرت پکڑے۔ اگر وہ چور کا ملک ہوتا تو وہ اسی وقت واپس کر دیا جاتا کہ تم اپنا یہ مال لے کر چلے جاؤ۔ یہ تمام چیزیں بڑی وضاحت کے ساتھ قرآن میں موجود ہیں، احادیثِ رسول پاک ﷺ میں موجود ہیں۔ جن لوگوں نے عمل کرنا تھا انہوں نے کبھی نہیں پوچھا۔ آپ اندازہ کریں کہ جن کا قرآن کی دعوت پر ایمان تھا اس سے اگر زنا بھی ہو گیا تو وہ خود آ گیا کہ مجھے رجم کرو، اس نے مسئلے نہیں پوچھے کہ قرآن میں آیت موجود ہے یا موجود نہیں؟ اس نے مسائل نہیں پوچھے کہ حضور! یہ آپ کا حکم ہے یا اللہ کا حکم ہے؟ اور جناب مدعی کوئی نہیں ہے، گواہ کوئی نہیں ہے، میں بلاوجہ پتھر کھانے کے لیے کیوں چلا جاؤں؟ اس کا ضمیر زندہ تھا، اس کو پتہ تھا کہ اللہ نے قرآن میں ایک سزا رکھی ہے اور اگر دنیا میں سزا مل گئی تو میں آخرت کی سزا سے بچ جاؤں گا۔ اس کا ایمان اس کو آرام سے بیٹھنے ہی نہیں دیتا تھا کہ غلطی ہو گئی ہے تو اب مجھے پاک ہونا ہے، حضور ﷺ کی خدمت میں آ گئے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

حضرت امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جیسے آدمی کہہ رہے ہیں کہ مسئلہ شریعت میں یہ تھا کہ اگر رمضان

المبارک کی راتوں میں کوئی آدمی عشا کی نماز پڑھ کر سو جائے تو سونے کے چاہے ایک گھنٹے بعد بھی اٹھ جائے تو کھانا بھی منع، پینا بھی منع اور عورت بھی حرام۔ یا تو جاگتا رہے اور سب کچھ کھانے کے بعد سو جائے پھر تو ٹھیک ہے۔ اگر اس کو پہلے نیند آ گئی تو آنکھ چاہے آدمی رات کو بھی کھل جائے تو اس کا اس وقت سے روزہ شروع ہو جاتا تھا اور رات کو میاں بیوی کا ملنا جائز نہیں تھا، لیکن دیکھیں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا آدمی پوچھ رہا ہے۔ اور آج ایک طالب بھی مسئلہ پوچھنے کے لیے نہیں آئے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا عبقری انسان جس کی ایک عظیم شخصیت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی بیٹھے ہیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں تو برباد ہو گیا، یا رسول اللہ! میں تو ہلاک ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر کیا ہو گیا ہے؟ کہا: یا رسول اللہ! رات کو اللہ نے بیوی سے ملنا منع فرمایا تھا، میں صبر نہ کر سکا اور رات کو بیوی سے مل بیٹھا تو لہٰذا میں تو برباد ہو گیا، مجھے سزا دیں، تاکہ وہ سزا میں دنیا کے اندر قبول کرلوں۔

انہوں نے قرآن کی دعوت کو سمجھا تھا کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن کیا چاہتا ہے؟ اور قرآن کیا مطالبہ کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ایسی رحمت فرمائی، قرآن نازل فرما دیا:

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ﴾ [البقرة:۱۸۷]

اللہ نے فرمایا: میرے مدنی! عمر کو بھی کوئی سزا نہ دو، ان کی غلطی کی وجہ سے قیامت تک امت کو چھوٹ مل گئی۔ اس نے تو غلطی کر لی، لیکن ہم نے پوری امت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما دیا ہے کہ اب رات کو کھانے کی بھی اجازت ہے، پینے کی بھی اجازت ہے اور میاں بیوی کے ملنے کی بھی اجازت ہے۔ جب تک صبح صادق نہ ہو کھاتے رہو، پیتے رہو اور میاں بیوی ملتے رہیں، کیونکہ اللہ جانتے ہیں کہ میرے بندوں کو بڑی تکلیف تھی کہ دن کو بھی نہیں مل سکتے تھے۔ بعض آدمی بڑی قوت والے ہوتے ہیں، ان سے صبر نہیں ہوتا، اس لیے اللہ پاک نے رحمت فرما دی۔

[سنن أبي داود، حديث:۵۰۶، باب: كيف الأذان؟]

سود کے خلاف قرآن کا مطالبہ:

تو اصل قرآن اس لیے آیا تھا کہ ہم قرآن مقدس کی دعوت کو سمجھیں اور قرآن پاک کے مطالبے کو سمجھیں کہ یہ قرآن ہم سے کیا چاہتا ہے؟ لیکن ہم نے مباحث میں، نکات میں، اشارات میں اور انہی بحثوں میں قوم کو ایسا اُلجھا ڈالا ہے

کہ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج قرآن کی تنفیذ اتنی مشکل ہوگئی ہے...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ کفر کے ماحول میں قرآن کا نفاذ اتنا مشکل نہیں تھا، جتنا مسلمانوں کے اندر اس کو نافذ کرنا مشکل ہوگیا ہے، کیونکہ وہ تو کافر تھے، ان کے لیے تو ایک حکم آگیا:

﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ [التوبة:٢٨]

بات ختم ہوگئی کہ مشرک پلید ہے، نکال دو، لیکن مسلمان کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، کلمہ پڑھتا ہوں، قرآن کو سینے سے لگاتا ہے، قرآن کو چومتا ہے، بوسے دے رہا ہے، قرآن کو سر پر رکھ رہا ہے، ریشمی غلافوں میں لپیٹ رہا ہے اور قرآن جو مطالبہ کرتا ہے تو کہتے ہیں بہر حال بات تو بالکل ٹھیک ہے، ہمارا اللہ کے قرآن پر ایمان ہے، لیکن حضرت! بینک کے بغیر گزارہ نہیں ہوسکتا ہے، سود کے بغیر ہم انڈسٹری کیسے لگائیں؟ اور جناب سود کے بغیر فیکٹری کیسے چلائیں؟ اب دیکھیں! ہم کپاس کا کام کریں گے تو ہم نے تو لاکھوں روپے کی کپاس خریدنی ہے، اتنا کہاں سے ملے گا؟ مجبوراً ہماری لسٹ بڑھے گی تو بینک ہم سے سود لے گا۔ خدا کے بندے! جب پورے معاشرے کو تم نے سودی بنا دیا ہے، اس لیے مشکل ہو رہی ہے، ورنہ اگر لینے والا بھی سود کو حرام کو سمجھے اور دینے والا بھی سود کو حرام سمجھے تو کسی لسٹ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر معاشرے میں اسلام ہو اور مجھے پتہ ہو کہ میں نے دو ہزار من کپاس فلاں فیکٹری کو بھیجی ہے اور میرا پیسہ بھی نہیں مرے گا، میرا پیسہ مجھے صحیح ملے گا، ایک پیسے کی بھی بددیانتی نہیں ہوگی تو میں پیسے کا مطالبہ بھی نہیں کروں گا۔ آج کتنے بڑے بڑے زمیندار ہیں، جن کی بیس ہزار من کپاس فیکٹری میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم فیکس کریں گے تو آپ کو ٹیلی فون کردیں گے۔ اور زمیندار کہتے ہیں کہ جب ہمیں ضرورت ہوگی ہم پیسے لے لیں گے۔ اگر ہمارا اسلام کا معاشرہ ہوتا، کپاس بھیجنے والا بھی دیانتدار ہوتا، وہ اندر اینٹیں ڈال کر نہ بھیجتا کہ پہلے دو ہزار من پانی کپاس پر چھڑکا کرے، تاکہ وزن کریں تو کپاس بھاری نکلے اور لینے والے حضرات بے ایمان نہ ہوتے کہ اڑھائی من پورا ہو تو اس وقت کٹوتی لگا دو اور دس سیر ہم بعد میں کاٹیں گے، بیس سیر من ایک بورے کے پیچھے کٹ جائے گی۔ اور جس فیکٹری میں دس ہزار بار آئے اوسطاً دس سیر اگر کاٹا جائے تو فیکٹری والا کتنی کپاس حرام کی کھا گیا؟ تو اب اگر سود نہیں آئے گا، حرام نہیں آئے گا تو کیا آئے گا؟

آپ معاشرے کو اسلامی بنا دیں۔ اب آپ کے ملک میں اللہ کی رحمت سے کتنے لوگ ہیں جو سود کے بالکل

قریب نہیں جاتے۔ انہوں نے با قاعدہ مضاربت پر اپنے کاروبار کھول لیے کہ بھائی ! ہم نے دو کروڑ کی انڈسٹری لگائی ہے۔ جو آدمی ہمارے ساتھ حصہ رکھنا چاہے حصہ رکھے۔ پارٹی ایماندار تھی، لوگوں کی لائنیں لگ گئیں، یعنی انہیں دو کروڑ ضرورت تھا، تین کروڑ جمع ہو گیا۔ انہوں نے کہا: ہم نے تو دو کروڑ سے کام کرنا ہے، باقی واپس لے جاؤ۔ کسی نے دس ہزار کا شیئر خرید لیا، کسی نے لاکھ کا، کسی نے دو لاکھ کا، کسی نے دس لاکھ کا اور کسی نے پچاس لاکھ کا۔ اپنے پیسے آ گئے اور اپنے پیسے سے انڈسٹری لگائی، سود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو اس لیے ہمیں یہ چیزیں کیوں مشکل نظر آتی ہیں؟

جدید حرام کاروبار:

نام بدل کر حرام کو حلال کرنا۔ اب ایسے مولوی پیدا ہو گئے کہ انہوں نے کہا کہ سود علیحدہ چیز ہے، ربوا علیحدہ چیز ہے اور بینک کے جو سروسز چارجز ہیں علیحدہ چیزیں ہیں۔ جو علیحدہ چیز ہے اور انشورنس پالیسی علیحدہ چیز ہے، اس سے تو غریبوں کا تحفظ ہو رہا ہے۔ اگر ایک غریب آدمی مر جاتا ہے تو اس کے بچوں کے مستقبل کا ذریعہ بنتے ہیں اور جوئے میں تو آدمی ہار جاتا ہے، حالانکہ واقعی یہ تمام چیزیں جواء ہیں۔ یہ ہے کہ اس جوئے کو اچھا لباس پہنا دیا گیا ہے، جیسے آدمی خالص برانڈی بوتل میں ڈال دے اور اوپر لکھ دے "شراب المؤمنین" یا اوپر "شراب الصالحین" لکھ دے تو وہ اندر تو پاک نہیں ہو جائے گی، وہ اندر تو برانڈی ہی رہے گی، اندر تو شراب ہی رہے گی، نام لکھنے سے تو کچھ نہیں ہو جائے گا۔ تو جوئے کا کیا معنی ہوتا ہے کہ جوا کھیلنے والے دس دس ہزار روپے پھینک رہے ہیں، میرا پتہ نکل آیا تو میں نے سب کے دس ہزار لے لیے، اس کا نام جوا ہے۔ میں نے پتہ دس ہزار کا ڈالا تھا اور لے لیا نوے ہزار۔ تو دس ہزار تو میرے اپنے تھے، وہ بھی مجھے مل گئے اور مزید نوے ہزار دوسروں کے بھی مجھے بغیر محنت کے مل گئے کہ صرف نمبر اس پتے کے مطابق پڑ گیا یہ جوا ہوتا ہے۔

اسی طرح انشورنس ہے۔ ایک لاکھ آدمی کی انشورنس کی اور ایک ایک ہزار روپیہ فیس کا لیا، ایک کروڑ جمع ہوا۔ سال میں دو حادثے ہوئے، دو لاکھ ادا کر دیا، یا دس حادثے ہوئے اور باقی کے ہضم ہو گئے اور دس حادثوں کی پیمنٹ کر دی تو اسی کا نام جوا ہے۔ جس نے ایک قسط ادا کی تھی تو اس کو پالیسی کا دو لاکھ مل گیا، جس غریب نے پوری پیمنٹ کی تھی حادثہ نہیں ہوا تو وہی پیسے سود ملا کر مل گئے اور سود مثال سات پرسنٹ ملا۔ انہوں نے تمہارا وہی پیسہ سترہ

پرسنٹ سود پر ڈال دیا اور سات تمہیں دے دیا اور دس خود کھاتے رہے۔ کوئی گھر سے نہیں دیتا ہے، یہ تو ایک ہیر پھیر ہے، ایک کاروبار ہے اور یہودیوں کا بنایا ہوا جال ہے، جس کے اندر قومیں الجھتی جا رہی ہیں۔

آپ یقین کر لیں! میرا اپنا تجربہ ہے، میرے اپنے علاقوں میں جن غریب زمینداروں نے ٹریکٹر سود پر لیے، زرعی بینکوں سے قرضہ لے کر ٹریکٹر خریدے، تجربہ ہے کہ ان کی زمینیں بک گئیں، پھر جا کر پیسے ادا ہوئے۔ اور جن لوگوں نے نقد پر لیے تھے، اللہ کی رحمت سے ان کو برکت ہوئی، منافع ہوا اور ایک سال کے بعد ان کے ایک ٹریکٹر کی بجائے دو ٹریکٹر ہو گئے اور حوادث سے بھی محفوظ رہے اور فصلات بھی محفوظ رہیں اور کامیاب رہے۔ جس نے سود کی لعنت میں ہاتھ ڈالا، انجام کاروبار برباد ہوا۔ ایک آدمی بڑے اونچے درجے پر سود پر چلا گیا، اولاد پاگل ہو گئی یا بیوی بے حیا ہو کر نکل گئی یا خود کینسر کا مریض ہو گیا، اللہ نے کسی نہ کسی شکل میں تو عذاب کا نمونہ دکھانا ہے تو اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ ہم نے قرآن کو اس لیے پڑھا ہے:

''ہم تو بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں۔''

مسلمان کا کام ہی شرعی احکام کو ماننا ہے، اسی لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ جو مومن ہیں ان کا ایمان ہوتا ہے کہ اللہ کا حکم ہے اور خالق مالک کا حکم ہے، اسی میں ہماری بہتری ہے، اس میں فلاح ہے، اسی میں ہماری کامیابی ہے۔ اگرچہ مگرچہ، چنانچہ چونکہ میں نہیں پڑتا اور کہتا ہے: ''اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ صَدَّقْنَا''۔

حدیبیہ کی جو صلح ہو رہی ہے وہ بظاہر سمجھ نہیں آ رہی، لیکن جب حضور ﷺ نے حکم دے دیا کہ میں نے مشرکین کے ساتھ صلح کر لی ہے تو بس مان لیا کہ حضور! ہمیں سمجھ آئے یا نہ آئے، حتیٰ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اتنے پریشان تھے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اٹھو، اپنے جانور ذبح کر دو، بال منڈاؤ اور احرام کھول دو تو سارے صحابہ بیٹھے رہے۔ حضور ﷺ غصہ میں اپنے خیمے میں گئے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: یا رسول! کیا وجہ ہے کہ آج آپ کو بڑا جلال ہے؟ فرمایا: میں نے صحابہ کو حکم دیا ہے کہ اپنے جانور ذبح کرو، سر منڈاؤ اور احرام کھول دو۔ اس دفعہ عمرہ نہیں ہوگا، اگلے سال...... ان شاء اللہ...... عمرہ قضا کریں گے، لیکن صحابہ میں سے ایک آدمی بھی اپنا قربانی والا جانور ذبح کرنے کے لیے نہیں اٹھا، میرے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اتنی سمجھدار تھیں، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صحابہ بڑی لمبی امیدیں لگا کر اور آٹھ دن اونٹوں پر سوار ہو کر اور پیدل احرام باندھ کر مدینہ سے عمرہ کے لیے روانہ ہوئے تھے، اب چونکہ عمرہ نصیب نہیں ہو رہا، صحابہ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ جبرئیل علیہ السلام کو نازل کر دے کہ

چلو عمرہ کے لیے۔ وہ انتظار میں ہیں، وگرنہ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کے حکم کی وہ تعمیل نہ کریں۔ آپ اپنا قربانی کا جانور ذبح کریں اور دیکھیں کہ صحابہ کیا کرتے ہیں؟ حضور ﷺ خیمہ سے باہر تشریف لائے، اپنا جانور منگوایا اور اس کو ذبح کیا۔ اب صحابہ کو یقین ہوگیا کہ اب عمرہ کی کوئی امید نہیں رہی تو سب جانور ذبح کرنے کے لیے دوڑ پڑے، سب نے تعمیل حکم کردی کہ اب امید ختم ہوگئی۔ اگر اللہ نے عمرہ کرانا ہوتا تو اپنے نبی کو احرام نہ کھولنے دیتے۔ تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ اب منشاء خداوندی یہی ہے کہ جو ہمیں حضور ﷺ نے حکم دیا، اس کی تعمیل کریں۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۷۳۱، باب: الشُّرُوطِ فِي الْجِهَادِ وَالْمُصَالَحَةِ...]

آپ مجھے ایک صحابی دکھلا دیں جس نے حضور ﷺ سے جا کر یہ پوچھا ہو کہ داڑھی اتنی رکھوں یا اتنی رکھوں؟ بڑی رکھوں یا چھوٹی رکھوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: داڑھی رکھو تو سب نے داڑھی رکھی۔ جب حضور ﷺ کا حکم ہے تو آگے چونکہ چنانچہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر ابحاث میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ کا حکم آ گیا:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ [الحشر: ۷]

''جو میرا مدنی حکم دے پکڑ لو اور جس چیز سے منع کریں رک جاؤ۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: شراب حرام ہے۔ ایک صحابی دکھلائیں کہ اس نے آپ کی خدمت میں آ کر کہا ہو کہ حضور! مجھے بیس سال سے عادت ہے، میرے لیے ذرا چھوڑنا مشکل ہے، حضور! میں ایک یا دو مہینے میں چھوڑ دوں گا، آہستہ آہستہ خوراک کم کروں گا، طبیعت ذرا برداشت کے قابل ہو جائے، لیکن آپ کو ایسا ایک صحابی نہیں ملے گا، شراب کا گلاس ہاتھ میں تھا توڑ دیا اور بات ختم۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ مدینہ کی گلیوں میں شراب ایسے بہہ رہی تھی جیسے ندیاں چلتی ہیں، کیونکہ ہر گھر میں شراب بھری ہوئی تھی، شراب تو ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ پانی نہیں پیتے تھے وہ تو شراب پیتے تھے، وہ تو اپنے اونٹوں کو بھی شراب پلاتے تھے، اپنے گھوڑوں کو بھی جنگ میں شراب پلاتے تھے، ان کی تو شراب کا یہ عالم تھا کہ ان کی قوم شرابی تھی، لیکن جب اللہ نے حکم دیا کہ شراب حرام ہے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے مدینہ کی گلیوں میں ایک چکر لگایا ''یَا اَیُّھَا النَّاسُ '' خبردار! لوگو! اللہ نے شراب حرام کردی۔ جس آدمی کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا اس نے یہ نہیں کہا کہ میں یہ تو پی لوں، میں اور نہیں پیوں گا۔ اس نے کہا: حرام کا حکم پہنچ گیا تو بات ختم۔

حضور ﷺ نے فرمادیا: جادو ختم کہ جادو حرام ہے، پھر کوئی پوچھنے نہیں گیا کہ حضور! وہ جادو انتر منتر والا حرام

ہے یا جنتر منتر والا بھی حرام ہے؟ بنگال والا جادو حرام ہے یا سینگال والا جادو حرام ہے، انہوں نے کہا: جب جادو حرام ہے تو بس حرام ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کتا حرام، بکری حلال۔ اب کسی نے نہیں پوچھا کہ کالا کتا حلال ہے یا حرام ہیں؟ پالتو کتا حرام ہے یا جنگلی کتا حرام ہے؟ بڑے سر والا حرام ہے یا چھوٹے سر والا حرام ہے؟ چھوٹی ٹانگوں والا حرام ہے یا بڑی ٹانگوں والا حرام ہے؟ کبھی ایک صحابی کا سوال دکھا دیں۔

دوسری شادی:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے چار بیویوں کی اجازت دی ہے تو بات ختم۔ کسی کے گھر میں پانچ ہیں تو ایک کو طلاق دو، چار رکھ سکتے ہو، اسی وقت کسی کے گھر میں سے ایک فارغ، کسی کے گھر میں تین فارغ اور کسی کے گھر سے دس عورتیں فارغ، چار رکھ سکتے ہو، تو اب کوئی پوچھنے نہیں آیا کہ پہلی بیوی سے اجازت لیں یا نہ لیں؟ اگر پہلی بیوی نہ مانے تو تو کیا ہم دوسری شادی کر سکتے ہیں؟ کہ جب دوسری شادی کریں تو پہلی بیوی کو تکلیف ہوگی، اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کوئی پوچھنے کی ضرورت نہیں، عدل کر سکتے ہو تو چار بھی رکھ سکتے ہو۔ لمبی چوڑی بحثوں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں، کون راضی ہوتا ہے کہ ایک پلیٹ تو مجھے روزانہ کھانے کو ملتی ہے وہ کسی اور کے گھر میں چلی جائے وہ تو راضی نہیں ہوگی، بلکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام کیا چاہتا ہے؟ اسلام یہ چاہتا ہے کہ زنا نہ ہو، گناہ نہ ہو، آدمی آوارہ کتے کی طرح پھر کر لوگوں کے گھروں میں لڑکیاں نہ ڈھونڈتا پھرے۔ اگر ایک بیوی سے گزارہ نہیں تو دوسری شادی کر لے، اگر دو کے ساتھ بھی گزارہ نہیں ہو رہا تو تین کر لے اور تین کے ساتھ بھی اس کی زندگی کا گزارہ نہیں ہو رہا چار کر لے۔ اپنا آرام سے رہے، حرام سے بچا رہے اور عزت سے رہے۔ یہ تو نہیں کہ اگر معشوق رکھنا چاہے تو سو رکھ لے اور بیوی راضی ہے۔ اور دوسری شادی کرنا چاہے تو سارا خاندان ڈنڈے لے کر کھڑا ہے، یعنی حرام کرے تو خاندان راضی ہے کہ مرد ایسے کرتے رہتے ہیں، مردوں کا منہ کس نے روکا ہے؟ جانور ہے، وہ تو چرتا رہتا ہے، اس کی مرضی ہے کبھی گھاس میں منہ ڈالے کبھی کانٹے میں منہ ڈال دیا، لیکن جب ان کو کہو کہ شادی کر رہا ہے تو کہتے ہیں کہ ہماری بچی کو طلاق دے، بچے ہم لے جائیں گے، ہم کورٹ میں جائیں گے، ہم تمہاری جائیداد چھین گے اور ہم تم کو مار ڈالیں گے۔ وجہ کیا ہے؟ ہم کہاں سے مسلمان ہیں؟

فرشتوں کی کثرت تسبیح:

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور ﷺ بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے اپنی نظر مبارک اٹھا کر آسمان کی طرف

دیکھا اور آپ نے فرمایا کہ آسمان سے چرچراہٹ کی آوازیں آرہی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ آنی بھی چاہئیں، کیونکہ آسمان میں ایک بالشت کے برابر بھی جگہ خالی نہیں ہے، مگر کوئی نہ کوئی اللہ کا فرشتہ رکوع میں ہے، سجدے میں ہے اور اللہ کی تسبیح وتقدیس بیان کر رہا ہے۔ جب اتنی بڑی مخلوق آسمانوں میں ہوگی تو آسمان سے آوازیں تو آئیں گی۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ﴾ [المدثر:۳۱]

میرے مدنی! فرشتوں کا جو عدد ہے اس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

فاسق کا لغوی معنیٰ:

﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا ۙ وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ﴾ [البقرۃ:۲۶]

اس کو گمراہی دی اور اس کو ہدایت دی۔ اللہ نے فرمایا: گمراہ نہیں ہوتے، مگر وہ لوگ جو میرے علم میں ہیں کہ یہ فاسق ہیں۔

''فَاسِقِيْنَ'' کا لفظ ''كَافِرِيْنَ'' پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اصل فسق کا معنی ہے ''اَلْخُرُوْجُ عَنْ طَاعَةِ اللهِ'' (اللہ کی فرمانبرداری سے نکلنا) اس کا نام فسق ہے، اس لیے محاوراتِ عرب میں چوہے کو ''فُوَيْسِقَةٌ'' کہتے ہیں، یہ بھی فاسق ہے، کیونکہ یہ بھی نکلنے کے مختلف راستے بناتا ہے۔ داخل ہونے کا ایک راستہ ہوگا اور نکلنے کا دوسرا راستہ ہوگا۔ فاسق کا معنی ہے اللہ کی فرمانبرداری سے نکلنے والا۔ تو جو بالکل نکل گیا وہ کافر کے درجہ پر پہنچ گیا۔ اور ایک فاسق وہ ہے جو کافر تو نہیں، لیکن گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے یا صغیرہ گناہ کو بار بار کرتا ہے وہ بھی فاسق ہے۔

حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ ﷺ نے فرمایا ﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا ۙ﴾ کہ اس سے بہت زیادہ گمراہ ہوتے ہیں، یعنی منافق جن کے دلوں میں نفاق ہے ﴿وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ﴾ اور قرآن سے ہدایت ایمان والے حاصل کرتے ہیں، یہ جو منافق اور کافر ہیں ان کی گمراہی پر گمراہی بڑھتی گئی، حالانکہ وہ جانتے بھی ہیں کہ اللہ کا قرآن حق ہے، پھر بھی انکار کر رہے ہیں۔

﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا ۙ وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۶]

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں ''فَاسِقِيْنَ'' سے مراد منافق ہیں، جو اللہ کی فرمانبرداری سے نکلنے

والے ہیں۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن جب نازل ہوا تو یہ منافق، کافر اور فاسق اللہ کی اطاعت سے نکلے۔ جب انہوں نے خود فسق اختیار کیا تو اللہ نے ان کے لیے ہدایت کے راستے بند کر دیئے۔

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مثالیں بیان فرمائی ہیں کہ حضرت ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ اس سے خوارج کا فتنہ مراد ہے کہ وہ بظاہر مسلمان تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور بظاہر وہ قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کے قرآن کے احکام کو من و عن اس طرح نہ مانا جیسا کہ حضور ﷺ پر نازل ہوا، بلکہ اس کے اندر اپنی طرف سے تاویلات کیں اور حضور ﷺ کے فرامین اور جمہور صحابہ کی متفق علیہ باتوں کو چھوڑا اور ایک نیا راستہ پیدا کیا۔ اسی لیے خوارج کو خوارج کہا جاتا ہے کہ وہ اہل سنت والجماعت سے خروج کر گئے اور اپنی من مانی تاویلات کرتے رہے۔ تو آیت کا معنی یہ ہوا کہ جیسے کافر کفر میں بڑھتا چلا جاتا ہے، اسی طرح گمراہ فرقے جب قرآن مقدس کو پڑھتے ہیں اور اپنی تاویلات کرتے ہیں تو وہ بھی گمراہیوں میں بھٹک جاتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۵، البقرۃ: الآیۃ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا]

اصل اہل قرآن کون لوگ ہیں؟

اسی طرح جیسے موجودہ دور میں بہت بڑا فتنہ انکار حدیث کا شروع ہوا۔ وہ لوگ بظاہر اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں اور وہ اپنی کتابوں میں، رسالوں میں، تحریرات میں اور تقریروں میں یہی تاثر دیتے ہیں کہ ہم سب سے زیادہ قرآن کو ماننے والے ہیں، یعنی وہ...... نعوذ باللہ...... قرآن کا سہارا لے کر احادیثِ رسول کا انکار کر دیتے ہیں، حالانکہ حدیثِ رسول ﷺ کا انکار در اصل قرآن کا انکار ہے۔ کیونکہ دنیا میں کہیں قاعدہ نہیں ہے کہ آدمی لفظوں کو تو مان لے اور معنی کو تسلیم نہ کرے۔ یعنی ایک آدمی کو آرڈر لکھیں، وہ کہے کہ آپ کے حروف، آپ کے الفاظ، آپ کے جملے اور آپ کے لکھے ہوئے احکام میری آنکھوں پر، لیکن میں اس پر عمل نہیں کروں گا اور معانی کو بدل ڈالوں گا۔ اس لیے جب تک ہم حدیث رسول پاک ﷺ پر ایمان نہیں لائیں گے اس وقت تک ہم قرآن کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور حدیث پر ایمان لانے کا حکم بھی تو ہمیں قرآن پاک نے دیا ہے، اللہ کے قرآن ہی نے فیصلہ فرما دیا کہ میری اطاعت

کرو اور میرے رسول پاک ﷺ کی اطاعت کرو۔ اللہ پاک نے فرمایا:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء:۸۰]

''جس نے میرے رسول کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی۔''

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر:۷]

''جن چیزوں کا تمہیں اللہ کے پیغمبر حکم کریں ان کو پکڑ لو اور جن کو روکیں ان سے رک جاؤ۔''

تو اب...... نعوذ باللہ...... کتنا خوش کن نعرہ ہے ''اہل قرآن'' کہ اس کے اوپر لیبل کتنا پیارا ہے کہ ہم تو اہل قرآن ہیں۔ ایک اسلام، ایک دین، ایک اللہ، ایک کعبہ اور ایک رسول، یعنی کتنا اعلیٰ نعرہ لیا ہوا ہے اور پھر یہ ہے کہ ہم حدیث پاک کا اس لیے انکار کر رہے ہیں یہ تو اڑھائی سو سال بعد لکھی ہوئی چیز ہے۔ پتہ نہیں کہ یہ رسول پاک ﷺ کا فرمان بھی ہے یا نہیں ہے؟ پتہ نہیں یہ حضور ﷺ نے فرمایا بھی تھا یا نہیں فرمایا تھا؟ تو اب نتیجہ کیا نکلے گا کہ جب آپ پہلے اسٹیٹ پر آئیں گے، حدیث رسول پاک ﷺ کا انکار کر بیٹھیں گے۔ تو اب قرآن کا انکار کرنا آسان ہو جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ جب آدمی ائمہ اربعہ کے خلاف کرتا ہے تو بظاہر تو اس کے پاس خوش کن نعرہ ہوتا ہے کہ ہم خود ایک بات کو سمجھ رہے ہیں، لیکن کچھ عرصہ کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب بات سمجھ نہ آئی تو ٹھوکر کھائی اور صراط مستقیم سے ہٹ گیا۔ اور جب آدمی ائمہ کرام کا بھی ادب کرے گا، یعنی کوئی آدمی حضرت امام احمد بن حنبل، امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کی شان میں گستاخی نہیں کر سکتا، ان کی بے ادبی نہیں کر سکتا تو صحابہ رضی اللہ عنہم یا حضور ﷺ کا بے ادب کیسے ہو سکتا ہے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی اس کے اندر حکمتیں ہیں۔ اور پھر یہ کہہ دینا کہ اللہ نے قرآن کو محفوظ رکھنے کا وعدہ کیا ہے، لیکن حدیث کو محفوظ رکھنے کا وعدہ ہی نہیں کیا تو کیا مطلب ہے کہ لفظ محفوظ رہیں گے، معنی ختم ہو جائے گا؟ تو پھر کیا محفوظ ہو گیا کہ قرآن پاک کے لفظ محفوظ رہیں اور اس کا معنی ختم ہو جائے اور معنی سمجھانے والے حضرت محمد رسول ﷺ ہیں۔

اور اسی طرح یاد رکھیں کہ ان کے جو شبہات ہیں کہ اڑھائی سو سال کے بعد حدیث لکھی گئی۔ حدیث لکھے جانے کا معنی یہ ہے کہ تدوین حدیث کا باقاعدہ کام اڑھائی سو سال کے بعد شروع ہوا، ورنہ حضور ﷺ کے فرمان

حضور ﷺ کی زندگی میں ہی لکھے جاتے تھے، لیکن اب ان کو ترتیب دینا، ان کو جمع کرنا، ان کو مدون کرنا اور پھر ان کو صحاح یا سنن کے طریقے کے اندر کتابوں کی شکل میں لے آنا، یہ سارا کام دو اڑھائی سو سال کے بعد ہوا۔ جیسے قرآن میرے سرکار ﷺ پر اترا، لیکن جمع کرنے کا کام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شروع ہوا، قرآن لکھا ہوا تو موجود تھا اور قرآن سینوں میں بھی موجود تھا۔

اور حدیث کی صحت کی سب سے بڑی دلیل آپ یہ دیکھیں کہ آج جوامت پورے عالم اسلام میں نمازیں ادا کر رہی ہے، یعنی پانچ نمازیں، فجر کی دو رکعتیں، ظہر کی چار رکعتیں، عصر کی چار رکعتیں، مغرب کی تین رکعتیں اور عشا کی چار رکعتیں، یہ قرآن میں تو کہیں نہیں، کسی جگہ قرآن مقدس میں یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ آپ فجر کی نماز پڑھیں تو دو رکعت پڑھیں، کسی جگہ یہ نہیں لکھا کہ فجر کی نماز پڑھیں تو قراءت زور سے پڑھیں، ظہر وعصر میں آہستہ پڑھیں، قرآن کی کسی آیت میں یہ نہیں لکھا ہوا کہ عشا کی نماز کے اندر چار رکعتیں اور مغرب کی نماز کے اندر تین رکعتیں ہیں۔ یہ ہمیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے سکھلایا ہے۔ آج چودہ سو سال گزر گئے اور آج پندرھویں صدی میں ہم داخل ہو گئے، آج تک کوئی کلمہ پڑھنے والا مسلمان یہ نہیں کہہ سکا ہے کہ مغرب کی تین رکعتیں نہیں ہیں، بلکہ چار رکعتیں ہیں، یا عشا کی چار رکعتیں نہیں، تین رکعتیں ہیں، یا فجر کی دو نہیں تین ہیں تو حدیث اگر محفوظ نہ ہوتی تو یہ عمل کیسے محفوظ ہے؟ چودہ سو سال تک ایک طرز پر عمل چلا آ رہا ہے اور ذرے کے برابر کوئی فرق نہیں آیا۔

اب کوئی اختلاف کا بہانہ یہ ڈھونڈے کہ کچھ لوگ آمین آہستہ سے کہتے ہیں اور بعض زور سے کہتے ہیں، حالانکہ یہ اصول کا مسئلہ تو نہیں ہے۔ اصول کا مسئلہ یا فرائض کا مسئلہ ادائیگی نماز ہے کہ اتنی رکعتیں ہیں، ان میں رکوع ہے، قعود ہے۔ اس کے اندر امت اسلام کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور بعض مسائل اختلافیہ میں افضل اور اولیٰ کا فرق ہے کہ بعض ائمہ کے نزدیک آمین کا زور سے کہنا زیادہ ثواب رکھتا ہے، زیادہ اعلیٰ ہے اور زیادہ اولیٰ ہے اور بعض ائمہ نے کہا کہ آمین چونکہ دعا ہے اور دعا آدمی جتنا آہستہ سے مانگے اتنا زیادہ اللہ کو پسند ہے، لہٰذا انہوں نے آہستہ کو ترجیح دی۔ آج تک امت میں ایسا کوئی فرد پیدا نہیں ہوا جس نے یہ کہا ہو کہ جو آمین آہستہ کہتے ہیں ان کی نماز نہیں ہوتی یا جو زور سے کہے نماز نہیں ہوتی ہے، وہ تو صرف افضل اور غیر افضل کے مسائل ہیں اور اعلیٰ واولیٰ کے مسائل ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی آدمی مثال بنائے کہ ان کا تو نماز میں ہاتھ باندھنے میں اتفاق نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے، ہاتھ باندھنے کے بارے میں سینے سے نیچے باندھنا بھی ثابت ہے، ناف پر بھی ثابت ہے اور ناف سے نیچے

باندھنا بھی ثابت ہے۔ یہ تو اللہ کی شان ہے کہ اللہ نے امت کے لیے آسانیاں پیدا فرمادیں، جس آدمی نے جہاں ہاتھ باندھ لیا اللہ نے نماز قبول کر لی۔ یہ تو راحت اور رحمت ہے میرے اللہ کی طرف سے، یہ تو جھگڑے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تو اس لیے جیسے قرآن پاک محفوظ ہے، ہمارا ایمان ہے کہ اسی طرح اس کے لفظ بھی محفوظ ہیں۔ معنی بھی محفوظ ہے اور فرمانِ رسول پاک ﷺ بھی محفوظ ہے۔ اور جس طرح ہم اللہ کے حکم کے پابند ہیں اسی طرح ہم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے حکم کے پابند ہیں۔ اور یہ بھی ہمارا ایمان ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ دین کے معاملہ میں کوئی حکم اللہ کے سوا دیتے ہی نہیں، دنیاوی معاملات علیحدہ ہوتے ہیں، دنیاوی معاملات میں بات ذاتی نہج پر آجاتی ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی بیویوں سے کوئی معاملہ فرمایا، ذاتی محبت میں کوئی معاملہ فرمایا، حضور ﷺ نے کسی کو باغبانی میں کھجوروں کے بارے میں کوئی مشورہ عطا فرمایا، ورنہ جتنے احکام دیے ہیں اللہ کے نبی اس وقت تک نہیں دیتے جب تک اللہ اس پر حکم جاری نہیں فرمادیتے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ [النجم: ۳،۴]

اللہ نے فرمایا کہ میرے نبی اپنی خواہش سے نہیں بولتے، بلکہ وہ تو وہ بولتے ہیں جو اللہ ان پر وحی فرماتے ہیں۔

گمراہ فرقوں کا ہتھیار:

اس لیے جتنے فرق ضالہ دنیا میں پیدا ہوئے ہیں وہ اسی طرح لوگوں کے دل و دماغ میں شبہات پیدا کرتے ہیں۔ جیسے روافض پیدا ہوئے، خوارج پیدا ہوئے، اسی طرح معتزلہ کے فرقے پیدا ہوئے، کرامیہ پیدا ہوئے، قدریہ پیدا ہوئے اور جہمیہ پیدا ہوئے۔ جیسے اب دنیا کے اندر قادیانیت کا فتنہ پیدا ہوا، کئی فتنے پیدا ہوئے، وہ سب اللہ کے دین کو سامنے رکھ کر لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے وہ ایک ایسی روایت کا سہارا لیتے ہیں، تاکہ مسلمانوں کے ذہن میں ایک الجھن بٹھادی جائے، ایک شبہ ڈال دیا جائے اور آدمی کو شبہ پڑ جائے تو بات خود بخود بڑھتی چلی جاتی ہے۔

دیکھیں! اگر میرا آپ کے ساتھ ایک معاملہ ہے، لیکن ایک آدمی آکر میرے کان میں شبہ ڈال دے کہ یہ جو طالب آپ کے سامنے بیٹھتے ہیں میں نے ایک جگہ دیکھا ہے کہ یہ آپ کی فلاں بات میں بڑی دشمنی کر رہے تھے۔ اب میرے دماغ میں ایک شبہ ڈال دیا، اب میں دشمنی والی عینک سے ان کو دیکھنا شروع کردوں گا۔ تو جب بھی ان

کی کوئی بات میری سمجھ نہیں آئے گی تو فوراً سوچوں گا کہ اس نے ٹھیک کہا تھا۔

اسی طرح اعدائے اسلام اللہ کے دین میں شبہات ڈالتے ہیں۔ جہاں انہیں کوئی واقعہ نظر آیا انہوں نے قوم کے ذہن میں ایک شبہ ڈال دیا، جیسا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ چونکہ بطل الاسلام تھے، اللہ نے انہیں اسلام کی عزت، خدمت اور جہاد میں ایک اعلیٰ مرتبہ عطا فرمایا تھا، حتیٰ کہ وہ ''سیف اللہ'' کے لقب سے ملقب ہوئے اور ''بطل الاسلام'' قرار پائے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جن سے کفر کانپ جاتا تھا اور جنہوں نے اپنی جنگی مہارت سے، اپنی جنگی تدبیروں سے اور اپنے بے لوث جہاد سے کفار کے ملکوں کے ملک فتح کر ڈالے اور اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ اب کافروں کو تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے عداوت ہے، ان کی عداوت کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے، وہ تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا نام برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

مالک بن نویرہ کے قتل کا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر اعتراض اور جواب:

اب فرق باطلہ نے ایک راستہ نکالا۔ ایک قصہ کتابوں میں آتا ہے، اس قصے کو اس انداز سے پیش کیا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی عظمت بھی ختم ہو جائے اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اعتراض بھی آ جائے۔ ایک تیر سے دشمن نے دو شکار کیے۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک شخص مالک بن نویرہ تھا، اس کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔ ان کے قتل کے بعد اس کی بیوی سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے شادی کی۔

تو اب اندازہ کریں کہ اس واقعہ کو کچھ اس انداز میں پیش کیا گیا، انہوں نے سب سے پہلے یہ کہا کہ مالک بن نویرہ مسلمان آدمی تھا، اس کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسی لیے قتل کیا تھا کہ اس کی بیوی پر قبضہ کر سکیں۔

❁......تو ایک تو قتل کا الزام لگایا کہ ایک مسلمان آدمی کو ناحق حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔

❁......دوسرا الزام یہ لگایا کہ قتل کا سبب ایک عورت تھی کہ آپ کی خواہش تھی کہ مالک بن نویرہ کی بیوی بڑی خوبصورت تھی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے۔ اب اس کی زندگی میں شادی کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا تو لہٰذا ان کو قتل کرا دیا، تاکہ اس کی بیوی کو اپنے گھر میں لے آ سکیں۔

❁......تیسرا الزام یہ لگایا کہ جس دن مالک بن نویرہ قتل ہوا اسی دن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کی بیوی کو اپنے گھر بلایا، اسی رات نکاح کر لیا، حالانکہ اس کی عدت بھی نہیں گزری تھی، چار مہینے دس دن اس کو عدت گزارنی

تھی۔عدت کے اندر نکاح نہیں ہو سکتا تو......نعوذ باللہ......ان پر زنا کا الزام بھی لگا دیا۔

اسی طرح ایک تیر سے دوسرا شکار یہ کیا، انہوں نے کہا کہ یہ سارا واقعہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ہوا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے باقاعدہ قصاص لیا جائے کہ انہوں نے مالک بن نویرہ کو کیوں قتل کیا ہے؟ اور اسی طرح ان پر حد جاری کی جائے کہ انہوں نے اس کی بیوی سے بغیر عدت کے گزرنے کے اسی رات اسے اپنے گھر میں ڈال لیا ہے۔حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے انہیں کمانڈر ہونے کے عہدے سے ہٹا دیا، لیکن چند دن انکوائری کرنے کے بعد انہیں چھوڑ دیا۔تو اب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول نے قصاص بھی نہ لیا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اتنے بڑے جرم پر پردہ ڈالا تو اب ایک تیر سے دو شکار کر لیے۔

اب جب لوگ پڑھیں گے کہ اچھا! حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا تو پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا کیا تو یہ کیسے خلیفۃ الرسول ہو سکتا ہے؟ جو قاتل سے قصاص نہ لے اور ایک آدمی نے......نعوذ باللہ......زنا کیا ہے اور اسے کچھ نہیں کہتا ہے کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بڑا طاقت ور کمانڈر تھا، لہٰذا وہ اپنے اک فوجی جرنیل سے دب گئے اور شریعت کے احکام کو چھوڑ دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات بھی نہ مانی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی مخالفت کی۔اس انداز میں انہوں نے کڑیاں ملائی ہیں......إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ......کہ ایک آدمی جب پڑھتا ہے تو وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ اصل قصہ کیا ہے؟

حالانکہ واقعہ یہ ہے مالک بن نویرہ اور ان کے دوسرے بھائی متمم بن نویرہ ہیں۔یہ دونوں بھائی اسلام لے آئے اور یہ اپنے علاقے کے برابر سردار تھے۔اسلام لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے علاقے کی سرداری پر قائم رکھا کہ تم اپنے علاقے کے اسی طرح سردار ہو۔اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذمہ لگایا کہ آئندہ زکوٰۃ اور صدقات اپنے علاقے اور اپنی قوم کا وصول کر کے مرکز یعنی مدینہ منورہ بھیجنا تمہاری ذمہ داری ہے۔مالک بن نویرہ وہ شخص ہے جو اسلام لانے کے بعد آہستہ آہستہ......نعوذ باللہ......ارتداد کی طرف بڑھنے لگ گیا اور صحیح کتابوں میں یہ روایت موجود ہے کہ جس دن میرے رسول پاک خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی ہے اس دن مالک بن نویرہ کے گھر میں مہندیاں لگائی گئیں، ڈھول بجائے گئے اور خوشیوں کے شادیانے بجائے گئے تو کیا کسی مسلمان سے آپ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن خوشیاں منائے؟ آپ کا ایمان یہ گوارہ کر

سکتا ہے کہ جو دن میرے مدنی ﷺ کی وفات کا ہو اس دن کسی مسلمان کے گھر میں مہندیاں لگائی جائیں، ڈھول بجائے جائیں اور خوشیاں منائی جائیں؟ تو یہ اسلام کی علامت ہو سکتی ہے؟

اس لیے بات کو سمجھیں! علماء اہل سنت والجماعت جو ہیں اور یہ ۱۲ ربیع الاول کے جلوس نکالے جاتے ہیں یا جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں، ایک اس وجہ سے بھی ان کو یہ مسئلہ بڑا مشکل ہو جاتا ہے کہ جیسے ۱۲ ربیع الاول پیدائش کا دن ہے اسی طرح وفات کا دن ہے۔ اگر ایک جانب سے ہم پیدائش کی خوشی منا رہے ہیں تو دوسری جانب وہی دن حضور ﷺ کی وفات کا دن ہے۔ تو دشمن اگر یہ کہہ دے کہ یہ ولادت کی خوشی نہیں، بلکہ موت کی خوشی منا رہے ہیں تو آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ تو ایسا کام کیوں کریں جس میں دشمن کو دین کے خلاف بات کرنے کا موقع ملے؟ جبکہ وہ کام نہ فرض ہو، نہ واجب ہو، نہ سنت ہو، نہ مستحب ہو اور نہ اس کی اجازت ہو۔

باقی جو اس کی بیوی تھی تو اس کو اس نے اپنی زندگی میں اپنے ارتداد سے ایک سال پہلے طلاق دی ہوئی تھی، لیکن چونکہ بڑا سردار تھا، اس لیے ویسے ہی گھر میں رکھا ہوا تھا۔ اب جناب حضور ﷺ کی وفات کے بعد جب یہ باتیں کھلیں، حضرت سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی تحقیق کے لیے بھیجا۔ اس نے جب جا کر مالک بن نویرہ سے بات کی۔ اس نے کہا کہ یہ بات تمہارا آدمی تمہارے اس ساتھی نبی کے بارے میں کہہ رہا ہے، یہ نہیں کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا، ہمارے آقا ﷺ نے فرمایا یا ہمارے مدنی سرکار ﷺ نے فرمایا۔ وہ تمہارا جو ایک ساتھی ہے، جیسے مکہ کے کافر کہتے تھے ''قَالَ صَاحِبُكُمْ، قَالَ رَجُلُكُمْ'' انہی الفاظ میں مالک بن نویرہ نے حضور ﷺ کی شان کے بارے میں وہی گستاخانہ لفظ کہے۔ حضرت امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان واقعات کا کوئی پتہ ہی نہیں ہے۔ حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ آپ اس علاقے میں جائیں اور تحقیق کریں۔ اگر وہ واقعتاً مرتد ہو چکا ہے اور دین اسلام سے نکل گیا تو اس کو عبرتناک سزا سے دو چار کریں، اسے قتل کر دیں اور اس کی پوری قوم کو سزا دیں۔ اگر بات غلط ہے تو پھر تحقیق کرنے کے بعد واپس آجائیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جا کر اس کا محاصرہ کیا تو وہاں یہ بھی پتہ چلا کہ جتنا زکوۃ وصدقات کا پیسہ جمع ہو چکا تھا، حضور ﷺ کی وفات کے دن اس نے اپنی قوم کو بلایا، کہا کہ یہ سارے زکوۃ وصدقات کے پیسے واپس لے لو،

اچھا ہوا کہ نبی فوت ہو گیا، تمہارا مال بچ گیا۔ اس سے بڑی دلیل ارتداد کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی پوری قوم میں یہ کہہ رہا ہے، ایک آدمی کے سامنے نہیں کہہ رہا۔ اس بنا پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حملہ کیا، اسے قتل کیا اور سزا دی۔ قوم کے کچھ لوگ گرفتار ہو گئے، کچھ نے توبہ کر لی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جہاں اس کے قتل کے بعد مال غنیمت کے طور پر مال حاصل کیا تو اس کی بیوی بھی مالِ غنیمت میں آئی۔ اس کی بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے تحقیق کی۔ اس نے کہا: وہ تو مجھے کئی سال سے طلاق دے چکا ہے۔ ظالم انسان تھا، اس نے جبراً مجھے روکا ہوا تھا۔ تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس سے باقاعدہ نکاح کیا۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بات پہنچی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے کہ مالک بن نویرہ تو مسلمان تھا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فوراً حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عہدے سے ہٹا دیا، معزول کر دیا اور فرمایا کہ اب انکوائری کرو، تا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ جرنل اپنے عہدے پر ہے تو انکوائری کیسے ہو؟ [مرقاۃ المفاتیح: ۱۲/۲۴۷، جامع الاحادیث، حدیث: ۲۷۴۲۹]

آپ نے دیکھا نہیں کہ ہمارے ملک میں جب کسی عہدے دار کے بارے میں انکوائری ہو اور عہدہ اس کے پاس ہے، کرسی اس کے پاس ہے تو سارے لوگ اس کا ساتھ دیں گے تو اس کے خلاف انکوائری کیسے ہو سکتی ہے؟ تو آپ نے ان کو معزول کر دیا۔ انکوائری ہوئی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سچے ثابت ہوئے اور اُس کا ارتداد ثابت ہو گیا۔ اور متمم بن نویرہ جو اس مالک بن نویرہ کا بھائی ہے اور ان بھائیوں میں اتنا پیار تھا کہ اس نے مالک بن نویرہ کے مرنے پر بڑے بڑے مرثیے لکھے اور قصیدے لکھے، لیکن جب اس کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے بلایا اور پوچھا کہ بھائی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: وہ مرتد ہو گیا تھا، اسلام سے نکل گیا تھا۔ اب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پھر اپنے عہدے پر بحال کر دیا، کیونکہ ان کا ایکشن عین اسلام کے مطابق ثابت ہوا۔

اب اتنی ساری تحقیق ایک عام فہم اہل سنت الجماعت کا فرد کہاں پڑھے گا؟ اتنی ساری کتابوں کو کہاں کھولے گا؟ اس کے دماغ میں تو یہ کیڑا ڈال دیا گیا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یہ کیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ کیا۔ جب پوری بات کا پتا نہیں ہے تو فوراً حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف بھی دل میں بغض آ گیا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے خلاف بھی دل میں بغض آ گیا، اصحابِ رسول کے خلاف بھی دل میں بغض آ گیا اور وہ خود بھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں مانتے۔ لیکن چونکہ یہاں اپنا مطلب تھا تو کہہ دیا کہ دیکھو! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ

بات نہیں مانی، کیا تم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مانتے ہو کہ تمہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات نہ ماننے کا دکھ ہو رہا ہے اور اگر عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے درمیان کسی قسم کا اختلاف ہوتا آپ اللہ کے کعبہ میں بیٹھے ٹھنڈے دل سے سوچیں تو کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی موت کے وقت یہ فیصلہ کرتے کہ میرے بعد خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دی جائے؟

بعض فرقِ ضالہ کے نظریات:

اسی طرح بعینہ روافض کا فتنہ پیدا ہوا، انہوں نے بعض اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کا دامن پکڑا اور باقی صحابہ رضی اللہ عنہم پر الزام لگائے، خوارج بالکل بعینہ ان کی ضد میں آئے۔ انہوں نے اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کا سہارا لیا اور اہل بیت رسول کے خلاف الزام تراشیاں کیں اور اتنا حد سے بڑھے اتنا حد سے بڑھے......نعوذ باللہ...... کہ انہوں نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تو ایمان ہی نہیں۔ انہوں نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے مخالف ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی سیدہ فاطمۃ الزہرا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جگر کا ٹکڑا ہے ان پر ایک سوکن لانا چاہتے تھے، دوسری شادی کرنا چاہتے تھے اور وہ بھی ابوجہل کی بیٹی سے۔ اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ تم فاطمہ کے بعد دوسری شادی نہ کرو، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار کیا اور دوسری شادی کر لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلیفہ برحق کا قصاص نہ لیا، ان کے قاتلوں سے آپ نے بیعت لی اور ان کو عہدے دیے۔ دیکھو کہ یہ کیسا بیٹا ہے جو دس ہزار کا لشکر لے کر اللہ کے نبی کی بیوی، ام المؤمنین، بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے مقابلہ پر نکلا، وہ تو ایمان سے بھی نکل گیا ......نعوذ باللہ...... تو خوارج نے صحابہ کا سہارا لیا اور اہل بیت رسول کا انکار کر دیا۔ اب ایک اہل سنت والجماعت جس کو اللہ نے صحیح عقل دی ہو وہ تو پورے دین کو سامنے رکھے گا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ہماری آنکھوں پر، اہل بیت بھی ہماری آنکھوں پر۔ ہم تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے بھی غلام ہیں، اہل بیت کے بھی غلام ہیں۔ جیسے ہمارے نزدیک حضرت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق ہیں، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق ہیں۔ وہ خلیفہ راشد ہیں۔ اگر ماں بیٹے میں جھگڑا ہوا ہے تو غلط فہمیاں تھیں، جو دشمنوں نے ڈال دی تھیں اور لڑانے کی کوشش کی۔ نہ ماں میں کوئی غلطی تھی اور نہ بیٹے میں کوئی غلطی تھی۔ ہم تو دونوں کے غلام ہیں اور دونوں کے دامن کے صاف کریں گے اور دونوں کے دامن پر جو کیچڑ آئے گی اور اعتراض آئے گا ہم اسے دفعہ کریں گے اور ان کا تحفظ کریں گے۔ اور خوارج نے اصحاب رسول کا سہارا لیا اور اہل بیت کا انکار کر دیا۔

اور بعض لوگوں نے اللہ کی توحید میں اتنی سختی اختیار کی کہ اللہ کے انبیاء اور اولیاء کی تنقیص کر بیٹھے، ان کی شان میں کمی کر بیٹھے، راستے سے ہٹتے چلے گئے اور یہ امت فرقوں میں بٹتی چلی گئی۔ اور یہی دشمن چاہتا تھا کہ امت محمد مصطفیٰ ﷺ کو لڑائے رکھو، ان کو مسائل میں الجھائے رکھو۔ جب تک یہ آپس میں لڑتے رہیں گے یہ کفر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر یہ اکٹھے ہو گئے، ان کے اختلافات مٹ گئے، یہ جسد واحد بن گئے اور یہ امت واحدہ بن گئے تو دنیا میں کفر باقی نہیں رہ سکتا۔ تو آج بھی اس نہج پر ہمیں ہر ہر مسئلہ میں لڑایا جا رہا ہے، اس لیے اللہ نے فرمایا کہ قرآن سراپا ہدایت ہے، ہم نے ہدایت کے لیے بھیجا۔ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ کیے وہ ہدایت میں پڑ گئے، جن لوگوں نے قرآن کو اپنے مقاصد میں استعمال کیا وہ کفر اور گمراہیوں میں گر گئے۔ گمراہیوں میں ڈھلتے گئے اور گمراہیوں میں بڑھتے گئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ ہدایت عطا فرمائیں اور قرآن سے ایمان حاصل کرنے والا بنائے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم قرآن پڑھ کر اور گمراہیوں میں بڑھتے چلے جائیں۔ ہمیشہ یاد رکھیں کہ یہ قاعدہ اور ضابطہ ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے، صراطِ مستقیم پر زندگی گزارنے کی توفیق بخشے اور صراطِ مستقیم پر اپنی رحمت سے موت نصیب کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نماز میں کھڑے ہیں اور کہتے ہیں ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ [الفاتحہ:۵] اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھلا دے، سیدھے راستے کی ہدایت فرما۔ ہم نماز پڑھ رہے ہیں، نماز تو سیدھا راستہ ہے، لیکن ہم کیوں بار بار مانگ رہے ہیں؟ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ! ہمیں ہدایت پر قائم فرما، ہدایت پر ثابت قدم فرما اور اسی ہدایت والے راستے پر موت عطا فرما۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم راستوں سے بھٹک جائیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں راستے میں ٹھوکر لگ جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت نے اللہ کی توحید کے مسئلے کو جیسے...... الحمد للہ...... سینے سے لگایا، اسی طرح شانِ نبوت اور شانِ رسالت کو اپنی آنکھوں میں بسایا، اسی طرح حقانیتِ صحابہ پر ایمان لے آئے، اہل بیت پر ایمان لے آئے، اسی طرح انہوں نے اولیاء کرام کا احترام سکھلایا، اسی طرح انہوں نے صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ محدثین، ائمہ مجتہدین، ائمہ فقہاء اور ائمہ قراء رحمہم اللہ اور علماء حقہ جو صحیح معنوں میں علمائے کتاب وسنت ہیں اور صحیح معنی میں وارث انبیاء ہیں، ان کا احترام ہمارے سینوں میں رکھا۔ اگر ایک سیڑھی چھوٹ گئی تو ہمارے پاؤں پھسلنے کا ایک تختہ ایک پائیدان ٹوٹ گیا۔ کسی وقت آپ چڑھتے ہوئے اترتے ہوئے گر جائیں گے اور اگر وہ

سیڑھیاں سلامت ہوں اور بالکل ترتیب سے بنی ہوں، اندھیرا بھی ہو جائے، بجلی بھی چلی جائے، آپ آرام سے قدم رکھتے ہوئے اندازے سے چلتے چلتے منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے، کیونکہ سیڑھیاں جو سالم تھیں۔ تو جن لوگوں نے اسی سلسلہ کو اپنے اساتذہ اور اپنے علماء سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک اپنے سینوں سے لگایا ہوا ہے، اللہ کی مہربانی سے وہ بھٹکنے سے محفوظ ہو جاتے ہیں، ورنہ یہ مختلف انداز ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی ذہنوں کے اندر یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ چار امام ہوئے، اس لیے قوم چار حصوں میں بٹ گئی۔ پھر بھی تو ٹکڑے گنیں کہ کتنے ٹکڑے ہوں گے؟ ابھی تو شکر ہے کہ چلو چار تک تو بات ہے اور اگر ہم نے ہر آدمی کو کہا کہ تم اپنی مرضی سے جو چاہو کرو، اپنی مرضی سے قرآن کی ہر آیت کو سمجھو اور فرمانِ رسول پاک ﷺ کو سمجھو اور اس کا خود ہی ترجمہ کر دو اور تاویل کر دو تو کتنے ٹکڑے ہوں گے؟ پھر آپ ٹکڑے گن ہی نہیں سکتے۔ تو سیدھی بات ہم کیوں نہ کریں جو اللہ نے کہی اور میرے نبی پاک ﷺ نے کہی۔ اگر ایک آدمی جاہل ہے تو عالم سے پوچھے، علم والے کے دروازے پر آئے اور اگر وہ خود عالم ہے، یعنی اللہ نے اس کو اتنا علم عطا فرمایا ہے کہ وہ کسی عالم سے پوچھنے کا محتاج نہیں رہا تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تو دیکھو کہ جو لوگ حج پر آتے ہیں، ان کو حج کرنا آتا ہے یا انہوں نے ایک حج کر لیا اور دو حج کر لیے، ایک عمرہ کر لیا اور دو عمرے کر لیے، چار عمرے کر لیے تو ان کو کیا پڑی ہوئی ہے کہ پوچھیں کہ عمرہ کیسے کرنا ہے؟ وہ کہے گا: ......الحمد للہ...... مجھے پتہ ہے کہ غسل کرنا ہے، دو رکعت پڑھنی ہیں، احرام باندھنا ہے، اللہ کے گھر میں جا کر طواف کرنا ہے، دو رکعت پڑھنی ہے، صفا و مروہ دوڑنا ہے، بال منڈوانے ہیں اور احرام کھول دینا ہے، عمرہ ہو گیا۔ جب وہ مسئلہ سیکھ گیا ہے اب اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ۴۳]

جب وہ عالم ہے، یعنی اس کو دین کے احکام کا علم ہے، اس کو قرآن و حدیث سے مسائل کے استنباط کا علم ہے، اس کو ناسخ و منسوخ کا علم ہے اور اس کو سب احکام پر نظر ہے تو وہ مسئلہ کیوں پوچھے؟ اسے کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جو آدمی نہیں جانتا وہ پوچھے، کیونکہ جہل کا علاج سوال ہے۔ اگر ایک آدمی کسی مسئلے میں جاہل ہے تو وہ سوال کرے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، وگرنہ اللہ فرما دیتے کہ ہر آدمی اکیلا نماز پڑھ لے، کوئی حکمت تو ہے کہ اللہ نے ہمیں پانچ وقت جماعت کی نماز کا پابند کر دیا ہے، ورنہ اللہ کی نماز ہے، اکیلے پڑھو، ادا تو ہو جاتی ہے۔ اگر ایک

آدمی اکیلے میں نماز پڑھ لے، نماز تو ادا ہو جائے گی، لیکن پانچ وقت پابند کیا گیا، اذان ہو، تکبیر ہو، امام ہو، جماعت ہو، ایک مسجد میں ہوں، ایک مقام پر ہوں اور ہر آدمی ایک امام کے حکم کے مطابق چلے رکوع میں اور سجود میں۔ اور اتنی سختی کی گئی کہ حضور ﷺ نے بددعا فرمائی: اگر کوئی شخص امام سے پہلے سر اٹھالے تو اللہ اس کے چہرے کو گدھے کا چہرہ بنادے۔ ہمیں اکٹھا کرنے کی کوئی حکمت تو تھی اور کوئی منشا شریعت تو تھا ہمیں ایک بات پر جمع کرنے کا۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! سونے کے پانی سے لکھنے والا جملہ ہے، اگر اپنے دماغ میں رکھ لو کہ بزرگوں نے فرمایا ہے:

"لَنْ يُصْلِحَ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا مَا أَصْلَحَ أَوَّلَهَا." [تفسیر القرآن:۶/۴۲]

"اس امت کا جو آخری زمانہ ہے یہ لوگ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے، مگر اس طریقہ سے جس طرح پہلی امت ٹھیک ہوتی تھی۔"

اور پہلی امت کیسے ٹھیک ہوتی تھی؟ اللہ کے قرآن سے اور محمد مدنی ﷺ کی غلامی سے ٹھیک ہوئی تھی۔ اور ہم بھی اس وقت ٹھیک ہوں گے جب اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی غلامی اختیار کریں گے، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب آدمی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا غلام بن جاتا ہے، چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی ہو، پھر اس ماحول میں خیر ہی خیر ہے، رحمت ہی رحمت ہے اور برکت ہی برکت ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ ایک آدمی زمیندار ہے، لیکن بیٹا نافرمان ہے، فاسق و فاجر ہے، شرابی ہے اور فتنہ والا آدمی ہے، چند دنوں کے اندر جائیداد بھی ختم، گھر بھی ختم، باپ دادا کے عزت بھی ختم اور پتہ لگتا ہے کہ کہیں جیل میں پڑا ہے یا کہیں گولی لگ گئی۔ اور اگر اس کے مقابلہ پر بڑا زمیندار ہے اور بیٹا دیندار ہے، اللہ نے بیٹے کو دین نصیب کر دیا، اتباع قرآن وسنت نصیب فرمادی تو اب وہ برسوں تک اپنے باپ کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے کہ یہ فلاں کا بیٹا ہے۔ باپ تو خیر اتنا اچھا نہیں تھا، لیکن ...... سبحان اللہ! ...... بیٹا بڑا اچھا ہے، ...... ماشاء اللہ ...... جب دیکھو قرآن میں ہے، نماز میں ہے، صدقہ وخیرات میں اور دین کے کاموں میں لگا ہوا ہے، ...... سبحان اللہ! ...... اس نے تو پورے علاقے کو بدل ڈالا۔ تو اصلاح کا حل اتباع کتاب وسنت ہے، اللہ اور اللہ کے رسول پاک ﷺ کی اطاعت ہے۔ اور جتنے سارے میں نے راستے بتائے ہیں وہ اسی بات کو پکا کرنے کے لیے ہیں۔

اب دیکھیں کہ ایک شہر میں کتنی مسجدیں ہیں، کتنے امام نماز پڑھا رہے ہوں گے، لیکن سب کا مقصد نماز، جماعت اور حضور ﷺ کی سنتوں کو زندہ کرنا ہے تو گویا اب آدمی تو بہت زیادہ ہیں، لیکن ہمیں سبق ایک ہی پڑھا رہے ہیں۔ جیسے کسی شاعر نے کہا تھا:

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں
زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سجا رہا ہوں
چراغ میرا ہے رات ان کی

بات کہنے والی زبانیں تو بہت ہیں، لیکن میں سب بات حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی کر رہا ہوں۔ اب ہم یہ کیسے دیکھیں کہ ان تمام باتیں کرنے والوں میں سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے؟ تو ہم ان کو قرآن وسنت کی روشنی میں دیکھیں گے۔ جس کا کہنا قرآن کے مطابق ہے اور جس کا کہنا حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق ہے وہ سچا ہے اور جس کا کہنا قرآن کے مخالف ہے، حضور ﷺ کے فرمان کے مخالف ہے وہ جھوٹا ہے۔ زبان سے تو کہہ رہا ہے، لیکن اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل اور حجت نہیں رکھتا۔

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ کا مصداق کون ہے؟

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ کا مطلب یہ نہیں ...... نعوذ باللہ ...... کہ قرآن سے گمراہی پھیلتی ہے۔ لفظی ترجمہ تو یہی ہے، لیکن مقصد اور مفہوم یہ ہے کہ جو قرآن پر ایمان لے آئے وہ ہدایت پا گئے اور جس نے انکار کیا وہ گمراہی میں پڑ گئے۔

مفسر نے بیان کیا کہ حضرت شعبہ رحمہ اللہ نے حضرت عمرو بن مرہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے، انہوں نے مصعب رحمہ اللہ سے روایت کی ہے، انہوں نے سعد رحمہ اللہ سے روایت کی ہے، مصعب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا کہ ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗئِكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۶، ۲۷] سے کیا مراد ہے اور کون لوگ مراد ہیں؟ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس سے مراد خوارج ہیں۔

مفسر فرماتے ہیں کہ اگر یہ سند ٹھیک ہے اور یہ بات حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے تو معنی یہ ہے کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر ومعنی بیان فرمایا، یہ مراد نہیں ہے کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ

جب یہ آیت نازل ہوئی ہے تو اس وقت خوارج کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ خوارج تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں، لہٰذا یہ تفسیر بالمعنی ہوگی، یعنی جن پر گمراہوں کی صفت آ رہی ہے اور جو اللہ کے ساتھ عہد و میثاق کو توڑنے والے، اللہ کے احکام کو توڑنے والے ہیں، جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں۔ چونکہ خوارج بھی ایسے تھے، انہوں نے بھی عہد کو توڑا، اسلام کے احکام کا انکار کیا، وہ بھی اسلام کے حکم سے نکل گئے اور خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نہروان پر جنگ کی، لہٰذا اس آیت کا مصداق وہ بھی بنتے ہیں، وگرنہ جس وقت قرآن اترا اس وقت روافض، خوارج اور معتزلہ نہیں تھے۔ دیکھنا ہوگا کہ قرآن نے جو صفات گمراہوں کی بیان کی ہیں وہ جن جن پر صادق آتی ہیں وہ گمراہ ہیں اور جو ہدایت کی صفتیں بیان کی ہیں وہ جن جن پر صادق آتی ہیں وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۵، البقرۃ: الآیۃ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا]

عہد و میثاق میں فرق:

یہاں ﴿اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ﴾ [البقرۃ: ۲۷] میں دو لفظ آئے: ایک ''عَهْدَ'' کا لفظ اور دوسرا ''مِیْثَاق'' کا لفظ آیا ہے۔ ''مِیْثَاق'' کا معنی بھی ''عَهْدَ'' ہوتا ہے اور ''عَهْدَ'' کا معنی بھی معاہدہ ہوتا ہے، جیسے ایک چیز پر عقد کرتے ہیں۔ لیکن دو لفظ اس لیے لائے کہ ان دو لفظوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ''عَهْدَ'' کہتے ہیں کہ آپس میں کسی چیز کا عہد کرنا۔ یہ عام ہے بندے کا اللہ سے عہد کرنا اور بندے کا بندوں سے عہد کرنا۔ اور ''مِیْثَاق'' ایسا معاہدہ ہے جس کے ساتھ قسم بھی شامل ہو، مجھے اللہ کی قسم ہے! میرا عہد ہے۔ تو یہ میثاق ہو گیا، لیکن مسلمان ہر مشکل میں ''عَهْدَ'' کا بھی پابند ہے اور ''مِیْثَاق'' کا بھی پابند ہے۔ قسم سے معاہدہ کرے یا بغیر قسم کے معاہدہ کرے، ''عَهْدَ'' اللہ اور اپنے درمیان ہے تب بھی پابندی کرے اور ''عَهْدَ'' بندوں کے درمیان ہے تو پھر بھی پابندی کرے، کیونکہ قیامت والے دن عہد کے بارے میں سوال ہوگا۔

خوارج کی وجہ تسمیہ:

اب مفسر فرماتے ہیں کہ خوارج کو خوارج کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ لوگ بھی اسلام کے حکم سے نکل گئے، اسلام کے عہد کو توڑ ڈالا۔ خلیفہ برحق خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خوارج اور نواصب نے جنگیں لڑیں اور نہروان کے مقام پر ان کا مقابلہ کیا تو وہ دین سے نکل گئے اور عہد کو توڑ ڈالا اور زمین میں فساد مچایا تو یہ صفتیں ان پر منطبق ہو گئیں۔ اس

بنا پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے مراد حرور یہ ہیں یا اس سے مراد خوارج ہیں۔

یاد رکھیں! قرآن جتنے بھی حکم بیان کرتا ہے انسان کو چاہیے کہ ان کو منطبق کرے۔ جہاں قرآن نے ایمان والوں کی صفتیں بیان کی ہیں وہاں اپنے گریبان میں نظر ڈالیں کہ تمہارے اندر وہ ایمان والی صفات ہیں یا نہیں ہیں؟ قرآن نے جہاں منافقوں والی صفات بیان کی ہیں وہاں اپنے دامن اور گریبان میں نظر ڈالو کہ کہیں ہمارے اندر تو کفر و شرک کے جراثیم داخل نہیں ہیں؟ یہ نہیں کہ قرآن پڑھیں کہ قرآن تو نازل ہوا تھا مکہ میں اور مدینہ منورہ میں، لہٰذا یہ ان لوگوں کے لیے تھا...... نعوذ باللہ...... یہ ہمارے لیے تو ہے ہی نہیں...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... قرآن کا حکم قیامت تک باقی ہے۔ قرآن پاک ایک نمونہ پیش کرتا ہے کہ مومن کی یہ صفتیں ہیں، منافق کی یہ صفتیں ہیں، مشرک کی یہ صفتیں ہیں، فاسق کی یہ صفتیں ہیں اور فاجر کی یہ صفتیں ہیں۔ اور مسلمان کا کام یہ ہے کہ قرآن کی جب اس دعوت کو پڑھے تو اپنے بدن پر، اپنے گھر والوں پر اور اپنے ماحول پر نظر ڈالے کہ ان کے اندر ایمان کی صفات ہیں یا نفاق کی صفات ہیں؟ اللہ پاک آپ کو، مجھے اور ہر مسلمان کو ایمان کی صفات نصیب کرے، اسی پر قائم و دائم رکھے اور اسی پر موت عطا فرمائے۔

یہودیوں میں چوہے کی صفات:

اب جدید اطباء نے یہ تحقیق کی ہے کہ اگر چوہے مر جائے اور آدمی اس کو ایسے پھینک دے تو اس سے بڑی غلیظ قسم کی بیماریاں پھیلتی ہیں، حتیٰ کہ طاعون تک بھی پھیل سکتا ہے۔ اس لیے ان کی تحقیق کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو اگر مارا جائے تو پھر اس کو اچھی طرح مٹی میں دبا کر دفن کر دیا جائے، تا کہ اس کے جراثیم باہر نہ پھیلیں۔ یہ اتنا خطرناک جانور ہے۔

اسی طرح ایک یہودی جس کا نام آپ نے سنا ہوگا ہیئر فورڈ کہ اس کی گاڑیاں ہیں، فورڈ کمپنی ہے۔ وہ اصل یہودی ہے، اس نے خود یہودیت پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس نے کہا: یہودی جتنی پالیسیاں بناتے ہیں یہ چوہے سے سیکھتے ہیں۔ تو اسی طرح کا یہ عمل کرتے ہیں کہ جب وہ دیکھے گا بات بنائے گا تو چھپ جائے گا۔ جہاں سے گھسے گا نکلنے کا راستہ کسی اور جگہ سے رکھے گا۔ اسی طرح یہ اندر اندر کاشتا رہے گا اور بظاہر نظر نہیں آئے گا تو اس نے کہا: جتنی یہودیت کی پالیسیاں ہیں وہ اسی سے لی ہوئی ہیں کہ اتنا چھوٹا جانور ہو کر اتنے بڑے درخت کو گرا دیتا ہے، کتنی بڑی

بڑی بلڈنگوں کو گرانے کا باعث بن جاتا ہے۔ تو ہم چھوٹی قوم ہو کر پورے عالم اسلام کو کیسے نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ حالانکہ وہ خود یہودی ہے۔ جب جھگڑا ہوا تو اس نے خود ایک کتاب لکھ ماری۔ جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، اختلاف ہوتے رہتے ہیں تو یہ باتیں بھی باہر نکل آتی ہیں۔ بہر حال فاسق کا معنی حد سے نکل جانا۔

پانچ چیزوں کو حرم میں بھی قتل کرنے کا حکم:

صحیحین کے اندر یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ پانچ چیزیں فواسق ہیں، حد سے نکلنے والی ہیں "یُقْتَلْنَ فِي الحِلِّ وَالحَرَمِ" حل کے اندر ہوں قتل کی جائیں اور حرم کے اندر ہوں تب بھی ان کو مار ڈالا جائے، یعنی ان کی کوئی ضرورت نہیں کہ حرم میں نہ مارا جائے۔ حل کہتے ہیں حرم سے باہر کا علاقہ اور حرم حرم ہے۔ حرم کے اندر تو جانور کا مارنا جائز نہیں، شکار کھیلنا جائز نہیں اور درختوں کا توڑنا جائز نہیں، لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ پانچ ایسی چیزیں ہیں جو حد سے نکلنے والی ہیں۔ یہ چاہے آپ کو حل میں ملیں یا حرم میں ملیں ان کو مار ڈالا ڈالا کرو۔ آپ نے فرمایا: کوا، چیل، بچھو، چوہا اور کاٹنے والا کتا۔ فرمایا: یہ جہاں بھی ملیں ان کو مار ڈالو۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۳۰۸۷، باب: مَا يُقْتَلُ الْمُحْرِمُ]

ایک کتا شکار کے لیے ہوتا ہے اور ایک کتا مویشی کی حفاظت کرنے کے لیے ہوتا ہے، ان کو نہیں مارا جاتا، کیونکہ اگر آپ ان کا ماریں گے تو ضمان دینی ہوگی، لیکن آوارہ کاٹنے والا کتا ہوتا ہے تو ایسے کتوں کو مار ڈالیں۔ اسی طرح چیل آ کر نقصان کرتی ہے۔ اگر چھوٹے بچے گوشت اٹھا کر آ رہے ہوں تو ایسا نقصان کرتی ہے کہ ان کے ہاتھ کو بھی کاٹ کر لے جاتی ہے۔ اسی طرح کوا گندگی کھانے والا ہے، گندگی پھیلانے والا۔ اور اسی طرح چوہا حرم میں ملے جہاں نظر آئے اس کو مار ڈالو۔

تفسیر:

﴿الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۲۷]

فساد کافر پھیلاتا ہے، مسلمان نہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا میں فساد پھیلانے والا کافر ہوتا ہے،

مسلمان تو کبھی فساد پھیلا ہی نہیں سکتا، مسلمان کا فساد سے کیا تعلق ہے؟ اور فساد ہمیشہ وہ پھیلاتا ہے جو ایک عہد کو توڑنے والا ہو۔ جو عہد کو قائم رکھنے والا ہے وہ فساد کو کیسے پھیلا سکتا ہے؟ اور جو آدمی رشتہ داروں کو بھی جوڑنے والا ہے، صلہ رحمی کرنے والا ہے اور دوستوں کو بھی جوڑنے والا ہے وہ کیسے فساد پھیلا سکتا ہے؟

اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے! یہ محض دشمنوں کا پروپیگنڈہ ہے کہ کبھی مسلمانوں کو......نعوذ باللہ...... فساد پھیلانے والا کہتے ہیں، کبھی مسلمانوں پر الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے تلوار کے زور سے اسلام پھیلایا، کبھی ان پر الزام لگاتے ہیں کہ مسلمانوں کا کام لوٹ مار کرنا ہے، لوگوں کی لڑکیوں کو کنیزیں بنالینا اور ان کے لڑکوں کو غلام بنالینا ہے، ان کی جائیدادیں چھین لینا ہے، مسلمانوں کا کام گوشت کھالینا، جانوروں کو ذبح کرلینا اور چار چار عورتوں کو گھر میں رکھ لینا ہے۔

تو یہ دراصل اسلام کے خلاف ایک پروپیگنڈہ ہے، وگرنہ جو لفظ اسلام ہے اس کا مادہ ہی سلامتی ہے۔ مسلمان تو سلامتی کا خواہاں ہوتا ہے، اسی طرح ایمان کا مادہ ہی امن ہے کہ جو ایمان والا ہے وہ امن والا ہے، جو مومن ہے وہ امن والا ہے اور جو مسلمان ہے وہ سلامتی والا ہے۔ کبھی سلامتی والا فساد نہیں پھیلاتا، لیکن جتنے فرقے کافر ہیں اور جتنے فرقے ضالہ ہیں وہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے ایسی ایسی باتیں چھیڑتے ہیں، ورنہ اگر آپ تاریخ عالم کو اٹھا کر مطالعہ کریں، آپ تاریخ پڑھ کر دیکھیں کہ سب سے بڑا فساد پھیلانے والا کافر ہوتا ہے، سب سے بڑا مفسد کافر ہوتا ہے، سب سے بڑا ظالم کافر ہوتا ہے، سب سے بڑا فاسق کافر ہوتا ہے، سب سے بڑا مجرم کافر ہوتا ہے اور سب سے بڑا دہشت گرد کافر ہوتا ہے۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: عین جنگ کے عالم میں بھی خبردار کسی بچے کو قتل نہ کیا جائے، کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے، کسی بوڑھے کو قتل نہ کیا جائے اور کسی مذہب کے پنڈت کو، راہب کو اور پادری کو قتل نہ کیا جائے۔ ہاں اس صورت میں کہ اگر وہ خود جنگ لڑ رہے ہیں، وہ خود قتال کر رہے ہیں تو ان کو قتل کیا جائے۔

[مسند أحمد بن حنبل، حدیث: ۲۷۲۸]

حضور ﷺ نے فرمایا: خبردار! کسی بستی کے بارے میں اگر تمہیں پتہ نہیں ہے، انتظار کرو رات کو شب خون مت مارو، انتظار کرو صبح کا۔ اگر اذان کی آواز آجائے تو اس بستی پر حملہ نہ کرو، ہوسکتا ہے وہاں غریب مسلمان بھی رہتے ہوں، وہ مفت میں مارے جائیں اور اگر اذان کی آواز نہ آئے تو پھر لڑائی کریں۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۱۵۴۹]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ:

آپ اندازہ لگائیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے روم کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ معاہدے کی مدت متعین تھی کہ دو سال میں ہم آپ پر چڑھائی نہیں کریں گے اور روم والے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر چڑھائی نہیں کریں گے۔ یہ معاہدہ تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے بابصیرت وقت کے امیر تھے۔ جب معاہدہ ختم ہونے کا وقت آ گیا، مثلاً: دو سال کی مدت ختم ہونے کو آ گئی تو آپ نے اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ آہستہ آہستہ روم کی طرف مارچ کرنا شروع کرو، تاکہ ہم دشمن کے بارڈر کے بالکل قریب پہنچ جائیں۔ اور جس وقت ہمارا معاہدہ ختم ہو جائے اس کے دوسرے دن ہم ان پر حملہ کر دیں گے، کیونکہ معاہدے کے اندر حملہ نہیں کر سکتے، ہم مسلمان ہیں، ان کے ساتھ عہد کیا ہوا ہے، لیکن جب معاہدے کی مدت گزر جائے تو پھر ہمارا کوئی معاہدہ نہیں۔ پھر ہمیں حق ہوگا کہ دشمن پر چڑھائی کر دیں اور وہ تیار نہیں ہوں گے اور ہم ان پر حملہ کر کے فوراً فتح حاصل کر لیں گے۔

آپ کی فوجیں چل رہی تھیں۔ ایک صحابی دوڑتے ہوئے آئے اور فرمایا: خبردار! مسلمانوں کو وفا کرنی چاہیے، غداری نہیں کرنی چاہیے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا معنی؟ انہوں نے کہا: حضور ﷺ نے فرمایا: کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہے، چاہے وہ معاہدہ گزر جائے جب تک ایک دوسرے کو خبر نہ دے دو اور ایک دوسرے کو اطلاع نہ کر دو کہ اب ہمارا تمہارا معاہدہ ختم ہو چکا ہے، اب ہم تم سے لڑیں گے تو جب تک ان کو باخبر نہ کر دو نہ لڑو۔ چوری چوری ان پر حملہ کر دینا، چاہے مدت معاہدے کے بعد بھی کیا جائے، اسلام کی وفاداری کی خلاف ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فوج کو حکم دیا: واپس آ جاؤ۔ جب حضور ﷺ کا فرمان مل گیا تو بات ختم۔

اسلام تو اتنا بڑا محافظت کرنے والا ہے اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی۔ اب آپ قرآن کی آیت کو پڑھیں اور اندازہ کریں کہ فساد کرنے والے کون ہیں؟

عہد توڑنے سے کیا مراد ہے؟

مفسر فرماتے ہیں کہ ان کافروں کے عہد توڑ ڈالنے سے کیا مراد ہے؟ فرماتے ہیں: اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوق کو جو حکم دیا کہ تم میرے نبیوں پر، میری کتابوں پر اور میرے شرائع پر ایمان لاؤ اور جن چیزوں کو چھوڑنے کا اللہ نے حکم دیا تھا تو جب کافروں نے ان کرنے والی چیزوں کو چھوڑ دیا اور نہ کرنے والی چیزوں کا ارتکاب کر لیا تو

گویا کہ انہوں نے اللہ کا وعدہ توڑ ڈالا۔

اور بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ آیت اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہے۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں صرف یہ دو قومیں تھیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد منافق ہیں، جنہوں نے اللہ پاک سے عہد کیے اور ایمان لائے اور توڑ ڈالے۔ اور اسی طرح اہل کتاب ہیں، جن سے ان کی کتابوں کے اندر باقاعدہ عہد لیا گیا تھا کہ جب میرے نبی حضرت محمد ﷺ پیدا ہوں گے تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کرو گے، باقاعدہ بشارتیں دی گئیں، باقاعدہ عہد لیا گیا اور یہ کتابوں میں پڑھے ہوئے ہیں، جانتے ہیں کہ تورات اور انجیل میں بھی لکھا ہوا ہے، لیکن ان اہل کتاب نے اس عہد کو پسِ پشت ڈال دیا، چند پیسے دنیا کے حاصل کر کے اللہ کے اس عہد کو توڑ ڈالا۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی بات کو زیادہ ترجیح دی ہے کہ اس سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد جمیع کفار ہیں، جمیع مشرکین ہیں اور جمیع منافقین ہیں۔ اور عہد سے مراد اللہ تعالیٰ نے سب سے اپنی توحید اور ربوبیت کا عہد لیا، اس کے بعد اپنے نبیوں کو ایسے ایسے معجزات دے کر بھیجا کہ دنیا کا کوئی آدمی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان معجزات کو دیکھنے کے بعد لوگ جانتے تھے کہ یہ اللہ کے نبی ہیں، لیکن اس کے بعد بھی وہ ایمان نہ لائے۔ اور مقاتل بن حیان نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔

زمخشری نے بھی اسی طرف میلان کیا ہے۔ انہوں نے بطور سوال ذکر کیا کہ کوئی پوچھے کہ وہ کیا عہد تھا جو انہوں نے توڑ ڈالا؟ تو جواب یہ دیا کہ عہد سے مراد وہ ہے جو اللہ نے ان کے دماغوں کے اندر توحید کا مسئلہ ڈالا تھا، گویا کہ اللہ نے ان سے عہد لیا اور اللہ نے ان کو اپنے نفسوں پر گواہ کیا ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ﴾ [الاعراف:١٧٢] انہوں نے اقرار کیا۔

ابوجعفر رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو توڑنے والے ہیں ان سے مراد منافق ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/ ٦٦، البقرة، الآیۃ: الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ...]

منافقین کی نشانیاں:

منافقوں کی چھ نشانیاں ہیں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ منافقوں کو اگر غلبہ ملے موقع ملے تو ان کی یہ نشانیاں صفتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ یعنی اگر منافق کمزور ہو اور دبا ہوا ہو تو اپنی حرکتیں ظاہر نہیں کرتا، لیکن جب اس کو کوئی موقع مل جائے تو

پھر ان کی یہ عادتیں نکل آتی ہیں۔ منافقین کی چھ نشانیاں کیا ہیں؟ اس لیے علماء نے فرمایا کہ جب یہ نشانیاں پڑھو تو اپنے اندر غور کرو کہ کیا یہ ہمارے اندر تو نہیں آگئی ہیں؟

❁......پہلی ان کی نشانی ہے ''اِذَا حَدَّثُوْا کَذَبُوْا'' کہ جب بات کریں تو جھوٹی بات کریں۔

آج کل مسلمان تو جھوٹ نہیں بولتا ویسے آدمی غور کرے کہ میں جھوٹ تو نہیں بولتا ہوں؟ کیا مسلمانوں میں اب جھوٹ کی بیماری تو نہیں پھیل گئی؟ اب تو......نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... کہ ایک تو تھا جھوٹ بول کر نہ شرمانا، ایک جھوٹ بول کر فخر کرنا اور اب تو یہ ہے کہ جھوٹ کے بغیر تو آدمی چل ہی نہیں سکتا۔ یعنی اب......نعوذ باللہ......اس کو اتنا عام بنا دیا گیا ہے۔ آج کل سب سے بڑا لیڈر وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا جھوٹا ہو، جو زیادہ قوم کو دھوکہ دے اور جو زیادہ قوم کو سبز باغ دکھلائے، وہ سب سے بڑا لیڈر ہوتا ہے۔ اور جو سچی بات کہنے والا ہو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ قوم اس کے ساتھ چلے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شاہ جی رحمہ اللہ کی تقریر اور ایک شخص کا تجزیہ:

اس لیے حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: لوگ تقریر میری سنتے ہیں، نعرے ہمارے ساتھ لگاتے ہیں اور جہاں میرا اعلان کر دو وہاں دو لاکھ کا مجمع تقریر سننے کے لیے آجاتا ہے، لیکن ووٹ دوسرے کو دیتے ہیں۔ ان کو پتہ ہے کہ اگر عطاء اللہ شاہ بخاری کامیاب ہو گیا تو یہ کہے گا کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو، یہ اگر کامیاب ہو گیا تو کہے گا کہ زانی کو سنگسار کر دو تو ایسے آدمی کو کون لے آئے گا؟ تو حضرت شاہ جی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں ایک جگہ تقریر کر رہا تھا کہ ہمیں کامیاب کیا تو ہم اسلام نافذ کریں گے، ہم سود ختم کر دیں گے، چور کا ہاتھ کاٹیں گے اور زانی کو سنگسار کریں گے تو ایک بوڑھا سا آدمی میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے، ایسے ایسے بار بار سر ہلاتا ہے۔ تقریر کرنے والے کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، جب اس کے مزاج کے خلاف کوئی کام کر رہا ہو۔ شاہ جی فرماتے ہیں کہ میں ادھر ادھر دیکھوں، لیکن پھر بھی اس پر نظر پڑ جائے۔ پھر وہ اسی طرح سر ہلائے اور ہنسے۔ میں نے کہا: میرے ساتھ مذاق بنا رہا ہے، سفید اس کی داڑھی ہے، بوڑھا آدمی ہے، اب میں کیا کروں؟ جب تقریر ختم ہوئی تو میں نے غصے سے اس کو پکڑ لیا کہ تم عجیب آدمی ہو میرے سامنے بیٹھ کر دانت نکالتے ہو!! اس نے کہا: شاہ جی! میں دانت نہیں نکال رہا تھا۔ تم تقریر کر رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ تم کیسے عقل والے آدمی ہو؟ جن لوگوں نے تم کو ووٹ دینا ہے ان کے

تم ہاتھ کاٹو گے، وہ پاگل ہیں کہ تمہیں ووٹ دیں؟ جنہوں نے تمہیں ووٹ دینا ہے وہ تو چکلے باز ہیں، زانی ہیں، وہ تمہیں ووٹ دیں؟ کیا وہ پاگل ہیں؟ اپنی پشت پر کوڑے کھائیں گے؟ میں نے کہا: تم بھی بن گئے، میں تو تمہاری کم عقلی پر ہنس رہا تھا کہ تم کس چکر میں پڑے ہوئے ہو؟ اس نے کہا: سیدھی سی بات ہے کہ علماء اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ ہمیں کتنے ووٹ ملیں گے؟ آسان سی بات ہے، مسجد کے نمازی گن لیں اور ایک سینما کے آدمی گن لیں۔ جتنے مسجد میں نماز پڑھنے آتے ہیں سمجھ لیں کہ اتنے تمہارے ووٹ پکے ہیں۔

منافقین کی دوسری نشانیاں:

یہ منافق کی نشانی ہے کہ جب بات کرے تو جھوٹی کرے۔

- ......دوسری نشانی ''وَإِذَا وَعَدُوْا أَخْلَفُوْا'' جب وعدہ کریں تو خلاف کریں۔
- ......تیسری نشانی ''وَإِذَا أُتُمِنُوْا خَانُوْا'' اور جب امانت رکھو تو خیانت کریں۔
- ......چوتھی نشانی ''وَنَقَضُوْا عَهْدَ اللهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهِ'' اور ہمارے دیے ہوئے عہد کو توڑ ڈالیں۔
- ......پانچویں نشانی ''وَقَطَعُوْا مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَنْ يُّوْصَلَ'' اور توڑ ڈالیں اس چیز کو جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا۔
- ......چھٹی نشانی ''وَأَفْسَدُوْا فِي الْأَرْضِ'' اور زمین میں فساد کریں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۶، البقرۃ، الآیۃ: اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللهِ مِنْ بَعْدِ...]

تفسیر:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٨﴾﴾

[البقرۃ: ۲۸]

''کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم بے جان تھے، پھر تمہیں جلایا۔ پھر تمہیں مارے گا، پھر تمہیں جلائے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

آیات کا آپس میں ارتباط:

ماقبل میں منکرین کا ذکر تھا، اب ان کو جھنجھوڑا جا رہا ہے۔ اگر تمہیں اللہ کی توحید پر ایمان نہیں تو اللہ کی نعمتوں کا کچھ خیال کرلو۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق کفارِ مکہ کا نظریہ:

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں ایک عجیب انداز سے خطاب فرمایا ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ کیسے تم اللہ سے کفر کرنے کی جرات کرتے ہو؟ اور اسی میں ایک مسئلہ ساتھ سمجھ لیں کہ حالانکہ مکہ کے مشرکین ہوں یا اہل کتاب ہوں اللہ کا انکار تو نہیں کرتے تھے، خدا کو تو مانتے تھے اور مشرکین مکہ بھی خدا کو مانتے تھے۔ ایک موٹی سی بات ہے کہ خدا کو نہ مانیں تو خدا کا گھر بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ خدا کو نہ مانیں تو اس کے گھر کا طواف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ علیحدہ بات ہے کہ شرک کرتے تھے، دہریے یا کمیونسٹ تو نہیں تھے کہ خدا ہے کہ یا نہیں؟ آج کل دنیا......نعوذ باللہ......اور فسادات میں مبتلا ہوگئی، دہریت پیدا ہوگئی۔ کمیونزم پیدا ہوا، اللہ کی رحمت سے اپنی موت آپ مر گیا۔ اب لوگوں کے دماغوں کے اندر جو کیڑے ہیں وہ بھی آہستہ آہستہ مر جائیں گے۔ اللہ کی ذات کا بھی انکار کرتے ہیں، مشرک تو اللہ کو مانتے تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ کو خالق مانتے تھے اور رازق مانتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اللہ کو بھی مانتے تھے اور اللہ کے ساتھ شریک بھی کرتے تھے، اس لیے وہ مشرک بنے، لیکن انہوں نے خدا کا انکار کبھی نہیں کیا، حضور ﷺ کے بعد بھی وہ خدا کو مانتے تھے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جب ابرہہ آیا تو عبد المطلب نے کس سے دعا مانگی تھی؟ اللہ کے کعبہ کا غلاف پکڑ کر کہا کہ میرا رب یہ تیرا گھر ہے اور اپنے گھر کی آپ ہی حفاظت کر سکتے ہیں، ہم تو عاجز ہیں، ہم تیرے گھر کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اسی طریقے سے سارے قرآن مقدس میں دیکھ لیں کہ جب بھی ان پر کوئی مصیبت آتی تھی تو خدا کو پکارتے تھے تو پھر اللہ نے ان کو یہ کیسے فرمایا ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ حالانکہ وہ اللہ سے کفر نہیں کرتے تھے۔ تو اس لیے بات کو سمجھیں! ایک آدمی چاہے لاکھ خدا کی توحید کو مانتا رہے، لیکن اگر وہ حضور ﷺ کی نبوت و رسالت کو نہ مانے تو گویا اس نے خدا کو نہیں مانا۔ ایک آدمی لاکھ دعوے کرتا پھرے کہ میں اللہ کو مانتا ہوں، اللہ کی ذات موجود ہے، اللہ خالق ہے اور رازق ہے، لیکن اللہ کے پاک نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لایا تو گویا اس نے خدا کو نہیں مانا۔ تو مسئلہ سمجھ آیا کہ انکار نبوت در اصل یہ بھی انکار خدا ہے، یعنی اگر کوئی آدمی حضور ﷺ کی اطاعت نہ کرے تو اللہ کی فرمانبرداری شمار نہیں ہوگی۔ اس لیے اللہ نے ان لوگوں کو فرمایا ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ حالانکہ وہ خدا کو مانتے تھے، اللہ کو خالق مانتے تھے، اللہ کو رازق مانتے تھے، اللہ کو پیدا کرنے والا مانتے تھے اور اللہ کو مُدَبِّر فِی الْاُمُوْر اور مُصَرِّف فِی الْاُمُوْر مانتے تھے، لیکن حضور ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے تھے، حضور پاک ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے تھے اور قرآن

کے کلام اللہ ہونے کا انکار کرتے تھے۔ اس لیے جب نبوت کا انکار، رسالت کا انکار اور قرآن کا انکار کیا تو گویا کہ اللہ کا انکار کیا۔

اسی سے یہ مسئلہ سمجھ لیں! جیسے ہمارے بعض مسلمان بھائی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں کہ مثلاً: قرآن کے احکام کو نہیں مانتے اور حضور ﷺ کے فرامین مبارکہ کو بھی نہیں مانتے، لیکن کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور کلمہ پڑھتے ہیں۔ تو اس کلمہ کا پھر کوئی اعتبار نہیں، یعنی آج اگر ایک آدمی...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... سزائے رجم کا منکر ہو یا ایک آدمی چور کے ہاتھ کاٹنے کا منکر ہو، اسے ظالمانہ سزا کہے کہ قرآن نے جو سزائیں دی ہیں یہ بڑی وحشیانہ ہیں، ظالمانہ ہیں، لاکھ کلمہ پڑھتا رہے اللہ کے ہاں وہ کافر ہے جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے۔ اپنے غلط عقائد سے اگر توبہ کرلے، اسلام کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے، رحمت کا دروازہ تو بند نہیں ہوا۔

کفر کی لغوی تفسیر:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ﴾ کیسے تم اللہ کا کفر کرتے ہو؟ کفر کا اصل معنی ہوتا ہے ناشکری اور انکار۔ کفر کا ایک معنی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی چیز کو چھپانا۔ کفارِ مکہ اللہ کے منکر نہ تھے، لیکن پھر بھی ان کو یہ کہا گیا کہ تم اللہ کا انکار کیسے کرتے ہو؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی رسالت کے منکر تھے اور انکارِ رسالت گویا کہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرنا ہے۔

﴿وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا﴾

اور تھے تم مردے یعنی نطفہ۔

بعض علماء نے فرمایا کہ ذرا وسعتِ نظر سے کام لیں کہ نطفہ جن چیزوں سے بن رہا ہے وہ پورے عالم میں بکھری پڑی ہیں۔ آدمی غور کرے! نطفہ کیا ہے؟ وہ خون سے بنتا ہے اور خون غذا سے بنتا ہے اور غذا کے حصول میں کئی لوگوں کی محنت اور کئی جگہوں سے ہوکر وہ انسان تک پہنچتی ہے اور وہ غذا کھانے کے بعد جاکر خون بنا۔ یہ ساری چیزیں تو مردہ تھیں، ان کے اندر کیا تھا؟ اور پھر خون بنا، وہ مردہ ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں ہمیں توجہ دلائی کہ اے انسان! تم کیسے ہو؟ مردہ سے تم کو زندہ کیا، بے جان غذاؤں سے بنے ہوئے نطفہ سے تمہاری زندگی بنائی، یعنی ایک مردہ چیز کو ہم نے زندہ کیا۔

بیٹی بیٹا دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے:

ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بہت بڑا رئیس اور سردار آدمی تھا، اس نے بڑے شوق سے اور چاہت سے ایک جگہ

شادی کی۔ شادی ہوگئی...... اور بڑے آدمیوں کے لیے شادی کیا مشکل ہے!؟ پیسہ ہو تو ہر رات شادی ہے، اسی لیے اردو کا محاورہ ہے کہ اگر دولت ہو تو ہر رات شب برات ہے اور ہر دن عید ہے۔ مسئلہ تو غریب کے لیے ہے...... جب اس رئیس نے شادی کر لی۔ بہر حال جب اس کی اولاد ہوئی تو بچی پیدا ہوئی۔ کہا: ٹھیک ہے۔ دوسری بھی بچی پیدا ہوئی، تیسری بھی بچی پیدا ہوئی۔ جب تین بچیاں ہوئیں تو اس کی طبیعت میں نفرت آگئی، اس نے اس بیوی کے ساتھ آنا جانا اور ملنا جلنا بند کر دیا۔ اس نے کہا: میں نے اتنی محبت سے شادی کی اور لڑکیاں پیدا ہو رہی ہیں تو اس کی بیوی نے اشعار کہے ہیں، جو بڑے عجیب اشعار ہیں! علماء نے کتابوں کے اندر نقل کیے ہیں۔

مجھ سے ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ عورت زمین ہے، جو بیج ڈالو گے وہی اگے گا۔ عورت کے ذمہ تو نہیں ہے کہ لڑکی پیدا کرے یا لڑکا پیدا کرے۔ یہ تو تمہارا بیج ہے، عورت تو زمین ہے۔ اگر تم نے گندم کا بیج ڈالا ہے تو گندم نکلے گا، جو ڈالا ہے وہ نکلے گا۔ اس میں عورت کا کیا مسئلہ ہے کہ عورت لڑکی پیدا کر رہی ہے۔

﴿فَاَحْيَاكُمْ﴾ پھر اللہ نے تمہیں زندہ کیا۔

﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ پھر تمہیں موت دیں گے اور پھر تمہیں زندہ کریں گے۔

یہاں موت دینے کو بھی اللہ نے نعمت شمار کیا ہے، کیونکہ اگر موت نہ آئے تو پھر وہ ابدی زندگی نصیب ہی نہیں ہو سکتی، اگر موت نہ آئے تو عالم دنیا سے عالم آخرت کی طرف انتقال ہو ہی نہیں سکتا۔

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ:

اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بڑا مشہور واقعہ ہے۔ بہر حال اللہ نے فرمایا: میرے پیغمبر سے کہہ دو کہ ایک جانور پر ہاتھ رکھ دیں، مثلاً: ایک گائے پر یا ایک بیل پر ہاتھ رکھیں۔ ان کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آجائیں اتنے سال ہم ان کی زندگی بڑھا دیتے ہیں، مثلاً: سو بال آگئے یا دو سو بال آگئے تو سو دو سو سال بڑھ گئے۔ تو انہوں نے کہا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ کہا: اس کے بعد مرنا تو ہے۔ انہوں نے کہا: جب پھر مرنا ہے تو اب مرنا بہتر ہے، کیونکہ دو سال کے بعد بھی تو مرنا ہی ہے۔

یہاں تو صرف ایک موت کا ذکر ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے تم مردہ تھے تو تمہیں زندہ کیا۔ زندگی کے بعد پھر تمہیں موت دیں گے اور پھر موت کے بعد زندگی دیں گے اور پھر تم آخرت میں چلے جاؤ گے اور اس کے بعد تو موت ہوگی نہیں۔

عذابِ قبر برحق ہے:

بہت سارے لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ قبر میں عذاب کیسے ہوتا ہے؟ قبر والوں کو سلام کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ اور قبر میں سوال و جواب کا کیا مسئلہ ہے؟ بس ایک موت پہلے تھی، مردہ تھے، زندہ ہو گئے۔ زندہ ہونے کے بعد مر گئے، مرنے کے بعد تو ہمیں پھر اسی دن اٹھایا جائے گا جب ہم آخرت میں جائیں گے۔ تو قبر میں تو زندگی کا کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں، قرآن نے ذکر ہی نہیں کیا تو قبر میں سوال جواب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پہلے لوگوں نے یہ غلط فہمی پیدا کی کہ مردے سنتے نہیں ہیں، پھر کہا کہ جب سنتے نہیں ہیں تو سوال جواب کس بات کا ہوگا؟ تو انجام اس غلط فہمی سے عذابِ قبر کا انکار کر دیا۔ علماء اہل سنت والجماعت نے جواب دیا ہے کہ ایک زندگی دنیا کی ہے، جس پر تمام احکام مرتب ہوتے ہیں، تکلیف مرتب ہوتی ہے اور اسی طرح پھر ایک زندگی ہے آخرت کی۔ دنیا کی زندگی میں عمل ہوگا اور آخرت کی زندگی میں جزا ہوگی اور بدلہ ہوگا۔ وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، وہاں احکام کی پابندیاں نہیں ہوں گی، وہاں راحت ہی راحت ہے۔ تو اصل زندگی دنیا کی تھی یا آخرت کی تھی، اس کا ذکر تو اللہ نے فرما دیا اور برزخ کا معاملہ نہ دنیا کی طرح مستقل زندگی ہے اور نہ آخرت کی طرح زندگی ہے، وہ تو گویا ایسے ہے جیسے ایک زندہ انسان کو نیند اور خواب کی کیفیت ہوتی ہے۔ تو عالم برزخ میں اللہ تعالیٰ جتنا قرآن مقدس میں ثابت ہے، جتنا احادیث پاک میں ثابت ہے، بس اتنی قسم کی ایک زندگی دے دیتے ہیں، وہ ہمارے سامنے ہے۔ آخرت میں جب اٹھائیں گے پھر بھی ہم اسی طرح زندہ ہوں گے، لیکن جو درمیانی کیفیت ہے، عالم برزخ ہے، وہ علم غیب ہے۔

اب اس کے اندر ایسا ہے کہ مثلاً سورج اپنے مقام پر موجود ہے اور آپ زمین پر ایک چیز رکھتے ہیں اور مصنوعی شیشے کو لے کر اس پر سورج کی شعاعیں ڈالتے ہیں تو کوئی حساب کرنے کی مشینیں یا گھڑیاں دھوپ لگے گی تو چل پڑے گی، اس کو کسی بیٹری کی ضرورت نہیں، وہ شمسی توانائی سے چلتی ہے۔ اگر سورج نہ ملے مثلاً: رات کو ضرورت ہے اسی عام لائٹ کے بھی سامنے کر دیں تو اس سے بھی وہ توانائی لے لیتی ہے، حالانکہ وہ مشین یا کیلکولیٹر جو ہے آپ کے ہاتھ میں ہے، کوئی تار نہیں، کچھ نہیں ہے اور سورج اپنی شعاعیں آسمانوں سے بکھیر رہا ہے، لیکن جب اس مشین پر پڑتا ہے تو اس کی بیٹری چارج ہو جاتی ہے اور وہ کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ روح کو علیین میں رکھتے ہیں اور کافروں کی روح کو سجین میں رکھتے ہیں، لیکن جس بندے کو نعمتیں دینی ہیں یا عذاب دینا ہے تو اس

روح کا تعلق اور روشنی اس میں ڈال دیتے ہیں، اس کے اندر وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

کوئی جھگڑے والا مسئلہ تو ہے ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا کہ ہمارا سارے قرآن پر ایمان ہو جائے گا، جیسے کہ اللہ پاک نے فرمایا کہ فرعون کو جب ہم نے غرق کیا اور غرق ہونے کے فوراً بعد اسے عذاب نار میں داخل کر دیا گیا:

﴿اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا﴾ [غافر:۴۶]

''وہ صبح وشام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں۔''

اسی طریقہ سے آیا کہ مومن سے بھی سوال ہوگا اور کافر سے بھی سوال ہوگا:

((مَنْ رَّبُّكَ؟ مَا دِيْنُكَ؟ مَاتَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ؟))

تو اب پھر ان تمام حدیثوں کا انکار کرنا پڑے گا کہ اگر ہم کہیں گے کہ جب بندہ مر گیا تو اس کے بعد بھی عذاب نہیں ہے۔

اب نتیجہ کیا نکلا کہ لوگ راستے سے ہٹ گئے۔ جو لوگ قبر کی زندگی کے قائل تھے وہ بڑھتے گئے، بڑھتے گئے، انہوں نے کہا: قبر کی زندگی کے اندر سوال جواب تو ہر آدمی سے ہوگا، اتنا تو کافر کو بھی زندگی ہے تو مومن کو زیادہ ہے، اچھا جی! اللہ کے ولیوں کو اور زیادہ ہے، اللہ کے نبیوں کو اور زیادہ ہے۔ وہ جہاں چاہتے ہیں مرضی آئے تو چلے بھی جاتے ہیں، وہ آگے بڑھتے گئے، انہوں نے کہا کہ ان کی زندگی تو بہت اعلیٰ ہے تو وہ جہاں چاہیں آئیں جائیں۔ اسی لیے بزرگوں کی زندگی بہت اعلیٰ ہے، جب چاہتے ہیں مریدوں کے گھروں میں ان کو ملنے کے لیے آجاتے ہیں۔ اور آگے بڑھتے گئے اور ادھر والے گھٹتے گئے، انہوں نے کہا: بس معمولی سی زندگی ہوتی ہے، بس سوال جواب ہوگا اور اس کے بعد کچھ نہیں۔ وہ ادھر گھٹتے گئے اور وہ ادھر بڑھتے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں پٹڑی سے ہٹ گئے، حالانکہ اصل بات کیا تھی کہ جتنا قرآن فرماتا ہے اور حدیث فرماتی ہے اتنا ہمارا ایمان ہے۔ قرآن نے فرمایا اور حدیث نے ہمیں بتلایا کہ جب قبرستان پر گزرو تو سلام کرو:

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ!)) [صحیح مسلم، حدیث: ۹۷۴، باب: ما يقال عند دخول القبور]

حدیث میں موجود ہے، ہمارا ایمان ہے کہ جب ہمیں سلام کا حکم دیا گیا ہے تو اللہ ان کو سنواتے بھی ہوں گے، وگرنہ ہم ہر دیوار، درخت اور ہر بے جان چیز سے گزرتے تو حکم ہوتا کہ سلام کرو۔

اور اسی طرح سوال جواب ہوتا ہے، ہمارا ایمان ہے، کیونکہ جو حدیث میں موجود ہے اس سے آگے نہ بڑھیں گے۔قدم بڑھائیں گے تو پھر ہلاکت کے گڑھوں میں گرتے چلے جائیں گے، یعنی جتنا ثابت ہے مان لیں اور جس کا ذکر نہیں چپ ہو جائیں۔جن جن چیزوں کی ہمارے سرکار ﷺ نے وضاحت فرمادی ہمارا ایمان ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے دیکھا ان دو قبروں پر عذاب ہو رہا ہے[1]۔حضور ﷺ سے کہا گیا کہ آج فلاں آدمی نے بڑی بے جگری سے جنگ لڑی ہے اور شہادت پا گیا۔آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس نے مال غنیمت سے ایک چیز چرائی اور اس کی وجہ سے آگ جل رہی ہے[2]۔تو جتنی چیزیں میرے نبی پاک ﷺ نے بتلائی ہیں اتنی مانیں، آگے قدم نہ بڑھائیں، کیونکہ جو آگے بڑھیں گا تو پھر ٹھوکریں لگیں گی۔

جیسے ہماری دوسری برادری آگے چلی گئی۔جو آدمی پیر کی قبر پر کھڑے ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ پیر کو سب پتہ ہے کہ فلاں میرا مرید آیا ہوا ہے اور اس کو یہ بھی پتہ ہے کہ مرید کیا مانگنے آیا ہے؟ دنیا میں پیر کے سامنے بیٹھو تو اس کو پتہ نہیں، مرنے کے بعد اس کو یہ بھی پتہ لگ جاتا ہے۔عجیب سی بات ہے!!

واقعہ:

ایک پیر صاحب تھے، انہوں نے اپنی بڑی شہرت کی کہ پیر صاحب اتنے اعلیٰ مقام کو پہنچے ہوئے ہیں کہ جو آدمی سامنے جاتا ہے حضرت سب جان لیتے ہیں کہ یہ آدمی کیوں آیا ہے؟ کیوں بیٹھا ہے؟ کیا غرض ہے؟ تو ایک طالب علم تھا...... طالب شرارتی ہوتے ہیں، طالب علم چاہے بوڑھے بھی ہو جائیں طالب طالب ہوتا ہے...... خدا کی قدرت ہے کہ ایک طالب علم کو شرارت سوجھی، اس نے عربی میں ایک شعر لکھا، جس میں اس کو گالی لکھی۔وہ گندا شعر ہے، میں پڑھنا نہیں چاہتا۔تو اس نے لکھنے کے بعد یہ کیا کہ جو شعر کاغذ میں لکھا ہوا تھا وہ جا کر حضرت کے بیٹھنے کی جگہ پر اونچے مقام پر رکھ دیا کہ جہاں حضرت آ کر بیٹھیں تو وہ کاغذ نظر آ جائے اور اس کے نیچے لکھا کہ چونکہ حضرت آپ سب کچھ جانتے ہیں تو مجمع میں یہ بھی بتادیں کہ یہ شعر کس نے لکھا ہے؟ اب حضرت نے وہ شعر پڑھا۔جب شعر پڑھا تو چہرہ بگڑنے لگ گیا۔پھر اس کو رکھ دیا، پھر غصہ آئے، پھر پڑھے اور پھر چپ کر کے رکھ دے۔مریدوں نے پوچھا: حضرت! کیا بات ہے؟ اس نے کہا: چھوڑو!۔انہوں نے کہا: حضرت! بتائیں تو سہی آخر کیا ہے؟ انہوں نے

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۶۱، باب: الجرید علی القبر]
[2] [صحیح البخاری، حدیث: ۳۰۷۴، باب: القلیل من الغلول]

جب زیادہ تنگ کیا تو اس نے کہا کہ کسی مردود نے بڑی بکواس لکھی ہے۔ انہوں نے پوچھا: کون ہے وہ شرارتی؟ تو اس نے کہا: پتہ نہیں؟ تو اس کا علم غیب تو وہیں کھل گیا۔ بھائی! جب تمہیں گالی دینے والا کا پتہ نہیں لگتا، صرف پیسے دینے والا کا پتہ لگتا ہے۔ اچھا تمہارا علم غیب ہے! جو تمہیں آ کر نذر و نیاز چڑھاتا ہے، اس کا پتہ لگتا ہے اور جو تمہیں گالی دے رہا ہے اس کا تمہیں پتہ نہیں لگتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔

اسی لیے شیخ غلام اللہ خان مرحوم کہا کرتے تھے کہ بابا! تمہارے پیروں میں کوئی زور ہوتا تو غلام اللہ زندہ رہتا!؟ میں نے جو کراچی سے خیبر تک تمہارے دروازے اکھاڑ ڈالے ہیں۔ اگر تمہارے پیروں میں زور ہوتا تو میں کہاں زندہ رہتا؟ وہ تو سب سے پہلے میری جان نکال لیتے۔ موت وحیات کا مالک تو صرف اللہ ہے۔

آیات کا ربط:

اس مسئلہ میں ہمیشہ یہ اصول یاد رکھیں کہ جتنی چیز قرآن وسنت میں ثابت ہے اس پر ایمان لانا ہے اور جس چیز کا اللہ کے قرآن اور حضور ﷺ کی حدیث میں ذکر نہیں ہے اس کی بحث میں پڑنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

فرمایا:

﴿كُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ﴾

"تھے تم مردہ، پس اس نے تم کو زندہ کیا۔"

وہاں "فاء" لگائی، کیونکہ اس زندگی میں فاصلہ بڑا تھوڑا ہے۔ نطفہ آیا، پھر قرار پکڑا اور اللہ نے اس کو زندہ کر دیا۔ لیکن اس کے بعد عمر پچاس سال ہے، سو سال ہے، ستر سال ہے، دس سال ہے، کیونکہ فاصلہ زیادہ ہے، اس لیے فرمایا

﴿ثُمَّ يُمِيتُكُمْ﴾

اور اس کے بعد قبر کی زندگی کا بھی اللہ کو پتہ ہے کہ ہم نے کتنی دیر قبر میں رہنا ہے؟ وہاں بھی فرمایا:

﴿ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾

چونکہ "فاء" تعقیب کے لیے ہوتی ہے اور "ثُمَّ" بعد مدت کے لیے ہوتا ہے اور تراخی کے لیے ہوتا ہے، فرمایا:

﴿ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾

اور اٹھنے کے بعد کتنے مراحل سے گزرنے کے بعد ہمیں میدان حشر میں حاضر ہونا ہوگا! اس لیے فرمایا:

﴿ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝۲۸﴾

اور پھر تم اپنے اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، میدانِ حشر میں جاؤ گے اور پھر اس کے بعد حساب و کتاب ہوگا۔ اللہ نے فرمایا: کم از کم اپنی زندگی اور اپنے بدن پر نظر ڈال لو، تمہیں میری قدرت کا اقرار کرنے پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ نعمتوں کا تذکرہ کیوں فرماتے ہیں؟

ان آیات مبارکہ میں اللہ نے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب نعمتوں کا ذکر کیا جائے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی اس نعمت دینے والی ذات کو پہچانے کہ ہمارا منعم حقیقی کون ہے؟ اور اس کی نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور کفر اور نافرمانی نہ کرے۔ اس آیت میں یہ فرمایا گیا کہ تم لوگ جس طرح اللہ کے نازل کیے ہوئے قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اسی طرح اللہ کی دی ہوئی حیات اور بدن کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے اپنی حیات و موت پر غور کرو کہ جس ذات نے موت و حیات دی ہے اس نے رسول اور احکام بھیجے ہیں، پھر ان کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۝۲۹﴾ [البقرۃ:۲۹]

اللہ نے فرمایا: زمین اور کل کائنات میں جو کچھ میں نے پیدا کیا ہے وہ میرے بندے کے لیے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اگر تمہیں پیدا فرما دیتے، لیکن پیدا ہونے کے بعد غذا کا انتظام نہ کرتے تو پھر تو تم زندہ نہ رہتے۔

اشیاء میں اصل حلت ہے یا حرمت؟

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۝۲۹﴾ [البقرۃ:۲۹]

بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ جب اللہ نے ہر چیز ہمارے لیے پیدا کی ہے تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز کے اندر اصل حلت و اباحت ہے، لیکن جن چیزوں کا اللہ نے حرام ہونے کا اعلان فرما دیا وہ حرام ہیں، کیونکہ جب پیدا ہمارے لیے کیا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ سب نعمتیں حلال ہیں۔

اور بعض علماء نے فرمایا: اصل ہر چیز میں حرمت ہے، لیکن وہ چیزیں جو اللہ نے ہمارے لیے حلال کردی ہیں وہ حلال ہیں، باقی حلال نہیں ہیں۔

اگر غور کریں تو یہ مقام اس بحث کا نہیں ہے، اس میں تو اللہ اپنی نعمتوں کا ذکر فرمار ہے ہیں کہ میرے بندو! دیکھو! زمین اور جو کچھ اس میں ہے میں نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔

[معارف القرآن: ۱/۱۷۴]

ایک بادشاہ کی بیماری کا واقعہ:

اس لیے تاریخ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بادشاہ نے زمین پر ایک کیڑا دیکھا، جو گندگی اپنے اوپر اٹھا کر چلتا ہے۔ بادشاہ کو بڑی نفرت آئی، کہنے لگا: دیکھو! یہ کیا گندی چیز ہے! اوپر گند اٹھایا ہوا ہے۔ اگر اللہ میاں اس کو پیدا نہ کرتے تو کون سا دنیا میں کمی آجاتی؟ یہ بھلا پیدا کرنے کی چیز تھی؟ اس کو پیدا کر دیا گیا۔ اگر یہ پیدا نہ ہوتا تو کون سا مخلوق کا کام رک جاتا؟ کون سا نظام درہم برہم ہو جاتا؟...... تو بات تھی ختم ہوگئی اور بادشاہ یہ بات بھول گیا۔

مدتوں کے بعد بادشاہ کے پاؤں پر پھوڑا نکل آیا، اس کا بڑا علاج کرایا، لیکن شفا نہ ہوئی۔ تمام جراح تنگ آگئے، بادشاہ مجبور ہے، پاؤں میں پھوڑا ہے، نہ جراب پہن سکتا ہے، نہ جوتا پہن سکتا ہے...... یہ تو جب نعمت چھن جاتی ہے پھر پتہ لگتا ہے۔ ابھی ہمارے ہاتھ پاؤں سالم ہیں، ایک ناخن ذرا ٹوٹ جائے تو پھر اندازہ ہوگا، آنکھ میں تمہارا اپنا بال گر جائے تو پھر پتہ لگے گا کہ کتنی بڑی نعمت ہے! کیونکہ ابھی تو ہم دیکھ رہے ہیں، کھا رہے ہیں اور پی رہے ہیں، اس لیے خدا کو بھولے ہوئے ہیں، ہمیں اللہ کی کوئی نعمت یاد نہیں۔ دیکھا نہیں!! ان سے آنکھوں والی نعمت کی قدر پوچھو جو اندھے ہیں، ان سے ٹانگوں کی قدر پوچھو جو لنگڑے ہیں، ان سے ہاتھوں کی قیمت پوچھو جو ہاتھوں سے محروم ہیں، ان سے عقل کی قیمت پوچھو جو پاگل ہو گئے ہیں، ان سے قوت کی قیمت پوچھو جو کمزور ہو گئے ہیں اور ان سے صحت کی قدر پوچھو جو بیمار ہو گئے ہیں۔ جب تک وہ نعمت موجود ہے انسان خدا کو بھولا ہوا ہے، لیکن جب وہ نعمت چھن جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ بڑے صحتمند نوجوان پر فالج کا حملہ ہوتا ہے، معذوری میں پڑا ہوا ہے کہ کوئی آئے تو اسے حمام اٹھا کر لے جائے۔ گھر والے بھی تنگ آگئے، ماں باپ بھی تنگ آگئے اور دوست بھی تنگ آگئے۔ اب اپنے پیشاب میں پڑا ہے، اپنی گندگی میں پڑا ہے، لیکن اٹھنے کی طاقت نہیں، حمام جانے کی طاقت نہیں، کوئی اور چارپائی

سے اٹھا کر وہیل چیئر پر لے جائے، اس کو پتہ ہوتا ہے کہ میری صحت کا کیا عالم تھا؟ میرے چلنے کی کیا نعمت تھی؟ جب نعمت چھن جاتی ہے تو پھر قدر معلوم ہوتی ہے...... تو خیر بڑا اعلاج معالجہ ہوا، لیکن بادشاہ ٹھیک نہ ہوا۔

ایک دن بادشاہ شکار پر گئے ہوئے تھے، دریا کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مجذوب فقیر آدمی گزرا، اس نے سلام کیا۔ بادشاہ موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے، کچھ انعام بھی دیا۔ اس فقیر کی نظر جب پاؤں پر پڑی تو اس نے کہا کہ بادشاہ سلامت! آپ کے پاؤں پر کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ایک پھوڑا ہے، میں تو بڑا تنگ آ گیا ہوں۔ میں نے بڑے بڑے اطباء بلائے ہیں، لیکن یہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس نے کہا: میں سنیاسی قسم کا آدمی، جوگی قسم کا آدمی ہوں اور جنگلوں میں پھرنے والا ہوں۔ ایک کیڑا جو گندگی اٹھا کر پھرتا ہے مل جائے تو میں ایک مرہم بنا دوں گا اور آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جلدی کرو، تلاش کرو۔ اب سارے سپاہی دوڑ پڑے اب اسی کو ڈھونڈ رہے ہیں جس کے بارے میں کہتا تھا کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے بارے میں اس کا یہ خیال تھا کہ اس کو اللہ نے پیدا کیوں کیا؟

اسی لیے بعض جاہل کہہ دیتے ہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اور ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ میرا مولیٰ جانتا ہے کہ اس میں کیا حکمتیں ہیں؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی ہے، غریب ہے، نماز پڑھ رہا ہے، تہجد پڑھ رہا ہے، اشراق پڑھ رہا ہے، اللہ کے قرآن پر ایمان ہے اور حضور پاک ﷺ پر ایمان ہے۔ سارا دن مزدوری کرتا ہے اور بچوں کا پیٹ بڑی مشکل سے پالتا ہے۔ اور اس کے مقابلہ پر ایک فاسق فاجر ہے، شرابی ہے، زانی ہے، بدکردار ہے، بداعمال ہے، بدصورت ہے اور جاہل ہے اور وہ کروڑوں میں کھیلتا ہے۔ بندہ کہتا ہے کہ عجیب بات ہے! اللہ نے اپنے بندے کو تو کچھ نہیں دیا ہے، جو اس کی عبادت کرنے والا ہے۔ اور جو اس کا مخالف ہے، فاسق فاجر ہے اور بے دید ہے، وہ سارا دن اللہ کے قوانین کو توڑنے والا ہے، اسے عورتیں بھی مل رہی ہیں، شراب بھی مل رہی ہے اور پیسہ بھی مل رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم جاہل ہیں، ہمارا علم محدود ہوتا ہے، ہماری پوری کائنات پر نظر ہو ہی نہیں سکتی، محلے میں نظر نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ کائنات میں ہماری نظر ہو، لیکن وہ جانتے ہیں: جس کو اللہ نے غریب رکھا ہے تو اس کے غریب رکھنے میں کوئی حکمتیں ہیں، جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے دولت دی ہے، دولت دینے میں امتحان اور آزمائشیں ہیں، وہ دینے والا سمجھتا ہے، ہم نہیں سمجھتے۔

تو اب اس کیڑے کو ڈھونڈ رہے ہیں، وہ مل گیا، اس کو پکڑا، اس کو کاٹا، اس کے اندر کا حصہ نکالا اور اس سے ایک

مرہم تیار کی اور بادشاہ کو کہا کہ اس کو تیس دن کے لیے باندھیں اور پھر اس کے بعد میں حاضر ہوں گا اور پھر دیکھیں گے کہ کیا ہوا ہے؟ بادشاہ نے مرہم باندھی تو نہ پھوڑا رہا اور نہ زخم رہا، سب ختم ہو گیا۔ اس نے کہا: اس فقیر کو ڈھونڈو، اس کو انعام دیں، لیکن وہ کہاں ملے؟ وہ تو اللہ نے تنبیہ کرنے کے لیے کسی کو بھیج دیا تھا۔

تفسیر:

یہاں آیت میں زمین کا مطلقاً ذکر ہے، لیکن آسمانوں کی تقسیم کا بھی ذکر آ گیا، لیکن صحیح قول سلف صالحین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان بھی سات پیدا کیے اور زمین بھی سات پیدا کی ہیں۔ اور ہر آسمان سے دوسرے آسمان تک کا جو فاصلہ ہے، حدیث پاک میں آتا ہے: حضور ﷺ نے فرمایا: ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال تک آدمی چلتا رہے گا وہاں تک پہنچے گا، اسی طرح پھر تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا اور ساتواں آسمان ہے۔ اللہ نے پھر زمینوں کو بھی سات زمینیں بنایا۔

یہاں ﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ﴾ ہے اور دوسری جگہ ہے ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ:۵]۔ وہاں ''علی'' یعنی اللہ عرش پر مستوی ہے، جیسے اس کی شان کو زیبا دیتا ہے اور یہاں ''اِلیٰ'' صلہ آیا ہے کہ اللہ نے آسمانوں کی طرف توجہ فرمائی اور آسمانوں کو سات حصے میں بنایا۔

بعض آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے آسمان پہلے بنائے، زمین بعد میں بنائی اور بعض آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے زمین پہلے بنائی اور آسمان بعد میں بنائے، جیسے قرآن مقدس کی ایک آیت میں آتا ہے:

﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا﴾ [النازعات:۳۰]

''آسمانوں کو بنانے کے بعد زمینوں کو بچھایا۔''

بعض مفسرین نے فرمایا ہے: دراصل اللہ نے زمین پیدا فرمائی، اس کے بعد آسمانوں کو بنایا۔ پھر اللہ نے زمین کو بچھایا اور پھیلایا۔ پیدا کرنا علیحدہ چیز ہے اور بچھانا علیحدہ چیز ہے۔ یہی قول راجح ہے اور اسی پر تقریباً تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۷، البقرۃ: الآیۃ: ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ...]

قیامت کا علم صرف اللہ کو ہے:

اب جدید علماء کہہ رہے ہیں کہ ایک دم دار تارا مشتری سے ٹکرائے گا۔ کہتے ہیں کہ ایک کروڑ سال کے بعد ٹکراتا

ہے۔ اب اندازہ کریں کہ خدا کی زمین پیدا ہوئے کتنی صدیاں گزر گئیں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی جانتا ہے، کون حساب لگا سکتا ہے؟ ہمارے حساب تو زیادہ سے زیادہ ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد چودہ صدیاں گزر گئیں اور ہم پندرھویں صدی میں داخل ہیں، لیکن حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر میرے مدنی پاک ﷺ کا بھی زمانہ نکالیں تو تقریباً آٹھ ہزار سال بنتا ہے۔ ہزار ہا سال گزر چکے ہیں اور اس کے بعد خدا جانے اور کتنے گزریں گے؟ یہ جاہلوں کا قول ہے کہ چودھویں صدی آگئی، اس کے بعد قیامت آئے گی۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی یہی دعویٰ کیا تھا کہ چودھویں صدی آخری صدی ہے، پندرھویں صدی نہیں آئے گی۔ اگر پندرھویں صدی آگئی تو میں جھوٹا۔ یہ جاہلانہ بات ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں، کیونکہ جب اللہ نے قیامت کا علم ہی کسی کو نہیں دیا تو صدیاں گننے کا کیا معنی ہے؟ قیامت کا علم ملے پھر تو ہم تاریخ گن سکتے ہیں کہ باقی سو سال ہے یا پچاس سال ہے؟ تو جب قیامت کے آنے کا کسی کو علم ہی نہیں ہے تو جتنی مدت باقی ہے اس کا بھی کسی کو علم نہیں ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اس نظام پر غور کرو ﴿وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ ۞﴾ [ق: ٦] کہ آسمان کے اندر کسی قسم کا کوئی سوراخ نہیں ہے۔ جیسے آج کل کہتے ہیں کہ اوزون میں ایک سوراخ ہو گیا ہے۔ یہ تو آسمان سے نیچے کی باتیں ہیں، آسمان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بادل جیسے آسمان سے نیچے ہیں اور چاند آسمان سے نیچے ہے اسی طرح اوزون کا غلاف بھی آسمانوں سے نیچے ہے۔ آسمانوں پر تو خدا جانے ہماری نظر بھی پہنچتی ہے کہ نہیں پہنچتی؟ اس لیے بعض کہتے ہیں کہ آسمان نیلا ہے، یہ ہمیں نیلگوں ایک خلا نظر آتا ہے، جس کو ہم نے آسمان بنایا ہوا ہے، ورنہ خدا جانے کہ آسمان کہاں ہے؟ وہاں تک ہماری وسعت نظر نہیں جاتی۔

زمین والوں کی طرح آسمان میں بھی کعبہ ہے:

حدیث مبارک میں آیا: اللہ نے ساتوں آسمانوں پر جو کعبہ بنایا ہے ساتوں آسمان والوں کے لیے۔ جیسے زمین والوں کے لیے کعبہ ہے، اسی طرح آسمان والوں کے لیے کعبہ ہے۔ اور آسمانوں سے اوپر ایک اللہ کا گھر ہے، اس کا نام بیت المعمور ہے۔ اگر اللہ کے کعبہ کو نیچے اتاریں تو بعینہٖ اسی کعبہ کے اوپر بیٹھے گا، یعنی اس کعبہ کا حکم تحت الثریٰ تک بھی ہے اور آسمانوں تک بھی ہے۔ حدیث مبارک کے اندر آتا ہے کہ اس کعبہ کا طواف کرنے کے لیے روزانہ

ستر ہزار فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور جو ایک دن طواف کرتا ہے اس کو قیامت تک پھر نمبر نہیں ملے گا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۳۲۰۷، باب: ذِكْرِ الْمَلَائِكَةِ]

سب سے زیادہ علم والے کون؟

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمام مخلوق پیدا کی ہے اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور سات آسمان بنائے، شاید تم یہ سمجھو کہ اب اللہ کو ہمارا کوئی پتہ نہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۷، البقرۃ: الآیۃ: هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ]

جب بھی اللہ کی توحید کا مسئلہ آئے گا تو دو صفتوں کا ضرور ذکر آئے گا: ایک عالم کامل کا ذکر آئے گا اور ایک قدرت کاملہ کا ذکر آئے گا۔ دو باتیں اگر انسان کے دماغ میں مستحکم ہو جائیں تو اللہ کی رحمت سے آدمی کفر اور شرک سے بچ جاتا ہے کہ قدرت کامل کا مالک اللہ ہے۔ بندے اور ہر جاندار کو اللہ نے عقل و قدرت دی ہے، لیکن وہ کامل نہیں ہوتی، بیماری عوارض وغیرہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح علم اللہ نے ہر چیز کو دیا ہے، جانوروں کو بھی ان کی ضرورت کے مطابق علم دیا ہے۔ سب سے زیادہ علم انسانوں کو دیا ہے اور انسانوں میں سب سے زیادہ علم انبیاء علیہم السلام کو دیا ہے اور انبیاء علیہم السلام میں سب سے زیادہ علم اللہ نے اپنے رسولوں کو دیا ہے، لیکن علم کامل کسی کا نہیں ہے، علم کامل صرف اللہ کی ذات کا علم ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا: مسلمانو! قدرت کاملہ بھی میرے ہاتھ میں ہے اور علم کامل بھی میرے ہاتھ میں ہے۔ جب یہ سب چیزیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور ہم نے بھی اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے تو ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ﴾ کیسے تم میرے ساتھ کفر و شرک کر رہے ہو؟

عذابِ قبر برحق ہے:

ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا یہ متفق علیہ مسئلہ ہے:

"عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ"

"قبر کا عذاب حق ہے۔"

"لَا يُنْكِرُهَا إِلَّا ضَالٌّ أَوْ مُضِلٌّ"

"اس کا انکار نہیں کرتا، مگر جو گم کردہ راہ ہے اور لوگوں کو بھی گمراہ کرنے والا ہے۔"

ہر چیز کا علم صرف اللہ کو ہے:

اللہ نے پھر سات آسمان پیدا فرمائے اور اللہ تعالیٰ کا علم تمام مخلوقات کو محیط ہے، مخلوقات کا ذرہ ذرہ اللہ کے علم میں ہے۔

اسی لیے یاد رکھیں کہ جیسے آپ نے قرآن کے اندر پڑھا ہے اور کوئی مقامات میں آپ پڑھتے بھی ہیں، اللہ نے فرمایا:

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ﴾[ق:١٦]

''میں ہر بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔''

اور اس طرح فرمایا کہ جب بھی مجھے پکارو تو میں سنتا ہوں۔

اور اسی طرح اللہ نے فرمایا:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾[الحدید:٤]

''اللہ کی ذات تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہوتے ہو۔''

اس کا معنی یہ نہیں ہوتا، جیسے بعض لوگ گمراہی میں پڑ گئے کہ اللہ شہ رگ سے قریب ہے تو شہ رگ تو اندر ہوتی ہے تو اللہ اندر داخل ہو جاتا ہے، جیسا کہ بعض روافض نے یہ عقیدہ رکھا۔ اور اسی طرح ہمارے بعض لوگ...... جو غلو میں مبتلا ہوئے...... انہوں نے بھی یہ عقیدے رکھے کہ ہمارے پیر میں اللہ کا حلول ہو گیا۔ کسی نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اللہ کا حلول ہو گیا۔ یہ عقائد کفریہ ہیں اور یہ عقائد شرکیہ ہیں۔ قریب ہونے کا معنی یہ ہے کہ ہر چیز اس کے علم میں ہے۔ جو چیز علم میں ہو وہ قریب ہوتی ہے اور جو چیز علم میں نہ ہو...... چاہے قریب بھی ہو...... دور ہوتی ہے۔ تو اس لیے اللہ کے قرب سے معیت علم مراد ہوتی ہے۔ جب اللہ کے علم میں ساری مخلوق ہے کہ کوئی چیز اللہ کے علم سے باہر نہیں ہے۔ اب اسی طرح دیکھیں مثال سمجھانے کے لیے: اگر تم نے گھر میں کوئی چیز رکھی ہو، الماری کے اندر ہو اور تالے کے اندر ہو، لیکن آپ کو علم ہے کہ میری چیز فلاں صندوق اور فلاں الماری کے خانے میں رکھی ہوئی ہے، گویا تمہیں ڈھونڈنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، بس الماری کھولی اور نکال لی۔ اور ایک چیز اس کا تمہیں علم نہ ہو، چاہے وہ تمہارے سامنے بھی رکھی ہو تو سارا دن ڈھونڈتا ہے اور دوسرے دن نظر آتی ہے تو کہتا ہے ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا

باللهِ" یہ تو یہاں پڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ علم نہیں ہوتا تو وہ چیز عدم علم کی وجہ سے دور ہو جاتی ہے اور علم ہونے کی وجہ سے چاہے کتنی دور ہو، لیکن قریب ہو جاتی ہے۔

اس کی دوسری مثال یوں سمجھ لیں! مثلاً: آپ کا بیٹا آپ سے ناراض ہو کر چلا گیا اور اسی مکہ میں چھپ گیا، لیکن آپ سے دور ہے۔ اب آپ ڈھونڈ رہے ہیں اور دوستوں سے پوچھ رہے ہیں اور سارا سارا دن آپ اس کے لیے پریشان ہیں، لیکن اگر آپ کا بیٹا سینکڑوں ہزاروں میل دور ایک ملک میں نوکری کر رہا ہے، لیکن ٹیلی فون پر آپ کا اس سے رابطہ ہے، وہ روزانہ شام کو آپ سے بات کرتا ہے کہ میں خیریت سے ہوں، میری ڈیوٹی ٹھیک ہو رہی ہے تو کوئی آپ سے پوچھے تو آپ کہیں گے: الحمد للہ! ٹھیک ہے، میری روزانہ ان سے بات ہوتی ہے، حالانکہ وہ اتنی دور ہے، لیکن آپ کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کے گھر میں ہے، کیونکہ اس کا روزانہ جو آپ سے کنٹیکٹ ہے اور آپ کے علم میں ہے کہ وہ فلاں جگہ پر ہے اور فلاں وقت پر نوکری کر رہا ہے۔

اور اگر وہ اسی شہر میں ہے کہ جس محلہ میں تم رہتے ہو، اس محلے کے دوسرے مکان میں بیٹا چھپ گیا، لیکن کسی کو بتاتا نہیں۔ اب باپ ڈھونڈ رہا ہے کہ پتہ نہیں، بیٹا کہاں گیا؟ تو جو چیز علم میں نہیں ہوتی وہ معلوم ہوتی ہے اور جو چیز علم میں ہو چاہے وہ کتنی دور ہو وہ نزدیک معلوم ہوتی ہے۔ اللہ کا علم ساری کائنات کو احاطہ میں لیے ہوئے ہے، یعنی کوئی چیونٹی، کوئی پتہ نہیں، مگر اللہ کے علم میں ہے۔ کوئی دنیا کے اندر تغیر و تبدل نہیں ہوتا، مگر اللہ کے حکم اور علم سے۔ اور کوئی ہماری حرکت اور سکون ایسی نہیں ہے کہ اللہ کے علم میں نہ ہو۔ ہم حرکت کرتے ہیں تو اس کے علم میں ہے، اٹھتے ہیں تو اس کے علم میں ہے، ہم نماز پڑھتے ہیں تو اس کے علم میں ہے اور عبادت کرتے ہیں تو اس کے علم میں ہے۔ اسی لیے "عِلْمُهٗ مُحِيْطٌ" کہ اللہ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تو جہاں آتا ہے کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے تو اس سے معیت علمی مراد ہوتی ہے۔ اور بعض مقام پر بطور خاص آتا ہے کہ میں اپنے عبد کے ساتھ ہوں، یا آتا ہے کہ میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔ ایک تو معیت عامہ ہے جو ساری مخلوق کو حاصل ہے اور جو اس کے پیارے بندوں کو حاصل ہوتی ہے وہ معیتِ نصرت ہے کہ اللہ کی مدد ان کے لیے آجاتی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿قَالَ كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝﴾ [الشعراء: ۶۲]

''میرا رب میرے ساتھ ہے اور وہ مجھے راستہ دکھلائے گا۔''

اسی طرح حضور پاک ﷺ کو فرمایا گیا کہ آپ بھی اپنے ساتھی سیدنا ابی بکر سے فرمادیں:

﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ﴾ [التوبۃ:۴۰]

''آپ غم نہ کرو، اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے۔''

تو اس کا معنی یہ نہیں کہ اللہ غار میں ہم دونوں کے ساتھ ہے۔ اسی لیے بعض جاہل بے چارے غلط فہمیوں کی بنا پر، جہالت کی بنا پر اور بلا وجہ غلو کی بنا پر ایک عادت ہو جاتی ہے تو پھر انسان ایسے ایسے غلط ترجمے کرتے ہیں کہ اسلام سے نکل کر کفر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہر مسلمان کو شرک سے محفوظ فرمائیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض علماء کے نزدیک آیت میں ''ثُمَّ'' سے خبر کا عطف خبر پر کیا گیا ہے، نہ کہ فعل کا عطف فعل پر، جیسے کسی شاعر نے کہا تھا:

قُلْ بِمَنْ سَادَ ثُمَّ سَادَ اَبُوْهُ
ثُمَّ قَدْ سَادَ قَبْلَ ذٰلِكَ جَدُّهُ

''جس نے سرداری کی پھر سرداری کی اس کے باپ نے پھر اس سے پہلے سرداری کی تھی اس کے دادا نے۔''

حالانکہ دادا پہلے تھا، پھر باپ تھا اور پھر یہ تھا تو اس لیے فرمایا: عطف خبر علی خبر ہے، فعل کا عطف فعل پر نہیں ہے کہ اللہ نے زمینوں کو پہلے پیدا فرمایا، بعد میں آسمانوں کو بنایا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾
وہی ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو سات آسمان کر دیے۔ اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

مخلوقات کی پیدائش کی ترتیب:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سدی نے ابی مالک اور ابی صالح رحمہما اللہ کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ

سے اور حضرت مرہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے آیت مبارکہ کی یہ تفسیر بیان فرمائی کہ اللہ تبارک تعالیٰ کا عرش مبارک پانی پر تھا اور اس وقت کوئی چیز پیدا نہیں کی گئی تھی ماسوا پانی کے اور پانی پر ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کا عرش تھا۔ ''فَلَمَّا أَرَادَ أَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ'' جب اللہ نے ارادہ فرمایا کہ مخلوق کو پیدا فرماؤں تو پھر اس پانی سے دھواں اٹھا، جیسے دھواں اٹھتا ہے، پھر وہ دھواں اٹھتے اٹھتے گویا پانی کے اوپر ایک سطح بن گئی اور اس کے اوپر چھا گیا۔ اس لیے اس کا نام سماء ہو گیا، یعنی آسمان ہو گیا۔ پھر جو اس دریا کا پانی تھا اس کو خشک کر ڈالا تو اس سے زمین بن گئی۔ پھر اس زمین کو بھی حصے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے سات زمینیں بنائیں۔ اتوار اور سوموار کے دنوں میں اللہ نے زمینوں کو پیدا فرمایا۔ فرماتے ہیں: اور وہ زمین ایک مچھلی پر ہے اور یہ مچھلی وہ ہے جس کا ذکر قرآن مقدس میں بھی آیا ﴿نٓ وَالْقَلَمِ﴾[القلم:۱] تو ''نون'' اور ''حوت'' مچھلی کو بھی کہتے ہیں۔ اس لیے بعض علماء نے یہ بھی تفسیر فرمائی ہے، تو گویا مچھلی پانی میں ہے اور اس کے اوپر زمین ہے اور پانی ایک چٹیل پتھر پر ہے اور وہ پتھر ایک فرشتے کی پشت پر ہے اور پھر وہ فرشتہ ایک بڑی چٹان پر ہے اور وہ چٹان ایک ہوا کے اندر ہے۔ اب جب حوت مچھلی نے حرکت کی تو اس سے اضطراب پیدا ہوا، جس سے زمین کے اندر بھونچال آیا اور اللہ نے اس زمین کو جمانے کے لیے پہاڑوں کو بوجھ کار کھا، پھر وہ زمین قرار پکڑ گئی۔ اور منگل اور بدھ کے دن زمین پر درخت، پہاڑ اور وہ چیزیں پیدا کیں جس سے انسان نفع حاصل کرتا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:

﴿وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ﴾

[حم سجدہ:۱۰]

پھر بنائے سات آسمان۔ دونوں جمعرات اور جمعہ میں بنائے۔ اور جمعہ کو جمعہ اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ جمعہ کے دن آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش جمع ہو گئی۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر آسمان میں ملائکہ کو پیدا کیا اور آسمانوں کو ستاروں وغیرہ سے زینت بخشی۔

دوسری آیت میں بھی ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾[الاعراف:۵۴]

اور جب اللہ تعالیٰ نے اس کام سے اپنی شان کے مطابق فراغت پائی تو جمعہ کے دن کی آخری گھڑی باقی تھی اسی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہی جمعہ کے دن کا آخری حصہ ہے جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کو بھی پیدا فرمائیں گے، لیکن وہ کون سا جمعہ ہوگا اس کا علم اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہے۔ یہ روایات مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کی ہیں، کیونکہ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے بہت پہلے پیدا کردی تھیں۔ اس لیے ابن کثیر اور دیگر تمام محققین فرماتے ہیں کہ ان چیزوں پر اجمالی ایمان لانا کافی ہے کہ اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ حق و سچ اور عدل ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے چاہے وہ چیزیں ہماری سمجھ میں آسکیں یا نہ آسکیں۔

لیکن کئی روایات اگرچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں، لیکن وہ سنداً ثابت نہیں ہیں، اسرائیلیات میں سے ہیں۔ مفسرین ان کو نقل کر دیتے ہیں، مگر ان کی بنا پر کوئی عقیدہ بنالینا درست نہیں ہے، جب تک ان کی حیثیت واضح نہ ہو جائے۔ کسی معتمد مفسر کا نقل کر دینا کافی نہیں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۸، البقرۃ: الآیۃ: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ]

کار اچھی کہ گھوڑی:

ایک بلوچ سردار تھا، خیال آیا، زندگی میں پہلی دفعہ کار لی۔ جب گاڑی لے کر آئے تو ان کے راستے کی سڑکیں تو کچی ہوتی تھیں، تو ایک چھوٹا سا پانی کا کھالہ تھا، ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ سردار صاحب نے کہا کہ گاڑی کیوں روک دی ہے؟ اس نے کہا: آگے کھالہ ہے اور کھالے کے اندر تو گاڑی نہیں جاسکتی۔ انہوں نے کہا: چلاؤ۔ اس نے کہا کہ حضرت! کیسے چلاؤں؟ اگر میں گاڑی چلاؤں گا، آپ تو نہیں جانتے، لیکن میں جانتا ہوں کہ کھالے میں گاڑی ٹوٹ جائے گی، نئی گاڑی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم نے اتنے پیسے خرچ کیے ہیں، یہ تو گھوڑی سے بھی خراب ہے۔ اس نے کہا کہ ایسی گاڑی کا کیا فائدہ ہے جو کھالہ بھی عبور نہیں کر سکتی؟ تو اس نے کہا کہ لے جاؤ! ہماری اپنی گھوڑی ٹھیک ہے۔ اس کو تو اشارہ کرتے ہیں، وہ تو نہر کو دجائے گی۔ دریا میں بھی ڈال دو تو چلی جائے گی، یہ کیسی کار ہے؟

ترتیب تخلیق کے متعلق حدیث:

((خَلَقَ اللّٰهُ التُّرْبَةَ يَوْمَ السَّبْتِ وَ خَلَقَ فِيْهَا الْجِبَالَ يَوْمَ الْاَحَدِ وَ خَلَقَ الشَّجَرَ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَ خَلَقَ الْمَكْرُوْهَ يَوْمَ الثُّلَاثَاءِ وَ خَلَقَ النُّوْرَ يَوْمَ الْاَرْبَعَاءِ وَ بَثَّ فِيْهَا الدَّوَابَّ يَوْمَ الْخَمِيْسِ وَ خَلَقَ آدَمَ علیہ السلام بَعْدَ الْعَصْرِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فِيْ آخِرِ الْخَلْقِ فِيْ آخِرِ سَاعَةٍ مِنْ سَاعَاتِ الْجُمُعَةِ فِيْمَا بَيْنَ الْعَصْرِ إِلَى

اللَّيْلِ)) [صحیح مسلم، حدیث:۲۷۸۹]

"اللہ تعالیٰ نے زمین ہفتے والے دن پیدا فرمائی، اتوار والے دن پہاڑ، اللہ تبارک وتعالیٰ نے درخت سوموار کے دن پیدا فرمائے، جتنی مکروہ پیش آنے والی ہیں وہ منگل کے دن پیدا ہوئیں، اللہ پاک نے بدھ کے دن نور پیدا فرمایا، خمیس کے دن (جمعرات والے دن) پھر جانور پیدا فرمائے اور اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر سے لے کر مغرب کے درمیان میں آخری گھڑی میں پیدا فرمایا۔"

مفسر فرماتے ہیں: امام مسلم نے یہ روایت نقل فرمائی ہے، یہ ان کے غرائب میں شمار کی جاتی ہے۔ اس روایت پر علی المدینی، امام بخاری اور بہت سارے حفاظ رحمہم اللہ نے کلام فرمایا کہ کیسے آپ نے یہ روایت نقل فرمائی؟ انہوں نے فرمایا: یہ در اصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تو نہیں، بلکہ یہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا قول معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی شاید یہ سنا ہے حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے۔ کہتے ہیں کہ بعض راویوں کو شبہ لگا کہ بجائے اس کے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی بات کو جو انہوں نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، اس لیے اس روایت پر بڑا کلام کیا گیا اور مفسر نے جو پہلی روایت نقل کی ہے وہ زیادہ صحیح ہے" وَاللّٰهُ تَعَالٰی أَعْلَمُ عِلْمُهُ أَتَمُّ" اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح راستے پر قائم رکھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۹، البقرۃ: الآیۃ: هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ]

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾

جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسی مخلوق قائم کرتا ہے جو اس میں فساد کرے یا خون بہائے؟ اور ہم تیری خوبیاں بیان کرتے ہیں اور تیری پاک ذات کو یاد کرتے ہیں۔ فرمایا: بے شک مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔

آیات کا ربط:

نعمتیں در اصل دو قسم کی ہوتی ہیں:

1 ......ایک نعمتیں ظاہری وصوری ہوتی ہیں، جیسے کھانا پینا زمین اور اس کی تمام اجناس وغیرہ۔

2 ......اور ایک معنوی نعمتیں ہیں، جیسا کہ انسان کو علم حاصل ہونا، خوشی مسرت سکون کا حاصل ہونا اور زندگی خوش

اسلوبی سے گزارنا وغیرہ۔

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے صوری نعمتوں کا ذکر فرمایا اور ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے معنوی نعمتوں کا ذکر فرمایا کہ اگر تمہارا کوئی باپ ہی نہ ہوتا اور تمہیں کوئی تعلیم و تربیت نہ دی جاتی تو دنیا پیدا ہونے کے بعد معاملہ درہم برہم ہو جاتا۔ تو اس لیے انسانیت کی ابتداء یعنی آدم علیہ السلام کا واقعہ اور ان کو تعلیم دینے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔
[معارف القرآن: ۱/ ۱۷۷]

اس آیت سے ایک مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ ملائکہ انسان سے پہلے پیدا ہوئے، کیونکہ ابھی حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہی نہیں ہوئے اور اللہ تعالیٰ ملائکہ سے فرما رہے ہیں ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ﴾ تو بات سمجھ آئی کہ ملائکہ کی مخلوق انسان سے پہلے پیدا ہوئی ہے اور اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ جنات بھی انسان سے پہلے پیدا کیے گئے۔

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ﴾ [البقرۃ: ۳۰]

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے یہ بات کی کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں تو اس کا ایک مقصد یہ تھا کہ اپنے بندوں کو تعلیم دی جائے کہ جب کوئی اہم کام کیا جائے تو اس کے لیے مشورہ ضروری ہے۔ تم اللہ کے اس امر سے سبق سیکھو کہ کبھی کوئی اہم کام کرنا ہو تو مشورے سے کرو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۰، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِیْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۱۵۹]

یہ امر بھی اس امت کو تعلیم دینے کے لیے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے ذکر کیا ہے، جنوں کے سامنے ذکر نہیں کیا، اس سے یہ اصول معلوم ہوا کہ مشورہ ان سے کرنا چاہیے جن میں مشورہ دینے کی صلاحیت و قابلیت ہو، ہر شخص سے مشورہ نہیں کرنا چاہیے۔ نیز اگر شرعی احکام میں مشورہ کرنا پڑے تو ان کے طریقۂ تنفیذ میں تو مشورے دے سکتا ہے، لیکن اللہ کے قانون کو تبدیل کرنے میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا، امت کو تعلیم دی جائے۔ اسی لیے اللہ نے قرآن میں فرمایا:

﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝﴾ [الشوریٰ: ۳۸]

مسلمانوں کے معاملات مشورے سے طے ہوتے ہیں، مشورے کے بعد فیصلہ ہوتا ہے۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد خلافت کا جو معاملہ ہے مشورہ ہے۔ جو مشورہ ہو جائے اور اربابِ حل وعقد کی رائے ہو جائے اس کے مطابق فیصلہ کرنا۔

اسی لیے ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ ایک دفعہ میرے آقا ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ تیرے باپ کو بلا کر یہ بتا دوں کہ میرے بعد خلیفہ ہوں گے، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ اللہ بھی ابوبکر کے بغیر کسی کو نہیں چاہتے اور رسول ﷺ بھی ابوبکر کے بغیر کسی کو نہیں چاہتے۔ اس لیے فرمایا: کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسا معاملہ ہے کہ میرے اللہ کو بھی یہی پسند ہے اور مومنین کو بھی یہی پسند ہے۔ مومنین کے دلوں میں ابوبکر کا انکار آ ہی نہیں سکتا۔ تو اس لیے حضور پاک ﷺ نے چھوڑ دیا۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۳۸۷، باب: مِنْ فَضَائِلِ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رضی اللہ عنہ]

مسائلِ شریعت مشورے سے طے نہیں ہو سکتے، ان کی تنفیذ ہو سکتی ہے:

متعلقہ جمہوریت اور یہ بھی یاد رکھیں کہ آج کل جو مغربی دنیا نے آپ کے ہاں جو ڈیموکریسی ہے، جمہوریت جس کو کہتے ہیں، وہ انہوں نے اللہ کے اس قرآن سے اور شوریٰ کے اس پیغام سے نظریہ لیا ہے کہ جب خدا نے نظام مشاورت پر رکھا ہے، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ہم اسمبلی بناتے ہیں، پارلیمنٹ بناتے ہیں اور مشورہ ہوتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ انہوں نے میٹھا میٹھا تو ہپ کیا ہے اور سارے قرآن کو نہیں مانا تو اس لیے ان کا نظام تباہی سے دو چار ہو گیا ہے۔ اگر وہ اللہ کے قرآن کو پورے کا پورا مان لیتے تو پوری دنیا میں امن قائم ہو جاتا۔ اللہ کے نظام میں اور ان کے نظام میں فرق کیا ہے؟ بنیادی بات یاد رکھ لیں! انگریزی نظام میں...... چاہے وہ پارلیمانی ہو یا صدارتی نظام ہو...... اس کے اندر اور اسلام کے اندر ایک فرق ہے۔ کافرانہ نظام یہ کہتا ہے کہ جب ہم نے لوگوں کے ووٹ سے اور مشورے سے پارلیمان چن لی تو اب پارلیمنٹ کی اکثریت جو فیصلہ کر دے وہ قانون نافذ ہوگا اور واجب العمل ہوگا۔ اور اسلام یہ کہتا ہے کہ مشورہ تو تم کر سکتے ہو، لیکن اللہ کے حکم میں تبدیلی نہیں کر سکتے، حکم اللہ کا چلے گا:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾ [یوسف:]

﴿لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ [البقرة: ۱۰۷]

فرمایا:

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الاعراف: ۵۴]

یہاں اسلام میں مسئلہ کیا ہے کہ حکم اللہ کا ہوگا، اس کے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اب نافذ کرنے کے طریقوں میں مشورہ ہوسکتا ہے کہ اس قانون کو ہم کیسے چلائیں؟ اس مسئلے کو ہم کیسے لاگو کریں؟ اس کا ہم انتظام کیسے کریں؟ اس کا ہم ثبوت کیسے مہیا کریں؟ لیکن اللہ کے قانون میں تبدیلی نہ ہو، وہاں تو بندوں کا قانون بنایا ہوا، بندوں کا چنا ہوا ہے کہ بندوں کے لیے ہے اور یہاں حکم اللہ کا ہے اور بندہ نائب ہے، اس کے حکم کو تنفیذ کرنے والا ہے، اس کے حکم کو توڑنے کا کوئی اختیار نہیں۔ انگریزی قوانین جمہوری شورئ ہیں، اب کافرانہ نظام میں اگر ان کی پارلیمنٹ ایک فیصلہ کردیتی ہے، جیسے بعض یورپ کے ملکوں میں فیصلے ہوچکے ہیں کہ لڑکوں نے مطالبہ کیا کہ..... نعوذ باللہ..... ہمیں بدفعلی کرانے کی اجازت دی جائے، انہوں نے کہا: عورتیں اگر فحاشی کرتی ہیں، بے حیائی کرتی ہیں..... یہ حقیقت ہے کہ اس کا ذریعہ اللہ نے لوگوں کو بنا دیا ہے۔ ایک عورت سینکڑوں دوستوں سے تعلقات رکھتی ہے اور وہ سب کی گرل فرینڈ بن کر رہتی ہے..... تو ہمیں بھی اجازت دیں ہم بھی بدفعلی کرائیں۔ جب پورے ملک میں شور اٹھا تو ان کو قانون میں اجازت دینی پڑی کہ ٹھیک ہے، جاؤ جو مرضی آئے کرو۔ کیونکہ ان کی اکثریت ایک بات پر آگئی۔ یہ تو علیحدہ بات ہے کہ اس کے نتائج خراب نکلنے پر وہ پھر چیخ اٹھے، لیکن اس کو روک نہیں سکے، اس لیے کہ وہ بندوں کا قانون تھا۔ بندوں کی اکثریت جو مطالبہ کرتی ہے۔ اسی طریقہ سے انہوں نے ایک دفعہ یہ بھی قانون بنایا کہ طلاق کا معاملہ مرد کے ہاتھ میں دیا گیا کہ مرد چاہے طلاق دے دے، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، عورت کو طلاق کا حق دے دیا جائے۔ تو اب چونکہ ان کے قانون کا تقاضا یہ ہے کہ جو اکثریت کہہ دے، لیکن اسلام یہ اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کہتا ہے ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ﴾ [یوسف: ۴۰] حکم اللہ کا نافذ ہوگا۔ یہ زمین بھی اللہ کی ہے اور آسمان بھی اللہ کا ہے ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ یہ مخلوق بھی اللہ کی ہے اور حکم بھی اللہ کا چلے گا ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الاعراف: ۵۴] ساری کائنات کے بندے اکٹھے ہوکر اللہ کے نظام کو نہیں توڑ سکتے۔

اس لیے حضور ﷺ نے ایک دفعہ قسم کھالی کہ آئندہ شہد نہیں پیوں گا تو اللہ نے فوراً قرآن نازل کردیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [التحریم: ۱]

اے میرے نبی! آپ نے کیسے اللہ کے حلال کو حرام کر دیا ہے؟ محض اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میرے قانون کو بدل رہے ہو۔ ایک چیز میں نے آپ کے لیے حلال کر دی ہے، اس کو حرام کوئی نہیں کر سکتا۔ جس کو میں نے حرام کر دیا اس کو حلال کوئی نہیں کر سکتا۔ حالانکہ حضور ﷺ نے امت پر حرام نہیں کی، یعنی حضور ﷺ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ شہد امت کے لیے حرام ہے۔ حضور ﷺ نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ آئندہ میں شہد نہیں پیوں گا، آئندہ اپنی باندی ماریہ قبطیہ کو نہیں بلاؤں گا۔ جب اللہ نے حلال کیا تو تو نہ بلانے کا کیا مطلب ہے؟ اگر ایک بیوی ناراض ہوتی ہے ہوتی رہے، جب اللہ نے چار بیویاں حلال کی ہیں تو لازمی بات ہے کہ پہلی بیوی تو دوسری بیوی سے کبھی خوش نہیں ہوگی، تیسری بیوی کبھی دوسری بیوی سے خوش نہیں ہوسکتی، اگر خوش نہیں ہوسکتی تو نہ ہو۔ جو چیز اللہ نے حلال کی ہے اسے کوئی حرام نہیں کر سکتا اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے کوئی حلال نہیں کر سکتا۔ تو انسانوں کے قانون میں اور اللہ کے نظام میں یہ فرق ہے۔

اسی طرح دوسری بات یہ سمجھیں! اسلام جہاں مشورے کا حکم دیتا ہے اب دیکھیں کہ اللہ نے خلیفہ بنانا چاہا، اس کا معاملہ فرشتوں کے آگے رکھا:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرۃ: ۳۰]

تیرے رب نے ملائکہ سے فرمایا، حالانکہ جن بھی تو موجود تھے۔ اگر ہر کسی سے ووٹ لینا ہوتا تو پھر فرشتوں کو جیسے بتایا تھا کہ میں نے خلیفہ بنانا ہے تو جنوں کو بھی بتاتے کہ میں نے خلیفہ بنانا ہے۔ تو جیسے فرشتوں کے اعتراض سنے تھے ویسے جنوں کے بھی اعتراض سنتے، کیونکہ اعلیٰ مخلوق اللہ کے ملائکہ تھے تو اس لیے اسلام یہ بھی سکھاتا ہے کہ مشورہ کرنے کے لیے مشورہ کس سے لیا جائے؟

اب تفسیر ابن کثیر کا ایک مسئلہ مجھے سمجھ نہ آئے تو میں پوچھنے کے لیے کہاں جاؤں؟ ہوٹل پر جاؤں، ہوٹل کے مینجر کے پاس جا کر کہوں کہ اتنے بڑے ہوٹل کو چلا رہے ہو، مجھے تفسیر ابن کثیر سمجھا دو۔ وہ کہے گا: مولوی صاحب! آپ پاگل تو نہیں ہو گئے؟ ٹھیک ہے میں نے ہوٹل کے معاملہ میں ماسٹر ڈگری کی ہوئی ہے، مجھے بڑے بڑے ہوٹلز کا تجربہ ہے، لیکن عجیب بات ہے! آپ مجھ سے تفسیر ابن کثیر کے بارے میں پوچھنے آگئے؟ میں کہوں کہ تمہیں تو نہیں آتا۔

اس کے بعد میں فوری طور پر ایک وکیل کے پاس چلا جاؤں، اس سے کہوں کہ آپ...... ماشاء اللہ...... بڑے

بار ایٹ لاء ہیں، آپ نے ایل ایل بی کیا ہوا ہے، آپ نے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ وہ کہے گا: میں نے تو برٹش لاء پڑھا ہے، مجھے کیا پتہ ابن کثیر کیا کہتی ہے؟

ایک جاہل ہے، ایک عالم ہے۔ دونوں میں سے جس کو پسند کرتے ہو ووٹ دے دو، دونوں برابر ہیں۔ اور ادھر کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کو اسلام نے برابر کر دیا، تم نے سب کو برابر کر دیا، تم نے تو سارے جہان کو برابر کر دیا، تم نے مرد اور عورت کا ووٹ اور جاہل اور عالم کا ووٹ برابر رکھا ہے۔ اور ایک عورت بے چاری اس نے پی ایچ ڈی کی، ڈگریاں لی ہوئی ہیں اور ایک جاہل ہے، اس کو بھی تم نے برابر رکھا ہوا ہے۔ اور ایک فاسق فاجر ڈاکو ہے اور ایک جج ہے، دونوں ووٹ ڈالیں گے، ووٹ برابر ہے۔ اس کی بھی ایک پرچی گنی جائے گی اور اس کی بھی ایک پرچی گنی جائے گی۔

تو اس لیے کسی شاعر نے بڑا اچھا فرق کیا تھا! اس نے کہا کہ اسلام میں انسانوں کو تولا جاتا ہے اور کفر کے نظام میں گنا جاتا ہے۔ اب چاہے نو عالم کھڑے ہیں اور ادھر دس جاہل کھڑے ہیں، جاہلوں والا جیت گیا ہے اور عالموں والا ہار گیا ہے۔ اس لیے کہ عالم نو بنتے ہیں اور جاہل دس بنتے ہیں۔ اسلام گنتا نہیں ہے، بلکہ اسلام وزن دیکھتا ہے ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [الاعراف: ۸] ایک آدمی متقی پرہیز گار اور درجہ صحابیت کو پہنچا ہے تو اسلام کہتا ہے: جس آدمی نے خود میرے مدنی ﷺ کے ہاتھ میں ہاتھ رکھ کر اسلام سیکھا ہے، اس کے مقابلہ پر تم ساری دنیا کے بندے لے آؤ اس ایک کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس لیے کہ اس نے براہ راست حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے دین سیکھا ہے۔

اسی لیے دیکھیں کہ میرے آقا سرکار مدینہ ﷺ کا جب کوئی مشورہ ہوتا تو پوچھتے کہ ابوبکر! تمہاری رائے کیا ہے؟ عمر! تمہاری رائے کیا ہے؟ عثمان! تمہاری رائے کیا ہے؟ علی! تمہاری رائے کیا ہے؟ حدیثیں یاد کرانی ہوتیں تو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کام لیتے، تقویٰ زہد کا کام ہوتا تو ابوذر رضی اللہ عنہ سے کام لیا جاتا، تلوار کا معاملہ ہوتا تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بلایا جاتا اور اگر رائے دین کے اہم معاملے ہوتے تو پھر خلفائے راشدین کو بلایا جاتا کہ جو آدمی جس منصب کے لائق ہے اس سے پوچھو۔

اور یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں بے چینیاں ہی بے چینیاں ہیں، کیونکہ جب ہم غلط آدمی سے مشورہ لیں گے، جو مشورہ دے سکتا ہی نہیں ہے۔ ایک آدمی نے کبھی زراعت زمینداری کا کام ہی نہیں کیا، اس سے آپ مشورہ لیں

کہ آج جولائی کی فلاں تاریخ ہوگئی ہے تو میں گندم کاشت کروں یا نہ کروں؟ اس بے چارے کو کیا پتہ کہ گندم کاشت کب ہوتی ہے؟ گندم تو اس موسم میں کٹ جاتی ہے، اس کا تو موسم بھی گزر جاتا ہے۔ اس کو کیا پتہ کہ یہ کپاس کی کاشت کا زمانہ ہے، اب تو ان فصلات کا زمانہ ہے اور وہ بھی اب لیٹ ہو رہے ہیں، کیونکہ بارشیں آرہی ہیں۔ جب بارشیں آئیں گی تو آپ کی کاشت متاثر ہوگی۔ اس لیے آپ اس آدمی سے مشورہ لیں گے جو زرعی امور کا ماہر ہو۔ ایک آدمی بیمار ہے، جیسے میرے پاس ایک آدمی آیا، اس نے کہا کہ آپ کو خواب کی تعبیر آتی ہے؟ میں نے جان چھڑائی کہ مجھے نہیں آتی، میں نے کہا: یہ جان چھوڑے، یہ ابھی خواب سنانے شروع کر دے گا۔

مجھے طلباء کی دعا اور درس کی برکت سے دو رکعت کا جو موقع ملتا ہے وہ بھی نہیں ملے گا۔ یہ حقیقت ہے، اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے، یہ سارا آپ لوگوں کی برکت کی وجہ سے نصیب ہو جاتا ہے۔ جمعرات کو دیکھیں! درس نہیں ہوتا تو ہم دعوتیں اڑانے کے لیے گئے ہوتے ہیں۔ کبھی اس دوست کی دعوت ہے اور اس دوست کی پارٹی ہے۔ حرم کی نماز نصیب نہیں ہوتی۔ یہ تو ساری حقیقت میں آپ لوگوں کی دعائیں ہیں، مجھے خوشامد کی ......الحمد للہ...... عادت نہیں ہے۔ حقیقت ہے کہ اس کا ذریعہ اللہ نے آپ لوگوں کو بنا دیا ہے۔ ایک درس اور علم کا ذریعہ، کتاب پڑھنے کا ذریعہ، پھر طواف کا ذریعہ، سب آپ حضرات کی برکت ہے، ورنہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔

بہرحال میں نے ان سے کہا کہ مجھے اتنا پتہ تو نہیں لگتا۔ اس نے کہا کہ نہیں جی، کچھ نہ کچھ تو پتہ لگتا ہوگا۔ اس نے جناب ایک خواب سنا دیا۔ مجھے جو آتا تھا میں نے بتا دیا۔ اس نے ایک اور سنا دیا۔ میں نے کہا: کتنے خواب دیکھتے ہو؟ اس نے کہا: مجھے تو روز خواب نظر آتے ہیں۔ میں نے کہا: کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤ، معدے کا علاج کراؤ، تمہارا معدہ خراب ہے، کیونکہ جب آدمی کا معدہ خراب ہو تو تبخیر دماغ پر چڑھتی ہے۔ جو کچھ تو رات کو دیکھتا ہے یہ خواب نہیں ہے۔ تم جا کر اپنا علاج کراؤ۔ اس نے کہا کہ اچھا پھر آپ معدے کا علاج بھی بتا دیں! میں نے کہا کہ اللہ کے بندے! میں ڈاکٹر نہیں ہوں، کسی ڈاکٹر کے پاس، کسی طبیب کے پاس جائیں۔ مجھے کیا پتہ کہ معدے کا علاج کیا ہوتا ہے؟

تو اس لیے یاد رکھیں کہ اسلام کہتا ہے کہ شوریٰ ہو، لیکن مشورہ اس سے لیا جائے جو مشورہ کا اہل ہو۔ صحت کا معاملہ ہے تو ڈاکٹر بتلائے گا، علم کا معاملہ ہے تو عالم بتائے گا، کوئی ٹیکنیکل مسئلہ ہے تو انجینئر بتلائے گا ''لِكُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ'' اللہ نے ہر فن کے لیے انسان پیدا کیے ہیں، وہ اپنے ان علوم کو ماہرانہ طریقہ سے جانتے ہیں۔ تو ان سے

رائے لی جائے گی۔

اس لیے اللہ نے جنات کے آگے یہ مسئلہ نہیں رکھا، اللہ نے ملائکہ کے آگے مسئلہ رکھا۔ یہ خلافۃ فی الارض کا مسئلہ ہے، جن کیا بتلائیں گے؟ ان کی طبیعتوں میں سرکشی ہی سرکشی ہے اور فساد ہی فساد ہے، وہ آگ والی شورش ہے، بھڑکنا ہے، جلنا ہے، مرنا ہے، انہوں نے کیا مشورہ دینا ہے؟ البتہ یہ لوگ (فرشتے) تسبیح والے ہیں، تقدیس والے ہیں، یہ اللہ کی عبادت والے ہیں، اطاعت والے ہیں، فرمانبرداری والے ہیں، ان کے آگے معاملہ رکھا جائے۔ اللہ نے اپنے بندوں کو تعلیم دی ہے، وگرنہ اللہ تعالیٰ کو مشورے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اللہ علام الغیوب ہیں ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ [ھود:۱۰۷] ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ﴾ [الانبیاء:۲۳] اس کی تو شان ہی یہی ہے کہ وہ جو چاہے کر دے، اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ ساری مخلوق سے وہ پوچھ سکتا ہے، لیکن اللہ کی ذات سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اسی لیے اس کی صفت آئی ﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ [الاخلاص:۲] اللہ وہ جس کا اپنا کام اٹکے ناں اور دوسرے کا کام جس کے بن ہو نہ سکے، وہ ذات پاک ہے، لیکن اللہ نے اپنے بندوں کو تعلیم دی کہ فرشتوں کے آگے معاملہ رکھا۔

حضور پاک ﷺ نے بھی مشورے کی تعلیم دی کہ جب کوئی معاملہ ہو تو مشورہ کرو۔ اللہ نے بھی اپنے پیغمبر کو حکم دیا:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ [آل عمران:۱۵۹]

تم مشورہ کر لو اور پھر اس کے بعد جب تم ارادہ باندھ لو تو پھر اپنے اللہ پر توکل کرو اور اس عمل کو نافذ کر دو۔ حضور ﷺ بھی مشاورت فرماتے رہے اور اسی طرح میرے آقا ﷺ نے فرمایا: جس رائے پر ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما اکٹھے ہو جائیں، یعنی جس رائے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے مل جائے، پھر مجھے سوچنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ اللہ نے ان دونوں کو اتنی صائب رائے دی ہے۔ تو جب ان کی رائے مل جاتی ہے تو اللہ کی بھی وہی رائے ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ کے حکم کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب خلافت کا معاملہ سنبھالا، جو مشورے سے طے کیا گیا اور پھر جب خلیفہ بن گئے تو چونکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی جانا تھا، اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اللہ کے نبی نے تمہیں پرچم پکڑایا ہے اور تمہیں حکم دیا تھا کہ یہ بڑے بڑے صحابہ تیرے ساتھ جائیں گے۔ اگر تم اجازت دو تو

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ جاؤ۔ مجھے ان کے مشوروں کی ضرورت ہوگی۔ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنا ہر کام مشورہ سے کام کرتے تھے، جیسے ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تو آپ نے فرمایا: آج علی نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ [أضواء على الصحيحين: ١/١٨٠]

دیکھیں! کتنی عظمت والی بات ہے! لیکن افسوس یہ ہے کہ روافض حضرات کو سمجھ نہ آئی، انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا کہ دیکھو! خلافت کے حقدار تو حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ نہیں تھا، غلط فتویٰ دے رہے تھے، خود فرما رہے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا۔ یہ تو دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے مستحق تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہیں تھے۔ انہوں نے یہ نہ سوچا کہ خلیفہ ہونے کے بعد ایک مسئلے کا علم نہ ہونا یہ کوئی بڑی بات تو نہیں ہوتی۔

اصل مسئلہ کیا تھا کہ ایک عورت پیش ہوئی، اس نے اعتراف زنا کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دے دیا۔ خدا کی قدرت یہ ہے کہ عورت نے بھی قبول کر لیا۔ جب اس عورت کو لے کر جانے لگے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آ رہے تھے، آپ نے پوچھا: کیوں عورت کو پکڑ کر لے جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رجم کا فیصلہ فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا: ٹھہرو! وہ وہیں رک گئے۔ آپ آئے اور کہا: اے امیر المؤمنین! آپ نے فیصلہ تو فرما دیا، جو بالکل شریعت کے مطابق ہے، لیکن آپ نے یہ تحقیق کر لی ہے کہ یہ عورت حاملہ تو نہیں ہے؟...... اب فطری بات ہے دو چار مہینے کا حمل تو نظر نہیں آتا، قاضی کے سامنے چاہے عورت کھڑی بھی ہو۔ ہاں! آٹھ نو مہینے کا حمل تو ظاہر ہو جاتا ہے...... تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تحقیق نہیں کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تحقیق تو کریں، اگر عورت حاملہ ہو اور جو بچہ پیٹ میں ہے وہ رجم میں مارا جائے تو اس بچے کا کیا قصور ہے؟ جرم تو اس عورت نے کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس عورت کو واپس بلاؤ۔ جب آئی تو پوچھا۔ اس نے کہا: مجھے حمل ہے۔ آپ نے روک دیا کہ جب تک وضع حمل نہ ہو رجم نہ کیا جائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا: اے علی! اگر آج تم نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا اور ایک بچہ بلا وجہ میرے حکم سے مارا جاتا۔

یہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کتنا بڑا مقام ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے پر فوراً عمل کیا، اپنے فیصلے کو بدل ڈالا۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ یہ تو خلافتِ عمر رضی اللہ عنہ کی دلیل ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناحق ہوتے تو جوان کے کہنے سے اپنا فیصلہ بدل

دیتے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے خلیفہ کب بنتے؟ اور اگر اسی فیصلہ سے خلافت نکلتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں سے کہتے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو فیصلے کا علم نہیں، تم نے ان کو خلیفہ بنا دیا، مجھے بناؤ۔ حضرت علی نے بھی مطالبہ نہیں کیا، چودہ سو سال بعد ان کو یاد آ گیا۔ یہی تو کمال ہے کہ خلافت کی کرسی موجود ہے، لیکن فیصلہ لے رہے ہیں۔

اسی طرح ایک عورت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پکڑ کر لایا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا: اس عورت نے زنا کیا ہے۔ اس عورت نے بھی اقرار کر لیا۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جاؤ! اس عورت پر حد جاری کر دو، اقرار ہو گیا اور اعتراف ہو گیا ہے۔ صحابہ پکڑ کر لے جا رہے تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو فرمایا: کیوں پکڑ کر لے جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ اس پر حد جاری ہو گئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ٹھہرو! اس کو کچھ نہ کہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ آپ نے اس عورت پر حد جاری کر دی ہے، آپ کو پتہ نہیں ہے یہ تو فلاں قبیلہ کی عورت ہے، یہ تو پاگل ہے، مجنونہ ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے کہ تین آدمیوں سے اللہ کا قلم اٹھ گیا ہے: اگر آدمی نیند میں ہے اس پر کچھ جرم نہیں ہے، اگر آدمی نابالغ ہے اس پر بھی جرم نہیں لگے گا اور اگر آدمی دیوانہ ہے تو اس پر بھی جرم نہیں لگے گا۔ یہ فلاں قبیلہ کی عورت ہے، میں جانتا ہوں یہ پاگل ہے۔ کبھی کبھی اس کا دماغ ٹھیک ہو جاتا ہے، لیکن اکثر یہ پاگل رہتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ نہیں تھا، آپ نے فوراً مشورہ قبول فرما لیا۔ اس قبیلے کے لوگوں کو بلایا، ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس عورت کو دورے پڑتے ہیں، اکثر یہ پاگل رہتی ہے، کبھی کچھ کہتی ہے اور کبھی کچھ کہتی ہے۔ پتہ نہیں آج اس کے دماغ میں کیا آ گیا ہے اور اس نے کہہ دیا، وگرنہ یہ پاگل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو، یہ پاگل ہے۔ [فیض القدیر: ۱۵/ ۲/ ۴۷]

تو مشورہ لینا اور اس پر عمل کرنا چاہیے، لیکن مشورہ اس سے لیا جائے جو مشورہ دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو اور جو مشورہ دینے کے قابل بھی ہو۔ ہر آدمی کا مشورہ قابل قبول نہیں ہوتا، ہر آدمی زید، عمر اور بکر جو آ کر کہہ دے ٹھیک ہے۔

اور یاد رکھیں! مشورے کے بعد بھی اللہ کے قانون کو نہ توڑا جائے۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سزا دی تو قانون کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا۔ تو قانون کے مطابق بس تحقیق میں فرق تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً نافذ کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم کے اندر تھا کہ یہ عورت پاگل ہے۔ اب کوئی کہے کہ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ نہیں تھا، اس طرح تو...... نعوذ باللہ...... نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی علم نہیں تھا، تو نبی کیسے بن گئے؟ جیسا کہ آگے واقعہ آ رہا ہے۔

دورِ نبوی میں ایک عورت کے ساتھ واقعہ اور آپ ﷺ کا فیصلہ:

جیسے ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک عورت مدینہ کی گلیوں میں سے صبح کی نماز کے لیے نکلی تو ایک آدمی نے زبردستی پکڑ کر زنا کر لیا۔ حضور ﷺ کے زمانے میں تو وہ آدمی زنا کر کے بھاگ گیا۔ عورت اٹھی، اس نے کپڑے وغیرہ ٹھیک کیے۔ ایک آدمی سامنے نظر آیا، اس نے سمجھا یہی ہے۔ اس نے اس آدمی کو پکڑ لیا کہ تم نے میرے ساتھ زنا کیا ہے۔ اس نے کہا: خدا کی بندی! میں نے کچھ نہیں کیا، لیکن عورت کہے کہ تم نے زنا کیا۔ اتنے میں لوگ اکٹھے ہو گئے...... اس زمانہ میں مدینہ کی آبادی زیادہ نہ تھی، ایک آدمی گزرا تو آدھے گھنٹے کے بعد دوسرا گزرا...... تو اب لوگ اکٹھے، شور ہو گیا۔ اس آدمی کو پکڑ کر لے آئے، حضور ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش ہو گیا۔ حضور ﷺ نے عورت سے پوچھا تو اس نے کہا کہ اس نے میرے ساتھ زنا کیا ہے۔ ان صحابہ سے پوچھا، انہوں نے کہا کہ ہم نے موقعہ پر آکر دیکھا ہے کہ یہ عورت تھی اور یہ مرد تھا۔ اس کو عورت نے پکڑا ہوا تھا اور یہ شور کر رہی تھی۔ جس کو عورت نے پکڑا وہ بے چارا اتنا شریف آدمی تھا کہ الزام لگنے کے بعد اس پر ایسا سکتہ طاری ہوا کہ وہ بول ہی نہ سکے...... اگر ایک بدمعاش پر تہمت لگے تو وہ کہے گا: چار اور لگا دو، کیا فرق پڑے گا؟ اور ایک شریف آدمی پر تہمت لگے تو وہ بالکل بے ہوش ہو جاتا ہے، اس کا تو زندگی کا کیریئر ہی ختم ہو گیا کہ میں نے کبھی گناہ نہیں کیا، لوگ مجھے کیا کہیں گے؟ مدینۃ الرسول میں اور حضور ﷺ کے زمانہ میں ایک عورت سے جبراً اور ظلماً زنا کیا...... وہ بے چارا گنگ اور چپ تھا۔ سارے گواہ اس کے خلاف گزر گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: حد جاری کرو۔ اب حد مارنے کے لیے جب اس کو پکڑ کر لے جانے لگے تو ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا: حضور! گناہ میں نے کیا ہے اور یہ بے گناہ ہے۔ اصل مجرم میں ہوں۔ ایک تو میں نے گناہ کیا اور دوسرا میری وجہ سے ایک بے گناہ مارا جائے تو میں اللہ سے ڈر گیا ہوں، اصل مجرم میں ہوں، یہ غریب تو وہاں تھا ہی نہیں۔ جب میں بھاگ رہا تھا تو یہ اس وقت آ رہا تھا۔ اس نے اعتراف کر لیا تو اب معاملہ بدل گیا تو حضور ﷺ کو علم نہیں تھا تو...... نعوذ باللہ...... کیا نبوت ختم ہو گئی؟

ایسے ہی اگر تم فیصلے کرنے شروع کر دو گے پھر تو اللہ کے نبیوں پر اثر آ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے! حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے تو کیا حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت ختم ہے؟ کیا یونس کی رسالت بھی ختم؟ تو یہ ایسے مسائل نہیں ہوتے۔ بہر حال مشورے کا کتنا بڑا فائدہ ہے!! قانون اللہ کا رہے گا۔ یہی دنیا کی پارلیمنٹ میں اور اسلام کے حکم میں

فرق ہے۔ یہاں پارلیمنٹ کی اکثریت قانون بناتی ہے اور توڑتی ہے۔ یہاں کوئی اللہ کے قانون کو توڑ نہیں سکتا، نبی اور خلیفہ تو اللہ کا نائب ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق کام کو چلاتا رہے۔ اپنی طرف سے وہ کوئی ایسا قانون بنائے جو مالک کے خلاف نہ ہو، بلکہ ایسے معاملات جن کا قرآن وسنت میں کوئی واضح حکم نہ ہو تو قرآن وسنت کے دوسرے مسائل کی روشنی میں وہ اجتہاد کر کے قیاس کریں گے۔ اصل حکم تو نہیں ہے، لیکن اس سے ملتا جلتا ہے۔

جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ شرابی کے لیے کتنی حد ہونی چاہیے؟ حضرت علی نے فرمایا: میرے خیال میں اسی (۸۰) کوڑے مارے جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اے علی! اسی (۸۰) کوڑے مارنے کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے کہا: دیکھیں کہ جو آدمی کسی بندے پر ناحق تہمت لگائے تو قرآن نے اس کے لیے اسی (۸۰) کوڑے رکھے ہیں تو جو شراب پیے گا، نشہ ہو گیا۔ جب نشہ ہو گا تو بکواس کرے گا۔ جب بکواس کرے گا تو کبھی کسی کو کچھ کہے گا اور کسی کو کچھ کہے گا تو اس کی حد اس سے ملتی جلتی ہونی چاہیے جو ناحق الزام لگانے والے کی حد ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ٹھیک ہے تمہاری دلیل۔ شراب پینے کی سزا کا حکم بھی اسی طرح ہو گا۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۳۶۲۴، باب: حَدِّ الخَمْرِ]

خلیفة اللہِ فِی الْاَرْضِ:

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے سامنے یہ ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں تو ملائکہ نے عرض کیا: اے پروردگار عالم! آپ ایک ایسی مخلوق کو نیابت اور خلافت کی خلعت سے سرفراز فرمانا چاہتے ہیں جو زمین میں فساد کریں گے اور خون ریزی کریں گے۔ اس مخلوق کے مقابلہ پر ہم ہر وقت تیری پاکی بولتے ہیں، تیری تحمید کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ تو یہ ایک طریقے سے گزارش بھی تھی کہ ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾ [البقرة: ۳۰]

''تحقیق میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

خلافت کا معنی یہاں نیابت ہے، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے احکام کے لیے اپنا نائب مقرر فرمانا چاہتے ہیں۔ دوسرا معنی ہے بعد میں آنے والا، جو کسی کے بعد آئے وہ خلیفہ ہوتا ہے، مثلاً: باپ چلا گیا اور بیٹا آ گیا تو بیٹا گویا

کہ باپ کا خلیفہ ہے۔ جیسے قرآن مقدس میں یہ لفظ اس معنی میں بھی موجود ہے، فرمایا:

﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَوٰةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ [مریم: ۵۹]

تو خلیفہ کا معنی کسی کے جانے کے بعد آکر اس چیز کو سنبھالنا۔

خلفائے راشدین:

جیسے کہ خلفائے راشدین کہ سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی وفات کے بعد مسند خلافت پر آگئے، اس لیے ان کا لقب خلیفہ ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ دراصل اللہ کے نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ حقیقی جو ہے اور خلیفہ بلافصل جو ہے اور جس پر صحیح معنی میں لفظ "خلیفہ" کا انطباق ہوتا ہے وہ سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اسی لیے جب سیدنا امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو "خلیفہ" کے لفظ کے ساتھ لکھا گیا تو آپ نے منع فرمادیا کہ مجھے "خلیفہ" نہ لکھو۔ آپ نے فرمایا: مجھے زیادہ سے زیادہ "امیر المؤمنین" لکھ دو، کیونکہ اگر آپ مجھے "خلیفہ" کہتے ہیں تو میں ابی بکر رضی اللہ عنہ کا خلیفہ ہوں تو میرے نام کے ساتھ یہ لکھنا پڑے گا "خَلِيْفَةُ خَلِيْفَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ" اور جو میرے بعد آئے گا وہ میرا خلیفہ ہوگا۔ تو اصل خلیفہ تو سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آئے۔

[جامع الاحادیث للسیوطی، حدیث: ۳۰۸۷۳، مسند عمر بن الخطاب]

خلیفہ کا اصل معنی ومطلب:

اب اللہ تعالیٰ تو حی وقیوم ہیں، آپ کی ذات تو ازل سے ابد الآباد تک ہے۔ تو یہاں خلیفہ کا یہ معنی نہیں کہ...... نعوذ باللہ...... اللہ تعالیٰ کے چلے جانے کے بعد آدم علیہ السلام خلیفہ ہوئے، بلکہ یہاں خلیفہ کا معنی یا تو یہ ہے کہ آپ سے پہلے چونکہ جنات کی قوم زمین میں موجود تھی تو ان کے بعد نیابت خلافت سلطنت امارت نظم کا چلانا آدم علیہ السلام کے ذمہ لگا۔

تو حضرت آدم علیہ السلام خلیفہ ہوئے کہ ان کے بعد آئے، بایں اعتبار حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ کہا جائے گا۔

اور دوسرا معنی یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توالد وتناسل میں اللہ نے یہ نظام رکھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پھر نوح آئیں گے، پھر اور انبیاء آئیں، پھر اور انبیاء واولاد آئیں گے، نبوت کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا اور اولادِ آدم علیہ السلام قیامت تک رہے گی تو اس بنا پر انہیں "خلیفہ" کہا جائے گا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۰، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

تخلیقِ آدم کی ضرورت کیوں پڑی؟

دو مخلوق جب اللہ نے پہلے پیدا فرمائیں: ایک کا تعلق عالمِ علوی سے ہے اور ایک کا تعلق عالم سفلی سے ہے۔ اب مخلوق اور دنیا کا جو اللہ تعالیٰ نے ایک نظام قائم فرمانا تھا، اصل میں یہ دونوں مخلوقات اس نظام کے لیے مناسب نہیں تھیں، کیونکہ اللہ نے فرشتوں کی جو مخلوق پیدا فرمائی ہے تو ان کے اندر تو قوتِ شہوانیت، کھانا، پینا، ان چیزوں کی خواہش ہی نہیں، اللہ نے ان کے اندر یہ قوتیں رکھی ہی نہیں ہیں۔ جس میں یہ قوت ہی نہ رکھی جائے وہ ان کے مسائل کو کیسے سمجھ سکتا ہے؟ ایک آدمی کو بھوک ہی نہیں لگتی تو اس کو بھوک کا کیا پتہ کہ بھوک کیا ہوتی ہے؟ ایک آدمی کے اندر مادہ شہوانیت ہے ہی نہیں تو اس کا گناہوں سے بچنا کیسا؟ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ جو چیزیں اللہ نے زمین میں پیدا فرمائی ہیں ان سے مستفع بھی نہیں ہو سکتے تھے کہ انسانوں کی طرح نہ تو ان کو سر چھپانے کی ضرورت ہے، نہ گھر بنانے کی ضرورت ہے اور نہ کسی کھیتی باڑی وغیرہ کی ضرورت ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے اتنی ساری چیزیں جو پیدا کی تھیں تو ان سے آخر کون مستفع ہوتا؟

اور جنات پر غور کریں تو جنات بھی ایک لطیف بدن رکھتے ہیں، آگ سے پیدا ہوئے ہیں، ان کو بھی ان چیزوں سے مستفع ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور خدا کی قدرت ہے کہ جیسے اللہ نے ملائکہ میں قوتِ شہوانیت نہیں رکھی، قوتِ حیوانیت نہیں رکھی جنات میں بھی قوتِ خیالیہ ان کی قوتِ عقلیہ پر غالب ہے۔ ان کے اندر قوتِ عقلیہ ہے، لیکن بڑی کمزور ہے، ان کی قوتِ خیالیہ ان پر غالب ہے۔ جو خیال آیا بس اسی کو وہ کر گزرے۔

اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا، جس کے اندر ایسی قوتیں رکھی جائیں کہ ایک طرف سے اس کا تعلق عالمِ علوی سے ہو اور دوسری طرف سے اس کا تعلق عالم سفلی سے ہو۔ یعنی اس کے اندر ایسی قوتیں رکھی جائیں کہ وہ ترقی کرنے پر آئیں تو ملائکہ سے بھی آگے نکل جائیں اور ان کے اندر دوسری طرف سے ایسی قوتیں بھی ہوں کہ عالم سفلی میں اللہ نے جو چیزیں پیدا کیں ان سے مستفع ہو سکیں تو اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین میں خلیفہ پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا اور ملائکہ کے سامنے رکھا:

﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرۃ:۳۰]

فرشتوں کے سامنے یہ بات رکھنے میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ جس کو اللہ نے تمکن فی الارض اور خلافت دینی تھی تو

اس کے لیے ضرورت ہے کہ اس کو ماننے والے تو ہوں۔ اور اس وقت جو مخلوق تھی، جس سے نظامِ عالم قائم کرنے کی خدمت لی گئی تھی وہ فرشتے تھے، لہٰذا اللہ نے فرشتوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا، پھر آدم علیہ السلام کی عظمت کا ان سے اعتراف کرایا اور اس کے بعد ان سب کو آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ میں ڈال کر سرنگوں کیا، تب جا کر نظام چلا۔ جیسے آپ ایک آدمی کو کسی ادارہ کا منیجر بناتے ہیں تو ملازمین سے کہیں گے کہ آج کے بعد یہ آپ کے منیجر ہیں، یہ ان کے اختیارات ہیں اور ادارہ کے تمام امور ان کے حکم سے سرانجام پائیں گے۔ اگر آپ اس کا ملازمین سے تعارف نہیں کرائیں گے تو ان کو کیسے پتہ چلے گا کہ یہ ہمارے منیجر ہیں۔ اور اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کسی کا خلیفہ ہونا صرف اس بات کا تقاضہ نہیں کرتا کہ آپ زبان سے ''خلیفہ'' کہتے رہیں، بلکہ اس کے لیے تمکن فی الارض بھی ضروری ہے کہ اس کو نظامِ سلطنت و حکومت ملے، تب ہی تو وہ ''خلیفہ'' کہلانے کا مستحق بنے گا۔

فرق:

اسی لیے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صاحب رحمہ اللہ نے بڑا عجیب اور اچھا جملہ لکھا ہے! انہوں نے لکھا کہ خلافت مسیحیت کی طرح ان کے اثنا عشر خلفاء پوپ نہیں ہیں، جیسے عیسائیوں کے پوپ پادری ہوتے ہیں کہ ہفتے کے بعد آپ گئے اور ان کو سلام کر لیا کہ جس کے لیے دلوں کا اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو کہ آدمی صرف دل میں کہے کہ یہ ہمارے پوپ صاحب ہیں، پادری صاحب ہیں اور اس کے بعد کبھی جھک کر ان کو سلام کر لیا اور بات کر لی، بلکہ خلافت کا معنی ہے تمکن فی الارض کہ اللہ زمین پر کنٹرول بھی دیں کہ حکومت چلانے کا اختیار بھی دیں، تب خلیفہ بنے گا۔ اس طرح نہیں جس طرح لوگ ۱۲ خلیفہ بنائے پھرتے ہیں، ایک انچ زمین پر بھی کبھی ان کو حکومت نہیں ملی؟ صرف زبانی کلامی خلافت نہیں ملتی۔ جن کو تم خلیفہ بناتے ہو کم از کم یہ تو ثابت کرو کہ ان کو کہیں کبھی کسی جگہ تمکن فی الارض نصیب ہوا، کوئی اقتدار ملا، کوئی سلطنت ملی، اور کہیں انہوں نے کام کیا، صرف کہہ دینے سے مسئلہ نہیں ہوتا۔

ہم تو...... الحمد للہ...... جس طرح اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں، اسی طرح اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں۔ ہمارے تو دلوں میں ان کے لیے احترام ہے، لیکن جو حقائق ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بنے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی اور مسلمانوں کو قتال سے، خونریزیوں سے اور جھگڑوں سے بچایا۔ اللہ ان کی عظمتوں کو بلند فرمائے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ایک ایسا فیصلہ کیا کہ اس کا فائدہ قیامت

تک کے لیے عالم اسلام کو پہنچا۔ اسی لیے میرے پاک نبی ﷺ نے پیشن گوئی فرمادی تھی کہ یہ جو میرا بیٹا ہے (حضرت حسن رضی اللہ عنہ) ایسا سردار ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے دو بڑی جماعتوں میں صلح کرائیں گے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۷۰۴، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ لِلْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ]

اور اس صلح کا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مشرق و مغرب تک اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے، اسلام اندلس تک جا پہنچا، چین تک جا پہنچا اور اسلام کی عظمتوں کا پوری دنیا کو اعتراف کرنا پڑا۔ پھر اس صلح کے بعد تو مسئلہ ہی ختم ہو گیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد یزید آ گیا۔ اس کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا معاملہ ہو گیا، پھر اس کے بعد تو معاملہ ہی نہ رہا، جو نبوت کے طریقہ پر مسئلہ چل رہا تھا پھر وہ مسئلہ ختم ہو گیا۔ تو انہوں نے اپنے یہ خلیفے خدا جانے کہاں سے بنا لیے؟ اور یہ بڑے عجیب لوگ ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ''دروغ گو را حافظہ نباشد'' کہ جھوٹے آدمی کا حافظہ نہیں ہوتا۔ جھوٹ بولنے والا آپ کو ایک بات سنائے گا اور دوسرے دن اسی کے خلاف بات سنا دے گا۔ یہ بات اس کو بھول جائے گی کہ کل میں نے کیا کہا تھا؟ کیونکہ جھوٹا ہے، کل بھی جھوٹ بولا تھا اور آج بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ جب ان سے کہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی میراث کیوں نہیں تقسیم کی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فدک کا مال کیوں نہ تقسیم کیا؟ تو کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کہاں ملی؟ وہ تو چند دن گزارہ ہی کرتے رہے، ان کو تو ایک دن بھی قرار نہیں ملا۔ چلو اہل سنت و الجماعت ان کو چوتھا خلیفہ تو مانتی ہی رہے گی، لیکن یہ ان کو چوتھی خلافت سے بھی محروم کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ خلافت کا معنی صرف زبانی کلامی بات نہیں ہوتی، بلکہ خلافت کا معنی ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کو تمکن حاصل ہو۔ اب دیکھیں! اس کے لیے کتنا بڑا انتظام ہے۔ اب حضور ﷺ کی منشا میں حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ کو خلافت دینا تھا تو آپ نے اپنی زندگی میں انتظام فرما دیا کہ حج آیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کھڑا کیا اور زندگی میں جہاد کے کئی ایسے مواقع آئے ہیں کہ جہاں حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا، یعنی اہم معاملات تو بھی حج، نماز اور جہاد ہے۔ تینوں میں حضور ﷺ نے انہیں امارت کے منصب پر بٹھا کر لوگوں کے سامنے ایک مسئلہ رکھ دیا۔ بھائی! سوچنا تمہارا کام ہے، مشورہ کرنا تمہارا کام ہے، لیکن دیکھ لو اور ساتھ قریشی ہونے کی قید بھی لگا دی۔ ان

سب میں اشارہ تھا کہ تمکن فی الارض ضروری ہے۔ اللہ نے جو خلیفہ بنایا اب یہ تو نہیں کہ ہوا میں خلیفہ بنادو۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو کہتے ہیں کہ میں آدم کو خلیفہ بنا رہا ہوں تو کہتے رہتے کہ آدم خلیفہ...... آدم خلیفہ...... اور بس۔ پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے آگے یہ مسئلہ رکھا، تا کہ ایک تو ان کو عظمتِ آدم علیہ السلام کا علم ہو سکے، پھر ان کے دلو دماغ میں حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت جاگزیں ہو جائے اور پھر چونکہ اس نظام کی تدبیر پر اللہ نے ملائکہ کو رکھا، تا کہ ان کو صحیح معنوں میں آدم علیہ السلام کے معاملات کا پتہ چل سکے اور پھر اتنا بڑا شرف اور عظمت بخشی کہ آدم علیہ السلام کو مسجود الملائکہ بھی بنا دیا۔

آدم علیہ السلام کو زمین پر خلیفہ مقرر کرنے کی حکمت:

جب یہ مسئلہ ہوا تو فرشتوں نے ایک بات عرض کی...... اعتراض اور حسد نہیں تھا، کیونکہ فرشتے اعتراض کر ہی نہیں سکتے ﴿لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ﴾ [الانبیا: ۲۷] وہ اللہ کے حکم کے مقابل تو بول ہی نہیں سکتے۔ یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے بادشاہ اپنے ماتحت کے سامنے کوئی چیز رکھے اور ماتحت مزید اس کو سمجھنے کے لیے اور حکمت جاننے کے لیے کوئی سوال کر دے تو وہ اعتراض نہیں کہلائے گا، اس لیے فرشتوں نے اعتراض نہیں...... بلکہ عرض کیا کہ ایک تو زمین میں فساد کرے گا اور دوسرا خون ریزی کرے گا۔

ان دونوں چیزوں کا علم ملائکہ کو کیسے ہوا؟ علم غیب ملائکہ کو تو ہوتا نہیں، تو اس کے بارے میں مفسرین نے فرمایا:

- ......ایک تو وہ جنات کو دیکھ چکے تھے کہ ان کا کام بھی سارا دن ہی فساد اور لڑائی ہے، کمزور کو طاقتور کھا جاتا ہے۔
- ......ایک روایت بیان کی گئی ہے، جس کو ابن کثیر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں خود فرمایا تھا کہ میں جو زمین میں آدم اور آدم کی اولاد بنانا چاہتا ہوں، ان میں فساد بھی ہوگا۔ یہ حدیث درست ہو تو بات ختم ہو گئی۔ اس لیے فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے رب کریم! آپ نے تو فرمایا کہ وہ فساد بھی کریں گے اور خون بھی بہائیں گے، پھر بھی آپ ان کو خلیفہ بنائیں گے؟ اس میں کون سی حکمتیں ہیں؟
- ......اور تیسری وجہ مفسرین نے یہ لکھی کہ آدم علیہ السلام کو اللہ نے مٹی سے پیدا فرمانے کا ارادہ کر لیا تو اس وجہ سے ملائکہ نے کہا کہ مٹی کا تعلق عالم سفلی سے ہے اور سفلی چیزوں کے اندر شہوانیت لازمی بات ہے۔ اور جب قوت

شہوانیت آئے تو لازمی بات کہ لذت اور پھر لذت کے ساتھ لازمی بات ہے کہ قوتِ غضبیہ بھی آئے گی اور جب غصہ آئے گا تو لڑائی ہوگی، اس وجہ سے ملائکہ نے اللہ کے آگے عرض کیا: اے اللہ! آپ جو مخلوق پیدا فرما رہے ہیں وہ تو زمین میں فساد کرے گی اور وہ تو خون ریزیاں کرے گی:

﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ﴾ [البقرۃ:۳۰]

اگر اس مخلوق کے پیدا کرنے کا مقصد عبادت ہے تو عبادت و اطاعت میں تو ہم کافی ہیں۔ اللہ نے فرمایا: میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ تمہارا علم بھی محدود ہے، تم تو اتنا جانتے ہو جتنا تمہیں بتایا ہے۔ تم جس بات سے ڈر رہے ہو کہ فساد کرے گا اور خون بہائے گا، اگر فساد اور خون ریزی نہ ہو تو حکومت کس پر کرے گا؟ تو خلیفہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

اسی پر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ بنی آدم پر اپنے احسانات کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے بنی آدم! تم اپنی شان کو دیکھو کہ تمہارے باپ کو پیدا کرنے سے پہلے ملاء اعلیٰ میں اس کا ذکر کیا ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ﴾ [البقرۃ:۳۰]۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۷۱، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ]

مفسر فرماتے ہیں: یہاں ایک حرف مقدر ہے، اصل تھا ''وَاذْكُرْ يَا مُحَمَّدُ!'' اللہ نے حکم دیا: اے محمد! آپ یاد کریں اس بات کو جب کہا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اور اس سے مقصود یہ تھا کہ آپ اپنی امت کو آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بیان فرمائیں۔ اس صورت میں یہ جملہ ''وَاذْكُرْ'' کے متعلق ہوگا۔

اور دوسرا قول علماء قواعد کے نزدیک یہ ہے کہ ''اِذْ'' یہاں زائدہ ہے، اصل معنی ہے ﴿قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ﴾ لیکن ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کا رد کیا ہے۔

قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ تمام مفسرین نے یہ قول رد کیا ہے کہ ''اِذْ'' زائدہ نہیں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۶۹، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ]

خلیفہ کا معنی:

❁ ..... مفسر فرماتے ہیں کہ خلیفہ کا معنی ہے کہ میں ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہوں جو قوم ایک دوسرے کے بعد آئے گی۔ ایک صدی گزرے گی تو وہ ایک دوسرے کے پیچھے آئیں گے۔

❁......بعض مفسرین نے فرمایا: خلیفہ سے مراد یہاں صرف حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

❁......بعض نے کہا کہ اس سے مراد صرف آدم علیہ السلام نہیں، بلکہ جنس آدم مراد ہے، چونکہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے آئیں گے اس لیے ان کو خلیفہ کہا گیا۔

❁......اور بعض نے کہا: آدم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کی اولاد مراد ہے، کیونکہ اگر خلیفہ کے لفظ سے صرف حضرت آدم علیہ السلام مراد ہوتے تو فرشتے یہ نہ کہتے ﴿اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ﴾ [البقرۃ:۳۰] کہ آپ زمین میں ایسی مخلوق بنانا چاہتے ہیں جو زمین میں فساد کرے گی اور خون بہائے گی؟ وہ صرف آدم علیہ السلام کے بارے میں ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟ انہوں نے لفظ خلیفہ سے یہ سمجھا، کیونکہ خلیفہ کا معنی ہی یہی ہوتا ہے جو لوگوں کے درمیان لڑائیوں و جھگڑوں کے فیصلے کر سکے۔ تو جب جھگڑے ہوں گے تو خلیفہ فیصلہ کرنے کے لیے جائے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک ایسی مخلوق پیدا ہو رہی ہے جو جھگڑے کرے گی اور مظالم کرے گی، ورنہ خلیفہ بنانے کی ضرورت کیا ہے؟

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۹، ۷۰، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ]

آیات میں ربط:

فرشتوں نے دو چیزوں کے بارے میں سوال کیا کہ وہ زمین میں فساد کریں گے اور خون ریزی کریں گے تو اللہ کے جواب بھی دو ہیں: ایک حاکمانہ جواب ہے ﴿قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰﴾ [البقرۃ:۳۰] اور دوسرا حکیمانہ جواب ہے ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرۃ:۳۱]۔ [معارف القرآن: ۱/۱۷۸]

نکات:

بنی آدم کے اندر جہاں سفکِ دماء ہو گی تو وہاں پھر شہادت کا جذبہ بھی ہو گا۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ اس عالم کو عالمِ ابتلاء، عالمِ امتحان اور عالمِ اختبار بنانا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں اپنے بندوں کی آزمائش کی جائے، امتحان لیا جائے اور ان کو ساری قوتوں اور نعمتوں سے سرفراز فرمایا جائے۔ تو اب ہم نے جو ان کے اندر قوات علمیہ رکھی ہیں، قوات عملیہ رکھی ہیں، قوات نظریہ رکھی ہیں، قوات شہوانیہ رکھی ہیں، قوات غضبیہ رکھی ہیں اور قوات حیوانیہ رکھی ہیں، ان ساری قوتوں میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں، کیونکہ جب ان قوتوں کا رخ آدمی سیدھے رخ کی طرف موڑ دے، پھر مدارج پر پہنچتا ہے اور روحانی ترقیوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یعنی ایک آدمی کو اللہ نے قوت علم دی ہے، اب اس سے وہ عالم بنیں گے، معلم بنیں گے، مفسر بنیں گے اور محدث بنیں گے۔ اگر وہ......نعوذ باللہ......اپنے اس علم کو

شیطان کے تابع کر دیں تو خسران و ذلت میں گر جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں قواتِ شوانیہ رکھی ہیں، وہ لذتیں حاصل کرتا ہے کھانے پینے سے اور عورت سے، ماکولات و مشروبات سے متمتع ہوتا ہے اور لذت حاصل کرتا ہے۔ اگر وہ حدود اللہ میں رہ کر لذت حاصل کرے گا تو عبادت ہے اور اگر وہ حدود اللہ کو توڑے گا تو سرکشی کا مرتکب ہوگا۔ تو اس کے لیے جہنم بھی تیار ہے اور سزائیں بھی تیار ہیں۔ اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے جتنی قوتوں کو پیدا کیا ہے تو ان کے اندر حکمتیں ہیں۔ اور جب ایک مخلوق کے اندر اللہ نے ایک قوت ہی نہیں رکھی ہے تو ان کے اندر اختیار، ابتلاء اور امتحان کا کوئی معنی ہی نہیں ہے، جیسا کہ اللہ نے فرشتوں کو معصوم بنایا۔ فرشتوں کی عصمت اضطراری ہے، اختیاری نہی ہے، وہ گناہ کر سکتے ہی نہیں، ان کے اندر گناہ کا مادہ ہی نہیں ہے۔ اصل عصمت اختیاری انبیاء علیہم السلام کو ہے۔ اللہ نے اپنے انبیاء کو، رسولوں کو معصوم بنایا۔ اللہ نے ان کو اتنی بڑی قوت دی، طاقت دی، اتنی بڑی صحت دی، اتنی بڑی جوانی دی اور اتنا بڑا کمال دیا، پھر بھی وہ اللہ کے راستے پر اللہ کے حدود کے اندر پابند رہے۔ مجال ہے کہ نظر ادھر ادھر بھٹک جائے۔ اصل یہ مقامِ عصمت ہے۔ جب ایک آدمی کے پاس وہ قوت ہی نہیں ہے تو اس میں بہادری کی کون سی بات ہے؟

اب دیکھیں کہ ایک آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے، وہ کہے: میں بڑا شریف آدمی ہوں، صفِ اوّل میں نماز پڑھتا ہوں، میری نماز قضا ہی نہیں ہوتی اور میں تو آنکھ اٹھا کر بھی نوجوان عورت کی طرف نہیں دیکھتا۔ جب اس کے اندر دیکھنے کی قابلیت ہی نہیں رہی۔ اگر دیکھو گے تو وہ تمہارے منہ کے اوپر تھوک دے گی، اس وجہ سے تم نہیں دیکھتے ہو۔ تو یہ کون سی بڑی بات ہے؟ اور تم نماز میں آجاتے ہو کون سی بہادری کی بات ہے؟ تم فارغ ہو، گھر والے تم سے تنگ ہیں۔ جب تم مسجد آجاتے ہو تو وہ کچھ آرام حاصل کر لیتے ہیں۔ اصل بہادری تو تب ہے جب تم جوان ہو اور تمہاری بیوی بلا رہی ہے کہ میرے ساتھ لیٹو، آرام کرو، ابھی نماز میں پندرہ منٹ دیر ہے، لیکن وہ کہتا ہے: نہیں میری تہجد چلی جائے گی۔ میں پہلے تہجد پڑھ لوں، نماز پڑھ لوں، تمہارے لیے پھر بھی دن موجود ہے، تمہارے حقوق پھر بھی ادا کر سکتا ہوں۔ یہ کمال ہے کہ بستر دعوت دے رہا ہے، حسن دعوت دے رہا ہے اور جوانی بلا رہی ہے، لیکن اللہ کی خشیت غالب ہے۔ وہ سب کچھ جھٹک دیتا ہے اور غسل کر رہا ہے اور ہاتھ باندھے اپنے پروردگارِ عالم کے سامنے کھڑا ہو رہا ہے۔

اسی لیے علماء نے فرمایا کہ چار چیزیں ایسی ہیں کہ وہ بظاہر حسن ہیں، لیکن وہ کسی دوسرے کے لیے احسن بن جاتی

ہے، یعنی توبہ کرنا بوڑھے آدمی کا حسن ہے۔ چلو بڑھاپے میں توبہ نصیب ہو جائے، لیکن اگر جوان توبہ کرے تو احسن ہے، جوانی کے اندر آدمی گناہوں کو چھوڑ دے، توبہ تو تب ہوئی۔ حیا مردوں کے اندر حسن ہے، بڑا اچھا ہے، لیکن اگر عورت میں حیا آئے تو احسن کے درجہ پر پہنچتا ہے۔ ہر آدمی عدل کرے یہ درجہ حسن ہے، لیکن کاتب معاملات اور امراء عدل کریں تو یہ درجہ احسن کو پہنچ جاتا ہے، کیونکہ وہ خود محتاج ہے، لیکن خرچ کر رہا ہے ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر:۹] یہ مقام صحابہ کرام کا تھا۔ وہ اپنے نفسوں اور اپنی اغراض پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے کہ خود محتاج ہیں، لیکن کہتے ہیں: چلو میرے بھائی کا وقت تو گزر جائے، ہمارا بھی گزر ہی جائے گا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا: اے میرے فرشتو! اے میرے بندو! میں جو مخلوق پیدا کر رہا ہوں، تمہیں ان کی برائیوں والی جانب تو نظر آئی ہے، لیکن ان کے اندر جو مراتب ہیں اور مقامات ہیں وہ تمہیں نظر ہی نہیں آتے، ان کے اندر میں نے جو مصلحتیں رکھی ہیں وہ تمہیں پتہ نہیں ہیں۔ میں آدم علیہ السلام کی اولاد میں نبی پیدا کروں گا، رسول پیدا کروں گا، انہی کے اندر صدیق پائے جائیں گے، انہی کے اندر شہداء پائے جائیں گے، انہی کے اندر صالحین پائے جائیں گے، انہی کے اندر عباد پائے جائیں گے، انہی کے اندر زہاد پائے جائیں گے، دنیا کو چھوڑ دینے والے کہ دنیا ہے، لیکن پھر بھی غرض نہیں ہے، انہی میں اولیاء ہوں گے، انہی میں ابرار ہوں گے، انہی میں وہ لوگ ہوں گے جو درجہ مقربین کو پہنچیں گے اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں گے اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ سے محبت کرنے والے ہوں گے اور انہی لوگوں کے اندر ان لوگوں کو پیدا کروں گا جو میرے انبیاء اور رسولوں کی اتباع کریں گے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ہوں گے۔ تو جہاں تمہیں مفسدین کا پہلو نظر آیا اور تمہیں لِيَسْفِكُ الدِّمَاءَ کا پہلو نظر آیا، تمہیں دوسرے پہلو کا علم ہی نہیں ہے کہ ان کے اندر مراتب کتنے ہیں؟ ان کے اندر مدارج کتنے ہوں گے؟ ان کے اندر ایسے ایسے لوگ پیدا کروں گا۔

اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے بندوں کے متعلق سوال:

اس کے بعد مفسر فرماتے ہیں: جیسے صحیح حدیث میں یہ بات موجود:

((إِنَّ الْمَلَائِكَةَ إِذَا صَعِدَتْ بِصَحِيفَةِ الْعَبْدِ إِلَى الرَّبِّ تَعَالَى يَسْأَلُهُمْ وَهُوَ أَعْلَمُ كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِيْ؟))

جب فرشتے بندوں کے عمل لے کر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتے ہیں، پروردگار عالم ان سے سوال کرتے ہیں......

حالانکہ رب جانتا ہے، پھر بھی سوال فرماتا ہے..... تم میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آرہے ہو؟

((فَيَقُولُونَ: تَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّونَ وَأَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّونَ))

''تو وہ کہیں گے: تیرے بندوں کو ہم نے اس حال میں چھوڑا کہ وہ نماز میں مصروف تھے اور تیرے بندوں کے پاس اس حال میں آئے کہ وہ نماز میں مشغول میں تھے۔''

چونکہ ملائکہ صبح کے وقت میں اور عصر کے وقت میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ جو رات والے ہیں وہ عصر کو اوپر سے آگئے، اسی طرح جو صبح والے ہیں وہ صبح کو آگئے اور رات والے واپس چلے گئے۔ تو جب وہ صبح کو جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اللہ کے بندے نماز کے اندر ہیں اور جب وہ عصر کو دیکھتے ہیں تو اللہ کے بندے نمازوں میں مصروف ہوتے ہیں۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۲۹، باب: قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ]

اور اسی طرح حدیث پاک میں آیا، میرے آقا نبی پاک ﷺ نے فرمایا: اللہ کی طرف بندوں کے اعمال اٹھا لیے جاتے ہیں اور ان کے عمل دن ہونے سے پہلے پہلے چلے جاتے ہیں، یعنی نماز کے وقت۔ اور دن کے اعمال رات کے آنے سے پہلے پہلے یعنی غروب آفتاب سے پہلے پہلے آسمانوں پر چلے جاتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے ان کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

خوش نصیب ہیں وہ بندے جو ان وقتوں میں اللہ کی نماز میں شریک ہوتے ہیں۔

بازار میں جانے کی دعا اور اس کی فضیلت:

جیسے حدیث میں آتا ہے کہ جب آدمی بازار میں جائے اور وہ یہ کلمہ پڑھے ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِي وَ يُمِيتُ، وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ'' تو اللہ تعالیٰ اس کی دس لاکھ نیکیاں لکھ دیتے ہیں، دس لاکھ گناہ معاف فرما دیتے ہیں اور دس لاکھ درجات بلند کر دیتے ہیں۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۴۲۸، باب: مَا يَقُولُ إِذَا دَخَلَ السُّوقَ]

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے بارے میں وعید:

حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ایک قوم پر اللہ کا عذاب آیا، وہ پیمائش میں کمی وبیشی کرتے تھے، یعنی جب دینا ہوتا تو تھوڑا دے دیا اور لینا ہوتا تو زیادہ لے لیا۔ کیا اب اس امت میں یہ عیب نہیں؟ آپ کسی مسلمان ملک کو آرڈر

دے کر دیکھ لیں اوپر لکھا ہوگا تیس گز اور اندر سے انتیس گز۔

جب تم اللہ کی نافرمانی کرو گے تو مخلوق بھی تمہاری نافرمانی کرے گی:

اسی لیے مالک بن دینا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ میں جب گھر میں دیکھتا ہوں کہ میری بیوی نے میری بات نہیں مانی، میں نے اپنے نوکر سے کام کہا، اس نے کام نہیں کیا، میں فوراً سمجھ جاتا ہوں کہ آج مجھ سے ایسا گناہ ہوا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں نافرمانی پیدا کر دی۔ وہ دراصل میرے گناہ کی سزا ہوتی ہے کہ بچہ نافرمان ہے، بیوی نافرمان ہے، نوکر نافرمان ہے اور دوست...... نعوذ باللہ...... نافرمان ہو گئے۔ اصل ان کی وجہ نہیں ہوتی۔

یہی تو غلطی ہے کہ ہم اپنا علاج غلط طریقے سے ڈھونڈ رہے ہیں اور جب تک تم صحیح بیماری کی تشخیص نہ کرو اور صحیح نسخہ استعمال نہ کرو تو تکلیف کیسے دور ہوگی؟

تمہارے اعمال کے مطابق تمہارے حکمران آئیں گے:

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب تم پر کوئی ظلم کرے اور تم پر سختی کرے تو اس کی ہلاکت کی دعا نہ مانگو، تم اپنے گناہوں سے توبہ کرو، تاکہ اللہ راضی ہو جائے۔ وہ اسی کو تمہارے لیے نرم کر دے گا، اسی کو تمہارے لیے مہربان کر دے گا۔ اور جب تم اللہ کے نافرمان ہو گے تو تمہارے اوپر جو حاکم ہیں ان کو اللہ تم پر ظالم بنا دے گا۔

اس لیے میرے عزیزو! اللہ نے فرمایا:

﴿وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ [البقرۃ:۵۷]

''میں اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا، وہ اپنی جانوں پر خود ظلم کرتے ہیں۔''

اللہ نے فرمایا: ہم کبھی کسی قوم کو عذاب نہیں دیتے جب تک کہ وہ عذاب کے پورے اسباب مکمل کر کے انتہاء تک نہیں پہنچ جاتے۔

اللہ کو چھوڑ کر دنیا کے اسباب کے پیچھے کیوں لگ گئے؟

ایک دفعہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے زمانہ میں بہت مصائب آئے تو انہوں نے تمام کو خط لکھا کہ یہ جتنے عذاب آرہے ہیں، ہماری معصیت کی وجہ سے ہیں۔ تم سب لوگ اپنے گھروں سے باہر نکلو اور سڑکوں پر اور دھوپ پر آجاؤ، نمازیں پڑھو، اللہ کے آگے تضرع اور عاجزی کرو اور خدا کے دروازے پر گر جاؤ اور اللہ سے مانگو اور جس کو اللہ نے

توفیق دی ہو وہ اللہ کے راستے میں خیرات بھی کرے۔امت نے فوراً یہ کام کیا تو ساری پریشانیاں دور ہو گئیں۔

لیکن جو علاج ہے وہ تو ہم ڈھونڈ ہی نہیں رہے، اس کی طرف تو ہم جا ہی نہیں رہے۔ہم اسباب کی طرف جا رہے ہیں، ہم اپنی فتح ظاہری اسباب کی طرف ڈھونڈ رہے ہیں اور ہم اپنی نجات کفر کی مدد کے ساتھ ڈھونڈ رہے ہیں، حالانکہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے دعا کریں اللہ ہم سے اپنے عذاب رفع فرمائے اور پریشانیاں رفع فرمائے اور ہمیں ہدایت کے راستے پر لگائے۔

آیات کا آپس میں ربط:

بعض علماء نے فرمایا کہ جب فرشتوں نے کہا﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ﴾ تو اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا﴿إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾[البقرة:۳۰] اور بعض علماء نے فرمایا کہ جب فرشتوں نے کہا﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ﴾ تو اس پر اللہ نے جواب دیا﴿إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾[البقرة:۳۰] تم جو کہتے ہو کہ ہم تسبیح کرنے والے ہیں، پاکی بولنے والے ہیں، تمہارے اندر بھی تو ابلیس ہے، تمہیں اس کا بھی پتہ نہیں ہے، جسے تم نہیں جانتے ہو، میں جانتا ہوں۔لیکن جمہور مفسرین اس طرف ہیں کہ یہ پہلی بات کا جواب ہے۔[تفسیر ابن کثیر:۱/۲۰۷، البقرة، الآیة: وإذ قال ربك للملٰئكة إني جاعل]

بعض مفسرین نے فرمایا کہ دراصل فرشتوں کے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمارے مولیٰ! زمین میں آدم اور آدم کی اولاد کی بجائے ہمیں آباد کر دو، ہم تیری تسبیح، تحمید اور تیرے حکم کی اطاعت کرنے والے ہیں۔اللہ نے فرمایا﴿إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾[البقرة:۳۰] اللہ ہی حکمتیں جانتا ہے کہ زمین کے اندر جو چیزیں ہیں ان سے نفع حاصل کرنے کی تمہارے اندر صلاحیت ہی نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ میری کیا حکمتیں ہیں؟ وہاں ایسی مخلوق کو پیدا کروں گا جو زمین کے اندر اور زمین کی نعمتوں سے متنفع ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو اور ان کے اندر خیر اور شر دونوں ہوں گے، تمہارا آسمانوں میں رہنا تمہارے لیے زیادہ لائق ہے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ نے جب فرمایا﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ﴾[البقرة:۳۰] معنی یہ تھا کہ میں خلیفہ بنانے والا ہوں، یعنی اللہ نے ان کو اس کی خبر دی ہے۔

اور حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ خبر نہیں، بلکہ اللہ نے بندوں کی تعلیم کے لیے گویا فرشتوں سے مشورہ لیا۔

مفسر فرماتے ہیں کہ استشار بھی ہو تو اس کے اندر اخبار کا معنی خود بخود پایا جاتا ہے۔ اگر مشورہ لیا جائے تو اس کے اندر خبر آگئی، وگرنہ مشورہ کس بات کا ہے؟

فرمایا: ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرة: ۳۰] اس میں زمین سے مراد مکہ ہے، جیسے حدیث پاک میں آیا ہے: حضور ﷺ نے فرمایا: زمین کو مکہ سے بچھایا گیا اور اس اللہ کے گھر کا سب سے پہلے فرشتوں نے طواف کیا۔

مفسر فرماتے ہیں: اس کے اندر ضعف ہے اور "ارض" سے مراد جنس ارض ہے، کیونکہ "اَلْأَرْض" پر الف لام جنس کا ہے۔ اس آیت ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرة: ۳۰] میں "اَلْأَرْض" سے مراد یہ نہیں کہ مکہ میں خلیفہ بھیج رہا ہوں، بلکہ پوری زمین کے لیے ہے، یہ لفظ عام ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۰، البقرة، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

"خَلِيفَةٌ": "فَعِيلَةٌ" کے وزن پر ہے۔ جیسے کوئی اپنی قوم میں اپنا خلیفہ بنائے تو کہا جاتا ہے "خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا" کہ فلاں نے اس کو خلیفہ بنایا اس کام کے اندر، جب وہ اس کام میں اس کا قائم مقام بن گیا ہے۔ جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ [یونس: ۱۴]

محمد بن اسحاق نے ایک اور ترجمہ بھی کیا ہے ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرة: ۳۰] انہوں نے کہا کہ اللہ نے فرمایا: میں زمین میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے والا ہوں جو اس زمین میں رہیں گے، اس زمین کو آباد کریں گے، زمین کے سکان بنیں گے اور وہ مخلوق تم میں سے نہیں ہوگی، بلکہ ایک اور جنس کی مخلوق پیدا کروں گا۔

مفسر فرماتے ہیں: ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہ بات ذکر کی گئی ہے:

"إِنَّ أَوَّلَ مَنْ سَكَنَ الْأَرْضَ الْجِنُّ فَأَفْسَدُوْا فِيهَا وَسَفَكُوا الدِّمَاءَ"

پہلے اللہ نے زمین میں جنات کو پیدا کیا، لیکن جب جنات آئے تو انہوں نے فساد کیا اور خون ریزیاں کیں ایک دوسرے کو قتل کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر ابلیس کو بھیجا۔ ابلیس نے آکر ان کو مارا، ان کو قتل کیا، ان کو بھگایا اور ایسے جزیروں کی طرف ان کو بھگایا جو دریاؤں اور سمندوں کے اندر تھے۔ وہاں جا کر ان کو بند کیا۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو آدم علیہ السلام چونکہ جنات کے بعد آئے اس لیے "خلیفہ" کہلائے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۰، البقرة، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

مشورہ کے اہل لوگ:

اللہ ان کو بھی حکم دیتے ہیں:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ [آل عمران:۱۵۹]

جب کوئی مسئلہ ہو تو آپ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرلیں، لیکن اسلام اس میں ایک سبق دیتا ہے کہ مشورہ لینے کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ اس میں ہر آدمی اپنی رائے کا اظہار کرے۔ ہر آدمی کی رائے کا اظہار تو معلوبہ بن جائے گا، پھر تو دنیا کا کوئی نظام نہ چل سکا ہے اور نہ قیامت تک چل سکے گا، کیونکہ اللہ نے جتنی زبانیں پیدا کی ہیں اور جتنے دماغ پیدا کیے ہیں سب کی سوچ اپنی ہوتی ہے۔ ایک آدمی کو ایک چیز پسند ہے اور دوسرے آدمی کو وہی چیز ناپسند ہے، اسی طرح ایک آدمی کو ایک رنگ بڑا اچھا لگتا ہے اور دوسرے آدمی کو اسی رنگ سے نفرت ہے، ایک آدمی کو کھانے میں ایک چیز مرغوب ہے اور دوسرے کو اسی چیز سے چڑ ہے، ایک آدمی کو بندہ پسند ہے اور دوسرے کو وہ ناپسند ہے اور ایک آدمی ایک پابندی کو اچھا سمجھتا ہے اور دوسرے پر وہ پابندی ناگوار گزرتی ہے۔

کیا فرشتے عالم الغیب ہیں؟

اب دوسری بات یہاں یہ پیدا ہوتی ہے کہ غلو کرنے والے لوگ جن کے اعتقاد میں اولیاء اللہ بھی عالم الغیب ہوتے ہیں، انبیاء ﷺ بھی عالم الغیب ہوتے ہیں اور پیر بھی عالم الغیب ہوتے ہیں، وہ بھی انہی قرآن کی آیات سے غلط معانی لیتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں کہ ابھی آدم علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے، ابھی آدم علیہ السلام کی اولاد بھی پیدا نہیں ہوئی، لیکن فرشتوں نے پہلے خبر دے دی کہ وہ فساد بھی کریں گے اور ناحق خون بھی بہائیں گے تو فرشتوں کو بھی علمِ غیب تھا۔ اور جب فرشتوں کو علمِ غیب ہے تو نبی تو فرشتوں سے افضل ہوتے ہیں، لہٰذا ان کو بھی علم الغیب ہو گیا۔ جب انبیاء ﷺ کو علمِ غیب ہوتا ہے تو اولیاء ان کے وارث ہوتے ہیں، وارثوں کو بھی اس جائیداد میں سے حصہ مل گیا۔ تو اس طرح کے مسائل بنا کر اور فرضی صغریٰ کبریٰ بنا کر لوگوں کو پیش کرتے ہیں۔ ہمیشہ یاد رکھیں کہ باطل مذہب جب بھی کوئی بات کرے گا صغریٰ بھی خود بناتا ہے، کبریٰ بھی خود بناتا ہے اور نتیجہ بھی خود نکالتا ہے۔ تو اب صغریٰ یہ بنایا کہ ملائکہ نے خبر دی اور کبریٰ یہ بنایا کہ جب ملائکہ نے خبر دی تو ملائکہ کو علم تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو علمِ غیب تھا۔ جب ان کو علمِ غیب تھا تو نبی اور رسل تو ان سے افضل ہوتے ہیں، ان کا علم تو ان سے بھی بڑا ہے، لہٰذا انہوں نے یہ استدلال کیا۔

حالانکہ اللہ کے قرآن کی تحریف معنوی ہے۔ اگر قرآن پاک کی اسی آیت مبارک کو مکمل پڑھ لیتے تو غلط بات کہہ کر مسلمانوں کے عقیدوں کو خراب نہ کرتے۔ اسی آیت میں جب اللہ نے تردید فرمادی: ﴿إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُونَ﴾ [البقرۃ: ۳۰] (میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے) تو بات ساری کی ساری ختم ہوگئی۔ ایک آیت کو بھی پورا نہ پڑھنا اور آیت کے بعض الفاظ کو پڑھ کر معانی حاصل کرنا یہ باطل فرقوں کی عادت ہے۔

نادانی کی ایک مثال:

جیسا کہ ایک مثال مشہور ہے کہ ایک بادشاہ اپنی بیگم کے ساتھ ایک جنگل میں سیر کے لیے گئے تھے۔ لوگوں نے آکر شکایت پیش کی کہ ہم غریب ہیں اور ہمیں گندم نہیں ملتی، ہم بھوکے مر رہے ہیں، کھانے کے لیے روٹی نہیں ملتی۔ مہربانی کریں! گندم کا انتظام کریں۔ تو ان کی بیگم نے پوچھا کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ تو سیکرٹری نے سمجھایا کہ غریب ہیں، بھوکے ہیں اور ان کو روٹی نہیں ملتی۔ اس نے کہا کہ اگر ان کو روٹی وغیرہ نہیں ملتی تو بسکٹ پیسٹری وغیرہ کھالیں۔ یہ اس نے اس لیے کہا کہ اس نے کبھی بھوک دیکھی نہیں تھی اور اس کو پتہ نہیں تھا کہ بھوک کیا ہوتی ہے؟ اس لیے اس نے بڑا مناسب مشورہ دیا۔

انسان اشرف المخلوقات کیوں ہے؟

اور یاد رکھیں! اسی سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو اشرف بنایا ہے اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ نے قرآن مقدس میں بھی فرمادیا:

﴿وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيٓ ءَادَمَ وَحَمَلۡنَٰهُمۡ فِي ٱلۡبَرِّ وَٱلۡبَحۡرِ وَرَزَقۡنَٰهُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَفَضَّلۡنَٰهُمۡ عَلَىٰ كَثِيرٖ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِيلٗا﴾ [الاسراء: ۷۰]

''ہم نے آدم کی اولاد کو عزت والا بنایا، انہیں خشکی اور تری میں ہم نے سوار کیا، گویا کہ یہ ہر چیز ان کے تابع ہوگئی بحر و بر تابع ہوگئے۔''

انسان تو اشرف المخلوقات ہے، لیکن اشرف کیوں ہے؟ اس میں مختلف علماء کے مباحث ہیں۔ ان کا صرف خلاصہ عرض کردیتا ہوں، لمبی چوڑی بحثیں اگر کسی نے پڑھنی ہیں تو کتابوں میں موجود ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ انسان اس لیے افضل ہے کہ انسان بولنے والا ہیں اور جتنے حیوانات ہیں وہ بولنے والے نہیں ہیں، یعنی نطق کی وجہ

سے انسان اشرف المخلوقات ہے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بول کر بیان کر دیتا ہے۔ مجھے پانی چاہیے تو میں کہہ کر مانگ لوں گا، مجھے کھانا چاہیے تو میں کہہ کر مانگ لوں گا۔ اور جتنے جانور ہیں: چرند ہیں، پرند ہیں اور حیوانات ہیں، ان کو اللہ نے یہ چیز نہیں عطا فرمائی کہ وہ زبان سے بول کر اپنے مالک سے کہیں۔

مثلاً: یہ ہے کہ ہدہد نے اپنی بولی میں بات کی، اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کا علم عطا فرمادیا، ورنہ یہ نہیں کہ چیونٹی کی زبان ہوتی ہے یا ہدہد کا نطق ہوتا ہے کہ جب وہ بولے گا تو ہم بھی سمجھ لیں گے، یا وہ اپنی تکلیفیں بیان کر دیں گے، اسی طرح آگر اونٹ نے آکر میرے آقا سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکایت کی کہ مالک مجھ سے کام زیادہ لیتا ہے اور میری خوراک کا انتظام نہیں کرتا۔ وہ معجزۂ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ اونٹ بولنے والا ہے۔ اس کو کوئی بھی بولنے والا نہیں سمجھتا، لہٰذا یاد رکھیں! علماء نے فرمایا کہ انسان اس لیے افضل ہے کہ انسان بولنے والا ہے، ورنہ کوئی جانور بولنے والا نہیں ہوتا، حالانکہ یہ دعویٰ کوئی اتنا بڑا دعویٰ نہیں ہے۔ جانور بولنے والا نہیں ہوتا، لیکن اللہ نے ان کو کوئی نہ کوئی تو زبان دی ہے، کوئی نہ کوئی آوازیں تو نکالتے ہیں، جس سے مالک سمجھ لیتا ہے کہ اس کو پیاس لگی ہوئی ہے، مالک سمجھ لیتا ہے کہ گائے صبح سے آواز نکال رہی ہے، اس کو بھوک لگی ہوئی ہے یا اس کو پانی کسی نے نہیں پلایا ہے۔ تو یہ اتنی فضل والی بات نہیں ہے، یعنی انسان اپنے نطق میں زیادہ فصاحت و بلاغت رکھتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کو اس کی بولی میں کچھ نہ کچھ کہنے کی توفیق بخشی ہے۔

اسی طرح بعض لوگوں نے کہا کہ انسان افضل ہے، کیونکہ اللہ نے اس کو عقل دی ہے۔ اس کی عقل اتنی مکمل ہوتی ہے کہ کوئی مخلوق اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور مخلوق میں شعور تو ہوتا ہے اور ادراک تو ہوتا ہے، لیکن عقل نہیں ہوتی۔ انسان کو اللہ نے عقل سے نوازا ہے۔ اس لیے یہ افضل ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی نہیں ہے، کیونکہ ہر چیز کو اللہ نے عقل دی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کو زیادہ دی ہے اور کسی کو تھوڑی دیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہر جانور میں عقل ہے۔ آپ اسے ایک صحرا میں چھوڑ دیں، شام کو لوٹ کر گھر آجاتے ہیں۔ آپ اس کو جنگل میں چھوڑ دیں، وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے سیدھا اپنے گھر میں پہنچتا ہے، دوسرے کے گھر میں بھی داخل نہیں ہوتا۔ شہروں میں ساری گلیاں ہوتی ہیں، وہ گلیوں کا چکر کاٹتے کاٹتے اپنے گھر میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک بلی ہے، آپ اس کو دوسرے محلے میں ڈالیں، وہ بھی شام کو گھر آجائے گی۔ اس کے اندر بھی اپنے گھر پہچاننے کی عقل تو ہے، وگرنہ وہ کیسے پہچان لیتی ہے کہ یہ میرا گھر ہے۔ ایک کتا ہے، اس کو آپ چھوڑ دیں، وہ بھی لوٹ کر گھر آجائے گا۔ نجس ہے، پلید ہے، لیکن اتنی عقل تو

اس کے اندر بھی موجود ہے۔ اور خاص طور پر بندر ہے۔ آپ جو حرکتیں کریں وہ اسی طرح کی حرکتیں کرے گا، بالکل ایسی نقل کرے گا کہ آدمی حیران ہو جائے! ایسی ایسی شرارتیں اس کو سوجھتی ہیں اور ایسی ایسی حرکتیں اس کو سوجھتی ہیں کہ آدمی دنگ رہ جاتے ہیں۔ اتنی عقل تو ان کو بھی ہے، لہٰذا عقل کی وجہ سے انسان کو اشرف کہنا کوئی دلیل نہیں بنتی ہے۔ ہر چیز میں عقل ہے، کسی کی زیادہ ہے اور کسی کی تھوڑا ہے۔

اصل میں انسان کو اللہ نے افضل جو بنایا ہے یا انسان کو جو شرف ملا ہے وہ یہی ہے جو آپ قرآن میں پڑھ رہے ہیں کہ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرۃ:۳۱] علم اور تعلم کی صفت کسی اور مخلوق میں نہیں ہے۔ یہ صفت صرف آدم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کی اولاد کو اللہ نے عطا فرمائی ہے۔

ایک ہے علم ہونا اور ایک ہے علم ہونے کے بعد دوسروں کو پڑھانا، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اتنا شرف عطا فرمایا کہ وہ ملائکہ اور جنات سے بھی افضل قرار پاگئے۔ علم اور تعلیم یہ سب سے بڑا اشرف ہے۔ اور پھر علم میں اعلیٰ علمِ دین ہے۔ دنیا کے جتنے بھی علوم ہیں آپ حاصل کریں ان کا ایک مرتبہ ہے، لیکن سب سے اعلیٰ مرتبہ علم کا یہ ہے کہ علم سے اس خالق اور مالک کو پہچانے جس نے اس کو پیدا کیا ہے اور اس کے بعد وہ اس کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کو پہچانے، کیونکہ اگر اللہ کا خالق ہونا پہچان لیا، لیکن اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کو نہ پہچانا، اللہ نے جو احکام جاری کیے ان کو نہ جانا اور ان کے اوپر عمل نہ کیا تو یہ علم کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ تو انسان کو اللہ نے افضل اس لیے بنایا کہ اس کو علم عطا فرمایا۔ قرآن مجید میں جہاں نبیوں کو علم دینے کا ذکر آیا ہے وہاں اللہ نے اس علم کی نسبت اپنی طرف کی ہے، جیسے:

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾ [البقرۃ:۳۱]

اسی طرح فرمایا:

﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ﴾ [الانبیاء:۸۰]

اور......:

﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۝﴾ [الکہف:۶۵]

معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کو براہ راست اللہ کی طرف سے علم ملتا ہے۔ پھر اس علم ملنے کے کئی طریقے ہیں جو وحی کی

اقسام میں بیان ہو چکے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے سینے میں تمام چیزوں کا القاء فرما دیا۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ نے پڑھایا تو ملائکہ بھی موجود تھے، لیکن ملائکہ استعداد نہ ہونے کی وجہ سے اس علم کو سمجھ نہ سکے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقاہت:

جیسا کہ ایک مثال بڑی مشہور ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ حضرت امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے...... وہ بہت بڑے امام تھے اور بہت بڑے محدث تھے۔ امام صاحب جن کے شاگرد ہوں استاذ کتنا بڑا ہوگا...... تو ایک آدمی نے آ کر مسئلہ پوچھا تو حضرت امام صاحب کے استاذ نے فرمایا کہ اس وقت مسئلہ میرے ذہن میں حاضر نہیں ہے...... اور یہ عالم کی شان ہوتی ہے کہ مسئلہ نہ آئے تو کہہ دے کہ مجھے نہیں آتا۔ یہ علم نہیں ہوتا کہ نہ آئے تو غلط بتلا دے اور قیامت تک اس کے گناہ کو اپنے سر پر لے لے..... تو انہوں نے فرما دیا کہ مجھے اس وقت اس مسئلے کا استحضار نہیں ہے۔ حضرت امام صاحب ساتھ بیٹھے تھے، استاذ سے اجازت لی کہ اگر اجازت ہو تو میں بتا دوں؟ انہوں نے فرمایا: ٹھیک ہے، تم بتلا دو۔ امام صاحب نے جب اس مسئلہ کو سمجھایا، استاذ ناراض ہوئے کہ کیسے مسئلہ بتا رہے ہو؟ تمہارے پاس اس پر حدیث مبارک سے کوئی دلیل ہے؟ یا خود اپنے سے ایک مسئلہ بیان کر رہے ہو؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: حضرت! فلاں حدیث مبارک ہے، آپ نے ہمیں سبق میں پڑھائی تھی۔ یہ حدیث ہے اور یہ مسئلہ ہے۔ استاذ صاحب نے جب سنا تو بڑے خوش ہوئے!!! اسی طرح جب دو چار دفعہ مسائل آئے اور آپ نے بتلائے اور حدیث مبارک کا استدلال پیش کیا تو استاذ صاحب بڑے خوش ہوئے اور فرمایا: خدا کے بندے! تم یہ کیسے سمجھ لیتے ہو؟ حالانکہ حدیثیں تو میں نے تمہیں پڑھائی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت! آپ تو محدث ہیں، آپ کا کام تو پڑھانا ہے اور ہمارا کام اس کے اندر کھوج لگانا ہے اور مسائل کا استنباط کرنا ہے۔ ہم مسئلہ تو اسی سے سمجھتے ہیں جو حدیث آپ ہمیں پڑھا رہے ہیں، ہم مسئلہ اپنے سے نہیں بتا سکتے۔

[الخیرات الحسان، ص: ۱۶۰، جامع بیان العلم وفضلہ ۲/۲۵۷]

کوئی امام...... نعوذ باللہ...... اپنے گھر سے کیسے مسئلہ بتا سکتا ہے؟ فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن پاک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھا تو ان سمجھنے والوں کی سمجھ میں فرق تھا، تابعین کا دور آیا تو ان میں سمجھنے والوں کی سمجھ

میں بھی فرق تھا اور تبع تابعین کا دور آیا اور جن لوگوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور دیکھا تھا ان کو مسائل کو سمجھنے کا ملکہ حاصل ہوا تھا، وہ بات کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

بدھ کے دن نور پیدا کیا گیا:

ابو جعفر رازی رحمہ اللہ نے ابو العالیہ رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ بھی نقل فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو بدھ کے دن پیدا فرمایا۔ اسی کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ نے نور بدھ کے دن پیدا فرمایا اور اسی کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ نے نور بدھ کے دن پیدا فرمایا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۰، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

تعلیمی کتاب کو بدھ کے دن شروع کرنا:

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے یہ قول ملتا ہے کہ اگر کوئی علم کی چیز ہو، یعنی قرآن، حدیث یا علم دین تو اس کو اگر بدھ کے دن شروع کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرماتے ہیں۔ اور اس میں ان لوگوں پر رد بھی ہے جو بدھ کے دن یا منگل کے دن کو منحوس سمجھتے ہیں، حالانکہ اس دن تو اللہ نے نور پیدا فرمایا، اس دن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملائکہ کو پیدا فرمایا۔ تو چونکہ علم بھی ایک نور ہے تو نور کو اس نور سے ایک مناسبت ہوتی ہے۔

شادی بیاہ میں مسلمانوں میں ہندوانہ رسم ورواج:

اس وجہ سے بزرگوں نے کہا کہ ایک تو لوگوں کے دماغ سے وہ رسم بد نکلے کہ بدھ کا دن منحوس ہے یا منگل کا دن منحوس ہے یا...... نعوذ باللہ...... صفر کا مہینہ یا محرم کے دنوں میں شادی نہیں کرنی چاہیے۔ اصل میں مشکل یہ ہے کہ یہ سب جاہلانہ عقیدے ہیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کفار کے عقیدے تھے اور ہمارے ملک میں بدقسمتی سے یہ ہندوؤں سے نقل ہوئے ہیں، کیونکہ مسلمانوں کی جو زیادہ تر معاشرت رہی ہے وہ ہندوؤں کے ساتھ رہی ہے کہ ہندو اور مسلمان مل کر رہتے تھے۔ تو جو ہندوؤں کے اندر رسمیں تھیں وہ مسلمانوں میں آ گئیں۔ اب اتنا رواج پڑ گیا، اتنی مجبوری بن گئی کہ پڑھے لکھے لوگ اس کو غلط بھی سمجھتے ہیں، لیکن پھر بھی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے، لیکن باپ دادا سے یہ رسمیں چلی آ رہی ہیں۔ آپ شادی میں، غمی میں، موت میں اور کسی بچے کے پیدا ہونے میں، تمام معاملات میں یکسیں! بعینہٖ وہی رسمیں ہیں جو ہندوؤں کے اندر ہیں۔ وہ رنگ ڈالتے ہیں، یہ رنگ ڈالتے ہیں۔ وہ

لوہے کے بید پکڑتے ہیں، یہ بھی لوہے کے بید پکڑتے ہیں۔ وہ سرخ دھاگے ہاتھوں میں باندھتے ہیں، یہ سرخ دھاگے ہاتھوں میں باندھتے ہیں اور اسی طریقہ سے وہ دولہا کو گھوڑی پر بٹھا کر لے آتے ہیں...... جو ساری زندگی گدھا پر بھی نہ بیٹھا ہو شادی والے دن اس کو گھوڑا یاد آجاتا ہے...... اس کو بڑی کلاہ والی پگڑی باندھ کر اس کے گلے میں پھول ڈالیں گے اور اس کو تاج پہنائیں گے کہ آگے پھول لٹکے ہوئے ہوں گے، چونکہ دلہن تو پردہ نہیں کرتی تو اب دولہا کو پردہ کرا دیتے ہیں۔ اسی طرح دولہا کے ساتھ ایک چلنے والا ہوگا۔ یہ بڑی عجیب عجیب رسمیں ہوں گی! یہ تمام کفر کی رسمیں ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کا دین محمد عربی ﷺ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے اور سنت ہے کہ جو دولہا ہے اچھے کپڑے پہنے، اچھا لباس پہنے جو اللہ نے اس کو عطا فرمایا ہو، اسی طرح دلہن کے لیے اس کے سنگھار کا سامان خریدے، اس کے میک اپ کے لیے جو ضرورت ہو وہ دینا، یہ سب چیزیں سنت ہے، کوئی منع نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں جو آج کل جہیز کی رسم ہے کہ جب لڑکے کی شادی کرتے ہیں تو لڑکے والے شرط کرتے ہیں کہ ہم آپ کی لڑکی اس شرط پر قبول کریں گے کہ آپ گاڑی دیں گے، فریزر دیں گے اور فلاں سامان دیں گے، یعنی لڑکے کی قیمت لگاتے ہیں۔

یہ بالکل حرام ہے، اس کا لینا بھی حرام ہے، استعمال کرنا بھی حرام ہے، بلکہ یہ ایک قسم کی رشوت ہے۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت بھیجی ہے کہ بھائی! آپ کس بات کا عوض لے رہے ہیں؟ کہ لڑکی بھی دیں اور جہیز بھی دیں، ورنہ یہ ہے کہ کوئی اچھا لڑکا رشتہ نہیں کرے گا، اچھا لڑکا نہیں ملے گا تو اب والدین مجبور ہیں کہ وہ اپنی بیٹیاں بھی دیں اور جہیز بھی مہیا کریں۔ اس لیے علماء نے لکھا کہ یہ رشوت کے ضمن میں آتا ہے۔ لینے والا بھی لعنتی ہے اور دینے والے بھی لعنتی ہیں۔ حالانکہ شریعت میں حق یہ ہے کہ لڑکا لڑکی کو حق المہر دے، اسی طرح شریعت یہ بھی کہتی ہے کہ لڑکے والوں کو اگر اللہ نے توفیق دی ہو تو وہ لڑکی کے والدین کی بھی مدد کر سکتا ہے۔ اگر وہ غریب ہیں اور یہ لڑکا امیر ہے تو جہاں لڑکی کو حق المہر دے وہاں اس کے والدین کی بھی مدد کرے تو یہ سنت ہے۔ اور ہمارے ہاں بالکل الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ یہ تمام بدعات ہیں اور احداث فی الدین ہیں۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا:

((إِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، فَإِنَّهَا ضَلَالَةٌ))

''تمام محدثات سے بدعات سے بچا کرو کہ بدعت کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے۔''

[سنن الترمذی، حدیث: ٢٦٧٦، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْأَخْذِ بِالسُّنَّةِ وَاجْتِنَابِ الْبِدَعِ]

اور بدعت سے ہی آدمی کفر کی طرف جاتا ہے۔ بہر حال عجیب عجیب رسمیں ہیں۔ اللہ پاک مسلمانوں کو پناہ عطا فرمائیں اور ہدایت عطا فرمائیں۔

فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو بدھ کے دن پیدا فرمایا، جنات کو خمیس کے پیدا فرمایا اور آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن پیدا فرمایا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۱، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

امام باقر رحمہ اللہ کی طرف منسوب ایک روایت:

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابو جعفر محمد بن علی بن حسین رحمہ اللہ سے، یعنی امام باقر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: سجل ایک فرشتہ ہے۔ ہاروت اور ماروت بھی اس کی جماعت میں سے تھے اور اس کو اجازت تھی کہ وہ تین دفعہ تین وقت میں ام الکتاب میں نظر ڈال سکتا تھا جتنا کہ اس کو اجازت تھی۔ ایک دن اس نے زیادہ نظر ڈالی تو اس کتاب میں دیکھ لیا کہ اللہ آدم علیہ السلام کو پیدا فرمائیں گے، ان کی اولاد ہوگی اور ایسے ایسے حالات ہوں گے تو اس نے اس بات کو چھپایا اور رازداری سے ہاروت اور ماروت کو بتلایا، چونکہ وہ اس کی جماعت میں سے تھے۔ جب اللہ نے فرمایا ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرۃ: ۳۰] کہ میں زمین میں خلیفہ بنانا چاہتا ہوں، انہوں نے چونکہ ام الکتاب میں پڑھا ہوا تھا، اس لیے ملائکہ پر اپنا زیادہ علم ظاہر کرنے کے لیے یہ بات کی۔

لیکن یہ بات بالکل غلط ہے۔ ایک تو امام باقر رحمہ اللہ سے یہ بات نقل کرنا ہی صحیح نہیں۔ اور مفسر فرماتے ہیں: اگر واقعی یہ روایت صحیح ثابت ہو جائے کہ حضرت ابو جعفر باقر رحمہ اللہ نے یہ بات کہی ہے تو پھر ہم یہ سمجھیں گے کہ انہوں نے اہل کتاب کی کسی کتاب میں یہ قول دیکھا ہوگا، لیکن اصل یہ ہے کہ یہ ان کی گھڑی ہوئی ہے، وہ ساری روایتیں اس طرح نقل کرتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۱، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

ہاروت اور ماروت کا من گھڑت قصہ:

جیسا کہ ہاروت اور ماروت کے قصہ میں انہوں نے گھڑا ہے کہ ایک عورت تھی اور اللہ نے ان کو امتحان میں ڈالا اور پھر اس عورت نے ان کو کہا کہ یا تو تم قتل کرو اور قتل نہیں کرتے ہو تو زنا کرو۔ انہوں نے قتل سے بھی انکار کیا اور زنا سے بھی انکار کیا تو اس نے کہا: چلو شراب پی لو۔ انہوں نے شراب پی لی تو شراب پی کر انہوں نے زنا بھی کر لیا اور ایک بت تھا اس کو سجدہ بھی کر لیا۔ اور ہاروت اور ماروت نے اس عورت کو اسم اعظم سکھلایا تھا۔ وہ اسم اعظم پڑھنے

سے آسمانوں پر چلی گئی تھی، زہرہ بن گئی۔ یہ سارے ان کے گھڑے ہوئے قصے ہیں۔ نہ تو ان کی کوئی اصل ہے اور نہ کوئی حقیقت ہے، نہ کوئی واقعہ ہے۔ بس ان کو ایک لفظ ہاروت اور ماروت ہاتھ آ گیا تو اگلا انہوں نے خود گھڑ لیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳۸، البقرۃ، الآیۃ: وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ...]

اس معاملے میں بڑے یہودی بادشاہ ہیں، جھوٹی روایات گھڑنے کے استاذ ہیں۔ یعنی جھوٹ سے بڑی سے بڑی کتابیں لکھ ڈالیں گے اور پھر اس کو فوراً بعد انکار بھی کر دیں گے کہ ہم تو نہیں مانتے۔ اور پھر جب ان پر کوئی دباؤ ڈالا جائے گا تو کہیں گے کہ ہاں انکار تو ہم کر رہے تھے، لیکن ہم نے تکیہ کیا تھا۔ تو اس لیے یہ بھی روایت ان کی گھڑی ہوئی ہے کہ ام الکتاب میں انہوں نے دیکھ لیا، جبکہ اللہ نے خود فرمایا ﴿اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ﴾ [البقرۃ: ۳۰] تو ان کو دیکھنے اور ام الکتاب کے کھولنے کی ان کو کیا ضرورت پڑ گئی؟

اسرائیلی روایات اور ان کی تردید:

مفسر فرماتے ہیں کہ اس روایت میں یہ آتا ہے کہ ان دو فرشتوں نے صرف یہ بات کی ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا﴾ [البقرۃ: ۳۰] تو یہ بات بھی غلط ہے، کیونکہ ملائکہ جمع کا صیغہ ہے اور اللہ نے ان کو خود فرمایا۔ جب نص قطعی میں ایک بات موجود ہے کہ رب نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو پھر کتابوں میں دیکھنے اور چوری سے علم حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ چوری سے تو وہ علم حاصل ہو جو اور کسی کو حاصل نہ ہو، جبکہ اللہ نے تو سب ملائکہ کو فرما دیا تھا۔ ایک اور روایت میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ جب اللہ نے ﴿اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۳۰] فرمایا تو دس ہزار فرشتوں نے یہ بات کہی۔ جب انہوں نے پروردگار پر یہ اعتراض کیا تو ایک آگ نکلی جس نے ان کو جلا ڈالا۔ یہ بھی ساری اسرائیل منکر روایات ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۱، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ]

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب تک اللہ خود ہمیں خبر نہ دیں تو کون ہے جو وہاں کیلکولیٹر لے کر کھڑا تھا کہ دس ہزار فرشتوں نے یا اتنی تعداد نے یہ جواب دیا۔ ایسی باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے مفسرین کا ایک اصول ہے کہ اللہ نے جن چیزوں کو قرآن میں مبہم رکھا ہے، یعنی خود نہیں بیان کیا، تم ان کو کھولنے کے پیچھے نہ پڑو، کیونکہ اگر ان کے پیچھے پڑو گے تو ٹھوکروں کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ انتہاء جا کر یہ ہوگی کہ آخر کار انکار کرنا پڑے گا کہ میں

نے بے سود محنت کی ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنی کتابیں اتاری ہیں انسانوں کی ہدایت کے لیے ہیں۔ تو جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی اللہ تعالیٰ کھول دیتے ہیں اور جس چیز کے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ بیان ہی نہیں فرماتے۔

دیندار لوگوں کی کیا صفات ہونی چاہئیں؟

جیسے حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ لوگ مثال دیتے ہیں کہ یہ دنیادار اور ہم دیندار ہیں تو وہ فرماتے تھے کہ یہ مثال ہی سرے سے غلط ہے کہ پیسے والوں کو، سرمایہ داروں کو، جاگیرداروں کو اور زمینداروں کو آدمی دنیادار سمجھے اور پیر کو، مولوی کو اور طالب کو دیندار سمجھے۔ یہ مثال ہی غلط ہے، کیونکہ دار کا معنی ہے کہ جو ہر وقت دنیا کا طالب ہو۔ ان میں جو ہماری طرف آتے ہیں اصل دیندار تو وہ ہیں جو دنیا کے باوجود دین کے متلاشی ہیں اور ہمارے جب دنیا والوں کے پیچھے بھاگتے ہیں دنیادار تو اصل ہم ہیں کہ ہم ان کے پیچھے جارہے ہیں، اپنے علم کو بیچ رہے ہیں، اپنی عزت کو بھی داؤ پر لگا رہے ہیں اور اپنے وقار کو بھی خراب کر رہے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ کا بادشاہ کے بچوں کو گھر پر نہ پڑھانے کا واقعہ:

امام مالک رحمہ اللہ سے بادشاہِ وقت نے کہا: مہربانی فرمائیں! میرے بچوں کو علم پڑھادیں، یعنی دنیا کا کام بھی نہیں کہا، بلکہ دین کا کام کہا کہ مہربانی فرما کہ میرے بچوں کو مؤطا امام مالک پڑھادیں اور اس کام کے لیے اتنی تکلیف فرمائیں کہ محل میں کسی جگہ بیٹھ کر پڑھادیں، کیونکہ بادشاہ کے بچے ہیں، شہزادے ہیں۔ اب اگر وہ ادھر آئیں گے تو ان کے لیے پہرے کا انتظام اور حفاظت کا انتظام مسئلہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ علم کے پاس لوگ آتے ہیں، علم کسی کے دروازے پر نہیں جاتا۔ فرمایا: جس کو پیاس ہوتی ہے پیاسا کنواں کے پاس آتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ کنواں پیاسے کے پاس جائے؟ بادشاہ نے کہا: بات تو ٹھیک ہے تو اس نے کہا کہ اچھا حضرت! آپ اتنی مہربانی فرمائیں کہ میں اپنے لڑکوں کو پابند کروں گا اور ان کی حفاظت کا انتظام کروں گا، لیکن جب آپ یہاں اپنے مدرسے میں سبق دیں تو ان کو علیحدہ بٹھادیں، دوسرے طالب علموں میں نہ بٹھائیں، کیونکہ آخر وہ بادشاہ کے بیٹے ہیں، لوگوں کی سطح پر اتر کر بیٹھیں گے تو مسئلے پیدا ہوں گے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: علم تقسیم نہیں ہوسکتا، یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا رہا ہوں اور اس میں کہوں کہ بڑا آدمی تو بیٹھے اور غریب نہ بیٹھے۔ جب

حضور ﷺ بیان فرماتے تھے تو جہاں ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم بیٹھے تھے تو وہاں ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی بیٹھتے تھے، کہیں اور کبھی حضور ﷺ نے نہیں فرمایا کہ تم علیحدہ پڑھو اور تم علیحدہ پڑھو۔ میں نبی پاک ﷺ کی حدیث کو کیسے تقسیم کرسکتا ہوں؟

اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ علم کی عظمت قائم ہوتی تھی، ورنہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں تھی۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ وہیں جا کر بھی پڑھا سکتے تھے۔ اگر آپ تشریف لے جاتے اور پڑھا دیتے تو شرعاً کوئی منع بھی نہیں تھا، لیکن عظمتِ علم کے خلاف ایک بات بنتی تھی کہ ان کے دلوں میں جو علماء کا احترام ہے وہ ختم ہو جائے گا، اس لیے حضرت امام مالک رحمہ اللہ اپنی بات پر اڑ گئے۔ چنانچہ وہ دونوں شہزادے امام مالک رحمہ اللہ کے پاس اسی عام مجلس میں ہی حدیث پڑھا کرتے تھے۔

حضرت لاہوری رحمہ اللہ کا صدر ایوب کے بیٹے کا نکاح پڑھانے کا واقعہ:

اور ہمارے اپنے دور کی بات ہے کہ صدر ایوب کے بیٹے کی شادی تھی یا کسی اور کی، بہرحال مجھے پورا یاد نہیں ہے۔ حضرت لاہوری رحمہ اللہ کی خدمت میں گورنر کالا باغ کو بھیجا اور ان کے ذمہ لگایا کہ حضرت لاہوی رحمہ اللہ میرے لڑکے کا نکاح پڑھا دیں۔ حضرت لاہوری رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس نے کہا کہ صدر صاحب کی یہ تمنا ہے کہ آپ اس کے بچے کا نکاح پڑھا دیں۔ آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ شریعت کا مسئلہ ہے، میں انکار نہیں کرتا، لیکن میری چند شرائط ہیں۔ اس نے پوچھا: کیا ہیں؟

1 ...... آپ نے فرمایا کہ میں اپنی سواری پر آؤں گا اور اپنی سواری پر واپس جاؤں گا، سرکاری گاڑی پر نہیں بیٹھوں گا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

2 ...... دوسری شرط یہ ہے کہ میں وہاں جب بیٹھوں تو مجھے کھانا پانی، یا پینے کے لیے بوتل یا چاہے وغیرہ پیش نہیں کریں گے، کیونکہ آپ پیش کریں گے، میں نہیں پیوں گا تو بدمزگی ہوگی، اس لیے بہتر ہے کہ آپ پیش ہی نہ کریں۔

3 ...... تیسری شرط یہ ہے کہ میں جب آؤں تو مجلس بالکل تیار ہو اور میں بیٹھتے ہوئے خطبہ شروع کر دوں۔ میں اس کے بعد زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔

4 ...... اور چوتھی شرط یہ ہے کہ میں نکاح پڑھانے پر کچھ لوں گا نہیں، جیسا کہ ایک رواج ہے کہ نکاح پڑھانے

کے بعد قاضی کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا جاتا ہے، وہ بھی نہیں لوں گا، کیونکہ آپ اگر دینے کی کوشش کریں گے تو میں لوں گا نہیں تو پھر بھی آپ کی مجلس میں بدمزگی ہوگی، اس لیے بہتر ہے کہ میں یہ شرائط پہلے آپ کو پیش کردوں اور آپ صدر صاحب کو بتلادیں۔ اگر انہیں قبول ہے تو فقیر حاضر ہے، ورنہ سلام علیکم...... مجھے کیا ضرورت ہے؟ تو انہوں نے ساری شرطیں قبول کرلیں۔

چنانچہ حضرت سائیکل چلاکر تشریف لائے، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی، رکشہ پر بھی آسکتے تھے، ٹیکسی بھی کرایہ پر لے سکتے تھے، لیکن اپنے فقر کی عظمت کو بحال رکھنے کے لیے اور علماء کی عزت کو بحال رکھنے کے لیے کہ سائیکل بھی صدر ہاؤس میں جاسکتی ہے۔ یہ نہ سمجھیں کہ یہاں قیمتی گاڑیاں کھڑی ہوسکتی ہیں، وہاں غریبوں کا سائیکل نہیں کھڑا ہوسکتا۔ تو حضرت سائیکل چلاکر آئے اور اس سے اتر کر مجلس میں بیٹھے اور خطبہ شروع فرمادیا۔ نکاح فرمایا اور اس کے بعد دعا کی اور اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ واپس آئے تو وہ گورنر پیچھے دوڑتے آئے اور صدر دوڑتے آئے کہ حضرت! چلو سلام علیکم کی اجازت تو دیں۔ فرمایا: شریعت کا جتنا کام تھا وہ میں نے کردیا۔ اس کے بعد مجھے آپ سے ہاتھ ملانے کی نہ کوئی خوشی ہے اور نہ مجھے کوئی فرحت ہے، بلکہ مجھے یہ یقین ہے کہ میں جتنی دیر آپ سے ملوں گا اتنی دیر دل پر سیاہی ہوگی، اتنا مجھ پر کدورت کا اثر ہوگا، کیونکہ کسی فاسق سے ہاتھ ملانے میں کون سی خوشی ہوسکتی ہے؟ آپ لوگ شریعت کے کھلے مخالف ہیں، بس کلمہ پڑھتے ہیں کہ مسلمان ہیں، اس لیے میں نے نکاح پڑھادیا۔ بس بات ختم ہوگئی اور سائیکل چلاکر واپس آگئے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

یہ تو اب کی باتیں ہیں، پرانے دور کی بھی نہیں ہیں۔ اسی طرح سارے ملتان کو پتہ ہے کہ شاہ جی موجود تھے اور اس وقت سکندر مرزا آیا۔ اس نے خود خواہش کی کہ کوئی ایسا سبب بنادیا جائے کہ میں ملتان آرہا ہوں تو شاہ جی سے ملاقات ہوجائے...... تو ڈاکٹر تاثیر تھے جہاں تک مجھے یاد ہے ان کو شاہ جی سے بڑی محبت تھی، یا مظفر علی شمسی تھا تو وہ رفض کی طرف مائل تھا، لیکن ختم نبوت کے معاملے میں حضرت شاہ جی کے ساتھ تھا۔ مجھے یاد آگیا، وہ مظفر علی شمسی تھا وہ روافض کا بہت بڑا مولوی تھا، اس وقت وہ ختم نبوت کے مسئلے پر حضرت شاہ جی کا بڑا ساتھی تھا، کیونکہ مولوی لوگ جلدی ڈھال لیتے ہیں...... تو اس کے ذمہ لگایا گیا کہ آپ کسی طرح مجلس بناؤ اور شاہ جی کو راضی کرو اور ایسے

حالات پیدا کرو کہ شاہ جی آجائیں تو ملاقات ہو جائے۔

خیر! مظفر علی شمسی آیا، شاہ جی اپنے غریب خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بڑا تیز آدمی تھا، لیڈر تھا اور خطیب قسم کا بندہ تھا۔ اس نے پہلے شاہ جی کا ادھر ادھر موڈ بنایا، تاکہ طبیعت ذرا ہموار ہو جائے۔ شاہ جی جب ٹھیک ٹھاک اپنے مزاج پر آئے، خوش ہوئے اور چائے پلائی تو کہنے لگا کہ شاہ جی! ہم تو آپ کے لیے جیلیں بھی کاٹتے رہے، ہم تو آپ کے لیے ہر تکلیف برداشت کرتے رہے، آپ بھی کبھی ہمارا لاڈ برداشت کریں گے کہ نہیں کریں گے؟ حضرت نے فرمایا: تم چھوڑو، کیا نخرے کرا رہے ہو؟ اتنی بڑی تمہید کی کیا بات ہے؟ تم کہو۔ تو اس نے کہا کہ سکندر مرزا کی خواہش ہے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مہربانی فرمائیں تو میری بھی لاج رہ جائے گی، میں نے وہاں ناز کر لیا کہ میں شاہ جی کو لے آؤں گا۔ تو اصل بات آپ کے ملنے یا نہ ملنے کی نہیں ہے، اب تو میری عزت کا سوال ہے، میری لاج رکھ لیں۔ تو فرمایا: شمسی! بات سنو! اگر وہ فقیر کی کٹیا پر چل کر آجائے تو اس کی عزت بڑھ جائے گی اور اگر فقیر وہاں چلا گیا تو میرا تو سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ کیا تم مجھے برباد کرنے آئے ہو؟ فقیر اس کے دروازے پر کیوں جائے؟ اگر اس کی عزت بڑھانا مقصود ہے تو اس سے اس کی اور زیادہ عزت بڑھے گی۔ جب وہ یہاں آئے گا، لوگ کہیں گے کہ صدر ہو کر فقیر کی کٹیا پر گیا تھا اور وہاں شاہ جی کے پاس نمک کی چائے پی تھی تو بھائی! تم اس کو فقیر کی کٹیا پر لے کر آؤ۔ فقیر کو کیا پڑی ہے کہ وہاں جائے؟ میرا سب کچھ برباد کرانا چاہتے ہو؟ ساری زندگی خدا کے سوا کسی کو فدوی نہیں لکھا، ساری زندگی اللہ کا بھکاری بن کر رہا ہوں۔ تم مجھے صدر کے دروازے پر لے کر جانا چاہتے ہو، کوئی عقل کی بات کرو۔ تو وہ چھوٹا سا منہ لے کر نکل گیا۔ تو یہ علماء کی عزت اور عظمت کا دور تھا۔

اصل تفسیر کی طرف عود:

اور ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ نے فرشتوں کو یہ بات بتائی تو انہوں نے یہ بات بطور تعجب کی تھی کہ کیسے وہ آپ کی نافرمانی کریں گے اور کیوں کریں گے؟ تو اللہ نے فرمایا ﴿إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُونَ﴾ [البقرۃ:۳۰]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا ارادہ فرمایا اور ملائکہ پر ظاہر فرمایا تو ملائکہ سوچنے لگے کہ ہم سے بھی زیادہ عزت والی مخلوق اللہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ ہم معصوم ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کرنے والے ہیں۔ جب انہوں نے ایسی بات کی تو امتحان میں ڈال دیے گئے، کیونکہ

جب کوئی بھی ذرہ فخر کرے تو امتحان تو آجاتا ہے، اسی لیے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق ایسی پیدا نہیں فرمائی جس پر کوئی امتحان نہ آیا ہو، جیسا کہ آسمان اور زمین پر بھی ابتلاء آئی، اللہ نے ان کو فرمایا:

﴿ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا ۖ قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ⑪﴾ [فصلت:11]

حضرت عبدالرزاق رحمہ اللہ نے معمر رحمہ اللہ سے اور انہوں نے حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ ﴿نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ﴾ [البقرۃ:30] میں تسبیح سے مراد اللہ کی پاکی بیان کرنا، یعنی "سُبْحَانَ اللّٰهِ... اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" مراد ہے اور اسی طرح تقدیس سے مراد اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا، یعنی نماز پڑھنا مراد ہے۔

﴿نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ﴾ [البقرۃ:30] کے معنی ہیں ایک قول یہ بھی ہے "نَحْنُ نُصَلِّي لَكَ" ہم آپ کی نماز پڑھتے ہیں۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تسبیح وتقدیس کا معنی ہے کہ ہم تیری عظمت و بڑائی کا اعتراف کرتے ہیں۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تقدیس کا معنی تطہیر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ نقصان سے پاک ہے۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے معنی کیا کہ "لَا نَعْصِيْ" ہم تیری نافرمانی نہیں کرتے، ہم ایسا کام ہی نہیں کرتے جو آپ کو ناپسند ہو، یعنی تسبیح وتقدیس یہ نہیں کہ زبانی وکلامی کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں بھی کرتے رہو۔

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تقدیس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی عظمت اور اس کی ذات کی پاکی کا اقرار کرنا۔ اسی لیے فرشتے کہتے ہیں "سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ" یعنی اس کی تنزیہ بیان کرتے ہیں کہ وہ تمام قسم کے شریکوں سے پاک ہے۔ "قُدُّوْسٌ" یعنی تعظیم کے لائق بھی وہی ہے تو ﴿نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ﴾ [البقرۃ:30] کا معنی یہ ہوا کہ اے میرے مولیٰ! ہم تیری تنزیہ بیان کرتے ہیں اور تیری عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: 1/71، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضرت ابی ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: "أَيُّ الْكَلَامِ أَفْضَلُ؟" (کون سا وظیفہ یا کون سا کلام پڑھنے میں زیادہ افضل ہے؟) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَا اصْطَفَى اللّٰهُ لِمَلَائِكَتِهِ" اللہ تعالیٰ نے جو اپنے ملائکہ کے لیے پسند فرمایا، یعنی "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سب سے افضل کلمات ہیں۔ اگر یہ افضل کلمات نہ ہوتے تو اللہ

اپنے فرشتوں کو نہ سکھلاتے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۷۳۱، باب: فَضْلِ سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ]

اسی طرح امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے کہ میرے آقا ﷺ معراج کی رات آسمانوں پر تشریف لے گئے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں: میں نے خود فرشتوں کی تسبیح سنی جو پڑھ رہے تھے: ''سُبْحَانَ الْعَلِیِّ الْأَعْلٰی، سُبْحَانَ الْعَلِیِّ الْأَعْلٰی، سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰی'' آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تسبیح میں نے پڑھی ہے۔

[الجامع الكبير للسيوطي، حديث: ۱۳۱۸۱]

اللہ کی تسبیح کے کلمات:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری کو اس حدیث مبارک پر ختم فرمایا ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ'' کہ حضور ﷺ نے فرمایا: دو کلمات ایسے ہیں کہ زبان کے اوپر ان کے پڑھنے سے کوئی بوجھ نہیں ہوتا، کوئی ثقل نہیں ہوتا اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اور فرمایا کہ دو کلمات ایسے ہیں جو رحمٰن کو بہت محبوب اور بہت پسند ہیں:

((كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ))

''رحمٰن کو بڑے محبوب ہیں، میزان میں بڑے بھاری ہیں اور زبان پر ہلکے ہیں۔''

اور وہ یہ ہیں:

((سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ))

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۵۶۳، باب قَوْلِ اللهِ تَعَالٰی: وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ...]

حضور پاک ﷺ فرماتے ہیں: میں نے خود فرشتوں کی تسبیح سنی جو پڑھ رہے تھے:

((سُبْحَانَ الْعَلِيِّ الْأَعْلٰى، سُبْحَانَ الْعَلِيِّ الْأَعْلٰى، سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰى))

آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تسبیح میں نے پڑھی ہے۔

[الجامع الكبير للسيوطي، حديث: ۱۳۱۸۱]

اور اسی طرح ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ'' فقط یا ''سُبْحَانَ الْعَلِيِّ الْأَعْلٰى'' یا اسی طرح ''سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَاللهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ'' یا ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' یا ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى، سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ'' یعنی جن انداز میں اور جن صیغوں میں اللہ کی تسبیح بیان کی جائے تو یہ کلمات بڑے افضل

ہیں اور اللہ کو بڑے محبوب ہیں۔

آدمی کو چاہیے اور کوشش کرے کہ جو وظائف، جو کلمات اور جو ادعیات حضور ﷺ سے ثابت ہیں ان کے ساتھ دل لگائے، کیونکہ ان میں جو برکات اور ثمرات ہیں وہ دنیا کے کسی کلام میں نہیں ہوتیں۔

سفر کی ایک دعا اور اس کی اہمیت:

دو آیات قرآن شریف میں آتی ہیں:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ [ھود:۴۱]

اور دوسری آیت مبارک ہے:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ڰ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝﴾ [الزمر:٦٧]

اور اسی طرح ایک سفر کی دعا ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝﴾ [الزخرف:۱۳،۱۴]

اگر کوئی آدمی انہیں سات سات دفعہ پڑھ لے تو اللہ کی رحمت سے اسے کسی حادثہ میں نقصان نہیں ہوگا۔ اتنی بڑی بات ہے کہ تفسیر قرطبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول مبارک نقل فرمایا ہے کہ یہ ایک دعا اور یہ دو آیتیں جو آدمی سفر میں کم از کم تین دفعہ اور زیادہ سے زیادہ سات دفعہ پڑھ لے گا اگر وہ ایکسیڈنٹ میں مرجائے تو قیامت والے دن اس کی دیت اللہ کو میں ادا کروں گا۔

[الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۹/ ۳۷، ھود، الآیۃ: وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ...]

واقعہ:

ایک طالب علم نے مجھے خود سنایا کہ ہم ریاض کا سفر کر رہے تھے۔ اپنے استاذ کو ملنے کے لیے گئے کہ حضرت! ہم سفر پر جا رہے ہیں، ہمارے لیے دعا کر دیں تو فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ نے ہمارے لیے دعا بھی کی اور اس کے بعد یہ دعا بھی سکھلائی کہ یہ سفر کی دعا ہے اور یہ دو آیتیں ہیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ یہ دو آیتیں امان کی آیات ہیں میری امت کے لیے۔ تو جب تم گاڑی میں جہاز میں سفر کرو یا کسی جانور پر سفر کرو تو یہ دعا پڑھ لیا کرو۔

طلبہ کہتے ہیں کہ اس وقت ٹیکسیاں چلتی تھیں تو ان کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔ ہم نے یہ دعا پڑھ لی۔ راستے میں گئے تو اللہ معاف فرمائے! گاڑی ۱۶۰ کی رفتار سے چل رہی تھی اور اس کے ٹائی راڈ نکل گئے...... ۱۶۰ کلومیٹر کی رفتار سے گاڑی جا رہی ہو تو پورا ہوائی جہاز ہو گیا تو جب اس کے ٹائی راڈ نکل جائیں تو آپ کس سے کنٹرول کریں گے؟ اور روڈ کی جگہ ہے، آپ شارع عام پر جا رہے ہیں، سامنے سے گاڑیاں آسکتی ہیں، پیچھے سے گاڑیاں آسکتی ہیں...... لیکن فرماتے ہیں کہ ایسا قدرت کا نظام ہے کہ فوری طور پر ہم سب نے کلمہ شہادت پڑھ لیا، کیونکہ موت سامنے تھی، واضح بات تھی۔ اور ڈرائیور نے بتا دیا تھا کہ ٹائی راڈ نکل چکے ہیں، سب کلمہ پڑھ لیں، تاکہ خاتمہ ایمان پر ہو جائے۔ تو ہم نے کلمہ پڑھ لیا اور اس کے بعد ڈر کے مارے آنکھیں بھی بند کر لیں کہ ابھی مرنا ہے، بس سیکنڈوں کا فاصلہ ہے۔ اس طرح کرتے کرتے گاڑی ٹھہر گئی تو ہم نے اتر کر دیکھا کہ گاڑی سڑک کے آدھا کلومیٹر نیچے تک چلتی گئی، کیونکہ ریت تھی، چلتے چلتے بالکل سیدھی ریت اور کوئی گڑھا نہیں آیا۔ تو بڑے آرام سے گاڑی جا کر کھڑی ہو گئی۔

ڈرائیور جب اترا تو اس نے کہا کہ تمہارے اندر کوئی آدمی ضرور ہے جس نے کوئی دعا پڑھی ہے؟ ہم نے کہا: ہم کون سے اتنے بڑے پیر فقیر آگئے۔ اس نے کہا کہ ایسے معاملات میں اللہ کے سوا کوئی بچانے پر قادر ہی نہیں ہو سکتا، اسباب تو بچا ہی نہیں سکتے۔ ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلا، بڑے آرام سے گاڑی رکی اور کسی کو دھکا بھی نہ لگا۔ ہم نے کہا ہم نے تو قرآن شریف کی یہ آیتیں پڑھی تھیں اور ہمیں کوئی پتہ نہیں ہے۔ حضور پاک ﷺ کی حدیث مبارک بھی ہے تو اللہ نے اپنے کلام کی برکت سے ہماری حفاظت فرمائی، یعنی یقین کامل ہو۔ اور میں نے بھی الحمد للہ...... کئی دوستوں کو حضور ﷺ کی یہ حدیث مبارک بتلائی، مجھے بھی کئی دوستوں نے پھر بتایا کہ ہمارے ساتھ ایسے ہوا اور ایسے ہوا۔ ہم نے دعا پڑھی تھی تو اللہ نے ہمیں محفوظ رکھا تھا۔ اب میں نے اس کو دعا کے طور پر چھپوایا بھی ہے، گاڑی پر لگا لیا ہے۔ آپ لوگ بھی اس کو چھپوا کر گاڑی اور اپنے گھر میں رکھ لیں۔

مخلوق میں خلیفۃ اللہ کا قیام ضروری ہے:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُونَ ۝٣٠﴾ [البقرة: ۳۰]

''تحقیق میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔''

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اللہ کے علم میں چونکہ یہ بات موجود تھی کہ اس خلیفہ سے میں نبی و رسول پیدا کروں گا اور اس خلیفہ کی اولاد سے میں ایسی قومیں پیدا کروں گا جو عباد صالحین ہوں گے، اسی کی اولاد سے میں ایسے لوگ پیدا کروں گا جو جنت کو آباد کریں گے، لیکن فرشتوں کی ایک پہلو پر نظر تھی، لیکن مالک الملک جو علام الغیوب ہیں، عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ہیں، ان کے علم میں تو ہر چیز تھی۔ اس لیے فرمایا: میں جانتا ہوں، تم نہیں جانتے۔

مفسر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت مبارکہ سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ بندوں میں کوئی خلیفہ ہو، جو ان کے مسائل حل کر سکے، ان کے مظلوم کی مدد کر سکے، ظالم کو ظلم سے روک سکے، اگر کوئی گناہ کرے تو اللہ کی حدود جاری کر سکے، لوگوں کو برائی سے منع کرے اور امور مہمہ کو ادا کرے۔ یہ سارے مسائل خلیفہ کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ جب یہ واجبات خلیفہ کے بغیر ادا ہی نہیں ہو سکتے تو ان کا ادا کرنا جس ذریعے سے ممکن ہو تو وہ واجب ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں میں امام ہو، امیر المومنین ہو اور خلیفۃ المسلمین ہو۔ اس کی باقاعدہ بیعت ہو، لوگ اس کی اطاعت کریں۔ اور اس خلیفہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ کی حدود اور اللہ کے احکام کو نافذ کرے۔ اسی کی برکات وثمرات ہوتی ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۲، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

اسلام میں خلیفہ کا انتخاب:

مفسر نے فرمایا کہ امامت یا تو نص سے ثابت ہو یا قرآن سے یا حدیث پاک سے۔ جیسے کہ علماء نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جو خلافت مبارکہ ہے تو گویا وہ بالکل ایسے ہے جیسے نص ہے، یعنی ایسے ہے جیسے ایک حکم قرآن پاک میں آجائے۔ یا نص کا معنی یہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ایک ایسی بات آجائے کہ جس کے اندر دو باتیں ہو بھی نہ سکتی ہوں۔ تو بعض حضرات تو اسی طرف گئے ہیں کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں اپنی زبان مبارک سے اور اپنے عمل مبارک سے ایک فیصلہ فرما دیا کہ ان کو اپنے مصلیٰ پر کھڑا کر دیا تو اس کے بعد سوچنے سمجھنے کی اور کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اور بعض نے فرمایا: ایسا تو نہیں، لیکن بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ تو کر دیا۔ معنی یہ ہوتا ہے کہ جو پہلا خلیفہ ہو وہ کسی دوسرے کو خلیفہ بنا دے، جیسا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے ارشاد فرما دیا کہ میرے بعد خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ہو۔ بس بات ختم ہو گئی، لوگوں نے اس بات کو قبول فرما لیا، یا یہ ہوتا کہ خلیفہ یہ کرے کہ ایک جماعت معین کر دے کہ اتنے افراد کی جماعت ہے، یہ جس کو

چن لے تم اس کو منظور کر لو، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھ آدمی معین کر دیے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان چھ آدمیوں کا جو بھی فیصلہ ہو جائے، اس کو امت قبول کر لے۔ اس میں یہ بھی نصیحت فرما دی کہ میرا بیٹا بھی ان ٦ میں داخل ہے، لیکن اس کو نہیں بنانا۔ اس لیے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلافت اپنے بیٹے کو دے کر گئے تھے، ورنہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما شان والے صحابی ہیں۔ اور یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ ''اِتِّبَاعَ أَهْلِ الْحَلِّ وَ الْعَقْدِ'' یعنی جن کے ہاتھ میں باندھنا چھوڑنا ہو، جو علم والے، عظمت والے، شان والے، کسی پر بیعت کا اتفاق ہو جائے تو وہ بھی خلیفہ ہوگا۔

تو اسی طرح یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں کوئی آدمی جبراً ڈنڈے کے زور سے بھی خلیفہ بن جائے تو پھر اس کے بھی خلاف نہ کرو، کیونکہ خلاف کرو گے تو فتنہ اور فساد پیدا ہوں گے، اس لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے بادشاہ، اپنے حاکم اور امیر کے حکم کو سنیں اور اس کی فرمانبرداری کریں۔

اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ کبھی ایک کالے رنگ کا غلام (یعنی حقیر آدمی) تمہارا حاکم بن جائے، اس کی بھی تم فرمانبرداری کرو۔ [سنن أبي داود، حدیث: ٤٦٠٧] اگر فرمانبرداری نہیں کرو گے تو فتنے اور فساد پھوٹ پڑیں گے، کیونکہ اس کی فرمانبرداری کرو گے تو وہ کم فتنہ ہے۔ اگر اس کے خلاف بغاوت کرو گے تو جو فتنے ہوں گے وہ زیادہ خطرناک ہیں، اس لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسی ایسی باتیں نہ کریں۔ اپنے امام، اپنے حاکم اور اولی الامر کی سمع اور اطاعت ضروری ہے۔ اس لیے قرآن نے بھی فرما دیا:

﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ﴾ [النساء:٥٩]

''اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔''

اولی الامر سے مراد بعض نے فرمایا کہ اپنے علماء اور بعض نے فرمایا کہ حکام کی اطاعت کرو۔ پہلے تو ...... الحمد للہ ...... یہ ہوتا تھا کہ حاکم بنتا وہی تھا جو ...... ماشاء اللہ ...... علم والا ہوتا تھا، کیونکہ یہ قاعدہ ہوتا تھا کہ جو بادشاہ اور امیر المومنین ہو جمعہ پڑھائے، عیدین کی نمازیں پڑھائے، قوم کو خطبات کرے اور قوم کو دین کے راستے پر لگائے۔ یہ تو اب ہمارے ہاں رواج آ گیا ہے کہ جس کے پاس دولت ہو، پیسہ ہو اور دنیا ہو، بس وہ بڑا آدمی بن جاتا ہے اور جو صلاحیتوں والے ہیں ان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے، لیکن شریعت کا مسئلہ یہ نہیں ہے۔

آگے فرمایا کہ جب خلیفہ بنایا جائے تو اس کے لیے گواہوں کی بھی ضرورت ہے۔ تو بعض علماء نے فرمایا کہ ہاں دو آدمی گواہ ہوں: ایک تجویز کرنے والا اور ایک بننے والا ہو گیا۔ اور اسی طرح انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۶ آدمیوں میں رکھا تھا: ایک عاقد حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ہو گئے اور ایک معقود بن گئے جن پر اتفاق کیا گیا، یعنی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور گویا کہ چار گواہ ہو گئے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۲، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَـٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

مسلمانوں کے خلیفہ کے لیے چند شرائط:

مسلمانوں کا جو خلیفہ بنے اور بادشاہ بنے اس کے اندر کیا کیا شرطیں ہونا ضروری ہیں؟ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مرد ہو۔ اب تو مسلمان عورتوں کو بناتے ہیں۔ تو پہلی شرط یہ ہے کہ تمہارا امیر، خلیفہ اور بادشاہ مرد ہو۔ جب قوم نامرد ہو جائے تو مرد کیسے بنیں گے؟ مرد ہی مردوں کا خلیفہ بنتا ہے، عورتوں پر تو نہیں بنتا۔ تو جب قوم نامرد ہو جائے تو بات ختم ہو گئی۔ دوسری شرائط یہ ہیں کہ وہ غلام نہ ہو، نابالغ نہ ہو، پاگل نہ ہو، کافر نہ ہو، بالکل ٹھیک ٹھاک انصاف کرنے والا ہو، مسائل کے اندر اجتہاد کرنے والا ہو، مسائل کو سمجھنے والا ہو اور اس کے اعضا بھی سالم ہوں، یہ نہ ہو کہ لنگڑا لولا ہو کہ لوگ اعتراض نہ کریں کہ لنگڑا جا رہا ہے۔ اس کی بھی دلوں میں عظمت نہیں بیٹھتی اور جنگی امور کا ماہر ہو، تاکہ ملک کی بھی حفاظت کر سکے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بے عقل ہو اور کوئی کچھ کرتا رہے۔ اور اگر قریشی ہو تو زیادہ بہتر ہے، ہاشمی ہونے کی شرط نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۲، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَـٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

خلیفہ کے لیے معصوم ہونے کی شرط درست نہیں:

البتہ مفسر فرماتے ہیں: ان کے نزدیک ایک اور بھی شرط ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ خلیفہ وہ بنے جو معصوم ہو، گناہگار نہ ہو۔ اور ان کی یہ بھی شرط ہے کہ معصوم عن الخطا ہو۔ تو وہ نبی کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ہمارے سب امام خطا سے پاک تھے، اس لیے انہوں نے ایک شرط اور بھی بڑھائی ہوئی ہے کہ وہ ہاشمی ہو، صرف قریشی نہ ہو، بلکہ قریش کے قبیلہ بنو ہاشم سے ہو۔ لیکن ہاشمی ہونے یا معصوم ہونے کی شرط صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ دنیا میں کوئی معصوم ملتا ہی نہیں، پھر تو دنیا میں کوئی مسلمانوں کا امیر ہی نہ بنے۔ معصوم عن الخطا تو صرف انبیاء علیہم السلام کی ذات ہے، اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں، ورنہ خطا تو سب سے ہو جاتی ہے۔ اگر ایسی بات نہ

ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو جاتے کہ آپ حضرت فاطمۃ الزہراء کے بعد دوسری شادی فرمانا چاہتے تھے، آپ نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور آپ نے معافی مانگ لی۔ تو معصوم سے تو غلطی ہو نہیں سکتی، معصوم کیسے غلطی کر سکتا ہے؟ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۲، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ]

واقعہ:

اسی طریقہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے آپ کو خدا بنایا تھا ان کو آگ میں جلوا دیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو ان کو آگ میں نہ جلانے دیتا، کیونکہ آگ کا عذاب اللہ دیتا ہے، بندے نہیں دیتے ہیں تو ان کو قتل کر دینا کافی سمجھتا۔ ان کو آگ میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو اب حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی معصوم نہ رہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کئی معاملات ہیں تو اس لیے معصوم ہونے والی شرط جو ہے تو چونکہ ان کے نزدیک بارہ امام ہی معصوم ہیں۔ اور یہ بڑا عجیب مذہب ہے! یہ کہتے ہیں کہ غار میں امام چھپا ہوا ہے امام مہدی، اس کے قائم مقام جو بن جائے وہ بھی معصوم بن جاتا ہے، وہ بھی پاک ہو جاتا ہے، جو مرضی آئے کرتا پھرے، اس لیے یہ اس کے حکم کو ٹال نہیں سکتے، کیونکہ ان کے نزدیک اس کا حکم ایسے ہوتا ہے جیسے قرآن کا حکم۔ اس لیے وہ جو حکم دے گا اس پر فوراً عمل کریں گے۔

بہرحال خلافت کے لیے اسلام کے اندر یہ شرائط ہیں کہ وہ مرد ہو، آزاد ہو، مسلمان ہو، عقل والا ہو، بالغ ہو، اسی طرح مسائل میں نظر رکھنے والا ہو، ہاتھ پاؤں کا سالم ہو، جنگی امور کا سمجھنے والا ہو، مجتہد ہو اور قریشی ہو۔ اگر قریشی نہ ملے تو پھر کسی اور کو لے سکتے ہیں۔ اسی طرح پھر یوں دیکھنا پڑتا ہے مثلاً چار آدمی آ گئے تو ان میں جو سب سے زیادہ شان والا ہوگا، اس کو مقدم کریں گے اور اگر اس کے اندر برابر ہوں تو ان میں جو عالم ہوگا اس کو مقدم کریں گے، اسی طرح اگر چاروں عالم ہیں تو پھر دیکھیں گے کہ کس کے اندر اجتہاد اور سمجھنے کی بصیرت زیادہ ہے؟ تو اس کو مقدم کریں گے۔ اگر اس میں بھی برابر ہیں تو پھر دیکھا جائے گا کہ جو عمر میں بڑا ہو اس کو حق دیا جائے، جو آدمی عمر میں زیادہ ہوگا وہ کم عمر والے سے زیادہ قابل احترام اور تجربہ کار ہوگا۔

اگر بادشاہ سے گناہ صادر ہو جائے تو معزول کر دیا جائے؟

اگر مسلمانوں نے بادشاہ بنایا یا خلیفہ بنایا، امیر بنایا وہ اگر فاسق ہو جائے، بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب

شروع کر دے تو کیا اس کو بادشاہت سے ہٹا دیں؟

تو مفسر فرماتے ہیں صحیح قول یہ ہے کہ نہیں ہٹایا جائے گا، کیونکہ کوئی انسان خطاؤں سے پاک نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: کبھی اپنے امیر کا انکار نہ کرو۔ اگر وہ کوئی ایسا کام کرے جو کھلا ہوا کفر ہے اور اس پر تمہارے پاس کوئی دلیل بھی ہو۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۰۵۶] ایسے نہیں کہ لوگ کہہ دیں۔ لوگوں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں بھی الزام لگا دیتے تھے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر بھی الزام لگایا، لوگوں نے تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ پر بھی الزام لگایا اور لوگوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر بھی الزام لگائے۔ لوگوں نے تو کسی کو بھی معاف نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی ایسا عمل ہو جو بالکل کھلا ہوا کفر ہو اور تمہارے پاس دلیل ہو تو ٹھیک ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۲، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

کیا اس بادشاہ کو یا امیر کو یہ بھی حق ہے کہ خود آپ کو ہٹا دے؟ مفسر فرماتے ہیں: جیسے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے خود استعفیٰ دے دیا، اپنا اقتدار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا، یہ بھی ایک طریقہ ہے، لیکن کہتے ہیں: اگر بادشاہ یا والی یا حاکم معزول ہو جائے، یعنی اس کو اتنا لاچار کر دیا جائے کہ وہ اب سمجھے کہ میں حکومت نہیں چلا سکتا، وہ اپنے آپ کو استعفیٰ کے لیے پیش کر دے تو ٹھیک ہے، جیسا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کیا اور اسی پر ان کی مدح ہوئی کہ...... الحمد للہ...... وہ مسلمانوں کے اندر صلح کا ذریعہ بن گئے، ورنہ قتال وفساد، لڑائیاں اور جھگڑے ہوتے، مسلمانوں کا قتل عام ہوتا۔ اللہ معاف فرمائے۔ ایک ملک کے اندر دو بادشاہ نہ بنائیں، بلکہ ایک ہی رہے، کیونکہ دو بنانے سے جھگڑے ہوں گے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۲، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

حکومت کے خلاف بغاوت نہ کریں:

جیسا کہ حدیث پاک میں آیا کہ ایک جگہ مسلمانوں کا بادشاہ ہے، والی ہے اور امیر ہے، نظام چلا رہا ہے۔ اب دوسرا آ کر کھڑا ہو گیا کہ مجھے بناؤ تو ایسے آدمی کو کہ جب معاملہ چل رہا ہو اور نظام چل رہا ہو، اس کو آ کر توڑنے کی کوشش کرے، اس کو قتل کر دیا جائے، چاہے کوئی بھی ہو، کیونکہ وہ بغاوت پھیلانا چاہتا ہے۔ جب ایک آدمی والی بن گیا ہے، اس کو کام کرنے دیں، وہ اپنا کام اطمینان کے ساتھ کرے۔ اور اسی پر جمہور ہیں۔ کرامیہ ایک فرقہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ دو بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں حق پر تھے، حالانکہ خلیفہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں خلافت راشدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس تھی۔ اور انہوں نے

ایک استدلال یہ بھی کیا کہ جب ایک وقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ دو نبی بھیج دیتے ہیں تو جب دو نبی اکٹھے آ سکتے ہیں اور نبوت امامت ہے سے بڑا درجہ ہے تو دو امام اکٹھے کیوں نہیں ہو سکتے؟

اور امام الحرمین نے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ مسلمانون کے دو بادشاہ بنائے جا سکتے ہیں، کیونکہ ملک بہت بڑا ہے، اس کے اندر صوبے ہیں، کچھ حصے ادھر تقسیم ہو گئے۔ اگر ملک چھوٹا ہے تو زیادہ والی نہیں بنانے چاہئیں۔ امام الحرمین کو اس مسئلے میں بڑا اتر دور ہا۔

اصل بات وہی یاد رکھیں کہ ایک ہی خلیفہ ہوگا، ایک بادشاہ ہوگا اور ایک ہی امیر المومنین ہوگا۔ پھر وہ اپنے نیچے نائب مقرر کر دیں گے تو ان کے نیچے جتنے صوبے ہوں گے وہاں اپنے والی بٹھا دیں گے، کیونکہ اگر دو ہوں تو لازماً اختلاف کا خطرہ ہوتا ہے۔

مفسر فرماتے ہیں: جیسے بنی عباس کا زمانہ آیا تو اس زمانہ میں یہی تھا کہ بنو عباس عراق میں تھے، فاطمین مصر میں تھے اور اموییں مغرب کے علاقوں میں تھے۔

مفسر فرماتے ہیں: جب ان آیات اور ان احکام کا موقع آئے گا تو میں وہاں تفصیل سے یہ احکام بیان کروں گا۔ ابھی تو چونکہ ایک لفظ آیا تھا کہ ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ اس کے مطابق اجمالی طریقہ پر مفسر نے خلیفہ کی صفات، خلیفہ کی شرائط اور خلیفہ کے حقوق کا ذکر کر دیا۔ کتاب میں ان احکام کے اندر اس کی باقاعدہ مفصل بحثیں موجود ہیں اور مفصل احکام و مسائل موجود ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۲، البقرۃ، الآیۃ: ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ﴾]

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ کہنے لگے: تو پاک ہے۔ ہمیں معلوم نہیں، مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا۔ بے شک تو ہی اصل جاننے والا، حکمت والا ہے۔ فرمایا: اے آدم! فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتایئے۔ پھر جب انہوں نے ان کے نام بتا دیئے فرمایا: کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ آسمانوں کی اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں میں جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدے کے بعد اسماء کی تعلیم دینے کی وجہ:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کا ذکر فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو چیزوں کے اسماء اور خواص و آثار بتلائے اور ملائکہ کو نہیں بتلائے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو اللہ نے اسماء کی تعلیم دی اور ملائکہ کو تعلیم نہ دی تو اس سے بھی حضرت آدم علیہ السلام کا شرف واضح ہوا کہ ان اسماء کی تعلیم کے اہل اور مستحق آدم علیہ السلام تو ہیں، لیکن ملائکہ نہیں ہیں اور خلافتِ ارضی کے مستحق بھی آدم علیہ السلام ہیں، ملائکہ نہیں ہیں۔

لیکن مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاں تک ملائکہ کے سجدے کا تعلق ہے وہ سجدہ پہلے تھا اور یہ تعلیم الاسماء سجدے کے بعد ہے، پہلے نہیں ہے۔ پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے کے بعد اس کو سجدہ کرو اور پیدا کرنے سے پہلے فرمایا:

﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ﴾

''میں زمین میں خلیفہ بنانا چاہتا ہوں۔''

اس پر ملائکہ نے عرض کیا:

﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾

''کیا آپ ان کو بنائیں گے جن کی اولاد زمین میں فساد کرے گی، خون ریزی کرے گی اور ہم آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور تسبیح وتحمید بیان کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ [البقرۃ:۳۰]

''میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔''

اور اس کے بعد حکم ہوا:

﴿اسْجُدُوا لِآدَمَ﴾

''آدم کو سجدہ کرو تو تمام ملائکہ نے سجدہ کیا۔''

اب یہ سجدے کا واقعہ گزرنے کے بعد اللہ نے آدم علیہ السلام کو اسماء سکھلائے۔ اگر اللہ چاہتے تو سجدہ عظمت اس کے بعد بھی کرا سکتے تھے، لیکن پھر اللہ کی قدرتِ کاملہ اور ملائکہ کی اطاعتِ کاملہ واضح نہ ہوتی، کیونکہ کسی آدمی پر جب کسی کا شرف وعظمت واضح ہو جائے تو آدمی خود بخود جھک جاتا ہے، اپنے دل میں مان لیتا ہے کہ وہ مجھ سے بڑا عالم ہے۔ تو پھر اگر اس کا سجدہ ہو تو کوئی اتنی بڑی بات نہیں، لیکن اس سے پہلے جب اللہ نے حکم دیا تو اللہ کی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہے کہ میں جس کو چاہوں عزت اور شرف بخشوں۔ اور ملائکہ کی اطاعت کا بھی کمال ہے کہ ان کو حکم دیا گیا تو انہوں نے فوراً سجدہ کیا اور اللہ کے حکم کی اطاعت کی، کیونکہ ان کی صفت ہے:

﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ [التحریم:۶]

کسی کی عظمت اس کے علم کے بعد آ جاتی ہے:

مثلاً کہ حضرت بنوری جو بہت بڑے عالم گزرے ہیں...... اللہ ان کی قبر پر رحمت فرمائے...... بہت بڑے محدث تھے، انہوں نے ترمذی شریف پر شرح بھی لکھی۔ تو وہ ایک دفعہ حضرت حماد اللہ ہالیجوی رحمہ اللہ کی خدمت میں تشریف لے گئے جو سندھ کے علاقے میں بزرگ تھے۔ حضرت بنوری رحمہ اللہ کی ان سے پہلے ملاقات نہیں تھی، یعنی غائبانہ تعارف تھا، دونوں ایک دوسرے کو غائبانہ تو جانتے تھے، لیکن باقاعدہ ملاقات نہیں تھی۔ تو حضرت بنوری رحمہ اللہ

جب حاضر ہوئے تو اتفاق سے بخاری شریف کی کسی حدیث پر مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ حضرت ہالیجوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عادت تھی کہ اگر کوئی مسئلہ پیش آجاتا تھا تو ان کی مجلس میں جتنے علماء موجود ہوتے تھے، ان میں سے کسی ایک عالم کو فرما دیتے تھے کہ اس مسئلے پر تم بات کرو یا اس مسئلہ پر تم بیان کردو۔ اگر وہ مسئلہ اس عالم نے صحیح معنوں میں سمجھا دیا اور اطمینان کامل ہوگیا تو ٹھیک ہے اور اگر حضرت الشیخ کے دل میں کوئی بات کھٹکی کہ مسئلہ واضح نہیں ہوا تو آخر میں حضرت خود اس مسئلہ پر تقریر فرماتے تھے۔ تو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ بھی مجلس میں بیٹھے تھے۔ ایک مسئلہ آیا، ایک عالم نے تقریر فرمائی اور اس کے بعد جب حضرت الشیخ نے اس حدیث پاک کی شرح بیان فرمائی تو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے خود مجلس سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ آج ہم پر اپنا جہل منکشف ہوا ہے، ہم تو دل میں سمجھتے تھے کہ ہم اتنے بڑے عالم ہیں اور اتنے بڑے محدث ہیں اور زندگی گزر گئی پڑھاتے پڑھاتے اور بھی کوئی آدمی اتنا سمجھے گا جتنا ہم نے سمجھا ہوا ہے؟ لیکن حضرت الشیخ کی تقریر سننے کے بعد پتہ چلا کہ ہم نے تو کچھ بھی سمجھا ہوا نہیں۔ تو جب آدمی کسی کے علم کا مقام دیکھتا ہے تو عظمت خود بخود دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

سجدہ ملائکہ پہلے اور تعلیم بعد میں، وجہ مناسبت کیا ہے؟

فرشتوں کے سجدے کے بعد ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرة:٣١] آدم علیہ السلام کو اسماء کا علم عطا فرمایا۔

مفسر فرماتے ہیں کہ سجدے کا مقام پہلے تھا، اس کو بعد میں ذکر کیا گیا اور تعلیمِ اسماء کو پہلے ذکر کیا، اس کی وجہ مناسبتِ مقام ہے، کیونکہ اللہ نے فرمایا ﴿اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرة:٣٠] اور اس کے بعد امتحان ہوگیا کہ اللہ نے فرشتوں سے کہا: خبر دو۔ اور فرشتے خبر نہ دے سکے، چونکہ مناسبتِ مقام کا تقاضہ یہ تھا تو اس لیے اس آیت کے بعد اس کو ذکر کیا اور سجدے کو بعد میں ذکر کیا گیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/٧٢، ٧٣، البقرة، الآية: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

کس چیز کے اسماء سکھلائے گئے؟ سدی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرة:٣١] سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی اولاد کے اسماء بتلا دیے کہ اتنی اولاد ہوگی، ہر انسان کا نام ان کو بتلایا گیا اور اس کے بعد جتنے جانور پیدا ہوں گے ان کا بھی بتلا دیا گیا۔

حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو جو نام سکھلائے تو ان ناموں سے وہ نام مراد ہیں جو اب دنیا میں لوگوں کے اندر متعارف ہیں۔ اللہ نے ان کو بتلایا کہ یہ انسان ہے، یہ جانور ہے، یہ آسمان ہے، یہ زمین ہے اور یہ خشکی ہے وغیرہ۔

بعض مفسرین نے یہ روایت بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف نام نہیں بتلائے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے آثار، خواص، خصلتیں اور صفات بھی بتلا دیے اور ان ساری چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے مثالی وجود دے کر آدم علیہ السلام کو دکھا دیا، تا کہ سب کی مکمل معرفت حاصل ہو جائے۔

آیت سے یہ معلوم ہوا کہ لغت کا علم سب سے پہلے اللہ نے آدم علیہ السلام کو عطا فرمایا، اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے آپس میں اختلاط کی وجہ سے حروف و معانی میں کچھ اور چیزیں بھی بنتی اور بڑھتی گئیں۔

حضرت ابن ابی حاتم رحمہ اللہ اور ابن جریر رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ سے مراد یہ ہے کہ پیالہ، ہنڈیا اور چھوٹی چیزیں جیسے ہوا کا نکلنا ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ہر چیز کے نام بتائے، ہر جانور و پرندے کے نام بتائے۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ سے روایت ہے کہ اللہ نے ان کو تمام چیزوں کے نام بتائے۔

حضرت ربیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ نے ان کو فرشتوں اور ستاروں کے بھی نام بتلائے اور جتنی ان کی اولاد ہونی تھی ان کے نام بھی بتائے۔

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو صرف ملائکہ کے نام بتلائے اور اولادِ آدم کے نام بتائے، کیونکہ ﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ [البقرة:۳۱] میں جو ضمیر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو عقل والی چیزوں کے نام بتلائے اور غیر عقل والی کے نام نہیں بتلائے اور جانور عقل والے نہیں ہوتے۔ اور اسی کو ترجیح دی ہے۔

لیکن مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفسر ابن جریر رحمہ اللہ کا اس قول کو راجح قرار دینا زیادہ قوی نہیں ہے، کیونکہ "ھُمْ" ضمیر سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اس سے صرف ذوی العقول ہی شامل ہیں، لیکن عقل والوں کو تغلیبا بطور غلبہ کے ذکر کر دیا، جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ [النور:۴۵]

"ھُمْ" ضمیر ہے۔ بعض ایسے ہیں جو اپنے پیٹ پر چلتے ہیں، جیسے سانپ وغیرہ اور بعض جانور ایسے ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں، جیسے انسان اور بعض چوپائے ایسے ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں، وہاں بھی ضمیر جمع کی ہے، لہٰذا یہاں ذوی العقول کو تغلیباً ذکر کر دیا ہے تو اس لیے ابن جریر رحمہ اللہ کا یہ دلیل دینا مضبوط نہیں ہے۔ [تفسیر ابن

کثیر:۱/۷۳، البقرۃ، الآیۃ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

قرآن میں قراءتوں کا اختلاف:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک قراءت یہ بھی ہے کہ ﴿ثُمَّ عَرَضَهُنَّ﴾ اور ابن ابی کعب کی قراءت میں ﴿ثُمَّ عَرَضَهَا﴾ ہے۔

فرق:

یاد رکھیں یہ قراءت کے اختلاف ہوتے ہیں، یعنی ایک جگہ ضمیر مذکر کی آگئی اور ایک مونث کی ضمیر آگئی، اسی طرح ایک دفعہ ضمیر ما یعقل کی آگئی اور ایک جگہ ما لا یعقل کی آگئی۔ یہ اختلاف قراءت ہیں، اسی سے بعض اوقات فرق باطلہ وہ استدلال کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یوں فرماتے ہیں اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ یوں فرماتے ہیں اور باقی قراء صحابہ کچھ اور پڑھ رہے ہیں تو معلوم ہوا یہ کہ قراءت کا اختلاف ہے کہ اللہ نے قرآن کو سات قراءتوں میں نازل فرمایا اور سات کی سات قراءت معروف و مشہور ہیں۔ آدمی جس قراءت سے بھی پڑھے گا الحمدللہ...... ترجمہ صحیح ہوگا۔

مفسر فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ اللہ نے ان کو تمام اشیاء کے نام بتلائے، یعنی ذات کا نام بھی بتلایا اور ان کی صفات و افعال بھی بتلائے، کیونکہ آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد نے دنیا آباد کرنی تھی۔ اگر ان کو دنیا کی اشیاء کے استعمال کا طریقہ نہ آتا تو وہ ان سے نفع نہ اٹھا سکتے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۷۳، البقرۃ، الآیۃ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

حضرت آدم علیہ السلام کا علم:

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اتنا وسیع علم دیا کہ تمام عالم کی چیزوں کے نام بتلا دیے، ان کے خواص بتلا دیے، ان کی صفات بتلا دیں اور ان کے افعال بتلا دیے، لیکن اس کے باوجود بھی آدم علیہ السلام کا علم اللہ کے مقابلہ پر قلیل ہے۔ اسی سے اندازہ کریں کہ اللہ کا علم کتنا ہوگا؟ اس لیے فرمایا:

﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ [یوسف:۷۶]

تمہیں جتنا علم دیا جائے تم سے بڑا اور عالم ہے، اس سے اور بڑا عالم ہے، لیکن سب سے بڑے علم والی اللہ کی

ذات ہے۔ اسی لیے اتنے بڑے علوم کے باوجود بھی انبیاء علیہم السلام کہتے ہیں:

﴿إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ﴾ [المائدۃ:۱۰۹]

حدیثِ شفاعت کا بیان:

امام بخاری نے کتاب التفسیر میں صحیح بخاری کے اندر یہ روایت مبارک نقل فرمائی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن لوگ جمع ہوں گے، وہ آپس میں کہیں گے کہ آج کوئی ذات ہو جو پروردگارِ عالم کے دربار میں ہماری سفارش کرے، تا کہ ہم جو محشر کی سختی میں ہیں اس سے اللہ پاک ہمیں نجات عطا فرمائیں۔ (تا کہ مقدمات ہمارے کی کاروائی تو شروع ہو جائے) اس کے بعد وہ سب اکٹھے ہو کر حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے: اے آدم! تم ہی سب انسانوں کے باپ ہو، تمہیں اللہ نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا، اپنے فرشتوں کو تجھ سے سجدہ کروایا اور تمہیں ہر چیز کے ناموں کا علم عطا فرمایا۔ تو اس حدیث میں بھی ہے "وَعَلَّمَكَ أَسْمَاءَ كُلِّ شَيْءٍ" "تمہیں ہر چیز کا علم سکھلایا، آپ اپنے رب کی بارگاہ میں ہماری سفارش کریں، تا کہ ہمیں اس مقام سے راحت اور چھٹکارا ملے، لیکن آدم علیہ السلام کہیں گے کہ میں اس کا اہل نہیں اور اس کے بعد وہ اپنی غلطی کو یاد کریں گے کہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ [البقرۃ:۳۵]

اس درخت کے قریب نہ جانا، لیکن میں کھا بیٹھا تو اس لیے میں ڈرتا ہوں، مجھے حیا آتی ہے کہ میں اللہ کے آگے جا کر کیسے سفارش کروں؟

دراصل یاد رکھیں کہ یہ بھی انبیاء علیہم السلام کی شان ہے، کیونکہ علم جتنا بڑا ہوتا ہے اور جتنی بڑی شان ہوتی ہے اتنا اللہ کا ڈر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جتنے علماء ہوں گے اور جتنے اہلِ علم ہوں گے ان کے دلوں میں اللہ کی عظمت زیادہ پیدا ہوتی ہے، ورنہ حضرت آدم علیہ السلام سے غلطی ہوئی اور اللہ نے معاف فرما دی۔ جب انہوں نے اللہ سے درخواست کی ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ [الاعراف:۲۳] تو غلطی معاف ہو گئی، معافی مل گئی، لیکن معافی کے بعد ان کا ڈر باقی ہے۔ یہ ایک مقام ہوتا ہے۔

اس کی چھوٹی سی مثال دیکھیں! اگر ایک آدمی تہجد گزار ہے، شب بیدار ہے، یعنی رات کو اللہ اسے جاگنے کی توفیق

دیتے ہیں اور وہ تہجد پڑھنے کا عادی ہے، اگر کسی دن اس کی تہجد رہ جائے تو سارا دن اس کو بے چینی رہتی ہے کہ رات میری تہجد رہ گئی، حالانکہ اس کو پتہ ہے کہ تہجد ایک نفلی عبادت ہے، پڑھے تو ثواب ہے اور نہ پڑھے تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس کو پتہ ہوتا ہے کہ میں نے رات کو تہجد نہیں پڑھی، کوئی گناہ تو نہیں کیا ہے اور پھر میں نے عمداً بھی نہیں چھوڑی، میں غفلت میں آ گیا، نیند میں آ گیا اور اگر انسان کی فرض نماز نیند کی وجہ سے قضا ہو جائے تو گناہ گار نہیں ہے، اللہ کے ہاں پکڑ نہیں ہوگی، کیونکہ وہ غفلت میں آ گیا، کسی نے جگایا نہیں، اس نے بعد میں اٹھ کر قضا کر لی، جب فرض نماز پر بھی اتنا مؤاخذہ نہیں ہے تو تہجد پر اگر نہ اٹھے تو کیا فرق پڑے گا؟ لیکن اس کو آرام نہیں ہوتا، وہ اتنی رکعتیں پڑھ رہا ہے، توبہ کر رہا ہے، استغفار کر رہا ہے اور سوچ رہا ہے کہ لازماً آج مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی وجہ سے مجھے تہجد نصیب نہیں ہوئی یا کوئی نہ کوئی حرام کا لقمہ میرے اندر چلا گیا ہے یا میں نے کوئی زبان سے گندی بات نکالی ہے جس کی سزا مجھے یہ ملی کہ رات کو جاگنے سے محروم ہو گیا۔ اور اس کے مقابلہ میں جو فرض نماز بھی نہ پڑھتا ہو اس کو تہجد کا کیا درد ہوگا؟

اس لیے پھر یہ حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں آئیں گے، حضرت آدم علیہ السلام ان کی طرف بھیجیں گے کہ تم نوح علیہ السلام کی طرف جاؤ۔ وہ پہلے رسول ہیں، جن کو اللہ نے زمین والوں کی طرف بھیجا تو حضرت نوح علیہ السلام بھی فرمائیں گے کہ میں بھی اس مقام پر کھڑے ہونے والوں میں سے نہیں ہوں کہ تمہاری سفارش کر سکوں، میں نے بھی بغیر علم کے بیٹے کی بخشش مانگ لی تھی، مجھے بھی حیا آتی ہے کہ میں آج کیسے جاؤں؟ وہ کہیں گے کہ تم حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السلام کے پاس جاؤ، کیونکہ وہ اللہ کے خلیل ہیں۔ وہ فرمائیں گے: موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، وہ اللہ کے ایسے بندے ہیں اور ایسے رسول ہیں، ان کو اللہ نے اپنے کلام سے مشرف فرمایا اور جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تورات جیسی جامع کتاب عطا فرمائی۔ ان کے پاس آئیں گے تو وہ بھی انکار کر دیں گے، وہ فرمائیں گے کہ میرے ہاتھوں سے ایک آدمی مر گیا تھا، کہیں اللہ پاک مجھ سے پوچھ نہ لیں۔ وہ کہیں گے کہ تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کے رسول ہیں، جن کو اللہ نے "کلمۃ اللہ" کا خطاب دیا، کیونکہ وہ اللہ کے کلمہ سے پیدا ہوئے اور جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر روح پھونکی، ان کے پاس جاؤ، وہ سفارش کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ میں بھی اس مقام پر نہیں ہوں۔ میں تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ سب کے سب حضرت محمد رسول اللہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں جاؤ، کیونکہ وہ ایک ایسی شان والا بندہ ہے، جس کے بارے میں اللہ نے فرما دیا کہ

میرے مدنی! اگر آپ سے نبوت سے پہلے کوئی بات ہو یا بعد میں ہو میں نے سب معاف کر دیا تو ان کے پاس جائیں، وہ آپ کی سفارش کریں گے۔ فرماتے ہیں کہ میں چلوں گا، حتیٰ کہ میں اپنے پروردگار سے اجازت مانگوں گا۔ جب میں اپنے پروردگار کی زیارت کروں گا تو میں سجدے میں گر جاؤں گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے اس حالت سجدہ میں رہنے دیں گے جتنی دیر چاہیں گے۔ میں سجدے میں اللہ کی حمد وثنا بیان کروں گا۔ اس کے بعد حکم ہوگا: اے محمد! آپ اپنا سر سجدے سے اٹھائیں، مانگیں دیے جائیں گے، بات کریں سنی جائے گی، سفارش کریں قبول کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جو مانگو گے میں دوں گا۔ پھر میں سجدے سے سر اٹھاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ اس وقت مجھے اپنی حمد کرنے کا طریقہ بتلائیں گے، پھر میں اللہ کی حمد بیان کروں گا۔ اس کے بعد حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اللہ کے آگے سفارش کروں گا تو ایک بڑی مقدار کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔ پھر میں اپنے پروردگار کی زیارت کروں گا اور سجدے میں گر جاؤں گا۔ پھر اجازت مانگوں گا، پھر اللہ مجھے اجازت دیں گے، میری سفارش دوبارہ قبول ہوگی اور دوسری تعداد جنت میں داخل کی جائے گی۔ اس کے بعد میں پھر سجدہ کروں گا اور اللہ سے درخواست کروں گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ پھر میری سفارش قبول فرمائیں گے اور پھر ایک تعداد کو جنت میں داخل فرمادیں گے۔ اسی طرح ایک اور دوسری حدیث مبارک میں آتا ہے میں سفارشیں کروں گا، سفارش کروں گا اور سفارش کروں گا۔ صرف ایک شفاعت نہیں، بلکہ حضور پاک ﷺ کئی بار شفاعت کریں گے۔ اور اس کے بعد فرماتے ہیں کہ میری شفاعت منظور ہوگی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

((هَلْ رَضِيتَ؟ يَا مُحَمَّدُ!))

''اے محمد مصطفیٰ! اب آپ اپنے رب سے راضی ہو گئے کہ نہیں؟''

تو میں کہوں گا:

((رَضِيتُ يَا رَبِّ! رَضِيتُ يَا رَبِّ! رَضِيتُ يَا رَبِّ!))

''اے اللہ! میں راضی ہوں۔ اے اللہ! میں راضی ہوں۔ اے اللہ! میں راضی ہوں۔''

کیونکہ اللہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ کو راضی کریں گے:

﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝﴾ [الضحیٰ:٥]

اللہ نے قرآن میں وعدہ فرمایا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ جہنم میں صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جن کو

قرآن نے روکا ہوا ہے، یعنی جن کے بارے میں قرآن کا فیصلہ ہے کہ وہ جہنمی ہیں، وہ تو جہنم میں رہیں گے، ان کے بارے میں تو سفارش قبول نہیں ہوگی، اسی طرح وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ جہنم میں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے، یعنی جو کافر ہیں، مشرک ہیں یا جن جرائم پر قرآن میں سزا آ گئی ہے، پھر وہی باقی بچیں گے، وگرنہ سب کے بارے میں اللہ سفارش قبول کریں گے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی سیاق کے ساتھ اس کو ذکر کیا ہے، مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث امام مسلم اور نسائی نے بھی روایت کی ہے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۴۷۱۲، باب: ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ...]

فرشتوں کا اللہ کے سامنے عاجزی اور ضعف کا اعتراف:

پھر ان فرشتوں کے سامنے وہ مسمیات اور وہ چیزیں پیش کی گئیں جن چیزوں کا نام رکھا گیا تھا، مثلاً: گلاس تھا، تو فرشتوں کے سامنے رکھا گیا کہ اس کا نام کیا ہے؟ تو اس طرح باقی مسمیات رکھے گئے، کیونکہ جب تک مسمیات ہی سامنے نہ ہوں تو نام کیسے بتلائیں گے؟ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت مرہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی یہ تفسیر فرمائی کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو نام بتلائے اور ان تمام چیزوں کو اپنے فرشتوں پر پیش کیا کہ تم ان چیزوں کے نام بتاؤ۔

اور حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ ان ناموں والوں کو فرشتوں کے سامنے رکھا۔

حضرت حسن رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ اللہ نے ہر چیز کا نام بتلایا اور ہر چیز کا مسمیٰ بھی بتا دیا اور پھر اللہ پاک نے جو امتیں قیامت تک آئیں گی ان امتوں کی تفصیل ان کے نام اور ان کی صفات اور افعال آدم علیہ السلام کو بتلائے۔ اللہ نے فرشتوں سے فرمایا: تم کہتے ہو کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ جو مخلوق ہے ہم ان سب سے افضل ہیں۔ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ تم افضل ہو تو ان چیزوں کے نام بتلاؤ، ہم امتحان کرتے ہیں کہ انسان افضل ہیں یا تم افضل ہو؟

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب سے راجح قول وہی ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے، یا جن لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ذکر کیا، یعنی اللہ فرمائیں گے:

﴿فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ﴾ [البقرۃ: ۳۱]

اے فرشتو! ان چیزوں کے نام بتاؤ جو میں نے تمہارے اوپر پیش کی ہیں۔ یہ تمہارے سامنے موجود ہیں تو جب ان کے بارے میں تم نہیں بتلا سکتے تو وہ مخلوق جو تم نے دیکھی نہیں ان کے بارے میں تم کیسے جان سکتے ہو؟ تو ملائکہ نے

لاجواب ہوکر اپنی عاجزی وضعف کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ پاک ہے تیری ذات، تنزیہ وتقدیس کرتے ہیں، ہم نہیں جانتے، مگر جتنا تو نے ہمیں بتلایا۔ آپ کے مخلوق پیدا کرنے میں جو حکمتیں ہیں وہ سراپا عدل اور حق ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۳، ۷۴، البقرۃ، الآیۃ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' سے توحید کا مفہوم ہمیں سمجھ آگیا اور ''سُبْحَانَ اللّٰهِ'' سے کیا مراد ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسا کلمہ ہے جس نے کہا اس سے اللہ راضی ہوئے اور اللہ محبوب رکھتے ہیں کہ اس کی پاکی بیان کی جائے۔

حضرت میمون بن مہران رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ'' کا کیا معنی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اللہ کی عظمت وبڑائی کا اقرار اور ہر صفت نقصان سے اس کی پاکی کا اعتراف کرنا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۴، البقرۃ، الآیۃ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

صحابہ کرام کا ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' کہنے میں کیا حکمت تھی؟

جب صحابہ رضی اللہ عنہم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات پوچھی تو صحابہ رضی اللہ عنہم فوراً کہتے تھے ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' (اللہ جانے اور اللہ کا رسول جانے) حالانکہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کو صحابہ رضی اللہ عنہم کو علم ہے، جیسا کہ حجۃ الوداع کے دن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کونسا دن ہے؟ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پتہ تھا کہ جمعہ کا دن ہے، سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پتہ تھا کہ یوم الوقوف ہے اور سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پتہ تھا کہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود فوراً کہا: ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' کیونکہ یہی مقام ہوتا ہے جو لوگ صحیح معنوں میں عظمت رکھتے ہیں اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے، کیونکہ ایک عام چیز ہے، سب جان رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی پوچھ رہے ہیں: یہ کون سا دن ہے؟ کون سا مہینہ ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کوئی خاص حکمت ہے جو اللہ نے اپنے رسول کو بتلائی ہے اور ہمیں نہیں معلوم تو اس لیے فوراً کہہ دیا: اللہ جانتے ہیں اور اللہ کا رسول جانتے ہیں، ہم تو نہیں جانتے۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوم الوقوف ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں جی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کا دن ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں جی!۔ تصدیق کرتے گئے۔

حضرت درخواستی رحمہ اللہ کے حافظے کے واقعات:

حضرت درخواستی رحمہ اللہ کو ہم نے دیکھا ہے...... ماشاء اللہ...... ان کی عمر بھی تقریباً ۱۰۰ سے متجاوز ہوگی (اب ان

کا انتقال پر ملال ہو چکا ہے۔) فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی بیس سال پہلے یا تیس سال پہلے کسی جلسے میں ملا تھا...... حالانکہ جلسے میں کیا آدمی کو کوئی ہوش ہوتا ہے؟ اس کے بعد مجھے کئی لوگ خط لکھتے ہیں کہ ہم آپ کو ملے اور آپ نے بڑی بے مروتی سے ہمیں ہاتھ دیا۔ اب وہ بے چارے حج میں ملتے ہیں۔ جب ایک آدمی نے حج پر ایک گھنٹہ تقریر کی ہو تو تھکان اتنا ہوتی ہے کہ آدمی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ ہل چلانے میں آدمی اتنا نہیں تھکتا، جتنا دماغی کام سے تھک جاتا ہے۔ تو اب دماغ تھکا ہوتا ہے اس نے کہا کہ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" اب ان کے جواب دیتے گئے۔ باقی تو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کون ملا تھا یا کون تھا؟...... لیکن حضرت کو اگر کوئی تیس سال پہلے ملا ہو وہ بھی جلسے میں اور اس کے بعد پھر سامنے آئے تو حضرت فرماتے ہیں کہ اچھا بھائی! تمہارا نام فلاں ہے اور فلاں جلسہ میں تم مجھے ملے تھے؟ تو وہ کہتا: ہاں جی!۔ یعنی بڑھاپے میں بھی اتنا حافظہ تھا۔

ایک دفعہ مجھے یاد ہے کہ یہاں تشریف لے آئے تو امام الحرم مدظلہ کی خدمت میں ہم انہیں ملاقات کے لیے لے گئے۔ اس وقت صحت کچھ زیادہ بہتر تھی۔ اب علماء کی مجلس میں تو علمی بات ہی ہو گی۔ کبھی حدیث پر بحث ہو گئی اور کبھی کسی اور کتاب کا ذکر چھڑ گیا۔ تو حضرت امام صاحب نے فرمایا کہ ماشاء اللہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنا بڑا علم عطا فرمایا ہے۔ انہوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ کے بارے میں پوچھا کہ ان کی کتابیں بھی آپ کی نظر سے گزری ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ میں نے ان کی فلاں فلاں کتاب پڑھی تھی۔ ان کا ایک قصیدہ بڑا مشہور ہے کہ اس کی انتہاء نون پر ہوتی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ان کا قصیدہ نونیہ بھی میری نظر سے گزرا تھا، آج سے بیس سال پہلے وہ کتاب مجھے ملی تھی اور میں نے پڑھی تھی۔ تو اس وقت حضرت نے کوئی ڈیڑھ سو اشعار یاد سے پڑھے۔ اب آگے والے دنگ بیٹھے ہوئے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے!! ہمارا امام اور ہمارے ملک کی کتاب ہے اور ہمیں بھی ڈیڑھ سو اشعار یاد نہیں اور اس آدمی کو ڈیڑھ سو اشعار یاد ہیں جو کہتا ہے کہ بیس سال پہلے کتاب دیکھی تھی۔ امام الحرم بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے بڑی عزت دی۔ اللہ انہیں بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔ علماء کی تو تکریم کرتے ہیں، کیونکہ جوہری جوہر کو پہچانتا ہے۔ ایک آدمی موتی کو نہ پہچانتا ہو، اس کو کیا پتہ کہ یہ ہیرا ہے یا پتھر ہے؟ جوہری کو قدر ہوتی ہے کہ ہیرے کی کیا قیمت ہے اور پتھر کی کیا قیمت ہے؟ تو انہوں نے خود کہا کہ اب آپ گاڑی نہ چلائیں، میں گاڑی خود چلاؤں گا اور حضرت کو ان کے مقام پر چھوڑ آؤں گا۔ تو یہ ایک اور نعمت ہے کہ اللہ علم دے اور پھر اس کو سینوں میں محفوظ بھی رکھے، دماغوں میں محفوظ بھی رکھے۔

تین ماہ میں ایک بچے کا قرآن یاد کرنا:

میں نے پتہ نہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ نہیں بتایا کہ ایک بچے نے تین ماہ میں قرآن پاک حفظ کیا، عبدالعزیز بن یحییٰ اس کا نام ہے، موجود ہے اور اب...... ماشاء اللہ!...... وہ قراءتِ سبعہ حفظ کر رہا ہے۔ تو آپ اندازہ کریں کہ تین مہینے میں تیس سپارے حفظ کرنا۔ ابھی وہ بچہ ہے، یہ نہیں کہ پڑھا لکھا عالم ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ترجمہ ہوتا ہے، لیکن ایک بچہ اللہ نے اس کو ہمت عطا فرمائی۔ اسی طرح جنوبی افریقہ کے ابی بکر میرے دوست ہیں، ایک لڑکے نے چھ مہینے میں قرآن حفظ کیا اور پھر پورا قرآن ضبط بھی ہے، یہ نہیں کہ آگے حفظ کرتے جاؤ اور پیچھے بھولتے جاؤ۔

غیب کا معنی کیا ہوتا ہے؟ اس لیے بعض لوگوں نے مسلمانوں کے عقیدے برباد کرنے کے لیے عجیب عجیب ڈھونگ رچا رکھے ہیں...... نعوذ باللہ...... انہوں نے کہا کہ اللہ کے آگے تو غیب ہے ہی نہیں، اصل عالم الغیب تو انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں، اولیاء ہوتے ہیں کہ جن کے آگے غیب ہوتا ہے اور پھر وہ جانتے ہیں۔ خدا کے آگے تو ہر چیز موجود ہے، لہٰذا عالم الغیب کیا ہوا؟ اس لیے غیب کا معنی سمجھیں ''غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ'' کا معنی یہ ہے کہ جو چیزیں آسمانوں و زمین میں ساری مخلوق سے غیب ہیں ان کو بھی اللہ جانتے ہیں، یعنی جو چیزیں تمام مخلوق سے غیب ہیں، وہ نہیں جانتے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو بھی جانتے ہیں۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت تو قرآن میں بھی موجود ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾ [الحشر:۲۲]

اور کہیں آیا:

﴿عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴾ [المائدۃ:۱۰۹]

اور کہیں فرمایا:

﴿عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ [آل عمران:۱۱۹]

اور کہیں آیا:

﴿اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴾ [البقرۃ:۳۲]

اس لیے یہ تمام صفتیں ہیں۔ یہ لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ اللہ سے تو کوئی چیز غائب نہیں تو علم غیب اللہ کو کیا ہوا؟ علم

غیب تو نبی کو ہوتا ہے، نبی کا معنی ہی خبر دینے والا ہوتا ہے اور آگے ایک لفظ اور ساتھ بڑھا دیا کہ غیب کی خبر دینے والا۔

تو بھائی! خبر دینے کا کیا معنی ہے؟ جو اللہ اپنے نبی کو بتلاتے ہیں وہ اس کی آگے خبر دیتے ہیں اور جو اللہ نہ بتلائیں نبی خبر نہیں دیتے۔ اس لیے کہا گیا: نبی کو نبی مانا گیا۔ نبی کا معنی خبر دینے والا، یعنی وہ خبریں جو اللہ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو عطا فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں سب علم غیب جاننے والا ہوں، چاہے ظاہر ہو چاہے چھپا ہوا ہو:

﴿وَإِن تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى ۝﴾ [طہٰ:۷]

چاہے تو زور سے بات کر و یا آہستہ آہستہ کرو اور ایک چیز وہ ہے جو ابھی زبان پر بھی نہیں، دل میں اخفا کیا ہوا ہے، اللہ نے فرمایا: وہ بھی میں جاننے والا ہوں، میرے ہاں وہ بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔

اور جیسا کہ قرآن پاک میں ہدہد کے قصے کے بارے میں خبر آئی، انہوں نے بھی سلیمان علیہ السلام کو آ کر عرض کیا:

﴿أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ۝ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝﴾ [النمل:۲۵،۲۶]

حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں ہدہد نے آ کر عرض کیا کہ قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ سورج کی پوجا کر رہے ہیں؟ چاند تاروں کی پوجا کر رہے ہیں؟ اس ذات کی عبادت کیوں نہیں کرتے جو نکالنے والا ہے ہر وہ چیز جو آسمان وزمین میں چھپی ہوئی ہے اور جاننے والا ہے ان چیزوں کو جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ اصل عبادت کا تو وہ مستحق ہے جس کے سامنے کائنات کے ذرے ذرے کا راز ہے۔ ایسی چیز کی عبادت کرنے کا کیا فائدہ جس کو اپنے عابد کا بھی پتہ نہ ہو؟ کوئی سورج کی عبادت کرے تو سورج کو کیا پتہ کہ کون میری عبادت کر رہا ہے؟ جب وہ اپنے عابد کو نہیں جانتا تو اس کو نفع نقصان کیسے پہنچائے گا؟ کوئی اگر آگ کی عبادت کر رہا ہے تو آگ کو کیا پتہ کہ میرا عابد کون ہے؟ آپ دیکھیں کہ آگ پرست آگ کی عبادت کرتے ہیں...... نعوذ باللہ...... نفع نقصان خدا سب کچھ آگ ہے، اسی عبادت کرنے والے کو کہو کہ آگ کو ہاتھ تو لگاؤ۔ آخر تم اتنے عرصہ سے عبادت کر رہے ہو، تم ہاتھ ڈال کر دیکھو شاید تمہیں نہ جلائے، کیونکہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو۔ دو منٹ میں پتہ لگ جائے گا کہ ہاتھ جلاتی ہے یا نہیں جلاتی؟ کیونکہ اس کا کام جلانا ہے، چاہے مولوی ڈالے، پیر ڈالے، کوئی بھی اس کے اندر ہاتھ ڈالے اس کا کام جلانا ہوتا ہے۔

یہ جو دکھاتے ہیں کہ آگ میں گزر گیا، یہ شعبدے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ آگ اپنے خصائص کو کھو دیتی ہے۔

کبھی تو ایسے ہوتا ہے کہ ساحر لوگ آنکھوں پر ایک قسم کا تصرف کرتے ہیں کہ تمہیں وہ چیز نظر آئے گی جو وہ دکھانا چاہتا ہے، جیسے ہپناٹائز کر دیتے ہیں کہ اس کو معمول بنا لیتے ہیں۔ اب وہ وہی کہے گا جو تم کہہ رہے ہو، وہی بولے گا جو تم بلاوانا چاہتے ہو اور وہ وہی سوچے گا جو تم کر رہے ہو۔

اور کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ بعض چیزیں بطور دوا استعمال ہوتی ہیں، مثلاً: اس کو استعمال کر لیا اور آگ پر کھڑا ہوا تو آگ نے کچھ نہ کیا اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قدرت اپنا نظارہ دکھانے کے لیے بھی اور بندوں کے امتحان کے لیے بھی ایسے حالات کر دیتی ہے کہ بندہ گزر جائے۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عبادت کے لائق تو وہ ہوتا ہے جو اپنے عبادت کرنے والوں کو جانے تو سہی کہ یہ میرا فرمانبردار ہے یا نافرمان ہے، یہ مانگ رہا ہے اور یہ نہیں مانگ رہا۔ اگر وہ جانتا ہی نہ ہو تو اس کی عبادت کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

تفسیر:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر منقول ہے کہ ﴿أَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ۝﴾ [البقرة: ۳۳] جیسے میں چھپی ہوئی چیز کو جانتا ہوں اسی طرح ظاہر کو جانتا ہوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ۚ﴾ [البقرة: ۳۰] یہ بات تو انہوں نے ظاہر کی تھی اور جو کچھ ابلیس نے بڑائی تکبر اور عداوت اپنے دل میں چھپائی ہوئی تھی اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں۔

حضرت ابو العالیہ، حضرت ربیع بن انس اور حضرت قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ایک تو فرشتوں نے یہ بات کی تھی ﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا﴾ آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرنا چاہتے ہیں جو زمین میں فساد کرے گی اور خون ریزی کرے گی؟ اور ایک ان کے دل میں یہ بات تھی کہ ہم سے افضل کوئی مخلوق پیدا نہیں ہوگی، ہم سب سے افضل ہیں۔ تو اللہ نے فرمایا: جو تم ظاہر کرتے ہو میں جانتا ہوں اور جو تم نے چھپایا ہوا ہے وہ بھی جانتا ہوں۔ یہ تو میرے ہاتھ میں ہے کہ میں جس کو چاہوں فضیلت دے دوں۔

حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ فرشتوں نے جو چھپایا تھا وہ یہ تھا کہ اللہ نے جو مخلوق پیدا کی ہم ان سے زیادہ علم اور زیادہ عزت والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: جیسے تم ان چیزوں کے نام نہیں جانتے اسی طرح تم یہ بھی نہیں جانتے کہ میں جن کو پیدا کرنے والا ہوں، جو مخلوق میری اطاعت بھی کرے گی اور میری

نافرمانی بھی کرے گی ان کو بھی جنت میں داخل کروں گا اور ان کو جہنم میں بھی داخل کروں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو علم عطا فرمایا تو فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کا اقرار کرلیا۔

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: راجح قول وہی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿أَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ...﴾ (میرے علم میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں مخفی ہے۔) کا معنی یہ ہے کہ ''مَا تُظْهِرُونَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تُخْفُونَ فِي أَنْفُسِكُمْ'' [تفسیر ابن کثیر، البقرۃ، الآیۃ: ۳۳] اور جس کو تم اپنی زبانوں سے ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم اپنے جی میں چھپاتے ہو میں سب جانتا ہوں، میرے اوپر کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ اور جو کچھ فرشتوں نے اپنی زبانوں سے ظاہر کیا تھا وہ یہ تھا کہ مولیٰ! آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرنے والے ہیں جو زمین میں فساد کریں گے اور خون ریزی کریں گے؟ اور جو چھپایا ہوا تھا وہ ابلیس کے دل کے اندر تھا کہ میں اللہ کے اوامر کی مخالفت کروں گا۔ اس کے دل کے اندر تکبر اور جو آدم علیہ السلام سے حسد اور عداوت تھی وہ بھی اللہ کے علم میں تھی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۴، ۷۵، البقرۃ، الآیۃ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

اعتراض:

اگر ابلیس نے دل کے اندر چھپایا ہوا تھا، باقی ملائکہ نے تو نہیں چھپایا تھا، یہاں صیغہ جمع کا آیا ہے کہ ﴿أَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ اللہ نے مخاطب تو سب کو فرمایا کہ جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو، حالانکہ چھپانے والا ایک ہے۔

جواب:

محاوراتِ عرب میں ایسا ہوتا ہے کہ جیسے کہا جاتا ہے ''قَتَلَ الْجَيْشُ وَ هَزَمُوا'' کہ لشکر نے لڑائی لڑی اور لشکر نے شکست کھائی۔ اب یہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ سب نے لڑائی کی ہو اور سب نے شکست کھائی ہو، گویا کہ خبر یہ دی جاتی ہے کہ لشکر ہار گیا۔ اب ضروری تو نہیں کہ ہر بندہ ہارا، لیکن اس کی جمع کے صیغہ کے ساتھ خبر دی اور اسی طرح آیت میں ہے ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَآءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ﴾ [الحجرات: ۴] حالانکہ وہاں پکارنے والا بنی تمیم کا ایک آدمی تھا، لیکن اللہ نے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا۔ یہاں بھی چاہے چھپانے والا ایک ابلیس تھا، لیکن اللہ نے مخاطب سب کو فرمادیا۔ ''وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ وَعِلْمُهُ أَتَمُّ'' [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۵، البقرۃ، الآیۃ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۠ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب سجدہ میں چلے گئے، مگر شیطان، اس نے نہ مانا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

آیات کا ربط:

گزشتہ آیات میں آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر علمی فضیلت بیان کی تھی، اب اس آیت مبارکہ میں عملی فضیلت کا اظہار ہے کہ اللہ نے پھر ملائکہ کو حکم دے کر آدم علیہ السلام کو اتنا بڑا شرف اور اعزاز بخشا کہ تمام ملائکہ نے باقاعدہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ اللہ نے ملائکہ کو سجدے کا حکم دیا، لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ ابلیس ملائکہ میں سے نہیں ہے، ابلیس جن ہے۔ جیسے قرآن مجید میں موجود ہے:

﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ [الکہف: ۵۰]

''ابلیس جنات میں سے ہے اور اس نے اللہ کے حکم سے خروج کیا۔''

ابلیس جن تھا، ابلیس کا ملائکہ کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ اس کے بارے میں محققین علماء کرام کی تحقیق یہ ہے کہ دراصل ابلیس جنوں میں سے تھا اور جنوں کو زمین میں آباد کیا گیا۔ ابلیس بھی زمین میں رہتا تھا، ابلیس کا مقام آسمانوں میں نہیں تھا۔ جنات نے زمین میں جب فساد برپا کیا اور خون ریزی کی تو ابلیس ان کے فساد اور خون ریزی میں شریک نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت اور ذکر میں مشغول رہتا تھا۔ سنت اللہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہر مخلوق کو کچھ موقع دیتے ہیں کہ وہ گناہ سے سنبھل کر توبہ کر لیں، لیکن جب نافرمانی حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی پکڑ آتی ہے۔ تو جب ان کا حدود سے تجاوز کرنے کا وقت آیا تو اللہ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ جا کر جنات کو ماریں، جنوں کو سزا دیں اور انہیں مجبور کریں کہ وہ زمین کے علاوہ جزیروں، پہاڑوں اور دور افتادہ جگہوں میں جا کر رہیں۔ ان کو آزادی سے رہنے کی اجازت نہ ہو، ملائکہ نے آکر جب اللہ کے حکم کی تعمیل کی تو ابلیس عبادت گزار تھا، اس کا فسادات سے کوئی تعلق نہیں تھا تو اس نے بھی جنات کو مارنے بھگانے سزائیں دینے میں فرشتوں کا ساتھ دیا۔ ملائکہ کی سفارش پر اور ملائکہ کے عرض کرنے پر اس کو بھی ملائکہ کے ساتھ آسمان پر رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ تو اس طرح ابلیس آسمان میں پہنچا۔

اب اس آیت کے اندر صراحت ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ جب ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے یہ سارا واقعہ حضور ﷺ کو بتلایا، اس لیے یہاں پر ایک لفظ مقدر ہے "وَاذْكُرْ يَا مُحَمَّدُ!" اے محمد! آپ یاد کریں اس وقت کو کہ جب ہم نے ملائکہ سے فرمایا کہ تم آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہیں کیا۔

اور بعض علماء نے فرمایا: خطاب براہ راست اگرچہ حضور ﷺ کو ہے، لیکن مراد ساری امت کو مخاطب کرنا ہے۔ اس لیے یہاں لفظ "اُذْكُرُوْا" مقدر ہے یعنی اللہ پاک بنی آدم کو یاد دلاتے ہیں: یاد کرو اے آدم کی اولاد! جب ہم نے ملائکہ کو حکم دے کر تمہارے ابا کو مسجود الملائکہ بنایا، تمہارا ابا آدم کو ہم نے اتنا بڑا اشرف بخشا۔

سوال: ابلیس فرشتوں میں کیسے شمار ہوا؟ ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تھا اور اس کو براہ راست مخاطب بھی نہیں کیا گیا، اس کے بعد اس پر یہ عذاب اور غضب کیوں آیا؟

اس کے علماء کرام نے دو جواب دیے ہیں۔

پہلا جواب:

1 ......ایک جواب تو یہ ہے کہ ملائکہ کو حکم ملا تھا۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب اعلیٰ کو حکم ملے تو ادنیٰ خود بخود اس کے اندر آجاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ پھر سب کو نام لے لے کر حکم کیا جائے، جیسے سردار کو حکم ملے کہ تم اس کے آگے جھک جاؤ تو نوکر خود بخود جھک جائیں گے۔ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا:

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ [طٰہٰ:۲۴]

اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو چکا ہے۔

اور دوسری جگہ آتا ہے:

﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ [طٰہٰ:۴۳]

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف فرعون یا اس کے سرداروں کے لیے تو پیغمبر اور رسول نہیں بنائے گئے تھے، بلکہ بنو اسرائیل اور قبط کی تمام قوم کے لیے رسول اور نبی تھے، لیکن جب فرعون کو دعوت دی جائے گی تو وہ دعوت سب کو شمار ہوگی، یہ نہیں کہ ایک ایک کا نام لے کر ہدایت کی جائے کہ اس کے پاس بھی جاؤ اور اس کے پاس بھی جاؤ۔ اسی طرح ابلیس لعین بھی ملائکہ کے ساتھ رہ رہا تھا تو جب ملائکہ جیسی قوم کو یہ حکم ملا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، اس کے بعد

ابلیس کو براہِ راست حکم دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی، اس لیے ابلیس بھی اس حکم کے اندر شامل تھا۔

ازواج مطہرات کے لیے پردے کا حکم:

جیسا کہ اللہ نے بعض احکام میں اپنے پاک نبی ﷺ کی بیویوں کو حکم دیا:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ﴾ [الاحزاب: ۳۳]

اے میرے مدنی کی بیویو! اے میرے نبی کی بیویو! تم اپنے گھروں میں رہا کرو، اپنے گھروں میں قرار پکڑا کرو اور گھروں سے باہر زینت جاہلیت کر کے باہر نہ نکلا کرو۔ اب بظاہر خطاب حضور ﷺ کی بیویوں کو ہے، لیکن حکم سب امت کی عورتوں کے لیے ہے۔ جب اللہ کے پاک پیغمبر کی پاک بیویوں کو یہ حکم ہے کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلیں اور کسی کی بیوی کی کیا حیثیت ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اولوالعزم کی شان والی، عزت والی اور عصمت والی بیویوں کو یہ حکم کیا گیا تو وہ بھی اس حکم کے اندر شامل ہیں اور دوسری خواتین بھی۔

دوسرا جواب:

2 ......اس کا دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا تھا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، اسی طرح اللہ نے ابلیس لعین کو بھی حکم دیا تھا، کیونکہ قرآن پاک میں دوسری جگہ یہ صراحتاً مذکور ہے۔ فرمایا:

﴿مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ﴾ [الاعراف: ۱۲]

اور بعض علماء نے یہ فرمایا ہے کہ وہ تبعاً للملائکہ بھی اس حکم میں شامل تھا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے بطورِ خاص بھی اس کو حکم دیا تھا کہ تم بھی سجدہ کرو، لیکن اس نے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو اس بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر لعنت آئی۔

روایات میں آتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ کے فرشتوں میں سے اسرافیل علیہ السلام نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا اور بعد میں سب نے سجدہ کیا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ انہوں نے اللہ کے حکم کی سب سے پہلے تعمیل کی تھی تو اللہ نے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو بھی یہ شرف بخشا کہ ان کی پیشانی پر پورا قرآن لکھ دیا کہ قرآن مقدس جس طرح اللہ نے لوحِ محفوظ اور بیت العزت میں محفوظ رکھا اور اسی طرح حضور پاک ﷺ کے سینے میں محفوظ رکھا، اس کو ایک مقام یہ بھی بخشا گیا کہ اسرافیل علیہ السلام

کی پیشانی پر اللہ کے حکم سے قرآن کامل لکھ دیا گیا۔ اس کو بھی محدثین کرام نے ذکر فرمایا ہے۔

[الدر المنثور للسیوطی: ۱/۱۱۵]

اب جو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا گیا وہ کونسا سجدہ تھا؟ سجدہ عبادت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ تو بالکل نہیں تھا، اس کے اندر تو کوئی شبہ نہیں ہے، کیونکہ کسی بھی شریعت وملت میں اللہ کے سوا کسی غیر کے لیے سجدۂ عبادت جائز نہیں، کیونکہ عبادت وسجدہ صرف اللہ کے لیے ہے۔ یہ سجدۂ تعظیم تھا یا سجدۂ تحیہ یا سجدۂ تکریم تھا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۷، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ]

سجدۂ عبادت اور سجدۂ تعظیم میں فرق:

علماء نے سجدۂ عبادت اور سجدۂ تعظیم کے حکم میں فرق کیا ہے:

بطور عبادت سجدہ کیا جائے، جیسے ہم نماز میں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں تو یہ خالص بندگی اور عبادت ہے۔ ایسا سجدہ جسے بھی ہو، خواہ وہ ملک ہو، اللہ کا نبی ہو، ولی ہو یا اور کوئی ذی مرتبہ شخصیت ہو تو اس کے کفر میں تو کوئی شبہ ہی نہیں، کیونکہ اللہ کے سوا کسی غیر کا سجدہ کفر ہے۔

لیکن اگر بطور تعظیم سجدہ کرے، جیسے لوگ سردار یا استاذ یا بزرگ کے آگے جھک جاتے ہیں، ان کا مقصد تعظیم و تحیہ ہوتا ہے، اس کو تمام فقہاء کرام نے حرام قرار دیا ہے، کفر قرار نہیں دیا۔

یہ سجدہ تعظیمی پہلی شریعتوں میں جائز تھا، اس امت کے لیے جائز نہیں ہے۔ جب آدم علیہ السلام کو ملائکہ نے سجدہ کیا، یا یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے اور ان کے ماں باپ یا جو اس وقت خالہ تھیں انہوں نے سجدہ کیا اس سے استدلال پکڑ کر اپنے پیروں کو یا قبروں پر سجدہ کرتے ہیں کہ دیکھو! ملائکہ نے بھی تو تعظیم کا سجدہ کیا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اور والدین نے بھی تو تعظیمی سجدہ کیا اور جس نے انکار کیا وہ شیطان بن گیا، لہٰذا ہم جو بزرگوں کو سجدہ کر رہے ہیں یہ تعظیمی سجدہ ہے اور جو انکار کرتا ہے...... نعوذ باللہ...... وہ شیطان ہے کہ وہ تعظیم کا انکار کر رہے ہیں۔ اس سے استدلال پکڑتے ہیں تو یہ بالکل جاہلیت والی بات ہے اور ایسا قیاس ہے جس کی کوئی دلیل بھی نہیں بن سکتی۔ سب سے پہلے تو یہ بات سمجھیں کہ جو معاملات آسمانوں میں ہوں ان کا زمین سے کیا تعلق ہے؟ یہ ایک موٹی سی بات یاد رکھ لیں! زمین کے احکام علیحدہ ہوتے ہیں اور آسمانوں پر جو احکام ہوتے ہیں وہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ اب طواف تو ملائکہ بھی بیت المعمور کا کرتے ہیں، نماز اور عبادت ملائکہ بھی کرتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی

تسبیح وتحمید و تقدیس کرتے ہیں، لیکن ان کی عبادت اور ہماری عبادت کا کیا جوڑ ہوسکتا ہے؟ کیا ان پر روزے فرض ہیں؟ جس طرح ہم پر رمضان کے مہینے میں فرض ہیں، ان کے لیے کوئی پانچ نمازیں فرض ہیں؟ جس طرح ہم پر پانچ نمازیں فرض ہیں، ان کے لیے نکاح کرنا سنت ہے؟ جیسے بندوں کے لیے نکاح کرنا سنت ہے، ان کے لیے توالد تناسل اولاد کا ہونا ان سارے احکام کا ان سے تعلق ہی نہیں ہے، کیونکہ آسمان کے سارے احکام ہی نرالے ہیں۔ اسی لیے جب اللہ تبارک وتعالیٰ عالم آخرت میں اپنے بندوں کو اپنی رحمت سے شرف بخشیں گے اور اپنی مہربانی سے ہم جیسوں کو بھی جنت میں بھیجیں گے، وہاں احکام علیحدہ ہوں گے، نہ تکلیف ہوگی اور نہ شریعت ہوگی، نہ وہاں نماز ہوگی، نہ روزہ ہوگا اور نہ کوئی عبادت ہوگی۔ وہاں تو آرام ہی آرام ہے۔ ہاں! اگر اپنی مرضی سے کوئی عبادت کرنا چاہے تو اس کی مرضی ہوگی۔ اس لیے آسمان کے احکام کو زمین پر قیاس کرنا یہ کوئی عقل میں آنے والی بات نہیں۔ یہ تو ایسے ہو جائے گا مثلاً: کوئی آدمی یہ کہے کہ میں جو اپنے ملک میں نماز پڑھتا تھا میں تو اسی طرح پڑھوں گا، ہم روز روز نماز کیوں بدلتے رہیں؟ ہم ساری زندگی اپنے ملک میں نماز پڑھتے آئے ہیں، جس ٹائم پر پڑھتے تھے ہم اسی ٹائم پر پڑھیں گے۔ اور وہ اپنی گھڑی کو بھی نہ بدلے۔ اب وہ کہے کہ ہم وہاں پونے پانچ بجے نماز پڑھتے تھے اور میں یہاں اسی گھڑی کے مطابق پڑھوں گا۔ وہ تو پونے سات ہو جائیں گے۔ وہ تو ایک اقلیم سے دوسری اقلیم کا ٹائم بدل جائے گا، مثلاً: یوں اندازہ کریں کہ یہاں سے آدمی ایک ملک کا سفر کرتا ہے تو یہاں سے مثلاً: ایک بجے ہم رات سفر کر رہے ہیں تو آج کل یہاں اس ٹائم کے مطابق آدمی اس ملک میں پہنچتا ہے تو وہاں ابھی فجر کی نماز میں دو گھنٹہ باقی ہوتا ہے اور یہ نماز راستے میں گزر گئی تو اس وجہ سے جب اس اقلیم کا دوسری اقلیم سے وقت نہیں ملتا، ایک جگہ دن ہے اور دوسری جگہ رات ہے، ایک جگہ رات ہے اور دوسری جگہ دن ہے، ایک جگہ مثلاً: ہم ابھی مغرب کی نماز پڑھ رہے ہیں اور دوسری جگہ آدھی رات بھی ہوگئی ہے، ایک جگہ آدھی رات ہوگئی ہے تو دوسری جگہ صبح کا سورج نکل رہا ہے اور بعض ملک ایسے بھی آجاتے ہیں کہ وہاں مغرب اور عشا کا ٹائم اتنا قریب ہے کہ آپ جب مغرب کی نماز ختم کرتے ہیں تو عشا شروع ہوگئی، اتنا قریب ٹائم ہے۔ بعض ملک ایسے ہیں جہاں عشا کی نماز کا وقت ملتا ہی نہیں، سورج ادھر سے غروب ہوا اور ادھر سورج نکل گیا تو فجر ہوگئی، عشا کا وقت ہی نہ ملا اور فجر ہوگئی۔

تو اگر زمین کے احکامات میں اتنے اختلافات ہیں تو یہ کتنی بڑی جہالت ہے کہ آسمانوں کے فیصلے کو زمین پر نافذ کیا جائے۔ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا تو ہم بھی پیروں کو سجدہ کریں گے۔ اور دوسری یہ بات کہ

یوسف علیہ السلام کو سجدہ ہوا تھا تو یوسف علیہ السلام کی شریعت کا زمانہ الگ ہے، میرے آقا محمد عربی ﷺ کی شریعت کا زمانہ علیحدہ ہے۔ اُس دور کے احکام علیحدہ ہیں اور اِس دور کے احکام علیحدہ ہیں۔ تو یہ بہت بڑی جہالت ہے۔ اصل بات یاد رکھیں کہ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو اگر ملائکہ نے سجدہ کیا ہے تو آدم علیہ السلام کی بزرگی دیکھ کر، ان کی شکل وصورت دیکھ کر اور ان کی عظمت کو دیکھ کر خود سجدے میں گر پڑے یا اللہ نے حکم دیا، ان کو تو اللہ نے حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اور ان کے باپ نے سجدہ کیا تو یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھا تھا اور نبی کا خواب ایسا ہوتا ہے جیسے اللہ کی وحی ہو، اللہ کے نبی کا خواب کبھی جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ میں بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں، اسی طرح بعینہٖ یوسف علیہ السلام نے بچپن میں خواب دیکھا تھا:

﴿إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۝﴾ [یوسف:۴]

ابا جان! میں نے دیکھا ہے کہ آسمان سے گیارہ ستارے ٹوٹے ہیں اور سورج اور چاند میرے آگے جھک رہے ہیں۔

ابا نے کہا: اس خواب کو راز رکھو، کسی کو نہ بتاؤ، مبادا لوگ حسد میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں شرف دیں گے، عزت دیں گے اور مقام دیں گے۔ یہ تمہاری بہت بڑی عظمت کی دلیل ہے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے سجدہ کیا تو اس وقت انہوں نے یہی بات فرمائی:

﴿هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا﴾ [یوسف:۱۰۰]

''ابا جان! یہ میرے خواب کی تعبیر ہے جو آج اللہ نے پوری کر دی۔''

وہاں بھی اگر سجدہ ہوا تو اللہ کے حکم سے سجدہ ہوا، یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو اگر سجدہ ہوا تو اللہ کے حکم سے سجدہ ہوا اور یوسف علیہ السلام کو سجدہ ہوا تو اللہ کے حکم سے ہوا۔ اور ہم جو کہتے ہیں قبر پر سجدہ نہ کرو، کسی زندہ انسان کو سجدہ نہ کرو، کسی سورج چاند کو سجدہ نہ کرو، ہم بھی اللہ کے حکم کے مطابق کہتے ہیں۔

تفسیر:

جیسے قرآن مجید میں اس سے روکا گیا ہے:

﴿لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝﴾ [حم سجدہ:۳۷]

حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ صحابہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! ہم جب قیصر و کسریٰ کے ملک میں جاتے ہیں تو وہاں لوگ اپنے بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں۔ اگر دنیا کے بادشاہوں کو سجدہ ہو رہا ہے تو آپ ہمارے دنیا اور آخرت میں بادشاہ ہیں تو آپ کو ہم سجدہ کیوں نہ کریں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: خبردار! اگر میں کسی کے لیے سجدے کی اجازت دیتا تو میں بیوی کے ذمہ لگاتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، لیکن اللہ کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں۔ [سنن أبي داود، حديث: ۲۱۴۰، بَابٌ: فِي حَقِّ الزَّوْجِ عَلَى الْمَرْأَةِ]

دوسری حدیث شریف میں ارشاد ہے:

((لَعَنَ اللهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ))

''یہود و نصاریٰ پر اللہ لعنت کریں کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۹۰، بَابُ مَا جَاءَ فِي قَبْرِ النَّبِيِّ ﷺ، وَأَبِي بَكْرٍ...]

اسی طریقہ سے دیکھیں کہ انہوں نے متعہ کا مسئلہ نکالا، حالانکہ وہ ابتداء اسلام میں تھا۔ اور ابتداء اسلام میں تو لوگ شراب بھی پیتے تھے۔ جب شراب کی حرمت نہیں آئی تھی تو لوگ شراب پیتے رہے۔ جب حرام ہی نہیں کیا گیا تو کیا جرم ہے؟ جب تک اللہ نے کعبہ نہیں بدلا لوگ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے۔ کعبہ میں کھڑے ہوتے تھے، لیکن نماز ادھر پڑھتے تھے۔ اسی طرح متعہ ابتداء میں تھا، لیکن جب متعہ کے بارے میں صراحتاً تصریح آگئی، نفی آگئی اور نہی آگئی، اعلان ہو گیا کہ آج کے بعد متعہ نہیں ہوگا۔ اور اللہ نے قرآن پاک میں دو چیزوں کا فیصلہ کر دیا، اللہ نے فرما دیا: تمہارے لیے وہ عورت حلال ہے جو آزاد ہے، مسلمان ہے، تیرے نکاح میں آئی ہے یا وہ باندی جو جہاد میں تیرے نصیب میں آئے۔ ان دو کے علاوہ اور کوئی عورت تمہارے لیے حلال نہیں۔ تو اللہ نے قرآن میں بھی پابندی لگا دی اور حضور ﷺ کی طرف سے اعلان آگیا، لیکن انہوں نے متعہ کو ایک گنجائش دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا آپ توجہ کریں کہ آج پوری دنیا میں جتنا طوائف کا کاروبار ہے وہ سب انہی جیسے لوگوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ پوری دنیا کی طوائفوں کی تاریخ پر آپ نظر ڈالیں، چاہے وہ نسلی طوائف ہو چاہے اصلی طوائف ہو، یا کسی شریف گھرانے کی لڑکی کو کسی نے اغوا کیا اس کو سنبھال نہ سکا اور اس کے بعد وہ پھرتی پھراتی طوائف بن گئی۔ ان سب کے پاس آپ جا کر معلومات کر لیں، اخبار موجود ہیں، رسالے موجود ہیں اور کتابیں موجود ہیں تو اس مذہب میں ان کو گنجائش مل رہی ہے کہ یہ جو میں پیشہ کر رہی ہوں زنا نہیں ہے، بلکہ متعہ ہے، لہٰذا جرم نہیں ہے۔ دنیا

کے اندر کوئی آدمی کتنا خراب کیوں نہ ہو، لیکن کون کہتا ہے کہ میں جہنم میں جاؤں؟ کوئی آدمی اپنے آپ کو آگ میں جلانا نہیں چاہتا، چاہے وہ گناہ گار ہو، شرابی ہو۔ ان کے دماغ میں بھی یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ یہ متعہ جائز ہے اور متعہ ہوتا ہی یہی ہے کہ نہ گواہوں کی ضرورت، نہ خطبہ کی ضرورت، نہ نکاح کی ضرورت، نہ رخصتی کی ضرورت، نہ طلاق کی ضرورت، نہ نسب کی ضرورت اور نہ حسب کی ضرورت۔ بس ایک ٹائم کا فیصلہ کر لیا کہ اتنے ٹائم کے لیے اتنے پیسے ہیں۔ تو جو زنا والا گروہ ہے وہ سب کا سب ان کے گروہ میں چلا گیا، سارے کے سارے اس مذہب میں چلے گئے کہ ان کو وہاں مذہب میں تسکین ملی۔ اہل سنت کے نزدیک اگر میں فاحشہ ہوں اور زانیہ ہوں تو رجم کی حقدار ہوں، میں کوڑے کی حقدار ہوں اور میں جہنم کی حقدار ہوں، لیکن یہ کتنا میٹھا مذہب ہے کہ جو کہتا ہے جو مرضی آئے کرو۔

اسی طرح اگر زکوٰۃ کا مسئلہ آجائے تو کہا جاتا ہے کہ ان کی زکوٰۃ نہ کاٹی جائے، کیونکہ ان کے مسلک میں زکوٰۃ کا مسئلہ ہے ہی نہیں جو اہل سنت والجماعت کے مسلک میں ہے۔ لیکن اس کی گنجائش کا نتیجہ کیا نکلا جتنے مالدار سنی تھے اپنا پیسہ بچانے کے لیے فارم بھر کر ان میں شامل ہو گئے کہ بھائی! ہمارے اڑھائی پرسنٹ بچ جائیں۔ ایمان جاتا ہے تو جائے، ایمان کا کیا ہے؟ وہ تو پھر کلمہ پڑھ لیں گے، لیکن اڑھائی پرسنٹ تو بچ جائیں گے۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! جب بھی آپ لچک دیں گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ تباہی کے غار میں چلے جائیں گے، لوگ کرتے کرتے پھر کفر و شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔

یہودی عورت کے چوری کرنے اور سفارش کرنے کا واقعہ:

یہی وجہ تھی کہ ایک فاطمہ نامی عورت کا کیس آیا اور یہودیوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس کا ہاتھ نہ کٹے۔ اگر اس کا ہاتھ کٹ گیا تو ہمارے خاندان کی ناک کٹ جائے گی کہ ان کے تو خاندان کی عورتیں بھی چور ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ کون سفارش کرے؟ تاکہ حضور ﷺ سے رعایت مانگی جائے کہ جھگڑا یہودی عورت کا ہے، جو آپ کے دین کو بھی نہیں مانتی تو آپ اگر تھوڑی سی رعایت دے دیں گے تو یہودیوں کے دل میں آپ کی محبت پیدا ہو جائے گی، دین اسلام کی رغبت پیدا ہو جائے گی کہ حضور پاک ﷺ نے ہماری رعایت کر دی، ہماری عزت رکھ دی اور ممکن ہے اس عورت کا قبیلہ مخزومیہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ جو حضور ﷺ کے اتنے

محبوب تھے کہ حضور ﷺ کے بیٹے تھے، ان کو انہوں نے بریفنگ کی کہ دیکھو! ایک تو یہ ہے کہ مسلمان کا مقدمہ ہی نہیں تو اللہ کے نبی کا دین مسلمانوں کے لیے ہے اور جو کلمہ نہیں پڑھتے ان کا دین کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اصل میں وہ خود پھنس گئے تھے، اپنا مقدمہ اپنی مرضی سے حضور ﷺ کی خدمت میں لے آئے، حضور ﷺ نے انہیں نہیں بلایا تھا، وہ تو اس لیے لائے تھے کہ نیا دین ہے، نئے نبی ہیں، شاید ادھر سے ہمیں کوئی رعایت مل جائے تو اب جب انہیں پتہ چلا کہ اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، کوئی رعایت نہیں ہے تو اب انہوں نے کہا کہ ہم نے فیصلہ خود کورٹ میں جا کر پیش کر دیا، اللہ نے بھی حکم دیا کہ اگر کوئی ہمارے پیغمبر ﷺ کے پاس یا ہمارے حاکم کے پاس دوسرے مذہب والا فیصلہ کرانے آتا ہے تو اللہ کے قرآن کے مطابق فیصلہ کریں۔

اب حضرت اسامہ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ایک یہودی عورت کا مسئلہ ہے، ہمارے دین سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپ انہیں تھوڑی سی رعایت دے دیں، کوئی سزا مقرر فرما دیں اور پھر وہ مدعی کو بھی راضی کرنے پر تیار ہیں، جرمانہ بھگتنے پر بھی تیار ہیں، صرف ہاتھ نہ کاٹا جائے، اتنی رعایت کر دیں تو شاید یہ خاندان اسلام میں آجائے۔ حضور پاک ﷺ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسامہ! خبردار! اللہ کی حدود ہیں، سفارش کرنے کی جرات کرنے کے لیے آئے ہو؟ شریعت کا مسئلہ ہے کہ سفارش اس وقت تک کی جاتی ہے جب تک معاملہ عدالت میں نہ پہنچے۔ جب معاملہ عدالت میں آ گیا تو اب سفارش کا کیا مطلب؟ ہاں! اگر کوئی جھگڑا ہے، آپ نے ان کے عدالت کے پاس جانے سے پہلے اور حکومت کے پاس مقدمہ دائر کرنے سے پہلے آپس میں صلح کر لی تو معاملہ ختم ہو گیا۔ اگر وہ جھگڑا قاضی کے پاس گیا تو پھر رعایت نہیں ہے۔ تمہیں اتنی جرات ہو گئی کہ تم اللہ کی حدود میں سفارش کرنے کے لیے آ گئے؟ خبردار! سن لو یہ تو فاطمہ مخزومیہ ہے، یہودی قبیلہ کی لڑکی ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟ میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں ہاتھ کاٹ دیتا۔ اسلام کے قانون میں لچک کا کیا معنی ہے؟ [صحیح البخاري، حدیث: ۳۴۷۵، کتاب: حدیث الغار]

﴿فَسَجَدُوٓا﴾ میں فا تعقیب کے لیے ہے۔ جب اللہ نے ملائکہ کو حکم دیا تو ملائکہ فوراً سجدے میں گر گئے۔ ﴿اَبٰى﴾ مگر ابلیس نے انکار کیا ﴿وَاسْتَكْبَرَ﴾ اور استکبار کیا۔ اس کے بعد فرمایا ﴿وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۳۴] لفظ "کان" آیا ہے، یعنی تمہیں اب معلوم ہوا، لیکن اللہ کے علم میں تو وہ پہلے ہی کافر تھا اور منکر تھا۔

دوسری آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ شیطان نے کہا:

﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ﴾ [الاعراف: ۱۲]

''میں اس سے بہتر ہوں۔ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔''

(حدیث) اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو ساری دنیا سے زیادہ علم عطا فرمایا تو وہ ساری مخلوق سے افضل ٹھہرے اور ان میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو زیادہ علم عطا فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اوّلین و آخرین کا علم عطا فرمایا گیا۔ جو علوم اوّلین وآخرین کو دیے گئے تھے اللہ نے مجھے وہ بھی عطا فرمائے ہیں۔

جیسا کہ حدیث پاک میں یہ بات واضح موجود ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک ابن آدم جنت والوں کے عمل کرتا ہے، گویا کہ جنت ایک ہاتھ کے فاصلے پر رہ جاتی ہے، یعنی بالکل جنت کے قریب پہنچ جاتا ہے، لیکن پھر وہ کافروں والے عمل کرتا ہے اور جہنم میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی ساری زندگی دوزخ والوں کے عمل کرتا رہا، کافروں کے اعمال کرتا رہا، جہنم بالکل قریب آگئی، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت غالب آئی، اللہ نے اس کا رخ ہدایت کی طرف موڑ دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے پلٹا کھایا، کفر وشرک سے توبہ کی، توحید اور اعمالِ صالحہ پر آیا اور جنت میں داخل ہو گیا۔ [صحيح البخاري، حديث: ۳۲۰۸، بَابُ: ذِكْرِ الْمَلَائِكَةِ]

نجات اعمال کا دارومدار نیک خاتمے پر ہے:

اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ آخری زمانے میں میری امت پر ایک وقت ایسا آئے گا، ایک ایسا دورِ فتن آئے گا کہ صبح کو ایک آدمی باقاعدہ ایمان والا ہوگا، لیکن شام کو کافر ہو جائے گا۔ اور فرمایا کہ شام کو ایمان والا ہوگا اور صبح کو کافر ہو جائے گا۔ اس لیے اس دور کے اندر خصوصی طور پر اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے اور اللہ سے ایمان اور حسن خاتمہ کی دعا کرتے رہنا ضروری ہے۔ [صحيح مسلم، حديث: ۱۱۸، بَابُ: الْحَثِّ عَلَى الْمُبَادَرَةِ بِالْأَعْمَالِ...]

سجدہ نہ کرنے سے ابلیس کافر کیسے ہو گیا؟

یہاں ایک اشکال ہے کہ سجدہ نہ کرنا بدعملی ہے، جس کی وجہ سے بندہ فاسق ہو جاتا ہے تو ابلیس سجدہ نہ کرنے سے کافر کیسے ہو گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی بدعملی نہیں ہے، بلکہ یہاں اس نے اعراض کیا اور اللہ کے حکم سے منہ موڑا کہ یا اللہ! تو نے مجھے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے، میں تو آدم سے زیادہ بہتر اور افضل ہوں۔ تو اللہ تبارک

تعالیٰ کے حکم سے کوئی اعراض کرے اور اس پر اعتراض کرے تو اس کے کفر میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا اور اس کے ساتھ اس نے تکبر کیا، جس کا ذکر دوسری آیت میں ہے۔ اس نے کہا:

﴿أَنَا۠ خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُۥ مِن طِينٍ ⑫﴾ [الاعراف: ۱۲]

تکبر کرنا تو صرف میرے اللہ کی شان ہے۔

جیسے حدیث صریح میں آتا ہے: پروردگار عالم نے فرمایا:

((اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي وَ الْعَظَمَةُ إِزَارِي)) [سنن ابی داود، حدیث: ۴۰۹۰، باب: ما جاء في الكبر]

کبریائی اور عظمت میرے لیے لازم وملزوم ہے۔ اگر کوئی تکبر کرے گا تو میں اس کی گردن توڑ ڈالوں گا۔ اس لیے مخلوق کا تکبر کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کی دوسری وجہ:

اور دوسری وجہ ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کی حسد تھا۔ حسد کا معنی یہ ہے کہ آدمی دوسرے سے زوال نعمت کا ارادہ کرے کہ وہ نعمت اس سے چھین لی جائے اور مجھے مل جائے۔ حسد اتنا بڑا جرم ہے کہ ابلیس نے آسمانوں میں کیا، دنیا میں آنے کے بعد آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کے ساتھ حسد کیا، اس لیے سب سے پہلا گناہ جو اسمانوں اور زمینوں میں کیا گیا ہے وہ حسد ہے اور حسد کی وجہ سے ابلیس ملعون و مردود بنا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۸، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُوا لِآدَمَ]

حجر اسود کئی بار بادشاہ لے گئے:

جیسا کہ تاریخوں کے اندر موجود ہے کہ کئی بار حجر اسود کو نکالا گیا، کئی دفعہ لوگ حجر اسود کو لے گئے، یعنی کعبۃ اللہ سے نکال کر دوسروں ملکوں میں لے گئے۔ ایک دفعہ ایک بادشاہ یمن میں لے گیا، اس نے جا کر پہاڑوں میں پتھروں میں پھینک دیا۔ قریشِ مکہ بے چارے جا کر ڈھونڈ کر لے آئے۔ اور اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا اور حجر اسود کو نکال کر لے گیا۔ افغانستان کے مجاہدوں کو اللہ نے توفیق دی، افغانستان کی نسل میں سے ایک بادشاہ اٹھا (افغانستان اور عرب کا فاصلہ ملاحظہ کرلو) وہاں سے وہ اپنی فوجیں لے کر یمن میں آ کر لڑا اور حجر اسود لے آیا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو پہلے سے چنا ہوا ہے۔

حضور ﷺ کو سابقہ انبیاء علیہم السلام پر بہت سی چیزوں میں فضیلت دی گئی:

یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت میرے پاک نبی ﷺ کی اس حدیث پر عمل کرتے ہیں، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: تمام کائنات کی زمین پاک ہے اور ساری زمین کو پاک بنا دیا اور سجدہ کی جگہ بنا دیا۔[صحیح مسلم، حدیث: ۵۲۳، کِتَابُ الْمَسَاجِدِ] یعنی میری امت کا بندہ کسی جگہ موجود ہے، یہ دیکھ لے کہ کوئی پلیدی تو نہیں پڑی ہوئی، نجاست اور غلاظت پارس کی علامت تو نہیں پڑی ہوئی ہے، اگر نہیں ہے تو زمین پر تیمم بھی کر سکتا ہے اور سجدہ بھی کر سکتا ہے۔لیکن جن کے دل کے اندر شرک کا روگ ہوتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ ملنگ ایک ٹھیکری اپنے ساتھ رکھتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک کربلا کی زمین کا سجدہ ہے۔اب وہ بت پرستی کر رہے ہیں، اہل سنت والجماعت کا بت پرستی سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ ان ملنگوں کا سجدہ ایک مخصوص ٹھیکری پر ہے، ایک مخصوص مٹی پر ہے اور ایک مخصوص چیز پر ہے۔اس کے بغیر وہ کہتے ہیں: ہمارا سجدہ بھی نہیں ہوتا۔تو جب ان کا سجدہ کسی خاص چیز پر کیا گیا تو مخالفت آئی اس حدیث کی اور دوسری عمل محمد عربی ﷺ کی مخالفت آئی کہ حضور ﷺ نے کبھی ٹھیکری ساتھ نہیں لی، حضور پاک ﷺ جنت سے بھی کوئی ٹھیکری ساتھ نہیں لائے، حالانکہ معراج کی رات آپ کو جنت کی سیر کرائی گئی۔اگر آپ چاہتے تو جنت سے کوئی پتھر کا ٹکڑا لے آتے، اس پر نماز پڑھتے، لیکن حضور پاک ﷺ جب مکہ میں ہیں تو مکہ میں پڑھی اور مدینہ میں ہیں تو مدینہ میں پڑھی، نہ کبھی ٹھیکریاں رکھیں، نہ کبھی ٹکڑے رکھے اور نہ کبھی سامنے کوئی تصویریں رکھیں۔اسی طرح آپ دیکھیں کہ جب آپ جنازہ پڑھتے ہیں، حالانکہ جنازہ بھی نماز ہے، دعا ہے، لیکن جنازہ میں رکوع بھی نہیں ہے اور سجود بھی نہیں ہے۔وجہ کیا ہے کہ میت سامنے رکھی ہوتی ہے، اگر اس نماز میں رکوع اور سجود ہوتا تو کوئی جاہل آدمی یہ عقیدہ بنا لیتا کہ بندے کو سجدہ ہو رہا ہے، بندے کو رکوع ہو رہا ہے۔اللہ نے فرمایا: تم کھڑے کھڑے درود بھی پڑھ لو، دعا بھی پڑھ لو، سلام پھیر لو اور چلے جاؤ، تاکہ امت قیامت تک شرک کے راستے پر نہ چل پڑے۔جتنے شرک کے راستے تھے وہ شریعت اسلام نے بند کر دیے ہیں۔تو اس لیے ایسی باتوں سے استدلال کرنا جہالت ہے۔

آدم و موسیٰ علیہما السلام کا مناظرہ:

مفسر فرماتے ہیں اور بھی بہت سی احادیث مبارکہ ہیں جو اس موضوع پر دلالت کرتی ہیں، جیسا کہ آپ نے

حدیث شفاعت پہلے پڑھی ہے، موسیٰ علیہ السلام کی وہ بات جو حدیث مبارک میں موجود ہے:

((قَالَ: أَنْتَ آدَمُ الَّذِيْ خَلَقَهُ بِيَدِهِ وَنَفَخَ فِيْهِ رُوْحَهُ وَ أَسْجَدَ لَهُ مَلَائِكَتَهُ))

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا کہ یا اللہ! مہربانی فرمائیں اور مجھے آدم علیہ السلام کی زیارت کرائیں، کیونکہ جس نے اپنی ذات کو بھی جنت سے نکالا اور اسی وجہ سے ہم بھی جنت سے نکالے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے ملا دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: تم ہی وہ ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم مبارک سے اس میں روح پھونکی اور جن کو ملائکہ سے سجدہ کروایا، یعنی اتنی بڑی فضیلت اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہیں نصیب فرمائی۔

حدیث مبارک کا مضمون طویل ہے، لیکن یہاں مختصراً مفسر نے ذکر فرمایا کہ جس سے یہ ثابت کرنا تھا کہ آدم علیہ السلام بھی یہ اعتراف کریں گے کہ اللہ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا اور اللہ نے خود آپ کے اندر نفخ روح فرمایا، پھر اللہ نے تمام فرشتوں سے سجدہ کروایا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ابا حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ اگر آپ غلطی نہ کرتے (اس درخت سے چکھ نہ لیتے) تو نہ آپ جنت سے باہر آتے اور نہ پھر ہمیں جنت سے محروم ہونا پڑتا۔ آدم علیہ السلام پھر جواب میں فرمائیں گے: اے موسیٰ! تم وہی ہو جس کو اللہ نے تورات عطا فرمائی ہے اور جس کو اللہ نے نبی بنایا اور رسول بنایا؟ وہ کہیں گے: ہاں جی! میں وہی ہوں جس کو اللہ تعالیٰ نے معجزات بھی عطا فرمائے۔ تو حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: کیا پھر تورات میں تم نے یہ نہیں پڑھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے سے بھی پہلے فیصلے کر لیے تھے کہ اس طرح آدم پیدا ہوں گے، اس طرح ان کو جنت میں رکھا جائے گا اور اس طرح آدم کو درخت سے منع کیا جائے گا؟ وہ کہیں گے: ہاں یہ تو میں نے پڑھا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ [صحيح البخاري، حديث: ٣٤٠٩، باب: وَفَاةُ مُوسٰى وَذِكْرُهُ بَعْدُ]

ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

"كَانَ إِبْلِيْسُ مِنْ حَيٍّ مِنْ أَحْيَاءِ الْمَلَائِكَةِ"

ابلیس بھی دراصل ملائکہ کے ایک قبیلے میں سے تھا، اس کو جلانے والی آگ سے پیدا کیا گیا تھا، ملائکہ کے اندر اس کا نام حارث تھا اور وہ جنت کے خزانوں کا داروغہ تھا۔ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام فرشتوں کو نور سے پیدا کیا اس قبیلے کے علاوہ جو ابلیس والا قبیلہ ہے، ان کو آگ سے پیدا کیا گیا تھا۔ پھر زمین میں جنات

نے سرکشی کی تو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو حکم کیا کہ تو ان فرشتوں کی جماعت لے جا، جن کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور جا کر ان جنات کو زمین کے اطراف جزائر وغیرہ میں پہنچادے۔ جب ابلیس نے یہ کیا تو اس کے دل میں غرور پیدا ہوا کہ جنات کے مقابلہ کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے اور میں نے ایسا کام کیا ہے جو کسی نے نہیں کیا، میں نے جنات کو شکست دی اور ان کو بھگا دیا۔ اللہ نے جان لیا کہ اس کے دل میں غرور پیدا ہو گیا ہے اور ملائکہ مطلع نہ ہو سکے، ان کو کیا پتہ کہ اس کے دل کے اندر کیا ہے؟ کیونکہ ملائکہ تو ظاہر کو جانتے تھے، علم غیب تو خاصۂ خدا ہے، اس کے سوا تو کوئی علم غیب کو نہیں جانتا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۵، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ]

تخلیقِ آدم علیہ السلام:

پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ مٹی کو لایا جائے۔ تو مٹی کو آسمانوں پر لے گئے تو وہ ایسی مٹی تھی جو اعلیٰ قسم کی تھی کہ جس کو گوندھا جائے تو چکناہٹ پیدا ہو۔ پھر اس مٹی کو گوندھا جائے یا پکایا جائے۔ جیسے برتن بناتے ہیں تو پہلے اچھی سے اچھی مٹی ڈھونڈتے ہیں، پھر مٹی کو صاف کرتے ہیں کہ گرد و غبار نکالا جائے، پھر پانی ڈال کر اس کو گوندتے ہیں، تا کہ چکناہٹ پیدا ہو، پھر اس سے برتن بناتے ہیں۔ اس کے بعد ان برتنوں کو سکھاتے ہیں، سکھانے کے بعد پھر ان برتنوں کو بھٹیوں میں پکاتے ہیں، پھر ان سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ تو یہ مراحل ہیں کہ پہلے مٹی تھی، پھر گوندھی گئی، پھر سکھائی گئی اور پھر پکائی گئی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے بنایا اور جب آدم علیہ السلام کا جسد بنایا تو چالیس دن تک وہ جسد ایسے پڑا رہا۔ اب جب ابلیس گزرتا تو اس کو چھیڑتا اور اس سے آواز پیدا ہوتی تو وہ کہتا کہ ہے تو یہ کوئی خالی چیز، جس کے اندر سے یہ آواز آتی ہے۔

اللہ پاک نے ان کو ایسی مٹی سے بنایا:

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿١٤﴾﴾ [رحمٰن: ۱۴]

جیسے پکی ہوئی مٹی کو فخار کہتے ہیں کہ جب اینٹیں پک جاتی ہیں اس کو مارو تو اس سے آواز آتی ہے۔ مٹی کو اگر پکالیا جائے تو اس کو اگر آپ برتن پر ماریں گے تو آواز کرنے والا ہوگا۔ تو جسدِ آدم ایسے تھا، اندر سے خالی تھا، یعنی بھرا ہوا نہیں تھا۔

اب ابلیس آتا تو منہ کی طرف سے داخل ہوتا تو نیچے سے نکل جاتا اور نیچے کی طرف سے داخل ہوتا تو منہ کی طرف

سے نکل جاتا، کیونکہ اندر سے خالی تھا اب اس کے بعد کہتا کہ تم اسی لیے تو نہیں بنائے گئے کہ بس آواز آتی رہے۔ اگر مجھے تم پر غلبہ ملا تو میں تمہیں ہلاک کر دوں گا، اگر مجھے تم پر مسلط کیا گیا تو میں تجھے نافرمانی پر تیار کروں گا۔

اب اللہ تعالیٰ نے روح پھونکی اور وہ روح سر سے پھونکی گئی، یعنی اس کی ابتداء دماغ کی طرف سے کی گئی۔ پہلے سر میں روح آئی، پھر منہ میں روح، ایسے آہستہ آہستہ چلتے چلتے سارے بدن کے اندر روح پیدا ہو گئی۔ جیسے روح چلتی گئی ویسے گوشت بھی بنتا گیا، ہڈیاں بھی بنتی گئیں اور ہر چیز اپنے مقام پر بنتی گئی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۵، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُوا۟ لِـَٔادَمَ]

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ یہ اللہ کا نظام ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو روح اعلیٰ جانب سے داخل کی گئی، یعنی اوپر سے داخل کی گئی، لیکن جب آدمی پر موت آتی ہے تو روح نیچے سے نکالی جاتی ہے۔ پہلے پاؤں جواب دیں گے، پھر پنڈلیاں جواب دیں گی، اسی طرح نیچے کا حصہ جواب دے گا۔ اور اسی طرح کرتے کرتے آنکھوں سے اور سر سے روح نکل گئی اور آخر کار انسان ختم ہو گیا، کیونکہ جب آدمی پر موت آتی ہے ﴿وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝۲۹﴾ [القیامۃ: ۲۹] پنڈلی پنڈلی سے ٹکرا رہی ہے، پاؤں حرکت کرنا چھوڑ گئے، دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے، آدھا بدن ٹھنڈا ہو گیا ہے۔

اس لیے قاعدہ ہوتا ہے کہ اگر موت کے قریب ہے تو جب اس پر موت آجائے تو اس کی آنکھوں کو بند کر دیں، کیونکہ جب آنکھیں کھلی ہوں اور روح نکل جائے تو اب وہ بے چارہ کیسے آنکھیں بند کرے؟ روح تو پرواز کر گئی اور جس حالت میں آدمی پڑا ہے اس حالت میں پڑا رہے گا، کیونکہ اب وہ حرکت تو کر نہیں سکتا۔

اس لیے حکم ہوتا ہے کہ جو اس کے قریب بیٹھے ہوں وہ اس کی ٹانگوں کو بھی سیدھا کر دیں، کیونکہ اگر یوں ہی رہ گئیں تو یوں ہی اکڑ جائیں گی، لیکن چونکہ اس وقت ان کے اندر سے روح تازہ نکلی ہوتی ہے تو بدن میں گرمی اور حرارت موجود ہوتی ہے، لہٰذا حکم ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ بھی سیدھے کر دیں، پاؤں بھی سیدھے کر دیں، رخ بھی قبلے کی طرف کر دیں اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اچھی طرح بند کر دیں اور اگر باندھ دیں تو اور اچھی بات ہے، تاکہ منہ کھلا ہوا نہ رہ جائے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پٹی باندھ دیتے ہیں، کیونکہ اگر منہ کھلا ہوا ہے تو پھر وہ خود تو منہ بند کر نہیں سکتا، وہ تو اس دنیا سے چلا گیا۔

ہمارے ہاں جاہلیت میں رواج بن گیا ہے، لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ اگر آنکھیں کھلی ہوں تو کہتے ہیں کہ

بیٹے کا انتظار کر رہا ہے، باپ کا انتظار کر رہا ہے اور بھائی کا انتظار کر رہا ہے۔ دیکھا نہیں کہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور دروازے کی طرف نظر ہے؟ اس کی روح جب ختم ہو گئی تو مٹی کا وہ انتظار کر رہا ہے۔ باتیں تو اس وقت تک ہیں جب تک روح اندر ہے۔ جب روح پرواز کر گئی تو بات ختم ہو گئی۔ کہاں کا بیٹا؟ کہاں کا بھائی؟ وہ تو قصہ ہی ختم ہو گیا۔ پھر آدمی کو کیا پتہ کہ کس نے آنا ہے اور کس نے نہیں آنا ہے؟

تو اس لیے روح جب نکالی جاتی ہے تو نیچے سے نکالی جاتی ہے اور جب ڈالی گئی تو اوپر سے ڈالی گئی ہے۔ جب آدمی کی روح نکل جاتی ہے تو وہ چیزیں اس کے سامنے ہیں۔ اگر اللہ کا صالح بندہ ہے تو اللہ کے ملائکۃ الرحمۃ اس کے سامنے ہوتے ہیں، ان پر وہ نظریں لگائے ہوئے ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے اگر برا آدمی ہوتا ہے تو عذاب والے فرشتے آئے ہوتے ہیں، ان پر اس کی نظریں ہوتی ہیں۔ اس لیے حکم ہوتا ہے کہ اب اس کی آنکھیں بند کر دیں، کیونکہ جب روح نکل جائے تو آدمی کے پلے میں کچھ نہیں رہتا۔ اسی طرح آنکھیں کھلی رہیں گی، جہاں بازو پڑا ہے پڑا رہے گا، جہاں ہاتھ مڑے ہوئے ہیں تو مڑے رہیں گے اور اگر سیدھے کر دیں تو آسانی ہو جائے گی غسل میں، تدفین میں اور تجہیز میں، کیونکہ اسلام نے جن جن چیزوں کا حکم دیا ہے اس کے اندر کروڑوں حکمتیں ہیں۔

اب دیکھیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: انسان کی جب قبر بناؤ تو قبر بہت زیادہ گہری بھی نہ ہو اور بہت زیادہ اونچی بھی نہ ہو۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ چار اور پانچ فٹ کے درمیان ہو، اس سے زیادہ نیچے نہ لے جائیں۔ اور تین چار فٹ سے زیادہ چوڑی نہ ہو، اسی طرح سات آٹھ فٹ لمبی ہونی چاہیے۔ تو اس کے اندر کروڑوں حکمتیں ہیں۔ میں آج ہی پڑھ رہا تھا، جدید تحقیق آئی ہے کہ اگر آدمی کو زمین میں دو یا تین فٹ نیچے رکھا جائے تو زمین کے اثرات اس پر زیادہ جاتے ہیں اور اس کے بدن کے اثرات مٹی سے باہر بھی آتے ہیں اور جانوروں کو بھی اس کی ہوا پہنچ جاتی ہے اور جانور بھی اس کو نکال سکتے ہیں۔ اور اگر آپ اسے چھ فٹ سے زیادہ نیچے لے جائیں تو نیچے جو پانی کے اثرات ہیں وہ قبر میں جلدی آ جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے مردے پر اثرات پیدا ہوتے ہیں، لیکن اگر آپ اسے چار پانچ فٹ کی سطح پر رکھیں گے تو نہ اس کے اثرات باہر جائیں گے اور نیچے متاثر ہوں گے۔ تو اب حضور ﷺ نے تو چودہ سو سال پہلے ہمیں یہ بات سمجھا دی تھی، انہوں نے تو اب طبقات الارض پر بحث کی ہے کہ زمین کی تہیں کتنی ہیں؟ زمین کی گہرائی کے اثرات کتنے ہیں؟ کہاں تک جراثیم کا اثر جاتا ہے؟ کہاں تک زمین کے اثرات نہیں جاتے؟ اور نیچے پانی کی سطح کہاں تک آ کر اس کو متاثر کرتی ہے اور کہاں تک نہیں کرتی؟ مختلف علاقوں کی مختلف زمینیں ہیں۔

اس لیے پھر حضور ﷺ نے ہمیں قبر کی تعلیم دے دی کہ ایک لحد ہے اور ایک شق ہے۔ یعنی ایک تو یہ ہے کہ اسی طرح آپ قبر کھودیں اور مردے کو نیچے زمین پر رکھ دیں اور ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ قبر کی دیوار میں کھدائی کر کے پھر میت کے لیے ایک جگہ بنائیں، پھر میت کو اس کے اندر رکھا جائے۔ تو یہ دونوں حکمتیں تھیں، کیونکہ زمینیں مختلف ہیں۔ بعض زمینیں ایسی ہیں کہ آپ اس میں لحد بنا ہی نہیں سکتے۔ اگر لحد بنائیں گے تو ٹوٹ جائے گی تو وہاں آپ شق کا فائدہ لے لیں گے اور جہاں آپ کو زمین بڑی اچھی ملتی ہے، اعلیٰ مٹی ہوتی ہے کہ آپ اس کو جہاں کھود کر کھڑا کر دیں تو ایسے کھڑی ہے جیسے سیمنٹ کھڑی ہوتی ہے تو اس میں آپ لحد بنائیں۔ تو بہر حال اب چودہ سو سال کے بعد جدید علوم بھی تحقیق کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے جو چودہ سو سال پہلے محمد عربی ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا، یعنی حیرت ہوتی ہے!!

سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی بیماری بتلا دینا معجزۂ رسول ﷺ ہے:

آج اسی طرح میں ایک حدیث مبارک پڑھ رہا تھا۔ ایک صحابی حضرت سعید رضی اللہ عنہ ایک دفعہ بیمار ہوئے، ان کو شدید تکلیف ہوئی...... حضور ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ جب انہیں کسی صحابی کی بیماری کا پتہ چلتا تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔ عیادتِ مریض سنت رسول ﷺ ہے، اس کے اندر بڑا اجر و ثواب ہے...... حضور ﷺ تشریف لے گئے تو وہ صحابی فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ میرے پاس آئے، میرے قریب بیٹھے اور آپ نے میری تسلی کے کلمات بھی فرمائے۔ اس کے بعد اپنا دایاں ہاتھ میرے دل والی جگہ پر رکھا اور اس کے بعد فرمایا کہ تمہیں دل کی تکلیف ہے۔ اور فرمایا کہ حارث بن کلدہ طائف میں بنوثقیف کے اندر طبیب ہے، اس کے پاس جا کر تم علاج کرواؤ۔ صحابی فرماتے ہیں کہ بہت اچھا! حضور میں جاتا ہوں۔ حارث بن کلدہ اس زمانے میں بڑا طبیب تھا، وہ حضرت معاویہ کے زمانے تک رہا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تم حارث کے پاس جاؤ تو اس کو یہ بھی بتلا دینا کہ وہ تمہیں عجوہ کھجور بھی کھلایا کرے، اس کی گٹھلیاں نکال کر سات کھجوریں تم کو کھلایا کرے۔

[سنن أبي داود، حديث: ٣٨٧٥، باب: فِي تَمْرَةِ الْعَجْوَةِ]

یعنی چودہ سو سال پہلے جبکہ نہ کوئی ای سی جی تھا، نہ اس وقت تک کوئی ایکو مشینیں بنیں تھیں اور نہ اس وقت اسکوپ آئے تھے۔ بس ہاتھ رکھا اور فرما دیا کہ دل خراب ہے۔ یہ معجزہ ہے۔ اور ایک یہ بھی ہے کہ ہاتھ رکھنے کے بعد دل کی حرکات سے معلوم کر لینا کہ اس کی حرکت درست کام نہیں کر رہی؟ اور اس کے بعد پھر علاج بھی تجویز کر دیا۔

عجوہ کھجور کی برکات اور فوائد:

حضور ﷺ پر اللہ کے کروڑوں صلوۃ وسلام ہوں۔ آج دنیا اس تحقیق پر پہنچی ہے کہ عجوہ کھجور بہترین ٹانک ہے۔ کھجور کے اندر بڑی قوتیں ہیں اور بڑے فوائد ہیں۔ میں نے خود ایک آدمی کو دیکھا تھا، پتہ نہیں زندہ ہے یا نہیں ہے، میرے خیال میں وہ اس زمانہ میں پولیس میں افسر تھے، چھوٹے چھوٹے تھے...... ماشاء اللہ...... ان کی بڑی عمر تھی، ریٹائرڈ ہو گئے اور پنشن ہو گئی۔ پھر بھی میں نے ان کو دیکھا، اس وقت بھی ان کی صحت بڑی ٹھیک ٹھاک تھی۔ میں نے ان سے ایک دفعہ پوچھا: ماشاء اللہ آپ کی صحت اسی طرح ہے، عمر کا اثر آپ پر نہیں آتا؟ اس نے کہا: ہم تو ساری زندگی ایک ایسے محکمے میں رہے اس میں جہنم کے سوا اور کچھ بنتا نہیں، لیکن حضور ﷺ کی ایک حدیث مبارک پڑھی تھی اس کو میں نے زندگی میں نہیں چھوڑا۔ میں نے کہا: فرمائیں۔ اس نے کہا کہ میں نے کھجور کے بارے میں حضور ﷺ کی ایک حدیث مبارک پڑھی تھی اور میں نے اپنی زندگی کا معمول بنالیا ہے کہ رات کو میں کھانا کھاتا ہی نہیں ہوں، میں سات دانے کھجور کے لے کر کھالیتا ہوں اور اس کے اوپر ایک گلاس دودھ کا پی لیتا ہوں...... الحمد للہ...... آج تک مجھے کوئی کمزوری قریب نہیں آئی، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے۔

شہد سے شوگر کے علاج کا واقعہ:

اسی طرح دو تین سال پہلے کی بات ہے۔ ایک ڈاکٹر صاحب کا جماعت کے ساتھ تعلق ہے، بہت سادہ اور اللہ والے آدمی ہیں، انہوں نے مجھے ناشتے پر بلالیا۔ میں ان کے پاس گیا تو وہاں ایک آدمی...... ماشاء اللہ...... وہ بھی بڑے پڑھے لکھوں میں سے تھے، کسی ملک کے اندر سفیر کے عہدے پر رہے، انہوں نے کہا کہ مجھے شوگر کی تکلیف تھی، میں نے پہلے خبر نہیں رکھی اور جب میں نے چیک اپ کرایا تو شوگر بالکل آخری درجوں پر پہنچی ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ یہ چھوڑ دو اور یہ چھوڑ دو، یہ گولی کھاؤ اور یہ انجکشن لگواؤ اور یہ کرو، میں گھر آیا اور میں نے کہا کہ کچھ بھی نہیں کرنا، نہ انجکشن نہ گولی اور نہ کچھ اور، حضور ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے کہ پیدل چلا کرو۔ اس نے کہا کہ ایک تو میں نے اس حدیث پر فوراً عمل شروع کر دیا کہ پیدل چلو۔ تو صبح اٹھا اور ایک دو کلومیٹر پیدل چلا۔ بس اس وقت پہنچا جب فجر کی نماز کھڑی ہو رہی ہے۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اور گھر آ گیا۔ دوسرا میں نے ناشتہ میں اور شام کے کھانے میں شہد کا کھانا لازم قرار دے دیا کہ میں شہد ضرور کھاؤں گا، چاہے ایک چمچ کھالوں۔ اور اس نے کہا کہ میں نے بیس پچیس دن کے بعد جا کر ڈاکٹروں کا چیک اپ کرایا تو انہوں نے کہا کہ تم تو بالکل نارمل ہو گئے

ہو،تم کون سی دوائی کھا رہے ہو؟ میں نے کہا: شہد کھا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا: شہد تو میٹھی چیز ہے، تم اس کے ساتھ کیسے علاج کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ میں تو بس اس کے ساتھ علاج کر رہا ہوں، میرے پاس ایک ہی دلیل ہے کہ قرآن نے کہا کہ شفاء ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ شفاء ہے اور پیٹ کی بیماریوں میں حضور پاک ﷺ نے شہد دی ہے، لہٰذا میں بس اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں نے شہد شروع کر دی اور اللہ نے مجھے شفاء دی ہے، بس میں تو گولی نہیں کھاتا، بس یہی شہد آپ کے سامنے کھا رہا ہوں اور اب بھی مجھے آپ چیک کروالیں میری شوگر نارمل ہے، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔

یہ ایمان کی بات ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ایمانِ کامل نصیب فرمائیں اور اتباعِ سنت رسول پاک ﷺ نصیب فرمائیں۔

واقعہ:

پرانی بات ہے، حضرت شاہ جی رحمہ اللہ زندہ تھے۔ ایک وزیر شاہ جی کی خدمت میں ملنے کے لیے آئے کہ حضرت! آپ ووٹوں میں ہماری امداد فرمائیں اور ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر اللہ نے ہمیں کامیاب کر دیا تو اسلام کے لیے جتنا ہوگا ہم کوشش کریں گے۔ شاہ جی سنتے رہے اور اس کے بعد مسکرا دیے! فرمایا: بابو! تم اپنے اس چار فٹ کے بدن پر اسلام نافذ نہیں کرتے ہو تو پورے ملک میں کیسے اسلام نافذ کرو گے؟ اپنے گھر میں اپنی بیوی پر اور بیٹی پر بہو پر تو نافذ نہیں کر سکتے تو باہر کیا کریں گے؟

حضرت مدنی رحمہ اللہ کا اپنے شیخ کے ساتھ ادب کا واقعہ:

حضرت مدنی رحمہ اللہ تھے، جبکہ ادب کا یہ عالم تھا کہ حضرت کے بال جب گر جاتے تو اکٹھے کرتے رہتے اور لفافے میں رکھتے رہتے اور حضرت کی خدمت میں بھیجے کہ میں اپنے شیخ کی کوئی خدمت تو کر نہیں سکتا، یہ میرے سر کے بال اور چہرے کے بال ہیں ان سے جوتے سلوالیں، تاکہ کم از کم آپ کے جوتے میں تو رہوں۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، یہ عشق کی بات ہے، یہ ادب کا مقام تھا۔

انسان جلد باز کیوں ہے؟

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب آدم علیہ السلام کو ناف تک روح آئی تو آپ نے دیکھا تو آپ کو بڑا اچھا لگا کہ ہاتھ میں

بھی ہے تو جلدی سے اٹھنے لگے، تو کیسے اٹھتے؟ نیچے تو ابھی روح آئی نہیں تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ﴾ [الانبیاء: ۳۷]

انسان کو پیدا ہی جلد باز کیا گیا ہے، ابھی روح مکمل نہیں ہوئی اور حضرت اٹھنے پر تیار ہو گئے...... یہ اللہ تعالیٰ نے بطور فخر کے فرمایا کہ اگر خوشی آئے تو سنبھال نہیں سکتا، دکھ آئے تو صبر نہیں کر سکتا، دولت ملے تو فرعون اور قارون بن جاتا ہے اور غریب بنے تو کیمونسٹ بن جاتا ہے۔ یعنی اگر دولت آئے تو فرعون بن جاتا ہے کہ پدرم سلطان بود کہ باپ بھی ایسا تھا، دادا بھی ایسا تھا اور پردادا بھی ایسا تھا اور اگر نہ ملے اور بھوکا مرنے لگے تو کہتا ہے کہ اچھا خدا ہے! ان کافروں کو دیا اور ہمیں نہیں دیا، ہم بھوکے مر رہے ہیں۔ چلو جی خدا کو چھوڑو، ہم خدا کو مانتے ہی نہیں ہیں...... نعوذ باللہ...... اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فخر فرمایا...... جب روح مکمل ہوئی تو حضرت آدم علیہ السلام کو چھینک آئی تو کہا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" اللہ نے الہام کیا کہ چھینک آئے تو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" کہنا ہے۔ جب آدم علیہ السلام نے اللہ کا شکر ادا کیا تو انہوں نے فرمایا: اے آدم! تجھ پر اللہ رحم کرے، تو کتنا خوش نصیب ہے کہ ہم میں سے کسی کو چھینک آئے تو کہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" اور سننے والا کہے "يَرْحَمُكَ اللّٰهُ"۔ پھر چھینکنے والا کہے "يَهْدِيْنَا وَ يَهْدِيْكُمُ اللّٰهُ" لیکن تو شان والا نبی اور خلیفہ ہے، جس کو اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں: اللہ تجھ پر رحم کرے۔

پھر آگے اس روایت میں ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو حکم دیا جو صرف ابلیس کے ساتھ گئے تھے جنات پر کنٹرول کرنے کے لیے اور جنہوں نے کہا تھا:

﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۳۰]

تو ان کو کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ سب ملائکہ نے سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے انکار کیا اور تکبر کیا، کیونکہ اس کے دل میں بڑائی اور غرور آ چکا تھا۔ ابلیس نے کہا: میں تو سجدہ نہیں کرتا، کیونکہ میں بڑا ہوں اور یہ آدم چھوٹا ہے، کیونکہ میں تو پہلے پیدا ہوا ہوں اور یہ تو ابھی پیدا ہوا ہے، لہٰذا بطور عمر کے میں بڑا ہوں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ میں بطور خلقت کے اس سے زیادہ قوت والا ہوں۔ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا اور اس

کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور آگ مٹی سے زیادہ قوت رکھتی ہے۔ جب ابلیس نے انکار کیا کہ آدم کو سجدہ کرے تو اللہ نے ابلیس کو بھی ہر خیر سے اور بھلائی سے دور کر دیا۔ ابلیس ابلس سے ہے، یعنی اس کو بعد کر دیا گیا، اس کو مایوس کر دیا گیا، خیر سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو شیطان، مردود، مرجوم اور ملعون بنایا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۵، البقرة الآية: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا...]

اور اللہ نے اس کو مردود اس لیے بنایا کہ اس نے جو گناہ کیا جو نافرمانی کی، چونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو ایسی سزا نہیں دیتے جب تک کہ وہ نافرمانی نہ کرے، اللہ کا عذاب نہیں آتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ﴾ [القصص: ۵۹]

''ہم کسی بستی والوں پر ہلاکت نازل نہیں کرتے جب تک کہ وہ ظلم نہ کریں۔''

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا: ہم اس بستی پر عذاب نہیں کرتے اگر بستی والے اسلام کے ساتھ رہیں اور اطاعت و فرمانبرداری کرتے رہیں۔

گزشتہ باتوں پر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تنقید:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سیاق کے ساتھ ہم نے جو واقعہ نقل کیا ہے اس کے اندر غرابت ہے اور اس کے اندر بہت ساری چیزیں ایسی آئیں جو قابل بحث ہیں۔ اگر ایک ایک چیز پر ہم بحث کریں تو بات لمبی ہو جائے گی، چونکہ اس کو بعض مشہور مفسرین نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی نسبت سے نقل کیا ہے تو ہم نے بھی علوم میں اضافہ کے لیے اس کو نقل تو کر دیا، وگرنہ اس کے اندر بہت ساری چیزیں قابل اعتراض بھی ہیں اور قابل بحث بھی ہیں...... وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ وَعِلْمُهُ أَتَمُّ......

نکات:

اب مفسر ایک اور روایت نقل فرماتے ہیں جو انہوں نے حضرت ابن عباس، حضرت مرہ، حضرت ابن مسعود اور بہت سارے صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کی ہے کہ جب اللہ نے تمام مخلوق کو پیدا فرما دیا، زمین پیدا فرما دی، آسمان پیدا فرما دیے اور تمام مخلوقات پیدا فرما دیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ابلیس کی ڈیوٹی لگائی گئی آسمان دنیا پر اور یہ ابلیس ملائکہ کے قبیلے سے جن کو جن کہا جاتا تھا، یعنی پہلے آپ نے یہ قول پڑھا تھا کہ کچھ ملائکہ ایسے ہیں جن کو اللہ نے آگ

سے پیدا کیا۔ اب یہ دوسرا قول ہے کہ ملائکہ میں سے ہے اور ان ملائکہ کو جن کہا جاتا ہے۔ اور انہیں جن اس لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی ''هُمْ خَزَانُ الْجَنَّةِ'' کہ وہ جنت کے داروغہ ہیں اور جنت کے نگہبان ہیں، اس لیے ان کو جن کہا جاتا ہے۔

ویسے جن کا معنی ہے کہ ایسی چیز جو چھپی ہوئی ہو، یعنی میں پردے میں ہو، اندھیرے میں ہو۔ علماء نے لکھا ہے کہ جنات کا وجود عام طور پر ہم سے چھپا ہوا ہے، نظر نہیں آتا اور اس طرح اگر وہ کسی ہیئت میں بھی آئیں تو ان کے بدن پر بال اتنے ہوتے ہیں کہ وہ بالوں میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور بشر کو بشر اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی چیزیں کھلی ہوئی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو جسم کے ایسے حصے عطا فرمائے ہیں جو کھلے ہوئے ہیں اور واضح ہیں اور اس کے خطوط نظر آنے والے ہیں۔ تو ایک قول میں یہ بھی آیا کہ ابلیس کو آسمانِ دنیا پر ڈیوٹی دی گئی کہ تمہاری یہاں خدمات ہیں، اس لیے اس کے دل کے اندر ایک تکبر پیدا ہو گیا کہ میں شاید کوئی بڑی چیز ہوں تو اس لیے میری اتنی بڑی ڈیوٹی لگائی گئی ہے، میرے اندر کوئی ایسی بات ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۶، البقرة، الآیة: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ]

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ اگر آدمی کو اللہ جمال عطا فرمائیں تو پھر بھی تکبر نہ کرے، کیونکہ خدا جو جمال دینے والا ہے وہ چھیننے پر قادر بھی ہے۔ کتنے خوبصورت لوگ ہیں! بیماری آئی اور دیکھنے کے قابل بھی نہ رہے۔ اس لیے جمال ایک فانی چیز ہے۔

لڑکی کے جمال کو دیکھ کر محبت کرنے والے کا واقعہ:

جیسا کہ لکھا ہے کہ ایک شخص کو کسی لڑکی سے عشق ہو گیا اور وہ پڑھنا بھی بھول گیا، ہر چیز بھول گیا، بس اس کا حسن یاد رہا۔ تو اس لڑکی کو بھی بڑی سمجھ تھی، اس نے یوں کیا کہ کسی طبیب سے جا کر ایک دوالی جو پیٹ چلانے والی ہو اور دست آور ہو۔ اس نے جب وہ دوائی لی تو اسہال لگے تو وہ تین دن میں ہی اب لڑکی کا رنگ بدل گیا...... اللہ معاف کرے! انسان کو جب اسہال لگ جائیں اور آدمی کے بدن سے نمک کم ہو جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ آدمی چل نہیں سکتا، کھڑا نہیں ہو سکتا، اٹھ بھی نہیں سکتا...... اب کچھ دنوں کے بعد اس لڑکے نے دیکھا تو حیران ہو گیا! تو اس لڑکی نے بلایا اور کہا کہ تمہارا وہ عشق کدھر گیا؟ اس نے کہا: تم اس بات کے عاشق تھے، جاؤ اس ڈبے میں گند بھرا

ہوا ہے، اس کو لے لو، تم اسی بات کے عاشق تھے کہ جب تک میرے اندر یہ گندگی کھڑی تھی تو عشق تھا، وہ گندگی نکل گئی تو تمہارا عشق بھی ہوا ہو گیا۔ تو اس لیے آدمی کو اگر جمال ملے تو شکر کرے کہ اللہ نے انسان بنایا۔

تخلیقِ آدم علیہ السلام کے وقت مٹی کی پناہ:

اللہ پاک نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ زمین سے جا کر مٹی لے آئیں۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام زمین سے مٹی لینے کے لیے آئے تو زمین نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتی ہوں تم سے کہ تم مجھے اٹھانے کے بعد نقصان پہنچاؤ (جتنا اٹھاؤ گے تو مٹی کم ہو گئی) یا مجھے اس لیے اٹھاؤ کہ مجھے عیب دار کر دو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام چلے گئے اور نہ اٹھایا۔ اور عرض کیا: اے اللہ! زمین نے آپ کے نام سے پناہ پکڑ لی ہے تو میں نے نہیں اٹھایا، میں نے اس کو پناہ دے دی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت میکائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم جاؤ اور مٹی اٹھا کے لے آؤ۔ میکائیل نے بھی نہیں اٹھائی اور واپس چلے گئے اور وہی بات عرض کی۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو حکم دیا کہ جاؤ اور مٹی لے کر آؤ۔ ملک الموت جب آئے تو زمین نے کہا: میں پناہ پکڑتی ہوں اللہ کے نام سے، مجھے نہ اٹھاؤ۔ ملک الموت نے کہا کہ میں بھی پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے نام سے کہ اللہ حکم دیں اور میں تعمیل نہ کروں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم پناہ پکڑتی ہو تو میں بھی پناہ پکڑتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا تو انہوں نے مٹی کو ایک جگہ سے نہ اٹھایا بلکہ کئی جگہوں سے مٹی اٹھائی۔ کہیں مٹی کا رنگ سرخ تھا، کہیں مٹی کا رنگ سفید تھا اور کہیں سیاہ تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۷۶/۱، البقرة، الآیة: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ]

لوگوں کی رنگت مختلف ہونے کی وجہ:

یہی وجہ ہے کہ ہماری اصل مٹی سے ہے اور مٹی مختلف ہے: کہیں سفید ہے، کہیں لال ہے، کہیں سیاہ ہے، کہیں زیادہ سرخ، کہیں سفیدی سرخی ملی ہوئی ہے اور کہیں سیاہی سفید ملی ہوئی ہے۔ اسی لیے اللہ نے آدم علیہ السلام کی اولاد میں بھی مختلف رنگ رکھے ہیں۔ کہیں کوئی رنگ ہے اور کہیں کوئی رنگ ہے۔ ایک وجہ یہ ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارے اصحاب میں چونکہ اختلاف ہے، وہ اختلاف پھر نسل میں آئے گا ذریت میں بھی آئے گا۔ مثلاً: یوں دیکھیں کہ جو لوگ کالے ہیں تو ان کی اولادیں بھی کالی ہوتی ہیں اور جو لوگ گورے ہیں تو ان کی اولادیں بھی گوری ہوتی ہیں، اسی طرح اگر عورت کا رنگ سفید ہے اور مرد کا سیاہ ہے تو اولاد متوسط قسم کی ہوتی ہے۔

اسی طرح اختلاف باعتبار موسم کے بھی ہوتا ہے کہ ٹھنڈے علاقے میں اکثر گورے ہوتے ہیں، جہاں بالکل گرمی پڑتی

ہے تو وہاں لوگ سیاہ ہوتے ہیں اور جہاں گرمی بھی ہے اور سردی بھی ہے وہاں گندم گوں ہوتے ہیں۔ کبھی چھ مہینے سردی ہے اور چھ مہینے گرمی ہے تو ایک وجہ اختلاف موسم بھی ہوتا ہے۔

اور اس اختلاف کی ایک اصل وجہ بھی ہے۔ بنیادی طور پر مٹی میں اختلاف آیا تو وہ بھی اپنی جگہ اثر انداز ہوتا ہے۔ تو اس لیے کوئی یہ نہ کہے کہ یورپ میں تو سب سفید ہوتے ہیں، سارے لوگ گورے چٹے ہوتے ہیں اور جتنے کافروں کے ملک ہیں خدا کی قدرت ہے سارے ٹھنڈے ہیں، وہاں اکثر لوگ گورے ہوتے ہیں، جیسے ہمارے ہاں جو ٹھنڈے علاقے ہیں وہاں لوگ سفید رنگ کے ہوتے ہیں، جو گرم علاقے ہیں وہاں کے لوگ سیاہی مائل ہوتے ہیں۔ تو بہرحال ایک وجہ یہ ذکر کی گئی ہے۔

جب اس مٹی میں پانی ڈالا گیا تو وہ "طِينٍ لَّازِبٍ" بن گئی۔ "لَازِب" کا معنی ہے ایک دوسرے کو چپکنے والی۔

اس کے بعد اللہ نے ملائکہ سے فرمایا:

﴿إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ ۝ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ۝﴾ [ص: ۷۱، ۷۲]

"میں ایک بشر پیدا کروں گا مٹی سے۔ جب میں اس کو بنا لوں اور اس میں روح پھونک دوں پس تم اس کے آگے سجدے میں گر پڑو۔"

تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ہاتھ مبارک سے پیدا فرمایا، جیسا اس کو اس کو ہاتھ زیبا ہے، تا کہ ابلیس تکبر نہ کر سکے، تا کہ اللہ پاک اس کو فرما سکیں کہ تم کیسے تکبر کرتے ہو اس انسان سے جس کو میں نے تقریباً چالیس سال کی مدت میں پیدا کیا؟ حضرت آدم علیہ السلام دھڑ کی شکل میں رہے، یعنی ان میں روح نہ پھونکا گیا۔ ملائکہ گزرتے تو ڈرتے کہ خدا جانے یہ کیا چیز ہے؟ اور سب سے زیادہ ڈرنے والا ابلیس تھا کہ پتہ نہیں یہ کیا چیز پیدا ہو رہی ہے؟ اور اس کے بعد ابلیس جب اس کو دیکھتا اور اس کو چھیڑتا تو اس کے اندر سے آواز پیدا ہوتی، جیسے پکی اینٹ سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر بھی فرمایا:

﴿خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝﴾ [الرحمٰن: ۱۴]

تو وہ ابلیس کہتا کہ پتہ نہیں کہ یہ کس چیز کے لیے پیدا ہوا؟ منہ کی طرف سے ابلیس داخل ہوتا اور نیچے کی طرف سے نکل جاتا اور ملائکہ سے کہنے لگا کہ ڈرو نہیں، یہ کوئی خدا نہیں ہے، یہ اندر سے خالی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: اللہ پاک نے حکم دیا کہ جب اس میں روح پھونکی جائے تو تم اس کو سجدہ کرو۔ جب روح پھونکی گئی، جب سر میں ڈالی گئی اور دماغ نے حرکت کی تو حضرت آدم علیہ السلام کو چھینک آئی تو ملائکہ نے کہا کہ کہو "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" تو انہوں نے کہا کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" اللہ پاک نے جواب میں فرمایا: "یَرْحَمُكَ رَبُّكَ" اور جب آنکھوں میں روح آ گئی، جب آنکھیں کام کرنے لگیں تو جنت کے پھل وغیرہ نظر آنے لگے تو انہوں نے جلدی کی کہ میں جاؤں، تاکہ جنت کے پھل حاصل کرلوں۔ اسی لیے اولاد میں بھی ابھی تک جلدی ہے، اس کے اندر عجلتیں ہیں تو وہ چاہتا ہے کہ ہر بات عجلت کے اندر ہو جائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب حکم کیا تو تمام ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا، انکار کیا اور تکبر کیا ﴿وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ اور تھا کافروں میں سے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم فرمایا: اے ملعون! تم نے کیوں سجدہ نہیں کیا؟ جس کو میں نے اپنے ہاتھو سے پیدا کیا اور میں نے تجھے حکم بھی دیا تھا کہ سجدہ کرو؟ کہنے لگا کہ میں تو اس سے زیادہ بہتر ہوں، بشر کو سجدہ نہیں کرسکتا، میں اس مخلوق کو جو مٹی سے پیدا کی گئی سجدہ نہیں کرسکتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ﴿١٣﴾﴾ [الاعراف: ١٣]

یہ خلاصہ ہے، ورنہ تفصیل بعض آیات میں آتی ہے۔ اس لیے قاعدہ ہوتا ہے کہ قرآن میں کہیں اجمال ہوتا ہے اور کہیں تفصیل ہوتی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷٦، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا...]

اس لیے آدمی بعض اوقات قرآن پڑھتے ہیں تو گھبرا جاتے ہیں کہ وہاں تو آیا کہ پہلے اللہ نے پیدا فرمایا پھر ملائکہ کو حکم ملا اور یہاں ہے کہ جیسے ہی آدم علیہ السلام کو پیدا کروں تو تم سجدے میں گر جاؤ۔ اصل میں ایک جگہ اجمال ہے اور ایک جگہ تفصیل ہے، ایک جگہ اللہ نے واقعات کو کھول کر بیان کیا ہے اور ایک جگہ صرف خلاصے کو ذکر کر دیا۔ تو اس لیے کوئی تعارض نہیں ہوتا۔ جب ساری آیات کو سامنے رکھا جائے تو بات سمجھنا آسان ہو جاتی ہے۔

نکات:

اب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کی تعلیم دی اور پھر اس کے بعد ملائکہ پر پیش کیا:

﴿فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣١﴾﴾ [البقرۃ: ٣١]

تم ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔

انہوں نے عرض کیا:

﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴾[البقرۃ:۳۲]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سدی کی تفسیر کے اندر یہ قول صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن اس کے اندر بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو روایات اسرائیلیہ میں سے داخل کر دی گئیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۶، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ]

غیر مسلم کا اسلام کی تعریف لکھنے کا مقصد:

ایک انگریز نے لکھا کہ اسلام جیسا اعلیٰ دین کوئی نہیں۔ مسلمان بڑے خوش ہو گئے کہ فلاں گبن نے تو بڑا اچھا لکھا ہے، فلاں نے بڑا اچھا لکھا ہے۔ خدا کے بندے! وہ اچھا نہیں لکھتے، وہ تو آپ کو زہر کھلانا چاہتے ہیں، اس زہر کے اوپر انہوں نے شکر لگا دی ہے۔ جیسے کونین کے اوپر شوگر لگا دیتے ہیں کہ کڑوی نہ لگے اور جلدی نگلی جائے، اب اندر تو کونین ہے۔ کوئی عیسائی کبھی آپ کے نبی کی تعریف نہیں کرتا:

﴿وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ﴾[البقرۃ:۱۲۰]

یہود و عیسائی کبھی تمہارے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ اگر اس نے کہیں تعریف کی ہے تو اس کا مقصد تمہیں اپنے قریب کر کے پھر غار ہلاکت میں ڈالنا ہے کہ تمہارے دماغ میں یہ آ جائے کہ کافر ہو کر کتنا سچا لکھتا ہے، یہودی ہو کر کتنی سچی بات لکھی، عیسائی ہو کر اس نے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کیسی شان بیان کی، جبکہ ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک جال ہے۔ جیسے ایک مچھلی کو پھنسانے کے لیے جال کے آگے چھوٹی مچھلی کو لگاتے ہیں۔ مچھلیوں نے مچھلی کو دیکھا، آئیں اور پھنس گئیں۔ ہم نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیان کر رہا ہے قریب آئے تو اس نے برباد کر دیا۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! کبھی کوئی الجھن ہو تو فوراً اہل علم سے رجوع کریں، ایسا نہ ہو کہ آدمی پھر بھٹکتا ہوا چلا جائے۔

مرزا قادیانی اور حکیم نوردین بھیروی:

سب سے بڑا جو قادیانیوں کے گمراہ کرنے کا ذریعہ تھا وہ حکیم نورالدین تھا، وہ بڑا علم والا تھا اور وہ سب سے پہلے مرزا قادیانی بدبخت کا خلیفہ بنا۔ اس کے بعد جب مرزا قادیانی مر گیا تو اس کی اولاد سے اس حکیم کا جھگڑا ہوا، اس

جھگڑے کے بعد وہ بدبخت قادیان سے نکلا اور لاہور پہنچا تو اس نے قادیانی جماعت کے مقابلہ پر لاہوری مرزائی کی ایک نئی بنیاد رکھی۔ ان کا جو احمد علی مرزائی تھا، جس نے تفسیر قرآن بھی لکھی، لاہوری فرقہ کا مرزائی تھا، پھر وہ بھی اسی نور دین کا پیدا کردہ تھا۔ تو یہ اتنے خطرناک لوگ تھے! علامہ اقبال کتنے پڑھے لکھے تھے! اس کی پوری فیملی کو اس نے گھیر لیا تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے! ان کے بھائی کو تو قادیانی بنا دیا اور علامہ صاحب بھی کافی عرصہ تک اس کے چنگل میں رہے اور اس کے دلائل سے متاثر رہے۔ یہ تو اللہ نے کرم فرمایا کہ علامہ صاحب کی حضرت انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی تو ان پر جب حقائق کھلے تو علامہ صاحب کو اللہ پاک نے توفیق دی کہ انہوں نے قادیانیت کے خلاف جہاد کیا۔ پھر ساری زندگی قادیانیت سے ٹکر لی۔ اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں فرمائے۔

اسی لیے حضرت شاہ جی بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میرا بس چلے تو میں شاہ جی کی تقریروں پر پابندی لگا دوں۔ محبت میں فرمایا کہ اتنا بڑا ساحر البیان آدمی، جو دو دو لاکھ کے مجمع پر جادو کر دیتا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ پٹڑی سے اتر گیا تو یہ قوم کو لے ڈوبے گا، پوری قوم برباد ہو جائے گی، کیونکہ انسان ہے۔ اس لیے بڑے بڑے عابد اور بڑے بڑے زاہد راستے سے جب بھٹکتے ہیں تو اللہ پاک رحمت فرمائے پھر بڑی تباہیاں ہوتی ہیں۔

اسی لیے حکم ہوتا ہے کہ علم استاذ سے حاصل کرو اور اگر آپ تزکیہ کی طرف جانا چاہتے ہیں، اگر وہ تصوف جو کتاب وسنت کے مطابق ہے، اس کے اندر جانا چاہتے ہیں تو کسی شیخ کامل کی صحبت اختیار کریں، ورنہ انجام یہ ہوگا کہ آپ پٹڑی سے اتریں گے تو آپ کو روکنے والا کوئی نہیں ہوگا، آپ کا راستہ بدلنے والا کوئی نہیں ہوگا، سڑک پر قائم رکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائیں۔ یہاں ہمارے ایک ساتھی تھے، بہت بڑے عبادت گزار تھے۔ اس شخص نے بڑی محنت کی، ریاضت کی اور عبادت کی۔ اللہ کے گھر میں ایک دن اس نے مجھے کچھ باتیں سنائیں تو میں نے کہا کہ مہربانی کریں! معلوم ہوتا ہے کہ آپ پٹڑی سے اتر رہے ہیں، کسی شیخ کی خدمت میں جائیں، کسی عالم کی صحبت اختیار کریں اور ان کی نگرانی میں رہیں۔ کہنے لگے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا کہ ایسی بات ہے، آپ کی باتوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ تھوڑا تھوڑا ہٹ رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں تو۔ کچھ دن گزرے تو وہ اپنی راہ پر

آ گیا کہ میں رات بدر گیا تھا اور اصحاب بدر مجھے ملنے کے لیے آئے تھے، فلاں جگہ گیا تو فلاں بزرگ قبر سے نکل کر مجھے ملنے کے لیے آ گئے۔ بس وہ بے چارہ گیا۔

ابلیس کا تعارف:

ایک روایت مبارک میں آیا کہ ابلیس کا نام عزازیل تھا اور یہ بڑے شرف والے فرشتوں میں سے تھا اور ان فرشتوں میں سے تھا جس کو اللہ نے چار پر عطا فرمائے تھے، یعنی بعض ملائکہ کے ہزار پر بھی ہوتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۷، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ]

اور اسی طرح بعینہٖ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے خواب میں دکھایا گیا کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام دو فرشتے...... جو انسانوں کی شکل میں تھے...... ان پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ طواف کر رہے ہیں۔

دجال مکہ میں:

اور اسی طرح ایک روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ دجال بھی طواف کر رہا ہے تو اب اس میں اشکال یہ پیدا ہوتا تھا کہ دجال کیسے طواف کر رہا ہے؟ دجال کا تو حرم میں داخلہ ہی بند ہے۔ تمام دنیا پر دجال پھرے گا، تمام زمین پر دجال اپنی قوت استدراجیہ سے پوری زمین پر گھوم لے گا، لیکن یہ جو دو مقام ہیں، اللہ نے ان کو عظمت بخشی ہے: حرم مکہ اور حرم مدینہ کہ ان کے اندر دجال داخل نہیں ہو سکے گا[1]۔ ایک حدیث مبارک میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حرمین شریفین کی حدود پر فرشتوں کا پہرہ لگا دیں گے۔ دجال اگر داخل ہونے کی کوشش کرے گا تو فرشتے اس کو دھکیل دیں گے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۱۸۸۱، باب: لَا يَدْخُلُ الدَّجَّالُ الْمَدِينَةَ] تو پھر یہ کیسے ہوا کہ دجال طواف کر رہا تھا؟ اس میں بھی یہی ہے کہ اس میں کچھ اس قسم کی علامات ابھی تھیں کہ اس کے بارے میں شبہ ہوتا تھا کہ آیا یہ دجال ہو۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ دجال حرمین میں داخل نہیں ہو گا۔ جب وہ دجالیت کا دعویٰ کرے گا...... نعوذ باللہ...... خدائی کا دعویٰ کرے گا، اپنی حدود سے تجاوز کرے گا تو دجال بنے گا۔ تو دجالیت سے پہلے تو کوئی دجال نہیں ہے۔ اب جب دجالیت کا دعویٰ کرے گا تو پھر حرمین شریفین میں داخل نہیں ہو سکے گا، ورنہ اس سے پہلے وہ داخل ہو تو کوئی اشکال اور مشکل نہیں۔ [المنہاج شرح صحیح مسلم: ۱۸/ ۴۹۲]

[1] [الجامع الصغیر السیوطی، حدیث: ۴۲۵۲]

مرزا قادیانی مسلمانوں میں:

مثال کے طور پر جیسے قادیانی تھا۔ جب تک اس نے نبوت کا دعویٰ نہ کیا اس وقت تک تو علماء بھی اس سے ملتے تھے، بیٹھتے اٹھتے تھے۔ اس نے ابتدائی زندگی میں عیسائیت کے خلاف مناظرے کئے اور کتابیں لکھیں اور ان کتابوں پر تقریظات علماء اہل حدیث نے لکھیں، کیونکہ اس وقت وہ بدبخت مرزائی تو نہیں تھا، اس وقت تو اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اتفاق یہ ہوگیا کہ اس کو عیسائیت کے خلاف جب شہرت ملی، حالانکہ یہ بھی دراصل انگریزوں کی ایک سازش تھی۔ انہوں نے یہ مناظرے خود کروائے تھے، لیکن عام مسلمانوں کو پتہ نہیں چلتا تھا، تاکہ اس کی دنیا میں شہرت ہو جائے کہ یہ انگریزوں کا بڑا دشمن ہے، نصرانیوں کا بڑا مخالف ہے اور عیسائیوں کا بڑا مخالف ہے۔ اور جب اس کی شہرت ہوگئی تو اب انگریزوں نے اس سے کام لیا کہ اس سے نبوت کا دعویٰ کراؤ اور مسلمانوں کے اندر دو ٹکڑے کرو، کیونکہ ان کی یہ تحقیق تھی اور ان کی یہ رپورٹ تھی کہ یہ جو ہندوستان کا علاقہ ہے یہ بڑا مذہبی علاقہ ہے اور اس پر مذہب کے بڑے اثرات ہیں کہ آدم علیہ السلام کو یہاں اتارا گیا اور پھر نوح علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے، ان کی اولادیں وہاں تشریف لے گئیں۔ تو اس وجہ سے ایک مذہبی اثرات کا حامل علاقہ قرار دیا گیا اور آپ دیکھیں کہ کتنے بڑے بڑے لوگ اللہ نے وہاں پیدا کیے!! حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ، حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ اور اسی طرح سید احمد شہید رحمہ اللہ، شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کتنے بڑے خانوادے ہیں۔ اللہ پاک ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ یہ لوگ ہندوستان میں پیدا ہوئے، اسی طرح حضرت نانوتوی رحمہ اللہ، حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ یہ سب بڑے بڑے لوگ وہیں پیدا ہوئے اور بڑا دین کا کام ہوا۔ ان انگریزوں نے یہ سوچا کہ یہاں کوئی مذہبی فتنہ کھڑا کرو، اس پر کنٹرول کرنا بڑا مشکل ہو جائے گا تو انہوں نے نبی پیدا کر دیا۔ اب نبی بننے سے پہلے وہ عام آدمی تھا، ہر بندے کے ساتھ ملتا تھا اور علماء بھی ملتے تھے جلسوں میں جاتے تھے۔

ابلیس فرشتوں میں:

تو اس لیے یاد رکھیں کہ ابلیس لعین نے جب انکار خداوندی کیا تو لعین بنا۔ جب تک اس نے انکار نہیں کیا، وہ چاہے آسمانوں میں رہے، زمین میں رہے، سوال پیدا نہیں ہوسکتا کوئی کہے کہ پہلے کیوں رہتا تھا؟

انسان کو سجدہ جائز نہیں:

اسی طرح فرماتے ہیں کہ ایک روایت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نقل کی گئی۔ وہ حضور ﷺ کے بڑی شان والے صحابی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

((قَدِمْتُ الشَّامَ فَرَأَيْتُهُمْ يَسْجُدُوْنَ لِأَسَاقِفِهِمْ وَ عُلَمَائِهِمْ فَأَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَحَقُّ أَنْ نَسْجُدَ لَكَ فَقَالَ: لَا، لَوْ كُنْتُ اٰمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا مِنْ عِظَمِ حَقِّهِ عَلَيْهَا.))

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۱۸۵۳، باب: حَقِّ الزَّوْجِ عَلَى الْمَرْأَةِ، واللفظ تفسیر ابن کثیر]

جب میں شام آیا تو میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ اپنے پادریوں کو سجدہ کرتے ہیں تو جب واپس آئے تو انہوں نے آکر عرض کیا: اگر لوگ اپنے پادریوں کو اپنے مولویوں کو اپنے پنڈتوں کو سجدے کر رہے ہیں تو حضور! آپ تو سب سے زیادہ اس بات کے حقدار ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں، کیونکہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اللہ کے نبی ہیں، خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں، سید الاولین والاخرین ہیں، اللہ نے آپ کو ہمارا بادشاہ بھی بنایا ہے تو آپ زیادہ حق دار ہیں کہ ہم بھی آپ کو سجدہ کیا کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: خبردار! نہیں۔

تو اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ صحابہ جو حضور ﷺ کو سجدہ کرنا چاہتے تھے وہ سجدہ عبادت والا نہیں تھا، کیونکہ صحابی غیر اللہ کو عبادت کا سجدہ تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ غیر اللہ کا سجدہ تو شرک ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم تو شرک سے نکل کر توحید کے علمبردار بنے ہوئے ہیں تو وہ بھی سجدۂ تعظیم کے لیے کرنا چاہتے تھے، لیکن حضور ﷺ نے فرمایا: خبردار! نہیں۔ اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ کسی کے لیے سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، کیونکہ زوج کا جو زوجہ پر حق ہے خاوند کا عورت پر حق ہے وہ اتنا بڑا حق ہے اتنا بڑا حق ہے کہ اگر تعظیم کی ضرورت ہوتی تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، لیکن فرمایا کہ سجدہ کسی غیر کے لیے، کسی بشر کے لیے اور کسی انسان کے لیے جائز ہی نہیں تو عورت کو بھی حکم نہیں دیا۔

حاکم وقت کی اطاعت:

اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا ''اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ'' ''تم پانچ چیزوں کو پلے باندھ لو۔ سب سے پہلا سبق دیا ''اَلسَّمْعُ وَ الطَّاعَةُ'' جو بھی تمہارا امیر ہو، تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اس کی بات کو سنو اور اطاعت کرو، کیونکہ اگر تم

اطاعت سے خروج کرو گے تو فتنہ وفساد دنیا میں پھیلے گا، کوئی کنٹرول نہیں کر سکے گا۔

[سنن الترمذي، حديث: ٢٨٦٣، باب: ما جاء في مثل الصّلاة...]

خرابیاں اور برائیاں کس میں نہیں ہوتیں، جیسے جیسے ادوار بدلتے جائیں گے، جیسے جیسے ہمارے اعمال بدلتے جائیں گے اسی طرح ہمارے معاملات بدلتے جائیں گے۔ یہ تو ایک فطری بات ہے کہ رات آئے گی تو رات کے لوازم آئیں گے۔ دن آئے گا تو دن کے لوازم آئیں گے۔ جب رعایا صحابہ تھے تو حاکم محمد رسول اللہ ﷺ تھے اور جب رعایا خیر القرون تھے تو آگے بھی سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، سیدنا عثمان، سیدنا علی، سیدنا حسن اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہم حاکم تھے۔ اب اگر آگے ہم آ گئے ہیں تو معاملہ تو اسی طرح ہوگا۔

تو اسی طرح جب گھریلو زندگی ہے تو لازمی بات ہے کہ ایک عورت اور ایک خاوند ہے۔ ان دو میں سے کسی ایک کو تو بڑا بنانا ہے، وگرنہ تو گھر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لیے وہاں اللہ نے خاوند کو بڑا بنایا۔ حقوق زوج کے بھی ہیں اور زوجہ کے بھی ہیں:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [البقرة:٢٢٨]

دونوں پر حقوق ہیں، لیکن شانِ قوامیت جو اللہ نے دی ہے وہ مردوں کو عطا فرما دی۔

اس لیے یہ مسئلہ سمجھ لیں! حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یہ بات واضح ہو گئی، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ خبردار! اگر کسی بشر کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو میں عورت کو حکم دیتا کہ خاوند کو سجدہ کرے، لیکن یہ تو اس زمانہ کی باتیں ہیں جب عورت عورت تھی اور مرد مرد تھا اور دونوں کے دلوں میں اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام تھے۔ اب نہ مرد مرد ہے اور نہ عورت عورت رہی، عورت مردوں سے آگے نکل گئی اور مرد نامردوں میں عورتوں سے نیچے گر گئے۔ اب تو پوری جنس بھی بدل گئی، حالات بھی بدل گئے۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے! اب جب آدمی احادیث مبارکہ کو پڑھتا ہے تو ہمارے نوجوان سوچتے ہیں کہ ایسے تھا کہ عورت اتنا اپنے خاوند کے تابع ہو، اب تو یہ باتیں ایسے لگتی ہیں جیسے کوئی حکایات ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کو تھا یا آدم قبلہ تھے؟

اور ایک قول یہ ہے کہ دراصل یہ سجدہ بھی اللہ تعالیٰ کو تھا اور آدم علیہ السلام کی پوزیشن ایسے تھی جیسا قبلہ ہے۔ تو اب ہم

کعبہ کی طرف سجدہ کرتے ہیں، حالانکہ ہم سجدہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کو کر رہے ہیں۔

مفسر فرماتے ہیں کہ یہ قول ضعیف ہے۔ اس مثال وتشبیہ میں اعتراض ہے، کیونکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو قبلہ بنایا گیا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ [البقرۃ: ۳۴] آدم کو سجدہ کرو سجدہ آدم کے لیے ہی تھا تو یہاں تو اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ کعبہ کو سجدہ کرو ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ: ۱۴۴] صرف اپنے رخ کو مسجد حرام کی طرف کرو، سجدہ تو اللہ کے لیے ہے۔ اور صاف فرق ہے کہ ﴿اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ امر ہے تو اس کو اس مثال کے ساتھ تشبیہ دینا ضعیف ہے، اس لیے کہ وہ سجدہ آدم علیہ السلام ہی کے لیے ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ہے ﴿وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾ [یوسف: ۱۰۰] وہاں بھی لام ہے کہ یوسف علیہ السلام کے لیے سجدہ ہے، یوسف علیہ السلام کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔ سیدھی سی بات ہے کہ ان کی شریعت علیحدہ تھی اور شریعت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم علیحدہ ہے۔ پہلا قول زیادہ راجح ہے کہ اللہ نے جو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو یہ آدم علیہ السلام کا اکرام وتعظیم وتحیہ تھا، تاکہ دنیا پر خلیفہ کی عظمت واضح ہو سکے اور پتہ چل سکے کہ جو خلیفہ ہوگا اس کی اطاعت ضروری و لازمی ہوگی۔ تو یہ سجدہ آدم علیہ السلام کے لیے تھا اور اطاعت اللہ کے لیے تھی، یعنی سجدہ تو آدم علیہ السلام کو کیا گیا، لیکن فرمانبرداری اللہ کی کی گئی، کیونکہ اللہ نے حکم دیا تھا:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ڭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾

[البقرۃ: ۳۴]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس قول کو ترجیح دی ہے، باقی جو دونوں قول ہیں رازی رحمہ اللہ نے ان کی تضعیف کی ہے کہ اگر آدم علیہ السلام کو قبلہ کی طرح بنایا جائے تو پھر کوئی عظمت واضح نہیں ہوتی، کیونکہ اگر ایک دیوار کو بھی کعبہ بنایا گیا تو کیا فرق پڑے گا۔

اور بعض لوگوں نے کہا کہ یہ حقیقتاً سجدہ نہیں تھا، بلکہ صرف سر جھکانا وتواضع تھا۔ یہ قول بھی ضعیف ہے۔ جب اللہ قرآن میں لفظ سجدۃ فرماتے ہیں تو اس کی تاویلات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو راجح قول بھی یہی ہے کہ یہ سجدہ اکرام وتعظیم تھا، آدم علیہ السلام کے لیے اور اللہ کے لیے اطاعت تھی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۷، ۷۸، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ]

متکبر جنت میں نہیں جائے گا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ))

''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل کے اندر رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا۔''

[سنن الترمذی، حدیث:۱۹۹۸، باب:مَا جَاءَ فِي الْكِبْرِ]

داخل نہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ اوّل وہلہ میں عزت والے مومنین کے ساتھ آخر میں داخل تو ہوگا کہ مسلمان جو ہے، لیکن اوّل دخول سے محروم ہوجائے گا، اوّل اس عظمت سے محروم ہوجائے گا، اگر اس کے دل کے اندر ذرے کے برابر کبر ہے۔ تو اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی فوراً استغفار کرے۔

﴿وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ کا کیا معنی ہے؟

بعض علماء نے فرمایا: ''کَانَ'' ''صَارَ'' کے معنی میں ہے کہ جب اس نے سجدہ نہ کیا اور انکار کیا تو کافروں میں سے ہوگیا، جیسے ﴿فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ﴾ [ہود:۴۳] حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں آیا کہ جب اس نے انکار کیا تو ہوگیا ڈوبنے والوں میں سے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ''کَانَ فِيْ عِلْمِ اللهِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ'' اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ وہ کافروں میں سے ہے۔ [تفسیر ابن کثیر:۷۸/۱، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ]

کرامت کا معنی:

مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے ہاتھوں پر کسی خارق عادت چیز کا ہوجانا (یعنی ایسی نئی چیز جو خلاف عادت کسی دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہوسکے) جیسے اللہ کے اولیاء کے لیے کرامت ہے، انہوں نے فرمایا کہ ان چیزوں سے بھی آدمی کو حیران نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ کبھی کبھی خارق عادت اللہ معاف کرے ولی کی تو بڑی شان ہے، لیکن فاسق فاجر کے ہاتھوں پر بھی ظاہر ہوجاتی ہے۔

اس لیے دیکھیں! ابلیس ملعون و مردود ہے، لیکن کتنی خوارق عادات ہیں کہ چاہے تو انسان کی شکل بن جائے، چاہے جانور بن جائے، گدھا بن جائے، سانپ بن جائے یا بچھو بن جائے، چاہے ہوا بن جائے اور ایک منٹ میں لاکھوں میلوں کا سفر کرڈالے۔ تو یہ ساری چیزیں بزرگی کی دلیل تو نہیں ہوتیں۔

[تفسیر ابن کثیر:۷۸/۱، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ]

سچے پیر کی پہچان:

اس لیے علماء نے لکھا: اگر کسی کی ولایت کو پرکھنا ہے تو اس کی اتباع رسول ﷺ کو پرکھیں۔ اگر اس کا عمل، اس کا کردار، اس کی صورت وسیرت اور اس کی شکل سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق ہے تو اللہ کا ولی ہے، چاہے اس کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو یا نہ ہو۔ ضروری تو نہیں کہ کرامت کا اظہار ہو۔ اللہ چاہیں گے تو ظاہر کریں گے اور اگر اللہ نہیں چاہیں گے تو ظاہر نہیں کریں گے۔ اور اس کے مقابلہ پر ایک آدمی شکل میں فاسق ہے، فاجر ہے اور شریعت کا مخالف ہے، لیکن ایسے ایسے کمالات دکھاتا ہے کہ کبھی پانی پر چل رہا ہے، کبھی آگ پر چل رہا ہے اور کبھی آپ کے دلوں کی باتیں بتا رہا ہے تو یہ شیطان ہو سکتا ہے، اللہ کا ولی نہیں ہو سکتا۔ کاہن ہو سکتا ہے، منجم ہو سکتا ہے، دجال من الدجاجلہ ہو سکتا ہے، اللہ کا ولی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ کے ولی کے لیے تو شرط ہے کہ وہ محمد عربی ﷺ کے نقش قدم پر ہو۔ ایک آدمی سنت رسول کا پابند ہے وہ اللہ کا ولی ہے، چاہے اس کے ہاتھ پر کچھ ظاہر نہ ہو۔ اب آدمی کہے کہ ہم نے تو کوئی کرامت نہیں دیکھی، ہم نے کوئی بزرگی نہیں دیکھی، یہ کوئی بات نہیں۔

اصل ولایت کمالِ اتباعِ سنت ﷺ ہے:

ایک اللہ والے کی خدمت میں ایک آدمی گیا، کچھ دن کے لیے رہا اور اجازت لی تو فرمایا کہ کیسے آئے تھے؟ اس نے کہا: ارادہ تھا کہ حضرت! آپ سے بیعت ہو جاؤں، لیکن میں اتنے دن آپ کی خدمت میں رہا، آپ کی کوئی کرامت کوئی نئی چیز تو میں نے دیکھی نہیں تو میرے دل کو آپ کی پیری لگی نہیں، اس لیے میں اب جا رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ نے ہماری کوئی کرامت اور کوئی بزرگی نہیں دیکھی، لیکن جتنے دن رہے ہو ہمارا کوئی عمل حضور ﷺ کی سنت کے مخالف دیکھا ہے؟ اس نے کہا: یہ تو ہے۔ میں نے واقعی کوئی عمل سنت کے مخالف نہیں دیکھا۔ تو ان بزرگوں نے فرمایا: ہم تو بس اتباع سنت جانتے ہیں، باقی پیری کرامت ہمیں نہیں آتی۔ وہ تو اللہ چاہیں تو ظاہر فرما دیں۔

ابن صیاد کا ذکر جس پر دجال کا شبہ ہوتا تھا:

حضور ﷺ کے زمانہ میں ایک لڑکا ابن صیاد تھا۔ اس پر بھی ایسے جنون وغیرہ کے دورے پڑتے تھے اور وہ بھی ایسی باتیں کرتا۔ ایک دن حضور ﷺ آئے تو وہ کپڑا لے کر پڑا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم کہتے ہو غیب کی باتیں میں جانتا ہوں، چلو بتاؤ میں نے اس وقت اپنے دل میں کیا چھپایا ہوا ہے؟ تو اس نے اپنے اوپر کپڑا ڈالا اور

اپنے جنات وغیرہ سے پوچھ کر بتایا کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ دُخ دُخ اور کوئی پتہ نہیں لگتا، اتنا مجھے معلوم ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارا غیب ہے، یہ تو ظن وتخیل کی بنا پر کسی ایک لفظ کا آدھا حرف بتلانا یہ تو غیب نہ ہوا۔ غیب کا معنی تو یہ ہے کہ تو پوری بات کھول دے کہ میرے دل میں کیا ہے؟ اور حضور ﷺ نے آیت بھی وہ رکھی جو علامات قیامت میں تھی:

﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾ [الدخان:۱۰]

تو اب ابن صیاد تو وہ ہے جس کے دجال ہونے کا شبہ لگتا تھا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۳۰۵۵، باب: كَيْفَ يُعْرَضُ الْإِسْلَامُ عَلَى الصَّبِيِّ]

اس کے بعد فرمایا کہ اسی ابن صیاد کے بارے میں یہ ہے کہ اگر اس کو غصہ آتا یا کوئی چھیڑ دیتا تو ایسے پھیل جاتا تھا کہ پورا راستہ بند کر دیتا تھا اور پھر سمٹ جاتا تھا۔ تو ایسی چیزیں تو فاسق فاجر کے ہاتھوں پر بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۸، جامع الاحادیث للسیوطی، ۳۹۸۱۵]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو دجال ہونے کے شبہ میں قتل کر دینا چاہتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ دجال جب قرب قیامت دجالیت کا دعویٰ کرے گا تو اس سے خوارقِ عادات ظاہر ہوں گی۔ آسمانوں سے کہے گا: بارش برساؤ تو بارش برسنی شروع ہو جائے گی۔ زمین سے کہے گا: کھیتی نکالو تو کھیتی نکل آئے گی اور اس کے پیچھے زمین کے خزانے ایسے بھاگ رہے ہوں گے جیسے چرواہے کے پیچھے جانور چلتے ہیں۔ اور ایک آدمی کو قتل کرے گا اور پھر زندہ کر دے گا (مگر اس کو نہ قتل کر سکے گا اور نہ زندہ کر سکے گا)

تو ایسی چیزیں تو ان کے ہاتھوں پر بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ یہ کوئی کمال نہیں ہوتا کہ کوئی آدمی آسمانوں میں اڑنے لگ جائے، پانی پر چلنے لگ جائے اور آگ پر چلنے لگ جائے، ایسا آدمی ولی نہیں ہوسکتا جب تک کہ اتباعِ سنتِ رسول پاک ﷺ نہ ہوگی۔ اتباعِ سنت ہے تو پھر وہ ولی ہے، پھر ہمارا اس پر ایمان ہے۔ اس لیے حضرت لیث بن سعد رحمہ اللہ فرماتے تھے: اگر تم کسی کو دیکھو کہ پانی پر چل رہا ہے اور ہواؤں میں اڑ رہا ہے تو اس کو پہلے قرآن وسنت کے مطابق جانچو۔ اگر قرآن وسنت کے مطابق اترتا ہے تو ولی ہے اور اگر قرآن وسنت کے مطابق نہیں ہے تو ولی نہیں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۸، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ]

تفسیر:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آیت کا ظاہر یہی ہے کہ سجدہ کرنے والے سب فرشتے تھے، کیونکہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝٣٠ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝٣١﴾

[الحجر: ۳۰، ۳۱]

خلیفہ بنانے کے بعد ظاہری عملی فضیلت ظاہر کی کہ ملائکہ کو سجدہ کروادیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۸، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ]

نوٹ:

یہاں تک تفسیر انوار الحرم حضرت مولانا محمد مکی حجازی حفظہ اللہ کے سلسلہ دروس سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۳۴ کی تفسیر مکمل ہوئی۔ آگے جلد نمبر ۳ سے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۳۵ سے تفسیری دروس شروع ہوں گے۔

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَ بِتَوْفِيْقِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ

امداد اللہ انور غفرلہ اللہ

تفسیر مکی

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: بیت اللہ، کتاب اللہ اور اہل اللہ۔ اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درس قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا محمد مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحید خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں، وہاں عشق رسول ﷺ اور سلف صالحین کی محبت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمال مہارت سے سامعین کو راہ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستی، فکر آخرت، اخلاص و تقویٰ، اخلاق حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ زیر نظر تفسیر "انوار الحرم" المعروف "تفسیر مکی" حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس کا مجموعہ ہے۔

مکتبۃ الفقیہ
223

تفسیرِ مکی

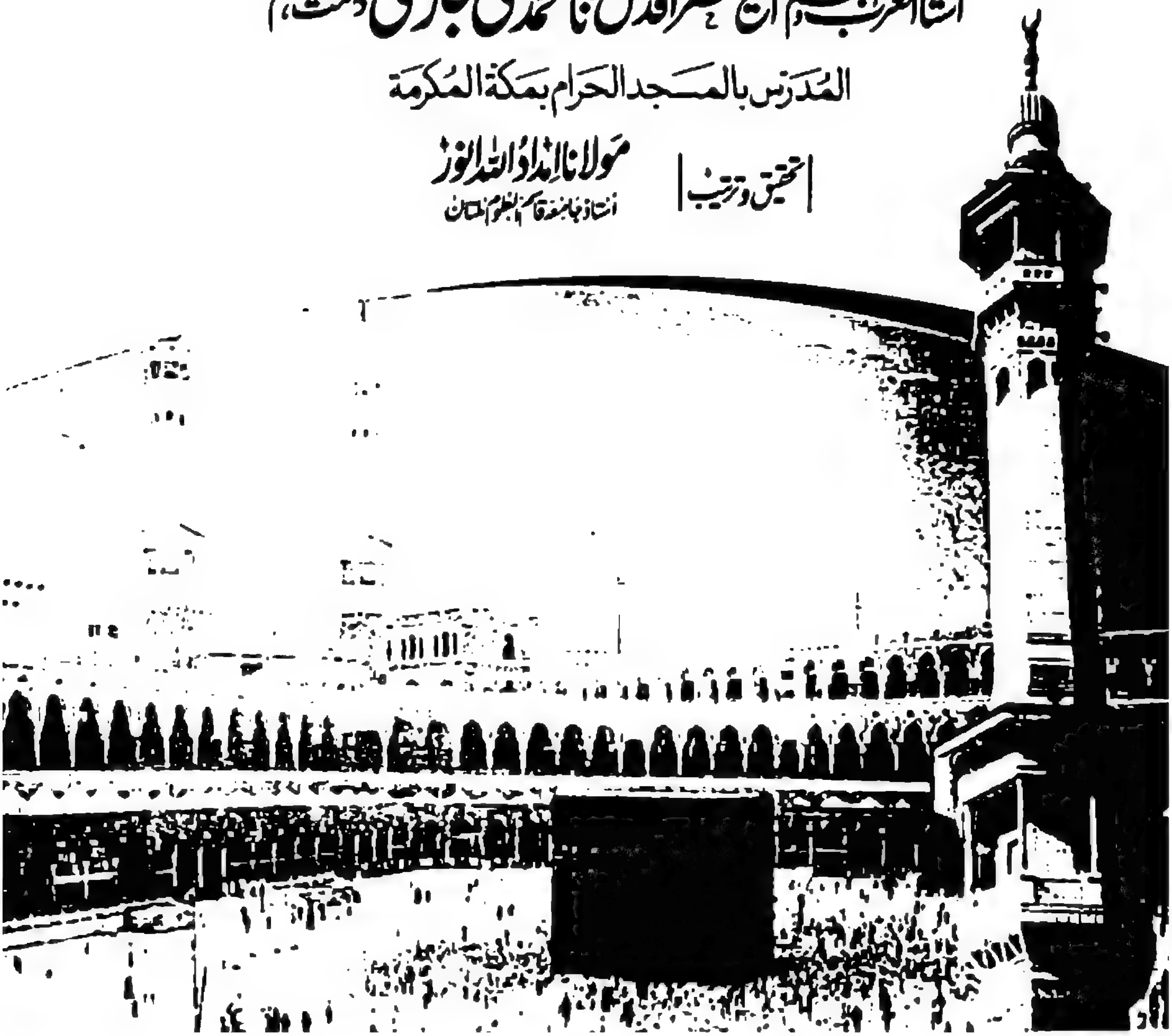
جلد 3

اُستاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم

المُدرِّس بالمسجد الحرام بمکۃ المُکرمۃ

تحقیق وترتیب | مولانا امداد اللہ انور

اُستاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان



نام کتاب — تفسیر مکی جلد: 3

صاحب خطبات — استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

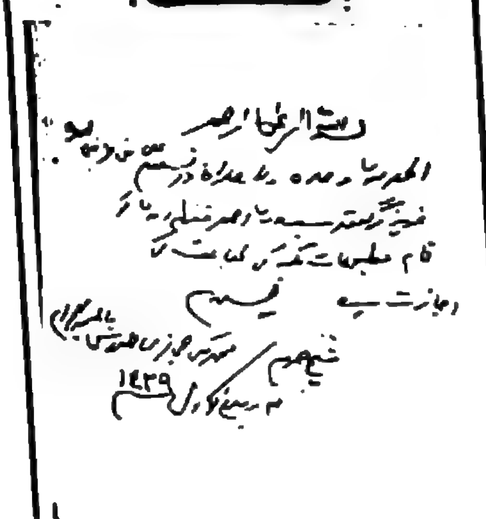
تحقیق و ترتیب — مولانا امداد اللہ انور
استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان

کمپوزنگ — دار التصنیف معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اشاعت اول — مارچ 2019ء

تعداد — 1100

اجازت طباعت



ناشر

مکتبۃ الفقیر

www.Tasawwuf.org
0300-9652292,03228669680
0335-7873390,03101702690
E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com

بسم الله الرحمن الرحيم



فہرست مضامین

- پیش لفظ — 29

تفسیر سورۃ البقرۃ — 31

- اماں حوا علیہا السلام کی پیدائش کا پس منظر — 39
- عورت، مرد کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی — 41
- عورت میں نیڑھا پن — 41
- شادی شدہ عورت کی اپنے گھر کی طرف توجہ — 42
- عورت، مرد برابر نہیں ہو سکتے — 43

- متعہ کے حرام ہونے کی وجہ 44
- حضرت آدم علیہ السلام و حواء علیہا السلام کے باہمی نکاح کا احوال 44
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے آسمان پر نکاح 45
- تفسیر 46
- حضرت آدم علیہ السلام آسمان والی جنت میں رہتے تھے 46
- جنت ہمیں نظر کیوں نہیں آتی؟ 49
- دنیا میں ہر وقت کہیں نہ کہیں نماز کی اذانیں ہو رہی ہیں 50
- آدم علیہ السلام کی تخلیق اور فرشتوں کا سجدہ کرنا جنت میں نہیں تھا 51
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے تذکرہ میں قرآن کا طرز 52
- تفسیر 53
- "ظالمین" کا معنی 53
- انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے چار مراحل 54
- ①... اعتقادیات 54
- ②...... تبلیغ احکام، تبلیغ رسالت 54
- عصمت یونس علیہ السلام 54
- امامیہ فرقہ کے نزدیک نبی کفر بھی کر سکتا ہے 55
- ③...... فتویٰ و اجتہاد 56
- ④ ..... اقوال، افعال اور اعمال 56
- توبہ کا مسئلہ کیسے سمجھ آتا؟ 57
- سجدۂ سہو کا طریقہ کون بتاتا؟ 57
- قضا شدہ نماز کیسے پڑھتے؟ 58
- بعض صوفیاء کی غلط فہمی 58
- حضرت حواء علیہا السلام کب اور کیسے پیدا ہوئیں؟ 60
- فرعونوں کی بیویاں 61

- امیر لوگوں کی بیویاں 62
- بیوی نہیں...... عذاب خداوندی 62
- کیے کا دھرا 62
- ماڈرن بیوی 62
- اصل وفا شعاری؟ 63
- حضرت حواء علیہا السلام کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کا نکاح 64
- "حواء" نام کی وجہ تسمیہ 64
- آدم علیہ السلام اور حواء علیہا السلام کا مکالمہ 65
- آدم علیہ السلام اور ملائکہ کا مکالمہ 65
- ایک نفیس بحث 65
- ممنوع درخت کس چیز کا تھا؟ 66
- درخت کا نام ذکر نہ کرنا خالی از حکمت نہیں 67
- قرآن مجید...... درسِ عبرت 68
- دعوتِ فکر 68
- ہر چیز میں دعوت 69
- اللہ کو منانے کا طریقہ آدم علیہ السلام سے سیکھو 69
- نجات! قرآن پر عمل کرنے میں ہے 69
- ایک ایک حرف میں دعوت 70
- ڈرامہ بازی چھوڑ دیجیے 70
- قرآن کی بھی مانیں 70
- قرآن پر بدعملی کی ایک مثال 71
- اسلام پر پوری طرح عمل کرو 71
- کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے 72
- بیوی کے لیے وارننگ 72

"عنہا" سے مراد جنت ہے یا ممنوعہ درخت؟	72
مسئلہ عصمت انبیاء علیہم السلام	73
اضطراری اور اختیاری عصمت	74
معصوم کا معنی و مفہوم	74
نبوت و ولایت میں فرق	75
نبی کی توہین کرنے والے کی توبہ قابل قبول نہیں	76
شیطان جنت میں کیسے داخل ہوا؟	77
ابلیس کے گمراہ کرنے کے طریقے	79
شیطان نے آدم علیہ السلام کو بہکانے کا کیا طریقہ اپنایا؟	79
شیطان کے گمراہ کرنے کے مختلف جال	80
اصلاح نفس کے لیے اولیاء اللہ کی تدابیر	83
شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکہ کیسے دیا؟	84
آدم علیہ السلام کو کون سے ملک میں اُتارا گیا؟	85
آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن اُتارا گیا؟	86
جنت ہماری میراث ہے	86
ما قبل آیات سے ربط	87
ایک ولی اللہ کا بادشاہ کی دولت ٹھکرانے کا واقعہ	88
"تواب" اور "اواب" میں فرق	89
سب سے پہلے گناہ کر کے توبہ کرنے والا	90
خطاء آدم کے متعلق فرقہ ضالہ کے اعتراض کا جواب	90
جنت سے نکالے جانے کی حکمت	91
توبہ کردن در جوانی شیوہ پیغمبری	92
پانچ سے پہلے	92
حضرت آدم علیہ السلام کے کلمات توبہ کیا تھے؟	93

◆ کیا آدم علیہ السلام کی بشریت میں خدا کی روح تھی؟ 94
◆ توبہ کے کلمات کے متعلق روایات کا خلاصہ 95
◆ مؤمن جہنمیوں کے لیے شفاعت 97
◆ "اھبطوا" مکرر لانے کی وجہ 97
◆ سورۂ بقرہ مدینہ میں سب سے پہلی نازل ہونے والی سورت 98
◆ بنو قریظہ، بنو نضیر اور یہودیوں کا تعارف 99
◆ یہودیوں کو "بنی اسرائیل" کہنے کی وجہ 102
◆ تاریخ انسانی کی قدیم زبانیں 104
◆ نکاح میں جاہلانہ اور ظالمانہ رسومات 106
◆ سُود کی مذمت 108
◆ اسلام کیسے آئے گا؟ 109
◆ اسلام پر اتفاق 109
◆ اُمت محمدیہ ﷺ پر انعامات 111
◆ ہمارا طرزِ عمل 112
◆ عمل کی عزت 113
◆ سگریٹ نوشی کی مذمت 114
◆ تفسیر 115
◆ اُمت محمدیہ ﷺ کی فضیلت 115
◆ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایثار 115
◆ فاروق کا پاسی کا امن 117
◆ تمام ٹیکس سے چھٹکارا 118
◆ پہنچی ہوئی سرکار!! 118
◆ اصل مجذوب کون؟ 118
◆ اکابر کا مقام رضا 119

◆ تتمہ واقعہ سابقہ 120
◆ حضور ﷺ کی آمد کی بشارات اور خصوصیات 120
◆ عہد پر چلنے کے سب پابند ہیں 121
◆ عہد کی تفسیر 121
◆ ایمان نہ لانے کے بہانے 121
◆ ﴿وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ﴾ کا مفہوم 122
◆ آیت میں ترغیب وترہیب کا مضمون 122
◆ اہل علم کے انکار اور اقرار کا تاثر 123
◆ قرآن وحدیث کو بھی مسلمان نہ بیچیں 124
◆ بلا طمع ہدیہ ملے تو قبول کرلو 124
◆ "ثَمَنًا قَلِيلًا" کی تفسیر 124
◆ تعلیم قرآن وغیرہ پر اجرت لینا 125
◆ جنت کی خوشبو سے محرومی 126
◆ دم کا معاوضہ لینا 126
◆ تقویٰ کا معنی 127
◆ مولانا تاج محمود امروٹی ؒ کا واقعہ 127
◆ ربط آیات 128
◆ یہودی حق کے ساتھ باطل کو ملا دیتے تھے 128
◆ باطل فرقوں کا وطیرہ 128
◆ دعوت فکر 130
◆ بناوٹی اور حقیقی مساوات 131
◆ نفاذ شریعت کے کھوکھلے نعرے 132
◆ تیری دنیا کو بہت غور سے دیکھا میں نے 133
◆ تورات میں حضور ﷺ کی آمد اور صفات کا ذکر 134

◆ یہودیوں کا سنگسار کرنے کا حکم چھپانا 135
◆ یہودیوں کو امر و نہی کرنے کا کیا فائدہ؟ 136
◆ کیا خدا دوسروں کی بات ماننے پر مجبور ہے؟ 137
◆ کتمان حق کی ایک اور صورت 138
◆ مرزا قادیانی کے جھوٹے دعوے 139
◆ ورقہ بن نوفل کے سچ کا اظہار 140
◆ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا واقعہ 140
◆ حضرت ثمامہ بن اُثال رضی اللہ عنہ کا واقعہ 140
◆ سراقہ بن مالک کا واقعہ 141
◆ پسندیدہ دین...... صرف اسلام 142
◆ دھوکہ کی محبت سے عداوت اچھی 143
◆ دوغلی پالیسی (منافقت) 143
◆ اعمال کی حکمرانی 144
◆ کتمان حق 145
◆ زکوٰۃ و تزکیہ میں مناسبت 146
◆ زکوٰۃ کے بعض احکام 146
◆ کرنسی کیسے ایجاد ہوئی؟ 147
◆ وجوب زکوٰۃ کا ضابطہ 147
◆ زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریقہ 148
◆ زکوٰۃ کی تملیک کا حیلہ 150
◆ زکوٰۃ کے مستحقین 151
◆ ربیع الاول میں عمرہ کا اہتمام 152
◆ حضور اکرم ﷺ کی محبت ہے تو سنت کی اتباع کرو 153
◆ حق چھپانے والے علماء کا انجام؟ 153

◆ صدقۃ الفطر
154

◆ مسلمانوں میں عملی انحطاط
155

◆ حضور اکرم ﷺ کی شفقت
160

◆ پردہ کی اہمیت پر تالیف
162

◆ پکوڑے فروش مناظر!!!
163

◆ ایک بدو کا واقعہ
164

◆ شاہ جی کا وکیل کو عقلی جواب
165

◆ تکفیر
166

◆ گناہگار بھی تبلیغ کر سکتے ہیں
167

◆ علم پر عمل کی ضرورت
168

◆ بے عمل عالم کی مثال
169

◆ مسئلہ معراج نبوی
170

◆ مسئلہ عذاب قبر
171

◆ جنت کا باغ یا جہنم کا گڑھا
174

◆ جلد کو عذاب دینے میں حکمت
175

◆ رسول اللہ ﷺ کی حقانیت کی دلیل
176

◆ حقیقی عالم؟
177

◆ مبلغ کے لیے ضروری صفات
181

◆ آج کے مسلمان!!!
182

◆ داعی کے لیے وعید
182

◆ آیت کے اولین مخاطب
183

◆ معیت خداوندی کا مفہوم اور اقسام
183

◆ عام معیت
183

◆ خاص معیت
184

◆ مقام صبر کی اہمیت 184
◆ صبر کی جزاء 184
◆ اعمال کے مختلف درجات 184
◆ بے حساب اجر 185
◆ صبر کی تین قسمیں 185
◆ حضرت نوح علیہ السلام کا صبر 186
◆ صبر کی پہلی قسم 186
◆ صبر کی عملی مثال 187
◆ ماتم اور نوحہ خوانی کی ممانعت 187
◆ ہم میں سے نہیں 187
◆ آنسو بہانا صبر کے منافی نہیں 189
◆ جہلاء کے طور طریقے 189
◆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم کی وفات کا صدمہ 189
◆ ہر حال میں صبر کی تعلیم 190
◆ صبر کے وقت مسنون دعا 190
◆ مسنون دعا کی برکت 190
◆ نماز بھی صبر ہے 191
◆ ہر مشکل میں نماز 191
◆ آنکھوں کی ٹھنڈک 191
◆ نماز سے عام لوگوں کو فوائد حاصل کیوں نہیں ہوتے؟ 191
◆ ایک گناہ گار کا واقعہ 193
◆ نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ 195
◆ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نماز میں انہماک 195
◆ صلوٰۃ الحاجت 196

تفسیر سورۃ بقرہ

◆ نیک عورت کی پسندیدگی	196
◆ نیک عورت کے اوصاف	197
◆ لفظ "عورت" کا معنی	197
◆ سرکار دو جہاں کی نماز!!	197
◆ بیڈروم کا معنی	198
◆ تہجد کی نماز کا اثر اور طریقہ	198
◆ صبر کی تفسیر	200
◆ بڑا صبر	201
◆ پہلے دن سے صبر	201
◆ مشکلات کے باوجود دینداری پر صبر	202
◆ تفسیر	203
◆ صحابہ ؓ کی مشقتیں	204
◆ ابن عباس ؓ کے صبر کا واقعہ	205
◆ قصہ قارون میں نکتہ	205
◆ تفسیر	206
◆ "ظن" کا معنی	207
◆ "نصرۃ" اور "نضرۃ" میں فرق	212
◆ فرعونیت کے جراثیم	212
◆ ہر فرعون کا انجام یکساں	214
◆ ظلم کو بقا نہیں	214
◆ ظالم کی وراثت...... مظلوم کے حصہ میں	214
◆ صحت...... سب سے بڑی نعمت	214
◆ عالم کی شان کا واقعہ	215
◆ ایک اشکال اور اس کے جوابات	216

◆ افضلیت خلفاء راشدین ___ 218
◆ جزوی فضیلت کے تذکرے کی مثالیں ___ 219
◆ مدینہ و گردونواح میں یہود کی آبادکاری ___ 220
◆ ایک شبہ کی وضاحت ___ 221
◆ معاملات کی تفصیل ___ 221
◆ شہادت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ___ 223
◆ یہودیوں کے کرتوت ___ 228
◆ یہود...... ہر فتنہ کی جڑ ___ 228
◆ اس امت سے پہلے کتنی امتیں گزریں؟ ___ 229
◆ تقویٰ کا لغوی اور اصطلاحی معنی ___ 229
◆ تقویٰ کی افادیت ___ 230
◆ تقویٰ کی اہمیت ___ 230
◆ پورے دین کا خلاصہ ___ 230
◆ جرائم کی روک تھام میں تقویٰ کی اہمیت ___ 230
◆ تقویٰ کے درجات ___ 231
◆ کسی گناہ کو چھوٹا نہ سمجھو ___ 231
◆ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا تقویٰ ___ 234
◆ مولانا حبیب اللہ گمانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تقویٰ ___ 235
◆ مولانا گمانوی رحمۃ اللہ علیہ کا گدھے کے ساتھ حسن سلوک ___ 235
◆ "تخوّف" سے کیا مراد ہے؟ ___ 238
◆ تطہیر ___ 238
◆ آدمی کے چھوٹنے کے چاروں طریقے کام دے جائیں گے ___ 238
◆ مسلمان، شفاعت کا حقدار ہوگا ___ 239
◆ اولاد کو والدین کا فائدہ ___ 239

◆ والدین کو اولاد کا فائدہ	240
◆ جنت واجب ہوگئی	241
◆ نیکی کا اجر...... برائی کا وبال	241
◆ بہت سخت معاملہ	241
◆ سعودی عرب کے لوگوں کی عملی خوبیاں	242
◆ ﴿عَدْلٌ﴾ کی تفسیر	244
◆ ﴿وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ﴾ کی تفسیر	244
◆ جادو کی حرمت	245
◆ حضور اکرم ﷺ پر جادو	245
◆ جادو کس نے کیا تھا؟	246
◆ جادو کے اثرات	246
◆ جادو کا زمانہ	247
◆ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کی وجہ	247
◆ فرعون کا حکم ثانی	248
◆ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش	248
◆ دشمن سے حفاظت کروائی	249
◆ جب اللہ نوازنے پر آئے!!	249
◆ کفریہ منصوبہ بندی	249
◆ فرعون سے بڑھ کر فرعون!!	249
◆ خدا کے قانون سے مقابلہ	249
◆ منصوبہ بندی صرف مسلمان کے لیے ہی کیوں؟	250
◆ ایک منہ...... دو ہاتھ	250
◆ نظام قدرت!!	250
◆ فرعون کے خواب کی تعبیر	250

◆ بڑا عذاب؟	251
◆ ﴿یسومونکم﴾ کا معنی	251
◆ فرعون کا مختصر تعارف	252
◆ نعمت بھی...... امتحان بھی	252
◆ ایک عظیم معجزہ	253
◆ چاند دو ٹکڑے ہونے کا معجزہ	254
◆ متفرق معجزات کا تذکرہ	254
◆ فرعون کے غرق ہونے کا قصہ	255
◆ دس محرم کا روزہ کیوں؟	256
◆ یہود کی مشابہت سے احتراز	256
◆ عاشوراء کے روزے کا پس منظر	256
◆ تفسیر	257
◆ فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل کی تاریخ	258
◆ مدینہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب	259
◆ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت بلافصل کا استدلال	259
◆ استدلالِ مذکور کا جواب	260
◆ قیام میں دنوں کا ذکر کیوں نہیں؟	261
◆ رات کی اہمیت	261
◆ اعداد و شمار کی حکمتیں	263
◆ "سات" (7) کا عدد	263
◆ اعداد کی اکائیاں دہائیاں	263
◆ عدد کامل؟	263
◆ چالیس (40) کا عدد	264
◆ چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی	264

انسان کی تخلیق اور چالیس کا عدد	264
کچھ باتیں سامری کے بارے میں	265
فرشتے کے ذریعے سامری کی پرورش	265
ہدایت اللہ کے ہاتھ میں	265
جاہل کے گھر میں عالم کی پیدائش	266
وارث شاہ کا کارنامہ!	266
قصہ سامری کی تکمیل	266
انبیاء علیہم السلام کی خصوصی تربیت	267
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت	267
موسیٰ علیہ السلام کی تربیت	267
ذوالحجہ کے دس دنوں کے روزوں کی فضیلت	269
ہر ہر لفظ حکمت بھرا	269
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ۳۰ دن کا روزہ	271
تیس راتوں پر مزید دس کیوں بڑھائی گئیں؟	272
موسیٰ علیہ السلام آزمائش میں مبتلا	274
بنی اسرائیل کی جہالت	275
توحید کی خاطر جلال کا مظاہرہ	275
سامری سے پوچھ گچھ	276
سامری! اب تیری خیر نہیں!!	276
سامری کا انجام	277
واقعات میں عبرت کا درس	277
داعی کے لیے سبق	277
توبہ کی قبولیت کی منظوری	278
توبہ کا طریقہ کار	278

◆ شریعت محمدی اور شریعت موسوی میں مماثلت 278
◆ یہود کی دو جماعتیں 279
◆ اسلام لانے اور ہجرت سے تمام گناہ معاف 279
◆ قوم کی اپنے کیے پر شرمندگی 280
◆ ﴿بَارِئِكُمْ﴾ کا معنی 280
◆ ﴿اِلٰى بَارِئِكُمْ﴾ لانے کی وجہ 280
◆ قصاصاً قتل کرنا باعث ثواب ہے 280
◆ "رجم" کرنا باعث ثواب ہے 281
◆ حکم خدا کی تعمیل میں بلا تفریق قتل 281
◆ مزید قتل کرنے سے منع 281
◆ مقتولین درجہ شہادت پر فائز 281
◆ شہداء کے فضائل و مناقب 282
◆ شہادت کے وقت تکلیف سے نجات 282
◆ جنت میں اپنے مکان کا دیدار 282
◆ عذاب قبر سے حفاظت اور جنت کے مزے 282
◆ بہتر (72) حور عین سے شادی 282
◆ لفظ "خُذُوْا" کا مفہوم 283
◆ بنی اسرائیل کے قتل ہونے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا 283
◆ بنی اسرائیل کی صفات 283
◆ عناصر اربعہ کی تاثیر 283
◆ بے نمازی پر نماز کا بوجھ 284
◆ نماز کی فکر 284
◆ مومن اور منافق کی مثال 285
◆ بچھڑے کی پوجا کے متعلق اسرائیلیوں کی آراء 285

رسم و رواج	286
کتے کے جھوٹے کا حکم	286
خدا سے ہمکلامی اور آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ	287
فرقِ مراتب	288
نظامِ قدرت	288
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خصوصیت	289
شوریٰ یا جمہوریت؟	290
اُمت محمدیہ اور سابقہ اقوام کے احوال میں مماثلت	291
بارش کیوں برستی ہے؟	291
کفر کی عینک	291
مسبب الاسباب پر نظر	291
گوہ کا سوراخ	292
قوم لوط اور دیگر اقوام کے جرائم سے مماثلت	292
عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	293
موسیٰ علیہ السلام پر ہارون علیہ السلام کے قتل کا الزام	295
حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر الزام	295
حضرت علی رضی اللہ عنہ پر الزام	295
موسیٰ علیہ السلام کی جان خلاصی	296
خدا کو دیکھنے کا مطالبہ کرنے والوں کا انجام	296
ایک شبہ اور اس کا ازالہ	297
دنیا میں دیدارِ خداوندی ممکن نہیں	298
حقیقی رؤیت	298
درجات کے لحاظ سے رؤیت	298
لیلۃ المعراج میں رؤیت ہوئی یا نہیں؟	299

﴿جھزتا﴾ کی تفسیر	299
﴿الصَّعِقَۃ﴾ کی تفسیر	299
ام صاعقہ کی ہلاکت کیسے ہوئی؟	300
انسان کے چار ماد وں کا ثبوت	300
﴿الصَّعِقَۃ﴾ کی ایک اور تفسیر	301
ستر آدمیوں کو مختلف کیفیات کے ساتھ زندہ کیا	302
سماعِ کلامِ خداوندی کی حالت	302
کلامِ خداوندی کی تاثیر	303
عبدالہادی دینپوری رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے کی بشاشت	303
ذکر اللہ کی لذت!!	304
ذکر کی کثرت کا حکم	305
میاں مسعود احمد کا واقعہ	305
آمدم بر سر مطلب	307
امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر اور اس کا رد	308
کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر جوتوں سمیت گئے تھے؟	308
مسلمانوں کی حالتِ زار	310
جذبۂ جہاد کا فقدان	310
مظلوموں کے ہمدرد	311
بے حس مسلمان!!	311
وعدۂ نصرت کی شرط	311
ذلت کا سبب......ترکِ جہاد	312
پیسہ ہی پیسہ!!	312
میری موت مجھ سے ڈرتی ہے!!	313
بنی اسرائیل کا جہاد سے انکار	313

- موسیٰ علیہ السلام کی بے بسی 313
- وادیٔ تیہ میں چالیس سال 314
- اسلام کا نعرہ 314
- کمزور اور مضبوط بنیاد؟ 315
- گرمی کے ستائے ہوئے 315
- بنی اسرائیل کی رعایت 315
- بادلوں کا سایہ 315
- من وسلویٰ کا انتظام 316
- آیات کا ارتباط 317
- مفسرین کے اقوال 317
- حضرت العلاء الحضرمی رضی اللہ عنہ کی کرامات 318
- مَن وسلویٰ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال 319
- کھمبی کا پانی 322
- اثمد سرمہ کی افادیت 323
- افطاری کی دعوت 323
- دودھ، شہد اور زمزم سے شفاء 323
- جوانی جیسا ہی چاہا 324
- بازاری مشروبات کی حقیقت 324
- سگریٹ سے افطاری 324
- ایسے روزے کا کیا فائدہ؟ 324
- روزے کا مقصد؟ 325
- انگریزی تعلیمات سے مرعوبیت 325
- ماضی اور حال کا تقابل 325
- جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے 326

- امر ضائع نہیں ہوگا 326
- عجوہ اور کھمبی کی فضیلت 326
- "مَنّ" کے مشابہ اشیاء 327
- افریقہ کے جنگلات 327
- بلب کی طرح روشن پودا 327
- درختوں کے فوائد پر مشتمل کتاب 327
- رات کی چاندنی 328
- قدرت کے کرشمے 328
- آسمان سے دسترخوان کا اترنا 328
- غیبی مدد 328
- اڑھائی پتی بوٹی 328
- زخمی بندر اور اس کا علاج 329
- درآمدات جنت 329
- حجر اسود 329
- عصائے موسوی 330
- دریائے فرات اور نیل 331
- عجوہ کھجور 332
- کھمبی کی فضیلت 332
- کیا کھمبی شجرۂ خبیثہ ہے؟ 333
- کلمۂ خبیثہ سے مراد؟ 333
- شجرۂ خبیثہ سے مراد؟ 333
- شجرۂ طیبہ 333
- توحید کی رسی 334
- "سلویٰ" کون سا جانور تھا؟ 334

- بٹیر کے گوشت کی لذت 334
- جائز ذخیرہ اندوزی 334
- جاہلانہ توکل 335
- رزق کا ذمہ دار ..... صرف اللہ!! 335
- پہلے نافرمانی ..... پھر سرکشی 335
- بدبختی، شفاعت سے محروم 336
- غفور رحیم ..... جبار اور قہار 336
- مثال سے وضاحت 337
- خوف اور امید کے درمیان 337
- بٹیر کے ذخیرے 337
- حضرت اسماعیل علیہ السلام کا رزق 338
- ہر حال میں شکر کی تعلیم 338
- حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ اور ایک نوجوان کا واقعہ 338
- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا امتیازی وصف 339
- ایک صحابی کا ایثار 339
- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی 340
- مہمان نوازی اور مغربی تہذیب 340
- مہمان نوازی اور اسلامی تہذیب 340
- نہ تصدیق ..... نہ تکذیب 341
- اسرائیلی روایات کا حکم 341
- روزہ توڑنا گوارا نہیں 342
- حقوق العباد کی اہمیت 342
- خاوند کو ناراض کرنے والی عورت کے بارے میں وعید 343
- نفلی روزہ کے لیے خاوند سے اجازت لینا 343

- امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی عدالت میں یہودی کا مقدمہ — 343
- وادی تیہ میں بنی اسرائیل کا قدرتی لباس — 345
- صحابہ رضی اللہ عنہم کا حضور اکرم ﷺ کی اتباع کامل — 345
- بنی اسرائیل کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی — 346
- ﴿الْقَرْيَةَ﴾ کی تفسیر — 347
- بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہونے کا حکم — 348
- مسلمانوں کی تباہ حالی — 348
- نماز شکر — 350
- غزوہ احزاب کا مختصر تذکرہ — 351
- ستر ہزار اسرائیلی ہلاک ہو گئے — 351
- قریہ سے کون سا شہر مراد ہے؟ — 352
- شہر میں جھک کر داخل ہونے کا حکم — 353
- اب سجدہ تعظیمی کسی کے لیے جائز نہیں — 354
- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سجدہ رسول ﷺ کی ممانعت — 356
- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ کے سامنے کھڑے ہونے کی ممانعت — 356
- فتوحات پر بھی تواضع فرمانا — 357
- ﴿وَقُولُوا حِطَّةٌ﴾ کی تفسیر — 357
- ایک کافر کا تلوار سونتنے کا واقعہ — 358
- صلوٰۃ چاشت — 359
- بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمیاں — 359
- رَاعِنَا اور انْظُرْنَا میں فرق — 360
- بنی اسرائیل سے خطاب کا طرز — 360
- منافقین اور کافروں کے خطاب میں وجہ فرق — 361
- سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ — 361

لوگوں کی سمجھ کے مطابق بات کرو	362
ذبیحہ کیوں حلال اور میتہ کیوں حرام؟	364
یہود و نصاریٰ عورتوں سے شادی کیوں جائز ہے؟	364
جب بھی انبیاء ﷩ کو جہاد کا حکم ملتا ہے تو فتح بھی ملتی ہے	366
معمولی غلطی پر بڑا نقصان	366
صلوٰۃ الاستسقاء میں اختلاف کی حیثیت	367
پتھر پر عصا مارنے سے پانی کا نکلنا	368
پانی تھوڑا تھوڑا نکلا یا چشموں کی صورت میں؟	369
زمزم کا چشمہ	370
حضرت ایوب علیہ السلام کے لیے چشمہ	370
آپ ﷺ کے ہاتھوں سے جاری پانی کے معجزات	371
تلبیر	372
ایک ظالم جاگیردار کا واقعہ	372
علماء کی توہین کرنے والے کا عبرتناک انجام	373
بارہ چشموں والے پتھر کی کیفیات	374
من گھڑت قصہ اور اس کی تردید	375
ہندوؤں کا "گاؤ ماتا" کی پوجا کرنا	375
دولت مندوں کے گھروں کی چمک دمک	376
عقیدے کا فساد	376
فاسد عقیدہ لوگوں کی حرکتیں	377
اولیاء اللہ کی شان	378
اس پتھر کی مزید تفصیل	378
آپ ﷺ کے براق کے متعلق	378
نعلین مبارک کی تصویر پر قرآن کی تحریر	381

- پتھر کی مزید تفسیر 382
- پتھر کی تعیین میں علماء کے مختلف اقوال کیوں؟ 382
- انبیاء علیہم السلام کی میراث نہیں ہوتی 383
- شک ظاہر کرنے کا گناہ 384
- نظر بد کا اثر اور علاج 385
- موسیٰ علیہ السلام بہت حیاء دار تھے 386
- مقام ابراہیم علیہ السلام والا پتھر 387
- حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حضور اکرم ﷺ سے عقیدت 388
- حضور اکرم ﷺ کے ایک غلام کی قدر 388
- حضور اکرم ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ 389
- سورۃ اعراف اور سورۃ البقرۃ میں فرقِ خطاب 389
- بنی اسرائیل کا زمینی خوراک کا مطالبہ 390
- قدرتی چیزوں کے استعمال کا صحیح طریقہ 391
- حرام کی بجائے حلال بیوی پر گزارہ 391
- تفسیر 392
- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا 392
- آپ ﷺ کی پسندیدہ غذائیں 393
- تفسیر 395
- "فوم" کی تفسیر ابن عباس 395
- بنی اسرائیل کی ذلت کیوں آئی؟ 398
- بعض فرقوں میں مسلمانوں کے درمیان منافرت کی تعلیم 398
- تفسیر 400
- مسلمانوں کے پاس دنیا میں عظیم نعمتیں 401
- حضور اکرم ﷺ کے زمانہ کے چار فرقے 401

﴿وَالصّٰبِئِیْنَ﴾ کا مصداق	401
"صابی" کا ایک اور معنی	402
ایمان کی اصل تفسیر	402
ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ضروری ہے	404
دنیا حقیر ہے	404
نیک مومن میت کی پکار	405
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا واقعہ	405
شام کے اسلامی ملک کا واقعہ	407
تفسیر	409
قبولیت عمل کے لیے چند اصول	411
امام مالک رحمہ اللہ کا ادب حدیث	411
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطبہ کا واقعہ	413
یہود کی وجہ تسمیہ	413
آسمانی شریعتوں میں نسخ اور تبدیلی کیوں؟	414
ائمہ کرام کا اجتہاد	416
بے بی ٹیوب کا مسئلہ	417
اتباع سنت پر ایک صحابی رسول کا واقعہ	421
نصاریٰ کی وجہ تسمیہ	422
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اقوام عالم کے نبی ہیں	422
امت محمدیہ ﷺ کے القابات	423
ایمان و اسلام میں فرق	424
﴿وَالصّٰبِئِیْنَ﴾ کا مصداق	424
صورت واقعہ	426
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر کھانے کا واقعہ	427

◆ طور پہاڑ کو بنی اسرائیل پر کھڑا کرنے کا واقعہ 429

◆ پہاڑ حقیقتاً کھڑا ہو گیا تھا 429

◆ اسلام پر عمل کو قرب قیامت مشکل سمجھا جائے گا 431

◆ قرب قیامت اسلام کا نام باقی رہے گا 432

◆ قرآن کی فریاد 432

◆ حضرت داؤد علیہ السلام کے کمالات 433

◆ ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت 435

◆ آج کل دولتمندوں کا ظلم 435

◆ بنی اسرائیل تین حصوں میں منقسم ہو گئی 436

◆ بعض بنی اسرائیل کی شکلیں مسخ کر دی گئیں 436

◆ مسخ کی تین قسمیں 437

◆ اللہ سے کیے گئے خاص اور عام عہد 438

◆ اللہ کی کتاب پڑھنے کے اثرات 438

◆ طور پہاڑ 439

◆ کیا طور پہاڑ سرمہ بن گیا؟ 439

◆ ایک غلط فہمی کا ازالہ 440

◆ ایصالِ ثواب کا مسنون طریقہ 442

◆ افضل الایام کون سا دن ہے؟ 443

◆ جمعہ کے دن کی فضیلت 443

◆ سزا ایسی کہ ظاہراً بندر اور باطناً انسان 443

◆ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نزدیک انسان کی حیثیتیں 445

◆ بچی کو زندہ درگور کرنے کا واقعہ 445

◆ سخت دل کو نرم کرنے کا طریقہ 446

◆ حضرت ایوب علیہ السلام کا حیلہ 447

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ	448
آج رات جنت میں سوؤں تو طلاق	449
بندر بننے والوں کے واقعہ کی تفصیل	451
حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تدبر	451
اصحاب کہف کا غار	453
مسخ کا معنی	454
حقیقتاً بندر بنائے گئے تھے	455
اہل کتاب کی نسبت	460
اسلام دنیاوی ترقی کا مخالف نہیں	461
سورۃ البقرۃ کی وجہ تسمیہ	462
عموماً جھگڑے کا سبب دولت ہے یا عورت	463
وحی کے ذریعے قاتل نہ بتانا حکمت ہے	463
چند علمی لطیفے	464
واقعہ قتل	465
جنتی اور جہنمی لوگوں کے نام کی کتابیں	466
منکر تقدیر فرقہ کا رد	466
بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کے لیے گائے خود امتحان بن گئی	467
لیلۃ القدر والی عظیم دعا	467
بنی اسرائیل کی گائے کی قیمت	468
اسماعیلی فرقہ	468
بنی اسرائیل کے مقتول کا قصہ	471
شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے ذمہ دار	474
تتمہ واقعہ مقتول	475
ایک نافرمان بیٹے کا واقعہ	476

◆ بزرگ کا مقولہ "اللہ کا فضل ہوگیا" واقعہ 477
◆ مصیبت کو اپنی زبان سے نہ مانگو 480
◆ حدود میں احتیاط 480
◆ حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت خوشبو لگانے کا حکم 483
◆ کیا حرم میں اب بھی شکار ہے؟ 483
◆ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوئی کا واقعہ 484
◆ ہر مسئلے کا جواب ضروری نہیں 484
◆ حیوان میں بیع سلم 486
◆ اس آیت کو مؤخر کیوں کیا گیا؟ 487
◆ گائے کا گوشت کا کونسا حصہ مردے کو لگایا گیا؟ 488
◆ مختلف واقعات میں خدا کی قدرت کا اظہار 489
◆ معجزات رسول اکرم ﷺ 491
◆ کھجور کی لکڑی کے رونے کا معجزہ 491
◆ بے جان اشیاء کو نطق دینے کے واقعات 492
◆ موت کے مختلف انداز 493
◆ زہر آلود گوشت حضور اکرم ﷺ کے سامنے بول پڑا 494
◆ ﴿فادارءتم﴾ کا معنی و تفسیر 494
◆ بھلائی اور برائی کبھی پوشیدہ نہیں رہتی 495
◆ گوشت کا کون سا حصہ مردہ کو لگایا گیا؟ 495
◆ اسرائیلی روایات کا حکم 496
◆ سورۂ بقرہ میں پانچ مقامات پر احیائے موتی کا بیان 497
◆ مُردوں کو زندہ کرنے کی مثال 497
◆ ایک یہودی کا سر کچلنے کا واقعہ 498
◆ آیت کا ماقبل سے ربط 499

◆ پتھروں کی اقسام 500

◆ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کا علم 501

◆ پتھر کی مثال دینے کی وجہ 503

◆ یہ آیات ہمارے لیے سبق ہیں 505

◆ گناہوں سے دل سخت ہو جاتے ہیں 505

◆ گناہوں کا علاج 506

◆ پتھروں کا رونا حقیقی ہے یا مجازی؟ 509

◆ پتھروں میں خاصیات 511

◆ حجر اسود 512

◆ سود کی حرمت 514

◆ اُمت محمدیہ میں بھی سابقہ قوموں جیسے اعمال 517

◆ دلوں کی سختی حقیقی تھی یا مجازی؟ 519

◆ "أو" کس معنی میں ہے؟ 520

◆ دل کی سختی سے پناہ مانگو 522

◆ سنگ دلی کی انتہاء 522

◆ کثرت کلام قساوت قلبی کا سبب ہے 524

◆ مذاق میں بھی دوسرے کو تکلیف نہ دو 524

◆ بدبختی کی چار علامات 525

◆ تحریف کی اقسام 528

◆ قرآن میں بعض لوگوں کی لفظی و معنوی تحریف 529

◆ علماء حق اور علماء سو 532

◆ ہر صدی میں ایک مجدد ہوتا ہے 533

◆ قرب قیامت کے حالات 534

◆ یہود و منافقین کا تذکرہ 536

◆ مناظین کے بارے میں 538
◆ حضور اکرم ﷺ کی صورت عیسائیوں کے پاس 538
◆ آیات کا باہمی ربط 539
◆ محمد ﷺ کو امی کہنے کی وجہ 540
◆ یہودیوں کی قسمیں 540
◆ حضور اکرم ﷺ کی امت بھی امی ہے 540
◆ حضور اکرم ﷺ کی تعلیم 543
◆ یہودیوں کے امانی 544
◆ ﴿أَمَانِيَّ﴾ کا معنی "پڑھنا" بھی آتا ہے 545
◆ بعض سوشل لوگ 545
◆ فقیر کی دعا سے بارش کا برسنا 546
◆ حلال رزق دعا کی قبولیت کا سبب ہے 547
◆ مکی صاحب کے والد کی احتیاط 548
◆ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی احتیاط 548
◆ ایک استاد کی سوکھی روٹی کھانے کا واقعہ 549
◆ "أمّی" کی کچھ اور تفسیریں 549
◆ دولت کے بھوکے عامل 550
◆ "قتل" کی تفسیر 550
◆ ماقبل آیات سے ربط 552
◆ حضرت مسیح علیہ السلام اور دجال کا آنا حقیقت ہے 554
◆ دعویٰ بنی اسرائیل کہ جہنم میں نہیں جائیں گے 555
◆ یہودیوں نے حضور اکرم ﷺ کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا 556
◆ فتح خیبر اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کی شادی 557
◆ حضور اکرم ﷺ پہ زہر کا اثر 559

- صدیق اکبر ؓ پر زہر کا اثر 560
- فتنوں کے دور میں ہدایت کی دعا کی اہمیت 561
- کافروں کے اچھے اعمال کہاں جائیں گے؟ 563
- گناہگار مسلمان کا انجام 564
- گناہوں کی اقسام اور بندوں کے حقوق 564
- زندگی میں اپنی وصیت لکھنے کا طریقہ 566
- داڑھی کی اہمیت 568
- عبادت میں اخلاص کی ضرورت 569
- جو کفر کے گھیرے میں آجائے، اس کا انجام 570
- مومن گناہگار کا انجام 571
- فاحشہ عورت کی بخشش کا واقعہ 572
- ﴿بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً﴾ کی تفسیر 573
- کبائر کی تعداد 573
- گناہوں کی مثال 574
- بنی اسرائیل کے لیے فیصلہ کن بات 575
- والدین کی خدمت 577
- والدین کی ناقدری کے واقعات 577
- والدین کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کا اجر 579
- والدین کے نافرمان کے لیے حضور اقدس ﷺ کی بددعا 579
- والدین کافر بھی ہوں تو خدمت کے حق دار ہیں 579
- والدین کی اطاعت کے متعلق واقعات 581
- والدہ کی بددعا لگنے کا واقعہ 583
- ایک بادشاہ کا جنگلی جانوروں میں کمبل تقسیم کرنے کا واقعہ 585
- کفر کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اقسام 586

- افضل عمل نماز وقت مقررہ پر ادا کرنا 587
- تعارض بین الاحادیث کے شبہ کا جواب 587
- مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ غلام محمد دین پوری رحمۃ اللہ علیہ 588
- مسواک کے فائدے 588
- جدید ٹوتھ پیسٹ کی خرابیاں 589
- تفسیر 589
- کافر کو ابتداء بالسلام نہیں کرنی چاہیے 590
- آیات کا ربط 591
- کتاب اللہ پر عمل نہ کرنے والے کی سزا 594
- عامی کے لیے تقلید اور مجتہد کے لیے اجتہاد لازم ہے 594
- عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا پادری کو کنیز فروخت کرنے کا واقعہ 595
- تورات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات 597
- ایمان کی اہمیت 598
- حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید 601
- نبی اور رسول کی تعریف 602
- تائید بروح القدس کا معنیٰ 603
- فرشتوں اور نبیوں میں سب سے آخر میں موت کس کو آئے گی؟ 605
- معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام 606
- عمرہ، حج اور طواف کی فضیلت 606
- شریعت کے احکام منسوخ یا تبدیل کیوں ہوتے ہیں؟ 608
- حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لیے تائید جبرائیلی 609
- نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنے کا جائز و شرعی طریقہ 610
- تفسیر 612
- "روح القدس" اسم اعظم ہے 613

- اسم اعظم کون سا ہے؟ 613
- دعا کی قبولیت کے بعض طریقے 614
- روح اور قدس کسے کہتے ہیں؟ 615
- لعنت کا مفہوم 617
- سنت نبوی ﷺ اور جدید تعلیم یافتہ 618
- جدید تعلیم یافتہ شخص کا واقعہ 620
- ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ایمان کا ثبوت عقلی دلائل سے 621
- ﴿قلوبنا غلف﴾ کی ایک تفسیر 621
- گزشتہ آیات سے ربط 622
- تسبیح و تنزیہ کی وضاحت 623
- تقلید 625
- چودہ سو سال بعد بھی بخاری شریف کو حفظ کرنے والے 627
- روس سے آزاد شدہ ریاستوں میں احیائے دین 627
- آسمان و زمین میں پہلا گناہ حسد تھا 628
- حضرت نانوتوی رحمہ اللہ پر انکار ختم نبوت کا اعتراض و جواب 629
- مسلمان کو عذاب ہونے کی وجہ 632
- یہود و نصاریٰ کافر کیوں؟ 634
- خدا کی توحید کو بلا دلیل کے مانو 636
- حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ 638
- اللہ تعالیٰ سے امید اور خوف کی مقدار 639
- مسئلہ ثابت کرنے کے طریقے 640
- کن صورتوں میں موت کی تمنا جائز ہے؟ 641
- طویل عمر کے بعد بھی تو جہنم سے نہیں بچ سکتے 642
- موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے ایک جن سے آپ ﷺ کی ملاقات 642

- جوانی کے نیک اعمال بڑھاپے میں بھی لکھے جاتے ہیں 643
- کسی چیز کی محبت محب کو اندھا بہرا کر دیتی ہے 643
- حضور اکرم ﷺ سے عشق و محبت کے تقاضے 644
- اتباعِ سنت میں ایک بزرگ کا واقعہ 644
- تفسیر 646
- اگر یہود موت کی تمنا کرتے تو سب مر جاتے 647
- حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا واقعہ 647
- والدین کی اطاعت سے عمر میں برکت ہوتی ہے 648
- تفسیر 648
- حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ایک کرامت 648
- صحابیِ رسول پر تہمت لگانے والا بددعا سے اندھا ہو گیا 649
- ﴿وَلَن يَتَمَنَّوْهُ﴾ کی اور ایک تفسیر 649
- حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں نصارائے نجران 649
- جوش اور جگر 650
- عیسائیوں کی ہٹ دھرمی 650
- طویل عمری کی فضیلت 650
- وحدتِ ادیان کے فلسفے کا رد 652



عرضِ ناشر

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: 1 ...... بیت اللہ، 2 ...... کتاب اللہ، 3 ...... اہل اللہ۔

اور اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، رمضان ہو یا شوال، حج کا موسم ہو یا عمرے کا، حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کا درسِ قرآن مسجدِ حرام میں بلا ناغہ ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں دوسرے مشائخ کے دروس بھی ہوتے ہیں، تاہم جس کثرت سے اور ذوق شوق سے لوگ حضرت مکی مدظلہ کے درس میں شرکت کرتے ہیں، دوسرے دروس میں یہ کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ چنانچہ برِصغیر پاک و ہند، بلکہ پوری دنیا میں جہاں بھی اردو دان طبقہ حرم شریف میں آتا ہے، حضرت مکی مدظلہ کے درس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحیدِ خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے،

بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمال مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔

حضرتِ اقدس کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص وتقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر تفسیر ''انوار الحرم'' المعروف ''تفسیر مکی'' حضرتِ اقدس کے چند دروس کا مجموعہ ہے۔ جسے اس سے قبل اک اور ادارہ نے شائع کیا تھا اب اسے حضرت اقدس ہی کے حکم پر ''مکتبۃ الفقیر'' شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اللہ رب العزت اس کتاب اور ''مکتبۃ الفقیر'' دونوں کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین ﷺ

اجازت ہو تو آکر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہو گا

قارئینِ کرام! گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی، کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تا زیست اپنی رضا کے لیے یہ خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ہماری آخرت کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

دعاؤں کا طالب:
فقیر سیف اللہ احمد نقشبندی مجددی
مکتبۃ الفقیر

تفسیر سورۂ بقرہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَقُلۡنَا یٰۤاٰدَمُ اسۡکُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُکَ الۡجَنَّۃَ وَکُلَا مِنۡہَا رَغَدًا حَیۡثُ شِئۡتُمَا ۪ وَلَا تَقۡرَبَا ہٰذِہِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّہُمَا الشَّیۡطٰنُ عَنۡہَا فَاَخۡرَجَہُمَا مِمَّا کَانَا فِیۡہِ ۪ وَقُلۡنَا اہۡبِطُوۡا بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۳۶﴾﴾

[البقرۃ:۳۵،۳۶]

اور ہم نے کہا: اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس میں سے جہاں کہیں سے چاہو، کھاؤ اور اس درخت کے پاس مت جانا ورنہ تم ظالم ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے ان کو اس جگہ سے ہلا دیا، پھر ان کو اس عزت و راحت سے نکالا جس میں وہ تھے، اور ہم نے کہا: تم سب اُترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانہ ہے اور ایک وقت تک نفع اُٹھانا ہے۔

اماں حواء علیہا السلام کی پیدائش کا پس منظر:

مسجود الملائکہ بنانے کے بعد دوسرا فیصلہ ہوا کہ آدم علیہ السلام کو کتنی دیر جنت میں رکھنا ہے۔ چونکہ یہ اللہ کے علم میں تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقُلۡنَا یٰۤاٰدَمُ اسۡکُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُکَ الۡجَنَّۃَ﴾ [البقرۃ:۳۵]

اس مسئلے میں ہمیں قرآن مقدس سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ یہ حکم دونوں کے لیے تھا، آدم علیہ السلام کے لیے بھی ہے اور بی بی حوا علیہا السلام کے لیے بھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنت میں جانے سے قبل بیوی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر بیوی پہلے پیدا نہ ہوئی ہوتی تو حکم دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور بی بی کے پیدا کرنے کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں، ان میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آدم علیہ السلام پر ہلکی سی نیند (اونگھ) طاری کر دی۔ اس کی مزید تفصیل آگے آ رہی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۷۸/۱، ۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

جدید دنیا جو آج اپنے علوم پر بڑا فخر کرتی ہے، اصل میں یہ سب کچھ ان لوگوں نے قرآن سے حاصل کیا ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ ایمان نہیں لے آتے۔ آج کل آپ دیکھیں! اگر تو کوئی معمولی سی چیز ہو تو ایسے کاٹ دیتے ہیں، لیکن اگر کوئی بڑا آپریشن ہو تو کہتے ہیں کہ اس سے پہلے مریض کو بے ہوش کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ اگر ہم بے ہوش کیے بغیر ایک آدمی کا پورا ہاتھ کاٹ دیں تو وہ کیسے برداشت کرے گا؟ آخر انسان ہے، اس کو ٹانکے بھی لگانے پڑیں گے، اندر سے گندگی نکالنی ہوگی۔ آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اب وہ بے ہوش پڑا ہے، اسے کچھ پتہ ہی نہیں ہے کہ میرا آپریشن بھی ہو گیا اور ٹانکے بھی لگ گئے۔ جب ہوش آیا تو سب کچھ ہو چکا تھا، وہ مرحلہ گزر گیا۔ اب اگر کوئی درد ہو گا تو گولی دے دیں گے، اس پر انجکشن لگا دیں گے۔ تو یہ ساری چیزیں ہوتی ہیں۔

اللہ کا نظام دیکھیں! اللہ قادر تھے کہ آدم علیہ السلام جاگتے رہتے اور حواء کو پیدا کر دیتے، لیکن ان کو سلایا گیا۔ جب ان کو نیند آ گئی تو ان کی بائیں پسلی سے آدم علیہ السلام کی بیوی سیدہ حواء علیہا السلام کو پیدا کیا گیا۔ یہ کمالِ قدرت ہے کہ اللہ چاہیں تو اسی وقت مکمل عورت بن جائے۔

جیسا کہ ایک صحابی نے پوچھا کہ حضور! جنت میں اونٹنیاں بھی ہوں گی؟...... اعرابی لوگوں کو اونٹ بڑا پسند ہوتا تھا۔ اب تک بھی دیکھیں کہ ان کو اونٹ، گھوڑا بڑا پیارا ہے، لاکھوں میں اونٹ کو خریدتے ہیں...... آپ ﷺ نے فرمایا: جو چاہو گے وہ ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ حضور! اگر اونٹنی ہوگی تو پھر اونٹنی کے بچے بھی ہوں گے اور اونٹنی کا دودھ بھی ہوگا؟...... کیونکہ یہ لوگ اونٹ کو بڑا محبوب رکھتے ہیں...... حضور ﷺ نے فرمایا: جب تم تمنا کرو گے اسی وقت اونٹنی حاملہ ہو جائے گی، اسی وقت بچہ پیدا ہو جائے گا اور اسی وقت دودھ دینا شروع کر دے گی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو پتھر سے پیدا کر کے دکھلا دیا کہ اللہ اس بات پر قادر

ہیں کہ پتھر سے اونٹنی نکل آئے اور وہ حاملہ بھی ہو، وضع حمل بھی ہو جائے اور اسی وقت دودھ دینا شروع کر دے۔

اس طرح بی بی حواء علیہا السلام کو اللہ نے آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے زندہ نکالا، اس لیے ان کا نام حواء پڑ گیا، کیونکہ ''حی'' زندہ کو کہتے ہیں اور ''میت'' مردہ کو کہتے ہیں تو بی بی صاحبہ کو زندہ آدم علیہ السلام سے نکالا گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

عورت، مرد کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی:

علماء نے لکھا ہے کہ اس میں بھی اللہ کی حکمتیں ہیں:

ایک تو عورت کو بائیں طرف سے پیدا کیا گیا، کیونکہ دائیں طرف کی افضلیت واضح ہے، جتنا دایاں ہاتھ افضل ہے اُتنا بایاں نہیں ہے، اور کام دونوں کے بغیر نہیں ہو سکتا، اسی طرح مرد و عورت نہ ہوں تو گاڑی بھی نہیں چل سکتی۔ لیکن دائیں ہاتھ میں اللہ نے زیادہ قوت رکھی ہے، زیادہ خیر والے کام دائیں سے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی بڑا آدمی ہو تو آپ اس کو دائیں جانب بٹھائیں گے، مسجد میں داخل ہوں گے تو دایاں قدم پہلے رکھیں گے، کھانا کھائیں گے تو دایاں ہاتھ استعمال کریں گے۔

میں یہ بات اسلام کے نقطۂ نظر سے عرض کر رہا ہوں، جن لوگوں کا مذہب اسلام نہیں ہے تو ان کے نزدیک نہ دائیں کی کوئی اہمیت ہے اور نہ بائیں کی کوئی بات ہے۔ ان کے لیے تو سب برابر ہے، اس لیے کہ جب اسلام ہی دل و دماغ کے اندر نہ ہو تو یہ باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ وہ کہتے ہیں: دایاں کیا ہے؟ اور بایاں کیا ہے؟ حالانکہ اُصولاً اگر دیکھا جائے تو یہ بڑی بدبخت قوم ہے۔

آپ دیکھیں! مثلاً کوٹ ہے یا واسکٹ ہے، اس کے اندر جو بٹن لگائے جاتے ہیں، آپ کے بٹن کس طرح ہوتے ہیں؟ اس میں انگریز بھی فرق کرتا ہے کہ مرد کے بٹن ایک طرف ہوں گے اور عورت کے بٹن دوسری طرف ہوں گے، اس لیے کہ بعض اوقات ایک جیسے کوٹ ہوتے ہیں تو بٹن سے پہچانا جاتا ہے کہ بائیں طرف ہیں یا دائیں طرف ہیں۔ اس حد تک وہ اپنے معاملات میں فرق کرتے ہیں، لیکن جب اسلام کی بات آ جائے تو کہتے ہیں کہ دایاں کیا اور بایاں کیا ہے؟

عورت میں ٹیڑھا پن:

اللہ نے بی بی حواء علیہا السلام کو بائیں پسلی سے پیدا کیا اور اس کے لیے حدیث مبارک میں ایک مثال بھی دی گئی

ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ عورت کو ٹیڑھی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ اس میں کچھ نہ کچھ ٹیڑھا پن ہوتا ہے، کچھ نہ کچھ کجی ہوتی ہے، ایسا نہ ہو کہ سیدھا کرنا چاہو اور توڑ ڈالو، اور اس کو اپنے حال پر بھی نہ چھوڑ دو کہ زیادہ ٹیڑھی ہو جائے۔ تھوڑا ٹیڑھا پن تو ہر عورت کے اندر ہوتا ہے، چاہے وہ کتنی بڑی عظیم عورت کیوں نہ ہو۔ لہٰذا وہ برداشت کرو۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ گزارا کرو، اگر کوئی غلطی ہو جائے تو برداشت کرلو، کوئی کام تمہارے منشاء کے خلاف ہو جائے تو صبر کرلو۔ اور بالکل آزاد نہ چھوڑ دو، اس پر کنٹرول بھی رکھو، ورنہ یہ مزید ٹیڑھی ہو جائے گی۔ [صحيح البخاري، حديث:٥١٨٦، باب:الوصاة بالنساء]

حضور ﷺ نے کتنی پیاری مثال دی!! فرمایا کہ تمہارا ایک ڈنڈا لٹکتا رہے، موجود رہے۔ فرمایا: مارو نہیں، استعمال بھی نہ کرو، لیکن اسے احساس تو رہے کہ گھر میں ایک چیز موجود ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کنٹرول ہو اور برداشت بھی ہو تو گاڑی چلے گی۔ چھوٹی موٹی غلطی ہو جائے تو اس کو برداشت کرو، کیونکہ اس کی پیدائش ہی ایسی جگہ سے ہوئی ہے کہ اس کے اندر کجی فطری طور پر ہوتی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے اندر یہ حکمت بھی تھی کہ مرد اور عورت کا آپس میں قلبی تعلق بھی قائم رہے۔ چونکہ ہر آدمی کا دل بائیں طرف ہے اور بائیں طرف کا جو پستان ہے اس سے اپنے ہاتھ کی دو انگشت نیچے دل ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت میں ہر چیز کی حکمتیں ہیں، اگر وہ چاہتے تو دائیں پسلی سے بھی پیدا فرما سکتے تھے، لیکن بائیں پسلی سے پیدا فرمایا کہ ایک قلبی تعلق مرد اور عورت کا ہوتا ہے۔

شادی شدہ عورت کی اپنے گھر کی طرف توجہ:

اب دیکھیں کہ ایک عورت کی شادی ہو جاتی ہے۔ اگر صحیح مقام پر رشتہ ہو جائے اور میاں بیوی میں محبت پیدا ہو جائے تو وہ اپنے ماں باپ کو بھی بھول جاتی ہے۔ یہ خدا کی قدرت ہے! چنانچہ اگر وہ ماں باپ کو ملنے آ جائے اور شام ہونے لگ جائے تو کہے گی کہ میں نے گھر جانا ہے۔ اور قدرت کی بات دیکھیں کہ جس گھر میں پرورش پاتی ہے اور اٹھارہ برس گزارتی ہے اور جو ماں باپ اس کو پالتے ہیں، پھر اس کی شادی کے لیے اچھی جگہ ڈھونڈتے ہیں اور اپنی طاقت کے مطابق اس کی شادی پر زیور اور کپڑا دیتے ہیں، اس گھر کو لڑکی اپنا گھر نہیں کہتی، جب شادی ہو جائے اور خاوند کے گھر چلی جائے تو کہتی ہے کہ یہ میرا گھر ہے۔ اگر ماں باپ کے گھر بیٹھی ہو اور کہے کہ جانا چاہتی ہوں اور وہ یہ پوچھیں کہ کہاں جانا چاہتی ہو تو کہتی ہے کہ اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ عورت کا گھر تب بنتا ہے جب وہ کسی کی

بیوی بنتی ہے، اسی سے پھر اُنس ہوتا ہے، اسی سے پھر تعلق ہوتا ہے، اسی سے پھر اللہ پاک دلوں کے اندر مودّت اور محبت پیدا کرتے ہیں۔

اصل بیوی تو وہی ہے کہ اللہ دونوں میں محبت، مودّت اور سکون نصیب فرمائے، ورنہ تو ایک جہنم ہے۔ اگر انسان کو محبت کرنے والی، حیا والی بیوی مل جائے تو دنیا کے اندر جنت ہے، وگرنہ دنیا کے اندر جہنم ہے کہ جب بھی گھر جائے تو لڑائی، جب بھی گھر جائے جھگڑا اور جب بھی گھر جائے فتنہ!!! بس شکایات کے بنڈل کہ اس نے یہ کہا تھا اور میں نے یہ کہا تھا۔ کبھی ہمسائے سے لڑائی اور کبھی ہمسائے کے گھر والوں سے لڑائی، کبھی اس کا گلہ اور کبھی اس کا شکوہ، کبھی اس کی شکایت اور کبھی اس کے خلاف بات، کبھی ماں کے خلاف، کبھی سسر کے خلاف، حتیٰ کہ خاوند کو اس کے ماں باپ سے چھڑائے گی، تب اس کو آرام آئے گا۔

عورت، مرد برابر نہیں ہو سکتے:

اللہ کی شان ہے کہ اس نے عورت کو بائیں پسلی سے پیدا کیا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں عورت کی عزت نہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ اسلام میں عورت کا بہت بڑا مقام ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ لوگوں نے عزت اس کو سمجھ لیا ہے کہ اگر مرد مصلّی پہ کھڑا ہے تو عورت بھی مصلّی پر کھڑی ہو، تب تو عزت ہے وگرنہ کوئی عزت نہیں، اگر مرد نبی بنتا ہے تو عورت کو بھی نبی بناؤ، مرد کو خلافت ملتی ہے تو عورت کو بھی ملے، مرد کو عہدہ ملتا ہے تو عورت کو بھی عہدہ ملے، تب برابر ہوں گے، وگرنہ ہماری بے عزتی ہو گئی۔ حالانکہ یہ غلط بات ہے۔ اُصول یہ ہے کہ جو جس چیز کا مستحق ہے، اللہ نے وہ اس کو عطا کی ہے۔ وہ بنانے والے ہیں، وہ خالق ہیں، وہ مالک ہیں، اگر کسی انسان نے ایک گلاس بنایا تو اس کو اس کی باریکیوں کا پتہ ہے کہ اس میں کون سا مادہ استعمال ہوا، پلاسٹک کون سا استعمال ہوا ہے، یہ کتنا عرصہ چلنے کے لیے ہے، اس کے اندر کیا کیا خرابی ہے؟ اور کیا کیا اچھائی ہے؟ وہ مالک جس نے انسان کو پیدا کیا ہے، اس نے فیصلے کر دیئے ہیں کہ یہ فرائض مرد کے ہیں اور یہ عورت کے ہیں۔

یہ تو شکر کرو کہ عورتوں کے ہاتھوں میں نہیں، ورنہ وہ کہتیں کہ اگر ایک بچہ مجھے پیدا ہو تو ایک مرد کو پیدا ہو، تب ہم برابر ہوں گے۔ اور ایک مہینہ مجھے حیض آئے تو ایک مہینہ مرد کو آئے، تب ہم برابر ہوں گے۔ اللہ نے فرائض رکھے ہیں، یہ مردوں کے فرائض ہیں اور یہ عورتوں کے فرائض ہیں۔ انہی کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتیں اور انہی کے اندر حکمتیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اسلام اور ایمان ہو۔ اگر ان چیزوں سے محروم ہو تو کم از کم اس کے اندر اتنی عقل سلیم تو

ہو کہ دن کو دن کہے اور رات کو رات کہے۔

آدم علیہ السلام کے جنت میں جانے سے پہلے ان کو نیند آ گئی۔ جب اُٹھے اور دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ میری بیوی ہے کہ گوشت بھی میرا، خون بھی میرا، اسی سے اللہ نے میری بیوی پیدا کی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۷۹، البقرۃ:الآیۃ:۳۵]

اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کا نکاح کس نے پڑھا تھا؟ بات یہ ہے کہ نکاح کا حکم دینے والے اللہ ہیں، اللہ کو مانیں گے تو نکاح ہے، اللہ کو جو نہ مانے، ان کے لیے بیٹی بھی حلال ہے، بہن بھی حلال ہے، بیوی بھی حلال ہے۔ جو لوگ خدا کو مانتے ہی نہیں ہیں، نکاح کے قائل نہیں، بلکہ اس کے برخلاف متعہ کے جواز کے قائل ہیں، ان کے مذہب میں اگر ایک عورت کے ساتھ بیس آدمیوں نے متعہ کیا تو پتہ نہیں کہ کس کا نطفہ ٹھہر گیا؟ اس سے جو لڑکی پیدا ہوئی، اس کا باپ پھر اسی سے جا کر متعہ کر لے۔ ایسے واقعات پر لوگوں نے باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں۔

متعہ کے حرام ہونے کی وجہ:

ایک آدمی کا ایک طوائف سے تعلق تھا، اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس نے طوائف کو بھگا دیا۔ وہ لڑکی جوان ہوئی، پھر وہ طوائف بنی تو اسی خاندان کے لڑکے نے پھر اس سے تعلق رکھا۔ اس کو تو پتہ نہیں تھا کہ یہ میرے باپ کا نطفہ ہے۔ کافی عرصہ بعد جا کر اس پر یہ راز کھلا کہ یہ تو میرا بھائی ہے۔

اسلام نے متعہ کو کیوں حرام قرار دیا؟ زنا سے کیوں منع کیا؟ اس لیے کہ متعہ یا زنا کے نتیجے میں ہونے والی اولاد کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ یہ کس کے نطفے سے ہوئی ہے؟ کیا پتہ کہ اس کا باپ کون بنے گا؟ یہ عورت کس کی وارث بنے گی؟ اس کے نطفے کا، سکنٰی کا، رہائش کا، ہر چیز کا کون ذمہ دار ہوگا؟ وہ تو ٹائم پاس ایک بات ہوگئی کہ وقت گزارا اور چل دیئے۔ اس لیے شریعت نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام وحواء علیہا السلام کے باہمی نکاح کا احوال:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو باقاعدہ نکاح کا حکم دیا۔ جب اللہ نے فرمادیا کہ تمہاری بیوی ہے تو بات ختم ہوگئی...... نکاح کا سارا مسئلہ ہم اس لیے کرتے ہیں، تاکہ اللہ کے حکم کے مطابق بیوی حلال ہو جائے۔ قاضی کو بلاؤ، گواہوں کو بلاؤ، ایجاب وقبول کراؤ اور اعلان کرو، تاکہ اللہ کا حکم پورا ہو جائے اور شریعت کے مطابق یہ میری بیوی

کہلانے کی حقدار ہو، میرے لیے حلال ہو...... اور جب خود خالق فرما دے کہ یہ تمہاری بیوی ہے تو پھر کسی مولوی کو بلانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر کسی قاضی کی یا گواہوں کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی تو وہاں آدم علیہ السلام کی اولاد ہی پیدا نہیں ہوئی تو گواہوں کے ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی تو قاضی صاحب بھی پیدا نہیں ہوئے، گواہ پیدا نہیں ہوئے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی حواء علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی بیوی قرار دے دیا۔ اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود حکم دیا: ﴿وَقُلْنَا يَادَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ [البقرۃ: ۳۵] جب اللہ نے فرما دیا کہ "تم اور تمہاری بیوی" تو باقی تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

حضور ﷺ کا حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے آسمان پر نکاح:

احادیثِ صحیحہ میں یہ واقعہ موجود ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی طلاق کے بعد بی بی زینب رضی اللہ عنہا کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ حالانکہ بی بی زینب رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی پھوپھی کی لڑکی تھیں، انہوں نے عرض کیا کہ میں انکار نہیں کرسکتی، جب تک کہ میں استخارہ نہ کرلوں۔

اور استخارے کا حکم بھی تو ہمیں حضور پاک ﷺ نے دیا ہے کہ اگر کوئی کام کرنا ہو، شادی کرنی ہو، تجارت کرنی ہو تو پہلے استخارہ کرلو۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۵۱۶]

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نماز پڑھو اور اس کے بعد دعائے استخارہ پڑھ لو۔ ایک تو استخارہ کی لمبی دعا ہے، اگر اس کا موقع نہ بھی ملے تو حدیث مبارک میں دو لفظ آتے ہیں: "أَللّٰهُمَّ خِرْ لِيْ وَ اخْتَرْ لِيْ"۔ دو رکعت استخارہ کی نیت سے پڑھ لیں، اس کے بعد یہی دعا سات مرتبہ پڑھ کر سو جائیں۔ اس طرح سات راتوں تک کریں۔ ان شاء اللہ! اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے کوئی نہ کوئی جہت متعین ہو جائے گی۔ اگر کرنے کی ہے تو اس میں خیر ہے، یعنی ہم نے اللہ سے پوچھ لیا، اس کے بعد کوئی نقصان ہوگا ہی نہیں۔

[تفسیر القرطبي: ۱۳/۲۰۷، القصص: الآیۃ: ۶۸]

صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ ہمیں استخارہ کی دعا ایسے یاد کرواتے تھے جیسے قرآن سکھا رہے ہوں۔ یعنی اتنی اہم بات تھی اور آج مسلمانوں کے اندر یہ سب سے غیر اہم بات ہے۔ نعوذ باللہ! کتنے لوگ ہیں جو استخارہ کرتے ہیں؟ مسلمان ان سب چیزوں کو بھول گئے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۶۳۸۲، بابُ: الدُّعَاءِ عِنْدَ الاِسْتِخَارَۃِ]

شریعت کے اندر اصول یہ ہے کہ آپ دوستوں سے مشورہ بھی لیں اور استخارہ بھی کریں۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس نے استخارہ کرلیا، وہ کبھی نامراد نہیں ہوگا اور جس نے مشورہ کرلیا، وہ کبھی شرمندہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ مثال مشہور ہے کہ ایک ایک ہے اور دو ملیں تو گیارہ ہو جاتے ہیں۔ مختلف رائے سامنے آنے کے بعد آدمی کو مشورہ مل جاتا ہے۔

تو بی بی زینب رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں استخارہ کروں گی۔ اتنی دیر میں جبرائیل علیہ السلام نازل ہو گئے، اللہ نے آسمانوں سے حکم دے دیا: ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا﴾ [الاحزاب: ۳۷] اللہ نے فرمایا: ہم نے آپ کا نکاح کر دیا، بی بی زینب آپ کی بیوی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکم کے بعد بی بی زینب کے گھر آئے تو بی بی زینب بول پڑیں کہ آپ میری اجازت کے بغیر اس وقت میں میرے گھر میں کیسے آ گئے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے میرا نکاح کر دیا ہے، قرآن پاک میں آیت نازل ہو گئی ہے۔

[المعجم الكبير للطبراني، حديث: ۱۱۰۰، ذِكْرُ تَزْوِيجِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم زَيْنَبَ...]

اس کے بعد سے بی بی صاحبہ باقی ازواج مطہرات پر اس بات میں ہمیشہ فخر فرماتی تھیں کہ تم عورتوں کا نکاح تمہارے والدین اور بھائیوں نے کیا ہے اور میرا نکاح میرے اللہ نے کیا ہے۔

ایسا سوال کرنا جہالت کی دلیل ہوتی ہے کہ آدم علیہ السلام کا نکاح کیسے ہوا تھا؟ قاضی کون تھا؟ گواہ کون تھے؟ خدا کے بندے! جب قرآن میں موجود ہے، جب اللہ نے خود ان کو آدم علیہ السلام کی بیوی بنا دیا ہے تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

تفسیر:

﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ جب اللہ کی طرف نسبت ہو تو صیغہ جمع کا لا کر کہیں کہیں ایسے انداز میں خطاب ہوتا ہے۔

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ﴾ وہاں قصہ کی ابتداء ہو رہی تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے پاک پیغمبر کو سنا رہے تھے: "اُذْكُرْ يَا مُحَمَّدُ!" پھر جب قصہ شروع ہو گیا اور سارا منظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہے تو فرمایا: ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ گویا ایسی منظر کشی کی کہ ابھی آدم علیہ السلام کو سجدہ ہو رہا ہے۔ اس لیے یہاں فرمایا: ﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ ہم نے حکم دیا: اے آدم! ٹھہرو تم بھی اور تمہاری بیوی بھی، تم دونوں جنت میں رہو۔

حضرت آدم علیہ السلام آسمان والی جنت میں رہتے تھے:

جنت سے مراد کون سی جنت ہے؟ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کے اندر معتزلہ اور قدریہ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ

جنت یہاں زمین میں تھی جو ایک بڑا خوبصورت باغ تھا۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ جمہور اسلاف کا یہ فیصلہ ہے اور اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ جنت آسمانوں میں ہے، جس کے اندر آدم علیہ السلام کو رکھا گیا۔ اور یہی قرآن کا سیاق و سباق ہے کہ اگر جنت آسمانوں میں نہیں تو اُتارنے کا کیا فائدہ ہے؟ اگر زمین میں ہوتے تو حکم ہوتا کہ نکلو، حالانکہ لفظ "اِهْبِطُوْا" کا ہے۔ اور جمہور اہل سنت والجماعت کا یہ مسلک اور عقیدہ ہے کہ جنت آسمانوں میں ہے اور جنت میں تکلیف کا نہ ہونا اور نہ نکالا جانا، یہ عالم آخرت کے بعد کے حکم ہیں، اور آدم اور حواء علیہما السلام پر جو پابندی لگی اور جنت سے نکالے گئے تو یہ عالم آخرت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ جیسا کہ معراج کی رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنت میں داخل ہوئے تھے، لیکن پھر واپس تشریف لے آئے۔ تو دار العمل یعنی دنیا کے اختتام پر دار الجزاء میں جانے پر جنت کے یہ خواص ظاہر ہوں گے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مفصل بحث "سورۃ الاعراف" میں ذکر ہوگی، لیکن بہر حال قول اول راجح ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھہرایا اور اس سے مراد "جنت الخلد" ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۸، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

ان آیات میں کئی مراحل ہیں: پہلا مرحلہ تخلیقِ آدم کا، دوسرا مرحلہ تعلیم آدم کا اور تیسرا مرحلہ تکریم آدم کا تھا۔ اس کے بعد جنت میں جانے کا حکم دیا اور اس حکم کی نسبت بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے، فرشتوں کو واسطہ نہیں بنایا۔ اس میں بھی آدم علیہ السلام کی بہت بڑی عزت ہے۔

اسی آیتِ مبارکہ میں "الجنۃ" معرف باللام آیا ہے، اس سے وہ جنت مراد ہوتی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہو۔ اور آپ اسی سورت میں پڑھ چکے ہیں ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۳] تو اس آیت میں دنیا کے باغ کی خوشخبری تو نہیں تھی، کیونکہ پہلے جہنم کا ذکر تھا کہ جو کافر قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکے اور قیامت تک بھی نہیں کر سکیں گے، ان کے لیے ہم نے جہنم تیار کی ہے کہ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ اب جہنم کے بعد مومنوں کے لیے جو خوشخبری ہے تو وہ اسی جنت کی ہے۔ چونکہ اس جنت کا پہلے ذکر ہو چکا تھا تو اب اللہ نے اس جنت کا ذکر "الف لام" کے ساتھ فرمایا۔ لہٰذا اس سے مراد وہی جنت ہے جس کی پہلے خوشخبری دی جا چکی ہے تو وہ بھی جنت الخلد مراد تھی اور اس سے مراد بھی جنت الخلد ہے، دنیا کی جنت اس سے مراد نہیں ہے۔ اسے اصطلاح میں "معرف باللام" کہتے ہیں۔ یعنی لفظ "جنۃ" کو

الف لام عہد خارجی کے ساتھ سابقہ مذکورہ جنت کے معنی میں معروف کیا گیا۔ اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہو۔ [تفسیر القرطبی: ۱/ ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

جیسے اللہ پاک نے قرآن مقدس میں فرمایا:

﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝﴾ [الانشراح: ۵،۶]

حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''عسر'' ایک ہے اور ''یسر'' دو ہیں۔ فرمایا کہ کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ''عسر'' دو ''یسر'' پر غالب آ جائے، حالانکہ قرآن میں ''عسر'' کا ذکر بھی تو دو دفعہ آیا ہے اور ''یسر'' کا ذکر بھی دو دفعہ آیا ہے، لیکن حضور ﷺ نے فرمایا: ''عسر'' ایک ہے اور ''یسر'' دو ہیں۔[1] وجہ یہ ہے کہ ''یسرًا'' بغیر الف لام کے ہے تو پہلا ''یسر'' علیحدہ ہے اور دوسرا ''یسر'' علیحدہ ہے، لیکن دوسرے ''العسر'' پر الف لام ہے تو اس سے مراد وہی پہلے والا ''عسر'' ہے، لہٰذا ''عسر'' ایک ہو گیا اور ''یسر'' دو ہیں۔[2] تو یہاں بھی جب لفظ ''الجنۃ'' آیا تو ''جنت'' وہی پہلے والی مراد ہے جس کا ذکر قرآن مقدس کے اندر ہو چکا ہے۔

مفسرین کرام، محدثین کرام نے ایک استدلال حدیث مبارک سے بھی کیا ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ ذکر فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن جب لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں آئیں گے تو کہیں گے: ''يَا أَبَانَا! اسْتَفْتِحْ لَنَا أَبْوَابَ الْجَنَّةِ'' (حضرت آدم! مہربانی کرو اور ہمارے لیے جنت کا دروازہ کھلواؤ) آدم علیہ السلام فرمائیں گے: خدا کے بندو! تم مجھ سے جنت کا دروازہ کھلوانا چاہتے ہو، مجھے جنت سے نکلوانے کا ذریعہ بھی تو میری غلطی تھی، میری غلطی کی وجہ سے تو تم جنت سے نکالے گئے تھے اور اب تم مجھ سے جنت کا دروازہ کھلوانا چاہتے ہو، میں شفاعت نہیں کر سکتا، تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۳۲۹، باب: أدنى أهل الجنة منزلة فيها]

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی جنت تھی جس کے اندر حضرت آدم علیہ السلام رہتے تھے، جس سے آدم علیہ السلام کو نکالا گیا۔ اگر وہ جنت زمین والی ہوتی، کوئی باغ ہوتا تو پھر اس سے نکالنے اور اس میں کی گئی غلطی کا تذکرہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ مکالمہ روزِ قیامت کا ہے، اس وقت تو دنیا ختم ہو چکی ہو گی۔ اس لیے علماء

---

[1] [المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث: ۳۹۵۰، تفسیر سورۃ الم نشرح]

[2] [شرح مشکل الآثار، حدیث: ۲۰۲۴، بابُ بيانِ مُشكِلِ ما رُوِيَ عن رسولِ اللهِ ﷺ من قولِه: "المؤمنُ..."]

نے فرمایا کہ جنت سے مراد وہی ''جنت الخلد'' ہے۔

اسی طرح صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آپس میں ایک مکالمہ ہوگا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام سے یہ کہیں گے کہ آپ ہمارے ابا ہیں، ابوالبشر ہیں اور آپ وہی ہیں جن کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا اور جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود روح پھونکی اور جس کو اللہ نے اپنی جنتوں میں ٹھہرایا، لیکن تم نے ہمیں جنت سے نکالا۔ حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے کہ اے موسیٰ! تم اللہ کے نبی ہو، کیا تم نے تورات میں یہ نہیں پڑھا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے اور زمین وآسمان کے پیدا ہونے سے بھی پہلے تورات میں لکھا ہوا تھا کہ ایسے ہوگا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہیں گے: لکھا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب آدم علیہ السلام غالب آجائیں گے کہ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ جو تقدیر کے فیصلے ہونے تھے، وہ ہونے تھے، ان کو دنیا کی کوئی طاقت بدل نہیں سکتی۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام چپ ہو گئے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٦٦١٤، باب: تحاجّ آدمُ وموسى عند الله]

الحاصل یہ کہ اللہ کی تقدیر کے سامنے کون بات کرسکتا ہے؟ اس لیے علماء نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی آدم علیہ السلام کو یہ کہیں گے کہ اللہ نے آپ کو اپنی جنت میں ٹھہرایا اور پھر اس جنت سے آپ نے ہمیں نکلوایا۔

جنت ہمیں نظر کیوں نہیں آتی؟

بعض لوگ اشکال کرتے ہیں کہ اگر جنت آسمانوں میں ہے تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتی؟ یا جہنم اگر زمینوں میں ہے تو ہم نے اب تک کیوں نہیں دیکھی؟ حالانکہ ہم نے ایسی ایسی نئی ایجادات کی ہیں کہ ہم نے زمین کے چکر بھی لگالیے ہیں اور پوری زمین کے اردگرد ہمارے سیارات گھوم چکے ہیں۔

یہ محض ایک جہل کی بات ہے، یہ دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اتنے سیارات ہیں کہ جن کی ابھی روشنی بھی زمین پر نہیں پہنچی ہے۔ تم تو ابھی تک چاند کے اندر مغز ماریاں کررہے ہو، اللہ کے کئی اتنے بڑے سیارات ہیں، جن کو ہم ابھی تک نہیں دیکھ سکے تو اللہ کی جنتیں (جب تک اللہ ہمیں نہ دکھلائے) ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ اور دوسری بات قرآن مقدس میں یہ بھی منصوص ہے کہ آدمی چاہے کتنی اونچی اُڑان اُڑ لے، لیکن آسمانوں میں داخل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ

فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾[الاعراف:۴۰]

دنیا میں ہر وقت کہیں نہ کہیں نماز کی اذانیں ہو رہی ہیں:

ایک آدمی نے تحقیق کی ہے اور مشینوں کے ذریعے یا کمپیوٹر کے ذریعے حساب لگایا ہے اور عجیب اللہ کی قدرت معلوم ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ اللہ نے جو یہ نظام رکھا ہے، اس میں اوقات کا فرق ہے۔ مثلاً یہاں آٹھ بج رہے ہیں تو آپ کے ملک میں دس بج رہے ہیں اور اسی طرح بعض ملکوں میں ابھی چھ بجے ہیں اور بعض ملکوں میں ابھی چار بجے ہیں، یعنی کہیں دو گھنٹے آگے، کہیں چار گھنٹے آگے اور کوئی دو گھنٹے پیچھے۔ کہیں دن ہے اور کہیں رات۔ ایک فرق چلا آرہا ہے۔ اس حساب سے معلوم ہو رہا ہے کہ تمام عالم جو اس وقت دنیا میں موجود ہے یعنی جو ملک زمین پر موجود ہیں، کوئی وقت ایسا نہیں ہے جس میں کسی نہ کسی جگہ ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند نہ ہو رہی ہو۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ پورے عالم کے اس نظام کو اللہ نے اقالیم سبعہ میں تقسیم کر دیا۔ یہ اقالیم سبعہ کے اوقات کا اختلاف اس لیے ہے کہ خداوند قدوس نے ہمیں توجہ دلائی ہے کہ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا﴾[الفرقان:۶۲] ہم نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا خلیفہ بنا دیا، اور کہیں فرمایا: ﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾[الحج:۶۱] ہم رات کو دن میں داخل کرتے ہیں اور کبھی ہم دن کو رات میں داخل کر دیتے ہیں، اور کسی مقام پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ غور کرو ﴿وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾[القصص:۷۳] اللہ تعالیٰ کی رحمت میں سے ہے کہ تمہارے لیے دن اور رات کا ایک نظام بنایا ہے۔

اب جدید تحقیق نے یہ بات واضح کر دی ہے، کمپیوٹرائزڈ طریقے سے حساب کیا ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دنیا میں چوبیس گھنٹے کے اندر ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں گزرتا کہ جب ''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' کی آواز بلند نہ ہو رہی ہو، یعنی اگر سعودی عرب کے اندر ایک اذان کی آواز ختم ہو رہی ہے تو اسی وقت دوسرے ملک میں دوسری اذان کا وقت ہو رہا ہے تو وہاں ''اللہ اکبر'' شروع ہو رہا ہے، اس کی اذان جب ختم ہو رہی ہوتی ہے تو تیسرے ملک میں وقت شروع ہو رہا ہوتا ہے اور مؤذن ''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' کہہ رہا ہوتا ہے۔

اسی حساب سے ہمیں وہ حدیث پاک بھی سمجھ آجاتی ہے کہ ''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ: اَللّٰهُ، اَللّٰهُ''[1] (قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی، جب تک کوئی نہ کوئی ''اللہ اللہ'' کہنے والا موجود رہے گا)۔

[1] [صحیح مسلم، حدیث:۱۴۸، باب: ذَهَابِ الْإِيْمَانِ آخِرَ الزَّمَانِ]

"اِخْتِلَافُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ" کے اندر جہاں دیگر حکمتیں ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتیں ہیں، وہاں ایک سبب یہ بھی ہے کہ کوئی لمحہ بھی ایسا نہ گزرے کہ جس میں اللہ کا ذکر نہ ہو رہا ہو۔

لہٰذا کسی کا یہ کہنا کہ جنت ہمیں کیوں نظر نہیں آتی؟ یا جہنم ہمیں کیوں نظر نہیں آتی؟ یہ بالکل جاہلانہ بات ہے۔ ہمیں تو اپنی رُوح بھی نظر نہیں آتی، ہمیں تو پھول میں سے خوشبو بھی نظر نہیں آتی، ہم جس ہوا سے زندہ ہیں وہ ہوا بھی نظر نہیں آتی۔ ہمارا نہ دیکھنا کسی چیز کے عدم کی دلیل نہیں ہوتا۔ قاعدہ ہے: "عَدَمُ الرُّؤْيَةِ لَا يَسْتَلْزِمُ عَدَمَ الْوُجُوْدِ" کہ کسی چیز کی عدمِ رؤیت عدمِ وجود پر دلالت نہیں کرتی۔ ہم نے تو کئی ملک نہیں دیکھے تو کیا وہ ملک نہیں ہیں؟ کئی ایسے مناظر ہیں جو ہم نے نہیں دیکھے تو کیا وہ ہوں گے بھی نہیں؟

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ "اَلْجَنَّةُ مَخْلُوْقَةٌ وَ النَّارُ مَخْلُوْقَةٌ" کیونکہ جنت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان قرآن مقدس میں موجود ہے: ﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ اور جہنم کے بارے میں اللہ نے فرمادیا ہے: ﴿أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ لہٰذا ﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ میں مذکور "جنت" سے مراد بھی وہی "جنت الخلد" ہے۔

[شرح العقائد النسفية، ص:٢٥٨، مَبْحَثُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ]

آدم علیہ السلام کی تخلیق اور فرشتوں کا سجدہ کرنا جنت میں نہیں تھا:

ان آیاتِ مبارکہ سے ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ تخلیق آدم کا مرحلہ جنت کے علاوہ کسی اور جگہ تھا، اسی طرح تکریم آدم کا مسئلہ بھی کسی اور جگہ تھا، اسی طرح بی بی حواء کا پیدا ہونا، دخولِ جنت اور اسکانِ جنت سے قبل کا مرحلہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ﴾ (تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو)۔ تو پہلے بیوی پیدا ہو چکی تھی، اسی لیے تو اللہ نے حکم دیا کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت کے اندر رہو۔

نکات:

اس لفظ سے ایک اشارہ بھی ملتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو جنت میں مستقل ٹھہرانے کے لیے داخل نہیں کیا گیا تھا، بلکہ فرمایا: ﴿اُسْكُنْ﴾ کہ تم سکون پکڑو۔ اور جب زمین کا مسئلہ آیا تو فرمایا: ﴿مُسْتَقَرٌّ﴾ اور یہاں مجرد حکم تھا۔

اسی سے علماء نے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ ہر بیوی رہائش وغیرہ میں اپنے خاوند کے تابع ہوگی، یعنی جہاں خاوند رہے گا، وہاں بیوی رہے گی۔

لفظ "زوج" مماثلت عددی پر دلالت کرتا ہے۔ تو ﴿زَوْجُكَ﴾ سے معلوم ہوا کہ اللہ نے مرد اور بیوی کو برابری دی ہے کہ دونوں کی جنس ایک ہے اور دونوں کے منامات، ماکولات، مشروبات ہر ایک میں تماثل وتشابہ ہے۔ تو ﴿زَوْجُكَ﴾ (تیری بیوی) یعنی تیرے برابر کہ جیسے تجھے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے، جیسے تجھے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا ہے، اسی طرح حواء کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا فرمایا۔

حضور ﷺ کی بیویوں کے تذکرہ میں قرآن کا طرز:

علماء نے لکھا ہے کہ اگر آپ غور کریں، قرآن پاک میں تدبر اور تفکر کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اللہ نے جہاں جہاں انبیاء کی عورتوں کا ذکر کیا ہے، وہاں "امرأة" کا لفظ آیا ہے یا سورۂ یوسف میں "نسوة" کا لفظ استعمال ہوا ہے: ﴿فَمَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ﴾ [یوسف: ۵۰] لیکن جہاں میرے مدنی سرکار کا ذکر آیا ہے، اللہ نے ان کی بیویوں کے لیے "امرأة" کا لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا﴾ [الاحزاب: ۲۸]

دیکھیں! یہاں "أزواج النبي" فرمایا۔ اس میں ایک اشارہ دیا گیا کہ ہم نے اپنے نبی کو بیویاں بھی ایسی دی ہیں جو ان کی شان کے لائق ہیں۔ جبکہ دیگر انبیاء کی بیویوں کا تذکرہ کرتے وقت دوسرا انداز اختیار کیا، چنانچہ فرمایا: "اِمْرَاَتَ لُوْطٍ" یعنی لوط علیہ السلام کی بیوی ان کے برابر نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ نبی ہیں اور بیوی کافرہ ہے۔ اسی طرح فرمایا: "اِمْرَاَتَ نُوْحٍ" نوح علیہ السلام کی بیوی ان کے برابر نہیں ہو سکتی، کیونکہ نوح علیہ السلام پیغمبر ہیں اور بیوی کافرہ ہے۔ ایک اور جگہ "اِمْرَاَتَ فِرْعَوْنَ" کے الفاظ آئے ہیں، اس لیے کہ فرعون کافر ہے اور بی بی آسیہ مومن ہے تو دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اس لیے وہاں اللہ نے "زوج" کا لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ "امرأة" کا لفظ استعمال فرمایا اور جہاں "زوج" کا لفظ آیا، وہاں تماثل اور برابری کی جھلک ملتی ہے، وہاں یہ اشارہ ملتا ہے کہ آدم! تم بھی شان والے ہو تو حواء بھی شان والی ہے، تم اگر ابو البشر ہو، تمام انسانوں کے باپ ہو تو بی بی حواء بھی تمام انسانوں کی ماں ہے۔ تمہیں ہم نے اتنا مرتبہ بخشا ہے تو بی بی حواء کو بہت بڑا مرتبہ بخشا ہے۔

اللہ نے حضرت حواء علیہا السلام کو زندہ آدم علیہ السلام سے پیدا کیا، اور ان کی پیدائش بھی عجیب انداز میں ہوئی، جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔

آج دنیا کے ڈاکٹر جب بھی کوئی آپریشن کرتے ہیں تو پہلے آدمی کو بے ہوش کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ سب کچھ

ہم سے سیکھا ہے اور ہمیں آکر سکھاتے ہیں۔ آج ساری دنیا کے علوم دیکھ لو، ان کی ابتداء افلاطون سے ہوگی، بقراط سے ہوگی، بوعلی سینا سے ہوگی یا رازی سے ہوگی۔ اور یہ دنیا کہاں جائے گی؟ یہ تو چور ہیں، انہوں نے مسلمانوں کی کتابوں کو چرایا، انہوں نے قرطبہ اور اشبیلیہ کی لائبریریوں سے ہمارے مسلمانوں کے علوم کو چرایا اور بغداد سے دین کو چرایا۔ ان ظالموں نے ان علوم کو حاصل کرنے کے بعد ان کتابوں کو دریا برد کردیا، جیسا کہ امام ابویوسف رحمہ اللہ کی کتاب "الخراج" کو ضائع کیا گیا۔

امام ابویوسف رحمہ اللہ کی بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جو تین سو جلدوں پر مشتمل تھیں، لیکن دشمنوں نے ان کو ضائع کیا، اپنے مفادات کو حاصل کرلیا اور ان کو انگریزی زبانوں میں منتقل کرکے اپنے میوزیم کے پنجروں میں ڈال گئے۔

آج بھی آپ ان کی لائبریریوں میں جا کر دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے کہ میں نے جب کافروں کی لائبریریوں میں آکر اپنے اجداد کی کتابیں دیکھی ہیں تو دل ہوتا ہے سہ پارہ، یعنی دل دو ٹکڑے نہیں، بلکہ تیس ٹکڑے ہوجاتا ہے کہ علم ہمارا تھا، کتابیں ہماری تھیں، لیکن بدقسمتی ہے کہ مسلمانوں سے اپنے ورثہ سے غفلت کی اور دشمنوں نے ان سے بڑے بڑے علوم حاصل کرلیے اور آج وہ فخر کرتے ہیں کہ یہ ہم نے کیا ہے، حالانکہ انہوں نے کچھ نہیں کیا، یہ تو چور ہیں، انہوں نے تو ہمارے ان علوم کو چرایا ہے۔

تفسیر:

﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ اور ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا: "وَ لَا تَأْكُلَا" (کہ تم اسے مت کھاؤ)، بلکہ حکم دے دیا کہ قریب ہی نہ جاؤ۔ حالانکہ مطلب یہی ہے کہ اس کو نہ کھاؤ، لیکن اسی طرح کہتے ہیں کہ اگر قریب جاؤ گے تو دل میں کھانے کی خواہش پیدا ہوگی، اس لیے قریب ہی نہ جاؤ۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى﴾ یہاں بھی اللہ نے آدم علیہ السلام کو اور بی بی حوا رضی اللہ عنہا دونوں کو نہی میں شریک کیا ہے۔

[تفسیر القرطبی: ۱/۳۰۲]

"ظالمین" کا معنی:

لفظ "ظالمین" کہیں تو "کافرین" کے معنی میں آتا ہے اور کہیں "حد سے تجاوز کرنے والے" کے معنی میں آتا ہے۔ ظلم کی تعریف ہے: "وَضْعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَحَلِّهِ" (کسی چیز کو اس کے محل میں نہ رکھنا)۔ اس لیے کافر کو ظالم کہا

گیا کہ اللہ نے پیشانی اپنی ذات کو سجدہ کرنے کے لیے پیدا کی تھی، لیکن ان ظالموں نے اللہ کو چھوڑ کر اصنام، اشجار اور ابحار کو سجدے کرنے شروع کر دیئے۔ یہ "وَضْعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَوْضُوعِهٖ" ہے۔ تو اللہ نے فرمایا: تم اگر میری اس نہی کا ارتکاب کر بیٹھو گے تو پھر گویا کہ تم بھی اپنی جان کے اوپر زیادتی کرنے والے ہو گے۔

کہیں ظالمین سے کافرین مراد ہوتے ہیں، اور کہیں مجرمین مراد ہوتے ہیں اور کہیں فاسقین مراد ہوتے ہیں اور کہیں یہ لفظ تنبیہ کے لیے آجاتا ہے، جیسے آدم علیہ السلام اور حواء علیہا السلام کے بارے میں یہاں آیا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے چار مراحل

اللہ نے حکم دیا: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [البقرة: ۳۵] (کہ تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا) کھانا تو در کنار، بلکہ تم اس درخت کے قریب بھی نہ جانا۔ لیکن آدم علیہ السلام کھا بیٹھے۔ علماء نے کہا ہے کہ اس مسئلے کو آپ چار مراحل میں لے لیں تو اس کا سمجھنا آسان ہو جائے گا: ایک مرحلہ اعتقادیات کا ہے، دوسرا مرحلہ تبلیغ احکام کا ہے، تیسرا مرحلہ فتویٰ و اجتہاد کا ہے اور چوتھا مرحلہ اقوال، افعال، اعمال کا ہے۔ یہ چار حصے کر لیں تو آپ کو مسئلہ سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔

①......اعتقادیات:

اللہ کے تمام انبیاء اعتقادیات میں بالکل دین فطرت پر ہیں۔ ان کے اعتقادیات میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اگر اللہ ان کو نبوت کے لیے چُن لیں اور ان کو توحید کا پتہ نہ ہو، ایسی بات نہیں ہے۔ تو اعتقادیات میں عصمتِ انبیاء واضح ہو گئی۔

②......تبلیغِ احکام، تبلیغِ رسالت:

اس میں اللہ کے نبی من کل الوجوہ معصوم ہیں۔ ناممکن ہے کہ اللہ اپنے پیغمبروں کو کوئی حکم دے اور وہ رسالت میں کوئی کوتاہی کریں یا اللہ کے حکم کو پہنچانے میں کوئی کمی کریں۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

عصمتِ یونس علیہ السلام:

حضرت یونس علیہ السلام کے معاملہ میں پاکستان کے ایک معروف سکالر کو دھوکہ لگا۔ وہ لکھ بیٹھے کہ ان سے فریضۂ

رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی ہوئی۔ حالانکہ اگر فریضۂ رسالت ہی ادا نہ ہو تو پھر رسول کہاں رہا؟ اور اگر اس نے فریضۂ رسالت پورا ہی نہیں کیا تو پھر حضرت یونس علیہ السلام کا عذاب کی دھمکی دینے کا کیا مطلب؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی بستی پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتے جب تک کہ اس میں کوئی رسول نہ بھیج دیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝۱۵﴾ [الاسراء: ۱۵] اگر رسول آ کر اپنا کام پورا نہ کرے تو پھر قوم پر عذاب کیوں سنائے؟ وہاں تو فریضۂ رسالت کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے فریضۂ رسالت مکمل ادا کیا، قوم نہ مانی تو آپ نے قوم کو ڈرایا کہ تم پر تین دن کے بعد عذاب نازل ہوگا۔ اب عذاب کی علامات شروع ہوگئیں تو اللہ کے نبی حضرت یونس علیہ السلام وہاں سے چلے گئے، حالانکہ ان کو انتظار کرنا چاہیے تھا۔ وہ اس بستی سے اس وقت تک باہر نہ جاتے جب تک اللہ کا حکم نہ آتا۔ کیونکہ اللہ اپنے نبیوں کو حکم دیتے ہیں کہ اب تم باہر چلے جاؤ۔ جیسے لوط علیہ السلام کو حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ جب قوم پر عذاب نازل کرتے ہیں تو اپنے نبیوں کو خود نکال لیتے ہیں، اپنے رسولوں کو خود نکال لیتے ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اس حکم کا انتظار نہ فرمایا اور چل پڑے۔ اس پر اللہ کی ناراضی آگئی کہ میرے حکم کے بغیر کیوں چلے؟ رسالت تو پوری ہوگئی، رسالت میں تو کوتاہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (نعوذ باللہ!) پھر رسول کیا رسول رہا؟

جب قوم پر عذاب کے آثار آئے اور قوم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اللہ کے نبی چلے گئے ہیں تو قوم یکدم خدا کے دروازہ پر گر گئی، معافی مانگنے اور گڑگڑانے لگ گئی، آخر قوم کو معافی مل گئی۔ اب یونس علیہ السلام گھبرا گئے کہ میں اگر میں ان کے پاس جاؤں تو قوم کہے گی: یہ تو جھوٹا ہے،...... نعوذ باللہ!...... میں نے تو ان کو کہا تھا کہ تین دن کے بعد عذاب آئے گا، لیکن عذاب تو ٹل گیا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ پیش آ گیا تھا، اس میں تو فریضۂ رسالت کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

اسی لیے یاد رکھ لیں کہ تبلیغِ احکام، تبلیغِ رسالت کے اندر بھی اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں اور عقیدے میں بھی اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کا نبی نبوت سے پہلے کفر کرتا رہا ہو۔ جیسے لوگوں کو دھوکہ لگا کہ ...... نعوذ باللہ!...... ابراہیم علیہ السلام نے آہستہ آہستہ توحید سمجھی۔ یہ بڑے مغالطے ہیں جن سے لوگوں کو غلطیاں ہوئیں۔ اللہ ان کو معاف فرمائے۔

امامیہ فرقہ کے نزدیک نبی کفر بھی کر سکتا ہے:

یہ بھی یاد رکھیں کہ امامیہ برادری ہر مسئلے میں عجیب ہے۔ ان کے عقیدے میں امامت، نبوت سے بڑھ کر ہے،

یعنی نبوت کی شان کم ہے اور امام کی شان زیادہ ہے۔ ان کے عقیدے میں ہے کہ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت میں بیعت لی تھی۔ یہ عجیب لوگ ہیں، ان کے نزدیک نبی کفر بھی کر سکتا ہے۔

③......فتویٰ واجتہاد:

تیسرا مرحلہ فتویٰ واجتہاد کا ہے۔ اس کے اندر انبیاء علیہم السلام پر جو حکم اللہ نازل نہ فرمائے، اس میں کبھی اجتہاد میں لغزش ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ اجتہاد کے طور پر ایک حکم بیان کرتے ہیں، حالانکہ اللہ کی مرضی اس کے خلاف ہوتی ہے تو اللہ اپنے نبیوں کو فوراً وحی نازل کر دیتے ہیں، جیسا کہ بدر کے قیدیوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑ دیا، لیکن اللہ نے فوراً قرآن نازل کر دیا اور اصل مسئلہ سے آگاہ فرما دیا۔ لہٰذا اس سے بھی انبیاء علیہم السلام پاک ہو گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر مجتہد خطا بھی کرے گا اور صواب پر بھی ہوگا، لیکن خطا پر بھی اس کو ثواب ملے گا، کیونکہ اس نے محنت کی ہے، اس کی محنت کو خدا ضائع نہیں کرتے۔ چنانچہ اگر اجتہاد غلط ہو گیا تو ایک اجر ملے گا، لیکن اگر اس نے محنت کی اور مسئلہ ٹھیک معلوم کر لیا تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔ البتہ یہ راز قیامت میں کھلے گا کہ مجتہد نے جو مسئلہ بیان کیا تھا، وہ ٹھیک تھا یا نہیں۔ اس لیے کہ اب تو وحی نہیں آ رہی۔ [صحیح البخاری، حدیث ۷۳۵۲، بابُ: أجرِ الحاكمِ إذا اجتهدَ فأصابَ أو أخطأَ]

④......اقوال، افعال اور اعمال:

اور چوتھا مرحلہ ہے انبیاء کے اقوال، افعال اور اعمال کا۔ اس کے اندر انبیاء سے کبھی ترکِ اَولیٰ و ترکِ افضل ہو جاتا ہے۔ کوئی چھوٹی سی خطا ہو جائے تو وہ بھی ارادۃً نہیں، بلکہ سہواً و نسیاناً ہوتی ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، أَرْضَى كَمَا يَرْضَى الْبَشَرُ، وَأَغْضَبُ كَمَا يَغْضَبُ الْبَشَرُ))

''میں اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، بشر ہوں، میں بھی راضی وخوش ہو سکتا ہوں جیسے تم راضی وخوش ہو جاتے ہو۔ مجھے بھی غصہ آ جاتا ہے جیسے تمہیں غصہ آ جاتا ہے۔''

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۶۰۳، بابُ مَنْ لَعَنَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَوْ سَبَّهُ...]

انبیاء علیہم السلام کے نفوس تو ایسے پاک ہوتے ہیں جیسے پانی کی فطرت میں برودت ہے۔ اس کو خارجی چیزیں گرم کر دیتی ہیں۔ مثلاً آگ پر رکھیں تو پانی گرم ہو جائے گا، دھوپ میں رکھیں تو گرم ہو جائے گا، گرم ہوا چلے تو گرم

ہوجائے گا۔ اب پانی خارجی اثر قبول کر رہا ہے۔ اور اگر پانی کو گرم کرلیں اور اسی کو آپ آگ پر ڈال دیں تو وہ آگ کو بجھا دے گا۔ حالانکہ پانی آگ کی طرح گرم ہے کہ اس میں انگلی ڈالیں تو آپ کے ہاتھ جلا ڈالے لیکن آپ اسی گرم پانی کو آگ پر ڈال دیں تو آگ کو بجھا دیتا ہے، وجہ یہ ہے کہ اس کی فطرت میں برودت ہے۔

انبیاء ﷺ کی فطرت میں بھی عصمت ہے اور اگر غلطی نظر آرہی ہے تو وہ خارجی اثر ہے، اسی لیے قرآن کہتا ہے: ﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ﴾ [یوسف: ۲۴] اللہ نے فرمایا کہ ہم نے یوسف سے پھیرا ''سوء'' اور ''فحشاء'' کو۔ یعنی برائی آرہی تھی، ہم نے اس برائی کو پھیر دیا۔ یہ نہیں کہا کہ یوسف علیہ السلام برائی کی طرف جارہے تھے، بلکہ برائی یوسف کی طرف آرہی تھی تو اللہ نے اس برائی کو پھیر دیا۔

خارجی اثرات بھی اس لیے اثر کرتے ہیں کہ اس کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، ورنہ وہ خارجی اثرات بھی اثر نہ کرتے، اللہ ان اثرات کو دور کر دیتے، روک دیتے۔

توبہ کا مسئلہ کیسے سمجھ آتا؟

اگر آدم علیہ السلام غلطی نہ کرتے تو توبہ کا مسئلہ کون سمجھاتا کہ توبہ کیا ہے؟ اور جب توبہ کا مسئلہ سمجھ نہ آتا تو قیامت تک اولاد برباد ہوجاتی۔ آدم علیہ السلام سے جب یہ بات ہوئی تو اب رونا دھونا اور آہ و زاری شروع کی اور تین سو سال تک روتے رہے۔[1] اب اولاد کو مسئلہ سمجھ آیا کہ جب تم غلطی کرو تو تمہیں بھی گریہ وزاری کرنی ہے، اللہ کے دروازے پر لوٹنا ہے، توبہ کرنی ہے اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ توبہ قبول فرما لیتے ہیں۔

اس میں ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ (ان کو شیطان نے پھسلایا) خارجی اثر ہے، اندر سے بالکل کچھ نہیں۔ وہ تو معصوم تھے، باہر سے ایک اثر آرہا ہے اور اثر بھی ایسے انداز میں آرہا ہے کہ آدم علیہ السلام کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی اللہ کے نام پر دھوکہ دے گا، کیونکہ ان کا ابھی تک مخلوق سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

سجدۂ سہو کا طریقہ کون بتاتا؟

حضور ﷺ کو نماز میں سہو آیا۔ چار رکعات کی نماز دو رکعات پڑھا دی اور سلام پھیر دیا۔ ذوالیدین نامی ایک صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا گیا:

((يَا رَسُولَ اللهِ! أَنَسِيتَ أَمْ قُصِرَتِ الصَّلَاةُ؟))

---

[1] [إحياء العلوم: ۴/ ۲۲۲، المقام الأول من المرابطة]

''یارسول اللہ! آپ بھول گئے یا نماز چھوٹی ہو گئی ہے؟''

حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَمْ أَنْسَ، وَلَمْ تُقْصَرِ الصَّلَاةُ))

''نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز چھوٹی ہوئی ہے۔''

صحابی نے عرض کیا: کچھ تو ضرور ہوا ہے۔ حضور ﷺ نے باقی صحابہ سے پوچھا تو صحابہ نے عرض کیا: حضور! ذوالیدین نے بات تو ٹھیک کی ہے۔ حضور ﷺ نے پھر نماز پوری کی۔

[سنن أبي داود، حدیث:١٠٠٨، بابُ: السَّهْوِ فِي السَّجْدَتَيْنِ]

اب دیکھیں کہ بظاہر تو سہو آ گیا۔ لیکن اگر یہ سہو نہ آتا تو ہمیں سجدۂ سہو کا مسئلہ کون سمجھاتا؟ حضور ﷺ پر اگر یہ بھول طاری نہ ہوتی تو ہم اگر نماز میں بھول جاتے تو کیا طریقہ اختیار کرتے؟

قضا شدہ نماز کیسے پڑھتے؟

حضور ﷺ کو نیند آ گئی، نماز قضا ہو گئی، سورج نکل آیا۔ اب بظاہر تو سورج نکل آیا، نماز قضا ہو گئی، لیکن اگر حضور ﷺ سے نماز قضا نہ ہوتی تو قضا نماز کا مسئلہ کون سمجھاتا؟

[صحیح مسلم، حدیث:٦٨٠، بابُ: قَضَاءِ الصَّلَاةِ الْفَائِتَةِ...]

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، خارجی اثرات کبھی اثر کرتے ہیں، اگر ان سے کبھی ترکِ اَولیٰ اور ترکِ افضل ہو جاتا ہے تو اس میں بھی اللہ کی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ پوری دنیا کو سبق سکھلانا ہوتا ہے۔ اور وہ غلطی اللہ کو اتنی پیاری ہوتی ہے کہ عام شخص کی نیکی بھی اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔

بعض صوفیاء کی غلط فہمی:

بعض صوفی پیر دھوکہ میں آ گئے کہ کبھی کبھی گناہ کرنے دیا کرو کہ اس سے بھی بڑے بڑے مرتبے ملتے ہیں۔ وہ اس چکر میں پڑے ہوئے ہیں، کہتے ہیں کہ بزرگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں، اس کے بغیر بھی تو ترقی نہیں ہوتی، حالانکہ شریعت میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ خواہ مخواہ اپنے آپ کو گناہ کے لیے پیش نہیں کرنا چاہیے، ورنہ معلوم نہیں توبہ بھی نصیب ہو یا نہ ہو۔ کتنے لوگ ایسے گزرے ہیں جن کی ساری زندگی عبادت میں گزری، مگر کسی ایک گناہ کی وجہ سے سب نیکیاں ضائع ہو گئیں اور انجام اور خاتمہ خراب ہو گیا۔

یہ بات ذہن میں رکھیں کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں، اندر باہر سے پاک ہیں، ظاہر باطن سے پاک ہیں۔ ان سے اگر کوئی بات ہوئی ہے تو اثر خارجی کی وجہ سے ہوئی ہے اور اس میں بھی اللہ کی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اس لیے اللہ نے آدم علیہ السلام کے مسئلے میں بھی فرمایا: ﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ [طٰہٰ: ۱۱۵] کہ آدم بھول گئے۔ اگر تم روزے کی حالت میں بھول کر پانی کا گلاس پی جاؤ، تمہاری بھول تو معاف ہے اور آدم علیہ السلام نے بھول کر اس درخت سے دانہ کھایا تو معاف نہ ہو۔ اور پھر اس پر گرفت بھی ہوئی، اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقام بہت اونچا اور بہت نازک ہے، جیسے کہتے ہیں: ''حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِينَ'' (نیک لوگوں کی نیکیاں مقرب حضرات کے گناہ کے درجہ میں ہوتی ہیں)۔ [احیاء العلوم ۴/۴۹ بیان ما ینبغي أن یبادر إلیه التائب...]

اس لیے یاد رکھیں کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، اور اندر باہر سے پاک ہوتے ہیں، اور پھر ان لفظوں کو ظلم سے کیوں تعبیر کیا جاتا ہے؟ اس کی مثال ایسے ہے کہ اگر کوئی شان والا چھوٹی سی بھی غلطی کرے تو بڑی نظر آتی ہے، یہ قاعدہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ جیسے مشہور ہے کہ ایک بزرگ کو لوگ پتھر مارے جا رہے تھے، وہ برداشت کرتے رہے۔ ایک آدمی نے آکر پتھر مارا تو ان کی چیخ نکل گئی۔ پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: یہ تو میری بات کو سمجھتا تھا، اس نے پتھر مارا تو مجھے تکلیف ہوئی۔ دوسرے تو نہیں سمجھتے تھے، اس لیے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی، کیونکہ وہ نہ جاننے والے تھے۔

اس لیے کبھی انبیاء سے ترکِ اَولیٰ ہو جاتا ہے۔ جیسے اگر ایک تہجد گزار کی تہجد بھی رہ جائے تو وہ روتا رہتا ہے اور اگر بے نماز کی نماز چلی جائے تو اس کو پروا بھی نہیں ہوتی، اس کو کوئی غم نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق بات سمجھنے کی توفیق دے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حافظ ابوبکر بن مردویہ نے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت ابراہیم تیمی اپنے والد سے نقل کرتے ہیں اور وہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! آپ ہمیں یہ بتلائیں کہ کیا آدم علیہ السلام بھی نبی تھے؟ کیونکہ قرآن میں ﴿خَلِيفَةً﴾ کا لفظ آیا ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! آپ نبی بھی تھے، رسول بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے سامنے کلام فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی کلام کا شرف بخشا۔ [المعجم الاوسط، حدیث: ۴۲۵۹]

اس عبارت میں دو لفظ آگئے ہیں، نبی کا لفظ بھی آیا ہے اور رسول کا لفظ بھی آیا ہے۔ اگر یہ حدیث مبارکہ درجۂ

صحت تک پہنچتی ہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اصطلاحی طور پر مراد نہیں کہ نبی بھی فرما دیا اور رسول بھی فرما دیا۔ کیونکہ آدم علیہ السلام پر کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اور نہ آپ کو کوئی شریعت دی گئی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے خلافت بھی دی اور نبوت بھی دی، لیکن آپ سے زیادہ کام عمرانِ ارض (زمین کو آباد کرنے) کا لیا گیا اور یہاں آپ کی نسل کو پھیلایا گیا۔ ان کو اشیاء کے نام سکھائے گئے تھے، پھر ان کو اس دنیا کی چیزوں سے نفع حاصل کرنے کے طریقے بتلائے گئے۔ اور ابتداء رسالت و شریعت حضرت نوح علیہ السلام سے ہوئی۔

کنز العمال حدیث نمبر ۳۲۲۶۹ میں ہے: "أَوَّلُ الرُّسُلِ آدَمُ وَ آخِرُهُمْ مُحَمَّدٌ" اور کنز العمال حدیث نمبر ۳۵۵۶۴ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ سب سے پہلے نبی آدم علیہ السلام تھے۔

ان احادیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام نبی بھی تھے اور رسول بھی تھے۔ اور اس روایت مبارکہ میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اپنی قدرت سے اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا اور انہیں نفع حاصل کرنے کے طریقے بتلائے گئے اور ابتداء رسالت و شریعت حضرت نوح علیہ السلام سے ہوئی۔

اور اس روایت مبارکہ میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اپنی قدرت سے اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا اور ان میں نفخ روح فرمایا اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ تُو اور تیری بیوی جنت میں رہو۔ اس حکم کے درمیان میں کوئی فرشتہ نہیں تھا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے براہِ راست حکم فرمایا: ﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [البقرۃ:۳۵]

[المعجم الاوسط، حدیث: ۴۲۵۹]

حضرت حواء علیہا السلام کب اور کیسے پیدا ہوئیں؟

محمد بن اسحاق نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابلیس پر ناراضگی کا اظہار کر کے اس کو مردود و ملعون کر دیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف توجہ فرمائی اور ان کو تمام اسماء کی تعلیم دے چکے تو آدم علیہ السلام پر ایک اونگھ ڈالی گئی، تا کہ ان کو نیند آ جائے۔ یہی باتیں جو ہمیں اہل کتاب سے پہنچی ہیں، یعنی تورات والوں سے، اہل علم سے اور ان روایات میں یہ بھی نقل کیا گیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بائیں جانب کی ایک پسلی کو نکالا اور وہیں سے بی بی حواء علیہا السلام کو پیدا کیا گیا اور پھر اس جگہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے

ٹھیک کر دیا۔

جیسا کہ حضور پاک ﷺ کا شق صدر ہوا اور کئی دفعہ آپ کا سینہ مبارک کھولا گیا اور پھر جوڑا گیا اور اسی وقت حضور ﷺ ٹھیک ہو گئے۔ ایک حدیث مبارک میں آتا ہے، ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کے سینہ مبارک پر ٹانکے کا نشان بھی دیکھا۔ لیکن اسی وقت ٹھیک ہو گئے کہ سینہ کھل بھی گیا، حکمت سے بھر بھی دیا گیا اور اندر سے اللہ جو چیز اپنے علم کے مطابق دھونا چاہتے تھے، دھو بھی دیا گیا اور پھر جوڑ دیا گیا اور سب برابر ہو گیا۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ اس جگہ گوشت وغیرہ سب ٹھیک ہو گیا۔

آدم علیہ السلام اسی طرح نیند کی حالت میں تھے، ان کو پتہ بھی نہیں تھا، وہ اپنی نیند سے بیدار نہیں ہوئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت حواء علیہا السلام کو پیدا فرمایا اور اس کو عورت بنایا، تا کہ آدم علیہ السلام اس کی طرف سکون پکڑ سکیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۸، ۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک ایسا نظام بنایا ہے کہ مرد کو جو صحیح معنوں میں تسکین اور سکون ہے، طمانینت ہے، وہ اپنی بیوی سے حاصل ہوتی ہے اور اسی طرح بیوی کو تسکین اپنے خاوند سے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بی بی حواء علیہا السلام کو پیدا فرما دیا، تا کہ آدم علیہ السلام اس سے سکون حاصل کریں۔ اسی سے علماء نے مسائل استنباط کیے ہیں کہ خدا نہ کرے کسی گھر میں اگر بیوی فرماں بردار نہیں ہے، اطاعت شعار نہیں ہے اور اپنے خاوند کی حاجات اور ضروریات کا خیال رکھنے والی نہیں ہے، یعنی اس سے خاوند کو سکون نہیں ملتا تو علماء نے فرمایا: گویا کہ یہ بیوی نہیں ہے، کیونکہ بیوی کے بنانے کا مقصد یہ ہے کہ خاوند کے سکون کا ذریعہ بنے، اس کے اطمینان کا ذریعہ بنے۔

غریبوں کی بیویاں:

ایسا تو نہیں ہونا چاہیے کہ وہ سارا دن مردوں کی طرح کام کرے، کاشتکاری کرے یا مزدوری کرے۔ اس طرح تو وہ مزدور کہلائے گی، بیوی تو نہ ہوئی۔ غریبوں کے حقیقتاً احوال یہ ہیں کہ ان لوگوں نے بیوی کو ایک بہترین مزدور سمجھا ہوا ہے کہ جس کو تنخواہ بھی نہیں دینی پڑتی اور کام بھی چوبیس گھنٹے لیا جاتا ہے، وہ کھیتی باڑی میں ہے، کہیں چاول کاشت کر رہی ہے، کہیں گندم کاشت کر رہی ہے اور پھر خاوند کی روٹی لا رہی ہے، جانوروں کو چارہ ڈال رہی ہے، پھر گھر کے اندر صفائی بھی اس نے کرنی ہے، کھانا بھی اسی نے پکانا ہے اور بچوں کو بھی اسی نے سنبھالنا ہے، یعنی ایک بہترین نوکر اور مزدور ہے۔

امیر لوگوں کی بیویاں:

اور جو بڑے لوگوں کی بیویاں ہیں وہ اپنے خاوند پر حکومت کرتی ہیں، خاوندوں کے ہاں سب سے اہم شخصیت بیوی ہے، اس کے سامنے نوکروں کی ایک فوج ظفر موج کھڑی ہے، نوکرانیاں علیحدہ ہیں، نوکر علیحدہ ہیں، ڈرائیور علیحدہ ہے اور پھر اس کے باوجود بیگم کا موڈ ہر وقت آف ہے۔

بیوی نہیں......عذابِ خداوندی:

ان دونوں معاملات میں یہ عورتیں نہیں ہوتیں، بلکہ اللہ کی طرف سے عذاب ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کبھی ہمارے گناہوں کی سزا اس شکل میں عطا فرماتے ہیں کہ گھر میں بیوی نافرمان ہوگئی یا اولاد کے اندر نافرمانی آگئی، اس طرح دوستوں کے درمیان جھگڑے پیدا ہوگئے، رشتہ داروں کے اندر بغض وعناد پیدا ہوگیا۔

کیے کا دھرا:

یہ دراصل ہمارے اعمال کی سزا ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے نہیں ہیں، حالانکہ اس کی اصل وجہ ہمارے گناہ ہیں کہ کوئی نہ کوئی ذہنی پریشانی ہے اور پھر گھریلو پریشانی کا کوئی حل ہی نہیں۔ آپ مار بھی نہیں سکتے، اگر بچوں کی ماں ہو تو آپ طلاق بھی نہیں دے سکتے۔ یہ ایک مستقل عذاب ہے جو آپ کے گلے میں پڑا ہوا ہے، یعنی جسے اُردو محاورہ میں کہتے ہیں کہ جیسے آدمی نہ تو نگل سکتا ہے اور نہ پھینک سکتا ہے۔ اور اسی طرح جو متوسط طبقہ ہے، ان کے بھی حالات یہ ہیں ﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝﴾ [سبا: ۱۳] بہت کم گھرانے ہیں جن کے گھروں کے اندر صحیح معنی میں سکون ہے، آرام ہے۔

ماڈرن بیوی:

ایک دفعہ ہم بیٹھے تھے تو ایک دوست کہنے لگے: اللہ کا فضل اور مہربانی ہے کہ مجھے اللہ نے جو بیوی عطا فرمائی ہے بڑی فرمانبردار ہے، بڑی وفا شعار ہے۔ اور پھر مجھے اس نے اپنا گھر دکھایا کہ دیکھیں! اس نے میرا گھر کیسے سجا رکھا ہے؟ اور کیسے بنایا ہوا ہے؟

خیر! میں اس کی بات سنتا رہا۔ ساری باتیں سننے کے بعد میں نے کہا کہ وہ آپ کی وفا شعار، خدمت گزار اور مخلص بیوی اس وقت کہاں ہے؟......اسے پتہ تھا کہ اتنے سال بعد میں بھی گھر میں آرہا ہوں......کم از کم میرے

لیے کوئی کھانا، کوئی چائے وغیرہ بنانے میں تمہاری مدد کرتی۔ اس نے کہا کہ ایک پارٹی میں گئی ہوئی ہے۔ میں نے کہا: اللہ کے بندے! جب وہ بازاروں میں گھومتی ہے، ڈرائیور کے ساتھ اکیلی پھرتی ہے، شام کو کلب اٹینڈ کرتی ہے اور تم نہیں روکتے ہو، فائیو سٹار ہوٹلوں میں جا کر وہ کھانا کھاتی ہے تم نہیں روکتے ہو تو پھر وہ تمہاری وفادار کیوں نہ ہو؟ جب تم اس کے ایک غلام ہو، تم اس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتے کہ آج تم کہاں گئی تھی؟ آخر گھر میں مہمان بیٹھا ہوں، تم مجھے نوکروں سے چائے پلا رہے ہو، یہ کوئی فرمانبرداری نہیں ہے۔ فرمانبرداری تو تب ہے کہ تم اسے کوئی حکم دو اور وہ اس کو پورا کرے، اب جب تم اس کے غلام بنے ہوئے ہو، پھر اگر وہ تمہارا گھر ٹھیک کر دے یا دو چار میٹھی باتیں کر دے تو اس میں کون سی وفا شعاری والی بات ہے؟

اصل وفا شعاری؟

وفا شعاری تو یہ ہے کہ وہ بے نماز تھی، تم نے اس کو کہا کہ نماز پڑھو تو وہ نمازی بن گئی، اس نے قرآن پاک کبھی نہیں پڑھا تھا، تم نے کہا کہ قرآن کی تعلیم حاصل کرو، کم از کم دو چار سورتیں یاد کرو، تاکہ نماز صحیح ہو تو اس نے بات مان لی۔ تم نے اسے کہا کہ گھر میں حرام نہیں آنا چاہیے، اگر میں کبھی بھٹکنے لگوں تو مجھے روکو، میرے بچوں کے پیٹ میں حرام مت داخل کرو اور میں جب گھر سے باہر چلا جاؤں تو تمہاری آواز کوئی نہ سنے، تمہیں کوئی کھڑکیوں سے تاکتا جھانکتا ہوا نہ پھرے۔ اگر وہ ان باتوں میں آپ کا کہا مانتی ہے تو بڑی شکر گزار ہے۔ اور اگر اس کے بعد وہ کہے کہ میں کوئی قید میں ہوں، آپ جائیں اپنے دوستوں سے ملیں، میری سہیلیاں ہیں میں بھی ان کو ملنے کے لیے جاتی ہوں، آپ بھی واپس آجائیں گے اور میں بھی واپس آجاؤں گی۔ یہ تو کوئی وفا شعاری نہ ہوئی، بلکہ یہ تو گزارے والی بات ہوئی کہ تم بھی اس حال میں گزارہ کرو اور میں بھی اس حال میں گزارہ کروں۔ اس طرح تو جو بری عورتیں ہیں وہ سب سے زیادہ وفادار ہوئیں۔ وہ تو سب سے زیادہ خاوند کا خیال رکھتی ہیں کہ کپڑوں میں، کھانے میں، نہانے دھونے میں، وہ تو پھر بڑی وفادار ہوئیں۔ لیکن بس اتنا ہوتا ہے کہ وہ باقی لوگوں کو بھی راضی کرتی رہتی ہیں، کیونکہ اچھا آدمی تو وہی ہوتا ہے کہ جس سے کوئی ناراض نہ ہو، جس سے لوگ ناراض ہو جائیں وہ کیا اچھا ہے؟ وہ تو بد خلق ہوئی...... اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... اللہ پاک ہمارے گھروں پر رحم فرمائیں، اگر ہمارے گھر صحیح ہوں گے تو ہماری اولادیں صحیح ہوں گی، اگر ہمارے گھر صحیح نہیں ہوں گے تو آنے والی نسل کبھی صحیح نہیں ہوگی۔

یہ اُصول یاد رکھ لیں! باپ بے چارہ جتنا زور لگا لے بیٹا ٹھیک نہیں ہو سکتا، جب تک ماں ٹھیک نہ ہو۔ کیونکہ باپ

کتنی دیر اولاد پر محنت کرے گا؟ اولاد کا زیادہ تر وقت ماں کے ساتھ گزرتا ہے، پیدا ہونے سے جوان ہونے تک اگر والدہ نے اس کو غلط راستہ پر لگا دیا تو آپ جتنی مرضی تقریریں کرتے رہیں، کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

حضرت حواء علیہا السلام کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کا نکاح:

بہر حال اللہ تعالیٰ نے بی بی حواء علیہا السلام کو اس لیے پیدا کیا، تا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تسکین حاصل ہو۔ جس گھر میں سکون نہ ملے وہ گھر نہیں، جس بیوی سے سکون نہ ملے وہ بیوی نہیں۔ اس لیے کہ اللہ نے دونوں چیزیں سکون کے لیے بنائی ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ جب نیند کھلی اور حضرت آدم علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک عورت ساتھ بیٹھی ہوئی ہے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ! تیری قدرت ہے، گوشت بھی میرا ہو، خون بھی میرا ہو اور پھر اسے آپ نے میرے لیے میری بیوی بنایا ہے۔ ﴿لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا﴾ تو حضرت آدم علیہ السلام کو اس سے تسکین ہوئی۔ ''فَلَمَّا زَوَّجَهُ اللّٰهُ'' اللہ نے آپ کا نکاح فرمایا اور ان کو آپ کی بیوی بنایا اور اللہ نے ان کے اپنے سکون کے لیے ان کے بدن سے ایک حصہ نکالا کیونکہ آدمی کا اپنا جزو ہوگا تو اس سے زیادہ قربت حاصل ہوگی۔ اُصولی بات ہے کہ ایک کپڑا ہے، اس سے ایک ٹکڑا کاٹ کر اسی میں لگاؤ تو لگ جائے گا اور اگر دوسرا کپڑا لگاؤ گے تو کوئی نہ کوئی فرق تو ہوگا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۷۸/۱، ۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

اسی لیے قدرتی بات ہے کہ ہر مرد کا فطرتی طور پر عورت کی طرف میلان ہوتا ہے، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں، وہ حلال میں پابند رہتے ہیں اور جو اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈرنے والے نہیں ہیں، ان کے لیے حلال، حرام کا کوئی مسئلہ ہی نہیں، ان کے لیے تو نہ کوئی حلال ہے اور نہ حرام ہے۔ جب آدمی خدا کو ہی نہ مانے، اللہ کے رسول پاک پر بھی ایمان نہ لے آئے، اللہ کے قرآن وشریعت پر بھی ایمان نہ لے آئے تو اس کا ہر روز عید ہے اور ہر رات شب برأت ہے، اس کے لیے تو ہر وقت محفلیں ہیں، شراب ہے، عریانیاں اور فحاشی ہے۔

''حواء'' نام کی وجہ تسمیہ:

بعض مفسرین نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بی بی حواء علیہا السلام کو جنت میں داخل ہونے کے بعد پیدا کیا گیا۔

اور ایک روایت یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنت سے شیطان کو نکال دیا اور آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھہرایا۔ اگرچہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس ہر نعمت موجود تھی، مگر چونکہ اکیلے تھے، اس لیے پریشان سے تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی بائیں پسلی سے بی بی حواء کو پیدا فرمایا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

آدم علیہ السلام اور حواء علیہا السلام کا مکالمہ:

جب بی بی حواء پیدا ہوئیں تو حضرت آدم علیہ السلام سوئے ہوئے تھے۔ جب آپ کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میرے ساتھ ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں عورت ہوں۔ اس سے پوچھا: اللہ پاک نے تجھے کیوں بھیجا ہے؟ اس نے کہا: اس لیے کہ تم میرے ساتھ تسکین حاصل کر سکو، تا کہ ہم اکٹھے رہ سکیں۔ آپ نے فرمایا: اچھا! [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

آدم علیہ السلام اور ملائکہ کا مکالمہ:

اس موقع پر ملائکہ نے کہا کہ اللہ نے جو انہیں بڑا علم دیا ہے تو اب پتہ کرتے ہیں کہ ان کو اس عورت کا نام بھی آتا ہے یا نہیں آتا، کیونکہ یہ بعد میں پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ ملائکہ نے آدم علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ یہ میری بیوی ہے۔ انہوں نے پوچھا: اس کا نام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: حواء ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ "حواء" نام کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا: کیونکہ اللہ نے اس کو ایک زندہ سے پیدا کیا ہے، اس لیے ان کو "حواء" کہا گیا ہے۔ اب ملائکہ پھر چپ ہو گئے، آدم علیہ السلام کا علم پھر بھی فائق رہا۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ تو ان کو علم عطا فرما چکے تھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا کہ تم بھی اور تمہاری بیوی بھی جنت میں رہو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

اس لیے بعض علماء نے فرمایا: یہ حکم جنت میں داخل ہونے کے بعد کا ہے اور حضرت حواء علیہا السلام کی پیدائش بھی جنت میں داخل ہونے کے بعد ہوئی ہے کہ ﴿وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا﴾ اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ کہ تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جاؤ۔

ایک نفیس بحث:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ وغیرہ نے ایک بڑی نفیس اور دقیق بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک امر ہوتا ہے اور ایک نہی۔ امر یہ کہ اللہ نے حکم دیا کہ یہ کام کرو، اور ایک نہی ہے کہ اس کام کو نہ کرو۔ جہاں اللہ کے حکم کی تعمیل نہ ہو وہاں تو بچنے کی کوئی اُمید نہیں ہے، کیونکہ یہ استکبار پر دلالت کرتا ہے جیسے ابلیس نے کیا، لیکن

جن چیزوں سے اللہ نے روکا، اگر کبھی آدمی سے ارتکاب نہی ہو جائے تو وہاں معافی ملنے کا راستہ ہوتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی ارتکاب نہی ہوا تھا کہ ایک چیز سے روکا گیا تھا، پھر اس کے قریب چلے گئے۔ یہ نہیں کہ اوامر کی خلاف ورزی ہوئی ہو اور نہی کے مرتکب ہوئے، بلکہ امر اور نہی میں بڑا فرق ہے۔

ممنوع درخت کس چیز کا تھا؟

﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ یہ درخت کون سا تھا؟ اللہ نے قرآن میں اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو وہ درخت دکھلا بھی دیا گیا، ﴿هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ اشارہ کے ساتھ سامنے دکھلا دیا گیا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں مختلف اقوال ہیں:

1 ...... بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ انگور کی بیلیں تھیں، اور بعض یہود نے کہا کہ وہ گندم کا درخت تھا۔

2 ...... حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ کھجور کا درخت تھا۔

3 ...... ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ انجیر کا درخت تھا۔

4 ...... ابو جعفر رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ درخت ایسا تھا کہ اس کے کھانے کے بعد لازماً پیشاب، پاخانہ کی حاجت ہوتی تھی اور جنت میں یہ چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

5 ...... حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ درخت ایسا تھا کہ اس کی ٹہنیاں آپس میں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں اور اس کا پھل بھی تھا، وہ ملائکہ کھاتے رہتے تھے اور اس پھل کے کھانے کا یہ فائدہ تھا کہ جو کھائے وہ ہمیشہ جنت میں رہتا ہے، یعنی وہ جنت سے نہیں نکالا جاتا۔

6 ...... مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس درخت کے بارے میں تقریباً چھ اقوال آپ نے پڑھے ہیں، لیکن علامہ ابو جعفر بن جریر رحمہ اللہ جو بہت بڑے مفسر اور محدث ہیں، انہوں نے ''تفسیر ابن جریر'' میں لکھا ہے کہ اس بارے میں ہمارے لیے سب سے محقق بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی کو ایک معین درخت سے منع فرمایا کہ اس درخت سے نہیں کھانا، باقی کسی درخت سے منع نہیں کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس کو کھا لیا۔ اب ہمیں کوئی علم نہیں کہ وہ کون سا درخت تھا؟ اس لیے کہ اللہ پاک نے بھی قرآن پاک میں کوئی ذکر نہیں فرمایا کہ وہ درخت کون سا تھا اور اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین مبارک سے بھی ہمیں کوئی ذکر نہیں ملا کہ وہ درخت کون سا تھا؟

لہٰذا جس کے بارے میں قرآن اور حضور پاک ﷺ ہی نہ بتلائیں تو کتب سابقہ کی بنیاد پر ہم ٹھوکریں کھاتے رہیں گے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اللہ کو پتہ ہے کہ کون سا درخت تھا؟

حضرت عبدالرزاق نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ سنبلہ یعنی سٹے والی چیز تھی، جیسے قرآن پاک میں ہے: ﴿أَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ [البقرۃ:۲۶۱] سنبلہ جس کو ''سٹہ'' کہتے ہیں، اس میں دانے ہوتے ہیں۔ اور محمد بن اسحاق فرماتے ہیں کہ وہ ''بر'' تھا، یہ بھی گندم کی ایک قسم ہے خالص گندم، اور ایک وہ جس کی لال روٹی ہوتی ہے، اس کو ''بر'' کہتے ہیں، وہ بھی گندم کی ایک قسم ہے۔

اس کے بعد مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ابوالجلد کے پاس ایک خط لکھا، ان سے پوچھا کہ تم مجھے بتاؤ کہ وہ کون سا درخت تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو منع فرمایا تھا؟ جس کے نیچے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ منظور فرمائی تھی؟ تو ابوالجلد نے جواب دیا کہ آپ نے مجھ سے پوچھا کہ وہ درخت کون سا تھا؟ جس کے نیچے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ منظور فرمائی تھی، وہ ''زیتون'' کا درخت تھا۔

محمد بن اسحاق فرماتے ہیں: بعض اہل یمن نے وہب بن منبہ کی روایت سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ ''بر'' ہے جس کو ہم ''باجرہ'' کہتے ہیں، لیکن انہوں نے کہا کہ یہ ایسے تھا جیسے گائے کے اندر تلی، گردہ یا دل ہوتا ہے، اتنا بڑا اس کا دانہ تھا اور وہ مکھن سے زیادہ نرم تھا اور شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔

لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ وہب بن منبہ یا کعب احبار سے جتنے اقوال ملتے ہیں، وہ اکثر کتب متقدمہ سے ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہود ونصاریٰ کی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے پاس تھا تو ان سے وہ روایات پڑھتے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو سنا دیا کرتے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۷۹، البقرۃ: الآیۃ:۳۵]

درخت کا نام ذکر نہ کرنا خالی از حکمت نہیں:

اللہ نے قرآن مجید میں باقاعدہ کئی چیزوں کے نام بھی لیے ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝١ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝٢ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝٣﴾ [التین:۱ تا ۳] اسی طرح اللہ نے فرمایا: ﴿فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ۝٦٨﴾ [الرحمٰن:۶۸] کھجور اور انار کا نام آیا ہے، اسی طرح ''اعناب'' کا نام بھی آیا ہے۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ یہاں بھی چاہتے تو درخت کا ایک نام ذکر فرما دیتے، لیکن اللہ کی حکمتیں ہیں کہ قرآن میں ان چیزوں کا ذکر فرماتے ہیں جس کی

بندوں کو ضرورت ہو، جس کو بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو، اس کو ذکر نہیں فرماتے۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

قرآن مجید...... درسِ عبرت:

کیونکہ قرآن کتاب ہدایت ہے، کتاب موعظت ہے، کوئی قصے کہانی کی کتاب نہیں ہے۔ قرآن تو عبرت پکڑنے کے لیے ہمیں دعوت دیتا ہے کہ لوگوں کے قصے کو پکڑو اور سمجھو کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کیوں پیدا کیا؟

...آدم علیہ السلام کو اللہ نے "خلافت فی الأرض" کے لیے کیوں منتخب کیا؟

... پھر غور کرو کہ ہم کتنے بڑے باپ کے بیٹے ہیں کہ جن کو تمام ملائکہ نے سجدہ کیا؟

...... پھر غور کرو کہ ہم کس جنت سے نکالے گئے ہیں؟

......پھر وہاں کس راستے سے پہنچیں گے؟

......اور پھر غور کرو کہ ملائکہ کے ساتھ رہنے والا ملعون و مردود کیوں بن گیا؟

یہ تو دعوت ہے۔ قرآن اس لیے نہیں آیا کہ بس آپ اس کو پڑھتے رہیں، چومتے رہیں یا سینے سے لگاتے رہیں یا غلاف دے کر اونچی جگہوں پر رکھتے رہیں۔ قرآن تو ہمیں جھنجھوڑنے کے لیے آیا ہے، قرآن ہمیں جھنجھوڑتا ہے کہ آدم علیہ السلام کا قصہ پڑھو، سوچو تو سہی کہ تم کتنے بڑے باپ کے بیٹے ہو اور کیا کر رہے ہو؟

مثال سے وضاحت:

اب دیکھیں! مثال کے طور پر اگر میں کوئی گندا کام کروں تو لوگ کہیں گے کہ دیکھو کتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے، وہ کتنا بڑا عالم تھا اور اس کا حال دیکھو! باپ نے ساری زندگی کس طرح تقویٰ و پرہیزگاری میں گزاری اور یہ ان کی اولاد ہو کر کیا کر رہا ہے۔

دعوتِ فکر:

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں زمین کی خلافت کے لیے چن لیا تھا اور ہم زمین پر عذاب بن گئے ہیں۔ اور پھر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اللہ نے ہماری جنس کی پیدائش میں ملائکہ کو رد کر دیا تھا کہ میں جانتا ہوں اور تم نہیں جانتے ہو۔ اب جب ہم زمین میں فساد کر رہے ہیں، خون ریزی کر رہے ہیں، ڈاکے مار رہے ہیں، قتل کر رہے ہیں، عصمتیں

لوٹ رہے ہیں، ایک دوسرے کی بے عزتیاں کر رہے ہیں، بھائی بہن کے ساتھ پکڑے جا رہے ہیں، باپ بیٹیوں کے ساتھ زنا میں پکڑے جا رہے ہیں تو ملائکہ کیا کہتے ہوں گے؟

ہر چیز میں دعوت:

اللہ کا قرآن تو ہمیں یہ دعوت دیتا ہے کہ تم میرے قصوں میں غور کرو کہ میں نے کیوں قرآن اُتارا ہے؟ قرآن اس لیے نہیں آیا کہ تم قرآن پڑھو اور ہضم کر جاؤ۔ تم قرآن پڑھو، ایک کان سے سنو اور دوسرے کان سے قصہ آدم کو نکال ڈالو۔ قرآن جھنجھوڑتا ہے کہ ہم نے آدم کو کیوں پیدا کیا؟ پھر ہم نے آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے ایک عورت کو کیوں پیدا کیا؟ ایک سلسلہ توالد وتناسل اور ایک سلسلہ اُلفت ومحبت پیدا کرنا تھا کہ قیامت تک یہ مرد اور عورت کا سلسلہ تعلق اور اُنس قائم رہے۔ کیا تمہاری عورت صحیح معنوں میں حواء کی بیٹی بن رہی ہے؟ صحیح معنوں میں وہ اپنی ماں کے نقش قدم پر ہے یا نہیں؟ صحیح معنوں میں وہ اسی ترتیب سے چل رہی ہے جو ترتیب اللہ نے عورت کے لیے رکھی ہے؟ ہر چیز میں ایک دعوت ہے، عورت پڑھے تو حواء علیہا السلام کی زندگی کو سامنے رکھے، مرد پڑھے تو حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی کو سامنے رکھے۔

اللہ کو منانے کا طریقہ آدم علیہ السلام سے سیکھو:

اور پھر ہمیں حکم ملتا ہے کہ ساری نعمتیں دینے کے بعد ایک چیز سے روکا گیا، تمام نعمتیں جو مرضی آئے کھاؤ، صرف ایک درخت کے قریب نہ جاؤ، لیکن آدم علیہ السلام کھا بیٹھے۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ تم بھی اگر کبھی ایسی چیز جس سے اللہ نے منع کیا ہے، کھا بیٹھے تو تمہیں بھی جنت سے محروم ہونا پڑے گا، پھر تمہارے اوپر بھی وہی اختبار وامتحان کے دروازے کھل جائیں گے اور اگر کھا بیٹھو تو پھر جیسے آدم علیہ السلام نے رو رو کر تین سو سال رات اور دن ایک کر دیئے کہ سر سجدے میں ڈال دیا کہ مولا! میری غلطی معاف فرما۔ اگر تم بھی کبھی غلطی کر بیٹھو تو آدم علیہ السلام کی توبہ سے راستہ سیکھو، آدم علیہ السلام کی زاری سے زاری سیکھو، آدم علیہ السلام کے تضرع سے تضرع سیکھو۔

نجات! قرآن پر عمل کرنے میں ہے:

اللہ کا قرآن دعوت دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ ہم قرآن مجید اس لیے پڑھیں گے کہ اللہ کا قرآن ہے۔ بلکہ دیکھو کہ قرآن پڑھنے کے بعد نتیجہ کیا نکلا؟ ایک آدمی نے قرآن پڑھنے کے بعد سینے سے بس لگا لیا اور قرآن اندر داخل نہیں

ہوا۔ اس کی زندگی میں نہ نماز ہے، نہ روزے ہیں، نہ حج ہے، نہ زکوٰۃ ہے، نہ اس کی زبان پر سچ ہے، نہ معاملات میں کوئی دیانت ہے، نہ امانت ہے، نہ اپنے وعدے کا کوئی پاس ہے، نہ قول کا کوئی پاس ہے تو ایسے قرآن پڑھنے کا کیا فائدہ ہوگا؟

ایک ایک حرف میں دعوت:

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ قرآن کے ایک ایک حرف میں دعوت ہے، ایک ایک حرف میں ہمارے لیے عبرت ہے، ایک ایک حرف میں ہمارے لیے تنبیہ ہے۔ کہیں وعدے کہیں وعید ہے، کہیں ترغیب اور کہیں ترہیب ہے۔ اللہ کے قرآن کو پڑھنے کے بعد ہم سمجھیں، وگرنہ قرآن دونوں جہانوں کا بادشاہ ہے۔ کیا بادشاہ کا حکم بھی کبھی ٹالا ہے؟ اگر ہاتھ سے قرآن گر گیا تو کہتے ہیں کہ مسئلہ بتائیں میں کیا کروں؟ یعنی اتنا احترام ہے کہ قرآن شریف ہاتھ سے گر گیا ہے تو خیرات کر رہا ہے، لیکن جو قرآن کہتا ہے کہ نماز پڑھو، نماز نہیں پڑھتا۔ نعوذ باللہ! ہم لوگ اتنے ڈرامے باز بن گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے بھی ڈرامہ کرتے ہیں۔

ڈرامہ بازی چھوڑیئے:

جیسے ڈرامے والے لوگ کبھی رو رہے ہوتے ہیں اور کبھی ہنس رہے ہوتے ہیں، کبھی نقل کر رہے ہوتے ہیں۔ کبھی داڑھی والے اور کبھی بغیر داڑھی کے، کبھی مونچھوں والے اور کبھی بغیر مونچھوں کے۔ اسی طرح ہم بھی ......معاذ اللہ!...... اللہ میاں سے ڈرامے کر رہے ہیں، ہم انسان ہیں یا کیا بلا ہیں کہ ادھر کہتے ہیں کہ اللہ کا قرآن (سبحان اللہ جی!) دونوں جہانوں کا بادشاہ ہے اور اس کو چوم رہے ہیں، دونوں آنکھوں پر رکھ رہے ہیں اور اسی قرآن کو جہاں لگا رہے ہیں، وہاں داڑھی چٹ ہے۔ ایمان سے کہو کہ خدا سے ڈرامہ ہے یا نہیں کہ ہم کہہ کچھ رہے ہیں، دکھلا کچھ رہے ہیں اور عمل ہم کچھ کر رہے ہیں؟

قرآن کی بھی مانیں:

آپ مجھے اپنے ملک میں ایک آدمی دکھا دیں، جو لوگوں میں کھڑے ہو کر جرأت سے یہ کہے کہ میں قرآن کو نہیں مانتا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ آج اتنے سال گزر گئے کیا قرآن کو کسی نے مانا ہے؟ قرآن کے مطابق کوئی حکم آیا ہے؟ قرآن کے مطابق کوئی عمل ہوا ہے؟ قرآن کے مطابق کوئی قانون بنا ہے؟

قرآن پر بدعملی کی ایک مثال:

ایک دفعہ قرآن کا قانون بنایا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ طلاق پہلے دو اور مشورہ بعد میں دو۔ اس کے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ ہم نے جو عائلی قوانین بنائے ہیں وہ بالکل اسلام کے مطابق ہیں۔ کیونکہ وہ بدبخت پرویز کا سمجھا ہوا اسلام تھا۔ اس نے ان کو بنا کر دیئے تھے۔ اس بدبخت نے ان کو جو کہہ دیا کہ یہ قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن نے جو کہا کہ اگر جھگڑا ہو جائے تو ایک ''حَکَمْ'' (فیصلہ کرنے والا) خاوند کی طرف سے بنے اور ایک ''حَکَمْ'' بیوی کی طرف سے بنے، وہ دونوں ان دونوں کے درمیان صلح کرنے کی کوشش کریں۔ اگر اصلاح ہو جائے، اللہ توفیق دے تو بڑی اچھی بات ہے۔ تو اس سے اس نے یہ سمجھا کہ طلاق تو پہلے دے دو اور صلح بعد میں کراتے رہو، یعنی استنجاء پہلے کرلو اور پیشاب بعد میں کرتے رہو، نماز پہلے پڑھ لو اور وضو بعد میں کرتے رہو، غسل پہلے کرلو اور بیوی کو بعد میں مل لینا۔ اور پھر اس کو وہ قرآن کا قانون کہتے ہیں، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

جو بھی اسٹیج پر کھڑا ہوگا، وہ کہے گا: سبحان اللہ! ہم تو پکے قرآن کے خادم ہیں، ہم تو اسلام کے خادم ہیں، لیکن کیا کریں حالات کا تقاضا ہے، مجبوری ہے۔ تو بھائی! کیا کافروں کا ملک ہے کہ اسلام نافذ نہیں ہو سکتا؟ وہاں کافر بستے ہیں، یہودی رہتے ہیں، نصرانی رہتے ہیں، ہندو رہتے ہیں؟ جب مسلمانوں کا ملک ہے، کلمہ پڑھنے والوں کا ملک ہے تو آپ اسلام نافذ کریں، جو نہیں مانتا اس کو سزا دیں۔ اگر کوئی تمہارا حکم نہ مانے تو تم سزا دے سکتے ہو، اگر کوئی تمہاری مخالفت کرے تو تم اس کو جہنم رسید کرنے پر تُل جاتے ہو، دنیا کے اندر جائیدادیں ضبط، فیکٹریاں ضبط، کارخانے ضبط، بینک اکاؤنٹ ضبط، اس کی اولادیں جیل میں، بچے جیل میں، ناحق مقدمات اور قدم قدم پر عذاب ڈال دیتے ہو۔ اللہ کا حکم قرآن میں موجود ہے اور جو قرآن کا حکم نہ مانے، اس کی سیدھی سزا ہے، وہ بے دین اور مرتد ہے۔

یہ کیا بات ہوئی کہ ہمیں ماحول اجازت نہیں دیتا؟ گھروں کے اندر اسلام کا ماحول نہیں ہے تو کہتے ہیں کہ کیا کریں، میں نے بڑا زور لگایا ہے بیوی نہیں مانتی، میں نے اپنی بیوی کو بڑا کہا ہے کہ باریک کپڑے نہ پہنا کرو، سر پر دوپٹہ لیا کرو۔ کیا کریں حضرت! مصیبت یہ ہے کہ بیوی نہیں مانتی ہے۔

اسلام پر پوری طرح عمل کرو:

ایک صحابی مسلمان ہوگئے۔ ان کی ماں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ اس نے کہا کہ میں مر جاؤں گی، اگر تم نے محمد

عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلمہ نہیں چھوڑا۔ وہ صحابی آئے اور کہا: اماں! بات سنو، تم نے اگر کل مرنا ہے تو آج مر جاؤ، میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں چھوڑ سکتا۔ انہوں نے جب یہ کہا تو ان کی ماں ٹھیک ہو گئی۔

کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے:

اللہ کے بندے! اگر تم اسلام پر ڈٹ جاؤ تو بیوی کی کیا طاقت ہے کہ وہ ٹھیک نہ ہو؟ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے؟ یا تو بیوی ہو یا اسلام ہو، ان میں سے ایک کو چنو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ دونوں چلتے رہیں۔ یا اسلام یا کفر، یا تختہ مقام آزادی کا یا تخت مقام آزادی کا، کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ درمیان میں کوئی مقام نہیں ہے۔

بیوی کے لیے وارننگ:

سیدھی سی بات ہے، آپ اس کو سمجھا دیں کہ میں آپ کو تین دن کے لیے مہلت دے رہا ہوں۔ نماز پڑھو، مسلمان بنو، حیا کے ساتھ رہو تو میری بیوی ہو۔ وگرنہ تین دن کے بعد اپنا بوریا بستر اُٹھاؤ اور السلام علیکم۔ تجھے کوئی خاوند مل جائے گا تو مجھے کوئی بیوی مل جائے گی۔ پھر دیکھو کہ ٹھیک ہوتی ہے یا نہیں۔ وہ سب سے پہلے مصلی پر تسبیح لیکر بیٹھی ہوگی! شرط لگا لو۔ لیکن تم جو جا کر کہو کہ نماز پڑھو تو وہ کہتی ہے کہ کیا کروں کہ سارا دن بچے کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ تم کہتے ہو: اچھا! کوئی بات نہیں۔ پھر وہ نماز کیوں پڑھے گی؟ جب خاوند اتنا بے غیرت ہے، نماز معاف کر سکتا ہے تو پھر بیوی کیوں پڑھے؟ سیدھی بات ہے کہ ہم اللہ میاں سے بھی ڈرامے کرتے ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ ہمیں ہدایت دے۔

''عَنۡهَا'' سے مراد جنت ہے یا ممنوعہ درخت؟

﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيۡطٰنُ عَنۡهَا﴾ پھر شیطان نے ان دونوں کو اس سے پھسلایا۔

''عنہا'' کی ضمیر کا مرجع بعض علماء کے نزدیک ''جنت'' ہے کہ جنت سے اس نے پھسلایا۔ جیسا کہ عاصم نے اپنی قرأت میں ''فَاَزَالَهُمَا'' پڑھا ہے کہ وہاں سے اس کو ہٹایا، پھسلایا۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اقرب مرجع ''درخت'' ہے کہ شیطان نے اس کو پھسلایا اس درخت کے ذریعے۔

قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''زَلَّ'' کا معنی پھسلانا ہے۔ تو اب معنی ہوا: ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيۡطٰنُ عَنۡهَا﴾ ''اَیۡ بِسَبَبِهَا'' کہ پھسلانے کا سبب یہی درخت بنا کہ شیطان نے اسی درخت کے ذریعہ پھسلایا۔

ابلیس لعین سمجھ گیا تھا کہ اس چیز سے اللہ نے ان کو منع فرمایا ہے کہ اس چیز کے قریب نہ جاؤ۔ اگر میں کسی طرح ان کو اس درخت کے کھانے پر مجبور کردوں تو وہ اللہ کی نہی کو توڑ بیٹھیں گے۔ جب اللہ کی نہی کو توڑ بیٹھیں گے تو لازمی بات ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کے اوپر سختی اور ناراضی آئے گی۔

﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ جس چیز میں وہ تھے یعنی اللہ نے جو ان کو رحمت کے لباس دیئے تھے، جنت کا گھر دیا تھا، وہاں کے بہترین کھانے اور نعمتیں دی تھیں، ان سب سے ان کو نکلنا پڑا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۰، البقرۃ: الآیۃ: ۳۶]

مسئلہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام:

''زَلَّ'' کا معنی ہے: پھسلنا۔ یعنی شیطان نے ان دونوں کو پھسلایا اور ان دونوں کو اس جنت سے نکالا۔

اب یہاں جو سب سے اہم مسئلہ ہے وہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جس کو سمجھنے کے لیے انتہائی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ انبیاء اور رسولوں یا اولیاء کی شان میں آدمی کوئی چھوٹی سی غلطی بھی کر بیٹھے تو بہت بڑا جرم ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوبین، عبادِ صالحین، اولیاء متقین، انبیاء مرسلین کے بارے میں کسی قسم کی تنقیص یا توہین کو کسی لحاظ سے معناً، لفظاً، قولاً، عملاً، فعلاً، ارادۃً برداشت نہیں فرماتے اور اس پر عتاب آجاتا ہے۔

اہل سنت والجماعت اور تمام سلف صالحین کا اس بات پر اتفاق ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اللہ کے نبی تمام اور رسول صغائر اور کبائر اور تمام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں۔ جیسے اللہ نے آدم علیہ السلام کو مسجود الملائکہ بنا کر افضلیت آدم کا کھلا اظہار کیا ہے۔ اور جب آدم علیہ السلام افضل ہیں تو اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام انبیاء بھی معصوم ہوتے ہیں، کیونکہ ملائکہ کے معصوم ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان کے بارے میں قرآن مقدس میں یہ نص موجود ہے کہ ﴿يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ [النحل: ۵۰]
جب ملائکہ معصوم ہوتے ہیں اور انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں تو یہ بات کبھی نہیں ہوسکتی کہ غیر معصوم، معصوم سے افضل ہوجائے۔ اس لیے یہ بات طے ہے کہ جتنے اللہ کے پیغمبر ہیں، رسول ہیں، وہ معصوم ہیں۔ کیونکہ اگر خدانہ کرے انبیاء علیہم السلام کی عصمت نہ ہو تو پھر ان کی اطاعت کا کیا مطلب؟ اور اللہ نے یہ حکم دیا ہے:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ [التغابن: ۱۲]

''اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔''

اور دوسرے مقام پر تو بڑی واضح بات فرمادی:

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ﴾[النساء:۸۰]

''جس شخص نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی، اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی۔''

اور ایک آیت میں فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللهَ﴾[الفتح:۱۰]

''جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں گویا اللہ کی بیعت کر رہے ہیں۔''

یعنی حضور پاک ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کو اللہ نے اپنی بیعت قرار دے دیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات متصف بصفات الکمال والجمال ہے اور منزہ ہے ''عَنْ سَائِرِ صِفَاتِ النُّقْصَانِ'' وہ تو ہر صفتِ نقصان سے منزہ اور پاک ہے۔ جب اللہ نے فرمادیا کہ جنہوں نے آپ کی بیعت کی ہے انہوں نے گویا اللہ کی بیعت کی ہے تو جب اتنا بڑا مرتبہ اللہ کے نبی کو سونپا گیا اور پھر یہ بھی فرمادیا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ [الاحزاب:۵۷] تو یہ ساری آیات اور پھر نبوت کا مقامِ شہادت کہ تمام انبیاء پر اور تمام اُمم پر ان کا شاہد ہونا، گواہی دینا اس بات پر واضح دلیل ہے۔ اور یہی اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے تمام انبیاء معصوم ہیں۔

اضطراری اور اختیاری عصمت:

ایک عصمت اضطراری ہے اور ایک عصمت اختیاری ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے، یعنی معصوم تو ملائکہ بھی ہیں، لیکن ان کی عصمت اضطراری ہے، اس لیے کہ اللہ نے ملائکہ میں قواتِ شہوانیہ، حیوانیہ کو رکھا ہی نہیں، ان میں ملکوتی صفات ہیں۔ اور انبیاء معصوم ہیں، لیکن ان کی عصمت کا مرتبہ ملائکہ سے بلند ہے، کیونکہ ان کی عصمت اختیاری ہے، اللہ نے ان میں ساری قوتیں رکھی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ غلط کام نہیں کرتے۔

معصوم کا معنی ومفہوم:

''معصوم'' اسے کہتے ہیں جو نفس اور شیطان کے حملہ سے پاک ہو اور ان کے دھوکہ میں بھی نہ آئے، یعنی اندر سے بھی پاک اور باہر سے بھی پاک ہو۔

اللہ کے جتنے نبی اور جتنے رسول ہیں (ان پر اللہ کے کروڑوں صلوٰۃ ہوں) وہ نفس اور شیطان کے دھوکہ سے

پاک ہوتے ہیں، یعنی ان کا اندر بھی پاک ہوتا ہے اور باہر بھی پاک ہوتا ہے اور وہ ہر طرح کے دھوکہ سے محفوظ بھی ہوتے ہیں۔

نفس اس طرح پاک ہے کہ اللہ نے ان کو چن لیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ [الحج:۷۵] اور اسی طرح لفظ "يَصْطَفِيْ" آیا ہے، "اِصْطِفَاء" اور "اِجْتِبَاء" یہ افتعال کے وزن پر ہیں، یعنی اللہ نے جن کو اپنے لیے چن لیا ہے۔

اور اسی کو دوسری آیت میں واضح کر دیا: ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ﴾ [طٰہٰ:۴۱] (میں نے اپنے لیے تمہیں چن لیا ہے)۔

اور تیسری آیت میں فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ [شوریٰ:۱۳] (اللہ جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور جو اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ اس کو اپنی طرف ہدایت دے دیتا ہے)۔

نبوت وولایت میں فرق:

لفظ "اِصْطَفٰى" نبوت کے لیے ہے۔ اور مرتبۂ ولایت کسب سے، محنت سے، جدوجہد سے حاصل ہو سکتا ہے، لیکن نبوت ورسالت کا عہدہ بغیر آرڈر کے حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس بات کو سمجھیں اور یاد رکھیں کہ اللہ کے اولیاء وہ ہوتے ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں۔ اب جتنا آدمی تقوئی میں بڑھتا گیا، بڑھتا گیا، بڑھتا گیا وہ مرتبہ ولایت تک پہنچتا گیا۔ حرام سے بچتا گیا، حلال کو اختیار کرتا گیا، اللہ کے تقوئی میں اور خشیت میں بڑھتا گیا۔ اب وہ محنت سے مقامِ ولایت کو جا پہنچا، اللہ کا ولی بن گیا۔ لیکن نبوت ورسالت محنت سے حاصل نہیں ہوتی، یہ ایسا عہدہ ہے اور مرتبہ ہے کہ جب تک اللہ کا انتخاب نہ ہو، چاہے وہ کتنا پاک کیوں نہ ہو، عظمت والا کیوں نہ ہو، نبی نہیں کہلا سکتا۔

اب دیکھیں! دنیا میں ایک علم حاصل کرنا ہے کہ کسی نے M.A کر لیا، کسی نے ڈبل M.A کر لیا، کسی نے P.H.D کر لی، کسی نے دو علوم کے اندر P.H.D کر لی، کسی نے چار علوم کے اندر P.H.D کر لی۔ تو علم حاصل کرنا ہر کسی کی محنت پر موقوف ہے۔ میں نے محنت کی، اس نے کی اور اس نے کی، سب کو ڈگری مل جائے گی۔ لیکن کسی ملک کا سفیر بن جانا بغیر آرڈر کے نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر ڈگری والا کہے کہ میرے پاس ڈگری ہے، لہٰذا میں سفیر ہوں۔ اس ملک والا کہے گا کہ میں یہ بات کیسے مانوں؟ پہلے آپ اپنے ملک کا آرڈر دکھلائیں، پھر اسنادِ سفارت پیش کریں، پھر اگر وہ ملک ان اسنادِ سفارت کو قبول کرے اور قبول کرنے کے بعد آپ کے اعزاز میں گارڈ

آف آرڈر پیش کرے، پھر جا کر تمہارا یہ عہدہ پکا ہوگا۔

اسی طرح آدمی محنت کرنے سے مقامِ ولایت تک تو پہنچ سکتا ہے، لیکن مقامِ نبوت تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک کہ آرڈر نہ ہو، کیونکہ وہاں اللہ چنتا ہے۔ جب تک اللہ چن کر آرڈر نہ کرے کہ یہ میرا نبی ہے تو اس وقت تک مقامِ نبوت اور مقامِ رسالت حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی سے یہ اندازہ لگالیں کہ جب اللہ نے چن لیا اور اللہ ہر صفتِ نقصان سے پاک ہے اور ساری مخلوق اگر مل کر کسی کو چنے تو غلطی ہو سکتی ہے، لیکن اللہ کے چننے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ اللہ نے جن کو چنا، اگر ان کے اندر کوئی نقص و کمی رہ جائے تو...... نعوذ باللہ!...... اللہ کے چناؤ پر اعتراض آئے گا۔

نبی کی توہین کرنے والے کی توبہ قابلِ قبول نہیں:

ایک آدمی ساری زندگی شرک میں مبتلا رہا، اگر وہ آخری عمر میں توبہ کرلے تو اس کی توبہ قبول ہے۔ لیکن نبی کی توہین کرنے والا زندیق ہے اور اس کی سزا قتل ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہے۔ جب اس کی توبہ قبول نہیں تو چھٹکارا کیسے ملے گا؟

آپ دیکھیں کہ حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ کی بڑی عظیم الشان کتاب ہے جس کا نام ہے، "اَلشِّفَاء بِتَعْرِيْفِ حُقُوْقِ الْمُصْطَفٰى"...... اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے...... میرے خیال میں اس فن اور موضوع پر جو قلم انہوں نے اُٹھایا ہے اور کسی نے نہیں اُٹھایا۔ بڑی جامع اور مدلل کتاب ہے، جس میں انہوں نے کہا کہ کوئی آدمی اللہ، اللہ کے نبی کے بارے میں گستاخی کا کوئی لفظ کہے اور اس کے بعد کچھ بھی کرتا رہے تو اس کی سزا قتل ہے، موت ہے اور اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہے۔

[الشفا: ۲/۲۱۶، اَلْبَابُ الْأَوَّلُ فِي بَيَانِ مَا هُوَ فِي حَقِّهِ ﷺ سَبٌّ...]

چنانچہ آپ دیکھیں! جب مکہ فتح ہوا تو حضور ﷺ نے چار آدمیوں اور دو عورتوں کے بارے میں اپنے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ تمہیں حرم میں ملیں یا کعبہ کے غلاف کے نیچے بھی کھڑے ہوں تو ان کو قتل کردو، کیونکہ وہ حضور ﷺ کو گالیاں دیتے ہیں۔ [سنن النسائی، حدیث: ۴۰۶۷، اَلْحُكْمُ فِي الْمُرْتَدِّ]

نبی کی شان سے گرا ہوا کوئی لفظ کہہ دیا جائے تو وہ گالی ہے۔ جیسے آپ کسی افسر کو کہیں کہ تم غلط کہہ رہے ہو یا تم بکواس کررہے ہو تو یہ گالی ہے، تم اپنے فرائض صحیح انجام نہیں دے رہے، تم عدل نہیں کررہے۔ اس سے بڑی گالی کیا ہوگی؟ گویا کہ تم اسے ظالم کہہ رہے ہو۔

اگر انبیاء کی شان میں کوئی کوتاہی کا لفظ آ جائے تو فرمایا: وہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا تو پھر بندہ کہاں جائے؟ جب توبہ کا راستہ ہی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ساری محنت اکارت ہو گئی۔ اس لیے جب بھی انبیاء کی شان کا معاملہ آئے تو انسان کو بڑے ادب سے رہنا چاہیے۔ اگر کوئی مسئلہ سمجھ نہ آئے تو قلم روک دے۔ قلم کو روک دینا آسان ہے، لیکن انبیاء کی شان میں کوئی لفظ زیادہ لکھ بیٹھنا، ناقابلِ معافی ہے۔ اسی لیے کسی شاعر نے کیا ہی بات کہی تھی:

؎ با خدا دیوانہ باش
با محمد ہوشیار

خدا کے ساتھ تو دیوانگی کی حد تک چلے جاؤ، لیکن نبی کے دربار میں جاؤ تو خبردار! یہ اللہ کے محبوب کا دربار ہے، یہاں گستاخی کی معافی نہیں ملتی۔

﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلٰى حِيْنٍ﴾

[البقرة:٣٦]

شیطان جنت میں کیسے داخل ہوا؟

سدی، ابوالعالیہ اور وہب بن منبہ نے بہت ساری روایات اسرائیلیہ وغیرہ نقل کی ہیں کہ آدم علیہ السلام کو شیطان نے کیسے نکالا؟ کیسے بہکایا؟ کیسے وسوسہ ڈالا؟ پھر جب شیطان کو جنت سے نکال دیا تو وہ دوبارہ جنت میں داخل کیسے ہوا؟

بعض روایات وقصص میں آتا ہے کہ وہ سانپ کی شکل میں سانپ کے اندر داخل ہو کر چلا گیا۔ یہ واقعات سورۃ الاعراف میں مفصل ذکر ہوں گے، فی الحال کچھ واقعات یہاں بھی ذکر کرتے ہیں۔

ابن ابی حاتم نے اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَمَّا ذَاقَ آدَمُ مِنَ الشَّجَرَةِ فَرَّ هَارِبًا فَتَعَلَّقَتْ شَجَرَةٌ بِشَعْرِهِ فَنُودِيَ: يَا آدَمُ! أَفِرَارًا مِنِّي؟ قَالَ: بَلْ حَيَاءً مِنْكَ، قَالَ: يَا آدَمُ! أُخْرُجْ مِنْ جِوَارِي، فَبِعِزَّتِي لَا يُسَاكِنُنِي فِيهَا مَنْ عَصَانِي، وَ لَوْ خَلَقْتُ مِثْلَكَ مِلْءَ الْأَرْضِ خَلْقًا ثُمَّ عَصَوْنِي لَأَسْكَنْتُهُمْ دَارَ الْعَاصِينَ.))

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۰، البقرة، الآية:٣٦]

''جب آدم علیہ السلام نے اس درخت سے چکھا تو بھاگے اور ایک درخت کی شاخیں آپ کے بالوں میں پھنس گئیں تو آواز

آئی: اے آدم! کیا تم مجھ سے بھاگ رہے ہو؟ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ آپ سے حیاء کی وجہ سے۔ تو اللہ نے فرمایا: تم میری ہمسایہ گیری سے نکلو، مجھے اپنی عزت کی قسم! میں کسی کو بھی اپنے قریب جنت میں نہیں رکھوں گا جو میری نافرمانی کرے۔ اگر میں زمین بھر دوں ایسی مخلوق سے جو میری نافرمانی کرے تو میں ان کو بھی نافرمانوں کی جگہ (جہنم) میں داخل کر دوں۔"

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اس کے اندر غرابت ہے، حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ کے درمیان میں انقطاع ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نہیں ٹھہرائے گئے تھے جنت میں، مگر اتنی دیر عصر سے لے کر غروبِ شمس تک۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ کی شرط پر ہے۔

اوقات کو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی جانتے ہیں، ہم ان کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جیسے آتا ہے کہ قیامت کا ایک دن ہزار سال کے برابر ہوگا۔ لہٰذا جنت کے اسی اندازہ سے عصر سے لیکر مغرب تک کے وقت کا اندازہ لگائیں۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ تو عصر سے مغرب تک کا وقت اسی حساب سے نکالنا ہوگا۔

عبد بن حمید کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت کے اندر ایک گھڑی ٹھہرے اور ایک گھڑی تقریباً ایک سو تیس سال کے برابر تھی۔

حضرت ابو جعفر الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نو بجے یا دس بجے نکالا گیا۔ آپ جنت سے ایک ٹہنی بھی لے آئے اور آپ کے سر پر جنت کے درختوں میں سے ایک تاج بھی تھا اور اس کا نام "اکلیل" ہے۔

بہرحال یہ روایات بھی آئی ہیں۔ یہاں مفسر رحمہ اللہ نے ذکر نہیں فرمایا، جیسا کہ وہ اشارہ فرما گئے ہیں کہ وہ سورۃ الاعراف کے اندر جا کر اس کی مفصل بحث کریں گے۔

لیکن تمام روایات کو جمع کرنے کے بعد اور تمام اقوال جتنے اس بارے میں ملے ہیں، ان سب کا حاصل یہ تھا کہ اصل میں ابلیس لعین نے آدم علیہ السلام کو دھوکہ میں ڈالا تو وہ دھوکہ بھی اس انداز میں تھا کہ "محبتِ خداوندی میں آ کر وہ دھوکہ کھا گئے۔" [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۰، البقرۃ: الآیۃ: ۳۶]

ابلیس کے گمراہ کرنے کے طریقے:

دھوکہ دینے کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات ایک شریف آدمی کو شریف بن کر دھوکہ دیا جاتا ہے، ایک ڈاکو کو ڈاکو بن کر دھوکہ دیا جاتا ہے اور چور کو چور بن کر دھوکہ دیا جاتا ہے۔

اسی طرح ابلیس لعین کے لوگوں کو بہکانے اور ہلاکت میں ڈالنے کے بھی مختلف انداز ہیں، چنانچہ عالم کو اس کے علم کے ذریعہ دھوکہ دیتا ہے، کبھی عابد کو اس کی عبادت کے ذریعہ دھوکہ دیتا ہے، کبھی ایک آدمی کو اس کی صداقت کی بناء پر دھوکہ دیتا ہے، شریف آدمی کو شرافت کے انداز میں دھوکہ دیتا ہے۔

یہ اس کے جال ہیں، ان اللہ تبارک وتعالیٰ ہی بچا سکتا ہے۔ ہم شیطان کے حملے سے اس کے علاوہ نہیں بچ سکتے کہ ہم اللہ کی پناہ پکڑیں: ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' یا اللہ! ہم تجھ سے پناہ پکڑتے ہیں کہ یہ ایسا خطرناک دشمن ہے جو ہمیں نظر بھی نہیں آتا اور اس کے تسلط کا یہ عالم ہے کہ جتنا دور سے چاہے وسوسے ڈال دے اور پھر جس شکل میں چاہے سامنے آجائے۔ اس کے حملوں سے بچنے کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں: ﴿إِنَّهُ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ [الاعراف: ۲۷] کہ وہ تمہیں دیکھ سکتا ہے اور تم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ اب جو دشمن نظر آنے والا بھی نہ ہو تو آدمی اس کے حملے سے کیسے بچے؟ اس سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ پھر ہم پروردگار عالم کی پناہ میں آجائیں جس کو دنیا کی کوئی طاقت ہی نہیں دیکھ سکتی۔

شیطان نے آدم علیہ السلام کو بہکانے کا کیا طریقہ اپنایا؟

علماء نے لکھا ہے کہ شیطان نے آدم علیہ السلام کو اس انداز میں دھوکہ دیا کہ ان سے کہا: تمہیں پتہ ہے کہ اللہ نے تمہیں اس درخت سے کیوں روکا ہے؟ آدم علیہ السلام نے کہا: نہیں۔ اس نے کہا: یہ شجرۃ الخلد ہے، یعنی ایسا درخت ہے کہ جو اس سے کھاتا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور اس کا یہ ملک، سلطنت اور راحت و آرام بھی کبھی بوسیدہ نہیں ہوتے۔ ورنہ یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو خلافت فی الارض کے لیے چنا ہے، آپ نے زمین میں جانا ہے اور زمین میں جانے کے بعد آپ نے مرنا ہے۔ آدم علیہ السلام نے پوچھا: وہ موت کیا چیز ہے؟ اس نے کہا: میں آپ کو بتاتا ہوں۔ چنانچہ اس نے موت کی شکل اختیار کی، ایک جانور بنایا اور دکھایا کہ اس کو موت آرہی ہے، سکرات لگی ہوئی ہے اور اس کے بعد وہ مر گیا۔ آدم علیہ السلام نے پوچھا: اس درخت کا کیا فائدہ ہے؟ شیطان نے کہا: یہ درخت کھالو تو کبھی موت نہیں آئے گی، کیونکہ یہ شجرۃ الخلد ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ اس درخت کے کھانے سے آپ ہمیشہ اپنے پروردگار عالم

کے پاس جنت میں رہیں گے۔ اور اگر آپ نے نہ کھایا تو کبھی نہ کبھی آپ کو نیچے بھیجا جائے گا، کیونکہ آپ نے زمین میں خلافت کرنی ہے، آپ یہاں سے نکالے جائیں گے۔

اب آدم علیہ السلام پر دراصل یہ غلبہ ہوا کہ میں اللہ کے قرب میں رہوں، میں اللہ سے دور نہ ہو جاؤں اور میں جنت میں رہوں۔ اور اس بدبخت نے یہ بھی کیا جو قرآن میں آتا ہے: ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ [الاعراف:۲۱] مجھے اللہ کی قسم ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور آپ کو پیدا کیا ہے، میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں، ﴿فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ﴾ [الاعراف:۲۲] اب حضرت آدم علیہ السلام نے دھوکہ اس وجہ سے کھایا کہ مجھے قربِ خداوندی حاصل رہے۔ اگر میں نے نہ کھایا تو میں اللہ سے دور ہو جاؤں گا اور جنت سے نکال دیا جاؤں گا اور مجھے زمین میں جانا ہوگا۔ چونکہ آدم علیہ السلام قربِ خداوندی کے متلاشی تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب چاہتے تھے، اسی لیے ان کو دھوکہ بھی اسی شکل میں دیا گیا۔

شیطان کے گمراہ کرنے کے مختلف جال:

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ بہت بڑے اللہ والے گزرے ہیں، بہت بڑے موحد اور حنبلی المسلک تھے۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ عبادت کر رہے تھے، اچانک دیکھا کہ درخت پر روشنی ہی روشنی ہے، اس کے بعد ایک آواز آئی کہ تم نے میری اتنی عبادت کی ہے، اتنی محنت کی ہے، اتنی چلّہ کشی کی ہے، اتنی ریاضت کی ہے کہ میں تجھ سے راضی ہو گیا ہوں، اس کے بعد میں نے تم پر تمام عبادتیں معاف کر دی ہیں...... اب ایک روشنی بھی ہو اور اس سے یہ آواز بھی آرہی ہو تو فوری طور پر آدمی کے ذہن میں خیال آئے گا کہ یہ تو اللہ کی طرف سے کوئی آواز ہے، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ درخت سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا تھا...... انہوں نے فوراً ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' پڑھا اور دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھے پناہ دے۔ اسی وقت شیطان لعین سامنے آگیا اور کہنے لگا: اے عبدالقادر! تم بچ گئے، تمہیں تمہارے علم نے بچا لیا ہے، ورنہ میں نے اسی طریقہ سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ آپ نے دوبارہ پڑھا: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' اللہ! مجھے پناہ دے۔ شیطان سے تو مجھے اللہ نے بچایا ہے، علم نے کہاں بچایا ہے؟ کتنے علم والے ہیں جو بے چارے بھٹک گئے، مجھے تو میرے اللہ نے بچا لیا۔ اس نے کہا: اے عبدالقادر! میرے پاس دنیا میں لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ستر ہزار نوری پھندے ہیں، یعنی بظاہر نور ہوتا ہے اور اندر ظلمت ہوتی ہے۔

جیسا کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ دجال جب ظاہر ہوگا تو وہ زمین کو حکم کرے گا کہ خزانے نکالو تو زمین خزانے نکال دے گی، خشک دریاؤں کو چلنے کا حکم دے گا تو وہ چل پڑیں گے، برباد اور اُجڑے ہوئے کھیتوں کو حکم کرے گا کہ آباد ہو جاؤ تو وہ آباد ہو جائیں گے۔

اور اسی طرح فرمایا کہ اس کے ساتھ جنت بھی ہوگی اور جہنم بھی ہوگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: دجال کی جو ظاہراً جنت ہوگی وہ حقیقت میں جہنم ہوگی اور جو اس کی جہنم ہوگی وہ حقیقت میں جنت ہوگی۔ چنانچہ جس کو وہ اپنی جنت میں داخل کرے گا، گویا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں چلا جائے گا اور جو اس کا انکار کرے گا، اس کی بات نہیں مانے گا، پکا مومن بنے گا تو اسے وہ اپنی جہنم میں ڈالے گا، جبکہ درحقیقت وہ جنت میں چلا جائے گا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۳۳۸، بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالَى: إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا...]

انسان کو کسی نہ کسی رنگ میں دھوکہ لگ سکتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ہمارے بہت سارے مسلمان لوگوں کو ابتداء میں یہی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک بزرگ کا مزار ہے، چنانچہ وہ فاتحہ پڑھنے کے لیے وہاں چلے جاتے ہیں، فاتحہ کے بعد اور آگے بڑھتے ہیں کہ میری ان کے ساتھ زیادہ عقیدت ہو، زیادہ محبت ہو، اب وہ آہستہ آہستہ ہاتھ لگانے پر آتے ہیں، پھر اس کے بعد بوسے پر آجاتے ہیں، پھر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے پر آجاتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ چکر لگانے پر آجاتے ہیں اور پھر انتہاء میں وہ قبر پر سر سجدے میں ڈال دیتے ہیں۔

اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی مشکل پیش آگئی تو دوسرے نے کہا کہ آپ فلاں بزرگ کی قبر پر جاؤ اور آپ وہاں نو راتیں بیٹھو اور رات دن تم بس اس بزرگ کا تصور ذہن میں رکھو، گویا کہ وہ بزرگ آگئے ہیں اور تیری مدد کر رہے ہیں اور تجھے مشکل سے نکال رہے ہیں۔

اب وہ بے چارا رات دن قرآن بھی پڑھ رہا ہے، وظیفے بھی پڑھ رہا ہے اور تصورات میں بھی پڑا ہوا ہے۔ رات کو شیطان نے دھوکہ دیا، شیخ کی شکل بنا کر اس کے سامنے آیا اور کہا کہ تمہاری مشکل میں نے حل کر دی ہے۔

خدا کی قدرت ہے کہ کام بھی ہو جاتے ہیں، کیونکہ اللہ کی طرف سے بندے پر امتحان آتا ہے۔ کام تو آخر ہندو کے بھی ہو جاتے ہیں، کام تو یہودیوں اور نصرانیوں کے بھی ہو جاتے ہیں، آخر اللہ نے جو لکھا ہے کام تو ہوتا ہے۔ اب اس آدمی کو آپ لاکھ تقریر کریں، قرآن سنائیں، حدیث سنائیں، قبر پرستی سے ڈرائیں، وہ کہے گا کہ مولوی صاحب! بڑی عجیب بات ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ قبر سے شیخ نکل آیا اور اس نے میری مدد کی اور

اس نے کہا کہ جاؤ تمہارا کام میں نے کر دیا ہے، اور میرا کام ہو گیا۔ اب اس پر تقریر کیا اثر کرے؟ ہاں! جس کو اللہ ہدایت عطا فرما دے وہ سمجھ جائے کہ ایسے جنات کے تصرف ہوتے ہیں، ورنہ نفع کا مالک صرف اللہ ہے، اور کوئی نفع دینے والا اور نقصان دینے والا نہیں۔ اور جس بزرگ کو میں اپنا حاجت روا بنا رہا ہوں ان پر تو خود موت آ گئی ہے، وہ تو خود دفن ہو چکے ہیں، ان پر تو خود مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہیں، وہ اپنی مصیبتیں رفع نہیں کر سکے تو میری حاجت روائی کیا کریں گے؟

ایک طرف تو کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ مظلوم تھے اور شہید ہو گئے اور ساتھ بہتر (۷۲) حضرات اور بھی شہید ہو گئے اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت چھن گئی، بی بی زہراء رضی اللہ عنہا کا فدک بھی چھن گیا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہ اپنی بیوی کی مشکل کشائی کی، نہ اپنی اولاد کی مشکل کشائی کی، اور نہ اولاد کی اولاد کی مشکل کشائی کی، اور تیری مشکل کشائی کے لیے وہ تیار ہیں!!!

کہتے ہیں کہ وہ تو اللہ کی رضا پر راضی تھے، وگرنہ حضرت علی کا نعرہ لگاتے تو سارے مر جاتے۔ اچھا! وہ تو رضا پر راضی تھے، شہید ہونا چاہتے تھے تو تم اللہ کی رضا پر راضی کیوں نہیں ہو؟ اگر وہ اللہ کی رضا پر راضی تھے تو ہمیں یہی سبق دے گئے ہیں کہ ہمارے ماننے والے بھی اللہ کی رضا پر راضی رہیں، اللہ شہادت لکھے تو الحمدللہ، تکلیفیں لکھے تو الحمدللہ، خوشیاں لکھے تو الحمدللہ، دکھ دے تو الحمدللہ، سکھ دے تو الحمدللہ۔ ہمیں بھی تو پھر ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔

کتنے لوگ ہیں کہ جن کی زندگی میں نہ نماز ہے، نہ روزہ ہے، نہ زکوٰۃ ہے، کبھی کسی کو حج نصیب ہو گیا تو ہو گیا۔ اور اس کے متعلق بھی یہ عقیدہ ہے کہ زواری یعنی کربلا میں امام حسین کے روضہ کی زیارت میں زیادہ ثواب ہے اور حج کا ثواب کم ہے۔ جیسے ہمارے بعض سرمایہ دار یا امیر آدمی حج کے لیے آتے ہیں، حج کرنا ان کا بھی مقصد نہیں ہوتا، بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ پکنک کر لیں اور دیکھ لیں کہ وہاں اتنے آدمی کٹھے ہوتے ہیں، وہاں کیا ہوتا ہے؟ ایسے وہ بھی حج کرنے کے لیے آ جاتے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جن کو مکہ اور مدینہ میں رہتے ہوئے بھی نماز کی فکر نہیں، روزہ کی پروا نہیں، حج وہ نہیں کرتے، زکوٰۃ وہ نہیں دیتے، قرآن پاک کا خیال وہ نہیں کرتے!! وجہ کیا ہے؟

وجہ یہ ہے کہ دماغوں میں ایک دھوکہ آ گیا ہے کہ ہم اہل بیت رسول کے محب ہیں اور اہل بیت قیامت کے دن جنتوں کے مالک ہوں گے، ہمیں تو عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں وہ پکڑ کر جنت میں لے جائیں گے۔ ایک بات دماغ میں بٹھا دی گئی ہے اور وہ بات دماغ سے نکلتی ہی نہیں ہے۔ وجہ کیا ہے......؟ وجہ یہ ہے کہ ﴿وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ

الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ [الانفال:۴۸] شیطان نے غلط اعمال کو دماغوں میں مزین کر دیا ہے کہ یہ اصل عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شیطان کے دھوکہ سے بچائے۔

ایک شخص عالم ہوگا۔ اس کی ساری زندگی علم میں گزری ہوگی۔ شیطان اس کے دماغ میں کیڑا ڈال دے گا کہ تم سے بڑا عالم تو کوئی ہے ہی نہیں، باقی تو کچھ بھی نہیں، فلاں کو تو چھوڑ دو وہ تو بالکل جاہل آدمی ہے۔ آپ اس سے پوچھیں کہ امام ابوحنیفہ ؒ کتنے بڑے عالم تھے؟ تو وہ کہے گا: چھوڑو جی! وہ تو کوفہ کا ایک قصائی تھا...... نعوذ باللہ!...... حالانکہ امام ابوحنیفہ ؒ تابعین کے دور کے آدمی ہیں، خیر القرون کے دور کے آدمی ہیں، کوئی ان کی فقہ کو مانے یا نہ مانے، لیکن گستاخی کرنے کا تو کسی کو حق نہیں ہے۔

امام مالک ؒ کے پاس اس مسئلہ پر کوئی صحیح حدیث موجود ہو، تمہیں کیا پتہ ہے؟ ان کا زمانہ اقرب الی زمان رسول اللہ ﷺ ہے، ہم چودہ سو سال پیچھے آ گئے اور وہ صرف سو سال پیچھے ہیں تو جو لوگ تیرہ سو سال حضور پاک ﷺ کے زمانہ سے ہم سے زیادہ قریب ہیں تو ان کو حضور ﷺ کی حدیث اور سنت کا علم، حضور ﷺ کے اقوال اور افعال کا علم ہو سکتا ہے وہ ہمیں کیسے ہو سکتا ہے؟ جنہوں نے ان لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے دین پڑھا ہوا اور پھر کوفہ، صحابہ ؓ کا مرکز بن گیا تھا، یعنی بڑے بڑے اجلاء صحابہ ؓ ان کا مرکز بن گئے، حضرت علی ؓ نے دار الخلافہ وہاں بنا لیا تو تمام علم جو مدینہ منورہ کا تھا اور حضور ﷺ کی سنت کا تھا، وہ کوفہ منتقل ہو گیا۔ لیکن بس شیطان دماغ میں ایک کیڑا ڈال دے گا۔

آج کل تو لوگ کہتے ہیں کہ اگر امام ابوحنیفہ پیدا نہ ہوتے تو لوگ بالکل ٹھیک ہوتے، یہ جھگڑے بھی نہ ہوتے۔ یہ جھگڑا ہی ان چاروں اماموں نے کیا ہوا ہے۔ یاد رکھو! اگر یہ چار نہ ہوتے تو تم چار ہزار بن جاتے، چار لاکھ بن جاتے، پھر کیا ہوتا؟ ابھی تو شکر کرو کہ ان چار نے محنت کر کے ایک چیز کو منضبط کیا ہوا ہے، اگر ہم ہر آدمی کو چھٹی دے دیں گے تو کئی ہزار بن جاؤ گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔

اصلاحِ نفس کے لیے اولیاء اللہ کی تدابیر:

بعض اولیاء نے لوگوں کی اصلاح کے لیے کچھ طریقے وضع کیے۔ اب اگر ہمیں ان کا بظاہر کوئی ثبوت نہ ملے تو ہمیں یہ سوچ کر خاموشی اختیار کر لینی چاہیے کہ اب تو وہ فوت ہو گئے ہیں، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ ان کی قبروں پر رحمت فرمائیں۔

اور پھر ہم مجموعی طور پر کسی کی خدمات کا نتیجہ دیکھیں! قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک عالم ہے، مثلاً وہ درس دے رہا ہے، وعظ کر رہا ہے، تفسیر پڑھا رہا ہے، حدیث پڑھا رہا ہے، ہمیں ایک نتیجہ دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ اس کے ساتھ جڑتے ہیں وہ موحد بن رہے ہیں یا بدعتی بن رہے ہیں؟ وہ موحد بن رہے ہیں یا مشرک بن رہے ہیں؟ وہ نمازی بن رہے ہیں یا بے نمازی بن رہے ہیں؟ وہ اچھے بن رہے ہیں یا بُرے بن رہے ہیں؟ ان کی اصلاح ہو رہی ہے یا ان کی خرابی ہو رہی ہے؟ ان کے کام اصلاح والے ہیں تو الحمد للہ کہیں۔ ہوسکتا ہے کسی میں کچھ غلطیاں ہوں، مگر اس کی خدمات تو ہیں اور اس سے لوگوں کو بڑا فائدہ ہوا ہے۔

اصل میں یہ سب کچھ عداوتِ شیطان کا نتیجہ ہے۔ جب شیطان دشمنی پر آتا ہے تو سب سے پہلے وہ اللہ کے اولیاء کے ساتھ دشمنی پیدا کرتا ہے، وہ صحیح معنوں میں عباد اللہ الصالحین کا دشمن بنتا ہے اور جب آدمی ان کا دشمن بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ'' [صحیح بخاری، رقم: ۶۵۰۲] (جو میرے دوستوں کے ساتھ دشمنی رکھے وہ میرے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جائے)۔ پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی بھٹکا اور گیا۔ پھر آدمی ایسے ہے جیسے دو دھاری تلوار پر چل رہا ہے کہ پھسلا تو گیا۔

شیطان جب کسی عابد کو دھوکہ دیتا ہے تو عبادت کے رنگ میں دھوکہ دیتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص عابد ہے، ساری رات عبادت میں کھڑا رہتا ہے، تو یہ اس کے دل میں ڈال دے گا کہ تیری جیسی عبادت کسی نے نہیں کی، تُو نے تو کمال کر دیا، تُو واقعی اللہ کا بندہ ہے۔ بس یہ چیز دماغ کے اندر آئی اور بندہ گیا۔ اور عالم کو علم میں دھوکہ دیتا ہے کہ تم اتنے بڑے عالم ہو کہ تم نے جو حدیث سمجھی ہے تیرہ سو سال پہلے کے امام بھی نہیں سمجھ سکے، تم نے کمال کر دیا ہے۔ پہلے تیرہ سو سال والے سب غلط ہیں۔ جب ایسی بات ذہن میں آئی تو سمجھو کہ آدمی سیدھے راستے سے گیا۔

شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکہ کیسے دیا؟

اسی طرح شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکہ دیا کہ مجھے اللہ کی قسم ہے کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اب آدم علیہ السلام جیسے مومن، اللہ کے نبی، وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی اللہ کے نام پر بھی جھوٹی قسم کھا جائے گا...... مومن تو صاف دل ہوتا ہے، مومن جیسے اس کا دل صاف ہوتا ہے وہ دوسرے کو بھی صاف سمجھتا ہے، اس کو تو یہ تصور بھی نہیں ہوسکتا...... اور پھر حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کہ یہ شجرۃ الخلد ہے، اس کو جب کھاؤ گے تو ہمیشہ جنت میں رہو گے۔ آدم علیہ السلام پہلے ہی یہ چاہتے تھے کہ میں جنت سے نہ نکلوں۔ اور اسی رنگ میں ان کو دھوکہ دیا گیا۔

باقی یہ باتیں کہ شیطان سانپ کے منہ میں گھس گیا، اس کے اندر کیسے چلا گیا؟ اندر جانے کی ضرورت تو اس کو ہو جس کی باہر بات نہ چلے۔ ایک آدمی اگر یہاں سے بیٹھے بیٹھے اپنی بات دور نہ پہنچا سکے تو وہ سفر کرے گا۔ جب وہ دور بیٹھ کے بھی وسوسہ ڈال سکتا ہے تو پھر اسے اندر جانے کی ضرورت کیا ہے؟ اور ہمیں جھگڑنے کی ضرورت کیا ہے کہ کبھی اس کو سانپ کے منہ میں ڈالیں اور کبھی کسی اور چیز کے منہ میں۔ ہمیں جب گمراہ کرتا ہے تو سانپ بن کر تو نہیں کرتا، ہمارے دلوں کے اندر بھی تو وسوسہ ڈال دیتا ہے، خیال ڈال دیتا ہے اور ہم بھٹک جاتے ہیں۔ جب قرآن نے کہہ دیا: ﴿فَوَسْوَسَ﴾ کہ شیطان نے وسوسہ ڈالا۔

آدم علیہ السلام کو کون سے ملک میں اُتارا گیا؟

﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ اللہ نے حکم دیا کہ جنت سے اُترو۔ چنانچہ آدم علیہ السلام ہند میں اُترے اور جنت کے درختوں کے کچھ پتے بھی اپنے ساتھ لائے، وہ پتے آپ نے ہندوستان کی زمین میں چھوڑے، وہاں کچھ بوٹیاں وغیرہ پیدا ہوئیں جن سے عطر وغیرہ پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے عطر اس وجہ سے مشہور ہیں کہ وہاں کچھ وہ پتے آگئے تھے جو آدم علیہ السلام جنت سے لائے تھے۔ ان سے یہ چیزیں پیدا ہوئیں۔ آدم علیہ السلام اس لیے ساتھ لائے تھے کہ جنت کی کچھ نعمتیں بطور یادگار میرے پاس رہیں، کیونکہ آپ کو دُکھ تھا کہ میں جنت سے اُتارا جا رہا ہوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہندوستان کی اس جگہ کا نام ''رحنا'' تھا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت میں ہے کہ مکہ اور طائف کے درمیان ''رحنا'' مقام پر اُتارے گئے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ''ہندوستان'' میں اُتارا گیا اور حضرت حواء علیہا السلام کو ''جدّہ'' میں اُتارا گیا اور ابلیس کو ''بصرہ'' کے قریب ایک جگہ پر اُتارا گیا اور سانپ کو ''اصفہان'' میں اُتارا گیا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ''صفا'' میں اُتارا گیا اور بی بی حواء علیہا السلام کو ''مروہ'' میں اُتارا گیا۔

حضرت رجاء بن سلمہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام اُترے تو رکوع کی کیفیت میں تھے، سر جھکائے ہوئے تھے اور ابلیس کو جب اُتارا گیا تو اس نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے اور سر کو تکبر کر کے اُٹھایا ہوا تھا۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو زمین پر اُتارا تو آپ کو ہر چیز کی صنعت کا

علم بھی عطا فرمایا اور جنت کے پھل بھی عطا فرمائے۔ یہ جو پھل تم کھا رہے ہو، گویا یہ جنت کے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ان کے اندر تغیر آئے گا اور جنت کے پھلوں کے اندر کوئی تغیر نہیں آئے گا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۰، البقرۃ: الآیۃ: ۳۶]

آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن اُتارا گیا؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ، فِيهِ خُلِقَ آدَمُ وَ فِيهِ أُدْخِلَ الْجَنَّةَ وَ فِيهِ أُخْرِجَ مِنْهَا.)) [صحیح مسلم، حدیث: ۸۵۴، باب: فَضْلِ يَوْمِ الْجُمُعَةِ]

"سب سے بہتر دن جمعہ کا ہے، کیونکہ جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت میں داخل فرمایا اور جمعہ کے دن حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا گیا۔"

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہمارے لیے اس آیت میں بہت بڑی تنبیہ ہے کہ اگر ہمارے ابا حضرت آدم علیہ السلام کو اتنی معمولی سی غلطی پر اتنی بڑی تنبیہ ہوئی تو ہم کس قطار و شمار میں ہیں کہ دنیا میں رہیں اور جو مرضی آئے کھاتے رہیں اور جو مرضی آئے پیتے رہیں اور جو مرضی آئے حرام کرتے رہیں؟ نہیں، بلکہ ہمیں اس سے سبق لینا چاہیے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۰، البقرۃ: الآیۃ: ۳۶]

جنت ہماری میراث ہے:

حضرت فتح الموصلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم جنت کے لوگ تھے، ہمارا گھر جنت میں تھا، لیکن اس نے ہمیں قیدی بنا کر وہاں سے نکالا۔ اب ہمارا سب سے بڑا غم یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے ابا کی اس جگہ جنت میں پہنچیں۔ اور وہ کیسے پہنچیں گے؟ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۱، البقرۃ: الآیۃ: ۳۶]

﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۳۷﴾

پھر آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں، پھر اللہ آدم کی طرف متوجہ ہو گیا، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

ماقبل آیات سے ربط:

پہلے اللہ نے حکم دیا: ﴿اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ (آدم کو سجدہ کرو)۔ یہ حکم ہے۔ ﴿فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِیْسَ﴾ سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا، امر نہیں مانا، رب کا حکم نہیں مانا۔ کیوں؟ ﴿اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ﴾ انکار کیا، تکبر کیا۔ اللہ نے حکم دیا کہ میرا شریک مت بناؤ، اللہ نے حکم دیا: ﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ اب جو نماز نہیں پڑھتا تو یہ تکبر ہے۔

ایک حکم ہے کہ شراب نہ پیو، زنا نہ کرو، چوری نہ کرو، ڈاکہ نہ مارو اور قتل نہ کرو۔ اب اگر کوئی ان میں پڑ جائے تو یہ ارتکابِ نہی ہوگا کہ زنا کی شہوت ہوئی، لذات کی شہوت میں مبتلا ہو گیا، کسی سے انتقام کی شہوت میں مبتلا ہو کر قتل کر بیٹھا تو اسے تکبر نہیں کہتے، بلکہ یہ شہوت کا غلبہ ہوتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ جو حکم کا انکار کرے، اس کے لیے جہنم ابدی ہے، لیکن جس نے ارتکابِ نہی کیا، اس کے لیے دروازہ کھلا ہوا ہے کہ وہ توبہ کر سکتا ہے، اس کو معافی مل سکتی ہے۔ اگر وہ توبہ توڑ بیٹھے تو وہ پھر توبہ کر لے، بلکہ اگر بندے غلطی نہ کریں تو اللہ فرماتے ہیں کہ پھر میری صفت "سَتَّار" ہونے کا...... "غَفَّار" ہونے کا...... "غَفُوْر" ہونے کا...... "رَحِیْم" ہونے کا اور "رَحْمَان" ہونے کا اظہار کب ہوگا؟

ایک حدیث مبارک میں یہ لفظ بھی آئے ہیں کہ اگر میرے بندے غلطی نہ کرتے تو میں ان کو تباہ کر دیتا اور ان کی جگہ اور مخلوق پیدا کر دیتا جو گناہ کر کے مجھ سے توبہ کرتی۔ جہاں میں "قَہَّار" ہوں وہاں میں "سَتَّار" بھی تو ہوں۔ یہ بھی تو شانِ بادشاہی ہوتی ہے کہ آپ بڑے سے بڑا جرم کریں اور آ کر ہاتھ باندھ لیں کہ میں مجرم ہوں تو بادشاہ کہے گا کہ اچھا جاؤ میں نے معاف کیا۔ یہ بھی تو بادشاہوں کی صفت ہے اور اللہ تو شہنشاہوں کے شہنشاہ ہیں، وہ تو "مَلِكُ الْمُلُوْكِ" ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ کے حکم کا کہیں انکار نہیں کیا۔ یہ بات یاد رکھیں! صرف ارتکابِ نہی ہوا اور وہ کیوں ہوا؟ اس کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی کئی حکمتیں تھیں۔

اسی لیے علماء نے ایک بڑی باریک بات بیان کی ہے کہ ارتکابِ نہی جب بھی ہوتا ہے تو اس کا تعلق مادۂ غضب کے ساتھ ہوتا ہے اور معافی کا تعلق رحم کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو ایک صفت غضب ہے اور ایک صفت رحمت ہے۔ اور یہ بھی حدیث میں واضح موجود ہے کہ میرے اللہ کی صفت رحمت، صفت غضب پر غالب ہے۔

ایک ولی اللہ کا بادشاہ کی دولت ٹھکرانے کا واقعہ:

ایک بادشاہ نے ایک اللہ کے ولی کو خط لکھا کہ چونکہ آپ کا لنگر بہت وسیع ہے، ماشاءاللہ! ہزاروں آدمی لنگر کھانے آتے ہیں اور آپ کے ہاں قیام کرتے ہیں، اتنے زیادہ اخراجات کا بوجھ برداشت کرنا آپ کے لیے باعثِ پریشانی ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے ملک کا چوتھا حصہ آپ کے لنگر کے لیے وقف کردوں، تاکہ اس کی تمام آمدنی آپ کے لنگر پر خرچ ہو اور آپ کا لنگر ہمیشہ قائم ودائم رہے۔ آپ مجھ سے میری سلطنت کا چوتھا حصہ لے لیں۔ اس اللہ والے نے اس کو جواب میں لکھا، جو فارسی کا ایک شعر تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تمہیں تمہاری نیت اور تمہارے ارادے کے مطابق ثواب عطا فرمائیں گے، لیکن ہمیں جو اللہ نے رات کی شہنشاہی بخشی ہے، اس کے مقابلے میں تمہاری شہنشاہی میں کوئی لذت نہیں ہے۔ تم تو ہمیں چوتھے حصے کی شہنشاہی دینا چاہتے ہو، اللہ نے ہمیں آدھی رات کی شہنشاہی دی ہوئی ہے۔ مجھے جو نیم شب کی سلطنت ملی ہوئی ہے تو میں تمہارے اس ملک کو ایک رات کے بدلے قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ اللہ کا دروازہ چھوڑ کر محتاجوں کا محتاج ہو جاؤں۔ [ملفوظاتِ حکیم الامت: ۳/ ۲۴۳، بزرگوں کا استغنا اور سلطان شمس الدین......]

دیکھیں! ایک بندہ چاہے بادشاہ ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اللہ کا محتاج ہے، چاہے وہ کتنا بڑا غنی ہو، کروڑ پتی ہو، پیسے والا ہو، تب وہ بھی کسی کا محتاج ہے۔ تو محتاج کا محتاج بننے میں کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے محتاج بنو جو کبھی محتاج نہیں ہوگا۔ جو غنی ہے، سارا جہان جس کا محتاج ہے۔ جب ہم اس کے محتاج ہیں تو اس کے بندوں کا محتاج بننے کی کیا ضرورت ہے؟ اسی لیے اقبال رحمہ اللہ نے بھی بڑی اونچی بات کی تھی:

ع جو اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک

اقبال بھی بڑا مردِ قلندر تھا، فقیر آدمی تھا، آخری زندگی میں اللہ نے اس سے بڑا کام لیا۔ وہ اللہ کے قرآن میں ڈوب جاتا تھا۔

......تم تو قرآن پڑھتے ہو تعویذ لکھنے کے لیے،

......تم تو اس وقت قرآن کا ختم کراتے ہو جب کوئی مقدمہ ہو جائے، تاکہ مصیبت سے بچیں،

......تم تو قرآن پڑھتے ہو جب تم پر کوئی بلا ٹوٹ پڑے،

......یا اس وقت قرآن پڑھتے ہو جب کوئی بوڑھا مرنے والا ہو، تاکہ یہ جلدی مرے اور ہماری جان چھوڑے۔

لیکن ان لوگوں نے زندگی کا درس حاصل کرنے اور پوری دنیا کو سبق پڑھانے کے لیے قرآن پڑھا تھا۔ وہ قرآن پڑھتے پڑھتے بے ہوش ہو جایا کرتے تھے، اور جب ان کو کچھ ہوش آتا تھا تو کچھ کہہ دیتے تھے۔ جو قرآن مقدس کی آیات کا اثر دماغ میں آتا تھا، اس کو پھر اشعار میں ڈھالتے تھے۔ چنانچہ اقبال نے بڑی خوب بات کی:

ے جو اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو تیرے گدا ہیں دارا و جم

اگر تم اپنے مالک اور رازق کو نہ پہچانو تو بادشاہوں کے دروازے پر بھیک مانگتے رہو، دھکے کھاتے رہو، سرمایہ داروں کے دروازوں پر پڑے رہو اور امیر آدمیوں کے پیچھے بھاگتے رہو۔ ان سے کبھی چندہ، کبھی زکوٰۃ اور خیرات (جو اُن کے مال کا گند اور میل ہو) اس کو ہضم کرتے رہو۔ وہ تمہیں کوئی پاک صاف مال تھوڑا دیتے ہیں، وہ اپنا میل مولویوں کے منہ ڈالتے ہیں۔ زکوٰۃ کیا ہے؟ اور کیوں اللہ نے زکوٰۃ کے مال سے اپنے نبی کو محروم رکھا ہے؟ کیوں اللہ نے حکم دیا کہ آپ کے لیے زکوٰۃ حلال نہیں، آپ کی اولاد کے لیے بھی زکوٰۃ حلال نہیں۔ بہر حال سید کی اولاد کے لیے زکوٰۃ حلال نہیں، اس لیے کہ میرے نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو مال کا میل ہے، اور اللہ اپنے بندوں کو اس میل سے محفوظ فرماتے ہیں۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۷۲، باب: تَرْكِ اسْتِعْمَالِ آلِ النَّبِيِّ عَلَى الصَّدَقَةِ]

''تواب'' اور ''اوّاب'' میں فرق:

ایک لفظ ''توب'' ہے اور ایک ''اوب'' ہوتا ہے۔ توبہ کا معنی ہوتا ہے: گناہ سے رجوع کرنا، معصیت سے رجوع کرنا۔ اور ''اوب'' کا معنی ہوتا ہے: غفلت سے ذکر کی طرف رجوع کرنا۔ جیسے اللہ نے اپنے نبی کے بارے میں فرمایا: ﴿نِعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝﴾ [ص: ۳۰] کہ میرا بندہ کتنا اچھا ہے وہ میری طرف لوٹنے والا ہے۔ یعنی غفلت سے ذکر اللہ کی طرف آنے کو ''اوب'' کہتے ہیں۔ اور توبہ کہتے ہیں: گناہ سے نیکی کی طرف لوٹ جانا۔ اور جب یہ کہا جاتا ہے: ''فَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ'' (اللہ نے توبہ قبول فرمالی) تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے جو انتقام کا ارادہ فرمایا تھا، اس سے رجوع فرمالیا۔ اللہ نے اپنے نافرمان کو سزا دینی تھی، لیکن اب اسے سزا کی بجائے معافی دے دی۔

''فَتَابَ عَلَيْهِ'' جب ان کلمات سے آدم علیہ السلام نے معافی مانگی تو اللہ نے ان کی توبہ کو قبول فرمالیا اور آگے توبہ قبول کرنے کی وجہ بھی بیان فرمائی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ﴾ وہ توبہ قبول کرنے والا ہے کہ جب بھی کوئی بندہ

گناہوں کے بعد توبہ کرتا ہے تو اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اور آگے فرمایا: ﴿الرَّحِيمُ﴾ اللہ نے جو توبہ قبول فرمائی تو کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ کمزور ہے، کمزور ہونے کی وجہ سے معافی دے دی، ڈر کی وجہ سے معافی دے دی، ......نعوذ باللہ!...... کسی غرض کی وجہ سے معافی دے دی۔ نہیں! بلکہ وہ مہربان ہے، اس لیے معافی دے دی۔

سب سے پہلے گناہ کر کے توبہ کرنے والا:

اس آیت سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جس طرح سب سے پہلا گناہ کرنے والا آسمانوں میں جن ہے تو اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ سب سے پہلے توبہ کرنے والے حضرت آدم علیہ السلام ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے توبہ کی توفیق عطا فرمائی۔

خطاء آدم کے متعلق فرقہ ضالہ کے اعتراض کا جواب:

بعض فرق ضالہ اور مستشرقین اس قسم کے اعتراض اُٹھاتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام سے غلطی ہوئی تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے انہیں توبہ کی توفیق بھی دے دی اور معافی کے کلمات بھی سکھا دیئے، لیکن ابلیس کو نہ تو معافی کے الفاظ سکھائے اور نہ ہی توبہ کی توفیق دی۔ ایسا کیوں ہوا؟

اس سے پہلے یہ ذکر کیا گیا کہ ایک ہے اللہ کے اوامر کی نافرمانی اور ایک ہے ارتکابِ منہیات۔ جب اللہ نے حکم دیا کہ سجدہ کرو اور اس نے سجدہ نہ کیا تو اللہ نے بتلا دیا: ﴿أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ﴾ کہ اس نے تکبر کی وجہ سے انکار کیا۔ اور دوسری چیز ہے ارتکابِ نہی۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کام سے منع کیا اور بندہ خواہشات سے مغلوب ہو کر اس میں پڑ گیا۔ ایسی صورتحال میں نافرمانی کی وجہ تکبر نہیں ہوتا، بلکہ ایسا غلبۂ خواہش کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیسے اللہ نے منع کیا کہ رمضان کے روزے میں پانی نہ پیو، لیکن اب غلبہ آ گیا تو وہ بے چارا پانی پی بیٹھا۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام سے ارتکابِ نہی ہوا ہے، اس لیے اللہ نے ان کو توبہ کی توفیق عطا فرما دی، جبکہ ابلیس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی، اور پھر نہ تو اس نے معافی مانگی اور نہ ہی اس کو معافی ملی۔

علماء کرام نے اس کا ایک دوسرا جواب یہ بھی دیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے ارتکابِ نہی ہو گیا تھا۔ وہ اس طور پر کہ ان کو درخت کے قریب نہ جانے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن آپ اس درخت کا پھل چکھ بیٹھے۔ اس کے بعد ان پر ندامت طاری ہو گئی اور رونا شروع کر دیا کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہو گئی، میں بھول گیا، میں شیطان کے دھوکہ میں

آ گیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمینوں میں اُتار دیا، آدم علیہ السلام پھر بھی روتے رہے، جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ تین سو سال تک روتے رہے۔

[احیاء العلوم: ۴/۲۲۲]

لیکن ابلیس لعین کو جب اللہ نے فرمایا: ﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ۖ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ﴿١٢﴾﴾ [الاعراف: ۱۲] کہ اے بدبخت! تُو نے سجدہ کیوں نہیں کیا جبکہ میں نے تمہیں حکم دیا؟ تو اس نے یہ نہیں کہا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، میں بھول گیا، مجھے معاف فرمادیں، میں دوبارہ سجدہ کرکے اپنی غلطی کا ازالہ کرتا ہوں۔ نہیں، بلکہ اس نے کہا: ﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ﴾ میں تو اس سے بہتر ہوں۔ گویا کہ اس نے پھر بھی تکبر کیا۔ تو جو اللہ کا حکم بھی نہ مانے اور تکبر پر بھی اَڑا رہے تو اس کی سزا یہی تھی: ﴿وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ﴿٧٨﴾﴾ [ص: ۷۸] اللہ نے بھی حکم فرما دیا کہ نکل جاؤ اور قیامت تک تجھ پر لعنت ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اتنی بڑی سزا سننے کے بعد سجدے میں گر جاتا کہ مجھے لعنتی اور مرجوم و مردود بنا دیا گیا، میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے دور ہو گیا ہوں، اتنی بات کر کے وہ خدا کے دروازے پر گر جاتا۔ لیکن اس نے کہا: ﴿فَبِعِزَّتِكَ﴾ مجھے آپ کے جلال کی قسم! میں تیرے بندوں کو گمراہ کرتا رہوں گا۔ گویا اس نے باقاعدہ...... نعوذ باللہ!...... اللہ کے ساتھ مقابلہ والی کیفیت اختیار کرلی، مخلوق ہو کر خالق سے ٹکرانے کا منصوبہ بنالیا۔

جنت سے نکالے جانے کی حکمت:

آدم علیہ السلام کی خطا کی وجہ سے اگرچہ ہمیں جنت سے نکال دیا گیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اتنی بڑی نعمت ملی کہ ہم دنیا کو آباد کرنے کا ذریعہ بن گئے۔ چنانچہ آپ نے حدیث مبارک میں پڑھا ہے کہ میرے آقا سرکارِ مدینہ ﷺ نے فرمایا:

((خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ فِيهِ الشَّمْسُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ، فِيهِ خُلِقَ آدَمُ، وَ فِيهِ أُدْخِلَ الْجَنَّةَ، وَ فِيهِ أُخْرِجَ مِنْهَا.)) [صحیح مسلم، حدیث: ۸۵۴، باب: فضل یوم الجمعۃ]

''سب سے بہتر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے وہ جمعہ کا ہے، کیونکہ آدم علیہ السلام اسی جمعہ کے دن پیدا کیے گئے اور اسی جمعہ کے دن ان کو جنت میں داخل کیا گیا اور اسی جمعہ کے دن ان کو جنت سے نکالا گیا۔''

حضور پاک ﷺ نے آدم علیہ السلام کے جنت سے نکالے جانے کو بڑی عزت میں شمار فرمایا کہ جہاں جمعہ کی شان

کی عظمت بیان فرمائی کہ جمعہ اتنا عظیم الشان دن ہے کہ آدم علیہ السلام پیدا بھی جمعہ کے دن ہوئے، جنت میں بھی جمعہ کو گئے اور جنت سے نکالے بھی جمعہ کے دن گئے، کیونکہ ان کے جنت سے باہر آنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی کروڑوں حکمتیں تھیں۔

توبہ کردن دَر جوانی شیوۂ پیغمبری:

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے گناہ گار بندے کی توبہ سے خوش ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اے میرے ملائکہ! میرے اس گناہ گار بندے کو بھی پتہ چل گیا ہے کہ میرا بھی کوئی رب ہے جو میری غلطیاں معاف کرے گا، اسی لیے تو میرے دروازے پر رو رہا ہے، اسی لیے تو میرے دروازے پر گڑگڑا رہا ہے اور معافیاں مانگ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ تم بھی گواہ ہو جاؤ کہ میں نے اپنے اس بندے کے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔ [مسند احمد، حدیث: ۷۹۴۸]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ بہت بڑی بات ہے۔ جیسا کہ ایک بزرگ شاعر نے بھی کہا:

توبہ کردن دَر جوانی شیوۂ پیغمبری

جوانی میں توبہ کرنا پیغمبروں کا شیوہ رہا ہے۔ اس لیے تم بھی جوانی میں توبہ کرو اور صحت کی حالت میں توبہ کرو۔

پانچ سے پہلے:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ پانچ چیزوں کا خیال رکھا کرو:

1. ......تم اپنی جوانی میں کوئی عبادت کا کام کرلو بڑھاپے سے پہلے۔
2. ......صحت ہے تو بیماری سے پہلے کوئی کام کرلو۔
3. ......تمہیں اللہ تعالیٰ نے غنیٰ دیا ہے تو فقر سے پہلے پہلے تم اپنا کوئی کام کر جاؤ۔
4. ......فراغت ہے تو مشغولیت سے پہلے پہلے کام کرلو۔
5. ......زندگی ہے تو موت سے پہلے موت کے بعد کے لیے کوئی کام کر جاؤ۔

اگر تم ایسی تیاری کرلو گے تو پھر اللہ تعالیٰ تمہیں کبھی ذلیل ورُسوا نہیں کریں گے۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۵۱۷۴، کِتَابُ الرِّقَاقِ، اَلفَصْلُ الثَّانِیْ]

حضرت آدم علیہ السلام کے کلماتِ توبہ کیا تھے؟

حضرت مجاہد، حضرت سعید بن جبیر، حضرت ابو العالیہ، حضرت ربیع بن انس، حضرت حسن، حضرت قتادہ، حضرت محمد بن کعب القرظی، حضرت خالد بن معدان، حضرت عطاء الخراسانی، حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہم اللہ، یہ سب حضرات فرماتے ہیں کہ توبہ کے یہی کلمات تھے: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [الاعراف: ۲۳]

اسی لیے علماء نے فرمایا ہے کہ جب آدمی اللہ سے معافی مانگے تو پہلے اپنی غلطی کا اعتراف کرے، جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اعتراف کیا اور پھر اللہ کی ان صفات سے اللہ کے آگے درخواست پیش کرے جن صفتوں کے اندر رحمت اور اللہ تعالیٰ کے کرم کا تذکرہ ہے۔

بنوتمیم قبیلہ کے ایک آدمی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا کہ ہمیں بتلائیں کہ وہ کون سے کلمات تھے جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سکھلائے؟ انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو حج کرنے کا طریقہ سکھلایا، کیونکہ انسانوں میں سب سے پہلے حج کرنے والے حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اس لیے کہ اور تو کوئی بندہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اگر یہ قول بھی لے لیا جائے تو ٹھیک ہے (کہ جب آدم علیہ السلام حج کریں گے تو حج سے سب گناہ مٹ جائیں گے)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ نہیں فرمایا کہ صرف یہی کلمات سکھلائے، بلکہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو حج کا طریقہ بتلایا۔

حدیث مبارک میں آتا ہے: "مَنْ حَجَّ فَلَمْ يَرْفُثْ وَ لَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ وَلَدَتْهُ أُمُّهٗ"

[مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۷۱۳۶]

ایک روایت میں آتا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی: اے پروردگارِ عالم! اے ارحم الراحمین! میں نے تو غلطی کی ہے، مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے، کیا یہ میرے پیدا ہونے سے پہلے لکھی ہوئی تھی یا نہیں؟ اللہ نے فرمایا: ہاں! لکھی ہوئی تھی۔ عرض کیا: اگر پہلے سے لکھی ہوئی تھی تو معافی بھی عطا فرما دیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ آدم علیہ السلام نے کہا کہ اے ربِ کریم! کیا تُو نے

مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں فرمایا؟ اللہ نے فرمایا: ہاں۔ عرض کیا: کیا آپ نے مجھ میں اپنی روح مبارک نہیں پھونکی؟ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۱، البقرۃ: الآیۃ: ۳۷]

کیا آدم علیہ السلام کی بشریت میں خدا کی روح تھی؟

اس معاملے میں بہت لوگ مغالطے میں پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ نے آدم علیہ السلام میں اپنی روح پھونکی۔ اب لباس تو بشر کا ہے، لیکن اس کے اندر روح تو خدا کی ہے، اندر تو خدا ہے۔ اسی مصیبت میں تو پہلے لوگ گمراہ ہوئے ہیں...... اللہ معاف فرمائے!...... اسی لیے عیسائی گمراہ ہوئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا لقب آ گیا روح اللہ، کلمۃ اللہ۔ ایسے لقب جب آئے تو عیسائی گمراہ ہو گئے۔ اسی طرح ہمارے بعض جاہل صوفی...... جنہوں نے سبز کپڑے پہن لیے، تسبیح ہاتھ میں پکڑ لی...... کہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، پھر اللہ نے ان میں اپنی روح پھونکی۔ اور اصل تو روح ہوتی ہے، جسد تو کوئی چیز نہیں ہے۔ تو جب آدم علیہ السلام کے اندر روح چلی گئی تو اصل میں آپ ہوئے باہر سے تو آدم ہے اور جناب غلطی بھی آپ کرتا ہے اور پکڑتا بھی آپ ہے، حالانکہ خود ہی تو وہ درخت کھایا تھا...... معاذ اللہ!......

ان بدبختوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اللہ تو کھانے سے پاک ہے، اور اگر اندر خدا ہے اور باہر آدم کا لباس ہے تو آدم علیہ السلام کے کپڑے کیوں اُتر گئے؟ کیا خدا ننگا ہو گیا؟...... نعوذ باللہ!...... جاہل لوگ ہیں، گمراہی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اب اللہ نے فرمایا کہ یہ میرا گھر ہے تو کیا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں رہتے ہیں؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صالح (علیہ السلام) کی اونٹنی میری ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ باقی تمہاری ہیں؟ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ایک چیز کو اپنی ذات کے ساتھ نسبت دے کر کہہ دیا کہ میں نے اپنی روح اس میں پھونکی، ورنہ باقی سب کو بھی تو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ آدم علیہ السلام میں جو روح پھونکی گئی تو وہ اللہ کی روح ہے یا تمہاری ہے؟...... نعوذ باللہ...... اب آدم علیہ السلام خدا بن گئے؟ یا جیسے حلولیہ فرقہ ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ حلول کر گیا (کسی دوسرے کے جسم میں آ گیا)۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!!!! اسی طرح امامیہ کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں حلول کر گئے کہ پہلے تو علی تھا، پھر اللہ بھی اندر آ گیا تو مولا بن گیا۔ اسی لیے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو "مولا علی" کہتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ ایک دوسرے کو ملیں گے تو السلام علیکم ورحمۃ اللہ نہیں کہیں گے، بلکہ ایک کہے گا: "یا علی مدد" اور دوسرا کہے گا: "مولا علی مدد" ان کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مقامِ اُلوہیت اور مقامِ ربوبیت پر پہنچ گئے تھے۔ انا للہ وانا الیہ

راجعون!!!

یہ تمام عقائد قرآن وسنت کے خلاف ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات، اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان، اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت، اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفاتِ کمال، اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفاتِ جلال، اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات شان کا جو مقام اور مرتبہ ہے کسی بندے یا کسی مخلوق میں کہاں اتنی طاقت ہے کہ اس تک پہنچ سکے؟

اس لیے ہمیشہ یاد رکھا کریں کہ ایسے الفاظ سے یہ جاہل لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ دیکھو! اللہ نے اپنی روح پھونک دی۔ تمام روحیں اللہ نے پیدا کی ہیں اور پھر روح ایسی چیز ہے کہ جس پر فنا کبھی نہیں آئے گی۔ ہر چیز پر فنا آئے گی لیکن روح باقی رہے گی، اسی طرح عرش باقی ہوگا، جنت باقی ہوگی، غلمان جنت باقی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ نے جہنم پیدا کی، وہ باقی ہوگی۔

توبہ کے کلمات کے متعلق روایات کا خلاصہ:

حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا: یا اللہ! آپ ہی نے تو مجھے پیدا فرمایا، آپ ہی نے تو میرے اندر روح پھونکی، آپ ہی نے تو مجھے اتنی بڑی عظمت بخشی اور میرے پیدا ہونے سے پہلے آپ کے علم میں یہ چیزیں لکھی ہوئی تھیں کہ ایسا میرے بندے سے ہوگا۔ یہ اعتراف ہوتا ہے کہ یہ چیز آپ کے علم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا: اے اللہ! اگر میں توبہ کروں، رجوع کروں تو کیا پھر مجھے جنت میں لوٹایا جائے گا یا نہیں؟ اللہ نے فرمایا: ہاں! لوٹایا جائے گا، جب تم توبہ کرو گے تو ہم بھی معافی عطا کردیں گے۔

اس لیے بعض لوگوں نے کہا کہ یہ کلمات تھے۔ بہرحال ان میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لیے کہ آدم علیہ السلام اتنا عرصہ جو معافی مانگتے رہے تو یہ ساری باتیں کی ہوں گی۔ ان سب کا جو اہم خلاصہ ہے، وہ الفاظ مبارک یہ تھے:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ [الاعراف: ۲۳]

ابن ابی حاتم نے بھی ایک حدیث نقل کی ہے، وہ بھی اسی سے ملتی جلتی ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب کریم! میں اگر رجوع کروں، توبہ کروں تو کیا اپنے گھر جنت میں مجھے دوبارہ بھیجیں گے؟ اللہ نے فرمایا: ہاں۔ یہی وہ کلمات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سکھلائے۔ لیکن اس روایت کے اندر انقطاع ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے یہ قول نقل فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جو کلمات سکھائے اور پھر آدم علیہ السلام

نے ان کلمات سے معافی مانگی، وہ یہ ہیں:
''اَللّٰهُمَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي، فَاغْفِرْ لِي فَإِنَّكَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ، اَللّٰهُمَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي، فَارْحَمْنِي إِنَّكَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي، فَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ.''
[کنز العمال: ۵۰۵۶، تفسیر قرطبی: ۴/۴۰، ۱۶/۶۸]

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۳۸، ۳۹]

ہم نے حکم دیا تم سب یہاں سے نیچے جاؤ، پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو میری ہدایت پر چلا تو نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری کتابوں کو جھٹلایا تو وہ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم اُترو۔ علماء نے فرمایا کہ ﴿اهْبِطُوْا﴾ جمع کا صیغہ اس لیے استعمال کہ آدم علیہ السلام کی پشت کے اندر ساری مخلوق تو موجود تھی۔

﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى﴾ اللہ پاک خبر دیتے ہیں کہ جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو اُتارا اور آدم علیہ السلام کی بیوی کو بھی اُتارا گیا، اسی طرح ابلیس کو بھی جنت سے نکالا گیا۔ اس آیت کے اندر بظاہر آپ کو خطاب ہے، لیکن اشارہ آپ کی اولاد کو تھا کہ جب میں تمہارے لیے کتابیں، رسول اور نبی بھیجوں گا، وہ میری کتابیں لے کر آئیں گے تو تم ان کی اتباع اور پیروی کرنا، اس لیے کہ انبیاء اور رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح بیان اور ہدایت لے کر آئیں گے۔

﴿هُدًى﴾ سے مراد ایک قول یہ بھی ہے کہ جب تمہارے پاس میرے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئیں تو جو اُن کی اتباع کرے گا، اس پر کوئی ڈر بھی نہیں ہوگا اور اس پر کوئی غم بھی نہیں ہوگا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے ''قرآن'' مراد ہے۔ دونوں قول ٹھیک ہیں، قرآن پاک بھی ہدایت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہدایت ہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوالعالیہ کا قول زیادہ عام ہے۔ اللہ نے فرمایا: جو میں نے کتابیں اُتاریں اور جو میں نے رسول بھیجے۔ اس کے اندر ساری کتابیں بھی آگئیں، سارے رسل بھی آگئے، نبی پاک ﷺ بھی آگئے، قرآن بھی آگیا۔

﴿فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [البقرۃ:۳۸] ان پر مستقبل میں ڈر نہیں ہوگا، یعنی آخرت میں ان کو کوئی ڈر نہیں ہوگا۔ اللہ ان کے لیے آسانیاں فرمادیں ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ اور نہ ان کو ان چیزوں پر غم ہوگا جو دنیا میں گزر چکی ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۸۲، البقرۃ: الآیۃ:۳۸]

مؤمن جہنمیوں کے لیے شفاعت:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث مبارک ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کافر اور مشرک کہ جن کا کفر و شرک پر خاتمہ ہوا ہے، وہ تو ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، ان پر نہ موت آئے گی اور نہ وہ زندہ ہوں گے۔ ہاں البتہ بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ایمان دار ہوں گے، لیکن گناہوں کی وجہ سے جہنم میں ہوں گے، سزا کے طور پر ان پر موت آئے گی، ان کو جہنم کی آگ جلا کر کوئلہ کر دے گی اور اللہ مجھے اجازت دیں گے، میں ان کی شفاعت کروں گا، وہ بخشے جائیں گے۔ [صحیح مسلم، حدیث:۳۰۶، باب: إِثْبَاتِ الشَّفَاعَةِ...]

''اهْبِطُوْا'' مکرر لانے کی وجہ:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب ﴿اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ میں ﴿اهْبِطُوْا﴾ کا لفظ ایک مرتبہ آگیا تو ﴿اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا﴾ میں اسے دوبارہ کیوں لایا گیا؟ اس کے جواب میں بعض علماء نے فرمایا کہ اصل وجہ یہ ہے کہ اُس ﴿اهْبِطُوْا﴾ کا حکم الگ تھا اور اِس ﴿اهْبِطُوْا﴾ کا حکم الگ ہے۔ جب حکم کے اندر مغایرت آگئی تو تکرار نہ رہا۔

بعض علماء نے کہا کہ پہلے حکم ہوا تو آسمانِ دنیا پر آگئے، اور جب دوبارہ حکم ہوا تو آسمانِ دنیا سے بھی اُتر کر زمین پر آگئے۔

بعض نے کہا کہ تاکید کے لیے ہے۔ جیسے کوئی آدمی دوست سے کہتا ہے: ''قُمْ قُمْ'' حالانکہ ایک دفعہ ''قُمْ'' کہنا کافی ہوتا ہے، لیکن وہ تاکید کے لیے دوبار کہہ دیتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی تاکید کے لیے دوسری بار حکم دیا گیا۔

مفسر فرماتے ہیں کہ پہلا قول صحیح ہے، کیونکہ اگر آسمانِ دنیا مراد ہو اور دوسرا حکم زمین کے لیے مراد ہو تو پھر بھی

اشکال ہوگا، کیونکہ پہلے حکم کے اندر بھی تو زمین کا تذکرہ موجود ہے، ﴿وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ﴾۔ اس لیے اصل بات یہ ہے کہ اس حکم کا تعلق الگ تھا اور اس حکم کا تعلق الگ ہے۔ یہاں یہ حکم دیا جارہا ہے کہ ﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ﴾ اور وہاں یہ بتلایا جارہا تھا کہ تم نے زمین میں رہنا ہے اور اس میں قرار پکڑنا ہے اور مدتِ معلومہ تک رہنا ہے۔ اور جب دونوں احکام کے درمیان تغایر ہے تو قرآن میں کوئی تکرار نہ ہوا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۲، البقرۃ: الآیۃ: ۳۸]

﴿يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۝ وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ ۖ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ ۝﴾ [البقرۃ: ۴۰، ۴۱]

اے بنی اسرائیل! میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے تھے اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو۔ اور اس کتاب کو مان لو جو میں نے اُتاری ہے (اور) اس کتاب کو سچ بتانے والی ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم سب سے اوّل اس کے منکر نہ بنو اور میری آیات پر تھوڑا سا مول نہ لو اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرمارہے ہیں۔

سورۃ بقرۃ مدینہ میں سب سے پہلی نازل ہونے والی سورت:

نبی کریم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو اہل کتاب میں سے یہود کے بڑے قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر آباد تھے اور یہ بنی اسرائیل میں سے تھے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی خاص نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور ان کو خطاب کیا ہے۔

ہجرت سے پہلے جو سورتیں اُتری ہیں وہ سورتیں ''مکی'' کہلاتی ہیں۔ اور جو حضور پاک ﷺ پر ہجرت کے بعد سورتیں اُتاری گئیں وہ ''مدنی'' کہلاتی ہیں۔[1] تو مدینہ منورہ میں جانے کے بعد جو پہلی سورت نازل ہوئی ہے ''

[1] الدر المنثور للسیوطی: ۶/ ۳۲۵، علوم القرآن، ص: ۶۰]

سورۃ البقرۃ ہے، یہ سورت مکہ سے ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۵، ذِکْرُ مَا وَرَدَ فِيْ فَضْلِ السَّبْعِ الطُّوَلِ]

بنو قریظہ، بنو نضیر اور یہودیوں کا تعارف:

میرے آقا خاتم الانبیاء حبیب کبریاء ﷺ جب مدینہ منورہ میں پہنچے تو وہاں یہود بڑے آباد تھے، بنو قریظہ تھے، بنو نضیر تھے بنی قینقاع تھے۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ وہ تعداد کے اعتبار سے اتنے زیادہ نہیں تھے، ان کا عدد بڑا محدود تھا۔ اصل میں جو مدینہ منورہ کے بڑے قبائل تھے: اوس اور خزرج، وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے، یہود بہت تھوڑے تھے، لیکن ان کو باقی قبائل پر علمی تفوق تھا، یعنی باقی قبائل کو لوگ اُمی سمجھتے تھے، کہتے تھے کہ یہ جاہل اور اَن پڑھ لوگ ہیں، لیکن یہود کے بارے میں ہر آدمی کے دماغ میں یہ بات تھی کہ یہ اہل کتاب ہیں اور یہ اہل علم ہیں، ان کے پاس اَحبار (بڑے علماء) ہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر آپ ابتداء سے ان کی نسل پر بھی غور کریں تو یہ بنیادی طور پر دولت پرست لوگ ہیں، یعنی بنیادی طور پر انہوں نے مادہ پرستی کا سبق سیکھا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ مال اور دولت پر ہمارا کنٹرول رہے۔ چونکہ یہ بڑی مکار وعیار قوم ہے اور بڑی متعصب قوم ہے۔ ان کے اندر اتنا تعصب ہے کہ اگر ان کا کوئی یہودی رشیہ میں بھی ہو تو اس کو یہ اپنے پاس بلائیں گے، وہ اگر دنیا کے کسی ملک میں بھی ہو تو اس کو بلائیں گے۔ لیکن اگر کوئی آدمی ان کی قوم بنی اسرائیل سے تعلق نہیں رکھتا، وہ چاہے یہودی بھی بن جائے تو اسے یہ یہودی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اگرچہ اسے اپنے قبائل اور مذہب میں شامل کر لیں گے، لیکن اسے دوسرے نمبر کا شہری سمجھیں گے۔ اسے ویسے حقوق دینے پر یہ تیار نہیں ہوں گے جیسے حقوق اپنی نسل کو دیتے ہیں۔

اس قوم میں نسل پرستی، قوم پرستی کا مرض بہت زیادہ ہے۔ ان کے بڑے عجیب مکر و خداع ہیں۔ ان پر سے تاریخ آہستہ آہستہ پردہ اُٹھا رہی ہے اور آہستہ آہستہ پردہ اُٹھتا چلا جائے گا اور ایک وقت آ جائے گا جب یہود اپنی ذلت کی انتہاء کو پہنچ جائیں گے۔ تمام دنیا کا یہ اصول ہے کہ ہر چیز کے پکنے کے بعد کٹنے کا وقت بھی آتا ہے۔ دنیا کے اندر جتنی فصلات ہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ گندم کاشت کرتے ہیں، جب وہ پک جاتی ہے تو اسے کاٹا جاتا ہے، اسی طرح یہ نظامِ عالم ہے کہ جب دن چڑھتا ہے تو دن ڈھلتا بھی ہے۔ جب رات جوش کر کے آتی ہے تو وہ جاتی بھی ہے۔ یہ ایک نظامِ عالم ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت چیلنج نہیں کر سکتی۔ جس طرح ایک بچہ پیدا ہوتا ہے، بڑا ہوتا ہے، جوانی کی عمر کو پہنچتا ہے تو اسی طرح اس نے بڑھاپے میں بھی قدم رکھنا ہے۔ یہود اپنی مادہ پرستی اور اقتصادی قوت

کے پیشِ نظر عروج کی انتہاء پر پہنچ گئے ہیں تو ان کی ذلت کے دن بھی قریب آنے والے ہیں اور ان کو پتہ ہے کہ ہماری ذلت عالم اسلام کے ہاتھوں سے ہوگی۔ چنانچہ آپ پوری دنیا پر نظر ڈالیں تو یہودی ہر جگہ آپ کو اسلام کے خلاف زہر پھیلاتا ہوا نظر آئے گا۔

جہاں جتنا مسلمان دین پر زیادہ پختہ ہے، وہ ان کا اتنا بڑا دشمن ہے اور جہاں جہاں مسلمان صرف نام کا مسلمان ہے وہ اس سے گزارا کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک لیبل ہے، جیسے ہم پر یہودیت کا لیبل ہے، نصرانیوں پر نصاریٰ کا لیبل ہے، ان پر بھی مسلمان ہونے کا ایک لیبل ہے، ورنہ عمل کے اعتبار سے ہمارے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ خنزیر وہ بھی کھاتے ہیں اور خنزیر یہ بھی کھاتے ہیں، شراب وہ بھی پیتے ہیں اور شراب یہ بھی پیتے ہیں، جیسے وہ کلبوں میں جاتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی ان کلبوں میں جاتے ہیں، جیسے ان کے ہاں مختلف قسم کی پارٹیاں اور مختلف قسم کے کردار ہوتے ہیں وہ مسلمانوں کے اندر بھی ہوتے ہیں۔ جو مسلمان دین پر پختہ ہو، جو مسلمان اپنے مذہب و ایمان اور اعمالِ صالحہ پر پختہ ہو، وہ ان کا دشمن ہے وہ چاہے دنیا کے کسی کونے میں بھی رہتا ہو۔

بہر حال ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے براہِ راست بنی اسرائیل کو خطاب کیا ہے۔ چونکہ حضور ﷺ کے مدینہ منورہ جانے کے بعد سب سے پہلے مخاطب پڑھے لکھے بنی اسرائیل تھے۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں جیسے یہود کے قبائل موجود تھے، ایسے ہی نصاریٰ بھی موجود تھے جو اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے، لیکن یہ لوگ مدینہ منورہ میں آباد نہیں تھے، بلکہ تقریباً شام اور نجران میں تھے، کچھ جانب یمن میں آباد تھے اور زیادہ تر شام کی طرف آباد تھے۔ ان کے وفود آتے رہے، حضور ﷺ سے باتیں بھی ہوتی رہیں، حضور ﷺ سے مکالمات بھی ہوتے رہے، حضور ﷺ سے وہ دین کی باتیں بھی سمجھتے رہے اور ان کے بڑے لوگ اسلام بھی لاتے رہے۔

لیکن مدینہ منورہ میں جو آباد تھے وہ بنی اسرائیل تھے، یہود تھے اور ان کی جگہیں قلعہ نما تھیں، اسی وجہ سے مدینہ پر بھی ان کا کنٹرول تھا۔ جیسا کہ آج کل انہوں نے گریٹر اسرائیل کے نقشہ میں دکھلایا ہوا ہے کہ مدینہ منورہ بھی ہمارا ہے، خیبر، تبوک، فلاں علاقے بھی ہمارے ہیں۔ دراصل یہ غداری ہے، ورنہ ان کی ان علاقوں میں کوئی حکومت یا سلطنت نہیں تھی، بلکہ یہ تو اپنے علاقوں سے، بیت المقدس سے نکل کر مدینہ منورہ اس لیے آئے تھے کہ انہوں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ ایک آخری نبی پیدا ہوگا جس کا نام محمد رسول اللہ ﷺ ہوگا۔ انہوں نے تورات میں

باقاعدہ پڑھا تھا کہ حضور پاک ﷺ کی پیدائش مکہ میں ہوگی اور حضور پاک ﷺ کی ہجرت یثرب، مدینہ پاک کی طرف ہوگی۔¹ اور انہوں نے یہ بھی پڑھا ہوا تھا کہ حضور ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان کا فاصلہ زیادہ ہوگا بہ نسبت ایک عام آدمی کے۔[سنن الترمذی، حدیث: ۳۶۳۵، بابُ ما جاءَ فِي صِفَةِ النَّبِيِّ ﷺ]

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ حضور ﷺ کا سینہ مبارک چوڑا تھا، یہ بات نہیں ہے، یہ بھی علاماتِ نبوت میں سے ہے۔ سینے کا چوڑا ہونا مرد کی ایک بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے، حسن سمجھا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو عرب کہہ دیتے: "وسع صدرہ" (آپ ﷺ کا سینہ مبارک چوڑا تھا) لیکن جن صحابہ نے بھی ذکر کیا ہے اور تورات میں بھی علامات کے اندر ذکر آیا ہے، وہاں سینہ کے چوڑا ہونے کا تذکرہ نہیں، بلکہ یہ آتا ہے کہ دو کندھوں کے درمیان میں فاصلہ زیادہ تھا۔ یہ خواص نبوت کی علامت تھی، جیسا کہ مہر نبوت تھی۔

اسی طرح حضور ﷺ کا چلنے کا تذکرہ تھا کہ جب آپ زمین پر چلتے تھے تو ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اوپر سے نیچے کی طرف آرہے ہوں، حالانکہ زمین بالکل سیدھی ہوتی تھی۔

[سنن الترمذي، حديث: ۳۶۳۷]

حضور ﷺ کا قد مبارک بہت زیادہ لمبا نہیں تھا اور نہ ہی بہت چھوٹا تھا، بلکہ آپ ﷺ کا قد مبارک بڑے جمال پر یعنی عین اعتدال پر تھا۔ البتہ یہ بات بھی معجزات اور خصائصِ نبوت میں سے تھی کہ جب آپ ﷺ صحابہ کے درمیان کھڑے ہوتے تو ان سے اونچے نظر آتے تھے۔[سنن الترمذی، حدیث: ۳۶۳۸]

یہ شانِ نبوت تھی جس کا ذکر انہوں نے باقاعدہ تورات میں پڑھا تھا، انہوں نے آپ کے صحابہ کا ذکر بھی تورات میں پڑھا تھا، انہوں نے آپ کی اُمت کا ذکر بھی تورات میں پڑھا تھا اور یہ لوگ مدینہ منورہ میں اس انتظار میں آئے تھے کہ جب اللہ کے نبی آئیں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے۔ مدینہ منورہ ان کا اپنا ملک تو نہیں تھا کہ یہ کہیں کہ ہمیں یہاں سے کیوں نکالا گیا تھا؟ یہ تو اپنے ملک سے چل کر یہاں آئے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ حضور پاک ﷺ پر ایمان لے آئیں۔ لیکن جب حضور پاک ﷺ کی پیدائش ہوئی تو یہ دشمن بن گئے۔ کہنے لگے کہ نبوت تو ہمارے خاندان سے نکل گئی، بنو اسرائیل کی بجائے بنو اسماعیل میں چلی گئی ہے، اب تو ہمارا نام ونشان مٹ جائے گا۔ وہ اس حسد اور بغض میں مبتلا ہو گئے، عناد میں آ گئے۔ اس لیے انہوں نے حضور پاک ﷺ کا کلمہ نہیں

¹[مشكاة المصابيح، حديث: ۵۷۷۱، باب: فضائل سيد المرسلين صلوات الله وسلامه عليه، الفصل الثاني]

پڑھا، بلکہ حضور پاک ﷺ اور اسلام کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی، سازشیں کیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں بھی رُسوا کیا اور آخرت میں بھی رُسوا ہوں گے۔

اور بہت جلد وہ وقت آئے گا جس کے بارے میں میرے آقا ﷺ نے خوشخبری دی ہے اور آپ ﷺ نے پیشین گوئی دی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جتنی طاقت اور قوت کو چلے جائیں، لیکن ایک وقت آئے گا کہ ان کو دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملے گی، بلکہ یہ اگر کسی درخت یا پتھر کے پیچھے بھی چھپیں گے تو وہ درخت اور پتھر بھی پکار پکار کر کہے گا: "يَا عَبْدَ اللهِ! يَا مُسْلِمُ! هٰذَا يَهُودِيٌّ فَاقْتُلْهُ" (اے مسلمان! ادھر آؤ میرے پیچھے ایک بدبخت یہودی چھپا ہوا ہے اس کو مار ڈالو)۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک درخت ہے "الغرقد"، اس کو "شجرۃ الیہود" کہا جاتا ہے، وہ ان کے بارے میں نہیں بتلائے گا۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۹۲۲، باب: لا تقوم الساعۃ حتی تغبُد...]

معلوم یہ ہوتا ہے کہ اب نقشہ جو بن رہا ہے، خدا کی قدرت ہے کہ تمام دنیا سے یہودیوں کو بلا کر ایک جگہ آباد کیا جا رہا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی پر موت آنے لگتی ہے تو اپنے ٹھکانہ پر اللہ اس کو پہنچا دیتے ہیں۔

اس میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتیں ہیں، جنہیں بڑی گہری نظر سے اسلام والے لوگ جانتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ آخر کوئی وجہ ہے کہ یہ کبھی جرمنی میں آباد رہے، کبھی یہ رشیا میں آباد رہے، کبھی یہ دنیا کے مختلف ملکوں میں بکھرے ہوئے تھے، لیکن اب یہ سمٹ سمٹ کر ایک مقام پر پہنچ رہے ہیں اور وہ مقام بالکل عین اس جگہ کے قریب ہے کہ جہاں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اُتریں گے تو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے اُترنے کے بعد ہی ان پر تباہی کا دور آئے گا۔

یہودیوں کو "بنی اسرائیل" کہنے کی وجہ:

حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب "اسرائیل" تھا، یہ "اسرا" اور "ایل" سے مرکب ہے۔ "اسرا" کا معنی "عبد" ہوتا ہے اور "ایل" کا معنی ہے "اللہ"۔ تو "اسرائیل" کا معنی "عبداللہ" ہے۔

اور بعض نے کہا کہ "اسرا" کا معنی ہے: "پسندیدہ، چنا ہوا" اور "ایل" کا معنی "اللہ" ہوتا ہے تو "اسرائیل" کا معنی "صفوۃ اللہ" ہوگا۔ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل ہے تو حضرت یعقوب علیہ السلام سے لے کر میرے حضور ﷺ تک اتنی بڑی مدت میں اللہ نے چار ہزار نبی بھیجے ہیں اور یہ سارے بنی اسرائیل میں آئے، اس لیے اللہ نے قرآن میں فرمایا: ﴿وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۴۷] لیکن بنو اسماعیل میں ایک نبی بھیجے جو ان تمام سے زیادہ افضل اور شان والے تھے۔

اس لیے اب خاص طور پر یہاں بنی اسرائیل کو خطاب ہے، اس کو "تذکیر بنعم اللہ" کہتے ہیں۔ پہلے "تذکیر بنعم عامة" تھا، ﴿الَّذِیْ خَلَقَكُمْ﴾، ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ وہ خطاب عام تھا، اور یہ "تذکیر بنعم خاصة علی بنی اسرائیل" ہے، اس لیے خطاب آیا: ﴿یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ﴾ [البقرة:۴۰]

اور اسی خطاب میں بھی ایک حکمت ہے کہ جہاں جہاں بھی ذکر آتا ہے وہاں "بنی اسرائیل" آیا ہے حالانکہ یہ تو حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے، اللہ نے "یا بنی یعقوب" نہیں فرمایا، یہ خطاب بھی دراصل اللہ کے لطف وکرم اور اس کی مہربانیوں کا ایک شاہکار ہے، کیونکہ جب کسی کو خطاب لقب سے کیا جائے تو یہ بڑے پیار کی علامت ہوتی ہے۔ جیسے محاورات میں کہا جاتا ہے: "یَا ابْنَ الْکَرِیْمِ! اِفْعَلْ کَذَا" (اے سخی کے بیٹے! تم بھی سخاوت کرو)۔
[تفسیر ابن کثیر:۱/ ۸۲، البقرة:الآیة:۸۲]

﴿یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ۝﴾
[البقرة:۴۰] خاص نعمت جو اللہ نے بنی اسرائیل پر فرمائی، ان میں سب سے بڑی نعمت یہ تھی۔

ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان میں چار ہزار نبی بھیجے اور ان پر اپنی کتابیں بھیجیں۔

اور تیسری نعمت یہ تھی کہ اللہ نے ان کو باقاعدہ بادشاہتیں بھی عطا کیں۔

اور پھر اللہ نے ان کو بیت المقدس میں رہنے کی سعادت بھی بخشی۔

اللہ نے فرمایا: میری تمام نعمتوں کو یاد کرو کہ میں نے تمہیں فرعون سے چھڑایا۔

اور تمہارے دشمن کو تمہارے سامنے غرق کر کے عذاب میں ڈالا۔

میں نے تم پر من وسلویٰ اُتارا۔

﴿وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ علماء نے لکھا ہے کہ اس عہد سے وہ مراد ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا﴾ [المائدة:۱۲] کہ ہم نے تمہارے پاس رسول بھیجے اور تمہارے اندر بارہ نقباء بنائے اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر تم نے نمازوں کو قائم کیا اور زکوٰۃ ادا کی اور میرے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان لے آئے تو پھر میں تمہارے گناہوں کو بدل ڈالوں گا اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کروں گا کہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ تم اس وعدے کو یاد کرو اور اپنے اس عہد پر

قائم رہو۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام انبیاء سے عہد لیا اور حکم دیا تھا کہ تم اپنی امت کو بتاؤ کہ ایک آخری نبی محمد رسول اللہ ﷺ پیدا ہوں گے، اور جب میرے اس نبی کا زمانہ آئے تو تم پر لازم ہوگا کہ ان پر ایمان لاؤ اور ان کی اعانت کرو۔ نیز ان کی کتب میں نبی کریم ﷺ کی تمام صفات ذکر کردی گئی تھیں۔تو اب اللہ نے فرمایا کہ یاد کرو کہ میں نے جب یہ ساری نعمتیں تم پر کیں اور تم سے وعدہ بھی لے لیا تو اب تم کیا کرر ہے ہو؟ تم نے اس وعدہ وعہد کو بھی توڑ ڈالا، ان نعمتوں کو بھی بھول گئے اور محمد رسول اللہ کے دشمن بن گئے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۸۳]

آیت مبارکہ میں ''اسرائیل'' سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں، جبکہ ابو داؤد طیالسی نے مسند میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، حضور ﷺ نے ان کو بطور سوال فرمایا:''هَلْ تَعْلَمُوْنَ أَنَّ إِسْرَائِيلَ يَعْقُوبُ؟'' (تم جانتے ہو کہ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل ہے)؟ اس پوری جماعت نے کہا:''أَللّٰهُمَّ نَعَمْ'' (ہاں! آپ صحیح فرمارہے ہیں)۔حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''أَللّٰهُمَّ اشْهَدْ'' (یا اللہ! تُو گواہ ہوجا) کہ اب یہ خود اقرار کررہے ہیں کہ ''اسرائیل'' سے مراد یعقوب علیہ السلام ہیں اور یعقوب اللہ کے نبی ہیں اور میں بھی اللہ کا نبی ہوں تو پھر آپ کی مخالفت کا کیا معنیٰ؟

ایک قول حضرت عمیر مولیٰ حضرت ابن عباس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا کہ اسرائیل کا ترجمہ ''عبداللہ'' ہے۔[تفسیر ابن کثیر:۱/ ۸۲، البقرۃ: الآیۃ: ۴۰]

تاریخِ انسانی کی قدیم زبانیں:

آج کل جیسے کسی کو اللہ کا بندہ کہا جائے تو اس زبان میں ''اسرائیل'' کہا جاتا تھا۔ یادرکھیں کہ پہلے جتنی زبانیں بھی گزری ہیں، تقریباً تمام انبیاء اور کتابیں سریانی زبان میں آئیں یا عبرانی زبان میں آئیں، یعنی سب سے پہلے سریانی زبان تھی، اس کے بعد عبرانی زبان آئی، عبرانی کے بعد پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کا زمانہ آیا تو پھر عربی زبان آئی۔علماء نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے لغت عربی میں کلام کرنے والے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، اور ان تمام لغات کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

ہوا یوں تھا کہ آدم علیہ السلام ایک لغت لے آئے اور وہ چلتی رہی، چلتی رہی، پھر اولاد بڑھتی گئی، بڑھتی گئی، مکان

بدلتے گئے، ملک بدلتے گئے، آبادیوں میں اضافہ ہوتا گیا تو اب الفاظ میں بھی کچھ تغیر آتا گیا، زبانیں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔

اب چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ جو آخری پیغمبر بھیجے گئے ہیں، ان کو عرب میں مبعوث فرمایا جائے اور ان کی لغت بھی عربی ہو۔ سب سے آخری نبی بھی عربی اور آخری کتاب قرآن بھی عربی اور اسی طرح جنت کی زبان بھی عربی ہے اور اسی طرح اللہ کا قرآن اللہ کا کلام بھی عربی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس زبان کو بڑا شرف بخشا۔

ایک تو اُمّ القریٰ یعنی کعبۃ اللہ کو تمام کائنات کی بستیوں کا مرکز اصلی بنایا اور کعبہ کو مرکز ہدایت بنایا اور اسی کعبہ میں "رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْن" کو پیدا فرمایا اور اسی کعبہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک اُتارا جو "هُدًى لِّلْعَالَمِيْن" ہے اور پھر قیامت تک کے لیے عربی زبان آگئی۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں اگر آدمی عربی لغت سیکھ لے تو اللہ کے دین کو سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ قرآن بھی عربی، آخری پیغمبر حضور پاک ﷺ بھی عربی اور اہل جنت کا کلام بھی عربی ہوگا تو اس لحاظ سے آدمی کو اس زبان سے ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک بات ہمیشہ یاد رکھا کریں کہ بعض لوگ جو اعداء اسلام ہیں یعنی اسلام کے دشمن ہیں چاہے وہ یہودی ہوں، وہ نصرانی ہوں، گمراہ فرقے ہوں، جو دنیا میں اس وقت دندناتے پھر رہے ہیں، وہ لوگوں کے دلوں میں ایک نفرت پیدا کرتے ہیں کہ عربوں کا حال آپ نے دیکھا ہے، ان کا کردار دیکھو، ان کا عمل دیکھو، ان کا لباس دیکھو اور یہ اپنی دولت کی کثرت کی وجہ سے دنیا کے ملکوں میں عیاشیاں کرتے ہیں اور اسلام کے خلاف کام کرتے ہیں تو پھر عربی سے محبت کا کیا معنی ہے؟

یہ دراصل اسلام دشمنی ہے۔ ہمیں عرب کے کسی فرد سے تو تعلق نہیں ہے، بعض عرب علاقے ایسے بھی ہیں جہاں مسلمان بھی نہیں ہیں، حالانکہ وہ عرب علاقے ہیں، لیکن ان میں غیر مسلم آباد ہیں۔ ہم تو لغت عربی سے پیار کرتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلام اللہ ہے، یہ کلام محمد رسول اللہ ﷺ ہے اور یہ کلام اہل جنت ہے اور ہم عرب سے اس لیے محبت کرتے ہیں کہ انہی سے اللہ نے ہمیں نبی بھی عربی عطا فرمایا۔ اصل محبت ہمیں حضور ﷺ سے ہے، اصل محبت ہمیں اپنے اللہ سے ہے، اصل محبت اللہ کے کلام سے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے مرکز ہدایت خانہ کعبہ سے ہے۔ اور اب اس مرکز کے اندر کچھ لوگ اچھے ہوں تو کچھ لوگ بُرے بھی ہوں گے، یہ تو نظام عالم ہے کبھی دن ہوگا تو کبھی رات ہوگی، کبھی روشنی ہوگی تو کبھی اندھیرا ہوگا۔ اگر ساری دنیا ہی صالح بن جائے اور کوئی بُرا نہ رہے تو

پھر صالحین کی کیا قیمت ہوگی؟ اگر ساری دنیا ہی سچ بولنے والی بن جائے تو ہر آدمی سچا ہوگا، پھر سچ کی قدر کیسے معلوم ہوگی؟

حق اور باطل کا مقابلہ تو ہر دور میں رہا ہے، صدق اور کذب کا مقابلہ تو ہر دور میں رہا ہے، ظلمت اور روشنی کا مقابلہ تو ہر دور میں رہا ہے، اور میرے مدنی سرکار ﷺ کی سب سے پہلے مخالفت کرنے والے قریش مکہ بھی عربی تھے اور سب سے پہلے ایمان لانے والے بھی عرب تھے، سب سے پہلے جان دینے والے بھی عرب تھے اور پھر پوری دنیا میں اسلام پھیلانے والے بھی عرب تھے۔ اگر حضور ﷺ کے صحابہ اتنی قربانی نہ دیتے تو کیا آپ اور میں کلمہ پڑھتے؟ پتہ نہیں ہم ہندو یا سکھ ہوتے یا پتہ نہیں کیا بلا ہوتے؟

آپ کے ملک کو بنے ہوئے پچاس سال ہونے والے ہیں یا ہو گئے ہیں، 1947ء میں آپ کا ملک آزاد ہوا، آپ دیکھ لیں کہ نصف صدی گزرنے کے بعد حال یہ ہے کہ ملک تو مسلمانوں کا ہے، لیکن تہذیب ابھی بھی ہندو کی ہے، شادی میں وہی کچھ ہوتا ہے، غمی میں وہی کچھ ہوتا ہے، موت و حیات میں وہی کچھ ہوتا ہے جس کو ہندوؤں نے رواج دیا ہوا ہے۔

نکاح میں جاہلانہ اور ظالمانہ رُسومات:

یہ منگنی اور مہندی، کیا سب اسلام کی رسمیں ہیں؟ ان کا اسلام سے کیا تعلق ہے؟ آپ کے ہاں انگوٹھی پہنانے کی رسم ہے، مہندی کی رسم ہے، منگنی کی رسم ہے، آج جناب دولہے کے ہاتھ میں لوہے کے کڑے پہنائے جا رہے ہیں، اسے گھوڑے پر چڑھایا جا رہا ہے، وہ بے چارہ ساری زندگی کھوتے پر نہیں چڑھا ہوگا اور آپ اس کو گھوڑے پر بٹھا رہے ہیں، ایسے لگتا ہے کہ بے چارہ ابھی گرا اور ابھی گرا، اور ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ اس کے لیے گھوڑے پر چڑھنا ایک عذاب بن جاتا ہے۔ اصل میں یہ ہندو تہذیب کا ایک پرتاؤ ہے جو ہمارے معاملات میں نظر آتا ہے۔

دوسری طرف دیکھیں تو جہیز کی لعنت ہے۔ جہیز کا اسلام سے کیا تعلق ہے کہ لڑکی والے لڑکی بھی دیں اور دولت بھی دیں؟ وہ غریب اشتہاروں میں لکھتے ہیں کہ ہماری لڑکی کی عمر یہ ہے اور اس کی تعلیم یہ ہے اور ہم لڑکے کو سیٹل کریں گے، بزنس کروائیں گے، تاکہ کوئی اچھا رشتہ مل جائے۔ یہ ہندوانہ رسم نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

آپ نے گویا ان سے لڑکی بھی لے لی اور عہدہ یا ملازمت کی رشوت بھی وصول کر لی۔ حالانکہ یہ بالکل حرام ہے اور سو فیصد حرام ہے، اس کے حرام ہونے میں ایک پیسے کا شبہ بھی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ رشوت بھی ہے اور جوا بھی

ہے کہ اگر آپ کا کسی بڑے آدمی کی لڑکی پر داؤ لگ گیا تو آپ کروڑوں کے مالک بن گئے۔ اس طرح یہ جُوا ہو گیا۔

اور اس کے بعد آپ نے شرط رکھ کر زبردستی وصول کیا کہ اتنے جوڑے دولہے کے لیے لیں گے اور دولہے کے باپ، ماں اور بہنوں کے لیے بھی اتنے جوڑے لیں گے اور بارات میں اتنے آدمی آئیں گے اور کھانے کا مینو یہ ہو گا تو یہ رشوت بھی ہو گئی۔ ایسا کھانا بھی حرام ہے اور اس طرح مشروط کر کے چیزیں لینا بھی حرام ہے۔ یہ ساری ہندوانہ رُسوم ہیں۔ اسی تہذیب کا اثر ہمارے اندر ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے۔

آج بھی کسی نوجوان عورت کا خاوند مر جائے تو اس کو ڈائن (بلا) کہتے ہیں کہ ہمارے بیٹے کو کھا گئی۔ کیا موت لڑکی کے ہاتھ میں تھی؟ کیا یہ مسلمان کا عقیدہ ہے؟ حالانکہ موت دینے والا اللہ ہے، پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ دوسروں سے کہتے ہیں: خبردار! اس لڑکی سے نکاح نہ کرنا، جو اس سے نکاح کرے گا یہ اس کو کھا جائے گی۔

لوگوں کے عجیب عجیب عقیدے ہوتے ہیں کہ اگر مہینے کے فلاں دن فلاں تاریخ کو کوئی مر گیا تو کہتے ہیں: خبردار رہو! یہ مردہ گھر کے سات بندے کھائے گا، یہ قبر سے آئے گا، ان کو بھی پکڑ کر لے جائے گا۔ ایمان سے بتلائیں، کیا یہ مسلمانوں کے عقیدے ہیں؟ ان کا اسلام سے کوئی تعلق ہے؟

کتنے بڑے لوگ ہیں جو ذمہ دار ہیں، سرمایہ دار ہیں، جاگیر دار ہیں اور ان کی لڑکیوں کی عمر گھر میں بیٹھے بیٹھے سو سال ہو گئی، لیکن ان کی شادی نہیں کی۔ اس ڈر سے کہ اگر ان شادی کر دی تو انہیں زمین دینی پڑے گی۔ اسی طرح جائیداد میں سے اپنی بہنوں کو ان کا حصہ نہیں دیتے، بس ان پر یہ احسان کیا ہوتا ہے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر کھا رہی ہیں۔ اور نہ ہی ان کی شادی کرتے ہیں، تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کا شوہر کوئی تگڑا مضبوط آدمی ہو اور وہ مطالبہ کرے کہ میری بیوی کی جائیداد دو۔ اور بعض بڑے بڑے زمیندار ایسے بھی ہیں کہ بہن کی شادی تو کر دی، اتفاق سے اس کا خاوند فوت ہو گیا تو اب وہ بیچاری ساری زندگی بیٹھی رہے گی۔ جیسے ہندوؤں کی رسم تھی کہ خاوند کے مرنے کے بعد عورت دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتی، مسلمانوں کی بھی وہی رسم ہے کہ وہ عورت دوسری شادی نہیں کر سکتی جس کا خاوند فوت ہو گیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ زندہ عورت کو جلا دیتے تھے، ستی کر دیتے تھے، وہ تو چلو ایک دفعہ جل کر مر جاتی تھی اور یہ تو ساری زندگی گھر میں جل رہی ہے اور مر رہی ہے اور اس کو شادی کرنے ہی نہیں دیتے۔

حالانکہ اسلام کا حکم یہ تھا کہ اگر خاوند فوت ہو جائے تو چار مہینے دس دن عورت انتظار کرے، اس کے بعد غسل کرے، اچھے کپڑے پہنے، تاکہ اور لوگ خطبہ کے لیے آئیں، وہ کسی اور کے گھر جا کر آباد ہو، اللہ اس کا اور کسی

دوسرے مرد کا گھر بھی آباد کرے، ان کی اولاد ہو اور دونوں گناہ سے بچ جائیں۔ یہ ساری رسمیں اسی کفر کی صحبت کی وجہ سے ہیں۔

سود کی مذمت:

آج جو مسلمانوں میں سود ہے، اس کو ہندوؤں نے رواج دیا تھا۔ پہلے ہندو سود دیتے تھے، مسلمانوں میں سود لینے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ آج سے پچاس سال پہلے آپ مجھے کوئی مسلمان گھرانہ بتا سکتے ہیں جو سود کا کام کرتا تھا۔ تمام سودی کاروبار کرنے والا ہندو تھا۔ جب ہندو دفع ہو گیا، اللہ نے اس کو دفع کر دیا تو مسلمانوں نے اس کا پورے کا پورا چارج سنبھال لیا۔ وہ بدبخت سود پیسے اور پائی میں لیتا تھا، آنہ اور روپے میں لیتا تھا اور یہ سینکڑوں اور ہزاروں میں لیتے ہیں۔ سود ہمارے اندر اتنا عام ہو گیا ہے کہ ہم اس سے نکل ہی نہیں سکتے۔ ایک دفعہ آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں...... اللہ معاف فرمائے، اللہ حرام سے بچائے...... ایک دفعہ جب سود میں پاؤں پڑ گیا تو جہنم میں پھنس گئے، اب آگ لگتی جائے گی اور سود آپ کی جائیداد کو کھاتا چلا جائے گا، اور وہ اوپر جو ساہوکار بیٹھے ہوئے ہیں، تمام دنیا کا پیسہ ان کو جا رہا ہے۔

واقعہ:

مجھے سفر میں ایک ماہر اقتصادیات ملے، وہ مجھے اعداد و شمار بتا رہے تھے کہ ایک بینک کے جو ٹریولر چیک ایشو ہوتے ہیں وہ گم ہو گئے اور گر گئے اور پھر ان کا مطالبہ کسی نے نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ یہ جو گم شدہ ہیں جن کا وارث کوئی نہیں بنا، اتنے ارب صرف ایک بینک کے پاس ہیں اور وہ اسی سے اپنا کام چلا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں: کوئی مانگے تو ہم اسے دیں، ہمیں کیا پتہ کس کے ہیں؟ ان کے پاس پیسہ تو موجود ہے، لیکن لینے والا کوئی نہیں ہے۔

آپ اندازہ کریں کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جو اپنا سرمایہ بینکوں میں امانت رکھوا دیتے ہیں، اولاد کو نہیں بتاتے، بیوی بچوں کو نہیں بتاتے، راستے میں ایکسیڈنٹ ہوا اور مر گئے۔ جب کسی کو بتا نہیں سکا تو بینک اس کا سرمایہ ہضم کر جائے گا۔ اور ساری زندگی وہ اس پیسے سے سود کا کام کرتے رہیں گے اور قبر میں وہ لعنت کا مستحق ہوتا رہے گا۔ وجہ کیا ہے کہ اسلام کے خلاف ایک عمل کیا۔ سود، ربوا حرام ہے، ہم نے ان اداروں میں کام کیا جو سودی کاروبار کرتے تھے۔

اور دوسرا ہم نے اسلام کے خلاف یہ کام کیا کہ اسلام کا حکم ہے کہ تیری دو راتیں نہ گزرے، مگر تیری وصیت

سرہانے کے نیچے لکھی ہوئی موجود ہو۔[1] چلو تم اولاد سے کچھ چھپانا بھی چاہتے ہو تو ایک وصیت نامہ بنوا کر ایک قابل، دیانت دار آدمی کے پاس رکھوا دو، تاکہ کم از کم تمہاری موت کے بعد یہ پتہ تو چل سکے کہ کسی کا قرضہ تم نے دینا ہے اور کس نے تم نے لینا ہے؟ ویسے سب کہتے ہیں کہ دعا کرو، اسلام آجائے۔

اسلام کیسے آئے گا؟

کئی لوگ مجھے ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت اخصوصی دعا فرمائیں اسلام آجائے۔ میں کہتا ہوں: کہاں سے آئے؟ اگر کہیں سے چل پڑا ہے تو اس کے لیے ٹکٹ کا انتظام کریں، کوئی جہاز یا بحری جہاز بھیجیں؟ تاکہ اسلام آجائے۔ اور یہ بھی ہمیں سمجھاؤ کہ پیدل آرہا ہو تو کوئی پانی لے کر جائیں، اسلام راستہ میں بھوکا پیاسا ہوگا، اور ہوائی جہاز سے آرہا ہے تو یہ بھی تو پتہ ہو کہ کون سے ٹرمینل پر جہاز لگے گا، تاکہ وہاں سے جا کر اسلام کو اُتاریں۔

او بدبختو! اسلام تو تمہارے اندر ہے، تم آج ایمان کا اظہار کر دو تو اسلام آجائے گا۔ کیا تم اسلام کو باہر سے امپورٹ کرو گے؟ اس کے لیے لائسنس لینا پڑے گا؟ اس کی باقاعدہ کوئی ایل سی کھولنی پڑے گی؟ بکنگ کروانی ہوگی؟ کوئی پہلے بینک ڈرافٹ بھیجنا پڑے گا؟ آج اگر ہم پکے مسلمان بن جائیں۔ مثلاً بیس گھروں پر مشتمل ایک بستی ہے، وہ سارے پکے مسلمان بن جائیں تو ہم کہہ سکیں گے کہ اس بستی میں اسلام موجود ہے۔ اگر شہر والے سب کھڑے ہو جائیں کہ ہم اللہ اور رسول کے خلاف کوئی بات نہیں سنتے۔ یہی تو اسلام ہے۔ اور کہاں سے اسلام آجائے؟ کیا مدینہ شریف سے پھر اس کو لے کر چلیں گے؟ پہلے جا کر اس پوری آبادی کو کلمہ پڑھائیں گے؟ کیا وہ مسلمان نہیں ہیں؟ اور اگر ہم نے کلمہ پڑھا ہوا ہے، ہم مسلمان ہیں اللہ اور رسول کے حکم کے پابند ہیں تو ہر آدمی اپنے گھر میں نظر ڈالے، جو چیزیں اسلام کے خلاف ہیں ان کو چھوڑ دے اور جو اسلام کے مطابق ہیں ان کو پکڑ لے۔ اسلام آگیا۔

اسلام پر اتفاق:

بعض لوگ کہتے ہیں: حضرت! ہمارے ملک میں لوگ اسلام چاہتے ہیں، لیکن مولوی اسلام نہیں چاہتے، مولوی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ مولوی نہ لڑیں تو اسلام ایک دن میں آجائے گا۔

میں نے کہا کہ مولوی جن باتوں پر نہیں لڑتے، ان باتوں پر تم مہربانی کر کے عمل کر لو۔ کسی مولوی نے تمہیں آج

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۲۷۳۸، باب الوصايا وَقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ، وَصِيَّةُ الرَّجُلِ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ]

تک کہا ہے کہ تم نماز نہ پڑھو، ایک مولوی کا نام بتاؤ۔ کیا وہ مولوی شافعی، حنبلی، حنفی، مالکی یا دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث یا تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتا ہے؟ آپ بتائیں، کیا انہوں نے کبھی باقاعدہ اشتہار چھاپا ہے کہ نمازیں نہ پڑھا کرو؟ یا کسی ایک مولوی نے تمہیں کہا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دیا ہے تو تم زکوٰۃ نہ دیا کرو۔ ایک مولوی نے کہا ہو کہ شراب پیا کرو، سور کا گوشت کھایا کرو، حرام استعمال کرو، حلال سے بچو۔ کسی ایک مولوی کا نام تو مجھے بتادو۔ جن باتوں میں مولوی اکٹھے ہیں ان باتوں کو تو پہلے مان لو، جن پر مولویوں کا جھگڑا ہے، ان کو نہ ماننا۔ بعد میں فیصلہ کرلیں گے۔

جب تمام مولوی نماز پر متفق ہیں، روزے پر متفق ہیں، زکوٰۃ پر متفق ہیں، اللہ کی توحید پر متفق ہیں، اللہ کے قرآن پر متفق ہیں اور حضور ﷺ کی ذات پر متفق ہیں تو کتنے لوگ ہیں جو نماز نہیں پڑھتے؟ کیا وہ بھی مولوی کے جھگڑے سے نہیں پڑھتے؟ وہ مسجد بناتے ہیں، جھگڑا ہوتا ہے، تم خود مسجد بناؤ جھگڑے والی مسجد میں نہ جاؤ۔ تم لوگوں کے لیے مثال پیدا کرو کہ دیکھو! ہماری مسجد میں جھگڑا نہیں ہوتا۔ تم اپنے گھر کے باہر چٹائی بچھا کر نماز پڑھنا شروع کردو، کوئی پوچھے کہ مسجد میں کیوں نہیں جاتے؟ تو تم کہو کہ مولوی لڑتے ہیں، اللہ نے تو ساری زمین کو ہمارے لیے مسجد بنایا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم جمعہ پڑھنے کے لیے کہاں جائیں؟ کہاں افطار کرنے کے لیے جائیں؟ مولویوں کا تو ایک وقت پر جمعہ نہیں ہوتا۔ شکر کرو کہ ایک وقت پر نہیں ہوتا تو تمہیں نصیب ہو جاتا ہے، اگر ایک وقت پر ہوتا تو تمہیں یہ بھی نصیب نہ ہوتا۔ یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ کہیں ایک بجے ہوا تو کہیں سوا ایک بجے ہوا۔ کہیں ڈیڑھ بجے ہوا تو کہیں پونے دو بجے ہوا۔ کہیں دو بجے اور کہیں اڑھائی بجے ہوا، سب لوگ کہیں نہ کہیں پہنچ گئے۔ اگر سب کا ایک ٹائم معین ہوتا تو ایک آدمی بھی نہ جاتا، جتنے پڑھتے ہیں ان میں سے دو حصے نہ جاتے۔

اگر شیطان کو کنکریاں مارنے کا ایک گھنٹہ مقرر ہوتا تو کتنے لوگ مر جاتے؟ لیکن اللہ کی شان ہے کہ اللہ نے سارا دن دے دیا۔ بعض ائمہ کے نزدیک تو تینوں دن کنکریاں مارنے کی اجازت ہے کہ جب چاہو، مارلو۔ بعض ائمہ کے نزدیک تو اتنی رعایت ہے کہ آخری دن جا کر پہلے دو دن کی قضا بھی کرلو۔ اتنی رعایت مل گئی تو ہم بچ گئے، وگرنہ تو ہماری جانیں تباہ و برباد ہو جاتیں۔

میرے بھائی! یہ بلاوجہ الزام ہوتا ہے کہ مولوی لڑ رہے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صراط

مستقیم نصیب فرمادے، اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارے دل ودماغ اور ظاہر وباطن میں قرآن واسلام کو نافذ کردے۔ اسلام تو ہمارے اندر موجود ہے، صرف یہ ہے کہ ہم نے اس پر عمل کرنا ہے۔

دیکھیں! جب مؤذن ''اللہ اکبر'' کہے گا۔ مکہ میں، مدینہ میں اذان ہوتی ہے اور آپ کے ملک میں اذان ہوتی ہے تو مؤذن ہمیں نماز کے لیے ہی بلا رہا ہوتا ہے۔ لڑانے کے لیے تو بلا رہا ہوتا۔

کائنات میں ایک ساعت ایسی نہیں گزرتی جس میں ''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' کی آواز نہ گونجے۔ ایک ملک میں اذانیں ختم ہوتی ہیں تو دوسرے ملک میں شروع ہو رہی ہوتی ہیں۔ کوئی لمحہ اللہ کی ندا سے خالی نہیں ہے۔ جدید پڑھے لکھے لوگوں نے باقاعدہ آج ریسرچ کی ہے کہ پوری کائنات کے اوقات میں جو فرق رکھا گیا ہے اس میں اللہ کی حکمت ہے کہ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں کہ جب پکارنے والا پکار نہ رہا ہو۔ لیکن ہم سب سننے کے باوجود باہر کھڑے ہیں، سگریٹ ہاتھ میں ہے، اس کے بعد ہم نے کپڑا بیچنا ہے اور پھر ہم نے بستر لگانا ہے۔ نماز پڑھتے نہیں اور پھر کہتے ہیں کہ مولوی لڑتے ہیں۔ تمہاری نماز سے مولوی کے لڑنے کا کیا تعلق ہے؟

او خدا کے بندو! تم جس کو اسلام سمجھتے ہو، اسی پر چل پڑو۔ مولویوں کو چھوڑو۔ تم آخر کس کو اسلام سمجھتے ہو؟ تم نے بھی تو آخر کلمہ پڑھا ہے ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' اب تم جس کو اسلام سمجھتے ہو اسی پر چل پڑو، جو اللہ کے فرائض ہیں کم از کم وہ پورے کرلو، واجبات پورے کرلو، اہم چیزوں پر عمل کرلو، پہلے آپ بنیادی مسئلے تو حل کرلیں۔ باقی جو غیر اہم چیزیں ہیں، نوافل ہیں، وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں صحیح معنوں میں مسلمان بنادے۔

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝﴾

[البقرۃ:۴۰]

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلی نعمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام لے کر خطاب کیا۔ اگر اللہ اپنے قرآن میں ان کا نام نہ لیتے تو ان کا نام بھی دنیا میں نہ ہوتا۔

اُمتِ محمدیہ ﷺ پر انعامات:

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے ہمیں جو نعمتیں ملی ہیں ہم ان کو گن ہی نہیں سکتے:

......اللہ نے ہمیں توحید کا عقیدہ دیا،

......اللہ نے کعبۃ اللہ جیسا مرکزِ ہدایت دیا،

......اللہ نے قرآن جیسی جامع مانع کامل کتاب عطا فرمائی،

......خاتم النبیین دیا، رحمۃ للعالمین دیا،

اور پھر اوپر سے پردہ بھی ڈال دیا، تاکہ قبولیت یا عدمِ قبولیت کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ پھر اللہ نے کتنی عنایت فرمائی:

......پوری زمین کو ہمارے لیے مسجد بنا دیا کہ جہاں مرضی آئے نماز پڑھ لو،

......پانی نہ ملے تو تیمم کرلو،

......چار عورتوں سے نکاح کرلو، جھگڑا ہو جائے طلاق بھی دے سکتے ہو،

......وراثت کا نظام بنا دیا،

تاکہ دولت ایک بندے کے گھر میں بند نہ رہے، یہ نظام ایک ہاتھ میں مرکوز نہ رہے، بلکہ آگے آگے چلتا رہے۔ پہلے ایک مالک تھا، پھر چار بیٹے مالک بنے، چار بیٹوں کے چار چار بیٹے ہوئے، ان میں میراث تقسیم ہوئی تو سولہ ہوگئے۔ سولہ کے آگے چار چار بیٹے ہوئے تو چونسٹھ مالک بن گئے۔ جب تک یہ دولت چلتی رہتی ہے تو اس میں فائدہ ہوتا ہے، جہاں رُک گئی جام ہوگئی، یا کسی جگہ اس کو بریک لگ گئی تو تباہی آگئی۔

ہمارا طرزِ عمل:

اللہ نے اتنی بڑی بڑی نعمتیں دیں، لیکن ہم نے کیا کیا؟

......توحید کے مقابلہ پر شرک کیا،

......اللہ کے سجدے کے مقابلہ پر ہم نے قبروں کو سجدہ کیا،

......اللہ کے نام پر قربانی کی بجائے ہم نے قبروں کے نام پر قربانیاں کیں،

......اللہ سے مانگنے کی بجائے ہم نے غیروں سے مانگا،

......حضور ﷺ کی ختم نبوت کے خلاف کسی نے نبوت کے دعوے کیے اور کچھ لوگوں نے دعویٰ کرنے والوں کا ساتھ دیا۔

اب بھی مسلمانوں کی دکانوں پر جا کر دیکھ لیں، قادیانیوں کی بنی ہوئی چیزیں بک رہی ہیں، کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ ہم کیا پی رہے ہیں؟ اور اس کا نفع کس کو جا رہا ہے؟ اور کون کون سی چیزیں ہیں جو ہم یہود سے لے رہے ہیں اور یہودیوں کو ان کا فائدہ پہنچا رہے ہیں؟ کیا کیا چیزیں ہیں جو نصرانیوں سے لے رہے ہیں اور اس کا فائدہ ہم نصاریٰ کو پہنچا رہے ہیں؟ کیا چیزیں ہیں جو ہندوؤں سے لے رہے ہیں اور ان کا فائدہ ہم اس ہندو کو، اس بُت پرست کو پہنچا رہے ہیں جو ہماری مسجدوں کو شہید کر رہا ہے؟ ہماری بیٹیوں کی عزت وعصمت کو لوٹ رہا ہے۔ ہمیں آج بھی اس کا آم بڑا میٹھا لگتا ہے، آج بھی ہمیں اس کی چیزیں بڑی پسند ہیں۔ اور نہیں تو ان کی فلم تو دیکھ ہی لیں گے۔ آخر ہم میں اور بنو اسرائیل میں کیا فرق ہے؟

عمل کی عزت:

ایک بات یاد رکھنا کہ اللہ کے ہاں عمل کی عزت ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری

اگر تمہارے عمل بہتر ہوں گے تو اللہ کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی، کسی اور قوم کے بہتر ہوں گے تو ان کے ساتھ ہوگی۔ باقی فیصلے آخرت میں ہوں گے۔ اللہ کے ہاں عمل کو دیکھا جاتا ہے۔ جب ہمارے عمل اچھے تھے، ہم نے قرآن کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور حضور ﷺ کی اتباع کر لی تھی تو بحر و بر، قیصر و کسریٰ اور دنیا کی سلطنتیں مسلمانوں کے پاؤں کے نیچے تھیں۔

جن اعمال کی بناء پر اللہ نے یہودیوں پر ذلت و رُسوائی مسلط کی تھی، جب وہ اعمال ہم نے اپنا لیے تو وہی رُسوائی ہمارے کھاتے میں آ گئی۔ ان کے ساتھ کسی کا کوئی ذاتی جھگڑا تو نہیں ہے، ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ:٦١] اس لیے کہ وہ انبیاء کی مخالفت کرتے تھے، انبیاء کو گالیاں دیتے تھے، انبیاء کو قتل کرتے تھے، اللہ کی کتابوں کو بدل ڈالتے تھے، وہ غلط مسئلے بتاتے تھے، دین کو بیچا کرتے تھے، غیب کی جھوٹی خبریں دیا کرتے تھے، ان میں غیر اللہ کو سجدہ عام ہو گیا تھا، ان میں ربوا عام ہو گیا تھا، زنا عام ہو گیا تھا۔ آج یہ چیزیں مسلمانوں کے اندر عام ہو گئیں تو ذلت ہمارے حصہ میں آ گئی۔ ذات کے ساتھ تو یہ فیصلہ نہیں ہے، بلکہ جن

جن لوگوں کے عمل اس طرح کے ہوں گے ان پر ذلت آئے گی، چاہے وہ کوئی بھی ہوں اور کہیں بھی ہوں۔

سگریٹ نوشی کی مذمت:

آج میں ایک جگہ اعداد و شمار دیکھ رہا تھا کہ مسلمان صرف ایک دن میں جو سگریٹ پر پیسہ خرچ کرتا ہے، اگر اپنے مسلمان ملکوں پر خرچ کرے تو کوئی مسلمان غریب نہ رہے۔ آپ یہودیوں اور کافروں کو چھوڑیں، مسلمان کہلانے والے ایک دن میں کتنے پیسوں کا سگریٹ پیتے ہیں، ان پیسوں کو اپنے ہاتھ سے آگ لگاتے ہیں، اگر وہ یہ پیسہ اپنے غریب مسلمان بھائیوں کو دے دیں تو کوئی آدمی بھوکا نہ رہے اور کوئی مسلمان ملک کسی سے قرض نہ مانگے۔
اور دوسرے نمبر پر چائے ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر سگریٹ اور چائے نہ ہو تو مخلوق مر جائے گی؟ جب تک یہ سگریٹ نہیں تھی اور یہ چائے نہیں آئی تھی تو کیا مخلوق مر گئی تھی یا ان کی صحتیں اچھی نہیں تھیں؟ ایسی بات نہیں ہے۔ جب یہ چیزیں نہیں ہوتی تھیں تو لوگوں کی عمر سو سال ہوا کرتی تھی، اب ہم ساٹھ پر آ گئے ہیں۔
مثلاً آپ کی تنخواہ ایک ہزار ریال ہے تو خود اندازہ کر لیں کہ چائے اور سگریٹ مہینہ میں کتنے کا پیتے ہیں؟ اور دشمن نے کیسا خوبصورت جال پھیلایا ہے، ہر ڈبی پر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ زہر ہے، یہ کینسر پیدا کرتا ہے، یہ بیماریاں پیدا کرتا ہے اور ہر ڈبی پر مہر بھی لگی ہوئی ہے۔ مسلمان ہے، عقل والا، دماغ والا ہے، پھر بھی پیسے دے کر لے بھی رہا ہے، اس سے بڑی جاہل قوم آپ نے دیکھی ہوگی جو دھوئیں میں پیسہ اُڑا دے؟ جو چائے لذت کے لیے پی رہی ہے؟ اس میں ہم بھی شریک ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کوئی یہ کہے گا کہ چائے تو حلال ہے۔ ٹھیک ہے حلال ہے، لیکن اگر نہ پی جائے تو کون سا قہر ٹوٹ پڑے گا؟ کتنی دوسری حلال اشیاء ہیں جو ہم کھا لیتے ہیں، پی لیتے ہیں۔ اگر ہم صرف یہ دو چیزیں بچا لیں تو کشمیر کا کوئی مسلمان ننگا نہ رہے، بوسنیا کا کوئی مسلمان بھوکا نہ مرے، کشمیر کے اندر کوئی میری بیٹی بغیر کپڑوں کے نہ رہے۔ وہ خیموں میں پڑے ہیں، ان کے پاس پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہیں، تن ڈھانپنے کے لیے لباس نہیں ہے، کھانے پینے کے لیے سامان نہیں ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں مسلمان اس حالت میں ہیں کہ اگر پانچ دن تک ان کو غذا نہ پہنچائی گئی تو وہ بھوک سے مر جائیں گے اور ہم ہیں کہ...... ماشاء اللہ!...... حرم شریف کے باہر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔
کہتے ہیں: اللہ تیرا بڑا شکر ہے کہ تُو نے ہمیں کعبہ میں رکھا ہے۔ کیا کعبہ میں رہنے کا ڈھنگ یہی ہے؟ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم اپنے ملک میں جا کر رہتے، وہاں دھواں اُڑاتے خدا کے کعبہ میں تو نہ اُڑاتے، وہاں گندگی پھیلاتے

محمد ﷺ کے شہر مدینہ میں تو نہ پھیلاتے، وہاں جھوٹ بولتے اللہ کے حرم میں تو جھوٹ نہ بولتے، اس سے تو کروڑ درجہ بہتر تھا کہ بھوکے رہتے، لیکن حرمین شریفین کی بے ادبی نہ کرتے اور اللہ کے حرم کے گستاخ نہ بنتے۔

ایک آدمی اللہ کے حرم میں رہنے کے بعد ایسی منکرات کرتا ہے، اس کے لیے بس دعا کریں، اللہ فضل فرمادے۔ وہ رحیم ہیں، رحم کا معاملہ فرمائیں۔ لیکن ہماری فصل پک چکی ہے اور کٹنے کے انتظار میں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ کریم ہے، ہمیں کچھ دن مہلت عطا فرمادے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ میری نعمتوں کو یاد کرو۔

تفسیر:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرآن مقدس میں موسیٰ علیہ السلام کا خطاب ہے کہ آپ نے بھی اپنی قوم سے فرمایا تھا:

﴿يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ [المائدۃ:۲۰] آیت سے مراد اس زمانہ کے جہان والے ہیں، وگرنہ اُمتِ محمدیہ ﷺ تو افضل ہے اور حضور ﷺ کی امت پر اس سے زیادہ بڑی نعمتیں ہیں۔

اُمتِ محمدیہ ﷺ کی فضیلت:

بعض علماء نے فرمایا کہ جزوی فضیلت، کلی فضیلت کو متاثر نہیں کرسکتی۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ انفرادی طور پر اللہ نے ان کو ایسی نعمت دی ہو، جو دوسری اُمت کو نہیں دی۔ لیکن جب مجموعی نعتوں پر نظر ڈالیں تو اُمتِ محمد مصطفیٰ ﷺ افضل امت ہے اور تمام امتوں سے زیادہ شرف والی اُمت ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایثار:

آپ نے دیکھا نہیں کہ جب حکم ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جو لوگ سمجھنے والے ہیں، انہوں نے کیا کیا!!؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ابوبکر تم کیا لے آئے ہو؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! گھر میں جو کچھ تھا سب لے آیا ہوں۔ جب اللہ کے نام پر مانگا گیا ہے، اللہ کے دین کے لیے مانگا گیا ہے تو میں کچھ گھر میں کیسے رکھ کر آتا؟ جو کچھ میرے گھر میں تھا، وہ میں لپیٹ کر حضور ﷺ کے دربار میں لے آیا ہوں۔ تھوڑا ہے یا زیادہ، میرے گھر میں یہی تھا۔ [سنن أبي داود، حدیث: ۱۶۷۸، باب: في الرُّخصةِ في ذٰلكَ]

حضور پاک ﷺ نے حکم دیا کہ اگر تم سے کوئی گناہ ہوجائے یا غلطی ہوجائے تو فوراً نیکی کا کام کرو، تاکہ نیکی اس

گناہ کو مٹانے والی بن جائے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ [ہود: ۱۱۴]

جب تم نیکی کرتے ہو تو وہ تمہاری برائیوں کو ختم کر دیتی ہے۔

حتیٰ کہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جب آدمی وضو کرتا ہے تو اس کے گناہ گر جاتے ہیں۔ جب کلی کرتا ہے تو منہ کے گناہ گر جاتے ہیں، ناک میں پانی ڈال کر صاف کرتا ہے تو ناک کے گناہ گر جاتے ہیں اور جب چہرہ دھوتا ہے تو آنکھوں اور چہرے کے گناہ گر جاتے ہیں اور جب ہاتھوں پر پانی ڈالتا ہے تو ہاتھوں کے گناہ گر جاتے ہیں اور جب مسح کرتا ہے تو دل و دماغ کے گناہ گر جاتے ہیں، جب پاؤں کو دھوتا ہے تو پاؤں کے گناہ گر جاتے ہیں اور گناہوں سے پاک صاف ہو کر مسجد میں آتا ہے۔ نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے پاک صاف کر کے بھیج دیتے ہیں۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۴، باب: خُرُوجِ الْخَطَايَا مَعَ...]

حدیث مبارک میں یہ بھی آتا ہے کہ ایک نماز دوسری نماز تک کے گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ ایک رمضان دوسرے رمضان تک کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

[شعب الایمان، حدیث: ۳۳۴۸، فَضَائِلُ شَهْرِ رَمَضَانَ]

اسی طرح فرمایا: ہجرت گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور حج گناہوں کو مٹا دیتا ہے، اور فرمایا: اس کے بعد جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے کبائر بھی معاف فرما دیتے ہیں۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۱۹۲، باب: كَوْنِ الْإِسْلَامِ يَهْدِمُ مَا قَبْلَهُ وَكَذَا الْهِجْرَةِ...]

اگر حقوق العباد ہیں تو وہ ادا کرنے سے معاف ہو جاتے ہیں، اگر ادا نہ کرو تو معاف نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ تو بندے کا حق ہے، اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے! میں نے اپنے حق تو تجھے معاف کر دیئے، جو تیرے اپنے بھائیوں کے حق ہیں تم ان کو ادا کرو۔ اگر ادا نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تیری نیکیاں چھین لیں گے، پھر نیکیاں ان کو دے دی جائیں گی۔

واقعہ:

میرا ایک دوست بڑا آدمی ہے۔ وہ مجھے بڑے فخر سے بتا رہا تھا کہ اللہ نے مجھے بڑا کام دیا ہے، بڑی آمدنی ہے اور میں ہر سال باقاعدہ اپنے تمام ملازمین کے نام لکھ کر قرعہ اندازی کرتا ہوں، جس کا نام نکل آتا ہے اس کو اپنے

پیسوں سے حج کراتا ہوں۔ میں نے کہا: بدبخت! تُو نے کبھی نماز پڑھی ہے؟ اس نے کہا: نہیں پڑھی، یہ کوتاہی تو ہوجاتی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی کافر لوگوں کو حج پر بھیجتا رہے تو اس کو کیا فائدہ ہوگا؟ خدا کے بندے! جو اللہ نے تم پر فرض کیا ہے، تم نے وہ نماز نہیں پڑھی، میرے ساتھ ہو اور میں تمہارے سامنے اُٹھ کر مسجد میں پڑھ کر آیا ہوں، تمہیں پھر بھی حیا نہیں آئی تو حج پر بھیجنے کا کیا فائدہ ہے؟

نکتہ:

علماء نے لکھا ہے کہ تورات اور انجیل میں باقاعدہ میرے مدنی سرکار ﷺ کی ایک ایک صفت لکھی ہوئی تھی۔ آپ کا حلیہ موجود تھا، آپ کی صورت موجود، آپ کی سیرت موجود، آپ کی جائے پیدائش موجود، اور پیدا ہونے کے وقت کی علامات موجود، حتیٰ کہ بعض لوگوں نے کتابوں کو سامنے رکھ کر اپنے تخیلات سے کچھ تصویریں بھی بنائی ہوئی تھیں...... اب بھی دنیا میں رواج ہے کہ اگر کسی مجرم کا تھوڑا بہت حلیہ مل جائے تو پھر آرٹسٹوں کو بلا کر گورنمنٹ کہہ دیتی ہے کہ اس کا قد کاٹھ ایسے تھا اور حلیہ کچھ یوں تھا، تم ایک فرضی تصویر بناؤ جس سے لوگوں کو اندازہ ہو کہ تقریباً ایسا ہوگا، تاکہ اس کو آسانی سے تلاش کیا جاسکے...... تورات اور انجیل میں حضور ﷺ کی پوری شکل اور تفصیل موجود تھی کہ اس پیغمبر کا نام احمد ہوگا اور یہ بھی موجود تھا کہ حضور ﷺ مکہ میں پیدا ہوں گے۔ یعنی کتنے کاہن اور ان کے منجمین اور کتنے ان کے علم جفر والے اور کتنے ان کے علم کتاب والے، تمام لوگ ایک ایک ذرّے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

غاروں کا باسی کاہن:

کتابوں میں لکھا ہے کہ مشرکین مکہ کے زمانہ میں ایک بہت بڑا کاہن تھا، جو غاروں میں پڑا رہتا تھا اور باہر نہیں آتا تھا...... جیسے آپ کے ملک میں جوگی اور نجومی وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی بڑی ریاضت کرتے ہیں، بڑے بڑے مجاہدے کرتے ہیں، سالوں تک بھوکے رہتے ہیں، سالوں تک کبھی گوشت نہیں چکھتے، سالہا سال تک نمک نہیں چکھتے، سالوں تک لباس نہیں پہنتے، صرف دو چادروں میں پڑے رہتے ہیں اور سالوں تک ایک حالت میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اور محنت کرنے سے آدمی بہرحال کسی نہ کسی طرف تو جاتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ سیدھی سڑک نہ ملی، ورنہ آخر آدمی کی محنت بے کار تو نہیں جاتی، کسی نہ کسی طرف اس کا فائدہ تو ہوتا ہے...... جس دن میرے آقا

حضور ﷺ کی پیدائش ہوئی ہے تو اسی دن صبح کے وقت لوگوں نے دیکھا کہ اس کاہن کے بال کھلے ہوئے ہیں، لوگوں سے پوچھ رہا ہے اور پاگلوں کی طرح مکہ کی گلیوں میں پھر رہا ہے۔

ایسے لوگوں کے بڑے معتقد ہوتے ہیں۔ آج کل بھی ایسے ہے کہ جو دو چادریں پہن کر کہیں بیٹھا رہے۔ چھ سات مہینے بھوکا تو مرنا پڑے گا، مگر اس کے بعد مزے ہیں۔ روٹی کھانے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ ورنہ کسی قبر کے قریب بیٹھ جاؤ تو سمجھ لو کہ تمہاری بِل لگ گئی۔ دو چار غلاف ڈال دو اور لوگوں کو خواب سنانے شروع کر دو کہ خواب میں حضرت صاحب ملے اور مجھے حکم دیا کہ یہاں پہنچو، ورنہ میں تو مکہ شریف میں رہتا تھا، مدینہ شریف میں رہتا تھا۔ میں مکہ شریف چھوڑ کر آیا ہوں......حرام کھانے کے لیے!!!

تمام ٹیکس سے چھٹکارا:

آپ خود دیکھیں کہ وہ حرام ہوگا، حلال تو ہوگا نہیں، آگے بھی جہنم ملے گی۔ لیکن دنیا میں مزے ہی مزے ہیں، کوئی انکم ٹیکس نہیں، کوئی ہیلتھ ٹیکس نہیں، نہ پیدائش ٹیکس لگے گا اور نہ ہی موت ٹیکس۔ ٹیکس لگانے والا آئے تو لوگ جوتے مار مار کر اس کا سر پلپلا کر دیں کہ یہ بے چارا تو فقیر آدمی ہے، کیا اس پر بھی ٹیکس لگے گا؟ توبہ توبہ اَستَغفِرُاللّٰہ! یار کتنا بڑا نالائق افسر ہے، اللہ والوں کا بھی خیال نہیں رکھتا۔ یہ تو اتنا مسکین ہے کہ باپ دادے کی قبر بیچ رہا ہے۔

پہنچی ہوئی سرکار!!

اگر کوئی کپڑے اُتار کر پھینک دے تو کہیں گے کہ یہ تو مجذوب ہے، یہ تو پہنچا ہوا بزرگ ہے، یہ تو مادرزاد ولی ہے، اندر باہر سے یہ اب بالکل پہنچ گیا۔ ہم تو دیکھتے رہے کہ جہاں پہلے تھا اب بھی وہیں ہے، پتہ نہیں کہاں پہنچ گیا؟ جب آدمی بالکل پاگل ہو جائے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس پہنچ گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ عقل والا نہیں پہنچتا، جب دماغ خراب ہو جائے تو پہنچ جاتا ہے۔

اصل مجذوب کون؟

خدا کے بندے! جو اصل مجذوب تھے، وہ اور تھے، وہ اللہ اور اس کے نبی کی سنت کے پابند تھے۔ ''جذب'' کا معنی ہے: دنیا سے اللہ کی طرف چلے جانا، لوگوں سے تعلق ہی نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ وہ شریعت کے خلاف کرتے تھے، وہ تو بالکل گویا اپنی جان اور اپنا سب کچھ فنا کر چکے تھے کہ ان کو کسی بات کا احساس بھی باقی نہیں رہا

تھا، یعنی انہوں نے اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو مٹا دیا تھا۔

اکابر کا مقامِ رضا:

حضرت سری سقطی رحمہ اللہ ایک دفعہ بیٹھے تھے، ایک شاگرد کہنے لگا: حضرت! جب سے میں آپ کو دیکھ رہا ہوں، آپ خوش خوش نظر آتے ہیں، کبھی بھی غمگین دکھائی نہیں دیتے، اس کی کیا وجہ ہے؟ آخر انسان پر کبھی غم بھی تو آتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ غم تو تب آئے جب کوئی کام ہماری مرضی کے خلاف ہو۔ جب سب کام ہماری مرضی کے مطابق ہو رہے ہیں تو غم کس بات کا؟ اس نے کہا: ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق کیسے ہو رہا ہے؟ کیا یہ ساری دنیا آپ کی مرضی کے مطابق چل رہی ہے؟ انہوں نے فرمایا: خدا کے بندے! دنیا میں ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے، ہم نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ لہٰذا اب دنیا میں جو کام بھی ہو رہا ہے، وہ ایسے ہے جیسے ہماری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔

اب جو اللہ کی رضا ہے وہ ہماری رضا ہے، ''رَضِينَا بِرِضَائِهِ'' جیسا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أَللّٰهُمَّ! لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا رَادَّ لِمَا قَضَيْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ)) [کتاب الدعاء للطبرانی، رقم: ٦٨٦]

اور جیسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھا تھا:

((رَضِينَا بِاللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا، وَبِالْقُرْآنِ إِمَامًا وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبِيًّا))

[شرح مشکل الآثار، حدیث: ۱۴۷۵، بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ...]

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگا کرو:

((أَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ إِيمَانًا يُبَاشِرُ قَلْبِي، وَ يَقِينًا صَادِقًا حَتّٰى أَعْلَمَ أَنْ لَا يُصِيبُنِي إِلَّا مَا كَتَبْتَ لِي، وَرِضًا بِمَا قَسَمْتَ لِي)) [المعجم الاوسط، حدیث: ۵۹۷۴]

''یا اللہ! مجھے ایسا پختہ ایمان دے دے، ایسا یقین کامل دے دے میں اس مقام تک پہنچ جاؤں، مجھے کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی جب تک تیرا حکم نہ ہو، میں تیری ہر قضا پر راضی ہو جاؤں۔''

مقامِ رضا تو اللہ والوں کا مقام ہے۔ کہاں وہ اور کہاں یہ لوگ جو شریعت سے بھی باہر ہوں، اور اسلام سے بھی باہر ہوں، قرآن و سنت سے بھی باہر ہوں، سر منڈا کر ہر آدمی قلندر بنا چاہے تو سر منڈانے سے قلندری نہیں مل جاتی، اس کے لیے تو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔

تتمہ واقعہ سابقہ:

وہ نجومی آیا اور پاگلوں کی طرح پوچھ رہا ہے کہ لوگو! مجھے بتاؤ کہ آج کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟ لوگوں نے کہا: تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم تو آج تک غار سے باہر نہیں نکلے اور آج دیوانوں کی طرح گلیوں میں پھر رہے ہو؟ اس نے کہا: یہ باتیں چھوڑو اور مجھے بتاؤ کہ آج کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟

پوچھتے پوچھتے وہ حضرت عبدالمطلب کے گھر میں آ گیا۔ ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہاں! میرے لڑکے کے گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے، میرا لڑکا فوت ہوا ہوا ہے، یہ بچہ یتیم ہے۔ نجومی نے کہا: مہربانی کرو اور وہ بچہ مجھے دکھاؤ۔ حضرت عبدالمطلب حضور ﷺ کو لے کر آئے۔ اس نے دیکھا تو بے ہوش ہو کر گر گیا۔ جب ہوش آیا تو کہنے لگا: ہاں! اس اُمت کا نبی پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس نے جو علامات پڑھی ہوئی تھیں، وہ حضور ﷺ کے اندر منطبق تھیں۔ [سیرت حلبیہ: ۱/ ۲۲۴، ۲۲۵]

حضور ﷺ کی آمد کی بشارات اور خصوصیات:

اکثر انبیاء علیہم السلام نے حضور ﷺ کی آمد کی بشارت دی۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی بشارت دی: ﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝۶﴾ [الصف: ۶] کہ میرے بعد ایک رسول پیدا ہوں گے جن کا نام احمد ہوگا۔

اسی طرح کتاب تورات کے اندر باقاعدہ موجود تھا، "مَوْلِدُہٗ بِمَكَّةَ" مکہ میں پیدا ہوں گے اور یثرب کی طرف ہجرت کریں گے...... مدینہ منورہ اس وقت "یثرب" کہلاتا تھا...... اور یہ بھی باقاعدہ موجود تھا کہ حضور پاک ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت کی علامت ہوگی۔ یہ بھی تورات میں موجود تھا کہ ہدیہ قبول کریں گے اور صدقہ قبول نہیں کریں گے، یعنی صدقہ کا مال نہیں کھائیں گے۔

اسی طرح یہ بھی موجود تھا کہ آپ اور آپ کی امت اللہ کا شکر کرنے والے ہوں گے، اور یہ بھی موجود تھا کہ آپ کی اُمت پنڈلیوں تک چادر باندھنے والی ہوگی اور وضو کرنے والی ہوگی، اور یہ بھی موجود تھا کہ آپ کی امت وقت کا بڑا خیال رکھنے والی ہوگی، تاکہ ان کی نمازیں ضائع نہ ہو جائیں۔

عہد پر چلنے کے سب پابند ہیں:

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِي﴾ [البقرۃ: ۴۰] اس عہد سے دین اسلام کا عہد مراد ہے کہ اللہ نے سب بندوں کو حکم دیا تھا کہ دین اسلام پر چلو گے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۰]

عہد کی تفسیر:

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ کا عہد یہ ہے کہ اگر تم اتباع کرو گے تو میں تمہیں جنت میں داخل کروں گا، اگر تم دین اسلام کو قائم رکھو گے تو میں تمہیں جنت نصیب کردوں گا، اور ان کو یہ بھی حکم فرمایا: صرف مجھ سے ڈرو اور کسی سے نہ ڈرو۔ اصل ڈرنا اور اصل خشیت اللہ کی ذات سے ہے، کیونکہ نفع و نقصان کا مالک وہ ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۰]

ایمان نہ لانے کے بہانے:

بنی اسرائیل کہتے تھے کہ اگر ہم حضور پاک ﷺ پر ایمان لے آئیں تو ہمارے معتقدین ہم سے بھاگ جائیں گے اور ہمارے نذرانے، ہمارے ہدیے، ہماری دولت یہ سب کچھ ختم ہو جائے گی اور اسی طرح بعض یہ کہتے تھے کہ اگر ہم اسلام لے آئے تو مسلمان تو پہلے سے کمزور ہیں یہ تو ہماری مدد کر نہیں سکتے، ہمیں اگر ہمارے قبائل نے یا دیگر قبائل نے نقصان پہنچایا تو کون ہماری حفاظت کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے غلط خیالات دل میں نہ رکھو، ڈرنا ہے تو صرف اللہ کی ذات سے ڈرو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جو چاہیں گے وہ کر دیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے بدر میں بے سروسامانی کے باوجود مسلمانوں کو فتح دی تھی۔

ہاں! اگر ایسا ہو گیا کہ انسان اندھیرے میں ڈر گیا یا کسی درندے سے ڈر گیا تو یہ طبعی تقاضے ہیں۔ چنانچہ بندہ اچھی بات سنتا ہے تو خوش ہو جاتا ہے، کوئی خبر غلط ہو تو غمگین ہو جاتا ہے، تکلیف آئے تو واویلا کرتا ہے، اسی طرح کوئی خطرناک جانور سامنے آ جائے تو ڈر جاتا ہے، یہ تو بشری تقاضا ہے۔ لیکن آیت کا مطلب یہ ہے کہ اعتقاد میں محبت بھی اللہ سے کرے اور خوف بھی اللہ کا رکھے، یعنی دل میں اللہ کا اتنا خوف ہو کہ پتہ نہیں مجھے چھوٹی سی غلطی پر مالک پکڑ لے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی رحمت سے امید بھی ہو کہ وہ کلمۂ توحید اور نیک اعمال کی وجہ سے بخش دے گا۔

﴿وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ کا مفہوم:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''مجھ سے ڈرو'' کا معنی یہ ہے کہ تم جو آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے ہو تو کہیں ایسا نہ ہو کہ جیسے تمہارے آباؤ اجداد پر انکار کی وجہ سے سختی آئی، ان پر مسخ کا عذاب آیا، ان کو بندر اور خنزیر بنا ڈالا گیا، تم پر بھی وہ عذاب آجائے، اس لیے تم مجھ سے ڈرو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۰]

آیت میں ترغیب وترہیب کا مضمون:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آیت میں غور کیا جائے تو یہ ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی ہے، یعنی پہلے ترغیب تھی کہ اے بنی اسرائیل! تم میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کیا۔ اور ﴿وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ [البقرۃ: ۴۰] میں ترہیب ہے، کیونکہ انسان کے طبائع مختلف ہوتے ہیں، بعض طبیعتیں ترہیب کو زیادہ قبول کرتی ہیں اور بعض طبیعتیں ترغیب کو زیادہ قبول کرتی ہیں، جیسے بعض بچے ڈانٹ ڈپٹ سے کام ٹھیک کرتے ہیں اور بعض پیار کی زبان سمجھتے ہیں۔

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس میں ترغیب بھی دی ہے اور ترہیب بھی دی ہے، وعد بھی ہے اور وعید بھی ہے۔ تمام انواع پر اللہ کا قرآن مشتمل ہے، تاکہ جو لوگ عبرت پکڑنے والے ہیں وہ عبرت پکڑیں اور جو لوگ نصیحت حاصل کرنے والے ہیں، وہ نصیحت حاصل کریں۔

قرآن مقدس سے پہلے تورات، زبور، انجیل، صحائف ابراہیم علیہ السلام، صحائف موسیٰ علیہ السلام جتنی کتابیں ہیں، اللہ کا قرآن ان سب کی تصدیق کرنے والا ہے تو تم ایسی کتاب پر ایمان لے آؤ۔

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس میں اہل کتاب کو خطاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں کے اندر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نام، آپ کی صفتیں، آپ کی شان موجود پاتے تھے تو اللہ نے فرمایا: تم ایمان لے آؤ ایسے نبی پاک پر جن کا تمہاری کتابوں کے اندر ذکر موجود ہے اور تم جانتے ہو کہ وہ سچا نبی ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کی تفسیر کی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۰]

﴿وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ﴾ [البقرۃ: ۴۱] اس سے مراد یہ ہے؟

کہ تم پہلا فریق اور پہلی جماعت کفر کرنے والی نہ بنو، حالانکہ تمہارے پاس علم موجود ہے جو دوسرے لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تم سب سے پہلے حضور پاک ﷺ کا کفر کرنے والے نہ بنو۔ اور ایک قول یہ ہے کہ تم اہل کتاب میں سے پہلے کافر نہ بنو۔ کیونکہ یہ سورت مدنی ہے اور یہود سے پہلے کفار مکہ کافر بن چکے تھے۔ یہود نے تورات میں نبی کریم ﷺ کی تمام صفات پڑھی ہوئی تھیں، اس لیے ان کو کہا گیا ہے کہ تم پہلے کافر نہ بنو۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱ / ۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۱]

اہل علم کے انکار اور اقرار کا تاثر:

اور دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی علم والا آدمی انکار کرے تو اس کے انکار کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی علم والا آدمی اقرار کرے تو اس کے اقرار کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اور مدینہ منورہ میں اہل علم تھے۔ اگر وہ سارے کے سارے ایمان لے آتے تو فوراً تمام قبائل عرب مسلمان ہو جاتے، کیونکہ قبائل عرب نے ان پر نظریں ڈالی ہوئی تھیں کہ یہ کیا کرتے ہیں؟ اور انہوں نے کفر کیا تو اسلام پھیلنے میں تو کافی رکاوٹ آئی۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے راستے کھول دیئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اہل کتاب اور اہل علم ہو، تمہارے پاس تورات و انجیل ہے، تم تو پہلے کافر نہ بنو۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَكُونُوٓا أَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهِۦ﴾ کے اندر ''بِہٖ'' کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے کیونکہ پہلے گزر چکا ہے: ﴿اٰمِنُوا بِمَآ اَنْزَلْتُ﴾۔ تو معنی ہوا کہ تم پہلے قرآن کا کفر کرنے والے نہ بنو۔ اور اسی قول کو انہوں نے ترجیح دی ہے۔

یہ دو قول ہو گئے: پہلا یہ کہ ضمیر کا مرجع حضرت محمد ﷺ ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ اور یہ دونوں قول صحیح متقارب متلازم ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں۔ کیونکہ جو آدمی قرآن سے کفر کرے گا تو اس نے حضور ﷺ کا کفر کیا، اور جو آدمی حضور ﷺ کا کفر کرے گا تو وہ قرآن کا بھی کافر و منکر بنا۔ لہٰذا دونوں قول صحیح ہیں، ان کے اندر کوئی تضاد نہیں ہے۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ تم قرآن کی آیات پر اس لیے ایمان نہیں لا رہے کہ ہمارا پیسہ، ہمارا عہدہ اور

ہمارے ہدیے، نذرانے چلے جائیں گے تو تم آیات اور ایمان دے رہے ہو اور پیسہ لے رہے ہو۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۱]

قرآن وحدیث کو بھی مسلمان نہ بیچیں:

گویا کہا کہ اگر تم نے قرآن وحدیث کے بدلے میں پیسے لیے تو تم نے قرآن وحدیث کو بیچ دیا اور پیسہ لے لیا۔ اگر کوئی چیز خریدی جاتی ہے تو پیسہ نہیں خریدا جاتا۔ مقصودِ اصلی متاع ہوتا ہے، مقصودِ اصلی پیسہ نہیں ہوتا۔ تو یہاں ﴿ثَمَنًا قَلِیْلًا﴾ اس لیے کہا گیا کہ اس متاع کا مقصد پیسہ ہوتا ہے کہ کل کو بیچوں گا تو پیسے زیادہ بن جائیں گے۔ تو درحقیقت مقصود تو وہی حصولِ مال ہی ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ چند ٹکوں کے لیے تم اللہ کے قرآن کا سودا بھی نہ کرو۔

بلا طمع ہدیہ ملے تو قبول کرلو:

حدیث مبارک میں موجود ہے کہ سیدنا امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک دفعہ تشریف لا رہے تھے اور آگے آقائے دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک ہدیہ پیش کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی بڑے خلوص سے عرض کیا: الحمدللہ! میرے پاس تو اب سب کچھ ہے، یہ کسی غریب کو دے دیں، تاکہ اس کی حاجت پوری ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر! یہ ہدیہ ہے، جب تم آرہے تھے تو کیا تمہارے دل میں خیال تھا کہ میں تمہیں ہدیہ دوں گا؟ انہوں نے عرض کیا: حضور! میرے دل میں تو یہ بات نہیں تھی۔ فرمایا: اگر کوئی چیز بغیر طمع کے تمہیں مل جائے تو اس کو لے لو اور استعمال کرو، یہ رزق ہے جو اللہ نے تمہارے پاس بھیجا ہے، اس سے کیسے انکار کرتے ہو؟

''ثَمَنًا قَلِیْلًا'' کی تفسیر:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ ''ثَمَنًا قَلِیْلًا'' سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ساری دنیا کو اگر اکٹھا کیا جائے تو اللہ کے دین کے مقابلہ میں متاعِ قلیل ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ''آیات'' سے مراد وہ کتاب ہے جو اللہ نے ان کی طرف اُتاری۔ اور دنیا اور دنیا کی لذات اور شہوات سب ''ثَمَن قَلِیْل'' میں داخل ہیں۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ثَمَنًا قَلِیْلًا'' کا معنی ہے کہ تم معمولی لالچ کی بناء پر اللہ کی توحید کو نہ چھپاؤ کہ پیسے ملیں گے۔ حالانکہ عزت دینے والا بھی خدا ہے اور ذلت دینے والا بھی خدا ہے۔ اگر وہ عزت نہ دے تو ساری

دنیا عزت نہیں دے سکتی، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ ذلت نہ دے تو ساری دنیا ذلت نہیں دے سکتی۔

حضرت ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تم اللہ کے دین پر اُجرت نہ لیا کرو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۱]

تعلیم قرآن وغیرہ پر اُجرت لینا:

تعلیم قرآن اور امامت واذان کی اُجرت لینا اس آیت کے تحت داخل نہیں ہے، کیونکہ اگر ان کاموں پر اُجرت نہ لی جائے تو اس میں دین کا ضیاع ہے۔ پہلے ائمہ ان پر اُجرت لینے کو ناجائز قرار دیتے تھے، لیکن متاخرین علماء نے ان کاموں پر اُجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ البتہ قراءتِ قرآن پر اُجرت لینا بالاتفاق ناجائز ہے، کیونکہ اس پر اُجرت نہ لینے میں دین کا ضیاع نہیں ہے۔

اسی لیے میرے پاک سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدم کے بیٹے کا منہ بھر ہی نہیں سکتا، قبر کی مٹی ہی بھرے گی۔

[صحيح البخاري، حديث: ٦٤٣٦، باب: ما يُتَّقى من فتنة المال]

واقعہ:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وصایا ہیں جو انہوں نے اپنے شاگرد امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کو وصیتیں کی تھیں: اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اگر تم کبھی نائی کی دکان پر حجامت بنوانے کے لیے جاؤ، ریٹ اگر پانچ روپے ہو تو تم دس دیا کرو، یعنی اگر سارے پانچ روپے دیتے ہوں اور تم مولوی حجامت کرانے کے لیے جاؤ تو دس روپے دو۔ اگر تم دو روپے بھی کم دو گے تو سارا دن وہ تمہارے تمام مولویوں کا جلوس نکالتا رہے گا، اور ہر کسی کو کہتا رہے گا کہ وہ مولوی آکر تین روپے دے کر چلا گیا ہے، یہ تو ساری دنیا کو لوٹ کر کھاتے ہیں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: لوگوں کے اندر باتیں پھیلانے کے اڈے ہوتے ہیں۔ تم اپنے علم کی عزت کو قائم رکھو۔ کسی سے کوئی چیز خریدو تو اس کا حق مت کھاؤ، تاکہ وہ دنیا میں تمہارے خلاف باتیں نہ کر سکے۔ یہ پھر ایک عالم کی توہین نہیں ہوتی، بلکہ سب کی توہین ہوتی ہے۔ حالانکہ گناہ تو میرا ہوا تو اس میں سارے مولویوں کا کیا قصور؟

یہودیوں کی کتاب کے اندر یہ بات لکھی ہوئی ملی کہ اے آدم کے بیٹے! تم لوگوں کو علم مفت پہنچاؤ، تمہیں بھی تو میں نے مفت سکھایا ہے۔ اللہ نے جو علم دیا، کیا کوئی پیسے لیے ہیں؟ جب اللہ نے ہمیں مفت میں علم دیا ہے۔ کھانے کا، پینے کا، بولنے کا، چلنے کا کیا وہ پیسے لیتے ہیں؟ تم حق بات کھولنے میں، علم کے نشر کرنے میں اس وجہ سے تبدیلی نہ

کرو کہ کہیں ہمارا عہدہ نہ چلا جائے، یہ گدی نہ چلی جائے، ہماری سجادہ نشینی کو دھوکہ نہ لگ جائے۔ اور تم اس کے بدلے کیا یہ دنیا کی عارضی نعمتیں لے رہے ہو، جو قلیل بھی ہیں اور مٹنے والی بھی ہیں۔

جنت کی خوشبو سے محرومی:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللهِ لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" [ابوداؤد، حدیث: ۳۶۶۴، باب: فِي طَلَبِ الْعِلْمِ لِغَيْرِ اللهِ...]

"اگر کوئی آدمی ایسا علم حاصل کر رہا ہے جو اللہ کی رضا والا ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ میں اس علم سے دنیا کے اندر کوئی بدلہ حاصل کروں گا تو اس کو قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نصیب نہیں ہوگی۔"

دَم کا معاوضہ لینا:

جمہور علماء نے بخاری شریف کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ایک آدمی کو بچھو نے کاٹ لیا تھا تو صحابی نے اس پر سورۃ فاتحہ پڑھی تھی اور اس پر اُجرت لی تھی۔[1] اور اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے ایک آدمی کی شادی کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں تو کیا قرآن ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو اتنی سورتیں پڑھا دو۔[2] لہٰذا اُجرت لینا ثابت ہوگیا۔

ایک حدیث پاک میں ہے کہ اصحابِ صفہ میں سے ایک شخص نے کسی کو قرآن پڑھایا تو اس نے آکر اس کو کمان بطور ہدیہ پیش کی کہ یہ تیر کمان لے لو۔ انہوں نے کہا کہ میں حضور ﷺ سے پوچھوں گا۔ پھر حضور ﷺ کی خدمت میں آکر پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر چاہتے ہو کہ جہنم کی کمان تیرے گلے میں ڈالی جائے تو لے لو۔ اس نے کہا کہ میں نہیں لیتا۔

[سنن أبي داود، حديث: ۳۴۱۶، أبواب الإجارة في كسب المعلم]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جب وہ اللہ کے لیے پڑھا چکا تھا تو بات ختم ہوگئی۔ اس کے بعد لینے کا کیا معنی ہے؟ کسی کا بیت المال سے وظیفہ مقرر نہیں ہے تو اگر اس کی با قاعدہ تنخواہ مقرر

[1] [صحيح البخاري، حديث: ۲۲۷۶، باب: ما يعطى في الرقية على أحياء العرب بفاتحة الكتاب]

[2] [صحيح البخاري، حديث: ۵۰۸۷، باب: تزويج المعسر]

کردی جائے تو یہ جائز ہے۔

تقویٰ کا معنی:

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تقویٰ کا معنی یہ ہے کہ تم اللہ کی اطاعت کرو اللہ کی طرف سے نور و ہدایت پر خالص اسی کے لیے۔ اور اسی طرح اللہ کے عذاب سے بچنے کے لیے گناہوں سے بچو اور خالص اس سے ڈرو، یعنی تم حق بات اور حضور ﷺ کی جو صفات تورات میں لکھی ہوئی ہیں، ان کو نہ چھپاؤ۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۴، البقرۃ: الآیۃ: ۴۱]

مولانا تاج محمود امروٹی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

حضرت تاج محمود امروٹی رحمہ اللہ بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں، بڑے موحد اور بڑے مجاہد تھے، سندھ کے علاقہ امروٹ کے تھے۔

ایک دفعہ بڑے بڑے علماء کا مجمع تھا، والد صاحب نور اللہ مرقدہ بھی وہیں تھے تو انہوں نے کہا کہ میں اپنے سب ساتھیوں کو ہدایت کرتا ہوں کہ تبلیغ کرو، تقریر کرو تو کوئی پیسہ نہیں لینا۔ اگر وہ ہدیہ بھی دیں تب بھی نہیں لینا۔ سب نے کہا کہ ٹھیک ہے...... حضرت اتنے بڑے عالم اور مجاہد جب بات کر رہے ہوں تو ان کے سامنے کون بات کرے؟...... والد صاحب بلوچ تھے، وہ کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کہا: حضرت! بات سنیں! یا تو جو بزرگی آپ کے پاس ہے وہ ہمیں دے دیں، پھر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ہدیہ بھی نہیں لیں گے۔ اگر آپ یہ نہیں دے سکتے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی اللہ کے دین پر پیسے نہیں مانگوں گا۔ ہاں! کسی نے مانگے بغیر اور بغیر نیت کے ہدیہ دیا تو وہ میں لے لوں گا۔ حضرت ہنس پڑے اور فرمایا: تم سارے مولوی چپ کر کے بیٹھے رہے، سچی بات نہیں کی، لیکن اس نے سچی بات کر دی۔ بلوچ آدمی ہے، بات کھلی تو کر دی ہے۔ اور فرمانے لگے: ہاں! اگر بغیر سوچے اور بغیر ارادے کے ملیں تو لے سکتے ہیں، جائز ہے۔ لیکن کسی سے ارادتاً نہ لو، کسی جگہ دین پہنچانے جاؤ کہ مجھے کچھ ملے گا، ایسی نیت نہ کریں۔

اللہ پاک سے دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں بچائے، اللہ ہمارے ساتھیوں کو بچائے اور دین کا کام کرنے کی توفیق دے۔

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝٤٢ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ ۝٤٣﴾ [البقرة: ۴۲، ۴۳]

اور صحیح میں غلط مت ملاؤ اور سچ کو جان بوجھ کر مت چھپاؤ۔ اور نماز قائم رکھو اور زکوۃ دیا کرو اور نماز میں جھکنے والوں کے ساتھ جھکو۔

ربط آیات:

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو نعمتیں یاد دلائی گئی تھیں اور اوامر و نواہی ذکر کیے گئے تھے، ان آیات میں منہیات کا ایک پہلو ذکر کیا گیا ہے۔

یہودی حق کے ساتھ باطل کو ملا دیتے تھے:

ان آیات میں دو چیزوں کے بارے میں تنبیہ کی گئی ہے: ایک یہ کہ تم حق اور باطل کو خلط ملط نہ کرو اور دوسرا یہ کہ حق کو مت چھپاؤ۔

یہودیوں سے جب کچھ لوگ سوال کرتے کہ تم اہل علم اور اہل کتاب ہو اور تورات اور انجیل اللہ کی کتابیں ہیں، کیا ان کتب میں محمد ﷺ کی صفات کا ذکر ہے؟ تو وہ کہتے کہ نہیں۔ گویا کہ انہوں نے حق کو چھپا دیا۔ اور کبھی وہ یہ کرتے تھے کہ اس آدمی کو ہم بالکل انکار تو نہیں کر سکتے کہ اس نے بھی تورات کا کچھ مطالعہ کیا ہوا ہے، یا اس کا تورات والوں سے تعلق ہے۔ چنانچہ وہ کچھ ایسی صفتیں بیان کر دیتے کہ جس سے وہ آدمی شبہات میں پڑ جائے یا ایک صفت بتا دی اور چار اپنی طرف سے ملا دیں تو اس طرح سننے والے کو بات صحیح طریقہ سے سمجھ نہ آتی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں حق اور باطل کو ملا دینا بھی جرم ہے اور حق کا چھپا دینا بھی جرم ہے۔ اس لیے دونوں سے منع فرما دیا۔

باطل فرقوں کا وطیرہ:

تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح نظر آئے گی کہ جب بھی باطل فرقے نے دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے تو انہوں نے حق کو باطل میں ملا دیا ہے یا باطل کے اوپر حق کا ایک ملمع چڑھا دیا ہے۔ چنانچہ دیکھنے والے کو بظاہر اوپر سے حق نظر آتا ہے، لیکن اندر اس کے ایک باطل چھپا ہوا ہوتا ہے اور اس کا مقصد لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے گمراہ کرنا

ہوتا ہے۔ جس طرح اگر کوئی ملاوٹ والی چیز یہ کہہ کر فروخت کرے کہ اس میں ملاوٹ کی گئی ہے تو ادنی عقل والا شخص بھی کبھی اس سے وہ چیز نہ خریدے گا۔ اس لیے ملاوٹ کرنے والے سو فیصد خالص کا لیبل لگاتے ہیں اور بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، اس لیے لوگ ان کے دھوکہ میں آجاتے ہیں، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے۔

دیکھو! اگر کوئی آدمی بازار میں بیٹھا دودھ بیچ رہا ہو اور کوئی شخص اس کے پاس جا کر کہے کہ مجھے ایک کلو دودھ چاہیے۔ جواب میں وہ کہہ دے کہ ایک کلو دودھ کی قیمت دس روپے ہے، لیکن میں ایک کلو دودھ اس شرط پر دوں گا کہ اس میں تین حصے دودھ اور ایک پاؤ پانی ہوگا اور اس کو ایک کلو دودھ شمار کروں گا۔ کوئی پاگل سے پاگل بھی خریدنے کے لیے تیار نہیں ہوگا، کیونکہ وہ یہ کہے گا کہ تم عجیب آدمی ہو! میں تم سے دودھ خریدنے کے لیے آیا ہوں، پانی خریدنے کے لیے تو نہیں آیا۔ تم نے دس روپے کلو دودھ کی قیمت بتائی ہے، میں دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن یہ کون سی عقل مندی ہے کہ تجھ سے ایک پاؤ پانی انہی پیسوں میں خریدلوں، جبکہ اللہ نے پانی کی نعمت عام فرمائی ہے اور بغیر قیمت کے میسر ہے۔ دوسری طرف اسی بازار میں ایک اور دکاندار آدھا دودھ اور آدھا پانی ملا کر بیچ رہا ہو تو بڑی سے بڑی عقل والا بھی خرید لے گا، پڑھا لکھا بھی خرید لے گا، اس کو عالم بھی خرید لے گا، اس کو وکیل بھی خرید لے گا اور ڈاکٹر بھی خرید لے گا، کیونکہ اس نے پانی کو دودھ میں ملا دیا ہے۔ اب وہاں کھڑے ہو کر کون فیصلہ کرتا رہے کہ کتنا پانی ہے اور کتنا دودھ ہے؟ کتنی مشینیں لے کر گاہک پھرتا رہے؟ وہ کہے گا: جو کچھ ملتا ہے لے لو۔ حالانکہ اس نے بھی دس روپے کلو دیا ہے۔ لیکن اگر وہ پانی علیحدہ بیچنا چاہے تو کوئی لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

اسی طرح باطل فرقوں کا بھی ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ جب بھی وہ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر انہیں گمراہ کرتے ہیں تو وہ کبھی ایسا نہیں کہتے کہ حق یہ ہے اور باطل یہ ہے اور ہم باطل کے پرستار ہیں۔ وہ تو حق کو باطل کے ساتھ ملا کر دھوکہ دیتے ہیں۔

ربیع الاول کا مہینہ ہے۔ ایمان سے بتائیں کہ پوری دنیا میں کون سا آدمی ایسا ہو سکتا ہے جو حضور ﷺ کا کلمہ پڑھتا ہو، حضور ﷺ کو اپنا نبی اور رہبر و رہنما مانتا ہو، خاتم الانبیاء مانتا ہو، امام الانبیاء والمرسلین مانتا ہو، سید الاولین والآخرین مانتا ہو، شفیع المذنبین مانتا ہو اور حضور پاک ﷺ کی نبوت کو قیامت تک کے لیے مانتا ہو، آپ ﷺ کی ہدایت کو تمام عالم کے لیے مانتا ہو تو وہ حضور ﷺ کی شان یا حضور ﷺ کی ولادت یا حضور ﷺ کے معجزات یا حضور ﷺ کی عظمت شان کا منکر ہو؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے، کوئی ایسا بدبخت انسان پیدا نہیں ہوسکتا کہ جسے حضور ﷺ کی ولادت پر خوشی نہ ہو، حضور ﷺ کی وفات پر غم نہ ہو، لیکن اب ایک طرف عظمتِ رسول کا پہلو ہے، ایک طرف حضور ﷺ کی شان اور عظمت ہے۔ اس کے اندر ہم نے کیا ملا دیا ہے کہ اپنی مجالس، اپنی محفلیں، بینر، جلوس، بدعات ومحدثات اور منکرات کا ایک طوفان برپا کر دیا جاتا ہے۔

دعوتِ فکر:

آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں! آپ اللہ کے کعبہ میں ہیں، آپ بالکل اپنے آپ کو کسی جماعت سے معلق نہ کریں، خالی الذہن ہو کر سوچیں! آج جو امت حضور ﷺ کی عظمت کے نام پر جھنڈیوں میں، بجلیوں میں، قمقموں میں اور سبیلیں لگانے میں جو کروڑ ہا روپے خرچ ہوتے ہیں، اگر میرے مدنی سرکار ﷺ زندہ ہوتے تو اس فضول خرچی کو گوارا فرما لیتے؟ جبکہ اُمتِ رسول کا یہ عالم ہے کہ پچاس ہزار مسلمانوں کی آبادی کا علاقہ ہے بوسنیا میں، صومالیہ میں، برما میں، فلسطین میں، شام میں جو تین مہینے سے بھوکا اور پیاسا ہے، وہ بھوک سے مر رہے ہیں، لیکن محض ہم اپنی دکان کو چمکانے کے لیے، اپنی پارٹی کا نام اونچا کرنے کے لیے، اپنی جماعت کے جھنڈے بلند کرنے کے لیے، حُبِّ رسول کا نام لے کر قوم کو بدعات اور احداثات میں ڈال رہے ہیں۔ اس کا فیصلہ تو قیامت میں ہوگا، جب اللہ کا دربار ہوگا، حضور ﷺ موجود ہوں گے اور تمام اُمتیں سامنے کھڑی ہوں گی، پھر پتہ چلے گا کہ بدعت کا عمل کرنے والوں کی کیا سزا ہے؟ اور اتباعِ سنت کرنے والوں کا کیا مقام ہے؟

اب نتیجہ یہ نکلا کہ نام ولادتِ رسول اللہ ہے اور کام وہ کر رہے ہیں جو حضور ﷺ کی زندگی میں ثابت نہیں ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ روزہ رکھو، تو پھر روزہ رکھو، کسی نے منع نہیں کیا۔ جس کام کا حضور ﷺ نے حکم دیا ہے، اس کو کرو۔

اسی طرح دیکھو کہ سب سے زیادہ محبت کرنے والے اصحابِ رسول اللہ ہیں، ان سب سے زیادہ محبت کرنے والے اہلِ بیتِ رسول اللہ ہیں۔ اگر یہ باتیں دین کا جز ہوتیں یا بربناء محبت حضور ﷺ کو پسند ہوتیں تو سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مناتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، اہل بیت نبی، بناتِ رسول اللہ ﷺ اور ازواجِ رسول اللہ ﷺ جلوس نکالتے، میلاد کی محفلیں سجاتے۔ آج اگر روکا جائے تو براہِ راست طعنہ دیں گے کہ یہ رسول اللہ کے منکر ہیں، ان کے دلوں میں تو حضور ﷺ کا بغض ہے۔ اندازہ کریں کہ بات کتنی

تھی اور کہاں تک پہنچ گئی؟

اسی طرح آپ دیکھیں کہ جب یہ نعرہ لگایا جاتا ہے کہ ہم انبیاء کے غلام ہیں، کیا اس میں کوئی شک ہے؟ جو انبیاء کا غلام نہ ہو کیا وہ مسلمان ہو سکتا ہے؟ جو انبیاء کے نقشِ قدم پر نہ چلے کیا وہ مسلمان ہو سکتا ہے؟

لیکن انبیاء کے ایک خوش نما اور رنگین نعرے میں نتیجہ کیا نکلتا ہے کہ رب کی توحید کی بجائے شرک کو چھپا دیا جاتا ہے، یعنی شرک کو توحید کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ تم کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتے ہو تو موحد ہو، تم اگر جا کر قبر پر سجدہ کرتے ہو تو یہ تعظیم کا سجدہ ہے، جبکہ نماز کا سجدہ عبادت کا سجدہ ہے۔ اور بزرگوں سے مانگنے کا فلسفہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دراصل ان بزرگوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے، یہ بزرگ اپنے اللہ سے کہتے ہیں۔ اگر یہی بات ہندو کرے کہ جس بھگوان کو میں پوجتا ہوں اس کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے، جن پتھروں کو میں پوجتا ہوں انہیں بھی اللہ نے پیدا کیا ہے، جس گنگا اور جمنا کو میں پوجتا ہوں اس کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے اور جتنی میں نے مورتیاں بنائی ہوئی ہیں ان سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟ کیا اللہ کے نبی یہی دعوت دینے کے لیے آئے تھے؟ کیا حضور پاک ﷺ اسی دعوت کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے کہ نماز بھی پڑھ لیا کرو اور اپنے خداؤں کو سجدہ بھی کر لیا کرو؟ نماز بھی پڑھ لیا کرو اور غیر اللہ کو بھی پکار لیا کرو۔ اس لیے تو اللہ کے پیغمبر نہیں آئے۔ حُبِّ نبی میں ہم نے توحید کی مخالفت کی اور شرک کیا، اسی طرح محبتِ ولادتِ رسول میں ہم نے بدعات کو ایجاد کیا۔

اسی طرح حُبِّ علی کے نتیجے میں صحابہ سے بغض کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کا دعویٰ ہے اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سے بغض، عداوت اور دشمنی ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں نے حُبِّ اصحابِ رسول اللہ کو سامنے رکھا اور اہلِ بیت سے عداوت کر لی۔ اس طریقہ سے حق اور باطل کو گڈمڈ کر دیا گیا۔

بناوٹی اور حقیقی مساوات:

آپ ہر مقام پر دیکھ لیں! تاجر اپنی تجارت میں جھوٹ بول رہا ہے، دکاندار اپنی دکانداری کے سودوں میں ملاوٹ کر رہا ہے، مولوی اپنے مسلکوں میں ملاوٹ کر رہا ہے، لیڈر اپنی لیڈری میں ملاوٹ کر رہا ہے، کبھی وہ کہتا ہے کہ جناب! ہمارا اصل مقصد تو مساواتِ محمدی ہے، ہم تو مساواتِ محمدی کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مساواتِ محمدی کا معنی ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو اللہ نے ایک نعمت دی ہے تو اس نعمت والے اور بغیر نعمت والے کو برابر کر دیں۔ کیا مساوات

محمدی کا یہی معنی ہے کہ عورت اور مرد کو ایک کر دیا جائے؟ جاہل اور عالم کو ایک کر دیا جائے؟ باپ اور بیٹے کو ایک کر دیا جائے؟ کیا نبی اور غیر نبی برابر ہو سکتا ہے؟ کیا صحابی اور غیر صحابی برابر ہو سکتا ہے؟ کیا تابعی اور غیر تابعی برابر ہو سکتا ہے؟ کیا ایک عالم اور جاہل برابر ہو سکتا ہے؟ جبکہ اللہ نے فرمادیا: ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [الزمر:۹] کہ کیا علم والے اور بغیر علم والے برابر ہو سکتے ہیں؟ اللہ نے فرمایا: یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کبھی اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتا ہے؟ اللہ نے فرمادیا: کبھی زندہ اور مردہ برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے فرمادیا کہ کبھی مومن اور کافر برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ تو ایک نظامِ عالم ہے۔

بظاہر مساواتِ محمدی کا نعرہ ہے، لیکن اندر سے چاہتے ہیں کہ ڈسکو کلب قائم ہوں، ہمارے اوپر ہر قسم کے تھیز قائم ہوں، مَیں اور تُو کی تمیز مٹ جائے، حیا اور بے حیائی کے فلسفے ختم کر دیئے جائیں اور مرد و عورت سب برابر ہوں، بازار اور مارکیٹ میں برابر ہوں، ملازمت میں بھی برابر ہوں، سکولوں میں کالجوں میں، غرض ہر جگہ برابر ہوں، ایک طوفان بے حیائی اور عریانی کا ہو اور پوری دنیا اس میں ڈوب جائے۔

نفاذِ شریعت کے کھوکھلے نعرے:

اسی طرح بڑے بڑے نعرے لگائے جاتے ہیں کہ ہم اسلام لائیں گے۔ پتہ نہیں کون سا اسلام لائیں گے؟ ایک آدمی سے پوچھو تو کہتا ہے کہ نظامِ مصطفیٰ لایا جائے، دوسرا کہتا ہے کہ اسلام کا آئین لایا جائے، تیسرا کہتا ہے کہ نفاذِ شریعت کیا جائے اور کوئی کہتا ہے کہ آئین نفاذِ شریعت کیا جائے گا۔ ان سے پوچھو کہ یہ ساری چیزیں کیا ہیں؟ کیا نظامِ مصطفیٰ کوئی علیحدہ چیز ہے؟ اسلام کوئی علیحدہ چیز ہے؟ آئین اسلامی کوئی علیحدہ چیز ہے؟ اسلامی آئین کوئی علیحدہ چیز ہے؟ نفاذِ شریعت کوئی علیحدہ چیز ہے؟ وجہ کیا ہے کہ ہمیں بظاہر اتنے خوش نما نعرے دینے کے بعد اپنے گھر والوں میں اسلام نہیں ہے؟ ان کی اپنی چار دیواری کے اندر بھی اسلام نہیں ہے، ان کے اپنے بیٹوں کے اندر بھی اسلام نہیں ہے، اپنی بیٹیوں کے اندر بھی اسلام نہیں ہے۔ اب ایک آدمی اگر نفاذِ اسلام کا نعرہ لگائے اور دھمال ڈال کر اس کا استقبال کیا جائے، ایک آدمی اسلام کا نعرہ دے اور اس کا استقبال بھنگڑا ناچ کر کیا جائے، کیا وہی بھنگڑے والا اسلام لائے گا؟ اور وہی دھمال والا اسلام لائے گا؟ ایک آدمی اسلام کا نعرہ لگائے اور قوالیوں کے ذریعہ اسلام لائے گا۔

یہ اصل میں حق اور باطل کو ملا دیا جاتا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر حق کی پہچان نہیں رہتی۔ اگر ایک

یاقوت کا نگینہ ہو، ایک زمرد کا نگینہ ہو یا ایک مرجان کا نگینہ ہو اور اسی رنگ کے شیشوں کے اندر ڈال دیا جائے یا مثلاً جیسے آج کل ایک اصلی ہیرا ہوتا ہے اور ایک اسی کی طرح آرٹیفشل چیزیں بن رہی ہیں، اگر ہم ان کو آپس میں ملا دیں تو اصلی کی پہچان بڑی مشکل ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے کوئی جوہری مشینیں لگا کر دیکھ لے یا وہ پہچاننے کا کوئی طریقہ جانتا ہو، اس کو رگڑ کر پہچان لے یا اسے آگ پر ڈال کر پہچان لے، ورنہ عام آدمی تو دھوکہ کھا جائے گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ سرخ رنگ کے شیشے کو "یاقوت" سمجھ کر خرید لے گا، ایک سرخ رنگ کی چیز کو "مرجان" سمجھ کر خرید لے گا اور ایک سبز قسم کے شیشے کو "زمرد" سمجھ کر خرید لے گا اور اسی طرح باہر کے بنے ہوئے نقلی قسم کے پتھر کو وہ "ہیرا" سمجھ کر خرید لے گا۔

یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں اسلام کا نام تو لیا جاتا ہے، لیکن اسلام کہیں ملتا نہیں ہے۔ اسلام کا نعرہ لگایا جاتا ہے، لیکن اسلام نافذ نہیں ہے۔ اسلام سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے، لیکن اسلام ہمیں ملتا نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے خانقاہوں کے رنگ میں اسلام کو ختم کر دیا ہے، بعض لوگوں نے اپنے جلسے اور جلوسوں کے ذریعے لوگوں کو دھوکے میں ڈالا ہوا ہے اور بعض لوگوں نے اسلام کے لیبل لگا کر اندر اتنے بھیانک کام کیے ہوئے ہیں کہ آدمی کو سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔

تیری دنیا کو بہت غور سے دیکھا میں نے:

کسی شاعر نے بڑی عجیب رباعی لکھی تھی!! بڑی مدت سے میری نظر سے گزری۔ اس نے لکھا:

مسجدوں ، مندروں ، گرجاؤں ، کلیساؤں میں
نور ایمان کے اُجالے میں اندھیرے میں

بظاہر مندر بنائے ہوئے ہیں، کسی نے کلیسا بنایا ہوا ہے اور کسی نے ہسپتال بنائے ہوئے ہیں، مشنری کے تابع ہیں کہ وہ عیسائی ادارے ہیں، لیکن ان کے در پردہ زنا کے اڈے ہیں، اسمگلنگ کے اڈے ہیں، چوری کے اڈے ہیں، جاسوسی کے اڈے ہیں، کیا کیا بُرائی وہاں نہیں ہوتی؟

اسی طرح کتنے لوگ ہیں جو بظاہر مسجدوں کا نام لیتے ہیں لیکن مقصد پیٹ پالنا ہوتا ہے، مقصد چندہ کر کے زندگی گزارنا ہوتا ہے اور کتنے لوگ ہیں جو مسجدوں میں منہ کالا کرتے ہوئے پکڑے گئے؟ کتنے لوگ ہیں جنہوں نے

مسجدوں کے اندر اللہ کے حکم کی خلاف ورزیاں کی ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو مسجدوں میں بیٹھ کر لوگوں کو غلط فتوے دیتے ہیں؟ اور کتنے لوگ ہیں جو مسجدوں میں بیٹھ کر اللہ کی توحید کی بجائے شرک و بدعت کا پرچار کرتے ہیں؟ حضور ﷺ کی سنت کی بجائے شرک و بدعت کے علمبردار بنتے ہیں۔ اور شاعر نے آگے کہا:

مولوی ، پادری ، پنڈتوں کے حسین روپ میں
ظالم و جابر و سفاک لٹیرے دیکھے
یارب! تیری دنیا کو بہت غور سے دیکھا مَیں نے

بظاہر دیکھیں تو وہ قوم کے لیڈر ہیں اور جناب قوم کی ہمدردی میں بے چاروں کو نیند نہیں آتی، لیکن اندر مقصود قوم کو لوٹنا ہے۔

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ لہٰذا حق کو باطل میں نہ ملاؤ۔ حق کو حق رہنے دو اور باطل کو باطل رہنے دو۔

﴿وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾﴾ اور تم حق کو چھپاتے ہو، تمہاری تورات و انجیل میں حضور ﷺ کی تمام صفات مذکور ہیں اور تم ان کو چھپاتے ہو۔

تورات میں حضور ﷺ کی آمد اور صفات کا ذکر:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک دن حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: اے عبداللہ بن سلام! میں ایک بات پوچھتا ہوں۔ اب تو تم ...... الحمد للہ! ...... مسلمان ہو گئے، ہمارے بھائی بن گئے اور اسلام والے بن گئے، لیکن یہ بتاؤ کہ اسلام لانے سے پہلے اور کلمۂ نبوت پڑھنے سے پہلے تم اپنے تورات کے علم کے مطابق حضور ﷺ پاک کو جانتے تھے کہ حضرت محمد (ﷺ) واقعی اللہ کے سچے نبی ہیں؟ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کتنا پیارا جواب دیا!! کہنے لگے: امیر المومنین! خدا کی قسم ہے! ہمیں اپنے بیٹے کے اندر تو شبہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا بیٹا نہ ہو، خدا جانے میری عورت نے خیانت کی ہو ...... کیونکہ اولاد کے بارے میں ایک عورت کی گواہی ہے، اس پر اعتماد ہوتا ہے کہ اس نے بُرائی نہیں کی ہوگی، اس کے علاوہ میرے پاس کوئی گواہ تو نہیں ہیں، زیادہ سے زیادہ بعد میں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اولاد کی شکل باپ سے ملتی ہے، تمہاری بھی شکل کسی اور بندے سے مل سکتی ہے، بڑی سے بڑی یہ شہادت ہو سکتی تھی کہ بلڈ ملتا ہے اور اب بلڈ کا ماننا کوئی گواہی نہیں رہا، کیونکہ اب دنیا کی جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ماں اور باپ اور بیٹے کا گروپ ایک ہو، بلکہ ان کے اندر بھی اختلاف ہو سکتا ہے ...... حضرت عبداللہ بن

سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: امیر المومنین! ہمیں اپنے بیٹے میں تو شبہ ہو سکتا ہے، لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہے، کیونکہ ان کی گواہی اللہ نے تورات میں دی ہے، ان کی صفتوں کا ذکر تو رب العالمین نے کیا ہے۔

[روح المعاني: ٢/٥٢، البقرة: الآية: الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ]

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرة: ١٤٦] کہ وہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولادوں کو پہچانتے ہوں۔ ایک آدمی کا بیٹا دور سے بھی آ رہا ہو تو وہ پہچان لیتا ہے کہ میرا بیٹا آ رہا ہے، اگرچہ چہرہ بھی نہ دیکھے۔ اس کی چال سے بھی اس کو پہچان لیتا ہے، بیٹے کے قد و قامت سے بھی پہچان لیتا ہے اور بیٹے کو آواز سے بھی پہچان لیتا ہے۔

تو اللہ نے فرمایا کہ یہ جانتے ہیں لیکن حق کو چھپا دیتے ہیں، جب ان سے پوچھا جاتا ہے تو مسئلہ گول کر جاتے ہیں۔

یہودیوں کا سنگسار کرنے کا حکم چھپانا:

یہود کی ایک عورت سے زنا ہو گیا۔ انہوں نے سوچا کہ ہم اس کا فیصلہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جاتے ہیں، یہود کے بڑے خاندان کی عورت ہے اور پھر مسلمان بھی نہیں ہے، شاید ہمیں کوئی رعایت دے دیں۔ اس وجہ سے ہماری عورت بچ جائے گی، ورنہ تورات میں تو زنا کی سزا سنگسار کرنا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب اس عورت کا مقدمہ لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوچ لو، تم یہودی ہو، میرے مذہب پر ایمان نہیں رکھتے ہو، لیکن اگر تم نے مجھ سے فیصلہ کرانا ہے "فَأَحْكُمُ بِهٖ مَا حَكَمَ اللّٰهُ" تو پھر میں وہی فیصلہ کروں گا جو اللہ کا فیصلہ ہو گا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا! اب تم یہ بتلاؤ کہ اگر کسی آدمی سے زنا ہو جائے تو تمہارے دین اور مذہب میں اس کیا سزا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہماری کتابوں میں تو بس اتنا ہے کہ اس کو دو چار دُرّے مار لو یا اس کا منہ کالا کر دو اور اس کو گدھے پر بٹھا کر اس کو گلیوں میں پھراؤ، تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ یہ بڑا ذلیل آدمی ہے، اس نے ایسی حرکت کی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہاری شریعت کا فیصلہ نہیں ہے، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ انہوں نے کہا: جناب! ہماری کتاب میں بالکل یہی فیصلہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ان کو چیلنج کریں کہ تم تورات لے آؤ، ہم تمہاری کتاب میں دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا فیصلہ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم کچھ کہہ رہے ہیں اور تم کچھ کہہ رہے ہو، اگر تم اپنے

دعویٰ میں سچے ہو تو کتاب لے آؤ۔ انہوں نے کہا کہ ہم ادھر کیوں لے آئیں؟ ایسا کریں کہ آپ ہمارے پاس آ جائیں...... ایک اُصولی بات ہے کہ جب ایسا معاملہ ہو تو باطل ہمیشہ بہانے بناتا ہے...... حضور ﷺ نے فرمایا: چلو میں تمہارے پاس آتا ہوں۔

اللہ کا نبی سچا ہو تو سچ کو کبھی آنچ نہیں آتی، لیکن باطل کہے گا کہ میں چل کر نہیں آؤں گا، آدھا تم چل کر آؤ اور آدھا ہم چل کر آئیں گے، درمیان میں بیٹھ کر بات کریں گے۔ یہ دراصل صرف ایک چکر ہوتا ہے، ورنہ جو حق والا ہے، وہ کہتا ہے: مجھے جہاں لے جانا ہے لے جاؤ، مکہ میں بھی حق بات کہنی ہے اور مدینہ میں بھی حق بات کہنی ہے۔ میں نے کفر کے دیار میں بھی حق بات کہنی ہے۔

بہرحال کتاب تورات منگوائی گئی۔ پہلے تو انہوں نے تورات لانے میں دیر لگا دی۔ پھر جب لے آئے تو ان کے بڑے نے چالاکی یہ کی کہ تورات کی جس آیت میں زنا کی سزا لکھی ہوئی تھی، اس پر ہاتھ رکھ لیا اور آگے پیچھے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور کہا کہ اس میں کہیں رجم کا تذکرہ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تورات کے حافظ تھے، انہوں نے کہا: اپنا ہاتھ اُٹھاؤ۔ جب اس نے ہاتھ اُٹھایا تو آیتِ رجم اس کے نیچے موجود تھی۔

[صحيح البخاري، حديث: ٦٨١٩، باب: الرجم في البلاط]

آج کل بھی یہ ہوتا ہے کہ کوئی بڑا آدمی کسی مولوی کے پاس جا کر مسئلہ پوچھے تو وہ بھی حق کو چھپا دیتا ہے، اس لیے کہ کہیں یہ بڑا آدمی مجھ سے ناراض نہ ہو جائے یا میرے جو وظیفے ہیں وہ بند نہ ہو جائیں۔ یعنی اگر کوئی بات دین کی بھی ہوگی تو ہیرا پھیری کریں گے۔ یہ تو یہودیوں کی عادت تھی۔

یہودیوں کو امر و نہی کرنے کا کیا فائدہ؟

بنی اسرائیل کے لوگ خواہ یہود ہوں یا نصاریٰ وہ حضور ﷺ پر ایمان ہی نہیں لائے اور قرآن کو نہیں مانتے تو ان کو آیات کے ذریعہ امر اور نہی کرنے کا کیا فائدہ ہوگا؟ علماء نے اس کے دو جواب دیئے ہیں:

پہلا جواب: یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مخلوق کے خالق ہیں، چاہے وہ مسلمان ہوں یا کافر ہوں، یہودی ہوں یا نصرانی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اللہ کی مخلوق نہیں ہوں یا میں اللہ کا بندہ نہیں ہوں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایسا کرو اور ایسا نہ کرو۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ جو ایمان والے ہیں وہ اسے مان لیتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ اس پر ایمان نہیں لے آتے، لیکن اللہ نے عام خطاب کر کے سب کے لیے وضاحت کر دی

ہے، کیونکہ اللہ نے قرآن اور نبی ﷺ کو ساری مخلوق کے لیے بھیجا ہے۔ (اس سے علماء نے ایک مسئلہ مستنبط فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نہ ماننے والوں کو اُصول کے ساتھ فروعات کا بھی حکم دیتے ہیں)۔

دوسرا جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب سے پہلے ان کو اپنی نعمتیں یاد دلائیں، پھر جب وہ ایمان نہ لائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات میں یہ حکم دیا کہ اگر تم ایمان نہیں لے آتے تو کم از کم حق اور باطل کو تو نہ ملاؤ۔ حق کو حق بتلاؤ اور باطل کو باطل بتلاؤ اور حق کو نہ چھپاؤ۔ اگر تم ایسا کروگے تو دوسرے لوگ بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

مفسرین کا ضابطہ ہے: ''اَلْعِبْرَةُ لِعُمُوْمِ اللَّفْظِ لَا بِخُصُوْصِ السَّبَبِ'' کہ آیت اگرچہ ایک سبب خاص میں نازل ہوئی ہو، لیکن اس کا حکم قیامت تک عام ہوتا ہے۔ تو پھر ان آیات میں اگرچہ بنواسرائیل کو مخاطب کر کے حق کو باطل سے خلط ملط کرنے اور کتمانِ حق سے روکا گیا ہے، لیکن یہ حکم قیامت تک کے آنے والے ہر اس شخص کے لیے ہے جو حق کو باطل سے ملاتا اور حق کو چھپاتا ہے۔

کیا خدا دوسروں کی بات ماننے پر مجبور ہے؟

اللہ کو جو نہ مانے، بھلا وہ بھی مسلمان ہے؟ اللہ وحدہ لاشریک ہے، یہ صفت اسی کی ہونی چاہیے، نفع ونقصان کا مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، روزی دینے والا اللہ ہے، بچے دینے والا اللہ ہے، موت وحیات کا خالق ومالک اللہ ہے، انبیاء کو پیدا کرنے والا خدا ہے۔ یہاں خدا کا بھی کوئی انکار کرسکتا ہے؟ لیکن بہرحال یہ بھی اللہ کے پیارے لوگ ہیں، ان کی اللہ تک بڑی پہنچ ہے، خدا ان کی بات کو رد نہیں کرسکتا، یہ اپنی بات زبردستی منوا لیتے ہیں۔ اب آدمی اُلجھن میں پڑ گیا کہ اللہ کا نام بھی لے رہا ہے اور اللہ کے پیاروں کو اللہ کی ذات میں اتنا مؤثر اور قوت والا بنا رہا ہے کہ اللہ ان کی بات کو رد کر ہی نہیں سکتا۔ جب کسی کی بات کو کوئی نہ ٹال سکے تو وہ کمزور ہوا۔ مثلاً ایک آدمی ایسا ہے کہ آپ اس کی بات کو رد نہیں کرسکتے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کمزور ہیں اور وہ آپ پر حاوی ہے یا آپ کی کوئی مجبوری اس کو پتہ ہے، ورنہ وہ آپ کی مجبوری ظاہر کر دے گا۔ اس لیے وہ جو بات بھی کرے، آپ اس کی بات کو مان لیتے ہیں، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے ان پیاروں کی بات کو رد ہی نہیں کرسکتے تو پھر وہ خدا کیسے ہوئے؟ آدمی جب قرآن میں پڑھتا ہے کہ نوح علیہ السلام نے بیٹے کے لیے دعا مانگی تو خدا نے رد کردی تو وہ حیران ہو جاتا ہے کہ عجیب بات ہے! اِدھر تو نبی کی نہیں مانی اور اُدھر یہ کہتے ہیں کہ پیروں کی خدا رد نہیں کرسکتا۔ اب اس آدمی کے دماغ میں ایک ہلچل مچ گئی۔ اگر وہ اس کو سیدھا مسئلہ بتا دیتا کہ بھائی! نفع ونقصان کا مالک اللہ ہے، اللہ کے نبی بڑی شان

والے ہیں، اللہ کے ولی بھی بڑی شان والے ہیں، وہ اللہ سے مانگتے ہیں۔ اللہ چاہے تو دے دیتا ہے، اللہ نہ چاہے تو نہیں دیتا۔

ایک سیدھی سی بات اس کو سمجھ آجاتی کہ نفع ونقصان کا خالق حقیقی اللہ ہے، نذر و نیاز کا مستحق اللہ ہے، عبادت کے لائق اللہ ہے، مانگنے کا، قربانیوں کا، استغاثہ کا لائق اللہ ہے۔ بھائی! اللہ نے اپنے انبیاء کو بڑی شان دی ہے، لیکن اللہ کے نبی بھی اللہ کے بندے ہیں، اللہ کی مخلوق ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے محتاج ہیں، اللہ تعالیٰ سے مانگنے والے ہیں اور جتنے صحابہ ہیں، اولیاء ہیں، سب اللہ کی مخلوق ہیں، سب اللہ سے مانگنے والے ہیں۔ اب چونکہ یہ مخلوق ہیں اور وہ خالق ہے، یہ مملوک ہیں وہ مالک ہے۔ اگر مالک کی مرضی آئے تو مان لے، نہ آئے تو نہ مانے۔

کتمانِ حق کی ایک اور صورت:

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی نے آکر مسئلہ پوچھا کہ داڑھی کٹانا صغیرہ گناہ ہے یا کبیرہ؟ تو دیکھا کہ سامنے بادشاہ بیٹھا ہے، کوئی وزیر بیٹھا ہے یا بہت بڑا افسر بیٹھا ہے جس سے مجھے نقصان پہنچ سکتا ہے تو مصیبت کو ٹالنے کے لیے کہہ دیتا ہے کہ میں اس مسئلے پر کچھ زیادہ مطالعہ نہیں کرسکا، بعد میں دیکھ کر آپ کو بتادوں گا۔ یہ بھی کتمانِ حق ہے۔ جب پتہ ہے کہ نبی کی مخالفت ہے، حضور ﷺ کی سنت اور شکل مبارک کی مخالفت ہے، اگر اس کو چھوٹا گناہ بھی مانیں تو بار بار کرنے سے وہ خود بخود بڑا ہوجاتا ہے۔ چھوٹے گناہ کا کیا معنیٰ؟ چھوٹا تو تب ہوا جب پہلی دفعہ کوئی غلطی کرے گا، لیکن جو آدمی روزانہ اسی گناہ کو دوہرا رہا ہے تو پھر وہ چھوٹا کیسے رہا؟ سیدھی بات کریں کہ گناہ کبیرہ ہے اور اس کا منڈانے والا فاسق اور فاجر ہے، اس کی اذان ٹھیک نہیں، اس کی نماز ٹھیک نہیں، اس کی امامت ٹھیک نہیں۔ آپ کھلی بات بتادیں، تاکہ دوسرا آدمی اس گناہ سے بچے۔ اور اگر اس کو اندھیرے میں ڈال دیں گے تو وہ اُلجھن میں مبتلا رہے گا۔

کسی نے آدمی نے پوچھ لیا کہ یہ جو گیارہویں شریف کرتے ہیں، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کہا: بہرحال پہلے زمانے میں تھی تو نہیں، لیکن کوئی حرج بھی نہیں، خیرات ہی ہے۔ چونکہ یہ پیرانِ پیر کی ہے اور وہ حضور ﷺ کے زمانہ کے بعد میں پیدا ہوئے، اس لیے قرآن وحدیث میں بھی اس کا کوئی حکم نہیں۔ لیکن خیرات ہے، بزرگوں کے نام پر غریبوں کو دودھ مل جاتا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ ویسے بہرحال قرآن وحدیث میں نہیں ہے۔ اب آدمی اُلجھن میں پڑ گیا۔ اس نے سوچا کہ چلو قرآن وحدیث میں اس کا حکم نہ بھی ہو تو کوئی بات نہیں، کام تو

اچھا ہے۔ اگر وہ سیدھی بات کر دیتا کہ اس طرح دن کا معین کرنا، یہ گیارہویں کی رات کی تعیین کرنا بندہ کے اختیار میں نہیں، دن یا رات کی تعیین کا حق تو صرف میرے اللہ کو ہے، وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ لیلۃ القدر ہے، یہ دس ذی الحجہ کی رات ہے، یہ نو کا دن ہے، یہ منیٰ میں دس، گیارہ، بارہ کے دن ہیں، یہ رمضان کا مہینہ ہے، یہ عیدین کے دن ہیں۔ بندے اگر کوئی دن متعین کریں تو یہ بالکل دین کے خلاف ہے اور پھر جب ہم اس کی غیر اللہ کی طرف نسبت کر دیتے ہیں تو اس وجہ سے بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اس کو چاہیے تھا کہ ایک سیدھی بات کہہ دیتا کہ اللہ کے بندے! خیرات اللہ کے نام پر ہوتی ہے۔

اب اگلا بندہ کہے گا: جناب! میں تو اللہ کے نام پر کرتا ہوں، پیر کو تو ثواب پہنچاتا ہوں۔ اس سے کوئی پوچھے کہ پورا مہینہ ثواب نہیں ہوتا؟ صرف گیارہویں کی رات کو ثواب ہوتا ہے؟ یہ بڑا اچھا ثواب ہے جو گیارہ کی رات میں ہی مخصوص ہے، نہ دس کو ثواب ہوتا ہے، نہ بارہ کو ہوتا ہے اور نہ تیرہ کو ہوتا ہے۔

اس لیے یہ نہ سمجھا کرو کہ یہ حکم یہودیوں کے لیے ہے اور ہمارے لیے نہیں ہے۔ ہمارے لیے بھی اور قیامت تک آنے والے ہر بندے کے لیے ہے کہ کبھی حق کو باطل میں نہ ملاؤ۔ لوگوں نے اس لیے دھوکہ کھایا کہ حق کو باطل میں ملا دیا اور اس پر حق کا پردہ چڑھا دیا اور اس کے اندر باطل کو چھپا دیا۔ بڑے بڑے عقلمند اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس اُلجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مرزا قادیانی کے جھوٹے دعوے:

مرزا قادیانی نے دعویٰ نبوت کیا، آپ اس کی ساری کتابیں دیکھیں، کبھی وہ آپ کو ایک عالم دین کے روپ میں نظر آئے گا، کبھی وہ آپ کو ایک مصلح کے روپ میں نظر آئے گا کہ لوگوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے، کبھی وہ آپ کو عیسائیوں کا سب سے بڑا دشمن دکھائی دے گا کہ اس کی پوری زندگی مناظرے کرتے ہوئے گزر گئی، پھر کبھی وہ مجتہد بن کر مسائل میں اجتہاد کرتا نظر آئے گا، کبھی آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے آپ کو مجدد کے مرتبہ پر لے گیا ہے، کبھی اپنے آپ کو مہدی کے مرتبہ پر لے گیا ہے، کبھی اپنے آپ کو عیسیٰ بن مریم کہلوانے کے درپے ہے اور آخر میں نظر آئے گا کہ وہ نبوت کے دروازے پر آ گیا، بلکہ اپنے آپ کو اور زیادہ افضل کر گیا۔ اس طرح حق کو باطل سے ملاتے ملاتے جب لوگ اس کے معتقد ہو گئے تو اس نے انہیں گمراہی میں ڈال دیا۔

ورقہ بن نوفل کے سچ کا اظہار:

بی بی سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں...... ورقہ بن نوفل پرانی کتابیں پڑھنے والا آدمی تھا...... اس نے فوراً کہا: خدیجہ! تمہیں مبارک ہو، یہ مجھے وہی فرشتہ معلوم ہوتا ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اُترتا تھا اور وہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اُترا ہے۔ اس نے سچی بات کہہ دی، حق بات کا اظہار کر دیا۔ اسی لیے اگر کسی میں کوئی اچھی عادت ہے تو آپ کھل کر اس کا اعتراف کریں۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳، باب: بدء الوحي]

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے ایک مرتبہ میرے آقا کی خدمت میں آئے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا بہت احترام فرمایا، آپ نے ایک ''وسادۃ'' (تکیہ) منگوایا...... حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی قالین، غالیچے اور صوفے تو تھے نہیں...... اور فرمایا: تم اوپر بیٹھو۔ اتنا احترام کیا۔ لیکن وہ سرہانے پر نہیں بیٹھا، بلکہ اُتر کر بیٹھ گیا کہ حضور! یہ ناممکن ہے کہ میں آپ کے سامنے کسی اونچی جگہ پر بیٹھوں۔ ٹھیک ہے میں مہمان ہوں، آپ نے تکریم کی ہے، آپ نے احترامِ ضیف کا حق ادا کر دیا ہے، لیکن میں یہ جرأت کیسے کر سکتا ہوں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے خود اونچی جگہ پر بیٹھوں اور اللہ کے نبی نیچی جگہ پر بیٹھیں۔ میں بالکل عام لوگوں کے ساتھ مٹی پر بیٹھوں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں تم ان لوگوں میں سے ہو جن کے دلوں میں تکبر نہیں ہوتا۔

[سیرۃ ابن ہشام: ۲/۵۸۰، قُدُومُ عَدِيٍّ عَلَى الرَّسُولِ وَإِسْلَامُهُ]

دیکھیں! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدھی بات کہہ دی، حالانکہ اس وقت وہ دشمن اسلام تھا، لیکن سچی بات جو ہے وہ سچی بات ہے۔

حضرت ثمامہ بن اُثال رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

ثمامہ بن اُثال نجد کے علاقے کا بہادر آدمی تھا، گرفتار ہو گیا، صحابہ اس کو پکڑ کر لے آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ اسے مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اپنے امور سے فارغ ہوئے اور آپ اس کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ہاں! کیا خیال ہے تمہارا؟ اب تم کیا چاہتے ہو؟...... آپ غور کریں کہ ایک شخص کافر و مشرک ہے، قیدی ہے اور اسے پتہ ہے کہ اب مجھے مدینہ منورہ میں کوئی چھڑانے والا نہیں ہے۔ میں مسلمانوں کے قبضہ میں

ہوں، حضور (ﷺ) اشارہ فرمائیں تو میری گردن اُڑ جائے گی...... اس کے باوجود بھی وہ کہنے لگا: اگر آپ مجھے قتل کرتے ہیں تو کردیں، لیکن آپ بھی ایک ایسے آدمی کو قتل کریں گے جس کا بدلہ لینے والا اس کا قبیلہ موجود ہے، میں کوئی گراپڑا آدمی نہیں ہوں۔ اور اگر آپ مجھے معاف کردیں تو آپ ایک مرد کو معاف کریں گے جو احسان کا بدلہ دینا جانتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں کافر ہوں، لیکن ایک مرد آدمی ہوں۔ اگر آپ مجھ پر احسان کریں گے تو میں احسان کو بھولوں گا نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اس کو اپنے حال پر رہنے دو۔ چنانچہ اسے پیشاب وغیرہ کے لیے کھول دیتے، کھانا پانی بھی دے دیتے اور پھر باندھ دیتے۔

جب ایک دن گزر گیا تو پھر حضور ﷺ نے پوچھا: بتاؤ اب کس نتیجہ پر پہنچے ہو؟ اس نے کہا: میری تو وہی بات ہے۔ قتل کرو گے تو بدلہ لیا جائے گا، چھوڑ دو گے تو احسان کا بدلہ دوں گا، کافر رہوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا اس کو بندھا رہنے دو۔ جب تین دن گزر گئے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تین دن ہو گئے ہیں، اب تم سوچ کر بات کرو۔ تم جانتے ہو کہ اس وقت تمہیں کوئی چھڑانے والا نہیں۔ اس نے کہا: مجھے پتہ ہے کہ کوئی چھڑانے والا نہیں، لیکن میں اپنی اسی بات پر کھڑا ہوں۔ آپ نے احسان کرنا ہے تو کریں، مجھے موقع ملا تو میں آپ کے احسان کا بدلہ دوں گا۔ اور اگر آپ نے قتل کرنا ہے تو دیر کا ہے کی؟ قتل کردیں، میرا بھی قبیلہ ہے، میری قوم بدلہ لے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: چلو ہم احسان کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس کو چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر گزری تو غسل کر کے حاضر ہو گیا اور عرض کیا: حضور! مجھے کلمہ پڑھا دیں۔ تین دن جو آپ نے یہاں رکھا ہے، اصل میں مجھے اسلام سمجھ آ گیا ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٤٣٧٢، باب: وَفْدِ بَنِي حَنِيفَةَ، وَحَدِيثُ ثُمَامَةَ بْنِ...]

اب دیکھیں! ایک کافر جو مسلمانوں کی قید میں تھا، اس نے بھی جھوٹ نہیں بولا، بلکہ سیدھی بات کردی۔

سراقہ بن مالک کا واقعہ:

ہجرت والی رات جب میرے سرکارِ مدینہ، رحمتِ دو جہان ﷺ جا رہے تھے، سراقہ بن مالک جو حضور ﷺ کے قتل کرنے کا اتنا شوق رکھتا تھا کہ جب اس کو خبر ملی تو اس نے اپنی نوکرانی سے کہا: میرا گھوڑا چپکے سے لے کر فلاں جگہ کھڑا کردو، میں گھر کے دروازے سے نہیں نکلتا، بلکہ گھر کی پچھلی دیوار کو پھاند کر جاؤں گا، تاکہ اور لوگوں کو پتہ نہ چلے۔ میں جا کر حضور ﷺ کو پکڑوں گا اور پھر مجھے انعام میں سو اونٹ ملیں گے۔

بہر حال لمبا واقعہ ہے۔ مختصر یہ کہ اس نے حضور اکرم ﷺ کو دیکھ لیا اور کفار کو خبر کرنا چاہی تو اس کا گھوڑا زمین

میں دھنس گیا۔ اس وقت کہنے لگا کہ میں سمجھ گیا ہوں، یہ آپ کی بددعا کا اثر ہے، ورنہ میرا گھوڑا ایسا نہیں کہ زمین میں دھنس جائے۔ جب تک آپ مجھے معافی نہ دیں مجھے نجات نہیں مل سکتی، آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ اس راستہ سے آپ کے دشمنوں کو پیچھے نہیں آنے دوں گا۔ میں اپنے کفر پر ہوں، لیکن یہ میرا وعدہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اچھا! ہم بھی تمہیں ایک خوشخبری دیتے ہیں، ایک مبارکباد دیتے ہیں کہ ایک وقت آئے گا جب کسریٰ بادشاہ کے کنگن تمہارے ہاتھوں میں ہوں گے۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ اپنے سفر پر دوبارہ سے روانہ ہو گئے۔

حضور ﷺ کو تلاش کر کے پکڑنے کے لیے مکہ والوں کے قافلے اونٹوں اور گھوڑوں پر دوڑ رہے تھے اور ادھر سراقہ راستے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب بھی کوئی اس کے پاس سے گزرنے لگتا تو یہ اس سے پوچھتا: ہاں بھائی! کہاں جا رہے ہو؟ وہ کہتا: محمد اور ابوبکر کی تلاش کے لیے نکلے ہیں، یہ ان کو کہتا کہ اس راستے سے میں نے ان کو بڑا دیکھ لیا ہے، اس راستے پر نہیں، تم کسی اور راستہ پر تلاش کرو۔ یعنی اپنے وعدے پر قائم رہا، وعدہ خلافی نہیں کی۔ ایک آدمی کو بھی حضور ﷺ کے تعاقب میں نہیں جانے دیا۔ سب کے سب واپس آ گئے کہ جب سراقہ سردار کہہ رہا ہے تو ٹھیک ہے۔

[صحيح البخاري، حديث:٣٦١٥، باب: علامات النبوة في الإسلام]

ہمیشہ کے لیے یہ حکم ہے کہ جب بھی کوئی بات کرو تو صاف صاف کرو۔ یہ اگر مگر، چونکہ چنانچہ، اوپر نیچے ملا جلا کر دھوکہ دینے والی باتیں نہ کرو۔ ایک آدمی مسئلہ پوچھتا ہے، اگر مسئلہ صحیح جانتے ہو تو اس کو بتا دو اور اگر نہیں جانتے تو کہہ دو کہ میں نہیں جانتا۔ اسی طرح اگر کوئی دنیاوی معاملہ ہے تو جو حق بات ہے، وہ کرو، حق اور باطل کو خلط ملط نہ کرو۔ یہ حکم صرف یہودیوں کے لیے نہیں تھا، یہ ہم سب کے لیے ہے اور قیامت تک اس حکم پر قائم رہنا چاہیے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی یہی فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق کو باطل کے ساتھ اور صدق کو کذب کے ساتھ خلط نہ کرو۔

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تم حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم سب امتِ محمدیہ کو صحیح معنوں میں نصیحت کرو اور صحیح بات بتلاؤ۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۴، البقرۃ: الآیۃ: ۴۲]

پسندیدہ دین......صرف اسلام:

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران: ۱۹] اور دوسرے مقام پر

فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران: ۸۵] اگر کوئی اسلام کے خلاف کسی دین کا دعویٰ کرے تو اللہ ہرگز قبول نہیں فرمائیں گے۔ لہٰذا اگر کوئی یہ کہے کہ میں تو یہودیت پر رہوں گا، یا کوئی کہے کہ میں نصرانیت پر رہوں گا تو اللہ کے ہاں اس کا دین قبول نہیں ہوگا، کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے بھی میری نبوت کا سنا اور مجھ پر ایمان نہ لے آیا تو وہ کفر پر مرے گا۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۰، باب: وُجُوْبِ اِيْمَانِ أَهْلِ الْكِتَابِ بِرِسَالَةِ الْإِسْلَامِ]

اس لیے اللہ نے فرمایا کہ تم یہ نہ کرو کہ یہودیت کو اسلام سے ملا دو، نصرانیت کو اسلام سے ملا دو کہ اسلام میں بھی تو یہی توحید، رسالت، آخرت کا حکم ہے اور نصرانیت میں بھی یہی باتیں تھیں اور یہودیت میں بھی، تمہیں بھی حکم ہے کہ ذبح کر کے کھایا کرو اور ہم بھی ذبح کر کے کھاتے ہیں، تمہیں بھی حکم ہے کہ عورت سے نکاح کرو اور ہم بھی نکاح کرتے ہیں، تم آخرت پر یقین رکھتے ہو اور ہم بھی آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور تم بھی خدا کی وحدانیت کے قائل ہو اور ہم بھی خدا کی وحدانیت کے قائل ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا بیٹا ہے۔ خدا مانتے ہیں تو بیٹا مانتے ہیں۔ خدا نہ مانیں تو بیٹا کیسے مانیں؟ پہلے باپ مانیں گے تو پھر بیٹا بھی مانیں گے۔ تو یہ چیزیں خلط ملط کرنے والی ہیں۔ فرمایا کہ سیدھی بات کرو۔

دھوکہ کی محبت سے عداوت اچھی:

اللہ کی وحدانیت کا معنی یہ ہے کہ أحدٌ بھی وہ ہے، صمدٌ بھی وہ ہے، لَمْ يَلِدْ بھی وہ ہے، وَ لَمْ يُوْلَدْ بھی وہ ہے۔ یہ نہیں کہ تم واحد بھی مان لو اور بیٹا بھی مان لو۔ یہ نہیں ہے کہ تم واحد بھی مان لو اور بیوی بھی بنا ڈالو۔ یہ نہیں ہے کہ تم واحد بھی مانو اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بنا دو۔ یہ نہیں ہے کہ تم اللہ کو وحدہ لاشریک بھی مان لو اور قبروں پر جا کر سجدے بھی کر لو۔ سیدھی بات ہے اسلام پر سیدھے سیدھے چلو، ورنہ بالکل علیحدہ ہٹ جاؤ، تاکہ اسلام کے نام کلنک کا ٹیکہ نہ بنو۔ اس لیے کسی نے کہا تھا:

؂ بگڑی ہوئی عقل سے حماقت اچھی
اور دھوکہ کی محبت سے عداوت اچھی

دوغلی پالیسی (منافقت):

ہمارے ایک دوست ہیں...... میں ان کا نام تو نہیں لیتا۔ وہ بڑے زمیندار ہیں...... وہ مجھے ملنے کے لیے آئے تو میں

نے ان سے ان کے ایک رشتہ دار کے بارے میں پوچھا کہ فلاں صاحب کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ ٹھیک ہیں۔ میں نے کہا کہ ان کے علاقے میں شیعہ سنی کا کوئی جھگڑا ہوا تھا تو اس کا کیا بنا؟ اس نے کہا: کمی صاحب! آپ شیعہ سنی کی بات کرتے ہیں، شکر کریں! ہمارے ہاں یہودی نصرانی نہیں، وگرنہ خان صاحب تو ان کے ساتھ بھی بنا کر رکھتے۔ ان کے پاس جو آ جائے وہ ان کے ساتھ ہیں۔ دن کو اِس کے ساتھ ہیں تو رات کو اُس کے ساتھ ہیں۔ وہ تو سب سے بڑے منافق ہیں۔

اعمال کی حکمرانی:

میرے پاس کافی سارے لوگ آتے ہیں جو کہتے ہیں کہ دعا کریں، ہمارے ملک میں اچھے لوگ آ جائیں۔ میں کہتا ہوں: خدا کے بندے! ایک بات یاد رکھو! جیسے ہم ہوں گے ویسے ہمارے اوپر لوگ ہوں گے۔

ایک موٹی بات یاد رکھو! ہم مکھن نکالتے ہیں تو جیسے دودھ ہوگا ویسے مکھن نکلے گا۔ اگر دودھ بھینس کا ہوگا تو مکھن ویسا نکلے گا، اگر گائے کا ہوگا تو ایسا نکلے گا، بکری کا ہوگا تو ویسے نکلے گا اور اگر دودھ زہریلا ہوگا تو مکھن اور زیادہ زہر والا ہوگا، کیونکہ مکھن تو دودھ کا خلاصہ ہوتا ہے۔ اگر وہ زہر پہلے ایک مَن دودھ میں پھیلا ہوا تھا اور اب ایک کلو مکھن میں آ جائے گا۔ جب تک ہم خود ٹھیک نہیں ہوں گے ہمارے اوپر والے کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ اوپر والے ہم میں سے آتے ہیں اور تو کوئی جنس نہیں ہے۔ وہ بھی ہمارے اندر سے نکلتے ہیں۔ جب ہمارے اندر زہر ہے تو مکھن کے اندر بھی زہر ہی آئے گی۔ جب ہم بُرے ہوں گے تو ہم پر بدترین حکمران آئیں گے، جب ہم اچھے ہوں گے تو ہم پر بہترین حکمران آئیں گے۔

آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ دیکھ لیں! ایک سے بڑھ کر ایک آتا رہا، کیونکہ پورا معاشرہ خیر کا تھا، پورے معاشرے میں دین تھا، پورے معاشرے میں اسلام تھا۔ جب ہمارے اپنے اندر دین باقی نہیں رہا تو دین والوں کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

این خیال است و محال است و جنوں

یہ تو بس ایک مجنونوں والی بات ہے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ یعنی یہودیت اور نصرانیت تمہاری گھڑی ہوئی چیز ہے، اس کا اللہ تبارک وتعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ﴿وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [البقرة:۴۲] کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو حکم دیا کہ تم حق کو نہ چھپاؤ، تمہارے پاس معرفت اور علم ہے۔ حضور ﷺ کی حقانیت اور نبوت ورسالت اور صداقت کو جانتے ہو کہ تمہارے پاس تورات ہے جس میں حضور ﷺ کی ساری صفتیں لکھی ہوئی ہیں، اس کے باوجود تم حق کو چھپا رہے ہو، ایسا نہ کرو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۴، البقرة: الآیة: ۴۲]

کتمانِ حق:

﴿وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ﴾ حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت سدی رحمہ اللہ، حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور ربیع بن انس کا ایک قول یہ بھی ہے کہ تم حق کو چھپاتے ہو، یعنی تمہیں پتہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے نبی اور پیغمبر ہیں اور تم تورات میں ان کی صفتیں پڑھ چکے ہو، لیکن تم چھپا رہے ہو۔ یا منصوب ہے، اس کو پچھلی آیت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو بہر حال ترجمہ یہ ہوگا: "لَا تَجْمَعُوْا بَيْنَ هٰذَا وَ بَيْنَ هٰذَا" کہ تم ایسا نہ کرو کہ حق کو باطل کے ساتھ بھی ملاؤ اور حق کو چھپاؤ بھی۔ یعنی نہ یہ کرو اور نہ یہ کرو۔ جیسے محاوراتِ عرب میں بھی آتا ہے کہ "لَا تَأْكُلِ السَّمَكَ وَ تَشْرَبَ اللَّبَنَ" نہ کھاؤ مچھلی اور نہ پیو دودھ، یعنی مچھلی کھا کر دودھ نہ پیو۔

علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ﴿تَكْتُمُونَ الْحَقَّ﴾ ہے۔ دراصل یہ آیتِ مبارک کئی مقام پر آئی ہے، ایک جگہ پر ﴿تَكْتُمُونَ﴾ کا لفظ بھی آتا ہے تو مصحف عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ میں بھی قراءت ﴿وَ تَكْتُمُونَ الْحَقَّ﴾ آئی ہے۔ اس قراءت میں یہ جملہ حالیہ ہونے کی بناء پر منصوب ہوگا تو معنی ہوگا: "فِي حَالِ كِتْمَانِكُمُ الْحَقَّ" یعنی اس حال میں کہ تم حق کو چھپا رہے ہو اور تم جانتے بھی ہو کہ حق کیا ہے۔ ﴿وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ اور تم جانتے ہو کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں، ان کی نبوت اور رسالت حق ہے، اور تم جانتے ہو کہ حق چھپانے میں کتنا بڑا نقصان ہے کہ لوگ ایمان سے محروم ہو جائیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے لیے عذابِ جہنم دائمی ہو جائے گا۔ تم حق چھپا کر لوگوں کو جہنم کی طرف جانے والے راستے پر ڈال رہے ہو اور تم اس بات کو جانتے بھی ہو۔

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ﴾ [البقرة:۴۳] اللہ نے ان کو حکم دیا کہ نماز قائم کرو۔ یعنی تم

حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھو اور تم زکوٰۃ بھی حضور ﷺ کو پہنچاؤ، تاکہ حضور ﷺ اسے مستحقین زکوٰۃ پر تقسیم کریں اور حضور اکرم ﷺ کے بعد زکوٰۃ کے مصارف میں خرچ کرو۔ اور تم رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ، یعنی اُمتِ محمد ﷺ کے ساتھ جماعت میں ملو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۴، البقرۃ: الآیۃ: ۴۲]

زکوٰۃ وتزکیہ میں مناسبت:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے کہ زکوٰۃ کا معنی یہ ہے کہ تم خالص اللہ کی اطاعت کرو، اپنا تزکیۂ نفس کرو۔ ''زکوٰۃ'' کا لفظ جیسے مال کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی طرح تزکیۂ نفس کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ﴿وَ يُزَكِّيْهِمْ﴾۔ ''تزکیہ'' کا اصل معنی ہوتا ہے: خالص کرنا، پاک کرنا۔ آدمی جب اپنے مال کی زکوٰۃ نکالتا ہے تو وہ اپنے مال کو پاک کر دیتا ہے، اسی طرح جب آدمی اپنے بدن کا تزکیہ کرتا ہے تو اسے گناہوں اور بُری عادتوں سے پاک صاف کر دیتا ہے۔ اس لیے اس کو ''تزکیہ'' کہا جاتا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۴، البقرۃ: الآیۃ: ۴۲]

زکوٰۃ کے بعض احکام:

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ جب زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے تو کس چیز میں زکوٰۃ ادا ہوگی؟ انہوں نے فرمایا: دوسو یا دوسو سے اوپر۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۴، البقرۃ: الآیۃ: ۴۲]

اس زمانہ میں دراہم اور دینار ہوتے تھے اور زیادہ تر مال مویشی بکریاں، بھیڑیں اونٹ وغیرہ تھے۔ دورِ حاضر میں تقریباً ہر چیز پر زکوٰۃ ہوتی ہے کہ وزن دیکھا جاتا ہے سونا اور چاندی سے۔ اصل میں اسلام کا منشاء یہ ہے کہ آدمی اپنے معاملات کو سونے اور چاندی سے کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً میں نے آپ سے دس تولہ سونا لیا تو اب آپ کو دس تولہ سونا ہی دینا ہے۔ اس میں کسی کا بھی نقصان نہیں ہوتا، جبکہ پیسوں کے معاملہ میں تو بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی نے آج سے دس سال پہلے آپ کو دس ہزار روپے دینے تھے اور آج وہ آپ کو دس ہزار روپے دے دے تو دس سال پہلے کے دس ہزار آج کے ڈیڑھ لاکھ کے برابر ہوں گے تو آپ کو نقصان ہوگا، اس لیے کہ آج روپے کی وہ حیثیت نہیں ہے جو دس سال پہلے تھی، کیونکہ پیسہ، روپیہ گر گیا۔ لیکن سونا اور چاندی ایک ٹھوس دھات ہیں، اس کا جو اصل ہے وہ قائم رہتا ہے۔ اصل شریعت کا حکم یہ تھا کہ سونا اور چاندی کو سامنے رکھا جائے۔

اسی لیے اب بھی فقہاء اسی بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ آدمی کا اگر نکاح ہے تو وہ حق المہر میں سونا چاندی دے۔ یعنی جو مقرر کر رہا ہے، دے رہا ہے یا آئندہ دے گا تو وہ کہے کہ میں دس تولہ سونا دوں گا، میں سو تولہ چاندی دوں گا، ورنہ اگر اس نے کہا کہ میں پچاس ہزار روپیہ اپنی بیوی کو حق المہر دوں گا۔ اگر آج سے پچیس سال پہلے اس کا نکاح ہوا تھا تو آج پچاس ہزار کی قیمت پانچ ہزار کے برابر ہوگی تو ایسا کرنے سے اس عورت کا سارا سرمایہ ہی ڈوب جائے گا۔

کرنسی کیسے ایجاد ہوئی؟

لیکن بعد میں اتنے وزن کا اُٹھانا اور اُسے لے جانا آدمی کے لیے مشکلات کا باعث بننے لگا تو اس کا حل یہ نکالا گیا کہ کاغذ کے نوٹ چھپ گئے، مگر اس میں یہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ اگر ایک ملک ایک ارب روپے کے نوٹ چھاپتا ہے تو اس کے پاس ایک ارب کی قیمت کے برابر سونا موجود ہو۔

ہمارا پیسہ کیوں گر جاتا ہے؟ اس کی یہی وجہ ہوتی ہے کہ ہمارے سونے کی سکیورٹی کم ہے اور ہم نوٹ چھاپتے چلے جا رہے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس کاغذ کے ٹکڑے کو خرید کر کیا کریں گے؟ اس لیے وہ آہستہ آہستہ گرتے گرتے اپنی موت مر جاتا ہے۔ چونکہ اس کی اصل سکیورٹی سونا ہے، اگر ہم نے سونا ایک ارب کے برابر رکھا ہے اور نوٹ دو ارب کے چھاپ دیئے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمارا نوٹ خود بخود پچاس پیسے کا ہو جائے گا۔ اگلے لوگ اسی سونے کو سامنے رکھ کر ہمارے روپے کی قیمت لگائیں گے کہ ان کا سونا ہمارے پاس ایک ارب روپے کا پڑا ہے اور نوٹ ان کا دو ارب کا گردش کر رہا ہے، اس کا مطلب ہے کہ اب ان کے پیسے کی قیمت آٹھ آنے کے برابر ہے۔ اسی طرح جب ہم چار ارب پر چلے جائیں تو چار آنے کے برابر رہ جائے گا۔

وجوبِ زکوٰۃ کا ضابطہ:

یاد رکھیں کہ اسلام کا ایک اصول اور ضابطہ ہے کہ اگر آدمی کے پاس ساڑھے سات تولے سونا یا ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت کے برابر پیسے ہیں یا ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کے برابر پیسے ہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ مثال کے طور پر: اگر پانچ سو ریال تولہ ہے تو ساڑھے سات تولہ سونے کی قیمت جتنی بنے گی، اس پر زکوٰۃ لاگو ہوگی۔

زکوۃ کی ادائیگی کا طریقہ:

اور پھر زکوۃ دینے کا آسان طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے پاس جتنا پیسے ہیں ان کو جمع کر کے حساب کرلیں اور اس میں آپ کی رہائش، کھانا پینا، آپ کے ہتھیار، آپ کے اوزار، آپ کی سواری وغیرہ سب نکالیں، ان میں زکوۃ نہیں ہوتی، یہ اللہ نے آپ کو معاف کی ہیں۔ جس مکان میں آپ رہتے ہیں یا آپ کے بچے رہتے ہیں چاہے آپ نے وہ مکان دس لاکھ ریال میں خریدا ہے، اس پر کوئی زکوۃ نہیں ہے۔ آپ نے اگر ایک ورکشاپ بنایا ہوا ہے، آپ کے پاس اوزار ہیں وہ چاہے دو لاکھ کے ہوں اور آپ انہی اوزار سے تو کمار ہے ہیں، اسلام نے اس لیے ان میں رعایت دی ہے۔ اسی طرح آپ کے بیوی، بچوں اور گھر کا نفقہ خرچہ سارا نکالنے کے بعد جو حاصل منافع آپ کے پاس بچتا ہے اور جس پر سال بھی گزر چکا ہے، آپ پر صرف اس کی زکوۃ واجب ہے اور وہ بھی صرف اڑھائی فیصد ہے۔

ہاں! اس وقت یہ معاملہ ذرا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک کاروباری آدمی ہر مہینے کا حساب کیسے رکھے؟ مثلاً: ایک دن کسی شخص کی دکان میں ایک لاکھ کا سرمایہ تھا، دوسرے دن اس نے کپڑا خرید لیا تو اس کا سرمایہ فوراً دو لاکھ کا ہو گیا اور دس دن کے بعد اس کا سرمایہ آدھا بک گیا اور آدھا رہ گیا۔ مہینے کے بعد اس نے مزید چار لاکھ کا کپڑا لے کر ڈال دیا۔ اس صورت حال میں زکوۃ کی ادائیگی کے لیے حساب کتاب کیسے ہوگا؟ یہ بات سمجھ لیں کہ جب کوئی آدمی زکوۃ کے نصاب کا مالک ہوتا ہے تو اس وقت سے سال پورا ہونے پر اس سال کی زکوۃ فرض ہوتی ہے۔ درمیان میں اگر مال گھٹتا بڑھتا رہے تو اسی کو سال کے اندر شمار کرلے، اس لیے کہ ہر مہینے کا الگ حساب لگانا مشکل ہو جائے گا۔ کیونکہ ایک مال پر محرم میں سال پورا ہوگا تو دوسرے مال پر صفر میں پورا ہوگا۔ اس لیے سال میں ایک مہینہ معین کرلیں۔ مثلاً: آپ کہتے ہیں کہ میں تو رمضان میں زکوۃ ادا کروں گا یا محرم میں ادا کروں گا یا ذی الحجہ میں ادا کروں گا، تاکہ مجھے زیادہ ثواب ملے۔ تو آپ اسی مہینہ میں حساب کریں، جو خالص نفع تمہارے پاس آئے، اس کی قیمت لگا کر آپ اڑھائی فیصد زکوۃ ادا کریں۔

بعض لوگوں کو یہ مغالطہ بھی ہوتا ہے کہ چونکہ ساڑھے سات تولہ سونے پر زکوۃ ہے، اور میرے پاس ساڑھے دس تولہ سونا ہو گیا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اوپر جو تین تولے ہیں، ان کی ہم نے زکوۃ دینی ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ

ساڑھے سات تولے کے بعد جب ہم صاحبِ نصاب بن گئے۔ اس کے بعد اگر ہمارے پاس ساڑھے دس تولے سونا آگیا تو اب ہم فقط ساڑھے سات تولہ کے بعد حاصل ہونے والے سونے کی زکوٰۃ نہیں دیں گے، بلکہ پورے ساڑھے دس تولہ کی زکوٰۃ دیں گے۔

باقی جو صدقات ہیں، وہ تو انسان سال میں جب چاہے کرتا ہے اور جتنی اللہ تبارک وتعالیٰ توفیق عطا فرمائے، وہ کرتا ہے۔ وہ صدقاتِ نافلہ ہیں، لیکن زکوٰۃ اللہ کی طرف سے فرض ہے، جیسے نماز اور روزہ فرض ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر آج بھی دنیا صحیح معنوں میں زکوٰۃ دے اور صحیح لوگوں کو دے۔ ایسا نہ ہو جیسے ہمارے ہاں زکوٰۃ چلتی ہے کہ بعض مدرسے ہیں...... اللہ معاف فرمائے اور دعا کریں اللہ مجھے بچائے اور ہر مسلمان کو بچائے...... کہ ان کا فقط بورڈ لگا ہوتا ہے، اندر کوئی مدرسہ نہیں ہوتا۔ دو کمرے بنائے ہوتے ہیں، اوپر ایک بڑا بورڈ لگا ہوا ہے جس پر مدرسے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ مہتمم نے ایک حافظ بھی رکھا ہوا ہوتا ہے، ہزار روپے مہینہ اس کو تنخواہ دیتا ہے، وہ آٹھ دس بچے لے کر بیٹھ جاتا ہے، گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ وہ بچے پڑھتے ہیں اور پھر گھر بھاگ جاتے ہیں۔ نہ روٹی کا مسئلہ اور نہ کسی اور چیز کا مسئلہ، وہ تو بستی کے بچے ہوتے ہیں۔ اب مقامی لوگوں سے جھوٹی سفارشیں کرا کر زکوٰۃ حاصل کرتا ہے کہ اس کے پاس اتنے مدرس ہیں اور دو سو بچے ہیں اور کھانے پینے کا انتظام ہے۔

حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپے اس کی زکوٰۃ منظور ہو جاتی ہے۔ اب جب وہ زکوٰۃ لینے کے لیے جاتا ہے تو آگے کلرک اور افسر بیٹھے ہوتے ہیں جنہوں نے چیک پاس کرنے ہوتے ہیں، ان کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ اس کا کوئی مدرسہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: مولوی صاحب! ہم آپ کے مدرسہ کو جانتے ہیں، ہم نے آپ کی رپورٹیں دیکھی ہوئی ہیں، ہم نے آپ کا مدرسہ بھی دیکھا ہوا ہے، لہٰذا مہربانی کر کے بیس فیصد ہمیں دے دو اور باقی سارا لے جاؤ۔ اگر ہمیں بیس ہزار نہیں دیتے تو بھاگ جاؤ۔ موقع پر آئیں گے، انکوائری کریں گے کہ تمہارا مدرسہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ وہ بھی سمجھتا ہے کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ ان سے کہتا ہے: ٹھیک ہے بیس ہزار آپ رکھیں، اسی ہزار مجھے دے دیں۔ اسی ہزار اس بے ایمان کو مل جاتے ہیں، جس نے ''گزران العلوم'' بنایا ہوا ہے، ان میں سے دس ہزار اس نے مدرسہ کو دے دیئے اور ستر ہزار جیب میں ڈال لیے۔ مونچھوں کو تیل لگایا، گلے میں سبز کپڑا ڈالا، لوگوں نے دیکھا تو کہا: حضرت صاحب آگئے!!! کتنا آسان کام ہے۔

یاد رکھیں! جب تک زکوٰۃ صحیح بندے کو نہ دی جائے، ادا نہیں ہوتی۔ چنانچہ اگر آپ نے ایک آدمی کو زکوٰۃ دے

دی کہ بھائی! یہ میری طرف سے تقسیم کر دو۔ بعد میں اس نے تقسیم نہ کی تو آپ کے ذمہ سے ادا نہیں ہوگی۔ ایک تو وہ لینے والا گناہ گار ہوگا کہ اس نے بے ایمانی کی اور زکوٰۃ کا پیسہ کھایا، دوسرا تمہاری بھی زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔ مشکل دونوں پر ہے۔

اسلام نے کتنا اچھا اصول بنایا ہے کہ ہر آدمی اپنی زکوٰۃ کا خود حساب کرے۔ اور اللہ نے فرمایا: سب سے پہلے اپنے غریب رشتہ داروں کو دو۔ ہر آدمی کو اپنے رشتہ داروں کا پتہ ہوتا ہے کہ میری بہن غریب ہے، میری چچازاد، میری پھوپھی زاد بہن غریب ہیں۔ اگر...... خدا رحمت کرے...... تیرے رشتہ داروں میں کوئی غریب نہیں ہے تو اپنے محلے کے غریبوں کو دو۔ دور والوں کو تو نہیں، البتہ آدمی اپنے محلے میں تو جانتا ہی ہے کہ فلاں شخص غریب ہے۔ اگر محلے میں بھی کوئی نہیں تو اپنے شہر والوں کو دو۔ شہر والوں میں بھی کوئی غریب نہیں تو قریب کے شہر والے کو زکوٰۃ دو۔

وہاں بھی کوئی نہیں تو پھر بہتر حل یہ ہوتا ہے کہ جو دین کے صحیح مدرسے ہیں، ان میں جمع کرا دو...... کیونکہ یہ بھی نہیں کہ ساری دنیا جھوٹ بول رہی ہے...... بڑے بہترین مدارس بھی قائم ہیں جن کے اندر...... ماشاء اللہ!...... اللہ کی رحمت ہے، ہزار ہزار، دو دو ہزار طلبہ پڑھ رہے ہیں، آپ انکھوں سے جا کر دیکھ لیں کہ کون سا مدرسہ صحیح طریقہ سے چل رہا ہے؟ جو صحیح چل رہا ہو تو سمجھو کہ یہ خرچ بھی صحیح کر رہا ہے۔ کیونکہ جس ادارے میں زکوٰۃ کی رقم صحیح مصرف میں خرچ نہ ہو تو وہ قائم نہیں رہ سکتا۔

یہ لوگ بھی صحیح مصرف میں خرچ کرتے ہیں اور ان کو پتہ ہوتا ہے کہ مدزکوٰۃ کو ہم نے کہاں خرچ کرنا ہے۔ وہ زکوٰۃ کے پیسوں سے اپنے مدرسین کو تنخواہ نہیں دے سکتے، زکوٰۃ کے پیسوں سے مدرسے کی تعمیر نہیں کر سکتے، زکوٰۃ کے پیسوں سے مسجد نہیں بنا سکتے، زکوٰۃ کے پیسوں سے مسجد کے اندر کوئی قالین، غالیچے نہیں ڈال سکتے۔ تو جو صحیح مدرسے والے لوگ ہیں وہ زکوٰۃ کے پیسوں کو علیحدہ رکھتے ہیں، زکوٰۃ کو مطبخ میں بچوں کے کھانے پر خرچ کرتے ہیں، بچوں کے کپڑوں اور وظائف پر خرچ کرتے ہیں۔

زکوٰۃ کی تملیک کا حیلہ:

بعض مدرسہ والوں نے تو بڑا اچھا انتظام کیا ہے...... اللہ ان علماء کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے اور اللہ ہمیں ان کے طریقوں پر چلنے کی توفیق دے...... انہوں نے زکوٰۃ کے خرچ کرنے کا ایک بڑا اچھا حل نکالا ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے ہر طالب علم کے لیے چار سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو چار سو روپے اس

طالب علم کو پکڑا دیتے ہیں، اس طرح زکوٰۃ دینے والے کی زکوٰۃ صحیح ادا ہو گئی۔

اب مدرسہ بے چارا کہاں سے خرچ کرے؟ مدرسے بھی تو غریب ہوتے ہیں، ان کی آمدنی بھی یہی زکوٰۃ ہوتی ہے، صدقات ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مطبخ کا خرچہ چار سو روپے رکھا ہوا ہے۔ طالب علم کو چار سو روپے دے دیئے اور اس کو کہہ دیا کہ تم نے مطبخ سے کھانا ہے تو وہاں جا کر چار سو روپے جمع کرواؤ۔ اس نے ادھر سے لے لیے تو مالک بن گیا اور مطبخ میں جا کر جمع کرا دیئے۔ بندہ حلال کا بھی کھاتا رہا اور مدرسہ بھی چلتا رہا۔ زکوٰۃ بھی صحیح ادا ہو گئی، کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے کسی کو مالک بنانا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً: میں نے ہزار روپے زکوٰۃ نکالی ہے تو مجھ پر لازم ہے کہ میں کسی کو اس کا مالک بناؤں، وہ ان پیسوں کو اپنے قبضے میں لے اور پھر اپنی مرضی سے خرچ کرے، تب جا کر یہ زکوٰۃ ادا ہوتی ہے۔

بعض مدرسوں والے پہلے یہ کرتے تھے کہ طالب علم کو دو سو دے دیئے کہ یہ زکوٰۃ کے ہیں، لے لو اور اس کے بعد اس کو کہا کہ جلدی کرو، ادھر رکھو، اپنا مہینے کا خرچ مدرسے میں جمع کراؤ۔

یہ بڑا اچھا طریقہ ہے کہ کھانے کی قیمت معین کر دی جائے۔ لڑکے کو آپ نے ماہانہ وظیفہ دے دیا، لڑکا ان پیسوں کا مالک بن گیا۔ وہ آپ کے مطبخ سے کھانا نہیں کھانا چاہتا تو نہ کھائے۔ بعض لڑکے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں مدرسہ کے مطبخ سے نہیں کھانا ہے، لہٰذا وہ پیسے جمع نہ کرائے، نہ اس کو کارڈ ملے گا اور نہ کھانا ملے گا۔ جہاں سے اس کی مرضی آئے، جا کر کھالے۔

زکوٰۃ کے مستحقین:

زکوٰۃ کے مستحقین معین ہیں، ان مستحقین کے علاوہ کسی جگہ خرچ نہیں کی جا سکتی۔ اللہ نے قرآن میں حصر کر دیا ہے کہ زکوٰۃ صرف ان لوگوں پر خرچ ہو سکتی ہے جو فقیر ہیں، جو مسکین ہیں، اسی طرح جن کو ڈیوٹی پر لگایا ہوا ہے کہ زکوٰۃ وصول کرو یا ایسے لوگ جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوتے ہیں، اگر ان کے پاس پیسہ نہیں ہے تو ان کی تالیف قلب کے لیے ان کو زکوٰۃ دیں۔ وہ یہ تو نہ سمجھیں کہ ہم نے اچھا مذہب قبول کیا کہ روٹی بھی نہیں ملتی، کھانا بھی نہیں ملتا۔ اسی طرح کسی آدمی کی گردن پھنسی ہوئی ہے، مثلاً اس سے ایکسیڈنٹ ہو گیا، اس نے دیت بھرنی ہے تو اس کو چھڑائیں۔ یا کوئی غلام ہے آزاد ہونا چاہتا ہے تو اس کو چھڑائیں۔ کوئی آدمی قرضوں میں جکڑا ہوا ہے آپ اس کو قرضہ سے چھڑانے کے لیے زکوٰۃ دیں، زکوٰۃ کے پیسے کا اس کو مالک بنائیں، یعنی وہ لے لے، اب اس کی جو

مرضی آئے وہ کرے۔

ہمارے ہاں بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ کسی غریب رشتہ دار کو زکوٰۃ کے پیسے دے کر حج پر بلا لیتے ہیں...... ہمارے یہاں مکہ مکرمہ میں رہنے والوں میں یہ بڑی مصیبت پھیلی ہوئی ہے......وہ کہتے ہیں کہ مثلاً میری بہن غریب ہے اور میں اس کو حج کرانا چاہتا ہوں اور میرے پاس زکوٰۃ کے پیسے ہیں۔اب مثلاً چالیس ہزار روپے میں داخلہ ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں ان کو چالیس ہزار کا ڈرافٹ بھیج دیتا ہوں یا میں اس کو پارسل کر دیتا ہوں، تا کہ میری بہن حج کرلے۔

اللہ کے بندے! جب چالیس ہزار تم نے اس کو دے دیا تو وہ خود زکوٰۃ دینے والی بن گئی۔اس کے پاس تو اتنا پیسہ آ گیا کہ وہ صاحب نصاب بن گئی۔اور پھر تمہارا یہ شرط لگانا بھی صحیح نہیں کہ میں زکوٰۃ دوں گا، اور تم یہ پیسے حج میں لگاؤ۔تمہارا کام یہ تھا کہ تم اس کو زکوٰۃ کے پیسے بھیج دو، وہ اپنے ہاتھ میں لے لے۔اس کے بعد اگر اللہ کی توفیق سے وہ جہاں خرچ کرے، اس پر کوئی پابندی نہیں۔

اپنی زکوٰۃ دو بھی اور اس کو ضائع بھی نہ کرو۔سب سے پہلے یہ کام کرو کہ اپنے غریب رشتہ داروں کی ایک فہرست بنا کر اپنے پاس رکھ لو اور سال کے بعد جب اللہ تمہیں توفیق دے تو باقاعدہ زکوٰۃ ان کے پاس بھیجو اور ان کو مالک بناؤ۔ اور ان سے کہو کہ اب تمہاری مرضی ہے، ان پیسوں کو جہاں خرچ کرو، ہماری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ہم نے تو زکوٰۃ دینی تھی، وہ آپ کو دے دی۔اور اس کے علاوہ جو صحیح دینی مدارس ہیں، وہاں بھی زکوٰۃ لگائی جا سکتی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ زکوٰۃ فریضہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے اور زکوٰۃ اور نماز نہ ہو تو باقی تمہارے کسی عمل کے قبول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۴، البقرۃ: الآیۃ: ۴۳]

ربیع الاول میں عمرہ کا اہتمام:

اب دیکھا نہیں کہ ربیع الاول میں عمرے پر بڑا زور ہے، گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔کیا ہے کہ حضور پاک ﷺ کے میلاد مبارک کا مہینہ ہے۔اگر کوئی پوچھے کہ حضور پاک ﷺ نے جو نماز کا حکم دیا ہے وہ کب پڑھیں گے؟ تو جواب ملتا ہے: بس جی! اس کے لیے دعا کریں۔

حضور اکرم ﷺ کی محبت ہے تو سنت کی اتباع کرو:

بھائی! حضور پاک ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری سنت کے مطابق شکل بناؤ، سنت کے مطابق کھاؤ، سنت کے مطابق پیو۔ اگر تمہیں حضور پاک ﷺ کی ولادت سے محبت ہے تو حضور ﷺ کی اتباع کرو، حضور ﷺ کے حکم پر چلو، حضور ﷺ کے دین اسلام کا جو مشن ہے اسے زندہ رکھو، قائم رکھو۔ جھنڈیاں لگانے سے تو دین نہیں آجاتا۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے کہ اس مہینے میں آپ پورا زور لگا دیں اور اس کے بعد نماز غائب، روزہ غائب۔ ایک رات تو تم کھڑے ہو جاؤ کہ آج حضور ﷺ کی پیدائش کے مہینے کی رات ہے اور پیدائش والا دن ہے، آج تو سو نفل پڑھ لو اور صبح کو فرض نماز بھی نہ پڑھو تو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ اسلام نے جو باتیں سکھائی ہیں، ان پر عمل کریں۔

ایک صحابی نے آکر پوچھا: حضور! اللہ نے کتنی نمازیں فرض کی ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اس نے کہا: مجھے اللہ کی قسم ہے! نہ میں بڑھاؤں گا اور نہ گھٹاؤں گا۔ بس جو آپ نے حکم دے دیا ہے، اس کو پورا کروں گا۔ جب وہ جانے لگا تو حضور ﷺ نے فرمایا: اگر کسی نے جنتی بندہ دیکھنا ہو تو اس کو دیکھ لو۔ یہ جنتی ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث:۱۸۹۱، بَابُ وُجُوبِ صَوْمِ رَمَضَانَ]

حق چھپانے والے علماء کا انجام؟

میرے عزیز! اللہ کے کعبہ میں بیٹھ کر میں آپ کو دیانتداری سے بات بتاؤں کہ جو علماء حق کو چھپاتے ہیں یا حق کو ملاتے ہیں، ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو یہودیوں کے علماء کا ہوگا۔

اس لیے سب سے پہلے اپنے عقیدے کو ٹھیک کرلو۔ عقیدے میں ذرا سی بھول آئی تو سمجھو پھر جہنم ہے۔ عقیدہ اتنا ٹھیک ہو جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام منجنیق میں بیٹھے ہوئے ہیں، فرشتے اللہ کے حکم سے آرہے ہیں...... تم تو کہتے ہو کہ ہم اللہ کے پیاروں سے کہتے ہیں اور پیارے آگے کہتے ہیں، ہم ان کو کہتے ہیں یہ اس کو کہتے ہیں۔ ہماری سنتا نہیں، ان کی موڑتا نہیں...... اب دیکھیں کہ اللہ کے فرشتے آگئے، اللہ کی اجازت سے آئے اور فرشتے نے آکر عرض کیا: اے ابراہیم الخلیل! پہاڑوں پر میری ڈیوٹی ہے اور میں اللہ سے تمہاری مدد کرنے کی اجازت لے کر آیا ہوں، آپ مجھے حکم دیں کہ میں ان کافروں پر پہاڑوں کو ملا دوں، یہ ظالم خود بخود اسی آگ کے اندر بھسم ہو کر رہ جائیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: مجھے کیا ضرورت ہے تم سے مدد لینے کی؟ سارے فرشتے آتے رہے اور آپ

انہیں یہی جواب دیتے رہے۔ آخر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے، انہوں نے فرمایا: آپ مجھے حکم دیں اور آپ نبی ہیں اور میری طاقت کو جانتے ہیں، ایک ہاتھ پر اُٹھا کر ان سب کو پھینک دوں۔ فرمایا: جبرائیل! مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ اب جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا: اگر آپ کو فرشتوں کی مدد کی ضرورت نہیں تو اللہ سے مانگ لیں، اللہ سے مانگنا تو منع نہیں، آپ تو دعا بھی نہیں کر رہے۔

ابراہیم علیہ السلام مسکرا دیئے اور فرمایا: جبرائیل! مجھے ایک بات بتاؤ کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، میرے اللہ کے علم میں ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ واقعی اللہ کے علم میں ہے۔ فرمایا: جب اللہ کے علم میں ہے تو پھر مانگنے سے کیا فرق پڑے گا؟ جب وہ جانتے ہیں کہ خلیل جلنے والا ہے، وہ جلانے پر راضی ہے تو ہم بھی راضی ہیں۔ دروازہ تو میں اس کا کھٹکھٹاؤں جسے پتہ نہ ہو کہ کون سائل میرے دروازے پر کھڑا ہے؟ وہ جانتے ہیں آگ ان کے حکم کے بغیر جلا نہیں سکتی، کوئی حرکت اور کوئی تصرف اس کے حکم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی اگر میرے جلانے پر راضی ہیں تو میں ان کا بندہ ہوں، میں بھی راضی ہوں۔

[تفسیر الرازي، الانبیاء: الآیۃ:۶۹]

ایمان سے بتلاؤ کہ پھر اللہ کی مدد آئی یا نہیں؟ پھر آگ گلزار بن گئی کہ نہیں؟ اس لیے سب سے پہلے اپنے عقیدوں کی اصلاح کرو اور اس کے بعد اللہ نے جو فرائض رکھے ہیں ان کو پورا کرو اور اس کے ساتھ کبائر سے بچو اور پھر دیکھو کہ اللہ کی مدد کیسے آتی ہے۔

صدقۃ الفطر:

حضرت حارث العکلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ سے صدقہ فطر مراد ہے۔

صدقہ فطر کا حکم یہ ہے کہ اس دن نماز عید کے ادا کرنے سے پہلے دے دیا جائے۔ یہاں کے علمائے کرام نے اس کا وزن تقریباً تین کلو چاول رکھا ہوا ہے۔ اور ائمہ احناف کے نزدیک پونے دو سیر گندم یا احتیاط میں دو سیر ہے۔ ایک فرق صدقہ فطر میں یہ بھی ہے کہ ان ائمہ کے نزدیک صدقۃ الفطر جنس کے بغیر ادا نہیں ہوتا۔ آپ کھجوریں دیں، یا آپ کشمش دیں یا آپ چاول دیں یا آپ گندم دیں۔ جنس کو چھوڑ کر قیمت دینے سے ادا نہیں ہوگا۔ صرف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک قیمت سے بھی ادا ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اگر آدمی نے وہ جنس نہیں دی، بلکہ اتنے پیسے دے دیئے تو مقصد غریب کو نفع پہنچانا ہے۔ ان چیزوں کو لے کر وہ بیچے گا تو کھانا کھاتا پھرے گا۔

بہر حال باقی ائمہ کے نزدیک جنس دینا ضروری ہوتا ہے اور حنابلہ کے نزدیک بھی جنس دینا ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنس ادا کرو۔

﴿وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ۝﴾ [البقرۃ: ۴۳] اللہ نے حکم دیا تم ان مومنوں کے ساتھ مل جاؤ۔ اور سب سے احسن اور افضل عمل نماز ہے، جس نے نماز ٹھیک کر لی، اس کے سارے عمل ٹھیک ہو گئے، اگر نماز ٹھیک نہ ہوئی تو کوئی عمل ٹھیک نہ ہوگا۔

اس آیت سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ جماعت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے۔

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝﴾
[البقرۃ: ۴۴]

کیا تم لوگوں کو نیک کام کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھولتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو، پھر کیوں نہیں سوچتے؟

مسلمانوں میں عملی انحطاط:

یہاں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک نئے اسلوب سے مخاطب فرمایا ہے، اس میں زجر و توبیخ اور تہدید ہے اور قیامت تک امت محمدیہ کے لیے ہدایت بھی ہے۔

یہ بیان کیا کہ آدمی لوگوں کو تو بھلائی کا حکم کرے، لیکن خود اپنے اوپر اس بھلائی کو نافذ نہ کرے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ جیسا کہ یہود کے علماء کی یہ عادت تھی کہ وہ لوگوں کو تو بھلائی کا حکم دیتے تھے کہ تم اللہ اور اس کے رسولوں کی اطاعت کرو اور اللہ کی کتاب پہ عمل کرو، لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی مصیبت ہے کہ آدمی لوگوں سے تو کہے، لیکن خود عمل نہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں جہاں بھی آپ نظر ڈالیں گے عالم اسلام میں مسلمانوں کی حالت زار انتہائی خطرناک حد تک تباہ کن ہے، اگر عالم اسلام کے اعتقاد پر نظر ڈالیں تو حالت تباہ ہے، اسی طرح ان کے معاملات پر

نظر ڈالیں تو حالت تباہ ہے، عبادات پر نظر ڈالیں تو بھی حالات تباہ ہیں اور ان کی موجودہ دور کی جو ضروریات ہیں یا ان کے قوانین ہیں، نظام ہیں، اقتصادیات ہیں اور معاشیات ہیں، سب میں مسلمان کی حالت بڑی خراب ہے۔

اعتقادیات پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ آج کتنے مسلمان ہیں جو کلمۂ شہادت بھی ادا کرتے ہیں اور اللہ کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن نے فرمایا: ﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ [یوسف:۱۰۶] ایسے لوگ ہوں گے کہ اللہ پر ایمان بھی لانے والے ہوں گے اور اس کے ساتھ شرک کرنے والے بھی ہوں گے، کلمہ پڑھنے والے ہیں، "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھ رہے ہیں، ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کا ورد کر رہے ہیں، نمازوں میں ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ [سورۃ الفاتحہ] یہ سب پڑھ رہے ہیں اور قبروں پر سجدے بھی کر رہے ہیں، قبروں کے طواف بھی کر رہے ہیں، قبروں پر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہیں اور اُلٹے پاؤں چل رہے ہیں اور ان کی تعظیم بھی وہی کر رہے ہیں جو اللہ کے گھر کی تعظیم ہے۔

اسی طرح ان کے مسائل نبوت میں عقیدوں کو دیکھو تو کتنے لوگ ہیں جو قادیانیت کے فتنہ میں مبتلا ہو گئے؟ کتنے لوگ ہیں جنہوں نے نبوت کے مرتبہ کو اُلوہیت کے ساتھ ملا دیا؟ عبادات پر نظر ڈالیں، کتنے لوگ ہیں جو نمازیں پڑھتے ہیں؟ میرے خیال میں اگر پوری نسبت نکالی جائے تو پانچ فیصد بھی نمازی نہیں نکلیں گے، یعنی پچانوے فیصد مسلمان تو نماز پڑھتے ہی نہیں، بلکہ ان میں سے یوں سمجھیں کہ اسی فیصد کو تو نماز کا علم ہی نہیں ہے، ان کو پتہ ہی نہیں کہ نماز کیا ہے؟

کتنے لوگ ہیں جو مکہ میں رہتے ہیں، ...... ماشاء اللہ! ...... سفید داڑھیاں ہو گئیں، لیکن نماز نہیں آتی، ان کو اب تک دعائے قنوت نہیں آتی، نماز جنازہ کی دعائیں نہیں آتیں، ان کو فاتحہ کا قرآن کے حقوق کے مطابق تلفظ کرنا نہیں آتا اور صحیح لفظ پڑھنے نہیں آتے اور عمر ستر سال ہو گئی ہے۔ مکہ کے اندر بھی ایسے لوگ ہیں۔

واقعہ:

ایک دوست واقعہ سنا رہے تھے کہ میں ایک اسلامی ملک میں گیا۔ مسلمانوں کا ملک ہے، کافروں کا نہیں۔ اور

وہاں تفریح گاہ میں گیا، تا کہ سانس بھی لوں اور آرام بھی کروں اور کوئی چائے پی لوں۔ اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا۔ خیال تھا کہ کہیں سے اذان کی آواز آئے گی تو نماز پڑھوں گا، لیکن کہیں سے بھی آواز نہ آئی۔ میں نے سوچا، ممکن ہے کہ مسجد دور ہو، اذان کی آواز مجھے نہ آئی ہو۔ چلو ان مسلمانوں میں سے کچھ لوگ نماز کے لیے اُٹھیں گے تو میں بھی ان کے ساتھ نماز پڑھنے چلا جاؤں گا، لیکن ان میں سے بھی کوئی نماز کے لیے نہیں اُٹھا۔ اب میں اکیلا اُٹھا، میں جانتا تھا کہ قبلہ کس طرف ہے۔ چنانچہ میں نے اسی طرف رُخ کر کے اذان دی اور اس کے بعد خود ہی اقامت کہنا شروع کی کہ شاید کوئی شریک ہو جائے، لیکن کوئی شریک نہیں ہوا۔ میں نے اکیلے نماز پڑھی، پورا پارک لوگوں سے بھرا ہوا تھا، کم از کم اس میں دو سو سے اوپر لوگ ہوں گے اور میں اکیلا نماز پڑھ رہا ہوں۔ ان میں سے ایک بھی نہیں اُٹھا کہ چلو میری جماعت ہو جائے۔

نماز سے فارغ ہو کر میں اسی میز کرسی پر آ کر بیٹھا تو تھوڑی دیر بعد اس ایریا کا مالک میرے پاس آیا، بڑے ادب سے اور احترام سے ملا اور کہنے لگا: میں ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ مہربانی کر کے مان لیں۔ میں نے پوچھا: آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا کہ آپ مہربانی کر کے عشاء کی نماز میرے گھر میں پڑھ لیں، میری عمر اس وقت پچاس سال ہو گئی ہے، لیکن پچاس سال سے ہمارے گھر میں نماز نہیں ہوئی ہے۔ میں نے آج آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، مجھے تو آتی نہیں، چلو کم از کم تم میرے گھر میں نماز پڑھ لو۔ مسلمان کا گھر ہے، شاید تیرے نماز پڑھنے سے اللہ تعالیٰ کوئی رحمت فرما دیں۔ یہ مسلمان ملک کی بات ہے۔

اسی طرح آپ گاڑیوں میں سفر کریں، ٹرین میں سفر کریں، ہوائی جہاز میں سفر کریں اور بسوں میں سفر کریں۔ آپ خود اندازہ لگا لیں گے کہ ان میں سے کتنے آدمی ہیں جو اُٹھ کر نماز پڑھتے ہیں؟ کیا باقی سفر کرنے والے مسلمان نہیں ہوتے؟

جب کافروں کے جہازوں میں یا ایئر لائنز میں سفر کرتے ہیں، ان کو اگر ہم کہیں کہ ہم نے نماز پڑھنی ہے، آپ نے ہمیں نماز کے ٹائم کے مطابق باخبر کرنا ہے تو وہ بے چارے ہمارے لیے بہت محنت کرتے ہیں، پہلے وہ اوقات کے ٹائم ٹیبل نکالتے ہیں کہ آپ کے ملک کا کیا ٹائم ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ اور اب یہاں کیا ٹائم ہوگا؟ اور پھر وہ مکمل سے حساب کر کے قبلہ ڈھونڈتے ہیں اور پھر ان کی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ نماز پڑھنے کی جگہ آپ کے لیے کھلی رہے، آپ وہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیں۔

اس کے برعکس اگر آپ اپنے ساتھ بیٹھے کسی مسلمان سے نماز پڑھنے کا کہہ دیں تو وہ آپ کو یوں جواب دے گا: تُو اتنا بڑا نمازی کہاں سے آ گیا! ابھی تو مسافر ہو، جہاز سے اُتر کر پڑھ لینا، کون سا ابھی مر رہے ہو؟ جہاز میں کوئی نماز نہیں ہوتی، ہم نے بڑے نمازی دیکھے ہیں، لیکن تم جیسا کوئی نہیں دیکھا۔

یہ مسلمان کا رویہ ہے!! ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ آدمی کو غیرت ہو تو اسی وقت مر جائے، چہ جائیکہ وہ بھی ہاں میں ہاں ملائے اور یہ کہے کہ میں بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھ لیتا ہوں، یا صرف اتنا ہی کہہ دے کہ بڑی اچھی بات ہے، ایک بھائی نماز پڑھ رہا ہے۔ نہیں، بلکہ اس کی بجائے اُلٹا پڑھنے والے پر طنز کرے گا اور پھر پڑھنے والے کے سامنے سو بہانے بنائے گا کہ آپ وضو کیسے کریں گے؟ یہاں تو جگہ تنگ ہوگی، آپ ہاتھ کیسے دھوئیں گے؟ اور منہ کیسے دھوئیں گے؟ جب آدمی کی نیت بد ہو تو ہزار بہانے ہوتے ہیں اور نیت ٹھیک ہو تو کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے سارے اسباب مہیا فرما دیتے ہیں اور نماز پڑھنے سے اطمینانِ قلب الگ حاصل ہوتا ہے، اللہ کی رضا علیحدہ حاصل ہوتی ہے۔

اور اس کی وجہ سے کافر لوگ ہم فقیروں کی خدمت بھی زیادہ کرتے ہیں۔ دوسروں کو اگر ایک دفعہ چائے پوچھیں گے تو ہم سے چار دفعہ پوچھیں گے۔ یہ بھی پوچھیں گے کہ کوئی گرم چیز بنا کر آپ کے لیے لے آئیں؟ میٹھا کتنا ڈالیں؟ صرف اس وجہ سے کہ چلو کوئی تو ہے اللہ کا نام لینے والا۔

عالم اسلام میں جہاں بھی نظر ڈالو، اعتقادیات میں ختم، عبادات میں ختم اور معاملات میں ختم ہیں۔ معاملات کا یہ عالم ہے کہ کسی کو امانت دے کر تجربہ کر لو کہ وہ چیز واپس ملتی ہے؟ قرض دے کر تجربہ کر لو تمہیں ملتا ہے؟ تمہیں بتلائیں گے کچھ اور کریں گے کچھ۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ معاشرے کو چلانے کے لیے جو قوتیں درکار ہوتی ہیں، ان میں بگاڑ آ چکا ہے۔ ایک وہ قوت ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، کرسی ہو، قانون ہو، جس کا حکم چلتا ہو اور ایک وہ قوت ہے جس کی حکومت انسانوں کے دلوں پر ہو، یعنی علماء کرام، لوگوں کے دلوں میں جن کا احترام ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ دو طاقتیں انجن ہیں جو ٹرین کو پٹڑی پر چلانے والی ہیں اور جب یہ دو قوتیں بگڑ جائیں تو ضروری بات ہے کہ نقصان ہوگا۔ جب آپ کی گاڑی کا انجن فیل ہو جائے تو گاڑی کھڑے ہو جائے گی، پھسل جائے گی تو پوری گاڑی پٹڑی سے اُتر جائے گی، بکھر جائے تو پوری گاڑی تباہ ہو جائے گی۔

اور یہ دونوں طبقے ہمارے اندر سے پیدا ہوتے ہیں، باہر سے تو نہیں آتے۔ جو مولوی پیدا ہوں گے کیا وہ کسی اور ملک سے آئیں گے؟ امپورٹ کر کے کاروبار کے ذریعے منگوائے جائیں گے؟ وہ بھی ہمارے اندر سے نکلیں گے، ہمارے بیٹے ہوں گے، ہماری اولادیں ہوں گی، ہمارے بھائی ہوں گے، ہمارے رشتہ دار ہوں گے، ہماری قوم کا آدمی ہوگا۔ چونکہ ہمارے عمل اتنے تباہ و برباد ہو چکے ہیں، اس لیے اب جو ہمارے اندر سے کریم نکلتی ہے، وہ بھی زہریلی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پورے عالم کے اندر اللہ کی شریعت کے اوامر، اسلامی نظام، اور جو شرائع تھے، وہ ختم ہو گئے۔

اس لیے حکم ہوتا ہے کہ آدمی کسی کو حکم کرے تو خیر کا حکم کرے۔ اللہ نے حضور ﷺ کی اُمت کو "خَيْرَ أُمَّةٍ" بھی اسی لیے فرمایا ہے کہ کسی دوسری اُمت کی اتنی بڑی ذمہ داری نہیں آئی، جتنی اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذمہ داری آئی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾
[آل عمران:۱۰۴]

اسی طرح فرمایا:

﴿وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾ [سورۃ العصر]

چونکہ رسول اللہ ﷺ کی اُمت خیر الامم ہے، افضل الامم ہے، اشرف الامم ہے اور خاتم الامم ہے، اس لیے اس کی ذمہ داری بھی عظیم ہے۔ چنانچہ جب آپ کسی کو خیر کا امر کریں تو اس سے پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کر لیں۔ کیونکہ علماء کا یہ قاعدہ ہے کہ جو شخص کامل فی ذاتہ نہ ہو، وہ کامل لغیرہ کیسے بنے گا؟ جب وہ خود کامل نہیں بنا تو کسی اور کو کیا کامل بنائے گا؟ یوں سمجھ لیں کہ ایک کمہار ہے جو مٹی کے گلاس بناتا ہے، اگر وہ خود گلاس بنانا نہ جانے تو تمہیں کیسے سکھلائے گا؟ جب اپنے فن میں وہ خود کامل ہوگا تب ہی وہ کسی کو سکھلا سکے گا۔

دوسری اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ کسی دوسرے آدمی کو حکم کرتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے تو اس حکم کا اثر نہیں ہوتا۔ لوگ ایک کان سے سن لیں گے اور دوسرے کان سے نکال دیں گے۔ لوگوں پر صرف اس بات کا اثر ہوتا ہے جو دل سے کہی جائے۔ بقول شاعر:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں ، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

جب کوئی بات دل سے نکلے اور بات کہنے والا خود اپنی اس بات پر عمل کرنے والا ہو تو اس بات کو طاقتِ پرواز مل جاتی ہے۔ آپ کسی سے کہیں کہ سونا چاندی جمع نہ کرو، دولت کے چکر میں نہ پڑو، یہ آنی جانی چیزیں ہیں، بس اتنا مال اپنے پاس رکھو کہ عزت کے ساتھ زندگی گزر جائے، زیادہ جھنجھٹ میں نہ پڑو، اصل زندگی تو آخرت کی ہے اور اس کے لیے تیاری کرو۔ دوسری طرف خود تمہارے گھر میں سونے اور چاندی، محلات، گاڑیاں اور کاریں ہوں تو دوسرے پر کیا اثر ہوگا؟

واقعہ:

مثل مشہور ہے کہ ایک بزرگ کی خدمت میں ایک بوڑھی عورت بچہ لے کر آئی اور کہنے لگی کہ اس کو گڑ کھانے کی بڑی عادت ہے، یہ بہت میٹھا کھاتا ہے، کہیں بیمار نہ ہو جائے۔ اس پر دَم کر دیں۔ انہوں نے فرمایا: اس کو کل لے آنا۔ جب وہ بڑھیا چلی گئی تو ساتھیوں نے کہا: حضرت! آپ نے دعا کرنی تھی، آج ہی دعا فرما دیتے، باقی معاملہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ فرمایا: گڑ کھانا کوئی حرام تو نہیں ہے، آج میں نے صبح خود گڑ کھایا تھا تو اس کے لیے کیسے دعا کرتا؟

حضور اکرم ﷺ کی مشقت:

سب سے افضل ذات میرے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ آپ کی شان کے برابر نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ قیامت تک کوئی پیدا ہوگا...... صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم...... اس ذات پاک کو دیکھو کہ ولادت کے بعد سے لے کر چالیس سال تک مکہ میں زندگی گزارنی پڑی اور ہر مشقت والے کام سے گزرنا پڑا۔ کبھی بکریاں چرانی پڑیں اور کبھی تجارت کرنی پڑی، کبھی سفر کرنے پڑے۔ عین کٹھالیوں میں سے نکال کر اور پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا، مہینوں مہینوں حضور ﷺ اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں...... آپ ذرا تصور تو کریں، رات کو آدھا گھنٹہ جاگ کر بیٹھیں، آپ کو پتہ چل جائے گا کہ کتنا مشکل کام ہے!!...... جب اللہ نے اپنی نبی کی تکمیل کر لی، بالکل ''سِرَاجًا مُّنِيرًا'' ہیں، اب حکم ہوا کہ اُٹھو اور لوگوں کو دعوت دو۔ اور پھر یہی وجہ تھی کہ اگر غزوۂ خندق کے موقع پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے پیٹ پر ایک پتھر باندھا ہوا تھا تو آمنہ کے لعل نے دو پتھر باندھے ہوئے تھے۔

ایک مرتبہ نماز کی اقامت ہوگئی، آپ ﷺ فوراً گھر میں تشریف لے گئے اور پھر واپس آ کر نماز پڑھائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ آپ نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا کہ تکبیر ہو جائے اور آپ گھر چلے جائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں جب مصلّٰی پر آیا تو مجھے یاد آیا کہ میرے گھر میں سونے کی ڈلی پڑی ہوئی ہے، میں نے سوچا کہ یہ نبی کی شان نہیں کہ وہ نمازیں پڑھائے اور گھر میں سونا پڑا ہوا ہو۔ چنانچہ میں جا کر حکم دے آیا کہ خیرات کردو، اور پھر آ کر نماز پڑھائی۔

آج جو شخص اپنے آپ کو دین پر سمجھتا ہے کہ میں دین پر پکا ہوں، اس کا دین بھی بس دو چار باتوں میں محدود رہ گیا ہے اور اتباعِ سنت کا معاملہ چند عبادات میں رہ گیا ہے...... اللہ رحمت کرے...... ان کے گھروں میں دیکھو تو آپ کو پوری انگریزی تہذیب نظر آئے گی، تمام دنیا کے کفار کے جو قیمتی قالین ہوں گے وہ ان کے گھر پڑے ہوں گے، تمام دیواروں پر ریشمی پردے لہرا رہے ہوں گے اور ان کے پانی کے گلاس ایسے ہوں گے جیسا کہ شراب کے جام ہوتے ہیں، ان کی کرسیاں، ڈائننگ ٹیبل، بیڈ روم اور ڈرائنگ روم دیکھیں تو آپ حیران ہو جائیں گے!! وہاں ان کو حضور ﷺ کی سنت نظر نہیں آتی، وہاں سنتِ رسول کہاں چلی جاتی ہے؟ وہاں کیوں کسی سنت والے کو درد نہیں آتا کہ ان کے گریبان کو پکڑ کر جھنجوڑے کہ یہاں تمہارے پاس کیوں سنت نہیں ہے؟ وہاں ان کے گریبانوں میں ہاتھ کیوں نہیں ڈالا جاتا جہاں ایک شادی پر کئی کئی لاکھ خرچ کرتے ہیں؟

مجھے بتلایا گیا کہ ایک جگہ ان کے شادی گھر کا ایک رات کا کرایہ ایک لاکھ چھپن ہزار ریال تھا۔ اگر آپ اپنے پیسوں میں حساب کریں تو کتنا بنے گا؟ چلو اپنے پیسوں میں بھی حساب نہ کرو، اس کے پیسوں میں رہنے دو، تب بھی کتنی بڑی رقم ہے! میں نے کہا: خدا کے بندے! کون سا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا کہ ڈیڑھ لاکھ صرف رات کے چھ یا آٹھ گھنٹے کا کرایہ ادا کرنا پڑا؟ اس کے متبادل اگر تم اپنے کسی دوست کی اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ دو چار کوٹھیاں خالی کروا لیتے یا شامیانوں سے چاندنی لگوا دیتے تو اس سے ڈبل رونق ہوتی اور خرچ بھی کم ہوتا، پچاس ہزار میں تمہارا کام نکل جاتا۔ کہنے لگے: جی! کیا کریں؟ لڑکی والے نہیں مانتے تھے، ہم نے انہیں بڑا سمجھایا۔ اور پھر کہنے لگے کہ یہ ہمارا کم از کم ریٹ ہے، ورنہ یہاں تین لاکھ، چار لاکھ، پانچ لاکھ ایک رات کا کرایہ دینا پڑتا ہے۔ اب یہ جو انتظام ہو رہے ہیں، کیا یہ سنت کے مطابق ہیں؟

حضور ﷺ جنگ سے تشریف لا رہے تھے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کے استقبال کے لیے چادر کا ایک

صرف ٹکڑا دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ جب حضور ﷺ آئے اور آپ ﷺ کی نظر پڑی تو آپ بغیر ملے ہوئے گھر سے واپس چلے گئے...... یہی حجرہ تھا جس میں میرے مدنی سرکار کا روضہ ہے، اس کا طول و عرض دیکھ لو۔ اب تو بہت بڑا ہے، اس وقت اس سے بھی چھوٹا تھا۔ یہ جہاں جالی لگی ہوئی ہے، سارا حجرہ نہیں ہے، بلکہ اندر جتنی جگہ روکی ہوئی ہے، وہ حجرہ ہے۔ یہ چھوٹا سا حجرہ مبارک تھا، دروازہ بھی نہیں تھا، ایسے ٹاٹ اور بوریاں ڈالی جاتی تھیں اور اس دیوار میں ایک طاقچہ تھا جس میں دیا رکھا جاتا تھا، یا کبھی کوئی اور سامان رکھ دیا۔ تو بی بی صاحبہ نے وہاں ایک کپڑا لٹکا دیا، تاکہ اچھا لگے اور گھر صاف ستھرا نظر آئے۔

بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا چونکہ بڑی عالمہ اور بڑی ذکیہ تھیں، ایسے تو حضور ﷺ نے نہیں فرمایا کہ جس نے آدھا دین سیکھنا ہو عائشہ رضی اللہ عنہا سے سیکھ لو...... یہ ملنگ جو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے دشمن ہیں، ان کی دشمنی کا مقصد یہ ہے کہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کی عزت و عصمت ختم ہو جائے، اور جب ان کی عزت و عصمت ختم ہو جائے گی تو نبی کا دین ویسے ختم ہو جائے گا۔ ورنہ ان کا بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا جھگڑا ہے؟ چودہ سو سال گزر گئے، نہ اب یہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اصل میں ان کی دشمنی دین محمد سے ہے۔ جب بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے اعتماد اُٹھ جائے گا تو نبی کا آدھا دین ختم ہو جائے گا، وہ روایتیں ختم ہو جائیں گی جو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہیں۔

بہرحال حضور ﷺ واپس تشریف لے گئے۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سمجھ گئی کہ حضور ﷺ کو یہ پردہ ناگوار گزرا ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے بتلا بھی دیا کہ اللہ کے نبی کے گھر میں دیواروں پر پردے کا لگا ہونا نامناسب ہے۔

ایمان سے بتائیں! آج ہمارا کوئی گھر ہے جو اس قسم کے پردوں سے خالی ہو۔ چاہے وہ مولوی صاحب کا ہو، میرا ہو یا تیرا ہو، اس میں چل کر ذرا پردوں کی بہار تو دیکھیں! پردے تو پردے رہے، اب تو لگانے والے ہزاروں روپے لیتے ہیں۔ ہزاروں کے کپڑے ہوتے ہیں اور پھر پردے کئی کئی قسم کے ہوتے ہیں، کوئی دو کپڑے والا، کوئی تین پرت والا، کوئی ریشم والا...... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ...... دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں ہدایت دے اور ہم دین کی طرف لوٹیں۔

پردہ کی اہمیت پر تالیف:

ایک مولوی صاحب تھے۔ فوت ہو گئے...... اللہ ان کی قبر پر رحمت کرے...... انہوں نے ایک کتاب لکھی،

بلاشبہ بڑی اچھی کتاب لکھی۔ انہوں نے لکھا کہ اسلام میں پردے کا کیا حکم ہے؟ بڑے مضبوط دلائل دیئے، بڑی محنت کی اور پھر اس میں تاریخی طور پر بحث کی اور دلائل دیئے کہ:

......رومن امپائر میں عورت کا کیا مقام تھا؟

...... یونان کی تہذیب میں عورت کا کیا مقام تھا؟

......مصر کی تہذیب میں عورت کا کیا مقام تھا؟

......زمانہ جاہلیت میں عورت کا کیا مقام تھا؟

......اسلام میں عورت کا کیا مقام ہے؟

......اسلام نے آکر پردے کا حکم دیا ہے تو کیوں دیا ہے؟

لیکن یہ بات افسوس سے کہنی پڑ رہی ہے کہ ان کی اپنی بیٹیاں پردہ نہیں کرتیں۔

ان کے ایک مخالف تھے، وہ بھی فوت ہو گئے ہیں...... ان کا نام نہیں لینا چاہیے۔ اللہ غیبت سے بچائے...... وہ بھی بڑے لیڈر تھے، اس کی بیٹی بھی پردہ نہیں کرتی تھی، ایک بار تقریر کر رہے تھے تو کسی آدمی نے اسے چٹ لکھی کہ تم بار بار اسلام کا نام استعمال کر رہے ہو، تمہاری اپنی بیٹی بھی پردہ نہیں کرتی، تم اپنے گھر میں پہلے بیٹی کو تو اسلام کا پابند کرو۔ اس نے جواب دیا کہ ٹھیک ہے میری بیٹی پردہ نہیں کرتی، لیکن میں نے کسی مولوی کی طرح پردہ کے موضوع پر کتاب تو نہیں لکھی۔ جن مولویوں نے کتاب لکھی ہے، ان کی بیٹیاں پردہ نہیں کرتیں، پہلے ان کو سمجھاؤ۔

آپ بتائیں کہ اس کے بعد ہمارے پلے کچھ رہ گیا؟

پکوڑے فروش مناظر!!!

جیسا کہ تاریخ میں ایک واقعہ ہے کہ عیسائیوں کا بڑا پادری تھا۔ ہندوستان کے کسی شہر میں آکر اس نے طوفان مچا دیا کہ کوئی مولوی میرے ساتھ مناظرہ کرے۔ سب کو للکار رہا ہے اور اخباروں میں باقاعدہ اشتہار چھپ رہے ہیں، رات دن اس نے دھوم مچا ڈالی...... پیسہ تو ان کے پاس ہوتا ہے، کیونکہ ان کو اپنی تبلیغ کے لیے لاکھوں ڈالر ملتے ہیں، ان کی باقاعدہ مشنریاں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے پادریوں کو ہمارے مولوی کی طرح تو نہیں رکھتے کہ بے چارا جا کر گھر گھر سے روٹیاں بھی لے آئے اور پانچ نمازیں بھی پڑھائے۔ صبح ہوتی جائے تو پھر اس کو روٹی کی فکر ہو کہ کہاں سے میرا ناشتہ آئے گا؟ اور کہاں سے میری دال آئے گی؟ اور کہاں سے میری لسی کا گلاس آئے گا؟ ان کے جو مبلغ ہیں،

مبشر ہیں، داعی ہیں، ان کے پنڈت اور راہب ہیں، ان کو وہ اتنا اعلیٰ سٹیٹس پر رکھتے ہیں کہ جیسے بادشاہوں کا معیار زندگی ہو، کوٹھیاں اور بنگلے ہوتے ہیں، اے سی کا سفر اور ہوائی جہاز کی فرسٹ کلاس کا ٹکٹ اور سالانہ بجٹ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے...... خیر مناظرہ طے ہو گیا۔ اس پادری کا دعویٰ تھا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) خدا کا بیٹا ہے اور اس پر وہ دلائل دے رہا تھا۔ ابھی وہ عالم صاحب جنہوں نے اس کے ساتھ مناظرہ کرنا تھا وہ وہاں نہیں پہنچے تھے کہ ایک مسلمان، جو چھابڑا لگا کر پکوڑے وغیرہ بیچا کرتا تھا، اس کو غصہ آ گیا، وہ اندر آ گیا، اس نے پکوڑے وہیں چھوڑ دیئے اور چلتے چلتے اسٹیج کے قریب آ گیا اور پادری سے کہا کہ کیا بات ہے؟ پادری نے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا: میں مسلمان ہوں اور تم سے بات کرنے آیا ہوں، پادری نے کہا: میں تمہارے ساتھ کیوں بات کروں؟ میں تو تمہارے مولوی صاحب کی انتظار میں ہوں جس سے مناظرہ طے ہے۔ اس نے کہا کہ مناظرہ تم مولوی سے کرنا، پہلے یہ تو سمجھاؤ کہ تم کہتے کیا ہو؟ میں جاہل آدمی ہوں، اَن پڑھ ہوں، پکوڑے بیچتا ہوں۔

پادری نے کہا: عیسیٰ (علیہ السلام) خدا کا بیٹا ہے۔ اس مسلمان نے کہا: یہ بتاؤ کہ خدا کا بس ایک ہی بیٹا ہے یا کوئی اور بھی بیٹا ہے؟ اس پادری نے کہا: خدا کا ایک بیٹا ہے۔ مسلمان نے کہا: کمال کرتے ہو؟ میں پکوڑے بیچتا ہوں، میرے گھر میں روٹی پوری نہیں، میرے سترہ بیٹے ہیں، خدا مجھ سے بھی کمزور ہوا کہ جنا بھی ایک بیٹا ہے، تم ایسے خدا کو مان رہے ہو جس کی اولاد تو صرف ایک لڑکا ہے۔ اس پر لوگوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے، پادری صاحب بھاگ گئے۔ اب پادری بے چارے سے کیا جواب بنے؟ وہ ملک چھوڑ کر وہیں جہاز پر چڑھ گیا۔

اس عالم نے یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھا کہ حقیقت بات یہ ہے کہ اس بندے نے جس انداز میں مناظرہ کیا، جو طرز استدلال اس نے اختیار کیا، میں مولوی ہو کر بھی نہ کر سکتا تھا۔ تو کبھی کبھی اَن پڑھ بندے کے منہ سے بھی ایسی بات نکل جاتی ہے جو پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں کر سکتے۔

ایک بدو کا واقعہ:

ایک بدو گنگنا بھی رہا تھا اور جنگل میں اونٹ چرا رہا تھا۔ ایک مولوی صاحب کی اس سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے سوچا کہ یہ بے چارا اَن پڑھ بندہ ہے، اس کی زندگی اونٹوں میں گزر گئی ہے، اس سے توحید کا مسئلہ پوچھتا ہوں، نہیں آتا ہو گا تو اس کو سمجھا دوں گا۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اسے سلام کیا، اس نے جواب دیا۔ مولوی صاحب نے پوچھا: تم کون ہو؟ بدو نے کہا: میں مسلمان ہوں۔ مولوی صاحب نے پوچھا: خدا کو مانتے ہو؟ اس نے کہا: مانتا

ہوں۔ انہوں نے پوچھا: اللہ کے بارے میں کیا عقیدہ ہے؟ بدو نے کہا: اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، خدا ہے، احد ہے، صمد ہے۔ پوچھا: اس بات پر تمہارے پاس دلیل کیا ہے؟ کیا تم نے خدا کو دیکھا ہے؟ کبھی تم خدا سے ملے ہو؟ تمہاری ملاقات ہوئی ہے؟ اس بدو نے اپنے اونٹوں کو کھڑا کر دیا اور کہا: مولوی صاحب بات سنو! اور پھر لید اُٹھا کر پوچھا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: لید ہے۔ پوچھا: یہ کس چیز کی لید ہے؟ مولوی صاحب نے جواب دیا: اونٹ کی لید ہے۔ اس نے پوچھا: کیا نشانی ہے؟ عالم نے کہا: پاؤں کا نشان لگا ہوا ہے۔ پوچھا: کس چیز کا پاؤں ہے، گائے کا ہے یا بکری کا ہے؟ عالم نے کہا: اونٹ کا پاؤں ہے۔ اس بدو نے کہا: اگر یہ پاؤں اونٹ پر دلالت کر رہا ہے، لید اونٹ پر دلالت کر رہی ہے تو کیا یہ ساری کائنات خدا پر دلالت نہیں کرتی؟ ایک ڈنڈا مار کر سر پھوڑ دوں گا۔ بڑا مولوی بنا پھرتا ہے! مولوی صاحب نے کہا: میاں! میرا سر نہ پھاڑ، میں تو تیرا امتحان لینے کے لیے آیا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ تُو صحیح عقیدے پر ہے اور تیرے پاس دلیل بھی ہے۔

تو کبھی ایک چھوٹا آدمی ایسی بات کہہ جاتا ہے جو بڑے سے بڑا آدمی بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے حکم ہے کہ اگر کوئی آدمی نصیحت کی بات کر رہا ہو تو اس کی بات سنو اور سمجھو۔ اگر کوئی بھلائی کی بات ہے تو لے لو، ورنہ چھوڑ دو۔

شاہ جی کا وکیل کو عقلی جواب:

شاہ جی رحمہ اللہ سے ایک دفعہ کسی بہت بڑے وکیل نے کہا: شاہ جی! عجیب بات ہے تم مولوی لوگ خواہ مخواہ اپنا مغز مار رہے ہو، لوگوں کو کچھ سمجھ تو آتا نہیں۔ رات دن سفر کرتے ہو، کبھی ریل میں اور کبھی گاڑیوں میں دھکے کھاتے ہو، جلسے کرتے ہو اور نتیجہ کچھ نہیں۔ قوم جہاں پہلے تھی، وہیں کی وہیں ہے۔ جیسے پہلے بگڑا ہوا حال تھا وہی آج بھی ہے۔ پھر یہ اشتہار، یہ بھاگ دوڑ، یہ محنتیں، صبح و شام سفر اور آپ لوگوں کی تقریریں کس فائدے کے لیے ہیں؟ بہتر ہے کہ یہ سب کچھ چھوڑ دیں، کاروبار کریں، تجارت کریں۔ شاہ جی نے بہت پیاری بات کی!! فرمایا: دیکھو بھائی! تم پڑھے لکھے آدمی ہو، قانون دان ہو، عقلیات سے تمہارا تعلق ہے، مجھے معلوم ہے کہ تم عقلی دلیل سے سمجھو گے، منقول سے تم نہیں سمجھ سکتے۔ پھر اس سے فرمانے لگے: مجھے یہ بات بتاؤ کہ آج رات جو میرا جلسہ تھا، تمہارے اندازے کے مطابق اس میں کتنے آدمی ہوں گے؟ اس نے کہا کہ اخبار والوں نے لکھا ہے کہ ایک لاکھ آدمی تھے، لیکن میرا خیال ہے کہ پندرہ بیس ہزار آدمی ہوں گے۔ اخبار والے تو ایسے لکھ دیتے ہیں۔ شاہ جی نے فرمایا: میرے برخوردار وکیل

صاحب! یہ بتائیں کہ جلسہ کب شروع ہوا تھا؟ اس نے کہا: عشاء کے بعد شروع ہوا۔ پوچھا: ختم کب ہوا؟ اس نے کہا: صبح کی اذان ہوئی، نماز پڑھی، ختم ہوگیا۔ پوچھا: کتنے گھنٹے رہا؟ اس نے کہا: تقریباً آٹھ گھنٹے رہا۔

شاہ جی نے فرمایا: وکیل صاحب! بار ایٹ لاء تو ہو، تمہارے تیس ہزار آدمیوں کو گناہوں اور جرائم سے روک کر میں نے بٹھائے رکھا، کیا یہ تھوڑی کامیابی ہے؟ ان میں کئی چور ہوں گے تو وہ چوری سے رُک گئے، زانی ہوں گے تو وہ زنا سے رک گئے، شراب والے شراب سے رک گئے، افیون والے افیون سے رک گئے، چرس والے چرس سے رک گئے، جھوٹ بولنے والے جھوٹ بولنے سے بچ گئے، غیبت والے غیبت سے بچ گئے، سگریٹ والے سگریٹ سے بچ گئے۔ آٹھ گھنٹے کے لیے معاشرے کے تیس ہزار آدمیوں کو گناہ سے بچائے رکھا اور قرآن سننے پہ لگائے رکھا، کیا یہ کم ہے؟ اس نے کہا: بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔

فرمایا: یہ تو ایک دن اور ایک جگہ کا جلسہ ہے، جبکہ سینکڑوں مولوی ہر رات لاکھوں لوگوں کو گناہوں سے روک کر اپنے پاس بٹھالیتے ہیں۔ باقی کوئی فائدہ ہو نہ ہو، چلو ہماری یہی محنت دیکھ لو۔ تمہاری کوئی پولیس اور کوئی مشنری اتنا بڑا کام نہیں کرسکتی کہ بیس ہزار آدمیوں کو اتنے وقت کے لیے جرائم سے روکے رکھے۔ اس وکیل نے کہا: ہاں! اب بات سمجھ آگئی۔

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ [البقرۃ:۴۴]

تفسیر:

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا کہ بنی اسرائیل کی یہ عادت تھی کہ لوگوں کو تو اطاعت و فرمانبرداری، اللہ سے ڈرنے اور تقویٰ کا حکم دیتے تھے، لیکن خود مخالفت کرتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کو شرم دلائی ہے کہ کیسی عجیب بات ہے کہ لوگوں کو تم بھلائی کا حکم کرتے ہو اور اپنی جانوں کو تم بھول جاتے ہو۔ کیونکہ انسان فطری طور پر سب سے پہلے اپنے نفس کی خیر مناتا ہے۔ تم لوگوں کو ہدایت کرو کہ وہ جہنم کی آگ سے بچ جائیں اور خود وہ کام کرو کہ جہنم میں چلے جاؤ تو یہ بڑی عجیب اور خلافِ عقل بات ہے۔

ابن جریج رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں کہ اہلِ کتاب اور منافق، لوگوں کو کہتے کہ روزہ رکھو اور ان کو حکم کرتے کہ تم نمازیں ادا کرو اور خود اس عمل کو چھوڑ دیتے۔ منافقین کا اصل مقصد دکھلاوا ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جو آدمی

دوسروں کو بھلائی کا حکم کرے، اس کو چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ خیر کی طرف دوڑنے اور خیر کو ڈھونڈنے والا ہو تو پھر اس کے قول میں بھی اثر اور برکت ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: بھولنے کا مطلب ہے چھوڑ دینا۔ ﴿وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ یعنی تم اپنے نفسوں کو چھوڑتے ہو، اور لوگوں کو تم بھلائی کا حکم کرتے ہو۔

ایک روایت میں حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ ترجمہ نقل کیا ہے کہ لوگوں کو تم حکم دیتے ہو کہ دین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہو جاؤ اور خود عمل نہیں کرتے ہو۔ لوگوں کو حکم دیتے ہو کہ نماز قائم کرو، لیکن خود عمل نہیں کرتے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آدمی کو اس وقت فقیہ نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اپنے نفس پر زیادہ سختی نہ کرے۔ نفس ایک ایسی چیز ہے جو سب سے زیادہ بُرائی پر ڈالنے والی ہے۔ آدمی اس وقت فقیہ ہوگا جب اپنی ذات کی بُرائیوں سے بغض رکھے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۵، البقرۃ: الآیۃ: ۴۴]

گناہ گار بھی تبلیغ کر سکتے ہیں:

حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہود کی یہ عادت تھی کہ اگر کوئی فیصلہ آ جاتا اور رشوت نہ دی جاتی تو حق کا حکم دیتے اور اگر رشوت دی جاتی تو حق کو بدل دیتے تھے۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جو خود گناہ کرتا ہے وہ لوگوں کو نہ روکے۔ ان حضرات نے اسی آیت سے دلیل پکڑی ہے کہ جب تم خود اچھا کام نہیں کرتے ہو تو لوگوں کو اچھائی کا حکم کیوں کرتے ہو؟

لیکن ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ تقریر کرنا علیحدہ نیکی ہے اور عمل کرنا علیحدہ نیکی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک نیکی نہ کرے تو دوسری نیکی کو بھی چھوڑ دے۔ جتنا ہو رہا ہے، وہ تو کرے۔ اور صحیح بات یہی ہے کہ عالم کو چاہیے کہ وہ بھلائی کا حکم کرتا رہے، چاہے خود نہ بھی کرتا ہو۔ اگر یہ بات لازم ہو جائے کہ صرف وہی بندہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے جس کے اندر خود کوئی گناہ نہ ہو تو پھر دنیا میں کوئی بندہ ایسا نہیں بچے گا جو تبلیغ کر سکے، کیونکہ ہر بندہ خطا کار اور گناہ گار ہے۔ معصوم تو صرف اللہ کے نبی ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ جب کسی عالم کی بات سنتے ہیں تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ اس شخص کا باپ تو بڑا عالم تھا، بہت بڑا متقی تھا اور بڑا اللہ والا تھا، مگر اس میں باپ والی

بات نہیں ہے۔ فرمایا: یہ بھی دراصل شیطان کا ایک دھوکہ ہوتا ہے، تا کہ اس سے جو دین کا فائدہ ہو رہا ہے اس کو ختم کر دوں۔ وگرنہ جب کوئی غیر صحابی، صحابی کے برابر نہیں ہو سکتا تو ہر بیٹا اپنے باپ کے برابر کیسے ہو سکتا ہے؟ کوئی شاگرد اپنے استاد کے برابر کیسے ہو سکتا ہے؟ کچھ نہ کچھ فرق تو ضرور ہو گا۔

اصل میں یہ دیکھنا ہے کہ ہمیں اس ماحول میں کیا کچھ مل رہا ہے؟ شکر و کرو کہ اس ماحول میں بھی کوئی اللہ کا نام لینے والا ہے، کوئی اللہ کی توحید بیان کرنے والا ہے اور اللہ کا قرآن پہنچانے والا ہے۔

اسی لیے حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر ایسی بات ہو جائے تو پھر دنیا میں کوئی حق کہنے والا ہی نہ بچے، کیونکہ ہر آدمی میں کوئی نہ کوئی خطا تو موجود ہوتی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: انہوں نے سچ کہا کہ کون ایسا آدمی ہے کہ اس کے اندر کوئی غلطی نہ پائی جائے۔

مفسر فرماتے ہیں: لیکن میں اپنی طرف سے یہ کہتا ہوں کہ یہ حالت بہت بُری ہے کہ لوگوں کو تو بھلائی کا حکم کرے اور خود گناہ کرے، لوگوں کو بُرائی سے منع کرے اور خود اس میں مبتلا ہو جائے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ کہنا نہ چھوڑے، تقریریں کرتا رہے، لیکن جب یہ عالم ہو کر گناہ کر رہا ہے تو یہ بے علم لوگوں سے زیادہ سزا کا حقدار بنے گا۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ جب ایک عالم غلطی کرتا ہے تو پھر لوگ اس کی اقتداء کرتے ہیں کہ دیکھو! اگر فلاں عالم صاحب ایسا کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی گنجائش ہے۔ اس وجہ سے ہزاروں لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہر عالم یہ کوشش کرے کہ پہلے خود عمل کرے اور پھر لوگوں کو کہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو امر کرنا جائز ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۵، البقرۃ: الآیۃ: ۴۴]

علم پر عمل کی ضرورت:

بہت ساری احادیث ایسی ہیں جن میں ایسے لوگوں کے لیے اور ایسے علماء کے لیے وعید آئی ہے جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتے۔ سب سے پہلے تو قرآن مقدس نے یہودیوں کے علماء کے بارے میں فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعۃ: ۵]

جن لوگوں پر ہم نے تورات کو رکھا، وہ تورات کے عالم بنے، ان کی مثال ایسے ہے جیسے گدھے پر کتابیں لاد دو تو اس کے لیے بوجھ ہی ہے، یہ کوئی فائدہ تو نہیں اٹھا سکتا۔ اگر عالم علم پڑھنے کے بعد عمل نہ کرے تو گویا اس کی مثال

بھی ایسے ہوگئی کہ وہ بھی علم کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر رہا۔

بے عمل عالم کی مثال:

اسی طرح حدیث پاک میں آیا، حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَثَلُ الْعَالِمِ الَّذِي يُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ وَ لَا يَعْمَلُ بِهٖ كَمَثَلِ السِّرَاجِ يُضِيءُ لِلنَّاسِ وَ يُحْرِقُ نَفْسَهٗ.))

[درمنثور: ۱/ ۱۵۷، تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۵]

جو عالم لوگوں کو تو بھلائی کا حکم دے کہ تم نمازیں پڑھو، روزے رکھو، زکوۃ دو، بُرائی کے کام نہ کرو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور خود عمل نہ کرے تو اس کی مثال شمع جیسی ہے کہ لوگوں کو تو روشنی پہنچا رہی ہے، لیکن خود جلتی جا رہی ہے۔ آپ نے شمع دیکھی ہوگی کہ اس سے گھر میں تو روشنی ہو جاتی ہے، آپ تو اس کی روشنی سے فائدہ اُٹھا لیتے ہیں، لیکن وہ خود جل جل کر ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بے عمل عالم اگر کچھ کہتا ہے تو دوسرے لوگ اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہوتے ہیں، لیکن وہ خود جہنم کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے۔

فرماتے ہیں: اس حدیث کے اندر سند کے اعتبار سے ضعف تو پایا جاتا ہے، لیکن بہرحال اس موضوع پر بہت ساری احادیث و روایات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پاک پیغمبر ﷺ نے نقل فرمائیں۔ دوسری حدیث مبارکہ کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں نقل فرمایا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

((مَرَرْتُ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِي عَلَى قَوْمٍ تُقْرَضُ شِفَاهُهُمْ بِمَقَارِيضَ مِنْ نَارٍ قَالَ قُلْتُ: مَنْ هٰؤُلَاءِ؟ قَالُوا: خُطَبَاءُ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا كَانُوا يَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ يَنْسَوْنَ أَنْفُسَهُمْ وَ هُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا يَعْقِلُونَ.)) [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۱۲۲۱۱]

مجھے جس رات اسراء اور معراج ہوا، میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ہونٹ جہنم کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے اور وہ پھر ٹھیک ہو جاتے، پھر کاٹے جاتے تو پھر ٹھیک ہو جاتے۔ میں نے جبرائیل سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں جن کو اتنی سخت سزا مل رہی ہے؟ جبرائیل نے عرض کیا: میرے آقا! یہ آپ کی امت کے وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے تھے اور خود نہیں کرتے تھے۔ چونکہ ان کے ہونٹوں سے خیر کی وہ باتیں نکلی تھیں جن پر یہ

خود عمل نہیں کرتے تھے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے لیے یہ سزا تجویز کی ہے۔ اور اس کے بعد انہوں نے پڑھا کہ وہ لوگوں کو تو بھلائی کا حکم کرتے تھے لیکن اپنی جانوں کو چھوڑ دیتے تھے۔

ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت فرمایا ہے کہ میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ میں معراج کی رات ایسی قوم پر گزرا کہ ان کے ہونٹ اور زبانیں جہنم کی مقراضوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا: جبرائیل! یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیل نے جواب دیا: یہ آپ کی امت کے وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو تو بھلائی کا حکم کرتے تھے لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۶، البقرۃ: الآیۃ: ۴۴]

مسئلہ معراجِ نبوی:

ان احادیثِ مبارکہ اور ان مسائل میں ایک بات سمجھ لیں۔ چونکہ حدیث ایک ہوتی ہے اور اس کے اندر بڑے بڑے مسائل پوشیدہ ہوتے ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ یاد رکھیں کہ معراج اور اسراء حق ہے اور اس کا منکر کافر ہے، کیونکہ قرآن مقدس سے اسراء بھی ثابت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج بھی ثابت ہے اور اسی طرح قرآن مقدس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اور پھر صحیح احادیث جن کو امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحاح میں نقل فرمایا ہے اور بڑی تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر کی ابتداء سے لے کر مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ اور معراج کے بعد مسجد اقصیٰ سے واپس آنے تک کے واقعات احادیث صحیحہ میں موجود ہیں۔ بعض لوگ جیسے منکرین حدیث...... اللہ تعالیٰ ان کے فتنوں سے بچائے...... اور اسی طرح بعض لوگ منکرین معجزات، اسی طریقہ سے بعض دہریین ہیں، مستشرقین ہیں، جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا انکار کیا ہے، بڑے رقیق قسم کے حملے کیے ہیں، ان کے پاس نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی حجت ہے۔ بلکہ معراج حق ہے، اسراء حق ہے، قرآن واحادیث سے ثابت ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ معراج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک کے ساتھ تھا یا روحانی معراج تھا؟

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم روحانی معراج کے قائل ہیں، لیکن اس میں بھی جمہور کی رائے یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جاگتے ہوئے اور آپ کے وجود کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام نشانیاں دکھلائیں۔ اگر یہ خواب کا معاملہ ہوتا یا یہ صرف

روحانی معاملہ ہوتا تو پھر کفارِ مکہ کو اتنا بڑا اعتراض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ خواب تو کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔ دنیا تو بڑے بڑے خواب دیکھ لیتی ہے، ان پر تو کبھی کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اس لیے بہر حال جمہور کی رائے اسی طرف ہے کہ معراج حضور ﷺ کو روح اور جسد مبارک کے ساتھ ہوا۔

اور بعض احادیث مبارک میں کچھ یوں بھی اختلاف آیا ہے جس سے دشمنوں نے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ مثلاً حضور ﷺ نے ذکر فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام چھٹے آسمان پر ملے، یوسف علیہ السلام فلاں آسمان پر ملے۔ تو انبیاء کی ترتیب میں اور آسمانوں میں ان سے ملاقات کے متعلق روایات میں ذرا اختلاف ہے۔ ایک روایت میں اگر ایک پیغمبر سے ملاقات کا ذکر چھٹے آسمان پر آیا ہے تو دوسری روایت میں پانچویں آسمان پر آ گیا ہے۔ دراصل یہ کوئی اختلاف یا تعارض نہیں ہے۔ یہ عظیم واقعہ تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے جیسے سنا اور جیسے سمجھا اس کو روایت کر دیا۔ اور دوسرا اس کے اندر کوئی اشکال نہیں ہے کہ انبیاء سے ملاقات مسجد اقصیٰ میں بھی ہوئی اور آسمانوں پر بھی ہوئی۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف آسمانوں پر مختلف انبیاء کی ملاقات متعدد بار ہوئی ہو، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام سے حضور ﷺ کی بار بار ملاقات ثابت ہے۔

مسئلہ عذابِ قبر:

اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اس عذاب سے آخرت والا عذاب مراد نہیں، کیونکہ آخرت کا عذاب تب ہوگا جب یہ دنیا فنا ہو جائے گی، اس عالم کو اللہ تبارک وتعالیٰ فنا کر دیں گے۔ پھر ساری مخلوق کو دوبارہ اُٹھایا جائے گا، قیامت قائم ہوگی، ساری مخلوق میدانِ محشر میں جمع ہوگی، پھر ان کا میزانِ عمل ہوگا، صحائف کی تقسیم ہوگی، حساب کتاب ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو گواہ لائیں گے اور اگر کوئی انکار کرے گا تو اُمتِ محمد مصطفیٰ ﷺ کو بطور گواہ لایا جائے گا، پھر اگر کوئی انکار کرے گا تو اس کے اپنے بدن کا ذرہ ذرہ گواہی دے گا اور اس کے بعد جنت اور جہنم کے فیصلے ہوں گے۔ لہٰذا عذابِ اُخروی اس وقت شروع ہوگا جب میدانِ حشر قائم ہوگا اور عالم آخرت شروع ہوگا۔

یہ جتنے واقعات ہم احادیث مبارک میں پڑھ رہے ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے اپنی مبارک آنکھوں سے دیکھا کہ بعض لوگوں کے ہونٹ اور زبانیں کاٹی جارہی تھیں، یہاں عالم برزخ کے عذاب کا تذکرہ ہے۔ (حضور اکرم ﷺ کو عالم مثال کے طور پر دکھایا گیا ہے یا سابقہ امتوں کے علماء کو عذاب دکھایا گیا ہے یا ان کو دیا جانے والا جو عذاب حضور اکرم ﷺ کو نظر آ رہا تھا وہ ان کی قبر کا عذاب تھا، لیکن حضور اکرم ﷺ کے سامنے سے ان

کے معراج کے موقع پر ان کی قبر تک کے فاصلہ کو ہٹا دیا گیا تھا)۔ جیسے حضور ﷺ دو قبروں پر گزرے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَ مَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ.))

''ان دو قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے، اور کسی بڑے گناہ کی وجہ سے بھی نہیں ہو رہا۔''

[صحیح بخاری، حدیث: ۱۳۷۸، بَابُ: عَذَابِ الْقَبْرِ مِنَ الْغِيبَةِ وَالْبَوْلِ]

اسی طرح حضور ﷺ اپنے ایک صحابی کو دفن کیا، اس صحابی کو ''ضغطة القبر'' آیا تو حضور ﷺ نے ان کے لیے اللہ کی پناہ مانگی تو اللہ سے ان پر قبر کو کشادہ فرما دیا۔ [المعجم الکبیر، حدیث: ۱۳۵۵۵]

یہ سارے واقعات عذابِ قبر وغیرہ پر دلالت کرتے ہیں۔

اس لیے یاد رکھیں! ''عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ'' (قبر کا عذاب حق ہے) اور اس کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو گم کردہ راہ ہیں، جو منکرین حدیث ہیں اور جو اللہ کے قرآن میں بھی بلاوجہ تاویلاتِ بعیدہ کرتے ہیں۔ اگر اس کو عذابِ قبر نہ مانیں تو ساری حدیثیں غلط ہو جائیں۔ وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کو جو عذاب دکھایا جا رہا تھا وہ عالم دنیا کا تو نہیں تھا، اس لیے کہ اس وقت وہ لوگ مر چکے تھے، جبکہ ابھی آخرت شروع نہیں ہوئی۔ اور دنیا و آخرت کے درمیان یہی برزخ ہی تو ہے۔

اور یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ عذابِ قبر کے لیے قبر کا وجود ضروری ہے۔ کوئی بندہ جہاں ہے وہیں اس کی قبر ہے۔ کوئی پانی میں ڈوب گیا تو وہی اس کے لیے قبر ہے، کوئی آگ میں جل گیا تو گویا آگ اس کے لیے قبر ہے، کوئی آدمی غاروں میں دب گیا تو وہی جگہ اس کے لیے قبر ہے، کسی کو سمندر میں ڈال دیا گیا تو وہی اس کے لیے قبر ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے آگے ان کو عذاب دینا یا ان کو راحت و آرام پہنچانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ لوگوں کو مشکلات اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ بعض اوقات لوگ اپنی حیثیت کا قیاس کرتے ہیں، اپنی قوت اور اپنے علم پر قیاس کرتے ہیں، جس کی وجہ سے پھر جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً دنیا کے اندر آدمی ہے، اس نے ایک سو کتابیں تالیف کیں، اس کو اللہ نے اتنا کام کرنے کی توفیق دی، جبکہ اس کے مقابلہ پر ایک آدمی ہے جس نے ایک قاعدہ بھی نہیں لکھا۔ اب اگر یہ آدمی سوچے کہ جب میں نے کچھ نہیں لکھا تو اس نے بھی کچھ نہیں لکھا ہوگا۔ تو یہ جہالت ہوتی ہے۔ بندوں کے اندر تو تفاوت ہے کہ ایک آدمی محنت کرتا

ہے اور وہ عظیم سے عظیم کامیابی حاصل کرتا ہے اور دوسرا محنت نہ کرنے کی وجہ سے پیچھے رہ جاتا ہے، لیکن بندہ مخلوق کی طاقت کو خالق کی طاقت پر قیاس نہ کرے، کیونکہ خالق تو خالق ہے، اس کی تو یہ شان ہے:

﴿إِذَا قَضَىٰٓ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ﴾ [آل عمران: ۴۷]

اور دوسرا دھوکہ آدمی کو اس لیے لگتا ہے کہ عالم برزخ، عذاب قبر یا قبر کی زندگی، قبر کے اندر آرام یا تکلیف کا ہونا، علم غیب ہے اور علم غیب سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے جو مغیبات سے تعلق رکھتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتے ہیں تو کبھی کبھی ظاہر فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے واقعات موجود ہیں کہ قبریں کھودی گئیں تو سانپ اور بچھو پائے گئے۔ ایسے واقعات بھی موجود ہیں کہ سالوں کے بعد قبر کھولی گئی تو میت ٹھیک ٹھاک سالم ہے اور اس کے اندر کوئی تغیر بھی نہیں آیا۔ کفن بوسیدہ ہو گیا ہے، لیکن لاش اسی طرح رکھی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ اس کو آج ہی دفن کیا گیا ہے۔

اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کے لیے دنیا کے اندر اپنی ان قدرتوں کا اظہار فرما دیتے ہیں کہ کوئی بندہ انکار نہ کر سکے، کوئی بندہ حجت قائم نہ کر سکے کہ مجھے تو یہ بات سمجھ نہیں آ سکی یا میری عقل یہاں تک نہ پہنچ سکی۔ اللہ نے اپنے انبیاء کو جتنے معجزات دیئے ہیں، جتنی آیات بینات ہیں، ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ اس دنیا میں بھی کھول کر بیان کر دیتے ہیں، تا کہ کسی کو کل کو کوئی اعتراض کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اور اسی طرح بڑے بڑے علماء نے حدیثوں کی شروحات میں جو بحثیں فرمائی ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور پاک ﷺ تک تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے ہیں، ان کو جتنے معجزے ملے ہیں، ان کو اللہ دنیا میں بھی ظاہر کر دیتے ہیں، تا کہ کل کو کوئی آدمی معجزے کا انکار نہ کر سکے اور یہ تصور بھی نہ کر سکے کہ جناب! یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک تخت ہو اور اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام بیٹھے ہوں اور پھر اسی پر آپ کے چار ہزار وزراء بیٹھے ہوں، پھر جنات بیٹھے ہوں اور وہ تخت اُڑتا جا رہا ہو۔

اب دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ انسانوں کی بنائی ہوئی چیزیں اُڑ رہی ہیں۔ اگر بندے اپنی عقل سے اتنی اختراعات کر سکتے ہیں اور جو اُن بندوں کا خالق ہے، اس کے لیے یہ کام کون سا مشکل ہے؟ اس لیے جتنے معجزات گزرے، دنیا میں ان کی تصدیق کا کوئی نہ کوئی نمونہ سامنے ہے، تا کہ کوئی بندہ اللہ کی قدرت کا انکار نہ کر سکے، اللہ کے ان انبیاء کے معجزات کا انکار نہ کر سکے۔

اس لیے یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ یہ جتنے واقعات حضور ﷺ کو دکھائے گئے، ان میں عالم برزخ کا انکشاف تھا۔

جنت کا باغ یا جہنم کا گڑھا:

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ نعمتیں اور عذاب اسی قبر سے شروع ہو جاتے ہیں۔ یعنی مومن (جو عقیدۂ توحید، عمل صالح اور خاتمہ بالخیر کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گیا) کے لیے آرام و راحت یہاں مرنے سے شروع ہو جاتا ہے، یعنی روح نکلنے کے وقت سے شروع ہو جاتا ہے۔ ابھی اس کی روح نکلنے کی گھڑی قریب آتی ہے تو ملائکہ جلوس کی شکل میں آتے ہیں، اس کا استقبال کرتے ہیں، جنت کی خوشخبریاں دیتے ہیں۔ تم تو اس کے جسم کو کفن پہناتے ہو اور اللہ کے فرشتے اس کی روح کے لیے کفن جنت سے لے کر آتے ہیں، جنت سے خوشبوئیں لے آتے ہیں اور پھر وہ اس کو جنت والے کفن میں لپیٹتے ہیں، پھر جب اوپر لے جاتے ہیں تو ہر آسمان سے سوال ہوتا ہے کہ کس کی روح لے کر جا رہے ہو؟ فرشتے کہتے ہیں کہ یہ فلاں بن فلاں کی روح ہے۔ تو کہتے ہیں: مبارک ہو! اللہ نے کرم فرمایا، اس کا خاتمہ ایمان پر ہو گیا۔ اسی طرح وہ روح اعلیٰ علیین تک چلی جاتی ہے۔ اور کافر یا گناہگار مومنین کو دیا جانے والا عذاب...... اللہ معاف کرے...... مرنے سے ہی شروع ہو جاتا ہے، ملائکہ جب روح کھینچنے کے لیے آتے ہیں تو ان کے ساتھ ملائکۃ العذاب بھی ہوتے ہیں، وہ آ کر اس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: اے خبیث روح! تُو ایک گندے جثہ میں تھی، جلدی نکل باہر اپنے ایسے رب کے آگے جو تیرے اوپر ناراض ہے۔ اور پھر وہ اس کو اس طرح نکالتے ہیں جیسے کسی بندے کے جسم کو لوہے کی کنگھی سے چھیدا جائے۔ اس انداز میں اس کی روح نکالی جاتی ہے، پھر اس روح کو نیچے سجین میں لے جاتے ہیں اور اس کے بعد عذابِ قبر شروع ہو جاتا ہے۔

[سنن النسائي، حديث: ۱۸۳۳، المعجم الاوسط، حديث: ۴۶۲]

مومن بندے کو قبر میں ہی راحتیں ملنا شروع ہو گئیں۔ سوال و جواب شروع ہو گیا۔ اگر اس نے صحیح صحیح جواب دے دیئے تو اس کے لیے قبر کو کھول دیا گیا، جنت کی طرف کھڑکی کھول دی گئی اور اس کی راحتیں شروع ہو گئیں۔ اب یہ تو نہیں کہ وہ راحتیں اور نعمتیں ہمیں نظر آ رہی ہوں۔ اب تو دنیا میں بھی ایسی چیزیں ہیں جنہیں بعض لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا ہوتا۔

جیسے ہمارے دیہات کے رہنے والے نئے حاجی صاحبان آتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے کبھی ایئر کنڈیشنڈ نہیں دیکھا ہوتا تو حرم میں داخل ہوتے ہی کہتے ہیں: یار! حرم اتنا ٹھنڈا کیسے ہے؟ یہ ٹھنڈی ہوا کدھر سے آ رہی ہے؟

ستون کو ہاتھ لگا کر بے چارے دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ تو دنیا کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں اور اللہ جس کو ٹھنڈک پہنچانا چاہیں اس کے آگے کیا مشکل ہے؟ وہ پروردگارِ عالم بھڑکتی ہوئی آگ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے گلزار بنا سکتے ہیں تو وہ اس مٹی والی قبر میں نہیں بنا سکتے؟ ان کے آگے ایسی کون سی مشکل بات ہے؟

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ یہ تمام احادیث عالم برزخ پر دلالت کر رہی ہیں، ان کا تعلق قبر سے ہے۔ عذاب، قبر سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور مزید عذاب آخرت میں ہوگا۔ اصل عذاب نہ دنیا کا ہے اور نہ قبر کا ہے، بلکہ اصل عذاب آخرت کا ہے۔ قبر کا عذاب بھی ایک دن ختم ہو جائے گا اور عالم برزخ بھی ایک دن ختم ہو جاتا ہے، پھر عالم آخرت آئے گا۔ اس لیے قرآن مقدس میں آتا ہے کہ جب وہ عالم آخرت کے عذاب کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ وہ قبر ہمارے لیے بہتر تھی، قبر کا عذاب پھر بھی تھوڑا تھا، اس عذاب کے ختم ہو جانے کی پھر بھی اُمید تھی اور یہ تو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اور یہ قاعدہ ہے کہ جو عضو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، اللہ کی طرف سے اسی عضو پر عذاب آتا ہے۔ چونکہ جھوٹ بولنے کا تعلق زبان سے ہے، اسی طرح لوگوں کو بھلائی کا حکم دینے اور خود عمل نہ کرنے کا تعلق بھی زبان سے ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ حکم دیں گے کہ ان کی زبانیں کاٹو۔ اور یہ بھی نہیں ہوگا کہ ایک دفعہ کاٹ دی تو معاملہ ختم، بلکہ وہاں قاعدہ یہ ہے کہ جب اللہ کا عذاب شروع ہوگا تو زبان کے ایک دفعہ جل جانے کے بعد فوراً دوسرا چمڑا پیدا ہو جائے گا۔ زبان کٹے گی اور پھر ٹھیک ہو جائے گی۔ اسی طرح وہ عذاب کو بھگتتا رہے گا، تاکہ ہر دفعہ اسے عذاب کی نئی تکلیف پہنچتی رہے۔

جلد کو عذاب دینے میں حکمت:

بعض علماء نے فرمایا کہ قرآن مقدس کی اس آیت کی حکمت سے اندازہ کریں کہ اللہ نے فرمایا:

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ﴾ [النساء:٥٦]

''جب بھی ان کی کھالیں جل جل کر پک جائیں گی تو ہم انہیں ان کے بدلے دوسری کھالیں دے دیں گے، تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔''

آج کی دنیا کی جدید تحقیق نے بھی یہ بات مان لی ہے کہ سب سے زیادہ تکلیف جلد سے ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی

انجیکشن لگوایا ہو تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جب سوئی داخل ہونے لگتی ہے تو درد ہوتا ہے پھر آگے درد نہیں ہوتا۔ اور اگر سوئی بہت زیادہ تیز اور نئی ہو تو کم درد ہوتا ہے اور اگر کبھی کسی غلط جگہ پر سوئی لگ جائے تو زیادہ درد ہوتا ہے۔ چونکہ تاثیر اور اثر کا تعلق جلد کے ساتھ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جلد کے عذاب کا ذکر کیا کہ ہم اس جلد کو فوراً بدل دیں گے، جس کی وجہ سے اسے نیا عذاب محسوس ہوگا۔ یہ نہیں کہ ایک دفعہ عذاب ہو جائے تو دوبارہ عذاب محسوس نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی حقانیت کی دلیل:

اللہ تعالیٰ نے چودہ سو سال پہلے قرآن مقدس میں ان الفاظ مبارک کو اپنے پاک پیغمبر پر نازل فرما کر یہ بات ثابت کر دی کہ حضور ﷺ نے ہمیں جو باتیں بتلائی ہیں، وہ صحیح ہیں، اس لیے کہ انہیں اللہ نے خبر دی ہے۔ وہاں کوئی میڈیکل کالج نہیں تھے، ریسرچ سنٹرز بھی نہیں تھے، جدید تحقیقاتی ادارے بھی نہیں تھے، اور نہ ہی بڑے بڑے لوگ بیٹھ کر مشینریوں پر تحقیق کر رہے تھے۔ صاف بات ہے کہ یہ خبر دینے والے پروردگار عالم ہیں جنہوں نے اپنے نبی ﷺ کو اس بات کی خبر دی، جس کو ہم نہیں جانتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف جلد کو ہی عذاب ہوگا، بلکہ جہنم کا عذاب اتنا گہرا ہوگا جو دلوں تک کو جھانک لے گا، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝﴾ [الہمزۃ: ۷]

امام احمد رحمہ اللہ نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت ابی وائل کہتے ہیں کہ میں حضرت اسامہ کا ردیف تھا، یعنی ہم دونوں ایک سواری پر بیٹھے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ عثمان سے بات کیوں نہیں کرتے؟ انہوں نے فرمایا: دیکھو! میں نہیں چاہتا کہ اپنی طرف سے کسی نئی بات کا افتتاح کر بیٹھوں اور میں کسی کو یہ نہیں کہوں گا کہ وہ پوری دنیا سے زیادہ بہتر ہے، چاہے مجھ پر امیر اور حاکم ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ اصل حقیقت کا پتہ تو اللہ کو ہوتا ہے کہ خیر ہے یا نہیں ہے۔ میں نے تو حضور ﷺ سے سنا ہے۔ میں نے پوچھا: کیا سنا؟ انہوں نے کہا: میں نے سنا، حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ایک آدمی کو لایا جائے گا اور اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اس کی آنتیں نکل آئیں گی، وہ انہی کے ساتھ ایسے چکر لگا رہا ہوگا جیسے کسی گدھے کو باندھ دیا جائے اور وہ کسی چکی کے ساتھ چکر لگا رہا ہو...... بعض چکیاں ایسی ہوتی ہیں جن پر اونٹ چلتے ہیں، بعض چکیاں ہوتی ہیں جہاں بیل چلتے ہیں، بعض ملکوں کے اندر چکیاں ہوتی ہیں ان پر خچر اور گدھے کو بھی لگا دیتے ہیں تو وہ ان کو گھماتا رہتا ہے...... اس کو جہنم میں ڈالا جائے گا تو وہ اپنی آنتوں میں اسی طرح جکڑا ہوا پھر رہا ہوگا، اس کا پیٹ پھٹے گا اور اس کی آنتیں اس کو ایسے لے لیں گی جیسا کہ چکی

پھیرنے کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ اس کو جب لوگ دیکھیں گے تو کہیں گے: تمہیں کیا ہوگیا؟ تم اس عذاب میں کیسے آ گئے؟ کیا تُو دنیا میں ہمیں اچھے کاموں کا حکم نہیں دیتا تھا اور برائی سے نہیں روکتا تھا؟ تُو تو ہمیں تقریریں کرتا تھا، تیری تقریریں سن کر ہم ٹھیک ہو گئے اور تمہیں کیا ہوگیا کہ تم جہنم میں پڑے ہو؟ وہ کہے گا: اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کو تو کہتا تھا، لیکن خود بھلائی کے کام نہیں کرتا تھا۔ میں تم لوگوں کو تو برائی سے منع کرتا تھا، لیکن خود برائیوں سے نہیں رکتا تھا، اس لیے اللہ نے مجھے اس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ [مسند احمد، حدیث: ۲۱۷۸۴]

جیسا کہ حضور ﷺ نے مثال دی ہے اور روایات میں بھی آیا ہے کہ جو لوگ دوسروں کو نیکی کا حکم کرتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے، ان کی مثال دیئے اور شمع کی سی ہوتی ہے کہ شمع کو جلا دو تو روشنی کر دیتی ہے، لیکن وہ خود جلتی چلی جارہی ہوتی ہے۔ اسی طرح بے عمل عالم لوگوں کو تو فائدہ پہنچا رہا ہوتا ہے، لیکن خود جلتا رہتا ہے۔

[درمنثور: ۱/۱۵۷، تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۵]

یہی تو وجہ ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زبانوں سے لاکھوں لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن خود بیچارے برباد ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، لیکن اس کے گھر والوں کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ لاکھوں کو فائدہ پہنچتا ہے، لیکن اس کے دوستوں کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ لاکھوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، لیکن اپنے اقرباء کو فائدہ نہیں پہنچاتے۔ لاکھوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، لیکن اپنے نفس کو فائدہ نہیں پہنچاتے اور خود اس نیکی پر عمل نہیں کرتے۔ اس لیے یہ بڑی سخت وعید آئی ہے۔ عالم کو چاہیے کہ وہ کبھی ایسی بات کرے تو اس پر خود بھی عمل کرنے کی کوشش کرے۔

حقیقی عالم؟

''عالم'' اس کو نہیں کہا جاتا جس کے دماغ میں معلومات کا ذخیرہ ہو۔ عالم کا معنی وہ ہے جو قرآن ہمیں سمجھاتا ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿٢٨﴾﴾ [فاطر: ۲۸]

عالم وہ ہیں جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ ''إنّما'' حصر کے لیے ہے، یعنی سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے علماء ہیں۔ تو جو ڈرنے والا ہو وہ برائی کیسے کرے؟ وہ حرام کیسے کھائے گا؟ وہ جھوٹ کیسے بولے گا؟ وہ سود کیسے کھائے گا؟ وہ لوگوں کو دھوکہ کیسے دے گا؟

اس لیے علماء نے فرمایا: علم کے بعد دیکھو کہ اس میں خشیت پیدا ہوئی ہے یا نہیں؟ اگر اس کے اندر خشیت نہیں ہے تو مجرد علم تو کتابیں بھی ہوتی ہیں، لائبریریاں بھی ہوتی ہیں۔ آج کل ایسا وقت بھی آ گیا، آج کل کمپیوٹر آ گئے ہیں،

ایسی ایسی چیزیں آگئی ہیں کہ پوری کتاب ایک چھوٹے سے کارڈ کے اندر بند کردیتے ہیں۔ کیا پھر ہم اس کمپیوٹر کو بھی عالم کہیں گے؟ عالم اسے کہتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والا ہو، جو جنت اور جہنم کو جانتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے قہّار ہونے کی صفت کو جانتا ہو، اللہ تعالیٰ کے سَرِیْعُ الْحِسَاب ہونے کی صفت کو جانتا ہو، اللہ تعالیٰ کے شَدِیْدُ الْعِقَاب ہونے کی صفت کو جانتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَام ہونے کی صفت کو جانتا ہو۔ ایسا بندہ گناہ کیسے کرسکتا ہے؟ اور اگر کبھی اس سے غلطی ہوجائے گی تو وہ پگھل جائے گا، وہ ڈرے گا، وہ دوڑے گا، جب تک اپنے پروردگار سے معافی نہ لے لے اس وقت تک اس کو چین ہی نہیں ملتا۔ آپ نے سنا نہیں کہ صحابہ سے جب کوئی غلطی ہوتی تھی تو فوراً دوڑ کر آتے کہ حضور! ہمیں پاک کردو، دنیا میں سزا دے دو، آخرت کی سزا نہیں چاہیے۔

شیطان نے آدم علیہ السلام کو دھوکہ دیا کہ اگر اس درخت کو کھالو گے تو ہمیشہ جنت میں رہو گے اور اگر نہیں کھاؤ گے تو نکالے جاؤ گے، زمین میں بھیجے جاؤ گے۔ آدم علیہ السلام اس کی قسم کے دھوکے میں آگئے، تاکہ میں اللہ کے قرب میں رہوں، میں یہ بعد حاصل نہ کروں، لیکن اس کے باوجود جب غلطی ہوگئی تو تین سو سال تک آپ روتے رہے، اللہ کے آگے فریاد کرتے رہے:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [الاعراف: ۲۳]

دیکھا نہیں کہ روتے روتے حضرت نوح علیہ السلام کے رخساروں پر گڑھے پڑ گئے تھے، جیسے کوئی نہر چلتی رہی ہو۔ اس لیے ان کا لقب ”نوح“ رکھا گیا۔

علم کا معنی صرف معلومات نہیں ہیں۔ یہی تو مشکل ہے کہ لوگوں کو کہو تو ان کو غصہ آجاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ پروفیسر ہے، اس کے پاس P.H.D کی ڈگری ہے اور یہ لوگ اس کو عالم نہیں مانتے۔ خدا کے بندے! علم، ڈگریوں کا نام نہیں ہے، علم کسی عہدے کا نام نہیں ہے، علم لچھے دار تقریروں کا نام نہیں ہے، علم زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے کا نام نہیں ہے۔ ایسے تو بڑے بڑے انگریز گزرے ہیں جنہوں نے انسائیکلو پیڈیے مرتب کر ڈالے ہیں، ایسے تو بڑے بڑے انگریز سیاح گزرے ہیں کہ دنیا کے طبقات الارض پر بحثیں لکھ ڈالی ہیں، لیکن جس نے اپنے خالق کو نہ جانا تو وہ کیسا عالم ہے؟ اگر اس کو توحید کا مسئلہ ہی سمجھ نہیں آیا تو عالم کیا ہوا؟ اگر اس کو اللہ کے نبیوں کی نبوت اور رسالت سمجھ نہ آئی تو عالم کیا ہوا؟ اگر اس کو جنت اور جہنم کی بات سمجھ نہیں آئی تو پھر عالم کیا ہوا؟ پھر اگر اللہ کا ڈر اس کے دل میں پیدا نہیں ہوا تو پھر وہ عالم کیسے ہوا؟

علم اسے کہتے ہیں کہ جس کے بعد خشیت پیدا ہو، تواضع پیدا ہو، اللہ کا ڈر پیدا ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو اور اس کا قدم عین سنت کے مطابق ہو، کبھی غلطی نہ کرے۔ بحیثیت ایک انسان کے پھسل جائے تو توبہ کرے، اللہ کے توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو سلیمان بن مہران الاعمش سے نقل کیا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يُعَافِي الْأُمِّيِّينَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا لَا يُعَافِي الْعُلَمَاءَ.))

''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جاہلوں کی زیادہ بخشش کریں گے بہ نسبت علماء کے۔''

[کنز العمال، حدیث: ۲۸۹۸۴]

ایک عالم اور ایک جاہل کے غلطی کرنے میں بڑا فرق ہے۔ جاہل کو تو پتہ نہیں تھا، لیکن عالم علم کے بعد غلطی کر رہا ہے۔ اس لیے جاہلوں کو زیادہ معافیاں ملیں گی۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ جو شخص صحیح معنوں میں عالم ہوگا تو اس کا درجہ بھی اتنا ہی بلند ہوگا۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص علم دین کے لیے سفر کر رہا ہو اور اسے راستے میں موت آجائے تو اس کے اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا۔

[سنن الدارمي، حديث: ۳۳۶، باب: في فضل العلم والعالم]

اس سے آپ اندازہ لگالیں کہ اگر یہ طالب علم کا مقام ہے تو عالم کا مقام کیا ہوگا؟ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں عالم ہو۔

اس لیے آتا ہے کہ عالم کی نیند بھی عبادت ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ نیند کرے گا تو اگلے سبق کے لیے تیار ہوگا۔ خود سمجھے گا تو آپ کو سمجھائے گا۔ اس لیے اس کی نیند بھی عبادت شمار ہوتی ہے۔ اور اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ نے فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [الزمر: ۹]

''کہہ دیجیے جو علم والے ہیں اور جو علم والے نہیں ہیں، وہ برابر ہو سکتے ہیں؟''

کسی مقام پر اللہ نے فرمایا کہ اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر ہو سکتا ہے؟ یعنی برابر نہیں ہو سکتے۔ اندھا سے کہا گیا ہے جو نہیں جانتا اور آنکھوں والے سے مراد جاننے والا ہے، یعنی عالم اور جاہل کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ لیکن عالم ہونے کے بعد جو اللہ سے نہ ڈرے تو پھر اس کے لیے عذاب بھی اتنا ہی سخت ہے، پکڑ بھی اتنی زیادہ ہے۔ اس لیے فرمایا کہ جاہلوں کو تو زیادہ معافی ملے گی، لیکن اہل علم کو کم ملے گی۔

البتہ یہ بات یاد رکھیں کہ عالم پر یہ عذاب تب ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں بغاوت کر کے نافرمانی کرے۔ اگر ویسے اس سے غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو علم دین کی وجہ سے بھی عذاب نہیں دیں گے۔ کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن عالم کو فرمائیں گے کہ میں نے تجھے عذاب دینے کے لیے اپنا علم نہیں دیا تھا۔[1] "اَلْمُتَّجِرُ الرَّابِحُ" اسی طرح آیا کہ جاہل کے لیے ستر مرتبہ استغفار اور عالم کے لیے ایک، کیونکہ عالم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝﴾ [الزمر:۹]

بنی اسرائیل پر اللہ کے زیادہ عذاب اور ناراضی اس لیے آئی، کیونکہ وہ کتاب جاننے والے تھے، وہ علم کو جاننے والے تھے، تورات کو جاننے والے تھے۔

ابن عساکر نے بھی ولید بن عقبہ کے قصہ میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ أُنَاسًا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَطَّلِعُونَ إِلَى أُنَاسٍ مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَيَقُولُونَ بِمَ دَخَلْتُمُ النَّارَ؟ فَوَاللّٰهِ مَا دَخَلْنَا الْجَنَّةَ إِلَّا بِمَا تَعَلَّمْنَا مِنْكُمْ، فَيَقُولُونَ إِنَّا كُنَّا نَقُولُ وَلَا نَفْعَلُ.))

[تاریخ دمشق لابن عساکر، رقم:۸۰۳۳]

"جنت میں جانے والے لوگ جہنم میں جانے والے لوگوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے: لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم بھی جہنم میں آ گئے ہو؟ ہم تو تم سے سیکھ کر جنت میں پہنچے اور تم خود جہنم میں کھڑے ہو۔ وہ کہیں گے: ہاں! ہم تم لوگوں کو تو کہتے تھے لیکن خود نہیں کرتے تھے۔"

یعنی تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے تھے لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے خلاف کرتے تھے۔ اس وجہ سے تمہیں تو نجات مل گئی اور ہمیں عذاب ہو رہا ہے۔

---

[1] [جامع الاحادیث، حدیث:۲۶۵۲۱، باب الثناء مع الیاء]

مبلغ کے لیے ضروری صفات:

ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: حضرت! میری خواہش ہے کہ میں لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروں۔ یعنی لوگوں کو بھلائی کا کہوں اور برائی سے منع کروں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اچھا! اس مرتبہ پر پہنچ گئے ہو؟ اس نے کہا: حضرت! میں اس قابل تو نہیں ہوا، لیکن امید تو کرتا ہوں کہ اللہ مجھے اس قابل بنا دے۔ آپ نے فرمایا: اللہ کے قرآن کی تین آیات کی وجہ سے اپنے آپ کو شرمندہ نہ کرنا۔ اس نے پوچھا: حضرت! وہ کون سی آیات ہیں؟ آپ نے یہ آیت پڑھی:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۴۴]

اور فرمایا: کیا تم اس آیت کے مطابق ہو کہ لوگوں کو وعظ کہتے رہو؟

پھر دوسری آیت پڑھی:

﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ [الصف: ۲،۳]

اس نے کہا: حضرت! اس مقام پر پہنچنا بڑا مشکل ہے، سب سے ناپسندیدہ چیز اور بڑی بغض والی چیز اللہ کے ہاں یہ ہے کہ جو تم کہو اور نہ کرو۔ آپ نے فرمایا: کیا یہ آیت تم پر منطبق ہوتی ہے؟ اس نے کہا: حضرت! میں اس پر پوری طرح تو منطبق نہیں ہو سکتا۔

آپ نے فرمایا: چلو اچھا! اس بات کو یاد کرو جو حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا:

﴿وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ...﴾ [ہود: ۸۸]

اے میری قوم! ایسی بات نہیں کہ میں تمہیں تو کسی کام سے منع کروں اور خود اسے کرتا رہوں، بلکہ میں تمہیں انہی چیزوں سے منع کرتا ہوں جن سے خود بھی رکتا ہوں اور ایسی چیزوں کے کرنے کا تمہیں حکم دیتا ہوں جن کو میں خود بھی سرانجام دیتا ہوں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اصلاح ہو۔

پوچھا: اس پر عمل ہو گیا؟ اس نے کہا: حضرت! میں تو اس مرتبہ پر بھی نہیں پہنچا۔ آپ نے فرمایا: جلدی نہ کرو، پہلے اپنے نفس کو تبلیغ کرو، پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرو، پہلے اپنے نفس کو سیدھا کرو، جب تمہاری اصلاح ہو جائے تو

پھر تم لوگوں کو امر بالمعروف کرو اور نہی عن المنکر کرو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸٦، البقرۃ: الآیۃ: ۴۴]

آج کے مسلمان!!!

مجھے ایک آدمی نے ایک بات سنائی۔ وہ بات سن کر مجھے ہنسی بھی آرہی تھی اور رونا بھی آرہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ ہمارے ملک میں جو مرغی بکتی ہے اس کی قیمت پچاس روپے ہوگئی ہے اور وہ وزن کے اعتبار سے بکتی ہے۔ چنانچہ لوگ بیچنے سے تھوڑی دیر پہلے اس کو آٹا اور دانے وغیرہ کھلا دیتے ہیں، تا کہ آدھا چھٹانک اس کا وزن اور بڑھ جائے۔

یہ مسلمانوں کا حال ہے!! گائے بیچیں گے تو تین دن تک اس کا دودھ نہیں نکالیں گے، گاہک بیچارا آئے گا، دیکھے گا تو کہیں گے: آپ ہمارے سامنے اس کا دودھ نکال کر دیکھ لیں۔ وہ دودھ نکالتا ہے تو آٹھ سیر دودھ نکلتا ہے۔ کہتا ہے: سُبْحَانَ اللهِ!۔ اسی گائے کو جب وہ گھر لے جاتا ہے تو آٹھ چھٹانک بھی دودھ نہیں دیتی۔ پھر پہلے مالک سے جا کر کہتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اب گھر بدل گیا ہے، بیچارا جانور ہے، گھر تبدیل ہو جائے تو اس پر کافی دن اثر رہتا ہے۔ دو چار مہینے تو صبر کرو۔

داعی کے لیے وعید:

علامہ طبرانی رحمہ اللہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ دَعَا النَّاسَ إِلَى قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ فَلَمْ يَعْمَلْ هُوَ بِهِ؛ لَمْ يَزَلْ فِي سَخَطِ اللهِ حَتّٰى يَكُفَّ أَوْ يَعْمَلَ مَا قَالَ أَوْ دَعَا إِلَيْهِ)) [المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۱۳۹۱۹]

''جو آدمی کسی کو کسی قول و عمل کی طرف بلائے اور خود نہ کرے تو وہ اللہ کے عذاب اور اللہ کی سختی کے سائے میں ہوتا ہے۔ جب تک کہ وہ اس بُری بات کو نہ چھوڑے یا اس پر عمل نہ کرے۔''

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں ان تین آیات کی وجہ سے لوگوں کو قصے وغیرہ بیان کرنے سے ڈرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کو تقریریں کروں اور ان کو قصے سناؤں۔ وہ تین آیات یہ ہیں (پھر آپ نے انہی تین آیات کا ذکر کیا جو اس سے پہلے آپ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی پڑھ چکے ہیں)۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸٦، البقرۃ: الآیۃ: ۴۴]

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۴۵،۴۶]

اور صبر سے اور نماز سے مدد پکڑو اور البتہ وہ بھاری ہے، مگر عاجزی کرنے والوں پر۔ جن کو خیال ہے کہ وہ اپنے رب کے رُوبرو ہونے والے ہیں اور یہ کہ ان کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا﴾ جہاں ''سین'' اور ''تاء'' آجائے وہاں طلب کا معنی بھی آجاتا ہے کہ مدد پکڑو صبر اور نماز کے ساتھ۔

آیت کے اوّلین مخاطب:

قرآن کی ان آیات کے پہلے مخاطب کون ہیں؟ علماء فرماتے ہیں کہ پہلے بنی اسرائیل کو ہی خطاب ہے کہ تم مدد پکڑو صبر اور نماز سے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر مسلمانوں کو حکم ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۱۵۳]

اس آیت میں مومنین کو خطاب ہے، جبکہ اوپر ذکر کی گئی آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہاں مطلقاً حکم ہے۔ خطاب تو بنی اسرائیل کو آرہا تھا، درمیان میں اللہ نے اپنے تمام بندوں کو حکم دیا ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ یہاں بھی خطاب مومنین کو ہے کہ ساری دنیا بھی اگر مخالف ہو جائے تو تم نہ گھبراؤ اور صبر اور نماز کے ذریعے مدد پکڑو۔

معیتِ خداوندی کا مفہوم اور اقسام:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝﴾ [الحدید:۴]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی مقامات پر اپنی معیت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ معیت کی دو قسمیں ہیں:

عام معیت:

ایک معیت علم ہے۔ جسے سلف صالحین نے ہمیں سمجھایا کہ چونکہ اللہ کا علم محیط ہے اور کائنات کا ہر ذرہ اس کے علم میں ہے تو ہر چیز اس کے قریب ہے۔

خاص معیت:

اور ایک معیت خاص ہوتی ہے، معیت خاص اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت اور حفاظت کے ذریعے ہوتی ہے۔ جیسے اللہ نے اپنے پاک پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا وہ الفاظ نقل فرمائے ہیں جو انہوں نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کہے تھے: ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ [التوبہ: ۴۰] کہ اے میرے صحابی! میرے ساتھی، میرے ہمسفر، میرے رفیق غار، ابوبکر! غم نہ کرو، اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہیں۔ یہ خاص معیت ہے۔

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کو بنو اسرائیل نے کہا تھا: اے موسیٰ! ہم تو آپ سے پہلے بھی مشکلات میں تھے اور آپ کے بعد بھی مشکلات میں آ گئے۔ دیکھیں! آگے دریا ہے اور پیچھے فرعون کی فوج ہے، اگر ہم رُک گئے تو فرعون کی فوج ہمیں تہ و بالا کر ڈالے گی اور اگر آگے بڑھتے ہیں تو دریا میں ڈوب جائیں گے۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ﴾ [الشعراء: ۶۲] میرا رب میرے ساتھ ہے۔ اس کو بھی معیت خاصہ کہتے ہیں۔

اسی طرح جب اللہ نے مومنین اور صابرین سے فرمایا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِينَ﴾ [البقرۃ: ۱۵۳] تو یہ معیت خاص ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مقام صبر کی اہمیت:

صبر کا اتنا بڑا مقام ہے کہ اللہ نے بطورِ خاص اپنے پیغمبر کو فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الاحقاف: ۳۵] میرے نبی! آپ بھی صبر کریں جیسا کہ پہلے بڑے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا۔ گویا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور ﷺ کو بھی صبر کا حکم دیا۔

صبر کی جزاء:

اور پھر اس کے بعد جو جزائے صبر ہے وہ اتنی بڑی ہے کہ فرمایا: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: ۱۰] قیامت کے دن صبر کرنے والوں کو جو اللہ اجر دیں گے، اس کا کوئی حد و حساب ہی نہیں ہے۔

اعمال کے مختلف درجات:

محدثین کرام، مفسرین عظام نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کے لیے درجات رکھے ہیں: ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ [الانعام: ۱۶۰] جو ایک نیکی کا کام کرے گا اللہ کو دس گنا ثواب دیں گے اور اسی طرح

کبھی عمل کا ثواب ستر گنا بڑھ جاتا ہے، جیسے کوئی رمضان میں عمل کرے۔ کبھی اعمالِ صالحہ کا درجہ سات سو تک بڑھ جاتا ہے جیسا کہ اللہ نے باقاعدہ مثال دی تھی۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾

[البقرۃ:۲۶۱]

اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ ثواب، مکان کی برکت کی وجہ سے بڑھ جاتا ہے، جیسا کہ حرم میں کوئی ایک نماز پڑھے یا عبادت کرے تو ایک لاکھ درجہ بڑھ جاتا ہے، آخر اس کی کوئی نہ کوئی حد تو ہے۔ اور ایک ہے کہ جیسے آپ کو کوئی بندہ خالی چیک دستخط کر کے دے دیتا ہے کہ یہ لے لو اور جتنی مرضی آئے رقم لکھ دو۔ وہاں کوئی حساب نہیں ہے۔

بے حساب اجر:

حدیث میں آتا ہے کہ ہر عمل پر ایک حد کے برابر بدلہ ملے گا، لیکن صبر کرنے والوں کا بدلہ ایسے ہے کہ مٹھیاں بھر بھر کر، ڈول بھر بھر کر ڈالا جائے گا، اس کا کوئی حساب نہیں ہے۔

صبر کی تلقین:

ایک اور حدیث مبارک میں آتا ہے کہ آقائے نامدار خاتم الانبیاء والمرسلین رحمۃ للعالمین ﷺ ایک دن کعبۃ اللہ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے آکر عرض کیا: حضور! کیا آپ ہمارے لیے دعا نہیں کرتے کہ اللہ ہماری مدد کرے؟...... ہم بڑی مشکل میں ہیں کہ کفارِ مکہ نے ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے، ہم چلتے ہیں تو کانٹے بچھائے جاتے ہیں، گالیاں دی جاتی ہیں، سب وشتم کیا جاتا ہے، ہمیں مارا جاتا ہے، انگاروں پر لٹایا جاتا ہے، اور ہماری عورتوں کو رسے مار مار کر اور نیزے مار مار کر ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، حضور! ہم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں، کیا آپ ہمارے لیے اللہ سے مدد نہیں مانگتے؟...... حضور ﷺ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور آپ نے فرمایا: کیا کہہ رہے ہو؟ تم پر مصیبتیں آگئی ہیں؟ تم بھول گئے ہو؟ تم تاریخ انسانیت پر نظر کرو، قصص انبیاء ومرسلین کا مطالعہ کرو۔ تم سے پہلے لوگ جو گزرے ہیں انہیں زمین میں باقاعدہ گڑھا کھود کو دفن کر دیا جاتا تھا، پھر آرا (جس سے لکڑی کو دو ٹکڑے کیا جاتا ہے) اس کے سر پر رکھ کر دو ٹکڑے کیا جاتا تھا، پھر بھی وہ اپنے دین پر ثابت قدم رہتے تھے۔ فرمایا: تم سے پہلے ایسے ایمان والے لوگ بھی

گزرے ہیں کہ لوہے کی کنگھیاں منگوا کر ان کے سروں سے کھینچتے تھے کہ ان کا پورا چمڑا اُدھیڑ لیتے تھے، لیکن پھر بھی وہ اپنے دین پر قائم رہتے تھے، انہوں نے اپنے دین کو نہیں چھوڑا۔ اور تم اتنی جلدی گھبرا گئے ہو کہ ہم پر مصیبتیں آگئی ہیں؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اللہ کی قسم ہے! اللہ نے جو دین دے کر مجھے بھیجا ہے وہ ضرور پورا ہوگا اور ایک وقت آئے گا کہ اگر کوئی عورت یا مرد یہاں سے صنعاء تک کا سفر کرے گا تو کسی کا اُسے ڈر نہیں ہوگا کہ راستے میں مجھے کوئی لوٹ لے گا یا میری عزت پر حملہ کرے گا۔ ہاں! صرف اتنا ڈر ہوگا کہ کوئی جنگل کا بھیڑیا اس کی بکری اُٹھا کر لے جائے۔ صرف اللہ کا ڈر ہوگا اور کوئی ڈر نہیں ہوگا۔ اسلام، اتنا امن قائم کر دے گا کہ کسی کو بھی کوئی ڈر نہیں رہے گا، لیکن تم جلدی کر رہے ہو، صبر کرو، وہ وقت آئے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صبر کی تلقین فرمائی۔

[صحيح البخاري، حديث: ٣٦١٢، باب: عَلَامَاتِ النُّبُوَّةِ فِي الإِسْلَامِ]

حضرت نوح علیہ السلام کا صبر:

آپ دیکھیں! اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کتنی بڑی عمر دی، ایک ہزار پچاس سال آپ کی عمر تھی، چالیس سال کے بعد نبوت ملی، ساڑھے نو سو سال تک تبلیغ کی اور پھر طوفان آیا، اس کے بعد بھی آپ ساٹھ سال زندہ رہے۔

اتنی بڑی عمر میں حضرت نوح علیہ السلام کو اتنا ستایا گیا، مارا گیا کہ کبھی کبھی بدبخت گلے میں کپڑا ڈال کر کھینچتے تھے کہ آپ بے ہوش ہو کر گر جاتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ مر گئے ہیں تو چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ کافر بدبخت اپنے بچوں کو لے آتے تھے اور دور سے کھڑا کر کے نوح علیہ السلام کی طرف اشارہ کر کے کہتے تھے کہ اس کا خیال کرنا، یہ دیوانہ اور مجنون ہے۔ بچے پتھر اُٹھا کر مارتے تھے، لیکن انہوں نے صبر کیا۔

صبر کی پہلی قسم:

صبر کا معنی ہے: "منع" یعنی کسی چیز کا روکنا۔ صبر کی صورت یہ ہے کہ جب کبھی آدمی کو کوئی صدمہ پہنچے تو وہ جزع و فزع اور واویلا کرنے سے رک جائے، بلکہ زبان سے "اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" کہے۔ اس طرح وہ اس بشارت کا مستحق قرار پائے گا جس کا حکم اللہ کے اس فرمان میں ہے: ﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ﴾ خوشخبری دے دو صبر کرنے والوں کو۔

اب سوال یہ ہے کہ صبر کرنے والے کون ہیں؟ تو ان کی تفصیل اس آیت میں آئی ہے:

﴿الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۱۵۶،۱۵۷]

''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے خصوصی عنایتیں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت پر ہیں۔''

صبر کی عملی مثال:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سفر میں تھے، آپ کو اطلاع ملی کہ آپ کا بیٹا فوت ہو گیا ہے، آپ سواری پر سوار تھے، آپ سواری سے اُترے، فوراً دو رکعت نماز نفل پڑھی اور اس کے بعد زبان سے فرمایا: ''اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' اللہ نے ہمیں یہی حکم دیا ہے کہ صبر اور نماز سے مدد پکڑو۔ مصیبت کی خبر آئی، الحمدللہ! ہم نے نماز بھی پڑھ لی اور صبر بھی کر لیا۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۸۷، البقرۃ: الآیۃ:۴۵]

ماتم اور نوحہ خوانی کی ممانعت:

اسلام کا یہ حکم ہے کہ آدمی کسی میت پر واویلا نہ کرے۔ اسی طرح آواز نکال کر زور زور سے رونا، چیخنا چلانا، ماتم اور نوحہ خوانی کرنا، اپنے رخساروں پر تھپڑ مارنا، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالنا، اپنے سر میں مٹی ڈالنا یا سیاہ لباس پہننا، یہ سارے کام اسلام میں ممنوع ہیں۔

ہم میں سے نہیں:

آقائے نامدار، خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو لوگ مصیبت میں آکر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتے ہیں، اپنے رخساروں پر تھپڑ مارتے ہیں اور سیاہ کپڑے پہنتے ہیں کہ یہ غم کی علامت ہے۔ فرمایا: ان کا میری جماعت سے کوئی تعلق نہیں، ان کا میرے طریقے سے کوئی تعلق نہیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ ایک عظیم واقعہ ہے۔ کوئی مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ان سے زیادہ غمناک تو سیدنا محمد رسول اللہ، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا واقعہ ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو تو اس لیے شرف ملا

ہے کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے نواسے ہیں، یعنی حضور ﷺ کی بیٹی کی اولاد ہیں۔اب جن کی وجہ سے انہیں شرف ملا ہے، ان کی موت صدمہ کتنا بڑا ہوگا!؟

حضور ﷺ کی وفات ہوئی۔آپ اندازہ کریں کہ صدمے کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا عبقری اور بطل الاسلام اور شدید آدمی، سخت آدمی، مضبوط آدمی کہ جس کے بارے میں تورات میں یہ پیشین گوئی آئی کہ وہ تو ایسا ہے جیسے لوہے کا آدمی ہو۔اتنے مضبوط آدمی حضور ﷺ کی وفات کے صدمے کو دیکھ کر تلوار نکال کر کھڑے ہو گئے کہ جو کہے گا کہ حضور ﷺ پر موت آ گئی ہے، میں اس کو قتل کر دوں گا۔حضور ﷺ پر موت کیسے آ سکتی ہے؟ اللہ کا نبی کیسے مر سکتا ہے؟ اللہ کے نبی کی نبوت قیامت تک ہے تو حضور ﷺ بھی قیامت تک زندہ رہیں گے۔

فرماتے ہیں کہ میرے دماغ نے مصیبت کے وقت کام چھوڑ دیا۔اور سیدہ فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کی موت سے مجھے اتنا صدمہ پڑا، اتنا غم ٹوٹا کہ اگر وہ اس دن پر ڈال دیا جائے تو دن، رات میں تبدیل ہو جائے گا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ ہجرت فرمانے کے بعد مدینے میں آئے تھے اس روشن دن جیسا ہم نے دن کوئی نہیں دیکھا اور جس دن آپ کی وفات ہوئی، اس دن جیسا اندھیرے والا دن ہم نے کوئی نہیں دیکھا۔ ایسے لگتا تھا کہ دن کی روشنی بھی چھن گئی ہے اور ہماری روشنیاں بھی آج ختم ہو گئی ہیں۔

صحابہ کرام پر غم کے بڑے بڑے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔لیکن مجال ہے کہ کسی نے کوئی بات شریعت کے خلاف کی ہو۔ ہم لوگ تو محبت میں بھی سنت کی مخالفت کرتے ہیں اور عداوت میں بھی حضور ﷺ کی سنت کی مخالفت کرتے ہیں، یعنی ہم غلو میں آ گئے ہیں...... نعوذ باللہ!...... احداث فی الدین میں آ گئے اور بدعتوں کے اسیر ہو گئے ہیں کہ اگر محبت کا پہلو آ جائے تو ہم تجاوز اور غلو کر کے آگے نکل جاتے ہیں اور اگر غم کا پہلو آ جائے تو پھر بھی غلو کر کے نکل جاتے ہیں۔

آج اگر کوئی محرم کے دنوں میں شادی کرے تو اس کو مار نہ ڈالیں!! یہ تو شکر ہے کہ ان کو اللہ نے طاقت نہیں دی۔ ایک طرف کہتے ہیں کہ یہ بھی کوئی انسان ہیں جو محرم میں شادی کر رہے ہیں، اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ حضرت نے علی اصغر کی شادی کربلا میں کی تھی۔اتنا بڑا جھوٹ ہے!! ادھر کہتے ہیں کہ شادی ہوئی تھی۔جب شادی ہوئی تھی تو اب جو محرم میں شادی کرے گا تو گویا اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سنت پر عمل کیا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سنت کی اتباع کی۔اس لیے ان کو بھی چاہیے کہ انہی دنوں میں شادی کیا کریں۔

آنسو بہانا صبر کے منافی نہیں:

ہاں! ایک ہے کہ آدمی غم کی حالت میں آنسو بہاتا ہے تو یہ اللہ کی رحمت کی دلیل ہے کہ آدمی پر غم ٹوٹ گیا، رو رہا ہے، آنسو بہہ رہے ہیں، لیکن زبان سے کوئی آواز نہیں، کوئی آہ وزاری نہیں، کوئی واویلا نہیں، زبان سے خلافِ شریعت کوئی لفظ نہیں نکالتا، فقط آنسو بہہ رہے ہیں تو ایسا کرنا جائز ہے، اسلام نے اس سے منع نہیں کیا۔ جو لوگ اللہ کے خوف سے اس وقت روتے ہیں تو ان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ یہ تو انسان کی فطرت ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ غمگین ہوتا ہے اور جب اسے کوئی خوشی ملتی ہے تو وہ اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ خوشی اور غمی کے حالات سے کوئی کیسے بچ سکتا ہے؟ یہ تو ہر کسی کو پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے اظہار کے جو طریقے ہم نے بنائے ہیں، وہ درست نہیں۔

جہلاء کے طور طریقے:

چنانچہ پہلے زمانے میں جاہل لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جب بھی ان کا کوئی بندہ مرتا تو ایک آدمی مکان کی چھت پر چڑھ کر اعلان کرتا کہ آج ہمارا فلاں سردار، فلاں سردار کا بیٹا، اور اتنا بڑا سخی اور ایسا ایسا بندہ مر گیا ہے۔ پھر کرائے پر عورتوں کو بلایا جاتا، وہ اکٹھی ہو کر باقاعدہ ماتم کرتیں۔ جب لوگ تعزیت کے لیے آتے تو وہ اندر سے رونا شروع کر دیتیں۔ جب لوگ چلے جاتے تو چپ کر کے بیٹھ جاتیں۔ یہ تو جاہلیت کے طریقے تھے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ مصیبت آئے تو صبر کرو اور کوئی بات زبان سے نہ نکلے۔

حضور ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم کی وفات کا صدمہ:

اس سے بڑی کوئی اور مثال ہوگی کہ حضور ﷺ اپنا بیٹا ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں۔ صحابی کہتے ہیں کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ بچے کی سانس اُکھڑ رہی ہے اور گلے سے ایسی آواز نکل رہی ہے جیسے کوئی مشکیزہ کھولا جائے اور پانی ختم ہو جائے اور آخری قطرے ٹپک رہے ہوں، ایسے سانس نکل رہی ہے اور حضور ﷺ کے آنسو بہہ رہے ہیں، فرما رہے ہیں کہ اے میرے بیٹے ابراہیم! تیری جدائی میں ہم بڑے غمگین ہیں، لیکن ہم اپنی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکالیں گے، مگر وہ جو اللہ کو پسند ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

[صحيح البخاري، حديث: ١٣٠٣، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم إِنَّا بِكَ لَمَحْزُونُونَ]

ہر حال میں صبر کی تعلیم:

اور اسلام کی تعلیمات میں سے ہے کہ اگر تمہیں پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے تو یہ بھی مصیبت ہے، اس پر بھی اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھو، اگر تمہارے دو روپے گر جائیں تو یہ بھی نقصان ہے، اس پر بھی اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھو۔

صبر کے وقت مسنون دعا:

میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی مصیبت کے وقت میں یہ کلمہ پڑھ لے اور یہ دعا کر لے:

((اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي، وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا.))

''اے اللہ! یہ جو چیز مجھ سے چلی گئی ہے اس کا بدلہ تُو اپنی طرف سے بہتر عطا فرما دے۔''

[صحیح مسلم، حدیث: ۹۱۸، باب: مَا يُقَالُ عِنْدَ الْمُصِيبَةِ]

اور اِنَّا لِلّٰہِ پڑھ کر صبر کر لے تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے بہتر چیز عطا فرمائیں گے جو اس کے ہاتھ سے چلی گئی ہو۔

مسنون دعا کی برکت:

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے خاوند بڑی شان والے صحابی تھے، ان کو اپنے خاوند سے بڑی محبت تھی۔ فرماتی ہیں کہ جب میرے خاوند فوت ہو گئے تو میں نے سوچا کہ حضور ﷺ کی سنت پر عمل کروں۔ چنانچہ میں نے یہی دعا پڑھ لی...... دوسری طرف میرے دل میں یہ بات بھی آ رہی تھی کہ مجھے اپنے پہلے خاوند ابو سلمہ سے اچھا کون ملے گا؟ لیکن حضور ﷺ کا فرمان ہے تو میرا ایمان ہے...... فرماتی ہیں کہ اس دعا کی برکت یہ ہوئی کہ اللہ کے نبی ﷺ نے خود مجھ سے شادی کر لی۔ میں حضور ﷺ کی بیوی بن گئی اور حضور ﷺ ابی سلمہ سے کروڑہا درجہ اعلیٰ و افضل تھے۔ وہ غلام تھا اور آپ ﷺ آقا تھے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۹۱۸، باب: مَا يُقَالُ عِنْدَ الْمُصِيبَةِ]

صبر کی دوسری قسم:

اور ایک ہے اللہ کی فرمانبرداری پر صبر کرنا۔ مثلاً اللہ نے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے تو اب خواہ گرمی ہو یا سردی، تکلیف ہو یا راحت ہر حال میں بندے کو چاہیے کہ وہ نماز پڑھے۔

صبر کی تیسری قسم:

اور نافرمانی پر صبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی کے جتنے بھی کام ہیں، بندہ اپنے آپ کو ان کاموں سے روکے رکھے۔

اللہ نے فرمایا: مدد پکڑو صبر کے ساتھ، یعنی مصیبت آئے تو صبر کرو، فرمانبرداری کا موقع ہو تو جم جاؤ اور اگر لوگ تمہیں گناہوں کی طرف بلائیں تو اس وقت اپنے آپ کو تھام لو۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۹۶، البقرۃ: الآیۃ: ۱۵۳]

نماز بھی صبر ہے:

پھر یہ صبر حاصل کیسے ہوگا؟ تو فرمایا: نماز پڑھو۔ نماز بھی ایک صبر ہے کہ آدمی پر حلال چیزیں، بات چیت، اِدھر اُدھر نگاہ کرنا، سب ممنوع ہو جاتا ہے اور نماز میں اس کی ہر ہر حرکت اور ہر ہر سکون، ہر ہر عمل اللہ کے سامنے ہے۔

ہر مشکل میں نماز:

اس آیت میں اللہ نے دو چیزیں بتائیں: ایک صبر اور ایک نماز کہ ان دو چیزوں سے مدد پکڑو۔ اس لیے حدیث مبارک میں ہے:

((كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ، صَلَّى.))

''جب بھی حضور اکرم ﷺ کو کوئی مشکل پیش آتی تھی تو وہ نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔''

[سنن ابی داود، حدیث: ۱۳۱۹، باب: وَقْتِ قِيَامِ النَّبِيِّ ﷺ مِنَ اللَّيْلِ]

آنکھوں کی ٹھنڈک:

حضور ﷺ نے فرمایا:

((جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ.)) [سنن النسائی، حدیث: ۳۹۴۰، باب: حُبِّ النِّسَاءِ]

اللہ نے نماز کو میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دیا ہے۔ جب کوئی غم ہو، نماز پڑھی تو ٹھنڈک آ گئی، سکون مل گیا، اطمینان ہو گیا، تسلی ہو گئی۔

نماز سے عام لوگوں کو فوائد حاصل کیوں نہیں ہوتے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نماز تو پڑھتے ہیں، لیکن ہمیں وہ منافع اور ثمرات حاصل نہیں ہوتے جن کا ذکر قرآن و

حدیث میں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ اللہ کا قرآن تو حق ہے اور حضور ﷺ کا فرمان مبارک بھی حق ہے، ان میں تو کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہمیں اس بارے میں فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ کہیں ہم سے کوئی ایسی کوتاہی تو نہیں ہورہی، جس کی وجہ سے ہم نماز کے ثمرات سے محروم ہیں۔

جو دوائی ہمارے لیے تجویز کی گئی ہے، ساری دنیا کے ڈاکٹر اور تمام اطباء اس بات پر متفق ہیں کہ بیماری کا یہی علاج ہے، اس کے علاوہ کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن مریض کو کوئی فائدہ نہیں ہورہا...... کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ دوائی اصلی نہیں، بلکہ نقلی ہوتی ہے۔ چلو آدمی اصلی دوائی کہیں سے ڈھونڈ لیتا ہے...... اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کی تجویز کردہ خوراک کے استعمال میں ہم غلطی کر لیتے ہیں، مثلاً ہم نے چوبیس گھنٹے میں پانچ دفعہ استعمال کرنی تھی، اور ہم چار دفعہ لے رہے ہیں تو وہ کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ ہاں! اگر دوا بھی صحیح تجویز ہوجائے، ہم اسے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق استعمال بھی ٹھیک کر لیں، اور پھر بھی مریض کو افاقہ نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دوا میں کوئی نقص نہیں ہے، بلکہ مریض کے اپنے معدے کے اندر کوئی ایسا مادہ ہے جو اس دوائی کو قبول نہیں کر رہا۔

اس کی مثال بھی حدیث مبارکہ میں موجود ہے۔ ایک صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے کہا کہ حضور! میرے بھائی کو اسہال کی تکلیف ہے، اس کا پیٹ چل رہا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کو شہد کا شربت پلاؤ۔ اس صحابی نے جا کر اپنے بھائی کو شہد پلا دیا۔ کچھ دیر بعد واپس آئے اور عرض کیا: حضور! آپ نے جو فرمایا تھا وہ میں نے پلایا ہے، لیکن اسہال تو اور زیادہ ہوگئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو پھر شہد پلاؤ۔ انہوں نے جا کر پھر پلا دیا، پھر کچھ دیر کے بعد حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضور! فائدہ نہیں ہوا، وہ تو اور زیادہ ہو رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: پھر پلاؤ...... اب صحابی حضور ﷺ کے حکم کا انکار تو نہیں کرسکتا، چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے...... انہوں نے پھر پلا دیا اور پھر آ کر شکایت کی کہ حضور! وہ تو اور زیادہ بیمار ہوگیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر پلاؤ۔ انہوں نے پھر پلا دیا۔ اب ان کے بھائی ٹھیک ہوگئے۔ وہ صحابی آپ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا: اب تو ٹھیک ہوگیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے سچ فرمایا ہے کہ شہد میں شفاء ہے۔ اللہ کا فرمان غلط نہیں ہوسکتا، اتنی دیر اس وجہ سے لگ گئی کہ تیرے بھائی کا پیٹ اسے قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس میں تمہارے بھائی کے پیٹ کا قصور ہے، اللہ کا فرمان تو کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۵٦٨٤، باب: الدَّواء بالعسل، صحیح مسلم، حدیث: ۲۲۱۷]

یہ مثال میں نے اس لیے عرض کی، تا کہ بات سمجھنی آسان ہو جائے۔ دوائی بھی ٹھیک ہے، طریقۂ استعمال بھی ٹھیک ہے، اور اس کے جو اوقاتِ معینہ ہیں وہ بھی ٹھیک ہیں، لیکن مریض ٹھیک نہیں ہو رہا تو اس کا مطلب ہے کہ مریض کے اندر کوئی مزید نقص اور خرابی ہے، اس کے معدے میں کوئی گڑبڑ ہے کہ وہ اس دوائی کو قبول نہیں کر رہا، ہضم نہیں کر رہا، جس کی وجہ سے دوائی فائدہ نہیں پہنچا رہی۔

کوئی دنیوی، جسمانی، مالی، داخلی یا خارجی پریشانیاں آ جائیں تو اس کا علاج صبر اور نماز ہے۔ اب یہ علاج تو اللہ کا تجویز کردہ ہے، اس میں تو کوئی شک وشبہ ہو نہیں سکتا، لیکن اگر کوئی بندہ نماز بھی ٹھیک پانچ اوقات میں ادا کر رہا ہے اور اس کو فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ابھی کوئی اور نقص ہے جس کی وجہ سے اس پر نماز کے ثمرات وبرکات صحیح معنوں میں مرتب نہیں ہو رہے۔

ایک گناہ گار کا واقعہ:

بزرگ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ کسی بڑے آدمی کا ایک بیٹا تھا، اس کے عزیز واقارب اسے کسی اللہ والے کی خدمت میں لے گئے اور ان سے درخواست کی کہ یہ نوجوان اپنے ماں باپ کا ایک ہی بیٹا ہے، اس کے والدین کے پاس بے انتہاء دولت ہے، اس کی زندگی گناہوں میں گزر رہی ہے۔ ہم نے اس کو بڑی منتوں سے آپ کی خدمت میں لانے کے لیے آمادہ کیا ہے۔ مہربانی کر کے اس کو بیعت کر لیں اور اس کی اصلاح کے لیے کوشش کریں۔ انہوں نے فرمایا: ہدایت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کو لائے ہو تو ٹھیک ہے، میں بیعت کر لیتا ہوں۔ اس نوجوان نے کہا کہ مجھے تو یہ لوگ زبردستی مجھے آپ کے پاس لے آئے ہیں، میں بیعت نہیں ہونا چاہتا۔ انہوں نے پوچھا: اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اس نے کہا: ٹھیک ہے، میں آپ کی بیعت ہو جاتا ہوں، آپ کو اپنا مرشد بنا لیتا ہوں، لیکن میری ایک شرط ہے کہ میں گانا اور عورت نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ میری کمزوری ہے۔ میں بالکل سیدھی بات کرتا ہوں، جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ دو چیزیں میری غذا بن چکی ہیں اور جزوِ حیات بن گئی ہیں۔ جب تک میں گانا نہ سنوں اور عورت سے نہ ملوں، میرے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے، باقی جو مرضی آئے، آپ مجھ سے منوا لیں...... وہ اللہ والے تھے، سمجھدار تھے، طبیب مریض کو سمجھتا ہے...... ان بزرگوں نے فرمایا کہ تمہاری دو باتیں ہم مانتے ہیں، ایک بات تم ہماری مانو۔ اس نے کہا: میں نے تو اپنی بات بتا دی، باقی آپ جو مجھ سے منوائیں وہ میں ماننے کے لیے تیار

ہوں۔ چوری میں نہیں کروں گا، ڈاکہ میں نہیں ڈالوں گا، قتل میں نہیں کروں گا، سود میں نہیں کھاتا۔ باقی مجھے کوئی بیاری نہیں، میرے اندر بس یہ دو بیاریاں ہیں۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ نماز پابندی سے پڑھا کرو اور کچھ نہیں۔ پابندیٔ اوقات سے مسجد میں جماعت کے ساتھ تم نے اللہ کی پانچ نمازیں ادا کرنی ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ میرا بھی وعدہ ہے۔ اگر آپ نے بزرگ ہوکر اتنی بڑی مہربانی کی ہے، میں نے آپ کو اپنی گندی باتیں بتلائی ہیں، آپ اس پر چپ ہو گئے تو آپ کے فرمان کے مطابق میں نماز نہیں چھوڑوں گا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

جب اپنے ڈیرے پر پہنچا تو ملازمین نے کہا کہ محفل کا انتظام کریں؟ اس نے کہا کہ آج عصر کو نہ کرو، کیونکہ میں نے اپنے مرشد سے وعدہ کرلیا ہے کہ پانچوں نمازیں باجماعت ادا کروں گا۔ اگر میں مجلس میں بیٹھ گیا اور شراب پی لی تو نشہ آجائے گا اور اس کے بعد اوقات میں پابندی نہیں ہوگی۔ اس لیے یہ محفل عشاء کے بعد کرنا۔ اور آئندہ کے لیے یہ مجلس عصر کی بجائے عشاء کے بعد سے شروع ہوا کرے گی۔ میں پانچ نمازیں بھی پڑھ لیا کروں گا اور عشاء کے بعد اپنی مجلس بھی بھگت لیا کروں گا، صبح تک نشہ اُتر چکا گا تو نہا دھو کر صبح کی نماز بھی پڑھ لیا کروں گا۔ ملازمین نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

عصر کی نماز اس نے مسجد میں پڑھنی تھی اور اب جانے کے لیے سوچا تو غسل کیا، اچھے کپڑے پہنے کہ چلو کچھ تو شریفانہ لباس پہن کر مسجد میں جاؤں...... یہ تو نہیں کہ آدمی ایسا لباس پہن کر جائے کہ پیچھے والے سارا بدن دیکھتے رہیں...... اس نے عصر کی نماز پڑھی، پھر مسجد میں ہی رہا، مغرب کے بعد بھی گھر نہیں گیا اور عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد بجائے ڈیرے کی طرف آنے کے اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ اور ملازم سے کہلا بھیجا کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آج محفل نہیں ہوگی، کل عشاء کے بعد ہوگی۔ یہ پیغام دیا اور گھر جا کر لیٹ گیا۔

اگلے دن پھر اس نے فجر سے لیکر عشاء تک پانچوں نمازیں مسجد میں پڑھیں۔ عشاء کی نماز جب ختم کی تو نوکروں سے پوچھا کہ سارے انتظامات موجود ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں جی! سارے انتظامات ہو چکے ہیں، بس آپ کا انتظار ہے۔ اس نے کہا کہ آج سے بوتلوں کو بھی توڑ دو اور عورتوں کو بھی یہاں سے نکال دو۔ اب اللہ کے گھر کا سجدہ دے کر عورتوں کو سجدہ دینے سے حیا آتی ہے، میں یہی پیشانی خدا کے دروازے پر جھکاؤں، اسی زبان سے کہوں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اور پھر اسی سے گندی عورتوں کو بوسہ دوں، یہ مجھے گوارا نہیں۔ یہ پاؤں جو اُٹھ کر اللہ کے گھر کی طرف چلے ہیں، اب گناہ کی طرف جائیں تو یہ بات مجھے سمجھ نہیں آتی۔ جب نیک راستے پر آگئے تو گناہ کے راستے کو چھوڑ دیا۔

چند دنوں کے بعد اس بزرگ کے پاس پہنچا، ماشاء اللہ! داڑھی رکھی ہوئی تھی، پگڑی باندھی ہوئی تھی، جا کر اپنے شیخ سے ملا اور کہا: الحمد للہ!۔ انہوں نے فرمایا: ہم نے تو آپ کو کچھ بھی نہیں کہا، ایک نسخہ بتلایا تھا، تم نے دوائی ٹھیک استعمال کر لی تو اللہ نے بیماریاں دور کر دیں۔ ہمارے پلّے میں کیا ہے؟ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ایک نسخہ تجویز کیا تھا کہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز برائیوں سے روکنے والی ہے۔ نماز، جب نماز ہے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا کہ آدمی برائی کرے، اگر نماز ہمیں برائی سے نہیں روک رہی تو اس نماز میں ہم سے کوئی کوتاہی ہو رہی ہوگی۔

نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم عبادت ایسے کرو جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر ایسے نہیں پڑھ سکتے تو کم از کم یہ خیال کرو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا جو اس طرح نماز پڑھے گا، اس کو نماز کے فوائد و ثمرات بھی ضرور حاصل ہوں گے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۵۰، بابُ: سُؤَالِ جِبْرِيلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الإِيمَانِ...]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نماز میں انہماک:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے جسم میں تیر پیوست ہو گیا۔ نکالنے لگے تو بہت تکلیف ہوئی۔ چنانچہ جراح سے کہا گیا کہ انتظار کرو، نماز کا وقت آنے دو۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز میں کھڑے ہوئے تو انہوں نے با آسانی تیر نکال لیا۔

[فضائل اعمال، ص: ۴۴۸، فضائل نماز، خشوع خضوع کا بیان]

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ کے حضور نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو اللہ کے خوف سے نماز میں مشغولیت کی وجہ سے ہمہ تن مگن ہو جاتے اور کسی چیز کی پرواہ نہ ہوتی۔ اس وجہ سے نماز میں آسانی سے تیر نکال لیا گیا۔ اور ہم نماز میں کھڑے ہوتے ہیں، بس ایک رسم ہے جو پوری ہو رہی ہے۔ اسی لیے اقبال رحمہ اللہ نے یا شاید حالی نے کہا تھا:

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی

اذان تو اب بھی ہوتی ہے، لیکن جو حضرت بلال والی تڑپ تھی، وہ کہاں سے آئے؟ مسجدیں اب بھی ہم نے بنائی ہوئی ہیں، حضور ﷺ کے زمانہ میں تو پتھر تھے اور ہمیں تو قالین ملے ہوئے ہیں، حضور ﷺ کے زمانہ میں تو پتھر انگاروں کی طرح جلتے تھے اور اب تو ایئر کنڈیشنڈ کے نیچے بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں، پھر بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری نمازیں ان نمازوں کی طرح نہیں ہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں پڑھی جاتی تھیں۔ اسی لیے شاعر

نے کہا تھا:

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
مَن اپنا پرانا پاپی ہے برسوں سے نمازی بن نہ سکا

صلوٰۃ الحاجت:

ایک بات یاد رکھیں کہ نماز سے پانچ وقت کی فرض نماز، واجبات اور سنن مؤکدہ مراد ہیں اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کبھی تمہیں کوئی مصیبت آجائے تو اس کام کی نیت سے دو رکعت نماز حاجت پڑھو اور اس کے بعد دعا کرو کہ اے میرے اللہ! تیرے قرآن میں حکم ہے کہ مشکل میں نماز سے مدد پکڑو۔ میری یہ مشکل حل نہیں ہو رہی، میں نماز پڑھ کر مدد مانگ رہا ہوں اور تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری حاجت پوری فرما۔ اللہ تعالیٰ اس مشکل کو حل فرمادیں گے۔

آگے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾ [البقرۃ:۴۵]

بعض علماء نے فرمایا کہ "اِنَّہَا" کی ضمیر "صبر" اور "صلوٰۃ" دونوں کی طرف راجع ہے اور بعض نے فرمایا کہ بنی اسرائیل سے آخر تک تمام وہ باتیں مراد ہیں کہ ان چیزوں یعنی نماز پر عمل کرنا، حق پر قائم رہنا، حق اور باطل کو آپس میں نہ ملانا، اللہ کی آیات کو نہ بیچنا، بلکہ سچی بات کہنا، یہ بڑا بھاری ہے، بڑا ثقیل ہے، بڑا بوجھل ہے، مگر ان لوگوں پر جن کے دل اللہ کے خوف سے پگھلنے والے ہیں۔

اور جمہور مفسرین نے فرمایا کہ اقرب مرجع "صلوٰۃ" ہے کہ اللہ نے فرمایا: نماز بڑی بھاری ہے، بڑی ثقیل ہے، بڑی بوجھل ہے، مگر ان لوگوں پر جن کے دل اللہ کے خوف سے پگھلنے والے ہیں، ان کے لیے بوجھل نہیں ہے۔

﴿لَكَبِيْرَةٌ﴾ "کبیر" کا معنی یہاں "بوجھل ہونا" ہے۔ یہاں حسی بوجھ مراد نہیں ہے، بلکہ معنوی بوجھ مراد ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۷، البقرۃ: الآیۃ: ۴۵]

نیک عورت کی پسندیدگی:

حضور ﷺ نے فرمایا: اس دنیا میں سے جو چیزیں مجھے پسند ہیں، ان میں سے ایک عورت ہے لیکن وہ عورت جو

صالحات میں سے ہو، جس کی زندگی، سیرت وصورت، قول وعمل سب میں صلاح ہو، جس کی ضد فساد ہے۔

عورت صالحہ ہو، یہ نہیں کہ وہ شارع عام ہو کہ جو آئے، اس پر سے گزر جائے۔ وہ عورتیں نہیں ہوتیں، وہ تو غلاظت کی بوریاں ہیں، وہ تو گندگی کی بوریاں ہیں اور اللہ کی زمین پر بوجھ ہیں۔

نیک عورت کے اوصاف:

حضور ﷺ نے ''مرأۃ صالحۃ'' کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ جب اس پر خاوند کی نظر پڑے تو وہ خوش ہو جائے اور خاوند حکم دے تو وہ اطاعت کرے۔ پھر کسی دوسرے لفظ کا سوال نہیں، خاوند کا حکم ہے بس، دوسرا لفظ ختم ہے۔ اور فرمایا کہ جب خاوند گھر سے غائب ہو جائے تو اس کی امانت کی حفاظت کرے، اس کی عزت کی حفاظت کرے، اس کی اولاد کی حفاظت کرے، اس کے مال کی حفاظت کرے، فرمایا: یہ ''مرأۃ صالحۃ'' ہوتی ہے۔

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۱۸۵۷، باب: أفضل النساء]

یہ نہیں کہ خاوند نے ابھی گھر سے باہر قدم رکھا تو اس نے ٹیلی فون اُٹھایا کہ (Come on) کم آن۔ یہ عورتیں نہیں ہوتیں، بلکہ یہ تو اللہ کا عذاب ہیں، ان کو عورت کہنا لفظ ''عورت'' کی توہین ہے۔

لفظ ''عورت'' کا معنیٰ:

''عورت'' کہتے ہیں: چھپائی جانے والی جگہ اور چھپائی جانے والی چیز کو۔ ''عَوْرَةُ الرَّجُل'' کیا ہے؟ ''مِنَ السُّرَّةِ إِلَى الرُّكْبَةِ'' یہ ''عورۃ'' ہے، ''عَوْرَةُ الْمَرْأَة'' کیا ہے؟ ''مِنَ الرَّأْسِ إِلَى الرِّجْلِ'' عورت کا سارا بدن عورت ہے۔ یہ جو باہر پھرنے والی ہیں محفلوں میں، ہوٹلوں میں، سارے لوگوں سے ہاتھ ملانے والی، یہ عورتیں نہیں ہوتیں، ان پر لفظ ''عورت'' کا اطلاق شرعاً اور عقلاً ہر لحاظ سے قبیح ہے۔ ان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنے آپ کو ''عورت'' کہلوائیں۔ یہ اپنے آپ کو اور جو مرضی آئے کہلوائیں، لیکن عربی لفظ کا استعمال ان کے حق میں نہیں ہو سکتا۔

دوسری چیز حضور اکرم ﷺ کو خوشبو پسند تھی اور تیسری چیز کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ'' (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے)۔

[سنن النسائی، حدیث: ۳۹۴۰، باب: حب النساء]

سرکارِ دو جہاں کی نماز!!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو نبی اکرم ﷺ کی محبوبہ بیوی ہیں، جمال والی، علم والی اور ایسی بیوی جو اللہ نے خود چن کر

دی تھی۔ اس کا کیا مقام ہوگا جس کا پیغام دینے کے لیے، صورت دکھلانے کے لیے اللہ نے جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا ہو!!
وہ فرماتی ہیں کہ جب حضور ﷺ نماز میں کھڑے ہوتے تو سورۃ الفاتحہ سے شروع فرماتے اور سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران، سورۃ نساء، سورۃ مائدۃ، سورۃ انعام آٹھ آٹھ سپارے ایک ایک رکعت میں پڑھتے تھے۔
فرماتی ہیں کہ سجدہ اتنا لمبا ہوتا کہ جب حضور ﷺ سجدہ فرماتے تو میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی تھی، کیونکہ حجرہ سات فٹ چوڑا تھا، اسی میں حضور ﷺ نماز پڑھ رہے ہوتے تھے اور اسی میں مَیں بھی لیٹی ہوتی تھیں۔
[صحیح البخاری، حدیث: ۳۸۲، باب: الصَّلَاۃِ عَلَی الْفِرَاشِ]

بیڈ روم کا معنی:

ہماری طرح تو نہیں تھا کہ یہ ڈرائنگ روم ہے، یہ بیڈ روم ہے اور یہ بس روم ہی روم ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ ''روم'' کا لفظ کہاں سے بنا ہے؟ یہ ''رم'' سے بنا ہے، ''رم'' ایک شراب ہوتی ہے۔ دونوں کا مادہ ملتا جلتا ہے، اُس کے اندر بھی انسان کو سونا ہوتا ہے اور اِس کے اندر بھی انسان کو سونا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں بیڈ روم۔ اگر اس کو پڑھنے میں تھوڑی سی غلطی کریں تو بیڈ روم بھی تو ہوسکتا ہے۔ یہ بَیڈ نہیں یہ تو بیڈ ہیں، یہ ایڈ نہیں ایڈز ہیں، یہ روم نہیں یہ تو رومن امپائر کے رم ہیں۔ یہ تو ایک عذاب ہے۔ پہلے زمانے میں کوئی روم نہیں ہوتے تھے۔ غربت کی زندگی میں گناہ نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ جب پورے گھر میں کل دو کمرے ہیں تو کوئی گناہ کرنے کے لیے کہاں جا کر چھپے گا؟ گھر کا ہر فرد ایک دوسرے کی نظر میں ہوتا تھا کہ وہاں بیٹا سویا ہے، وہاں بہن سوئی ہے، ادھر میں سویا ہوا ہوں۔ اب جتنے تمہارے روم بڑھتے گئے اتنی رونقیں بڑھتی گئیں، اتنے اللہ کی طرف سے عذاب بڑھتے گئے۔
بی بی صاحبہ فرماتی ہیں کہ میں اپنے پاؤں سکیڑ لیتی اور جب حضور ﷺ سجدے سے کھڑے ہوتے تو سیدھے کر لیتی تھی۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۸۲، باب: الصَّلَاۃِ عَلَی الْفِرَاشِ]

تہجد کی نماز کا اثر اور طریقہ:

ایک دفعہ تم ایسی نماز پڑھ کر تو دیکھو، پھر مولویوں سے کہنا کہ نماز میں فائدہ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ پچھلی رات جب سب لوگ سو رہے ہوں دو رکعت تو پڑھ کر دیکھو، اللہ کا بتلایا ہوا نسخہ آزما کر دیکھ لو، غسل کر کے پاک صاف ہو کر بہترین مصلے پر کھڑے ہو کر پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اور ایک ایک لفظ پر غور کر کے نماز پڑھو اور سجدے میں

جا کر رو پڑو اور پھر نماز پوری کر کے سلام پھیر دو۔ اس کے بعد دیکھو کہ تمہیں اللہ کی طرف سے طمانینت، سکون، راحت اور آرام ملا ہے کہ نہیں ملا؟ یہ چیزیں بتلانے کی نہیں ہیں، چکھنے کی ہیں۔ اب میں آپ کو کیسے بتلاؤں کہ یہ پانی میٹھا ہے یا کڑوا ہے۔ لاکھ تقریر کرتا رہوں کہ بھائی! اس میں چینی ملی ہوئی ہے۔ وہ کہے گا: نظر تو نہیں آ رہی۔ میں کہوں کہ بھائی! چینی بھی سفید اور پانی بھی سفید ہے، کیسے نظر آئے؟ وہ کہے گا: کچھ فرق تو ہونا چاہیے۔ اب میں اس کو کتنی دفعہ سمجھاتا رہوں؟ ہاں! اگر وہ چکھ لے تو ایک منٹ میں پتہ چل جائے گا۔

اُصولاً جتنی عبادات ہیں، ان کی لذت چکھنے سے ملتی ہے۔ تہجد کیا مزہ ہے؟ پڑھو تو مزہ آئے۔ آج رات تجربہ کرو، صرف دو رکعت پڑھ کر دیکھ لو۔ میں روز کا تو نہیں کہہ رہا ہوں، آج فیصلہ کر لو کہ رات کے آخری پہر ہم نے اُٹھنا ہے۔ اور یہ کوئی مشکل نہیں ہے، طلوع فجر سے پندرہ، بیس منٹ پہلے اُٹھ جاؤ۔ دوستوں کے لیے بھی تو تم چھ چھ گھنٹے ضائع کر دیتے ہو، فلم دیکھنے کے لیے بھی تو تین تین گھنٹے تمہاری پلک نیچے نہیں ہوتی۔ آنکھیں تباہ ہو جائیں، برباد ہو جائیں، لیکن نظر اُٹھا کر بیٹھے ہیں۔ آنکھ سے نظر نہ آئے تو چار نمبر کا شیشہ لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔

آج رات دو رکعت پڑھ کر دیکھ لو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ نئے کپڑے ہوں، بلکہ جو کپڑے اللہ نے دیئے ہیں وہی پہنو، البتہ پاک اور صاف ضرور ہوں۔ وضو عین سنت کے مطابق بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر شروع کرو، آرام سے ایک ایک عضو کو دھوؤ، اس کے بعد اللہ کے دربار میں کھڑے ہو کر ایک ایک لفظ پر غور کرو، اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہو تو سمجھو کہ اللہ بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، دنیا کی کوئی مخلوق اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جب وہ بڑا ہے تو اس کا حکم بھی چلے گا...... یا تو بڑا مانو نہیں، اگر مانو گے تو پھر اس کا حکم مانو۔ اگر حکم نہیں مان رہے ہو تو بڑا ماننے کا کیا مطلب ہے؟ ایک آدمی کہے کہ آپ ہمارے بڑے ہیں، آپ ہمارے بزرگ ہیں، وہ کہے کہ میری بات مانتے تو نہیں ہو، مجھے بڑا ماننے کا کیا فائدہ؟ جب اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہہ رہے ہو اور مان نہیں رہے تو تم نے یہ بڑا کیا مانا؟...... اور جب ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ پڑھو تو اللہ کی ربوبیت پر غور کرو، اُلوہیت پر غور کرو کہ کون اللہ؟ وہ اللہ جو "اَلْمُتَّصِفُ بِسَائِرِ صِفَاتِ الْكَمَالِ، اَلْمُتَنَزِّهُ بِسَائِرِ صِفَاتِ النُّقْصَانِ وَ الْاِخْتِلَالِ" ہے، اللہ کی عظمت دل میں آئے، رب کی ربوبیت دل میں آئے، اور عالمین پر نظر ڈالو اور پھر اللہ کی "رحمٰن" والی صفت پر نظر ڈالو، پھر "رحیم" والی صفت پر نظر ڈالو۔

اب آگے نکلو اور ﴿يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پر نظر ڈالو کہ ہم نے اس عالم سے آگے بھی جانا ہے، وہ اس عالم اور انصاف

کے دن کا مالک اللہ ہے۔ جب یہ ساری چیزیں آپ کی نظر میں آجائیں تو پھر آگے پڑھو: ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ عبادت کا مستحق بھی وہ ہے، پھر مدد کے قابل بھی وہ ہے، لہٰذا استعانت کے لیے اس کی درگاہ میں درخواست پیش کرو، ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ میرے پروردگارِ عالم! میرے ذمہ تو اتنا تھا کہ وضو کر کے تیرے رسول کے کہنے پر آج تیرے دروازے پر کھڑا ہوگیا، لیکن سیدھے راستے پر چلا کر جنت میں تُو نے پہنچانا ہے۔

قیام میں ایک ایک حرف پر اور ایک ایک حرکت پر غور ہو۔ جب رکوع میں جاؤ تو اس کی عظمتوں پر غور ہو، جب سجدے میں جاؤ تو اس کے علو پر غور ہو۔ وہ عالی ہے، وہ سب سے اعلیٰ ہے اور اس سے بڑا کوئی نہیں ہے، اس سے پہلے کوئی نہیں ہے، اس کے بعد کوئی نہیں ہے۔ اس انداز میں دو رکعت پڑھو اور پھر مجھے بتانا کہ نماز کا فائدہ ہوا یا نہیں ہوا۔

صبر کی تفسیر:

مقاتل بن حیان نے بھی اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ اگر تم نے آخرت کی بھلائی طلب کرنی ہے تو نماز سے مدد پکڑو، اللہ کے فرائض پر جمے رہو، ان کو پابندی سے ادا کرو۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ صبر سے مراد روزہ ہے جیسے صلوٰۃ سے مراد نماز ہے، کیونکہ صبر کا معنی ہوتا ہے: منع کرنا، یعنی اپنے آپ کو کسی چیز سے روکنا۔ اور روزہ اپنے نفس کو کھانے، پینے اور بیوی سے مجامعت سے روکنے کا نام ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ اس لیے رمضان المبارک کو صبر کا مہینہ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت سفیان ثوری نے ابو اسحاق سے اور انہوں نے جری بن کلیب سے اور انہوں نے بنو سلیم کے ایک آدمی سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلصَّوْمُ نِصْفُ الصَّبْرِ.)) [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۲۳۱۳۹]

''روزہ آدھا صبر ہے۔''

مثلاً صبر کے اگر سو درجات ہوں تو روزہ رکھنے والے نے گویا پچاس درجے صبر کے حاصل کر لیے۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ صبر کا معنی ہے: گناہوں سے رک جانا۔ کیونکہ ہر انسان فطری طور پر ان چیزوں کی طرف مائل ہوتا ہے جن میں لذت، شہوت اور عارضی مزہ ہو۔ جیسے اللہ نے فرمایا کہ لوگوں کے لیے مزین کر دی ہے عورتوں، مال، اولاد اور پیسے کی محبت۔ طبیعت اس طرف کھینچتی ہے، لیکن یہ رُکتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے میں

کہیں آخرت کی بھلائیوں سے محروم نہ ہو جاؤں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے صبر کو نماز کے ساتھ ذکر کیا تو اس سے بھی ایک اشارہ ملتا ہے کہ جب وہ اللہ کی نافرمانیوں سے رکے گا تو نمازیں بھی پڑھے گا۔ اگر کوئی شخص (نعوذ باللہ) گناہوں میں اُلجھ گیا تو وہ اللہ کے فرائض کیا ادا کرے گا؟ اور سب سے اعلیٰ فرض اللہ کی نماز ہے، کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے کہ نماز کو پابندی کے ساتھ اس کے اوقات میں پڑھنا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۷، البقرۃ: الآیۃ: ۴۵]

بڑا صبر:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اَلصَّبْرُ صَبْرَانِ" صبر دو قسم کا ہے: ایک مصیبت اور صدمہ کے وقت آدمی کا صبر کرنا، یہ بڑی اعلیٰ چیز ہے۔ لیکن اس سے بھی اعلیٰ صبر یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں سے بچے جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے منع کیا ہے۔ تو اپنے نفس کو گناہ اور منکرات سے روکنا، سب سے بڑا صبر ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ صبر یہ ہے کہ بندے کو جو تکلیف پہنچے، وہ یہ اعتراف کرے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جو کچھ بھی اللہ نے دکھ، تکلیف مجھے پہنچایا ہے اسی میں بہتری ہے، اللہ کا جو فیصلہ ہو وہ قبول ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۷، البقرۃ: الآیۃ: ۴۵]

پہلے دن سے صبر:

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے فرمایا: کبھی کبھی آدمی کسی کے مرنے پر بہت واویلا کرتا ہے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر روتے روتے ایک دن صبر کر لیتا ہے۔ جب دو چار دن بعد بھی صبر کرنا ہے تو آدمی پہلے کیوں نہ صبر کرلے۔ کیونکہ اللہ کا فیصلہ بالکل ہمارے حق میں ہے اور خیر ہی خیر ہے۔ اگرچہ بظاہر ہمیں کوئی پہلو نقصان کا بھی نظر آتا ہے، لیکن باطن میں اللہ کی رحمت ہے، اس لیے آدمی فوراً صبر کرے اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہے اور اس کے بعد جو حضور ﷺ نے دعا بتلائی ہے، اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي، وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا پڑھ لے تو اللہ کی رحمت ہی رحمت ہوگی۔

حضرت ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ [البقرۃ:۴۵] کہ اللہ کی رضا کے کاموں پر صبر پکڑو، یعنی جمے رہو۔ یہ بھی اللہ کی اطاعت ہے کیونکہ اللہ کی رضا کے کاموں پر جمار ہنا بھی مشکل ہے، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۸۷، البقرۃ: الآیۃ:۴۵]

مشکلات کے باوجود دینداری پر صبر:

اور جو آدمی دین کے قریب ہے وہ اتنا گزر رہا ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے امتحان ہے۔ یاد رکھو! اس بات پر صبر کر کے جمار ہنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔ میرے آقا، خاتم الانبیاء، حبیب کبریا، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مکہ میں پیدا ہوئے۔ جب نبوت کا اعلان کیا تو حضور ﷺ کی زندگی آرام سے گزر رہی تھی یا ابو جہل کی زندگی آرام سے گزر رہی تھی؟ آپ خود ٹھنڈے دل سے فیصلہ کریں۔

حضور پاک ﷺ کی زندگی تو یہ تھی: ﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى﴾ [الضحیٰ:۶] والد، ولادت سے بھی پہلے فوت ہو گئے اور والدہ جب آپ کی عمر سات، آٹھ سال تھی تو فوت ہو گئیں، پھر عبد المطلب کی کفالت میں آ گئے، وہ فوت ہوئے تو ابو طالب نے کفالت کی، بالآخر وہ بوڑھے ہو گئے۔ اب جب عین نبوت اور توحید کے اعلان کا وقت آیا تو ابو طالب نے بھی جواب دے دیا کہ میں تو قوم سے نہیں لڑ سکتا۔ آپ اسی سے اندازہ فرمالیں کہ ابو جہل، عتبہ، عتیبہ، شیبہ، ربیعہ، ابی لہب جیسے کافروں کی زندگی میں مزہ اور آرام تھا یا حضرت بلال، حضرت خباب، حضرت یاسر، حضرت عمار، بی بی سمیہ، حضرت ابی بکر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم کی زندگی میں آرام تھا؟

یہ انگاروں پر لیٹ رہے تھے اور کافر رات کو شرابیں پیتے تھے اور گانے سنتے تھے اور وہی نقشہ تو قیامت تک میرے سامنے بھی رہے گا۔ یہ تو پھر آپ کو برداشت کرنا پڑے گا، جو اللہ کے نبی والی پارٹی میں آئیں گے انہوں نے ماریں بھی کھانی ہیں، تکلیفیں بھی اُٹھانی ہیں، گالیاں بھی سننی ہیں، لوگ دھکے بھی دیں گے، مسجدوں سے بھی نکالیں گے، پتھر بھی ماریں گے۔ اور اگر شیطان والی پارٹی میں جانا ہے تو مزے ہی مزے ہیں اور اس سے بھی ہٹ کر بے دینوں کی طرف چلے جائیں تو ساری قوم تمہارے پیچھے ہے۔

یہ صبر بڑا مشکل ہوتا ہے۔ کوئی مذاق تو نہیں ہے کہ مار کھاتے رہو اور حق پر جمے رہو، انگاروں پر لٹائے جاؤ اور کلمہ پر جمے رہو۔ اور جان رہے ہو کہ ابو جہل جہنمی ہے، بلال جنتی ہے، لیکن بلال مار کھا رہا ہے اور جہنمی مار رہا ہے۔ یہ کوئی

آسان کام تو نہیں ہے کہ دین پر جمے رہیں۔

وجہ کیا ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے لیے اگلا جہان بنایا ہے۔ جن کا ایمان اللہ پر اور آخرت پر پکا ہے وہ دنیا کی تکلیفوں کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ تو ہوتا رہے گا، یہ چند روزہ ہے، پچاس سال، سو سال کے بعد تکلیفیں ختم ہو جائیں گی، اگلا جہان ہم کیوں برباد کریں جس میں ہم نے ہمیشہ رہنا ہے۔ یہ جہان تو کافر کے لیے جنت اور مومن کے لیے قید خانہ ہے۔

جب ایمان اس مقام پر چلا جائے کہ سامنے کافر و جہنمی ہے، اللہ کا دشمن ہے، اللہ کے رسول کا دشمن ہے، وہ کوڑے لے کر اس پر برسا رہا ہے، جو اللہ کا محبوب ہے اور اللہ کے رسول کا بھی محبوب ہے اور کوڑے کھا رہا ہے، پھر بھی کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! اے اللہ! میں ایمان پر قائم ہوں، یہ صبر ہے۔ اللہ کی رضا پر جم جانا، یہ سب سے بڑا صبر ہے۔ وگرنہ تو دو چار دن کے بعد آدمی کہتا ہے کہ چھوڑو یار داڑھی کو۔ جس دن سے داڑھی رکھی ہے اور نماز پڑھنی شروع کی ہے، اس دن سے روٹی بھی بند ہو گئی ہے، اسی دن سے نوکری سے نکل گئے، دھکے کھا رہے ہیں روٹی ملتی نہیں ہے۔ چھوڑو یار نماز کو، کیا نماز اور کیا روزہ؟ بس داڑھی منڈاؤ، برائی کرو۔ بس یہ آدمی گیا اور صبر نہ کر سکا۔

اس لیے کہا گیا کہ مصیبت کے وقت بھی صبر ہے، گناہوں سے بچنا بھی صبر ہے، اللہ کے احکام پر چلنا اور آخرت پر ایمان رکھنا، یہ بھی صبر کے مدارج ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نصیب فرمادے۔

تفسیر:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز اللہ کے کاموں پر جمانے کے لیے بہت زیادہ مددگار ہے، جیسا کہ اللہ نے حکم فرمایا:

﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ؕ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾﴾ [العنکبوت:۴۵]

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار صحابی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی امر پیش آتا، کوئی مشکل پیش آجاتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے۔

[سنن أبي داود، حديث:۱۳۱۹، بابُ وَقتِ قِيامِ النَّبِيِّ ﷺ مِنَ اللَّيلِ]

اور دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ فَزِعَ إِلَى الصَّلَاةِ'' جب حضور ﷺ کو کوئی حادثہ یا کوئی مشکل پیش آتی تو نماز کی طرف توجہ فرماتے۔ لیکن آج ہمیں کوئی مشکل پیش آتی ہے تو صرف اللہ کے دروازے پر نہیں جاتے، باقی سب جتن کر لیتے ہیں۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب غزوۂ خندق کے موقع پر کافروں نے مدینہ منورہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا، میں کافی دیر رات کو معلومات لینے کے بعد حضور ﷺ کی خدمت میں لوٹا تو آپ ﷺ کپڑا لپیٹے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کی رات سب سو رہے تھے، مگر ایک جاگنے والی ذات تھی اور وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تھی۔ حضور ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعائیں مانگ رہے تھے اور ساری رات جاگنے میں گزر گئی، حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔

ابن جریر رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر گزرے تو وہ پیٹ پکڑے ہوئے زمین پر اوندھے پڑے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے کہا: ''أَشِكَمْ دَرْدْ؟'' (کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے)؟ عرض کیا: جی! میرے پیٹ میں درد ہے۔ فرمایا: کھڑے ہو جاؤ، اللہ کی نماز پڑھو، نماز کے اندر اللہ نے شفا رکھی ہے۔[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۷، البقرۃ: الآیۃ: ۴۵]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی ہر مسئلہ نماز سے حل ہوتا تھا۔ یہ نہیں ہے کہ پیاس لگے تو پانی نہ پیو۔ تمہیں کون پانی پینے سے روکتا ہے؟ یہ تو اسباب ہیں، ان کو تو اختیار کرنا ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نظریہ یہ ہو کہ اصل میرا مالک اللہ ہے۔ اگر میرا اللہ نہ چاہے تو پانی پینے سے بھی میری پیاس نہ بجھے اور میرا اللہ چاہے تو ایک گھونٹ پانی سے بھی میری پیاس بجھا دے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کھجور کا ایک ایک دانہ کھا کر جہاد کیا تھا اور دشمن کا مقابلہ کیا تھا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی مشقتیں:

آپ سوچ سکتے ہیں کہ کھجور کے ایک دانے پر ایک دن کا گزارا کرنا۔ ذرا ایک دو دن تجربہ تو کرو۔ پھر ذرا صحابہ کے ایمان کو بھی آزماؤ۔ اور اس زمانے میں بھی پوچھنے والے تابعین پوچھ رہے ہیں کہ ایک کھجور کے دانے پر کیسے

گزارا کرتے تھے؟ کمال ہے! تو فرمایا: کمال کر رہے ہو، وہ زمانہ بھی تھا جب ایک کھجور دو آدمی تقسیم کرتے تھے۔ پوچھا: عجیب بات ہے پھر آدھی کھجور سے کیسے گزارا ہوتا تھا؟ فرمایا: خدا کے بندے! یہ تو ہمیں اس وقت پتہ چلا کہ جب وہ آدھی کھجور بھی ختم ہوگئی، صرف گٹھلیاں منہ میں لے کر چوستے رہتے تھے۔

کسی چیز کی قدر اس وقت آتی ہے جب وہ ملنا بند ہو جائے۔ اب میرے سامنے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں رکھی ہیں تو مجھے پانی کی کیا قدر ہوگی؟ آپ سفر کر رہے ہوں، گرمی میں جا رہے ہوں، گرمی سے آپ کا دماغ اُبل رہا ہو اور آگے جا کر آپ کو ایک گلاس کا چوتھا حصہ پانی مل جائے تو آپ کہیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! میں تو بچ گیا۔ اس وقت پانی کی قدر ہوگی۔ ذرا تجربہ کریں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے صبر کا واقعہ:

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سفر میں تھے، ان کو اپنے بھائی قثم کی موت کی اطلاع ملی تو انہوں نے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھا۔ پھر راستے سے ایک طرف ہٹ گئے، اپنی سواری کو بٹھایا، اس سے اُتر کر دو رکعت نماز پڑھی، آپ تشہد میں کافی دیر بیٹھے رہے، اس کے بعد جب اُٹھے اور اپنی سواری کی طرف جانے لگے تو یہ آیت پڑھ رہے تھے: ﴿وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ﴾ [البقرۃ:۴۵] کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ صبر اور نماز سے مدد پکڑو۔

ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کی رحمت کی طرف مدد کرنے والی ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۷، البقرۃ: الآیۃ:۴۵]

قصۂ قارون میں نکتہ:

جیسا کہ اللہ نے قارون کے قصہ میں فرمایا کہ جب لوگ قارون کی دولت کو دیکھ کر للچانے لگے کہ اے کاش! ہمارے پاس بھی اتنا مال ہوتا جتنا قارون کے پاس ہے۔ جو لوگ علم اور ایمان والے تھے، انہوں نے کہا: یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں بربادی و ہلاکت ہو، اللہ کا ثواب اور اللہ کی نعمتیں اس سے زیادہ ہیں، لیکن ان چیزوں کا پتہ ان لوگوں کو ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، اور یہ چیزیں حاصل نہیں ہوتیں، مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے تھے، اللہ کی اطاعت پر جمنے والے ہیں۔ اللہ پاک نے دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝﴾ [فصلت: ۳۴، ۳۵]

تم بُرائی اور بھلائی کو برابر نہ سمجھو، بلکہ اگر کوئی تمہارے ساتھ بُرا سلوک کرے تو تم بھلائی کے ساتھ اس کا جواب دو۔ جیسا کہ ہمارے آقا ﷺ نے ہمیں ارشاد فرمایا: جو تمہارے ساتھ رشتہ توڑے تم اس کے ساتھ جوڑو، جو تمہارے ساتھ زیادتی کرے تم بھلائی کرو، جو گالیاں دے تم دعائیں دو۔

وگرنہ تو دعائیں دینے والے کو ہر کوئی دعائیں دیتا ہے، اچھی بات کہنے والے کو تو ہر کوئی اچھی بات کہتا ہے، اصل تو یہ ہے کہ وہ توڑے اور تم جوڑو، وہ گالی دے اور تم کہو: ''جَزَاكَ اللّٰهُ'' بھائی! اللہ تیرا بھلا کرے، اللہ تجھے بھی اور مجھے بھی ہدایت دے۔ اور فرمایا کہ جو تم پر ظلم کرے تم معاف کرو۔ پھر تو بات ہے، یہ تو نہیں کہ تم رگڑ دو، بلکہ بدلہ تو یہ ہے کہ تم کو موقع ملے پھر بھی تم کہو کہ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا۔

اللہ فرماتے ہیں کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تم اور جن کے درمیان تمہاری دشمنی ہے ایسے ہو جاؤ گے جیسے خالص دوست ہوتے ہیں۔ فرمایا: یہ نعمتیں ایسے نہیں ملتیں، مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہیں اور جو خوش نصیب ہیں۔

تفسیر:

﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝﴾ [البقرۃ: ۴۵]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''خٰشِعِيْنَ'' سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جو اللہ نے اُتارا ہے اس کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے پکے مومن مراد ہیں، ان کے لیے نہ نماز مشکل ہے اور نہ صبر مشکل ہے۔

ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''خٰشِعِيْنَ'' سے مراد وہ ہیں جو اللہ کے عذاب وعقاب سے ڈرنے والے ہیں۔

حضرت مقاتل بن حیان فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے آگے تواضع کرنے والے ہیں۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے ﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ نماز بڑی بھاری ہے، لیکن ان لوگوں کے لیے جو تواضع کرنے والے ہیں، اطاعت کرنے والے ہیں، اللہ کے عذاب اور اللہ کی پکڑ سے ڈرنے والے ہیں، اللہ نے جو قرآن کے اندر وعدے کیے ہیں ان کے ماننے والے ہیں، اللہ نے جو عذاب کی وعید بیان کی ہے ان کی بھی

تصدیق کرنے والے ہیں۔

حضرت ابن جریر ﷫ نے یہ بھی فرمایا کہ ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اے یہود و نصاریٰ کے علماء و احبار، جو اللہ کی کتاب تورات کے پڑھنے والے ہو! تمہیں ہم حکم دیتے ہیں کہ اپنے نفسوں کو روکو، اللہ کی اطاعت پر جم جاؤ، نمازیں قائم کرو، تاکہ یہ تمہیں برائیوں اور منکر سے روکے اور یہ چیز تمہیں اللہ کی رضا کے قریب کرنے والی ہے۔ اور اس کا قائم کرنا بڑا آسان ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرنے اور اللہ کے آگے تواضع و عاجزی کرنے والے ہیں۔

﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلٰقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رٰجِعُونَ﴾ [البقرۃ:۴۶]

یعنی جنہیں یہ یقین ہے کہ ہمیں حشر میں اُٹھایا جائے گا اور ہم اللہ کے آگے پیش ہوں گے اور ان کے سب کام اللہ کی مشیت کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اللہ ان میں حکم کریں گے عدل سے، اگر وہ کسی کو جہنم میں ڈالیں گے تو وہ عدل و انصاف ہوگا اور اگر کسی کو جنت دیں گے تو وہ اللہ کا فضل اور اللہ کی رحمت ہوگی۔ جب ان لوگوں کو یقین ہوگیا کہ آخرت آنی ہے اور بدلہ ملنا ہے تو اب ان کے لیے اچھے کام کرنے آسان ہوگئے اور منکرات سے بچنا آسان ہوگیا۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۸۸، البقرۃ: الآیۃ:۴۵]

''ظنّ'' کا معنی:

﴿يَظُنُّونَ﴾ حضرت ابن جریر ﷫ فرماتے ہیں کہ محاوراتِ عرب میں ''ظنّ'' کا لفظ ''یقین'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ''شک'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

عربوں کو اگر یکدم اندھیرا ہوجائے تو کہتے ہیں: ''سدفة'' (اچانک اندھیرا ہوگیا)، اور اگر اچانک روشنی ہوجائے تو بھی ''سدفة'' ہی کہتے ہیں۔ یعنی اس لفظ کا اطلاق ''ظلمت'' پر بھی کردیتے ہیں اور ''روشنی'' پر بھی کردیتے ہیں۔ اور اسی طریقہ سے مدد مانگنے والے کو ''صارخ'' کہتے ہیں اور جو مدد کرنے والا ہے اس کو بھی ''صارخ'' کہہ دیتے ہیں۔

اصل میں ''ظنّ'' کا معنی ''گمان'' ہے، لیکن اس کی دو طرفیں ہیں، ایک طرف بڑھتے بڑھتے ''یقین'' تک پہنچ جاتی ہے اور ایک گرتے گرتے ''شک'' تک پہنچ جاتی ہے، اس لیے ظن غالب کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ درید بن

الصمۃ کا شعر ہے:

قُلْتُ لَهُمْ ظُنُّوا بِأَلْفَيْ مُدَجَّجٍ
سَرَاتُهُمْ فِي الْفَارِسِيِّ الْمُسَرَّدِ

''میں نے ان سے کہا کہ تم یقین کر لو کہ تم سے دو ہزار سوار غطفان کے پورے ہتھیار بند آ لڑیں گے، جن کے سردار چھوٹے چھوٹے حلقوں والی فارسی زرہیں پہنے ہوئے ہوں گے۔''

فَإِنْ يَعْبُرُوا قَوْمِي وَ أَقْعُدُ فِيكُمْ
وَ أَجْعَلُ مِنِّي الظَّنَّ غَيْبًا مُرَجَّمًا

یہاں بھی ''ظن'' بمعنی یقین ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر شعرائے عرب کا کلام دیکھا جائے تو کئی مقام پر ''ظن'' بمعنی یقین استعمال ہوا ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن میں جہاں جہاں بھی ''ظن'' کا لفظ آیا ہے وہ یقین کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ اس آیت بالا میں ہے۔

اور بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ''علم'' ہے۔ جیسا کہ قیامت کے دن مومن کو اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں ملے گا تو وہ خوش ہو کر دوڑ رہا ہو گا کہ مجھے پروانہ مل گیا ہے اور کہے گا:

﴿إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ ﴿٢٠﴾﴾ [الحاقۃ: ۲۰]

حدیث صحیح میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندے سے فرمائیں گے: میں نے تمہیں جوڑا بنایا، تمہارے لیے سکون بنایا، تمہاری تکریم کی، میں نے گھوڑے، اونٹ اور ہر چیز تیرے لیے مسخر کر دیئے اور تمہیں چھوڑا کہ جیسے چاہو آرام حاصل کرو، سردار بنو۔ یہ ساری نعمتیں میں نے تجھے دی تھیں یا نہیں دی تھیں؟ وہ کہے گا: ہاں ادی تھیں۔ اللہ فرمائیں گے: کیا تم نے کبھی یہ یاد کیا تھا کہ میں نے قیامت کے دن اللہ کے سامنے جانا ہے جس نے یہ ساری نعمتیں دی ہیں؟ وہ کہے گا: اللہ پاک! مجھے خیال نہیں آیا۔ اللہ فرمائیں گے: تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نے تمہیں بھلا دیا۔ اب جہنم میں چلے جاؤ۔

اس آیت کی مزید تفصیل ﴿نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ ۗ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٦٧﴾﴾ [التوبۃ: ۶۷] کے تحت بیان ہوگی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۸، البقرۃ: الآیۃ: ۴۵]

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝﴾ [البقرة:۴۷،۴۸]

"اے بنی اسرائیل! میرے احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے تھے اور اس کو کہ میں نے تمہیں تمام عالم پر فضیلت دی تھی۔ اور اس دن سے ڈرو کہ کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے سفارش قبول ہوگی اور نہ اس کی طرف سے فدیہ لیا جائے گا اور نہ اس کی مدد کی جائے گی۔"

گزشتہ آیات میں بھی تذکیرِ نعم تھی اور ان آیات میں بھی تذکیرِ نعم ہے۔

حضور ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ میری اُمت کے لوگ قرآن مجید کو ایسا بنا کر اور سنوار کر پڑھیں گے اور اتنی کثرت کے ساتھ پڑھیں گے کہ اگر تم ان کی تلاوت کو سن لو تو حیران ہو جاؤ کہ یہ کتنے قرآن پڑھنے والے لوگ ہیں!! لیکن وہ دین سے ایسے نکلیں گے جیسے تیر اپنے شکار سے نکل جاتا ہے۔ فرمایا کہ وہ لوگ ایسے دین سے نکلنے والے ہوں گے کہ دین کا ان پر کوئی معمولی سا اثر بھی نہیں ہوگا۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۳۶۱۰، باب علامات النبوۃ...]

جب آدمی کسی شکار کو تیر مارتا ہے تو بعض اوقات وہ تیر اس سے نکل جاتا ہے اور تیر کو دیکھو تو اس پر کوئی خون بھی نہیں ہوتا، یعنی اس شدت سے وہ اس کے اندر سے گزرتا ہے کہ اس پر خون کا ایک قطرہ بھی نہیں لگا ہوتا۔ کبھی گولی سے شکار کریں تو وہ جانور کے بدن سے تو آر پار ہو جاتی ہے، لیکن بالکل صاف ہوتی ہے، اس پر خون کا کوئی داغ بھی نہیں ہوتا۔

اسی طرح میرے آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ علاماتِ قیامت میں سے یہ بھی ایک علامت ہے کہ قرآن پڑھنے والے تو بہت ہوں گے اور ایک حدیث میں ہے کہ قاری القرآن قرآن کو بڑا سنوار سنوار کر پڑھیں گے، لیکن ایسے لوگ ختم ہو جائیں گے جو اس قرآن کا علم رکھتے ہوں گے اور اس پر عمل کرتے ہوں گے۔

اسی طرح میرے آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے قاری (قرآن پڑھنے والے) ایسے بھی ہوں گے جو قرآن پڑھ رہے ہوں گے اور اللہ کا قرآن ان پر لعنت کر رہا ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! قرآن

پڑھنے سے تو رحمت ہوتی ہے لعنت کیسے ملے گی؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: قرآن بھی پڑھ رہے ہوں گے اور قرآن کے حکم کی مخالفت بھی کر رہے ہوں گے۔

[روح المعانی، سورۃ: فاطر، آیۃ: ۲۹، تفسیر ابن بادیس، ص: ۳۸]

مثلاً قرآن کہتا ہے: نماز قائم کرو، وہ نماز نہیں پڑھتے ہوں گے۔ قرآن کہتا ہے: زکوٰۃ ادا کرو، وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ہوں گے، قرآن حکم دے رہا ہے کہ اپنی بیٹیوں کو جائیدادوں میں حصہ دو، لیکن وہ نہیں دے رہے ہوں گے۔ قرآن حکم دے رہا ہے کہ جب دولت آجائے تو زندگی میں ایک دفعہ حج کرو، وہ حج ادا نہیں کر رہے ہوں گے۔ قرآن حکم دے رہا ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد کرو، وہ نہیں کر رہے ہوں گے۔ قرآن انہیں حکم دے رہا ہے کہ اگر کسی ملک میں تمہارے لیے دین پر چلنا مشکل ہو جائے تو اس ملک کو چھوڑ دو، وہ ایسا نہیں کر رہے ہوں گے۔ قرآن حکم دے رہا ہے کہ زنا نہ کرو، وہ زنا کر رہے ہوں گے۔ قرآن حکم دے رہا ہے کہ غیبت نہ کرو، وہ غیبت کر رہے ہوں گے۔

یاد رکھیں! مسیح ایک لقب ہے، لیکن جب مسیح ابن مریم کہیں گے تو اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہوں گے، جیسا کہ قرآن مقدس نے ایک مقام پر یوں بھی ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا......﴾ [الزمر: ۷۱] کہ کافروں کو جہنم کی طرف چلایا جائے گا۔ اور دوسری جگہ مسلمانوں کے متعلق بعینہٖ یہی الفاظ ہیں: ﴿وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا......﴾ [الزمر: ۷۳] چلایا جائے گا ان لوگوں کو جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں جنت کی طرف جماعتیں جماعتیں۔

دیکھیں! یہاں کافروں کے لیے بھی لفظ ''سِيقَ'' آیا اور مسلمانوں کے لیے بھی لفظ ''سِيقَ'' آیا ہے۔ ''سِيقَ''، سَاقَ يَسُوقُ سے ہے، بمعنی چلانا۔ لیکن دونوں (کافر اور مسلمان) کے چلانے میں آسمان وزمین کا فرق ہے کہ مومنوں کو جب جنت کی طرف لے جایا جا رہا ہوگا تو ان کا بڑا اعزاز واکرام ہوگا، اللہ کے فرشتے ان کو سلام کر رہے ہوں گے، ان کا استقبال کر رہے ہوں گے۔ اور کافروں کو جب جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو ان کے چہرے اور پشت پر مار پڑ رہی ہوگی اور جہنم کے فرشتے ان کا استقبال کر رہے ہوں گے۔

جیسے یہاں لفظ دونوں جگہ ''سِيقَ'' کا ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان بہت بڑا بعد ہے۔ اسی طرح ایک مسیح ابن مریم ہے اور ایک مسیح الدجال ہے، ان میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔ دجال کو مسیح اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی ایک آنکھ بالکل ختم ہوگی اور باہر اُبھری ہوئی ہوگی۔ جیسے آج کل ''کانا'' کہا جاتا ہے۔ چونکہ وہ ممسوح العین ہوگا اس

لیے اس کا لقب ''مسیح'' پڑ گیا۔ اور حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے لیے ''مسیح'' کا لقب اس لیے آیا کہ انہوں نے دنیا میں بڑی سیر کی، مختلف علاقوں میں، مختلف جگہوں پر آپ تشریف لے گئے اور پھر اس سے بڑی کیا بات ہے کہ اللہ نے انہیں زندگی میں آسمانوں کی سیر کرادی اور زندگی میں آسمانوں پر بٹھا دیا اور پھر زندہ آسمانوں سے زمین پر اُتریں گے اور شریعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے۔ اپنے دور میں وہ بیماروں اور معذوروں پر اپنا ہاتھ پھیرتے تو وہ تندرست ہوجایا کرتے تھے۔ ہاتھ پھیرنے کو بھی ''مسح'' کہتے ہیں اور ''مسیح'' بھی اسی سے مشتق ہے۔ (انور)

''اسرائیل'' دراصل لقب ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ ہر لغت کا اپنا ترجمہ ہوتا ہے، جیسے ''اللہ'' عربی زبان کا لفظ ہے اور ''خدا'' فارسی زبان کا لفظ ہے۔ پہلے زمانے میں زیادہ تر سریانی یا عبرانی زبان بولی جاتی تھی۔ سب سے پہلے عربی زبان میں بات کرنے والے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، اسی لیے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہ عرب ہیں جنہوں نے عربوں سے لغت سیکھی ہے۔[1] اسماعیل علیہ السلام خود عرب نہیں تھے، اس لیے کہ وہ اولادِ ابراہیم میں سے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام شام سے تشریف لائے تھے۔ اسماعیل علیہ السلام کی زندگی مکہ میں گزری۔ آپ کی والدہ ماجدہ مصر سے تھیں۔ جو قبیلہ جرھم آباد ہوا تھا، وہ قحطانی قبیلہ تھا جو یمن سے آیا تھا۔ یہ لوگ خالص عرب تھے، ان سے اسماعیل علیہ السلام کی رشتہ داری ہوئی، ان سے آپ نے پہلی شادی کی، انہی میں سے آپ کے بیٹے پیدا ہوئے اور اسی قبیلہ جرہم سے آپ نے عربی سیکھی۔ اس لیے وہ ایسے عرب بنے جنہوں نے دوسرے عرب سے عربی کو سیکھا۔ جیسا کہ محاورات میں کہتے ہیں: ''اِسْتَعْجَمَ'' وہ آدمی جس نے عجمیت کی کوئی زبان سیکھی ہو۔ اسی طرح کہتے ہیں: ''عرب مستعربہ'' وہ عرب جنہوں نے عربی سیکھی ہو۔ اس سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہے جنہوں نے ان عربوں سے لغت سیکھی اور عربی لغت میں آپ نے کلام فرمایا۔

یہ سارا سلسلہ دراصل ایک ہی پیغمبر سے چلا آرہا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سیدنا اسحاق علیہ السلام اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے۔

تو اللہ نے خطاب فرمایا: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ﴾ اے اللہ کے بندے کے بیٹو! تم نبی کے بیٹے ہو، تم تو نبیوں کی

[1] [تفسیر القرطبی: ۱/ ۲۸۳، البقرۃ: ۲، الآیۃ: ۴۰]

اولاد ہو۔ یاد کرو میری نعمت۔

''نِعْمَۃٌ'' اور ''نَعْمَۃٌ'' میں فرق:

یاد رکھیں! ایک لفظ ہوتا ہے ''نَعْمَۃٌ'' نون کے فتحہ کے ساتھ، اور ایک ہوتا ہے ''نِعْمَۃٌ'' نون کے کسرہ کے ساتھ۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ ''نَعْمَۃٌ'' کہتے ہیں: خوشحالی، آسودگی، عیش وعشرت کی چیزیں جن میں آدمی لذت سے رہتا ہو، مثلاً باغ ہیں، محل ہیں، بڑے بڑے فارم ہیں۔

جبکہ ''نِعْمَۃٌ'' کا معنی ہوتا ہے: کسی پر احسان کرنا۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون لعین کے مقابلہ پر آئے تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اعتراض کیا تھا:

﴿اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾﴾ [الشعراء: ۱۸]

اے موسیٰ! تم وہی بچے نہیں ہو جو ہمارے گھر میں پلے ہو؟ ہم نے تمہیں اپنے گھر میں پالا پوسا اور جوان کیا اور آج تم ہمارے مقابلے پر آگئے ہو؟ تم نے یہاں زندگی گزاری، ہماری تربیت کا یہی صلہ دے رہے ہو؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾﴾ [الشعراء: ۲۲]

فرعون! بڑے عجیب آدمی ہو! بڑا عجیب احسان مجھ پر لگا رہے ہو! تم نے میری قوم کے چھ لاکھ بندوں کو اپنی مزدوری پر لگایا ہوا ہے، ان کی مزدوری ہضم کرتے چلے آرہے ہو، دوسری طرف تم نے اگر ایک بچے کو کچھ عرصہ کھلایا پلایا ہے تو وہ تمہیں بڑا یاد ہے۔ تم نے جو میری قوم متعدد بچوں کو قتل کر ڈالا، اُن کی بچیوں سے بیگار لی، اُن کو اپنے ملک میں قبطیوں کا غلام بنا ڈالا، میری قوم کا چھ لاکھ مزدور کما کما کر تمہارے خزانے بھرتا رہا، وہ تمہیں یاد نہیں اور تم ایک بچے کو کھلا کر احسان جتا رہے ہو، عجیب پاگل آدمی ہو۔

فرعونیت کے جراثیم:

آج کل بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ جتنے بھی وڈیرے ہوتے ہیں...... اللہ ان کو ہدایت دے...... ان سب کا وہی فرعون والا ذہن ہوتا ہے۔ یہ جتنے سرمایہ دار، جاگیردار، کارخانہ دار ہوتے ہیں...... یہ جتنے ''دار'' ہیں، دراصل ''مستحق دار'' ہیں...... ان کے دماغ میں وہی فرعونیت ہوتی ہے کہ تمام علاقے کے غریب کما کما کر ان کے خزانے

بھرتے رہیں اور ایک مرتبہ اگر کسی غریب کو ناجائز مقدمے میں چھڑالیں تو کہتے ہیں: یاد نہیں ہے کہ ہم نے تمہیں تھانے سے چھڑایا تھا؟ تمہیں یاد نہیں کہ ہم نے تمہیں جیل سے نکالا تھا؟ تمہیں یاد نہیں کہ ہم نے تمہارے باپ کو فلاں مصیبت سے بچایا تھا؟

خاندان کے خاندان، نسلوں کی نسلیں کماتی رہیں گے، یہ سب اُن کی کمائی لوٹتے رہیں گے، ان کے خون اور پسینے کی آمدنی اپنی تجوریوں میں ڈالتے رہیں گے اور اگر کبھی ٹھنڈے پانی کا گلاس پلایا ہوگا تو ہمیشہ اس کا طعنہ دیتے رہیں گے کہ تمہیں یاد نہیں کہ ہم نے تمہیں پانی پلایا تھا؟ یاد نہیں کہ جب تم ہمارے پاس آتے تھے تو ہم تمہیں کرسیوں پر بٹھاتے تھے، ہم تمہیں اپنے پاس بٹھاتے تھے، اپنے گھر بلاتے تھے؟ وہ کرسیاں جوان کے پسینے سے بنی ہوتی ہیں، ان کی دولت سے سے بنی ہوتی ہیں، ان کی مزدوریوں سے بنی ہوتی ہیں، وہ بھی انہی پر احسان جتلاتے ہیں، جیسا کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام پر احسان جتلایا۔

حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کا اس کے گھر میں آنا اللہ کی طرف سے ایک عجیب تنبیہ تھی کہ اے فرعون! تمہاری تمام تر فرعونیت کے باوجود، قوت وطاقت کے باوجود، شہنشاہیت کے باوجود، تمہارے اتنے بڑے لاؤ ولشکر کے باوجود دیکھو! جس بچے سے ہم نے تمہیں مروانا ہے، اس کو ہم تمہارے گھر میں پال رہے ہیں۔ اگر اس میں عقل ہوتی تو وہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے سبق سیکھ لیتا، وہ عبرت پکڑتا کہ ایک طرف تو میں بچوں کو قتل کروا رہا ہوں اور دوسری طرف ایک بچے کو خود پال رہا ہوں۔

اور پھر بار بار تنبیہ آنے کے باوجود بھی اس ظالم کو عقل نہ آئی۔ چنانچہ اس نے ایک دن موسیٰ علیہ السلام کو محبت میں اُٹھایا اور ان کو کھلانے لگا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی داڑھی پکڑ کر اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔ اس وقت فرعون کو تھوڑی سی عقل آئی کہ یہ وہی بچہ تو نہیں ہے میری حکومت کے زوال کا ذریعہ بنے گا؟ اس کی بیوی بڑی عقلمند تھی، کہنے لگی: یہ تو بچہ ہے اور بچے ایسے مارتے رہتے ہیں، اس کو کیا پتہ کہ آپ بادشاہ ہیں؟ اس کو تو حمرہ اور جمرہ میں فرق بھی معلوم نہیں۔ ایک طرف تم انگارے رکھ دو اور دوسری طرف کھجور رکھ دو تو اس کو کوئی پتہ نہیں لگے گا کہ یہ کھجور ہے اور یہ انگارے ہیں۔ ایک طرف تم جواہر رکھ دو اور ایک طرف تم انگارے رکھ دو، یہ روشن چیز کو دیکھ کر اس کو پکڑے گا۔ اس پر فرعون نے یہ معاملہ رفع دفع کر دیا۔ دراصل اس کے اندر عقل نہیں تھی، ورنہ وہ اس تنبیہ کو سمجھ لیتا۔

[تفسیر القرطبی: ۱۱/۱۹۲، سورۃ طٰہٰ: الآیۃ: وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي]

ہر فرعون کا انجام یکساں:

یاد رکھو! ہر زمانے کے فرعون کا انجام وہی ہوگا جو سابقہ فرعونوں کا ہوا ہے، ہر زمانے کے قارون کا وہی انجام ہوگا جو سابقہ قارون کا ہوا تھا، اور ہر ظالم کا انجام وہی ہوگا جو پہلے ظالموں کا ہوتا چلا آ رہا ہے۔

ظلم کو بقا نہیں:

ظلم آخر مٹ جاتا ہے اور مظلوم کو آخر اللہ تعالیٰ کی نصرت مل جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جلدی ملے۔ خدا کی منشاء ہے، وہ چاہے تو جلدی دے دے، وہ چاہے تو دیر سے دے دے۔

ظالم کی وراثت......مظلوم کے حصہ میں:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں ''نِعْمَةٌ'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس کا معنی ہے: منت (احسان)۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ دیکھو! ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو عیش وعشرت کی کتنی چیزیں دی تھیں، وہ لوگ کتنی لذتوں بھری زندگی گزر رہے تھے، لیکن جب وہ مسلسل ظلم کرتے رہے اور بنی اسرائیل پر انہوں نے اپنا احسان جتایا تو ہم نے ان کو پکڑ لیا اور مظلوم بنی اسرائیل کو اس ظالم فرعون کا وارث بنا دیا۔

اللہ نے فرما دیا کہ اے اولادِ اسرائیل! اے اولادِ یعقوب! اے میرے خاص اور چنے ہوئے بندے کی اولاد! یاد رکھو! تم ان نعمتوں کو جو میں نے احسان کیا، فضل کیا تم پر، میں نے تم کو بزرگی دی اور میں نے تم کو سارے جہان والوں پر فضیلت دی۔ ان نعمتوں کو یاد کرو۔ یعنی یاد کرو کہ اللہ نے ہمیں بندہ بنا دیا، انسانوں کے گھر میں پیدا کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں حیوان بنا دیتے تو ہم کیا کر لیتے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں ہاتھ پاؤں سالم دے دیئے، اگر لنگڑا کر دیتے تو ہم کیا کر لیتے؟ یا آنکھوں سے اندھا کر دیتے تو ہم کیا کر لیتے؟ اگر کوئی مستقل بیماری لگا دیتے تو ہم کیا کر لیتے؟

ان سب چیزوں کو یاد کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس منعم کا شکر ادا کرو، یعنی اس پر ایمان لے آؤ اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔

عزت......سب سے بڑی نعمت:

سب سے بڑی نعمت ''عزت'' ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو جو سب سے پہلی نعمت یاد دلائی۔ وہ یہ تھی

کہ میں نے تمہیں تمام عالم والوں پر اور تمام لوگوں پر فضیلت دی۔

آپ نے دیکھا نہیں کہ بعض لوگوں کے پاس دولت تو بہت ہوتی ہے، لاکھوں روپے ان کے پاس ہوتے ہیں، لیکن ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اگر کبھی ان کی بات چھڑ جائے تو لوگ کہتے ہیں کہ چھوڑو، حضرت! پیسے کا کیا ہے؟ پیسہ تو فقیروں کے پاس بھی ہوتا ہے، پیسہ تو طوائفوں کے پاس بھی ہوتا ہے، پیسہ تو ہندو مہاجن کے پاس بھی ہوتا ہے، اصل تو یہ ہے کہ بندے کی عزت ہو۔ چنانچہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ایک بگھا بھی زمین نہیں ہوتی، لیکن اللہ نے ان کو عزت دی ہوتی ہے۔

عالم کی شان کا واقعہ:

میرے ایک دوست تھے، وہ فوت ہو گئے...... اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں فرمائے...... بہت بڑے عالم کے بیٹے تھے اور خود بھی بڑے عالم تھے، بہت بڑی شخصیت تھے، ''رحمت اللہ'' ان کا نام تھا اور ''ارشد'' لقب تھا۔ ایک دن ہم اکٹھے بیٹھے تھے، اسی مجلس میں علاقہ کے دو چار سیٹھ اور تاجر اور بڑے بڑے زمیندار لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے اور چائے چل رہی تھی۔

ایک بڑے سیٹھ صاحب...... ان کا نام نہیں لیتا، تاکہ غیبت نہ ہو...... کہنے لگے: علامہ صاحب! عجیب بات ہے، آپ اتنے بڑے عالم اور فاضل ہیں، اللہ نے تمہیں اتنی لیاقت اور قابلیت دی ہے، تحریر اور تقریر کے میدان میں تمہیں بہت شہرت حاصل ہے، یہ تو بات ٹھیک ہے، لیکن ایسی قابلیت کا کیا فائدہ ہے کہ تمہارے پاس ایک ایکڑ زمین بھی نہیں ہے؟ اللہ کے بندے! اتنی زمین تو بنالو کہ چلو کم از کم تمہاری قبر تو اپنی زمین پر بن جائے...... وہ ان پر طنز نہیں کر رہا تھا، بلکہ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ دنیا میں کچھ جائیداد تو بنالیں...... اس پر علامہ صاحب مسکرا دیئے۔ سیٹھ نے کہا کہ آپ تو میری بات پر ہنس رہے ہیں۔ علامہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے اتنا کچھ بنایا ہے کہ تم جیسے کروڑپتی سیٹھ میرے جوتے پالش کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ میں اور کیا بناؤں؟ تم نے دولت بنائی، تم نے زمین بنائی، تم نے جاگیریں بنائیں، تم نے فیکٹریاں اور ملیں لگائیں اور میں نے یہ بنایا کہ تم سارے آکر میرے جوتے اٹھاتے ہو۔ میں دولت کو آگ لگاؤں؟ جبکہ تم دولت والے میرے جوتے اٹھانے میں فخر محسوس کرتے ہو۔

اس آیت میں ''عزت'' کی نعمت کو ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ اصل چیز عزت ہے، دولت نہیں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا: اے بنی اسرائیل! تم یاد رکھو میری اس نعمت کو یاد کرو کہ میں نے تم کو سب سے پہلے جہان والوں پر فضیلت

دی۔ اور وہ فضیلت کیا تھی؟ اس کا ذکر دوسری آیت میں ہے:

﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الدخان:۳۲]

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے علم کی رُو سے دنیا جہان والوں پر فوقیت دی۔''

ایک اور آیت میں نعمت کی تفصیل اس طرح مذکور ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [المائدۃ:۲۰]

''اور اس وقت کا دھیان کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر نازل فرمائی ہے کہ اس نے تم میں نبی پیدا کیے، تمہیں حکمران بنایا، اور تمہیں وہ کچھ عطا کیا جو تم سے پہلے دنیا جہان کے کسی فرد کو عطا نہیں کیا تھا۔''

ایک اشکال اور اس کے جوابات:

یہاں اشکال ہوتا ہے کہ اللہ نے فرمایا: ﴿وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو جہان والوں پر فضیلت دی۔ حالانکہ یہ بات تو واضح ہے کہ سب سے افضل محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور تمام اُمتوں سے افضل اُمتِ محمد مصطفیٰ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ...﴾ [آل عمران:۱۱۰]

اور حضور ﷺ نے فرمایا:

((أَنَا آخِرُ الْأَنْبِيَاءِ وَ أَنْتُمْ آخِرُ الْأُمَمِ.)) [ابن عساکر:۱/۱۹۱، درمنثور:۲/۲۴۴]

''اللہ نے مجھے نبیوں کا آخری بنایا اور تم آخری اُمت ہو۔''

نیز قرآن مجید میں ہے:

﴿جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرۃ:۱۴۳]

قیامت میں ''شہادت علی الناس'' کا مرتبہ اُمتِ محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملے گا۔ جب اللہ کسی اُمت کو ساری اُمتوں پر بطور گواہ چن لیں تو اس کی فضیلت کے اندر کیا شبہ ہوسکتا ہے؟

﴿وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ﴾ کا تقاضا یہ ہے کہ بنی اسرائیل تمام جہان والوں سے افضل ہوں اور دوسری آیات کا تقاضا یہ ہے کہ اُمتِ محمد مصطفیٰ ﷺ افضل و اعلیٰ ہو۔ علماء نے اس کے متعدد جواب دیئے ہیں:

❁......ایک جواب یہ دیا کہ عالَم اسی کو کہتے ہیں جو موجود ہو اور جو موجود نہ ہو وہ تو عالَم ہے ہی نہیں۔ جیسے اس وقت عالمِ دنیا ہے اور عالمِ آخرت نہیں ہے۔ ہم عالم دنیا کو عالم کہتے ہیں، اور عالَم کا اشتقاق علم سے ہے عالَم، عالِم، علماء، علم، ان سب کا مادہ اصلی علم ہے۔ علم تب ہوگا جب کوئی چیز ہوگی، اگر کوئی چیز نہ ہو تو علم کیسے ہو؟

جب اللہ نے بنو اسرائیل کو فضیلت دی تھی اس وقت حضور ﷺ اور آپ کی امت موجود ہی نہیں تھی تو ان پر بنی اسرائیل افضل نہیں ہو سکتے۔ یہ تو ان لوگوں پر افضل ہوں گے جو اس وقت موجود تھے۔ جو عالم تھا ہی نہیں، ان پر ان کی افضلیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

❁......بعض علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جس کو فضیلت دی جا رہی ہے، وہ من کل الوجوہ افضل ہو، بلکہ کبھی کسی ایک چیز میں بھی فضیلت دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: فلاں آدمی بڑا بہادر ہے۔ اس میں بہادری والی صفت پائی گئی۔ لیکن وہ عالم نہیں ہے تو اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ عالم سے بھی افضل ہے۔

جیسا کہ صفتِ حیا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اندر زیادہ تھی۔ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور اکرم ﷺ ٹیک لگا کر لیٹے ہوئے تھے کہ اتنے میں میرے ابا آئے، آپ ﷺ اسی طرح لیٹے رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تو حضور ﷺ اسی طرح لیٹے رہے، تھوڑی دیر گزری تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آنے کی اطلاع ملی، حضور ﷺ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنا کپڑا اپنی پنڈلی مبارک کے اوپر کر لیا اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اندر بلایا۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے یہ بات سمجھ نہ آئی کہ جب ابا ابوبکر موجود ہیں، حضرت عمر موجود ہیں تو حضرت عثمان کا آپ نے اتنا خیال فرمایا کہ میرے ابا کے لیے بھی نہیں فرمایا۔ میں نے حضور ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! عثمان بڑا شرمیلا ہے، بڑا حیا والا ہے، اتنا حیا والا ہے کہ اللہ کے فرشتے بھی اس سے حیا کرتے ہیں۔ اگر میں اسی طرح بے تکلفی میں لیٹا رہتا تو وہ بیٹھ نہ سکتا۔ اس کی طبیعت اتنی نفیس و نازک ہے اور صفتِ حیا کا اتنا غلبہ ہے کہ مجھے سیدھا ہو کر بیٹھنا پڑا، تاکہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ سکے۔ تو صفتِ حیا میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بڑی شان ہے۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۰۱، باب: مِنْ فَضَائِلِ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رضی اللہ عنہ]

حضور ﷺ کی دو بیٹیاں (حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا اور بی بی اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا) یکے بعد دیگرے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی

بیویاں بنیں۔ اسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا لقب ''ذوالنورین'' ہے کہ جن کے گھر میں اللہ کے نبی ﷺ کی دو نورعین تھیں[1]...... بچیوں کو''نورعین'' کہا جاتا ہے کہ میری آنکھوں کا نور ہے، دل کا سرور ہے...... جب دوسری بیٹی بھی فوت ہوگئیں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے عثمان! اگر اللہ مجھے سو بیٹیاں بھی دیتا تو میں انہیں یکے بعد دیگرے تیرے نکاح میں دیتا رہتا۔

[کنزالعمال، حدیث:۳۶۲۰۶]

دیکھیں! حضور ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کتنی عزت دی، جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں حضور ﷺ کی ایک بیٹی آئی۔ تو یہ جزوی فضیلتیں ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۸۸،۸۹، البقرۃ: الآیۃ:۴۷]

افضلیتِ خلفاء راشدین:

لیکن جب کل فضیلتوں کو سامنے رکھا جائے تو حضور ﷺ کے بعد سب سے افضل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے، کوئی سُنّی، اس وقت تک سُنّی نہیں بن سکتا جب تک اس کا یہ عقیدہ نہ ہو کہ پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اسی ترتیب سے جو ان کی افضلیت کا قائل نہ ہو، اس کو''اہلسنت والجماعت'' کہلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

وجہ یہ ہے کہ اگر ساری صفات اکٹھی کی جائیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں پائی جانے والی صفات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اندر کہاں ملیں گی؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تو اسلام میں لانے والے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے عثمان رضی اللہ عنہ اسلام میں آئے۔ سب سے پہلے اسلام لانے والے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نبی کی بیٹیاں لی ہیں اور دینے والے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، انہوں نے اپنی بیٹی حضور ﷺ کو دی ہے، اتنی بڑی قربانی دینے والے اور پھر سب سے اوّل اسلام لانے والے بھی ابوبکر ہیں۔ تو کلی فضیلت بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کی ہوئی۔

اسی طرح بنی اسرائیل کو بھی جزوی فضیلت حاصل تھی۔ ہاں! جب مجموعی فضیلتوں کو سامنے رکھا جائے گا تو اُمتِ محمدیہ ﷺ ساری اُمتوں سے افضل ہوگی۔ بنی اسرائیل میں سے چار ہزار نبی آئے، وہ چار ہزار نبی بھی شان والے، لیکن اللہ نے ایک آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھیجے، جو اُن چار ہزار انبیاء اور باقی تمام انبیاء سے شان میں بڑھ گئے۔ نیز حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام میرے ابا ہیں، میں ان کا بیٹا ہوں، لیکن قیامت والے دن

[1] [کنزالعمال، حدیث:۳۶۲۴۹]

وہ میرے پرچم کے نیچے ہوں گے۔

یہ جو شان اور شرف ملا، اس کی وجہ سے حضور ﷺ تمام انبیاء و مُرسلین سے اور آپ ﷺ کی اُمت تمام اُمتوں سے آگے نکل گئی۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ انبیاء کو بھی عظمت اور مرتبہ عطا ہوا، وہ بھی حضور ﷺ کی وجہ سے ہوا تو بے جا نہ ہوگا۔ جیسا کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے جب اشعار میں حضور اکرم ﷺ کی تعریف کی تو فرمایا:

مَا إِنْ مَدَحْتُ مُحَمَّدًا بِمَقَالَتِي

وَ لٰكِنْ مَدَحْتُ مَقَالَتِي بِمُحَمَّدٍ

[الصبح المنبي عن حيثية المتنبي: ١/٢٨٨]

لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے اپنے اشعار اور قصیدوں میں حضور اکرم ﷺ کی تعریف کی ہے اور بڑا کمال کر دکھایا ہے۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، بلکہ میرا قصیدہ اس لیے اچھا بن گیا کہ اس میں میرے مدنی کا نام آ گیا۔ مجھے یہ شرف ملا کہ اس میں محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر آ گیا۔

جزوی فضیلت کے تذکرے کی مثالیں:

اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں۔ لیکن وہاں کلی فضیلت مراد نہیں ہوتی، بلکہ جزوی فضیلت مراد ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ﴿٨﴾ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ﴿٩﴾ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ﴿١٠﴾﴾ [البلد: ٨، ٩، ١٠] اے میرے بندے! کیا تُو غور نہیں کرتا کہ میں نے تجھے دو آنکھیں دی ہیں، ان آنکھوں پر تُو غور کر لے کہ میں ان آنکھوں کے کیسے بنایا؟ اتنی نازک چیز کہ میں نے تمہارے اندر قوتِ باصرہ رکھا ہے۔ ذرا اس کے شفاف پردوں پر غور کرو، اس کے اندر پتلی پر غور کرو، اس کے اندر جو پانی کا ایک قطرہ ہے اس پر غور کرو، پھر اس کے مرکزِ اصلی پر غور کرو۔ پھر اتنی نرم و نازک چیز کی حفاظت پر غور کرو کہ اس کے اوپر پردے لگا دیئے ہیں، آگے پلکیں لگا دی ہیں، تاکہ کوئی گرد و غبار بھی اندر نہ چلا جائے۔ اور پھر اتنی چھوٹی چیز، اتنے محدب شیشے میں اتنی پاور دے دی ہے کہ اُٹھے تو بجلی پناہ مانگے اور گرے تو خانہ خراب کر دے۔ پھر بھی تُو مجھے نہیں مانتا۔

اور فرمایا کہ غور کرو کہ میں نے تمہیں ایک زبان دی ہے، ایک گوشت کا ٹکڑا ہے، کاٹ کر باہر پھینک دو تو تمہیں اس کی قدر کا اندازہ ہو جائے گا۔ جانور کی زبان دیکھی نہیں ہے کہ اس کو کاٹ کر کھاتے ہو؟ اس زبان میں میں نے

کتنی طاقتیں رکھی ہیں؟ تم بھی کوئی ٹکڑا بناؤ جو ایسے بولتا ہو۔

اس کے بعد فرمایا: میں نے تمہیں کیسے خوبصورت ہونٹ دیئے؟ اگر ایک ہونٹ کٹ جائے تو پھر دیکھو، اگر ایک ہونٹ میں کٹ لگ جائے تو دیکھو، ہونٹ میں ورم آ جائے تو دیکھو، نیچے والا ہونٹ نیچے گر جائے تو گھر والے بھی ڈر جائیں۔

دیکھیں! ان آیات میں اللہ نے آنکھ، زبان اور پھر ہونٹوں کا تذکرہ کیا۔ یہ تینوں اپنے طور پر بہت فوائد کے حامل ہیں، جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ لیکن ان کا یہ تذکرہ اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ ان کو پورے انسانی بدن پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ اس سے فقط ان کی جزوی فضیلت معلوم ہوتی ہے، کلی فضیلت پورے انسانی جسم کو حاصل ہے جس میں یہ تینوں بھی آ جاتے ہیں۔

مدینہ و گرد و نواح میں یہود کی آباد کاری:

تواریخ یہ بتلاتی ہیں کہ جب یمن کا بادشاہ ''تبع'' مدینہ منورہ میں آیا تھا، اس زمانہ میں یہود مدینہ منورہ میں آ کر آباد ہونا شروع ہوئے...... تبع، وہ بادشاہ ہے جس نے سب سے پہلے اللہ کے گھر کو غلاف دیا، یہ یمن کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا[1]...... اصل میں وہ مختلف فتوحات کرتے ہوئے مدینہ منورہ میں آیا تو اس کے ضمن میں کچھ یہود مدینہ منورہ میں آ گئے اور پھر وہ وہیں اقامت پذیر ہو گئے۔

اپنی کتابوں کی پیشین گوئی کے مطابق کہ ایک آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پیدا ہوں گے اور مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائیں گے تو ہم لوگ ان پر ایمان لائیں گے۔ ان کا مدینہ منورہ میں آنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایمان لانے میں سبقت ملے گی۔ یہ تبع کے زمانہ سے وہاں آ کر آباد ہوئے اور اس کے بعد بھی آتے رہے۔ ان کے معروف قبائل: بنو قریظہ، بنو قینقاع اور بنو نضیر تھے۔ ان کے علاوہ متفرق قبائل کے بھی کچھ لوگ ہیں جو مدینہ منورہ میں آ کر آباد ہوئے۔

ویسے یہ بات بالکل غلط ہے کہ مدینہ منورہ ان کا اپنا ملک تھا، جیسا کہ ان بدبختوں نے اپنے مکر اور خداع کے پیش نظر دنیا کو یہ تاثر دیا ہوا ہے کہ مدینہ منورہ تک اسرائیل کا حصہ بنتا ہے، یہ ہمارا علاقہ تھا، ہم مدینہ منورہ میں رہنے والے تھے، وہاں ہمارے گھر تھے، ہمارے قلعے تھے، وادیاں تھیں، لہٰذا یہ علاقہ ہمارا ہے۔ یہ سراسر دھوکہ اور فراڈ

[1] مصنف عبد الرزاق، حدیث: ۹۰۸٦

ہے۔ نہ ان کا مدینہ منورہ سے کوئی تعلق تھا، نہ ان کا سرزمین عرب سے کوئی تعلق رہا ہے، بلکہ یہ اپنے ملک چھوڑ کر یہاں آباد ہوئے تھے کہ حضور ﷺ پر ایمان لائیں گے، لیکن جب حضور ﷺ تشریف لے آئے تو بغض، حسد اور عناد کی وجہ سے ان لوگوں نے اللہ کے نبی سے کفر کیا۔

ایک شبہ کی وضاحت:

مستشرقین یہاں ایک شبہ پیدا کرتے ہیں کہ خداوند قدوس نے قرآن میں یہ حکم فرمایا ہے کہ اگر تم کسی کو خیرات یا صدقہ دو، یا کسی غریب کی مدد کرو تو پھر احسان جتلا کر اپنے اس صدقہ کو ضائع نہ کرو۔ اللہ نے فرمایا: ﴿لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى﴾ [البقرۃ: ۲۶۴] (اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع مت کرو)۔ یہاں تو اللہ نے احسان جتلانے سے منع کیا ہے اور ان آیات میں اللہ تعالیٰ خود احسان جتلا رہے ہیں کہ اے بنی اسرائیل! میرے احسان یاد کرو، میری نعمتیں یاد کرو جو ہم نے تمہارے اوپر کیں۔

پہلا جواب:

معاملات اور احکام کی کئی قسمیں ہیں، جب تک ہر قسم الگ سمجھ نہیں آئے گی، دماغ میں ایسی اُلجھنیں پیدا ہوتی رہیں گی:

- ......چنانچہ ایک معاملہ ہے جو بندوں کا بندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔
- ......ایک معاملہ ہے جو بندوں کا اپنے اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔
- ......اور ایک معاملہ ہے جو اللہ کا اپنی مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے۔

جو معاملہ اللہ اور مخلوق کے مابین ہوتا ہے، اس میں مخلوق کو اللہ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ تم یہ کام کرو اور یہ کام نہ کرو۔ اور ایک معاملہ وہ ہے جو بندوں کا بندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس دعا میں دو طرح کے معاملات کا ذکر ہے:

''اَللّٰهُمَّ اِنَّ لَكَ عَلَيَّ حُقُوْقًا كَثِيْرَةً فِيْمَا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ وَ حُقُوْقًا كَثِيْرَةً فِيْمَا بَيْنِيْ وَ بَيْنَ خَلْقِكَ.''

[ذخیرۃ العقبیٰ فی شرح المجتبیٰ]

معاملات کی تفصیل:

- ......ایک معاملہ بندوں کا بندوں سے ہے، جیسے لین دین ہے، خیرات، صدقہ، صلہ رحمی اور ہمدردی وغیرہ۔

......اور ایک معاملہ بندوں کا اپنے اللہ کے ساتھ ہے کہ ہم نے اللہ کے حکم کی اطاعت کرنی ہے، استعانت صرف اللہ سے کرنی ہے، نذر و نیاز اللہ کے نام پر ہے، سجدہ و رکوع اللہ کے لیے ہے اور نفع نقصان کا مالک ہم نے اللہ کو سمجھنا ہے وغیرہ۔ یہ معاملہ بندوں کا اللہ کے ساتھ ہے۔

......اور ایک معاملہ اللہ کا اپنی مخلوق کے ساتھ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو کسی کام کا حکم دیتے ہیں یا کسی کام سے منع کرتے ہیں۔

ان تینوں معاملات میں سے کسی ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اب دیکھیں! یہ جو اللہ نے کہا ہے کہ احسان نہ جتلاؤ، اس کا تعلق اس معاملے سے ہے جو مخلوق کا مخلوق کے ساتھ ہے، جبکہ اللہ کا بندوں پر احسان جتلانا دوسری قسم (اللہ کا بندوں کے ساتھ معاملہ) ہے۔ جب دونوں معاملے ہی الگ الگ ہیں تو ان کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا جائز نہیں، قیاس تو تب کیا جا سکتا تھا جب اللہ نے مخلوق کو دو طرح کے حکم دیئے ہوتے، ایک جگہ احسان جتلانے سے منع کیا ہوتا اور دوسری جگہ احسان جتلانے کا حکم دیا ہوتا۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو غیر اللہ کے نام کی قسم کھانے سے منع کیا ہے، لیکن خود ''التین، الزیتون'' وغیرہ کی قسم کھائی ہے۔ مخلوق کو غیر کی قسم کھانے سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ جب وہ اللہ کے علاوہ کسی کی قسم کھائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس چیز کو اللہ کے برابر سمجھ رہا ہے۔ اس سے شرک کا اندیشہ پیدا ہو گیا، اس لیے منع کر دیا۔ جبکہ خالق کے ہاں شرک کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ تو مخلوق کو منع کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے نام کی قسم نہ اُٹھائیں، اللہ تبارک و تعالیٰ خود تو اس کے مکلف نہیں ہے، لہٰذا وہ کسی بھی چیز کی قسم کھا سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کسی چیز کی قسم کھائی ہے تو وہ خالق کا معاملہ ہے اور یہاں (غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع کرنا) مخلوق کا معاملہ ہے، اور مخلوق کے لیے احکام علیحدہ ہوتے ہیں۔

یوں سمجھ لو جیسے کوئی آدمی کہے: عجیب بات ہے کہ دنیا میں ہمیں چار عورتیں رکھنے کی اجازت ہے اور آخرت میں اللہ ستر حوریں بھی دے گا اور بیویاں بھی ملیں گی۔ تو اس کی یہ بات جہالت پر مبنی ہوگی۔ کیونکہ دنیا کا حکم علیحدہ ہے اور عالَم آخرت کا حکم علیحدہ ہے۔ دنیا میں نماز فرض ہے اور آخرت میں نماز فرض ہی نہیں ہے، دنیا میں ہمارے اوپر روزہ فرض ہے اور جنت میں کوئی روزہ نہیں، دنیا میں اگر اللہ دولت دے تو حج فرض ہے، لیکن جنت میں جانے کے بعد کوئی حج فرض نہیں، دنیا میں ہمارے معاملات ہیں، نکاح ہے، طلاق ہے، میراث ہے، جائیداد ہے، تقسیم ہے،

آخرت میں یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ وہ عالَم ہی الگ ہے اور یہ عالَم ہی الگ ہے۔ لہٰذا اِس عالَم کو اُس عالَم پر کوئی قیاس کرے تو یہ جہالت والی بات ہے، ایسی بات تو ایک ادنیٰ آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہ آخرت کا معاملہ ہے اور ہم تو دنیا کے معاملہ کی بات کر رہے ہیں۔

دوسرا جواب:

علماء نے دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ ایک ہے خیرات وصدقہ کر کے اس پر احسان لگانا۔ اور ایک ہے کسی پر اپنی نعمت، انعام کرنا۔ پھر اگر وہ مُنعَم عَلَیہِم لوگ انکار کے اس مقام پر آجائیں کہ اپنے مُنعِم کے باغی بن جائیں تو وہاں نعمتیں یاد دِلانے کی اجازت ہے، چاہے وہ معاملہ مخلوق کے درمیان ہو یا خالق اور مخلوق کے درمیان ہو۔ جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جب محاصرہ کیا گیا اور کھانا پینا بند کر دیا گیا تو آپ نے اپنے انعامات یاد دِلا کر باغی محاصرین کو شرم دلائی تھی اور اس پر کسی صحابی نے بھی انکار نہیں کیا تھا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟

شہادتِ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ:

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، ذوالنورین، شہید مظلوم، خلیفہ ثالث، داماد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں جب ایک سازش کا شکار ہو گئے اور یہودیوں کے مکر میں پھنس گئے، ایسے ان کو اُلجھا دیا گیا کہ ماسوائے شہادت کے پھر کوئی راستہ ہی نہ رہا۔

یہودیوں کے پھیلائے ہوئے جال سے نکلنے کا بڑا لمبا واقعہ ہے۔ مختصراً بات اتنی سی ہے کہ یہودیوں نے اپنے لوگوں کے ذریعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو والیٔ مصر کی شکایت کی کہ آپ نے جو مصر کا گورنر رکھا ہے وہ بڑی زیادتی کر رہا ہے، ظلم کر رہا ہے...... حالانکہ وہ شکایتیں بھی غلط تھیں...... اور مطالبہ یہ کیا کہ مہربانی کریں اور وہاں کے گورنر کو بدل دیں۔ ہم بڑے مجبور ہو گئے ہیں، اس نے تو ظلم وستم کے پہاڑ توڑ ڈالے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے مطالبہ کو ہمدردی کے ساتھ سنا اور اس کے بعد ان کے مطالبہ کو مان کر آپ نے محمد بن ابی بکر کے نام ایک فرمان جاری کیا کہ میں ان کو گورنر بنا کر بھیج رہا ہوں اور جب وہ پہنچیں تو تم فوراً چارج چھوڑ دو اور ان کو گورنری کا اقتدار سپرد کر کے فوراً مدینہ میں حاضر ہو کر رپورٹ کرو۔ حضرت محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اپنا ایک دستہ لے کر چلے، اس دستے میں بھی یہودیوں نے اپنے بندے شامل کر لیے۔

جب وہ مصر کی طرف روانہ ہو گئے تو یہودیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قریب رہنے والے کچھ افراد کو اپنی سازش کا حصہ لیا۔ مروان، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کاتب تھے، ان کے بارے میں بعض تاریخیں کہتی ہیں کہ ان کو بھی اس سازش میں شریک کیا گیا تھا۔ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ مروان کو شریک نہیں بنایا گیا، بلکہ اسے بھی اسی طرح دھوکہ میں ڈالا گیا جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ڈالا گیا۔ اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مہر حاصل کر لی گئی اور بعینہ اسی طرز کتابت میں گورنر مصر کے نام ایک خطاب لکھا گیا اور اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مہر لگائی گئی...... اس زمانہ میں چونکہ مہر کا بڑا اعتماد تھا۔ اب بھی دیکھیں! عرب میں جب تک مہر نہ ہو، بات نہیں مانتے...... مہر لگا کر اس خط میں لکھا گیا کہ ''جب محمد بن ابی بکر تمہارے پاس پہنچیں تو ان کو قتل کر دو۔'' اور یہ لفافہ میں ڈال کر ایک قاصد کو دے دیا گیا کہ گورنر مصر کو یہ پہنچاؤ۔

اور ایسے انداز میں اس کو راستہ بتلایا گیا کہ وہ عین اس سڑک سے گزرے جہاں سے محمد بن ابی بکر کا قافلہ جا رہا ہے۔ دوسری طرف محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے کسی بندے کے ذریعے پوچھا گیا کہ حضرت! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: میں مصر جا رہا ہوں۔ ان سے کہا گیا: کمال ہے، تمہارے لیے تو سازش تیار ہو گئی ہے، وہاں تم پہنچو گے تو قتل کر دیئے جاؤ گے، حضرت عثمان نے یہ آرڈر جاری کیا ہے۔ انہوں نے کہا: میرے قتل کا آرڈر کیسے جاری ہو سکتا ہے، جبکہ مجھے انہوں نے گورنر بنا کر بھیجا ہے؟ ان سے کہا گیا: ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ ایک آدمی جس کا نام فلاں ہے، اس کے اونٹ کا رنگ فلاں ہے، اس کے پاس وہ پروانہ ہے اور وہ بھی مدینہ سے نکل پڑا ہے۔ اب یہ تمہاری ڈیوٹی ہے کہ راستے میں بندے لگاؤ اور اس سے وہ خط حاصل کرو۔ چونکہ اس بندے کو اسی راستے پر بھیجا گیا تھا جس پر محمد بن ابی بکر جا رہے تھے، لہٰذا وہ راستہ میں پکڑا گیا اور اس سے وہ خط نکل آیا۔ جب خط پڑھا تو محمد بن ابی بکر آگ بگولہ ہو گئے کہ عجیب بات ہے کہ اللہ کے نبی کے خلیفہ مجھے ایک حکم دیتے ہیں کہ گورنر بن جاؤ اور دوسرا حکم دیتے ہیں کہ مجھے قتل کر دیا جائے۔ میں نے کیا جرم کیا ہے کہ مجھے قتل کر دیں؟

ان کے وفد میں جو لوگ اس فتنہ کو ہوا دینے کے لیے شریک تھے، وہ کہنے لگے: کیا ایسا آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ بن سکتا ہے؟ چلو فوراً حضرت عثمان پر حملہ کرو۔ انہوں نے آ کر حضرت عثمان کا محاصرہ کر لیا، ان کے گھر پر ڈیرہ ڈال لیا۔ پہلے بیالیس آدمی تھے، پھر ان کے باقی آدمی بھی ملتے گئے تو اسی ہو گئے، پھر ڈیڑھ سو ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر میں محصور کر دیا گیا اور پہرہ لگا دیا کہ باہر نہ نکلنے دیا جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: یہ کیسی بات ہے کہ آپ ایک پروانہ جاری کرتے ہیں کہ گورنر بنادو اور دوسرے پروانے میں آپ حکم دیتے ہیں کہ قتل کردو؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے تو دوسرے پروانے کا کوئی پتہ نہیں۔ کہنے لگے: اس پر آپ کی مہر لگی ہوئی ہے، اس کا مطلب ہے کہ یہ شرارت مروان نے کی ہے، پھر آپ مروان کو ہمارے حوالے کردیں، ہم اس سے بدلہ لیتے ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کے بندو! یہ نبی کا شہر ہے، مدینہ منورہ ہے، یہاں تم کسی کا خون نہ بہاؤ۔ جس طرح مجھے کسی سازش میں الجھا دیا گیا ہے، اسی طرح اسے بھی الجھا دیا گیا ہوگا۔ جب تک میں تحقیق نہ کرالوں کہ اس کے اندر مروان کا قصور ہے یا نہیں، اس وقت میں اسے قتل کے لیے تمہارے سپرد نہیں کرسکتا۔ آپ اپنا ایک کمیشن بنادیں، میں بھی انکوائری کرتا ہوں، آپ بھی انکوائری کریں، ثابت ہوجائے تو ہم اس کو سزا دیں گے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ ایک سازش پکڑی جائے، اب خلیفہ تو اس کام میں معطل ہوجائے اور معاملہ تمہارے سپرد کردوں کہ تم جس کو چاہو سزا دو اور قتل کردو۔ پھر میرا خلافت پر بیٹھنے کا کیا فائدہ ہوا؟ مگر انہوں نے بات نہ مانی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹوں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو حکم دیا: میرے بیٹو! تم حضرت عثمان کے دروازے پر پہرہ دو۔ تم اگر علی کے بیٹے ہو، نبی کے نواسے ہو، عثمان کی حفاظت کرو، تمہاری لاشوں سے گزرے بغیر کوئی عثمان تک نہ پہنچنے پائے۔ وہ داماد مصطفیٰ ہیں، وہ خلیفہ رسول اللہ ہیں، اگر اللہ کے نبی کے شہر میں خلفاء کو ایسے قتل کردیا گیا تو پھر آنے والوں کا کیا بنے گا؟ حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے اور دروازے پر پہرہ دینے لگے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں قاصد کے ذریعے پیغام بھیجا کہ آپ خلیفہ رسول اللہ ہیں، ڈیڑھ دو سو آدمی آپ کی بغاوت پر آمادہ ہیں، اس وقت پورے مدینے میں ہماری طاقت وقوت موجود ہے، آپ ہمیں صرف بحیثیت خلیفہ رسول اللہ حکم دیں کہ ان باغیوں سے نمٹیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک گھنٹے کے بعد ان کی ایک بوٹی بھی پورے مدینہ میں نہیں ملے گی۔ پورا مدینہ ٹوٹ پڑے گا، وہ تو حکم کے انتظار میں ہے کہ جب خلیفہ آرڈر نہیں کرتا تو ہم کیا کریں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پیغام بھیجا کہ میں تمہارا شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس نیکی کا بدلہ دنیا وآخرت میں عطا فرمائیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ باغی مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں تو میں اپنا خون دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن میں محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں تلوار چلانے کی اجازت نہیں دے سکتا، میں اللہ کے نبی کے شہر

کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتا کہ میری وجہ سے یہاں تلوار چلے، لوگ لڑیں اور ایک دوسرے کو قتل کریں اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں مسلمانوں کا خون بہے۔ میں قیامت میں حضور ﷺ کے سامنے کیسے جاؤں گا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ میں شہید ہو جاؤں گا تو ایک آدمی کی قربانی تو مجھے گوارا ہے، لیکن پورے مدینہ منورہ کے امن کو تہہ و بالا کر دینا اور یہاں قتل و قتال کی اجازت دینا، مجھے گوارا نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سمجھایا کہ حضرت! آپ فتنوں کے روکنے کا دروازہ ہیں۔ اگر آپ کنٹرول نہیں کریں گے تو یہ دروازہ ٹوٹ جائے گا اور پھر بعد میں یہ فتنے ہم سے نہیں رکیں گے۔ آپ مہربانی کریں، ہمیں اجازت دیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اجازت نہیں دے سکتا۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کے باہر جھانک کر باغیوں کو خطاب کیا اور فرمایا:

❁ ......تم یہ جانتے ہو کہ اللہ کے نبی کی دو بیٹیاں میرے گھر میں رہی ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں! ہم جانتے ہیں۔

❁ ......فرمایا: تم یہ بات بھی جانتے ہو کہ جب اسلام مدینے میں آیا تو ایک بئر رومہ تھا جو یہودیوں کے قبضہ میں تھا جس کنویں کا پانی میٹھا تھا، باقی کسی کنویں کا پانی میٹھا نہیں تھا اور یہودی مسلمانوں کو وہاں سے پانی نہیں بھرنے دیتے تھے، خاتم الانبیاء حبیب کبریا، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم تسلیما کثیرا نے مسجد نبوی میں اعلان فرمایا کہ جو انسان اس کنویں کو یہودیوں سے خرید کر کے مسلمانوں کے لیے وقف کر دے، اس کی جنت کا قیامت میں میں ذمہ دار ہوں، یہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا؟ انہوں نے کہا: بالکل ہمیں معلوم ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا۔

❁ ......آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کنواں میں نے یہودیوں سے خرید کر مسلمانوں کو دیا تھا؟ انہوں نے کہا: ہمیں بالکل معلوم ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۲۷۷۸، باب: إِذَا وَقَفَ أَرْضًا أَوْ بِئْرًا]

❁ ......فرمایا: سارے مدینہ والوں کو پانی پلانے والا عثمان تھا اور آج مجھے پانی نہیں دیتے ہو، آج میرے لیے پانی بند ہے۔

❁ ......پھر فرمایا: یہ بھی یاد رکھو کہ غزوۂ تبوک کے زمانہ میں حضور پاک ﷺ نے جب چندہ مانگا تھا تو ایک ہزار اونٹ اور بعض روایات میں تین سو بمعہ پالان، بمعہ اسلحہ اور بمعہ سارے ساز و سامان کے دیئے اور حضور ﷺ

کے سامنے درہم ودنانیر کے میں نے ڈھیر لگا دیئے۔ حضور ﷺ نے اپنی گود مبارک میں وہ درہم لیے اور یوں ہلا رہے تھے، مسکرا رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ عثمان! تجھے مبارک ہو۔ آج کے بعد جو کچھ تم کرو، تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا، تیری جنت کا میں ذمہ دار ہوں۔[1] اس کے بعد پوچھا: کیا یہ میرا چندہ اور میرے احسان معلوم ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں! معلوم ہیں۔

❁.....آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر بھی تم مجھے قتل کرنے کے لیے تیار ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم تو اس لیے کھڑے ہیں کہ آپ نے دو پروانے کیوں جاری کیے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے جاری نہیں کیے۔

بہر حال انہوں نے نہ مانا۔ جوں جوں دیر ہوتی گئی تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حالت بگڑتی گئی۔ پانی ان کا بند ہوگیا، حسنین رضی اللہ عنہما نے پانی پہنچانے کی کوشش کی تو ان ظالموں نے وہ مشکیزے تیر مار کر چھلنی کر ڈالے، پانی نہ پہنچا۔

اور جب بالکل آخری وقت آگیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اور دیگر صحابہ نے پھر پیغام بھیجا کہ حضرت! مہربانی کریں، آج کتنے دن ہوگئے اور آپ بھوکے پیاسے اپنے گھر میں قید ہیں اور ڈیڑھ سو باغیوں نے مدینہ منورہ کے اندر ایک خلیفۂ رسول کو قید میں رکھا ہوا ہے، مہربانی کریں، آپ ہمیں حکم دیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک جگہ سے جھانکا اور فرمایا: اے علی! کیوں پریشان ہوتے ہو؟ مجھے آج حضور ﷺ کی زیارت ہوئی اور میں حضور ﷺ کا فراق اب زیادہ برداشت نہیں کرسکتا۔ لہٰذا میں نے تو شہید ہونا ہے۔

اس موقع پر باغیوں نے ایک اور پیشکش کردی کہ اگر آپ خلافت سے دستبردار ہوجائیں تو ہم آپ کو چھوڑ دیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں یہ کیسے چھوڑ دوں؟ جبکہ مجھے اللہ کے نبی ﷺ نے خود فرمایا تھا کہ اللہ تمہیں ایک قمیص پہنائے گا، اسے کبھی نہ اُتارنا، مظلوم شہید ہوجانا، لیکن خود خلافت سے نہ دستبردار نہ ہونا۔ اس لیے میں از خود خلافت نہیں چھوڑ سکتا۔

[سنن الترمذي، حدیث: ۳۷۰۵]

یہاں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا احسان جتلانا اس لیے تھا کہ اس وقت کچھ لوگ بغاوت کی حدوں کو پہنچ گئے تھے، اور پھر کسی صحابی نے اس پر اعتراض بھی نہیں کیا کہ آپ اپنے کیے ہوئے احسانات کیوں جتلا رہے ہیں۔ لہٰذا اگر ایسے حالات ہوجائیں تو احسان جتلانا جائز ہوتا ہے۔ اور پھر یہ احسانات کسی ایک فرد پر نہیں تھے، بلکہ پورے عالم

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۲۷۷۸، باب: إذا وقف أرضا أو بئرا؛ سنن الترمذی، حدیث: ۳۷۰۱]

اسلام پر تھے، پورے اہل مدینہ پر تھے، پورے مہاجرین وانصار پر تھے۔

ایسے حالات میں حضرت عثمان کا اپنے احسانات کا ذکر فرمانے اور کسی صحابی کے اس پر انکار نہ کرنے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو جیسے اللہ نے اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے، بندوں کو بھی اپنی نعمتوں کا ذکر کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

یہودیوں کے کرتوت:

یہ تورات جو اس وقت دنیا میں ملتی ہے، اگر آپ اس کو پڑھیں تو آپ کان پکڑ لیں۔ اس تورات میں انہوں نے لکھا ہے کہ لوط علیہ السلام...... نعوذ باللہ...... اپنی بیٹیوں سے زنا کرتے تھے۔ بھلا یہ اللہ کی کتاب ہو سکتی ہے؟ یہ ایسی بد بخت قوم ہے کہ انہوں نے چند روپے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل ہونے کے لیے پکڑوانے کی کوشش کی۔ یہ ایسی بد بخت اور اتنی ذلیل قوم ہے کہ اللہ کی نعمتوں کے بعد بغاوت کی انتہاء کر دی۔

اس لیے دیکھیں! اللہ نے ان کو سزائیں بھی ایسی دی ہیں۔ کسی دوسری اُمت کے بارے میں آپ کو ایسا واقعہ نہیں ملے گا کہ ان کو بندر یا خنزیر بنا دیا گیا، انسانیت سے نکال کر حیوان بنا دیا گیا ہو۔ بنی اسرائیل (یہود) پر اللہ نے ایسا عذاب بھیجا کہ شام کو سوتے وقت انسان تھے، جب صبح اُٹھے تو ستر ہزار آدمی بندر اور خنزیر بن چکے تھے۔

یہود...... ہر فتنہ کی جڑ:

آج اگر کوئی آدمی تحقیق کرے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ پوری دنیا میں جتنے فتنے ہیں، ان سب کے پیچھے یہودیوں کا ہاتھ ہے۔ وہ فتنے اگر عقیدے کے بارے میں ہیں تو ان کے پیچھے یہودی ہیں، اگر اقوال، افعال، اعمال کے بارے میں ہیں تو ان کے پیچھے یہودی ہیں، اور وہ فتنے اگر مال کے بارے میں ہیں یا اقتصادیات کے بارے میں ہیں تو ان کے پیچھے یہودی ہیں، اور وہ فتنے اسلامی لوگوں کو مارنے کے سلسلے میں ہیں تو ان کے پیچھے یہودی ہیں۔

یہ ایسے دشمن اسلام ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے دین اسلام سے، ایمان سے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ذات سے بغض وعناد ہے۔ یہ جہاں بھی ہیں، جس جگہ بھی ہیں، ان کا ایک ہی کام ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو کسی طرح نقصان پہنچاؤ۔ یہ ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔

اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے بڑی بہتری تھی کہ پہلی فضیلت بھی ان کو ملتی اور اب بھی ان کو فضیلت ملتی۔ ان کو دو دفعہ اجر ملتا، ایک پہلے نبی پر ایمان لانے کا اور ایک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لانے کا، ایک پہلی کتاب پر ایمان لانے کا اور اللہ کے قرآن پر ایمان لانے کا۔

[صحيح البخاري، حديث:٣٤٤٦، باب: قول الله: واذكر في الكتاب مريم]

اس اُمت سے پہلے کتنی اُمتیں گزریں؟

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ تم سے پہلے اُمتیں گزر چکی ہیں، تم سترہویں اُمت ہو، یعنی تم سے پہلے اُنہتر اُمتیں گزر چکی ہیں اور ستر کو پورا کرنے والے تم ہو۔ لیکن تم ان ستر اُمتوں میں سے سب سے زیادہ بہتر ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بہتر اُمت ہو۔

[سنن الترمذي، حديث:٣٠٠١، باب: ومن سورة آل عمران]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی اُمت کی فضیلت کے بارے میں بہت ساری احادیث ہیں جن کو میں نے ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ والی آیاتِ مبارکہ میں ذکر کیا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ١/٨٩، البقرة: الآية: ٤٧]

﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٨﴾﴾ [البقرة:٤٨]

''اور اس دن سے ڈرو کہ کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ اس کی سفارش قبول ہوگی اور نہ اس کی طرف سے فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔''

پچھلی آیات میں ترغیب کا پہلو تھا اور ان آیات میں ترہیب کا پہلو ہے۔

تقویٰ کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ:

لغت میں ''تقویٰ'' کسی چیز کی صیانت وحفاظت کو کہتے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں اس کا آسان مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ کام کو اللہ اور اللہ کے رسول کے فرامین مبارکہ کے خلاف ہو، اس سے بچنا چاہیے۔ ان احکام کا تعلق عقائد

سے ہو یا اقوال واعمال سے ہو، ان کو شامل ہے۔

تقویٰ کی افادیت:

اگر اسی لفظ "تقویٰ" پر غور کریں تو یہ اتنا جامع، مانع، کامل اور مکمل لفظ ہے کہ یہی ایک لفظ بندے کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ اگر تقویٰ پیدا ہو جائے تو مکمل شریعت پر عمل آسان ہے۔ تمام انبیاء نے اپنی قوموں سے کہا: "اِتَّقُوا اللّٰهَ، اِتَّقُوا اللّٰهَ" "اے قوم! اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو۔ اللہ نے قرآن پاک میں بھی فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] تم مخلوق کو حکم دیا گیا کہ اپنے رب سے ڈرو۔

تقویٰ کی اہمیت:

حضور اکرم ﷺ کے خطابات پر نظر کریں تو حضور ﷺ نے بارہا اپنے خطابات میں یہ فرمایا کہ "اِتَّقُوا اللّٰهَ" (اللہ سے ڈرو) اور "اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ" (میں تمہیں ایک ہی وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو)۔

پورے دین کا خلاصہ:

بعض اللہ والوں نے لکھا ہے کہ اگر پورے دین کا خلاصہ نکالا جائے تو صرف دو چیزوں میں نکلتا ہے: ایک اللہ سے ڈرنا اور دوسرا اللہ کی مخلوق پر شفقت کرنا۔ اسی کا نام دین واسلام ہے۔

جرائم کی روک تھام میں تقویٰ کی اہمیت:

دنیا میں جرائم ختم کرنے کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود جرائم کی سو فیصد روک تھام نہیں ہو سکی، بلکہ جتنی فورسز بڑھ رہی ہیں اس سے کہیں زیادہ جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ پر اسلام کا دستور دیکھیں! اسلام کہتا ہے کہ مسلمان جب کلمہ پڑھے تو اس کے دل میں اللہ کا ڈر جاگزین ہو جائے اور اس کے دل میں بھر جائے۔ جب اللہ کا ڈر دل میں داخل ہو گیا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ قتل اور دیگر جرائم پر آمادہ ہو، کیونکہ اسے تو پتہ ہے کہ میری ہر حرکت، میرا ہر عمل اور میرا ہر قول وفعل اللہ کے سامنے ہے، اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کے دل کے اندر تقویٰ آجائے گا تو اسے کسی فورس کی ضرورت نہیں ہے۔

تقویٰ کے درجات

تقویٰ کے بھی مختلف مدارج ہیں:

پہلا درجہ......کفر وشرک سے بچنا:

سب سے پہلے تقویٰ یہ ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ کفر وشرک سے بچے۔ اسی لیے قرآن نے مومنین کی صفت میں یہ بیان فرمایا: ﴿وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝﴾ [الفتح: ۲۶] صحابہ کے دلوں کو تقویٰ پر جما دیا، وہ اس کے مستحق تھے، اسی کے لائق تھے، وہ اسی کے اہل تھے۔ اور کہیں اللہ نے فرمایا: ﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ [الحجرات: ۳] اللہ نے ان کے دلوں کا امتحان کر لیا، مانجھ لیا، ان کے دلوں کو جانچ لیا تقویٰ کے لیے۔ تو جو آدمی کفر وشرک سے نہ بچے، وہ متقین کی صف میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔

دوسرا درجہ......گناہوں سے بچنا:

اور دوسرا تقویٰ یہ ہے کہ جتنے بھی بڑے بڑے اور ہلاک کر دینے والے گناہ ہیں، آدمی ان سے بچنے کے ساتھ ساتھ صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے۔ کیونکہ صغیرہ گناہ کو اگر بار بار کیا جائے تو وہ صغیرہ نہیں رہتا۔ اس لیے کسی شاعر نے کہا تھا کہ تم اپنے چھوٹے گناہوں کو چھوٹا نہ سمجھا کرو، دیکھا نہیں کہ پہاڑ بھی چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے بنتے ہیں، دیکھا نہیں ہے کہ گندم کے چھوٹے چھوٹے دانے ہوتے ہیں، ان کا ڈھیر لگا دو تو ٹیلہ بن جاتا ہے۔ بظاہر تو ایک اینٹ ہوتی ہے، لیکن اینٹ پر اینٹ جڑتی چلی جائے تو ایک دیوار بن جاتی ہے۔

کسی گناہ کو چھوٹا نہ سمجھو:

میرے آقا ﷺ نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: عائشہ! خبردار خیال رکھنا، گناہوں کو چھوٹا نہ سمجھنا۔

[سنن الدارمي، حديث: ۲۷۶۸، باب: في المحقرات]

آج کل لوگ کہتے ہیں کہ سگریٹ کیا ہے؟ یہ تو چھوٹے موٹے گناہ ہیں...... چھوٹے کے ساتھ "موٹے" بھی کہتے ہیں، کیونکہ ان کے ہاں مہملات بڑے ہوتے ہیں: روٹی، سوٹی۔ روٹی تو کھانے کی چیز ہے، سوٹی کیسے کھائی

جائے گی؟ کہتے ہیں: ہمارا کیا ہے ہم تو چھوٹا موٹا پہن لیتے ہیں...... اسی طرح کہتے ہیں: داڑھی منڈانا تو چھوٹا گناہ ہے، کوئی کبیرہ تو نہیں ہے۔

اس لیے میرے نبی پاک ﷺ نے فرمایا: خبردار! کبھی گناہوں کو حقیر سمجھ کر اپنے آپ کو اس جرأت پر آمادہ نہ کر لینا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: دیکھو! آدمی جب آگ جلاتا ہے اور بڑی لکڑی لے آتا ہے تو اس بڑی لکڑی کو آگ نہیں لگتی جب تک کہ چھوٹی چھوٹی لکڑیاں رکھ کر آگ نہ بھڑکائی جائے۔ انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تو آگ بھڑکتی ہے اور یہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مل کر انسان کو تباہی و بربادی اور ہلاکت کے کنارے پر ڈال دیتی ہیں۔

آپ دیکھیں! کوئی شخص یہ سوچ کر غیر محرم عورت پر نظر ڈال لیتا ہے کہ یہ تو صغیرہ گناہ ہے، وضو کروں گا تو دھل جائے گا۔ لیکن اگر اس کا انجام دیکھا جائے تو یہ گناہ صغیرہ نہیں رہتا۔ اس لیے کہ جب عورت پر نظر پڑے گی تو پھر دل کے اندر خیالاتِ فاسدہ پیدا ہوں گے، پھر قدم بڑھے گا اور اس کے بعد گناہ ہوگا اور اس کے بعد آدمی ہلاکت کے گڑھے میں گر جائے گا۔

اس لیے کبھی یہ نہ کہیں کہ یہ صغائر ہیں، صغائر کا اصرار کبیرہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ علماء کا مقولہ ہے: ''لَا صَغِيْرَةَ مَعَ إِصْرَارٍ وَ لَا كَبِيْرَةَ مَعَ إِسْتِغْفَارٍ'' (کبیرہ گناہ توبہ کے ساتھ باقی نہیں رہتا، اللہ معاف کر دیتے ہیں اور صغیرہ بار بار کرنے سے صغیرہ نہیں رہتا، بلکہ کبیرہ بن جاتا ہے)۔

[احیاء العلوم: ۳۲/۴، بَيَانُ مَا تُعْظَمُ بِهِ الصَّغَائِرُ مِنَ الذُّنُوبِ]

آپ ایک دفعہ تھوڑی سی مرچ چکھ لیں تو ذرا سی زبان کو لگے گی، لیکن اگر آپ اس کو کھانا شروع کر دیں تو کھاتے کھاتے انجام یہ ہوگا کہ اندر سے آنتیں بھی جل جائیں گی، معدہ بھی جل جائے گا اور اس کے بعد بیماریاں پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔ آپ حساب لگا لو کہ اگر روزانہ ایک گرام مرچ استعمال کرتے ہو تو مہینہ کے تیس گرام ہو گئے اور سال میں تین سو ساٹھ گرام اندر چلی گئی۔ تو پھر اس نے بھی کوئی نہ کوئی جگہ تو بنانی ہے۔ ایسا ہی معاملہ گناہ کا بھی ہے۔

تیسرا درجہ...... اللہ اور رسول کی ناپسندیدہ سے بچنا:

تیسرا درجہ یہ ہے کہ ہر ایسی چیز جس میں اللہ اور اللہ کے رسول کی ناپسندیدگی کا تصور بھی آجائے، انسان اس سے بھی بچ جائے۔ پھر ہر وقت دل میں اسی کا خیال رہے کہ میرے دل کی حالت تو نہیں بدلی۔ یہ عظیم درجہ ہے۔

امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ...... جو کہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں اور

قراءتِ قرآن سے اللہ نے ان کو بڑا مقام عطا فرمایا ہے...... سے ایک دن پوچھا: اُبی بن کعب! مجھے بتاؤ کہ تقویٰ کا معنی کیا ہے؟...... یہ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تقویٰ کا مطلب نہیں جانتے تھے، اصل میں جن کو اللہ سے زیادہ تعلق ہوتا ہے، وہی اس معاملہ میں زیادہ تحقیق کرتے ہیں کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوں۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ حضرت عمر قریش میں سے ہیں اور ان کی لغت عربی ہے۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ان کو تقویٰ کا معنی نہ آتا ہو۔ چنانچہ انہوں نے ایک مثال سے اس وضاحت کی...... انہوں نے پوچھا: امیر المومنین! کبھی ایسے راستے سے آپ کا گزر ہوا ہے جو پُرخطر ہو، جس میں کانٹے دار جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ پھسلن ہو؟ کیا زندگی کے اندر ایسا موقع بھی آیا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسا تو ہوتا ہے کہ ہم سفر میں ہوتے ہیں تو کبھی کبھی آدمی ایسی ایسی جگہوں سے گزرتا ہے کہ کانٹے دار جھاڑیاں ہوتی ہیں، پھسلن ہوتی ہے اور گرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پوچھا: پھر آپ نے اس راستے پر کیا کیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے اپنے کپڑوں کو اوپر کر لیا کہ کہیں کوئی کانٹا کپڑے میں نہ اُلجھ جائے اور پھر نظر راستہ پر لگا دی، اپنے بدن کو پورے کنٹرول اور اعتدال میں رکھا اور بچا بچا کر میں نے قدم رکھنے شروع کیے، تا کہ میں اس خطرناک راستے سے بحفاظت گزر جاؤں۔ یوں میں نے وہ راستہ پاس کیا۔

اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المومنین! اسی کا نام "تقویٰ" ہے۔ ایک طرف لذتیں ہیں، گناہ ہیں، زنا ہے، عورت ہے، مال حرام ہے، سود ہے، قمار ہے، نائٹ کلب ہے، ڈانس ہیں، ناچ گانے ہیں، رنگ آمیزی ہے، اس کی چاشنی ہے کہ ایک آدمی رات کو سویا اور صبح کو کروڑوں پتی ہو گیا۔ ساری چیزیں بلا رہی ہیں، لیکن وہ ان سب سے دامن بچا کر صراطِ مستقیم پر چلا جا رہا ہے، اسی کا نام تقویٰ ہے۔

[التذكرة في الوعظ للقرشي، ص:١٢٧]

جیسے دنیا کے راستوں میں کانٹے کھینچتے ہیں، اسی طرح جنت کے راستے میں گناہ کھینچتے ہیں۔ کون نہیں چاہتا کہ مجھے لذت نہ ملے؟ کون نہیں چاہتا کہ میرے دسترخوان پر کھانے نہ ہوں، مطعومات نہ ہوں، ماکولات نہ ہوں، مشروبات نہ ہوں اور میرے حرم میں عورتیں نہ ہوں اور ایک سے ایک جمیلہ قسم کی خادمائیں نہ ہوں، لیکن جو اللہ سے ڈرنے والا ہے وہ کہتا ہے کہ چھوڑو، اللہ جنت میں یہ نعمتیں عطا فرما دیں گے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بڑی پیاری بات کہی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ

تقویٰ کی تقریر کرنے والے بہت ہیں، لیکن عمل کرنے والے تھوڑے ہیں۔

میں نے پہلے بھی آپ کو ایک مثال عرض کی تھی۔ آج کل یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی بندہ اپنے ملک سے سفر کر رہا ہو، جدہ سے کراچی جا رہا ہو یا کراچی سے کسی اور ملک میں جا رہا ہو تو بڑے آدمی اس سے آکر پوچھتے ہیں کہ آپ نے کب سفر کرنا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ فلاں دن سفر کرنا ہے۔ کہتے ہیں: آپ فکر نہ کریں، وہاں ایئرپورٹ پر میرا دوست ہے، اگر آپ کو ضرورت ہو تو میں وہاں آپ کی خدمت کرسکتا ہوں۔ آپ کے پاس کتنا سامان ہوگا؟ وہ کہتا ہے کہ آخر دو سال کے بعد جانا ہے تو دو چار اٹیچی کیس تو بھر کرلے جاؤں گا، ساٹھ، ستر، اسی کلو وزن تو ہوگا۔ دوسرا کہتا ہے: آپ بے شک سو کلو لے آئیں، وہ میرا بڑا پیارا دوست ہے، میرے اس سے بڑے اچھے تعلقات ہیں، آپ غم نہ کریں، آپ کا سارا مال ہم پاس کروادیں گے، کوئی ایک دھیلا بھی نہیں لگے گا۔

اس پر وہ فخر کرتا ہے اور احسان جتلاتا ہے۔ وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ تقویٰ نہیں۔ جہاز کوئی اس کے باپ کا ہے یا اس کا کمپنی میں حصہ ہے جو رعایت کروا رہا ہے؟ یا اس کو کمپنی نے الاٹ کیا ہوا ہے کہ جس کو تم چاہو، سو کلو چھوڑ دو؟ نہ اس کے دل میں تقویٰ ہے، نہ سفارش کرنے والے کے دل میں تقویٰ ہے اور نہ اس کے دل میں تقویٰ ہے جو مال پاس کروا رہا ہے۔ اللہ کا ڈر نہیں ہے تو چاہے سو کلو گزار دو یا دو سو کلو گزار دو۔ اور وہ بڑا خوش ہو رہا ہوتا ہے کہ یہ کتنا اچھا آدمی ہے، میرا سامان کتنا اوور تھا، لیکن اس نے پرواہ نہیں کی۔ ایسی دوستی فائدے کی بجائے نقصان کا باعث ہے، کیونکہ نتیجتاً یہ تینوں اللہ کے ہاں مجرم بنے۔ اور جن کے دل میں تقویٰ ہوتا ہے وہ ایسے نہیں کرتے۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا تقویٰ:

حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ مدینہ منورہ جا رہے تھے...... اس زمانے میں مدینہ منورہ کا سفر اونٹوں پر ہوتا تھا، موٹر کاریں تو نہیں تھیں...... ایک ساتھی نے حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں جا کر ایک لفافہ پیش کیا اور کہا: حضرت! یہ میرا خط ہے اور مدینہ منورہ میں فلاں شخص کو دینا ہے...... اس زمانہ میں مدینہ شریف بڑی مشکلوں سے کوئی جاتا تھا، یعنی خط پہنچانا بھی ایک مسئلہ ہوتا تھا...... حاجی صاحب نے فرمایا کہ ذرا ٹھہر جاؤ، وہ اونٹ والا جس کے ساتھ ہم نے سفر طے کیا ہے، وہ موجود نہیں، اس کو آنے دو اور اس کے بعد میں آپ کا خط لے جاؤں گا۔ اس نے پوچھا: خط آپ نے لے جانا ہے یا اونٹ والے نے لے جانا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب میں نے اونٹ والے سے سودا طے کیا جو سامان میں نے اس کو دکھلایا تھا، اس وقت تمہارا یہ خط شامل نہیں تھا۔ اب اگر میں خط شامل کرلوں

تو اس بوجھ کا قیامت میں کون جواب دے گا؟

جن کے دلوں میں یوں تقویٰ اور اللہ کا ڈر ہو تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی ایسا کام کریں گے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب بنے۔ جو ایک تولہ وزن سے ڈر رہے ہوں، کیا وہ بیس کلو نا جائز کا سوچ سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

مولانا حبیب اللہ گمانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تقویٰ:

میرے اپنے استاد شیخ حبیب اللہ گمانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے...... اللہ ان کی قبر پر رحمت فرمائے...... انہوں نے حج کے لیے آنا تھا تو ہوائی جہاز میں سوار ہوئے۔ جب سیٹ پر بیٹھے تو اس وقت میرے ایک عزیز ان کے ساتھ سفر میں تھے، انہوں نے کہا: حضرت! چار گھنٹے کا سفر ہے، دو چار منٹ کی بات نہیں ہے، آپ یوں سیدھے بیٹھیں اور پھر پیٹی بھی باندھنی ہے، سیٹ پیچھے کردوں؟ فرمایا: نہیں! مجھے ایسے بیٹھنے دو۔ اس نے بڑا زور لگایا۔ حضرت کے آنسو نکل آئے اور فرمایا: ٹیک لگاتے ہوئے اپنے اللہ سے ڈرتا ہوں کہیں ناراض نہ ہو جائے۔ حبیب اللہ! تم تو گدھے پر چڑھا کرتے تھے اور آج ہوائی جہاز میں اکڑ کر بیٹھے ہو۔ یہ میرا بیٹھنا کہیں کبر میں نہ آجائے۔ کمزور اور بوڑھے آدمی کراچی سے لے کر جدہ اُترنے تک جھک کر بیٹھے رہے۔ مجال ہے کہ سیٹ سے ٹیک لگائی ہو۔

مولانا گمانوی رحمۃ اللہ علیہ کا گدھے کے ساتھ حسنِ سلوک:

ایک دفعہ میں ان کے ساتھ ایک جلسہ میں تھا، ان کی صدارت تھی۔ بہت بڑا جلسہ تھا اور حضرت موجود نہیں تھے۔ اتفاق سے جب ہم آئے تو اس وقت بھائی سیف الرحمٰن بھی میرے ساتھ تھے۔ جلسے والوں نے کہا کہ شیخ! ابھی تک آپ کے استاد نہیں پہنچے ہیں۔ یہ سارا اہتمام ان کے لیے کیا گیا ہے، ہمارے پاس تو کوئی گاڑی نہیں ہے، آپ لوگوں کے پاس چونکہ اپنی گاڑی ہے تو آپ جا کر حضرت کو لے آئیں۔ اگر ہم بس پر جائیں گے تو لیٹ ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس جیپ تھی، ہم نے دوڑائی اور حضرت کے گاؤں پہنچ گئے۔

یہ اتنے بڑے عالم تھے کہ ایک دفعہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث پڑھائی تو اس میں ان سے کوئی غلطی ہوگئی۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرت بنوری نے فلاں حدیث میں فلاں غلطی کی ہے۔ پھر فرمایا: حضرت سے کہتے ہو تو بے شک کہہ دو...... یعنی وہ آدمی جو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم شخصیت کو ٹوک سکتا ہو...... اور پھر جب حضرت حبیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے متعلق تقریر کی تو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ رو پڑے۔ اور مجھے یاد ہے کہ حضرت بنوری نے

فرمایا کہ میں خود جاؤں گا، میں سفارش نہیں کروں گا۔ حضرت کے جوتے خود انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سیدھے کیے اور کہنے لگے کہ مجھے پتہ نہیں تھا کہ اتنا بڑا عالم تم نے دیہات میں چھپایا ہوا ہے۔

پہنچ کر دیکھا تو حضرت گدھے پر سوار ہو کر گاؤں سے آ رہے تھے۔ ہم نے گاڑی روک کر اشارہ کیا، حضرت رُک گئے۔ ان سے جا کر ملے۔ ہم ان کے شاگرد تھے، جا کر کہا: حضرت! وہاں جلسہ میں انتظار ہو رہا ہے، اتنی مخلوق وہاں پریشان ہے، مہربانی کریں، ابھی جلدی چلیں۔ کہنے لگے: ٹھیک ہے، میں آپ کے کہنے سے انکار نہیں کرتا، لیکن گدھے کو بھی تو کہیں کرنا ہے۔ ہم نے کہا: حضرت! آپ اس کی فکر نہ کریں۔ سڑکوں پر لوگ کام کرتے رہے تھے، جن کو ''بیلدار'' کہا جاتا ہے۔ چونکہ واقف لوگوں کا علاقہ تھا تو میں نے ایک بندے کو اشارہ کیا تو وہ بے چارا دوڑتا ہوا آ گیا۔ میں نے استادوں سے پوچھا کہ گھر میں پہنچائے یا مدرسے میں؟ حضرت کہنے لگے: یہ کوئی تمہارا نوکر ہے؟ میں نے کہا: نوکر تو نہیں ہے۔ فرمایا: تم نے اس کو کیوں بلایا ہے؟ میں نے کہا: حضرت! یہ بلوچ ہے، ہماری برادری کا آدمی ہے، اتنی تو مروت ہوتی ہے کہ میرے کہنے سے ایک میل تک چلا جائے گا۔ کہنے لگے: وہ ڈیوٹی دے رہا ہے، وہ دوسرے کا نوکر ہے، تنخواہ ان سے لیتا ہے اور حکم تم چلاتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی؟ تمہیں اللہ کا کوئی ڈر نہیں ہے؟ تم نے اللہ کو جواب نہیں دینا؟ میں نے کہا کہ جناب! اس کی ڈیوٹی ہے، اس کو نہیں بھیجتے، میں کوئی دوسرا آدمی لے آتا ہوں۔ یہ سارے بستی والے ایسے ہیں کہ ان میں سے جس کو بھی کہہ دیں، وہ بھاگتا ہوا چلا آئے گا۔

کہنے لگے: بات سنو! تمہارے جلسے پر تو میں جانے کے لیے تیار ہوں، مگر میری ایک شرط ہے، اگر تم مانتے ہو تو میں جاؤں گا، وگرنہ میں نہیں جاؤں گا۔ ہم نے پوچھا: فرمائیں، کیا شرط ہے؟ کہنے لگے کہ گدھے کو اپنی جیپ میں بٹھاؤ۔ ہم نے کہا: حضرت! ہم گدھے کو کیسے جیپ میں بٹھائیں؟ کہنے لگے کہ دیکھو! میں اس پر سوار ہو کر آ رہا تھا، اب میں جیپ پر بڑا آدمی بن کر چلا جاؤں اور قیامت میں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے پکڑ لیں کہ تم اتنے اکڑ گئے تھے کہ جو جانور تمہیں اُٹھا کر آ رہا تھا، تم نے اُسے چھوڑ دیا؟ یہ مجھے اُٹھا کر آ رہا تھا، اب جب مجھے آرام ملے تو اس کو آرام کیوں نہ ملے؟ ہم نے کہا: حضرت! آپ کا حکم سر آنکھوں پر ہے، لیکن گدھا تو گدھا ہوتا ہے، ایسے تو اللہ نے نہیں فرمادیا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵﴾ [الجمعۃ:۵]

ایسے تو نہیں فرمادیا گیا کہ حمار سے جاہل جانور کوئی نہیں ہوتا۔ سب سے کند ذہن اور پاگل جانور اگر دیکھنا ہو تو گدھا ہے۔ اگر شاگرد کو سبق سمجھ نہ آرہا ہو تو اسے کہتے ہیں کہ تم گدھے ہو۔

کہتے ہیں کہ یہ واحد جانور ہے کہ اس پر آپ جتنا بھی بوجھ لادتے جائیں، یہ آواز نہیں نکالے گا، دس مَن رکھ دو، بیس مَن رکھ دو یا تیس مَن رکھ دو۔ آواز اس وقت نکالے گا جب بغیر سامان کے اکیلا ہوگا۔ ایسا بے وقوف جانور ہے۔ حالانکہ آدمی وہاں چیختا ہے جہاں اس پر بوجھ پڑے۔ اور اس کی یہ بھی عادت ہے کہ جب اس کو اوپر چڑھانا تو پیچھے جائے گا، پیچھے کھینچیں گے تو آگے جائے گا۔ یہی تو وجہ ہے کہ جب اس کو کشتی میں سوار کرایا جاتا ہے تو اس کو پیچھے کھینچتے ہیں تو یہ آگے بڑھ کر چڑھ جاتا ہے، وگرنہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کشتی پر سوار ہو۔ آپ تجربہ کرلیں۔

حضرت نے فرمایا: اس کے بغیر تو میں جلسہ میں نہیں جاتا۔ ایک وہ بیلدار اور دو بندے ہم تھے۔ ہماری خانگی تو وہیں مٹی میں مل گئی کہ ایک گدھے کو اُٹھا رہے ہیں۔ اس سے پہلے ایک سردار تھے، دماغ کے اندر اکڑفوں تھی۔ کپڑے بھی گدھے نے خراب کردیئے۔ اور پھر اس کو آگے بٹھایا۔ جہاں سے بھی گزرتے تو سارے لوگ ہنستے کہ دیکھو! گدھے کو گاڑی میں بٹھایا ہوا ہے۔

جب وہاں پہنچے اور گدھے کو اُتار دیا تو حضرت فرمانے لگے کہ بات یہ ہے کہ آپ لوگ گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ کے پیچھے گن مین اور توپیاں تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ تمہاری خانگی کو ذرا ڈھیلا کروں...... ہم بلوچ لوگ وہاں تو ایسے نہیں جاتے۔ وہاں تو برادری کا مسئلہ ہوتا ہے، جھگڑے ہوتے ہیں، سارے انتظامات کے ساتھ چلنا پڑتا ہے...... استادوں کو وہ بات پسند نہ آئی کہ کیا نوکر اور بندوقیں! تم بھی ایک بندے ہو، جب صحت وحیات کا ایک وقت مقرر ہے تو کیا تمہارے گن مین تمہیں بچالیں گے؟ ایک وقت مقرر ہے وہ ختم ہوجائے گا تو موت آجائے گی۔ اس لیے میں نے تمہاری اصلاح کے پیشِ نظر ایسا کرنے کو کہا تھا۔

اصل میں اللہ کا ڈر دل میں تھا کہ میں چڑھوں اور جانور نہ چڑھے اور اللہ اسی معاملے میں مجھے پکڑ لے تو میرا کیا بنے گا؟ ان لوگوں کی نظر اتنی وسیع تھی!!!

حدیث مبارکہ میں ہے کہ ایک عورت کو اللہ نے اس لیے جہنم میں ڈال دیا کہ اس نے بلی کو باندھ رکھا تھا، اسے کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا اور نہ ہی اسے چھوڑا کہ وہ خود جا کر کھائے۔[1] اور ایک عورت اس لیے جنت میں

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۲۳۶۵، باب: فضل سقي الماء]

چلی گئی کہ اس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا۔[مسند البزار، حدیث:۸۴۲۵]

"یوم" سے کیا مراد ہے؟

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا﴾ میں "یوم" سے قیامت کا دن مراد ہے۔ دن سے تو نہیں ڈرا جاتا، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس دن میں تم کو جو احوال پیش آنے والے ہیں، ان سے ڈرو۔ یہ وہی دن ہے جس میں مومنین کو عزت ملے گی اور کفار کو ذلت ملے گی۔

تفسیر:

﴿لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا﴾ جس دن کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا کہ کوئی کسی کے بدلہ میں کام آجائے۔ دنیا میں تو یہ ہوتا ہے کہ باپ نے جرم کیا تو بیٹے نے اپنے سر پر لے لیا یا مالک نے کوئی جرم کیا تو ملازم نے اپنے سر لے لیا۔ وہاں ایسے نہیں ہوگا، قیامت کے دن کے بارے میں تم یہ نہ سمجھو کہ کوئی کسی کے کام آجائے گا، نہیں۔ بلکہ وہ ایسا دن ہوگا کہ ہر آدمی کو اپنی جان کی فکر ہوگی، جیسے فرمایا: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝﴾[عبس:۳۷تا۳۴]

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا﴾ ان کو اس لیے ڈرایا گیا کہ وہ کہتے تھے: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾[المائدۃ:۱۸] ان کے دماغوں میں یہ بات تھی کہ جب ہم اللہ کے بیٹے عزیر کے پوجنے والے اور ماننے والے ہیں تو ان ہماری دوستی ہوگئی اور ہم سب اللہ کے پیارے اور محبّ بن گئے، کیونکہ کسی سے پہلے سے تعلق ہو تو وہ بھی کہتا ہے کہ یہ بھی میرا بیٹا ہے تو جب ہم اللہ کے محبوب ہیں تو ہمیں کون پکڑ سکتا ہے؟ تو اللہ نے فرمایا: خبردار! تم ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ سفارش قبول ہوگی۔ ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ...... الآیۃ﴾[البقرۃ:۴۸]

آدمی کے چھوٹنے کے چاروں طریقے کام نہ آئیں گے:

1 ......عذاب سے بچنے کی ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ کوئی کسی کے بدلے میں کام آجائے۔ اس کی تردید میں فرما دیا: ﴿لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا﴾

2 ......پھر ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی کا کوئی سفارشی آجائے اور سفارش کرکے اسے چھڑوا لے۔ اللہ نے

فرمایا: ﴿لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ...﴾

3 ......ایک اور صورت یہ ہوتی ہے کہ سفارش تو نہیں چل رہی تو مجرم کہتا ہے کہ کچھ پیسے دے کر میری جان چھڑاؤ۔ تو فرمایا: ﴿وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ ان سے بدلے میں کوئی فدیہ، کوئی مال بھی نہیں لیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن نے دوسرے مقام پر وضاحت فرمادی کہ ساری زمین، آسمان کے برابر یا ساری زمین سونے کی بھر کر بدلے میں دی جائے کہ قبول ہو جائے اور جہنم سے بچ جائے تو یہ بھی قبول نہیں ہوگی۔

4 ......آخری صورت یہ ہوتی ہے کہ پورے قبیلے کو اکٹھا کرو، مقابلہ کرتے ہیں، دیکھا جائے گا۔ یا ہم رہیں گے یا وہ رہیں گے۔ اس کے بارے میں بھی فرمادیا: ﴿وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾ ان کا کوئی مددگار بھی نہیں ہوگا جو ان کی مدد کرے اور اللہ کے عذاب کو قوت و طاقت سے روک سکے۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے۔ اور جس کے عذاب سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو پھر ہمارے لیے ضروری ہے کہ اس اللہ سے ڈریں۔ اور ڈرنے کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ اور احکام پر ایمان لائیں، اللہ کے مامورات پر عمل کریں اور منکرات و منہیات سے بچیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۹، البقرة: الآية: ۴۸]

یہ بات یاد رکھیں کہ یہ سارے حکم کافروں کے لیے ہیں، مثلاً: ایک آدمی کافر ہے اور ایک مسلمان ہے۔ کافر کا کفر مسلمان پر رکھ دیا جائے اور اس کا کوئی نقصان نہ ہو، ایسا نہیں ہوگا۔ یا مسلمان کی وجہ سے کافر رشتہ دار کو چھوڑ دیا جائے، ایسا بھی نہیں ہوگا۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کافر تھا، کفر پہ مر گیا، نوح علیہ السلام بھی اس کو نہ چھڑا سکے۔ جب دنیا میں نہ چھڑا سکے تو آخرت میں بھی نہیں چھڑا سکیں گے۔

مسلمان، شفاعت کا حقدار ہوگا:

مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ چنانچہ اگر ایک مسلمان گناہ گار ہے تو اس کی شفاعت ہوگی، کیونکہ اس کے اندر ایمان موجود ہے۔

اولاد کو والدین کا فائدہ:

اسی طرح ایک مسلمان شخص کی اولاد بھی مسلمان ہے، وہ اپنی ساری زندگی عبادت میں گزار گیا، لیکن اولاد اس

مرتبہ کو نہیں پہنچی، اللہ تبارک وتعالیٰ جب اہل جنت کا فیصلہ فرما دیں گے تو وہ آدمی عرض کرے گا: میری اولاد کا کیا بنے گا؟ اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے: تمہیں مبارک ہو! وہ بھی جنت میں ہیں، لیکن وہ تمہارے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ تمہاری عبادت اور محنت زیادہ تھی، اس لیے تمہیں اونچے درجات مل گئے۔ وہ کہے گا: اے اللہ! ٹھیک ہے، میں نے ساری زندگی عبادت کی، لیکن میں اپنی اولاد کے لیے بھی تو مانگتا رہا، اگر میں اتنی بڑی نعمتوں اور جنت میں رہوں اور میری اولاد نہ ہو تو پھر مجھے کیا راحت ملے گی؟ تو اللہ حکم دیں گے کہ اس کے بچوں کو بھی ادھر بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اس کی اولاد کو بھی اس کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ گویا کہ والدین کی وجہ سے اولاد کو فائدہ ہو گیا۔

والدین کو اولاد کا فائدہ:

اسی طرح والدین کو بھی اولاد کے اعمال کا فائدہ ہوگا۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں، لیکن تین عمل ایسے ہیں جو آدمی کے مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے:

1 ...... ان میں ایک تو یہ ہے کہ کوئی آدمی مرنے سے پہلے ایسا صدقہ کر جائے جو ہمیشہ جاری رہنے والا ہو، جیسے اس نے مسجد، مدرسہ یا کوئی ہسپتال وغیرہ بنایا ہو تو جب تک وہ صدقہ پھیلتا رہے گا، مرنے کے بعد بھی اس کو اس کا ثواب پہنچتا رہے گا۔

2 ...... دوسرا یہ کہ ایک عالم بندے نے اپنی زندگی میں کئی لوگوں کو پڑھایا۔ جب تک اس کے شاگرد پڑھتے پڑھاتے رہیں گے تو اس استاد کو بھی ثواب ملتا رہے گا۔

3 ...... تیسرا یہ کہ کوئی بندہ اپنی اولاد صالح چھوڑ گیا، یعنی اس کی اولاد اچھی تھی، والدین کے مرنے کے بعد بھی وہ ان کے لیے دعائیں کر رہے ہیں: اے اللہ! ہمارے والدین کی مغفرت فرما۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۱۶۳۱، باب: مَا يَلْحَقُ الْإِنْسَانَ مِنَ الثَّوَابِ بَعْدَ وَفَاتِهِ]

﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ [بنی اسرائیل: ۲۴]

﴿رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ﴾ [ابراہیم: ۴۰، ۴۱]

اور والدین کے صدقات و دیگر نیک کام کر رہے ہیں تو اولاد جو اچھا کام کرے گی، اس کا بدلہ والدین کو بھی ملتا

رہے گا۔

جنت واجب ہوگئی:

صحیح احادیث میں موجود ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے تین بچے بچپن میں فوت ہوگئے اور اس نے صبر کرلیا کہ اللہ کی مرضی ہے، قیامت والے دن اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں: ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر کسی کے دو بچے فوت ہوجائیں؟ فرمایا: دو پر بھی۔

راویٔ حدیث ''محمود'' کہتے ہیں: میں نے جابر سے کہا: تمہارا کیا خیال ہے اگر تم ایک کا کہتے تو کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کا بھی کہہ دیتے؟ فرمایا: خدا کی قسم! مجھے اس کا بھی گمان ہے۔ فرمایا: ایک کی وجہ سے بھی اس کو جنت مل جائے گی۔ [مسند احمد: ۱۴۲۸۵،۲۲] لہٰذا اب معصوم بچوں کی وجہ سے بھی والدین کو فائدہ پہنچ گیا۔

نیکی کا اجر...... بُرائی کا وبال:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَعُمِلَ بِهَا كَانَ لَهُ أَجْرُهَا وَ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا))

کسی بندے اچھا راستہ بنایا، کسی جگہ توحید وسنت کی اشاعت کا کام کیا، حدیث مبارک کا علم پھیلایا، نیکی کی بنیاد ڈالی، قیامت تک جو لوگ عمل کریں گے اس کی بنیاد ڈالنے والے کو بھی اللہ ثواب دیتے رہیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا:

((وَ مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعُمِلَ بِهَا كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَ وِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا.))

[سنن ابن ماجه حدیث: ۲۰۳، باب: مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْ سَيِّئَةً]

اور اگر کسی آدمی نے بُرائی کی بنیاد رکھی، مثلاً سینما بنایا، کلب بنایا، کوئی ڈانس گھر بنایا، بُرائی کے اڈے قائم کیے، شراب خانہ کھولا تو جب تک لوگ وہاں اس گناہ میں مبتلا رہیں گے، اس کھولنے والے کو بھی اس کا گناہ ملتا رہے گا۔

بہت سخت معاملہ:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب لوگ قبروں سے اُٹھیں گے تو نہ ان کے جسم پر لباس ہوگا، نہ پاؤں میں جوتی ہوگی اور نہ ان کا ختنہ کیا ہوا ہوگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول

اللہ! مرد بھی اور عورتیں بھی ہوں گی، کیا وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے نہ ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: معاملہ اس سے سخت ہوگا، کسی کو ایسا خیال تک نہ آئے گا۔

[صحیح بخاری، حدیث: ۶۵۲۷، باب: کیف الحشر]

سعودی عرب کے لوگوں کی عملی خوبیاں:

سعودی عرب کے لوگوں میں یہ خوبی ہے کہ ان کی زبان پر ہر وقت کوئی نہ کوئی دعا کا کلمہ ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ:

......وہ آپ کو پانی دیں گے، جب آپ پانی پئیں گے تو وہ کہیں گے: ﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا﴾ [النساء: ۴]

......کوئی اچھی چیز دیکھیں گے تو کہیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!

......بچے کو دیکھتے ہی کہیں گے: مَاشَاءَ اللّٰہُ!

......کسی کے بچے کو بستہ اٹھائے ہوئے دیکھیں گے تو کہیں گے...... مَاشَاءَ اللّٰہُ!...... اللہ اس کو عالم بنائے۔

......کسی کے بچے کو کوئی کام کرتے دیکھیں گے تو کہیں گے: ''اَللّٰہُ فِیْ عَوْنِكَ'' اللہ تمہاری مدد میں ہے، اللہ تمہارا ساتھی ہے۔

......آپ ان میں سے کسی سے کہیں کہ آئیں میرے ساتھ کھانا کھائیں تو وہ کہے گا: ''اَلرَّحْمٰنُ مَعَكَ'' اللہ تمہارے ساتھ ہیں، میں مجبور ہوں، میں نے کسی دوسری جگہ جانا ہے۔

......کھانے کے لیے بیٹھیں گے تو سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' نہ پڑھیں۔

......کھانے کے بعد ناممکن ہے کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا'' نہ پڑھیں۔

......کسی کو چھینک آئے تو وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہے بغیر نہیں رہ سکتے اور دوسرا اس کے جواب میں فوراً کہے گا: ''یَرْحَمُكَ اللّٰہُ'' پھر پہلا کہے گا: ''یَهْدِیْكُمُ اللّٰہُ''

......آپ نے کبھی اپنے ملک کے بڑے آدمی کو بھی دیکھا ہے کہ اس کو چھینک آئے تو وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

......کسی کے جنازے کو دیکھیں گے تو میت کو کندھا دینے اور جنازے میں شامل ہونے کے لیے دوڑ پڑیں گے۔ گویا کہ ان کے ہر کلمہ میں اللہ کا نام اور اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔

......اور دعائیں وہ مانگتے ہیں جو حضور پاک ﷺ نے مانگی ہیں، دوسری دعاؤں کے قریب ہی نہیں جاتے۔ آپ

ان سے کہیں کہ فلاں بزرگ نے یہ دعا لکھی ہے، وہ کہے گا: ٹھیک لکھی ہوگی، لیکن جب حضور ﷺ کی لکھی ہوئی دعا ہمارے پاس موجود ہے تو کیا وہ حضور ﷺ سے بڑا ہے کہ ہم اس کی لکھی ہوئی دعا پڑھنے لگ جائیں؟

اگر اللہ ان کو مال دیتا ہے تو ناممکن ہے کہ زکوٰۃ نہ دیں۔ یعنی اگر آپ ڈھونڈنا شروع کر دیں گے تو ہزار میں سے کوئی ایک ملے گا جو زکوٰۃ نہ دیتا ہو اور ہمارے ملک میں ہزاروں میں سے ایک ملے گا جو زکوٰۃ دیتا ہوگا۔

آپ فرق ملاحظہ کریں! رمضان المبارک کا مہینہ آئے گا تو بیوی بچے، آل اولاد، شہزادے، بادشاہ، وزیر، شہزادیاں سب اپنے گھر بار چھوڑ کر مکہ میں آجائیں گے یا مدینہ میں آجائیں گے۔ اور ساری ساری رات عبادت میں گزار دیں گے۔ ہمارے ہاں تو لوگ روزہ رکھ کے تاش کھیلتے ہیں، کوئی گانا لگا لیتا ہے، یا کوئی اور زیادہ پہنچا ہوا آدمی ہو تو وہ فلم لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایسا بندہ روزہ گزار رہا ہوتا ہے کہ کسی طرح روزے کا وقت گزر جائے۔

ہمارا آدمی مسجد میں اس وقت آئے گا جب ایک رکعت چلی جائے گی، اللہ اکبر، اللہ اکبر کر کے نماز پوری کرے گا اور پھر چلا جائے گا، نفلوں پر تو ویسے ہی زور نہیں دیتے اور سنتیں بھی پوری سوری پڑھ کے جتنا جلدی ہو سکے، مسجد سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عرب کی یہ عادت ہے کہ جماعت کھڑی ہونے سے پہلے مسجد میں آئیں گے، ان کو اگر جماعت سے پہلے پانچ منٹ بھی مل جائیں تو قرآن اُٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

آپ مشاہدہ کر لیں! ان کو آدھا منٹ بھی مل جائے تو وہ کہتے ہیں کہ چلو اتنی دیر میں ہم قرآن کی ایک یا دو آیتیں تو پڑھ لیں گے، ہم اپنا وقت کیوں ضائع کریں؟ یہ ان کے اندر بڑی خوبیاں ہیں کہ اللہ نے ان کو چن لیا ہے اور ان کے اندر اپنے نبی ﷺ کو بھیجا اور ان میں اللہ نے اپنا گھر رکھا ہے، ان لوگوں کے اندر اللہ نے اپنے نبی ﷺ کا شہر رکھا ہے۔ کوئی بات تو ہے، آخر کچھ خوبیاں تو ہیں۔

باقی آپ کہیں کہ یہ کوئی جبرائیل علیہ السلام کے بھائی ہیں، ان سے کوئی غلطی نہ ہو۔ ایسی بات نہیں ہے، یہ بھی آخر انسان ہیں۔

آئینہ دکھا دیا:

ایک آدمی مجھے کہنے لگا کہ فلاں آدمی ایسا کرتا ہے اور ایسا کرتا ہے۔ اللہ نے اس کو اتنی دولت دی ہے کہ اس کا پیسہ بینکوں میں رکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا: اللہ کے بندے! اگر اس کا چوتھا حصہ اللہ پاک تجھے دے دے تو پھر

دیکھیں گے کہ تم کیا کرتے ہو؟ ذرا یوں بھی تو آزمایا کرو کہ جو دولت اللہ نے ان کو دی ہے، اگر ہمیں ملتی تو ہم کیا کرتے؟

﴿عَدْلٌ﴾ کی تفسیر:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ کہ عدل کا معنی بدل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن ایسا نہیں ہوگا کہ کافر لوگ اپنا مال و دولت یا بیٹا دے کر اس کے بدلے میں عذاب سے نجات پالیں۔ وہاں اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عدل کا معنی ہے برابری۔ جیسے عدل و انصاف میں برابری ہوتی ہے کہ اس آدمی کے برابر فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ ایسے نہیں ہوگا۔

حضرت ابوالعالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عدل کا معنی فدیہ ہے۔

حضرت عبدالرزاق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ عدل کا معنی فرض یا نفل عبادت ہے، کیونکہ جب اس کا ایمان نہیں تو فرض و نفل عبادت کے قبول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس قول میں غرابت ہے۔ وہی پہلا ترجمہ راجح ہے کہ ان سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۹، البقرۃ: الآیۃ: ۴۸]

اور اس ترجمہ کی تائید اس حدیث پاک سے بھی ہوتی ہے جو ابن جریر رحمہ اللہ نے نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: "مَا الْعَدْلُ؟" عدل کیا ہے جو قرآن پاک میں آتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عدل کا معنی "فدیہ" ہے کہ ان سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا۔ [تفسیر جامع البیان لابی جعفر الطبری: ۳/ ۱۳۶]

﴿وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾ کی تفسیر:

اللہ نے فرمایا: ﴿فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۚ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ إِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ [الاحقاف: ۲۸] کیوں نہ ان کی مدد کی ان لوگوں نے جن کو انہوں نے خدا، مشکل کشا، حاجت روا بنا رکھا تھا، ان کی منتیں مانتے تھے، اللہ فرمائیں گے کہ وہ کہاں ہیں؟ فرمایا: بلکہ آج تو ان سے وہ بھی گم ہو گئے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ﴿مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾﴾ [الصافات: ۲۵] آج

تمہیں کیا ہو گیا، ہمارے عذاب سے کیوں ایک دوسرے کو نہیں چھڑاتے؟ دنیا میں تو ایک دوسرے کی مدد کے لیے بڑے دوڑتے تھے۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قیامت والے دن کوئی مدد کرنے والا مدد نہیں کرے گا، جیسے کوئی سفارش کرنے والا ان کی سفارش نہیں کرے گا۔ اس دن ان کے بدلہ میں کوئی فدیہ قبول نہیں ہوگا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ۴۸]

﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۴۹ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۰﴾ [البقرۃ: ۴۹، ۵۰]

اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے رہائی دی جو تمہیں برا عذاب دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔ اور جب ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھاڑ دیا، پھر ہم نے تمہیں بچایا اور فرعون کے لوگوں کو غرق کیا، جبکہ تم دیکھ رہے تھے۔

جادو کی حرمت:

علم نجوم، علم فلکیات اور علم کواکب یہ جتنے علوم ہیں، یہ بڑے خطرناک علوم ہیں۔ ان سب کا سیکھنا، سکھانا اور ان کے مطابق عمل کرنا حرام ہے اور ان پر اعتقاد رکھنا بندے کو کفر کے درجہ میں پہنچا دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی کسی پر جادو کرتا ہے، سحر کر کے نقصان پہنچاتا ہے گویا اس نے اللہ کی ذات کے ساتھ کفر کیا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی اس علم کی مبادیات کو اس لیے سیکھتا ہے کہ میں اس کو دفع کر سکوں، اس کو توڑ سکوں، کوئی بے چارا اگر مسحور ہو تو میں اس کا علاج کر سکوں تو اس نیت کے ساتھ کم از کم جائز ہے، ورنہ اس کا سیکھنا بھی حرام ہے، سکھانا بھی حرام ہے، پڑھنا، پڑھانا بھی حرام ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو:

اس دنیا میں جادو اور جادوگروں کا وجود ہے۔ یہ نہیں کہ جادو نہیں۔ جادو، باقاعدہ ایک علم ہے اور علوم سفلیہ میں

سے ہے۔ یہ اتنی ظالم بلا ہے کہ جب اللہ کے نبی حضرت خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء، رحمۃ للعالمین ﷺ پر یہودیوں نے جادو کیا توان پر بھی اس کا اثر ہو گیا۔

جادو کس نے کیا تھا؟

لبید بن اعصم منافق تھا، یہودیوں کا حلیف تھا، اس نے اور اس کی لڑکیوں نے یہ جادو کیا تھا۔ یہ بھی آتا ہے کہ جادو میں زیادہ تر عورتیں مبتلا ہوتی ہیں۔ اسی لیے قرآن مقدس نے فرمایا: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝﴾ [سورۃ الفلق] پھونک مارنے والی لڑکیاں جو گرہوں کے اندر پھونک مارتی ہیں، ان کے شر سے اللہ محفوظ رکھے۔

جادو کے اثرات:

اس جادو کی وجہ سے آقائے نامدار ﷺ کی ذاتی زندگی میں اتنا اثر ہو گیا کہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر ہم حضور ﷺ کے سامنے پانی رکھ دیتے تو آپ تھوڑا سا لے لیتے تھے، وگرنہ خود کبھی مانگتے نہیں تھے۔ آپ ﷺ کا کھانا اور نہ کھانا برابر ہو گیا تھا، اسی طریقے سے اپنے بیوی بچوں سے ملنا نہ ملنا برابر ہو گیا، اور طبیعت میں اتنا انقباض تھا، اتنا بوجھ اور ثقل تھا کہ حضور ﷺ کی طبع مبارک کی شگفتگی ختم ہو گئی۔ پہلے آپ ﷺ کا چہرہ مبارک گلاب کی طرح کھلا رہتا تھا، اس جادو کی وجہ سے وہ بند کر دیا گیا۔

نجات کا طریقہ:

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور ﷺ کو خواب کے اندر سکھلا دیا۔ حضور ﷺ نے دیکھا کہ اللہ کے فرشتے جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام آئے، ایک سرہانہ کی طرف کھڑا ہو گیا اور دوسرا پاؤں کی طرف کھڑا ہو گیا۔ ایک فرشتے نے سوال کیا کہ یہ جو سو رہے ہیں، ان کو کیا تکلیف ہے؟ اس سرہانہ والے نے جواب دیا کہ ان پر جادو کیا گیا ہے۔ پھر اس نے سوال کیا کہ جادو کس چیز میں کیا گیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک کنگھی ہے، جس میں حضور ﷺ کے بال مبارک ہیں۔ اس کنگھی کے اندر ان بالوں کو لپیٹا گیا ہے اور اس کے اندر میخیں لگائی گئی ہیں، اس کے اندر جادو کیا گیا ہے۔ اس نے پھر پوچھا کہ وہ کنگھی کہاں ہے؟ دوسرے فرشتے نے کہا: فلاں جگہ پر کھجوروں کا ایک جھنڈ ہے، وہاں ایک پرانا کنواں ہے، اس کنویں کے اندر جو نیچے لکڑی رکھتے ہیں، اس کے نیچے وہ دفن ہے۔ پوچھا: کس

نے کیا ہے؟ جواب دیا کہ لبید بن اعصم اور اس کی لڑکیوں نے کیا ہے۔

حضور ﷺ جب بیدار ہوئے تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو ساتھ لیا اور اس جگہ پہ تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ نے حکم دیا کہ کنویں کے اندر کھدائی کی جائے۔ جب کھدائی کی گئی تو وہ کنگھی مل گئی۔ اس کے اندر حضور ﷺ کے بال مبارک تھے اور ان میں سوئیاں لگائی گئی تھیں۔ صحابہ کرام نے ان گرہوں کو کھولنا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ گرہیں کھلتی گئیں، انہی کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کا چہرہ مبارک بھی کھلتا گیا اور ایسے ہو گیا جیسے چودھویں کا چاند روشن ہوتا ہے۔ جادو کا اثر سب ختم ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اس کو یہیں دفن کر دو۔

حضور پاک ﷺ نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتلایا کہ عائشہ! وہاں کی کھجوریں ایسے معلوم ہوتی تھیں جیسے شیطان کے سر ہوں۔ کھجوروں کے درخت ٹنڈ منڈ کھڑے تھے۔ اور اس کنویں کا پانی ایسے تھا جیسے کسی نے اس میں مہندی ملا دی ہو۔ اور فرمایا: اس ظالم نے کنگھی کے اندر میرے بال پھنسا کر ان کے اوپر سوئیاں لگائی ہوئی تھیں۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ لے آتے، ہم دیکھتے تو سہی کہ اس ظالم نے کیسے جادو کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ نے مجھے شفا دے دی ہے تو میں نہیں چاہتا کہ بات بڑھائی جائے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۵۷۶۳، باب: السِّحْرِ]

حضور ﷺ رحمۃ للعالمین تھے، آپ نہیں چاہتے تھے کہ میری وجہ سے صحابہ کو جوش آئے اور وہ جا کر دشمن کو قتل کر دیں۔ یہ کوئی ایسی بات تو نہیں تھی کہ جسے صحابہ برداشت کر لیتے۔ لیکن حضور ﷺ نے اپنی رحمت اور شفقت کے پیشِ نظر اس معاملے کو وہیں دفن کر دیا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ ظالموں نے اپنا زور لگا لیا، ﴿وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۚ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۝﴾ [الانفال: ۳۰] ان ظالموں نے اپنے مکر کی یہ تدبیریں کیں، لیکن اللہ کی تدبیر کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟

جادو کا زمانہ:

فرعون کا زمانہ، سحر کا زمانہ تھا، ہر قریہ میں جادوگر تھے اور بڑے بڑے ماہرین نجوم تھے جو ستاروں سے حساب کرتے تھے اور فلکیات کے ماہر تھے کہ یہ آج کوا کب فلاں کا وقت نہیں، بلکہ فلاں کا ہے۔

بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کی وجہ:

علماء تواریخ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے علم نجوم وغیرہ کے ذریعہ سے حساب نکالا تو انہوں نے کہا کہ عنقریب

ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اسی لڑکے کی وجہ سے تمہاری بربادی آئے گی۔ فرعون نے حکم جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو، اس کو اس کے ماں باپ کے سامنے قتل کر دیا جائے۔

چنانچہ قتل عام شروع ہو گیا۔ مرد، عورتیں اور جلاد بنی اسرائیل کی بستیوں کے اندر گھومتے رہتے تھے کہ کسی عورت کو حمل تو نہیں ہے۔ اگر کسی عورت کے بارے میں پتہ چلتا کہ وہ حاملہ ہے تو انتظار کرتے، جب ولادت کا وقت آتا تو ان کے آدمی وہاں پہنچے ہوئے ہوتے تھے۔ اگر لڑکی پیدا ہوتی تو چھوڑ دیتے اور اگر لڑکا پیدا ہوتا تو ماں باپ کے سامنے قتل کر دیتے تھے۔

بعض نے کہا کہ فرعون نے خواب دیکھا اور بعض نے کہا کہ فرعون نے نجومیوں کے کہنے پر ایسا کیا۔ بہرحال دونوں باتیں ملتی ہیں کہ اس بدبخت نے خواب بھی دیکھا ہو اور منجمین نے حساب بھی لگایا ہو۔ دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

فرعون کا حکم ثانی:

کچھ عرصہ کے بعد فرعون نے سوچا کہ اگر ہم ہر سال اسی طرح کرتے رہے تو ہماری خدمت کرنے والا تو کوئی باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ اس نے منجمین سے کہا کہ دوبارہ حساب کر کے بتاؤ کہ تقریباً وہ کون سا سال ہوگا؟ انہوں نے حساب کر کے اس سال کی علامات بتا دیں۔ فرعون نے نیا آرڈر جاری کرتے ہوئے کہا کہ اگر ساری نئی نسل کو قتل کر ڈالا تو ہمارے کام کون کرے گا؟ باقی تو بوڑھے رہ جائیں گے، یہ تو ویسے ریٹائر ہو جائیں گے اور ہمارے کام رک جائیں گے۔ لہٰذا ایک سال کے بچوں کو قتل کرو اور ایک سال کے بچوں کو چھوڑ دو۔ اللہ کا اپنا نظام ہوتا ہے، وہ کسی کے ماتحت نہیں ہوتا۔ دنیا اپنے آرڈر بناتی رہتی ہے لیکن خالق کے حکم اپنے ہوتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش:

خدا کی شان دیکھیں! حضرت ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس سال بچوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا، لہٰذا ہارون علیہ السلام یوں بچ گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا بھی اس سال ہوئے جس میں انہوں نے بچوں کو قتل کرنا تھا۔ بڑا مفصل واقعہ ہے کہ اللہ نے کیسے ان کی حفاظت فرمائی۔

دشمن سے حفاظت کروائی:

اور حفاظت بھی دشمن کے گھر میں کروائی۔ گویا کہ فرعون سے کہا کہ تم اپنے دشمن کا پہرہ دو، تم ہمارے نبی کے خادم بنو اور تم ہی اس کی حفاظت کرو۔ جب جوان ہوگا تو تمہاری ہی بربادی کا باعث بنے گا۔ تم تو بنی اسرائیل کے گھروں کے اندر بچوں کو قتل کروا رہے تھے اور موسیٰ علیہ السلام کی ماں پر کیسے نرمی کر دی؟

جب اللہ نوازنے پر آئے!!

جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب اللہ نوازنے پر آتے ہیں تو بیٹا بھی اپنا، دودھ بھی اپنا، پیسے بھی مل رہے ہیں اور ہدیے بھی مل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝۳۱﴾ [الاسراء:۳۱] (ظالمو!) اپنی اولادوں کو بھوک کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی رزق دیں گے، تمہیں بھی رزق دیں گے۔ رزاق تو صرف اللہ کی ذات ہے۔

کفریہ منصوبہ بندی:

اصل میں یہ سارے فلسفے کفر کے ہیں کہ بچوں کو مار ڈالو، تاکہ دشمن پیدا نہ ہو۔ بچیوں کو مار ڈالو، تاکہ بلاوجہ ہماری جائیداد کی وارث نہ بنیں اور ہم پر کھانے کا بوجھ نہ بنیں۔ یا گولیاں دے کر دونوں کو مار ڈالو۔

فرعون سے بڑھ کر فرعون!!

یہ وقت کے فرعون سے بھی بُرے ہیں اور ابوجہل اینڈ کمپنی سے بھی بُرے ہیں۔ چلو انہوں نے تو ایک کے بارے میں فیصلہ کیا تھا کہ لڑکیاں مار دو اور لڑکے رہنے دو اور فرعون نے کہا: لڑکوں کو مار دو اور لڑکیوں کو رہنے دو، جبکہ انہوں نے کہا کہ گولیاں دے کر دونوں کو مار دو۔ اب خود فیصلہ کریں کہ یہ ان دونوں سے بُرے ہیں یا اچھے ہیں؟

خدا کے قانون سے مقابلہ:

انہوں نے کہا کہ بس بندی کر دو۔ مردوں کی رگیں کاٹ دو، عورتوں کی نس بندی کر دو، گولیاں دو، تاکہ بچہ پیدا نہ ہو۔ بس ایک بیٹا ہو اور ایک بیٹی ہو۔ مجھے بتاؤ کہ اگر دونوں بچے پاگل ہوں تو پھر کیا کرو گے؟ یا دونوں اندھے ہوں، لنگڑے ہوں یا کینسر کے مریض ہوں تو پھر کیا کرو گے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے قانون سے مقابلہ اور جاہلیت ہے۔

منصوبہ بندی صرف مسلمان کے لیے ہی کیوں؟

ان ملکوں نے اپنے ہاں اس منصوبہ بندی پر کیوں عمل نہیں کیا؟ یہ آخر صرف ہمارے مسلمانوں کے لیے ہی کیوں ہے؟ بھائی! اگر آبادی بڑھ رہی ہے تو سب کی بڑھ رہی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ عالم اسلام کے دشمن نے انتقام لینا ہے، اور وہ انتقام اس شکل میں ہے کہ گولیاں کھلا کر بچے مار دیں گے، تاکہ کسی طریقے سے مسلمانوں کا عدد تباہ ہو۔ ان لوگوں کے پس منظر میں یہ ایک فلسفہ ہے۔

ایک منہ......دو ہاتھ:

ورنہ یاد رکھو! جو بچہ اللہ پیدا فرماتے ہیں، اگر کھانے کے لیے وہ ایک منہ لے کے آتا ہے تو کمانے کے لیے دو ہاتھ بھی لے کے آتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو دو پاؤں بھی دیتے ہیں۔

اور پھر کوئی پتہ نہیں ہوتا، کبھی کبھی ایک آدمی کے دس لڑکے ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے ایک ایسا ہوتا ہے جو سارے خاندان کو سنبھال لیتا ہے، سارے خاندان کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔

نظامِ قدرت!!

اب بھی دنیا میں دیکھ لیں کہ کسی کے چار بچے ہیں تو تین بے کار ہیں اور ایک لڑکا ایسا ہے جو کما کر سب کو کھلا رہا ہے۔ ایک لڑکا باہر ملک چلا گیا تو ان کی عزت کا ذریعہ بن گیا۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک نظام ہے۔ اس نظام سے جو ٹکرائے گا وہ خود پاش پاش ہو کر رہ جائے گا اور کچھ بھی نہیں ہوگا، اللہ کی تقدیر کو کوئی بھی منع نہیں کر سکتا۔

فرعون کے خواب کی تعبیر:

مفسر ﷫ فرماتے ہیں کہ فرعون ملعون نے ایک خواب دیکھا تھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ نکلی ہے اور قبطیوں کے جتنے گھر ہیں، سب میں وہ آگ داخل ہو جاتی ہے، مگر بنی اسرائیل کے گھروں میں داخل نہیں ہوتی۔ اس کی تعبیر یہ نکالی گئی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جس کی وجہ سے تم پر ہلاکت آئے گی۔

فرعون جن لوگوں سے قصے سنتا تھا، ان سے بھی اس نے سنا کہ بنی اسرائیل کہہ رہے ہیں کہ ہمارے اندر ایک آدمی پیدا ہوگا جس کی وجہ سے اللہ ہمیں قوت وعزت دیں گے۔ اس وجہ سے فرعون نے حکم دیا کہ جو بھی بچہ پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور بچیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اور بنی اسرائیل کے جتنے لوگ تھے ان کو محنت ومشقت والے

کاموں میں ڈالتا تھا کہ صفائی کرو، جھاڑو لگاؤ، بھنگی کا کام کرو، پتھروں کو توڑو۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۹۰، البقرۃ:الآیۃ:۴۹]

بڑا عذاب؟

﴿يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۴۹] سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ کسی کے گھر بچہ پیدا ہو اور اس کو والدین کے سامنے تہ تیغ کر دیا جائے اور پھر لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے، تاکہ ان سے گھروں کے کام کاج وغیرہ لیے جا سکیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت میں ﴿يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ﴾ کے درمیان میں ''واؤ'' عاطفہ نہیں آئی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پچھلے کی تفسیر ہے کہ وہ بُرا عذاب یہ تھا۔ لیکن سورۂ ابراہیم میں ''واؤ'' کے ساتھ ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بُرا عذاب اور تھا۔ اس لیے مفسرین نے فرمایا کہ اصل میں بُرا عذاب یہ بھی تھا کہ ان سے مشقت کے کام لیے جائیں، ان کے لڑکوں کو قتل کیا جائے، لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے۔ اور وہ زندہ چھوڑ دینا بھی کوئی ہمدردی کے لیے نہیں تھا، بلکہ اپنے گھریلو کام لینا مقصود تھا۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۹۰، البقرۃ:الآیۃ:۴۹]

﴿يَسُومُونَكُمْ﴾ کا معنی:

﴿يَسُومُونَكُمْ﴾ کا معنی ہوتا ہے: چکھانا۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''سَامَهُ خُطَّةَ خَسْفٍ'' (اس نے اس کو خسف کا مزہ چکھایا)۔ جیسا کہ عمرو بن کلثوم نے یہ شعر کہا ہے:

إِذَا مَا الْمَلْكُ سَامَ النَّاسَ خَسْفًا
أَبَيْنَا أَنْ نُقِرَّ الْخَسْفَ فِينَا

''جب ملک لوگوں کو زمین میں دفن کرنا چاہتا ہے تو ہم انکار کرتے ہیں کہ ہمارے اندر ہی دھنسائے رکھتا۔''

اور بعض مفسرین فرماتے ہیں: ﴿يَسُومُونَكُمْ﴾ کا معنی ''يُدِيمُونَ'' ہے، یعنی ہمیشہ عذاب میں رکھتے تھے۔ ہمیشہ چرنے والی بکری کو ''سائمہ'' کہا جاتا ہے۔ ''سَامَ يَسُومُ'' کا معنی ہے: ''دَامَ يَدِيمُ'' یعنی ہمیشہ تم کو بُرے عذاب میں ڈالتے تھے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں تو مناسبت یہی تھی، اس لیے فرما دیا: ﴿يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ﴾ گویا اس کی تفسیر ہے۔

اور سورۂ ابراہیم میں عطف کے ساتھ آیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اس سے پہلے فرمایا تھا: ﴿وَذَكِّرْهُمْ بِأَيّٰىمِ اللّٰهِ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝﴾ [ابراہیم:۵] یعنی اللہ کی نعمتیں ان کو یاد دلاؤ۔ تو وہاں علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا کہ تمہیں برا عذاب چکھاتے تھے اللہ نے اس سے چھڑایا، تمہارے بچوں کو زندہ قتل کر دیتے تھے اللہ نے اس سے چھڑایا، تمہاری لڑکیوں کو چھوڑ دیتے تھے اس عذاب سے اللہ نے چھڑایا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ۴۹]

''فرعون'' نام نہیں، لقب ہے:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''فرعون'' نام نہیں ہے، بلکہ یہ لقب ہے جو اتنا مشہور ہو گیا کہ مصر کے بادشاہ کا نام بن گیا، جیسا کہ ''قیصر'' روم کے بادشاہ کا لقب تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ۴۹]

فرعون کا مختصر تعارف:

موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جو فرعون تھا، بعض کتابوں میں اس کا نام ولید بن مصعب بن الریان اور بعض کتابوں میں مصعب ابن الریان ہے، وہ عملیق بن اود بن ارم بن سام بن نوح کی اولاد میں سے تھا اور اس کی کنیت ابو مرہ تھی، اس کے آباء فارس کے علاقہ اصطخر کے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ۴۹]

نعمت بھی...... امتحان بھی:

﴿وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ۝﴾

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم نے جو تمہیں اور تمہارے باپ کو نجات دی، یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ ''بَلَاءٌ'' کا معنی ''نعمت'' بھی آتا ہے اور ''فتنہ و اختبار و امتحان'' بھی آتا ہے۔ اصل میں اللہ کی نعمت بھی تو ایک امتحان ہے کہ بندہ اس نعمت کے بعد اللہ کا شکر ادا کرتا ہے یا نہیں کرتا؟ اسی لیے امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ کبھی برائی سے، کبھی بھلائی سے بطور آزمائش کے۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل لغت کے نزدیک ''شر'' میں یہ کلمہ استعمال ہو تو ''بَلَوْتُهُ، أَبْلُوهُ، بَلَاءً'' اور ''خیر'' میں ہو تو ''أُبْلِيهِ، إِبْلَاءً وَ بَلَاءً'' آتا ہے۔ جیسے زہیر بن سلمی نے کہا:

جَزَی اللّٰہُ بِالْاِحْسَانِ مَا فَعَلَا بِکُمْ
وَ اَبْلَاھُمَا خَیْرَ الْبَلَاءِ الَّذِیْ یَبْلُوْ

یہاں شاعر نے ''اِبْلَاء، بَلَاء'' دونوں کو شعر کے اندر جمع کر دیا ہے۔

ویسے عام طور پر خیر میں اِبْلَاء اور شر میں بَلَاء استعمال ہوتا ہے، لیکن کبھی دونوں میں بَلَاء استعمال ہوتا ہے۔

اور بعض نے کہا کہ یہ لفظ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس عذاب میں تم تھے وہ بڑا ذلت والا عذاب تھا کہ تمہارے بچے ذبح کر دیئے جائیں اور بچیاں چھوڑ دی جائیں۔ یہ بَلَاء ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ ''بَلَاء'' کا زیادہ استعمال ''شر'' میں ہوتا ہے، اور ذبح تمہارے لیے ایک بری چیز بھی ہے اور امتحان بھی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ۴۹]

ایک عظیم معجزہ:

اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۵۰]

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کو نجات ملنے کا واقعہ اللہ کی قدرت کا ایک نظارہ تھا۔ یہ کوئی معجزہ نہیں، بلکہ یہ تو اتفاقات وحادثات میں سے ہے۔ ایسے حادثے ہوتے رہتے ہیں کہ ایک جگہ طوفان آتا ہے اور چند آدمی اتفاقی طور پر بچ جاتے ہیں، کوئی بڑی بلڈنگ گر جاتی ہے، اس میں موجود سارے لوگ ہلاک ہوجاتے ہیں، مگر ایک آدمی بچ جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے...... معاذ اللہ!...... ان واقعات کو اپنے اللہ کی قدرتیں اور معجزے بنا کر قوم کے سامنے پیش کیا۔ یہ باتیں جہالت پر مبنی ہیں۔ ایسے حادثے کی کوئی ایک مثال تو لے آؤ کہ ایک دریا پوری طغیانی سے بہہ رہا ہو، ایک قوم لاکھوں کی تعداد میں اس پر سے صحیح سلامت گزر جائے اور دوسری قوم کے لاکھوں آدمی اسی دریا میں غرق ہوجائیں۔ ایک، دو آدمیوں کا بچ جانا تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ کیسا حادثہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو بنی اسرائیل تھے، ان کو تو دریا نے راستے دے اور وہ بحفاظت دریا پار کر گئے۔ اور ابھی وہ گزر رہے ہی تھے کہ پیچھے سے فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت وہاں پہنچ گیا، اس نے جب دریا میں بنے خشک راستے دیکھے تو وہ بھی اس میں کود پڑا۔ جب وہ اندر آگیا تو اس کو دریا نے پکڑ لیا۔ یہ کیسا دریا ہے جو اسرائیلی کو پہچان کرا سے راستہ دے رہا ہے اور قبطی کو پہچان کر اپنے اندر ڈبو رہا ہے؟

صاف ظاہر ہے کہ یہ اللہ کی قدرت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ ایسی باتوں کو حادثات قرار دینا بڑی جہالت کی بات ہے۔

چاند دو ٹکڑے ہونے کا معجزہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کی اور اپنی انگلی مبارک کا اشارہ فرمایا تو چاند دو ٹکڑے ہوگیا۔ یہ کیسا حادثہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہوگیا؟ ایسے کہہ دینے سے تو بات نہیں بنتی۔ اگر واقعی یہ کوئی حادثہ تھا تو تم بھی ایسا کوئی حادثہ دنیا کو دکھلاؤ کہ ہم نے بھی انگلی کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا ہے!! اتنے بڑے کرۂ عظیم کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا، اگر معجزہ اور اللہ کی قدرت کا اظہار نہیں تھا تو اور کیا چیز تھی؟ تم تو اربہا ڈالر خرچ کر کے چاند پر پہنچے ہو اور ابھی اس پر رہنے کی تم کو طاقت نہیں ہو رہی۔

ایسی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے دماغ قرآن وسنت کے مطالعہ سے خالی ہوتے ہیں۔ ورنہ جن کی نظر اللہ کے قرآن پر ہے اور احادیث رسول پاک پر ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرتیں ہیں اور اللہ کے انبیاء کے معجزات ہیں۔

متفرق معجزات کا تذکرہ:

اب دیکھیں!

......ایک ایسا وقت بھی آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالے میں ہاتھ رکھا اور انگلیوں سے پانی جوش مار کر نکلنے لگا۔[1]

ایسے واقعات کو کوئی حادثہ کہہ سکتا ہے؟

......ایک صحابی کی ٹانگ ٹوٹ گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ لگایا تو جڑ گئی۔[2]

......ایک صحابی کی آنکھ باہر نکل آئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک سے واپس اس کی جگہ میں رکھ دی تو ہمیشہ کے لیے جڑ گئی۔ [کنز العمال، حدیث: ۳۵۳۹۴]

تم بھی اسی طرح کسی کی نکلی ہوئی آنکھ واپس لگاؤ اور پھر اسے پہلے کی طرح ٹھیک کر کے دکھلاؤ تو مانیں کہ یہ حادثہ

---

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۳۵۷۳، بابُ: علامَاتِ النُّبوَّةِ فِي الإسْلَامِ]

[2] [صحیح البخاری، حدیث: ۴۰۳۹، بابُ قتلِ أبي رافعٍ عبدِ اللهِ بنِ أبي الحُقيقِ]

تھا اور ایسا ہو جاتا ہے۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کر سکیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈا کریں، لوگوں کے اذہان وقلوب میں شکوک اور شبہات پیدا کر کے انہیں اسلام سے متنفر کریں۔

فرعون کے غرق ہونے کا قصہ:

یہ قصہ اللہ نے کئی سورتوں میں بیان فرمایا ہے۔ یہ واقعہ سورۃ الشعراء میں زیادہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَاَنْجَيْنٰكُمْ﴾ ہم نے چھڑایا تم کو دشمن سے اور ہم نے تمہارے اور ان کے درمیان دریا کو رکاوٹ بنا دیا، ﴿وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝﴾ [البقرۃ: ۵۰] اور ہم نے تمہارے دشمنوں کو غرق کر دیا، اس حال میں کہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ دشمن غرق ہو رہا ہے، تاکہ تمہارے دلوں میں زیادہ سے زیادہ ٹھنڈک پیدا ہو۔ کیونکہ جب آدمی دشمن کو اپنی آنکھوں سے ذلیل ہوتا دیکھ لے تو دل بہت خوش ہوتا ہے۔ اور تمہارے دشمنوں کے لیے یہ بڑی ذلت تھی کہ جن کو وہ ذلیل کرتے تھے، آج وہ ان کے غرق ہونے کو دیکھ رہے ہیں۔

حضرت عبدالرزاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ نکلے اور فرعون کو یہ بات پہنچی تو اس نے کہا کہ ابھی صبر کرو، جب صبح کا مرغ اذان دے گا، اس وقت ہم ان کے پیچھے نکلیں گے۔ اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ اس رات کسی مرغ نے اذان نہ دی تو وہ اللہ کی قدرت سے لیٹ ہو گئے۔ صبح ہوئی تو فرعون نے ایک بکری منگوائی اور اس کو ذبح کیا، اس کے بعد فرعون نے کہا کہ پہلے ہم اس کا جگر وغیرہ بھونتے ہیں، اتنی دیر میں تم چھ لاکھ کا لشکر اکٹھا کرو۔ چنانچہ چھ لاکھ کا لشکر اس نے اکٹھا کر لیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام دریا پر پہنچے تو ان کے ساتھ ان کے ایک ساتھی تھے، حضرت یوشع بن نون۔ انہوں نے پوچھا: اللہ کا کیا حکم ہے؟ کس طرف چلنا ہے؟ فرمایا: اسی طرف کا حکم ہے، چلو دریا کی طرف۔ جب حکم دیا تو یوشع بن نون نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈالا، مگر وہ ڈوبنے لگ گیا تو یہ واپس آ گئے۔ دوبارہ ڈالا تو پھر گھوڑا ڈوبنے لگ گیا۔ پھر واپس آ گئے، تیسری مرتبہ گئے تو پھر ایسا ہی ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں نے کوئی جھوٹ تو نہیں بولا، میرے رب کا یہی حکم ہے کہ ہم نے اسی طرف جانا ہے۔ اس وقت اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی، جس میں فرمایا: ﴿اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ﴾ [الشعراء: ۶۳] تم اس دریا پر اپنا عصا مارو۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا اس پانی پر مارا تو وہ پھٹ گیا اور ایسے بن گیا جیسے دونوں طرف پہاڑ کھڑے ہوں۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ جو لوگ تھے، وہ سب کے سب

وہاں سے گزرے۔

فرعون، جب اُن کو پکڑنے کے لیے آیا تو وہ بھی اس میں داخل ہو گیا۔ جب فرعون کا پورا لشکر اندر آ گیا تو اللہ نے پانی کو حکم دیا کہ اب مل جاؤ۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام کو نجات ملی اور فرعون غرق ہوا۔ یہ دس (10) محرم کا دن تھا۔

دس محرم کا روزہ کیوں؟

میرے آقا ﷺ جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہودی لوگ محرم کی دس تاریخ کو روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم اس دن کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: یہ بڑی برکت اور رحمت والا دن ہے، جب اللہ نے بنی اسرائیل کو نجات دی تھی اور فرعون غرق ہوا تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے شکرانے کے طور پر اس دن کا روزہ رکھا تھا۔ اس لیے ہم بھی رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم سے تو زیادہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ میرا حق بنتا ہے، کیونکہ وہ بھی اللہ کے رسول تھے اور میں بھی اللہ کا رسول ہوں۔ پھر ان کا اور میرا طریقۂ دعوت بھی ایک ہے، ہمارا اصول ایک ہے، اسلام ایک ہے، توحید ایک ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ [صحيح البخاري، حديث: ٢٠٠٤، باب: صِيَامِ يَوْمِ عَاشُورَاءَ]

حضور ﷺ یہ روزہ اتنی پابندی سے رکھتے تھے جیسے رمضان کا روزہ ہو۔ پھر جب رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے تو حضور ﷺ نے اجازت دے دی، جو چاہے یہ روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٢٠٠٢، باب: صِيَامِ يَوْمِ عَاشُورَاءَ]

یہود کی مشابہت سے احتراز:

اس کے بعد حضور پاک ﷺ نے ایک ارشاد مبارک جاری فرما دیا: جو لوگ محرم کا روزہ رکھنا چاہیں تو وہ نُو اور دس محرم (دو دن) روزہ رکھیں یا دس کے ساتھ گیارہ محرم کا بھی روزہ رکھیں، تا کہ یہودیوں کے طریقے سے مخالفت بھی ہو جائے اور اللہ کا شکر بھی ادا ہو جائے۔ [صحيح مسلم، حديث: ١١٣٤، باب: أَيُّ يَوْمٍ يُصَامُ فِي عَاشُورَاءَ]

عاشوراء کے روزے کا پس منظر:

یومِ عاشوراء کا روزہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے چلا آ رہا ہے، جبکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی وجہ سے عاشوراء کے دن روزہ رکھا جاتا ہے۔ بہر حال اس روزے کی بڑی فضیلت ہے، اللہ پاک ہم

سب کو نصیب کرے۔

اور ایک روایت یہ بھی آئی ہے کہ اللہ نے جس دن بنی اسرائیل کے لیے دریا کو پھاڑا تھا، وہ بھی عاشوراء کا دن تھا۔

لیکن مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ ایک تو اس کے اندر زید العمی ہے وہ ضعیف ہے اور پھر اس کا جو شیخ ہے یزید الرقاشی، وہ اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۱، البقرۃ: الآیۃ: ۹۱]

بہر حال پہلی روایت جو ہم نے پڑھی، وہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو نجات دی اور فرعون کو اس کے متبعین سمیت غرق کر دیا۔

﴿وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَأَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَإِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝﴾
[البقرۃ: ۵۱ تا ۵۳]

اور جب ہم موسیٰ سے چالیس رات کو وعدہ کیا، پھر تم نے موسیٰ کے بعد بچھڑا بنا لیا اور تم ظالم تھے۔ پھر ہم نے تمہیں اس پر بھی معاف کر دیا، تاکہ تم احسان مانو۔ اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناحق سے الگ کرنے والے احکام دیئے، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک عمل، ان کی ناشکری اور اپنی نعمتوں کا ایک اور واقعہ ذکر فرمایا ہے۔

تفسیر:

فرمایا: یاد کرو جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بلایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ وہ کوہِ طور پر تشریف لے آئیں، چالیس راتوں کے لیے وہاں عبادت کریں۔ یعنی روزہ بھی ہو، عبادت بھی ہو، قیام بھی ہو۔

یہاں اختصار ہے، ایک اور جگہ اس کی تفصیل ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ابتدائی طور پر تیس دن کوہِ طور پر قیام کا حکم ملا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیس دن تک روزے رکھے اور رات دن اللہ کی عبادت میں مشغول رہے، جب آپ نے تیس دن کے بعد افطار فرما لیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ مزید دس راتیں عبادت میں گزارو۔ نتیجتاً چالیس

راتوں کی عبادت کا حکم دیا گیا۔

فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل کی تاریخ:

اس بات میں علماء کا اختلاف ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے گئے تو اپنی قوم کو کہاں چھوڑا؟ بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نجات دے دی اور فرعون کو اس کے لاؤ لشکر سمیت غرق کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر واپس مصر میں داخل ہو گئے۔ قرآن کریم کی بعض آیات سے اس قول کی تائید کا اشارہ ملتا ہے کہ اللہ نے فرمایا: جس مصر پر فرعون کی حکومت تھی، جس پر فراعنہ کا تسلط تھا، جس پر قبط کا قبضہ تھا، ہم نے اس کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو کمزور سمجھ کر ان پر ظلم کیے جاتے تھے، یعنی بنی اسرائیل کو۔ اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر واپس مصر میں آ کر آباد ہوئے اور قوم کو مصر میں چھوڑ کر پھر آپ کوہِ طور پر تشریف لے گئے۔

جبکہ بعض مفسرین اس قول سے اختلاف کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں دوبارہ مصر میں داخل ہونے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ تو مصر میں اس زمانے میں داخل ہوئے تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی تھی اور آپ کے بعد یہ قافلہ حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں آیا۔

بہر حال قرآن پاک نے یہاں اتنی بات کا اشارہ فرما دیا کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو پابند فرما دیا کہ ایک مقام معین پر آ کر راتیں گزاریں۔ یہاں اس مقام اور جگہ کا نام نہیں لیا گیا، لیکن دیگر آیات اور روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ میقات جس پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو پابند کیا تھا، وہ ''جبل طور'' تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں حضرت ہارون علیہ السلام کو ٹھہرایا، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہیں، عمر میں تو یہ موسیٰ علیہ السلام سے بڑے ہیں، لیکن شان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے بڑھ کر ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام رسول بھی ہیں اور نبی بھی ہیں، جبکہ حضرت ہارون علیہ السلام صرف نبی ہیں، رسول نہیں ہیں، بلکہ وہ شریعت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابع ہیں۔

دوسرے مقام پر موجود ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے فرمایا: اے میرے بھائی! تم میرے خلیفہ بنو، تم میری عدم موجودگی میں قوم کے اندر رہو، قوم کو سنبھالو اور ان کی اصلاح کرو۔ خبردار! خیال رکھنا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ تم ان لوگوں کے راستے پر لگ جاؤ جو پہلے دنیا میں فساد کرنے والے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنایا۔

مدینہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نائب:

میرے آقا سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ پر تشریف لے جا رہے تھے، حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بیمار تھیں، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم ہمارے ساتھ جہاد میں نہ جاؤ، بلکہ اپنے گھر کو سنبھالو، کیونکہ ماسوا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سنبھالنا مشکل تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے بہادر تھے، ان کے دل میں جذبہ تھا تو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حکم بڑا مشکل لگا۔ انکار تو نہیں کر سکتے تھے، البتہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ میرے لیے کتنی مجبوری ہوگی کہ میرے آقا دشمن کے نرغہ میں ہوں اور میں عورتوں کے ساتھ بیٹھا رہوں۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں بھی آپ کے ساتھ جنگ میں چلوں، گھر کے اندر جو تکلیف اور دُکھ سکھ ہے، وہ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہوگا۔

میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے علی! کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ تم بھی میری اسی طرح نیابت کرو جس طرح ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی نیابت کی تھی؟ اتنا بڑا مرتبہ میں تمہیں بخش رہا ہوں۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ راضی ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۴۴۱۶، باب: غَزْوَةِ تَبُوكَ وَهِيَ غَزْوَةُ الْعُسْرَةِ]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت بلا فصل کا استدلال:

بعض حضرات قرآن مجید کی آیت ﴿وَقَالَ مُوسٰى لِأَخِيهِ هٰرُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ﴾ [الاعراف: ۱۴۲] (اور کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون کو کہ تم میرے خلیفہ ہو میری قوم میں اور اصلاح کرتے رہنا اور پیروی نہ کرنا فساد مچانے والوں کے راستے کی) اور اس حدیث مبارک "أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى، إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي"[1] سے دلیل پکڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہاں موسیٰ علیہ السلام کے بھائی خلیفہ بنے اور یہاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر کے اندر پیچھے چھوڑا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کا حق صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی آدمی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کا حقدار نہیں بن سکتا۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک برحق خلفاء نہیں، بلکہ یہ زبردستی

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۰۴]

حضور ﷺ کے تختِ خلافت پر بیٹھ گئے تھے......نعوذ باللہ!......

استدلالِ مذکور کا جواب:

مذکورہ بالا استدلال بالکل غلط ہے۔ میں آپ کو ایک مثال سے بات سمجھاتا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں کہ اگر میں یہاں کوئی غلطی کروں تو کیا یہ سب علماء اور طلبہ میری اس غلطی میں شریک ہوجائیں گے اور مجھے روکنے والا کوئی بھی نہیں ہوگا؟ ایسی بات نہیں ہے۔ آخر کوئی ایک تو اُٹھ کے کہے گا کہ آپ یہ غلطی کی ہے۔

اگر خلافت بلا فصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھا اور حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے اُن سے زبردستی یہ حق چھین لیا تھا تو کیا حضور ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے اڑھائی لاکھ صحابہ میں سے کسی ایک صحابی نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا اور نہ ہی اس ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی؟ کیا اس وقت تمام صحابہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ متفق ہوگئے؟ اور آج چودہ سو سال گزرنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ظلم ہوا تھا؟

چلو اگر کسی ایک صحابی نے اس معاملے میں ان کا ساتھ نہ دیا تو کم از کم حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی کے سامنے اس کا اظہار تو کرتے کہ میرے ساتھ ظلم اور زیادتی ہوئی ہے۔ ایسا تو نہ کرتے کہ جن لوگوں نے ان سے خلافت چھین لی تھی، انہی کے وزیر اور مشیر بن جاتے اور ساری زندگی ان کی غلامی کرتے رہے۔ کم از کم ان سے علیحدگی اختیار کرلیتے، شاید اس وجہ سے صحابہ میں ایک جماعت پیدا ہوجاتی جو اُن کا ساتھ دیتی۔

آپ نے پڑھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ پر تھیں، لیکن صحابہ کی اکثریت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اگر حضور ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کا حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہوتا تو کیا صحابہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑے نہ ہوتے؟

دوسری بات یہ بھی یاد رکھیں کہ صرف ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنانے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر استدلال کرنا اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کہ ہارون علیہ السلام تو خود نبی تھے، موسیٰ علیہ السلام بھی نبی اور رسول تھے، وہاں تو خلیفہ بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات تو تب ہوتی جب ہمارے آقا ﷺ کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی نبی ہوتے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے واقعہ سے خلافت کے مسئلہ پر دلیل نہیں پکڑی جاسکتی۔

اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی کوئی خلافت کا مسئلہ نہ رہا۔

اور اس سے بھی اندازہ لگائیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿هٰرُوْنَ اُخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ﴾ ہارون اتم میری قوم کے اندر خلیفہ ہو، اور حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: تم گھر کے مسئلہ کے اندر ذمہ دار ہو۔ مملکت تو حضور ﷺ نے ان کے سپرد نہیں فرمائی تھی۔ لہٰذا ایسی باتوں سے استدلال کرنا، اللہ کے دین میں تحریف کرنے کے برابر ہے۔

قیام میں دنوں کا ذکر کیوں نہیں؟

یہاں چالیس راتوں کا ذکر ہے، حالانکہ جہاں چالیس راتیں تھیں وہاں چالیس دن بھی تو ساتھ تھے۔ یعنی ایسے تو نہیں تھا کہ موسیٰ علیہ السلام رات کو وہاں رہتے تھے اور دن کو واپس آجاتے تھے، بلکہ دن رات وہیں رہے۔ جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کے اندر صرف ''رات'' کا ذکر کیا ہے، ''دن'' کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام کے ہر لفظ اور ہر جملے میں حکمتیں ہیں۔ اللہ نے راتوں کا ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ روحانی تربیت کے لیے رات کا وقت زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ بندے کو رات کے وقت عبادت میں جتنی یکسوئی ہوتی ہے، اتنی یکسوئی دن میں حاصل نہیں ہوسکتی۔

رات کی اہمیت:

قرآن پاک پر نظر دوڑائیں تو یہ چیز واضح نظر آتی ہے کہ حضور ﷺ کو بہت سے اہم اُمور رات میں پیش آئے۔

...... چنانچہ قرآن مجید ''لیلۃ القدر'' میں نازل کیا گیا، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ①﴾ [القدر:۱] (ہم نے قرآن اُتارا ہے ایک برکت والی رات میں)۔

...... حضور ﷺ کو جب پہلا حکم ملا تھا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ① قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ②﴾ [المزمل:۱،۲] وہاں بھی رات کو اُٹھنے کا حکم دیا گیا۔ پہلی پہلی نماز کا جو حکم ملا، وہ رات کی عبادت کا حکم ملا۔

...... قرآن مقدس کی ایک اور آیت ہے: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا

مَحۡمُوۡدًا﴿۷۹﴾ [الاسراء:۷۹] رات کے اندر نیند کو چھوڑ کو اللہ کی عبادت زائدہ ادا کریں۔ یہاں بھی رات کو تہجد پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

......اور معراج جیسا عظیم معجزہ بھی میرے مدنی ﷺ کو رات کے وقت ملا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا﴾ [الاسراء:۱] پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے پاک پیغمبر کو رات کے بعض حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف۔

......اور نفس کی اصلاح کا طریقہ بھی یہ بتایا گیا ہے کہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے اللہ کی عبادت کی جائے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیۡلِ هِیَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّ اَقۡوَمُ قِیۡلًا﴿۶﴾﴾ [المزمل:۶] میرے مدنی! راتوں کو جاگنا نفس کو سخت روندتا ہے اور بات بھی سیدھی نکلتی ہے۔

اکثر مقامات پر آپ کو رات کا تذکرہ ملے گا۔ چنانچہ ''لیلۃ العید'' اور ''لیلۃ الجمعہ'' بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

......حضور ﷺ نے فرمایا: بندہ رات کے آخری حصے میں جب عبادت کرے تو اپنے رب کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ وہاں بھی ''رات'' کا ذکر آیا ہے۔

......اسی طرح صحیح حدیث میں موجود ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ ہر رات کے آخری حصے میں آسمانِ دنیا پر نزول اجلال فرماتے ہیں جیسے اس کی شان کو زیبا ہے، اور اعلان ہوتا ہے کہ ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اس کی حاجت پوری کروں؟ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ اس کو معاف کروں؟ ہے کوئی رزق مانگنے والا کہ میں اس کے رزق میں برکت دوں؟ ہے کوئی اولاد مانگنے والا کہ میں اس کو اولاد دوں؟ [صحیح البخاری، حدیث:۱۱۴۵، بابُ الدُّعاءِ في الصَّلاةِ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ]

......پھر یہ بات بھی ہے کہ رات کو سفر آسانی سے طے ہوتا ہے۔ چنانچہ پچھلے زمانے میں جب لوگ پیدل یا اونٹ وغیرہ پہ سفر کرتے تھے تو وہ شام ہوتے ہی سفر کا آغاز کر لیتے اور پھر ساری رات قافلہ چلتا رہتا تھا۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ چونکہ رات ٹھنڈی ہو چکی ہوتی ہے، اس لیے رات کے سفر میں تکلیف کم ہوتی ہے اور سفر آسانی سے گزرتا ہے۔ آدمی کو بھوک اور پیاس کا بھی اتنا احساس نہیں ہوتا، جتنا دن میں ہوتا ہے۔

......علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح دنیا کا سفر رات کو آسانی سے طے ہوتا ہے اسی طرح اللہ کی طرف روحانی ترقیوں کا سفر بھی رات کے اوقات میں آسانی سے طے ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے اپنی اصلاح کرنی ہو، اپنے آپ کو

انسان بناتا ہو، اپنے آپ کو اللہ کا مقرب بنانا ہو تو ان کو چاہیے کہ وہ رات کو تہجد پڑھیں، راتوں کو اللہ کے آگے زیادہ سے زیادہ تضرع کریں، زیادہ سے زیادہ عاجزی کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے گڑگڑائیں۔ رات کو اللہ کی خصوصی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ تم چالیس راتیں عبادت کرو۔ چنانچہ انہوں نے کوہِ طور پر چالیس راتیں عبادت کی۔

اعداد وشمار کی حکمتیں:

جتنے بھی اعداد ہیں، ان کی حکمت تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان اعداد پر ہمارا کوئی ایمان اور اعتقاد نہیں ہے۔ جیسا کہ آج کل بعض لوگ عدد کے چکر میں پڑے رہتے ہیں، ناموں کا عدد نکالتے ہیں، ماں باپ کے نام کا عدد نکالتے ہیں، پھر ضرب اور تقسیم کرتے ہیں، جہاں عدد تھوڑا بچ جائے، اسے غالب اور جدھر زیادہ ہو، اسے مغلوب سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے تمام علوم باطل ہیں، ان پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں ہے۔

''سات'' (7) کا عدد:

اللہ نے زمینیں سات پیدا فرمائیں، طواف کے سات چکر رکھے، صفا ومروہ کے بھی سات چکروں کا حکم دیا اور اسی طرح سات اعضاء پر سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ سب اللہ کی رحمتیں ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتیں ہیں، جنہیں ہم نہیں جانتے۔ وہ چاہتے تو آٹھ بھی کر سکتے تھے، وہ چاہتے تو چھ بھی کر سکتے تھے۔

اعداد کی اکائیاں، دہائیاں:

البتہ بعض علماء نے کچھ اشارات دیئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ اعداد میں اکائیاں بھی ہوتی ہیں اور دہائیاں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک اکائی ہے، دس دہائی ہے اور بیس، تیس، چالیس، پچاس دہائیاں ہیں۔ پھر سو، دو سو، یہ سینکڑے ہوتے ہیں، پھر ہزار ہوتے ہیں، ان کے بعد لاکھ کا عدد ہوتا ہے۔

عددِ کامل؟

ان میں سے کامل عدد ''دس'' ہے۔ ایک سے آپ گنیں تو دس کے ساتھ ایک لگے گا تو گیارہ ہو جائیں گے، دو لگیں گے تو بارہ ہو جائیں گے۔ اصل کامل عدد دس کا ہے جیسا کہ اللہ نے ایک جگہ فرمایا: ﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ یہ

دس پورے ہو گئے۔ جب کسی چیز کو زیادہ اہمیت دینی ہو تو اس کو چار دفعہ دہرا لیا جائے تو چالیس ہو جائے گا۔

اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ بہت بڑی اہمیت کا کام تھا، اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وہاں چالیس راتیں گزارنے کا حکم دیا۔

چالیس (40) کا عدد:

اللہ کی شان ہے کہ آدمی کی عمر کا بھی یہی عالم ہے کہ وہ چالیس سال تک آ کر بالکل پورا ہو جاتا ہے، ﴿حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً﴾ [الاحقاف:۱۵] یہ مرحلہ بھرپور جوانی کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد نہ تو ہڈیاں بڑھتی ہیں اور نہ ہی قد بڑھتا ہے۔ بلکہ اس کے بعد تو بندے کی عمر میں زوال آنے لگتا ہے۔

چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی:

اس لیے اللہ نے اپنی قدرت سے فیصلہ فرمایا اور ہر نبی کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا فرمائی۔ کسی بھی نبی کو چالیس سال سے پہلے نبوت نہیں ملی۔ البتہ اپنی قدرت کے اظہار کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بچپن میں انہی کی زبانی اعلان کروایا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ان کے بچپن کے زمانے میں حکم دیا: ﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝﴾ [مریم:۱۲]

انسان کی تخلیق اور چالیس کا عدد:

اسی طرح انسان کی تخلیق کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝﴾ [المومنون:۱۴]

پہلے چالیس دن تک نطفہ ہوتا ہے، پھر چالیس دن تک مضغہ ہوتا ہے، پھر چالیس دن بعد ہڈیاں بنتی ہیں۔ چالیس، چالیس دن کے بعد ایک مرحلہ طے ہوتا رہتا ہے، یعنی چالیس دن کے بعد بڑی تبدیلی آتی ہے۔ اس میں بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی کچھ حکمتیں ہیں۔

اور اسی طرح سے آتا ہے کہ جو شخص چالیس احادیث یاد کر لے تو اس کو علماء میں شمار کیا جائے گا۔

اور اسی طرح ایک ضعیف حدیث میں آتا ہے کہ جو بندہ چالیس نمازیں مسجد نبوی میں ادا کرے گا، اللہ پاک اس کو نفاق اور جہنم کی بیماری سے نجات دیں گے۔

بزرگوں نے چلہ مقرر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو بندہ چالیس دن تک اپنے گھر بار سے کٹ جائے گا، ریاضت کرے گا، نماز پڑھے گا، تہجد پڑھے گا، اللہ کے کام میں لگا رہے گا تو اس میں بھی تبدیلی آئے گی، وہ برائیوں سے اچھائیوں کی طرف تبدیل ہوگا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

((مَنْ أَخْلَصَ لِلّٰهِ تَعَالَىٰ أَرْبَعِينَ يَوْمًا ظَهَرَتْ يَنَابِيعُ الْحِكْمَةِ عَلَىٰ لِسَانِهِ.))

''جو بندہ چالیس دن اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرے، اس کی زبان پر حکمت کے چشمے ظاہر ہوتے ہیں۔'' [حلیۃ الاولیاء: ۵/۱۸۹]

کچھ باتیں سامری کے بارے میں

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بلا لیا تو موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے گئے۔ پیچھے قوم میں ایک شخص تھا جس کا نام ''سامری'' تھا، یہ بھی اسرائیلی تھا۔ بعض روایات کے اندر آتا ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام سے رشتہ داری بھی رکھتا تھا۔

فرشتے کے ذریعے سامری کی پرورش:

لوگوں نے لکھا ہے کہ سامری حلال سے پیدا نہیں ہوا تھا، بلکہ یہ نطفہ حرام سے پیدا ہوا تھا۔ جب یہ پیدا ہوا تو اس کی ماں اس کو ایک غار میں پھینک کر چلی گئی کہ اس کو وہاں سے کوئی لے جائے یا جنگل کا کوئی جانور اسے کھا جائے اور میری عزت محفوظ رہے۔ خدا کی قدرت دیکھیں! اللہ نے فرشتے کی ڈیوٹی لگائی کہ اس کی حفاظت کرو...... ہر کام میں اللہ کی حکمتیں ہوتی ہیں...... اس کی حفاظت کے لیے فرشتہ مقرر ہو گیا۔ اس نے فرشتے کی گود میں پرورش پائی، لیکن پھر بھی مشرک بن گیا۔

ہدایت، اللہ کے ہاتھ میں:

علماء نے لکھا ہے کہ یاد رکھو! ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ آپ دیکھیں! موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی گود میں پرورش پائی تو نبی بن گئے اور سامری ایک فرشتے کی گود میں پرورش پا کر بھی مشرک بن گیا۔

[تفسیر الشعراوی: ۵/۳۰۱۴، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۱۳]

ہدایت اور گمراہی کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ چاہیں تو کسی کو موحد بنا دیں، اور نہ چاہیں تو بندہ ساری زندگی شرک ہی کرتا رہے۔ کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی پوری زندگی شرک میں گزر جاتی ہے، آخر عمر میں مکہ میں

آئے تو موحد بن گئے، ساری زندگی قبروں پر سجدہ کرنے میں گزر گئی، اللہ نے عمرہ کرنے کی توفیق دی، حرم میں قرآن سنا، اللہ نے عقیدوں کی اصلاح کر دی۔

جاہل کے گھر میں عالم کی پیدائش:

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ظالم کے گھر میں ایک رحم والا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ایسے بھی ہوتا ہے کہ ایک جاہل کے گھر میں عالم پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ ہمارے زمانے میں لوگ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کی مثال دیتے ہیں۔ حضرت لاہوری رحمہ اللہ سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے، اللہ نے ہدایت دی، مفسر قرآن بنے اور پھر لاکھوں لوگوں کو ان کے ذریعے ہدایت ملی۔

وارث شاہ کا کارنامہ!

وارث شاہ سیدوں کے گھر میں پیدا ہوا، لیکن ہیر رانجھا کی کہانی لکھ کر چلا گیا۔ آج تک دنیا وہی ہیر رانجھا پڑھ رہی ہے۔ ہیر رانجھا کے پڑھنے سے کتنے لوگوں کو ہدایت ملی؟ یا کتنے لوگوں نے حج کر لیا؟ اس کے پڑھنے سے لڑکیوں کو عشق تو ہو سکتا ہے، ہدایت ملنے کی ذرہ برابر بھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح مردوں کے دلوں میں لوگوں کی لڑکیوں کو بھگانے کا شوق پیدا ہوگا اور وہ اس راستے میں تکلیفیں برداشت کریں گے۔

سیدوں کے گھر میں پیدا ہونے والا تو ''ہیر'' لکھے اور سکھوں کے گھر میں پیدا ہونے والا ''تفسیر'' لکھے!!! یہ اللہ کی شان ہے، جس کو چاہیں ہدایت دیں اور جسے چاہیں گمراہ کر دیں۔

قصۂ سامری کی تکمیل:

جو فرشتہ سامری کی پرورش کے لیے آتا تھا، اس کا گھوڑا جہاں قدم رکھتا، اس جگہ فوراً سبزہ نکل آتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس گھوڑے کے پاؤں میں کوئی ایسی برکت ہے کہ جہاں بھی یہ اپنا پاؤں رکھتا ہے وہاں سے سبزہ نکل آتا ہے۔ اس نے وہ مٹی اٹھا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔ پھر اس مٹی پر کچھ تجربات کیے۔ وہ اس طرح کہ اسے مختلف بے جان چیزوں پر ڈالا تو ان میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔

سامری، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس بدبخت کے دماغ میں ایک دفعہ ایک بات آ گئی۔ اس نے بنی اسرائیل سے کہا: تم لوگوں نے فرعون کی قوم سے جو سونے کے زیورات لیے تھے، وہ سب اکٹھے کرو...... اگرچہ

وہ دشمن کے زیورات ہیں، لیکن تمہارے لیے ان کا استعمال کرنا حلال نہیں...... چنانچہ وہ سارے زیور اکٹھے کر کے لے آئے۔ اس بدبخت نے ان زیورات کو پگھلا کر بیل کی شکل میں ایک چھوٹا سا بچھڑا بنادیا۔ پھر اس میں وہی مٹی ڈالی تو اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور اس سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے گائے کا بچہ آوازیں نکالتا ہے۔ جب ایسی آوازیں آئیں تو ساری قوم حیران ہو گئی کہ سونے کا بچھڑا ہے اور یہ آوازیں نکال رہا ہے، حالانکہ سونا کوئی بولنے والی چیز تو نہیں ہوتی۔ انہوں نے سامری سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: ﴿هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ﴾ [طٰہٰ: ۸۸] اے بنی اسرائیل! یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی خدا ہے۔ خدا تو یہاں ہمارے پاس ہے اور موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر ڈھونڈ رہے ہیں۔ ان کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ اصلی خدا یہ ہے۔ لہٰذا تم اس کی عبادت کرو۔ اس کے کہنے پر بہت ساری قوم بچھڑے کے سامنے سجدے میں گر گئی اور اس کی عبادت شروع کر دی۔ یوں اس نے اللہ کی توحید کے بعد دنیا میں شرک کا ایک فتنہ برپا کر دیا۔ [تفسیر الطبری: ۱۸/ ۳۵۵ طٰہٰ: الآیۃ: ۸۸]

انبیاء علیہم السلام کی خصوصی تربیت

آسمانی کتابوں کو نازل کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کی خصوصی تربیت کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن مقدس کے نازل ہونے سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصی طور پر تربیت کی گئی (یعنی اس کتاب کے لیے تیار کیا گیا)، کیونکہ رب عظیم نے ایک عظیم کتاب بھیجی، جسے ایک عظیم فرشتہ لے کر آیا اور وہ کتاب سب سے بڑی عظمت والے پیغمبر پر اُتاری گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت:

آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے مراحل پر نظر ڈالیں تو بعثت سے قبل کی زندگی سراپا جدوجہد نظر آئے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے، پوری مخلوق حتیٰ کہ اپنے اہل وعیال سے بھی کٹ جاتے تھے اور علیحدہ پہاڑ کی غار میں جا کر صرف خالق و مالک حقیقی کی طرف توجہ کرتے۔ اسی ذکر اور فکر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ابتدائی زندگی گزاری۔

موسیٰ علیہ السلام کی تربیت:

اسی طرح بعینہٖ ہمیں یہ بات اللہ کے قرآن میں ملتی ہے کہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے اللہ نے اپنے پیغمبر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت فرمائی۔

اگر آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی پر نظر ڈالیں تو ان کی پوری زندگی اختبارات، امتحانات میں گزرتی نظر آئے گی۔ پیدا ہوتے ہی ایک صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا گیا، پھر اس سے بڑا امتحان کیا ہو سکتا ہے کہ ایک دودھ پینے والا بچہ ہو اور جس کو پیدا ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہ گزرے ہوں اور اسے دریا میں ڈال دیا جائے، اور پھر جب وہ صندوق پکڑا جائے اور کھلے تو دشمن کے گھر۔ اس کے بعد فرعون کے پاس رہنا اور اس کے پاس رہتے ہوئے بچپن کے اندر امتحانات کا آنا اور آپ علیہ السلام کا فرعون کے منہ پر تھپڑ کا مارنا، یہ سب امتحانات ہی تو تھے، جن کے ذریعے ان کی تربیت کی جا رہی تھی۔

اس کے بعد جوانی آئی تو ایک اور امتحان میں مبتلا ہو گئے کہ ایک قبطی ان کے ہاتھوں سے مارا گیا اور فرعون اور اس کا لشکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پکڑ کر قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔

اب موسیٰ علیہ السلام مصر سے جا رہے ہیں اور پتہ بھی نہیں ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟ ایک اندازہ تھا کہ میں مدین کی طرف جا رہا ہوں۔ خیال تھا کہ میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہوں اور مدین والوں کا تعلق بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے شاید اسی وجہ سے وہ مجھے پناہ دے دیں، لیکن راستہ نہیں جانتے تھے۔ اللہ سے دعا کی اور چل پڑے۔

یہ کتنا بڑا امتحان تھا کہ وہ عظیم رسول اور اللہ کا نبی، جس کو اللہ نے فرعون کی قوت و سطوت کو مٹانے کے لیے پیدا فرمایا، وہ ایک نبی کے گھر دس سال بکریاں چرانے کی نوکری کر رہے ہیں!! ایک تو غربت اور وطن سے دوری ہے، اپنے والدین، بہن بھائیوں اور قبائل سے دوری اور دوسری طرف حکومت کا خوف لاحق ہے، ﴿فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِينَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ......﴾ [القصص: ١٨] ڈر رہے ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟ اور پھر ایک دن یا دو دن نہیں، بلکہ دس سال تک متواتر بکریاں چرانے کی ڈیوٹی لگ گئی۔ کتنے بڑے امتحانات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام گزر رہے ہیں!!!

جب آدمی پر امتحانات آتے ہیں تو تربیت خود بخود ہوتی ہے، آدمی جب مشقتوں کے اندر پڑتا ہے تو پھر کندن بن کر نکلتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ سونا اس وقت کھرا بنتا ہے جب اس کو آگ میں ڈالا جاتا ہے، ایسے تو کوئی پتہ نہیں کہ پیتل ہے، سونا ہے؟ یا کیا چیز ہے؟ لیکن جب اس کو کٹھالیوں میں ڈالتے ہیں، تیزاب میں ڈالتے ہیں اور آگ پر چڑھاتے ہیں تب جوہری فیصلہ کرتا ہے کہ یہ سونا ہے۔

بعینہ اسی طرح انسان کی بھی ایک تربیت ہوتی ہے، انسان بھی کٹھالیوں سے نکلتے ہیں اور مصائب کی بھٹیوں میں انہیں

ڈالا جاتا ہے اور پھر اس سے جو ختم ہو گئے وہ کھوٹے نکلے اور جو صحیح سالم نکلے، وہ خالص سونا (خالص مومن) کہلائے۔

بعض علماء کرام نے کتب سابقہ سے نقل کیا ہے (جن کی صحت کا علم اللہ کو ہے) کہ ذوالقعدہ کا پورا مہینہ اور دس دن ذوالحجہ کے تھے، تب جا کر یہ چالیس راتیں پوری ہوئیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۱، البقرۃ: الآیۃ: ۵۱]

ذوالحجہ کے دس دنوں کے روزوں کی فضیلت:

احادیث میں آتا ہے کہ جو آدمی عرفہ کے دن کا روزہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ایک سال کے گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۱۱۶۲، بَابُ اسْتِحْبَابِ... وَصَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ...]

ہاں! یہ علیحدہ مسئلہ ہے کہ اگر آپ حج کر رہے ہیں تو افضل یہ ہے کہ آپ روزہ نہ رکھیں۔ لیکن جو لوگ حج پر نہیں ہیں، مکہ میں رہتے ہیں یا جو بے چارے دور دراز شہروں میں رہتے ہیں، حج پر نہیں آسکے تو ان کے لیے دس دنوں کے روزوں کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اور ان ایام کی راتیں بھی بڑی فضیلت والی ہیں۔ چنانچہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ مزدلفہ کی رات لیلۃ القدر کی رات کے برابر ہے۔

یاد رکھیں! جس طرح اللہ نے زمانوں کو فضیلت بخشی ہے، اسی طرح بعض مقامات کو بھی فضیلت بخشی ہے، چنانچہ بیت المقدس میں ایک نماز پڑھیں تو پانچ ہزار نمازوں کے برابر ثواب ہے، مسجد نبوی میں نماز پڑھیں تو پچاس ہزار نماز کے برابر ثواب ہے اور مسجد حرام میں نماز پڑھیں تو ایک لاکھ نماز کے برابر ثواب ہے۔

[جامع الاحادیث، حدیث: ۱۳۵۹۸]

اس لیے علماء نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو موسیٰ علیہ السلام کو چالیس راتوں کے لیے پابند فرمایا تھا وہ بھی ذیقعدہ کا مہینہ اور ذی الحجہ کی دس راتیں تھیں، کیونکہ یہ حج حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام تو بہت بعد میں آئے۔

ہر ہر لفظ حکمت بھرا:

اللہ کے ہر ہر حکم میں اور قرآن کے ایک ایک لفظ میں حکمت ہے، آخر قرآن اللہ کا کلام ہے، اگر اللہ کے کلام میں اَسرار اور حکمتیں نہیں ہوں گی تو اور کس میں ہوں گی؟

دیکھیے! جہاں روزے کا حکم دیا، وہاں فرمایا: ﴿أَيَّامًا مَّعْدُودَٰتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ [البقرۃ:۱۸۴] جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اللہ نے اس کو اجازت دی ہے کہ وہ روزے رمضان کی بجائے بعد میں رکھ لے۔ یعنی ایام (دنوں) کا ذکر فرمایا، کیونکہ روزہ ''دن'' کو ہوتا ہے۔ اسی طرح جب اللہ نے حکم دیا کہ اگر تم حج میں بکری ذبح نہیں کر سکتے تو ﴿فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ...... الآیۃ﴾ [البقرۃ:۱۹۶] تو دس دنوں کے روزے رکھ لو۔ دیکھیں! یہاں بھی ''ایام'' کا لفظ ذکر فرمایا، کیونکہ روزے دن کے وقت رکھے جاتے ہیں۔ اور یہاں ''دن'' کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ ''رات'' کا ذکر کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَإِذْ وَٰعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً...... الآیۃ﴾ [البقرۃ:۵۱] اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَوَٰعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَٰثِينَ لَيْلَةً وَأَتْمَمْنَٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيقَٰتُ رَبِّهِۦٓ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً﴾ [الاعراف:۱۴۲] دیکھیے! یہاں بھی ''رات'' کا ذکر فرمایا ہے۔

ہاں! بعض لوگوں کے ہاں رات کو بھی روزہ ہوتا ہے، وہ سورج ڈوبنے کے بعد افطار نہیں کرتے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ بیٹھے رہیں گے، جب تک تارے نہ نکل آئیں۔ یہ لوگ ''تقیہ'' کے پرانے مریض ہیں، وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن مقدس کا حکم ہے: ﴿ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴾ [البقرۃ:۱۸۷] پھر روزہ کو پورا کرو رات تک۔ وہ کہتے ہیں کہ إِلَىٰ، مَعَ کے معنی میں ہے، لہٰذا رات داخل ہوگی تو ہمارا روزہ پورا ہوگا۔

اہلسنت والجماعت نے بھی اسی آیت سے دلیل دیتے ہوئے کہا ہے کہ ''إِلَىٰ'' بمعنی ''مَعَ'' بھی ہوتا ہے اور ''انتہاء'' کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ اب ہم اس آیت کا ترجمہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے معلوم کریں گے۔

سوچنے کی بات ہے کہ روزہ افطار کرنا کوئی چوری والی بات تو تھی نہیں کہ ایک یا دو آدمیوں کو اس کا پتہ چلا ہوگا اور باقیوں کو نہیں۔ حضور ﷺ مسجد نبوی میں بیٹھے ہیں، پروانے ساتھ بیٹھے ہیں اور حضور اکرم ﷺ افطار کر رہے ہیں، سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ ﷺ نے تارے نکلنے کا انتظار کیا یا مغرب کی اذان ہونے کا؟ نہیں! بلکہ اذان ہوتے ہی میرے نبی پاک ﷺ روزہ افطار کر لیتے تھے۔

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک میری اُمت افطار میں جلدی کرے گی اور سحری میں دیر کرے گی، اس وقت تک خیر پر رہے گی، کامیابی اور بھلائی پر رہے گی۔ یعنی افطار تو سورج ڈوبنے کے فوراً بعد کرے اور سحری کھانے میں دیر کرے، یعنی آخری وقت میں کھائے۔

اس حدیث کو غور سے سمجھیں! ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ افطار میں تاخیر کرنے پر زیادہ ثواب ملتا، مگر حضور اکرم ﷺ

نے فرمایا کہ افطار میں جلدی اور سحری میں دیر کی جائے۔ لیکن جلدی کا معنی یہ بھی نہیں کہ سورج ڈوبنے سے پہلے افطاری کرلیں، بلکہ ''جلدی'' کا معنی یہ ہے کہ جونہی افطار کا وقت شروع ہو، اسی وقت افطاری کرلی جائے۔ کیونکہ اللہ پاک نے ہمیں رات تک روزے کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا جونہی رات شروع ہوگئی تو ہمارے روزے کی انتہاء ہوگئی۔ اور پھر سحری میں دیر کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم انتظار کرتے رہیں کہ ابھی تو اندھیرا ہے، سورج نکلنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے، لہٰذا کھاتے پیتے رہو۔ نہیں، بلکہ صبح صادق ہوتے ہی سحری بند کردینی چاہیے۔

بندے پر لازم ہے کہ طاقت کا اظہار کرنے کی بجائے اپنی عاجزی کا اظہار کرے اور یوں کہے کہ مولا! اتنی دیر تُو نے کھانے پینے سے باز رہنے کا حکم دیا، میں نے صبر کرلیا، اب اجازت آگئی ہے تو اب میں کیوں صبر کروں؟ میں پانی کا پیاسا ہوں، کھانے کے لیے بھوکا ہوں، میں تو صرف تیرے حکم سے رُکا ہوا تھا۔

اور سحری میں تاخیر کا حکم دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جب بندہ آخری وقت میں پانی پیے گا اور کھانا کھائے گا تو اس کو اتنا فائدہ ہوگا کہ دن میں اس کی قوتیں بحال رہیں گی۔ اگر عشاء کے بعد ہی کوئی بندہ سحری کر کے سوجائے تو دن کے بارہ گھنٹوں کے ساتھ ساتھ رات کے آٹھ گھنٹے بھی اس کے ذمے ہوجائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ۳۰ دن کا روزہ:

بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ روزہ ایسے نہیں تھا جیسے ہمارے روزے ہوتے ہیں، بلکہ متواتر تیس دنوں اور راتوں کا روزہ تھا۔ اور اللہ کے نبیوں کے لیے یہ کوئی مشکل بھی نہیں ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کئی مرتبہ مسلسل دو دو دن، تین تین دن، چار چار دن کے روزے رکھتے تھے۔

بعض صحابہ نے بھی ایسا روزہ رکھنا شروع کیا تو دوسرے تیسرے دن بیہوش ہوگئے۔ کوئی یہاں گرا ہوا ہے، کوئی وہاں گرا ہوا ہے، کسی پر پانی ڈال رہے ہیں، کسی پر کپڑا ڈال رہے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: کیا ہوگیا؟ عرض کیا: روزہ رکھا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کون ہو تم میرا مقابلہ کرنے والے؟ خدا کے بندو! مجھے تو میرا رب کھلا دیتا ہے، پلا دیتا ہے، اللہ نے اپنے نبیوں کے لیے خصائص رکھے ہوئے ہیں، تم کیسے مقابلہ کرسکتے ہو کہ میں اگر چار دن کا مسلسل روزہ رکھوں تو تم بھی اس طرح رکھنے شروع کردو؟ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ خصوصی طاقت اور خصوصی قوت دیتے ہیں۔

آج بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جو ایمان والے لوگ ہیں، جن کے اندر قوتِ ایمانی موجود ہے، وہ سو سال کے

بوڑھے ہی کیوں نہ ہوں، ان کی تہجد نہیں چھوٹتی۔ دوسری طرف ہمارے ہٹے کٹے نوجوان ہیں جو فرض نماز ہی نہیں پڑھتے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے روزانہ چار چار کلو فروٹ کھا تو جائیں گے اور جب ان کو نماز کے لیے کہا جائے تو کہتے ہیں کہ پاؤں میں تکلیف ہے، موچ آگئی ہے۔ بعض شریف آدمی تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ حضرت! نماز پڑھنے کو تو ہم تیار ہیں، لیکن ہمارے کپڑے خراب ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ عورتوں کی طرح اب ان کے بھی کپڑے خراب ہونے شروع ہو گئے ہیں!! پہلے تو ہم سنتے تھے کہ عورتوں کے کپڑے خراب ہوتے ہیں۔ اب عورتوں کے کپڑے خراب نہیں ہوتے، عورتیں ترقی کر گئی ہیں، اب مردوں کے خراب ہوتے ہیں...... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰاجِعُوْنَ......

تیس راتوں پر مزید دس کیوں بڑھائی گئیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تیس دن کا روزہ رکھا، پھر مزید دس دن کا حکم کیوں ہوا؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ روزہ دار کے منہ سے ایک ہوا پیدا ہوتی ہے، اللہ کے ہاں وہ مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے منہ سے روزہ کی خوشبو آنے لگی تو انہوں نے مسواک کر لیا، اس پر اللہ نے فرمایا: دس دن مزید روزہ رکھو۔ اس کے اندر حکمتیں بھی تھیں، اللہ نے چالیس راتیں پوری کرائی تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے وہاں یہ عبادت کی اور قوم نے پیچھے ایک بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ اللہ نے فرمایا: پھر بھی میری نعمت یاد کرو کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔

یاد رکھیں! منہ سے بدبو آنا دو وجہ سے ہوتا ہے: ایک منہ میں گندگی کی وجہ سے۔ مثلاً ایک بندہ پان کھاتا رہتا ہے، اس نے کبھی اپنے منہ کو صاف نہیں کیا، کبھی مسواک کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہ تو بدبو ہے، یہ اللہ کو پسند نہیں ہے، یہ تو اللہ کا عذاب ہے کہ ساتھ کوئی شریف آدمی کھڑا نہیں ہو سکتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب آدمی بھوکا ہوتا ہے تو خالی معدہ کی وجہ سے اندر سے ایک ریح پیدا ہوتی ہے، یہاں وہ مراد ہے۔ منہ سے نکلنے والی بدبو جو اسباب خارجیہ وغیرہ سے ہو، وہ مراد نہیں، کیونکہ بدبو سے تو اسلام نے منع کیا ہے۔ حتیٰ کہ شریعت کہتی ہے کہ پیاز کھا کر مسجد میں نہ آؤ، لہسن کھا لو تو مسجد میں نہ آؤ، یعنی جو بھی بدبو والی چیز کھا لو تو جب تک منہ اچھی طرح سے صاف نہ کر لو، مسجد میں نہ آؤ۔

پھر میری نعمت یاد کرو کہ میں نے موسیٰ کو کتاب دی، میں نے موسیٰ کو فرقان دی، یعنی جو حق اور باطل کو جدا کرنے

والی ہے، حلال اور حرام کو جدا کرنے والی ہے، سچ اور جھوٹ کو جدا کرنے والی ہے۔ ایسی روشن کتاب عطا کی، تاکہ تم ہدایت پا سکو۔ تو تم میری نعمتیں یاد رکھو۔ کیا ان نعمتوں کا صلہ یہی ہے کہ تم میرے محمد مدنی کی مخالفت کرتے ہو؟ اسی بات کے لیے اللہ نے نعمتوں کا تذکرہ کیا۔

﴿وَإِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ﴾ ''الکتاب'' سے مراد ''تورات'' ہے اور ''الفرقان'' سے مراد حق و باطل اور ہدایت و گمراہی کے درمیان فرق کرنے والی تورات کی صفت ہے۔

یہ واقعہ بھی دریا سے نکلنے اور فرعون سے نجات کے بعد کا ہے، کیونکہ سورۃ الاعراف کا سیاق اسی پر دلالت کرتا ہے کہ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ [القصص: ۴۳] ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، قرونِ اُولیٰ کو ہلاک کرنے کے بعد۔ جس میں لوگوں کے لیے بصیرتیں، ہدایت اور رحمت ہے۔ اور تورات کا نام ہی فرقان ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ﴿وَإِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۵۳] میں ''واؤ'' زائدہ ہے، لیکن ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول غریب ہے کہ واؤ زائدہ ہے، بلکہ عطفِ (تفسیر) کے لیے ہے۔ لفظ ''الکتاب'' سے مراد ''تورات'' ہے اور ''الفرقان'' سے مراد بھی ''تورات'' ہے۔ اور کبھی ایسے ہوتا ہے کہ ایک چیز پر عطف ہوتا ہے، چیز وہی مراد ہوتی ہے، ان میں تغایر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ شعر کے اندر ہے:

وَ قَدَّمَتْ الْأَدِيْمَ لِرَاقِشِيْهِ
فَأَلْفَى قَوْلَهَا كَذِبًا وَ مِيْنًا

اور اسی طرح شعر ہے:

أَلَا حَبَّذَا هِنْدٌ وَ أَرْضٌ بِهَا هِنْدٌ
وَ هِنْدٌ أَتَى مِنْ دُوْنِهَا النَّأْيُ وَ الْبُعْدُ

یہاں پہلے شعر میں ''وَمِیْن'' سے مراد ''کذب'' ہے اور ''نَائِي'' کے معنی ''بعد'' کے آتے ہیں۔ گویا کہ معنی ایک ہے، لیکن آنے والے لفظ ''اَلْبُعْد'' کا عطف اسی پر ہو رہا ہے، جیسے قرآن میں ہے: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾ [المائدۃ: ۱۵] چنانچہ یہاں بھی ''نور'' اور ''کتاب'' کا معنی ایک ہی ہے، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرآن ہے۔ شاعر کا قول ہے:

حُيِّيْتَ مِنْ طَلَلٍ تَقَادَمَ عَهْدُهُ
أَقْوٰى وَ أَقْفَرَ بَعْدَ أُمِّ الْهَيْثَمِ

اس شعر میں بھی ''أقفر'' اور ''أقوى'' دونوں ایک چیز ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۱، ۹۲، البقرۃ: الآیۃ: ۵۳]

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ [البقرۃ: ۵۴]

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے قوم! تم نے بچھڑا بنا کر اپنا نقصان کیا، پس اب اپنے پیدا کرنے والے کی طرف توبہ کرو اور اپنی اپنی جان کو مار ڈالو۔ یہ تمہارے لیے تمہارے خالق کے نزدیک بہتر ہے۔ پھر اس نے تمہاری توبہ کو قبول کیا۔ بے شک وہی معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پہاڑ پر بلا کر کتاب تورات عطا فرمائی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کی توبہ قبول کی۔ اس آیت میں یہ واقعہ اختصار کے ساتھ آیا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے دیگر مختلف سورتوں (سورۃ الاعراف، سورۃ البقرۃ) اور ان کے علاوہ قرآن میں مختلف مقامات پر اس قصے کا تفصیلی ذکر فرمایا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام آزمائش میں مبتلا:

موسیٰ علیہ السلام جب دشمن کے امتحان سے نکل گئے تو اپنی قوم کے امتحان میں مبتلا ہو گئے۔ کیونکہ بسا اوقات اپنی قوم ایک ایسے مقام پر لے جاتی ہے کہ وہ داعی کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ماننے والوں نے ایک فتنہ کھڑا کر دیا کہ حضرت علی خود خدا ہیں۔ اس سے بڑا فتنہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ بندے کو خدا کہہ دیا جائے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابو طالب کے بیٹے، داماد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، خلیفہ رسول اللہ ہیں، ان کے متعلق یہ کہہ دیا جائے اور عقیدہ بنا لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اندر داخل ہو گئے ہیں...... نعوذ باللہ!......

بنی اسرائیل کی جہالت:

موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ کتنا بڑا امتحان تھا کہ آپ میقات پر بیٹھے ہیں، اللہ کی عبادت میں مشغول ہیں اور قوم نے ایک بچھڑے کو خدا بنالیا ہے، جس کو انسان کھیتوں میں ہل میں جوتتا ہے، کنویں پر رہٹ کے کام لگاتا ہے اور وہ رہٹ پر پھرتا رہتا ہے، جس سے بار برداری کا کام لیا جاتا ہے، جو ایک جانور ہے اور جس میں عقل بھی نہیں۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ ایسی بد بخت قوم ہے کہ انہوں نے بچھڑے کو خدا بنالیا۔ حالانکہ بچھڑے سے تو فرعون بہتر تھا، وہ انسان تو تھا، اس میں عقل تھی، وہ بولتا بھی تھا، انہوں نے ایک انسان (فرعون) کو تو خدا نہیں مانا۔ لیکن جب ایک بیل کھڑا ہو گیا تو اسے خدا بنالیا۔ چھوٹا سا بچھڑا اور وہ بھی سونے کا بنا ہوا...... ! کتنا بڑا امتحان ہے!!

حضرت ہارون علیہ السلام منع کر رہے ہیں، روک رہے ہیں، لیکن کوئی ان کی بات سننے کو تیار نہیں، بلکہ کہنے لگے کہ یہ بچھڑا خدا ہے۔ اس پر بطور دلیل وہ لوگ یہ جواب دیتے تھے کہ اس کے اندر سے آواز آتی ہے۔ حالانکہ یہ کوئی دلیل نہیں۔ وگرنہ پھر تو ٹیپ ریکارڈر کے اندر سے بھی آواز آتی ہے، پھر کوئی اس کو بھی خدا کہہ دے!! کوئی عقل کی بات ہے؟ خدا کے بندو! جو چیز تمہارے ہاتھ سے بنائی جائے، وہ تو مصنوع ہے، پھر مصنوع، صانع کیسے بن گیا؟ اور وہ چیز سونا ہے، اس کو تم نے آگ کے اندر پگھلایا، پھر اس کو مجسم شکل دی ہے۔ کیا خدا بھی آگ کے اندر پگھلتے ہیں؟ ڈھلتے رہتے ہیں؟ بنتے رہتے ہیں؟ اچھا خدا ہے کہ کبھی آگ میں پڑا ہے اور کبھی باہر پڑا ہے، عجیب خدا ہے!!!

موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ سنا ہوگا کہ ان کی محنتوں کا یہ نتیجہ نکلا ہے تو ان کے دل پر کیا گزری ہوگی!؟ قوم کہنے لگی کہ ہمارے لیے بھی ایسا خدا کسی نے دیکھا نہیں۔ یہ چیز کم از کم نظر تو آ رہی ہے، محسوس تو ہے، اسے دیکھ رہے ہیں اور ہاتھ لگا رہے ہیں، اس کی آواز سن رہے ہیں، اس کو چھوڑ کر ہم اس کو خدا مانیں جس کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا!! (بس موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ خدا ہے اور کوئی اس کو دیکھ تو نہیں سکتا۔

توحید کی خاطر جلال کا مظاہرہ:

موسیٰ علیہ السلام کو وہیں کوہِ طور پر اطلاع مل گئی اور موسیٰ علیہ السلام غصہ سے بھرے ہوئے تشریف لائے اور اللہ کی توحید کے لیے اتنے جلال میں آئے کہ آپ نے اپنے بھائی کو بالوں سے پکڑ لیا۔ اللہ نے دوسرے مقام پر اس واقعہ کو بڑا کھول کر بیان کیا ہے۔ اس میں داعی کو سبق ملتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے توحید کے لیے کتنی غیرت کا مظاہرہ کیا کہ اپنے

بھائی کے بال پکڑ لیے!! یہ بھی بھول گئے کہ ہارون (علیہ السلام) بھی اللہ کا نبی ہے اور میں ایک نبی کے بال پکڑ رہا ہوں۔ اتنا بھی نہیں کیا کہ پہلے ان سے رپورٹ (پوچھ گچھ) تو لے لیتے کہ ان کا قصور کیا ہے؟

یہ وہی قوم ہی تو تھی جو موسیٰ علیہ السلام کی اپنی بات بھی نہیں مانتی تھی۔ چنانچہ جب یہی قوم دریا کے کنارے کھڑی تھی، اللہ کے حکم سے دریا میں راستے بن گئے، ان میں سے بعض کہنے لگے کہ پہلے ہم اندر نہیں جاتے، پہلے آپ اندر چلیں اور روشندان بنوائیں، تاکہ ہم ایک دوسرے کو بھی دیکھتے چلے جائیں۔ اگر انہوں نے ہارون علیہ السلام کی بات بھی نہ مانی ہوتی تو اس وقت بھی نہ مانتے۔

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام توحید کی وجہ سے جلال میں آئے ہوئے تھے۔ ہارون علیہ السلام نے عرض کیا: ﴿يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۖ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَاءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي﴾ [طٰہٰ: ۹۴] حضرت! مہربانی فرمائیں، میرے بال نہ پکڑیں، میری داڑھی مبارک نہ پکڑیں، میرا کیا قصور ہے؟ میں نے ان کو بہت روکا، لیکن نہ مانے تو میں نے مناسب سمجھا کہ یہ آپ کے واپس آنے تک کسی ایک بات پر کھڑے تو رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے اندر ایسا تفرقہ پیدا ہو جائے کہ آپ کے آنے سے پہلے لڑائیاں شروع ہو جائیں۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام کا جوش ٹھنڈا ہوا۔

سامری سے پوچھ گچھ:

پھر موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو پکڑا اور کہا: بد بخت! تمہیں کیا سوجھی تھی؟ یہ تم نے کیا کر ڈالا ہے؟ اس نے کہا کہ جب فرعون اور اس کی فوج غرق ہوئی تو میں نے دیکھا کہ فرشتے کی سواری جس جگہ قدم رکھتی تھی تو وہ جگہ سرسبز ہو جاتی تھی اور وہاں فوری طور پر زمین سے گھاس اُگ آتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس مٹی میں، اس قدم میں کوئی کمال ضرور ہے۔ چنانچہ میں نے وہ مٹی سنبھال کر رکھ لی اور یہاں میں نے سونے کو اکٹھا کر کے اس کو ایک بچھڑے کی شکل دی، اس کے اندر یہ مٹی ڈالی تو وہ بولنے لگ گیا۔ میں نے کہا کہ یہ تمہارا خدا ہے۔

سامری! اب تیری خیر نہیں!!

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں تمہاری بھی خبر لیتا ہوں اور تمہارے اس جھوٹے خدا کی بھی خبر لیتا ہوں...... حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے جلال والے تھے...... فرمایا: اس بچھڑے کو ابھی ہم توڑتے ہیں اور توڑنے کے بعد اس کو جلاتے

ہیں اور پھر اس کی راکھ کو دریا کے اندر بکھیر دیں گے۔ اب تم دیکھو کہ خدا بھی کٹتا، جلتا اور بکھرتا ہے!!! اب قوم کو بھی ہوش آئی کہ وہ تو ہمارے سامنے جل گیا۔ بھلا یہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟

سامری کا انجام:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے کہا کہ تیرے لیے عذاب ہے، میں نے تیرے لیے ایک بددعا کر دی ہے، ساری زندگی تُو بھٹکتا رہے گا۔ تُو نے قوم کو توحید کے راستے سے بھٹکایا، تُو نے ان کو صراطِ مستقیم سے ہٹا کر بت پرستی میں ڈالا، اب تیرا انجام یہ ہے کہ تجھے کہیں تمہیں چین نہیں ملے گا اور تُو اپنی زبان سے کہتا رہے گا: "لَا مِسَاسَ! لَا مِسَاسَ!" رک جاؤ، میرے قریب کوئی نہ آئے، کوئی مجھے ہاتھ نہ لگائے۔ اللہ نے سامری پر ایک عذاب ڈال دیا کہ اس کو جو ہاتھ لگاتا تھا اس کو فوراً بخار چڑھتا تھا، تکلیف بڑھ جاتی تھی۔ اس لیے وہ چیختا تھا کہ میرے قریب نہ آنا، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔

واقعات میں عبرت کا درس:

یاد رکھیں! ان قصوں میں عبرت ہوتی ہے کہ جب خدا چاہتا ہے تو وہ بڑے بڑے جبروت اور بڑے بڑے طاغوت اور بڑے بڑے سامری اور بڑے بڑے بت، ایسے پاش پاش کر دیتا ہے کہ پھر ان کو اپنا وجود دنیا کے اندر بوجھ لگتا ہے۔ اور حق پر قائم رہنے والے اگر شہید ہو جاتے ہیں تو سرفراز ہو جاتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں تو غازی بن جاتے ہیں۔ اللہ کے راستے میں قتل ہونے کے بعد ابھی دفن نہیں ہوتے کہ اللہ ان کو جنتوں کی سیر کرا دیتے ہیں۔

داعی کے لیے سبق:

جب موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو انہوں نے اپنی قوم کو "یا قَوْمِ!" کے الفاظ سے مخاطب کیا۔ اس میں داعی کے لیے ایک سبق ہے کہ جب تم قوم کو دعوت دو تو غصہ اور جلال میں نہ آؤ اور سخت الفاظ نہ کہو۔ دیکھیں! موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کتنا بڑا گناہ کیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر بچھڑے کی پوجا کر رہے تھے، لیکن موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "اے میری قوم!" ﴿اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ بِاتِّخَاذِکُمُ الْعِجْلَ﴾ مؤکد کلام فرمائی کہ تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے۔

اس سے سبق ملتا ہے کہ اگر کوئی بندہ کفر و شرک کرتا ہے تو وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑتا، بلکہ اپنی جان پر ظلم کر رہا ہوتا ہے کہ جہنم میں جلے گا۔ یہ بات یاد رکھیں! اگر ساری دنیا کافر ہو جائے تو اللہ کا کوئی نقصان نہیں اور اگر ساری دنیا کلمہ

پڑھے تو اللہ کو کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اللہ تو غنی ہے، ساری دنیا محتاج ہے، ﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ﴾ [محمد:۳۸] غنی کو ہماری کیا ضرورت؟

﴿بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ﴾ (بچھڑے کو بنانے کی وجہ سے کہ اس کو تم نے معبود بنالیا)۔ جو بلید ہے، کند ذہن ہے، معمولی سا شعور رکھتا ہے، عقل سے بھی محروم ہے، جو اپنی طرف سے کچھ کرنے سے بھی قاصر ہے، تم نے اس کو اپنا معبود بنالیا؟ یہ تو پھر بھی سونے کا بچھڑا ہے، اگر دوسرا زندہ بچھڑا ہوتا تو وہ بھی گھاس کا محتاج ہوتا ہے۔ اور جو خود کسی دوسری چیز کا محتاج ہو، وہ کبھی خدا نہیں بن سکتا۔

توبہ کی قبولیت کی منظوری:

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی کہ اے میرے مولا! اب یہ قوم ٹھیک ہوگئی ہے، یہ توبہ کرنے پر تیار ہے، مہربانی فرمائیں۔ اللہ نے فرمایا: موسیٰ! اتنے معجزے، اتنی نعمتیں اور اتنے دلائل دیکھنے کے بعد جس قوم نے یہ ظلم کیا ہے اور پھر بھی وہ توبہ کرنے کے لیے تیار ہے تو اب بھی ہم ان کی توبہ منظور کر لیتے ہیں، لیکن سزا کے بغیر منظور نہیں کرتے۔ اور سزا یہ ہے کہ یہ اپنی جانوں کو ماریں، قتل کریں، پھر ہم توبہ قبول کریں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ اگر واقعی تم صحیح معنوں میں شرمندہ ہو تو شرط یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو، پھر تمہاری توبہ قبول ہوگی۔

توبہ کا طریقہ کار:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تمہارے ذمہ یہ ہے کہ مجرمین میں سے جو تمہارے سامنے آئے، اس کو مار دو۔ چاہے باپ کے سامنے بیٹا آئے یا بیٹے کے سامنے باپ آئے۔ اس قتل کے بعد تمہاری مغفرت ہو جائے گی، جنت میں بھی جاؤ گے اور تمہاری توبہ بھی منظور ہو جائے گی۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۹۲، البقرۃ: الآیۃ: ۵۴]

شریعتِ محمدی اور شریعتِ موسوی میں مماثلت:

بعض علماء نے فرمایا کہ جیسے ہماری شریعت میں بھی بعض گناہ ایسے ہیں کہ ان کی توبہ سزا کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔

مثلاً:

❁......ایک آدمی نے قتل عمد کیا اور اب وہ توبہ کرنا چاہے تو اس کے لیے مطلقاً معافی نہیں، بلکہ اس کو مقتول کے ورثاء

کے سپرد کیا جائے گا۔ وہ چاہیں تو اسے قتل کر دیں، چاہیں تو معاف کر دیں اور اگر چاہیں تو دیت لے لیں، پھر جا کر معافی ملے گی۔

❁......اسی طرح اگر کوئی شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے اور مقدمہ ثابت ہو جائے اور گواہ مل جائیں تو ان کی سزا رجم ہے، پتھر مار مار کر انہیں قتل کیا جائے گا، پھر ان کی توبہ منظور ہوگی۔

علماء فرماتے ہیں کہ ان آیات میں بھی اللہ نے اسی طرح کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿فَاقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ کہ جن لوگوں نے اس بچھڑے کی پوجا نہیں کی، وہ ان لوگوں کو قتل کریں، جنہوں نے اس کی پوجا کی ہے۔

یہود کی دو جماعتیں:

دراصل یہود کی دو جماعتیں بن گئی تھیں: ایک جماعت نے کہا کہ جب تک موسیٰ علیہ السلام واپس نہ آئیں اس وقت تک ہم اس کو خدا نہیں مانتے۔ اور دوسرے وہ تھے جو پوجا کرنے والے تھے۔ چنانچہ پوجا نہ کرنے والوں کو حکم دیا گیا کہ وہ پوجا کرنے والوں کو قتل کریں۔ جب وہ بیٹھ گئے تو ان پر اندھیرا چھا گیا اور انہوں نے اندھیرے میں قتل کرنا شروع کر دیا۔

بنی اسرائیل بڑی عجیب قوم ہے! یہ غلطی کرنے پر آئی تو بچھڑے کو خدا بنا لیا اور ٹھیک ہونے پر آئی تو کہنے لگے: ہم قتل ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اسی دن اور انہی واقعات میں بنی اسرائیل کے ستر ہزار آدمی قتل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر واقعہ کو اختصار سے نقل کیا ہے۔

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ یہ قتل کرنا تمہارے لیے بہتر ہے، کیونکہ دنیا کی زندگی خدا جانے کتنی باقی ہے؟ پانچ سال ہیں، دس سال ہیں، پچاس سال ہیں، لیکن آگے جو ہمیشہ کا عذاب ہے اس سے چند منٹ قتل کی سزا تمہارے لیے بہتر ہے، بجائے اس کے کہ ابد الآباد جہنم میں پڑے رہو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۲، البقرة: الآیۃ: ۵۴]

اسلام لانے اور ہجرت سے تمام گناہ معاف:

احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ جب انسان مسلمان ہوتا ہے...... اس کی پوری زندگی چاہے کفر پر کیوں نہ گزری ہو...... تو اس کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ دیکھیں! جب کفر و شرک معاف ہو جاتا ہے تو دوسری چیزیں خود بخود ختم ہو جاتی ہوں گی۔ اسی طرح احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ جب آدمی اللہ کے راستہ (دار الکفر سے نکل

دارالاسلام) کی طرف ہجرت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کردیتے ہیں۔[صحیح مسلم، حدیث: ۱۹۲، باب: کَوْنِ الْاِسْلَامِ یَہْدِمُ مَا قَبْلَہٗ...]

قوم کی اپنے کیے پر شرمندگی:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے آکر اس جھوٹے خدا کو توڑا اور وہ ان کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تو قوم والے شرمندہ ہوئے کہ اگر یہ خدا ہوتا تو یہ کیسے ٹوٹ پھوٹ جاتا؟ ہم نے تو بڑی بیوقوفی کی ہے، ہم نے تو بہت بڑی غفلت کی ہے، ہم اللہ کی توحید کو چھوڑ کر اس کو خدا بنانے میں مشغول ہوگئے۔

[روح البیان: ۱/۱۴۰]

﴿بَارِئِكُمْ﴾ کا معنیٰ:

﴿فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ، حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿بَارِئِكُمْ﴾ کا معنیٰ "خَالِقِكُمْ" ہے کہ تم اپنے خالق کی طرف لوٹو۔[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۲]

﴿اِلٰى بَارِئِكُمْ﴾ ملانے کی وجہ:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صرف لفظ ﴿فَتُوْبُوْٓا﴾ بھی تو بولا جاسکتا تھا، لیکن اللہ نے فرمایا: ﴿فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ﴾ یہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ تم بہت بڑا جرم کر چکے ہو، خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی عبادت کر رہے ہو، لہٰذا تم اپنے خالق کی طرف لوٹو۔ اس لیے ﴿بَارِئِكُمْ﴾ کا لفظ ساتھ لایا گیا۔[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۲]

قصاصاً قتل کرنا باعث ثواب ہے:

جو کام اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اس میں اللہ پاک سزا نہیں دیتے، ہاں اگر ایک کام بندہ اپنی منشاء سے کرتا ہے تو اس پر سزا دی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو قتل کردے تو یہ جرم عظیم ہے، لیکن اگر اس قاتل کا مقدمہ عدالت میں چلا جائے اور اس کا ثبوت مل جائے اور قاضیٔ وقت قصاص کا حکم دے تو اس کو قتل کرنے پر بھی ثواب ملے گا۔ اس لیے کہ وہ تو اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کر رہا ہے، اللہ نے حکم دیا ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی کو قتل کرے تو اس کو قصاصاً قتل کیا جائے گا۔

''رجم'' کرنا باعثِ ثواب ہے:

اسی طرح اگر آپ کسی آدمی کو ایک پتھر بھی ماریں تو بہت بڑا گناہ ہے، لیکن اگر زانی اور زانیہ دونوں شادی شدہ ہوں اور جرم ثابت ہو جائے تو قاضی ان کے لیے ''رجم'' کا حکم دے گا کہ ان دونوں کو پتھر مار مار کر ہلاک دیں۔ اس صورت میں رجم کرنے والے گناہ گار نہیں ہوں گے، بلکہ وہ ثواب حاصل کر رہے ہوں گے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے مطابق انہوں نے عمل کیا ہے۔

اب بنی اسرائیل ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں، قاتل تو قتل کر رہا ہے، لیکن قاتل اور مقتول دونوں کو اللہ نے معاف فرما دیا، کیونکہ ان دونوں نے اللہ کے حکم کی اطاعت کی تھی، اللہ کے حکم کی تعمیل کی تھی۔

حکمِ خدا کی تعمیل میں بلا تفریق قتل:

حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا: ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ تو وہ خنجر لے کر ایک دوسرے پر چڑھ گئے، پھر کوئی پروا نہیں کر رہا تھا کہ سامنے میرا رشتہ دار ہے، میرا عزیز ہے یا میرا بیٹا ہے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کپڑے سے اشارہ کیا کہ بس کرو، بس کرو۔ جب ان کے اشارے پر بس کی تو تقریباً ستر ہزار بنی اسرائیل قتل ہو چکے تھے۔

مزید قتل کرنے سے منع:

موسیٰ علیہ السلام نے جو اُن کو کپڑے کے ساتھ اشارہ کیا تھا، یہ اپنی طرف سے نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ان کی توبہ قبول کر لی ہے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اشارہ کر کے کہا کہ اب قتل کرنا بند کر دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۲]

مقتولین درجۂ شہادت پر فائز:

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے لیے بڑا سخت حکم آیا کہ ایک دوسرے کو قتل کرو۔ چنانچہ انہوں نے ہاتھوں میں چھرے اور چاقو لے لیے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ جب انہوں نے اللہ کے حکم کی اطاعت کی اور تقریباً ستر ہزار کے قریب قتل ہو گئے تو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کو روک دو، اس سے آگے قتل نہ کریں، میں نے ان کی توبہ قبول کر لی ہے۔ ان میں سے جو مارے گئے ہیں، ان کو ہم درجۂ شہادت دیتے ہیں اور

جو زندہ ہیں ان کی توبہ ہم نے قبول کرلی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۲]

شہداء کے فضائل ومناقب

شہادت کے وقت تکلیف سے نجات:

احادیث مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شہید کو جب بندوق، گولہ، تلوار یا کوئی بھی چیز لگتی ہے تو اس کو صرف اتنا درد ہوتا ہے جتنا درد بدن پر چیونٹی کے کاٹنے کا ہوتا ہے۔ یا کوئی بندہ اپنے ہاتھ سے بدن کے کسی حصے کو کاٹے، اتنی سی تکلیف ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کو زیادہ تکلیف سے بچالیتے ہیں۔

[سنن الترمذي، حديث: ١٦٦٨، باب: مَا جَاءَ فِي فَضْلِ الْمُرَابِطِ]

جنت میں اپنے مکان کا دیدار:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: شہید ابھی اللہ کے راستے میں شہید ہوتا ہے کہ اس کو اللہ پاک جنت میں اس کا مکان دکھلا دیتے ہیں۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۱۶۶۳، بابٌ: فِي ثَوَابِ الشَّهِيدِ]

عذابِ قبر سے حفاظت اور جنت کے مزے:

اسی طرح حضور پاک ﷺ نے فرمایا: جو اللہ کے راستے میں شہید ہوتا ہے اس کو عذابِ قبر سے بچالیا جاتا ہے۔

[سنن الترمذي، حديث: ١٦٦٣، بابٌ: فِي ثَوَابِ الشَّهِيدِ]

شہید کا تو بڑا مرتبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اُرواح مبارکہ کو سبز پرندوں کے اندر بھیج دیتے ہیں اور کبھی قنادیل معلقہ کے اندر بھیج دیتے ہیں اور جنت میں پھرتے ہیں، کھاتے ہیں اور لذتیں اُٹھاتے ہیں۔

[صحيح مسلم، حديث: ١٨٨٧، بابٌ: بَيَانِ أَنَّ أَرْوَاحَ الشُّهَدَاءِ فِي...]

بہتّر (72) حورِعین سے شادی:

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر شہید کی بہتّر (۷۲) حورِعین سے شادی کردیں گے، یعنی اس کو خصوصی طور پر ستر حوریں ملیں گی۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۱۶۶۳، بابٌ: فِي ثَوَابِ الشَّهِيدِ]

لفظ ''حُوْر'' کا مفہوم:

حور، حوراء سے اور عین، عیناء سے ہے، یعنی بڑی بڑی آنکھوں والی۔ وہ اس طرح کہ سفیدی بالکل سفید اور سیاہی بالکل سیاہ ہوگی، جس میں آنکھ کا جمال ہے۔ اس میں اگر کوئی اور رنگ پیدا ہو جائے تو پھر وہ جمال باقی نہیں رہتا۔

بنی اسرائیل کے قتل ہونے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا:

حضرت زہری رحمہ اللہ نے روایت کی ہے کہ جب بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ ایک دوسرے کو قتل کرو تو وہ تلواریں لے کر نکلے۔ موسیٰ علیہ السلام بھی ان کے ساتھ تھے۔ ایک دوسرے پر وہ تلواروں اور خنجروں سے حملہ کر رہے تھے اور موسیٰ علیہ السلام ہاتھ اُٹھائے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعائیں مانگ رہے تھے اور جب بنی اسرائیل کو ذرا موقع ملتا تو کہتے: اے اللہ کے نبی! اللہ کو پکارو، اللہ کو پکارو، ہمارے گناہ معاف فرما دے، ہماری خطائیں معاف فرما دے۔ اور آپ کے ہاتھ اُٹھانے میں مدد کرتے، کیونکہ کھڑے کھڑے تھک گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعائیں کیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی توبہ منظور فرمالی۔

لیکن جب واضح ہوا کہ ستر ہزار قتل ہو چکا ہے تو موسیٰ علیہ السلام بھی بڑے غمگین ہوئے۔ جو بنی اسرائیل بچ گئے تھے، ان کو بھی بڑا غم ہوا کہ ایک دو کی بات تو نہیں، ہزاروں آدمی قتل ہو گئے!!!! اس وقت اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ غم کیوں کر رہے ہو؟ جو قتل ہو گئے وہ زندہ ہیں، میرا رزق کھا رہے ہیں، ان کو تو مرتبۂ شہادت مل گیا اور جو بچ گئے ہیں ان کی میں نے توبہ قبول کرلی ہے۔ اس طرح سے موسیٰ علیہ السلام بھی خوش ہو گئے اور بنی اسرائیل بھی خوش ہو گئے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۲]

بنی اسرائیل کی صفات:

آپ بنی اسرائیل کے واقعات پڑھیں تو آپ کو ان میں عجیب عجیب باتیں نظر آئیں گی۔ دیکھیے! اگر قربانی دینے پر آئیں تو اپنی جانیں بھی قربان کر دیں کہ ہمیں قتل کرو، تاکہ اللہ راضی ہو جائے۔ اور اگر انکار کرنے اور بے وقوفی کرنے پر آئیں تو ایک بچھڑے کو خدا بنا کر اس کی عبادت شروع کر دیں۔

عناصر اربعہ کی تاثیر:

اصل میں آدم علیہ السلام کی اولاد کو اللہ نے عناصر اربعہ (آگ، پانی، ہوا اور مٹی) سے مرکب فرمایا ہے۔ ان میں

سے ہر ہر عنصر کی اپنی ایک حیثیت ہے، ہر ایک میں اپنی اپنی تاثیر ہے۔ چنانچہ آگ کا کام ''جلانا'' ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آدمی جب غصہ ہو تو اس کے چہرے کا رنگ لال ہو جاتا ہے، ایسے لگتا ہے کہ انگارہ ہو گیا، اور جب آدمی کو کوئی خوشی ملتی ہے تو اس کا چہرہ ایسے کھل جاتا ہے جیسے گلاب کا پھول کھل گیا ہو۔ اگر غم آجائے تو چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر آدمی کسی کام میں شرمندہ ہو تو اس کو پسینہ آجاتا ہے، کیونکہ تمام عناصر اربعہ اختلاط رکھتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ نے ہر بندے کے اندر مختلف قوتیں رکھی ہیں، اس کے اندر قوتِ حیوانیہ بھی ہے اور قوتِ ملکیہ بھی ہے۔ چنانچہ کبھی تو فرشتوں کے قریب ہو جاتا ہے، دن میں روزہ رکھتا ہے اور ساری ساری رات تہجد میں کھڑا رہتا ہے۔ ایسے لوگ جنہوں نے سال کے گیارہ مہینے مسجد میں قدم نہیں رکھا ہوتا، رمضان المبارک کے مہینے میں وہ بھی ساری ساری رات مسجد میں کھڑے عبادت میں مشغول ہوتے ہیں۔ جو لوگ کبھی فرض نہیں پڑھتے، وہ بھی روزہ رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں کہ اس کے بندوں کے اندر قوتیں مختلف ہیں، جب ایک قوت دب جاتی ہے تو دوسری کا ظہور ہوتا ہے۔ انسان پر اسی کے مطابق حالات سامنے آتے ہیں۔

آپ دیکھیں! جو لوگ اسلام سے پہلے اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے وہ جب اسلام لے آئے تو پھر دوسروں کی لڑکیوں کے سر کو بغیر دوپٹے کے برداشت نہیں کرتے تھے اور دوسروں کی بچیوں کے محافظ بن گئے۔ یتیموں، بیواؤں اور غریب بچیوں کے محافظ بن گئے۔ وجہ کیا تھی کہ اللہ نے ان کے اندر قوتِ ملکیہ غالب کر دی اور قوتِ شہوانیہ دب گئی۔

بے نمازی پر نماز کا بوجھ:

ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا (اللہ معاف فرمائے) آپ اسے نماز پڑھنے کا کہہ کے دیکھیں، اس کے لیے ایک نماز ایسے بن جاتی ہے جیسے کوئی بڑا پہاڑ اس کے سر پر کھڑا کر دیا گیا ہو، وہ مر مر کر مسجد کی طرف آئے گا اور ایسے سمجھے گا کہ جیسے مجھے پھانسی پر چڑھا رہے ہیں، اتنی مشکل سے وہ اُٹھے گا، وضو کرے گا اور آخری صف میں کھڑے ہونے کی کوشش کرے گا، تاکہ سلام کے بعد جلدی بھاگنے کا موقع ملے، اللہ کے گھر میں زیادہ دیر نہ ہو جائے، کہیں میں اللہ کے گھر میں پھنس نہ جاؤں، اس لیے آخری صف میں کھڑا ہوگا، تاکہ امام کے سلام پھیرتے ہی میں بھاگ جاؤں۔

نماز کی فکر:

اس کے برعکس جن لوگوں کو اللہ نے اپنی اطاعت، اپنی عبادت، اپنی نماز اور اپنے دروازوں کے لیے خشوع نصیب

فرمایا ہے وہ ایک نماز پڑھ کر ابھی گھر نہیں پہنچتے کہ ان کو دوسری نماز کی فکر لگ جاتی ہے۔

دیکھیے! بعض بوڑھے آدمی ہوتے ہیں، نماز کے بعد بے چارے پیدل گھر جا رہے ہوتے ہیں۔ کسی کام سے فارغ ہو کر جب گھر پہنچے تو دیکھا کہ ڈیڑھ یا دو بجے کا وقت ہو گیا ہے۔ کھانا کھاتے کھاتے اڑھائی بج گئے، پھر وہ سوچتے ہیں کہ اگر قیلولہ کیا تو نیند آجائے گی اور جماعت کا وقت نکل جائے گا، اس لیے وضو کر کے اللہ کے حرم میں چلے جاتے ہیں۔ ظہر کی نماز پڑھ کر گھر جائیں گے، چائے کی ایک پیالی پی کر تھوڑا سا آرام کریں گے تو پھر ان کو فکر ہوگی کہ عصر کی اذان ہونے والی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر وقت ان کا دل اللہ کے گھر میں اٹکا ہوا ہوتا ہے، یہ لوگ ''قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ'' کا مصداق ہوتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ایمان والے کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ جہاں بیٹھا ہو، اس کا دل اللہ کے کعبے سے، مسجد سے اٹکا ہوتا ہے۔

مومن اور منافق کی مثال:

اسی طرح بعض روایات میں آتا ہے کہ مومن کو مسجد میں ایسے آرام ملتا ہے جیسے مچھلی کو پانی کے اندر۔ مچھلی جب تک پانی کے اندر ہوتی ہے تو کبھی اِدھر جاتی ہے اور کبھی اُدھر جاتی ہے۔ اور اگر اس کو پانی سے باہر نکال دیا جائے تو کچھ ہی دیر میں تڑپ تڑپ کر مر جائے گی، اس لیے کہ پانی کے بغیر اس کی زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ایسی مثال مومن کی ہے جس کا دل مسجد کے بغیر نہ لگے۔ اور منافق کی مثال ایسی ہے جیسے پرندہ پنجرے کے اندر قید ہو اور اس انتظار میں ہو کہ دروازہ کھلے اور میں اُڑ جاؤں۔ [کشف الخفاء، حدیث:۲۶۸۹]

اب سمجھیں کہ ادھر بنی اسرائیل کی زیادتی کا یہ عالم ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر پہنچے تو انہوں نے ایک بچھڑے کو خدا بنا لیا اور جب اللہ کی فرمانبرداری پر آ گئے تو ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لیے بھی تیار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے اندر مختلف قوتیں اور مختلف صفات رکھی ہیں، جن کا ظہور مختلف اوقات میں ہوتا رہتا ہے۔

بچھڑے کی پوجا کے متعلق اسرائیلیوں کی آراء:

حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام جب واپس آئے تو آپ کے ساتھ ستر آدمی تھے جو ہارون علیہ السلام کے ساتھ علیحدہ رہے تھے، جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی اور اس کی عبادت کے بارے میں

سوچا بھی نہیں تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

دراصل موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے باقاعدہ عبادت کی، بعض لوگ ایسے تھے جن کے دلوں میں یہ بات آئی کہ ہم بھی عبادت کریں، لیکن انہوں نے اس کی پوجا کی نہیں تھی اور بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے اس بچھڑے کی عبادت بھی نہیں کی اور نہ ہی ان کے دلوں میں اس کا خیال آیا۔ وہ بالکل علیحدہ ہوگئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کے سوا کسی غیر کی عبادت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔

رسم و رواج:

رسم و رواج غلط یا صحیح ہو، جب ایک دفعہ قوموں میں چل پڑتا ہے تو چلتا رہتا ہے۔ اس لیے میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی کوئی اچھا رواج ڈالے گا، قیامت تک اللہ اس کو اجر دے گا اور جو آدمی بُرا راستہ پیدا کرے گا، اس پر جو لوگ بھی قیامت تک عمل کریں گے، اس گناہ میں وہ بھی شریک ہوگا۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۱۷، بَابُ الْحَثِّ عَلَى الصَّدَقَةِ...]

بنی اسرائیل نے اس زمانہ میں بچھڑے کی عبادت کی تھی، ہندو قوم آج تک گائے کی پوجا کر رہی ہے۔ اب تو لوگوں نے باقاعدہ گھروں کے اندر گائے کے مجسمے بنا کر رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں نے اپنے گھروں میں مختلف جانوروں (گائے وغیرہ) کے بچوں کی شکلیں بنائی ہوئی ہیں، کسی نے بڑی گائے کی تصویر لگائی ہوگی، کسی نے ہرن کی کھال کے اندر بھوسا بھروا کر پورا ہرن کھڑا کیا ہوا ہے، کسی نے کتا بنایا ہوا ہے اور وہ گھروں اور گاڑیوں میں ڈیکوریشن پیس کے طور پر سجایا ہوا ہے۔

یہ ایسی بُرائیاں ہیں جو ایک دفعہ چل پڑتی ہیں تو چلتی ہی رہتی ہیں، جب تک کہ اللہ اپنی رحمت سے ان کو ختم نہ کرے۔

کتے کے جھوٹے کا حکم:

بعض جانور تو حلال ہیں، اگر وہ برتن میں منہ مار دیں تو اسے دھونا بھی ضروری نہیں ہوتا، اگر وہ پانی میں منہ مار لیں تو پانی ناپاک نہیں ہوتا، لیکن کتا ایسا نجس ہے کہ اس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس برتن میں کتا منہ مار جائے، اس کو سات دفعہ دھوؤ اور ایک حدیث مبارک میں ہے کہ آٹھویں دفعہ مٹی کے ساتھ مانجھو، یعنی اتنا نجس ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۷۹، بَابُ حُكْمِ وُلُوغِ الْكَلْبِ]

اب جدید تحقیق نے یہ بات واضح کردی ہے کہ کتے کے منہ کے اندر جو جراثیم پائے جاتے ہیں، ان سے بچنے کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ برتن کو ایک بار مٹی سے مانجھ لو، کیونکہ مٹی سے مانجھے بغیر اس کے جراثیم ختم نہیں ہوتے۔

لیکن مسلمانوں نے کتوں کی تمثیلیں بنائی ہوئی ہیں، ان کے مجسمے اور فوٹو بنائے ہوئے ہیں، ان کی صورتیں بنائی ہوئی ہیں اور گھروں میں سجائی ہوئی ہیں...... نعوذ باللہ!...... اب اس پر ماسوائے ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' کے آدمی اور کیا کہہ سکتا ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو ہدایت دے اور ایسے فتنوں سے بچائے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی روایت میں ہے کہ جب بنی اسرائیل ایک دوسرے کو قتل کر رہے تھے تو ان کے اوپر ایک دھند چھا گئی، اندھیرا سا ہو گیا، اس کو ''سحاب'' کہتے ہیں۔ یہ اندھیرے میں ایک دوسرے کو ہاتھ لگا کر ڈھونڈتے اور اسے قتل کرتے، یعنی نظر نہیں آرہا تھا کہ کون ہے؟ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بندے کے سامنے اس کا باپ آگیا، بھائی آگیا، بیٹا آگیا، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ کون ہے؟ اس کو بھی قتل کرتے جا رہے تھے، اور ایک دوسرے کو کہتے جا رہے تھے کہ اللہ رحمت کرے اس بندے پر جس نے اللہ کے حکم پر صبر کیا اور اپنی جان دے دی، تاکہ اللہ کی رضا حاصل کرے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝۵۵ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۵۶﴾ [البقرۃ: ۵۶،۵۵]

اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم تیرا ہرگز یقین نہ کریں گے جب تک کہ اللہ کو سامنے نہ دیکھ لیں، پھر تمھیں بجلی نے پکڑا اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تمھیں تمھارے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دیا، تاکہ تم احسان مانو۔

خدا سے ہمکلامی اور آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ:

ان تمام آیات کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب موسیٰ علیہ السلام تورات لے کر آئے۔ اس وقت بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ کہنے لگے کہ یہ تورات اللہ کی کتاب ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعثت سے پہلے بھی آپ کو ہمکلامی کا شرف بخشا...... جب موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر کی

طرف تشریف لا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے کسی فرشتے کے واسطے کے بغیر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام فرمایا تھا...... اور اب بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلایا، چالیس راتوں کی ایک طویل مدت آپ اللہ کی عبادت میں مشغول رہے اور اللہ سے آپ کی کلام ہوئی اور کتاب کا انعام ملا تو ہمیں بھی اللہ کا کلام سنوائیں، تاکہ ہم بھی اپنے اللہ کا کلام سنیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے درخواست کی کہ یارب! آپ جانتے ہیں، آپ کے آگے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے، میری قوم میں یہ تمنا پیدا ہوگئی ہے، اگر آپ مہربانی فرمائیں تو آپ کے لیے کوئی بعید نہیں۔ جیسے آپ مجھ سے ہمکلام ہوسکتے ہیں، مجھے اپنا کلام سنا سکتے ہیں ایسے ہی ان کو بھی سنا سکتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے آپ کی درخواست منظور کی ہے، آپ اپنی قوم کے کچھ لوگ جو زیادہ علم، زیادہ سمجھ والے ہیں ان کو چنیں اور ان میں سے ستر آدمیوں کا ایک وفد لے کر پھر اسی مقام پر حاضر ہوں۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو چن لیا، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا﴾ [الاعراف:۱۵۵] (اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی منتخب کیے، تاکہ انہیں ہمارے طے کیے ہوئے وقت پر (کوہِ طور) لائیں)۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۹۳]

فرقِ مراتب:

اُمورِ مہمہ ہر آدمی سرانجام نہیں دے سکتا، بلکہ ان کے لیے افراد چنے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جتنی مخلوق پیدا فرمائی ہے ان کے اندر ہر لحاظ سے تفاوت رکھا ہے۔ مخلوق میں سے سب سے اعلیٰ مرتبہ اللہ کے انبیاء اور رسولوں کا ہے، پھر ان میں بھی مرتبے کا فرق رکھا ہے: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ [البقرۃ:۲۵۳] جب انبیاء اور رُسل میں تفاضل ہے تو اسی طرح دیگر لوگوں میں بھی تفاوت ہے۔

نظامِ قدرت:

اسی طرح قوتوں کے اندر بھی تفاوت ہے۔ آپ سو آدمیوں کو کھڑا کریں تو ان میں سے ہر ایک آدمی کی قوت میں فرق ہوگا۔ اللہ نے انسانوں کی دماغی قوتوں میں بھی فرق رکھا ہے، اسی طرح فکری، علمی اور جسمانی قوتوں میں بھی فرق رکھا ہے۔ یہ میرے اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے، یہ کسی بندے کا بنایا ہوا نظام نہیں ہے۔ یہ نظامِ قدرت ہے، اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خصوصیت:

میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں کتنے اہم واقعات پیش آئے۔ پندرہ سو کا لشکر حدیبیہ میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تو نہیں فرمایا کہ پندرہ سو میں سے کوئی چلا جائے، بلکہ باقاعدہ مشورہ ہوا کہ قریش مکہ سے بات کرنے کے لیے کس کو بھیجا جائے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مبارک یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جا کر بات کریں، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا کر فرمایا کہ مکہ والوں نے ہمیں روک دیا ہے، آپ جا کر بات کریں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! میں تو حاضر ہوں، میں تو غلام ہوں۔ آپ مجھے قریش مکہ سے بات کرنے کا حکم دے رہے ہیں، اس سے بڑا کوئی سخت حکم دیں تو بھی میں حاضر ہوں، لیکن بات یہ ہے کہ میرے جانے سے معاملہ حل نہیں ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ کفار کو تو میرے نام سے جلن ہوتی ہے، کفار قریش میرا نام برداشت نہیں کرسکیں گے۔ میں اگر آپ کا پیامبر اور سفیر بن کر جاؤں تو وہ مجھے دیکھتے ہی جل جائیں گے، پھر میرے ساتھ بات کرنے پر وہ کیسے آمادہ ہوں گے؟ اس طرح مذاکرات کامیاب نہیں ہوسکیں گے؟ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں موزوں حضرت عثمان ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمام کبار صحابہ موجود تھے، لیکن ان میں سے کسی کا نام نہیں لیا۔

اس وقت کے حالات یہ تھے کہ مسلمان عین جنگ کے دہانہ پر کھڑے ہوئے تھے، کفار قریش بھی اپنی عصبیت و جاہلیت کے اندر آئے ہوئے تھے، بدر میں جو کچھ ان کے ساتھ ہوا، وہ اسے بھولے نہیں تھے، اس کے بعد وہ کیسے برداشت کرسکتے تھے کہ اللہ کے نبی آئیں اور عمرہ کریں؟ اس وقت ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو معتدل مزاج ہو، جس کا حکم بھی مانا جاتا ہو، حوصلہ والا بھی ہو، اور ایسا بندہ ہو جس کا قریش مکہ پر احسان بھی ہو، اس کی عظمت ان کے دلوں میں ہو اور ایسے بندے صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے، اس لیے ان کا انتخاب کیا گیا۔

اللہ پاک نے ہر کام میں ہمیشہ درجات رکھے ہیں اور ہر کام کے لیے اللہ نے آدمی معین فرمائے ہیں۔ یہ اللہ کا ایک نظام ہے جو ابتدائے آفرینش سے چلا آرہا ہے اور قیامت تک چلتا رہے گا، دنیا کی کوئی طاقت اس میں ردّ و بدل نہیں کرسکتی۔ یہ بات طے ہے کہ ہر آدمی ہر کام نہیں کرسکتا۔ علم کا کام علم والوں کے ذمہ ہے اور کھیتی باڑی کسانوں کے ذمہ ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ ایک آدمی آپ کا بادشاہ بنے اور وہی ہل بھی چلائے گا۔ ہاں! دنیا میں

کچھ دنوں کے لیے دکھلاوا ہوتا ہے، شعبدہ بازیاں ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔

اسی لیے اللہ کے ساتھ ہمکلامی کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو چنا۔

شوریٰ یا جمہوریت؟

اسی چناؤ یا شوریٰ کو آج کل ہمارے لوگوں نے جمہوریت کا رنگ دے دیا ہے۔ فرق عام لوگوں کا اور اسلام کا یہ ہے کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ جب چننا ہے تو چننے والی اتھارٹی اس کام کے لیے سب سے زیادہ اہل ہو، پھر اسے چناؤ کا اختیار دیا جائے۔ یہ نہیں کہ عام آدمی جو چناؤ کی اہلیت ہی نہیں رکھتا، اس کو چناؤ کا اختیار دے دیا جائے۔ مثال کے طور پر آپ نے ایک شخص کو مدرسے میں استاد رکھنا ہے تو آپ تعلیمی بورڈ سے معلومات لیں گے کہ یہ بندہ استاد بننے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کو لے کر چل پڑے اور میقات پر پہنچے۔ جب اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام فرمایا تو انہوں نے بھی وہ کلام سن لیا۔ موسیٰ علیہ السلام بڑے خوش ہوئے کہ اللہ نے میری درخواست پوری کر دی، اب قوم کا ایمان مزید بڑھ جائے گا، کیونکہ انہوں نے میرے ساتھ آ کر خود اللہ کا کلام سن لیا ہے۔ لیکن خدا کی قدرت دیکھیں کہ قوم پھر ایک ضد میں اَڑ گئی۔ کہنے لگی کہ ہم نے کلام تو سنا ہے، لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ یہ کلام اللہ نے کیا ہے یا کسی اور نے کیا ہے۔ ہم اس وقت تک ایمان نہیں لے آئیں گے جب تک ہم اللہ کو دیکھ نہ لیں اور وہ ہمارے سامنے بیٹھ کر بات نہ کرے۔

چونکہ یہ گستاخی تھی کہ مخلوق اپنے خالق کے بارے میں اتنی جرأت سے مطالبے کرتی رہے، اس لیے یہ مطالبہ کرتے ہی ان پر ایک کڑک، بجلی سی آئی، صاعقہ گرا اور ستر کے ستر آدمی مر گئے۔

موسیٰ علیہ السلام نے پھر گڑگڑانا شروع کر دیا کہ اے رب کریم! آپ تو میری قوم حالات کو جانتے ہیں، واقعی انہوں نے زیادتی کی ہے۔ یہ تو مر گئے ہیں، یہ سارے ان کے سردار تھے۔ اب اگر میں اکیلا واپس جاؤں گا تو وہ کہیں گے کہ میں نے خود ان کو مار ڈالا ہے، وہ مجھ پر الزام لگائیں گے، کیونکہ قوم ایسی ہی ہے۔ جیسا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات کے بارے میں قوم کو پتہ نہیں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دفنا دیا تو کچھ دن گزرنے کے بعد قوم کھڑی ہو گئی اور کہنا شروع کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو خود مارا ہے۔

اُمت محمدیہ اور سابقہ اقوام کے احوال میں مماثلت

آج جب ہم سابقہ اقوام کے احوال پڑھتے ہیں اور پھر روزمرہ کے واقعات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ایسے لگتا ہے جیسے وہی کیفیت پیدا ہوئی ہوئی ہے۔

بارش کیوں برستی ہے؟

چنانچہ ایک دفعہ بارش ہوئی تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: آج کتنے لوگ ہیں جو اس کے بعد کفر میں بڑھ جائیں گے اور کتنے لوگ ہیں جو ایمان میں بڑھ جائیں گے۔ صحابہ حیران ہوئے اور عرض کیا کہ کیا مطلب؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ کہیں گے کہ بارش اس لیے برسی ہے کہ اب یہ فلاں مہینہ گزر گیا ہے، اب فلاں ستارہ فلاں برج میں آگیا ہے۔ یہ لوگ اس بارش کو ستاروں اور سیاروں تک محدود کریں گے، اس طرح وہ کفر میں بڑھتے چلے جائیں گے۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو کہیں گے کہ بارش اللہ کی قدرت سے ہوئی ہے تو وہ ایمان میں بڑھ جائیں گے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٨٤٦، بَابُ: يَسْتَقْبِلُ الإِمَامُ النَّاسَ إِذَا سَلَّمَ]

کفر کی عینک:

بارش تو دونوں نے دیکھی ہے، لیکن ایک کی آنکھوں پر کفر کی عینک لگی ہوئی ہے، اس لیے وہ کفر میں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ مون سون ہوائیں چلتی ہیں، بادل بنتے ہیں اور پھر جب ثقل بڑھتا ہے تو شدتِ حرارت پیدا ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں بادلوں سے بارش برستی ہے۔

مسبب الاسباب پر نظر:

خدا کے بندے! چلو ہم نے تمہاری سائنس کو مان لیا، لیکن یہ تو بتاؤ کہ ان مون سون ہواؤں کو چلانے والا کون ہے؟ گرمی بڑھانے والی طاقت کون سی ہے؟ جب یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہے تو سیدھی بات کرو کہ اللہ کی رحمت سے بارش ہوتی ہے۔ اگر آپ اسباب کی دنیا میں کھو جائیں گے تو ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ مومن اور کافر میں یہی تو فرق ہے کہ کافر ظاہری اسباب میں کھو جاتا ہے اور مومن کی نظر مسبب الاسباب پر لگی ہوتی ہے۔

گوہ کا سوراخ:

میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا کہ اے میری اُمت! پہلی اُمتیں جو گزر چکی ہیں جو جو حرکتیں انہوں نے کی ہیں میری اُمت بھی وہ کام کرے گی، حتیٰ کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھس گئی تھیں تو میری قوم بھی گوہ کے بل میں گھسے گی۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۳۴۵۶، باب: مَا ذُکِرَ عَنْ بَنِی إِسْرَائِیلَ]

آج آپ دنیا کے احوال پر نظر ڈالیں تو وہی منظر آپ کے سامنے آ جائے گا جس کی منظر کشی حضور ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے کی تھی۔

قوم لوط اور دیگر اقوام کے جرائم سے مماثلت:

❁......پہلی قوموں میں زنا عام تھا، آج زنا عام ہے۔

❁......قومِ لوط میں لواطت کا فعل (مرد کا مرد سے بُرائی کرنا) عام تھا، آج بھی یہ فعل عام ہے۔

❁......قومِ لوط کی یہ عادت تھی کہ وہ یہ بُرائی ایک دوسرے کے سامنے اور ایک مجلس میں کرتے تھے، ایک کمرے میں سب یہ بے حیائی کا فعل سرانجام دیتے تھے، آج بھی ایسے ہو رہا ہے۔

❁......قومِ لوط کے نوجوان لڑکوں میں یہ عادت تھی کہ وہ ایسا لباس پہنتے تھے کہ دور سے لڑکیاں نظر آئیں، یعنی ایسا لباس جو عورتوں کا ہوتا ہے، لڑکیوں کی طرح بال رکھتے تھے، انہی کی طرح سرخیاں لگاتے تھے، ناخنوں پر رنگ کرتے تھے اور اسی انداز میں چلتے تھے۔ آج بھی یہ سارے کام ہو رہے ہیں۔

❁......لوط علیہ السلام کی قوم کے لڑکوں میں یہ عادت بھی تھی کہ انگلیوں پر مہندی لگاتے تھے، چنانچہ آج بھی مرد اپنے ہاتھوں پر مہندی لگاتے ہیں۔

❁......قومِ لوط کے اندر یہ عادت تھی کہ وہ سڑکوں پر بیٹھ جاتے تھے، ایک پیالہ کنکریوں کا بھر کر رکھ لیتے تھے، کوئی آدمی جو بیچارا مسافر گزر رہا ہوتا، وہ اگر نوجوان ہوتا تو ہر آدمی کنکری لے کر پھینکتا تھا، جس آدمی کی کنکری اس کو لگ جاتی تھی تو وہ آدمی اس کے حصے میں آ جاتا تھا، یہ (کنکری پھینکنے والا) اس کو پکڑ کر گھر لے جاتا اور اس سے بُرائی کرتا۔ آج ہمارے معاشرے کے آوارہ لوگ سڑکوں پر بیٹھ کر شریفوں کو چھیڑتے ہیں۔

❁......اسی طرح قومِ لوط میں یہ عادت تھی کہ جب کوئی لڑکا گزرتا تو اس کے پیچھے سیٹیاں مارتے تھے۔ اور آج یہ

ہو رہا ہے۔

❁......اسی طرح ان میں یہ عادت تھی کہ اپنے پیٹ کی ہوا نکالنے کے لیے مقابلہ کرتے تھے کہ تم آواز زیادہ پیدا کرتے ہو یا میں؟ اور آج یہ بُرائی بھی موجود ہے۔

❁......پہلی اُمتوں کے لوگ اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے زنا کرتے تھے، آج ایسے واقعات ہو رہے ہیں۔

❁......اسی طرح پہلی اُمتوں میں اپنی ساس سے یعنی اپنی بیوی کی ماں سے زنا کیا جاتا تھا، آج مسلمانوں کے اندر بھی یہ مرض پایا جاتا ہے۔ یہاں تو پہلے ساس سے تعلق بنتا ہے پھر وہ اپنی لڑکی کا رشتہ کرواتی ہے۔

ان کے علاوہ ایک دوسرے پر قتل اور دیگر جھوٹے الزامات عائد کرنا، جھوٹی تہمتیں لگانا، یہ بالکل وہی واقعات سامنے آرہے ہیں کہ اگر آپ آنکھیں بند کر کے دیکھیں تو کبھی قومِ لوط سامنے آئے گی اور کبھی موسیٰ علیہ السلام کی قوم سامنے نظر آئے گی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے پکڑنے والوں سے تیس، پینتیس درہم رشوت لی تھی۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ پیسے لے کر اللہ کے نبی کو پکڑوانا چاہا۔ یہ تو علیحدہ بات ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو اُٹھا لیا اور پکڑوانے والے کی شکل حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی کر دی۔

عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ:

میں ایک کتاب میں واقعہ پڑھ رہا تھا۔ ہمارے ایک بزرگ حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ گزرے ہیں، آپ ''امرتسر'' کے علاقے میں تھے تو ایک مسجد میں نماز پڑھانے کے لیے تشریف لے جاتے۔ اس علاقے کا معزز اور مشہور قسم کا آدمی راستے میں کھڑا ہوتا اور بڑے ادب سے حضرت شاہ جی کو سلام کرتا، حضرت شاہ جی اس کے پاس سے گزر جاتے، لیکن نہ تو اس کے سلام کا جواب دیتے اور نہ ہی انہوں نے کبھی اس کی طرف دیکھا۔ اور ایسا ہر جمعہ کو ہوتا تھا، وہ بھی ہر جمعہ کو آکر اس راستے پہ کھڑا ہو جاتا جہاں سے حضرت شاہ جی نے گزرنا ہوتا تھا۔ بڑے ادب سے سلام کرتا...... جیسے ہند کے لوگوں کی تہذیب ہے...... ممکن ہے یہ بزرگ دل ہی دل میں سلام کا جواب دیتے ہوں، اس کا جاننے والا تو اللہ ہے۔

ایک دن جب واپس آئے تو شاہ جی کو ساتھیوں نے پکڑ لیا کہ حضرت! ناراضگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، وہ اس علاقے کا معزز آدمی ہے، ''سر'' کا خطاب یافتہ ہے اور علاقے کی اہم ترین شخصیات میں سے ہے، اس کے اخلاق

کا یہ عالم ہے کہ وہ اتنی بے عزتی کے بعد بھی کھڑے ہو کر آپ کو سلام کرتا ہے، مگر آپ جواب بھی نہیں دیتے اور اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں ہیں کہ انسان ہے یا جانور ہے؟ آخر آپ کو کیا غصہ ہے؟ حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں بتانا تو نہیں چاہتا تھا، لیکن آپ لوگوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے تو سنو:

جب انگریزوں کے خلاف تحریک چل رہی تھی تو اس دور میں انگریز کا کوئی بڑا افسر یا کوئی کلکٹر تھا، اس کا نوجوان لڑکا کسی نے موقع پا کر مار ڈالا اور قاتل چھپ گیا۔ انگریزوں کے اقتدار کا زمانہ تھا، انہوں نے پورے علاقے میں آگ لگا دی، لیکن ان کو قاتل نہ مل سکا۔ اس علاقے کے بڑے بڑے لوگ جو انگریزوں کے خیر خواہ اور ان کے پروردہ تھے، انہوں نے کہا کہ اوپر سے ہماری زبردست انکوائریاں ہو رہی ہیں کہ تمہیں ایک قاتل نہیں ملتا۔ اتنے دنوں میں قاتل ہمیں ہر شکل میں ملنا چاہیے اور جو قاتل کو ڈھونڈ کر دے گا، اسے ہم انعام دیں گے اور خطاب دیں گے۔

یہ بدبخت جو مجھے سلام کر رہا ہوتا ہے، اس کے علاقے کی ایک بوڑھی عورت تھی، اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ یہ بدبخت اس کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ تم اپنے بیٹے کو راضی کر لو کہ وہ قتل کا اقرار کر لے...... اس کا مقصد یہ تھا کہ میں انگریزوں کے ہاں سرخرو ہو جاؤں گا اور جاگیریں حاصل کروں گا...... میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ دو مہینوں کے اندر اندر تمہارے بیٹے کو چھڑا دوں گا۔ بس صرف ظاہری طور پر اقرار کر لے اور گرفتاری دے دے۔ پھر جب آگ ٹھنڈی ہو جائے گی تو میں تمہارے بیٹے کو بچا لوں گا۔ ویسے وہ تمہارے بیٹے کا نام لے رہے ہیں، اگر انہوں نے خود پکڑ لیا تو تم کیا کرو گی؟ یہ اس نے جھوٹا پروگرام بنایا۔ وہ غریب عورت بیچاری بیوہ بھی تھی، اس نے سوچا کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے، اگر انگریز اس کو پکڑ کر لے گئے تو میں کیا کر سکوں گی؟ یہ جو قرآن پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کر رہا ہے کہ میرے بیٹے کو رہا کروا دے گا، بہتر ہے کہ اس کی بات مان لوں۔

چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کو سمجھایا، بیٹا مان گیا۔ اس نے جا کر اس بیٹے کی مخبری کر دی۔ انگریزوں نے اس لڑکے کو پکڑا تو اس نے قتل کا اقرار کر لیا۔ اس آدمی کو القاب اور جاگیریں مل گئیں اور عدالت میں لڑکے پر مقدمہ چل پڑا۔ بڑھیا روزانہ اس کے دروازے پر آتی، دھکے کھاتی، لیکن یہ اس کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ اندر سے جواب ملتا کہ اتنی فرصت نہیں ہے، آج باہر گئے ہوئے ہیں، آج دورے پر گئے ہوئے ہیں، آج اندر میٹنگ ہو رہی ہے، آج بڑے آدمی آئے ہوئے ہیں۔ مہینوں کے بعد جب کبھی ملاقات ہوتی تو کہہ دیتا کہ تم فکر نہ کرو، تمہارے بیٹے کو سزا نہیں ہوگی۔ حضرت شاہ جی فرمانے لگے کہ بالآخر اس لڑکے کو پھانسی ہوئی اور اس کی لاش اس کی

ماں کو ملی۔ اس بدبخت کو میں سلام کا جواب کیوں دوں؟

آپ اندازہ کریں کہ اس نے انگریزوں سے القاب اور جاگیروں کے حصول کے لیے کیسے پُرفریب طریقے سے لڑکے پر قتل کا الزام لگوایا؟

موسیٰ علیہ السلام پر ہارون علیہ السلام کے قتل کا الزام:

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الزام لگایا کہ تم نے اپنے بھائی کو قتل کیا ہے۔ حضرت ہارون علیہ السلام بھی اللہ کے نبی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ خدا کے بندو! حضرت ہارون علیہ السلام ان کے بھائی ہیں اور نبی ہیں۔ میں نے تو اللہ سے مانگ مانگ کر بھائی ہارون لیا ہے اور اللہ سے عرض کیا کہ فرعون کے مقابلہ میں مجھے اکیلا نہ بھیجیں، میرا بھائی مجھ سے زیادہ زبان میں فصاحت والا ہے، بلاغت والا ہے۔ تو کیا میں اپنے بھائی کو قتل کر سکتا ہوں؟ لیکن انہوں نے کہا کہ آپ نے قتل کیا ہے، آپ نے اکیلے ان کو کیوں دفن کیا ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر الزام:

اسی طرح بعض لوگوں نے یہ مسئلہ بھی گھڑا ہوا ہے کہ بی بی فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کا جنازہ رات کے وقت ہوا۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ مسئلہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازہ گرایا تھا اور اہل بیت پر صحابہ نے...... نعوذ باللہ!...... اتنا ظلم کیا ہوا تھا کہ ڈر کے مارے ان کو رات کے وقت دفن کیا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر الزام:

ان لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اور خارجیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر الزام لگایا کہ انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خود مارا تھا، اسی لیے تو رات کو ہی دفن کر دیا، کسی کو کانوں کان خبر نہیں لگنے دی۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسری شادی کرنا چاہتے تھے اور بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہوتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا تھا کہ شادی نہ کرنا، اس لیے ان کو مار دیا۔

یہ دونوں جھوٹے ہیں۔ نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بی بی پر کوئی ظلم کیا اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اہل بیت پر کوئی ظلم کیا۔ وہ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیت تھی کہ میرا جنازہ رات کو پڑھیں اور رات ہی میں مجھے دفن کریں، تاکہ دن میں میرا جنازہ کوئی نہ دیکھ سکے۔ میں چاہتی ہوں کہ میری میت پر بھی کسی کی نظر نہ پڑے، میں

پردے کے ساتھ اللہ کے ہاں چلی جاؤں۔ وہ تو ایک عظمت کی بات تھی، لیکن دشمن تو ایسے مواقع ضائع نہیں کرتا۔

موسیٰ علیہ السلام کی جان خلاصی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کی: اے اللہ! مجھے ہارون کے قتل کے الزام سے بچائیں۔ اللہ نے فرمایا: قوم کو ان کی قبر پر لے آؤ اور وہاں ان کو کھڑا کرو۔ موسیٰ علیہ السلام قوم کو لے کر ہارون علیہ السلام کی قبر پر آئے، ہارون علیہ السلام کو دوبارہ زندہ کیا گیا، وہ قبر سے اُٹھے اور انہوں نے کہا: بدبختو! مجھے کسی نے نہیں مارا، میں تو اپنی موت مرا ہوں۔ تم یہ کیا جھوٹ الزام میرے بھائی پر لگا رہے ہو؟ تب جا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جان چھوٹی۔

خدا کو دیکھنے کا مطالبہ کرنے والوں کا انجام:

جب بنی اسرائیل کے ستر آدمیوں کو ''صاعقہ'' نے پکڑا اور وہ مر گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: پروردگارِ عالم! آپ نے ان کو مار دیا، ہلاک کر دیا، میری قوم کو تو آپ جانتے ہیں، میں انہیں کیا جواب دوں گا؟

ایک جگہ یوں آتا ہے کہ وہ ستر آدمی مرنے کے قریب ہو گئے۔ لیکن صحیح احادیث اور آیاتِ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ وہ مر گئے۔

بعض حضرات نے جو لکھا ہے کہ ان کو سکتہ ہو گیا تھا...... سکتہ ایک بیماری ہوتی ہے، اس میں بندے کی جسمانی حرکات اور نبض بند ہو جاتی ہے، سانس رُک جاتی ہے، چند لمحات کے لیے وہ کیفیات طاری ہوتی ہیں، ایسے لگتا ہے کہ آدمی مر گیا ہے...... وہ حضرات دلیل دیتے ہیں کہ قرآن میں آتا ہے: ﴿قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ﴾ [الاعراف:١٥٥] اگر آپ چاہیں تو ان کو ہلاک کر دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہلاک نہیں ہوئے تھے، بلکہ جب ان پر صاعقہ (بجلی) کی کڑک آئی تو وہ ڈر کے مارے سکتے کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔

یہ بات غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مر گئے تھے۔ کیونکہ قرآن جب اپنی تفسیر خود بیان کر دے تو پھر ایسی باتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن تو خود کہہ رہا ہے: ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝﴾ [البقرۃ:٥٦] قرآن کے اندر لفظ ''موت'' موجود ہے اور یہ لفظ قرآن میں جہاں بھی استعمال ہوا ہے تو وہاں حقیقی موت مراد ہے۔ جیسے: ﴿كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ [الروم:٥٠] دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ [البقرۃ:٢٥٩] یہاں ﴿مِائَةَ عَامٍ﴾

سے مراد سو سال تک ''حقیقی موت'' ہے۔

جبکہ اصحابِ کہف کے بارے میں ''موت'' کا لفظ نہیں آیا، بلکہ فرمایا: ﴿فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا﴾ [الکہف:۱۱] ہم نے ان کے کانوں پر پردہ دے دیا اتنی مدت کے لیے، تا کہ کوئی آواز نہ جائے۔ جب آواز ہی نہ جائے تو وہ پریشان نہیں ہوں گے، نیند میں رہیں گے، آرام سے رہیں گے، ہم نے ان پر نیند مسلط کردی، اور وہ نیند بھی تین سو نو سال کی تھی۔

اس لیے وہاں خود وضاحت فرمادی: ﴿وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۭ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾ [الکہف:۱۸] کیونکہ زندہ آدمی جب سو رہا ہو تو ایک طرف سوتے سوتے جگہ بھی گرم ہو جاتی ہے، بدن بھی گرم ہو جاتا ہے، گرمی کی وجہ سے وہ اُٹھ سکتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ان کے حالات کے مطابق ان کا انتظام کر دیا کہ کبھی دائیں لٹا دیتے اور کبھی بائیں لٹا دیتے۔ کیونکہ وہ زندہ ہیں، مردہ نہیں ہے۔ اور جہاں ''موت'' کا لفظ ہے وہاں مراد بھی ''موت'' ہی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ [الزمر:۳۰] اے میرے نبی! آپ پر بھی موت آئے گی اور ان سب پر بھی موت آئے گی، یہ حقیقت ہے جو کبھی ٹل نہیں سکتی۔

اس لیے یہاں بھی اللہ نے فرمایا کہ جب ہم نے ان ستر آدمیوں کو موت دی اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

ان ستر افراد نے رؤیتِ باری تعالیٰ کا سوال کیا، یہی سوال موسیٰ علیہ السلام نے بھی کیا تھا، موسیٰ علیہ السلام کو تو کوئی سزا نہیں ملی، پھر ان کو سزا کیوں ملی؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا سوال ادب اور محبت کے پیشِ نظر تھا، ان کو قلبی اشتیاق تھا کہ اللہ نے جیسے مجھ کو کلیم اللہ بنایا ہے، میرے ساتھ کلام فرمایا ہے، اسی طرح مجھے اپنا دیدار بھی کرادے۔ جبکہ بنی اسرائیل کا یہ سوال گستاخی پر مبنی تھا، چنانچہ انہوں نے تو شرط لگائی تھی کہ ہم آپ پر اس وقت تک ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا ہمارے سامنے نہ ہو۔ گویا کہ انہوں نے سوال کر کے اللہ کے نبی کو جھوٹا سمجھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اعتبار نہ کیا۔ اس وجہ سے ان کو سزا ملی۔

جیسا کہ کفار مکہ نے کہا تھا: ہم ایمان نہیں لائیں گے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ فرشتہ بھیجیں، وہ ہمارے سامنے آسمان سے اُترے اور اس کے ہاتھ میں ہمارے نام کا پرچہ لکھا ہوا ہو کہ فلاں بن فلاں! ہم تم کو حکم دیتے ہیں کہ میرے نبی پر ایمان لے آؤ، یا پھر خدا ہمارے سامنے آکر بات کرے۔ یہ ضد، عناد، بے ادبی اور اللہ کے نبی کی مخالفت تھی، اس لیے اللہ کا غضب آگیا۔ اگر ان کے اندر ادب ہوتا تو وہ یہ کہتے: اے موسیٰ! اللہ نے اتنا کرم فرمایا کہ ہمیں اپنا کلام سنادیا، اب مہربانی کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ اللہ ہمیں دیدار بھی کرادے۔ تو ان کو یہ سزا نہ ملتی۔

دنیا میں دیدارِ خداوندی ممکن نہیں:

رؤیت باری تعالیٰ آخرت میں حق ہے، لیکن دنیا کے اندر کوئی آنکھ اللہ کو نہیں دیکھ سکتی، کیونکہ انسانی آنکھ فانی چیز ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات باقی ہے، فنا ہونے والی چیز باقی رہنے والی چیز کا مشاہدہ نہیں کرسکتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو اس دنیا میں نہ اللہ کے ولی دیکھ سکتے ہیں، نہ اللہ کے نبی دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی اللہ کے رسول دیکھ سکتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ﴾ [الشوریٰ:۵۱] کسی بندے کو یہ طاقت نہیں کہ میرے ساتھ بغیر حجاب کے کلام کر سکے، بلکہ کلام تو ہوتا ہے تب بھی حجاب ہوتے ہیں یا میں وحی بھیجتا ہوں۔

حقیقی رؤیت:

آخرت میں چونکہ اللہ تعالیٰ ایسی حیات دیں گے کہ جس کے بعد کوئی فنا نہیں، اس زندگی میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یہ طاقت دیں گے کہ وہ اپنے پروردگار کی زیارت کرسکیں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: قیامت والے دن تمہیں رؤیت باری تعالیٰ نصیب ہوگی اور ایسی رؤیت نصیب ہوگی جیسے چودھویں کے چاند کو دیکھنے میں کوئی شک نہیں ہوتا، تم بھی حقیقتاً اپنے رب کو دیکھو گے۔

[صحيح البخاري، حديث:۷۴۳۶، باب قول الله تعالى: وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ...]

درجات کے لحاظ سے رؤیت:

آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ مومنین کو یہ رؤیت نصیب فرمائیں گے۔ وہاں مومنین کے مختلف درجات ہوں گے۔ چنانچہ بعض لوگوں کو ہر جمعہ زیارت نصیب ہوگی، بعض کو روزانہ زیارت نصیب ہوگی، بعض لوگوں کو صبح وشام

اللہ کی زیارت نصیب ہوگی اور بعض پر تو یہ پابندی بھی نہیں ہوگی، وہ جب چاہیں گے اپنے اللہ کو دیکھ سکیں گے۔

لیلۃ المعراج میں رؤیت ہوئی یا نہیں؟

حضور اکرم ﷺ کی اللہ تعالیٰ کی زیارت کے بارے میں صحابہ ؓ میں دو جماعتیں تھیں۔ بعض صحابہ اس کے قائل ہیں کہ معراج کی رات حضور اکرم ﷺ کو رؤیت نصیب ہوئی ہے۔ جو قائل ہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ معراج میں آسمانوں پر زیارت ہوئی، دنیا کے اندر نہیں ہوئی۔ اور بعض صحابہ اس کے بھی قائل نہیں، وہ کہتے ہیں کہ زیارت ہی نہیں ہوئی۔ کیونکہ جب ہم نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا کہ آپ نے اپنے رب کو دیکھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ایک ایسا نور ہے، کس کی طاقت ہے کہ اس نور کو دیکھ سکے؟

[صحیح مسلم، رقم: ۲۹۱، باب: فی قولہ علیہ السلام: نور أنی أراہ]

بہرحال اس کے اندر دو قول ہیں۔ اور جس مسئلہ میں صحابہ کی دو جماعتیں ہو جائیں تو آدمی کی جدھر بھی رائے ہو جائے، وہ الحمد للہ! بچ جاتا ہے، یعنی اس پر اللہ کی طرف سے کسی قسم کی خطا شمار نہیں ہوگی۔ باقی رہی خواب میں زیارت...... تو وہ نیک لوگوں کو بھی ہو جاتی ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ ؒ اور امام احمد ؒ اور دیگر اولیاء اللہ کو حاصل ہوئی۔ (انور)

﴿جَهْرَةً﴾ کی تفسیر:

﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ [البقرۃ: ۵۵] حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ ﴿جَهْرَةً﴾ کا معنی ہے: ''عَلَانِيَةً'' یعنی سرعام، کھلم کھلا۔ بنی اسرائیل کا مطالبہ تھا کہ خداوند قدوس بالکل ہمارے سامنے آکر اپنا دیدار کرائیں اور فرمائیں کہ میں کلام کر رہا ہوں، پھر ہم ایمان لائیں گے اور مانیں گے۔ حضرت قتادہ ؒ اور حضرت ربیع بن انس ؒ فرماتے ہیں کہ ﴿جَهْرَةً﴾ کا معنی ''عِيَانًا'' ہے کہ بالکل آنکھوں کے سامنے ہوں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

﴿اَلصّٰعِقَةُ﴾ کی تفسیر:

مروان بن الحکم بھی جب منبر مکہ پر خطبہ بیان کر رہے تھے تو انہوں نے ﴿اَلصّٰعِقَةُ﴾ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''صاعقہ'' سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے آسمانوں سے ایک ایسی آواز سنی اور شدتِ آواز کی وجہ سے وہ مر گئے۔

اُمم سابقہ کی ہلاکت کیسے ہوئی؟

اگر آپ قرآن مقدس کا مطالعہ کریں اور تمام اُمم کے احوال اور واقعات پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ اقوام کو کن کن طریقوں سے ہلاک کیا ہے۔ جیسے قوم عاد ہے، قومِ ثمود ہے، قومِ فرعون ہے، قومِ نوح ہے، یہ سب پیغمبروں کی قومیں ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ ۖ فَمِنْهُمْ مَنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَنْ أَغْرَقْنَا﴾ [العنکبوت: ۴۰] ہم نے ان سب کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا۔ چنانچہ بعض کو تو ہم نے آسمانوں سے پتھر برسا کر ہلاک کیا، بعض کو اللہ نے اس طرح ہلاک کیا کہ جبرائیل علیہ السلام کو اللہ نے حکم دیا، انہوں نے آکر ایک زبردست آواز (چیخ) نکالی، وہ اتنی شدید تھی کہ ان کے کانوں کے پردے پھٹ گئے اور وہ مر گئے۔ اللہ نے بعض قوموں کو زمین میں دھنسا دیا، جیسے قارون کو خسف کیا گیا، بعض قوموں کو اللہ نے غرق کیا، جیسے فرعون اور قبطی، جو موسیٰ علیہ السلام کے دشمن تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو پانی میں غرق کر دیا۔

انسان کے چار مادوں کا ثبوت:

اگر آدمی ذرا غور کرے تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے جو انسان بنایا ہے، اس کے اندر بھی عناصر اربعہ پائے جاتے ہیں: چنانچہ اس کے اندر ہوا بھی ہے، پانی بھی ہے، مٹی بھی ہے اور آگ بھی ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ انسان عناصر اربعہ سے مرکب ہے، یعنی چار عناصر کو اللہ نے انسان کے اندر جزوِ اعظم بنایا ہے، ورنہ انسان تو بظاہر نطفہ سے پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ ان عناصر اربعہ کا مرکب بھی ہے۔ دیکھیے:

...... کبھی انسان کے ناک سے پانی بہہ رہا ہے، کبھی آنکھ سے پانی بہہ رہا ہے اور آنسو بہہ رہے ہیں، یہ پانی کا مادہ اس کے اندر موجود ہے۔

...... اور اللہ نے انسان کے اندر ہوا رکھی ہے کہ آدمی سانس لیتا ہے، پھونک مارتا ہے تو ہوائیں پیدا ہو رہی ہیں۔

...... اسی طرح آپ نے دیکھا ہوگا کہ انسان کے بدن کے اندر مٹی ہے، انسان جب غسل کرنے کے لیے حمام میں بیٹھتا ہے تو گرمی کی شدت کی وجہ سے اس کے جسم سے پسینے نکلتے ہیں، جس کی وجہ سے مسام کھل جاتے ہیں اور اس کا میل باہر آجاتا ہے۔ اس قسم کے حمام میں آدمی غسل کرے تو اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ میں واقعی مٹی کا بنا ہوا ہوں،

کیونکہ تولے کے تولے آپ کے بدن کی مٹی کے بھر بھر کر نکلتے ہیں۔

آج کے اس جدید دور میں جو غسل خانے ہوتے ہیں، ان پر بھی ''حمام'' کا لفظ بولا جاتا ہے، حالانکہ یہ ''حمام'' نہیں ہوتے۔ اصل میں حمام، حمیم سے ہے، اس کا مطلب ہوتا ہے: گرم۔ چنانچہ قرآن مجید میں کفار کے بارے میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ان کے لیے کوئی ہمدرد نہیں ہوگا اور ان کو آگ میں ڈالا جائے گا اور جہنم کا جلتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔ اسی طرح جہاں جہاں حمیم کا لفظ آئے گا تو اس کے اندر گرمی کا معنی پایا جائے گا۔

اصل میں پہلے زمانے میں حمام بناتے وقت مکان کو اس طریقہ سے بند کر دیا جاتا تھا کہ اندر کی ہوا باہر نہ جائے اور باہر کی ہوا اندر نہ آئے، پھر ان کی دیواروں میں ہلکی ہلکی گرمی پیدا کی جاتی تھی۔ دیواروں کے اندر انگیٹھیاں بنائی ہوتی تھیں، ان کے اندر آگ جلا کے دیواروں کو گرم کیا جاتا تھا۔ اب تو دنیا ترقی کر گئی ہے، پائپ لائن آگئی، اس کے اندر گرم پانی سرکولیٹ کر لیا جاتا ہے۔

......آگ بھی انسان کے اندر موجود ہے جس کی حرارت سے انسان کا وجود گرم رکھا جاتا ہے۔

دیکھیے! اللہ نے جن چیزوں کو انسان کی بقاء کا سبب بنایا تھا، جب اللہ نے عذاب دینا چاہا تو انہی چیزوں کو انسان کی ہلاکت کا ذریعہ بنا کر بتا دیا کہ جن چیزوں کو میں تمہاری بقاء کا ذریعہ بنایا تھا، میں اس بات پر قادر ہوں کہ انہی چیزوں سے تم کو ہلاک و برباد کر دوں۔ چنانچہ کسی کو پانی کے عذاب میں غرق کر دیا، کسی کے لیے آگ برسا دی، کسی کے لیے پتھر برسا دیئے، کسی کے لیے اللہ نے چیخ بھیج دی، اور کسی کے لیے بجلی کی کڑک آگئی۔ اللہ تعالیٰ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ (عناصر اربعہ) میری مخلوقات ہیں، چاہوں تو ہوا سے تمہاری زندگی کا کام لوں اور چاہوں تو اس سے تمہاری بربادی کا کام لے لوں۔ چاہوں تو بارشیں بھیج کر تمہاری مردہ زمینوں کو زندہ کر دوں اور اگر میں چاہوں تو بارشیں بھیج کر اور طوفان بنا کر تمہاری فصلوں کو برباد کر دوں۔ یہ ساری چیزیں اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ جو چاہیں کریں اور جو چاہیں وہ حکم دیں: ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الاعراف: ۵۴]

﴿الصّٰعِقَةُ﴾ کی ایک اور تفسیر:

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿الصّٰعِقَةُ﴾ کا معنی ''آگ'' ہے۔ یعنی ان کے اوپر بجلی گری۔ ﴿وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ یعنی ایک مر رہا ہے اور دوسرا دیکھ رہا ہے۔ پھر جو مردہ تھے، اللہ پاک نے ان کو زندہ کر دیا اور جو بے ہوش

تھے، وہ ہوش میں آ گئے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

ستر آدمیوں کو مختلف کیفیات کے ساتھ زندہ کیا:

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ ان ستر آدمیوں نے بھی اس بچھڑے کی عبادت کی تھی، اس لیے ان پر بھی موت واقع ہوگئی۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا منظور فرمائی اور ان کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ جب زندہ ہونے لگے تو اللہ نے ان کو زندہ ہونے کی کیفیتیں بھی دکھلا دیں، چنانچہ وہ ایک دوسرے کو زندہ ہوتے وقت دیکھ رہے تھے، تاکہ ان کو بعث بعد الموت کا مسئلہ سمجھ میں آ جائے۔ اس لیے فرمایا: ﴿ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ﴾ [البقرۃ:۵۶]

ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے جو اُن کو موت دی تھی، وہ سزا کے طور پر تھی۔ یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ جن جن لوگوں نے بچھڑے کی عبادت کی ہے، ان کو قتل ہونا چاہیے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ظاہر نہیں ہوئے تھے، لیکن ان کے دل میں بھی بچھڑے کی عبادت کی تمنا تھی، اللہ نے ان کو بھی موت کی سزا دے دی اور اس کے بعد اللہ پاک نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو دوبارہ زندہ کیا، تاکہ وہ اپنی مدتِ حیات پوری کر لیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

سامعِ کلامِ خداوندی کی حالت:

محمد بن اسحاق نے روایت کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر چالیس دن کا چلہ پورا کرنے کے بعد واپس تشریف لائے تو قوم کو دیکھا کہ ایک بچھڑے کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں، آپ نے اپنے بھائی سے بھی اور سامری سے (جیسا کہ مذکور ہوا) جو فرمایا سو فرمایا۔ جیسا کہ دوسری آیات کے اندر مذکور ہے کہ اپنے بھائی پر بھی غصہ نکالا اور سامری پر بھی غصہ نکالا۔ اس کے بعد جب فارغ ہوئے تو آپ نے بچھڑے کو جلا کر ذرّہ ذرّہ کر دیا اور دریا کے اندر بکھیر دیا۔ اب موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر آدمیوں کو چنا جو بہتر تھے اور ان سے فرمایا: اللہ کے پاس چلو اور جو کچھ تم نے کیا ہے، اس سے توبہ کرو۔ اور جو تمہاری باقی برادری کے لوگ ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ اور انہیں روزہ رکھنے اور اپنے کپڑوں اور بدن کو پاک کرنے کا حکم دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان ستر آدمیوں کو لے کر طور سیناء کی طرف چلے...... یہ وہ وقت تھا کہ جس وقت کے بارے میں

اللہ نے ان کو حکم دیا تھا، ورنہ موسیٰ علیہ السلام وہاں بغیر اذنِ الٰہی کے نہیں جاتے تھے۔ جب وہ ستر آدمی اس کام کے لیے نکلے جس کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے ان کو حکم دیا تھا تو انہوں نے کہا: اے موسیٰ! اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ ہم اپنے رب کا کلام سنیں۔ فرمایا: اچھا! میں سوال کرتا ہوں۔

جب موسیٰ علیہ السلام طورِ سیناء پہاڑ کے قریب آئے تو نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اوپر بادل آ گیا اور اس نے سارے پہاڑ کو اپنے سایہ میں لے لیا اور موسیٰ علیہ السلام قریب ہو گئے۔ وہ لوگ بھی اس بادل کے اندر داخل ہو گئے۔ آپ نے اپنی قوم سے فرمایا: اے میری قوم کے ستر آدمیو! تم بھی قریب آتے جاؤ، قریب آتے جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ کلام فرماتے تھے تو ان کی پیشانی پر ایک ایسا نور، ایسی روشنی ظاہر ہوتی تھی کہ کوئی اس نور کی طرف دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ یہ اللہ کے کلام کا اثر ہوتا تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

کلامِ خداوندی کی تاثیر:

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ اللہ کا کلام پڑھتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے چہروں پر اس کا اثر ظاہر کر دیتے ہیں، ان کے چہروں کو بھی قرآن کی برکت سے منور فرما دیتے ہیں۔

دنیا میں کتنے سیاہ فام ہوتے ہیں، کتنے ملکوں کے لوگ بالکل سیاہ ہوتے ہیں، لیکن جب وہ صحیح معنوں میں عبادت کرتے ہیں تو ان کے چہرے پُرکشش بن جاتے ہیں، بندے کا دل کرتا ہے کہ اس سے بات کرے۔ جب آدمی ان کے پاس جاتا ہے، ان کی زیارت کرتا ہے، ان کی صحبت میں بیٹھتا ہے اور ان کی باتیں سنتا ہے تو اسے دلی سکون حاصل ہوتا ہے، ان کی مجلس میں بیٹھنے سے اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ تو صدیوں بعد اللہ کا کلام پڑھنے والوں کا حال ہے اور جس کو اللہ نے اپنا کلام خود نصیب فرما دیا ہو تو اس کا کیا عالم ہوگا!!

اس کے برخلاف کافر لوگ کتنے گورے ہوتے ہیں، حتیٰ کہ سفید رنگ کی وجہ سے ان کا لقب بھی ''گورا'' پڑ گیا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کو دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے ان پر اللہ کی لعنت اور پھٹکار برس رہی ہو، یا ایسے معلوم ہوگا جیسا کہ کسی بندر کا چہرہ ہو، ان کے چہروں میں کوئی کشش اور جاذبیت نہیں ہوتی۔

عبدالہادی دینپوری رحمہ اللہ کے چہرے کی بشاشت:

ہمارے ایک بزرگ اور شیخ تھے حضرت عبدالہادی دین پوری رحمہ اللہ۔ بڑے ہی عابد اور زاہد تھے، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ثُمَّ

اَلْحَمْدُلِلّٰہ! انہوں نے ساری زندگی عقیدۂ توحید اور اتباعِ سنت پر گزاری۔ ہر ہر قدم اور ہر ہر بات میں اتباعِ سنت کا خیال رکھتے تھے۔

اتباعِ سنت کا یہ عالَم تھا کہ ساری زندگی کچے کمرے میں گزار دی۔ ہزاروں ساتھیوں اور ہزاروں آدمیوں نے کہا کہ آپ کے لیے پکا مکان بنا دیتے ہیں؟ فرمایا: جب فقیر کا گزارا اسی میں ہو جاتا ہے تو پکے مکان بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ جب میرے آقا ﷺ پکے مکان میں نہیں رہے تو میں کیوں رہوں؟ چنانچہ کوئی ساتھی دری لے آتا اور کوئی قالین لے آتا۔ آپ بس گھاس منگوا کر نیچے بچھوا دیتے تھے، یہی ان کا قالین اور بستر تھا اور یہی ان کا مصلیٰ تھا۔

بیماری اتنی تھی کہ دو آدمی چار پائی کے اوپر اُٹھا کر لے آتے تھے اور اس کو صف میں رکھوا دیتے تھے کہ نماز باجماعت پڑھ سکیں۔ ان کو یہ گوارا نہیں تھا کہ میں نماز علیحدہ پڑھوں۔ اس قدر بڑھاپے کی حالت میں موت سے کچھ عرصہ قبل صرف ایک پیالی کے برابر دودھ، چائے اور بسکٹ کے برابر سوکھی روٹی کا ٹکڑا، یہ غذا رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود جب چہرے پر نظر ڈالی جاتی تو ایسے لگتا تھا جیسے کسی نوجوان معصوم بچے کا چہرہ ہے، اور چہرے کی بشاشت کو دیکھتے ہوئے محسوس بھی نہیں ہوتا تھا کہ انہیں کوئی بیماری اور تکلیف ہے، یا ان کو کوئی غم اور حزن لاحق ہے۔ حالانکہ دنیا کی ساری بیماریاں ان کو لگی ہوئی تھیں۔

ذکر اللہ کی لذت!!

جب آدمی اللہ کا ذکر کرتا ہے تو اس کی ایک لذت اور ایک روشنی ہوتی ہے۔ ذکر کا ایک مقام ہے جو باتوں سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔ مثال کے طور پر میں اگر آپ کو سمجھانا چاہوں کہ یہ پانی بہت میٹھا ہے اور اس کا ذائقہ بہت عمدہ ہے، سبحان اللہ، ماشاء اللہ! اس کی خوشبو بڑی عجیب ہے۔ جب تک آپ چکھیں گے نہیں، آپ کو ذرا سی بھی لذت حاصل نہیں ہوگی۔ اور اگر آپ صرف ایک گھونٹ پی لیں تو ساری لذتوں کا ادراک ہو جائے گا۔

بعض عرب لوگوں کے گھروں سے پانی پیا جائے تو...... سبحان اللہ!...... طبیعت فرحت میں آ جاتی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ پرانے زمانے کی مٹی کی صراحیوں کو پہلے عود اور لوبان کا دھواں دیتے ہیں، وہ دھواں اس کے اندر چلا جاتا ہے، پھر اس کو رکھ دیتے ہیں، تا کہ دھویں کے اثرات ختم ہو جائیں، پھر اس میں پانی ڈالتے ہیں تو قدرتی طور پر اس میں ایک ذائقہ بنتا ہے، ایک لطیف خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ ہر آدمی تو ایسے نہیں کر سکتا۔ یہ تو ان کو پتہ ہے کہ کتنا ہم نے دھواں دینا ہے۔ اگر ہم کریں گے تو کبھی زیادہ دھواں دے بیٹھیں گے، جس سے پانی کا ذائقہ کڑوا محسوس ہوگا اور کبھی

ذائقہ کم ہو جائے گا۔

اسی طرح اللہ کے ذکر کی لذت اللہ والوں سے پوچھیں، کبھی ان کی صحبت میں بیٹھ کر اللہ کا ذکر کریں، پھر پتہ چلے گا کہ اللہ کے ذکر کی کیا برکات ہیں؟ اس کے کیا ثمرات ہیں؟ اور کیا کیا لذات ہیں؟

ذکر کی کثرت کا حکم:

دیکھیں! نماز پانچ وقت فرض ہے اور روزہ سارے سال میں ایک مہینہ فرض ہے، لیکن جب اللہ کے ذکر کے بارے میں حکم آیا تو فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ [الاحزاب: ۴۱] کہ ایمان والو! اگر میرا ذکر کرنا ہے تو بہت ذکر کرو۔ فرمایا: کھڑے ہو تو میرا ذکر کرو، بیٹھے ہو تو میرا ذکر کرو، نیز فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [آل عمران: ۱۹۱] جو میرے بندے ہیں وہ کھڑے ہیں تو ان کی زبان پر میرا ذکر ہے، رکوع میں ہیں تو میرا ذکر ہے، سجدے میں ہیں تو میرا ذکر ہے، بیٹھے ہوئے ہیں تو میرا ذکر ہے۔ اگر کبھی لیٹتے ہیں اور آسمانوں پر نظر پڑتی ہے تو میری قدرت کے اندر غور وفکر کرتے ہیں۔

بہر حال جب لذت آتی ہے تو اللہ ایک نور پیدا کرتے ہیں: ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ [الفتح: ۲۹] کثرتِ عبادت کی وجہ سے اللہ ان کے چہروں پر ایک نورانیت پیدا کرتے ہیں، پھر ہر آدمی کا دل ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ چاہے آدمی ان سے واقف نہ بھی ہو، جانتا نہ بھی ہو کہ کون ہے؟ لیکن طبیعت کرے گی کہ میں اس کے ساتھ ملوں۔

میاں مسعود احمد کا واقعہ:

جن بزرگوں کا میں نے ماقبل میں ذکر کیا، ان کے پوتے ہیں، "میاں مسعود احمد صاحب" ان کا نام ہے۔ بالکل نوجوان ہیں...... اللہ ان کو اور زیادہ خدمتِ دین کی توفیق دے...... ہمارے ساتھ ان کے بھائیوں جیسے تعلقات ہیں۔ بچپن میں دادا کی صحبت میں رہے اور انہی سے تربیت حاصل کی۔ ایک مرتبہ حج کے سفر میں تھے تو مدینہ منورہ میں تشریف لائے، نہایت ہی سادہ لباس میں تھے، دیہاتی انداز میں چادر باندھی ہوئی تھی، اوپر کرتہ اور سر پر کپڑے کی ٹوپی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ آپ شلوار پہن لیں۔ انہوں نے کہا: شلوار، حضور ﷺ کو بھی پسند تھی، لیکن

آپ ﷺ نے ساری زندگی چادر ہی باندھی ہے، اس لیے میں بھی چادر ہی باندھوں گا۔

انہی کا واقعہ ہے کہ انہوں نے نماز پڑھی تو جو امامِ حرم تھے، نہ وہ ان کو جانتے تھے اور نہ یہ ان کو جانتے ہیں۔ جب نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو وہ سیدھے اِن کے پاس آئے اور کہا کہ آپ میرے لیے دعا کریں۔ انہوں نے کہا: حضرت! آپ حرم شریف کے امام ہیں، اتنے بڑے بزرگ ہیں، اللہ نے آپ کو مصلّٰی رسول پر کھڑا کیا ہے، یہ کوئی چھوٹا مرتبہ تو نہیں ہے، پھر بھی آپ مجھ سے دعا کروا رہے ہیں!!...... کوئی آدمی اگر کعبۃ اللہ کے اندر مصلّٰی پر کھڑا ہو یا مدینۃ الرسول میں مصلے پر کھڑا ہو تو یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کے فیصلے ہیں۔ اللہ جن کو چاہے ان کو چن کر امام بنا دے اور جنہیں چاہے آنے بھی نہ دے۔ یہ تو اللہ تبارک وتعالٰی کی قدرت کے فیصلے ہیں...... خیر امام صاحب نے کہا کہ حضرت! دعا کریں۔ انہوں نے کہا: میں آپ کے پاس چل کر آیا ہوں، اب تو آپ میرے لیے دعا کریں۔ اور جب آپ میرے پاس آئیں گے تو میں بھی آپ کے لیے دعا کروں گا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ امام صاحب کی ان سے کوئی جان پہچان نہیں تھی، یہ تو پہلی دفعہ حج پر آئے تھے۔ بیچارے عربی زبان بھی نہیں بول سکتے تھے۔ ویسے الحمدللہ! عالم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان وقتوں میں ہمارے علاقوں میں علم پڑھایا جاتا تھا، بولنا نہیں سکھایا جاتا تھا، یعنی لغت پر زور نہیں دیا جاتا تھا۔ ہمارے بزرگ کہتے تھے کہ ان کو عربی پوری پڑھا دو، لیکن ان کو بولنا نہ سکھاؤ۔ اگر یہ عربی بولنا سیکھ گئے تو کمانے کے لیے سب عرب ممالک میں بھاگ جائیں گے، پھر یہاں دین کون پڑھائے گا؟

اس کے اندر بھی حکمتیں تھیں کہ ہم نے تو ان کو مسجد میں ڈالنا ہے، جہاں ان کو سوکھی روٹی ملے اور مختلف بستیوں سے جا کر روٹی اکٹھی کر کے کھائیں اور اللہ کا قرآن پڑھائیں۔ اگر ان کو زبان بھی آگئی تو یہ باہر کے ملکوں میں نکل جائیں گے اور وہاں جب پیسے ملیں گے تو ادھر کیا کرنے کے لیے آئیں گے؟

آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ جو لوگ ڈگریوں والے بن گئے، ان میں سے کون دیہات میں کام کرنے کے لیے آیا؟ اب آپ کی حکومت ڈاکٹر کی منتیں کرتی ہے کہ مہربانی کرو، دیہات میں کام کرو۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے پھانسی پر لگا دو، لیکن میں دیہات میں نہیں جاؤں گا۔ ڈاکٹری چھوڑ دیتا ہے، مگر دیہات میں نہیں جاتا۔ المیہ تو یہ ہے کہ ان غریبوں کے پاس کون جائے گا؟ وہ کہتے ہیں کہ شہروں میں ہوں، سوسائٹی ہو، بنگلے ہوں، پنکھے ہوں، بجلیاں ہوں،

ایئر کنڈیشنڈ ہوں، شام کو سینما گھر ملے، تفریح ملے۔ ہم دیہات میں جا کر غریبوں مسکینوں کا علاج کیوں کریں؟ غریب تو ان کے نزدیک بندہ بھی نہیں ہوتا، وہ تو ان کے نزدیک جانور ہے، بلکہ جانور کے ساتھ تو کچھ ہمدردی رکھتے ہیں، غریب کے ساتھ اتنی ہمدردی بھی نہیں ہوتی۔ غریب مرتا ہے تو مر جائے، بھوکا پڑا ہے تو پڑا رہے، ملیریا پھیلا ہے تو پھیل جائے، وبا آگئی ہے تو آ جائے، اندھے ہوتے ہیں تو ہو جائیں، گندا پانی پی رہے ہیں تو پیتے رہیں، کوئی ان کا علاج کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ ان کو زبان نہ سکھلاؤ۔ اگر ان کو زبان سکھلاؤ گے اور بڑی بڑی ڈگریاں دو گے تو پھر یہ دین کا کام نہیں کریں گے۔ جب یہ فارغ ہو کر مؤذن یا امام بنے گا، حافظ، قاری، یا مولوی بنے گا، دس بیس بچوں کو یہ قرآن پڑھا دے گا تو یہ کوئی تھوڑی سعادت تو نہیں ہے کہ اتنے بچے حافظ ہو جائیں۔

بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے ذکر کے اپنے اثرات ہوتے ہیں جو خود بخود چہرے پر اُبھر آتے ہیں، ذاکر شاغل آدمی کے چہرہ گواہی دیتا ہے کہ یہ اللہ کا ذکر کرنے والا آدمی ہے۔ اور جو اللہ کے ذکر سے محروم ہوتا ہے، اس کے چہرے سے نحوست ٹپک رہی ہوتی ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس کا تجربہ کرنا ہو تو ایک دن صبح کو جا کر کسی شراب خانے کے باہر کھڑے ہو جاؤ۔ جو شرابی نکلے، اس کا چہرہ دیکھو، اس کے منہ پر لعنت برس رہی ہوگی۔ اور پھر مسجد کے باہر کھڑے ہو جاؤ، جو لوگ تہجد میں آئے ہوں، جب وہ باہر نکلیں تو غور سے دیکھنا، ان سے چہروں سے رحمت برس رہی ہوگی۔ تم جا کر اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر لو۔

آمدم بر سر مطلب:

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جب اللہ سے ہمکلام ہوتے تھے تو ان کے چہرے پر ایک نور ظاہر ہوتا تھا کہ کسی کو کوئی طاقت نہیں ہوتی تھی کہ کوئی ان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھ سکے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ قریب آ جاؤ تو وہ قریب آ گئے۔ ان کے آگے ایک پردہ آ گیا، گویا وہ دیکھ نہیں رہے۔ جب قوم بھی اس بادل میں داخل ہو گئی تو سجدے میں گر گئی۔ انہوں نے سنا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرما رہے ہیں، اللہ پاک حکم دے رہے

ہیں کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو، اوامر و نواہی بیان ہو رہے ہیں، خود انہوں نے اپنے کانوں سے یہ گفتگو کی۔ جب اللہ کا کلام ختم ہوا تو اس کے بعد بادل چھٹ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے کہ اب انہوں نے اپنے کانوں سے اللہ کا کلام سن لیا ہے، اب کیا کہتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ سن تو لیا ہے، لیکن ہم نے دیکھا تو نہیں کہ کون بات کر رہا تھا؟ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ. اس پر ان کو ایک جھٹکا، ایک زلزلہ لگا، اور یہی وہ ''صاعقہ'' تھا جس سے وہ مر گئے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳، ۹۴]

باقی واقعہ ماقبل میں گزر چکا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اُٹھے اور اپنے پروردگار کے آگے درخواست کی کہ یا اللہ! یا اللہ! مہربانی فرمائیں۔

امام رازی رحمہ اللہ کی تفسیر اور اس کا ردّ:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام رازی رحمہ اللہ نے ایک اور واقعہ بھی لکھا ہے کہ جب ان لوگوں کو موت کی سزا مل گئی، پھر موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے اللہ سے معافی مانگی تو معافی انہیں معافی بھی مل گئی۔ انہوں نے کہا کہ موسیٰ! آپ جو بھی دعا مانگتے ہیں تو اللہ قبول فرما لیتے ہیں اور آپ کی دعا رد نہیں ہوتی، آپ مہربانی کر کے دعا مانگیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی نبی بنا دے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی تو وہ سب کے سب نبی بن گئے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قصہ بالکل مَن گھڑت ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں صرف تین نبیوں کا ذکر آیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت یوشع بن نون علیہ السلام۔ ان کے علاوہ کسی اور نبی کا ذکر نہیں ہے، ان کا ذکر نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں۔ اگر وہ ستر آدمی نبی بن گئے ہوتے تو قرآن مجید یا ذخیرۂ احادیث میں کہیں نہ کہیں ان کا ذکر ضرور ہوتا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۴]

کیا حضور اکرم ﷺ عرش پر جوتوں سمیت گئے تھے؟

ہمارے لوگ بھی محبت میں آ کر کہتے ہیں کہ دیکھو! موسیٰ علیہ السلام کی بڑی شان ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو رسول بنایا، اللہ نے ان کو نبی بنایا، اللہ نے ان سے کلام فرمایا، لیکن جب موسیٰ علیہ السلام وادئ مقدس میں گئے تو اللہ نے حکم دیا: ﴿اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴾ [طٰہٰ: ۱۲] پہلے اپنے جوتے اُتارو، پھر وادئ مقدس میں آؤ۔ موسیٰ علیہ السلام نے جوتے اُتار دیئے۔ کہتے ہیں کہ ہمارے نبی کی شان دیکھو کہ اللہ نے فرمایا: آپ

جوتے نہ اُتاریں، عرش پر بھی جوتوں کے ساتھ آجائیں۔ لوگ جب یہ بات سنتے ہیں تو کہتے ہیں: سبحان اللہ! واقعی یہ عاشق رسول ہے، اس نے حضور ﷺ کے مقام کو سمجھا ہے!!

خدا کے بندے! وہاں تو جوتے اُتارنے کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے، مجھے بتاؤ کہ یہ قرآن مجید کی کس آیت میں ہے کہ حضور ﷺ جوتے پہن کر عرش پر گئے تھے؟ اس کے مقابلے میں تم بھی تو قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھو۔ یا کوئی ایسی حدیث مبارک پیش کرو جس میں حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان موجود ہو کہ میں جوتے پہن کر عرش پر گیا تھا!! لیکن یہ بات سننے والا کوئی نہیں!! محبت کی بات ہوتی ہے اور آگے ہماری برادری ہوتی ہے، جو صرف نام کے عاشق ہوتے ہیں۔ اللہ کے بندو! ہمیں بھی قرآن کی ایک آیت پڑھ کو سنا دو کہ اس آیت کے مطابق حضور ﷺ عرش پر گئے۔ قرآن مقدس میں تو حضور ﷺ کا سدرۃ المنتہیٰ تک جانا ثابت ہے، اس سے آگے جانے کا تذکرہ قرآن پاک کی کسی آیت میں نہیں۔ بعض روایات میں اس سے آگے جانے کا ذکر ہے، لیکن اللہ کے قرآن میں ذکر نہیں ہے۔

اسی طرح نمازوں کی تخفیف کے بارے میں مسئلہ پر غور کریں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے سے حضور ﷺ درخواست کر رہے ہیں کہ اے اللہ! میری اُمت کو پچاس نمازیں پڑھنے کی معافی دے دے، یہ پچاس نہیں پڑھ سکیں گے۔ اللہ نے پانچ نمازیں معاف فرما دیں۔ پھر درخواست کی، پھر درخواست کی، بار بار درخواست کرتے رہے، حتیٰ کہ پانچ نمازیں باقی رہ گئیں۔ تب اللہ نے فرمایا کہ تیری اُمت پانچ نمازیں پڑھے گی، لیکن پچاس نمازوں کا ثواب دوں گا۔ میرا فیصلہ نہیں بدلتا، فیصلہ وہی پچاس والا ہے، لیکن آپ کی اُمت پر ہم نے مہربانی کر دی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ کی اُمت یہ پانچ بھی نہیں پڑھے گی، لہٰذا آپ پھر جا کر درخواست کریں، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اب مجھے رعایت مانگنے سے حیا آتی ہے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۳۴۹، باب: كيف فُرِضَتِ الصَّلَاةُ فِي الإِسْرَاءِ؟]

جس نبی کو مانگنے سے بھی حیا آتی ہو، جس نبی کے ادب کا یہ عالم ہو کہ اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَ الصَّلَوٰتُ وَ الطَّيِّبَاتُ، جن کی نیازمندی کا یہ عالم ہو، جن کے تواضع کا یہ عالم ہو تو پھر حکم آئے: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ، ان کے بارے میں آپ کہیں گے کہ جوتوں سمیت عرش پہ چلے گئے؟ عجیب بات ہے!!

﴿وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۝﴾

[البقرۃ:۵۷،۵۸]

اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ اُتارے، پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں دیں، اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا، بلکہ وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ اور جب ہم نے کہا: اس شہر میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے چاہو بلا روک ٹوک کھاؤ اور دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور کہتے جاؤ: ''بخش دے'' ہم تمہارے قصور معاف کر دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو اور بھی زیادہ دیں گے۔

مسلمانوں کی حالتِ زار:

مسلمانو! ذرا ان الفاظ پر اور آج کے مسلمانوں کی حالت پر غور کرو، آج بھی جب کوئی آدمی مسلمانوں کو نماز کے لیے پکارتا ہے، مسجد میں حاضری کے لیے بلاتا ہے، کسی مسلمان کو یہ بتلاتا ہے کہ سود حرام ہے، سود اللہ سے جنگ ہے، اگر کسی آدمی کو کہتا ہے کہ داڑھی رکھ لو، نماز پڑھا کرو تو وہ جواب دیتا ہے کہ جاؤ! جاؤ! میں تمہیں بھی جانتا ہوں اور تمہارے دین اور مذہب کو بھی جانتا ہوں۔ یعنی آج بھی بعینہٖ وہی الفاظ بولے جاتے ہیں جو بنی اسرائیل نے کہے تھے۔ بس اتنا ہے کہ انہوں نے اپنی زبان سریانی میں کہا تھا اور ہم یہ الفاظ اپنی مقامی زبانوں میں ادا کرتے ہیں، ورنہ کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔

جذبۂ جہاد کا فقدان:

بنی اسرائیل نے جہاد سے انکار کر دیا تھا، آج مسلمانوں پر نظر ڈالو تو ہر قوم جہاد سے گویا انکار کر کے بیٹھی ہوئی ہے، جہاد کا نام تو ہر کوئی لیتا ہے، لیکن عملاً کوئی بھی جہاد کے لیے تیار نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر جہاد کا جذبہ ہوتا تو کیا آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ چند لاکھ یہودی یا چند لاکھ ہندو مسلمانوں کی عصمتوں کے ساتھ کشمیر میں کھیل رہے

ہوتے؟ اگر مسلمانوں کے اندر جہاد کا جذبہ ہوتا تو کیا آج ہماری مسجدوں کو شہید کر دیا جاتا؟ آج اگر مسلمانوں میں جذبۂ جہاد زندہ ہوتا تو مسلمانوں کی ہزاروں عورتوں کی ان کے ماں باپ، بھائی بہن اور ان کے شوہروں کے سامنے ان کی عصمت دری نہ کی جاتی۔

مظلوموں کے ہمدرد:

آپ اندازہ لگائیں! تاریخ کا جو بدترین انسان گزرا ہے، جس کو ''ظَالِمُ هٰذِهِ الْأُمَّة'' کا لقب ملا ہے، جس کے ہاتھوں اللہ کے نبی کے صحابہ شہید ہوئے ہیں، جسے ہم حجاج بن یوسف کے نام سے جانتے ہیں۔ لیکن جب اسے سندھ کے علاقہ دیبل سے چند بیٹیوں کا خط ملا کہ ہم پر راجہ داہر کی فوجوں نے حملہ کر کے ہماری عصمتیں لوٹی ہیں اور ہم ان کی قید میں ہیں، کیا مسلمان مر گئے ہیں کہ ہماری عزت کی حفاظت کریں؟ اس پر حجاج بن یوسف جیسا ظالم آدمی بھی تڑپ اُٹھا۔ چنانچہ اس نے سولہ سالہ محمد بن قاسم کو یہاں بھجوایا، جو اس کا داماد بھی تھا اور عزیز بھی تھا۔ اور وہ یہ جذبہ لے کر (کہ میں مسلمانوں کی بیٹیوں کی فریاد پر پہنچ رہا ہوں) عرب سے نکلا اور پوری دنیا کو تاخت و تاراج کرتا ہوا اسلام کے جھنڈے گاڑھ دیئے۔

بے حس مسلمان!!

آج کہاں ہیں وہ مسلمان جو مظلوموں کا درد محسوس کرنے والے تھے؟ اب تو بے حسی کا یہ عالم ہے کہ اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ آج مسجد میں اتنے مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا، آج کشمیر میں ہندوؤں نے اتنے مسلمانوں کو زندہ جلا دیا، لیکن زبان پر اِنَّا لِلّٰهِ کے الفاظ بھی نہیں آتے......!! کتنے مسلمان ہیں جو ایسی خبریں پڑھنے کے بعد اگر اور کچھ بھی نہ کر سکیں تو کم از کم اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ہی کہہ دیں؟ آپ بتائیں کہ کتنے مسلمان ہیں جو یہ اخبارات پڑھتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو بہتے ہیں؟ کبھی آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی ٹپکا ہو تو بتائیں؟ کیا آپ اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب ہماری بیٹیوں کے ساتھ یہ حشر کیا جائے گا؟ پھر آپ کو رونا آئے گا، پھر آپ چیخیں گے اور پھر آپ فریاد کریں گے؟ لیکن یاد رکھیں! اس وقت فریاد کرنے کا وقت گزر چکا ہوگا۔

وعدۂ نصرت کی شرط:

آج وہی بنی اسرائیل والے واقعات دہرائے جا رہے ہیں۔ ورنہ اسلام کا یہ وعدہ ہے: ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ

الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الروم: ۴۷] اگر تم مومن بن جاؤ تو میرا آج بھی وعدہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم تمہیں شکست نہیں دے سکتی: ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۹] اگر تم مومن بن جاؤ تو سب سے زیادہ سربلند میں تمہیں کروں گا۔ دشمن کے بارے میں تم سمجھتے ہو کہ اسے ٹیکنالوجی کی برتری حاصل ہے، لیکن اگر میرا اللہ چاہے تو یہی بنائے ہوئے ہتھیار اور ایٹم کے ذخائر ان کی تباہی و بربادی کا سبب بنا دے۔ شرط یہ ہے کہ تم مومن بن جاؤ۔

ذلت کا سبب......ترکِ جہاد:

میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا کہ ایک وقت آئے گا، میری اُمت ذلیل ہو جائے گی، ان کا کوئی رعب نہیں رہے گا اور دشمن ان پر اس طرح چڑھ دوڑیں گے جس طرح بھوکے لوگ کھانے پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ صحابہ ﷺ نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا اس وقت مسلمان تعداد میں تھوڑے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان تعداد میں تو زیادہ ہوں گے اور اتنی بڑی تعداد ہوگی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے، لیکن وہ جہاد کو چھوڑ بیٹھیں گے، موت کو بُرا سمجھیں گے اور دنیا حاصل کرنے میں لگ جائیں گے۔

[سنن أبي داود، حديث: ۴۲۹۷، باب: في تَدَاعِي الْأُمَمِ عَلَى الْإِسْلَامِ]

پیسہ ہی پیسہ!!

اسی پر غور کر کے اپنے گریبانوں میں جھانکیں کہ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو اپنے بیوی، بچوں، اور اپنے والدین کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو اپنے بیوی بچے، اپنا ملک اور گھر بار چھوڑ کر یہاں (غیر ممالک میں) آ پڑے ہیں؟ آخر کیوں؟ پیسے کمانے کے لیے۔ بہت کم لوگ ہیں جو یہاں عبادت کے لیے موجود ہیں، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے گھر کا روزانہ طواف کر رہے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو اللہ کے قرآن کا ختم پڑھ رہے ہیں، کتنے لوگ ہیں جو مسجد نبوی میں جا کر نمازیں ادا کر رہے ہیں، کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی شکل حضرت محمد ﷺ والی بنائی ہے اور کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اپنا لباس اسلامی بنالیا ہے؟ چند دنیاوی فوائد کے لیے سب کچھ چھوڑ کر یہاں پڑے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف حصولِ دنیا ہے اور اس دنیا کو حاصل کرنے کے لیے ہمارا پیچھے گھر اُجڑ جائے، عزتیں تار تار جائیں، گھر کے اندر تباہیاں ہو جائیں، والدین مر جائیں، ہمیں ان کے جنازے تک نصیب نہیں ہوتے، لیکن پھر بھی

پردیس میں پڑے ہیں۔

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری اُمت میں دنیا کی محبت بھر جائے گی، وہ موت کو برا سمجھیں گے۔ جب مسلمان موت سے ڈرنے لگے گا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ پوری دنیا میں ذلیل وخوار ہو جائے گا۔

میری موت مجھ سے ڈرتی ہے!!

ایک دن ایک خیر خواہ آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا: کیا آپ کو موت سے ڈر نہیں لگتا جو آپ دشمنوں کے اندر ہی گھستے چلے جاتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ مسکرائے اور ایک لطیف جملہ فرمایا کہ ''میری موت بھی مجھ سے ڈرتی ہے تو میں کیوں اس سے ڈروں؟'' اس نے پوچھا: موت آپ سے کیسے ڈرتی ہے؟ فرمایا: مجھے بتاؤ کہ موت وقت سے پہلے آسکتی ہے؟ اس نے کہا: وقت سے پہلے تو نہیں آسکتی، اس کا ایک وقت مقرر ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں جتنا بھی جنگ کے اندر گھستا چلا جاؤں، وہ مجھ سے بھاگتی چلی جائے گی کہ وقت تو آیا نہیں ہے، میں کیسے آسکتی ہوں؟

جی ہاں! جب ایمان اور جذبے سلامت ہوا کرتے تھے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے قیصر و کسریٰ کی طاقتوں کو پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ وہ بے سہارا اور بے اسباب لوگ تھے، لیکن ان کے پاس ایمان تھا۔ آج ہمارے پاس سب کچھ ہے، لیکن ایمان کی دولت نہیں ہے، اللہ کے قرآن سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔

بنی اسرائیل کا جہاد سے انکار:

بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو بڑا سخت جواب دیا۔ بندہ اسے پڑھ کر چونک اُٹھتا ہے۔ لیکن غور کریں کہ کیا آج ہم خود یہی جواب نہیں دیتے؟ انہوں نے بھی کہا تھا کہ جب تک وہ قوم اس بستی کے اندر آباد ہے ہم ہرگز اس میں داخل نہیں ہوں گے، تم جاؤ اور تمہارا خدا جائے اور ان سے جا کر لڑو، ہم یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کریں گے۔ اگر تم داخل ہو گئے اور فتح ہوئی تو ہم بھی آجائیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام کی بے بسی:

موسیٰ علیہ السلام کے سمجھانے کے باوجود جب قوم بالکل نہ مانی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! آپ کے حکم کی اطاعت کے لیے میرا تو ان پر زور نہیں چلتا، قوم کے احوال کو آپ دیکھ رہے ہیں،

پروردگارِ عالم! اب میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ میرا زور زیادہ سے زیادہ اپنی جان پر چلتا ہے یا اپنے بھائی کو کہہ سکتا ہوں، باقی تو پوری قوم میرا کہنا ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! تیری قوم نے میرے حکم کا انکار کر دیا ہے، یہ بیت المقدس میں نہیں جانا چاہتے، بلکہ مصر میں جا کر لذتیں اُٹھانا چاہتے ہیں اور یہ عیش و عشرت اور آرام کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں، لہٰذا ہم ان کو سزا دیتے ہیں کہ یہ چالیس سال تک پھرتے رہیں گے، نہ ان کو مصر کا راستہ ملے گا اور نہ ہی کسی اور شہر کا۔

آج ذرا آنکھیں بند کر کے دیکھو کہ مسلمان لذتیں حاصل کرنے کے لیے کہاں کہاں جاتے ہیں؟ کیا وہاں زیارات ہیں؟ یہ جو اتنے مسلمان مکہ اور مدینہ چھوڑ کر باقی ملکوں میں جاتے ہیں، ایمان سے بتلائیں کہ وہاں حرمین شریفین سے زیادہ کوئی عبادت موجود ہے؟ وہاں ان سے زیادہ مقدس مقامات موجود ہیں؟ نہیں، بالکل نہیں۔ بس ان کی چاہت ہوتی ہے کہ اسلامی ملک کی حدود سے باہر نکل جائیں جہاں ہمیں آزادی ملے، عریانی اور فحاشی ملے اور جہاں ہمیں بے حیائی ملے۔ اور اس پر ہم ماسوائے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آج ہم کہاں گر چکے ہیں۔

وادئ تیہ میں چالیس سال:

موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو چالیس سال کے لیے سزا ملی کہ بھٹک رہے ہیں، مصر جاتے ہیں تو ان کو راستہ نہیں ملتا۔ رات بھر سفر کرتے ہیں، جب صبح کو دیکھتے ہیں تو وہیں کے وہیں ہوتے ہیں۔

اسلام کا نعرہ:

ہم نے جب اپنا ملک بنایا تھا تو اسلام کا نعرہ دیا تھا، لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا نعرہ دیا گیا تھا۔ آخر کون سی چیز تھی جس نے ہندی، سندھی، پنجابی اور پشتو والوں کو اکٹھا کیا تھا؟ یہی وجہ تھی کہ ہم نے اسلام کا نعرہ دے کر ملک حاصل کیا، لیکن جب ہم نے اسلام سے غداری کی تو آج بنی اسرائیل کی طرح چالیس سال نہیں، بلکہ کئی سالوں سے بھٹک رہے ہیں۔ جہاں سے چلتے ہیں وہیں آجاتے ہیں، کوئی منزل ہماری کنارے نہیں لگ سکتی، کوئی کنارہ ہمارا منزلِ مقصود کو نہیں چھو سکتا، کوئی کام ہمارا کامیابی سے نہیں چل سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ ہم نے اسلام کے اس کلمۂ شہادت سے غداری کی ہے۔ یاد رکھو! اگر تمہیں آج بھی منزل ملے گی تو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے سہارے سے ملے گی۔

کمزور اور مضبوط بنیاد؟

جب ہم اپنی بنیاد سے مخلص نہیں ہوں گے تو ہماری عمارت کیسے مضبوط ہوگی؟ وہ عمارتیں کبھی نہیں ٹھہرا کرتیں جن کی بنیاد کمزور ہو۔ ایسی عمارتیں کبھی ہواؤں کے جھونکوں سے تباہ ہو جاتی ہیں اور کبھی معمولی زلزلے انہیں ہلا دیا کرتے ہیں، البتہ جن عمارتوں کی بنیادیں زمین کے اندر داخل ہو چکی ہوں، انہیں کوئی طوفان بھی نہیں ہلا سکتا۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اسلام کو بنیاد کہا ہے: ''بُنِيَ الإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ'' [صحیح بخاری، رقم: ۸] اسلام ایک عمارت کی مثل ہے، اس کی بنیاد کلمۂ شہادت ہے۔

گرمی کے ستائے ہوئے:

بنی اسرائیل کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہم کہاں ہیں؟ اوپر سے صحرا کی گرمی اور اس کی شدت، پینے کے لیے پانی نہیں، کھانے کے لیے کچھ نہیں، بس صحراء میں بھٹک رہے ہیں اور اللہ کے نبی بھی قوم کے ساتھ ہیں۔ جب گرمی نے ستایا، لُو کے تھپیڑے لگے اور صحراء کی ریت جلانے لگی تو اب سب سجدے میں گر گئے اور کہنے لگے: یا اللہ! مہربانی فرمایئے۔

ایمان سے بتلاؤ، آج ہماری یہی کیفیت ہے یا نہیں؟ آج اگر ہمارے اوپر کوئی عذاب آجائے تو کہتے ہیں کہ اذانیں دو، خیراتیں کرو اور بکرے ذبح کرو، تاکہ یہ عذاب ٹل جائے۔ اس وقت اللہ اکبر تمہیں کیوں یاد آگیا؟ تمہیں کیسے نمازیں یاد آگئیں؟

بنی اسرائیل کی رعایت:

اللہ تعالیٰ تو أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْن ہیں، وہ ہماری طرح تو معاملہ نہیں فرماتے، وہ تو اپنی رحمت کا معاملہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: اے موسیٰ! ہمارا فیصلہ تو نہیں بدلے گا، یہ چالیس سال اسی صحراء کے چکر میں رہیں گے، لیکن اگر تمہاری قوم کو رونا آگیا ہے، ندامت آگئی ہے تو ہم ان کی رعایت کر کے ان کے اوپر ایک سایہ کر دیتے ہیں، تاکہ یہ دھوپ کی تکلیف سے بچ جائیں۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر ایک ابر کا سایہ کر دیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۴]

بادلوں کا سایہ:

بعض علماء مفسرین فرماتے ہیں: ''غمام'' کا معنی ہوتا ہے ابر، یعنی بادل۔ اور بعض علماء نے فرمایا: بادل دو ہیں، ایک تو وہ بادل ہیں جو ہمارے سامنے آتے ہیں، یہ تو مون سون ہواؤں سے بنتے ہیں جو پانی کو اُٹھا کر اوپر لے جاتی

ہیں اور اللہ کی قدرت سے وہ پانی بادل بنتا ہے۔ اور ایک وہ ابر ہوتا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ [البقرۃ: ۲۱۰] جب قیامت والے دن اللہ تعالیٰ نزول اجلال فرمائیں گے، جب اللہ تبارک وتعالیٰ تخت پر تشریف فرما کر فیصلے فرمائیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ ابر جس میں اللہ تعالیٰ اپنی شان سے نزول اجلال فرمائیں گے یا جس میں ملائکہ آئیں گے، یہ بادل نہیں ہے، بلکہ اس سے علیحدہ ایک چیز ہے، وہ اللہ کے حکم سے پیدا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے بنی اسرائیل پر جو "غمام" بھیجا گیا تھا وہ یہ بادل نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کے اوپر ایک خاص قسم کا سایہ کر دیا گیا تھا۔

چنانچہ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ ابر بالکل سفید تھا، اس کا سایہ نہایت لطیف تھا اور اس کی چھاؤں اتنی مزیدار تھی کہ ان کی تمام تکلیفیں ختم ہو گئیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۴]

مَن وسلویٰ کا انتظام:

اب بنی اسرائیل نے کہا: اے موسیٰ! اللہ نے یہ کرم تو فرما دیا کہ ہم دھوپ کی شدت سے بچ گئے اور ہمیں پانی بھی ملنے لگ گیا، لیکن کھانا بھی تو چاہیے، کیونکہ بندہ کھانے کے بغیر تو زندہ نہیں رہ سکتا...... اسی پیٹ کے جہنم کو بھرنے کے لیے سب کچھ چھوڑ کر بے چارا بھٹک رہا ہے...... اللہ تعالیٰ نے ان پر مَن وسلویٰ اُتارا۔

"مَن" ایک میٹھی چیز تھی اور اس کے دانے ایسے تھے جیسے دھنیے کے دانے ہوتے ہیں، جسے بعض مفسرین "ترنجبین" بھی کہتے ہیں۔ اور حکیم بھی جانتے ہیں کہ "ترنجبین" ایک چیز ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے دانے ہوتے ہیں۔ اب بھی وہ شاید ملتی ہے۔ کسی آدمی کو مالیخولیا یا سوداء ہو جائے تو بعض اطباء اسی دوا کو پیس کر اس مریض کو سنگھاتے ہیں تو اس کو افاقہ ہو جاتا ہے۔ بہر حال وہ میٹھی چیز کے کچھ دانے تھے، اللہ تعالیٰ نے اسے "ترنجبین" کا نام دیا ہے، اس کی حقیقت اللہ ہی جانتے ہیں۔ چونکہ قرآن مجید اور احادیثِ رسول پاک میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ہے تو پھر ہمیں اپنی طرف سے کوئی چیز معین کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس کے اُترنے کا یہ عالم ہوتا تھا کہ بنی اسرائیل صبح اُٹھتے تھے تو صبح شبنم کے نازل ہونے کے ساتھ ہی ہر آدمی کے اردگرد وہ بھی اُترتی تھی، وہیں بیٹھے بیٹھے وہ اسے اُٹھا کر کھا لیتے تھے۔

"سَلْوٰی" ایک پرندے کو کہتے ہیں۔ بعض علماء نے کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ بٹیر تھا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ بٹیر نہیں تھا، بلکہ بٹیر کے مشابہ کوئی پرندہ تھا۔ بنی اسرائیل ان دانوں کو کھا لیتے اور اس پرندے کو بھون لیتے اور مزے سے کھانا شروع کر دیتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۵۷] ہم نے تمہیں حکم دیا کہ ہم نے تمہیں جو پاکیزہ چیزیں دی ہیں، پاکیزہ رزق دیا ہے۔ کھاؤ کہ اس کے لیے محنت اور مزدوری بھی نہ کرنی پڑے، رزق ڈھونڈنے کے لیے بھی نہ جانا پڑے، شکار کے لیے جنگلوں میں بھی نہ پھرنا پڑے، بٹیر پکڑنے کے لیے جال بھی نہ ڈالنے پڑیں، گندم کے فصلوں اور کھیتوں میں جا کر ساری ساری رات بھی نہ جاگنا پڑے، بلکہ اندھیرا ہو اور بٹیر ہر کسی کے ارد گرد بیٹھے ہوں اور ہاتھ سے پکڑتے جائیں اور بھون کر مزے سے کھاتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اتنی نعمتوں کے بعد بھی جب تم نے ہدایت کا راستہ اختیار نہ کیا اور موسیٰ علیہ السلام کی اتباع نہ کی تو یہ تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

آیات کا ارتباط:

مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مختلف نعمتوں سے نصیحت فرمائی۔ پہلے ان مصائب کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اللہ نے ان کو نجات دی تھی، جیسے فرعون کے مظالم سے اللہ نے ان کو چھڑایا تو اس کا نتیجہ کیا ہے کہ اللہ کا شکر کرو اور اللہ کی طرف لوٹو۔ اب ان آیات میں ان نعمتوں کا تذکرہ فرما رہے ہیں جو خاص بنی اسرائیل پر اللہ نے نازل فرمائیں۔

ویسے تو اللہ کی نعمتیں "لَا تُعَدُّ وَ لَا تُحْصَی" ہیں، لیکن بعض نعمتوں کا اللہ نے ان آیات میں ذکر کیا کہ ان پر سب سے بڑی نعمت یہ بھی ہوئی کہ ہم نے ان پر بادل کا سایہ کر دیا۔

مفسرین کے اقوال:

❁ ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ، حضرت ابی مجلز رحمہ اللہ، حضرت ضحاک رحمہ اللہ اور حضرت سدی رحمہ اللہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ارشاد فرمایا کہ اللہ نے ان کے اوپر بادل کا سایہ کر دیا۔

❁ ...... حضرت حسن رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل صحراء میں تھے، وہاں کوئی سایہ نہیں تھا،

اللہ تعالیٰ نے سورج کی تپش سے بچانے کے لیے بادل کا انتظام فرما دیا۔

❀......ابن جریر رحمہ اللہ نے دیگر مفسرین کا بھی قول نقل فرمایا ہے کہ وہ بادل، موجودہ بادل (جو ہم دیکھتے ہیں، اس) سے زیادہ ٹھنڈا اور زیادہ اچھا تھا۔ وہ ایک خاص بادل تھا کہ اس کے ہونے کی وجہ سے ایک سائے کا بھی انتظام ہوگیا اور دوسرا ٹھنڈک کا بھی انتظام ہوگیا تو ان کی پریشانی ختم ہوگئی۔

❀......حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے بھی اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ ''غمام'' سے مراد یہ بادل نہیں ہے جو تم دیکھتے ہو، بلکہ یہ خاص ''غمام'' ہے جس میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نزول اجلال فرمائیں گے اور یہ ''غمام'' خاص طور پر ان کے لیے تھا اور کسی کے لیے نہیں تھا۔

❀......حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب میدانِ بدر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا تھا: ﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ اَنْ یُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِیْنَ﴾ [آل عمران: ۱۲۴] کہ ہم نے آپ کی نصرت کے لیے آسمانوں سے تین ہزار فرشتے اُتارے ہوئے ہیں۔ وہ فرشتے اس بادل میں تشریف لا رہے تھے۔

❀......حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب تک بنی اسرائیل اس وادئ تیہ میں رہی، وہ بادل ہمیشہ ان پر سایہ فگن رہا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۴، ۹۵]

حضرت العلاء الحضرمی رضی اللہ عنہ کی کرامات:

حضرت العلاء الحضرمی رضی اللہ عنہ کو جب ساتھیوں نے کہا کہ حضرت! آگے تو بہت بڑا دریا ہے اور اس کے بعد یہ عالم ہے کہ اس پر پُل بھی نہیں ہے، نہ ہمارے پاس کوئی کشتی ہے اور نہ ہی کوئی بحری بیڑا، اور پھر دوسری طرف دشمن کی طاقت ہے۔ انہوں نے فرمایا: خدا کے بندو! پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ہم اپنے گھر سے کیوں نکلے ہیں؟ کہنے لگے: اللہ کے دین کے لیے نکلے ہیں۔ حضرت العلاء الحضرمی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ دریا کس کا ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ کا ہے۔ تب انہوں نے دعا مانگی، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھی اور دریا میں اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ چنانچہ سارا لشکر دریا پار کر گیا اور دشمن اس منظر کو دیکھ کر بھاگ گیا کہ جو لوگ دریاؤں سے نہیں گھبراتے...... دریا میں ایسے چل رہے ہیں جیسے سڑک پر چل رہے ہوں...... ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟

ایک دفعہ آئے اور کہا کہ ہم ایک ایسے جنگل میں پھنس گئے ہیں کہ اب میلوں تک پانی کا وجود نہیں ہے اور لشکر کے پاس پانی ختم ہو گیا ہے۔ انہوں نے دو رکعت نماز پڑھی اور ''يَا عَلِيمُ يَا عَلِيُّ، يَا حَلِيمُ يَا عَظِيمُ يَا إِلٰهَ الْعَالَمِينَ!'' پڑھ کر دعا مانگی کہ یا اللہ! ہمیں پانی عطا فرما۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ابھی انہوں نے ہاتھ نیچے نہیں کیے تھے کہ پانی کا چشمہ نکل آیا۔

اسی سے آپ اصحابِ رسول اللہ کی شان کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے چن چن کر ہیرے دیئے تھے۔ ایسے خالص ہیرے تھے کہ جن پر آج تک دشمن چیخ رہا ہے، لیکن کوئی الزام نہیں لگا تا۔ آج تک صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت، صداقت، دیانت، امانت، اخلاص، وفاداری اور قربانیوں کا جو منظر ہے، دنیا اس کی کوئی مثال پیش نہیں کر سکی اور نہ کبھی کر سکے گی۔

مَن وسلویٰ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال:

﴿وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى﴾

''اور اُتارا ہم نے تمہارے اوپر مَن اور سلویٰ۔''

مَن اور سلویٰ سے کیا مراد ہے؟

1 ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ ''مَنّ'' درختوں کے اوپر نازل ہوتا تھا، وہ صبح جا کر وہاں سے لے لیتے تھے اور اس کو کھاتے تھے۔

2 ...... دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ گوند کی قسم کی ایک چیز ہوتی تھی۔

3 ...... حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''مَنّ'' ایک چیز تھی جیسا کہ شبنم گرتی ہے، لیکن وہ ذرا سخت اور گوندھا ہوا ہوتا تھا، اس کے اندر سخت ''رِبّ'' ہوتا تھا۔ ''رِبّ'' شربت سے زیادہ گاڑھا ہوتا ہے، شربت تو قوام میں آ جاتا ہے، لیکن یہ اس سے بھی گاڑھا ہوتا ہے۔ مربہ اور جام کے درمیان میں ایک ''رِبّ'' ہوتا ہے جو ایک خاص شربت ہوتا ہے۔ اس قسم کی ایک چیز تھی جو اُن کے لیے اُتاری جاتی تھی۔

4 ...... حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تازہ تازہ انکار کر چکے تھے اور انہیں یہاں تک کہہ چکے تھے: ﴿يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا

قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ [المائدۃ:۲۴] لیکن جب وادئ تیہ میں کھانے پینے کو کچھ نہ ملا اور تکلیف ہوئی تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آگئے اور کہنے لگے کہ اب ہم یہاں زندہ کیسے رہیں گے؟ ہمارے کھانے کا کیا انتظام ہوگا؟ روٹی کے بغیر کیسے زندہ رہیں گے؟ اللہ پاک نے ان کی غذا کے لیے "مَنّ" اُتارا اور "مَنّ" زنجبیل کی طرح تھی، جو کہ یہاں مشہور چیز ہے۔ وہ درخت کے اوپر برستا تھا جیسے بارش یا برف گرتی ہے۔ وہ اس کو اُٹھا لیتے تھے۔ وہ چیز ایسی تھی کہ رنگت میں بالکل سفید اور مٹھاس میں شہد سے بھی زیادہ میٹھی تھی۔

۵ ...... مفسر رحمہ اللہ نے حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا یہ قول بھی نقل فرمایا ہے کہ "مَنّ" طلوع فجر سے لیکر سورج نکلنے تک اُترتا تھا، یعنی صبح صادق کے وقت وہ گرتا تھا اور سورج نکلنے تک وہ بند ہوجاتا تھا۔ ہر آدمی کو یہ حکم تھا کہ اتنا لے جو اس کو اس دن کے لیے کافی ہوجائے۔ تو ہر آدمی اتنا لے لیتا تھا جتنی اس کی ضرورت ہوتی تھی۔ اگر وہ زیادہ لے لیتا تو وہ ٹھیک نہیں رہتا تھا، خراب ہوجاتا تھا اور اس کے کھانے کے کام نہیں آتا تھا۔ مگر جب جمعہ کا دن ہوتا تھا تو اس دن ان کو حکم ہوتا تھا کہ دو دن کا لے لیں، کیونکہ ہفتے کا دن ان کے لیے حرمت کا دن تھا۔ تو اس دن ان کو اتنی بھی تکلیف نہ کرنی پڑے کہ اپنی غذا کو اُٹھائیں اور غذا کو جمع کریں اور اس کا انتظام کریں۔

۱۱ ...... حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ "مَنّ" جو اُن پر اُتارا گیا، وہ ایک قسم کا شراب تھا۔ وہ ایسے تھا جیسے شہد ہوتی ہے، اس کو وہ پانی میں ملا لیتے تھے اور اس کے بعد اس کو پی لیتے تھے۔

۱۲ ...... حضرت وہب بن منبہ سے پوچھا گیا کہ "مَنّ" کس کو کہتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: بالکل پتلی روئی کے دانے ہوتے ہیں یا ایسے جو چھنی ہوئی چیز ہو۔

۱۳ ...... اور ایک قول یہ بھی آیا ہے کہ ہمارے زمانے میں جو شہد پائی جاتی ہے، گویا کہ وہ اس "مَنّ" کا ایک حصہ ہے، یعنی اس کی لذت اور اس کی مٹھاس اس سے ستر گنا زیادہ اعلیٰ تھی۔

۱۴ ...... اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ وہ بھی ایک قسم کی شہد تھی۔ اُمیہ بن ابی الصلت کے اشعار میں بھی اس کا تذکرہ ہے:

فرأى اللّٰه أنّهم بمضيع
لا بذي مزرعٍ وَ لا مثمورا

فسناها عَلَيْهِمْ غَادِيَاتٍ
وَ يَرَى مِنْهُمْ خَلَايَا وَ خُورًا
عَسَلًا نَاطِفًا وَ مَاءً فُرَاتًا
وَ حَلِيبًا ذَا بَهْجَةٍ مَزْمُورًا

یعنی وہ ایک ایسی جگہ تھے جہاں ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ نہ وہاں کوئی کھیتی تھی اور نہ کوئی آبادی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے صبح کے وقت میں ایسا انتظام کر دیا، ان خالی جگہوں میں سے ان کے لیے ایسا شہد اُتارا جو بہت پسندیدہ تھا اور ایسا پانی جو ٹھنڈا اور تازہ، اور ایسا دودھ جو رونق والا۔ یا مزمور کا معنی ہے: بالکل صاف۔

تو اس نے بھی کہا کہ ''مَنّ'' ایک عسل کی قسم کا تھا یعنی شہد بہنے والا، ''اَلْحَلِيْبُ الْمَزْمُوْر'' صاف دودھ کہ جس کے اندر کسی قسم کی کوئی آمیزش نہ ہو۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام مفسرین کے اقوال تقریباً متقاربۃ المعنی ہیں، لیکن اس کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۵]

بعض علماء نے کہا کہ وہ ''ترنجبین'' کی طرح ایک چیز ہوتی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے دانے ہوتے تھے جیسے دھنیا کا دانہ ہوتا ہے۔ وہ اتنا لذیذ اور اتنا میٹھا تھا کہ اسی کو وہ پانی میں ڈال لیتے تھے اور ان کے لیے وہ خوراک ہو جاتی تھی، جیسے کارن فلاکس وغیرہ چیزیں۔ ان میں سے بعض میں چاولوں کے دانے اور بعض میں گندم کے دانے ہوتے ہیں۔

''مَنّ'' کھانے کا کام دیتی تھی اور ''سلویٰ'' ایک پرندہ تھا۔ بعض نے کہا کہ وہ بٹیر تھا اور بعض نے کہا کہ بٹیر کے مشابہ تھا۔ بعض نے اور بھی اقوال ذکر کیے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حقیقت تو اللہ جانتے ہیں، بس مقصد اتنا ہے کہ اللہ نے ان کے کھانے اور پینے کا انتظام کر دیا بغیر کسی تکلیف اور محنت کے۔ حتیٰ کہ وہ پرندہ بھی ان کے پاس خود بخود آجاتا اور وہ ''مَنّ'' ان کے اوپر خود بخود آ کر گر جاتا۔ سایہ بھی اللہ نے بادل کا خود بخود بنا دیا اور کسی محنت کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''مَنّ'' کے بارے میں مشہور بات ہے کہ اگر اس کو ایسے کھایا جائے تو بڑا لذیذ ہوتا ہے، بڑا مزہ دیتا ہے۔ جیسے آپ حلوہ کھا رہے ہوں اگر پانی میں ملا دیا جائے تو بہترین قسم کی شربت بن جاتی ہے اور

اگر اس کو کسی اور چیز میں ڈالا جائے تو اور لذت پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن فرمایا: وہ یہ نہیں ہے جو ہم پڑھ رہے ہیں، اس کی حقیقت اللہ جانتا ہے۔ اور میں نے پہلے بھی یہ عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں جو مشہور ہے وہ "ترنجبین" ہے اور یہ "ترنجبین" طبیب لوگ اس کو پیس کر دماغ کے امراض میں ان لوگوں کے لیے استعمال کرتے ہیں، جن لوگوں کو مالیخولیا ہو جاتا ہے یا سوداء زیادہ ہو جاتی ہے۔

چونکہ انسان کے اندر مختلف مادے ہیں: بعض میں بلغمی مادہ ہوتا ہے، بعض میں دموی مادہ ہوتا ہے، بعض میں صفراوی مادہ ہوتا ہے اور بعض میں سوداوی مادہ ہوتا ہے۔ جس چیز کا غلبہ ہو جاتا ہے، آدمی پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

چنانچہ اگر سوداوی مادہ کسی پر غالب ہو جائے تو وہ بندہ چھوٹی چھوٹی بات پر لوگوں سے جھگڑنے لگ جاتا ہے، کبھی اپنے آپ کو نقصان پہنچا بیٹھتا ہے، کبھی کوئی چیز اُٹھا کر خود کو مار دیتا ہے، یا پاگلوں کی طرح حرکتیں کرنے لگتا ہے۔

سمجھدار طبیب اس مادے کو کم کرنے کے لیے اس کا علاج کرتے ہیں، تاکہ یہ اعتدال پر آجائے۔ چنانچہ وہ "ترنجبین" کو پیس کر سوداء اور مالیخولیا کے مریض کو سنگھاتے ہیں، تاکہ اس کا یہ مرض ٹھیک ہو جائے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۵]

کھمبی کا پانی:

اس پر دلیل دیتے ہوئے مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں ایک روایت نقل کی ہے، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَ مَاؤُهَا شِفَاءُ الْعَيْنِ.)) [صحیح بخاری، حدیث: ۴۶۳۹]

"کھمبی بھی من کی ایک قسم ہے اور اس کا پانی آنکھوں کی بیماریوں کے لیے شفاء ہے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کبھی غلط نہیں ہو سکتا اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بعد کسی اور نسخے کی ضرورت ہے۔ البتہ بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں یہ کھمبی نکلتی ہے تو کبھی کبھار اس جگہ سانپ، بچھو یا کوئی اور زہریلا جانور اپنا زہر چھڑک دیتا ہے، ایسی کھمبی کا پانی اگر کوئی آنکھ میں ڈالے گا تو اس کا نقصان ہو سکتا ہے۔ اس بات کی احتیاط ضرور کریں، ایسا نہ ہو کہ حدیث پر اعتراض کی نوبت آجائے۔ بعض اطباء ایسا کرتے ہیں کہ بارش کے فوراً بعد جو صاف جگہ ہوتی ہے، وہاں سے اس کو اکٹھا کر کے اس کا پانی نکالتے ہیں، پھر اسی پانی میں سرمہ گھول لیتے ہیں۔

اثمد سرمہ کی افادیت:

ایک سرمہ وہ ہے جو حضور پاک ﷺ استعمال فرماتے تھے، اس کا نام "اثمد" ہے، یہ نسواری رنگ کا ہوتا ہے ہلکا سرخ قسم کا۔ اور جو سرمہ ہم استعمال کرتے ہیں، یہ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ آج کل تو لوگ جھوٹ بول کر ہر سرمے کو "اثمد" کہہ کر بیچتے ہیں، حالانکہ وہ اثمد نہیں ہوتا۔ ہاں اگر کسی معتبر آدمی کے پاس اثمد سرمہ ہو اور اس کو خود بھی پتہ ہو کہ اثمد کیا ہوتا ہے؟ اس سے خرید لیا جائے۔ پھر آپ زمزم اور کھمبی کا پانی اثمد سرمے میں ڈال کر گھول لیں اور آنکھوں میں ڈالیں تو آنکھوں کی تمام بیماریاں ختم ہو جائیں گی ...... ان شاء اللہ! ......

اور یہ کوئی مشکل بھی نہیں ہے۔ آپ کو مکہ، مدینہ میں اثمد بھی مل سکتا ہے اور جب بارش ہو جائے تو میدانِ عرفات میں اور ان وادیوں میں بے انتہاء کھمبی پیدا ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ زمزم نعمتِ عظیمہ بھی ہمارے پاس موجود ہے۔

افطاری کی دعوت:

رمضان المبارک کی بات ہے، افطار کے وقت مجھے ایک آدمی نے کہا کہ میرے ساتھ افطاری کریں۔ میں نے کہا: بہت اچھا...... یہاں کے لوگ سارا سال کھجور کی حفاظت کا اہتمام کرتے ہیں، تاکہ رمضان المبارک میں استعمال کریں۔ اور اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ عرب (مکہ اور مدینہ) میں کھجور اور زمزم کی نعمت عام ہے...... چنانچہ اس نے مجھے مدینہ پاک کی عجوہ کھجور کھلائی اور پھر ایک شربت پلایا، جو کہ بہت مزے کا تھا۔ میں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ دودھ، شہد اور زمزم ہے۔

دودھ، شہد اور زمزم سے شفاء:

- ...دودھ کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: یہ ایک ایسی نعمت ہے کہ جب کوئی پیش کرے تو انکار نہ کرو۔ [ترمذی، حدیث: ۲۷۹۰، بابُ: مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ رَدِّ الطِّيبِ]
- ...شہد کے بارے میں اللہ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا کہ اس کے اندر شفاء ہے۔ [النحل: ۶۹]
- ...زمزم کے متعلق حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ زمزم کا پانی غذا کی غذا ہے اور بیماریوں کی شفاء ہے۔ [مسند البزار، حدیث: ۳۹۲۹]
- ...عجوہ کھجور کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس کے سات دانے صبح کے وقت کھا لے گا،

سارا دن اس پر جادو اور کوئی زہر اثر نہیں کرے گا۔[صحیح بخاری، حدیث:٥٤٤٥، بابُ: العَجوَة]

جوانی جیسا بڑھاپا:

وہ آدمی کہنے لگا کہ میرا یہ معمول ہے کہ رمضان میں ان چیزوں کو اکٹھا کر کے شربت بناتا ہوں اور ساتھ کھجور استعمال کرتا ہوں۔ الحمد للہ! سارا سال نہ بیماری میرے قریب آتی ہے اور نہ مجھے کمزوری لاحق ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جب مجھے دیکھتے ہیں تو حیران ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم بوڑھے ہو، لیکن تمہارے قلب اور اعصاب کی حرکات ایسے معلوم ہوتی ہیں کہ جیسے سولہ سال کے جوان لڑکے ہو۔

بازاری مشروبات کی حقیقت:

عجوہ کھجور اور اس شربت کا اہتمام کرنا کون سا مشکل کام ہے؟ لیکن ہم سے یہ بھی نہیں ہوتا۔ ہمارا تو حال یہ ہے کہ دکان پر جا کر ایسا شربت ڈھونڈیں گے جو باہر کا بنا ہوا ہو۔ اس میں یقیناً حرام شامل ہوگا، زیادہ نہ بھی ہو تو کم از کم پیشاب یا الکحل کا ایک قطرہ ہی ڈال دیا گیا ہو تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟ شراب اور پیشاب میں کیا فرق ہے؟ کوئی فرق نہیں۔ شراب کی ماں الکحل ہے جو بچے جنتی ہے، وہ بھی حرام ہے اور وہ بھی حرام ہے۔ جس میں الکحل یا شراب ایک قطرہ ڈالا گیا ہو، وہ شربت ہم افطار کے وقت پی رہے ہوتے ہیں اور یہ دعا پڑھ رہے ہوتے ہیں: ''أَللّٰهُمَّ إِنِّي لَكَ صُمْتُ وَ بِكَ آمَنْتُ'' کیا ہمارا روزہ ہوگا اور کیا ہمیں ثواب ملے گا؟

سگریٹ سے افطاری:

اور بعض شریف لوگوں کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ سگریٹ سے افطار کرتے ہیں..... اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ...... روزہ تو رکھ لیا، مگر پھنس گئے کہ سارا دن سگریٹ نہیں پی سکتے۔ پھر وہ افطار ہی سگریٹ پہ کرتے ہیں۔ روزہ چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ ان کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ اگر روزہ نہیں رکھیں گے تو یہاں کوئی شکایت کر دے گا۔ ان کے پاس تو الحمد للہ! انتظام ہے کہ جو نماز نہ پڑھے یا روزہ نہ رکھے، یہ اس کو چوبیس گھنٹے میں ٹھیک ٹھاک روزہ دار اور نمازی بنا دیتے ہیں۔

ایسے روزے کا کیا فائدہ؟

آپ نے ایسے کافی سارے لوگ دیکھے ہوں گے جو روزہ میں گالیاں دیتے ہیں، ایسے بھی دیکھے ہوں گے جو روزہ

رکھ کر فلم دیکھتے ہیں اور ایسے روزہ دار بھی آپ نے دیکھے ہوں گے جو کہتے ہوں گے کہ یار! روزہ لگ رہا ہے، ذرا ٹیپ ریکارڈر کے اندر کوئی اچھا سا گانا تو لگاؤ۔ بتاؤ ایسے روزے کا کیا فائدہ؟

بھوکا رہنا مقصود نہیں:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی یہ برائیاں نہیں چھوڑتا، اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ [صحیح بخاری، حدیث: ۱۹۰۳]

روزے کا مقصد؟

روزے کا مقصد تو یہ تھا کہ آدمی اپنے نفس کو حرام سے روکے، اپنی جان کو حرام سے روکے، اپنے دماغ کو حرام سے روکے، اپنی قوتِ شہوانیہ کو حرام سے روکے، شراب اور جماع سے روکے۔ جب اللہ نے اپنی بیوی سے جماع حرام کر دیا تو جو آدمی دوسروں کو دیکھتا رہے گا، اس کو روزہ رکھنے سے خاک فائدہ ہوگا؟

آمدم برسرِ مطلب:

امام بخاری رحمہ اللہ کی نقل کردہ حدیث کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہے، اگر آپ اسی حدیث پر عمل کر لیں تو کسی قسم کے علاج کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

انگریزی تعلیمات سے مرعوبیت:

آج کل انگریز نے ہمیں سبق پڑھا دیا ہے کہ آپ نے سرمہ نہیں پہننا، مرد سرمہ نہیں پہنتے، یہ تو عورتوں کے لیے ہے۔ انگریز نے سرمہ پہننا عیب بنا دیا ہے، مجال ہے کہ کوئی بڑا آدمی سرمہ پہنے، کیونکہ انگریز نے جو منع کیا ہے۔ اور پھر دماغ میں یہ بٹھائی ہے کہ وہ پتھر ہوتا ہے، اس میں سکر ہوتا ہے، اس میں جص ہوتا ہے اور اس میں معدنیات کے اثرات ہوتے ہیں، جس سے آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔

ماضی اور حال کا تقابل:

ایمان سے بتلاؤ! جب تک تمہاری یہ دوائیں نہیں بنی تھیں، جب دنیا میں ہسپتال بھی نہیں بنے تھے، آنکھوں کے معالج نہیں ہوتے تھے، آئی ڈراپس بھی ایجاد نہیں ہوئے تھے، صرف ''سرمہ'' یا پھر ''مصبر'' ہوتا تھا، اس وقت

بیماریاں زیادہ تھیں یا اب زیادہ ہیں؟ جب بھی آنکھیں گرمی سے اُبل جاتی تھیں تو ٹھنڈے دودھ میں کپاس بھگو کر آنکھوں پر رکھ لیتے تھے، آنکھوں کو ٹھنڈک مل جاتی تھی۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے:

بس دماغ میں ایک بات بٹھائی گئی ہے کہ اگر کوئی مرد سرمہ پہن لے تو گویا اس نے عورتوں کی مشابہت اختیار کر لی۔ اور اگر عورت مردوں جیسا کوئی کام کرے تو کہتے ہیں کہ مساوات ہے، عورت اگر مردوں والی حرکتیں کرے تو کہتے ہیں: وہ بھی تو انسان ہے، مرد اور عورت میں کوئی زیادہ فرق تو نہیں ہے۔

بس یہ کہ ایک کو حمل ہوتا ہے اور ایک کو حمل نہیں ہوتا، ایک کو حیض آتا ہے اور ایک کو حیض نہیں آتا، ایک کو نفاس آتا ہے اور ایک کو نہیں آتا، ایک ماں بنتی ہے اور ایک بیٹا بنتا ہے اور ایک شوہر کہلاتا ہے اور ایک بیوی بنتی ہے۔ ان میں بھی کوئی بڑا فرق نہیں ہے، سب برابر ہے...... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ...... جب ہمارے دلوں میں اسلام نہیں ہے تو یہی کہتے رہیں گے۔

اجر ضائع نہیں ہوگا:

ہمارا اجر تو اللہ کے ہاں محفوظ ہے، وہ ضائع نہیں ہوتا، ہماری محنت و دعوت ضائع نہیں ہوتی۔ ہمیں تو یہی حکم ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے تم دعوت دیتے رہو، تاکہ قیامت میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم تک پیغام نہیں پہنچا تھا۔ انبیاء علیہم السلام دعوت دیتے رہے، مگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کی برادری نے کلمہ نہیں پڑھا، اپنے رشتہ داروں نے کلمہ نہیں پڑھا۔

عجوہ اور کھمبی کی فضیلت:

عجوہ کھجور کے بارے میں مفسر رحمہ اللہ نے جو حدیث بیان فرمائی ہے، یہ حدیث صحیح ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ وَ فِيهَا شِفَاءٌ مِنَ السُّمِّ. وَ الْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَ مَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ.))

"عجوہ جنت کے میووں میں سے ہے اور اس میں زہر سے شفا ہے اور کھمبی مَن کی ایک قسم ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لیے شفا ہے۔" [جامع ترمذی، حدیث: ۲۰۶۶، باب: ما جاء في الكمأة والعجوة]

اس میں کوئی شک نہیں کہ عجوہ کھجور جنت سے آئی ہو۔ ہمارے لیے تو مدینہ بھی جنت ہے، لیکن اللہ کے آگے کیا

مشکل ہے، ہوسکتا ہے کہ جب آدم علیہ السلام جنت سے نیچے آئے ہوں تو ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جنت کی چیزیں بھیج دی ہوں۔ بہرحال ''مَنّ'' ایک نعمت تھی اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ وَاللهُ أَعْلَمُ!

''مَنّ'' کے مشابہ اشیاء:

بنی اسرائیل کے زمانے میں ''مَنّ'' ایسی چیز تھی جو بلا کاشت اور بغیر کسی محنت کے خود اُترتی تھی اور غذا کا کام دیتی تھی۔ ہمارے زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی چیزیں زمینوں میں پیدا فرمادی ہیں جنہیں کاشت نہیں کیا جاتا، بلکہ وہ خود بخود نکل آتی ہیں۔ جیسے ''کَمْأَة'' (کھمبی) ہے، اس کو اُگانے کے لیے کبھی کسی آدمی نے ہل نہیں چلائے، کبھی بیج نہیں بوئے، کبھی محنت نہیں کی اور سردی و گرمی سے کبھی اس کی حفاظت بھی نہیں کی، برسات کے موسم میں صحراء کے اندر وہ نکل آتی ہے۔ جیسے یہ اللہ کی نعمت ہے، ایسے اللہ کی ہزاروں نعمتیں ہیں۔

افریقہ کے جنگلات:

چنانچہ افریقہ کے جنگلات میں ایسے عجیب عجیب درخت ہیں جو پہلے نہ کبھی کسی نے دیکھے تھے اور نہ سوچے تھے۔ ان کے عجیب عجیب فوائد اور منافع ہیں کہ آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ پھر ان کے پھل، ان کی شکلیں، ان کے ذائقے اور ان کی لذت بڑی عجیب ہوتی ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ بڑے بڑے ریسرچ سنٹرز مختلف درختوں کے پھلوں پر تجربات کر رہے ہیں اور اس تحقیق میں لگے ہوئے ہیں کہ ان کے اندر کیا کیا چیز ہے کہ جس وجہ سے ان کے اتنے فوائد ہیں۔ جہاں جہاں یہ درخت پائے جاتے ہیں، ان لوگوں نے باقاعدہ ایسے مقامات کو محفوظ کرلیا ہے۔

بلب کی طرح روشن پودا:

اسی طرح ایک پودا پایا جاتا ہے، خدا کی قدرت ہے کہ جب رات ہوتی ہے تو ایسے روشن ہوتا ہے جیسے بجلی کے چھوٹے چھوٹے بلب جل رہے ہوں۔ یہ نہیں کہ معمولی روشنی ہوتی ہے، بلکہ باقاعدہ کافی ساری روشنی ہوتی ہے۔

درختوں کے فوائد پر مشتمل کتاب:

ایک عالم نے کتاب لکھی: ''کشف الاسرار فی فوائد الاشجار'' اس کتاب کا نام ہے۔ اللہ نے درختوں کے اندر کیا کیا منافع رکھے ہیں؟ اور کون کون سی چیزیں اللہ نے اپنی قدرت سے پیدا فرمائی ہیں؟ اس بارے میں انہوں نے مستقل ایک کتاب لکھی ہے۔ اور مختلف ممالک میں پیدا ہونے والے درختوں اور ان کے فوائد و منافع سے لوگوں کو

آگاہ کیا ہے۔

رات کی چاندنی:

ایک ایسی بوٹی بھی اس دنیا میں اللہ نے پیدا فرمائی ہے کہ جس کو دور سے دیکھیں تو آپ کو ایسے معلوم ہو گا جیسے زینت کے لیے چھوٹے چھوٹے بلب لگا کر چاندنی بنا دیئے گئے ہوں۔

قدرت کے کرشمے:

اسی طرح بعض اشجار ایسے ہیں...... اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے...... جنہیں کسی نے کاشت تو نہیں کیا، لیکن ان کے پھلوں میں اتنے فوائد ہیں کہ آدمی پڑھ کے حیران ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے ہیں۔ وہ اپنے وسیع خزانوں سے کوئی ایک نعمت اپنے بندوں کے لیے اُتار دیں تو ان کے آگے کیا مشکل ہے۔

آسمان سے دسترخوان کا اُترنا:

پروردگارِ عالَم بارشیں برساتے ہیں، نباتات اور جمادات پیدا فرماتے ہیں، ان کے لیے ایک خاص نعمت کا اُتارنا کون سا مشکل ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آسمان سے کھانا اُترنے کی دعا مانگی تھی: ﴿اَللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنۡزِلۡ عَلَيۡنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوۡنُ لَنَا عِيۡدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنۡكَ ۚ وَارۡزُقۡنَا وَاَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ﴾ [المائدۃ: ۱۱۴] اللہ تعالیٰ نے آسمان سے دسترخوان اُتار دیا تھا۔ ایسے کئی واقعات ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے خاص بندوں کے لیے اپنی طرف سے نعمتوں کا انتظام فرما دیتے ہیں۔

غیبی مدد:

ایسے واقعات بھی تاریخ میں موجود ہیں کہ ایک چھوٹا بچہ غار میں چھوڑ دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے بکری، ہرنی یا اس قسم کے کسی جانور کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ آ کر اسے دودھ پلایا کرے۔ اللہ تعالیٰ تو قادر ہیں جو چاہیں اپنی نعمتوں میں سے پیدا فرما دیں۔

اڑھائی پتی بوٹی:

آپ کا جو عرفات کا میدان ہے یا اس کے ساتھ جو وادیاں لگتی ہیں اور طائف کی طرف جاتی ہیں، یہاں پر اللہ کی

قدرت سے ایک خاص بوٹی پیدا ہوتی ہے، وہ بڑی نایاب ہے۔

حضرت شیخ حسین علی رحمہ اللہ واں بچھراں کے علاقے کے تھے۔ بہت بڑے مفسر قرآن تھے، ساری زندگی درسِ قرآن دیتے رہے، عمر بھر اللہ کے قرآن کی نشرواشاعت میں مصروف رہے۔ آپ کے ملک کے تقریباً بڑے بڑے سب علماء، قرآن پاک میں ان کے شاگرد ہیں۔ وہ ایک مرتبہ حج پر تشریف لائے تو انہوں نے اس بوٹی کا تذکرہ فرمایا۔ یہ چھوٹی سی بوٹی ہوتی ہے، اس کو "اڑھائی پنی" کہتے ہیں، دو پن اس کے سالم ہوتے ہیں اور ایک پن آدھا ہوتا ہے۔ قدرت کی شان یہ ہے کہ اگر کسی آدمی کو مل جائے اور آدمی اس کے پتے ہی کھالے تو قوت کے لیے اس سے اعلیٰ کوئی چیز آج تک پیدا ہی نہیں ہوئی۔

زخمی بندر اور اس کا علاج:

ایک آدمی نے ہمیں اپنا ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگا کہ میں جنگل میں سفر کر رہا تھا، میں نے دیکھا کہ ایک جھاڑی میں بندر بری طرح پھنس گیا ہے، وہ اتنی سخت جھاڑی تھی، اس کے کانٹے اتنے تیز تھے کہ وہ بندر کی ٹانگوں اور بدن میں گھس گئے تھے۔ بندر چیخ رہا تھا، مگر نکل نہیں پا رہا تھا۔ پہلے تو میں ڈر گیا کہ یہ اتنا بڑا بندر ہے، اگر میں اس کی مدد کروں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے ہی نقصان پہنچا دے۔ لیکن آخر میں بھی انسان تھا، دل میں خیال آیا کہ ایک جانور کو تڑپتے ہوئے، مرتے ہوئے کیسے دیکھوں؟ چنانچہ میں جا کر اپنی لکڑی کے ذریعے بڑے آرام آرام سے کانٹے نکالے اور بندر کو درخت سے چھڑایا تو وہ نکل گیا۔ اس کے بعد میں بڑا خوش ہو گیا کہ چلو ایک جانور کی جان بچ گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ اس بندر نے ایک بوٹی سے جا کر کچھ پتے توڑے، ان کو چبایا اور پھر انہیں اپنے زخموں پر لگانے بیٹھ گیا۔

دیکھیں! بندر کو بھی اللہ نے اس بات کا علم دیا تھا کہ اگر یہ پتے لگالو گے تو تمہارے زخم ٹھیک ہو جائیں گے۔

درآمداتِ جنت

حجرِ اسود:

بعض چیزیں حقیقتاً جنت سے اس دنیا میں آئی ہوئی ہیں، جبکہ بعض کو مجازاً جنت کی چیزیں کہا جاتا ہے۔

حجر اسود کا جنت سے ہونا یقینی ہے، اس کے اندر کوئی شبہ نہیں۔ یہ حقیقتاً جنت کے پتھروں میں سے ایک پتھر ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اسے یہاں بھجوایا گیا اور پھر اس کی حفاظت کی گئی۔ جب طوفانِ نوح آیا اور کعبۃ اللہ کی عمارت گر گئی تو یہاں ایک قلعہ بن گیا۔ اس وقت بھی خدا کی قدرت سے جبل ابی قبیس کے اوپر غار کے اندر اس کی حفاظت کی گئی۔ پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی عمارت بنائی تو اس کو اللہ کے حکم سے پہاڑ سے اُٹھا کر یہاں نصب کیا۔

عصائے موسوی:

اسی طرح بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا عصا...... جس کے بارے میں اللہ نے قرآن میں ذکر فرمایا ہے: ﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَٰمُوسَىٰ ۝ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ ۝﴾ [طٰہٰ: ۱۷، ۱۸]...... بھی جنت کی لکڑیوں میں سے ایک لکڑی تھی اور وہ موسیٰ علیہ السلام کو حضرت شعیب علیہ السلام سے ملا تھا۔ جب شعیب علیہ السلام کے گھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قیام فرمایا اور دس سال تک ان کی بکریاں چرانے کا معاہدہ قبول فرمالیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت شعیب علیہ السلام نے حکم دیا کہ گھر کے اندر لکڑیاں پڑی ہیں، ان میں سے کوئی ایک لکڑی اُٹھالو، تا کہ بکریاں لے جانے میں تمہارے لیے آسانی ہو۔ روایت میں آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام وہ لکڑی خود لے کر آئے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بچی کو حکم دیا کہ اندر سے کوئی عصا اُٹھا کر موسیٰ (علیہ السلام) کو دے دو۔ جب وہ بچی عصا لے کر آئی تو شعیب علیہ السلام نے کہا: یہ تو نہ دو، یہ جا کر رکھ دو، اس کے علاوہ کوئی اور اُٹھا کر دے دو۔ جب اور اُٹھانے کے لیے بھیجا تو وہی عصا واپس آ گیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا: یہ موسیٰ (علیہ السلام) کو نہ دو، اس کے علاوہ کوئی اور دے دو، انہوں نے اس عصا کو پھر لکڑیوں میں ڈال دیا اور موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ کوئی چن لو تو موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسی کو چن لیا۔ پھر شعیب علیہ السلام نے فرمایا: یہ وہ عصا ہے جو آدم علیہ السلام سے ہمارے پاس نقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اس کو جنت سے ساتھ لائے تھے اور پھر اس کے بعد جوں جوں ان کی اولاد آتی گئی، یہ نقل ہوتا گیا، انبیاء علیہم السلام میں چلتے چلتے شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچا، حضرت شعیب علیہ السلام کے بعد وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس جب آیا تو اللہ نے اسے معجزۂ عظیمہ بنا دیا۔

دریائے فرات اور نیل:

روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ دریائے فرات اور دریائے نیل کی اصل بھی جنت سے ہے۔ یہ بھی روایات میں آتا ہے کہ دو دریا (دریائے نیل، دریائے فرات) اور دو نہریں (سیحون، جیحون) ہیں، ان کی اصل بھی جنت سے ہے۔[صحیح مسلم، حدیث:۲۸۳۹]

چونکہ اللہ تعالیٰ جنت اور جہنم کو پیدا فرما چکے ہیں، اس وقت جنت بھی موجود ہے اور جہنم بھی موجود ہے، جنت سے کوئی چشمہ آتا ہے اور ان میں گرتا ہے، ﴿وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝﴾ [ابراہیم:۲۰] اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی اصل جنت سے ہے۔

یہ تو بعض علماء کا قول ہے کہ یہ حقیقتاً جنت کی چیزیں ہیں۔

جبکہ دیگر بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ نہریں اور دریا حقیقتاً جنت سے نہیں نکالے گئے، بلکہ بطور تشبیہ کے کہا گیا ہے کہ ان کی اصل جنت سے ہے۔ اور تشبیہ کی وجہ یہ ہے کہ ان کا پانی اتنا اچھا ہے جیسا کہ وہ جنت کا پانی ہو۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان میں بہنے والا پانی بھی تو بارش کے ذریعے آسمان سے اُتارا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں اللہ نے حکم دیا تھا کہ آسمانوں کے دروازے کھول کر ان سے پانی برساؤ اور زمینوں کو بھی حکم دیا تھا کہ تم پانی نکالو۔ اور جب آسمان سے پانی برسایا گیا تو گویا یہ پانی جنت سے لایا گیا۔

اس میں کوئی اشکال والی بات ہی نہیں کہ جنت سے کیسے پانی آرہا ہے؟ جب اللہ آسمانوں سے بارش برسا سکتے تھے تو وہ اس بات پر بھی قادر ہیں کہ اس میں جنت کا پانی ڈال دیں۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ تشبیہ اور بیان ایک مثال سمجھانے کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ نے اس دنیا میں جو باغات، پھل اور پھول پیدا فرمائے ہیں، یہ تو جنت کے باغات اور پھلوں کے مقابلے میں ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں...... جیسا کہ ہم محاورات میں بھی کہہ دیتے ہیں کہ جی...... ماشاء اللہ!...... آپ نے ایسا باغ لگایا ہے کہ دل خوش ہو گیا، گویا جنت میں آگئے۔ حالانکہ حقیقی جنت تو اور ہے...... ورنہ حقیقی طور پر یہ نعمتیں جنت میں ملیں گی۔ یہاں تو یہ عارضی اور قابل فنا ہیں، یہ تو چند روزہ ہیں، جب دنیا فنا ہو جائے گی تو یہ نعمتیں بھی باقی نہیں رہیں گی۔ اصل نعمتیں عالم آخرت کی نعمتیں ہیں، عالم آخرت کبھی فنا نہیں ہو گا اور اس کی نعمتوں پر بھی زوال نہیں آئے گا۔

عجوہ کھجور:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عجوہ کھجور جنت سے ہے۔[1] اگر اس کو حقیقت پر محمول کیا جائے تو بھی اللہ کے نزدیک یہ کوئی بعید نہیں ہے۔ یا پھر اس کو مجازاً جنت کا پھل کہا گیا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح جنت کے پھل نعمت عظیم ہوں گے، اسی طرح عجوہ کھجور بھی نعمتِ عظیمہ ہے۔ مدینہ منورہ کی تو ہر کھجور نعمت ہے۔ جو چیز بھی مدینہ منورہ کی سرزمین میں پیدا ہوتی ہے ہمارے لیے تو وہ نعمت ہی نعمت ہے، لیکن جس چیز کو خود سرکار دو عالم ﷺ جنت کی چیز قرار دیں تو اس کے نعمت ہونے میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے؟

کھجور کی بے شمار اقسام:

الحمد للہ! تقریباً چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی یہاں کے لوگ کھجوروں کی اقسام جانتے ہیں، وہ یہ بتلاتے ہیں کہ تقریباً تین سو سے اوپر کھجور کی اقسام ہیں جو اس ملک میں ملتی ہیں اور تقریباً ایک سو بیس سے زیادہ اقسام ہیں جو صرف مدینہ منورہ کے علاقہ میں ملتی ہیں...... ماشاء اللہ!......

کھمبی کی فضیلت:

❁......حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بعض صحابہ آپس میں بحث فرما رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ''اَلْكَمْأَةُ جُدَرِيُّ الْأَرْضِ'' (کھمبی زمین کی چیچک ہے)۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اَلْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَ مَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ'' (کھمبی ''مَن'' کی ایک قسم ہے اور اس کا پانی آنکھوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے)۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۰۶۸، باب: ما جاء في الكمأة والعجوة]

❁......حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَ فِيْ يَدِهٖ كَمْأَةٌ'' (حضور اکرم ﷺ ہمارے تشریف لائے تو آپ کے ہاتھ میں کچھ کھمبیاں تھیں)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''هٰذَا مِنَ الْمَنِّ، وَ مَاؤُهٗ شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ'' (یہ مَن کی ایک قسم ہے اور اس کا پانی اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کے لیے شفا بنایا ہے)۔

[مسند أحمد، حدیث: ۱۱۲۳۴]

---

[1] [سنن الترمذی، حدیث: ۲۰۶۸، باب: ما جاء في الكمأة والعجوة]

کیا کھمبی شجرۂ خبیثہ ہے؟

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے آپس میں بحث کر رہے تھے کہ وہ کون سا درخت ہے جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِن فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِن قَرَارٍ ﴿٢٦﴾﴾ [ابراہیم:۲٦] (اور ناپاک کلمے کی مثال ایک خراب درخت کی طرح ہے جسے زمین کے اوپر ہی اوپر سے اُکھاڑ لیا جائے، اس میں ذرا بھی جماؤ نہ ہو)۔ بعض صحابہ کہنے لگے کہ وہ کھمبی ہے، کیونکہ اس کی جڑ نہیں ہوتی۔ بس ایسے زمین پر کھڑی ہوتی ہے، آسانی سے اُکھاڑا جا سکتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے جب یہ سنا تو فرمایا: ''اَلْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَ مَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ'' (کھمبی تو مَن کا حصہ ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لیے شفا ہے)۔

[مسند احمد بن حنبل، حدیث:۹۴٦۵]

کلمۂ خبیثہ سے مراد؟

کلمۂ خبیثہ سے شرک وکفر پر مبنی اور توحید کے مخالف کلمات مراد ہیں، اس کی مثال ایسا خراب درخت ہے جس کی کوئی مضبوط جڑ نہ ہو، بلکہ وہ خود اُگ آئے، اس میں جماؤ بالکل نہیں ہوتا، تھوڑا سا ہوا کا جھونکا آئے تو وہ گر جاتا ہے۔ اسی طرح مشرکین کے عقائد کی کوئی عقلی یا نقلی بنیاد نہیں ہوتی، جب ایک طرف سے تھوڑی سی آزمائش آتی ہے تو دوسری طرف جھک جاتے ہیں۔

شجرۂ خبیثہ سے مراد؟

''شجرۂ خبیثہ'' سے مراد ''تھوہر کا درخت'' ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ قرآن نے ایک مثال دی ہے، کسی درخت کو معین نہیں کیا، اس لیے ہمیں بھی متعین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

شجرۂ طیبہ:

اس کے بالمقابل قرآن مقدس میں ایک شجرۂ طیبہ کی مثال بھی ذکر کی گئی ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ﴿٢٤﴾﴾ [ابراہیم:۲۴] کلمہ طیبہ (کلمۂ شہادت) ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' کی مثال ایسے ہے جیسے ایک پاکیزہ بہترین درخت ہوتا ہے، اس کی جڑیں زمین میں ہوتی ہیں، وہ مضبوط ہوتا ہے اور اس کی شاخیں آسمان کی طرف بلند ہوتی ہیں، اور وہ اللہ کے

حکم سے لوگوں کو کھانے کے لیے پھل بھی دیتا ہے۔

توحید کی رسی:

جب کوئی آدمی توحید پر استقامت اختیار کر لیتا ہے تو گویا اس نے ایک ایسے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو اس کو کبھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ اسی لیے اللہ نے حکم دیا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران: ۱۰۳] اللہ کی رسی کو پکڑو۔ روایات کے مطابق وہ رَسی ''قرآن پاک'' ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم قرآن پاک کو مضبوطی سے پکڑ لوگے تو یہ تمہیں جنت میں پہنچادے گا۔

''سلویٰ'' کون سا جانور تھا؟

❁...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سلویٰ ایک پرندہ تھا جو اللہ نے ان کے لیے بھیجا۔ وہ پرندہ ایسے تھا جیسے بٹیر ہوتا ہے، وہ اس کو کھاتے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۶]

بٹیر کے گوشت کی افادیت:

علم حیوانات کے ماہر علماء نے لکھا ہے کہ بٹیر کا گوشت دلوں کو نرم کرتا ہے، یعنی دل کی شقاوت اور شدت کو نرمی میں تبدیل کرتا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل کے دلوں میں عجیب شقاوت آگئی تھی کہ وہ معجزہ دیکھنے کے بعد بھی کفر کررہے تھے۔ اس لیے ان کو بطور علاج سلویٰ (بٹیر کا گوشت) کھلایا گیا۔

❁...... حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سلویٰ، جنت کے پرندوں میں سے ایک پرندہ تھا، جو چڑے سے بڑا ہوتا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۶]

❁...... حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سلویٰ ایک سرخی مائل پرندہ تھا۔ جنوب سے جب ہوا چلتی تو ہوا ان کو اُڑا کر ان کے پاس لے آتی اور وہ پرندوں کو پکڑ لیتے، اور جتنا انہوں نے کھانا ہوتا، اس کو ذبح کرلیتے۔ اگر اس سے زیادہ رکھتے تو وہ گوشت خراب ہوجاتا تھا۔ یعنی ضرورت سے زیادہ محفوظ کرنے کی ان کو اجازت نہیں تھی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۶، ۹۷]

جائز ذخیرہ اندوزی:

ہماری شریعت میں اس کی اجازت ہے کہ آدمی اپنے گھر میں ہفتے، مہینے یا سال کا خرچ رکھے۔ حضور اکرم ﷺ

بھی اپنی بیویوں کو سال سال کا خرچ اکٹھا دے دیتے تھے، ہر بیوی کو سال بھر کا خرچہ دیا جاتا تھا، لیکن آپ ﷺ کی بیویاں اتنی سخی تھیں کہ وہ ملنے والا نان نفقہ اللہ کے راستے میں خرچ کر دیتی تھیں اور مہینے کے بعد کہتیں کہ ہمارے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ پھر عطا فرماتے اور وہ پھر سخاوت کر دیتیں۔

جاہلانہ توکل:

اس میں بھی اُمت کے لیے ایک سبق تھا کہ آدمی یہ نہ سوچے کہ آج جو کچھ کمایا ہے، وہ کھا لو، کل کو دیکھا جائے گا۔ آج کا مسلمان نماز پڑھتا نہیں ہے اور کہتا ہے کہ مجھے اللہ پر بڑا توکل ہے۔ بھئی! جب تمہاری زندگی میں نماز، روزہ نہیں ہے، دین اسلام تو دور کی بات ہے، اس کی شکل تک تمہارے پاس نہیں ہے تو تم متوکل کیسے بن گئے؟ اگر اللہ پر تمہارا یقین ہوتا تو کیا اللہ کا فرض ادا نہ کرتے؟ اگر تمہارا اللہ پر یقین ہوتا تو کیا اللہ کے عذاب سے نہ ڈرتے؟ اللہ تعالیٰ پر یقین ہوتا تو کیا تم اس کے حکم پر نہ چلتے؟ یہ محض جہالت ہوتی ہے کہ شرابی کبابی لوگ بھی کہتے پھرتے ہیں: جی! ہمارا اللہ پر بڑا یقین ہے، اللہ میاں ہمیں دے گا۔

رزق کا ذمہ دار...... صرف اللہ!!

اللہ کے بندے! غذا تو کتے کو بھی مل جاتی ہے۔ یہ کون سی بہادری ہے؟ اللہ نے جو جانور اس دنیا میں پیدا کیے ہیں، کیا وہ ان کو خوراک نہیں دیتا؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں: ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ [ہود: ٦] جو بھی زمین پر چلنے والی چیزیں ہیں جو ہم نے پیدا کی ہیں: کیڑے ہیں، حشرات ہیں، جانور ہیں، حلال ہیں، حرام ہیں، سب کو ہم رزق دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو جانور گوشت کھاتے ہیں، ان کو روزانہ گوشت مل جاتا ہے، بعض پرندے مچھلی کھاتے ہیں تو ان کو روزانہ مچھلی مل جاتی ہے، بعض جانور صرف جانور کو مار ڈالتے ہیں اور اس کی اوجھڑی نکال کر کھاتے ہیں، بعض جانور ایک قسم کا گھاس کھاتے ہیں اور کوئی شئے نہیں کھاتے تو اللہ تعالیٰ ان کو وہی گھاس عطا فرما دیتے ہیں۔

پہلے نافرمانی...... پھر سرکشی:

یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ آدمی شراب پیے اور کہے کہ میرا اللہ پر توکل ہے، چرس پیے اور اور کہے کہ میرا اللہ پر توکل ہے۔ نماز کبھی پڑھی نہیں اور کہتا ہے کہ خدا پر میرا بڑا یقین ہے۔ خاک یقین ہے تمہیں، جب تم خدا کی نماز ہی

نہیں پڑھتے ہو؟ جب تم اللہ کے فرائض کو بھی ادا نہیں کرتے ہو؟ پھر کہتے ہو کہ حضور اکرم ﷺ ہمارے بڑے شَفِيعُ الْمُذْنِبِين ہیں، وہ قیامت کے دن ہماری شفاعت کریں گے۔ کیا یہ سرکشی نہیں؟ ایک نافرمانی اور پھر اوپر سے سرکشی......!!!

بدعتی، شفاعت سے محروم:

حضور اکرم ﷺ نے خود فرمایا کہ میں حوضِ کوثر پر کھڑا ہوں گا، میری اُمت کے لوگوں کو فرشتے دھکے دے کر دور ہٹا رہے ہوں گے، حوضِ کوثر پر نہیں آنے دیں گے۔ حضور اکرم ﷺ فرمائیں گے: ان کو آنے دو، یہ تو میرے ہیں۔ فرشتے کہیں گے: یارسول اللہ! یہ آپ کی اُمت کے وہ لوگ ہیں، جنہوں نے بدعتیں ایجاد کی تھیں۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں کہوں گا: "سُحْقًا لَهُمْ" (اللہ ان کو برباد کرے) ان کو میرے آگے سے ہٹاؤ، حوضِ کوثر سے دور لے جاؤ۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۶۵۸۴، باب: فِي الحَوْضِ]

جب حضور اکرم ﷺ ایک بدعتی کو پانی پلانے کے لیے تیار نہیں ہیں تو کیا اس کی شفاعت فرمائیں گے؟ جب ایک بدعتی کو حضور ﷺ اپنے قریب نہیں آنے دیں گے تو قبروں پر سجدے کرنے والوں کے لیے شَفِيعُ الْمُذْنِبِين کیسے ہوں گے؟ حضور ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں، مگر ان کے لیے جن کا ایمان و عقیدہ توحید کے مطابق ہے اور وہ اتباعِ سنت کرنے والے ہیں۔ ہاں! جو آپ کی اُمت کے صحیح العقیدہ گناہگار ہوں گے، لازماً ان کے لیے شفاعت ہوگی اور اللہ تعالیٰ انبیاء کی سفارش قبول فرمائیں گے۔

غفور رحیم......جبار اور قہار:

اسی طرح یہ کہنا کہ مولوی لوگ ایسے ہی ڈراتے رہتے ہیں، اللہ بڑا غفور و رحیم ہے، وہ بخشنے پہ آئے تو کافروں کو بھی بخش دیتا ہے۔ جی ہاں! اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ مگر مجھے بتاؤ: جہاں اللہ رحمٰن اور رحیم ہے وہاں قہار نہیں ہے؟ جہاں غفور ہے وہاں "عَزِيزٌ ذُو انْتِقَام" نہیں ہے؟ جہاں غفور ہے وہاں "سَرِيعُ الْحِسَاب" نہیں ہے؟ جہاں غفور ہے وہاں "شَدِيدُ الْعِقَاب" نہیں ہے؟ جب تم نے غفور و رحیم پڑھا ہے تو یہ بھی پڑھو، تب ایمان بنے گا، جب ایمان بین الخوف والرجاء آئے گا۔ صرف اُمیدیں باندھتے چلے جاؤ اور خدا کا ڈر دل میں نہ ہو تو یہ ایمان نہیں کہلاتا۔ یہ تو جاہلوں والی بات ہے کہ جب ایک آدمی سے کہا جائے کہ نماز پڑھو تو وہ جواب دے کہ دعا کرو، اللہ بڑا غفور رحیم

ہے۔ بھائی! اسی غفور نے تو نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ تمہیں اگر اس غفور کی رحمت اور مغفرت پر یقین ہے تو اس کا حکم بھی مانو۔

مثال سے وضاحت:

تم یہاں ایک آدمی کے پاس نوکری کرتے ہو اور بارہ سو یا دو ہزار یا چار ہزار ریال تمہیں تنخواہ ملتی ہے۔ تم دو چار دن کام کرنے نہ جاؤ، ڈیوٹی نہ کرو۔ اور جو آدمی تمہیں ملے اور کہے کہ تم نوکری پر کیوں نہیں گئے؟ تو تم اس کے جواب میں کہہ دینا کہ میرا کفیل بڑا مہربان ہے، مجھے کام کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ایک ہفتہ تجربہ تو کر کے دیکھو! پھر پتہ چل جائے گا کہ وہ کیسے مہربانی کرتا ہے؟ وہ تو یہاں تمہارے پاؤں بھی نہیں لگنے دے گا اور سیدھا گھر پہنچائے گا، اگلی پچھلی کمائی بھی لے لے گا اور کہے گا کہ جو میرا نقصان ہوا ہے، وہ بھی ادا کرو۔

تم ایک بندے کا حق مارتے ہو تو وہ اتنا ناراض ہوجاتا ہے اور جس خالق و مالک نے تمہیں پیدا کیا ہے، تم ہر لمحہ اس کی نافرمانی کرو اور پھر کہو کہ وہ بڑا غفور ہے تو وہ کتنا ناراض ہوگا؟ اس کے غفور ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن ہم بھی تو کچھ حیا کریں، ہم بھی تو اس کی بندگی اور اطاعت کریں۔ ہاں! بندے ہیں، خطا ہوجاتی ہے، وہ غفور اور رحیم ہے، رحم کا معاملہ فرمادے گا۔ لاکھ ہم نیک بن جائیں، پھر بھی کوئی نہ کوئی خطا تو ہو ہی جائے گی۔ لاکھ ہم صالح بن جائیں، پھر بھی کہیں نہ کہیں بندہ غلطی کر بیٹھتا ہے، لاکھ ہم عابد بن جائیں، پھر بھی کچھ نہ کچھ خطائیں ہمارے اندر موجود ہوں گی۔ واقعی! وہ غفور رحیم ہیں، اپنی رحمت سے معاف فرمادیں گے۔

خوف اور اُمید کے درمیان:

یاد رکھیں! ایمان اسے کہتے ہیں کہ سزا کا ڈر ہو اور رحمت کی اُمید بھی ہو۔ صرف ڈر ہو تب بھی ایمان نہیں بنتا اور صرف اُمیدیں لگانے سے بھی ایمان نہیں بنتا۔ ایمان تب ہوگا جب دونوں چیزوں کو سامنے رکھا جائے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اور مجھے بھی ایسا ایمان نصیب کرے۔ (آمین)

بٹیر کے ڈھیر:

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمیں کھانے کے لیے گوشت چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ نے فرمایا: ہم ان کو ایسا گوشت دیتے ہیں جو دنیا میں بہت قلیل

پایا جاتا ہے، بہت قیمتی اور نایاب گوشت ہے۔ چنانچہ اللہ نے ہوا کو حکم دیا تو ہوا نے ان کے گھروں کے پاس آکر بٹیر ایک مربع میل میں بکھیر دیئے، یعنی ایک مربع میل کے اندر غذا ہی غذا ہے اور نیزے اتنا اونچا ڈھیر لگا دیا۔ اور فرمایا کہ اپنی ضرورت کے مطابق لے لو، لیکن انہوں نے ضرورت سے زائد لینا شروع کر دیا۔ جب زیادہ لے لیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ سارے گوشت میں بدبو پڑ گئی اور جو کھانے کے لیے بنایا تھا، وہ بھی خراب ہو گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۷]

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا رزق:

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب مکہ میں تشریف لے آئے تو ان کی ابتدائی غذا زمزم کا پانی تھا، اس کے علاوہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جنگل سے جو پرندے وغیرہ شکار کر کے لاتے تھے، ان پر گزارہ ہوتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گھر تشریف لائے تو ان کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارا کیسا گزارہ ہو رہا ہے؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بیوی نے کہا کہ ہمارا گزارہ تو بڑا مشکل ہو رہا ہے، صرف پانی ملتا ہے یا پرندے ملتے ہیں، جنہیں بھون بھون کر ہم کھا لیتے ہیں، اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں ملتی۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام ناراض ہوئے کہ یہ عورت تو اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتی ہے۔ [الکامل فی التاریخ ۱/ ۳۴]

ہر حال میں شکر کی تعلیم:

یاد رکھیں! ہمیں اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی دے رہا ہے اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ثُمَّ اَلْحَمْدُلِلّٰہِ! گوشت کھلائے تو اَلْحَمْدُلِلّٰہِ اور بھوکا سلائے تو اَلْحَمْدُلِلّٰہِ، روٹی مل جائے تو اَلْحَمْدُلِلّٰہِ! لیکن یہ مقام ملنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اللہ ہمیں صابر بنا دے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک نوجوان کا واقعہ:

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں زندگی میں ایک نوجوان سے جتنا شرمندہ ہوا، کسی سے اور اتنا شرمندہ نہیں ہوا۔ مریدوں نے پوچھا: حضرت! وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: ایک لڑکا جو اٹھتی جوانی کی عمر میں تھا...... بلخ، بخارا کی طرف سے تھا۔ جہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے ہیں، اس سرزمین نے بڑے لوگ پیدا کیے ہیں، اللہ تعالیٰ ان ائمۂ حدیث کی قبور پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے...... میرے پاس آکر بیٹھ گیا اور کچھ دن رہا اور لنگر میں کھا لیتا۔

میں نے ایک دن اس سے پوچھا: آپ کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! اللہ کا شکر ہے۔ پھر اس نے پوچھا: حضرت! آپ کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا: اللہ کا بڑا شکر ہے، مل جاتا ہے تو شکر کرتے ہیں، نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں۔ اس پر وہ نوجوان ہنس پڑا۔ میں نے پوچھا: اللہ کے بندے! ہنستے کیوں ہو؟ اس نے کہا: حضرت! ہمارے علاقے میں کتوں کا بھی یہی حال ہے کہ ملے تو کھا لیتے ہیں، نہ ملے تو چپ چاپ سو جاتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں حیران ہوا کہ یہ تو بہت مرتبے والا آدمی ہے، میں تو اس کو عام نوجوان سمجھتا رہا۔ پھر میں نے پوچھا: تمہارے ہاں جو اللہ والے لوگ ہیں، ان کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: ان کو مل جاتا ہے تو دوسروں کو دے دیتے ہیں اور نہ ملے تو شکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے مولا! آپ ہمیں آزما رہے ہیں، ہمیں نہ ملے تب بھی راضی ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا امتیازی وصف:

اللہ نے قرآن مجید میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ وصف بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دینے والے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر:۹] (اور ان کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے ان پر تنگ دستی کی حالت گزر رہی ہو)۔

ایک صحابی کا ایثار:

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میں سخت حاجت مند ہوں، مجھے کچھ کھلوایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھروں میں آدمی بھیجا، لیکن تمام گھروں سے جواب ملا کہ حضور! ہمارے پاس خود کچھ نہیں۔ یہ معلوم کر کے پھر آپ نے اور لوگوں سے کہا: کوئی ہے جو آج کی رات انہیں اپنا مہمان رکھے؟ ایک انصاری اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: حضور! میں انہیں اپنا مہمان رکھوں گا۔

چنانچہ یہ لے گئے اور اپنی بیوی سے کہا: دیکھو! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں، آج گو ہمیں کچھ بھی کھانے کو نہ ملے، لیکن یہ بھوکے نہ رہیں۔ بیوی نے کہا: آج گھر میں بھی برکت ہے، بچوں کے لیے البتہ کچھ ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں۔ فرمایا: دے دو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان ہے، پہلے اس کو کھلا دوں۔ جب میں روٹی رکھ لوں تو تم طریقے سے دیا بجھا دینا، تاکہ مہمان یہ سمجھے کہ ہم کھا رہے ہیں اور دراصل ہم کھائیں گے نہیں۔ وہ بیچارا یہ نہ سمجھے کہ

گھر والے بھوکے ہیں اور میں کچھ ان کو کھانا واپس کروں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ مہمان نے پیٹ بھر کر کھانا کھالیا۔

صبح جب یہ صحابی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے اور تمہاری بیوی کے رات کے عمل سے اللہ تعالیٰ خوش ہوا اور ہنس دیا۔ پھر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

[صحیح بخاری، حدیث: ۴۷۹۸، باب قَوْلِ اللّٰهِ: وَيُؤْثِرُونَ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ...]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عادت مبارک تھی کہ جب تک گھر میں مہمان نہ آتا تو روٹی نہیں کھاتے تھے۔ اتنے مہمان نواز تھے!! اور اگر مہمان نہ ملتا تو گھر سے نکل جاتے، باہر سے گزرنے والے کسی آدمی کو بلا لیتے کہ آپ میرے ساتھ کھانا کھالیں۔ اور اگر وہ بھی نہ ملتا تو گھر والوں سے کہتے کہ آپ کھالیں، میں نہیں کھاتا۔

اللہ کے فرشتے ان کے پاس آئے، انہوں نے سلام کیا، ابراہیم علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا، ﴿فَرَاغَ إِلٰٓى أَهْلِهٖ﴾ پھر چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گئے، ﴿فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ﴾ [الذاریات:۲۶] اور ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا، تیار کیا، اُٹھا کر مہمانوں کے سامنے رکھ دیا اور فرمایا: کھاؤ۔ انہوں نے کہا: ہم تو نہیں کھاتے۔

"رَاغَ" کا معنی ہوتا ہے: چپکے سے نکل جانا۔ یعنی ان کو پتہ بھی نہ چلنے دیا کہ میں گھر سے تمہارے لیے کچھ لانے جا رہا ہوں، اس خیال سے کہ کہیں یوں نہ کہہ دیں کہ بیٹھیں بیٹھیں! کیوں تکلیف کر رہے ہیں؟ یہ کریم لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے۔

مہمان نوازی اور مغربی تہذیب:

اصل میں مہمان سے پوچھنا، انگریزی تہذیب کا حصہ ہے، اسلام کی تہذیب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مہمان سامنے بیٹھا ہوتا ہے اور پوچھ رہے ہوتے ہیں کہ آپ ٹھنڈا پئیں گے یا گرم؟ آپ چائے پئیں گے؟ آپ کیا پینا پسند فرمائیں گے؟ شریف مہمان تو یہی کہے گا کہ رہنے دو، تکلیف نہ کرو۔

مہمان نوازی اور اسلامی تہذیب:

اسلام یہ کہتا ہے کہ اگر کوئی آدمی تمہارے گھر میں آیا ہے تو اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ بھی

ضروری نہیں ہے کہ تم کھانے پکاؤ اور دعوتیں کرو، بلکہ جو کچھ گھر میں تیار ہو وہی پیش کر دو۔ چائے کا وقت ہو تو چائے پلا دو، گرمی ہو تو شربت پلا دو، کھانے کا وقت ہے تو کھانا پیش کر دو۔ اور اگر ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو تو سادہ پانی ہی پلا دو۔ مہمان خود سمجھ جائے گا کہ اس غریب کے گھر میں یہی کچھ تھا۔ اگر اس کے علاوہ اور کوئی چیز ہوتی تو یہ ضرور مجھے پیش کر دیتا۔

آپ اندازہ لگائیں! انگور کا ایک دانہ بھی کوئی چیز ہے!؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس اگر انگور کا ایک دانہ ہوتا اور باہر دروازے پہ کوئی سائل آ جاتا تو وہ انگور کا دانہ اُٹھا کر اُسے دے دیتے تھے کہ ہمارے پاس تو یہی تھا تم کھا لو۔

نہ تصدیق...... نہ تکذیب:

اسرائیلی روایات کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَا تُكَذِّبُوهُمْ وَ لَا تُصَدِّقُوهُمْ'' کہ جب اہل کتاب تمہارے سامنے کوئی دلیل پیش کریں تو نہ ان کو جھٹلایا کرو اور نہ ہی ان کی تصدیق کیا کرو، بلکہ یہ کہا کرو: ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ...... الآیۃ﴾ [البقرۃ:۱۳۶] جو ہم پر اللہ نے اُتارا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے، اور جو اللہ نے تمہارے انبیاء پر اُتارا ہے اس پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ بنی اسرائیل جتنی روایات کریں گے ہم ان کے بارے میں یہی کہیں گے: ''لَا نُصَدِّقُ وَ لَا نُكَذِّبُ'' (نہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ ہی تکذیب کرتے ہیں)۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۴۴۸۵، بابُ: قُوْلُوْآ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا]

اسرائیلی روایات کا حکم:

علماء نے ایک قاعدہ بیان کیا ہے کہ جو بات آپ کو تورات یا انجیل میں ملے، اگر وہ قرآن اور حدیث مبارک کے مطابق ہو تو آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لو۔ اور اگر وہ قول اللہ کے قرآن یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے خلاف ہو تو اس کو چھوڑ دو۔ کیونکہ جب ایک قول اللہ کے قرآن اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے خلاف ہے تو وہ کبھی سچا نہیں ہو سکتا۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں: یا تو اس میں تحریف کی گئی ہوگی یا پھر وہ منسوخ ہوگا، اس لیے ہم اس کو رد کر دیں گے۔ اور اگر ایسا قول ملا ہے جو قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تصدیق یا تکذیب نہیں کرتا، یعنی محض ایک فائدہ ہے معلومات کا، نہ ہمارے موافق ہے اور نہ ہمارے مخالف ہے تو اس کے بارے میں قاعدہ یہی ہے: ''لَا نُصَدِّقُهُمْ وَ لَا نُكَذِّبُهُمْ'' ہم کہہ دیں گے کہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ البتہ کتابوں میں اسے نقل کر دیں گے،

تا کہ پڑھنے والے کو ایک طرح کا فائدہ حاصل ہو جائے۔

تاریخی معلومات سے علماء کو فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علماء ومفسرین اسرائیلی روایات کو اپنی کتابوں میں افادہ اور استفادہ کی غرض سے لکھ دیتے ہیں، لیکن ان پر سو فیصد اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

بنی اسرائیل کی اکثر روایات مَن گھڑت ہوتی ہیں۔ انہی کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے: ﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا...... الآية﴾ [النساء: ۴۶] لہٰذا جو لوگ اللہ کی کتابوں اور اس کے کلمات کو بدل ڈالیں، ان کے موارد، مفہوم اور معانی کو تبدیل کر دیں، ان کے کسی قول پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت سدی رحمہ اللہ کا یہ بھی قول ہے کہ سلویٰ پرندے چونکہ اللہ نے ان کے لیے خصوصی طور پر بھیجے تھے تو وہ بھی ایسے تھے کہ ان کے قریب آ جاتے، وہ دیکھتے کہ اگر موٹا تازہ ہے تو اس کو پکڑ کر ذبح کر دیتے اور اگر کمزور ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۷]

روزہ توڑنا گوارا نہیں:

ایک صحابی کا واقعہ پڑھ رہا تھا کہ میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر گرے ہوئے تھے اور اُٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ ایک اور صحابی ان کے پاس پہنچے اور پوچھا: پانی وغیرہ چاہیے؟ انہوں نے کہا: ایک تو میری یہ تمنا پوری کرو کہ مجھے پکڑ کر دشمن کے قریب کر دو، تا کہ لیٹے لیٹے دشمن کو ماروں، اور دوسری یہ کہ اگر تمہارے پاس پانی ہے تو میری ڈھال میں رکھ دو، میں اس وقت روزے کے ساتھ ہوں، اگر افطار تک اللہ نے زندہ رکھا تو اسی سے افطار کر لوں گا۔

دیکھیے! اس جان کنی کی حالت میں بھی وہ صحابی روزہ نہیں توڑ رہے ہیں، بلکہ افطاری کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

حقوق العباد کی اہمیت:

ایک آدمی نے حضور اکرم ﷺ کے سامنے کسی عورت کا تذکرہ کیا کہ وہ بہت نفلیں پڑھتی ہے، تہجد پڑھتی ہے، اشراق پڑھتی ہے، اوابین پڑھتی ہے، تلاوتِ قرآن کرتی ہے اور بڑی عابدہ، زاہدہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ بتلاؤ کہ اس کا ہمسائیوں کے ساتھ سلوک کیسا ہے؟ صحابی نے عرض کیا: حضور! اس کے ہمسائے تو سب ناراض ہیں، کسی کو گالی دیتی ہے اور کسی سے لڑتی جھگڑتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے لیے جہنم ہے۔ اس کو نوافل پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اسی طرح ایک دوسری عورت کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ تو صرف فرض نماز اور سنتِ مؤکدہ پڑھتی ہے، کوئی نفل نماز نہیں پڑھتی اور نفلی روزہ بھی نہیں رکھتی، صرف رمضان کے (فرض) روزے رکھتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: اس کا ہمسائی عورتوں کے ساتھ تعلق کیسا ہے؟ صحابی نے عرض کیا: ماشاء اللہ! بڑے اچھے تعلقات ہیں، کسی کے پاس آٹا نہیں ہوتا تو اس کے ہاں آٹا بھیج دیتی ہے، لسی ہو تو وہ بھیج دیتی ہے، دہی ہو تو وہ بھیج دیتی ہے، کسی کے پاس نمک نہ ہو تو وہ بھیج دیتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ جنتی عورت ہے۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۴۹۹۲، باب: الشَّفَقَةِ وَالرَّحْمَةِ عَلَى الْخَلْقِ]

خاوند کو ناراض کرنے والی عورت کے بارے میں وعید:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک عورت ساری رات مصلے پر کھڑی ہے، تہجد پڑھ رہی ہے۔ خاوند نے بلایا کہ میرے پاس آؤ۔ خاوند کی خواہش تھی، لیکن اس نے کہا کہ میں نفل پڑھ رہی ہوں۔ خاوند نے بلایا کہ میری تمنا ہے تو کہا کہ میں ابھی نماز سے فارغ ہوتی ہوں، نماز پڑھ رہی ہوں۔ ایسی عورت کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر خاوند ناراض ہو کر لیٹ گیا تو اللہ کے فرشتے اس عورت پر لعنت کرتے ہیں۔ تمہارے ذمہ پہلے خاوند کی اطاعت تھی، نفل پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟

[صحیح البخاري، حدیث: ۳۲۳۷، باب: إِذَا قَالَ أَحَدُكُمْ: آمِينَ وَالْمَلَائِكَةُ...]

نفلی روزہ کے لیے خاوند سے اجازت لینا:

اس لیے شریعت نے پابند کر دیا کہ کوئی عورت نفلی روزہ نہیں رکھ سکتی، جب تک کہ اپنے خاوند سے اجازت نہ لے کہ میں کل روزہ رکھ لوں؟ یا اگر وہ جانتی ہے کہ میرا خاوند بڑی قوت والا ہے، اس کو کسی نہ کسی وقت دن میں بھی خواہش ہو جاتی ہے تو وہ عورت روزہ نہ رکھے۔

امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی عدالت میں بیوی کا مقدمہ:

حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دربار میں ایک خاوند نے بیوی کے خلاف مقدمہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ امیر المؤمنین! یہ میری بیوی ہے، میرے نکاح کو ٹھیک چھ ماہ گزرے ہیں اور بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ لازمی بات ہے ......نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ!...... یہ عورت میرے نکاح سے پہلے حاملہ تھی، اس نے مجھ سے حمل چھپایا...... کیونکہ کسی

کو دو تین ماہ کے حمل کا پتہ نہیں لگتا، حمل چار مہینے کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ کافی مہینے تک تو پیٹ ظاہر نہیں ہوتا...... انہوں نے کہا کہ حضرت! انہوں نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے اور یہ میرا بچہ نہیں ہے، بلکہ یہ زنا سے پیدا ہوا ہے۔ مہربانی کریں اور میری عورت کو سزا دیں۔

عورت سے پوچھا گیا تو اس نے کہا: امیر المؤمنین! میرا اللہ جانتا ہے، میں ہر قسم کی قسم کھا سکتی ہوں کہ میں نے تو زندگی میں کبھی زنا نہیں کیا، یہ بچہ اسی کا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنی مختصری مدت میں بچہ پیدا ہو؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس بات پر عزم کر لیا کہ عورت کو سزا دی جائے۔ اتفاقاً حضرت علی کو اس مسئلے کے لیے بلایا گیا اور مشورہ لیا...... یہ تو شوریٰ تھی، ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ [شوریٰ:۳۸] کہ جب کوئی مشکل پیش آجائے تو مشورہ کرو۔ اور مشورہ کس سے کرو؟......

بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ جب آئے تو انہوں نے سارا قصہ سنا، خاوند کی باتیں سنیں، عورت کی باتیں سنیں، ان کے جوابات سنے اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے سنی اور پھر انہوں نے کہا کہ اس عورت کو بالکل سزا نہ دیں۔ یہ عورت بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے، یہ بچہ اسی مرد کا ہے۔ یہ خاوند بیچارا غلط فہمی کے اندر مبتلا ہے، کیونکہ اس کے دماغ میں ایک بات بیٹھی ہوئی ہے کہ نو مہینے سے پہلے بچہ پیدا نہیں ہوتا اور بچہ چھ مہینے میں پیدا ہو گیا۔ اس وجہ سے وہ بیچارا اپنی بیوی پر شک کر رہا ہے، حالانکہ قرآن کھول کر پڑھ لو، قرآن کہتا ہے: ﴿وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً...... الآية﴾ [الاحقاف:۱۵] کہ حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے۔ اور دوسری جگہ قرآن میں ارشاد فرمایا: ﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ۖ لِمَنْ أَرَادَ أَن يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ [البقرة:۲۳۳] کہ جو بچوں کو دودھ پلانا چاہیں تو دو سال تک پلائیں۔ ایک طرف آتا ہے کہ حمل سے لے کر دودھ چھڑانے تک تیس مہینے ہوتے ہیں اور دوسری طرف قرآن میں آتا ہے کہ دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے اور وہ چوبیس مہینے ہوتے ہیں۔ تیس سے چوبیس نکالو تو باقی چھ مہینے بچ گئے۔ لہٰذا حمل چھ مہینے کا ہو سکتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب سنا تو فرمایا: یہ تو بالکل ٹھیک ہے، یہ تو اللہ کے قرآن کا مسئلہ ہے۔ اور ان کو کہا کہ جاؤ، عورت ٹھیک کہہ رہی ہے، سچی ہے، چھ ماہ کا بچہ ہو سکتا ہے۔ تو یہ مشورہ اور معاملہ ہوتا تھا۔

[تفسیر القرطبي: ۱۶/۱۹۳، سورة الاحقاف: الآية: ۱۵]

وادیٔ تیہ میں بنی اسرائیل کا قدرتی لباس:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میدانِ تیہ کے اندر ان کے لیے ایسے کپڑے پیدا فرما دیئے جو پھٹتے بھی نہیں تھے اور میلے بھی نہیں ہوتے تھے، یعنی ان پر کوئی میل بھی نہیں چڑھتی تھی۔

علامہ کسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سلویٰ واحد ہے اور اس کی جمع سلاوی ہے۔

﴿كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۚ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۵۷] اللہ تعالیٰ کا یہ حکم کہ میرے پاکیزہ رزق سے کھاؤ۔ یہ اباحت کا حکم ہے تو جب بھوک لگے، ضرورت ہو تو کھاؤ اور اللہ پاک نے جو تمہیں رزق دیا ہے، اس کا شکر بھی ادا کرو، لیکن ان لوگوں نے ظلم کیا، اتنی نشانیاں اور اتنے معجزات دیکھنے کے بعد بھی اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کامل:

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب آپ بنی اسرائیل کے حالات پڑھتے ہیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ساری کائنات سے افضل اصحاب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ ہمیشہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ان کو بڑی بڑی تکلیفیں آئیں، لیکن انہوں نے کبھی اپنے پیغمبر کو تکلیف نہیں دی کہ یارسول اللہ! ہمارے لیے دعا کرو کہ ہمیں پانی ملے، ہمارے لیے دعا کرو کہ ہمیں کھانا ملے، ہمارے لیے دعا کرو کہ بادل کا سایہ ہو جائے، انہوں نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں۔

ہاں! کبھی ایسا ہوا کہ بالکل جب انتہاء کی بھوک کی وجہ سے حد سے زیادہ کمزور ہو گئے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اپنی تکلیف پیش کی تو سب تھوڑا تھوڑا اکٹھا کیا گیا، جو اتنا ہو گیا کہ جتنی جگہ میں بکری بیٹھتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہر آدمی برتن بھرے، سب کے برتن اس کھانے سے بھر گئے۔ اور ایسا بھی ہوا کہ پانی کی قلت ہو گئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی، دعا کے فوراً بعد برساتیں ہو گئیں، انہوں نے پانی بھر لیے۔ اب جب صحابہ رضی اللہ عنہم وہاں سے نکلے تو جہاں پر لشکر تھا، وہیں بادل برستا تھا، اس کے علاوہ نہیں برستا تھا۔

ایسے معجزات ہوتے تھے، لیکن اس کے باوجود بھی صحابہ رضی اللہ عنہم ایسا نہیں کرتے تھے جیسے بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا، بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کامل اتباع کرتے تھے۔

﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ [البقرۃ:۵۹]

"پھر ظالموں نے دوسرا لفظ بدل دیا، اس کے علاوہ جو اُن سے کہا گیا تھا، پھر ظالموں پر ہم نے آسمان سے عذاب اُتارا، اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔"

بنی اسرائیل کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی:

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کا دوسرا واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں ان کو حکم فرمایا تھا کہ تم بیت المقدس میں داخل ہو جاؤ۔ جب تم داخل ہو گئے تو اللہ کی نصرتِ خاصہ تمہارے ساتھ ہو گی۔ لیکن بنی اسرائیل نے حسبِ عادت نافرمانی کی، انکار کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو جواب دے دیا کہ ہم اس میں داخل نہیں ہوتے، کیونکہ اس علاقے میں بہت بڑی جبار اور قوت والی قوم آباد ہے اور ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

موسیٰ علیہ السلام نے انہیں بے حد سمجھایا کہ فتح، شکست، قوت و طاقت پر نہیں ہوتی، یہ ظاہری اسباب ہیں، اصل فتح تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے: ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ [آل عمران:۱۲۶] اللہ چاہے تو ابابیلوں کے ذریعے سے ابرہہ کے لشکر اور بڑے بڑے ہاتھیوں کو مروا دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم یہ کہہ رہے ہو۔ یہ میرے اللہ کا حکم ہے، آپ میرے ساتھ چلیں۔ لیکن انہوں نے کہا: بالکل نہیں، ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ [المائدۃ:۲۴] تم جاؤ اور تمہارا خدا جائے، جا کر لڑو، ہم تو نہیں جاتے۔ اس انکار پر ان کو سزا ملی کہ وادیٔ تیہ کے میدان میں چالیس سال تک بھٹکتے رہے۔

پھر جب گڑگڑائے، روئے تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے درخواستیں کیں۔ اللہ تعالیٰ نے پھر ان پر اپنی نعمتیں نازل فرما دیں اور اس چالیس سال کے عرصہ کے دوران حضرت ہارون علیہ السلام وادیٔ تیہ میں فوت ہو گئے۔

پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی وفات آ گئی تو اب قوم کا شیرازہ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے سپرد ہوا اور وہ بھی اللہ کے نبی ہیں اور شریعتِ تورات کے تابع ہیں۔ یوشع بن نون علیہ السلام نے قوم کو سمجھایا کہ اللہ کے بندو! کچھ عقل سے

کام لو، اللہ نے جو حکم دیا اور موسیٰ علیہ السلام نے آپ لوگوں سے کہا اور تم نے نہ مانا تو چالیس سال تک تم وادیٔ تیہ میں بھٹکتے رہے ہو۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابر کا سایہ بھی کر دیا اور کھانے کا انتظام بھی کر دیا، ورنہ صحراء میں بھٹکتے بھٹکتے مر جاتے۔ اب تم اللہ کے حکم پر کیوں نہیں چلتے اور اللہ کے حکم کے مطابق تم بیت المقدس میں داخل کیوں نہیں ہوتے؟ اب قوم تیار ہو گئی۔

یہ اللہ کی قدرت ہے کہ جب انکار کرنے پر آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی عظیم الشان شخصیت کا انکار کر دیا اور ماننے پر آئے تو جو موسیٰ علیہ السلام کے تابع نبی تھے، ان کی مان لی۔ کہنے لگے: ٹھیک ہے، ہم تیار ہیں۔ چلو اب پوری قوم تیار ہو گئی۔ ان کو حکم ملا کہ بیت المقدس میں داخل ہوں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۸]

﴿قَرْيَةَ﴾ کی تفسیر:

یہاں لفظ ﴿قَرْيَةَ﴾ ہے۔ لفظ ﴿قَرْيَةَ﴾ کا اطلاق عموماً بستی پر، لیکن کبھی کبھی شہر پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ اسی آیت میں ہے۔ یہاں ﴿هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ سے مراد کوئی بستی نہیں، بلکہ ''بیت المقدس'' ہے جو بڑا قدیمی شہر ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے یہ شہر ہے، لیکن اس پر ''قریہ'' کا اطلاق ہوا۔

اسی طرح جب آپ قرآن مقدس میں یوسف علیہ السلام کا قصہ پڑھیں گے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی آئے اور یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین کو روک لیا اور باقی بھائیوں کو واپس جانا پڑا تو ان کے بھائیوں میں سے جو بڑا یہودا تھا، اس نے بھی یہی کہا کہ تم لوگ جاؤ، میں تو نہیں جاؤں گا، میں تو یہیں بیٹھا رہوں گا۔ چونکہ میں نے اپنے ابا سے وعدہ کیا تھا کہ بنیامین کو واپس لے کر آؤں گا، اب ہم اس کو لے کر نہیں جا سکتے تو میں والد کے پاس جھوٹ بول کر کیسے جاؤں؟ میں جھوٹا ہوں، میرا قصور کوئی نہیں۔ اب جب والد آپ سے پوچھیں کہ بنیامین کیوں نہیں آیا تو تم جواب دینا: ﴿وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ﴾ [یوسف: ۸۲] کہ ابا جان! اگر آپ کو ہمارا اعتبار نہیں ہے تو آپ بستی والوں سے پوچھ لیں، جہاں ہم گئے۔

تو اب مصر کوئی بستی تو نہیں تھی، مصر تو ایک بڑا شہر ہے، اس کی ایک تاریخ ہے: ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ [البقرۃ: ۶۱] اگر دنیا کے اندر تہذیب دیکھی جائے تو چند تہذیبیں چل

رہی ہیں، جیسے تہذیب فارس ان کی تہذیب قدیم تہذیب ہے اور اسی طرح تہذیب یونان ہے اور تہذیب مصر ہے۔ یہ دنیا کے اندر بہت قدیم تہذیبیں ہیں اور پھر تہذیب اسلام آئی جس نے آ کر پوری دنیا کے اندر انقلاب برپا کر دیا، تمام دنیا کی تہذیبوں کو بھی ختم کر ڈالا اور تمام دنیا کے طور طریقوں کو بھی مٹا ڈالا اور دنیا کے اندر طریقۂ اسلام نافذ ہوا، ورنہ تہذیب مصر قدیم تہذیب ہے۔

بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہونے کا حکم:

بہر حال بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ بستی میں داخل ہو جاؤ اور کھاؤ پیو، تمہیں اجازت ہے اور جہاں سے چاہو، کھاؤ پیو۔ اور خدا کی قدرت ہے کہ بیت المقدس اور شام کے علاقے کی ظاہری برکات بھی ہیں اور باطنی برکات بھی ہیں کہ وہاں کا موسم، زیتون، انجیر، پھل اور باغات دیکھیں تو آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بڑا بڑا انجیر، زیتون ہوگا اور ایسے ہوگا جیسے اس سے شیرہ بہہ رہا ہو۔ اس لیے اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا کہ ہم اپنے نبی پاک کو جو مسجد حرام سے ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①﴾ [الاسراء:۱] جس کے اردگرد میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں، اپنے نبی کو ہم دکھانا چاہتے تھے، ظاہری برکتیں بھی اور باطنی برکتیں بھی کہ وہاں اللہ کے ہزاروں نبی پیدا ہوئے اور اتنا بڑا مقام ہے کہ جہاں سے میرے پاک نبی ﷺ کو معراج ہوا، اتنا بڑا مقام ہے کہ جس کو قبلہ بنایا گیا۔ اللہ پاک سے دعا کریں کہ اللہ مسجد اقصیٰ پھر مسلمانوں کے قبضہ میں دے دیں۔

اصل بات یاد رکھو کہ اللہ بڑا بے نیاز ذات ہے، دنیا میں تو بادشاہ ہوتے ہیں، اگر ان کے ساتھ آپ کوئی نافرمانی کریں، ان کی حکم عدولی کریں تو وہ کہتے ہیں کہ چلو اس کو دفع کرو، اس کی ہمیں کیا ضرورت ہے؟ یعنی اگر آدمی اپنے بادشاہ، سردار، وڈیرے کی کوئی بات نہ مانے تو وہ کہتے ہیں کہ چھوڑو اس کو، ہم نے اس کے لیے فائدے کے لیے کہا تھا، نہیں مانتا تو دفع ہو جائے، ہمارا کیا بگاڑے گا؟ اور اللہ تو ملک الاملاک ہے، وہ تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے، وہ مالک الملک ہے، جب ہم اس کی نافرمانی کرتے ہیں تو وہ بھی کہتا ہے کہ دفع ہو جائیں، اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں چھین لیتا ہے۔

مسلمانوں کی تباہ حالی:

جب ہم اس کے نافرمان بن جاتے ہیں تو پھر ہمارے لیے تباہی و بربادی آجاتی ہے، معاصی پھیل جاتے ہیں،

معاشرے میں جرائم بے انتہاء ہوجاتے ہیں، زنا عام ہوجاتا ہے، عریانی، فحاشی عام ہوجاتی ہے۔ آپ تاریخ اُٹھا کر عقل سلیم کے ساتھ تدبر اور تفکر کریں کہ سارے عالم اسلام پر نظر ڈالیں کہ جہاں جہاں اللہ کا عذاب ٹوٹا ہے۔ بے حیائی کے دور میں جو عورتیں ہیں ان سے تو شیطان شرماتا ہے، اس لیے قرآن نے کہا کہ شیطان کا مکر کمزور ہوتا ہے اور عورتوں کا مکر بڑا مضبوط ہوتا ہے: ﴿فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا﴾ [النساء: ٧٦] کہ شیطان کا مکر ضعیف ہوتا ہے، وہ میرے نیک بندوں پر نہیں چلتا، لیکن جب عورتوں کے مکر کا ذکر آیا تو فرمایا: ﴿اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ﴾ [یوسف: ٢٨] عورتوں کا مکر ایسا خطرناک ہے کہ یہ بڑے بڑے کو الٹ ڈالتا ہے۔

ایسے بربادی نہیں آتی، بربادی ہمارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے: ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْــَٔـلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [البقرۃ: ١٣٤] ہم ایسے کسی قوم کو نہیں پکڑتے، اللہ نے فرمایا: ﴿فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [التوبۃ: ٧٠] اور فرمایا: ہم نے قومِ نوح کو پکڑا: ﴿فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ [العنکبوت: ١٤] ہم نے ان کو اس حال میں پکڑا کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، حد سے نکل چکے تھے۔ اس لیے قومِ لوط کے بارے میں فرمایا کہ ملائکہ نے آکر کہا: ﴿اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ﴾ [العنکبوت: ٣١] ہم اس بستی کو برباد کرنے کے لیے جارہے ہیں، کیونکہ اس کے رہنے والے ظالم ہیں، حد سے بڑھنے والے ہیں۔

اللہ کبھی کسی قوم کو برباد نہیں کرتے جب تک وہ اپنی بربادی کے اسباب خود پیدا نہ کریں۔ اللہ کا نظامِ فطرت ہے، اس لیے اللہ نے فرمایا: ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِـيْمًا﴾ [النساء: ١٤٧] میرے بندو! اگر تم شکر گزار بن جاؤ، ایمان والے بن جاؤ تو میں تمہیں عذاب دے کر کیا کروں گا؟ تمہیں عذاب دینے میں مجھے کون سا فائدہ ہے؟ اور اللہ تو ارحم الراحمین ہیں۔

آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے بیٹے کو کبھی کوئی آدمی تھپڑ مارے تو کیا آپ برداشت کرتے ہیں؟ بلکہ آپ تو ڈنڈا لے کر بھاگ پڑتے ہیں، مولوی ہو چاہے عالم ہو، اس وقت کچھ یاد نہیں رہتا، پگڑی کہیں پڑی ہوگی، جوتی کہیں پڑی ہوگی، مولانا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر نکلیں گے اور کہیں گے کہ وہ کون ہے جس نے میرے بیٹے کو مارا ہے؟ مولوی صاحب کو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ کس حال میں کھڑا ہوں؟ لیکن اسی بچے کو کبھی تم خود رسیاں باندھ کر

مارتے ہو کہ سکول نہیں جاتا۔ اللہ بھی اپنے بندوں کو کبھی عذاب نہیں دیتے، جب حد سے بڑھ جاتے ہیں تو پھر قہر کا کوڑا برساتے ہیں، اللہ اپنے بندوں کو کبھی عذاب نہیں دیتے۔ اگر بندہ رو پڑے، معافی مانگ لے، اللہ کے دروازے پر آجائے، اللہ معاف کر دیتے ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں: میرا بندہ ہے، انسان ہے، غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جب بندے اپنی بے حیائی پر اُتر جاتے ہیں تو اللہ کے قہر آتے ہیں، اللہ کے عذاب کا کوڑا برسایا جاتا ہے، پھر اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

نمازِ شکر:

تو اللہ نے فرمایا: بستی میں داخل ہو جاؤ اور کھاؤ پیو، مزے کرو۔ اتنا عرصہ تم وادئ تیہ میں رہے، وہاں تمہیں من و سلویٰ ملتا رہا، اب بیت المقدس میں تمہیں ہر چیز ملے گی۔ "رَغَدًا" کا معنی ہے کھلا، وسیع، رچتا بستا ہوا کھاؤ پیو۔

اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ جو آٹھ رکعتیں تھیں، یہ ضحیٰ (چاشت) کی نماز ہے۔ ایک اشراق کی نماز ہوتی ہے، جو سورج نکلنے کے بعد (جب سورج چڑھ گیا تو) پڑھی جاتی ہے۔ اور چاشت کا وقت جب دھوپ زیادہ تیز ہو جائے۔ جیسا کہ عرب مثال دیتے ہیں کہ اونٹ کے بچوں کے پاؤں کو گرمی لگنے لگ جائے، وہ وقت چاشت کا ہوتا ہے (یعنی نو، دس بجے) اور بعض صحابہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے چاشت کی نماز نہیں پڑھی، بلکہ آٹھ رکعات اللہ کے شکر میں پڑھیں کہ میرے مولا! تیرا شکر ہے کہ آج مکہ فتح ہو گیا۔

اسی لیے روایات میں موجود ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جب کسریٰ کو فتح کیا اور بادشاہ کے محل میں داخل ہوئے تو آپ نے بھی کھڑے ہو کر آٹھ رکعتیں اللہ کے شکر میں پڑھیں۔ اس لیے حکم ہے کہ اگر اللہ کوئی نعمت دے تو جھک جاؤ۔ آپ نے دیکھا نہیں ہے کہ جس درخت پر پھل لگا ہوتا ہے تو جھکا ہوتا ہے اور جس درخت کی شاخوں پر پھل نہ ہو تو وہ اکڑ کر کھڑا ہوتا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۹]

اسی لیے آپ تجربہ کر لیں کہ جو برتن خالی ہو تو وہ بہت بجتا ہے، برتن بھرا ہوا ہو تو کم آواز کرتا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو وہ بڑا شور کریں گے کہ ہمارے باپ کے تو دس مربع شلجم کے باغ تھے۔ شلجم کے باغ پتہ نہیں کیسے ہوتے ہیں؟ اور کہے گا کہ ہماری وہاں اتنی بڑی کوٹھیاں ہیں، اگرچہ وہاں رہنے کے لیے ایک جھونپڑی بھی نہ ہو۔ اور جو آدمی بھرا ہوا ہوگا، یہاں بھی بھرا ہوا ہوگا، وہ کہے گا کہ اللہ کا شکر ہے وہاں بھی اللہ نے دیا

اور یہاں بھی الحمدللہ! اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں۔

غزوۂ احزاب کا مختصر تذکرہ:

دیکھیں! ساری کفر کی طاقتوں نے مدینہ منورہ میں جاکر گھیرا ڈال دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے سر سجدے میں ڈالا اور کہا: میرے اللہ! آج کفر کی ساری جماعتیں مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اکٹھی ہوگئی ہیں، ہماری مدد فرما اور ان جماعتوں کو شکست دے دے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ خدا کی شان ہے! جب ہم صبح کی نماز کے لیے اُٹھے تو دیکھتے ہیں کہ سامنے نہ دشمن ہے، نہ ان کا کوئی خیمہ ہے اور نہ فوج ہے۔ ہم حیران ہوگئے۔ اللہ نے رات کو ہوا کو حکم دیا، ہوا چلی اور ان سب کو اُٹھا کر پھینک دیا۔

یاد رکھو! جب تم مسلمان بن جاتے ہو تو اللہ کا وعدہ ہے: ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۹] تم سربلند رہو گے، شرط یہ ہے کہ تم مومن بن جاؤ، ایمان والے بن جاؤ۔ اگر تمہارے اندر ایمان آجائے تو ہوائیں بھی میری ہیں، فضائیں بھی میری ہیں، آسمان و زمین بھی میرے ہیں، میں جس کو حکم جہاں چاہوں دے دوں۔ اس لیے اللہ کے نبی ﷺ نے دعا مانگی:

((اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ، سَرِيْعَ الْحِسَابِ، اَللّٰهُمَّ اهْزِمِ الْأَحْزَابَ، اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَ زَلْزِلْهُمْ))

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۹۳۳، باب: الدُّعَاءِ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ بِالْهَزِيْمَةِ...]

میرے پروردگارِ عالم! آج مدینے کے خلاف پورے احزاب، پوری جماعتیں مقابلہ کے لیے جمع ہیں، ہم خندق کھود کر دفاعی پوزیشن میں ہیں، تاکہ دشمن کا دفاع کرسکیں، ان سے لڑنے کی ہماری طاقت نہیں، آپ ہماری مدد فرمائیں۔ اللہ نے فرمایا: میرے مدنی! گھبراتے کیوں ہو؟ سر سجدے سے اُٹھاؤ اور دیکھو دشمن کدھر ہے؟ ایک صحابی کہتے ہیں کہ اللہ نے ایسی ہوا چلائی کہ گھوڑے، خیمے، بندے سب اُڑ گئے اور جب ہوش آیا تو آنکھوں میں مٹی پڑی ہوئی ہے، ان کو کچھ نظر نہیں آتا۔

ستر ہزار اسرائیلی ہلاک ہوگئے:

﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ﴾ [البقرۃ: ۵۹] انہوں نے وہ لفظ بدل ڈالا جو ہم نے ان کو کہا تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ جب بیت المقدس کے دروازے سے داخل ہونا تو ''حِطَّةٌ'' کہنا۔ اور انہوں نے کہا: ''حِنْطَةٌ''

یعنی گندم کا دانہ۔ انہوں نے...... نعوذ باللہ!...... اللہ کے ساتھ ایک تمسخر کیا کہ اللہ کے حکم کو مذاق میں بدل دیا کہ میں تو معافی نہیں چاہیے، ہمیں گندم چاہیے۔ پھر نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے آسمانوں سے ان پر عذاب نازل کر دیا کہ تم خدا کے حکم کا مذاق اُڑاتے ہو۔ لیکن وہ عذاب ان پر اُترا جنہوں نے یہ ظلم کیا تھا، زیادتی کی تھی، استہزاء کیا تھا، صرف ان پر عذاب آیا۔ اور وہ عذاب یہ تھا کہ اللہ نے ان پر طاعون کی بیماری مسلط کر دی، ایک گھنٹہ میں ستر ہزار بندہ مر گیا۔

﴿رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ رجز، ''عذاب'' کو کہتے ہیں، کیونکہ عذاب بھی بندے مار دیتا ہے۔ اور وہ عذاب ہم نے بنی اسرائیل پر اس لیے اُتارا کہ وہ ہماری حدود سے نکلنے والے تھے کہ جب ہم نے کوئی حکم دیا تو اس کو توڑ ڈالا یا بدل ڈالا تو ہم نے بھی عذاب میں پکڑ لیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۹، ۱۰۰]

قریہ سے کون سا شہر مراد ہے؟

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زیادہ اولیٰ اور اصح یہ ہے کہ ﴿قَرۡیَۃَ﴾ سے مراد ''بیت المقدس'' ہے، جیسا کہ سدی، ربیع بن انس، قتادہ، ابو مسلم اصفہانی اور ان کے علاوہ دیگر مفسرین نے اس بات پر نص کیا ہے کہ ﴿قَرۡیَۃَ﴾ سے مراد بیت المقدس ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: بعض علماء فرماتے ہیں کہ ﴿قَرۡیَۃَ﴾ سے مراد ''اریحا'' ہے۔ جب وہ مصر سے نکلے تھے تو ان کا ارادہ بیت المقدس کو جانے کا تھا اور ''اریحا'' ان کے راستے میں بھی نہیں آتا۔ اس لیے یہ قول بعید ہے۔ اور بعض نے کہا کہ قریہ سے مراد مصر ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول اس قول سے بھی زیادہ بعید ہے۔ اس کو امام رازی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ لیکن صحیح اور راجح قول مفسرین کے نزدیک یہی ہے کہ قریہ سے مراد بیت المقدس ہے، اللہ نے اس میں ان کو داخل ہونے کا حکم دیا۔

جب یہ چالیس سال کے بعد میدانِ تیہ سے نکلے، حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی اور بیت المقدس فتح ہوا تو جمعہ کا دن تھا اور سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ اس وقت قاعدہ یہ تھا کہ اگر جمعہ کے دن کا سورج ڈوب جاتا تو لڑائی بند ہو جاتی تھی۔ یوشع بن نون نے اللہ سے بھی دعا کی اور سورج کو بھی مخاطب ہو کر فرمایا کہ تُو بھی اللہ کی مخلوق ہے اور میں بھی اللہ کی مخلوق ہوں اور میں اللہ کے حکم سے جہاد کے لیے نکلا ہوں اور تُو بھی اللہ کے حکم سے گردش کر رہا ہے، ٹھہر جا۔ تو اللہ نے سورج کو روک دیا، حتیٰ کہ فتح ہو گئی۔

اللہ نے فرمایا کہ اس شہر کے دروازے میں جب داخل ہوں تو اللہ کے لیے سجدۂ شکر کرو کہ اللہ پاک نے مہربانی فرمائی کہ ایک تو بیت المقدس جو تمہارے آباء کی میراث تھی، اللہ نے واپس دلا دی، دوسرا اللہ نے فتح و نصرت عطا فرمائی، اور تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں میدانِ تیہ میں مزید بھٹکنے سے بچا لیا۔

ان نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہونا۔ یا سجدہ کا معنی یہ تھا کہ اللہ کے آگے تواضع اختیار کرو اور متواضع ہو کر اللہ کی نعمتوں کو یاد کرتے ہوئے بیت المقدس کے اندر داخل ہوں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۸، ۹۹]

شہر میں جھک کر داخل ہونے کا حکم:

امام نووی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول مبارک نقل فرمایا کہ اللہ نے حکم دیا کہ جب دروازے سے داخل ہوں تو اس حال میں جیسے رکوع کی حالت ہوتی ہے۔ نماز میں رکوع و سجود ہیں، رکوع کی علیحدہ کیفیت ہے اور سجدے کی علیحدہ کیفیت ہے، لیکن کبھی لفظ رکوع اور سجود بولا جاتا ہے اور اس سے مراد مطلق نماز ہوتی ہے کہ نماز پڑھا کرو۔ اور کبھی لفظ رکوع اور سجود سے مراد تواضع ہوتی ہے کہ اللہ کے لیے تواضع کرو، اللہ کے لیے جھک جاؤ، غرور و تکبر نہ کرو۔ لہٰذا سجدہ سے مراد حقیقی سجدہ نہیں ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ رکوع کے عالم میں جھک کر اللہ کے حکم کے مطابق بیت المقدس کے اندر داخل ہو۔ ایک بڑا دروازہ ہوتا ہے اور ایک اس کے اندر چھوٹا دروازہ ہوتا ہے۔ تو چھوٹے دروازے سے آدمی گزرے تو لازماً جھک کر گزرے گا اور بڑے دروازے کو کھول دو تو سیدھا گزرے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول مبارک یہ بھی ہے کہ تم چھوٹے دروازے سے داخل ہو اور تواضع کے ساتھ داخل ہو، گردن اکڑا کر تکبر کے ساتھ داخل نہ ہو۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کو حکم دیا گیا کہ جب داخل ہوں تو سجدہ کر کے داخل ہوں۔ لیکن رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قول بعید ہے۔

بعض نے فرمایا کہ یہاں لفظ تو سجدے کا ہے، لیکن حقیقی حکم یہ ہے کہ تواضع اختیار کرو۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آدمی سجدے کے بل چلتا رہے۔ اس لیے انہوں نے فرمایا کہ تواضع مراد ہے۔

حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ اس دروازے کا رخ ایسے تھا کہ جھکیں تو قبلہ کی طرف رخ ہوتا تھا۔

حضرت ابن عباس ﷠، حضرت مجاہد ﷫، حضرت سدی ﷫، حضرت قتادہ ﷫ اور حضرت ضحاک ﷫ نے فرمایا کہ اس دروازے کا نام بھی "باب حطة" تھا کہ جس سے گناہ معاف ہوں گے۔ جیسے اللہ نے فرمایا تھا: ﴿وَقُولُوا حِطَّةٌ﴾ کہ تواضع بھی کرو اور زبان پر بھی استغفار ہو کہ یا اللہ! ہماری خطائیں معاف کر، ہمارے گناہ معاف کر، ہماری غلطیاں معاف کر، لیکن بنی اسرائیل ایک طرف سے داخل ہوئے۔

حضرت ابن مسعود ﷜ سے ایک روایت یہ بھی ہے، فرمایا کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ تواضع کر کے داخل ہوں، لیکن وہ اس طرح داخل ہوئے کہ سر کو اونچا کیے ہوئے تھے اور اللہ کے حکم کی مخالفت کی۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ تواضع کے ساتھ داخل ہوں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۹]

اب سجدۂ تعظیمی کسی کے لیے جائز نہیں:

یہاں کوئی مسجد نہیں تھی، بلکہ ایک دروازے سے گزرنا تھا۔ تو پھر کیا یہ دروازہ قبلہ کی طرف تھا کہ آدمی سجدہ قبلہ کی طرف کرے۔ اس لیے اتنے سارے اقوال میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ بات صرف اتنی تھی کہ ان کو حکم ملا کہ تم تواضع اختیار کرو۔ لیکن بعض باطل فرقے، کیونکہ ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ملائکہ نے سجدہ کیا، جیسے یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے اور ان کے والدین نے سجدہ کیا۔ بھائی بیت المقدس میں داخل ہوتے ہوئے بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ سجدہ کرو۔ اس سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ جب نبی کا سجدہ جائز ہے، آدم علیہ السلام کا سجدہ جائز ہے، فتح کرنے کے بعد بیت المقدس میں داخل ہوتے وقت سجدہ جائز ہے تو ہم بھی جب اللہ کے اولیاء کی قبروں پر داخل ہوتے ہیں تو ہم بھی سجدہ کرتے ہیں۔ مقصد تو وہی تواضع ہے، ہم بھی تو عاجزی کر رہے ہیں، اظہارِ عجز کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ان بزرگ بندوں کا احترام کر رہے ہیں۔

اصل میں یہ ساری باتیں صحیح نہیں ہیں۔ ایک بات یاد رکھیں کہ اگر ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تو کس کے حکم سے کیا ہے؟ اللہ نے حکم دیا کہ ﴿اسْجُدُوا لِآدَمَ﴾ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تو اللہ کے حکم سے کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھا تھا کہ ﴿إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۝٤﴾ [یوسف: ۴] اور انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے۔

اس لیے آپ دیکھیں کہ جب وہ سجدہ ہوا تو انہوں نے فوراً یہ کہا: ﴿وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ﴾

اے ابا جان! یہ دیکھیں وہ تاویل نکل آئی جو میں نے خواب دیکھا تھا: ﴿قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا﴾ [یوسف:۱۰۰] میرے رب نے میرے خواب کو سچا کر دیا۔ وہ تو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، ہر بندے کا خواب غلط ہوسکتا ہے، اللہ کے نبی کا خواب کبھی غلط نہیں ہوسکتا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ انبیاء کی اتنی بڑی شان ہوتی ہے کہ ان کی نیند کے عالم میں بھی شیطان تسلط نہیں کرسکتا، اللہ نے ان کو اس سے محفوظ رکھا ہے، اللہ نے ان کو معصوم بنایا ہے۔ اس لیے اللہ کے جتنے پیغمبر ہیں ان کا خواب ایسے ہے جیسے اللہ کی وحی ہو۔

ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ اگر آج آپ خواب دیکھ لیں کہ بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں تو کیا ذبح کریں گے؟ کوئی عالم فتویٰ دے گا کہ خواب کے مطابق جا کر بیٹے کو ذبح کر دو؟ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے پیغمبر ہیں، ان کا خواب ایسے ہے جیسے اللہ کا حکم اور وحی ہو۔ ان کا خواب کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جب انہوں نے کہا: ﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ﴾ اے میرے بیٹے! میں نے خواب دیکھا ہے: ﴿اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى﴾ لیکن اسماعیل علیہ السلام نے جواب دیا: ﴿قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ [الصافات:۱۰۲] اے ابا جان! آپ کر گزرو جو اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے۔ کیونکہ نبی کا خواب تو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

اس لیے اگر کوئی آدمی استدلال کرے کہ جب یوسف علیہ السلام کو سجدہ جائز ہے تو قبر کو سجدہ جائز ہے، آدم علیہ السلام کو سجدہ جائز ہے تو اس کے بیٹوں کو بھی سجدہ جائز ہے، اگر انبیاء کو سجدہ جائز ہے تو اللہ کے اولیاء کو بھی جائز ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ جہاں جہاں سجدہ ہوا ہے وہاں اللہ کا حکم ہے۔

یہاں ﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۵۸] اللہ نے حکم دیا کہ اس بستی کے اندر داخل ہو جاؤ اور ساتھ حکم دیا: ﴿وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ کہ جب تم دروازے سے داخل ہو تو شکر کا سجدہ کرو، تواضع اختیار کرو۔ تو یہ اللہ کا حکم ہے اور ہم جو سجدے سے منع کرتے ہیں وہ بھی اللہ کا حکم ہے: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۭ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝﴾ [فصلت:۳۷] میرے نبی! اپنی اُمت کو بتلا دیں کہ سورج، چاند، ہر چمکنے والی چیز، اونچی، نیچی چیز کو سجدہ جائز نہیں، سجدہ صرف اللہ کے لیے ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سجدۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ممانعت:

اب بعض حضرات فرق کرتے ہیں کہ عبادت کا سجدہ اور ہوتا ہے اور تعظیم کا سجدہ اور ہوتا ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر خود عرض کیا کہ یا رسول اللہ! دنیا کے بادشاہوں کے پاس جب لوگ جاتے ہیں تو ان کو سجدہ کرتے ہیں، آپ تو ہمارے دنیا کے بھی بادشاہ ہیں اور آخرت کے بھی، آپ تو رحمۃ للعالمین ہیں اور آپ تو صرف دنیا میں سردار نہیں، بلکہ آخرت میں بھی تمام انبیاء کے سردار ہیں، آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں...... صحابہ رضی اللہ عنہم نے تعظیم کا سجدہ پوچھا تھا یا عبادت کا سجدہ پوچھا تھا؟ تعظیم کا سجدہ پوچھا تھا کہ لوگ بادشاہوں کی تعظیم کرتے ہیں...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خبردار! اگر کسی کو سجدے کی اجازت ہوتی تو میں عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، لیکن اللہ کے سوا کسی کو سجدے کی اجازت نہیں ہے۔

[سنن أبي داود، حديث: ۲۱۴۰، بابٌ فِي حَقِّ الزَّوْجِ عَلَى الْمَرْأَةِ]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑے ہونے کی ممانعت:

صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تشریف لے آتے تھے تو ہم کھڑے ہو جاتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرما دیا کہ خبردار! میرے آنے پر کھڑے نہ ہوا کریں، ایسے نہ کیا کریں جیسے عجمی لوگ کرتے ہیں کہ سردار آ گیا تو کھڑے ہو گئے، سردار کھڑا ہو گیا تو ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئے، سردار بیٹھ گیا تو ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آ رہے ہوتے اور ہمارا دل کرتا کہ ہم استقبال کے لیے کھڑے ہوں، لیکن ہم ڈر جاتے تھے کہ ہمارے کھڑے ہونے کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پسند نہیں فرمائیں گے، ہمارا مقصد تو تعظیم ہے، لہٰذا ہم بیٹھے رہتے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے اندر آ کر بلا تکلف بیٹھ جاتے۔

[سنن الترمذي، حديث: ۲۷۵۴، مسند أحمد، حديث: ۱۲۵۲۶]

لہٰذا ہمیشہ یاد رکھیں کہ سجدہ چاہے تعظیم کا ہو چاہے وہ عبادت کا ہو، جائز نہیں۔ عبادت بھی تو تعظیم ہوتی ہے۔ جب آدمی اللہ کی عبادت کرتا ہے تو دل میں عظمت پیدا ہو جاتی ہے تو عبادت کرے گا۔ اگر دل میں اللہ کی عظمت ہی نہ ہو تو عبادت کا کیا معنی ہے؟ اس لیے رکوع کے اندر وظیفہ بھی عظمت کا ہے: ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' پاک ہے میرے رب کی ذات! جس کی صفت عظیم ہے، جو عظمتوں کا مالک ہے، جو سراپا عظمت ہے اور جس سے بڑا عظیم کوئی نہیں۔ اس کے بعد جا کر سجدے میں گرتا ہے اور کہتا ہے: ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى'' پاک ہے میرے رب کی ذات! جس کی

صفت جہت علو ہے، جو اعلیٰ ہے، جو عالی ہے، جس کے اوپر کوئی نہیں ہے، جس سے اول کوئی نہیں ہے، جس کے بعد کوئی نہیں ہے اور اے میرے اللہ! تیری بلندیوں کی انتہاء کوئی نہیں اور میری پستی کی انتہاء کوئی نہیں۔ میں نے اپنے چہرے کو مٹی میں ڈال کر تیرے آگے درخواست پیش کر دی ہے۔ پہلے وہ یہ تسبیح کہتا ہے اور اس کے بعد تشہد میں بیٹھتا ہے اور پھر حضور ﷺ پر درود بھیجتا ہے اور اس کے بعد دعائیں کرتا ہے۔

فتوحات پر بھی تواضع فرمانا:

حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ فتح دیتے تو آپ پر تواضع کا غلبہ ہو جاتا۔ جیسے آپ نے جب مکہ فتح کیا اور آپ ﷺ جب مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے گردن جھکا لی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی گردن اونٹنی کو لگ رہی تھی اور پھر حضور اکرم ﷺ نے آٹھ رکعات نماز ادا کی، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اسی کو صحابہ نے ہمیشہ کے لیے لازم پکڑا کہ جب بھی کوئی ملک فتح ہوتا تھا تو شکرانے کے نوافل پڑھتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کسریٰ کے محل میں داخل ہوئے تو انہوں نے بھی آٹھ رکعات نماز ادا کی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۹]

﴿قُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ کی تفسیر:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ﴿حِطَّةٌ﴾ کا معنی ہے کہ تم استغفار کرو کہ اے اللہ! ہمارے گناہ بخش دے، ہمارے گناہ گرا دے۔ تو مطلب یہ ہے کہ استغفار کرتے ہوئے داخل ہو اور دوسری روایت میں ہے کہ اس کا معنی یہ ہے، یہ امر حق ہے جو اللہ نے تم کو کہا ہے، اس کو پورا کرو۔

حضرت عکرمہ نے کہا ہے: ﴿حِطَّةٌ﴾ کا معنی یہ ہے کہ جب تم داخل ہو تو سجدہ بھی کرو اور کلمہ طیبہ بھی پڑھتے رہو۔

امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی کو خط لکھا کہ ﴿قُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ کا کیا ترجمہ ہے؟ انہوں نے لکھا کہ اللہ نے حکم دیا تھا کہ تم اپنے گناہوں کا بھی اقرار کرتے جاؤ کہ اے اللہ! ہم گناہ گار ہیں، ہم سے خطا ہوئی، اگر ہم پہلے آپ کے حکم کو تسلیم کر لیتے تو چالیس سال پہلے بیت المقدس میں داخل ہو جاتے، لیکن ہم نے انکار کیا تو ہمیں سزا ملی۔

حضرت حسن رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اے پروردگار عالم! ہم سے ہمارے گناہوں کو گرا دے۔ ﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۵۸] اللہ نے حکم دیا

کہ اگر تم لوگوں نے اس طرح عمل کیا جس طرح اللہ نے حکم دیا ہے تو اللہ پاک کا وعدہ ہے کہ تمہارے گناہ معاف کر دیں گے، تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے، اللہ تعالیٰ اور بھی نعمتیں اپنی رحمت سے زیادہ عطا فرمائیں گے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۸]

ایک کافر کا تلوار سونتنے کا واقعہ:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے آقا ﷺ آرام فرما رہے تھے کہ ایک دیہاتی چھپتے چھپتے آیا اور حضور اکرم ﷺ کی تلوار مبارک جو درخت سے لٹکی ہوئی تھی، اس کو کھینچ کر ننگا کیا، اتنے میں حضور اکرم ﷺ کی آنکھ کھل گئی تو اس نے کہا: "مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي؟" بتلاؤ کون ہے جو تمہیں میری تلوار سے بچائے؟...... اب صحابہ بڑے دور تھے، وہ دوڑتے بھی تو دشمن تلوار کا وار کر دیتا۔ تلوار مارنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟...... حضور اکرم ﷺ نے بڑی بہادری کے ساتھ تین بار فرمایا: "اَللّٰهُ!" میرا اللہ مجھے بچائے گا۔ کافر ڈرا، ہاتھ کانپا اور تلوار گر گئی۔ حضور اکرم ﷺ نے اُٹھالی اور فرمایا: "مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي؟" اب بتلاؤ تمہیں کون بچائے گا؟ اس نے کہا: اب مجھے کون بچائے گا؟ وہی جو آپ کا خالق ہے، آپ تو سخی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جاؤ۔

[صحيح البخاري، حديث: ۴۱۳۵، باب: غزوة ذات الرقاع]

حالانکہ حضور اکرم ﷺ اس سے بدلہ بھی لے سکتے تھے، کیونکہ وہ تو حضور اکرم ﷺ کو قتل کرنا چاہتا تھا، لیکن اللہ نے حضور اکرم ﷺ کو بچا لیا۔

اس لیے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے کبھی اپنی جان کا بدلہ نہیں لیا۔ کسی نے اگر حضور اکرم ﷺ کو تکلیف پہنچائی تو آپ نے معاف کر دیا۔ دین کے معاملہ میں نرمی نہیں فرمائی، صحابہ کے معاملہ میں نرمی نہیں فرمائی، اسلام کے معاملہ میں نرمی نہیں فرمائی، لیکن کسی نے اگر حضور پاک ﷺ کو ذاتی نقصان پہنچایا تو اس کو معاف کر دیا۔ دیکھا نہیں کہ ایک ظالم نے زہر دے دیا، لیکن حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اپنا بدلہ میں نہیں لیتا۔ البتہ صحابہ شہید ہوئے تو ان کا بدلہ لیا گیا۔

اس لیے یہ اصل بہادری ہوتی ہے کہ اللہ تمہیں غلبہ دے دے، اللہ قوت دے دے اور دشمن ذلیل ہو کر تیرے سامنے آ جائے تو پھر کہے کہ جاؤ تجھے چھوڑ دیا، جاؤ کوئی بدلہ نہیں لیتے، تم سے خدا بدلہ لے گا تو اس سے بڑا بدلہ کوئی نہیں۔ یہ اتنا بڑا بدلہ ہے کہ اگر حیا والا دشمن ہو تو ساری زندگی سر نہیں اُٹھا سکے گا، لیکن حیا نہ بھی ہو تب بھی اللہ بدلہ

لینے پر قادر ہیں۔

صلوٰۃِ چاشت:

اس لیے فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ مکہ میں ''ثنية العليا'' کی جانب سے داخل ہوئے اور اس کے بعد آپ ﷺ نے آٹھ رکعات نماز پڑھی۔ بعض نے کہا کہ وہ چاشت کی نماز تھی اور بعض نے کہا کہ یہ فتح کی خوشی کی نماز تھی۔ اس لیے بعض علماء نے فرمایا کہ ہر بادشاہ اور ہر امیر کو چاہیے کہ جب اللہ اس کو کسی شہر میں فتح عطا فرمائیں تو وہ بھی آٹھ رکعتیں پڑھیں، جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کسریٰ کو فتح کیا تو آپ نے بھی آٹھ رکعتیں نماز پڑھی۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ وہ آٹھ رکعتیں کیسے پڑھی جائیں؟ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ دو دو رکعتوں پر سلام پھیرتا جائے، چار دوگانے پڑھے گا تو آٹھ ہو جائیں گی۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ پڑھتا جائے اور آٹھ کے بعد ایک ہی دفعہ التحیات پڑھے اور سلام پھیرے۔

لیکن یاد رکھیں کہ افضل یہ ہے کہ اگر دن میں کوئی نماز ہو تو دو دو رکعت پڑھی جائیں، زیادہ ثواب ہے۔ اور رات کی نماز ہو تو چار چار رکعت اگر ملا کر پڑھی جائے تو زیادہ ثواب ہے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ جب تہجد پڑھتے تھے تو صحیح حدیث مبارک کے اندر آتا ہے کہ آپ ﷺ تہجد کی آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ چار چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: صحابی! تم یہ نہ پوچھو کہ وہ نماز کیسے ہوتی تھی؟ وہ تو محمد عربی ﷺ کی نماز تھی کہ کتنی لمبی قراءت تھی، کتنا لمبا رکوع تھا، کتنا لمبا سجدہ تھا اور کتنا حسن تھا اس نماز کے اندر؟

[صحيح البخاري، حديث:۱۱۴۷]

اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ اگر اللہ آپ کو رات کو توفیق دے تو چار چار رکعتیں اکٹھی پڑھیں، دن کو اگر نوافل پڑھنے کی توفیق دے تو دو دو رکعت پڑھیں۔ ویسے اکٹھا پڑھنا بھی جائز ہے۔

بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمیاں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ جب بیت المقدس میں داخل ہوں تو تواضع اور عاجزی سے داخل ہوں، لیکن وہ گھسٹ گھسٹ کر داخل ہونے لگے۔ اور اللہ نے حکم دیا کہ ﴿حِطَّةٌ﴾ کہتے ہوئے داخل ہونا، لیکن وہ کہنے لگے: ''حَبَّةٌ فِي شَعْرَةٍ، حَبَّةٌ فِي شَعْرَةٍ''...... کیونکہ جب آدمی کے

دماغ میں سرکشی اور انکار آجائے تو وہ اللہ کے حکم کو صحیح طریقہ سے نہیں مانتا۔ جیسے آج کل بھی لوگ شعائر اسلام کا مذاق بناتے ہیں۔ جب اللہ کسی قوم سے ناراض ہوتے ہیں تو وہ قوم اللہ کے حکم کا مذاق بناتی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے کہ کفار کو "شجرۃ الزقوم" سے کھلایا جائے گا تو ابو جہل نے کہا: اچھا! زقوم تو یہ ہے کہ مکھن میں شہد ملاؤ۔ تو وہ زقوم ہوتا ہے۔ تو وہ اپنی نوکرانی کو کہتا تھا: "زَقِّمِینَا" کہ مکھن اور شہد لے آؤ۔ اس کے ساتھی آکر بیٹھ جاتے تو وہ "تَزَقَّمُوا" کہ کر مذاق اُڑاتے تھے۔ ان کا مقصد اللہ کے قرآن، اللہ کے حکم کا مذاق اور تمسخر اُڑانا تھا۔

[روح البیان: ۷/۲۶۵، الصافات: الآیۃ: ۶۴]

رَاعِنَا اور رَاعِیْنَا میں فرق:

حضور اکرم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے یہودی کہتے تھے: "رَاعِیْنَا" ہمارے چرواہے۔ حالانکہ لفظ "رَاعِنَا" تھا کہ ذرا توجہ کرو۔ تو وہ اس کو کھینچ کر کہہ دیتے تھے: "رَاعِیْنَا" یہ تو ہمارا چرواہا ہے اور کہتا ہے کہ میں نبی ہوں، کیسے مان لیں؟

یہ کافروں کی پرانی عادت ہے کہ جن لوگوں پر اللہ کا غضب آتا ہے وہ اللہ کے الفاظ، اللہ کے احکام، اللہ کے اوامر کو بدل دیتے ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں اپنے دین پر قائم رکھے۔

﴿وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾﴾ [البقرۃ: ۶۰]

"اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا: اپنے عصا کو پتھر پر ماریں تو اس سے بارہ چشمے بہہ نکلے، ہر قوم نے اپنے گھاٹ کو پہچان لیا۔ اللہ کی روزی سے کھاؤ اور پیو اور ملک میں فساد نہ مچاتے پھرو۔"

بنی اسرائیل سے خطاب کا طرز:

ان آیات میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ اور ان میں یہ بات تھی کہ وہ پڑھی لکھی قوم تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں بہت ساری آیاتِ مبارکہ میں اہل کتاب کے ساتھ کچھ رعایات فرمائی ہیں، جیسا کہ قرآن مقدس کے اندر یہ بات موجود ہے کہ اگر اہل کتاب کوئی جانور ذبح کریں تو وہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے۔ اسی

طرح قرآن مقدس نے یہ بھی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی مسلمان بحالتِ مجبوری کسی کتابیہ یعنی اہل کتاب کی عورت سے نکاح کرنا چاہے تو جائز ہے۔ اسی طرح اللہ نے قرآن مقدس میں یہ بھی ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَھْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [العنکبوت:۴۶] کہ اہل کتاب سے اگر کوئی بات ہو تو ان سے ایسا جھگڑا نہ کرو، ایسی سخت گوئی نہ کرو جو مشرکین کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اگر ان سے کبھی مجادلہ ہو تو احسن طریق سے ہو، یعنی ان کو اسلام کی دعوت دی جائے اور بڑے احسن انداز میں بات کی جائے۔ اور اگر اہل کتاب کوئی ایسی بات بھی کریں تو ان کے جواب میں سختی کی بجائے نرمی کی جائے۔ تو ان ساری آیاتِ مبارکہ میں انہی بنی اسرائیل سے خطاب ہے جو اہل کتاب ہیں۔

منافقین اور کافروں کے خطاب میں وجہ فرق:

بعض مستشرقین یا ہندو ذہنیت رکھنے والے لوگ یا سوشلسٹ قسم کے جو نوجوان ہوتے ہیں، وہ ان باتوں سے بڑے عجیب قسم کے تاثرات پھیلاتے ہیں کہ جب ہندو بھی کافر ہے، ابوجہل بھی کافر ہے، کعب بن اشرف بھی کافر ہے، مشرکین میں سے اگر مشرک ہے وہ بھی کافر ہے، اور یہود بنی اسرائیل میں سے کوئی ہے تو بھی کافر ہے، لیکن بعض کافروں سے اسلام نرمی برت رہا ہے اور بعض کافروں سے سختی برت رہا ہے۔ تو اسلام کے خلاف یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب مشرکین مکہ کی باری آتی ہے تو قرآن ان کو مخاطب کرتا ہے: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝﴾ [الکافرون:۱،۲] اسی طرح قرآن پاک نے مکہ کے بعض مشرکوں کے بارے میں اتنے سخت الفاظ بھی استعمال فرمائے ہیں: ﴿عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝﴾ [القلم:۱۳] کہ سرکش وغیرہ۔ اور اہل کتاب کے بارے میں یہ رعایت کیوں کی جا رہی ہے؟

دراصل یہ اعتراضات محض اپنے دماغوں کی اختراعات ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ورنہ ایک بڑی واضح بات ہے جس کے اندر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی کا مخاطب اگر جاہل ہو تو خطاب علیحدہ ہوتا ہے اور عالم ہو تو خطاب علیحدہ ہوتا ہے، یعنی اگر آپ اپنے ملک میں جائیں اور کسی اَن پڑھ آدمی سے آپ کا واسطہ پڑ جائے، جاہل آدمی سے آپ کا واسطہ پڑ جائے، آپ اسی کے مزاج کے مطابق جب تک بات نہیں کریں گے تو تب تک وہ بات سمجھ نہیں سکیں گے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ معراج کا جلسہ تھا اور شاہ جی پنجاب کے کسی ایسے

علاقے میں تقریر فرما رہے تھے جہاں ٹھیٹ قسم کے یعنی بالکل غیر تعلیم یافتہ، دیہاتوں کا دور دراز علاقہ تھا، جہاں پڑھے لکھے لوگوں کی کوئی نسبت بھی نہیں تھی، یعنی سو میں سے کوئی ایک پڑھا ہوا ہو۔ پنجابی زبان بولنے والے تھے، اس کے علاوہ نہ اُردو سمجھتے تھے اور نہ ان کے پاس کوئی تعلیم تھی اور آگے اتنا بڑا خطیب کھڑا ہے جو ہندو پاک کا مایہ ناز خطیب تھا، زبان جس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوتی تھی اور جو فصاحت و بلاغت میں اپنا مقام رکھتے تھے۔

حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معراج کا جلسہ تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا بیان تھا تو جیسے مجھے اللہ نے توفیق عطا فرمائی، میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج بیان کیا کہ ایک رات کے بعض حصے میں اللہ پاک نے اتنے بڑے عجائبات دکھلائے کہ رات بھی ختم نہ ہو، یعنی مکہ مکرمہ سے بیت المقدس کا سفر، پھر سات آسمانوں کا سفر، پھر سدرۃ المنتہیٰ تک کا سفر، انبیاء سے ملاقات، اللہ کے دربار میں نمازوں کی بخشش کے لیے بار بار حاضری اور پھر واپس آنا کہ رات کا حصہ بھی نہ گزرے تو اس پر میں بات کر رہا تھا کہ اللہ کا نظام ہے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری چلی تو اللہ نے زمین و آسمان کی گردش کو روک دیا، اللہ نے ہر چیز کو روک دیا کہ میرے نبی کے معراج کی گھڑی ہے۔

فرماتے ہیں کہ میں اس انداز میں بیان کر رہا تھا تو اب میں نے دیکھا کہ لوگوں میں کوئی جذبہ، شوق، کوئی تجسس اور ان کے چہروں پر کوئی خوشی نہیں کہ میری بات سمجھ رہے ہوں۔ تو میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی بات ضرور ہے! یا تو یہ سارے کا سارا مجمع میرا مخالف ہے یا پھر ان کو میری بات سمجھ نہیں آ رہی کہ میں اُردو میں بات کر رہا تھا اور سامنے ٹھیٹ پنجابی بولنے والا۔ اور اُردو بھی جو دہلی اور لکھنو کی دھلی ہوئی زبان ہو، عام اُردو بھی نہیں تھی۔ تو میں نے اندازہ لگایا کہ ان کو میری بات سمجھ نہیں آ رہی۔ تو میں نے پنجابی کی طرف رخ موڑا کہ میں جو بات کہہ رہا ہوں کوئی تہاڈے پلے آندی پئی اے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔

شاہ جی کہتے ہیں کہ فوراً میرے دماغ میں آیا اور میں نے کہا: جب میرا نبی اوپر گیا، ''تیرے لونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہل ڈک لیے'' تو ان کے نعرے لگ گئے۔ ان کو سمجھ آ گئی کہ بخاری کیا کہنا چاہتا ہے۔ تو لوگ واہ واہ کرا ٹھے اور نعرے پر نعرہ، اور شاہ جی زندہ باد اور پتہ نہیں کیا کچھ ہو گیا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ جب بات ان کو سمجھ میں آئے گی تو وہ بیچارے بات کریں گے۔

لوگوں کی سمجھ کے مطابق بات کرو:

جب جاہل سے بات کی جائے تو اس کی عقل کے مطابق بات کی جاتی ہے اور جب ایک پڑھے لکھے سے بات کی

جائے تو اس کی عقل کے مطابق کی جاتی ہے۔ اور شریعت کا یہی حکم ہے: "كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ"[1] کہ تمہارے سامنے جو مخاطب ہوتے ہیں تو بات ایسے انداز میں کرو کہ کم از کم ان کے پلے میں بھی کوئی نہ کوئی بات پڑ جایا کرے۔

اب لازمی بات ہے کہ مشرکین مکہ جاہل تھے، ان کے پاس نہ کتاب ہے اور نہ علم ہے، نہ ان کے پاس کوئی دین ہے اور نہ کوئی مسئلہ ہے، وہ خالص مشرک تھے، بت پرست تھے، اپنی زندگی بتوں کی عبادت میں گزارنے والے تھے، شراب، ڈاکے، قتل، خونریزیوں میں زندگی گزارنے والے تھے، تو ایسی قوم کو تو اسی انداز میں جھنجھوڑنا تھا۔ اور جب حضور اکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو سامنے کی بات ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں، ان کے پاس پڑھے لکھے لوگ ہیں، علماء ہیں۔ پھر ان مشرکین کے پاس تو کوئی اصل نہیں ہے، یہودیوں کے پاس تو اصل ہے کہ وہ خدا کو مانتے ہیں، اپنے نبی کو مانتے ہیں، آخرت کو مانتے ہیں اور وہ اللہ کی اُتاری ہوئی کتاب تورات کے بارے میں ایمان رکھتے ہیں۔ ان کی اصل ہے اور مشرکین کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں تھی۔

یادرکھیں کہ جب آدمی کے درمیان میں مثلاً: دس نمبروں کا جھگڑا ہو اور دس نمبر تیرے میرے ایک ہی نہ ہوں تو آپس میں صلح ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر دس نمبروں میں چار یا پانچ نمبر ایسے ہیں کہ ان پر میری اور آپ کی گفتگو کا اتفاق ہوسکتا ہے تو باقی پانچ پر صلح ہونے کا امکان ہوسکتا ہے۔ اور جہاں دس پر ہی بات نہ ہوسکتی ہو تو کہاں صلح ہوگی؟

اہل کتاب کو اس لیے کہا گیا: ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ [آل عمران:۶۵] اے اہل کتاب! آؤ تمہارے اور ہمارے درمیان توحید کا مسئلہ مشترک ہے، تم خدا کو مانتے ہو اور ہم بھی خدا کو مانتے ہیں، تم بھی بتوں کی عبادت نہیں کرتے اور ہم بھی بتوں کی عبادت نہیں کرتے اور تم بھی لات وعزیٰ کو نہیں مانتے اور ہم بھی لات وعزیٰ کو نہیں مانتے تو اس بات پر آؤ، ہم آپس میں بیٹھ کر بات کریں۔

اہل کتاب کا ذبیحہ کیوں حلال کیا گیا؟ ذبیحہ کے اندر ایک قاعدہ کلیہ یاد رکھ لو: ﴿فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [الانعام:۱۱۸] جس جانور پر ذبح کرنے کے وقت اللہ کا نام لیا جائے وہ جانور حلال

[1] [الآداب الشرعیۃ: ۲/۳۴۹]

ہوجاتا ہے، ﴿وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ...... الآية﴾ [الانعام:۱۲۱] اور جس جانور پر ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لیا جائے تو وہ جانور حرام ہوجاتا ہے۔

ذبیحہ کیوں حلال اور میتہ کیوں حرام؟

وہ کیا ہے کہ نام لینے سے کیوں حلال ہوجاتا ہے اور نام نہ لینے سے کیوں حرام ہوجاتا ہے؟ اس پر غور کریں۔ وجہ یہ ہے کہ موت وحیات دینے والا اللہ ہے تو جب جانور کو ہم ذبح کررہے ہوتے ہیں تو گویا ظاہری طور پر اسباب کی حد تک، مجاز کی حد تک اس جانور کی زندگی کو ہم ختم کررہے ہوتے ہیں اور اسے ہم موت دے رہے ہوتے ہیں، حالانکہ اس کا مالک حقیقی اللہ ہے۔ جب ہم نے اللہ کا نام لے لیا تو یقین ہوگیا کہ اصل موت دینے والا تو مولا ہے، میرے ہاتھ میں تو بس عارضی طور پر چھری ہے تو میں تو عارضی طور پر ایک اسباب کی حد تک چلا رہا ہوں، ورنہ حقیقت میں مالک تو اللہ ہے۔ جب اس نے یہ اعتراف کیا تو اسی مالک کے نام پر اس جانور کو موت آئی تو حلال ہوگیا۔ تو جب اللہ کا نام نہ لیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ ایک قسم کا شرک آیا کہ اگر خدا مار سکتا ہے تو میں بھی مار سکتا ہوں۔ کیا ضرورت ہے کہ اللہ کا نام لوں؟ اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جانور حرام ہوگیا۔

کیونکہ بعض کافر اعتراض کرتے تھے کہ اگر جانور خود مر جائے تو وہ مسلمانوں کے نزدیک حرام ہے اور اگر جانور کو یہ خود ذبح کرکے ماردیں تو وہ حلال ہے۔ جو خدا مار ڈالے وہ ان کے نزدیک حرام ہوجاتا ہے اور جو بندہ مار ڈالے وہ ان کے نزدیک حلال ہوجاتا ہے۔ کیونکہ جو جانور مر گیا ہے، اس کو آخر اللہ نے مارا ہے، کسی بندے نے تو نہیں مارا ہے۔ اس میں بھی وجہ یہ ہے کہ مرنے کے وقت اس پر اللہ کا نام لینے والا کوئی نہیں تھا، اس لیے وہ حرام ہوگیا ہے اور یہ اس لیے حلال کیا گیا کہ ہم نے نہیں مارا، ہم نے تو کہا: بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ ﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝﴾ [الانعام:۱۶۲، ۱۶۳]

یہود و نصاریٰ عورتوں سے شادی کیوں جائز ہے؟

ہمیشہ یاد رکھیں کہ اہل کتاب کا ذبیحہ بھی اللہ کے نام پر تھا اور اہل کتاب کی اگر کوئی عورت گھر میں آئے وہ اللہ کو بھی مانتی ہوگی۔ اور ہمارے نبی کو نہ مانے، لیکن اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتی ہوگی یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتی ہوگی اور آنے کے بعد مسلمانوں کی زبان سے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی شان میں وہ اچھی باتیں سنے گی

کہ یہ مسلمان تو ان کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول تھے، کلیم اللہ تھے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ نے باتیں کیں اور اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بڑے بڑے معجزات عطا فرمائے تو وہ سوچے گی کہ یہ تو ہمارے مذہب کے قریب ہیں۔ اور اگر وہ نصرانی لڑکی ہے تو عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں مدح وثنا سنے گی تو اس کا اسلام کے قریب آجانا ممکن ہے۔ لیکن جو مشرک ہے، جس کا توحید پر بھی جھگڑا، قیامت میں بھی جھگڑا ہے، کوئی ایک نمبر بھی نہیں ہے جس پر ہماری آپس میں صلح ہو سکے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرو جو معاملہ کسی دوسرے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ایک ہے متفق طور پر کفر کا فتویٰ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں، وہ یہودی ہو یا نصرانی ہو، جب تک ہمارے آقا ﷺ کا کلمہ نہ پڑھیں، وہ کافر ہیں۔ اس لیے کہ جب ہم ان کے نبیوں کو مانتے ہیں اور وہ ہمارے نبی کو نہ مانیں تو ایک نبی کا انکار گویا تمام انبیاء کا انکار ہے۔ اس لیے ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں، لیکن ان کے ساتھ نرمی سے معاملہ کیا جائے گا، ان کے ساتھ بات عالمانہ انداز میں کی جائے گی۔ اس لیے اب آپ دیکھیں کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو جو حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں موجود ہیں یہ تو اس وقت بھی موجود نہیں تھے جب موسیٰ علیہ السلام کا دور تھا، اللہ نے فرمایا:

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ﴾ [البقرة: ۴۷] اے عبداللہ کے بیٹو! اے یعقوب کے بیٹو! میرے چنے ہوئے انسان کی اولاد! میری نعمتوں کو یاد کرو۔

اسی طرح اللہ نے ان کی تفصیلات قرآن میں فرمایا کہ ہم نے تم پر نبوت کا دروازہ کھول دیا کہ چار ہزار نبی تم میں پیدا کیے، ہم نے تم پر یہ نعمت کی کہ تمہیں اس زمانے کے لوگوں سے افضل بنا دیا، ہم نے تم پر نعمت کی کہ تم میں بادشاہ پیدا کیے، ہم نے نعمت کی کہ تم میں ایسا پیغمبر بھیجا جس کے ساتھ اللہ نے خود کلام فرمایا۔ اور فرمایا: میری نعمتیں یاد کرو کہ میں نے تمہیں دشمن کے عذاب سے چھڑایا، فرعون کے عذاب سے چھڑایا، وہ تمہارے لڑکوں کو قتل کر دیتا تھا، تمہاری بچیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ اس کے بعد کہ اس دشمن کو تمہارے سامنے دریا میں غرق کر دیا اور تم کو دریا سے نکالا۔ ان تمام نعمتوں کی تفصیل آپ پہلے پڑھ چکے ہیں، آخر میں آپ نے پڑھا کہ اللہ نے حکم دیا کہ تم بیت المقدس میں داخل ہو جاؤ اور قوم عمالقہ کے ساتھ مقابلہ کرو، ان کے خلاف جہاد کرو۔ اور یہ بھی ہمارا وعدہ تھا کہ جہاد کرو گے تو نصرت وفتح تمہاری ہوگی۔

جب بھی انبیاء علیہم السلام کو جہاد کا حکم ملتا ہے تو فتح بھی ملتی ہے:

اور ایک قاعدہ یاد رکھو کہ جس پیغمبر کو اللہ نے جہاد کا حکم دیا ہو کہ فلاں کفار کے ساتھ مقابلہ کرو تو یاد رکھو کہ اللہ پھر اس نبی کی حفاظت فرماتے ہیں، وہ نبی شہید نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے حکم دیا اور پھر نبی شہید ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مدد تو نہ آئی کہ اللہ نے اپنے نبی کو خود حکم دیا کہ مقابلہ کرو، اور جب نبی مقابلہ پر جائے تو خود قتل ہو جائے۔ اس لیے اس نبی کو جس کو جہاد کا حکم دیا گیا ہو، اس کو کبھی کوئی کافر تکلیف نہیں پہنچا سکتا، اللہ تعالیٰ کی نصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور جن جن انبیاء کو جہاد کا حکم اپنے زمانہ میں نہیں ملا، ان میں سے بعض اپنی قوم کے ہاتھوں شہید ہوئے ہیں، تا کہ اللہ تعالیٰ ان کو مراتب علیا پر یہ درجہ بھی عطا فرما دیں کہ اللہ کے راستے میں جام شہادت نوش کر گئے، جیسا کہ قرآن میں آتا ہے: ﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ [البقرۃ:٦١] کہ لوگوں نے انبیاء کو ناحق یعنی ناکردہ گناہوں میں قتل کر ڈالا۔

تو یہ قاعدہ اور سنۃ اللہ ہے جب اللہ حکم دیں گے تو اللہ مدد بھی کریں گے: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ [غافر:٥١] تحقیق پکی بات ہے کہ ہم اپنے رسولوں کی مدد کرتے ہیں، ہم ان کی اعانت کرتے ہیں، اور جب اللہ کی مدد شامل حال ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت مقابلہ نہیں کر سکتی۔

لیکن اللہ نے فرمایا: اے بنی اسرائیل! تم یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے تمہیں جہاد کی دعوت دی تو تم اکڑ گئے، تم نے کہا کہ ہم بیت المقدس میں داخل نہیں ہوتے، اس کے اندر تو بڑی جبار قوم ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کی مدد کا وعدہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ پتہ نہیں مدد میں دیر لگ جائے اور ہم مارے جائیں۔ اور اتنی سخت بات کہہ دی: ﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ [المائدۃ:٢٤] تم اور تمہارا رب جا کر قتال کرو۔ اس حکم کی نافرمانی کی پاداش میں ہم نے تمہیں میدانِ تیہ میں رکھا کہ اگر تم میرے نبی کا حکم نہیں مانتے ہو تو بھٹکتے رہو۔

یاد رکھو کہ جو قومیں اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرتی ہیں وہ بھٹکتی رہتی ہیں، وہ کبھی منزل مقصود کو نہیں پا سکتیں۔ منزل مقصود کے ملنے کا راستہ یہی ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے راستے پر آ جائیں۔

معمولی غلطی پر بڑا نقصان:

اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مقدس جماعت کوئی نہیں۔ نہ ہوئی ہے اور نہ پیدا ہوگی۔ صحابہ آسمانِ

نبوت کے چمکتے ہوئے تارے ہیں۔ صحابہ میرے اللہ کے نبی کے پیارے ہیں، صحابہ وہ ہیں جن کو اللہ نے اپنے نبی کے لیے چن لیا۔ لیکن انہوں نے بھی جب ایک غلطی کی جنگ احد کے موقع پر تو مسلمانوں کو شکست ہوگئی اور شکست بھی فتح ہونے کے بعد ہوئی، یعنی فتح ہو چکی تھی، کفر ہار گیا تھا، کفر کی طاقت کی کمر ٹوٹ چکی تھی اور کفر بھاگ رہا تھا، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے چند افراد سے اجتہادی خطا ہوگئی کہ انہوں نے سمجھا کہ اس درے پر قائم رہنے کا اس وقت تک حکم تھا جب تک ہمیں خطرہ ہو۔ اب تو دشمن بھاگ گیا، اب ہم کیوں کھڑے رہیں؟ تو خالد بن ولید نے پہاڑ کے پیچھے سے حملہ کیا اور مسلمانوں کی فتح، شکست میں بدل گئی اور اس جنگ میں ستر صحابہ شہید ہوئے۔ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی عزیز شہید ہوئے، صحابہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے اور میرے پاک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک میں خود کا کنارہ گھس گیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اونچی جگہ کھڑے تھے اور آپ نیچے بیٹھے اور پیچھے کو گرے تو کافروں نے اعلان کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شہید ہو گئے۔ اتنی بڑی شکست ہوگئی۔ وجہ یہ تھی کہ صرف ایک بات میں غلطی ہوگئی۔

اور جو نبی کا کوئی کہنا بھی نہ مانے، انہیں کامیابی کیسے مل سکتی ہے؟ جن کے قول میں بھی نافرمانی ہے اور فعل میں بھی نافرمانی ہے، جو اللہ کے دشمن کے گرویدہ ہیں، اللہ کے نام لینے والوں کے دشمن ہیں، ان کو کامیابی کیسے مل سکتی ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل نے انکار کیا تو ان کو سزا کیا ملی کہ اللہ نے فرمایا کہ چالیس سال تک اسی صحراء میں بھٹکتے رہو، لیکن پھر اللہ نے تم پر اپنی نعمتیں کیں کہ تمہارے کھانے پینے اور سائے کا انتظام کر دیا اور تمہارے کپڑوں کا انتظام کر دیا۔ پھر ان کو یاد دلایا کہ تمہیں حکم دیا گیا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ تو تواضع کرو، نیاز مندی کرو۔ آدمی کو اگر اللہ تعالیٰ کبھی کامیاب کر دے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ تکبر کرے، بلکہ اس کو چاہیے کہ زیادہ جھک جائے۔

صلوٰۃ الاستسقاء میں اختلاف کی حیثیت:

یاد رکھیں کہ یہ جھگڑے نہیں ہوتے، صرف علمی باریکیاں ہوتی ہیں، ائمہ کرام کے فہم میں اختلاف ہوتا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض لوگ...... جن کو ائمہ اربعہ سے عناد ہے وہ...... چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر بہانے نکال کر ائمہ کی برائیاں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ باقی ائمہ کے نزدیک استسقاء کے لیے نماز پڑھنا ہی ضروری ہے کہ امام آ کر نماز استسقاء پڑھائے، خطبہ دے اور لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے اور لمبی لمبی

دعائیں کرے اور اپنی چادر کو بدلے اور قول خیر کرے کہ اللہ تعالیٰ موسم کو بدل ڈالے۔ دعا کی جائے اور اس کے لیے نماز ضروری ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نماز ضروری نہیں آئی، یعنی واجب کے درجہ میں نہیں ہے، سنت تو ان کے نزدیک بھی ہے۔ یہ نہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ استسقاء کی نماز کے مخالف ہیں۔ جیسے لکھ دیتے ہیں کہ دیکھو جی! حضور اکرم ﷺ کے فرمان کا مخالف ہے۔ اللہ معاف فرمائے۔ اس لیے اس کی بجائے استسقاء کی دعا نہیں مانگی جا سکتی۔ بلکہ فرماتے ہیں کہ یہ دعا بغیر نماز کے بھی ہوتی ہے۔

جیسا کہ حضور اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں خطبہ پڑھ رہے تھے کہ ایک صحابی نے کھڑے ہو کر کہا کہ حضور! مہربانی کریں۔ بارشیں نہیں ہو رہیں، ہمارے تو مال برباد ہو گئے اور بچے ہلاک ہو رہے ہیں، لسی، دودھ، مکھن نہیں ملتا اور مال دودھ کہاں سے لائے؟ ان کو چارا نہیں ملتا۔ حضور اکرم ﷺ نے وہیں خطبہ میں کھڑے کھڑے دعا کی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جب ہم نماز پڑھ کر نکلے تو بارش شروع ہو گئی۔

[صحیح البخاري، حدیث:١٠١٨، بَابُ مَا قِيلَ: إِنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم لَمْ يُحَوِّلْ رِدَاءَهُ فِي الِاسْتِسْقَاءِ...]

اس کے لیے حضور ﷺ نے کوئی علیحدہ نماز نہیں پڑھی۔ تو یہ صحیح حدیث ہے۔ تو امام صاحب رحمہ اللہ صرف اتنا فرماتے ہیں کہ نماز پڑھو، الحمد للہ! یہ نماز بھی سنت سے ثابت ہے، سنت ہے، لیکن اگر امام نے نماز کے بغیر خطبہ میں کھڑے ہو کر دعا کر دی تو یہ بھی استسقاء ہے۔

پتھر پر عصا مارنے سے پانی کا نکلنا:

اس آیت مبارک سے معلوم ہوتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے اللہ تعالیٰ سے پانی طلب فرمایا تو یہاں کسی نماز کا ذکر نہیں، صرف پانی مانگنے کا ذکر ہے۔ اور قرآن کے الفاظ پر غور کریں: ﴿وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾﴾ [البقرۃ:٦٠] تو معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ پانی خاص اپنی قوم کے لیے مانگا تھا۔

ایک استسقاء یہ ہوتا ہے کہ آدمی بارشیں مانگتا ہے تو اللہ آسمانوں سے بارش برساتے ہیں، اس سے مسلمانوں، کافروں، فاسق و فاجر سب کو نفع ہوتا ہے۔ ایک ہے خاص کسی قوم کے لیے پانی مانگا جائے۔ تو وہاں اللہ کا نظام یہ

ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی زمین سے عطا فرما دیتے ہیں اور چاہتے ہیں تو کبھی کبھی ایک محدود علاقے میں بارش برسا دیتے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملا کہ پتھر پر اپنا عصا مارو۔ اللہ نے جب حکم دیا تو مطلب یہ تھا کہ جو بھی پتھر پڑا ہو۔ کیونکہ یہ مصر اور شام کے درمیان کے علاقے ہیں اور ان علاقوں میں ویسے بھی پہاڑ موجود ہیں۔ لیکن بعض مفسرین نے فرمایا کہ اللہ نے ایک خاص پتھر کے بارے میں حکم دیا، البتہ قرآن نے اس کی کوئی تعیین نہیں کی۔ آیت سے یہ بات بھی سمجھ آئی کہ وہ پتھر بڑا ضرور تھا، کیونکہ ایک پتھر چھوٹا سا ہو اور اس میں بارہ چشمے ہوں تو وہاں آدمی پانی بھرنے کے لیے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تو ہر قبیلہ کے لیے جب چشمے علیحدہ علیحدہ جاری کر دیئے گئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا راستہ الگ الگ ہے اور اس کا راستہ الگ ہے۔

﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ یہاں لفظ "ف" استعمال کیا گیا ہے، اور "ف" کا استعمال "تعقیب مع الوصل" کے لیے ہوتا ہے، یعنی جونہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر عصا مارا تو فوراً بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ نہیں کہ اس میں کئی دن لگے، کئی گھنٹے یا سال لگے۔ جیسا کہ حکم ہے: "إِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا" (جب امام تکبیر کہے تو تم تکبیر کہہ دو)۔

پانی تھوڑا تھوڑا نکلا یا چشموں کی صورت میں؟

﴿فَانْفَجَرَتْ﴾ کا معنی ہوتا ہے کثرت کے ساتھ کسی چیز کا بہہ نکلنا۔ لیکن دوسری جگہ قرآن کہتا ہے: ﴿فَانْبَجَسَتْ﴾ اس کا معنی ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا پانی کا رِسنا۔ اب دونوں لفظوں میں ایک قسم کا تعارض ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کوئی تعارض نہیں ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا مارا تو پہلی کیفیت یہ تھی کہ تھوڑا تھوڑا پانی رِسنا شروع ہوا اور کچھ دیر کے بعد وہ بڑھتا گیا۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ وقت کے احوال کا تقاضا ہے کہ یہ بھی اللہ کی شان تھی کہ جب وہ پانی لینے کے لیے آتے تو پانی پورے جوش سے نکل پڑتا اور جب وہ پانی نہ بھرتے تو تھوڑا تھوڑا رِستا رہتا، تاکہ اللہ کی نعمت ضائع نہ ہو جائے۔ اس لیے کہیں فرمایا: ﴿فَانْبَجَسَتْ﴾ اور کہیں فرمایا: ﴿فَانْفَجَرَتْ﴾

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھیں۔ ایک تو پتھر سے پانی کا نکلنا معجزہ ہے اور پھر پانی کا بارہ چشمے بننا بھی معجزہ ہے اور اس پانی کا میٹھا ہونا بھی معجزہ۔ اور اس پانی کے لیے کوئی کھدائی نہیں، صرف عصا مارا وہ بھی پتھر پر۔

حالانکہ لکڑی پتھر پر مارو تو لکڑی ٹوٹ جاتی ہے اور پتھر نہیں ٹوٹتا۔ لیکن یہاں معجزہ ہے کہ لکڑی نہیں ٹوٹی، بلکہ پتھر سے پانی پھوٹ پڑا۔

﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ﴾ ان کے پینے کی جگہ، یعنی بارہ چشمے تھے اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے تو ہر ہر قبیلہ نے اپنی ایک ایک جگہ مقرر کر لی کہ یہاں سے تم بھرو گے اور یہاں سے تم، تاکہ لڑائی جھگڑا اور اختلاف نہ ہو۔

زمزم کا چشمہ:

یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے چاہے تو پتھروں سے پانی جاری کردے۔ یہ جو زمزم ہے، یہ بھی پتھریلا مقام ہے۔ وہاں دیکھیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملا کہ اپنا عصا ماریں اور یہاں عصا بھی نہیں ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے پاؤں ہلا رہے ہیں اور وہاں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مانگا اور یہاں مانگنے والا بھی کوئی نہیں ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی نہیں مانگا۔ کیونکہ ابھی بچپنا ہے، صرف ان کی اماں دوڑ لگا رہی ہیں کہ پانی تلاش کروں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا حال مانگنے سے بھی زیادہ قوی ہے۔ ایک آدمی مانگ تو لیتا ہے اور ایک مانگنے کے قابل بھی نہیں ہوتا۔

آپ نے کبھی دیکھا کہ ہو کہ بیمار ہے اور زبان بند ہوگئی ہو، اب وہ بیچارا آنسو بہا رہا ہوتا ہے۔ اندر تو مانگ رہا ہوتا ہے زبان نہیں ہلا سکتا۔ اسماعیل علیہ السلام چونکہ چھوٹے بچے تھے، مانگ بھی نہیں سکتے تھے، لیکن پیاس کی شدت کا یہ عالم ہے کہ پاؤں اسی پتھر پر رگڑ رہے ہیں، اللہ نے فرمایا: جبرائیل! اس جگہ پر پَر مارو جہاں اسماعیل کے پاؤں لگے ہیں اور اسی جگہ وہی چشمہ نکلے۔ وہیں سے چشمہ پھوٹ پڑا۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے لیے چشمہ:

اسی طرح حضرت ایوب علیہ السلام نے جب اپنے پروردگار سے مانگا: پروردگارِ عالم! مجھے جو تکلیف پہنچی ہے اب اس تکلیف نے مجھے بے انتہاء عاجز کردیا ہے، آپ رحم کرنے والے ہیں رحم فرمائیں۔ تو اللہ نے حکم دیا: اے ایوب! جس جگہ تم بیٹھے ہو اس جگہ اپنا پاؤں مارو، اسی جگہ پانی نکلے گا، غسل بھی کرلو اور اسی پانی کو پی بھی لو، اس میں ہر بیماری کا علاج ہے۔

تو اللہ نے وہاں سے بھی زمین سے پانی نکالا جہاں حضرت ایوب علیہ السلام کا پاؤں لگا اور وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا لگا تو پانی جاری ہوا اور یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا پاؤں لگا، چشمہ جاری ہوگیا۔

آپ ﷺ کے ہاتھوں سے جاری پانی کے معجزات:

ایک دفعہ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پانی نہیں ہے، پینے کے لیے نہیں ہے اور وضو کے لیے بھی نہیں ہے...... اس زمانہ میں بڑے بڑے پیالے ہوتے تھے جس کو عربی میں "کاس" کہتے ہیں۔ اب تو انگریز کی تہذیب یہی ہے کہ ہر آدمی اپنے گلاس میں پانی پیے، تاکہ کبھی اکٹھے نہ ہوسکیں، ہمیشہ علیحدہ علیحدہ رہیں۔ پینا بھی علیحدہ، کھانا بھی علیحدہ، پلیٹ بھی ہر کسی کی علیحدہ، اور چمچہ، چھری کانٹا بھی علیحدہ، حمام بھی علیحدہ، بیڈروم بھی علیحدہ، یہ تفریق ہے۔ اور اسلام کہتا ہے کہ ملاؤ۔ نماز بھی ایک، مسجد بھی ایک، جمعہ بھی ایک، عیدین بھی ایک، حج بھی ایک، اور ایک ہی دسترخوان، ایک ہی برتن میں بیٹھ کر کھاؤ۔ پتہ نہیں کس کے ہاتھ میں اللہ برکت دے...... صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: پیالہ لے آؤ۔ ہم پیالہ لے آئے تو فرمایا: جن جن کے پاس پانی ہو وہ بھی لے آؤ۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ کسی کے پاس جتنا کچھ تھا، سارا پانی اکٹھا کیا۔ حضور ﷺ نے اس پانی کو اس پیالہ میں ڈال دیا۔ حضور ﷺ نے ہاتھ رکھا تو اللہ نے انگلیوں سے چشمہ جاری کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے جس چیز سے چاہیں عطا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پی بھی لو اور بھر بھی لو، جتنا مرضی آئے۔

[المعجم الاوسط، حدیث: ۲۱۵ ۴، المعجم الکبیر، حدیث: ۱۲۵۶۰]

اور کبھی انگلیوں کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ مشکیزے اوپر باندھے ہوئے ہیں، عورت بیٹھی ہوئی ہے، کافرہ عورت ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بی بی! میرے صحابہ کے پاس پانی نہیں ہے، انہیں پانی کی ضرورت ہے، اگر اجازت دو تو ہم تمہارے پانی کو استعمال کریں۔ لیکن اللہ ہمیں دے گا، سب یہ پانی ہوگا۔ عورت کیا جواب دیتی؟ چپ کھڑی ہے۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، اجازت ہے۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اتنا بڑا لشکر ہے۔ بہرحال حضور اکرم ﷺ نے پانی نکالا اور پڑھا اور پڑھنے کے بعد اس کے اندر اپنا لعابِ دہن بھی ڈالا اور اس پانی کو پھر مشکیزہ میں ڈال دیا اور مشکیزہ کا منہ باندھ دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کو دوسرے حصہ سے کھول دو اور سارے لشکر والے پانی بھر و۔ وہ عورت کہتی ہے کہ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں کہ سارا لشکر پانی پی بھی گیا اور برتن بھی بھر لیے اور میرا مشکیزہ اسی طرح ہے، اس میں بھی پانی کی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ تو یہ بھی پیغمبروں کے معجزے ہوتے ہیں!!! اللہ کے ان پر کروڑوں صلوٰۃ وسلام ہوں۔ [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۱۹۸۹۸]

تفسیر:

﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ﴾ اس کے بعد اللہ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کھاؤ پیو اور اشارہ کیا کہ ویسے تو سارا اللہ کا رزق ہے جو بھی ملتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ لیکن چونکہ تمہیں بغیر محنت کے مل رہا ہے، تم نے گھر نہیں بنایا، ہم نے بادل کا سایہ کر دیا، تم نے پانی کی تکلیف کا اظہار کیا تو ہم نے بارہ چشمے جاری کر دیئے، تم نے کھانے کے لیے مانگا تو ہم نے تم پر مَن و سلویٰ اُتار دیا۔ تو یہ تو خاص اللہ کے رزق میں سے رزق ہے جو تمہیں دیا گیا ہے۔

﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾ اور نہ بنو تم شور اور فساد مچانے والوں میں سے۔ یعنی زمین میں ظلم نہ کرو، فساد نہ کرو اور جرائم نہ کرو۔ کیونکہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو زمین میں فساد ہوتا ہے، اگر مسلمان یا تمام مخلوق اللہ کے حکم پر چلے تو فساد نہیں ہوگا۔ اس لیے فرمایا کہ کھاؤ پیو۔ اور اس سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ اللہ جو بندے کا رزق دے، اس میں سے کھائے پیے، استعمال کرے، لیکن شرط یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے، حدود سے نہ نکلے اور تکبر و فساد نہ کرے۔

ایک ظالم جاگیردار کا واقعہ:

مجھے یاد ہے۔ میں بالکل چھوٹا سا تھا۔ میری عمر آٹھ سال کے قریب تھی۔ ہمارے بہاولپور میں ایک بہت بڑا امیر کبیر، زمیندار اور بڑا جاگیردار آدمی تھا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ اس سے...... نعوذ باللہ!...... کوئی ایسا ظلم نہیں چھوٹا تھا جس نے غریبوں پر نہ ڈھایا ہو۔ غریبوں کی جائیدادیں ختم، غریبوں کے گھر میں اگر کوئی خوبصورت بچی ہے تو وہ ختم۔

والد صاحب نے اسے کئی دفعہ تقریروں میں جھنجھوڑا۔ وہ روزانہ دھمکیاں بھیجے اور پیغام بھیجے کہ مولوی صاحب! آپ ایسا نہ کریں، آپ میرے خلاف تقریریں کرتے ہیں، آپ میری طاقت کو نہیں جانتے کہ میں کیا ہوں!!؟ تمہارے جیسے مولوی کو اگر میں نے یوں مسل دیا تو کہیں ملو گے بھی نہیں، تمہارا تو وجود بھی نہیں ملے گا۔ تم غریب مولوی ہو، تم نے کیا ہم جاگیرداروں اور وڈیروں کا مقابلہ کرنا ہے؟ والد صاحب اپنے حق کی دعوت پر قائم رہے اور فرمایا: میں تو خیر کچھ نہیں ہوں، لیکن جس خدا کی میں دعوت دیتا ہوں وہ بہت بڑا ہے۔

چند دنوں کے اندر انقلاب آیا، نواب صاحب اس سے ناراض ہوئے اور اس کو نکال دیا اور اس کے بعد وہ بیماریوں کا مرقع ہو گیا۔ جائیدادیں بک گئیں۔ تو اس نے والد صاحب کے پاس آدمی بھیجے کہ خدا کے لیے مولانا!

مجھے معاف کردیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہم گئے تو اس نے کہا تھا کہ اس سے بڑا کوئی عذاب ہے کہ اس طرح پڑا ہوا ہوں؟ اور گھر والے پانی بھی نہیں ڈالتے۔ مانگتا رہتا ہوں، کبھی نوکر کو رحم آجاتا ہے تو پانی ڈال دیا۔ کیونکہ پیسہ تھا، دولت تھی، کوئی بیٹا مری میں بیٹھا ہوا ہے اور کوئی باہر بیٹھا ہوا ہے اور کوئی سیر پر گیا ہوا ہے اور کوئی بیٹی کسی محل میں ہے اور کوئی بیٹی کسی محل میں ہے اور میں پڑا ہوں۔ والد صاحب نے فرمایا کہ تم تو مولویوں کو مسلنا چاہتے تھے۔ اب دیکھو کہ تمہارا کیا حال ہے!؟ اس نے کہا: اسی لیے بلایا ہے کہ مجھے معاف کردو۔ دنیا تو گزر گئی، لیکن آخرت تو برباد نہ ہو۔ اب میں بستر سے اُٹھتا تو نہیں ہوں، لیکن کم از کم میری قبر کا مسئلہ حل ہو جائے۔ والد صاحب نے فرمایا: وہ تو تب حل ہوگا جب لوگوں کے حقوق واپس کروگے۔ جس کو لُوٹا ہے ان کو دو، جن سے چھینا ہے ان کو واپس کرو۔ حقوق العباد تو اللہ بھی معاف نہیں کرتے۔

اس لیے آدمی یہ نہ سمجھے کہ میرے پاس نعمتیں ہیں، میرے پاس دولت ہے۔ جو خدا دینے پر قادر ہے وہ لینے پر بھی قادر ہے۔ جو خداوند قدوس جب ہم رات کو سوئیں اور صبح کو امیر بنادے...... ماشاء اللہ!...... وہ یہ بھی کرسکتا ہے کہ رات کو سوئیں اور صبح کو بھکاری بنادے۔

علماء کی توہین کرنے والے کا عبرتناک انجام:

ایک دفعہ آپ کے ملک میں ایک آدمی نے کہا کہ میرا دل کرتا ہے کہ ان سب مولویوں کو کشتی میں ڈال کو سب کو سمندر میں غرق کردوں۔ اللہ نے اس کو ایسا غرق کیا کہ آج اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ آنکھوں سے ہم نے دیکھا کہ علماء کی بے عزتی کر کے سڑکوں پر پھینکوا دیا گیا۔ نتیجہ کیا نکلا کہ اللہ نے اسے ایسی موت دی کہ اُٹھانے والے بھی کوئی نہیں تھے۔

اللہ کی تقدیر بڑی زبردست ہے، ہر وقت اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ یہ نہ کہو کہ میں مولوی ہوں، میں عالم ہوں، میں بزرگ ہوں، میں اچھا ہوں، کوئی پتہ نہیں کہ کس خطا پر خدا پکڑے؟ کس غلطی پر خدا پکڑے؟ ہر وقت اللہ دے ڈرو۔ اگر کوئی ایسا کلمہ زبان سے نکل جائے تو معافی مانگو: یا اللہ! میں بندہ ہوں، انسان ہوں، میرے منہ سے گندی بات نکل گئی ہے، مجھے معاف فرمادے۔ میرے منہ سے تکبر اور غرور کا کلمہ نکل گیا ہے، مجھے بخش دے۔ تو اللہ معافی دے دیتے ہیں۔ لیکن اگر آدمی اکڑ جائے تو فرمایا: ہم اس کو عبرت بنادیتے ہیں، ہم ایسا نمونہ بنادیتے ہیں کہ

قیامت تک تاریخوں میں لکھا جائے کہ کیا حشر ہوا۔

بارہ چشموں والے پتھر کی کیفیات:

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مفسرین نے اس آیت پر بڑی تفصیل سے کلام فرمایا اور واقعات ذکر فرمائے ہیں، جیسا کہ مختصر حصہ حدیث مبارک کا ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ کی نعمتیں یہ تھیں کہ ان کے پاس ایک مربع پتھر تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اس پتھر پر اپنا عصا ماریں، ﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ تو اس پتھر سے بارہ چشمے بہہ نکلے، ہر طرف میں تین تین چشمے تھے، تا کہ بارہ قبیلے ہر قبیلہ اپنے اپنے چشمے سے لے لے اور ہر قبیلہ کو اس کا چشمہ بتا دیا گیا، اس سے پانی پیتے تھے۔

ایک حدیث مبارک کا یہ ایک حصہ، ایک ٹکڑا ہے جس کو امام نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے فی حدیث الفتون میں جو بڑی طویل حدیث ہے، ذکر کیا ہے۔ حضرت عطیۃ العوفی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو اُن کو پتھر دیا تھا، اس کی شکل بیل کے سر جیسی تھی اور بیل کے اوپر اس کو رکھتے تھے اور بیل ہی اس کو اُٹھاتا تھا۔ جب کسی منزل پر پہنچتے تو اس پتھر کو رکھ دیتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام عصا مارتے تو پانی جاری ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ان کو یہ پتھر عطا ہوا۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ اس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہانے کے وقت اپنے کپڑے رکھے تھے۔ جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ اس پتھر کو اُٹھالیں، کیونکہ اس میں قدرتِ خداوندی ہے اور آپ کے لیے معجزہ بھی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو اپنی ٹوکری میں رکھ لیا۔

عثمان بن عطاء الخراسانی اپنے والد عطاء الخراسانی سے روایت فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے بنی اسرائیل کو پتھر دیا، وہ پتھر اُٹھانا اور رکھنا حضرت ہارون علیہ السلام کی ذمہ داری تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر عصا مارتے تو اللہ پاک اس سے پانی جاری فرما دیتے تھے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ پتھر جبل طور کا ایک پتھر تھا، اس کو وہ اُٹھا کر ساتھ رکھتے تھے اور اسی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ نعمت عطا فرمائی تھی۔

یہ سارے واقعات روایات میں ملتے ہیں، بعض کتب مقدسہ سے منقول ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ اصول کی بات فرماتے ہیں اور زیادہ تفصیلوں میں نہیں جاتے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۰، البقرۃ: الآیۃ: ۶۰]

اس پتھر سے پانی کے چشمے پھوٹنے میں جہاں بنی اسرائیل کی ضرورت پوری ہوئی تھی وہاں اس سے ان کو لطیف تنبیہ بھی ہو گئی تھی کہ تم نے ایک گائے کا بچھڑا بنایا تھا اور اس میں مٹی ڈالی جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے پاؤں کی تھی اور اس سے آواز پیدا ہوئی تو تم نے خدا بنا لیا۔ ہم تمہیں بیل کے سر کی شکل کا پتھر دیتے ہیں جو بارہ قبیلوں کے لاکھوں آدمیوں کو پانی پلا رہا ہے، تو کیا یہ بھی خدا ہو گیا؟

تو یہ ایک قسم کی تنبیہ بھی ہے اور اس میں ابتلاء وامتحان بھی ہوتا ہے کہ ایسی شکل اگر کسی کو نظر آجائے تو ایمان والا آدمی تو محفوظ رہتا ہے، جس کا ایمان متزلزل ہو وہ ان واقعات کو دیکھ کر گمراہ ہو جاتا ہے۔

من گھڑت قصہ اور اس کی تردید:

جب ہم غار ثور پر جاتے ہیں تو وہاں پر ایک عورت کی شکل کا پتھر ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک کافر تھا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان پہنچانے کے لیے چھپا بیٹھا تھا، اللہ نے اس کو پتھر بنا دیا۔

آپ خود دیکھ لیں کہ یہ کوئی واقعہ نہیں ہے۔ جب ہجرت کا واقعہ قرآن میں موجود ہے، سارا واقعہ حدیث مبارک میں موجود ہے، یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے گھر سے چلنا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر جانا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خواب عرض کرنا، آپ کا اونٹنی مبارک لینا اور رات کو گھر سے نکلنا اور غار ثور پر چڑھنا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کندھوں پر اُٹھانا، عنکبوت کا جال ڈالنا، کبوتر کا بیٹھ جانا، سانپ کا ڈس لینا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے غلام کا آکر خبر پہنچانا، وہاں تین راتیں گزارنا اور وہاں سے چلنا یہ سب واقعہ صحیح احادیث میں موجود ہے، لیکن اس پتھر والی بات رہ گئی۔ اللہ پاک کے رسول نے اس کو ذکر نہیں کیا۔ اس لیے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ہندوؤں کا ''گاؤ ماتا'' کی پوجا کرنا:

اب دیکھیں کہ بنی اسرائیل نے چونکہ ایک بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ بچھڑا گائے سے پیدا ہوتا ہے تو ہندوؤں کو بھی موقع ملا کہ ہاں! بچھڑا ایسا تھا تو بچھڑے کی ماں تو بڑی پہنچی ہوئی ہوگی، لہٰذا انہوں نے بھی گاؤ ماتا کی پوجا شروع کر دی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے عصا دیا تھا کہ عصا پھینکو تو وہ سانپ بن جاتا تھا۔ اور سانپ بھی ایسا خطرناک کہ فرعون جیسے بادشاہ نے جو دیکھا تو کتابوں میں آتا ہے کہ وہ ایسا دوڑا کہ چلّانے لگا کہ خدا کے لیے مجھے اس سے بچاؤ۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ستر دفعہ اس کو لیٹرین میں جانا پڑا ڈر کے مارے۔ جب اتنا بڑا سانپ منہ کھولے بیٹھا ہو کہ پورے محل کو نگل جائے۔ تو ہندوؤں نے سانپ کو بھی خدا بنایا ہوا ہے، ''ناگ دیوتا'' ان کے نزدیک ہے۔

دولت مندوں کے گھروں کی چمک دمک:

اللہ نے جنت کے نمونے بیان کیے کہ ایسے باغ ہوں گے، ایسی نہریں بہتی ہوں گی، ایسی اس میں حوریں ہوں گی، ایسے غلمان ہوں گے، اس میں سونے چاندی کے برتن ہوں گے، اس کے اندر دیباج کی، کمخواب کی رضائیاں، تکیے اور کپڑے ہوں گے۔ جن کے پاس دولت آجاتی ہے تو ان کے ڈنر سیٹ، ٹی سیٹ، واٹر سیٹ بھی سونے کے ہوتے ہیں، ٹیبلوں کے کنارے پر بھی سونا لگا ہوا ہوتا ہے اور گھروں کے نیچے باقاعدہ نہریں بہہ رہی ہیں، باغات لگائے ہوئے ہیں، گھروں میں سوئمنگ پول لگائے ہوئے ہیں۔ جو قرآن میں پڑھا ہے، جنت کی نقل کر رہے ہیں۔

عقیدے کا فساد:

اصل میں یہ سب میرے اللہ کا امتحان ہے کہ ایک ایسی چیز کا اللہ تعالیٰ نمونہ دکھا دیتے ہیں اور بندوں کو امتحان میں ڈال دیتے ہیں۔ جو ایمان والا ہے وہ سمجھتا ہے کہ لکڑی ہے اور لکڑی کچھ نہیں، سانپ بن جاتا ہے تو اصل میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں بھی کچھ نہیں، یہ تو اللہ کا حکم تھا۔ لکڑی لکڑی ہے، موسیٰ موسیٰ ہے، خدا خدا ہے، معجزہ معجزہ ہے اور قدرت قدرت ہے اور وہ اپنے ایمان کو مضبوط سمجھتا ہے۔

اور جو بیچارے ڈگمگاتے یقین والے ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بادشاہو! سب کچھ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا، طور والی رات موسیٰ علیہ السلام کو سب کچھ مل گیا، تمام علم بھی مل گیا، تمام قوتیں بھی مل گئیں، تمام طاقتیں بھی مل گئیں، عصا اور ید بیضاء بھی مل گیا۔ ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر نبی کو مختار بنا دیا۔ وہ بھٹک گئے۔ بعد کی آنے والی نسلوں نے یوں کہا کہ سانپ سے اللہ نے کام لیا تو کام اپنوں سے لیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سانپ بھی کوئی چھوٹا خدا ضرور ہے...... معاذ اللہ!...... تو انہوں نے ''ناگ دیوتا'' بنالیا۔ انہوں نے سنا کہ سامری نے بچھڑا بنایا تھا تو انہوں نے ''گاؤ ماتا'' بنالی۔ کسی نے پڑھا کہ پہلے لوگوں نے لات، عزیٰ، منات بنایا تھا تو انہوں نے کہا: ہم بھی بزرگ، پیر بنالیتے ہیں۔ پنجاب کا علیحدہ، سرحد کا علیحدہ، سندھ کا علیحدہ، کراچی کا علیحدہ، بلوچستان کا علیحدہ، اوپر کا علیحدہ اور نیچے کا علیحدہ۔

اور اگر سندھی کو تکلیف ہو تو ملتان میں شفا ملتی ہے، اس کو اپنے سندھ والے پیر کوئی فائدہ نہیں دیتے۔ ایمان سے جا کر دیکھ لیں کہ سارے پیدل بغیر جوتے پہنے ہوئے جاتے ہیں۔ پیدل حضرت بہاؤ الحق کی مزار پر جائیں گے، کیونکہ تکلیفیں دور کرنے کے لیے وہاں جاتے ہیں۔ اور اگر پنجاب والوں کو تکلیف ہو تو وہ شہباز قلندر آئیں گے، مقامی پیر بھی اپنے مقامی لوگوں کو علاج نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ نافرمان ہے۔ دوڑتے دوسری جگہ جاتے ہیں، پھر دوسرا پیر دھوکہ کھا جاتا ہے کہ شریف آدمی پیدل آیا ہے، چلو مہربانی کر دو۔

عجیب ایک چکر ہے۔ کہیں جناب صحابہ کی قبریں بنائی ہوئی ہیں۔ اگر پوچھیں کہ اس کی کوئی سند ہے؟ تو کہتے ہیں کہ ہمارے بڑے کہتے تھے کہ صحابی ہے۔ بھائی! صحابی کو تو تیرہ سو سال ہو گئے اور تمہارے بزرگوں کو تو سو سال ہوئے۔ سو سال والے بندے کو تیرہ سو سال پہلے والا بندہ کیسے مل گیا؟ اس پر پوجا ہو رہی ہے۔ اور یہ غازی کی مزار ہے اس پر بھی پوجا ہے۔ ''سیف الملوک'' سنتے ہوئے ایمان تاہ ہو جاتا ہے، ''ہیر رانجھا'' سنتے ہوئے ایمان تاہ ہو جاتا ہے، قرآن شریف کا کہا جائے تو کہتے ہیں کہ ہم گناہگار لوگ ہیں، کیا ہم سننے کے قابل ہیں؟ بات تو ٹھیک ہے مسلمان سنیں گے، یہ بیچارے کیوں سنیں گے؟ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ دعا کرو اللہ مسلمانوں کو ہدایت دے۔

یاد رکھو کہ اللہ کی قدرت ہے۔ اولیاء برحق ہیں لیکن خدا کے سب محتاج ہیں، نفع ونقصان کا کوئی مالک نہیں ہے سوائے میرے اللہ کے، تمام انبیاء کو پیدا کرنے والا میرا اللہ ہے، تمام اولیاء کو پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ اور پھر وہ ولی کیسے بنے؟ مقامِ ولایت پر کیسے پہنچے کہ وہ خدا کے فرمانبردار بن گئے، خدا کے اطاعت گزار بن گئے، خدا کے حکم پر چلنے والے بن گئے، ساری دنیا کو اللہ کے لیے چھوڑ دیا، اللہ نے ان کو ولایت کا مقام عطا فرما دیا۔

ان کے مرنے کے بعد ہم نے ان کو مشکل کشا اور حاجت روا بنا لیا، ہم نے ان کی نذر و نیاز چڑھانا شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے۔

فاسد عقیدہ لوگوں کی حرکتیں:

عجیب عجیب حالات ہوتے ہیں۔ ڈاکو جب ڈاکہ مارنے کے لیے جاتے ہیں تو وہ بھی اپنے پیر کی مزار پر منت ماننے کے لیے جاتے ہیں، پیر جی! میری مدد کرنا، ڈاکے پر جا رہے ہیں، واپسی پر سائیں کی نذر چڑھائیں گے۔ پیر ان کی بھی مدد کرتا ہے۔ معاذ اللہ! ان ڈاکوؤں کو اچھی سامی مل جاتی ہے۔ زانی زنا کے لیے جاتا ہے، بدبخت وہ بھی مزار پر کھڑا ہے کہ سائیں مہربانی کرو، معشوق کو ملاؤ، تساں ہر کسیں کو ملیندے ہو، اساں جدا تھے ودے ہیں، یعنی

پیر اب زنا والوں کو بھی......معاذ اللہ!......ملاتے ہیں۔

توبہ کرو، اللہ کے دروازے پر توبہ کرو، اللہ پاک کے ولیوں کو بدنام نہ کرو، ورنہ قیامت کے دن انہی ولیوں نے مدعی بن کر تمہیں جہنم میں ڈلوانا ہے۔ ولی، ولی ہوتا ہے: ﴿أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [یونس: ۶۲] یہ نہیں کہ تم ان کی قبروں پر جا کر غلط قسم کی باتیں کرو، ان کی قبروں پر تم سرکس لگاؤ، ان کی قبروں پر تم تھیٹر لگاؤ، ان کی قبروں پر تم چلّے کھلواؤ، ان کی قبروں پر......نعوذ باللہ!......تم جوئے کے اڈے لگوا دو۔ قیامت کا دن جب ہوگا پھر پتہ چلے گا، جب اولیاء اللہ کا ہاتھ ہوگا اور تیری گردن ہوگی۔

اولیاء اللہ کی شان:

ہمارے ذمہ یہ تھا کہ ہم اولیاء اللہ کی قبروں پر قرآن کے درس کھولتے، حدیثِ رسول کے درس کھولتے، ان کی زندگیوں سے لوگوں کو تعلیم دلواتے کہ وہ دین پہنچانے کے لیے کہاں سے چلے تھے، کہاں پہنچے؟ حضرت معین الدین ﷫، حضرت علی ہجویری ﷫ اور حضرت بہاؤ الدین زکریا ﷫، سب عرب سے چلے اور دین کو پہنچاتے پہنچاتے ساری زندگیاں گزار دیں اور جہاں اللہ نے چاہا موت آگئی۔ اللہ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ انہوں نے قدم قدم پر اسلام پھیلایا اور ہم نے ان کے نام پر قدم قدم پر کفر اور شرک پھیلایا۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو فیصلے ہوں گے۔ تو اس کا پہلے حل ہے کہ توبہ کرو، اللہ کے دروازے پر لوٹ جاؤ۔

اس پتھر کی مزید تفصیل:

بعض کہتے ہیں کہ وہ پتھر سنگ مرمر کی طرح تھا، اس کا جسم ایک ہاتھ مربع تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی شکل ایسے تھی جیسے انسان کا سر ہوتا ہے۔ اور بعض علماء نے کہا کہ وہ جنت میں سے تھا اور دس ہاتھ لمبا تھا، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کا قد بھی دس ہاتھ تھا۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے آگے دو شاخیں تھیں جو رات کو روشن ہو جاتی تھیں اور اس پتھر کو گدھے پر رکھا جاتا تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۰، البقرۃ: الآیۃ: ۶۰]

آپ ﷺ کے براق کے متعلق:

اس لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض ہندوؤں کے جو خدا بنے ہوئے ہیں تو ان کے چار چار سر ہیں، آٹھ ٹانگیں ہیں، آٹھ ہاتھ ہیں، کسی کا ایک سر ادھر ہے اور کسی کا ایک سر اُدھر ہے۔ کوئی ایسے بنائے ہوئے ہیں کہ اوپر کا حصہ

عورت کا ہے اور نیچے کا حصہ مرد کا ہے، اوپر کا حصہ مرد کا ہے تو نیچے کا حصہ عورت کا ہے۔ ایسے آپ نے ہندوؤں کے بت سنے ہوں گے۔ مسلمانوں نے تو نہیں بنائے!!

ایمان سے بتلاؤ یہ جو ہمارے ہاں حضور اکرم علیہ السلام کی براق کی صورت فوٹو بکتا ہے اس کی بھی اوپر شکل عورت اور نیچے گھوڑے کی ہے۔ تو آپ کا کیا خیال ہے کہ جب حضور اکرم علیہ السلام براق پر جا رہے تھے تو کون چھپا ہوا تھا جس نے فوٹو لیا تھا؟ پورے مکہ والوں کو تو پتہ ہی نہیں چلا۔ کیونکہ حضور اکرم علیہ السلام رات کو گئے تھے۔ کسی کو پتہ نہیں چلا کہ حضور کب گئے اور کب واپس آئے؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مسلمان ہو چکے تھے اور سب سے قریبی ساتھی تھے ان کو بھی پتہ نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمان ہو چکے تھے ان کو بھی پتہ نہیں، دشمنوں کو بھی پتہ نہیں اور دوستوں کو بھی پتہ نہیں، تو یہ فوٹو بنانے والا کہاں سے ملا تھا جس نے فوٹو بنا لیا؟ اور وہ بھی ایسا کہ اوپر انسان اور نیچے گھوڑے کی شکل تھی۔ اور انسان......اللہ معاف فرمائے......مرد کی شکل نہیں بنائی۔

ایمان سے بتلائیں کہ یہ محبت ہے یا حضور اکرم علیہ السلام کی توہین اور ان سے دشمنی ہے؟ اللہ کے نبی جن کی ساری زندگی غیر محرم عورت پر نظر ہی نہیں پڑی، حضور اکرم علیہ السلام کا کسی غیر محرم عورت کے ہاتھ کو ہاتھ بھی نہیں لگا، میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی عورت اسلام لانے کے لیے آئی تو پردے کے اندر تھی اور تم نے براق کی ایسی شکل بنائی جو عورت کی ہو، کیا قیامت میں خدا کو کوئی جواب نہیں دو گے؟ کیا قبر میں نہیں جاؤ گے؟ لوگ اس فوٹو کو خرید رہے ہیں اور گھر میں لگا رہے ہیں کہ برکت ہوگی۔ برکت کیا ہوگی، بلکہ اللہ کا عذاب ٹوٹے گا، نبی کی توہین کر رہے ہو۔

اللہ کے بندو! براق کا معنی یہ ہے کہ جب بجلی چمکتی ہے تو تم دیکھ سکتے ہو؟ کیا تمہارے اندر طاقت ہے، وہ تمہیں اندھا کر کے نہ رکھ دے۔ وہ تو اللہ نے جنت کی سواری بھیجی تھی، جن جن صحابہ نے احادیث میں اس کا ذکر کیا ہے وہ انہوں نے تشبیہ دی کہ وہ ایک ایسا جانور تھا کہ گھوڑے سے چھوٹا تھا، گدھے سے بڑا تھا اور ایسے تھا جیسے خچر ہوتا ہے۔ اور وہ ایسا تھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں نظر پڑتی تھی وہیں قدم پڑتا تھا۔ اور سب سے تیز رفتار چیز روشنی ہے، تقریباً ایک ہزار میل ایک سیکنڈ کے اندر طے کر لیتی ہے، جیسے آنکھوں کی روشنی ہے جہاں نظر پڑتی ہے وہاں پہنچ جاتی ہے۔ اللہ نے اس سواری کو ایسا ہی بنا دیا تھا کہ دیکھیں! آپ گھوڑے پر جا رہے ہوں، آگے چڑھائی آ جائے تو سوار کو گھوڑے کو پکڑنا پڑتا ہے۔ فرمایا کہ اس براق کے وہاں اگلے پاؤں چھوٹے ہو جاتے تھے اور پیچھے والے پاؤں اونچے ہو جاتے تھے، اگر ڈھلوان آتی تھی تو اسی طرح اللہ تعالیٰ اس

کے پاؤں کو اونچا نیچا کر دیتے تھے، تاکہ حضور اکرم ﷺ کے آرام میں ذرا خلل نہ آئے۔

اور اس براق کو لانے والے حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے، دیکھنے والے جبرائیل علیہ السلام تھے، یا حضور پاک ﷺ تھے یا ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر تھے یا اللہ کے فرشتے تھے۔ بندوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ یہ بھی روایات کے اندر آ گیا کہ جب حضور اکرم ﷺ آنے لگے تو براق نے شوخی کی، جیسا کہ جانور سواری کے وقت شوخی کر رہا ہے تو جبرائیل علیہ السلام نے اس کو جھڑکا اور کہا کہ خبردار! آج تجھے پتہ ہے کہ تیرا سوار وہ ہے کہ جس کے مقابلہ پر اللہ نے دھرتی پر کوئی بندہ پیدا نہیں کیا، آج وہ سوار تجھ پر سوار ہونے والا ہے اور تُو شوخی کر رہی ہے!؟ [کنز العمال، حدیث: ۳۱۸۵۲]

اور میرے مولویوں نے یہ نکال لیا کہ "براق دیکھ کر دھمال کھیڈن لگ پئی، براق وی دھمال کھیڈ دی ودی اے"، یہ براق کی سنت پر چلتے ہیں، نبی ﷺ کی سنت پر نہیں۔ انہوں نے اپنا رقص نکال لیا کہ براق رقص کرنے لگ گیا تھا۔

حضور ﷺ پہاڑ پر چڑھے تھے، پہاڑ نے رقص شروع کر دیا تھا تو ہم کیسے رقص نہ کریں؟ خدا کے بندو! جب پہاڑ نے رقص کیا تو حضور ﷺ ناراض ہوئے کہ خوش ہوئے تھے؟ (حدیث) حضور ﷺ پہاڑ پر کھڑے تھے، پہاڑ ہلا۔ یہ بالکل صحیح حدیث ہے کہ حضور ﷺ پہاڑ پر کھڑے ہیں اور زلزلہ آیا تو حضور ﷺ نے غصہ میں آ کر پاؤں مارا اور فرمایا: اے پہاڑ! جم جاؤ، مت چلو کہ تمہارے اوپر کوئی نہیں ہے، مگر اللہ کا نبی ہے، صدیق ہے اور دو شہید ہیں۔ یعنی حضور ﷺ نے خوشخبری دے دو کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) شہید ہوں گے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٣٦٨٦، بَابُ: مَنَاقِبِ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ...]

پہاڑ نے رقص کیا تو حضور ﷺ نے پاؤں مارا۔ اگر تم رقص کرو گے تو حضور ﷺ تمہیں بھی جوتے ماریں گے۔ اگر رقص کرنے سے حضور ﷺ کو خوشی ہوتی، دھمال کھیلنے سے حضور ﷺ کو خوشی ہوتی تو سب سے پہلے صحابہ ڈالتے۔

علماء کے جلسوں میں ایسی نعتیں پڑھی جانے لگیں جو گانوں کی طرز پر بنائی جاتی ہیں...... اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ...... یعنی جو گانے کنجریاں گاتی ہیں، میراثی گاتے ہیں، ان طرزوں پر محمد مصطفیٰ ﷺ کی نعت کہی جاتی ہے۔ جس کی مدح کرنے والا خود رب العالمین ہو۔

بہر حال اس براق کو تو کسی نے نہیں دیکھا اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس براق پر بٹھایا گیا اور مجھے اس پر

بٹھایا گیا اور بیت المقدس پہنچے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اس براق کو صخرہ پتھر سے باندھا۔ اور یہ بھی حدیث مبارک میں موجود ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پتھر پر انگلی رکھی تو اس میں سوراخ ہو گیا...... وہاں ان کو کسی ڈرل مشین کی ضرورت نہیں پڑی...... اور وہیں براق کو باندھ دیا۔

اپنے پیغمبر کے ذریعہ سبق دیا کہ یہ نہ کہنا کہ ہم بڑے متوکل ہیں۔ اپنے جانور کو رسے سے باندھو اور پھر اللہ پر توکل کرو۔ ورنہ کیا براق حضرت جبرائیل علیہ السلام سے بھاگ جاتا؟ نہیں! بلکہ ایک سبق دیا گیا کہ اسبابِ دنیا پر عمل کرو، محنت کرو، تجارت کرو، کام کرو اور مانگو اللہ سے۔ یہ توکل نہیں ہوتا کہ تم اسبابِ دنیا کو چھوڑ دو۔

نعلین مبارک کی تصویر پر قرآن کی تحریر:

تمہارے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتے کی تصویر ہے یا نہیں ہے؟ اس نعل کی تصویر میں قرآن لکھا ہوا ہے یا کہ نہیں لکھا ہوا ہے؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے قرآن کو یہی عزت دی تھی کہ آپ جوتے میں لکھواتے تھے؟ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پتہ نہیں ان لوگوں نے مرنا بھی ہے کہ نہیں مرنا؟ انہوں نے اللہ کے دربار میں جانا بھی ہے کہ نہیں جانا؟ اللہ کے دربار میں پیش ہونا بھی ہے کہ نہیں ہونا؟ یہ بخشے ہوئے ہیں، پتہ نہیں ان کو کیا بلا ہے؟ خدا کے بندے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین مبارک کی صورت بن گئی، اس کے بعد اس میں سورۃ یٰسین لکھ دی اور سورتیں لکھ دیں اور وہ تصویر با قاعدہ بک رہی ہے اور مسلمانوں نے گھر میں لگائی ہوئی ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعل شریف ہے، اندر قرآن، اللہ کا کلام لکھا ہوا ہے اور وہ بھی جوتے میں!!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جوتا ہمارے لیے ساری دنیا کے تاجوں سے بڑھ کر ہے، لیکن کیا اللہ کے کلام کی یہ توہین نہیں کہ اس کو نبی کے جوتے میں لکھا جائے؟ ہمارے لیے زیادہ سربلند ہے، حضور کے پاؤں کی مٹی بھی مل جائے تو ہم اپنی آنکھوں کا سرمہ بنالیں۔ لیکن وہ نبی، جو نبی تب بنا جب قرآن اُترا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنا، کیا اس نبی نے قرآن کو اپنے جوتے میں لکھوالیا تھا؟ اور مسلمان ایسی تصویریں گھروں میں لگاتے ہیں اور بڑے خوش ہو کر دیکھتے ہیں......

إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... دعا کرو کہ اللہ انہیں ہدایت دے، اللہ ہمیں ہدایت دے۔

اگرچہ ان کا مقصد محبت ہے، لیکن وہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ مقصود ان کا محبت ہے، لیکن گاڑی پٹڑی سے اُتر گئی ہے، راستے سے اُتر گئی ہے۔ چاہتے وہ بھی یہی ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کریں، لیکن وہ طریقہ غلط ہے۔ طریقہ وہ

کامیاب ہوگا جو ابو بکر و عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم نے سمجھایا، وہ طریقہ کامیاب ہوگا جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھایا، وہ طریقہ کامیاب ہوگا جو اللہ کے قرآن نے سمجھایا: ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝﴾ [آل عمران: ۳۱] اللہ کے نبی کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو اگر تم محبت چاہتے ہو، ﴿قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ [النور: ۵۴]، ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۖ وَمَنْ تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۝﴾ [النساء: ۸۰]، ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ [الحشر: ۷]

دعا کریں اللہ ہمیں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور نافرمانیوں سے ہمیں بچائے۔

پتھر کی مزید تفسیر:

ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ جنت کا پتھر تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے اُتارا تو اس کو آدم علیہ السلام ہی ساتھ لائے تھے اور ان کے بعد جیسے جیسے پیغمبر آتے گئے تو وہ پتھر ان کو بطور میراث منتقل ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ وہ پتھر حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچا۔ اور عصا بھی دراصل آدم علیہ السلام جنت سے لائے تھے تو جب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس تشریف لائے اور ان کے گھر میں رہے اور دس سال تک ان کی بکریاں چراتے رہے اور ان کی بچی سے شادی ہوئی تو حضرت شعیب علیہ السلام نے وہ لکڑی بھی اور وہ پتھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کر دیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۰]

پتھر کی تعیین میں علماء کے مختلف اقوال کیوں؟

اس کی ایک حکمت یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر مستشرقین یا اعدائے دین اور اعدائے اسلام میں سے کوئی ایک بحث میں پیدا کر دے کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ ایک پتھر تھا، اس کے بارے میں یہ تو بتلایا نہیں کہ وہ پتھر کون سا تھا؟ تو اس کے لیے مفسرین ہمارے افادہ اور استفادہ کے لیے یہ بحثیں ذکر کر دیتے ہیں کہ ہم ان کو یہ جواب دے سکیں کہ ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اس پتھر پر تو علماء بڑی بحثیں کر چکے ہیں، بڑی تفصیل موجود ہے، یہ قول بھی ہے اور یہ قول بھی ہے، ورنہ ان کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باقی جنت سے پتھر کا آنا کوئی بعید نہیں ہے۔ جیسے حجر اسود جنت کا پتھر ہے۔ تو اگر اللہ تعالیٰ جنت کے پتھروں میں سے اسے بھیج سکتے ہیں اور اسی طرح مقام ابراہیم کے بارے میں آیا: ﴿فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا...... الآية﴾ [آل عمران: ۹۷] وہ بھی ایک

پتھر ہے اور اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو آسمانوں سے اُتارا تو جو چیزیں قیامت تک پیش آنے والی تھیں، وہ تو اللہ کے علم میں تھیں۔ لہٰذا ان کے حالات اور ضروریات کے مطابق جن چیزوں کی آگے ضرورت پڑنی تھی، وہ ساتھ اُتار دیں۔ تو یہ کوئی مشکل مسئلہ تو نہیں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے آگے تو کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں کوئی مشکل ہو، ﴿وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝﴾ [ابراہیم: ۲۰] اللہ تعالیٰ اگر اپنے نبی کو اُٹھا کر جنت کی سیر کرا سکتے ہیں تو زمین پر جنت کی چیزیں بھی بھیج سکتے ہیں۔ بہر حال یہ سب اقوال ہیں۔ اللہ کے قرآن نے ایک جامع لفظ اختیار فرمایا ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ پتھر وراثت میں ملتا آیا۔ اور یہ بات یاد رکھیں کہ وراثتِ نبی میں وہ پتھر مل رہا ہے جو جنت سے آیا تھا، ورنہ انبیاء علیہم السلام کی میراث نہیں ہوتی۔ انبیاء علیہم السلام کی پہلے تو جائیداد نہیں ہوتی۔ اگر جائیداد ہو تو اللہ کے انبیاء علیہم السلام اس کو خیرات کر دیتے ہیں کہ ہماری تمام چیزیں اللہ کے راستہ میں صدقہ ہیں۔ جب خیرات ہو گئی تو بات ہی ختم ہو گئی۔

انبیاء علیہم السلام کی میراث نہیں ہوتی:

اور پھر اللہ نے نبی اور غیر نبی میں فرق رکھا ہے۔ اگر عام اُمتی کی بھی میراث ہو اور نبی کی بھی میراث ہو تو پہچان میں کیا فرق رہا؟

اور پھر دیکھیں کہ عام اُمتی چاہے وہ اللہ کا ولی ہے، سید ہے، قطب ہے، اَبدال ہے، غوث ہے، صحابی ہے، تابعی ہے، کتنے بڑے مرتبے پر پہنچ جائے، فوت ہو جائے اور اس کی عورت بیوہ ہو جائے تو وہ دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ وہ پوری امت کی مائیں ہیں۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات ہوتی ہیں، انبیاء کی میراث نہیں ہوتی۔

بعض لوگ انہی چیزوں کو لے کر کہتے ہیں کہ دیکھو آدم علیہ السلام کی لکڑی بھی میراث میں چلتی رہی تو بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک کیوں نہیں ملا؟ تو اس لکڑی کا فائدہ صرف موسیٰ علیہ السلام کی اولاد کو تو نہیں ہوا، بلکہ اس کا فائدہ تو پوری بنی اسرائیل کو ہوا۔ اس پتھر کے پانی کا فائدہ بھی پورے بنی اسرائیل کو ہوا۔ تو انبیاء کے علم کا فائدہ بھی امت کو پہنچتا ہے۔ ان کی جائیداد میراث نہیں ہوتی اور نہ ان کی جائیدادیں تقسیم کی جاتی ہیں کہ ان کے وارث لڑتے رہیں، انبیاء کی جائیدادوں پر جھگڑے ہوتے رہیں۔

اور پھر اگر اللہ نبی کی اولاد کو وارث بنائے جیسے ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ باپ کے پاس بڑا پیسہ ہو اور اولاد پر بڑی سختی کر رہا ہو تو جب اولاد علیحدہ ہو کر دوستوں میں بیٹھتی ہے تو کہتی ہے کہ یار! دعا کرو، میرا باپ تو سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے، مرنے کا نام نہیں لیتا، مرے، جان چھوٹے، تا کہ مجھے جائیداد ملے۔ اگر باپ کی صحت کے بارے میں پوچھا جائے تو کہتا ہے کہ وہ تو پہلے سے ٹھیک ہو رہا ہے، وہ نہیں مرتا، وہ ہمارے بعد ہی مرے گا، ہماری جائیداد وہ نہیں چھوڑنے والا!! اب اگر خدانخواستہ نبی کی بھی جائیداد ہو اور ان کے خاندان میں کوئی ایسی تمنا کر بیٹھے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ انبیاء کی موت کی...... نعوذ باللہ!...... تمنا کر بیٹھے تو اس کا ایمان ہی ختم ہو جائے گا۔ اس لیے اللہ اپنے نبیوں کی وراثت رکھتے ہی نہیں۔

یہ جو میراث نقل ہو رہی ہے، یہ جنت کی چیز ہے اور جنت ایک ایسی چیز ہے: ﴿يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ﴾ یہ تو ہم سب مومن وارث ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ [المؤمنون: ۱۰،۱۱] کیونکہ وہ بابا آدم کی جگہ ہے۔ جب حلالی اولاد اپنے باپ کی جگہ میں پہنچے گی تو وہ حقیقی وارث ہو گی۔ اس لیے جنت کی نعمتوں سے ایسے حوالے نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ جنت کی نعمتیں ہیں۔ دعا کریں اللہ پاک ہر مسلمان کو نصیب فرمائے۔

ننگ ظاہر کرنے کا گناہ:

(حدیث) حضور ﷺ کی حدیث ہے کہ جو آدمی اپنا ننگ کسی کو دکھلائے، دکھلانے والا بھی لعنتی ہے اور دیکھنے والا بھی لعنتی ہے، "لَعَنَ اللّٰهُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُوْرَ إِلَيْهِ" اور لعنت ایسی چیز ہے جو شیطان پر آتی تھی۔ اللہ نے جو شیطان کو پہلی سزا دی ہے، وہ یہی تھی: ﴿وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ [ص: ۷۸] کہ تم پر میری لعنت ہے قیامت تک۔ جو آدمی شیطان کی برادری بن جائے تو اس سے بڑی کوئی سزا ہو سکتی ہے؟ کہ شیطان کو بھی لعنت ملے اور ہمیں بھی لعنت ملے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ تو یہ اتنا بڑا جرم ہے! انسان کو چاہیے کہ جب غسل کرے تو ستر ڈھانپے۔ علماء نے لکھا ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ غسل کے وقت احتیاط کرے، حمام کا دروازہ بند کرے، کیونکہ کبھی کبھی کسی کی نظرِ بد بھی لگ جاتی ہے۔ کبھی آدمی خوبصورت ہوتا ہے، اچھا جسم ہے، اچھی باڈی ہے، اس بیچارے نے کپڑے اُتارے تو کسی نے کہا کہ کمال ہے تو اس کا خاتمہ ہو گیا۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۳۱۲۵، باب: النظر إلى المخطوبة وبيان العورات، الفصل الثالث]

نظر بد کا اثر اور علاج:

حضور ﷺ جب حج پر تشریف لا رہے تھے تو ذوالحلیفہ جو مدینہ منورہ کا میقات ہے، وہاں ایک صحابی نے غسل کرنے کے لیے کپڑے اُتارے۔ دوسرے نے دیکھا تو اس نے کہا کہ کمال ہے، یہ تو سونے کا بنا ہوا بدن ہے۔ تو وہ بیچارا وہیں گر گیا۔ حضور ﷺ کو خبر دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تُو نے اپنے بھائی کو مار ڈالا ہے۔ جلدی کرو پانی لے آؤ۔ حضور ﷺ نے اسے حکم دیا کہ جلدی کرو وضو بھی کرو اور غسل بھی کرو (جس کی نظر لگی تھی) اس نے غسل کیا اور پانی کو ایک برتن میں اکٹھا کر کے اس کے اوپر ڈالا گیا جس کو نظر لگی تھی تو وہ فوراً ٹھیک ہو گیا۔

[سنن ابن ماجه، حديث: ٣٥٠٩، باب: العَيْنُ]

اگر کسی کو نظر لگ جائے اور اس کو پتہ ہو کہ اس کی نظر لگی ہے تو اسے فوراً کہے کہ تم وضو کرو۔ اس کو برتن میں وضو کروا کر غسل کراؤ اور وہ پانی اس آدمی پر ڈال دو جس کو نظر لگی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فوراً شفا عطا فرماتے ہیں۔ اگر تمہیں پتہ ہو کہ اس آدمی کی نظر لگتی ہے تو اس کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ جب وہ دور سے آ رہا ہو تو فوراً پڑھ لیا: ''مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' اور اس کی طرف اشارہ کر دیں تو یہ پڑھنے سے اس کی نظر نہیں لگتی۔ کبھی کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ باپ کی نظر بیٹے کو لگ جاتی ہے، ماں کی نظر خود اپنی اولاد کو لگ جاتی ہے، کوئی کلمہ ایسا نکل گیا کہ نظر لگ گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''اَلْعَيْنُ حَقٌّ'' نظر کا لگنا حق ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٥٧٤٠، باب: العَيْنُ حَقٌّ]

نظر کے بارے میں آتا ہے کہ نظر ایسی چیز ہے جو زندہ انسان کو قبر میں اُتار دیتی ہے اور جانور کو دیگچے میں پہنچا دیتی ہے۔[1] اس لیے بہر حال چھپ کر نہانے میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ ایسی باتوں سے محفوظ رہیں گے۔

دوسرا یہ بھی حکم ہے کہ ناف سے لیکر گھٹنوں تک مرد کو اپنا جسم چھپانا ضروری ہے۔ بعض لوگ احرام باندھتے ہیں تو ناف سے نیچے چادر باندھ لیتے ہیں، (نعوذ باللہ!) احرام کی حالت میں وہ لعنت لے رہے ہوتے ہیں۔ ناف تک کا چھپانا بھی ضروری ہے، یعنی آپ احرام باندھیں تو چادر ایسے انداز میں باندھیں کہ ناف بھی چھپ جائے۔ بہر حال اگر کبھی کھلے میدان کے اندر نہانا پڑے تو اتنا کپڑا ضرور باندھ لیا جائے کہ کسی آدمی کی نظر نہ پڑے۔ ایسا کپڑا بھی غسل کے لیے استعمال نہ کیا جائے کہ پانی پڑے تو بدن نظر آ رہا ہو اور دماغ میں یہ سمجھ رہا ہو کہ میں کپڑا باندھا ہوا

[1] [كنز العمال، حديث: ١٧٦٦٠، الفصل الثاني، في العَيْنِ]

ہے تو یہ بات بڑی غلط ہوتی ہے، اس لیے احتیاط کی جائے۔

موسیٰ علیہ السلام بہت حیاء دار تھے:

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے شرمیلے تھے، بڑے باحیا تھے، بڑے چھپنے والے تھے اور جب کبھی آپ کو غسل کی ضرورت ہوتی تو دور پہاڑوں میں نکل جاتے، تاکہ اپنی قوم، برادری سے دور چلے جائیں۔ اور دریا کے کنارے غسل کر کے واپس تشریف لے آتے تھے۔ اب قوم عجیب تھی۔ اس نے کہا: یہ اس لیے چھپتا ہے، یہ اگر مرد ہوتا تو سامنے نہاتا، اگر کو بیماری کوئی نہ ہوتی تو یہ سامنے کیوں نہیں نہاتا؟ یہ اس لیے چھپتا پھرتا ہے کہ اس کو برص بیماری ہے۔ اب دشمن کا کیا ہے جب دشمنی پر آجائے تو عیب لگانے میں کوئی دیر تو نہیں لگتی۔

ایک دن موسیٰ علیہ السلام دریا کے کنارے پر نہا رہے تھے اور آپ نے اپنے کپڑے اک پتھر پر اُتار کر رکھے اور آپ غسل فرمانے لگے، پانی میں مشغول ہوئے۔ جونہی غسل سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ پتھر کپڑے لے کر بھاگا جا رہا ہے۔ اب موسیٰ علیہ السلام گھبرا گئے کہ میرے کپڑے پتھر لے کر جا رہا ہے اور دوسرے میرے پاس کپڑے نہیں ہیں تو موسیٰ علیہ السلام غصے میں اس پتھر کے پیچھے دوڑے ''ثَوْبِي يَا حَجَرُ! ثَوْبِي يَا حَجَرُ!'' او پتھر! میرے کپڑے رکھ، کہاں تو بھاگ رہا ہے؟ اب موسیٰ علیہ السلام بھی غصہ میں بھول گئے کہ میں کہاں بھاگ رہا ہوں تو بھاگتے بھاگتے وہ الزام لگانے والے لوگ جس جگہ بیٹھے تھے وہیں آ کر وہ پتھر کھڑا ہو تو موسیٰ علیہ السلام بھی وہیں آ کر رُک گئے۔ اب موسیٰ علیہ السلام نے آ کر کپڑے اُٹھائے تو قوم نے دیکھا کہ ان کے اندر تو کوئی عیب نہیں ہے۔

اس لیے قرآن نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ۚ وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا﴾ [الاحزاب:٦٩] اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ کیا کرو جس سے انبیاء کو تکلیف پہنچے، ان کی شان میں کمی آئے۔ دیکھو! موسیٰ علیہ السلام پر ان ظالموں نے کیسا الزام لگایا؟ لیکن اللہ نے ان کو پاک صاف کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے ہاں بڑے مرتبے والے تھے۔

بہر حال وہ پتھر ان الزام لگانے والوں کے درمیان آ کر رک گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اس پتھر کو بھی عصا مارا تھا کہ تم میرے کپڑے لے کر کیوں بھاگے ہو؟ اس پتھر پر بھی اس مار کا نشان پڑ گیا اور اس پتھر نے تین یا چار یا پانچ بار سسکیاں بھی لی تھیں۔ یہ خدا کی قدرت ہے، قدرت کا نظام ہے۔

[صحيح البخاري، حديث:٢٧٨، باب: مَنِ اغْتَسَلَ عُرْيَانًا وَحْدَهُ فِي الْخَلْوَةِ...]

مقامِ ابراہیم علیہ السلام والا پتھر:

مثلاً دیکھیں کہ مقامِ ابراہیم پر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تو اس پتھر پر ان کے پاؤں کے نشانات پڑ گئے۔

ایک آدمی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ یہ جو مقامِ ابراہیم پر نشان ہے، یہ تو بڑا چھوٹا ہے، کیا ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں بالکل چھوٹے تھے؟ اب وہ آدمی پیمائش کر رہا ہے۔ خدا کے بندے! پہلے تو یہ دیکھو کہ ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ کو گزرے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟ تقریباً ساڑھے چار ہزار سال گزر گئے ہیں تو اس مدت کے بعد اب انہوں نے اس کے اوپر شیشہ چڑھا دیا ہماری قوم کی بدعت سے بچنے کے لیے، کیونکہ ہماری قوم بدعت کے اندر اتنی آگے گزر گئی ہے کہ پتھر ملے تو سلام، قبر ملے تو سلام، مقامِ ابراہیم کے اندر فوٹو ڈال دیتے ہیں کہ یہ میرا فوٹو ہے خیال رکھنا، میرے فوٹو کو پہچان لو، تاکہ قیامت کے دن میری سفارش کر سکو۔ یہ ہمارے عقیدوں کا حال ہے۔ اب تو خیر انہوں نے بلور چڑھا دیا۔ وگرنہ یہ پتھر تھا، باہر رکھا رہتا تھا اور اللہ کے کعبہ کے دروازے کے بالکل قریب تھا، سیلاب آیا تو یہ پیچھے چلا گیا، پھر اسی جگہ آیا اس پر بھی کئی انقلاب گزرے، بھرتے بھرتے بھر گیا۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ پورے کا پورا پاؤں اندر دھنس گیا ہو۔ مقصد تو یہ تھا کہ کچھ نشان قائم ہو جائے ایک علامت کے طور پر۔ اب یہ ضروری تو نہیں کہ عین اندر پاؤں دھنس جاتا اور انگلیوں کے نشان ہوتے اور ہمیں پتہ لگتا کہ پاؤں آپ کا آٹھ نمبر کا تھا یا نو نمبر کا تھا۔ ہماری قوم تو پاؤں کی پیمائش کر رہی ہے، ہماری قوم تو...... ماشاء اللہ!...... بڑی حضرت ہے۔

تمام انبیاء علیہم السلام کے جبے، دستار، تلواریں مبارک یہ لے گئے، مکہ مدینہ میں کوئی چیز نہیں، سب اُٹھا کر یہ اپنے ملک میں لے گئے۔ کوئی کہے گا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ مبارک ہے اور یہ دستار مبارک ہے اور ایسے ریشمی کپڑوں کی دستار ہے کہ پوری زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشمی کپڑا پہنا ہی نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا: ریشم مرد کے لیے حرام ہے (اور ان کے پاس خالص ریشم کی دستار ہے) پھر باقاعدہ حدیث مبارک میں موجود ہے کہ چھ ہاتھ سے زیادہ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پگڑی مبارک نہیں ہوتی تھی اور اس دستار کو ہمارے ہاں جو رکھی ہوئی ہے کھولا جائے تو بارہ ہاتھ لمبی ہے۔ یہ حدیث محل نظر ہے، غالباً بارہ ہاتھ کا بھی ثبوت ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا جتنا مال تھا وہ یہ لے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جتنا مال تھا وہ ہماری برادری لے گئی۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہمارے کام کی چیز ہے، ہم اس کا جلوس نکالیں گے۔ ایمان سے کہیں! میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں، آپ کعبہ شریف میں ہیں، سچی بات کریں! اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتے کے نیچے کی مٹی آپ کو مل جائے تو کیا آپ مجھے دیں گے؟ آپ کا دل گوارا کرے گا؟ آدمی اپنی جان دے دے گا، لیکن وہ مٹی نہیں دے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ میرے محبوب کی چیز ہے، تمہیں کیسے دے دوں؟ تم میرا سارا خاندان لے لو، لیکن میں یہ نہیں دے سکتا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت:

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جب موت آئی تو آپ نے وصیت فرمائی کہ یہ دو چادریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں اور فرمایا کہ یہ چادریں میں نے چھپا کر رکھی ہوئی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ناخن مبارک بھی چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ مجھے غسل دینے کے بعد انہی چادروں کے اندر کفن دینا اور یہ ناخن بھی میرے ساتھ قبر میں دفن کر دینا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی میرے پاس نشانیاں ہیں، میں ان کو کبھی نہیں چھوڑتا، نہ زندگی میں اور نہ موت میں۔ تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی چیز کسی کے پاس تھی تو کیا اس نے کہا کہ تم لے جاؤ؟

حضوا کرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خط کی قدر:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خط مبارک جو آپ نے ایک بادشاہ کو لکھا تھا اور وہ خط چلتا آیا اور چلتا آیا تو جب اس پر غربت کا عالم آیا، جس کے پاس یہ خط تھا کم از کم پچاس یا بیس ڈالر میں اس خط کو اپنی غربت کے زمانہ میں فروخت کیا۔ تو وہ ایک چھوٹا سا خط تھا اور ہمارے پاس ساری چیزیں موجود ہیں اور جہاں بھی جاؤ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک موجود ہیں۔ اللہ کے بندے! صحابہ میں بال تقسیم ہوئے تو کیا صحابہ چھوڑ گئے؟ وہ تو ان کے محبوب کی محبوب چیز تھی، وہ اس کو اپنی زندگی میں ساتھ لے گئے اور موت کے وقت بھی ساتھ رکھتے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے تو اپنی ٹوپی کے اندر سلوا لیے تھے کہ مجھ سے علیحدہ بھی نہ ہوں تو ان کو جب ایسی چیزیں محبوب تھیں تو کون اپنے محبوب کی چیز کسی کو دے گا؟ اور پھر وہ چیز بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ جس چیز کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہو جائے اس کی کتنی قیمت ہو جاتی ہے!!

آپ نے دیکھا نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے جس باغ میں کھجوریں لگائی تھیں، ہمارے

مسلمانوں نے ان کھجوروں کو جھپٹا مار مار کر ساری کھجوریں ہی ختم کر دیں۔

حضور اکرم ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ:

اگر ہمیں حضور ﷺ سے محبت ہے تو یاد رکھیں! حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ اللہ کا قرآن ہے جو گھر گھر میں موجود ہے۔ اس سے بڑا معجزہ محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملا ہی نہیں ہے، یہ قیامت تک قائم رہے گا اور میرے مدنی کی نبوت بھی قیامت تک قائم رہے گی۔ ساری دنیا کے معجزے ختم ہو گئے، وہ پتھر بھی نہ رہا، وہ عصا بھی نہ رہا، حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی جو پہاڑ سے نکلی تھی وہ بھی ختم ہو گئی، عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے بھی ختم ہو گئے، ہر پیغمبر کے معجزے ختم ہو گئے، لیکن میرے مدنی کی نہ نبوت ختم ہو گی اور نہ معجزہ قیامت تک ختم ہو گا۔ آپ کی نبوت و رسالت بھی قیامت تک، آپ کا دین بھی قیامت تک، آپ کی شریعت بھی قیامت تک اور اللہ نے آپ کو جو قرآن معجزہ عطا فرمایا، وہ بھی قیامت تک ہے۔ آپ بتلائیں اس کے علاوہ کوئی اور معجزہ ہے؟

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۃ اعراف میں بھی موسیٰ علیہ السلام کا قوم کے ساتھ یہ قصہ موجود ہے، لیکن فرق اتنا ہے کہ سورۃ اعراف مکی سورتوں میں سے ہے اور سورۃ البقرۃ مدنی سورتوں میں سے ہے۔

سورۃ اعراف اور سورۃ البقرۃ میں فرقِ تخاطب:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۃ اعراف میں صیغہ غائب کا آیا ہے اور سورۃ مدنی کے اندر خطاب ہے، کیونکہ مدینہ کے اندر یہود موجود ہے، اس لیے ان کو خطاب کیا جا رہا ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک سیاق سورۃ اعراف کا ہے اور ایک سیاق سورۃ البقرۃ کا ہے۔ اس میں دس وجہ سے فرق آتا ہے۔ ان میں سے بعض لفظی ہیں اور بعض معنوی ہیں۔ اگر کسی نے یہ دیکھنا ہو تو زمخشری نے اپنی تفسیر کے اندر وہ سوال بھی ذکر کیے اور ان کے جواب بھی وہاں دیئے ہیں...... وَاللّٰهُ تَبَارَكَ أَعْلَمُ......

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۰، ۱۰۱، البقرۃ: الآیۃ: ۶۰]

﴿وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآىِٕهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ۠ (۶۱)﴾ [البقرۃ: ۶۱]

اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کریں گے، پس آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا مانگیں کہ وہ ہمارے لیے نکال دے جو کچھ زمین سے اُگتا ہے، ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز وغیرہ۔ کیا تم اس چیز کو بدلنا چاہتے ہو جو ادنیٰ ہے اس کی جگہ جو بہتر ہے؟ کسی شہر میں اُترو تو جو تم مانگتے ہو تمہیں ملے گا۔ اور ان پر ذلت اور محتاجی لازم کر دی گئی اور وہ اللہ کا غصہ لے کر لوٹے۔ یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کے احکام کو نہیں مانتے تھے اور پیغمبروں کا ناحق خون کرتے تھے۔ یہ اس لیے تھا کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے گزر جاتے تھے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اِعراض، جحود اور کفرانِ نعمت کے بارے میں ذکر فرمایا ہے۔

بنی اسرائیل کا زمینی خوراک کا مطالبہ:

اتنی نعمتوں کے بعد بنی اسرائیل نے پھر کیا کیا؟ اللہ نے فرمایا: یاد کرو کہ جب تم نے کہا تھا: اے موسیٰ! ہم ہرگز صبر نہیں کر سکتے ایک قسم کے طعام پر۔ اب ان کے الفاظ میں غور کریں جو اللہ نے نقل فرمائے ہیں۔ یعنی یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ اے موسیٰ! اللہ سے عرض کریں کہ ہمیں اور قسم کا طعام ملے۔ لیکن کہا: ہم سے ایک ہی کھانے پر صبر نہیں ہو سکتا کہ ایک قسم کا کھانا کھاتے رہیں۔ حالانکہ یہ محبوب ترین کھانا ہے، جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

آج بھی آپ دیکھیں کہ بنی اسرائیل کے واقعہ کو ہزاروں سال بیت گئے، اب بھی دنیا ترقی اور اتنی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ پرندوں کا گوشت آدمی کے لیے زیادہ مفید ہے اور پرندوں کی غذا سب سے زیادہ محبوب غذا سمجھی جاتی ہے، ورنہ بعض گوشتوں کے اندر دسامت ہوتی ہے، بعض گوشتوں کے اندر ثقل ہے، بعض گوشتوں کو

نظامِ معدہ برداشت نہیں کر سکتا، بعض گوشت گردوں پر اثر ڈالتے ہیں اور بعض کے اندر چربی زیادہ ہوتی ہے وہ کولیسٹرول زیادہ پیدا کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے "لَنْ" کے ساتھ نفی کی کہ ﴿لَنْ نَّصْبِرَ﴾ جو نفی تاکید کے لیے ہوتی ہے کہ ہم ہرگز نہیں برداشت کریں گے کہ ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے رہیں۔

قدرتی چیزوں کے استعمال کا صحیح طریقہ:

خدا کی قدرت ہے کہ آج دنیا کی طب اس بات پر اتفاق کرتی ہے کہ اللہ کی جو بنائی ہوئی چیزیں ہیں وہ نقصان نہیں کرتیں بشرطیکہ ہم ان کو اسی شکل میں استعمال کریں۔ نقصان تب ہوتا ہے جب ہم اپنے مرچ مصالحے ڈالتے ہیں، جب ہم مرکب بناتے ہیں، انگاروں پر پکا کر کھاتے ہیں۔ کبھی گوشت نقصان نہیں دے گا، لیکن جب ہم نے اس میں گھی ڈالا، زعفران ڈالا، دارچینیاں ڈالیں، ہری مرچیں ڈالیں، کالی مرچیں ڈالیں، پھر پیلی مرچیں ڈالیں، پھر سبز مرچیں ڈالیں، تو وہ ایک قسم کا زہر بن گیا۔ وہ گوشت نہیں رہتا، بلکہ وہ تو ایک مرکب ہے جیسے حکیم صاحب نے کوئی نسخہ تیار کیا ہو، ہمارے لیے جوارش بنائی ہو۔

آپ دیکھ لیں کہ جتنے پھل ہیں ان کے نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھل آپ کھائیں، کبھی نقصان نہیں ہوگا۔ اور اللہ نے قدرتی طور پر ہر بندے میں تھرموسٹیٹ لگا دیا ہے کہ آپ پھل اس سے زیادہ مقدار سے نہیں کھا سکتے۔ آپ کا کتنا ہی محبوب ترین پھل ہو، آپ کھانا شروع کریں، ایک حد آجائے گی اور آپ کہیں گے کہ بس ہے۔ اللہ نے خود انتظام کر دیا ہے، بندہ ضرورت سے زیادہ کھا ہی نہیں سکتا۔ ہر آدمی کی چونکہ ضرورت مختلف ہے، لہٰذا خوراک مختلف ہے۔ ایک آدمی ایک پرتگال کھا کر سیراب ہو جاتا ہے اور دوسرا آدمی دس کلو بھی کھا سکتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے جتنی چیزیں بنائی ہیں، اگر ہم قدرت کی چیزوں کو اسی سادگی میں استعمال کریں تو بالکل نقصان نہیں ہے۔ ہم خود ان کو مرکبات میں بدلتے ہیں، کیونکہ ہمارا بھی تو ایک غذا پر گزارا نہیں ہوتا۔

حرام کی بجائے حلال بیوی پر گزارہ:

اسی لیے دیکھا ہے کہ گھر میں چاند سی خوبصورت بیوی بھی ہو تو بھی باہر گھومتا پھرے گا، کیونکہ بیچارا ایک بیوی پر کیسے گزارا کرے؟ اللہ نے گھر میں حلال کی بیوی دی ہو، شریف بھی ہو، خوبصورت بھی ہو، عزت کرنے والی بھی ہو، وفادار بھی ہو، لیکن کتے کی طرح گلیاں چاٹتا پھرے گا۔ اسی طرح یہ بیچارا ایک کھانے پر کیسے گزارا کرے؟ اس کو بھی

تو ٹیسٹ چینج کرنا ہوتا ہے۔ اور بیوی ذائقہ بدل لے تو کہتے ہیں کہ اس کو طلاق دیتے ہیں، اس کو قتل کرتے ہیں، میری بیوی نے اتنی جرأت کی کہ میرے حکم کے بغیر گھر سے باہر نکل گئی۔ تم جو سارا دن باہر پھرتے ہو اور لوگوں کی عورتوں کو تاڑتے ہو تو تمہاری بیوی کیوں نہ کرے؟ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ گندم سے گندم پیدا ہوگی، جَو سے جَو پیدا ہوگا۔ اگر تمہیں اللہ نے چلنے پھرنے کے لیے ٹانگیں دی ہیں تو اس کو بھی ٹانگیں دی ہیں، تمہارے پاس دو آنکھیں ہیں تو اس کے پاس بھی دو آنکھیں ہیں، تم اپنی بیوی سے وفادار رہو گے تو وہ بھی تمہاری وفادار رہے گی اور تم کبھی غیر پر نظر ڈالو گے تو وہ بھی غیر پر نظر ڈالے گی۔

تفسیر:

"بقل" ساگ کو کہتے ہیں اور "قثاء" ککڑی کو کہتے ہیں، "فُوم" سے مراد لہسن ہے۔ بعض نے کہا کہ اس سے مراد "گندم" ہے۔ ﴿وَعَدَسِهَا﴾ دال، ﴿وَبَصَلِهَا﴾ اور وصل پیاز۔ یہ چیزیں جو زمین سے اُگتی ہیں، یہودیوں نے کہا کہ ان سے ہمیں عطا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی شان دیکھو کہ مانگا ان اسرائیلیوں نے تھا، یہ چیزیں ہمارے گلے بھی پڑ گئیں۔ اگر وہ نہ مانگتے تو شاید اللہ ہمیں بھی پھلوں سے رزق عطا فرما دیتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا:

آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اپنی اولاد کے لیے دعا مانگی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام اپنے بچوں کو چھوڑ کر گئے تھے کہ ﴿وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ﴾ [ابراہیم: ۳۷] اب نبی کی دعا میں دیکھو کہ کتنی جان ہے اور کتنی شان ہے۔ اللہ کا پیغمبر کہتا ہے کہ میرے اللہ! میں اپنے بچوں کو ایسی جگہ چھوڑ کر جا رہا ہوں ﴿بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾ ایسی وادی میں جہاں کوئی زراعت نہیں، پانی نہیں، کوئی چیز نہیں اُگتی۔ پہلے ان کے کھانے کے لیے نہیں کہا، بلکہ پہلے کہا: ﴿رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ میرا اللہ! ان کو یہاں اس لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ یہ تیرے گھر کے قریب ہیں اور جہاں اللہ کا گھر ہو وہاں نمازیں ہوتی ہیں۔ یہ تو نہیں کہ مسجد بنا دو اور نماز نہ پڑھو، مسجد پر سونا لگا دو اور مسجد میں کوئی بھی داخل نہ ہو۔ ﴿رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ اے میرے رب! تاکہ تیری نماز کو قائم رکھ سکیں۔ اور اس کے بعد مانگا کہ مولا! چونکہ یہ اکیلے ہیں ﴿فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ﴾ میرے اللہ! نمازوں کے لیے بھی تو جماعت کی ضرورت ہوتی ہے، آبادی ہوگی تو تیرے گھر میں جماعت ہوگی، ان لوگوں کے دلوں کو میرے

بچوں کی طرف پھیر دے۔ یہ نبی کی دعا ہے۔ آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی: ﴿وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ﴾ میرے اللہ! میرے بچوں کو رزق اور پھل عطا فرما۔

اب دیکھیں کہ خدا کی شان ہے! پیغمبر نے یہ نہیں فرمایا کہ ان کو ککڑی عطا فرما، بصل عطا فرما، فوم عطا فرما، کوئی گندم، جو پیدا فرما دے، بلکہ کہا: پھلوں سے رزق عطا فرما۔ اگر زمین سے پھل اُگ سکتے ہیں تو باقی بھی ساری چیزیں اُگ سکتی ہیں اور پھل اعلیٰ زمینوں میں ہوتا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی کہ اس زمین میں خصوصی برکتیں عطا فرما۔ اسی ضمن میں پیغمبر نے سب کچھ مانگ لیا کہ اللہ میاں! آپ تو جانتے ہیں کہ پھل بھوک کے لیے نہیں کھائے جاتے، پھل تو لذت کے لیے کھائے جاتے ہیں تو پہلے کھانا ملے گا تو بعد میں پھل لذت کے لیے کھائیں گے تو پھل مانگ کر گویا سب کچھ مانگ لیا۔

اب بھی آپ دیکھیں کہ دعوتیں ہوتی ہیں تو پہلے کھانے لگائیں گے، سب کچھ لگنے کے بعد کہیں گے کہ فروٹ لاؤ۔ سب سے آخر میں پھل ہوتا ہے کہ وہ لذت کے لیے کھاتا ہے تو اس لیے پیغمبر نے ایک ایسی جامع دعا مانگی ہے کہ اللہ! میرے بچوں کو پھل عطا فرما، یعنی اس سے پہلے جو آپ نے دینا ہے ﴿وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ﴾ [ابراہیم: ۳۷] پھر یہ بھی بتلا دیا کہ تاکہ میرے اللہ! یہ تیرا شکر ادا کرسکیں، تیری نعمتوں کا حق ادا کرسکیں۔ اور پھر ساتھ یہ بھی درخواست کردی: ﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ﴾ [ابراہیم: ۳۸] میرے اللہ! میری ظاہری دعا کو جیسے تُو جانتا ہے دل کے اندر جو کچھ ہے وہ بھی تیرے سامنے ہے، ہر چیز تیرے سامنے ہے، یہ نہیں کہ زبان پر کچھ ہے اور اندر کچھ ہے۔ میرا ظاہر و باطن تیرے آگے ہے۔ لیکن یہاں بنی اسرائیل کیا کہہ رہے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسندیدہ غذائیں:

جیسا کہ حدیث مبارک میں موجود ہے کہ میرے مدنی سرکار کو ککڑی بہت پسند تھی۔ ایک کھیرا ہوتا ہے اور ایک ککڑی، ہلکے سبز رنگ کی اور تھوڑی لمبی ہوتی ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ بے حد پسند تھی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب غذا کھجور اور ککڑی تھی۔ بلکہ ایک صحابی آئے تو بہت کمزور تھے، بالکل نحیف تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اس کو کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: حضور! یہ کمزور ہے، یہ موٹا نہیں ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسا کرو کہ کھجور اور ککڑی لے لو، ان دونوں کو ملا کر کھاتا رہے تو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے کھائے تو وہ چند دنوں میں ٹھیک ہو گیا، موٹا

ہو گیا اور اس کا وزن وغیرہ سب برابر ہو گیا۔

اسی طرح حضور پاک ﷺ کو شہد اور دودھ بہت پسند تھا، یعنی کبھی شہد اور دودھ ملا لیتے اور کبھی دودھ ویسے نوش فرما لیتے، اور کبھی اگر گرمیاں زیادہ ہوتیں تو حضور ﷺ دودھ میں پانی ملا لیتے، جس کو دودھ کی لسی کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی رواج ہوتا ہے۔ ایک دہی والی لسی ہوتی ہے اور ایک دودھ والی لسی ہوتی ہے، ہمارے ہاں عام بنتی ہے۔ تو یہ حضور ﷺ کی بڑی محبوب غذاؤں میں ہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ کو بٹیر کا گوشت بھی بہت پسند تھا۔ اسی طرح بکرے کے چوڑے کا گوشت (جس کو دستی بھی کہتے ہیں) بڑا محبوب تھا، یعنی بعض چیزیں میرے آقا ﷺ کو مرغوب تھیں، جیسے خوشبو حضور ﷺ کو بہت پسند تھی۔ اور اس زمانہ میں مشک اور گلاب، عود اور عنبر یہ چار خوشبوئیں جو میرے آقا ﷺ کے زمانہ میں استعمال ہوتی تھیں۔

حضور ﷺ کو یہ چیزیں بہت محبوب تھیں۔ تو یہ خدا کی نعمتیں ہیں، لیکن بات یہ ہے کہ ایک اعلیٰ نعمت کو چھوڑ کر ادنیٰ مانگے تو یہ ناشکری ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ یہ نعمتیں نہیں ہیں، بلکہ ان کو تو ساری دنیا استعمال کر رہی ہے، اس کو ساری دنیا کھا رہی ہے، ساری دنیا ان سے فائدہ اُٹھا رہی ہے۔

بہر حال جب انہوں نے اللہ کی اعلیٰ نعمت کو چھوڑ کر مذکورہ بالا نعمتیں "بقل" مانگا...... ویسے ہر عام سبزی کو بھی "بقل" کہتے ہیں اور ساگ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور "بصل" پیاز کو کہتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: ﴿أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ﴾ ایک گھٹیا چیز کو مانگ رہے ہو اس کے بدلہ میں جو بہتر ہے، یعنی اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کو مانگ رہے ہو؟ اس کے بعد فرمایا: ﴿اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ﴾ اگر ایسی بات ہے تو تم کسی شہر میں اُترو وہاں ہر چیز تمہیں ملے گی۔

"ھبوط" کا معنی ہوتا ہے: "اوپر سے نیچے اُترنا" اور "صعود" کا معنی ہوتا ہے: "نیچے سے اوپر کی طرف چڑھنا"۔ یہاں معنی یہ ہے کہ اگر آدمی سفر میں ہو تو گویا وہ سواری پر ہے اور جب آدمی واپس کسی گھر میں آتا ہے تو گویا اب وہ سواری سے اُترا ہے، یعنی جو سفر میں ہے گویا وہ ہر وقت چڑھا ہوا ہے، جب سفر ختم ہو گیا، گھر آ گیا تو گویا ابھی اُترا ہے۔ اس لیے بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا: ﴿اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ﴾ مفسرین کرام نے فرمایا کہ اس لفظ میں ایک عجیب اشارہ ہے کہ جیسے سوار نیچے اُترتا ہے اسی طرح اگر آدمی اعلیٰ مرتبہ سے نیچے گر جائے تو وہ بھی اوپر سے نیچے آیا ہے۔

تفسیر:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اصل بات یہ ہے کہ ان پر جب اللہ کی نعمتیں آئیں تو وہ اور زیادہ اکڑ گئے، بجائے اس کے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرتے، انہوں نے کفرانِ نعمت کیا اور تکبر کیا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بقل، بصل، عدس اور قثاء سب چیزیں معروف ہیں اور فوم کے معنی میں اختلاف ہے۔ مفسرین کے نزدیک کیونکہ بعض قراء نے اس کو ''فاء'' کی بجائے ''ثاء'' کے ساتھ ''وَ ثُومِهَا'' پڑھا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ''ثوم'' اصل میں قدیم لغت کا لفظ ہے جب وہ محاورات کے اندر کہا جاتا تھا: ''فُوْمُوْا لَنَا'' تو معنی یہ ہوتا تھا کہ ہمارے لیے روٹی پکاؤ، تو اس لیے علماء نے ''فوم'' سے گندم کا معنی لے لیا ہے۔

حضرت ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہی بات ٹھیک ہے، کیونکہ بعض حروف مبدلہ ہوتے ہیں کہ ''ثاء'' کے ساتھ بھی آتے ہیں اور ''فاء'' کے ساتھ بھی آتے ہیں، جیسے ''عاثور، عافور'' ثاء کے ساتھ بھی اور فاء کے ساتھ بھی آ گیا، اسی طرح ''مغاثیر، مغافیر''۔ تو ان میں یہ تبادلہ ہوتا ہے کہ کبھی ''ثاء'' پڑھی جاتی ہے اور کبھی ''فاء'' پڑھی جاتی ہے، کیونکہ ''ثاء'' اور ''فاء'' کا مخرج بھی قریب ہے۔ لہٰذا یہ لغت عرب میں بہت پایا جاتا ہے، کئی مقامات پر یہ حروف قربِ مخرج کی بناء پر ایک دوسرے کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ ''فوم'' سے مراد گندم ہے جس کو آج کل آپ ''حِنطَة'' یا ''گیہوں'' کہتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۱، البقرۃ: الآیۃ: ۶۱]

''فوم'' کی تفسیر ابن عباس:

ایک روایت کے اندر یہ بھی آیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا: اس سے مراد گندم ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کیا تُو نے اُحیحہ بن الجلاح کا قول نہیں سنا؟

قَدْ كُنْتُ أَغْنَى النَّاسِ شَخْصًا وَاحِدًا

وَ رَدُّ الْمَدِيْنَةَ عَنْ زِرَاعَةِ فُوْمِ

''میں بہت بڑا صاحب یسر ہوں اس وجہ سے کہ میں گندم کی زراعت کرتا تھا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ''فُوم'' بنی ہاشم کی لغت میں ''گندم'' کو کہتے ہیں۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا کہ "فُوم" سے مراد گندم ہے۔ ابن درید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فوم گندم کے بٹے کو کہتے ہیں۔

حضرت علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ "فُوم" سے مراد ہر وہ دانہ ہے جس سے روٹی پکائی جائے (چاہے گندم ہو، چاہے جو ہو، چاہے باجرہ ہو، جن چیزوں سے بھی روٹی پکتی ہے اس پر "فُوم" کا اطلاق ہوتا ہے)۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ "فُوم" چنے کو کہتے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک قول نقل کیا ہے کہ ہر وہ دانے دار چیز جو کھائی جاتی ہے، اس پر "فُوم" کا اطلاق ہوتا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱۰۱/۱، البقرۃ: الآیۃ: ۶۱]

﴿قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ﴾ اس کے اندر ان کے لیے تقریع ہے، توبیخ ہے، جھڑک ہے، زجر ہے کہ یہ کیا کر رہے ہو کہ تم ایک اعلیٰ طعام کو چھوڑ کر ادنیٰ چیزیں اس کے بدلے میں مانگ رہے ہو؟

﴿اهْبِطُوا مِصْرًا﴾ حضرت ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کو اسی طرح پڑھا جائے گا، کیونکہ تمام مصاحف میں اسی طرح ہے۔ ﴿اهْبِطُوا مِصْرًا﴾ بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ اُترو کسی شہر میں۔ مصر شہر کو کہتے ہیں اور شہر کی کوئی تعیین نہیں تھی، جس شہر میں تم چلے جاؤ، یہ سبزیاں وغیرہ تم کو وہاں بھی مل جائیں گی۔

﴿اهْبِطُوا مِصْرًا﴾ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں بغیر اجراء کے ہے۔

حضرت ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس مصر سے مراد وہ مصر ہے جس میں فرعون کی بادشاہی تھی۔ چاہے اس کو "مِصْرًا" پڑھیں یا "مِصْر" پڑھیں، دونوں سے مراد فرعون کا مصر ہے۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے جو نعمتیں مانگیں، اللہ نے عطا فرما دیں۔ جب بادل مانگا تو بادل عطا فرما دیا، کھانا مانگا تو من وسلویٰ عطا فرما دیا، پانی مانگا تو بارہ چشمے عطا فرما دیئے، لیکن جب یہ سوال کیا تو اس کے بدلے میں کوئی جواب بھی نہیں آیا، اس لیے کہ یہ سوال، سوال نہیں تھا، بلکہ تکبر تھا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱۰۱/۱، البقرۃ: الآیۃ: ۶۱]

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾﴾ [البقرۃ: ۶۱]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ یہ ایسے ہے جیسے کسی کے اوپر خیمہ لگا دیا جائے تو جو کچھ خیمہ کے اندر ہوتا ہے اس کے چاروں طرف آجاتا ہے۔ اس لیے شرعی طور پر بھی اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے اندر بھی ذلت ان پر لازم کردی گئی، یعنی وہ جہاں بھی رہیں گے، کسی حال میں بھی ہوں گے، ذلت اور دناءت ان سے علیحدہ نہیں ہوگی۔ اگر چند دنوں کے لیے کسی طرح ان کو قوت حاصل بھی ہو تو وہ ان کی اپنی نہیں ہوتی، بلکہ دراصل کسی کے سائے کے نیچے ہوتی ہے، جب وہ سایہ ہٹے تو اس کے بعد پھر ان پر ذلت آگئی۔

اس لیے آپ بخت نصر کی تاریخ پڑھ کر دیکھیں، اسی طرح ہٹلر نے یہودیوں کے ساتھ کیا کیا، وہ تاریخ پڑھ کر دیکھیں اور اسی طرح فرعون کے زمانہ میں ان پر کتنی ذلت آئی، پھر موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کتنی ذلت آئی کہ ستر ہزار بنی اسرائیل طاعون کی بیماری میں ایک دن میں مر گئے۔ اور اس کے بعد ان پر کتنی بڑی ذلت آئی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری توبہ قبول کروں گا جب ایک دوسرے کو قتل کرو گے۔ تو ایک دن کے اندر ستر ہزار بنی اسرائیل قتل ہوئے۔ اس لیے یہودی کتنا ہی سرمایہ دار کیوں نہ ہو جائے اس کی شکل اور عمل سے ہر وقت معلوم ہوگا کہ بھوکا ہے۔

جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی سائل بن جائے، یعنی مانگتا ہو، منہ سے سوال کرتا ہو تو اس کی پیشانی پر فقر لکھ دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ کروڑوں پتی بن جائے لیکن ہمیشہ وہ مانگتا رہے گا اور معلوم ہوگا کہ یہ ہر وقت بھوکا ہے۔ یہ ذلت ہوسکتی ہے۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''ذلت'' سے مراد ''جزیہ'' ہے کہ دیکھیں کہ جب وہ مدینہ میں رہے تو ان کو جزیہ دینا پڑا، بلادِ عرب میں رہے تو جزیہ دینا پڑا، اب بھی جہاں رہتے ہیں دوسروں کو جزیہ دے کر ہی رہنا پڑتا ہے۔

عبدالرزاق نے معمر سے اور انہوں نے حضرت حسن رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے نقل فرمایا ہے کہ ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس حال میں رہیں گے کہ وہ مسلمانوں کو جزیہ عطا کریں گے، اپنے ہاتھ سے ذلیل اور عاجز ہو کر دیں گے۔

حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ذلیل کیا۔ ان کا کوئی شرف نہیں، کوئی مقام اور عزت نہیں اور اللہ نے ان کو ہمیشہ مسلمانوں کے قدموں کے نیچے کر دیا، ذلیل کر دیا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم بھی تو مسلمان بنیں۔ جب ہم مسلمان نہ بنیں اور ہمارے اعمال سے کافر اور یہودی بھی شرمائیں تو یہودی کیسے ذلیل ہوں؟

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۲، البقرۃ: الآیۃ: ۶۱]

بنی اسرائیل کی ذلت کیوں آئی؟

یہ یاد رکھیں کہ ان پر ذلت کیوں آئی تھی؟ کہ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تھی، انبیاء کو قتل کیا تھا، اللہ کے احکامات و آیات کے منکر ہو گئے تھے۔ اور جو توہین و ناشکری کریں گے ان کی تکلیفیں ہمیشہ کے لیے بڑھتی چلی جائیں گی۔ باقی ایمان اور کفر کا معاملہ رہا تو اس کی سزائیں آخرت میں ہوں گی کہ جو مومن ہے اللہ کی رحمت سے کسی نہ کسی طرح جنت میں آجائے گا اور جو کافر ہے وہ ہمیشہ جہنم میں جلے گا۔

﴿وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جیسے کوئی چیز خرید لیں تو اس کی ملکیت لازمی طور پر ثابت ہو گئی تو ان پر بھی اللہ کا غضب لازم ہو گیا، یعنی لوٹ آئے اللہ کے غضب کے ساتھ۔ ''بَآءَ یَبُوْءُ'' کا معنی ہوتا ہے: ''اِنْصَرَفُوْا''۔ جیسے قرآن میں دوسری جگہ بھی ہے: ﴿اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ﴾[المائدۃ:۲۹] حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے نے اپنے بھائی سے کہا تھا کہ اگر تم مجھے قتل کرو تو بھی میں تمہیں قتل نہیں کرتا، میں چاہتا ہوں کہ میرا گناہ بھی اور اپنا گناہ بھی تم خود لے لو، میں گناہ نہیں لینا چاہتا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خلاصہ یہ نکلا کہ وہ اس حال میں لوٹے کہ ان پر اللہ کا غضب ہو گیا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ﴾[البقرۃ:۶۱] اللہ نے فرمایا کہ ہم نے یہودیوں کو یہ سزا کیوں دی؟ ہم نے ان پر یہ دناءت اور مسکنت کیوں نازل فرمائی؟ اس لیے کہ انہوں نے ہماری آیات سے کفر کیا، انہوں نے تکبر کیا اور جو دین والے تھے ان کی توہین کی اور ہم نے ان پر ذلت اس لیے نازل کی کہ انہوں نے میرے نبیوں کی اور ان کی اتباع کرنے والے، صحابہ، تابعین، علماء کی اہانت کی، ان کو قتل کیا تو کفر و انکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر اللہ کا غضب ٹوٹ پڑا۔

بعض فرقوں میں مسلمانوں کے درمیان منافرت کی تعلیم:

آپ دیکھیں کہ آج صحابہ رضی اللہ عنہم سے مقدس کوئی جماعت نہیں، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالیاں دی جاتی ہیں اور ایک دو تین یا چار نہیں، بلکہ ہزاروں کتابیں لکھ کر، کتابوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام پر تبرا کیا جاتا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم کو......نعوذ باللہ!......منافق اور مرتد کہا جاتا ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لاکھوں صحابہ میں سے صرف تین کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ وہ مسلمان تھے، باقی......نعوذ باللہ!......سب مرتد ہو گئے۔ اور یہ کرنے والے وہ لوگ ہیں جو

کہتے ہیں کہ ہم بڑے مومن ہیں۔ جب سب صحابہ رضی اللہ عنہم کو نہ بخشا جائے، حضور ﷺ کی نبوت کے اوپر ڈاکہ ڈالا جائے اور حدیث کا کھلا انکار کر دیا جائے کہ حضور ﷺ کی حدیث کے محفوظ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اڑھائی سو سال کے بعد تک لوگوں کو حضور ﷺ کی باتیں کہاں یاد تھیں؟ یہ تو حدیثیں لوگوں نے خود بنائی ہیں۔

اسی طرح دیکھیں کہ جو جماعتیں دین کا کام کر رہی ہیں، اپنے بسترے خود اٹھاتی ہیں اور تبلیغ کر رہی ہیں، ان کو گالیاں دی جاتی ہیں، کسی مسجد میں جائیں تو لوگ کہتے ہیں کہ مسجد کو دھو ڈالو، کافر آ گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے کافروں کے آنے پر بھی کبھی مسجد نہیں دھلوائی، یہ مسلمانوں کے لیے دھلواتے ہیں۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں عیسائی آئے تو حضور ﷺ نے فرمایا: ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرا دو۔ یہ کسی حدیث میں نہیں ہے کہ جب وہ چلے گئے تو حضور ﷺ نے فرمایا ہو کہ مسجد کو دھو ڈالو۔ کئی کافر قید ہو کر آتے تھے تو حضور ﷺ فرماتے تھے کہ مسجد کے ستون کے ساتھ کافر کو باندھ دو، وہ بندھا رہتا تھا، جب چھوڑ دیا تو کبھی نہیں فرمایا کہ ڈول لے آؤ، یہاں کافر کھڑا تھا۔ لیکن تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ یہ حشر ہوتا ہے کہ دین کے نام لینے والے چلے جائیں گے، آپ سے کچھ نہیں لیتے، لیکن وہ کہتے ہیں: باہر پڑے رہو، سردی میں پڑے رہو، تم مسجد میں نہیں رہ سکتے، تم مسلمان نہیں ہو۔ اگر مسلمان نہیں ہیں تو کیا وہ گرنتھ لے کر پھر رہے ہیں؟ وید کی تبلیغ کرتے ہیں؟ ان کے پاس تورات ہوتی ہے، انجیل ہوتی ہے یا کوئی اور کتاب ہوتی ہے جس کا وہ نام لیتے ہیں؟ تمہارا دماغ نہیں ملتا نہ ملے، کافر تو نہ کہو۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''اَلْکِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَ غَمْطُ النَّاسِ''[1] تکبر یہی ہوتا ہے کہ حق کا انکار کرے اور لوگوں کی عزت کو چھپائے۔ اللہ کے حق کو پورا نہ کرے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرگوشی کرنے سے میں کنارہ کش نہیں ہوتا تھا، نہ اس چیز سے نہ اس چیز سے۔ ایک دن میں آپ ﷺ کی خدمت میں آیا تو آپ ﷺ کی خدمت میں مالک بن مرارہ الرھاوی بیٹھے تھے تو ان کی میں نے آخری بات سنی جو حضور پاک ﷺ سے کہہ رہے تھے کہ یا رسول اللہ! آپ جانتے ہیں کہ اللہ پاک نے مجھے بڑا جمال دیا ہے، خوبصورتی دی ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ میں کسی سے کم نہ رہوں، بلکہ میں ہر چیز سے اعلیٰ ہوں اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ لوگوں کے جوتے کے دو تسموں کے اندر بھی میں نہ گروں، میں تو جوتے میں

---

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۱۴۷]

بھی فخر کرنا چاہتا ہوں، لباس میں فخر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ فخر نہیں ہوتا، فخر یہ ہوتا ہے کہ حق کو چھپا دے اور لوگوں کی توہین کرے۔ اگر تم اچھا کپڑا، اچھا جوتا نہ پہنو تو تم بھی اللہ کی ناشکری کر رہے ہو۔

[مسند احمد بن حنبل: ۲۰۵۸]

حضور ﷺ نے تو فرمایا کہ منہ کے اندر بصل کی بدبو ہو تو مسجد میں نہ آؤ۔' اور جس کے پورے بدن سے بدبو آرہی ہو تو اس کے لیے بطریق اولیٰ مسجد میں آنے کی ممانعت ہوگی۔ لیکن کون ہے جو ان باتوں کو سنتا ہے؟

تفسیر:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ حال ہوگیا تھا کہ تین تین سو نبیوں کو ایک دن میں قتل کر دیتے تھے اور پھر شام کو اپنی دکانیں بھی کھولتے تھے اور بازار میں بھی بیٹھتے تھے جیسا کہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ قَتَلَهُ نَبِيٌّ أَوْ قَتَلَ نَبِيًّا وَ إِمَامُ ضَلَالَةٍ وَ مُمَثِّلٌ مِنَ الْمُمَثِّلِينَ" [کنز العمال: ۹۴۲۶۶] سب سے زیادہ عذاب اس شخص کو ہوگا جس کو نبی نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہو (کیونکہ وہ بڑا کافر ہوگا جس کو نبی اپنے ہاتھ سے قتل کرے، ورنہ ہر نبی اپنی اُمت پر مہربان ہوتا ہے) یا اس کو زیادہ سخت عذاب ہوگا جس نے اللہ کے کسی نبی کو قتل کیا ہو۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ ان آدمیوں کو سخت عذاب ہوگا جو بدعت، ضلالت اور گمراہی کے امام بن جاتے ہیں، ایسی بدعتیں نکالتے ہیں کہ ساری دنیا بدعتوں میں پڑی ہوئی ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو تصویریں بناتے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ ان کو یہ سزا اس لیے ملی کہ وہ عصیان کرنے والے تھے۔ "عصیان" کہتے ہیں کہ اللہ نے جن کاموں سے روکا ہے، ان کو کرنا۔ "يَعْتَدُوْنَ" کا معنی ہے: حد سے تجاوز کرنا، یعنی خدا کی نافرمانیوں والے کام بھی کرنا اور حد سے بھی نکل جانا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت کا عذاب رکھا ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۶۲﴾ [البقرة: ۶۲]

' [صحیح البخاری، حدیث: ۸۵۵]

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابئین جو بھی (ان میں سے) اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لایا اور نیک کام کیے تو ان کے لیے ان کا اجر و ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک قاعدہ، کلیہ، ایک اصول ذکر فرمایا ہے جو قیامت تک کے لیے تمام اللہ کی مخلوق کے لیے ہے۔ اگر وہ اس پر عمل کریں تو ان کے لیے باعثِ ہدایت اور باعثِ نجات و شفا ہے۔

مسلمانوں کے پاس دنیا میں عظیم نعمتیں:

اس لیے کسی مفسر نے ایک بڑی عجیب بات لکھی تھی! انہوں نے کہا کہ اللہ نے سورۃ الرحمٰن میں جو نعمتوں کا ذکر کیا ہے، اگر مسلمان ایک ایک نعمت پر غور کرے تو اللہ نے وہ سب نعمتیں عالم اسلام کو دی ہیں۔ آج بھی اگر آپ عالم اسلام پر نظر ڈالیں، مسلمانوں کے عدد پر نظر ڈالیں، الحمد للہ! عدد کے لحاظ سے بھی مسلمان ایک بہت بڑی قوت ہیں اور اسی طرح اگر اقتصادیات پر نظر ڈالیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمان ملکوں کو دولت سے مالا مال کیا ہوا ہے، کہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے خزائن میں سے کسی ملک کو سونا عطا فرما دیا، اللہ تبارک و تعالیٰ نے کسی ملک میں اپنے خزانۂ غیب سے تیل کے انتظامات فرما دیئے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے کسی ملک کو سمندر عطا فرما دیا۔

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ کے چار فرقے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ ایمان والوں کا ذکر آیا، ﴿وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا﴾ یہودیوں کا ذکر آیا، ﴿وَالنَّصٰرٰی﴾ نصرانیوں کا ذکر آیا، ﴿وَالصّٰبِـِٕیۡنَ﴾ صابیوں کا ذکر آیا ہے۔ ان چار کا ذکر قرآن پاک نے کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حضور ﷺ تشریف لائے تو اس وقت دنیا میں یہ چاروں فرقے موجود تھے۔

﴿وَالصّٰبِـِٕیۡنَ﴾ کا مصداق:

﴿وَالصّٰبِـِٕیۡنَ﴾ سے کون لوگ مراد ہیں؟ تو اس بارے میں علماء کرام نے متعدد اقوال ذکر کیے ہیں۔ ایک قول یہ ذکر کیا ہے کہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو سورج اور ستاروں کی پوجا کرتے تھے اور جو لوگ نمازیں بھی پڑھتے تھے، لیکن سورج نکلنے کے وقت سورج کی طرف رخ کر کے وہ یہ سمجھتے تھے کہ بڑا عالم اور مدبر افلاک اور مدبر سماوات والارض سورج ہے، سب کچھ نفع نقصان اسی کے اندر ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہودیت اور مجوسیت کا نام ''صابی'' ہے۔ اور بعض لوگوں نے کہا کہ یہ وہ لوگ تھے جو نصرانیت سے نکل گئے اور ایک نیا دین اختیار کیا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو یہودیت سے نکل گئے اور ایک نیا دین اختیار کیا۔ اب وہ نیا دین کیا تھا؟ بعض لوگوں نے تو سورج کی پوجا شروع کر دی، بعض لوگوں نے ستاروں کی پوجا شروع کر دی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱۰۳/۱، ۱۰۴، البقرۃ: الآیۃ: ۶۲]

''صابی'' کا ایک اور معنی:

حضور ﷺ کے زمانہ میں بھی مسلمان ہونے والے کو ''صابی'' کہتے تھے، یعنی جو نئے دین پر چلے وہ ''صابی'' ہے، چاہے وہ حق کا راستہ ہو یا باطل کا راستہ ہو۔ ﴿وَالصّٰبِـِٕیْنَ﴾ کے لفظ کا معنی حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں عوام کے نزدیک یہی تھا، اس لیے بعض نئے مسلمان ہونے والوں نے اپنے آپ کو ''صابی'' کہہ ڈالا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ قرآن ایک جامع کتاب ہے، ایک لفظ بول کر قیامت تک جتنی چیزیں پیدا ہوں گی اس میں سب کا ذکر آ گیا۔ یہودیت ونصرانیت کا ذکر کیا اور آگے ایک لفظ کہہ دیا صابئین کہ جو لوگ بھی نئے نئے فرقے بنانے والے ہیں، وہ سب مراد ہیں۔

یورپ میں آج ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو شیطان کی پوجا کرتے ہیں، ان کی پارٹی کا نام بھی ''شیطان پارٹی'' ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سارا نظام شیطان چلا رہا ہے، انہوں نے باقاعدہ شیطان کا مجسمہ بنا رکھا ہے اور باقاعدہ شیطان کی عبادت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شیطان راضی ہو جائے تو سارے کام منٹوں میں ہو جاتے ہیں۔ وہ باقاعدہ شیطان کی عبادت کرتے ہیں۔ آج بھی ہندو پاک میں ایسے مندر پائے جاتے ہیں کہ جہاں مرد وعورت کے خاص اعضاء کی پوجا کی جاتی ہے، ان کی تصویریں لگائی ہوئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان پیدا تو ان دو چیزوں سے ہی ہوتا ہے، اگر یہ دو چیزیں نہ ہوتیں تو آدمی کہاں سے پیدا ہوتا؟ تو انہوں نے ان چیزوں کو خدا بنایا ہوا ہے۔

ایمان کی اصل تفسیر:

مذکورہ آیت مبارکہ میں ﴿اٰمَنُوْا﴾ دو دفعہ آیا ہے تو بعض حضرات نے اس کے دو ترجمے کیے ہیں: ایک ترجمہ تو یہ ہے کہ جو لوگ اپنے اپنے نبیوں پر ایمان لے آئے اور سابقہ زمانے کے انبیاء پر بھی، اور اس کے بعد آنے والے

انبیاء پر بھی یا جنہوں نے یہودیت اختیار کی اور موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے، یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے یا ان پر تو ایمان نہیں لے آئے مجوسی تھے یا ستارہ پرست تھے، میرے نبی! ان کو بتلا دو کہ اگر نجات چاہتے ہو تو نجات اس وقت ملے گی جب صحیح معنوں میں اللہ پر ایمان لاؤ اور آخرت پر ایمان لاؤ، پھر نجات ملے گی۔ وگرنہ اگر پہلے ایمان پر رہو تو یہ فائدہ نہیں پہنچائے گا، کیونکہ وہ تو حضور مصطفیٰ ﷺ پر ایمان ہی نہیں لے آیا۔

اور بعض علماء نے یوں ترجمہ کیا ہے کہ میرے مدنی! جن لوگوں نے ظاہری ایمان کے دعوے کیے کہ ہم مسلمان ہیں، ہم ایمان والے ہیں لیکن ان کے اندر ایمان نہیں ہے صرف زبانی کلامی دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم یہودیت کے طریقے پر ہیں، لیکن انہوں نے تورات کو بدل ڈالا تو یہودیت پر بھی قائم نہ رہے اور جو نصرانیت کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا لیا اور تثلیث کا عقیدہ اختیار کر لیا اور وہ لوگ جنہوں نے آتش پرستی کی یا ستارہ پرستی کی، نیا دین پیدا کیا، یہ جب تک سچے اور پکے معنی میں، اندر، باہر سے ایمان نہیں لے آئیں گے اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی۔

تو اب نجات ملنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لائے۔ دو چیزوں کا ذکر کیا گیا اور باقی ساری چیزوں کا ذکر نہیں کیا گیا، حالانکہ ایک آدمی اللہ کو بھی مانے اور آخرت کو بھی مانے اور حضور ﷺ کو نہ مانے تو مسلمان نہیں ہو سکتا، اگر حضور ﷺ کی ختم نبوت کو نہ مانے تو مسلمان نہیں ہو سکتا، اللہ کے قرآن کو اللہ کی کتاب نہ مانے تو مسلمان نہیں ہو سکتا اور قرآن کو ناقص یا زائد مانے تو مسلمان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اول اور آخر ذکر کر دو تو درمیان والی چیز خود بخود آ گئی۔

جیسے فرمایا: ﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ [الرحمٰن:۱۷] اور کہیں فرمادیا: ﴿فَلَآ أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَٰرِقِ وَالْمَغَٰرِبِ إِنَّا لَقَٰدِرُونَ﴾ [المعارج:۴۰] اس کا یہ معنی تو نہیں ہوتا کہ صرف مشرق، مغرب اللہ کے لیے ہے اور درمیان شمال و جنوب کسی اور کا ہے، بلکہ وہ بھی اللہ کے لیے ہے اور شمال جنوب بھی اللہ کے لیے ہے۔ تو یہاں بھی ایسے ہے، کیونکہ حکم ہے کہ آخرت پر ایمان لائیں تو کیا ہم آخرت دیکھ رہے ہیں؟ آخرت کے بارے میں ہمیں خبر کس نے دی ہے؟ اللہ کے نبی نے خبر دی ہے تو نبی پر ایمان ہوگا تو آخرت پر بھی ایمان ہوگا۔ اللہ کے نبی کو خبر ملائکہ نے دی جو وحی لے آئے، لہٰذا ملائکہ پر ایمان ہوگا تو وحی پر بھی ایمان ہوگا۔

ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ضروری ہے:

اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا: یا رسول اللہ! باہر کے لوگ جب آتے ہیں اور آپ کے کپڑے مبارک بوسیدہ ہوتے ہیں، قمیص میں پیوند لگے ہوتے ہیں، چادر مبارک میں بھی ٹانکے لگے ہوتے ہیں اور نیچے بچھانے کے لیے بھی ٹاٹ ہے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے لیے کوئی اعلیٰ لباس بنوا دیا جائے، کم از کم ایک دو جوڑے رکھ لیے جائیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا کہہ رہے ہو؟ اللہ کا فرشتہ جس نے صور کو پھونکنا ہے اس نے صور اپنے منہ میں لیا ہوا ہے اور نظر اُٹھا کر او پر انتظار میں ہے کہ کب حکم ہوتا ہے اور صور پھونک دوں۔ تو قیامت جب آنے والی ہے تو ہم لباس میں وقت کیوں ضائع کریں؟ ہم کپڑوں میں وقت کیوں ضائع کریں؟ آخرت کے لیے تیاری کیوں نہ کریں؟

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [البقرة: ٦٢]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صرف ایمان لفظی، زبانی کلامی کافی نہیں ہے، بلکہ عمل صالح بھی ہو۔ قرآن میں جہاں ایمان کا ذکر آئے گا وہاں عمل صالح کا ذکر آئے گا۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾ [الکہف: ١٠٧] اور ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا﴾ [مریم: ٩٦] اور یہاں فرمایا: ﴿مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾

دنیا حقیر ہے:

اسی لیے ایک حدیث مبارک میں آیا کہ اللہ کے ہاں اگر اس دنیا کی کوئی قیمت اور قدر و منزلت ہوتی تو اللہ کبھی اپنے دشمنوں کو نہ دیتا۔[1] کیونکہ یہ تو اتنی گندی چیز ہے سارا مدار آخرت پر ہے اور یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم دنیا کی کامیابیوں کو دیکھتے ہیں اور ہم آخرت پر نظر نہیں ڈالتے۔

بعض اللہ کے پیارے بندے ہوتے ہیں اور وہ دنیا میں اتنے غریب اور فقر و فاقہ والے ہوتے ہیں کہ کہیں رشتہ مانگیں تو ان کو کوئی رشتہ بھی نہ دے، کسی کو جا کر سفارش کریں کوئی ان کی سفارش بھی نہ مانے، کسی کو کوئی بات کہیں

[1] [سنن الترمذی، حدیث: ٢٣٢٠، بَابُ مَا جَاءَ فِي هَوَانِ الدُّنْيَا عَلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ]

تو وہ بھی ان کی بات نہ مانے، اور لباس ان کے غریبانہ ہوتے ہیں اور ان کے بال بکھرے ہوئے ہوتے ہیں نہ وقت پر کنگھی ہے اور نہ وقت پر تیل ہے اور نہ وقت پر چیزیں میسر ہیں، لیکن فرمایا کہ اللہ کے ہاں روئے زمین پر یہ بہترین بندے ہوتے ہیں۔[1] اور فرمایا: ان کا اللہ کے ہاں اتنا بڑا مقام ہوتا ہے اگر اللہ پر کوئی قسم کھالیں، کہ اللہ کی قسم! اللہ یہ کام کردیں گے تو اللہ ان کے ناز پورا کردیتا ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۶۲۲، باب: فَضْلِ الضُّعَفَاءِ وَالْخَامِلِينَ]

نیک مومن میت کی پکار:

اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ جب مومن کی میت ہوتی ہے تو وہ کہتی ہے: "عَجِّلُوْنِي، عَجِّلُوْنِي" مجھے جلدی لے چلو، مجھے جلدی لے چلو، کیوں دیر کر رہے ہو مجھے نہلانے میں؟ کیوں دیر کر رہے ہو مجھے قبر میں پہنچانے میں؟ مجھے جلدی میرے گھر میں پہنچادو۔

اسی لیے روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جو اللہ کے پیارے کا جنازہ ہے تو دیکھو گے کہ وہ ایسے جاتا ہے کہ دوڑ کر بھی جاؤ تو جنازہ نہیں ملتا۔ آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ یہاں جنازہ اٹھتا ہے، مختلف لوگ اٹھانے والے ہوتے ہیں، سب اپنے بیٹے اور بھائی تو نہیں ہوتے، ہر آدمی کو موقع ملا تو اس نے کندھا دے دیا تو بعض جنازے ایسے تیزی سے نکلتے ہیں کہ بندہ ان کو نہیں پہنچ سکتا۔ پیچھے بھاگ کر ان کو پکڑنا پڑتا ہے اور بعض ایسے ثقیل ہوجاتے ہیں کہ اٹھاؤ تو اٹھتا نہیں، ایسے معلوم ہوتا ہے کہ سفر بھی نہیں کٹتا۔

تو احادیث مبارک میں آتا ہے کہ جب مومن کا جنازہ ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ مجھے جلدی گھر لے جاؤ، اور کافر کا جنازہ ہو تو وہ کہتا ہے کہ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟ میں کہاں جا رہا ہوں؟ کیونکہ اس کو پتہ ہے کہ آگے جو کچھ میرے سامنے آنے والا ہے۔ تو فرمایا کہ ہم ان کے لیے پھر فرشتے بھیجتے ہیں وہ آکر ان کو مبارک دیتے ہیں جو ایمان والے ہوتے ہیں۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۱۳۱۶، باب: قَوْلِ الْمَيِّتِ وَهُوَ عَلَى الْجَنَازَةِ: قَدِّمُونِي]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا واقعہ:

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! اسلام لانے سے پہلے میں کچھ لوگوں کے ساتھ رہتا تھا، بڑے عبادت گزار تھے، بڑے اللہ کی یاد میں اور نمازوں میں

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۴۷، باب: فَضْلِ الْفَقْرِ]

وقت گزارنے والے تھے۔

وجہ یہ تھی کہ حضرت سلمان فارسی کے اسلام لانے سے پہلے ان کے دل میں جب جذبہ آیا تو نصاریٰ کا ایک بہت بڑا راہب تھا اس کی خدمت میں چلے گئے تھے اور اس کی خدمت میں رہتے تھے۔ وہ جب مرنے لگا تو اس نے وصیت کی کہ میرا آخری وقت آگیا تو تم فلاں ایک راہب موجود ہے، تم اس کے پاس چلے جاؤ۔ پھر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اس کے پاس بھی کافی عرصہ زندگی گزاری اور جب اس کے بھی مرنے کا وقت آیا تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ میں کہاں جاؤں؟ تم مر رہے ہو تو کسی عالم کی جگہ تو بتلاؤ کہ میں وہاں جا کر اپنی زندگی گزاروں؟ تو اس نے کہا کہ اے سلمان! اب روئے زمین پر کوئی صحیح معنوں میں اللہ کی عبادت والا بندہ نہیں رہا، اب کوئی صحیح معنوں میں دین عیسیٰ (علیہ السلام) پر قائم نہیں رہ گیا۔ لوگوں نے عقائد بدل ڈالے ہیں، لہٰذا میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اگر تمہیں موقع ملے تو اب ہر بات کو چھوڑ دو۔ ایک جگہ ہے جو ''یثرب'' کہلاتی ہے، حجاز کی سرزمین کے اندر ہے، وہاں چلے جاؤ۔ وہاں ایک نبی آئے گا جس کا نام محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا، وہاں جا کر اس پیغمبر پر ایمان لاؤ اور اس کی اتباع کرو، اگر کامیابی چاہتے ہو۔

[المعجم الكبير للطبراني، حديث:٦٠٦٥]

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اس وجہ سے مدینہ منورہ آئے تھے تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ان لوگوں کے ساتھ میں رہا ہوں، وہ اسلام کا نام نہیں لیتے تھے، لیکن نمازیں پڑھتے تھے، عبادت کرتے تھے، اللہ کو مانتے تھے۔

تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ میرے مدنی! آپ ان کو سمجھا دیں کہ جو یہودی ہے یا نصرانی ہے یا کوئی ہے، جو بھی اللہ پر عقیدے میں پکا ہے، اپنے وقت کے نبی کا غلام ہے تو وہ کامیاب ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ وہ نصرانی ہو تو اس کو جنت نہ ملے۔ اگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک ان کے دین پر قائم رہا اور نبی آخر الزمان کے آنے سے پہلے وہ وفات پا گیا تو ضرور جنت ملے گی، لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت آگئی تو پہلے والے سارے دین ختم ہو گئے، پہلے والے دین منسوخ ہو گئے، پہلی شریعتیں ختم ہو گئیں تو اب ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھیں، لیکن اپنے اپنے زمانہ میں انہوں نے اگر اپنے نبی کے دین پر زندگی گزاری تو کامیاب ہیں۔

حضرت سلمان فارسی بیٹھے ہوئے تھے اور حضور پاک ﷺ سے باتیں کر رہے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں کچھ ایسے لوگوں کے پاس رہا ہوں، وہ نمازیں بھی پڑھتے تھے، وہ روزہ بھی رکھتے تھے اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتلاتے تھے کہ ایک نبی پیدا ہوں گے، جن کا نام محمد مصطفیٰ ہوگا اور وہ آپ پر ایمان بھی رکھتے تھے تو ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟ تو اس روایت میں یہ آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یاد رکھو! کہ اگر ایک آدمی موسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم تھا اور تورات پر عمل کرتا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگئے تو وہ اسی تورات پر قائم رہا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلمہ نہیں پڑھا تو کافر ہو کر مر گیا۔ جب عیسیٰ علیہ السلام آگئے اور اب ان کی نبوت پر ایمان لانا ضروری تھا۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر عمل پیرا تھا اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا زمانہ آگیا، لیکن وہ تو کہے کہ میں موسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم ہوں، وہ بھی اللہ کے نبی تھے، یا وہ یہ دعویٰ کرے کہ میں عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم ہوں، وہ بھی اللہ کے نبی تھے اور میں اللہ کو بھی مانتا ہوں اور آخرت کو بھی مانتا ہوں، عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مانتا ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ بھی جہنمی ہے، کیونکہ اس نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو تسلیم نہیں کیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۳، التوحید لابن مندہ، حدیث: ۱۵۱]

علماء نے لکھا ہے کہ اگر ایک عالم اپنے علم پر عمل نہ کرے تو وہ علم سے محروم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح حدیث میں آتا ہے: ''مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ'' [تفسیر البیضاوی: ۲/ ۸۲، النساء: الآیۃ: ۶۷] (جو عالم علم پڑھے اور اس پر عمل کرے اللہ اس کو ایسا علم عطا کرتے ہیں جو وہ جانتا بھی نہیں ہوتا)۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۸۲] تم تقویٰ اختیار کرو، پھر اللہ تمہیں علم نصیب کریں گے۔ تو جتنا آدمی پرہیزگاری اختیار کرے گا، تقویٰ اختیار کرے گا اتنا علم دین کے حصول میں آسانی ہوگی اور اللہ سینے کو کھولتے چلے جائیں گے اور اللہ کا دین سمجھ آتا چلا جائے گا۔

نام کے اسلامی ملک کا واقعہ:

آپ یقین کریں کہ مجھے ایک دوست نے سنایا کہ ایک اسلامی ملک کی بات ہے کہ وہ وہاں ایک ہوٹل میں گیا تو ٹیبل بھرے ہوئے تھے اور بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی، اتنا رش تھا۔ بڑی مشکل سے مجھے جگہ ملی اور میں جا کر بیٹھا تو گھڑی دیکھی تو مغرب کا وقت تھا۔ میں نے ویٹر کو بلایا کہ مغرب کا وقت ہو گیا ہے، میں نے نماز پڑھنی ہے۔ تو اس نے کہا کہ نماز کیا ہوتی ہے؟ میں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ تو اس نے کہا: مسلمان ہوں۔ میں نے کہا کہ یہاں کوئی مسجد ہے؟

تو اس نے کہا: ہم نے تو نہیں دیکھی۔ میں نے کہا کہ تم میرے حال پر اتنی مہربانی کردو کہ کوئی ایسی جگہ ہے کہ جہاں میں وضو کرلوں؟ تو اس نے کہا کہ یہ ٹائلٹ بنے ہوئے ہیں...... اب وہاں کوئی ٹونٹی تو نہیں ہے، نہ ڈبہ ہے، نہ گلاس ہے، نہ وہاں لوٹا ہے۔ انگریزی ماحول میں لوٹا رکھا جائے تو کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی دیہاتی ہے۔ تو وہاں کاغذ پر گزارا ہوتا ہے یا وہ ایک گلاس پلاسٹک کا رکھ لیتے ہیں، اس کے اندر شیو کے آلات ہوتے ہیں، ضرورت پڑنے پر اسی کے اندر پانی ڈال کر گزارا کرلیا۔ یہ غیر مسلم شعار کی باتیں ہیں، اللہ نے ہم کو محفوظ رکھا ہے۔...... میں نے اس کو کہا کہ کوئی اور جگہ بتاؤ تو اس نے کہا کہ یہ جو ہمارے ساتھ باغ ہے تو اس میں پانی کے نل لگے ہوئے ہیں۔

میں نے وہاں جا کر وضو کرلیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے پاس عربی رومال تھا، میں نے ایک آدمی سے پوچھا اور سمت کا کچھ اندازہ بھی لگایا اور وہیں رومال بچھایا اور نماز شروع کردی۔ میں نے نماز پڑھ لی، میں نے کہا کہ اللہ کا فرض تو نہ جائے، لیکن ان میں سے ایک انسان بھی نہیں اُٹھا جس نے نماز پڑھی ہو، سینکڑوں ٹیبل جہاں بھرے ہوئے ہیں کم از کم چار پانچ سو آدمی جہاں بیٹھا ہوا ہوا ان میں سے ایک آدمی بھی نہیں اُٹھا جس نے نماز پڑھی ہو۔

پھر وہ کہنے لگا کہ میں نماز پڑھ کر اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا تو اس ہوٹل کا جو منیجر تھا وہ آیا اور اس نے مجھے کہا کہ میں نے آج آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں، لیکن چھبیس سال سے ہمارے گھر میں کسی نے نماز نہیں پڑھی۔ تم میرے اوپر اتنا احسان کرو کہ اب اس کے بعد کوئی اور نماز ہے یا ختم ہوگئی ہیں؟ تو میں نے کہا کہ عشاء کی نماز ہے۔ اس نے کہا کہ وہ نماز میرے گھر میں پڑھ لو، کم از کم میں یہ تو ڈائری میں لکھ لوں گا کہ میرے گھر میں کسی مسلمان نے نماز پڑھی تھی۔ تو میں نے کہا: میرے نماز پڑھنے سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ جب چھبیس سال سے تم نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے کہا کہ چلو میرے گھر میں اللہ کا نام تو لیا جائے گا۔ اتنی بات اگر تم مان لو تو تمہاری مہربانی ہے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، کھانا کھالوں۔ اس منیجر نے کہا کہ یہاں ہم کھانے کا بڑا خیال کرتے ہیں، بڑی احتیاط کرتے ہیں۔ عام طور پر جو ہمارے پاس گوشت ہوتا ہے بالکل خالص ہوتا ہے، کرنٹ سے ذبح ہوتا ہے، بالکل حلال ہوتا ہے۔ آپ ڈریں نہ، ہے وہ کرنٹ والا، لیکن جو آدمی جانور کو کرنٹ دیتا ہے وہ ''اللہ اکبر'' پڑھتا ہے، لہٰذا ہمارا گوشت تو خالص حلال ہے۔ باقی ہمارے برتن بھی بالکل پاک صاف ہیں، ہم نے اپنے کک (باورچی) کو ہدایت کی ہوئی ہے کہ خنزیر علیحدہ برتن میں پکایا کر اور باقی گوشت دوسرے برتن میں پکایا کر، البتہ وہاں چمچ ایک ہوتا

ہے وہ کبھی اِدھر لگ گیا اور کبھی اُدھر لگ گیا۔

تفسیر:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اسی طرح علی بن ابی طلحہ سے ایک روایت ہے کہ اس آیت کے بعد پھر یہ آیت مبارک نازل ہوئی: ﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ [آل عمران:۸۵]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا پہلا قول دیکھا جائے یا علی بن ابی طلحہ کا تو آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے، لہٰذا سارے کلام کا خلاصہ یہ نکلا کہ وہ تمام لوگ جن کے پاس جو اللہ نے اپنا نبی بھیجا اور وہ ان کی شریعت پر کاربند رہے اور ان کی اتباع کی، وہ کامیاب ہوگئے۔ اب جب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا زمانہ آگیا تو اب وہی لوگ دنیا و آخرت میں کامیاب ہوں گے جنہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کی اور قرآن اور دین اسلام پر عمل کیا۔ تو اب اگر کوئی آدمی یہ دماغ میں رکھے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے کے بعد میں عیسیٰ علیہ السلام یا موسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم رہوں اور نجات ملے تو اس کو نجات نہیں ملے گی۔ کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بشارت دی کہ ہمارے بعد ایک نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ آئیں گے، تم ان پر ایمان لانا تو آپ پر ایمان نہ لانے والے نے اپنے نبی کی بات بھی نہ مانی۔ یہ ایسے ہے کہ ایک حکومت نے ایک حکم جاری کیا پچھلے سال، نئے سال میں آکر انہوں نے ایک نیا قانون، نیا حکم جاری کر کے پچھلے قانون کو ختم کر دیا تو اب ہر کسی کو جدید حکم کی پیروی کرنی ہوگی۔ اب اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ جب پہلا حکم موجود ہے اور وہ بھی حکومت نے جاری کیا تھا، میں تو اسی کو پکڑے ہوئے ہوں تو سب اس کو یہ کہیں گے کہ جب حکومت نے اس کو ختم کر دیا ہے، اس کو کالعدم اور منسوخ کر دیا ہے، اب ایک نیا حکم آگیا ہے، اب تمہیں اس پر چلنا ہوگا۔

تو بعینہٖ اسی طرح جتنی شریعتیں آئی ہیں، اپنے اپنے زمانہ میں سب حق پر تھیں، لیکن جب ان کا زمانہ گزر گیا اور نئی شریعت آگئی تو اب اس پر عمل کرنا ضروری ہے اور جب سب سے آخر میں شریعت محمد مدنی ﷺ آئی تو تمام ادیان ختم ہوگئے۔ ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ [التوبۃ:۳۳] اور اس کے بعد اللہ نے فیصلہ فرمادیا: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران:۱۹] اور فیصلہ فرمادیا: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [المائدہ:۳] اور فیصلہ فرمادیا:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [آل عمران:۸۵]

اس کی ایک بڑی واضح مثال ہے کہ حضور ﷺ مجلس مبارک میں موجود تھے۔ صحابہ کرام اور خلفاء راشدین بھی موجود تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی آدمی نے تورات کے کچھ پرانے کاغذات دیئے جن پر تورات لکھی ہوئی تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے اور حضور اکرم ﷺ کو سنانے لگے کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے تو حضور ﷺ کا چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہوتا گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جلدی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اشارہ کیا کہ کیا کر رہے ہو؟ اللہ کے بندے! تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حضور ﷺ کے چہرہ مبارک پر جلال ہے؟...... کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی راز دانِ نبوت تھے، حضور ﷺ کے اشارات کو سمجھنے والے تھے، حضور ﷺ کا غصہ دیکھ کر فوراً سمجھ گئے کہ جلال کی وجہ حضرت عمر کا تورات کو پڑھنا ہے...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب تورات سے سر اُٹھا کر حضور ﷺ کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ وہاں تو جلال ہی جلال ہے، حضور ﷺ ناراض ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً عرض کیا کہ یارسول اللہ! "رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَ بِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَ بِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا وَ رَسُوْلًا" ہمارے آقا! ہم نے الحمد للہ اپنے رب کی ربوبیت کا اقرار کیا ہے، دین اسلام کو دین سمجھ کر قبول کیا ہے اور آپ کی ذات مبارک کی نبوت و رسالت پر میرا کامل مکمل ایمان ہے۔ تو حضور ﷺ کا غصہ کم ہوا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے عمر! تمہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام صاحبِ تورات خود بھی موجود ہوتے تو وہ میری پیروی کرتے اور میری شریعت پر چلتے اور تم شریعتِ اسلام کے ہوتے ہوئے تورات کو دیکھ رہے ہو؟ اس میں پوری اُمت کے لیے تنبیہ تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تورات اور کتبِ سابقہ میں اُلجھ جائیں۔

[مشکاة المصابیح، حدیث: ۱۹۴، باب: الاعتصام بالکتاب والسنۃ]

اور یہی وجہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے آسمانوں پر اُٹھا لیا ہے، وہ زندہ آسمانوں پر موجود ہیں۔ قیامت سے پہلے وہ آسمانوں سے اُتریں گے اور وہ خود صاحبِ شریعت پیغمبر اور رسول ہونے کے باوجود شریعتِ محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع کریں گے۔

تو کسی اور جھوٹے ظلی، بروزی نبی کی نبوت کیسے چل سکتی ہے؟ جب یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اگر اللہ سابقہ انبیاء کو بھی زندہ فرما دیں تو وہ حضور ﷺ کی پیروی کریں گے تو آج اگر کوئی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والا دعویٰ کرے اور پھر وہ اس کے اندر تاویلات سے کام لے کہ میری نبوت اصلی نہیں ہے، بلکہ ظلی ہے، میری نبوت بروزی ہے یا میری

نبوت اطاعتِ مدنی کی وجہ سے ہے تو ان باتوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ پاک نے تو نبوت کا دروازہ ہی بند کردیا ہے۔ حضور ﷺ تمام انبیاء کے خاتم ہیں، اب نبوت قیامت تک صرف ہمارے آقا، سرکارِ مدینہ، حبیبِ کبریاء، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہوگی۔ تو لہٰذا ایک بات واضح ہوگئی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اصول بھی یاد رکھ لیں۔

قبولیتِ عمل کے لیے چند اصول:

جیسے قرآن نے ایک بات واضح کردی ہے کہ جو لوگ ظاہراً ایمان لائے یا ایمان لائے سابقہ نبیوں پر اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی یا نصرانیت اختیار کی یا کوئی اور دین اختیار کیا تو فرمایا: نجات صرف ان کو ملے گی جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لائیں، حضور ﷺ کی شریعت پر ایمان لائیں اور اچھے اعمال کریں۔ اور اسی طرح حضور ﷺ نے بھی ایک اصول بیان فرمادیا، اگر اس اصول کو سامنے رکھ لیں تو تمام جھگڑے ختم ہوجائیں۔

حضور ﷺ نے دو لفظوں میں دین کا خلاصہ بیان فرمایا ہے کہ اے میری اُمت! یاد رکھو! اللہ کے ہاں کوئی عمل قبول ہی نہیں ہوگا جب تک اس میں دو شرطیں نہیں ہوں گی:

- ......پہلی شرط یہ ہے کہ جو بھی عمل کرو، وہ خالص اللہ کی رضا کے لیے کرو۔ اگر اللہ کے سوا تم نے اس میں کسی کو شریک بنالیا تو عمل قبول نہیں ہوگا۔
- ......اور دوسری شرط عمل کے مقبول ہونے کی یہ ہے کہ وہ عمل عین موافق ہو اس شریعت کے جو شریعت حضرت محمد رسول اللہ ﷺ لائے ہیں۔ اگر حضور ﷺ کے عمل کے موافق نہیں تو عمل مردود ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ادبِ حدیث:

دیکھیں جو حضور ﷺ کے غلام ہیں ان کی سوچ کتنی بڑی ہوتی ہے۔ ایک آدمی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا۔ امام مالک امام دار الہجرت ہیں اور یہ عاشقِ محمد مصطفیٰ ہیں، جن کے عشق کا یہ عالم تھا کہ حضور ﷺ کی حدیث مبارک پڑھا رہے تھے اور بچھو پشت پر چڑھ گیا، اس نے سات ڈنک مارے۔ آپ کا چہرہ سیاہ ہوتا گیا، لیکن درسِ حدیث بند نہیں کیا اور اپنی نشست کو بھی نہیں بدلا۔ جب سبق ختم ہوگیا تو فرمایا: ذرا کپڑا اُٹھا کر تو دیکھو کس چیز نے مجھے کاٹا ہے؟ جب دیکھا کہ وہاں تو بچھو بیٹھا ہے تو اس کو مارا، جبکہ وہ سات مقامات پر ڈنک لگا چکا تھا۔ تو شاگردوں

نے عرض کیا کہ حضرت! آپ نے یہ کیا کیا ہے؟ اگر پہلی دفعہ ہی جلدی سے جھٹک دیتے تو باقی زہر سے تو بچ جاتے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نبی پاک ﷺ کی حدیث پڑھ رہا تھا، مجھے ہلتے ہوئے حیا آتی تھی۔

حضور پاک ﷺ سے عشق کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی آدمی دروازے پر سوال کرنے کے لیے آتا تو غلام کو بھیجتے کہ پوچھو کیا بات ہے؟ تو وہ کہتا کہ میں نے کوئی مسئلہ پوچھنا ہے تو فرماتے کہ اس سے پوچھ لیا کرو کہ مسئلہ حدیث مبارک کا ہے یا فقہ کا ہے یا عام کوئی دنیوی بات ہے۔ اگر وہ کہتا کہ میں نے حدیث شریف سمجھنی ہے تو امام مالک فرماتے کہ اس سے کہو کہ وہ میرے مقامِ درس پر چلے، میں ابھی آتا ہوں۔ تو امام صاحب باقاعدہ تیاری فرماتے، پگڑی مبارک سر پر رکھتے، خوشبو لگاتے اور تیار ہو کر مسند پر بیٹھتے تھے۔ پھر کہتے تھے کہ اب حضور ﷺ کی حدیث پوچھو۔ فرماتے کہ کھڑے کھڑے حضور ﷺ کی حدیث بتا دوں، یہ ادب کے خلاف ہے اور حضور ﷺ کی حدیث بتلاؤں اور ننگے سر بیٹھا ہوں، یہ ادب کے خلاف ہے۔

اب تو ہم نے خلافِ سنت نمازیں بھی...... ماشاء اللہ!...... شروع کر دی ہیں اور اپنے عقل سے اس کو دین بھی سمجھا ہوا ہے، حالانکہ یہ مسئلہ نہیں سمجھا کہ کپڑا نہ ہو تو سر ننگے نماز جائز ہے۔ کون کہتا ہے کہ ناجائز ہے؟ جیسے صحابہ کے پاس کپڑا نہیں ہوتا تھا، غریب لوگ تھے، دو وقت کی روٹی مشکل سے ہوتی تھی تو کہاں سے وہ کپڑے اور ٹوپیاں لے آتے؟ کسی بے چارے کے پاس تو دو چادریں بھی نہیں ہوتی تھیں، ایک چادر باندھے ہوئے کھڑے ہوتے تھے۔ تو ایک ہے کپڑے کا نہ ہونا اور ایک ہے کہ عمداً کپڑا سر پر نہ رکھنا کہ ہمارے فیشن میں فرق نہ آئے، یہ کہاں حکم لکھا ہوا ہے؟ حالانکہ اللہ کے قرآن نصِ قطعی میں ہے: ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ [الاعراف: ۳۱] اللہ نے حکم دیا کہ نماز کے لیے آؤ تو تیاری کر کے آؤ، کیونکہ اللہ کے دربار میں حاضر ہو رہے ہو۔ تم اگر کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں جاتے ہو تو تیار ہو کر جاتے ہو اور اپنے کسی بزرگ کو ملنے کے لیے جاتے ہو تو تیار ہو کر جاتے ہو، لیکن اللہ کی دربار میں جیسے مرضی آئے چل پڑو؟

امام مالک رحمہ اللہ کو اتنا ادب اور احترام تھا کہ میں حضور ﷺ کی حدیث مبارک کیسے پڑھوں؟ جبکہ میرے سر پر پگڑی نہ ہو۔ جن لوگوں نے ادب کیا ہے انہی کو اللہ نے مرتبے بھی دیئے ہیں۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ بے ادب ہمیشہ محروم ہوئے ہیں جیسا کہ فارسی کا محاورہ ہے: ''باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطبہ کا واقعہ:

حضرت عمر نے ایک دفعہ خطبہ میں صحابہ سے پوچھا کہ میں اگر اللہ کے قرآن یا حضور اکرم ﷺ کے راستے سے ہٹ جاؤں تو تم کیا کرو گے؟...... اندازہ کرو کہ ایسا آدمی جس کے مشورے کے مطابق اللہ نے عرش سے قرآن اُتارا، وہ پوچھ رہے ہیں کہ پھر تم میری بات مانو گے یا نہیں مانو گے؟ تو ایک بدو بیٹھا ہوا تھا، وہ سب سے پہلے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ عمر! بات سنو، تم محمد کے طریقے سے ہٹو گے تو تلوار سے تیری گردن توڑ دوں گا۔ حضرت عمر نے کہا کہ الحمد للہ! اللہ! تیرا شکر ہے کہ مجھے سیدھا چلانے والے موجود ہیں۔ اللہ! تیرا شکر ہے کہ لوگ مجھے بھٹکنے نہیں دیں گے۔

اور ادھر ہم کیا کہتے ہیں کہ بڑا بزرگ ہے، اسی میں تو ہم مرتے ہیں، اسی لیے ہم گمراہ ہوتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے جو فرمایا ہے، سائیں دا پتر ہے، ایویں تاں نئیں آکھ گئے، اے کوئی راز دی گل اے جو بابے کو سمجھ نئیں آندی پئی۔ خدا کے بندے! چودہ سو سال میں وہ بات نہ صحابہ کو سمجھ میں آئی، نہ تابعین کو سمجھ آئی اور نہ تبع تابعین کو سمجھ آئی اور نہ محدثین کو سمجھ آئی اور نہ ائمہ فقہاء کو کو سمجھ آئی اور نہ ائمہ مفسرین کو سمجھ آئی اور آج بزرگ سائیں نوں سمجھ آگئی۔ بھلا شریعت بھی کوئی راز ہے اور ہم اس راز کو حل نہیں کر سکے؟ یعنی کیا عقیدہ بھی راز ہے......!؟

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دین کو بگاڑنے میں سب سے بڑا ہاتھ بُرے پیروں اور بُرے مولویوں کا ہے۔ ان لوگوں نے دین کو رُسوا کر دیا، اسلام کو رُسوا کر دیا اور مذہب کو رُسوا کر دیا۔ لوگوں کے دلوں سے عظمتِ قرآن، عظمتِ حدیث اور عظمتِ اسلام کو ختم کر دیا۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب ضرورت کے وقت مولوی کے لیے جائز ہے تو پھر میرے لیے بھی جائز ہے۔ اگر یہ دو طبقے ٹھیک ہو جائیں تو ساری دنیا کی اصلاح ہو جائے گی۔

یہود کی وجہ تسمیہ:

بعض علماء نے فرمایا کہ یہود کو یہود اس لیے کہتے ہیں کہ قرآن میں آیا ہے: ﴿إِنَّا هُدْنَآ إِلَيْكَ﴾ [الاعراف:١٥٦] حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ ہم توبہ کرتے ہیں، رجوع کرتے ہیں تیری طرف۔ چونکہ یہودیوں نے بھی توبہ کی تھی اور توبہ کو تہود کہتے ہیں، اس لیے انہوں نے توبہ میں اپنے آپ قتل کر ڈالا تھا۔ اتنی بڑی توبہ تھی، اس وجہ سے ان کو یہود کہا گیا۔

اور بعض علماء کہتے ہیں کہ یہود کو اس لیے یہود کہا گیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام ''یہودا'' تھا،

یہ اس کی طرف منسوب ہیں، اس لیے یہ یہود کہلاتے ہیں۔

اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہ ''الھوادۃ'' سے ہے جس کا معنی آپس میں محبت کرنا ہے۔ آپس میں یہ قومی طور پر بڑی محبت کرتے ہیں۔ آج بھی ان کے اندر قومیت کا اثر باقی ہے، اب بھی موجودہ دور میں وہی لوگ یہودی ہیں جو ان کی نسل سے آرہے ہیں اور کوئی آدمی یہودیت میں داخل نہیں ہوسکتا اور کسی آدمی کو یہودیت کا مرتبہ دینے کے لیے وہ تیار نہیں ہوتے۔

ابو عمرو بن العلاء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہودیوں کو یہود اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی عادت تھی کہ جب یہ تورات پڑھتے تھے تو ہلتے تھے (اور اب بھی ہلتے ہیں) اس لیے ان کو یہود کہا گیا کہ ہود کا معنی ہوتا ہے تحرک۔

اس لیے قرآن پڑھتے ہوئے ہمارے ہاں جو لوگ ہلتے رہتے ہیں، بعض علماء اس کو بڑی سختی سے منع کرتے ہیں کہ یہ تو یہود کی عادت تھی، بلکہ آدمی آرام اور سکون سے بیٹھے جیسا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کہتے ہیں کہ جب حضور ﷺ قرآن پاک پڑھتے یا ہم حضور مبارک ﷺ کے دربار میں حاضر ہوتے تو ہماری کیفیت ایسی ہوتی تھی کہ گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پرندہ ایسی چیز ہے کہ ذرا سی بھی ٹہنی ہل جائے تو اڑ جاتے ہیں یعنی گویا کہ ہم ایسے بیٹھتے تھے جیسے بے جان پتھر ہوں کہ کوئی حرکت نہیں ہورہی اور سکون و ادب اور آرام کے ساتھ بیٹھے تھے۔

بہر حال اگر دیکھا جائے تو یہ سارے اقوال صحیح ہیں، کیونکہ ان کی توبہ بھی اتنی مشقت کے بعد قبول ہوئی، یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ اور وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، یہ نسبت بھی ٹھیک ہے۔ اسی طرح تورات پڑھتے ہوئے وہ ہلتے تھے، یہ نسبت بھی ان کی طرف ٹھیک ہے۔ اور پھر یعقوب کی اولاد میں ان کے بڑے بیٹے کا نام یہودا تھا، اس کی طرف یہودی منسوب ہوئے تو یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ یہ سارے اقوال اور ساری صفات ایک قوم میں جمع ہوسکتی ہیں، لہٰذا ان میں کوئی تعارض یا تضاد نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۳، البقرۃ، الآیۃ: ۶۲]

آسمانی شریعتوں میں نسخ اور تبدیلی کیوں؟

شبہ: لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ بعض دشمنانِ اسلام شبہ ڈالتے ہیں...... اللہ تعالیٰ معاف کرے اور اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو شبہات سے بچائے کہ دنیا میں تو قانون بدلتے رہتے ہیں، مثلاً ایک دفعہ پارلیمنٹ قانون بناتی ہے اور دو

سال کے بعد اس قانون کو منسوخ کرنا پڑ جاتا ہے یا اس کے اندر و بدل کرنا پڑ جاتا ہے، کیونکہ وہ قانون بنانے والے انسان ہیں اور ان کو پتہ نہیں ہوتا کہ پانچ سال کے بعد حالات کیا رخ اختیار کریں گے؟..... تو وہ کہتے ہیں کہ جب مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارا اللہ علام الغیوب ہے، عالم الغیب ہے اور ہمارے خدا کو ذرّے ذرّے کا علم ہے، قیامت تک جو حالات پیش آئیں گے اس کا بھی علم ہے تو پھر اللہ پاک نے شریعتیں کیوں بدل ڈالیں؟ ایسی شریعت کیوں نہیں بنا دی کہ اس کو بدلنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی؟ تو ہر پیغمبر کے زمانہ میں شریعت بدلتی رہی۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اور شریعت تھی، عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اور شریعت تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور شریعت ہے۔ تو بعض لوگ دین میں، انبیاء کی شریعتوں میں اس قسم کے شبہات پیدا کرتے ہیں اور ہماری نوجوان نسل بہت جلدی متاثر ہو جاتی ہے، کیونکہ ان کے ذہن میں پہلے سے دین کا مطالعہ نہیں ہوتا۔

جواب: پہلی بات تو یہ سمجھو کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک شریعت اسلام ایک ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک جو بنیاد اور اساسی اصول ہے وہ ایک ہے۔ تمام انبیاء کی قرآن میں دعوت کھول کر پڑھیں، سب کی ایک ہی دعوت توحید ہے، اللہ کی وحدانیت، ربوبیت، اُلوہیت، اسماء وصفات ایک ہے، تمام نبی ایک ہی دعوت دیتے نظر آئیں گے۔

تو اصول توحید ایک ہیں، تمام انبیاء علیہم السلام دعوت دیں گے کہ نبوت و رسالت پر ایمان ضروری ہے۔ ان کے نزدیک ہر مسئلہ ایک ہے۔ تمام انبیاء نے بتلایا کہ اللہ نے جتنے نبی اور رسول بھیجے ہیں سب بشر ہیں، اولادِ آدم ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ تمام انبیاء نے قوم کو درس دیا کہ یہ دنیا فانی ہے اور اس کے بعد ایک اصل دار آئے گا دارِ آخرت، قیامت ہے، حشر ہے، نشر ہے، حساب و کتاب ہے، جزا ہے اور جنت وجہنم ہے، کوئی اختلاف بھی نہیں ہے۔ تو ہمیشہ یاد رکھیں کہ بنیادی مسائل میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کم و بیش نبی کی دعوت ایک ہے، کوئی اس میں اختلاف نہیں ہے، البتہ جو اختلافات آئے ہیں وہ فروعات میں آئے ہیں۔ اور فروعی مسائل میں اختلاف ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہی رحمت ہے۔ یہ تو بندوں پر اس کا احسان ہے کہ اگر فروعی مسائل میں اللہ تعالیٰ ایک حکم جاری کر دیتے تو نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جو لوگوں کے پاس طاقت تھی وہ تمہارے پاس کہاں ہے؟

اسی سے اندازہ کر لیں کہ آپ سے پہلے جو آپ کے والدین تھے یا آپ کے دادا تھے ان کی جو قوتیں اور طاقتیں تھیں، ہمتیں تھیں، وہ سب تمہارے پاس ہیں؟ اور جو تمہارے پاس ہے وہ تمہاری نوجوان نسل کے پاس نہیں

ہے۔ تو یہ تبدیل کرنا...... معاذ اللہ!...... اس لیے نہیں ہے کہ اللہ کو علم نہیں تھا، بلکہ یہ ایسے ہے کہ جیسے ایک مریض ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور ڈاکٹر اس کے لیے ایک نسخہ تجویز کرتا ہے اور اس کو کہتا ہے کہ پانچ دن کے بعد آؤ۔ پانچ دن کے بعد ڈاکٹر پھر چیک اَپ کرتا ہے اور اس کا نسخہ بدل دیتا ہے تو اب کوئی بیوقوف ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ ڈاکٹر نے نسخہ کیوں بدل دیا؟ وہی پہلا نسخہ دے دیتے، اسی سے مریض ٹھیک ہو رہا تھا، لیکن یہ بات کہنا جہالت ہوگی۔ جو سمجھدار ہوگا وہ کہے گا کہ اب چونکہ مریض میں تبدیلی آگئی ہے تو دوا میں بھی تبدیلی ضروری ہے۔ تو اس لیے اللہ نے فروعی مسائل میں تبدیلیاں رکھیں۔

آج سے ہزار سال پہلے کی قوموں کی تاریخ پڑھیں۔ ان کی قوتیں الگ، ان کی طاقتیں الگ، ان کی ہمتیں الگ، ان کے دماغ الگ، ان کی صلاحیتیں الگ تھیں، ان کا ماحول الگ تھا۔ اس کے بعد آٹھ سو سال، پھر چھ سو سال دیکھتے چلے جائیں کہ جوں جوں بندوں کی مرض کی حالت بدلتی گئی، اللہ اپنی شریعتوں میں تبدیلی فرماتے گئے۔ یہ تو کمال رحمت ہے، یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا عین عدل اور انصاف ہے۔ اور اب دیکھیں کہ جب ارتقائی طور پر اُمتیں ارتقاء کو پہنچ گئیں تو اللہ نے ایک شریعت دے دی جو قیامت تک کے لیے ہے، اس کے بعد کوئی شریعت نہیں ہے۔

جیسے آپ بچپن میں کتنی بڑی قمیص پہنتے ہیں؟ جب چار ماہ کا ہو جائے، دو سال کا ہو جائے، پھر تین سال کا ہے، لیکن جب آپ پچیس سال کے ہوتے ہیں تو اس کی ایک ہی پیمائش ہے کیا؟ وہ آخر تک چلتی جائے گی۔ تو یہ تو حالات کے مطابق اللہ نے ہم پر رحم کیا ہے۔ یہ جہالت ہے کہ کوئی آدمی اللہ کے علم پر اعتراض کرے۔

ائمہ کرام کا اجتہاد:

جس طرح آج بھی بعض لوگ شبہات ڈالتے ہیں کہ چار امام کیسے ہو گئے؟ کبھی تو جھگڑا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کچھ کہتے ہیں اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کچھ کہتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کچھ کہتے ہیں۔ دیکھیں! ان کے اندر اختلاف ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو جھگڑا نہ ہوتا۔ یہ بھی ائمہ کرام کی بے ادبی، تنقید ہے۔ اور ان کی شان میں کوئی ایسا غلط لفظ استعمال کرنا، یہ سب سے بڑی جہالت کی دلیل ہے۔ تمام ائمہ کرام کے اندر بھی اصول کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جتنے مسئلے منصوص ہیں، ان کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جو قرآن سے ثابت ہو گئے یا ''علی لسان رسول اللہ ﷺ'' ثابت ہو گئے، یعنی بالکل حضور پاک ﷺ سے کھلی ہوئی بات واضح ہو گئی، اس میں کسی امام کا اختلاف نہیں ہے۔

یاد رکھیں! ان ائمہ کرام کے اندر بھی اختلاف وہاں پیدا ہوا جہاں حضور پاک ﷺ کے دو فرمان آ گئے۔ اب ان دو فرمانوں کی تاریخ کیسے ہے؟ پہلے کون سا ہے اور بعد میں کون سا ہے؟ پھر فقہاء نے اس پر بحث کی۔ ناسخ، منسوخ کو ڈھونڈا، دونوں حکم اپنی جگہ پر برقرار رکھے گئے اور ان میں اعلیٰ، افضل، غیر افضل کا فرق کر دیا گیا کہ اس پر عمل کرو گے تو بہت زیادہ ثواب ہے اور اگر اس پر عمل کرو تو اس میں بھی ثواب ہے۔ دونوں جائز ہیں۔ یا ایسے مسائل جو قرآن یا احادیث مبارک سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے تعامل سے، اجماع امت سے نہ نکلے اور امت کو ایک نیا مسئلہ پیش آ گیا تو اب فطری بات ہے کہ جب مسئلہ نیا پیش آ جائے تو کیا کریں گے؟

بے بی ٹیوب کا مسئلہ:

مثال کے طور پر بے بی ٹیوب کا نیا مسئلہ پیش آ گیا کہ وہ سرنج کے ذریعے مادہ منویہ لے لیتے ہیں اور اس کو ایک ٹیوب میں رکھتے ہیں یا مادہ منویہ لے کر اس کو ایک عورت کے رحم کے اندر داخل کر دیتے ہیں۔ اب یہ کام نہ حضور ﷺ کے زمانہ میں ہوا اور نہ صحابہ کے زمانہ میں ہوا تو یہ مسئلہ آپ امت کو کیسے سمجھائیں گے؟ کیونکہ یہ مسئلہ تو اب پیش آیا ہے۔

اسی طرح جو آج کل پوری دنیا میں بینکوں کے جھگڑے چل رہے ہیں، یہ حضور ﷺ کے زمانہ میں تو نہیں تھے۔ وہاں تو ربا کی ایک ہی صورت تھی کہ جو بڑے بڑے یہودی تھے یا بڑے بڑے مشرکین مکہ تھے یا پیسے والے لوگ تھے وہ غریبوں کو پیسے دیتے تھے اور اس پر سود لیتے تھے، لیکن یہ صورت پیدا نہیں ہوئی کہ جس طرح ساہوکار سود لیتا تھا۔ اگر غریب بھی پیسے رکھ لے تو بینک اس کو بھی سود دیتا ہے، یہ صورت تو اس وقت پیش ہی نہیں آئی تھی۔

اسی طریقے سے مثلاً: چاند پر جانے کے مسائل ہیں۔ اسی طریقے سے اگر ایک آدمی زخمی ہو گیا ہے تو ہم اس کو بلڈ دے رہے ہیں، خون دے رہے ہیں اور پتہ نہیں ہے کہ خون مسلمان کا ہے یا کافر کا۔

اسی طریقے سے آج اگر کسی کا ہارٹ کا آپریشن ہو، اس کی سرجری کی جائے تو اس کے والوز ہوتے ہیں، اگر والوز بند ہوتے ہیں تو ان کو تبدیل کیا جاتا ہے۔ اب وہ والوز سؤر کے بھی ملتے ہیں، گائے کے بھی ملتے ہیں، پلاسٹک کے بھی ملتے ہیں اور سب سے مہنگے پلاسٹک والے ہیں اور سب سے سستے خنزیر والے ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے ملک میں خنزیر عام ہے، وہ تو روزانہ کاٹا جاتا ہے تو اس کے والوز نکال لیتے ہیں۔ تو اب ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا کہ خنزیر

نجس العین ہے، اس کا کوئی جز و چھوٹا سا جسم کے اندر رکھیں تو اس کا کیا حکم ہے؟

اب اس کے مطابق آپ مجھے کوئی چیز پڑھ کر سنائیں کہ فلاں جگہ یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے۔ حدیث مبارک میں مسئلہ آ گیا کہ مکھی مر گئی اور ہمارے کسی برتن میں پانی میں پڑ گئی تو حکم ہے کہ اس کو پانی میں ڈبا کر باہر نکال دو، کیونکہ اس کے ایک پر میں شفا ہوتی ہے اور جس پر میں شفا ہوتی ہے وہ پر پانی سے بچاتی ہے، اس لیے اس کو ڈبا دو، تا کہ پانی میں شفا والا پر ڈوب جائے۔[1] لیکن اگر جھینگر پڑ گیا، بچھو پڑ گیا یا مچھر پڑ گیا تو کیا حکم ہے؟ اور کتنے جانور اُڑنے والے ہیں جن کا نام نہیں آتا، سب کا نام ہم کہاں سے ڈھونڈیں گے؟ ان میں سے کوئی مر گیا۔

پھر ایسے مسائل میں ائمہ کرام قرآن و سنت کی روشنی میں اجتہاد کرتے ہیں اور پھر ان کو قرآن و سنت کے مطابق اللہ نے انشراحِ صدر دیا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً:

وہ مسئلے کی تحقیق کرتے ہیں کہ زنا کیوں حرام ہے؟ کہ کسی غیر مرد کا نطفہ کسی عورت میں ڈالا جا رہا ہے۔ اب وہ اگر مرد کے ذریعے ڈالا جائے تب بھی حرام ہے اور اگر سرنج کے ذریعے ڈالا جائے تب بھی حرام ہے۔ اب انہوں نے اس سے مسئلہ نکال لیا۔ مسئلہ وہی ہے کہ جس کی اصل قرآن میں موجود ہے کہ زنا حرام ہے۔ اسی طرح حکم ہے کوئی آدمی کسی دوسرے کے درخت کو پانی نہ لگائے کہ عورت اپنے خاوند سے حاملہ ہے اور زانی زنا کر رہا ہے، یعنی وہ بھی پانی لگا رہا ہے کسی دوسرے کے درخت کو، اس سے علماء نے مسئلہ نکال لیا کہ یہ بات غلط ہے کہ غیر خاوند کے نطفہ کو عورت کے اندر ڈالا جائے، بے بی ٹیوب کے ذریعے یا سرنج کے ذریعے۔ ہاں اگر مرد بے چارا ضعیف ہے، لیکن اسی کا مادہ منویہ، اس کے جراثیم درست ہیں، حمل تو ٹھہر سکتا ہے، لیکن وہ بیچارا مریض ہے، کمزور ہے، وہ اپنی طاقت سے وہاں پانی نہیں پہنچا سکتا تو اگر اسی کا مادہ لے کر اس کی عورت میں ڈالا جائے تو یہ ٹھیک ہے، زنا نہ ہوا۔ لیکن اگر ہم نے کسی غیر کا نطفہ لے کر اس کے اندر ٹھہرایا تو وہ دوسرے کا بیٹا ہے اور اس کو زبردستی ہم میاں بیوی کا وارث بنا رہے ہیں، حالانکہ وہ ان کا نطفہ ہی نہیں ہے، وہ نطفہ ہی حرام ہے۔ تو یہ مسئلہ اسی سے نکالا گیا ہے، لیکن قرآن و سنت کی روشنی میں ان کا اجتہاد کرنا پڑا۔

اسی طریقے سے انہوں نے مسئلہ نکال لیا کہ جس جانور میں بہنے والا خون نہیں ہوتا، جیسے مکھی ہے۔ جس کے بارے میں حکم ہے کہ اس کو غوطہ دے کر پھینک دو۔ اسی طرح اگر چھوٹے چھوٹے جانور کھانے پینے کی چیزوں میں

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۳۳۲۰، باب: إذا وقع الذباب في شراب أحدكم فليغمسه...]

پڑ جائیں تو یہ چیزیں حرام نہیں ہوں گی، کیونکہ مکھی سے جب حرام نہیں ہوں گی تو ان اشیاء سے بھی حرام نہیں ہو رہی ہیں۔ تو اسی فرمانِ رسول پر انہوں نے قیاس کیا ہے، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں نکالی ہے۔

اور اسی طرح سے جب انہوں نے کہا کہ ربوا حرام ہے تو انہوں نے کہا: بالکل حرام ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: سود دینے والا اور سود لینے والا، سود کی گواہی دینے والا، سود کا معاملہ لکھنے والا اور اس میں اعانت کرنے والا، سب پر اللہ کی لعنت ہے۔[1] تو انہوں نے کہا کہ اگر یہ دونوں طرف بھی ہو تب بھی لعنت ہے، کیونکہ جب دینے والا بھی برابر اور لینے والا بھی برابر ہے، گواہی دینے والا تو کچھ بھی نہیں لے رہا ہے، اس کے پلّے میں تو کوئی پیسہ نہیں جا رہا ہے، نہ مدعی کی طرف سے اور نہ مدعی علیہ کی طرف سے، نہ بینک کی طرف سے اور نہ اس سائل کی طرف سے، لیکن سب پر اللہ کی لعنت ہے تو اس سے نتیجہ نکل آیا کہ سود کسی شکل میں بھی حلال نہیں ہو سکتا، چاہے ہم اس کی کتنی صورتیں بناتے چلے جائیں کہ ہم بھی دیتے ہیں، وہ بھی ہمیں دیتے ہیں اور جناب یہ ہے کہ ہر بینک کی پرسنٹیج مختلف ہوتی ہے، بعض سات پرسنٹ دیتے ہیں، بعض ساڑھے سات پرسنٹ دیتے ہیں، بعض پندرہ بھی دیتے ہیں اور بعض دنیا کے بینک ایسے بھی ہیں جو پچیس پرسنٹ بھی دیتے ہیں اور اگلے دن مجھے ایک آدمی بتلا رہا تھا کہ کون سا اسلامی ملک ہے وہاں شرح سود ستر پرسنٹ ہے۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ ائمہ میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔ اللہ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائے۔ اگر وہ یہ محنت نہ کرتے تو آج ہم اندھیروں میں بھٹکتے رہتے، ایک ایک مسئلہ ڈھونڈنے کے لیے ہماری داڑھیاں سفید ہو جاتیں، لیکن وہ مسئلہ نہ ملتا۔ یہ ان کی محنتیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو جزا عطا فرمائے۔

اب دیکھیں کہ اگر حضور پاک ﷺ کی ایک حدیث ڈھونڈنی ہو ہم کہیں کہ حضور ﷺ کی ایک حدیث مبارک ہے جس میں تلوار پر سونا چڑھانے کا ذکر آیا ہے تو ڈھونڈو کہاں ہے؟ تو ہے کوئی مائی کا لال جو ڈھونڈ لیتا تو اللہ امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی اور امام نسائی وغیرہ پر کروڑوں رحمتیں کرے، انہوں نے ہمارے لیے کتنی آسانی کردی کہ ان کی کتابوں میں کتاب الجہاد کھولو اور اس حدیث کو دیکھ لو۔

اسی طرح ہم کہیں کہ حضور پاک ﷺ کی ایک حدیث پاک ہے کہ جب آخر زمانے میں جھگڑے ہو جائیں اور

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۱۵۹۸، باب: لعن آکل الربا وموکلہ]

جب بڑے فساد ہو جائیں، انتشار ہو جائے اور ایسے حالات ہو جائیں تو مسلمان کو چاہیے کہ وہ بالکل علیحدہ بیٹھ جائے، اپنا دروازہ بند کر دے، اپنی تلوار توڑ ڈالے اور چپ کر کے بیٹھ جائے۔ اللہ کے فرائض پورے کرتا رہے اور کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو۔ تو اب ہم اگر اس حدیث کو ڈھونڈنا چاہتے تو کوئی مائی کا لال ہے جو ڈھونڈ کر دکھاتا؟ اللہ تعالیٰ ان ائمہ محدثین پر رحمت کرے جنہوں نے احادیث کو مبوب و مفصل جمع کر دیا، انہوں نے لکھ دیا ہے، "کتاب الفتن" کھولو تو ایک منٹ میں حدیث نکل آئے گی۔

اچھا آدمی مرجائے تو ہم اس کو دفن کیسے کریں؟ کفن کیسے دیں؟ جنازہ کیسے پڑھائیں؟ قبر میں کیسے رکھیں؟ قبر کیسے بنائیں؟ اور رخ کس طرف کریں؟ بھائی! اس میں حضور ﷺ کا فرمان کہاں کہاں ہے؟ کوئی مائی کا لال ہے جو اس کو ڈھونڈتا؟ ان ائمہ محدثین کی برکتیں ہیں کہ ہم کہیں گے کہ فوراً "کتاب الجنائز" کھولو اور ایک منٹ میں حدیث نکل آئے گی، ورنہ یہ "كتاب الإيمان، كتاب الطهارة، كتاب الفتن، كتاب الجهاد، كتاب الجنائز" کیا یہ حضور ﷺ مرتب فرما گئے ہیں کہ اسی طرح کتابیں لکھا کرو؟ تو جن لوگوں نے اس طرح لکھا ہے کیا انہوں نے حضور ﷺ کی مخالفت کی ہے اور بدعت کی ہے؟ اب حضور ﷺ نے نہیں فرمایا تو انہوں نے کیوں لکھا؟ یہ تو کومن سینس کی بات ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ "عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ، تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ"[1] (تم پر میری سنت لازم ہے اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت۔ اس کو تھام لو اور داڑھ کے ساتھ مضبوطی سے پکڑ لو۔) تو اب ہم حضور کی سنت کو واضح کریں گے تو کوئی اس کو پکڑے گا تو جب حضور کی سنت ہمیں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے تو ہم اس کو کیسے پکڑیں گے؟ تو جن لوگوں نے حضور ﷺ کی سنت کے باب علیحدہ علیحدہ باندھ دیئے ہیں کہ نماز کا مسئلہ دیکھنا ہو تو کتاب الصلوٰۃ دیکھ لو، پاکی پلیدی کے مسائل دیکھنے ہوں، مذی، ودی کیا ہے؟ پیشاب کیا ہے؟ غسل کیا ہے؟ جنابت کیا ہے؟ کتاب الطہارۃ دیکھ لو۔ ہمارے پاس کوئی چار سو بکریاں اور پچاس بھیڑیں اور ڈیڑھ سو گائے اور دو سو اونٹ ہیں تو ہم زکوۃ کیسے دیں؟ کون سا مشکل مسئلہ ہے؟ باب الزکوۃ نکالو تو ایک منٹ میں مسئلہ حل گیا ہے۔ یہ سارا کام جسے ائمہ محدثین نے کیا کہ حضور اکرم ﷺ کی احادیث کو ترتیب دے دیں۔ جیسے امام ابوحنیفہ کی فقہ کے مسائل پڑھے تو کتنی بڑی بات امام اعمش نے کہی تھی کہ ایسے معلوم ہوتا ہے

[1] [سنن أبي داود، حديث: ٤٦٠٧، باب في لزوم السنة]

کہ ہم تو ایسے ہیں کہ جیسے میڈیکل سٹور والا دواؤں کو ترتیب پر لگا دیتا ہے، اصل طبیب اور حکیم تو تم فقیہ لوگ ہو جو مریض کی مرض ڈھونڈ کر دوا نکال کر دیتے ہو۔ اتنی ترتیب سے دوائیں رکھی ہوئی ہیں کہ پچاس آدمی بھی نسخے والے آجائیں تو ایک منٹ میں وہ ڈھونڈ کر دے دے گا اور آپ مجھے کھڑا کر دیں تو آدمی شیشیاں توڑ ڈالیں گے اور ایک مریض پر تین گھنٹے لگا دیں گے۔ تجربہ کرلو، اگر نہ مانتا ہو۔ کوئی انگریزی پڑھا لکھا لے جاؤ اور اس کو کہو کہ تم بھی تو پڑھے لکھے ہو، کہتے ہیں کہ ہم خود ہر چیز سمجھ سکتے ہیں، اس کو ایک ڈاکٹر کی پرچی دے دو۔ پہلے تو اس سے ڈاکٹر کی پرچی پڑھی نہیں جائے گی۔ ڈاکٹر صاحبان بھی ایک ایسی قوم ہیں کہ ان کے اپنے میڈیکل ورڈز ہوتے ہیں جو کسی کا باپ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اگر وہ ایس پی لکھ دیں تو ہم سمجھیں گے کہ ایس پی پولیس کے افسر کو کہتے ہیں، ڈاکٹر کہے گا میں نے سیرپ لکھا ہے، وہ ٹی این لکھ دے تو ہم کہیں گے کہ اس سے جو ہمارے بڑے بڑے سیکرٹری ہیں وہ مراد ہوں گے، لیکن ڈاکٹر کہے گا کہ اس سے ٹنکچر مراد ہے۔ اس لیے یاد رکھو کہ جو آدمی ائمہ کرام کی مخالفت کرتا ہے وہ دور جہالت میں پڑا ہوا ہے۔

اتباعِ سنت پر ایک صحابیٔ رسول کا واقعہ:

ایک صحابی جنگ کے میدان میں اور عورت بھی میدانِ جنگ میں آگئے اور صحابی نے کہا: تیرے ساتھ میں نکاح کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ میں نے سنا ہے کہ تم بیوہ عورت ہو، عدت بھی گزار چکی ہو۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ تو صحابیٔ رسول نے کہا کہ ایک بات یہ بھی سن لو کہ کل میں شہید بھی ہو جاؤں گا، لیکن نکاح ضرور کرنا ہے۔ تمہاری مرضی ہے، نکاح کرو یا نہ کرو۔ کیونکہ میں جنگ میں ہوں اور مجھے اپنے اللہ پر ایمان ہے کہ میں کل شہید ہو جاؤں گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ محمد مدنی ﷺ کی سنت نکاح پر عمل ہو جائے۔ یہ نہ ہو کہ کل میں قیامت کے دن پکڑا جاؤں کہ نکاح میرا طریقہ تھا، تم نے کیوں اس پر عمل نہیں کیا؟ صرف میں نے حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ آگے بھی ایمان والی عورت تھی، اس نے کہا کہ شاید میرے بھی مقدر میں یہی لکھا ہے، چھ پہلے شہید ہو گئے ہیں، ساتویں تم سہی۔ میں راضی ہوں نکاح پڑھو۔ نکاح ہو گیا اور صحابی صبح شہید ہو گئے۔

اب تم لوگ اس کو کیا کہو گے کہ عورت کو بس مرد کی خواہش تھی اور مرد کو عورت کی خواہش تھی۔ اگر عورت کو مرد کی خواہش ہوتی تو وہ تیرے میرے جیسا بزدل ڈھونڈتی جو بے غیرت گھر میں بیٹھا رہتا، نہ گھر سے باہر نکلتا اور نہ مرتا، وہ نکھٹو ڈھونڈتی جو صرف سگریٹ پر زور رکھتا ہو، تاکہ وہ اس کو خوش رکھے۔ وہ تو ایسا بیوقوف ڈھونڈتی، نہ کہ اس کو جو

کل شہید ہو جائے۔ اگر مرد کو بھی عورت کی کوئی تمنا ہوتی تو کہتا کہ جنگ تو کرلو، زندگی باقی رہ گئی، مدینہ پاک واپس خیریت سے پہنچ گئے تو شادی کرلیں گے، اگر ویسے شہید ہو گئے تو بھلا ایک رات کے لیے شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کہ خاوند کے مرجانے پر چار ماہ دس دن عدت بھی گزارنی پڑے۔ لیکن دونوں کا مقصد اتباع رسول اللہ تھا کہ حضور ﷺ کا حکم ہے "اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي" (نکاح میرا طریقہ ہے) جو نکاح سے انکار کرے، اس کا محمد مدنی کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔ [2] لیکن آج تو ہم صرف نام کے مسلمان رہ گئے۔ جیسے احادیث میں آتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا، اسلام نام کا رہ جائے گا اور قرآن صرف کتابوں میں لکھا ہوا رہ جائے گا، عمل کرنے والے نہیں ہوں گے۔ [3] اور آج وہی زمانہ ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں، ﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ۝﴾ [سبا: ۱۳]

نصاریٰ کی وجہ تسمیہ:

"نصاریٰ" کو "نصاریٰ" اس لیے کہا گیا کہ وہ ایک دوسرے کی بہت مدد کرتے تھے، ایک دوسرے کے دُکھ میں نصرت کرتے تھے، اس وجہ سے ان کو نصاریٰ کیا گیا۔ اسی لیے "انصار" بھی کہا گیا۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ﴾ کون ہے جو میری اللہ کے راستے میں مدد کرے؟ ﴿قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ﴾ [الصف: ۱۴] تو ان کو بھی "انصار" کہا گیا۔

دوسرا قول یہ بھی ہے کہ نصرانیوں کو نصاریٰ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایک جگہ تھی جس کا نام "ناصرہ" تھا، وہ اس جگہ کے رہنے والے تھے، اس لیے ان کو نصاریٰ کہا جاتا ہے۔ اسی قول کو حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا اور حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے بھی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح کا ایک قول مبارک منقول ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نصاریٰ، نصرانی کی جمع ہے، جیسا کہ نشاویٰ نشوان کی جمع ہے اور سکاریٰ سکران کی جمع ہے اور عورت کو بھی نصرانہ کہتے ہیں، جیسا کہ کسی شاعر نے بھی اس کو کہا تھا: "نصرانة لم تحنف"

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۳، البقرۃ: الآیۃ: ۶۲]

حضور اکرم ﷺ اقوام عالم کے نبی ہیں:

جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو خاتم النبیین بنا کر بھیجا اور آپ کو تمام بنی آدم کے لیے اور تمام مخلوقات کے

---

[1] [سنن ابن ماجہ حدیث: ۱۸۴۶ باب: ما جاء في فضل النكاح]
[2] [صحیح البخاری حدیث: ۵۰۶۳ باب: الترغيب في النكاح]
[3] [شعب الایمان حدیث: ۱۷۶۳]

لیے رسول بنا کر بھیجا۔ جیسا کہ آپ متعدد آیات کے اندر پڑھ چکے ہیں کہ ہمارے آقا، سرکارِ مدینہ کی نبوت کسی ایک علاقہ کے لیے نہیں ہے، جیسا کہ پہلے انبیاء علیہم السلام آتے تھے۔ قومِ لوط میں علیحدہ نبی، قومِ شعیب علیہ السلام میں علیحدہ نبی، قومِ ثمود میں علیحدہ نبی، قومِ نوح میں علیحدہ نبی، لیکن جب خاتم الانبیاء، افضل الانبیاء کی باری آئی تو آپ کو اللہ نے تمام انسانوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا۔ اسی لیے کئی مقام پر آیا ہے: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [الاعراف:۱۵۸] یہاں "النّاس" کے ساتھ خطاب کیا گیا اور اسی طرح آیا ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ [سبا:۲۸] اور اسی طرح اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [الانبیاء:۱۰۷] کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے گورا، کالا، عرب، عجم، انس و جن تمام کے لیے نبی بنا کر بھیجا ہے اور اس کے بعد وضاحت فرما دی کہ "إِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ لَا رَسُوْلَ بَعْدِيْ وَلَا نَبِيَّ" (رسالت اور نبوت ختم ہو گئی۔ اب میری نبوت کے بعد نہ کسی کی نبوت ہو گی اور نہ رسالت ہو گی)۔ اب قیامت تک کے لیے نبوت و رسالت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو گی۔

[سنن الترمذي، حديث: ۲۲۷۲، بَابُ: ذَهَبَتِ النُّبُوَّةُ وَبَقِيَتِ الْمُبَشِّرَاتُ]

اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے القابات:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو "مؤمن و مسلمہ" کا لقب ملا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ ایمان لانے والے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہیں، یعنی قیامت میں ایسے بھی پیغمبر ہوں گے جن کے ساتھ دس آدمی ہوں گے، ایسے بھی پیغمبر ہوں گے جن کے ساتھ کوئی بھی نہیں ہو گا اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت آئے گی تو بہت بڑی اُمت ہو گی، لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت آئے گی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی حیران ہو جائیں گے۔[1]

اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو "مؤمن" اس لیے کہا جاتا ہے کہ جہاں وہ اپنے پاک نبی پر ایمان لاتے ہیں، وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ تو کثرتِ ایمان کی وجہ سے ان کو "مؤمن" کہا گیا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۳، البقرۃ: الآیۃ: ۶۲]

اور اسلام کا معنی ہے استسلام۔ تو اسلام کا معنی یہ ہوا کہ بندہ اپنے آپ کو اللہ اور اللہ کے رسول کے سپرد کرے کہ

---

[1] [صحيح البخاري، حديث: ۵۷۵۲، بَابُ: مَنْ لَمْ يَرْقِ]

جو اللہ کا حکم ہے بس ٹھیک ہے۔ اس لیے مسلمان کا معنی ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو پورا سپرد کر دینے، سونپ دینے والا۔

ایمان و اسلام میں فرق:

بعض علمی تحقیقات ہوتی ہیں کہ "مَا الْإِيْمَانُ، مَا الْإِسْلَامُ؟" یہ لفظ ایک دوسرے کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی اس کو مسلمان بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کو مومن بھی کہہ سکتے ہیں۔ تو استعمال میں یہ لفظ مترادف ہیں، ایک دوسرے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

﴿وَالصّٰبِئِيْنَ﴾ کا مصداق:

بعض لوگوں نے بھی فرمایا ہے کہ ﴿وَالصّٰبِئِيْنَ﴾ اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے۔ اس لیے امام ابو اسحاق رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر یہ اہل کتاب ہیں تو ان کا ذبیحہ کھانا حلال ہوگا اور ان کی لڑکیوں سے نکاح بھی جائز ہوگا۔

بعض نے کہا کہ وہ ایک ایسی قوم ہے جو ملائکہ کی عبادت کرتی ہے، یعنی وہ اپنے عقل سے ملائکہ کی تصویریں اور تمثیل بنا لیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ......نعوذ باللہ!...... یہ ہمارے چھوٹے چھوٹے خدا ہیں۔ اور انہوں نے کہا: صابئین قبلہ کی طرف نماز بھی پڑھتے ہیں اور پانچ نمازیں بھی پڑھتے ہیں تو زیاد نے ارادہ کیا کہ ان پر میں جزیہ معاف کر دوں، لیکن بعد میں ان کو پتہ چلا کہ یہ تو ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں، یہ تو مشرک ہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ صابئین کا فرقہ عراق کے اندر ایک مقام ہے وہاں یہ رہنے والے تھے اور یہ تمام انبیاء کو مانتے تھے۔ وہ ہر سال میں تیس دن کے روزے رکھتے تھے اور جانب یمن نماز بھی پڑھتے تھے۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ ﴿وَالصّٰبِئِيْنَ﴾ کس کو کہتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: صابی ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو اللہ کو مانتا ہو، توحید کا اقرار کرتا ہو، لیکن کسی شریعت و دین پر عمل نہ کرتا ہو اور کفر بھی نہ کرتا ہو۔

عبدالرحمٰن بن زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ دین والے تھے، موصل میں رہتے تھے اور صرف توحید کا اقرار کرتے تھے لیکن نہ کسی کتاب پر ایمان رکھتے تھے، نہ کسی نبی پر اور کسی شریعت پر۔ یہی وجہ تھی کہ مکہ کے کافروں میں سے جب کوئی اسلام لاتا تو اس کو کہتے کہ یہ بھی "صابی" ہو گئے، کیونکہ وہ سنتے تھے کہ یہ بھی لا الٰہ الا اللہ پڑھتے ہیں جیسے صابئین لا الٰہ الا اللہ کا کلمہ پڑھتے تھے۔

خلیل نے کہا ہے کہ ان صابئین کا دین ایسے تھا جیسے نصاریٰ کا دین ہے، لیکن ان کا عقیدہ یہ تھا کہ قبلہ جنوب کی

طرف ہوتا ہے۔ وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہ یہود اور مجوس کی طرح ملے جلے قسم کے لوگ ہیں، کچھ یہودیت سے نکلے اور کچھ مجوسیت سے نکلے۔ ان کا ذبیحہ نہیں کھانا چاہئے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنا چاہیے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان تمام اقوال کو اگر سامنے رکھا جائے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ توحید کے ماننے والے تھے لیکن ان میں یہ بیماری تھی کہ وہ ستاروں کو مانتے تھے، یعنی ستارہ پرست قوم تھی کہ فلاں ستارہ فلاں برج میں چلا گیا اور فلاں ستارہ فلاں برج میں چلا گیا۔ جیسے آج مسلمانوں میں بھی یہ ہے کہ خدا کا کلمہ بھی پڑھتے ہیں اور باقاعدہ ہفتہ وار رسالوں میں چھپتا ہے کہ تمہارا برج اسد ہے، تمہارا برج کون سا ہے؟ تمہارا شمس ہے، قوسِ قزح ہے، تمہارے لیے یہ ہفتہ کیسے ہوگا؟

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صابئین وہ قوم تھی جو ستاروں کی عبادت کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہی ستارے ہمارا قبلہ ہیں اور یہی ہماری دعاؤں کا ذریعہ ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ خدا پر تو ہمارا ایمان ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے سارے اختیارات ان تاروں کو دے دیئے ہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جیسے ابراہیم علیہ السلام کی قوم "کشرانیین" کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ اب سارا امر اور تفویض تاروں کے پاس ہے، اب تمام نظامِ عالم کے چلانے والے ہی سیارات ہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر غور کریں تو سب سے بہتر قول وہ ہے جو حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم تھی جو نہ یہود کے دین پر تھی، نہ نصاریٰ کے دین پر اور نہ ہی مجوس و مشرکین کے دین پر تھی۔ وہ اپنے اپنے خیال میں بس ایک دین پر جمع ہوتے تھے، ان کا کوئی مقرر دین و شریعت نہیں تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ صابی وہ لوگ ہیں جن کے پاس کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی، یعنی وہ کلمہ تو پڑھتے رہے، اللہ کی توحید کا اقرار تو کرتے رہے، لیکن ان کے پاس کسی کی نبوت نہیں پہنچی، کیونکہ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بنی اسرائیل: ۱۵] تو صابی کا اصل معنی یہ ہے کہ جو دینوں کو چھوڑ کر نکل جائے اور بغیر دین کے اپنا طریقہ بنائے، یعنی یہودیت کو چھوڑ کر نکل گیا تو صابی ہے، نصرانیت کو چھوڑ کر نکل گیا تو صابی ہے، مجوسیت کو یا مشرکین کو چھوڑ کر نکل گیا، ان سب پر صابی کا اطلاق ہوگا۔

باقی امام صاحب رحمہ اللہ نے جو فتویٰ دیا ہے تو امام صاحب رحمہ اللہ کا فتویٰ ان صابی لوگوں کے بارے میں ہے جو

اہل کتاب ہیں، یعنی وہ اگر کسی کتاب پر قائم ہیں تو ان اہل کتاب کے بارے میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے اجازت دی ہے کہ ان کا ذبیحہ بھی حلال ہوتا ہے اور اہل کتاب کی لڑکی سے نکاح بھی جائز ہوتا ہے۔ وَ اللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ وَ عِلْمُهٗ أَتَمُّ. [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۴، البقرۃ: الآیۃ: ۶۲]

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ؕ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخٰسِرِينَ ۝﴾ [البقرۃ: ۶۳، ۶۴]

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر طور پہاڑ کو اُٹھایا کہ جو کتاب ہم نے تمہیں دی ہے، قوت کے ساتھ پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے یاد رکھو، تا کہ تم بچ جاؤ۔ پھر تم اس عہد کے بعد پھر گئے۔ پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور تباہ ہو جاتے۔

صورتِ واقعہ:

ان آیات میں پھر بنی اسرائیل کو خطاب ہوا کہ یاد کرو وہ وقت کہ جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور ہم نے تمہارے اوپر طور پہاڑ کو اُٹھایا، حکم دیا کہ پکڑو جو حکم ہم نے تم کو دیئے ہیں تورات میں قوت اور طاقت سے، صحیح نیت سے اور اس کو یاد کرو، پڑھو اور عمل کرو جو اس کے اندر ہے، تا کہ ہو جاؤ تم بھی اللہ سے ڈرنے والوں میں سے۔ پھر تم پھر گئے اس کے بعد، پھر تم نے منہ موڑا اس عہد کے بعد۔ اگر اللہ کا فضل اور اللہ کی رحمت شاملِ حال نہ ہوتی تو تم ہمیشہ خسارے والوں میں ہو جاتے۔

"میثاق" کا معنی ہوتا ہے: پختہ عقد، پکا عہد۔ دراصل بنی اسرائیل نے خود یہ مطالبہ کیا تھا کہ اللہ سے دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں کوئی شریعت و کتاب عطا فرمائیں۔ ہم آپ کا حکم تو مانتے ہیں، لیکن ہمارے پاس کوئی دستور و قانون نہیں ہے، ہم بے آئین، بے دستور قوم ہیں۔ کوئی ایسی جامع کتاب ہو جس میں ہر چیز واضح ہو اور ہم اس پر عمل کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے بندو! میں اللہ کا نبی ہوں، جو اللہ حکم دیتا ہے میں وہ پہنچا دیتا ہوں۔ انہوں نے کہا: وہ تو ٹھیک ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر باقاعدہ ایک کامل مکمل کتاب ہو اور اس میں تمام

احکام ومسائل واضح لکھے ہوئے ہوں تو بڑی آسانی ہوگی اور ہم اس پر عمل کریں گے۔

موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت وفضل سے موسیٰ علیہ السلام کی دعا منظور فرمالی اور حکم دیا کہ جبل طور پر آجاؤ اور وہاں تیس دن ورات روزہ رکھو، تنہائی میں بیٹھ کر عبادت کرو، تاکہ تم کتاب کا تحمل کرنے کے لیے پہلے تیار ہو جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام جبل طور پر اللہ کی عبادت کے لیے تشریف لے گئے۔ جب تیس دن پورے ہو گئے تو اللہ نے حکم دے دیا کہ دس دن مزید پورے کرو ﴿فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً﴾ [الاعراف: ۱۴۲] تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس راتیں پوری کیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے کامل، مکمل کتاب تورات عطا فرمائی۔

تورات ایک ہی دفعہ پوری مکمل لکھی ہوئی دی گئی اور تورات بھی اللہ کی ایک عظیم کتاب تھی جو ایک جامع، مانع، کامل، مکمل شریعت اور اس زمانہ کے حالات کے مطابق تھی۔ جب بنی اسرائیل کو تورات مل گئی تو انہوں نے کہا کہ تورات ہمیں مل گئی ہے، اللہ کی کتاب ہے اور اللہ نے آپ سے کلام فرمایا ہے۔ ہم بھی سننا چاہتے ہیں کہ اللہ ہم سے بھی کلام کرے، ہم سے بھی بات کرے، کم از کم ہم سن تو لیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم ہے کہ یہ میری کتاب ہے۔ تو ستر آدمی کو لے کر گئے تو انہوں نے اللہ کا کلام بھی سن لیا۔ اس کے بعد پھر اکڑ گئے ﴿لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ﴾ [البقرۃ: ۵۵] تو انہوں نے جب یہ گستاخی کی تو اللہ کا حکم ہوا اور بجلی گری تو سب کے سب ختم ہو گئے۔

اب موسیٰ علیہ السلام سجدے میں گر گئے کہ اے اللہ! یہ پوری بنی اسرائیل کے منتخب لوگ تھے، انہوں نے واقعی غلطی کی، زیادتی کی، گستاخی کی۔ اگر یہ لوگ مر گئے تو میرے لئے بڑی مشکلات ہو جائیں گی۔ آپ مہربانی فرمائیں تو اللہ نے ان کو پھر زندہ کر دیا۔ ﴿ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِّن بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ [البقرۃ: ۵۶] اب وہ تورات لے کر واپس آگئے، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم نے خود مانگی تھی، اب تم اس کتاب تورات پر عمل کرو۔ کہنے لگے: یہ تو بڑا مشکل ہے، اس کے حکم تو بہت سخت ہیں، ہم سے تو اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ جیسے آج کل بعض مسلمان کہتے ہیں کہ قرآن کے احکام سخت ہیں کہ انسان کا ہاتھ کاٹ دو، یہ جنگل کا قانون ہے۔ اگر ایک آدمی نے غلطی کی، اس سے زنا ہو گیا تو وہ آخر انسان ہے، اس کی اتنی بڑی سخت سزا ہے کہ اس کے لیے گڑھا کھود کر اس میں اس کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دو۔ یہ تو بڑا مشکل مسئلہ ہے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر کھانے کا واقعہ:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب پورے روم کو فتح کر لیا اور روم کا ایک بڑا کرنل تھا جو ان کی فوج کی کمان کر

رہا تھا، وہ بھی قید ہو کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قید میں آ گیا۔ چونکہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسلام کے عظیم سپاہی تھے، بطل اسلام تھے: انہوں نے اس قیدی کو جنگی اصولوں کے مطابق آرام سے رکھا، اپنے خیمے کے ساتھ اس کو خیمہ دیا اور اس کا خیال رکھتے۔

ایک رات حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھا تھا، اس نے کہا: اے خالد! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں کہ آپ فاتح ہیں، میں آپ کا قیدی ہوں، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے اور جنگوں میں فتح وشکست ہوتی رہتی ہے، لیکن جس بے جگری اور جس بہادری اور جس جنگی تکنیک سے تم نے جنگ لڑی ہے، میرے دل میں تمہارا احترام اتنا بڑھ گیا ہے کہ جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ تم مسلمانوں کے عظیم ہیرو ہو اور میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ میرے علاقے میں ایک خطرناک زہر ہوتی ہے اور یہ اپنے دشمنوں کو کسی طرح کھانے میں، چائے میں، شربت میں ملا کر دے دیتے ہیں اور آدمی ہلاک ہو جاتا ہے۔ میرا علاقہ اس معاملہ میں بڑا خطرناک ہے، لہٰذا خیال رکھنا کہ کبھی میرے ملک کے کسی آدمی کے ہاتھ سے کھانے پینے والی چیز نہ لینا۔ اپنے لوگوں کے ہاتھ سے کھانا، میں نہیں چاہتا کہ میرے محسن کو کوئی خبیث زہر دے کر مار ڈالے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ وہ زہر کیا بلا ہوتی ہے؟ اس نے کہا کہ بس ایک معمولی سا پاؤڈر ہے، اس کا ایک قطرہ بھی اندر چلا جائے تو آدمی مرجاتا ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ وہ تمہارے پاس بھی ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں! میرے پاس بھی ہے اور اپنی انگوٹھی کے اوپر سے نگینہ نکالا تو نیچے سے وہ پاؤڈر نکل آیا۔ اس نے کہا کہ ہمارا ہر بڑا افسر اس زہر کو اپنے پاس رکھتا ہے کہ اگر ہم قید ہو جائیں اور بچنے کی کوئی امید نہ رہے اور اس سٹیج پر پہنچ جائیں کہ ہمیں راز اُگلنے پڑیں تو ہم زہر کھا کر مرجاتے ہیں، تا کہ اپنے ملک کے راز نہ نکالیں تو وہ زہر میرے پاس بھی ہے۔ آپ نے پوچھا کہ کتنے سے آدمی مرجاتا ہے؟ اس نے کہا کہ ایک قطرہ کھا لے تو مرجاتا ہے۔ یہ جو میری انگوٹھی میں ہے، اس سے کئی آدمی مر سکتے ہیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پانی ساتھ رکھا ہوا تھا اور اس انگوٹھی کو لے کر سارا زہر منہ میں ڈال دیا اور کہا کہ "بِاسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْأَرْضِ وَالسَّمَاءِ، بِاسْمِ اللّٰهِ الَّذِي لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ دَاءٌ" اب وہ جرنیل دیکھ رہا ہے کہ ابھی گرے اور ابھی مرے، لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ٹھیک ٹھاک کھڑے ہیں۔ اس کرنل نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا پڑھا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا ہوا ہے کہ ہر چیز سے پہلے یہ پڑھ لو تو کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ میں نے اس کو پڑھ لیا ہے تو نقصان ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا زہر ہمارا کیا کرے گا؟ جس خدا نے اس زہر کو پیدا کیا

ہے، اس خدا سے تو میں نے پناہ مانگی ہے کہ اس ذات کے نام کے ساتھ میں پناہ پکڑ رہا ہوں، جس کا نام آ جائے تو دنیا کی کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی، وہ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے۔ میں شوق سے پی رہا ہوں یا اپنے ایمان اور یقین کو بڑھانے کے لیے پی رہا ہوں۔ [معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم، حدیث: ۲۳۹۴، خَالِدُ بْنُ الْوَلِیدِ الْمَخْزُومِیُّ...]

جب آدمی اس مقام پر ہو جائے کہ جہاں زہر اثر نہ کرے، جہاں دریاؤں پر گھوڑے دوڑا دیں تو دریاؤں پر سڑکیں بن جائیں، وہاں ہمیں کیا ضرورت ہو گی کہ ہم سود لیں؟۔ سود کے بغیر ہم کیسے زندہ رہیں گے؟ ربوا کے بغیر ہم کیسے زندہ رہیں گے؟ یہ بالکل وہی حال ہے جو بنی اسرائیل کا تھا۔ آج ہمارا حال وہی ہو چکا ہے، بلکہ ہم ......نعوذ باللہ!......ان سے بھی گر گئے ہیں۔

طور پہاڑ کو بنی اسرائیل پر کھڑا کرنے کا واقعہ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تم نے تو خود کتاب مانگی تھی، اب اللہ نے کتاب دی ہے تو تم انکار کر رہے ہو۔ انہوں نے کہا: کیا کریں، اس پر تو عمل نہیں ہو سکتا؟ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے عرض کیا کہ انہوں نے خود کتاب مانگی تھی، اب یہ لوگ تو پھر گئے ہیں۔ اللہ نے حکم دیا: اے جبرائیل! جبل طور کو اُٹھا کر ان کے اوپر کھڑا کرو۔ جبرائیل علیہ السلام نے پہاڑ اُٹھا کر قوم بنی اسرائیل پر کھڑا کر دیا۔ اب جب انہوں نے پہاڑ کو دیکھا تو کہا کہ یہ کیا ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر نہیں مانو گے تو یہ تمہارے اوپر آ رہا ہے۔ اب سب سجدے میں گر گئے اور اوپر دیکھ رہے ہیں کہ قریب ہے یا دور ہے؟ کہنے لگے: ہم مانتے ہیں، مہربانی کرو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تورات پر عمل کرنا بڑا مشکل ہے!؟ انہوں نے کہا: مرنے سے تو بہتر ہے۔ یہ جو اوپر سے پہاڑ گرے اور ہم سارے ایک منٹ میں مر جائیں تو اس سے تو اس تورات پر عمل کرنا بہتر ہے۔ اسی واقعہ کو ان آیات کے اندر بیان کیا گیا ہے۔

پہاڑ حقیقتاً کھڑا ہو گیا تھا:

بعض اُردو کی تفسیر لکھنے والے علماء نے غلطی کی، اللہ ان کی اور ہماری غلطیوں کو معاف فرمائے۔ ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ﴾ کہ پہاڑ طور کو ان کے اوپر لا کر کھڑا کرنا، یہ حقیقت نہیں تھی، بلکہ یہ ایسے ہے کہ ان کے اوپر مثالی طور پر ایک پہاڑ، ایک سایہ بادلوں کی طرح کھڑا کر دیا جائے اور انہیں ڈرایا جائے کہ اگر نہیں مانو گے تو یہ تمہارے اوپر گر جائے گا، وگرنہ حقیقتاً وہ جبل طور نہیں تھا۔

ان مفسرین کو یہ مغالطہ اس لیے لگا کہ اللہ نے دوسری سورت میں ارشاد فرمایا: ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ.......الآیۃ﴾ [الاعراف:۱۷۱] ''وَاقِعٌۢ بِهِمْ'' کہ جب ہم نے پہاڑ کو ان کے اوپر کھڑا کردیا، وہ ایسا تھا کہ گویا ان کے اوپر خیمہ سایہ کیے ہوئے ہے۔ ان کو ایک یہ مغالطہ لگا کہ ''كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ'' گویا کہ وہ ایک سائبان ہے، لہٰذا وہ حقیقت نہیں۔ اور دوسرا ان کو یہ مغالطہ لگا ﴿وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ﴾ اور انہیں گمان ہوا کہ یہ ہم پر گرنے والا ہے۔ یہ بھی ان کا خیال اور گمان تھا، حقیقت نہیں تھی۔ اور تیسری غلطی ان سے یہ ہوئی کہ انہوں نے قرآن میں پڑھا ہے کہ ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ڐ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۵۶] دین میں کوئی زبردستی نہیں کہ آدمی تلوار اُٹھالے کہ کلمہ پڑھتے ہو یا ماردوں؟ اس لیے انہوں نے کہا کہ یہ جو اوپر پہاڑ حقیقتاً کھڑا کردیا جائے اور کہا جائے کہ مانو، نہیں تو پہاڑ گراتے ہیں۔ یہ تو اکراہ و جبر ہوگیا، جبکہ اسلام میں جبر نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کو غلطی لگی اور کہا کہ حقیقتاً اس پہاڑ کو اُٹھایا نہیں گیا تھا، بلکہ ایسا انتظام کردیا کہ قوم یوں سمجھے کہ پہاڑ ہم پر گر پڑے گا، حقیقتاً پہاڑ ان پر نہیں گر رہا تھا اور نہ پہاڑ ان کے اوپر تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام یا دین میں جبر نہیں، یعنی کافر کو ہم زبردستی کلمہ پڑھوائیں، اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی کہ کافر پر ہم ڈنڈا لے کر کھڑے ہوجائیں کہ کلمہ پڑھو، اس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ دلائل موجود ہیں، عقل کے ساتھ وہ خود سمجھ لیں۔ لیکن اگر مسلمان ہونے کے بعد پھر وہ انکار کرے تو اس کو اسلام پر قائم رکھنے کے لیے جبر ہوگا۔ یہاں بھی بنی اسرائیل اب مسلمان تو نہیں ہو رہے تھے کہ اللہ نے پہاڑ کھڑا کردیا کہ ایمان لاتے ہو تو ٹھیک ہے، وگرنہ ہم پہاڑ گراتے ہیں۔ وہ پہلے سے تو مسلمان تھے اور انہوں نے تورات خود مانگی تھی، لیکن مانگنے کے بعد عمل نہیں کر رہے تھے۔ جیسے آج کوئی مسلمان دین پر عمل نہ کرے، شراب پیے تو اس کو کوڑے ماریں گے، زنا کرے تو رجم کریں گے، یہ اکراہ نہیں ہے۔ دین میں اکراہ علیحدہ چیز ہے اور دین کو قبول کرنے کے بعد حکم نہ ماننا علیحدہ چیز ہے۔ جیسے آپ کسی کالج میں داخلہ لینا چاہتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: داخلہ لیں یا نہ لیں، یہ آپ کی مرضی ہے، لیکن جب آپ نے داخلہ لے لیا، فارم بھر دیا اور ان کے قوانین کو قبول کرلیا تو اب ان قوانین کی پابندی کرنا تمہارے ذمہ لازمی ہے۔ کیا اسلام نے کبھی یہ مطالبہ کیا ہے کہ یہودی، نصرانی زنا کر رہے ہیں، ان کو بھی پکڑ کر رجم کردو؟ اسلام نے یہ سزا ان کے لیے رکھی ہے جس نے قرآن کو مان لیا ہے۔ تو اب جرم پر سزا قبول کرو۔

دوسرا ان مفسرین کو یہ مغالطہ لگا کہ ﴿كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ﴾ گویا کہ وہ ایک سائبان تھا۔ یہ مثال تب ہوتی جب "رَفَعْنَا بِهٖ" ہوتا۔ جب "رَفَعَ" بھی موجود اور "نَا" سے اس کی نسبت بھی اللہ کی طرف ہے اور لفظ "فَوْقَ" بھی ہے تو خود سمجھ آرہا ہے کہ وہ پہاڑ کا اُٹھایا جانا حقیقی تھا، مثال نہیں تھی، کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہو رہا تھا۔ اس لیے قرآن نے فرمایا: ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾۔

باقی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنا بڑا پہاڑ اُٹھایا کیسے گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اُٹھانے والا بندہ نہیں تھا، وہ تو جبرائیل علیہ السلام تھے، ان کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ انہوں نے لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں اُٹھائیں اور آسمانوں تک لے گئے تو ایک پہاڑ کو اُٹھانا کون سا مسئلہ تھا۔

اگر یہ مثال ہوتی تو ﴿فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [البقرة: ٦٤] تو فضل اور رحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہ حقیقتاً پہاڑ تھا۔ اللہ نے فرمایا: اگر میرا فضل نہ ہوتا اور میری رحمت نہ ہوتی، میں تمہاری توبہ منظور نہ کرلیتا تو پہاڑ تمہارے اوپر گر جاتا اور تم کفر کی حالت میں مرجاتے، لیکن میں نے پھر بھی رحمت کی کہ پہاڑ ہٹالیا اور تمہاری توبہ قبول کرلی۔

اسلام پر عمل کو قربِ قیامت مشکل سمجھا جائے گا:

اسی لیے میرے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ایک وقت آئے گا، میری امت کے لوگ کلمہ بھی میرا پڑھنے والے ہوں گے، قرآن کی تلاوت بھی کریں گے، لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا۔

[صحيح البخاري، حديث: ٦٩٣١، باب: قَتْلِ الخَوَارِجِ وَالمُلْحِدِينَ]

اسی طرح حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ ان کا قبلہ معاملات کے اندر عورتیں بن جائیں گی، ان کا دین ان کے دینار بن جائیں گے، ان کے جو بڑے بڑے سردار ہیں وہ شریر ہوں گے اور ان پر جو حاکم ہوں گے وہ ظالم ہوں گے، ان پر ظلم کرنے والے ہوں گے۔ اور حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ پیسہ ان کا سب سے بڑا مرکز توجہ بن جائے گا کہ پیسہ کمانا چاہیے، چاہے حرام سے ملے، چاہے منشیات اور ہیروئن بیچ کر ملے، لوگوں کے معصوم بچے قتل کر کے اور اغواء کر کے ملے۔ فرمایا: جب یہ وقت آجائے گا تو پھر قبر میں دفن ہو جانا زندہ ہونے سے بہتر ہوگا۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ جب تمہارے غنی بخیل بن جائیں، یعنی تمہارے پیسے والے لوگ بخیل بن

جائیں، اگر وہ چاہیں تو اپنے الیکشن میں کروڑوں روپے خرچ کر دیں، لیکن ان کے ڈیرے پر مسجد ویران پڑی ہوئی ہوگی، مسجد میں کبھی دس روپے بھی نہیں لگا سکتے۔ وہ اگر چاہیں تو اربوں روپے خرچ کر دیں، لیکن انہوں نے کبھی اپنے محلے میں بیوہ عورت کو وظیفہ نہیں دیا، کبھی کسی یتیم کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا، کبھی کسی غریب کے گھر آ کر عید کے دن بھی کھانا نہیں پہنچایا کہ ان کا کم از کم عید کا دن اچھا گزر جائے۔ میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے اغنیاء بخلاء بن جائیں، جب تمہارے حاکم بُرے لوگ بن جائیں اور جب تمہارے علماء حق کہنا چھوڑ دیں، بلکہ وہ بھی دنیا کی رو میں بہہ جائیں، اور وہ بھی چلتے چلتے اسی رنگ میں رنگ جائیں، صرف عوام کو دھوکہ دینے کے لیے ایک چادر لپیٹ لیں اور اسلام کو ڈھال بنانا شروع کر دیں تو فرمایا کہ جب وہ وقت آ جائے تو آدمی کا مرجانا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

قربِ قیامت اسلام کا نام باقی رہے گا:

اور اس طرح میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ قربِ قیامت اسلام باقی نہیں رہے گا، مگر نام کا، جب نام پوچھو گے کہ کون ہو؟ تو کہے گا کہ میں تو...... ماشاء اللہ...... مسلمان ہوں۔ اس سے پوچھیں کہ نماز پڑھتے ہو؟ تو کہے گا کہ نہیں۔ روزہ رکھتے ہو؟ تو کہے گا کہ کبھی کبھی رکھ لیتا ہوں۔ عید کی نماز پڑھتے ہو؟ ہاں! موقع مل جائے تو پڑھ لیتے ہیں۔ اچھا عید کی رکعتوں اور جنازے میں کیا فرق ہے؟ تو جواب دے گا کہ جیسے لوگ پڑھتے ہیں تو ہم بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ اسلام کا صرف نام باقی رہ جائے گا۔ اور قرآن باقی نہیں رہے گا، مگر کتابوں میں لکھا ہوگا کہ سونے کے پانی سے قرآن کو لکھیں گے، چاندی کے پانی سے قرآن کو لکھیں گے، سونے کی تاروں سے قرآن کو لکھا جائے گا اور کروڑوں روپے خرچ کیے جائیں گے، لیکن قرآن پر عمل کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث:۲۷۶، کِتَابُ الْعِلْمِ، اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ]

قرآن کی فریاد:

اسی لیے حدیث پاک میں آتا ہے، حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت والے دن اللہ کا قرآن اللہ کی بارگاہ میں استغاثہ پیش کرے گا: ﴿وَقَالَ الرَّسُولُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۝﴾ [الفرقان:۳۰] کہ اے پروردگارِ عالم! یہی تیرے بندے ہیں جنہوں نے مجھے اپنے گھروں سے نکال دیا تھا، مجھے اونچے اونچے طاقوں پر سجا دیا تھا، کبھی میں دھو دھو کر پلایا جاتا تھا اور کبھی میں میت پر پھرایا جاتا تھا اور کبھی میں قسموں اور حلفوں کے

لیے بازاروں میں منگوا کر سروں پر اُٹھایا جاتا تھا، لیکن مجھ پر عمل کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے: تو میرا کلام ہے، تو میری کتاب ہے، تو میرا قرآن ہے۔ جس نے تمہیں چھوڑا ہے، آج اس کی سزا جہنم ہے۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے حق میں فیصلہ فرمادیں گے۔

دعا کرو قیامت والے دن قرآن ہماری سفارش کرنے والا بنے، قرآن ہم پر دعویٰ کرنے والا نہ بن جائے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے کمالات:

ان آیات میں اللہ پاک نے بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت اور حکومت کا زمانہ تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے بڑی شان والے پیغمبر اور بادشاہ بھی تھے۔ اللہ نے جتنے نبی بھیجے بعض کو نبوت کے ساتھ بادشاہی بھی عطا فرمائی، جن میں حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کو نبوت بھی ملی اور تخت بھی ملا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خود اختیار دیا۔ اللہ نے فرمایا: جبرائیل! میرے نبی سے جا کر پوچھو کہ کیا پسند کرتے ہو کہ ہم نبوت ورسالت کے ساتھ تمہیں بادشاہ بھی بنادیں یا تم یہ چاہتے ہو کہ رسالت ونبوت کے ساتھ صرف اللہ کے شکر گزار بندے بنو؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے تخت وحکومت نہیں چاہیے، میں تو خدا کا شکر گزار بندہ بننے پر راضی ہوں۔ مجھے صرف نبوت ورسالت کا جو مقام ملا ہے، وہ بہت بڑا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خود اپنی منشاء سے اختیار فرمایا، ہمارے آقا سردار دوجہاں نے، افضل الانبیاء نے فقر کو اختیار کیا اور ہم دنیا میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا قبول فرمالیتے تو پتہ نہیں کہ اُمت کا کیا حال ہوجاتا؟

اس لیے حضرت سیدنا داؤد علیہ السلام کو اللہ نے سب سے بڑا معجزہ یہ دیا تھا کہ ان کو ایسی آواز عطا فرمائی اور آپ کی زبان مبارک میں ایسا اثر رکھا تھا کہ جب آپ زبور کی تلاوت فرماتے تھے تو پرندے اُڑتے ہوئے رُک جاتے تھے، دریاؤں کی موجیں تھم جاتی تھیں اور جب آپ اللہ کا ذکر شروع کرتے تو پہاڑ بھی آپ کے ساتھ ذکر میں مشغول ہوجاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آواز میں ایسی تاثیر رکھی کہ پتھر بھی موم ہوجاتے، دریا اپنی روانی کو بھول جاتے، پرندے اپنی اُڑان کو بھول کر کھڑے ہوجاتے، جب تک حضرت پڑھتے رہتے، پرندے اوپر سایہ کرکے کھڑے ہوتے۔

[روح البیان: ۱/۳۹۲، البقرۃ: الآیۃ: ۲۵۱]

اللہ نے ان کو دوسرا معجزہ یہ عطا فرمایا تھا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ﴾ [سبا:۱۰] کہ اللہ نے ان کے ہاتھ میں لوہے کو نرم کر دیا۔ ہم لوہے کو آگ میں ڈال کر نرم کرتے ہیں، لیکن داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں اللہ نے لوہا ایسا نرم کر دیا کہ جہاں سے پکڑتے، اس کو موڑ دیتے اور جہاں سے چاہتے اس کو توڑ دیتے اور جہاں چاہتے جوڑ دیتے تھے اور جنگ میں جو زرہ پہنی جاتی ہے، اس کے موجد حضرت داؤد علیہ السلام ہیں، کیونکہ پہلے زمانے میں تلواروں، نیزوں اور تیروں سے جنگ ہوتی تھی تو زرہیں بنتی تھیں، کڑے لگا لگا کر قمیص بنائی جاتی تھی اور وہ پہن لی جاتی تھی، تاکہ سینہ تیرے لگنے سے محفوظ ہو جائے۔

جیسے آج کل بلٹ پروف جیکٹ ہوتے ہیں۔ یہ اندر سے پہن لیتے ہیں، تاکہ خدانخواستہ کوئی دشمن گولی مارے تو گولی اثر نہ کرے۔ بہرحال جیسے جیسے دنیا میں چیزیں ایجاد ہوتی جارہی ہیں، اسی طرح کے توڑ بھی بنتے جارہے ہیں۔ اس زمانہ میں زرہ استعمال ہوتی تھی، سب سے پہلے زرہ بنانے والے حضرت داؤد علیہ السلام ہیں۔

جیسا کہ سب سے پہلے لکڑی کا کام کرنے والے حضرت نوح علیہ السلام ہیں کہ جنہوں نے کشتی بنائی۔ اور دیکھ لو! دنیا ہزار ترقی کر لے، ہزار علوم کے عروج پر پہنچ جائے، لیکن آج اگر آپ بحری جہاز بناتے ہیں تو آپ کو شکل وہی رکھنی پڑتی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام نے رکھی تھی، یعنی اس کا انداز وہی ہوگا، چاہے چھوٹی بنائیں یا بڑی بنائیں۔ اب آپ چاہے اس کا نام جہاز رکھ دیں کہ بڑے بڑے جہاز بنا کر اندر انجن لگالیں، لیکن آپ مجبور ہیں کہ آپ اس کے علاوہ شکل نہیں بنا سکتے۔

اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام نے جو زرہ بنائی تھی، آج آپ جتنی چاہیں بلٹ پروف جیکٹس بنالیں، لیکن جیسے زرہ سینے پر پہنی جاتی تھی، شکل وہی رہے گی۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سر پر ''خود'' پہنی جاتی تھی، آج بھی اسی طرح وہ ''خود'' پہنی جاتی ہے۔ آپ اس کی شکلیں لاکھ بدلتے رہیں، لیکن انداز وہی ہے جو ابتداء میں اللہ کے پیغمبروں نے اختیار کیا تھا۔

تو یہ واقعہ جو آپ اس آیت میں پڑھ رہے ہیں، حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے کا ہے۔

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ﴾ [البقرۃ:۶۵]

''اور تم خوب جان چکے ہو تم میں سے جنہوں نے ہفتہ کے دن زیادتی کی تھی، ہم نے ان سے کہا تھا کہ ذلیل ہونے والے بندر بن جاؤ۔''

ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت:

اس دور میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ تم ہفتے میں جب چاہو مچھلی کا شکار کر سکتے ہو، لیکن ''یوم السبت'' یعنی ہفتے کا دن چونکہ عبادت کا دن ہے اور آدمی اگر شکار میں کھو جائے تو وہ عبادت نہیں کر سکتا، لہٰذا ''سبت'' والے دن شکار بند ہے، آگے پیچھے ایام میں شکار کرو، مچھلی پکڑو اور دریاؤں سے فائدہ اُٹھاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو بتلا دیا کہ ہفتے والے دن شکار نہیں کھیلنا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، اللہ کا حکم ہو گیا ہے۔

اب جب کچھ دن گزرے تو انہوں نے کہا کہ عجیب بات ہے! اللہ کو کیا منظور ہے کہ ہفتے والے دن شکار نہ کرو؟ آخر کیا وجہ ہے؟...... کیونکہ ان کے دماغ میں اپنی آزادی کلبلائی کہ ہر آدمی اپنی رائے میں آزاد ہے، جو چاہے کرے۔ یہ کیا پابندی ہو گئی کہ اس دن شکار کرو اور اس دن نہ کرو۔ ہم کیسے یہ پابندیاں قبول کر لیں؟ اب اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو آزمائش میں ڈالا...... اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہوئی کہ اللہ نے مچھلیوں کو حکم دے دیا کہ جب ہفتے کا دن آئے تو سطح سمندر پر آجاؤ اور باقی دن تم دریا کی تہہ میں رہو۔ اب جب بنی اسرائیل ہفتے کے دن آتے تو ان کا بڑا جی للچاتا کہ دیکھو! آج تو مچھلیاں بھی بہت ساری ہیں اور باقی دنوں میں تو مچھلیاں ہمیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔

اب انہوں نے ایک حیلہ نکالا کہ جو نہریں بہتی تھیں، ان کے قریب چھوٹی چھوٹی ندیاں اور نالے بنا لیے اور آگے بڑے بڑے حوض بنا دیئے اور ایک آدمی کو بٹھا دیتے کہ جب وہ پانی اور مچھلیاں اس حوض میں بھر جائیں تو تم اس کو ایک پتھر رکھ کر بند کر دو۔ لہٰذا ہفتے والے دن حوض میں مچھلیاں بھر جاتیں اور اتوار کو جا کر وہ پکڑ لیتے کہ ہفتے والے دن تو شکار نہیں کیا، ہم نے تو اتوار کو جا کر شکار کیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اللہ کے قانون کو توڑنے کا ایک راستہ بنا دیا۔

آج کل دولتمندوں کا ظلم:

جیسے آج بڑے آدمی، جتنے بڑے سرمایہ دار ہیں، جتنے بڑے جاگیردار ہیں، وہ کہتے ہیں کہ واقعی زنا تو حرام ہے، لیکن نکاح کرنا تو جائز ہے۔ چنانچہ لڑکی کو بلایا اور اپنے دونوکر بھی بٹھا لیے اور مفت کی روٹیاں توڑنے والے مولوی کو بلا کر کہتے ہیں کہ مہربانی فرمائیں، یہ لڑکی ہے اور ہم نے نکاح کرنا ہے، کیونکہ حضرت ہم زنا سے ڈرتے ہیں، زنا حرام ہے، جہنم کی سزا ملتی ہے تو اس مولوی نے نکاح پڑھا دیا۔ یہ نہیں پوچھا کہ لڑکی کون ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟ اس کا

باپ کہاں ہے؟ اس کا ولی کہاں ہے؟ اس کا وارث کہاں ہے؟ اور یہ کس کے حکم سے نکاح ہو رہا ہے؟ کون نکاح کرنے والا ہے؟ حق المہر کیا ہے؟ شرائط کون کون سی ہیں؟ بس نکاح پڑھا دیا اور کہا کہ حضرت! مبارک ہو۔ اس ظالم نے پندرہ بیس دن اس بچی پر ظلم کیا اور اس کے بعد اس کو چھوڑ دیا۔ اور اس کے بعد ایک اور بچی آ گئی تو مولوی صاحب پھر نکاح پڑھنے کے لئے آ گئے، کیونکہ مولوی صاحب کو تو ہر نکاح پر پیسہ ملتا ہے، وہ کیوں انکار کرے؟ اس لئے مولوی صاحبان کبھی یہ بھی نہیں دیکھتے کہ قادیانیوں کا نکاح پڑھ رہے ہیں، کس کا نکاح کس وجوہ کی بناء پر پڑھ رہے ہیں؟ خدا کے بندو! پہلے اس سے اس کا عقیدہ تو پوچھو کہ تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ جب اگلا آدمی ہی مسلمان نہ ہو تو نکاح پڑھنے کا کیا معنی ہے؟

بنی اسرائیل تین حصوں میں منقسم ہو گئی:

بنی اسرائیل کے تین حصے ہو گئے: ایک حصہ ایسا جو اُن کو کہتا کہ ایسا نہ کرو، اللہ کے حکم کو مذاق نہ بناؤ، اللہ کی نافرمانی نہ کرو، لیکن وہ نہ مانتے۔ اور ایک جماعت ایسی تھی جو کہتے کہ چھوڑو، یہ مانتے تو ویسے بھی نہیں، اس لئے تم اپنا کام کرو۔ جیسے آج کل بعض لوگ بڑے نیک ہو جاتے ہیں کہ چھوڑو قوم مانتی تو نہیں ہے، بس اپنی نماز روزے کی فکر کرو۔ حالانکہ یہ کوئی نیکی نہیں ہوتی کہ اگر قوم نہ مانے تو تم نہ روکو۔ علماء نے لکھا ہے کہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہیں۔ اگر وہ نہیں مانتے تو نہ مانے۔ یہ نہیں کہ ہم بھی خاموش ہو کر بیٹھ جائیں اور حق کا کلمہ چھوڑ دیں۔ اگر لوگوں نے اللہ کے دین کو چھوڑا ہے تو ہم بھی اگر اللہ کے دین کو چھوڑ دیں تو فرق کیا رہ جائے گا؟

بعض بنی اسرائیل کی شکلیں مسخ کر دی گئیں:

تو اب بنو اسرائیل کی قوم تین حصوں میں منقسم ہو گئی۔ بہر حال یہ ہوتا رہا اور جب قوم اپنی بے حیائی کی بالکل انتہاء پر پہنچ گئی تو اللہ نے فرمایا: ﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ﴾ [البقرة:٦٥] سب بندر بن جاؤ۔ تو جب وہ شام کو سوئے تو انسان تھے اور صبح کو جب اُٹھے تو بندر بنے ہوئے تھے۔ مرد بندر بن گئے اور عورتیں بندریاں بن گئیں۔

اس کے بعد مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ تین دن تک اسی بندر کی حالت میں رہے اور تین دن کے بعد اللہ کا عذاب آیا اور سارے کے سارے مر گئے، ختم ہو گئے، اس کے بعد پھر ان کی نسل نہیں چلی۔

اس لئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان بندر کیسے بن گیا؟ بھائی! تم تو ڈارون کا نظریہ مانتے ہو کہ پہلے انسان بندر

تھا، پھر ترقی کرتے کرتے انسان بن گیا۔ اگر بندر ترقی کرتے کرتے انسان بن جاتا ہے تو پھر تنزلی کرتے کرتے بندر بھی تو بن سکتا ہے۔ اگر تم ڈارون کے کہنے پر بندر کو انسان بنا سکتے ہو تو کیا ہم اللہ کا فرمان چھوڑ دیں؟ اللہ نے ہی انسانوں کو بندر بنا دیا اور: ﴿وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ﴾ [ابراہیم: ۲۰] اللہ تبارک وتعالیٰ کے آگے یہ بات کوئی مشکل نہیں ہے، وہ چاہیں تو انسانوں کو حیوان بنا دیں، وہ چاہیں تو حیوانوں کو انسان بنا دیں۔ اس چیز کو ''مسخ'' کہتے ہیں، یعنی شکل کا بدل جانا۔

مسخ کی تین قسمیں:

علماء نے لکھا ہے کہ مسخ تین قسم پر ہے: ایک تو مسخ حقیقی ہوتی ہے کہ گوشت تھا، لیکن اللہ کے عذاب سے پتھر بن گیا، یہ حقیقی مسخ ہے۔ اسی طرح گوشت پوست کا انسان دریا میں داخل ہوا تو انسان تھا، جب غرق ہوا تو انسان تھا، ڈوب رہا تھا تو انسان تھا اور ڈوبنے کے بعد جب اللہ نے اس کی لاش کو باہر پھینکا تو وہ پتھر کی لاش بن گئی۔ یہ مسخ حقیقی ہے۔

اور دوسرا مسخ صوری کہ شکل بدل گئی کہ پہلے انسان کی شکل تھی، اب بندر کی شکل بن گئی۔ اس میں عقل اور سمجھ موجود ہے، اس کے اندر انسانی ادراک اور سمجھ کی ساری قوتیں موجود ہیں، لیکن اس کی شکل تبدیل ہو گئی ہے، یہ مسخ صوری ہے۔

تیسری قسم مسخ معنوی ہے کہ آدمی کی شکل بھی انسان کی ہے، صورت بھی انسان کی ہے، لیکن اس کے عمل ایسے ہو گئے ہیں جیسے حیوانوں والے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ کوئی درندہ انسان کو دیکھے تو اس کو چیر پھاڑ کر جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی انسانوں کو قتل کر ڈالتا ہے، یہ بھی انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کروا دیتا ہے۔ کتنے ایسے انسان ہیں جنہیں انسانوں کو قتل کرنے میں لذت ملتی ہے، جو انسانوں کے خون بہانے میں خوش ہوتے ہیں، انسانوں کے قتل کے اندر انہیں بڑی آسائشیں ملتی ہیں، ان کو ذہنی تسکین ملتی ہے۔

تو بنی اسرائیل کا مسخ صوری تھا، ان کی شکلیں بندر اور بندریوں کی بنا ڈالیں، لیکن ان کی عقل اسی طرح قائم رہی۔ اس لیے قرآن پاک نے اگلی آیات میں جو صیغے استعمال فرمائے، اس میں عقل والوں کے لیے جمع کا صیغہ ''خٰسِئِیْنَ'' آیا ہے، ''یاء'' اور ''نون'' کے ساتھ جمع ذوی العقول کے لیے ہوتی ہے۔ اور اسی طرح جب اللہ نے حکم دیا: ﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ﴾ [البقرۃ: ۶۵] اس کے اندر بھی وہ حکم ہے جو ذوی العقول کو دیا جاتا ہے کہ

ذلیل وخوار ہو کر بندر ہو جاؤ۔

"نَكَالًا" اس کا معنی ہے: عذاب، عبرت اور تماشہ کہ ان سے آگے والی بستیاں، ان سے پیچھے والی بستیاں، آنے والے لوگ اور گزرنے والے لوگ سب کے لیے ہم نے ان کو عذاب کا نمونہ بنا دیا۔ اور اس عذاب دینے کا مقصد ہے: ﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۸] کہ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں وہ ان واقعات سے عبرت پکڑیں، ان واقعات سے نصیحت پکڑیں اور کبھی ایسا کام نہ کریں جو اللہ کی نافرمانی والا ہو۔

توان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی اسرائیل کی بدعملی، عہد شکنی، اللہ کے قوانین کو توڑنے کے حیلے اور بہانے اور پھر ان کا انجام کار بتلا کر اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کو تنبیہ کی ہے کہ وہ ایسا نہ کریں۔

اللہ سے کیے گئے خاص اور عام عہد

ایک عہد وہ ہے جو تمام دنیا سے تھا، عالم اَرواح کے اندر لیا گیا۔ ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾ [الاعراف: ۱۷۲] سب نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا کہ آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ بعض عہد ہیں جو خاص ہیں۔ جیسا کہ تمام انبیاء سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے عہد لیا تھا کہ آپ میرے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بشارت کرتے رہیں اور اعلان کرتے رہیں اور ان کے آنے کے بارے میں اپنی اپنی امتوں کو خبر کرتے رہیں۔

اسی طرح جب بنی اسرائیل نے مطالبہ کیا تھا کہ اے اللہ! ہمیں کتاب اور ایسی جامع دستاویز دیں کہ اس پر ہم عمل کریں۔ تو اللہ نے ان سے عہد لیا اور جب ان کو تورات مل گئی تو وہ یہ عہد بھول گئے۔

ان واقعات کے اعادہ کا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ حضور ﷺ کے زمانے میں تو موجود نہیں، لیکن جو موجود تھے، ان کو بتلایا جا رہا ہے کہ تمہارے آباء واجداد نے بھی ایسا کیا اور ہلاک ہوئے۔ تم ایسا نہ کرو کہ حضور ﷺ کے ساتھ عہد کرتے ہو اور پھر توڑ دیتے ہو۔ تم بھی اپنے باپ، دادا کے طریقوں پر نہ چلو۔ اسی طرح اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ہدایت کی گئی کہ تم بھی بنی اسرائیل کی طرح نہ کرنا۔

اللہ کی کتاب پڑھنے کے اثرات:

تو اللہ نے حکم فرمایا کہ ہم نے تم کو جو کتاب دی ہے، اس کو طاقت کے ساتھ پکڑو، یعنی اس پر عمل کرو۔ یہ نہیں کہ

کتاب کو طاقت کے ساتھ پکڑلو، سینے سے لگالو، لیکن عمل نہ کرو۔ اور جو کچھ کتاب کے اندر ہے، اس کو بار بار یاد کرتے رہو، پڑھتے رہو، تاکہ تم بھی ڈرنے والوں میں سے ہوجاؤ۔ کیونکہ جب اللہ کی کتاب پڑھی جاتی ہے، اللہ کا قرآن پڑھا جاتا ہے تو اس کا دل پر ایک خاص اثر ہوتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے رحمت نازل ہوتی ہے، دل میں خشوع وخضوع پیدا ہوتا ہے اور آدمی ڈرنے والوں میں شامل ہوتا ہے۔

طور پہاڑ:

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس پہاڑ سے مراد "طور" پہاڑ تھا۔ وہ اُٹھا کران کے سروں کے اوپر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ جبل طور مشہور پہاڑ ہے اور اس پہاڑ کو اللہ نے بڑا شرف بخشا ہے، اسی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور اسی مقام پر اللہ سے انہوں نے کلام فرمایا اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر اللہ نے اپنی خصوصی تجلی فرمائی اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو معجزات عطا فرمائے اور یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی چالیس راتیں عبادت کی اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ اپنی قوم کے سرداروں کو لے کر آئے تھے اور اسی پہاڑ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُٹھا کران پر کھڑا کر دیا اور جب انہوں نے معافی مانگ لی اور اقرار کرلیا تو پہاڑ پھر اپنی جگہ پر آگیا۔

کیا طور پہاڑ سرمہ بن گیا؟

بعض لوگوں نے یہ لکھ دیا کہ یہ سرمہ جو ہم استعمال کرتے ہیں، یہ سرمہ اس جبل طور کا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی: ﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ﴾ کہ پروردگار عالم! میں دیکھنا چاہتا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ﴾ کہ تم اس پہاڑ کے اوپر دیکھو۔ اگر یہ پہاڑ میری تجلی برداشت کرسکتا ہے تو پھر ایک انسان بھی برداشت کرسکتا ہے اور اگر اتنی صلب، طاقت والا پہاڑ متحمل نہیں ہوسکتا تو پھر ایک عاجز انسان کیسے متحمل ہوسکتا ہے؟ تو قرآن کہتا ہے: ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ۝۱۴۳﴾ [الاعراف: ۱۴۳] اللہ پاک نے جب اس پہاڑ پر تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کردیا اور اس کے بعد موسیٰ بھی بے ہوش ہوکر گر گئے۔ تو اس لیے بعض لوگوں نے سرمہ کا مسئلہ نکال لیا۔ حالانکہ سرمہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اس پورے پہاڑ کو

ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ پہاڑ کے کسی حصہ پر یہ واقعہ پیش آیا۔ پہاڑ تو بڑے لمبے ہوتے ہیں، بڑے طویل ہوتے ہیں، بعض پہاڑوں کے سینکڑوں میلوں تک سلسلے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو اسی طرح اب بھی دنیا میں طورسینا موجود ہے، وہ علاقہ موجود ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ وہ سرمہ بن گیا تھا اور ہم جو سرمہ پہنتے ہیں، اسی پہاڑ کا حصہ ہے۔ یہ بالکل جھوٹی روایات ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے جب تجلی فرمائی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ کتنا حصہ ریزہ ریزہ ہوگیا؟ دایاں، بایاں، خلف، قدام، یہ قرآن نے ذکر نہیں فرمایا۔ صرف یہ ارشاد فرمادیا: ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾[الاعراف:۱۴۳]

اور فرمادیا: ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ﴾[الاعراف:۱۷۱] کہ اس کوہِ طور کو ان کے اوپر اُٹھایا گیا تو جب وہ سرمہ بن گیا تھا تو پھر اس جبل طور کو اُٹھائے جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس لیے ہمیشہ یہ بات یاد رکھیں کہ آدمی اللہ کے قرآن میں کبھی جسارت نہ کرے، یعنی آدمی کبھی یہ نہ کرے کہ اپنی عقل وفکر کی سطح پر اللہ کے قرآن میں قطعاً کوئی بات کہے۔ اللہ کے قرآن کے ہم پابند ہیں کہ جو ہمیں حضور پاک ﷺ نے پڑھایا ہے اور سمجھایا ہے، اس سے ہم اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتے، کیونکہ قرآن نازل بھی حضور ﷺ پر ہوا۔ اور اللہ نے میرے مدنی پاک کے سینے میں جمع فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ہی قرآن کی تفسیر حضور ﷺ کو پڑھائی اور حضور ﷺ نے صحابہ کو پڑھائی۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ جیسے جیسے مسئلے پیش آتے گئے، جدید علماء کرام ان سے استنباط کرتے گئے، لیکن اسی قرآن کے حکم کی روشنی میں کہ قرآن کا کوئی حکم نہیں ٹوٹے گا، اصل حکم برقرار رہے گا، اس کی بنیادی حیثیت برقرار رہے گی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

اسی سے اگر بعض مسائل سمجھے گئے تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک آدمی نے سوال کیا کہ اے علی! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ حضور ﷺ نے آپ کو کوئی خاص چیز لکھ کر دی تھی اور وہ آپ نے اپنے پاس رکھی ہوئی ہے اور کسی پر آپ ظاہر بھی نہیں فرماتے۔ وہ کیا چیز ہے؟ تو اسی بات کو ان لوگوں نے لیا ہے کہ وہ حضور پاک ﷺ کی وصیت تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وصی رسول اللہ ہیں کہ آپ ﷺ نے وصیت فرمادی کہ میرے بعد تم خلیفہ ہو اور جو تم پر ایمان نہیں لائے گا تو اس کا میرے اوپر بھی کوئی ایمان نہیں ہے۔ تو یہ وصیت نامہ لکھا ہوا حضرت

علی رضی اللہ عنہ کے پاس تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو چھپا کر تلوار کے نیام کے اندر رکھا ہوا تھا لیکن آپ کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ان کے پاس موجود تھی۔

تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی سوال کیا گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کوئی ایسی خاص چیز عطا فرمائی ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کے بندے! ہمیں اللہ کے پاک نبی نے کوئی ایسی خاص چیز عطا نہیں فرمائی ہے۔ یہ دیکھو کہ جو کاغذ میرے پاس ہے، اس میں زکوٰۃ کے احکام لکھے ہوئے ہیں کہ اونٹوں کی کتنی زکوٰۃ ہے؟ اور بکریوں کی کتنی زکوٰۃ ہے؟ بیل اور گائے میں کتنی زکوٰۃ ہے؟ تا کہ میں وہ بھول نہ جاؤں۔ ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ قرآن سب نے پڑھا ہے، لیکن اللہ نے فہم کسی کو زیادہ دیا ہے، ورنہ اللہ کے قرآن کے سوا ہمارے پاس کچھ نہیں ہے اور کوئی وصیت نہیں ہے۔ [صحیح البخاری، حدیث ۱۱۱، باب: کِتَابَةِ الْعِلْمِ]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی تردید فرمائی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی فرما دیا کہ ہاں! مگر سمجھ، وہ سب کو مختلف دی ہے کہ سو یا پچاس طالب العلم ہوتے ہیں، لیکن ان میں ایک طالب العلم ہے جو ماشاء اللہ! زیادہ ذکی ہے، اس کو اللہ پاک نے زیادہ قرآن کی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ اسی طرح ہر دور میں ہر محدث، ہر مفسر کے پاس، ہر عالم کے پاس جب ان کے شاگرد آتے تھے تو جو طالب العلم ان میں بہت زیادہ ذکی اور ذہین ہوتے ہیں تو استاد ان شاگردوں پر فخر کرتے ہیں کہ فلاں میرا طالب ہے، میرے پاس پڑھا ہے۔ تو استاد اس کی فہم پر فخر کرتا ہے۔

تو بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں کوئی وصیت وغیرہ نہیں دی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی فرما دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں کوئی وصیت نہیں ہے اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کوئی وصیت پیش کی اور نہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر کوئی وصیت پیش کی، نہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر کوئی وصیت پیش کی۔ چلو یہ لوگ بہانہ بناتے ہیں کہ اس وقت ڈر تھا کہ تقیہ کرتے رہے اور چھپاتے رہے، لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خود خلیفہ بن گئے تو اس وقت لوگوں کو دکھا دیتے کہ میرے پاس وصیت تھی، میں تو ڈرتا تھا کہ میں کیا کروں، میں مسلمانوں کو لڑانا نہیں چاہتا تھا، اس لئے میں نے ظاہر نہیں کی تھی۔

چودہ سو سال کے بعد ان لوگوں نے وہ وصیت پڑھ لی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے پاس نہیں ہے۔ اب کیا کریں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سچا مانیں یا چودھویں صدی کے ایک ذاکر کو سچا مانیں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو ہم سچا مانیں یا چودھویں صدی کے ذاکر کو سچا مانیں؟

ایصالِ ثواب کا مسنون طریقہ:

وعلیکم السلام کا معنی دعا ہے۔ ہم جو آپس میں السلام علیکم کہتے ہیں، یہ بھی دعا ہے کہ تم پر اللہ کی طرف سے سلامتی ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکات ہوں۔ تو جب ہم قبرستان میں بھی کہتے ہیں: السلام علیکم کہ ان پر بھی اللہ کی طرف سے سلامتی اور رحمتیں نازل ہوں۔

اسی طرح صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رات کو دیکھا کہ حضور ﷺ میرے حجرے میں نہیں ہیں تو میں آپ کو ڈھونڈتے ہوئے چل نکلی۔ میں نے آ کر دیکھا کہ آپ ﷺ جنت البقیع کے قبرستان میں ہیں اور ان کے لیے دعا کر رہے ہیں۔ بی بی صاحبہ فرماتی ہیں کہ میں بھی پیچھے چھپ کر کھڑی ہوگئی اور آمین، آمین کہہ کر حضور ﷺ کی دعا میں شریک ہوگئی۔ اگر دعا منع ہوتی تو حضور پاک ﷺ قبرستان میں کھڑے ہو کر دعا نہ فرماتے۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۹۷۴]

اسی طرح حضور پاک ﷺ نے حکم دیا ہے کہ جب کسی مردے کو قبر میں دفن کر لو اور مٹی اوپر ڈال دو تو فرمایا کہ یہی وقت ہے بندے سے سوال و جواب کا۔ تم اپنے بھائی کے لیے دعا مانگو، اللہ تعالیٰ اس کو سوال و جواب میں ثابت قدم رکھے۔

لہٰذا دعا مانگنا منع نہیں ہے۔ لیکن یہ جو ہمارے ہاں رواج ہے کہ جب بڑا آدمی مر گیا تو حافظ کرائے پر بٹھا دیئے، ختم پڑھ رہے ہیں۔ اور غریب مر جائے تو اس کو غسل دینے والا، جنازہ پڑھنے والا بھی کوئی نہیں، جنازے کو کندھا دینے والا بھی کوئی نہیں۔ بڑا آدمی مر جائے، چاہے ڈاکے میں مر جائے، چاہے قاتل ہونے کی وجہ سے پھانسی چڑھ جائے یا زنا میں مر جائے تو اس کے لیے ہزاروں آدمی جنازے پر آئے ہوئے ہیں۔

یہ جو ہم نے رواج بنائے ہوئے ہیں کہ اچھا اب قبرستان میں چھولے لے کر آؤ، ان گندم لے کر آؤ، اب مٹھائیاں لے کر آؤ، وہاں تقسیم کریں گے اور وہاں پتاشے لے کر آؤ، وہاں ڈالیں گے، یہ ساری بدعات ہیں۔ باقی آپ دعا کریں، آپ خیرات کریں، روزانہ اپنے گھر میں خیرات کرو۔ تمہارے والدین فوت ہوگئے، ان کے لیے مسجد بنا دو، ان کے لیے کوئی مدرسہ بنا دو، ان کے لیے کوئی یتیم خانہ کھول دو اور ان کے لیے کوئی پانی کے مستقل کنویں لگوا دو کہ جب تک وہ مسجدیں، مدرسے اور کنویں چلتے رہیں گے تو اس وقت تک تیرے باپ دادا کو ثواب

پہنچتا رہے گا۔ خیرات سے کوئی منع نہیں کرتا۔

افضل الایام کون سا دن ہے؟

جتنی اُمتیں گزری ہیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک دن مقرر فرمایا۔ جیسے یہودیوں کے لیے ''یوم السبت'' یعنی ہفتہ کا دن تھا، عیسائیوں کے لیے ''یوم الأحد'' یعنی اتوار کا دن تھا اور اللہ تعالیٰ نے اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لیے ''یوم الجمعة'' کا دن مقرر فرمایا۔ اسی طرح حضور ﷺ نے ایک حدیث مبارک میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جمعہ کا دن خاص طور پر اللہ نے میری اُمت کے لیے محفوظ کر کے رکھ دیا تھا۔ یہودیوں نے ''سبت'' کو اختیار کیا تو ان کو ''سبت'' کی تعظیم کا حکم دیا گیا اور نصاریٰ نے ''یوم الأحد'' کو اختیار کیا تو انہیں اس دن کی تعظیم کا حکم دیا گیا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک ایسا دن جو ''أفضل الأیام'' ہے، اس کو اُمتِ محمدیہ ﷺ کے لیے باقی رکھا۔

جمعہ کے دن کی فضیلت:

اور اسی طرح احادیث مبارکہ میں آتا ہے: ''سَيِّدُ الْأَيَّامِ يَوْمُ الْجُمُعَةِ، فِيهِ خُلِقَ آدَمُ، وَفِيهِ أُدْخِلَ الْجَنَّةَ''[1] اللہ تبارک وتعالیٰ نے جمعہ کے دن ہی حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور جمعہ کے دن کی آخری چند گھڑیاں جب باقی تھیں تو اس وقت حضرت آدم علیہ السلام میں رُوح پھونکی گئی اور وہ زندہ ہو گئے اور مکمل انسان بنے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کو جنت میں داخلے کا حکم اسی جمعہ کے دن ملا اور اسی طرح آسمان سے دنیا کی طرف اُترنے کا حکم بھی جمعہ کے دن ہوا۔ اور اسی طرح فرمایا گیا کہ قیامت جب قائم ہوگی تو وہ بھی جمعہ کا دن ہوگا۔

اس لئے اس دن کے بڑے فضائل وخصائل ہیں۔ چونکہ سب سے افضل اُمت حضور ﷺ کی اُمت تھی، اس اُمت کو کعبہ بھی اللہ نے افضل عطا فرمایا، کتاب بھی افضل عطا فرمائی، شریعت بھی افضل عطا فرمائی، نبی اور رسول بھی افضل عطا فرمایا اور چھٹی کا دن بھی سب سے افضل عطا فرمایا۔

سزا ایسی کہ ظاہراً بندر اور باطناً انسان:

تو اب یہودیوں نے ''سبت'' کے دن شکار کرنے کے لیے حیلہ نکالا کہ بعض لوگ کنڈیاں اور رسیاں ڈال دیتے کہ مچھلیاں تو ان میں پھنس جائیں، لیکن ہفتے کو نہیں پکڑیں گے، بلکہ جب رات ہو جائے گی تو جا کر پکڑ لیں گے۔

[1] [شعب الایمان، حدیث: ۲۷۱۰]

پھر وہ مچھلی پکاتے تو خوشبو دور تک جاتی، اردگرد کے لوگ پوچھتے کہ آپ نے مچھلی کہاں سے لی؟ وہ ان کو بتاتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ بات اتنی پھیلی کہ ممانعت کے دن مچھلی بازاروں میں فروخت ہونے لگی۔

اللہ نے ان کو سزا بھی ایسی دی کہ شکل تو بندر کی تھی، لیکن وہ حقیقتاً تو بندر نہیں بنے تھے۔ چونکہ انہوں نے بھی تو اسی طرح اللہ کے حکم کو توڑا تھا کہ بظاہر وہ یہ کر رہے تھے کہ ہم تو خدا کے حکم کو نہیں توڑنا چاہتے، ہمیں تو اللہ نے منع فرمایا ہے کہ ''سبت'' کے دن میں شکار نہ کرو، ہم تو اتوار کی رات میں شکار کرتے ہیں، ''سبت'' کو شکار نہیں کرتے، ہم اللہ کے حکم کو مان رہے ہیں۔ تو اللہ نے ان کو سزا بھی یہی دی کہ ظاہری طور پر بندر بنا دیا اور باطنی طور پر انسان رہے۔ اس لیے ان کی شکلیں تبدیل ہو گئیں۔

اب بعض لوگ ...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ!...... مستشرقین اور خاص طور پر یہودی لابیاں جتنی ہیں یا جتنی نصرانی لابیاں ہیں اور ان کے پروردہ لوگ قرآن کی آیات میں اشتباہات پیدا کرتے ہیں کہ دیکھو! یہ کہتے ہیں کہ ان کو کہا: بندر بن جاؤ تو وہ بندر بن گئے۔ یہ کیسے ہے؟ یہ تو ایسے ہے جیسے بس کسی کو ڈانٹ دیا جائے کہ تم تو بندر ہو۔ جیسے کوئی آدمی اپنے شاگرد کو کہتا ہے کہ تمہیں اتنا عرصہ ہو گیا ہے، تم انسان نہیں بنے، تم گدھے کے گدھے رہ گئے ہو۔ تو وہ کہتے ہیں کہ یہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ وہ گدھا ہو، حالانکہ وہ انسان کی حقیقت میں ہوتا ہے، لیکن اس کے اعمال گدھوں کے مشابہ ہو جاتے ہیں، اس لیے اس کو کہہ دیا جاتا ہے کہ اتنا عرصہ ہم نے تمہیں انسان بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن تم اسی طرح گدھے کے گدھے ہی رہے۔ جیسے عام طور پر آدمی محاورات میں کہتا ہے کہ اتنا بڑا اونٹ جتنا قد نکال لیا ہے، لیکن ابھی تمہیں پیشاب کرنے کا طریقہ بھی نہیں آتا ہے۔ تو انہوں نے کہا یہ محاوراتی باتیں ہیں، کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مگر اللہ کے ہاں کیا مشکل ہے۔

اس سے بعض لوگ جنہوں نے قرآن کے ترجمے لکھے ہیں اور تفسیریں لکھی ہیں، اس میں وہ بھی بے چارے دھوکہ کھا گئے ہیں کہ طور پہاڑ کو ان پر حقیقتاً کھڑا نہیں کیا گیا تھا، بلکہ گویا ایسا سماں بنا دیا گیا کہ وہ یہ سمجھیں کہ طور اوپر آ پڑے گا، لیکن حقیقتاً وہ پہاڑ نہیں کھڑا کیا گیا تھا۔

یہ سب جہالت کے کرشمے ہیں، اللہ کے قرآن وحدیث کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ وگرنہ وہاں بھی جب ''رَفَعَ'' کا صلہ ''اِلیٰ'' آ جائے تو حقیقی رفع مراد ہوتا ہے، مثالی یا مجازی رفع مراد نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد

باری تعالیٰ ہے:﴿اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ ؕ وَالَّذِیْنَ یَمْكُرُوْنَ السَّیِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَمَكْرُ اُولٰٓىِٕكَ هُوَ یَبُوْرُ﴾[فاطر:۱۰] اور اسی طرح فرمایا:﴿وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا﴾[النساء:۱۵۷،۱۵۸] اور اسی طرح اللہ پاک نے واضح فرمادیا:﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ﴾ اور پھر جب رفع بھی معلوم ہوا اور نزول بھی معلوم ہو تو پھر نزول کے مقابلہ پر جب رفع ہو تو وہاں رفع حقیقی مراد ہوتا ہے، یعنی جب آقائے نامدار، خاتم الانبیاء ﷺ نے فرمادیا کہ عیسیٰ علیہ السلام دمشق شہر کی جامع مسجد کے مشرقی منار پر اُتریں گے تو نزول تب ہوگا جب صعود ہو، رفع ہو، جب رفع ہی نہ ہو تو نزول کا کوئی معنی ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یہ پہاڑ بھی بنواسرائیل کے سروں پر حقیقتاً کھڑا کیا گیا اور ان کو حقیقتاً بندر بنادیا گیا اور پھر وہ تین دن تک زندہ رہے اور اس کے بعد مرگئے۔

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نزدیک انسان کی حیثیتیں:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کا واقعہ لکھا ہے کہ (چونکہ حضور ﷺ کی اُمت پر مسخ اور خسف کا مجموعی عذاب نہیں آئے گا، معنوی طور پر مسخ موجود ہے) بعض لوگ بظاہر انسان ہیں، لیکن اندر سے وہ بندر ہیں۔ بظاہر انسان ہیں، لیکن اندر سے وہ ریچھ ہیں۔ بظاہر انسان ہیں، لیکن اندر سے درندے بن چکے ہیں۔ مسخ معنوی کی شکلیں موجود ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ جس کو چاہتے ہیں، اس کو اس بندے کی اصلیت دکھا بھی دیتے ہیں۔

بچی کو زندہ درگور کرنے کا واقعہ:

ایک دفعہ خاتم الانبیاء ﷺ نے ایک صحابی سے حال پوچھا تو انہوں نے کہا کہ حضور! ہم آپ کو کیا حالات سنائیں، زمانہ کفر میں یہ عالم تھا کہ ہم اپنی بچیوں کو زندہ درگور کردیتے تھے۔ میں اپنی بچی کو جب دفن کرنے کے لیے لے گیا اور میں اس کے لیے جب گڑھا کھود رہا تھا اور لڑکی کو کنارہ پر بٹھایا ہوا تھا، اس غریب کو تو پتہ نہیں تھا کہ یہ مجھے دفن کرے گا یا پتہ تھا، مگر ڈر کے مارے سہمی ہوئی تھی۔ حضور! جب میں وہ مٹی کدال سے نکال رہا تھا، مٹی میرے منہ پر پڑی تو بچی نے اپنی دوپٹے سے میرا چہرہ صاف کیا کہ میرے باپ کے منہ پر مٹی نہ پڑے۔ حضور ﷺ رو پڑے اور فرمایا: پھر بھی تجھے رحم نہیں آیا؟ اس پر بھی تجھے اپنی بیٹی پر رحم نہیں آیا اور تم نے اس کو زندہ دفن کردیا؟ میرے قریب سے اُٹھ جاؤ۔

سخت دل کو نرم کرنے کا طریقہ:

اسی طرح ایک صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ حضور! مجھے اپنے بچوں پر پیار ہی نہیں آتا کہ میں اپنے بچوں سے پیار کروں۔ ہر وقت ان کو ڈانٹتا رہتا ہوں، لیکن ان سے محبت نہیں کر سکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا! تمہارا دل اتنا پتھر ہو چکا ہے۔ تو آپ ﷺ نے علاج بتا دیا کہ یتیم بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو، اللہ تعالیٰ تیرے دل کو نرم کر دیں گے۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۵۰۰۱، بابُ: الشَّفَقَةِ وَالرَّحْمَةِ...]

اسی طرح آج کل جو ہمارا نیا معاشرہ ہے، جسے لوگ آج کل مہذب معاشرہ اور ترقی یافتہ معاشرہ کہتے ہیں کہ جس میں ایک انسان کی بیوی دوسرے آدمی کے پاس جا رہی ہے اور اس کی بیوی اس کے ساتھ جا رہی ہے اور بعض کے کلب ہیں جہاں (گاڑیوں) کی چابیاں ڈبوں میں ڈال دیتے ہیں اور اندھیرے میں اس کو ہلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چابی اٹھا لو۔ جس کی چابی جس کے ہاتھ میں آگئی تو وہ اس آدمی کی گاڑی اور اس کی بیوی لے کر چلا جائے گا۔ کیا یہ کسی انسان سے متصور ہو سکتا ہے کہ اپنے سامنے دوسرے کی بیوی کو لے آئے اور اس کی بیوی دوسرا لے جائے اور دوسرے کی بیوی یہ لے جائے؟

﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۶۶﴾ [البقرۃ:۶۶]

پھر ہم نے اس واقعہ کو ان لوگوں کے لیے جو وہاں تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے، عبرت، اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت بنا دیا۔

یہاں مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ "وَ تَحَيَّلُوْا" (انہوں نے حیلہ کیا)۔ حیلہ کے مسئلے میں لوگ بطور خاص امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کی فقہ پر چلنے والوں کو زیادہ مورد طعن قرار دیتے ہیں کہ یہ لوگ حیلے کرتے ہیں، وہ لوگ اکثر مسائل میں حیلے سے کام لیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک حیلہ ہوتا ہے کہ اللہ کے قانون کو توڑا جائے۔ یہ حیلہ قرآن کے بھی خلاف ہے، سنت کے بھی خلاف ہے، اللہ کے رسول کے فرمان کے خلاف بھی ہے، جیسا کہ بنو اسرائیل نے خدا کے قانون کو توڑنے کے لیے حیلہ کیا۔ اب ایسا حیلہ کرنا ہی تمام ائمہ محدثین، فقہاء اور امام

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حرام ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ حیلہ کرتے ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا حیلہ:

حضرت ایوب علیہ السلام جب بیمار تھے اور آپ کو تکلیف تھی تو ان کی بیوی کو راستے میں ایک بزرگ کی شکل میں شیطان ملا (شیطان بھی بڑی بڑی شکلیں بنالیتا ہے، خیال کیا کرو) اور سلام کیا کہ بیٹی! کیا حال ہے؟ کیوں پریشان ہے؟ اس نے کہا: حضرت ایوب علیہ السلام کو تکلیف ہے اور میں محنت مزدوری کر کے اتنی روٹی لے جاتی ہوں کہ جس سے میاں بیوی کا گزارا ہوجائے، یا ہم بادشاہ تھے تو آج ہمیں مزدوری کر کے روٹی کھانی پڑتی ہے، اس لئے پریشان ہیں۔

شیطان نے کہا کہ کوئی مسئلہ ہی نہیں، آپ تو ایسے پریشان ہیں، آپ ہم اللہ والوں کے دروازے پر آتی نہیں ہیں۔ اس نے کہا کہ کیا کریں؟ شیطان نے کہا: حارث کے نام کی منت مان لو کہ میرے خاوند کو شفاء ہوجائے، وہ ٹھیک ہوجائے تو میں حارث کے نام پر اتنی منت مانوں گی۔ جیسے آپ نذر نیاز حسین مانتے ہیں تو بیوی صاحبہ نے کہا کہ ہم منت کس بات کی مان لیں؟ ہمارے گھر میں روٹی کھانے کو نہیں ہے اور تم کہتے ہو کہ منت مان لو؟ شیطان نے کہا کہ یہ بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں، اللہ والوں کو تو پیسوں کی ضرورت نہیں ہوتی، ان کو تو تمہاری محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ منت مان لو، چاہے کوئی چھوٹی سی چیز ہو، ایک گندم کا دانہ، اور نہ ملے تو ایک مکھی پکڑ کر اس کے نام کی مار ڈالو۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ والوں کو تو تم پر مہربانی کرنے کا ایک بہانہ چاہیے۔

بی بی صاحبہ بڑی خوش ہوگئیں۔ واپس آ کر حضرت ایوب علیہ السلام کو بتلایا کہ آج مجھے ایک بزرگ مل گئے تھے، انہوں نے کہا کہ حارث کی منت مان لو۔ حضرت ایوب علیہ السلام جلال میں آگئے...... وہ تو سمجھ گئے، کیونکہ آخر نبی تھے...... انہوں نے کہا: جانتی ہو کہ حارث کس کا نام ہے؟ بی بی صاحبہ نے کہا: نہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا: وہ شیطان بدبخت تھا، جو ہمیں اللہ کا نام چھوڑ کر غیر اللہ کی منت ماننے کو کہہ رہا تھا، اور تم نے نبی کی بیوی ہو کر ایسی بات کی ہے۔ مجھے خدا کی قسم ہے! اگر اللہ نے مجھے شفا دی تو میں سو کوڑے تمہاری پیٹھ پر ماروں گا کہ تم نبی کے گھر میں آ کر غیروں کی منت کے مشورے دیتی ہو!؟ میں اللہ کا نبی ہوں اور میری بیوی کہتی ہے کہ غیر کی منت مان لو اور وہ بھی شیطان کی منت مان لوں۔ اب بیوی ڈری، اس نے کہا کہ مجھے کیا پتہ کہ وہ کون تھا، میں نے تو اس کی شکل دیکھ کر

دھوکہ کھایا ہے۔ اب حضرت ایوب علیہ السلام نے بھی تو قسم کھالی کہ واللہ! مجھے اللہ کی قسم ہے کہ تیری پشت پر سو کوڑے ماروں گا۔

اب اس کے بعد حضرت ایوب علیہ السلام نے اللہ کے آگے فریاد کی تو اللہ کے حکم سے آپ کو شفاء ہوگئی، اولاد واپس مل گئی، ملک واپس مل گیا، تخت واپس مل گیا اور آپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم نے میرے ساتھ بڑی وفا کی ہے، لیکن میں اللہ کا نبی ہوں، اللہ کی قسم نہیں توڑ سکتا، تمہاری پشت پر کوڑے مارنے ہیں...... آگے بھی تو حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی تھی۔ اگر آپ کی اور ہماری بیوی ہوتی تو پہلے شوہر کی کمر پر کوڑے ماردیتی ان شاء اللہ۔ اگر اس کو کوڑے نہ ملتے تو چپل تو ہیں، خاوند کو سیدھا کر دیتی ہیں، اس لئے آپ نے دیکھا ہے کہ بڑی بڑی ایڑی رکھتی ہیں...... بہر حال وہ تو نبی کی بیوی تھی، اس نے کہا: ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' اگر اللہ کے نبی کی بات پوری ہوتی ہے تو میری پشت حاضر ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام تیار ہوئے تو اللہ نے حکم اُتار دیا: ﴿وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ۭ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ؀﴾ [ص:۴۴] اے میرے نبی! تمہاری قسم بھی ٹھیک ہے، تم بھی نہیں توڑ سکتے، لیکن تمہاری بیوی بھی میری بڑی عابدہ بندی ہے، جس نے ساری زندگی تیری خدمت میں گزار دی، اس کی پشت پر کوڑے ہم بھی برداشت نہیں کرتے۔ آپ ایسا کریں کہ کھجور کا گوشہ منگوالیں، جس پر سو لکڑی ہوں۔ آپ اس کو ایک دفعہ ماریں تو قسم پوری ہوگئی۔ تم اپنی قسم میں حانث نہیں ہوگے اور مسئلہ حل ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام نے کھجور کا ایک خوشہ منگوایا جس میں سو لکڑیاں تھیں، اس کو ایک دفعہ مار لیا تو قسم پوری ہوگی۔

اب یہ حیلہ ہے، یہ کس نے سکھلایا ہے؟ اللہ نے سکھلایا ہے کہ کہاں سو کوڑے اور کہاں خوشے کی سو لکڑیاں، لیکن سو کا عدد پورا ہوگیا تو بات ختم ہوگئی۔ اللہ نے اپنے نبی کی قسم بھی پوری کر دی اور اس صابرہ بیوی کو بچالیا۔ یہ حیلہ ہے، لیکن یہ اسلام پر عمل کرنے کے لئے ہے، اللہ کے فرمان کو توڑنے کے لیے نہیں ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ:

اسی طرح قرآن پاک میں دیکھیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا کاسہ زبردستی اپنے بھائیوں کی گندم میں چھپا دیا اور جب بھائی جانے لگے تو کہا کہ ٹھہر جاؤ قافلے والو! تمہارے پاس ہماری چوری ہے۔ انہوں نے کہا: ﴿وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ﴾ (ہم چور نہیں ہیں)۔ انہوں نے کہا کہ زیادہ بات نہ کرو، ہم تمہاری تلاشی لیں گے۔ اگر ہمارے بادشاہ کا

پیانہ تمہارے پاس ملے تو تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا کہ اگر ہمارے مل میں وہ مل جائے اور جس کے مال میں وہ تمہیں ملے، وہ تمہارا نوکر رہے گا۔ ہماری شریعت میں یہی حکم ہے۔

اب جب تلاشی لی گئی تو بنیامین کی بوری سے وہ پیالہ نکل آیا۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو! یہ پیالہ نکل آیا ہے۔ انہوں نے کہا: اب بنیامین کو لے جاتے ہیں، کیونکہ تمہارا فیصلہ ہے کہ جس کے مال سے برتن نکلے گا، وہ آدمی یہاں رہے گا۔ اللہ نے خود قرآن میں فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۭ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ [یوسف:۷۶] ہم نے یوسف کو خود یہ ترکیب سمجھائی کہ بھائی کو روکنے کے لیے ایسا کرو، تاکہ دوسروں کو یہ محسوس نہ ہو کہ بادشاہ نے زبردستی بھائی چھین لیا ہے، کیونکہ یوسف علیہ السلام بھی بادشاہ تھے، بھائی کو زبردستی ان سے لے سکتے تھے اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام خود بھی مظلوم تھے اور ان کے بھائی بھی مظلوم تھے۔ ان لوگوں نے انہیں کنویں میں ڈالا تھا، وہ زبردستی کر سکتے تھے، لیکن کہا کہ بات بھی رہ جائے اور بھائی بھی بھائی کو مل جائے۔ تو اللہ نے فرمایا: یہ طریقے ہم نے خود سکھلائے، یہ راستے ہم نے سے خود سکھلا دیئے۔

تو اس لیے یاد رکھیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہوں یا بعض ائمہ کرام جو حیلہ کے جواز کے قائل ہیں، اس سے مراد وہ حیلے ہیں جو اسلام کے قانون کو توڑنے کا ذریعہ نہ بنیں۔

آج رات جنت میں سوؤں تو طلاق:

کتابوں میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے بیٹھے بیٹھے قسم کھالی کہ اگر آج رات میں جنت میں نہ سوؤں تو میری بیوی کو طلاقیں ہیں...... بعض ایسے بے وقوف ہوتے ہیں کہ غصہ کسی پر آجائے، لیکن طلاق بیوی کو دے دیتے ہیں، باہر لڑائی ہو جائے تو باہر سے گرم ہو کر آئیں تو وہ ساری گرمی بیوی پر نکال دیتے ہیں...... جب اس آدمی کو تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا اور غصہ ختم ہوا تو اس نے کہا کہ عجیب بات ہے، میں کیسے جنت میں سو جاؤں گا؟ اب بیوی بھی گئی اور جنت بھی گئی۔ اب تو دونوں جنتیں گئیں۔ تو اب مولویوں کے پاس بھاگو۔ مشکل وقت میں بے چارے مولوی یاد آتے ہیں، مثلاً حلال، حرام میں پھنس جائیں، کوئی بندہ مر جائے، کوئی پیدا ہو جائے، پھر یہ غریب کام آتے ہیں۔

بہرصورت جب اس بندے کے دماغ میں طلاق کا خوف سمایا تو اب وہ مولوی کے پاس بھاگا۔ یہ لوگ بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں کہ حضرت! جب میں نے طلاق دی تو میں بڑے غصے میں تھا، مجھے بڑا جوش تھا۔ وہ سمجھتے ہیں

کہ اس طرح میں طلاق سے بچ جاؤں گا۔ بھلا شریف آدمی! کوئی پیار میں بھی طلاق دیتا ہے؟ طلاق جب بھی کوئی دے گا تو وہ غصہ میں ہی دے گا۔ محبت میں بھی کسی نے طلاق دی ہے؟ یہ کون سی بات ہوئی کہ تم غصہ میں تھے تو طلاق نہیں ہوئی؟

حضور ﷺ نے فرمایا:

((ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ، وَ هَزْلُهُنَّ جِدٌّ: النِّكَاحُ، وَ الطَّلَاقُ، وَ الرَّجْعَةُ.))

''تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی حقیقت بھی حقیقت ہے اور مذاق بھی حقیقت ہے: نکاح، طلاق اور رجوع۔''

[جامع ترمذی، حدیث: ۱۱۸۴، باب: مَا جَاءَ فِي الْجِدِّ وَالْهَزْلِ...]

مذاق میں نکاح کر لینا، مذاق میں طلاق دے دینا، مذاق میں طلاق رجعی کے بعد رجوع کر لینا۔ یعنی اگر کوئی ہنسی خوشی سے ایسے کہہ دے کہ آج تو میرا مذاق کرنے کا موڈ ہو رہا ہے کہ بیوی کو طلاق دیتا ہوں تو وہ شرعی طور پر طلاق ہو جاتی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں: میں نے ایک عورت کو، ایجاب وقبول کے کلمے میں تیرے لئے حلال کر کے تیری بیوی بنا دیا ہے، تم ایسے کلمے استعمال کر کے اس کی عزت سے کھیلنا چاہتے ہو؟ اب اگر تم کھیل بھی رہے ہو تو وہ حقیقت ہے، تمہیں سزا ملنی چاہئے، اس لیے وہ طلاق ہو گئی، تاکہ آئندہ تیری زبان پر ایسے الفاظ کبھی نہ آئیں۔ تم ایک انسان کی زندگی سے کھیلتے ہو جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کر دیا ہے۔ مذاق کے اور بھی تو طریقے ہو سکتے ہیں، گالی دے دو، اس کو علیحدہ کمرے میں بٹھا دو، ماں باپ کے گھر بھیج دو۔ یہ تو نہیں ہے کہ تمہارے منہ سے ہر وقت طلاق کے سوا کوئی لفظ بھی نہ نکلے۔ نمک زیادہ تو طلاق، وقت پر کپڑے نہیں دھوئے تو طلاق، صبح کو ایک طلاق، شام کو ایک طلاق کہ مہینے میں اوسطاً ایک ہزار طلاق ہو جائے۔ یہ کوئی انسان کا کام ہے۔

اب بہر حال وہ آدمی ایک مولوی صاحب کے پاس پہنچے کہ میرے منہ سے یہ بات نکل گئی تو اب میں کیا کروں؟ انہوں نے کہا کہ ایک راستہ ہے کہ اگر آج تم کسی طرح مدینہ منورہ پہنچ جاؤ اور وہاں جا کر حضور ﷺ کے روضہ مبارک سے لے کر منبر تک کا جو ٹکڑا ہے، وہاں ایک منٹ کے لیے لیٹ جاؤ تو کوئی طلاق نہیں ہوگی۔ کیونکہ تمہاری قسم پوری ہو گئی کہ تم جنت میں لیٹ گئے، چونکہ وہ بھی جنت ہے۔ حضور ﷺ نے خود فرمایا: ''مَا بَيْنَ بَيْتِي وَ مِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ''[1] میرے گھر سے لے کر منبر تک کا ٹکڑا جنت کا ٹکڑا ہے۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب!

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۱۱۹۵، باب فَضْلِ مَا بَيْنَ الْقَبْرِ وَالْمِنْبَرِ]

بات تو تمہاری ٹھیک ہے، لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب میں مدینے پہنچ جاؤں۔ تو آج رات کیسے پہنچ جاؤں؟ مولوی صاحب نے کہا کہ پھر اور کوئی حل نہیں ہے۔

وہ آدمی حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی خدمت میں بھاگتا ہوا آیا اور اپنی مشکل سامنے رکھی کہ حضرت! میں نے ایسے کہہ دیا ہے تو اس کا کوئی حل ہے؟ حضرت امام صاحب نے فرمایا: تمہارے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس نے کہا کہ باپ تو مر گیا ہے، لیکن بوڑھی ماں زندہ ہے۔ فرمایا: اس کے قدموں میں جا کر لیٹ جاؤ تو تمہاری قسم پوری ہو گئی، کیونکہ یہ بھی اللہ نے فرمایا ہے کہ جنت ماں باپ کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے تو تم جنت میں لیٹ گئے۔

یہ وہ حیلے ہوتے ہیں کہ اس سے بیوی بھی بچ گئی اور شریعت کے خلاف بھی نہ ہوا۔ یہ وہ حیلے ہیں جو انسان کو اسلام پر قائم رکھیں، اسلام سے نکالیں نہیں۔ اس کو راستہ دے دو، ایسا نہ ہو کہ وہ بے چارا اسلام سے نکل جائے۔ ان کو شریعت نے جائز رکھا ہے جو حیلے اسلام کے قانون کو توڑنے کا ذریعہ بنیں، وہ سب کے نزدیک حرام ہیں۔ قرآن وسنت پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اور مجھے بھی توفیق دے۔

بندر بننے والوں کے واقعہ کی تفصیل:

جن لوگوں نے "سبت" (ہفتہ) کے دن تجاوز کیا اور اللہ کی حدود سے نکل گئے اور اللہ تعالیٰ فرمانبرداری کے بجائے مخالفت کی۔ جیسے اس واقعہ کا اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں بھی ذکر فرمایا ہے، لیکن یہاں اجمال ہے اور سورۃ الاعراف کے اندر یہ مفصل واقعہ موجود ہے۔

﴿وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ [الاعراف: ۱۶۳]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پیر:

ایک دفعہ میرے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پیر لگا ہوا ہے۔ بھائی! کہاں لگا ہوا ہے؟ اس نے کہا: حرم شریف کے اندر ایک جگہ ہے، آپ چوری چوری آئیں، میں آپ کو دکھاؤں گا۔ کسی کو پتہ نہ لگے۔ میں نے اس کو کہا: پہلے یہ بتلاؤ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیر کو تم کیسے پہچانتے ہو؟ کیا تم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا تھا؟ اس نے کہا: نہیں دیکھا۔ میں نے پوچھا: کیا اس جگہ لکھا ہوا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پیر ہے؟ کہتا ہے کہ لکھا ہوا بھی

نہیں ہے۔ میں نے کہا: تم کہتے ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پیر (پاؤں) ہے اور کوئی کہہ دے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پیر ہے اور تیسرا آدمی کہہ دے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پیر ہے اور چوتھا آدمی کہہ دے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پیر ہے تو پھر کیسے ثابت کریں گے کہ کس کا پیر ہے؟ جس کی جس سے محبت ہے، وہ اسی کا نام لے لے۔ کوئی دلیل ہے؟ کہنے لگا: دلیل تو کوئی نہیں، لیکن بس مولا علی کا پاؤں ہے۔

اب اس کا کوئی علاج تو نہیں ہے۔ خیر وہاں گئے تو کوئی پاؤں نہیں، وہ ایک سنگ مرمر کا پتھر ہوتا ہے، اس کے اندر بعض چیزیں قابل غور ہوتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ دریا بہہ رہا ہے اور بعض جگہ معلوم ہوتا ہے کہ درخت بنا ہوا ہے۔ یہ تو قدرتی طور پر اس کے اندر ہوتا ہے تو ایسا نشان تھا تو اس نے کہہ دیا کہ بس پاؤں ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے تمہاری ایک بات مان لی کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پاؤں ہے، ٹھیک ہے، تم سچے ہو بس۔ اب میں نے کہا کہ ذرا اس کی پیمائش کرو کہ یہ کتنا لمبا ہے؟ کہنے لگا: کس لیے؟ میں نے کہا: پاؤں بتاؤ تو قد خود بخود نکل آئے گا۔ یہ تو سولہ انچ سے بھی لمبا ہے، تم کوئی ڈھیلے مولوی کے پاس تو نہیں گئے تھے کہ وہ دیکھتے ہوئے ڈر جاتا ہے، مان جاتا ہے۔ میں تو اللہ کو ماننے والا آدمی ہوں، پتھروں کو ماننے والا آدمی نہیں ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قد مبارک کتنا تھا؟ کیونکہ اگر آدمی کا قد پانچ فٹ اور پانچ انچ ہو تو اس کا پاؤں زیادہ سے زیادہ کتنا لمبا ہو سکتا ہے؟ عقل کی بات کرو کہ یا تو مجھے عقل سے سمجھاؤ یا کسی دلیل سے سمجھاؤ یا مجھے وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لکھا ہوا دکھاؤ۔ کہنے لگا کہ بس میں نے اندازۃً کہہ دیا۔ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو نہیں دیکھا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قد کتنا لمبا تھا۔ میں نے کہا: پھر تو نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پاؤں کیسے دیکھ لیا؟ جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تم نے دیکھا بھی نہیں تھا اور تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کس عمر میں مکہ چھوڑ گئے تھے؟ کہنے لگا: کوئی پتہ نہیں ہے، ویسے میرے خیال میں دس بارہ سال کی عمر میں چھوڑ کر گئے تھے۔ میں نے پوچھا: دس بارہ سال کے بچے کا پاؤں کتنا ہوتا ہے؟ اور حج پر بھی میں نے اسے کہا: مجھے ایک اور بات بتلاؤ کہ یہ جس پتھر پر پاؤں آ گیا ہے، آپ کو پتہ ہے کہ یہ موجودہ زمانے کے پتھر ہیں؟ یہ تو کوئی اصلی پتھر ہے نہیں، یہ تو آرٹیفیشل ہے، اس میں کاربن ڈالا ہی نہیں گیا، وائٹ رکھا گیا ہے، تا کہ ٹھنڈا رہے۔ یہ تو بتایا گیا ہے کہ حقیقی پتھر نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے زمانے میں ابھی بنا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو چودہ سو سال گزر گئے ہیں تو اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پاؤں کیسے آ گیا ہے؟

اب وہ ٹھنڈا ہو گیا اور کہنے لگا کہ بات تو ٹھیک ہے۔ میں نے کہا: تم لوگ اسی طرح عقیدوں کو برباد کر دیتے ہو،

کوئی نئی چیز نظر آ گئی تو دھوکے میں آ جاتے ہو۔ کسی نے کہا: پتھر میں تصویر ہے اور کسی نے کہا کہ چاند میں تصویر ہے اور کسی نے کہا: سورج میں تصویر ہے، کسی نے کہا کہ دیوار میں تصویر ہے اور کسی نے کہا: رات ایک بزرگ میرے گھر میں آئے تھے۔

یہ ایسے خیالات ہوتے ہیں جن خیالات میں آدمی سوتا ہے کبھی وہی خیالات متشکل ہو جاتے ہیں، وہی چیزیں ہمیں خواب میں نظر آ جاتی ہیں، بعض چیزیں ہمارے لاشعور میں محفوظ ہوتی ہیں، جب ہم ان کو دہراتے ہیں تو وہ لاشعور سے نکل کر شعور میں آ جاتی ہیں اور لوگ پھر ان سے غلط قسم کے اعتقادات بنانے شروع کر دیتے ہیں۔

اصحابِ کہف کا غار:

حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک جماعت جب جہاد کرتے کرتے اصحاب کہف کے علاقے میں پہنچ گئی تو حضرت معاویہ کے دل میں بھی خیال آیا اور انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تیاری کریں اور اس غار کو ڈھونڈیں، کہیں وہ غار انہی پہاڑوں میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا: اے امیر! ایسا نہ کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب اپنے پاک پیغمبر کو خبر دی ہے کہ اگر تم اس غار تک پہنچ جاؤ گے اور تم دیکھو گے تو تمہارا دل خوف اور رعب سے بھر جائے گا تو پھر اس کو کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟ اس لیے اس کو بلاوجہ ڈھونڈنے کی ضرورت کیا ہے؟ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کے بندے! یہ تو اس زمانے کا واقعہ نقل فرمایا ہے کہ اگر کوئی ان کو اس زمانے میں دیکھتا تو اس کے دلوں میں خوف اور رعب ڈال دیا جاتا، تاکہ کوئی اندر جا کر ان کو نقصان نہ پہنچائے۔ اب تو وہ زمانہ بھی گزر گیا اور وقت بھی گزر گیا اور اس وقت تو وہ سو رہے تھے، اب تو ان پر حقیقی موت آ گئی ہے تو ہمیں دیکھنے میں کیا حرج ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ جس چیز کو اللہ نے پردہ دیا ہے تو اس کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بہر حال صحابہ کو شوق تھا، صحابہ چلے گئے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک غار کے قریب گئے۔ وہاں جا کر ذہنی طور پر کچھ خیال گزرا کہ یہی غار ہے۔ جب اس غار کے قریب پہنچے تو ایک ایسی اندھیری اور طوفان آیا کہ ان سب کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں تو وہ جلدی جلدی اس پہاڑ سے بھی نیچے آ گئے اور اتنے ڈر گئے کہ کافی دیر تک ان پر خوف مسلط رہا۔ انہوں نے آ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ ہمارے ساتھ تو یہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت ابن

عباس نے صحیح کہا تھا کہ ہم کو نہیں ڈھونڈنا چاہیے تھا۔ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے پردے میں رکھا ہے تو ہم بلا وجہ اس کو کیوں ڈھونڈیں؟

﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ [البقرة:٦٥]

اللہ نے ان کو حکم دیا کہ بندر ذلیل وخوار ہو کر بن جاؤ۔

مسخ کا معنیٰ:

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مسخ کر ڈالا تھا اور صورتاً وہ بندر نہیں بنائے گئے، بلکہ ان کے دلوں کی یہ کیفیت ہوگئی جیسے حیوانوں کے دل اور خیالات ہوتے ہیں۔ تو حضرت مجاہد رحمہ اللہ مسخ معنوی کے قائل تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا...... الآية﴾ [الجمعة:٥] کہ جن لوگوں کو ہم نے تورات کا علم دیا تھا، انہوں نے اس علم پر عمل نہیں کیا تو ان کی مثال ایسے ہے جیسے گدھا ہوتا ہے۔

(حدیث) اور دوسری نشانی ہے کہ میرے پاک نبی نے فرمایا: "مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللَّهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" جب عالم علم حاصل کرے اور اس پر عمل کرے تو اللہ اس کو ایسا علم دیتے ہیں کہ وہ جانتا بھی نہیں۔ یعنی اپنے علم پر عمل کرنے سے اللہ اس کے سینے کو کھول دیتے ہیں، اللہ اس کو انشراحِ صدر عطا فرماتے ہیں، اللہ اس کو قرآن وحدیث کی ایسی فہم عطا فرما دیتے ہیں کہ عام آدمی اس بات کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔

اسی طرح دیکھیں کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے سورۃ البقرۃ ۱۲ سال میں پڑھی ہے۔ حالانکہ وہ عرب تھے، ان کے لئے پڑھنا کون سا مشکل تھا؟ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کے ایک ایک حرف پر عمل کیا ہے، ایسا نہیں کہ زبان سے پڑھی اور چلے گئے۔

[تفسیر القرطبي: ١٥٢/١، سورة البقرة، تحت: الكَلَامُ فِي نُزُولِهَا وَفَضْلِهَا...]

جیسا کہ ایک مثال مشہور ہے کہ ایک مولوی صاحب کتاب پڑھ رہے تھے تو ایک داڑھی والے بزرگ آئے تو پڑھانے والے ڈر گئے کہ یہ کوئی بڑا عالم آگیا ہے۔ درس بند کیا اور طالبوں سے کہا کہ حضرت کے لئے پانی لاؤ، لسی لاؤ، یہ لاؤ اور وہ لاؤ اور حضرت کو بٹھاؤ اور طالب سب کے سب حضرت کی خدمت کے لئے بھاگ پڑے تو ان

[1] [تفسیر البیضاوی: ٢/ ٨٢، النساء، الآیۃ: ٦٧]

مولوی صاحب نے پوچھا کہ حضرت! آپ کا اسم گرامی کیا ہے؟ اس نے کہا: مولبی جوسف۔ استاد نے طالب علموں کو کہا کہ سبق پڑھو، یہ تو جوسف ہے۔ جو آدمی اپنا نام نہیں جانتا تو وہ کتنا بڑا عالم ہوگا۔

حقیقتاً بندر بنائے گئے تھے:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات ٹھیک ہے اور سند پکی ہے کہ یہ قول حضرت مجاہد کا ہے، لیکن ان کا قول ظاہر قرآن کے بھی خلاف ہے اور سیاق و سباق کے بھی خلاف ہے۔ اللہ نے فرمایا: ﴿قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ۚ أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيلِ ﴿٦٠﴾﴾ [المائدۃ: ٦٠] جب اللہ نے غضب کیا، جب اللہ نے لعنت کی تو اس کا معنی کیا ہوا کہ بس ان کے دل بندر کی طرح ہو گئے تھے؟ یہ بات قرآن کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ جن لوگوں پر اللہ نے غضب کیا، اللہ نے لعنت کی تو اللہ نے فرمایا کہ ان کو بندر بنا دیا، ان کو خنزیر بنا دیا اور سب سے آخری درجہ ان لوگوں کا یہ ہے کہ اپنے سوا غیروں کی عبادت کرنے والا بنا دیا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے جو نوجوان تھے، ان کو اللہ نے بندر بنا دیا اور جو اُن میں زیادہ بوڑھے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے خنزیر کی شکل دے دی، کیونکہ جب بوڑھا آدمی جرم کرتا ہے تو اللہ کا جلال زیادہ غضب میں آتا ہے۔ اس لیے حدیث پاک میں آتا ہے کہ سب سے بُرا شخص وہ ہے جو بوڑھا ہو جائے، لیکن پھر بھی زنا نہ چھوڑے۔ اس لیے حکم ہے کہ جب بال سفید آنے لگ جائیں تو اب تو تجھے ڈرانے والا تیرے چہرے پر آ گیا، اب تو شرم کر کہ بال سفید ہو گئے اور اب بھی تُو نہیں بدلا، اب بھی تیرے اندر جرائم وہی ہیں۔

اسی طرح شیبان النحوی نے بھی کہا ہے کہ اللہ نے حکم دیا: ﴿كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ تو وہ حقیقتاً بندر بن گئے اور بندر بن کر ایک دوسرے پر بندروں والی آوازیں نکالنے لگے اور اسی طرح خنزیروں والی آواز بھی نکالنے لگے اور اس کے بعد فرمایا کہ پہلے وہ مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں، لیکن اللہ نے ان کو حقیقتاً بدل ڈالا، ان کا چہرہ مسخ ہو گیا اور ان کی صورتیں حقیقتاً تبدیل ہو گئیں اور بندر بن گئے۔

حضرت عطاء الخراسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے بستی والوں کو حکم دیا: ﴿كُونُوا قِرَدَةً﴾ تو سب کے سب بندر بن گئے۔ اب جب قوم والے گئے تو دیکھا کہ وہ سارے بندر بن چکے ہیں تو وہ ان کو کہتے: او بدبختو! ہم نے تمہیں

نہیں کہا تھا کہ اللہ کی نافرمانی نہ کرو۔ تو اب سزا مل گئی ہے؟ تو وہ سر ہلاتے کہ ہاں تم نے روکا تو تھا، لیکن ہم نے نہ مانا۔ وہ نام لے لے کر کہتے تھے کہ یا فلان! یا فلان! یا فلان! ہم نے تمہیں نہیں روکا تھا کہ خدا کے حکم کی مخالفت نہ کرو۔ اب تو انجام دیکھ لیا؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے جب ان کو مسخ کر کے بندر بنا دیا تو وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہے، بلکہ تین دن کے بعد سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ تین دن سے زیادہ مسخ شدہ قوموں کو نہیں رکھا جاتا۔ وہ ان عذاب کے دنوں میں نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں اور نہ ان کی آگے نسل بڑھائی جاتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ ہمارے ہاں بندر، خنزیر پائے جاتے ہیں، یہ تو وہ حیوان ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے۔ چھ دنوں کے اندر ساری چیزوں کو پیدا کیا، البتہ مسخ شدہ جو قوم تھی، اس کو اللہ نے تین دن کے بعد ہلاک و برباد کر دیا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ ''قِرَدَةً'' کا معنی ہے کہ ذلیل وخوار ہو جاؤ۔ لیکن راجح قول پہلے والا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱۰۵/۱، البقرة:الآیة:٦٥]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کو بھی چھٹی کے لئے جمعہ کا دن دیا تھا، لیکن انہوں نے جمعہ کا دن قبول نہ کیا اور ''سبت'' (ہفتے کا دن) قبول کیا۔ اب جب اللہ پاک نے فرمایا کہ تمہارے لیے جمعہ ہے تو انہوں نے کہا نہیں، ہم ''سبت'' لیں گے۔ انہوں نے مخالفت کی تو اللہ نے ان کو امتحان میں ڈال دیا۔ اللہ نے اس دن میں ان پر ان چیزوں کو حرام کر دیا، جو باقی دنوں میں حلال تھیں، وہ ایک ایسی بستی میں تھے جو ''ایلہ'' اور ''طور'' کے درمیان میں ہے، اس بستی کا نام ''مدین'' تھا۔ کیونکہ حدیث پاک میں آتا ہے، میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم برائی کو روکنے سے رُک جاؤ گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جب عذاب آئے گا تو تم بھی اس عذاب میں کچلے جاؤ گے اور تمہارا شمار بھی انہی میں سے ہوگا، چاہے تم نے وہ گناہ نہ بھی کیا ہو۔

یہود نے ہفتہ کا دن مانگا، کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب مخلوقات کو پیدا فرمایا تو جمعہ کے دن تمام مخلوقات مکمل ہو گئیں۔ اسی وجہ سے کہتے تھے کہ چھٹی کا دن ''سبت'' ہوگا۔ تو اس لیے وہ کہتے تھے کہ ''سبت'' زیادہ بہتر ہے، کیونکہ یہ ایک ایسا دن ہے کہ کوئی کام نہیں، کیونکہ ''احد'' سے کام شروع ہوا اور جمعہ کو جا کر کام ختم ہوا۔ تو جیسے تورات انہوں نے خود مانگی تھی اور پھر خود کہا کہ ہم سے عمل نہیں ہوتا، اسی طرح ''یوم السبت'' بھی خود مانگا۔ جب اللہ نے دے دیا تو کہا کہ نہیں، یہ ہمارے لئے بڑا مشکل ہے، کیونکہ ''سبت'' کے

دن ہی مچھلیاں ملتی ہیں اور دوسرے دنوں میں مچھلیاں نہیں ملتیں۔

آدمی جو چیز مانگ کر حاصل کرے تو اس پر اللہ تعالیٰ امتحان لیتے ہیں، اس لئے حدیث میں حکم ہے کہ اگر قاضی کا عہدہ ہو یا اور کوئی عہدہ ہو تو اس کو طلب نہ کرو۔ اس کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر اللہ کو منظور ہے اور اللہ نے تمہیں کچھ بنا دیا ہے تو اللہ تمہاری مدد کریں گے۔ اور اگر تم اس کو خود حاصل کرو گے تو اللہ امتحان میں ڈال دیں گے اور تم مشکل میں آجاؤ گے۔

[صحيح البخاري، حديث:٧١٤٦، باب: مَنْ لَمْ يَسْأَلِ الإِمَارَةَ...]

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ﴾ [البقرۃ:٦٥] اور آیت: ﴿وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ﴾ [الاعراف:١٦٣] حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں بستی سے مراد "ایلہ" کی بستی ہے اور یہی بستی ہے جو دریا کے کنارے پر واقع تھی۔

ان کے علماء نے ان کو روکا کہ تمہاری ہلاکت ہو، اللہ کے حکم کو نہ توڑو۔ تم کیا کر رہے ہو؟ خدا نے تمہیں منع کیا ہے، تم یہ کام نہ کرو۔ لیکن وہ علماء کی بات نہیں سنتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے تو اتوار کے دن شکار کیا ہے، ہفتے کے دن تو شکار ہی نہیں کیا۔ ان کو علماء اور فقہاء نے سمجھایا کہ ایسے حیلے بہانے نہ کرو، یہ باتیں اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تم شکار ہفتے کے دن کرتے ہو اور تم پکڑتے اتوار کے دن ہو۔ یہ باتیں کر کے تم اللہ کے قانون کو نہ توڑو۔

علماء نے ایک تاریخی واقعہ لکھا ہے۔ اس کی حقیقت تو بہرحال اللہ جانتے ہیں کہ ایک بزرگ دریا کے کنارے بیٹھے وضو فرما رہے تھے اور جب انہوں نے پانی میں ہاتھ ڈالا تو وہاں کنارے پر ایک بچھو ڈوب رہا تھا، اس نے فوراً ڈس دیا تو بزرگ نے دیکھا کہ بچھو ہے، اگر میں اس کو نہ نکالوں تو یہ ڈوب جائے گا۔ اس کو نکالنے کے لیے ہاتھ دیں، لیکن وہ پھر ڈنک مار دے تو وہ تکلیف سے چھوڑ دیں تو وہ پھر گر جائے۔ اس کے بعد انہوں نے اس کو نکالنے کے لیے پھر ہاتھ دیا تو وہاں ایک آدمی گزرا۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب پاگل تو نہیں ہو گئے، جب وہ تمہیں بار بار ڈس رہا ہے تو وہ کیا تمہاری بات مانے گا؟ تم کیوں خواہ مخواہ ہاتھ دے رہے ہو۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ جب وہ بری عادت نہیں چھوڑتا تو ہم اچھی عادت کیوں چھوڑ دیں؟

بہرحال جب بنی اسرائیل نے انکار کر دیا اور علماء کی بات نہ مانی تو اب جو لوگ اچھے مسلمان اور بات ماننے والے تھے، انہوں نے نہ ماننے والوں کو کہا کہ ہم تو تمہارے ساتھ نہیں رہتے، لہٰذا شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دو۔ تو شہر کے

درمیان میں ایک دیوار دے دی کہ نہ ماننے والے ایک طرف رہیں اور ماننے والے دوسری طرف رہیں۔ اور دو دروازے لگا دیئے کہ مسلمان اس دروازے سے گزرا کریں اور وہ اس دروازے سے گزرا کریں، لیکن ایک دوسرے کے دروازے سے گزرتے رہتے تھے، کوئی دشمنی تو تھی نہیں، البتہ ان کو نصیحت کی گئی، لیکن انہوں نے بات نہ مانی۔ تو ایک دن ایسا ہوا کہ جب مسلمان ان کے دروازے کی طرف گزرے تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے۔ انہوں نے کہا کہ عجیب بات ہے آج دروازہ کیوں بند ہے!؟ تو مسلمان دیوار پر جا کر اندر کود ے، تاکہ دیکھیں کہ آج کسی نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟ تو دیکھا کہ وہ تو بندر بن چکے ہیں اور ایک دوسرے پر بندروں کی طرح اُچھل رہے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو چکا تھا۔ قرآن میں ہے: ﴿فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ۝﴾ [الاعراف:۱۶۶] جس چیز سے انہیں روکا گیا تھا، جب انہوں نے سرکشی کی تو اللہ نے بھی حکم دے دیا کہ ذلیل بندر بن جاؤ۔ حضرت داؤد نے بھی ان پر لعنت کی کہ لعنتی قوم ہو کہ نہ نبیوں کی مانتے، نہ علماء کی مانتے ہو اور نہ فقہاء کی مانتے ہو۔ اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے بھی اس قوم پر لعنت بھیجی:

﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ۝﴾ [البقرۃ:۶۶] تو اس کے اندر "" کی "ھا" ضمیر کس کی طرف لوٹ رہی ہے؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ ضمیر "قِرَدَةً" کی طرف راجع ہے کہ ان کو ہم نے بندر بنا دیا، تاکہ وہ عبرت بنیں۔ اور بعض نے کہا کہ "حِیْتَان" کی طرف راجع ہے کہ اللہ نے مچھلیوں کو ابتلاء بنا دیا۔ اور بعض نے کہا کہ "ھا" ضمیر عذاب کی طرف راجع ہے کہ دیکھو! ہمارا عذاب کیسے آیا؟ ہم نے ان کو کیسے عبرت کا نشان بنا دیا، آگے والوں کے لیے بھی اور پیچھے والوں کے لیے بھی۔ اور بعض نے فرمایا کہ ضمیر بستی کی طرف راجع ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح قول یہی ہے کہ ضمیر بستی کی طرف راجع ہے۔ کیونکہ عذاب بھی بستی والوں پر آیا اور مسخ بھی بستی والوں پر آیا، اللہ کی عقوبت بھی بستی والوں پر آئی۔ لہٰذا ضمیر کا رجوع بستی کی طرف ہے، اللہ نے اس بستی والوں پر عذاب کیا، کیونکہ انہوں نے تجاوز کیا تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۶، ۱۰۷، البقرۃ: الآیۃ: ۶۵]

"نَكَالًا" کا معنی ہے عذاب۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو ایسی سزا دی کہ وہ دنیا کے لئے عبرت بن گئے۔

﴿لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ سے یا آگے اور پیچھے والی بستیاں مراد ہیں یا ان سے آگے آنے والے لوگ اور پیچھے والے لوگ مراد ہیں کہ وہ اس سے عبرت پکڑیں۔

حضرت اسماعیل بن ابی خالد، حضرت قتادہ اور حضرت عطیہ العوفی فرماتے ہیں: ﴿بَیْنَ یَدَیْهَا﴾ سے مراد وہ لوگ

ہیں جو پہلے گزر گئے یا بعد والے۔

حضرت ابو العالیہ، حضرت ربیع اور حضرت عطیہ فرماتے ہیں کہ ﴿وَمَا خَلْفَهَا﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو بنی اسرائیل کے بعد بچ گئے، تاکہ وہ عبرت پکڑیں کہ کہیں وہ ان عمل نہ کریں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے تو عبرت ٹھیک ہے، لیکن جو پہلے گزر ہیں ان کے لئے یہ عبرت کیسے ہو سکتی ہے؟ لہٰذا یہ بات ٹھیک ہے کہ جو بستیاں سامنے تھیں یا جو بستیاں پیچھے تھیں کہ دائیں بائیں آگے پیچھے آباد تھیں، ان سب کے لئے عبرت کا ایک نمونہ بن گیا، تاکہ اللہ کی نافرمانی نہ کریں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ کہے کہ یہ ایک تصور ہے کہ اس طرح کہہ دیا جاتا ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ راجح قول پہلا یعنی مکان والا ہے۔ ﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ان کے اگلے پچھلے گناہوں کی وجہ سے ان کو عبرت بنا ڈالا گیا۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کے اندر تین قول نقل کیے ہیں:

1 ..... پہلا قول یہ ہے کہ بستی والے جو اُن سے پہلے تھے، اللہ نے علم دیا تھا کہ اس طرح کا ایک واقعہ گزر چکا ہے۔

2 ..... دوسرا قول یہ ہے کہ اس وقت جو بستیاں آگے پیچھے موجود تھیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے عبرت بنا دیا۔

3 ..... تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی جو انہوں نے گناہ کئے تھے اور یہ جو گناہ کیا تھا، اللہ نے ان سب گناہوں میں پکڑ کر ان کو عبرت کا نشان بنا دیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۷، البقرۃ: الآیۃ: ٦٥]

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاۗءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّاشِيَةَ فِيْهَا ۭ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۭ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾

[البقرۃ: ٦٧ تا ٧١]

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، وہ کہنے لگے: کیا تُو ہم سے مذاق کرتا ہے؟ فرمایا: اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ کہنے لگے: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر کہ وہ ہمیں بتا دے کہ وہ گائے کیسی ہے؟ کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ بن بیاہی، بڑھاپے اور جوانی کے درمیان میں ہے، اب کر ڈالو جو تمہیں حکم ملا ہے۔ کہنے لگے: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر کہ وہ ہمیں بتا دے کہ اس کا رنگ کیسا ہے؟ کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے زرد، تیز رنگ ہے اس کا، دیکھنے والوں کو بھاتی ہے۔ بولے: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر وہ ہمیں بتائے کہ وہ کس قسم میں ہے، کیونکہ اس گائے میں ہمیں شبہ پڑا ہے اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پالیں گے۔ کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے، محنت والی نہیں کہ زمین کو جوتتی ہو یا کھیتی کو پانی دیتی ہو، بے عیب ہے، اس میں کوئی داغ نہیں۔ کہنے لگے: اب تُو نے پوری بات کہہ دی ہے۔ پھر اس کو ذبح کیا اور وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کریں گے۔

اس آیت مبارک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک اور واقعہ اور اللہ کے حکم پر ان کا ردِ عمل ذکر فرمایا ہے۔ ان آیات کے مخاطب بھی بنی اسرائیل (یہودی) ہیں۔

اہل کتاب کی نسبت:

اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُتاری گئی، اگر یہودی اس پر صحیح معنی میں عمل پیرا ہوں اور انجیل جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اُتاری گئی، اگر عیسائی اس پر صحیح معنی میں عمل پیرا ہوں تو ان کو "اہل کتاب" کہلانے کا حق ہے۔

ایک نسبت ہوتی ہے جیسے الحمد للہ! ہم اپنی نسبت قرآن وحدیث کی طرف کرتے ہیں، اپنی نسبت اہلسنت و الجماعت کی طرف کرتے ہیں، لیکن کتنے لوگ ہیں جو صحیح معنوں میں اہلسنت والجماعت کے طریقے پر قائم ہیں۔ وہ نسبت تو باقی رہتی ہے۔ آج کل جو نصاریٰ موجود ہیں، وہ اکثر تثلیث کے قائل ہیں اور ان کی اکثریت بالکل لامذہب ہے، ان کا مذہب سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ سابقہ زمانہ میں کلیسا اور سائنس آپس میں ٹکرا گئی، یعنی جو لوگ راہب یا نصاریٰ کے بڑے بڑے پادری تھے اور ان کے مقابلہ میں وہ لوگ تھے جو سائنس کی ترقی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے جب اپنے اپنے نظریات پیش کیے تو ان کا آپس میں ایک ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔ نتیجہ نکلا کہ مذہب اور ان کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی۔ جب تک ان کلیسا والوں کا زور رہا، ان کے ہاتھ

میں طاقت اور قوت رہی، انہوں نے بھی سائنسدانوں کو پھانسیوں پر لٹکوایا اور ان کو سزائیں دلوائیں، ان کے ہاتھ کٹوا دیئے اور ان کی آنکھیں نکلوا دیں اور ہر وہ آدمی جو سائنسی ترقی میں یا دنیوی ترقی میں پڑتا تو اس پر کفر کے فتوے صادر کر دیتے۔ اور اس کے بعد جب نئی ٹیکنالوجی کا دور آیا تو اس کا نتیجہ بھی یہ ہوا کہ انہوں نے مذہب والوں کو ذلیل کرنا شروع کر دیا، انہوں نے بھی تو آخر اپنا انتقام لینا تھا۔

اسلام دنیاوی ترقی کا مخالف نہیں:

دراصل یہی وہ وجہ ہے کہ جو آج بھی یہود و نصاریٰ کے دماغ میں ہے کہ جو صحیح معنی کے اندر مسلمان ہیں، ان سے وہ نفرت کرتے ہیں کہ سابقہ اثرات ان کے دماغوں میں موجود ہیں، ورنہ الحمدللہ! اسلام نہ سائنس کی ترقی سے الرجک ہے اور نہ اسلام سائنسی ترقی کا معارض و مخالف ہے اور نہ اسلام نے کوئی تفریق کھینچی ہے کہ جو دین والا ہے، وہ دنیا کا کام ہی نہ کرے، بلکہ اسلام نے تو رہبانیت کی مکمل نفی کی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معاشرے سے کاٹ لے، دنیا سے کاٹ لے اور اپنے آپ کو علیحدہ کر کے غاروں میں اور معبد خانوں میں بند کر دے، اسلام تو اس کا مخالف ہے۔ بلکہ اسلام کی جو عظیم عبادت گاہ اللہ کا کعبہ ہے، اس کے اندر جب آپ سب سے عظیم عبادت طواف کرتے ہیں تو اس کی جو عظیم دعا ہے، اس میں بھی اللہ نے سب کچھ دیا ہے کہ ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [البقرۃ:۲۰۱] اس میں اللہ نے ہمیں دنیا کی بھلائیاں بھی مانگنے کا حکم دیا اور آخرت کی بھلائیاں بھی مانگنے کا حکم دیا ہے۔ اسلام تو صرف یہ تقاضا اور مطالبہ کرتا ہے کہ تم دنیا میں نہ کھو جاؤ اور اللہ کو نہ بھولو۔ اسلام تو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اگر دنیا ملے تو حلال، حرام کی تمیز کرو۔ اسلام تو ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اگر انسان کو اپنی جبلی خواہش کے مطابق لذات کی بھی ضرورت ہے، مطعومات اور ماکولات کی بھی ضرورت ہے، ملبوسات اور منکوحات کی بھی ضرورت ہے تو اسلام یہ پابندی لگاتا ہے کہ تم کھاؤ اور پیو جو چاہتے ہو، صرف اسراف نہ کرو اور حلال حرام کا فرق کرو۔ اسلام یہ پابندی نہیں لگاتا کہ آپ اعلیٰ لباس نہ پہنیں، بلکہ اسلام تو حکم دیتا ہے کہ اگر جمعہ کا دن ہے تو آپ غسل کریں اور نیا لباس پہنیں، اگر نیا نہ ہو تو کم از کم دھلا ہوا پہنو، اسلام حکم دیتا ہے کہ خوشبو لگائیں، نظافت اختیار کریں کہ انسان کے لباس سے، بدن سے، منہ سے، بغلوں سے، ہاتھ پاؤں کی انگلیوں سے، یعنی کہیں سے بھی بدبو نہیں پھوٹنی چاہئے۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ تجارت کریں کہ سب سے پہلے میرے پیارے نبی

خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء نے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال لے کر تجارت کر کے اُمت کو نمونہ پیش کیا۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ کھیتی باڑی کریں کہ ہمارے ابا آدم علیہ السلام نے کھیتی باڑی کی تھی۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ صنعتکاری اختیار کریں کہ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بنائی، حضرت داؤد علیہ السلام نے زرہ بنائی۔ اسی طرح بعض انبیاء نے کپڑے سینے کا کام کیا۔ اسلام مزدور کی عظمت کو بلند کرتا ہے کہ اللہ کے نبی نے مزدوری لے کر بکریاں چرائیں۔ کیا اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اتنے پیسے نہیں بھجوا سکتے تھے کہ ان کو مزدوری نہ کرنی پڑے؟ آج لوگ مکہ میں کمانے آتے ہیں، ان کو پیسہ مل جاتا ہے اور اللہ کے نبی کے لئے کوئی کمی تو نہیں تھی۔ اُمت کو ایک تعلیم دینی تھی کہ کل کو کوئی عامل اور مزدوری کرنے والا اپنی مزدوری کو گھٹیا نہ سمجھے، مزدوری کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھے۔ حضور ﷺ نے تجارت فرمائی۔ سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں کپڑے کی تجارت کی اور آپ کبھی کبھی اپنے کندھے پر چادریں لے کر بھی بیچتے تھے۔ تو اسلام کا تو دراصل سائنس اور ترقی سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

اسی طرح جتنے نظریات، آسمان وزمین کے بارے میں، شمس وقمر کے بارے میں، سیارات و برج کے بارے میں ہیں، اسلام تو کسی سائنس سے نہیں ٹکراتا، ہاں! البتہ اسلام اتنا درس ضرور دیتا ہے کہ تم ایسی چیزوں میں تدبر، غور وفکر کرو کہ جس سے بندوں کو فائدہ پہنچے، بے فائدہ اپنی محنتوں کو، اپنی قابلیتوں کو، اپنی دولتوں کو ضائع نہ کرو۔ لیکن مشکل وہی ہے کہ کلیسا اور مذہب کی جو جنگ تھی، آج تک جدید لوگوں کے دماغوں میں موجود ہے۔ اس لیے مذہب کا آدمی جہاں بھی ہوگا، وہ اس کو کچلنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے دماغوں کے اندر خطرہ موجود ہے کہ اگر کہیں پھر مذہب والے آئے تو پتہ نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا کریں؟ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ اسلام تو سلامتی کا درس دیتا ہے، ایمان، امن کا سبق پڑھاتا ہے، اسلام تو دعوت دیتا ہے کہ آگے بڑھیں اور اللہ کی زمین سے فائدہ اُٹھائیں۔ اسلام دعوت دیتا ہے کہ ہم نے شمس وقمر اور نجوم سب مسخر کر دیئے ہیں، تم ان سے فائدہ اُٹھاؤ، یہ تمہارے لیے علامات اور ہدایت ہیں، یہ تمہیں راستہ بتلاتے ہیں، تمہاری سمت متعین کرتے ہیں، تمہیں اوقات بتلاتے ہیں، ان کے بارے میں تو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں خود دعوت دی ہے۔

سورۃ البقرۃ کی وجہ تسمیہ:

ان آیات میں گائے ذبح کرنے کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس سورت کا نام جو سورۃ البقرۃ ہے، وہ بھی اس واقعہ

کی وجہ سے ہے۔

عموماً جھگڑے کا سبب دولت ہے یا عورت:

اگر آپ تحقیق کریں تو ہر جھگڑے کے پسِ منظر میں یا دولت ہوگی یا عورت ہوگی، اس کے علاوہ اور کوئی فتنہ کا ذریعہ نہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ دولت ہے یا عورت ہے۔ بنی اسرائیل کے لوگوں کا قصہ ہے کہ ایک دولت مند کو اس کے بھتیجے نے قتل کر دیا۔ اس کے بھتیجے کے دماغ میں آیا کہ یہ دولت مجھے مل جائے۔

یہ دولت ایسی بری چیز ہے کہ ہر آدمی اس کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور یہ ایسی بدبخت ہے کہ اس کو جتنا حاصل کرنے پر زور لگاؤ تو اتنا اور دور ہوتی ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ دولت کی بنیاد سونا ہوتا ہے۔ تمام دنیا کی کرنسی اور سرمایہ کی مقدار سونے پر ہے، اور سونے کا نام عربی میں ''ذھب'' ہے، اس کا مادہ ''ذَھَبَ یَذْھَبُ'' ہے کہ جانے والا اور یہ کبھی کسی کے پاس ٹکتا بھی نہیں ہے۔ اور اسی طرح ایک شاعر نے ایک بڑی عجیب بات کی۔ اس نے کہا کہ آپ ساری دنیا کے پیسوں پر نظر ڈالیں تو اس کے ہمیشہ دو رخ ہوں گے۔ پوری دنیا میں آج تک کوئی پیسہ، کوئی درہم، کوئی اشرفی، کوئی کرنسی، کوئی ڈالر، کوئی پونڈ، کوئی روپیہ ایسا بنا ہی نہیں کہ دونوں طرف اس کی ایک شکل ہو۔ تو اس شاعر نے کہا کہ اس سے بڑی دلیل منافقت کی کیا ہو سکتی ہے کہ جس کے دو منہ ہوں، منافق کے بھی دو چہرے ہوتے ہیں، ظاہری کچھ اور اندر سے کچھ ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک نے منافق کی تعریف کی ہے: ﴿مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝﴾ [النساء:۱۴۳] کہ منافق ہمیشہ دو کشتیوں پر پاؤں رکھتا ہے، نہ ادھر ہے اور نہ اُدھر۔ دونوں کشتیوں پر کھڑا ہے کہ یہ تیرنے لگی تو ادھر آجاؤں گا اور وہ تیرنے لگی تو اُدھر چلا جاؤں گا۔ اللہ کی مہربانی یہ ہوتی ہے کہ دونوں کشتیاں ڈوب جاتی ہیں اور وہ ڈوب جاتا ہے۔ تو دولت کے معنی یہی ہے کہ یہ تو جانے والی چیز ہے۔ سب سے بڑی چیز ''ذھب'' ہے، وہ ''ذَھَبَ'' جانے سے ہے۔ اور ''فِضَّۃ'' تفضض سے ہے۔

اس دولت کی لالچ میں آکر بھتیجے نے سوچا کہ چچا کی دولت پر کیسے قبضہ کروں؟ کیونکہ اس کی زندگی میں قبضہ بڑا مشکل ہے، کیونکہ جب تک آدمی زندہ ہے، وہ اپنی جائیداد کیسے چھوڑ دے گا؟

وحی کے ذریعے قاتل نہ بتلانا حکمت ہے:

اللہ کی شان ہے کہ اگر چاہتے تو موسیٰ علیہ السلام کو خبر کر دیتے کہ اس کا قاتل فلاں ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے

یہاں بھی نہیں بتلایا اور ہارون علیہ السلام کی موت میں بھی نہیں بتلایا۔ وجہ یہ تھی کہ اگر ہم نے وحی کے ذریعہ خبر کردی تو یہ قوم تو پہلے موسیٰ علیہ السلام کا انکار کررہی ہے، تکذیب کررہی ہے، تورات کو جھٹلا رہی ہے تو اب کون سی بات مان لے گی؟ بلکہ مزید یہ کفر میں اکڑ جائے گی، اس لیے وحی کے ذریعے خبر دینے کی ضرورت نہیں۔ ہارون علیہ السلام جب فوت ہوگئے تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الزام لگا دیا کہ ہارون علیہ السلام کے قاتل تم ہو، آپ نے انہیں قتل کردیا ہے اور انہیں دفن کردیا ہے۔ چونکہ وہ ہم سے زیادہ ملے ہوئے تھے، ہمارے ساتھ زیادہ مہربانی کرتے تھے تو تمہیں یہ بات پسند نہیں تھی تو تم نے اپنے بھائی کو مار ڈالا ہے۔ وہاں بھی اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعے یہ حکم دیا کہ اپنے بھائی کی میت پر آجاؤ اور قبر پر آکر کھڑے ہوجاؤ، اس سے کہو: ''قُمْ بِإِذْنِ اللّٰهِ'' تو ہم تمہارے بھائی کو زندہ کردیتے ہیں۔ جب قیامت میں ہم نے ساری مخلوق کو زندگی دینی ہے تو ایک پیغمبر کو یا ایک فرد کو دوبارہ اُٹھا دینا کون سا مشکل مسئلہ ہے؟ موسیٰ علیہ السلام قبر پر کھڑے ہوئے، بنی اسرائیل کو بھی لے آئے، حضرت ہارون علیہ السلام اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کھڑے ہوگئے اور کہا کہ عقل کی بات کرو، میں اپنی موت سے مرا ہوں، مجھے موسیٰ علیہ السلام نے نہیں مارا۔ تو اب وہ چپ ہوگئے۔

چند علمی لطیفے:

میں نے ایک دفعہ پاسپورٹ پڑھا کہ اس پر ''حامل'' لکھا ہوا ہوتا ہے، ان کو یہ پتہ نہیں ہے کہ حامل، حمل والی عورت کو کہتے ہیں، جس کے پیٹ میں بچہ ہو یا بڑا۔ میں نے کئی دوستوں سے کہا کہ کم از کم یہ بات کہیں پہنچاؤ جن کے ہاتھ میں ہو۔ کم از کم مذاق تو نہ بناؤ کہ ہر ایک کے پاسپورٹ میں تم نے حمل والی عورت لکھ دیا ہے، وہ کم از کم ترجمہ تو ٹھیک کردے۔ جب لوگ پڑھتے ہوں گے تو کتنا ہنستے ہوں گے کہ ان کے بارہ کروڑ آدمیوں میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کو عربی آتی ہو۔ کتنے لوگ ہماری بے عزتی کریں گے، لیکن کوئی سنتا نہیں ہے۔ اور ہماری کون سنتا ہے؟ ہمارا تو حق ہے کہ لوگوں کو حق کی بات بتلادیں، اب اس آگے والے کی مرضی ہے۔

اور دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ اسی میں آپ آگے پڑھیں۔ پتہ نہیں ان کو کون سا عربی مترجم ملا تھا کہ اگر سال کے بعد تجدید نہ کیا گیا تو ختم ہوجائے گا۔ وہاں عربی کا جو ترجمہ کیا ہے، یہ لکھا ہے کہ اگر تجدید کرایا گیا پانچ سال کے بعد تو یہ ختم ہوجائے گا۔ اب اگر اتنا بڑا جاہلانہ ترجمہ ہو تو آدمی کیا کرے؟ بہر حال یہ جانیں اور ان کا کام جانے۔ اللہ نے ہمیں محفوظ رکھا ہے اور آگے بھی محفوظ رکھے، لیکن حق کی بات بتلانا تو فرض ہے کہ بتلاؤ، تاکہ کسی کی تضحیک نہ ہو اور

کوئی پڑھیں تو کم از کم نہ ہنسیں، حالانکہ مشکل بھی کوئی نہیں تھی کہ اگر تم کو ترجمہ والا کوئی نہیں ملا تھا تو دو چار عرب ملکوں کے پاسپورٹ سامنے رکھ لیتے اور اس کی نقل کر لیتے۔ کون سا یہ مشکل مسئلہ تھا جو تم سے حل نہیں ہو سکا۔ لیکن کسی نے ادھر غور ہی نہیں کیا اور غور کرتے بھی نہیں ہیں، حالانکہ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اگر مجھے عربی نہیں آتی تو دوسروں کے لکھے ہوئے کاغذ ہوتے ہیں، وہی لکھ لیا۔ چونکہ ہمارے ہاں لکھا ہوتا ہے حامل ہذا روانہ ہے تو اسی طرح حامل کو پاسپورٹ کے اندر ہم ڈھونڈھ کر لے آئے، جیسے ہم نے مزاح کو مذاق بنا دیا۔

جیسے خط میں لکھتے ہیں کہ ''اگر آپ نے میرا یہ کام کیا تو میں آپ کا بڑا مشکور ہوں گا'' حالانکہ یہ غلط لفظ ہے، کیونکہ ''مشکور'' کا معنی ہوتا ہے کہ تم میرے شکر گزار بنو، یعنی کام بھی تم نے کیا ہے اور شکر گزار بھی تم بنو۔ اصل میں تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ آپ نے میرے ساتھ مہربانی کی تو میں آپ کا شکر گزار رہوں گا، میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا، یہ نہیں کہ مشکور بھی میں ہوں گا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ لفظ چلتا ہے اور ہر پڑھا لکھا آدمی ماشاءاللہ! یہی لکھتا ہے۔

اور آپ نے اکثر دیکھا اور سنا ہوگا کہ آپ کو ہم سے کیا ناراضگی ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ اصل لفظ ہے ''ناراضی''، پتہ نہیں ''گی'' انہوں نے کہاں سے لگا دیا ہے۔ یہ الفاظ کے آگے پیچھے تھوڑی سے دُم لگا دیتے ہیں۔ بہر حال کوئی ایک غلطی نہیں ہے کہ میں جس کا رونا روؤں۔ میں نے ایک دفعہ ان اغلاط پر تیس ورق لکھے تھے، بہر حال میں نے لکھ کر اس کو رکھ دیا کہ تمہاری اس بات کو کس نے سننا ہے، اس نقار خانہ میں ایک طوطی کا شور کون سنے گا؟ تو میں نے اپنے آپ کو کہا کہ چھوڑو اور اس محنت کو رہنے دو، جو جیسے چل رہا ہے، اس کو چلنے دو۔ کسی نے ہماری ماننی تو نہیں ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً﴾ تنوین تھی، کوئی تخصیص نہیں تھی۔ نکرہ تھا کہ کسی گائے کو ذبح کر کے گوشت کا ٹکڑا لگا دیتے تو مسئلہ حل ہو جاتا لیکن انہوں نے پوچھنا شروع کیا، جس کی وجہ سے ان پر سختی آئی۔

اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اپنی جانوں پر خود سختی نہ کیا کرو۔ جو شریعت کا حکم ہے بس اس کو پورا کر دو۔ ایسا نہ کرو جیسا کہ بنی اسرائیل نے اپنی جانوں پر سختی تو اللہ نے بھی ان کو مشقت میں ڈال دیا۔

واقعہ قتل:

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یہ واقعہ اس طرح بیان فرمایا عبیدہ السلمان کے ذریعہ سے کہ بنی اسرائیل کے اندر ایک شخص عقیم تھا یعنی بانجھ تھا، اس کی اولاد کوئی نہیں تھی، بعض روایات میں اس کا نام ''عامیل'' تھا۔ لیکن بہت بڑا مالدار

تھا، اس کے بھائی کا بیٹا یعنی اس کا بھتیجا اس کا وارث تھا تو اس نے مال حاصل کرنے کے لیے اس کو قتل کر دیا اور اس کو رات کو اُٹھا کر ایک آدمی کے دروازے پر ڈال دیا اور صبح کو اس آدمی پر دعویٰ کیا کہ اس نے قتل کیا ہے، لیکن انہوں نے کہا کہ ہم نے قتل نہیں کیا۔ حتیٰ کہ دونوں جانب سے آدمیوں نے ہتھیار اُٹھا لیے اور ایک دوسرے سے لڑائی کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور بات بڑھ گئی تو ان میں جو لوگ صاحب الرائے اور صاحب العقل تھے، انہوں نے کہا کہ خدا کے بندے! تم کیوں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو؟ ایک آدمی کے قتل کا مقدمہ ہے، اب اگر تم لڑائی کرو گے تو تم سے اور آدمی قتل ہو جائیں گے۔ جبکہ اللہ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے اندر موجود ہیں، یہ واقعہ اللہ کے نبی کے سامنے رکھو۔ اس کے بعد وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور آ کر یہ سارا واقعہ ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے یہ حکم کیا ہے کہ تم گائے ذبح کرو۔

جنتی اور جہنمی لوگوں کے نام کی کتابیں:

اس طرح ایک روایت مبارک میں آتا ہے کہ آقائے نامدار، خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں...... کتاب سے مراد یہ نہیں ہے جو ہمارے ہاں ایک تصور ہے۔ عربی میں کتاب، لکھے ہوئے کاغذ کو کہتے ہیں...... تو حضور پاک ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ یہ دو کتابیں کیا ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: ہم کیا جانتے ہیں؟ جب تک آپ ہمیں نہ بتلائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دائیں ہاتھ میں جو کتاب ہے، اس میں ان لوگوں کے نام ہیں جن کو اللہ نے جنت ہی کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ جو بائیں ہاتھ میں نام ہیں، ان کو اللہ نے پیدا ہی جہنم کے لیے کیا ہے۔

[سنن الترمذي، حديث: ٢١٤١، باب: ما جاء أن الله كتب كتابا...]

جیسا کہ قرآن میں اللہ نے فرمایا کہ ہم نے جہنم کے لیے کتنی مخلوق پیدا کی ہے اور جنوں میں بھی پیدا کیے ہیں اور انسانوں میں بھی پیدا کیے ہیں۔ تو اس لیے اصل معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ وہ مالک ہے اور مالک اپنی ملک میں جیسے چاہے تصرف کرے اور جو چاہے تصرف کرے۔

منکر تقدیر فرقہ کا رد:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس ایک باطل فرقے قدریہ کے ایک آدمی نے آ کر سوال کیا کہ آپ جو تقدیر

کا مسئلہ بیان فرماتے ہیں کہ جس کے لیے اللہ نے ہدایت لکھی ہے، وہ ہدایت پر رہے گا اور اگر اللہ نے گمراہی لکھی ہے تو وہ گمراہی پر رہے گا۔ تو پھر بندے کا کیا قصور ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ پہلے یہ بتلاؤ کہ اللہ پاک جو یہ تصرف فرما رہے ہیں، اپنے ملک میں کر رہے ہیں یا تمہارے ملک میں کر رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ اپنے ملک میں کر رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر تمہیں پوچھنے کا کیا مطلب ہے؟ جو چیز کسی کی ملک میں ہے، اس کی مرضی ہے۔ آپ کے دو ملازم ہوتے ہیں، آپ ایک کو کہتے ہیں کہ یہ کام کرو اور دوسرے کو کہتے ہیں کہ یہ کام کرو۔ تو کسی تیسرے آدمی کو کیا حق ہے کہ آپ سے آکر کہے کہ آپ نے اس کو اس ڈیوٹی پر کیوں لگایا اور اس کو ڈیوٹی پر کیوں نہیں لگایا؟ تو وہ کہے گا کہ میرے ملازم ہیں، میرے نوکر ہیں، میں جو مناسب سمجھوں گا، اس کو ڈیوٹی دوں گا۔

بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کے لیے گائے خود امتحان بن گئی:

اب دیکھیں! اس واقعہ میں بڑی عظیم آزمائش ہے کہ پہلے یہ قوم بچھڑے کی عبادت کر چکی تھی، اب اس قوم کے لیے امتحان بھی ایک گائے کو بنا دیا گیا۔ اور یہ ان کے لیے ایک سبق بنا کہ جو خدا ہوتا ہے، وہ ذبح ہونے کے قابل نہیں ہوتا، لیکن اس کے ساتھ ان کے دماغ میں ایک اُلجھن بھی پیدا ہو سکتی تھی کہ گائے کی وجہ سے مقتول زندہ ہو گیا ہے تو اس لیے دراصل اس میں آزمائش تھی کہ جو ایمان والے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے حکم کی تعمیل کرو اور بات ختم ہو گئی۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ نے ان کو حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو تو اگر وہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو بات ختم ہو جاتی، لیکن ان لوگوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے ان لوگوں کے اوپر سختی زیادہ بڑھا دی۔

لیلۃ القدر والی عظیم دعا:

اس لیے ہمیشہ اللہ سے معافی مانگا کریں۔ ''اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي'' [ابن ماجہ، ترمذی، احمد] یہ بڑی عظیم دعا ہے، بڑی جامع دعا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے خود پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! اگر مجھے لیلۃ القدر نصیب ہو جائے تو میں اللہ سے کیا دعا مانگوں؟...... اور آپ لوگ لیلۃ القدر کی فضیلت بھی جانتے ہیں کہ ایک ہزار مہینوں کی

عبادت سے زیادہ بہتر ہے اور پھر پوچھنے والی محبوبہ محبوب خدا ہیں اور بتلانے والے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں...... آپ نے فرمایا: اے عائشہ! جب تمہیں ایسا موقع ملے تو اللہ سے معافی کا سوال کرو اور یوں کہو: "اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي" یا اللہ! میں تجھ سے معافی چاہتی ہوں۔ جب اللہ سے معافی مل گئی تو سارے کام ہو گئے۔ جب مالک نے معاف کر دیا تو بات ختم ہو گئی۔

[ترمذي، حديث: ۳۵۱۳، ابن ماجه، حديث: ۳۸۵۰، باب: الدُّعَاءِ بِالْعَفْوِ...]

اس لیے فرمایا کہ آدمی ہر وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا رہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں صحت و عافیت اور معافی عطا فرمائے۔ اور صحت کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ صرف جسمانی صحت ہو، بلکہ روحانی بھی صحت ہو، اللہ تعالیٰ شرک کی بیماریوں سے بچائے، جتنے امراضِ روحانیہ یا جسمانیہ ہیں، ان تمام امراض سے نجات عطا فرمائے اور ہمیں معافی عطا فرمادے۔

قاتل کے لوگ ٹال مٹول کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال پر سوال کرتے رہے کہ کیسی گائے ہو؟ جس کو ذبح کریں تو مقتول زندہ ہو کر بتائے گا کہ مجھے کس نے قتل کیا ہے؟ تو ان کے سامنے اس گائے کی صفات بیان ہوتی گئیں۔

بنی اسرائیل کی گائے کی قیمت:

یہاں تک کہ صرف ایک آدمی کے پاس ان صفات والی ایک گائے تھی۔ اس نے کہا کہ میں اپنی گائے کسی صورت میں نہیں بیچتا، کیونکہ اس کو پتہ چل گیا اور اس کے ہاتھ میں طاقت آ گئی کہ گائے ایک ہے، انہوں نے لینی ہے تو میری مرضی ہے، میں جتنے پیسے مانگوں۔ اور کہا کہ ایک شرط پر گائے دوں گا کہ اس کو ذبح کرنے کے بعد اس کا چمڑا سونے کا بھر کر مجھے دو گے۔ انہوں نے منظور کر لیا۔

اسماعیلی فرقہ:

آپ خود اندازہ کریں کہ ایک گائے کے چمڑے میں کتنا سونا آیا ہوگا!؟ تمہارے ملک کے اندر بھی ایسی قوم ہے جو اپنے امام کو سونے سے تولتے ہیں (اسماعیلی فرقہ) اور اس کے بعد چاندی میں وزن کرتے ہیں، اس کے بعد سفید سونے میں وزن کیا اور پھر وہ سونا اسی امام کو دیتے ہیں اور امام اتنا پہنچا ہوا ہے ماشاء اللہ کہ اس نے زندگی میں کبھی نماز نہیں پڑھی، اعلیٰ قسم کی شراب پیتا ہے، تمام دنیا میں اس کے جواء کھیلنے کے لئے اڈے ہیں، لیکن امام ہے۔

اس مذہب کے عقیدے والوں کا یہ عالم ہے ان کی لڑکی لڑکے کا نکاح نہیں ہوتا، جب تک کہ امام نہ آئیں۔ سال میں ایک دفعہ دورے پر اس ملک میں ان کا امام آتا ہے تو نکاح کا انداز بھی عجیب ہوتا ہے۔ وہ تو جو پڑھتا ہے خدا جانے کیا پڑھتا ہے، اس کے بعد دلہنیں راستے پر لیٹ جاتی ہیں اور اپنے بال بچھا دیتی ہیں، ان کے بالوں کے اوپر امام صاحب قدم اُٹھاتے ہوئے گزر جاتے ہیں، جب ان کے بالوں کے اوپر قدم آ گیا تو بات پکی ہو گئی۔

اپنے عبادت خانوں کو وہ مسجد نہیں کہتے، بلکہ جماعت خانے کہلاتے ہیں، ان کے اوپر پہرا ہوتا ہے، ان کے مسلک کے علاوہ کوئی آدمی جماعت خانہ میں نہیں جا سکتا۔ حالانکہ جب عبادت کی جگہ ہے تو ہر کسی کو آنے دیں۔ جیسے الحمدللہ! یہ کعبہ اللہ کا گھر ہے، یہاں کسی پر پابندی نہیں، چاہے شافعی ہے، مالکی ہے، حنبلی ہے، اہلحدیث ہے، کوئی بھی آ جائے۔ لیکن اسماعیلیوں کے جماعت خانے بند ہیں، کوئی دوسرا آدمی ان کے اندر نہیں جا سکتا۔

ان کے مذہب کی کوئی کتاب آپ کو ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی۔ ویسے میرے پاس تو ہیں۔ بات کا مقصد یہ ہے کہ عام نہیں ملے گی۔ ہم نے تو ان کا کوئی دوست ڈھونڈ لیا کہ ہم تمہاری کتابیں دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کتابوں کے اندر ان کے باپ، دادا، پردادا کے فوٹو ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ بہر حال میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہر پڑھا لکھا آدمی اپنے اتنے علم کے باوجود اس کو امام مانتا ہے۔

اسی طرح کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ امام غار میں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے، بارہ سو سال سے اس غار میں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد ان کے بعد آئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ...... اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں فرمائیں...... وہ تو چوتھے خلیفہ ہیں، آپ کی شہادت ہوئی تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ آئے، پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ آئے، پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ آئے۔ دعا کریں اللہ سب کو ہدایت عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ سب کو سیدھی بات سمجھنے کی توفیق دے، صراط مستقیم پر چلائے، وگرنہ ہماری طاقت نہیں ہے۔

اسی لیے جب مومن جنت میں پہنچیں گے تو کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۔ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ [الاعراف: ۴۳] اللہ تیرا شکر ہے تُو نے ہمیں جنت کا راستہ دکھلایا، اگر تُو نہ دکھلاتا تو ہم کبھی جنت میں نہ پہنچ پاتے۔ جب نماز پڑھیں گے تو کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اور جب دعا کریں گے تو حمد کریں گے اور جب جنت میں جائیں گے تو تب بھی حمد کریں گے۔ پانی پئیں گے، کھانا کھائیں گے تو حمد کریں گے، کپڑا پہنیں گے تو کہیں گے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانَا'' حمام سے باہر نکلیں گے تو کہیں گے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَذْهَبَ عَنِّي

الْأَذَى وَ عَافَانِي'' یا اللہ! تیرا شکر ہے تُو نے اس گندگی سے محفوظ رکھا اور نکال دیا۔ اگر یہ بند ہو جائے اور پیٹ سے نہ نکلے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اس لیے آدمی ہر حال میں اپنے اللہ سے پناہ مانگے، اللہ کا شکر کرے، اللہ سے معافی مانگے، تب بچ سکتا ہے۔

بہر حال بنی اسرائیل قیمت دینے کے لیے تیار ہو گئی۔ یہ فرق آج اللہ کے لیے یہ دماغ سے نکال دو کہ یہ وہابی ہے یا فلاں ہے، اس بات کو دماغ سے نکال دو۔ ہم سب کلمہ پڑھتے ہیں۔ ایمان سے بتائیں کہ بعض مزارات کے دروازے سونے کے بنے ہوئے ہیں یا نہیں بنے ہوئے؟ اور ان کے گنبدوں کے اوپر جو کلس ہوتے ہیں وہ سونے کے لگائے گئے، اندر سونے کے پانی سے کام کیے گئے، یہ سب کچھ مزارات پر لگانے سے کیا فائدہ ہوا؟ اللہ کا ولی جس کی قبر کو اللہ نے جنت کا باغ بنا دیا ہے تو کیا وہ تمہارے اس سونے چاندی کا محتاج ہے؟ اگر خدا نہ کرے، خدا نہ کرے کوئی گناہ گار ہے اور قبر میں پکڑا گیا، اس کی قبر کے اوپر سونا چاندی لگا دیں تو اس کو کوئی فائدہ ہے؟ میرے پاک نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ قبر دو قسم کی ہوگی: ''إِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ''[1] یا جنت کے باغوں میں سے باغ کا ٹکڑا ہوگی یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہوگی۔

میرے پاک نبی ﷺ نے فرمایا: میری بیٹی فاطمہ! اگر کوئی مال ضرورت ہے تو وہ مجھ سے مانگ لو، قبر میں محمد (ﷺ) نہیں چھڑوائے گا۔ اگر اللہ کا نبی اپنی بیٹی سے یہ کہے کہ تیرے عمل کام آئیں گے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۲۷۵۳، باب: وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ...]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وصیت کی کہ میری یہ دو پرانی چادریں ہیں، ان کو دھو ڈالو اور ان میں مجھے کفن دینا۔ عرض کیا گیا: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ خلیفۃ رسول اللہ ہیں، خلیفۃ المسلمین، امیر المومنین ہیں اور محسن اسلام ہیں، آپ کے لیے کیا نئے کپڑے کی دو چادریں نہیں مل سکتیں؟ اب تو اللہ کی رحمت ہے اور اسلام کے پاس بڑی طاقت ہے۔ آپ نے فرمایا: بیٹی عائشہ! نئے کپڑوں کی زندہ آدمی کو زیادہ ضرورت ہے، اُمتِ مصطفیٰ ﷺ کے کسی غریب کو نئی چادریں دے دو، اس کا سال گزر جائے گا۔ مردہ آدمی کو نئے، پُرانے سے کیا تعلق ہے؟ اگر اللہ نے معاف کر دیا تو یہ پُرانی چادریں کافی ہیں اور اگر معاف نہ کیا تو کیا نئی چادریں مجھے چھڑا ئیں گی؟

[كنز العمال، حديث: ۳۵۷۱۸، وفاتُہ(أبي بكر) رضی اللہ عنہ]

[1] [سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۶۰]

کتنے شہید ہوتے ہیں جو جل جاتے ہیں یا ٹینکوں کے نیچے آجاتے ہیں، بموں سے اُڑ جاتے ہیں، ان کے وجود کا ذرہ بھی نہیں ملتا، لیکن وہ جنتوں میں ہیں۔ اللہ پاک نے ان کی ارواح کو جنتوں میں رکھا ہوا ہے اور وہ جنتوں کے اندر سیر کر رہے ہیں، رزق بھی کھا رہے ہیں اور اللہ فرمارہے کہ میرے ان شہیدوں کو مردہ بھی نہ کہو، حالانکہ ہمیں ان کی لاش بھی نہیں ملی، کسی نے جنازہ بھی نہیں پڑھا، خدا فرماتا ہے: تمہیں پتہ نہ ہو، لیکن میں تو جانتا ہوں۔ میرے راستہ میں شہید ہوا ہے، وہ جنت میں ہے۔ لیکن ہم بزرگوں کی مزارات پر سونا چاندی لگا رہے ہیں۔ اگر کوئی آدمی سمجھائے تو کہتے ہیں کہ دیکھیں! یہ وہابی اللہ والوں کے منکر ہیں، اللہ کے اولیاء کو نہیں مانتے، ان کو ولیوں کے روضے سے تکلیف ہوتی ہے۔ خدا کے بندے! روضے سے تکلیف نہیں ہوتی، بلکہ تمہارے غیر شرعی کاموں سے تکلیف ہوتی ہے۔ اگر یہ باتیں دین میں شامل ہوتیں، دین کا حصہ ہوتیں تو کم از کم ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے مزار سب سے پہلے بنتے۔ اس لیے دین کو سمجھا کرو اور اللہ سے دعا کرو کہ اللہ ہمیں ہدایت دے۔ کتنے قبرستان ایسے ہیں، اللہ جانتے ہیں ان میں کتنے اللہ کے اولیاء ہیں، کتنے اللہ کے مقبول ترین بندے ہیں، لیکن ان قبروں پر جانے والا کوئی نہیں۔ جہاں کوئی رونق نہیں ہے، اس پر کوئی فاتحہ پڑھنے والا نہیں ہے، ان پر ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَادَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ إِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ'' کہنے والا نہیں ہے، ان کے لئے کوئی دعائے مغفرت کرنے والا نہیں ہے، لیکن جہاں رونق ہے وہاں ہم کھڑے ہیں، وہ رونق چاہے قبر پر ہو یا لکڑی کے تعزیے پر ہو، ہم وہاں کھڑے ہیں۔ پہلے زمانے میں لوگ روضے پر جاتے تھے اور تعزیہ ایسا روضہ ہے جو ہمارے پاس چل کر آتا ہے۔ دعا مانگو کہ اللہ ہدایت دے اور ان کو صراطِ مستقیم نظر آجائے۔

بنی اسرائیل کے مقتول کا قصہ:

بہرحال بنی اسرائیل نے گائے کو ذبح کر کے اس کا ٹکڑا مردے کو لگایا تو وہ زندہ ہو گیا۔ اس سے پوچھا کہ تجھ کو کس نے قتل کیا؟ اس نے کہا کہ مجھے میرے بھتیجے نے قتل کیا ہے۔ یہ کہنے کے بعد وہ دوبارہ مر گیا تو انہوں نے قاتل کو پکڑ لیا اور وہ مال سے بھی محروم ہو گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱۰۸/۱، البقرۃ: الآیۃ: ۶۷، ذِكْرُ بَسْطِ الْقِصَّةِ]

اس لئے آج تک یہ مسئلہ چلا آرہا ہے کہ قاتل وارث نہیں بنتا ہے، جیسے مسلمان کا کافر وارث نہیں بنتا۔

﴿لَا فَارِضٌ﴾ یعنی بوڑھی نہ ہو، ﴿وَلَا بِكْرٌ﴾ اور چھوٹی بھی نہ ہو، ﴿عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ متوسط ادھیڑ عمر ہو۔

﴿صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا﴾ زرد رنگ کی گائے ہو، اور اس کا رنگ بالکل صاف ہو۔ ﴿تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ﴾ دیکھنے والوں کو بھلی لگے۔ ﴿لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ﴾ ایسی گائے نہ ہو کہ جس کو محنت اور مشقت نے کمزور کر دیا ہو، یعنی ہل چلانے، پانی نکالنے والی نہ ہو۔ ﴿مُسَلَّمَةٌ﴾ جس کے اندر کسی قسم کا عیب بھی نہ ہو، یعنی لنگڑی، اندھی، کانی نہ ہو۔ ﴿لَّا شِيَةَ فِيْهَا﴾ بعض نے کہا کہ اس کے اندر کوئی سفیدی کا ٹکڑا بھی نہ ہو، ایک رنگ ہو۔ ﴿اِنْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ اگر وہ قوم ان شاء اللہ نہ کہتی تو ساری زندگی ڈھونڈتے رہتے، لیکن وہ گائے نہ ملتی۔ جب انہوں نے اللہ کا نام لیا تو ان کا راستہ آسان ہو گیا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس قسم کی گائے ایک بڑھیا کے پاس تھی اور اس بڑھیا کے یتیم بچے تھے، وہی ان کی نگرانی کرنے والے تھے۔ جب اس بڑھیا کو پتہ چلا کہ اس گائے کے علاوہ ان کا کام نہیں بنتا تو اس نے قیمت بڑھانی شروع کر دی، تاکہ میرے غریب بچوں کو بھلا ہو جائے۔ قوم موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں آئی کہ ہم نے گائے تو ڈھونڈ نکالی ہے، لیکن وہ بڑھیا بہت زیادہ قیمت مانگتی ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ نے تو تمہیں ایک گائے کا حکم دیا تھا، لیکن تم خود اپنے اوپر سختی کرتے گئے، اب اس کے علاوہ کوئی حل نہیں کہ اس کو راضی کرو اور اس سے گائے خریدو۔ انہوں نے اس سے خرید کر گائے کو ذبح کیا۔ اس کی ایک ہڈی لے کر مقتول کو لگائی تو اللہ نے اس کی روح لوٹا دی تو اس نے اپنا قاتل بتلا دیا۔

حضرت محمد بن جریر رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قصہ اس طرح نقل فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک بوڑھا آدمی تھا، وہ بہت مال رکھتا تھا اور اس کے بھائی کی اولاد غریب تھی، ان کے پاس مال نہیں تھا اور اس بوڑھے کی بھی کوئی اولاد نہیں تھی، اس کے وہ بھتیجے ہی اس کے وارث تھے۔ انہوں نے یہ تمنا کی کہ ہمارا چچا مر جائے، تاکہ ہم اس کے مال کے وارث بنیں۔ جب اس بوڑھے پر زندگی دراز ہو گئی اور موت کو دیر ہو گئی تو شیطان نے ان لڑکوں کے دماغ میں یہ بات ڈال دی کہ تم اپنے چچا کو قتل کر دو اور اس کے مال کے جلدی وارث بن جاؤ اور جس شہر کے تم نہیں ہو، وہاں اپنے چچا کی لاش ڈال کر اس کی دیت کے حقدار بھی بن جاؤ، تمہیں دونوں طرف فائدہ ہو جائے گا۔

وہاں دو شہر تھے، ایک شہر میں یہ رہتے تھے اور دوسرا شہر علیحدہ تھا۔ اور ان کا رواج تھا کہ کوئی آدمی قتل ہو گیا اور قتل ہونے کے بعد اس کی لاش دو شہروں کے درمیان پڑی ہوئی مل گئی تو پیمائش کرو، جس بستی کو اس مقتول کی لاش

سے زیادہ قربت ہو، وہ بستی والے دیت ادا کریں۔ یہ ان کا آپس میں قانون بنا ہوا تھا۔

جب ان کے دماغ میں شیطان نے یہ بات مزین کردی اور کافی دیر ہوگئی ان کے چچا پر موت نہ آئی تو انہوں نے اپنے چچا کو قتل کر دیا اور اس کے بعد دوسرے شہر کے بڑے دروازہ پر ڈال دیا۔ جب صبح ہوئی تو مقتول کے بھتیجے اس بستی اور شہر والوں کے پاس مدعی بن کر آگئے کہ ہمارے چچا کی لاش تمہارے دروازے پر ملی ہے، لہٰذا تم ہمیں دیت ادا کرو۔ اس شہر والوں نے کہا کہ ہم قسم کھاتے ہیں کہ نہ تو ہم نے قتل کیا ہے اور نہ ہم جانتے ہیں کہ قاتل کون ہے اور نہ ہم نے اپنے شہر کا دروازہ کھولا ہے۔ لاش باہر پڑی ہوئی ہے تو ہم نے کیسے قتل کیا ہے؟

اس کے بعد وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ ہم نے تو اپنے چچا کی لاش ان کے دروازے پر پائی ہے اور انہوں نے قسم کھالی ہے کہ ہم نے نہیں کیا اور نہ ہم نے دروازہ کھولا ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی دے کر اُتارا۔ اللہ نے فرمایا کہ آپ ان کو حکم کریں کہ ایک گائے کو ذبح کریں اور اس کے گوشت کا ٹکڑا اس مقتول کو لگائیں۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی بہت سارا مال رکھتا تھا اور اس کی ایک لڑکی تھی، اس کے بھتیجے نے آکر رشتہ مانگا تو اس نے کہا کہ تم غریب ہو، میں تم کو رشتہ نہیں دیتا۔ اس وجہ سے اس جوان کو غصہ آیا، اس نے کہا کہ میں اپنے چچا کو قتل کردوں گا اور اس کا مال بھی لے لوں گا اور پھر جب میرے چچا کی بیٹی اکیلی ہوگی تو مجبوراً مجھ سے شادی بھی کرے گی، میں اس سے نکاح کروں گا اور پھر چچا کا مدعی بن کر دیت کے پیسے بھی لے لوں گا۔

قبائل بنو اسرائیل میں تاجروں کا ایک وفد مال بیچنے کے لئے آیا اور یہ لڑکا اپنے چچا کے پاس آیا اور کہنے لگا: تم مہربانی کرو، میرے ساتھ چلو، میں ان سے کچھ سامان خریدتا ہوں۔ تم بڑے آدمی ہو، تم کو دیکھ کر مجھے بھی سامان مل جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ اس کے ذریعے میں تجارت کرلوں اور مجھے بھی پیسہ جائے۔ وہ ساتھ چل پڑا۔ جب وہ قبیلے میں پہنچے تو اس نوجوان نے چچا کو قتل کر دیا اور گھر واپس آگیا۔

جب صبح ہوئی تو وہ بہانہ بنا کر اس کا پتہ کرنے کے لئے گیا کہ میرا چچا کہاں ہے؟ گویا کہ اس کو پتہ ہی نہیں ہے، حالانکہ خود قتل کر چکا تھا۔ جب اس قبیلے میں پہنچا تو دیکھا کہ لوگ اکٹھے ہیں، کہنے لگا کہ تم نے میرے چچا کو قتل کر ڈالا ہے، دیت ادا کرو۔ اس کے بعد رونا شروع کر دیا اور مٹی اُٹھا کر اپنے سر میں ڈالتا اور کہتا کہ ہائے! میرا چچا مر گیا،

ہائے! میرا چچا قتل ہو گیا، میں تو بالکل یتیم ہو گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۸، ۱۰۹، البقرۃ: الآیۃ: ۶۷، ذکر بسط القصۃ]

شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کے ذمہ دار:

تو عام عادت یہی ہے کہ جو لوگ زیادہ شور کرتے ہیں اصل قاتل وہی ہوتے ہیں، جیسے قاتلینِ حسین۔ اور یہ بات نہیں کہ میں الزاماً ان پر کہہ رہا ہوں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو انہی لوگوں نے خط لکھے تھے، ان کے مخالفوں نے تو نہیں لکھے تھے کہ آپ آجائیں، ہم آپ کی بیعت کریں گے، یزید کی بیعت توڑ دیں گے، ہم یزید کو امیر المومنین ماننے پر تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اڑھائی سو خط لکھا اور وہ خط بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔

جب اتنے زیادہ خطوط آگئے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جو مکہ میں بڑی شان والے صحابہ اور تابعین موجود تھے، ان سے مشورہ کیا کہ میں کیا کروں؟ ان سب نے مشورہ دیا کہ آپ مہربانی کر کے مکہ نہ چھوڑیں۔ تمام صحابہ اور تابعین نے یہ رائے دی کہ آپ اہل بیت رسول ہیں، نواسۂ رسول ہیں اور یہ جو کوفے کے لوگ آپ کو خط لکھ رہے ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے، کوفے والے لوگ مکار، غدار ہیں، ان کے خطوط کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

جب تمام لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مکہ نہ چھوڑنے کا مشورہ دیا تو حضرت حسین نے فرمایا: تم ٹھیک مشورہ دیتے ہو، تم میری محبت کی وجہ سے کہتے ہو کہ میں مکہ سے باہر نہ جاؤں کہ کہیں میرے ساتھ دھوکہ نہ ہو جائے، لیکن اللہ نے مجھے قیامت میں پکڑ لیا کہ اڑھائی سو خطوط لکھ کر تمہیں بلایا کہ ہم آپ کی بیعت کریں گے تو میں کیا جواب دوں گا؟ تو ان کے خطوط لکھنے پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ آمادہ ہوئے تو ان کو مشورہ دیا گیا کہ آپ خود نہ جائیں، بلکہ ایک وفد بھیج دیں۔ ان کے ساتھ دیکھیں کیا معاملہ ہوتا ہے؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ اور ان کے فرزندان کو بھیجا۔ جب وہ پہنچے تو سب لوگوں نے ان کی بیعت کر لی۔

انہوں نے اطلاع بھیجی کہ حضرت! یہاں تو ساری مخلوق آپ کا انتظار کر رہی ہے، ایک رات میں اتنے ہزار لوگوں نے میری بیعت کی ہے۔ جب وہ اطلاع حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ملی تو آپ مکہ سے چل پڑے۔ ادھر انہوں نے حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ اور ان کے فرزندوں کو قتل کر دیا۔ اصل بلانے والے، دعوت دینے والے اور تفرقہ ڈالنے والے یہی تھے، قتل کرنے کے اسباب مہیا کرنے والے بھی یہی تھے۔ ٹھیک ہے کہ قاتل شمر بن گیا، ابن زیاد بن گیا، لیکن قتل کا اصل ذریعہ بننے والے یہی تھے۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ میں بیٹھے رہتے تو دنیا کی کوئی طاقت آ کر

ان کو قتل نہیں کر سکتی تھی۔

تتمہ واقعہ مقتول:

موسیٰ علیہ السلام کے پاس جب مقدمہ پہنچا تو آپ نے فرمایا: دیت تو ادا کرنی ہوگی۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے موسیٰ! آپ اللہ کے رسول ہیں، مہربانی کریں، اللہ سے دعا مانگیں، اللہ ہماری مشکل حل کرے، قاتل کا پتہ چل جائے اور اسی کو پکڑا جائے۔ اس آدمی کی دیت ادا کرنا ہمارے لیے کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے، ہم تو پورے شہر والے لوگ ہیں، اگر دو دو روپے بھی چندہ کریں تو دیت ادا ہو جائے گی، لیکن ساری زندگی ہم پر طعنہ تو رہے گا کہ ایک بوڑھے آدمی کو بلاوجہ انہوں نے قتل کر دیا تھا۔ اس لیے آپ اللہ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس قضیہ کا حل فرمائیں اور جو صحیح قاتل ہے، وہ واضح ہو جائے۔ اللہ پاک نے فرمایا:

﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ [البقرۃ:72]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ نے حکم دیا ہے کہ گائے ذبح کرو۔ وہ کہنے لگے کہ حضرت! ہم تو قاتل کے بارے میں پوچھتے ہیں اور آپ ہمیں کہتے ہیں کہ گائے ذبح کرو۔ گائے ذبح کرنے کا بھلا قاتل سے کیا تعلق ہے؟ آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں کہ میں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جو جہالت کرنے والے ہیں، یعنی استہزاء کرنا تو جاہلوں کا کام ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ اس بات کو پیش کر دیتے جو اُن کو حکم ملا تھا اور گائے ذبح کر دیتے تو وہ گائے ان کے لئے کافی ہو جاتی، یعنی کوئی گائے بھی ذبح کر دیتے، کیونکہ "بقرۃً" نکرہ تنوین کے ساتھ تھا کہ کوئی سی گائے ذبح کر لو، لیکن ان بدبختوں نے اپنے اوپر خود سختی کر لی۔ اس لئے شریعت کا حکم ہے کہ جو کام اللہ پاک حکم فرما دیں، بس آدمی اس کو اپنی طاقت کے مطابق ادا کر دے، اس کی باریکیوں میں نہ پڑے۔ اگر باریکیوں میں پڑے گا تو لازمی بات ہے کہ سختی ہوگی۔

مفسرین رحمہم اللہ فرماتے ہیں: "فَارِضٌ" کا معنی ہے کہ ایسی بوڑھی گائے جو بالکل ولادت کے قابل نہ رہے۔ "بِكْرٌ" اس جانور کو کہتے ہیں کہ جس جانور کا ایک بچہ ہو، یعنی جانور ابھی بالکل جوان ہو۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ "عَوَانٌ" اس کو کہتے ہیں کہ جو آدمی عمر کو پہنچ چکی ہو، یعنی اس کی اولاد بھی ہو اور اس کی اولاد کی بھی اولاد ہو چکی ہو۔ بنی اسرائیل

گائے کا رنگ پوچھنے لگے تو فرمایا: زرد کھلا ہوا رنگ ہو، دیکھنے والوں کو اچھا لگے۔ ایسی گائے تلاش کرنے لگے تو ان کو ایسی گائے نہ ملی۔

اس زمانے میں ایک لڑکا تھا جو اپنے والدین کا بڑا فرمانبردار تھا۔ ایک دن اس کے والد سوئے ہوئے تھے اور سیف (الماری) کی چابیاں باپ کے سرہانے تھیں۔ ایک تاجر جو موتی بیچ رہا تھا، وہ گزرا، اس نے کہا کہ یہ موتی ہیں، میں ان کو ستر ہزار میں بیچتا ہوں، کیا تم خریدو گے؟ اس نے کہا کہ میں خریدنے کے لئے تیار ہوں، لیکن میرا باپ سویا ہوا ہے اور چابی ان کے سرہانے کے نیچے ہے، جب وہ اٹھیں گے تو الماری کھول کر پیسے نکالیں گے۔ تاجر نے کہا: مجھے جلدی ہے۔ لڑکے نے کہا: تم ٹھہر جاؤ، ستر ہزار کا اسی ہزار دوں گا۔ تاجر نے کہا کہ نہیں، مجھے بڑی جلدی ہے، تم خریدتے ہو تو باپ کو اٹھا دو، میں تمہیں ساٹھ ہزار میں دیتا ہوں۔ اس نے کہا: میں باپ کی نیند نہیں خراب کرتا۔ تاجر نے کہا: اچھا پچاس ہزار دے دو۔ اس طرح کرتے کرتے اس نے کہا: مجھے تیس ہزار دے دو۔ اب ستر ہزار والا سودا تیس ہزار روپے میں مل رہا ہے صرف اتنی دیر میں۔ لیکن اس نے کہا: میں باپ کو نہیں اٹھاتا۔ تم ٹھہر جاؤ، میرا باپ نیند سے اٹھے گا، میں تمہیں اسی کی بجائے لاکھ دے دوں گا، لیکن میں اپنے باپ کی نیند نہیں خراب کرنا چاہتا۔ میرا والد سویا ہوا ہے، میں اپنے باپ کو کیوں پریشان کروں؟ اس نے کہا: مجھے جلدی ہے۔ تو لڑکے نے کہا: میں سودا چھوڑ سکتا ہوں، لیکن اپنے باپ کے آرام میں خلل نہیں ڈال سکتا۔ بہرحال وہ چلا گیا، سودا نہ ہو سکا۔

اللہ تعالیٰ نے والدین کی فرمانبرداری کے صلہ میں یہ گائے جو اس کے پاس تھی، تو بنی اسرائیل وہ گائے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے دروازے پر آ گئے کہ ہمیں یہ گائے چاہیے۔ اللہ نے اس کو یوں بدلہ دیا کہ اگر تم نے اپنے والدین کی فرمانبرداری کی ہے تو میرے خزانے میں کون سی کمی ہے۔

ایک نافرمان بیٹے کا واقعہ:

ایک بہت بڑے عالم تھے، اپنے بیٹے پر ناراض تھے، کیونکہ وہ نافرمان تھا۔ باپ بڑے متقی، بڑے پرہیزگار، بڑی عظمت والے تھے، لیکن خدا کی شان کہ بیٹا نافرمان ہے۔ نافرمانی میں اتنی حد کر دی کہ ایک چور کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔ اس چور نے سامان چرایا اور لڑکے نے وہ بریف کیس لے کر اپنے گھر میں رکھ دیا۔ اور پولیس کو اطلاع دے دی کہ میرا باپ جس کو اتنا بڑا عالم سمجھتے ہو وہ تو چوروں کا مال گھر میں رکھتا ہے...... اس سے بڑی کوئی دشمنی ہو سکتی ہے کہ بیٹا اپنے باپ پر چوری کا الزام لگا کر پولیس کو رپورٹ کر دے!؟...... بہرحال پولیس نے آ کر ان

کے گھر کو گھیر لیا...... میرے والد صاحب کو انہوں نے خود یہ واقعہ سنایا...... جب پولیس آئی تو میں نے دروازے پر آ کر پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کے گھر میں چوری کا مال ہے اور یہ خانہ تلاشی کے وارنٹ ہیں، ہم نے تلاشی لینی ہے۔ عالم نے کہا کہ اتنی اجازت دے دو کہ میں اپنی عورتوں کو ایک طرف پردے میں کر دوں۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ فرماتے ہیں: میں تو حیران ہو گیا کہ میرے گھر میں چوری کا مال؟ پھر کہا کہ یا اللہ! اس داڑھی کو اس عمر میں رُسوا نہ کرنا کہ ساری زندگی تیرا قرآن وحدیث پڑھاتا رہا، منہ کالا تو نہ کروں۔ اس کے بعد میں نے ان کو کہا: آ جاؤ۔ سارا گھر انہوں نے چھان مارا، لیکن وہ صندوق ان کو نظر نہ آیا۔ ڈھونڈتے رہے، لیکن نہ ملا، کیونکہ اللہ والوں کی اللہ مدد کرتے ہیں۔

بزرگ کا مقولہ ''اللہ کا فضل ہو گیا'' واقعہ:

ہمارے بھی ایک بزرگ تھے۔ فوت ہو گئے۔ وہ ہر بات میں کہتے تھے کہ ''اللہ کا فضل ہو گیا''۔ صبح تہجد کی نماز کے لئے وہ اُٹھے اور تہجد شروع کرنے کا ارادہ کیا تو چور اندر آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ تم کون ہو؟ چور جانتے تھے کہ حضرت کے پاس ایک چھوٹی سی صندوق ہے جس کے اندر طالبوں کے پیسے ہوتے تھے، اس کو اُٹھانے کے لیے آئے تھے۔ چوروں نے کہا کہ زیادہ بات نہ کرنا، ہم نے صندوق اُٹھانی ہے اور اس سے پیسے لینے ہیں اور چپ کر کے چلے جائیں گے۔ اگر زیادہ بات کرو گے تو ایک ڈنڈا ماریں گے اور تمہارا کام ہو جائے گا۔ بزرگ نے کہا کہ میں اپنی تہجد پڑھتا ہوں، اللہ کے فضل سے تم پیسے نہیں لے جا سکتے۔ ویسے میں اپنی نماز پڑھتا ہوں، اللہ کے فضل سے تم لے جاؤ۔ انہوں نے اپنی نماز شروع کر دی۔ چور اس تالے کو توڑ رہے ہیں اور زور لگا رہے ہیں، مگر تالا کھلتا نہیں ہے، حالانکہ کمزور سا تالا تھا۔ حضرت نے دو رکعت پڑھ کر پوچھا کہ کھل گیا؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ فرمایا: اللہ کے فضل سے تم مال نہیں اُٹھا سکتے ہو، ویسے تمہاری مرضی ہے تم پھر کوشش کرو، میں نماز پڑھتا ہوں۔ وہ چور صبح تک زور لگاتے رہے، حتیٰ کہ بھاگ گئے۔

صبح جب حضرت نماز کے لئے آئے تو کہنے لگے: اللہ کے فضل سے اللہ کا غضب ہو گیا۔ رات چور آ گئے تھے اور طالبوں کا مال لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے ان کو کہا کہ اللہ کے فضل سے تم لے کر نہیں جا سکتے۔ انہوں نے زور بڑا لگایا، لیکن نہیں لے جا سکے۔ اللہ کے فضل سے میں نے ان کو پہچان بھی لیا، لیکن اللہ کے فضل سے بتاؤں گا بھی نہیں۔

وہ فوت ہو گئے ہیں، بہت بڑے اللہ والے تھے، ساری زندگی قرآن وحدیث پڑھاتے ہوئے گزر گئی۔

ان کے تقویٰ کا یہ عالم تھا (میرے استاد کے استاد تھے) اس زمانے میں مٹی کے دیئے بنے ہوتے تھے، ان میں تیل ڈال کر کپاس کا فیتہ بنا کر اس میں رکھ دیتے تھے، اگر کوئی آتا تو حضرت فرماتے کہ میرے ملنے کے لیے آئے ہو یا مدرسے کے کام کے لیے؟ اگر آنے والا کہتا کہ آپ سے ملنے آیا ہوں تو فرماتے: میں یہ دیا بجھا دوں، کیونکہ یہ مدرسے کے پیسے سے جل رہا ہے۔ اس کی روشنی میں اگر تم سے بات کروں تو قیامت میں کیا جواب دوں گا؟

بہر حال وہ عالم فرمانے لگے کہ پولیس والے آئے اور تلاشی لی۔ ان کو سامان نہ ملا تو چلے گئے۔ حضرت جب غصہ میں آئے تو آکر عاق نامہ لکھا کہ میں اپنے بیٹے کو جائیداد سے محروم کرتا ہوں، عاق کرتا ہوں اور علماء سے اس پر دستخط لئے۔ اس ضمن میں والد صاحب بھی دستخط کرانے کے لئے آئے۔ آپ پڑھ لیں اور دستخط کر دیں۔ جب میرے ساتھ اتنی زیادتی کی ہے تو میں کیا کروں؟ میں ایسی اولاد کو عاق کرنا چاہتا ہوں۔

والد صاحب کو سارا واقعہ سنایا تو والد صاحب نے فرمایا: گزارش یہ ہے کہ علماء نے دستخط کر دیئے ہیں، لیکن میں دستخط نہیں کرتا۔ انہوں نے پوچھا: کیا بات ہے؟ والد صاحب نے فرمایا: یہ بچہ آپ کے گھر میں اور آپ کے نطفہ سے پیدا ہوا ہے۔ کہنے لگے کہ یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ والد صاحب نے فرمایا: پھر اس کو معاف کر دو۔ اللہ نے ہمارے کتنے بڑے گناہ معاف کر دیئے ہیں، تم بھی اس کو معاف کر دو، وگرنہ ہمیشہ کے لئے برباد ہو جائے گا اور نسل تیری ختم ہو جائے گی۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ وہ ناراض ہو کر چلے گئے۔

کچھ عرصہ کے بعد آئے۔ والد صاحب کو مٹھائی دی اور کہا کہ آپ نے مجھے بڑا اچھا مشورہ دیا تھا۔ میرا بیٹا ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں چلا گیا تھا۔ میں یہاں سے گیا اور اس کے بیوی، بچوں کے لیے کپڑے بھی لے گیا اور اس کو معاف بھی کر دیا۔ اب الحمدللہ! بیٹا واپس بھی آ گیا ہے، وہ عالم بھی بن گیا ہے اور فلاں جگہ پر قرآن وحدیث کا درس دے رہا ہے۔ والد صاحب نے فرمایا: اگر تم اس کو اس وقت محروم کر دیتے تو وہ اور باغی ہو جاتا اور دین چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ فرمایا: اسی لیے تو آیا ہوں کہ آپ کو مٹھائی کھلاؤں کہ میرا بیٹا ٹھیک ہو گیا ہے۔

اس لیے اپنی اولاد کو بددعا بھی نہ دینا، کچھ بھی ہو جائے، ان کو بددعا نہ دو اور ان کو عاق بھی نہ کرو، انہیں دل سے معاف کر دو کہ اولاد بُری ہے، جیسے ہے، میں اس کو اللہ کے معاف کرتا ہوں۔ اے اللہ! ان کو صالح بنا دے۔ تُو دلوں کو پھیرنے والا ہے، تُو قادر ہے، ان کے دلوں کو پھیر دے اور ان کو ہمارا فرمانبردار بنا دے، اطاعت گزار بنا دے۔ ان کو شرارت کی بجائے شرافت نصیب فرما دے۔ بے حیائی کے بجائے حیاء نصیب فرما دے۔ ان کے تمام امراض دور

کردے۔ دعا کرتے رہو کہ رحمت کی گھڑی لگ جائے گی اور اللہ کی رحمت سے معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔

اس کو کہا کہ ہمارے ساتھ اس گائے کا سودا کرو۔ اس لڑکے نے کہا: نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس کو لے کر آئے اور کہا کہ ہم نے اس لڑکے کو بڑے پیسے دیئے ہیں، لیکن یہ گائے نہیں دیتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ان کو گائے کیوں نہیں دیتے؟ اس نے کہا کہ آپ کا حکم علیحدہ بات ہے، باقی وہ میرا مال ہے اور میری مرضی ہے کہ میں بیچوں یا نہ بیچوں۔ آپ نے فرمایا: تم نے بالکل سچ کہا، تمہارا مال ہے اور تمہارا حق ہے تم چاہو بیچ دو، چاہو نہ بیچو۔ موسیٰ نے ان لوگوں کو کہا کہ تم اس کو راضی کرو۔ اس لڑکے نے کہا کہ اگر تم نے مجھ کو راضی کرنا ہے تو مجھے اس کے برابر سونا وزن کر کے دیں تو وہ دس گنا سونے پر راضی ہوا۔ اس گائے کو لے لیا اور اس کو ذبح کر کے دو کندھوں کے درمیان ٹکڑے کو کاٹ کر مردے پر لگایا تو وہ زندہ ہو گیا اور اس نے بتلایا کہ مجھے میرے بھتیجے نے قتل کیا ہے۔ اس کو پکڑا گیا اور اس کو قتل کیا گیا۔

اور ایک دوسری روایت میں کچھ حضرات نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ اس میں باتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ جب ایک قبیلے نے دیکھا کہ بنو اسرائیل کے لوگ زیادہ شرارت کرنے لگے ہیں۔ انہوں نے اپنا علیحدہ ایک شہر بسایا۔ جب شام ہوتی تو کہتے کہ اندر آ جاؤ۔ شام کو گیٹ بند کر دیتے اور جب صبح ہوتی تو ان کا سردار خود جا کر دروازہ کھلواتا۔ اس بھتیجے نے چچا کو قتل کر کے اس کی نعش اسی شہر کے دروازے کے پاس ڈال دی۔ صبح کو جب سردار نے دروازہ کھلوانے کے لیے دیکھا کہ کوئی نہیں تو دروازہ کھلوایا۔

مفسر فرماتے ہیں کہ یہ جو واقعہ نقل کیا ہے، بعض عبیدہ کی روایات میں سے ہے اور بعض ابو العالیہ کی روایات سے ہے اور بعض سدی کی روایات سے ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کس روایت میں قصہ زیادہ ہے اور کسی میں کم ہے اور کسی میں تفصیل ہے، کسی میں ابہام ہے اور کسی میں اجمال ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ یہ جتنا واقعہ ہم نے بیان کیا ہے، یہ کتب بنی اسرائیل سے لیا گیا ہے۔ جس کو کتابوں میں نقل کرنا تو جائز ہے، لیکن ہم اس کی تصدیق بھی نہیں کریں گے اور تکذیب بھی نہیں کریں گے، کیونکہ ہم صرف اتنا لیں گے جو اللہ کے قرآن کے مطابق ہے۔ اگر اللہ کے قرآن کے خلاف ہے تو ہم اس کو چھوڑ دیں گے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۹، ۱۱۰، البقرۃ: الآیۃ: ۶۷، ذِكْرُ بَسْطِ الْقِصَّةِ]

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بنو اسرائیل کی سرکشی اور ان کے کثرتِ سوال کے بارے میں خبر دی ہے کہ بلاوجہ اپنے پیغمبر سے سوال کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے بلاوجہ اپنے نفسوں پر خود تنگی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر

تنگی بڑھادی۔

مصیبت کو اپنی زبان سے نہ مانگو:

قاعدہ ہے کہ جب بندے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ معافی عطا فرماتے ہیں۔ روایات میں آیا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل جانے کے بعد تکلیف ہوئی تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے اس جیل کی زندگی سے نجات عطا فرمائیں، رہائی عطا فرمائیں۔ جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے اللہ نے پیغام دیا کہ آپ نے ہی تو کہا تھا: ﴿رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ﴾ [یوسف: ۳۳] کہ یہ عورتیں مجھے جس طرف بلا رہی ہیں، اس سے زیادہ بہتر ہے کہ آپ مجھے جیل بھیج دیں۔ مجھے جیل منظور ہے، لیکن ان عورتوں کی بات ماننا منظور نہیں ہے۔ اس وقت جیل تم نے خود مانگی تھی تو ہم نے آپ کو مانگی ہوئی چیز دے دی ہے۔ اگر اس وقت تم یہ دعا مانگ لیتے کہ اے اللہ! مجھے عورتوں کے مکر سے بھی بچا اور جیل سے بھی بچا تو ہم دونوں سے بچا لیتے، ہمارے لیے تو کوئی مشکل نہیں تھا۔

[أدب الدنیا والدین، ص: ۳۱۶، ۳۱۷]

اس لیے آدمی زبان سے کبھی ایسے الفاظ نہ کہے، زبان سے ایسے پیچیدہ سوالات کرنے کی کوشش نہ کرے کہ جس کا نتیجہ سختی کی صورت میں برآمد ہو۔

حدود میں احتیاط:

حضور اکرم ﷺ نے وعظ میں ارشاد فرمایا: اگر خدانخواستہ اپنے گھر میں یا کسی عورت کو زنا کرتے ہوئے دیکھے تو ضروری ہے کہ چار گواہ ہوں اور ان چار گواہوں کی شہادت ایسی ہونی چاہیے کہ اس عمل کو اپنی آنکھوں سے دخول کرتے ہوئے دیکھیں۔ یہ نہیں کہ ایک کمرے میں مرد و عورت کھڑے تھے تو اس پر حد جاری ہو جائے۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کو تادیباً تو سزا دی جائے گی کہ ایک غیر محرم عورت کسی دوسرے کے کمرے میں کیوں پائی گئی؟ یا وہ غلط قسم کی باتیں کرتے ہوئے پائے گئے، لیکن ان پر حد جاری نہیں ہوگی۔ حد اس وقت جاری ہوتی ہے جب چار گواہ ایسی بات دیکھیں۔

اس لیے کبھی بھی ایسی بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ کبھی قرآن پاک کا کوئی حکم سنے اور فوراً ......نعوذ باللہ!......اعتراض کر دے کہ یہ بات سمجھ نہیں آتی اور یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ دراصل اللہ تعالیٰ یہ چاہتے

نہیں ہیں کہ اس کے بندوں کو پتھر مار مار کر مارا جائے۔ وہ یہ چاہتے نہیں کہ لوگ فرضی قصے بنالیں اور ایک دوسرے پر حدود اللہ کا اجراء کر دیں۔ اللہ نے جہاں سزا سخت رکھی ہے وہاں ثبوت اس سے بھی زیادہ سخت رکھا ہے کہ کروڑوں لاکھوں میں کوئی ایک آدھا قصہ ثابت ہوگا، وہ نمونہ بن جائے گا اور دنیا خود بخود ڈر جائے گی۔

جیسے ہمارے ہاں...... اللہ معاف فرمائے...... لوگ سر پر قرآن رکھ کر جھوٹی گواہی دے دیتے ہیں۔ آپ کسی کو پانچ سو روپے دے دیں اور جو مرضی آئے، گواہی دلوائیں۔ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہمارے جتنے پولیس اسٹیشن ہیں، ان سب نے اپنے ٹاؤٹ رکھے ہوئے ہوتے ہیں، جو بھی کبھی وقوعہ ہوگا تو وہ اس کی گواہی لکھ دیں گے، ان کو پتہ ہے کہ ہمارا ٹاؤٹ ہے، جو ہم لکھ دیں گے، اس کی گواہی دے دے گا۔ حالانکہ اس گواہ کا نہ اس علاقے سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ اس گواہ کو اس واقعے کا کوئی پتہ ہوتا ہے۔ صرف پولیس نے اپنے اعتماد پر جو بندے رکھے ہوئے ہیں، ان کی گواہی خود بخود لکھ دیتے ہیں کہ یہ واقعہ یوں ہوا ہے۔ اور وہ بے ایمان عدالتوں کے اندر آ کر کہتے ہیں کہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ اللہ کو اپنے بندوں کا پتہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں میرے بندوں کے ایمان کا کیا مقام ہے، اس کے بعد تابعین میں ان کے ایمان کا کیا مقام ہے، اور اسی طرح جب قیامت تک دور چلا جائے گا تو ان کے ایمان کا کیا مقام ہوگا۔ اس لئے اللہ ایسا جامع قانون بناتے ہیں جو ہر دور میں کارگر ہو۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ سزا بہت کم ہو، لیکن ایسی ہو کہ پھر دنیا کے لئے نمونہ اور عبرت بن جائے۔ اس لئے حدود میں اگر تھوڑا سا شبہ بھی ہو جائے تو ساقط ہو جاتی ہیں۔

واقعہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک آدمی نے گواہی دی کہ میں نے اس حالت میں دیکھا ہے کہ عورت نیچے لیٹی ہوئی تھی اور مرد اس کے اوپر لیٹا ہوا تھا اور عورت کی ٹانگیں اوپر یوں کھڑی تھیں جیسے گدھے کے کان کھڑے ہوتے ہیں اور دونوں کی سانس اُکھڑی ہوئی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: دخول دیکھا تھا؟ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تک یہ گواہی نہ ملے تو حد جاری نہیں ہوگی۔

اسی طریقے سے کسی کو کہا جائے کہ قمار (جوا) حرام ہے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں جوا اور قسم کا تھا، اب ہم تو مشینوں سے کھیلتے ہیں، مشینیں فیصلہ کرتی ہیں۔ اس زمانے میں کمپیوٹر ہی نہیں تھا تو یہ جوا نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں جو خنزیر تھا، وہ اب نہیں ہے۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں جو کتا حرام تھا،

اب وہ کتا ہی نہیں۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں جو چیزیں حرام تھیں، وہ اب تو نہیں ہیں۔ یہ اللہ کے قرآن میں اور اللہ کے احکام میں ایسے سوال پیدا کرنے سے اللہ کی طرف سے عذاب آتا ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو حکم دیا ہے کہ عمرہ کرو کہ میقات پر آکر دو رکعت پڑھو، نیت کرو، احرام باندھو اور لبیک کہتے ہوئے کعبہ پاک میں آجاؤ، طواف کرو، دو رکعت پڑھو، صفا اور مروہ کی سعی کرو، بال منڈاؤ اور احرام کھول دو، بس عمرہ پورا ہو گیا۔ اب آدمی کہے کہ میں جب عمرہ کے لیے آؤں تو حرم کے کس دروازے سے داخل ہوں؟ اپنے لیے وہ پریشانی پیدا کر رہا ہے۔ مثلاً وہ دوپہر کو آیا، دھوپ کا وقت ہے، ''باب العمرہ'' سے آیا اور ان کو کہا گیا کہ آپ نے ''باب السلام'' سے داخل ہونا ہے تو اب اس بے چارے نے سامان سر پر رکھا ہوا ہے اور بچوں کو لے کر دھوپ میں جا رہا ہے۔ حالانکہ اسلام نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔

وہ تو ایک واقعہ ہے کہ جب حضور ﷺ داخل ہوئے تھے تو کس دروازے سے داخل ہوئے تھے؟ کوئی ضروری تو نہیں کہ ہم اسی جگہ سے داخل ہوں۔ جس جانب سے آرہے ہو، اس میں داخل ہو جاؤ۔ جہاں سے بھی اللہ نے موقع دیا ہے داخل ہو جاؤ۔ اپنے آپ کو ایک پریشانی میں ہم نے خود ڈالا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے نیت کرنی ہے، وہ کیسے کریں؟ میرا کندھا حجر اسود کے کونے کے بالکل برابر ہو۔ یہ برابر کرتے کرتے اٹھارہ آدمی گر جاتے ہیں اور وہ ڈٹ کر کھڑا ہوا کندھا برابر کر رہا ہے، پیچھے والے اس کو آگے دھکا دے رہے ہیں، وہ پھر واپس آجاتا ہے کہ کندھا تو برابر نہیں ہوا ہے۔ جب میں اشارہ کروں تو میرے ہاتھ کیسے ہوں؟ انگلیاں بند ہوں یا کھلی ہوں؟ انگوٹھا کدھر ہو؟ ہاتھ اوپر ہو یا نیچے ہو؟ اس طرح کھڑا ہے۔ خدا کے بندے! حجر اسود سے شروع کرنا ہے، ادھر اُدھر ہاتھ ہو گیا تو کیا بات ہو گئی؟ مطلب تو یہ ہے کہ اس سے پہلے شروع نہ کرو اور اس کے بعد شروع نہ کرو۔ باقی رہا اشارہ تو وہ بوسے کے قائم مقام ہے۔ دو ہاتھوں سے کرو گے تو الحمدللہ! اور اگر ایک ہاتھ سے کر دو گے تو الحمدللہ! پہلی دفعہ کر دیا یا آخری دفعہ کر دیا۔ درمیان میں بھول گیا، تب بھی کوئی بات نہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

جب اسلام نے ہمیں پریشانیوں میں نہیں ڈالا تو ہم اپنے آپ کو پریشانیوں میں کیوں ڈالیں؟ بعض بے چارے ایک قسم کی چادر چھ، سات گز لمبی لیتے ہیں، اسی کو آدھا نیچے باندھتے ہیں اور اسی کو آدھا اوپر باندھتے ہیں، کسی نے بکسوا لگایا ہے اور کسی نے پن لگائی ہوئی ہے کہ اگر میرا احرام نیچے گر گیا تو عمرہ بھاگ جائے گا۔ یہ سب ہم نے اپنے لیے خود مشکلات پیدا کی ہیں۔

بعض آجاتے ہیں کہ یہ مسئلہ بتلائیں کہ جب ہم احرام باندھیں تو اس میں گرہ لگائیں یا نہ لگائیں۔ خدا کے بندے! چادر ہے، جیسے مرضی آئے باندھ لو۔ دو چادریں باندھنی ہیں، ایک اوپر باندھنی ہے اور نیچے باندھنی ہے، ہاتھ سے باندھ لو۔ گرہ لگا دو یا رسی اوپر ڈال دو، جیسے مرضی آئے کرلو۔ بعض آدمی چادر ایسے باندھتے ہیں کہ جب صفا و مروہ پر دوڑتے ہیں تو آدھے ننگے ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ چادر ایسے باندھ رہا ہے کہ چادر کو گرہ نہ لگے۔ جب گرہ نہیں لگے گی تو آخر وہ کھلے گی۔

یہ وہ چیزیں ہیں کہ ہم اسلام کے اندر خود اپنے لیے مصیبتیں اور مشقتیں پیدا کرتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرائض، واجبات، سنتیں سکھا دیئے تو اب آپ مستحبات پر بھی عمل کرنے کی کوشش کریں۔ ہر چیز آہستہ آہستہ آسان ہوتی چلی جائے گی، ہر چیز آپ کو سمجھ آتی چلی جائے گی۔ اب جب آپ دوبارہ عمرہ کریں گے تو غور کریں کہ میری کوئی سنت تو نہیں چھوٹ گئی، میرا کوئی مستحب امر تو نہیں چھوٹ گیا۔ اگر فرائض اور واجبات پورے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت خوشبو لگانے کا حکم:

بعض لوگ آکر کہتے ہیں کہ اگر ہم نے حجر اسود کو ہاتھ لگا دیا تو بکری پڑ جائے گی، کیونکہ اس کے اوپر خوشبو لگی ہوئی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر تمہیں خوشبو لگی ہوئی نظر آرہی ہے کہ کسی نے تازہ عطر لگایا ہے اور تم نے ہاتھ لگایا تو ہاتھ کو عطر لگ جائے گا تو تم ہاتھ نہ لگاؤ۔ اور اگر ویسے خوشبو آرہی ہے، اور وہاں تو سارا دن لوگ خوشبو لگاتے ہیں اور وہ خوشبوئیں ہمیشہ رہتی ہیں۔ اگر بفرض محال خوشبو لگ بھی جائے تو دھو ڈالو، کیونکہ آپ نے خود تو لگائی نہیں ہے۔

کئی آدمی مسئلہ پوچھنے آجاتے ہیں کہ میں نے احرام باندھا ہوا تھا اور عرفات میں ایک کیڑا جا رہا تھا تو کیا کروں؟ ویسے لوگوں کے سو بکرے جاتے ہیں، ادھر اس کو کیڑے کی فکر لگی ہوئی ہے۔ عمرہ کرنے حرام کے پیسے سے آیا ہوگا اور کیڑے کا مسئلہ پوچھ رہا ہے۔ کتنا اس نے جھوٹ بولا ہوگا اور فارم بھرتے ہوئے اس نے کتنی قسمیں کھائی ہوں گی، اس نے ڈالر لیتے ہوئے کتنے جھوٹ بولے ہوں گے، لیکن کیڑے کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ مر گیا ہے تو مر گیا۔ کچھ نہیں ہوتا۔ ایذاء دینے والی شئے ہے، مر گئی تو مر گئی۔

کیا حرم میں اب بھی شکار ہے؟

مسئلہ یہ ہے کہ احرام میں شکار نہ کھیلو تو کیا کیڑوں مکوڑوں کا کوئی شکار کھیلتا ہے؟ وہ تو ہے شکار، نہ کھیلو۔ اور اگر

آپ اپنا بکرا لے گئے، مرغے لے گئے اور خود ذبح کئے تو کوئی حرام نہیں ہے۔ یہ بھی اس زمانے کے مسئلے تھے کہ جس زمانہ میں یہ جگہ جنگل تھی اور شکار ملتے تھے، اب تو بندے ملتے ہیں، شکار تو نہیں ملتے۔ اب تو اس مسئلے سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میری اتنی عمر گزر گئی ہے، مجھے تو کبھی شکار نہیں ملا، آپ کو کہیں ملا ہو تو ملا ہو۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوفی کا واقعہ:

مسجد الحرام کے اندر بیٹھے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک آدمی نے مسئلہ پوچھا کہ حضرت! آپ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں، آپ میرا ایک مسئلہ حل فرمائیں کہ میں احرام میں تھا، ایک مچھر مجھ پر آ کر بیٹھا، میں نے اس کو مارا تو اس کا خون لگ گیا ہے۔ آپ نے اس کو غور سے دیکھا اور پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟ اس نے کہا: میں کوفہ سے آیا ہوں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خون کر کے اس کو پروا نہیں اور یہاں مچھر کا مسئلہ پوچھنے کے لئے آیا ہے، بڑے شریف لوگ ہیں۔ خدا کے بندے! کچھ بھی نہیں ہوتا، مچھر کا خون لگ گیا، مکھی کا خون لگ گیا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

ہر مسئلے کا جواب ضروری نہیں:

حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے ایک مجلس میں سو مسئلے پوچھے گئے۔ آپ ہر مسئلے کے بعد فرماتے: "لَا أَعْلَمُ" (میں نہیں جانتا، کسی اور سے پوچھو)۔

جو آدمی کہہ دے کہ مجھے نہیں آتا، یہ عالم کی دلیل ہے۔ اور جو ہر مسئلہ بتاتا رہے، یہ جاہل کا کام ہے۔ ہر مسئلہ ذہن میں کیسے مستحضر ہو سکتا ہے؟ انسان ہے کوئی کمپیوٹر تو نہیں ہے۔ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جو ہم روزانہ پوچھے جاتے ہیں، وہ ہمیں یاد ہو جاتے ہیں، کیونکہ مسئلے کو بار بار پھیرا دیا گیا تو یاد ہو گیا اور دماغ میں بیٹھ گیا۔

حضرت ابن جریج روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو حکم دیا گیا کہ کوئی گائے ذبح کر لو۔ لیکن ان لوگوں نے اپنے نفسوں پر خود سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اللہ کی قسم ہے، اگر وہ استثناء نہ کرتے، یعنی لفظ "ان شاء اللہ" نہ کہتے تو قیامت تک ان کو یہ مقصد حاصل نہ ہو سکتا۔ یہ تو جب ان کے منہ سے نکلا: ﴿وَإِنَّآ إِن شَآءَ ٱللَّهُ لَمُهْتَدُونَ﴾ [البقرۃ:۷۰] تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مشکل حل کر دی۔

[الدر المنثور:۱/۱۸۸، البقرۃ: الآیۃ:۷۰]

آپ ان کو کہہ دیں کہ ایسی گائے ہو جو بالکل بوڑھی بھی نہ ہو اور بالکل جوان بھی نہ ہو۔ کیونکہ درمیانی عمر کے بیل کا نمو پورا ہو چکا ہوتا ہے۔ قوت، طاقت اور حسن کے اندر، جیسے جب انسان کی تیس سال کی عمر ہو تو عین شباب ہوتا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ایسی گائے جس کا بچہ اور بچے کا بچہ بھی ہو چکا ہو۔

حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گائے سے مراد جنگلی گائے تھی، جسے ہم نیل گائے کہتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک قول یہ بھی نقل کیا گیا کہ جو آدمی زرد رنگ کا جوتا پہنے تو ہمیشہ اللہ پاک اس کو خوشی میں رکھے گا، جب تک وہ پہنے رکھے گا۔ لیکن اس کی سند کے بارے میں پتہ نہیں ہے کہ سند صحیح ہے یا نہیں۔ چونکہ اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی تو حضور پاک ﷺ کے نعل مبارک کے بارے میں بھی ضرور آتا۔ حالانکہ حضور پاک ﷺ نے کبھی زرد رنگ کا جوتا پابندی کے ساتھ نہیں پہنا۔ عام طور پر مراکش کے لوگ پیلے رنگ کا جوتا پہنتے ہیں۔ دراصل بعض روایات کی نسبت کردی جاتی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، لیکن حقیقتاً وہ قول ان کی ذات تک نہیں پہنچتا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس کے پاؤں یعنی کھر صفراء ہوں۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ اس کے سینگ اور کھر زرد رنگ کے ہونے چاہئیں۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ سیاہ رنگ کی گائے ہو۔ لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے۔

دیکھنے میں سیاہی مائل نظر آئے، جیسے ہمارے ہاں گندم کے کھیت یا گنے کے کھیت ہوتے ہیں۔ اگر بہت زیادہ سبز ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ سیاہی کی طرف مائل ہیں۔ یہاں بھی اصل معنی یہی تھا کہ زرد رنگ ہو، لیکن اتنا گہرا زرد ہو کہ سیاہ نظر آئے۔ اور تورات کے اندر سرخ رنگ کی گائے کا ذکر ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہے، کیونکہ جب قرآن ''صفراء'' کہہ رہا ہے تو تورات اس کے مخالف نہیں ہو سکتی، اتنا گہرا زرد ہو کہ دور سے سرخی کی طرف مائل نظر آئے۔ واللہ اعلم۔

﴿مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا﴾ ایک رنگ کی ہو، اس کے اندر دوسرے رنگ کے داغ نہ ہوں اور کسی قسم کا کوئی عیب نہ ہو۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اتنے بیانات اور اتنے سوالات و جوابات کے بعد انہوں نے محنت و مشقت کے بعد اس کو ذبح کیا۔ اس کے اندر ان کی مذمت کا بیان ہے، کیونکہ یہ بلاوجہ ان کی سرکشی تھی کہ گائے کیسی ہو؟ اس کا رنگ کیسا ہو؟ فلاں کیسا ہو؟ ان کے اسئلہ اور اجوبہ سے نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ وہ ذبح کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ اتنی بڑی قیمت ادا

کر کے ذبح کرنا بڑا مشکل تھا، لیکن ذبح کر ڈالا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پیسوں کے زیادہ ہونے والی بات تو کسی روایت سے ثابت نہیں ہے، البتہ بنی اسرائیل کی کتابوں سے یہ قصے نقل کئے گئے ہیں، جن کے صحیح ہونے کا ہمیں یقین نہیں ہے۔

یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ اس کی قیمت صرف تین دینار تھی۔ اس قول کی سند حضرت عکرمہ رحمہ اللہ تک بہت اچھی ہے۔ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی لازماً یہ اہل کتاب سے نقل کیا ہوگا۔ باقی جو قصے ہیں کہ اتنی اور اتنی قیمت تھی۔ جب یہ واقعات ہوتے ہیں تو کچھ لوگ خود قصے کو بڑھا دیتے ہیں اور اس کے اندر اپنی طرف سے عجیب عجیب باتوں کے اضافے کرتے رہتے ہیں۔ ایک نے اضافہ کیا، پھر دوسرے نے اضافہ کیا، پھر تیسرے نے اضافہ کیا، اس طرح بات بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی، حقیقت اس بات کی کچھ بھی نہیں ہوتی۔

بعض نے فرمایا: وہ اس لئے بھی ذبح نہیں کر رہے تھے، کیونکہ وہ کہہ چکے تھے کہ ہم قاتل نہیں ہیں۔ اگر ہماری جماعت کا کوئی آدمی قاتل نکل آیا تو ہم کتنے شرمندہ اور ذلیل ہوں گے۔ اس لیے سوال بڑھاتے رہو، نہ گائے ملے گی اور نہ ذبح کریں گے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۰، ۱۱۱]

حیوان میں بیع سلم:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان آیات سے جمہور نے یہ مسئلہ لے لیا کہ بیع سلم حیوان کے اندر جائز ہے۔

لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام ثوری رحمہ اللہ کے نزدیک حیوان میں بیع سلم جائز نہیں، کیونکہ حیوان کے احوال کو ضبط کرنا بڑا مشکل ہے۔ حیوان کے اندر بڑی قسمیں ہوتی ہیں، ان کو ضبط کرنا مشکل ہے۔ مثلاً دُبلا، فربہ ہونا وغیرہ۔ اور اس مسئلے کے اندر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیحدہ نہیں ہیں، بلکہ صحابہ میں سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۱]

﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝﴾ [البقرة: ۷۲، ۷۳]

اور جب تم نے ایک شخص کو مار ڈالا تھا، پھر ایک دوسرے پر دھرنے لگے اور اللہ نے ظاہر کرنا تھا جو تم چھپا رہے تھے۔ پھر ہم نے کہا: اس مردہ کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو، اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ تمہیں اپنی قدرت کے نمونے دکھاتا ہے، تاکہ تم غور کرو۔

اس آیت کو مؤخر کیوں کیا گیا؟

یہ آیاتِ مبارکہ سابقہ واقعہ کا تتمہ ہیں۔ اس بات کو پہلے ہونا چاہیے تھا۔ مفسرین کرام نے فرمایا: اس تقدیم و تاخیر میں ایک حکمت ہے، کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے، مخلوق کا کلام نہیں ہے، فصاحت و بلاغت میں دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر ترتیب سے بیان کیا جاتا تو وہ قصہ کا انداز ہو جاتا ہے، جیسے تاریخ کے قصص اور کہانیاں ہوتی ہیں، ان کی ترتیب ہوتی ہے اور قرآن قصے، کہانیوں کی کتاب نہیں ہے، قرآن کا مقصد غافل قوتوں کو جھنجھوڑنا اور جگاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس لئے اس واقعہ کو مقدم و مؤخر بیان کیا کہ ان کو غفلت سے نکالا جائے اور ہر آیت کا ایک علیحدہ فائدہ حاصل ہو۔

علماء نے ایک جواب یہ بھی عطا فرمایا ہے کہ قرآن پاک ایک دفعہ نہیں اُترا، بلکہ تیئس سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا اُترا۔ آیات آیات، سورتیں سورتیں ہو کر نازل ہوئیں، جیسے جیسے بندوں کے اندر سوال و احتیاج پیدا ہوا، ویسے ان پر آیات نازل ہو گئیں۔

جب مدینہ منورہ میں بنی اسرائیل نے اپنی بڑائی کا اظہار کیا کہ ہم اہل کتاب اور اہل علم ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی کہ تم موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے ہو، تمہارے تو باپ دادا کا بھی یہی حال تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام زندہ تھے۔

اس لئے کبھی آیات میں تقدیم اور کبھی تاخیر، کبھی واقعہ، قصہ کا ایک ٹکڑا اور کبھی دوسرا ٹکڑا اور کبھی تیسرا ٹکڑا ذکر کیا۔

اس آیت کے اندر لفظ ''نَفْسًا'' سے اشارہ ہے کہ تم نے ایک محترم شخص کو قتل کیا۔ جیسے تنوین کبھی قلت کا فائدہ دیتی ہے اور کبھی عظمت کا فائدہ دیتی ہے کہ ایک صاحب مال آدمی تھا اور اس کو قتل کرنے والا بھتیجا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو چچا والد ہوتا ہے، ''اَلْعَمُّ صِنْوُ أَبِيهِ'' چچا باپ کی طرح ہوتا ہے، جیسے باپ کا مقام ہے اسی طرح چچا کا مقام ہے تو ضروری تھا کہ چچا کی تم حفاظت کرتے، اس کی خدمت کرتے، نہ کہ اس کو قتل کر ڈالتے۔ پھر تم نے قتل کرنے کے بعد چھپانے کی کوشش کی، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ جس چیز کو تم چھپا رہے ہو، اس کو ظاہر کریں۔ آدمی چاہے سات دروازے بند کر کے گناہ کرے، گناہ چھپتا نہیں، آخر ظاہر ہو جاتا ہے۔

متاخرین علماء نے لکھا ہے کہ خاص طور پر کسی انسان کو قتل کرنا کبھی نہیں چھپتا، دیر سویر ضرور ظاہر ہو جاتا ہے، کیونکہ انسان کی حرمت اتنی بڑی ہے۔ اللہ کے پاک پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ کے کعبہ سے بھی انسان کی حرمت زیادہ ہے۔ جب اتنی بڑی باعظمت چیز کو کوئی قتل کر ڈالے تو یہ چیز چھپتی نہیں۔ سال یا اس سے زیادہ عرصہ کے بعد حقیقت کھل کر رہتی ہے، جیسے کسی شاعر نے کہا:

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

لہو ایک دن بولتا ہے اس کو کھولنے کے لئے۔ یہاں ایک عجیب انداز ہے اللہ نے اس قتل کو کھولنے کے لیے اپنی قدرت کا ایک نرالا انداز دکھلایا۔ فرمایا: ﴿اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ (لگاؤ اس کو اس کا ٹکڑا)۔

گائے کا گوشت کا کونسا حصہ مردے کو لگایا گیا؟

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کی زبان کا ٹکڑا لگا دو۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس کی دم کا ٹکڑا لگاؤ، کیونکہ ہر چیز گل جاتی ہے، لیکن سرین کی ہڈی باقی رہتی ہے۔ قرآن پاک نے کوئی معین نہیں کیا کہ وہ ٹکڑا کون سا تھا۔ جب ٹکڑے کو لگایا گیا تو وہ مقتول کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا: میرا قاتل میرا بھتیجا ہے۔ یہ کہتے ہی وہ مر گیا۔ اللہ نے فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۷۳] اے جاہلو! اللہ تبارک وتعالیٰ اسی طرح مردوں کو زندہ فرما دیں گے جیسے یہ مردہ تمہارے سامنے زندہ ہو گیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سارے مردوں کو کھڑا کر دیں گے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۲]

ایک مردہ گائے کا ٹکڑا ایک مردہ انسان کو لگایا جائے اور وہ بول پڑے اور جہاں ہم نے اپنا ایک عظیم فرشتہ مقرر کیا ہے کہ صور میں پھونکے گا تو تمام ارواح دوڑ کر اپنے اپنے جسد میں پہنچ جائیں گی۔ اس وقت تمہارا زندہ کرنا کون سا مشکل ہے۔

لیکن بعض علماء نے ایک عجیب مثال لکھی ہے کہ گھوڑا، گدھا، خچر، گائے بھینس ان کو باندھ کر کھڑا کر دو۔ جب ان کے سامنے انسان کھاتا، پیتا، چلتا پھرتا ہے، اُٹھتا بیٹھتا ہے تو انسانی حرکتوں کو جانور عجیب انداز سے دیکھتے ہیں کہ یہ کیا کر رہا ہے، کیونکہ شعور حیوانی شعور انسانی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں جزو حیوانی سے جزو انسانی کو زندہ کر دیا۔ حالانکہ حیوان، حیوان ہوتا ہے اور انسان، انسان ہوتا ہے۔ انسان تو اشرف مخلوقات ہے۔ حیوان،

انسان کے عقل وشعور کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس سے ہم نے ایک مردہ کو زندہ کر دیا۔

مشکل واقعات میں خدا کی قدرت کا اظہار:

(واقعہ) ایک بات یہ بھی سمجھ لیں کہ جہاں جہاں تاریخ کے واقعات گزرے ہیں کہ مشکل واقعات پیش آئے تو میرے اللہ کی قدرتیں عجیب عجیب رنگ میں پیش آئیں، کیونکہ کمال قدرت اللہ کے ہاتھ میں ہے، تمام صفاتِ کمال و جلال سے متصف اللہ کی ذات ہے۔

(واقعہ) جب بی بی مریم علیہا السلام پر پوری قوم نے الزام لگا دیا کہ بغیر شادی اور نکاح کے بیٹا ہو گیا تو ...... نعوذ باللہ...... لازمی بات ہے کہ یہ اولاد ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم بھی جھولے میں ہو، چند دن کے بچے ہو، جو عام عادت میں کبھی بولنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اللہ نے حکم دیا کہ تم بولو۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام بول پڑے اور فرمایا: ﴿إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا﴾ [مریم: ۳۰] جب ایک بچہ اس طرح بول پڑا کہ بڑے سے بڑا عقل والا بھی اس طرح بات نہ کر سکے کہ کیا کہہ رہے ہو، میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ کا نبی ہوں، میں برکتوں والا ہوں، میرا وجود اللہ نے سراپا برکت بنا دیا ہے، تم کیا کر رہے ہو؟ تو اللہ نے کیسے بی بی مریم علیہا السلام کی صداقت، ان کی صفائی اور ان کی عصمت کو بیان کیا۔

(واقعہ) اسی طرح جب یوسف علیہ السلام کی عصمت کا وقت آیا، وہاں بھی ایک بچہ بول پڑا۔ اس نے کہا کہ عزیز مصر! تم تو بڑے وزیر ہو بڑے حاکم ہو، رات دن تمہارے سامنے قضایا اور جھگڑے آتے ہیں، اتنی عقل بھی نہیں رکھتے ہو، زلیخا اور یوسف علیہ السلام کا کرتہ دیکھ لو، موقع پر تم آچکے ہو، دونوں کو کوئی لمبا چوڑا وقت تو نہیں ملا کہ وہ اپنا لباس بدل ڈالیں۔ اس لیے دیکھ لو کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹی ہے یا پیچھے سے؟ اگر یوسف علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹی ہے تو ...... نعوذ باللہ! ...... یوسف علیہ السلام کوشش کر رہے ہوں گے اور زلیخا کو پکڑنے کے لیے آگے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اور وہ ان کو ٹالنے کی کوشش کر رہی ہوگی تو صاف ظاہر ہے قمیص آگے سے پھٹے گی۔ اور اگر یوسف علیہ السلام بھاگ رہے ہیں اور وہ پکڑ رہی ہے تو قمیص پیچھے سے پھٹے گی، یہ واضح بات ہے۔ جب قمیص پر نظر ڈالی تو یوسف علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی تھی تو اس نے زلیخا سے کہا: واقعی یہ تمہارا مکر ہے اور عورتوں کا مکر بہت بڑا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کرتی بھی خود ہیں اور الزام بھی خود لگاتی ہیں۔

(واقعہ) ایک عورت کو پیسے دے کر اس بات پر تیار کیا کہ جب موسیٰ علیہ السلام تقریر کے لیے خطبہ دیں تو تم کھڑے ہو کر الزام لگاؤ کہ...... نعوذ باللہ!...... موسیٰ (علیہ السلام) نے میرے ساتھ برا فعل کیا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے خطاب فرمایا تو خدا کی شان ہے کہ آپ زنا کی مذمت بیان فرما رہے تھے کہ اگر زانی محصن یعنی شادی شدہ ہو تو اس کی سزا رجم ہے، سنگسار کر دیا جائے گا۔ اتنے میں قارون کھڑا ہو گیا اور کہا کہ یہ سزا تو بڑی سخت ہے، لیکن اگر خدا نہ کرے، آپ سے بھی یہ جرم ہو جائے تو آپ کو بھی یہی سزا ملے گی؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: بالکل، اللہ کا قانون کسی کے لیے نہیں بدلتا، یہ کوئی بندوں کا قانون تو نہیں ہے کہ بڑا آدمی اس میں شبہ پیدا کر کے اور گواہوں کو توڑ موڑ کر چھوٹ جائے اور غریب بے چارا بغیر جرم کے بھی پڑا رہے۔

ایک اخبار کے اندر میں پڑھ رہا تھا کہ ایک صوبے کی جیلوں کے اندر کئی ہزار آدمی کئی سالوں سے جیل میں پڑے ہیں جن کا جرم بھی کوئی نہیں ہے، انہیں آج عدالت کے سامنے بھی نہیں لایا گیا کہ اس بے چارے کا جرم کیا ہے۔ بعض لوگ ایسے جرائم میں پکڑے گئے کہ جس جرم کے ثابت ہونے کے بعد اس کی سزا چھ ماہ بنتی ہے، لیکن وہ پانچ سال سے جیل میں پڑا ہوا ہے، ابھی تک فیصلہ نہیں ہو رہا۔ اب اس غریب کو کون پوچھے گا اور کون اس کا مقدمہ چلائے گا، کون اس کا وکیل کرے گا اور کیس نکالے گا؟

اس وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ کے قانون کے اندر لچک پیدا ہونے کا کوئی سوال بھی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ تو عورت کھڑی ہو گئی اور کہا کہ دیکھو! یہ بچہ موسیٰ (علیہ السلام) کا ہے، موسیٰ علیہ السلام کو بھی جلال اور غصہ آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ میرا اللہ! اب یہ دشمن اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ تیرے نبی پر لوگوں میں کھڑے ہو کر اتنی بڑی تہمت لگائیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے اس عورت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: بتاؤ۔ اب عورت نے بھی کہا کہ قارون نے پیسے دیئے تھے۔

(واقعہ) فرعون کی لڑکی کی ایک خادمہ تھی جو اس کے بال بنایا کرتی تھی، اس کے ہاتھ سے ایک دن کنگھی گری اور اس کی زبان سے ایسا لفظ نکل گیا جس سے فرعون کی بیٹی کو شبہ ہو گیا۔ اس نے کہا: اچھا! تم فرعون کو خدا نہیں مانتی ہو؟ اس عورت نے کہا: میرا خدا تو خدا ہے، یہ تو بندہ ہے۔ بہر حال لمبا چوڑا واقعہ ہے۔

(واقعہ) اسی طرح اصحاب الاخدود کا واقعہ ہے کہ جب ایک عورت کو آگ میں ڈالنے کی باری آئی تو اس عورت کا ایک چھوٹا بچہ بھی تھا۔ اب لازمی بات ہے اور فطرتِ انسانی ہے کہ عورت کو جب آگ کی طرف لے جا رہے تھے تو اس کے پاؤں کانپ رہے، اس کا بچہ بول پڑا: ماں! گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ پانچ منٹ کی آگ ہے

اور آگے تو جنت ہی جنت ہے، فکر نہ کرو اور آگ میں چھلانگ لگاؤ۔ وہاں بھی اللہ پاک کی قدرت سے ایک چھوٹا بچہ بول پڑا۔

معجزاتِ رسول اکرم ﷺ:

اور کبھی کبھی پتھر بول پڑتے ہیں۔ حضور ﷺ کے ہاتھوں میں کنکریوں نے کلمہ پڑھ لیا، انہوں نے گواہی دی کہ یہ اللہ کے سچے نبی ہیں۔ صحیح مسلم شریف کے اندر واقعہ موجود ہے کہ مکہ میں اس پتھر کو اچھی طرح پہچانتا ہوں، میں ابھی نبی نہیں بنا تھا، یعنی ابھی نبوت بھی نہیں ملی تھی، مگر میں جب وہاں سے گزرتا تھا تو وہ پتھر مجھے سلام کہتا تھا۔

[صحیح مسلم، حدیث:۲۲۷۷]

ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب ہم حضور ﷺ کے ساتھ کبھی کبھی باہر جاتے تھے تو جس پتھر سے گزرتے، وہ سلام کہتا تھا اور جس درخت سے گزرتے، وہ بھی سلام کہتا تھا۔

[کنز العمال، حدیث:۳۵۴۳۶]

اور اسی طرح صحیح احادیث کے اندر موجود ہے، میرے آقا، سرکارِ مدینہ ﷺ کو قضائے حاجت کے لیے ایک جگہ کی ضرورت تھی...... چونکہ حضور ﷺ بڑے شرمیلے اور سراپا حیا تھے اور میدان بالکل دور تک کھلا تھا، کوئی آڑ کی جگہ نہیں تھی کہ وہاں اوٹ میں بیٹھ کر قضائے حاجت کرلیں...... آپ نے ایک صحابی سے فرمایا: وہ دور کھجور کے دو درخت کھڑے ہیں، انہیں جاکر میرا سلام کہو اور ان کو کہو کہ وہ میرے پاس آجائیں۔ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے جاکر سلام کہا تو وہ اسی طرح چلتے ہوئے آئے جس طرح آدمی چل کر آتا ہے اور آکر مل کر کھڑے ہوگئے۔ حضور ﷺ نے ان کی اوٹ میں بیٹھ کر فارغ ہو کر ان کو حکم دیا کہ چلے جاؤ تو وہ چلے گئے۔ [صحیح مسلم، حدیث:۳۰۱۲]

کھجور کی لکڑی کے رونے کا معجزہ:

اسی طرح حضور ﷺ جب مسجد نبوی میں ابتدائے اسلام میں خطبہ دیتے تھے، اس وقت کھجوروں کے ستون تھے اور کھجوروں کی چھڑیاں چھت ڈالی گئی تھیں۔ آپ کے لیے جو منبر بنایا گیا، وہ کھجور کا ایک تنا تھا، اس سے آپ ٹیک لگا کر کھڑے ہوجاتے اور خطبہ فرماتے تھے۔ ایک عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا: یارسول اللہ! میرے پاس جو غلام ہے، وہ لکڑی کا کام جانتا ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے کوئی منبر بنوا لوں، تاکہ آپ آرام سے اس کے اوپر بیٹھ سکیں۔ حضور ﷺ نے اجازت دے دی۔ اس نے تین قدم کا ایک منبر

بنایا، تاکہ حضور ﷺ اس پر بیٹھنا چاہیں تو بیٹھ جائیں اور اگر اس پر کھڑے ہونا چاہیں تو کھڑے ہو جائیں۔ منبر جمعہ والے دن لاکر رکھ دیا گیا۔ حضور ﷺ نے اس پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا اور کھجور کے ستون سے ٹیک نہ لگائی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ اس ستون نے رونا شروع کر دیا۔ لکڑی کا ستون رو رہا ہے، جیسے کوئی بچہ ماں باپ کے فراق و جدائی میں روتا ہے۔ حضور ﷺ اُترے اور اس ستون کو گلے لگایا اور تسلی دی تو اس کا رونا اور بلبلانا ختم ہوا۔ [صحیح البخاری، حدیث:۹۱۸، بَابُ: الْخُطْبَةِ عَلَى الْمِنْبَرِ]

بے جان اشیاء کو نطق دینے کے واقعات:

آپ ﷺ نے اُحد پہاڑ کے متعلق ارشاد فرمایا: یہ وہ پہاڑ ہے جس کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور وہ بھی ہم سے محبت کرتا ہے۔ اب پہاڑ کیسے محبت کرتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس میں ادراک اور شعور پیدا نہ کرے۔

[صحيح البخاري، حديث:۲۰۸۳]

صحیح حدیث مبارک کے اندر ہے کہ حضور ﷺ، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بعض روایات میں ہے کہ جبل اُحد پر تھے تو پہاڑ میں زلزلہ آیا اور اضطراب پیدا ہوا۔ حضور ﷺ نے اس پر اپنا پاؤں مارا اور فرمایا: "اُسْكُنْ" (ٹھہر جاؤ)۔ تمہارے اوپر کوئی نہیں، مگر ایک اللہ کا نبی ہے، ایک صدیق ہے اور ایک شہید ہے۔ پہاڑ نے سمجھ لیا اور چپ ہو گیا۔ [صحیح البخاری، حدیث:۳۶۸۶، بَابُ: مَنَاقِبِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ...]

اللہ تعالیٰ اپنی کمال قدرت کے نمونے دکھاتے ہیں۔ چاہتے ہیں تو آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرما دیتے ہیں، بی بی حواء علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا فرما دیتے ہیں اور چاہتے ہیں تو ملائکہ کو نور سے پیدا فرما دیتے ہیں، چاہتے ہیں تو جنوں کو آگ سے پیدا فرما دیتے ہیں، چاہتے ہیں تو بنو آدم کے توالد و تناسل کو نطفہ منی سے پیدا فرما دیتے ہیں اور کبھی چاہیں گے تو اتنی بڑی مخلوق کو اپنے حکم "کُنْ" سے پیدا فرما دیں گے، جیسے تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت کا اظہار فرمایا ہے۔ اگر ساری دنیا مٹی سے پیدا ہوتی تو دشمنانِ اسلام، فلاسفہ یونان، اور جو لوگ عقلیات کی دنیا سے باہر نہیں نکلتے تو وہ کہتے کہ مٹی کے اندر ایک مادہ ہے، اسی سے ہر چیز پیدا ہوتی ہے۔ اللہ نے فرمایا: میں چاہتا ہوں تو مٹی سے بھی پیدا کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں تو آگ سے بھی پیدا کرتا ہوں، حالانکہ آگ کا کام جلانا ہے، لیکن اللہ نے جنوں کو آگ سے پیدا کر دیا، نور کا کام روشن کرنا ہے، لیکن اللہ نے ملائکہ کو نور سے پیدا فرما دیا۔ ایک نطفہ حقیر، مادہ منویہ ہے، پانی کے چند قطرے ہیں، "ماء مهين" ہے، اس سے اللہ نے اتنی

بڑی مخلوق پیدا فرمادی۔

موت کے مختلف انداز:

جیسے تخلیق کے اسباب مختلف ہیں، اسی طرح موت کے اسباب بھی مختلف ہیں۔ کسی کو بیماری سے موت آگئی، کسی کو دل کے صدمے سے موت آگئی، کسی کو چوٹ لگنے سے موت آگئی، کسی کو زہر سے موت آگئی، کسی کو خسف سے موت آگئی اور کسی کو مسخ سے موت آگئی۔ پھر موت کے مراحل مختلف ہیں تو پھر جلانے کے مراحل بھی مختلف۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کہیں تو مُردوں کو یوں جلایا (زندہ کیا) کہ مردے پر کھڑے ہو جاؤ اور کہو: ''قُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ'' تو مردہ کھڑا ہو گیا۔ یہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے معجزہ دیا تھا۔ اور کہیں اللہ نے یہ انتظام عجیب فرمادیا کہ ایک آدمی قتل ہو کر مرجاتا ہے، اس کے قاتل کی تلاش ہے اور اس کے لئے کئی قدرت کے ذرائع ہو سکتے تھے، وہ قاتل خود بول پڑتا کہ میں قاتل ہوں۔

قیامت میں بھی ایسا واقعہ ہوگا کہ جب گواہ آجائیں گے، جب اللہ کے نبی گواہیاں دے دیں گے، لیکن منکرین پھر بھی نہیں مانیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے ملائکہ سے فرمائیں گے: ﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝۶۵﴾ [یٰس:۶۵] آج کے دن ان کی زبانوں پر مہر لگادو، ان کے منہ بند کردو۔ ان کے ہاتھوں کو ہم حکم دیں گے کہ بولو، گواہی دو۔ ان کے پاؤں کو حکم دیں گے کہ بولو، گواہی دو۔ جو کچھ تم نے دنیا میں کیا تھا، بولو۔ اب ہاتھ بول رہے ہیں، پاؤں بول رہے ہیں، ران بول رہی ہے اور جبڑے بول رہے ہیں، ہر چیز گواہی دے رہی ہے۔ آدمی ہکا بکا کھڑا ہے کہ میرے اعضاء میرے خلاف ہو گئے، دوسروں کی گواہی کا تو میں نے انکار کردیا، اب ان کا کیا کروں۔ اب کافر حیران ہوں گے اور غصہ سے جھنجھلا اٹھیں گے اور کہیں گے: ﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝۲۱﴾ [فصلت:۲۱] اے ہمارے اعضاء! دنیا میں ہم نے تمہیں لذتیں دیں، مزے کرائے اور آج تم ہی ہمارے خلاف گواہی دے رہو؟ تم نے کیوں ہم پر گواہی دی ہے؟ چمڑے کہیں گے: اے بدبخت! کیا کہہ رہے ہو؟ جس اللہ نے زبان اور پتھروں کو بلوادیا، اس نے ہمیں حکم دیا تو ہماری کیا طاقت ہے کہ ہم نہ بولیں؟ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے کمال قدرت کے نظارے دکھلاتے ہیں کہ ہم چاہیں تو تمہاری زبان سے گواہی لے لیں، ہم چاہیں تو تیرے پاؤں بول پڑیں، ہم چاہیں تو تیرے ہاتھ بول پڑیں، ہم چاہیں تو پتھر بول پڑیں، ہم چاہیں تو ایک

مردہ گائے کا ٹکڑا انسان کو لگاؤ تو وہ زندہ ہو جائے۔

زہر آلود گوشت حضور اکرم ﷺ کے سامنے بول پڑا:

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے اندر بڑے بڑے عجائب اور بڑی بڑی حکمتیں رکھی ہیں۔ اس کے اندر ایک اور بھی تنبیہ کی گئی ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل فخر کرتے تھے کہ ہم اہل کتاب ہیں، ہم اہل علم ہیں، ہمارے اندر احبار و رہبان ہیں اور ہم صاحب تورات ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ تمہارے آباؤ اجداد جو اتنے بڑے علم کے دعویدار ہیں، ایک قاتل کو تلاش نہ کر سکے اور ہم نے چاہا تو ایک مردہ جانور سے تلاش کر دیا۔ اللہ کی کمال قدرت دیکھیں! کبھی خود گوشت بول پڑتا ہے اور کبھی گوشت سے وہ مردہ بول پڑتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ جب غزوۂ خیبر پر گئے تو ایک یہودیہ عورت نے بکرے کے چوڑے میں زہر ملا کر اور بھون کو حضور ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا۔ حضور ﷺ نے وہ لقمہ اُٹھایا تو وہ گوشت بول پڑا کہ حضور! مجھے استعمال نہ کریں، میرے اندر تو زہر ہے۔ جب یہودیہ کو پکڑا گیا اور اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا آپ کو کس نے بتلایا؟ فرمایا: یہ گوشت بول رہا ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث:۵۷۷۷، باب ما یُذکر فی سُمّ النبی ﷺ]

دراصل دکھانا یہ ہوتا ہے کہ غافل لوگ سمجھ جائیں، ہر چیز کا مالک اللہ ہے، قدرتِ کاملہ اللہ کو حاصل ہے، تمام احیاء و اماتت کی قدرت اللہ کو ہے۔

﴿فَادّٰرَءْتُمْ﴾ کا معنی و تفسیر:

﴿فَادّٰرَءْتُمْ﴾ کا معنی ہے: "اِخْتَلَفْتُمْ" یعنی اس میں تم نے جھگڑا کیا اور ایک دوسرے پر الزام دھرا۔ ﴿فَادّٰرَءْتُمْ﴾ کی تفسیر امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی "اِخْتَلَفْتُمْ" سے کی ہے اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے اس کا معنی "اخْتَصَمْتُمْ فِیْھَا" سے کیا ہے کہ تم نے اس میں جھگڑا کیا۔

حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا کہ کچھ کہتے تھے: تم نے قتل کیا۔ دوسرے کہتے: نہیں، تم لوگوں نے قتل کیا۔ اصل میں یہ تفسیری الفاظ ہیں، ہر انسان جب تفسیر بیان کرتا ہے تو فطری بات ہے کہ وہ الفاظ اپنے ہی استعمال کرے گا۔

اس لیے بعض نے فرمایا: "اِخْتَلَفْتُمْ" کہ تم نے اختلاف کیا۔ اور بعض نے فرمایا: "اِخْتَصَمْتُمْ" کہ تم نے جھگڑا

کیا۔ بعض نے دوسرا معنی کیا۔ بات ایک ہی جتی ہے، اس میں کوئی تضاد نہیں ہے، صرف ہر انسان کے تفسیری الفاظ کی ادائیگی علیحدہ ہے۔

﴿وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۷۲] حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ علیم بذات الصدور ہیں، اس کے سامنے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ چاہے انسان اس کو کتنا چھپانا چاہے، انسان اس کو دل میں رکھے، دماغ میں رکھے، افکار میں رکھے، وہ اللہ کے آگے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۲، البقرۃ: الآیۃ: ۷۲]

بھلائی اور برائی کبھی پوشیدہ نہیں رہتی:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حبیب بن رافع رحمہ اللہ سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ کوئی آدمی اگر سات گھروں کے اندر چھپ کر بھی بھلائی کا کام کرے تو اللہ اس کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ اور کوئی آدمی برائی کا کام سات گھروں کے اندر چھپ کر کرے تو وہ بھی ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ اس کی تصدیق کے لیے انہوں نے اس آیت مبارکہ کو پڑھا۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی آدمی نے بھلائی کی اور کسی کو پتہ نہ چلا، یعنی عام اصولی طور پر قاعدہ یہ ہے کہ جو آدمی اچھائی کرتا ہے، وہ بھی ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ اور جو برائی کرتا ہے، وہ بھی ظاہر ہو کر رہتی ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ اس کا ترجمہ یوں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اگر چاہیں تو اس کو ظاہر فرما دیتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۲، البقرۃ: الآیۃ: ۷۲]

گوشت کا کون سا حصہ مردہ کو لگایا گیا؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے اس گائے کے تلاش کرنے میں چالیس سال محنت کی اور چالیس سال کے بعد ان کو اس قسم کی گائے ایک آدمی کے پاس ملی اور وہ اس کو کہتے کہ اتنی رقم لے لو اور اتنی رقم لے لو۔ اس نے کہا: نہیں۔ حتیٰ کہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کا چمڑا مجھے اشرفیوں سے بھر کر دے دو، پھر میں گائے دوں گا۔ انہوں نے قیمت ادا کی اور اس گائے کو ذبح کر کے اس کا ٹکڑا مردے کو لگایا تو وہ مقتول کھڑا ہوا کہ اس کی رگوں سے خون بہہ رہا تھا، جیسے قتل کے وقت تھا۔ اور اس نے بتایا۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ ہڈی جو حلقوم کے قریب ہوتی ہے، اس کو لگائی گئی تو وہ بول پڑا اور بعض روایات کے اندر ہے کہ انہوں نے گوشت کا کچھ حصہ مقتول کو لگایا۔

حضرت معمر نے حضرت قتادہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے ران کے حصے کا گوشت لگایا تو وہ کھڑا ہو گیا اور کہا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے گائے کی ران کے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر لگایا تو وہ کھڑا ہو گیا اور بتلایا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دو کندھوں کے درمیان جو گوشت کا ٹکڑا ہے، وہ لگایا تو وہ زندہ ہو گیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تمہیں کس نے قتل کیا ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے میرے بھائی کے بیٹے نے قتل کیا ہے۔

ایک روایت کے اندر یہ آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ تم اس گائے کی ہڈی کا کوئی ٹکڑا لے کر اس مردے کو لگاؤ۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۲، البقرۃ: الآیۃ: ۷۲]

اسرائیلی روایات کا حکم:

پہلے کئی دفعہ عرض کر دیا ہے کہ یہ ساری روایات اسرائیلیہ ہیں۔ ویسے علماء کے نزدیک یہ بات متفق علیہ ہے کہ اسرائیلی روایات کو نقل کرنا جائز ہے، ان کو کتابوں میں نقل کیا جائے گا، تا کہ ہماری معلومات میں کچھ اضافہ ہو جائے، لیکن ان کے بارے میں یہ بھی پکی بات ہے کہ ہم ان کی نہ تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب کر سکتے ہیں۔

بعض علماء کرام نے ایک اچھی تفصیل بیان فرمائی کہ اگر ہمیں اسرائیلی کتابوں میں کوئی روایت ملتی ہے، اب ہم اس کو دیکھیں گے کہ وہ روایت اللہ کے احکام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کو قبول کر لیں گے، کیونکہ اس کی تصدیق قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ اور کتب اسرائیلیہ کی جو روایت مخالف قرآن وسنت ہے، اس کو ہم رد کر دیں گے۔ اور جو کتب اسرائیلیہ کی روایت ہے کہ اس میں نہ مخالفت ہے اور نہ موافقت ہے تو ایسی روایات ہم صرف معلومات کے لیے لیں گے، لیکن اس پر ہم سو فیصدی اعتماد نہیں کر سکیں گے۔ تصدیق اس لیے نہیں کر سکتے کہ خدا نہ کرے، وہ روایت جھوٹی ہو اور ہمیں اس کی کوئی سند بھی معلوم نہیں، اور تکذیب اس لیے نہیں کر سکتے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کی کوئی آیت ہو تو ہم اللہ کے حکم کی تکذیب کر بیٹھیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ اس گائے کے بعض ٹکڑے اس مردے کو لگائے گئے۔

اور بعض نے کہا کہ ریڑھ کی ہڈی کا آخری مہرہ لگایا گیا۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ زندہ فرمائیں گے مردہ کو۔

اسی طرح کا معنی یہ نہیں ہے کہ گائے ذبح ہوگی، اس کے گوشت کے ٹکڑے آئیں گے اور مُردوں کو لگائے جائیں گے، بلکہ معنی یہ ہے کہ جو خداوند کریم اس مُردہ کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے، تمام مردہ مخلوق کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔ اس لیے ایک تشبیہ دی گئی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ دنیا کے اندر کچھ ایسے واقعات دکھلا دیتے ہیں کہ انسانوں کو عقلی طور پر اعتراض باقی نہ رہے کہ جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو ہم دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۲، البقرۃ: الآیۃ: ۷۲]

سورۃ بقرۃ میں پانچ مقامات پر احیائے موتی کا بیان:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۃ البقرۃ کے اندر اللہ نے پانچ جگہ پر احیاء موتی کا مسئلہ ذکر فرمایا ہے:

❁......﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۵۶] جب ستر آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر گئے تھے اور ان پر بھی موت آگئی تو اس کے بعد ہم نے تم کو دوبارہ زندہ کیا۔

❁......دوسرا قصہ یہ ہے۔

❁......اور تیسرا ان لوگوں کا قصہ ہے جو اپنی حویلیوں سے نکلے اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے، ان پر بھی موت آگئی۔

❁......اور وہ قصہ جو بستی پر گزرے جو مُردہ ہو چکی تھی۔

❁......اور اللہ پاک نے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا ہے۔

وہ پانچوں قصے اسی سورت کے اندر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمادی کہ جیسے ہم ایک مُردے کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہیں، اسی طرح تمام مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسے واقعات میں اپنے بندوں کو تنبیہ کی ہے وہ مسئلہ معاد کو بھی سمجھ لیں۔

مُردوں کو زندہ کرنے کی مثال:

حضرت ابورزین العقیلی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! اللہ مُردوں کو کیسے زندہ فرمائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا کبھی ایسی بستی پر گزر ہوا ہے جو اُجڑ گئی ہو اور ویران ہوگئی ہو؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں جی۔ آپ نے فرمایا: پھر کبھی وہاں سے گزرے بھی ہو کہ وہاں آبادی ہے، سبزہ نکل آیا ہے؟ انہوں

نے عرض کیا: ہاں، حضور! ایسا بھی ہوا ہے، کئی دفعہ ہم گزرے ہیں، زمین خالی پڑی ہے، بارشیں ہو جاتی ہیں اور پھر گزرتے ہیں تو سبزے نکل آتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ'' اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ قادر ہیں کہ مُردہ زمین کو زندہ کر کے اس سے سبزہ اُگا لیتے ہیں تو ''كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى'' ان مُردہ انسانوں کو بھی دوبارہ اُگالیں گے۔ ان کے آگے کیا مشکل ہے؟ اس نے کہا: ہاں! یہ بات ٹھیک ہے۔

[مسند أحمد بن حنبل، حديث: ۱۶۱۹۳، ۱۶۱۹۴]

امام مالک ؒ نے اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط فرمایا ہے کہ مرنے کے بعد جب کوئی آدمی زندہ ہو کر کہے تو اس کی بات سچی ہوگی، اس لیے کہ وہ عالم برزخ کا مشاہدہ کر چکا ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اب قبر میں جانے کے بعد، موت کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی جھوٹ بولے۔ جیسے اس واقعہ کے اندر ہے کہ مقتول کو مارا گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کو زندہ کیا تو اس نے کہا کہ فلاں نے مجھے قتل کیا ہے۔ چنانچہ اسی کی بات پر فیصلہ کیا گیا اور اس سے گواہ نہیں مانگے گئے کہ تم گواہ لے آؤ۔ واقعی اس نے تمہیں مارا تھا یا نہیں مارا تھا؟ اس کے استنباط کا فائدہ یہ ہے کہ عام طور پر تو قتل تب تک ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ گواہ نہ ملیں۔ اور شواہد اور آلۂ قتل یہ چیزیں اعانت کرتی ہیں، اصل ثبوت تو گواہوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۳]

ایک یہودی کا سر کچلنے کا واقعہ:

امام مالک ؒ فرماتے ہیں کہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کو اس طرح قتل کیا کہ اس کے سر کو پتھر پر رکھ کر اس کے سر پر پتھر مارا۔ ابھی اس لڑکی کے اندر جان موجود تھی، کچھ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ اس سے پوچھا کہ تمہیں کس نے مارا؟ کیا فلاں نے مارا؟ جب اس یہودی کا نام آیا تو اس نے کہا کہ ہاں! مجھے اس یہودی نے مارا ہے۔ اس یہودی کو پکڑا گیا تو اس نے حضور پاک ﷺ کے سامنے اقرار کر لیا کہ واقعی میں نے مارا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کا سر بھی اسی طرح پتھر پر رکھواور اس کے سر پر پتھر مار کر اسی طرح اس کا سر کچل ڈالو، جیسے اس نے کیا تھا۔ چنانچہ اس کو وہی سزا دی گئی۔ [صحیح البخاري، حدیث: ۵۲۹۵ بَابُ: الْإِشَارَةِ فِي الطَّلَاقِ وَالْأُمُوْرِ]

لیکن جمہور کہتے ہیں کہ اور شواہد بھی ہوں۔ باقی اس واقعہ کو امام مالک ؒ حجت بنا رہے ہیں، وہ تو معجزہ ہے، نبی موجود ہے اور اللہ کے حکم سے یہ کیا گیا۔ اسی طرح جب اس لڑکی کو کہا گیا کہ فلاں یہودی نے مارا ہے؟ اس یہودی نے بھی پکڑے جانے کے بعد اعتراف کر لیا کہ میں نے کیا ہے۔ اس لیے جمہور کہتے ہیں کہ صرف مقتول کا کہہ دینا

کافی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ دیگر شواہد بھی دیکھے جائیں گے کہ اس بات پر وہ دلالت کر رہے ہیں۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۳]

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ [البقرۃ: ۷۴]

پھر اس سب کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی سخت، اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے اور ان میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں، اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔

آیت کا ماقبل سے ربط:

اس آیت کے اندر بھی بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ قرآن پاک میں کسی بھی واقعہ کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے عبرت پکڑنی چاہیے اور موعظت حاصل کرنی چاہیے۔ ان تمام واقعات کے بعد جو آپ پڑھ چکے ہیں، بنو اسرائیل کو چاہیے تھا کہ اللہ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتے، ان کی فرمانبرداری کرتے اور ان کی اتباع کرتے، لیکن وہ اور زیادہ اکڑ گئے اور زیادہ نافرمانیوں اور گناہوں کی زندگی میں پڑ گئے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی توحید کے راستے سے ہٹ گئے تو ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ ان کی ان کیفیات کا ذکر فرما رہے ہیں کہ اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے اور یہ ایسے ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پتھر سے تشبیہ دی ہے، حالانکہ لوہا، تانبا، پیتل اور بھی ایسی دھاتیں موجود ہیں جو بہت سخت ہیں، ان سے بھی تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ اور لوہا وغیرہ ایسی دھاتیں ہیں جو پتھروں کو بھی توڑ ڈالتی ہیں، لیکن اللہ نے ان کے دلوں کو پتھر کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی کہ تانبا، لوہا، پیتل کو اگر آگ پر رکھا جائے تو پگھل جاتا ہے، لیکن پتھر ایک ایسی چیز ہے جو پگھلتا نہیں ہے۔ اس میں اشارہ کیا گیا کہ تمہارے دل ایسے سخت ہو گئے ہیں کہ تمہارے سامنے تخویف بھی آئی، تمہارے سامنے ترہیب بھی آئی، تمہارے سامنے اللہ کے عذاب بھی آئے، تمہاری

اپنی قوم بنی اسرائیل میں سے ستر ہزار بندوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسخ کر کے بندر اور خنزیر کی شکل بنا دیا اور وہ تین دن تک زندہ رہے اور اس کے بعد مر گئے۔ اتنا بڑا عذاب دیکھنے کے باوجود بھی تمہارے دل نہیں پگھلے۔

یاد رکھیں! اصل صلاح دل کی صلاح ہے اور اصل بگاڑ دلوں کا بگاڑ ہے۔ اگر دل ٹھیک ہو جائیں تو سارا جسد خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے اور اگر دل بگڑ جائیں تو سارا بدن خود بخود بگڑ جاتا ہے۔ اس لیے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بدن میں ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ جب وہ ٹھیک ہو جاتا ہے تو سارا بدن ٹھیک ہو جاتا ہے، جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، خبردار وہ دل ہے۔[1] حضور ﷺ نے اسی لیے رات دن یہ دعائیں مانگیں: ''اَللّٰهُمَّ يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ! ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰى دِيْنِكَ'' اے میرے اللہ! دلوں کا مالک تو ہے، مہربانی فرما کر انہیں دین پر ثابت قدم فرما دے۔

[سنن الترمذي، حديث: ۲۱۴۰، باب: ما جاء أنَّ القلوب بين أصبعي...]

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ ''ذٰلِكَ'' سے اشارہ ہے کہ جو واقعات آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں، جو آیات و معجزات آپ دیکھ چکے ہیں، ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ ان کو دیکھ کر بھی ان کے دل پتھر ہو چکے ہیں یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو چکے ہیں، اس لیے حدیث پاک میں بڑی مختصر دعا آئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ دعا مانگا کرو: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْقَسْوَةِ وَ الْغَفْلَةِ'' اے اللہ! ہمیں بدبختی اور غفلت سے پناہ عطا فرما کہ ہمارے دل سخت ہو جائیں یا ہمارے دلوں پر شقاوت کا زنگ لگ جائے، ہم تجھ سے پناہ مانگتے ہیں۔

[المعجم الصغير، حديث: ۳۱۶]

پتھروں کی اقسام:

اللہ تعالیٰ نے یہاں پتھروں کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی قسم:

اللہ نے فرمایا: بعض پتھر ایسے ہیں کہ جن سے نہریں بہہ رہی ہیں، چشمے جاری ہو جاتے ہیں اور وہ نہریں نکل نکل کر دنیا سیراب کر رہی ہیں۔ علماء نے فرمایا کہ اللہ نے یہ ان علماء کی مثال دی ہے جو علماء راسخین ہوتے ہیں، جو اپنے علم پر عمل کرنے والے ہیں، قرآن وسنت پر چلنے والے ہیں، جن کو اللہ نے قرآن میں ''رَاسِخُوْنَ'' لقب دیا ہے:

[1] [صحیح البخاری، حدیث ۵۲، باب: فضل من استبرأ لدينه]

﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ [آل عمران:۷]

بعض وہ ہوتے ہیں جو علماء کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں، علماء کی شکل وصورت بنا لیتے ہیں، وہ علم سے بھی دور ہوتے ہیں اور عمل سے بھی دور ہوتے ہیں، فقط انہوں نے لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے ایک شکل بنائی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کی مثال قرآن دیتا ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعہ:۵] جیسے ایک گدھا ہو اور اس کے اوپر آپ کتابیں لاد دیں۔ اس لیے اگر کوئی عالم ایسا ہے جس کا مطالعہ بھی ہے، جس کی وسعتِ نظر بھی ہے، مطالعہ کی عادت بھی ہے، لیکن عمل نہیں ہے تو اس کی مثال گدھے کی ہے، جیسے اس کے اوپر کتابیں لاد دی جائیں۔

تو علماء راسخین کی مثال اس پتھر کی سی ہے جس سے چشمے اور نہریں پھوٹتی ہیں اور پوری دنیا کو سیراب کرتی ہیں۔ اس لیے آپ صحابہ کرام ؓ خصوصا خلفائے راشدین کے علم پر نظر ڈالیں، تابعین محدثین، فقہاء اُمت کے علم پر نظر ڈالیں، آپ ذرا آنکھیں بند کر کے غور کریں کہ کتنے لوگ اس عالم میں ہیں جو فقط امام بخاری ؒ، امام مسلم ؒ، امام نسائی ؒ اور امام ترمذی ؒ کی محنت سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں؟ اور پورے عالم اسلام میں کتنے لوگ ہیں جو امام ابوحنیفہ ؒ، امام مالک ؒ، امام شافعی ؒ اور امام احمد بن حنبل ؒ کی فقہ اور مسائل سے استفادہ کر رہے ہیں تو ان کے علم کی بھی اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا میں نہریں جاری کر دی ہیں کہ جہاں جاؤ ان کے علم کی نہریں بہہ رہی ہیں اور علم حاصل کرنے والے علم حاصل کر رہے ہیں۔

دوسری قسم:

اس قسم کے پتھر کی مثال ایسے ہے کہ ان سے نہریں تو نہیں نکلتیں، لیکن ان کے اندر سے پانی تھوڑا تھوڑا رستا رہتا ہے، کوئی چشمہ بھی نہیں بن رہا، کوئی نہر بھی نہیں بن رہی، لیکن کچھ نہ کچھ پانی نکل رہا ہے۔

علماء نے فرمایا کہ یہ علماء ربانیین کی مثال ہے، جو صحیح عالم ہیں، لیکن ان کے علم سے لوگوں کو زیادہ فائدہ نہ پہنچ سکا۔ بڑے بڑے عالم ہیں ماشاء اللہ! لیکن دیہاتوں کے اندر زندگی گزر گئی، کوئی ان سے فائدہ حاصل نہ کر سکا، ان کو کوئی جان بھی نہ پایا کہ اتنا بڑا عالم یہاں رہتا ہے۔

حضرت ہالیجوی ؒ کا علم:

آپ اندازہ فرمائیں کہ حضرت بنوری صاحب جیسے آدمی جنہوں نے ترمذی شریف کی شرح لکھی ہے، انہوں نے

اور بھی بہت کتابیں لکھی ہیں، ساری زندگی جن کی حدیث پڑھانے میں گزر گئی، جب وہ ہالیجوی کے پاس سندھ کے علاقہ میں تشریف لے گئے تو سندھ کے اندر بالکل ایک قصبہ سا ہے، غیر معروف سی جگہ ہے، وہاں حضرت ہالیجوی رہتے تھے......اب تو وہ وفات پا گئے، اب ان کی اولاد ہے......تو حضرت یوسف بنوری، حضرت حماد اللہ ہالیجوی کی خدمت میں آئے۔ حضرت یوسف بنوری فرماتے ہیں کہ ایک حدیث پر حضرت درس دے رہے تھے تو حضرت بنوری جیسا عالم فرماتا ہے کہ میں نے جب حضرت ہالیجوی کی اس حدیث مبارک پر تقریر سنی تو مجھ کو پتہ لگا کہ میں عالم تو عالم میں کتنا بڑا جاہل ہوں، اس دن مجھ پر اپنا جہل کھلا اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ اتنا بڑا عالم سندھ کی اس چھوٹی سی بستی میں موجود ہے۔

اسی طرح سندھ کے اندر حضرت عمر نوح گوھر ے ہیں، بہت بڑی شخصیت تھے، جنہوں نے سب سے پہلے قرآن کی تفسیر سندھی زبان میں لکھی، یعنی اتنا بڑا اعزاز ان کو ملا۔ میں نے جب اس علاقہ کو دیکھا تو ایک قصبہ تھا۔ تو اتنے بڑے بڑے لوگ دیہاتوں میں بیٹھے رہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلا۔

اسی طرح حضرت حبیب اللہ گمانوی رحمۃ اللہ علیہ اور بڑے بڑے علماء سندھ میں، بلوچستان میں، قبائل میں، پہاڑوں میں اور ایسے ایسے مقامات پر بیٹھے رہے جن بے چاروں کے بارے میں لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کتنا بڑا عالم ہے۔ جب کوئی عالم وہاں گیا اور ان سے بات سنی تو پتہ چلا، لیکن ان کا فیض دنیا میں نہ پھیلا۔

تو بعض علماء ایسے ہوتے ہیں کہ اندر سے علم سے بھرے ہوتے ہیں، لیکن ان کا فیض نہیں پھیل سکتا، وہ بھی علماء ربانیین ہیں۔ ان کی مثال بھی ایسے ہے جیسے پتھر سے پانی رس رہا ہے، ان کا علم تو رس رہا ہے، لیکن وہ نہریں بن کر نہیں بہہ رہا کہ پوری دنیا میں پہنچ جائے اور لوگوں کو سیراب کر ڈالے۔

یہ اللہ کی شان ہوتی ہے۔ پوری دنیا میں آپ چلے جائیں، ہر جگہ قاری عبد الباسط کا قرآن آپ کو سنائی دے گا، بلاد کفر میں بھی چلے جائیں، اللہ نے اس سے کام لے لیا، جبکہ اس سے بڑے بڑے قاری موجود تھے، بڑے بڑے اساتذہ موجود تھے، بلکہ بڑے بڑے قراء تو کہتے ہیں کہ قراءت کے فن سے وہ غلط پڑھتا ہے، یعنی بعض لوگ اس کی قراءت پر بھی اعتراض کرتے تھے۔ میں اعتراض نہیں کر رہا، (نعوذ باللہ) میں خود قاری نہیں ہوں، مجھے خود قراءت کا فن نہیں آتا، میرے لئے تو تمام قاری واجب الاحترام ہیں، جو بھی قرآن کی خدمت کر رہا ہے ہمارے لیے واجب الاحترام ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ نے کسی سے نہروں کا کام لیا ہے اور کسی سے کام لیا کہ پانی پتھر

سے رِس رہا ہے، پانی اس کے اندر بھرا ہوا ہے۔

تیسری قسم:

اور بعض پتھر ایسے ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر جاتے ہیں۔ علماء نے فرمایا: یہ مثال ہے ان عابد، زاہد لوگوں کی ہے جو عبادت، زہد میں لگے ہوئے ہیں، حرام چھوڑا ہوا ہے، حلال کا رزق اختیار کیے ہوئے ہیں، اپنے اپنے مقام پر بیٹھے ہوئے ہیں، رات دن سر سجدے میں پڑا ہوا ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا: یہ تشبیہ ایک اور طرح سے بھی ہے کہ بعض پتھر ایسے ہیں جن سے نہریں بہہ نکلتی ہیں، یعنی بعض علماء ایسے ہیں جو خوف سے اتنا روتے ہیں کہ ان کی آنکھیں ایسے بہہ رہی ہوتی ہیں جیسے نہریں بہہ رہی ہوں۔ اس لیے حضرت نوح علیہ السلام کا لقب "نوح" اس لیے پڑ گیا تھا کہ روتے روتے ان کے رخساروں پر آنسوؤں سے جھریاں پڑ گئی تھیں، کثرتِ بکاء کی وجہ سے ان کا لقب نوح پڑ گیا، وگرنہ یہ ان کا نام نہیں تھا۔

تیسری مثال: ان کی یہ ہے کہ بعض ایسے پتھر ہوتے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر جاتے ہیں۔ ان کی مثال ایسے ہے کہ میرے ڈر کی وجہ سے رونے کی شکل بنائے ہوئے ہیں، آنسو نہیں بہہ رہے، لیکن رو رہا ہے، کوشش کر رہا ہے، گڑگڑا رہا ہے اور تواضع کر رہا ہے، لیکن آنسو نہیں بہہ رہے۔

تو علماء نے فرمایا کہ اللہ نے پتھروں کی تین اقسام بیان کر کے دراصل اپنے بندوں کی قسمیں ذکر فرمائی ہیں۔

ان آیات کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۷۴] بنی اسرائیل! تم یہ نہ سمجھو کہ جیسے تم اللہ سے غافل ہو گئے ہو، اللہ کی یاد کو چھوڑ بیٹھے ہو، لیکن اللہ تم سے غافل نہیں ہے، اللہ جانتے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اس کا بدلہ ملے گا۔ اچھے اعمال کرو گے تو تمہیں بدلہ بھی اچھا ملے گا اور بُرے اعمال کرو گے تو تمہیں بدلہ بھی اسی طرح کا ملے گا: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ [الزلزال: ۷، ۸]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۳، البقرۃ: الآیۃ: ۷۴]

پتھر کی مثال دینے کی وجہ:

علماء فرماتے ہیں کہ پتھر سے مثال اس لیے دی گئی کہ پتھر تو جمادات میں سے ہے، اس کے اندر تو کوئی عقل و شعور نہیں ہے، اس میں قساوتِ قلب انسانیہ کا ذکر آیا اور اس کو پتھر سے تشبیہ دی گئی، کیونکہ حیوانات میں تو کچھ نہ کچھ

ادراک و شعور ہوتا ہے، لیکن جمادات میں وہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے جمادات کی پوجا کا جب وقت آیا، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں آیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ابا جان سے فرمایا: ﴿يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا﴾ [مریم: ۴۲] اے میرے ابا جان! آپ ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتے ہیں جو سنتے نہیں، دیکھتے نہیں، جو کچھ نفع نہیں پہنچا سکتے؟ تو علماء نے فرمایا: پھر پتھر سے کیوں مثال دی گئی؟

مفسرین کرام نے جواب دیا ہے کہ پہلی بات تو یہ یاد رکھو کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ پتھر میں کچھ شعور نہیں۔ پتھر کے اندر بھی ادراک اور شعور ہے، کیونکہ اللہ نے قرآن پاک میں واضح فرمادیا: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ﴾ تمام آسمان اور زمینیں اور جو کچھ ان کے اندر ہے، سب میری تسبیح بیان کررہے ہیں۔ اور اللہ نے فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾ [بنی اسرائیل: ۴۴] کوئی ایسی چیز نہیں جو میری پاکی بیان نہ کرے، میری تسبیح بیان نہ کرے، میری تنزیہ بیان نہ کرے، لیکن تم ان تسبیحوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ تو ہر چیز کے اندر پتھر بھی آ گیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں فرمادیا ہے کہ ہم نے داؤد علیہ السلام کے لیے پتھر، پہاڑ تابع اور مسخر کردیئے تھے اور ان کے لیے لوہا بھی مسخر کردیا تھا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کا ذکر کرتے تو پہاڑ بھی ساتھ ذکر میں مشغول ہوجاتے تھے، وہ بھی باقاعدہ جواب دیتے تھے، لہٰذا پتھروں میں بھی ادراک موجود ہے، جیسا کہ جبل اُحد کا واقعہ بھی ماقبل میں گزر چکا ہے۔ صحیح مسلم شریف کی حدیث کے اندر موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''إِنِّي لَأَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُبْعَثَ، إِنِّي لَأَعْرِفُهُ الْآنَ'' [صحیح مسلم، رقم: ۲۲۷۷] مکہ مکرمہ میں ایک پتھر ہے جس کو میں پہچانتا ہوں، ابھی مجھے نبوت بھی نہیں ملی تھی اور میں جب اس پتھر کے قریب سے گزرتا تھا تو وہ مجھ پر سلام کہتا تھا۔

اسی سے بھی ہمارے حضرات مسئلہ نکالتے ہیں کہ دیکھو! حدیث کے اندر لفظ ہیں کہ جب حضور ﷺ گزرتے تھے تو وہ پتھر سلام کہتا تھا: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدُ!''۔ اور اسی طرح حدیث ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ سفر میں ہوتے تو کسی پتھر پر گزرتے، کسی درخت پر گزرتے تو وہ آپ پر سلام کہتا تھا۔ [کنز العمال، حدیث: ۳۵۴۳۶]

اب یہ کہتے ہیں کہ جب پتھر ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدُ!'' پڑھتے ہیں اور ہم پڑھتے ہیں تو وہابیوں کو کیوں تکلیف ہوتی ہے؟ اللہ کے بندے! مجھے یہ بتلائیں کہ حضور ﷺ جب اس پتھر پر گزرتے تھے تو پتھر سلام قریب سے

پڑھتا تھا یا دور سے پڑھتا تھا؟ تو جب تم بھی روضے پر جاؤ تو پڑھو، حضور ﷺ کے سامنے جاؤ تو پڑھو۔ حضور ﷺ کے سامنے صلوٰۃ وسلام پڑھنے پر کسی کوئی اعتراض نہیں ہے، کوئی دنیا کا عقل مند آدمی اعتراض نہیں کر سکتا۔ حضور ﷺ جب سامنے ہوں تو کوئی صلوٰۃ وسلام نہ پڑھے۔ کوئی دنیا میں ایسا بندہ ہو سکتا ہے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن مسئلہ اتنا ہے کہ کیا غائب طور پر ندا بحرف "یا" جائز ہے یا نہیں؟ وہ تو مسئلہ ہی ایسا ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کا معجزہ دکھا دیا کہ جب پتھر کے قریب آئے تو پتھر نے سلام عرض کیا، اکثر پتھروں نے نہیں بھی پڑھا۔ یہ تو میرے پاک نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کے معجزات ہیں۔ "صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ عَلٰى آلِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ وَ سَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا."

یہ آیات ہمارے لیے سبق ہیں:

ان ساری آیاتِ مبارکہ سے ہمیں یہ سبق ملا کہ کہیں تمہارے دل تو ایسے نہیں ہو گئے جیسے پتھر ہوں کہ وہ شقاوت، قساوت اور غفلت میں آکر ایسے بن گئے ہوں، جیسے پتھر ہے کہ نہ ان پر تخویف اثر کرے، نہ ترہیب اثر کرے، نہ اللہ کا قرآن اثر کرے اور نہ فرمانِ رسول اثر کرے۔

گناہوں سے دل سخت ہو جاتے ہیں:

علماء نے لکھا ہے کہ دل سخت اس وقت ہوتے ہیں جب آدمی اللہ کی یاد سے دور ہو جاتا ہے، جب اللہ کا ذکر چھوٹ جائے اور معاصی میں آدمی منہمک ہو جائے۔ نماز چھوٹ گئی اور اللہ کا ذکر چھوٹ گیا، تلاوتِ قرآن چھوٹ گئی، غفلت جب آتی گئی تو آدمی گناہوں میں بڑھتا گیا، معصیت میں بڑھتا گیا تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دل سخت ہو جاتے ہیں۔

اس لیے حضور ﷺ نے ایک مثال دی، آپ ﷺ نے فرمایا: جب آدمی پہلا گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، (یہ گناہوں کی سیاہی ہے، اللہ سے دعا کریں کہ اللہ پاک معاف فرما دے، اللہ ہمارے دلوں کو بھی محفوظ فرمائے اور ہر مسلمان کے دل کو بھی محفوظ فرمائے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب وہ دوسرا گناہ کرتا ہے تو دوسرا نقطہ لگ جاتا ہے، جب تیسرا گناہ کرتا ہے تو تیسرا نقطہ لگ جاتا ہے، پھر گناہ کرتے کرتے اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور پھر اس پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۳۳۴، باب: ومن سورۃ: وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ]

دوسری حدیث پاک میں حضور ﷺ نے فرمایا: اگر بندے سے گناہ ہو گیا (ہر آدمی سے گناہ ہوتا ہے، ہم سب

گناہ گار ہیں ماسوا انبیاء ﷺ کے) لیکن وہ ڈر رہا ہے، ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں، لرز رہا ہے، خوف لاحق ہو گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ میرے اوپر پہاڑ گر پڑا ہے، یہ ایمان کی علامت ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٦٣٠٨، باب: التوبة]

جیسے ایک رات میں باہر گیا ہوا تھا تو رات کو بارہ بجے کے قریب واپس آیا۔ سڑک پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا ہے۔ جب میں گاڑی سے اُترا تو میرے پاس دوڑ کر آیا اور کہنے لگا کہ میں نو بجے سے یہاں بیٹھا ہوں۔ میں نے پوچھا: اللہ کے بندے! کیوں بیٹھے ہو؟ ٹیلی فون کر لیتے، پوچھ لیتے، ٹائم مقرر کر لیتے تو تکلیف نہ ہوتی۔ اس نے کہا کہ میں نے ایک بات کی ہے، اس بات کے ڈر مجھے آرام نہیں آ رہا۔ میں نے اس آدمی کی آنکھیں دیکھیں تو اس کی آنکھیں سرخ معلوم ہوتی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دو دن سے سویا نہیں ہے، پریشان ہے۔ بہر حال الحمد للہ! کوئی اتنی بات بھی نہیں تھی۔ اس نے مسئلہ پوچھا اور میں نے اس کو سمجھا دیا تو وہ چلا گیا۔

تو یہ علامتِ ایمان ہے کہ کوئی چھوٹی سی بھی غلطی ہو تو نیند اور چین نہیں ہے، بھاگ رہا ہے اور پوچھ رہا ہے کہ میں کیا کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ ایمان کی علامت ہے۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب وہ مرتبہ آ جائے کہ گناہ کرو اور یوں محسوس ہو جیسے ناک پر مکھی بیٹھی تھی، اُڑا دی تو سمجھ لو کہ اب ایمان اندر نہیں ہے۔[1] جب وہ اسٹیج آ جائے کہ اپنے گناہوں پر فخر بھی کرنے لگ جاؤ کہ میں نے اتنے ڈاکے ڈالے اور اتنے قتل کر دیئے اور ہم نے اتنی لڑکیاں اغوا کر ڈالیں اور ہم نے اتنا نشہ بیچا اور ہم نے ایسے اسمگلنگ کی تو جب یہ مقام آ جائے تو سمجھو کہ اب دلوں پر مہریں لگ گئی ہیں۔

گناہوں کا علاج:

اس لیے ہم سب اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور احتساب کریں۔ اس کا علاج ذکر اللہ ہے۔ سب سے پہلے تو آدمی گناہوں سے توبہ کرے، کیونکہ توبہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر ستر سال آدمی گناہوں میں پڑا رہے، ستر سال زنا، شراب، بے حیائی میں ڈوبا رہے اور ایک دفعہ اللہ کے دروازے پر گر جائے اور سچے دل سے توبہ کرے، اللہ فرماتے ہیں: اے میرے بندے! میں تیرے سارے گناہ بخشنے پر تیار ہوں۔ آنا تیرا کام ہے اور بخشنا میرا کام ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ خوش ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ملائکہ کو بلا کر فرماتے ہیں: دیکھو! میرا بندہ ستر سال

[1] صحيح البخاري، حديث: ٦٣٠٨، باب: التوبة

نافرمان رہ گیا، لیکن آج میرے دروازے پر گر گیا، اس کو پتہ چل گیا ہے کہ میرا بھی مالک ہے جو مجھے معافی دے دے گا۔ تو تم گواہ ہو جاؤ، اس کے پچھلے سارے گناہ میں نے معاف کر دیئے ہیں۔ [مسند احمد، حدیث: ۷۹۴۸]

حدیث میں آتا ہے: "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ" جب آدمی سچی توبہ کر لے تو گویا گناہ رہ ہی نہیں گئے، مٹ گئے، ختم ہو گئے۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۴۲۵۰، باب، ذِكْرِ التَّوْبَةِ]

اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی مرد یا عورت گناہ میں مبتلا تھا، اس نے توبہ کر لی تو اب اس کو اس گناہ کا طعنہ نہ دو۔ پھر یہ نہ کہنا کہ چھوڑو تم شرابی تھے، ایسے تھے اور ایسے تھے۔ ایسا نہ کرو، جب اس نے توبہ کر لی ہے تو مالک الملک نے جب اس کا پچھلا کھاتہ معاف کر دیا ہے تو تم کون ہو اعتراض کرنے والے۔

دوسرا علاج یہ ہے کہ کثرت سے اللہ کا ذکر کرو۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ جو گھر خالی ہوتا ہے وہاں جن ڈیرا لگا لیتے ہیں، اگر دل اللہ کی یاد سے خالی ہے تو شیطان ڈیرا لگا لیتا ہے اور جب تم اللہ کو یاد کرتے ہو تو شیطان تم سے بھاگ جاتا ہے۔ اور نماز بھی اللہ کی یاد اور اللہ کا ذکر ہے، قرآن بھی اللہ کا ذکر ہے، طواف بھی اللہ کا ذکر ہے۔ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے تسبیح، درود شریف، ذکر کلمہ جو تمہیں یاد ہے وہ کثرت سے پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے غفلت اور قساوت سے پناہ مانگتے رہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے تمام معاملات ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ بڑے بڑے کبائر کا جو ذکر کیا ہے، ان سے بچے۔ اور انسان خطا کار ہے، انسان سے خطائیں ہو جاتی ہیں تو فوراً توبہ کرے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اور کچھ بھی نہ ہو سکے تو چپ رہے۔ چپ رہنا، یہ بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے کہ اپنی زبان کو محفوظ رکھ لیا، تم نے اپنی زبان کو بلاوجہ کسی گناہ میں نہیں اُلجھایا۔ یہ بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے۔

حضرت عوفی ؒ اپنی تفسیر کے اندر فرماتے ہیں کہ جب اس مقتول کو اس گائے کا ٹکڑا لگایا گیا تو وہ مقتول اُٹھ کر بیٹھ گیا، ایسے زندہ ہو گیا جیسے بالکل کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم کو کس نے قتل کیا؟ اس نے کہا کہ مجھے میرے بھائی کے لڑکوں نے قتل کیا۔ اس کے بعد وہ مر گیا، اس کی روح قبض کر لی گئی۔ جب وہ یہ کہہ کر مر گیا تو اس کے بھتیجے کہنے لگے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے، ہم نے تو اس کو قتل نہیں کیا ہے۔

اتنی بڑی بات کہ مردہ زندہ ہو کر ایک بات کرے اور اس کے بعد بھی وہ کہیں کہ ہم نہیں مانتے ہیں۔ تو آدمی جب جہالت و بدبختی کی انتہاء پر پہنچ جاتا ہے تو پھر یہی حال ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے کہ آپ اس کو جتنا ہدایت

کریں، وہ کہے گا کہ ہم بس جہاں چل رہے ہیں، ٹھیک ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ دلوں کے اندر نرمی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ان کے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔

مفسر رحمہ اللہ نے اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ادراک تو رکھا ہے۔ ہر چیز کے اندر ادراک تو موجود ہے، یہی وجہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر اپنی تجلی ڈالی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلی کو برداشت نہ کر سکا۔ اس طرح دنیا کے اندر جتنی بھی چیزیں ہیں، ہر چیز کے اندر اللہ نے ادارک وشعور اس کی حیثیت کے مطابق رکھا ہے، بعض چیزوں کا شعور ہمیں نظر آ جاتا ہے اور بعض چیزوں کا ہمیں نظر نہیں آتا۔ مفسر رحمہ اللہ اس پر دلیل کے لیے قرآن پاک کی دوسری آیت نقل فرما رہے ہیں: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۗ إِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾ [بنی اسرائیل:۴۴] ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اللہ کی تسبیح بیان کر رہی ہیں اور ان دونوں کے اندر کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اس کی تسبیح اور حمد بیان نہیں کر رہی، لیکن تم ان کی تسبیحات کو سمجھ نہیں سکتے، اللہ پاک ہی علم والے اور بخشش والے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ وہ ذات پاک کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی تسبیح بیان کر رہا ہے، لیکن یہ چند کروڑ یا چند لاکھ کا فرید بخت اس کا جو انکار کر رہے ہیں تو اللہ ان کو عذاب کیوں نہیں دیتے؟ فرمایا: وہ بخشنے والے ہیں، وہ علم والے ہیں، وہ اپنے بندوں کو آخر وقت تک مہلت دے دیتے ہیں۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ تو یہ فرماتے تھے کہ جس پتھر سے بھی چشمہ نکلے یا جس پتھر سے بھی پانی بہتا ہو یا جو پتھر بھی پہاڑ کی چوٹی سے گرتے ہیں، یہ سب اللہ کی خشیت، ہیبت وجلال اور عظمت کا اثر ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں خود بیان فرمایا ہے۔ بعض پتھر بھی تمہارے دلوں سے نرم ہیں، تمہارے دل ان پتھروں سے سخت ہیں۔ پتھر بھی کبھی نرم ہو جاتے ہیں، لیکن تم اللہ کا قرآن سننے کے بعد بھی نرم نہیں ہوتے، تم معجزات دیکھنے کے بعد بھی نرم نہیں ہوتے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی آیات اور نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی نرم نہیں ہوتے۔

ابو علی جبائی نے اپنی تفسیر کے اندر لکھا ہے: ﴿وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ ''هُوَ سُقُوْطُ الْبَرَدِ مِنَ السَّحَابِ'' جب بادلوں سے اولے برستے ہیں، یہ اللہ کی ہیبت اور عظمت کا اعتراف ہے۔

قاضی باقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ترجمہ بعید ہے۔ کیونکہ اولے برسنا علیحدہ چیز ہے اور پتھر کا پھٹ کر اس سے پانی نکلنا علیحدہ چیز ہے۔ اس لیے مفسر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ قول صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ ابو علی جبائی معتزلی ہے۔ اس نے

پتھر کے اس احساس کا انکار کر کے اولوں کے گرنے کی بعید از کار تاویل کر دی ہے۔ (انور)

ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ اس سے مراد کثرتِ بکاء ہے اور اس کی مثال جو تھوڑا رونے والے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں کہ ان کے دلوں کے اندر تو خشیت موجود ہے، لیکن آنکھوں سے آنسو نہیں بہتے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۳، البقرۃ: الآیۃ: ۷۴]

علماء نے لکھا ہے کہ آدمی کے آنسو نہ نکلیں تو یہ بھی دل کی سختی کی علامت ہے۔ دلوں میں نرمی آتی ہے تو آدمی کو رونا بھی آتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے دربار میں گڑگڑانا بھی آتا ہے اور آنسو بھی بہتے ہیں اور اللہ کے راستے میں اللہ کے خوف سے جو آنسو بہتے ہیں، اللہ کے ہاں اتنی عظیم قیمت رکھتے ہیں کہ ایک حدیث مبارک کے اندر آتا ہے کہ جب آدمی کے آنسو بہنے لگ جائیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کو جہنم سے پانچ سو سال کے فاصلے تک دور کر دو، میرے ڈر سے میرا بندہ رو رہا ہے، میں تو رحم کرنے والا ہوں، میں تو رحمت کرنے والا ہوں، پھر میں اپنے بندے کو کیسے نہ معاف کروں؟

اگر اللہ کے دربار میں مثلاً رونا نہ آئے، جیسے بعض لوگوں کو رونا نہیں آتا تو ان کے لیے بھی حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہیں رونا نہ آئے تو رونے کی کیفیت بنالو، رونے کی شکل بنالو، گڑگڑاؤ، عاجزی کرو، ایسے محسوس ہو کہ یہ رو رہا ہے۔[1] کیونکہ رونا تو ہمارے بس میں نہیں ہے، جب تک دل نرم نہ ہوں۔ لیکن آدمی وہ ہیئت بنا کر کوشش کرے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب اللہ کے بندے اللہ کے دروازے پر رونا شروع کرتے ہیں تو وہ خالی نہیں لوٹاتا۔

پتھروں کا رونا حقیقی ہے یا مجازی؟

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ حقیقت نہیں ہے، بلکہ مجازی معنی مراد ہے، یعنی پتھر کی ایک مثال دی گئی ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ ایک بستی سے گزرے تو دیکھا کہ ایک دیوار ہے، قریب ہے کہ وہ گر جائے۔ تو اس دیوار کی طرف گرنے کے ارادہ کی نسبت کر دی گئی۔ اسی طرح یہاں بھی بطور مجاز پتھروں کی طرف اسناد کر دی گئی۔

لیکن مفسرین فرماتے ہیں کہ مجازی معنی وہاں مراد لیا جاتا ہے جہاں حقیقی معنی مراد نہ لیا جا سکتا ہو۔ ہمیں یہاں مجازی معنی مراد لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ پتھروں کے اندر ایسی صفتیں پیدا فرما دیتے ہیں۔ پتھروں نے

[1] [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۴۱۹۶، باب: الحزن والبکاء]

حضور ﷺ پر سلام پیش کیا، پتھروں نے کلمہ شہادت پڑھا، جانوروں نے آ کر حضور ﷺ کو شکایت پیش کی کہ ہمارا مالک ہم سے زیادہ کام لیتا ہے۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حج کے موقع پر ہم خود دیکھ رہے تھے کہ جب آپ ﷺ نے قربانی فرمائی تھی، اونٹ خود بڑھ بڑھ کر آگے آتے تھے کہ ہم حضور ﷺ کے ہاتھ سے ذبح ہو جائیں۔ ایسی چیزیں اللہ تبارک وتعالیٰ جانوروں میں بھی پیدا فرما دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ پتھروں میں بھی پیدا فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾﴾ [الاحزاب:۷۲]

اور صحیح روایت کے اندر ہے کہ احد پہاڑ ہمیں محبوب رکھتا ہے اور ہم اس کو محبوب رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ کو جبل اُحد سے بڑی محبت تھی۔[1] اس لیے حضور ﷺ جب سفر سے تشریف لے آتے، دور سے جب یہ پہاڑ نظر آتا تو حضور ﷺ اپنی اونٹنی کو بھگاتے تھے، اونٹنی سے کہتے: جلدی کرو، جلدی کرو، ایسا پہاڑ آ رہا ہے جس میں محبوب رکھتا ہوں اور وہ ہمیں محبوب رکھتا ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۲۸۹۳، باب: مَنْ غَزَا بِصَبِيٍّ لِلْخِدْمَةِ]

اور پھر اسی محبوب پہاڑ کے دامن میں حضور ﷺ کے پیارے چچا سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ستر صحابہ دفن ہیں۔

ایک حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کہتی ہیں کہ ہماری خواہش تھی کہ اپنے شہداء کو جنت البقیع میں لے آئیں اور انہوں نے ارادہ بھی کر لیا اور اس پر عمل کر لیا۔ جب حضور ﷺ کو خبر ملی تو فرمایا: خبردار! ان کو اسی مقام پر لوٹاؤ جہاں وہ شہید ہوئے ہیں، کیونکہ وہ بڑی عظیم جگہ ہے۔

تو یہ پہاڑ محبت تب کرے گا جب اس کے اندر ادراک و شعور ہو۔ وہ سمجھے کہ محمد عربی کون ہے؟ جب وہ سمجھتا نہ ہو تو محبت کیسے کرے گا؟

اسی طرح صحیح مسلم کے اندر بھی یہ روایت موجود ہے، فرمایا: ''إِنِّي لَأَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُبْعَثَ، إِنِّي لَأَعْرِفُهُ الْآنَ'' (مجھے ابھی نبوت نہیں ملی تھی، مکہ کے اندر ایک پتھر کو پہچانتا ہوں کہ جب میں گزرتا تھا تو

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۴۰۸۳، باب: أُحُدٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ]

وہ پتھر مجھ پر سلام پڑھتا تھا)۔[صحیح مسلم، حدیث:۲۲۷۷]

اور اسی طرح حدیث مبارک کے اندر آتا ہے کہ جو آدمی ایمان اور یقین کے ساتھ حجر اسود کو بوسہ دے گا یا ہاتھ لگائے گا تو قیامت میں وہ گواہی دے کہ یا اللہ! اس نے مجھے بوسہ دیا تھا۔

[سنن الترمذي، حديث: ۹۶۱، بَابُ: مَا جَاءَ فِي الحَجَرِ الأَسْوَدِ]

اس لئے پتھروں کا بولنا، ان کا کلام کرنا، پتھروں کا سلام پیش کرنا، اللہ کے پاک پیغمبر کے دربار میں بات کرنا، یہ ساری باتیں دلالت کرتی ہیں کہ پتھروں کے اندر بھی ادراک اور ایک قسم کی حیات ہے جو ہمیں بظاہر سمجھ نہیں آتی۔ کیونکہ ہم لوگ تو جاہل ہیں اور ہمارا علم اتنا وسیع نہیں، ویسے جن لوگوں کو پتھروں کی شناس ہوتی ہے وہ جب پتھر خریدتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ یہ پتھر زندہ ہے اور یہ پتھر مردہ ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے اندر ایک قسم کا پانی ہوتا ہے، ان کے اندر بھی ایک قسم کی حیات ہے اور ایک موت ہے۔

پتھروں میں خاصیات:

اسی سے تو لوگ گمراہ ہو گئے اور انہوں نے پتھروں کو بھگوان بنانا شروع کر دیا۔ یہ نہ سمجھے کہ جو ان کا خالق و مالک ہے اس کو بھول جاؤ گے تو کیا فائدہ ہوگا؟ ان کے اندر اللہ نے یہ نفع ونقصان رکھے ہیں۔ یہ نہیں کہ یہ نفع نقصان کے مالک ہیں۔ اسی سے لوگوں کے اعتقادات خراب ہو جاتے ہیں کہ فلاں پتھر میں نے پہنا تو مجھے خوشحال کر دے گا اور فلاں پتھر پہنا تو وہ مجھے برباد کر دے گا۔ اب اس کے نزدیک برباد کرنے والا اور نصیب کھولنے والا پتھر بن گیا تو یہ توحید کی بجائے شرک میں مبتلا ہو گیا، حالانکہ مسلمان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ نفع ونقصان کا مالک اللہ ہے۔

اللہ نے اگر اس کے اندر فائدہ رکھا ہے تو وہ جانے، اور نہیں رکھا تو وہ مالک ہے، وہ جانے اور اس کا کام جانے۔ ہمارے تو نفع ونقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ورنہ ہر چیز کے اندر خصائص ہیں، جیسے بعض جانوروں کا گوشت گرم ہے اور بعض جانوروں کا گوشت معتدل ہوتا ہے اور بعض جانوروں کا گوشت بادی ہوتا ہے، بعض کا گوشت ہاضم ہوتا ہے۔ آپ کوئی گوشت کھائیں، اگر چربی ہے تو وہ کولیسٹرول پیدا کرے گا۔ اس لئے یہ اللہ نے خواص رکھے ہوتے ہیں، لیکن کوئی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوتا۔ نفع ونقصان کا مالک تو صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ جس پتھر کو میرے پاک پیغمبر نے چوما ہو، اس کا کوئی اور پتھر مقابلہ نہیں کر سکتا اور اُمت اس کو بوسہ دے رہی ہے۔

اور روافض اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ہم اس پتھر کو کیوں چوم رہے ہیں؟ کیونکہ اس کو اللہ کے نبیوں نے بوسہ

دیا ہے اور ہمارے آقا ﷺ نے بوسہ دیا ہے، لیکن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جن کے ساتھ میرے حضور ﷺ کی پوری زندگی گزر گئی، کیا ان کے ایمان میں خلل ہے؟ خود وہ عقل کریں، غور کریں اور سوچیں کہ وہ کہاں بھٹک رہے ہیں؟ جن صحابہ کو حضور ﷺ نے اپنے سینے سے لگا لیا ہو، جن صحابہ کے ہاتھ میں میرے مدنی نے اپنا ہاتھ دے دیا ہو اور جس صحابی کے بارے میں میرا مدنی کہے کہ ساری دنیا کے میں نے احسان اُتار دیئے، لیکن ابوبکر کے احسان نہیں اُتار سکا[1] تو ان کے ایمان میں اگر کوئی شک کرے تو یہی کہا جائے گا کہ ان کے دل پتھر ہو گئے۔ مسئلہ سمجھ نہیں آرہا۔

حجر اسود:

حجر اسود اتنی شان والا پتھر ہے کہ جب یہ آیا تو اس کے اندر اتنی روشنی تھی کہ جہاں جہاں تک اس کی شعاعیں پہنچیں وہاں تک اللہ نے اپنا حرم بنا لیا۔ بعض روایات کے اندر ہے کہ یہ چمکتا تھا، لیکن گناہوں نے اس کے اندر سیاہی کا اثر ڈال دیا۔ اتنی شان والا پتھر ہونے کے باوجود کتنی دفعہ ٹوٹا اور کتنی بار دشمن اُٹھا کر لے گئے، لیکن اپنے نفع ونقصان کا مالک نہیں ہے۔ جب طوفانِ نوح آیا تو طوفان میں بہہ گیا اور کتنی مدتوں تک جبل ابی قبیس کے غار کے اندر رہ گیا۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ حجر اسود کو کعبہ میں لگاؤ۔ انہوں نے عرض کیا: اللہ میاں! حجر اسود کہاں ہے؟ اللہ نے فرمایا: اس کو ڈھونڈو۔ عرض کیا: اللہ میاں! کیسے ڈھونڈیں؟ مجھے کیا پتہ کہ حجر اسود کون سا ہے؟ اور اسی طرح یمن کا ایک ظالم بادشاہ آیا اور اس کو توڑ کر یمن کے پہاڑوں اور پتھروں میں پھینک دیا، پھر قریش مکہ گئے اور تلاش کر کے لے آئے۔ اسی طرح ایک اور ظالم آیا، اس کو اُٹھایا اور اسے اپنے ملک میں پھینک دیا تو افغانستان کی طرف سے ایک مسلمان بادشاہ اُٹھا، اس نے اس کو چھڑایا۔ جو حجر اسود اپنی حفاظت بھی نہ کر سکا، وہ ہمارے نفع ونقصان کا مالک کیسے بنے گا؟ اس لیے اپنے عقیدوں کو ٹھیک رکھو اور یہی مسلمان کا مقام ہوتا ہے کہ کافر بھٹک جاتا ہے اور مومن صراطِ مستقیم پر کھڑا رہتا ہے اور کہتا ہے: تمہاری بڑی شان ہے اور تمہاری بڑی صفتیں ہیں، لیکن نفع نقصان کا مالک میرا خدا ہے۔

اگر نقصان کا مالک پتھر ہوتا تو حجر اسود ہوتا یا کعبہ شریف کی دیواروں میں جو پتھر لگا ہوا ہے، اس کے اندر نقصان ہوتا، یا مقامِ ابراہیم کے پتھر کے اندر نفع نقصان ہوتا، یا طور سیناء کے پہاڑ میں ہوتا، یا اس صخرہ میں ہوتا جہاں تمام انبیاء علیہم السلام نے آکر اپنے جانور باندھے اور حضور ﷺ کی براق بھی باندھی گئی، لیکن کوئی نفع ونقصان کا مالک نہیں

---

[1] جامع الاصول فی احادیث الرسول، حدیث: ۶۴۰۵

ہے، نفع نقصان کا مالک صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ اگر اللہ نے کسی چیز کو عزت دی ہے تو "آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا" اور کسی چیز میں اللہ نے فائدہ رکھا ہے تو "آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا" اور کسی چیز میں فائدہ نہیں رکھا تو "آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا"۔ ہر چیز کا مالک اور مختار، حاجت روا اور مشکل کشا صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں۔ یہی فرق ہے جہاں آدمی آکر پھنستا ہے، چنانچہ بعض لوگ پتھروں کو خدا بنا لیتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔

﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا﴾ علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اتنا بڑا شرف بخشا ہے کہ اس کی سب سے بڑی فرماں بردار مخلوق ملائکہ ہیں، ان کو بھی اللہ نے آدم علیہ السلام کے سجدے کا حکم دیا اور آدم علیہ السلام کو مسجود الملائکہ بنایا اور اللہ تعالیٰ نے خلافت فی الارض کے لئے حضرت آدم علیہ السلام اور اولادِ آدم کو منتخب فرمایا، فرشتوں کو زمین کی خلافت کے لئے منتخب نہیں فرمایا۔

ان تمام چیزوں کو دیکھنے کے بعد اندازہ لگائیں کہ انسان کا کتنا بڑا مقام ہے!! چونکہ اعلیٰ مخلوقات تین تھیں: انسان، جنات اور فرشتے۔ پھر اللہ نے جتنے نبی اور رسول بھیجے، سب اولادِ آدم ہیں، اس لیے انسان اشرف المخلوقات ہے، جس کے بارے میں اللہ نے قسم کھا کر فرمایا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝﴾ [التین: ۴] ہمیں قسم ہے! تحقیق یہی بات ہے کہ ہم نے انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ ہیئت پر پیدا فرمایا۔

اور علماء نے لکھا ہے کہ جب ہم لوگ دو ضرب دو، چار کہا کرتے تھے اور قلم، تختی اور ہندسوں سے ضرب تقسیم کرتے تھے تو غلطیاں ہماری حدود کی تھیں، لیکن اب جبکہ کمپیوٹرائزڈ نظام آگیا، اب وہ غلطی کرے گا تو غلطی اسی کے مطابق ہوگی۔ ایک ہندسہ پر بھی اگر ہاتھ غلط ٹچ کر گیا تو سمجھ لیں کہ اربوں کا چکر ہوگیا۔ وہاں سینکڑوں کا حساب نہیں بگڑے گا۔

اس لئے انسان جب انسان بننے پر آیا تو مسجود الملائکہ بن گیا، انسان جب اپنے مقامِ انسانیت اور مقامِ عبودیت پر پورا اُترا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار رسول اور نبی ان میں آئے، انسان جب انسانیت کے معراج کو پہنچا تو محمد عربی ﷺ کی شکل میں سامنے آیا اور جب انسان گر گیا تو ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝﴾ [التین: ۵] پھر اس کے گرنے کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں، اس کو پہلی زمین پر بھی جگہ نہیں ملتی، دوسری اور تیسری پر بھی نہیں، بلکہ اسفل سافلین میں گرتا ہے۔ اور جب اوپر جاتا ہے تو علیین کو چھوتا ہے اور جب نیچے جاتا ہے تو سجین اور اسفل سافلین میں جا پہنچتا ہے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بھی یہی ارشاد فرمایا ہے: اے بنی اسرائیل! تمہارے دل اتنے سخت

ہو گئے کہ پتھروں کی بھی تمہارے دلوں کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ایسے واقعات کا ذکر فرما کر غافل بندوں کو جھنجوڑتے اور جگاتے ہیں کہ کہیں تم بھی بنی اسرائیل کی طرح نہ بن جانا کہ اپنے پاک نبی کے معجزات دیکھو، دلائل دیکھو اور پھر اعتراض کرنے لگو۔ اور اللہ کے نبی کے فرمان میں اگر اور مگر، چونکہ، چنانچہ نکالنے لگ جاؤ، جیسا کہ بنی اسرائیل کو حکم ملا تھا کہ ایک گائے ذبح کرو، لیکن وہ سوال کرنے لگ گئے کہ کیسی ہو؟ اس کا رنگ کیا ہو؟ عمر کتنی ہو؟ قد کیسا ہو؟ تو تم ایسا نہ کر بیٹھنا۔

آج اللہ نہ کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جو افضل اُمت ہے، ان اعمال پر پہنچی ہوئی ہے جس طرح اُمم سابقہ تھیں۔ وہ اللہ کے قانون میں حجتیں نکالتے تھے، آج بھی لوگوں کو جب اللہ کے قوانین کے بارے میں بتلایا جاتا ہے تو وہ بھی حجتیں نکالتے ہیں۔ جب ان کو کہا جاتا ہے کہ سود حرام ہے، کسی بھی شکل میں حرام ہے اور اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے ایک قاعدہ کلیہ بیان فرمادیا کہ ہر وہ قرض جو زیادت کو کھینچے یا ہر وہ معاملہ جس میں زیادت کی شرط لگائی جائے، وہ سود ہے۔ حتیٰ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنے نبی کو ایک خاص حکم دیا: ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝٦﴾ [المدثر:٦] آپ کے لئے حرام ہے، آپ بھی ایسا نہ کریں کہ کسی آدمی کو ہدیہ دیں اور پھر تمنا کریں کہ وہ مجھے زیادہ ہدیہ دے۔ جیسا کہ بڑے آدمی کے پاس کوئی خوبصورت چیز بنا کر لے جاتے ہیں کہ میں نے اس پر ایک ہزار ریال خرچ کیا ہے، اگر وہ اس سے خوش ہو جائے گا تو مجھے پانچ ہزار ریال دے گا۔ تو اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو منع فرمایا کہ آپ کے لئے تو یہ حرام ہے کہ آپ کسی پر احسان کریں اور پھر یہ تمنا کریں کہ مجھے زیادہ دے، یہ آپ کی شان کے لائق بھی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ کوئی ربوا نہیں، لیکن ایک زیادتی جتنی ہے کہ دینے والے کی نیت یہ ہے کہ ہدیہ کے بعد مجھے زیادہ ملے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی پاک کے لیے یہ حرام کر دیا، لیکن اُمت کے لئے یہ فرمادیا کہ اگر تم ایسا کرو گے، تمہیں گناہ تو نہیں ہوگا، لیکن تمہیں ثواب بھی کوئی نہیں ہوگا۔ جو تم اللہ کے لیے دو گے، اسی پر اجر وثواب ہوگا اور جو تم لوگوں کو اس لیے ہدیہ دو گے کہ وہ تمہیں اس کے بدلے میں زیادہ ہدیہ دیں گے، اس پر تمہیں گناہ تو نہیں ہوگا، لیکن فائدہ بھی نہیں ہوگا، کیونکہ تمہاری نیت زیادہ لینے کی ہے۔ اللہ نے اتنا واضح فرمادیا۔

سود کی حرمت:

اور حضور اکرم ﷺ نے اتنا واضح فرمادیا کہ سود کا معاملہ لکھنے والا، سود لینے والا، دینے والا، سود کے معاملہ کی

گواہی دینے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۱۵۹۸، باب: لَعْنِ آكِلِ الرِّبَا وَمُؤْكِلِهِ]

علماء کرام تو اتنی احتیاط فرماتے تھے کہ اگر کوئی بلڈنگ جس میں سودی کاروبار ہوتا ہے، اس کے سائے کے نیچے بھی نہیں بیٹھتے تھے کہ کہیں اللہ کے عذاب کا ہم شکار نہ ہو جائیں۔ آج اگر لوگوں کو کہا جائے کہ سود حرام ہے تو کہتے ہیں: ٹھیک ہے، لیکن سود کے بغیر معاملات کیسے چلیں گے؟ ہماری ترقی رُک جائے گی، اسلام اتنا پابند کر دینے والا مذہب ہے کہ یہ چاہتا نہیں کہ مسلمان ترقی کرے اور مسلمان تو اس وقت ترقی کرے گا جب ہم باہر کے ملکوں سے معاملات کریں گے، ان سے سود لیں گے اور سود پر قرضے لیں گے اور ہم اپنے ملک میں کام کریں گے تو یہاں ترقی ہوگی۔ حالانکہ عقل کے اندھے کو بھی سمجھ آتا ہے کہ ایک آدمی مثلاً لون پر فیکٹری لگاتا ہے، اس نے اسی کے اوپر پچاس لاکھ قرض لے کر لگایا، بینک کو چھ پرسنٹ سود مل گیا، کارخانہ لگ گیا۔ جس دن سے قرضہ منظور ہوا اس دن سے سود لگنا شروع ہو گیا، کارخانہ بنتے بناتے ہمیں پانچ سال لگ گئے۔ صرف بجلی کا کنکشن نہ ملے تو فیکٹری کھڑی ہے، اگر گیس سے چلتی ہے تو گیس کا کنکشن نہ ملے تب بھی کھڑی ہے یا اس کے کچھ پارٹس ہم نے باہر سے منگوانے تھے، اس میں کوئی گڑبڑ ہو گئی اور وہ نہیں آ رہے۔ اب پانچ سال بعد جب فیکٹری چلنے کی پوزیشن میں آئے گی تو آپ حساب تقسیم کریں کہ پچاس لاکھ والا قرضہ کہاں پہنچا ہوا ہوگا؟

اس کے مقابلہ میں اللہ نے ایک آدمی کو توفیق دی ہے، اس نے پچاس لاکھ اپنی جیب سے نکال کر فیکٹری لگالی۔ یا ایک آدمی کے پاس پیسہ نہیں تھا، لیکن اللہ نے عقل دی تھی، اس نے ایک کمیٹی بنا کر اعلان کر دیا کہ میں فیکٹری لگانا چاہتا ہوں، اس نے ایک ایک لاکھ کے پچاس حصے رکھ دیئے کہ جب نفع ہوگا تو ان پچاس پر تقسیم کر دیں گے، نقصان ہوگا تب بھی ان پچاس پر تقسیم کر دیں گے۔

یہ ایک موٹی بات ہے اور عقل کے اندھے کو بھی یہ بات سمجھ آسکتی ہے کہ جب تم اپنے پیسے اور بغیر سودی کاروبار کے فیکٹری چلاؤ گے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ اور اگر سودی قرضے سے لگاؤ گے تو سود لیتے رہو گے اور دیتے رہو گے، لیکن قرضہ سے کبھی نہیں نکلو گے۔ جب حساب کرو گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ آمدنی ایک کروڑ، خرچ سوا کروڑ اور قرضہ پچیس لاکھ ہے۔

اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اگر تم میرا کہا مان لو تو میرا وعدہ ہے: ﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم

بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [الاعراف:۹۶] میں آسمانوں اور زمینوں کے خزانوں کو تمہارے لئے کھول دوں گا، تمہیں قرضہ لینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اُصولی بات یہ ہے کہ جب دنیا کا کوئی ملک اپنے بنائے ہوئے قانون کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تو تم کیوں اللہ کے قانون کو چھوڑتے ہو؟ لیکن تم اس میں حیل وحجت کرتے ہو۔ اگر حکم دیا جاتا ہے کہ زانی کو رجم کرو تو کہتے ہیں: قرآن پاک میں تو رجم کا حکم نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن چیزوں کا قرآن میں ذکر نہ ہو تو ان کا قصہ ختم ہو جائے گا؟ کیا تم نے اللہ کے قرآن کو انسائیکلوپیڈیا سمجھا ہوا ہے کہ اس کے انڈیکس دیئے ہوئے ہوتے۔ اللہ کا قرآن تو ایک جامع دستور ہے، اس نے ایک آرڈر دیا ہے: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [الحشر:۷] جو میرا پیغمبر کہتا ہے، وہ میرا حکم ہے۔ تو جب خود حضور اکرم ﷺ نے رجم کیا تو اس میں اگرچہ، چونکہ، چنانچہ کا کیا مطلب ہے؟ اسلام کا قانون جیسے کتاب اللہ ہے، اسی طرح سنت رسول اللہ بھی ہے۔ جب قرآن میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم آیا تو کہنے لگے کہ یہ تو جنگل کا قانون ہے اور کسی نے کہا: ہاتھ نہیں کاٹیں گے، بلکہ اُنگلیاں کاٹیں گے۔

ان باتوں کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل نے اللہ کے حکم کے اندر حیلے اور بہانے تراشے تھے اور کہا تھا: ﴿ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا﴾ تو کیا ہمارا وہی حال نہیں ہے کہ اللہ کے قانون کے اندر ہم بھی اپنی عقل کے تابع آکر کہہ دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے، مولوی کہتے ہیں، لیکن یہ عقل میں یہ بات نہیں بیٹھتی، یعنی...... معاذ اللہ!...... ہماری عقل اتنی بلند ہے کہ اللہ کے قانون کی غلطیاں نکال لیتی ہے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ میری عقل کا خالق و مالک کون ہے؟ وہ چاہے تو مجھے پاگل کردے، میری عقل بھی چھین لے تو پھر میں کس سے فیصلے کروں گا؟

اس لئے قرآن نے ہمارے سامنے بنی اسرائیل کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ایسا نہیں کرنا۔ نہیں تو تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو جائیں گے، پھر لاکھ اللہ کے قرآن پڑھواتے رہو اور محلوں میں شبینے پڑھواتے رہو اور ایک ایک رات میں ختم پڑھواتے رہو، لیکن عمل نہیں کروگے۔ جب شادی ہو تو دلہا دلہن کو قرآن کے سائے میں گزاریں گے، جب وہ عمل نہیں کریں گے تو وہ اوپر سے لعنت بھیج رہا ہے۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جن پر قرآن لعنت کرے گا۔ [تفسیر روح المعانی، سورۃ: فاطر، آیۃ:۲۹]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک جس نے نماز بھی نہیں پڑھی، ان کا نکاح بھی ختم ہو جاتا ہے۔ تو قصہ ہی ختم

ہوگیا، نکاح کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، شام کو رخصتی ہو، عشاء کی نماز نہ پڑھی تو کافر، اور فجر کی نہ پڑھی تب بھی کافر، دونوں میں سے ایک نے نماز نہ پڑھی تو ایک کافر ہوگیا تو نکاح نہ رہا۔ کیونکہ کافر اور مسلمان کا تو نکاح نہیں رہتا ہے۔ اس لئے یہ سارے حالات ہمارے سامنے رکھے گئے۔ یہ مسئلہ صرف امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک ہے۔

اُمتِ محمدیہ میں بھی سابقہ قوموں جیسے اعمال:

حضور اکرم ﷺ نے جو فرمایا تھا، وہ سچ ثابت ہو رہا ہے یا نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میری اُمت اتم بھی وہ عمل کروگے جو تم سے پہلوں نے کئے تھے۔ اور فرمایا: اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھس گئے تھے تو تم بھی اس میں گھسو گے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۴۵۶، باب: مَا ذُكِرَ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ]

قومِ لوط میں لڑکوں (کے ساتھ لواطت) کی بیماری تھی، آج بھی یہ بیماری اس اُمت میں موجود ہے۔ قومِ لوط کے اندر یہ عادت تھی کہ لڑکے عورتوں کی طرح کا لباس پہنتے تھے اور بال بناتے تھے اور عورتوں کی طرح لہک لہک کر چلتے تھے اور آج یہ بیماری اس اُمت میں موجود ہے۔ اور قومِ لوط کے اندر یہی عادت تھی کہ راستے میں بیٹھ جاتے تھے، جب کوئی گزرنے والا گزرتا تو لوگ اس کے اوپر سیٹیاں بجاتے تھے، آج ہمارے نوجوان بھی ایسا کرتے ہیں۔ قومِ لوط کے اندر یہ عادت تھی کہ کنکریوں سے بھرے ہوئے پیالے رکھے ہوتے، کوئی آدمی گزرتا تو ان کے اوپر کنکریاں پھینکتے تھے جس پر اس کی کنکری پڑ جائے تو وہ اس کو پکڑ کر لے جاتا اور اس کے ساتھ بدفعلی کرتا اور کہتا کہ میری کنکری اس کو لگ گئی تو یہ میرے قرعے میں آگیا، آج اس کے ساتھ میں نے برائی کرنی ہے۔ کیا اس اُمت میں اب کلبوں کے اندر چابیوں کے تبادلے ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے؟ اللہ کے حرم ہے بیٹھ کر بتلاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

واقعہ:

ایک بہت بڑے آدمی کی بیگم صاحبہ کلب میں رات گزارتی رہی...... میں ان کا نام نہیں لے سکتا، کیونکہ نام لیا جائے تو غیبت ہوتی ہے۔ اصل مقصد تو عبرت ہوتی ہے، کوئی ذاتی اعتراض نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ واقعہ اخباروں کے اندر بھی آگیا...... جب وہ رات کلب میں گزار کر نشے کی حالت میں گھر آتی تو ڈرائیور کو بھیج کر کہتی کہ میری شلوار وہاں رہ گئی ہے، وہ لے آؤ...... وہ مسلمان کی بیوی تھی، یہ نہ سوچیں کہ کسی ہندو یا سکھ کی بیوی تھی...... پھر آگے دیکھیں کہ جب ڈرائیور وہاں گیا اور چوکیدار سے کنٹیکٹ کیا تو اس نے کہا کہ بیگم صاحبہ سے اس شلوار کا رنگ پوچھو، یہاں تو

کئی شلواریں پڑی ہیں۔

یہ اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بیٹیوں کی کمائی ہے۔ اسی طرح پہلی اُمتوں میں سوتیلی ماؤں سے زنا ہوا اور آج اس دور میں حقیقی ماؤں سے زنا ہو رہے ہیں، حقیقی بہنوں اور بیٹیوں سے زنا ہو رہے ہیں۔

ایک دفعہ کسی شریف آدمی نے مجھے چٹ بھیجی کہ آپ کے درس میں دو آدمی بیٹھے ہیں، وہ حافظ قرآن بھی ہیں اور قرآن کا درس باقاعدگی سے سنتے ہیں، لیکن رات کو ان کے گھروں میں ننگی فلمیں بھی چلتی ہیں اور اپنی عورتوں سے بھی پیشہ کرواتے ہیں۔ آپ بتلائیں یہ کیسے مسلمان ہیں؟ جب ہمیں کعبہ کا اتنا حیا نہیں، حرم کا اتنا حیا نہیں، حضور اکرم ﷺ کے روضے کے باہر کھڑے ہو کر لوگ سگریٹ پیتے ہیں، کعبہ کے طواف کے دوران جیب میں سگریٹ کی ڈبیاں آپ نے ڈالی ہوئی ہیں، اس حجر اسود پر عورت حجر اسود کو بوسہ دے رہی ہے اور مرد اس کو چھیڑ رہا ہے اور وہ پکڑا گیا اور اس کے کپڑوں پہ مادہ منویہ پایا گیا تو کیا خیال ہے کہ اس کے بعد بھی ہم مسلمان ہیں؟ لیکن اس کے باوجود مسئلہ پوچھتے ہیں، مسئلہ تو تب پوچھیں گے جب ہمارے اندر اسلام ہو۔

آپ خود دیکھیں کہ کتنے لوگ ہیں جو نماز کے وقت نماز نہیں پڑھتے۔ کتنے لوگوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ملتزم سے چمٹ کر چہرے کو رگڑ رہے ہوں گے، بارش آجائے تو میزاب رحمت کے نیچے مرجاتے ہیں، لیکن وہی چہرہ ہے اور داڑھی کٹا رہے ہیں۔ ان کو ذرہ بھر احساس نہیں ہوتا کہ ہم سنت محمد مصطفیٰ ﷺ چھوڑ کر کعبہ کی دیوار کو بھی گواہ بنا رہے ہیں۔ کم از کم کچھ تو ادب کرو، اور ڈرو کہ دور کھڑے ہو جاؤ کہ اے اللہ! میں کہاں اس قابل ہوں کہ اپنا چہرہ تیرے کعبہ کو لگاؤں؟ میں نے تو آپ کے نبی ﷺ کی سنت کو ختم کیا ہوا ہے۔

کتنے لوگ ہیں جو عمرہ کرنے آتے ہیں، لیکن ان کو عمرہ کرنے کا پتہ نہیں ہے اور کتنے لوگ جو احرام باندھے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کو یہ بھی پتہ نہیں کہ ناف کے اوپر باندھنا ہے یا اس کے نیچے باندھنا ہے۔ کتنے بندے ہیں جو آپ کو صفا و مروہ پر دوڑتے ہوئے نظر آئیں گے، لیکن ان کو پتہ بھی نہیں کہ صفا کیا ہے اور مروہ کیا ہے؟ کتنے پرانے مکے میں رہنے والوں کو میں نے دیکھا اور ماشاء اللہ! روزانہ طواف کرتے ہوئے دیکھا، لیکن کوئی دوست آجائے تو طواف کے درمیان اس کو ملتے ہوئے جا رہے ہیں، یہ کون سا طواف ہے کہ تم نے سینہ بھی پھیر لیا اور رُخ بھی پھیر لیا؟ لیکن پھر بھی مسئلے کا پتہ نہیں ہے کہ جہاں سے میں نے چھوڑا ہے، اس سے ایک قدم پیچھے دوبارہ شروع کروں، لیکن ایسے ہی آگے چلے جا رہے ہیں۔ آپ نماز کے حکم میں ہیں، صرف طواف میں بولنے کی اجازت ہے اور بولنا بھی اس

وقت جب کوئی شریعت کا مسئلہ ہو یا کوئی دین کی بات ہو۔ یہ نہیں کہ تم طواف کے دوران ہاتھ میں ہاتھ ڈالو اور گپیں ہانکتے رہو۔

بولنے کا تو یہ مطلب ہے کہ پہلے نماز میں بولنے کی اجازت تھی، لوگ سلام کا جواب بھی دیتے تھے، لیکن اللہ نے منع کر دیا۔ اب نماز میں بولنا منع ہے، طواف میں بولنا جائز ہے۔ لیکن شریعت کا مسئلہ ہے، لیکن ہم طواف میں گپیں ہانک رہے ہوتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی مسجد میں آ کر کسی چیز کا اعلان کرے تو تم کہو: "لَا رَدَّ اللهُ عَلَيْكَ" [1] اللہ تیری وہ چیز واپس نہ کرے۔ ان مسجدوں کو تم نے اعلان کا اڈا بنالیا ہے، کیا تمہارے پاس کوئی اور اعلان کا ذریعہ نہیں ہے؟

دلوں کی سختی حقیقی تھی یا مجازی؟

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ بعض علماء نے فرمایا: یہ بطور مجاز کے ہے۔ جیسے مجازی طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ تم انسان نہیں، تم تو کوئی پتھر ہو۔ لیکن راجح قول یہ ہے کہ مجاز نہیں، بلکہ حقیقت ہے کہ اللہ نے پتھروں میں شعور رکھا ہے۔ اگر پتھروں میں ادراک اور شعور نہ ہوتا تو اللہ کیوں فرماتے کہ ہر چیز میری تسبیح کر رہی ہے؟

"أو" کا اصل استعمال "شک" کے لئے ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے، پھر یہاں "أو" کیوں لایا گیا ہے؟ ﴿اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ بعض علماء فرماتے ہیں کہ "أو" تخییر کے لئے ہے، یعنی وہ پتھر کی طرح ہے یا پتھر سے زیادہ سخت ہے، جیسا کہ محاورہ میں کہا جاتا ہے: "جَالِسِ الْحَسَنَ أَوِ ابْنِ سِيْرِيْنَ" تم چاہو تو حضرت حسن کے پاس بیٹھ کر سبق حاصل کرو یا ابن سیرین کے پاس بیٹھ کر فائدہ حاصل کرو۔

اسی طرح امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، لیکن انہوں نے ایک قول اور بھی نقل کیا ہے کہ کبھی "أو" کا استعمال ابہام کے لیے ہوتا ہے اور وہ ابہام مخاطب کے اعتبار سے ہے، وگرنہ اللہ تعالیٰ کے آگے تو کوئی چیز بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ جیسا کہ محاوراتِ عرب میں کہتے ہیں: "أَكَلْتُ الْخُبْزَ أَوِ التَّمَرَ" (پتہ نہیں میں نے روٹی کھائی ہے یا کھجور کھائی ہے) حالانکہ اس کو پتہ ہوتا ہے، لیکن کہنے کے لئے ہے یہ کہہ دیتے ہیں۔

---

[1] [سنن الترمذی، حدیث: ۱۳۲۱، سنن ابن ماجہ، حدیث: ۷۶۷، بابُ: النَّهْيِ عَنْ إِنْشَادِ الضَّوَالِّ فِي الْمَسَاجِدِ]

اور بعض علماء نے فرمایا: "أو" اس طرح استعمال ہوا ہے: "كُلْ حُلْوًا أَوْ حَامِضًا" چاہو تو تم میٹھا کھاؤ یا کھٹا کھاؤ، یعنی ان دو سے باہر نہ جاؤ۔ تو یہاں معنی یہ ہوگا کہ تمہارے دل یا تو پتھر کی طرح سخت ہیں یا پتھر سے بھی زیادہ سخت۔ یعنی ان دو قسموں سے باہر نہیں ہیں۔ ابن جحر فرماتے ہیں: اگر ہم یہ دو حالتیں لے لیں تو ترجمہ یہ ہوگا کہ بعض کے دل تو ایسے ہیں جیسے پتھر اور بعض کے دل ان سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱۱۳/۱، ۱۱۴، البقرۃ: الآیۃ: ۷۴]

جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ ملائکہ نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ اے اللہ! پتھر تو بڑی سخت چیز ہے، اس سے بھی کوئی سخت چیز ہے؟ فرمایا: ہاں! لوہا اس کو بھی توڑ دیتا ہے۔ انہوں نے پھر پوچھا: اے اللہ! لوہے سے بھی کوئی سخت چیز ہے؟ اللہ نے فرمایا: ہاں! آگ ہے جو لوہے کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ فرشتوں نے عرض کی: آگ سے بھی کوئی سخت چیز ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں! پانی ہے جو آگ کو بھی بجھا دیتا ہے۔ انہوں نے عرض کیا: پانی سے بھی کوئی سخت چیز ہے؟ فرمایا: ہوا، پانی کو بھی خشک کر دیتی ہے۔ انہوں نے کہا: ہوا سے بھی کوئی سخت چیز ہے؟ اللہ نے فرمایا: ہاں ابن آدم ہے جو اس طرح دائیں ہاتھ سے صدقہ کرے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے۔

[سنن الترمذي، حديث: ۳۳۶۹]

علماء نے فرمایا کہ سخت چیز کے ساتھ مثال دی جا رہی تھی۔ اگر اس کی مثال تانبے کے ساتھ دی جاتی تو وہ آگ پر پگھل جاتا ہے، لیکن ان کے دل تو ایسے ہیں جو قرآن سننے کے بعد بھی نہیں پگھلتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں ایک ایسی چیز کی مثال بیان کی، جو کسی صورت نہیں پگھلتی۔

"أو" کس معنی میں ہے؟

بعض مفسرین نے جواب دیا ہے کہ "أو" بھی اپنے معنی میں نہیں ہوتا، بلکہ "واؤ" کے معنی میں ہوتا ہے، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا﴾ [الدھر: ۲۴] اے میرے پاک نبی! ہرگز اطاعت نہ کریں ان گناہ گاروں کی اور نہ ان ناشکروں کی۔ ﴿عُذْرًا أَوْ نُذْرًا﴾ [المرسلات: ۶] میں بھی "أو"، "واؤ" کے معنی میں ہے اور اس آیت میں بھی "أو"، "واؤ" کے معنی میں ہے کہ ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہیں اور پتھر سے زیادہ سخت ہیں۔

جمہور علماء و مفسرین، اور سلف و صالحین نے یہ جواب دیا ہے کہ اللہ نے قرآن میں اپنے بندوں کی عقل کے

مطابق خطاب کیا ہے، وگرنہ اللہ کے علم میں تو ہر چیز ہوتی ہے، اللہ کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "أو" بمعنی "بل" ہے، "بل" اضراب کے لئے ہوتا ہے، جیسے بہت سارے مقام پر "فی" بمعنی "إلی" آجاتا ہے یا کبھی کبھی "إلی" بمعنی "فی" آجاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ [الانعام: ۱۱] اے پیغمبر! آپ مشرکین مکہ سے کہیں کہ وہ زمین میں پھریں اور دیکھیں کہ پہلی قومیں جو تباہ و برباد ہوئی ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ "فِي" ظرفیت کے لیے ہوتا ہے۔ اب کوئی آدمی زمین کو پھاڑ کر اندر تو نہیں جا سکتا، اس لیے یہاں "فِي" بمعنی "عَلَی" ہے۔ اس طرح دوسری آیت میں ہے: ﴿فَلَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوْعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَّأَبْقٰى﴾ [طٰہٰ: ۷۱] فرعون نے جب ان لوگوں کو دھمکی دی تھی جو ایمان لے آئے تھے کہ تم موسیٰ (علیہ السلام) کی بات مان رہے ہو اور میری مخالفت کر رہے ہو، میں تمہیں کھجوروں کے جھنڈ کے اندر پھانسی دوں گا۔ اب ان کے اندر تو پھانسی نہیں ہوتی، بلکہ معنی یہ تھا کہ ان پر لٹکا دوں گا۔ تو یہاں بھی "فِي" بمعنی "عَلَی" ہے۔

اسی طرح قرآن مقدس کے بہت سارے مقامات میں "إلی" بمعنی "فِي" کے آگیا، اور کہیں "فِي" بمعنی "عَلَی" آگیا اور کبھی "أَوْ" بمعنی "واؤ" کے یا کبھی "بَلْ" کے معنی میں آگیا اور کبھی "تخییر" کے لیے آگیا اور "أَوْ" کا اصل استعمال "شک" کے لیے ہوتا ہے، لیکن دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس کا استعمال اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کے لیے تو جائز نہیں ہو سکتا۔ چونکہ شک تو اس کو ہوتا ہے جس کا علم مکمل نہ ہو۔ ایک آدمی کہے کہ میں نے فلاں کتاب میں یہ پڑھا تھا یا یہ پڑھا تھا۔ جیسے راوی کہتا ہے کہ یوں کہا تھا یا یوں کہا تھا۔ لیکن اللہ کی شان تو یہ ہے کہ اس کی ذات نہ کبھی بہکتی ہے اور نہ بھولتی ہے۔ وہ بھولنے سے بھی پاک ہے اور اس کا علم کامل ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک قول یہ ہے کہ "أَوْ" بمعنی "بَلْ" ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ یہ سخت ہو گئے پتھر کی طرح، بلکہ پتھر سے بھی زیادہ۔ جیسا کہ قرآن میں آتا ہے: ﴿إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً﴾ [النساء: ۷۷] یہاں "أو" بمعنی "بَلْ" ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَأَرْسَلْنٰهُ إِلٰى مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيْدُوْنَ﴾ [الصافات: ۱۴۷] کہ ہم نے ان کو پیغمبر بنا کر بھیجا ایک ایسی قوم کے پاس جن کی تعداد ایک لاکھ کے برابر تھی یا زیادہ تھی۔ تو یہاں بھی "أو" بمعنی "بَلْ" کے ہے اور اسی طرح آتا ہے: ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى﴾ [النجم: ۹] یہاں بھی "أو" بمعنی "بَلْ" کے ہے۔

بعض مفسرین نے یہ ارشاد فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ تمہاری شرع کے مطابق یہ پتھر ہیں یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مخاطب فرما کر ویسے کلام فرمایا جیسے ان کے محاورات ہیں۔ مفسر ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو نقل فرمایا:

أُحِبُّ مُحَمَّدًا حُبًّا شَدِيدًا
وَ عَبَّاسًا وَ حَمْزَةَ وَ الْوَصِيَّا
فَإِنْ يَكُ حُبُّهُمْ رُشْدًا أُصِبْهُ
وَ لَسْتُ بِمُخْطِئٍ إِنْ كَانَ غَيًّا

وہاں بھی ابہام مخاطب کے لیے ہے، یعنی کہنے والے کو ابہام نہیں ہے کہ اگر ان کی محبت ہدایت ہے تو میں ہدایت پر پہنچ جاؤں گا اور میں اگر ان کی محبت میں گمراہی پر ہوں، پھر بھی میں خطا پر نہیں ہوں، مجھے یقین ہے کہ میں ان سے محبت کے معاملے میں حق پر ہوں۔ اگر آپ کو کوئی شبہ ہے تو ہوتا رہے۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب ابوالاسود نے یہ اشعار کہے تو لوگوں نے اس سے کہا کہ تمہیں شبہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی محبت یا اہل بیت کی محبت ہدایت کا راستہ ہے یا نہیں ہے؟ اس نے کہا: مجھے تو کوئی شبہ نہیں، یہ تو انداز تخاطب ہے کہ مخاطب کو ابہام میں ڈالا جا رہا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: ﴿وَإِنَّا أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ [سبا: ۲۴] کہ اے میرے نبی! ان کافروں کو کہہ دیں کہ ہم یا تم دونوں میں سے کوئی تو ہدایت پر ہے اور کوئی تو گمراہی پر ہے۔ تو یہ مخاطب کو ابہام میں ڈالنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ تو ابوالاسود نے کہا کہ اس آیت کے اندر جو آ رہا ہے تو کہنے والے کو تو کوئی شک نہ تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۴، البقرۃ: الآیۃ: ۷۴]

دل کی سختی سے پناہ مانگو:

حضور اکرم ﷺ نے سخت دل ہونے سے پناہ مانگی ہے: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْقَسْوَةِ وَ الْغَفْلَةِ'' اے اللہ! ہمیں قسوہ (دل کی سختی) اور غفلہ (غفلت) سے پناہ عطا فرما دے۔ [المعجم الصغیر، حدیث: ۳۱۶]

سنگ دلی کی انتہاء:

بعض دل ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں ''رحم'' کا مادہ ہی نہیں ہوتا، یعنی ان کی لغت میں کبھی ''رحم'' کا لفظ ہی نہیں

ہوتا، جیسے فرعون، ہامان، شداد، تاتاری گزرے۔ یہ لوگ ایسے تھے کہ ان کو لوگوں کے خون سے ہولی کھیلتے ہوئے خوشی ہوتی تھی، تاتاری انسانوں کو قتل کرنے کے بعد ان کی کھوپڑیوں کے مینار بنواتے تھے، ان کے جنگجو سرداروں میں جس کا مینار اونچا ہوگیا، وہ بڑا سردار ہے کہ اس نے زیادہ بندوں کو مارا ہے۔ اور ان کی شقاوتوں کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ انسان کو قتل کرتے، اس کا سر جسم سے جدا اور اندر سے مغز وغیرہ نکال کر اور کھوپڑی کا پیالہ بنا کر اس میں شراب پیتے تھے۔ بہت سارے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے مخالف کو آگ کے بھٹے میں ڈلوا دیتے ہیں، ان کو پروا بھی نہیں ہوتی۔ حالانکہ انسان اگر کوئی حادثہ بھی دیکھ لے تو دو چار دن تک نیند نہیں آتی کہ کیسے انسان تڑپ اور پھڑک رہے تھے!؟ کیسے ان کے اعضاء ٹکڑے ٹکڑے ہوئے پڑے تھے!؟ لیکن بعض لوگ لطف لیتے ہیں...... اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے...... انسان جب حیوان بنتا ہے تو پھر درندے بھی اس سے شرماتے ہیں۔ آج آپ کشمیریوں سے، بوسنیا کے مسلمانوں سے جا کر پوچھیں کہ وہاں درندوں نے کیا سلوک کیا ہے؟ ہم تو اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں، کھا پی رہے ہیں، دس دس کھانے کھا کر ڈکار مار دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ یا اللہ! ان کو فتح عطا فرما۔

دعا تو تب ہوتی ہے کہ اللہ کے پیغمبر بھی مقامِ بدر میں کھڑے تھے، پاؤں جل رہے تھے، اوپر سورج کی گرمی سے آگ برس رہی تھی، سامنے دشمن کی قوت تھی، اپنے پاس تین سو تیرہ کی ایک قلیل جماعت تھی، تمام اسباب منقطع ہوگئے تھے اور حضور اکرم ﷺ دعا کر رہے ہیں کہ میرے پروردگار! آج تُو نے اگر میری مدد نہ کی تو مسلمان مٹ جائیں گے۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۱۷۶۳، باب: الْإِمْدَادِ بِالْمَلَائِكَةِ فِي غَزْوَةِ بَدْرٍ]

؎ گر تُو فضائے بدر پیدا کردے تو فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں قطار اندر قطار اب بھی

جب تک فضاء ہی پیدا نہ کرسکو تو دعا کا کیا معنی ہے؟ اور اس طرح کی دعائیں کر کے بھی ہم اس کو احسان سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمان بھائیوں کے لیے دعا تو کرتے ہیں۔ اب تو لوگ اخبار کے اندر پڑھتے ہیں کہ اتنے لوگ قتل ہوگئے تو ان کی زبانوں سے ''إِنَّا لِلّٰهِ'' بھی نہیں نکلتا، کیونکہ روزانہ جو ایسی خبریں پڑھ رہے ہیں۔ افسوس کی کیفیت ہی مٹ گئی ہے، اب ہم اس مقام پر آگئے ہیں کہ ہمارے دل بھی مسلمانوں کے لیے نہیں دھڑکتے۔ اگر وہ بات میرے بیٹے،

بیٹی، بہن، بھائی وغیرہ پر آ جائے تو پھر روتے ہیں کہ ہمارے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے، حالانکہ ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ [الحجرات:١٠] مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اگر کسی مسلمان کی بیٹی کی بے عزتی ہوتی ہے تو گویا ہماری بیٹی کی بے عزتی ہوئی۔ ہمیں تڑپنا چاہیے اور ہمیں غیرت آنی چاہیے، ہمارا ضمیر بیدار ہونا چاہیے، لیکن سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وجہ وہی قساوتِ قلب ہے کہ ہمارے دل سخت ہو گئے ہیں، اس کا علاج توبہ ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی قول کو ابن جریر رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔ تو یہ ایسے ہوگا جیسے قرآن میں آیت ہے: ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ [البقرۃ:١٧] اور ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ﴾ [البقرۃ:١٩] کہ وہ ان دو حالتوں سے باہر نہیں نکلے یا جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً﴾ [النور:٣٩] یا فرمایا: ﴿أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ﴾ [النور:٤٠] یعنی بعض کافر اُن میں سے اس حالت پر ہیں اور بعض اُن میں سے اس حالت پر ہیں۔

کثرتِ کلام قساوتِ قلبی کا سبب ہے:

حافظ ابوبکر مردویہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

((لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللهِ؛ فَإِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللهِ قَسْوَةٌ لِلْقَلْبِ، وَ إِنَّ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللهِ الْقَلْبُ الْقَاسِي.)) [سنن الترمذی، حدیث:٢٤١١]

''اللہ کے ذکر کے سوا بلاوجہ باتیں نہ کیا کرو، ورنہ تمہارا دل سخت ہو جائیں گے اور اللہ کی رحمت سے سب سے بعید وہ ہوتا ہے جس کا دل سخت ہو۔''

مذاق میں بھی دوسرے کو تکلیف نہ دو:

آج یہی عذاب ہے۔ ایک آدمی نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ میں مولانا مکی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا: مجھے مولانا کا تو پتہ نہیں، البتہ مکی میں ہوں۔ کہنے لگا کہ آپ سچی بات کر رہے ہیں؟ میں نے کہا: مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن وہ بے چارا بار بار پوچھے۔ اس کو کہا: بات کیا ہے؟ کہنے لگا: ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے ایک آدمی ملا تھا، اس نے کہا کہ مولوی مکی تو مر گیا ہے۔ میں چونکہ آپ کا شاگرد ہوں، میں بے ہوش ہو گیا اور پھر کسی سے آپ کا ٹیلی فون نمبر لیا اور آپ سے بات کی، لیکن مجھے تسلی نہیں ہو رہی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی نے ایسے ہی مذاق کے لیے کہہ دیا

ہوگا اور اس بے چارے کو اتنی تکلیف ہوئی۔ اس لیے تم وہ بات کرو جس کا تمہیں فائدہ ہو، ورنہ چپ رہو۔

بعض لوگوں کو میں نے دیکھا...... ماشاء اللہ!...... وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے۔ اور کئی بزرگ دیکھے کہ ہم بات کر رہے ہیں اور وہ اپنا قرآن اور اللہ کے ذکر میں لگے ہوئے ہیں، ہر حال میں ذکر ہے، کیونکہ ان کو پتہ ہے کہ جو گھڑی گزر گئی، میری زندگی کی گھڑی گزر گئی۔ ماں باپ تو خوش ہوتے ہیں کہ بیٹا بڑا ہو رہا ہے، یہ نہیں سوچتے کہ موت کے قریب جا رہا ہے۔ لیکن ہم غافل ہیں، اپنے اوقات کو ضائع کرتے ہیں اور اپنے اوقات گالیوں میں اور جھوٹے قصے کہانیوں میں گزارتے ہیں۔

اس لیے اس بارے میں حضور اکرم ﷺ کا فرمان سنیں کہ جو آدمی بھی اللہ کے ذکر کے علاوہ کثرت کے ساتھ بات کرتا ہے، یہ دل کی سختی کا ذریعہ ہے۔ تحقیق وہ لوگ جو اللہ سے بہت دور ہو جاتے ہیں، وہ لوگ ہیں جن کے دل سخت ہو گئے ہیں۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۱۱]

بدبختی کی چار علامات:

حضرت بزار نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((أَرْبَعٌ مِنَ الشَّقَاءِ: جُمُوْدُ الْعَيْنِ وَ قَسْوَةُ الْقَلْبِ وَ الْحِرْصُ عَلَى الدُّنْيَا وَ طُوْلُ الْأَمَلِ.))

[جامع الاحادیث، حدیث: ۳۰۸۹]

چار چیزیں بدبختی کی علامت ہیں:

- ...... پہلی علامت یہ ہے کہ آنکھوں سے آنسو نہ بہیں کہ لاکھ دعائیں مانگ رہا ہے اور نمازیں پڑھ رہا ہے، طواف کر رہا ہے، ملتزم پر لگا ہوا ہے، لیکن آنسو نہیں نکلتا۔
- ...... دوسری علامت یہ ہے کہ دل سخت ہو گیا ہے کہ کسی بات کا بھی اثر نہیں لیتا۔
- ...... تیسری علامت یہ ہے کہ بڑی بڑی اُمیدیں لگائی ہوئی ہیں کہ میں یہ کروں گا اور وہ کروں گا۔
- ...... اور چوتھی علامت یہ ہے کہ دنیا پر ہر وقت حرص ہے کہ کس طرح سے پیسہ بنے۔

یہ ساری بدبختی کی علامات ہیں، کیونکہ مومن جانتا ہے کہ جو میرے اللہ نے میرے مقدر میں لکھا ہے، مجھے وہی ملے گا۔

نکات:

عربوں کا ایک محاورہ ہے: "اَلنَّصِيبُ يُصِيبُ وَ لَوْ تَحْتَ الْجَبَلَيْنِ" دو پہاڑوں کے نیچے بھی رکھ دو، جو ہمارا نصیب ہے وہ ہمیں پہنچے گا۔ ایک صحابی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اسلام سے پہلے کا کوئی واقعہ سناؤ۔ اس نے کہا: حضور! جب میں کافر تھا تو میں نے تقریباً اپنی آٹھ بیٹیاں اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دیں۔ حضور اکرم ﷺ رو پڑے اور فرمایا: تجھے اپنی بیٹیوں پر رحم بھی نہیں آیا؟

[المعجم الکبیر، حدیث: ۸۶۳]

اسی طرح ایک اور صحابی آئے اور کہا: حضور! آپ بھی روتے ہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: الحمد للہ! مجھے اللہ نے نرم دل عطا فرمایا ہے، مجھے اللہ تبارک و تعالیٰ نے رحمت للعالمین بنا کر بھیجا ہے، مجھے اللہ تعالیٰ نے قساوتِ قلب سے محفوظ رکھا ہے۔ اس صحابی نے کہا: یا رسول اللہ! اس وقت تو ہمارے ہاں رواج تھا اور ہم لوگ عادی تھے۔ اس لیے رحم کا کیا مطلب ہے، اللہ پاک ہم سب کو شقاوتِ قلبی سے بچائیں اور اللہ تعالیٰ ہمیں سعادت نصیب فرمائیں۔

﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۷۵ تا ۷۷]

اب کیا تم اے مسلمانو! توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے اور ان میں ایک فرقہ تھا جو اللہ کا کلام سنتا تھا، پھر وہ اُس کو جان بوجھ کر بدل ڈالتے تھے، حالانکہ وہ جانتے تھے۔ اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں، کہتے ہیں: ہم مسلمان ہوئے اور جب ایک دوسرے کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: تم ان سے کیوں کہہ دیتے ہو جو اللہ نے تم پر ظاہر کیا ہے، تاکہ اس سے وہ تمہارے رب کے سامنے تمہیں جھٹلائیں، کیا تم نہیں سمجھتے؟ کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔

﴿وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ اس میں مفسرین کے دو گروہوں میں سے ایک کہتا ہے کہ اس سے

مراد وہ ستر لوگ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام ان کو کوہ طور پر ساتھ لے گئے، کلام سنا تو کہنے لگے: ہمیں زیارت کروائیں۔ اللہ نے ان کو مار دیا، پھر بعد میں زندہ کر دیا اور بظاہر زندہ ہو کر موسیٰ علیہ السلام سے راضی ہو گئے اور ان کے ساتھ مل کر بنی اسرائیل میں آ گئے۔

اب قوم ان کے پاس اکٹھی ہو کر پوچھنے لگی: آپ لوگوں نے اللہ کا کلام سنا؟ کہنے لگے: ہم نے اللہ کا کلام سنا ہے۔ قوم نے کہا: اللہ نے کیا حکم دیا ہے؟ کہا کہ اللہ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ تورات میری کتاب ہے، موسیٰ میرے نبی اور رسول ہیں، ان کی اطاعت کرو، تورات کے اندر جو باتیں ہیں سب کی تعمیل کرو۔ یہ ساری باتیں ٹھیک ٹھیک بتاتے آئے اور آخر میں آ کر ایک لفظ بڑھا دیا کہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر تمہیں ہمت اور طاقت ہو تو کر لینا، ورنہ نہ کرنا۔

(لطیفہ) جیسا کہ مثل مشہور ہے کہ ایک جھوٹا گواہ تھا، اس نے کسی آدمی سے طے کیا کہ ہزار روپے لے کر جھوٹی گواہی دوں گا۔ لیکن چونکہ وہ جھوٹا مشہور تھا تو اب پیسے دینے والے کو بھی ڈر تھا کہ پیسے دوں، پھر یہ گواہی نہ دے۔ دوسری طرف جھوٹے آدمی کو بھی ڈر ہوا کہ میں جھوٹی گواہی بھی دے دوں اور یہ مجھے پیسے نہ دے۔ بہرحال انہوں نے آپس میں طے کیا کہ جب میں گواہی دے دوں تو میں پیچھے ہاتھ کروں گا، تم دے دینا۔ اگر مجھے پیسے نہ دیئے تو میں شور کروں گا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ اب عدالت میں جا کر اس نے گواہی دی اور اس کے بعد ہاتھ پیچھے کیا۔ دوسرے آدمی نے کہا: خواہ مخواہ اب اس جھوٹے آدمی کو پیسے دینے کی کیا ضرورت ہے؟ گواہی تو ہو گئی ہے۔ جھوٹا آدمی اس کو بار بار ہاتھ مارتا ہے، لیکن وہ آرام سے کھڑا ہے اور اس کو یقین ہو گیا ہے کہ یہ مجھے پیسے نہیں دیتا۔ اتفاق سے مجسٹریٹ نے جب ساری باتیں لکھ لیں تو گواہ سے پوچھا کہ آپ نے اور کچھ کہنا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے جتنا مجھے سکھایا تھا اتنا تو میں نے کہہ دیا ہے۔

مسلمان چاہتے تھے کہ اہل کتاب اسلام میں جلدی داخل ہو جائیں، کیونکہ جب پڑھے لکھے لوگ اسلام میں داخل ہوں گے تو اسلام کو ترقی اور عظمت ملے گی اور پھر پوری دنیا پر اس کے اثرات مرتب ہوں گے کہ اسلام سچا مذہب ہے، اس لیے تو اہل کتاب نے مان لیا ہے۔ اللہ نے ان آیات میں فرمایا کہ اے اُمتِ مصطفیٰ! تم ان لوگوں سے طمع رکھتے ہو جنہوں نے اللہ کا کلام سن کر بھی بدل ڈالا، کیا وہ تمہاری بات مان لیں گے؟ تم ان سے کیا اُمیدیں لگا کر بیٹھے ہو کہ اہل کتاب ہمارے دوست بن جائیں گے؟ ہمارے ساتھ اسلام میں آ جائیں گے؟

جیسے آج کل کئی لوگ اس زعم میں ہیں کہ یہ اہل کتاب معقول لوگ ہیں، اسلام اور حضور اکرم ﷺ کی بڑی

تعریفیں کرتے ہیں، یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس لیے ان کے ساتھ ہمیں رہنا چاہیے۔ حالانکہ یہ ایک وہم ہے۔ جو لوگ چودہ سو سال تک اپنی فطرت نہ بدل سکے تو تم ان کی کیا فطرت بدلو گے؟

دوسرا قول یہ ہے کہ کلام سے مراد تورات ہے۔ تورات بھی اللہ کا کلام اور اللہ کی کتاب ہے۔ بطور خاص وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گئے تھے، بلکہ بنی اسرائیل کے عام بڑے بڑے احبار و علماء مراد ہیں کہ یہ اللہ کا کلام سنتے ہیں اور اس میں تحریف کر دیتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۵]

تحریف کی اقسام:

تحریف دو قسم کی ہوتی ہے: ایک تحریفِ لفظی اور دوسری تحریفِ معنوی۔ تحریفِ لفظی یہ ہے کہ اللہ کی کلام کے لفظ کو بدل ڈالا۔ تحریفِ معنوی یہ ہے کہ لفظ تو اپنی جگہ رہنے دیں، لیکن معنی بدل دیا کہ یہ مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں جہاں جہاں بھی آیا ہے تو انہوں نے تحریفِ لفظی کی تھی، لفظ ہی بدل ڈالے تھے۔ جیسے قرآن نے دوسری جگہ خود ہی بیان فرمادیا: ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ [النساء:۴۶] کہ وہ کلمات کو بھی بدل ڈالتے تھے، آگے کا لفظ پیچھے کر دیا اور پیچھے کا لفظ آگے کر دیا تو اس سے ترجمہ بہت بگڑ گیا۔

ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی جو صفات تورات میں موجود تھیں، ان کو بدل ڈالا۔ جیسے حضور اکرم ﷺ کے بارے میں تورات میں یہ علامت موجود تھی: ''لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَ لَا بِالْقَصِيْرِ'' حضور پاک ﷺ کا قد مبارک بہت لمبا بھی نہیں اور بہت چھوٹا بھی نہیں، یعنی معتدل اور میانہ قد ہے۔ ان بدبختوں نے اس لفظ کو اُڑا دیا اور ''بِالطَّوِيْلِ'' کا لفظ رہنے دیا، تاکہ کوئی دیکھے کہ تورات میں تو لمبا قد آیا ہے اور آپ کا قد تو معتدل ہے تو یہ نشانی آپ ﷺ میں نہیں ملتی۔ اسی طریقہ سے تورات میں حضور اکرم ﷺ کی جو صفات تھیں، وہ بدل ڈالیں۔

اسی طرح جب ان کا کوئی بڑا آدمی جرم میں مبتلا ہوتا اور وہ وقت کے احبار و رہبان سے فتویٰ لیتا کہ مجھ سے فلاں گناہ ہو گیا ہے، اس کی کیا سزا ہے؟ تو وہ دیکھتے کہ یہ بڑا آدمی ہے، یہ ہدیہ ٹھیک دے گا تو وہ سزا والے پیرے میں تبدیلی کر کے چھوٹی سزا اور نرم سزا بتا دیتے تھے۔ اور اگر کوئی عام اور غریب آدمی پھنس جاتا تو اس کو پوری سزا بتاتے تھے۔ اس طرح انہوں نے تورات میں بہت ساری تبدیلیاں کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۵]

قرآن میں بعض لوگوں کی لفظی ومعنوی تحریف:

آج کل بھی......اللہ معاف کرے، اللہ معاف کرے......قرآن میں تحریف معنوی عام ہے، ہر کوئی اپنی منشاء سے قرآن کے معانی بدل رہا ہے۔ جو چیز اُسے سوٹ کرتی ہے وہ قرآن سے لے لیتا ہے اور جس آیت میں اس کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے تو اس کے معنی بدل دیتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام بدل ڈالے ہیں۔

(واقعہ) پُرانی بات ہے، میری عمر اس وقت بارہ تیرہ سال کی تھی۔ ایک مولوی صاحب اوران کے والد بہت بڑے عالم تھے، اپنے وقت میں مشہور علماء میں شمار ہوتے تھے اوران کا بیٹا بھی بڑا عالم تھا، لیکن چونکہ دولت مل گئی، پیسہ مل گیا، شہرت مل گئی، وہ بڑا آدمی بن گیا......اور جس شخص کو تھوڑی سی شہرت مل جائے وہ زمین پر نہیں ٹکتا، وہ اوپر اُڑنا شروع کر دیتا ہے...... بہرحال اس مولوی کو بھی بڑا مقام اور شہرت ملی تھی۔ اتفاق سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے خود سنا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ ٹھیک ہے، شراب حرام ہے، لیکن یہ وھسکی حرام نہیں ہے، کیونکہ قرآن میں خمر آیا ہے کہ جو عقل کو ڈھانپ دے، آدمی عقل میں نہ رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس خمر کی حرمت آئی، وہ انگور سے نکالا جاتا تھا اور وھسکی کوئی سیب سے بناتا ہے، کوئی مالٹے سے بناتا ہے اور کوئی گندم سے۔ اس لیے یہ حرام نہیں۔

ایک اور آدمی ہیں، وہ بھی اپنے آپ کو عالم کہتے ہیں، اس نے بھی تقریر میں مولویوں پر طنز کیا ہے۔ کہنے لگا کہ اگر ان مولویوں کو دو دو کلو انگور لا کر دیں تو کھا جاتے ہیں اور اسی انگور کا ہم پانی نکال لیں تو حرام ہو جاتا ہے۔ لوگ کہنے لگے کہ بات تو اس نے بڑی کی ہے کہ جب انگور حلال ہے تو اس سے جو پانی نکالا ہے، وہ کیوں حرام ہے؟ یہ مولوی بڑا پڑھا لکھا ہے، یہ پُرانے ملاں ہیں، یہ پُرانی کتابوں سے باہر بھی نہیں نکلتے۔

حالانکہ اتنا غور نہیں کیا کہ اللہ نے تمہارے لیے بیوی حلال کی ہے، اگر اسی بیوی سے ایک بچی نکلی تو کیا وہ تمہارے لیے حلال ہے؟ کیا اس سے بھی شادی کر سکتے ہو؟ ورنہ تو بیٹیوں سے بھی شادی کرو، وہ بھی تو اس عورت سے نکلی ہیں۔ جب ماں حلال ہے تو اس کی بیٹی کیوں حرام ہے؟

بس لوگوں کا ایک دماغ ہے، ان کا قرآن وحدیث سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، کسی کی کوئی بات سن لی تو پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ ان کو کسی نے کہا کہ انگور کا پانی حرام ہے، حالانکہ اصل تو مسکر حرام ہے، جو چیز نشہ دے وہ حرام ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ" ہر نشہ آور چیز حرام ہے، وہ چاہے انگور

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۶۱۲۴، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا]

سے نکالو یا گندم سے نکالو یا گڑ سے نکالو یا کسی بلا سے نکالو۔ اگر وہ مسکر بن گیا ہے تو حرام ہے، اور اگر مسکر نہیں بنا تو حلال ہے۔

اس طرح قرآن پاک کی تحریف معنوی عام ہے اور قرآن کی تحریف لفظی بھی ہورہی ہے، جیسا کہ بعض فرق باطلہ کا عقیدہ ہے کہ اس قرآن کو تین صحابہ نے لکھا ہے: ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے۔ اور یہ قرآن ٹھیک نہیں ہے، اس قرآن کو بدلا گیا ہے اور اس میں کہیں اضافہ کیا گیا ہے اور کہیں کمی کی گئی ہے۔ اس میں اہل بیت کی جتنی باتیں تھیں وہ نکال دی گئی ہیں۔ ان کا اس قرآن پر قطعاً ایمان نہیں ہے اور قرآن میں انہوں نے تحریف کی ہے، جیسے قرآن میں آیا ہے: ﴿عَلِيٌّ حَكِيمٌ﴾ [الشوریٰ:51] تو انہوں نے کہا: یہاں "عَلِيٌّ" سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ جہاں قرآن میں ﴿عَلِيًّا﴾ کا لفظ ملا تو نیچے لکھ دیا کہ علی بن ابی طالب۔ قرآن میں آیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ [المائدۃ:67] اے میرے رسول! جو ہم نے آپ پر بھیجا ہے آپ اس کو پہنچا دیجیے۔ کہتے ہیں کہ یہاں آگے لکھا تھا: "بِخِلَافَةِ عَلِيٍّ" کہ علی کی خلافت کے بارے میں جو ہم نے آپ کو فرمایا ہے وہ پہنچا دیجیے۔ وہ کہتے ہیں کہ سنیوں نے اس لفظ کو کاٹ دیا ہے۔

اور اسی طرح ان کا کلمہ اتنا کیا، اور کہتے ہیں کہ سنیوں نے کلمہ بھی چھوٹا کر دیا ہے، اسی طرح اذان کے بارے میں کہتے ہیں کہ تم اذان بھی پوری نہیں دیتے، درمیان میں کھا گئے ہو اور انہوں نے اسی طرح اذان بھی لمبی کر دی۔ اسی طرح انہوں نے یہ تحریف بھی کی ہے کہ سورج غروب ہو تو افطار کرو، لیکن وہ کہتے ہیں کہ جب تک تارے نہ نکلیں، اس وقت تک غروب کیسے ہو سکتا ہے؟ قرآن میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم آیا تو انہوں نے کہا: انگلیاں کاٹو۔ زکوۃ کا حکم آیا تو انہوں نے کہا: ہمارے لیے کوئی زکوۃ نہیں ہے۔ اور ہمارے سامنے بعض جاہل سنی کہلانے والے لوگ کہتے ہیں کہ یہ تحریف معنوی تو ہے، تحریف لفظی نہیں ہے، یعنی انہوں نے قرآن کا لفظ تو نہیں بدلا، لیکن معانی انہوں نے بدلے ہیں، جیسے قرآن کے لفظ ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ﴾ کا ترجمہ کیا: اے غیب کی خبر دینے والے! چلو "نباء" کا ترجمہ "خبر دینا" ہے، لیکن "غیب کی خبر" کا ترجمہ کہاں سے لگا لیا ہے؟

بہر حال اللہ ہمیں تحریف لفظی اور معنوی سے بچائے اور اسی طرح قرآن پر عمل کرنے کی توفیق دے جس طرح میرے آقا ﷺ نے ہمیں سمجھایا اور پہنچایا ہے۔

﴿مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ﴾ یہ تحریف بھی کرتے ہیں اس بات کے بعد کہ یہ جانتے اور سمجھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود

بھی جان بوجھ کر اللہ کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ غلطی پر ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ کے کلام میں غلط طور پر تحریف وتبدیلی کر رہے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ [المائدۃ: ۱۳]۔ اگر صرف اعراب زبر زیر میں بھی فرق آجائے تو معنی اتنا بدل جاتا ہے کہ انسان کفر میں جا پہنچتا ہے، جیسا کہ ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ اگر اس کو کوئی ''اَنْعَمْتُ'' پڑھے تو کفر ہو جائے گا، کیونکہ ''اَنْعَمْتَ'' کا معنی ہے: جن پر تُو نے انعام فرمایا اور ''اَنْعَمْتُ'' کا معنی ہے: جن پر میں نے انعام کیا۔ معنی میں اتنا بڑا فرق واقع ہو جائے گا، جو مستلزم کفر ہے، صرف ایک زبر کو بدلنے سے، تو جو لوگ حرف اور کلمات ہی بدل ڈالیں تو اس کا اندازہ خود کیا جا سکتا ہے۔

﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اللہ پاک نے اپنے پاک پیغمبر اور مومنین کو فرمایا کہ ان سے امید نہ لگاؤ، یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے، کیونکہ یہ تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کا کلام کوہِ طور پر سنا، لیکن پھر بھی اللہ کے کلام کو بدل ڈالا۔ اس لیے ان کا کیا حل ہو سکتا ہے؟

محمد بن اسحاق نے بعض اہل علم سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کی خواہش ظاہر کی تو اس واقعہ کے آخر میں ہے کہ جب بنی اسرائیل کے وہ چیدہ چیدہ لوگ سجدہ میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے اوامر اور منہیات دیئے، جو انہوں نے سنا، اس کو سمجھا۔ اب موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر بنی اسرائیل کی طرف تشریف لے آئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا کہ اللہ نے یہ حکم دیا ہے، یہ حکم نہیں دیا اور اس کو کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو نہ کرنے کا۔ اور جو موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا انہوں اس کو بدل ڈالا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلام کے اندر اپنے پیغمبر کو بتایا: ﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ﴾۔

دوسرا قول حضرت سدی کا یہ ہے کہ کلام اللہ سے مراد تورات ہے کہ اس کو بھی انہوں نے بدل ڈالا۔ یہ قول زیادہ عام ہے، کیونکہ وہ ایک خاص موقع تھا۔ کلام اللہ سے مراد تورات ہے، اسی قول کو ابن جریر نے بھی لیا ہے۔ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ کلام اللہ کے سننے کا معنی ہو کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے سنا، بلکہ موسیٰ علیہ السلام سے جن لوگوں نے کلامِ الٰہی سنا، وہ بھی مراد ہیں۔

بہر حال مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قول نقل فرمائے ہیں اور یہ دونوں قول جمع ہو سکتے ہیں کہ جو لوگ اس وقت تھے، انہوں نے اس حکم میں تحریف کی اور جو لوگ بعد میں آئے، انہوں نے تورات میں تحریف کی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا: ﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ ۝﴾ [التوبۃ: ٦] اگر کوئی مشرک آپ سے امان طلب کرے، پناہ مانگے کہ مجھے امان دے دو تو آپ اس کو پناہ دے دیں، تا کہ وہ سنے کہ اللہ کا حکم کیا ہوتا ہے۔ تو اب یہ ضروری نہیں کہ وہ مشرک اللہ کا کلام، اللہ سے سنے، بلکہ اللہ کا کلام پیغمبر اور ان کے بعد علماء کے واسطہ سے سنے گا۔

اسی لیے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے اللہ کے کلام کو سننے اور سمجھنے کے بعد بھی اللہ کے کلام کو بدل ڈالا۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تحریف کرنے والے اور حق چھپانے والے ان کے علماء تھے، کیونکہ جاہل کو تو یہ پتہ ہی نہیں کہ تورات میں کیا لکھا ہوا ہے؟ تو وہ تحریف کیسے کر سکتا ہے؟

حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ﴿وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ کا معنی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم گناہ کر رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی کرتے ہیں۔

حضرت ابن زید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ﴿يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ﴾ کہ کتاب تورات جو سنتے اور پڑھتے ہیں، اسی میں تبدیلی کی کہ جو چیزیں اللہ نے حلال کی تھیں، ان کو حرام کر دیا۔ جو چیزیں اللہ نے حرام کی تھیں، ان کو حلال کر دیا۔ اور جو حق تھا، اس کو باطل اور جو باطل تھا، اس کو حق بنا دیا۔

علماء حق اور علماء سو:

اب اگر ان کے پاس کوئی سائل کوئی ایسا سوال لے آتا جو قابلِ اُلجھن نہ ہو اور وہ رشوت دیتا تو اس کو صحیح مسئلہ بتا دیتے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ رحمت فرمائیں۔ آج کل ہم بھی بعینہٖ اسی قسم کے اَدوار سے گزر رہے ہیں، ﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ۝﴾ [سبا: ۱۳] مگر جو صحیح معنوں میں عالم ہیں، ایسے علماء کو تو اللہ نے ہر دور میں محفوظ رکھا ہے، کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ ہر دور کے اندر علماء تو ہوتے ہیں، لیکن دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک علماء حق ہوتے ہیں اور دوسرے علماء سُو ہوتے ہیں۔ علماء حق وہ ہوتے ہیں جو اللہ کے قرآن اور سنت مصطفیٰ پر ایسے جمے ہوتے ہیں کہ پہاڑ اپنی جگہ

سے ہٹ سکتا ہے، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے۔ جو حق ہے وہ بتاتے ہیں، چاہے نقصان ہو یا فائدہ ہو۔ اور بعض علماء بظاہر تو علماء والا لباس اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے پاس علم بھی ہوتا ہے اور بڑے جبے بھی پہنے ہوتے ہیں، لیکن علماء سُو ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی منفعت حاصل کرو، بڑے لوگوں کے ساتھ مل جاؤ، اقتدار والوں کی خدمت خوشامد کرو اور ایسے ایسے مسئلے بتاؤ جن سے وہ خوش ہو جائیں اور ہمیں کوئی نہ کوئی دنیاوی مفاد حاصل ہو جائے۔

یہ ہر دور میں رہا ہے، کیونکہ جب دن ہے تو رات ہوگی اور جب رات ہوگی تو دن ہوگا۔ جب روشنی ہے تو اندھیرا بھی ہوگا اور اندھیرا ہے تو روشنی بھی ہوگی۔ حق ہے تو مقابلہ پر باطل بھی ہوگا، صدق ہے تو مقابلہ پر کذب بھی ہوگا، اگر جھوٹ نہ ہو تو سچ کی کیا قیمت ہے؟ اگر ساری دنیا ہی سچ بولنے والی ہو تو کون کسی کو سچا کہے گا؟ جھوٹ کے مقابلہ پر ایک آدمی سچ بولنے والا ہو تو پھر سچ کی قیمت بنتی ہے۔

اسی طرح یہ قاعدہ ہے، اللہ کا نظام ہے اور یہ سنت اللہ جو ابتداء سے لے کر آج تک چلی آرہی ہے، ہر دور میں حق والے علماء بھی رہے ہیں اور علماء سُو بھی رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اللہ کے احکام کو رشوت کے لیے، دولت کے لیے اور اقتدار کے لیے ہمیشہ بدل ڈالا۔

ہر صدی میں ایک مجدد ہوتا ہے:

خدا کی قدرت یہ ہے۔ آپ غور کریں! جیسے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ نے ایک ایسا نظام بنا دیا ہے کہ ہر صدی گزرنے پر ایک ایسا آدمی پیدا فرما دیتے ہیں جو اس کے دین کا محافظ بنتا ہے۔[1] ہر سو سال کے ختم پر جب ایک صدی پوری ہوگی اور دوسری صدی شروع ہوگی اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی آدمی ضرور پیدا فرما دیتے ہیں جو اللہ کے دین کی تجدید کرتا ہے، یعنی جیسے ایک عمارت کا رنگ روغن خراب ہو جائے تو آپ دوبارہ رنگ روغن کرتے ہیں، دروازے کھڑکیاں وغیرہ ٹھیک کرتے ہیں تو وہ بھی دین میں جتنا ضعف آجائے اس پر کام کرتے ہیں۔

سب سے پہلا دور خیر القرون کا ہے، اس پر تو بحث نہیں، کیونکہ وہ تو نبی کریم ﷺ کا دور ہے، اس سے اعلیٰ دور تو دنیا میں کوئی ہو نہیں سکتا۔ آپ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور ہے اور ان کے بعد تابعین کا دور ہے، اسی طرح پھر تبع تابعین کا دور ہے۔ علماء نے نشاندہی کی ہے کہ تقریباً سات سو سال تک ان میں جو لوگ اللہ نے پیدا فرمائے، وہ

[1] [سنن أبي داود، حديث: ٤٢٩١، باب: ما يذكر في قرن المائة]

سارے سرزمین عرب میں پیدا فرمائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے چلیں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور جتنے بڑے بڑے لوگ سات سو سال تک پیدا ہوئے، وہ سارے عرب میں پیدا ہوئے۔

جب یہ سات صدیاں بیت گئیں اور اگلا دور شروع ہوا تو اللہ کی قدرت دیکھیں کہ پھر یہ سارا سلسلہ عرب کی بجائے عجم کے سپرد ہو گیا۔ کیونکہ اللہ کا ایک نظام ہے کہ تم لوگ اگر میرے دین پر نہیں رہو گے تو میں قادر ہوں اور لوگ پیدا کر دوں، ﴿وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم﴾ [محمد:۳۸] اگر تم نے میرے دین سے اعراض کر لیا تو ہم اور قوم لے آئیں گے، ہمیں تمہاری کیا ضرورت ہے؟ اللہ تو غنی ہیں، بے پرواہیں۔ جب عرب کا دین کے ساتھ وہ تعلق نہ رہا جو ہونا چاہیے تھا تو یہ نعمت ان سے چھین لی گئی اور بجائے عرب کے عجم کی طرف چلی گئی۔

اور عجم میں اللہ کی شان یہ ہے کہ یہ ہندوستان کو نصیب ہوئی۔ ہند سے مراد صرف موجودہ ہندوستان نہیں ہے۔ ان میں اللہ نے بڑے بڑے لوگ پیدا کیے: شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ، سید احمد بریلی رحمہ اللہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ وغیرہ پیدا کیے اور پھر یہ سلسلہ چلتا آیا اور چلتا آیا، حضرت محمود الحسن اسیر مالٹا پیدا ہوئے۔ بڑے بڑے لوگ عجم میں پیدا ہوئے۔ اسی کی طرف اقبال نے اپنے ایک شعر میں بھی اشارہ کیا تھا:

شکوہ ترکمانی ذہن ہندی نطق اعرابی

اسی طرح ایک وقت آنے والا ہے کہ جب پوری روئے زمین پر دین محمد مصطفیٰ غالب آجائے گا، جیسے یہ کعبہ سامنے ہے، مجھے یقین ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی گھر روئے زمین پر نہیں بچے گا چاہے مٹی کا بنا ہوا ہو یا بالوں کا بنا ہوا ہو، خیمے کا بنا ہوا ہو، مگر اس میں کلمۂ اسلام داخل ہو کر رہے گا۔[1] یا تو یہ کلمہ اللہ تعالیٰ اس کے اعزاز سے داخل کریں گے یا پھر اللہ ان کو مغلوب کریں گے، لیکن دین اسلام پورے روئے ارض پر قائم ہوگا۔ جیسے ابتداء میں اللہ نے اسلام کو عظمت بخشی تھی اور اللہ کا اپنے پاک نبی سے وعدہ ہے: ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ آپ کے دین کو ہم تمام ادیان پر غالب کر دیں گے، اور وہ وعدہ ضرور پورا ہوگا۔

قربِ قیامت کے حالات:

احادیث میں آتا ہے کہ وہ حضرت مہدی علیہ السلام کا زمانہ ہوگا...... اور مہدی سے روافض والا مہدی مراد نہیں ہے

[1] [مشکاۃ المصابیح، حدیث:۴۲، کتاب الایمان و الفصل الثالث]

اور...... اس زمانہ میں خراسان (موجودہ افغانستان اور اس کے ملحقہ علاقے) سے ایک لشکر اس کی اعانت کے لیے آئے گا اور پھر وہ آ کر بیت المقدس میں جھنڈا گاڑ دے گا، پوری دنیا کی کوئی طاقت اس کو نہیں روک سکے گی۔

اب یہ کڑیاں ملائیں کہ جب اللہ نے تجدید دین کا کام لیا تو اس کے لیے بھی اس علاقے کو منتخب کر لیا کہ اب وہاں سے لوگ پیدا ہو رہے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ غلبۂ دین کا کام لیں گے تو وہیں سے آدمی اُٹھے گا۔

اور اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے جذبے اور ان کی قربانی کو، کیسے انہوں نے سرخ ریچھ یعنی روس کو شکست دی ہے!؟ یہ سارا اللہ کا نظام ہے، کافر لاکھ اپنا قانون بناتے رہیں، اپنے دماغ کو لڑاتے رہیں، اللہ کا بھی اوپر سے ایک نظام چل رہا ہے۔ اور عین وہ موقع آئے گا جب پوری دنیا میں کفر کو پناہ نہیں ملے گی، پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہوگا۔ اور اسی دور میں خروجِ دجال کا موقع آئے گا اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا، پوری دنیا پر اسلام چھا جائے گا اور اللہ پوری دنیا پر اسلام کو غالب کر دیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ کفر جہاں ہے اسلام سے ڈر رہا ہے۔ وہ پاگل نہیں ہو گئے، وہ پڑھ رہے ہیں، تم تو پڑھتے نہیں ہو۔ تم لوگوں نے قرآن شریف تعویذ لکھنے کے لیے رکھا ہے یا کبھی کسی کا پیسہ چوری ہو جائے یا جھگڑا ہو جائے تو قرآن ہاتھ رکھنے کے لیے رکھا ہوا ہے یا کوئی دلہا دلہن کو رخصت کرنا ہو تو ان کے سر پر سایہ کرنے کے لیے۔ زیادہ سے زیادہ کسی کا بچہ ڈرتا ہو تو کہتے ہیں: جیب میں پنج سورہ رکھ لو۔ حالانکہ جب قرآن اندر ہی داخل نہیں ہوگا تو جیب میں رکھنے کا کیا فائدہ؟ بڑے بڑے کافر ہیں جنہوں نے قرآن کا ترجمہ کیا ہے تو کیا وہ ترجمہ کرنے سے مسلمان ہو گئے؟ کافروں کے بڑے بڑے پریس ہیں، جنہوں نے سب سے اعلیٰ قرآن چھاپا۔ اللہ تعالیٰ خادم الحرمین کو جزائے خیر عطا فرمائے...... ساڑھے چار سو ریال میں ایک قرآن شریف ملتا ہے، لیکن اللہ نے خادم الحرمین کے دماغ میں ایک بات ڈالی کہ کل کو کافر طعنہ نہ دیں کہ یہ خود قرآن کو اتنا اچھا کیوں نہیں چھاپ رہے؟ چنانچہ انہوں نے مدینہ منورہ کے اندر "مجمع فہد" قائم کیا، جس کی مثال پوری دنیا قائم نہیں کر سکتی۔ پوری دنیا میں اتنا بڑا پریس نہیں جو قرآن چھاپتا ہو۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے اور اللہ تعالیٰ زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی توفیق دے۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضور اکرم ﷺ سے یہ باتیں پوچھیں۔ میرے آقا سرکار مدینہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مت گھبراؤ، ایک وقت آئے گا جب پوری روئے ارض پر اسلام غالب آئے گا۔ صحابی کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضور اکرم ﷺ چپ کر گئے تو چپ کرنے کی بھی وجہ تھی کہ جب اسلام کا غلبہ آئے گا، آخر

قیامت بھی آنی ہے کہ ایک ٹھنڈی ہوا چلے گی، جتنے اسلام والے ایمان والے لوگ ہوں گے، وہ مر جائیں گے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ چپ ہو گئے کہ غلبہ کی خوشی سنائی ہے، اب مسلمان اُداس نہ ہو جائیں۔

یہ ایک نظام ہے جو چلتا آ رہا ہے اور وہ تمام نشانیاں جو میرے آقا ﷺ نے بتائی ہیں، وہ بالکل اپنے وقت پر پوری ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم کس پلڑے میں اپنا وزن ڈالتے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ نے جو کرنا ہے، وہ کرے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کو پوری دنیا کی طاقت نہ روک سکتی ہے، نہ ٹال سکتی ہے اور نہ منع کر سکتی ہے۔ دینِ حق غالب ہوگا اور ضرور ہوگا۔ میرے اللہ جو فیصلہ فرما دیتے ہیں، اس کو پھر دنیا کی کوئی طاقت نہیں ٹال سکتی۔

یہود و منافقین کا تذکرہ:

﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٧٦﴾﴾ [البقرة:٧٦]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان یہودیوں کا یہ عالم ہے کہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم پکے مسلمان ہیں، ہم بھی ایمان لے آئے ہیں کہ واقعی تمہارے نبی سچے ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کی تمہاری طرف بھیجا گیا ہے۔

منافقوں کا ہمیشہ یہی عالم ہوتا ہے کہ جو ملا، اس سے مل گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ماشاء اللہ! یہ بڑا سوشل اور بڑا وسیع الظرف آدمی ہے، ماشاء اللہ! بڑا وسیع القلب آدمی ہے، کسی مذہب سے اس کا کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے۔ جس شخص کی ایسے تعریف کی جائے تو سمجھا کرو کہ وہ ایمان سے فارغ ہے۔ کیونکہ کسی سے جھگڑا نہ ہونا، اگر شرافت کی دلیل ہے تو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ لوگ جھگڑا کیوں کرتے تھے؟ پھر تو حضور اکرم ﷺ کی ذات ایسی ہوتی کہ کوئی بھی آپ سے جھگڑا نہ کرتا۔ دیکھ لیں کہ حضور اکرم ﷺ کے دشمن زیادہ تھے یا دوست زیادہ تھے؟

بہر حال جب وہ یہودی علیحدہ ہوتے تو ان کو ان کے بڑے بڑے علماء سمجھاتے کہ تم مسلمانوں کو جا کر بتا دیتے ہو کہ ہماری کتاب میں بھی موجود ہے کہ ان کے پیغمبر سچے نبی ہیں۔

﴿وَقَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٧٢﴾﴾ [آل عمران:٧٢]

حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ منافقین یہود کا طریقہ یہ تھا کہ جب حضور

اکرم ﷺ کے اصحاب سے ملتے تو کہتے: "آمنا"۔ اسی طرح حضرت سدی نے فرمایا کہ یہ یہودیوں میں سے ایک جماعت تھی، پہلے ایمان لے آئے، پھر انہوں نے نفاق اختیار کر لیا۔

اصل بات یہ تھی کہ مدینہ منورہ میں جو یہودی تھے، ایک تو ان کے دلوں میں حضور اکرم ﷺ کا حسد تھا اور دین اسلام اور رسالت محمد مصطفیٰ ﷺ سے بغض تھا۔ اگر ان کو خبر ملتی کہ مسلمان فلاں جگہ غالب ہو گئے ہیں تو مسلمانوں کے ساتھ مل جاتے، پھر خبر ملتی کہ فلاں جگہ سے مسلمانوں کو نقصان ہوا تو فوراً مکہ کے کافروں کو پیغام بھیجنا شروع کر دیتے تھے۔ ﴿مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا﴾ [النساء: ۱۴۳]

اسی طرح ربیع بن انس اور قتادہ اور بہت سارے سلف و خلف نے یہی قول نقل فرمایا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے پاس وہ لوگ آئیں جو پکے مومن ہیں۔ جو منافق ہیں ان کو ہمارے پاس آنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تو کافروں اور منافقوں کے بڑے بڑے سرداروں نے کہا: اگر ہمارا مدینہ میں آنا جانا اور داخلہ بند ہو گیا تو ہمیں پتہ نہیں چلے گا کہ مسلمان ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟ ہمارا آنا جانا ہو گا تو اندر کی خبر کا ہمیں پتہ چلتا رہے گا، لہٰذا تم لوگ ایسا کرو کہ مدینہ میں جاؤ، جب تمہیں مسلمان ملیں تو کہو کہ ہم تو ایمان لے آئے اور ہم مسلمان ہیں، اس لئے ہم تمہارے پاس آتے ہیں۔ اور جب تم لوگ ہمارے پاس واپس آجاؤ تو تم اپنے اسی کفر پر جمے رہو۔ چنانچہ وہ لوگ جب مدینہ میں آتے اور آکر یہ اظہار کرتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور عصر کو جب واپس لوٹتے تو کافروں کو جا کر کہتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو منافقوں کے بارے میں باخبر کر دیا، جیسا کہ سورۃ المنافقون اور قرآن مقدس کی ایک اور آیت میں بھی ہے: ﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ﴾ [التوبۃ: ۱۰۱]

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ان منافقوں کے ناموں کے بارے میں بھی باخبر کر دیا کہ فلاں منافق ہے، فلاں منافق ہے۔ چونکہ اس مسئلے کا تعلق تبلیغ سے نہیں تھا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے نہیں تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ حضور پاک ﷺ باخبر ہو جائیں۔ لیکن یہ کمال امانت و دیانت ہے کہ میرے آقا ﷺ نے ان لوگوں کے ناموں کی فہرست حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو بتلا دی، تاکہ اللہ نے جو مجھے بتایا ہے میں کسی کو بتا دوں۔ اور حضور اکرم ﷺ نے ان کو شریک راز بنایا۔ ان کو یہ حکم نہیں دیا کہ تم دوسرے لوگوں کو بتاؤ۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کا

نفاق اور ان کے نام حضور اکرم ﷺ کو بتا دیئے تو وہ گھبرا گئے اور ان کا آنا جانا رُک گیا۔

منافقین کے بارے میں:

ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک دن حضور اکرم ﷺ بنو قریظہ میں تشریف لے آئے۔ بنو قریظہ کے قلعہ کے نیچے کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے فرمایا: اے خنزیر اور بندروں کے بھائیو! اے طاغوت کے پجاریو! اب یہودی گھبرا گئے کہ حضور اکرم ﷺ کو کس نے بتایا کہ ہماری قوم کے کچھ لوگ بندر بھی بن گئے تھے، خنزیر بھی بن گئے تھے اور یہ ان کو کس نے بتایا کہ ہم نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اندر سے کسی نے جا کر ان کو خبر کر دی ہے۔

اسی سے بعض علماء نے یہ مسئلہ بھی استنباط کیا ہے کہ دعوت کا انداز ہمیشہ محبت سے ہونا چاہیے، جیسے اللہ نے فرعون کے بارے میں فرمایا کہ جا کر اس سے نرمی سے بات کرو، سخت بات نہ کرو۔ لیکن کبھی کبھی اگر داعی ایسے حالات دیکھے کہ قوم اتنی مردہ دل ہوگئی ہے کہ ان پر کوئی بات اثر بھی نہیں کرتی تو اس کو سخت الفاظ میں بھی بیان کرنے کی اجازت ہے، کیونکہ طبائع مختلف ہیں، بعض طبیعتیں اللہ نے ایسی پیدا فرما دی ہیں کہ ان پر نرم بات کا اثر نہیں ہوتا، بلکہ ان پر سخت بات اثر کرتی ہے۔

؎ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مگر مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اور دوسری جگہ اقبال نے کہا:

ع زہر بھی کرتا ہے کبھی کار تریاقی

حضرت مجاہد رحمہ اللہ کا ایک قول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہودیوں کے پاس بھیجا تو یہودیوں نے کچھ ایسی باتیں کیں جو میرے آقا ﷺ کی شان کے خلاف تھیں۔

حضور اکرم ﷺ کی صورت عیسائیوں کے پاس:

حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم ﷺ کو ایک واقعہ سنایا کہ ہم ایک گرجا میں گئے جو ایک بادشاہ نے بنوایا تھا۔ اس گرجا کے پادری نے ہم سے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟ ہم نے کہا: ہم مکہ کے رہنے والے ہیں۔ پادری نے

کہا: اگر تم مکہ مکرمہ کے رہنے والے ہو تو مکہ مکرمہ میں ایک عظیم ہستی پیدا ہوں گی، جن کا نام محمد بن عبداللہ ہوگا۔ اگر میں ان کی تصویریں تمہیں دکھلاؤں تو کیا پہچان لو گے؟ ہم نے کہا: پہچان لیں گے۔

اس پادری نے آ کر ایک الماری کھولی، اس میں تصویریں تھیں، وہ ہمیں دکھائیں۔ ہم نے کہا: ان میں تو نہیں ہیں۔ اس نے ایک اور الماری کھولی، اس کے اندر سب تصویریں ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ ہمیں کہا: ان میں دیکھو، کوئی ہے؟ ہم نے کہا: نہیں ہے۔ پھر اس نے جا کر آخری الماری کھولی، اس میں جا کر ہم نے دیکھا تو اس میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ہم نے کہا: یہی ہیں۔ اس پادری نے کہا: اس کا مطلب ہے کہ اللہ کے سچے اور آخری نبی پیدا ہو گئے ہیں۔

اس دور میں مصور نے تورات و انجیل کی معلومات اور اپنے تخیلات کی بنا پر یہ تصویریں بنائی ہوئی تھیں۔ اس طرح اہل کتاب کے پاس حضور اکرم ﷺ کے بارے میں معلومات تھیں، لیکن وہ خواہ مخواہ لوگوں پر چھپاتے تھے، تاکہ وہ ایمان نہ لے آئیں، حالانکہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ سب جانتے ہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيْهِمْ ۚ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۚ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۷۸، ۷۹]

اور بعض اُن میں اَن پڑھ ہیں جو کتاب کی خبر نہیں رکھتے، سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور اُن کے پاس خیالات کے سوا کچھ نہیں۔ پس اُن لوگوں کے لیے خرابی ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب کو لکھتے ہیں، پھر کہہ دیتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے، تاکہ اس پر تھوڑا سا مول لے لیں۔ پس اُن کے لیے خرابی ہے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور اُن کے لیے اُن کی اپنی اس کمائی سے ہلاکت ہے۔

آیات کا باہمی ربط:

ان آیاتِ مبارکہ میں یہودیوں کے دوسرے گروہ کا ذکر ہے۔ پہلا گروہ وہ جو پڑھے لکھے لوگ تھے، جو اللہ کی کتاب اور احکام کو بدل ڈالتے تھے اور اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اُمّی تھے۔ "أُمِّيُّوْن"، "اُمّی" کی جمع ہے، اس کا معنی قرآن نے آگے خود بیان فرمایا، کہا: ﴿لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ جو پڑھے لکھے نہیں تھے

اور کتاب نہیں جانتے تھے، اُمّی، ان پڑھ کو کہتے ہیں۔ اُمّی کی نسبت ماں کی طرف کی جاتی ہے، جیسے آدمی ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اور ابھی اس کو پڑھنا لکھنا نہیں سکھایا گیا تو وہ اُمّی یعنی ان پڑھ ہے۔

محمد ﷺ کو اُمّی کہنے کی وجہ:

کسی کو اُمّی کہنا، یہ صفت تعریف نہیں ہے، لیکن اللہ کی شان ہے کہ وہ لفظ جو ساری دنیا کے لئے باعث تنقیص تھا، وہی لفظ جب حضور اکرم ﷺ سے لگا تو باعثِ شرف بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ﴾ [الاعراف:۱۵۷] اور میرا وہ نبی اُمّی یعنی محمد مصطفیٰ ﷺ۔ لیکن جب حضور اکرم ﷺ کے ساتھ لگا تو معنی یہ ہوا کہ ایسی جگہ پیدا ہوئے جہاں کوئی مدرسہ نہیں، علماء نہیں، کتابیں نہیں تھیں، لیکن شان یہ ہے کہ سارے عالم کو پڑھا دیا۔ اس لئے بھی حضور اکرم ﷺ کو اُمّی کہا گیا ہے کہ آپ جس اُمت میں پیدا ہوئے، جس قبیلہ میں پیدا ہوئے، وہ لوگ بھی اُمّی تھے، ان کے پاس کوئی علم نہیں تھا اور اس وجہ سے بھی حضور اکرم ﷺ کو اُمّی کہا گیا کہ آپ کی پیدائش مکہ میں ہوئی اور مکہ کا نام اُمّ القریٰ یعنی تمام بستیوں کی ماں ہے۔

یہودیوں کی قسمیں:

وہ جاہل لوگ جو کتاب تورات کو نہیں جانتے، مگر وہ انہی اُمیدوں اور گمانوں میں پڑے ہوئے ہیں جو ان کے احبار نے ان کے دماغوں میں ڈالی ہوئی ہیں، جن کا ذکر اگلی آیات میں آرہا ہے۔ غور کریں کہ یہودیوں کی دو پارٹیاں ہوگئیں: ایک ان کے عالم جنہوں نے تورات کو بدل ڈالا اور دوسرے جاہل لوگ جن کو راہبوں نے اُمیدوں میں ڈال دیا تھا۔ اب کہیں حضور اکرم ﷺ کی اُمت تو اس حال میں مبتلا نہیں ہے؟ آج ہمارا تو یہی عالم نہیں ہے کہ کوئی اللہ کے قرآن کو بدل رہا ہے اور کوئی حدیث کا انکار کر رہا ہے، کوئی عائلی قانون بنا کر کہتا ہے کہ یہ اسلام کا قانون ہے اور قرآن کا قانون ہے۔ اور جو جاہل ہیں ان کو اس گمان میں ڈالا ہوا ہے کہ جب کلمہ پڑھ لیا تو بات ختم ہوگئی، تمہارے جیسا پکا مسلمان کوئی نہیں ہے۔ ﴿وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ﴾ [البقرۃ:۷۸]

حضور اکرم ﷺ کی امت بھی اُمّی ہے:

''اُمِّيُّوْن''، ''اُمّی'' کی جمع ہے، اس کا معنی ہے: ایسا آدمی جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ حضور اکرم ﷺ کی صفات

میں بھی یہ آیا ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ [العنکبوت: ۴۸] میرے نبی! قرآن پاک اُترنے سے پہلے آپ کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ ہی آپ اپنے ہاتھ مبارک سے لکھنا جانتے تھے۔ اگر آپ پڑھنے والے یا لکھنے والے ہوتے تو "مُبْطِلُوْن" یعنی کفار کو شک کرنے کا زیادہ موقع حاصل ہوتا کہ حضور پاک ﷺ تو پڑھے لکھے ہیں، قرآن خود بنا کر کہہ دیتے ہیں کہ اللہ نے اُتارا ہے۔ لیکن جب ایک شخص نے پڑھا ہی نہ ہو، کسی مدرسہ میں بھی نہ بیٹھا ہو، کسی استاد کے پاس زانوئے تلمذ بھی تہہ نہ کیے ہوں، کبھی اس نے کسی کے سامنے کوئی قراءت، کوئی لکھنے اور پڑھنے کا کام کیا ہی نہ ہو تو پھر جب وہ اللہ کا قرآن پڑھے تو صاف بات ہے کہ یہ اللہ کی وحی ہے۔

اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی جب بعثت ہوئی ہے تو آپ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے، لیکن اس کے بعد جیسے اللہ تعالیٰ نے حضور پاک ﷺ کو قرآن کا علم عطا فرما دیا کہ اللہ نے بطور خاص اپنی رحمت کے ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ جب قرآن پڑھا جائے تو آپ چپ کر کے سنتے رہیں، اپنی زبان مبارک کو نہ ہلائیں، ہم قرآن آپ کے سینے میں بٹھا دیں گے۔

چنانچہ اللہ نے پورا قرآن حضور پاک ﷺ کے سینہ مبارک میں جمع کر دیا اور فرما دیا: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى﴾ [الاعلیٰ: ٦] کہ ہم آپ کو ایسا قرآن پڑھا دیں گے کہ پھر آپ بھولیں گے بھی نہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض آیات اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سینہ مبارک سے خود اُٹھا لیں، لیکن اس کے علاوہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے پڑھایا، آپ ﷺ نہیں بھولیں گے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے اتنا علم عطا فرمایا ہے جو مجھ سے پہلے گزرے ہیں یا میرے بعد آئیں گے، ان کا علم اللہ نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ [روح البیان: ۳/۳۸۶]

اور جب اللہ نے اتنا بڑا علم عطا فرمایا تو اس کے بعد لکھنے کا علم عطا فرمایا گیا یا نہیں؟ اس کے اندر مفسرین کے دو قول ہیں:

❁ ...... پہلا قول یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی شان بھی یہی ہے کہ آپ کسی سے پڑھیں بھی نہیں، کسی مدرسہ میں بھی نہ جائیں اور ساری دنیا کو پڑھا دیں۔ کیونکہ پڑھا ہوا آدمی پڑھا دے تو کوئی بہادری کی بات نہیں، لیکن کمال اُن لوگوں کا ہوتا ہے جنہوں نے علم نہ پڑھا ہو اور وہ علم کے مشکل مسئلے حل کر ڈالیں۔ آسمان وزمین کے تمام مباحث،

مسائل اور قیامت تک آنے والے تمام حالات پر ایسی روشنی ڈالیں جو اول درجے پر صحیح ثابت ہوتی آ رہی ہیں۔
حضور اکرم ﷺ نے ایسے ایسے علوم کا ذکر فرمایا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات موجود ہے کہ ایک دن انہوں نے حضور پاک ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کبھی کبھی عربی میں ایسے لفظ بولتے ہیں جو ہمیں سمجھ نہیں آتے، حالانکہ ہم عرب ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا: اے ابو بکر! ایسے کیوں نہ ہو، میں بنو ہاشم کے خاندان میں پیدا ہوا ہوں، میری ولادت مکہ میں ہوئی اور میری تربیت بنو سعد کے قبیلہ میں ہوئی، اگر مجھ سے فصاحت و بلاغت کا اظہار نہیں ہوگا تو کس سے ہوگا؟

ان کی دلیل یہی دو آیات اور حضور اکرم ﷺ کا اپنا فرمان بھی ہے: ''إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ، لَا نَكْتُبُ وَ لَا نَحْسُبُ، الشَّهْرُ هٰكَذَا وَ هٰكَذَا'' (ہم اُمت اُمیہ ہیں کہ لکھنا پڑھنا زیادہ حساب کتاب نہیں جانتے۔ مہینہ کبھی دس، دس، دس یعنی تیس کا ہوتا ہے اور کبھی اُنتیس کا ہوتا ہے)۔

[صحيح البخاري، حديث: ١٩١٣، بابُ: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ]

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے دین کا نظام آسان رکھ دیا ہے کہ شریعت کے جتنے احکام ہیں، ان کا تعلق قمری مہینوں سے ہے، شمسی سے نہیں۔ نظامِ قمر کا دور تقریباً اٹھائیس دن میں مکمل ہوتا ہے، نظامِ شمسی کا دورہ تقریباً تین سو ساٹھ دنوں کے اندر جا کر مکمل ہوتا ہے۔ نظامِ شمسی کو سمجھنے کے لیے بڑی بڑی رصدگاہوں کی ضرورت ہے، لیکن چاند کا نظام سادہ ہے۔ بڑی آسانی نظامِ قمری کے اندر یہ ہے جس پر بڑا شور ہوتا ہے کہ لوگ چاند پر پہنچ گئے اور یہ مولوی ابھی تک یہیں کھڑے ہیں۔ آج مشینوں سے حساب کر کے بتایا جا سکتا ہے کہ چاند اس وقت کہاں ہے؟ اور چاند کس تاریخ کو فلاں علاقہ میں نظر آ سکتا ہے یا ابھی نظر نہیں آ سکتا۔ تو لوگ خواہ مخواہ عید پر تماشا بناتے ہیں کہ کوئی کہتا ہے کہ آج عید ہوگی اور کوئی کہتا ہے: کل عید ہوگی۔ مولوی ہر مسلمان کو لڑوا رہے ہیں، اگر یہ اتفاق کر لیں تو سارے مسلمانوں کی عید ایک دن ہو جائے گی۔

مسئلہ سمجھیں! اسلام چاند کے تابع نہیں ہے، جیسے کعبہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میرے گھر کا طواف کرو۔ اگر یہ کعبہ نہ ہو تو کیا طواف ختم ہو جائے گا؟ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں یہ ڈوب گیا تھا، سیدنا ابراہیم علیہ السلام جب یہاں تشریف لائے تو یہاں کوئی کمرہ نہیں تھا، کوئی کعبہ شریف نہیں تھا، بس ایک ٹیلہ پڑا تھا تو کیا طواف ختم ہو گیا تھا؟ کیا ہم اس پتھر اور اس چار دیواری کے پجاری ہیں؟ اس لیے اس کے گرد پھرتے ہیں؟ نہیں، بلکہ

ہم نے اللہ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے، ان پتھروں کی عبادت نہیں کرنی۔ اسلام تو اس حکم کی تعمیل کا نام ہے کہ اللہ نے اس کا طواف کرنے کا حکم دیا ہے، چاہے اس کی عمارت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بنائی تھی یا مکہ کے کافروں نے بنائی تھی، ہم نے طواف کرنا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی تعلیم:

اب اگر کسی کو کہہ دو کہ حضور اکرم ﷺ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے تو وہ کہے کہ یہ گستاخ ہے تو لڑائی شروع ہوگئی۔ یہ کوئی نہیں پوچھے گا کہ مولوی کی کیا جرأت ہے؟ حضور اکرم ﷺ کے غلاموں کے غلام کی بڑی شان ہے۔ مولوی تو حضور اکرم ﷺ کے دروازے کی مٹی کی تہہ کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ تو اللہ نے فرمایا: ﴿النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ﴾ اور پھر اس کی تفصیل بیان فرما دی: ﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ [العنکبوت:۴۸] میرے نبی! آپ کتاب پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے اور قلم سے دائیں ہاتھ سے لکھنا بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ اللہ پاک فرمارہے ہیں، مولوی نہیں کہہ رہا۔

اصل بات سمجھنے والی یہ ہے کہ ایک آدمی پڑھا لکھا نہ ہو اور ساری دنیا کو پڑھادے، یہ شان زیادہ ہے یا جو پڑھا لکھا ہو وہ پڑھادے، اس کی شان زیادہ ہے؟ کمال یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کو کسی کا شاگرد نہیں بننے دیا، کیونکہ استاد کا درجہ زیادہ ہوتا ہے اور میرے نبی سے کسی کا درجہ زیادہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے احناف اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ امام بھی ہیں، حجہ بھی ہیں، حافظ الحدیث بھی ہیں، لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے پاس تو کچھ احادیث ثلاثیات ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی احادیث ہی ثلاثیات اور ثنائی ہیں۔

اسی طرح اگر حضور اکرم ﷺ کسی کے شاگرد ہوتے تو دنیا کہتی: خاتم الانبیاء کی بڑی شان ہے، لیکن فلاں کا شاگرد تو ہے۔ اللہ نے فرمایا: میں اپنے نبی کو کسی سے پڑھنے نہیں دیتا، خود پڑھادوں گا۔ میں نے اپنے مدنی کا نظام ہی ایسا بنایا کہ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ باپ فوت ہوگئے، تاکہ باپ یہ نہ کہے کہ میں نے پالا تھا۔ ابھی بچپن تھا کہ ماں بھی فوت ہوگئیں، وہ بھی احسان نہ جتلائیں کہ میری گود میں پلے ہو۔ اللہ نے فرمایا: ہم ان کو پالیں گے اور ہم ہی ان کی حفاظت فرمائیں گے اور ان کو ہم پڑھائیں گے۔ پڑھانے والا نوری فرشتہ ہو، اللہ کے حکم سے آئے

اور پڑھائے، لیکن میرے مدنی کا خادم ہو۔ وہ بھی نہ کہہ سکے کہ میں نے پڑھایا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور اکرم ﷺ کے پاس بغیر اجازت کے داخل بھی نہیں ہو سکتے، جب تک آپ ﷺ اجازت نہ دیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے بارے میں کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے اس کو پڑھایا تھا۔

یہودیوں کے اُمّی:

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کی ایک ایسی جماعت تھی جو کتاب کو نہیں مانتے تھے، اپنے گمان اور خیال کے مطابق کلام کرتے تھے، اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ پر اُمیدیں اور تمنائیں لگاتے تھے، ان کی وہ اُمیدیں سچی نہیں تھیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۷، البقرۃ: الآیۃ: ۷۸]

یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ شروع آیت میں آیا: ﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾ [البقرۃ: ۷۸] اور بعد میں آیا: ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ [البقرۃ: ۷۹] اس سے پہلے ان لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے جن لوگوں نے کلام اللہ میں تحریف کی، یعنی ان کے رہبان اور پادری۔ اس کے بعد اُمیین کا ذکر آیا اور ان کی مذمت آئی کہ یہ ''اُمیین'' ہیں، جاہل ہیں، اس کے پاس جھوٹی تمناؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن ان لوگوں کی ہلاکت و بربادی دیکھو جو لکھنا بھی جانتے ہیں، پڑھنا بھی جانتے ہیں، مسئلہ خود لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کا کلام اور حکم نہیں ہوتا۔ یہ اس لیے کرتے ہیں: ﴿لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ تاکہ دنیا کے اندر تھوڑا سا سامان و دولت حاصل کر سکیں۔

﴿ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ ''ثمن'' قیمت کو کہتے ہیں، اور ''قلیل'' بمعنی تھوڑی۔ یہاں یہ مربوط نہیں کہ تھوڑے پیسے لیتے تھے اور تورات بدل ڈالتے تھے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اللہ کا حکم بدلنے کے مقابلہ میں چاہے پوری دنیا کی دولت بھی مل جائے، تھوڑی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ دنیا میں رہنا، کھانا، پینا معمولی نفع ہے۔ اصل نفع وہ ہے جو لوگ حیاتِ اُخروی میں اُٹھائیں گے، دنیا تو عارضی اور فانی چیز ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ دنیا حاصل کرنے کے لیے اور دنیا میں مرتبہ، عہدہ بچانے کے لیے اللہ کے کلام کو بدل ڈالتے ہیں، ان کے لیے ہلاکت و بربادی ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے جن اُمّیین کی صفت بیان کی ہے، ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو کتاب (تورات) کو سمجھنے والے نہیں تھے اور اس کے باوجود جھوٹ گھڑتے تھے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''مَا تَغَنَّيْتُ وَ لَا تَمَنَّيْتُ...مُنْذُ أَسْلَمْتُ'' (میں نے زندگی میں کبھی بھی گانا نہیں گایا اور کبھی بھی جھوٹ نہیں گھڑا)۔ لیکن آج کل تو گانا گانا فخر سمجھا جاتا ہے اور گانے والوں کا اتنا بڑا اعزاز ہوتا ہے کہ کسی عالم کا اتنا بڑا اعزاز نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے: ﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝﴾ [النور:۲۶] یعنی اچھا اچھوں کی طرف اور گندا شیطان کی طرف ضرور مائل ہوتا ہے۔ بہرحال اس حدیث سے ہمیں معلوم ہوا کہ جھوٹ بولنا، جھوٹا گھڑنا شریعت کے اندر حرام ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۷، البقرۃ: الآیۃ: ۷۸]

﴿اَمَانِيَّ﴾ کا معنی ''پڑھنا'' بھی آتا ہے:

بعض مفسرین نے فرمایا: ﴿اِلَّآ اَمَانِيَّ﴾ میں دو قراءتیں ہیں، ایک تخفیف کے ساتھ اور ایک تشدید کے ساتھ ہے۔

بعض نے فرمایا: ﴿اَمَانِيَّ﴾ کا معنی ہے: تلاوت کرنا، جیسے قرآن میں آتا ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ﴾ [الحج:۵۲] جب اللہ کا نبی پڑھتا ہے تو اس کی تلاوت میں شیطان روڑے اٹکاتا ہے۔ ﴿اَمَانِيَّ﴾ کا معنی تلاوت کریں گے تو استثناء منقطع ہوگا اور ''لٰکِنْ'' کے معنی لے گا۔ مطلب یہ ہوگا کہ وہ کتاب کو نہیں جانتے، لیکن تلاوت کرتے ہیں، جیسا کہ کعب بن مالک شاعر نے اور بعض تفسیروں میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا نام آیا ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ شعر کہا:

تَمَنّٰى كِتَابَ اللهِ أَوَّلَ لَيْلَةٍ
وَ آخِرَهُ لَاقٰى حِمَامَ الْمَقَادِرِ

''اوّل رات میں تو اللہ کا قرآن پڑھتے رہے اور جب رات کا آخری حصہ آیا تو شہید کر دیئے گئے۔''

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۷، البقرۃ: الآیۃ: ۷۸]

بعض سوشل لوگ:

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ رحمٰن بھی راضی اور شیطان بھی راضی ہو کہ کوئی بھنگی مل جائے تو اس کے ساتھ بھی

[1] المعجم الکبیر، حدیث: ۵۰۶۱؛ سنن ابن ماجہ، حدیث: ۳۱۱، باب کراھۃ مس الذکر بالیمین]

چلے جاتے ہیں، کوئی تعزیہ والا ہو تو اس کے ساتھ بھی چلے جاتے ہیں، کوئی دلدل والا مل جائے، اس کے ساتھ بھی چلے جاتے ہیں اور کبھی ہندو، مندر میں بلائے تو وہاں چلے جاتے ہیں اور پرشاد کھا لیتے ہیں۔ اسی طرح کبھی کوئی نماز والا مل جائے تو نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم تو بڑے سوشل لوگ ہیں، ہم کسی لڑتے جھگڑتے نہیں ہیں، ہم نے سب کو راضی رکھا ہوا ہے، نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، شراب بھی پی لیتے ہیں، جھوٹ بھی بول لیتے ہیں۔

ایک افسر اتنا پکا نمازی تھا، مجال ہے کہ پانچ وقت نماز میں سے کوئی نماز چھوٹنے اور قرآن شریف کی تلاوت کا اتنا بڑا پابند تھا کہ صبح کی نماز کے بعد چاہے کچھ ہو جائے، وہ تلاوت ضرور کرتا تھا اور دوسری طرف رشوت لینے کا اتنا عادی تھا کہ لوگوں کو کہتا: صبح مسجد میں منزل پڑھ رہا ہوں گا وہیں آ کر پیسے دے دینا، لفافے کے اندر رقم رکھ کر لے آنا۔ کوئی کہتا: یہاں نیچے رکھ دو۔ یہی وہ آدمی ہیں جن کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ''رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَ الْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ''

[روح المعاني، سورة: فاطر، آية: ۲۹، تفسیر ابن باديس، ص: ۳۸]

اور میرے آقا ﷺ کی حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے سر پر مٹی بھی ہوتی ہے، سر پر عمامہ نہیں ہوتا اور پاؤں پر غبار ہوتا ہے کہ پاؤں میں پہننے کے لیے جوتا بھی نہیں ہوتا، پھٹے پرانے کپڑوں میں ہوتے ہیں، کسی سے رشتہ مانگیں تو ان کو کوئی رشتہ نہ دے، کسی کو سفارش کریں تو ان کی سفارش نہ مانی جائے، کسی سے بات کریں تو کوئی ان کی بات نہ سنے، لیکن اللہ کے ہاں ان کا اتنا بڑا مرتبہ ہوتا ہے کہ اگر وہ قسم کھا لیں تو اللہ اس کو پورا کر دیتا ہے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۴۳، باب: فضل الفقر، صحیح مسلم، حدیث: ۲۶۲۲]

فقیر کی دعا سے بارش کا برسنا:

حضرت حکیم الاسلام قاری طیب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ بارش نہ آئے، نماز استسقاء پڑھی اور دعائیں مانگیں، لیکن بارش نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت میری عمر چھوٹی سی تھی۔ مجھے اپنے استاد نے بلا کر فرمایا کہ فلاں گلی میں ایک فقیر بیٹھا ہے، اس کو جا کر کہو کہ اللہ سے دعا مانگے اور بارش آئے، ہم تو بارش کے بغیر مر گئے۔ آپ نے فرمایا: حضرت! میں تو بچہ ہوں۔ استاد نے کہا: کیونکہ تم جاتے رہتے ہو، کبھی اس کو لسی پلاتے ہو، کبھی پانی پلاتے ہو اور کبھی اس کو کچھ دے دیتے ہو، وہ تمہارے ساتھ مانوس ہے، تم جا کر اس کو کہو۔ فرماتے ہیں کہ میں اس کے پاس گیا اور کہا: حضرت! اللہ سے دعا کرو، پانی نہیں ہے، لوگ پریشان ہیں۔ کہنے لگے: اچھا! تم میرے پاس کیوں آ گئے؟ میں نے

کہا: نیکی کا کام ہے۔ کہنے لگے: اللہ میاں کو کہتے تو ہیں، لیکن آج کل ہم سے ناراض ہیں، پتہ نہیں شاید ہماری بات مان لیں۔ تم مولویوں نے زور لگایا ہے؟ میں نے کہا: حضرت! مولویوں کے بس میں کیا ہے؟ اگر ان کے بس میں کچھ ہوتا تو ساری دنیا ٹھیک ہو جاتی، مولوی بھی بندے ہوتے ہیں، کبھی اللہ نے دعا منظور کر لی اور کبھی نہیں کی۔ ان بزرگوں نے کہا: چلو ہم اپنے اللہ سے مانگتے ہیں۔ قاری صاحب نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ میں ابھی مدرسہ نہیں پہنچا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔

ایسے بھی لوگ تھے!! کیونکہ اندر حلال ہے اور زبان پر کبھی جھوٹ نہیں آیا۔ جب ہاتھ اُٹھاتے ہیں تو اللہ خالی نہیں لوٹاتا۔

حلال رزق دعا کی قبولیت کا سبب ہے:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تمہارے لباس حرام کے ہوں گے، تمہارے کھانے حرام کے ہوں گے، تمہیں غذا حرام سے ملے گی اور چیخ چیخ کر کہو گے: ''یَارَبِّ، یَارَبِّ، یَارَبِّ!'' پھر کہاں سے تمہاری دعائیں قبول ہوں گی؟

[صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۱۵، باب: قَبُولِ الصَّدَقَةِ مِنَ الْكَسْبِ الطَّيِّبِ]

جب اندر حرام چلا جائے تو دعا قبول نہیں ہوتی۔ آج ہمارے اندر حرام کسی نہ کسی شکل میں داخل ہو چکا ہے۔

﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ﴿١٣﴾﴾ [سبا: ۱۳] مگر وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی رحمت سے بچایا ہوا ہے۔

آج ہم مولوی بھی روتے ہیں، پیر بھی روتے ہیں، سفید داڑھیوں والے بھی روتے ہیں، حالانکہ حدیث میں ہے کہ دعا کے لیے بندہ جب ہاتھ اُٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میری رحمت کو حیاء آتی ہے کہ میں اس کے ہاتھوں کو کیسے خالی لوٹا دوں۔[1] لیکن آج اتنے سفید داڑھیوں والے رو رہے ہیں کچھ نہیں ہو رہا، ہر جگہ مسلمان قتل ہو رہے ہیں، عصمتیں، عزتیں لٹ رہی ہیں، مسلمانوں کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے ہندو اجتماعی زیادتی کر رہے ہیں اور مسلمان بیٹیوں کے پستان کاٹ کر اوپر لکھا جاتا ہے: ''اسلام زندہ باد'' اور ہم بے غیرت زندہ ہیں، گھروں میں کھا پی رہے ہیں، ہمارے اندر تھوڑا سا فرق بھی نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت اس لیے نہیں آرہی کہ ہمارے بدن حرام سے پلے ہیں، ہمارے اندر حرام ہے۔ کسی کے اندر رشوت کا پیسہ ہے، کسی کے پیٹ میں یتیم کا پیسہ ہے، کسی کے پیٹ میں دھوکہ کا پیسہ ہے، کسی کے پیٹ میں جوئے کا پیسہ ہے اور کسی کے پیٹ میں ربوا کا پیسہ ہے

[1] [سنن أبي داود، حدیث: ۱۴۸۸، باب: الدُّعَاءِ]

اور مُلّا، مولوی کے پیٹ میں زکوٰۃ، صدقات اور چندے کا پیسہ ہے۔

مکی صاحب کے والد کی احتیاط:

میرے والد کی خدمت میں ایک آدمی نے اس زمانہ میں دس ہزار ریال آ کر پیش کئے۔ میں اس وقت چھوٹا تھا اور ان کے پاس بیٹھا تھا۔ والد صاحب نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: زکوٰۃ کے پیسے ہیں۔ آپ نے فرمایا: الحمدللہ! میں زمیندار آدمی ہوں، میں زکوٰۃ نہیں لیتا، میرے لئے حرام ہے۔ اس نے کہا: میں اس لئے دے رہا ہوں کہ جن کو آپ جانتے ہیں، مستحق ہیں ان کو دے دیں، ہم تو باہر کے مسافر ہیں، ہم تو نہیں جانتے۔ والد صاحب بلوچ آدمی تھے، جلال کے اندر آ کر ایسے ہاتھ مارا تو پیسے دور جا پڑے۔ اب وہ ان کو چن رہا ہے۔ والد صاحب نے فرمایا: سارے حرم میں نوکر میں نظر آیا تھا، زکوٰۃ تیری ہوگی اور چلانے والا میں تجھے ملا ہوں؟ زکوٰۃ تمہارے ذمہ ہے، تم جا کر ڈھونڈو کہ کون مستحق ہے اور کون مستحق نہیں ہے؟ اگر کچھ ریال میری جیب کے اندر رہ گئے اور وہ میں نے اپنے بچوں کو کھلا دیئے تو قیامت کے دن کون ذمہ دار ہوگا؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی احتیاط:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس جنگ فتح ہونے کے بعد مشک (کستوری) آیا، آپ نے مجاہدین میں اس کو تقسیم کرنا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ماتھا پکڑ کر گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بیوی نے پوچھا: امیر المومنین! کیا بات ہے؟ کیوں پریشان بیٹھے ہیں؟ انہوں نے کہا: آج میں ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ ایک ملک فتح ہوا، وہاں سے کچھ مشک آیا ہے اور اس کو تقسیم کرنا ہے۔ اب اس کا وزن کرنا، تولنا ہے، اس کے رتی ماشے بنانے ہیں، تاکہ ایک ایک رتی کا فرق نہ پڑے اور ہم نے کبھی مشک تولا ہی نہیں ہے، ہم تو سیدھی سیدھی زندگی گزارنے والے لوگ ہیں، اگر وزن غلط ہو گیا تو قیامت میں پکڑا جاؤں گا۔ بیوی نے عرض کیا: میں بھی سردار کے گھرانے کی بیٹی ہوں، ہم نے زندگی میں بڑا مشک دیکھا ہے، رکھا بھی ہے، مجھے بڑا تجربہ ہے۔ آپ مجھے بتائیں کہ کل اس کا کتنا وزن ہے؟ اور کتنے فوجیوں پر اس کو تقسیم کرنا ہے؟ اتنے بنا کر آپ کو دے دیتی ہوں، آپ تقسیم کر دیں۔ آپ نے فرمایا: تم وزن ٹھیک کرو گی، حصے بھی ٹھیک بناؤ گی، لیکن جو تیرے ہاتھ کو لگ جائے، قیامت میں عمر اس کا جواب کیسے دے گا؟ آپ نے اُٹھایا اور اس کو بیت المال میں لے گئے اور خزانچی کو کہا کہ اس کو خود تقسیم کرو، میں اس سے بَری

ہوں، مجھے تقسیم کرنا نہیں آتا۔

ایک استاد کی سوکھی روٹی کھانے کا واقعہ:

ہم نے اپنے استادوں کو دیکھا ہے۔ ایک میرے استاد تھے، ان کی عمر نوّے سال تھی، صبح کی نماز کے بعد میں گیا کہ استاد کو سلام کرلوں۔ جس کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے وہاں آیا تو دیکھا کہ ایک چائے کا گلاس اور سوکھی روٹی کھا رہے ہیں۔ میں نے دور سے دیکھا اور واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے لڑ پڑا کہ عجیب لوگ ہو! ہمارے دس دس کھانے بن رہے ہیں اور حضرت شیخ کے لیے آپ نے ناشتہ بھی نہیں بھیجا۔ انہوں نے کہا: ناراض نہ ہوں، ہم تو سب سے پہلے حضرت کے پاس ناشتہ لے کر گئے، انہوں نے انکار کر دیا اور کہا: ایک گلاس میں چائے ڈال کر لے آؤ۔ میں نے حضرت کی خدمت میں آکر عرض کیا: حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کہنے لگے: بات یہ ہے کہ جب پرسوں ہم لاہور سے آرہے تھے، سمہ سٹہ جنکشن پر ایک روٹی خریدی تھی اور تھوڑے سے آلو بنے ہوئے لیے تھے، آدھی راستے میں ٹرین میں کھالی، آدھی جو بچ گئی اس کو لپیٹ کر تھیلے میں ڈال لیا، کیونکہ آدھی روٹی جب بچی ہوئی موجود ہے تو ناشتہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے کہا: حضرت! آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ فرمانے لگے: بھائی! یہ عارضی تکلیف ہے، دعا کرو اللہ قبر، حشر میں تکلیف نہ دے۔ میرے آقا نے تو پیٹ پر پتھر باندھے، انہیں بعض اوقات اتنا بھی کھانے کو نہیں ملا۔

''اُمّی'' کی کچھ اور تفسیریں:

﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾ [البقرة:۷۸] ایک قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب کی تفصیلات اور حقائق کو نہیں جانتے، لیکن وہ آپ کی نبوت کے بارے میں گمان رکھتے ہیں۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾ ''يَكْذِبُونَ'' کا معنی ہے کہ جھوٹ بولتے ہیں۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ پر اپنی طرف سے خیال باندھتے ہیں، ان کے خیالات بھی سچے نہیں ہوتے، یعنی اپنی طرف سے خیالات کرتے ہیں کہ اس طرح ہوگا اور یوں ہوگا۔ علماء نے لکھا ہے کہ دنیا کے اندر جتنے باطل فرقے ہیں، ان سب لوگوں کے پاس مسئلے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی،

محض ان کے تخیلات اور توہمات ہوتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۷۷، البقرۃ، الآیۃ: ۷۸]

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾
[البقرۃ: ۷۹]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بھی یہود کی ایک قسم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو گمراہی کی دعوت دینے والے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں، تا کہ لوگوں سے مال، باطل طریقوں سے حاصل کر سکیں۔ جیسے آج مسلمانوں میں بھی ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو بڑے لقب لینے والے ہیں اور ان کو یہ لقب انگریزوں سے ملے ہیں۔ انگریز اپنے دشمن کو تو لقب نہیں دے گا، جو اُن کے مفادات کے لیے کام کرتے ہیں، انہی کو دے گا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۷۷، البقرۃ، الآیۃ: ۷۹]

دولت کے بھوکے عالم:

یہ بیماری یہودیوں میں تھی، چلتی چلتی مسلمانوں کے اندر بھی آ گئی۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو برائیاں پہلی اُمتوں کے اندر تھیں، وہ میری اُمت کے اندر بھی ہوں گی۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں، ان کے پاس غریب بے چارے آ کر کہتے ہیں: مولوی صاحب! مہربانی کریں، میرا لڑکا بیمار ہے، اس کے بارے میں کتاب دیکھیں تو ایسے ان کو کوئی بات بتا دی۔

''وَیْلٌ'' کی تفسیر:

''وَیْلٌ'' سے مراد ہلاکت و بربادی ہے۔ ابو عیاض نے فرمایا: ''وَیْلٌ'' پیپ ہے جو جہنم کی تہہ میں ہو گی۔

حضرت عطاء بن یسار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وَیْلٌ'' جہنم کے اندر ایک وادی ہے، اللہ ان پہاڑوں کو وہاں ڈالیں تو یہ بھی پانی ہو جائیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہر کسی کو جہنم سے بچائے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جہنم کے اندر ایک وادی ہے جس کا نام ''وَیْلٌ'' ہے، جب کافر کو ڈالا جائے گا تو چالیس سال تک لڑھکتے لڑھکتے اس کی تہہ تک پہنچے گا۔

مفسر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث بھی غریب ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول ہے کہ ''وَیْلٌ'' سخت عذاب کو کہتے ہیں۔

امام سیبویہ نے فرمایا: محاوراتِ عرب میں آیا: ''وَیْلٌ لِمَنْ وَقَعَ فِی الْھَلَکَۃِ'' ویل ہے اس کے لیے جو ہلاکت کے اندر گر گیا۔ ''وَیْحٌ مَنْ أَشْرَفَ عَلَیْھَا'' اور ہلاکت اس کے لیے ہے جو تباہی کے قریب آ گیا۔

علامہ اصمعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''وَیْلٌ'' کا کلمہ درد کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ''وَیْحٌ'' رحم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کسی کو کہیں: ''وَیْحَکَ'' کہ اللہ تجھ پر رحم کرے، حالانکہ اس کو ڈانٹ رہا ہوتا ہے اور کسی کو تکلیف ہو تو کہتا ہے: ''یَا وَیْلِیْ، یَا وَیْلَتَا''

خلیل نحوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''وَیْلٌ، وَیْحٌ، وَیْسٌ، وَیْہٌ، وَیْکَ، وَیْبَ'' یہ سب ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ سب اقوال متقاربۃ المعنی ہیں، کیونکہ اگر ''وَیْلٌ'' جہنم کی وادی کا نام ہے تو وہ بھی ہلاکت و بربادی ہے، اور اگر جہنم کے کسی پہاڑ کا نام ہے تو تب بھی ہلاکت و بربادی ہے، اور جہنم کے گہرے گڑھے کا نام ہے جس میں چالیس سال تک آدمی گرتا ہوا چلا جائے گا، تب بھی ہلاکت و بربادی ہے۔

تو جن کی بربادی کے لیے اللہ نے فرمایا: ﴿فَوَیْلٌ لَّھُمْ﴾ تو ان کی ہلاکت کیسی ہو گی جو اللہ کے کلام کو، اللہ کی تورات کو بدل دیتے ہیں، اللہ کے فرمان کو بدل دیتے ہیں، تاکہ لوگوں کو دھوکہ دے کر ان کا مال کھائیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اے مسلمانو! اہل کتاب سے تم پوچھنا چاہتے ہو، تم کیسی عقل کی بات کر رہے ہو؟ حالانکہ اللہ نے تمہارے نبی پاک ﷺ پر جو قرآن اُتارا ہے، وہ تر و تازہ ہے، وہ تمہارے اللہ کی طرف سے ہے، وہ بوسیدہ نہیں ہو گا۔ اللہ کا قرآن ہر وقت موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی قرآن میں اہل کتاب کے بارے میں خبر دی ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی کتاب کو بدل ڈالا۔ تو پھر تم ان پر اعتبار کر کے ان سے کیسے مسئلے پوچھتے ہو؟ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اہل کتاب تو تم سے نہیں پوچھتے، لیکن تم ان کے دروازے پر پھرتے ہو کہ ہمیں مسئلہ بتائیں۔

آج بھی دیکھ لیں! کوئی عیسائی رائٹر کتاب لکھ جائے تو مسلمان بڑے حوالے دیتے ہیں کہ فلاں نے کتاب لکھی ہے، حالانکہ تمہارے پاس تو اللہ کا قرآن موجود ہے، تمہارے پاس تو حضور اکرم ﷺ کی حدیث موجود ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۷۷، البقرۃ، الآیۃ: ۷۹]

﴿وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨٢﴾﴾ [البقرة:۸۰تا۸۲]

اور کہتے ہیں: ہمیں ہرگز آگ نہ لگے گی، مگر گنے چنے دن۔ آپ کہہ دیجیے: کیا تم اللہ کے ہاں سے عہد لے چکے ہو کہ اب اللہ اپنے کے خلاف ہرگز نہیں کرے گا یا تم اللہ پر بات جوڑ رہے ہو جو تم نہیں جانتے؟ کیوں نہیں، جس نے گناہ کمایا اور اُس کو اُس کے گناہ نے گھیر لیا، وہی لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، وہ جنتی ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ماقبل آیات سے ربط:

ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے بعض غلط اعتقادات کا ذکر فرمایا ہے جو انہوں نے اپنے ماننے والوں کے اندر پھیلا رکھے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو آگ نہیں چھوئے گی، مگر چند گنے چنے دن کہ پہلے تو ہمیں جہنم کی آگ لگے گی نہیں، ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کے محبوب اور بیٹے ہیں، یعنی ہم اس کے بیٹے کو ماننے والے ہیں تو ہم بھی اس کے بیٹے ہو گئے۔ یہودی یہ کہتے تھے کہ جب ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہو گئے تو اس لیے ہمیں عذاب نہیں ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کا قرآن میں دوسرے مقام پر رد فرمایا کہ آپ ان کو کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں یہ یقین ہے کہ آخرت کا عذاب تمہیں نہیں ہوگا، جہنم کی آگ تمہیں نہیں چھوئے گی اور تم اللہ کے بڑے محبوب اور مقبول بندے ہو تو موت کی تمنا کرو، تاکہ جلدی مرو اور تمہیں پتہ چلے کہ تمہیں عذاب ہوتا ہے یا نہیں۔ اور قرآن نے آگے یہ بھی فرما دیا کہ میرے نبی! یہ یہودی کبھی زبانی کلامی نہیں کہہ سکتے کہ ہم پر موت آ جائے۔ جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے، ان کو پتہ ہے، اللہ بھی جانتے ہیں کہ ان ظالمین نے دنیا میں کیا کچھ ظلم کیے ہیں۔

دوسرا لوگوں کے دماغوں کے اندر انہوں نے یہ بٹھایا ہوا تھا کہ اگر ہمیں جہنم میں ڈالا بھی گیا تو چند دنوں کے لیے

ڈالا جائے گا اور اس کے بعد ہم نکل آئیں گے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ چند دن بھی ہمیں آگ اس لیے لگے گی کہ ہمارے آباؤ اجداد نے ایک بچھڑے کی عبادت کی تھی اور اس کو خدا بنا بیٹھے تھے۔ جتنے دن وہ اس کی عبادت میں مشغول رہے تھے، بس اتنے دن بنی اسرائیل آگ میں ڈالے جائیں گے، پھر نکال لیے جائیں گے۔

دوسری دلیل وہ یہ دیتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے دو وعدے فرمائے تھے: ایک وعدہ یہ فرمایا تھا کہ تیرے بیٹوں کو عذاب نہیں دوں گا اور دوسرا یہ وعدہ فرمایا کہ تیرے بیٹوں کو یعنی آگے جو نسل چلے گی، ان کو بھی عذاب ہوگا تو تھوڑا سا ہوگا۔ یہ کتابوں کے اندر سے حوالہ دیتے تھے۔ حقیقت کا علم اللہ کو ہے کہ وہ اللہ کا کلام بھی تھا یا اپنے ہاتھوں سے لکھا ہوا تھا۔

اگر اللہ کا کلام بھی ہو تو اس سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے وہ بیٹے مراد ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ہیں۔ چونکہ یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے پکڑ کر کنویں میں ڈالا تھا اور ان کو بیچا تھا تو ان کا ایک بہت بڑا جرم تھا اور بیٹوں نے آکر باپ کے سامنے اقرار کرلیا: ﴿يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ﴾ [یوسف:۹۷] اے ہمارے ابا جان! ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگیں، ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے خطا کی، ہم نے یوسف سے زیادتی کی، اپنے بھائی سے حسد کی بنا پر یہ سب کچھ کیا۔ ابا جان نے اس کے جواب میں فرمایا تھا: ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ [یوسف:۹۸] اے میرے بیٹو! تم بھی اقرار کر رہے ہو تو میں بھی اپنے اللہ سے بخشش مانگوں گا۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا گناہ دو قسم کا تھا: ایک تو انہوں نے اپنے بھائی سے زیادتی کی تھی کہ انہیں مارا، انہیں گھسیٹا، انہیں کنویں میں ڈالا اور ان کو غلام بنا کر کھوٹے پیسوں میں بیچ ڈالا۔ یہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ زیادتی ہوئی، وہ انہوں نے معاف کردی کہ جب سارے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے گئے تو انہوں نے کچھ پہچان لیا کہ یوسف ہیں تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ [یوسف:۹۲] اے میرے بھائیو! جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا، آج کے بعد تم پر کوئی طعنہ بھی نہیں۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں معاف کردیا اور جو انہوں نے اپنے باپ اور اللہ کے نبی کے سامنے جھوٹ بولا تو حضرت یعقوب ﷺ نے بھی وعدہ کرلیا کہ میں آنے والے وقت میں تمہارے لیے بخشش مانگوں گا۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے بخشش نہ مانگی اور اس سے اشارہ کیا تھا کہ میں تمہارے لیے تہجد کے وقت بخشش مانگوں گا، کیونکہ رات کا آخری پہر اللہ کی خصوصی رحمت کا ہوتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر آدمی کو

کوئی مشکل پیش آئے، اگر کوئی پریشانی پیش آئے تورات کا جو آخری حصہ ہے، اس وقت اللہ تعالیٰ سے مانگیں۔

یہود نے اپنے لیے جو دعویٰ کیا کہ ان کو جہنم کی آگ نہیں پہنچے گی، مگر چند گنے چنے دن، پھر ان کو جہنم سے مکمل نجات مل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا ہے کہ جو تم یہ دعویٰ کر رہے ہو، اس دعویٰ پر کیا تمہارے پاس اللہ کا کوئی وعدہ، کوئی عہد ہے؟ کیونکہ ایسی باتیں عقل سے تو ثابت نہیں ہوسکتیں۔ اس قسم کی باتوں کے لیے تمہارے پاس باقاعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عہد یعنی دلیل سمعی ہونی چاہیے۔ اگر ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے خلاف کبھی نہیں کرتے، کیونکہ عہد کا خلاف کرنا صفتِ نقصان ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ تمام صفاتِ نقصان سے منزہ اور پاک ہیں۔ لیکن تمہارے پاس تو ایسا کوئی عہد نہیں، نہ تورات میں، نہ انجیل میں اور نہ قرآن میں۔ تو تم نے یہ دعویٰ کہاں سے کرلیا؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلکہ تم اللہ پر ایک ایسی بات کہہ رہے ہو جو تم نہیں جانتے، بلکہ اپنی طرف سے جھوٹ اور افتراء بنا رہے ہو۔

محمد بن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہود یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اس دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے۔ ہمیں قیامت والے دن صرف سات دن جہنم میں ڈالا جائے گا، یعنی ہر ہزار سال کے بدلے ہمیں ایک دن جہنم میں جانا پڑے گا۔ جب سات دن پورے ہوجائیں گے تو ہم جہنم سے نکل آئیں گے۔ حالانکہ جب پہلا دعویٰ جھوٹا ہے تو دوسرا بھی خود بخود جھوٹا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۸، البقرۃ، الآیۃ: ۸۰]

حضرت مسیح علیہ السلام اور دجال کا آنا حقیقت ہے:

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ دجال ایک افسانہ ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ اس کے بارے میں احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بارے میں احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عیسیٰ بن مریم علیہ السلام دمشق میں اس طرح اُتریں گے کہ ان کے دونوں ہاتھ فرشتوں کے کندھوں پر ہوں گے، ان کے بالوں سے پانی ٹپک رہا ہوگا۔ معلوم ہوگا کہ وہ ابھی ابھی آسمانوں سے غسل کر کے تشریف لا رہے ہیں۔[1] جب وہ زمین پر آئیں گے تو نماز کی اذان ہوچکی ہوگی، تکبیر بھی ہوچکی ہوگی اور حضرت مہدی علیہ السلام مصلے پر نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوں گے۔ جب وہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو دیکھیں گے تو ہٹنے کی کوشش کریں گے کہ نبی کے ہوتے ہوئے کوئی اور امام نہیں بن سکتا۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: تم ہی نماز پڑھاؤ، پہلی نماز میں تمہارے پیچھے

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۷۲۹۳، باب: ذِكْرُ الدَّجَّالِ وَصِفَتِهِ وَمَا مَعَهُ]

پڑھوں گا، تا کہ واضح ہو جائے کہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کے تابع ہوں، حضور اکرم ﷺ کی شریعت کی اتباع کروں گا، کیونکہ میں کوئی نئی نبوت لے کر نہیں آیا، میں تو سابقہ نبی ہوں، آپ سے پہلے میری نبوت کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب تو میں اتباع اور تصدیق کے لیے اُتارا گیا ہوں۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۷، باب: نُزُوْلِ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ حَاكِمًا]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کریں گے، وہ آکر صلیب کو توڑ ڈالیں گے، یعنی عیسائیت کی قوت ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جائے گی اور دنیا ایک دفعہ پھر عدل و انصاف اور رحمت سے بھر جائے گی، زمین اپنے خزانے اُگل دے گی اور آسمان اوپر سے رحمتیں برسائے گا۔

[صحيح البخاري، حديث: ۳۴۴۸، باب: نُزُوْلِ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ علیہ السلام]

دعویٰ بنی اسرائیل کہ جہنم میں نہیں جائیں گے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ یہود کہتے تھے: ﴿لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً﴾ [البقرۃ: ۸۰] ہم لوگ آگ میں نہیں جائیں گے، مگر چالیس راتیں۔ کیونکہ ہمارے باپ دادا نے بچھڑے کی عبادت چالیس دن کی تھی، اس لیے اتنے دن ہمیں عذاب ہوگا۔ حالانکہ ان کو یہ علم ہے کہ اللہ کا فیصلہ ہے: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾ [الانعام: ۱۶۴] ہم کسی کو کسی دوسرے کے گناہ میں نہیں پکڑیں گے۔

قرطبی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمہ اللہ کے حوالہ سے اور اسی طرح حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے کہ یہودی یہ خیال کرتے تھے کہ ہم نے تورات میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ جہنم کے دو کنارے ہیں، ان پر چلتے چلتے آدمی اس مقام تک پہنچتا ہے جہاں ﴿أَذَٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ﴾ [الصافات: ۶۲] جو جہنم کا ایک درخت ہے اور جہنم کے وسط میں ہے۔ لہٰذا چالیس سال چلتے چلتے ہم عذاب بھگتیں گے، اس جگہ پر جب پہنچیں گے تو عذاب کی مدت ختم ہو جائے گی اور ہم فارغ ہو کر نکل جائیں گے۔ انہوں نے ایک جگہ کہا کہ ہمیں سات دن عذاب ہوگا، دوسری جگہ کہتے ہیں کہ ہمیں چالیس راتیں عذاب ہوگا اور اس ایک روایت میں کہتے ہیں کہ ہمیں چالیس سال عذاب ہوگا۔

اب چالیس سال دنیا والے ہیں یا آخرت والے ہیں؟ کیونکہ دنیا کا سال علیحدہ ہے، جب دنیا نئی پیدا ہوگی تو ایک دن کسی کے لیے ایک ہزار سال کے برابر ہوگا اور کسی کے لیے پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ اب اگر وہ

چالیس سال رہیں گے تو چالیس کو پچاس ہزار سال سے ضرب دیں تو کتنا عرصہ جہنم میں رہیں گے۔ اصل یہ ہے کہ یہ سب کذب وافتراء تھا جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے خلاف باندھا تھا اور اللہ کی تورات کو بدل ڈالا تھا۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ بنی اسرائیل یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم جہنم میں نہیں جائیں گے، مگر چنے ہوئے چند دن اور یہ دن اتنے ہوں گے جتنے دن گائے کے بچھڑے کی عبادت کی گئی تھی۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ یہودیوں نے ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر مباحثہ کیا اور کہنے لگے کہ ہم جہنم میں نہیں جائیں گے۔ اگر جہنم میں گئے تو صرف چالیس راتوں کے لیے جائیں گے، اس کے بعد ہمارے بعد جہنم میں ایک اور قوم آئے گی (یعنی نعوذ باللہ آپ کی امت آئے گی)۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ ان کے سر پر رکھا اور فرمایا: تم ہمیشہ جہنم میں رہو گے، کبھی نہیں نکلو گے اور تمہارے بعد کوئی داخل نہیں ہوں گے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت مبارک نازل فرمائی کہ یہود دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم جہنم میں نہیں جائیں گے، مگر چند دن۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۸، البقرۃ، الآیۃ: ۸۰]

یہودیوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا:

حافظ ابوبکر مردویہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ سے روایت نقل فرمائی ہے کہ جب خیبر فتح ہو گیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہودیوں نے ایک بھنی ہوئی بکری پیش کی۔ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بکری کا گوشت بہت پسند تھا تو انہوں نے بکری کے اگلے چوڑے بنائے اور ان کو بھون کر اس کے اندر زہر ڈال دیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ پیش کر دیا۔ دوسری روایت کے اندر یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تناول بھی فرمایا اور کچھ صحابہ نے بھی گوشت کو کھا لیا اور وہیں فوت ہو گئے یعنی فوری طور پر زہر نے اتنا اثر کیا کہ وہیں شہید ہو گئے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہودیوں کو جمع کرو۔ تو ان کو جمع کیا گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا باپ کون ہے؟ تم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہمارا باپ فلاں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جھوٹ بولتے ہو، بلکہ تم فلاں کے بیٹے ہو۔ کہنے لگے: ہاں! سچی بات ہے۔ آپ نے سچ فرمایا، ہم نے جھوٹ بولا ہے۔ ہم دھوکہ دینا چاہتے تھے، لیکن آپ نے سچی بات فرمائی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں تم سے کوئی

بات پوچھوں تو سچی بات بتاؤ گے؟ انہوں نے کہا: ہم خود بخود بتائیں گے، کیونکہ اگر ہم جھوٹ بولیں گے تو آپ کو پتہ چل جائے گا، اس لئے جھوٹ بولنے کا کیا فائدہ ہوگا؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم جہنم میں جاؤ گے؟ کہنے لگے: جائیں گے، لیکن تھوڑی مدت کے لیے اور پھر ہم وہاں سے نکل آئیں گے، پھر آپ کی اُمت کو وہاں ڈالا جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم جھوٹ بول رہے ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں ہمیشہ جہنم میں رکھیں گے اور تمہارے بعد میری اُمت کو نہیں ڈالا جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کے بعد اگر میں تم سے کوئی بات پوچھوں تو سچی بات کرو گے یا نہیں؟ کہنے لگے: سچی بات کریں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے اس بکری کے گوشت کے اندر زہر ملایا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! ملایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں؟ انہوں نے کہا: اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اس لئے ملایا ہے کہ اگر تم جھوٹے ہو، یعنی سچے نبی نہیں ہو تو زہر اثر کرے گا اور ہماری جان بھی چھوٹ جائے گی اور اگر تم اللہ کے سچے نبی ہو تو زہر تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اس لئے ہم نے اپنی طرف سے ایک قسم کا امتحان رکھا تھا اور ہم نے زہر ملایا تھا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۵۷۷۷، باب: ما يذكر في سم النبي ﷺ]

مفسر رحمہ اللہ کا اس روایت کو نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہم جہنم میں نہیں رہیں گے، مگر تھوڑے سے دن۔ جیسا کہ قرآن پاک نے ان کے اس واقعہ کا ذکر کیا: ﴿وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً﴾ [البقرۃ: ۸۰] ہمیں آگ نہیں چھوئے گی، مگر چند دن۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۸، البقرۃ، الآیۃ: ۸۰]

فتح خیبر اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کی شادی:

حضور اکرم ﷺ نے خیبر میں یہودیوں کے ساتھ بڑی رعایت کی تھی۔ خیبر فتح ہو چکا تھا، اسلام کو غلبہ مل چکا تھا، کفر شکست تسلیم کر چکا تھا۔ اگر حضور اکرم ﷺ چاہتے تو ان کی نسل ہی ختم کر دیتے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے ان سے بڑی رعایت کی اور آپ ﷺ ہمیشہ جنگ میں اعلان فرماتے تھے کہ خبردار! کسی غیر مذہب کے عالم پر حملہ نہ کیا جائے اور نہ اسے قتل کیا جائے۔ ہاں! اگر وہ خود ہتھیار لے کر مسلمانوں کے خلاف لڑ رہا ہو تو اسے قتل کیا جائے۔ اسی طرح حکم تھا کہ کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے، کسی بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کیا جائے[1]۔ کسی بستی پر شب خون نہ مارا جائے جب تک اس بستی کے بارے میں تمہیں پتہ نہ ہو کہ اس بستی کے رہنے والے لوگ کون ہیں۔ صبح کی اذان کا انتظار کیا

[1] [سنن أبي داود، حديث: ۲۶۱۴، باب: في دعاء المشركين]

جائے، اگر اذان کی آواز آجائے تو بستی پر حملہ نہ کرو، کیونکہ اس میں مسلمان بھی رہتے ہوں گے اور وہ بے چارے بلاوجہ مارے جائیں گے۔ اگر کسی بستی سے اذان کی آواز نہ آئے تو سمجھ لو کہ یہ مسلمانوں کی بستی نہیں ہوگی پھر اس پر تم حملہ کر سکتے ہو۔ [سنن أبي داود، حدیث: ۲۶۳۵، باب: في دُعاءِ المُشركينَ]

جنگ فتح ہو جانے کے بعد بی بی صفیہ جو حضور اکرم ﷺ کی بعد میں بیوی بنی تھیں، گرفتار ہو کر حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئیں تو صحابہ نے مشورہ دیا کہ وہ ایک سردار کی بیوی تھیں اور آپ نے وہ ایک غلام کو دے دی۔ شریعت کے اندر تو کوئی منع نہیں ہے، بہتر یہ تھا کہ آپ اس لڑکی کو اپنے لئے رکھتے، سردار گھرانے کی لڑکی ہے، چلو سردار دوجہاں کے گھر میں آجائے اور ان کے دلوں کو ٹھیس نہ پہنچے۔ یعنی اتنی رعایت کی جارہی ہے کہ کسی کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔ حضور اکرم ﷺ نے رائے قبول فرمائی اور حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور فرمایا کہ وہ عورت جو تمہارے حصے میں آئی ہے تم مجھے اپنی خوشی کے ساتھ واپس کرنا چاہتے ہو یا مال کے عوض؟ انہوں نے کہا: میرا تو اپنا جان و مال بھی قربان ہے، ایک لڑکی کا کیا مسئلہ ہے۔ حضور! قسم ہے میں نے تو ابھی اس کی شکل تک بھی نہیں دیکھی۔ (چونکہ اللہ نے اس کو حضور اکرم ﷺ کے لیے محفوظ رکھنا تھا تو کسی دوسرے کو ان کی شکل دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی)۔ حضور اکرم ﷺ نے بی بی صفیہ کو اپنے حصے میں لے کر آزاد فرما دیا اور نکاح کر کے ان کی شان کو اتنا اونچا کر دیا کہ وہ اُمہات المومنین میں شامل ہو گئیں۔ [صحیح البخاري، حدیث: ۳۷۱، باب: مَا يُذْكَرُ فِي الْفَخِذِ...]

بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں کہ اللہ نے مجھے بڑا نصیب والا بنایا ہے۔ جب میں حضور اکرم ﷺ کی بیوی بن گئی تو جتنے حضور اکرم ﷺ کے صحابہ کے گھروں کے اندر میرے خاندان کے لڑکے یا لڑکیاں قید میں تھے، انہوں نے ان کو آزاد کر دیا۔ کیونکہ یہ اب حضور اکرم ﷺ کے رشتہ دار ہو گئے، ان کو ہم کیسے غلام بنا سکتے ہیں؟ ان سے ہم نوکروں والا کام کیسے لے سکتے ہیں؟ اس لئے بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ میری وجہ سے میری قوم کے سینکڑوں لوگوں کو آزادی مل گئی۔

جب آپ نبی کریم ﷺ کی زوجہ بنیں، آپ کی اور بیویاں بھی تھیں، چونکہ بی بی عائشہ اور بی بی حفصہ کا آپس میں بڑا اتفاق و اتحاد تھا۔ فطری بات ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں اور بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں، دونوں قریش سے تعلق رکھتی تھیں، ان کا نسب، قوم، قبیلہ بھی ایک تھا اور پھر ان کے والدین کو جو مرتبہ حضور اکرم ﷺ کے ہاں ملا تھا، وہ اور کسی کو نہیں ملا تھا۔

ایک دن حضور اکرم ﷺ تشریف لائے تو بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا رو رہی تھیں۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: کیوں رو رہی ہو؟ انہوں نے کہا: آج مجھے بی بی عائشہ نے طعنہ دیا ہے کہ تم ہمارے مقابلہ پر کس بات پر ناز کرتی ہو؟ تم یہودیوں کی لڑکی ہو...... ایک یہودی کی بیٹی اور ایک یہودی کی بیوی تھیں...... حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: صفیہ! کیا تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟ انہوں نے کہا: میں ان کو کیا جواب دیتی؟ میرا تو انہی کے خاندان سے تعلق ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم ان کو بتاؤ کہ میرا تعلق تو دو نبیوں سے ہے: میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے ہوں، وہ نبی تھے اور محمد مصطفیٰ ﷺ میرے شوہر ہیں اور وہ بھی نبی ہیں۔ اور تمہارا شوہر تو نبی ہے، لیکن باپ تو نبی نہیں ہے۔ بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا نے یہ جواب یاد کر لیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد یہ بات ہوئی تو بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا نے ان کو جواب دیا تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

[تفسیر القرطبی: ۱۶/۳۲۶، سورۃ الحجرات: ۱۱، الترمذی، حدیث: ۳۸۹۲]

حضور اکرم ﷺ بی بی عائشہ کے گھر تشریف لائے، دیکھا کہ ان کا موڈ خراب ہے۔ پوچھا تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: حضور! اللہ نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے یا بیویوں کے جھگڑے کا جواب سکھانے کے لیے بھیجا ہے؟ حضور! یہ جواب صفیہ نہیں دے سکتی، یہ آپ نے اس کو سکھایا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی اگر غیر خاندان کا کٹ کر میرے گھر آ جائے اور میں اس کی امداد نہ کروں تو یہ نبوت و رسالت کے خلاف ہے۔ وہ میری بیوی ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف بخشا ہے۔

حضور اکرم ﷺ پر زہر کا اثر:

حضور اکرم ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ یہ معاملات کئے، لیکن انہوں نے آپ کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ یہ اتنی دھوکے باز قوم ہے کہ اللہ کے نبی کو دھوکہ دینے سے باز نہیں آ سکتی تو تمہارے ساتھ کیا وفا کرے گی؟ حضور اکرم ﷺ کو جب زہر دیا گیا تو ایک روایت میں یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ جس عورت نے زہر دیا تھا، اس کا نام فاطمہ تھا، حضور اکرم ﷺ نے اس عورت کو بلایا اور ان کے سرداروں کو بلایا اور فرمایا: اس گوشت میں زہر ہے؟ تو وہ مان گئے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ اس عورت نے کہا: آپ کو کیسے پتہ چلا کہ اس میں زہر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: گوشت نے مجھے بتایا ہے، اللہ نے اسے بولنے کی توفیق دی ہے۔ لیکن یہ بات بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے

اس کو نوش فرمالیا۔لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: سنو! میں نے جو زہر کھالیا، مجھے اللہ نے بچالیا،لیکن چونکہ میرے صحابہ شہید ہوگئے،لہٰذا ان کا بدلہ اس عورت سے لیا جائے گا جس نے زہر ملایا ہے، میں اپنا بدلہ نہیں لیتا۔

اللہ کی قدرت دیکھیں کہ ساری زندگی میرے آقا ﷺ پر اس زہر کا اثر نہیں ہوا،لیکن جب وفات کی گھڑی قریب آئی،صحیح احادیث مبارک میں یہ الفاظ ہیں،آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! معلوم ہوتا ہے کہ اندر سے میری آنتیں کٹی جارہی ہیں، یہ اس زہر کا اثر ہے جو مجھے خیبر میں دیا گیا تھا۔

[صحيح البخاري، حديث:۴۴۲۸، بابُ: مَرَضِ النَّبِيِّ ﷺ وَوَفَاتِهِ]

محدثین اور علماء نے اس کی وجہ لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موت کی جتنی قسمیں بنائی ہیں، ان میں سب سے بڑا درجہ اس کا ہے جو اللہ کے راستے میں شہید ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے چونکہ اپنے پیغمبر کو باعتبار شان کے سارے نبیوں سے افضل بنایا، آپ ﷺ کی زندگی میں بھی کوئی آپ کی شان کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اللہ نے آپ ﷺ کو مرتبۂ شہادت دینے کے لئے اس زہر کے اثر کو باقی رکھا، ورنہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس بات پر قادر ہیں کہ جب خیبر میں اس زہر نے اثر نہیں کیا تو مدینے میں اثر کیوں کرے؟ لیکن یہ اس لیے ہوا، تاکہ میں اپنے نبی کی شان شہادت کے ساتھ بلند کروں۔ یہ نصیبوں اور اللہ کی قدرت کے فیصلے ہیں، وہ جن کے چاہے نصیب بلند کردے۔جس طرح حضور اکرم ﷺ کو زہر کی وجہ سے مرتبۂ شہادت ملا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر زہر کا اثر:

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب سانپ نے ڈس لیا تھا، اس کا اثر بدن میں رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے وزیر کو وہی مرتبہ نصیب فرمادیا۔

اسی طرح تاریخ پر نظر دوڑا کر دیکھیں کہ میرے مدنی پاک ﷺ کے نواسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اسی طرح سب سے بڑے بطل اسلام حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھی زہر دیا گیا،لیکن وہ سالم رہ گئے۔سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو بھی زہر دیا گیا،مگر وہ اس کے اثر سے شہید ہوگئے۔

جب حضور اکرم ﷺ نے دو لقمے کھالیے تو پھر گوشت بول پڑا کہ میرے اندر زہر ہے۔ اگر وہ گوشت پہلے بول پڑتا تو حضور ﷺ وہ دو لقمے بھی نہ کھاتے۔ چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو مرتبۂ شہادت دینا تھا،لہٰذا اس وقت

گوشت کو بولنے کی اجازت نہیں ملی۔ دوسرا یہ بھی فیصلہ فرما دیا کہ علم غیب کا مالک اللہ ہے۔ اگر نبی کو علم غیب ہوتا تو وہ زہر کو جاننے کے بعد تو نہ کھاتے، کیونکہ زہر کھانا شریعت کے اندر حرام ہے، وہ تو خودکشی ہے۔ ورنہ شریعت کے اندر اس کی اجازت نہیں ہے۔ اگر نبی کو علم غیب ہوتا اور صحابہ کو علم غیب ہوتا تو وہ بھی زہر والا گوشت نہ کھاتے۔

فتنوں کے دور ہمیں ہدایت کی دعا کی اہمیت:

اس لیے دن رات اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں اپنی رحمت کے ساتھ ہدایت پر رکھیں اور اپنی رحمت کے ساتھ ہمیں ہدایت پر موت نصیب فرمائیں۔ اسی وجہ سے ہم نماز کے اندر دعا مانگتے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ [الفاتحہ] اے اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما۔ حالانکہ جو نماز پڑھ رہا ہے وہ صراطِ مستقیم پر کھڑا ہے، لیکن بار بار مانگنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یا اللہ! ہمیں ہدایت پر ثابت قدم فرما اور اسی طرح ہدایت فرما کر ہمیں جنت میں پہنچا دے۔

حدیث میں آتا ہے اور قرآن میں بھی موجود ہے کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہوں گے تو وہ کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۣ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ [الاعراف: ۴۳] اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تُو نے ہمیں جنت کا راستہ دکھایا، تُو نے ہمیں جنت میں پہنچایا۔ اگر آپ ہمیں جنت کا راستہ نہ دکھاتے اور جنت میں نہ پہنچاتے تو ہم ہرگز نہیں پہنچ سکتے تھے۔ [الزہد والرقائق لابن المبارک: ۱/ ۵۰۸]

اس لیے ہمیشہ دعا کیا کریں کہ اللہ پاک اپنے فضل وکرم کے ساتھ ہمیشہ اسلام پر رکھیں، اسلام پر موت دیں۔ ورنہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، یہ فتنوں کا دور ہے، پُرخطر دور ہے، جس کے بارے میں میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا: ایک وقت میری اُمت پر ایسا بھی آجائے گا کہ آدمی صبح کو مومن ہوگا تو شام کو کافر ہوگا، شام کو مومن ہوگا تو صبح کو کافر ہوگا۔[1] یعنی ایسے ایسے فتنے آجائیں گے کہ لوگ اپنے ایمان سے محروم ہو جائیں گے۔ کوئی ذاتی مفادات کے لیے، کوئی اقتدار کے لیے، کوئی دولت کے لیے اور کوئی جھوٹے جاہ و مال اور منصب کے لیے اللہ کے دین کو چھوڑ دیں گے اور اللہ کے راستے سے ہٹ جائیں گے۔

اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم اللہ کے دروازے پر لوٹ آئیں، توبہ کریں، اللہ سے معافی مانگتے رہیں اور اللہ سے ہمیشہ یہ دعا کرتے رہیں کہ اے اللہ! ہمیں ہدایت پر رکھنا۔ ورنہ دنیا کے اندر جتنے باطل فرقے ہیں، انہوں نے

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۱۸۶، باب: الحث على المبادرة بالأعمال قبل تظاهر الفتن]

اپنے اپنے ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے، اپنے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے مختلف دلائل بھی تلاش کیے ہوئے ہیں اور ایسے سوالات وجوابات ہوتے ہیں کہ عام آدمی سنے تو گھبرا جائے، اس کو سمجھ بھی نہ آئے کہ میں کیا کروں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ﴾ [المؤمنون: ۵۳] ہر جماعت اپنے اپنے مسلک اور اپنے اپنے طریقے پر چلی جارہی ہے اور اسی پر خوش ہے، لیکن یہ فیصلہ قیامت میں ہوگا، پھر ہم سب کو علیحدہ علیحدہ کردیں گے، جنت والوں کو بھی علیحدہ کردیں گے اور جہنم والوں کو بھی علیحدہ کردیں گے، ورنہ دنیا کے اندر ہر جماعت، ہر مذہب، ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ میں ہی حق پر چل رہا ہوں۔

اگلی آیاتِ مبارکہ کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک اُصولی قاعدہ بیان فرمادیا ہے کہ دنیا کے اندر دو قسمیں ہیں: ایک مؤمن، ایک کافر۔ مومن جنتی ہے، کافر اللہ کے عدل کے مطابق جہنمی ہے۔ تو اللہ نے ایک فیصلہ فرمادیا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ ہم جہنم میں نہیں رہیں گے، کیا تمہارے ہاتھ میں جہنم ہے کہ جتنے دن چاہو گے جہنم میں رہو گے اور جب چاہو گے نکل جاؤ گے؟

دنیا کے قید خانے بھی مجرموں کے ہاتھ میں نہیں ہوتے ہیں، بلکہ باقاعدہ عدالتیں سزائیں دیتی ہیں اور جیل بھیجا جاتا ہے، اس کی تاریخ لگتی ہے اور اس کے دن پورے ہوتے ہیں تو اس کو ایک دن بھی زیادہ جیل میں نہیں رکھا جاتا، اس کو جیل سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ جب دنیا کے قید خانے میں کوئی اپنی مرضی سے جا نہیں سکتا اور اپنی مرضی سے نکل نہیں سکتا تو تم نے جہنم کو مذاق سمجھ رکھا ہے کہ جتنے چاہو گے اندر رہو گے اور جب چاہو گے باہر نکل آؤ گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۞﴾ [البقرۃ: ۸۰تا۸۲]

ایسا ہرگز نہیں جیسے تم کہتے ہو، بلکہ جو بھی بُرا کام کرے اور اس کے گناہ اس کا احاطہ کرلیں...... اور یہ کافر کے گناہ ہوسکتے ہیں جو اس کا احاطہ کریں گے، کیونکہ مسلمان جتنا بڑا گناہ گار کیوں نہ ہو، اس کے اندر ایمان کی چنگاری موجود ہوتی ہے، لہٰذا اس کے گناہ اس کا احاطہ نہیں کرسکتے...... آگ ان سے جدا نہیں ہوگی۔ اس لیے فرمایا: ﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ یہ جس کے ساتھی ہیں، اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ چالیس راتوں کے بعد نکل آئیں گے، بلکہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بڑا کفر کیا کہ میرے محبوب ﷺ کا کلمہ نہیں پڑھا،

ان کی نبوت پر ایمان نہیں لائے۔ اور ان کے مقابلہ پر جو لوگ ایمان لے آئے اور اچھے عمل کیے، یہ جنت کے ساتھی ہیں، یہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے، کبھی جنت سے نکالے نہیں جائیں گے۔

اس آیت کے اندر دو قسموں کا بیان آ گیا۔ جو شخص کافر بھی ہے اور گناہ گار بھی، جن گناہوں نے بھی احاطہ کیا ہوا ہے، ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ جو شخص مومن بھی ہے اور عمل بھی سارے اچھے ہیں تو وہ ہمیشہ جنت میں رہے گا۔

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۸۱، ۸۲]

کافروں کے اچھے اعمال کہاں جائیں گے؟

اور ایک قسم یہ ہے کہ کافر ہے، لیکن اس کے اعمال اچھے بھی ہیں۔ جیسے بہت سارے کافر ایسے ہوتے ہیں جو بڑے بڑے سکول اور ہسپتال بنا دیتے ہیں، غریبوں کی امداد کرتے ہیں، کہیں زلزلہ آ جائے تو وہاں امداد کو پہنچ جاتے ہیں۔ بظاہر ان کے یہ اعمال اچھے ہیں، لیکن حقیقت میں کچھ نہیں۔ جیسے قالین پر شیر بنا ہوا ہے، اس کے اوپر آدمی چڑھتا رہتا ہے، وہ شیر نہیں، وہ تو شیر کی شکل ہے، ان کے بھی یہ اعمال ہمیں بظاہر اچھے لگ رہے ہیں، لیکن چونکہ اصل بنیادی شرط ایمان کی نہیں ہے، لہٰذا ان کے ان اعمال کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَـيْـــًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝﴾ [النور:۳۹]

جن لوگوں کے اندر کفر ہے، وہ چاہے دنیا میں جتنے اعمالِ صالحہ کریں، ان کی مثال سراب کی سی ہے کہ دور سے پانی نظر آتا ہے، لیکن پانی نہیں ہوتا۔

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی مقامات پر ارشاد فرمایا: جو آدمی کافر ہے، اگر وہ اعمالِ صالحہ کرتا بھی ہو تو ان اعمالِ صالحہ کا قیامت میں کوئی دخل نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ عادل ہیں وہ کافروں کو ان کے اعمال کا بدلہ دنیا میں دے دیتے ہیں، صحت دے دی، شہرت دے دی، عزت دے دی، پیسہ دے دیا، لیکن آخرت میں ان کے عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ ان کے عمل ایسے ہوں گے جیسے کوئی ریت کو اُڑا دے اور ہاتھ میں کچھ نہ بچے۔ اس لیے جو

کافر ہے، عمل اچھے ہیں، جب شرط نہ رہے تو مشروط خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ کسی سے شرط کرتے ہیں کہ اگر تم میرے پاس آئے تو میں آپ کی تکریم کروں گا۔ اگر وہ نہ آئے تو تم بھی تکریم نہیں کرو گے۔ کیونکہ جب شرط نہیں ہے تو مشروط خود بخود ختم ہو گیا۔ اسی لیے ہر عمل کے قبول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ پر ایمان ہو۔

گناہگار مسلمان کا انجام:

اب ایک آدمی اللہ کو نہ مانتا ہو اور وہ کہے کہ میرے عمل اچھے ہوں تو ان کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اور ایک مومن آدمی ہے، اس کے اچھے عمل بھی ہیں اور برے عمل بھی ہیں۔ اگر عمل برے ہیں تو ان کی دو کیفیتیں ہیں:

1 ...... اگر اس نے دنیا میں توبہ کر لی تو الحمد للہ! اللہ توبہ قبول فرما لیں گے۔ کیونکہ جب آدمی توبہ کرے تو وہ گناہ ختم ہو جاتے ہیں، اس کے گناہوں کو اللہ ایسے مٹا دیتے ہیں گویا کہ اس نے وہ گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ میرے آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ"[1] (جو شخص کسی گناہ سے توبہ کرے تو گویا اس نے وہ گناہ کیا ہی نہیں تھا)۔ یعنی اگر ایک آدمی ستر سال تک کفر و شرک کرتا رہے، لیکن اللہ کے دربار میں توبہ کر لے تو سارے گناہ معاف ہو گئے۔

2 ...... اسی طریقہ سے ایک آدمی مسلمان ہے، اللہ و رسول پر ایمان ہے، قرآن پر ایمان ہے، اعمال اچھے بھی ہیں اور برے بھی ہیں، لیکن توبہ نہیں کر سکا اور بغیر توبہ کے مر گیا، گناہ کی حالت میں مر گیا۔ مثلاً شراب کے نشہ میں تھا، ہارٹ اٹیک ہوا اور مر گیا، یا نشہ کی حالت میں کسی دریا میں گرا اور ڈوب کر مر گیا اور اس کو توبہ کا موقع نہیں ملا۔ اسی طرح ایک چور چوری کر رہا ہے، اسی حالت میں کسی نے ڈنڈا مارا تو موقع پر مر گیا۔ اس کو بھی توبہ کرنے کا موقع نہیں ملا، حالانکہ مسلمان تو تھا۔ اس کے بارے میں یہ ہے کہ یہ اللہ کی مشیت پر ہے۔ چاہیں تو اس کو جہنم میں ڈال دیں اور وہ اپنی سزا کی مدت پوری کرنے کے بعد جہنم سے نکالا جائے گا اور اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں تو اس کو معاف فرما دیں۔

گناہوں کی اقسام اور بندوں کے حقوق:

گناہ دو قسم کے ہیں: ایک اللہ کے حقوق اور ایک بندے کے حقوق ہیں۔ اللہ اپنے حقوق تو توبہ سے معاف فرما دیتے ہیں اور اگر چاہیں تو بغیر توبہ کے معاف فرما دیں۔ لیکن بندے کے حقوق معاف نہیں فرماتے، جب تک تم

[1] [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۴۲۵۰، باب: ذِكْرُ التَّوْبَةِ]

بندے کو اس کا حق ادا نہ کرو۔ تمہارے ذمہ کسی کا قرضہ ہے یا کسی کی جائیداد ہے، تمہارے ذمہ کسی کی کوئی چیز ہے وہ تمہیں ادا کرنے ہوں گے یا معافی لینی ہوگی۔ اگر وہ معاف کردے تو تم بخشے گئے، اگر وہ معاف نہ کرے تو اس کو ادا کردو۔ اور اگر وہ آدمی مر گیا جس کے تم نے پیسے دینے تھے تو اس کے وارثوں کو ادا کردو۔ اگر اس کا وارث نہ ملے تو اتنے پیسے اس کے نام سے خیرات کردو کہ اللہ میاں! پیسے فلاں آدمی کے تھے اور آپ جانتے ہیں کہ مجھے وہ ملتا نہیں ہے تو ان پیسوں کو خیرات کردو۔ اس کا ثواب اللہ اس کو بھی عطا فرمائیں گے اور تمہیں بھی عطا فرمائیں گے اور قیامت میں اس کا مواخذہ بھی نہیں ہوگا۔ چونکہ حقوق العباد اتنے اہم ہیں کہ شہید کا ہر گناہ معاف ہوجاتا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اس کے خون کا قطرہ بعد میں گرتا ہے اور اللہ اس کے سارے گناہ معاف کردیتے ہیں [1] لیکن حقوق العباد شہید سے بھی معاف نہیں ہوتے۔ اگر کسی کے ذمہ کوئی قرض ہے یا کوئی لین دین ہے وہ چاہے اللہ کے راستے میں شہید بھی ہوجائے تو وہ قرض معاف نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ انسان کا حق ہے۔

اگر کسی آدمی نے کسی بندے کے حقوق دینے تھے اور دنیا میں ادا نہیں کیے اور مر گیا۔ مثلاً آپ نے کسی کا ایک ہزار ریال دینا تھا، آپ نے ادا نہیں کیا اور موت آگئی۔ اب آپ کے وارث بھی ادا کردیں تو ادا ہوجائے گا۔ آپ کے وارثوں نے ادا نہیں کیا تو قیامت میں معاملہ یہ ہوگا کہ قیامت میں دولت، پیسہ تو کسی کے پاس نہیں ہوگا، نہ کسی امیر کے پاس ہوگا، نہ کسی غریب کے پاس ہوگا۔ سب بغیر کفن کے اپنی اپنی قبروں سے ایسے کھڑے ہوں گے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ سب کو ان کے اعمال کے مطابق لباس عطا فرمائیں گے۔ اب اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس آدمی کی اتنی ہزار نیکیاں اس قرضہ کے بدلے میں اس آدمی کو دے دو۔ اگر تمہارے اوپر قرضہ اتنا ہے کہ نیکیاں ساری ختم ہوگئیں تو ملائکہ کہیں گے: اللہ میاں! نیکیاں نہیں بچیں، قرض لینے والے موجود ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ ان کے گناہ اس پر رکھ دو، یہ اتنی دیر جہنم بھگتے۔ حقوق العباد کی کسی شکل میں معافی نہیں مل سکتی جب تک کہ تم بندے کے حقوق کو بخشواؤ گے نہیں۔

بعض لوگ اس معاملہ میں بڑی غفلت کرتے ہیں۔ جیسے تم کسی کی غیبت کرتے ہو، یہ بھی حقوق العباد ہے۔ اسی طرح تم نے کسی کو گالی دی، کسی کو برا کہا، یا کسی پر تہمت لگائی یا کسی پر الزام لگایا ہے، یہ سب حقوق العباد ہیں۔ جو بھی تم نے کسی دوسرے کو ایذاء پہنچائی، وہ دنیا میں بھی تم سے بدلہ لینے کا حق دار ہے اور آخرت میں بھی حق دار ہے۔ لہٰذا

[1] [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۲۷۹۹، باب: فَضْلِ الشَّهَادَةِ فِي سَبِيلِ اللهِ]

کوئی ایسا بندہ موجود ہے تو جلدی سے معافی لے لو۔ اس کو کہہ دو کہ میں نے آپ کی غیبت کی تھی، مجھے آپ معاف کر دیں۔ دنیا کے اندر ایسا آدمی کوئی بھی نہیں ہوتا کہ آپ جا کر کہیں اور وہ آپ کو معاف نہ کرے۔ کسی کا قرضہ دینا ہے تو ادا کرو۔ اگر قرض دینے کی طاقت نہیں تو اپنے ورثاء کو وصیت کرو کہ اگر میں مر جاؤں تو میرا اتنا قرضہ ہے، ادا کر دینا۔ تمام معاملات کو رجسٹر میں لکھ کر محفوظ رکھو، تاکہ تمہارے بعد تمہارے ورثاء کو پتہ چلے کہ تم نے کس کا قرضہ دینا ہے اور کس سے قرضہ لینا ہے؟ اس لئے اسلام کے اندر حکم ہے کہ تم میں سے کوئی آدمی نیند نہ کرے، مگر وصیت لکھی ہوئی سرہانے کے نیچے موجود ہو،[1] کیونکہ کوئی پتہ نہیں موت کس وقت آ جائے۔

زندگی میں اپنی وصیت لکھنے کا طریقہ:

وصیت کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ لکھو کہ میری موت کے بعد جو میرا ترکہ بچے، اس کو شریعت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ شریعت کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھایا جائے، اللہ کے قرآن اور سنت کے مطابق اس کو تقسیم کر دیا جائے یا پہلے کسی عالم کے پاس جا کر باقاعدہ فتویٰ کیا حاصل کر لو کہ میری بیوی ہے، اتنے بچے ہیں، ماں باپ ہیں، فلاں ہے، اگر میں مر جاؤں تو میری جائیداد شرعی طور پر تقسیم کیسے ہوگی؟ وہ آپ کو حصص نکال کر دیں گے، وہ اپنی وصیت میں درج کر دو کہ میں نے فلاں عالم سے فتویٰ لیا تھا، لہٰذا میری جائیداد کو اس طرح تقسیم کیا جائے۔

اور دوسرا تفصیل لکھ دو کہ اتنے آدمیوں سے قرض لینا ہے اور اتنے آدمیوں کو میں نے قرض دینا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی صدقہ جاریہ کی وصیت بھی کرو، اگر اللہ نے آپ کو توفیق دی ہے کہ فلاں مدرسہ میں دو کمرے بنوا دینا، فلاں مسجد کی چھت نہیں ہے، چھت ڈلوا دینا، فلاں علاقے میں پانی کا انتظام نہیں ہے وہاں کنواں لگوا دینا۔ اگر زندگی میں کر دو تو بہت اچھی بات ہے، ورنہ وصیت کر جاؤ اور وصیت میں یہ بات بھی یاد رکھو کہ جو خیرات کا کام کرنا ہے، وہ اپنی جائیداد کے تیسرے حصے سے زیادہ نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ساری جائیداد اللہ کے راستے میں دے دو اور اولاد پیچھے خوار ہوتی پھرے۔ یہ ناجائز ہے، شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔

حضور اکرم ﷺ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا: یا رسول اللہ! میرا دل چاہتا ہے کہ جتنا مجھے اللہ نے دیا ہے، میں سارا خیرات کر دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل نہیں۔ انہوں نے کہا: حضور! مجھے اتنی اجازت دیں کہ

---

[1] [صحیح البخاری حدیث: ۲۷۳۸ باب: الوَصَايَا وَقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: وَصِيَّةُ الرَّجُلِ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ]

میں مال کا تیسرا حصہ خیرات کر دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیسرا حصہ خیرات کر دو، تمہیں اجازت ہے، لیکن تیسرا حصہ بھی زیادہ ہے اس سے بھی کم کرنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بُری بات ہے کہ تم اپنے بچوں کو یتیم اور مسکین چھوڑ جاؤ، وہ لوگوں سے بھیک مانگتے پھریں۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم ان کو غنی چھوڑ کر جاؤ، ان کے لئے جائیداد چھوڑ کر جاؤ، تا کہ وہ کسی کے محتاج نہ رہیں، کسی کے دروازے پر جا کر قرض مانگنے کے محتاج نہ ہوں۔

[صحيح البخاري، حديث: ۲۷۴۲، باب: أَنْ يَتْرُكَ وَرَثَتَهُ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ...]

کافر نے ہر حال میں جہنم میں رہنا ہے، اس کا جہنم سے نکلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور مومن نے اللہ کی رحمت سے جنت میں جانا ہے اور ضرور رہنا ہے، اگر گناہوں کی وجہ سے وہ عذاب بھگتتا ہے تو علیحدہ بات ہے، لیکن ایک نہ ایک وقت جنت میں جائے گا۔

(حدیث) جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہے تو اللہ اسے کسی نہ کسی وقت جہنم سے ضرور نکالیں گے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۳۹، باب: قول الله تعالی: وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ...]

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں قیامت میں سفارش کروں گا، شفاعت کروں گا، شفاعت کروں گا، حتی کہ میری سفارش پر اللہ تعالی لاکھوں کروڑوں کو جہنم سے نکالیں گے اور اس کے بعد اللہ فرمائیں گے: اے محمد مصطفی! اب تم راضی ہو گئے ہو یا نہیں؟ حضور اکرم ﷺ عرض کریں گے: اے میرے رب! میں راضی ہو گیا، میں راضی ہو گیا۔ [کنز العمال، حدیث: ۳۹۷۵۸، باب: الشفاعة، المعجم الاوسط، حدیث: ۲۰۶۲]

ایک اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ راضی ہونے کے بعد بھی عرض کریں گے: یا اللہ، یارب العالمین! وہ لوگ جن کے دل میں ذرہ کے برابر بھی ایمان ہے، وہ تو جہنم میں ہیں۔ مہربانی کریں ان کے بارے میں بھی میری سفارش منظور کر لیں۔ اللہ پاک فرمائیں گے: ان کو رہنے دو، ان کو میں اپنی رحمت سے نکالوں گا۔ پھر اللہ پاک ان کو اپنی رحمت کے ساتھ جہنم سے نکال دیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝﴾ [الضحیٰ:۵] یہ آیت سب سے بڑی اُمید دلانے والی آیت ہے کہ اللہ نے اپنے نبی سے وعدہ کیا ہے کہ ہم آپ کو اتنا دیں گے کہ آپ کو راضی کر دیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ہمیں یقین ہے رحمت دو جہاں ﷺ اس وقت تک راضی نہیں ہوں گے جب تک ساری اُمت جنت میں نہ چلی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے راضی کرنے کا وعدہ کیا ہے تو ضرور پورا فرمائیں گے۔ اللہ کا وعدہ تو کبھی خلاف نہیں ہوتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، مقامِ محمود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لئے ہے، ''لواء الحمد'' (حمد کا جھنڈا) حضور اکرم ﷺ کے ہاتھ میں ہوگا اور شفاعت کا پرچم بھی حضور اکرم ﷺ کے پاس ہوگا۔ ہم پر لازم ہے کہ کم از کم ہم اپنی شکل اور حالت ایسی بنائیں کہ حضور اکرم ﷺ کے سامنے جانے کے قابل ہوجائیں، ایسی حالت تو نہ ہو کہ ہم حضور اکرم ﷺ کے سامنے بھی نہ جاسکیں۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں حوض کوثر پر کھڑا ہوں گا، میری اُمت کے لوگوں کو فرشتے دھکے دے دے کر ہٹا رہے ہوں گے۔ حضور اکرم ﷺ فرمائیں گے: ٹھہرو ٹھہرو، ملائکہ! ان کو کچھ نہ کہو، یہ تو میری اُمت ہے، ان کو آنے دو۔ فرشتے عرض کریں گے: حضور! آپ کو پتہ نہیں ہے کہ یہ لوگ آپ کے بعد کیا کیا بدعات اور شرک میں پڑ گئے، انہوں نے تو دین میں نئے نئے مسئلے نکال لئے۔ حضور اکرم ﷺ فرمائیں گے: بربادی ہو ان کے لئے، ان کو جہنم میں لے جاؤ۔

[صحيح البخاري، حديث: ٦٥٨٣، باب: في الحوض]

اگر ہم سامنے جانے کے قابل بھی نہ ہوں اور حضور اکرم ﷺ فرمائیں کہ ان کو دفع کرو تو ہماری سفارش کون کرے گا؟

داڑھی کی اہمیت:

ایک آدمی نے مضمون لکھا کہ مولوی داڑھی داڑھی کہتے رہتے ہیں، کیا داڑھی میں اسلام رکھا ہوتا ہے؟ حالانکہ اس بے وقوف کو پتہ نہیں کہ داڑھی میں اسلام نہیں، اسلام میں داڑھی ہے۔ ورنہ تو جس بچے کی داڑھی نہ نکلی ہو، وہ مسلمان نہ ہو، کوئی عورت مسلمان نہ ہو کہ اس کی داڑھی نہیں ہوتی۔ بلکہ معنی یہ ہے کہ اسلام میں داڑھی کا حکم ہے اور یہ سنت الانبیاء والمرسلین ہے اور دنیا میں کوئی اللہ کا ولی نہیں گزرا، جس نے داڑھی نہ رکھی ہو۔ آپ نے دنیا میں کوئی ایسا ولی، عالم، محدث نہیں سنا ہوگا جو داڑھی نہ رکھتا ہو اور پھر بھی ولی اللہ ہو۔ اس لیے کوشش کرو، ہمت کرو، اللہ تعالیٰ توفیق دے۔

جو اَب تک ہم نے غلطی کی، اللہ تعالیٰ معاف فرمادے، کم از کم جن کو اللہ نے مکہ ومدینہ نصیب فرمادیا ہے اور وہ اپنا چہرہ کعبہ پر بھی رگڑتے ہیں، ان کو تو لحاظ کرنا چاہیے کہ ہم نے تو کعبہ کی دیواروں کو گواہ بنالیا ہے۔ ویسے بھی

اُصولی بات یہ ہے کہ ایک آدمی کو خط لکھوں اور کسی کو دوں کہ فلاں آدمی کے پاس لے جاؤ۔ وہ جب واپس آئے اور میں اس سے پوچھوں۔ وہ کہے کہ مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ میں نے کہا: کیا بات ہے، اس نے میرا خط قبول نہیں کیا؟ اس نے کہا: نہیں، بلکہ اس نے خط لے کر پھاڑ کر گندی نالی میں پھینک دیا۔ ایمان سے بتائیں! اس وقت میرے دل پہ کیا گزرے گی؟ اور جب تم حضور اکرم ﷺ کی سنت کے بال پر اُسترا پھیر کر گندی نالی میں بہادو تو حضور اکرم ﷺ کے دل پر کیا گزرے گی؟

حضرت شاہ جی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ہمیں کہنے کی عادت پڑ گئی ہے اور لوگوں کو سننے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ہم کہتے کہتے مرجائیں گے اور یہ سنتے سنتے مرجائیں گے، پرنالہ وہیں رہے گا جہاں تھا۔ لیکن الحمد للہ! ہم سرخرو ہیں، ہم نے اللہ کا فرمان تم تک پہنچادیا ہے، تم قیامت میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں کسی نے بات پہنچائی نہیں تھی۔ آگے کوئی مانے یا نہ مانے اس کی مرضی ہے۔

میرے آقا ﷺ نے فرمایا: جب بھی اللہ سے جنت مانگو تو جنت الفردوس مانگا کرو۔ کیونکہ وہ سب سے اعلیٰ جنت ہے، ساتواں آسمان اس کی زمین ہے اور اس کی چھت عرشِ معلی ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٢٧٩٠، باب: دَرَجَاتِ الْمُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللهِ]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ ایمان لے آئے اور اچھے عمل کیے، یعنی جو عمل موافق ہو شریعت محمد مصطفیٰ ﷺ کے، یعنی ہر عمل اچھا نہیں ہوتا۔ جسے تم اپنی عقل سے کہو، وہ عمل اچھا نہیں ہوتا، بلکہ اس عمل کے اچھے ہونے کے لئے شرط ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کی شریعت کے مطابق ہو۔ مثلاً کوئی آدمی طواف اُلٹا کرے تو اس کا عمل صالح نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوگا، کیونکہ وہ شریعت اور حضور اکرم ﷺ کے طریقے کے موافق نہیں۔ اگر کوئی اذان دے، لیکن حضرت بلال رضی اللہ عنہ والی اذان نہ ہو، اس سے پہلے بھی ٹکڑا بڑھادیا، درمیان میں بھی ٹکڑا بڑھادیا اور بعد میں بھی ٹکڑا بڑھادیا تو وہ عمل صالح نہیں ہوگا، کیونکہ وہ شریعت محمد مصطفیٰ ﷺ کے موافق نہیں ہے۔

عبادت میں اخلاص کی ضرورت:

حدیث مبارک کے اندر آتا ہے کہ ہر عمل کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں، اگر وہ شرطیں پائی جائیں گی تو عمل قبول ہوگا، ورنہ قبول نہیں ہوگا۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عمل خالص اللہ کے لئے ہو، اللہ کے سوا کسی غیر کو شریک نہ کرے۔ اگر کہتا ہے کہ یا اللہ!

خیرات تیرے فلاں کے نام پر ہے تو اللہ فرماتے ہیں: اے بندہ! جب تُو ان کو میرا شریک کر رہا ہے تو مجھے ایسی خیرات کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ہے کہ میرے اللہ! خیرات تیرے نام پر ہے، اس کا ثواب ان کو عطا فرما، یہ علیحدہ بات ہے، کیونکہ ثواب دینا تو اللہ کا کام ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ حضور پاک ﷺ کی سنت کے مطابق ہو، اگر چہ چھوٹا سا عمل کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس کا بڑا مرتبہ عطا فرما دیتے ہیں۔

تو وہ لوگ جنت والے ہیں، وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتٰبِ ۗ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا﴾ [النساء: ۱۲۳] نہ تمہاری اُمیدیں کچھ رکھتی ہیں اور نہ اہل کتاب کی اُمیدیں کچھ رکھتی ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ جو برائی کرے گا اس کو بدلہ ملے گا، اس کو جہنم ملے گی، اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا کوئی مدد کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔ اور جو آدمی اچھا عمل کرے، چاہے مرد ہے یا عورت ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان رکھنے والا ہو۔ یہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جنت میں داخل کریں گے اور ان پر ذرے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اگر مرنے سے پہلے اسلام قبول کر لیا تو وہ مسلمان ہو گیا۔ بہت سارے لوگ ہوتے ہیں کہ پوری زندگی کفر میں گزر گئی، لیکن آخری وقت مسلمان ہو گیا۔ جس آدمی کو ایمان پر موت آئی اور اس نے عمل صالح کیے، اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے جنت میں داخل فرمائیں گے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور تمام کلمہ پڑھنے والوں کو جنت میں داخل فرمائیں۔

جو کفر کے گھیرے میں آجائے، اس کا انجام:

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّأَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

[البقرۃ: ۸۱]

ایسے نہیں ہے جیسے تم کہتے ہو۔ تمنا کرتے ہو کہ ہم جہنم میں نہیں رہیں گے، مگر تھوڑے دن۔ تمہاری یہ بات غلط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قاعدہ یہ ہے کہ جس شخص نے گناہ کیا اور گناہوں نے اس کا احاطہ کر لیا، وہی جہنم کے

ساتھی ہیں اور وہی جہنم میں رہیں گے۔ ﴿مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ سے مراد یہ ہے کہ جس نے کفر کیا اور اس کی موت بھی کفر پر آئی ہو۔

مومن گناہ گار کا انجام:

علماء نے لکھا ہے، جیسے اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے جنت متقین کے لئے تیار کی ہے۔ اور فرمایا: ﴿وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ [الشعراء: ۹۰] اسی سے معتزلہ کے فرقہ ضالہ کو دھوکا لگا کہ جب جنت متقی لوگوں کے لیے ہے تو جو گناہ کرتا ہے وہ متقی تو نہیں ہے، وہ تو فاسق ہے اور اگر اسی حالت میں مر گیا تو وہ جنت میں نہیں جائے گا، بلکہ جہنم میں جائے گا۔

عقیدۂ اہلسنت والجماعت سلفاً وخلفاً جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ جو آدمی مسلمان ہے اور اس سے گناہ کبیرہ ہوا ہے اور گناہ کی حالت میں ہی مر گیا تو اللہ چاہیں گے تو اس کے گناہ کے بقدر سزا دیں گے اور اگر چاہیں تو وہ سزا بھی نہ دیں اور معاف فرما دیں۔ اللہ قادر ہیں، وہ تو بڑے ارحم الراحمین اور اکرم الاکرمین ہیں، معاف کرنے پر آئیں تو بڑی سی خطاء پر معاف فرما دیتے ہیں، اگر محاسبہ لینے پر آئیں تو چھوٹی سی خطاء بھی معاف نہ کریں۔ کسی فارسی نے فرمایا:

رحمتِ حق بہانہ ے جوید

اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بندوں کو چھوڑنے کے لئے کوئی چھوٹا سا بہانہ چاہتی ہے، وہ تو کہتے ہیں: میرا بندہ کسی حال میں آکر میرے دروازے پر گر جائے تو معاف کر دوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اللہ تعالیٰ کے غضب پر سبقت رکھتی ہے، اللہ کی رحمت ہر چیز پر چھا چکی ہے اور اس کی صفت ''الرَّحْمٰن''، ''الرَّحِيْم'' ہے، یہ سب سے بڑا اظہار صفت ہے کہ جب اللہ نے اپنے استقرار عرش کا ذکر کیا تو فرمایا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ: ۵] حالانکہ ایسے مواقع پر صفت جبار، صفت قہار، صفت متکبر، کبریاء ان کو زیبا تھی، لیکن وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت والی صفت کا ذکر فرمایا۔

صحیح حدیث میں یہ بات ثابت ہے کہ اللہ نے سو رحمتیں پیدا فرمائیں (ہمارے سمجھانے کے لئے) اس میں سے صرف ایک حصہ (ایک جزء) دنیا میں بھیجی ہے اور ساری مخلوق کو ایک جزء سے حصہ ملا ہے۔ والد اپنی اولاد پر جو رحمت کرتے ہیں، میاں بیوی کی آپس میں جو مودّت اور رحمت ہوتی ہے، جانوروں کو اپنے بچوں سے جو مودّت اور رحمت ہوتی ہے، یہ صرف ایک جزء کا اثر ہے اور ننانوے حصے میں نے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں اور اس کا اظہار

میں قیامت میں اپنے بندوں پر کروں گا۔

[صحيح البخاري، حديث: ٦٠٠٠، باب: جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ]

جب دنیا میں ایک رحمت کا یہ عالم ہے تو جب وہ ننانوے رحمتیں بھی آجائیں گی تو اس وقت رحمتوں کے دریا بہہ رہے ہوں گے۔ کوئی بدبخت باغی ہی ہوگا جو جہنم میں جائے گا، ورنہ مسلمان جو اللہ کی توحید کا قائل ہے وہ جنت میں جائے گا۔ اس لئے اہلسنت والجماعت نے فرمایا کہ کوئی کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا۔

فاحشہ عورت کی بخشش کا واقعہ:

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ایک فاحشہ عورت جس کی ساری زندگی گناہ میں گزر چکی تھی اور اعلانیہ زنا کرنے والی، اللہ کے قانون کو توڑنے والی عورت تھی۔ ایک مقام سے گزری، پیاس لگی، پانی نکالا، قریب دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے تڑپ رہا ہے تو اس نے وہ پانی خود نہیں پیا، بلکہ کتے کو ڈال دیا کہ میں تو دوسرا پانی نکال لوں گی۔ یہ تو جانور ہے، پانی نہیں نکال سکتا۔ اللہ نے صرف اسی وجہ سے اس کو معاف کر دیا۔ حالانکہ کتا نجس ہے، حلال جانور نہیں ہے۔

[مسند البزار، حدیث: ۸۷۲۵]

اس لئے اسلام نے ہمیں حکم دیا ہے کہ راستے میں کانٹا بھی پڑا ہو تو ہٹا دو۔ شاید اس کانٹے کے ہٹانے کی وجہ سے تیرا مالک راضی ہو جائے۔ اس لئے یہ بھی حکم ہے کہ کوئی اندھا گزر رہا ہو تو اس کو راستہ پار کرا دو، اور کوئی معذور گزر رہا ہو تو اس کا ہاتھ پکڑ لو، کوئی آدمی گرنے والا ہو تو اس کو سہارا دے کر تھام لو، کوئی آدمی بیٹھا ہے، پانی کا گلاس دے کر پلا دو۔ یہ نہ سمجھو کہ یہ معمولی کام ہے، اللہ تعالیٰ تو بخشش کے لئے بہانہ چاہتے ہیں، پتہ نہیں کس معمولی بات پر راضی ہو جائیں۔

علماء اہلسنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ جس آدمی کی موت ایمان اور عقیدۂ توحید پر آئے تو اس کی بخشش ہو جائے گی۔ اگر مشرک ہے تو اس کی بخشش نہیں ہوگی۔ مشرک کا یہ معنی نہیں کہ وہ بتوں کی پوجا کرتا ہو، چاہے بتوں کی پوجا کرے، شمس و قمر کی پوجا کرے، آگ کی پوجا کرے، گنگا جمنا کی پوجا کرے یا کسی قبر کی پوجا کرے، اس کو سجدہ کرے یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کرے یا حضرت عزیر علیہ السلام کی پوجا کرے، جبرائیل و میکائیل علیہما السلام، فرشتوں کی پوجا کرے، سب شرک ہے۔

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ کی تفسیر:

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے معنی یہ کیا ہے کہ اے بنو اسرائیل! جس نے بُرے اعمال کئے، جیسے تم کر رہے ہو کہ تم نے ہمارے نبی کو نہیں مانا، انہوں نے بھی نہیں مانا تھا جس طرح تم نے کفر کیا، اسی طرح انہوں نے بھی کفر کیا تھا، چاہے عرب ہو یا عجم ہو، چاہے اہل کتاب ہو یا اُمّی ہو، چاہے بنی اسرائیل سے ہو یا بنی اسماعیل سے ہو، کفر نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اس کی کوئی اچھائی نہیں بچی، کیونکہ کافر کے اعمالِ حسنہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اس لیے نتیجہ نکلے گا: ﴿فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ حضرت حسن رحمہ اللہ اور حضرت سدی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''سَيِّئَةً'' سے مراد ایسا گناہ ہے جو کبیرہ ہے، اور بڑے گناہوں میں پہلی چیز شرک ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۹، البقرۃ، الآیۃ: ۸۱]

کبائر کی تعداد:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسے گناہ جو بندے کو ہلاک اور برباد کر دینے والے ہیں، وہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، کسی انسان کو ناحق قتل کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، پاکدامن عورت پر تہمت لگانا، میدانِ جنگ سے دشمن کے مقابلہ کے وقت بھاگ جانا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا، جھوٹی قسم کھانا، بیت اللہ میں بے دینی پھیلانا۔

[الجامع الصغیر، حدیث: ۸۷۳۱، بخاری، حدیث: ۲۷۶۶، باب: قَوْلِ اللهِ تَعَالٰى: إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ...]

بعض علماء نے ستر کبائر لکھے ہوئے ہیں اور بعض نے اس سے بھی زیادہ گناہ شمار کئے ہیں۔ اس کے بارے میں علامہ ذہبی رحمہ اللہ کی ایک کتاب ہے: ''الکبائر''، علامہ ابن نجیم کا رسالہ ''رسائل ابن نجیم'' میں موجود ہے اور اسی طرح ابن حجر مکی رحمہ اللہ کی کتاب ہے: ''الزواجر''، اس میں علماء نے ان تمام روایات کو جمع کیا ہے۔

﴿وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ﴾ حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کا معنی ہے کہ اس کے دل میں بُرائی داخل ہوگئی، کیونکہ ایمان اور کفر کا اصل مقام دل ہے۔ اگر دل ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے، اگر دل خراب ہے تو سب خراب ہے۔

(واقعہ) حضرت لقمان کے بارے میں لکھا ہے کہ سردار نے ان کو حکم دیا کہ ایک بکرا ذبح کرو اور اس کے بعد کہا کہ اس بکرے کے گوشت کے دو عمدہ ٹکڑے لے آؤ، جو سب سے زیادہ بہتر ہوں۔ حضرت لقمان ایک زبان کا ٹکڑا

اور ایک دل کا ٹکڑا کاٹ کر لے آئے کہ یہ سب سے اچھے ٹکڑے ہیں۔ کچھ دن گزر گئے تو سردار نے پھر حکم دیا کہ بکرا ذبح کرو اور اس کے بعد حکم دیا کہ اس کے اندر جو خراب گوشت کے ٹکڑے ہوں، وہ لے آؤ۔ حضرت لقمان پھر بھی زبان اور دل کاٹ کر لے آئے۔ ان کے سردار نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ جب یہ اچھے ہوں تو ان سے اچھا کوئی نہیں اور اگر برے ہو جائیں تو ان سے برا اور کوئی نہیں ہوتا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بدن کے اندر گوشت کا لوتھڑا ہے، اگر وہ ٹھیک ہو جائے تو سارا بدن ٹھیک ہو جاتا ہے اور وہ خراب ہو جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ فرمایا: سن لو، وہ دل ہے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۵۲، باب: فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی مجھے دو چیزوں کی ضمانت دے: ایک زبان اور دوسری شرمگاہ کی کہ ان کو غلط استعمال نہیں کروں گا، اس کی جنت کا میں محمد ضامن ہوں۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۷۴، باب: حِفْظِ اللِّسَانِ]

﴿وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ﴾ حضرت ربیع بن خیثم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے کہ جو اس حال میں مر گیا کہ گناہوں پر توبہ نہ کر سکا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے آقا ﷺ نے فرمایا: ''إِيَّاكُمْ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوبِ، فَإِنَّهُنَّ يَجْتَمِعْنَ عَلَى الرَّجُلِ حَتَّى يُهْلِكْنَهُ'' یعنی خبردار! گناہوں سے بچتے رہنا۔ یہ نہ کہا کرو کہ یہ معمولی گناہ ہے، صغیرہ گناہ ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے گناہ جمع ہو کر بندے کو برباد کر دیتے ہیں۔ [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۳۸۱۸]

گناہوں کی مثال:

اس کے لیے حضور اکرم ﷺ نے ایک مثال دے کر سمجھایا کہ کچھ لوگ جنگل میں سفر کر رہے ہوں اور ایک جگہ پڑاؤ ڈالیں کہ ہم کھانا پکالیں اور وہ سب ساتھی جنگل میں دوڑ پڑیں، کوئی ایک لکڑی لا رہا ہے، کوئی دو لا رہا ہے، کوئی چھوٹی لا رہا ہے اور کوئی بڑی لکڑی لا رہا ہے۔ جب ساری لکڑیوں کو جمع کر کے آگ جلائی تو بہت بڑی آگ بن گئی تو جو کچھ پکانا تھا، پکالیا۔ جیسے یہ چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جمع ہو کر اتنی بڑی آگ کا ذریعہ بن گئیں، اسی طرح تیرے چھوٹے چھوٹے گناہ اکٹھے ہو کر تجھے جلانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

علماء نے اسی حدیث کے ضمن میں فرمایا کہ بڑی لکڑی آگ نہیں پکڑتی، پہلے اس کے نیچے چھوٹی لکڑیاں رکھ کر آگ جلائی جاتی ہے تو آگ بھڑکتے بھڑکتے بڑی لکڑیوں کو بھی لگ جاتی ہے۔ اس طرح بندے کے چھوٹے

چھوٹے گناہ جمع ہو کر جلانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اگر کبھی چھوٹا گناہ ہو جائے تو اس کا علاج اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾ [ہود: ۱۱۴] میرے بندے اگر کبھی ایسی غلطی ہو جائے تو اچھے کام کر لیا کرو، ان سے میں تیرے چھوٹے گناہ مٹا دوں گا، اور بھی کبیرہ گناہ ہو جائے تو فرمایا: توبہ کے دروازے بند نہیں ہوئے، جب تک سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع نہیں ہوگا، اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اسی طرح جب بندہ موت کے قریب ہو اور اس کو سکرات الموت لگی ہوئی ہو۔ اب اندر سے خرخر کی آواز آتی ہے، نگلنے کی طاقت نہیں رہی، پانی باہر آجاتا ہے۔ یہ مقام جب آجائے تو پھر بھی توقبول نہیں ہوتی، اس لئے پہلے توبہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کو منانے کی کوشش کرو۔

بنی اسرائیل کے لیے فیصلہ کن بات:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۸۲] اور جو لوگ اللہ پر سچا ایمان لے آئے اللہ کے رسولوں پر ایمان لے آئے اور پھر عمل بھی اچھے کئے (یعنی جو عمل سنت کے مطابق ہو وہ عمل اچھا ہوتا ہے اور جو سنت کے مخالف ہو وہ خراب ہے)۔ یہی لوگ ہیں جو جنت والے ہیں اور یہ جنت میں ہمیشہ رہیں۔ تو مطلب یہ نکلا کہ ہر خیر والا اپنے مقام پر ہے اور ہر شر والا اپنے مقام پر ہے۔ اس میں بنی اسرائیل اور غیر کی کوئی تفریق نہیں ہے، بلکہ جو ایمان لے آئے، اچھے عمل کرے، وہ جنتی ہے۔ اور جو کفر پر مرے، وہ جہنمی ہے۔ لہٰذا تمہارا یہ دعویٰ کرنا کہ ہم جہنم میں نہیں جائیں گے یا جہنم میں چند روز جائیں گے، یہ زبانی کلامی دعوے ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ إِلَّا اللّٰهَ ۗ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۸۳]

اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا (کہ) عبادت نہ کرنا، مگر اللہ کی اور والدین سے عمدہ سلوک کرنا اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے بھی۔ اور کہو لوگوں کو نیک بات، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ پھر تم (اس عہد سے) پھر گئے، مگر تم میں سے تھوڑے سے اور تم ہو ہی پھرنے والے۔

ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے نواقضات کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارے ساتھ میرا کوئی عہد نہیں کہ میں تمہیں جہنم میں نہیں ڈالوں گا، بلکہ ہم نے تم سے عہد لیا تھا، تم نے عہد توڑ ڈالا اور اس عہد میں کئی شرطیں تھیں:

پہلی شرط یہ تھی کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے۔ کیونکہ جو اللہ کے سوا کسی غیر کی عبادت کرے گا، وہ مشرک ہے اور مشرک کے لئے نجات کوئی نہیں۔ ﴿لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ نماز، رکوع، سجود، صدقہ و خیرات کرنا عبادت ہے اور دعا مانگنا بھی عبادت ہے، بلکہ فرمایا: "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ"[1] تو دعا بھی صرف اللہ سے مانگنی چاہیے۔

علماء نے لکھا ہے کہ آدمی نماز میں دعا مانگ رہا ہو یا علیحدگی میں دعا مانگ رہا ہو تو اس کی دعا کو دیکھ کر اندازہ لگاؤ کہ اس کا اللہ سے کتنا تعلق ہے؟ بعض آدمی ایک سیکنڈ سے زیادہ ہاتھ کھڑے نہیں کر سکتے، ان کو اللہ تعالیٰ مانگنے نہیں دیتا۔ اور ایک آدمی دعا میں مشغول ہے، گز گزا رہا ہے اور اس کا جی نہیں بھر رہا۔ ساری کتابیں آپ پڑھ لیں، ایک جگہ بھی آپ ثابت نہیں کر سکتے کہ کسی پیغمبر نے اللہ کے سوا کسی دوسرے پیغمبر سے مانگا ہو، ایک نبی نے دوسرے نبی سے مانگا ہو یا ایک پیغمبر نے کسی دوسرے پیغمبر کا واسطہ اور وسیلہ پکڑا ہو۔

دوسرا حکم یہ تھا کہ ہم نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ اپنے والدین سے احسان کا معاملہ کرو۔ والدین کا اتنا بڑا مرتبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ احسان کا ذکر فرمایا۔ حالانکہ اللہ کی توحید کے بعد نبوت کا درجہ ہے، لیکن کئی مقامات پر عبادت کے بعد والدین سے احسان کا حکم ہے۔ جیسے: ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [النساء:٣٦] اور فرمایا: ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا﴾ [الاحقاف:١٥] اللہ نے اپنی عبادت کے بعد اس کو ذکر کیا، کیونکہ حقیقی طور پر پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں اور مجازی طور پر والدین ہیں، اس لئے جب خالق حقیقی کا شکر کرو تو ان کا بھی شکر کرو کہ ان اسباب کے ذریعے تُو اس دنیا میں آیا ہے۔ پھر والدین میں سب سے بڑا مرتبہ ماں کا ہے۔

ایک صحابی نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا: حضور! مجھے بتائیں، سب سے زیادہ بھلائی کس کے ساتھ کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ بھلائی کرو۔ صحابی نے عرض کیا: اس کے بعد کس سے کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں کے ساتھ بھلائی کر۔ اس نے عرض کیا: حضور! اس کے بعد؟ حضور اکرم ﷺ

[1] [سنن الترمذی، حدیث: ٣٣٧١]

نے فرمایا: ماں کے ساتھ بھلائی کر۔ صحابی نے عرض کیا: اس کے بعد؟ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: باپ کے ساتھ بھلائی کر۔

[صحيح البخاري، حديث: ٥٩٧١، باب: مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ الصُّحْبَةِ]

تین دفعہ اللہ کے نبی ﷺ نے ماں کا نام لیا، کیونکہ وہ تین مرحلوں میں گزری ہے، ایک پیٹ میں اُٹھانے کا مرحلہ، دوسرا ولادت کا مرحلہ اور تیسرا ولادت کے بعد رضاعت کا مرحلہ ہے۔ چونکہ ماں نے تین تکلیفیں برداشت کی تھیں تو حضور اکرم ﷺ نے بھی تینوں مقام ماں کو دیئے اور چوتھے پر باپ کو رکھا۔

والدین کی خدمت:

ایک صحابی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا: میری ماں بہت بوڑھی ہوگئی ہے اور میں نے اپنی پیٹھ اپنی ماں کے لئے سواری بنائی ہوئی ہے، جہاں مجھے حکم دیتی ہے پیٹھ پر اُٹھا کر لے جاتا ہوں اور میں چوبیس گھنٹے ان کی خدمت کے لئے کھڑا ہوں۔ میرے ہاتھ بھی ان کے لئے ہیں، میری پشت بھی ان کے لئے ہے، میرا جسم و جان بھی ان کے لئے ہے، میرا مال بھی اس کے لئے ہے، کیا میں اپنی ماں کا شکریہ ادا کر چکا ہوں؟ اس نے مجھے دس مہینے اُٹھایا اور مجھے دس سال ہو گئے، اللہ کا شکر ہے اُٹھا رہا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم ان کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ وہ جب اُٹھا رہی تھی تو دعا مانگتی تھی: میرا بچہ بڑا ہو، جوان ہو، عالم بنے، عزت والا بنے اور تم اُٹھا تو رہے ہو، لیکن دعا مانگتے ہو کہ جلدی مرے اور میری جان چھوٹ جائے۔ اس کے اُٹھانے اور تیرے اُٹھانے میں بڑا فرق ہے۔

والدین کی ناقدری کے واقعات:

ہمارے معاشرے میں جتنا آج والدین ذلیل ہو رہے ہیں اتنا کوئی ذلیل نہیں ہو رہا۔ مجھے ایک باپ نے خود سنایا کہ میں نے اپنے بیٹے کو جوتیاں سی سی کر پڑھایا...... وہ جوتوں کا کام نہیں کرتا تھا، بڑی قوم کا آدمی تھا...... لیکن مسافر، مزدوری میں سب کرنا پڑتا ہے اور کہا کہ لوگوں کے باغوں میں مالی بھی رہا، سر پر بوریاں بھی اُٹھائیں، لیکن بیٹے کو کہا: تم پڑھو اور تم کوئی کام نہ کرو۔ جب بیٹے کو اعلیٰ تعلیم مل گئی اور کمپنی میں منیجر کے عہدے پر لگا اور گاڑی ملی، بیس پچیس ہزار تنخواہ لگی۔ میں مدتوں کے بعد گیا کہ چلو بیٹے کو بھی مل لوں گا اور اپنا ملک بھی دیکھ آؤں گا۔ میرے پاس ایڈریس تھا اور تو میں کچھ نہیں جانتا تھا، اس ایڈریس پر ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہر حال میں وہاں پہنچ گیا اور وہاں

جا کر کہا: میں نے فلاں صاحب کو ملنا ہے۔ انہوں نے کہا: ٹھہریں، پہلے ہم اجازت لیں گے۔ میں نے کہا: اجازت کیا لو گے؟ میرا بیٹا ہے۔ انہوں نے کہا: صاحب کا آرڈر ہے۔ انہوں نے جا کر اطلاع دی۔ آدھا گھنٹہ تو میں بیٹھا رہا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ باہر تشریف لے آئے اور ان کے ساتھ اور بھی کئی دوست تھے، ان کے ساتھ ہنستا ہوا آیا اور میرے پاس سے گزرنے لگا تو کہا: میں ابھی آتا ہوں۔ دوستوں نے کہا: یہ کون ہے؟ کہنے لگا: نوکر ہے، گاؤں سے ملنے آیا ہے۔ وہ دوستوں کو گاڑی تک چھوڑنے کے لئے گیا۔ میں اسی وقت وہاں سے اُٹھ کر چھپ گیا، ساتھ ایک مسجد تھی، وہاں میں چار گھنٹے تک روتا رہا کہ اس قسم کی اولاد بھی ہوگئی ہے، جو باپ کو نوکر کہتی ہے۔ اس کے بعد میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میں اس کو ملوں۔ پتہ نہیں اس نے مجھے ڈھونڈا ہوگا یا نہیں ڈھونڈا ہوگا۔ جس نے منہ پر اس طرح کہا، اس نے بعد میں کیا ڈھونڈا ہوگا؟

ہمارے ہاں تو ایسی بھی ناخلف اولادیں موجود ہیں۔ یہاں ایک بڑا آدمی ہے، اس کے باپ کے سر پر اٹیچی کیس ہو اور بیٹا آگے جا رہا ہے۔ حالانکہ والدین کا اتنا بڑا حق ہے کہ اللہ نے اپنے حق کے بعد والدین کے حق کا ذکر فرمادیا کہ میری عبادت کرو اور اپنے والدین کے حقوق بھی ادا کرو۔

یاد رکھیں! جن اولادوں پر والدین ناراض ہیں، وہ اولادیں دنیا و آخرت میں ذلیل ہو جائیں گی۔ چاہے ان کو چند سالوں میں کچھ ترقی مل جائے۔ اور جنہوں نے والدین کی عزت نہیں کی ان کی اپنی اولاد بھی ان کی عزت نہیں کرے گی۔

ایک دفعہ ایک آدمی میرے پاس روتا ہوا آیا۔ سفید داڑھی تھی۔ میں نے اُٹھ کر اس کو بٹھایا اور پوچھا: کیوں روتے ہو؟ کہنے لگا: آج مجھے میرے بیٹے نے لاٹھیوں سے مارا ہے۔ میرا اور کوئی نہیں تھا، میں نے کہا: چلو آپ کو فریاد سنادوں۔ میں نے اس کے سامنے اس کے بیٹے کو بلا کر ٹھیک ٹھاک مارا۔ لیکن میں جب اس کو حد سے زیادہ مارنے لگا تو باپ نے اُٹھ کر اُلٹا مجھے پکڑ لیا کہ اس کو معاف کر دیں۔ میں نے کہا: آپ نے ہی تو شکایت کی تھی۔ کہنے لگا: میں نے بھی اپنے باپ کو اسی طرح مارا تھا، مجھے سزا مل گئی ہے۔ میں نے ایک تھپڑ مارا تھا اور مجھے اتنی سوٹیاں کھانا پڑیں۔ یہ تو جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا﴾ [الاحقاف:١٥] تم نے اللہ کا وعدہ بھی توڑ ڈالا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھی حق ادا نہیں کیا۔ تم اس کے باپ ہونے پر فخر کرتے ہو، وہ تو میرا نبی ہے، تم اس کے کہنے پر چلتے۔ ادھر کہتے ہو

کہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کے پیارے ہیں اور ادھر نہ میری عبادت کرتے ہو اور نہ والدین کا حق ادا کرتے ہو۔

والدین کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کا اجر:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس آدمی نے پانچ دفعہ نماز پڑھ کر اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار میں سر جھکایا، اس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پانچ دفعہ جس نے نماز پڑھنے کے بعد اپنے والدین کے لیے بخشش مانگی، اس نے اپنے والدین کا شکر ادا کیا۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ والد یا والدہ جو دعا اپنے بیٹے کے حق میں مانگیں، وہ ایسے ہوتی ہے جیسے کوئی اللہ کا نبی اپنی اُمت کے لیے دعا مانگے۔ روایات میں ہے کہ والد یا والدہ اولاد کو بددعا کر دیں تو وہ بددعا کبھی بھی خالی نہیں جاتی۔

(مسئلہ) حتیٰ کہ فقہاء نے یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ تم نماز پڑھ رہے ہو اور والدہ نے پکارا اور تمہیں یقین ہے کہ مجھے جماعت مل جائے گی تو نماز توڑ کر ماں کی بات پوری سن لو۔ اسی طرح یہ بھی موجود ہے کہ جن لوگوں پر والدین ناراض ہوتے ہیں، موت کے وقت ان کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں، ان کی زبانوں پر کلمہ جاری نہیں ہوتا۔

والدین کے نافرمان کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بددعا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہلاکت ہو، ہلاکت ہو، ہلاکت ہو۔ صحابہ نے پوچھا: کس کے لیے یہ بددعا فرمائی؟ ارشاد فرمایا کہ جس کے بوڑھے والدین ہوں اور وہ آدمی (انہیں راضی نہ کر لے) ان سے جنت حاصل نہ کر سکے۔ ایسے آدمی کے لیے بربادی ہو۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۵۵۱]

تو جن کے والدین زندہ ہیں، وہ ان کو راضی کر لیں۔ اور اگر والدین ناراض حالت میں مر گئے تو ان کا بدلہ یہ ہے کہ جو تمہارے والدین کے دوست ہیں ان کے ساتھ بہتر سلوک کرو اور والدین کے لیے دعائیں کرو۔ عبادت کرو، صدقہ جاریہ کرو اور کہیں مدرسہ، مسجد یا ہسپتال قائم کر دو۔

والدین کے ساتھ احسان کا مطلب ہے کہ والدین کی ہر حالت میں اطاعت کرو، جب تک وہ اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ کریں۔ اگر تمہارے والدین کافر بھی ہوں تو ان کے ساتھ بھلائی کرو۔

والدین کافر بھی ہوں تو خدمت کے حق دار ہیں:

صحیح احادیث میں موجود ہے، بی بی اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض

کیا: میری والدہ مجھے مدینہ میں ملنے کے لئے آئی ہیں، لیکن میری والدہ مسلمان نہیں ہیں، کیا میں والدہ کی خدمت کروں؟ میں ان کو گھر میں رہنے دوں یا نہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اپنی والدہ کا احترام کرو، وہ کافرہ ہے تو کیا؟ تمہاری ماں تو ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۵۹۷۸، باب: صِلَةِ الْوَالِدِ الْمُشْرِكِ]

اس سے علماء نے مسئلہ نکالا ہے کہ اگرچہ والدین کافر ہوں، پھر بھی اولاد کے لئے ضروری ہے کہ ان کی خدمت کریں۔

حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا زوجہ نبی کریم ﷺ اور اُمہات المومنین میں سے ہیں، ان کے والد ابوسفیان مکہ سے مدینہ آئے۔ بی بی اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے بھی جا کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! میرے والد آئے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ وہ کافر ہیں۔ کیا میں اپنے والد کا احترام کرسکتی ہوں؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اپنے والد کا احترام کرو، اور یہ ضروری ہے چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔

روایت میں آتا ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے مکہ فتح کرلیا اور طائف کا محاصرہ کیا اور جعرانہ کے مقام پر کنواں کھودا، وہاں پانی کڑوا نکلا۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے پاس پانی کا کوئی انتظام نہیں ہے، ہم نے بڑی محنت سے یہ کنواں کھودا ہے لیکن اس کا پانی کڑوا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کنویں پر تشریف لے آئے اور فرمایا: اس سے پانی کا ڈول نکالو۔ وہ نکالا گیا تو حضور اکرم ﷺ نے اپنا لعابِ دہن اس میں ڈال دیا اور فرمایا: اس پانی کو واپس اس کنویں میں ڈال دو۔ جب پانی کو کنویں میں ڈالا گیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اب اس پانی کو استعمال کرو۔ صحابہ کہتے ہیں کہ اس جیسا بہترین پانی ہمیں دنیا میں ملا ہی نہیں۔

تقریباً ایک ماہ تک اس جگہ حضور اکرم ﷺ قیام فرما رہے۔ چونکہ غنائم تقسیم کرنے تھے اور طائف کا محاصرہ بھی کرچکے تھے، اسی جگہ سے حضور اکرم ﷺ نے احرام باندھ کر عمرہ بھی کیا۔

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم اس مقام جعرانہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بوڑھی عورت لاٹھی ٹیکتے ہوئے آئی۔ جب حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچی تو آقائے نامدار ﷺ نے اپنی چادر مبارک بچھادی، اس بڑھیا کو اس پر بٹھا کر اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوگئے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس سے پوچھا: کیسے آئی ہو؟ کیا بات ہے؟ اس بڑھیا نے کہا: میرے قبیلے کے اتنے لوگ قیدی ہیں، ان کو میں چھڑوانے کے لئے آئی ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ ان کو فوراً چھوڑ دو۔ اس بڑھیا نے کہا: حضور! ان کا سارا مال صحابہ لے آئے ہیں، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ

سارا مال بھی لوٹا دو۔ اس کے بعد اس نے کہا: حضور! میرے علاقے کا فلاں کام ہے، حضور اکرم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: وہ بھی کر دو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم حیران ہو گئے۔ ایک بوڑھی سی عورت ہے اور ایسے باتیں کر رہی ہے جیسے حضور اکرم ﷺ کو آرڈر کر رہی ہو اور حضور اکرم ﷺ بھی انکار نہیں فرماتے، بلکہ جو اس کے منہ سے نکلتا ہے، فرماتے ہیں: کر دو۔ جو مانگتی ہے، فرماتے ہیں: دے دو۔

جب وہ چلی گئیں تو ہم نے حضور پاک ﷺ سے پوچھا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ میری ماں تھی جس نے مجھے دودھ پلایا تھا۔ میں اپنی ماں کو انکار کیسے کر سکتا تھا؟

تو رضاعت کی وجہ سے بھی ماں کے وہ حقوق ہیں جو حقیقی ماں کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا شریعت کے اندر یہ مسئلہ ہے کہ ہر حال میں والدین کے ساتھ بھلائی کرو۔ علماء نے اس کا ایک طریقہ یہ بھی لکھا ہے کہ ہر نماز کے بعد والدین کے لئے دعا کرو۔

والدین کی اطاعت کے متعلق واقعات:

ایک مسئلہ یاد رکھیں! والدین کی اطاعت ہم پر ہر حال میں فرض ہے۔ والدین اپنی اولاد کی جائیداد مانگیں، ان کا حق ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''أَنْتَ وَ مَالُكَ لِأَبِيكَ'' کہ تم اور تمہارا مال سب تمہارے باپ کا ہے۔ اگر ضرورت مند والدین تمہاری پوری جائیداد بھی لینا چاہیں تو ان کو حق ہے۔

اسی طرح شریعت کے اندر بھی یہ مسئلہ ہے کہ والدین اگر غریب ہیں اور بیٹے کو اللہ تعالیٰ نے نوکری دے دی اور پیسہ دے دیا تو والدین کا تمام خرچہ بیٹے کے ذمہ ہے، ورنہ وہ قیامت میں اللہ کے ہاں پکڑا جائے گا۔

میرے آقا ﷺ نے یہ بھی فرمایا: اگر کسی نوجوان پر حج فرض ہو گیا ہے، لیکن اس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بوڑھا زندہ ہے، وہ اجازت نہیں دیتے تو جب تک وہ اجازت نہیں دیتے، وہ حج نہ کرے، بلکہ ان کی خدمت میں رہے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کے سامنے ایک نوجوان صحابی آئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے سنا ہے کہ آپ فوج بھیج رہے ہیں تو میرا نام بھی ان میں لکھ دیں۔ میں جہاد میں جانے کے لئے آیا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: تمہارے والدین زندہ ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں! وہ بہت بوڑھے ہیں۔ جب میں آیا تو وہ رو

رہے تھے، انہوں نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی کہ تم جہاد پر نہ جاؤ، ہماری کون خدمت کرنے والا ہے؟ لیکن حضور! میرے جذبۂ جہاد کا یہ عالم ہے کہ میں ان کو روتا ہوا چھوڑ آیا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم واپس جاؤ اور والدین کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو۔ اور واپس جاؤ، جس طرح تم ان کو روتا ہوا چھوڑ آئے ہو، اسی طرح ان کو ہنساؤ۔ [صحیح البخاري، حدیث:۳۰۰۴، بابُ: الجهادِ بإذنِ الأبوَينِ]

علماء نے لکھا ہے کہ جس اولاد پر والدین ناراض ہوں، اس کا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوتا۔ لیکن خبردار! اگر والدین تجھے مجبور کریں کہ خدا کے ساتھ شرک کر دیا جیسے بعض جاہل والدین اپنی اولاد کو کہتے ہیں: چلو پیر کی قبر پر سجدہ کرو، چلو وہاں نذر و نیاز چڑھانے کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہر بات میں والدین کی اطاعت کرنا، لیکن جو چیز اللہ کے ہاں حرام اور کفر و شرک ہیں، ان میں والدین کی اطاعت نہ کرنا۔ اگر والدین کفر کے لیے جبر کریں، آدمی نہیں مانے گا۔ اگر گناہِ کبیرہ کے لئے کہیں تو نہیں مانے گا۔

جیسے دیہات کے اندر ہوتا ہے، مثلاً آپ کے خاندان میں سے کسی نے زیادتی کی تھی تو والدین بیٹے کو بلا کر کہتے ہیں: تم کیسے نوجوان ہو، تم جا کر ان سے بدلہ لو، ان کی لڑکی اُٹھا لو اور ان کی بے عزتی کرو۔ ایسے معاملات میں والدین کی اطاعت نہیں کی جائے گی، یعنی جو چیزیں اللہ نے حرام اور منع کر دی ہیں، ان میں والدین کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب وہ مسلمان ہو گئے، ان کی والدہ بوڑھی تھیں۔ جب ان کو پتہ چلا کہ میرا بیٹا مسلمان ہو گیا ہے تو اس نے بیٹے کو بلایا اور پوچھا: کیا تم اسلام لے آئے ہو؟ انہوں نے کہا: الحمدللہ! میں اسلام لے آیا ہوں۔ ان کی ماں نے کہا: خدا کی قسم! میں کھانا بھی نہیں کھاؤں گی، پانی بھی نہیں پیوں گی، جب تک کہ تم کافر نہ بنو۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بڑی کوششیں کیں اور منتیں کیں کہ اماں جان! تم کھانا کھا لو۔ بولے: تم دھوپ میں کیوں بیٹھی ہو؟ اس نے کہا: میں نے قسم کھالی ہے کہ جب تک تم محمد عربی ﷺ کا دامن نہیں چھوڑو گے، جب تک تم اسلام کو نہیں چھوڑو گے، میں اپنی بھوک ہڑتال کو نہیں چھوڑوں گی۔ اس طرح تیسرا دن بھی ہو گیا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی ماں کے پاس آ کر کہا: اے میری ماں! بات سن لو، اگر تم اسی طرح بیٹھے بیٹھے تڑپتی ہوئی بھی مر جاؤ، تب بھی میں اسلام نہیں چھوڑ سکتا، میں اب جہنم میں جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

جب ان کی ماں کو یقین ہو گیا کہ بیٹا کسی شکل میں نہیں مانتا تو اس نے بھوک ہڑتال توڑ ڈالی۔

اس لئے اللہ پاک نے قرآن میں حکم نازل فرمادیا کہ خبردار! کسی ایسی بات میں والدین کی اطاعت نہ کرنا جو باتیں اللہ کے حکم کے خلاف ہوں، ورنہ ہر حال میں ہر صورت میں والدین کی اطاعت ضروری ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اگر والدین کافر ہیں، یہودی ہیں، نصرانی ہیں، ہندو ہیں، آغا خانی ہیں یا قادیانی ہیں، ان کی زندگی میں تو دعا کر سکتا ہے کہ یا اللہ! میرے والدین کو ہدایت عطا فرما، میرے والدین کو اسلام کی دولت سے مالا مال فرما۔ لیکن اگر وہ کفر کی حالت میں مر جائیں تو والدین کے لئے بخشش نہیں مانگ سکتا، کیونکہ اللہ نے قرآن میں واضح فرمادیا: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿١١٤﴾﴾ [التوبۃ: ۱۱۴] ابراہیم علیہ السلام اس وقت تک بخشش کی دعا مانگتے رہے جب تک واضح نہیں ہو گیا۔ جب واضح ہو گیا کہ میرا باپ کفر پر مر گیا ہے تو بخشش ختم۔

گریبان کے اندر جھانکیں۔ دیکھیں! کتنے بیٹے ہیں جو والدین کا خیال کرتے ہیں۔ اپنی بیوی کا سب کو خیال ہے، اپنے دوستوں کا سب کو خیال ہے، اپنے ساتھیوں کا سب کو خیال ہے، لیکن ایسی بے حیت اولاد ہے کہ باپ کو خط لکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ ایسی اولاد نے دنیا میں بھی ذلیل ہونا ہے اور آخرت میں بھی ذلیل ہونا ہے۔ جو کچھ تم آج اپنے والدین کے ساتھ کر رہے ہو، اس عاقبت کو جھیلنے کے لئے تیار ہو جاؤ کہ تمہاری اولاد تمہارے ساتھ کیا کرتی ہے۔

والدہ کی بددعا لگنے کا واقعہ:

حدیث میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں جُریج نامی ایک آدمی بڑا عابد و زاہد تھا۔ اس کی زندگی عبادت میں گزر گئی۔ ایک دفعہ والدہ نے کسی کام سے بلایا، دیر ہو گئی، اپنی عبادت میں مشغول رہا۔ جب گیا تو والدہ نے کہا: اتنی دیر سے آیا ہے؟ اس نے کہا: مصروف تھا۔ اس نے کہا: عجیب تمہاری عبادت ہے کہ ماں تجھے بلا رہی ہے اور تم اپنی عبادتوں میں لگے ہوئے ہو۔ ماں نے غصے سے کہا: تم اس وقت تک نہ مرو جب تک تجھے اللہ فاحشہ عورت کے منہ نہ لگائے۔

اس کی والدہ فوت ہو گئیں۔ مدت گزر گئی۔ وہ اپنے اس عبادت خانہ میں موجود تھا کہ ایک عورت نے عبادت کے لیے آنا جانا شروع کیا۔ کبھی آ کر مسئلہ پوچھتی اور کبھی آ کر عبادت کا ذریعہ پوچھ لیتی۔ بعض لوگوں نے اسے

اُکسایا اور شیطان نے بھی اس کے دماغ میں خیال ڈالا۔ اس عورت نے ایک چرواہے کے ساتھ بدفعلی کی۔ جب بچہ پیدا ہونے پر آیا تو اس عورت نے قوم کے سامنے تہمت لگادی کہ یہ جو تمہارا پیر بنا بیٹھا ہے، اس نے میری بے عزتی کی ہے اور یہ بچہ اسی کا ہے۔

شہر والے دوڑ پڑے اور اس کو مارنا شروع کر دیا۔ کسی نے اس کا عبادت خانہ توڑ ڈالا، کسی نے غسل خانہ توڑ ڈالا اور کسی نے گھر کا سامان اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اس نے کہا: خدا کے بندو! عقل کرو، میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ انہوں نے کہا: ایک عورت لڑکا لے کر سامنے کھڑی ہے اور کہتی ہے کہ اسی کا لڑکا ہے، اس کے بعد بھی ہم تمہاری بات مانیں۔ اس نے کہا: میں نے یہ جرم نہیں کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میری والدہ نے مجھے بددعا دی تھی اور یہ عورت میرے متھے لگ گئی۔ ماں کے منہ سے جو کلمہ نکلا تھا، اس کی سزا اللہ نے مجھے دنیا میں دے دی ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ١٢٠٦، باب: إِذَا دَعَتِ الْأُمُّ وَلَدَهَا فِي الصَّلَاةِ]

اور ہم نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ اپنے رشتہ داروں سے بھلائی کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول ہے کہ جس آدمی کے رشتہ دار غریب ہوں، اس کو جائز نہیں کہ وہ زکوۃ کسی دوسرے کو دے۔

چونکہ رشتے داروں کا حق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار بیان فرمایا ہے۔ آج ہم صرف رشتہ داروں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جو ہمارے ساتھ تعلق رکھیں۔ اگر کوئی رشتہ دار ہم سے تھوڑی سی زیادتی کرے تو ہم ناراض ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو تم سے رشتہ (تعلق) توڑے، تم اس سے تعلق جوڑو۔

[مسند أحمد، حديث: ١٧٤٥٢]

اور ہم نے تم سے یہ بھی وعدہ لیا تھا کہ جتنے یتیم ہیں، ان سے ہمدردی کرو۔ کہتے ہیں: جس کا باپ نہ ہو اور نابالغ ہو وہ یتیم ہے۔ بالغ ہونے کے بعد آدمی یتیم نہیں رہتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آدمی مسکین، یتیم بچوں کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے اور یتیموں کی خبر گیری کرتا ہے اور ان کی امداد کرتا ہے، یتیموں کے ساتھ اولاد جیسا سلوک کرتا ہے، قیامت میں اس کا گھر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے قریب ہوگا۔

اس لئے اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یتیم بنایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد آپ کی ولادت سے پہلے ہی فوت ہوگئے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چھ سال تھی، والدہ فوت ہوگئیں۔ ﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝﴾ [الضحی: ٦، ٧] اللہ نے اپنے نبی کو یتیم بنایا، تاکہ یتیموں کے درد کا پتہ چل سکے۔ کیونکہ جس آدمی نے غریبی نہ

دیکھی ہو، خود شاہوں کے گھر میں آنکھ کھولی ہو، اسے ایک غریب کے دکھ درد کا کیا پتہ ہو سکتا ہے؟

(واقعہ) تاریخ کے اندر آتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنی بیگم کے ساتھ کسی علاقے میں چلا گیا۔ وہاں غریب لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ان لوگوں نے مظاہرہ کیا اور بڑی فریادیں کیں۔ بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا: یہ کیا کہتے ہیں؟ اس نے کہا: غریب ہیں، بھوکے ہیں، کھانے کو نہیں ملتا، روٹی مانگ رہے ہیں۔ ان کی بیگم نے فوری طور پر حکم جاری کیا: اگر ان کو روٹی نہیں ملتی تو ان کو کہیں کہ کیک کھائیں، پیسٹری کھائیں، بسکٹ کھائیں۔

تو ایسے لوگ اس طرح کے فیصلے کرتے ہیں۔ ان کو پتہ نہیں کہ جن کو سوکھی روٹی نہیں ملتی، وہ کیک کہاں سے کھائیں گے؟

ایک بادشاہ کا جنگلی جانوروں میں کمبل تقسیم کرنے کا واقعہ:

مظفر گڑھ میں سیت پور کے علاقے کی بات ہے۔ بادشاہ ایک دفعہ شکار کے لیے نکلے۔ رات کا وقت تھا، گیدڑ بڑی آوازیں نکال رہے تھے۔ بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا: یہ گیدڑ کیوں رو رہے ہیں؟ اس نے کہا: ان کو سردی لگتی ہے، کپڑے مانگ رہے ہیں۔ بادشاہ نے آرڈر جاری کر دیا کہ اتنے لاکھ کمبل ان میں تقسیم کیے جائیں۔ وہ لاکھوں کے کمبل وزیروں کے گھروں میں چلے گئے۔ اتفاق سے سال دو سال کے بعد بادشاہ سلامت کو پھر خیال آ گیا۔ رات کو پھر شکار کو نکلا، گیدڑ چیخ رہے تھے۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا: ہم نے آرڈر کیا تھا کہ ان کو کپڑے دے دو، یہ تو ابھی تک رو رہے ہیں۔ وزیر نے کہا: جناب! یہ تو خوشیاں منا رہے ہیں، آپ کا استقبال کر رہے ہیں، آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ بادشاہ نے کہا: ہماری طرف سے بھی ان کو ''تھینک یو'' کہہ دینا۔

اسی لئے اللہ اپنے نبیوں کو یتیم پیدا کرتا ہے، چالیس سال تک بکریاں چروا دیتا ہے، تاکہ ان کو تکلیفوں کا پتہ لگے کہ مزدور کیا ہوتا ہے؟ غریب کیا ہوتا ہے؟ اگر ایک بکری بھاگ جاتی ہے تو چرواہے کو کتنا خیال کرنا پڑتا ہے، اس لئے وہ سب کا خیال کرتا ہے۔ جو لوگ ان مراحل سے نہ گزرے ہوں، ان کو یہ باتیں سمجھانے سے نہیں سمجھائی جا سکتیں۔ جس آدمی نے غریبی ہی نہیں دیکھی، اس کو غریب کا کیا پتہ ہے؟ جس نے یتیمی ہی نہیں دیکھی، اس کو یتیم کا پتہ ہے؟ جس بے چارے نے تکلیف نہیں دیکھی، اس کو تکلیف کا کیا پتہ؟

(واقعہ) حضرت شاہ جی رحمہ اللہ ہمیشہ مسکراتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب میں ان لیڈروں کی باتیں سنتا ہوں اور

اسلام کے نعرے سنتا ہوں تو مجھے افسوس ہوتا ہے، میرا دل جاگ جاتا ہے۔ جو آدمی اپنے چھ فٹ کے بدن پر اسلام نافذ نہیں کر سکتا، وہ پورے ملک میں کہاں سے اسلام نافذ کر سکتا ہے؟ لیکن لوگ بے وقوف ہیں، ان کی باتیں مان لیتے ہیں۔

کفر کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اقسام:

لغت کے اعتبار سے کفر کا معنی چھپانا ہے اور اصطلاحِ شرع میں جامع تعریف یہ ہے کہ اللہ کے پاک پیغمبر جو اللہ کی طرف سے تشریف لائے ہیں، ان کی تصدیق نہ کرنا کفر ہے۔ جو ہمارے پاک نبی حکم لائے، بلکہ سب کا ماننا ایمان ہے۔ یہ نہیں کہ آدھا مانے اور آدھا نہ مانے۔ بلکہ سب پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان کی تصدیق نہ کرنے کا نام کفر ہے۔ کفر کی کئی قسمیں ہیں:

1 ...... کفر تکذیب: مثلاً اللہ کے نبی کو جھٹلا دیا کہ یہ نبی نہیں ہیں، یہ تو جادوگر ہے۔

2 ...... کفر استکبار: تکبر کرنا اور بات نہ ماننا، جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: ﴿أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝٣٤﴾ [البقرۃ: ۳۴] ابلیس لعین نے انکار بھی کیا تھا اور تکبر بھی کیا تھا۔ انکار کی وجہ تکبر تھا: ﴿قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۖ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ۝٧٦﴾ [ص: ۷۶] کہ میں آدم سے بہتر ہوں، آپ نے مجھے آگ سے بنایا ہے اور اس کو آپ نے مٹی سے بنایا ہے۔

3 ...... کفر اعراض: اللہ کے احکام سے روگردانی کرنا۔ اللہ کے نبی دعوت دے رہے ہوں اور یہ منہ پھیر کر چلا جائے۔ اس کو قرآن نے فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ۝١٢٤﴾ [طٰہٰ: ۱۲۴] جن لوگوں نے ہمارے قرآن اور آیات سے اعراض کیا۔

4 ...... کفر نفاق: ﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا﴾ [البقرۃ: ۷۶] کہ جب مسلمان ملے تو کہے ہم تو پکے مسلمان ہیں، ہم تو پکے مومن ہیں، روزہ رکھتے ہیں، تمہارے ساتھ مسجد میں آتے ہیں، حلال کھاتے ہیں، ہم تو پکے مومن ہیں اور جب اپنے شیطانوں، کافروں، سرداروں کے پاس جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ آج کل تم تو بڑی نمازیں پڑھ رہے ہو۔ کہتے ہیں: ہم تو ان کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ یہ کفر نفاق ہے کہ آدمی ظاہر میں کچھ کرتا ہے اور باطن میں کفر رکھتا ہے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں منافقوں کا حال تھا۔

5 ......کفرارتیاب: کہ اللہ کے احکام کے اندر شک ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قیامت آئے گی اور یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں، اللہ فرماتے ہیں کہ جنت اور جہنم ہوگی لیکن یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں، اللہ فرماتے ہیں: عذابِ قبر ہوگا، یہ کہتے ہیں کہ سمجھ نہیں آتا، کیسے ہوگا۔

یہ پانچ قسمیں نہ قرآن پاک میں ذکر کی گئی ہیں اور نہ کسی حدیث پاک میں حضور پاک ﷺ نے نمبر لگائے ہیں۔ علماء ومفسرین اور سلف صالحین نے جو یہ قسمیں لکھی ہیں، انہوں نے قرآن پاک سے استنباط کی ہیں اور انہوں نے کفر کی پانچ قسمیں بنا کر ہمارے لیے واضح کر دیا ہے۔

افضل عمل نماز وقتِ مقررہ پر ادا کرنا:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا کہ سب سے افضل ترین عمل کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی نماز وقت پر ادا کرنا۔ یہ نہیں کہ جب نیند کھلی تو نماز پڑھ لی یا جب موقع ملا تو نماز پڑھ لی، یا اپنے کام کاج سے فارغ ہو گئے تو چلو نماز پڑھ لو۔ بلکہ نماز کو اس کی شروط، حدود، ارکان اور اوقات کے اندر ادا کرنا سب سے افضل عمل ہے۔

[صحيح البخاري، حديث:٥٢٧، باب: فضل الصلاة لوقتها]

احادیث میں آتا ہے کہ نماز دین کا عمود ہے۔ جیسے عمارت عمود (ستون) پر کھڑی ہوتی ہے، اگر خدانخواستہ وہ عمود گر جائے تو عمارت بیٹھ جائے گی۔ اسی طرح جس نے نماز کا خیال نہیں کیا، گویا اس کا سارا دین تباہ ہو گیا۔

[شعب الإيمان، حديث:٢٥٥٠]

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: حضور! اس کے بعد دوسرا عمل بیان فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے والدین کی فرمانبرداری کرو۔ اس صحابی نے پوچھا: اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔ [صحیح البخاری، حدیث:٥٢٧، باب: فضل الصلاة لوقتها]

تعارض بین الاحادیث کے شبہ کا جواب:

بعض احادیث میں جہاد مقدم ہے اور کہیں والدین کی اطاعت کو مقدم ذکر کیا گیا ہے۔ حضور پاک ﷺ نے صلوٰۃ کو مقدم کر دیا۔ یہ احادیث میں تعارض نہیں ہے، بلکہ جیسے دنیا کا کوئی طبیب دوائی دیتا ہے اور ہفتے کے بعد جاتے ہیں تو دوائی میں کچھ ردّ و بدل کر دیتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام ہمارے روحانی معالج ہوتے ہیں، روحانی بیماریاں جو

اصل بیماریاں ہیں، ان کو ہٹانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ اس لئے حضور اکرم ﷺ کے سامنے جو مریض بھی حاضر ہوتا تھا، جس بات کا وہ سوال کرتا، حضور اکرم ﷺ اسی کا جواب دیتے تھے، تاکہ اس کا ساتھ ساتھ علاج بھی ہو جائے۔ یعنی ایک آدمی پکا نمازی ہے، لیکن جہاد میں کمزور ہے تو حضور اکرم ﷺ فرماتے کہ سب سے افضل عمل جہاد ہے، تاکہ اس کا جہاد کا جذبہ برقرار رہے۔ اور ایک آدمی آیا، وہ نمازی بھی ہے اور مجاہد بھی ہے، لیکن والدین کے معاملے میں کمزور ہے۔ اس نے جب آپ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے والدین کی اطاعت کرو۔ لہٰذا یہ احادیث میں تعارض نہیں ہوتا، بلکہ سائل کے حالات کے مطابق علاج ہوتا ہے۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور خلیفہ غلام محمد دین پوری رحمۃ اللہ علیہ:

ایک بہت بڑے، شیخ، عالم، مجاہد گزرے ہیں، حضرت غلام محمد دین پوری رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کا لقب تھا ''خلیفہ''۔ ان کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: میں تھانہ بھون جا رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: حضرت تھانوی کو میرا اسلام عرض کریں اور دو تین مسواک دیئے کہ یہ ہدیہ بھی حضرت کی خدمت میں دے دینا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو جب یہ ہدیہ ملا تو بہت خوش ہوئے۔ جتنے خلفاء اور شاگرد موجود تھے، ان سے فرمایا: حضرت خلیفہ صاحب نے مجھے یہ مسواک کا ہدیہ کیوں بھیجا ہے؟ انہوں نے کہا: ہدیہ ہے۔ فرمایا: میں کچھ دنوں سے مستحبات میں غفلت کر رہا تھا تو حضرت نے نصیحت کی ہے کہ خبردار! مستحبات کا خیال رکھو۔ اگر مستحب کو چھوڑ دو گے تو سنت چھوٹ جائے گی اور جب سنت چھوٹ جائے گی تو فرض چھوٹ جائے گا۔ کسی سنت کو چھوٹا خیال نہ کرو کہ مسواک کیا تو کیا، نہ کیا تو نہ کیا۔ کیا مسواک سنت مصطفیٰ ﷺ نہیں ہے؟

شریعت کے اندر مسواک کا اتنا حکم ہے کہ اگر مسواک نہ ہو تو آپ وضو کرتے ہوئے انگلی کو مسواک کے طور پر استعمال کریں، تاکہ مسواک کا ثواب حاصل ہو جائے۔ اس سے ثواب کے کئی درجے (ستر درجے) بڑھ جاتے ہیں۔

مسواک کے فائدے:

علماء نے احادیث کی روشنی میں مسواک کے ستر فوائد لکھے ہیں۔ سب سے چھوٹا فائدہ ہے کہ جو آدمی پابندی سے ہر نماز کے ساتھ مسواک کرے، اللہ اس کا خاتمہ ایمان پر فرما دیتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ سونے سے پہلے مسواک کرتے تھے اور اس کے اندر حکمتیں ہیں۔ چودہ سو سال کے بعد اب جدید تحقیقات یہاں تک آگئی ہیں کہ ڈاکٹر مجبور کرتے ہیں کہ سونے سے پہلے برش ضرور کریں اور اُٹھتے ہوئے سب سے پہلا کام یہی کریں کہ برش کریں۔ حالانکہ یہ باتیں تو حضور اکرم ﷺ نے ہمیں چودہ سو سال پہلے سکھا دیں اور جو حضور اکرم ﷺ نے مسواک بتایا ہے، وہ کسی تکلف کا محتاج بھی نہیں ہے۔

جدید ٹوتھ پیسٹ کی خرابیاں:

برش کے لیے تو ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ٹوتھ پیسٹ بھی رکھیں۔ اگر آدمی متقی ہے تو اس کو خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے اندر خنزیر کے اجزاء ملے ہوئے نہ ہوں۔ آج کل جتنے پیسٹ ملتے ہیں، سو میں سے ننانوے فیصد کے اندر سور کی چربی ہوتی ہے اور نوجوان جتنی کریمیں لگاتے ہیں، یہ سب سور کی چربی سے بنتی ہیں۔ اسی کی وجہ سے چکناہٹ زیادہ دیر تک باقی رہتی ہے اور جتنے خوبصورت صابن ہیں ان سب میں خنزیر کی چربی ہوتی ہے اور مسواک کے اندر کوئی چیز نہیں ملائی جا سکتی۔ جب خراب ہو گیا، اس کو کاٹ دیا تو وہ پھر تازہ ہو گیا۔ مسواک کو آپ مسوڑھوں پر دانتوں پر استعمال کر سکتے ہیں اور برش جو قیمتی ہوتا ہے وہ خنزیر کے بالوں کا ہوتا ہے۔ نہیں تو وہ ربز کا بنا ہوا ہوگا، اور ربز کے ریشے جو اندر بلائیں چھوڑتے ہیں، وہ بیماریاں زیادہ پیدا کرتے ہیں۔

تفسیر:

﴿وَالْمَسٰكِيْنِ﴾ اس کی تفصیلی بحث سورۃ النساء میں آئے گی۔ مسکین وہ لوگ ہیں جن کے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں کہ اپنی جان اور اپنے اہل پر خرچ کر سکیں۔

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ [البقرۃ: ۸۳] جب لوگوں سے بات کرو تو نرم رویہ اختیار کرو۔ یہ دعوت ہے۔ اور ایک ہے کہ کہیں برائی دیکھو تو وہاں طاقت استعمال کرو۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ اس سے مراد ہے کہ لوگوں کو بھلائی کا حکم کرو اور برائی سے روکو اور برداشت کرو۔ اگر لوگ گندی بات کریں تو اعراض کر کے گزر جاؤ، لڑائی جھگڑا نہ کرو۔ ہر وہ قول اور ہر وہ لفظ جس سے اللہ کی رضا حاصل ہو بہتر ہے اور جس سے اللہ کی ناراضگی حاصل ہو وہ بہتر نہیں ہوتی۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کوئی نیکی چھوٹی سمجھ کر چھوڑا نہ کرو (کہ پانی پلانا یہ تو معمولی نیکی ہے، بلکہ

اس کو کرو) اگر کچھ بھی نہ کرسکو تو کم از کم جب اپنے بھائی سے ملو تو خوش ہو کر ملو، (اس طرح نہ ملو کہ آدمی ڈرتا رہے)۔
[صحیح مسلم، حدیث: ۲۶۲۶، باب: اسْتِحْبَابِ طَلَاقَةِ الْوَجْهِ عِنْدَ اللِّقَاءِ]

اللہ تعالیٰ کا کروڑ کروڑ شکر ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی اُمت نے بہت ساری چیزوں پر عمل کر کے سنبھال لیا، یعنی جو پہلی اُمتوں نے نہیں کیا اور آپ ﷺ کی اُمت نے کرلیا۔ الحمدللہ!

کافر کو ابتداء بالسلام نہیں کرنی چاہیے:

بعض لوگوں نے عجیب اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ اسد بن وداعہ جب اپنے گھر سے نکلتے تھے تو جو آدمی بھی راستے میں ملتا تھا، چاہے یہودی ملتا یا نصرانی ملتا، اس کو بھی کہتے تھے: السلام علیکم۔ لوگوں نے کہا: یہ کیا کر رہے ہو؟ یہودیوں اور نصرانیوں کو بھی سلام کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: اللہ نے فرمایا ہے کہ لوگوں سے اچھی بات کرو۔ یہ لوگ ہی تو ہیں چاہے یہودی ہوں یا نصرانی ہوں۔

لیکن صحیحین کی حدیث مبارک ہے کہ کافر کو ابتداء میں سلام نہ کرو۔ اگر وہ تمہیں کچھ کہے تو تم کہو: وعلیک، یوں کہ پتہ نہیں اس نے کیا کہا ہے۔ اگر اس نے اچھی بات کہی ہے تو ہم نے بھی کہہ دیا کہ تم پر بھی ہو۔ اسی طرح اگر کسی کافر کو خط لکھنا پڑے تو اس کے اندر میرے آقا ﷺ کی سنت موجود ہے، آپ ﷺ لکھتے تھے: ﴿وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى﴾ [طٰہٰ: ۴۷] اللہ کی طرف سے سلامتی اس پر ہو، جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اس لیے صحیح قول یہ ہے کہ کافر پر تم ابتداء میں سلام نہ کرو اور نہ کافر کی تکریم کرو اور نہ کافر سے دل سے محبت کرو۔

یاد رکھیں! ایک ہے معاملات لین دین، تجارت، اُٹھنا، بیٹھنا، یہ کافروں کے ساتھ جائز ہے۔ مثلاً: آپ کسی کمپنی سے مال لیتے ہیں وہ کمپنی کافروں کی ہے یا آپ کسی کمپنی کو مال بیچتے ہیں وہ کافروں کی ہے، آپ کی کمپنی میں کافر ملازم کام کرتے ہیں، کوئی بات نہیں، لیکن دل میں کافر سے محبت کبھی مسلمان کو نہیں ہونی چاہیے۔ اسی طرح کافروں سے معاملات میں آدمی نظر رکھے کہ جتنی حدود ہیں، اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے، اس پر چلے اور جس سے روکا ہے، اس سے رک جائے۔

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٨٤﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٥﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٨٦﴾﴾ [البقرۃ: ۸۴تا۸۶]

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنے خون نہ بہاؤ اور اپنے ایک دوسرے کو اپنے وطن سے نہ نکالو۔ پھر تم نے اس کو قبول کیا اور تم (اپنے اوپر خود) گواہ تھے۔ پھر تم اے یہودیو! قتل کرتے ہو آپس میں اور نکالتے ہو اپنے سے ایک فریق کو ان کے وطن سے، تم ان کے خلاف گناہ اور ظلم کا تعاون کرتے ہو۔ اور اگر وہ تمہارے پاس کسی کے قیدی ہو کر آئیں تو تم ان کا فدیہ دے کر چھڑا دیتے ہو، حالانکہ تم پر ان کا نکال دینا حرام ہے۔ تو کیا تم بعض کتاب کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟ پس اس شخص کی جو تم میں سے یہ کام کرے کوئی سزا نہیں، مگر ذلت و رسوائی دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں گے، اور اللہ غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلہ میں خریدا، ان سے نہ تو عذاب کو ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔

آیات کا ربط:

اللہ پاک نے ان سے عہد لیا تھا کہ تم خونریزی نہیں کرو گے، کیونکہ جب آدمی اپنے کسی رشتہ دار یا برادری کے آدمی کو قتل کرے تو گویا اس نے اپنے آپ کو قتل کیا۔ دوسرا وعدہ یہ ہے کہ تم کسی پر ظلم کر کے ان کی دیوار، ان کی حویلیوں سے، ان کے وطن سے، ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے، اور تم اقرار بھی کرتے ہو کہ یہ وعدہ تھا، ہمارے آباؤ اجداد سے یہ عہد لیا گیا تھا اور تم گواہی بھی دیتے ہو، لیکن تم نے میرے عہد کو توڑ ڈالا ہے اور خونریزی کی اور ان

کو گھروں سے نکالا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو مشرکین کے دو بڑے قبیلے تھے اور یہودیوں کے بھی دو قبیلے تھے۔ مشرکین کے دو بڑے قبیلے ایک اوس اور دوسرا خزرج تھا اور یہودیوں کے بڑے قبائل ایک بنو قریظہ اور دوسرا بنونضیر تھا۔ اوس اور خزرج کے اندر بڑی خون ریز لڑائیاں ہوئی تھیں۔ بنو قریظہ، بنونضیر، بنو قینقاع، یہ یہود تھے۔ ان لوگوں نے آپس میں ایک معاہدہ کیا، بنو قینقاع اور بنونضیر، خزرج کے حلیف بن گئے اور بنو قریظہ اوس کے حلیف بن گئے۔ ''حلیف'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جو تمہارے دوست وہ ہمارے دوست اور جو تمہارے دشمن وہ ہمارے دشمن ہیں۔ جو تم سے لڑائی کرے گا ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ جب لڑائیاں ہوتیں تو صاف ظاہر ہے کہ یہودی بھی ایک دوسرے کے خلاف لڑتے تھے، جس سے اللہ نے روکا تھا کہ تم خون نہ بہاؤ اور ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔

اس ساری لڑائی کے بعد جس کا زور چلتا، ان کو اس علاقے سے اور اس قبیلہ سے نکال دیتا اور ان کا مال لوٹ لیتا اور گھر توڑ دیتا۔ اس سب کے باوجود یہودی ایک بات میں بڑے پکے تھے۔ یہود کا کوئی ایک آدمی قید ہو جاتا تو ان کے سارے قبیلے اکٹھے ہو جاتے کہ ہمارے اہل کتاب میں سے ایک آدمی قید ہو گیا ہے، لہٰذا پیسے اکٹھے کرو اور اس کا فدیہ ادا کرو اور اس کو چھڑوا لیتے۔ اگر لوگ ان کو کہتے کہ تمہارا تو جھگڑا تھا؟ تو کہتے: اللہ کا حکم ہے کہ اگر ہماری قوم کا کوئی قید ہو جائے تو اس کو ہم چھڑائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم عجیب لوگ ہو! تمہیں حکم دیا گیا تھا کہ قتل نہ کرو، قتل کرتے ہو۔ تمہیں حکم دیا گیا تھا کہ ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور تم نکال رہے ہو۔ لیکن فدیہ دینے کے لئے تیار ہو۔ حالانکہ ان کا نکالنا بھی تم پر حرام تھا تو ان کو نکالا کیوں تھا؟ قتل کیوں کیا تھا؟ اصل وجہ ہی تھی کہ ان کو اللہ کے حکم کی تعمیل نہیں کرنی تھی، بلکہ جو حکم ان کو آسان نظر آتا، اس پر عمل کر لیتے۔ یہ ان کے اپنے نفس کی خواہش تھی کہ جو مزاج کے مطابق لگتا اس کو لے لیتے اور جو حکم مزاج کے مطابق نہ لگتا اس کو چھوڑ دیتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اللہ کے بعض حکموں پر ایمان لاتے ہو اور بعض کو چھوڑ دیتے ہو۔

وجہ یہی ہے کہ جو اس کو پسند آیا وہ مان لیا اور جو دل کو گوارا نہ ہوا اس کو نہ مانا۔ مثال کے طور پر عمرہ بڑی عبادت ہے۔ ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ کے درمیان تک اللہ گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

عمرہ گناہوں کو اور فقر کو مٹا دیتا ہے۔ اب ایک آدمی اتنا خرچ کرتا ہے، عمرہ کرتا ہے، مشقتیں بھی برداشت کرتا ہے، اس کو اگر کہیں کہ داڑھی بھی رکھ لے تو کہے گا: دعا کریں۔ اس کا مطلب ہوا کہ عمرہ والا حکم پسند آگیا، جان ماردی، پچیس ہزار لگا دیے، داڑھی والا حکم پسند نہیں تو اس کو نہیں مانتے۔ حالانکہ دونوں حضور اکرم ﷺ کی سنتیں ہیں کہ ایک سنت سے محبت ہے اور دوسری سے کیوں دشمنی ہے؟ اس طرح یہودیوں میں اور ہمارے میں کیا فرق رہا؟ وہ بھی اسی طرح کرتے تھے کہ جو حکم ان کو پسند آیا اس کو مان لیا اور کر لیا اور جو حکم پسند نہ آیا اس کو نہ کیا۔

اسی طرح ایک آدمی زمیندار ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جائیداد میں بہن، بیٹی کو حصہ نہ دوں۔ اس کو سمجھایا جائے کہ قرآن میں ہے: ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ [النساء:۱۱] عورت کا بھی میراث میں حصہ ہے۔ تو وہ کہتا ہے: ٹھیک ہے، لیکن ہمارے ہاں رواج نہیں ہے۔ اس کو چونکہ نقصان ہے، اس لئے وہ اس حکم کو نہیں مانتا۔

اسی طرح ایک آدمی کی نوجوان بیٹی بیوہ ہو جائے تو وہ اس کی دوسری شادی نہیں کرے گا۔ کہے گا کہ ہمارے خاندان میں یہ بات عیب ہے۔ غریب تو نہیں ہیں، اللہ پاک نے سب کچھ دے رکھا ہے، کوئی بھوک ننگی تو نہیں ہے، ہم اس کو کھلا سکتے ہیں اور خاوند بھی اتنی جائیداد دے کر گیا ہے کہ گھر میں بیٹھ کر کھا سکتی ہے۔

تم کسی کی بیٹی کو چٹ لکھ کر بھیجو کہ میں تم سے خالص محبت کرتا ہوں، یہ تمہیں پسند ہے۔ اور اگر کوئی تمہاری بیٹی کو ایسا لکھے تو یہ پسند نہیں۔ اس لئے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [المائدة:۴۴] جو میرے اُتارے ہوئے قرآن کے قانون کو نہیں مانتا، وہ کافر ہے۔ کیا ہمارے سب کام قرآن کے مطابق ہیں؟

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مرد کے لئے اس کا کپڑا نصف پنڈلی تک ہو، یہ افضل ہے۔ ٹخنوں سے اوپر جائز ہے، نیچے ہو تو حرام ہے اور عورتوں کے لئے فرمایا: ان کا کپڑا پاؤں سے ایک بالشت یا دو بالشت نیچے ہو، تاکہ ان کا چلتے ہوئے پاؤں نظر نہ آئے۔

اب ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے کہ جن کی عورتیں یہاں منی اسکرٹ میں آگئیں اور مردوں کے دامن جوتے کے نیچے آتے ہیں۔ کہتے ہیں: فیشن ایسا ہے۔ اور کچھ لوگ ایسے بن گئے ہیں کہ انہوں نے کہا: پنڈلی پر چادر رکھ لو، مسواک جیب میں رکھ لو تو دنیا میں تمہارے جیسا حدیث پر عمل کرنے والا کوئی پیدا بھی نہیں ہوا۔

گھروں پر پردے لٹکے ہوئے ہوں تو اگر ان کو کہا جائے تو کہتے ہیں: ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ [الضحیٰ:۱۱]

تو یہ سنت کہاں گئی کہ حضور اکرم ﷺ کے گھر میں پردے نہیں تھے۔

حضور اکرم ﷺ نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تھا کہ کپڑا اس وقت تک نہ بدلا کرو، جب تک ٹاکیاں نہ لگالو۔ تو کوئی ہے جو اس سنت پر عمل کرتا ہو؟

حضور اکرم ﷺ کا سرہانہ چمڑے کا تھا اور اس کے اندر کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے۔ آج کسی کے گھر کے اندر اس سنت پر عمل ہو رہا ہے؟ حضور اکرم ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا گھر میں چکی پیس کر بچوں کو روٹی کھلاتی تھیں۔ آج کیا گھر کے اندر تمہاری کسی عورت نے بھی چکی پیسی ہے؟ یہ تو ممکن ہے کہ تم سے چکی پسواتی ہو، کیونکہ آج کل خاوند بڑے فرمانبردار ہیں اور اولاد نافرمان۔

کتاب اللہ پر عمل نہ کرنے والے کی سزا:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسے شخص کی سزا کیا ہے جو بعض کتاب پر عمل کرتا ہے اور بعض پر عمل نہیں کرتا۔ اس کی سزا یہ ہے کہ دنیا میں رُسوائی ہے اور آخرت میں سخت عذاب ہے۔ اب ضروری نہیں کہ وہ رُسوائی ہر فرد کو ملے۔ بنی اسرائیل پر ایسا وقت بھی آیا کہ چھ چھ لاکھ بنی اسرائیل ایک دن میں مرے، اور ستر ہزار آدمی ایک دن میں قتل ہوا، ستر ستر ہزار آدمی طاعون کی بیماری سے مرا۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝﴾ [البقرۃ: ۷۴] اگر کوئی یہ کہے کہ نہ ماننے والوں کو عذاب کیوں نہیں ہوتا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں غافل نہیں، میں اس کو جانتا ہوں۔ یہ اللہ کی مرضی ہے کہ اس کو کب پکڑے اور کب سزا دے اور کب سزا نہ دے۔ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اس کی مرضی ہے۔ بنی اسرائیل یہ ساری حرکتیں کہ کبھی حکم مان لیا اور کبھی حکم نہیں مانا اور کبھی حکم بدل دیا، اس لئے کرتے تھے کہ دنیا کی زندگانی لے لیں اور آخرت کو بیچ ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر انہوں نے دنیا کو چنا ہے تو ان کو عیش کرنے دو، جب آخرت آئے گی تو نہ ان سے عذاب کو کم کیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کرنے والا ہوگا کہ ان کو عذاب سے بچا سکے۔

عامی کے لیے تقلید اور مجتہد کے لیے اجتہاد لازم ہے:

علماء نے لکھا ہے کہ اگر عالم نے فقہی مسائل میں کسی امام کے قول کو لیا ہے تو اسی پر عمل کرتا رہے۔ اگر وہ عالم اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ افضل، اعلیٰ، اولیٰ کے فیصلے وہ خود سمجھتا ہے، ناسخ اور منسوخ کو سمجھ سکتا ہے تو اس کو کسی کی پابندی

لازم نہیں۔ اگر اتنا عالم نہیں تو کسی کی اتباع میں رہے۔ کیونکہ اگر اپنے آپ کو تقسیم کرے گا کہ کبھی اس پر عمل کر لیا اور کبھی اس پر عمل کر لیا تو آدمی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے۔

(حدیث) "مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَ تَرَاحُمِهِمْ وَ تَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَ الْحُمَّى "[1] (ایمان والوں کی مثال محبت میں، ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے میں اور ایک دوسرے پر رحم کھانے میں ایسے ہے جیسے کہ ایک نفس ہوں، ایک جان ہوں۔ ساری دنیا کے مسلمان آپس میں ایسے ہیں، ایک جسم ہے۔ اگر پاؤں میں کانٹا بھی لگ جائے تو سارے بدن کو تکلیف ہوتی ہے، سارا بدن رات کو جاگ رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ تکلیف تو صرف پاؤں کو ہوتی ہے۔ اسی طرح مومن بھی گویا یک جان ہیں، مشرق میں مسلمان کو تکلیف ہو تو مغرب میں رہنے والے مسلمان کو تڑپنا چاہیے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو سمجھو کہ ہمارے اندر ایمان کمزور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان مختلف مقامات پر رہنے والے علیحدہ علیحدہ مارے جا رہے ہیں، قتل ہو رہے ہیں، عزتیں لٹ رہی ہیں اور باقی مسلمان دل کرے تو دعا کر لی اور بہت زیادہ رحم آیا تو کہہ دیا کہ بہت افسوس ہے، مسلمانوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے، حالانکہ مسلمان کو ایک جسد کی طرح ہونا چاہیے تھا۔ اور جب ایسے ہو جائے گا تو دنیا کی کوئی طاقت ان کو تکلیف نہیں دے سکے گی۔

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا پادری کو کنیز فروخت کرنے کا واقعہ:

مفسر رحمہ اللہ نے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے جو اسباط نے حضرت سدی سے نقل کیا ہے۔ عبد خیر فرماتے ہیں کہ سلمان بن ربیعہ الباھلی کی قیادت میں ہم نے بلنجر کے علاقہ پر حملہ کیا۔ وہاں جا کر ہم نے محاصرہ کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں کو فتح دی۔ وہاں سے مال بھی حاصل ہوا اور لڑکیاں بھی قیدی بنیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی بڑھیا سات سو درہم میں خرید لی۔

اس کو وہ لے کر آئے تو ان کا ایک پادری تھا جس کا نام راس جالوت تھا، عبداللہ بن سلام اس کے پاس آئے اور کہا: میرے پاس ایک یہودی بڑھیا ہے، جسے میں بیچنا چاہتا ہوں، تم خریدو گے؟ اس نے کہا: ہاں! بالکل خریدوں گا۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا: میں نے اس کو سات سو درہم میں خریدا ہے۔ جالوت نے کہا: میں تمہیں چودہ

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۶۷۵۱]

سو درہم دیتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا: میں نے تو قسم کھائی ہے کہ اس کو چار ہزار درہم سے کم میں نہیں بیچوں گا۔ اگر لینا ہے تو چار ہزار درہم میں لے لو، ورنہ میں نہیں دیتا۔ اس نے کہا: چار ہزار درہم بہت زیادہ ہیں، البتہ میں دو ہزار درہم دینے کے لیے تیار ہوں۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا: تم یہودی ہو، تمہیں یہ کنیز جس قیمت پر بھی بیچوں گا، خریدنی ہوگی، ورنہ تم اپنے دین سے بھی کافر ہو جاؤ گے۔ اس نے کہا: وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: کان ادھر لاؤ، میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ اس نے کان قریب کیا تو حضرت عبداللہ بن سلام نے تورات کی وہ آیت پڑھی جس میں اللہ نے حکم دیا تھا کہ اگر کوئی یہودی یا یہودیہ قید ہو جائے تو ان کا چھڑانا تم لوگوں پر فرض ہے۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، میں چھڑاتا ہوں۔ چنانچہ وہ اندر گیا اور چار ہزار درہم لے آیا اور کہا: لے لو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم عبداللہ بن سلام ہو؟ آپ نے کہا: ہاں! میں عبداللہ بن سلام ہوں۔ اس نے کہا: ورنہ کسی کو تورات کا کیا پتہ کہ اس کے اندر کیا لکھا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا: میں چار ہزار نہیں لیتا، یہ دو ہزار تم واپس رکھ لو اور دو ہزار لے لیے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ دو ہزار پر پادری راضی تھا، چار ہزار تو گویا زبردستی لیا تھا۔ اس لئے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے یہ گوارا نہ کیا کہ مسلمان ایک بیع کرے جو زبردستی کسی سے وصول کی جائے۔

حضرت ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن سلام رأس الجالوت کے پاس کوفہ شہر سے گزرے۔ اور رأس الجالوت کی یہ عادت تھی کہ جو یہودی لڑکیاں عرب مسلمانوں کے پاس قید ہوتیں اور ان کے ساتھ مسلمان مجاہد مل چکے ہوتے تو وہ ان کا فدیہ نہیں دیتا تھا کہ یہ تو اب اس قابل نہیں رہی کہ ہمارے خاندان میں واپس آئے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی مسلمان کا حمل ٹھہرے اور یہ بچہ ہمارے ہاں پیدا ہو۔ پھر تو مسلمانوں کا ایک آدمی ہمارے ہاں پیدا ہو گیا۔ اس لیے وہ ان کو نہیں چھڑواتا تھا۔ لیکن جو لڑکیاں مسلمانوں کی قیدی بن جاتیں، لیکن ابھی تقسیم نہ ہوئی ہوتیں اور نہ کسی مجاہد کو ملی ہوتی تھیں، ان کا فدیہ دے کر چھڑا لیتا تھا۔

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جب اس پر گزرے تو اس کو کہا: تم تو اپنے مذہب پر عمل نہیں کر رہے۔ اس نے کہا: وہ کیسے؟ فرمایا: تمہیں تو تورات کے اندر یہ حکم ہے کہ ہر قیدی کو چھڑاؤ، چاہے مرد ہو یا عورت ہو۔ وہاں یہ نہیں لکھا کہ جو مسلمان کے گھر میں ہو اس کو نہ چھڑاؤ اور باقیوں کو چھڑاؤ۔ تم تو اپنے دین سے بھی انحراف کر رہے ہو۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، ہم سب کو چھڑاتے ہیں۔

اس لیے اللہ پاک نے یہود کی مذمت کی کہ جو اُن سے اللہ نے وعدے لئے، انہوں نے ان سب کو بدل ڈالا اور

اپنی منشاء پر چلتے رہے۔[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۲۱،البقرۃ:الآیۃ:۸۵]

تورات میں حضور انور ﷺ کی صفات:

اُمت مسلمہ کے نزدیک یہ قاعدہ ہے کہ نہ تو ہم نے ان کی کسی امانت و دیانت پر اعتبار کرنا ہے اور نہ ہم نے کسی یہودی کی روایت کا اعتبار کرنا ہے۔ اس لئے کتب اسرائیلیہ کی جتنی روایات ہیں، ان کے بارے میں اہلسنت والجماعت سلفا خلفا کا متفق علیہ فیصلہ ہے کہ اگر وہ روایت کتاب اللہ یا سنت رسول ﷺ کے مطابق ہے تو لیں گے اور اگر مخالف ہے تو اس کو رڈ کر دیں گے۔ اور اگر نہ موافق ہے اور نہ مخالف ہے تو "لَا نُصَدِّقُ وَ لَا نُكَذِّبُ" ہم نہ کہیں گے کہ یہ سچی ہے اور نہ کہیں گے کہ جھوٹی ہے، کیونکہ ان لوگوں کا تو یہ عالم ہے کہ انہوں نے اللہ کی تورات کو بدل ڈالا۔ انہوں نے تورات میں ہمارے حضور اکرم ﷺ کی صفات کو بدل ڈالا، حالانکہ حضور اکرم ﷺ کی صفات لکھی ہوئی تھیں کہ آپ مکہ میں پیدا ہوں گے، مکہ میں نبوت کا دعویٰ کریں گے، مکہ میں آپ پر وحی اُترے گی، مدینہ منورہ آپ ہجرت کریں گے، آپ ﷺ نہ بہت زیادہ لمبے ہوں گے اور آپ ﷺ کا قد مبارک چھوٹا ہوگا، بلکہ اعتدال پر ہوگا۔ اور یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ آپ ﷺ کے دو کندھوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوگا اور آپ ﷺ کی پشت پر مہر نبوت کی علامت ہوگی اور آپ ﷺ ہدیہ قبول فرمائیں گے، لیکن صدقہ اور خیرات قبول نہیں فرمائیں گے، یعنی خود استعمال نہیں کریں گے۔ اور یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ حضور اکرم ﷺ جب چلیں گے تو ایسے معلوم ہوگا جیسے اوپر سے نیچے اُتر رہے ہیں اور آپ ﷺ بڑے حلم اور بردباری کے ساتھ چلیں گے۔ حضور پاک ﷺ قمیص نہیں پہنیں گے، حضور پاک ﷺ کبھی کبھی دو چادریں مبارک بھی استعمال فرمائیں گے۔ حضور پاک ﷺ ٹوپی مبارک کے اوپر پگڑی مبارک باندھیں گے۔

یہ تمام عادات وصفات یہودیوں نے اپنی کتابوں سے مٹا ڈالیں، تاکہ لوگ ہماری کتاب پڑھ کر حضور اکرم ﷺ پر ایمان نہ لائیں۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کا قصہ بیان فرمایا، تاکہ سمجھ لیں کہ ان کا اصل دین کیا ہے۔ اللہ نے فرمایا: ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں بھی رُسوائی ہے اور آخرت کے اندر اللہ تعالیٰ ان کو سخت عذاب دیں گے، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے احکام کی مخالفت کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دی کہ دنیا میں مزے کرو، آخرت کس نے دیکھی ہے؟ فرمایا: ان لوگوں کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جب ہم ان کو

قیامت کے دن جہنم میں ڈالیں گے تو ان کو یہ ہوگا کہ ایک دن کی چھٹی مل جائے، عذاب میں خفت آ جائے۔ ایسا بالکل نہیں ہوگا اور نہ قیامت میں ان کا کوئی مددگار ہوگا جو ان کی مدد کر کے ان کو جہنم سے چھڑا لے۔

یہی بات ذہن میں رکھ لیں! اصل جزا، سزا کا مقام آخرت ہے، دنیا نہیں ہے۔ دنیا مسافر خانہ ہے، اصل فیصلے، اصل کامیابیاں، اصل جزا، اصل سزا، جنت، جہنم۔ یہ سب عالم آخرت میں ہوں گے۔ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء ہے، یہاں اللہ پاک سزا یا انعام کا بھی تھوڑا سا نمونہ دکھا دیتے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ [البقرۃ:۸۷]

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور ان کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو صریح معجزات دیئے اور ہم نے ان کو روح القدس (جبرئیل) کے ساتھ قوت دی۔ کیا جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول آیا ایسے احکام کے ساتھ جن کو تمہارے نفس پسند نہ کرتے تھے، تم نے تکبر کیا، پھر ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم نے قتل کر دیا۔

ایمان کی اہمیت:

اللہ پاک نے ایک قاعدہ وضابطہ بیان فرمایا کہ جو آدمی ایمان لایا اور اچھے عمل کیے اور ایمان پر مر گیا تو اس کے لئے دائمی جنت ہے اور جس نے کفر کیا اور کفر پر ہی مر گیا تو اس کے لئے ہمیشہ کے لئے جہنم ہے۔ نہ اس میں بنی اسرائیل کے لئے کوئی خصوصی رعایت ہے اور نہ دوسری اقوام کے لئے۔ اور نہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی نسب فائدہ پہنچائے گا اور قرابت، رشتہ داری فائدہ پہنچائے گی، جب تک ایمان نہ ہو۔

تمام دنیا کی تاریخ پر نظر دوڑا کر دیکھ لیں کہ حضرت آدم علیہ السلام پہلے خلیفۃ اللہ فی الارض ہیں۔ ان کے دو صلبی بیٹے ہیں: ایک قاتل ہے اور ایک فرمانبردار ہے۔ قاتل جہنم میں گیا اور فرمانبردار جنت میں گیا۔ تو اس کو آدم علیہ السلام کی وجہ سے رعایت نہیں ملے گی، اللہ کے قانون میں ایسی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سب سے پہلے رسول نبی ہیں،

ان کا بیٹا کافر تھا، اس کو حضرت نوح علیہ السلام کی وجہ سے رعایت مل جائے کہ نبی کا بیٹا ہے، ایسا نہیں ہوگا۔ لوط علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، ان کی بیوی کافرہ ہے، اس کو پیغمبر کی وجہ سے رعایت مل جائے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ کا ایک نظام ہے، وہ مالک الملک ہے، وہ خالق کائنات ہے، وہ غنی ہے، ساری دنیا اس کی محتاج ہے۔ انہوں نے ایک قانون بنا دیا ہے کہ ایمان پر مرو گے تو جنت ہے، کفر پر مرو گے تو جہنم ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ دولتِ ایمان بھی نصیب فرما دے اور اللہ کے نبی کے ساتھ بھی تعلق ہو تو شان زیادہ ہے۔ جیسے دنیا کی ایک عام عورت ہے اور ایک نبی کی بیوی ہے۔ تو جو نبی کی بیوی کا مرتبہ ہے یا نبی کی بیٹی کا مرتبہ ہے، وہ اُمت کی عام عورتوں کا مرتبہ نہیں ہوسکتا۔ اگر ایک آدمی سید ہے، اس کا سلسلۂ نسب حضور اکرم ﷺ سے ملتا ہے، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے یا سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے یا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اور اس کے بعد وہ ایمان والا بھی ہے اور اعمالِ صالحہ بھی کرتا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ ہم سے افضل ہے، کیونکہ اس کو رشتہ داری کی وجہ سے بھی شرف مل رہا ہے جو کسی غیر رشتہ دار کو نہیں ملتا۔ لیکن اگر پہلی شرط اور پہلی کڑی ہی ٹوٹ جائے تو زنجیر جڑ نہیں سکتی۔ پہلی کڑی ایمان ہے، اگر وہ حلقہ، وہ کڑی ہی ایمان والی ٹوٹ گئی تو پھر نبی کے ساتھ کیا رشتہ؟

مقامِ بدر میں جب حضور اکرم ﷺ نے پوچھا تھا: یہ سردار ہیں، مکہ کے سردار ہیں، قید ہو گئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ ہم ان کو قتل کر دیں یا ان کو قید میں ڈال دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں یا بغیر فدیہ کے چھوڑ دیں؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میری رائے تو یہ ہے کہ تلوار سے ان کی گردن اُڑا دیں۔ جب انہوں نے آپ کا کلمہ نہیں پڑھا اور آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لے آئے تو رشتہ داری کس بات کی ہے؟ آپ مجھے حکم دیں، میں اپنے رشتہ داروں کی گردن اُڑاتا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیں، وہ اپنے رشتہ داروں کی گردن اُڑائیں۔ جن جن کے رشتہ دار ہیں، وہ تلوار لے کر ان کی گردن اُڑا دیں۔

[صحیح مسلم: ۱۷۶۳، بابُ: الإمْدادِ بِالْمَلَائِكَةِ فِي غَزْوَةِ بَدْرٍ وَإِبَاحَةِ الْغَنَائِمِ]

یہی رشتہ داری والا دھوکا یہودیوں کو لگا ہوا تھا اور آج ہمارے جاہلوں کو لگا ہوا ہے اور علماء سوء مبتدعین جو بدعت کے امام ہیں، وہ بھی ان کو اس اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ ہمارا کاروبار چلتا رہے۔ اور ذہنوں کے اندر یہ بات بٹھائی ہوئی ہے کہ یہ سادات ہیں، حضور اکرم ﷺ کے خاندان سے ہیں، عمل اچھے ہوں یا نہ ہوں، کیا فرق پڑتا ہے؟ یہی نظریہ ہمارے لوگوں نے دماغ میں ڈال دیا کہ مرشد ہے، اس کا باپ بڑا ولی تھا، حضرت خواجہ معین

الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہے، حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہے، یہ حضرت جیلانی محبوب سبحانی کی اولاد میں سے ہے، یہ حضرت بہاء الحق ملتانی کی اولاد میں سے ہے، یہ حضرت گنج شکر کی اولاد میں سے ہے، ان کے بڑوں کا بڑا مقام تھا۔ ان کو بھی خالی نہ سمجھو، ان کی وجہ سے ہم چھوٹ جائیں گے۔ وہی یہودیوں والا ذہن ہے۔ وہ بھی کہتے تھے: ﴿نَحْنُ أَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَأَحِبّٰٓؤُهُ﴾ [المائدۃ:۱۸] حالانکہ مسئلہ واضح ہے کہ ابولہب، ابوطالب حضور اکرم ﷺ کے چچا ہیں، ابوجہل حضور اکرم ﷺ کے ساتھ رشتہ داری رکھتا ہے، یہ بھی جہنم میں چلے گئے۔

تو جن کا ڈائریکٹ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تعلق تھا وہ تو جہنم میں چلے جائیں اور ہم مرشد در مرشد کے دامن کو پکڑ کر جنت میں چلے جائیں گے۔

آپ ایک مسجد بنائیں، سونے چاندی کی اینٹیں لگا دیں، کروڑوں روپے لگا دیں۔ اگر اس مسجد کا رخ قبلہ کی بجائے دوسری طرف کر دیں تو نماز نہیں ہوتی۔ حالانکہ مسجد بڑی خوبصورت اور شاندار ہے۔ چونکہ اس کا رخ قبلہ کی طرف نہیں، اس لئے وہ مسجد نہیں کہلا سکتی۔ اور اگر کسی کا رخ توحید و رسالت کی طرف نہیں آتا تو بھی مسلمان نہیں کہلا سکتا۔

حضور اکرم ﷺ نے قربانی کے وقت جو آیات پڑھی تھیں، یہ تھیں: ﴿إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [الانعام:۷۹] ﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ [الانعام:۱۶۳] میرے اللہ! میں اپنا رخ تیری طرف کر رہا ہوں، تُو ہی آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ میرا اللہ! میں تمام کو چھوڑ کر خالص تیرے دامن کو پکڑنے والا ہوں اور مجھے مشرکین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے اللہ! میں اقرار کرتا ہوں کہ میری عبادت بدنی، میری عبادت مالی، میری نمازیں، میری زندگی، میری موت سب تیرے لئے ہے اور تُو ہی رب العالمین ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں ہے اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ الحمد للہ! ہم جس طرح محمد مدنی ﷺ کے اُمتی ہیں، اسی طرح صحابہ و اہل بیت، اولیاء اللہ کے بھی پیروکار ہیں، لیکن ان کی پیروی کتاب و سنت کے حکم کے مطابق ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے ایک قاعدہ ضابطہ بتا دیا ہے کہ اگر کسی پیغمبر کا بیٹا اپنے کفر کی وجہ سے جہنم سے نہیں بچ سکتا اور تم بے وقوف ہو کہ ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی تم کہتے ہو کہ ہم حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، اس لئے جنت میں چلے جائیں گے۔ تمہارے یہ دعوے جھوٹے ہیں کہ اللہ نے ہم سے عہد کیا ہے۔ بلکہ اللہ نے جو تم سے وعدے لئے تھے، تم نے وہ بھی توڑ ڈالے ہیں۔

تحقیق ہم نے دی موسیٰ کو کتاب تورات.........اور پھر بنی اسرائیل میں تقریباً چار ہزار نبی آئے، ان سب کو کوئی نئی کتاب نہیں دی گئی، وہی کتاب تورات کا حکم کرتے تھے اور اسی پر وہ چلتے تھے۔ پھر تورات کے بعض احکام منسوخ ہوئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل ہوئی۔ وہ بھی جامع کتاب تھی۔ قرآن مقدس میں انجیل کا ذکر متعدد مقام پر آیا ہے، کسی مقام پر زبور کا ذکر آیا ہے، لیکن زیادہ تورات کا ذکر آیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ نخلہ پر صبح کی نماز پڑھا رہے تھے، جن وہاں سے گزرے اور انہوں نے قرآن سنا تو کہا: ﴿يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى﴾ [الاحقاف:۳۰] حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی گزر چکے تھے، لیکن جنات نے موسیٰ علیہ السلام کا نام لیا۔ کیونکہ یہ جامع شریعت تھی، اس لئے انہوں نے اس کا ذکر کر دیا کہ تورات میں ہمیں ایسے الفاظ سنائی دیئے تھے یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سنائی دیئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا کلام پڑھ رہے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ﴾ جہاں اس طرح کا جملہ ہو کہ واؤ، لام، قد، ہو اور اتیان کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو معنی ہوتا ہے: ''پکی بات ہے'' ہم نے موسیٰ کو کتاب دی ہے۔

﴿وَقَفَّيْنَا﴾ کا معنی ہے: کسی کے نقش قدم پر چلنا۔ جیسے ہم نے ان کے پیچھے متواتر اپنے رسول بھیجے، یعنی ہمارا کتنا بڑا احسان ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام جیسا رسول بھیجا، جن کو ہم نے کلام کا شرف بخشا تھا کہ بغیر کسی واسطے کے ہم نے موسیٰ سے کلام کیا تھا اور اس کے بعد ہم نے تمہاری بہتری کے لئے پے در پے متواتر رسول بھیجے۔

﴿وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ماں کی طرف کی جاتی ہے، ورنہ دنیا میں ہر اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ قیامت میں ماں کی طرف نسبت جائے گی۔ یہ غلط بات ہے، یہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے: ﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [الاحزاب:۵] کہ جب کسی کو بلاؤ تو اس کے باپ کی طرف نسبت کر کے بلاؤ۔ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ماں کی طرف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بغیر باپ کے پیدا کیا تھا۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۲۲، البقرۃ:الآیۃ:۸۷]

حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید:

﴿الْبَيِّنٰتِ﴾ کا معنی ہے: واضح کھلی ہوئی دلیل۔ ﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ پھر ہم نے عیسیٰ کی حفاظت کی

جبرائیل کے ساتھ، جن کا لقب ''روح القدس'' ہے۔ اور جبرائیل علیہ السلام کا لقب روح، رسول کریم، روح الامین بھی آیا ہے۔ اللہ نے فرمایا: ہم نے عیسیٰ کی مدد روح القدس کے ساتھ کی، کیونکہ تم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو مارنے کی بجائے ان کو قتل کے درپے ہو گئے تھے تو ہم نے جبرائیل کو بھیجا، جو ہر وقت ان کے ساتھ رہے اور ان کی حفاظت کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے سے آسمانوں پر اُٹھائے جانے تک حضرت جبرائیل علیہ السلام کا پہرہ ساتھ ہوتا تھا، ورنہ تم تو ہر جگہ ان کو قتل کرنے پر تیار تھے۔

﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ [البقرۃ:۸۷]
تمہارے پاس جب بھی کوئی رسول آیا، جب بھی میرا پیغمبر آیا اور ایسا حکم لایا جو تمہارے نفسوں کی خواہش کے مطابق نہیں، تمہیں پسند نہیں تو تم نے تکبر کر لیا اور اکڑ گئے کہ ہم نہیں مانتے اور تم نے ان رسولوں کی ایک جماعت کو جھٹلایا کہ تم جھوٹے ہو، ہم تمہاری نبوت کو نہیں مانتے اور رسولوں کی ایک جماعت کو قتل کرتے ہو۔

﴿كَذَّبْتُمْ﴾ ماضی کا صیغہ ہے اور ﴿تَقْتُلُوْنَ﴾ مضارع کا صیغہ ہے۔ ماضی کا صیغہ اس لئے آیا کہ جن کو تم جھٹلا چکے ہو، وہ بات ختم ہوگئی، وہ گزر گئے، اور مضارع کا صیغہ آگے آیا کہ اب بھی تو تم نبی کو قتل کرنا چاہتے ہو۔ جیسے قرآن نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ [البقرۃ:۶۱]

اور ایک روایت میں ہے کہ ایک ایک دن میں ستر انبیاء علیہم السلام کو قتل کر ڈالا، کیونکہ ایک ایک قوم اور ایک ایک قبیلہ کے لئے نبی آتے تھے، ایک ایک بستی کے لئے نبی آتے تھے۔ یہ بدبخت ایسے تھے کہ ان کو قتل کر دیتے تھے۔ اور اللہ پاک نے مضارع کے صیغہ سے اشارہ کر دیا کہ تمہارے باپ دادا کے قتل کرنے والی عادت ابھی تمہارے اندر موجود ہے، جیسا کہ حدیث میں موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہود کے علاقے میں تشریف لے گئے تو انہوں نے اوپر سے پتھر پھینک کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش کی۔ تو کیا انبیاء کو جھٹلا کر اور ان کو قتل کرنے کے بعد اب بھی تم یہ اُمید کرتے ہو کہ تم چند دن جہنم میں رہو گے اور پھر نکل جاؤ گے؟ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲۲، البقرۃ: الآیۃ: ۸۷]

نبی اور رسول کی تعریف:

﴿وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ﴾ رسول کی مشہور تعریف یہ ہے جو صاحب کتاب اور صاحب شریعت ہو۔ اور نبی وہ ہوتا ہے جس کے لئے علیحدہ کتاب یا شریعت نہیں ہوتی، بلکہ وہ کسی شریعت اور کتاب کے تابع ہوتا ہے۔ یہاں اللہ

تعالیٰ نے فرمایا: اس کے بعد ہم نے رسول بھیجے، حالانکہ تورات کے بعد کوئی ایسی کتاب نازل نہیں ہوئی، اور جب کتاب نازل ہوئی تو رسول بھی صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے۔

بعض علماء نے فرمایا: کبھی اس لفظ سے مقصود پیغام دینے والے، رسالت کا حق ادا کرنے والے ہوتے ہیں، اصطلاحی معنی مراد نہیں ہوتا کہ نئی شریعت لے کر آئے، جیسے قرآن میں آتا ہے: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝﴾ [بنی اسرائیل: ۱۵] ہم کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتے، جب تک ہم اپنا رسول ان کے پاس نہیں بھیج دیتے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں چار ہزار نبی گزرے ہیں۔ جیسے کبھی لفظ ''اسلام'' آجاتا ہے اور کبھی لفظ ''ایمان'' آجاتا ہے، اسی طرح کہیں ''رسول'' کا لفظ ہے اور کہیں ''نبی'' کا لفظ ہے، کیونکہ یہ ایک دوسرے کے معنی کے اندر استعمال ہوتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام واضح اور کھلی نشانیاں لائے، اگر عام آدمی بھی غور کرے تو عقیدۂ توحید سمجھ لے۔

تائید بروح القدس کا معنی:

﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ تائید کا معنی یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت مریم علیہا السلام کے پاس جبرائیل علیہ السلام تشریف لے کر آئے اور انہوں نے پھونک ماری۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ بی بی مریم علیہا السلام اللہ تعالیٰ کی قدرت سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ حاملہ ہوگئیں۔

اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ تخلیق ایک چیز سے نہیں بنایا۔ آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا، کیونکہ مٹی تو پیدا کرتی ہے اور آگ تو جلاتی ہے۔ ہم نے آگ سے بھی ایک مخلوق پیدا کر دی اور ہم نے پانی سے بھی مخلوق پیدا کر دی۔ اور اگر پھر اسی مادے کو ہمیشہ کے لئے پیدا کرنے کا ذریعہ بنا لیا جاتا تو قوم اسی میں اُلجھ جاتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اس مادے کے بغیر بھی پیدا کر دیا۔ آج دنیا علوم کی ترقی کے عروج پر پہنچی ہوئی ہے، اس کے باوجود ڈاکٹر اس کے محتاج ہیں کہ مرد اور عورت کے مادہ منویہ کو لے کر ملائیں گے اور جوڑے بنیں گے، پھر جا کر بچہ پیدا ہوگا اور یہاں جوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بی بی مریم علیہا السلام (جنس) انسان سے تعلق رکھتی ہیں اور ملائکہ جنس نور سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی جنس بھی آپس میں نہیں ملتی۔ بی بی مریم علیہا السلام ماں باپ سے پیدا ہوئیں اور جبرائیل علیہ السلام امر ''کُن'' سے پیدا ہوئے۔

اللہ کی شان دیکھیں! جو پھونک حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ماری تھی، کسی بندے کو بھیج دیتے یا کسی عبد صالح کو بھیج دیتے کہ تم جا کر پھونک مار دو، لیکن اس طرح دشمن بی بی مریم علیہا السلام کے کردار پر حملہ کرتے۔ چنانچہ اللہ نے پھونک مارنے کے لئے اس ذات کو بھیجا جو گناہوں سے پاک ہے۔ کوئی وہم، شک اور ذہن کے اندر گندا خیال لا ہی نہیں سکتا۔ اس لئے جب حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور بی بی مریم علیہا السلام نے ان کو دیکھا تو چیخ پڑیں۔ آج کی عورت تو نہیں تھیں۔

آج کی عورت تو بڑی معزز اور مکرم شمار ہوتی ہے جو سوشل، غیر مردوں سے ہاتھ ملاتی ہو، غیر مردوں کے ساتھ فلور پر ڈانس کر سکتی ہو، ہوٹلوں میں پھرتی ہو، لیکن اسلام کی نظر میں ایسی عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں، اسلام کے اندر عورت کا ایک مقام ہے۔ وہ ماں، بیٹی، بہن، بیوی ہوتی ہے، اس کے علاوہ اسلام میں پانچواں رشتہ ہی نہیں ہے اور اسی کے اندر اس کا مقام ہے، اللہ نے اس کو عظمت دی، نبیوں کی ماں بنایا، اسے تسکین و موّدت و رحمت کا ذریعہ بنایا۔ اللہ نے اس کو اتنی شان دی ہے کہ اللہ نے پورے قرآن کی ایک سورت کا نام اس "عورت" کے نام پر رکھا ہے۔

اسلام عورت کی عظمت کو گھٹاتا نہیں، لیکن اس کی حدود ہیں۔ جب حدود سے کوئی تجاوز کرے تو وہ خود اپنے آپ کو گڑھے میں ڈالتا ہے۔ اسلام کی حدود کے اندر رہیں تو عظمت ہے۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا پر نظر ڈالیں، اور وہ عورتیں جو عظیم محدث، مفسر گزری ہیں، اللہ کی اولیاء بی بی رابعہ بصریہ گزری ہیں، اس طرح بی بی مریم علیہا السلام گزری ہیں، امراۃ عمران گزری ہیں، بی بی آسیہ گزری ہیں۔ ان کی عظمتوں کا یہ عالم ہے کہ ابھی حضور اکرم ﷺ دنیا میں ہیں اور خوش خبری دی جاتی ہے کہ ہم آپ کی بی بی آسیہ، بی بی مریم سے شادی کریں گے۔

بی بی مریم علیہا السلام کی جب حضرت جبرائیل علیہ السلام پر نظر پڑی تو بول پڑیں: ﴿إِنِّيٓ أَعُوذُ بِٱلرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا﴾ [مریم:۱۸] خبردار! غیر مرد ہو، میرے قریب نہ آؤ اور میں اپنے اللہ کے نام رحمٰن سے پناہ مانگتی ہوں، تم اگر اس رحمٰن کو ماننے والے ہو تو تم بھی رحم کرو۔ کنواری، باعزت لڑکی کے قریب نہ آؤ۔

آج کی تہذیب کے تقاضے آپ جانتے ہیں، ہم مولوی لوگ ہیں، پرانے لوگ ہیں، آپ تو وی۔ سی۔ آر۔ پر بیٹھنے والی قوم ہیں، ہماری جدید نسل ایٹمی اور جدید ترقیاتی نسل ہے۔ میں نے ایک میگزین میں عورت کے بارے میں پڑھا۔ اس نے لکھا کہ میری لڑکی کی عمر آٹھ سال ہے، میرے ذہن میں آیا کہ بیٹھ کر اس سے جنسی موضوع پر بات کروں اور اس کو سمجھاؤں کہ جنس کیا ہوتی ہے۔ جب میں نے اس سے اس موضوع پر بات کی تو وہ مجھ سے زیادہ

اس میں سمجھدار نکلی۔

جدید دور کے لوگ ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جہنم میں جائیں یا کہاں جائیں۔ آج ہم سب جہنم کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ اللہ نے نکال لیا تو ٹھیک، ورنہ بچنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ خشکی و بری، ہواؤں اور فضاؤں میں فساد پھیل چکا ہے۔ عقیدے بھی برباد ہیں، عمل بھی برباد ہیں، افکار بھی برباد ہیں۔ نام کا اسلام رہ گیا ہے، تاکہ ہم اسلام کو بدنام کر سکیں۔ اللہ قادر ہیں، اس سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اس غارِ ہلاکت سے نکال دے۔ قوم یونس جب اللہ کے دروازے پر گئی تو اللہ کو رحم آ گیا، آیا ہوا عذاب ٹل گیا۔ اللہ ہم سب سے بھی عذاب کو ٹال دیں اور ہم کو بچا لیں۔ وہ قادر ہیں، ورنہ ہم اپنی طرف سے اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ فصل پک چکی ہے اور کٹنے کا وقت آ چکا ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ جس طرح ہم اجتماعی طور پر گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں، اسی طرح اجتماعی طور پر اللہ کے آگے توبہ کر کے اس کے دروازے پر گر جائیں، اپنی ناکامیوں پر غور کریں اور فردِ جرم بنا کر ایک ایک پر ندامت کا احساس دلائیں اور اللہ کے آگے گر جائیں۔ وہ رحیم و کریم ہیں، اسلام کی اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو نکال لیں گے اور کنارے پر لگا دیں گے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ان سے کہا: ﴿إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا﴾ [مریم:١٩] میں تو تیرے رب کا قاصد ہوں، مجھ سے ڈرنے کی کیا بات ہے؟ میں فرشتہ ہوں اور دور کھڑے ہو کر پھونک ماردی اور عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

﴿وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ﴾ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو شیطان مس کرتا ہے، یعنی ہاتھ لگاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مس شیطان سے محفوظ رکھا۔ اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ''روح'' اس لئے کہا گیا ہے کہ جیسے روح سے بندہ زندہ ہوتا ہے، اسی طرح اللہ کے قرآن سے مردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/ ١٢٣]

فرشتوں اور نبیوں میں سب سے آخر میں موت کس کو آئے گی؟

اللہ کی شان دیکھئے! جب ساری دنیا ختم ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ جبرائیل علیہ السلام سے پوچھیں گے: اب کون بچ گیا؟ وہ کہیں گے: اللہ میاں! ہم چار ہی بچے ہیں اور کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: آج تم ان تینوں کی روح قبض کرو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ جبرائیل علیہ السلام سے پوچھیں گے تو عرض کریں گے: اب تو میں تیرا ایک بندہ باقی ہوں۔

اللہ فرمائیں گے: تم بھی مر جاؤ۔ تو فرشتوں میں آخری موت حضرت جبرائیل علیہ السلام کو آئے گی۔ اور مشہور روایات میں یوں ہے کہ سب سے آخر میں حضرت ملک الموت کو ہی موت آئے گی۔ (انور)

اور نبیوں میں آخری موت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آئے گی، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں میں ابھی زندہ موجود ہیں، انہوں نے زمین پر اُترنا ہے، وہ چالیس سال تک یہاں رہیں گے، ان کی شادی ہوگی، دنیا میں امن قائم فرمائیں گے، اسلام کا بول بالا ہوگا اور وہ روضۂ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں دفن ہوں گے۔ وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دفن کی جگہ باقی ہے۔ اللہ کی شان دیکھیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جس فرشتے کو جوڑ رکھا تھا، ان کو بھی آخر میں موت آئے گی۔

معجزاتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

اللہ پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں دیں کہ اندھے پر ہاتھ پھیرتے تو بینا ہو جاتا، کوڑھی اور برص والے شخص پر ہاتھ پھیرتے تو ٹھیک ہو جاتا، مردے پر ہاتھ پھیرتے تو مردہ کھڑا ہو جاتا اور اس کو کہتے: ''قُمْ بِإِذْنِ اللّٰہِ'' تو وہ مردہ کھڑا ہو کر بول پڑتا۔

اے بنی اسرائیل! تم نے اتنی نشانیاں دیکھنے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی نہ مانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی نہ مانا، تورات کو بھی نہ مانا، بلکہ تم نے یہ کیا کہ جب بھی رسول میرا حکم لے کر آیا جو تمہارے نفس اور خواہش کے خلاف ہوتا تم اس کا انکار کر دیتے تھے اور تم نے انبیاء کی ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم نے قتل کیا، یہی تمہارا دین اور ایمان ہے۔

عمرہ، حج اور طواف کی فضیلت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بار بار حج کرنا اور بار بار عمرہ کرنا گناہوں کو مٹا ڈالتا ہے اور غریبی کو بھی مٹا ڈالتا ہے، یعنی آدمی جتنے زیادہ حج کرے، عمرے کرے، اس کے دو فائدے ہوتے ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ مٹا دیتے ہیں، دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ اس کے رزق میں برکتیں عطا فرما دیتے ہیں۔ حالانکہ بظاہر دیکھیں احج عمرے میں پیسہ خرچ ہوتا ہے، لیکن اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ خزانۂ غیب میں سے عطا فرما دیتے ہیں۔

اصل بات یہ ہوتی ہے کہ آدمی کا اللہ پر یقین کامل ہو جائے۔ زکوٰۃ میں بظاہر پیسہ خرچ ہوتا ہے کہ اڑھائی فیصد

نکالتے ہیں اور سود میں بظاہر پیسہ بڑھ رہا ہے، سات فیصد بیس فیصد لے رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾ [البقرة:٢٧٦] زکوٰۃ دینے سے اللہ برکتیں عطا فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے مال کو محفوظ رکھتے ہیں، اس کی اولاد کو محفوظ رکھتے ہیں، اس کو حوادثات سے بچا لیتے ہیں، آنے والی بڑی بڑی مصیبتوں کو ٹال دیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ پر سود کا پیسہ آ گیا، حرام کا پیسہ آ گیا، لیکن اس کا انجام یہ ہوگا کہ ایک جگہ سے لاکھوں مل گئے، لیکن دوسری جگہ کوئی بیماری گلے پڑ جائے گی تو لاکھوں خرچ ہو جائیں گے، تیسری جگہ کوئی مقدمہ بن جائے گا تو لاکھوں اس میں لگ جائیں گے، چوتھی جگہ کوئی حادثہ ہو جائے گا تو لاکھوں اس پر خرچ ہو جائیں گے۔

علماء نے لکھا ہے جو آدمی غریب ہو، جس کے رزق میں تنگی ہو، اس کو چاہیے کہ بار بار عمرے کرے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے رزق میں برکتیں عطا فرما دیتے ہیں اور رزق کو کھول دیتے ہیں۔

عمرے کی اصل فضیلت وہی ہے جو آدمی اپنے وطن سے آتے ہوئے میقات سے احرام باندھے، لیکن ہمارے لوگ چھٹیوں میں جاتے ہیں، مفت میں عمرہ مل رہا ہے، لیکن اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایئرپورٹ سے احرام باندھ کر اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں فارغ ہو جائے۔ اگر آپ مکہ میں رہتے ہیں اور مدینہ گئے، تب بھی آپ کو واپسی پر میقات کا عمرہ مل سکتا ہے۔ آپ طائف گئے، واپسی پر میقات ہے، وہاں سے بھی عمرہ مل سکتا ہے۔ اگر آپ مکہ کے اندر رہتے ہیں، آپ تنعیم چلے گئے اور احرام باندھ کر عمرہ کیا، اس طرح عمرہ تو ہو جاتا ہے، لیکن یہ میقات کے برابر نہیں، حل علیحدہ چیز ہے، میقات علیحدہ چیز ہے۔ میقات صرف پانچ ہیں جو حضور اکرم ﷺ نے مقرر فرمائے ہیں۔

آپ مکہ میں رہتے ہیں، کثرت سے طواف کریں۔ کیونکہ یہ عبادت پوری دنیا میں میسر نہیں آ سکتی۔ باقی ہر عبادت آپ پوری دنیا میں کر سکتے ہیں، لیکن طواف اللہ کے گھر کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا طواف کی عبادت نفلی عبادات میں سے افضل ترین ہے۔ آدمی جتنے شوق، ذوق اور تمنا سے اور عاجزی سے طواف کرے، اس کو مذاق نہ سمجھے، بلکہ یہ سمجھے کہ میں اللہ کے دربار میں حاضر ہوں۔

علماء نے لکھا ہے جب آدمی حجر اسود پر بوسہ دیتا ہے، اشارہ کرتا ہے گویا وہ اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر مصافحہ کرنے کے بعد عبادت کی ابتداء کر رہا ہوتا ہے۔ طواف میں ذکر اللہ پر زور دے...... ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَا

إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، وَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ''......اسی طرح کلمہ طیبہ، آیتِ کریمہ، چوتھا کلمہ، درود شریف اور جو بھی چیز تمہیں یاد ہے اور جس میں تمہارا دل لگے، خشوع وخضوع کے ساتھ ادب سے چلے، نظر نیچی رکھے، طواف کرنے کے بعد دو رکعت ادا کرے اور ملتزم پر آ کر دعا کرے۔ اگر اللہ پاک نے یہاں آنے کی توفیق دی ہے تو اس کے گھر کے حقوق ادا کرے۔

اللہ پاک نے بنی اسرائیل میں ان کی قوم سے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا، ان کو کچھ نئے احکام ملے، جو تورات میں نہیں تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو کھلی کھلی نشانیاں دیں، یعنی معجزات دیئے اور وہ معجزات بڑے بڑے تھے اور یہ اللہ نے اس لئے دیئے، تا کہ لوگ ان کی صداقت پر ایمان لے آئیں کہ وہ اللہ کے سچے رسول، سچے پیغمبر اور سچے نبی ہیں۔

شریعت کے احکام منسوخ یا تبدیل کیوں ہوتے ہیں؟

یاد رکھیں! شریعت کا جو اختلاف ہوتا ہے وہ اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ بعض مستشرقین اور معاندین اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ جب خدا اعلام الغیوب ہے تو اس کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ قانون بدل دے؟ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں اور قانون ہو، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں اور شریعت آ جائے، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں شریعت کے احکام بدل جائیں، عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اور احکام آ جائیں، تو اللہ کو احکام بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟

یہ اعتراض جہالت ہے۔ اللہ نے جہاں احکام بدلے ہیں، وہاں اپنے بندوں پر رحم کھایا ہے۔ حالات اللہ کے علم میں ہیں۔ ہمارے والدین جو عبادت میں مشقت برداشت کر سکتے تھے وہ ہم برداشت نہیں کر سکتے اور جو ہمیں نصیب ہے، اللہ ہماری آنے والی اولادوں کو ہدایت دے، پتہ نہیں وہ کیا کریں گی؟ کیونکہ روزانہ ہم جتنا جتنا قیامت کے قریب جا رہے ہیں، کمزوریوں کی طرف بڑھ رہے ہیں ہر چیز بڑھاپے کی طرف جا رہی ہے۔ جیسے انسان بڑھاپے کی طرف جاتا ہے تو اس کے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دنیا بھی ختم ہونے کی طرف جا رہی ہے، جوانی کی طرف نہیں جا رہی۔ اللہ تعالیٰ رحم فرما کر اپنے بندوں پر نرمی فرما دیتے ہیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تہجد فرض کر دی، ہر پیغمبر پر فرض تھی اور اس اُمت پر بھی فرض تھی کہ آدھی رات آرام کرو اور آدھی رات تہجد پڑھو۔ پھر یہ ہوا کہ دو حصے رات کے تہجد پڑھو اور ایک حصہ رام کرو۔ پھر آیت آ گئی کہ دو حصے آرام کرو اور ایک حصہ تہجد پڑھو۔ اس کے بعد جب پانچ نمازیں فرض ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے تہجد کی فرضیت ختم

کردی کہ اب پانچ نمازیں فرض ادا کرو۔ اگر اللہ توفیق دے تو تہجد پڑھ لو۔ اگر نہ پڑھو تو گناہ کوئی نہیں ہے۔ اگر دنیا میں ڈاکٹر مریض کے حالات کو دیکھ کر نسخہ بدل ڈالے تو اس کو کہتے ہیں کہ ڈاکٹر بڑا سمجھدار ہے۔ جیسے جیسے مرض تبدیل ہوتا گیا دوائیں بھی تبدیل کرتے گئے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات دیکھ کر قانون میں تبدیلی فرمادیں تو کہتے ہیں: کیوں بدلا ہے؟ بندے پر کوئی اعتراض نہیں کرتا، لیکن خالق پر اعتراض کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت اور احکام کے اندر تبدیلی تھی۔ اللہ نے ان کو بڑے معجزات دیئے، تاکہ لوگ معجزات کو دیکھ کر ان کی صداقت کو پہچان لیں، لیکن یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ تورات کے مخالف آرڈر لے کر آگئے، شریعت کے خلاف حکم دے رہے ہیں۔ اس کو انہوں نے عناد اور بغض بنالیا، جیسا کہ قرآن میں ہے: ﴿وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ﴾ [آل عمران: ۵۰] حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ بعض چیزیں جو تم پر حرام ہیں، حلال کردوں، تاکہ تمہارے ساتھ رعایت ہوجائے، اور میں کھلی ہوئی نشانی لے کر آیا ہوں۔ لیکن بنی اسرائیل کا معاملہ تھا کہ وہ انبیاء کے ساتھ سخت بُرا معاملہ کرتے تھے اور بعض تو کہتے: ہم تو تورات کو پکڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ تورات کے احکام کو بھی انہوں نے بدل ڈالا تھا۔

حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لیے تائید جبرائیلی:

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝﴾ [الشعراء: ۱۹۳، ۱۹۴] روح الامین قرآن لے کر آیا۔ یہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام کا لقب روح الامین ہے۔ جس زمانہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، اس زمانہ میں شاعر لوگوں کا بڑا زور تھا۔ عرب میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے۔ بعض شعراء جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے، وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص میں اشعار کہتے تھے۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر تھے اور یہ ان کافروں کو استعاروں میں جواب دیتے تھے۔

ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے منبر منگوایا، اس پر حسان رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دفاع کیا اور کافروں کو جواب دیتے رہے، آپ قصیدہ پڑھتے رہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگتے رہے: ''اَللّٰهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ'' یا اللہ! میرے اس صحابی کی جبرائیل کے ذریعے مدد فرما،

جو اس کے دل و دماغ میں مضمون ڈالے، جیسے جبرائیل میرے لئے قرآن لے آتا ہے اور میری تائید ہوتی ہے۔

(مسئلہ) اگر کسی بڑی شان والے کے سامنے اس کے حکم پر چھوٹا آدمی منبر پر کھڑا ہو جائے تو جائز ہے۔ جیسے بڑے بڑے علماء بیٹھے ہوتے ہیں، لیکن چھوٹے طالب کو کہتے ہیں کہ تم تقریر کرو، تلاوت کرو۔ اس میں علماء کی توہین نہیں ہوتی، بلکہ یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت ہے۔

نعت رسولِ مقبول ﷺ پڑھنے کا جائز و شرعی طریقہ:

جس نعت میں اللہ کی توحید ہے، محمد ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہے یا حضور اکرم ﷺ کی تعریف ہے، لیکن ایسی تعریف جو حدودِ شریعت سے باہر نہ نکلے، یہ نہ ہو کہ تعریف کرتے کرتے نبی کو خدا بنا دیں۔ یہ تعریف نہیں ہوتی، بلکہ کفر ہوتا ہے۔

اس کی دلیل موجود ہے کہ میرے آقا ﷺ ایک دفعہ جنگ سے تشریف لے آئے، بعض بچیوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں حضور اکرم ﷺ کی محبت میں خوشی سے گیت گانا شروع کیا اور انہوں نے ایک شعر کہا: ''وَفِينَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِي غَدٍ'' ہمارے درمیان میں اللہ نے ایک ایسا نبی بھیجا ہے جو کل کی خبریں بھی جانتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کو فرمایا: چپ کرو، ایسی بات نہ کرو، جو شریعت کے خلاف ہے۔ جو تم پہلے کہہ رہی تھیں وہ کہو۔ علم غیب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور کسی کے پاس نہیں ہوتا۔

[صحيح البخاري، حديث: 5147، باب: ضَرْبِ الدُّفِّ فِي النِّكَاحِ وَالْوَلِيمَةِ]

اس سے علماء نے مسئلہ نکالا کہ حضور اکرم ﷺ کی مدح جائز، نعت پڑھنا جائز، لیکن اس میں ایسے الفاظ نہ ہوں جو شریعت کے خلاف ہوں، ایسے الفاظ نہ ہوں جو اللہ کی توحید سے ٹکرا جائیں اور قرآن و سنت کے احکام کے خلاف ہوں۔ نعت پڑھنا جائز ہے، لیکن باجے وغیرہ کے بغیر۔ طبلہ، سارنگی، ہارمونیم، پتہ نہیں کیا کیا بلائیں ہوتی ہیں، موسیقی اور لہو ولعب کے جو بھی آلات ہوتے ہیں، یہ نہ ہوں۔

بعض بزرگوں کے بارے میں جو آیا ہے کہ وہ سنتے تھے۔ دعا کریں کہ اللہ ان پر رحم فرما دے۔ پتہ نہیں وہ کن حالات میں سنتے تھے؟ کیا وجوہات تھیں؟ کیا مجبوریاں تھیں؟ ان کے سننے کو کوئی شرعی دلیل بنائے تو وہ دلیل نہیں بن سکتی۔ کیونکہ شریعت میں دلیل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فرمان ہے۔ کسی بزرگ، مولوی یا پیر کا عمل شریعت میں حجت نہیں بن سکتا۔ تمام علماء، محدثین اور فقہاء کا متفق علیہ فیصلہ ہے: ''کلامِ صوفیاء در شریعت حجت نیست'' جتنے

صوفی بزرگ گزرے ہیں، ان کا کلام شریعت میں حجت نہیں ہوتا۔ صوفی حضرات کبھی اپنے استغراق میں بیٹھے ہوتے ہیں کوئی بات ان کی زبان سے نکل جاتی ہے تو وہ شریعت میں حجت نہیں بنتی۔

آج کل لوگ حضور اکرم ﷺ کی نعت غیر محرم عورتوں سے سنتے ہیں...... لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ...... حالانکہ غیر محرم عورت کی خوش آوازی سننا حرام ہے، چہ جائیکہ آدمی غیر محرم عورت سے ریڈیو، ٹیلی ویژن پر، اسکرین پر، محفلوں میں اس کی نعت سنے۔ اللہ نے فرمایا: عورت قرآن زور سے نہ پڑھے، عورت اذان نہیں دے سکتی، تاکہ اس کی آواز غیر محرم نہ سنے۔ عورت امام نہیں بن سکتی، تاکہ مقتدی اس کی آواز نہ سنیں۔ عورت کو حکم ہے کہ گھر میں عبادت کرے، زور سے بات نہ کرے، تاکہ اس کی آواز باہر نہ جائے۔ آج کل ایک اور رواج ہے کہ بعض عورتیں قاری ہیں، اچھا قرآن پڑھنے والی ہیں، لوگ ان کی کیسٹ سنتے ہیں، یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔ غیر محرم عورت کی آواز سننا ہی حرام ہے، چاہے وہ قرآن تلاوت کرے، حدیث تلاوت کرے یا نعت پڑھے۔

حضور پاک ﷺ کے زمانہ میں کبھی کسی نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا سے نعت سنی؟ کبھی بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے قرآن کی آواز صحابہ کے کان میں آئی؟ ہاں! ازواجِ مطہرات سے مسئلہ پوچھتے تھے اور درمیان میں پردہ لٹکا دیتے تھے۔ امی جان! شریعت کا فلاں مسئلہ بتا دیں۔ ماں اپنے بیٹوں کو مسئلہ بتا دیتی تھی کہ مسئلہ یوں ہے۔ کیونکہ بعض مسائل گھر کے ہوتے ہیں، میاں بیوی کے درمیان پیش آتے ہیں اور کسی کے سامنے وہ نہیں ہو سکتے۔ ان سے پوچھتے کہ حضور اکرم ﷺ کتنے پانی سے غسل فرماتے تھے؟ کیا کبھی ایسے بھی ہوا کہ ایک برتن سے اکٹھے غسل فرمایا ہو؟ فرمایا: ہاں! مسئلے معلوم ہو گیا ہے کہ میاں بیوی ایک ٹب سے دونوں نہالیں تو کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ سمجھ لیں کہ حضور اکرم ﷺ کی نعت پڑھنا، لکھنا، حضور اکرم ﷺ کی شان میں قصیدے لکھنا جائز، مدح، ثنا، سننی، پڑھنی، پڑھانی جائز ہے، عشق اور ایمان کی علامت ہے، لیکن جو چیزیں شریعت کے خلاف ہوں، وہ حرام ہیں، مثلاً گانا بجانا وغیرہ۔ سوز و ساز نہ ہوں۔ یہ جو بڑے بڑے عاشق بنے پھرتے ہیں کہ فلاں قوال حضور اکرم ﷺ کا بڑا عاشق ہے۔ داڑھی منڈواتا ہے اور عاشق ہے!! دو کلو پان کھا جاتا ہے اور عاشق ہے!! کیا ......معاذ اللہ!...... حضور اکرم ﷺ پان کھاتے تھے؟ آپ اس کے سر پر کبھی ٹوپی نہیں دیکھیں گے، پھر بھی وہ اپنے آپ کو عاشق کہلاتا ہے۔

بعض لوگ فلمی انداز میں نعتیں پڑھتے ہیں، یہ بھی ناجائز ہے۔ جو اللہ نے تمہیں آواز دی ہے اس کے ساتھ محمد

مدنی ﷺ کی نعت پڑھو۔ ادب، وضو، انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ نعت پڑھو اور اس تصور کے ساتھ نعت پڑھو کہ اللہ قیامت میں بھی حضور اکرم ﷺ کے سامنے نعت پڑھنے کی سعادت نصیب فرمائیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسجد سے گزرے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے شعر پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ بات ناگوار گزری۔ آپ نے فرمایا: عجیب بات ہے کہ تم مسجد میں کھڑے ہوکر شعر پڑھتے ہو، کیا مسجد شعر پڑھنے کی جگہ ہے؟ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے عمر! ناراض نہ ہوں۔ یہ شعر تو میں نے اس وقت بھی پڑھے تھے جب آپ سے بھی زیادہ شان والی ہستی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ موجود تھے۔ انہوں نے منع نہیں کیا تو آپ کیوں منع کرتے ہیں؟ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور کہا: ابو ہریرہ! میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، آپ گواہی دیں اس بات کی کہ مجھے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا: ''أَجِبْ عَنِّي'' (میری طرف سے مشرکین کو جواب دو)؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''نَعَمْ'' ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔

[صحیح بخاری، حدیث: ۳۲۱۲، باب: ذِكْرِ الْمَلَائِكَةِ]

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب میں نے جواب دیا تھا تو حضور اکرم ﷺ نے دعا کی تھی: ''اَللّٰهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ؟'' اے پروردگار عالم! میرے شاعر کی مدد فرما، جبرائیل امین کی طرف سے تقویت دے کر اور ان کے ذریعے اس کے دل ودماغ میں مضمون ڈال دے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بالکل آپ نے صحیح کہا ہے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ بھی پڑھا۔

وَ جِبْرِيْلُ رَسُوْلُ اللهِ فِيْنَا
وَ رُوْحُ الْقُدُسِ لَيْسَ بِهٖ خِفَاءُ

''جبرائیل علیہ السلام ہمارے درمیان اللہ کا قاصد اور روح القدس ہے اور اس میں کوئی خفا نہیں ہے۔''

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۹۰، باب: فَضَائِلِ حَسَّانَ بْنِ ثَابِتٍ رضی اللہ عنہ]

تفسیر:

حضرت شہر بن حوشب الاشعری سے روایت ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے آکر حضور اکرم ﷺ سے ایک سوال کیا کہ روح کیا ہے؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''أَنْشُدُكُمْ بِاللهِ وَ بِأَيَّامِهٖ عِنْدَ بَنِي إِسْرَائِيلَ، هَلْ

تَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ جِبْرَائِيْلُ وَ هُوَ الَّذِيْ يَأْتِيْنِيْ؟ قَالُوْا: نَعَمْ'' میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں اور ان ایام کی جو بنی اسرائیل پر آئے، کیا تم یہ جانتے ہو کہ روح سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ اور یہ وہی فرشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے پاس آتا ہے۔ (اس حدیث پاک میں بھی یہ بات وضاحت سے آگئی کہ ''روح'' سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں)۔ انہوں نے کہا: جی ہاں! روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۲]

صحیح ابن حبان میں ایک روایت ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت فرمائی ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''إِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رَوْعِيْ اَنَّهٗ لَنْ تَمُوْتَ نَفْسٌ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا وَ اَجَلَهَا، فَاتَّقُوْا اللهَ وَ اَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ'' روح القدس یعنی جبرائیل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی، اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی بندہ اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک کہ اللہ نے اس کا جو وقت لکھا ہے، وہ پورا نہ کر لے، اور جو رزق لکھا ہے وہ پورا نہ کر لے اور تم اللہ سے ڈرو اور رزق حاصل کرنے میں اچھا طریقہ اختیار کرو۔ (یہ نہ کرو کہ حلال، حرام، مشتبہات، منکرات اور محرمات سب کو جمع کرتے جاؤ، حالانکہ تم نے جتنا رزق کھانا ہے، جو اللہ نے تمہارے لئے لکھا ہے، تمہارا رزق کوئی اور نہیں کھا سکتا اور جتنی تمہاری زندگی ہے، اتنا دنیا میں رہنا ہے)۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۲، ۱۲۳، شرح السنۃ للبغوی، حدیث: ۴۱۱۲]

''روح القدس'' اسم اعظم ہے:

ابن ابی حاتم نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ اس آیت میں اسم اعظم ہے اور یہ وہی اسم اعظم ہے جو اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا اور اس اسم اعظم کی برکت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۳]

اسم اعظم کون سا ہے؟

اللہ کے اسماء بہت ہیں، لیکن ان میں ایک اسم اعظم ہے، ''إِذَا دُعِيَ بِهِ اسْتَجَابَ'' (جب اس اسم کے ساتھ دعا کی جائے تو وہ قبول ہوتی ہے)، اس کو ''اسم اعظم'' کہتے ہیں، اور وہ اسم اعظم کیا ہے؟ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک راز میں رکھ دیا ہے۔

بعض روایات میں آتا ہے: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الانبیاء: ۸۷] اس آیت

میں اسم اعظم ہے، کیونکہ جس آدمی نے بھی اس کے ساتھ دعا مانگی ہے، اللہ پاک اس کی دعا منظور فرماتے ہیں۔

بعض روایات میں آیۃ الکرسی کے بارے میں آیا ہے کہ اس کے اندر اسم اعظم ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ "سورۃ الحشر" کی آخری تین آیات میں اسم اعظم ہے۔ اسی طرح "یا حَیُّ یا قَیُّومُ!" اسم اعظم ہے۔ اسی طرح "یا ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِکْرَام" بھی اسم اعظم ہے۔

یہ مختلف اقوال ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس کو چھپا دیا ہے۔ اور بندے کا کام یہ ہے کہ اس کو تلاش کرے اور اللہ کے اسماء کے ساتھ اللہ سے دعا مانگے۔

یاد رکھیں! وہ دعائیں کبھی قبول نہیں ہوتیں جو شریعت کے خلاف ہوں، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کے خلاف ہوں۔ مثلاً: ایک آدمی ڈاکہ مارنے کے لیے جا رہا ہے اور کامیابی کی دعا مانگ رہا ہے، ایسے لوگ حدودِ اسلام سے بھی نکل سکتے ہیں، کیونکہ اس نے گناہ کے لیے دعا کو ذریعہ بنایا، جو خود گناہ ہے۔ آدمی کو وہ دعا مانگنی چاہیے جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق ہو۔ آدمی کو چاہیے کہ اللہ کے اسماء کے ساتھ دعا مانگے۔

دعا کی قبولیت کے بعض طریقے:

بعض بزرگوں نے ایک طریقہ لکھا ہے۔ طریقہ محنت والا ہے، اس شرط پر آپ حضرات کو بتا رہا ہوں کہ آپ اس کو غلط استعمال نہیں کریں گے۔ اگر آپ نے اس کو غلط استعمال کیا تو قیامت میں آپ پکڑے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے جو ننانوے اسماء ہیں، ان میں سے تین نام منتخب کرلو، یعنی ابتداء سے جہاں اللہ کے نام شروع ہوتے ہیں، احادیث میں موجود ہیں اور چھپے ہوئے مل جاتے ہیں۔ ان میں تین ناموں پر نشان لگا کر مثلاً: یا اللہ! یا رحمٰن! یا رحیم۔ ان تین ناموں کے ساتھ گیارہ دن تک، سات دن تک یا اکیس دن تک کسی خاص کام کے بارے میں دعا مانگتے رہو۔ صبح و شام، اُٹھتے بیٹھتے، وضو ہے یا نہیں، چلتے پھرتے، جب بھی یاد آجائے تو مانگو: یا اللہ! یا رحمٰن! یا رحیم! میری فلاں حاجت پوری کردے۔ اس کے بعد اور تین نام اور اس کے بعد اور تین نام لیں۔

جن ناموں کے ساتھ آپ کی دعا فوراً منظور ہو جائے تو سمجھ لو کہ تمہارے حق میں اللہ کو وہی منظور ہے۔ بس انہی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلو۔ ان شاء اللہ! ہر جگہ کامیابی ملے گی۔ یہ ایک ایسا آسان طریقہ ہے کہ جس میں شریعت کی بھی مخالفت نہیں ہے اور اللہ کا حکم بھی ہے کہ ان ناموں کے ساتھ پکارو۔

بعض علماء نے ایک اور طریقہ بھی لکھا ہے کہ قرآن میں جو آیات ہیں، ایک تو یہ آیت ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِی الْمُؤْمِنِیْنَ ۝﴾ [الانبیاء: ۸۷، ۸۸]، دوسری آیت ﴿وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝﴾ [الانبیاء: ۸۳]، اور تیسری آیت ﴿وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ۝﴾ [آل عمران: ۱۷۳]، چوتھی آیت ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝﴾ [غافر: ۴۴]، پانچویں آیت ﴿فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝﴾ [القمر: ۱۰] ہر آیت کو کم از کم سو سو دفعہ پڑھے، پانچ سو دفعہ پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو منظور فرماتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جو آدمی ان پانچ آیات کو اس انداز میں پڑھ کر اللہ سے دعا مانگے اور اس کو یقین نہ ہو کہ میرا کام ہوگا یا نہیں تو سمجھو کہ وہ اللہ پر ایمان بھی نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ آیات ایسی ہیں جہاں قرآن میں آئی ہیں تو ان کے آگے آیا ہے: ﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ۝﴾ [الانبیاء: ۷۶] کہ جنہوں نے ہم سے ان آیات کے ذریعے مانگا ہے، ہم نے ان کو دیا ہے۔ فرمایا: میں اس آدمی پر حیران ہوتا ہوں۔ وہ بڑا بدبخت ہے کہ ان کے ساتھ دعا مانگے اور اس کی دعا قبول نہ ہو۔ شرط یہ ہے کہ جب دعا مانگو تو پہلے استغفار کرلو، کپڑے پاک ہوں، بدن پاک ہو، جگہ پاک ہو اور اس دن میں کوشش کرو کہ کم از کم آپ کے اندر حرام کا رزق نہ جائے۔

ایک بوڑھا آدمی اور اس کی سفید داڑھی ہے۔ ماشاء اللہ! بڑا نیک آدمی ہے۔ میں نے اس کو صف اوّل میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بارے میں بڑا حسنِ ظن رکھتا تھا کہ یہ اللہ کا ولی ہے۔ میں طواف کر رہا تھا تو ایک آدمی نے پتہ نہیں اس کو کیا کہا، انہوں نے کہا: یہ شیطان ہے، کتے کا بچہ ہے، کافر ہے، حرام زادہ ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ اس کو تو میں ولی سمجھتا تھا، جو دوسروں کو کتے کا بچہ کہتا ہے۔ دوسرے چکر میں آیا تو وہ پھر وہی گالیاں یہاں پورے طواف میں دیتا رہا۔

روح اور قدس کسے کہتے ہیں؟

حضرت ابن ابی نجیح رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''روح''، ان فرشتوں کا لقب ہے جو ملائکہ پر سپروائزر اور ان کی محافظت کرنے والے ہیں۔

حضرت ابوجعفر الرازی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرماتے ہیں کہ "قدس" سے مراد پروردگار عالم ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: قدس سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے اور روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔

حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: قدس سے مراد "برکۃ" ہے، یعنی جہاں اللہ کی تقدیس بیان کی جائے۔

حضرت عوفی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرماتے ہیں: ﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ اللہ کی پاکی مراد ہے۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل بھیجی تو روح کے ساتھ، جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو بھی روح کے ساتھ بھیجا۔ دونوں روح اللہ ہیں۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مقام پر "روح" سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، اور یہی راجح قول ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ میں بھی "روح" سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ اگر روح سے مراد بھی انجیل ہو اور ﴿تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ﴾ [المائدۃ:۱۱۰] میں "الانجیل" سے مراد بھی "انجیل" ہو تو اس طرح تکرار ہو جائے گا اور ایک ایسی بات کو دہرایا گیا جس کا فائدہ بھی نہ ہو۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۱۲۳]

﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۸۸]

اور کہتے ہیں: ہمارے دلوں پر پردے پڑ چکے ہیں، بلکہ اللہ نے ان کو ان کے کفر کے سبب لعنت کی ہے، پس تھوڑے ہی ایمان قبول کرتے ہیں۔

﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ یہودیوں کی شرارتوں میں یہ بھی تھا کہ وہ کہتے تھے: ہمارے دل پردے میں ہیں اور وہ اس بات کو عزت اور شرف کے طور پر کہتے تھے کہ ہمارے دلوں پر اس طرح غلاف چڑھا ہوا ہے کہ ان کے اندر کسی دوسرے کی بات داخل نہیں ہو سکتی، ہم اس کو سمجھ نہیں سکتے۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "غُلْف"، "غِلَاف" سے بھی ہے اور "أَغْلَف" سے بھی ہے۔ "غُلْف" کا معنی "أَكِنَّة" بھی ہے، جیسے قرآن میں دوسرے مقام پر آیا: ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ﴾

مِنۢ بَيۡنِنَا وَبَيۡنِكَ حِجَابٌ فَاعۡمَلۡ اِنَّنَا عٰمِلُوۡنَ ۝﴾[فصلت:۵]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۲]

لعنت کا مفہوم:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿بَلۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَقَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝﴾[البقرۃ:۸۸] اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمادی ہے، اللہ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کردیا ہے۔ اور یہ اسی لعنت کا اثر ہے کہ ان کو بات سمجھ نہیں آتی۔

لعنت کا معنیٰ ہے: ''اَلْبُعْدُ عَنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ'' اللہ کی رحمت سے دور ہوجانا۔ علماء نے فرمایا: جب آدمی ارتکاب جرم کی وجہ سے لعنت کا مستحق بنتا ہے تو اس کا اثر سب سے پہلے یہ ہوتا ہے کہ اس کی عقل کام نہیں کرتی اور اس کو حق بات سمجھ نہیں آتی۔ اس کو آپ جتنا حق بات سمجھانے کی کوشش کریں، وہ کہے گا: آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن ہمارے دماغ میں یہ بات نہیں بیٹھتی۔ اس طرح وہ آدمی صحیح بات سمجھنے سے قاصر ہوجاتا ہے، اس کا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

مثال کے طور پر زمین پر سب سے پہلا جرم قابیل نے کیا کہ اپنے بھائی ہابیل کو قتل کرڈالا۔ ہابیل بڑا مطیع اور فرمانبردار تھا، قابیل نافرمان تھا۔ قابیل نے جب ہابیل کو قتل کردیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ایسی لعنت فرمائی کہ اس کی عقل جواب دے گئی۔ اس کو سمجھ نہ آئے کہ لاش کو کدھر لے جاؤں۔ لاش اُٹھا کر پہاڑوں میں پھر رہا ہے، کیونکہ آبادی میں تو جا نہیں سکتا۔ جب تھک ہار کر بیٹھ گیا تو اس نے دیکھا کہ چند کوے اکٹھے ہوئے ہیں، ایک کوا مردہ پڑا ہوا ہے، سارے کوے اس کے اردگرد اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک جگہ اپنی چونچ سے گڑھا کھود کر مردہ کو اس میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ جب اس نے ان کو دیکھا تو کہنے لگا: ﴿يٰوَيۡلَتٰۤى اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِثۡلَ هٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوۡءَةَ اَخِىۡ ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِيۡنَ ۝﴾[المائدۃ:۳۱] میں تو ان کوؤں سے بھی کم عقل نکلا، کمزور نکلا۔ مجھے اتنی سمجھ نہ آئی کہ بھائی کی لاش کو گڑھے میں ڈال کر چھپادوں۔

اصل وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جرم کی وجہ سے عقل چھین لیتے ہیں اور اس بندے کو صحیح راستہ نہیں ملتا۔ آج کہیں قتل کی واردات ہوجائے تو پولیس کہتی ہے: اس جگہ کو بالکل نہ چھیڑیں اور اس محل وقوع کے قریب مت جائیں۔ اس لئے اپنے آدمی بھیج کر پہرہ لگادیتے ہیں کہ یہاں سے کوئی آدمی نہ گزرے۔ پھر قدم ڈھونڈتے ہیں، نعش کی ہیئت کو ڈھونڈتے ہیں کہ اس کا رخ کس طرف ہے اور اس کو گولی کہاں سے لگی ہے؟ ان ساری چیزوں پر وہ نظر کرتے ہیں۔ کیونکہ قاتل ضرور کوئی نہ کوئی غلطی کرتا ہے۔ اگر کوئی سمجھدار اور محنت کرنے والا آفیسر ہو، اس کو مجرمین اور جرائم کے

بارے میں تجربہ ہو تو وہ اسی غلطی پر زور لگاتا ہے کہ کوئی غلطی ظاہر ہو اور ہم اس کو پکڑیں۔ مثلاً اس مجرم کی جیب سے کوئی کاغذ گر گیا، سگریٹ پی کر مجرم نے پھینک دیا۔ تو وہ افسر دیکھتے ہیں کہ کس برانڈ کا سگریٹ ہے؟ یہ کہاں بکتا ہے؟ جب انسان سے اس طرح کی ملتی ہے تو قاتل تک پہنچ جاتے ہیں، کیونکہ جب آدمی جرم کرتا ہے تو عقل کی نعمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس سے لازماً کوئی نہ کوئی غلطی ہوتی ہے جس سے وہ پکڑا جاتا ہے۔

جن لوگوں نے اتنا بڑا کفر کیا ہو، اللہ کے ساتھ شریک بنا ڈالا ہو، حضور اکرم ﷺ کی رسالت کا انکار کیا ہو، حضور اکرم ﷺ کی سیرت وصورت، صفات کو چھپا دیا ہو، تورات کو بدل ڈالا ہو تو ان جرائم پر ان کو سزا ملے گی کہ ان کی عقل کام کرنا چھوڑ جائے گی، لیکن وہ سمجھیں گے کہ آپ کی بات ہمارے دل ودماغ میں داخل نہیں ہوتی۔

سنت نبوی ﷺ اور جدید تعلیم یافتہ:

جیسے آج کل جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے اور ان کی تعلیم ابتدائی مراحل سے آخر تک انگریزی سکولوں میں ہوتی ہے، ان کو بھی جب آپ کوئی دین کی بات سمجھائیں تو وہ فوراً کہیں گے: آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ چودہ سو سال گزر گئے، اب بھی آپ نماز کا کہتے ہیں، ٹخنوں سے اوپر شلوار رکھنے کا کہتے ہیں، آپ کہتے ہو کہ سرمہ ڈالا کرو، حالانکہ ڈاکٹروں نے تحقیق کی ہے کہ اس کے اندر سکہ ہوتا ہے جو آنکھوں کے لئے نقصان دہ ہے اور آپ کہتے ہو کہ سنت ہے۔ اس طرح ان کے دماغ میں یہ بات نہیں بیٹھتی، ان کو کون سمجھائے کہ حضور پاک ﷺ نے جس سرمہ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے، اس سرمہ کو تلاش کر کے اس میں سکہ دکھاؤ تو ہم تمہاری بات مانیں۔ تم جھوٹے سرمے بنا دو تو اس میں حضور اکرم ﷺ کا کیا قصور ہے؟

اصل وجہ یہ ہے کہ اللہ اپنی ناراضگی کی وجہ سے ان کی عقل پر پردہ ڈال دیتے ہیں، وہ دنیا کی باتیں سمجھ لیتے ہیں، لیکن آخرت کی باتیں نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حضور اکرم ﷺ کے یہ جتنے منکر اور کافر ہیں، دنیا کمانے کے ڈھنگ تو بڑے جانتے ہیں، لیکن آخرت کی باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔

ان کو کسی انگریز کا قول سنا دو کہ ابراہام لنکن نے لکھا ہے، مورث بکائے نے یہ لکھا ہے، گلیلو نے لکھا ہے تو کہیں گے: یہ مولوی بڑا پڑھا لکھا ہے، اور اگر آپ ان کو کہیں گے: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا ہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا ہے تو کہیں گے: چھوڑو، یہ وہی مولوی ہے جو ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کو لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ چودہ سو سال پہلے گزر گئے ہیں، وہ تو

اس زمانہ میں پیدا ہوئے جب سائنس کا دور نہیں تھا، ان کو کیا پتہ کہ آسمان کیا ہوتا ہے؟ زمین کیا ہوتی ہے؟ چاند تارے کیا ہوتے ہیں؟

حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان ہے کہ جو باتیں حضور اکرم ﷺ نے اللہ کے قرآن میں بتائی ہیں، چودہ سو سال کے بعد ابھی سائنس وہاں پہنچ رہی ہے۔ یہ تو اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ زمین و آسمان کی پیدائش سے پہلے ہائیڈروجن اور نائٹروجن کا جب اشتراک ہوا تو اس سے ایک دھواں سا خارج ہوا، وہ چلتے چلتے مختلف ٹکڑوں میں بٹ گیا، کہیں آسمان بن گیا اور کہیں زمین بن گئی۔

حالانکہ قرآن پاک کو کھول کر دیکھیں، چودہ سو سال پہلے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب ہم نے زمین و آسمان کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو یہ دھواں دھواں تھا۔ یہ بے چارے تو ٹھوکریں کھاتے کھاتے اب وہاں پہنچے ہیں۔ انہوں نے کہاں سے ترقی کی ہے؟ ہمیں تو چودہ سو سال پہلے حضور اکرم ﷺ نے یہ بات پڑھا دی تھی۔ تم نے تو اب ترقی کی ہے۔

جدید سائنس اب اس بات پر پہنچی ہے کہ نباتات میں جوڑا ہوتا ہے: ایک نر ہوتا ہے اور ایک مادہ ہوتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے فرمادیا: ﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ [الذاریات:۴۹] ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے۔

اب ان کی ایک تحقیق سے معلوم ہوا کہ نباتات میں بھی حمل ہوتا ہے، پولن مادہ کبھی اس کو پانی کے ذریعے پہنچ جاتا ہے اور کبھی ہواؤں کے ذریعے اس کو پہنچ جاتا ہے اور کبھی ساتھ والے پودے پر وہ مادہ موجود ہوتا ہے، جب وہ پودا ہلتا ہے تو گر کر اس پر پہنچ جاتا ہے تو سبزی میں پھل پھول لگ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے پہلے بیان فرمادیا ہے: ﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ﴾ [الحجر:۲۲] ہم کچھ ہوائیں ایسی چلاتے ہیں جو حمل کرنے والی ہیں۔ یہ بے چارے سمجھتے ہیں کہ یہاں ہمارا دماغ پہنچا، ان کو یہ پتہ چلا، مولویوں کو کوئی پتہ نہیں ہے۔

ان کو پتہ نہیں کہ ان کے جتنے بڑے بڑے جدید سائنسدان ہیں، یہ چور ہیں، انہوں نے سب ہماری کتابوں سے چرایا ہے۔ یہ علیحدہ بدقسمتی ہے کہ ہمارے مولوی تعویذ لکھنے لگے اور اسی چکر میں پڑے ہوئے ہیں اور ان لوگوں نے سائنسی ترقیاں کر کے پوری دنیا پر کنٹرول کر لیا اور ہم نے اپنا کام چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں تو اللہ پاک نے ہر چیز قرآن پاک پر حضور اکرم ﷺ کے فرمان میں کھول کھول کر بیان کر دی ہے۔

جدید تعلیم یافتہ شخص کا واقعہ:

کچھ دن قبل ایک آدمی باہر سے آئے تھے اور کئی علوم میں انہوں نے P.H.D کیا ہوا تھا۔ ان سے باتیں چل رہی تھیں، وہ مجھے بڑے فخر سے سنانے لگا کہ میں نے بڑی ریسرچ کی ہے، مجھے بڑی تحقیق ہوئی ہے، آپ سنیں گے تو حیران ہو جائیں گے کہ یہ گوہ کیا ہے؟ اور اس کے پاؤں کی انگلیاں کتنی ہوتی ہیں؟ زمین سے یہ کتنی اونچی ہوتی ہے؟ اس کا طول وعرض کتنا ہوتا ہے؟ اس کے گوشت میں کیا کیا فوائد ہیں؟ کہنے لگا: آپ کا یہ موضوع تو نہیں ہے، کیونکہ آپ حضرات کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے کہا: آپ کو یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ ہمارا تعلق نہیں ہے؟ یہ ہماری کتابوں میں موجود ہے کہ گوہ کی عمر سات سو سال ہوتی ہے، کیا تمہیں یہ پتہ ہے؟ وہ حیران ہو کر دیکھنے لگا اور کہا: جرمنی کے ایک کتب خانہ میں ایک کتاب سے پڑھا تھا۔ آپ کو کس نے بتا دیا؟ میں نے دو چار کتابیں نکال کر اس کو دکھائیں کہ دیکھو! ان میں یہ بات لکھی ہوئی ہے۔

اور یہ واحد جانور ہے جو کبھی مذکر ہوتا ہے اور کبھی مؤنث ہوتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا: آپ کو یہ تحقیق ہے؟ کہنے لگا: یہ تو ابھی پتہ نہیں۔ میں نے کہا: آپ ریسرچ کریں۔ اور میں نے کہا: آپ کو پتہ ہے کہ یہ واحد جانور ہے جس کے دانت ایک ہڈی ہوتی ہے اور اس میں ٹکڑے نہیں ہوتے۔ کہنے لگا: آپ کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے؟ ہمارے مولوی اگر ان کو نہ پڑھیں تو اس میں علم کا قصور تو نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں نے تو ہر چیز لکھ دی ہے، مگر وہ حیران ہو گیا۔ میں نے کہا: حضور اکرم ﷺ کے سامنے گوہ کا گوشت لایا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو حرام بھی نہیں کہتا، لیکن میں خود نہیں کھاتا۔

احادیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے دسترخوان پر اس کو کئی دفعہ کھایا گیا۔ اگر یہ حرام ہوتی تو حضور اکرم ﷺ اس کو کھانے سے منع فرما دیتے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے سامنے تو کوئی آدمی حرام نہیں کھا سکتا۔ حضور اکرم ﷺ کے نہ کھانے کی دو وجوہات تھیں، جو احادیث میں آگئیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے کراہت آتی ہے اور دوسری جگہ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے گوشت سے ایک بدبو پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ مجھے اللہ کے فرشتوں سے ہر وقت ہمکلام ہونا ہوتا ہے اور ان کو یہ بدبو اچھی نہیں لگتی، اس وجہ سے میں نہیں کھاتا۔

حضور اکرم ﷺ لہسن نہیں کھاتے تھے، اگرچہ یہ حلال ہے، لیکن چونکہ منہ میں بدبو پیدا ہوتی ہے، اس لئے

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص تھوم (لہسن) کھالے، وہ مسجد میں نہ آئے۔ کیونکہ اس کے منہ سے ہوا آئے گی۔ یا ان کی بدبو ختم کردو کہ ان کو نمک سے دھوڈالو یا پکا ڈالو، تا کہ بدبو پیدا نہ ہو تو کھا کر مسجد میں جا سکتے ہیں۔

ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ایمان کا ثبوت عقلی دلائل سے:

اللہ پاک نے ہر چیز کو بیان فرمایا ہے۔ لیکن ان جدید لوگوں کو سمجھ نہیں آتا، کیونکہ ان کی عقل پر جرائم اور قرآن کے انکار کی وجہ سے قدرت ایک پردہ ڈال دیتی ہے، حق بات ان دل و دماغ کے اندر داخل نہیں ہو سکتی۔ جن کے دل و دماغ کے اندر سیدنا ابوبکر صدیق، عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا بغض بیٹھ گیا ہو، ان کو لاکھ سمجھاؤ اور حضور اکرم ﷺ کے روضہ پر لے جاؤ کہ حضور اکرم ﷺ کا مزار ہے اور یہ ابوبکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا مزار ہے۔ وہ کہے گا: میں سلام نہیں پڑھتا۔ اللہ کی طرف سے دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔

ایک طرف تو کہتے ہیں کہ مدینہ کی مٹی میں شفاء ہے تو حضور اکرم ﷺ کے روضہ کی مٹی میں کتنی برکت ہوگی۔ جس میں ابوبکر صدیق، عمر فاروق رضی اللہ عنہما سوئے ہوئے ہیں اس میں شبہ ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ جس نے سب سے پہلے کلمہ پڑھا وہ بھی مسلمان نہ ہو تو چودہ سو سال بعد کلمہ پڑھنے والے کا کیا اعتبار سے ہے؟ تمہیں ماں باپ نے پڑھایا اور انہیں محمد رسول اللہ ﷺ نے کلمہ پڑھایا، تیرے ماں باپ کا پڑھایا ہوا کلمہ بڑا پکا ہے اور جن کو میرے نبی نے کلمہ پڑھایا، ان کا کچا تھا۔

تم اپنے بچے کو بزرگ کے پاس یا تبلیغی جماعت کے پاس بھیجتے ہو، وہ ماہ دو ماہ میں ٹھیک ہو جاتا ہے اور جن کی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں زندگی گزر گئی، ان کی کوئی اصلاح نہیں ہوئی؟ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں جو چڑھ جائے وہ عذاب سے جائے اور جو مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ دفن ہو جائے وہ نہ بچے۔

ان کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی۔ ان کو اتنا بغض ہے کہ اپنی کتابوں میں وظیفہ لکھا ہوا ہے کہ صحابہ کا نام لکھ کر جوتا مارنے سے بیماری چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت دے، اللہ ان کی آنکھوں کو کھول دے اور ان سے پردوں کو ہٹادے اور ان کو معنوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت نصیب فرمادے۔

﴿قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ کی ایک تفسیر:

"غُلْفٌ" کا ایک معنی یہ ہے کہ ہمارے دل سمجھتے نہیں ہیں۔ ایک "غُلُفٌ" ہے لام کی جزم کے ساتھ اور ایک

"غُلُفٌ" ہے لام کے ضمہ کے ساتھ۔ اور جب لام کے ضمہ کے ساتھ ہو تو معنی ہوگا کہ ہمارے دل گویا کہ برتن ہیں، تورات وانجیل کے علم سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور وہ کہتے تھے کہ ہمیں تمہارے علم اور کتاب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور ایک قول ہے: "لَمْ تُخْتَنْ" کہ ہمارے دلوں پر پردہ ہے۔ جیسے بغیر ختنہ کے پردہ پڑا ہوتا ہے، اسی طرح گویا کہ ان کے دل ختنہ کئے ہوئے نہیں ہیں، ختنہ اس لئے کرتے ہیں، تاکہ پاکی حاصل ہو جائے، گندی چیز اندر نہ رہے اور انسان کے عضو کا حصہ صاف ہو جائے۔

﴿فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ﴾ ان میں سے نہیں ایمان لائیں گے، مگر تھوڑے لوگ۔ اور ایک ترجمہ یہ ہے کہ نہیں ہے ان کا ایمان، مگر تھوڑا۔ یعنی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعض باتوں پر تو ایمان ہے اور بعض سے انکار ہے، اور تھوڑی باتوں پر ایمان بدلنے سے آدمی مسلمان نہیں بنتا۔ مسلمان تب بنتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی کامل شریعت پر ایمان لائے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آگیا تو ان پر ضروری تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر ایمان لاتے۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا، اب ان کو سابقہ کتابوں پر ایمان کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۳، البقرۃ: الآیۃ: ۸۸]

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۸۹]

اور جب (ان یہودیوں) کے پاس اللہ کی طرف سے کتاب (قرآن) آیا جو تصدیق کرتا ہے اس کی جو اُن کے پاس ہے، یہ (نزولِ قرآن سے) پہلے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے) کافروں پر فتح کی دعا مانگا کرتے تھے۔ پھر جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پاس آئے جن کو یہ حق جانتے تھے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کر دیا۔ پس کافروں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔

گزشتہ آیات سے ربط:

اس آیت کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی مزید شقاوتوں کی خبر دی ہے کہ جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب آئی جو سابقہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کفار یہود کا یہ عالم ہے کہ

جب اللہ تعالیٰ نے قرآن اُتارا اور قرآن جامع، کامل، مکمل کتاب ہے، جو سابقہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے تو اُصولاً اور عقلاً قاعدہ یہ ہے کہ وہ ایسی کتاب کو فوراً مان لیتے کہ اللہ نے ایسی کتاب تو نہیں بھیجی جو اُن کی نفی کر رہی ہو۔

❁......تصدیق ایک تو اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی کتابیں اُتاری ہیں جن میں تورات اور انجیل بھی اللہ کی کتابیں ہیں۔

❁......دوسری تصدیق یہ تھی کہ جن جن لوگوں کو تورات، زبور اور انجیل ملی، وہ اللہ کے برحق پیغمبر، سچے نبی اور سچے رسول تھے۔

❁......تیسری تصدیق یہ تھی کہ جو بنیادی اور اُصولی مسائل ہیں، وہ سب کتب میں یکساں تھے۔ جیسے تورات، انجیل بھی توحید کی دعوت ہے، قرآن میں بھی توحید کی دعوت ہے۔ ان کتب میں بھی نبوت و رسالت کا مسئلہ موجود ہے، قرآن بھی نبوت و رسالت کا مسئلہ سمجھا رہا ہے۔ تورات و انجیل میں بھی معاد کا مسئلہ موجود ہے کہ قیامت برحق ہے، ہم نے مرنا ہے، پھر اُٹھنا ہے۔

اور فروعی مسائل میں اختلاف ہوا، ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور یہ تبدیلیاں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے حسب حال رحم فرمایا اور احکام تبدیل فرما دیے۔

تسبیح و تنزیہ کی وضاحت:

جب تک آدمی کو تین چیزوں کی سمجھ نہ آئے، توحید کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا۔ (۱) تنزیہ، (۲) تسبیح، (۳) تکبیر۔

کتابوں کے اندر ''تنزیہ'' کی تفصیل موجود ہے۔ مختصراً اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ نقصان سے پاک ہے۔ مثلاً: آپ نماز شروع کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ''، رکوع میں کہتے ہیں: ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ''، سجدے میں کہتے ہیں: ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى''، طواف میں کہتے ہیں: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ''، نماز کے بعد وظیفہ پڑھتے ہیں: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ''، اسی طرح قرآن مقدس میں جہاں بھی لفظ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ①﴾ [الحدید:۱]، ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ①﴾ [الجمعۃ:۱]، ﴿وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ إِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝﴾ [بنی اسرائیل:۴۴] آیا ہے، یہ سب تنزیہ ہے۔

تسبیح کا معنی ہوتا ہے: تنزیہ بیان کرنا، اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا کہ ہمارا رب اس صفتِ نقصان سے پاک ہے جو اللہ کی شان کے مطابق نہ ہو۔ ہمارا رب پاک ہے۔ جب تک پاکی کا عقیدہ نہ بنے توحید کی بنیاد نہیں بنتی۔ جیسے

یہودیوں نے تورات کے اندر ایک جگہ تحریف کر کے لکھا ہے کہ جب نوح علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی کہ یہ لوگ اسلام نہیں لاتے، یہ بغاوت میں اتنے پکے ہو گئے ہیں کہ اگر ان کی اور بھی نسل پیدا ہوگی تو وہ کافر ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے دعا مانگی: اے اللہ! اس قوم کو ہلاک اور برباد کر دے۔ اللہ نے دعا منظور کر کے ایک طوفان بھیجا اور ساری دنیا غرق ہو گئی، ماسوائے ان لوگوں کے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے تھے۔

یہودی اس واقعہ کو لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ جب لوگ غرق ہو گئے تو اللہ تعالیٰ...... معاذ اللہ...... رونے لگ گئے اور روتے روتے آنکھیں سوج گئیں، فرشتے عیادت کرنے کے لیے آئے کہ اب آنکھوں میں آرام ہے؟ تکلیف کم ہوگئی ہے؟ جس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ رو رہا ہے، طوفان روک نہیں سکتا،...... نعوذ باللہ...... اللہ رو رہا ہے اور کسی کو بچا نہ سکے۔ یہ تو نقص ہے، اور اللہ تعالیٰ صفتِ نقصان سے پاک ہے۔ جو کمزور ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جب تک تنزیہ کی صفت نہ آئے توحید کا عقیدہ اس وقت تک نہیں آ سکتا۔

اسی لیے یہود و نصاریٰ مارے گئے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا لیا اور بی بی مریم علیہا السلام کو...... نعوذ باللہ...... اللہ کی بیوی بنا دیا، مشرکین مکہ نے اللہ کے تمام فرشتوں کو...... نعوذ باللہ...... اللہ کی بیٹیاں بنا دیا۔ پروردگار عالم کی صفت ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝﴾ ہے، وہ نہ جنتا ہے اور نہ جنا گیا ہے۔ وہ تو دونوں چیزوں سے پاک ہے۔ یہ دونوں چیزیں نقصان اور کمزوری کا باعث ہیں، اللہ ان سے پاک ہیں۔

بعض لوگوں نے نشہ میں بیٹھ کر کتاب لکھ دی کہ اللہ میاں نے حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ سے کشتی لڑی۔ بہر حال اللہ میاں غالب آ گئے، کیونکہ وہ اللہ یہاں دو سال بڑے تھے۔ (کتاب: فوائد فریدیہ) اور کسی نے لکھ دیا کہ اللہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں سیر کر رہے تھے، اللہ میاں کا پاؤں کیلے کے چھلکے پر آ گیا...... نعوذ باللہ...... خدا گرنے لگے تو پیر صاحب نے پکڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم دستگیر ہو۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ تنزیہ کے خلاف ہے، اس کے بغیر توحید کچھ نہیں آ سکتی۔ اللہ نیند سے پاک ہے، ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ کیونکہ نیند نقصان ہے، غفلت ہے۔ اسی طرح مر جانا، فنا ہو جانا صفتِ نقصان ہے، اللہ اس سے بھی پاک ہے۔ اس لئے یہودی، نصرانی اور مشرکین مارے گئے، کیونکہ انہوں نے اللہ کے ساتھ نقصان والی صفتیں جوڑ دیں۔ اس لئے اپنے عقیدہ کو ٹھیک کریں، جب تک توحید نہیں آئے گی، جنت نہیں ملے گی۔

تنزیہ کا معنی ہے کہ تمام کمالات اس کی ذات میں ہیں، وہ سراپا کمال ہے، اس کے کمالات کا کوئی مقابلہ نہیں

کرسکتا۔

تکبیر کا معنی ہے کہ وہ سب سے بڑا ہے، ساری دنیا اس سے نیچے، ساری دنیا اس کی محتاج، ساری دنیا اس کے بندے، اس سے مانگنے والے ہیں، کبریائی صرف اسی کی ذات کو زیبا ہے۔ جب تک دل میں خدا کی بڑائی نہ بیٹھے، اس وقت تک توحید نہیں آسکتی۔ اگر ہمارے دماغ کے اندر ہو کہ فلاں بڑا ملک ہے، فلاں سپر طاقت ہے۔ یہ مسلمان کے عقیدے کے خلاف ہے۔ سپر طاقت اللہ ہے، وہ سب سے بڑا اور سب سے عظمت والا ہے، وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ [البروج:١٦] ہے، سب اسباب کے محتاج ہیں اور اللہ خالق الاسباب ہیں۔ اگر تیرے دل و دماغ میں اللہ سے بڑا اور کوئی ہے تو تُو کافر ہے، مسلمان ہیں اور اگر تُو خدا کی عظمت کے مقابلے پر کہتا: یا پیر! یا معین الدین! یا غوث الاعظم! کہے تو یہ خداؤں کی لسٹ لگ گئی ہے، سب پکار میں برابر آگئے اور جو خدا کے برابر کسی کو جانے، وہ مسلمان نہیں ہوتا۔

ہم اللہ کے ولیوں کے دشمن نہیں ہیں، اللہ کے ولیوں کا دشمن کافر ہوتا ہے۔ اللہ کے ولی برحق ہیں، اللہ کے ولیوں کی کرامات کا قرآن میں بیان ہے، ان کا کوئی انکار نہیں کرسکتا اور یہ بھی نہیں کہ تم ولی کو نبی بنادو اور نبی کو خدا بنادو۔ نبی نبی ہوتا ہے، ولی ولی ہوتا ہے اور خدا خدا ہوتا ہے۔ اگر تم نے اللہ کی عظمتوں کے برابر کسی کو کیا تو تم مر گئے، کافر ہو گئے۔ اسی مسئلے کے اندر یہود اور نصاریٰ مارے گئے، جس میں آج جاہل مسلمان مبتلا ہیں۔

تفسیر:

قرآن میں کہیں لفظ "الکتاب" معرّف باللام آتا ہے، جیسے: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ﴾ اور کہیں "کتابٌ" تنکیر کے ساتھ آتا ہے، جیسے: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ﴾ اور ﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ﴾۔ جہاں لفظ "کتاب" معرّف باللام ہو تو مراد "قرآن" ہوتا ہے اور جہاں تنکیر کے ساتھ آئے، وہاں کتاب کی عظمتِ شان کا بیان ہوتا ہے کہ کتاب کہلانے کا مستحق قرآن ہے، باقی سب کتابیں اسی کی محتاج ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی حدیث اسی کی تفسیر ہے۔

﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ اور ایسی کتاب جو تصدیق کرنے والی ہے اس شریعت کی جو اُن کے پاس ہے۔

﴿وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ حال یہ ہے کہ یہ مدد مانگتے تھے ان لوگوں پر جو کافر ہیں۔ یعنی جب یہود کا کافروں سے مقابلہ ہوتا یا لڑائی جھگڑا ہو جاتا تو کافروں کو کہتے تھے کہ تم ہمارے ساتھ لڑو، تمہارے لڑنے کے ابھی تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ ایک نبی آخر الزمان پیدا ہوگا، جس کا نام "محمد" ہوگا، ہم اس پر ایمان

لائیں گے اور اس نبی کے غلام اور اُمت بن کر تم سے لڑیں گے اور ہم تمہیں ایسے کاٹ ڈالیں گے جیسے قوم عاد اور قوم ارم کو کاٹا گیا تھا۔ ﴿فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ﴾ [البقرۃ:۸۹] پس لعنت ہو اللہ کی ان پر جو انکار کرنے والے ہیں۔ یہاں "کافرین" سے مراد یہود ہیں، کیونکہ بنو اسرائیل کا قصہ چلا آرہا ہے، ورنہ اللہ کی لعنت ہر کافر پر ہے، چاہے وہ کافر کسی نسب میں ہو یا کسی قوم میں ہو۔

حضرت عاصم بن عمرو حضرت قتادہ الانصاری سے اور وہ اپنے بزرگوں سے روایت نقل کرتے ہیں۔ خدا کی قسم ہے! یہ آیات ہمارے اور اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ یہودی کہتے تھے: وہ زمانہ قریب آگیا ہے جب اللہ کے نبی پیدا ہوں گے، ہم ان کی اتباع کریں گے، ان کے آنے کا وقت قریب آچکا ہے، ان کی اتباع کرنے کے بعد جب ہم ان سے مل جائیں گے تو ہم تم سے سارے بدلے لیں گے، تمہیں ایسے قتل کریں گے جیسے عاد اور ارم کو کیا گیا۔

اور ان کو یہ خیال تھا کہ وہ ہمارے درمیان پیدا ہوگا۔ لیکن جب اللہ نے قریش بنو ہاشم میں نبی پیدا فرمایا تو الحمد للہ! ہم نے حضور اکرم ﷺ کی غلامی کی اور یہ یہود کافر ہو گئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ﴾ [البقرۃ:۸۹] کفر کرنے والوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول یہ بھی ہے: ﴿وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا﴾ [البقرۃ:۸۹] کا معنی ہے کہ جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خاتم الانبیاء پیدا ہوں گے تو ہم ہم حضور اکرم ﷺ کی امداد کریں گے اور ان (مشرکین) کے خلاف لڑیں گے اور ان سے بدلہ لیں گے۔ حالانکہ یہ بات نہیں تھی، وہ جھوٹ بولتے تھے۔

محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک واقعہ کیا ہے کہ یہودی حضور اکرم ﷺ کی ذات سے اوس اور خزرج کے قبیلوں کے خلاف مدد پکڑتے تھے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت بشر بن البراء بن معرور رضی اللہ عنہ نے کہا: اے یہودیو! تمہیں کیا ہو گیا؟ تم اللہ سے ڈرو اور حضور اکرم ﷺ پر ایمان لے آؤ۔ تم لوگ ہی ہمیں حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے بارے میں خبر دیتے تھے، حضور اکرم ﷺ کی صفات تم بیان کرتے تھے، حضور اکرم ﷺ کی نشانیاں تم بتانے والے تھے۔ اب جب اللہ کے نبی آگئے ہیں تو تم کفر کرتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور ایمان لے آؤ۔ وہ کہنے لگے: جو ہم نے تم کو کہا تھا، یہ وہ نبی نہیں ہیں اور جو ہم تم کو صفات بیان کرتے تھے، وہ ان میں نہیں ملتیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲۴، البقرۃ: الآیہ: ۸۹]

چودہ سو سال بعد بھی بخاری شریف کو حفظ کرنے والے:

ہمارے ایک ساتھی نے کچھ سال قبل ایک مدرسہ بنایا اور ایک نیا سلسلہ شروع کیا کہ اپنے مدرسہ میں طلبہ کو ''بخاری شریف'' حفظ کراتے ہیں۔ ماشاء اللہ! سنا ہے کہ کئی لڑکے حافظ بن گئے۔ بڑی بات ہے کہ چودہ سو سال بعد اللہ نے حضور اکرم ﷺ کی حدیث کی حجیت کو ثابت کرنے کے لئے ایسا ذریعہ پیدا کر دیا۔

حدیث پاک گویا قرآن پاک کی تفسیر ہے۔ حالانکہ حافظے ختم ہو گئے۔ پہلے دور میں عام بدو کو بھی پچاس ہزار اشعار یاد ہوتے تھے، جب پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے تو لگاتار دو تین دن یاد سے پڑھ رہے ہیں۔ اس انحطاط اور بدعملی کے دور میں کہ جب ہم نام کے مسلمان رہ گئے ہیں، ایسی مثال سامنے آجائے کہ بخاری شریف یاد ہو جائے، کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ بخاری شریف عظیم کتاب ہے اور ''اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللّٰہِ'' ہے، اللہ کے قرآن کے بعد صحیح کتاب ہے، سوائے مرجوع و منسوخ روایات کے اس پر آدمی آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتا ہے۔ اللہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر اور تمام محدثین اور تمام ائمہ فقہاء کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ مسلمانوں کا کوئی ایسا مدرسہ نہیں ہو سکتا جہاں بخاری شریف نہ پڑھائی جاتی ہو۔

روس سے آزاد شدہ ریاستوں میں احیائے دین:

ان بزرگوں نے جو اثرات ثمرقند و بخارا میں چھوڑے تھے، وہاں کمیونسٹ نے ستر سال تک تالے لگا کر رکھے۔ ستر سال کے بعد جب تالے ٹوٹے ہیں تو وہاں قرآن و حدیث موجود ہے۔ اللہ پاک ان لوگوں کو جزائے خیر دے جو وہاں کام کر رہے ہیں۔ ہمارے ساتھی ہیں اور ایک والد صاحب کے شاگرد اور ایک میرے شاگرد بھی ہیں۔ انہوں نے ایک سو چھپن مساجد کی ان ریاستوں کے اندر بنیاد رکھی ہے۔ دو سو استاد وہاں قرآن و حدیث پڑھا رہے ہیں اور دس ہزار طالب علم پڑھ رہے ہیں۔ یہ محنت ہمارے ساتھیوں کی ہے اور جو پوری دنیا کر رہی ہے اس کا پتہ نہیں ہے۔

تعلیم الاسلام، تقویۃ الایمان، حضرت مفتی کفایت اللہ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور اسی طرح اور بزرگوں کی کتابیں اُزبک زبان کے اندر لاکھوں کی تعداد میں تراجم ہو کر شائع ہو گئے ہیں۔ شیخ نعمان صاحب ان کے آباؤ اجداد تاشقند کے ہیں، بتاتے ہیں کہ وہاں اتنی پابندی کے باوجود لڑکے تو لڑکے، لڑکیاں بھی حافظاتِ قرآن

موجود ہیں، یعنی لوگوں کے سینوں سے اسلام نہ نکل سکا۔ بظاہر دشمن نے دبائے رکھا، مسجدیں بند ہیں، اذانیں نہیں ہوتی تھیں، جماعت نہیں ہوتی تھی، لیکن اسلام کو کوئی دبا نہیں سکتا۔ اللہ نے اس میں ایک ایسی قوت رکھی ہے کہ اس کو آپ جتنا مٹائیں گے، یہ اتنا اُبھرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم پھونکیں مار کر یہ چراغ بجھا ڈالیں۔ تم جتنی بجھانے کی کوشش کرو گے اللہ اس نور کو اتنا چمکائے گا۔

یہ گناہوں کی وجہ سے جھٹکے لگ جاتے ہیں، ورنہ اگر ہم اللہ کی طرف لوٹیں تو اللہ کی رحمت دیر ہی نہیں کرتی ہے۔ آپ ایک قدم آگے بڑھیں، اللہ کی رحمت دس قدم آگے آتی ہے۔

آسمان وزمین میں پہلا گناہ حسد تھا:

علماء نے لکھا ہے کہ سب سے پہلا گناہ جو آسمانوں میں ہوا وہ بھی حسد ہے اور سب سے پہلا گناہ جو زمین پر ہوا وہ بھی حسد ہے۔ ابلیس نے آسمانوں پر حسد کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ شان مل گئی اور مجھے نہ ملی۔ اور زمین میں قابیل نے اپنے بھائی ہابیل سے حسد کیا کہ اس کے حصے میں بیوی بھی خوبصورت آگئی اور اس کے حصے میں نیکی بھی آگئی اور وہ جو خیرات کرتا ہے اللہ قبول کر لیتے ہیں، میں جو کرتا ہوں وہ قبول نہیں ہوتی، اور آدم علیہ السلام کو بھی ان سے زیادہ محبت ہے، قابیل حسد میں جتلا ہوا اور اس نے اپنے بھائی کو قتل کر ڈالا۔

حسد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھے اور یہ تمنا کرے کہ اس سے یہ نعمت زائل ہو جائے اور مجھے مل جائے۔ اس طرح کسی کی عزت کو دیکھ کر حسد کرنا، اقتدار، دولت کو دیکھ کر حسد کرنا، کسی کی اولاد کو دیکھ کر حسد کرنا۔ حاسد اللہ کی تقسیم قسمت کا منکر ہوتا ہے، اللہ کے فیصلے کا انکار کرتا ہے کہ اس کو امیر کیوں بنایا ہے؟ اور مجھے غریب کیوں بنایا ہے؟ وہ الد کی تقدیر کا منکر ہوتا ہے۔ دعا کریں اللہ ہر مسلمان کو حسد سے بچائے۔

''غبطہ'' علیحدہ چیز ہے۔ ''حسد'' کا معنی ہوتا ہے: دوسرے سے زوالِ نعمت کی نیت کی جائے۔ ''غبطہ'' یہ ہے کہ کسی آدمی کو دیکھا، مثلاً بڑا تہجد گزار ہے، شب بیداری کرتا ہے اور اس کی اولاد بھی بڑی فرمانبردار ہے، اللہ نے اس کو دین اور دنیا بھی دی ہوئی ہے، وہ کہتا ہے: اے اللہ! اس کو بھی مبارک کر اور مجھے بھی عطا فرما۔

حاسد آدمی اپنے حسد میں خود جلتا رہتا ہے، یہ اس کے لئے سب سے بڑی سزا ہے۔ اس لیے حسد سے بچیں۔ یہودیوں نے جو بربادی قبول کی، اس کی وجہ حسد تھا۔ کیونکہ عربوں سے ان کا جھگڑا تھا اور نبوت عرب میں آگئی تو

انہوں نے کہا: ہم نہیں مانتے۔ ابوجہل جانتا تھا اور اقرار کرتا تھا کہ یہ نبی بالکل سچے ہیں۔ اس سے کہا گیا: مانتے کیوں نہیں ہو؟ اس نے کہا: ہمارے اور ان کے خاندان کا مقابلہ ہے، کبھی ان کا امیر بنتا ہے اور کبھی ہمارا امیر بنتا ہے۔ اب ان کے خاندان میں نبوت آگئی تو ہم نبی تو نہیں بن سکتے، اس لئے ان کو نہیں مانیں گے۔ یہ بھی حسد تھا۔

﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰي غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ [البقرۃ: ۹۰]

جس کے بدلہ میں انہوں نے خود کو بیچا یہ کہ انہوں نے کفر کیا اس کا جس کو اللہ نے اُتارا حسد کرتے ہوئے، اللہ اپنے فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (رسول بنا کر وحی) اُتارے۔ پس یہ (اللہ کی طرف سے) غصہ پر غصہ کے ساتھ لوٹے اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

ان آیات میں بنی اسرائیل کی مزید بدبختی، غلط عقائد اور غلط اعمال کے بارے میں ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے کیا بُرا سودا کیا ہے۔

مفسرین نے یہاں ﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ﴾ میں دو قول نقل کیے ہیں: چنانچہ بعض مفسرین فرماتے ہیں: "اِشْتَرَوْا" شِرَاء (خریدنا)، یعنی کیا بُری چیز انہوں نے اپنے نفسوں کے بدلے میں خریدی۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ لفظ "شِرَاء" کبھی بیع میں بھی استعمال ہوتا ہے کہ کیا بُرا سودا کیا کہ انہوں جانوں کو بیچ ڈالا۔ جس کو بیچا وہ جان ہے اور جو اس کے بدلے میں خریدا وہ کفر ہے۔ اتنا بڑا گھاٹے کا سودا ہے کہ اپنی جانوں کو دے کر کفر کر لیا۔ یا اس کا معنی ہے کہ انہوں نے کفر کے بدلے میں اپنی جانوں کو خرید لیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے...... نعوذ باللہ...... جیسے آدمی کوئی چیز خرید کر اس کا مالک بن جاتا ہے کہ ہم نے اپنی جانیں خرید لی ہیں، اب ہم پر کیسے عذاب ہو سکتا ہے؟ ان جانوں کے اندر اور کسی کا تصرف کیا ہو سکتا ہے؟

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ پر انکارِ ختم نبوت کا اعتراض و جواب:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "تحذیر الناس" میں بڑی عظیم اور بڑی دقیق بحث کی ہے، اس کے پڑھنے اور سمجھنے کے لیے علم کی ضرورت ہے۔ ہم جیسے طالب علموں کی فکر سے بالاتر کتاب ہے۔ اس بحث

سے مخالفین، مبتدعین نے بڑا شور مچایا ہے کہ یہ دیوبندی حضور اکرم ﷺ کو آخری رسول نہیں مانتے۔

اصل وجہ یہ ہے کہ ان بے چاروں کو بات سمجھ نہ آئی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ ایک چیز آخری ہوتی ہے اور اس کا آخری ہونا حقیقی ہے یا اس کا آخری ہونا مجازی یا صوری ہے۔ (اب اتنے دقیق مسئلے کو سمجھنے کے لئے بہت بڑے علم کی ضرورت ہے)۔ حضور اکرم ﷺ کو اللہ نے جو خاتم الانبیاء والمرسلین بنایا ہے تو آپ ﷺ کا آخری ہونا صرف ظاہری نہیں، بلکہ ظاہری بھی ہے اور باطنی بھی ہے، حقیقی بھی ہے اور معنوی بھی ہے۔ اب جو حقیقی آخر ہوگا اس کا آخری ہونا اتنا محقق ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی اگر علی سبیل المثال کوئی اور چیز آئے تو اس کے آخری ہونے کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس کی ابتداء ''سورۃ الفاتحہ'' سے کی اور سب سے آخری ''سورۃ الناس'' ہے، حالانکہ باعتبار نزول کے سورۃ الناس آخری نہیں ہے اور سورۃ الفاتحہ باعتبار نزول کے اول آیت نہیں ہے، بلکہ سورۃ العلق کی پانچ آیات ہیں اور آخری آیات ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدۃ:۳] اور ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ①﴾ [النصر:۱] اور ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾ [البقرۃ:۲۸۱] جو آخری وقت میں نازل ہوئیں، لیکن ترتیب نزول الگ تھی اور ترتیب قراءت میں آخری سورۃ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ①﴾ [الناس:۱] ہے۔

اس پر علماء نے ایک نکتہ بھی لکھ دیا ہے جیسے سورۃ الفاتحہ شروع کرتے ہیں تو کیسے پڑھتے ہیں؟ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ آپ حرف باء سے شروع کریں گے اور جب ختم کریں گے تو ''النّاس'' کے سین پر ختم کریں گے۔ اور جب ان دونوں کو ملائیں گے تو مطلب یہ ہوگا کہ بات ختم ہوئی۔ اگر بفرض محال آج اگر کوئی آدمی اپنے پاس ترجمہ پڑھنے کے لئے سورتیں لکھے کہ سورۃ الناس پہلے لکھ دے اور سورۃ الفاتحہ بعد میں لکھ دے تو کیا اس میں سورۃ الناس کے آخری ہونے میں کوئی خطرہ ہوسکتا ہے؟ کیونکہ ہر آدمی کہے گا کہ سورۃ الناس بعد میں ہے، اس بے چارے نے پڑھنے کے لئے پہلے لکھ دی ہے۔

یہی بات حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے فرمائی تھی۔ لوگوں نے اس کو سمجھا نہیں اور فتوے لگانے شروع کر دیئے کہ اب اگر آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی آ بھی جائے تو آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ حضور اکرم ﷺ حقیقتاً بھی آخری ہیں، ظاہراً بھی آخری ہیں اور معنوی طور پر بھی آخری ہیں۔ اس لئے

اب اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُتریں گے تو ان سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ وہ تو پہلے سے نبی تھے اور وہ بنو اسرائیل کے آخری نبی تھے، اس کے بعد حضور اکرم ﷺ آ گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اس طرح آخری بنتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے خاندان میں آخر میں آئے اور ان کا اس طرح آخری ہونا کوئی حقیقی نہیں تھا۔ حقیقی ختم نبوت کا تاج حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملا۔

اس کی حضور اکرم ﷺ نے کافی پیاری مثال دی ہے کہ ایک عام آدمی کو بھی سمجھ آ جائے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزیں ہیں: پہلی چیز ہے: ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ'، اگر اللہ کی توحید پر اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر ایمان نہیں تو بات ختم ہو گئی۔ جب ایمان آ گیا تو اقامت صلوٰۃ (نماز کا قائم کرنا)، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا، اللہ کے گھر کا حج طاقت والوں کو ادا کرنا، اب آ کر اسلام مکمل ہو گیا۔

اب اگر ایک آدمی زکوٰۃ نہیں دیتا تو گویا ایک دیوار نہیں، روزے نہیں تو دوسری دیوار نہیں، اگر نماز نہیں تو تیسری دیوار ختم، دولت کے باوجود حج نہیں کرتا تو چوتھی دیوار ختم اور اگر کلمۂ توحید ہی نہیں تو اصل ہی ختم ہو گیا۔ حضور اکرم ﷺ نے بناء کے ساتھ مثال دی، تاکہ ہر آدمی کو مثال سمجھ آ سکے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے اپنی ختم نبوت کی مثال بڑی عجیب بیان فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی بلڈنگ بناتا ہے، ساری اینٹیں لگ گئیں اور صرف ایک اینٹ اس میں نہیں لگی۔ جو بھی دیکھنے والا آئے گا تو کہے گا: ماشاء اللہ! عمارت تو مکمل ہو گئی ہے، ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے، یہاں اینٹ لگنی چاہیے تھی۔ جب وہ اینٹ لگا دو تو عمارت مکمل ہو گئی۔ اب ایک محل میں مثلاً ایک لاکھ چوبیس ہزار اینٹیں لگانے کی جگہ تھی، ایک اینٹ باقی تھی، جب وہ لگ گئی تو جگہ نہ رہی۔ اگر آپ ایک اور اینٹ لگائیں گے تو کہاں لگائیں گے؟ اس لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: نبوت کے محل میں جو آخری اینٹ کی جگہ تھی، وہ اللہ نے مجھے بھیج کر مکمل کر دی ہے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۳۵۳۵، باب: خاتم النبیین ﷺ]

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے ختم نبوت کی تین قسمیں قرار دی ہیں: (۱) ختم نبوت مکانی (۲) ختم نبوت زمانی (۳) ختم نبوت مرتبی۔ ختم نبوت کا مرتبہ تو حضور اکرم ﷺ کو سب انبیاء کے بعد نبی بنانے سے پہلے مل گیا تھا، باقی انبیاء کو نبوت کا مرتبہ بعد میں ملنے سے آپ ﷺ کی ختم نبوت پر کوئی فرق نہیں پڑا، اسی طرح حضور اکرم ﷺ اس وقت بھی خاتم النبیین تھے جب باقی انبیاء دنیا میں آتے رہے۔ آپ ﷺ زمانہ کے اعتبار سے خاتم النبیین ہیں،

جب آپ ﷺ دنیا میں تشریف لائے تو پھر اور کوئی نیا نبی نہیں آ سکتا اور نہ ہی مکانی طور پر کوئی آپ کے بعد نبی بن سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے متعلق آپ ﷺ نے خود ہی فرما دیا تھا جبکہ وہ نئے نبی نہیں، وہ بھی اپنی نبوت کے ساتھ حضور اکرم ﷺ سے پہلے آ چکے ہیں۔

اگر اب بھی کوئی فتنہ پرور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ پر انکار ختم نبوت کا الزام لگائے تو اس کی اپنی حماقت ہے۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے تو اس بات میں حضور اکرم ﷺ کی ختم نبوت کی عظمت ہی آشکارا ہو رہی ہے۔ (امداد اللہ انور)

ان آیات کے اندر بھی مثال دی ہے کہ ان لوگوں نے اپنی جانوں کے بدلے کفر کو خریدا بغض اور عناد کی وجہ سے کہ اللہ نے بنو اسرائیل کی بجائے اپنا نبی بنو اسماعیل میں کیوں بھیجا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ میری مرضی اور میرا فضل ہے، میں جس پر چاہوں فضل کروں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جیسے روزی تقسیم کرنے میں ہم سے نہیں پوچھتے تو نبوت والی نعمت کی تقسیم میں وہ ہمارے کیسے محتاج ہو سکتے ہیں؟ اس کی مرضی ہے۔ ان کے سودے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے غضب پر غضب کے مستحق ہوتے گئے اور ان میں اگر اور برائیاں نہ بھی ہوں تو کفر ہی عذاب کے لئے کافی ہے۔ کافروں کے لئے اہانت لگانے والا عذاب ہے۔

مسلمان کو عذاب ہونے کی وجہ:

اس سے ایک اندازہ نکلا کہ مسلمانوں کو بھی عذاب ہو سکتا ہے۔ (اللہ تبارک وتعالیٰ ہر مسلمان کو بغیر عذاب اور بغیر حساب کے جنت نصیب فرمائے)۔ اللہ پاک چاہیں تو مسلمان کو بھی عذاب ہوگا، لیکن وہ عذاب اہانت والا نہیں ہوگا، وہ صرف کافروں کو ہوگا۔ جیسے کپڑا میلا ہو جائے تو اس کو گرم پانی میں ڈالتے ہیں، گرم پانی میں بھی صاف نہ نکلے تو اس میں کیمیکل ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں: اس کو بھی بھٹی پر چڑھاؤ۔ اب اس کپڑے کو جلانا مقصد نہیں ہوتا، بلکہ اس کی میل کو جلانا مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اگر کسی گناہ گار مسلمان کو جہنم میں ڈالا تو اس کے گناہوں کو جلانا اور اس کو پاک کرنا مقصود ہوگا۔ جب وہ پاک صاف ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دیں گے۔ اس لئے مومن کے عذاب میں اور کافر کے عذاب میں بڑا فرق ہے، کافر کو عذاب اہانت کے لیے ہوگا اور مسلمان کو عذاب طہارت کے لیے ہوگا۔

﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی پہلی ناراضگی یہ تھی کہ انہوں نے تورات پر عمل نہ کیا اور اس کو بدل ڈالا۔ پھر اللہ تعالیٰ کا غضب آیا کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے دشمن بن

گئے۔﴿فَبَاءُوْ﴾ کا معنی ''رَجَعُوْا'' بھی ہے اور ''اِسْتَوْجَبُوْا'' بھی ہے کہ وہ اس بات کے مستحق بن گئے، اپنے اوپر اللہ کے قہر کو واجب کر لیا۔

حضرت ابو العالیہ فرماتے ہیں کہ پہلے ان پر غضب اس بات پر آیا کہ انہوں نے انجیل کا بھی انکار کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی انکار کیا اور پھر ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب اس لئے آیا کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کا انکار کیا اور قرآن کا بھی انکار کیا۔

حضرت سدی فرماتے ہیں کہ یہود پر پہلا غضب اس وقت ہوا جب انہوں نے گائے کے بچھڑے کی عبادت کی تھی، اس کو خدا بنا لیا تھا۔ اور دوسرا غضب اس وقت آیا جب انہوں نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ کفر کیا۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۲۵، البقرۃ:الآیۃ:۹۰]

اللہ پاک ہمیں ان واقعات کے ذریعے سے جگاتے ہیں کہ تم بھی اگر ایسا کرو گے تو تم پر بھی غضب پر غضب آئیں گے، کبھی تم پر زلزلے آئیں گے اور کبھی کافر تم پر مسلط ہو جائیں گے اور کبھی تم پر غضب آئے گا کہ تمہاری اولادیں نافرمان ہو جائیں گی اور کبھی تم پر قحط پیدا کر دوں گا، کھانے کے لئے کچھ نہیں ملے گا اور کبھی تم پر غضب آئے گا کہ بارشیں نہیں ہوں گی اور کبھی تم پر غضب آئے گا کہ زمینیں اپنی برکتیں چھوڑ دیں گی۔ یہ ہماری نافرمانیوں کی وجہ سے آتا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾ وَلَقَدْ جَاءَكُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٩٢﴾﴾ [البقرۃ:۹۱،۹۲]

اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ (اس قرآن) پر جس کو اللہ نے اُتارا ہے، کہتے ہیں: ہم تو اس (تورات) پر ایمان رکھیں گے جو ہم پر اُتاری گئی، حالانکہ یہ انکار کر رہے ہیں جو اس کے بعد آئی (یعنی قرآن) اور یہ حق ہے، تصدیق کرتی ہے اس تورات کی جو اُن کے پاس ہے۔ کہہ دیجیے پھر تم نے اللہ کے انبیاء کو اس سے پہلے کیوں قتل کیا؟ اگر تم (تورات پر) ایمان رکھتے تھے۔ اور تمہارے پاس موسیٰ معجزات لے کر آئے، پھر تم نے ان کے (میقات پر جانے کے) بعد بچھڑے کو (معبود) بنا لیا اور تم حد سے گزر گئے تھے۔

ان آیات میں بھی بنی اسرائیل کی شقاوت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ جب ان کو ایمان کی دعوت دی جاتی ہے کہ قرآن پر ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں: ہم تو صرف اسی کتاب پر ایمان لائیں گے جو ہم پر اُتری ہے۔ تورات کے علاوہ جتنی کتابیں ہیں ان کا انکار کرتے ہیں۔ انجیل کا انکار کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا، بلکہ ان پر ایسی تہمتیں لگائیں جو کسی شریف انسان سے متوقع نہیں ہوسکتیں، قتل کرنے کی کوشش بھی کی۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا: ان کو کہیں کہ اگر تم واقعی تورات پر ایمان لاتے ہو اور تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ ہم اس کتاب پر ایمان لائیں گے جو ہمارے پیغمبر پر اُتری ہے تو پھر تم نے اس پہلے انبیاء کو کیوں قتل کیا؟ کیا تورات میں.....نعوذ باللہ...... یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کردو؟ ایک دو نبی نہیں، بلکہ اللہ کے سینکڑوں انبیاء کو تم نے قتل کیا۔

تم دعویٰ کرتے ہو کہ ہم صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی مانیں گے اور کتاب تورات کو مانیں گے، اس کے علاوہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی نہیں مانتے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں مانتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: موسیٰ تمہارے پاس کھلی نشانیاں معجزات عصا، ید بیضا لے کر آئے، لیکن ان معجزات کو دیکھنے کے بعد بھی تم نے بچھڑے کی عبادت شروع کردی تھی۔

یہود و نصاریٰ کافر کیوں؟

ایک مسئلے کو ذہن میں رکھنا! آج کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس دھوکہ میں ہے کہ نصرانی، یہودی ان سب لوگوں کو آپ کافر کہتے ہیں، جہنمی کہتے ہیں، حالانکہ وہ بھی اللہ کی ایک کتاب کو مانتے ہیں۔ تورات کو، انجیل کو، اللہ کو، آخرت کو، جنت کو، جہنم کو مانتے ہیں اور اچھے اچھے کام کرتے ہیں، جہاں مسلمانوں کو تکلیف ہوتی ہے دوائیں لے کر پہنچ جاتے ہیں، جہاں سردی ہوتی ہے وہاں رضائیاں اور کمبل پہنچاتے ہیں، جہاں قحط پڑتا ہے وہاں آٹا، گندم، دالیں اور کھانے کی چیزیں پہنچاتے ہیں، ایسے شریف آدمیوں کو ہم بلاوجہ کافر اور جہنمی کیوں کہہ دیں؟ ان کے مقابلہ پر دیکھو کہ مسلمان چوری کرتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں، ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں، سود کھاتے ہیں۔ اس طرح وہ تقابل کا ایک نقشہ کھینچتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں یہود و نصاریٰ کی محبت پیدا ہوجائے۔ اگر یہی بات ہوتی تو جو یہودی اور نصرانی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے، وہ بھی تو ایک کتاب کے ماننے کے دعوے دار تھے تو پھر ان کو ایمان کی دعوت دینے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یہ فرماتے کہ تم اپنی کتاب کو مانتے رہو، ہم

اپنی کتاب کو مانتے ہیں، تم بھی مسلمان ہو ہم بھی مسلمان ہیں۔

یاد رکھیں! جب پہلی شریعت ختم ہو جائے اور پہلی کتاب کو منسوخ کر دیا جائے تو عقل کا اندھا آدمی بھی جانتا ہے کہ کسی ملک میں انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کو اگر منسوخ کر دیا جائے تو کوئی آدمی یہ حوالہ نہیں دے سکتا کہ پہلے یہ قانون موجود تھا۔ کیونکہ کورٹ کہے گی کہ یہ قانون اگرچہ پہلے موجود تھا، لیکن اب تو موجود نہیں ہے۔ اس لئے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تو پہلی شریعت منسوخ ہوگئی، اس وقت جو آدمی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا اور عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لایا تو وہ کافر کہلائے گا۔ اسی طرح جب حضور اکرم ﷺ تشریف لے آئے تو ساری شریعتیں ختم، تمام ادیان ختم ہو گئے، اللہ نے آپ ﷺ کے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دیا۔ اب حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں کوئی آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلمہ پڑھے یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلمہ پڑھے یا وہ دعویٰ کرے کہ میں تورات پر عمل کرتا ہوں یا انجیل پر عمل کرتا ہوں تو وہ کافر کہلایا، کیونکہ اس نے حضور پاک ﷺ کا کلمہ نہیں پڑھا اور اللہ نے جو حضور اکرم ﷺ پر کتاب اُتاری ہے، اس پر ایمان نہیں لایا۔

یاد رکھیں کہ ایک نبی کا انکار کرو یا ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کا انکار کرو، بات برابر ہے۔ یعنی آپ قبلہ کا انکار یا ساری مسجدیں جن کا رُخ قبلہ کی طرف ہے، ان کا انکار کریں، ایک جیسا ہے۔ کیونکہ تمام مساجد کا قبلہ کعبۃ اللہ ہے۔ تو جب سب سے افضل اور سب سے اعلیٰ خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے وعدے لئے کہ جب میرے نبی کا زمانہ آئے تو ان کی مدد کرنا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ وہ ان کے بعد آئیں گے تو انبیاء سے وعدہ لینے کی کیا ضرورت تھی؟ مقصد یہ تھا کہ حضور اکرم ﷺ کی عظمت واضح ہو جائے کہ جب ہم نبیوں سے یہ وعدے لئے جا رہے ہیں کہ اگر تم کو میرے نبی محمد مصطفیٰ کا زمانہ ملے تو ان کی اتباع کرو گے، اس لئے حضور اکرم ﷺ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر ناراض ہوئے جب وہ تورات حضور اکرم ﷺ کو سنانے لگے۔ آپ ﷺ جلال میں آ گئے اور فرمایا: اے عمر! اگر آج خود موسیٰ علیہ السلام میرے زمانہ میں موجود ہوتے تو وہ بھی میری اتباع کرتے اور تم قرآن کے ہوتے ہوئے تورات پڑھ رہے ہو؟

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۱۹۴، باب: الاعتصام بالکتاب والسنۃ]

دوسری بات سمجھ لیں کہ پوری دنیا میں جتنے باطل مذاہب ہیں، ایک تو اس وجہ سے کافر ہیں کہ ان کا قرآن پر ایمان نہیں ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان نہیں ہے، اس لئے ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ جو اللہ کی

توحید کا منکر ہے اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے، جو حضور اکرم ﷺ کی رسالت کا منکر ہے اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں، اللہ تعالیٰ کے قرآن کی صداقت اور حقانیت کا جو منکر ہے اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ وہ تو اپنے نبیوں کی کتاب کو بھی نہیں مانتے اور جو اُن کے پاس کتاب ہے اس کو بدل ڈالا، اللہ کی توحید کے مقابلہ پر تثلیث کا عقیدہ پیدا کیا، کسی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنادیا اور کسی نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنادیا، کسی نے بی بی مریم علیہا السلام کو اللہ کی بیوی بنادیا، کسی نے کہا: ان تین میں سے ہر ایک خدا ہے۔ جب یہ عقیدے گھڑ لیے تو اس وجہ سے بھی وہ کافر ہیں۔ جو اللہ کی ذات اور صفات میں شرک کرنے والا ہے اس کے کفر کے اندر کسی کو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا یہ کہنا کہ شریف آدمی ہیں، لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ کسی کی مدد کرنے سے کسی کا جرم ختم نہیں ہو جاتا۔ مثلاً ایک ڈاکو ڈاکہ مار کر غریبوں میں مال تقسیم کر دے تو کوئی عقل والا آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ بڑا اچھا کام ہے۔ یہ کونسی انسانیت ہے کہ دو انسانوں کو قتل کر و اور چار انسانوں کو کھلا دو۔ اس لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس کو میری نبوت کا زمانہ ملا اور مجھ پر ایمان نہیں لے آیا، وہ یہودی ہو یا نصرانی ہو یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو، وہ کافر ہے۔ چونکہ میں آخری نبی ہوں اور میری شریعت آخری شریعت ہے، مجھ پر جو کتاب اُتری ہے وہ آخری کتاب ہے اور میری نبوت کے بعد جو آدمی میری نبوت اور رسالت پر ایمان نہ لے آئے، اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

اگر کوئی آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا، پھر حضور اکرم ﷺ پر ایمان لے آیا تو ہم ان کو دہرا اجر دیں گے، ایک اپنے نبی پر ایمان لانے کا اور ایک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لانے کا۔ لیکن اگر ایک نبی کا انکار کرے تو گویا ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کا انکار کر دیا، کیونکہ جو کسی ایک نبی پر ایمان لے آئے، اس کو سارے انبیاء پر ایمان لانا ہوگا۔ جیسے فرمایا: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ﴾ [البقرۃ:۲۸۵] ہم اس میں کوئی تفریق نہیں کریں گے کہ اس رسول پر ایمان لائیں اور اس پر ایمان نہ لائیں۔

خدا کی توحید کو بلا دلیل کے مانو:

کتب میں لکھا ہے کہ امام رازی رحمہ اللہ کو ایک خیال آ گیا کہ اللہ کی توحید پر میں نے سینکڑوں دلائل جمع کئے ہیں تو ایک بدو اونٹ لے کر جا رہا تھا، اونٹ کی مہار ڈنڈے سے باندھ کر اس ڈنڈے کو کندھے پر رکھ کر گنگناتا ہوا جا رہا

ہے اور اس کے پیچھے اونٹ آ رہے ہیں۔ رازی کو کچھ سوجھی کہ اس سے پوچھوں تو سہی، اس کو توحید کی کوئی دلیل آتی بھی ہے یا نہیں؟ چنانچہ جا کر اسے سلام کیا اور پوچھا: خدا کو مانتے ہو؟ اس نے کہا: بالکل۔ اس کو کہا: تم نے خدا کو کیسے پہچانا ہے کہ خدا ہے؟ اس نے کہا: واہ بھائی صاحب! کیسی باتیں کرتے ہو؟ اس شخص نے لید اُٹھا کر کہا: یہ کیا ہے؟ امام رازی نے فرمایا: لید ہے۔ اس نے کہا: جہاں لید پڑی ہو تو ہمیں پتہ لگتا ہے کہ ادھر سے اونٹ گزر گیا ہے۔ پھر ایک مینگنی اُٹھا کر پوچھا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: مینگنی ہے۔ پوچھا: کس جانور کی ہے؟ انہوں نے کہا: بکری کی ہے۔ اس نے کہا: مینگنی دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ بکری کی ہے، لید دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ اونٹ کی ہے اور یہ ساری کائنات دیکھ کر پتہ نہیں چلتا کہ خدا ہے!!؟ انہوں نے کہا: بات تیری ٹھیک ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے پتہ چلے گا کہ خدا وحدہ لاشریک ہے؟ اس نے ڈنڈا اُٹھایا اور ان کے پیچھے بھاگ پڑا۔ امام رازی صاحب آگے ہیں اور وہ پیچھے ہے۔ انہوں نے کہا: خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ اس نے کہا: خدا پر دلیل مانگتے ہو، میں ابھی تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔ امام رازی ﷫ کہتے ہیں کہ میں نے آ کر دو رکعت نماز پڑھی، اللہ کا شکر ادا کیا اور عرض کیا: اللہ میاں! اس کا جتنا پکا عقیدہ ہے، اتنا تو میرا بھی نہیں ہوگا کہ بندے ہو کر خالق پر دلیل مانگتے ہو۔

جب اللہ راضی ہوتا ہے تو جاہل کو بھی دین سمجھا دیتا ہے اور جب اللہ ناراض ہوتا ہے تو بڑے سے بڑے عالم بہک جاتے ہیں، بک جاتے ہیں اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے گمراہ ہوئے کہ ان کے علم کو دیکھو تو حیرت ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کیا کرو کہ اللہ ہدایت پر رکھیں اور خاتمہ ایمان پر فرمائیں۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ۖ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا ۖ قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِ إِيمَانُكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩٣﴾﴾ [البقرۃ: ۹۳]

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے اوپر طور کو اُٹھایا (کہ) لو جو ہم تمہیں دے رہے ہیں قوت کے ساتھ اور قبول کرو، کہنے لگے: ہم نے قبول کیا اور نہ مانا۔ اور ان کے دلوں میں ان کے کفر کی وجہ سے بچھڑے کی محبت سرایت کر گئی تھی، کہہ دیجیے! بری چیز ہے جس کا تمہیں تمہارا ایمان حکم دے رہا ہے، اگر تم مومن ہو۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کی مزید شقاوتوں کا بیان ہے۔ ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا﴾ کا عامل محذوف ہے، یعنی ''وَ اذْكُرْ إِذْ

أَخَذْنَا" (یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا)۔ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل سے ایک عہد لیا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی اتباع کرو گے، اللہ کے رسول کی اتباع کرو گے، اللہ کے جو حکم آئیں گے ان کو سنو گے اور مانو گے، اللہ تبارک و تعالیٰ جن چیزوں منع فرمائیں گے تم رک جاؤ گے۔ انہوں نے یہ عہد دے دیا، مگر اس کے بعد مکر گئے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کسی آدمی کے باپ دادا نے کوئی کام کیا ہو اور وہ اپنے باپ دادا کے طریقہ پر قائم ہو تو وہ بھی ان میں شمار ہوگا اور اسی طرح کا مجرم ہوگا جیسے اس کے باپ دادا تھے۔ اگر انہوں نے نقضِ عہد کیا تھا تو گویا انہوں نے بھی نقضِ عہد کیا۔ اگر انہوں نے گاؤ سالہ کی عبادت کی تو گویا انہوں نے بھی گاؤ سالہ کی عبادت کی۔

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ قوت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی آدمی زور سے قرآن سے چمٹ جائے کہ قوت سے پکڑ رہا ہوں، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ پوری دیانت داری، امانت اور حکمت کے ساتھ ان کے احکام پر عمل کرو۔

﴿وَاسْمَعُوْا﴾ اور سنو۔ سننے کا یہ معنی نہیں کہ تم تقریر سنو اور اس کے بعد اپنے اپنے کام میں لگ جاؤ، بلکہ ایسا سننا ہو کہ جس پر عمل کیا جائے، ورنہ جب حضور اکرم ﷺ قرآن پاک پڑھتے تھے تو کفار مکہ بھی سنتے تھے، لیکن ان کے سننے کا ان کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔

﴿قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور نہ مانا۔ اس پر مفسرین نے لکھا ہے کہ انہوں نے زبانِ قال سے کہا: ﴿سَمِعْنَا﴾ کہ اللہ میاں! ہم نے سن لیا، مان لیا اور زبانِ حال سے کہا: ﴿عَصَيْنَا﴾ کیونکہ جب پہاڑ ہٹ گیا تو وہ اسی طرح ہو گئے جیسے پہلے تھے۔ لہٰذا تعارض نہ رہا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ:

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک کشتی میں موجود تھا، اس کشتی کو طوفان نے گھیرا تو سارے مکے کے سردار کہنے لگے: یا اللہ! یا اللہ! ہمیں بچا لے۔ اللہ نے مہربانی کی، طوفان سے ہماری کشتی نکل گئی۔ جب کنارے کے قریب پہنچے تو چھلانگ مار کر سب اُتر گئے اور ہر کسی نے اپنا بت نکالا اور اس کی پوجا شروع کر دی۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: خدا کی قسم ہے! اس دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اپنا ہاتھ محمد مصطفیٰ ﷺ کے ہاتھ پر رکھوں گا اور مسلمان ہو جاؤں گا۔ مجھے تو اسی دن سمجھ آ گیا کہ محمد ﷺ سچ کہتے ہیں۔

نصرانیوں کا بھی ...... نعوذ باللہ ...... یہ عقیدہ ہے کہ جو آدمی نصاریٰ میں داخل ہوتا ہے اس کو ایک پانی سے غسل

دیتے ہیں، جس کو عربی میں "صباغ" کہتے ہیں، انگریزی اور اُردو میں بپتسمہ کہتے ہیں۔ اب وہ تمام گناہوں سے پاک ہوگیا۔ اور یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر ایک آدمی ہفتہ بھر گناہ کرتا ہے، چوری کرتا ہے، شراب پیتا ہے، ڈاکے مارتا ہے، لیکن اتوار کے دن پادری کے سامنے آکر اپنے گناہوں کا اقرار کرلے تو پادری اس کو سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے اور اس کے سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

بعینہٖ اسی طرح مجوسیوں کا بھی عقیدہ ہے (مجوسی، جو لوگ آگ کی پوجا کرتے ہیں، ہندوستان میں وہ پارسی کہلاتے ہیں) کہ ہر وقت ان کے عبادت خانے میں آگ کا الاؤ روشن رہتا ہے اور ان کے گھروں کے اندر بھی آگ جلتی رہتی ہے اور وہ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر اشلوک پڑھتے رہتے ہیں اور اس کے اردگرد پھرتے ہیں، یہ ان کی ایک عبادت ہے۔ اور ان کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ ہم جہنم میں نہیں جائیں گے۔ جب ہم نے آگ کو خدا مانا ہوا ہے اور اس کی ہم عبادت کررہے ہیں تو یہ اپنے عبادت کرنے والوں کو نہیں جلائے گی۔

اللہ تعالیٰ سے اُمید اور خوف کی مقدار:

حالانکہ ہمارا ایمان ہے کہ جنت کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولنے والے بھی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہوں گے، سب سے پہلے شفاعت کرنے والے آپ ﷺ ہوں گے، سب سے پہلے جنت کے اندر جانے والے آپ ﷺ ہوں گے، سب سے اعلیٰ مقام "مقامِ محمود" آپ ﷺ کے پاس ہوگا، "لِوَاءُ الْحَمْد" (حمد کا جھنڈا) آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کے ڈرنے کا یہ عالم تھا کہ ساری ساری رات مصلے پر کھڑے رہتے تھے، پاؤں مبارک سوج جاتے تھے، اکثر رات نماز اور تہجد میں گزرتی تھی۔

حضور ﷺ سے عرض کیا گیا: ایک نیا جوڑا پہن لیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نیا جوڑا پہن کر کیا کروں گا؟ اللہ کا فرشتہ صور کو منہ میں لئے ہوئے انتظار کررہا ہے کہ کب مجھے حکم ملے اور میں پھونکوں اور قیامت قائم ہوجائے۔ تو جب زندگی کا اتنا بھروسہ بھی نہیں ہے تو اچھے کپڑے پہننے کی کیا ضرورت ہے؟ اتنی بڑی شان کے باوجود اللہ کی خشیت سے آنسو مبارک بہتے تھے تو آپ ﷺ کی داڑھی مبارک بھیگ جاتی تھی۔ حضور اکرم ﷺ سجدے میں سر رکھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اللہ کی یاد میں گھنٹے گزر گئے ہیں۔ یہی عمل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا، یہی عمل تابعین کا تھا، یہی عمل محدثین کا تھا اور یہی عمل اللہ کے اولیاء کا تھا۔

یاد رکھیں! دنیا نے یہ مذہب ایسے اس لئے بنائے ہیں، تاکہ لوگوں کو دین سے ہٹا دیں، اللہ کے قرآن سے ہٹا دیں اور جھوٹی اُمیدوں میں مبتلا کر دیں کہ دیکھیں! ایک زانیہ عورت نے کتے کو پانی پلایا تھا، اللہ اس سے راضی ہو گئے اور اس کو معاف کر دیا تو عمل کی کیا ضرورت ہے؟ تم بھی زنا کرتے رہو، شراب پیتے رہو، اگر اللہ راضی ہونے پر آ گیا تو کسی چھوٹی سی بات پر راضی ہو جائے گا۔ لیکن یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اگر اللہ جہنم میں ڈالنے پر آئے تو ایک بلی کی وجہ سے جہنم میں ڈال دیا۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ سے ڈرتے بھی رہیں اور اس کی رحمت کی اُمید بھی رکھیں۔

مسئلہ ثابت کرنے کے طریقے:

مسئلہ ثابت کرنے کے تین طریقے ہوتے ہیں:

1 ......ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اُٹھ کر مسئلہ بتلا دے تو سمجھ آ گیا۔

2 ......اور ایک یہ ہوتا ہے کہ آگے آدمی ماننے والا نہیں تو مناظرہ کیا جاتا ہے اور دلائل دیئے جاتے ہیں۔ جب مناظرہ سے آگے بات بڑھ جائے تو مجادلہ بھی ہوتا ہے، یعنی جھگڑے تک نوبت چلی جاتی ہے۔

3 ......اور سمجھانے کا ایک طریقہ مباہلہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک دوسرے کو چیلنج کرتا ہے کہ آؤ میدان میں نکلتے ہیں۔ تم بھی اپنے بیوی بچے لے آؤ اور میں بھی اپنے بیوی بچے لے آتا ہوں۔ میدان میں کھڑے ہو کر جو جھوٹا ہو، اس کے لئے عذاب مانگتے ہیں۔ جو حق پر ہو گا وہ بچ جائے گا اور جو باطل پر ہو گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۹۴، ۹۵]

کہہ دیجئے اگر آخرت کا گھر اللہ کے ہاں خالص تمہارے لئے ہے نہ کہ دیگر لوگوں کے لیے تو موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو۔ اور کبھی بھی یہ موت کی تمنا نہیں کریں گے، ان گناہوں کی وجہ سے جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں۔ اور اللہ گناہگاروں کو خوب جانتا ہے۔

سوال و جواب:

کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہودی جھوٹے ہیں تو تم مسلمان کب سچے ہو؟ کیا تم نے موت کی تمنا کی ہے کہ ہمیں

موت ملے اور جنت میں جائیں؟ تم بھی تو لاکھوں روپے خرچ کرتے ہو، ہسپتال میں ٹیکے لگواتے ہو اور علاج کراتے ہو کہ بچ جاؤں، دو چار دن اور زندگی مل جائے۔ تو تم نے بھی تو موت کی تمنا نہیں کی؟ علماء نے لکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے تو کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ صرف ہم ہی جنت میں جائیں گے، بلکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جو ایمان اور عمل صالح پر مرے گا وہ جنت میں جائے گا اور اگر گناہگار ہوگا تو اللہ کی مرضی ہے، اللہ جنت میں بھیجیں یا جہنم میں بھیجیں۔ اس لئے مسلمان تو ڈرتا ہے۔

کن صورتوں میں موت کی تمنا جائز ہے؟

دوسری بات کہ موت کی تمنا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ موت اور زندگی کی ایک گھڑی معین ہے، وہ نہ آگے ہوتی ہے اور نہ پیچھے ہوتی ہے۔ اسی طرح اپنے آپ کو موت دینا شریعت میں حرام ہے کہ کوئی آدمی گولی رکھ کر، یا خنجر رکھ کر یا زہر پی کر مر جائے تو وہ بھی حرام موت مرتا ہے اور جہنم میں یہی عذاب اسے ہمیشہ کے لئے ہوتا رہے گا، اسی عذاب سے وہ جیتا اور مرتا رہے گا۔ لہٰذا موت کی تمنا ناجائز ہے۔

لیکن علماء نے لکھا ہے کہ اگر دنیا میں اسبابِ زندگی ختم ہوتے نظر آ گئے، اس وقت کسی نے موت کی تمنا کر لی تو وہ قابلِ اعتراض نہیں ہوتی، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ (جنہوں نے صحیح بخاری لکھی ہے، جن کی کتاب کو اللہ نے مقبولیت کا درجہ دیا ہے) جب اپنے ملک میں مخالفین سے تنگ آ گئے، بادشاہوں نے تنگ کر دیا، ساری دنیا مخالف ہو گئی تو حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی کہا: میرا اللہ! آج تیری اتنی وسیع زمین مجھ پر تنگ ہو گئی، مجھے جینے کا کوئی مقام نہیں ملتا، رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا، اس سے بہتر ہے کہ مجھے موت عطا فرما دے۔ لہٰذا ایسے حالات کے اندر اگر کسی نے موت کی تمنا کی ہے تو اسے ہم شریعت کا مخالف نہیں کہیں گے۔

اسی طرح اگر کوئی آدمی شوقِ جہاد کے اندر آ کر ایسی باتیں کہتا ہے تو وہ قابلِ اعتراض نہیں ہوتیں۔ جیسا کہ جنگ اُحد کے اندر ایک صحابی نے اپنے ہاتھ کے اندر کھجوریں پکڑی ہوئی تھیں، دوسرے ساتھی سے کہا: جلدی دوڑو، مجھے اُحد کی طرف سے جنت کی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔ کھجوریں ڈال کر گئے اور شہید ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اختیار دیا تھا کہ اگر دنیا میں رہنا چاہتے ہو تو ہم آپ کی عمر بڑھا دیتے ہیں، ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں۔ اگر آپ ہمارے پاس آنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا:

"اَللّٰهُمَّ! أَلْحِقْنِيْ بِالرَّفِيْقِ الْأَعْلٰى" "اے اللہ! میں تیرے پاس آنا چاہتا ہوں۔[سنن الترمذی، حدیث:۳۴۹۶]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ خدا کا ایک ایسا بندہ بھی ہے جس کو اللہ نے اختیار دیا ہے کہ دنیا میں رہنا چاہتے ہو یا آخرت میں آنا چاہتے ہو تو اس بندے نے اللہ کا ملنا چن لیا ہے۔ اس بات پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہمیں تعجب ہوا کہ رسول اللہ نے تو کسی بھی ایک بندے کی بات کی ہے کہ اسے دنیا اور آخرت میں سے کسی ایک کا اختیار دیا گیا ہے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس بات پر رونے لگ گئے!! لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی ہم میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے کہ اس "عبد" سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

[صحیح البخاری، حدیث:۳۶۵۴، بَابُ: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: سُدُّوا الْأَبْوَابَ إِلَّا بَابَ أَبِي بَكْرٍ...]

طویل عمر کے بعد بھی تو جہنم سے نہیں بچ سکتے:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ نے فرمایا: یہ یہودی زندگی پر بڑے بھوکے ہیں، مشرکین سے بھی زیادہ کہ ان کو بھی ڈر ہوتا ہے کہ ہم نے مرنے کے بعد جہنم میں جانا ہے، لیکن وہ بھی زندگی پر اتنے حریص نہیں، جتنے یہودی حریص ہیں۔ ان کا ہر آدمی تمنا کرتا ہے کہ مجھے ایک ہزار سال کی زندگی ملے، میں دنیا میں ہزار سال زندہ رہوں۔ اللہ نے فرمایا: اگر ہم ان کو ہزار سال کی زندگی دے بھی دیں تو کیا اس طرح وہ عذاب سے بچ جائیں گے؟ پہلی اُمتوں کے لوگوں کی عمریں ہزار ہزار سال ہوتی تھیں، کیا وہ عذاب سے بچ گئے؟

موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے ایک جن سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات:

ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باب السلام سے عکاظ بازار کی طرف جا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ ایک آدمی آ رہا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ آنے والا جن معلوم ہوتا ہے، اس کی چال ایسے ہے۔ جب قریب آ کر اس نے سلام کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم کون ہو؟ اس نے کہا: حضور! میں جن ہوں۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ مجھے آپ اسلام سکھلائیں اور اللہ کا قرآن سنائیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو کلمہ پڑھایا۔ اس کے بعد اُس نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تورات سنی تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے انجیل بھی سنی تھی اور آج حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ کا قرآن بھی سن لیا ہے۔

اسی طرح سانپوں کی بڑی عمر ہوتی ہے۔ بڑی عمر ہو جانے سے کیا ہو جاتا ہے؟ اللہ پاک سے دعا کرو کہ اللہ جتنی عمر دے اسلام، ایمان پر دے اور خاتمہ ایمان پر ہو۔ پھر تھوڑی عمر بھی ہو تو سبحان اللہ!! اور بڑی عمر بھی ہو تو سبحان اللہ!!

جوانی کے نیک اعمال بڑھاپے میں بھی لکھے جاتے ہیں:

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے، بال سفید ہو جاتے ہیں اور آدمی چلنے کے قابل نہیں رہتا تو اللہ پاک فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ میرا بندہ صحت میں دس پارے قرآن کے پڑھتا تھا، اب بوڑھا ہو گیا ہے، لیکن تم لکھتے رہو کہ یہ پڑھ رہا ہے، عاجز ہو گیا ہے، لیکن اس کا دل تو کرتا ہے۔ لہٰذا جب تک زندہ ہے، اس کے یہ اعمال لکھتے چلے جاؤ۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو ساٹھ سال سے زیادہ عمر عطا فرماتے ہیں اور وہ ایمان پر قائم رہتا ہے، وہ شکر کرے کہ اللہ نے مجھے جنتی بنا دیا ہے۔ اسی طرح اگر عمر تھوڑی بھی ہے، لیکن ایمان پر گزری ہے تو سبحان اللہ!

کسی چیز کی محبت محب کو اندھا بہرا کر دیتی ہے:

اس لئے اللہ پاک نے فرمایا: اگر ان یہودیوں کو ہزار سال عمر بھی دے دیں، تب بھی یہ اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ اور اللہ جاننے والے ہیں جو یہ عمل کر رہے ہیں، اللہ کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، اس لئے ان کو ان کے ہر عمل کی سزا ملے گی۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَ يُصِمُّ"[1] (کسی چیز کی محبت آدمی کو بہرا اور اندھا کر دیتی ہے)۔ یعنی جب آدمی کسی چیز کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اندھا ہو جاتا ہے، اس کو دوسرا راستہ نظر ہی نہیں آتا اور بہرا ہو جاتا ہے کہ کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

اللہ پاک نے جن کے دلوں کے اندر توحید کی محبت بھر دی ہے وہ توحید کے دیوانے ہو گئے، اسلام کے پروانے بن گئے۔ انہوں نے اسلام کے لئے تکلیفیں اُٹھائیں، انہیں انگاروں پر لٹایا گیا، پھانسیوں پر لٹکایا گیا، ان کی ٹانگوں کو چیرا گیا، لیکن وہ اللہ کی توحید کی محبت سے باز نہ آسکے اور ان کی زبانوں پر "اَللّٰهُ الصَّمَدُ" کے نعرے رہے۔

[1] [سنن ابی داؤد، حدیث: ۵۱۳۰، باب: في الهوى]

حضور اکرم ﷺ سے عشق ومحبت کے تقاضے:

اسی طرح جو لوگ حضور ﷺ کی محبت میں آئے اپنی جانیں قربان کردیں، اپنے بچے قربان کردیئے، اپنی اولادیں قربان کردیں۔ کہہ دینا تو بڑا آسان ہے، لیکن کوئی عمل کر کے دکھلائے کہ جنگ ہورہی ہے اور تیروں کی برسات آرہی ہے، ایک صحابی ڈھال لے کر حضور ﷺ کے سامنے کھڑے ہیں، کہیں سے تیر آتے ہیں تو ڈھال پر روک رہے ہیں۔ خدا کی قدرت کہ دشمن کے تیروں کی بارش کی وجہ سے ان کی ڈھال ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد جب تیر آئے تو صحابی نے اپنا ہاتھ آگے کردیا، اپنا بدن چھلنی کروادیا، لیکن حضور ﷺ تک تیر نہیں پہنچنے دیا۔

زبان سے کہہ دینا تو بڑا آسان ہے کہ ماشاء اللہ! حضور کملی والے سے ہمیں بڑی محبت ہے، حضور ﷺ کا روضہ مبارک دیکھ کر سینے میں ٹھنڈک پڑجاتی ہے۔ سبحان اللہ! ہم تو نبی کے غلام ہیں، لیکن دو تولے کی داڑھی بھی نہیں رکھ سکتے، پانچ وقت کی نماز ادا نہیں کرسکتے۔ اذان ہورہی ہے، لیکن کاروبار میں مست بیٹھے ہوئے ہیں۔ ویسے پوچھو تو کہتے ہیں: ہم حضور ﷺ کے غلام ہیں، حضور کی محبت ہی تو ہمیں مکہ، مدینہ میں لے آئی ہے، لیکن ایسے بھی بدبخت لوگ یہاں رہتے ہیں جن کو سالہا سال گزر جاتے ہیں، لیکن کعبہ کی نماز بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں سالہا سال گزر جائیں گے مدینہ نصیب نہیں ہے، طواف نصیب نہیں، رمضان کے اندر سگریٹ پیتے ہیں، رمضان المبارک کے مہینہ میں ٹیپ لگا کر گانے سنتے رہتے ہیں...... اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ...... اس لئے دعویٰ کرنا بڑا آسان ہے، لیکن میرے محمد مدنی ﷺ کے ساتھ عشق نبھانا بڑا مشکل ہے۔ اپنے عمل، کردار اور اپنے لباس سے عشق کا اظہار بڑا مشکل ہے۔

اتباعِ سنت میں ایک بزرگ کا واقعہ:

ہمارے ایک شیخ تھے، تقریباً ایک سو دو سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ ساری زندگی انہوں نے شیشے کے گلاس میں پانی نہیں پیا۔ جب دنیا نے زور لگایا تو فرمایا: بالکل جائز ہے، میں انکار نہیں کرتا، مگر میرے پاک نبی ﷺ نے مٹی کے برتن میں پیا ہے، میں اس سے پیوں گا۔ ساری زندگی انہوں نے میز پر بیٹھ کر کھانے کا تصور ہی نہیں کیا۔ جب ان کے گاؤں میں بجلی آگئی تو سب لوگوں نے زور لگایا کہ آپ کی مسجد اور آپ کے گھر میں ہم بجلی لگادیتے ہیں، خرچ نہیں لیں گے، اور ساتھ یہ بھی کہ آپ کی مسجد اور گھر کی بجلی کا بل چارج نہیں کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا: میرے

نبی کے گھر میں بجلی نہیں تھی، میں بجلی نہیں لگواؤں گا۔ میں جب تک زندہ ہوں، گھر میں دیا جلے گا اور مسجد میں بھی دیا جلے گا۔ یہ لوگ عاشق رسول اللہ تھے!! اللہ تعالیٰ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں فرمائے۔

یہ لوگ تھے جن کی صحبت میں بیٹھنے کے بعد شرابی نے توبہ کر لی، ڈاکو نے توبہ کر لی، چور نے توبہ کر لی، زانی نے توبہ کر لی۔ ہم بڑے سے بڑے خطرناک قسم کے لوگوں کو حضرت کی خدمت میں جاتے تھے، کیونکہ ہماری برادری ایسی ہے، اللہ پاک سب کو ہدایت دے۔ ان کو کسی نہ کسی بہانے سے اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ حضرت نے کچھ نہیں کہا، صرف پوچھ لیتے تھے کہ اس کا نام کیا ہے؟ کون ہے؟ کس علاقے کا ہے؟ کیا کام کرتا ہے؟ تو کہتے: ماشاء اللہ! اللہ مجھے اچھے کاموں کی توفیق دے، اللہ تمہیں بُرے کاموں سے بچالے۔ اللہ تجھے میرے مدنی کا غلام بنا دے۔ جب صبح کے وقت ان کی مسجد سے نکلتے تو وہ آدمی کہتے: ہماری توبہ کراؤ، جو گناہ ہو گئے وہ ہو گئے، آگے (ان شاء اللہ) ختم!

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی اپنی زندگی سنت محمد مصطفیٰ ﷺ پر تھی۔ آج پیر نہیں ہیں، پیر تو وہ ہوتے تھے کہ جن کی نظر پڑنے سے انقلابات آتے تھے، جن کی صحبت اختیار کرنے سے انسانوں میں تبدیلی آتی تھی۔ اب یا تو ہماری آنکھیں کام نہیں کرتیں، ورنہ ہمیں کوئی ایسی جگہ نظر آتی یا اللہ والوں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم نے ان اندھوں کے سامنے نہیں آنا۔ لہٰذا ہم کہیں چھپ چھپا کر زندگی گزاریں۔

جیسا کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ایک وقت آجائے گا کہ آدمی اپنے دین کو بچانے کے لئے پہاڑوں کی غاروں میں بھاگ جائیں گے، وہ علیحدہ جا کر رہیں گے، جلوت کو پسند نہیں کریں گے اور کسی سے بات نہیں کریں گے۔

میں نے باہر کی دنیا میں سوچا ہے یا سمجھا ہے۔ یہ تبلیغی جماعت والے لوگ غنیمت ہیں، ان کے اندر بھی اگر کوئی لگ جائے تو تبدیلی آتی ہے، اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنت کو قبول فرمائے۔ میں تو اس نظریے کا آدمی ہوں کہ جو آدمی جس شکل میں بھی دین کا کام کر رہا ہے، وہ غنیمت ہے۔ کوئی قلم سے کام لے رہا ہے، کوئی اپنے محاضرات سے کام لے رہا ہے اور کوئی جدید انداز سے دین کا کام کر رہا ہے..... اللہ پاک سب کی محنت قبول فرمائے..... چونکہ جو بھی دین کا کام کرے، ان کے لئے ہمارے دلوں میں محبت ہے، ہمارے دلوں کے اندر بغض، شرک و بدعت والے کے لئے ہے، صحابہ کے دشمن کے لئے ہے، اہل بیت کے دشمن کے لئے ہے۔ ورنہ جو آدمی جس جماعت سے ہے، جس طرح ہے اور جیسا کام کرتا ہے، ہم دعائیں کرتے ہیں کہ اللہ پاک سب کی محنت کو قبول فرمائے۔

اس دور میں کوئی آدمی خدا کا نام لے تو شکر کرو، ورنہ ہم تو ایسے دور سے گزر رہے ہیں کہ لوگ رات دن، دولت دولت، پیسے کے چکر میں ہیں، ان کو خدا یاد ہے اور نہ رسول یاد ہے۔ اس دور کے اندر بھی کوئی آدمی صبح کی نماز پڑھا کر بیس بچوں کو بٹھا کر پڑھاتا ہے تو شکر کرو کہ کوئی قرآن کا نام لینے والا تو ہے، اس کی برکت سے بستی بچی ہوئی ہے۔ اور اس آدمی کی فکر کرو جو محروم ہے۔ اللہ پاک اس کو مسجد کے اندر آنے کی توفیق دے، اللہ پاک جھگڑوں اور اختلافات سے بچائے، اللہ ہمارے دلوں کے اندر سے بغض، عناد اور کدورتیں دور فرمادے۔

تفسیر:

حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو پکڑا جو سامری نے سونے چاندی کا بنایا تھا اور مبرد کے ساتھ اس کو ذرہ ذرہ کر دیا، پھر اس کو دریا میں پھینک دیا، پھر اس دریا سے جتنے دریاؤں کو پانی جاتا تھا سب دریاؤں میں کچھ نہ کچھ ذرہ اس کا بھی پہنچ گیا۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اس دریا سے اب سارے پانی پی لو۔ انہوں نے پانی پیا۔ کہتے ہیں کہ جس آدمی کے دل میں اس بچھڑے کی محبت تھی، اس کی مونچھوں والی جگہ پر اس سونے کے کچھ ذرات ظاہر ہو گئے۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ﴾ [البقرۃ: ۹۳] یہ ہیں جن کے دلوں میں ابھی تک محبت بھری ہوئی ہے۔

بعض روایات کے اندر آتا ہے کہ جب ان لوگوں نے اس دریا کا پانی پیا تو ان کو جنون ہو گیا، یعنی ان کے دماغوں پر اثر ہو گیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲۶، البقرۃ: الآیۃ: ۹۳]

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾﴾ [البقرۃ: ۹۶]

اور آپ ان کو لوگوں سے زیادہ زندگی کا حریص دیکھیں گے اور ان لوگوں سے بھی جنہوں نے شرک کیا ہے، ان میں سے ہر ایک پسند کرتا ہے کاش کہ اس کی عمر ہزار سال کی ہو، پھر بھی یہ عذاب سے نہیں بچ سکے گا، اگرچہ اس کو یہ عمر دے دی جائے اور اللہ دیکھتا ہے جو یہ عمل کرتے ہیں۔

اگر یہود موت کی تمنا کرتے تو سب مر جاتے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان آیات کا ترجمہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ اگر آخرت کی حویلی خالص ان کے لئے ہے اور انہی کے لئے اگر جنت ہے تو ان کو چاہئے کہ یہ موت کی تمنا کریں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہاں دوسرا ترجمہ فرمایا کہ تم یہ دعا کرو کہ ہم دو میں سے جو جھوٹا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ موت دے۔ اگر تمہیں موت آگئی تو جنت میں چلے جاؤ گے، اگر تم سچے ہو۔ لیکن اللہ نے فرمایا: یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ یہ جانتے ہیں، ان کے پاس علم ہے، یہ کبھی ایسی بات نہیں کریں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے دین کے علم کے بعد کفر کر رہے ہیں جس دن یہ چیلنج ہوا۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَوْ أَنَّ الْيَهُوْدَ تَمَنَّوُا الْمَوْتَ لَمَاتُوْا'' اگر یہودی اس چیلنج کے بعد اس دن موت مانگ لیتے کہ اللہ میاں! ہمیں موت دے دے اگر ہم جھوٹے ہوں تو تمام یہودیوں پر موت آجاتی اور جہنم میں اپنا ٹھکانہ دیکھ لیتے۔ اور اگر میرے مقابلے میں مباہلے کے لئے نکلتے تو یہ واپس اس حال میں لوٹتے کہ وہ اپنے گھروں میں اپنے اہل وعیال میں سے کسی کو موجود نہ پاتے۔

اس میں ایک خلجان ہوتا ہے کہ جب موت کا وقت مقرر ہے تو آگے کیسے آجاتا اور ان کو جلدی موت کیسے آجاتی؟ یاد رکھیں! تقدیر میں جو اللہ نے لوح محفوظ میں لکھا ہے وہ صدق و عدل ہے، اس میں کسی قسم کا شک اور شبہ نہیں ہوسکتا۔ اس میں ساری تفصیلات لکھی ہوئی ہیں کہ اگر موت کی تمنا کریں گے تو ہم ان کو موت دے دیں گے، اگر تمنا نہیں کریں گے تو اپنے وقت پر مریں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے بدلا نہیں کرتے۔ ہاں! تقدیر کے بعض معاملات ایسے ہیں کہ اللہ چاہتے ہیں تو بدل دیتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی قدرت کا اظہار فرماتے ہیں کہ میں تقدیر کا مالک اور خالق ہوں، قضا وقدر میرے ہاتھ میں ہے، خلق اور امر میرے ہاتھ میں ہے۔ اب وہ کسی کی زندگی بڑھا دیں تو اس کی مرضی ہے، اس کی شان ہے وہ جیسے چاہیں کردیں۔ وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ [ہود: ۱۰۷] ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۷]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا واقعہ:

جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ملک الموت پر ناراض ہوئے تو موت کا فرشتہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا

اور واقعہ ذکر کیا تو اللہ نے حکم دیا کہ آپ ان سے کہیں کہ کسی بیل پر ہاتھ رکھ لیں، ان کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آجائیں گے، اتنے سال ان کی زندگی بڑھا دیں گے...... اور ہاتھ کے نیچے ہزاروں بال آجاتے ہیں...... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے عزرائیل! یہ بات بتلاؤ کہ اتنی عمر بڑھ جانے کے بعد پھر کیا ہوگا؟ انہوں نے کہا: موت تو آئے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: بعد میں جو مرنا ہے تو وقت پر مر جائیں، لہٰذا مجھے اور عمر بڑھوانے کی تمنا نہیں ہے۔

والدین کی اطاعت سے عمر میں برکت ہوتی ہے:

اسی طرح حدیث پاک میں آتا ہے: جو شخص یہ چاہے کہ میری عمر لمبی ہو اور میرے رزق کے اندر برکتیں پیدا ہو جائیں، وہ اپنے والدین کی فرمانبرداری کرے، والدین کی اطاعت کرے، والدین کو راضی کر لے۔ ان کی دعا لگے گی تو اللہ عمر بھی دراز کر دیں گے اور رزق بھی بڑھا دیں گے۔

اس کے اندر بھی اللہ کی تقدیر میں یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اگر یہ والدین کو راضی کرے گا تو ہم اس کی عمر اتنی بڑھا دیں گے، اگر والدین کو ناراض کرے گا تو اس کی عمر متعین یہ ہے۔ جیسا کہ اصحاب کہف پر اللہ نے تین سو نو سال نیند مسلط فرما دی اور نیند کے بعد بیدار ہو گئے۔ یہ تمام چیزیں، ان کی تفصیلات لوح محفوظ میں لکھ دی ہیں جو اللہ نے اپنے کمال علم سے کہ ابھی ہم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، تمام چیزیں اللہ پاک نے لکھ دی تھیں۔

تفسیر:

دوسری بات تحدی ہے کہ اگر وہ اللہ کے نبی کے مقابلہ پر آکر چیلنج کرتے اور اس چیلنج کو قبول کر لیتے تو اللہ اپنے نبی کو سچا فرما دیتے۔ اس لئے فرمایا: اگر اس دن یہودی موت کی تمنا کر لیتے تو ان میں سے ایک بھی باقی نہ بچتا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ایک کرامت:

ایک آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا...... وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بڑا بغض رکھنے والا تھا...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے (بطور طنز) جواب میں کہا: "جمرہ" (انگارہ) ہے۔ فرمایا: تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: "ابن شہاب" (انگارے کا بیٹا)۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کس قبیلے سے ہو؟ اس نے کہا: "الحرقة". آپ نے فرمایا: کون سی جگہ کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا: "بحرة النار". آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کے کس قبیلے میں؟ کہا: "ذات لذی" میں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اپنے گھر کی طرف لوٹ جاؤ، اللہ نے

تمہارے گھر کو جلا دیا۔ جب وہ گھر لوٹا تو اس کا پورا گھر جل چکا تھا اور گھر کے رہنے والے بھی اکثر جل چکے تھے۔

[موطا امام مالک]

کوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ان کی گستاخی کرے تو اللہ نے اس وقت دنیا میں اس کا اثر ظاہر کر دیا تو جو اللہ کے نبی کے سامنے گستاخی کی جرأت کرے، وہ کیسے بچ سکتا ہے؟

صحابیٔ رسول پر تہمت لگانے والا بددعا سے اندھا ہو گیا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک آدمی نے ایک صحابی پر تہمت لگائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو گورنر بنا کر بھیجا تھا...... اب تو نہیں ہو سکتا کہ ساری دنیا گورنر سے خوش ہو جائے...... ان پر ایک آدمی نے جھوٹی تہمت لگا دی۔ آپ نے ان کو بلا لیا اور اس آدمی کو بھی بلا لیا۔ اس آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیٹھ کر اس صحابی پر تہمت لگائی کہ اس نے فلاں غلطی کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس صحابی سے پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا: میں صفائی میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں اتنا دور مدینہ میں آیا ہوں اور یہ مدعی بن کر آیا ہے اور گواہ بھی لے آیا ہے۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ میری انکوائری ہوگی تو میں بھی گواہ لے آتا۔ لہٰذا میرے اور اس کے درمیان اللہ احکم الحاکمین ہے، اور اسی وقت اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ اُٹھا لئے کہ یا اللہ! اگر میں سچا ہوں اور یہ ظالم مجھ پر ناحق تہمت لگا رہا ہے تو مجھے زندگی میں دکھا دے کہ یہ اندھا ہو جائے۔ ابھی انہوں نے ہاتھ بند کئے تھے کہ وہ اسی مجلس میں اندھا ہو گیا۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس کو دیکھا گیا کہ کوفہ کے بازاروں میں اندھا ہو کر بھیک مانگتا پھرتا تھا۔

﴿وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ﴾ کی اور ایک تفسیر:

ایک روایت میں ہے کہ عباد بن منصور نے حضرت حسن سے پوچھا: آپ نے اس آیت سے کیا سمجھا ہے کہ وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے بوجہ اس کفر و شرک کے جو وہ آگے بھیج چکے ہیں؟ انہوں نے کہا: تم مجھے بتلاؤ، اگر وہ موت کو محبوب رکھتے، پسند کرتے اور مانگ لیتے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ مر جاتے؟ اگر مانگتے تب بھی نہ مرتے، چونکہ موت کا ایک وقت معین ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ قول غریب ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بات مضبوط ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲۷]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نصارائے نجران:

عیسائیوں کا وفد نجران سے آیا اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مناظرہ کیا اور پوچھا: آپ عیسیٰ علیہ السلام کو

مانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: بالکل مانتے ہیں۔ انہوں نے کہا: یہ بتلائیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے ان کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کی کوئی مثال دیں۔ دنیا میں کوئی ایسا آدمی ہے جو بغیر باپ کے پیدا ہوا ہو؟ یا تو ہمیں کوئی دوسرا بندہ دکھائیں یا پھر ہمارے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ مان لیں تو اللہ نے قرآن نازل فرمایا: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٥٩﴾﴾ [آل عمران:۵۹] کہ عیسیٰ کی اللہ کے نزدیک پیدائش کی مثال ایسے ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی۔ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ فرمایا: ہو جا۔ تو وہ جیتے جاگتے انسان ہو گئے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۲۷]

جوش اور جگر:

جیسے جوش مراد آبادی اور جگر مراد آبادی دونوں شاعر تھے، جوش کمیونسٹ اور دہریہ قسم کا آدمی تھا اور جگر مذہبی ذہن رکھنے والا آدمی تھا۔ ایک دن اکٹھے ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، جگر نے بیٹھے بیٹھے کہا: اللہ!۔ جوش نے فوراً جگر کی طرف دیکھ کر کہا: اچھا! آپ نے مجھے پکارا ہے؟ جگر نے فرمایا: میں نے تو اپنے خدا کو پکارا تھا، پتہ نہیں شیطان درمیان میں کہاں سے ٹپک پڑا؟

عیسائیوں کی ہٹ دھرمی:

عیسائیوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کا بیٹا ہے۔ اللہ نے فرمایا: اس لئے کہتے ہو کہ اس کا باپ نہیں۔ اس طرح تو آدم علیہ السلام کا بھی باپ نہیں اور ماں بھی نہیں ہے۔ عیسائیوں سے جواب نہ بنا اور خاموش ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ باہر کھڑے ہو کر اللہ سے دعا مانگتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ رات کو موقع دیں۔ پھر رات کو سوچ کر جواب دیں گے۔ رات کو پھر گئے کہ ہم مباہلہ نہیں کرتے۔ ان کے پادریوں نے بتلا دیا کہ اگر مباہلہ کرو گے تو اللہ کا قہر ٹوٹ پڑے گا، کیونکہ یہ اللہ کے سچے نبی ہیں، لیکن ہم مانتے نہیں۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۱۲۷]

طویل عمری کی فضیلت:

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ابن جزری نے اس آیت کی تفسیر فرمائی ہے کہ اس کا ایک پہلو بہت شاندار ہے،

لیکن ایک پہلو میں قابلِ اعتراض بات بنتی ہے کہ مباہلہ صرف اس بات پر ہے کہ موت مانگو۔ یہ تو دشمن بھی کہہ سکتا ہے کہ مسلمان بھی تو موت نہیں مانگتے اور کتنے مسلمان ہیں جو بیمار ہوتے ہیں تو اپنے اوپر لاکھوں خرچ کرتے ہیں، بلکہ حدیث پاک میں آیا، حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''خَیْرُ النَّاسِ مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَ حَسُنَ عَمَلُہٗ'' (تم لوگوں میں وہ آدمی بڑا اچھا ہوتا ہے کہ جس کی عمر بھی لمبی ہو اور وہ عمل بھی اچھے کرے)۔[کنز العمال، حدیث: ۴۳۶۴۹]

کیونکہ ایک آدمی چالیس سال نماز پڑھے، اب پانچ نمازوں کا حساب لگالیں اور اگر اللہ اس کو سو سال عمر دے اور وہ سو سال نماز پڑھے تو ظاہر بات ہے کہ اس کی نمازیں زیادہ ہو جائیں گی، اس کی عبادت زیادہ ہو جائے گی اور جتنے نیک اعمال زیادہ اور خوبصورت ہوتے چلے جائیں گے، اتنے درجات بڑھتے چلے جائیں گے۔

اگر بڑی عمر بری ہوتی تو صحیح احادیث کے اندر موجود ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے خادم ہیں، وہ اور ان کی والدہ اُمِّ سلیم رضی اللہ عنہا بھی موجود تھیں۔ انہوں نے عرض کیا: حضور! آپ کا یہ چھوٹا خادم انس ہے، اس کے لئے تو دعا فرمادیں۔ حضور ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی: اے اللہ! میرے اس خادم کی عمر، اس کی اولاد اور اس کے رزق و مال میں بھی برکت عطا فرما۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ حضور ﷺ کی ساری دعائیں منظور ہوگئیں۔ عمر اتنی لمبی ہوگئی کہ میں ایک سو بیس سال کی عمر کو پہنچ گیا، اور اللہ نے اولاد اتنی دی کہ اولاد کی اولاد اور ان کی اولاد کو گنوں تو ایک سو بیس آدمی بنتے ہیں، اور اللہ نے میرے رزق میں ایسی برکتیں عطا فرمادیں کہ ساری دنیا کے باغ سال میں ایک دفعہ پھل لاتے ہیں اور میرا باغ دو دفعہ پھل لاتا ہے، ساری دنیا کے باغوں میں ریحان کی خوشبو ریحان کی ہے، لیکن میرے باغ میں جو ریحان ہے، اس کی خوشبو مشک وغیرہ کی ہے۔[صحیح البخاری، حدیث: ۱۹۸۲ بباب: مَنْ زَارَ قَوْمًا فَلَمْ یُفْطِرْ عِنْدَھُمْ]

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ایک ہزار پچاس سال ہے، جس میں ساڑھے نو سو سال تو آپ نے تبلیغ فرمائی اور چالیس سال کے بعد آپ کو نبوت ملی۔ طوفان کے بعد بھی آپ ساٹھ سال زندہ رہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اسی لئے موت کی تمنا کو مقامِ مباہلہ قرار دینا، یہ بات قابلِ اعتراض لگتی ہے۔ کیونکہ وہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تم موت کی تمنا کرو۔ اور پھر حضور ﷺ نے موت کی تمنا سے منع بھی فرمایا ہے کہ موت کی تمنا بھی نہ کیا کرو اور یہ تمنا بھی نہ کیا کرو کہ دشمن سے ہمارا مقابلہ ہو۔ ہاں! ہو جائے تو پھر جم جاؤ، لیکن خود نہ مانگا کرو۔ اس

لئے اصل بات وہی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمائی کہ اگر تم سچے ہو تو باہر نکل کر مباہلہ کرو۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۸، البقرۃ: الآیۃ: ۹۶]

وحدتِ ادیان کے فلسفے کا رد:

میرے آقا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی آدمی کو اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی، جب تک کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لے آئے۔ جدید پڑھے لکھے لوگوں کو بھی مغالطہ ہے اور ان لوگوں کو بھی جنہوں نے علم مطالعہ سے حاصل کیا اور باقاعدہ کسی استاد سے یا طریق علم سے حاصل نہیں کیا۔ ان کو بھی ذہنوں میں ایک مغالطہ ہے کہ جو آدمی اللہ پر ایمان رکھتا ہو، آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور دنیا میں اچھے کام کرتا ہو تو وہ بھی جنت میں جائے گا اور جہنم میں نہیں جائے گا۔

یہ غلط بات ہے۔ اور اس کو وہ وحدتِ ادیان سمجھتے ہیں کہ تمام دین ایک ہیں، اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء علیہم السلام بھیجے ہیں، سب کا دین ایک ہے، لہٰذا اگر کوئی آدمی کسی نبی پر ایمان رکھتا ہے تو یہ اس کی نجات کے لئے کافی ہے۔ بلکہ آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کے جو وید ہیں، دراصل ان کے معتقدات میں یہ ہے کہ وید بھی اللہ کی اُتاری ہوئی کتابیں ہیں، بھگوان وغیرہ جتنے انہوں نے بنائے ہوئے ہیں، ان کو بس سفارشی سمجھتے ہیں اور اپنی محبت کے اظہار کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، ورنہ ان کا ایمان بھی خدا پر ہے۔

یہ ایک بڑا دھوکہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے فتنوں سے محفوظ رکھے اور جو ہماری جدید نسل ہے جس کو "نوجوان طبقہ" کہتے ہیں اور انہوں نے مشنری سکولوں میں پڑھا ہے۔ ماں باپ کو اس لئے داخل کرتے ہیں کہ انگریزی سیکھ لے گا، لیکن ان کو نہیں پتا کہ ایمان سے بھی فارغ ہو کر گھر آئے گا۔ ان کے اندر ماسوائے ایمان کے سب کچھ ہوگا، اس کی تہذیب بھی اچھی ہو جائے گی، اس کا بولنا بھی اچھا ہو جائے گا، لباس پہننا بھی وہ سیکھ جائے گا، لیکن وہ ایمان کی دولت سے خالی ہو کر لوٹے گا!!!

کوئی آدمی اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ آپ کے ملک میں کروڑوں روپے خرچ کر کے لوگوں کو ان کے مذہب پر قائم رکھے۔ تم بھی تو محنت کرتے ہو کہ وہ مسلمان بنے، قرآن و حدیث کا متبع بنے، حافظ قرآن بنے اور اس کی تہذیب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈھل جائے۔ اس لئے وہ بھی اتنا پیسہ خرچ کرتے ہیں کہ بچے پڑھ جائیں۔ پڑھنے کے بعد انہی لوگوں نے اقتدار میں آنا ہے، انہی لوگوں نے کرسیوں پر بیٹھنا ہے۔ آپ کے مدارس عربیہ کا کوئی آدمی پڑھا ہوا کرسی

پر نہیں آئے گا۔ اقتدار میں وہ آئیں گے جو آکسفورڈ سے پڑھیں گے۔ اور جب وہ آئیں گے تو وہ بھی ان کے قالب میں ڈھل کر آئیں گے۔

یہاں تک "تفسیر مکی" حضرت مولانا محمد مکی مجازی مدظلہ کے سلسلہ دروس سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 35 تا 96 کی تفسیر مکمل ہوئی۔ آگے جلد نمبر 4 میں سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 97 سے تفسیری دروس شروع ہوں گے۔

وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ وَ بِتَوْفِيْقِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ

امداد اللہ انور غفرلہ اللہ

الله الله الله

مكتبة الفقير

MAKTABA-TUL FAQEER

تفسیرِ مکی

اس کائناتِ رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: بیت اللہ، کتاب اللہ اور اہل اللہ۔ اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا محمد مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحیدِ خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں، وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عظمت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمال مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص و تقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ زیرِ نظر تفسیر "انوار الحرم" المعروف "تفسیر مکی" حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس کا مجموعہ ہے۔

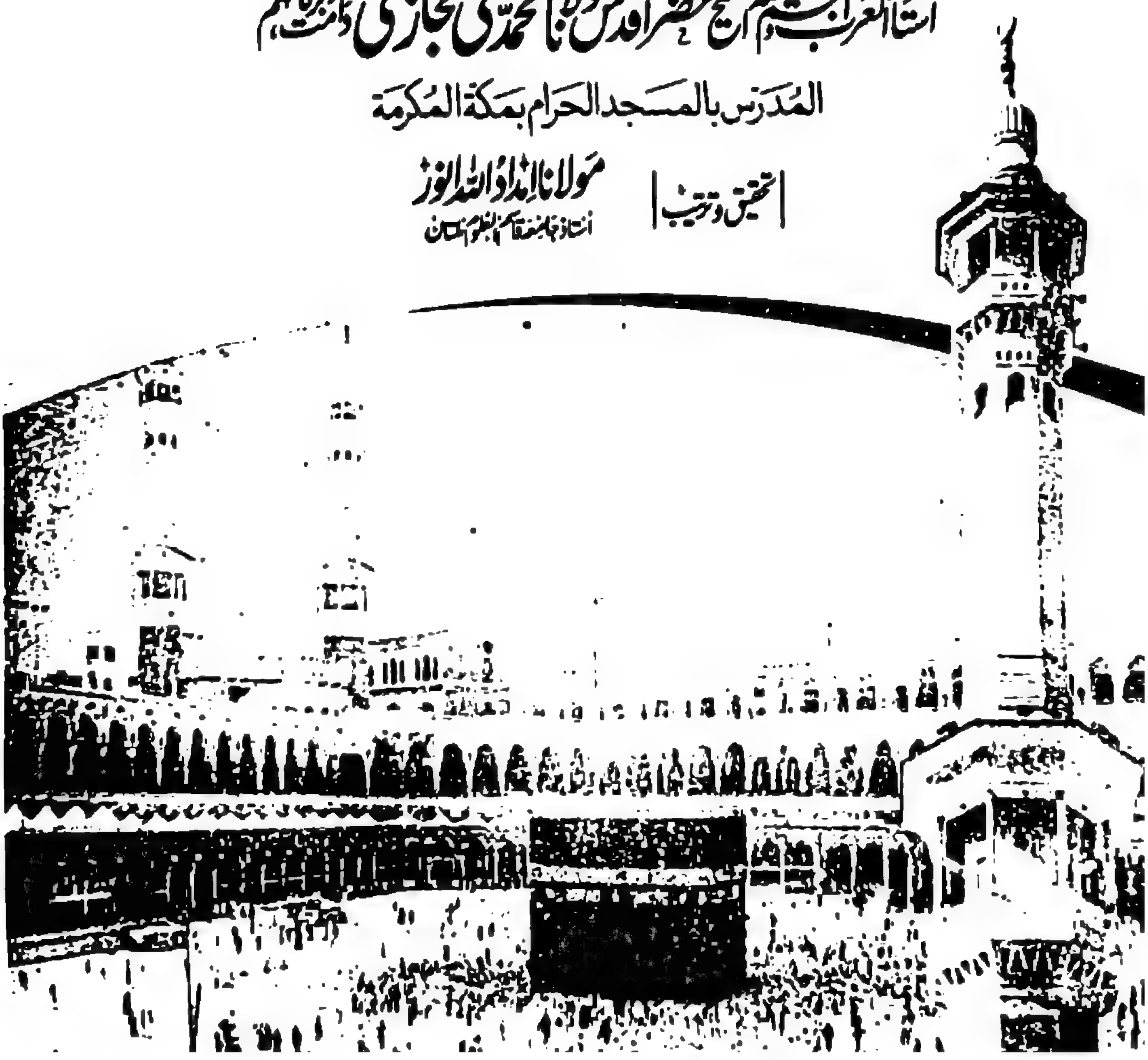
مکتبۃ الفقیر
223 سنت پورہ فیصل آباد
0322-8669680
Cell: 0300-9652292 Email: ALFaqeerfsd@yahoo.com

تفسیر مکی

جلد 4

استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمكة المكرمة

تحقیق و ترتیب | مولانا امداد اللہ انور
استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان



نام کتاب — تفسیر مکی جلد 4

صاحبِ خطبات — استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

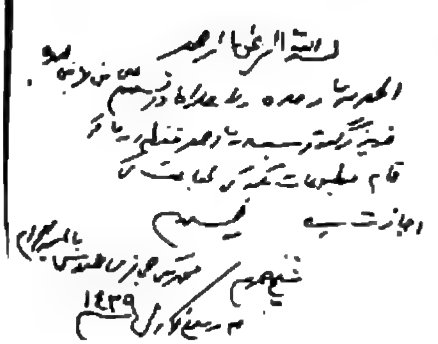
تحقیق و ترتیب — مولانا امداد اللہ انور
استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان

کمپوزنگ — دارالتصنیف معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اشاعت اول — اکتوبر 2019ء

تعداد — 1100

اجازت طباعت


بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
اجازت ہے
۱۴۳۹

ناشر

مکتبۃ الفقیر

www.Tasawwuf.org

0300-9652292,03228669680

0335-7873390,03101702690

E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

- عرضِ ناشر 28
- پیش لفظ 30

تفسیر سورہ بقرہ 31

- یہودیوں کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ 31
- یہودیوں کے سوالات اور حضور ﷺ کے جوابات 32
- اگر حضور ﷺ کا دل نہیں سوتا تھا تو نیند کیسے آگئی؟ 35
- سونے کے آداب 37
- ■ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا اسلام لانے کا واقعہ 39

شانِ نزول کی دوسری روایت	40
انہ جیتنہ کی تفسیر	43
سابقہ انبیاء علیہم کے معجزات	43
حضور اکرم ﷺ کے معجزات	44
پیدائش والے دن ایک کاہن نے آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی	45
آپ ﷺ کا ایک پہلوان کو گرا دینا	46
آپ ﷺ کا چہرہ دیکھ کر ایمان لانے والے	46
واقعہ	48
سحر کی تعریف	50
قوم کو بے وقوف بنانے والوں کا واقعہ	50
تیسری قسم	52
سحر، انسانوں پر اثر کر سکتا ہے یا نہیں؟	52
کیا جادو کے اثر سے کسی چیز کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے یا نہیں؟	53
جادو کا حکم	54
معجزہ اور سحر میں فرق	54
سحر	54
معجزہ	54
کرامت	54
معجزہ، کرامت اور سحر میں فرق	55
حضرت سلیمان علیہ السلام جادوگر نہیں تھے	56
ہاروت و ماروت کا قصہ	56
عورتوں کا فتنہ سب فتنوں سے بڑھ کر ہے	58
شراب، اُم الخبائث ہے	59
شراب کی حد کتنے کوڑے ہونی چاہیے؟	59

سحر کلام	60
ہاروت وماروت کے قصہ کی تردید	61
ہاروت وماروت کے قصہ کے متعلق بعض علماء کی رائے	61
اس واقعہ میں راجح قول	62
شبہ اور اس کا ازالہ	63
واقعات	63
حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادوگری کا الزام	65
جادو کے بارے میں ایک اور واقعہ	68
حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا "یا ساریۃ الجبل!" کہنے کا واقعہ	71
اچھی بیوی کی صفات	72
شیطان کی جماعتیں اور ان کے امور	73
جادوگری کی سزا	74
پانچواں مسئلہ	75
جادو کی آٹھ اقسام	76
ٹونے ٹوٹکے	77
قوتِ تخیلہ کا اثر کس طرح ہوتا ہے؟	77
﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے ساتھ مومنوں کو خطاب	83
ربط آیات	84
شانِ نزول	84
گستاخِ رسول واجب القتل ہے، اس کا قصاص بھی نہیں	85
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادب فرض ہے	85
شانِ نزول	87
جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا، وہ انہی میں شمار ہوگا	87
کفار کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے سے متعلق احکام	88

فہرست مضامین

﴿رَاعِنَا﴾ کا لفظ 90
قرآن میں احکام کی تبدیلی کی وجوہات 90
نسخ کا معنی 91
نسخ اور منسوخ کی قسمیں 91
نکات 92
پتھر کی پوجا کے جواز کے لیے ہندوؤں کا مسلمانوں پر اعتراض 93
اُمہات المؤمنین کا لقب صرف نبی ﷺ کی ازواج کے لیے 95
نسخ القرآن میں حکمت 96
نسخ کے معنی کے متعلق علماء کے اقوال 97
دو حریص، جن کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا 97
نسخ کے اور بھی اقوال 98
﴿نُنْسِهَا﴾ کی قراءتیں 98
بہترین قاری اور بہترین قاضی 99
حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے ہاں نسخ کی تفسیر 99
نسخ کی حکمتیں 100
نسب کا ثبوت نکاح سے ہوتا ہے 101
نکاح میں بھی بہت ساری حکمتیں ہیں 101
ایک حکم کی تبدیلی میں حکمت 102
کعبہ شریف کی تعمیر کتنی بار ہوئی؟ 102
حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تقدیر کے متعلق مسئلہ پوچھنے کا واقعہ 103
تورات کے بعد قرآن کو کیوں بھیجا گیا؟ 103
نسخ کی مثالیں 106
نسخ کے متعلق معتزلہ کا عقیدہ 107
قرآن میں نسخ کی مقدار 107

قبر آخرت کی یاد دلاتی ہے	108
کفار کے برتنوں کا حکم	109
کرامات صحابہ علیہم	110
زمزم پینے کے بعد دعا کی قبولیت کا واقعہ	111
بلا وجہ سوالات کرنے کے نقصانات	113
سوال کر کے امت کو مشکل میں ڈالنے والے کے لیے وعید	114
آیاتِ مبارکہ کا شانِ نزول	116
منافقوں والی نماز	118
نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ	118
علمی نکات	119
مسلمانوں کے داخلی معاملات	119
مسلمانوں کے لیے خارجی معاملات	121
کفار کے مسلمانوں پر مظالم	122
کفار مل کر مسلمانوں پر حملہ اور جنگ کرتے ہیں	122
غزوۂ خندق میں کفار کا اتحاد	123
مشکل وقت میں صرف اللہ سے مدد حاصل کریں	123
مصیبت کے موقع پر اذان دینے کا حکم	125
آیات کا ماقبل سے ربط	127
جنت کس کو ملے گی؟	128
حوضِ کوثر سے ہٹا دیئے جانے والے	129
آپ ﷺ کے سامنے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تورات پڑھنے کا واقعہ	130
عیسائی اور یہودی افراط و تفریط میں مبتلا ہیں	131
پادریوں کے چلے بھی مردود	134
عبادت میں مجاہدہ کرنے کا مسنون طریقہ	134

مصائب دنیا کے خوف سے شادی نہ کرنے کی وعید	135
واقعہ	135
اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ	136
مسنون عمل کے فوائد	137
بدعت کا معنی ومفہوم	138
آیت کا شان نزول	139
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلان حج	141
دخول جنت اللہ کے فضل سے ہوگا	142
بیت اللہ و مسجد نبوی ﷺ و مسجد اقصیٰ کس نے بنائیں؟	142
مساجد کو ویران کرنے کا معنی	143
مساجد کو ویران کرنے میں یہود ونصاریٰ کا کردار	144
مساجد کی آباد کاری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا کردار	145
مسجد اقصیٰ ضرور آزاد ہوگی	147
اسلام ہر غریب وامیر کے گھر میں داخل ہوگا	147
مساجد کی رونق عمارت سے نہیں، نمازیوں سے بنتی ہے	148
﴿وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا﴾ کی تفسیر	149
مسجد کے آداب	149
تحیۃ المسجد کے مسائل	150
عصر اور فجر کے بعد تحیۃ المسجد کا حکم	150
مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں نماز کی فضیلت اور ثواب	150
مساجد کے متعلق چند مسائل	151
مساجد کو ویران کرنے والے کون لوگ ہیں؟	152
ابوجہل کا آپ ﷺ پر دوبارہ حملہ کرنا اور اس کا انجام	153
مساجد اللہ کا گھر ہیں، بندوں کی ملک نہیں	154

- مسجد کا نام مہ کہنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا 155
- ایک شبہ اور اس کا ازالہ 156
- مسجد حرام کا احترام 156
- غیر متبع سنت پیر کا واقعہ 157
- مساجد کے آداب 158
- کافر اور مشرک کو مسجد میں جانے دیں 159
- حجۃ الوداع سے پہلے والے حج کے امیر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے 160
- ماقبل آیات سے ربط 161
- تحویل قبلہ پر یہود و مشرکین کے اعتراضات 161
- قبلہ کی جہت متعین کرنے کی حکمت 162
- آیات کا شان نزول 162
- جنگ اور سواری اور مجبوری میں نماز کا قبلہ 163
- ناواقف نمازی پہلے جہت قبلہ کی تعیین کرے 163
- آیت کا نزول نجاشی کے بارے میں 165
- نجاشی کس طرف نماز پڑھتا تھا؟ 166
- نجاشی کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کی خصوصیات 167
- پہلی خصوصیت 167
- دوسری خصوصیت 167
- تیسری خصوصیت 168
- مسجد حرام کا اطلاق 168
- قبلہ دو ہونے کی وجہ 170
- کیا مسلمان پتھر اور عمارت کی پوجا کرتے ہیں؟ 170
- آیت کا خلاصہ 173
- گزشتہ آیات کے ساتھ ربط 173

یہود و نصاریٰ کی گمراہی	174
اللہ تعالیٰ امتحان کیوں لیتا ہے؟	175
منکرین خدا اور مذہب کی بدحالی	176
عقیدت اور عداوت میں غلو کرنے والوں کی بدحالی	176
ایک پادری سے مناظرہ، چنے بیچنے والے نے ہرا دیا	177
آیت مبارکہ سے یہود و نصاریٰ کا رد	180
ابن آدم کا اللہ کو جھٹلانا	181
اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے باوجود وہ اپنے بندوں سے رزق نہیں روکتا	182
سجدۂ عبادت و تعظیمی میں فرق	183
ظلی و بروزی نبی کی داستانیں	184
بدعت کا لغوی اور حقیقی اطلاق	188
آیات کا ربط	190
یہود و نصاریٰ کے دو دعووں کا رد	190
مشرکین مکہ کی ہٹ دھرمی	192
ایک بزرگ اور ان کی بیوی	193
ربط آیات	193
جدید عقلمندوں کی بدحواسی	194
شبہات کا جواب	195
"بشیر" اور "نذیر" کی تفسیر	197
تبلیغ کرنا آپ کا کام ہدایت دینا میرا کام ہے	198
﴿وَلَا تُسْئَلُ﴾ کی مختلف قراءتیں	199
قرآن کی مختلف قراءتیں	199
عجمی زبان پر ایک لطیفہ	201
دوسرا لطیفہ	201

حضور اکرم ﷺ کے والدین کا ایمان	202
حضور اکرم ﷺ کی صداقت نبوت	203
حضرت علاء حضرمی رضی اللہ عنہ کی قبولیت دعاؤں کا تذکرہ	216
مسواک کی سنت کے اثر کا واقعہ	217
محمد بن قاسم اور فتح ہندوستان	218
انفرادی اور اجتماعی گناہ کی معافی کا طریقہ	218
حق پر قائم رہنے والی جماعت	219
مفسر رحمہ اللہ کا طرز استدلال	219
بنی اسرائیل کو تذکر آلاء اللہ	222
جنت میں حضور اکرم ﷺ کی امت کی کثرت	223
شرک کی مذمت	223
اتحاد امت کی اہمیت	224
قیامت کے دن بچہ کا والدین کے لیے شفاعت کرنا	227
یہود ونصاریٰ کا ملت ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ اور اس کی تردید	228
اہل سنت والجماعت کی پہچان	229
امامت سے کیا مراد ہے؟	229
نبی کے مخصوص من اللہ ہونے کا معنی	230
امامت کا انتخاب کیسے ہوتا ہے؟	230
﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى﴾ میں ابتلاء کے معنی	231
﴿لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴾ کی تفسیر	232
﴿رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ﴾ کی وضاحت	232
سنت نبوی پر عمل مہلک وموذی امراض کا علاج ہے	234
ماں کا بچے کو دودھ پلانے کی حکمتیں	235
﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ کی تفسیر	236

فہرست مضامین

داڑھی کی سنت	237
ایک انگریز کا واقعہ	239
دس چیزیں فطرت میں سے ہیں	239
حضور اکرم ﷺ کا لباس	242
اردو میں حدیث کی تصانیف لکھنے والوں کا حال	246
حدیث کی تصنیف کے اصول	246
تفسیر	247
پہلا قبلہ	249
بیت اللہ کی تاریخ	250
ابوجہل کا کفر فرعون کے کفر سے زیادہ سخت تھا	252
حرم کی خصوصیت کہ وہاں کوئی بھوکا نہیں رہتا	257
سارا حرم امن کی جگہ ہے	258
حرم میں قتال حرام ہے	258
مقام ابراہیم کون سی جگہ ہے؟	260
مقام ابراہیم کا مصداق	261
شبہ اور اس کا ازالہ	263
باطنیہ فرقے کا نظریہ	264
خلفائے راشدین کی اتباع کا حکم	265
صحابہ رضی اللہ عنہم کا باہمی احترام	266
موافقات عمر رضی اللہ عنہ	266
قیامت کے دن سب سے پہلے لباس کسے پہنایا جائے گا؟	269
﴿لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ﴾ کی تفسیر	269
جماعت سے پہلے مسجد میں اجتماعی ذکر	271
مکی صاحب کا واقعہ	272

طواف افضل ہے یا نماز؟	272
اتباعِ سنت کا واقعہ	273
ربط آیات	274
کعبہ کی سب سے پہلی تعمیر	275
مکہ کی طرح مدینہ میں بھی برکتیں ہیں	277
مکہ و مدینہ کے پہاڑ سرسبز کیوں نہیں؟	278
مکہ اور مدینہ میں کون افضل ہے؟	278
اللہ کی طرف سے مکہ کی آبادی کا انتظام	279
کعبہ کے قریب قبیلہ جرہم کا پڑاؤ	282
حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پہلی شادی اور ابراہیم علیہ السلام کی ملاقات کا واقعہ	282
کعبہ کے بناء کے پتھر بڑے بڑے تھے	285
کعبہ کی جگہ کا تعین کیسے ہوا؟	285
اسماعیل علیہ السلام کو حجر اسود کی تلاش کا حکم	285
کعبہ کی بنیاد میں	286
والد کے ایمان کے سوا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سب دعائیں قبول	293
﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ کی تفسیر	295
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کرنے کی وجہ	296
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے بارش	297
تین اعمال صدقہ جاریہ ہیں	298
حضرت جبرائیل علیہ السلام کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مناسک حج سکھانا	298
مسئلہ تقدیر کے متعلق کچھ وضاحت	300
تمام انبیاء و رسول انسان کیوں ہیں؟	301
نبی کا کام قرآن کی وضاحت	302
حکمت کی تفسیر	303

تزکیہ نفس بالسیہ معتبر ہے	304
تزکیہ نفس کے مراتب	304
تزکیہ نفس کرنے والے صوفیاء کی اقسام	305
حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کی عاجزی	305
اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کی حکمتیں	306
قبر پر مٹھی بھر مٹی ڈالنے سے بخشش کا واقعہ	307
ایمان کی مٹھاس پانے کا واقعہ	307
اللہ کی رحمت بندوں کے گناہوں سے زیادہ وسیع ہے	308
"نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں" کا مطلب	308
اعمالِ صالحہ کرنے کے بعد دعائیں قبول ہوتی ہیں	309
آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے نبی بنے اور آخر میں مبعوث ہوئے	310
"آخِرُ لَبِنَةٍ" کی تفسیر	311
آیات کا ربط	312
گمراہ فرقوں کے ساتھ ساتھ آکبہ باطلہ کی تردید ضروری ہے	313
ایک ماہر فلکیات کا دینی مدرسہ کا سائنس کا سبق سننا	315
کعب بن اشرف یہودی کے قتل کا واقعہ	318
ہر شخص اپنی اولاد کو عقیدہ کی وصیت کرے	320
سب سے پہلے کون سی مسجد کی بنیاد رکھی گئی؟	321
یہود و نصاریٰ کا دین یعقوبی پر قائم رہنے کا دعویٰ	321
حضرت یعقوب علیہ السلام کا وفات کے وقت وصیت کرنا	323
شانِ نزول	325
﴿حَنِيفًا﴾ کی مختلف تفاسیر	325
ربطِ آیات	326
اسلام کو کھوکھلا کرنے والی دیمک	326

تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے	327
حضور اکرم ﷺ کی ختم نبوت	327
قرآن پڑھنے کا ذوق رکھنے والے شخص کا واقعہ	330
﴿وَالْأَسْبَاطِ﴾ کی مختلف تفسیریں	330
آیت مبارکہ سے یہود و نصاریٰ کا رد	331
چار بڑے بتوں کا ذکر	332
اللہ تعالیٰ کا رنگ سب سے بہترین رنگ ہے	332
عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا گواہ	333
شبہ اور اس کا ازالہ	334
اُحد پہاڑ کا خوشی سے جھومنا	334
﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ کی تفسیر	334
تحویل کعبۃ اللہ	336
میاں بیوی کے درمیان شیطان کا مکر	338
یہود و نصاریٰ کے اعتراضات اور ان کے جوابات	339
کعبہ پر اللہ کی رحمتوں کا نزول	340
﴿وَسَطًا﴾ کی تفسیر	340
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت اور محبت میں دو گروہ	341
امت وسط کا معنی	341
﴿السُّفَهَاءُ﴾ سے مراد کون ہیں؟	342
شریعت کے کسی حکم پر عمل سے ثواب ضائع نہیں ہوتا	343
یہودی امت محمدیہ پر تین چیزوں میں حسد کرتے ہیں	345
امت محمدیہ سابقہ امتوں کی گواہی دے گی	345
ہاتھ نہ پھیلانے والے شخص کو جنت کی بشارت	346
جنتی اور دوزخی کی پہچان	347

قاضی احسان احمد شجاع آبادی ﷫ کا بار بار کلمہ پڑھنے کا واقعہ 347
اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے 348
کسی کے اچھے بُرے کا اندازہ کیسے ہوگا؟ 348
کس کی تعریف اور مذمت معتبر ہے؟ 349
تدریجاً اسلام میں نرمی آگئی 350
احکامات کی تبدیلی کی حکمتیں 351
بیت اللہ میں آنے کے آداب 351
مسجد حرام میں ایک لاکھ نماز کا ثواب 352
حضور اکرم ﷺ کا مقام ادب 354
کعبہ کے قبلہ ہونے کی حضور اکرم ﷺ کی تڑپ 354
ہوائی جہاز میں نماز 355
بیت المقدس کی طرف رخ کرنے سے یہودی مسلمان ہو سکتے تھے؟ 357
مسیلمہ کذاب کا آپ ﷺ سے خلافت کا تقاضا 358
﴿لَا تَتَّبِعُوا الْيَهُوْدَ﴾ کی تفسیر 358
آپ ﷺ کی نبوت میں عبداللہ بن سلام ﷜ کا موقف 359
کعبہ کے متعلق یہود کے شبہات 360
انسان کی مجموعی قوتیں اور نبوت کی اہلیت 362
کثرت ذکر اللہ کا حکم 364
اللہ کا شکر کیسے کیا جائے؟ 364
شکر نعمتوں میں اضافے کا سبب ہے 365
گناہ کرنے والے کا شکر قبول نہیں کیا جاتا 366
اللہ تعالیٰ بندے کو کیسے یاد کرتا ہے؟ 366
اتباع شریعت اور مصائب پر صبر کی تلقین 368
مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر نصرانی عورت کا اسلام قبول نہ کرنا 369

قرآن کس کس پر لعنت کرتا ہے؟	369
صبر کا معنی	370
ایک صحابیہ کے صبر کا واقعہ	370
حضرت ابراہیم علیہ السلام، بی بی سارہ رضی اللہ عنہا اور ظالم بادشاہ کا واقعہ	371
حضرت جریج رحمۃ اللہ علیہ پر تہمت کا واقعہ	371
صبر کرنے والوں کے لیے بلاحساب جنت کا انعام	372
صبر کے انعام کی کوئی حد نہیں	373
صبر کی آخری حد اللہ کے راستے میں شہید ہو جانا ہے	373
ایک صحابی کا آپ ﷺ کے ساتھ محبت کا واقعہ	374
شہید کے درجات	374
شہداء کی ارواح جنت میں کہاں ہوں گی؟	376
صبر کا امتحان	377
قیامت کے دن انسان کے اعضاء اس کے خلاف گواہی دیں گے	377
صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان لانے میں اخلاص	378
انسانی فیصلے غلط بھی ہوتے ہیں	378
اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے امتحان کیسے لیتا ہے؟	380
مکہ والوں پر قحط کا واقعہ	380
مجاہدین صحابہ کا مجاہدہ	381
صبر کرنے والوں کے لیے تین انعامات	382
دنیا حقیر چیز ہے	384
جنت والوں کو اللہ کی رضا و دیدار نصیب ہوگا	385
حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا صبر کا عمل اور اس کا انعام	386
اپنی مخطوبہ کو کس حد تک دیکھنا جائز ہے؟	387
عدت کے اندر صراحتاً خطبہ نہ دے	388

کسی کی منگنی پر منگنی جائز نہیں	388
ایک محدث کے چہرے کے مسخ ہونے کا واقعہ	388
دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟	389
پرانی یاد آنے پر ﴿انا للہ﴾ کہنے کا اجر	389
بچے کی وفات پر صبر کرنے کا اجر	390
آیات کا ماقبل سے ربط	390
آیت کا شان نزول	391
حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ	391
آب زمزم کا واقعہ	392
زمزم پینے کے فوائد	394
صبر کرنے والوں کو آخرت میں اجر ملے گا	395
صفا و مروہ کی سعی کے مسائل	395
﴿ومن تطوع خیرا﴾ سے کیا مراد ہے؟	399
دین حق کو چھپانا یا بدلنا موجب لعنت اور عذاب ہے	400
یہود کا رجم کا حکم چھپانے کا واقعہ	401
اطاعت رسول میں تمام مشکلات کا حل	402
منصوبہ بندی کا حکم	402
قبر کا عذاب	404
کفار پر لعنت بھیجنے کا حکم	405
آیت کا شان نزول	407
کچھ بنیادی عقائد اور مسائل	408
علاج قرآنی	411
اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم	412
اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی حکمت	413

◆ سائنس اور قرآن کا تقابلی جائزہ ____ 415

◆ زمین کی گردش کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جواب ____ 416

◆ نکتہ ____ 417

◆ ہوائیں بھی اللہ کی نعمت ____ 420

◆ ہواؤں کے مختلف نام ____ 420

◆ کافر اور مسلمان کی سوچ میں فرق ____ 423

◆ مومن اور کافر کی نظر میں دنیا کی حیثیت ____ 423

◆ آیات کا شان نزول ____ 425

◆ آیات میں مشرکین مکہ کی حالت کا بیان ____ 426

◆ شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اپنے شاگرد کو نصیحت ____ 427

◆ غیر اللہ کو پکارنا بڑا گناہ ہے ____ 427

◆ سات شہیدوں کی بیوہ کے نکاح کا واقعہ ____ 430

◆ ﴿إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ کی تفسیر ____ 430

◆ مشرکین کی اقسام ____ 431

◆ ڈاکوؤں کا بزرگ کی تصویر دیکھ کر سامان چھوڑ دینے کا واقعہ ____ 432

◆ بزرگوں کی تصویر بنانے والے ____ 432

◆ ذی روح کے مصورین کو قیامت کے عذاب ہوگا ____ 433

◆ ماقبل آیات کے ساتھ ربط ____ 434

◆ ﴿حَلَالًا طَيِّبًا﴾ کا معنی ____ 434

◆ حلال اور حرام چیز کا معیار ____ 434

◆ مسجد کی طرف اٹھنے والے قدم پر ثواب ملتا ہے ____ 436

◆ ﴿خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ کی مختلف تفاسیر ____ 436

◆ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے ____ 438

◆ شیطان کے حربے ____ 439

- بدعت کے متعلق مسائل — 439
- حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ کا شیطان سے مکالمہ — 440
- ایک اللہ والے کی تہجد قضا ہونے کا واقعہ — 441
- بے نمازی پیر کا واقعہ — 442
- خان محمد کنتہ کا واقعہ — 442
- حلال رزق کی اہمیت — 442
- دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟ — 443
- درد کے علاج کا نبوی نسخہ — 444
- طلاق ہر حال میں واقع ہو جاتی ہے — 445
- میاں بیوی میں لڑائی پر شیطان زیادہ خوش ہوتا ہے — 446
- طلاق دینے کا سنت طریقہ — 447
- زمانہ جاہلیت کی رسم بد کی تردید — 447
- غصہ میں قسم یا منت ماننا بھی شیطانی دھوکہ ہے — 447
- مسئلہ تقلید — 448
- کافروں کی مثال — 451
- خطاب مؤمنین — 452
- شکر کا معنی — 453
- مشینی ذبیحہ کا حکم — 455
- بندوق اور گولی سے شکار کا حکم — 456
- سدھائے ہوئے کتوں کا شکار — 456
- میتہ کے احکام — 457
- مسئلہ — 457
- خنزیر کے احکام — 457
- دو مردار اور دو خون حلال ہیں — 458

انتقالِ خون کا مسئلہ	459
خنزیر کے متعلق مسائل	459
غیر اللہ کے نام کی چیزوں کا حکم	460
حلال کھانے کا حکم	461
تین مستجاب الدعوات کو حرام کھلانے کا واقعہ	462
شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کا تحفہ واپس کرنے پر انکار کا واقعہ	463
یورپ میں مسلمانوں کا حال	464
مردار اور اس کے انڈے بھی حرام ہیں	464
غیر اللہ کے نام پر ذبح ہونے والا جانور	466
بتوں کی پوجا کی وجہ	466
غیر اللہ کے نام کا جانور	467
حلال میں ہر انسان کے لیے راحت ہے	468
﴿أُولِي الْأَمْرِ﴾ کا مصداق و معنی	468
قحط کی وجہ سے ایک صحابی کی بھوک	469
باغات کے رستوں میں پھل کھانے کا حکم	470
حالتِ اضطرار میں حرام کھانے کا حکم	470
جن کو پیغامِ رسالت نہیں پہنچا تو ان کی نجات کا حکم	471
تحریف تورات و انجیل	472
تحریف قرآن	472
فرزدق شاعر کا بادشاہ کے ساتھ واقعہ	473
تحریف کرنے کی وجوہات	474
یہود کی عہد شکنیاں اور ان کا انجام	475
یہود کی ذلیل ہیں یا نہیں؟	476
سونے چاندی کا استعمال مردوں پر حرام ہے	478

فہرست مضامین

آیات کا ربط	479
﴿وَالْبِرَّ﴾ کا معنی و مفہوم	479
ایمانیات کی تفصیل	479
﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ کی تفسیر	480
عمل کے قبول ہونے کی شرائط	481
افضل صدقہ کا بیان	482
کھانے پینے میں بھی ہمسائے کا خیال	483
حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا نوجوان سے ملاقات کا واقعہ	483
﴿وَالْيَتٰمٰى﴾ ... یتیم کی تعریف	484
مسکین کی تعریف	484
مسئلہ	485
گردن چھڑانے کے کیا معنی ہیں؟	486
بے نمازی کا حکم	487
﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ کی تفسیر	488
وعدہ پورا کرنا اور اس کی میعاد	488
"ابواب البر والصلۃ" صفاتِ ایمان	488
ایمان اطاعت الٰہی و اطاعت رسول کا نام ہے	489
﴿وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ کون لوگ ہیں؟	490
قصاص کا معنی	491
تمام احکام الٰہی کو تسلیم کرنا فرض ہے	491
انگریزی قانون ناقص ہے	493
قتل کی اقسام اور ان کے احکام	494
قصاص میں برابری	495
ذمی کافر کے بدلہ میں مسلمان کا قتل	497

- ◆ عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کیا جائے گا 497
- ◆ قاتل زیادہ ہوں تو ان کا حکم 498
- ◆ معاف کرنے پر قاتل کی رضا کا حکم 499
- ◆ ﴿ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ﴾ کی تفسیر 499
- ◆ آیات کا باہمی ربط 500
- ◆ آیت سے متعلق امام رازی رحمہ اللہ کی تفسیر کا جواب 501
- ◆ ایک واقعہ 504
- ◆ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا واقعہ 504
- ◆ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کا ملفوظ 505
- ◆ ﴿بِالْمَعْرُوفِ﴾ کی تفسیر 505
- ◆ وصیت کب کرے؟ 505
- ◆ تہائی مال کی وصیت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد 506
- ◆ منہ بولے بیٹے کی وصیت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد 507
- ◆ وصیت کے بعد اس میں کمی بیشی کرنا 507
- ◆ وصیت کرنے والوں کے لیے بشارت نبوی 508
- ◆ ربط آیات 509
- ◆ روزے کی فرضیت کیوں ہوئی؟ 509
- ◆ صوم کا لغوی اور شرعی معنی 510
- ◆ رمضان سے پہلے کون سے روزے فرض تھے؟ 510
- ◆ روزہ گناہوں کی ڈھال ہے 511
- ◆ خصوصی طور پر روزے کا بدلہ اللہ تعالیٰ دیں گے 512
- ◆ روزے کے چند احکام 512
- ◆ روزہ ہمیں کیا درس دیتا ہے؟ 515
- ◆ روزہ صرف کھانے پینے سے رکنے کا نام نہیں 515

◆ اکابر کے روزوں کی مثال 516
◆ وقت کا جلدی گزرنا قیامت کی علامت ہے 517
◆ نماز میں تین تبدیلیاں ہوئیں 517
◆ روزے میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں 518
◆ روزے کی نیت کب سے کرنی ہے؟ 519
◆ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں 520
◆ رمضان اور آسمانی کتابوں کے نزول کا خصوصی تعلق 520
◆ آسمانی کتابوں کا نزول رمضان میں ہوا 521
◆ قرآن پاک کو ایک بار میں نازل کیوں نہ کیا گیا؟ 522
◆ حالت سفر میں روزہ رکھے یا چھوڑ دے؟ 523
◆ مریض اور مسافر کے روزے کا حکم 524
◆ رخصت پر عمل نہ کرنے کی وعید 525
◆ ائمہ کرام کا اختلاف کے باوجود باہمی ادب واحترام 525
◆ معرفت الٰہی کیسے حاصل ہوتی ہے؟ 526
◆ ایک گنہگار کا ایک بزرگ سے بیعت کا واقعہ 527
◆ قضاء روزوں کی ادائیگی کا طریقہ 528
◆ ایک دن روزہ، ایک دن افطار 528
◆ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا عدل چرواہے کی زبانی 530
◆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک جنگل میں پڑاؤ ڈالنے کا واقعہ 530
◆ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دریائے نیل کو خط لکھنے کا واقعہ 531
◆ عبادت بھی کرو، معاملات میں بھی حصہ لو 531
◆ شان نزول 533
◆ ربط آیات 534
◆ دعا مانگنے کا صحیح طریقہ 534

اللہ بندے کے کتنا قریب ہے؟	535
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا انکار کفر ہے	536
حلولی فرقے	537
معیت خداوندی کا معنی	538
دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟	540
ایک کافر کی پکار پر اللہ کی طرف سے جواب	541
ایک کلمہ جو جنت کے خزانوں میں سے ایک ہے	541
دعا کی قبولیت کا ایک راز	542
شکر اور کفر کی تفسیر	544
ابلیس کا ایک آیت سے غلط استدلال	548
جتنا مانگو، اللہ تعالیٰ کی رحمت تو اس سے بھی زیادہ ہے	550
نیک آدمی کی تحنیک کی برکت	551
دعا مانگنے کے فائدے	551
دعا جلد قبول نہ ہونے میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں	552
تبدیلی حکم کا سبب	558
خیط ابیض و خیط اسود کے معنی	563
اعتکاف کے مسائل	567
ماقبل آیات سے ربط	569
مال حرام کی اقسام و احکام	570
حرام طریقہ سے مال کمانے کے مسائل	571
فسخ نکاح کے بعد دوسری جگہ شادی	573
دودھ روکے ہوئے جانور کا بیچنا اور اس کی قیمت کا حکم	574
زمانہ جاہلیت کی خرید و فروخت	574
قیامت کے دن تین سوالات سے پہلے کوئی نہیں ہل سکے گا	575

فہرست مضامین

حرام کھانے کا نتیجہ 575
حلال رزق کی برکات وثمرات 575
شان نزول اور چاند سے متعلقہ شرعی احکام 576
زمانہ جاہلیت کی بری رسمیں 582



عرضِ ناشر

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: 1 ...... بیت اللہ، 2 ...... کتاب اللہ، 3 ...... اہل اللہ۔

اور اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، رمضان ہو یا شوال، حج کا موسم ہو یا عمرے کا، حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کا درسِ قرآن مسجدِ حرام میں بلا ناغہ ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں دوسرے مشائخ کے دروس بھی ہوتے ہیں، تاہم جس کثرت سے اور ذوق شوق سے لوگ حضرت مکی مدظلہ کے درس میں شرکت کرتے ہیں، دوسرے دروس میں یہ کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ چنانچہ برصغیر پاک و ہند، بلکہ پوری دنیا میں جہاں بھی اردو داں طبقہ حرم شریف میں آتا ہے، حضرت مکی مدظلہ کے درس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحیدِ خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے،

بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمالِ مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔

حضرتِ اقدس کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص وتقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت وکردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر تفسیر ''انوارالحرم'' المعروف ''تفسیرِ مکی'' حضرتِ اقدس کے چند دروس کا مجموعہ ہے۔ جسے اس سے قبل اک اور ادارہ نے شائع کیا تھا اب اسے حضرت اقدس ہی کے حکم پر ''مکتبۃ الفقیر'' شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اللہ رب العزت اس کتاب اور ''مکتبۃ الفقیر'' دونوں کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین ﷺ

اجازت ہو تو آ کر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہو گا

قارئینِ کرام! گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی، کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تازیست اپنی رضا کے لیے یہ خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ہماری آخرت کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

دعاؤں کا طالب:

فقیر سیف اللہ احمد نقشبندی مجددی

مکتبۃ الفقیر



پیشِ لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حضرت شیخ مولانا محمد مکی حجازی ان موفق من اللہ لوگوں میں سے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے سرزمین حرم میں طُوْبٰی لِمَنْ جَعَلَہُ اللّٰہُ مِفْتَاحًا لِلْخَیْرِ وَ مِغْلَاقًا لِلشَّرِّ کا مصداق کامل بنایا ہے، بفضلہ ان کے دروسِ حرم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہر سال سینکڑوں لوگوں کو شرک و بدعت کے اندھیروں سے توحید کا نور عطا فرمایا ہے۔

اللہ بہترین جزائے خیر دے مملکت اسلامیہ سعودیہ عربیہ کو جن کے تعاون کی بدولت نصف صدی سے یہ سلسلہ خیر جاری و ساری ہے، اسی سلسلہ خیر کی ایک کڑی قرآن حکیم کی عام فہم اور مفید ترین تفسیری فوائد پر مشتمل تفسیر کی کی جلد چہارم آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ شیخ مکی زاد اللہ برکاتہم کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے ہزاروں عقیدت مندوں میں سے ہم خدام کو اس کار خیر کی نشر و اشاعت کی سعادت بخشی۔ اللہ جزائے خیر دے عزیز صالح حافظ محمد عادل صاحب سلمہ اللہ کو کہ انہوں نے اس کو حسب استطاعت پوری محنت اور توجہ سے طبع کرانے کی سعادت حاصل کی۔ اللہ کریم اپنے فضل خاص سے تاسی بأسوة السلف کے طور پر حضرت شیخ مکی کے اس فیضِ علمی کو قبولیت تامہ تامہ سے نوازے۔ آمین

وَ مَا ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

یکے از خدام اسلاف

ظفر احمد قاسم

الخادم بحدیث النبی الشریف بجامعہ خالد بن ولید ؒ وہاڑی

تفسیر سورۂ بقرہ

﴿قُلۡ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِيۡلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلۡبِكَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَهُدًى وَّبُشۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۹۷﴾ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبۡرِيۡلَ وَمِيۡكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۹۸﴾﴾
[البقرة:۹۷،۹۸]

''کہہ دیجیے: جو جبریل کا دشمن ہے (غصہ سے مر جائے)، اسی نے آپ (ﷺ) کے دل پر اللہ کے حکم سے قرآن لایا ہے، جو تصدیق کرتا ہے جو آپ (ﷺ) سے پہلے اُتارا گیا ہے۔ اور ماننے والوں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے۔ جو شخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ بھی کافروں کا دشمن ہے۔''

یہودیوں کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ:

ان آیات میں یہود کی مزید شقاوتوں کو بیان فرمایا ہے۔ جہاں یہود نے حضور ﷺ کی عداوت اور دشمنی میں اور بہانے بنائے، وہاں ایک دفعہ انہوں نے یہ بھی سوال کیا کہ اے محمد! آپ پر اللہ پاک نے جس فرشتے کے

ذریعہ وحی اُتاری ہے، وہ کون سا فرشتہ ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کے ذریعہ مجھ پر وحی اُتاری ہے۔ کہنے لگے: اگر جبرئیل کے بجائے میکائیل فرشتہ، آپ پر وحی لے کر آتا تو ہم اسلام لے آتے: کیونکہ جبرئیل سے ہماری دشمنی ہے، جبرئیل ہی ہمیشہ ہماری قوم پر عذاب لے کر آتے رہے اور ہمارے بارے میں اللہ نے جتنے سخت احکامات جاری فرمائے، وہ سارے کے سارے جبرئیل ہی لے کر آئے اور آپ پر بھی وحی جبرئیل لائے ہیں تو ہم دشمن کی لائی ہوئی وحی پر کیسے ایمان لے آئیں؟ لہٰذا ہم ایمان نہیں لا سکتے۔

فارسی کا ایک محاورہ ہے: ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' یعنی جب آدمی نے ایک بات تسلیم ہی نہ کرنی ہو تو پھر بہانہ بنانے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ مختلف بہانے بنائے جا سکتے ہیں، اصل بات یہ تھی۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وحی سیدھی دل پر اُتاری جائے، یعنی سمع، بصر باقی اعضاء کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ دل میں آنے کے بعد وہ باقی اعضاء کو پہنچ رہی ہے، جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: کبھی کبھی ایسی کیفیت ہوتی تھی کہ سردیوں کی راتوں میں، جبکہ شدید سردی ہوتی تھی، حضور ﷺ پر وحی اُترتی تو آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر ثقل وحی کی وجہ سے پسینہ نمودار ہو جاتا تھا، لیکن ہمیں جبرائیل علیہ السلام نظر نہیں آتے تھے۔

اس کو یوں سمجھیں کہ آدمی آدھی نیند میں دیکھتا ہے تو اس کی کیفیت بالکل یہ ہوتی ہے کہ باقی اعضاء معطل ہوتے ہیں، ہاتھ پاؤں سوئے ہوتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف اس کا القاء بھی دل سے ہوتا ہے اور انسان دل سے سمجھ رہا ہوتا ہے۔

یہودیوں کے سوالات اور حضور ﷺ کے جوابات:

یہودیوں نے یہ بات کیوں کی تھی؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت حضور ﷺ کی خدمت میں آئی اور کہا: ہم آپ ﷺ سے چند چیزیں پوچھنا چاہتے ہیں اور ان چیزوں کے بارے میں نبی کے بغیر کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس ان کے بیٹے آئے کہ ہمارے ساتھ یوسف کو بھیجیں تو انہوں نے کہا تھا: تم میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم یوسف کی حفاظت کرو گے۔ انہوں نے اللہ کی قسم کھائی اور وعدہ کیا۔ تم بھی اسی طرح میرے ساتھ وعدہ کرو کہ اگر میں جواب دے دوں اور تم جان لو کہ وہ جواب ٹھیک ہے، کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ میری اتباع کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ

بالکل ٹھیک ہے، ہم مسلمان ہو جائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''سَلُونِي عَمَّا شِئْتُمْ'' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۲۵۱۴]

''پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟''

انہوں نے کہا: ایک سوال یہ ہے کہ حضرت یعقوب نے تورات کے اُترنے سے پہلے کون سا کھانا اپنے اوپر حرام کیا تھا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ مرد کا نطفہ کیسا ہوتا ہے اور عورت کا پانی کیسا ہوتا ہے؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ کبھی لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی پیدا ہوتی ہے، حالانکہ میاں بیوی بھی ایک ہیں اور دونوں کا پانی بھی ایک قسم کا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اور ہمیں یہ بتائیں کہ تورات میں جس نبی اُمّی کا ذکر ہے کہ ایک اُمّی نبی پیدا ہوں گے تو وہ کون ہے؟ اور اس نبی کا اللہ کے فرشتوں میں سے دوست کون ہے جو وحی لے کر آنے والا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم قسم کھاؤ، اگر میں بتادوں تو ایمان لے آؤ گے؟ انہوں نے کہا: بالکل ہم قسم کھاتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ اگر آپ ہمیں جواب دے دیں تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: پہلی بات سنو! حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النساء کی بیماری میں بیمار ہوئے اور شدید بیمار ہو گئے۔ جب بیماری طویل ہو گئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے منت مانی: یا اللہ! اگر آپ مجھے بیماری سے شفاء عطا فرمادیں تو اپنا سب سے محبوب کھانا اور اپنے سب سے محبوب مشروب چھوڑ دوں گا۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو شفاء دے دی تو انہوں نے اپنا محبوب کھانا اونٹ کا گوشت اور محبوب مشروب اونٹ کا دودھ چھوڑ دیا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بتلاؤ یہ بات ٹھیک ہے؟ انہوں نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ نے فرمایا: اے میرے اللہ! تُو گواہ ہو جا ان کے اس اقرار پر۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں قسم دیتا ہوں اس خدائے واحد کی جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات اُتاری، کیا تم جانتے ہو کہ مرد کا پانی گاڑھا اور سفید ہوتا ہے اور عورت کا پانی پتلا اور پیلا ہوتا ہے؟ اگر مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آجاتا ہے تو بچہ پیدا ہوتا ہے اور اگر عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آجاتا ہے تو بچی پیدا ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بتاؤ یہ بات ٹھیک ہے؟ کہنے لگے: بالکل ٹھیک ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! تُو گواہ ہو جا!

اور حضور ﷺ نے فرمایا: تورات میں نبی اُمّی کا جو ذکر ہے، اس کی صفات میں یہ ہے کہ اس کا دل نہیں سوئے گا، آنکھیں نیند کریں گی۔ وہ کہنے لگے: بالکل ٹھیک ہے۔

بس آپ مہربانی کر کے بتلادیں کہ فرشتوں میں آپ کا دوست کون ہے؟ اسی پر آپ کا اور ہمارا فیصلہ ہوتا ہے۔
حضور ﷺ نے فرمایا: ''فَإِنَّ وَلِيِّيَ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ لَمْ يَبْعَثِ اللَّهُ نَبِيًّا قَطُّ إِلَّا وَ هُوَ وَلِيُّهُ'' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۲۵۱۴] (میرا ولی جبرئیل ہے۔ اور جتنے نبی آئے ہیں، سب کا ولی جبرائیل ہے)۔ کہنے لگے: اب ہم آپ کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ آپ پر ایمان نہیں لا سکتے؛ کیونکہ جبرائیل ہمارا دشمن ہے، ہم دشمن کی بات کو کیسے مان لیں؟
تو اللہ پاک نے یہ آیت اُتاری:

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٩٧﴾﴾ [البقرۃ: ۹۷]

تو یہود اللہ کے غضب کے مستحق بن کر لوٹے کہ انہوں نے جان لیا کہ آپ ﷺ سچے نبی ہیں، لیکن پھر بھی نہ مانے؛ کیونکہ آپ ﷺ کے پاس وحی جبرائیل لاتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے یہ سوال بھی کیا کہ روح کس کا لقب ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں اس اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ جس نے تورات میں احکام اُتارے ہیں، وہ روح جبرائیل کا لقب ہے اور وہی اللہ کا فرشتہ ہے، جس کا لقب روح ہے، میری طرف وحی لے کر آتا ہے۔ تو یہود کہنے لگے: وہ جبرائیل ہمارا بڑا دشمن ہے، اس وجہ سے ہم آپ پر ایمان نہیں لا سکتے؛ کیونکہ جب بھی جبرائیل آتا ہے تو خون بہانے کے حکم اور اللہ کا عذاب لے کر آتا ہے۔ اگر جبرائیل کے بجائے کوئی اور فرشتہ ہوتا تو ہم آپ پر ایمان لے آتے، لیکن جبرائیل کی موجودگی میں ہم ایمان نہیں لا سکتے۔

یہ باتیں بالکل جہالت ہیں، جبرائیل تو تمام رسولوں کے پاس وحی لے کر آئے، تمام نبیوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واسطہ ہیں۔ جبرائیل علیہ السلام اتنی شان والے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عرش کے پاس رکھا ہے۔ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اللہ پاک نے جتنے فرشتے بنائے ہیں، ان سب کے سردار جبرائیل علیہ السلام ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت حضور ﷺ کی خدمت میں آئی اور آکر کہنے لگی: اے ابوالقاسم! ہم نے آپ سے پانچ چیزیں پوچھنی ہیں، اگر آپ ان چیزوں کے بارے میں صحیح جواب دے دیں تو ہم مان لیں گے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں اور ہم آپ کی اتباع کریں گے اور آپ کا کلمہ پڑھ لیں

گے۔ حضور ﷺ نے ان سے ویسے عہد لیا، جیسے گزشتہ روایات میں ذکر ہوا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: پوچھو! کیا پوچھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ پہلا سوال ہم یہ کرتے ہیں کہ ہمیں پیغمبر اور نبی کی نشانی بتلائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

''تَنَامُ عَيْنَاهُ وَ لَا يَنَامُ قَلْبُهُ'' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۲۵۱۴]

''نبی جو ہوتے ہیں ان کی آنکھیں تو نیند کرتی ہیں، لیکن دل ان کا جاگتا ہے۔''

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی کی یہ صفت ہے، ورنہ اکثر کتابوں میں یہ آتا ہے کہ یہ صفت ہمارے آقا ﷺ کی ہے کہ آپ کی آنکھیں سو جاتی تھیں، لیکن دل مبارک غفلت میں نہیں ہوتا تھا۔

اگر حضور ﷺ کا دل نہیں سوتا تھا تو نیند کیسے آگئی؟

سوال: بعض لوگوں نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ اگر حضور ﷺ کا دل نہیں سوتا تھا اور آنکھیں سوتی تھیں تو وہ حدیث جس میں ہے کہ حضور ﷺ سفر مبارک سے واپس آرہے تھے اور آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تم نہ سونا، تم جاگتے رہنا، قافلہ سارا تھکا ہوا ہے، ایک آدمی جاگتا رہے، تاکہ ہماری نماز ضائع نہ ہو جائے اور تم وقت پر اذان دے دینا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اونٹ کے پالان کے ساتھ ٹیک لگائی اور صبح صادق کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا کہ جونہی صبح صادق نکلے گی، میں جلدی اذان کہہ دوں گا، حضور ﷺ غلس (اندھیرے) میں نماز پڑھ لیں گے اور ٹھنڈے وقت میں قافلہ چل پڑے گا، لیکن مجھ پر نیند غالب آگئی۔ چونکہ سفر میں تھکے ہوئے تھے، اونٹوں کا سفر تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے نیند آگئی، قافلہ والوں کو بھی نیند آگئی، حضور ﷺ کو بھی نیند آگئی۔ سب سے پہلے حضور ﷺ کی آنکھ کھلی تو سورج نکل چکا تھا۔ آپ ﷺ نے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور فرمایا: جلدی کرو، بلال کو بلاؤ۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اچھی ہم نے تمہاری ڈیوٹی لگائی، تم نے ہماری نماز بھی ختم کر دی، سورج نکل چکا ہے۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! آپ بھی تو سو گئے تھے، جس اللہ نے آپ کو سلا دیا، اس نے مجھے بھی سلا دیا، میں کیا کر سکتا تھا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: جلدی کرو، اس وادی سے باہر نکلو، اس وادی میں شیطان کا اثر ہے۔

جس جگہ آدمی کی نماز نہ ہو تو سمجھ لو کہ وہاں شیطان کا ڈیرہ ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ لگا لو جن کوٹھیوں میں نماز نہیں

ہوتی، جن بڑے بڑے گھروں میں نمازیں نہیں ہوتیں، جن بڑے بڑے محلات میں نمازیں نہیں ہوتیں یا نماز کی توفیق ہی نہیں ہوتی، وہاں شیطان کا اثر ہوتا ہے، شیطان کا وہاں ڈیرہ ہوتا ہے۔ ہم فقیر لوگ ہیں، دین کے لیے کبھی کہیں اور کبھی کہیں سفر ہوتا ہے۔ تجربہ کیا ہے، بعض مقامات پر جاؤ تو تہجد نہیں چھوٹتی اور بعض مقام پر جاؤ تو فرض نماز بڑی مشکل سے پڑھی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان جگہوں پر شیطان کے اثرات ہوتے ہیں۔

حضور پاک ﷺ اس جگہ سے تشریف لے گئے اور دوسری جگہ جا کر آپ نے نماز پڑھی۔ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ کی یہ علامت تھی کہ آپ کا دل نہیں سوتا تھا تو نماز کیسے چلی گئی؟

پہلا جواب: یاد رکھیں! اوقات کا تعلق آنکھوں سے ہے، دل سے نہیں ہے۔ جیسے آپ لوگ نیند میں خواب دیکھتے ہیں، وہ خواب بھی دل میں القاء ہوتا ہے، آپ کی آنکھیں تو بند ہوتی ہیں، لیکن آپ خواب بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ نبی کے علاوہ تمام انسانوں کی آنکھیں بھی سوتی ہیں اور دل بھی۔ یہ صرف آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھیں سوتی ہیں، لیکن دل نہیں سوتا۔ اور جب ہم خواب دیکھتے ہیں کہ مکہ میں طواف کر رہے ہیں، فلاں دوست سے مل رہے ہیں، سب کچھ خواب میں دیکھ رہے ہیں، لیکن آپ پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ اوقات کا تعلق آنکھوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے حضور ﷺ کو نیند آ گئی، باوجود اس کے دل جاگتا تھا، چونکہ آنکھوں پر نیند تھی۔

دوسرا جواب: کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر سے ایسی باتیں اپنی منشاء سے کرا دیتے ہیں، تاکہ قیامت تک کے لیے لوگوں کو دین کا مسئلہ سمجھ آ جائے کہ اگر ہم سو جائیں اور نماز چلی جائے تو کیا کریں؟ اگر حضور ﷺ کی نماز قضاء نہ ہوتی تو ہمیں قضاء نماز کا مسئلہ بھی معلوم نہ ہوتا۔ حضور نے سورج نکلنے کے بعد یہ انتظار بھی نہیں فرمایا کہ ظہر کی نماز پڑھ لیں گے یا آئندہ جہاں پڑاؤ کریں گے، پڑھ لیں گے۔

اس سے یہ بھی مسئلہ سمجھ آ گیا کہ اگر تمہیں نیند آ گئی اور سورج نکل آیا، تمہاری آنکھ کھل گئی ہے تو جلدی سے وضو کر کے فوراً نماز ادا کرو۔ اور اس سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ اگر آدمی سو جائے اور اُٹھانے والا کوئی نہ ہو، وقت چلا گیا اور نماز قضاء ہو گئی، اس نے اُٹھ کر قضاء پڑھ لی تو اللہ کی طرف سے عذاب نہیں ہو گا؛ کیونکہ سونے والا اگر غفلت کرے یا نابالغ بچہ بلوغ سے پہلے کوئی غفلت کرے یا دماغ خراب ہو جائے تو اس پر بھی مؤاخذہ نہیں ہوتا۔

یاد رکھیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پاگل پر ہر چیز کا مؤاخذہ نہیں ہوتا، بلکہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ پاگل پر بھی مؤاخذہ ہوتا اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا پاگل پر مؤاخذہ نہیں ہوتا۔ پاگل ایک وہ ہوتا ہے جو مجنون ہے، جسے

آپ دیوانہ کہتے ہیں کہ اس کا دماغ کام ہی نہیں کرتا، اور ایک ہے نشہ پیا اور دماغ کام نہیں کر رہا۔ دونوں کے احکام میں بڑا فرق ہے۔ اگر آدمی نے نشہ کی حالت میں حقوق العباد کو ضائع کیا تو اس کو ادا کرنا پڑے گا۔

جیسے سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ نے نشہ کی حالت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دو اونٹنیاں ذبح کر دیں، حضور ﷺ نے بدلے میں دو اونٹنیاں دلوائیں کہ ادا کرو۔ یہ مسئلہ تب تھا، جب نشہ حرام نہیں تھا۔ اب تو چونکہ پینا بھی حرام ہے، جو پیے گا پہلے اس کو اسی کوڑے لگیں گے، اگلا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔

بہر حال حضور ﷺ کی آنکھ اس لیے نہ کھلی، تا کہ اُمت کو قضاء نماز کا مسئلہ معلوم ہو جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ نبیوں کے معاملات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، اللہ چاہیں تو جگا دیں، اگر اللہ نہ چاہیں تو نہ جگائیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی ہے۔

سونے کے آداب:

سونے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ آدمی دائیں طرف لیٹے، دایاں ہاتھ رخسار کے نیچے ہو اور رُخ قبلہ کی طرف ہو۔ یہ مشکل نہیں ہے، لیکن ہم لوگ ان باتوں کا خیال نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں کئی بیت الخلاؤں کا رُخ تو قبلہ کی طرف ہوتا ہے، لیکن چارپائی کا رُخ قبلہ کی طرف نہیں ہوتا، ہمیں اس بات کا خیال نہیں ہوتا۔ یاد رکھیں! جتنا ہم زیادہ ادب کریں گے، اتنی زیادہ ہم پر اللہ کی طرف سے رحمتیں نازل ہوں گی۔

علماء نے لکھا ہے کہ جب آپ دائیں طرف لیٹیں گے تو اس میں حکمت ہے؛ کیونکہ دل بائیں طرف ہوتا ہے، دل لٹک جاتا ہے تو آدمی غفلت کی نیند نہیں سوتا۔ اور اگر دوسرے رُخ سو جائیں گے تو آپ غافل ہو جائیں گے، دل کو زیادہ راحت مل جاتی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ دائیں طرف لیٹنا انبیاء کی نیند ہے، بائیں طرف لیٹنا غفلت والوں کی نیند ہے، اوندھا لیٹنا فاسق و فاجر اور شیطانوں کی نیند ہے، اُلٹا لیٹنا علامت قومِ لوط میں سے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے حالات سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھیں۔ کوشش کیا کریں کہ جب سونے لگیں تو سنت کے مطابق کچھ دیر لیٹ جائیں، تا کہ حضور ﷺ کی سنت پوری ہو جائے۔ چاہے وہ ایک منٹ کے لیے ہو، سوتے ہوئے سنت یاد رہی، اللہ کو ہم یاد کریں گے تو اللہ ہمیں یاد کریں گے اور حضور ﷺ کی سنتوں کو یاد کریں گے تو حضور ﷺ کے ساتھ محبت اور تعلق

قائم ہوگا۔ حضور ﷺ سے اصل محبت کا معنی یہ ہے کہ آپ اپنی شکل، صورت، سیرت، کردار، اعمال، اقوال، افعال الغرض ہر چیز میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع کریں۔

دوسرا سوال: انہوں نے یہ کیا کہ لڑکا کیسے پیدا ہوتا ہے اور لڑکی کیسے پیدا ہوتی ہے؟

جواب: حضور ﷺ نے فرمایا: ''يَلْتَقِي الْمَاءَانِ فَإِذَا عَلَا مَاءُ الرَّجُلِ مَاءَ الْمَرْأَةِ أَذْكَرَتْ وَ إِذَا عَلَا مَاءُ الْمَرْأَةِ آنَثَتْ. '' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۲۴۸۳] (اگر مرد کا پانی غالب آجائے تو بچہ پیدا ہوتا ہے اور اگر عورت کا پانی غالب آجائے تو بچی پیدا ہوتی ہے)۔

تیسرا سوال: انہوں نے کہا کہ یہ بتلائیں یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر کیا چیز حرام کی تھی؟

جواب: آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو عرق النساء کی تکلیف تھی۔ انہوں نے منت مانی تھی کہ اگر مجھے اس بیماری سے شفاء حاصل ہوگئی تو میں گوشت نہیں کھاؤں گا، اللہ نے شفاء دے دی۔ یہودیوں نے کہا کہ آپ نے بالکل سچی بات کہی ہے۔

چوتھا سوال: انہوں نے کہ آپ یہ بتلائیں کہ بادل کی گرج کی کیا حقیقت ہے؟

جواب: حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے، جس کو اللہ نے ان بادلوں پر مسخر کیا ہوا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے یا اس کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا ہوتا ہے، وہ ان پر برساتا ہے تو اس سے یہ آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہودیوں نے کہا: آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔

پانچواں سوال: انہوں نے کہا کہ ایک بات باقی رہ گئی کہ ہر نبی کا فرشتوں میں سے ایک وحی لانے والا ہوتا ہے، آپ بتلائیں کہ آپ کا وحی لانے والا کون ہے جو وحی لے کر آتا ہے؟

جواب: حضور ﷺ نے فرمایا: میرے پاس اللہ کا فرشتہ جبرائیل وحی لاتا ہے۔ یہودی کہنے لگے: یہ جبرائیل جب بھی آتا ہے اللہ کے عذاب لے کر آتا ہے، اللہ کی طرف سے جنگ کا حکم لے کر آتا ہے، یہ ہمارا دشمن ہے، اگر آپ کا دوست میکائیل ہوتا جو بارش کی خبر لے کر آتا ہے، جس سے سبزے اُگتے ہیں اور آبادیاں اُگتی ہیں تو ہم آپ پر ایمان لے آتے۔ اس پر اللہ نے قرآن نازل فرمایا: اے میرے مدنی کریم! جو جبرائیل کا دشمن ہے، وہ میرا دشمن ہے، میں اس کا دشمن ہوں۔ جبرائیل بھی میرا فرشتہ ہے اور میکائیل بھی میرا فرشتہ ہے۔ اگر کسی کا مجھ پر ایمان ہے تو ایسے بہانے بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قول نقل کیا ہے کہ جبرائیل، میکائیل اور اسرائیل، ان کا معنیٰ ”عبداللہ“ ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا اسلام لانے کا واقعہ:

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے سنا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں آرہے ہیں۔ وہ ایک بستی میں تھے اور اپنی کھیتی باڑی کررہے تھے۔ یہ تورات کے بہت بڑے عالم تھے۔ پھر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں آپ سے تین چیزوں کے بارے میں پوچھتا ہوں اور ان کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہوتا، مگر نبیوں کو علم ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابھی جبرائیل نے ان کے متعلق بتایا ہے۔ انہوں نے کہا: جبرائیل نے؟ فرمایا: ہاں۔ کہا: وہ تو فرشتوں میں یہودیوں کا دشمن ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی:

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ:۹۷]

اور فرمایا: پوچھو۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! آپ قیامت کی پہلی نشانی کے بارے میں مجھے خبر دیں، جنت والوں کو جو سب سے پہلے کھانا ملے گا، وہ کیا ہوگا؟ یہ کیا بات ہے کہ میاں بیوی کے ملنے کے بعد کبھی لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی پیدا ہوتی ہے؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کی پہلی نشانی یہ ہے کہ ایک آگ نکلے گی اور وہ لوگوں کو ہانک کر قیامت کے میدان کی طرف لے جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مچھلی کے جگر سے عجیب غذائیں بنا کر اللہ تعالیٰ جنت والوں کو کھلائیں گے (یہ دنیا کے اندر بھی ایک نعمت ہے اور آخرت کی مچھلی کا تو کوئی مقابلہ بھی نہیں کرسکتا)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مرد کا پانی غالب آجائے تو لڑکا پیدا ہوتا ہے اور اگر عورت کا پانی غالب آجائے تو لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ جب عبداللہ بن سلام نے یہ سنا تو کہا: ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ“ میں مسلمان ہوتا ہوں، مجھے کلمہ پڑھادیں۔ آپ نے جو فرمایا ہے وہ حق اور صحیح ہے اور ان مسائل کا جواب صرف نبی ہی دے سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد عرض کیا: یارسول اللہ! قومِ یہود بہتان لگانے والی قوم ہے، آپ مہربانی کرکے میری قوم کے کچھ لوگوں کو بلا کر میرے بارے میں پوچھ لیں۔ یعنی میں عام آدمی نہیں ہوں، ان کا ایک بڑا عالم ہوں اور میرا اسلام لے آنا معمولی بات نہیں ہے، لہٰذا آپ میرے بارے میں تسلی کرلیں۔

قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جب بڑے بڑے احبار، رہبان، علماء کسی دین کو قبول کرتے ہیں تو اس کی عزت میں اضافہ

ہوتا ہے، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اسلام لانے کے بعد اس پر قائم رہے اور حضور ﷺ کے بڑے جلیل القدر صحابی بنے۔ جب کوئی تورات کی بات آتی تو حضور ﷺ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو بلاتے تھے۔ اسی طرح ابن صوریا اور بھی بڑے بڑے لوگ مسلمان ہوئے۔ جو بغض وعناد میں تھے وہ محروم ہو گئے۔

جب یہودی آ گئے تو حضور پاک ﷺ نے ان سے فرمایا: ''أَيُّ رَجُلٍ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ فِيكُمْ؟'' [صحیح بخاری، رقم: ۳۹۳۸] (تمہارے اندر عبداللہ بن سلام کیسا آدمی ہے، اس کا کیا رُتبہ ہے؟) وہ کہنے لگے: وہ بہت اعلیٰ ہے، نسب کے لحاظ سے بھی اعلیٰ ہے، حسب کے لحاظ سے بھی اعلیٰ ہے، وہ ہمارا سردار ہے اور اس کا والد بھی ہمارا سردار تھا، وہ بہت بڑی شان والا آدمی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر عبداللہ بن سلام کلمہ پڑھ لے، مسلمان ہو جائے تو کیا تم اسلام لے آؤ گے؟ وہ کہنے لگے: اللہ اس کو اس سے بچائے کہ وہ تمہارے مذہب میں جائے۔ (نعوذ باللہ! آدمی جب تعصب میں ہوتا ہے تو وہ اپنے سوا کسی کو حق پر نہیں سمجھتا)۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اندر بیٹھے تھے، باہر نکلے اور پڑھا: ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' جب یہودیوں نے دیکھا کہ وہ مسلمان ہو گیا تو کہنے لگے: یہ تو بُرا آدمی ہے اور اس کا باپ بھی بُرا تھا۔ فوراً ان کی شان کو گھٹانے لگ گئے۔ حضرت ابن سلام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں اسی سے ڈرتا تھا۔ [صحیح بخاری، رقم: ۳۹۳۸]

شانِ نزول کی دوسری روایت:

دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مناظرہ کیا اور وہ مناظرہ یہودیوں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے درمیان حضور اقدس ﷺ کے متعلق ہوا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روحاء مقام پر دیکھا کہ لوگ پتھر اُٹھا اُٹھا کر لا رہے ہیں، پتھروں پر نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا: ان کا گمان یہ ہے کہ ان پتھروں پر حضور پاک ﷺ نے نماز پڑھی تھی، اسی وجہ سے یہ ان پتھروں پر نماز پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس فعل کو پسند نہ کیا اور فرمایا: حضور پاک ﷺ کو جہاں موقع ملتا تھا نماز پڑھ لیتے تھے، کسی وادی میں آئے تو پڑھ لی (خیبر میں آئے تو پڑھ لی، تبوک میں آئے تو پڑھ لی، بدر میں آئے تو پڑھ لی، مکہ، مدینہ کے راستے میں آئے تو پڑھ لی۔ حضور ﷺ نے کوئی ایسی پابندی تو نہیں کی ہے کہ خاص پتھر اُٹھا کر لائے جائیں اور ان پر نمازیں پڑھی جائیں،

لہٰذا تمہیں بھی جہاں موقع ملے، پڑھ لو) اور چلے گئے۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں یہود کے تعلیمی اداروں (مدرسوں) میں جاتا تھا، جب میں یہ سنتا کہ تورات، قرآن کے بارے میں بتلا رہی ہے تو مجھے عجیب اور بڑا اچھا لگتا کہ کتابیں کیسے ایک دوسرے کی تصدیق کر رہی ہیں!؟ ایک دفعہ یہودی کہنے لگے: آپ ہمیں بڑے پیارے لگتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیوں اچھا لگتا ہوں؟ انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے پاس آتے ہیں، ہماری مجلسوں میں بیٹھتے ہیں، ہمارے ساتھ باتیں کرتے ہیں اور تو کوئی نہیں آتا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اس لیے نہیں آتا کہ مجھے تمہارے ساتھ کوئی محبت ہوگئی ہے، بلکہ جب میں تورات سنتا ہوں اور تورات قرآن کی تصدیق کرتی ہے اور قرآن سنتا ہوں تو وہ تورات کی تصدیق کرتا ہے تو یہ بات مجھے بڑی پسند آتی ہے۔ اس کے بعد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرے تو انہوں نے کہا کہ دیکھو! آپ کے ساتھ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جارہے ہیں، تم ان سے مل لو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہودیوں سے کہا: میں تمہیں اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے تمہیں پیدا کیا اور جس اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا، جس اللہ نے کتاب تورات نازل فرمائی، تم یہ بتاؤ کہ تم ہمارے ان پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ تو وہ خاموش ہوگئے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کا رسول تو ہے۔ ان یہودیوں کے پاس جو اور لوگ بیٹھے تھے، انہوں نے کہا کہ حضرت عمر نے تو آج تمہارے ساتھ بڑی سخت بات کی اور تم سے اپنی بات منوالی، لہٰذا تم اس کے ساتھ کوئی ایسی بات کرو، ورنہ لوگوں میں ہمارے خلاف زہر پھیل جائے گا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیت گئے اور ہم نے ان کے نبی کے بارے میں مان لیا کہ وہ سچا نبی ہے۔ انہوں نے اپنے بڑے راہب سے کہا کہ اگر یہ مناظرہ اور علم کی بات ہے تو تم یہ بات کرو، ہم نہیں کر سکتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم تو برباد ہوگئے۔ انہوں نے کہا: ہم کیوں برباد ہوگئے؟ انہوں نے کہا کہ جب تم مانتے ہو کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی ہیں اور پھر کلمہ نہیں پڑھتے ہو تو صاف ظاہر ہے کہ ہلاک و برباد ہو جاؤ گے۔ کہنے لگے: ہم ہلاک نہیں ہوں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیسے ہلاک نہیں ہوگے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ کے فرشتوں میں سے بعض ہمارے دشمن ہیں اور بعض ہمارے دوست ہیں۔ جبرائیل ہمارا دشمن ہے اور میکائیل سے صلح ہے، وہ ہمارے ساتھ صلح کرنے والا فرشتہ ہے؛ کیونکہ جبرائیل جب بھی آتا ہے تو اللہ کی طرف سے سخت حکم لے کر آتا ہے، کبھی حرب کا، کبھی شدت کا۔ اور جب میکائیل آتا ہے تو بارشیں لے کر آتا ہے، مہربانی لے کر آتا ہے اور اللہ کی رحمتیں لے کر آتا ہے۔ تمہارے نبی کا ساتھی جبرائیل ہے، اس وجہ سے ہم ان کا کلمہ نہیں پڑھتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: یہ بتلاؤ کہ اللہ کے ہاں جبرائیل ومیکائیل کا کیا مرتبہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک عرش کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے بھی اس رب کی قسم ہے جو عرش والا ہے کہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ دونوں عرش کے قریب رہنے والے آپس میں دشمن ہوں، اور پھر جبرائیل ان سے دوستی رکھے۔ جن کا میکائیل دشمن ہو یا میکائیل ان سے نرمی کرے جن کے ساتھ جبرائیل کی دشمنی ہو۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ جب ان کا اللہ کے ساتھ یہ تعلق ہے تو تمہارا یہ کہنا کہ ایک دوست ہے اور ایک دشمن ہے، جھوٹی بات ہے۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں وہاں سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ ایک آدمی کے گھر سے باہر تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ابھی اللہ نے مجھ پر قرآن نازل کیا ہے۔ حضور ﷺ نے یہ آیات مبارکہ تلاوت کیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں ابھی آ رہا تھا کہ آپ کو خبر دوں کہ یہودیوں سے کیا کیا بات ہوئی، لیکن اللہ عرش والے نے میری خبر دینے سے پہلے آپ کو خبر دے دی۔

ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہودیوں سے پوچھا کہ تم حضور ﷺ کے بارے میں اپنی کتابوں میں کیا پاتے ہو؟ کہنے لگے: اللہ نے ہر نبی کے ساتھ ایک فرشتہ رکھا ہے اور حضور ﷺ کا ساتھ جبرائیل ہے، اگر فرشتہ میکائیل حضور ﷺ کے پاس آتا تو ہم اسلام لے آتے۔ آگے گزشتہ روایت والی تفصیل ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں سے اُٹھے اور حضور ﷺ کی خدمت میں آئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیات مبارکہ اُتاریں۔

﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾ [البقرة:۹۹]

"اور ہم نے آپ (ﷺ) پر واضح آیات اُتاری ہیں، ان کا انکار نہیں کرتے، مگر وہی لوگ جو نافرمان ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے ان آیاتِ مبارکہ میں حضور ﷺ کی رسالت ونبوت کا اثبات فرمایا اور کفار، خاص طور پر یہود ونصاریٰ کا رد فرمایا ہے۔ ان آیات میں اللہ نے فرمایا: اگر یہ جبرائیل کی وجہ سے ایمان نہیں لے آتے، جبرائیل تو آپ کے پاس وحی لے کر آیا ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی تو ہم نے آپ کو ایسی نشانیاں عطا فرمائی ہیں، جن کا کوئی عاقل انکار نہیں کرسکتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی معاند ہو، اس کے دل میں حسد ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے، وگرنہ

ہم نے تو آپ کو بڑی بڑی نشانیاں عطا فرمائی ہیں۔

"اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ" کی تفسیر:

بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں کچھ آیات ایسی بھی اُتاری ہیں جن کا اقرار یہودیوں کو بھی کرنا پڑتا ہے، جیسا کہ حضور ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ ذکر فرمایا، حالانکہ حضور پاک ﷺ اس زمانہ میں موجود بھی نہیں تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات اور آیات عطا فرمائیں، ان کا ذکر فرمایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے قصہ موسیٰ و فرعون کا ذکر فرمایا اور اسی طرح وہ چیزیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کر دی تھیں، اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کا ذکر فرمایا۔ جب یہ ساری کھلی ہوئی نشانیاں ان کو مل گئیں اور جو خبر تورات میں ہے، وہی خبر محمد مصطفیٰ ﷺ دے رہے ہیں، حالانکہ حضور پاک ﷺ نے تورات نہیں پڑھی تھی، ترپین سال تک تورات کا کوئی عالم حضور ﷺ کے پاس نہیں آیا، لیکن آپ نے ایسی خبر دی کہ جس کا پتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھا یا موسیٰ علیہ السلام کے متبعین کو تھا، لہٰذا ان واقعات کے بعد یہود کو چاہیے تھا کہ وہ فوراً ایمان لے آتے۔

سابقہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات:

علماء نے فرمایا: قرآن کی واضح آیات کی طرف جہاں اشارہ ہوتا ہے وہاں آیات بینات معجزات بھی مراد لیے جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ﴾ [بنی اسرائیل:۱۰۱]

''ہم نے حضرت موسیٰ کو نو آیات بینات، یعنی واضح نشانیاں عطا فرمائیں۔''

اس لیے علماء کرام، محدثین عظام اور سلف صالحین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ سب سے افضل شان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ آپ کی نبوت و رسالت بھی افضل ہے، آپ کی شریعت بھی افضل ہے، آپ پر جو کتاب اُتاری گئی وہ بھی افضل ہے اور اللہ نے جو میرے نبی کو معجزات دیئے ہیں وہ تمام انبیاء کے معجزات سے افضل ہیں۔ اللہ نے ہر زمانے میں اپنے انبیاء کو معجزات دیئے ہیں، لیکن جو معجزات حضور پاک ﷺ کو ملے ہیں، ان کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ پہلے انبیاء کو جتنے معجزے ملے تھے، ان کی نبوت کی مدت ایک زمانہ کے لیے محدود تھی تو ان

کے معجزات بھی اس زمانے کے لیے ہی تھے، جب وہ وقت گزر گیا تو اس معجزہ کا صرف ذکر رہ گیا، لیکن وہ معجزہ حقیقتاً باقی نہیں ہے، جیسا کہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے اندر ایسی قوت رکھ دی تھی کہ جب بھی آپ دشمن کے مقابلہ میں اپنا عصا پھینکتے تھے تو وہ ایک اژدھا بن جاتا تھا اور اسی عصا کے معجزے کو دیکھ کر فرعون کے ساحرین مؤمن بن گئے۔ لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وقت گزر گیا تو وہ معجزہ بھی گزر گیا۔ آج حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا ذکر تو ہے، لیکن وہ معجزہ موجود نہیں ہے، اس کا ذکر اللہ نے قرآن میں فرما دیا، وگرنہ ہزاروں سال بعد اس کے ذکر کے باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بڑے معجزات ملے، آپ مُردے کو ''قُمْ بِاِذْنِ اللہ'' کہتے تو وہ کھڑا ہو جاتا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی کا پرندہ بنا کر پھونک مارتے تو وہ زندہ ہو کر اُڑ جاتا، کوئی کوڑھ یا برص کا مریض آتا تو اس پر ہاتھ پھیر دیتے، وہ شفاء یاب ہو جاتا اور اگر کوئی مادرزاد اندھا آپ کے پاس آتا، آپ اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر دیتے تو اس کی بصارت لوٹ آتی۔ کتنے بڑے معجزے ہیں، لیکن وہ اب باقی نہیں ہیں، صرف ان کا ذکر باقی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے معجزات:

حضور ﷺ کی نبوت و رسالت قیامت تک ہے، آپ کی شریعت بھی قیامت تک ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ایسے معجزے دیئے ہیں جو قیامت تک قائم ہیں۔ سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے، اس لیے آج چودہ سو سال گزر چکے ہیں، لیکن قرآن کا معارضہ کرنے والے جرأت نہ کر سکے کہ وہ اللہ کے قرآن کے مقابلہ میں ایک آیت بھی بنا سکیں۔ کافروں نے قرآن ماننے سے تو انکار کر دیا، یہود و نصاریٰ نے قرآن ماننے سے تو انکار کر دیا، روافض اور ان کے بعض فرق نے اللہ کے قرآن کی صحت سے انکار کر دیا، لیکن آج تک کسی بڑے سے بڑے معارض کو، کسی بڑے سے بڑے کافر، مستشرق اور کسی دشمن اسلام کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ قرآن کے مقابلہ میں ایک آیت بنا کر لے آتا۔ اللہ نے قرآن کے اندر تحدی یعنی چیلنج کیا کہ قرآن کے مقابلہ پر تم بھی قرآن بنا کر لے آؤ، اگر سارا قرآن نہیں بنا سکتے تو دس سورتیں بنا کر لے آؤ، اگر دس سورتیں بنا کر نہیں لا سکتے تو ایک سورت بنا کر لے آؤ اور اگر ایک سورت بھی نہیں بنا سکتے تو ایک آیت بنا کر لے آؤ، لیکن قرآن نے واضح کر دیا کہ یہ ایسا معجزہ ہے ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا

﴿وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ نہ زمانہ ماضی میں کوئی کر سکا ہے اور نہ زمانہ مستقبل میں کوئی قرآن کا مقابلہ کر سکے گا۔

حضور پاک ﷺ کی حیات طیبہ پر نظر ڈالیں تو حضور پاک ﷺ کا وجود مسعود بھی ایک معجزہ ہے۔ حضور ﷺ کے بعد ان کی شان جیسا کوئی پیدا نہیں ہوسکا اور اللہ کے پاک پیغمبر نے کیسے لوگوں کے اندر انقلاب برپا کردیا کہ ظالم، وحشی، کافر، عبادت غیر اللہ میں منہمک، فسق وفجور اور ظلمت میں ڈوبی ہوئی قوم کو میرے اللہ نے ہدایت کے اس مرتبے پر کھڑا کردیا کہ وہ پوری دنیا کے لیے نجوم ہدایت بن گئی، وہ لوگ دنیا کے لیے نور اسلام اور نور مبین بن گئے، ان کی زندگی چمکتا ہوا ستارہ بن گئی۔ اس سے بڑا معجزہ کیا ہوسکتا ہے؟

اسی طرح حضور ﷺ کو اللہ نے معجزہ عطا فرمایا کہ آسمان پر چاند دو ٹکڑے ہوگیا، اس کو اپنوں نے بھی دیکھا اور غیروں نے بھی دیکھا، اس کو مسلمانوں نے بھی دیکھا اور کافروں نے بھی دیکھا۔ اسی طرح حضور ﷺ کے سینکڑوں معجزات ہیں۔

پیدائش والے دن ایک کاہن نے آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی:

جب حضور ﷺ کی ولادت ہوئی تو ایک بہت بڑا کاہن جو غاروں میں رہتا تھا اور کبھی باہر نہیں آتا تھا، سرگرداں ہوکر مکہ کی گلیوں میں پھرنے لگا اور لوگوں سے پوچھنے لگا کہ آج جو رات گزر گئی ہے، اس میں مکہ کے اندر کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟ تو اسے راستے میں ایک آدمی ملا اور پوچھا: بات کیا ہے؟ کاہن کہتا ہے: آپ مجھے یہ بتادیں کہ کیا گزشتہ رات مکہ میں کوئی بچہ پیدا ہوا؟ اس نے کہا: ہم نے سنا ہے کہ عبدالمطلب کے گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا ہے۔ اس کاہن نے کہا: مجھے جلدی جلدی اس گھر میں لے جاؤ۔ وہ عبدالمطلب کے پاس لے آیا اور وہ لوگ کاہنوں کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کو بڑا پہنچا ہوا شخص مانتے تھے اور اپنے تمام دکھ سکھ میں کاہنوں سے مشورہ لیتے تھے۔ (کاہن ان لوگوں کو کہا جاتا تھا جو پہاڑوں میں رہتے تھے، جنات کے ساتھ ان کا تعلق ہوتا تھا، آسمان، فلکیات اور ستاروں کے علم کے ماہر ہوتے تھے)۔ عبدالمطلب نے اس کاہن سے حیران ہوکر پوچھا کہ آج آپ کیسے باہر آگئے؟ اس نے کہا کہ مجھے یہ بتلاؤ کہ تمہارے گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! میرے بیٹے عبداللہ کے گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے۔ کہنے لگا: مہربانی کرو، مجھے اس بچے کی زیارت کراؤ۔ عبدالمطلب حضور پاک ﷺ کو ہاتھوں پر اٹھا کر لے آئے۔ کاہن نے جب آپ کو دیکھا تو کہنے لگا: عبدالمطلب! یہ بچہ اس اُمت کا

نبی ہے اور اس کے فوراً بعد کہا: (کیونکہ حق بات نکل چکی تھی) ہاں! ایک جن نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا ہے، اس لیے یہ دودھ قبول نہیں کرے گا، مجھے کہو تو میں جن کو دور کردوں؟ عبدالمطلب نے کہا: ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں، وہ تو دودھ پی رہا ہے، کون کہتا ہے کہ جن نے ہاتھ رکھا ہوا ہے، دودھ نہیں پیتا ہے۔ دیکھیں! ایک دن کے بچے کو دیکھ کر پہچان لینا، یہ صاف دلالت تھی کہ ان لوگوں کو حضور ﷺ کا پورا پورا پتہ تھا۔ اللہ نے فرمایا: ہم نے اتنی کھلی نشانیاں دی ہیں۔

آپ ﷺ کا ایک پہلوان کو گرادینا:

ایک دن حضور ﷺ مکہ مکرمہ میں تھے، رکانہ نامی ایک بہت بڑا مشہور پہلوان تھا، کہتا ہے: میری آپ سے ایک بات ہے، میں پڑھا لکھا نہیں ہوں، میں ایک کشتی لڑنے والا پہلوان ہوں، لیکن آج تک مکہ اور اس علاقہ میں کوئی پیدا نہیں ہوا جو مجھے گراسکے، لہٰذا آپ میرے ساتھ کشتی کریں، اگر آپ نے مجھے گرالیا تو میں سمجھوں گا کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، یعنی کشتی کے ذریعہ بھی نبوت کا امتحان لیا جارہا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کو گرادیا اور اس پر غالب آگئے۔ کہنے لگا: حضور! مجھے ایک موقع اور دے دیں۔ آپ ﷺ نے ایک موقع اور دے دیا اور اس کو گرادیا، تیسری دفعہ پھر گرادیا۔ اس نے کہا: مجھے اللہ کی قسم ہے! میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے نبی ہیں۔

آپ ﷺ کا چہرہ دیکھ کر ایمان لانے والے:

حضور ﷺ کا چہرہ بھی نبوت کی علامت تھا۔ کافروں کے ایک بڑے سردار نے آکر حضور اکرم ﷺ کا چہرہ دیکھا اور کہا: مجھے کلمہ پڑھادیں۔ جب واپس آیا تو ابوجہل کہنے لگا: عجیب آدمی ہو! تم نے کیسے کلمہ پڑھ لیا؟ تم تو بڑے سردار ہو، عقل والے ہو، تم نے کوئی بات بھی نہیں پوچھی؟ اس نے کہا: خدا کی قسم ہے! جب میں نے حضور اکرم ﷺ کا چہرہ دیکھا تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ چہرہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔

آپ ﷺ کے اخلاق و کردار اور گفتار سب واضح علامات ہیں۔ اللہ نے آپ ﷺ کو ایسے معجزات عطا فرمائے کہ کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ حضور اکرم ﷺ نے اگر پتھروں کو اشارہ کیا تو پتھر بھی کلمہ پڑھنے لگ گئے، پانی میں ہاتھ رکھا تو پانی کا چشمہ جاری ہوگیا، لعاب دہن ڈالا تو کنویں کا پانی میٹھا ہوگیا۔

اللہ فرماتے ہیں: اے میرے نبی! یہ نشانیاں تو جبرائیل لے کر نہیں آئے، لیکن اس کے باوجود بھی یہ نہیں مانتے۔

اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں حسد وعناد ہے۔ جب دلوں کے اندر کینہ آجائے تو آدمی بڑے سے بڑے عظیم المرتبت انسان کو بھی ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔

﴿وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ إِلَّا الْفٰسِقُوْنَ﴾ اور نہیں انکار کرتا ان کا، مگر جو فاسق ہے۔ فاسق کا لفظ بھی عام گنہگار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کوئی آدمی اگر بڑا گناہ کرلے تو وہ فاسق ہے، اسی طرح فاجر اس کو کہتے ہیں جو کبائر کا ارتکاب بھی کرتا ہے اور پھر لوگوں کے سامنے کھلے گناہ کرنے والا ہے، یعنی شراب کھلے عام پی رہا ہے تو یہ فاسق سے فاجر بن جاتا ہے۔ لیکن کبھی فاسق سے مراد کافر ہوتا ہے۔ ہر جگہ سیاق وسباق کو دیکھنا پڑتا ہے۔ جو اللہ کی آیات بینات کا انکار کردے، اس کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟

﴿أَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۰۰، ۱۰۱]

''جب بھی (ان یہود نے حضور ﷺ پر ایمان لانے کا) عہد کیا تو ان میں سے ایک فریق نے اس عہد کو پھینک دیا، بلکہ ان میں سے اکثر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے رسول (محمد ﷺ) آئے، جو تصدیق کرتے ہیں اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تو اہل کتاب میں سے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو اپنے پس پشت ڈال دیا، گویا کہ وہ (اس کو) جانتے تک نہیں۔''

قرآن پاک کے اندر جو مسائل اُصولی ہیں، وہ ایک ہی ہیں۔ اللہ نے جو فرمان حضرت نوح علیہ السلام کو عطا فرمایا، وہی فرمان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمایا۔ البتہ فروعی مسائل میں ہر زمانے کے اعتبار سے پروردگار عالم نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا۔ جو حکم جس وقت کے مناسب تھا، دیا گیا۔ وگرنہ اصولِ دین سب مشترک ہیں، اور وہ تین ہیں: مسئلہ توحید، مسئلہ نبوت ورسالت اور مسئلہ معاد۔ یہ تین چیزیں اُصولی ہیں، اسی کو علماء کہتے ہیں: ''الإيمان بالثلاثيات'' اور انہی کو ''الأصول الثلاثة'' کہا جاتا ہے۔ جب توحید آئے گی تو شرک کی جمیع اقسام کا رد ہوگا اور اللہ نے جتنے رسول اور نبی بھیجے ہیں وہ برحق ہیں، سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، سب بشر ہیں، اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ جب ہم نے نبی کو مان لیا تو ان کی شریعت کو خود بخود مان لیں گے، جب ہمارا نبی پر ایمان ہوگا تو اس کی کتاب

پر بھی ایمان ہوگا۔ مسئلہ معاد یہ ہے کہ ہم نے مرنا ہے اور پھر دوبارہ زندہ ہونا ہے اور ہمارا حساب و کتاب، جزا و سزا، جنت و جہنم ہوگی۔

حضور ﷺ کو جو کتاب ملی ہے، اس نے تصدیق کی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے پہلے کتابیں اُتاری ہیں، وہ حق ہیں۔

واقعہ:

ایک واقعہ مشہور ہے کہ اس زمانے میں یہودیوں کی ایک عورت اور ایک مرد نے زنا کا ارتکاب کیا۔ وہ عورت بڑے قبیلے کی تھی۔ یہودیوں نے سوچا کہ اگر ہم اس کا معاملہ مسلمانوں کے نبی کے سپرد کر دیں تو ممکن ہے کہ کوئی رعایت کا فیصلہ کر دیں۔ چنانچہ وہ اپنا مسئلہ حضور پاک ﷺ کی خدمت میں لے کر آئے اور عرض کیا کہ ہمارا یہ فیصلہ آپ کر دیں۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اس مسئلے کا فیصلہ میں کر دوں گا، تم یہ بتلاؤ کہ تورات میں کیا حکم ہے؟ کہنے لگے: ہمارے پاس تو بس اتنا حکم ہے کہ اگر کسی سے زنا ہو جائے تو اس کی اہانت کی جائے، یعنی اس کے منہ پر سیاہی مَل دی جائے، گدھے پر بٹھا کر بازار میں گھمایا جائے تو اس کی سزا پوری ہوگئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم غلط کہتے ہو۔ انہوں نے کہا: ہم ٹھیک کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ چونکہ حافظ تورات تھے، حضور ﷺ کو بتلا چکے تھے، حضور ﷺ نے یہودیوں سے فرمایا: تم کتاب تورات لے آؤ کہ وہ زنا کی سزا کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ وہ تورات لے آئے اور اپنے ایک پڑھے لکھے کو بھی لے آئے۔ اس نے حضور ﷺ کے سامنے تورات کھولی اور اس جگہ پر ہاتھ رکھ لیا، جس جگہ زنا کا حکم موجود تھا، اور اس نے آگے پیچھے کی عبارت پڑھنی شروع کر دی۔

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اِرْفَعْ يَدَكَ عَنِ الْكِتَابِ'' (کتاب سے ہاتھ اُٹھاؤ)۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جب اس نے ہاتھ اُٹھایا تو آیت رجم ایسے چمک رہی تھی جیسے موتی چمکتے ہیں کہ اگر مرد اور عورت دونوں شادی شدہ ہیں، انہوں نے زنا کیا ہے تو انہیں رجم کیا جائے گا (یعنی سنگسار کیا جائے گا)۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہودیو! اللہ کے قرآن کے اندر بھی رجم کا حکم ہے اور تورات میں بھی رجم کا حکم ہے۔ آؤ، میں اللہ کے قرآن کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں۔ یہود پریشان ہو گئے کہ ہم خود آئے تھے، اب بچ نہیں سکتے۔

اللہ نے فرمایا: جب میرے نبی آئے تو وہ ایسی کتاب لے کر آئے جو تصدیق کرنے والی ہے اس کی کتاب کی جو تمہارے پاس ہے، لیکن اہل کتاب نے اس کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا۔ یہ حقیقتاً پھینکنا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا معنی

یہ ہے کہ جب قرآن کو نہ مانا تو گویا پشت کے پیچھے پھینک دیا۔ ان کے متعلق اللہ نے فرمایا۔

﴿وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۚ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۚ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۚ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۗ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [البقرة:۱۰۲،۱۰۳]

''اور انہوں نے اس جادو کی پیروی بھی کی جس کو شیاطین سلیمان کی حکومت (کے عہد) میں پڑھتے تھے حالانکہ سلیمان نے کفر (جادو) نہیں کیا تھا، لیکن شیاطین نے کفر کیا جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور اس علم کے پیچھے ہو لیے جو بابل (شہر) میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اُتارا گیا، اور یہ فرشتے نہیں سکھاتے تھے کسی کو (جادو) حتیٰ کہ کہہ دیتے: ہم آزمائش کے لیے ہیں، تم کفر نہ کرو۔ پھر بھی یہ ان سے وہ جادو سیکھتے تھے جس سے وہ مرد اور اس کی بیوی میں جدائی ڈالتے تھے اور یہ (جادوگر) نہیں نقصان کر سکتے اس سے کسی کا اللہ کے حکم کے بغیر، اور وہ چیز سیکھتے ہیں جو ان کا نقصان کرے اور نفع نہ دے۔ اور وہ جان چکے ہیں کہ جس نے جادو اختیار کیا، اس کا آخرت (جنت) میں کوئی حصہ نہیں، برا ہے جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچا۔ کاش کہ یہ جانتے ہوتے۔ اور اگر یہودی (نبی ﷺ اور قرآن پر) ایمان لاتے اور اللہ سے ڈرتے تو اللہ کی طرف سے بہتر ثواب ملتا، کاش کہ وہ جانتے ہوتے۔''

اور وہ شیاطین کے پیچھے چلے! اس لیے کہ انہوں نے رحمٰن اور رحمٰن کے بندوں کی اتباع چھوڑ دی، انہوں نے شیطان اور شیطان کی ذریت کی اتباع کی۔ تو لازمی بات ہے جو شیطان کی اتباع کرے گا، وہ بھٹکتا چلا جائے گا اور جہنم میں جا گرے گا۔ اللہ نے فرمایا: اے میرے رسول! آپ غم نہ کریں۔ یہ یہود ایسی قوم ہے انہوں نے تو حضرت سلیمان علیہ السلام پر بھی الزام لگایا کہ وہ جادوگر تھے، انہوں نے جادو کے زور سے جنات و شیاطین کو اپنے تابع

کیا ہوا تھا اور انہوں نے اتنا بڑا کفر کیا۔ حالانکہ یہ نہیں جانتے کہ سلیمان تو نبی ہیں، انہوں نے کبھی جادو نہیں کیا، انہوں نے کبھی کفر نہیں کیا۔ انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر بھی یہ الزام عائد کیا، حالانکہ شیاطین نے کفر کیا، سلیمان علیہ السلام نے تو کفر نہیں کیا۔

اس ضمن میں ہاروت اور ماروت کا قصہ ذکر فرمایا۔ اس واقعہ کے بارے میں بڑی بڑی روایات نقل کی گئی ہیں اور کتابوں میں اس کی بڑی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں۔

سحر کی تعریف:

سحر، جادو کو کہتے ہیں۔ اس کی کئی اقسام ہیں:

پہلی قسم:

حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا، لیکن دوسرے کو اس طرح دھوکہ میں مبتلا کیا جاتا ہے، اس کی قوتِ خیالیہ پر ایسا اثر ڈالا جاتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جادوگر جو کچھ دکھا رہا ہے، وہ ٹھیک ہے۔ حالانکہ وہ بات حقیقت میں نہیں ہوتی۔ جیسا کہ فرعون کے زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں جادوگر آئے اور انہوں نے رسیاں ڈالیں تو قرآن نے صاف بتلایا: ﴿يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ۝﴾ [طٰہٰ: ٦٦] انہوں نے قوتِ خیالیہ پر ایسا اثر ڈالا کہ سب لوگ یہ سمجھنے لگے کہ یہ سانپ دوڑ رہے ہیں، حالانکہ وہ سانپ نہیں تھے، بلکہ رسیاں تھیں۔

دوسری قسم:

اسبابِ خفیہ استعمال کیے جاتے ہیں اور وہ چونکہ ہمیں نظر نہیں آتے، اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس نے سب کچھ اپنی قوت سے کر ڈالا ہے، کیونکہ وہ اسباب ایسے خفی ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے آدمی کو کوئی پتہ نہیں چلتا۔

قوم کو بے وقوف بنانے والوں کا واقعہ:

جیسا کہ ایک علاقہ میں دو آدمی فوج میں ملازم تھے اور فوج کے ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ (Signal) سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے کوئی غلطی کی تو ان کو نوکری سے نکال دیا گیا تو بے کار ہو گئے کہ اب کیا کریں۔ شیطان نے ان کے دماغ میں ڈالا کہ سب سے آسان کام پیر بننا ہے، اس میں کچھ نہیں کرنا پڑتا، صرف جبہ، اور ایک عصا ہاتھ میں لے لو اور سبز پگڑی باندھ لو تو پیر بن جاؤ گے۔ اور کسی نے یہ نہیں پوچھنا کہ آپ کہاں سے پڑھے ہیں یا آپ

پڑھے ہوئے بھی ہیں یا بالکل اللہ کی رحمت ہے؟ بہر حال ایک خلیفہ بن گیا اور ایک پیر بن گیا۔ چونکہ ٹیلی فون کے مسئلے کو جانتے تھے تو انہوں نے اپنے اور خلیفہ کے ڈیرے کے درمیان ایک ہزار میٹر کا فاصل رکھا اور زمین میں انہوں نے تار بچھادی اور تار کے ذریعے انہوں نے اپنے کوڈ ورڈز (CodeWords) مقرر کر لیے اور لوگ آنے شروع ہوئے خلیفہ کے پاس کہ حضرت سے ملنا ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت وظیفہ میں موجود ہیں، وہ پوچھتے کہ کب ملنے کے لیے آئیں؟ وہ کہہ دیتا فلاں وقت میں آئیں۔ وہ بے چارے چلے جاتے۔

اللہ کی قدرت ہے کہ جوں جوں انتظار بڑھے ویسے ویسے آدمی کا شوق بڑھتا جاتا ہے تو وہ جب دوبارہ آئے تو خلیفہ ان سے پوچھتا کہ کیا بات ہے؟ کیوں بلا وجہ پیر صاحب کو پریشان کرتے ہو؟ وہ اپنی پریشانی بتلا دیتے، میں حضرت سے دعا کروانے آیا ہوں، تعویذ لینے آیا ہوں، تاکہ میری مقدمہ سے جان چھوٹ جائے تو وہ کہتا کہ بیٹھ جاؤ اور خلیفہ صاحب مراقبہ شروع کر دیتے اور تھوڑی دیر کے بعد کہہ دیتا: جاؤ، حضرت صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ اب ایک ہزار میٹر کے فاصلے میں پانچ دس منٹ تو لگ جاتے ہیں اور جب ادب سے جا رہا ہو، پاؤں میں جوتا بھی نہ ہو تو اور زیادہ وقت لگتا ہے۔ اب خلیفہ صاحب نے مصلے کے نیچے جو تار کا سسٹم لگایا ہوا تھا، ہاتھ مار کر حضرت کو اطلاع کر دی کہ یہ آپ کے پاس مقدمہ کے سلسلہ میں آ رہا ہے۔ جب یہ آدمی وہاں گیا، حضرت مصلے پر بیٹھے ہیں، اس نے سلام کیا، حضرت نے جواب دے کر غصہ سے دیکھا کہ کیا بات ہے؟ کیوں مجھے پریشان کرتے ہو؟ اگر مقدمہ ہو گیا تو کوئی آسمان ٹوٹ پڑے گا، جاؤ مقدمہ ختم ہو جائے گا۔ اب وہ آدمی خوش ہو گیا کہ حضرت تو بہت پہنچے ہوئے ہیں، میں نے ابھی حضرت کو کچھ بتلایا ہی نہیں اور حضرت نے سارا قصہ ہی جان لیا۔ اب وہ آدمی تو قدموں میں گر گیا کہ حضرت! مجھے تو مرید بنالیں۔ سبحان اللہ! حضرت کو تو ہمارے اندر کا بھی پتہ ہے۔

دیکھیں! اب اسباب خفیہ تھے، دیکھنے والے کو نظر نہیں آ رہے تو وہ دھوکے میں مبتلا ہو گیا۔ اسی طرح جادوگر بھی کرتے ہیں کہ اسباب تو ہیں، لیکن وہ اسباب چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور ہمیں نظر نہیں آ رہے ہوتے۔ اب ان کا ہاتھ بظاہر صاف ہے، لیکن انہوں نے اپنے ہاتھوں پر کچھ عرصہ ایسی دواؤں کا عمل کیا ہوا ہوتا ہے کہ وہ دوائیں ہمیں نظر نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے ہمارے سامنے ہاتھ دھویا ہے۔

حالانکہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو آدمی اگر استعمال کرے، جیسے آم کا درخت مشہور ہے، اس کا جب بور نکلتا ہے اس بور کو پانچ سات دن ہاتھوں پر رگڑتے رہیں تو ایک سال تک اس کا اثر ہاتھوں میں رہتا ہے۔ اگر کسی آدمی کو

بچھو، مچھر بھڑ یا موذی جانور کاٹ لے اور وہ اپنا ہاتھ اس پر پھیر دے تو ایک منٹ میں آدمی ٹھیک ہو جائے گا، اور لوگ کہیں گے: ماشاء اللہ! حضرت کی بڑی کرامت ہے، حضرت کے ہاتھ میں اتنا اثر ہے۔ حالانکہ آم کے بور کا اثر ہے۔ بعض لوگ انگاروں پر ناچتے ہیں، حالانکہ یہ کوئی کرامت نہیں ہوتی اور نہ اس میں کوئی بزرگی ہوتی ہے۔ یہ ابی لہب کہلانے والی بات ہوئی کہ آگ کے شعلوں کا باپ تو اس نے کنیت بھی وہی رکھی اور اللہ نے اس کا ٹھکانہ بھی وہی دیا۔ اس لیے یہ کوئی بزرگی نہیں، بعض دوائیں دنیا میں ایسی موجود ہیں کہ جب آدمی اپنے بدن پر یا پاؤں پر لگا کر انگارے پر پاؤں رکھ کر چلے تو آپ کا پاؤں نہیں جلے گا۔

تیسری قسم:

شیاطین وجنوں سے مدد لی جاتی ہے، ان کے ساتھ تعلق جوڑا جاتا ہے۔ جیسے انسان کا بندوں سے تعلق ہوسکتا ہے ایسے ہی جنات سے بھی تعلق ہوسکتا ہے۔ جن بھی ایک مخلوق ہے، جن جنات سے تعلق ہو جاتا ہے تو وہ جنات کے لیے کچھ کلمات مخصوص کرتے ہیں، جب وہ پڑھتے ہیں تو جنات آ جاتے ہیں۔ یہ آدمی اس جن سے کہتا ہے کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے۔ جن نے وہ چیز ایک منٹ میں لا کر دے دی۔ چونکہ وہ جنات ہمیں نظر نہیں آ رہے ہوتے تو ہم اس کے جادو کو جادو سمجھتے ہوئے قائل ہو جاتے ہیں۔ جنات کو اللہ نے اتنی قوت استدراجیہ دی ہوئی ہے کہ وہ ہوا بن جاتے ہیں، وہ اُڑ سکتے ہیں، وہ جانور بن جاتے ہیں، سانپ بن جاتے ہیں، وہ انسانوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، وہ سیکنڈوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جاتے ہیں، ہزاروں سال ان کی عمر ہوتی ہے۔ جادوگر ان شیاطین کی اعانت کے ساتھ اپنے شعبدے دکھلاتا ہے۔

سحر، انسانوں پر اثر کرسکتا ہے یا نہیں؟

سحر، انسانوں پر اثر کرتا ہے، اس کے اثرات بد ہوتے ہیں۔ بلکہ خدا کی قدرت ہے کہ جتنے باطل علوم ہیں، جتنے شیطانی علوم ہیں، ان کا اثر جلدی ہوتا ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے عموماً آدمی خیر سے دور اور شر اور گناہوں کے قریب ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ خیر کمزور ہو رہی ہے اور شر کامیاب ہو رہا ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ شر کی قوتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ جادو انسان پر اثر کرتا ہے، بلکہ اللہ کے اولیاء پر بھی اثر کر جاتا ہے، اللہ کے نبیوں پر بھی اثر کرتا ہے، اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ حضرت محمد رسول ﷺ پر بھی جادو نے اثر کر لیا۔

کیا جادو کے اثر سے کسی چیز کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے یا نہیں؟

مثلاً انسان پر جادو کرو، وہ پتھر بن جائے یا کسی چیز پر جادو کرو، اس کی حقیقت بدل جائے کہ انسان سے حیوان بن گیا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا؟ اس کے بارے میں دو قول ہیں:

پہلا قول:

بعض علمائے کرام تو یہ فرماتے ہیں کہ جادو سے کسی چیز کی حقیقت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ کوئی جادوگر یہ نہیں کر سکتا کہ کسی انسان کو حیوان بنا دے۔ اگر ایسا جادوگروں کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ کسی اللہ کے ولی کو نہ چھوڑتے۔

دوسرا قول:

بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ جادو سے حقیقت بھی تبدیل ہوتی ہے۔ انہوں نے حضرت کعب احبار رحمہ اللہ کے ایک قول سے استدلال کیا ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے: اللہ نے مجھے کچھ ایسے کلمات سکھلا دیئے ہیں کہ اگر وہ وظیفہ میں نہ پڑھتا تو یہودی مجھے گدھا بنا دیتے، لیکن اللہ نے مجھے ایسے کلمات عطا فرمائے ہیں کہ ان کے پڑھنے سے مجھ پر جادو اثر نہیں کرتا۔ یہ روایت مختلف کتابوں میں موجود ہے اور لوگوں نے انہیں یہ بھی کہا کہ مہربانی کر کے ہمیں بھی بتلائیں کہ وہ کلمات کیا ہیں، تا کہ ہم بھی وہ کلمات سیکھ لیں اور جادوگروں کے فتنوں سے بچ جائیں تو انہوں نے وہ کلمات سکھلا دیئے۔ وہ کلمات یہ ہیں:

''أَعُوذُ بِاللهِ بِوَجْهِ اللهِ الْعَظِيْمِ الَّذِىْ لَيْسَ شَيْئٌ أَعْظَمَ مِنْهُ وَ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّ لَا فَاجِرٌ وَ بِأَسْمَاءِ اللهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَ مَا لَمْ أَعْلَمْ، مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَ بَرَأَ وَ ذَرَأَ.''

اس روایت کو سامنے رکھ کر بعض علماء اس کے قائل ہیں کہ حضرت کعب رحمہ اللہ جیسا آدمی جو کہہ رہا ہے، اس کا مطلب ہے کہ ہیئت تبدیل ہو سکتی ہے۔ لیکن اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جیسا گدھا احمق ہوتا ہے اور پوری دنیا میں حماقت کے لیے ضرب المثل ہے، اسی طرح مجھے بھی یہ لوگ بیوقوف بنا دیتے۔ بہر حال اکثر علماء نے فرمایا کہ حضرت کعب احبار رحمہ اللہ کا مقصد یہ تھا کہ اگر میں کلمات نہ پڑھتا تو یہود مجھے بے وقوف بنا دیتے، جیسے گدھا احمق اور بے وقوف جانور ہے۔

جادو کا حکم:

جادو اس زمانہ میں بھی تھا اور اب بھی ساحر موجود ہیں۔ اس زمانہ میں بھی سحر سب سے زیادہ یہود میں تھا، بڑے جادوگر یہودی تھے، اب بھی جادو ان کے اندر زیادہ ہے۔ جادو پر عقیدت رکھنا اور جادو والا عمل کرنا اور جادو کا علم سیکھنا بھی کفر ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ جو جادو کرتا ہے یا جادو سیکھتا ہے یا جادو پر عقیدت رکھتا ہے تو اس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا ہے۔ یہ علم حرام ہے اور شیطانی علوم میں خاص طور پر سحر کی وہ قسم جس میں شیطانوں سے مدد لی جاتی ہو، اس کے کفر صریح ہونے میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ سحر کی بعض ایسی قسمیں ہیں جن سے شیاطین سے استمداد نہیں لی جاتی، بلکہ قوتِ خیالیہ پر اثر ڈالا جاتا ہے، اس کے فسق و فجور ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اکثر جادو وہ ہوتا ہے جس میں شیاطین سے استمداد لی جاتی ہے تو جب کوئی شیاطین کو مددگار سمجھے، اس کے کفر ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ البتہ اگر کوئی شخص ایسا منتر یا عمل سیکھے جس میں شرکیہ الفاظ کا استعمال بھی نہ ہو اور غیر اللہ سے مدد بھی نہ مانگی جاتی ہو تو جائز کام کے لیے اس کو سیکھنے کی گنجائش ہے۔

معجزہ اور سحر میں فرق

سحر:

وہ ہوتا ہے جو ساحر کی قوتِ خیالیہ، اس کے کرتب، کسب مہارت اور تعیین وقت کے ساتھ لوگوں کو محیر العقول کام کر دکھاتا ہے۔

معجزہ:

جو خرقِ عادت نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو اور وہ اس کو اپنی نبوت کی تصدیق کے لیے پیش کرے اور اُمت اس کی مثل لانے سے قاصر ہو۔

کرامت:

جو خرقِ عادت کسی ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہو۔ اس میں نبوت کا دعویٰ نہیں ہوتا۔

ان میں دو طرح کا فرق ہے: ایک تو فرق دونوں شخصوں میں ہے، وہ یہ کہ جس کے ہاتھ پر معجزہ یا کرامت ظاہر ہو رہی ہے، اگر وہ خرقِ عادت کام کرنے کے ساتھ ساتھ نبوت کا دعویٰ بھی رکھتا ہے تو وہ نبی ہے اور اگر کسی نبی کا تبع ہے اور اس سے کوئی کام خلافِ عادت ظاہر ہوا ہے تو وہ ولی ہے۔ بشرطیکہ اس کا عمل اور کردار شریعت کے مطابق، صورت، سیرت شریعت کے مطابق، قرآن پر عمل کرنے والا ہو۔ اور جس کے ہاتھ پر جادو ظاہر ہو رہا ہے، اس کی زندگی بھی شریعت کے خلاف، عمل بھی شریعت کے خلاف، اُٹھنا بیٹھنا بھی شریعت کے خلاف ہوتا ہے، بلکہ جادو ان لوگوں کا زیادہ چلتا ہے جو زیادہ پلید رہتے ہوں؛ کیونکہ ساحرین کا شیطانوں سے تعلق ہوتا ہے اور شیاطین کا میلان ان کی طرف ہوتا ہے جو ان کے ہم جنس ہوتے ہیں۔ جیسے پاک لوگوں کا تعلق پاک لوگوں سے ہوتا ہے، اسی طرح ناپاک لوگوں کا تعلق ناپاک لوگوں سے ہوتا ہے۔ تو آدمی سیکھنے سے فرق کر سکتا ہے کہ یہ کرامت ہے اور یہ جادو ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ معجزہ اور کرامت میں کوئی اسبابِ خفیہ نہیں ہوتے، وہ تو خالص اللہ کا فعل ہوتا ہے۔ اللہ اس کو اپنے نبی یا ولی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیتے ہیں۔ جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾ [الانفال: ۱۷]

جب حضور ﷺ نے مٹی کی مٹھی بھر کر دشمنوں کی طرف پھینکی اور فرمایا: ''شَاهَتِ الْوُجُوهُ'' تو اللہ نے فرمایا: آپ نے یہ مٹی نہیں پھینکی، یہ تو میں نے پھینکی ہے، کیونکہ یہ آپ کیسے کر سکتے ہیں کہ سب کی آنکھوں میں پہنچا دیں؟ اصل تو اللہ کا فعل ہے، ہم نے آپ کے ہاتھ پر ظاہر کر دیا ہے۔ اللہ اس کو نبی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیں تو وہ معجزہ ہوتا ہے اور اگر ولی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیں تو وہ کرامت ہوتی ہے۔ معجزہ بھی برحق ہے اور کرامت بھی برحق ہے، لیکن معجزہ اللہ کے حکم کے بغیر نبی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوتا، اس میں نبوت کا دعویٰ ہوتا ہے، اسی طرح کرامت بھی اللہ کے حکم کے بغیر، اللہ کے ارادے کے بغیر ولی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوتی، نیز اس میں نبوت کا دعویٰ بھی نہیں ہوتا۔

معجزہ، کرامت اور سحر میں فرق:

معجزہ، کرامت اور سحر میں اتنا بڑا فرق ہے کہ معمولی سی توجہ سے فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ ولیوں کا تعلق رحمانی ہوگا اور ساحرین کا شیطانوں سے تعلق ہوگا۔ اس لیے شریعت نے پابندی لگا دی ہے کہ کبھی جادوگروں کے پاس نہ جایا کرو، کبھی نجومی کے پاس نہ جایا کرو، کبھی کاہنوں کے پاس نہ جایا کرو۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص ان

کاہنوں، عرافوں، نجومیوں اور جادوگروں کے پاس جائے اور ان کی باتوں کی تصدیق کرے، مان لے کہ یہ سچ کہہ رہا ہے، اس نے کفر کیا اس کتاب کا جو نازل کی اللہ نے محمد ﷺ پر۔ یعنی وہ کافر ہو جاتا ہے۔ [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۹۵۳۶]

حضرت سلیمان علیہ السلام جادوگر نہیں تھے:

حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے۔ اور اللہ کے سارے انبیاء معصوم ہوتے ہیں، وہ علومِ باطلہ سے پاک ہوتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جنات کا مسخر ہونا، ہوا کا مسخر ہونا، ان کا معجزہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا اور مختلف پرندوں کو ان کے تابع فرما دیا، پرندوں کی زبانیں اور لغات کا علم بھی عطا فرما دیا اور جنات و شیاطین کو بھی ان کے لیے مسخر کر دیا اور ہوا کو بھی ان کے تابع کر دیا کہ ان کا تخت ان کے حکم کے مطابق اُڑتا تھا اور صبح کے پہلے حصہ میں ایک مہینے کا سفر طے کرتا تھا اور شام کے حصے میں ایک مہینے کا سفر طے کرتا تھا۔ یہ معجزات تھے، ان کا سحر سے کوئی تعلق نہیں۔

ہاروت و ماروت کا قصہ:

قرآن مقدس نے دو نام ذکر فرمائے: ہاروت اور ماروت۔ اور یہ بھی ذکر فرمایا کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں، ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے بابل میں اُتارا گیا امتحان کے لیے۔ لوگ ان سے جادو کے بارے میں آکر پوچھتے تھے، سیکھتے تھے، لیکن وہ ان کو باخبر کرتے تھے کہ ایسی چیزوں سے بچو، یہ امتحان ہے، اس میں پڑ کر کفر کے کناروں میں نہ پہنچ جاؤ۔ ہم تمہیں بتلا دیں گے، اگر بچ جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔

مفسرین کرام نے ان کے واقعہ کو بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں لوگ فسق و فجور، منکرات اور اللہ کی نافرمانیوں میں اتنے مبتلا ہو گئے کہ ملائکہ دفتروں کے دفتر لکھ کر اللہ کے دربار میں پیش کرتے۔ اس پر بعض ملائکہ نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں عرض کیا کہ یا رب! یہ آپ کے کیسے بندے ہیں؟ جن کو آپ نے پیدا فرمایا اور جنہیں آپ نے تمام مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی اور بڑی نعمتوں سے نوازا ہے، لیکن آپ کے بندوں کا یہ عالم ہے کہ وہ اتنے نافرمان، اتنے گناہگار اور اتنے منکرات میں گر گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ سے فرمایا: یہ بھی میری مخلوق ہے، تم بھی میری مخلوق ہو، لیکن تمہارے اور ان کے درمیان ایک بہت بڑا فرق ہے کہ تم میری ایسی مخلوق ہو کہ جن کو میں نے معصوم پیدا کیا ہے اور قوتِ شہوانیہ، قوتِ حیوانیہ، قوتِ غضبیہ جو انسان کو

راستے سے ہٹانے والی ہیں، تمہارے اندر میں نے وہ قوتیں رکھی ہی نہیں ہیں، لہٰذا تم تو گناہ کرنے سے پاک ہو اور انسانوں کو جہاں قوتِ علمیہ سے نوازا ہے، وہاں میں نے ان کے اندر قوتِ حیوانیہ، شہوانیہ اور غضبیہ بھی رکھی ہیں۔ اگر وہ قوتیں تمہارے اندر بھی رکھ دوں تو تم بھی اسی طرح غلطیاں کرو گے۔ ملائکہ نے عرض کیا: یارب کریم! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان قوات کے ہونے کے بعد آدمی کے بھٹکنے کا خطرہ ہوتا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں کہ انسان باقی ساری قوتوں سے کام نہ لے اور قوتِ حیوانیہ اور شہوانیہ میں اتنا مبتلا ہو جائے کہ اپنے خالق و مالک کے احکام کو بھی بھول جائے۔ اگر ہمارے اندر ایسی قوتیں رکھی جائیں تو ہم ایسی غلطیاں نہیں کریں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو حکم فرمایا کہ تم اپنے ملائکہ میں سے کوئی سے دو فرشتے منتخب کرو، میں ان کو دنیا کے اندر بھیج کر یہ قوات رکھتا ہوں اور ان کا اختبار و امتحان کر لیتے ہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں؟

فرشتوں نے دو فرشتوں کو منتخب کیا: ایک کا نام ہاروت تھا اور ایک کا نام ماروت تھا۔ یہ دونوں فرشتے اللہ کی عبادت میں بڑے مصروف تھے۔ ویسے تو سارے فرشتے عبادت گزار ہیں، لیکن بعض دوسروں سے بڑھ جاتے ہیں۔ ان دونوں فرشتوں میں اللہ نے قوتِ حیوانیہ رکھ دی اور انہیں حکم دیا کہ زمین میں جا کر عدل وانصاف سے لوگوں کے درمیان فیصلے کرو۔ خبردار! قتل سے بچنا، زنا سے بچنا اور شربِ خمر سے بچنا۔ وہ زمین میں آگئے اور لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے لگے اور اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے اور جب شام کو فارغ ہوتے تو اسمِ اعظم پڑھتے اور آسمانوں پر چلے جاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے امتحان کے لیے ایک عورت جس کا نام ''زہرہ'' نقل کیا گیا ہے اور بعض روایات میں ملتا ہے کہ اس عورت کی روح کا تعلق ستارہ زہرہ سے بھی تھا اور بعض کہتے ہیں کہ ستارہ زہرہ تو بعد میں بنا، وہ عورت انسان تھی، لیکن وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اسے ستارے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی تھی، گویا حسن و جمال میں ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے۔ وہ ایک قضیے میں ان کے پاس آئی، جب ہاروت اور ماروت نے اس عورت کو دیکھا تو ان دونوں کے دل میں اس کے حسن و جمال نے اتنا اثر کر دیا کہ وہ اس کی طرف مائل ہو گئے اور اس کو روزانہ مختلف حیلوں بہانوں سے بلاتے رہے اور آخر اس پر اتنا ظاہر کر دیا کہ تم ہمارے ساتھ مل جاؤ، اب ہم تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس عورت نے ان دونوں کے سامنے کہا کہ اگر تم مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے جسم و جان اور حسن و جمال سے تمتع حاصل کرنا چاہتے ہو تو میری کچھ شرائط ہیں: ایک تو میرا خاوند ہے، جب تک وہ زندہ ہے میں کسی دوسرے کے

قریب نہیں جاسکتی، پہلے اس کو قتل کرنا ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں بت پرست ہوں، میرا جو خدا اور بت ہے، اس کے سامنے تمہیں بھی سجدہ کرنا ہوگا۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ شراب بھی پینی ہوگی۔ اگر یہ تین شرطیں منظور ہیں تو میں حاضر ہوں، ورنہ تمہارے قریب نہیں آسکتی۔ بہرحال وہ سوچتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو عورت کے مکر اور امتحان سے محفوظ رکھے۔

عورتوں کا فتنہ سب فتنوں سے بڑھ کر ہے:

حضور اکرم ﷺ نے اپنے آخری وقت میں اُمت کو نصیحت فرمائی اور بار بار فرمایا:

"اِیَّاکُمْ وَ فِتْنَةَ النِّسَاء، اِیَّاکُمْ وَ فِتْنَةَ النِّسَاء، اِیَّاکُمْ وَ فِتْنَةَ النِّسَاء."

"اے میری اُمت! خبردار! عورتوں کے فتنے سے بچنا، عورتوں کے فتنے سے بچنا، عورتوں کے فتنے سے بچنا۔"

بعض علماء نے لکھا کہ دنیا میں سب سے بڑا مکر اور سب سے بڑا فتنہ عورت کا فتنہ ہے۔ بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ عورت کے مقابلے میں شیطان کا مکر بھی کچھ نہیں ہوتا اور انہوں نے قرآن کی مقدس آیت سے استدلال کیا ہے، ﴿اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا﴾ [النساء:۷۶] شیطان کا مکر ضعیف ہے اور اس کا مکر میرے پاک بندوں پر نہیں چلتا۔ لیکن عورت کے مکر کے بارے میں قرآن میں آتا ہے: ﴿اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ﴾ [یوسف:۲۸] تحقیق عورتوں کا مکر بہت بڑا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب آزادی کا پروانہ ملا تو انہوں نے سب سے پہلی یہ بات کہی: ﴿اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ﴾ [یوسف:۵۰] پہلے وہ فیصلہ کرو جن عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے، انگلیاں کاٹ ڈالی تھیں، میرا رب ان عورتوں کے مکر کے بارے میں جانتا ہے۔

علمائے متاخرین نے لکھا ہے کہ دنیا میں دو فتنے ہیں: ایک دولت اور ایک عورت۔ دولت بھی بہت بڑا فتنہ ہے کہ بڑے سے بڑے قدآور لوگ، بڑے علم والے لوگ اور بڑی عظمتوں والے لوگ دولت میں بک گئے۔ فتوے، احکام، مسائل بدل ڈالے، اللہ کے قرآن میں تحریفات کر ڈالیں، اللہ کے نبی کی حدیثوں کو بدل ڈالا۔ اس کا مقصد دولت کا حصول تھا، لیکن جب دولت کا فتنہ ناکام ہو جاتا ہے تو وہاں سے عورت کا فتنہ شروع ہوتا ہے۔ وہ دولت سے بڑا فتنہ ہے، جب تک اللہ عورت کے فتنے سے نہ بچائے، آدمی نہیں بچ سکتا۔

شراب، اُمّ الخبائث ہے:

ان دونوں نے مشورہ کیا کہ بت کے آگے سجدہ کرنا کفر و شرک ہے۔ یہ تو بڑی مشکل بات ہے اور قتل ناحق، بہت بڑا ظلم ہے کہ آدمی کسی کو ناحق قتل کرے۔ اس کے خاوند سے تو ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے، اس لیے ہم قتل بھی نہیں کر سکتے۔ یہ بڑے گناہ ہیں۔ شراب پینا بہر حال گناہ تو ہے، لیکن ان کے مقابلہ میں اتنا بڑا گناہ نہیں ہے، کچھ دیر نشہ ہو جائے گا۔ جب وہ عورت دوبارہ آئی تو انہوں نے کہا: بات یہ ہے کہ ہم تمہاری پہلی دو شرطیں پوری نہیں کر سکتے، البتہ تیسری شرط شراب پینے کی ہمیں قبول ہے۔ شراب لے آؤ، وہ ہمیں پلا دو۔ اس نے کہا: یہاں تو نہیں ہو سکتا کہ تم یہاں عدالت میں بیٹھ کر فیصلے کرتے ہو۔ تم میرے پاس آؤ، وہاں میں انتظام کروں گی۔ وہ ان کو اپنے مکان پر لے گئی اور ان کو شراب پلائی۔ جب نشہ میں آ گئے تو اس نے اپنے خاوند کو بھی قتل کروا دیا اور بت کے آگے سجدہ بھی کروا دیا۔

اس لیے حدیث میں آتا ہے کہ شراب، اُمّ الخبائث ہے۔ یہ برائیوں کی ماں ہے، اس سے برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جب آدمی شراب پی لیتا ہے تو اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے، اس میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔

شراب کی حد کتنے کوڑے ہونی چاہیے؟

بعض لوگ شراب پیتے ہیں، ان کا دماغ ٹھیک رہتا ہے، بلکہ شراب پینے کے بعد وہ زیادہ کام کرتے ہیں۔ ایک چیز اگر نہ پینے والے کو پلائی جائے اور اس کو نشہ دے تو اس کا نشہ حرام ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ پینے سے آدمی کی قوتِ مدافعت بڑھ جائے۔ حلال و حرام کے فیصلے کے لیے کسی نشئی کو شراب نہیں پلائی جاتی، بلکہ عام آدمی کو دیکھا جائے گا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ." [صحیح بخاری، رقم: ۴۳۴۳]

"ہر نشہ کرنے والی چیز حرام ہے۔"

چاہے وہ شراب کو جَو سے بنایا گیا، گڑ سے بنایا گیا یا فروٹ سے بنایا گیا۔ غرض کسی چیز سے اس کو بنایا گیا ہو، میرے سرکار نے ایک قاعدہ کلیہ سمجھا دیا کہ ہر نشہ کر دینے والی چیز حرام ہے۔ اور اس کے بعد آپ ﷺ نے

وضاحت بھی فرمادی کہ اس کی تھوڑی سی مقدار بھی حرام ہے اور زیادہ مقدار بھی حرام ہے۔ فرمایا: حرام چیز کی قیمت بھی حرام، اس کا بیچنا بھی حرام، اس کا خریدنا بھی حرام، اس کا نفع حاصل کرنا بھی حرام ہے؛ کیونکہ جب اصل حرام ہے تو اس کی قیمت بھی حرام ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ کی رائے میں شراب پینے والے کو کتنے کوڑے مارنے چاہئیں؟ آپ نے فرمایا: اسّی کوڑے مارنے چاہئیں۔ پوچھا گیا: اسّی کوڑے کیوں مارے جائیں؟ آپ نے فرمایا: جو آدمی شراب پیے گا، اس کو نشہ ہوگا تو وہ منہ سے گندی گندی باتیں نکالے گا، کسی پر تہمت لگائے گا، کسی پر بہتان باندھے گا۔ تو جیسے بہتان لگانے والے کی حد قذف اسّی کوڑے ہے، اسی طرح اس کی بھی حد اسّی کوڑے ہونی چاہیے۔

تتمہ کلام:

جب یہ سارے کام ہو گئے تو عورت نے کہا: تم مجھے بھی سکھا دو۔ انہوں نے اس کو بھی سکھا دیئے اور اس عورت کے ساتھ برا کیا۔ برائی کرنے کے بعد ہوش آیا، نشہ اُترا تو دیکھا کہ ہم نے قتل بھی کر لیا، بت کو سجدہ بھی کر لیا، اللہ معاف فرمائے زنا بھی کر لیا، عورت بھی غائب ہو گئی۔ دوڑتے ہوئے حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس آئے، ہم تو ہلاک و برباد ہو گئے، ہم اتنے بڑے گناہ ہو گئے ہیں، ان کا کیا حل ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ سے معافی مانگتے ہیں، جو اللہ فیصلہ فرمائیں گے۔ ان کی توبہ کے بعد اللہ نے حکم دیا: تم تو اولادِ آدم پر اعتراض کرتے تھے، اب تم نے کیا کر لیا ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ میاں! ہمارا اعتراض بالکل غلط تھا، آپ کا فرمان ٹھیک تھا، ہم راستہ سے ہٹ گئے، آپ ہماری توبہ منظور فرمالیں۔ اللہ نے حکم دیا کہ اب دنیا کی سزا چُن لو یا آخرت کی سزا چُن لو۔ کوئی ایک سزا تو بہرحال ملنی ہے۔ انہوں نے کہا: ہمیں دنیا کی سزا قبول ہے؛ کیونکہ دنیا کی سزا کی ایک حد ہوتی ہے، لیکن آخرت کی سزا ختم نہیں ہوتی، وہ شدید بھی ہے، عظیم بھی ہے، الیم بھی ہے۔

لوگ کہتے: ہمیں سحر سکھلاؤ۔ وہ کہتے کہ دیکھو! ہم پہلے خود ایک عذاب میں مبتلا ہیں، تم یہ کام مت سیکھو، لیکن اگر سیکھنا چاہتے ہو تو اس کو غلط استعمال نہ کرنا۔ جب لوگ مجبور کرتے تو وہ ان کو بتلا بھی دیتے۔ اور وہ عورت جس نے یہ سارا کام کیا، اس نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اس کے بعد اسم اعظم پڑھا، وہ آسمانوں کی طرف چلی گئی اور اس کی شکل قوتِ بشریہ سے قوتِ کوکبیہ میں بدل کر آسمان میں زہرہ بنا دیا گیا، جو زہرہ ستارے کے نام سے مشہور ہے۔ یہ

روایات مختلف مفسرین نے اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔ ابن کثیر، درمنثور اور دیگر مفسرین نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔

ہاروت وماروت کے قصہ کی تردید:

اس واقعہ کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں: اکثر محدثین کرام، سلف صالحین کی رائے یہ ہے کہ یہ بالکل غلط، من گھڑت قصہ اور یہ بھی یہودیوں کی ایک کارستانی ہے، جیسے یہودیوں نے اپنی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جھوٹے قصے گھڑے ہیں، ان میں سے ایک قصہ یہ بھی ہے، جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

محدثین کرام نے یہ بھی بحث فرمائی ہے کہ جن لوگوں نے یہ قصہ جن روایات سے نقل کیا ہے، کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ہے جو صحیح کے درجہ کو پہنچتی ہو اور درایۃً بھی یہ قصہ صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ اللہ کے فرشتے معصوم ہیں، اور معصوم گناہ نہیں کرسکتا۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ان کو اُلٹا کنویں میں لٹکا دیا گیا تو جو خود عذاب میں لٹکا ہوا ہو، وہ دوسرے کو جادو کیسے سکھا رہا ہے؟ چہ جائیکہ اس وقت لوگوں کو تعلیم دی جائے۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ عورت جو زہرہ ستارہ بن گئی، زہرہ ستارہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے پیدا ہونے سے بھی پہلے آسمانوں پر موجود تھا اور یہ قصہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا تو یہ عورت کیسے زہرہ بن گئی؟

چوتھی بات یہ ہے کہ بڑی عجیب بات ہے کہ عورت زنا کے بعد ستارہ بن جائے۔ اسم اعظم کی برکات پر ہمارا ایمان ہے، لیکن اس کے لیے طہارت اور پاکیزگی چاہیے، ایمان چاہیے۔ یہ نہیں کہ کوئی ناپاک اور گندا بھی اللہ کے پاک نام کو استعمال کرے۔ یہ بات بھی اراد تاً سمجھ نہیں آتی۔ یہودیوں نے ایسے قصے گھڑے ہیں کہ علماء کو آج تک وہ کانٹے چننے پڑ رہے ہیں؛ کیونکہ پڑھنے والا آدمی تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ اب اس بے چارے کو یہ تو پتہ نہیں ہوتا کہ یہ روایت کس کی ہے۔

ہاروت وماروت کے قصہ کے متعلق بعض علماء کی رائے:

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ راوی ضعیف ہیں، لیکن اس روایت کے بیس طرق ہیں جن سے یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے، تو کم از کم حسن لغیرہ کے درجہ تک یہ بات پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ من گھڑت اور موضوع قصہ ہے، بلکہ اس کی کچھ نہ کچھ حقیقت تو ہے، لیکن ایسی باتیں کریں گے جو قابل عمل ہوں، مثلاً

فرشتوں نے شراب کیسے پی؟ انہوں نے کہا: فرشتے معصوم ہیں، وہ کھانے پینے اور قوت شہوانیہ سے پاک ہیں، لیکن یہ اس وقت تک جب تک وہ فرشتے رہے، جب اللہ نے ان کو فرشتوں سے نکال قوت شہوانیہ ڈال دیں تو اب وہ فرشتے نہیں رہے اور ان میں یہ بات ختم ہوگئی کہ فرشتے سے گناہ نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ کہنا کہ وہ عورت زہرہ ستارہ بن گئی، حالانکہ زہرہ ستارہ پہلے سے موجود تھا، لیکن اس نے اسم اعظم حاصل کرنے کے بعد اس کے ذریعے جو دعا مانگی کہ مجھے بھی اس مقام پر پہنچا دیا جائے تو اس کی روح کا علاقہ اس ستارہ کے ساتھ قائم کر دیا گیا۔ اسم اعظم کی برکات اپنی جگہ قائم رہیں گے، گو حاصل کرنے کا طریقہ غلط، لیکن جب حاصل کرلیا جائے اور توبہ کرلی جائے اور اس پر اللہ کو پکارا جائے تو اللہ سب کی سنیں گے۔

باقی یہ کہنا کہ عذاب کی حالت میں سکھلاتے کیسے تھے؟ آج بھی دنیا میں مجرم جیل خانوں میں پڑے ہوتے ہیں، بیڑیاں لگی ہوئی ہوتی ہیں، وہاں بھی وہ سکھا رہے ہوتے ہیں۔ جب اللہ کو آزمائش مقصود تھی تو چاہے وہ کسی حال میں ہوں، کسی نے ان کے قریب جا کر کھڑا ہو کر پوچھا تو انہوں نے بتلا دیا۔ اس لیے اس کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سو فیصد جھوٹا قصہ ہے۔ بہر حال یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی اصل موجود ہے۔ لیکن ہم اس کے بارے میں ایسی تاویلات سے کام لیں گے جو اللہ کے قرآن اور حدیث کے خلاف بھی نہ ہوں اور واقعہ بھی بن جائے۔

اس واقعہ میں راجح قول:

تیسرا قول علماء کا یہ ہے کہ جتنا قرآن میں موجود ہے اتنی بات پر ایمان رکھو، باقی معاملے میں توقف اختیار کرو۔ نہ یہ کہو کہ صحیح ہے اور نہ یہ کہو کہ غلط ہے، بلکہ معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دو اور اتنی بات مانو جتنا اللہ نے قرآن میں بیان فرما دیا ہے کہ اللہ نے دو فرشتوں کو بابل میں اُتارا: ایک کا نام ہاروت اور دوسرے کا نام ماروت ہے۔ وہ لوگوں کو سکھلاتے تھے، لیکن ساتھ یہ بھی کہہ دیتے کہ خبردار! خبردار! کفر میں نہ پڑو۔ اس لیے یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جیسے ایک عالم کے پاس کوئی فلسفہ یا منطق پڑھنے کے لیے آئے اور وہ عالم اس کو کہے: خیال کرنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ فلسفہ میں اُلجھ کر قرآن وحدیث کو چھوڑ جاؤ۔ میں تمہیں پڑھا تو دیتا ہوں، تاکہ تمہیں حق اور باطل کا پتہ چل سکے، لیکن اس علم کے ذریعے کفر اختیار نہ کرلینا۔ تو اس عالم کے لیے پڑھانا جائز ہے۔ اب اگر کوئی آدمی کسی بات کو سمجھنے کے

بعد اس سے غلط نتیجہ اخذ کرے تو وہ خود گناہگار ہے، سکھانے والے کا اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس نے تو کہہ دیا ہے کہ کفر نہ کرو، ہم تو آزمائش ہیں۔ اس لیے علماء نے فرمایا: اتنی بات پر عمل کرو، جتنی قرآن میں موجود ہے۔

شبہ اور اس کا ازالہ:

اگر معجزے اور سحر کے درمیان فرق کے لیے جادو کی تعلیم دینا مقصود تھا تو نبیوں کے ذریعہ دے دیتے، آسمانوں سے فرشتے اُتارنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے نبی ہدایت محضہ کے لیے آئے ہیں، ان کی تعلیم سے چاہے اسباب بعیدہ کی حد تک بھی کوئی شرک کا پہلو نکلے، اللہ اپنے نبیوں کو اس سے پاک رکھتے ہیں اور لوگ انبیاء کے جادو کو جاننے کی وجہ سے جادوگر نہ کہہ سکیں۔

باقی فرشتوں سے اللہ جہاں تشریعی کام لیتے ہیں وہاں تکوینی کام بھی لیتے ہیں۔ جیسے فرشتے ایک مومن کی حفاظت کرتے ہیں، ویسے کافر کی بھی حفاظت کرتے ہیں۔ مومن کا بچہ اگر رحم میں ہے وہاں فرشتے ڈیوٹی دے رہے ہیں، تو کافر کے بچے کے لیے بھی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ اسی طرح حیوانات جب پیدا ہوتے ہیں وہاں بھی فرشتے ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ فرشتوں سے تکوینی اور تشریعی یعنی دونوں کام لیے جاتے ہیں۔ اللہ کے انبیاء سے تشریعی کام لیا جاتا ہے، اس کو تکوینیات میں نہیں ڈالا جاتا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی نبی کے ذریعہ یہ کام نہ لیا اور آسمانوں سے دو فرشتے اُتارے گئے اور وہ دنیا کے لیے آزمائش بن گئے اور لوگ پوچھتے تو وہ ان کو بتلا بھی دیتے۔

اس سے بعض علماء نے یہ بھی نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کوئی آدمی جادو کو کفر اور حرام سمجھے، لیکن وہ اس کو اس لیے سمجھ رہا ہے، تاکہ میں اس کا توڑ کر سکوں اور مبتلا لوگوں کو بچا سکوں اور ان کو سحر کے اثر سے نکال سکوں تو اس کو اجازت ہے، بشرطیکہ اس میں شرکیہ الفاظ نہ ہوں۔ لیکن یاد رکھیں! شرکیہ الفاظ والے یا لوگوں کو دھوکہ دینے والے سحر کا پڑھنا اور سیکھنا حرام ہے، اس پر اعتقاد رکھنا بھی کفر ہے؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو آدمی سحر سیکھے گا اور اس پر عمل کرے گا، وہ کفر کو اختیار کرے گا۔

واقعات:

سابقہ انبیاء کی کتابوں میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کی صفات موجود تھیں۔ ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے، ایک بوڑھے آدمی نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ایک پُرانا سا کاغذ پیش کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے

جب وہ کاغذ دیکھا تو رونے لگے گئے، داڑھی مبارک آنسوؤں سے بھیگ گئی اور کہنے لگے: "لَا لِعُمَرَ وَ لَا لِبَنِیْہِ" (نہ عمر کا ہے اور نہ عمر کے بیٹے کا کچھ ہے)۔ ساری مجلس حیران ہے کہ کون سا ایسا کاغذ ہے جس کو دیکھ کر عمر رو پڑے ہیں؟ جب ان سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: میں ابھی اسلام نہیں لایا تھا، کفر کا زمانہ تھا اور جاہلیت کا دور تھا، میں نے تجارت کے لیے ایک دفعہ شام کا سفر کیا۔ سفر کے دوران اتفاق سے ایسا ہوا کہ قافلہ نکل گیا اور میں اکیلا رہ گیا...... اس زمانہ میں قافلہ کے بغیر سفر کرنا آسان بات نہیں ہوتی تھی...... میں بڑا اُداس ہو کر ایک دیوار کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا کہ قافلہ نکل گیا، اب پتہ نہیں دوسرا قافلہ کب ملے گا؟ ایک آدمی آیا اور کھڑا ہو کر مجھے دیکھتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے کہا: آؤ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میں نے کہا: خدا کے بندے! میں پہلے پریشان ہوں، میرا قافلہ نکل گیا ہے اور اب تم مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتے ہو، میں تمہارے گھر جا کر کیا کروں گا؟ اس آدمی نے کہا: گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، تم میرے ساتھ میرے گھر چلو، کھانا کھاؤ، آرام کرو اور اس کے بعد میں تجھے ایسا تیز رفتار گھوڑا دوں گا کہ تم دیکھ کر حیران ہو جاؤ گے، وہ تمہارے قافلے کو ایک دن میں پکڑ لے گا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں حیران کہ جان پہچان نہیں، لیکن وہ مجھے گھر لے گیا، کھانا کھلایا، بڑی عزت و تکریم کی اور اس کے بعد صبح صبح اس نے اپنے نوکروں کو تیار کیا کہ گھوڑے تیار کر کے ان کو قافلے میں پہنچاؤ۔ اس کے بعد ایک کاغذ لے کر آ گیا، کہنے لگا کہ اس کاغذ پر مجھے دستخط کر دو۔ میں نے اس کو کہا: یہ کیسا کاغذ ہے؟ کیا بات ہے؟ اس نے کہا: بات یہ ہے کہ جب تم اس ملک کے بادشاہ بنو گے تو مجھ پر ٹیکس نہیں لگاؤ گے۔ آپ نے فرمایا: مجھے تو کبھی سردار بننے کا خیال بھی نہیں آیا اور تم مجھے یہاں کا بادشاہ بنا رہے ہو۔ اس نے کہا: اگر تم بادشاہ نہ بنو گے تو تمہارے اس دستخط کو لے کر میں کیا کروں گا؟ یہ میرے کس کام آئیں گے؟ اور اگر تم بن گئے تو تمہیں اتنی سخاوت کرنے میں کیا تکلیف ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو کہا: مجھے بتلاؤ، وجہ کیا ہے؟ اس نے کہا: تمہارا نام عمر ہے، تم خطاب کے بیٹے ہو؟ آپ نے کہا: یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس نے کہا: قریشی ہو؟ آپ نے کہا: یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس نے کہا: مکہ میں پیدا ہوئے ہو۔ وہاں ایک نبی پیدا ہوگا، جس کا نام محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا اور تم اس کے وزیر بنو گے، اس کے ساتھی بنو گے، اس کے دین اور مذہب کا پرچم لے کر اُٹھو گے اور پوری دنیا پر چھا جاؤ گے، جس جگہ اب تم بیٹھے ہو تمہاری حکومت ہوگی۔ یہ سب کچھ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے، میں نے تمہاری وہ نشانیاں پڑھی ہیں، اس لیے تمہیں گھر لایا ہوں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں ہنس پڑا اور اس کو کہا: ٹھیک، اگر تمہارا خیال ہے تو لکھوا لو۔ جب ہم بادشاہ بنیں گے تو تمہیں ٹیکس نہیں لگائیں گے۔ میں نے لکھ دیا۔ بات بھول گئی، مدت گزر گئی۔ آج وہ بوڑھا آدمی میرا لکھا ہوا لے کر آیا ہے اور میں اس جگہ کا بادشاہ ہوں اور اسلام مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں کسی پر ٹیکس معاف کردوں، اس لیے میں نے کہا کہ یہ میری ذاتی حکومت تو نہیں ہے اور نہ میرے بیٹے کی جائیداد ہے، جو اسلام حکم کرے گا وہ سب پر نافذ ہوگا، میں کچھ نہیں کرسکتا۔

احبار یہود نے بیت المقدس کی چابیاں بغیر کسی جنگ کے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر رکھ دیں۔ وہ پاگل تو نہیں ہو گئے تھے، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کتابوں میں پڑھ چکے تھے کہ یہ وہی خلیفہ ہے جس کے ہاتھ پر بیت المقدس فتح ہوگا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادوگری کا الزام:

مفسرین فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان آیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت کچھ عرصہ کے لیے چلی گئی تو انسانوں اور جنات کی بہت ساری جماعتیں مرتد ہو گئیں اور شہوات کے پیچھے چل پڑیں اور جادو کی کتابیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی کے نیچے چھپا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو پھر حکومت عطا فرما دی اور پھر ملک عطا فرما دیا۔ لوگ پھر دین پر آ گئے جیسے پہلے تھے۔ خدا کی قدرت ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام فوت ہو گئے تو جنات اور مخالفین نے آ کر وہ کتابیں نکالیں اور لوگوں سے کہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جادو کے زور سے ہم پر حکومت کرتے تھے اور وہ جادو ان کتابوں میں ہے جو انہوں نے اپنی کرسی کے نیچے چھپا دی تھیں۔

ان کتابوں میں ہر وہ چیز تھی جو اللہ کے راستے سے روکنے والی تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت آصف بن برخیا سلیمان علیہ السلام کا کاتب تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام جو حکم فرماتے اس کو لکھ لیتا اور اس کو دفن کر دیا جاتا تو جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات ہو گئی تو لوگوں نے اس کو نکالا اور اس کی دو سطروں کے درمیان ایک سطر اپنی طرف سے بڑھاتے گئے، جس میں جادو کی تعلیم اور کفریات تھے۔ جب لوگوں کو پتہ چلا تو انہوں نے گالیاں دینا شروع کیں کہ کفر لکھ گئے، حالانکہ جہالت تھی۔ اس لیے اللہ نے وضاحت فرما دی کہ یہ شیاطین کے کام ہیں۔ نعوذ باللہ! سلیمان علیہ السلام نے سحر نہیں لکھوایا۔ انہوں نے نہ کبھی سحر کیا اور نہ کبھی سحر کی تعلیم دی، نہ ان کی زبان مبارک سے، نہ قلم

سے منکرات نکلے۔ وہ اللہ کے نبی تھے۔ یہ حرکت ساری شیاطین کی تھی، لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے۔

جیسے آج بھی ہوتا کہ گمراہ قسم کے لوگ قرآن کا ترجمہ مثلاً انگریزی میں کر دیا۔ اب علماء دین بے چارے انگریزی نہیں جانتے، سارا ترجمہ انہوں نے ٹھیک کر دیا، لیکن بعض آیات میں ایسا مسئلہ اُلجھا دیا کہ بندہ کفر میں چلا جائے۔ اسی طریقہ سے بعض لوگوں نے کتابوں کے ترجمے کیے، بعض لوگوں نے احادیث مبارکہ کے ترجمے کیے۔ لوگ پڑھنے والے بڑے مطمئن ہوتے ہیں کہ اگر وہ آدمی دیندار نہیں تھا تو اس کو قرآن کے ترجمے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنا بڑا آدمی تھا، اس نے قرآن کی خدمت کی اور اس کا ترجمہ کیا۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ باطل کیا کچھ نہیں کرتا۔ جب کوئی مسلمان ہو کر گمراہ کرتا ہے تو اتنا بڑا کافر بن کر گمراہ نہیں کر سکتا، اس لیے کوئی آدمی کہے کہ میں یہودی ہوں تو کون اس کی بات مانے گا؟ کوئی کہے کہ میں نصرانی ہوں تو کون اس کی بات مانے گا؟ کوئی کہے کہ میں ہندو ہوں تو کون اس کی بات مانے گا؟ اگر وہی ہندو داڑھی رکھ لے، مسجد میں مصلے پر کھڑے ہو کر امام بن جائے تو کیا کرو گے؟ وہ تسبیحات بھی پڑھتا رہے اور ذکر بھی کرتا رہے، جمعہ بھی پڑھاتا رہے، جیسا کہ آپ کے ملک میں ہو چکا ہے کہ کئی مساجد میں ہندو پکڑے گئے کہ وہ مسلمانوں کے امام بن کر کھڑے رہے۔ ایسی باتیں ہر دور میں ہوتی ہیں، شیاطین الانس والجن ایسے حملے کرتے ہیں۔ زیادہ تر وہ آدمی اس کے اندر پھنستا ہے جو زبانیں نہیں جانتا۔ اس لیے بہت سارے تراجم جو انگریزی میں کیے گئے ہیں، ان میں ایسا زہر بھرا ہوا ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ کئی ترجمے ایسے ہیں جو ازبک زبانوں میں کیے گئے ہیں، کئی ترجمے ایسے ہیں جو افریقی زبانوں میں کیے گئے یا عربی میں ترجمے کیے گئے اور ازبک والے علاقوں میں پہنچائے گئے، وہ اس کو جاننے والے نہیں اور انہوں نے اس کے اندر ایک سطر بھی بڑھا دی تو سارا دین ختم ہو گیا۔ اس لیے جب کوئی قرآن کا ترجمہ یا کوئی کتاب پڑھو، پہلے علماء اور ذمہ دار آدمی سے پوچھ لو کہ یہ ترجمے والا شخص قابل اعتبار ہے؟ کیونکہ جب ایک دفعہ ٹھوکر لگ گئی تو ٹھیک ہونا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

ابن جریر نے حضرت شہر بن حوشب سے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا ملک اور سلطنت نہ رہی تو شیاطین ان کی عدم موجودگی میں خود جادو اور منتر وغیرہ لکھتے کہ فلاں کام کرنا ہو تو سورج کی طرف رخ کر کے یہ کلمات پڑھو گے تو تمہارا کام ہو جائے گا اور فلاں کام کرنا ہو تو سورج کی طرف پشت کر کے یہ کلمات پڑھو گے تو تمہارا کام ہو جائے گا؛ کیونکہ شیاطین سورج اور چاند تاروں کے پجاری ہوتے ہیں، اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو حکم دیا کہ جب سورج نکل رہا ہو، جب سورج ڈوب رہا ہو، جب سورج سر پر ہو تو نماز ادا نہ کرو؛ کیونکہ

یہ اوقات ان لوگوں کے ہیں جو سورج کے پجاری ہیں، وہ ان اوقات میں عبادت کرتے ہیں، کہیں مسلمانوں کی عبادت سے وہ حجت نہ پکڑیں کہ یہ بھی ہماری موافقت کررہے ہیں۔ ان لوگوں نے ایسا جادو لکھنے کے بعد اس کتاب کے اوپر عنوان یہ دیا کہ یہ تمام چیزیں لکھنے والا آصف بن برخیا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے اور ان کے لیے لکھی گئی ہیں۔ یہ ان کے علمی خزانے کے موتی ہیں جو ہم نے جمع کیے ہیں۔ اور اس کے بعد اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت کے نیچے دفن کر دیا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام فوت ہو گئے تو ابلیس انسانوں کی شکل میں آ کر لوگوں سے کہنے لگا: اے لوگو! خیال رکھو! حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کا نبی نہیں تھا، بلکہ وہ جادوگر تھا اور اگر اس کا جادو ڈھونڈنا ہے تو اس کے آس پاس اور اس کے سامان میں تلاش کرو۔ جب لوگوں نے تلاش شروع کی تو ابلیس نے ان کو خود بتایا کہ اس جگہ دفن ہے۔ جب لوگوں نے تلاش کیا تو وہ سحر (جادو) مل گیا۔ کہنے لگے: ہاں! بالکل سچی بات ہے، سلیمان علیہ السلام نبی نہیں تھے، بلکہ جادوگر تھے، اسی جادو کے زور سے انہوں نے ہمیں اپنا غلام بنایا ہوا تھا، ہم پر اپنا غلبہ حاصل کیا ہوا تھا۔ اس وقت جو ایمان والے تھے، انہوں نے کہا: وہ اللہ کے نبی تھے اور سچے علم والے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا، جہاں آپ نے دیگر انبیاء کا ذکر کیا، وہاں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر بھی فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھی نبی تھے تو یہود کہنے لگے: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حق اور باطل کو ملا دیا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام تو نبی نہیں تھے، بلکہ (نعوذ باللہ) جادوگر تھے اور جادو کے زور پر ہوا پر چلتے اور ہوا پر تخت اُڑاتے تھے۔ اللہ پاک نے ان کے رد میں قرآن پاک نازل فرمایا کہ یہ لوگ شیاطین کے پیچھے چل پڑے، جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں شیاطین جادوگر تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تو کبھی کفر نہیں کیا، وہ تو اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے جن کو اللہ نے نبوت بھی عطا کی اور ملک بھی عطا کیا۔

حضرت ابی مجلز کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چرند و پرند اور جانور حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیئے تھے، اللہ کے پیغمبر نے ان تمام جانوروں سے ایک عہد لیا تھا کہ جو تمہیں میرا عہد یاد دلائے تو تم اس کو اس کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ اس لیے جب بھی کسی آدمی کو اس قسم کی مشکلات سے واسطہ پڑتا ہے جیسا کہ مشہور بات ہے کہ گھر میں سانپ ہو، اگر آدمی اس کو کہہ دے کہ ہم تمہیں عہد سلیمان کے بارے میں یاد دلاتے ہیں، تم ہمیں ایذاء نہ پہنچاؤ، ہم تمہیں ایذاء نہیں پہنچائیں گے۔ اگر وہ جن ہے تو نکل جائے گا، اگر حقیقتاً سانپ ہے تو نہیں نکلے گا، پھر مارنے کی اجازت ہے۔ شیاطین کو اس طرح جادو پھیلانے کا موقع مل گیا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جادو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے بھی موجود تھا، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعون نے جادوگروں کو مقابلہ کرنے کے لیے بلایا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے بہت پہلے کا ہے۔ لہٰذا جادو پہلے بھی تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے جنات کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا اور ہواؤں کو تابع کر دیا تو جنات و شیاطین نے بدلہ لینے کے لیے ان چیزوں کو پھیلایا۔

جادو کے بارے میں ایک اور واقعہ:

قصہ ہاروت و ماروت اور سحر کے بارے میں ایک اور قصہ بھی کتابوں میں آیا ہے، اس کو اس لیے ذکر کرتے ہیں، تاکہ تنبیہ ہو جائے، اہل علم ان میں سے حق لے لیں اور باطل کو چھوڑ دیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: دومۃ الجندل (ایک قبیلہ) کی ایک عورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد آئی، وہ سحر کے بارے میں بعض چیزیں معلوم کرنا چاہتی تھی۔ حضرت عائشہ اپنے بھانجے عروہ سے کہتی ہیں کہ جب اس عورت کو پتہ چلا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی ہے تو وہ عورت غم میں سخت روتی تھی، مجھے خوف آتا تھا، میں اس پر ترس کھاتی تھی اور مجھے خوف تھا کہ وہ اتنی غمزدہ ہے۔ اس عورت نے کہا: میں ڈرتی ہوں اس بات سے کہ شاید میں ہلاک ہو گئی۔ اب اللہ کے نبی بھی وفات پا گئے ہیں تو میرے مسئلے کا حل کیا ہوگا؟ کہنے لگی کہ مدت ہو گئی، مجھ سے میرا خاوند غائب ہو گیا ہے، میں بڑی پریشان تھی، ایک بوڑھی عورت میرے پاس آئی، میں نے اس سے شکوہ کیا کہ میرا خاوند اتنے عرصہ سے غائب ہے، اس نے کہا: ایک کام ہے، اگر تم میری بات مان لو اور میری بات پر عمل کرو تو تمہارا خاوند آ جائے گا۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ میں مان گئی۔ وہ عورت دوسری دفعہ آئی تو اس کے ساتھ دو سیاہ رنگ کے کتے تھے، کتے پر تو وہ خود سوار ہو گئی اور ایک کتے پر اس نے مجھ کو سوا کیا۔ ہم کتوں کو دوڑاتے ہوئے بابل میں ایک کنویں پر پہنچے، وہاں دیکھا کہ دو آدمی کنویں کے اندر اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں، انہوں نے کہا: کیوں آئے ہو؟ ہم نے کہا: جادو سیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا: ہم تو اللہ کی طرف سے آزمائش میں مبتلا ہیں، تم واپس لوٹ جاؤ، کفر میں نہ پڑو۔ ہم نے کہا: ہم نے ضرور سیکھنا ہے۔ جب میں نے بہت زیادہ اصرار کیا کہ مجھے جادو سکھاؤ تو انہوں نے کہا: فلاں جو تندور ہے، وہاں پیشاب کر کے پھر ہمارے پاس واپس آؤ۔ کہتی ہے: میں وہاں پیشاب کرنے کے لیے گئی، لیکن میں ڈر گئی اور میں نے پیشاب نہ کیا۔ انہوں نے پوچھا: پیشاب کر آئی ہو؟ میں نے کہا:

ہاں! کر آئی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تم نے کوئی چیز دیکھی تھی؟ میں نے کہا: میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے کہا: تم اپنے گھر لوٹ جاؤ، تم جادو اور کفر میں نہ پڑو۔ میں نے کہا: میں لوٹتی نہیں ہوں، میں سیکھنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا: جاؤ، پھر اس طرح کرو جیسے ہم نے تمہیں کہا ہے۔ جب میں اس تندور کے پاس گئی تو پھر ڈر گئی۔ میرے بال کھڑے ہونے لگ گئے، میں کانپنے لگ گئی اور واپس آ کر کہا کہ میں نے کر لیا ہے۔ انہوں نے کہا: تم نے وہاں کوئی چیز دیکھی؟ میں نے کہا: نہیں۔ انہوں نے کہا: جھوٹ بول رہی ہو، تم نے پیشاب کیا ہی نہیں ہے۔ تم لوٹ جاؤ، کفر میں نہ پڑو۔ اس عورت نے کہا کہ میں ان کے حکم پر دوبارہ گئی اور وہاں جا کر پیشاب کیا۔ جب فارغ ہوئی تو دیکھا کہ میرے اندر سے گھڑسوار نکلا اور وہ آسمانوں کی طرف غائب ہو گیا۔ جب میں واپس آئی تو انہوں نے کہا: پیشاب کر لیا؟ میں نے کہا: کر آئی ہوں۔ انہوں نے کہا: کچھ دیکھا تھا؟ میں نے ان کو بتلایا۔ انہوں نے کہا: وہ تمہارا ایمان تھا، وہ خارج ہو کر چلا گیا، اب تم کافر ہو گئی ہو، اب تم لوٹ جاؤ۔ میں نے اس عورت سے کہا: میرا کچھ بنا تو نہیں، میرا ایمان بھی چلا گیا۔ اس نے کہا: تم ابھی غم نہ کرو۔ اس عورت نے مجھے گندم کے دانے دیئے اور کہا: ان کو کاشت کرو۔ میں نے ان کو کاشت کیا۔ اس نے کہا: جب یہ زیادہ ہو جائیں تو ان کو صاف کرو تو میں نے صاف کیا۔ اس کے بعد اس نے کہا: ان کو خشک کرو، میں نے خشک کیا۔ اس نے کہا: ان کو پیسو، میں نے پیسا۔ اس نے کہا: اس کی روٹی بناؤ، میں نے اس کی روٹی بنائی۔ اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ میں کوئی چیز بھی چاہتی تھی تو فوراً میرے ہاتھ میں آ جاتی تھی۔ اب میں نے کچھ کیا نہیں اور میں آئندہ بھی کبھی نہیں کروں گی۔ اس وقت اصحاب رسول موجود تھے، اس نے ان سے عرض کیا کہ مجھے بتلاؤ، میں کیا کروں، اس کا کیا حل ہے؟ صحابہ ﷡ خاموش رہے۔ انہوں نے کہا: ہم کیسے فتویٰ دے سکتے ہیں جس کے بارے میں ہمیں علم نہیں، تم حضرت ابن عباس ﷜ کی طرف رجوع کرو۔ اور ایک صحابی نے کہا: اگر تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہیں تو ان کو لے کر آؤ، ہم ان کو اس کا حل اور فتویٰ بتلائیں گے۔

حضرت ہشام فرماتے ہیں: صحابہ تقویٰ وخشیت والے تھے، یہ نہیں تھا کہ بات نہ جانتے ہوں اور کہہ دیتے، بلکہ وہ محتاط لوگ تھے، ہر بات پر زبان نہیں کھولتے تھے۔

اس واقعہ کو لے کر بعض علماء نے یہ بھی استدلال کیا کہ جادو کے زور سے کسی چیز کی حقیقت کو بھی بدلا جا سکتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جادوگر کسی چیز کو بدل نہیں سکتا، بلکہ وہ قوت خیالیہ پر اثر ڈالتا ہے۔ جیسے ہپناٹزم ہوتا ہے کہ آدمی

پر ایسا اثر ڈالتے ہیں کہ وہ آدمی تابع ہو جاتا ہے، اس کو جو چاہے وہ کروائے تو اس کا نام سحر ہے۔

یہ جادو سب سے زیادہ یہودیوں میں ہے، اس کے بعد روافض میں ہے اور ہندوستان کے بنگال کے علاقوں میں اب تک پایا جاتا ہے، بعض مصر کے علاقوں میں بھی یہ پایا جاتا ہے۔

اب یورپ میں انگریز اس کے اندر مبتلا ہو گئے اور ان کے اندر ایک نیا علم چلا ہے، اس علم کو وہ ''علم الحاضرات'' کہتے ہیں، یعنی کسی غائب کو حاضر کرنا کہ ایک کمرہ کو بند کر کے، اندھیرا کر کے، کمرے کے اندر ایک ٹیبل پر خالی گلاس رکھ دیتے ہیں اور سامنے ایک بندے کو آنکھیں بند کر کے بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں: آپ کو اپنے باپ سے ملنا ہے تو اس کا تصور کر کے بیٹھ جائیں، میں عمل کروں گا۔ جب یہ گلاس حرکت کرنے لگے تو سمجھ لینا کہ میں نے تمہارے باپ کی روح منگوالی ہے۔ جو باپ سے پوچھنا ہو پوچھ لینا۔ اس کے اندر کئی لوگ مبتلا ہوئے اور کہا کہ ہم نے خود اپنے باپ سے بات کی ہے۔ یہ سب علوم باطلہ اور کفر ہیں، قرآن وسنت کے خلاف ہیں۔ ہاں! اگر ایک آدمی عابد وزاہد ہے، کثرت سے درود شریف پڑھتا ہے، اس کا مال حلال کا ہے، حرام کھانا پیٹ کے اندر نہیں جاتا، پاک بستر پر سوتا ہے اور اللہ سے دعائیں مانگتا ہے تو اس کو حضور اکرم ﷺ کی خواب میں زیارت ہوگی۔ یہ بات ٹھیک ہے۔

حضور پاک ﷺ کی سچی زیارت ہوتی ہے؛ کیونکہ شیطان سب کی شکل بنا لیتا ہے، لیکن اللہ کے نبی کی شکل نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح اللہ کے اولیاء یا انسان کو اپنے ماں باپ کی خواب میں زیارت ہو جاتی ہے اور کیفیات خواب سے آدمی اندازہ لگا لیتا ہے۔

بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم ﷺ سے ورقہ بن نوفل کے بارے میں پوچھا کہ اس نے آپ کی تصدیق بھی کر دی تھی اور ساتھ یہ تمنا بھی کر دی کہ میں آپ کی مدد کروں گا تو اس کا مرنے کے بعد کیا حال ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا کہ اس پر بڑا سفید لباس ہے، اگر وہ جہنمی ہوتا تو اس پر سفید لباس نہ ہوتا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ﴾ [آل عمران:۱۰۶] اور فرمایا: ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ [آل عمران:۱۰۷] کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ چہروں کو رونق والا اور سفید کر دیں گے اور کچھ کے چہروں کو سیاہ کر دیں گے۔ سیاہ چہرے جہنمی کی علامت ہوں گے اور سفید چہرے جنتی کی علامت ہوں گے۔

کسی آدمی نے اپنے والدین کو اچھے لباس میں دیکھا، اچھی ہیئت اور صورت میں دیکھا تو اللہ کا شکر کرے۔ اگر

(نعوذ باللہ) کسی بُری حالت میں دیکھا تو صدقہ وخیرات اور دعائیں کرے۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں تو اپنے ولی پر آنے والی دور کی بات کھول دیتے ہیں اور وہ اللہ کے ولی کرامت کے اعتبار سے اس بات کو بتا دیتے ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا "یا ساریہ الجبل!" کہنے کا واقعہ:

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دے رہے تھے کہ اس دوران فرمایا: "یَا سَارِیَۃُ! اَلْجَبَلَ، یَا سَارِیَۃُ! اَلْجَبَلَ، یَا سَارِیَۃُ! اَلْجَبَلَ" اے ساریہ! پہاڑ کو اپنی پشت پر لے کر جنگ کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حیران ہوئے اور آپ سے پوچھا کہ ساریہ تو نہاوند ایک علاقے کا نام ہے اور وہ اڑھائی سو میل دور ہے تو آپ کیسے یہ بات فرما رہے تھے؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے میرے سامنے اس میدانِ جنگ کا نقشہ ظاہر کر دیا اور میں نے آواز دی تو اللہ نے پہنچا دی۔ جب حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ واپس آئے تو انہوں نے کہا: ہم شکست کھا رہے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جو آواز دی تو ہم نے اپنی جنگ کا طریقہ بدلا تو اللہ نے ہمیں فتح عطا فرما دی۔

اگر اللہ چاہیں تو اس کو کسی پر کھول دیتے ہیں، نہیں چاہتے تو کسی پر بھی نہیں کھولتے۔ یہ کسی کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے ہمارے لوگ اپنے عقیدے خراب کر کے یہ کہہ دیتے ہیں کہ میرے شیخ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یہ حد سے تجاوز ہے۔

بابل شہر ایک نہاوند میں ہے اور ایک عراق میں ہے۔ قرآن مقدس کے اندر جس بابل کا ذکر ہے وہ عراق میں ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ جتنے فتنے پیدا ہوئے، تقریباً اسی زمین سے پیدا ہوئے۔

ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حرم نبوی میں دعا مانگ رہے تھے: اے اللہ! مجھے یمن میں برکت عطا فرما، یمن کے علاقہ میں برکت عطا فرما، مکہ میں برکت عطا فرما، مدینہ میں برکت عطا فرما۔ ایک صحابی نے عرض کیا: عراق کے لیے بھی دعا مانگیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ انہوں نے دوبارہ کہا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ انہوں نے تیسری دفعہ کہا کہ حضور! عراق کے لیے دعا کر دیں، وہاں ہمارا آنا جانا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں کہ اس جگہ سے فتنے اٹھیں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اُمت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، ان میں سے بہتر (۷۲) جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں جائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: وہ نجات پانے والا کون سا فرقہ ہوگا؟

آپ ﷺ نے فرمایا: جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ وہ بہتر فرقے عراق سے پیدا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سفر کر رہے تھے، نماز کا وقت آیا، مؤذن نے آپ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ نماز کا وقت ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آگے چلو۔ جب اس جگہ سے نکل گئے تو آپ نے فرمایا: اب اذان کہو۔ اذان کہی گئی تو آپ نے نماز پڑھی اور فرمایا: میرے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے مجھے منع کیا تھا کہ کبھی قبرستان میں نماز نہ پڑھنا، اور مجھے فرمایا: کبھی تمہارا بابل کی زمین سے گزر ہو تو وہاں بھی نماز نہ پڑھنا، کیونکہ اس زمین پر اللہ کی لعنت ہے۔ اس لیے میں نے وہاں نماز نہیں پڑھی۔

﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ﴾ [البقرة:۱۰۲]

لوگ ہاروت وماروت سے اس قسم کا جادو سیکھتے تھے کہ میاں اور بیوی کے درمیان جھگڑا ڈلوا دیا۔

یہ انتہائی مذموم حرکت ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کا ایک ایسا رشتہ رکھا ہے جس کی بنیاد محبت ہی محبت ہے اور رحمت ہی رحمت ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ [البقرة:۱۸۷]

''وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔''

اچھی بیوی کی صفات:

بعض علماء نے فرمایا: جیسے لباس بندے کو چھپا لیتا ہے تو میاں بیوی کو جو رشتہ ہے، یہ دونوں کو گناہوں سے اور شیطانی حرکات سے چھپا لیتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو آپس میں مودّت اور محبت عطا فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے اندر جو قوتِ شہوانیہ رکھی ہے اس کو پورا کرنے کے لیے حلال کا ایک راستہ پیدا فرمایا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اچھی عورت وہ ہوتی ہے کہ جب اس پر خاوند کی نظر پڑے تو خاوند کو خوش کر دے اور جب خاوند حکم کرے تو عورت اس کی فرمانبرداری کرے اور جب خاوند باہر چلا جائے تو اس کی عزت، اولاد اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔ ماں اور بیٹے میں وہ بے تکلفی پیدا نہیں ہو سکتی جو میاں بیوی میں ہے، ایک بھائی اور بہن میں وہ بات نہیں ہو سکتی جو ایک میاں بیوی میں ہو سکتی ہے۔ اور زندگی کی بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو آدمی اپنی ماں اور

بہن سے بھی نہیں کہہ سکتا، لیکن بیوی سے کہہ سکتا ہے۔ بیوی، مرد کی زندگی میں باقاعدہ شریک حیات ہے۔ اب جو اس رشتہ کو توڑ ڈالے، اس سے بڑا شیطان کون ہوگا کہ دونوں میاں بیوی کے درمیان نا چاقی اور فساد کرا دیا جائے۔ جب دونوں کے درمیان فساد ہوگا تو یہ نسلوں میں چلا جائے گا، دو خاندان لڑ جائیں گے، دونوں گناہ کریں گے، اولاد برباد ہوگی، آگے نسل بھی غلطیوں میں پڑتی پڑتی آخر کار ہلاکت میں چلی جائے گی۔

شیطان کی جماعتیں اور ان کے اُمور:

''إِنَّ إِبْلِيسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ، ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ، فَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً أَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً.''

[صحیح مسلم، رقم: ۲۸۱۳]

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح مسلم میں حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ حضور پاک ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: شیطان اپنا تخت پانی پر ڈالتا ہے، وہ اپنی جماعتوں کی جماعتیں بھیجتا ہے کہ جا کر لوگوں کو گمراہ کریں۔ جب وہ واپس آتے ہیں تو سب سے زیادہ وہ اس کے قریب ہوتا ہے جو سب سے زیادہ دنیا کے اندر فتنہ ڈالے۔ اس لیے جب وہ واپس آتے ہیں تو ان سے پوچھتا ہے کہ تم نے کیا کیا؟ ایک کہتا ہے کہ فلاں شخص کو میں نے ایسے گمراہ کیا اور اس نے ایسی ایسی باتیں کیں۔ وہ کہتا ہے: تم نے کچھ نہیں کیا۔ اس طرح پوچھتے پوچھتے ایک شیطان کہتا ہے کہ میں نے میاں بیوی کے درمیان جھگڑا کرا دیا۔ ابلیس کہتا ہے: تم نے بہت اچھا کیا ہے، میرے قریب آ جاؤ۔ اس کو اپنے قریب بٹھاتا ہے اور ہاتھ ملاتا ہے اور کہتا ہے: تم ہی بڑا کام کر کے آئے ہو؛ کیونکہ وہ گھر برباد ہو گیا اور جہنم بن گیا۔

﴿وَمَا هُمْ بِضَآرِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ [البقرۃ: ۱۰۲]

دنیا کے اندر کوئی نفع یا نقصان اللہ کے حکم کے بغیر نہیں پہنچ سکتا۔

کیونکہ ہر چیز اللہ کی طرف لوٹ جائے گی۔ جب تک اللہ کا حکم اور اذن نہ ہو، دنیا کی کوئی طاقت کسی کو نقصان نہیں دے سکتی۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی بُری بات ہوگی تو نسبت شیطان کی طرف ہوگی اور جب اچھی بات ہوگی تو نسبت رحمٰن کی طرف ہوگی، ورنہ خالق خیر بھی اسی کی ذات ہے اور خالق شر بھی اسی کی ذات ہے۔ حضرت محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نقصان اس وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اس کو علیحدہ چھوڑ دیں، اپنی رحمت سے دور

کردیں۔ جب رحمت کا سایہ نہیں رہے گا تو نقصان ہوگا۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ دعا مانگا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے میرے نفس کے حوالہ نہ کرنا ایک آنکھ جھپکنے کی دیر یا اس سے بھی تھوڑی دیر۔ بلکہ مجھے اپنے سایہ رحمت کے نیچے رکھنا۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ چاہتے ہیں تو جادوگر کو مسلط کردیتے ہیں اور اگر نہ چاہیں تو وہ کیا کرسکتا ہے۔ اللہ اس کی حفاظت فرماتے ہیں، شیطان خود بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اس لیے کہ اللہ نے شیطان کو فرمایا تھا کہ جاؤ، جو تمہارے دل میں آئے کرو۔

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ۝﴾ [الحجر: ۴۲]

"جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا، مگر وہ سرکشوں میں سے ہے جس نے تمہاری پیروی کی۔"

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے انبیاء اور عباد صالحین کو شیطان کے حملوں سے محفوظ فرما لیتے ہیں، شیطان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

جادوگر کی سزا:

بجالہ بن عبدہ فرماتے ہیں: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حکم جاری کیا کہ جادوگر مرد ہو یا عورت، اس کو قتل کردو۔ ہم نے تین جادوگروں کو قتل کیا۔ اس روایت کو امام بخاری نے بھی نقل کیا ہے۔

بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی تھی، اس نے بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا پر جادو کردیا۔ جب ثابت ہوگیا تو بی بی صاحبہ نے اس کے قتل کا حکم دیا، وہ قتل کردی گئی۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ کے تین صحابہ کا یہی فتویٰ ہے کہ ساحر کو قتل کیا جائے۔

ترمذی میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ساحر کی سزا یہ ہے کہ اس کی گردن اُڑا دو، اس کو قتل کردو۔

ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک ایسا جادوگر تھا کہ لوگوں کے سامنے آکر وہ جادوگری کرتا، چیخ کر سر کو جدا کردیتا، پھر وہ گردن لگا دیتا کہ آدمی اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ لوگ کہتے تھے: بڑی بات ہے، یہ تو مُردے کو زندہ کردیتا ہے۔ ایک مہاجر صحابی ایک دن تلوار لے کر آگئے۔ اس جادوگر نے اپنا جادو دکھانا شروع کیا، صحابی نے اس کو تلوار ماری اور اس کی گردن اُڑا دی اور کہا: اگر سچا ہے تو اب خود اپنی گردن لگا لے اور اپنے آپ کو زندہ کرے اور صحابی نے یہ آیت پڑھی: ﴿أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ ۝﴾ [الانبیاء: ۳] ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ اس صحابی پر ناراض ہوگئے کہ تم

نے میری اجازت کے بغیر کیوں قتل کر دیا؟ اور ان کو جیل میں ڈال دیا، پھر ان کو چھوڑ دیا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت جندب رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ آدمی جادو سے کرتب دکھاتا تھا، حضرت جندب رضی اللہ عنہ آئے اور اس کو قتل کر دیا۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے جو قتل کا حکم دیا یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جو قتل کا حکم دیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سحر میں شرک بھی پایا جاتا تھا۔

معتزلہ کہتے ہیں: دنیا میں جادو کا کوئی وجود نہیں ہے، بلکہ جو اس کے وجود کا عقیدہ رکھتا ہو، وہ کافر ہے۔

اہلسنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ سحر موجود ہے، اس کا اثر بھی ہے۔ البتہ اہلسنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ جب جادوگر اس قسم کے الفاظ کہتا ہے تو اللہ کی قدرت اور قضا سے ایسا ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ جادو یا ستارہ یا نجوم یا چاند، سورج اثر کرتے ہیں۔ ان کا اثر نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ لیکن منجمین، فلاسفہ یہ بات نہیں مانتے۔

پانچواں مسئلہ:

بعض علماء کہتے ہیں: علم تو علم ہے، جاننا تو بہتر ہے۔ جب ہم جادو کو جانتے ہوں گے تو جادو اور معجزے کے درمیان فرق کر سکیں گے، وگرنہ فرق کیسے ہو سکے گا؟ مفسرین فرماتے ہیں: یہ شرعاً حرام ہے۔ جب حضور اکرم ﷺ نے اس کو حرام کر دیا تو یہ حرام ہے۔

اور جو آدمی گرہ لگاتے ہیں، یہ بھی جادو کی ایک قسم ہے: مفسرین فرماتے ہیں: محققین علماء نے جو یہ بات کی ہے، ان کے پاس اس کی کوئی دلیل بھی تو ہونی چاہیے۔ انہوں نے علم سحر کو اس آیت میں داخل کیا ہے:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝﴾ [الزمر:۹]

مفسرین فرماتے ہیں: اس میں نظر ہے۔ یہ آیت تو ان کی مدح میں ہے جو علم شرعی حاصل کرتے ہیں۔ باقی ان کا یہ کہنا کہ معجزے کا کیسے پتہ چلے گا؟ سب سے بڑا معجزہ حضور اکرم ﷺ کا قرآن ہے تو کیا قرآن سیکھنے کے لیے جادو سیکھنا ضروری ہے؟ یا جو لوگ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں تھے، ان کا معجزہ سمجھ نہیں آیا؟ حالانکہ انہوں نے نہ جادو سیکھا اور نہ جادو کا علم پڑھا۔

جادو کی آٹھ اقسام

ابو عبداللہ الرازی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ آٹھ قسم کا جادو ہوتا ہے:

پہلی قسم:

''الأول سحر الكذابين و الكشدانيين'' جو سات ستاروں کی عبادت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ تمام دنیا کا نظام ان سات ستاروں کے پاس ہے، انہی کے ذریعے پوری کائنات میں خیر و شر کا نظام چل رہا ہے۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی طرف نبی بنا کر بھیجا اور انہوں نے ان کے اس عقیدے کا رد کیا اور ان کے ساتھ مقابلہ کیا اور اللہ نے حق کو غالب فرما دیا۔

ابو عبداللہ الرازی نے ایک کتاب ''السر المكتوم فی مخاطب الشمس و النجوم'' لکھی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب لکھی تھی، لیکن بعد میں انہوں نے توبہ کر لی تھی۔ بعض لوگوں نے لکھا کہ اس نے کتاب کو عقیدہ کے طور پر نہیں لکھا تھا، بلکہ انہوں نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ ستاروں کو کیسے مخاطب کرتے ہیں اور کون سے کلمات پڑھتے ہیں؟ سب اس کتاب میں لکھ دیا۔ بعض علماء ایسے ہوتے ہیں جو ہر فن میں ایک کتاب لکھ دیتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے چونکہ ان کو علم عطا فرمایا ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی اس کو پڑھنے کے بعد غلط استعمال کرے۔ بہرحال بہتر یہ ہوتا ہے کہ علماء کو ایسی کتابوں کی تصنیف سے پرہیز کرنا چاہیے؛ کیونکہ ہزاروں میں سے ایک آدمی علم کے لیے پڑھتا ہے اور نو سو ننانوے آدمی نقصان پہنچانے کے لیے پڑھتے ہیں۔ وہ ایسی کتابیں جب بھی پڑھے گا تو جادو سیکھے گا۔

دوسری قسم:

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اوہام اور قوتِ نفسانیہ کے ذریعہ جادو کرتے ہیں؛ کیونکہ کبھی کبھی وہم کی بھی تاثیر ہوتی ہے۔ مثلاً آپ سڑک پر جا رہے ہیں اور آپ کو وہم ہو گیا کہ میں گرا تو آپ گر جائیں گے اور اگر وہم نہ آئے تو آپ پُل سے بھی گزر جائیں گے۔ اس قوتِ وہمیہ کو ''لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' پڑھ کر ختم

کر دے، چل پڑے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔

طبی ٹوٹکے:

علمائے طب کہتے ہیں کہ جس مرد کو ناک سے خون آتا ہو تو آپ اس کو سرخ چیز نہ دکھائیں، اگر سرخ چیز دکھائیں گے تو اس کا خون جاری ہو جائے گا۔ اسی طرح سے علمائے طب کہتے ہیں کہ جس کو مرگی کا مرض ہے، اس کو بہت تیز چمکنے والی چیز نہ دکھائیں، ورنہ اس کو دورہ پڑ جائے گا اور اسی طرح جو چیزیں گول پھرنے والی ہیں، اگر مرگی والے کو وہاں لے جاؤ تو دورہ پڑ جائے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی جو طبیعتیں پیدا کی ہیں، لازمی بات ہے کہ ان پر اثر پڑتا ہے۔ جیسا کہ نظر بد کا لگ جانا حق ہے۔ اس لیے جب بھی آپ کو کوئی چیز اچھی نظر آئے تو "مَاشَاءَ اللّٰهِ" یا "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" یا "سُبْحَانَ اللّٰهِ" کہہ دیں تو نظر نہیں لگے گی۔

اسی طرح اگر کسی آدمی کی نظر لگتی ہو تو اس سے بچنے کے لیے علماء نے لکھا ہے کہ جب وہ سامنے آئے تو لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ یا اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، یا آیۃ الکرسی پڑھ کر پھونک دیں تو اس کی نظر نہیں لگے گی۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اَلْعَيْنُ حَقٌّ، وَ لَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابَقَ الْقَدَرَ سَبَقَتْهُ الْعَيْنُ." [صحیح مسلم، رقم:۲۱۸۸]

"نظر لگنا برحق ہے، اور اگر اللہ کی تقدیر سے بھی سبقت لے جانے والی کوئی چیز ہوتی تو یہ نظر ہوتی۔"

اس لیے روایت میں آتا ہے کہ آدمی کو نظر، قبر میں پہنچا دیتی ہے اور اونٹ کو دیگچے میں پہنچا دیتی ہے۔

قوتِ تخلیہ کا اثر کس طرح ہوتا ہے؟

جو لوگ قوتِ تخلیہ ڈالتے ہیں، بعض اتنے قوی ہوتے ہیں کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں گے اور آپ کو مسحور کر دیں گے اور کبھی وہ آلات بھی استعمال کرتے ہیں۔

اصل میں بات یہ ہوتی ہے کہ اگر نفس بدن سے مستغلی ہے تو عالم سماوات کے ساتھ تعلق شدید ہے، گویا وہ ارواحِ سماویہ کی روح ہے، اس کی تاثیر بہت زیادہ ہوتی ہے، اور اگر ضعیف ہے تو اس کی تاثیر بدن پر ہوتی ہے۔ ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے یہ ہے کہ غذا کم کھائے، لوگوں سے علیحدہ رہے، ریاء سے بچے تو طبیعت کے اندر یہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ یہ تصرف کرنا کبھی کبھی تو شریعت کی حدود میں ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے ولی ہوتے ہیں کہ کسی پر نظر

ڈالتے ہیں تو وہ تابع ہو جاتا ہے، دنیا چھوڑ دیتا ہے اور اچھے کام شروع کر دیتا ہے۔ یہ کرامات ہیں۔ اور کبھی کبھی وہ لوگ ہوتے ہیں جو شریعت، قرآن وحدیث کے بھی مخالف ہیں، ان کی شکل وصورت بھی شریعت کے خلاف ہے اور اللہ ورسول کے بھی خلاف کام کرتے ہیں، یہ شیطان ہوتے ہیں۔ جیسے اللہ نے دجال کو بھی قوتیں دی ہیں کہ وہ آئے گا تو ساری دنیا پر چلے گا، زمین کو حکم دے گا کہ اپنے خزانے نکالو تو وہ اپنے خزانے نکال دے گی، خشک دریاؤں کو حکم دے گا کہ چلو تو وہ چل پڑیں گے، نہروں کو حکم دے گا کہ ٹھہرو تو نہریں ٹھہر جائیں گے، بادلوں کو حکم دے گا کہ برسو تو بادل برسنا شروع ہو جائیں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ کوئی آدمی اگر ایسا اثر پیدا کرتا ہے اور اس کی صحبت میں اثر ہوتا ہے تو اس کی شکل وصورت اور افعال شریعت کے مطابق ہیں تو وہ ولی ہے، اگر شریعت کے خلاف ہیں تو وہ دجال ہے، شیطان ہے۔ ولیوں کی تاثیر خیر کے کاموں میں ہوتی ہے۔ بزرگوں کے ایسے واقعات موجود ہیں کہ بڑے شرابی اور گناہگار لوگ ان کی صحبت میں تھوڑی دیر بیٹھے، بزرگوں نے توجہ کی اور دعا کی تو ان لوگوں نے توبہ کرلی اور بڑے بڑے شیطان قسم کے لوگ ٹھیک ہو گئے۔

تیسری قسم:

ارواحِ ارضیہ یعنی جو جنات زمین میں موجود ہیں، ان سے مدد لینا۔ چونکہ مرنے کے بعد دو کیفیات ہیں: مومن ہوگا یا کافر ہوگا۔ اگر مومن ہوں گے تو ارواح اعلیٰ علیین میں جائیں گی اور اگر کافر ہوں گے تو اسفل سافلین میں جائیں گی۔ اگر وہ زندہ ہے تو کوئی شک نہیں، وہ زمین پر ہوتے ہیں تو جادوگران ارواحِ ارضیہ یعنی ان جناتِ ارضیہ کی روح کے ساتھ تعلق جوڑتے ہیں اور ان سے مدد لیتے ہیں۔

یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، چھوٹے چھوٹے جادوگر اور منتر پڑھنے والے کر لیتے ہیں۔ فلاسفہ اور معتزلہ اس کو نہیں مانتے۔ ان ارواحِ ارضیہ کے ساتھ تعلق آسان اعمال کے ساتھ ہو جاتا ہے کہ عود جلا دیا، لوبان جلا دیا، ان کے دھوئیں میں ان جنات کی ارواح حاضر ہوتی ہیں۔ بہرحال اس قسم کو عزائم اور عمل تسخیر کہتے ہیں، یہ جادو کی تیسری قسم ہے۔

چوتھی قسم:

اس کو تخیلات کہتے ہیں کہ کسی کی آنکھوں کو قبضے میں لے لینا اور ہاتھوں کی کاریگری دکھانا کہ ایک جادوگر بیٹھتا ہے اور لوگوں کو باتوں میں لگا کر ان کی آنکھیں ایک چیز پر مرکوز کر دیتا ہے اور جب سب لوگوں کی نظریں اس پر گاڑ دیتا

ہے تو اس کے بعد وہ حرکت کر کے دوسری چیز دکھا دیتا ہے کہ دیکھنے والے حیران ہو جاتے ہیں۔ ان کے بعض طریقے ایسے ہوتے ہیں یا تو وہ کبھی ایسی جگہ کھڑا ہوتا ہے جو سب سے زیادہ روشنی والی ہو یا ایسی جگہ کھڑا ہوتا ہے جو سب سے زیادہ اندھیرے والی ہو۔ چونکہ تیز روشنی میں بھی آدمی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے اور اندھیرے میں بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے تو اس لیے جب جادوگر اپنے ہاتھوں سے حرکتیں کرتے ہیں تو بات سمجھ نہیں آتی اور وہ اس کو جادو سمجھتا ہے، حالانکہ جادو نہیں ہوتا، بلکہ ہماری آنکھوں پر ایک کنٹرول اور ہاتھوں کی چالاکی ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض مفسرین نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ پر جو جادوگر آئے تھے، وہ بھی دراصل یہی شعبدہ تھا، انہوں نے بھی لوگوں کی آنکھوں پر کنٹرول کر لیا۔ جیسا کہ قرآن میں آتا ہے:

﴿فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ ۝٦٦﴾ [طٰہٰ: ٦٦]

ان کے دماغوں میں قوت خیالیہ میں یہ بات ایسے ڈال دی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں، حالانکہ وہ حقیقت میں نہیں دوڑ رہی تھیں۔

پانچویں قسم:

بعض اعمالِ عجیبہ جو کہ دیکھنے میں بڑے عجیب لگتے ہیں، حالانکہ یہ بھی ایک فن اور کاریگری ہے۔ جیسا کہ سینگ لگا دیا اور ایک لکڑی کا گھوڑا ہو، اس پر ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے، ٹھیک جب گھنٹہ ہوتا ہے تو وہ آ کر اس پر مارتا ہے، اس طرح وہ آ رہا ہے اور جا رہا ہے۔ یہ ایک شعبدہ ہے جو دیکھنے والے کو حیرانی میں مبتلا کر دیتا ہے کہ ایک لکڑی کے بندے کو کیسے پتہ کہ گھنٹہ ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ اس کے چلنے کی انہوں نے حرکات ایسی رکھی ہیں کہ جب اس کے پاؤں کا پہلا نمبر دبے گا تو وہ سمجھے گا کہ ایک بج گیا ہے اور جب دو نمبر دبے گا تو دو بج گئے۔ انڈیا کے حیدر آباد میں یہ موجود ہے اور اسی طرح سے پیرس میں ایک گھڑی بنائی ہے جو پانی کے ساتھ چلتی ہے۔

جیسے ہندوستان کے اندر رہٹ ہوتے تھے اس حساب سے کہ پانی ایک جگہ گرتا ہے، دوسری جگہ گرتا ہے، پھر تیسری جگہ اور اس پانی کی حرکات سے سوئیاں ٹھیک چل رہی ہیں، ایک منٹ بھی غلطی نہیں کرتیں۔ سینکڑوں سال گزر گئے اور اس میں فرق نہیں آیا اور آج تک لوگ نہیں سمجھ سکے۔ مغلیہ دور کے اندر ایک حوض بنایا گیا تھا، اس کی خاصیت یہ تھی کہ گرمیوں کے موسم میں اس کا پانی معتدل تھا، لیکن جب سردیوں کا زمانہ آتا تو پانی گرم ہوتا تھا۔ تحقیق

اور ریسرچ سے معلوم ہوا کہ ایک موم بتی وہ گرم ہوتا تھا۔ اب اس موم بتی کو ہوا نہیں لگ رہی تھی اور وہ جل بھی رہی تھی۔ سالہا سال گزر گئے، وہ ختم بھی نہیں ہوئی۔ جب اس کو کھودا تو دوبارہ اس کو نہیں بنا سکے۔ انگریز جو شیطانوں کا بھی باپ ہے، لیکن اب تک وہ نہیں بنا سکا۔ وہ پریشان ہیں کہ یہ کیا بات تھی کہ اس زمانے کے کاریگر بنا گئے۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: رومی اور ہندی لوگوں نے ایسی صورتیں بنائی ہیں کہ دیکھنے والا فرق نہیں کر سکتا کہ یہ صورت ہے یا حقیقتاً انسان کھڑا ہے۔ بعض اوقات انہوں نے شیروں کے ایسے مجسمے بنائے ہیں کہ کئی لوگ دھاڑیں مار مار کر ڈر کر بھاگ آئے۔ اس میں بھی ان کی ایک کاریگری اور فن ہے، لیکن دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔

(واقعہ) ایک بادشاہ کے پاس رومی کاریگروں اور ہندی کاریگروں کا آپس میں مقابلہ ہو گیا۔ روم کے کاریگر کہیں کہ ہم زیادہ فنکار ہیں اور ہندی کہیں ہم زیادہ کاریگر ہیں۔ وہ دونوں بوٹے اور تصویریں بناتے تھے۔ بادشاہ کے بیٹھنے کا بڑا کمرہ تھا، اس نے کہا: اس کے درمیان میں پردہ کر دو کہ ایک حصہ میں رومی کام کریں اور دوسرے حصہ میں ہندی کام کریں۔ اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ کس کا کام اچھا ہے۔ جب دونوں اپنے اپنے حصہ میں داخل ہوئے تو دونوں کے دروازے بند کر دیئے گئے، تاکہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں۔ رومیوں نے ایسے پھول اور بوٹے بنائے، محسوس یہ ہوتا تھا کہ حقیقتاً ہمارے سامنے پھول ہے اور ہندی کاریگروں نے بھی اپنا فن دکھایا۔ جب تاریخ مقرر آ گئی اور دونوں نے اپنا فن انتہاء کو پہنچا دیا، بادشاہ اپنے وزراء کو لے کر ان کے کام کو دیکھنے آیا۔ درمیان سے پردہ ہٹا دیا گیا۔ ہندی کاریگروں نے اپنی دیوار کو اتنا صاف پالش کیا، شیشے کا رنگ دیا کہ جب بادشاہ اندر داخل ہوا تو جو رومیوں نے بنایا تھا وہ ادھر نظر آ رہا تھا اور اس میں کمال یہ تھا کہ ہر چیز سیدھی نظر آتی تھی، اُلٹی نظر نہیں آتی تھی، حالانکہ شیشہ میں چیز اُلٹی نظر آتی ہے۔ بادشاہ نے کہا: ہندی قوم تم لوگوں سے زیادہ نمبر لے گئی۔ تم لوگوں نے بڑی محنت کی، لیکن ان لوگوں نے تمہارے علم کو اپنی دیوار میں منتقل کر دیا۔ اس قسم کے عجائبات بھی دنیا میں ہوتے ہیں اور لوگ اس کو جادو سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ جادو نہیں ہوتا۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم میں لکھا ہے کہ بعض لوگ ایسے صندوق بناتے ہیں کہ جس میں گھڑیاں ہوتی ہیں اور بعض ایسے طریقے کے ہیں کہ بہت بھاری چیز کو ایک خفیف چیز سے کھینچ لیں گے۔ مثلاً ایک مَن کے پتھر کو ایک دھاگے سے کھینچا، دھاگا بھی نہ ٹوٹا اور پتھر بھی کھنچ آیا۔ تو یہ جادو نہیں، کیونکہ اس کے اسباب اور علامات موجود ہیں، لیکن لوگ اس کو بھی جادو شمار کرتے ہیں۔

اسی طریقے سے نصرانیوں کے حیلے ہیں کہ انہوں نے بیت المقدس میں ایسا انتظام کیا کہ مخفی طور پر ایسی جگہ سے آگ داخل کرتے ہیں کہ وہ قنادیل میں جلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس سے وہ جاہل لوگوں پر اپنا اثر ڈالتے ہیں اور ان کے خاص لوگ جانتے ہیں کہ یہ حقیقت نہیں، بلکہ یہ آگ ہے جو خاص طریقہ سے جلائی جاتی ہے۔

(واقعہ) ایک نصرانی راہب اپنے کنیسہ میں عبادت کرتا تھا۔ اس نے وہاں ایک کمزور پرندے کو دیکھا کہ وہ بڑی کمزور آواز نکالتا ہے، اس کی آواز میں اتنا درد ہے کہ باقی پرندے بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں تو اس راہب نے اس شکل کا ایک پرندہ بنایا اور اس کو اندر سے خالی رکھا اور اس طریقہ سے بنایا کہ اس طرف سے ہوا گزرے تو اس پرندے کی طرح آواز نکلے۔ اس نے عبادت خانے کی چھت پر اس کو رکھ دیا اور زیتون وغیرہ رکھ دیتا۔ جب ہواؤں کا زمانہ آتا تو اس طرف سے وہ دروازہ کھول دیتا۔ جب ہوا چلتی اور اس پرندے سے آواز نکلتی تو سارے پرندے اکٹھے ہو جاتے تھے اور زیتون کھاتے تھے۔ لوگ آ کر دیکھتے تو کہتے کہ اس بزرگ کی کرامت ہے کہ اس کو سلام کرنے کے لیے سارے پرندے آ رہے ہیں۔ لاکھوں لوگ اس طرح برباد ہو گئے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قیامت تک ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، جو لوگوں کے عقیدے برباد کرتے ہیں۔

چھٹی قسم:

بعض جادوگر دواؤں کے خواص سے فائدہ اُٹھاتے ہیں کہ دوا پلائی، آدمی کو نشہ ہو گیا، آدمی کا درد بدن سے ختم ہو گیا۔ ایسی چیزیں وہ اپنے مشروبات اور مطعومات میں تیار کرتے ہیں۔ جیسے مقناطیس میں بھی اس کا مشاہدہ کیا گیا۔ بعض ایسی دوائیاں ہیں کہ آدمی اگر ہاتھوں پر لگا کر سانپ کو پکڑ لے تو اگر سانپ ڈس بھی لے تو کچھ نہیں ہوتا۔

ساتویں قسم:

ساتویں قسم یہ کہ جادوگر دعویٰ کرتا ہے کہ میں اسم اعظم کا عامل ہوں، جنات میرے تابع ہیں۔ بعض سننے والے ضعیف العقل ہوتے ہیں، وہ بھی مان لیتے ہیں کہ شاید اس کے پاس اسم اعظم ہے۔ بعض لوگ اپنے تجربات سے دیکھتے ہیں کہ یہ آدمی چالاک ہے تو اس سے بات نہیں کرتا اور جو سیدھے سادے نظر آتے ہیں تو اس کو کہتا ہے: میں اسم اعظم کا عامل ہوں، جن میرے تابع ہیں، تم جو چیز کہو، میں ابھی لا کر دکھا سکتا ہوں، منگوا سکتا ہوں۔ جب کوئی آدمی ان کے ہاتھ آ جاتا ہے تو اس کو لُوٹ کر چلے جاتے ہیں۔

آٹھویں قسم:

چغلی کر کے لوگوں کو آپس میں لڑوانا۔ اور لوگوں نے سمجھا کہ میں اس سے تعویذ لے کر آیا تو ان کی آپس میں دشمنی ہوگئی ہے۔ ایک چغلی لوگوں کو لڑوانے اور لوگوں کو جدا کرنے کے لیے ہوتی ہے، یہ حرام ہے۔ اور ایک ایسا جھوٹ ہوتا ہے جس کے ذریعے سے آدمی لوگوں کو ملانا چاہتا ہے، جھگڑا ختم کرانا چاہتا ہے، یہ گناہ نہیں ہوتا۔ کافروں کے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے ایسی بات کی کہ ان کا باہم تعلق ختم ہو جائے، یہ ٹھیک ہے۔ جیسا کہ حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جنگ احزاب کے موقع پر کیا تھا، جس کی تفصیل سورۃ الاحزاب میں آئے گی۔ یہ چغلی حرام نہیں ہے، بلکہ جنگ میں تو ایسے حیلے اور تدبیریں کی جاتی ہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ نے سحر کی ساری انواع بیان کی ہیں۔ اصل میں بعض چیزیں مخفی ہوتی ہیں اور سحر بھی یہی ہے کہ خفیہ طور پر کسی کے اوپر اثر کر دے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ''إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا'' [صحیح بخاری، رقم: ۵۱۴۶] اللہ نے بعض بندوں کو بولنے میں جادو دیا ہوتا ہے۔ وہ بات کرتے ہیں تو لوگوں کے دلوں کو کھینچ لیتے ہیں۔ اس لیے امام رازی رحمہ اللہ نے بعض ایسی چیزوں کو بھی سحر میں شامل کر دیا، جو حقیقتاً سحر نہیں ہیں، کیونکہ وہ بھی مخفی ہیں۔

اس لیے رمضان المبارک میں جو آدمی صبح کو کھانا کھاتا ہے، اس کو ''سحری'' کہتے ہیں؛ کیونکہ وہ بھی رات کو چھپ کر کھاتا ہے اور جیسا کہ ابو جہل علیہ اللعنہ نے بدر والے دن عتبہ سے کہا تھا: ''إِنْتَفَخَ سَحْرُهُ'' (ڈر کے مارے اس کا پتہ بھی پھول گیا ہے)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''تُوُفِّيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَيْتِي، وَ فِي يَوْمِي، وَ بَيْنَ سَحْرِي وَ نَحْرِي.'' [صحیح بخاری، رقم: ۴۴۵۱]

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں، میری باری کے دن اور میرے سینے اور حلق کے درمیان وفات پائی، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک میرے سینے پر تھا (سَحر، پتہ کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی چھپا ہوا ہوتا ہے) جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَالَ أَلْقُوا ۖ فَلَمَّا أَلْقَوْا سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاءُو بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ۝﴾ [الاعراف: ۱۱۶]

کہ انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا، یعنی ایسے مخفی طریقے سے عمل کیا کہ کسی دوسرے کو سمجھ نہ آئے۔

ابو عبد اللہ القرطبی نے لکھا ہے کہ اہلسنت والجماعت کے نزدیک سحر حقیقت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے

بغیر تو بہر حال کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن معتزلہ کہتے ہیں: جادو حقیقت نہیں، بلکہ ایک دھوکہ اور تخیل ہے، یہ ہاتھ کی چالاکی یا آنکھوں پر اثر ڈالتا ہے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بعض کلام ایسے ہوتے ہیں جن کو وہ یاد کرتے ہیں، بعض کلام ایسے ہوتے ہیں جو اللہ کے کلام سے پڑھتے ہیں اور بعض ایسے کلام ہوتے ہیں جو شیاطین کے عہد ہوتے ہیں اور دوائیں اور دھوئیں ہوتے ہیں جو اثر کرتے ہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ "إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا" یا تو یہ تعریف ہے یا جادو کی مذمت ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بعض آدمی میرے پاس مقدمہ لے کر آتے ہیں، ایک آدمی زیادہ بولنے والا اور اپنی بات کو سمجھانے والا ہوتا ہے، حالانکہ وہ جھوٹا ہوتا ہے، لیکن اپنی بات کے زور پر اپنی بات منوالیتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ کرتا ہوں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝﴾ [البقرة: ۱۰۴]

"اے ایمان والو! (نبی) کو "رَاعِنَا" نہ کہو، بلکہ "اُنْظُرْنَا" (ہماری طرف دیکھیے) کہو اور سنو، اور انکار کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کے ساتھ مومنوں کو خطاب:

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی ایک اور قباحت کا ذکر فرمایا اور حضور اکرم ﷺ کی عظمت کو بیان فرمایا ہے اور آپ کی اُمت کی عظمت کو اس طرح بیان فرمایا کہ اٹھاسی (۸۸) مقامات پر قرآن میں ان کو مخاطب فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے دوستوں سے فرمایا کہ خیال کیا کرو جہاں قرآن میں ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے خطاب آئے تو اپنے فکر و نظر اور دل و جان کے ساتھ اللہ کے کلام کی طرف متوجہ ہو جایا کرو؛ کیونکہ اللہ بغیر کسی واسطہ کے اپنے مومنین بندوں سے خطاب فرما رہے ہوتے ہیں اور اللہ پاک جب بھی مومنین کو خطاب فرماتے ہیں تو کسی خیر کا حکم دیتے ہیں اور شر سے منع فرماتے ہیں۔

ربط آیات:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ [البقرة:۱۰۴]

جیسے آدمی جادو کے ذریعے سے دکھلاتا کچھ ہے اور اس کی حقیقت کچھ ہوتی ہے، اسی طرح یہودیوں کا سحر لسانی تھا، جس سے بظاہر تو عظمت محمد مصطفیٰ ﷺ معلوم ہو، لیکن در پردہ ان کا مقصد حضور اکرم ﷺ کی اہانت تھا۔ اس طرح گزشتہ آیات اور اس آیت کے درمیان ربط معلوم ہو گیا۔

شانِ نزول:

یہودیوں کی یہ عادت تھی کہ جب وہ آپ ﷺ کی خدمت میں آتے تو بڑے ادب واحترام سے کہتے تھے: ﴿رَاعِنَا﴾ اب ظاہر لفظ کا معنی یہ ہے کہ ہماری رعایت کیجیے، ہم سے مہربانی کیجیے۔ لیکن ان کا مقصد توہین تھا کہ بظاہر تو ﴿رَاعِنَا﴾ بول رہے ہیں، لیکن اپنے لہجے کو بدل دیتے تھے اور کہتے تھے: ''رَاعِيْنَا'' یعنی تم تو ہمارے چرواہے ہو (نعوذباللہ من ذلك)۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ مکہ میں مشرکین کی بکریاں چراتے رہے اور اب نبوت کا دعویٰ کرتے ہو۔

''رَاعِيْنَا'' کا دوسرا معنی آتا ہے: (نعوذ باللہ) تم بے عقل ہو۔ جو لوگ اس وقت نئے نئے مسلمان ہوئے تھے وہ سمجھتے تھے کہ یہودیوں کے بڑے بڑے علماء، احبار اور رُہبان جب اس لفظ سے اللہ کے نبی کو پکارتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بڑا اچھا لفظ ہے، وگرنہ ان لفظوں کے ساتھ یہ نہ بلاتے۔ تو ان ایمان والے لوگوں نے بھی حضور اکرم ﷺ کو اس لفظ کے ساتھ مخاطب کرنا شروع کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس میں یہ آیت اُتاری کہ اے ایمان والو! تم ان کی باتوں میں آکر ایسا لفظ اختیار نہ کرو کہ جس کے معنی بظاہر ٹھیک ہیں، لیکن در پردہ دشمن اس سے اہانت کا معنی لیتا ہے۔ اور میرے نبی کی شان اتنی بڑی ہے کہ اس کی شان میں اشارۃً یا کنایۃً کسی طرح بھی اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا کلمہ زبان سے نکالے جس سے میرے پاک نبی کی شان میں کمی ہوتی ہو تو اس کے کفر میں کوئی شک نہیں۔

علمائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرے اور ایسا لفظ زبان سے کہے جو میرے حضور ﷺ کی شان کے لائق نہ ہو یا (نعوذ باللہ) کوئی سب وشتم کرے یا حضور اکرم ﷺ کی اہانت وتوہین کرے تو وہ زندیق اور واجب القتل ہے۔

گستاخِ رسول واجب القتل ہے، اس کا قصاص بھی نہیں:

اسی موضوع پر عظیم کتاب علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''الصارم المسلول علی شاتم الرسول'' لکھی ہے کہ اگر کوئی آدمی حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرے تو اس کی سزا یہ ہے کہ وہ واجب القتل ہے اور وہ زندیق ہے، اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ اور جو آدمی ایسے آدمی کو قتل کرے گا، اس پر سزا بھی نہیں ہوگی۔

اور اس پر احادیث سے استدلال کیا ہے کہ ایک نابینا صحابی کی شادی ایک کنیز سے ہوئی اور وہ نوجوان لڑکی تھی، بڑی خوبصورت تھی، کافرہ تھی، اس کو اپنی جوانی پر گھمنڈ تھا۔ جب بھی صحابی آتے تو وہ پوچھتی کہ آپ کہاں رہ گئے؟ وہ کہتے کہ مجھے حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں دیر ہوگئی تو وہ بدبخت لڑکی حضور پاک ﷺ کی شان میں گستاخی کرتی تھی۔ اس صحابی نے بڑا سمجھایا اور اس کو ہدایت کی، لیکن وہ باز نہ آئی۔ ایک دن اس صحابی نے سوچا کہ اگر میں ایسے مقابلہ کروں تو وہ آنکھ والی ہے، وہ بھاگ جائے گی اور اگر کہہ کر مقابلہ کروں تو ہو سکتا ہے کہ وہ طاقت میں بھی مجھ سے زیادہ ہو جائے، کیونکہ جوان لڑکی ہے۔ میں نے ایک دن ارادہ کر لیا، جب وہ سو گئی تو اس کے سینہ پر بیٹھا اور اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا اور اس وقت تک ہاتھ نہیں اُٹھائے جب تک یقین نہیں ہو گیا کہ یہ شاتمہ، بدبخت عورت اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ اس کو قتل کرنے کے بعد حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے بڑا برداشت کیا، لیکن آپ کی شان میں گستاخی میں کب تک برداشت کرتا، میری قوتِ برداشت جواب دے گئی اور میں نے اس کو مار ڈالا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے، اور آپ ﷺ نے اس پر کوئی مقدمہ قائم نہیں فرمایا اور اسے کسی قتل کی سزا بھی نہیں دی۔ اس سے علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے استدلال کیا کہ اگر کوئی شاتم رسول ہے، چاہے وہ صراحتاً گستاخی کرے یا کنایۃً گستاخی کرے یا اشارۃً گستاخی کرے تو اس کے کفر میں علماء کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ادب فرض ہے:

ادب، ہمیشہ دوستوں کو اور اپنوں کو سکھایا جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنین سے خطاب فرمایا۔ اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ

أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿٢﴾ [الحجرات:٢]

اے ایمان والو! خبردار! میرے مدنی ﷺ کے سامنے اپنی آواز کو اونچا بھی نہ کرو، یعنی آپ کے فرمان کی مخالفت نہ کرو، گستاخانہ طور پر یا ایسے ذریعہ سے کہ جس سے میرے مدنی کی آواز دب جائے اور توہین کا پہلو نکلے۔ وگرنہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اونچی آواز میں اذان دیتے تھے، اسی طرح بعض صحابی جب بات کرتے تھے تو اونچی آواز میں کرتے تھے۔ ان کی فطرتاً آواز اونچی تھی۔ اس لیے اس آیت میں مقصد یہ ہے کہ کوئی آدمی توہین کے ارادے سے میرے پاک نبی ﷺ سے بات کرے کہ اس کی آواز اونچی ہو جائے یا نافرمانی کرے یا انکار کرے یا حضور پاک ﷺ کے سامنے ایسا شور مچائے کہ حضور اکرم ﷺ کی آواز دب جائے۔

فرمایا: جب میرے مدنی پاک جا رہے ہوں تو ان کو ایسے نہ بلایا کرو جیسے تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو کہ اے فلانے! ادھر آؤ۔ بلکہ میرے نبی ﷺ کے سامنے آکر ادب سے عرض کیا کرو۔ اگر تم نے کبھی ایسی غلطی کی کہ تمہاری آواز میرے نبی کی آواز سے اونچی ہو گئی تو اس کی سزا یہ ہے کہ میں تمہارے نیک اعمال برباد کر دوں گا اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔

تیسرا ادب: فرمایا: جو لوگ میرے مدنی کے سامنے آکر پست آواز میں بات کرتے ہیں، ادب سے بات کرتے ہیں، یہ پکے مومن ہیں، ان کے دلوں کو میں نے آزما لیا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو تقویٰ کے اعلیٰ مرتبہ پر ہیں اور انہی کے لیے مغفرت ہے اور بہت بڑے درجات ہیں۔

چوتھا ادب: اللہ نے سکھایا ہے کہ کچھ لوگ جنگل سے آئے اور حضور پاک ﷺ کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر زور زور سے کہنے لگے: "أُخْرُجْ يَا مُحَمَّدُ! أُخْرُجْ يَا مُحَمَّدُ" (محمد! باہر آ، ہماری بات سن)۔ اس وقت حضور اکرم ﷺ سوئے ہوئے تھے اللہ پاک نے فرمایا: خبردار! میرے نبی جب اپنے حجرے میں چلے جائیں تو باہر سے شور نہ مچایا کرو، بلکہ صبر کرو اور جب میرا نبی خود باہر آئے اور تمہاری طرف توجہ کرے تو درخواست پیش کرو۔

اس لیے اللہ نے اس آیت میں اشارہ فرمایا کہ ایسا لفظ استعمال کیا کرو جس کا دوسرا معنی نہ ہو، تاکہ دوسری تاویل نہ ہو سکے۔ اور جس چیز کا تمہیں حضور اکرم ﷺ حکم کریں، اس کی اطاعت کرو۔ اور جو کافر ایسے لفظ کہتے ہیں، وہ حضور اکرم ﷺ کی اہانت کرتے ہیں، ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔

﴿مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَّبِّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝﴾ [البقرۃ:۱۰۵]

''نہیں پسند کرتے اہل کتاب کافر اور مشرکین کہ تم پر خیر (وحی) نازل ہو تمہارے رب کی طرف سے، حالانکہ اللہ اپنی رحمت (نبوت) سے مخصوص کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔''

شانِ نزول:

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ یہودیوں کے بڑے راہب مسلمانوں سے کہنے لگے کہ اگر تمہارے دین میں کوئی بات زیادہ بہتر ہوتی یا تمہارا دین ہمارے دین سے مجموعی طور پر بہتر ہوتا تو ہم مان لیتے، لیکن دین اسلام زیادہ بہتر نہیں۔ اللہ نے ان کی اس بات کو رد کرتے ہوئے کہا: کافر اہل کتاب اور مشرکین یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے اوپر کوئی بھلائی نازل کرے، ان کے دلوں میں حسد و بغض ہے، ان کو دین اسلام کی اچھائی نظر نہیں آرہی، حالانکہ یہ جاہل اتنا بھی نہیں جانتے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت برحق ہے، تورات اور انجیل اللہ کی کتابیں ہیں، لیکن وہ دونوں صرف بنی اسرائیل کے لیے نبی تھے، ساری کائنات کے لیے نبی نہیں تھے۔ یہ شرف صرف حضور اکرم ﷺ کو ملا ہے کہ آپ ﷺ کی نبوت بھی ساری کائنات کے لیے اور رسالت و شریعت بھی ساری کائنات کے لیے ہے اور نبوت آپ پر آکر ختم ہوگئی۔ اللہ نے فرمایا: چونکہ ان کافر، یہودیوں اور عیسائیوں کے دلوں میں بغض وحسد ہے، یہ مسلمانوں کی خیر کبھی پسند نہیں کرتے اور اللہ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ جس کو خاص کرلیں، جس کو چن لیں اپنی نبوت کے لیے، اس کی مرضی ہے۔ یہ اعتراض کرنے والے کون ہیں؟

جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا، وہ انہی میں شمار ہوگا:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات میں مسلمانوں کو منع فرمایا ہے کہ تم کافروں کے کسی کام کی، فعل کی مشابہت نہ کیا کرو کہ ان کے لباس وغیرہ میں ان کی پیروی کی جائے، ان کی عادات میں اور ان کے قول میں مسلمانوں کے لیے ان کی پیروی کرنا ہلاکت کا باعث ہے؛ کیونکہ یہود جب بات کرتے تھے تو توریہ کرتے تھے۔

احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ جب یہودی آ کر حضور پاک ﷺ کو سلام کرتے تو کہتے: "اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ" یعنی آپ ﷺ پر موت آئے۔ اس لیے ہمیں یہ حکم دیا گیا کہ جب کبھی یہودی یا کافر تم کو سلام کرے تو تم کہو: "وَعَلَیْکُمْ"، تاکہ جو کچھ اس نے کہا، وہ بلا اللہ تعالیٰ اس پر ڈالے۔ اللہ کی رحمت سے ہماری جو اُن کے بارے میں دعا ہے وہ اللہ منظور فرمائیں گے اور ان کی بد دعا ہمیں نہیں لگے گی۔ اس بات کا خلاصہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ کافر کی کسی بات میں پیروی نہ کرے۔

کفار کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے سے متعلق احکام:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ." [سنن ابی داود، رقم: ۴۰۳۱]

"جو آدمی جس قوم کی شکل اختیار کرتا ہے وہ ان میں سے شمار ہوگا۔"

اس لیے جو لباس خاص طور پر یہود و نصاریٰ یا مشرکین اور کافرین کی علامت ہے، مسلمان اس سے بچیں۔ اگر کوئی شخص اس طرح کرے گا تو اللہ اس کو انہی میں سے بنادے گا اور وہ ان میں سے اُٹھایا جائے گا۔

کوٹ، پتلون کے مسئلے کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں؛ کیونکہ یہ اب کافروں کی علامت نہیں رہا۔ کوئی آدمی پینٹ پتلون پہنے ہوئے ہو اور ہم یہ سمجھیں کہ یہ کافر ہے۔ چونکہ اب اس کو مسلمان اتنا استعمال کرتے ہیں کہ اب یہ کفار کا مخصوص لباس نہیں رہا، لیکن بعض چیزیں جیسے ٹائی لگانا یا ایسے کپڑے پہننا جس کے اندر چھ ستارے ہوتے ہیں یہودیوں کے، یا تین ستارے ہوں عیسائیوں کے، تاکہ وہ اس سے تثلیث کا عقیدہ ثابت کریں۔ بہر حال جو چیزیں ان کا شعار ہیں، جس کو دیکھ کر فوراً نظر اُدھر جائے کہ یہ یہودیوں کا شعار ہے یا یہ نصرانیوں کا شعار ہے، ہندو لوگ دھوتی الٹا کر پہنتے ہیں تو یہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں، اسی طرح سے وہ چوٹی رکھتا ہے، جائز نہیں ہے؛ کیونکہ وہ ان کا شعار اور ان کی علامت ہے۔ اسی طرح جیسے پادریوں کے لباس ہیں، وہ ان کے شعار ہیں۔ اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں، مسلمانوں کو استعمال نہیں کرنی چاہئیں۔ ہندو عورتیں اس طرح ساڑھی باندھتی ہیں کہ آدھا پیٹ کھلا ہوتا ہے، یہ ان کا شعار ہے، اگر مسلمان عورت اس طرح باندھے تو یہ بالکل حرام ہے؛ کیونکہ مسلمان عورت سر سے لے کر پاؤں تک عورت ہے۔ عورت کا معنی وہ چیز ہے جو چھپائی جائے، اور

مرد کا عورۃ یعنی ستر ناف کے نیچے سے لے کر گھٹنے سمیت تک ہے، اس جگہ کا چھپانا شریعت کے اندر فرض ہے، اگر اس میں ذرا بھی جگہ کھلی ہوگی تو نماز نہیں ہوگی، دیکھنے اور دکھانے والے دونوں پر لعنت ہوگی۔

عورت برقعہ کا کرتہ اتنا لمبا پہنے کہ ایک بالشت کے برابر پاؤں سے بھی نیچے ہو کہ وہ کپڑا زمین پر پڑ جائے اور عورت کے پاؤں بھی نظر نہ آئیں۔ عیسائی تین انگلیوں سے سلام کرتے ہیں، تاکہ تثلیث کا عقیدہ ثابت ہو، اور یہ ان کا شعار ہے۔ اس لیے ایسے شعار جو باطل فرقوں کے ہوتے ہیں، ان سے بچنا ضروری ہے، ورنہ قیامت میں اللہ پاک انہی میں سے اُٹھائیں گے۔

حضرت خیثمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے خطاب فرمایا اور تورات میں خطاب ہوتا تھا: ''يَا أَيُّهَا الْمَسَاكِينُ!''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ﴿رَاعِنَا﴾ کا معنی ''ارعنا سمعك'' ہے، یعنی ہماری بات سننے میں آپ ہماری رعایت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حضور اکرم ﷺ کو ایسے نہ کہو، یہ حضور اکرم ﷺ کی شان کے خلاف ہے۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قینقاع قبیلہ سے ایک یہودی جس کا نام رفاعہ بن زید تھا، وہ بھی حضور پاک ﷺ کی خدمت میں آتا اور کہتا تھا: ''ارعنی سمعك وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ'' مسلمانوں نے سمجھا کہ شاید یہ بڑا اچھا کلمہ ہے کہ اس سے انبیاء کی عزت و وقار کیا جاتا ہے تو انہوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا کہ ایسا لفظ یا کوئی ایسا کلمہ اختیار نہ کرو جو حضور اکرم ﷺ کی شان میں کوتاہی کا ذریعہ بنتا ہو؛ کیونکہ یہودی تو دشمن ہیں، وہ تو ایسی باتیں کرتے ہیں۔

کافروں کا ایک ذہین آدمی تھا، وہ بڑے فخر سے لوگوں کو کہتا تھا کہ تم کمال کرتے ہو، محمد کے پیچھے جاتے ہو، میں اس سے زیادہ سمجھدار ہوں، میرے پاس دو دل ہیں اور میرے پاس اتنا عقل اور فہم ہے۔ اللہ نے اس کو اس طرح سزا دی کہ جب بدر کے میدان میں کافروں کو شکست ہوئی تو وہ بدبخت بھی وہاں تھا۔ یہ ڈر کے مارے بھاگا تو ایک جوتا ہاتھ میں تھا اور ایک پاؤں میں تھا۔ راستہ کے اندر ابوسفیان ملے اور پوچھا کہ لوگوں کا کیا حال ہوا؟ اس نے کہا: شکست ہوگئی۔ ابوسفیان نے کہا: ان کے ساتھ تو جو ہوا سو ہوا، لیکن تمہیں کیا ہوگیا کہ ایک جوتا ہاتھ میں ہے اور دوسرا پہنے ہوئے ہو؟ کہنے لگا: اچھا! میں سمجھا کہ دونوں پہنے ہوئے ہوں۔ تب لوگوں کو سمجھ آئی کہ یہ اس طرح کا سمجھدار ہے۔

﴿رَاعِنَا﴾ کا لفظ:

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: راجح بات یہ ہے کہ ﴿رَاعِنَا﴾ کا لفظ عام استعمال ہوتا تھا، لیکن اللہ کو حضور اکرم ﷺ کی شان میں پسند نہ آیا تو منع فرما دیا کہ خبردار ایہ کلمہ آئندہ نہیں کہنا۔

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۞﴾ [البقرة:۱۰۶،۱۰۷]

''ہم جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے زیادہ مفید یا اس جیسی اُتارتے ہیں، کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی محافظ اور کوئی مددگار نہیں (جو عذاب سے بچا سکے)۔''

قرآن میں احکام کی تبدیلی کی وجوہات:

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود اور اعدائے اسلام کا رد فرمایا ہے جو لوگ اسلام پر اور حضور پاک ﷺ کی ذات مبارکہ پر الزام لگاتے تھے کہ آپ کے پیغمبر بھی ایک حکم دیتے ہیں، پھر اس کو بدل دیتے ہیں اور نیا حکم دے دیتے ہیں۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو پیغمبر آپ کو دیتا ہے تو اس میں تبدیلی کیوں ہوتی ہے؟ اگر خدا کا پہلا حکم خیر تھا تو پھر اس خیر کو بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر یہ پہلا حکم (نعوذ باللہ!) غلط تھا تو پھر خدا نے اس عمل کے کرنے کا حکم کیسے دے دیا؟

یہ ایک شبہ تھا جس سے اعدائے اسلام نے اور خصوصاً یہود نے مسلمانوں کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے بدظن کرنے کی کوشش کی۔ اس کے جواب میں پروردگار عالم نے فرمایا کہ جو آیت یا جو حکم ہم منسوخ کر دیتے ہیں وہ حکم بھی اپنے وقت و زمانہ کے اعتبار سے خیر ہی خیر تھا، اور اس کے بدلے میں جو حکم دے رہے ہیں وہ بھی بطور حکم اور ثواب کے اس سے بڑھ کر ہوتا ہے یا اس کے برابر ہوتا ہے۔ یعنی ایک آیت اگر پہلے نازل ہوئی تو وہ بھی اللہ کا کلام ہے اور پھر دوسری آیت نازل ہوئی تو وہ بھی اللہ کا کلام ہے۔ بہتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بطور ثواب، بطور اجر،

بطورِ مصلحت پہلے حکم سے دوسرے حکم میں زیادہ بہتری اور ثواب ہے یا اس میں ثواب تو زیادہ تھا، مگر مصلحت کے تقاضے کے مطابق اس کا بدلنا زیادہ ضروری تھا۔

نسخ کا معنی:

نسخ کا ایک معنی ہے: "نقل کرنا"۔ یعنی کتاب کو نقل کریں تو اس کو بھی نسخ کہتے ہیں اور ایک معنی "کسی چیز کو ہٹا دینا، بدل دینا"۔ جیسے "نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ" (سورج نے آکر سائے کو ختم کر دیا)۔ تو ایک حکم کو دوسرے کی طرف نقل کر دیا جائے، یہ نسخ قرآن کا معنی ہے۔

نسخ اور منسوخ کی قسمیں:

1 ...... "منسوخ الحکم و التلاوۃ": پہلے ایک حکم تھا، اللہ نے اس کو منسوخ فرما دیا اور آیت بھی منسوخ التلاوۃ ہوگئی، یعنی اب وہ آیت نہ پڑھی جاتی ہے اور نہ اس پر عمل کیا جاتا ہے، اس کو "منسوخ الحکم و التلاوۃ" کہتے ہیں، یعنی حکم اور آیت کی تلاوت دونوں منسوخ ہیں۔ جیسے سورۃ الاحزاب بڑی طویل سورۃ تھی، حتیٰ کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ سورۃ البقرۃ کے برابر تھی، یعنی تقریباً دوسو آیات، اور اب سورۃ الاحزاب جو اللہ کے قرآن میں موجود ہے، اس میں تہتر آیات ہیں۔ اس کی باقی آیات منسوخ الحکم اور منسوخ التلاوۃ ہوگئیں۔ اب نہ تو پڑھی جاتی ہیں اور نہ ہی اس کے احکام پر عمل ہوتا ہے۔

2 ...... دوسری قسم "منسوخ الحکم باقی التلاوۃ": حکم منسوخ ہے، لیکن تلاوت منسوخ نہیں ہے، یعنی قرآن پاک میں وہ آیت موجود ہے، پڑھی جاتی ہے، تلاوت کا حکم ختم نہیں ہوا، صرف اس پر عمل کو منسوخ کر دیا گیا ہے، تلاوت میں ثواب اس کا موجود ہے۔ جیسے پہلے حکم یہ ہوتا تھا کہ اگر کسی عورت کا خاوند مر جائے تو اس کی عدت ایک سال تھی۔ اب اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسرا حکم دے کر پہلا حکم منسوخ فرمایا کہ اگر کسی عورت کا شوہر فوت ہو جائے تو ﴿أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا﴾ اس کی عدت (چاند کے اعتبار سے) چار مہینے دس دن ہے۔ پہلی آیت میں جو عورت کو حکم تھا، وہ بھی پڑھی جاتی ہے، لیکن اس پر عمل باقی نہیں رہا کہ کوئی عورت ایک سال عدت میں بیٹھے۔

3 ...... تیسری قسم "منسوخ التلاوۃ باقی الحکم": اس آیت کا تلاوت کرنا منسوخ ہوگیا، لیکن حکم باقی ہے۔ اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتے ہیں کہ ہم نے ایک دفعہ ایک حکم دیا، ضروری تو نہیں کہ وہ حکم ہر وقت لکھا

ہوا باقی رہے۔ بس نبی ﷺ نے بتلا دیا کہ وہ حکم باقی ہے، رسول اللہ ﷺ نے منسوخ نہیں کیا۔ جیسا کہ رجم کی آیت تھی:

"اَلشَّیْخُ وَ الشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا شَاھِدًا نَطَاقًا"

یعنی اللہ نے حکم فرمایا کہ اگر شادی شدہ مرد اور عورت زنا کرے اور زنا ثابت ہو جائے، گواہوں کے ساتھ یا اقرار کے ساتھ تو ان دونوں کو رجم کیا جائے۔

اب یہ آیت نہیں پڑھی جاتی، مگر اس کا حکم باقی ہے۔ اسی لیے امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے منبر رسول ﷺ پر کھڑے ہو کر خطبے میں فرمایا: "رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ رَجَمْنَا" لوگو! حضور اکرم ﷺ نے بھی رجم کیا اور ہم نے بھی رجم کیا)۔ ایسا نہ ہو کہ صدیاں گزرنے کے بعد کچھ لوگ آ جائیں اور کہیں: "اِنَّا لَمْ نَجِدْ آیَۃَ الرَّجْمِ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ" کہ اللہ کے قرآن میں آیت رجم تو نہیں ہے تو ہم رجم کیوں کریں؟ فرمایا: "وَاللّٰہِ! لَوْ لَا نَخَافُ" میں اگر اس سے نہ ڈرتا کہ کل آنے والے لوگ کہیں یہ نہ کہہ دیں، "زِیْدَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ اَوْ نُقِصَ مِنْہُ" اللہ کے قرآن میں بڑھا دیا گیا یا گھٹا دیا گیا تو میں حکم دیتا کہ آیت رجم کو لکھ دیا جائے۔

4 ......"باقی التلاوۃ باقی الحکم": یعنی قرآن کی وہ قسم جس کی تلاوت بھی باقی ہے اور حکم پر عمل کرنا بھی باقی ہے، اور یہ قسم اکثر قرآن پر مشتمل ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ نسخ و منسوخ کا مسئلہ اوامر و نواہی میں ہوتا ہے، یعنی ایک امر تھا، پھر اس کو منسوخ کر دیا گیا، یا ایک نہی تھی، وہ منسوخ کر دی گئی۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اخبار و حالات میں کبھی نسخ ہو۔ جیسے اللہ کے نبی ﷺ نے قوم عاد، قوم نوح، قوم ثمود کے بارے میں خبر دی، ان اخبار و حالات میں نسخ نہیں ہوتا؛ کیونکہ وہ تو ایک خبر، ایک واقعہ اور ایک قصہ ہے، ان میں نسخ ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نسخ جب بھی ہوگا تو وہ کسی حکم یا نہی میں ہوگا۔ اور حکمت و مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ احکام میں حسب احوال تغیر اور تبدل کیا جاتا ہے۔

نکات:

جیسا کہ آج کل ایک بڑا جھگڑا چلا ہوا ہے لوگوں میں کہ یہ بنیاد پرست ہے، یہ نہیں ہے۔ یہ اصطلاح آج کل نکلی ہوئی ہے۔ مجھ سے ایک جلسے میں سوال کیا گیا کہ بنیاد پرست کے کیا معنی ہیں؟ میں نے کہا: کوئی بنیاد پرست، کوئی

سورج پرست، کوئی آگ پرست، کوئی دیوتا پرست، کوئی سانپ پرست، کوئی قبر پرست، ہم تو خدا پرست ہیں، ہم کیا جانیں بنیاد وغیرہ کے معنی؟ ہم بنیاد پرست تھوڑی ہیں، ہم تو خدا پرست، خدا کی عبادت کرنے والے لوگ ہیں۔ ہم کسی کی پرستش کا کیا کریں؟

یہ تو ایسے ہے بس ایک عیسائیوں کے زمانے میں ایک اصطلاح تھی Fundamentalism کی، جو انہوں نے مسلمانوں کے گلے میں ڈالی ہوئی ہے، یہ دکھانے کے لیے کہ یہ جو پرانے مولوی، پرانے مسلمان اور پکے قسم کے لوگ ہیں، یہ بالکل اِدھر اُدھر ہٹنا نہیں چاہتے، یہ بنیاد پرست ہیں، یہ بڑے خطرناک ہیں۔ اصل میں یہ اصطلاح عیسائیت کے اندر تھی، اس کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اور مسلمان تو ہوتا ہی خدا پرست ہے، وہ تو کسی اور کی پرستش کا تصور بھی نہیں کر سکتا، سوچ ہی نہیں سکتا۔ ہم جب کعبے کی طرف رخ کرتے ہیں تو یہ صرف جہت کعبہ ہے، ہم سجدہ تو اپنے خدا کو کر رہے ہیں۔

پتھر کی پوجا کے جواز کے لیے ہندوؤں کا مسلمانوں پر اعتراض:

بعض ہندو مسلمانوں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ دیکھو جی! اگر ہم پتھر کو سجدہ کرتے ہیں تو مسلمان بھی تو پتھر کی بنی ہوئی عمارت کو سجدہ کرتے ہیں؟

یہ خیال غلط ہے۔ اگر بالفرض محال آج اس کعبے کی عمارت نہ ہو تو کیا ہم نماز چھوڑ دیں گے؟ جب یہ کعبہ تعمیر ہو رہا تھا تو تعمیر سے پہلے باقاعدہ گرا دیا گیا تھا، زمین کے برابر ہو گیا تھا، لوگ کیا نماز پڑھنا چھوڑ گئے تھے؟ کہ پتھر ہمارے سامنے نہیں ہے یا جب ہم ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوتے ہیں، نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں تو کیا کعبہ ہمارے سامنے ہوتا ہے؟ تو اگر ہم پتھر کے پجاری ہوتے تو وہاں بھی ہم پتھر کا ایک بت کھڑا کر کے نماز پڑھتے۔ کیا اسی طرح ابھی بھی مسجد حرام کی تیسری منزل کی چھت پر کھڑے ہو جائیں تو کعبہ تو نیچے رہ جاتا ہے اور ہم کعبے سے اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا بات صاف سمجھ آ گئی کہ مسلمان پتھر کی پوجا نہیں کرتا، وہ تو اللہ کے حکم پر اللہ کا سجدہ کرتا ہے اور سجدہ کے لیے نماز میں رخ کرنے کے لیے اللہ نے ایک مرکز بنا دیا ہے کہ آخر مسلمانوں کی توجہ کا بھی تو کوئی مرکز، کوئی جہت ہو۔ ایسا تو نہ ہو کہ ایک آدمی اِدھر منہ کر لے اور ایک اُدھر منہ کر لے۔ چار آدمی مختلف جہتوں میں نماز پڑھیں تو یہ ایک تماشا سا لگے گا۔ اللہ نے ایک مرکز، ایک قبلہ بنا دیا ہے، یہ وہ مرکزیت ہے، یہی وہ

اجتماعیت ہے اور یہی وہ امتنان ہے جو دشمن سے برداشت نہیں ہوتا۔ جب نماز کا وقت آئے، مسلمان دنیا کے کسی علاقے میں ہوں، سب کعبے کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾[البقرۃ:۱۴۴]

والی آیت جب اُتری جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو علم ہوا تو بعض علماء نے فرمایا کہ اس سے یہ بات سمجھ آئی کہ ہمارے علم میں تو نسخ کا علم اس حکم کے نزول کے بعد آیا، لیکن اللہ کے علم میں تو پہلے تھا کہ کس زمانہ میں کس دن تک بیت المقدس قبلہ رہے گا، اس کے بعد قبلہ کب کعبہ بنے گا۔ اس کے علم میں یہ سب چیزیں پہلے سے موجود تھیں تو صرف یہ ہمارے لیے ایک نئی چیز بن گئی۔

اگر کوئی مریض ایک ڈاکٹر کے پاس آیا، اس نے اس کا چیک اپ کیا، مرض کی تشخیص کی، اس کا درجہ حرارت دیکھا، بلڈ پریشر دیکھا، ایکسرے وغیرہ کروائے، پھر ایک نسخہ تجویز کیا اور ڈاکٹر نے اسی وقت ذہن میں یہ فیصلہ کر لیا کہ میں نے پانچ دن کے لیے اس کو یہ دوائی دینی ہے، پانچ دن کے بعد میں نے یہ دوائی دینی ہے اور دس دن کے بعد اس کو میں نے پھر اس دوائی پر لانا ہے اور دو مہینے کے بعد میں نے پھر اس کو یہ دوائی دینی ہے۔ پھر تین مہینے کے بعد کورس مکمل ہو جاتا ہے۔

اب ہمیں جب دوا دیتا ہے تو ہمیں اس وقت پتہ چلتا ہے کہ گولی بدل گئی، کل ہمیں دوسری گولی دی گئی اور آج اور دی گئی، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ پہلی گولی بدل گئی اور دوسری آگئی، کیونکہ ہمیں علم نہیں ہوتا اور پھر اس پر اعتراض بھی نہیں کرتے، بلاچوں چرا اس وہ دوائی استعمال کرتے ہیں۔ تو اللہ کے علم میں یہ چیز پہلے سے تھی، کعبہ بیت المقدس کب تک قبلہ رہنا ہے اور اس کے بعد ہم نے اس کو کب منسوخ کر دینا ہے۔

ناسخ و منسوخ کے علاوہ ایک قسم یہ ہے کہ حکم نہیں تھا، حکم آیا ہی بعد میں۔ وہ علیحدہ مسئلہ ہے۔ جیسے پردہ کا حکم پہلے نازل نہیں ہوا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کے گھر میں بھی صحابہ آتے تھے، کھانا کھاتے تھے، حضور اکرم ﷺ بھی صحابہ کے گھروں میں جاتے تھے تو کوئی پردہ نہیں ہوتا تھا۔ اللہ نے جب پردہ کا حکم نازل کر دیا تو اب حضور اکرم ﷺ نے اپنے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بھی منع فرما دیا کہ آج کے بعد تم میرے گھر میں داخل نہیں ہو سکتے، اللہ نے پردے کا حکم دے دیا۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ کی جتنی بیویاں ہیں، وہ اُمت کے لیے ماں کا درجہ رکھتی ہیں۔ ماں

بھی ایسی نہیں کہ زبانی کلامی، بلکہ اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ میرے نبی ﷺ کی جتنی بیویاں ہیں، وہ اُمت کی مائیں ہیں۔

اُمہات المؤمنین کا لقب صرف نبی ﷺ کی ازواج کے لیے:

یاد رکھیں! اللہ نے جو اُمت کے لیے ماں کا حکم دیا ہے، یہ حکم صرف نبی ﷺ کی بیوی کو حاصل ہے۔ نبی ﷺ کی بیٹیوں کو بھی یہ مرتبہ حاصل نہیں ہے۔

مسئلہ سمجھیے! ان بیویوں کی اولاد کو بھی یہ مرتبہ حاصل نہیں؛ کیونکہ اگر ان کو یہ مرتبہ حاصل ہو تو جب نبی ﷺ کی بیوی ہماری ماں بنی تو ان کی بیٹی ہماری کیا بنے گی؟ تو پھر بہن سے تو نکاح نہیں ہوسکتا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح کیسے ہوا؟ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا نکاح کیسے ہوا؟ تو پھر یہ حکم صرف اسی تک محدود ہے۔ ﴿وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ﴾ [الاحزاب:٦] تو اللہ نے یہ مرتبہ نبی ﷺ کی بیویوں کو دے دیا۔ اس کی حکمت کیا ہے؟ اس کی کئی حکمتیں ہیں:

افسوس یہ ہے کہ آج بھی دنیا میں اسلام کے نام سے بہت ملک ہیں، اپنے آپ کو اسلامی ملک کہلاتے ہیں، نام بھی انہوں نے بڑے خوبصورت رکھے ہیں اور اپنے آپ کو اسلامی بھی لکھتے ہیں، ان میں سب کچھ ہے، نہیں ہے تو اسلام نہیں ہے۔ حالانکہ اگر آپ غور کریں! اسلامی ملک وہ ہوتا ہے جہاں اسلام ہو، جہاں اسلام کی حکمرانی ہو، جہاں اسلام کا قانون چلتا ہو، جہاں اسلام بحیثیت دستور کے، بحیثیت ضابطہ حیات کے نافذ ہو، وہاں اس ملک کو آپ اسلامی کہیں، وہاں آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کا ملک ہے، یعنی اس میں تو مسلمان رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اسلامی حدود کا تعلق ہے، جب تک وہ نافذ نہ ہوں تو اس وقت تک ہمیں صحیح معنوں میں اسلام کا ملک کہلانے کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ چونکہ مسلمان حاکم ہوتے ہیں تو اس وجہ سے ہم اسلامی کہہ دیتے ہیں، وہاں نماز، روزہ بھی ہوتا ہے، مسجدیں بھی ہوتی ہیں، قرآن بھی پڑھا جاتا ہے، اس نسبت کے ساتھ اسلامی کہہ دیا جاتا ہے، ورنہ حقیقی معنوں میں اسلامی ملک وہ ہوتے ہیں جہاں اسلام نافذ ہو۔

اور یہ بھی آپ یقین کرلیں! آپ ساری دنیا کے نظام کو کنگھال ڈالیں، آپ ساری دنیا کے فلسفے کو اپنا کر دیکھ لیں، آپ ساری دنیا کے چاہے جمہوری نظام ہو یا سیکولر نظام ہو، چاہے وہ شیوعیین ہو، سوشلسٹ ہوں یا جمہوریت پسند ہوں، چاہے وہ پارلیمانی ہوں یا صدارتی ہوں، آپ ساری دنیا کے نظاموں کو دیکھ لیں، اس قوم کو، انسانیت کو،

اولادِ آدم کو امن نہیں ملے گا، جب تک وہ محمد مدنی ﷺ کے قانون کو نہیں اپنائیں گے۔ بندوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں، بندے توڑ ڈالتے ہیں، ایک انسان قانون بناتا ہے تو دوسرا اسے توڑنے کا راستہ نکال لیتا ہے۔ ایک پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس ہوتا ہے تو اس سے زیادہ اچھا دماغ رکھنے والے آدمی اس کو توڑ بھی دیتے ہیں۔ اگر، مگر، کیونکہ، چونکہ، چنانچہ، ہیں، ہی، بھی کے فرق بھی نکال لیتے ہیں اور ان کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔ یہ اللہ کا نظام ہے جس میں انسانوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس میں زیر زبر کی کوئی تبدیلی کریں۔ اور پھر ساری دنیا کے نظام جرم ختم نہیں کرتے۔ وقتی طور پر ایک انسداد ہوتا ہے، لیکن جرم ختم نہیں ہوتا۔ جیسے انگریزی کی دوائی بیماری کو ختم نہیں کرتی، اسی طرح انگریز کا قانون بھی اصل روحانی بیماری کو ختم نہیں کرتا۔ آپ بیمار ہوں گے، ڈاکٹر کے پاس جائیں گے تو وہ کوئی اینٹی بائیوٹک تجویز کر دیتا ہے کہ جناب! آپ کو نزلہ ہے، فلاں کیپسول کھالیں تو نزلہ ختم ہو جائے گا، لیکن ان شاء اللہ پھیپھڑے تباہ ہو جائیں گے، اور اگر کوئی دوائی پھیپھڑے ٹھیک کرنے کے لیے دے گا تو ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے، لیکن جگر ڈیمج ہو جائے گا، اگر وہ جگر ٹھیک کرنے کی دوائی دے گا تو جگر تو ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا، مگر دماغ پر اثر ہو جائے گا؛ کیونکہ وہ تو جراثیم کو زور سے مارنے کی کوشش کرتا ہے، اس بیماری کو جڑ سے نہیں کاٹتا۔ اسی طرح یہ قانون ہے جو برائی کو ختم نہیں کرتا، زنا کو ختم نہیں کرتا، ڈاکہ کو ختم نہیں کرتا اور اسلام کا قانون یہ ہے کہ جرم ختم کر دیتا ہے، مثلاً ہاتھ اگر اتنا لمبا ہو گیا ہے کہ دوسرے کے گھر میں چلا گیا ہے تو اس کو ختم کرو، ایسے ہاتھ کو دنیا میں زندہ رہنے کی ضرورت کیا ہے جو دوسروں کے گھر میں داخل ہو جاتا ہے، دوسرے کی جیب میں داخل ہو جاتا ہے، اور پھر ایسے بندے کو دنیا میں زندہ رہنے کا کیا حق حاصل ہے جو دوسرے کی بیوی کی عزت لوٹتا ہو۔ تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب وہ چار اسلام کی سزائیں نافذ ہو جاتی ہیں تو پوری دنیا میں امن قائم ہو جاتا ہے۔

نسخِ القرآن میں حکمت:

جن کا اللہ پر ایمان ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جو اللہ نے حکم منسوخ کیا ہے اس میں بھی حکمتیں ہیں اور جو اللہ نے حکم باقی رکھا ہے اس میں بھی حکمتیں ہیں، اللہ کے نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ ہیں اس میں بھی حکمتیں ہیں، تا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ جو قرآن میں ہے، ہم تو صرف وہی مانیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک عورت آئی اور پوچھنے لگی کہ آپ نے جو فلاں حکم دیا ہے، میں نے قرآن پڑھا ہے، لیکن قرآن میں تو نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بی بی! قرآن میں ہے۔ اس نے کہا: حضرت! میں نے سارا قرآن پڑھا ہے، الحمد للہ! میں

ایک عرب عورت ہوں اور سمجھنے والی ہوں، قرآن میں یہ حکم نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے قرآن پڑھا ہی نہیں ہے، اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو یہ اعتراض نہ کرتی؛ کیونکہ قرآن کہتا ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۷﴾ [الحشر:۷]

نسخ میں کئی مصلحتیں ہیں، کبھی یہ ہوتا ہے کہ پہلے جو حکم تھا، اس کے بعد جو حکم آیا وہ ثواب میں باعتبار پہلے کے زیادہ انفع تھا، یا پہلے جو حکم تھا اس میں شدت تھی اور بعد میں جو حکم آیا اس میں نرمی، رحمت اور بندوں کے لیے آسانی ہوگئی۔ وغیرہ۔

نسخ کے معنی کے متعلق علماء کے اقوال:

اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نسخ کا معنی یہ ہے کہ ہم کوئی آیت تبدیل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم اگر کسی آیت کو مٹا دیتے ہیں۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے اور یہی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب سے بھی مروی ہے کہ ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ﴾ کا مطلب یہی ہے کہ بعض اوقات ﴿مِنْ اٰيَةٍ﴾ لکھے ہوئے حروف قرآن میں باقی ہیں، لیکن حکم بدل جاتا ہے۔

ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کچھ دیر کے لیے ایک چیز کا چھوڑ دینا اور حکم نہ بھیجنا۔ اور سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی کسی چیز کو روک لینا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا معنی اُٹھا لینا ہے، یعنی جیسے اللہ نے پہلے آیت نازل کی تھی کہ جب شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت زنا کریں تو انہیں رجم کر دیا جائے اور اسی طرح حدیث میں ہے: ''لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَأَحَبَّ أَنْ يَكُونَ لَهُ ثَالِثٌ'' [جامع ترمذی، رقم:۲۳۳۷] (ابن آدم کو اگر اللہ تبارک وتعالیٰ دو سونے کی وادیاں دے دے تو وہ چاہے گا کہ مجھے تیسری بھی ملے)۔

دو حریص، جن کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا:

(حدیث) اسی طرح حدیث پاک میں آتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: دو حریص دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جن کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مَنْهُومٌ فِي الْعِلْمِ لَا يَشْبَعُ مِنْهُ وَ مَنْهُومٌ فِي الدُّنْيَا لَا يَشْبَعُ مِنْهَا'' [سنن الدارمی، رقم:۳۴۰] ایک علم کا حریص، وہ کبھی سیر نہیں ہوتا، اسے حرص ہوتا ہے کہ میں یہ بھی پڑھ لوں اور یہ بھی پڑھ لوں، میں یہ کتاب بھی خرید لوں اور یہ بھی خرید لوں، اور اسی طرح فرمایا کہ جن لوگوں کو دنیا کی ہوس پڑ گئی، ان کا

پیٹ دنیا سے کبھی نہیں بھرتا۔ جب ہزار نہ ہوں تو کہتے ہیں: بس بھئی! ہزار مل جائیں تو کام چل جائے گا، اور جب ہزار مل جائے تو کہتے ہیں: یار! ہزار سے کیا بنتا ہے؟ آج کل تو پیسے کی قیمت نہیں ہے، لاکھوں ملیں تو پھر گاڑی چلے گی۔ اب چاہے لاکھوں بھی مل جائیں تو لاکھوں سے کیا بنتا ہے؟ ہمیں تو کروڑوں ملنے چاہئیں۔ اسی طرح آقائے نامدار خاتم الانبیاء ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابن آدم کا پیٹ کسی چیز سے نہیں بھرے گا، مانگتا ہی رہے گا، لیکن جب قبر میں جائے گا تو پھر مٹی سے بھر جائے گا، اس وقت تمنا خود بخود ختم ہو جائے گی۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: نسخ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں تو کسی حلال چیز کی حرمت بیان فرما دیں یا کسی حرام چیز کو حلال فرما دیں۔ چونکہ سب تحلیل وتحریم اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس میں بندے کو اختیار نہیں ہے۔ جن کا استعمال مباح تھا ان کو روک دے اور جن سے روکا تھا ان کو مباح کر دے۔

نسخ کے اور بھی اقوال:

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نسخ کے اور معانی بھی ہیں، ایک نسخ کا معنی یہ ہوتا ہے کہ دلیل شرعی جب مل جائے تو پہلا حکم اُٹھا لیا جائے، کبھی یہ حکم ہوتا ہے کہ آسان کے بدلے ثقیل آجائے، کبھی حکم ثقیل تھا، پھر خفیف آ گیا۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ نے نسخ کے انواع وشروط کے احکام دیکھنے ہوں تو اصولِ فقہ کی کتابیں دیکھیں، آپ کو ساری تفصیل مل جائے گی؛ کیونکہ تفسیر میں اتنا ذکر کیا جاتا ہے جتنا آیت کے سمجھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے، باقی تفصیلات اور اس کے احکامات کے لیے ماشاء اللہ باقی الگ الگ کتابیں موجود ہیں۔ یہ احکام دیکھنے ہوں تو اصولِ فقہ میں ملیں گے۔

روایت میں ہے کہ دو آدمی تھے، ان کو حضور اکرم ﷺ نے دو آیتیں پڑھائی تھیں، دونوں آیات وہ یاد کرتے تھے اور پڑھا کرتے تھے۔ ایک رات جب وہ دونوں آیات یاد نہ رہیں اور وہ نہ پڑھ سکے۔ جب صبح ہوئی تو انہوں نے حضور پاک ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم اتنے عرصے تک یہ آیات پڑھتے رہے اور اب ہمیں بالکل بھول گئیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ آیات ان آیات میں سے ہیں جو اللہ نے خود بھلوا دی ہیں، بس اب آپ خود ان سے غافل ہو جائیں، ان کی طرف توجہ نہ کریں۔

﴿نُنْسِهَا﴾ کی قراءتیں:

﴿اَوْ نُنْسِهَا﴾ کو بھی دو طرح سے پڑھا گیا ہے، "نَنْسَاهَا" اور "نُنْسِهَا"۔ جن کے نزدیک "نَنْسَاهَا" ہے، ان

کے نزدیک تو اس کا معنی "نُؤَخِّرُهَا" ہے، یعنی ایک چیز کو پیچھے کر دیا۔

علی بن ابی طلحہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ﴿فَاِنْنَسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا﴾ کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم آیت کو نہ بدلتے ہیں اور نہ اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب سے نقل کرتے ہیں: "أَوْ نَنْسَاهَا نُثْبِتَ خَطَّهَا وَ نُبَدِّلَ حُكْمَهَا" کہ ہم اس کے خط کو ثابت رکھتے ہیں اور اس کے حکم کو بدل دیتے ہیں۔ اور "نُنْسِهَا" کی قراءت کے مطابق حضرت معمر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو چاہیں بھلا دیں۔ جیسے اللہ نے قرآن میں دوسری جگہ فرمایا: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝﴾ [الاعلیٰ: ٦] کہ اے ہمارے نبی! آپ کو ایسا پڑھا دیں گے کہ آپ کبھی نہیں بھولیں گے، لیکن اللہ جو چاہیں وہ بھلوا دیں اور ذہن سے اُٹھا لیں۔ جیسے لیلۃ القدر کی تعیین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھلا دی گئی۔

بہترین قاری اور بہترین قاضی:

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ عُمَرُ: أَقْرَأُنَا أُبَيٌّ وَ أَقْضَانَا عَلِيٌّ." [عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب سے بہتر قاری اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں اور بہتر فیصلہ (قضا) کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "أَقْضَانَا عَلِيٌّ" اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فیصلہ کرنے والا بنایا ہے، یعنی اللہ نے ان کو فیصلے کا بڑا علم دیا ہے۔ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کو اللہ نے قرآن پڑھنے کا علم دیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ہم حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کی بعض چیزوں کو چھوڑ بھی دیتے ہیں؛ کیونکہ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کی عادت مبارک ہے کہ وہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے تھے اسے نہیں چھوڑتے تھے، بعض چیزیں جب منسوخ بھی ہو گئیں اور بعض چیزوں کو جبکہ احکام ختم ہو گئے تو بھی پڑھتے تھے۔

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے ہاں نسخ کی تفسیر:

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ کے بارے میں فرمایا کہ مکلفین

کے مصلحت کے اعتبار سے دوسرا حکم بہتر ہے۔

حضرت علی بن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اللہ جو دوسرا حکم دیتے ہیں، وہ نفع میں زیادہ ہے اور تمہارے لیے اللہ کی طرف سے زیادہ مہربانی اور نرمی ہے۔

اور سدی رحمہ اللہ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں: ہم اس سے بہتر لاتے ہیں جس کو ہم نے منسوخ کر دیا یا اس کی مثل لاتے ہیں جس کو ہم نے چھوڑ دیا۔

نسخ کی حکمتیں:

اس میں کئی حکمتیں ہیں، لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ہمیں ہر حکمت سمجھ میں آئے، کچھ چیزیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، آدمی اب ہر وقت اسی بات میں لگا رہے کہ جی! بکری تو حلال ہے اور سور حرام ہے اور اس کو حلال کیوں کیا؟ اور اس کو حرام کیوں کیا؟ تو آسان مسئلہ یہی ہے کہ اللہ دونوں کو پیدا کرنے والا ہے، مالک ہے، ہمیں پیدا کرنے والا ہے، مالک ہے، اس نے ہمارے لیے جو حلال کیا وہ ہمارے لیے حلال ہے، اس نے ہمارے لیے جو حرام کیا وہ ہمارے لیے حرام ہے۔ زیادہ بحث میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں، ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے آگے سر جھکا دیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جس کو حرام کیا، اس میں ضرور کوئی حکمت ہے۔ یہ دیکھو جی! خنزیر کو اللہ نے حرام کیا، جو اقوام اس کا گوشت کھاتی ہیں، اب انہوں نے بھی اعتراف کر لیا ہے کہ خنزیر کے گوشت کھانے سے فلاں بیماری پیدا ہوتی ہے، آدمی کی غیرت ختم ہو جاتی ہے، اس کے گردے ختم ہو جاتے ہیں، آدمی کی فلاں چیز ختم ہو جاتی ہے۔ خنزیر وہ واحد جانور ہے جس میں غیرت نہیں ہوتی، چنانچہ جتنے لوگ اس کا گوشت کھائیں گے اسی صفت کے ہو جائیں گے۔ اس لیے اب انہوں نے یہ خود اعتراف کر لیا ہے، یعنی کافروں نے خود مان لیا کہ اس کے کھانے سے ایڈز ہو سکتی ہے، اس کے کھانے سے کینسر اور فلاں بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔ لیکن ہمیں تو ایک ہی بات پر ایمان ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ حرام ہے اور میرے اللہ نے فرما دیا کہ حرام ہے تو بات ختم ہو گئی۔ کیونکہ جب ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سب سے افضل کون ہے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ سب سے بڑے علم والے کون ہیں؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ سب سے بڑے عقل والے کون ہے؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ سب سے بڑے فہم والے کون ہیں؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جب انہوں نے فرما دیا کہ میرے اللہ نے یہ حرام کیا ہے تو ہماری عقل ان سے بڑی ہو تو ہم بات کریں، جب ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے تو ہم حضور

اکرم ﷺ کے فرمانے پر یقین کریں گے، اس پر ایک تو ہمیں ثواب ملے گا، دوسرا ہم حرام سے بچیں گے۔ ہم نے حضور اکرم ﷺ کی اطاعت بھی کر لی اور حرام سے بھی بچ گئے۔

نسب کا ثبوت نکاح سے ہوتا ہے:

دوسری مثال کہ اللہ نے عورت سے نکاح کا حکم دیا تو اب بیوی سے ملنا صرف حلال نہیں، بلکہ ثواب ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی خاوند اپنی بیوی کے ساتھ کھیل کود میں معروف رہے تو نفل پڑھنے سے زیادہ ثواب ہے۔ چونکہ نفلیں پڑھنے سے تو ثواب ہی ملے گا، جبکہ بیوی سے ملنے میں گناہوں سے بھی بچے گا، زنا سے بھی اور حرام سے بھی بچے گا۔ اس میں اللہ نے حلال کر دیا، باقی کو حرام کر دیا، تو اس حلت وحرمت کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ جو حلال کیا ہے اس میں حکمت ہے اور جو حرام کیا ہے اس میں بھی حکمت ہے۔

نکاح میں بھی بہت ساری حکمتیں ہیں:

اب وہ لوگ جن کے نزدیک زنا میں کوئی برائی نہیں تھی، اب انہوں نے بھی اعتراف کر لیا ہے کہ اگر انسانیت کو بچانا ہے تو اسلام کا قانون نافذ کرو۔ اب وہ بھی مان گئے، تنگ آ گئے، جنہوں نے زنا کو عام کر دیا تھا۔ سڑکوں میں، پارکوں میں، ہوٹلوں میں زنا، کتوں کی طرح زنا ہو رہا ہے، کوئی روک ٹوک والا نہیں ہے، نتیجہ کیا نکلا کہ سو سال، پچاس سال کے بعد نسل مشتبہ ہو گئی، پتہ ہی نہیں کہ کون کس کا بیٹا ہے؟ نسل ہی ختم ہو گئی، نہ باپ کا پتہ ہے نہ ماں کا پتہ ہے، نہ دادے کا پتہ ہے، نہ چاچے کا پتہ ہے۔ نسل کا کیا معنی ہے؟ ان کے اندر کیا ہمدردی آئے گی تو رحم کیسے پیدا ہوگا؟ حقیقی بیٹا تو ہے نہیں، رحم کیسے پیدا ہو؟ مرد خود غیر مطمئن ہے اپنی اولاد سے، پتہ نہیں کہ میری اولاد ہے؟ پتہ نہیں کسی اور کی ہے؟ تو ہمدردی کیسے ہوگی؟ اس لیے وہ بھی اب تنگ آ گئے۔ اسی لیے اللہ نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے، "لَا شَكَّ فِيْ ذٰلِكَ" ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کے اس حرام کرنے میں کروڑوں حکمتیں ہیں، ہمیں سمجھ آئے تو الحمدللہ، نہ سمجھ میں آئے تو ہمارا کام صرف ماننا ہے، ہمارا علم، عقل اور ہماری معلومات بھی ناقص، اللہ کا علم کامل ہے اور اللہ کی ہر صفت میں کمال، جمال اور جلال ہے تو اس کا جو فیصلہ ہے وہ اپنے بندوں کے لیے بالکل حق ہے۔ بندے کا کام یہ ہے کہ بلا چوں و چراں گردن جھکائے کہ جس کو اللہ نے حلال کیا تو الحمدللہ، اگر حرام کیا تو بھی الحمدللہ، اس میں ہمارے لیے فائدہ ہے۔

ایک حکم کی تبدیلی میں حکمت:

اللہ تعالیٰ حکم کو بدل کر بندوں کا امتحان لیتے ہیں کہ میرے بندے میرے حکم کے تابع ہوتے ہیں یا نہیں؟ ایسا تو نہیں کہ پہلی بات پر کھڑے رہیں گے۔

کعبہ شریف کی تعمیر کتنی بار ہوئی؟

کعبۃ اللہ کی تعمیر کئی مرتبہ ہوئی۔ سب سے پہلے اللہ کے حکم سے فرشتوں نے تعمیر کیا، پھر آدم علیہ السلام نے بنایا، پھر ابراہیم علیہ السلام نے بنایا، پھر قوم عمالقہ نے بنایا، پھر قبیلہ جرہم نے بنایا، یہ تقریباً گیارہ مرتبہ ردّ و بدل ہوئی۔ اب کوئی مسلمان پتھر کا پجاری تو نہیں ہے، ہم تو بس اللہ کے حکم کی تعمیل میں سجدہ کر رہے ہیں، اللہ کا حکم ہے: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ [البقرة: ۱۴۴]

ہم مقامِ ابراہیم کے پیچھے نماز کیوں پڑھتے ہیں؟ اس لیے کہ اللہ نے حکم دیا ہے: ﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى﴾ [البقرة: ۱۲۵] اس لیے ہمیشہ سب سے پہلے اپنے عقائد کی اصلاح کریں۔

مفسر رحمہ اللہ، ابن کثیر میں فرماتے ہیں کہ امام ابو جعفر رحمہ اللہ اور ابن جریر رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ اس آیت ﴿أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١٠٧﴾﴾ [البقرة: ۱۰۷] میں خطاب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس کے بعد ساری اُمت کے لیے ہے۔ اس میں اللہ نے فرمایا کہ اے محمد! کیا آپ نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک میں ہوں اور اس میں میرا حکم چلتا ہے، آسمانوں اور زمینوں میں میں جو چاہوں حکم کروں اور جس چیز سے چاہوں تغیر و تبدل کروں۔ اگر کوئی آدمی ہمارے احکام منسوخ کرنے پر اعتراض کرتا ہے کہ پہلا حکم کیوں منسوخ کر دیا؟ تو یہ اس کی جہالت ہے؛ کیونکہ تکوینی طور پر بھی جب ساری کائنات کا میں مالک ہوں، مجھے اپنی کائنات میں تغیر اور تبدل کا حق ہے، میں چاہوں تو رات کر دوں، میں چاہوں تو دن کر دوں، میں چاہوں تو روشنی کر دوں اور میں چاہوں تو اندھیرا کر دوں۔ اگر ان تمام چیزوں میں تکوینیات کے طور پر میرا ہی اختیار ہے، آسمان اور زمین بھی میرے ہیں اور ان کے اندر تمام مخلوق بھی میری ہے تو پھر اگر میں اپنے ارادے سے کوئی حکم بدل دوں تو کسی کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ اعتراض تو تب کرے جب کسی دوسرے کی ملکیت میں کوئی تصرف کرے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تقدیر کے متعلق مسئلہ پوچھنے کا واقعہ:

ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا: اے علی! مجھے ایک مسئلہ سمجھ نہیں آتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کون سا مسئلہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ تقدیر کا مسئلہ ہے..... تقدیر کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے کہ آدمی اس میں زیادہ نہ اُلجھے؛ کیونکہ بسا اوقات ہم اپنی جہالت کی وجہ سے مسئلہ کو صحیح سمجھ نہیں سکتے اور آدمی کا ایمان (نعوذ باللہ) متزلزل ہو جاتا ہے..... کہنے لگا: اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کو تو ایمان والا بنا دیا اور اس کے بھائی کو کافر بنا دیا، ایمان والے کو جنت میں اور اس کے بھائی کو جہنم میں بھیج دیا۔ ایک ہی باپ کے تو دو بیٹے ہیں، دونوں کے ماں باپ ایک ہیں۔ یا مثال کے طور پر ابو جہل لعنۃ اللہ علیہ تو جہنم کا سردار بن گیا اور اس کا بیٹا عکرمہ رضی اللہ عنہ جنت کا سردار بن گیا۔ اللہ نے ایسا کیوں کر دیا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی پیاری بات کی، آپ نے فرمایا: پہلے یہ بتاؤ کہ یہ دونوں بندے اللہ نے بنائے ہیں یا تم نے بنائے ہیں؟ اس نے کہا کہ بنائے تو اللہ ہی نے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ مخلوق تمہاری مِلک ہے یا اللہ کی مِلک ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی مِلک ہے، ہمارا کیا ہے، ہم تو کچھ بھی نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر وہ اپنی مِلک میں جو چاہے اس کی مرضی۔ تم تب اعتراض کرو کہ تمہاری مِلک میں اللہ نے کوئی ایسا فیصلہ کیا ہو، تمہیں اچھا نہ لگتا ہو۔ اگر وہ اپنی مِلک کے اندر تصرف کر رہا ہے تو وہ جانتا ہے کہ یہ جنت کے لائق ہے اور یہ جنت کے لائق نہیں ہے۔ بنانے والا جانتا ہے، ہمیں اس کے بارے میں کیا پتہ ہے، ہم تو اس کی ظاہری صورت کو دیکھ رہے ہیں، حقیقت جو ہے وہ تو صرف اللہ کے علم میں ہے، اس کے باطن کا پتہ تو اللہ کو ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ خطاب حضور اکرم ﷺ کو ہے، لیکن سارے معترضین اور یہودیوں کو اس میں جواب دیا ہے۔

تورات کے بعد قرآن کو کیوں بھیجا گیا؟

ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اللہ نے تورات کے بعد یہ کتاب کیوں بھیج دی؟ پہلا حکم صحیح تھا تو دوسرا غلط ہے اور دوسرا صحیح تھا تو پہلا غلط کیوں ہے؟ اللہ کے احکام میں کبھی تناقض نہیں ہو سکتا، اللہ بھولنے اور نسیان سے پاک ہے تو اللہ دوسرا حکم کیوں دیتے ہیں؟ ان کو یہ سمجھایا کہ بدبختو! بادشاہ مصلحت کے مطابق جیسے احکام چاہتے ہیں نازل فرماتے ہیں۔ یعنی یہ تو ہمارے اوپر اللہ کا رحم ہے کہ اللہ نے اپنے احکام میں ہمارے اوپر نرمی فرما دی، ورنہ اگر وہی

حکم باقی ہوتا جو شروع میں اللہ نے پچاس نمازوں کا دیا تھا تو کیا حال ہوتا؟ یہ تو حضور اکرم ﷺ کی درخواست پر پانچ پانچ معاف ہو کر پانچ رہ گئیں۔ آپ نے حال دیکھا ہے کہ لوگ اب پانچ نمازیں بھی نہیں پڑھتے، آپ نے دیکھا ہے کہ کتنے لوگ ہیں جو صحیح معنوں میں اللہ کی نماز ادا کرتے ہیں، آپ نے اپنے ملک میں دیکھا ہوگا کہ فجر کی نماز میں مسجدوں میں ایک صف بھی کامل نہیں بنتی اور پھر ظہر میں ماشاء اللہ ان کے کاروبار کا وقت ہوتا ہے، عصر میں ان کے سونے کا وقت ہوتا ہے، مغرب میں لوگوں کے واپس گھر جانے کا وقت ہوتا ہے اور عشاء کو تو ویسے بھی گھر سے نہیں نکلتے، لہٰذا مسجدیں ویران ہیں۔

یاد رکھو کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے کہ جو شخص ایک نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے، کوئی عذر بیماری کچھ نہیں تھا، تندرست تھا اور بغیر کسی عذر کے اس نے نماز چھوڑ دی تو اس نے کفر کیا۔

یاد رکھو! جو لوگ یہاں عمرے پر آئے ہوئے ہیں، انہیں اب عمرہ کرنا ہے اور بڑی تمنا ہے کہ حج کریں اور حرم میں بھوکے، پیاسے پڑے رہیں گے، لیکن اگر کوئی فرض نماز چھوڑ دی تو ایسے حج اور عمرے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس سے بہتر ہے کہ اپنے گھر چلا جائے۔ اگر ایک فرض نماز چھوڑ کر حج اور عمرہ کرے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ حج کا حکم جبرائیل علیہ السلام لے کر آئے اور نماز خود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ لائے، حج استطاعت والے پر فرض ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ قانون کی پابندی اور رکاوٹ بھی نہ ہو، اس پر حج فرض ہے، لیکن نماز ہر مسلمان بالغ، غریب، امیر، مرد وعورت پر فرض ہے۔ اگر ایک نماز چھوڑنے کی اتنی بڑی سزا ہے تو جو پڑھتے ہی نہیں، ان کا کیا ہوگا؟ اس لیے میرے بھائی! اگر آپ کو اللہ نے توفیق دی ہے سب سے پہلے اپنی نمازوں کا خیال رکھو، ضروری نہیں ہے کہ حرم شریف میں آ کر نماز پڑھیں، بلکہ جہاں مسجد قریب ہے وہاں ادا کریں، اللہ توفیق دے تو حرم میں آ جائیں۔ الحمدللہ! حرم کی فضیلت تو دنیا میں کہیں بھی میسر نہیں آ سکتی کہ ساری زندگی ہم جس کعبے کے لیے ترستے رہے، اس کے سامنے اللہ ہمیں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی توفیق دے دے۔ اس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے، وگرنہ آپ نے نمازوں کی پابندی نہیں کی تو ایک ہزار حج بھی کر لیں تو کوئی فائدہ نہیں۔ ایک ہزار حج ادا کرو اور نماز نہ پڑھو، گھر جانے کے بعد مسجدوں کے اندر نماز کی حاضری نہ دو تو ایسے عمرہ اور حج کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ علامتِ قیامت ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک وقت آئے گا، مولوی شہرت کے لیے حج کریں گے اور امیر سیر وسیاحت کے لیے حج کریں گے اور درمیانی طبقہ تجارت کے لیے حج کرے گا، غریب بھیک مانگنے کے لیے حج کرے گا۔ ایمان سے کہیں

کہ آج وہ وقت آ گیا ہے یا نہیں؟ لوگ ہر سال آ جاتے ہیں، جن کے گھر میں ماشاء اللہ روٹی بھی نہیں پکتی، کیا خیال ہے کہ ان کو کعبہ شریف کا شوق ہے؟ انہیں صرف مانگنے کا شوق ہے، ہر سال وہاں سے آتے ہیں بیس ہزار خرچ کرکے، یہاں سے ایک لاکھ بھیک اکٹھی کر کے لے جاتے ہیں، گھاٹے کا سودا ہے بھلا؟ اسی ہزار بھی بچ گیا اور لوگوں نے کہا کہ ہاں جی! بڑا مقبول آدمی ہے کہ اللہ ہر سال گھر بلاتا ہے، اللہ کا پیارا ہے۔ اللہ کے بندو! اگر اللہ کے پیارے ایسے بنتے ہوتے تو جو مکہ میں پیدا ہوئے تو وہ جہنم میں نہ جاتے۔ جو لوگ پیدا بھی مکہ میں ہوئے، زمزم کی گھٹیاں جنہیں دی گئیں اور جنہوں نے اپنی جوانی اور شباب مکہ میں گزارا، کعبے کے مجاور بھی بنے رہے، کعبۃ اللہ بھی بناتے رہے، لیکن شرک کیا تو سیدھے جہنم میں چلے گئے۔ اس لیے ہمیشہ اللہ کے احکام کی پابندی کریں۔ اگر اللہ نے آپ کو حج نصیب کرنا ہے، حج کے لیے تیاری کریں۔ دوسروں کے حقوق کا خیال رکھیں، اللہ کے فرائض کا خیال رکھیں۔

گناہوں سے بچنے کا خیال رکھیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سرزمین حرم ہے، علماء نے لکھا ہے کہ یہاں کوئی برائی کا ارادہ بھی کرلے تو اللہ پکڑ لیتے ہیں۔ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ الحاد سے مراد شرک ہے، بے دینی ہے۔ لیکن بعض علماء لکھتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ عام ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ [الحج: ۲۵]

فرمایا کہ جو شخص دوسرے ملک میں گناہ کے ارادے سے جائے تو پکڑا نہیں جاتا، لیکن یہ سرزمین حرم ہے، اتنی عظمت والی جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ کے ارادہ پر بھی پکڑ لیتے ہیں، اس لیے اپنی زبانوں کو محفوظ رکھو۔ کبھی زبان سے ایسا لفظ نکلتا ہے کہ فوراً پکڑ آ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں نے جو اعتراض کیا کہ اللہ کے احکام نہیں بدل سکتے۔ یہ بات تو عقلاً بھی درست نہیں ہے۔ کوئی جاہل سے جاہل بھی نہیں کہہ سکتا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر صرف ایک حکم دے سکتا ہو اور دوسرا حکم نہ دے سکتا ہو تو پھر قادر کیسے ہو؟ ''قدیر'' کا تو معنی یہ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ [الحج: ۲۰]

﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ [ھود: ۱۶]

﴿يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ﴾ [آل عمران: ۴۰]

﴿يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ﴾[المائدة:١]

اس لیے میرے آقا سرکارِ دوعالم ﷺ اکثر یہ دعا کرتے تھے: میرے اللہ! کوئی روکنے والا نہیں جب تُو دینے پہ آئے اور کوئی دینے والا نہیں جب تُو روکنے پہ آئے۔ کسی کو کوئی چیز نفع نہیں پہنچا سکتی۔ حضور پاک ﷺ روزانہ ہر دعا کے بعد یہ دعا فرماتے تھے:

"يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ! ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰى دِيْنِكَ." [سنن ابن ماجہ، رقم:١٩٩، مسند احمد بن حنبل، رقم:١٧٦٣٠]

اے اللہ! دلوں اور آنکھوں کے پھیرنے والے! ہمیں دین پر قائم فرما۔ کیونکہ تُو جب چاہے دلوں کو پھیر دے، سالہا سال کفر کرنے والوں کو میرے مدنی ﷺ کا صحابی بنا دے اور اگر وہ چاہے تو گنہگاروں کو ولی بنا دے اور چاہے تو پیغمبروں کے بیٹوں کا کافر بنا کر موت سے ہمکنار کر دے۔ کس کو دخل دینے کی طاقت ہے؟ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو اسی وقت غرق کر دیا، اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔

نسخ کی مثالیں:

یہود کا اعتراض عقلاً بھی غلط ہے اور شرعاً بھی؛ کیونکہ نسخ پہلی کتابوں اور پہلی شریعتوں میں بھی موجود ہے، جیسا کہ آدم علیہ السلام کے زمانے میں اللہ نے حکم دیا تھا کہ آدم و حواء سے جو اولاد پیدا ہو، بیٹے ہوں یا بیٹیاں، ان کا آپس میں نکاح جائز ہے، اب بہن بھائی کا نکاح جائز نہیں ہے، لیکن ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے جائز رکھا تھا۔ اس حکم میں بھی حکمتیں تھیں اور بعد میں جب اس نکاح کو حرام کیا گیا تو اس میں بھی حکمتیں ہیں۔ اسی طرح نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے لیے کشتی سے نکلنے کے بعد ہر قسم کے حیوانات کھانا حلال تھا، بعد میں کئی حیوانات کو حرام کر دیا گیا۔ دو بہنوں کو ایک وقت میں ایک شخص کے نکاح میں رہنا اسرائیل علیہ السلام اور ان کی اولاد کے لیے حلال تھا، تورات اور اس کے بعد کی شریعتوں میں اس کو حرام کر دیا گیا۔ اور ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرو، وہ تیار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس حکم پر عمل کرنے سے پہلے اپنے حکم کو منسوخ کر دیا۔ اور بنی اسرائیل نے جب بچھڑے کی عبادت کی تو ان کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو قتل کرو، جب کئی لوگ قتل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ یہود بھی ان تمام باتوں کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ضد و عناد سے اعتراض کرتے ہیں۔

نسخ کے متعلق معتزلہ کا عقیدہ:

سب سے پہلے نسخ کی مخالفت یہود نے کی، ان کے بعد فرقہ معتزلہ نے کی۔ کہتے ہیں: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ﴾ یہاں ایک قید ہے کہ اگر ہم چاہتے تو کوئی آیت منسوخ کر کے اس کے بدلے میں بہتر لاتے، لیکن ہم نے کوئی آیت منسوخ نہیں کی۔ یعنی اللہ نے کوئی حکم منسوخ نہیں کیا، اگر چاہتے تو کر دیتے۔ یہ معتزلہ کا عقیدہ ہے جو فرقہ ضالہ ہے۔ لیکن اہلسنت والجماعت، صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر متقدمین اور متاخرین تمام کے تمام قرآن میں نسخ واقع ہونے کے قائل ہیں۔ پھر علماء کے درمیان اصطلاح کا تھوڑا سا اختلاف ہے، متاخرین علماء نے تو بالکلیہ ایک حکم کو بدل دینے کا نام نسخ رکھا ہے، یعنی ایک تمام کا تمام بدل جائے، جیسے پہلے قبلہ بیت المقدس تھا، اس کے بعد اللہ نے حکم دیا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ: ۱۴۴] پہلا حکم بالکل اور پورے کا پورا بدل گیا۔ اور متقدمین علماء یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ سارا حکم نہ بدلے، بلکہ اس کا کوئی ایک جزو ہی بدل جائے تو وہ بھی نسخ ہے۔

قرآن میں نسخ کی مقدار:

متقدمین علماء نے لکھا ہے کہ قرآن میں تقریباً پانچ سو آیات ایسی ہیں جو منسوخ ہوگئیں یا تو وہ بالکلیہ منسوخ کر دی گئیں یا بھلا دی گئیں یا پھر وہ آیات باقی تو ہیں، لیکن وہ حکم ختم کر دیا گیا؛ کیونکہ بعض نے یہ شرط لگادی کہ نسخ کا معنی ہے کہ پورا حکم بدلے۔ جب یہ شرط لگی تو آیات کم ہوگئیں، اس لیے انہوں نے کہا کہ کل پچیس آیات ہیں جن میں نسخ ہوا ہے، گویا پانچ سو سے ہو کر ۲۵ پر آ گئے۔ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ان آیات میں بھی تطبیق کی کوشش کی تو اس کے نتیجہ میں وہ پانچ آیات کے قائل ہیں، یعنی قرآن میں کل پانچ آیات ایسی ہیں جن میں نسخ ہوا ہے۔ کیونکہ جب تطبیق کرنا ممکن ہے تو ہم بلا وجہ نسخ کی طرف کیوں جائیں؟ بہر صورت اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک علماء حق نسخ کے قائل ہیں۔

جیسے ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک آدمی لوگوں کو وعظ کر رہا ہے، آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون آدمی ہے اور کیا کر رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ آتا ہے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں نہیں، یہ وعظ و نصیحت نہیں کرتا، اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سمجھیں کہ میں کوئی عالم ہوں۔ یہ اپنی شہرت چاہتا ہے۔ لہٰذا آپ نے اس کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم ناسخ و منسوخ کے تمام احکام جانتے ہو؟ تم جانتے ہو

کہ قرآن مقدس میں کتنی آیات منسوخ ہیں؟ اور کون سی آیات ناسخ ہیں؟ اس طرح حدیث پاک میں حضور اکرم ﷺ کے کتنے حکم منسوخ ہوئے ہیں؟ ان کے بارے میں تمہیں علم ہے؟

کیونکہ ایسے واقعات صرف قرآن میں نہیں، احادیث میں بھی موجود ہیں۔ اس طرح بعض احکام ایسے ہیں کہ جن کا نسخ صرف احادیث مبارکہ سے ثابت ہے، جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، فرماتے ہیں کہ میں سفر سے واپس آیا تو حضور اکرم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا: السلام علیکم! حضور اکرم ﷺ نے جواب نہ دیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں دل میں بہت گھبرا گیا کہ آقا ﷺ نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا، شاید حضور اکرم ﷺ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ لہٰذا میں پیچھے ہٹ کر چلا گیا۔ حضور اکرم ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے مجھے بلوایا اور فرمایا: اللہ کے بندے! میں نے سلام کا جواب اس لیے نہیں دیا کہ پہلے نماز کی حالت میں سلام کا جواب دینا شریعت میں جائز تھا، اب اللہ نے منع کر دیا ہے کہ نماز کی حالت میں کوئی بھی سلام کا جواب نہیں دے سکتا۔ میں چونکہ نماز پڑھ رہا تھا، اس لیے سلام کا جواب نہیں دیا۔

تو پہلا حکم یہ تھا کہ نماز کی حالت میں سلام کا جواب دینا جائز ہے، یعنی کوئی السلام علیکم کہے تو کہہ سکتے تھے: وعلیکم السلام! اپنی نماز بھی جاری رکھی۔ لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم منسوخ کر دیا اور اس کا ذکر بھی احادیث مبارکہ میں موجود ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی آیات مبارکہ آئی ہیں، جن میں نسخ واقع ہوا ہے۔

قبر آخرت کی یاد دلاتی ہے:

حضور پاک ﷺ نے فرمایا: میں نے تم لوگوں کو منع کیا تھا کہ قبروں پر نہ جایا کرو اور قبروں کی زیارت نہ کیا کرو۔ فرمایا کہ اب میں اجازت دیتا ہوں کہ جایا کرو۔

لیکن زیارت کا معنی تو یہ نہیں ہوتا جو ہمارے ملک میں زیارت کا مطلب سمجھایا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو تجارت اور شرک ہوتا ہے، ہمارے ملک میں تو باقاعدہ قبریں فروخت ہوتی ہیں، باقاعدہ وہاں میلے لگتے ہیں، وہاں نیکس اور تماشے کا انتظام کیا جاتا ہے، پھر قبروں پر سجدہ اور ہاتھ باندھ کر باقاعدہ قبر کا طواف ہوتا ہے جیسے اللہ کے کعبے کا طواف ہوتا ہے۔ اس سے بڑا شرک کوئی ہو سکتا ہے؟ اللہ کے گھر کا چونکہ طواف ہے تو ولی کی قبر کا بھی طواف

ہے، اللہ کے کعبے کی طرف ہم نے سجدہ کرنا ہے تو قبر کی طرف بھی سجدہ کرنا ہے اور یہاں تو میرے خیال میں لوگ صرف نماز میں سجدہ کرتے ہیں، پہلے چوکھٹ پر پھر قبر پر سجدہ کرتے ہیں، وہاں لوگ اس کے بعد ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں گے اور اُلٹے پاؤں واپس آئیں گے کہ قبر والے کی تعظیم ہو رہی ہے۔ اب خدا جانے کی تعظیم کس کی کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ ایسے شرک سے بچائے۔ مقصد زیارت کا کیا ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قبروں کی زیارت کرو، کیوں؟ قبروں کی زیارت کرنے سے آدمی کو اپنی موت یاد آتی ہے اور آدمی کو اپنی آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے کہ جب وہ کسی اللہ کے ولی کی قبر پر جاتا ہے تو اس کے دل میں یقین آجاتا ہے کہ مولیٰ! یہ تیرے صالح بندے بھی مٹی کے نیچے سو گئے تو ہم نے بھی مرنا ہے، ہمیں بھی اسی جگہ جانا ہے اور ہمیں بھی موت آئے گی اور ہم پر بھی یہ وحشت کا گھر آئے گا، لہٰذا ہمارا خاتمہ ایمان پر فرما کہ ہمارے لیے قبر باغ جنت، نہ کہ جہنم کے گڑھے بن جائیں۔

لہٰذا پہلے منع کا حکم تھا، پھر حضور اکرم ﷺ نے اجازت دے دی۔

کفار کے برتنوں کا حکم:

جس طرح حضور اکرم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو منع فرمایا تھا کہ اگر تم لوگ سفر میں جاؤ، راستے میں کافروں کی آبادیاں ہوتی ہیں، اس میں یہودی، نصرانی اور مشرک بھی ہوتے ہیں تو ان کافروں کے برتنوں میں تم کھانا نہ کھایا کرو۔ مسافر کو جیسے آج ضرورت پیش آتی ہے، پہلے دور میں بھی سفر کرتے تھے تو راستے میں کافروں کی ایک بستی آگئی اور مسلمان بے چارا محتاج ہے کہ میں نے ان سے برتن لے کر کھانا پکانا ہے، اب کیا کروں؟

جبکہ ادھر حضور اکرم ﷺ نے منع فرما دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اب سفر بھی ضروری ہے، بعض علاقے ایسے ہیں کہ راستے میں مسلمانوں کی کوئی بستی ہی نہیں آتی اور ہم برتن لینے کے لیے مجبور ہوتے ہیں، ہم کیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا میں اجازت دیتا ہوں، لیکن ان کو اچھی طرح دھولیا کرو اور پاک کرلیا کرو، تاکہ کسی قسم کا اس کے اندر شبہ نہ رہ جائے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے پہلے بہت سی چیزوں سے منع کر دیا۔ یہ کھجور کا جو درخت ہے، اس کے تنے سے لوگ پہلے مٹکا بناتے تھے، اس کے باہر سے لکڑی صاف کرلی، اندر سے سوراخ کر کے مٹکے کی شکل بنالی۔ اسی طریقے سے جو آپ کے ہاں کدو ہوتا ہے، لمبا بھی ہوتا ہے اور گول بھی، اس کو بھی اندر سے صاف کر کے سکھا کر مادہ

نکال کر برتن بنا لیتے تھے۔ اس سے بھی حضور اکرم ﷺ نے منع فرمایا کہ اس طرح کے برتن تم استعمال نہ کیا کرو؛ کیونکہ لوگ اس میں شراب بنایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ابتداء میں شراب ان چیزوں میں بناتے تھے، ان میں بند کر کے زمینوں میں دفن کر دیتے تھے، اس میں خمیر زیادہ اُٹھتا تھا؛ کیونکہ یہ بالکل بند ہو جاتا تھا اور ہوا اس میں نہ جا سکتی تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے منع فرما دیا تو جب حرمت شراب قائم ہو گئی اور مسلمانوں کو پتہ چل گیا کہ شراب حرام ہو گئی ہے، "كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ" (ہر نشہ آور چیز حرام ہے)۔ جب الحمد للہ! تمام لوگ نشہ آور چیزوں سے بچ گئے تو پھر حضور اکرم ﷺ نے اجازت دے دی کہ اب کوئی بات نہیں، اگر تم ان برتنوں کو استعمال کرتے ہو تو کرلو۔ ابتداء میں اندیشہ تھا کہ کہیں آدمی ان برتنوں کے استعمال سے نشہ آور اشیاء کی طرف نہ چلا جائے۔ لہٰذا جب پورا سد باب ہو گیا تو ان برتنوں کے استعمال کی اجازت مل گئی۔

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تمہیں ناسخ و منسوخ کا پتہ نہیں ہے تو پھر تمہیں تقریر اور وعظ و نصیحت کا کیا حق حاصل ہے؟ جب تمہیں پتہ نہیں اور تم ایک ایسی حدیث سناتے رہو گے جو منسوخ ہو چکی ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کی کتابوں میں حضور اکرم ﷺ کی بشارت دی گئی، آپ ﷺ کی پیدائش اور آپ ﷺ کی پیدائش کی جگہ کا ذکر اور آپ ﷺ کی علامات اتنی واضح تھیں کہ ان میں کوئی معاند تو شک کر سکتا ہے، لیکن عقل والا شک نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی وہ انکار کر گئے اور کتابوں میں تحریف کر دی اور لوگ پوچھتے تو کہتے کہ جس نبی کے آنے کا ذکر تورات میں ہے، یہ وہ نبی نہیں ہیں۔ اس لیے کہ یہود کے مزاج میں رد کرنا، خیانت کرنا اور اللہ کے احکام میں تبدیلیاں کرنا شامل ہے۔ لہٰذا آج وہ نسخ کا انکار کرتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

کراماتِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

اسی لیے آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے واقعات پڑھیں کہ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے مصر کے دریائے نیل کو خط لکھا تھا۔ سوچو! دریا کو بھی کوئی خط لکھتا ہے؟ آج تم کوئی خط لکھ کر پانی میں ڈالو، مٹ جائے گا، دھل جائے گا، گم ہو جائے گا، لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دریاؤں کو حکم نامے جاری کر دیئے۔ پھر کمال کی بات یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جو مصر کے گورنر تھے، انہوں نے یہ بھی نہیں کیا کہ امیر المؤمنین نے کیا آرڈر جاری کیا، بھلا دریا کو بھی کوئی آرڈر کرتا ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خط بھیج دیا، انہوں نے کہا کہ ہمارے ذمے تعمیل حکم ہے، بہر حال دریا میں وہ خط

ڈال دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم خط رکھ کر باہر آئے تو اسی رات دریا اتنا چڑھ گیا کہ کبھی نہیں چڑھا تھا اور پورا علاقہ آباد ہو گیا اور آج تک پھر کبھی نہیں اُترا۔ یعنی دریا، فضائیں اور جنگل کے حیوانات بھی ان کے تابع ہو گئے، سمندر تابع ہو گئے۔

اور اسی طرح ایک موقع پر دریا عبور کرنا تھا، کشتیاں موجود نہیں ہیں، حیران ہیں کہ کشتیاں نہیں ہیں، کہنے لگے: چل پڑو، دریا کے اوپر چل پڑے۔ دریا ان کے تابع ہیں، دریا اپنا کام کر رہا ہے۔ صحابہ کے لشکر اوپر سے گزرے، کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔

ایک مرتبہ جب خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کو زہر دیا گیا تو کمانڈر نے بتایا کہ یہ ایک ایسا زہر ہے کہ اس کا ایک قطرہ زبان پر لگ جائے تو آدمی مر جاتا ہے۔ دیکھنا! کہیں دشمن تمہارے کھانے میں زہر نہ دے دے، کھانا کھانے میں احتیاط رکھنا۔ خالد رضی اللہ عنہ بن ولید نے کہا کہ دکھلاؤ تو سہی، تمہارا زہر کہاں ہے؟ انہوں نے انگیٹھی کھولی، زہر نکالا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ہاتھ میں لیا اور فرمایا:

''بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِي لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَاءِ، وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.''

[سنن الترمذی، رقم: ۳۳۸۸/ سنن أبی داود، رقم: ۵۰۸۸]

اور پی گئے۔ اس نے کہا: یہ کیا کر رہے ہو؟ خالد رضی اللہ عنہ بن ولید نے فرمایا کہ میرے مدنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دعا پڑھ لو تو کوئی چیز نقصان نہیں دے سکتی، بس میرا ایمان ہے۔ آج تم یہ آیت سات مرتبہ پڑھ کو کھا کر دیکھو کہ تمہیں ہضم ہوتی ہے۔ اب کیا قرآن بدل گیا؟ یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بدل گیا؟ ٹھنڈے دل سے سوچو، یہ کہو کہ نہ قرآن بدلا ہے اور نہ فرمان بدلا ہے، بلکہ ہمارا ایمان بدل گیا کہ ہمارا ایمان ہے ہی نہیں۔ ہم زمزم کا پانی بھی پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گولی بھی دینا، اللہ میاں شفا دے گا۔ اب پتہ نہیں عقیدہ زمزم پر تھا یا گولی پر؟ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تم خود منافق ہو تو فائدہ کیا ہوگا؟ نہ تمہیں زمزم فائدہ دے گا اور نہ گولیاں فائدہ دیں گی۔ جن کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر یقین ہے، ان کو زم زم پینے سے شفا بھی ملتی ہے۔

زمزم پینے کے بعد دعا کی قبولیت کا واقعہ:

یعنی آپ اندازہ لگائیں! سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ، امام بخاری رحمہ اللہ کے بھی استاد ہیں، محدث جلیل گزرے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ میں زمزم پینے کے لیے آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی کھڑا ہے اور زمزم پی رہا ہے، پتہ نہیں کون ہے؟ زمزم پینے کے بعد اس نے کہا: یا اللہ! تیرے سچے نبی کی سچی حدیث ہے، تیرا نبی بھی سچا اور نبی کا فرمان بھی سچا کہ زمزم کا پانی جس غرض کے لیے پیو، اللہ وہ پوری کرتے ہیں۔۔۔۔ یاد رکھو اما، زمزم یہ صرف بیماریوں کا علاج نہیں، بلکہ اس کے پینے کے بعد جو دعا مانگو، وہ قبول ہوتی ہے۔ اس لیے محدثین کرام نے لکھا ہے کہ زمزم کا پانی جنت کے حوضِ کوثر کے پانی سے بھی افضل ہے، جنت کے پانی سے بھی افضل ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے معراج کی رات جب حضور اکرم ﷺ کا سینہ مبارک کھولا تو ہر چیز جنت سے لے آئے لیکن پانی زمزم کا لیا تو اس سے معلوم ہوا کہ اگر جنت کا پانی افضل ہوتا تو جبرائیل علیہ السلام جنت سے پانی لے آتے۔ اگر جبرائیل علیہ السلام نے زمزم کا پانی لیا ہے تو محدثین نے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ یہ ایسا پانی ہے جو جنت کے پانی سے بھی افضل ہے۔ اس آدمی نے کیا دعا مانگی؟ تم کیا دعا مانگتے ہو کہ اللہ میاں! پیسے دے دو، بعض حاجی یہ دعا کرتے ہیں کہ کسی کا بٹوہ ملے غسل خانے میں، کسی کا پاسپورٹ، کسی کی ٹکٹ مل جائے، نام بدل دیں گے، حاجی کے لیے تو سب جائز ہے نا؟ یعنی طواف کرتے ہوئے جیب کاٹ لینا، ایمان سے کہو یہودی آکر کاٹتے ہیں؟ ایمان سے بتاؤ کہ ایک کعبے میں، بیت اللہ میں جیب کٹ رہی ہے تو کیا کاٹنے کے لیے یہودی آتا ہے؟ مسلمان کعبہ کا طواف بھی کر رہا ہے اور نظر لوگوں کے بٹوے پر، جیب پر، پاسپورٹ پر اور ٹکٹ پر، اور آیا بھی کعبہ میں ہے، شرم بھی نہیں آتی۔ آج مجھے ایک دوسرے سنا رہے تھے کہ ایک نیا طریقہ نکالا ہے کہ سپرے ہاتھ میں ہے، وضو کر رہا ہے، اس کے کپڑوں پر سپرے کر دیتے ہیں اور پھر اس کو خود کہہ دیتے ہیں کہ بھئی! تمہارے کپڑے گندے ہو گئے ہیں، انہیں دھو لو۔ اب اگر آدمی کا قمیص گندہ ہو جائے تو دھونے کے لیے غریب کیسے نماز پڑھے؟ وضو کے لیے جب اُتارے گا تو بٹوہ یا کپڑے کچھ تو باہر رکھے گا۔ یعنی کیا خیال ہے آپ کا کہ یہ مسلمان ہیں؟ دعا کرو، اللہ پاک ان کو ہدایت دے۔۔۔۔ حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زمزم پی کر جو دعا مانگو، قبول ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ آج مجھے سفیان بن عیینہ مل جائے اور حضور پاک ﷺ کی سو حدیثیں سنا دے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ابھی اس نے ڈول رکھا ہی تھا کہ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور میں نے کہا: میں سفیان ہوں اور تمہاری دعا قبول ہو گئی ہے، چلو میں تمہیں حدیث سناؤں۔ اس کو میں لے آیا اور میں نے اس کو حضور پاک ﷺ کی احادیث سنانا شروع کر دیں۔

﴿اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾ [البقرۃ:۱۰۸]

"کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے جس طرح سے موسیٰ سے سوال ہو چکے اس سے پہلے؟ اور جس نے ایمان کی جگہ کفر کمایا، سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔"

یہاں "اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا"، "لَا تَسْـَٔلُوْا" کے معنی میں ہے یا بطور استفہام انکاری ہے۔ اس کا مخاطب عام ہے مومن اور کافر سب کو شامل ہے؛ کیونکہ اللہ کے نبی تو سب کے لیے آئے ہیں، جنہوں نے آپ ﷺ کی نبوت کو مان لیا، وہ (الحمد للہ!) اُمت محمدیہ میں شامل ہو گئے اور جنہوں نے نہ مانا وہ محروم ہو گئے۔ باقی حضور اکرم ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے۔

بلا وجہ سوالات کرنے کے نقصانات:

رافع بن حرملہ اور وہب بن زید آئے اور کہنے لگے: یا محمد! اگر آسمان سے ہمارے سامنے کتاب اُترے اور ہم اس کو پڑھیں اور مکہ میں ہمارے لیے نہریں جاری ہو جائیں تو ہم تصدیق کریں گے کہ آپ سچے نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ مبارکہ نازل کی کہ تم بھی ایسے سوال کرتے ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے تھے!!؟؟

دوسری حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے آکر حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! مہربانی فرمائیں کہ ہمارے گناہوں کا کفارہ بھی ایسا ہو جائے جیسا کہ بنی اسرائیل کے زمانے میں تھا، (بنی اسرائیل کے زمانے میں یہ تھا کہ کسی آدمی سے کوئی گناہ ہو جاتا تو اس کے دروازے پر لکھا جاتا کہ اس نے فلاں گناہ کیا ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے۔ اگر کفارہ ادا کر دیتا تب بھی دنیا میں ذلیل ہو جاتا کہ ہر کسی کو پتہ چل گیا کہ گناہ کیا ہے اور کفارہ ادا نہ کرتا تو دنیا میں بھی ذلیل اور آخرت میں بھی ذلیل)۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، تم تو بہتر حالت میں ہو۔ تم سے کوئی گناہ ہو گیا تو اللہ معاف کر دیتے ہیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا، تم ایسی باتیں مانگتے ہو کہ دنیا کی رُسوائی حاصل ہو جائے یا دنیا اور آخرت دونوں کی رُسوائی حاصل ہو جائے۔ لہٰذا ایسے سوالات نہ کیا کرو۔

مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جیسے انہوں نے کہا تھا کہ اللہ پاک ہمیں زیارت کرائیں، ایسے ہی قریشیوں نے کہا تھا کہ حضور اکرم ﷺ صفا پہاڑ سونے کا بنا دیں، پھر ہم ایمان لائیں گے۔ آپ ﷺ

نے فرمایا: جیسے بنی اسرائیل نے سوال کیا تھا، تم بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہو؟ سدی رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ سے اسی کی مثل روایت کیا گیا ہے۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:

﴿وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾ [البقرۃ:۱۰۸]

جو ایمان لانے کے بعد کفر خریدے، وہ سیدھے راستے سے گمراہی کی طرف نکل گیا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حال ان لوگوں کا ہے، جنہوں نے پیغمبر کی تصدیق کے بجائے ان کی مخالفت کی اور اللہ کے انبیاء سے ایسے سرکشی کے سوال کئے جن کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سوال کر کے نرمی کی بجائے سختی مول لیتے ہیں، یعنی پہلے نرمی تھی، طرح طرح کے سوالات کیے، جس سے سختی والے احکام نازل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت بیان کی ہے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور تعنت کے سوال کرتے، جیسا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بطور ضد و عناد اور جھٹلانے کے لیے سوال کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ﴾ مطلب یہ ہے کہ جس نے ایمان کے بدلے کفر کو خریدا، ﴿فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾ [البقرۃ:۱۰۸] تو وہ صراط مستقیم سے نکل کر جہالت اور گمراہی کے راستے میں جا پڑا۔

سوال کر کے اُمت کو مشکل میں ڈالنے والے کے لیے وعید:

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ وہ آدمی اللہ کے ہاں غضب کا مستحق ہوتا ہے جو کوئی سوال کرے اور اس کے سوال کرنے کی وجہ سے اللہ اس چیز کو حرام کر دیں اور ساری اُمت قیامت تک مشکل میں مبتلا ہو جائے۔ یہ حکم خاص طور پر اس زمانے میں تھا جب وحی اُتر رہی تھی، قرآن نازل ہو رہا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے؛ کیونکہ اگر کوئی سوال ہوتا تو فوراً اس کے مطابق حکم آجاتا۔ اس لیے اللہ نے اپنے بندوں کو منع فرمایا۔ علماء نے لکھا ہے کہ آج بھی بندہ ایسے سوالات نہ کرے جو بلاوجہ پریشانی کا باعث ہوں۔ مثلاً فرضی مثالیں پیدا کر کے آدمی مسئلے سوچنا شروع کر دے۔

جیسے کہ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ مسئلہ پیش آگیا کہ آپ اپنا لشکر مسلمانوں کی مدد کے لیے لے جا رہے تھے، جب راستے میں پہنچے تو آپ کو اطلاع ملی کہ جس جگہ آپ جا رہے ہیں، وہاں طاعون کی بیماری ہے (اللہ

پاک اس سے محفوظ رکھے، اللہ کا عذاب ہے، اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر عذاب بھیجتے ہیں تو کبھی طاعون مسلط کر دیتے ہیں، کبھی آندھیاں بھیج دیتے ہیں، کبھی پانی ختم کر دیتے ہیں، کبھی فصلات ختم کر دیتے ہیں۔ تو یہ "أنواع من العذاب" ہیں، ان کا علاج یہ ہوتا ہے کہ توبہ و استغفار اور اللہ کی طرف رجوع کرو، نمازیں پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو، صدقات کرو، اللہ سے معافی مانگو)، جب طاعون کے بارے میں پتہ چلا تو صحابہ رضی اللہ عنہم رُک گئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا کہ ہمارے لیے ایک بڑا مشکل مسئلہ پیش آ گیا ہے کہ جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں مسلمانوں کی افواج کی مدد کرنی ہے اور وہاں طاعون کی بیماری بھی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری ساری فوج طاعون کا شکار ہو جائے۔ اب ہمیں بتائیں کہ ہم کیا کریں؟ آپ نے اس کے لیے بڑے بڑے علماء صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر لیا کہ اس مسئلہ کا حل نکالو کہ اب ہم کیا کریں؟ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ہمیں جانا چاہیے، جو اللہ کی تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہونا ہے، وہ ٹل نہیں سکتا۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ بالکل نہیں جانا چاہیے، ہمیں جب پتہ ہے کہ وہاں بیماری ہے اور اللہ کے قرآن میں موجود ہے:

﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ [البقرۃ:۱۹۵]

اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ جب ہم دیکھ رہے ہوں کہ آگ جل رہی ہے تو یہ کوئی عقل مندی نہیں کہ آدمی اس میں کود پڑے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ آگے دریا بہہ رہا ہے تو یہ کوئی عقل مندی نہیں کہ آدمی یہ کہے کہ میں اس میں داخل ہو جاؤں، جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ اللہ نے کہا کہ اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔ اب اس پر بحث ہوئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے غور کرنے کے بعد فرمایا کہ لشکر کو روک دو، ہم اس عذاب والی بستی میں داخل نہیں ہوں گے۔ لہٰذا قافلہ کو واپس چلنا چاہیے۔ ایک آدمی کو جلال آ گیا...... بعض آدمی جلالی بھی ہوتے ہیں...... اس نے کہا: یا امیر المؤمنین! آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہو!؟ اللہ کی تقدیر سے کون بھاگ سکتا ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ کے بندے! اللہ کی تقدیر سے بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ جانا تو پھر بھی اللہ کی تقدیر کی طرف ہے، کہیں بھی چلے جائیں تو اللہ کی تقدیر سے کون بھاگ سکتا ہے؟ تو آپ اسی مسئلے پر جم گئے۔ صبح کو ایک صحابی آئے، انہوں نے آ کر حدیث سنا دی، انہوں نے امیر المؤمنین سے کہا کہ آپ نے صحیح فیصلہ کیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے حدیث سنی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تمہیں پتہ چل جائے کہ کسی بستی میں

طاعون پھیلا ہوا ہے تو اس میں تم کبھی داخل نہ ہونا اور اگر تم پہلے سے ایسی بستی میں موجود ہو جہاں طاعون آ جائے تو پھر تم اس بستی سے نہ نکلو، لیکن اگر تم اس طاعون والی بستی سے باہر ہو اور اس میں آ رہے ہو اور تمہیں پتہ چل جائے کہ اس بستی میں طاعون آیا ہے تو اس میں داخل نہ ہو۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان سُن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خوش ہو گئے اور کہا: الحمدللہ! اللہ نے مجھ سے بھی وہی فیصلہ کرایا ہے جو حضور اکرم ﷺ کا فیصلہ ہے۔ اس میں بھی حکمتیں ہیں کہ تم طاعون والے علاقے سے باہر ہو تو بلا وجہ عذاب میں کیوں جاؤ؟ اور اگر وہاں عذاب آ گیا ہے تو تم باہر نکل جاؤ گے تو لوگوں کا جنازہ کون پڑھے گا؟ کون دفن کرے گا؟ کون ان کی قبریں بنائے گا؟ اور پھر تم جہاں جاؤ گے تو اس بیماری کو بھی ساتھ لے جاؤ گے، پھیلاؤ گے اور دوسرے مسلمانوں کے لیے بھی بیماری کا سبب بنو گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے نبی پاک ﷺ کے فرمان میں حکمتیں ہیں۔

﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّٰهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٠﴾﴾ [البقرۃ:۱۰۹،۱۱۰]

"بہت سے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) پسند کرتے ہیں کہ تمہیں لوٹا لے جاتے تمہارے ایمان لانے کے بعد، حالت کفر میں اپنی طرف سے حسد کرتے ہوئے، بعد اس کے کہ ان کے لیے حق واضح ہو گیا۔ پس (اے مؤمنو!) تم بھی ان کو چھوڑ دو اور ان سے اعراض کرو جب تک کہ اللہ اپنا نیا حکم لائے (ان سے جہاد کا)، بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ، اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے لیے، پاؤ گے اس کو اللہ کے پاس، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ دیکھتا ہے۔"

آیاتِ مبارکہ کا شانِ نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حیی بن اخطب، ابو یاسر ابن اخطب دونوں یہودیوں کے بڑے سردار تھے۔ ان دونوں کو اسلام سے بڑی عداوت اور مسلمانوں سے بغض تھا۔ آپ ﷺ کو خصوصی طور پر ان دونوں

کے بارے میں بتلایا گیا کہ یہ دونوں اپنی طاقت کے مطابق لوگوں کو اسلام سے روکتے ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

زہری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ یہ کعب بن اشرف کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ کعب بن اشرف یہودیوں کا بڑا مشہور آدمی اور شاعر تھا اور اپنے شعروں میں ہجو کرتا تھا، یعنی حضور اکرم ﷺ کی شان کے خلاف شعر کہتا تھا، اس پر اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اُمّی بنا کر بھیجا، آپ کسی مدرسہ اور کسی استاد سے نہیں پڑھے تھے، لیکن انہیں بتاتے تھے کہ تمہاری تورات، انجیل میں یہ لکھا ہوا ہے، اور وہ بات جس کی حضور اکرم ﷺ خبر دیتے، ان کے حسد اور بغض کو مزید بڑھا دیتا۔ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ یہود جو مخالفت کرتے ہیں، جہالت کی وجہ سے نہیں کرتے، بلکہ ان پر تو حق روشن ہو چکا ہے، ان کو پتہ ہے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ سچے نبی ہیں، ان کو پتہ ہے کہ اللہ کا قرآن سچی کتاب ہے، ان کو پتہ ہے کہ دین اسلام سچا دین ہے، پھر یہ بغض اور حسد کی بناء پر مخالفت کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل سے نبوت چلی گئی اور اولادِ اسماعیل میں چلی آئی تو اللہ پاک نے فرمایا کہ آپ اپنی اُمت کو حکم دیں کہ کفار و مشرکین جو آپ کو تکالیف دیں، ان سے درگزر کرتے رہیں اور اللہ کی مدد و نصرت کا انتظار کریں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پہلے حکم نازل ہوا تھا کہ ان کو معاف کر دیں اور ان سے اعراض کریں۔ پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ نیا حکم یہ نازل ہوا کہ اللہ نے اب طاقت دی ہے، اگر یہ لڑائی کریں تو آپ بھی اس کے بدلے میں لڑائی کریں اور ان کے ساتھ قتال و جہاد کریں۔

قتادہ رحمہ اللہ اور سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ [البقرۃ:۱۰۹] کا حکم پہلے تھا، مگر جب تلوار کا حکم آیا تو یہ حکم ختم ہو گیا۔

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ مشرکین کو معاف کر دیتے تھے، درگزر کرتے تھے جیسا کہ اللہ نے حکم دیا تھا کہ درگزر کرو، برداشت کرو اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر انتظار کرتے رہے، جب اللہ نے جہاد اور قتال کا حکم دیا تو پھر اللہ کے نبی اُٹھے اور کافروں کے بڑے بڑے سردار قتل ہوئے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحاح ستہ میں تو یہ روایت موجود نہیں ہے، لیکن اس روایت کی اصل صحیحین میں

اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت میں موجود ہے۔ [صحیح بخاری، رقم:۵۶۶۳/صحیح مسلم، رقم:۱۷۹۸]

جب نماز پڑھیں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے تو اللہ کی نصرت شامل حال ہوگی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ نماز قائم کرو۔ جہاں بھی قرآن میں دیکھو قائم کرنے کا حکم ملے گا۔ نماز قائم کرنے کا معنی یہ ہے کہ نماز کو وقت پر ادا کرو اور نماز کے تمام ارکان اور شرائط پورے کرو۔ وقت پر نماز ادا کرنے کے بارے میں تاکید آئی ہے۔

منافقوں والی نماز:

(حدیث) حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ منافقوں کی نماز ہوتی ہے کہ انتظار کرتے کرتے عصر کو اتنا لیٹ کر دیتے ہیں کہ سورج غروب ہونے کے قریب آ جاتا ہے۔

نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ:

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک صحابی نے جلدی جلدی نماز پڑھی...... جیسے اکثر ہمارے بھائی نماز پڑھتے ہیں، اللہ اکبر اللہ اکبر! ایک سجدے میں سیدھے نہیں ہوتے اور دوسرے سجدے میں چلے جاتے ہیں، رکوع سے سیدھے کھڑے نہیں ہوتے کہ سیدھے سجدے میں چلے جاتے ہیں...... اس طرح ایک صحابی نے نماز پڑھی، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، سلام کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِرْجِعْ فَصَلِّ، فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ." [صحیح بخاری، رقم:۷۵۷]

جاؤ، نماز پھر پڑھو، تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ وہ بیچارا گیا، اس نے پھر سے نماز پڑھی، واپس آ گیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ نماز پڑھو، تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ اس نے جا کر تیسری مرتبہ نماز پڑھی اور پھر آ کر سلام کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے بندے! پھر نماز پڑھو، تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ اس نے کہا: حضور! میں دیہاتی ہوں، میں نے اسی طرح سے نماز یاد کی ہوئی ہے، میں تو جتنی مرتبہ پڑھوں گا اسی طرح پڑھوں گا۔ اب آپ مہربانی فرما کر مجھے نماز سکھلا دیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے بندے! جب رکوع میں جاؤ تو اطمینان سے پوری کمر سیدھی ہو جائے، جب جھک جاؤ تو اپنے گھٹنوں کو ذرا مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور پھر بڑے آرام سے تسبیح کہو تو شاید حدیث کے الفاظ یہیں تک بیان کیے گئے ہیں تو تم کو پتہ تو ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، ایسے تو نہیں کہ پتہ ہی نہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، جلدی جلدی میں ایسے بالکل نماز ادا نہیں

ہوتی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ رحمت فرمائے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم رکوع سے اٹھو تو "سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ" کہو، پورے جوڑ اپنی جگہ پر آ جائیں، سیدھے کھڑے ہو جاؤ، پھر کھڑے کھڑے "رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ" کہو۔ پھر تم سجدہ میں جاؤ تو سجدہ بھی پورے اطمینان سے کرو۔ اپنے ہاتھوں کو ایسے رکھو کہ ان کا رخ بھی قبلہ کی طرف ہو اور کلائیوں کو یوں نہ بچھاؤ، بلکہ اپنے بازو زمین سے اوپر ہوں اور پہلو پیٹ سے دور ہو اور کم از کم تین بار "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" کہو اور اگر اللہ توفیق دے تو سات مرتبہ بھی کہہ سکتے ہو۔ اگر نفل پڑھ رہے ہو تو اس سے زیادہ بار بھی کہہ لو تو کوئی منع نہیں ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جتنا لمبا سجدہ ہو، بندہ اتنا ہی اللہ کے قریب ہوتا ہے؛ کیونکہ سجدہ انسان کے تذلل کی آخری انتہا ہے کہ آدمی اپنے چہرے کو مٹی میں ڈال کر کہتا ہے کہ یا اللہ اب میں تیرے دروازے پر آ گیا، میرا سب سے زیادہ عزت والا بدن کا حصہ چہرہ تھا، اس عزت والے حصہ کو میں نے مٹی میں ملا دیا ہے۔ جب اس انتہاء پر آتا ہے تو مولا کے قریب ہو جاتا ہے، فرمایا کہ جب سجدہ سے اٹھو تو سیدھے بیٹھو اور "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ وَ ارْحَمْنِیْ وَ ارْزُقْنِیْ وَ اهْدِنِیْ وَ اعْفُ عَنِّیْ" یہ دعا پڑھو۔ پھر دوسرا سجدہ کرو، یہ نہیں کہ بغیر تعدیل ارکان کے اللہ اکبر کہتے رہو۔ اس طرح نماز ناقص ہوتی ہے، اس لیے حکم ہے نمازوں کو قائم کرو۔

علمی نکات:

قرآن پاک ایسی مذہبی کتاب نہیں کہ صرف تبرک کے لیے پڑھی جائے۔ قرآن کوئی وظیفہ کی کتاب بھی نہیں کہ آپ اس کو بطور وظیفہ پڑھیں گے اور آپ کو ثواب ہوگا، کسی کو تکلیف ہوگی اور آپ پڑھ کر پھونک ماریں گے تو وہ ٹھیک ہو جائے گا اور اگر کوئی بندہ مر جائے تو اس کے اوپر پھر الیں گے اور وہ بخشا جائے گا۔ اللہ کا قرآن تو ایک جامع اور کامل و مکمل زندگی ہے، نظامِ حیات اور دستورِ حیات ہے جو اوپر سے لے کر آخر تک ہر مسئلے پر اپنا ایک نظریہ بیان کرتا ہے، جو اس پر عمل کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ [آل عمران:۱۹]... ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ [آل عمران:۸۵]

مسلمانوں کے داخلی معاملات:

اور جب یہ دین کامل و مکمل ہے تو اس نے ساری باتیں بتائیں۔ اس نے ہمیں خارجی اور داخلی تعلقات کے

بارے میں بتایا ہے۔ اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ داخلی طور پر تم ایسے بن جاؤ کہ بالکل شیر و شکر ہو۔ اسلام ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ یہ مومنوں کی ایک جماعت ہے، نہ ان کے اندر کوئی رنگ کا جھگڑا کہ یہ کالا، پیلا یا سفید ہے، نہ ان کے اندر زبان کا جھگڑا کہ یہ فارسی النسل اور یہ عربی النسل ہے، نہ ان کے اندر کسی بات کا تفاخر کہ یہ امیر ہے یا غریب ہے۔ اوس اور خزرج ساری عمر ایک دوسرے کے دشمن تھے، لیکن جب اسلام لائے تو بھائی بھائی بن گئے۔ اور اسلام نے ہمیں پہلا سبق یہ دیا کہ ایمان لانے والے بھائی ہیں۔ اب مومن مشرق یا مغرب میں ہے وہ ایک دوسرے کا بھائی ہے۔ جب کلمہ پڑھ لیا تو ہر کلمہ پڑھنے والا دوسرے کا بھائی ہے۔ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' اور بھائی بننے کا معنی یہ ہوتا ہے کہ بھائی بھائی کا درد محسوس کرے۔

آپ دیکھ لیں کہ مہاجرین جو مکہ سے تشریف لے گئے تھے، بڑے بڑے سردار گھرانے کے لوگ تھے، بڑے خاندان والے، مگر جب مدینہ پہنچے تو دو تین کپڑوں میں پہنچے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو مدینہ والو! یہ تمہارے بھائی ہیں، مہاجر ہیں، لٹے ہوئے ہیں، گھر ان کے چھن گئے ہیں، اولادیں ان کی علیحدہ ہوگئیں، مال و متاع ان کا چھن گیا، یہ مہاجر ہو کر محض دین اسلام اور ایمان کے لیے، اللہ کے نبی ﷺ کے لیے مدینے آئے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ تم ایک دوسرے کو بھائی بنا لو۔ انصار نے کہا: ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ!'' حاضر یا رسول اللہ! بالکل ہمارے بھائی ہیں۔ اچھا! بھائی بنانے کا مقصد کیا تھا کہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ انصاریوں نے کہا: ہمارے گھر میں دو کمرے ہیں: ایک کمرہ تمہارے لیے۔ اگر میرے پاس کھجور کے چار درخت ہیں تو دو تمہارے۔ میرے پاس دو بکریاں ہیں تو ایک بکری تمہاری، حتیٰ کہ بعض انصار صحابہ نے تو یہ بھی پیشکش کی کہ میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے جس کو چاہو پسند کرو، میں اس کو طلاق دے دیتا ہوں، عدت کے بعد شادی کر لینا۔ جب بھائی بن گئے تو میں شادی والا اور تم بغیر شادی کے کیوں رہو؟ لیکن مہاجرین کی بھی تو غیرت تھی، انہوں نے کہا: اللہ تمہیں جزائے خیر دے، تم نے تو ہمیں بھائی بنا لیا، ہمیں گھروں میں جگہ دے دی، بس اللہ تمہیں برکت دے، اللہ تمہیں نصرت دے۔ یہ نہیں کہ تمہارے سروں پر سوار ہو جائیں کہ اب ہم یہ کہیں کہ ہم مدینہ والوں کو نکال دیں اور خود یہاں رہ جائیں۔ بالکل نہیں! گھر، بیویاں اور مال سب تمہیں مبارک، اولادیں اور باغ بھی تمہارے، ہمیں بس ایک آدمی رسی دے دو، کوئی کلہاڑی دے دو، ہم لکڑیاں کاٹ کر بیچیں گے اور کھائیں گے۔

[مسند احمد بن حنبل: ۳/۴۷۳، اتحاف السادة المتقین: ۸/۲۰۲، جمع الجوامع، رقم: ۹۶۶۰، کنز العمال، رقم: ۳۷۳۸]

اب ہماری داخلی پالیسی یہ ہوئی: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ [الحجرات:۱۰] کہ مومن بھائی ہیں، ﴿رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح:۲۹] آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحمت کرنے والے اور پھر نبی پاک ﷺ نے کتنی تاکید کردی: ''مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ'' [صحیح بخاری، رقم:۵۹۹۷] کہ تم رحم نہیں کروگے تو تم پر بھی رحمت والا رحم نہیں کرے گا۔ اور فرمایا کہ جو کوئی اپنے سے کمزور والے پر رحم کرے، رحمت والا اس پر رحم کرے گا۔ قرآن نے فرمایا: ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ [التوبۃ:۷۱] اے ایمان والو! تم ہی دراصل ایک دوسرے کے دوست ہو۔ مومن، مومن کا دوست، بھائی اور خیر خواہ ہے۔ پھر کیا سبق دیا: ﴿الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾ [الزخرف:۶۷] فرمایا کہ یاد رکھو! تمام دوستیاں آخرت میں ختم ہوجائیں گی، لیکن ایمان والوں کی دوستیاں قائم رہیں گی۔ جو دوستی اللہ اور اس کے رسول اکرم ﷺ کے لیے ہو، جو اللہ کے لیے محبت کرے، اللہ کے لیے بغض رکھے، اللہ کے لیے دے دے، اللہ کے لیے روک لے، اس نے اپنا ایمان پورا کرلیا۔

یہ ہماری داخلی پالیسی تھی جو اسلام نے ہمیں سکھائی کہ ہم کیسے رہیں؟ کبھی جھگڑا نہ کریں کہ یہ اُردو، سندھی، پنجابی یا پشتو یا کوئی اور زبان بولتا ہے۔ کوئی عربی، چینی، ہندی بولے، مسلمان تو بس ایک ہوجائیں، آپس میں اتحاد و اتفاق ہو۔ ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ [آل عمران:۱۰۳] فرمایا کہ اللہ کی رسّی (قرآن) کو آپس میں مضبوطی سے پکڑلو اور آپس میں جھگڑے اور اختلاف نہ کیا کرو، گویا کہ یہ ہمارا داخلی مسئلہ تھا۔

مسلمانوں کے لیے خارجی معاملات:

اب ہم نے باہر والوں سے خارجی طور پر بھی تو تعلقات رکھنے ہیں، وہ کیسے رکھیں؟ فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ [الفتح:۲۹] کافروں کے مقابلے پر چٹان بن جاؤ، کافروں کے مقابلہ پر سخت ہوجاؤ، کافروں کے مقابلے پر کبھی نرمی نہ کرنا۔ فرمایا کہ کفار آپس میں دوست ہیں، تمہارے کبھی دوست نہیں بن سکتے۔ فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ﴾ [الممتحنۃ:۱] مسلمانو! جو میرا اور میرے رسول ﷺ کا دشمن ہے اس کو دوست کبھی نہ بنانا۔ ہمیں ہدایت دی گئی کہ ہم خارجی معاملات کیسے کریں؟ فرمایا: کفار کے مقابلے پر مضبوط رہو، ان کے ساتھ معاملات رکھو، لیکن قلبی تعلق نہیں، ہمدردی نہیں، قلبی واسطہ نہیں۔ ان سے خیر اور بھلائی کی امید کبھی نہ کرنا، وہ تمہارے دشمن ہیں اور تم کتنی باتیں ان کی مانتے جاؤ، وہ کبھی تمہارے ساتھ راضی نہیں ہوں گے۔

کفار کے مسلمانوں پر مظالم:

فرمایا کہ یہ یہودی اور نصرانی تم سے کبھی راضی نہیں ہوں گے، مگر یہ کہ تم اپنا دین چھوڑ کر یہودی اور نصرانی بن جاؤ تو پھر راضی ہو جائیں گے کہ ہمارے کروڑوں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ زندگی گزاری، ایک ملک میں رہ کر زندگی گزاری، کبھی ان کے کسی عبادت خانے کو نہیں چھوا، کبھی ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کی، کبھی ان کے ساتھ دشمنی نہیں کی، کبھی کسی مسئلے سے ان کو نقصان نہیں پہنچایا، لیکن جب بھی ہندو کو موقع ملا اس نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ جب بھی کافر کو طاقت ملی اس نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا؟ مسلمانوں کی مسجدیں اس نے شہید کیں، عصمتوں کو پامال کیا، ہزاروں مسلمان عورتوں کی اجتماعی طور پر آبروریزی کی، مسلمان عورتوں کو (نعوذ باللہ) بغیر کپڑوں کے گھروں سے نکال کر ان کی فلمیں بنائی گئیں، مسلمان عورتوں کے پستان کاٹے گئے اور کئی کئی افراد ان کے ساتھ بدفعلی کی اور پانی مانگنے پر ان پر پیشاب کرتے رہے۔ کیا ایسی قوموں سے تم کسی بھلائی کی توقع کر سکتے ہو؟ اسلام نے تو واضح کر دیا: ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا﴾ [الفتح:۲۹] مسلمانوں کو اللہ کے قرآن نے واضح کر دیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ﴾ [الممتحنۃ:۱] قرآن نے واضح کر دیا کہ کبھی ان کے سامنے نہ جھکنا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۙ﴾ [الاحزاب:۱] میرے مدنی ﷺ! کبھی کافروں اور منافقوں کی بات نہ ماننا، کبھی ان کی کسی بات پر آپ قائل نہ ہو جانا، یہ دشمن ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کمزور ہیں، ان کے بغیر گزارہ کیسے کریں؟ فرمایا: ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ [النساء:۸۱] اللہ پر توکل کر لو تو جس نے اللہ پر توکل کر لیا اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ [الطلاق:۳] جس نے اللہ پر توکل کیا اللہ اس کے لیے کافی ہے اور پھر اس کے لیے اسلام نے ہمیں نمونے دکھلا دیئے۔

کفار مل کر مسلمانوں پر حملہ اور جنگ کرتے ہیں:

اسلام نے ہمیں دکھایا کہ اس وقت غور کر لو جب میرے پاک نبی ﷺ مدینہ منورہ میں تھے اور صحابہ کی جماعت مدینہ منورہ میں تھی اور تمام کفر کی طاقتیں مل گئیں۔ تمام کفار یعنی یہود کے بنو قریظہ اور بنو نضیر اور مکہ کے کفار بنو ثقیف، بنو غطفان یہ تمام جتنے بڑے بڑے قبائل تھے، سب مل کر اکٹھے ہو گئے اور عہد کیا کہ اکٹھے ہو کر مدینہ پر

حملہ کرو اور مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔ یعنی آپ اندازہ لگائیں کہ چودہ سو سال پہلے بھی کفر اسلام کے خلاف ایک تھا اور آج بھی کفر اسلام کے خلاف ایک ہے۔ جہاں اسلام کو مٹانے کا وقت آئے گا سب کافر مل جائیں گے، جہاں مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچانے کا وقت آئے گا، تمام کفر کی طاقتیں مل جائیں گی۔

غزوۂ خندق میں کفار کا اتحاد:

حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں سب مل گئے اور جب حضور اکرم ﷺ کو پتہ چلا کہ اتنی افواج آ رہی ہیں۔ اس زمانے میں بارہ ہزار کے لشکر نے مدینہ کو گھیر لیا۔ جنگجو تیار ہو کر آئے تھے اور مسلمانوں کی کل تعداد تین ہزار تھی۔ یعنی اتنا بڑا واقعہ پیش آیا کہ حضور پاک ﷺ کو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے خندق کھودنا پڑی۔ جب جنگ اور دشمن زیادہ ہو اور خطرہ بہت ہو تو شہر کے باہر ایک خندق یا ایک نہر بنا دیتے، دشمن اسے عبور نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر اپنے مورچے لگا کر بیٹھ جاتے ہیں جو بھی عبور کرے گا، تیروں پر رکھ لیں گے؛ کیونکہ ہم تو تھوڑے ہیں وہ زیادہ ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے یہ خندق کھودی۔ یہ بڑا مشہور واقعہ ہے اور اندر جو بنو قریظہ یہودی بیٹھے ہوئے تھے، وہ تو مدینہ کے اندر تھے، وہ تو مدینہ سے چند میل کے فاصلے پر تھے اور ان کی طاقت، جائیدادیں، قلعے وغیرہ سب کچھ تھے، بارہ سو تو اکیلا ان کے پاس لڑاکا آدمی موجود تھا۔ بعض روایات میں سات سو اور بعض میں نو سو یا بارہ سو آتا ہے، وہ بھی ان سے مل گئے جو باہر سے آ رہے ہیں یعنی اندر سے بھی دشمن موجود اور باہر بھی پوری قوت نے انہیں گھیرے میں لے رکھا تھا۔

مشکل وقت میں صرف اللہ سے مدد حاصل کریں:

اتنی دہشت اور خوف تھا، میرے پاک نبی ﷺ نے ایک رات میں اشارہ فرمایا کہ میرے صحابہ میں کون ہے جو دشمنوں کے حالات لے کر آئے اور میرے دشمنوں کا پتہ کرے؟ ان کے ارادے کیا ہیں اور تعداد کتنی ہے؟ اور حملہ کرنے کے بارے میں کیا منصوبے بنا رہے ہیں؟ ان کی خبر لے آئے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم جرأت نہیں ہوئی کہ ہم جواب دیں۔ ہم چپ کر گئے کہ کیسے جائیں؟ دشمن کے کیمپ میں اتنی شدید سردی اور پھر اتنی ٹھنڈی ہوا اور اتنی بڑی دشمن کی طاقت اور اس کے اندر گھس کر جانا اور خبر لے کر آنا کوئی معمولی بات تو نہیں تھی، واپس آنے کا کوئی یقین ہی نہیں تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم تو ڈر کے مارے چپ ہو گئے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے پھر بھی فرمایا کہ کون

ہے جو دشمن کے کیمپ سے ان کی خبر لے کر آئے؟ صحابہ ﷺ کہتے ہیں کہ ہم تیسری مرتبہ پر بھی چپ رہے کہ ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ حضور اکرم ﷺ کے قریب حضرت حذیفہ ﷺ بیٹھے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ حذیفہ! اُٹھو اور حال احوال لے کر آؤ، لیکن ایک بات یاد رکھنا! میں تمہیں معلومات لینے کے لیے بھیج رہا ہوں، ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا کہ اُلٹا دشمن کو ہم سے لڑوا دو۔ صرف یہ معلوم کرنا کہ ان کے ارادے، طریقہ جنگ اور وہ کس جانب سے حملہ کرنا چاہتے ہیں؟ ان کی تعداد کیا ہے؟ حضرت حذیفہ ﷺ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کا حکم تھا، خدا کی قسم! میں کھڑا تو ہو گیا تھا، مگر مجھ میں ہمت نہیں پڑ رہی تھی، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے کہ اتنے دشمنوں کے اندر ایسی شدید سردی میں کیسے جاؤں؟ کیونکہ اب تو حضور اکرم ﷺ نے میرا نام لے لیا تھا تو انکار تو نہیں ہو سکتا تھا، پہلے تو ایک عام بات تھی کہ کون جائے گا؟ لیکن اب تو حضور اکرم ﷺ نے میرا نام لے لیا۔ حذیفہ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں کھڑا ہو گیا اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یا اللہ! اس شدید سردی کے موسم میں میرے صحابی (جو قوم کی خبر لینے کے لیے جا رہا ہے) ان کی تُو حفاظت فرما اور ان کو خیریت سے واپس لے آ۔ حضرت حذیفہ ﷺ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی دعا ایسے لگی کہ میں جونہی نکلا تو میں سمجھا کہ میں ایسے گرم حمام میں جا رہا ہوں جس میں سردی ہی نہیں۔ ہم جو اندر بیٹھ کر بھی کانپ رہے تھے باہر یوں لگا کہ جیسے میرے اردگرد گرمی کا انتظام کیا گیا ہے اور میں جہاں جہاں سے گزر رہا ہوں یوں لگتا تھا جیسے کسی کو پتہ نہیں چل رہا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کی دعا تھی، حضرت حذیفہ ﷺ ساری معلومات لے کر واپس آ گئے۔ انہوں نے آ کر حضور اکرم ﷺ کو خبر دی کہ دشمنوں کی تعداد بارہ ہزار ہے اور دشمن مسلح ہے اور تمام کے تمام آپس میں متحد ہیں اور ان کا ارادہ یہ ہے کہ محاصرہ اور لمبا کرو۔ اس طرف سے ہم نے رسد کاٹی ہوئی ہے، مدینہ والوں کو گندم اور پانی نہیں پہنچ سکتا، نہ انہیں کہیں سے کوئی امداد پہنچ سکتی ہے۔ ایک مہینے کے بعد تو یہ خود بخود ہتھیار ڈال دیں گے۔ ہمیں جنگ کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ایسی حالت میں میرے نبی ﷺ نے اپنے اللہ کے آگے ہاتھ اُٹھائے اور عرض کیا: اے اللہ! تیرے سوا ہماری کون مدد کرے گا؟ ہمیں اس واقعہ سے سبق ملا کہ جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو کس سے مانگو؟ صرف اللہ سے۔ حضور اکرم ﷺ نے دعا مانگی اپنے اللہ سے، اور آج کا مسلمان...... اللہ معاف فرمائے...... کبھی کافروں سے اور کبھی غیروں سے مدد مانگتا ہے۔ جب بات ہی اُلٹ ہو گئی تو اللہ کی مدد کیسے آئے؟ جبکہ قرآن نے یہ بتا دیا: ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ [آل عمران:۱۲۶] کہ مسلمانو! تمہاری مدد اللہ کے سوا کہیں سے نہیں آتی۔ حضور اکرم ﷺ نے جب دعا

مانگی تو اللہ نے قرآن نازل فرمایا کہ میرے نبی! جو میرے اوپر توکل کرتے ہیں، ان کی حفاظت میں خود کرتا ہوں۔ اللہ نے فرمایا کہ جب تم نے میرے آگے پھیلائے ہیں تو میں نے بھی ایک لشکر بھیجا ہے جو تمہیں نظر بھی نہیں آتا اور ہم نے ہوا کو حکم دیا ہے کہ کافروں کو اُڑا دو اور ایسے حکم دیا کہ یہ درمیان میں خندق ہے اس طرف دشمن ہیں اور دوسری طرف حضور اکرم ﷺ ہیں، ہوا دشمنوں کی طرف ہے اور ادھر مسلمانوں کی طرف نہیں ہے۔ ہوا بھی ایسی اللہ کے حکم کے تابع ہے کہ جہاں حکم ملا کہ خبردار! ادھر مدینہ والوں کو پریشان نہیں کرنا، وہ آرام سے سوتے رہیں، نیند کریں۔ ادھر ہمارے اور ہمارے نبی ﷺ کے دشمن ہیں، ان کو ہم نے سبق سکھانا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے بادِ صبا بھیج کر میری مدد کی اور قوم عاد کو ہلاک کیا تو تبور والی ہوا بھیجی، ہوا ایسی چلی کہ خیمے اُڑ گئے۔ جانور، برتن، کھانے وغیرہ سب اُڑ گئے اور یوں پتھر برسائے اور مٹی پڑی کہ ہاتھ بھی نظر نہ آئے۔ دشمنوں نے بھاگنا شروع کیا اور جس کا جدھر منہ آیا، بھاگ پڑا۔ اب صبح کی جب نماز ہوئی تو لازمی بات ہے کہ بارہ ہزار آدمی ہوں تو شور ہوتا ہے، کوئی آواز اور خیمہ نہیں۔ صحابہ نے جا کر دیکھا تو وہاں تو کوئی بندہ ہی نہیں۔ انہوں نے آکر کہا کہ حضور! وہاں تو کچھ نہیں، پتہ نہیں وہ سب کہاں گئے؟ حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور واپس مدینہ تشریف لے آئے اور آپ ﷺ نے اپنی زرہ مبارک بھی اُتار دی۔ اُتار کر بیٹھے ہی تھے کہ جبرائیل علیہ السلام آ گئے، کہنے لگے کہ حضور! آپ نے زرہ اُتار دی ہے، لیکن ہم نے تو ابھی تک نہیں اُتاری اور میں کافروں کو فلاں مقام تک بھگا کر آیا ہوں، وہ جوں دوڑتے تھے تو ہم فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آوازیں دیتے تھے کہ پیچھے سے مسلمانوں کی فوج چڑھی آرہی ہے اور دوڑتے دوڑتے ان کا ستیاناس ہو گیا، اب وہ کبھی مدینہ کا رخ نہیں کریں گے۔ اب بنو قریظہ جو آپ کے مدینے میں دشمن ہیں، ان کا محاصرہ کر کے آپ کو انہیں ختم کرنا چاہیے اور میں جا کر ان کے دلوں میں رعب ڈالتا ہوں اور آپ جا کر محاصرہ کریں۔ یہ کیا تھا؟ اگر حضور پاک ﷺ مسلمانوں کی مدد کی دعا مانگتے، ویسے ہی خندق کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ سبق دیا گیا کہ نظر اپنے اسباب پر رکھو، لیکن بھروسہ اپنے اللہ پر رکھو اور غیر سے امید نہ لگاؤ اور جب دشمن مقابلہ پر آ جائے تو تمہارے پاس علاج کیا ہے کہ نماز قائم کرو۔

مصیبت کے موقع پر اذان دینے کا حکم:

ہمارے ملک میں ایک نیا رواج ہے کہ کوئی مصیبت آ جائے تو اذان دیتے ہیں۔ پتہ نہیں ہمارے مولویوں کو یہ

مسئلہ کہاں سے ملا ہے؟ یہ تو ہم نے پڑھا ہے اور حدیثوں میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو جب کوئی مشکل اور مصیبت پیش آجاتی تو آپ ﷺ جلدی سے نماز شروع کر دیتے اور اللہ نے بھی حکم دیا ہے: ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَي الْخٰشِعِيْنَ﴾ [البقرة: ۴۵] کہ ایمان والو! کوئی مصیبت پڑ جائے تو صبر اور نماز سے مدد پکڑو۔ اسی لیے حکم ہے کہ تم پر جیسی کوئی مصیبت آجائے تو فوراً نماز شروع کر دو، فوراً اللہ کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ۔ اسی کو علماء نے صلوٰۃ الحاجۃ کے نام سے لکھا ہے کہ جب کوئی مصیبت آجائے تو اللہ کے سامنے دو رکعت نماز پڑھو۔ اس کے آگے اپنی مشکل کشائی کراؤ، اللہ سے مدد مانگو۔ اسی لیے حکم ہے کہ چاند کو گرہن لگ جائے تو نماز پڑھو، سورج کو گرہن لگ جائے تو نماز پڑھو، کوئی مصیبت آجائے تو ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (نماز قائم کرو)۔ لیکن ہمارے لوگوں نے نیا مسئلہ نکالا ہے کہ اذان دو۔ اصل میں اذان ایک آدمی کو دینی پڑتی ہے، تکلیف تو کوئی ہوتی ہی نہیں۔ ایک آدمی لاؤڈ سپیکر لگالیتا ہے اور سارے محلے والوں کو بھی نہیں سونے دیتا۔ ایک اُترتا ہے تو دوسرا چڑھ جاتا ہے۔ دن رات یہی کام ہوتا ہے، لیکن نماز نہ محلے والے پڑھنے آتے ہیں اور نہ مولوی خود پڑھتا ہے، صرف اذانوں پر زور ہے۔ اصل مقصد جو ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اہل کتاب چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان سے کفر کی طرف لوٹائیں۔ پھر حکم دیا کہ کیسے مقابلہ کرو؟ فرمایا: ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ [البقرة: ۴۳] کہ تم اپنی عبادت پر قائم رہو۔ عبادت بدنیہ اور مالیہ پر قائم رہو۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور جب تمہاری نمازیں قائم اور ٹھیک ہو جائیں تو اللہ کی مدد اور نصرت آجائے گی۔ آج ہم لوگ یہ بنیادی فلسفہ نہیں سمجھتے کہ جب ہم نماز میں اللہ کے آگے جھکتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہم عاجز ہیں، ہم خود کو کچھ نہیں سمجھتے، ہم تو تیرے دروازے پر گر گئے تو جب ہم سب سے بڑی قوت کو اپنے ساتھ کر لیتے ہیں تو چھوٹی قوتیں ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہیں؟

اس کا یہ معنی نہیں کہ آلات اور اسباب نہ اپناؤ۔ ورنہ حضور اکرم ﷺ بھی خندق نہ کھودتے۔ آلات اور اسباب بھی بناؤ اور اپنی قدر امکان کوشش بھی کرو، لیکن اصل بھروسہ اور تعلق اپنے اللہ کے ساتھ جوڑو۔ اور یہ فرمایا کہ نماز کے ساتھ زکوٰۃ بھی ادا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ غریب اور امیر کی لڑائی ہو جائے۔ وہ غریب ہوتا جائے اور تم دولت مند بنتے جاؤ، اپنی دولت میں ان کو بھی شریک کرو اور مسلمان جب صحیح معنی میں زکوٰۃ ادا کرنا شروع کر دیں تو کسی محلے میں کوئی غریب نہیں رہ سکتا۔ اور فرمایا کہ جو تم دے رہے ہو، یہ نہ سمجھو کہ ضائع ہو گیا، بلکہ جو دے رہے ہو وہ آگے اللہ کے ہاں

محفوظ ہے اور پھر جو تم عمل کر رہے ہو، چاہے عبادت بدنیہ ہو یا مالیہ ہو، وہ تمہارے عمل کو دیکھنے والے ہیں کہ تم دکھاوے کے لیے کر رہے ہو یا دل سے کر رہے ہو۔

اس لیے مفسر ﷫ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان آیات میں ان اعمال کی ترغیب دی ہے جن سے تم کو نفع پہنچے اور جن کا فائدہ تمہیں قیامت والے دن ملے اور اس کی وجہ سے دنیا میں بھی اور قیامت میں بھی اللہ کی مدد آئے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ اللہ کی طرف سے خبر ہے کہ اللہ پاک نے مومنوں کو حکم دیا تھا تو اللہ پاک فرماتے ہیں کہ تم جو عمل کرتے ہو، خواہ اچھا کرو یا بُرا، ظاہری طور پر کرو یا چھپ کر، اللہ کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کا تمہیں بدلہ دیں گے۔

ابن کثیر ﷫ فرماتے ہیں کہ ﴿إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝﴾ یہ جملہ باعتبار ظاہر خبر ہے، مگر اس کے اندر وعظ بھی ہے، وعدہ بھی ہے کہ اچھا عمل کرو گے تو بدلہ دوں گا، وعید بھی ہے کہ بُرا کرو گے تو سزا دوں گا اور اس میں حکم اور زجر بھی ہے۔ اللہ پاک نے قوم کو خبر دی کہ میں تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہوں۔ تاکہ وہ پوری محنت کے ساتھ عمل کریں اور وہ عمل اللہ کے ہاں ذخیرہ ہوں گے اور اللہ ان کا ثواب دیں گے۔

﴿وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ بَلَىٰ ۚ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝﴾ [البقرة:۱۱۱،۱۱۲]

"اور (اہل کتاب) کہتے ہیں: ہرگز داخل نہ ہوگا جنت میں، مگر جو یہودی ہوگا یا عیسائی، یہ ان کی جھوٹی خواہشات ہیں، (ان سے) کہہ دیجیے اپنی کوئی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ہاں جس نے خود کو اللہ کے سپرد کیا اور وہ موحد تھا اس کے لیے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے، نہ ایسے لوگوں پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

آیات کا ماقبل سے ربط:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود کا ایک دعویٰ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ہی جنت میں داخل ہوں گے۔ ان کے مقابلے میں یہ دوسرا فرقہ نصرانیوں کا ہے، نصرانی صرف اپنے جنت میں داخل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان

آیات کا پچھلی آیات سے تعلق یہ ہے کہ یہود نسخ کے قائل نہیں تھے تو اسی وجہ سے یہود اس بات پر بھی اڑے ہوئے تھے کہ تورات اللہ کی کتاب ہے، جو اس پر عمل کرے گا بس وہی جنت میں جائے گا؛ کیونکہ یہی بس اللہ کا حکم ہے اور یہ حکم ختم نہیں ہو سکتا۔ نصاریٰ نے بھی اس کے تقابل پر یہ کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے رسول ہیں اور انجیل بھی اللہ کی کتاب ہے، تورات پہلے اور انجیل بعد میں ہے۔ لہٰذا انجیل پر عمل کرنے والے یعنی صرف نصاریٰ جنت میں جائیں گے، ان کے علاوہ کوئی نہیں جائے گا۔ پہلا دعویٰ ان کا یہ تھا۔ اب اسی دعویٰ میں وہ ذرا آگے بڑھتے گئے اور کہا کہ جو یہودی ہے، چاہے تو وہ تورات پر عمل کرے یا نہ کرے وہ جنت میں جائے گا، یعنی جو یہودی کے گھر میں پیدا ہو گیا، یہود کے ملک میں رہ کر اپنا اندراج یہودیوں میں کرانے کے بعد یہودی ہے، چاہے وہ تورات پر عمل نہ بھی کرتا ہو، نصرانیوں نے بھی یہی دعویٰ کر دیا کہ جو شخص نسلی طور پر نصرانی ہے، انجیل پڑھے یا نہ پڑھے، جنت میں صرف نصرانی جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں جہاں جہاں نصرانی موجود ہیں، انہیں اپنے مذہب کا کوئی پتہ نہیں، وہ صرف کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں اور ان کی مذہب سے بیگانگی کا یہ عالم ہے کہ ان کے جو گرجے اور عبادت گاہیں ہیں، وہ سالہا سال سے ویران پڑی ہوئی ہیں۔ اب ان لوگوں نے ان کو بیچنا شروع کر دیا ہے کہ عمارت ضائع ہونے کے بجائے پیسے مل جائیں، لیکن دعویٰ یہ ہے کہ جنت میں صرف نصرانی جائے گا۔ اور ان کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں چند گمراہ فرقوں نے بھی یہی دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے کہ جو ان کے فرقہ میں شامل ہو گیا وہ جنت میں جائے گا، خواہ کوئی عمل بھی نہ کرے اور خواہ توحید و رسالت کا عقیدہ بھی نہ رکھتا ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے دعویٰ نقل کر کے مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ تم ایسا کبھی نہ کرنا۔

جنت کس کو ملے گی؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ان کی تمنائیں ہیں، خواہشیں ہیں، ورنہ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ آگے اللہ نے فرمایا: چیلنج کرو اہل کتاب کو کہ تم جو دعویٰ کرتے ہو اس کی دلیل دو، صرف زبانی کلامی کہنے سے تو کچھ نہیں ہو جاتا۔ اگر کوئی دلیل ہے تو لے آؤ، کوئی عقلی یا نقلی لے آؤ، تورات و انجیل میں سے کوئی حکم لے آؤ۔ آگے اللہ نے قاعدہ کلیہ بتا دیا کہ نہ یہودیوں نے جنت کا ٹھیکہ لیا ہے، نہ نصرانیوں نے اور نہ صرف مسلمان کہلانے والوں نے۔ فرمایا: ﴿بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ ہم نے جنت کسی قوم کے لیے نہیں بنائی کہ صرف یہودی جائیں

گے یا صرف نصاریٰ جائیں گے یا صرف مسلمانوں کا لفظ کہلانے والے یا عربی بولنے والے یا گورے یا کالے۔ فرمایا کہ نہیں، جنت میں وہ جائے گا جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ نام چہرے کا ہوتا ہے، مراد سارا بدن ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ:۱۴۴] اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف کرو کہ پورے بدن میں سب سے اشرف چہرہ ہے، لہٰذا حکم بھی چہرہ کا ہوتا ہے، لیکن اس سے مراد پورا بدن ہوتا ہے۔

اسلام کا معنی ہے: استسلام یعنی اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے کہ مولا! تیرا حکم ہے، میں اس کی تعمیل کروں گا۔ جب اس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا کہ مولا! تیرے حکم کے اتباع میں جو ملے گا اس کی تعمیل کروں گا اور اس کے ساتھ مخلص ہو اور منافق نہ ہو، تو پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی اطاعت کرنے والا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اطاعت ظاہری طور پر بھی نہ ہو کہ جب لوگوں کو دیکھا تو لمبی لمبی نمازیں پڑھ لیں اور جب گھر میں ہو تو نماز، روزہ سب عبادتیں ختم۔ کیونکہ منافق کا ایمان قبول نہیں کہ جو ظاہر میں اسلام اسلام کرے اور عمل کافروں والا کرے۔ ہم لوگوں نے آج کل یہی سمجھ لیا ہے کہ ہم چونکہ مسلمان ہیں، ہمارے باپ دادا بھی مسلمان تھے اور ہمارے شناختی کارڈ پر بھی مسلم لکھا ہوا ہے، لہٰذا ہم پکے مسلمان ہیں، ہم تو جنت میں جائیں گے چاہے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کریں یا نہ کریں، اعمال صالحہ کریں یا نہ کریں، حالانکہ دوسری جگہ اللہ نے وضاحت کر دی۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾ [الکہف:۱۰۷]

جو لوگ ایمان لے کر آئے۔ ایمان لانے کی نشانی کیا ہے؟ کہ عمل اچھے کیے جن اعمال کا اللہ نے حکم دیا اور فرمایا: ہم نے ان کی مہمانی کے لیے جنت والے باغ تیار کر رکھے ہیں۔

﴿خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ [الکہف:۱۰۸]

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اس سے کبھی نکلیں گے بھی نہیں، نہ نکلنے کی تمنا کریں گے۔

حوضِ کوثر سے ہٹا دیئے جانے والے:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: حوضِ کوثر پر آنے والے چند فرشتے لوگوں کو پکڑ کر لا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا: لے آؤ میرے اُمتیوں کو، میں ان کو حوضِ کوثر سے پلاؤں۔ فرشتے جواب دیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپ

کے بعد بدعتیں ایجاد کی تھیں تو فرشتے ان کو جہنم میں ڈال دیں گے۔

آپ ﷺ کے سامنے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تورات پڑھنے کا واقعہ:

ایک دن حضور اقدس ﷺ تشریف فرما تھے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو کسی نے تورات کے اوراق دے دیئے تو آپ دیکھ رہے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پڑھے لکھے آدمی تھے، وہ تورات پڑھنے لگے، حضور ﷺ کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا، غصے اور جلال میں آ گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ راز دانِ نبوت تھے، وہ سمجھ گئے کہ حضور اکرم ﷺ ناراض ہو گئے ہیں۔ انہوں نے جلدی سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اشارہ کیا کہ کیا کر رہے ہو؟ حضور ﷺ ناراض ہو رہے ہیں۔ اب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کتاب سے نظر ہٹا کر جب حضرت محمد ﷺ کے چہرے پر ڈالی، جس کی سیرت اور خُلق قرآن تھا تو دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ جلال میں ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی سمجھنے والے تھے۔ فوری طور پر عرض کیا کہ آقا! ہم اللہ کی ربوبیت اور اُلوہیت کے قائل، توحید کے قائل اور آپ کی نبوت و رسالت کے قائل ہیں، مجھ سے کیا ایسی غلطی ہوئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عمر! میرے اور قرآن کے ہوتے ہوئے تم اپنی توجہ تورات کی طرف کر رہے ہو۔ اب بھی اگر موسیٰ علیہ السلام دنیا میں موجود ہوتے تو وہ بھی میری شریعت پر ہی چلتے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام خود نبی اور رسول ہیں، اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دنیا میں کوئی شخص، چاہے یہودی ہے یا نصرانی، جب اس کو میری نبوت و رسالت کی اطلاع مل گئی ہے تو ان کے سارے دین ختم، ساری کتابیں اور شریعتیں ختم، اب قرآن کے بعد جو آدمی یہ کہے کہ میں تورات پر کھڑا ہوں، وہ بھی کافر ہے، انجیل کا دعویٰ کرے تو وہ بھی کافر ہے۔ ایمان جب بنے گا کہ جب تورات کا زمانہ تھا تو کہا: ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا''، انجیل اور قرآن کا حکم بھی آیا تو ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' کہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم نے جنت میں جانا ہے تو ایک بات یاد رکھو، ﴿بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دو اور عمل میں سچے اور مخلص بنو، منافقت نہ ہو۔ اس لیے ﴿فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ﴾ اس کا ثواب رب کے پاس محفوظ ہے، فرمایا: ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ پہلے مفرد ضمیر ﴿فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ﴾ پھر عند اللہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی ''مَنْ'' کے لفظ کی رعایت ہوتی ہے، معنی کی رعایت نہیں ہوتی، لفظ کے اعتبار سے چونکہ مفرد ہے۔ ﴿بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ﴾ آگے معنی کی رعایت کر دی: ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ اور اسلام پر پکے عمل

کرنے والے قیامت کے دن جب اپنے رب کے پاس آئیں گے تو ان کو کوئی ڈر اور کوئی غم نہ ہوگا، جنت ان کے انتظار میں ہوگی۔

عیسائی اور یہودی افراط وتفریط میں مبتلا ہیں:

بعض لوگ آپس میں اتنے بغض اور غلو میں آکر برباد ہوئے کہ نصرانیوں نے تو محبت میں بڑھ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا دیا، انہوں نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے، انہی نصرانیوں کی جماعت میں سے ایک جماعت اس طرف چلی گئی کہ (نعوذ باللہ) عیسیٰ علیہ السلام خود خدا ہیں اور ایک جماعت نصاریٰ کی اس طرف چلی گئی کہ بہرحال یہ تینوں خدا ہیں: عیسیٰ، بی بی مریم اور اللہ تعالیٰ۔ تو وہ غلو میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بنا دیا۔ اور یہودی دشمنی میں اتنے بڑھے کہ انہوں نے کہا کہ (نعوذ باللہ) عیسیٰ علیہ السلام تو خود حلال کی اولاد بھی نہیں ہیں، وہ تو یوسف نجار کا بیٹا ہے اور بلاوجہ بی بی مریم نے اپنے گناہ کو چھپانے کے لیے ساری کہانی گھڑی ہے۔ اور پھر انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے بڑی کوششیں کیں۔ اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ آدمی یا محبت میں گمراہ ہوتا ہے یا بغض میں گمراہ ہوتا ہے۔ کبھی عداوت میں بہت زیادہ بڑھنے سے گمراہ ہو گیا۔ اس لیے دعا کریں کہ اللہ ہمیں قرآن وحدیث کی سمجھ عطا فرمائے، اللہ ہمیں صحیح علماء کی اتباع نصیب فرمائے، ورنہ جو آدمی جس جگہ کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا آج بھی آپ یہودیوں کو لیں، وہ کہیں گے کہ مسلمان گمراہ ہیں اور ہم حق پر ہیں۔ آج بھی نصرانی کہیں گے کہ مسلمان گمراہ ہیں، یہ گوشت کھاتے ہیں اور عورتیں رکھتے ہیں اور ان کا کیا کام ہے، ورنہ مسلمان ترقی نہ کر جاتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسے مسلمان ہیں کہ جھوٹ ان کے اندر ہیں؟

ایک آدمی نے باقاعدہ کتاب میں لکھا کہ جب میں نے ان مسلمانوں کو دیکھا تو اسلام لانے کا ارادہ میں نے بدل لیا، اس نے کہا کہ میں نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ خنزیر کا گوشت کھاتے، شراب پیتے، زنا کرتے، عورتوں کے ساتھ ناچ گانے کرتے، ان کی عورتیں بے پردہ پھرتی ہیں، ان کے گھروں میں گندی فلمیں چلتی ہیں، حلال وحرام کی ان کے یہاں کوئی قید نہیں، بینکوں میں یہ معاملہ کرتے ہیں، پھر ان کا یہ کیسا اسلام ہے؟ اور ہم میں اور ان میں پھر فرق کیا ہے؟ پھر جو دنیا کا کام ہے یہ بھی کر رہے ہیں ہم بھی کر رہے ہیں۔ جو محنت کرے گا ترقی کر جائے گا، جو نہیں کرے گا وہ ذلیل ہو جائے گا۔ پھر ان کے مذہب میں اگر کوئی بات سچی ہوتی تو یہ اپنے مذہب پر

کیوں نہ چلتے؟

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یاد رکھو! ہر عمل جو اللہ کے ہاں قبول ہوتا ہے، اس کے اندر دو شرطیں پائی جانی ضروری ہیں: پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ اگر اللہ کے لیے خالص نہیں ہے تو مقبول نہیں، جیسے کوئی کہے کہ یہ نیاز اللہ اور فلاں کی ہے وغیرہ۔ یہ عمل اللہ تعالیٰ کے لیے خالص رہا ہی نہیں۔ یا اسی طرح کوئی کسی خاص جگہ جا کر صدقہ کرنے کو لازم سمجھے تو یہ عمل بھی خالص اللہ کے لیے نہ رہا؛ کیونکہ اگر خالص اللہ کے لیے عمل ہوتا تو جہاں بھی صدقہ دیا جائے اللہ تعالیٰ اجر دیں گے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ عمل اللہ کے لیے ہو اور سنت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق بھی ہو۔ اگر بڑا عمل ہے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق نہیں تو قبول نہیں ہوگا۔ تو ہر عمل میں دو باتیں ہوں تو وہ قبول ہوگا، ورنہ مردود ہوگا۔

کعبہ شریف کے چار کونے ہیں، ان کے دو کونوں کو ہاتھ لگاتے ہو کہ نہیں؟ ایک موٹی بات یاد رکھو کہ دین سمجھنا مشکل نہیں۔ رکن یمانی پر ہاتھ لگاتے ہو، حجر اسود کو بوسہ دیتے ہو، رکن عراقی اور رکن شامی پر نہ ہاتھ لگاتے ہو، نہ اشارہ کرتے ہو، نہ بوسہ دیتے ہو۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہاتھ لگایا وہاں ہاتھ لگانا اور جہاں بوسہ دیا وہاں بوسہ دینا سنت اور جہاں ہاتھ نہیں لگایا وہاں نہ لگانا سنت ہے، اب اسی کو دیکھ کر اور لمبے چوڑے جھگڑوں میں نہ جاؤ۔ جو آدمی کہے کہ قبر شریف کا بوسہ جائز ہے تو اس سے کہو کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سی قبر کا بوسہ لیا تھا؟ دکھاؤ۔

جس پتھر پر ابا ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام کو مصلیٰ تو قرار دیا، لیکن بوسہ نہیں دیا، ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ تو کہہ دیا کہ وہاں اس کے پیچھے نماز پڑھو، وہاں نماز پڑھنے کا یہ معنی بھی نہیں ہے کہ وہاں مقام ابراہیم کو سجدہ کرو۔ بعض جاہلوں کو مصیبت ہے، کہتے ہیں کہ دیکھو! وہ پتھر جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں لگے ہیں، جب اس جگہ پر سجدہ جائز ہے تو پھر پیر سائیں کی قبر پر جائز کیوں نہیں؟ یہاں تو خود پورا پیر موجود ہے اور وہاں تو صرف پاؤں لگے ہیں۔

تو یاد رکھو! وہاں سجدہ نہیں، مسئلہ کو سمجھو۔ ﴿وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى﴾ [البقرۃ:۱۲۵] اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مشورہ لیا تھا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دیا تھا، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فِيهِ

اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ[آل عمران:۹۷] یعنی اس جگہ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھیں گے، اس مقام پر سجدہ ہم اللہ کو کریں گے، تاکہ ثواب بانیٔ کعبہ کو بھی ملتا رہے، عبادت ہم اللہ کی کریں گے۔ چنانچہ اب کوئی کہے کہ جناب! جب پتھر کے پیچھے نماز جائز ہے تو پیر سائیں کی قبر کے پیچھے جائز کیوں نہیں؟ وہاں بھی ہم نماز اللہ کے لیے پڑھیں گے، لیکن ثواب پیر صاحب کو ہوگا۔ لیکن میرے مدنی آقا ﷺ نے فرمادیا کہ خبردار! جہاں سامنے قبر ہو وہاں نماز نہ پڑھنا۔ اگر حضور اکرم ﷺ نہ روکتے تو ہم پڑھتے۔ حضور پاک ﷺ نے یہ مسئلہ سمجھادیا کہ اللہ نے جنازہ میں رکوع نہیں رکھا تو پھر قبر پر نماز کیسے؟ جنازہ میں رکوع اور سجود اس لیے نہیں، تاکہ کوئی جاہل یہ نہ سمجھے کہ میت کو سجدہ ہو رہا ہے۔ اس دھوکے سے بچنے کے لیے اللہ نے جنازہ میں رکوع و سجود نہیں رکھا۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ خبردار! کسی مقبرے پر نماز نہ پڑھنا، فرمایا: خبردار! کسی قبر پر کوئی بناء اور عمارت نہ بنانا، خبردار! کسی قبر کو اونچا نہ کرنا، نہ اس پر چلنا اور نہ اس پر ٹیک لگا کر بیٹھنا۔ پہلی امتیں جو گمراہ ہوئی ہیں وہ بھی اسی وجہ سے کہ وہ اپنے صالحین کی قبروں پر بیٹھتے تھے، پھر ان سے محبت کرتے کرتے پہلے ان کی تصویریں بنائیں، پھر ان کے بت بنائے اور ان کی پوجا کرنے لگ گئے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے وہاں منع فرمادیا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قبر کی زیارت کرو، تو کیا ہم نہیں کرتے؟ "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِیْنَ" اب سورج نکلے تو نماز نہ پڑھو، سورج ڈوب رہا ہو تو نماز نہ پڑھو، سورج سر پر ہے تو نماز نہ پڑھو، تاکہ کسی دیکھنے والے کو شبہ نہ پڑے کہ یہ سوج کے پجاری ہیں؛ کیونکہ سورج کی عبادت کرنے والے ان اوقات میں سورج کی عبادت کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ تم ان اوقات میں میری عبادت بھی نہ کرو، تاکہ لوگوں کو دھوکہ بھی نہ پڑے، تاکہ کوئی جاہل کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ سوچنے نہ پڑ جائے کہ یہ سورج کے پجاری ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر سامنے آگ جل رہی ہو تو نماز نہ پڑھو، تاکہ لوگوں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ یہ آگ کے پجاری ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ اگر حضور اکرم ﷺ کے سامنے دیوار پر قرآن لٹکا ہوا ہوتا تو حضور اکرم ﷺ اُتار دیتے۔ کبھی تلوار بھی لٹکی ہوتی تو حضور اکرم ﷺ اُتار دیتے، تاکہ کوئی دھوکہ میں نہ پڑے کہ تلوار کو سجدہ ہو رہا ہے۔ اگر سامنے قبر ہے تو پھر بھی میری عبادت نہ کرو، تاکہ دیکھنے والا یہ نہ سمجھے کہ یہ قبر کی پوجا کر رہا ہے۔

ایک اُصولی بات یاد رکھو کہ جو کام تم کر رہے ہو یا جو عمل تم کر رہے ہو تو کیا یہ اللہ کے لیے ہے یا اس میں کسی

دوسرے کا بھی کچھ حصہ ہے؟ اگر کسی کا حصہ ہے تو یہی معنی ہے شریک بنانے کا۔ اب عمل میں شرکت آگئی تو اللہ کے ہاں یہ عمل مقبول نہیں۔ اللہ کے ہاں کون سا عمل مقبول ہوتا ہے؟ جو خالص اسی کے لیے ہو، ﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [المؤمن: ۱۴] فرمایا: اسی کو پکارو۔ خالص عمل کی مقبولیت کے لیے کچھ اصول ہونے چاہئیں، وہ اصول قرآن وسنت سے حاصل ہوتے ہیں، اگر وہ عمل قرآن وسنت کے مطابق ہو تو مقبول ہے، ورنہ مردود ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ'' [صحیح بخاری، باب النجش، صحیح مسلم، رقم: ۱۷۱۸] کہ تم میں سے جو عمل کرنے والا عمل کرے اور اگر وہ عمل میری سنت کے مطابق نہ ہو تو ایسے عمل کو پھینک دو، اس کی کوئی حیثیت و قیمت نہیں، وہ مردود ہے۔

پادریوں کے چلّے بھی مردود:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ نصرانی، یہودی یا ان کے جو بڑے بڑے پادری ہیں، ساری ساری زندگی مجاہدے کرتے ہیں، غاروں میں رہتے ہیں اور کئی کئی سال کے روزے رکھتے ہیں، ہڈیوں کے ڈھانچے بن جاتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان کا عمل خالص اللہ کے لیے ہو، لیکن چونکہ شریعت کے مطابق نہیں، اس لیے اللہ نے انہیں بھی رد کر دیا کہ ان کا کوئی عمل قبول نہیں۔

عبادت میں مجاہدہ کرنے کا مسنون طریقہ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگ اُمہات المومنین کے پاس آئے اور آپ ﷺ کے عمل کے متعلق دریافت کیا تو بعض نے فیصلہ کیا کہ ہم رات کو بالکل نہیں سوئیں گے، بعض نے کہا کہ ہم خصی ہو جاتے ہیں، زندگی میں کبھی شادی نہیں کریں گے اور بعض نے کہا کہ ہم ساری زندگی روزے رکھیں گے۔ حضور اکرم ﷺ کو پتہ چلا تو تشریف لائے اور فرمایا: کہاں ہیں میرے صحابہ؟ میں نے سنا ہے کہ تم نے ایسا مشورہ کیا ہے کہ ہم اللہ کی عبادت کریں، اللہ کو راضی کریں۔ کون ہے تم میں سے جو میری شان کا مقابلہ کرے؟ فرمایا کہ تم میرے مقابل بن سکتے ہو؟ نبی کے برابر تمہارا مرتبہ ہوسکتا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، میں رات کو اُٹھتا بھی ہوں، تہجد بھی پڑھتا ہوں اور سو بھی جاتا ہوں، شادیاں بھی کرتا ہوں، میری بیویاں بھی ہیں، ان کے حقوق بھی ادا کرتا ہوں۔ فرمایا کہ جب میں یہ سارے کام کرتا ہوں تو میرا مقابلہ تم نہیں کر سکتے، پھر اور

آگے بڑھ رہے ہو۔ جب تک میری سنت کے مطابق عمل نہیں کرو گے اللہ کے ہاں کوئی اجر نہیں ملے گا۔

مصائبِ دنیا کے خوف سے شادی نہ کرنے کی وعید:

آج بھی کئی آدمی کہتے ہیں کہ میں شادی نہیں کروں گا۔ پوچھا کہ کیوں؟ کہتے ہیں کہ بس بھائی! بیوی کے بڑے جھگڑے ہوتے ہیں، میں بس اللہ کی عبادت کروں گا۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسی عبادت کی مجھے کوئی ضرورت نہیں، تُو نے میرے محمد ﷺ کی سنت کا انکار کیا ہے۔ جب اللہ کے نبی ﷺ نے شادی کی تو تم کون ہوتے ہو شادی نہ کرنے والے؟ کیا تم ان سے بھی زیادہ پاک بن سکتے ہو؟ جو معصوم ہے اور اس کے علاوہ تو کوئی معصوم بھی نہیں ہے۔ جب حضور اکرم ﷺ نے ایک شادی نہیں کی، بلکہ حضور اکرم ﷺ کے نکاح تو پچیس ہوئے اور گیارہ تو باقاعدہ بیویاں ساتھ تھیں، جنہیں حضور پاک ﷺ باقاعدہ ملے ہیں۔ وفات کے وقت بھی ۹ بیویاں حضور اکرم ﷺ کے پاس موجود تھیں۔

واقعہ:

ہمارے پاس ایک حافظ صاحب تھے، معلوم نہیں زندہ ہیں یا فوت ہو گئے ہیں۔ اللہ کی رحمت سے قرآن پر زبان ایسے چلتی تھی کہ وہ جب پیشاب کرنے جاتے تو زبان کو پکڑ کر بیٹھ جاتے، لیکن زبان چل رہی ہوتی تھی۔ یعنی پیشاب کے دوران بھی زبان نہیں رک سکتی تھی اور قرآن پڑھتے ہوئے اتنی زبان چلنے لگی کہ ایک منٹ کے لیے بھی اللہ کے قرآن سے ان کی زبان نہیں رکتی تھی تو اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کی زبان پر اپنا ذکر اتنا حاوی کر دیتے ہیں گویا کہ وہ دنیا سے کٹ گئے ہیں، نہ ان کو پیسے، نہ دنیا اور نہ کمانے کی غرض ہے، بس ہر وقت اللہ کا ذکر ہے۔ لیکن کوئی شریعت کا مخالف ہو اور یہ کہا جائے کہ یہ اللہ تک پہنچ گیا ہے تو اس کے لیے یہ حکم ہے کہ سب سے پہلی چیز موافقت عمل ہے، اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ شریعت انبیاء کے خلاف عمل کرتے ہیں، اللہ کے ساتھ شرک والے عمل کرتے ہیں، ان کے عمل ہمارے پاس آئے تو ہم نے ان کو ہوا میں اُڑا دیا، جیسے روئی اُڑاتے ہیں۔ یعنی ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آخرت میں بھی ان پر کوئی ڈر نہیں ہوگا اور نہ موت کی پریشانی ہوگی، بلکہ وہ تو موت کے لیے تیار ہوتے ہیں، ان کو پتہ ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے اور اس کے بعد تو ہمیں اللہ کی رحمتیں اور

نعمتیں ملتی ہیں۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۱۱۳]

"اور یہودی کہتے ہیں: عیسائی درست راہ پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں: یہودی درست راہ پر نہیں، حالانکہ یہ دونوں فریق کتاب کو پڑھتے ہیں۔ اسی طرح سے ان لوگوں نے ان کی سی بات کہی جو جاہل ہیں۔ اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔"

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمایا کہ یہود اور نصاریٰ کا آپس میں بغض و عناد اور تجاوز اور ظلم دیکھو کہ ایک دوسرے کو جھوٹا کہتے ہیں۔ یہودی کہتے ہیں کہ نصرانیوں کے پاس کوئی دلیل، حجت کچھ بھی نہیں ہے، نصرانیوں کا بھی یہی کہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حالانکہ یہ کتاب پڑھنے والے ہیں، یہ جھوٹ بول رہے ہیں کہ جب تک یہودی دین موسیٰ علیہ السلام پر قائم تھے، تورات اللہ کی کتاب تھی، اسی طرح جو نصرانی صحیح معنوں میں عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم تھے، ان کے پاس بھی اللہ کی کتاب انجیل تھی، لیکن ضد میں آکر یہ کہنا کہ کچھ بھی نہیں جیسے آج کل کوئی آدمی جس جماعت یا عقیدہ سے لگ گیا وہ دوسرے کو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ حالانکہ اصول یہ ہے کہ اگر کوئی چیز اچھی ہے تو اس کو اچھا کہیں اور اگر کوئی چیز بری ہے تو اس کو برا کہیں۔ یعنی ایک جماعت اگر اچھا کام کر رہی ہے تو آپ کہیں کہ ان کا کام اچھا ہے، اگر ان کے اندر کوئی خامی یا برائی ہے تو پھر خامی اور برائی کا بھی ان کو کہیں۔ یہ نہیں کہ جس سے بھی اختلاف ہو جائے تو آدمی اس کو باطل قرار دے دے، صرف اپنے آپ کو سمجھے کہ میں حق پر ہوں اور دنیا میں کوئی حق پر نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ ہر انسان کے اندر خامیاں بھی ہوتی ہیں، لیکن جہاں تک ایمان اور اسلام کا تعلق ہے، قرآن اور حدیث میں واضح ہے، ان میں دو باتیں تو ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس کے اندر تو بالکل کھلے ہوئے قاعدے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی اُمت کو چمکتی ہوئی شریعت دے کر جا رہا ہوں، اس کی رات

بھی دن کی طرح روشن ہے، اس کے اندر کا راستہ بالکل صراط مستقیم ہے، مثلاً حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ نماز پڑھو۔ صرف نماز کا حکم نہیں دیا، بلکہ نماز پڑھ کر دکھا دی، آپ ﷺ نے فرمایا: وضو کرو اور آپ ﷺ نے وضو کر کے دکھلا دیا، آپ ﷺ نے جہاد کے حکم کے ساتھ جہاد کر کے بھی دکھا دیا۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم ﷺ کے طریقے پر چل کر اور عمل کر کے ایک ایک مسئلہ امت تک پہنچا دیا، اس کے اندر تو کسی جھگڑے اور اختلاف کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر بعض فروعی مسائل میں اختلاف ہوتا ہے تو اس کو آدمی اتنی اہمیت تو نہ دے کہ ایک دوسرے کو کافر قرار دے کر لڑائی جھگڑے اور فتنہ وفساد کھڑا لے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب بغض آ جاتا ہے تو آدمی ضد میں بڑھتا چلا جاتا ہے اور حدود سے نکل جاتا ہے اور پھر حدود سے نکلنے کے بعد گمراہی ہی گمراہی ہے۔

مسنون عمل کے فوائد:

بہرحال اگر وہ عمل سنت کے مطابق ہے تو "آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا"، اور اگر وہ چیز قرآن، فرمانِ رسول ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کے خلاف ہے تو سیدھی بات ہے کہ وہ گمراہی ہے اور اس پر عمل کرنے سے آدمی گمراہ ہوگا اور وہ دین کے اندر ایجاد کی ہوئی چیز ہے۔ ایک موٹی سی بات ہے کہ آپ کے علاقے یا ملک میں کسی جگہ ایک آدمی ایک مسئلہ بیان کرتا ہے، آپ غور کریں کہ قرآن وحدیث میں ہے؟ اگر نہیں ہے تو اس مولوی صاحب کو بھی علیحدگی میں سمجھاؤ؛ کیونکہ لوگوں کے سامنے اسے چھیڑو گے تو اسے بھی جوش آ جائے گا، پھر تو بات لڑائی میں چلی جائے گی، بات سمجھنے میں نہیں جائے گی۔ جب علیحدہ ہوں اور اس کو علیحدگی میں جا کر بڑے ادب سے پوچھیں کہ حضرت! آپ نے جو مسئلہ بیان کیا ہے، اس مسئلے کے متعلق قرآن وحدیث یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل سے متعلق کوئی ثبوت ہے؟ اگر ہے تو آپ ہمیں دکھلا دیں، آپ بتا دیں کہ فلاں جگہ فلاں کتاب میں ہے، دکھا دیں تو ہماری تسلی ہو جائے، "جَزَاكَ اللهُ" اگر وہ دکھلاتا ہے تو یہ بات بھی یاد رکھ لینا کہ ہر آدمی تو کتابیں لیے پھرتا ہے، ہر آدمی کی کتاب میں تحقیق باعث حجت اور دلیل نہیں ہوتی۔ اب دیکھیں! سارے محدثین نے جو زندگی گزار دی فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف، مردود یا منقطع ہے، اس کا راوی ضعیف، متروک یا رافضی ہے یا یہ راوی جھوٹا یا اس کا حافظہ ختم ہو گیا تھا یا یہ راوی غیر مقبول ہے۔ یہ باتیں اس لیے کیں کہ کوئی آدمی جرأت کر کے حضور اکرم ﷺ کی ذات پر کوئی غلط بات منسوب نہ کر لے، انہوں نے ساری زندگی اس میں محنت کر کے گزاری۔ تو اس کے لیے دو باتیں ہیں کہ ایک عمل اللہ کے لیے خالص ہو اور

دوسری بات کہ وہ عمل خالص محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت کے مطابق ہو۔ اب دیکھیں کہ آدمی جب حمام میں داخل ہوتا ہے تو پہلے کون سا پاؤں رکھے گا؟ بایاں۔ اور پڑھے گا: "اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ"۔ باہر نکلے گا تو دایاں پاؤں رکھے گا اور یہ پڑھے گا: "غُفْرَانَكَ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَذْهَبَ عَنِّي الْأَذٰى وَ عَافَانِي" بظاہر آدمی کے نزدیک چھوٹی سی سنت ہے، لیکن اس کا اتنا بڑا ثواب ہے کہ کروڑوں غیر مسنون عمل کرتے ہو، اس کے ثواب کو نہیں پہنچ سکتے ؛ کیونکہ تم نے اس وقت بھی حضور اکرم ﷺ کی سنت پر عمل جاری رکھا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وضو کرو، نماز پڑھو اور مسواک کرو۔ اب مسواک جو کرتے ہو تو میرے نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ منہ کو پاک کرنے کا اور تیرے رب کو راضی کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لیے محدثین نے لکھا کہ مسواک کرنے سے آدمی کو ستر سے زائد فوائد حاصل ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک یہ کہ مسواک کی سنت پر عمل کرنے والے کا خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ اب اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی کہ خاتمہ ایمان پر ہوجائے اور جنت نصیب ہوجائے۔

اور مشقت کتنی ہے؟ صرف مسواک۔ یہ ایک سنت مبارکہ ہے، لیکن اس میں کئی فوائد ہیں، مثلاً: اس سے تمہارے دانت صاف ہوں گے، غذا اچھی طرح ہضم ہوجائے گی اور تم بیماریوں سے محفوظ رہو گے۔ اگر تمہارا منہ اور دانت گندے ہوں تو غذا بھی گندی ہوکر جائے گی، وہی دانتوں کا زہر آپ کے معدے میں پہنچے گا، معدہ میں پہنچ کر بیماریوں کا سبب بنے گا۔ اس لیے یاد رکھیں کہ سنت کے موافق عمل کرو گے تو جنت بھی ملے گی اور اگر لاکھ تیرا عمل خوبصورت ہو، لیکن بدعت ہو تو اس عمل کا کوئی فائدہ نہیں۔

بدعت کا معنی ومفہوم:

بدعت کا معنی ہے: ایسا عمل کرنا جس کا ثبوت قرآن میں بھی نہ ملے اور حدیث پاک میں بھی نہ ملے، اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم اور خیر القرون میں اس عمل پر ثبوت نہ ملے۔ بعد میں لوگوں نے اسے دین سمجھ کر بنایا ہو، اسی کا نام "بدعت" ہے۔ اس تعریف پر لوگ اعتراض کرکے یہ سوالات شروع کردیتے ہیں کہ یہ جو بٹن پہنے ہوئے ہیں، یہ بدعت نہیں ہیں؟ کیا یہ حضور اکرم ﷺ نے پہنے تھے؟ پوری دنیا میں پہلے گاڑیاں اور ہوائی جہاز وغیرہ نہیں تھے، اب آگئے ہیں، اسی طرح اور بھی بہت سے ٹیکنالوجیز دنیا میں آگئی ہیں اور بہت سی آئیں گی۔ پہلے زمانے میں لوگ

ایک ایک مہینہ سمندروں اور دریاؤں میں رہ کر حج کرنے آتے تھے، اب تین چار گھنٹوں میں بھی پہنچ جاتے ہیں۔ ہم ساڑھے تین چار گھنٹے میں اپنے ملک سے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ دنیا کے اندر جو ایجادات ہیں ان کا دین سے کیا تعلق ہے؟ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں مل نہیں لگی تھی، مل کا کپڑا نہیں ملتا تھا، اب مل لگ گئی ہے، صرف ریشم خالص نہ پہنو، باقی جو مرضی آئے پہن لو، منع نہیں۔ اسی طرح شریعت کے اندر ٹخنوں سے نیچے کپڑا نہ پہنو، اس کے علاوہ جو مرضی پہنو۔ شلوار، تہبند یا پاجامہ اور قمیص چھوٹی ہو یا بڑی کوئی بات نہیں۔ بدعت وہ ہے کہ آدمی دین کے اندر کوئی نیا طریقہ پیدا کرے، اس کو ہم بدعت کہیں گے کہ بدعت کا معنی یہی ہوتا ہے کہ ایسی چیز کا احداث فی الدین کیا جائے کہ جس کا ثبوت قرآن وحدیث اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے نہ ملے۔

آیت کا شانِ نزول:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نجران کے علاقے سے عیسائیوں کا ایک وفد حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا۔

"أَحبار" یا "حَبر" سے ہوتا ہے یا "حِبر" سے۔ "حَبر" کے معنی ہوتے ہیں: زینت۔ کیونکہ دنیا میں قوم کے علماء بھی زینت ہوتے ہیں، علماء سے لوگ پہچانے جاتے ہیں کہ جیسے ایک چھوٹی سی بستی ہو اور وہاں ایک عالم پیدا ہو تو پوری بستی اس عالم کے نام سے جانی جاتی ہے اور ایک بڑے سے بڑا علاقہ ہو وہاں کوئی سرمایہ دار ہو یا مل آنر ہو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ مر گیا تو جان چھوٹی ختم۔ تو علماء جو ہوتے ہیں وہ قوم کی زینت ہوتے ہیں، لیکن کون علماء؟ وہ جو وارثِ انبیاء ہوں۔ ایسے علماء، جو علماء سُوء ہوتے ہیں، اللہ ان کے فتنوں سے بچائے۔ اور دوسرا لفظ ہے: "حِبر" اس کے معنی سیاہی کے آتے ہیں جو قلم میں ڈالتے ہیں وہ سیاہی ہے۔ اب جو لکھا جاتا ہے وہ کافی عرصہ تک باقی رہتا ہے۔ علماء کا علم بھی اسی طرح چلتا رہتا ہے کہ شاگردوں کے شاگرد آتے رہتے ہیں۔ اس لیے احبار بڑے بڑے علماء کو کہتے ہیں اور رہبان یہود ونصاریٰ کے بڑے بڑے پادری، صوفی اور پیروں کو کہتے ہیں۔

بہر حال وہ وفد جس میں یہود ونصاریٰ کے عالم تھے اور ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا تو رافع بن حرملۃ نے ان سے کہا کہ تم تو جھوٹے ہو، میں انجیل کو نہیں مانتا، نصرانیوں نے کہا کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کو بھی نہیں مانتے اور تورات کو بھی نہیں مانتے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ ان کا حال دیکھو کہ یہ ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی

تردید میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ کہتے ہیں کہ تم کسی چیز پر بھی نہیں ہو۔ حالانکہ تورات میں عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری موجود ہے، انجیل کا اُترنا موجود ہے۔ اگر یہ تورات کے ماننے والے ہوتے تو عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتے اور عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں بھی تورات اور موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق موجود ہے، اگر یہ صحیح معنیٰ میں دین عیسیٰ پر ہوتے تو بھی موسیٰ علیہ السلام اور تورات پر اعتراض نہ کرتے اور ایک دوسرے کو کافر نہ کہتے۔

قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابتداء میں جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے، وہ سچے تھے، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا انہوں نے بھی بدعتیں اختیار کیں اور تفرق اختیار کر کے مختلف راستے نکال لیے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت جب اُتری حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں، اس وقت جو یہود و نصاریٰ تھے، اگر یہودی کہتے کہ تم کچھ نہیں تو وہ بھی سچے تھے؛ کیونکہ اس زمانے میں جو یہود موجود تھے وہ جھوٹے تھے۔ نصاریٰ ان کو جھوٹا کہہ رہے تھے، بات تو دونوں سچ کہہ رہے تھے، لیکن اللہ پاک ان کی تردید فرما رہے ہیں کہ یہ غلط کہتے ہیں؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں دونوں جھوٹے ہو چکے تھے، لیکن ابتداء میں اصل تورات اور انجیل تو موجود تھی۔ پھر "مَا أَنْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ" کہنا غلط تھا؛ کیونکہ تورات و انجیل کسی نہ کسی حالت میں موجود تھی، اگرچہ اس وقت والے لوگ ان پر عامل نہ تھے اور تحریف کر چکے تھے۔

اللہ نے فرمایا کہ اسی طرح ان لوگوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ جن کے پاس علم نہیں تھا۔ ان سے کون مراد ہے؟ یہودیوں اور نصرانیوں میں سے جو جاہل ہیں، وہی ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ تم کسی چیز پر نہیں ہو۔ لیکن راجح قول یہ ہے کہ جب یہودیوں نے نصرانیوں کی اور نصرانیوں نے یہودیوں کی تردید کی تو مکہ کے مشرک جو جاہل تھے، ان کے پاس تو کوئی کتاب اور سابقہ دین بھی نہ تھا، یہ مشرکین مکہ تو خالص جاہل تھے، جب ان پڑھے لکھوں نے ایک دوسرے کو جھوٹا کہا تو ان مشرکوں نے کہا کہ تم سب جھوٹے ہو اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ (نعوذ باللہ) حضور پاک ﷺ کا بھی کوئی دین نہیں۔

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ عام ہے۔ یہودی، نصرانی اور پڑھے لکھے، علماء بھی لڑ پڑے تو جاہل یہی کہنے لگے کہ تم بھی کچھ نہیں، ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ ہوں یا صابی دیا مجوسی یا مشرک، سب قیامت کے دن میرے دربار میں حاضر ہوں گے اور ہم ان کے درمیان حق اور عدل کا فیصلہ فرما دیں گے۔ اس

دن واضح ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون غلطی پر ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلانِ حج:

اللہ کا گھر جب بن گیا تو اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا کہ اعلان کرو کہ میرا کعبہ بن گیا ہے، لوگو! حج کرنے کے لیے آؤ۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے باری تعالیٰ! اگر میں یہاں مکہ میں اعلان کروں تو میری کون سنتا ہے؟ وہاں تو قبیلہ بنو جرہم کے علاوہ کوئی قبیلہ آباد نہ تھا، اتنی بڑی آبادی بھی نہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ یہ جو کچے کے اردگرد گھر ہیں، میری آواز ان تک بھی نہیں پہنچی ہوگی تو میں کون سے لوگوں کو بلاؤں کہ حج کے لیے آجاؤ۔ اللہ نے حکم فرمایا کہ تمہارے ذمہ میرے حکم کی تعمیل ہے، تم اعلان کرو، باقی پہنچانا ہمارے ذمہ ہے۔ تمہاری ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ کھڑے ہو کر اعلان کر دو۔ اللہ نے اس آواز کو ایسا پہنچایا کہ پوری دنیا میں آواز پہنچ گئی، حتیٰ کہ بعض روایات میں ہے کہ اگر ماں کے بطن میں بھی کوئی بچہ تھا تو وہاں تک بھی آواز پہنچی اور بعض روایات میں آیا ہے کہ جس نے ندائے خلیل پر لبیک کہا تھا یا جس نے ایک مرتبہ لبیک کہا تھا تو اللہ اسے ایک مرتبہ حاضری نصیب کریں گے اور جس نے دو مرتبہ لبیک لبیک کہا، اسے دو مرتبہ حاضری نصیب کریں گے۔ جس نے عالم ارواح میں لبیک کہا تھا تو اسے تو اللہ ضرور بالضرور بھیجیں گے، خواہ وہ غریب ہو یا امیر، حج کی فرضیت کے لیے اصل مسئلہ غریب یا امیر کا نہیں، مسئلہ ہے فرض ہونے کا کہ بھئی! یہ فرض کس پر ہے ایک یہ ہے؟

جس نے لبیک کہا ہے وہ آئے گا۔ اچھا! یہ بھی علماء نے لکھا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان والے زیادہ آئیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ہمارے ابا حضرت آدم علیہ السلام کو اُتارا گیا تو وہ ہند میں اُترے تھے تو سب سے پہلا حج ہمارے ابا نے ہند سے پیدل چل کر کیا۔ چونکہ ہمارے باپ نے وہاں سے کیا ہے تو اس اولاد میں اثرات زیادہ ہیں بہ نسبت دوسرے ملکوں کے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہندوستان تا بنگال اور پاکستان کے کمزور حاجی آپ کو ایسے بھی نظر آئیں گے کہ ابھی جہاز سے اُتریں گے اور مر جائیں گے، لیکن حج پر آئے ہوئے ہیں۔ اتنے بوڑھے، کمزور اور ہڈیوں کے ڈھانچے چل نہیں سکتے اور لکڑی پکڑ کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ بحری جہاز میں مشقتیں برداشت کر کے کعبہ شریف میں آجائیں تو بے چاروں کو یہ تک پتہ نہیں کہ کعبہ شریف کدھر ہے، کوئی پتہ نہیں کہ صفا اور مروہ کدھر ہے، طواف کرتے کوئی بھول جائے تو بے چاروں کو دس دن تک تو گھر تک نہیں ملتا۔

دخولِ جنت اللہ کے فضل سے ہوگا:

(حدیث) صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ جو لوگ جنت میں جائیں گے وہ اپنے اعمال سے جائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جنت میں جائیں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں! میں بھی۔ یعنی انبیاء علیہم السلام بھی اللہ کے فضل سے جنت میں جائیں گے۔

چنانچہ اہلسنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ جو جنت میں جائے گا وہ اللہ کے فضل سے جائے گا اور جو جہنم میں جائے گا وہ اللہ کے عدل سے جائے گا۔ اللہ کسی کو جہنم میں نہیں ڈالتے جب تک اس کے ساتھ عدل کا تقاضا پورا نہیں ہوتا اور جنت دیتے ہیں تو وہ بھی مہربانی ہے۔

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۚ أُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَّدْخُلُوْهَآ إِلَّا خَآئِفِيْنَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْأٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١١٤﴾﴾ [البقرة:١١٤]

''اور کون بڑا ظالم ہے اس سے جو اللہ کی مساجد سے روکے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور وہ اس کے ویران کرنے کے درپے ہو (ان کو جہاد کے ساتھ خوف زدہ کرو کہ) یہ لوگ ان میں داخل نہ ہونے پائیں، مگر خوف زدہ ہو کر، ان کے لیے دنیا میں ذلت ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔''

اب فرمایا کہ اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد سے روکنے والا ہے کہ ان میں اللہ کا ذکر نہ ہو اور کوشش کرتا ہے کہ ان مسجدوں کو ویران و منہدم کردے۔ فرمایا: جو یہ کرنے والے ہیں، ان کے لیے سزا ہے کہ دنیا میں بھی رُسوا کریں گے اور آخرت میں ان کو بہت بڑا عذاب ہوگا۔ اس آیت کا ماقبل سے تعلق یہ ہے کہ سب سے بڑی مساجد تین ہیں: ایک اللہ کا کعبہ مسجد الحرام اور دوسری مدینہ منورہ کی مسجد (مسجد نبوی) اور تیسری بیت المقدس (مسجد اقصیٰ)۔ یہ تینوں سب سے افضل اور شان والی مسجدیں ہیں، جن کا مقابلہ دنیا کی کوئی مسجد نہیں کرسکتی۔ اگرچہ آیت میں ﴿مَسٰجِدَ اللّٰهِ﴾ کا حکم سب مسجدوں کے لیے مشترک ہے۔

بیت اللہ و مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم و مسجد اقصیٰ کس نے بنائیں؟

بعض مسجدیں علماء اور بعض اولیاء اللہ اور بعض عام مسلمانوں نے بنائیں، لیکن یہ کعبہ تو ایسا ہے جو اللہ کے حکم سے

سب سے پہلے ملائکہ نے بنایا۔ پھر آدم علیہ السلام نے، پھر حضرت ادریس علیہ السلام نے اور پھر حضرت نوح علیہ السلام نے بنایا۔ اور مدینہ کی مسجد بھی اتنی شان والی ہے کہ جس کی بنیاد خود حضور اکرم ﷺ نے رکھی، وہاں زندگی کا ایک حصہ گزارا، نمازیں پڑھائیں، دس سال کی زندگی آپ ﷺ کی مدینہ میں گزری۔ اور مسجد اقصیٰ بھی بڑی شان والی مسجد ہے، جس کو حضرت داؤد علیہ السلام وسلیمان علیہ السلام نے بنایا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ مدنی کریم ﷺ کے وزیر امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بنایا، مسجد اقصیٰ کی شان اتنی بڑی ہے کہ اللہ چاہتے تو اپنے محبوب کو سیدھا معراج کی رات آسمان پر لے جاتے، لیکن اللہ پاک پہلے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئے، وہاں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء سے ملاقات ہوئی اور پھر وہاں سے معراج شروع ہوا۔ اس لیے قرآن پاک نے صاف کہہ دیا: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①﴾ [الاسراء:١] میرے مدنی! ہم آپ کو اس مسجد کی طرف لے جا رہے ہیں جس کے اردگرد ہم نے ظاہری اور باطنی دونوں برکتیں رکھی ہیں۔ ظاہری برکتیں یہ ہیں: پھل، فواکہ، نہریں اور چشمے۔ باطنی برکتیں یہ ہیں کہ اس زمین سے اللہ نے سینکڑوں انبیاء پیدا فرمائے۔

مساجد کو ویران کرنے کا معنی:

پہلے تو قبلہ بیت المقدس تھا، پھر بیت اللہ بنا تو یہودیوں نے نسخ کا انکار کیا اور کہا کہ یہ حکم غلط ہے کہ پہلے قبلہ بیت المقدس تھا، اب یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تو اس حکم کو غلط کرنے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ بدظن ہوں اور اللہ کی مسجدیں برباد ہوں؛ کیونکہ لوگوں کے دماغ میں شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ پتہ نہیں، وہ قبلہ سچا تھا یا یہ قبلہ سچا ہے تو اس کی وجہ سے دونوں گھروں میں آنے سے رک جائیں گے۔ برباد کرنے کا اصل سبب یہودی بنے۔ اسی طرح نصرانیوں نے یہود کا مقابلہ کیا اور بیت المقدس کو برباد کر دیا۔ ستر ہزار یہودیوں کو تو صرف بخت نصر کے زمانے میں قتل کرایا۔ انہوں نے بھی مسجدوں کو ویران کیا۔ مکہ کے مشرکین نے بھی چوکیاں بٹھادیں کہ مسلمانوں کو کعبہ میں نہ آنے دیں اور محمد ﷺ کو بھی نہ آنے دو۔ حضور اکرم ﷺ حدیبیہ میں بیٹھے ہیں، کافر اندر نہیں آنے دے رہے تو ان سب نے اللہ کے گھروں کو ویران کرنے کی کوششیں کیں۔ یہودیوں نے مدینہ منورہ میں بھی یہی کوشش کی کہ مکہ والوں سے مل کر مدینہ پر حملہ کروایا، تاکہ مسجد نبوی ویران ہوجائے۔ اس لیے اللہ پاک نے پہلے ان تین جماعتوں کا ذکر کیا، اس کے

بعد یہ آیت آئی:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا﴾ [البقرۃ: ۱۱۴]

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ان کی بات کا رد فرمایا کہ اگر تم جنت میں جانے کا دعویٰ کرتے ہو اور اپنے آپ کو اللہ کا محبوب سمجھتے ہو تو جو اللہ کا پیارا ہوگا وہ اللہ کے گھروں کو برباد نہیں کرے گا۔ اگر تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں اور یہ دعویٰ ہے کہ جنت میں کوئی نہیں جائے گا، مگر یہود و نصاریٰ، تم تو دنیا میں جنت کے دعویدار ہو اور تمہارا عالم تو یہ ہے کہ تم اللہ کے گھروں کو برباد کر رہے ہو۔ اگر تم اللہ کے دوست، پیارے اور فرمانبردار ہوتے اور واقعتاً تم صحیح معنوں میں جنت کے حق دار ہوتے تو اللہ کے گھروں کو برباد کیوں کرتے؟ ان آیات میں جو حکم ہے وہ تمام روئے زمین کی مساجد کے لیے ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ بھی ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ﴾ [التوبۃ: ۱۸] اس آیت میں اللہ نے اپنے ماننے والوں کے ذمہ لگایا کہ جہاں بھی مسجد ہو، اس مسجد کا آباد کرنا ایمان کی نشانی ہے اور مسجد کا ویران کرنا کفر کی نشانی ہے۔ اب مسجد کی بربادی ایک تو ظاہراً ہوتی ہے جسے تخریب ظاہری کہا جاتا ہے، جیسے مسجد کو توڑ دینا اور گرا دینا، مسجد کا نام و نشان مٹا دینا، یہ بھی مسجد کا برباد کرنا ہے۔ اور ایک ہے مسجد کی تخریب معنوی یا تخریب باطنی، اس میں مسجدوں کو تو نہیں گرایا جاتا، لیکن اس میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ مسجدوں میں کسی کو آنے نہ دیا جائے۔ تو جب مسجد میں کوئی نہیں آئے گا تو مسجد برباد اور ویران ہوگی۔

مساجد کو ویران کرنے میں یہود و نصاریٰ کا کردار:

یہ تو یا تخریب ظاہری ہے جیسے کہ یہودیوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام جو اللہ کے پیغمبر حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے ہیں، ان کو قتل کر دیا۔ یہ سابقہ دور سے چلا آرہا ہے۔ یاد رکھو کہ جتنے حق والے ہوتے ہیں وہ کافروں کے ہاتھ سے ہمیشہ شہید ہوتے ہیں، حتیٰ کہ بعض انبیاء بھی ان کے ظلم نہ بچ سکے، بلکہ بنی اسرائیل نے تو سینکڑوں ہزاروں انبیاء تک کو قتل کیا۔ حالانکہ اللہ نے ستر ہزار یا اس سے بھی زیادہ انبیاء ان کی نسلوں میں بھیجے، لیکن ان ظالموں نے ناحق گناہ کیے، حالانکہ انبیاء تو معصوم ہوتے ہیں اور نبی کا قتل تو کبھی حق ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ اللہ نے ان کے لیے ''بِغَيْرِ الْحَقِّ'' کہہ کر ان کے ظلم کو اور آشکارا کر دیا کہ میرے پیغمبروں کو انہوں نے ناحق قتل کر دیا اور ستر ستر نبی ایک دن میں قتل ہوئے۔ اسی طرح

تاریخ عالم پر نظر ڈالیں تو اسی طرح حق والے باطل والوں کی تلواروں کے نیچے آئے۔ ہمیشہ حق والوں نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے قربانیاں دیں، ہمیشہ حق والوں نے اللہ کے لیے قید، صعوبتیں اور جیلیں برداشت کیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو جب یہودیوں نے قتل کیا، اس وقت روم کے جو نصاریٰ تھے ان کے بادشاہ کا نام طیطلوس تھا، اس کو نصاریٰ نے تیار کیا کہ ہم یہودیوں سے بدلہ لیں گے اور اس زمانے میں عراق کے اندر بھی ایک مجوسی بادشاہ تھا۔ بعض مؤرخین نے اس کا نام بخت نصر لکھا ہے۔ ویسے یہ بات تاریخی اعتبار سے غلط ہے؛ اس لیے کہ بخت نصر کا جو زمانہ ہے وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بہت پہلے کا ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ بادشاہ دوسرا ہو، وہ بخت نصر اوّل ہو اور اسے بخت نصر ثانی سمجھا جاتا ہو۔ جیسے مصر کے بادشاہوں کا لقب فرعون ہوتا تھا، حبشہ کا جو بادشاہ ہوتا اس کا لقب نجاشی ہوتا تھا اور روم کے بادشاہ کا لقب قیصر ہوتا تھا اور فارس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ ہوتا تھا۔ اسی طرح اس کا لقب بھی بخت نصر ہوسکتا ہے، اس لیے شاید اس کا لقب بخت نصر ثانی ہو۔ بخت نصر اوّل جو بھی ہو ہی نہیں سکتا تو اس طیطلوس نے بخت نصر ثانی سے مدد مانگی کہ یہودی اب اپنے ظلم و جور میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالا تو اس یہود بے بہبود قوم سے ہم انتقام لینا چاہتے ہیں، تم ہماری مدد کرو۔ اس بادشاہ نے بھی اپنی افواج اور طیطلوس نے بھی روم سے اپنی افواج نکال کر بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کا محاصرہ کرلیا، یہودیوں کو قتل کر کے ان کی جائیدادیں ویران کر ڈالیں، لیکن اس کے ساتھ ان ظالموں نے یہ کیا کہ یہود تو دشمن تھے، لیکن اللہ کا گھر بیت المقدس کو بھی برباد کر دیا، بیت المقدس کو بھی انہوں نے منہدم کر دیا اور مسجد کے اندر نجاسات پھینکی گئیں اور مسجد کے اندر خنزیر ذبح کر کے اس کا گوشت اور خون پھینکا گیا۔ یہ وہی بات ہے جو آج بھی کافر دہراتے ہیں کہ مسلمانوں کے گھروں اور ان کی مسجدوں میں آ کر خنزیر ڈال دیتے ہیں، خون ڈال دیتے ہیں۔ یہ یہود و نصاریٰ کی پرانی رسم ہے۔ انہوں نے جہاں یہودیوں کا قتل عام کر ڈالا اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مسجد اقصیٰ کو بھی برباد کر دیا۔

مساجد کی آباد کاری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا کردار:

اور یاد رکھیں کہ یہ مسجد اقصیٰ اتنے عرصے تک منہدم اور ویران رہی، جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو اس وزیر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی افواج بھیجیں اور ساتھ انہیں یہ بھی حکم دیا کہ مسجد اقصیٰ چونکہ اللہ کا گھر ہے اور یہ قبلہ انبیاء ہے، اسے داؤد علیہ السلام نے بنایا ہے، اس گھر کو دوبارہ تعمیر کیا جائے، پھر اس کو آباد کیا سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے۔ اور یہ

خدا کی شان ہے کہ اللہ جس کے نصیب میں کوئی بات رکھ دے، اسے کون روک سکتا ہے؟ یعنی آج دنیا میں کوئی دشمن سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نہ ماننے والا بھی اور آپ رضی اللہ عنہ کے نام سے نفرت کرنے والا بھی یہ انکار نہیں کرسکتا کہ مسجد اقصیٰ کو آباد کرنے والا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھا۔ آپ اندازہ کریں کہ قبلہ اوّل کی آبادی ظاہری بھی کی، اس کو دوبارہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تعمیر کرایا اور آج آپ جس قبلہ کے اندر نماز پڑھ رہے ہیں، اس قبلہ کی معنوی آبادی بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ذریعے ہوئی تھی، یعنی مسجد اقصیٰ کی تو آپ رضی اللہ عنہ نے تعمیر بھی دوبارہ کرادی اور اللہ کا کعبہ، ابتدائے اسلام میں جب سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت فرمایا تو ابتدائے اسلام میں جتنی نمازیں، عبادت اور اللہ کا ذکر ہوتا تھا، وہ ذکر خفیہ طریقے سے ہوتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے، انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی دن کلمہ پڑھا اور اپنا ہاتھ نبوت کے ہاتھ میں دیا تو غیرتِ فاروقی نے یہ برداشت نہ کیا کہ ہم اب بھی چھپ کر نماز پڑھیں۔ انہوں نے سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ الحمدللہ! میں مسلمان ہوگیا ہوں، میں ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت اللہ کے نزدیک حق نہیں ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بالکل حق ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ کیا یہ باطل اور بت اور ان کی بت پرستی کے باطل ہونے میں کوئی شبہ ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بالکل نہیں، وہ باطل پر ہیں اور ہم حق پر ہیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ غیرتِ فاروقی یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ جھوٹے خدا کے ماننے والے تو کعبے میں کھل کر عبادت کریں اور ہم سچے خدا کے ماننے والے چھپ کر عبادت کریں۔ یہ میری غیرت کے خلاف ہے۔ آپ مہربانی کریں، آپ آگے چلیں، آج ہم جتنے مسلمان ہیں تیس ہیں یا چالیس، اور قلیل ہیں، لیکن ایمان تو ہمارے اندر موجود ہے تو سب سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آگے چلے اور پیچھے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور پھر امیر حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تلوار ان کے ہاتھ میں ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے قریشیو! اگر کسی کو شوق ہو اپنی بیوی کو بیوہ کرانے کا، بچوں کو یتیم کرانے کا تو میرے سامنے آئے، کیونکہ عمر مسلمان ہو چکا ہے، آج کعبہ میں تمہاری بات نہیں چلے گی۔ اس کعبہ کو آباد کرنے کا ذریعہ بھی عمر بنا اور مسجد اقصیٰ مسلمانوں کے قبضہ میں رہی، تو پھر کافی عرصہ گزر جانے کے بعد جب ضعف آگیا اور مسلمانوں کے اندر کمزوری کے پہلو داخل ہونا شروع ہوگئے تو (نعوذ باللہ) پھر اس پر کفار نے قبضہ کرلیا تو مسجد اقصیٰ پھر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر کافروں کے ہاتھ میں چلی گئی اور پھر چھٹی صدی ہجری میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے دوبارہ جنگ لڑ کر مسجد اقصیٰ کو آزاد کرایا،

اس نے پھر کافروں سے چھینا۔

مسجد اقصیٰ ضرور آزاد ہوگی:

اور آج بدقسمتی سے ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے پھر کافروں کے ہاتھ آگئی ہے، لیکن ان شاء اللہ! ہمیں اپنے اللہ کے فرمان اور فرمانِ رسول ﷺ پر ایسا یقین ہے کہ جیسے اب رات ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور جیسے اللہ کا گھر ہمارے سامنے ہے اور کعبہ میں ہمیں کوئی شبہ نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے فرمان میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ پوری روئے زمین پر اسلام کو پھر غالب کردیں گے اور فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہود کو کہیں پناہ نہیں ملے گی، اگر یہ کسی پتھر یا درخت کے پیچھے چھپیں گے تو وہ بول پڑیں گے: اے مسلمان! ادھر آؤ، میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے، اس بدبخت کو قتل کردو۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ اسلام کا سورج پھر پوری آب وتاب سے چمکے گا۔ پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہوگا۔

اسلام ہر غریب وامیر کے گھر میں داخل ہوگا:

جیسا کہ میرے مدنی سرکار ﷺ نے فرمایا: کوئی مٹی کا بنا ہوا گھر یا بالوں کا بنا ہوا خیمہ نہیں بچے گا، مگر اسلام اس کے اندر داخل ہوکر رہے گا۔ فرمایا کہ اسلام کا داخلہ عزت کے ساتھ ہوگا، اسلام میں لوگ اگر عزت سے داخل نہیں ہوں گے تو پھر عاجز ہوکر سرنگوں یا ذلیل ہوکر اسلام کی حقانیت کو جان لیں گے۔

اسی طرح اللہ نے قرآن مقدس میں دو مقام پر فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ [الصف: ۹] فرمایا کہ میرے مدنی! ہم تیرے دین کو تمام ادیان پر غالب کردیں گے۔ اور ایک جگہ فرمایا: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ [التوبۃ: ۳۲] اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ ان دونوں لفظوں میں اشارہ ہے کہ یہ نہیں اسلام صرف کافروں پر غالب ہوگا، بلکہ کافروں کی جتنی انواع ہیں: یہودی، نصرانی، بدھ مت، ہندومت یا جو بھی مذاہب ہیں، اللہ سب پر اسلام کو غالب کردے گا۔ بہرحال اللہ پاک ہم سب مسلمانوں کو حق بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حدیبیہ کے مقام پر حضور اکرم ﷺ کو روکا گیا، آخر نتیجہ یہ نکلا کہ حضور اکرم ﷺ بغیر عمرہ کے واپس مدینہ تشریف لے گئے۔ اللہ نے فرمایا: حالانکہ تم لوگوں کو تو یہ چاہیے تھا کہ جب تم اللہ کے گھروں میں داخل ہوتے تو

ڈرتے ہوئے داخل ہوتے، کہیں بے ادبی اور اللہ کے گھر کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔ اسی لیے مسنون ہے کہ جب آدمی مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرے اور اللہ کا ذکر کرے۔

مشرکین مکہ کو دنیا کی رُسوائی اسی دن حاصل ہوئی تھی جس دن حضور اکرم ﷺ اپنی جماعت کے ساتھ اسلام اور توحید کا پرچم لہراتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے اور بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ بلال! یہ اللہ کا گھر ہے، جس میں مشرک ہمیں داخل نہیں ہونے دیتے تھے، آج الحمد للہ! ہم فاتح مکہ کی حیثیت سے کعبہ میں داخل ہو رہے ہیں، آج تم کعبے کی چھت پر چڑھ جاؤ اور اذان بلند کرو۔

تو اللہ نے فرمایا کہ دنیا کی ذلت تو تمہیں پہنچے گی اور آخرت میں بھی تمہارے لیے دردناک عذاب ہے۔

مساجد کی رونق عمارت سے نہیں، نمازیوں سے بنتی ہے:

مسجدوں کو آباد کرنا ایک تو یہ ہے کہ ظاہر میں بڑی بڑی خوبصورت مسجدیں بنانا۔ یہ آباد کرنا نہیں ہے۔ مسجدوں کی آبادی نماز پڑھنے سے ہوتی ہے چاہے مسجد کچی ہو۔ حضور اکرم ﷺ نے جب مسجد نبوی بنائی تو اس کی دیواریں کچی تھیں اور کھجور کی چھڑیاں ڈالی ہوئی تھیں، جب بارش ہوتی تھی تو چھت ٹپکتی تھی اور سب کے کپڑے گیلے ہو جاتے تھے اور زمین پانی سے تر ہو جاتی تھی اور اسی کیچڑ کے اندر سجدہ اور اسی میں نمازیں ہوتی تھیں، لیکن اس مسجد کا مقابلہ دنیا کی کون سی مسجد کر سکتی ہے؟ اس لیے اصل آبادی مساجد کی یہ ہے کہ وقت پر اذان اور جماعت ہو، اللہ کے ذکر سے مسجدوں کو آباد کیا جائے۔ ہاں اس کے ساتھ اللہ کی توفیق ہو کہ اللہ کا گھر خوبصورت بنائے تو منع نہیں ہے، لیکن اصل مسجد کا آباد رہنا عمارت کا نام نہیں ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: "مَسَاجِدُهَا عَامِرَةٌ وَ هِيَ خَرَابٌ عَنِ الْهُدَى"[] کہ میری امت پر ایک وقت آئے گا، بڑی خوبصورت مسجدیں بنائیں گے، جو بڑی مزین ہوں گی، لیکن نماز پڑھنے والے نہیں ہوں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کو علاماتِ قیامت میں شمار کیا ہے۔ جیسا کہ اقبال مرحوم نے کہا ہے:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں سے نمازی بن نہ سکا

﴿وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا﴾ کی تفسیر:

مسجدوں کو آباد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں نمازیں اور اللہ کا ذکر زیادہ ہو۔ اور مسجدوں کی آبادی میں یہ بھی داخل ہے کہ ایسے امام بنائیں جو قرآن وحدیث کو سمجھنے والے، قاری القرآن ہوں، ایسے امام نہ بنائیں کہ جو قرآن بھی صحیح نہ پڑھیں۔ اسی طرح مسجدوں کو گرانا بھی بربادی ہے اور مسجد سے کسی کو روکنا بھی بربادی ہے۔ بلکہ علماء نے فرمایا کہ اگر کوئی مسجد سے تو نہیں روکتا، لیکن مسجد کے قریب اس نے گانے بجانے کی کوئی دکان بنا رکھی ہے یا ریڈیو یا ٹی وی کی دکانیں یا لاؤڈ سپیکر لگا دیتے ہیں، ہر دو منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی گانا چل رہا ہے، یہ بھی مسجد کی بربادی ہے، اس کو بھی مسجد سے روکنے والا سمجھا جائے گا۔ اور اسی طرح اگر کوئی مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے اور ایک آدمی زور زور سے قرآن پڑھتا اور ذکر کرنا شروع کر دیتا ہے تو دوسروں کی نماز خراب کر دی، تو یہ بھی مسجدوں سے روکنے والا ہے۔ ہاں! اگر مسجد خالی ہے، کسی کو حرج نہیں ہوتا تو آپ اللہ کا ذکر زور سے اور قرآن زور سے پڑھ سکتے ہیں، اور اسی طرح مسجدوں میں ایسے کام کیے جائیں جو حضور اکرم ﷺ سے ثابت نہ ہوں، یعنی جو چیزیں قرآن وسنت کے خلاف ہوں، نئی نئی بدعتیں ایجاد کی جائیں؛ کیونکہ سنت کے ذریعے آبادی اور بدعت کے ذریعے بربادی ہوتی ہے، یہ بھی مسجدیں ویران کرنے کا ذریعہ ہیں۔

مسجد کے آداب:

آدمی پاک لباس پہن کر مسجد میں داخل ہو جو اللہ نے اس کو دیا ہے۔ مسجدوں کے احترام میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اپنا ناک صاف کر کے مسجدوں میں نہ پھینکو اور مسجد میں باہر کی کوئی گندی چیز مت لاؤ، اور اگر تم نے کوئی لہسن، پیاز یا کوئی بدبودار چیز کھائی ہو یا سگریٹ، حقہ پیتے ہیں، نسوار اور نشہ کھاتے ہو تو اپنا منہ صاف کر کے مسجد میں جاؤ۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو لوگ کچے پیاز کھائیں اور لہسن کھائیں، فرمایا کہ وہ جماعت میں نہ آئیں؛ کیونکہ اس سے نمازی کو ایذاء ہوتی ہے، ساتھ جو کھڑا ہو اس کے لیے تو آپ نفرت کا باعث بن جائیں گے اور گویا آپ اس کو مسجد سے روکنے کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اور یہ بھی آدابِ مسجد میں شامل ہے کہ جب آپ مسجد میں داخل ہوں تو پہلے دایاں قدم رکھیں اور یہ دعا پڑھیں: ''بِسْمِ اللّٰهِ وَ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ وَ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ''۔ اسی طرح مسجد کے آداب میں یہ شامل ہے کہ جب آپ باہر نکلیں تو پہلے بایاں پاؤں

باہر رکھیں اور اس کے بعد پڑھیں: "بِسْمِ اللّٰهِ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذُنُوْبِیْ وَ افْتَحْ لِیْ أَبْوَابَ فَضْلِكَ" مسلمانو! یہ صلوٰۃ وسلام کے موقع ہوتے ہیں اور اسی طرح آپ نماز کے اندر بھی پڑھتے ہیں: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ"، نماز پڑھیں گے تو اس میں بھی پڑھیں گے درود ابراہیمی۔

تحیۃ المسجد کے مسائل:

تو اصل جو طریقہ کار ہے جو اللہ کے نبی نے خود سکھایا ہے اور اسی طرح مسجدوں کے اندر داخل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ توفیق دے تو دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کریں۔

فجر کی اذان ہوگئی، آپ اب مسجد میں داخل ہوئے تو اب جو دو رکعت سنت فجر سے پہلے پڑھنی ہے، بس وہی پڑھ لو۔ اسی کے اندر تحیۃ المسجد بھی آگئی اور سارے حق ادا ہو گئے اور ان کے بعد فجر کے فرض پڑھنے کے علاوہ کوئی نماز نہ پڑھو۔ یعنی اسی طرح آپ اب عشاء سے پہلے آئے، اپنی چار سنتیں جو غیر مؤکدہ ہیں یا دو سنتیں پڑھ لیں، تحیۃ المسجد بھی اسی میں آگئی۔ ہاں اگر وقت موجود ہے اور آپ اذان کے بعد آئے اور نماز تک دس یا پندرہ منٹ کا وقفہ ہے تو آپ تحیۃ المسجد کی دو رکعت بھی پڑھ لیں اور پھر سنت بھی ادا کرلیں۔ زیادہ سے زیادہ جتنی محنت کریں گے، اللہ پاک اتنا ہی اجر عطا فرمائیں گے۔

عصر اور فجر کے بعد تحیۃ المسجد کا حکم:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر مکروہ وقت ہے تو تحیۃ المسجد بھی نہ پڑھی جائے، یعنی اگر عصر کے بعد مسجد میں داخل ہوں تو مغرب تک تحیۃ المسجد نہ پڑھیں اور فجر کے بعد مسجد میں داخل ہوں تو سورج نکلنے تک تحیۃ المسجد نہ پڑھیں۔

مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں نماز کی فضیلت اور ثواب:

مسجد نبوی کی فضیلت ہے کہ حضور اکرم ﷺ ہجرت فرمانے کے بعد جب مدینہ تشریف لے آگئے تو جس مسجد کو میرے نبی ﷺ نے ہاتھوں سے بنایا اور جس میں آپ ﷺ نے خود امام بن کر دس سال تک نمازیں پڑھائیں، اس مسجد کی فضیلت بھی بہت بڑی ہے۔ اور بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اس میں ایک نماز پچاس ہزار نماز کے برابر ہے، لیکن زیادہ راجح اور صحیح حدیث مبارک میں ایک نماز ایک ہزار کے برابر ہے۔

لیکن ایک بات کا فرق سمجھ لیں کہ ایک ہزار یا پچاس ہزار کا ثواب ان لوگوں کو ملے گا جو مسجد نبوی میں نماز

پڑھیں، مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ پاک کی کسی اور مسجد میں نماز پڑھے تو یہ فضیلت نہیں ملے گی۔ لیکن مسجد حرام میں نماز باجماعت پڑھیں گے تو ستائیس لاکھ نمازوں کا ثواب ملے گا اور اگر آپ نے حرم میں اکیلے بھی ادا کی تو ان شاء اللہ! ایک لاکھ کا ثواب اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے۔ چونکہ رحمت کے معاملے میں آدمی کو ان اعمال پر عمل کر لینا چاہیے جن میں زیادہ ثواب ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [البقرۃ:۲۶۱] میں چاہوں تو جتنا جس کا اجر و ثواب بڑھا دوں۔ اس لیے فرمایا کہ میری رحمت جو ہے وہ ہر چیز سے زیادہ ہے۔ اور تیسری مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس ہے، وہاں ایک نماز پڑھنے کا ثواب ایک ہزار کے برابر ہے۔ یہ تین مساجد دنیا کی تمام مساجد میں افضل، اعلیٰ اور اشرف ہیں۔

مساجد کے متعلق چند مسائل:

جب آپ نے ایک جگہ مسجد بنا دی تو یہ اللہ کا گھر ہے، پھر اس میں آپ کوئی تصرف نہیں کر سکتے، یعنی اس کو توڑ کر مکان یا دکان نہیں بنا سکتے۔

میرے ایک دوست تعلق والے ہیں، وہ ڈی سی کے عہدہ پر تھے، انہوں نے مجھے بڑے فخر سے بات سنائی۔ کہنے لگا: جی ماشاء اللہ! اللہ کی رحمت اور توفیق سے میں جس ضلع بھی جاتا ہوں، وہاں مسجد بناتا ہوں۔ میں نے کہا: وہ مسجد آپ کیسے بناتے ہیں؟ اس نے کہا کہ مسجد کے لیے ہم چندہ مقرر کر دیتے ہیں کہ جو آدمی کام کے لیے آتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ دس روپے مسجد کے لیے دے دو، اور کاموں کے معیار کے مطابق یومیہ ہزار روپے لیتے ہیں، اگر کوئی بڑی پارٹی آ گئی تو اس سے پچاس ہزار روپے یا دس ہزار روپے مسجد کے لیے لے لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ حضرت! اس طرح تو مسجد بنوانا حرام ہے! کیونکہ جو آدمی اپنے اقتدار کے دباؤ سے کسی سے پیسہ لیتا ہے، یہ بھی رشوت ہے۔ اس لیے آپ مہربانی فرما کر ایسی مسجدیں نہ بنوایا کریں، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اپنے حلال کے پیسے سے ایک چھپر ڈال دیں اور وہاں لوگوں کو نماز پڑھوا دیں، اس سے آپ کو زیادہ ثواب ملے گا۔

زکوٰۃ کا پیسہ بھی مسجدوں پر نہیں لگ سکتا۔ زکوٰۃ کے پیسے کا مصرف وہی ہے جو اللہ نے معین کر دیا ہے، اس کے علاوہ کسی پر صرف نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح جو مسجد بن گئی، لیکن اس میں پانی کا انتظام نہیں ہے تو یہ بھی مسجد کو ویران کرنے کے مترادف ہے۔ مثلاً

جب ہم سفر میں ہوتے ہیں، کئی مساجد ایسی ہوتی ہیں جن میں نماز کے لیے رک جاتے ہیں، لیکن وہاں پانی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اب وضو کہاں جا کر کریں؟ ہم نے ایسی بھی مساجد دیکھی ہیں کہ ان کے اندر اتنا بڑا گھاس کھڑا ہوا ہے اور ایسے لگتا ہے کہ اس میں کبھی بھول کر بھی کوئی آدمی داخل نہیں ہوا۔ اسی طرح شریعت نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اگر اللہ نے آپ کو گھر دیا ہے تو اپنے گھر میں بھی ایک چھوٹی سی جگہ مسجد بنالو کہ عورتیں وہاں نماز پڑھیں اور ان کو مسجد کا ثواب ملتا رہے۔ یہ بھی اللہ مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے گھروں کو آباد کرنے والے ہیں۔ واللہ اعلم۔

مساجد کو ویران کرنے والے کون لوگ ہیں؟

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مفسرین کا اس بات کا اختلاف ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کی مساجد سے روکا اور ان کو ویران کرنے اور خراب کرنے کی کوشش کی، اس سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس میں دو قول ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کی مساجد سے روکا اور ان کی ویرانی کی کوشش کی، وہ نصاریٰ ہی ہیں؛ کیونکہ نصرانی بیت المقدس کی مسجد میں گندگی ڈالا کرتے اور لوگوں کو منع کرتے کہ اس میں نماز نہ پڑھیں؛ کیونکہ بیت المقدس کے ساتھ یہودیوں کی عقیدت ہے اور یہودیوں اور نصرانیوں کی آپس میں بڑی دشمنی تھی، اس لیے نصرانی کوشش کر رہے تھے کہ بیت المقدس کو ویران کریں اور اس میں کوئی گندی چیزیں ڈال دیں اور لوگوں کو منع کریں۔

عبدالرزاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا﴾ سے مراد بخت نصر اور اس کے ساتھی ہیں کہ بخت نصر نے مسجد اقصیٰ کو ویران کیا، خراب کیا اور نصرانیوں نے بھی اس کی مدد کی۔

یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ کی مساجد سے روکنے والے اور مساجد کو خراب کرنے والے نصرانی ہیں، یہودیوں سے بغض کرنے کی وجہ سے، کیونکہ انہوں نے بخت نصر بابلی (جو عقیدہ کے طور پر مجوسی تھا) سے مدد لے کر بیت المقدس کو منہدم اور ویران کیا۔

سدی رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں کہ بخت نصر نے چڑھائی کی اور بیت المقدس کو خراب کیا اور حکم دیا کہ اس کے اندر مردار جانور ڈال دیئے جائیں، اس میں روم والوں نے بھی مدد کی کہ بنی اسرائیل کے یہودیوں نے بھی یحییٰ بن

زکریا علیہ السلام کو قتل کیا تھا۔اسی طرح حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نصرانی ہیں۔

دوسرا قول مفسرین کا یہ ہے کہ اس آیت سے مراد مشرکین مکہ ہیں، جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عمرہ کرنے سے منع کر دیا اور حدیبیہ کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جانور وہیں ذبح کر دیئے اور بغیر عمرہ ادا کیے واپس مدینہ پاک تشریف لے گئے۔حالانکہ اس زمانے میں مشرکین مکہ کا کعبہ کے احترام کا یہ عالم تھا کہ ان کے باپ کا قاتل بھی مل جاتا تھا تو حرم میں قتل نہیں کرتے تھے،لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دیا۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے قول سے حجت پکڑی کہ قریش نے اللہ کے کعبے کو خراب اور منہدم نہیں کیا اور نصرانیوں نے تو بیت المقدس کو توڑ ڈالا۔اس لیے آیت سے نصاریٰ مراد ہیں۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر نصرانیوں نے یہودیوں کو منع کیا کہ بیت المقدس میں داخل نہ ہوں تو نصرانی حق پر تھے؛ کیونکہ ان کا دین یہودیوں سے اس وقت زیادہ بہتر تھا؛ کیونکہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم تھے اور یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر اور اپنا دین چھوڑ چکے تھے اور اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان کے ذریعے لعنت بھی بھیجی تھی تو ایسے ملعونوں کو روکا جاتا،لیکن یہ تو نہیں کہ وہ (عیسائی) بیت المقدس کو بھی منہدم کر دیتے۔

ابو جہل کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دوبارہ حملہ کرنا اور اس کا انجام:

ایک دفعہ کعبہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عبادت فرما رہے تھے تو ابو جہل آکر کہنے لگا کہ آئندہ آپ یہاں آکر نماز نہ پڑھا کریں، آئندہ مسجد الحرام اور کعبۃ اللہ کے پاس عبادت نہ کیا کریں۔اور اس بدبخت نے اتنے گستاخانہ الفاظ کہے، کہنے لگا: (نعوذ باللہ) پھر میں آپ کو یہاں نماز پڑھتے ہوئے نہ دیکھوں، ورنہ میں آپ کی گردن مَسل ڈالوں گا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے، اور اس وقت جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی آپ پھر مسجد میں آگئے اور نماز پڑھ رہے تھے تو مکہ کے سرداروں نے ابو جہل کو چھیڑا کہ تم نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو چیلنج کیا تھا کہ میں نماز نہیں پڑھنے دوں گا۔محمد کو دیکھیں! نماز پڑھ رہے ہیں۔ابو جہل گیا اور بڑا پتھر اُٹھا کر لے آیا۔(نعوذ باللہ!) اس نے ارادہ کیا کہ جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدہ میں جائیں گے تو میں پتھر مار کر قتل کر دوں گا۔ابھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک گیا کہ اُلٹے پاؤں واپس آگیا اور کانپتے کانپتے پتھر بھی ہاتھ سے گر گیا۔کفار مکہ نے ابو جہل کو جا پکڑا کہ تم

تو بڑے بہادر ہو، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہنے لگا کہ محمد (ﷺ) اور میرے درمیان آگ کی ایک خندق تھی، اگر میں آگے جاتا تو آگ میں جل کر مر جاتا، اس لیے بھاگ کر واپس آ گیا اور حملہ نہیں کر سکا۔ اسی طرح اس نے دوسری مرتبہ بھی حملہ کرنے کا ارادہ کیا، حضور اکرم ﷺ کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا، لیکن ناکام ہو کر واپس چلا گیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس ذات کی قسم! اگر یہ بدبخت مجھ پر حملہ کرتا تو اللہ کے فرشتے اس کی بوٹی بوٹی کر کے اُڑا دیتے، لیکن آج اس نے جرأت نہیں کی اور وہ ناکام ہو کر واپس لوٹ گیا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ ان سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ کے نبی ﷺ کو مسجد میں نہ آنے دے۔

مساجد اللہ کا گھر ہیں، بندوں کی مِلک نہیں:

اب تو پوری دنیا میں یہ حال ہو گیا ہے کہ اللہ کی مسجدیں تو بہت کم ہیں۔ جس ملک میں چلے جاؤ، کہتے ہیں کہ یہ فلاں پارٹی کی مسجد ہے اور یہ فلاں پارٹی کی مسجد ہے۔ او جی! کوئی اللہ کی مسجد بھی ہے کہ نہیں؟ تو جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں جی، ویسے تو سب اللہ کی مسجدیں ہیں، لیکن ان کے علاوہ دوسری جماعت والا (نعوذ باللہ!) مسجد میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ کتنی مساجد ہیں کہ لوگ تبلیغ کے لیے وہاں گئے تو کتنے لوگوں نے انہیں اُٹھا کر مسجد سے باہر ڈال دیا۔ کپڑے، بستر اُٹھا کر باہر پھینک دیئے، مسجدوں کو دھو ڈالا کہ اس میں کوئی اللہ کا نام لیوا نہیں آ سکتا۔ یعنی اتنا ظلم اور تشدد ہے کہ بس ایک ٹھیکیداری ہے کہ یہ اگر دیوبندی کی ہے تو بریلوی نہیں آ سکتا، کسی بریلوی کی ہے تو دیوبندی نہیں آ سکتا، اہل حدیث کی مسجد میں حنفی نہیں آ سکتا، کوئی آمین کہہ دے تو بس لڑائیاں شروع ہو گئیں، یعنی اپنے فسادات اور وہ بھی مسلمانوں میں ہیں۔

اللہ کے بندو! اللہ کی مسجدیں تو ہوتی ہی اللہ کے لیے ہیں، اگر مسجد تمہاری مِلک ہے تو وہ اللہ کا گھر تو نہیں رہا۔ ﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ [الجن:۱۸] تمام مساجد اللہ کے لیے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ یہ مسجدیں اللہ کے گھر ہیں، ان کے اندر اللہ کا ذکر کیا جائے، اللہ کا نام بلند کیا جائے، اس میں نمازیں ہوں، تلاوت ہو، قرآن ہو، عبادت ہو، صبح و شام اللہ کی تسبیح ہو۔

اسی طرح اللہ نے فرمایا کہ اللہ کی مساجد کو وہ آباد کرتے ہیں جن کا اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان ہے، جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے نہیں ڈرتا اور جس کو اپنی سزا و جزا کا کوئی پتہ نہیں، وہ چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر جھگڑا کرتا

ہے۔ حالانکہ ہمیشہ یاد رکھو کہ جتنے فرقے باطلہ اور ضالّہ ہیں، جتنے گمراہ فرقے ہیں، وہ تو پہلے ہی تمہاری مسجدوں سے دور ہیں اور بلکہ ان کو تو اللہ توفیق ہی نہیں دیتا کہ وہ اپنے عبادت خانے کا نام مسجد رکھ لیں، جیسا کہ یہود و نصاریٰ کے نزدیک کنیسہ، گرجا، سکھوں کا گردوارہ اور ہندوؤں کا مندر وغیرہ۔ اسی طرح ان کے عبادت خانوں کے نام بھی مسجد نہیں ہیں۔

یہ لفظ اللہ نے اگر دیا ہے تو اہل سنت والجماعت کو نصیب فرمایا ہے۔ کعبہ کا نام بھی مسجد الحرام ہے اور مدینہ پاک کا شرف بھی حضور اکرم ﷺ کی ذات اور مسجد النبی ہے، اور جہاں دو رکعت نفل نماز پڑھنے سے عمرہ کا ثواب ملتا ہے وہ مسجد قبا ہے، اسی طرح جہاں تحویل قبلہ ہوئی وہ مسجد قبلتین ہے، میرے مدنی سرکار ﷺ جہاں معراج سے گئے وہ مسجد اقصیٰ ہے، اسی سے اندازہ لگالو کہ نبی ﷺ کے ماننے والے کون ہیں، جن کی مسجدیں ہیں، جو لوگ مسجد کے لفظ سے بھی الرجک ہیں، ان کا پھر اسلام سے کیا تعلق ہے؟

مسجد کا نام رکھنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا:

اللہ نے مسجد کا لفظ اہلسنت والجماعت کو دیا کہ ان کے نزدیک مسجدیں ہیں: کیونکہ ہمارا تعلق ہی مسجد الحرام سے ہے، ہمارا رُخ اور قبلہ بھی مسجد الحرام ہے۔ اللہ نے فرمایا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ:۱۴۴] اللہ نے "شَطْرَ الْكَعْبَةِ" نہیں فرمایا کہ تم اپنے رخ کعبہ کی طرف پھیرو، بلکہ اللہ نے فرمایا کہ مسجد الحرام کی طرف پھیرو۔ اب اہلسنت والجماعت ہی ایک ایسی جماعت ہے جن کا تعلق مسجد سے ہے۔ اب اگر تم اہلسنت ہونے کے باوجود بھی لڑائیاں شروع کردو کہ یہ داخل ہوسکتا ہے اور یہ داخل نہیں ہوسکتا، یہ نوری مسجد ہے، یہ خاکی، یہ عرشی اور وہ فرشی مسجد ہے تو پھر قیامت کا انتظار کرو اور تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پھر اللہ سے خیر مانگو کہ اللہ خاتمہ بھی ایمان پر کردے۔ جب مسجدیں تقسیم اور مسجدوں کی امامت پر جھگڑا، اذان پر جھگڑا اور اب تو عالم ایسے بھی لوگ پیدا ہو گئے ہیں کہ مسجدوں میں نمازیوں پر حملہ، چاہے عبادت کوئی کر رہا ہو یا ذکر و اذکار یا درس و تدریس میں مشغول ہو، اسلام یہ حکم تو نہیں دیتا کہ آپ اس انداز سے لڑائیاں لڑیں۔ ایک آدمی چلو آپ کو قبول نہیں، وہ آکر مسجد میں نماز پڑھتا ہے تو یہ کون سی عقلمندی ہے کہ اسے منع کیا جائے کہ تم نماز نہیں پڑھ سکتے؟ یا اس کو مسجد میں موت کے بھینٹ چڑھا دیا جائے، یا اس لیے کہ تمہارا اس پارٹی سے تعلق نہیں ہے، تم اس لیے نماز نہیں پڑھ سکتے۔

اب جبکہ ضرورت ہے کہ اللہ مسلمانوں کو ملنے کی توفیق دے، اب اگر ہم ان مسائل میں اُلجھ گئے تو نتیجہ کیا نکلے گا کہ دشمن تو یہی چاہتا ہے کہ تم لڑتے رہو اور تمہارا علم تقریر، قلم اور طاقت وقوت آپس میں لگی رہے، تا کہ دشمن کی طرف تم نظر ہی نہ اُٹھا سکو، اللہ رحمت فرمائے۔ تو اس لیے یاد رکھو! مسجدوں کا ویران کرنا دو طریقوں سے ہوتا ہے: ایک مسجد کا گرا دینا، یہ بھی ظلم ہے، یا مسجد کے اندر ایسے حالات پیدا کر دینا کہ لوگ نماز ہی نہ پڑھنے آئیں، یہ بھی بڑا ظلم ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے صرف ظاہری چیز پر نظر رکھی کہ نصاریٰ نے بیت المقدس کو خراب کیا، لیکن مسجد الحرام کو مکہ کے قریشیوں نے خراب نہیں کیا یعنی توڑا نہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے بڑی خرابی کیا ہوگی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے گھر سے روک دیا جائے۔ عمارت بنا دی جائے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ آنے دیا جائے اور بتوں کو وہاں داخل کر دیا جائے، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا کہ اللہ کی توحید ماننے والے تو مسجد میں نہ آئیں، لیکن جو بت پرستی، قبر پرستی اور غیر اللہ کو مشکل کشا ماننے والے ہوں، وہ کہیں کہ ہم مسجد آباد کر رہے ہیں۔ یہ کس قسم کی مسجد آباد کریں گے؟ بہر حال مساجد جو بھی ہیں، وہ اللہ کے لیے ہیں، اس کے اندر کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ کہے کہ یہ میری مسجد ہے، یہ تیری ہے۔

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ [البقرۃ: ۱۱۴] کہ اللہ کیوں نہ عذاب دے ان لوگوں کو جو مسجد الحرام سے روکنے والے ہیں؟ اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اس کے ولی، وارث اور مجاور ہیں۔ فرمایا: اللہ کی مسجدوں کا وارث وہ ہو سکتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہو، یہ نہیں کہ ہر آدمی دعویٰ کرے کہ یہ مسجد ہم نے بنائی تھی۔

مسجد حرام کا احترام:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا ترجمہ بعض مفسرین کے قول میں یہ ہے کہ نہیں زیب دیتا ان لوگوں کو کہ داخل ہوں مسجد حرام میں مگر ڈرتے ہوئے، ہیبت اور خوف سے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کے گھر میں داخل ہوتے، ہیبت اور عظمت کے ساتھ داخل ہوتے کہ میں اللہ تعالیٰ کے گھر میں جا رہا ہوں۔ جب انسان کسی بادشاہ کے گھر میں قدم رکھتا ہے تو لازمی بات ہے کہ اس کے دل میں ہیبت ہوتی ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں قدم رکھ رہا ہو جو بادشاہوں کا بادشاہ، ساری کائنات کا مالک، قادر مطلق ہے تو اس کے گھر میں جب بندہ قدم رکھے تو

آرام سے، ادب سے رکھے۔

غیر متبع سنت پیر کا واقعہ:

ایک آدمی نے سنا کہ فلاں جگہ بڑا پیر، بزرگ رہتا ہے تو اس کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور بیعت کر لوں اور اللہ اللہ سیکھوں۔ وہاں کچھ دن رہا اور اس سے اجازت لی کہ حضرت! مجھے اجازت ہے؟ جب اس نے اجازت مانگی تو اس نے پوچھا کہ بھئی! تم کیسے آئے تھے؟ یہاں کچھ دن رہے اور جا رہے ہو، کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ آیا تو میں آپ کا نام سن کر تھا کہ آپ بڑے پیر اور بزرگ ہیں اور آپ کے بڑے مرید ہیں، تو میرا بھی دل ہوا اور میں بھی آپ کے پاس آ گیا کہ مرید ہوتا ہوں۔ لیکن اب میرا دل مرید ہونے کو نہیں چاہتا، اس لیے واپس جا رہا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے؟ جواب دیا کہ آج آپ جب عصر کے بعد مسجد میں داخل ہوئے تو آپ نے بایاں پاؤں مسجد میں پہلے رکھا اور دایاں پاؤں بعد میں رکھا، اسی وقت میں نے سمجھ لیا کہ جو اللہ کے گھر میں داخل ہونا نہیں جانتا، وہ اللہ کو کیسے جانتا ہوگا؟ اس لیے ایسے آدمی سے بیعت کر کے اپنے آپ کو گمراہ کرنے والی بات ہے۔

پہلے لوگ جو پیر و مرشد پکڑتے تھے تو اس پر نظر رکھتے تھے کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کا کتنا متبع ہے اور اس کا اپنا عمل و کردار اور زندگی سنت کے کتنے مطابق ہے۔ اگر وہ خود ہی (نعوذ باللہ!) قرآن و سنت کا مخالف ہے اور اس نے کبھی خود اللہ کے فرائض: نماز، روزہ وغیرہ ادا نہیں کیے، نہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور نہ قرآن اور تسبیح وغیرہ ہے تو وہ کسی کی کیا اصلاح کرے گا؟ وہ تو اور گمراہی کا ذریعہ بنے گا۔ جو آدمی ان سے تعلق جوڑے گا، وہ لازمی یہ سوچے گا کہ جب میرا مرشد نماز نہیں پڑھتا تو مجھے نماز پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب میرا مرشد روزہ نہیں رکھتا اور گانا سنتا اور غیر عورتوں کے ساتھ بیٹھتا ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے اللہ سے ڈرنے کی؟ اگر قیامت کے دن پیر بخشا گیا تو ہم بھی بخشے جائیں گے، جہنم میں اگر یہ سزا بھگت لے گا تو ہم بھی سزا بھگت لیں گے۔

پہلے دور میں یہ بات نہیں ہوتی، لوگ سمجھدار تھے۔ اگر کسی کے پاس حدیث پڑھنے کے لیے جاتے تھے تو پہلے سوچتے تھے کہ یہ کتنا بڑا محدث ہے، کسی سے اگر حدیث سننے کے لیے جاتے تھے تو تحقیق کرتے تھے، ان کو اگر تھوڑا سا بھی شک و شبہ ہو جاتا تو وہ اس سے کبھی روایت نہیں لیتے تھے اور اگر کسی نے اپنی اصلاح کے لیے کسی شیخ کے ساتھ تعلق جوڑا تو دیکھتے کہ خود شیخ بھی اپنی اصلاح کے تابع ہے کہ نہیں؟ وہ خود بھی کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ

کا عامل ہے کہ نہیں۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں داخل ہونے کے آداب ہیں۔

مساجد کے آداب:

اسی طرح مساجد کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اگر آدمی حالت جنابت میں ہو تو مسجد میں داخل نہ ہو، یا اسے احتلام ہو گیا تو جب تک غسل نہ کرے تو مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی عورت حیض کی حالت میں ہے یا نفاس کی حالت میں ہے تو اسے بھی مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

اور یہ بڑی غلطی ہے کہ اب جو لوگ حج کرنے آئیں گے کہ سب سے پہلے جو عورت حائضہ ہو جاتی ہے وہ وہاں سے احرام ہی نہیں باندھتی کہ میں تو ناپاک ہوں، حالانکہ اس کو پتہ ہونا چاہیے کہ حالت حیض میں احرام باندھنا جائز ہے، صرف یہ ہے کہ نماز نہ پڑھے، غسل کرلے اور لبیک پڑھتی ہوئی آجائے۔ اور دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی عورت احرام باندھ کر آگئی اور راستہ میں اس کو حیض آگیا تو پہلے تو وہ عورت شرم سے بتاتی نہیں کہ مجھے حیض آگیا ہے، حالانکہ یہاں شرم کرنے کا مقام نہیں ہے؛ کیونکہ اللہ پاک نے آدم کی بیٹیوں پر ایک چیز لکھی ہے تو پھر اس میں شرم کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کسی نے بتا بھی دیا تو اپنے کسی عزیز رشتہ دار محرم کو بتائے گی یا خاوند کو بتائے گی۔ اکثر کو مسائل کا علم نہیں ہوتا تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں جی اسب عمرہ کے لیے جائیں، کسی کے لیے عمرہ منع نہیں ہے۔ اکثر کو مسائل کا علم نہیں ہوتا تو وہ اسی حالت میں مسجد حرام میں داخل ہو جاتی ہیں، حالانکہ اس کا مسجد میں داخل ہونا حرام ہے۔ اگر وہ اس ناپاکی میں حج اور عمرہ کا طواف کرے تو توبہ بھی کرنی پڑے گی اور تین سو (۳۰۰) ریال کی بکری بھی ذبح کرنی پڑے گی۔ لوگوں کو ابھی تک یہ پتہ نہیں کہ مسجد میں کون آ سکتا ہے اور کون نہیں آ سکتا؟ یعنی ابھی تک لوگ اتنا بھی نہیں سمجھے، اس سے بڑی بدقسمتی ہماری کیا ہو سکتی ہے؟ اس لیے حکم ہے کہ حالت جنابت میں کوئی مسجد میں داخل نہ ہو، حالت حیض و نفاس میں عورت داخل نہ ہو۔

اسی طرح جب مسجد میں داخل ہوں تو سنت یہ ہے کہ پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھیں اور مسجد حرام میں جب آپ داخل ہوں تو پہلے اللہ تعالیٰ کے کعبے کا طواف کریں اور پھر بیٹھیں، لیکن اگر طواف کرنے کی ہمت نہ ہو تو پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھیں اور پھر بیٹھیں۔

اور یہ بھی مسجد کے آداب میں سے ہے کہ مسجد میں جتنی دیر بیٹھیں، قرآن پڑھتے رہیں، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے

رہیں، یا نوافل پڑھتے رہیں، طواف کرتے رہیں، یا پھر کعبۃ اللہ کو دیکھتے رہیں۔ اگر کچھ بھی نہیں کر سکتے تو خاموشی سے بیٹھے رہیں اور بات نہ کریں۔

اسی طرح میرے سرکار مدینہ ﷺ نے سنا کہ کوئی آدمی اپنا اونٹ ڈھونڈ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ کسی نے میرا اونٹ دیکھا ہے؟ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے گھروں کو اعلان کی جگہ بنا دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایسے آدمی کی چیز اللہ واپس ہی نہ کرے۔ اور اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی مسجدوں میں تجارت کی باتیں کر رہا ہو تو آپ کہیں کہ اللہ تیری تجارت میں کبھی برکت نہ دے۔

یہ مسجدیں کاروبار کے لیے ہیں یا تمہارا سامان ڈھونڈنے کے لیے ہیں؟ آج کل تو خیر ہمارے ہاں رواج ہو گیا ہے کہ کسی کا بچہ گم ہو جائے تو مولوی صاحب سے کہتے ہیں کہ اعلان کرو۔ ہم نے ویسے ہی مسجدوں کو اعلان گاہ بنا دیا ہے۔

دوسری وجہ کیا ہے؟ اللہ رحمت فرمائے کہ ہماری مولوی برادری جتنی ہے، انہوں نے مسجدوں میں جمعہ کے دن دین سکھانے کے لیے تھا کہ اس دن لوگوں کو دین سکھایا جاتا، طہارت کے، صلوٰۃ کے، زکوٰۃ کے، نکاح وطلاق کے، رضاعت، عورتوں کی عدت کے مسائل سمجھائے جاتے، اللہ کی توحید کا بیان ہوتا، حضور پاک ﷺ کی سیرت کا بیان ہوتا، یوں کہا اور فلاں کی ہم گردن توڑ دیں گے، یہ قصے کہانیاں ہوتی رہتی ہیں، اور اسی پر دین کہاں سے سیکھیں؟ جو دین سیکھنے کا مرکز تھا وہاں تو دین سکھایا نہیں جاتا، جو مقام دین سمجھانے کا تھا وہاں دین سمجھایا ہی نہیں جاتا تو لوگ کہاں سے سیکھ کر آئیں۔

اور دوسری وجوہات کچھ یہ بھی ہیں کہ ہمارے ہاں رواج بن گیا ہے کہ اگر آواز خوبصورت ہے اور بال بھی ہیں، داڑھی پگڑی بھی ہے تو بس امام بنا لو۔ اس بے چارے کو خود طہارت کے مسئلے نہ آتے ہوں، چاہے اس کو سجدہ سہو کا بھی پتہ نہ ہو۔ جب اس کو خود مسائل نہیں آئیں گے تو وہ لوگوں کو کیا مسائل بیان کرے گا؟ اس لیے وہ لوگوں کو دور دور کی باتوں میں اُلجھائے رکھے گا کہ کوئی آدمی غلطی سے اُٹھ کر مجھ سے مسئلہ ہی نہ پوچھ لے، اگر مسئلہ پوچھ لیا تو میرا علم کھل جائے گا اور میں کیا کروں گا؟

کافر اور مشرک کو مسجد میں نہ آنے دیں:

اب یہ ہے کہ کافر اور مشرک، ان کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے گھروں میں داخل نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی

مساجد میں ان کو داخل نہ ہونے دیں۔ ہاں اگر بالفرض محال ایسے حالات ہیں کہ جگہ ہی نہیں، جیسے نصرانیوں کا وفد آیا اور حضور اکرم ﷺ نے مسجد میں ٹھہرا دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک تو ان کے ٹھہرانے کے لیے جگہ نہیں تھی، دوسری بات یہ تھی کہ مسجد میں رہ کر ہمارے دین، عبادت اور نماز کو دیکھیں، تاکہ ان کے دلوں میں ہمارا دین اثر کرے، اس وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے ان کو مسجد میں ٹھہرا دیا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں: اللہ پاک نے فرمایا کہ تمہیں عزت اور غلبہ دے دیں تو ان کو اللہ کی مساجد میں داخل نہ ہونے دیں، اگر آئیں بھی تو پھر ڈرتے ہوئے ذلت اور خوف کے ساتھ آئیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جب مکہ فتح کرا دیا اور حضور اکرم ﷺ کو غلبۂ کامل حاصل ہو گیا۔

حجۃ الوداع سے پہلے والے حج کے امیر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے:

حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع سے ایک سال قبل یعنی جس سال حج فرض ہوا، آپ ﷺ نے اس سال حج نہیں کیا اور پہلے سال حج کا امیر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بنایا اور فرمایا کہ تم امیر بن کر جاؤ اور تمام مسلمانوں کو حج کے ارکان ادا کراؤ، ان کو حج کے ارکان سکھاؤ۔ میں اگلے سال حج کروں گا۔ اور اس کے ساتھ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو حکم دے کر بھیجا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے علی! امیر تو ابو بکر ہوں گے، لیکن تمہارے ذمہ یہ کام ہے کہ اس زمانے میں یہ رواج ہوتا تھا کہ اگر کوئی بادشاہ بڑا اہم حکم جاری کرے تو جب تک بادشاہ کا کوئی قریبی رشتہ دار وہ حکم لے کر نہ آئے، وہ مانتے نہیں تھے۔ اس لیے حضور پاک ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ اور مکہ میں جا کر یہ کام کرو کہ جتنی اونچی اونچی قبریں بنی ہوئی ہیں اور بڑے بڑے نشانات ہیں، سب کو توڑ کر برابر کر دو اور کوئی قبر اونچی نہ چھوڑو، ان کو بالکل برابر کر دو۔ صرف ایک علامت باقی رہے گی کہ یہ قبر ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں کوئی بت ہے، سب کو توڑ ڈالو، جہاں کوئی تصویریں لگی ہوئی ہوں، ان سب کو مٹا ڈالو۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے مشرکوں، کافروں اور یہودیوں کو دنیا میں بھی رُسوا کیا اور آخرت میں بھی ان کے لیے بڑا دردناک عذاب تیار کیا ہوا ہے۔ دنیا میں اس طرح رُسوا کیا کہ انہوں نے مکہ سے مسلمانوں کو روکا تھا، اللہ تعالیٰ نے قیامت تک مشرکوں کو روک دیا۔ تو اسی طرح ان کو سزا ملی جس طرح انہوں نے عمل کیا تھا۔ اور آخرت

میں اللہ ان کو دردناک عذاب دیں گے؛ کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے گھر کی حرمت کو توڑا، اس کے گھر کی عزت و عظمت کو توڑا، اللہ تعالیٰ کے گھر میں بتوں کو رکھا اور اللہ کے گھر میں کھڑے ہو کر غیر اللہ کو پکارا اور اللہ کے کعبے کا طواف عریانی کی حالت میں کیا تو اللہ پاک نے دنیا اور آخرت میں ایسی سزا دی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اللہ کی مسجد میں آ کر غیر اللہ کو پکارے یا غیر اللہ سے مدد مانگے تو اس کے لیے بھی یہی وعید ہوگی۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ دعا مانگتے تھے: یا الٰہ العالمین! ہمیں دنیا کی رُسوائی سے بھی بچانا اور ہمیں آخرت کی ذلت و رُسوائی سے بھی بچانا۔

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۱۵﴾ [البقرۃ:۱۱۵]

''اور مشرق و مغرب اللہ ہی کا ہے، پس جس طرف (نماز میں) رُخ کرو ادھر اللہ متوجہ ہے، بلاشبہ اللہ وسیع فضل والا ہے، جاننے والا ہے۔''

ماقبل آیات سے ربط:

گزشتہ آیات میں یہود کا ردّ تھا، ان آیات میں بھی ان کا ردّ ہے کہ وہ ناسخ و منسوخ کے منکر تھے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضور پاک ﷺ کو حکم دیا کہ اب آپ کا قبلہ کعبہ ابراہیمی ہے؛ کیونکہ اصل حقیقت میں قبلہ اوّل کعبہ ہی تھا۔

تحویل قبلہ پر یہود و مشرکین کے اعتراضات:

جب تحویل قبلہ کا حکم ہوا تو اس سے پہلے یہود، مشرکین کو یوں بتایا کرتے تھے کہ تمہارے قبلہ کو محمد قبلہ ہی نہیں مانتے اور بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں، گویا ہمارا دین سچا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو بدلنے کا حکم دیا تو یوں کہا کہ دیکھا مکہ والوں کو راضی کرنے کے لیے کعبہ کو بدل دیا اور ہمارا قبلہ چھوڑ دیا۔

دوسرا پروپیگنڈہ یہ کیا کہ جن لوگوں نے نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی تھیں اور اس دوران وہ فوت ہو گئے، اگر پہلا قبلہ غلط تھا تو ان کی نمازوں کے بارے میں کیا کہو گے؟ اور اگر یہ قبلہ بہتر ہے تو اس کی طرف انبیاء کو نماز کیوں پڑھوائی گئی؟ اور اگر وہ کعبہ بہتر تھا تو بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟ لہٰذا ناسخ و منسوخ کا یہ مسئلہ ہمیں سمجھ نہیں آتا۔

بس یہ تو (نعوذ باللہ!) نبی پاک ﷺ کی اپنی مرضی ہے کہ کبھی قبلہ اِدھر بنا لیتے ہیں اور کبھی اُدھر بنا لیتے ہیں، لہٰذا ہم حضور اکرم ﷺ کی بات کو نہیں مانتے اور نہ ہی ناسخ و منسوخ کو مانتے ہیں۔

اس کے جواب میں یہ مختصر، جامع اور کامل آیت نازل کی گئی، جس میں اتنے بڑے مسائل، شبہات اور اعتراضات کا جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بنیادی بات کہہ دی کہ آپ ان کو کہہ دیں کہ مشرق اور مغرب کا مالک اللہ ہے۔ کیا مشرق اور مغرب یہودیوں اور نصرانیوں نے بنائے ہیں؟ جب ساری جہتیں اللہ کی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ اپنے بندوں کو جس طرف حکم دیں تو اس طرف اپنا رخ کرلیں۔ تم کون ہو اعتراض کرنے والے؟ نہ تمہارا زمینوں میں کوئی حصہ اور نہ آسمانوں میں۔ اس طرف اپنا رخ کریں نہ زمین و آسمان کی پیدائش، نہ مغرب و مشرق میں کوئی حصہ۔ تو جب سب کچھ اللہ تعالیٰ کا ہے تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جب چاہیں، جس طرف چاہیں، جب تک چاہیں اور جتنا عرصہ چاہیں اس کی مرضی ہے بدل دیں۔ تو بنیادی طور پر اُن کا رَدّ ہو گیا۔

قبلہ کی جہت متعین کرنے کی حکمت:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کے تحت ارشاد فرماتے ہیں کہ مشرق ہے یا مغرب یہ تو اللہ کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہیں، جدھر چاہیں اپنے بندوں کو متوجہ ہونے کا حکم دے دیں۔ تعیین جہت قبلہ میں سب سے بڑی حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اجتماعیت، اتحاد و اتفاق اور ایک مرکز پر نظر جمانے کی تربیت دے رہے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ جدھر چاہیں حکم دے دیں۔ اور اگر ہر آدمی کو اللہ تعالیٰ حکم دیتے کہ جہاں مرضی آئے، جس طرف دل کرے رخ کر کے نماز پڑھتے رہو تو اس میں ایک انتشار اور افتراق کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ اِدھر منہ کیے ہوئے ہیں، کچھ اُدھر کیے ہوئے ہیں، لیکن جب مرکز ایک ہو تو اس میں اجتماعیت، اتحاد اور وحدت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس کا حکم دیا۔

آیات کا شانِ نزول:

ابو عبید القاسم بن سلام نے کتاب ''ناسخ و منسوخ'' میں یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جو نسخ کا حکم آیا، وہ یہی قبلہ کا تھا۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں: یہ آیت پہلے نازل ہوئی تو ابھی کعبۃ اللہ کی طرف رُخ پھیرنے کا حکم نہیں ہوا تھا تو اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی، تاکہ اپنے پیغمبر کو بتائیں اور

صحابہ ؓ کو بھی تعلیم دی کہ جدھر بھی تم رخ پھیرو گے، اسی طرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

ابن کثیر ؒ فرماتے ہیں کہ یہ کہا کہ کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہے۔ اگر اس سے مراد معیت علم ہے تو یہ بات صحیح ہے۔

جنگ اور سواری اور مجبوری میں نماز کا قبلہ:

بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ نے اس لیے نازل فرمائی کہ آپ نے اپنی سواری پر نفل نماز پڑھنی ہو تو جس طرف سواری کا رُخ ہو، آپ نماز پڑھ سکتے ہیں یا اسی طرح کسی کا خوف ہو یا دشمن سے جنگ ہو تو اس حالت میں ایک جہت متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہ آیت حالت جنگ کے لیے نازل ہوئی ہے کہ جنگ میں جدھر بھی رخ ہے، نماز نہ چھوڑو۔ نماز پڑھو، ادھر بھی اللہ کی ذات ہے، ہر جہت اللہ کے لیے ہے۔

حضرت ابن عمر ؓ جب سفر میں ہوتے، جب سواری پر ہوتے تو سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل پڑھتے، چاہے سواری کا رخ جدھر ہو جائے۔ جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضور اکرم ﷺ بھی نفل نماز سواری پر پڑھتے تھے، جبکہ سواری کا رخ بھی بدلتا رہتا تھا۔

صحیح بخاری میں بھی یہ روایت آتی ہے کہ عبداللہ بن عمر ؓ سے جب پوچھا جاتا کہ حضرت! جب جنگ میں خوف کا عالم ہو تو نماز کس رخ پر پڑھیں؟ آپ ؓ فرماتے کہ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر جیسے موقع ملے اور قبلہ کی طرف رخ ہو سکے یا نہ ہو سکے، ہر حال میں نماز ادا کرو۔

حضرت نافع ؒ فرماتے تھے: یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابن عمر ؓ ایسی بات اپنی طرف سے کریں۔ لازمی بات ہے کہ یہ بات انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے سنی ہوگی۔

امام شافعی ؒ فرماتے ہیں: بڑا لمبا سفر ہو یا ویسے آدمی سفر پر ہے تو نفل نماز آدمی اسی حالت سفر میں سواری پر بیٹھ کر پڑھتا رہے، سواری کا رخ اگر قبلہ سے بھی بدل جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور یہی امام ابوحنیفہ ؒ کا قول ہے، لیکن امام مالک ؒ اس کے خلاف ہیں۔ امام ابو یوسف ؒ و ابو سعید ؒ نے بھی فرمایا کہ اگر کوئی شہر کے اندر پھر رہا ہے اور نفل نماز سواری پر پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھ سکتا ہے۔

ناواقف نمازی پہلے جہت قبلہ کی تعیین کرے:

مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت ایسے نازل ہوئی کہ کچھ صحابہ سفر میں تھے، قبلہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ قبلہ کدھر

ہے، کوئی اِدھر کا اور کوئی اُدھر کا کہے تو سب نے جس کا خیال جدھر جدھر آیا، پڑھ لی۔ جب حضور اکرم ﷺ کو عرض کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب کی نمازیں ٹھیک ہیں، سب جہتیں میری ہیں، ان سب کی نمازیں ادا ہو گئی ہیں۔ اس لیے یہ مسئلہ ہے کہ آدمی سفر میں یا صحرا میں ہے اور قبلہ کی تعیین نہیں ہو سکتی تو وہ اپنی طرف سے جہت معلوم کرنے کی کوشش کرے اور اس کے بعد جس طرف اس کا غالب گمان ہو کہ قبلہ اس طرف ہے تو نماز پڑھ لے۔ نماز پڑھنے کے بعد روشنی ہو جائے اور پتہ چلے کہ جس طرف میں نے نماز پڑھی، وہ غلط سمت ہے تو پھر بھی اس کی نماز ادا ہو جائے گی، دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت عامر بن ربیعہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک اندھیری رات میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ جب آپ ﷺ نے پڑاؤ فرمایا تو ہر آدمی نے یہ کیا کہ میں عارضی طور پر اینٹیں رکھ کر اپنی مسجد بنالوں...... کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس بات کا حرص تھا کہ مسجد میں نماز پڑھنے کا درجہ بڑھ جاتا ہے، لہٰذا وہ جب سفر میں بھی ہوتے تو اس طرح مسجد بناتے اور اس میں نماز پڑھتے، اور بعض صحابہ کے پاس اگر اینٹیں نہ بھی ہوتیں تو صحرا کی ریت سے دیوار بنالیتے، اور بعض کچھ بھی نہ کرتے، صرف ایک لکیر کھینچ لیتے، تاکہ ہمیں مسجد کا ثواب مل جائے...... وہ کہتے ہیں کہ ہم رات کو پتھر رکھ کر نمازیں پڑھتے رہے۔ اب صبح جب اُٹھے تو ہم سب کی نمازیں قبلہ کی سمت کے مخالف تھیں تو حضور پاک ﷺ کی خدمت میں ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! رات ہماری نمازیں تو سب غلط ہو گئیں۔ آپ ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نے جدھر نماز پڑھی ہے، ہم نے قبول کر لی۔

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے، حالانکہ اس میں اشعث السمان ضعیف ہے اور اس کا استاد عاصم بھی ضعیف درجہ کا ہے۔ اصل میں امام ترمذی رحمہ اللہ جب کسی حدیث کو حسن کہہ دیں تو ان کے پاس دوسری سندیں بھی ہوتی ہیں جو اس حدیث کو قوی کر رہی ہوتی ہیں۔ مختلف سندیں ایک دوسری کو طاقت پہنچائیں تو حدیث حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔

حضرت عطاء رحمہ اللہ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے ایک سَریہ بھیجا...... سَریہ کا معنی یہ ہوتا ہے کہ حضور پاک ﷺ کسی جانب فوج بھیجیں، لیکن خود اس میں شرکت نہ فرمائیں...... راستے میں ایک جگہ ایسی آئی کہ ہمیں ایک سخت اندھیری رات سے واسطہ پڑ گیا۔ رات اتنی اندھیری تھی کہ کوئی چیز سمجھ نہیں آتی تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ہمیں یہ پتہ نہ چلے کہ کعبہ شریف کس طرف ہے۔ ہم میں سے ایک جماعت نے کہا: ہم

نے پہچان لیا کہ قبلہ ادھر ہے، حالانکہ وہ شمال کی طرف نماز پڑھ رہے تھے۔ ہم نے کہا: اچھا ایسے کرو کہ نمازیں پڑھ لو، لیکن نشان لگا لو کہ ہم نے کس طرف نماز پڑھی۔ جب روشنی ہوگی تو پھر اندازہ ہو جائے گا۔ کہتے ہیں کہ جب روشنی ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ ہم سب نے غلط جانب نماز پڑھی تھی۔ ہم نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم نے بہت تلاش کیا، لیکن قبلہ نہیں ملا، ہم نے نمازیں پڑھ لیں اور صبح دیکھا تو قبلہ کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔ یہ سن کر حضور اکرم ﷺ چپ ہو گئے، آپ ﷺ نے کوئی حکم جاری نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی یہ آیت نازل کی۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ بادل چھا گئے اور بادلوں کی وجہ سے اندھیرا ہو گیا کہ ہم حیران ہو گئے کہ کعبہ شریف کدھر ہے؟ سب نے کعبہ کی سمت تلاش کی اور ہم سب نے جیسے جیسے اندازہ لگایا وہاں نشان لگا دیا، نمازیں پڑھ لیں، لیکن جب اندھیرا ختم ہو گیا تو ہم سب نے غلط سمت نماز پڑھ لی تھی۔ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ہم نے عرض کیا تو آپ ﷺ نے اس پر خاموشی اختیار کی تو اللہ پاک نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیں نماز کا اعادہ کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ فرمایا کہ اللہ تمہاری اس نماز کو قبول فرمائے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جتنی روایات میں نے نقل کی ہیں، ان میں سے بعض روایات میں ضعف ہے، لیکن شاید ایک دوسری کو طاقت پہنچا رہی ہیں، اس لیے نقل کر دی گئی ہیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک آدمی نے نماز پڑھی، بعد میں اس کو پتہ چل گیا کہ میں نے غلطی کی اور قبلہ کی طرف نماز نہیں پڑھی تو اب وہ نماز لوٹائے یا نہ لوٹائے؟ اس بارے میں علماء کے دو قول ہیں: جو دلائل ابھی آپ نے پڑھے ہیں، ان کی رُو سے نماز کو دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ وہ نماز لوٹائے۔

علماء احناف نے ایک اور بھی وضاحت کی کہ نمازی نے غلط سمت نماز پڑھ لی، اگر نماز کے دوران پتہ لگ جائے کہ قبلہ اس طرف ہے تو اسے لازم ہے کہ نماز میں اسی طرف رخ موڑ لے اور اگر نماز پڑھ لی، نماز کا وقت باقی ہے تو کسی نے بتلا دیا کہ کعبہ اس طرف ہے تو اسے چاہیے کہ وہ دوبارہ نہ پڑھے۔

آیت کا نزول نجاشی کے بارے میں:

بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ آیت نجاشی کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ نجاشی حبشہ کا بادشاہ تھا...... یہ نجاشی کا لقب

ہے؛ کیونکہ اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ مختلف علاقوں کے بادشاہوں کے القاب مختلف ہوا کرتے تھے، جیسے مصر کا فرعون، فارس کا کسریٰ، روم کا قیصر اور حبشہ کے بادشاہ کا لقب نجاشی تھا...... یہ نجاشی بادشاہ بڑا ہی خدا ترس انسان تھا، جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے مکہ مکرمہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو اس نے مسلمانوں کا ساتھ دیا اور ان کو پناہ دی اور امن و امان میں رکھا۔ اور جب اس نے اللہ کے نبی ﷺ کی باتیں سنیں اور قرآن سنا تو اس نے اسی وقت اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ اور یہ بادشاہوں میں وہی شخص ہے جس نے اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا جو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں، ان کا نکاح حضور اکرم ﷺ سے کروایا اور حق مہر بھی اپنی طرف سے ادا کیا اور ان کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ مدینہ منورہ بھجوایا۔ بہرحال یہ بڑے عظیم انسان گزرے ہیں۔ جب ان کی وفات ہوگئی تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کا جنازہ پڑھو تو بعض نے پوچھا کہ یارسول اللہ! وہ تو مسلمان نہیں تھا۔ اس پر یہ آیت بھی نازل ہوئی کہ بعض اہل کتاب میں سے بھی ایسے لوگ ہیں جو اپنے صحیح دین اور جو اللہ نے تمہاری طرف اُتارا ہے، اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں، ﴿وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ﴾ تو حضور اکرم ﷺ نے بہرحال اس کا جنازہ مدینہ منورہ میں پڑھا۔

اسی سے یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان باعث اختلاف بن گیا کہ بعض علماء اور ائمہ کرام جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی ایک روایت میں ہے اور امام شافعی اور اہلحدیث علماء غائبانہ جنازہ کو جائز سمجھتے ہیں، یعنی اگر کوئی ہمارا مسلمان کسی دوسرے ملک میں فوت ہوگیا تو اگر کسی اور جگہ اس کا جنازہ غائبانہ طور پر ادا کردیا جائے تو جائز ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کی الشرح الکبیر علی متن المقنع (۲/ ۳۵۵) اور امام احمد کی ایک روایت کے نزدیک غائبانہ جنازہ جائز نہیں ہے، اور جو جائز سمجھتے ہیں ان کی دلیل مدینہ منورہ میں نجاشی کے جنازہ والی روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے پڑھا۔

اور امام صاحب فرماتے ہیں کہ یہ حضور اکرم ﷺ کی خصوصیت تھی؛ کیونکہ اس کے بعد حضور اکرم ﷺ سے کسی کا بھی غائبانہ جنازہ پڑھنا ثابت نہیں ہوتا۔ حضور اکرم ﷺ کے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم جنگ کے میدانوں میں شہید ہوتے رہے، حضور پاک ﷺ نے ان کی شہادت کی خبریں بھی خود عطا فرمائیں، لیکن اس کے باوجود بھی آپ ﷺ نے ان کا غائبانہ جنازہ نہیں پڑھا۔

نجاشی کس طرف نماز پڑھتا تھا؟

نجاشی قبلہ طرف نماز پڑھنے والا نہیں تھا تو یہ اعتراض بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشرق و مغرب اللہ کا ہے،

جس طرف بھی نماز پڑھی تو نماز ہو جاتی ہے۔ لیکن ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے ساتھ اس واقعہ کو جوڑنا کوئی مضبوط بات نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر غرابت ہے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ نجاشی بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتا تھا، اس کو پتا نہیں تھا کہ اللہ نے تحویل قبلہ کا حکم فرمایا ہے کہ نہیں۔

نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی خصوصیات

قرطبی نے نقل کیا ہے کہ جب نجاشی فوت ہو گیا تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر غائبانہ جنازہ پڑھا۔ اس لیے بعض ائمہ صلوۃ علی الغائب کی طرف چلے گئے کہ نماز جنازہ غائبانہ پڑھنا جائز ہے۔ لیکن مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ خصوصیت تین وجہ سے ہے۔

پہلی خصوصیت:

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نجاشی کی میت کو اور لحد کو سامنے دکھا دیا اور درمیان میں تمام زمین کو لپیٹ دیا گیا۔ یہ خصوصیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔

دوسری خصوصیت:

بعض علماء نے فرمایا کہ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ تو مسلمان تھا اور جس ملک میں فوت ہوا، وہاں کوئی مسلمان ایسا نہیں تھا جو اس کا جنازہ پڑھ سکے، لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وجہ سے اس کا جنازہ پڑھا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے ملک میں ہو اور وہ مر گیا، اس کا نماز جنازہ کسی نے نہیں پڑھا تو دوسرے ملک کے مسلمان اس کے لیے ایسے نماز جنازہ پڑھ سکتے ہیں، اور اگر وہاں کوئی مسلمان موجود ہو اور اس نے اس کی نماز جنازہ پڑھ لی تو پھر دوبارہ غائبانہ جنازہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس دوسری توجیہ پر قرطبی رحمہ اللہ نے اعتراض کیا۔ اس نے کہا کہ بادشاہ تھا اور مسلمان تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس کوئی بھی جنازہ پڑھنے والا مسلمان موجود نہ ہو۔ لیکن ابن عربی رحمہ اللہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ وہاں مسلمان تھے، لیکن ان کو جنازہ کا طریقہ ہی نہیں آتا تھا کہ جنازہ کیا

چیز ہے۔ چونکہ ان کو یہ مسائل معلوم ہی نہ تھے، اس لیے مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جواب بڑا معقول اور عمدہ ہے۔

تیسری خصوصیت:

تیسری وجہ مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چونکہ وہ بادشاہ تھا، اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اس کا جنازہ پڑھایا، تاکہ دوسرے بادشاہوں کے دل بھی اسلام کی طرف مائل ہوں، تاکہ لوگوں کو چلے کہ حضور پاک ﷺ اپنے ماننے والوں سے کتنی محبت کرتے ہیں کہ ان غائبانہ جنازہ پڑھتے ہیں اور ان کے لیے دعائیں کرتے ہیں، تاکہ دوسرے لوگوں کے لیے اسلام میں داخل ہونے کا یہ سبب بنے۔ بعض ائمہ کے نزدیک یہ صرف خصوصیت تھی، لہٰذا غائبانہ جنازہ دوسرے کسی واقعہ میں ثابت بھی نہیں ہوتا۔

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ لِأَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ أَهْلِ الشَّامِ وَ أَهْلِ الْعِرَاقِ.'' [تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۲۹ (جامع ترمذی، رقم: ۳۴۴)]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مشرق اور مغرب کے درمیان مدینہ، شام اور عراق والوں کا قبلہ ہے۔

مسجد حرام کا اِطلاق:

﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا﴾ کے کیا معنی؟ کہ جب ہم نماز پڑھتے ہیں تو مغرب کی جانب رخ کرکے پڑھتے ہیں؛ کیونکہ ہماری جہتِ قبلہ مغرب ہے اور بعض ملکوں کی جانب قبلہ بالکل مشرق ہے اور اسی طرح بعض کو شمال اور بعض کو جنوب لگے گا۔ چونکہ پوری دنیا کے اندر جہات بدلیں گی۔ جہت کے لیے ضروری ہے کہ ہم جہاں بھی نماز پڑھیں، ہماری مسجدوں کے رخ اللہ تعالیٰ کے گھر کی طرف ہوں، اگر مسجد الحرام کے اندر ہم موجود ہیں اور کعبہ ہمیں نظر آرہا ہے تو پھر ہر بندے کا اس طرف رخ ہونا ضروری ہے، اگر ہم مسجد الحرام سے باہر ہیں تو پھر یہ ساری مسجد الحرام ہمارے لیے قبلہ ہے اور اگر پھر ہم مسجد الحرام سے باہر چلے جائیں تو پھر پورا حرم ہمارے لیے قبلہ بن جاتا ہے۔ چونکہ پورے حرم پر بھی مسجد الحرام کا اطلاق ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کہ اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کرو اور مسجد الحرام کا اطلاق موجودہ مسجد پر ہوتا ہے، ورنہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں تو مسجد مطاف جتنی تھی، اس کا چوتھا حصہ بھی نہیں تھا، پھر مسجد بڑھتی گئی۔

ایک تو مسجد الحرام کا اس پر اطلاق ہو گیا، ایک اطلاق پورے حدِ حرم پر ہے، جہاں تک حرم ہے وہاں مسجد الحرام ہے، جیسا کہ عرفات تک حدِّ حرم ہے، اسی طرح جعرانہ تک حدِّ حرم ہے، تنعیم تک حدِ حرم ہے، یعنی کسی جانب تین میل، سات میل اور کسی جانب اس سے بھی زیادہ ہے تو یہ پورا حرم کا علاقہ ہے، اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مسجد الحرام فرمایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [البقرۃ:۱۹۶] کہ تمتع وہی لوگ کر سکتے ہیں کہ جن کے اہل وعیال مسجد الحرام میں رہنے والے نہ ہوں۔ باہر سے آنے والے آفاقی ہیں اور عشرہ حج کے اندر جنہوں نے عمرہ کیا ہے تو اب لوگوں کے بال بچے تو اس مسجد میں نہیں رہتے، لوگوں کے بال بچے تو پورے حرم میں رہتے ہیں، اس لیے اطلاق مسجد الحرام کا پورے حرم پر بھی ہو گیا۔

اس لیے فرمایا کہ مشرکین پلید ہیں، آج کے بعد ان کا مسجد الحرام میں داخلہ منع ہے۔ لہٰذا ان کو بھی ہم حدحرم پر روک دیتے ہیں۔ اور اسی طرح جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ﴾ [البقرۃ:۱۹۶] قربانی کے جانور کو اپنی جگہ پر پہنچاؤ کہ قربانی کا جانور کعبہ میں پہنچا کر ذبح کرو۔ کعبہ میں کوئی ذبح نہیں کرتا۔ کعبہ میں کون جانور ذبح کرے؟ منیٰ میں کسی مذبح خانے میں جانور کو ذبح کرے گا۔ چونکہ منیٰ بھی حرم کے اندر ہے، لہٰذا یہ بھی مسجد الحرام اور کعبہ کے حکم میں آ گیا۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ اگر کعبہ کے سامنے ہے تو عین کعبہ ضروری ہے، اگر باہر ہے تو پوری مسجد ہمارے لیے کعبہ کے حکم میں ہے، یعنی اس میں ہمارے لیے اتنی رعایت ہے کہ اب ہم اپنے ملک میں مسجد بناتے ہیں تو عین جہت کعبہ نہ بھی ہو تو پھر بھی ٹھیک ہے، مکہ کی طرف اس کا رخ ہو، اتنی جہت کافی ہے۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ اب کچھ جدید آلات ایسے بھی آ گئے ہیں کہ جہاں بھی آدمی ہو، صحیح جہت قبلہ کی تعیین کی جا سکتی ہے۔ بعض لوگ سورج کے ساتھ سایہ کا نشانہ لگا کر مغرب اور مشرق کی جہت صحیح کر لیتے ہیں، ورنہ اس طرف رخ ہو جائے تو الحمد للہ! نماز ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف جہت کی طرف پڑھی جانے والی نماز قبول فرماتے ہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سند میں ایک راوی ابی معشر ہے، ان کے بارے میں محدثین نے کلام کیا ہے کہ آخری عمر میں ان کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سند کے ساتھ بھی روایت کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ'' (مشرق اور مغرب کے درمیان میں قبلہ ہے)۔ اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا

کہ پہلی سند جس میں ابی معشر راوی ہے، یہ سند صحیح ہے اور زیادہ اصح ہے۔ حضرت امام ترمذی رحمہ اللہ کی اس روایت کو صحابہ میں سے بھی کئی صحابہ نے روایت کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی اس روایت کو نقل فرمایا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ مشرق تمہارے بائیں طرف اور مغرب تمہارے دائیں طرف ہو تو تمہارا رخ قبلہ کی طرف ہو جائے گا۔ یہ مدینہ والوں کو سمجھا رہے ہیں۔

قبلہ دو ہونے کی وجہ:

ایک اور قول مفسر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: اگر کوئی آدمی یہ اعتراض کرے (نعوذ باللہ!) پہلے کعبہ بیت المقدس تھا، اب یہ کعبہ کیوں ہو گیا؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی اللہ کا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں تھیں، اگر اوّل سے (حضرت آدم علیہ السلام سے) لے کر میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کا ایک ہی قبلہ رہتا، مثلاً بیت المقدس یا کعبۂ ابراہیمی رہتا تو نتیجہ یہ نکلتا کہ مخالفین اعتراض کرتے کہ دیکھو! مسلمان بھی تو کسی نہ کسی جہت کی پوجا کرتے ہیں، اگر ہم لوگ سورج، آگ، دیوی، دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قبلے ہی دو کر دیئے۔ کبھی تو رخ بیت المقدس کو ہو رہا ہے اور پھر حکم ہو جاتا ہے کہ بیت اللہ کی طرف۔ اور بعض روایات کے مطابق پہلے قبلہ بیت اللہ تھا، پھر اللہ نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا، پھر دوبارہ اسی کعبہ کی طرف لوٹنے کا حکم دیا، تاکہ کسی دشمن اسلام کو یہ موقع ہی نہ ملے کہ مسلمان ایک طرف کعبہ یا کسی ایک جہت کا پجاری ہے، بلکہ واضح ہو گیا کہ مسلمان اپنے اللہ کے حکم کا پابند ہے۔ مشرق بھی اللہ تعالیٰ کا ہے اور مغرب بھی اللہ تعالیٰ کا ہے، اللہ تعالیٰ نے جس طرف حکم دیا، جھک گیا اور جس طرف حکم نہیں دیا، نہیں جھکا۔

کیا مسلمان پتھر اور عمارت کی پوجا کرتے ہیں؟

ایک اعتراض ہندو بھی کرتے ہیں کہ تم لوگ جو ہم پر اعتراض کرتے ہو کہ ہم بتوں کے پجاری ہیں، تم بھی تو پتھر اور (مقام ابراہیم ایک پتھر ہے) اس کو پوجتے ہو اور اسی طرح تمہارے سامنے بھی تو ایک پتھر کی عمارت ہے۔ یہ بات غلط ہے؛ کیونکہ آج اس خانہ کعبہ کو اللہ نہ کرے، گرا دیا جائے تو کیا ہم نماز پڑھنا چھوڑ دیں گے؟ اس لیے کہ ہمارے سامنے وہ پتھر نہیں ہے یا اس زمانے میں جب کعبۃ اللہ کی عمارت ہی نہیں تھی، بہہ گیا تھا، کعبہ شریف یہاں

ایک ٹیلہ تھا، پتہ نہیں لگتا تھا۔ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کعبہ بنانے کے لیے آئے تو اللہ سے پوچھا کہ میرے مولا! میں کہاں کعبہ بناؤں؟ مجھے کیا پتہ کہ کعبہ کہاں تھا؟ اور اس کا طول وعرض کیا ہے، مجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں۔

اچھا! اگر (نعوذ باللہ!) ان ہندوؤں کی طرح کسی دیوتا کی پوجا کرتے ہیں تو ہم کعبہ سے اونچا ہوکر نماز نہیں پڑھیں گے: کیونکہ ہمارے سامنے پھر کعبہ نہ ہوا، کعبہ تو نیچے ہوگیا۔ پھر ہم ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر بھی نماز نہ پڑھیں، ہم بیس ہزار یا تیس ہزار فٹ کی بلندی پر چلے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ اعتراضات مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ اور مقامِ ابراہیم پر جہاں تک نماز کا مسئلہ ہے میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح کیا، اسلام پھیل گیا تو اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ دو رکعت طواف کہاں ادا کریں؟ یہ تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ لیا کہ بھائی! طواف کے بعد جو دو رکعت ہم نے پڑھنی ہیں، کہاں پڑھیں؟ آپ لوگوں کا کیا مشورہ ہے؟ کسی نے کہا: یہاں پڑھیں اور کسی نے کہا: وہاں پڑھیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میری بات مانیں تو کعبہ ابراہیمی اور بنانے والے ابراہیم علیہ السلام اور آپ بھی ولد ابراہیم علیہ السلام اور آپ بھی علی ملت ابراہیم علیہ السلام، تو مہربانی کرکے مقامِ ابراہیم کو مصلیٰ بنالیں، جہاں ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوتے اور اللہ کے کعبہ کی تعمیر کرتے تھے، تاکہ ان کی یاد قیامت تک باقی رہ جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے قبول فرمالی اور اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن نازل فرمادیا: ﴿وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرٰهِيمَ مُصَلًّى﴾ مقامِ ابراہیم ہی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی جگہ بنالی۔ وہ پتھر درمیان میں آئے، پیچھے آئے، جہاں مرضی آئے، جہاں آپ کو موقع ملے، آپ وہاں کھڑے ہوجائیں۔

اگر پوجا ہوتی تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ہوتی، اس کے باوجود بھی مسلمانوں کا مسئلہ دیکھیں! اگر مقامِ ابراہیم پر جگہ نہ ہو تو کوئی ضروری نہیں، اگر ہم مقامِ ابراہیم کے پجاری ہوتے تو جگہ نہ ہوتی، پھر بھی ہم ضرور پڑھتے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ مقامِ ابراہیم پر رَش ہوگیا، جگہ نہیں ہے تو تم حطیم میں پڑھ لو، اگر حطیم میں بھی جگہ نہیں ہے تو مطاف میں کسی جگہ پڑھ لو، اگر مطاف میں بھی جگہ نہیں ہے تو پوری مسجد الحرام میں جس جگہ دل چاہے پڑھ لو، اگر مسجد حرام میں بھی تمہیں بھول گئی ہو، گھر چلے گئے ہو تو وہیں جاکر پڑھ لو۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں واقعہ آتا ہے کہ انہوں نے طواف کیا، قدرتی طور پر عصر اور مغرب کے درمیان وقت تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت تو میں دو رکعت نہیں پڑھتا۔ ادھر قافلہ مدینہ کو جانے والا تھا، آپ قافلہ

میں چلے گئے، تنعیم سے بھی گزر گئے، وہاں جا کر بعد میں آپ نے دو رکعتیں پڑھ لیں۔ لہٰذا اب کسی پتھر کے پابند ہوتے تو اس کے بغیر ہماری کسی دوسری جگہ نماز نہ ہوتی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ مسلمان نہ تو کسی پتھر کا پجاری ہے، نہ کسی خاص جہت کا اور نہ ہی سورج اور کواکب کا پجاری ہے، بلکہ وہ تو اپنے اللہ کے حکم کا پابند ہے۔

اس لیے ایسے مسائل کو سمجھا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح عقیدہ عطا فرمائیں۔ ہم اس جہت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں، اگر ہم نے حجر اسود کو بوسہ دیا تو اتباع سنت رسول ﷺ کی وجہ سے دیا۔

ایسا دور بھی گزرا کہ حجر اسود چوری ہو گیا، مکہ میں تھا ہی نہیں تو کیا لوگوں نے طواف کرنا چھوڑ دیا تھا کہ حجر اسود نہیں ہے تو پھر ہم بوسہ کس کو دیں؟ جب نوح علیہ السلام کا طوفان آیا تو کعبہ بھی بہہ گیا اور حجر اسود بھی۔ جب نوح علیہ السلام کا طوفان آیا اور پوری سرزمین عرب کو ڈبو دیا تو اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ حجر اسود جبل ابو قبیس میں جا کر ٹھہر گیا۔ لہٰذا ہمیشہ یاد رکھیں کہ مسلمان ہر مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا پابند ہے، یہی فرق مسلمان اور غیر مسلمان کا ہے۔

مثال کے طور پر مسلمانوں کا ایک آدمی مر جاتا ہے تو یہ فوراً کہے گا کہ بس اللہ کی مرضی۔ اللہ کی قضا جو مقرر تھی، وقت آ گیا۔ اس کے بعد پوچھے گا کہ وجہ کیا بنی؟ وہ بیمار تھا اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہارٹ اٹیک ہوا، ان چیزوں کو تبعاً بیان کرے گا۔ اصل اور پکی بات وہ یہ کرے گا کہ بس حضرت! وقت آ گیا تھا، اللہ پاک نے جو وقت لکھا تھا وہ پورا ہو گیا۔ جبکہ کافر اسباب میں اٹک جاتا ہے اور وہ کم بخت حقیقی سبب کی طرف نہیں جاتا۔ ورنہ تو کافر اور مسلمان دونوں مرتے ہیں، لیکن وہ جب مرتا ہے، اس سے پوچھیں گے کہ تمہارے باپ کو کیا ہوا تھا؟ وہ کہے گا کہ ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا، اس نے بڑی غلطی کی تھی، میں نے انہیں کہا تھا کہ بائی پاس کروالو، وغیرہ وغیرہ۔ اور مسلمانوں کا دماغ سیدھا اللہ تعالیٰ کی طرف جاتا ہے۔ یہی مسلمان اور غیر مسلمان کا فرق ہے۔

مسلمان کے ہاں بچہ پیدا ہو گا تو وہ کہے گا: اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور احسان سے پیدا ہوا اور کافر کہے گا کہ میں نے شادی کی اور بیوی کا علاج کرایا تو میری محنت سے پیدا ہوا ہے، خدا نے تھوڑی دیا ہے۔ میں شادی نہ کرتا تو بچہ کہاں سے پیدا ہوتا؟ اس بے وقوف سے پوچھو کہ تمہیں کس نے پیدا کیا؟

یہی بات جاہل کی دیکھ لیں! وہ کہتا ہے کہ میرا فلاں کام اٹک گیا تھا، میں پیر صاحب کی قبر پر نو راتیں بیٹھا، بس میرا کام ہو گیا۔ مسلمان کہے گا کہ پیر کا بھی خدا کرتا ہے اور تمہارا بھی خدا نے کیا۔ اس پیر کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے اور قیامت والے دن اس پیر کو پھر کون اٹھائے گا؟ جنت میں کون لے جائے گا؟ تو اسے جب لے جانے والا بھی اللہ

تعالیٰ ہے تو ہمیں دینے والا بھی اللہ ہے۔ چنانچہ مسلمان راستے میں نہیں اٹکتا، بلکہ سیدھا اللہ تعالیٰ کی طرف جاتا ہے۔ یاد رکھیں! اصل وجہ یہ ہے کہ نہ جوگی کچھ کرسکتا ہے، نہ یہ مٹی کے بھگوان کچھ کر سکتے ہیں، نہ مُردہ کچھ کرسکتا ہے اور نہ زندہ کچھ کرسکتا ہے، سب اسی اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس نے سب کو پیدا کیا ہے۔

آیت کا خلاصہ:

آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ساری کائنات اور ذرّہ ذرّہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ جب بھی جس جگہ بھی تم چہرے کو پھیر کر دعا مانگو گے تو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ یہ نہیں ہے کہ تم مشرق میں مانگو تو میں سنوں اور تم مغرب میں مانگو تو میں نہ سنوں۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ مجھ سے مانگو، میں دعائیں منظور کروں گا تو مسلمانوں نے پوچھا کہ کہاں جا کر مانگیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جہاں ہو، جیسے ہو مانگو، میں سننے والا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی دو صفات کا ذکر آیا: ایک "وَاسِعٌ" اور ایک صفت "عَلِيْمٌ" کہ اللہ پاک کی ساری مخلوق کو اللہ پاک کی ذات ہی کفایت کرنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جود و فضل سے سب کو رزق دینے والے ہیں، تمام مخلوق پر اس کی رحمت واسع ہے، اللہ پاک اپنے بندوں کے ہر عمل کو جاننے والے ہیں، اللہ کے آگے ان کا کوئی عمل بھی چھپا ہوا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز دور نہیں، بلکہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ چھوٹا بڑا سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، جیسا عمل کریں گے ویسی ہی اللہ ان کو جزا عطا فرمائیں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝﴾ [البقرۃ:۱۱۶، ۱۱۷]

"اور (یہود و نصاریٰ) کہتے ہیں: اللہ نے اولاد بنائی ہے، وہ تو سب باتوں سے پاک ہے، بلکہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، سب اس کے تابع فرمان ہیں۔ وہ بغیر کسی سابقہ مثال کے آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ حکم کرتا ہے کسی ایجاد کا تو وہ اس کو کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔"

گزشتہ آیات کے ساتھ ربط:

گزشتہ آیات اور یہ آیات یہود و نصاریٰ کی تردید کے لیے آئی ہیں، اسی طرح مشرکین عرب جنہوں نے

فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا تھا، اللہ تعالیٰ ان آیات میں ان تمام فرقوں کی تردید کر رہے ہیں جو اللہ کے لیے بیٹے یا بیٹیوں کی نسبت کرتے ہیں، لہٰذا فرمایا: سبحانہ وتعالیٰ ان جیسے عیوب سے پاک اور منزہ ہے، اس کی ذات بلند و بالا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثل و بے مثال ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت واحد، احد اور صمد کے علاوہ ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ﴾ [الاخلاص: ۳] بھی ہے، اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ کاملہ سے متصف ہیں اور تمام صفاتِ نقصان سے منزہ ہیں، یعنی جو صفتیں نقص کا ذریعہ ہوں یا جن میں نقص کا شائبہ بھی پایا جائے، اللہ تعالیٰ ان تمام نقائص سے پاک ہیں، لیکن دنیا میں جتنے لوگ مختلف اَدوار اور ازمان میں پیدا ہوئے، مختلف مذاہب، طبقات اور مختلف جماعتیں پیدا ہوئی ہیں، ان تمام نے اللہ تعالیٰ کی توحید کے عقیدہ میں غلو کیا، جیسا کہ یہود و نصاریٰ۔

یہود و نصاریٰ کی گمراہی:

ان کا ذکر اکثر اس لیے کیا جاتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں یہ دونوں طبقے موجود تھے اور یہود و نصاریٰ آج بھی دنیا میں موجود ہیں اور ان سے پہلے جتنے لوگ تھے، وہ یا تو فنا ہو گئے اور ان کا نام تک نہیں رہا، ان کا زمانہ اتنا بعید تھا کہ ان کا ذکر کیا جاتا تو لوگوں کو بات سمجھ نہ آتی۔ یہودیوں نے عقیدۂ توحید میں حد سے تجاوز کر کے اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹے کا اثبات کیا۔ حضرت عزیر علیہ السلام جو کہ ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، ان کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ پھر اسی بات پر قائم نہ رہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے، حتیٰ کہ یہ دعویٰ کیا ہم سب اللہ تعالیٰ کی اولاد ہیں، ہم سب اللہ کے محبوب اور پسندیدہ لوگ ہیں۔

اسی طرح نصرانیوں نے بھی حد سے تجاوز کر کے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا، جس کے بارے میں قرآن پاک نے کئی مقامات پر وضاحت بھی فرمائی اور پھر بعض نصاریٰ نے کچھ اور بھی تجاوز کیا اور کہا کہ بی بی مریم علیہا السلام اللہ کی بیوی ہیں (نعوذ باللہ!)، اور اکثر عیسائی عقیدۂ تثلیث میں کھو گئے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ جہالت ہے۔ اور دوسری بڑی وجہ یہ کہ جب محبت میں جہالت بھی ساتھ ہو تو آدمی غلو کرتا ہے اور بڑھتا ہوا حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔

نصاریٰ کے سامنے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات آئے تو انہوں نے ان کی بات سننے کی طرف توجہ نہ کی، بلکہ فوراً ان کو اللہ کا بیٹا بنا بیٹھے۔ اسی طرح یہود نے عزیر علیہ السلام کے دوبارہ زندہ ہونے کو دیکھا تو وہ بھی اس میں کھو گئے۔ اور یہی واقعہ مشرکین مکہ کا تھا کہ جب ان کے سامنے فرشتوں کا ذکر آیا کہ وہ اللہ کی آسمانی مخلوق ہے اور وہ

فرشتے نظر بھی نہیں آتے، فرشتے آسمانوں سے اُترتے اور اوپر جاتے ہیں اور کسی کو ان کی باتیں بھی سنائی نہیں دیتیں تو انہوں نے بھی اپنے تخیل سے ایک عقیدہ گھڑلیا کہ جتنے فرشتے ہیں، دراصل یہ اللہ کی لڑکیاں ہیں اور جیسے ہم لڑکیوں کو چھپاتے ہیں تو اللہ نے بھی لڑکیوں کو چھپا رکھا ہے اور ان کو زمینوں میں نہیں، بلکہ آسمانوں میں آباد کیا اور ان کو ایسی شکل وصورت دی ہے کہ کوئی ان کو دیکھ نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ امتحان کیوں لیتا ہے؟

یہ بات یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاء اور امتحان ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا اس لیے امتحان لیتے ہیں، تاکہ جو صحیح معنی میں مومن ہیں وہ بھی نکھر کر سامنے آجائیں اور جو کافر ہیں وہ بھی کھل کر سامنے آجائیں، اور جو منافق ہیں وہ بھی سامنے آجائیں۔ مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں امتحان سے پہلے بھی اور امتحان کے بعد بھی۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ میں جو جانتا ہوں، وہ ذرا بندوں کے سامنے بھی آجائے کہ کس نے ابوجہل اور کس نے صدیق بننا ہے؟ کس نے دشمن اور کسی نے دوست بننا ہے؟ اللہ کے تو علم میں ہے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اس آزمائش کی بھٹی میں نہ ڈالتے تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا غنا وحیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور ابوجہل کی عداوت و جہالت سامنے نہ آتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو معجزات بھی عطا فرماتے ہیں، پھر انبیاء پر مشقتیں بھی ڈالتے ہیں، تاکہ جو صحیح عقیدے والا آدمی ہے اس کو پتہ چل سکے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی جان بچانے کے لیے مختلف مقامات پر چھپ رہے ہیں، پناہ لے رہے ہیں، اللہ کے آگے فریادیں کر رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے یہود کی دشمنی سے بچا، مجھے یہودیوں کے قاتلانہ حملے سے بچا، اپنے ساتھیوں سے مدد مانگ رہے ہیں کہ کون ہے تم میں سے میری اس مشکل وقت میں مدد کرے؟ اب جو اہل ایمان ہے وہ ان چیزوں پر بھی نظر رکھتا ہے، کہتا ہے کہ خدا نہ کرے! اللہ کا بیٹا ہو، اگر خدانخواستہ خداوند قدوس کی بیوی ہو تو مصیبت آنے کا کیا مطلب؟ ہر آدمی اپنی بیوی کی حفاظت کرتا ہے (نعوذ باللہ!) خدا اپنی بیوی کی حفاظت نہیں کرسکتا، اللہ تعالیٰ اپنے بیٹے کی حفاظت نہیں کرسکتے۔

جب وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول اور نبی ہیں، یہ جنس بشر اور اولادِ آدم میں سے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کو پیدا کیا، یہ بھی اسی طرح ماں کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اولادِ آدم کی طرح انہوں نے بھی اپنی ماں کے پیٹ

میں نو ماہ کا وقت گزارا ہے، اگر کہیں کوئی ایسا واقعہ آیا ہے تو یہ معجزہ ہے، کرامت اولیاء میں شمار ہوگا۔ یہ نہیں کہ ہم کہیں کہ یہ خدا ہے یا خدا کا بیٹا یا اس کی بیوی ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

منکرین خدا اور مذہب کی بدحالی:

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ جب بھی آدمی (اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے) توحید کے عقیدے سے بھٹکتا ہے تو اس کو ہمیشہ دو چیزیں ہلاک کرتی ہیں: یا تو وہ محبت میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ پٹڑی سے اُتر جاتا ہے یا پھر اتنا نیچے آ جاتا ہے کہ اس کے دل میں نفرت آ جاتی ہے، جس کی وجہ سے دماغوں کے اندر دہریت پیدا ہو جاتی ہے، پھر آدمی کہتا ہے: یار! کہاں ہے خدا؟ اس کے ماننے والے مسلمان تو ہر جگہ مار کھا رہے ہیں، اس کا نام لینے والے تو ہر جگہ بے عزت ہو رہے ہیں، اس کی نمازیں پڑھنے والے تو ذلیل ہو رہے ہیں، اور جو خدا کو مانتے نہیں، شراب پیتے ہیں اور ان کے ہاں حلال وحرام کی تمیز نہیں ہے، وہ تو بڑے مزے میں ہیں، ان کے پاس تو امن وسکون ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ خدا وغیرہ کا قصہ مولویوں کا بنایا ہوا ہے، کوئی خدا، نبی اور رسول نہیں، بس جس نے اچھا کام کیا وہ اچھا لیڈر ہے اور جس نے بُرا کام کیا وہ بُرا لیڈر ہے، بات ختم ہوگئی۔ ایسے لوگ بالکل نفرت میں آ جاتے ہیں اور خدا کا انکار کر کے دہریت میں چلے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم نے دنیا میں بس کھایا، کمایا، دولت اور روٹی سب کچھ ہمارے پاس موجود ہیں۔ جو چاہیں ہم آزادی سے کرتے رہیں، جس چیز کی ضرورت ہو وہ ہم لے لیں اور جس کی ضرورت نہ ہو وہ چھوڑ دیں۔ کسی کے ساتھ زیادتی نہ کریں، بس نہ کوئی خدا ہے، نہ رسول اور نہ ہی قیامت وآخرت ہے۔ جو لوگ ہزاروں سال پہلے مر گئے، وہ کہاں ہیں؟ آباؤاجداد مر گئے، ہم بھی مر جائیں گے، مٹی میں مل جائیں گے۔ وہ اس نفرت میں آکر (اللہ تعالیٰ معاف کرے) کفار کے ساتھ مل گئے۔

عقیدت اور عداوت میں غلو کرنے والوں کی بدحالی:

جن لوگوں نے حضور اکرم ﷺ کے صرف معجزات پر نظر رکھی کہ حضور اکرم ﷺ کی انگلی سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں، لعابِ دہن سے کڑوے کنوئیں میٹھے ہو جائیں، حضور اکرم ﷺ پتھر پر چوٹ لگائیں تو چٹانیں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں، حضور اکرم ﷺ پہاڑ پر پاؤں ماریں تو زلزلہ آنے سے رک جائے۔ جب انہوں نے ان معجزات پر نظر ڈالی تو بس انہی میں کھو گئے اور کہا کہ یہ صورتاً تو بشر تھے، بشریت کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا، لیکن اصل

میں خود خدا تھے۔ جب عرش پر تھے تو خدا تھے اور جب مدینے میں اُترے تو محمد مصطفیٰ ﷺ بن گئے۔ یہ بھی دراصل اسی محبت کا نتیجہ تھا، لیکن محبت میں غلو اور تجاوز کر گئے اور حد سے نکل گئے۔

بعض لوگ تعصب کا شکار ہو گئے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ تو ہماری طرح کھانا کھاتے ہیں، بازاروں میں جاتے ہیں، ان کو دکھ تکلیف آتی ہے تو کیسے خدا کا رسول مان لیں؟ ایک عام آدمی ہے، مکہ مکرمہ کی سرداری لینے کے لیے ایک نعرہ دے دیا ہے، تاکہ لوگ اس کے پاس اکٹھے ہو جائیں۔ یہ کوئی نبی اور رسول نہیں ہے۔ وہ دشمنی میں بڑھ کر نبوت و رسالت کا بھی انکار کر بیٹھے اور کوئی محبت میں ایسے بڑھے کہ خدا کے مرتبے پر فائز کر بیٹھے۔ لہٰذا دونوں راستے سے ہٹ گئے۔

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو ہدایت اور صراطِ مستقیم پر رکھا، انہوں نے اپنے عقیدے کو صاف رکھا کہ جب ساری کائنات کا مالک و خالق اللہ تعالیٰ ہے تو اس کو بیٹوں کی کیا ضرورت ہے؟ بیٹے کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو محتاج ہو، جیسے اپنے بڑھاپے کا خطرہ ہو کہ کل جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا تو میری لاٹھی کون پکڑے گا؟ کھانے اور رہائش کا انتظام کون کرے گا؟ بیمار پڑ جاؤں تو میری عیادت اور مدد کون کرے گا؟ اللہ تو ہر نقص سے پاک ہیں، انہیں کیا ضرورت ہے؟ ساری کائنات جس کی مخلوق ہو، اس کو کیا ضرورت ہے کہ بیٹے بنائے؟ اسے کیا بیوی کی احتیاج ہے؟ اللہ تعالیٰ کا تو سارا مِلک ہے، سب اس کے عبد ہیں، وہ چاہے تو ساری مخلوق کو ایک لمحہ میں ختم فرما دے اور چاہے تو ساری مخلوق دوبارہ پیدا فرما دے۔ اس پاک ذات کو کس چیز کی ضرورت ہے؟

اسی طرح انہوں نے کہا کہ جتنے رسول آئے ہیں، بالکل اللہ کے نبی ہیں، ان کے والدین ہیں، ان پر بھی ولادت کا دور گزرا ہے، ان پر بھی دورِ رضاعت گزرا ہے، ان پر جوانی اور بڑھاپے کا دور گزرا ہے، ان پر بخار اور تکالیف آئی ہیں، ان پر جادو ہوئے ہیں، ان پر بھی زخم لگے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے ایسے معجزات عطا فرمائے۔ اس لیے الحمدللہ! وہ لوگ راہِ حق پر رہے۔

ایک پادری سے مناظرہ، چنے بیچنے والے نے ہرا دیا:

دنیا میں ایک ایسا طبقہ لوگوں کا موجود ہے کہ جس قسم کا آدمی دعویٰ کرے، اس کے ماننے والے کچھ دنوں بعد اسے مل ہی جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ دنیا میں کتنے پیر ہیں، ہر پیر کا کوئی نہ کوئی حلقہ موجود ہے۔ کسی کے پانچ

ہزار اور کسی کے دس ہزار ہیں، ایسے بھی پیر ہیں کہ جن کو خود نماز پڑھنی نہیں آتی، لیکن ان کے بھی مرید ہیں۔

مرزا نے دعویٰ نبوت کیا، اس کے ماننے والے بھی موجود ہیں، جس نے مجدد کا دعویٰ کیا اور کسی نے بڑے عجیب عجیب دعوے کیے، ان کے ماننے والے بھی موجود ہیں۔ اسی طرح اس کے ساتھ عیسائیوں نے بھی اس مسئلہ پر بڑا شور مچایا اور کہا کہ اس مسئلہ پر ہمارے ساتھ مناظرہ کریں اور ایسے مسائل پر اہل حق ہمیشہ احتراز کرتے ہیں کہ مناظرہ تو ایسی بات میں کیا جاتا ہے کہ جس کے حق ہونے میں کوئی شک ہو، تاکہ آدمی دلائل دے کر حق بات کو واضح کرے، لیکن جو بات قرآن وسنت اور شرع وعقل کے بالکل خلاف ہو، اس پر کیا بات کرنی ہے؟ لیکن باطل جب مجبور کر دیتا ہے تو علماء مجبور ہو جاتے ہیں کہ اب اگر ہم جواب نہیں دیں گے تو لوگ باتیں بنائیں گے کہ دیکھا جی! مولوی جھوٹے ہیں، اس لیے سامنے آ کر بات نہیں کرتے۔

ہمیشہ یاد رکھیں! مناظرہ یا مسئلہ وہاں ضروری ہوتا ہے جب پوچھنے والے نے اپنی تسلی کرنی ہو کہ جی! مجھے اس مسئلہ میں تسلی کرنا ہے کہ عشاء کی نماز کی چار رکعات ہیں یا تین یا دو، کتنی ہیں؟ اور میں عشاء کی نماز کیسے پڑھوں؟ آپ نے اس کو بتا دیا کہ چار رکعت فرض ہیں اور چار سنتیں پہلے ہیں، پڑھ لو تو ثواب ملے گا، نہیں پڑھو گے تو گناہ نہیں ہوگا، دو سنتیں بعد میں پڑھو گے اور اس کے بعد تین رکعت وتر پڑھو گے۔ اب اس نے مسئلہ سمجھنا تھا، آپ نے سمجھا دیا، لیکن ایک ہوتا ہے محض فساد۔ مسئلہ سمجھنا مقصد نہیں ہوتا، مقصد صرف فساد مچانا اور ایک شرارت کرنی ہوتی ہے کہ جب میں شور کروں گا تو لوگ کہیں گے کہ نہیں جی! اس بات میں بھی کچھ وزن معلوم ہوتا تھا اور کچھ کہیں گے کہ نہیں، وہ تو جھوٹ بول رہا تھا۔ بس یہیں سے لڑائی شروع ہوگئی۔ دو فرقے پیدا ہو گئے: کچھ اس کے اور کچھ دوسرے کے حامی بن گئے۔

واقعہ:

اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ جب اس مسئلہ اہمیت پر علماء کو چیلنج کیا تھا تو حضرت نانوتوی ؒ کو مناظرہ کے لیے بلایا گیا۔ ابھی حضرت نانوتوی ؒ تشریف نہیں لائے تھے، وہ اپنی تقریر کر رہا تھا کہ کوئی بے چارہ چنے بیچنے والا جو جلسے کے باہر کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کی عقل میں کوئی بات آئی تو اندر چلا گیا۔ اس نے کہا: پادری صاحب! کیا شور کر رہے ہو، مسئلہ کیا ہے؟ ساری مخلوق کیوں اکٹھی کی ہوئی ہے؟ سینکڑوں لوگ اکٹھے کیوں ہیں؟ اس نے کہا: بس

میں مناظرے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ تمہارے مسلمانوں کا مولوی ابھی تک نہیں آیا ہے۔ اس نے کہا کہ مناظرہ تم نے کرنا کس موضوع پر ہے؟ اس نے کہا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے، ہم اس کے بیٹے کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا: اچھا تم مانتے ہو؟ کہا: ہاں بالکل۔ اس آدمی نے کہا: اللہ کا بیٹا ہے کون؟ اس نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اس نے کہا: خدا کی عمر کتنی ہے؟ اب پادری صاحب چپ۔ اللہ کی عمر کیسے بتائیں؟ اس نے کہا کہ تم نے اللہ کا بیٹا جو بنایا ہے تو عمر بھی بتاؤ نا! خدا بوڑھا ہے یا جوان؟ اس کا جواب تو آیا ہی نہیں۔ اس نے پادری سے کہا: اچھا یہ بتاؤ کہ اللہ کا ایک ہی بیٹا ہے یا دو، چار، پانچ اور بھی ہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں، بس ایک ہی بیٹا ہے۔ اس نے کہا: کمال کرتے ہو، میں چنے بیچتا ہوں، سات تو میرے ہیں، ایسا کمزور خدا کہ ایک کے جننے کے بعد چھٹی ہو گئی۔ ایسا خدا جو مجھ سے بھی کمزور ہو، میں نہیں مانتا۔ پادری مناظرہ چھوڑ کر بھاگ گیا، جھوٹا آدمی کیا جواب دے سکتا ہے؟ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ آئے تو بتایا گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ بہرحال ایسے آدمی کا علاج تو یہی تھا۔ علمی بحثیں کرتے تو کچھ لوگوں کو سمجھ آتی اور کچھ کو نہ آتی۔ کچھ لوگوں کے دماغ میں مسئلہ داخل ہوتا تو کچھ لوگوں کے دماغ میں داخل ہی نہ ہوتا۔ یہ تو ایک ایسا علاج ہے ہر کسی کو ماشاء اللہ! سمجھ آ گیا، اچھا مناظرہ کیا۔

واقعہ:

ایک پنڈت دیانند سرسوتی سے مناظرے پر گئے تو ان کے لیے شرائط طے کرنے کے لیے علماء کو بھیجا گیا۔ جب وہ علماء آئے تو انہوں نے دیکھا کہ اس پادری کے آگے انواع و اقسام کے کھانے پڑے ہوئے ہیں، وہ بھی کھا رہا ہے اور باتیں بھی کر رہا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم بڑے گھبرائے کہ یہ اتنا کھاتا ہے، کہیں مولانا کو کھانے میں چیلنج نہ کر دے کہ کھانے میں مقابلہ کرو۔ مولوی قاسم صاحب تو اس زمانے میں ایک چپاتی پر دن بھر گزارتے تھے تو اس نے کہا کہ ہمارے استاد صرف چپاتی ہی کھا سکتے ہیں اور یہ آدمی پچاس آدمیوں کا کھانا کھا گیا۔

جب وہ واپس آئے تو پریشان! مولانا نے فرمایا کہ بھئی! چپ چپ لگتے ہو، کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ پادری اگر کھانے پر آپ سے مناظرہ کر لے تو وہ تو بہت کھاتا ہے، آپ کیسے مناظرہ کریں گے؟ حضرت نے فرمایا کہ بھائی! مناظرہ علم میں ہوتا ہے، جہل میں ہوتا ہی نہیں۔ کھانے کا تعلق جہالت سے ہے، اگر اس نے کھانے میں چیلنج کیا تو ہم کوئی بھینس کھڑی کر دیں گے، کیونکہ اس کا علم سے تو تعلق نہیں ہے، اور اگر اس نے زیادہ مجبور کیا تو تم

میرے ساتھ آئے ہو، تم کس بلا کا علاج ہو؟ اور اگر علم میں مناظرہ ہوا تو علم میں ہم حاضر ہیں اور نہ کھانا وہ علم کی صفت ہے، اس سے کہیں گے کہ تم نہ کھانے میں ہمارے ساتھ مناظرہ کرو کہ بھئی! کھانا ایک مرتبہ کھا لیتے ہیں، وضو کر کے ہمیں مسجد میں بند کر دو، نمازیں پڑھتے رہو اور ایک مہینے تک کھانا نہ دو، پھر جو زندہ رہ جائے وہ سچا ہے اور جو مر جائے وہ جھوٹا ہے۔ نہ کھانا، یہ علم کی صفت ہے، اس میں ہم مناظرہ کر لیں گے۔

اگر کھانا صفتِ علم ہوتا تو اللہ بندے کو سب سے زیادہ کھانے کی توفیق دیتا، جیسا کہ جانور زیادہ کھاتا ہے۔ چونکہ وہ جاہل ہے، اس لیے زیادہ کھاتا ہے، اور جس میں زیادہ علمیت آجائے گی اس کا کھانا اتنا کم ہوتا جائے گا، وہ تو ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے گا، کھانے میں تو نہیں لگا رہے گا (یہ واقعہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی کتاب ''انتصار الاسلام'' کے دیباچہ میں کچھ تغیر کے ساتھ درج ہے۔ انور) پھر اللہ تعالیٰ ان کی غذا کو ذکر بنا دیتے ہیں، تلاوت وعبادت کو غذا بنا دیتے ہیں۔

اسی لیے آپ تصور کر سکتے ہیں کہ دو دو مہینے تک اللہ کے نبی ﷺ کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، وہاں کھانا پکتا ہی نہیں تھا تو گزارا کیسے ہوتا تھا؟ تو بیوی نے فرمایا: کھجور کے دانے مل جاتے تھے اور پانی مل جاتا تھا۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور پاک ﷺ کے گھرانے میں تو کھجوریں بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائیں۔

بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے گھی لگی ہوئی روٹی زندگی بھر نہیں کھائی...... ہمارا ناشتہ تو پراٹھے کے بغیر ہوتا ہی نہیں...... اس لیے میں کہہ رہا تھا کہ لوگ اسی لیے دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کتنے بڑے جاہل ہیں؟ جو چیز میری مخلوق اور میری ملک ہے، جو اس میں چاہوں، میں کروں، مجھے کسی سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

آیت مبارکہ سے یہود و نصاریٰ کا ردّ:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ اور ان لوگوں پر رد کیا ہے جنہوں نے اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں ثابت کیں۔ اللہ نے ان سب کو ان کے دعویٰ میں جھوٹا کیا کہ ان کا یہ قول جھوٹا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و بالا اور مقدس ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات ان باتوں سے پاک ہے جو یہ ظالم کہتے ہیں۔ ایسے نہیں جیسے ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیٹا لازمی اپنے ماں باپ کے مشابہ ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا تو کوئی شبیہ ہو ہی نہیں سکتا، پھر اللہ تعالیٰ کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لیے فرمایا کہ خداوند قدوس اس سے پاک ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی نظیر ہو۔ نہ اس کی عظمت و کبریائی میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کی کوئی بیوی ہے۔

دوسری بات یہ کہ جب بھی کوئی اولاد ہوگی، لازماً وہ اپنے والد کی جز ہوگی اور جز و اسی چیز کا ہوسکتا ہے جو قابل تقسیم ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر طرح کی تقسیم سے منزہ اور مقدس ہے۔

تیسری بات یہ کہ خدا کا بیٹا بھی تو کیا وہ بھی خدا ہوگا؟ اگر وہ خدا ہو تو خدا کسی کا محتاج نہیں ہوتا، جبکہ ایسا بیٹا وجود میں باپ کا محتاج ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بیٹا خدا نہیں ہوگا تو پھر کیا ہوگا؟ اگر مخلوق ہوگا تو دنیا میں یہ قاعدہ ہے کہ ابنیت اور عبدیت دنیا میں جمع نہیں ہوسکتی، یعنی اگر بفرض محال کسی نے غلام خریدا اور وہ اس کا بیٹا تھا، مثلاً بچپن میں جنگ میں گرفتار ہوگیا تھا، پھر بکتے بکتے جب باپ نے خریدا تو پتہ چلا کہ وہ اس کا بیٹا ہے تو وہ اسی وقت آزاد ہوجاتا ہے؛ کیونکہ جو بیٹا ہے وہ عبد نہیں ہوسکتا؛ کیونکہ عبدیت اور ابنیت بندے میں جمع نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جب ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عبد ہو تو اللہ کے بیٹے ہونے کا کیا مقصد؟ اس لیے سب سے پہلا جواب یہ دیا کہ ﴿سُبۡحٰنَہٗ﴾ اللہ کی ذات پاک ہے۔

ابن آدم کا اللہ کو جھٹلانا:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث قدسی نقل کی ہے:

"عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ قَالَ اللّٰهُ: كَذَّبَنِي ابْنُ آدَمَ وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ، وَ شَتَمَنِي، وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ، فَأَمَّا تَكْذِيبُهُ إِيَّايَ فَزَعَمَ أَنِّي لَا أَقْدِرُ أَنْ أُعِيدَهُ كَمَا كَانَ، وَ أَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ، فَقَوْلُهُ لِي وَلَدٌ، فَسُبْحَانِي أَنْ أَتَّخِذَ صَاحِبَةً أَوْ وَلَدًا." [صحیح بخاری، رقم: ۴۴۸۲]

اللہ پاک نے فرمایا کہ ابن آدم نے مجھے جھٹلایا، میری تکذیب کی، حالانکہ بندے کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اپنے خالق و مالک کو جھٹلاتا۔ ابن آدم نے مجھے گالی دی، حالانکہ اسے نہیں چاہیے تھا کہ وہ مجھے گالی دیتا۔ اب تکذیب کا کیا معنی؟ اللہ کو کیسے جھٹلایا؟ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ بندے یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلاتے ہیں۔ کیا میں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہوں؟ جب میں پہلے

بنانے پر قادر ہوں تو تمہیں قبر سے دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہوں۔ فرمایا کہ ان کا گالی دینا یہ ہے کہ وہ میرے لیے بیوی اور بچے ثابت کرتے ہیں، حالانکہ میری ذات بیوی اور بچے سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے باوجود وہ اپنے بندوں سے رزق نہیں روکتا:

صحیحین میں روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

"لَيْسَ أَحَدٌ، أَوْ: لَيْسَ شَيْءٌ أَصْبَرَ عَلَى أَذًى سَمِعَهُ مِنَ اللهِ، إِنَّهُمْ لَيَدْعُونَ لَهُ وَلَدًا، وَإِنَّهُ لَيُعَافِيهِمْ وَ يَرْزُقُهُمْ." [صحیح بخاری، رقم:٦٠٩٩]

اللہ سے بڑا صبر کرنے والا کون ہے؟ جتنی تکالیف اللہ تعالیٰ کو پہنچائی گئیں اور اللہ نے سنیں، اس کے بعد وہ صبر کا مظاہرہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف اولاد اور بیوی جیسی گندی باتیں منسوب کی جائیں، لیکن اس کے باوجود وہ ان کو رزق بھی دیتا ہے اور صحت بھی دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کمال صبر ہے، اللہ تعالیٰ کا کمال ہے کہ وہ پھر بھی ہمیں زندہ رکھتے ہیں۔

﴿كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ ﴿قَانِتُونَ﴾ کے معنی "مُصَلِّيْنَ" یعنی نماز پڑھنے والے کے ہیں۔ اسی طرح حضرت عکرمہ اور ابو مالک نے فرمایا: یعنی وہ تمام اشیاء جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں، وہ اپنی عبدیت کا اقرار کرنے والی ہیں کہ ہم اللہ کی مخلوق ہیں۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ﴿قَانِتُونَ﴾ کا معنی اخلاص ہے اور ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والے سب قیامت کے دن اسی کے سامنے حاضر ہونے والے اور اس کی اطاعت کرنے والے ہیں۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو بھی مخلوق آسمانوں اور زمینوں میں ہے، سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو انسان بننے کا حکم دیا وہ انسان بن گیا، جس کو حیوان بنایا وہ حیوان بن گیا، کوئی حیوان یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے انسان کیوں نہیں بنایا؟ اور کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کسی اور مخلوق میں کیوں پیدا نہیں کیا؟

اس کے بعد دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ جب آسمانوں اور زمینوں کی تمام مخلوق اسی کی ملک اور مخلوق اور مملوک ہے تو پھر اس کے لیے بیٹے کی کیا ضرورت ہے؟

اور تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ تمام کی تمام مخلوق اسی کی اطاعت گزار ہے، وہ تو خود اعتراف کرنے والے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات منزہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات برتر وبالا ہے، جن کو تم اللہ کا بیٹا بنا رہے ہو وہ تو خود کہتے ہیں کہ خدا بیٹے سے پاک ہے، اللہ تعالیٰ کی صفت ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝﴾ ہے۔

سجدۂ عبادت و تعظیمی میں فرق:

اسی طرح یاد رکھیں کہ عیسائی، مسلمانوں کو یہ دھوکہ بھی دیتے ہیں کہ ہم اصل میں عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا تو کہتے ہیں، لیکن ہمارا بیٹا کہنے سے وہ حقیقی بیٹا مراد نہیں، بلکہ یہ مجازی بیٹا ہے۔ جیسا کہ آج کل آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ جتنے اہل بدعت ہیں، ان کو جب آپ کہیں گے کہ آپ قبر پر سجدہ کرتے ہیں، اپنے پیروں کو ان کی خانقاہوں میں سجدہ کرتے ہیں تو وہ کہیں گے: نہیں جی! حقیقی سجدہ عبادت اور نماز والا ہے، وہ تو اللہ کے لیے ہے، یہ تو تعظیمی سجدہ ہے، یہ شکل تو ہے سجدہ والی، لیکن اس سے تو مقصد ہمارا تعظیم ہے، اور اللہ تعالیٰ نے خود حکم دیا ہے کہ میرے بندوں کی توقیر کرو۔ لہٰذا ہم تو تعظیم کر رہے ہیں، یہ سجدہ حقیقی یا عبادت والا نہیں، بلکہ تعظیمی ہے۔ وہ اس پر بعض فقہاء کے اقوال سے بھی حجت پکڑتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کسی آدمی نے غیر اللہ کو تعظیم کی نیت سے سجدہ کیا تو یہ حرام ہے، لیکن کفر نہیں۔ کفر تو اس وقت ہوگا جب اسی طرح کا خیال عبودیت کرے جو اللہ کے لیے کیا جاتا ہے، جب اس قسم کا تذلل اختیار کرے گا تو کفر ہے، ورنہ اس کا مقصد تعظیم تھا، جیسے آدمی والدین کے پاؤں میں گر جاتا ہے، کبھی باپ کے پاؤں میں گر جاتا ہے۔

لیکن اصولی بات یاد رکھیں کہ جب تک دل میں تعظیم نہ ہو تو سجدہ ہوتا ہی نہیں۔ سب سے پہلے عظمت، پھر اس ذات کے ساتھ محبت، پھر غایت تذلل اور غایت عبودیت پیدا ہوگی۔ لہٰذا سب سے بہتر راستہ ان علماء کرام نے اختیار فرمایا کہ کسی حال میں بھی ہو، غیر اللہ کو سجدہ کفر ہے؛ کیونکہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے اجازت مانگی تھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدہ کے لیے کہ یا رسول اللہ! لوگ بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں، ہم بھی آپ کو سجدہ کریں؟ لازمی بات ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تعظیم والا سجدہ کرنا چاہتے ہوں گے، کوئی عبادت والا سجدہ تو نہیں کرنا چاہتے ہوں گے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی یہی چاہتے ہوں گے کہ جیسے لوگ بادشاہوں کے سامنے جھکتے ہیں اور کوئی فرشی سلام بجالاتے ہیں، کوئی باقاعدہ زمین پر سجدہ کرتا ہے، کوئی ہاتھ باندھ کر اپنے معروضات پیش کرتا ہے، ہم بھی آپ کو ایسا سجدہ کریں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بالکل نہیں! اللہ کے سوا مخلوق میں کسی کو سجدہ کی اجازت ہوتی تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کی تعظیم میں سجدہ کرے، لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا چونکہ کسی غیر کو سجدہ کی اجازت ہی نہیں ہے، لہٰذا خبردار! کوئی کسی کو سجدہ نہ کرے۔ راستہ ہی بند کر دیا، تاکہ سجدہ کی ظاہری شکل بھی کسی غیر کے سامنے نہ بنے، ورنہ تو پھر راستے نکلتے چلے جائیں گے اور آدمی ایک نہ ایک بہانہ بناتا چلا جائے گا۔

چنانچہ عیسائیوں نے بھی ایک بہانہ بنایا، انہوں نے دیکھا کہ جب ہم علماء جواب نہیں دے سکتے اور قرآن و حدیث کے دلائل کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تو اب جان چھڑانے کے لیے انہوں نے ایک اور راستہ اختیار کر لیا اور کہا کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کو حقیقی بیٹا نہیں مانتے، بلکہ مجازی بیٹا مانتے ہیں۔ یہ باطل کا قاعدہ ہے کہ جب وہ لاجواب ہوتا ہے تو بہانہ بناتا ہے۔

ظلی و بروزی نبی کی داستانیں:

مرزا غلام احمد قادیانی کا علماء کرام نے خوب تعاقب کیا کہ تم نے کیسے نبوت کا دعویٰ کر دیا؟ حضور اکرم ﷺ پر تو اللہ تعالیٰ نے نبوت ختم فرما دی، سب سے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، تُو نے پھر قراءتوں کا سہارا لیا۔ ''خَاتَمَ النَّبِيِّينَ'' ''ت'' کے زبر کے ساتھ یا ''خَاتِمَ النَّبِيِّينَ'' ''ت'' کے زیر کے ساتھ ہے۔ جب علماء نے تمام لغت کی کتابیں سامنے رکھ دیں اور کہا کہ ''خَاتَم'' ہو یا ''خَاتِم''، معنی ایک ہی بنتا ہے، اور پھر جب اس آیت قرآنی کا ترجمہ خود حضور اکرم ﷺ نے فرما دیا اور فرمایا: ''أَنَا خَاتِمُ الْأَنْبِيَاءِ وَ أَنْتُمْ خَاتِمُ الْأُمَمِ'' اور پھر دوسری حدیث میں فرما دیا: ''أَنَا خَاتِمُ الْأَنْبِيَاءِ وَ أَنْتُمْ آخِرُ الْأُمَمِ'' اور اس کے بعد فرما دیا: ''لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَ لَا رَسُوْلَ بَعْدِيْ'' حضور اکرم ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو بھی فرمایا کہ علی! تم باعتبار قرابت کے میرے ایسے قریب ہو جیسے ہارون علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے قریب تھے۔ وہاں بھی میرے نبی ﷺ نے فرما دیا کہ کوئی بدظن اور بدبخت دھوکہ نہ دے سکے۔ تم میرے قریب ہو ہارون علیہ السلام کی طرح، لیکن خبردار! میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ہارون علیہ السلام کی طرح تمہیں بھی نبی سمجھ بیٹھے۔

اتنی وضاحتوں کے بعد مرزا نے ایک اور چال چلی، اس نے کہا کہ تم نے تو سمجھا ہی نہیں، میں نے یہ جو کہا ہے کہ میں نبی ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں تو ظلی نبی ہوں اور حضور اکرم ﷺ کے بعد کوئی حقیقی نبی نہیں ہوگا۔ حضور

اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد نبی نہیں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اب کوئی حقیقی نبی نہیں ہوگا، کوئی تشریعی نبی نہیں ہوگا، بلکہ میں حضور اکرم ﷺ کی شریعت کے اوپر چلوں گا اور میں ظل ہوں گا، گویا حضور اکرم ﷺ کا پرتو اور سایہ ہوں۔ اور سایہ کہتے ہیں کہ انسان چل رہا ہے تو اس کا سایہ ہے اب سایہ تو اسی انسان کا ہے، لیکن وہ سایہ ہے اور یہ انسان ہے۔

علماء کرام نے پکڑا اور فرمایا کہ اگر تم ظلی نبی ہو تو پھر صحابہ تم سے زیادہ اقرب ہیں، اگر تم چودہ سو سال کے بعد اتباع کر کے حضور اکرم ﷺ کا ظل بننا چاہتے ہو تو پھر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ زیادہ حق دار ہیں اور باقی تین خلفاء زیادہ حق دار ہیں، عشرہ مبشرہ زیادہ حق دار ہیں، جب انہوں نے اپنے آپ کے لیے ظل کا دعویٰ نہیں کیا تو تمہاری ظلیت کو ہم کیسے مان لیں؟

ہاں البتہ یہ ہے کہ تم ''ظل'' تو نہیں ہو، بلکہ ''ذل'' ہو۔ ظل اگر ''ظ'' سے ہو تو سایہ کے معنی میں ہوتا ہے اور اگر ''ذ'' سے ہو تو ذلیل کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی تم ذلیل ہو، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے خود فرما دیا ہے کہ میرے بعد تیس ایسے دجال ہوں گے جو جھوٹے ہوں گے اور ان سب میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ میں نبی ہوں۔ لیکن خبردار! میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، میرے بعد کوئی رسول نہیں ہوگا۔ یہ تو اجماعی عقیدہ ہے کہ اگر ایک آدمی نبی ﷺ کی رسالت کا بھی قائل ہو، نبوت و شریعت کا بھی قائل ہو، لیکن آپ کے خاتم النبیین ہونے کا قائل نہ ہو تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیٹا کے دعویٰ کی تردید میں جب عیسائیوں کے خلاف علماء حق میدان میں نکلے ان سے کہتا کہ تم کیسے بدبخت ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے ہو؟ اگر عیسیٰ علیہ السلام ابن اللہ ہے تو پھر بتاؤ کہ وہ کب پیدا ہوئے؟ اتنے ہزار ہا سال میں تو تم نے خدا کا کوئی اور بیٹا نہیں بنایا اور پھر عیسیٰ علیہ السلام جن کو تم کہتے ہو کہ خدا کا بیٹا ہے، وہ تو خود کہتے ہیں: ﴿اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ﴾ میں تو اللہ کا ایک بندہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے، (نعوذ باللہ!) میں اللہ کا بیٹا نہیں ہوں۔

آپ ساری انجیل پڑھ لیں، کسی جگہ آپ کو یہ نہیں ملے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو اللہ کا بیٹا کہا ہو۔ عیسائی بھی مجازی بیٹے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مجازی کا کیا معنی؟ ایک آدمی جب کسی کے قریب ہوتا ہے تو آدمی کہتا ہے کہ فلاں شخص کو فلاں نے بیٹا بنا لیا ہے۔ بیٹا تو نہیں ہوتا، وہ تو غیر ہے، لیکن محبت اور اکرام و تکریم میں ایسا مرتبہ دیا گیا ہے، لہٰذا وہ

بیٹا ہے۔

دوسرا وہ یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی صفات کا پَرتو ہم عیسیٰ علیہ السلام میں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ گویا یہ اللہ کا مجازی بیٹا ہے۔ مجازی کا مطلب یہ کہ جیسے اللہ مُردوں کو زندہ کرتا، اندھوں کو آنکھیں دیتا ہے، اللہ کا بھی ماں باپ نہیں ہے، بغیر باپ کے ہے، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام بھی مُردوں کو زندہ کرتے، اندھوں کو بینائی دیتے ہیں اور ایک حصے میں عیسیٰ علیہ السلام کا بھی باپ نہیں ہے، لہٰذا وہ صفات ہمیں عیسیٰ علیہ السلام میں نظر آتی ہیں۔ علماء نے کہا کہ بدبختو! اگر ایسی بات ہے تو پھر تمام انبیاء اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو اللہ نے چن لیا: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الانعام: ۱۲۴] اگر کسی کے ہاتھ پر مُردہ زندہ ہونے سے وہ خدائی صفات آ جاتی ہیں تو پھر یہ تو ابراہیم علیہ السلام میں بھی موجود ہیں، جب ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے پوچھا: ﴿رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ﴾ [البقرۃ: ۲۶۰] اللہ پاک! مجھے تو دکھائیں کہ مُردہ کیسے زندہ ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا کہ کیا ابھی تمہارا اس پر ایمان و یقین نہیں ہے کہ میں مُردوں کو زندہ کرنے والا ہوں؟ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: ہاں! میرا ایمان ہے، لیکن میں اپنے علم الیقین کو عین الیقین میں بدلنا چاہتا ہوں کہ میں مشاہدہ کرلوں کہ مُردہ کا احیاء کیسے ہوتا ہے؟ فرمایا: ابراہیم! چار پرندے لے لو، پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو، ان کا گوشت آپس میں ملا دو، پھر اس گوشت کو چار حصوں میں تقسیم کر کے مختلف پہاڑوں پر رکھ دو اور پھر ایک جگہ کھڑے ہو جاؤ اور ان کو پکارو تو پھر دیکھنا کہ تمہارے سامنے کیسے زندہ ہو کر آ جائیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی طرح کیا اور جب بلایا تو پرندے زندہ ہو گئے۔ علماء نے کہا کہ یہی اگر دلیل ہے تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی خدا یا خدا کا بیٹا مانو۔

اسی طرح آپ دیکھیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اللہ کے حکم سے لکڑی میں حیات پیدا کر دی کہ جس ستون کے ساتھ حضور اکرم ﷺ ٹیک لگا کر خطبہ پڑھتے تھے، حضور پاک ﷺ نے جب خطبہ دینا چھوڑ دیا تو اس تنے سے باقاعدہ رونے کی آواز آنے لگی۔ اب ہم کیا حضور اکرم ﷺ کو خدا کا بیٹا بنا لیں؟

ہمیشہ یاد رکھیں کہ یہ جتنے باطل اور گمراہ کافر فرقے ہوتے ہیں، اسی طرح کے جھوٹے دلائل اکٹھے کر کے اور قرآن و حدیث میں تحریف کر کے اپنے مطلب کی آیت کا ایک ٹکڑا لے کر باقی سارا قرآن چھوڑ دیں گے، اس پر عمل نہیں کریں گے، صرف اس کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیں گے، جیسے عیسائیوں نے کہا کہ دیکھیں جی! قرآن میں آیا

ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ [الحجر: ۹] (تحقیق ہم نے یہ قرآن اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔ یہاں اللہ نے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے اور جمع کے کم از کم تین ہوتے ہیں، لہٰذا ہمارا تثلیث کا عقیدہ ٹھیک ہوگیا۔

اسی طرح کئی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم حفاظت کرنے والے ہیں، ہم قرآن کو نازل کرنے والے ہیں۔ یہ جمع ہے اور جمع کم از کم تین عدد کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا عیسائیوں نے کہا کہ ان میں سے ہر ایک خدا ہے اور تینوں قرآن اور ذکر کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اب ایک آیت پیش کردی، لیکن جہاں قرآن نے کہا: ﴿إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ﴾ [حم السجدۃ: ۶] اس آیت کا انکار کردیا، اور ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ کا بھی انکار کردیا، سارے قرآن کو چھوڑ دیا اور لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے ایک آیت لے لی اور کہا کہ دیکھو جی! قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کا صیغہ جمع کے لیے استعمال ہوا ہے۔

حالانکہ یاد رکھو! قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی جمع کا صیغہ تعظیم کے لیے بھی ہوتا ہے، جیسے دنیا میں بادشاہ کسی کو آرڈر لکھتے ہیں تو وہ یہ نہیں لکھتے کہ میں نے لکھا ہے، بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ ہم نے یہ لکھا ہے۔ حالانکہ آرڈر تو ایک آدمی نے کیا ہوتا ہے، وہ جمع کا صیغہ بطور عظمت و تعظیم کے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات تو واحد ہے، لیکن عظمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے بھی جمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔

اس لیے پروردگارِ عالم نے قرآن پاک کی اس آیت میں تین انداز میں رد بیان فرمادیا ہے۔ سب سے پہلے تو فرمایا کہ اللہ پاک کی ذات ہے اور جاہلوں کی طرف توجہ کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو ہے سب اس کا مملوک ہے اور عبد ہے تو عبدیت اور ابنیت جمع ہی نہیں ہوسکتی۔ جب ساری کی ساری مخلوق اسی کی ہے اور آسمان اور زمین کا ذرہ ذرہ اس کا ہے تو اگر تمہیں عقل ہوتا تو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے۔

مفسر رحمہ اللہ اصل مضمون کی طرف عود کر رہے ہیں کہ ﴿قَانِتُونَ﴾ کے معنی میں جو قول حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، وہی قول ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے جیسا یہ سب اقوال کو جمع کرنے والا قول ہے، کیونکہ قنوت کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا اور خود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دینا۔ خواہ اطاعت شرعی طور پر کرے، جیسا کہ مومن کرتا

ہے کہ وہ تمام احکام میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے، یا تکوینی طور پر کرے، جیسے تقدیر کا تو وہ بھی پابند ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز سجدہ کرتی ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، چاہے وہ خوشی سے اطاعت کرے یا مجبوراً کرے۔ تقدیر کے حکم سے کوئی نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح ہر چیز کے سائے صبح یا شام کو کبھی چڑھ رہے ہیں اور کبھی اُتر رہے ہیں اور کبھی پھیل اور کبھی سکڑ رہے ہیں، یہ سب دراصل اللہ تعالیٰ کو سجدہ اور اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی اطاعت سے نہیں نکل سکتی۔

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض احادیث مبارکہ میں یہ ذکر کیا گیا ہے:

"كُلُّ حَرْفٍ مِنَ الْقُرْآنِ يُذْكَرُ فِيهِ الْقُنُوتُ فَهُوَ الطَّاعَةُ." [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۱۱۷۱۱]

جہاں جہاں قرآن پاک میں لفظ قنوت آیا ہے وہاں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قنوت کے معنی اطاعت کے ہیں اور جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو حدیث ضعیف ہے، ضعف بھی شدید ہے۔ اس لیے اس پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور جو اس حدیث کے مرفوع ہونے کا انکار کرتے ہیں ہو سکتا ہے کہ کسی صحابی یا تابعی کا قول مبارک ہو۔ اس قسم کی اسناد کے ساتھ بہت سی آیات مبارکہ کی تفسیر منقول ہے، لیکن ان کے اندر نکارت پائی جاتی ہے؛ کیونکہ ان کی سند میں ضعف ہوتا ہے۔

﴿بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ [البقرۃ: ۱۱۷] اور کہیں ﴿فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ [الزمر: ۴۶] آتا ہے۔ "بدیع" یا "فطر" کا لغوی معنی ہے ایسی چیز بنانا جس کا پہلے کوئی نمونہ اور مثال نہ ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین بنایا تو اس سے پہلے نہ کوئی آسمان و زمین تھا اور نہ ان کی کوئی مثال تھی۔

بدعت کا لغوی اور حقیقی اطلاق:

ابوداؤد شریف میں روایت ہے:

"إِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ." [سنن ابی داؤد، رقم: ۴۶۰۷]

دین کے اندر کوئی نئی چیز پیدا کی جائے جس کی اصل قرآن و حدیث پاک اور اقوال صحابہ میں نہ ہو تو وہ چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بدعت شرعی ہے اور بدعت کا لفظ کبھی کبھی بطور لغت کے بھی استعمال کیا جاتا ہے،

جیسا کہ تراویح جب رمضان المبارک میں پڑھی جاتی تھی تو صحابہ ﷺ متفرق پڑھتے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر ان تمام صحابہ کو ایک قاری پر جمع کر دیا جائے تو اچھا ہے۔ چنانچہ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ آپ سب کو ایک مصلے پر تراویح پڑھایا کرو۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پڑھانا شروع کر دیں تو کسی صحابی نے انکار نہ کیا۔ ایک تو خلیفہ راشد کا حکم ہو گیا اور دوسرا جب کوئی صحابی بھی انکار نہ کرے تو اجماع صحابہ ہو جاتا ہے، اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو جائے تو پھر وہ حکم مقامِ سنت پر آ جاتا ہے، پھر اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ ہے تو نیا طریقہ، لیکن اچھا ہے۔ اب اس کو بدعت نہیں کہہ سکتے؛ کیونکہ خلیفہ راشد کا عمل تو ہوتا ہی سنت ہے، بدعت ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے باعتبار لغت کے کہا تھا کہ ایک نئی چیز ہے؛ کیونکہ اس سے پہلے ایک امام پر صحابہ رضی اللہ عنہم جمع نہیں ہوئے تھے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ "بَدِیع"، "فَعِیل" کے وزن پر "مُبْدِع" کے معنی میں ہے، جیسا کہ "أَلِیم"، "مُؤْلِم" کے معنی میں ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت (اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے) کے بعد زمینوں اور آسمانوں کے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا۔ اس میں بھی نصاریٰ کی تردید ہے کہ تم تو کہتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے کیسے بنایا؟ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو بغیر مثال کے پیدا کر دیا، وہ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور عظمت وسلطنت کا یہ عالم ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرمالیں تو بس ایک ہی دفعہ حکم دیتے ہیں، وہ ہو جاتی ہے۔ تم عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش پر کیوں حیران ہو رہے ہو؟ یہاں بھی تو ہم نے حکم دیا تو ہو گیا۔

﴿وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۘ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿١١٨﴾﴾ [البقرۃ:۱۱۸]

"اور وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کہتے ہیں: کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ (کہ تم اس کے رسول ہو) یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی؟ اسی طرح ان کی بات کی طرح کہا تھا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے، ان کے دل ایک جیسے ہیں، ہم نے یقین رکھنے والی قوم کے لیے نشانیاں واضح کر دی ہیں۔"

آیات کا ربط:

گزشتہ آیات میں اللہ پاک نے فرمایا کہ یہودی و نصرانی جو اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہیں، ان کا توحید کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے بیٹے بنا دیئے۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کا نبوت کے بارے میں بھی حال دیکھو! ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ نبوت کے بارے میں علم نہیں رکھتے؛ کیونکہ اس علم کا کیا فائدہ جو حقیقت تک نہ پہنچائے۔ اس لیے آدمی کتنے بڑے علوم کا ماہر ہو جائے، لیکن اگر وہ اللہ کی توحید اور حضور اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کا عقیدہ نہیں سمجھا تو وہ جاہل ہے۔ اصل علم تو وہ ہے جس سے آدمی اپنے مالک کو پہچانے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو پہچانے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کا علم حاصل کرے۔ اگر اس کے پاس ایسا علم ہے جو اسے دنیاوی معاملات میں فائدہ تو پہنچاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور انبیاء و رسل کی تعلیمات میں فائدہ نہیں پہنچاتا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہود و نصاریٰ کے دو دعووں کا رد:

پہلا سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو نہیں جانتے، یعنی جنہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور ذات و صفات کا علم نہیں، وہ جاہل یہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک ہم سے خود براہِ راست گفتگو کیوں نہیں کرتے؟ یعنی انبیاء جو فرماتے ہیں کہ ہم پر وحی آتی ہے، اللہ تعالیٰ فرشتے بھیجتے ہیں اور کبھی فرشتے کے بغیر بھی دل میں القاء فرماتے ہیں وغیرہ۔ اب یہ کافر کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بات کیوں نہیں کرتے؟ (نعوذ باللہ!) یہ اتنا بڑا جہل ہے جیسے آج اگر کوئی وزیر حکم لے کر آئے اور کوئی کہے کہ یہ حکم میں تب مانوں گا جب بادشاہ خود مجھے آ کر کہے۔ اور اگر بادشاہ ہر آدمی کو خود حکم پہنچاتا پھرے تو یہ بادشاہ کی شان ہوگی؟ اس لیے قرآن پاک نے ان کے اس جاہلانہ سوال کا جواب ہی نہیں دیا؛ کیونکہ یہ سوال قابل جواب ہی نہیں تھا، یہ تو جہل مرکب ہے۔ اللہ کو کیا ضرورت ہے کہ خود آ کر بات کریں؟ جبکہ دنیا کے بادشاہ کو ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ ہر ایک سے خود آ کر بات کرے۔

دوسرا سوال: کفار نے کہا کہ ایسے کوئی واضح نشان آئے جو نبوتِ محمدیہ پر دلالت کرے۔ پہلا سوال جاہلانہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب ہی نہیں دیا، البتہ دوسرے کا جواب اللہ تعالیٰ نے دیا، فرمایا: میرے نبی! یہ تو جاہل ہیں، کہتے ہیں کہ ایک نشانی لے آؤ، تحقیق ہم نے کھول کھول کر آپ کو نشانیاں دیں، ہم نے آپ کو کیا ایک معجزہ دیا ہے؟

نہیں، بلکہ ہم نے تو آپ کو ساوی وارضی معجزات عطا کیے، ہم نے آپ کو ایسے بھی معجزات عطا فرمائے کہ جن کا تعلق نباتات، جمادات، حیوانات، انسانوں، زمینوں اور پانی تک ہے۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس آیت سے مراد معجزات ہیں اور بعض علماء نے کہا کہ ان آیات سے مراد قرآن مجید کی کھلی نشانیاں ہیں۔ لیکن یہاں معجزات ہی مراد ہیں؛ کیونکہ سب سے پہلے جو ان کا سوال تھا وہ نشانی کے بارے میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے مدنی! ان کی باتیں سن کر آپ غمگین نہ ہوں، ان سے پہلے جو کافر اور مشرک گزرے ہیں، انہوں نے بھی ایسے سوالات کیے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے پاس براہ راست خود فرشتہ کیوں نہیں بھیجا؟ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ خود بات کیوں نہیں کرتے؟ یا فلاں نشانی خود کیوں نہیں عطا کی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے دل گویا ایک دوسرے کے بالکل متشابہ ہیں، حالانکہ جو مشرکین مکہ میں پیدا ہوئے وہ نوح علیہ السلام کے زمانہ کے کافروں کو نہیں ملے، لیکن باتیں دونوں کی ایک ہی ہیں۔ گویا کہ ان کے ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، جیسے انہوں نے انبیاء کو شاعر کہا، اسی طرح انہوں نے بھی کہا۔ انہوں نے ساحر، جادوگر، کاہن، جھوٹا کہا، اسی طرح انہوں نے بھی انبیاء کو یہ سب کچھ کہا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿أَتَوَاصَوْا بِهِ﴾ یہ ایک دوسرے کو وصیت کر گئے تھے کہ یہ بات ہر آنے والے نبی سے کہنا۔

ایک لفظ تشابہ ہوتا ہے اور ایک تشبیہ۔ دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ تشبیہ، مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان فرق ہوتا ہے، یعنی مشبہ بہ عموماً مشبہ سے بڑھا ہوتا ہے، جیسا کہ عام طور پر آپ محاورات میں مثال دیکھتے ہیں کہ زید ایسے ہے جیسے شیر۔ تو اب شیر طاقت میں بڑھا ہوا ہے، یعنی زید کی شجاعت کو تشبیہ دی جا رہی ہے۔ تشابہ کے اندر یہ نہیں ہوتا، یہاں دونوں برابر ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے تشبیہ نہیں، بلکہ تشابہ کا لفظ لائے ہیں۔ جیسے ان کے دلوں میں کفر و عناد اور پتھر سے زیادہ سختی تھی، اسی طرح مشرکین عرب کے دل بھی ایسے ہی سخت ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تو بڑی بڑی نشانیاں کھول کر رکھ دی ہیں، لیکن ان نشانیوں کا فائدہ صرف ان کو ہوتا ہے جو ایمان لانے والے ہوتے ہیں، جو یقین کرنے والے ہوتے ہیں۔ جس آدمی نے انکار ہی کرنا ہو، اس کے لیے لاکھ نشانیاں بھی تھوڑی ہیں، اس کے لیے لاکھوں دلائل بھی بے کار ہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت نصیب فرمانی ہو، اور جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے کھول دے، اس کے لیے معمولی سی بات ہدایت کا ذریعہ بن

جاتی ہے۔

مشرکین مکہ کی ہٹ دھرمی:

محمد بن اسحاق سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رافع بن حر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: یا محمد! اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں، جیسے آپ کہتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں تو اللہ سے کہیں کہ ہمارے ساتھ براہِ راست کلام کریں اور ہم اللہ کا کلام سنیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں اور ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سوال رافع بن حر کا نہیں، بلکہ نصرانیوں کا سوال تھا کہ خدا خود ہمارے ساتھ بات کرے؛ کیونکہ اس سے پہلے جو آیات تھیں وہ ساری نصرانیوں کے رَد میں تھیں۔ اس لیے سیاق کا تقاضا یہی ہے کہ یہ آیت نصاریٰ کے رد میں ہے۔

قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خود کیوں نہیں کہتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے نبی ہیں؟ اللہ کو تمہاری کیا ضرورت ہے کہ تمہارے ساتھ بات کرے؟ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ بات آجاتی ہے کہ اللہ اگر بات کر لیتے تو اچھا تھا، یہ مسلمان ہو جاتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کلام فرمائیں گے تو بھی یہ نہیں مانیں گے، جیسے موسیٰ علیہ السلام سے قوم نے کہا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے کے بعد کہنے لگے کہ کلام تو سنا ہے، لیکن دیکھا تو نہیں ہے۔ تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے سوالات جو خاص جاہلانہ تھے، ان کے جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ظاہر سیاق کا تقاضا یہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہم سے خود بات کیوں نہیں کرتے؟ جیسا کہ اللہ پاک نے دوسری جگہ قرآن میں ارشاد فرمایا کہ جب ان کو، یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی معجزہ دیتے ہیں، نشانی پہنچتی ہے تو یہ مشرکین مکہ کہتے ہیں کہ یہ معجزہ تو ہم نہیں مانتے، ان کو پہلے انبیاء جیسے معجزات کیوں نہیں ملے؟ موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور عصا ملا تھا، ان کو کیوں نہیں ملا؟ جب ان کو ملا تھا تو وہاں بھی نہ ماننے والوں نے نہ مانا۔ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سانپ والا معجزہ بھی دے دیتے تو کوئی بڑی بات نہ تھی، لیکن نہ ماننے والے پھر بھی نہ مانتے؛ کیونکہ مشرکین مکہ اس قسم کے سوالات کرتے تھے۔

ایک بزرگ اور ان کی بیوی:

ایک مشہور مثال ہے کہ ایک پیر صاحب تھے، ان کی بیوی اس کی پیری نہیں مانتی تھی...... کیونکہ بیویاں اکثر مانتی نہیں ہیں۔ ویسے حقیقت میں ہوتا بھی ایسا ہے کہ بیوی عام طور پر (خاوند کتنا بڑا بزرگ بن جائے) بیوی بزرگی نہیں مانتی...... بہرحال پیر صاحب کہیں کہ دیکھو! اتنے لوگ میرے مرید ہیں، لاکھوں لوگ مجھے سلام کرتے ہیں اور تم ایسی مٹی کی بنی ہوئی ہو کہ میری کسی بات کا تم پر اثر نہیں ہوتا۔ بیوی کہتی ہے: اچھا چھوڑو! تم جیسے بڑے پیر دیکھے ہیں، اگر تم واقعی بڑے پیر ہو تو مجھے اُڑ کر دکھاؤ۔ ایک دن پیر صاحب کو غصہ آیا تو اس نے اپنے مکان کے اوپر اُڑ کر دکھادیا۔ اب جناب پیر صاحب بڑے خوش ہو کر آئے کہ آج تو بیوی میری بزرگی مان ہی لے گی۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو! آج تو میں اُڑ رہا تھا۔ اس نے کہا: اچھا! اس لیے ٹیڑھے لگ رہے تھے، اس لیے تمہاری اُڑان ٹھیک نہیں تھی؛ کیونکہ کوئی اور پیر ہوتا تو سیدھا اُڑتا۔

جب نہ ماننا ہو تو اُڑتا ہوا آدمی بھی ٹیڑھا نظر آئے گا۔ اسی لیے آدمی نے نہ کھیلنا ہو تو آنگن ٹیڑھا نظر آتا ہے۔

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾﴾ [البقرۃ:۱۱۹]

”(اے محمد!) ہم نے آپ کو سچا دین دے کر رسول بنا کر بھیجا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور آپ سے دوزخیوں کا نہیں پوچھا جائے گا۔“

ربط آیات:

اللہ تعالیٰ نے گزشتہ آیات میں فرمایا کہ یہود اور مشرکین توحید اور نبوت و رسالت دونوں میں گم کردہ راہ پر ہیں اور ان کے پاس کوئی دلائل نہیں، نہ ان کے پاس کوئی دلیل عقلی ہے نہ نقلی، اور وہ رسالت کی تصدیق کے لیے مَن چاہی نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر حضور سیدنا محمد ﷺ کے زمانہ تک قرآن خود یہ بیان فرما رہا ہے کہ ان سب کے سوال ایک جیسے تھے۔ مطالبات ایک جیسے ہیں، ایسا کیوں تھا؟ حالانکہ درمیان میں اتنے بڑے

فاصلے ہیں، آج تو مواصلات کے ذرائع نے دنیا کو سکیڑ کر ایک ملک بنا دیا ہے، جدید سائنسی آلات کے ذریعے آپ پوری دنیا سے رابطہ کر سکتے ہیں، لیکن پہلے دور میں تو یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک بات شام والے کہیں اور وہی بات مکہ والے کہیں؛ کیونکہ درمیان میں کوئی ایسا رابطہ نہیں تھا کہ ان کے درمیان ذہنی ہم آہنگی ہو سکتی ہو۔ پھر ان سوالات کا ایک جیسے ہونا تو گویا دل ان کے ایک ہیں۔ اور کسی جگہ قرآن مقدس میں فرماتا ہے: ﴿أَتَوَاصَوْا بِهِ﴾ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ ایک دوسرے کو وصیت کرتے چلے گئے کہ تم بھی یہی بات کہنا۔

جدید عقلمندوں کی بدحواسی:

علماء کرام تمام کتب سابقہ اور تمام کتب موجودہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دراصل تمام لوگ اپنے عقل اور ہوا کے متبع تھے، ہر چیز کو عقل کے ترازو میں تولنا چاہتے تھے اور انہوں نے کہا کہ یہ یوں دیکھیں کہ آج دنیا چاہے ترقی پر چلی گئی، لیکن آج بھی کافر اسی عقل کے چکر میں مبتلا ہے، وہ کہتا ہے کہ ایک نبی سرزمین مکہ میں پیدا ہوتے ہیں، وہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان پر اللہ کی وحی آتی ہے تو ہم پر کیوں نہیں آتی؟ وہ کہتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ سرزمین عرب کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعے منتخب فرما لیا، لیکن ایشیاء کے ممالک اور دوسرے ممالک کو اللہ تعالیٰ نے منتخب نہیں فرمایا۔

آج بھی جب آپ ان کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرائیں، اسلام کی حدود، بنیادی عقائد کے بارے میں قائل کرنا چاہیں تو بالکل وہی بات کریں گے جیسا کہ آپ نے قرآن مقدس میں پڑھا ہے: ﴿أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ﴾ [ص: ۵] یہ کیسا پیغمبر ہے جو کہتا ہے کہ سارے خداؤں کو چھوڑ دو اور ایک اللہ کو مان لو، یہ تو عجیب بات ہے! عقل میں نہیں آتی کہ ایک اللہ سارے جہان کا کام کر گزرے۔

آج ملکوں کے پاس بڑی طاقت ہے، مشینری ہے، میڈیا ہے، پھر بھی وہ اپنے ملک کے کام نہیں کر سکتے تو ایک اللہ سارے ملکوں کے کام کیسے کر سکتا ہے؟ ایک اکیلا زمیندار جس کی کئی ایکڑ زمین ہو، وہ اکیلا کاشت نہیں کر سکتا، اس کاشت کے اندر بھی نقائص، مثلاً کھاد صحیح نہیں ڈالی گئی، بیج نہیں تھا یا پانی نہیں پہنچایا گیا وغیرہ۔ تو ایک خدا ساری کائنات اور ایسی چیزیں جو ہم نے دیکھی ہی نہیں، جیسے زہرہ، مریخ، مشتری وغیرہ اتنے بڑے کرے ہیں کہ کئی گنا بڑی ہماری دنیا بڑھا دی جائے تو پھر بھی ہماری دنیا چھوٹی ہے، ان سب کا نظام ایک خدا چلاتا ہے، یہ بات عقل میں

نہیں آتی۔

اور اسی طرح ہمارے دماغ میں یہ بات بھی نہیں آتی کہ ساری کائنات کے الہٰ (جو کائنات کے ذرّے ذرّے کا مالک ہے) نے ہم جیسے ایک بندے کو نبی بنا دیا، جو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی جاتا ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سمجھ نہیں آتی۔ اگر خداوند قدوس نے اپنی رسالت کا کوئی کام ہی لینا تھا تو کسی بڑے آدمی کو منتخب کرتے۔ کسی سرمایہ دار، ساہوکار، دولت مند تاجر کو، جس کے پاس پیسہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے احکام لوگوں تک پہنچانے کے ذرائع بھی رکھتا۔ اس نے تو ایک یتیم مکہ کو جس کے گھر میں دیا نہیں جلتا، جن کے اپنے گھر میں کھانا اور اتنا پیسہ نہیں کہ دائی کو دیا جاسکے۔ جس کا اپنا یہ عالم ہے کہ کبھی دادا کی کفالت میں اور کبھی چچا کی، جن کے اپنے معاش کا کوئی مستقل نہیں، مکہ والوں کی بکریاں چراتے، کبھی محنت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے لوگ ولید بن مغیرہ، عتبہ، شیبہ جو اس زمانے میں بھی سو سو اونٹ ذبح کر کے اس کے شوربے میں حاجیوں کو ثرید بنا کر کھلاتے تھے، ان لوگوں کو خدا نے نبی نہیں بنایا اور یتیم مکہ کو نبی بنا دیا۔ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی۔

شبہات کا جواب:

یہ سارا مسئلہ اس لیے اُلجھتا ہے کہ ہر آدمی سمجھتا ہے کہ میرے پاس جو عقل ہے وہ اتنی بڑی ترازو اور روشن ورہبر ہے کہ غلطی نہیں کرسکتی۔ اسی لیے آج بھی آپ دیکھیں کہ کوئی آدمی غلطی بھی کر رہا ہو تو بڑی مشکل سے مانے گا کہ کیوں جی! میں کوئی غلط کہہ رہا ہوں؟ آپ کو سمجھ ہے اور مجھے سمجھ نہیں ہے؟ یہ ساری بنیاد اس سے چلی ہے کہ سب سے بڑا رہبر انہوں نے اپنی عقل کو مانا کہ جب آدمی اپنی عقل کے مطابق فیصلہ کرتا ہے تو اپنی ہوائے نفس، خواہشات کے تابع ہو جاتا ہے اور شیاطین جن وانس اس کو مزید گمراہیوں کے راستے کی طرف بھٹکاتے چلے جاتے ہیں اور سیدھے راستے کی طرف آنے ہی نہیں دیتے۔

حالانکہ دنیا کے اندر آپ دیکھتے ہیں کہ گندم کا وزن کرنا ہو تو اس کا علیحدہ ایک ترازو ہوتا ہے اور گنے کا وزن کرنا ہو تو اس کے لیے علیحدہ ترازو ہوتا ہے۔ مثلاً ٹرک لا کھڑا کر دیں گے، وہ اسی وقت آپ کو بتائے گا کہ ٹرک کا وزن اتنا ہے اور گنے کا وزن اتنا ہے۔ آپ چاندی اور سونا وزن کریں، اسی طرح زمرد، ہیرے وغیرہ کو وزن کرنا ہو تو چھوٹے اور بڑے نفیس سے کمپیوٹرائزڈ ترازو سے کرتے ہیں۔ اب جس ترازو میں ہیرا تولا جاتا ہے، اس میں اگر آپ گنے کا

ایک ٹرک لے کر کھڑا کر دیں تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ وہ ترازو ہی ٹوٹ جائے گا اور پھر کہنے والا یہ کہے کہ یہ بڑا بیکار ترازو ہے۔ کہتے تھے کہ یہ بڑا قیمتی ترازو ہے اور اس میں بڑے بڑے ہیرے تولتے ہیں، میرا تو یہ گنے کا ٹرک بھی وزن نہیں کر سکا، اور کہتے ہیں کہ اس میں کروڑوں روپے کے ہیرے تلتے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ آدمی نے اپنی عقل کے ترازو میں دنیاوی معلومات کو تولنا تھا، مگر اس نے اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت کو بھی اسی میں تولنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ عقل مسخ ہوگئی۔ اصل بات یہ تھی کہ خدا کی اُلوہیت اور انبیاء کی نبوت و رسالت کو سمجھنے کے لیے اس کی کتاب والے ترازو میں سمجھے، جو میرے اللہ تعالیٰ نے کتاب اور میزان کو اُتارا تھا، اس ترازو میں دیکھتے تو بات سمجھ آجاتی۔

جن لوگوں نے اپنی عقل کو اس روشنی کے تابع کر دیا جو قرآن و سنت کی روشنی ہے تو ایک منٹ میں مسئلہ حل ہوگیا۔ حبشہ سے بلال رضی اللہ عنہ آئے اور فارس رضی اللہ عنہ سے سلمان آئے، ان حضرت کو سمجھ گئے، اسی طرح دنیا کے کونے کونے سے لوگ آئے، عرب و عجم اور فارس سے آئے، ہر قسم کی مخلوق آئی اور انہوں نے آکر دیکھا کہ جب یہ رسول دعویٰ کرتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں تو اسے اللہ کی کتاب کی روشنی میں جانچا جائے، اس کو تو ہم پھر اسی کتاب کی روشنی میں جانچیں گے جو رسول لے کر آیا ہے اور جن باتوں کا یہ کتاب حکم دیتی ہے، اس پر یہ رسول کاربند ہے کہ نہیں؟ ان احکام پر چلنے والا ہے کہ نہیں؟ ان صفات سے موصوف ہے کہ نہیں؟ جب یہ سب باتیں ان میں پائیں تو سمجھ لو کہ اللہ کا سچا بھیجا ہوا رسول ہے کہ جو اللہ نے اسے حکم دیا ہے، وہ کر کے دکھا رہا ہے اور جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، اس سے رک رہا ہے۔

اب اس کو اپنی عقل کی ترازو میں تولیں کہ انسان ہے، کھانا کھاتا ہے، بخار آتا ہے اور بخار بھی ایسا کہ اگر ہم جیسے لوگوں کو آئے تو ہم تو ختم ہو جائیں، یعنی جو دو آدمیوں کو بخار آئے، وہ اللہ کے نبی کو آتا ہے۔ کیونکہ جتنی شان بڑی ہے، اتنی آزمائش بھی بڑی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یہ تو جاہل ہیں، ان کے علومِ دنیا سے ہمیں کیا واسطہ ہے؟ ہم نے ان کو پیدا کر کے بھیجا تھا کہ جن و انس میری عبادت کریں تو جب انہوں نے میری ذات کا علم حاصل نہیں کیا اور میرے بھیجے ہوئے پیغمبر اور رسولوں کو نہیں پہچانا تو ان کے علم کا کیا فائدہ؟ یہ تو جاہل ہیں۔

پھر یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے بات کرے۔ اللہ ان کا کوئی محتاج ہے؟ اللہ تو اس بات پر بھی قادر ہے کہ ان سب کو فنا کر کے ایک اور قوم پیدا فرما دے، پھر ان کی کوئی مثل بھی دنیا کے اندر نہ ملے تو اسے کیا پڑی ہے کہ ایک ایک سے بات کرے اور کہے کہ میرے نبی کو مان لو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ نشانیاں کہتے ہیں؟ نشانیاں تو ہم نے

اتنی دی ہیں کہ اگر کوئی حق تلاش کرنا چاہے تو دھوکہ میں نہیں رہے گا، لیکن یہ معنی نہیں ہوتا کہ ہر آدمی جو مطالبہ کرے، اس کی بات پوری کردو تو پھر خدا نہ ہوا، بلکہ لوگوں کے تابع ہو گیا۔ (نعوذ باللہ!)

''بشیر'' اور ''نذیر'' کی تفسیر:

ان آیات میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ [فاطر: ۲۴] میرے مدنی! ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم ان کے مطالبے پورے کریں؟ آپ کو جو ہم نے بھیجا ہے حق کے ساتھ، یہی بہت بڑی نشانی ہے۔ ہم نے جب کہا کہ ہم نے رسول بنایا ہے اور ہم نے بھیجا ہے تو بات ختم ہو گئی۔ پھر کون ہے اعتراض کرنے والا؟ ہم نے آپ کو بھیجا بشارت دینے والا اور ڈرانے والا، ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں، ان کی جنت کی بشارت دینے والا، کامیابی اور فلاح کی بشارت دینے والا اور ان لوگوں کو ڈرانے والا جو کافر و مشرک ہیں، اللہ کے انبیاء کی رسالت و نبوت کے منکر ہیں۔

کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کی صفات بیان فرمائی ہیں، وہاں ایک صفت آئی ہے ''بَشِیر'' اور ''نَذِیر''۔ ''نذیر'' کا معنی ہوتا ہے ڈرانے والا۔ لیکن ڈرانا بھی کئی طرح کا ہوتا ہے: کوئی دشمن کو ڈراتا ہے، آدمی سانپ کو دیکھ لے تو ڈر کر بھاگتا ہے اور دوسروں کو ڈراتا ہے۔ اللہ کے انبیاء کا جو ڈرانا ہے، اس کے اندر ایک رحمت اور ہمدردی چھپی ہوتی ہے، جیسے باپ بھی اپنے بچے کو ڈراتا ہے، بیٹا! رات کو بے وقت باہر گلی میں نہ نکلنا۔ لیکن اس ڈرانے میں ہمدردی ہے۔ استاد بھی ڈراتا ہے کہ ایسی غلطی نہ کرنا، گندے بچوں کے ساتھ مت کھیلنا۔ اس ڈرانے میں ایک ہمدردی اور رحمت ہوتی ہے کہ میرا بچہ یا شاگرد غلطیوں سے بچ جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انبیاء کو بھی ڈرانے والا بنا کر بھیجتے ہیں، ان کے ڈرانے میں بھی ایک رحمت ہوتی ہے کہ امت جہنم سے بچ جائے۔ اسی لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال ایسے ہے جیسے تم جہنم کے کنارے پر کھڑے ہو، تم اس میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمہیں پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں، خیال کرو، خیال کرو، جہنم میں نہ گرو۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تمہاری اور میری مثال ایسے ہے کہ لوگ زبردستی جہنم میں جانا چاہتے ہیں اور میں کھینچ کھینچ کر ان کو نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس لیے فرمایا کہ آپ کے لیے یہی بڑی گواہی اور نشانی ہے کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے، کوئی مانتا ہے تو مان لے، ورنہ اپنی عاقبت خود خراب کرے گا۔ اور آپ کیوں غمگین ہوتے ہیں؟

آپ سے ان جہنم والوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ کیوں جہنم میں گئے؟

تبلیغ کرنا آپ کا کام، ہدایت دینا میرا کام ہے:

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے مدنی آقا ﷺ کے ذمے "اِنذار" اور "تبشیر" ہے۔ آپ دعوت دیتے رہیں، اس کے بعد اگر کسی نے مان لیا تو اس کا اپنا فائدہ ہے، اگر نہیں مانا تو اس کا اپنا نقصان ہے، ہم آپ سے نہیں پوچھیں گے کہ یہ جہنمی لوگ کافر و مشرک کیوں رہ گئے؟ ایمان کیوں نہیں لائے؟ قرآن میں دوسرے مقام پر بھی فرمایا: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى ٱللَّهِ بِإِذْنِهِۦ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝﴾ [الاحزاب: ۴۵، ۴۶] اے میرے مدنی! ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا ڈرانے والا، اپنی توحید کی طرف دعوت دینے والا بنا کر بھیجا، ہم نے آپ کو سراج منیر بنا کر بھیجا، تاکہ آپ کی نبوت کی روشنی ہر گھر میں پھیل جائے، آپ کی ذمہ داری صرف اتنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہی میری سنت ہے، ﴿وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝﴾ [فاطر: ۲۴] ہم نے کوئی اُمت پیدا نہیں کی، مگر ہم نے ڈرانے والا بھیجا، ہم نے ان کو اپنے عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۝﴾ [بنی اسرائیل: ۱۵] جب تک کہ ہم اپنا پیغمبر ان کے پاس نہ بھیجیں، جب تک بات مکمل نہ ہو جائے، اس وقت تک ہم کسی قوم پر عذاب نہیں بھیجتے۔ اسی طرح فرمایا: ﴿تَبَارَكَ ٱلَّذِي نَزَّلَ ٱلْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِۦ لِيَكُونَ لِلْعَٰلَمِينَ نَذِيرًا ۝﴾ [الفرقان: ۱] پاک ہے وہ ذات جس نے اُتارا قرآن اپنے عبد محمد ﷺ پر، تاکہ وہ تمام عالم کو ڈرانے والے ہوں۔ پہلے انبیاء کے ڈرانے کا علاقہ محدود ہوتا تھا کہ وہ اپنی اپنی اقوام کو ڈرانے کے لیے آئے، اپنے علاقے میں ڈرانے کے لیے آئے، لیکن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے پورے عالم کے لیے "نذیر" بنا کر بھیجا۔ چونکہ آپ ﷺ کی نبوت تمام دنیا کے انس و جن اور قیامت تک کے لیے تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو مقام بشارت و نذارت تفویض فرمایا ہے، وہ پوری دنیا کے لیے تفویض فرمایا ہے اور اسی طرح انبیاء و رُسل کے بعد پھر صحابہ اور ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین، فقہاء اور علماء قیامت تک ہیں، ان کی ذمہ داری بھی فقط یہ ہوتی ہے کہ وہ حق بات بتادیں اور واضح کردیں کہ یہ صراطِ مستقیم ہے اور یہ بتادیں کہ یہ حزب الرحمٰن ہے اور یہ حزب الشیطان ہے، وہ یہ بتادیں کہ یہ طریقہ حق اور یہ باطل ہے۔ ان کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ لوگوں کو زبردستی ایمان کی طرف لائیں، دلوں کا بدلنا میرے اللہ کے اختیار میں ہے۔ علماء حق کا کام

صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کریں، وہ ایک مسئلہ قوم کو سمجھا دیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبوت و رسالت کا معنی اور یہ معاد کا مسئلہ ہے اور یہ حق اور یہ باطل ہے۔ کوئی مان لے تو الحمدللہ! اور جو نہ مانے تو اس نے قیامت میں خود جواب دینا ہے۔

﴿وَلَا تُسْئَلُ﴾ کی مختلف قراءتیں:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر قاریوں نے ﴿وَلَا تُسْئَلُ﴾ پڑھا ہے، اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے "وَ لَا" کے بجائے "مَا" بھی پڑھا ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں "وَلَنْ تُسْئَلَ" ہے۔ اس قراءت کے اختلاف سے بعض فرق باطلہ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں کہ قرآن پاک ایک صحابی ﴿وَلَا تُسْئَلُ﴾، ایک صحابی "وَمَا تُسْئَلُ"، اور ایک صحابی "وَلَنْ تُسْئَلَ" پڑھتے ہیں تو صحابہ نے قرآن بدل دیا۔ یہ جہالت کی بات ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس سات قراءتوں کے مطابق اُتارا ہے۔ قراءت کا اختلاف خود اللہ کی طرف سے اُتارا ہوا ہے۔ جو جس قراءت میں پڑھے، معنی اور ترجمہ میں فرق نہیں آئے گا اور اس کو تحریف کہا جائے گا۔

قرآن کی مختلف قراءتیں:

جیسے قرآن میں آپ پڑھتے ہیں: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ﴾ [الروم: ۵۴] تو "ضُعْف" بھی قراءت ہے، اسی طرح زبر کے ساتھ "ضَعْف" بھی قراءت ہے، ترجمہ دونوں کا ایک ہے۔ اسی طرح فرمایا: ﴿وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ [ہود: ۴۱] اکثر قراء ﴿مَجْرٖىهَا﴾ کو ﴿مُجْرٰىهَا﴾ (میم کو پیش اور را کو کھڑی زبر کے ساتھ) پڑھتے ہیں۔ یہ بھی قراءت کا اختلاف ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک صحابی نے قرآن پڑھا، جب اس نے قرآن پڑھا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جلال والے آدمی تھے تو عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً کپڑا اس کے گلے میں ڈالا اور پکڑ لیا اور فرمایا: تم قرآن کیسے پڑھ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ مجھے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح پڑھایا ہے۔ اس کو پکڑ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ آپ نے فرمایا: کیا کر رہے ہو؟ عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! یہ تو قرآن عجیب طرح سے پڑھتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے سناؤ۔ صحابی نے سنایا۔ اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اب تم بھی سناؤ۔ انہوں نے بھی سنایا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے یہ بھی اور وہ بھی۔ تو اللہ کے بندے!

اس میں قراءت کا اختلاف ہے۔

اور قراءت میں کیوں اختلاف ہے؟ اس بات کو بھی دماغ میں رکھ لیں۔ اصل پتہ تو علماء قراءت کو ہے۔ جب میرے مدنی سرکار ﷺ تشریف لائے تو قرآن لغت عرب میں اور لغت قریش میں اُتارا گیا، لیکن اس وقت بڑے بڑے قبائل تھے جیسے بنوثقیف اور بنووائل وغیرہ۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ قدرتی طور پر تھوڑے سے فاصلے کے بعد قبائل کے اندر لحن بدل جاتا ہے۔ اب دیکھیں کہ کوئی یمن والا عربی بول رہا ہے، کوئی شام والا، الجزائر والا عربی بول رہا ہو تو فرق ہوگا۔ اتنا بڑا فرق ہے کہ بندہ حیران ہوجاتا ہے۔ حالانکہ صحیح معنوں میں عرب ہیں۔ یہ سارے عرب بلادِ عرب اور عربی بولنے والے لوگ ہیں، لیکن ان کی عربی اُن کو اور اُن کی عربی ان کو سمجھ نہیں آتی۔

کئی دفعہ جب ہم ایام حج میں صبح کو بیٹھے ہوتے ہیں تو لوگ مسائل پوچھنے کے لیے آجاتے ہیں۔ کبھی کوئی عربی آجائے گا مسئلہ پوچھنے۔ ہمیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ آخر ہم مجبور ہوکر یہ کہتے ہیں کہ ہم نے نہیں سمجھا۔ مہربانی کرو کہ کسی عربی زبان والے کے پاس جاؤ۔ وہ دراصل عربی بول رہا ہوتا ہے، لیکن اصولی طور پر ان کے اندر لحن اور ادائے حروف، ادائے مخارج اور ان کے بات کرنے میں اتنا بڑا فرق پڑجاتا ہے کہ یہ بات عربوں کو سمجھ نہیں آتی۔

جب قرآن اُترا تو تمام قبائل بیچارے اس طرح نہیں پڑھ سکتے تھے: کیونکہ ان کے لحن میں فرق آرہا تھا، ان کے الفاظ کی ادائیگی اور مخارج میں فرق آرہا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے رعایت کردی کہ اللہ کا کلام ہے، کوئی غلط نہیں پڑھے گا۔ اس لیے قراءتوں کی رعایت دے دی گئی، تاکہ ہر آدمی قرآن کے ان الفاظ کو اپنی قراءت میں صحیح طریقے سے ادا کرسکے۔ پھر جو قاری جس علاقے میں چلا گیا، وہاں اس کی قراءت پھیل گئی، کہیں قراءتِ حفص اور کہیں عاصم کی قراءت عام ہوگئی: کیونکہ قاری کا جس علاقے سے گزر ہوا، جہاں جہاں اس کے شاگرد پہنچے، اسی کی قراءت اس ملک میں پھیلتی چلی گئی۔

الحمدللہ! اہلسنت والجماعت میں آج بھی ایسے قراء موجود ہیں جو ''قراء سبعہ'' کہلاتے ہیں، وہ سات قراءتوں کے مطابق قرآن پاک پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اب بھی یہ نہیں کہ ہم آج سے چودہ سو سال پہلے کی بات کررہے ہیں، اب بھی مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ میں ایسے قاری ہیں کہ پورا قرآن ایک قراءت میں ختم کریں گے اور دوسرا قرآن دوسری قراءت میں شروع کریں گے، پھر تیسری اور چوتھی بارنئی قراءت سے پڑھیں گے۔

لہٰذا قراءت کا اختلاف علیحدہ بات ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرآن میں تبدیل یا تحریف یا قرآن میں حرف یا جملہ

بدل دینا علیحدہ بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن میں نہ کوئی حرف بڑھایا جاسکتا ہے اور نہ گھٹایا جاسکتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں جو علماء ہوتے ہیں انہوں نے قرآن و حدیث والی عربی پڑھی ہوتی ہے، وہ بیچارے آکر پریشان ہوتے ہیں، انہیں کہا جائے: ''أقلدی'' تو وہ کہیں گے: ''أقلدی'' ہوتا ہے۔ اصل لفظ ''أقول لك'' تھا، لیکن جب بازاری عربی ہوگی تو یہی حال ہوگا۔

عجمی زبان پر ایک لطیفہ:

جیسے ایک مولوی اور ایک دیہاتی کی آپس میں دوستی تھی۔ وہ مولوی صاحب شہر جانے لگے تو انہوں نے اپنے دوست دیہاتی سے پوچھا کہ آپ کو سودا سامان کی ضرورت ہو تو میں شہر جا رہا ہوں، تمہارے لیے لے آؤں گا۔ اس نے کہا: مولوی صاحب! میں دیہاتی آدمی ہوں، میرے لیے آپ کیا لائیں گے؟ کیسے اُٹھائیں گے؟ اس نے کہا کہ نہیں بھائی! کوئی بات نہیں، مجھے بتادو، میں لے آؤں گا۔ اس نے کہا کہ مجھے مٹی ٹھیک کرنے کے لیے ''کہی اور وہولہ'' کی ضرورت ہے، میرے لیے لے آنا۔ مولوی صاحب نے ڈائری میں لکھ لیا اور اس کے بعد تشریف لے گئے۔

کافی دنوں کے بعد جب واپس آئے تو دیہاتی ملنے گیا تو اس نے کہا: حضرت! خیریت سے آپ واپس آگئے، میرے سامان کا کیا ہوا؟ حضرت نے فرمایا کہ کمال ہے کہ تم ایسے دیہاتی بنتے ہو، میں نے سارا شہر ڈھونڈ مارا، لیکن تم نے ایسا سامان لکھوایا تھا کہ نہیں ملا۔ میں نے تمہارے سامان کے لیے شہر میں کوئی دکان نہیں چھوڑی۔ تمہاری دوستی میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مر گیا۔ حضرت عجیب بات ہے۔ اس نے کہا: میں ایک ایک دکان پر گیا اور پوچھا کہ ''کَہِیِ وَ هُوَ لَہٗ'' تمہارے پاس ہے؟ وہ لکھا تھا نا ''کہی و ہولہ'' اب مولوی صاحب اس کو زبر زیر کے ساتھ پڑھ رہے تھے اور جس دکاندار کے پاس جاتے، وہ کہتا کہ یہ لفظ تو ہم نے آج سنا ہے۔ اس نے کہا: مولوی صاحب! یہ ''کہی وہولہ'' ہے۔ مولوی نے کہا: لاحول ولاقوۃ، میں تو ایک ایک دکان سے پوچھ پوچھ کر مر گیا۔

دوسرا لطیفہ:

میرے استادوں کے بھی استاد بہت بڑے عالم اور مفسر جنہوں نے تفسیر قرآن لکھی ہے محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ۔ ان کی تفسیر ''معارف القرآن'' کے نام سے بہت مشہور ہے۔ بعد میں ایک مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے

لکھی۔ ان سے پہلے محمد ادریس صاحب نے لکھی، یعنی اتنے بڑے عالم۔ اب وہ ایک دن بڑے غصے اور جوش میں آئے اور آ کر طلبہ سے کہنے لگے کہ جب میں گھر سے نکلا، راستے میں یہ کریم تبت سنو کے بڑے بڑے بورڈ لگے ہوئے تھے "تبت سنو" تو حضرت پڑھتے ہوئے آئے، آ کر طلبہ سے کہنے لگے کہ لوگ بڑے بے وقوف ہیں، ہر جگہ لکھا ہوا ہے: "تَبَّتْ سُنو"، آخر "قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَد" کیوں نہ سنو؟ یہ تو لکھ دیتے ہیں کہ تبت سنو۔ تو طلبہ نے کہا: حضرت! یہ "تَبَّتْ" نہیں ہے، یہ دلائی لامہ والا "تبت" ہے اور اس کے حوالے سے انہوں نے ایک Snow بنائی ہوئی ہے۔ یہ "تبت" ایک جگہ کا نام ہے، قرآن والا تبت سورۃ نہیں ہے۔ چونکہ مولانا صاحب کا دماغ قرآن میں اٹکا ہوا تھا، دوسری طرف ان کا دماغ کبھی جا ہی نہیں سکتا تھا، اس لیے انہوں نے اسے "تَبَّتْ" پڑھ دیا۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ مولوی صاحب نے غلط پڑھا تھا اور پھر ان پر فتوے لگانا شروع کر دے تو یہ کون سی عقلمندی ہوگی؟

حضور اکرم ﷺ کے والدین کا ایمان:

ایک حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے والدین کے متعلق پوچھا کہ ان کا اُخروی انجام کیسا ہوا؟ وہ تو اس زمانہ میں فوت ہوئے جو زمانہ جاہلیت کا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ ان کے بارے میں سوال نہ کریں۔ پھر حضور پاک ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں دوبارہ ان کے بارے میں سوال نہیں کیا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کتاب تذکرہ میں ہم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے والدین کو دوبارہ زندہ کیا اور وہ ایمان لے آئے اور اس حدیث کا بھی ہم نے وہاں جواب دیا ہے کہ اس حدیث کی کوئی حیثیت نہیں، کوئی اصل نہیں، اور نہ وہ حدیث صحاح ستہ میں موجود ہے، اور نہ کوئی اس حدیث کے اندر اتنا استدلال اور اتنی طاقت ہے۔ نیز اس کی سند بھی ضعیف ہے، اس سے عقیدہ کے بارے میں حجت نہیں پکڑی جا سکتی۔ واللہ اعلم۔

آپ کو ہم نے ڈرانے والا اور بشارت دینے والا بنا کر بھیجا۔ آپ ان لوگوں کے بارے میں سوال نہ کریں جن کے بارے میں جہنم کا فیصلہ ہو چکا ہو۔

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے اس کا رَد کیا ہے کہ یہ بھی حجت والی بات نہیں ہے؛ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ حضور اکرم ﷺ اپنے والدین کے بارے میں شک میں پڑے ہوں اور جو بھی بات ہے اللہ تعالیٰ نے ان

پر واضح فرمادی ہوگی۔

علامہ سیوطی ؒ نے حضور اکرم ﷺ کے والدین کی نجات کے بارے میں کئی رسائل لکھے ہیں، جن میں انہوں نے کئی دلائل سے ان کے ایمان لانے اور نجات پانے کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ (امداداللہ انور)

ابن کثیر ؒ فرماتے ہیں کہ پہلی جو قراءت صحیح ہے آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا ان لوگوں کے بارے میں جو ایمان نہیں لے آئے۔ آپ کے ذمہ صرف پہنچانا ہے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کے دادا سیدنا ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے والد کے لیے بخشش مانگتے رہے: میرے اللہ! میرے باپ کی مغفرت فرما، وہ گم کردہ راہوں میں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا، ان کی موت کفر پر آگئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بس اب اس کے بعد سوال نہ کرنا۔ قرآن میں آگیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے ایک زمانہ مقررہ تک اپنے والدین کے لیے بخشش مانگی، لیکن جب ہم نے واضح کردیا کہ بس وہ جہنم میں گئے تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی بخشش مانگنا چھوڑ دی۔

اس لیے مفسر ؒ فرماتے ہیں کہ ابن جریر کا یہ قول بھی قابلِ حجت نہیں ہے۔ صحیحین میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے، اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ جو لوگ حضور اکرم ﷺ پر ایمان نہیں لائے، چاہے وہ جو بھی ہوں، زمانہ جاہلیت اور شرک میں فوت ہوگئے تو وہ ''اصحاب الجحیم'' ہیں۔ (سوائے حضور اکرم ﷺ کے والدین کریمین کے)۔ (امداداللہ انور)

حضور اکرم ﷺ کی صداقت نبوت:

اب مفسر ؒ سورۃ البقرۃ کی اس آیت مبارکہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جیسے آپ نے پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب اور معاندین و معارضین کا رَدّ فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا کہ آپ ﷺ کی رسالت و نبوت کی صداقت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے، جب بھیجنے والا تصدیق کردے کہ میں نے بھیجا ہے تو معترض کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے۔

اصولی بات یہ ہے کہ اب دنیا میں کسی ملک نے کسی کو سفیر بنا کر بھیجا ہو تو جب بھیجنے والے کا آرڈر موجود ہو تو اعتراض کرنے والے کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اب یہ ضروری نہیں کہ جس ملک میں وہ سفیر بنا کر بھیجا جائے، اس ملک

والے بھی یہ کہیں کہ بادشاہ خود آ کر کہے: یہ ہمارے سفیر ہیں۔ یہ بات تو عقل اور نقل کے خلاف ہے۔ اور پھر اگر آپ غور کریں تو یہ سوال کسی پیغمبر کے لیے نہیں کیا گیا۔ سب سے پہلے شریعت کی ابتداء نوح علیہ السلام سے ہوئی تو نوح علیہ السلام سے لے کر جتنے پیغمبر تشریف لائے، سب شان والے ہیں، ہم سب پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن کسی پیغمبر کے بارے میں آپ کو یہ بات نہیں ملے گی کہ ان کے آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا اہتمام کیا ہو کہ سابقہ کتابوں میں بھی ذکر، سابقہ انبیاء کرام سے بھی ان کے بارے میں کوئی عہد لیا گیا ہو، اللہ تعالیٰ نے جتنا اہتمام کیا ہے وہ آپ ﷺ کی شان کی وجہ سے ہے! کیونکہ آپ ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے۔ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں۔ اور یہ سلسلہ جاتا ہے ہزاروں سال تک۔ اس لیے اتنا اہتمام کیا گیا ہے کہ ماسوا اس انسان کے جس کی عقل اللہ تعالیٰ نے چھین لی ہے یا جس کے دل پہ مہر لگ گئی ہو۔ اگر وہ عقل سلیم سے ذرا سا بھی غور کرے تو اسے حضور اکرم ﷺ کی صداقت نظر آ جائے گی۔

اس لیے آپ دیکھیں کہ بڑے بڑے مذاہب کے لوگ جو بھی دنیا میں گزرے ہیں، یہودی، عیسائی اور بدھ مت، سب نے حضور اکرم ﷺ کی فضیلت کا اعتراف کیا۔ حضور اکرم ﷺ کی شان میں کتابیں، قصیدے اور مدحیہ اشعار لکھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہر آدمی نے تعریف اپنی عقل کے مطابق کی، لیکن انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی فضیلت کا اعتراف کیا۔ اور یہ سلسلہ صرف حضور اکرم ﷺ کی شان میں آپ کو ملے گا کہ حضور اکرم ﷺ ابھی پیدا نہیں ہوئے اور اللہ تعالیٰ تمام انبیاء سے عہد لے رہے ہیں کہ جب میرے نبی ﷺ کا زمانہ آئے گا تو ان پر ایمان لے آنا اور ان کی مدد بھی کرنا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ سب سے آخر میں آئیں گے، لیکن مسئلہ کی اہمیت و عظمت کو واضح کرنے کے لیے ایسا کہا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا وعدہ لیا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کتنے لوگ ہیں جو کافر ہو جائیں گے، کتنے لوگ ہیں جو میری ربوبیت کا انکار کریں گے، لیکن مسئلہ کی عظمت کے پیش نظر عالم ارواح میں عہد لیا جا رہا ہے کہ اعتراف کرو کہ تمہارا رب کون ہے؟ سب نے اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارے رب ہیں۔ اسی طرح بعینہ نبی ﷺ کی نبوت و عظمت کا مقام اُجاگر کرنے کے لیے اور پھر تمام کتب سابقہ میں اور تمام کتب منزلہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی صفات کا بیان فرمایا اور تمام پیغمبر جو تشریف لاتے رہے، وہ حضور اکرم ﷺ کے آنے کا ذکر فرماتے رہے۔ چنانچہ قرآن مقدس کے اندر یہ آیت موجود ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام

نے اپنے زمانے میں اپنے حوارین اور انصار سے فرمایا کہ اے لوگو! تم اس زمانے کا انتظار کرو کہ جب ایک رسول پیدا ہوں گے اور میرے بعد وہ آئیں گے اور ان کا نام احمد مجتبیٰ ہوگا۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا گیا، آپ ﷺ کے خلفاء کا ذکر کیا گیا، آپ ﷺ کے مولد، ہجرت، صفات، عادات کا ذکر کیا گیا، حتیٰ کہ جو سابقہ بادشاہ گزرے تھے ان لوگوں نے اپنے اپنے تخیلات اور کتابوں کی صفات کے مطابق تصاویر بنا کر بھی اپنے گھر میں رکھ لی تھیں کہ اس شکل والا نبی پیدا ہوگا، جس کا نام محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ (ﷺ) ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود بھی کوئی حضور اکرم ﷺ کی نبوت کا انکار کرے تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے دل پر مہر لگ چکی ہے۔ یہ بھی میرے اللہ تعالیٰ کا نظام ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو ایک چیز کو غلط بھی کہتے ہیں، لیکن چھوڑتے بھی نہیں ہیں۔ حالانکہ ان سے جب پوچھا جائے تو اعتراف کرتے ہیں کہ یہ کام غلط ہے، لیکن اسی کام پر ان کی زندگی کا ایسا مدار بن جاتا ہے کہ چھوڑ نہیں سکتے۔ آج بھی کتنے لوگ ہیں کہ جن سے آپ پوچھیں گے تو وہ اقرار کریں گے کہ سود حرام ہے اور سودی معیشت ایک انتہائی خطرناک معیشت ہے، چند لوگوں کو بڑا بنا دیتی ہے اور لاکھوں کی ہلاکت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ سود کو نہیں چھوڑتے۔ اسی طرح بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی شان بڑی ہے، آپ ﷺ کی عظمت بڑی ہے، لیکن ایمان نہیں لاتے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے نبی! آپ اس فکر میں نہ پڑیں، ہم نے آپ کو حق کے ساتھ جنت کی بشارت دینے والا بنا کر بھیجا ہے اور کافروں کو جہنم سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اب اس کے بعد بھی کوئی ایمان نہ لائے تو آپ غم نہ کریں۔ ان کافروں اور جہنمیوں کے بارے میں آپ سے نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ اسلام یا ایمان کیوں نہیں لائے؟ ان لوگوں نے آپ کا کلمہ کیوں نہیں پڑھا؟ آپ کی ذمہ داری تو صرف اتنی ہے کہ آپ فرائض رسالت کے ذریعے میری دعوت کو پہنچا دیں، ان کا حساب لینا، جزا دینا اور ان کو پکڑنا، یہ پھر ہمارا کام ہے۔

اس کے ضمن میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے ملا اور میں نے ان سے کہا: چونکہ آپ تورات پڑھنے والے ہیں، مہربانی فرما کر مجھے خبر دیں کہ تورات کے اندر حضور اکرم ﷺ کی صفات کیا بیان ہوئی ہیں؟ چونکہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں تورات اور انجیل موجود تھیں (اگرچہ محرف تھیں)، انہوں نے فرمایا کہ ہاں میں بتاتا ہوں۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرو

بن العاص ﷛ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! اللہ کے نبی ﷺ کو جو صفات تورات میں موجود ہیں، بعینہ انہی صفات کے ساتھ آپ ﷺ کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ چنانچہ ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا﴾ [الاحزاب: ۴۵] یہ آیت قرآن اور تورات دونوں میں موجود ہے۔ اے میرے پاک نبی! تحقیق ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا ہے، ہم نے آپ کو ایمان والوں کے لیے بشارت دینے والا اور کافروں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور ایسی قوم کے لیے جن کے پاس کوئی کتاب نہیں آئی تھی، ان کو کتاب پڑھ کر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے، آپ میرے عبد بھی ہیں، میرے رسول بھی ہیں اور ہم نے آپ کا نام "متوکل" رکھا، یعنی اللہ پر توکل رکھنے والا کہ حضور اکرم ﷺ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنے والے تھے۔ حضور اکرم ﷺ ہر بات میں وظیفہ پڑھتے: "لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ"۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اے میری اُمت! اگر سوال کرو تو سیدھا اللہ سے کرو، اگر مدد پکڑو تو اللہ کے ساتھ مدد پکڑو اور جب کسی پر بھروسہ کرو تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرو؛ کیونکہ اگر مخلوق پر بھروسہ کرو گے مخلوق خود فانی ہے، مخلوق تو خود محتاج اور فنا ہونے والی ہے، پھر تمہارا توکل کس کام کا ہے؟ تم اس ذات پر توکل کرو جس نے ہمیشہ رہنا ہے۔

آپ ﷺ کی یہ بھی فضیلت ہے کہ حضور اکرم ﷺ سخت اور ترش رو نہیں تھے، نہ ایسی زبان استعمال کرنے والے تھے کہ آپ ﷺ کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نکلے کہ جو دوسروں کے لیے بھاری معلوم ہو، اور محمد ﷺ کی یہ صفات مبارکہ تھیں کہ وہ بازاروں میں شور مچانے والے نہیں تھے۔ حضور اکرم ﷺ ضرورت کے لیے، تجارت و کاروبار کے لیے بازار میں بھی تشریف لے جاتے، لیکن آپ ﷺ کی یہ شان نہیں تھی کہ اپنی چیزوں کو بیچنے کے لیے شور مچائیں اور آوازیں لگائیں، بلکہ ہر کام میں اعتدال تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے کبھی بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہیں دیا، حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کسی نے زیادتی کی تو آپ ﷺ نے معاف فرما دیا، حضور اکرم ﷺ نے کبھی گالی کا جواب گالی سے نہیں دیا، لوگوں نے راستے میں کانٹے بچھائے تو آپ ﷺ نے دعائیں دیں، حضور پاک ﷺ کو اگر کسی نے کوئی لفظ سخت بھی کہا جو آپ ﷺ کی شان کے خلاف تھا تو بھی حضور پاک ﷺ نے ہمیشہ معافی عطا فرما دی، حضور پاک ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس وقت تک زمین سے نہیں اُٹھایا جب تک کہ یہ بگڑی ہوئی امت سیدھی نہیں ہوگئی اور جب تک انہوں نے اقرار توحید نہیں کرلیا۔ اور اس عقیدۂ توحید کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی اندھی آنکھوں کو توحید

کی روشنی عطا فرمادی، ان کے کان جو حق سننے سے بند تھے، ان کو کھول دیا اور ان کے دل جو غلافوں میں پڑے تھے، ان کو حضور پاک ﷺ کے ساتھ انشراح صدر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی ہمت دی، اتنی طاقت دی کہ پورے جزیرۂ عرب کے اندر اسلام کا پرچم لہرا گیا۔ وہ لوگ جو مشرک تھے موحد بن گئے، جو ظالم تھے وہ ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ کی تصویر بن گئے، جو لوگوں کو ڈاکے مار کر لوٹا کرتے تھے وہ ان لوگوں میں سے بن گئے جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر:۹] وہ دوسروں کو اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوں۔ اسی لیے آج بھی الحمد للہ! نظرِ انصاف سے دیکھنے والے جو لوگ ہیں وہ صحیح معنی میں اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ انقلاب لائے ہیں۔

دنیا میں بڑے بڑے انقلاب آئے، کوئی معاشی انقلاب آیا جس میں صرف پیٹ کا مسئلہ حل ہو گیا، کسی انقلاب کے اندر کوئی خاص عنوان سامنے تھا، اس کے پیشِ نظر انقلاب آیا، لیکن سب سے بڑا انقلاب حضور اقدس ﷺ لے کر آئے کہ عقیدہ اور سیرت میں انقلاب آیا، وہ بھیڑیے، وحشی قوم جن کا کام قتل کرنا، شرابیں پینا، ڈاکے مارنا، سرمایۂ افتخار تھا، ان کو ایسا بنا دیا کہ قرآن نے ان کا خود نقشہ کھینچا ہے: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح:۲۹] کہ میرے مدنی کے صحابہ کو تو دیکھو! کفر کے مقابلے میں چٹان بن جاتے ہیں، لیکن آپس میں مہربان ہیں۔ ان کی عملی زندگی ایسی ہے: ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ [الفتح:۲۹] جب ان کو دیکھو گے تو کوئی رکوع اور سجدہ میں ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضا کے طالب ہیں اور رات کو کثرتِ عبادت کی وجہ سے ان کے چہروں پر نورِ توحید اور نورِ عبادت چمکتا ہے اور وہ علامات ان کے چہروں سے نظر آ رہی ہیں۔ آپ اندازہ فرمائیں کہ پوری دنیا عاجز ہے، یعنی آج تک بھی اور قیامت تک بھی کوئی حضور اکرم ﷺ کے صحابہ جیسی ایک جماعت پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضور پاک ﷺ کے ساتھ جو وعدہ فرمایا وہ کامیاب ہوا، دین مکمل ہو گیا، نعمتیں پوری ہو گئیں اور پوری دنیا پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دین کو پھیلایا۔ آپ ﷺ کی تمام صفات جیسی قرآن مجید میں ہیں، ویسے ہی تورات وانجیل میں موجود ہیں۔

عطاء فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں کعب احبار سے ملا، چونکہ کعب احبار کے پاس سابقہ کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا اور سابقہ کتابوں کا علم تھا، ان سے بھی میں نے حضور اکرم ﷺ کی صفات کے متعلق پوچھا۔ فرماتے ہیں کہ انہوں نے تورات وانجیل میں جو کچھ تھا اور جو کچھ قرآن میں تھا، اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں پایا۔ اسی طرح صفات بیان

کیں جو پہلے مجھے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھی۔ ہاں البتہ تھوڑا سا الفاظ میں فرق ضرور تھا، معنی اور ترجمہ بھی ایک ہی تھا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے میرے نبی! ان مخالفوں کی باتوں کا آپ غم نہ کریں۔ آپ کی صداقت تو قرآن، تورات اور زبور سب میں موجود ہے۔ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے، یہ تو محض فساد مچانا چاہتے ہیں، ان کا مقصد محض اعتراض برائے اعتراض ہے، یعنی اگر کوئی معجزہ مانگیں اور ہم آپ کو وہ معجزہ عطا بھی فرمادیں تو یہ ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ کسی دوسرے معجزہ کا مطالبہ شروع کر دیں گے۔

جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ معجزات کا مطالبہ کیا کہ یہ پہاڑ ہٹ جائیں، چشمے نکل آئیں، کھیتی باڑی ہو جائے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بھی خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی مشکل تو نہیں، اگر اللہ تعالیٰ یہ ساری باتیں مجھے عطا فرمادیں۔ شاید یہ مکہ والے ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے نبی! سنت اللہ یہ ہے کہ اگر کوئی قوم مطالبہ کرے، معجزہ مانگے اور وہ معجزہ ان کے مطابق ان کو دے دیا جائے اور پھر بھی وہ ایمان نہ لائیں تو پھر ان کو ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے مٹا دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ قوم صالح علیہ السلام نے خود معجزہ مانگا، اللہ تعالیٰ کے نبی کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کی نبوت کا اقرار کریں گے، لیکن ایک شرط ہے کہ اس پہاڑ سے ایک اونٹنی نکل آئے اور وہ گابھن ہو اور اس کے بعد دودھ دینا شروع کر دے اور پھر جس کا دودھ بھی پئیں تو پھر ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کو نبی مان لیں گے۔ حضرت صالح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، انہیں بڑی نصیحت کی اور سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ سے معجزات کا مطالبہ نہ کرو! کیونکہ جب کوئی چیز مانگی جائے اور مل جائے اور پھر آدمی ایمان نہ لائے تو پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں جی! ہم تو اپنی پر پکے ہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو معجزہ عطا فرمایا۔ ان کے سامنے پتھر سے ایک اونٹنی نکل آئی اور اتنی عظیم ماشاء اللہ! ایک دن جو دودھ دیتی تھی تو ساری قوم کو کافی ہو جاتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حکم فرمادیا: جو بستی کا چشمہ ہے اس سے ایک دن تم دودھ پیا کرو اور ایک دن پانی اونٹنی کے لیے چھوڑ دیا کرو۔ ایک دن تم پانی پیا کرو اور اونٹنی پانی نہیں پیا کرے گی اور ایک طریقے سے ہم نے تمہارے لیے حصہ کر دیا۔ ایک دن دودھ استعمال کرو اور پانی اونٹنی استعمال کرے گی اور ایک دن پانی تم استعمال کرو اور دودھ آپ کو نہیں ملے گا۔

چند دنوں تک تو اس پر چلتے رہے، لیکن کچھ عرصے کے بعد پھر اپنے کفر پر آگئے، کہنے لگے: یہ کیا ہے کہ ہم دودھ پینے کے لیے پابند ہیں؟ سارا پانی اونٹنی پی جاتی ہے اور ہم پانی پینے سے محروم رہتے ہیں۔ یہ اچھا جانور ہے کہ جس کی وجہ سے ہم پانی بھی نہ پئیں۔ لہٰذا اپنے چند لوگوں کو تیار کیا کہ اس اونٹنی کو ختم کرو۔ جب اس اونٹنی کو ذبح کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے پکڑ لیا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرے نبی! مکہ والے جو مطالبات کرتے ہیں ہمارے لیے مشکل نہیں، ہم تو ہر چیز پر قادر ہیں، ہم نے چاہا تو طائف میں چشمے نکال دیئے، آج بھی طائف کے چشمے دنیا کے اندر ضرب المثل ہیں۔ طائف کا موسم ضرب المثل ہے، وہاں کے پھل دیکھیں تو اس جیسا انگور دنیا میں نہیں، انار دنیا میں نہیں، اگر یہاں سومیل ہم پہاڑوں میں چشمے جاری کر سکتے ہیں اور پھر سب سے بڑا چشمہ ماءِ زمزم ہم نے مکہ میں جاری کر دیا تو کیا باقی چشمے جاری کرنے پر ہم قدرت نہیں رکھتے؟ لیکن اگر یہ قوم اسلام نہ لائی اور انہوں نے ایمان قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر قریش کا بچہ بچہ قیامت تک کے لیے نسلاً نسلاً ختم کر دیا جائے گا۔ آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، جس کے مقدر میں اسلام ہے وہ اسلام لے آئیں، جن کے مقدر میں کفر ہے وہ کفر میں مر جائیں گے اور یہ عالم جو ہے وہ چلتا رہے گا۔

چونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ ضدی قوم ہے، کہیں معجزات دیکھنے کے بعد ضد پر نہ آجائے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا قہر ٹوٹ پڑے گا۔ دیکھا نہیں کہ فرعون کی قوم نے خود مطالبات کیے، جب پورے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو غرق کر ڈالا۔ یہ تو سنت اللہ فی الدین ہے، ﴿سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝﴾ [الفتح: ۲۳] یہ تو اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ایسی قومیں جب مانگتی ہیں تو علماء نے لکھا ہے کہ یاد رکھو! آدمی خود کہے کہ یا اللہ! یہ چیز دے دے، پھر میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا اور اس کے بعد اگر نافرمانی ہوتی ہے تو پھر پکڑ آجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بس یہ معافی مانگتا رہے کہ اللہ! میں تیرا بندہ ہوں، عاجز ہوں، میں اتنی طاقت ہی نہیں رکھتا کہ تیرے احکام کی بجا آوری کر سکوں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مولا! تیری عبادت کا جیسا حق ہے ویسے ہم نے تیری عبادت نہیں کی، ہم نے تیری شان کو پہچانا نہیں، ہم نے تیری معرفت حاصل نہیں جو حقیقی معنوں میں تیری معرفت ہے، اور ہم نے صحیح معنوں میں

تیری نعمتوں کا شکر بھی ادا نہیں کیا، بلکہ ہم تو اللہ کا شکر کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے کہ تیری نعمتوں کا شکر ادا کر سکیں۔
اسی لیے حضور پاک ﷺ نے اپنی اُمت کو سبق پڑھایا۔ جب بھی دعا مانگو تو کہو:

''اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَ الْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ.'' [سنن ابن ماجہ، رقم: ۳۸۷۱]

اے اللہ! ہمیں معافی عطا فرما اور عافیت بھی عطا فرما۔ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو بڑی باتیں اپنے منہ سے نکال پھینکتے ہیں۔ یا اللہ! آپ دیکھیں کہ آدمی جب نئے نئے مکہ مکرمہ میں آتے ہیں تو ان کی نماز، روزہ دیکھیں، ان کا طواف اور احرام دیکھو۔ جب ایک سال گزر جائے گا تو بیس فیصد کمی آجائے گی اور جب چار پانچ سال کا ہو جائے تو پھر آپ کو ہدایت بھی کریں گے کہ کیا کر رہے ہو؟ یہ عربوں کو کیا تم نہیں دیکھتے، یہ مکے والے بھی تو سگریٹ پیتے ہیں، ہمیں کہتے ہیں کہ سگریٹ نہ پیو۔ حالانکہ ہر آدمی یہ جانتا ہے کہ انہوں نے کلمہ ان عربوں کا نہیں پڑھا، ہم نے کلمہ محمد رسول اللہ ﷺ کا پڑھا ہے، ہمارے لیے نمونہ اور اُسوہ وہ مدنی ﷺ کی ذات ہے۔

کی محمد سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اگر یہ عربی محمد مدنی ﷺ کے غلام بنیں گے تو ہم ان کے غلام ہوں گے، پھر ہم ان کے غلاموں کے بھی غلام بننے کے لیے تیار ہو جائیں گے، اور دین محمد مصطفیٰ ﷺ کو انہوں نے اگر خود چھوڑ دیا تو وہ پہلے پکڑے جائیں گے؛ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے نبی کی بیویو! خبردار! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو، محمد ﷺ کی بیویاں ہو، تمہارے گھروں میں قرآن اُترتا ہے، اگر تم نے غلطی کی تو تم کو دوگنا عذاب دوں گا، اگر تم سے کوتاہی ہوئی تو تمہیں ہم زیادہ پکڑیں گے۔

وجہ کیا ہوتی ہے؟ خود قرآن پاک میں فرمایا کہ دیکھو! جب ہم خود کسی بندے کو پکڑ لیتے ہیں، ہم کسی بندے پر سختی بھیجتے ہیں، بیماری اور دکھ بھیجتے ہیں تو مجھ سے بڑی لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے اور جب ہم وہ تکالیف ہٹا دیتے ہیں اور اس پر نعمتیں بھیج دیتے ہیں تو ہمیں ایسے بھول جاتا ہے کہ یاد ہی نہیں کہ میرا کوئی خدا ہے، یاد نہیں کہ میرا کوئی پیدا کرنے والا ہے، یاد ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرائض نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بھی ہے۔

اللہ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صراطِ مستقیم پر رکھے اور ہمیں امتحان اور ابتلاؤں سے بچائے اور معافی عطا

فرمائے۔ کیونکہ ہم بالکل عاجز ہیں اور ہم بالکل ناکارہ ہیں اور ہم آج اس دور سے گزر رہے ہیں جو قیامت کے قرب کا دور ہے اور یہ بھی دور ابتلاء اور فتن کا ہے۔ یہ ایسا دور ہے کہ اگر کوئی آدمی دسویں حصے کے برابر بھی دین پر عمل کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے شکر و کرو کہ چلو کوئی دین کا نام لینے والا تو ہے؛ کیونکہ جب فتنے ہر طرف سے منہ کھولے ہوئے ہوں، حرام عام ہو جائے، کفر عام اور بدعات دین بن جائیں، جو نماز پڑھتے ہیں وہ تو ملاں قسم کا گھرانہ ہے اور جن کے گھروں میں قرآن کریم پڑھا جائے وہ تو یہ سمجھو کہ چودہ سو سال پرانے لوگ ہیں۔

آج عزت کی علامت کیا ہے؟ کون لوگ عزت دار سمجھے جاتے ہیں؟ جن کے گھروں میں پردہ نہ ہو، جن کے گھروں کے اندر وی سی آر چلتے ہوں، جن کے گھروں میں ڈانس فلور ہوں اور جن کی لڑکیاں دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ڈانس کرتی ہوں، ہوٹلوں میں جاتی ہوں، دوپٹے جن کے اُڑتے ہوں، نئے سال منائے جائیں تو اپنی اور پرائی بیوی کا پتہ نہ ہو اور پرائی بیٹی اور بہن کا پتہ نہ ہو۔ یہ بڑے آدمی کی علامات ہیں تو اس دور میں اگر کوئی حیا کرتا ہے اور نماز، روزہ کرتا ہے تو شکر و کرو، کہ وہ تو کوئی مجاہد ہے کہ اب بھی خدا کا نام لیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کی صفات ہر جگہ موجود ہیں، اگر کوئی نہ مانے تو نہ ماننے والوں کا قصور ہے، آپ پر تو کوئی سوال نہیں آئے گا۔

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝﴾

[البقرۃ: ۱۲۰، ۱۲۱]

''اور آپ سے یہود اور نصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے، حتیٰ کہ آپ ان کے دین کی پیروی کریں۔ آپ کہہ دیجیے: جو راہ اللہ بتا دے، وہی سیدھی راہ ہے۔ اور اگر بالفرض آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آ گیا تو آپ کو اللہ سے بچانے والا اور کوئی مددگار نہ ہوگا۔ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس کو اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور جنہوں نے اس کا انکار کیا وہ نقصان (جہنم) میں رہیں گے۔''

گزشتہ آیات میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے نبوتِ محمدی پر اعتراضات کا رد تھا۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک قاعدہ بیان فرمادیا کہ آپ یہود و نصاریٰ کو سمجھانے کے لیے جتنی محنت کریں، یہ راضی نہیں ہو سکتے۔ ہاں! ایک صورت میں راضی ہو سکتے ہیں کہ آپ اپنا دین چھوڑ کر ان کے دین کے تابع ہو جائیں۔ اور ان کا دین اختیار کرنا تو محال ہے، وہ تو حضور اکرم ﷺ کبھی نہیں کر سکتے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے تو وہ باطل کی پیروی کیسے کریں؟

اور اسی میں اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ایک سبق دیا گیا کہ آپ یہود و نصاریٰ کی کتنی خوشامدیں کریں، آپ ان کی کتنی شرائط مان لیں، آپ ان کے کتنے خیر خواہ بن جائیں، وہ کبھی آپ سے راضی نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ یہودی یا نصرانی نہ بن جائیں۔

اس سے ایک بات واضح ہوگئی کہ کبھی کوئی کافر اور گمراہ فرقہ آپ پر راضی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ آپ ﷺ اپنا دین چھوڑ کر اس کی پیروی نہ کریں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ بیان فرمایا: اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ سے دوستی مت کرو؛ کیونکہ کافر ایک دوسرے کا دوست تو ہو سکتا ہے، مسلمانوں کا دوست نہیں ہو سکتا۔

آپ تاریخ عالَم پر نظر ڈال کر دیکھ لیں! پوری دنیا میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کفر جس رنگ میں ہے، ان کے نام تو علیحدہ ہو سکتے ہیں، مگر ''اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ''، کفر ایک جماعت ہے، اب کا سب سے بڑا دشمن اسلام ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں فرقِ باطلہ کا حال ہے کہ وہ جماعت حقہ سے تب تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک ان کے فرقہ میں شامل نہ ہو جائیں۔

اسی طرح ہمارے بڑے بڑے مولوی صاحبان اور مبلغ حضرات تو بیچارے کوشش کرتے ہیں کہ ہم کسی باطل کے ساتھ نہ ٹکرائیں، ان کا مقابلہ اور ان سے سخت بات نہ کریں اور کسی بدعت والے سے نہ لڑیں، کسی بغض صحابہ والے سے جھگڑا نہ کریں، کسی بغض اہل بیت والے کی کھل کر مخالفت نہ کریں۔ ان سے ملتے اور ان کی مجلسوں میں جاتے ہیں اور دعوتوں میں شریک ہو جاتے ہیں، اور دل میں یہ ہوتا ہے کہ نرمی اختیار کر کے ان کو قائل کریں گے اور راستہ پر لے آئیں گے۔ لیکن آپ لوگ بتائیں کہ وہ آج تک کتنے لوگوں کو لے آئے ہیں؟ کبھی کوئی اہل بدعت آپ سے راضی نہیں ہو سکتا، آپ لاکھ راضی کر لیں، جب تک آپ اچھے طریقے سے بدعات نہ کرو، وہ کبھی آپ کو مسلمان ماننے کے لیے بھی تیار نہیں۔

کتنے ہمارے ایسے لوگ ہیں کہ اگر قل خوانی ہو تو کہتے ہیں کہ یہ ایک رواج بن گیا، آدمی مر جاتے ہیں تو تیسرے دن قل خوانی ہوتی ہے، اب نہ جائیں تو جھگڑے ہوں گے، برادری ناراض ہوگی اور اس کے بعد فتنے کھڑے ہو جائیں گے۔ چپ کر کے چلے جائیں گے، چلو زیادہ سے زیادہ تقویٰ کرنا ہے تو چاول نہیں کھائیں گے، چپ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ آپ جائیں، بیٹھ جائیں، چاول نہ کھائیں، پھر بھی وہ کہیں گے کہ دیکھا جی! وہابی ہے، بس ویسے ہی ہمیں خوش کرنے کے لیے آیا تھا۔

ہمیشہ یاد رکھیں کہ حق بات کے لیے آپ کو ہمیشہ کھل کر بات کرنا پڑے گی اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا کہ آپ اگر مولوی، خطیب، واعظ یا کچھ بھی ہیں، جس دن آپ نے کھل کر توحید بیان کی، اسی دن جھگڑا شروع ہو جائے گا، لیکن اسی دن لوگ آپ کے ساتھ جڑنا بھی شروع ہو جائیں گے۔ اگر پچاس آدمی آپ کو گالی دیں گے تو پچاس آپ کے ساتھی بھی بن جائیں گے۔ جس دن آپ حق کا مسئلہ سنائیں گے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حق کا اثر نہ ہو۔

اگر یہ نرم پالیسی ہو تو مکہ والے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے: آپ ایسا کریں کہ ایک سال ہمارے مذہب کو اختیار کریں، ایک سال ہم آپ کا مذہب مان لیتے ہیں۔ ایک سال آپ کا دین چلے گا ہمارا مذہب ختم، ایک سال پھر آپ ہمارے مذہب پر رہیں آپ کا دین ختم۔ اچھا! بعد میں کچھ یوں بھی آ گئے کہ آپ ایسا کریں، آپ اپنا کام تو کریں، لیکن ہمارے خداؤں کا نام نہ لیں، بس ہماری تردید نہ کریں، آپ لوگوں سے یہ کہیں کہ اللہ کو مانو، مجھے نبی مانو، میرا کلمہ پڑھ لو، لیکن یہ نہ کہو کہ یہ مشرک ہیں، یہ جہنمی اور کافر ہیں، یہ لات و عزیٰ کے بندے ہیں۔ یہ بات نہ کریں تو پھر بھی ہم آپ کے ساتھ گزارا کرتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بدبختو! کیا کہتے ہو؟ اگر سورج اور چاند بھی لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دو تو میں پھر بھی اللہ کی توحید کو نہیں چھوڑ سکتا۔ جب حضور اکرم ﷺ نے توحید کی بات شروع کی تو اب ایک ایک موتی نکلنا شروع ہوا، کبھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، کبھی عمر فاروق رضی اللہ عنہ، کبھی عثمان غنی رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ اور کبھی بلال آئے۔ کبھی دس ہوئے، کبھی بیس ہوئے، پھر ہجرت شروع ہوئی، دین حبشہ تک پہنچ گیا، پھر میرا مدنی ﷺ مدینہ پہنچ گیا اور پھر اسلام پھیلنا شروع ہو گیا۔

ہمارے مسلمانوں نے ان کی طرح داڑھیاں منڈوائیں، ان کی طرح سوٹ پہنے، ان کی زبان انگریزی اپنائی، ان کی طرح سود کھایا اور کلب، ہوٹل اور شراب خانے بنائے۔ ہر کام میں ان کی نقل کر لی، لیکن وہ راضی نہ

ہوئے۔ بعض ہمارے نقل کرنے والے ان سے بھی آگے نکل گئے، انہوں نے اپنی لڑکیوں کو منی سکرٹ پہنائی، مسلمانوں نے بھی پہنائی، انہوں نے اپنی لڑکیوں کو بے پردہ کیا، ڈانس کلب میں لے گئے، انہوں نے شراب پی اور خنزیر کھایا اور انہوں نے سود کھایا اور بینکوں پر ایمان رکھا، اور یہ سب کام مسلمانوں نے بھی کیے۔ یعنی مسلمانوں نے بھی بعینہ ایسے کام کیے کہ آپ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ انگریز ہیں یا مسلمان ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ آپ سے راضی نہیں ہوئے۔ وہ آج بھی کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے، اس کو رگڑا لگاؤ۔ حالانکہ ان کو پتہ ہے کہ اس میں رہنے والے نوے فیصد ہماری برادری کے لوگ ہیں، ہمارے کہنے پر چلتے اور ہماری شکل بناتے ہیں اور ہمارے سکولوں میں پڑھتے اور ہماری ڈگریاں لے کر نوکری حاصل کرتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی وہ راضی نہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہیں تو مسلمان ناں! ابھی یہ کہتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں، یہ اسلام کا جو نام لیتا ہے، یہ نام لینا بھی ان کو برداشت نہیں۔

یاد رکھو! ایک نفی ہوتی ہے "لَا" کے ساتھ اور ایک نفی "لَمْ" کے ساتھ اور ایک نفی "لَنْ" کے ساتھ ہوتی ہے، یہ نفی تابید کے لیے ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ﴾ [البقرۃ: ۲۴] کہ زمانہ ماضی میں بھی تم میرے قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکے اور آئندہ قیامت تک بھی نہیں کر سکو گے تو وہاں بھی "لَمْ" اور "لَنْ تَفْعَلُوْا" دونوں لفظ آئے تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۲۰] ہرگز نہیں راضی ہوں گے یہود و نصاریٰ، جب تک آپ ان کی ملت اور ان کے طریقے کی اتباع نہیں کرو گے۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ یہود و نصاریٰ کا تو صرف نام لیا کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں یہود و نصاریٰ ہی دو زیادہ مشہور مذہب تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو اہل کتاب ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، جبکہ مشرکین مکہ کا کوئی مذہب ہی نہ تھا، ان کے پاس نہ تو کوئی کتاب تھی اور نہ دلیل تھی۔ ان کے پاس تو یہ تھا کہ جو پتھر اچھا لگا اسے خدا بنا لیا اور جو اچھا نہ لگا اسے پھینک دیا۔ مشرکین مکہ تو اپنے خدا جیب میں رکھتے تھے۔ راستے میں چلے گئے، کوئی اور اچھا اور خوبصورت پتھر نظر آ گیا تو پرانا پھینک دیا اور نیا خدا جیب میں رکھ لیا کہ یہ ہمارا خدا ہے اس خدا کو ہم نے چھٹی دے دی۔ کبھی لات و منات اور کبھی عزیٰ کو پوجنا شروع کر دیا؛ کیونکہ ان کا کوئی مذہب تو تھا ہی نہیں۔

ویسے بھی مشرکین کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ جہاں کوئی جھنڈا نظر آیا تو ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

سبز غلاف ڈال دو، یہ بھی پوچھنا گوارا نہیں کرتا کہ یہاں کوئی قبر بھی ہے کہ نہیں؟ آپ غلاف یا جھنڈی کو درخت یا ٹیلے پر ڈال دو اور کہو کہ رات مجھے پتہ چلا ہے کہ یہاں ایک بزرگ دفن ہے۔ بس کام شروع ہو گیا۔ کسی نے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرنی کہ یہاں اللہ کا کوئی بزرگ دفن ہوا بھی تھا یا نہیں؟

کسی کو زندہ پیر یا غازی پیر بنا دیں گے، کوئی صحابی پیر بنا دیں گے، یعنی حضور اکرم ﷺ کے صحابہ وہاں دفن ہیں، آج تک کسی نے تحقیق نہیں کی کہ کون سے صحابہ دفن ہیں؟ ان کا نام کیا تھا؟ کس جگہ سے تشریف لائے تھے؟ اور کس سن میں یہاں پہنچے تھے؟ اس کی تو ضرورت ہی نہیں ہے، بس سجدہ کرنا ہے، ہمیں جھنڈا چاہیے۔ اگر جھنڈا نہ ملے تو لوہے کا ایک پنجہ لگا دو، وہ اس سے شروع ہو جائیں گے۔ اگر وہ بھی نہ ملے تو ایک کالا کپڑا باندھ دو، وہ ایک کالا جھنڈا بن جائے گا۔ کیونکہ مشرک تو بس اپنی خواہشات کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے، اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ البتہ یہود و نصاریٰ دعوے دار تھے کہ ہمارا دین ہے، ہمارے پاس تورات اور انجیل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان پڑھے لکھے لوگوں کا نام لیا۔ ان پڑھے لکھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ ان کے دین پر نہ چلو تو راضی نہیں ہوتے تو یہ مشرک کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا نام لے لیا، ورنہ مجوسی، روافض، خوارج، آغا خانی اور قادیانی، جتنے بھی باطل فرقے ہیں، آپ لاکھ ہمدردی کریں، لیکن آپ جب تک ان کی جماعت میں شامل نہیں ہوں گے، وہ راضی نہیں ہوں گے۔ اس لیے فرمایا: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۲۰] دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ملت اسلام پر رکھے اور اپنی رحمت سے ہمیں فرقہائے باطلہ سے بچائے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہودی اور نصرانی یہ دونوں گروہ ہرگز راضی نہیں ہوں گے۔ لہٰذا آپ ان کو راضی کرنے کی کوشش کرنا چھوڑ دیں۔ آپ کو جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا ہے، بس آپ اس پر رہیں اور اپنی دعوت پر جمے رہیں۔ ایسی آیات مبارکہ قرآن مقدس میں جہاں بھی ہیں، اصل خطاب تو حضور پاک ﷺ کو ہے، لیکن اس سے مقصود اُمت کو تنبیہ ہوتی ہے کہ اُمت کو یہ بات سمجھ آ جائے کہ جب اتنا بڑا حکم اللہ اپنے نبی کو فرما رہے ہیں تو اگر غیر نبی نے کوئی ایسی بات کی تو اس کا انجام کیا ہو گا؟

اس آیت مبارکہ کو سامنے رکھیں اور پورے عالم پر نظر ڈالیں! مسلمان جس ملک میں بھی ہیں وہ اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور طاقت کے لحاظ سے ہر جگہ ذلیل ہو رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ آپ یہود و نصاریٰ کی پیروی نہ کریں، وگرنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اُٹھ جائے تو ہم ذلیل ہو جائیں گے۔ چونکہ مسلمانوں کے لیے اصل نصرت تو اللہ ہی کی طرف سے ہے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت اور نصرت واپس لے لی تو پھر ہم جیسا بیکار دنیا میں کوئی نہیں، پھر نہ ہم دنیا کے رہیں گے اور نہ دین کے۔ یعنی ہم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی ہے، ان کو ناراض کر لیا ہے اور جن کو راضی کرنے کے لیے چلے تھے وہ بھی ہمارے نہ بنے، وہ بھی ہمیں منافق سمجھتے ہیں کہ جب یہ اپنا دین چھوڑ سکتے ہیں تو ہمارے ساتھ کہاں رہیں گے؟ ان کی نظروں میں بھی ہم منافق بن گئے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو بھی ہم نے ناراض کر لیا تو ہم نہ اِدھر کے رہے اور نہ اُدھر کے رہے۔ اب اِدھر اللہ تعالیٰ کے عذاب بھی ہم پر ٹوٹ رہے ہیں اور دشمنوں کی مار بھی پڑ رہی ہے۔

حضرت علاء حضرمی رضی اللہ عنہ کی قبولیت دعاؤں کا تذکرہ:

حضرت علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ ایک لشکر کی قیادت فرما رہے ہیں۔ اس لشکر والوں نے عرض کیا کہ حضرت! ہم ایک ایسے صحراء میں اُلجھ گئے، راستہ بھول گئے، میلوں تک پانی نہیں ہے، ہمارے پاس جو پانی ہے وہ زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹے نکال دے گا اور اس کے بعد لشکر اور جانور، اونٹ، گھوڑے اور انسان پانی کے بغیر ہم کب تک زندہ رہیں گے؟ انہوں نے فرمایا کہ غم کرنے کی کوئی بات نہیں۔ آپ نے اسی وقت تیمم فرما کر دو رکعت نماز پڑھی، پھر ہاتھ اُٹھائے اور یہ الفاظ ''اَللّٰهُمَّ يَا عَلِيْمُ، يَا حَلِيْمُ، يَا عَلِيُّ، يَا عَظِيْمُ'' کہے اور اسماء اللہ کے ساتھ دعا کی اور دو لفظ کہے کہ یا اللہ! ہم تیرے بندے ہیں اور آپ کو ہماری نیتوں کا پتہ ہے، اگر ہم تیرے نام کی بلندی کے لیے نکلے ہیں تو ہماری مدد فرما اور اگر ہماری نیت کے اندر کھوٹ ہے تو پھر ٹھیک ہے، ہمیں مرنا چاہیے۔ اتنی ہی دیر تھی۔ لشکر والے کہتے ہیں کہ ابھی علاء الحضرمی نے ہاتھ بھی نیچے نہیں ڈالے تھے کہ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے بادل بھیج دیئے، بارش برسنے لگی، پانی ہی پانی جمع ہو گیا، گڑھے بھر گئے، جانوروں نے پانی پی لیا، راستے کا سامان ہو گیا۔ وہ صحراء اور ریت جو عذاب بن گئی تھی، وہ جم گئی اور راستہ بھی بن گیا۔

اس کے بعد وہی لشکر دریا پر جا پہنچا اور کوئی پُل اور راستہ وسائل اور کشتی نہیں ہے، پھر لشکر والے کہنے لگے: حضرت! دریا کیسے عبور کریں؟ فرمایا: کوئی بات نہیں۔ اسی وقت دو رکعت نماز پڑھی اور دعا مانگی۔ فرمایا: چلو، دریا میں سواریاں ڈال دو۔ اس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریا عبور کرلیا۔ آپ نے فرمایا کہ کسی کی کوئی چیز تو نہیں رہ گئی تو صحابہ نے فرمایا: کسی کی کوئی چیز نہیں گری۔

آج تم سارے مولوی اکٹھے کر کے زور لگالو اللہ رحمت کرے جو پہلے امید ہوتی ہے وہ بھی ختم ہوجاتی ہے۔ آخر وجہ کیا ہے؟ آپ تو قرآن ان سے زیادہ پڑھتے ہیں، دعائیں بھی آپ بڑی بڑی مانگتے ہیں۔ صحابہ نے تو میرے خیال میں کبھی ایک دن میں دو طواف اکٹھے نہیں کیے ہوں گے، آپ لوگ تو ماشاءاللہ! دس دس طواف اکٹھے کرتے ہیں اور ایک ایک دن میں پانچ پانچ عمرے بھی اکٹھے کرلیتے ہیں۔ ماشاءاللہ! بڑی جدوجہد کر رہے ہیں، لیکن حالات وہی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ یاد رکھو! اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر حرام آگیا ہے اور جب بدن میں حرام داخل ہوجائے تو دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

اس لیے یاد رکھیں کہ جب تک عالم اسلام یہود و نصاریٰ کے تابع رہے گا، اس کی پیروی کرے گا اور ان کے حکم پر چلے گا تو اللہ کی نصرت ختم ہوجائے گی اور مسلمان ذلیل ہوجائیں گے اور جس دن اپنے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کھڑا ہوگیا اور اپنے اللہ کو راضی کرلیا، اس دن یہ یہود و نصاریٰ اور مجوسی وہ تو تمہارے نام سے ڈرے گا۔ اب تو ہم قصے سنتے ہیں تو عجیب لگتے ہیں۔

مسواک کی سنت کے اثر کا واقعہ:

ایک مرتبہ ایک کافر مسلمانوں کے لشکر میں جاسوسی کر رہا تھا۔ نماز کا وقت آیا تو مسلمان مسواک کر رہے تھے۔ اس نے جلدی سے جا کر اپنی فوج کو رپورٹ دی کہ ان کے ساتھ مت لڑو؛ کیونکہ یہ تو دانت تیز کر رہے ہیں، ہمیں کھا جائیں گے۔ اس کو پتہ تو نہیں تھا کہ مسواک کیا چیز ہے؟ یعنی مسلمان کی مسواک کی سنت کا یہ اثر تھا کہ کافر بھاگ گئے۔ مسلمانوں کے نعرہ تکبیر میں یہ اثر ہوتا تھا کہ ہزاروں کافروں کا مسلح لشکر ہے اور چار سپاہی وہ بھی نہتے ہیں تو اللہ اکبر کہتے تھے، سب کافر ہتھیار ڈال دیتے تھے۔ ان چار نے ان کے ہتھیار سے ہزارہا آدمیوں کو آگے لگایا ہوا ہے۔ اب تو ایک کافر بھی نہیں ڈرتا۔ آخر وجہ کیا ہے؟ کہ نعرے بڑھتے جا رہے ہیں، کافر اور بہادر ہوتا جا رہا ہے۔

محمد بن قاسم اور فتح ہندوستان:

آپ اندازہ فرمائیں کہ چار یا پانچ لڑکیاں تھیں، دیبل کی بندرگاہ پر جن کو راجا داہر نے گرفتار کیا تھا۔ ان لڑکیوں نے کوئلے سے ایک رومال پر خط لکھ کر بھیجا کہ بھئی! ہم مسلمان لڑکیاں ہیں اور راجا داہر کافر کی فوج نے ہمیں پکڑ لیا ہے، ہماری عصمت لوٹی ہے اور ہم اس کی قید میں ہیں۔ مسلمانوں کی غیرت جاگ اُٹھی کہ اپنی بیٹیوں کو رہا کروائیں۔ محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ یہاں سے یلغار کرتا ہوا چلا، کفر کو روند دیا، تباہ و برباد کر دیا اور پورا ملک فتح کر لیا۔

آج دیکھیے! ہم مسلمانوں کی پانچ پانچ سو عورتوں کی ہندو ڈانس کروا کر فلمیں بنواتے ہیں اور ہم بے غیرت زندہ ہیں۔ ان کے ساتھ ہماری دوستیاں اور تعلقات ہیں، ہم ان کی چیزیں خریدتے اور ان کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ ہندو اور وہ بھی بت پرست، یہود و نصاریٰ بھی نہیں۔ یعنی جن کو مسلمان کے نام سے ڈر لگتا تھا کہ مسلمان کا نام بھی تو ہندو کانپنا شروع کر دیتا تھا۔ ہندو کی تاریخ میں بزدلی، مکاریت اور اتنی بزدل قوم تھی کہ کروڑ پتی ہندو لوگ تو ایک آواز سے دبک جایا کرتے تھے اور تین دن کے لیے گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ آج وہ ہندو مسلمانوں کی عزتوں سے کھیلتا ہے۔ وجہ کیا ہے کہ اسلام ہے ہی نہیں۔

آپ وہاں چلے جائیں، دیکھ لیں، آپ کو پتہ نہیں چلے گا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان؟ وہ بھی داڑھی کٹواتا ہے، مسلمان بھی کٹواتا ہے... ہندو سوٹ پہنتا ہے تو مسلمان بھی پہنتا ہے... ہندو لڑکی تلک لگاتی ہے تو مسلمان عورت بھی تلک لگواتی ہے... مسلمان لڑکی عائشہ کہلواتی ہے اور ہندو اوشی کہلواتی ہے... پردہ اور لباس دونوں کے عریاں ہیں... بازاروں میں ہندو اور مسلمان لڑکیاں دونوں پھرتی ہیں۔ ان دونوں میں کسی کو فرق معلوم نہیں ہوتا کہ مسلمان کون ہے اور غیر مسلم کون؟ تو ہندو مسلمان سے کیوں ڈرے گا؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اور مسلمانوں کو اپنے دروازے پر گر کر توبہ کرنے کی توفیق دے دے۔

انفرادی اور اجتماعی گناہ کی معافی کا طریقہ:

یاد رکھو! گناہ جب تک اکیلے ہو تو توبہ اکیلے کافی ہوتی ہے، یعنی مجھ سے گناہ ہو گیا تو مجھے کرنی چاہیے، لیکن جب گناہ اجتماعی ہو جائے اور جس میں پوری امت مبتلا ہو جائے تو جب تک توبہ بھی اجتماعی نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل نہیں ہوگی۔ اب تو امت کو اجتماعی طور پر اللہ کے دروازے پر گرنا چاہیے، اجتماعی طور پر توبہ اور اللہ تعالیٰ

کو راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کبھی آپ سے راضی نہیں ہو سکتے تو پھر ہم کیسے راضی کر سکتے ہیں؟ جس اللہ نے پیدا فرمایا، وہی اللہ فرما رہے ہیں کہ یہ کبھی آپ سے راضی نہیں ہو سکتے۔

حق پر قائم رہنے والی جماعت:

حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ہمیشہ میری امت میں ایک جماعت ایسی رہے گی جو حق کے لیے جہاد کرتی رہے گی اور اپنے حق پر اللہ کی مدد سے غالب ہوگی اور ان کو کوئی مخالفت کرنے والا نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ غالب کا معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کے دلائل کے ساتھ غالب رہے گی۔ پوری دنیا کے ہر ملک، ہر علاقے میں الحمدللہ! ایسی جماعت موجود ہوتی ہے جو دین پر قائم ہے، جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول پاک ﷺ کی رسالت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقے پر قائم ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ سے فرمایا: ہم نے آپ کو علم اور نبوت عطا فرمائی اور ہم نے آپ کو خبر دی کہ یہود و نصاریٰ کبھی آپ کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ اگر اس کے بعد آپ نے ان کی اتباع کی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نہیں ہوگی۔

مفسر رحمہ اللہ کا طرزِ استدلال:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بہت سے فقہاء کرام نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ کفر جس انداز میں بھی ہو، ایک ملت ہے۔ جب ملت کو مفرد ذکر کیا گیا تو معلوم یہ ہوا کہ تمام کفر ایک ملت کی طرح ہے خواہ وہ کسی قسم کا ہو۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے مدنی پاک! آپ ان کو فرما دیں کہ میرا راستہ الگ، تمہارا الگ ہے۔ اس وجہ سے مفسرین اور فقہاء نے یہ مسئلہ نکالا کہ مسلمان، کافر کا اور کافر، مسلمان کا وارث نہیں بنے گا۔ اگر کافر مر جائیں تو پھر وہ ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں، یعنی یہودی اور نصرانی، ہندو یا یہودی کا۔ کیونکہ کفر ایک ملت ہے۔ اسی کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ نے فتویٰ دیا ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک قول امام مالک رحمہ اللہ کا یہ بھی ہے کہ جیسے مسلمان، کافر کا وارث نہیں بن سکتا تو کافر بھی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔ اسی طرح یہودی، نصرانی کا اور نصرانی، یہودی کا وارث نہیں بنے گا۔ ہر آدمی اپنی اپنی ملت کا وارث بنے گا۔ یعنی ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ کفار سب ایک ملت ہیں، جبکہ امام مالک رحمہ اللہ کے ایک

قول کے مطابق کفر ہر قسم کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ ہیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان اہل کتاب کے بارے میں ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے، ان کی بات پر عمل کرنے والے مومن۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو ماننے والے مومن اور پھر اہل کتاب میں سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے سعادت عطا فرمائی، وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ابھی ایمان لے آئے، قرآن پر بھی ایمان لے آئے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو دوہرا اجر عطا فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ [القصص: ٥٤] ایک اپنی کتاب پر عمل کرنے کا اور ایک اللہ کے قرآن پر عمل کرنے کا۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت کا اہل کتاب سے تعلق نہیں ہے، بلکہ اس آیت کا تعلق اصحاب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ لوگ جن کو ہم نے قرآن عطا فرمایا، وہ اس کو ویسا ہی پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جب قرآن پڑھے تو قرآن پاک کے مخارج کی قراءت میں لحن اور الفاظ کی ادائیگی کا خیال رکھے، کہیں غلط نہ پڑھے اور کوئی رحمت کی آیت آجائے تو اللہ سے رحمت مانگے اور جب عذاب کی آیت آجائے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے اور جہاں کوئی تسبیح کی آیت آجائے تو اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس بیان کرے، جہاں استغفار کی آیت آئے تو استغفار کرے اور جہاں دعائیں آئیں تو وہاں اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگے۔ یہ ہے قرآن کی تلاوت کا حق۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے! قرآن کو صحیح پڑھنے کا معنی یہ ہے کہ جن چیزوں کو قرآن حلال کہتا ہے ان کو حلال سمجھے اور جن کو حرام کرتا ہے ان کو حرام سمجھے۔ اور قرآن اسی طرح پڑھے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُتارا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن میں کوئی بھی تحریف نہ کرے، نہ لفظی اور نہ معنوی۔ اللہ کے قرآن کے ترجمے میں بھی کوئی تبدیلی نہ کرے۔ جو اللہ پاک نے فرمایا، اسی پر قائم رہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے: قرآن صحیح معنی میں پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ جو قرآن کی محکم آیات ہیں ان پر ایمان لے آئے اور جو متشابہ آیات ہیں ان کو محکمات کے تابع کر دے اور اگر مشکلات القرآن آجائیں اور سمجھ نہ آئیں تو کسی قرآن کے عالم کے پاس چلا جائے، اس سے سمجھے اور اس کے مطابق چلے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جو قرآن کی پیروی کرے گا اس کا دامن پکڑے گا تو قرآن اس کو ریاض الجنۃ میں پہنچائے گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تم قرآن پڑھو تو جب رحمت کی آیت آئے تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرو اور جب کوئی عذاب کی آیت آئے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے پناہ پکڑو۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن پڑھتے اور رحمت کی آیت پر آتے تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے اور عذاب کی آیت پر آتے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"مَا مِنْ أَحَدٍ يَسْمَعُ بِيْ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَ لَا يَهُودِيٌّ، وَ لَا نَصْرَانِيٌّ وَ لَا يُؤْمِنُ بِيْ إِلَّا دَخَلَ النَّارَ."

[مستدرک الحاکم، رقم: ۳۳۰۹]

خدا کی قسم! جس شخص نے میری نبوت کے بارے میں سنا، چاہے وہ یہودی ہے یا نصرانی ہے، اس کو میری نبوت کی اطلاع مل گئی، پھر وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا تو وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ کیونکہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آگئے تو پہلے والے تمام ادیان، کتابیں اور تمام شریعتیں منسوخ ہوگئیں۔ کوئی یہ کہے کہ میں یہودی بن کر نجات پا جاؤں گا یا میں نصرانی بن کر نجات پا جاؤں گا، یہ نہیں ہوسکتا۔ اب نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا۔ واللہ اعلم۔

﴿يٰبَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢٢﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿١٢٣﴾﴾

[البقرۃ: ۱۲۲، ۱۲۳]

"اے بنی اسرائیل! میرے احسان کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا تھا اور اس کو کہ میں نے زمانہ والوں پر تمہیں بڑائی دی تھی۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کے کوئی کام نہ آئے گا اور نہ اس سے فدیہ وصول کیا جائے گا اور نہ اس کی سفارش کام آئے گی اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔"

بنی اسرائیل کو تذکر بآلاء اللہ:

اللہ تعالیٰ نے کلامِ مقدس کی ان آیات میں بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا ہے۔ اور مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ خداوند قدوس نے پورے قرآن میں تین مقامات پر بنی اسرائیل سے خطاب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی قوم کو خطاب فرمانا اتنا بڑا اعزاز وشرف ہے کہ جس کا اندازہ اہلِ علم ہی کر سکتے ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کی سنت تو یہ ہے کہ پروردگارِ عالم اپنے انبیاء اور رسولوں کو خطاب فرماتے ہیں اور انبیاء و رسل کو خطاب کے بعد حکم ہوتا ہے کہ اپنی اپنی امتوں کو یہ ہدایات پہنچادیں۔

خاص طور پر جتنی سابقہ کتب گزری ہیں، تورات وانجیل اور صحائف، ان میں تو سارا خطاب ہی انبیاء اور رسولوں کو ہے، البتہ یہ شان اور عظمت آپ کی اُمت کو ملی ہے کہ اللہ پاک نے اُمتِ محمد یہ ﷺ کو بھی کئی جگہ خطاب فرمایا، جیسے: ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا﴾ [البقرۃ:۲۱]، ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ [البقرۃ:۱۰۴]... یہ ایک بہت بڑا شرف ہے کہ اللہ کسی قوم کو خطاب فرمائے۔ کسی کو بادشاہ خود خط لکھ کر خطاب فرمائیں تو وہ خوشی سے اُچھلتا پھرے گا اور سب کو دکھاتا پھرے گا کہ مجھے بادشاہ سلامت نے خط لکھا ہے اور جو بادشاہوں کا بادشاہ اور ساری کائنات کے ذرّہ ذرّہ کا مالک ہے، وہ جب کسی کو خطاب فرمائے تو کتنا بڑا اعزاز ہے!! اور پھر خطاب بھی اتنے عظیم انداز میں فرمایا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے بنی اسرائیل! اے اولادِ یعقوب! تو اللہ تعالیٰ نے خطاب میں بھی ایک نسبت فرمائی کہ تم تو میرے ایک نبی کی اولاد ہو۔

پہلے دو خطاب اسی سورت میں گزر چکے ہیں۔ ان تین خطابات کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو پھر کہیں مخاطب نہیں فرمایا؛ کیونکہ وہ اپنے اعمال، احوال کی وجہ سے اس اعزاز سے محروم ہو گئے، وہ تو اس قابل بھی نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ ان کو خطاب فرمائے۔

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے جو خطاب فرمایا، مفسرین کی اصطلاح میں اس کو "اَلتَّذْكِيْرُ بِنِعَمِ اللّٰهِ" کہتے ہیں۔ اسی طرح کبھی "اَلتَّذْكِيْرُ بِأَيَّامِ اللّٰهِ" ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خاص خاص دنوں کا ذکر کر کے ڈراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو پہلے "اَلتَّذْكِيْرُ بِنِعَمِ اللّٰهِ" کے ساتھ مخاطب فرمایا، پھر اس کے بعد بنی اسرائیل کے احوال آئے۔ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حق نہیں ادا کیا اور پھر ان کے احوال ذکر کرنے کے بعد

"اُذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ" پر اللہ تعالیٰ نے خطاب کو ختم فرمایا کہ جب تفصیلی نعمتوں کا ذکر اور ان کے احوال کا ذکر آ گیا، پھر اجمالی طور پر اللہ تعالیٰ نے دوبارہ مخاطب فرمایا، تاکہ شاید وہ پھر بندے بن جائیں اور ان کو ہدایت مل جائے۔ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں فرمائی ہیں، ان کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

جنت میں حضور اکرم ﷺ کی اُمت کی کثرت:

حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے بھی ہم ہوں گے اور سب سے آخر میں بھی ہم ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: یارسول اللہ! اوّلون اور آخرون سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: باعتبار دخول جنت کے؛ کیونکہ جنت میں سب سے پہلے میری امت داخل ہوگی، لہٰذا ہم اوّل ہو گئے اور بعثت کے اعتبار سے میری اُمت سب سے آخر میں آئی تو سب سے آخر میں بھی ہم اہل جنت ہو گئے۔ یہ شرف میری اُمت کو ملا۔

اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں بھی آتا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم چوتھا حصہ ہو گے، یعنی تمام جنت والوں کا ایک چوتھائی ہوں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کچھ اُداس ہونے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدھے تم ہو گے اور آدھا سارا جہان ہوگا۔ اور ایک حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ تم دو حصے ہو گے، یعنی اگر جنت میں کل افراد کو لیا جائے تو دو حصے اُمت محمدیہ ﷺ کے ہوں گے اور باقی سارے جہاں سے ایک حصہ ہوگا۔

شرک کی مذمت:

حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ مومن ہر حال میں نفع میں ہے۔ اس پر مصیبت پڑے اور صبر کرے تب بھی درجہ ملے گا، نعمت ملے اور شکر کرے تب بھی درجہ ملے گا۔ مومن کے لیے توحید کتنی بڑی نعمت ہے!! لیکن جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی نعمت کو چھوڑ دیا، نتیجہ کیا نکلا کہ غیروں سے اولادیں مانگ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وہ نعمت ہی چھین لی۔ ورنہ آخر آپ خود عقل والے لوگ ہیں، خود سمجھ سکتے ہیں کہ ایک چلتا پھرتا انسان جو زندہ ہے، چل رہا ہے، پھر رہا ہے، دوڑ رہا ہے، کام کر رہا ہے، وہ ان لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہوتا ہے جو فارغ ہو گئے اور اس دنیا سے بھی چلے گئے اور عالم بالا میں پہنچ گئے۔ ان سے جا کر کہتا ہے کہ آپ میری حاجت پوری کریں۔ ہم نے ایک سجدہ کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہزاروں دروازوں پر گھما دیا، بس ٹھوکریں کھاتے رہو، پھرتے رہو۔ باقی دنیا کے کام ہیں وہ تو ہوتے رہیں گے۔ بچے تیرے بھی ہوتے ہیں، بچے یہودی کے بھی ہوتے ہیں۔ بیماری، دولت ہندو کو بھی ملتی ہے اور تجھے بھی ملتی ہے۔ یہ تو

نظامِ عالم ہے، اس میں تو ہندو، مسلم اور کافر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی میں سب نے رہنا ہے، سب نے جینا ہے، سب نے کھانا ہے اور نظامِ عالم کو چلنا ہے۔ رات، دن، سورج، چاند، دریا، گرمی سب کچھ ہندو کے لیے بھی ہے اور مسلمانوں کے لیے بھی ہے۔ یہ تو نظام عالم ہے، یہ تو چلتا رہے گا۔ فرق اتنا ہے کہ جو میرا ہے وہ ہر بات کو میری طرف منسوب کرتا ہے اور جو میرا نہیں ہے وہ غیروں میں اٹک جاتا ہے۔

اتحادِ اُمت کی اہمیت:

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی نعمت سے نوازا کہ میرے پاک نبی ﷺ آئے کہ جس نے دشمنوں کو بھائی بنا دیا۔ اور اوس و خزرج جیسے قبائل جن میں بات بات پر قتل ہوتے تھے، جو لوگ اپنی بچیوں کو زندہ در گور کر ڈالتے تھے، جو لوگ شراب پینے کو فخر سمجھتے تھے، جو لوگ عصمتیں لوٹنے کو اپنی عزت جانا کرتے تھے، میرے مدنی آقا ﷺ نے ان کی ایسی تصویر بنا دی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: ﴿رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ وہ تو آپس میں شیر و شکر ہیں۔ میرے مدنی کی جماعت کو دیکھو گے تو کبھی رکوع میں ہوں گے، کبھی سجدے میں ہوں گے، اللہ تعالیٰ کا فضل اور رضا طلب کرنے والے ہوں گے اور رات کی عبادت کی وجہ سے ان کی پیشانیوں پر نورِ عبادت چمکتا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے جتنے قبائل بنائے ہیں، یہ قبیلے اور شاخیں صرف تمہاری پہچان کے لیے ہیں۔ کہاں بلال حبشی رضی اللہ عنہ اور کہاں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ! لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پکارتے تو سیدنا بلال کہہ کر پکارتے تھے، بلال! تم تو ہمارے سردار ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس پاک نبی ﷺ کی نعمت سے عربی، عجمی، فارسی سب کو ایک بنا دیا اور حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ آج کے بعد کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں، کسی گورے کو کالے پر فضیلت نہیں۔

ہم نے جب اس نعمت اسلام کی قدر چھوڑی تو قوموں میں بٹ گئے۔ کہیں مہاجر، کہیں پختون، کہیں پنجابی اور کہیں لسانی جھگڑے ہیں۔ یہ کون کرنے والے ہیں؟ جو سب پڑھتے ہیں، "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت چھین لی۔ جب ہم نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو ہم صوبائیت، لسانیت اور قوموں میں بٹ گئے۔ وہ اسلام والی وحدت، اجتماعیت، اُخوت، ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ کہ تمام کلمہ پڑھنے والے بھائی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مومن ایسے ہیں جیسے ایک عمارت ہوتی ہے۔ اور کہیں فرمایا: جیسے ایک جان ہوتی

ہے کہ پاؤں میں کانٹا لگے تو سب بدن کو تکلیف پہنچتی ہے۔ مومن مشرق، مغرب، شمال اور جنوب جہاں بھی ہیں، سب ہمارے بھائی ہیں۔

لیکن جب ہم نے اس نعمت اتحاد کی ناقدری کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہر آدمی جب اخبار پڑھتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ تو دوسرے علاقے کی بات ہے، میرا گھر تو ابھی محفوظ ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ یہ تو آگ ہے، چل پڑی ہے، پھیلتے پھیلتے ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ تیرا گھر بھی بھسم ہو جائے گا۔ اب ہم لوگوں کے بچوں کو مرتا ہوا دیکھتے ہیں، میں نے خود اندازہ لگایا ہے کہ مسلمان اتنا بے حس ہو گیا ہے، اخبار میں پڑھیں کہ آج اتنے مسلمان مر گئے، اِنَّا لِلّٰہِ بھی زبان سے نہیں نکلتا۔ اتنا بھی نہیں کہتا کہ مسلمان تھے، اِنَّا لِلّٰہِ پڑھ لیں، چلو کوئی بھی تھے، تھے تو مسلمان ناں؟ تھے تو آخر ہمارے بھائی! وجہ کیا ہے؟ جب بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری اور عقیدے میں ناقدری کرو گے تو اللہ تعالیٰ وہ نعمت چھین لیں گے۔

اب اسی حکم میں ایک نماز کو دیکھ لیں! اس سے بڑی دنیا میں کوئی عبادت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ وقت مسلمانوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ ورنہ کیا ہے کہ سب کو حکم ملتا کہ جہاں اپنے گھر میں نماز پڑھ لو۔ لیکن جماعت کا یہ جو اسلام نے سلسلہ بنایا کہ آدمی محلے کی مسجد میں آئے اور جمعہ کے دن تمام محلے والے ایک جامع مسجد میں آئیں، عید والے دن تمام جامع مساجد والے بھی ایک مقام پر آئیں۔ پانچ وقت میں ایک امام کے پیچھے اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اتحاد و اتفاق کا سبق ملتا ہے کہ ایک امام کے پیچھے اللہ اکبر اللہ اکبر۔ امام نے حکم دیا کہ رکوع میں چلے جاؤ تو سب رکوع میں چلے گئے۔ بوڑھے، امیر، غریب، عورت، مرد، جاہل اور عالم بھی، تاکہ ان میں ایک وحدت پیدا ہو، اجتماعیت پیدا ہو اور دن میں پانچ وقت ان سب کو یہ پڑھاؤ۔ نیند سے اُٹھیں تو جماعت کا سبق پڑھاؤ۔ کام میں مشغول ہو گئے، اب ظہر آگئی ہے۔ سارا دن دماغ دوسری طرف چلا گیا، پھر اتحاد کا درس پڑھایا، فرمایا: عصر کی نماز میں ان کو پھر اجتماعیت کا سبق پڑھاؤ۔ وہ دن گزرنے والا ہے، رات آنے والی ہے، پھر مغرب میں ان کو اجتماعیت کا سبق پڑھاؤ۔ سونے کا وقت آگیا، غفلت کا دور شروع ہو گیا، فرمایا کہ ایک بار پھر ان کو اکٹھا کرو، قرآن بھی سنا دو اور ایک امام کے پیچھے کھڑا بھی کر دو۔ امام نہ ہو تو آپ کو پتہ ہے کہ کیا نتیجہ ہوگا؟ کہ کوئی سجدے میں ہے تو کوئی رکوع میں پڑا ہوگا۔ جب ہم علیحدہ علیحدہ نمازیں پڑھتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی اپنی اپنی کیفیت میں ہے، کوئی رکوع میں ہے تو کوئی سجدے میں ہے اور کوئی التحیات میں ہے، لیکن جب ہم ایک امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو

ہمارے اندر ایک اجتماعیت، ایک وحدت اور اتفاق۔ اور پھر صفوں کا بنانا، برابر کھڑے ہونا، صفوں کی ترتیب کہ علم والوں کو آگے جگہ دو، دین کی سمجھ والوں کو آگے جگہ دو، اس کے بعد عورتوں اور بچوں کو جگہ دو۔ صفیں بالکل برابر کرلو، کندھے سے کندھا ملا ہوا ہو۔ یہاں سے اجتماع کا درس حاصل ہوتا ہے۔

سارا جو سبق ایک نماز کی برکت سے ملا اور جب ہم نے اس نعمت کو ٹھکرا دیا تو نتیجہ کیا نکلا کہ آپ نے پڑھا ہوگا حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ نماز میں صفیں سیدھی کیا کرو۔ اگر نماز میں صفیں ٹیڑھی کرو گے تو اللہ تمہارے دل بھی ٹیڑھے کردے گا۔ نماز اور دل کا کیا مسئلہ تھا؟ اللہ کے نبی ﷺ نے ہمیں ایک اشارہ دے دیا کہ جب دل ٹیڑھا ہو جائے تو آپ نے دیکھا ہے ناں! آدمی کہتا ہے کہ میرا دل نہیں مان رہا، بس میرے دل میں اس آدمی سے نفرت آگئی ہے۔ میاں، بیوی کی زندگی گزرتی ہے، سالہا سال جھگڑا ہوتا ہے، اب سارا خاندان اکٹھا ہوتا ہے کہ مہربانی کرو، صلح کرلو۔ میاں بیوی ہو، اتنا عرصہ اکٹھے رہے ہو، کہتے ہیں کہ اب دل پھر گیا، اب نہیں جڑتا جی۔ دل تو شیشہ ہوتا ہے، ٹوٹ گیا تو پھر کیسے جڑے؟ اللہ پاک نے اپنے نبی کے ذریعے فرمایا: میں نے تمہیں اکٹھے ہونے کا حکم دیا ہے۔ اگر تم یہاں اکٹھے نہ ہوئے تو پھر پورے عالم میں بھی ہم تمہیں ٹیڑھا کردیں گے۔ پھر نتیجہ یہ نکلے گا کہ تمہارے دل ٹیڑھے ہو جائیں گے اور جب دل ٹیڑھے ہوں گے تو پھر جھگڑے ہوں، اختلاف ہوں گے۔

اب اس آیت کو سمجھیں، پھر تمہیں سمجھ آئے گی کہ کیا فرمایا؟ فرمایا کہ کیا ضرورت تھی بنی اسرائیل کو مخاطب کیا جاتا؟ ایک تو یہود، حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں موجود تھے، دوسرا وہ اہل کتاب تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں ہزاروں نبی بھیجے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری نعمتوں کو یاد کرو، جب میں نے تمہیں جہان والوں پر فضیلت دی، لیکن تم نے اس کے بعد کفرانِ نعمت کیا۔ فرمایا: ڈرو۔

سب سے بڑی چیز ڈرنا ہے۔ جب ڈر آگیا تو سب کچھ آگیا۔ ڈرو اس دن سے جس دن کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا، کوئی کسی کو ذرہ برابر نفع نہیں پہنچا سکے گا اور جس دن کوئی عذر بھی قبول نہیں کیا جائے گا، کوئی فدیہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی کسی کی شفاعت نفع پہنچائے گی اور نہ ہی وہ مدد کیے جائیں گے۔ لیکن کیا معنی یاد رکھو کہ اگر تم کفر پر مر گئے، اگر تم شرک پر مر گئے، اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری پر مر گئے تو آخرت کا عذاب بھگتنا پڑے گا۔ اور اگر تم ایمان پر مرو گے تو اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو فائدہ پہنچائیں گے۔ ایمان والوں کا تو جو چھوٹا بچہ بھی فوت ہو جاتا ہے، وہ بھی قیامت کے دن اپنے والدین کی شفاعت کا ذریعہ بن جائے گا۔ یعنی ایک چھوٹا بچہ جو پیدا ہونے کے فوراً

بعد مر گیا، چاہے ولادت کے کچھ عرصہ سال بعد یا پھر بلوغت سے پہلے مر جائے تو وہ بھی والدین کی شفاعت کا ذریعہ بن جائے گا، حتیٰ کہ کچا ضائع ہونے والا بچہ بھی نفع پہنچائے گا۔

قیامت کے دن بچہ کا والدین کے لیے شفاعت کرنا:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اس بچے پر صبر کیا، قیامت کے دن وہ بچہ اپنے والدین کی شفاعت کرے گا۔ اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جن کی ایمان پر موت آئی، لیکن گنہگار تھے، ان کے بارے میں انبیاء کی شفاعت قبول فرمائیں گے۔ لیکن جو والدین کفر وشرک پر مر گئے، ان کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔ اور اگر وہ یہ کہیں کہ میری وجہ سے میرے بیٹے کو جہنم میں ڈال دو تو فرمایا کہ وہاں بدلہ بھی قبول نہیں ہوگا، ہر کسی نے اپنی سزا خود بھگتنی ہے۔ اور ان کو کسی کی سفارش بھی نفع نہیں دے گی، کافر کے لیے شفاعت نہیں ہوگی۔ شفاعت تو ان لوگوں کے لیے ہوگی جن کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہوگا، اگرچہ وہ ہوں گنہگار۔ ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ [البقرۃ:۲۵۵] اجازت کے بغیر کون ہے جو سفارش کر سکے؟ فرمایا: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ صَفًّا ڼ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ [النبا:۳۸] کہ قیامت کے دن جس دن جبرائیل علیہ السلام اور ملائکہ بھی صف میں ہوں گے، کسی کو جراُت نہیں ہوگی کہ بات کر سکے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ اذن نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بعد بات کریں گے اور بات بھی وہ کریں گے جو حق ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا اور یہ قرآن میں ان کا نام لے کر آخری خطاب ہے، اس کے بعد وہ اس خطاب کے مستحق نہ رہے۔ تین مقامات پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے خطاب فرمایا، لیکن جب وہ اعراض میں آ گئے، کفرانِ نعمت میں آ گئے تو نتیجتاً فرمایا: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾ [آل عمران:۱۱۲] یعنی ان پر مسکنت ذلت پھینک دی گئی۔

یاد رکھو! یہ جملہ تمام قوموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر محمد مصطفیٰ ﷺ کی اُمت نے بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ کی تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس طرح اُس اُمت کو نعمتوں سے محروم کر دیا گیا، اسی طرح اس اُمت کو بھی محروم کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پہ رحم فرمائیں اور ہمیں اپنی رحمتوں سے محروم نہ فرمائیں۔

﴿وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۲۴]

"اور جب ابراہیم کو ان کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو انہوں نے وہ پوری کیں (اس کے انعام کے طور پر اللہ نے) فرمایا: میں تمہیں لوگوں کے لیے امام بناؤں گا۔ عرض کیا: اور میری اولاد سے بھی؟ فرمایا: میرا عہد (ان میں سے) ظالموں کو حاصل نہ ہوگا۔"

یہود و نصاریٰ کا ملتِ ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ اور اس کی تردید:

ان آیاتِ مبارکہ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔ گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو خطاب تھا، اس کے بعد سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا۔ اس کی مناسبت یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر تمام مذاہب کے لوگ ایمان، اتباع اور محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ کا دعویٰ بھی یہی ہے کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں، اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ذکر فرما کر دو چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

ایک تو یہ کہ اگر تم واقعی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تو ملت ابراہیمی پر ہیں۔ اگر تم دعویٰ میں سچے ہو کہ تم ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار اور ان کی اتباع کرنے والے ہو تو خاتم الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو ولد ابراہیم اور ولد اسماعیل میں سے ہیں، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟

اور دوسرا اشارہ یہ کیا کہ تم دعویٰ کرتے ہو ملتِ ابراہیمی پر ہونے کا، جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو حقیقتاً ملتِ ابراہیمی پر ہیں۔ اب حق کو پہچاننے کی یہ صورت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دین، شریعت، عمل، سیرت و صورت اور طریقہ کار کو دیکھ لو اور اس کے بعد پھر تم لوگ اپنے اپنے طریقے کو بھی دیکھ لو اور پھر سب مل کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے کو دیکھو اور خود فیصلہ کرو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہونے کے دعویٰ میں سچا کون ہے؟

ہر ادنیٰ علم والے شخص کو بھی پتہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑ ڈالا تو جس پیغمبر نے بتوں کو توڑ ڈالا اور بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اسی بت پرستی کی بناء پر اپنے والد کی جدائی کو برداشت کیا، اپنا ملک چھوڑ گئے

اور ہجرت فرمائی، جبکہ تم تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا بھی کررہے ہو اور کہتے ہو کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تو توحید کے لیے اپنے آپ کو آگ میں ڈال دیا اور نصرانی خدا کا بیٹا بنا کر بھی کہتے ہیں کہ ہم ملت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ یہودیوں نے بھی اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنا کر کہا کہ ہم ملت ابراہیم علیہ السلام پر ہیں۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے قصے کو بیان فرمایا اور دعوت دی کہ آنکھیں کھول کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ دیکھو کہ ملت ابراہیم علیہ السلام پر تو صرف حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو پھر میرے پاک پیغمبر کی اتباع کرو۔

اہل سنت والجماعت کی پہچان:

اسی طرح ہر جماعت کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ مثلاً اہل سنت والجماعت میں جتنی جماعتیں ہیں، ان سب کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم اہلسنت والجماعت ہیں اور ہم صحیح راستے پر ہیں۔ ان سب کو حق راستے پر ماننے کا طریقہ یہ ہوگا کہ ان کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، جن کے عقائد و اعمال اور سیرت وصورت حضور پاک ﷺ کے فرمان اور قرآن سے اور عمل صحابہ سے ملتی ہو، وہ اہلسنت والجماعت ہیں۔ صرف زبانی کہلانے سے ہر آدمی اہلسنت والجماعت میں سے نہیں بن جاتا اور جن لوگوں کا عمل قرآن وسنت اور عمل صحابہ کے مخالف ہوگا، اس کا اہلسنت والجماعت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا کیونکہ بچہ پیدا ہونے سے لے کر موت تک جتنے احکام ہیں وہ سب حضور اکرم ﷺ نے کھول کر بیان کردیئے ہیں، ان کے اندر کوئی شبہ نہیں۔ جوانی اور بڑھاپا، دن اور رات کیسے گزارے؟ نکاح، شادی، موت، غسل، کفن، دفن اور قبر وغیرہ غرض ہر ایک مسئلہ سنت میں موجود ہے۔ جس آدمی کا عمل قرآن وسنت اور عمل صحابہ کے مطابق نہیں ہے، اس کا اہلسنت والجماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

امامت سے کیا مراد ہے؟

﴿قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ [البقرۃ:۱۲۴]

ان آیات میں "امامت" کا لفظ آیا ہے۔ کبھی "امامت" سے "نبوت" مراد ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ جن کو خود نبی بناتے ہیں بلاشک وشبہ وہ امام بھی ہوتے ہیں۔ اور ایک امامت انبیاء کے بعد یعنی خلافت کے معنی میں آتی ہے اور اس میں بھی اہلسنت والجماعت کے نزدیک معصوم صرف نبی کی ذات ہوتی ہے، یعنی جتنے انبیاء اور رسل ہیں وہ

معصوم ہیں۔ انبیاء کے بعد صحابہ کا درجہ، پھر تابعین کا، پھر اللہ کے اولیاء، صالحین کا درجہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معصوم تو نہیں، البتہ محفوظ ضرور ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں گناہوں سے بچاتے ہیں اور کوئی غلطی ہو تو فوراً توبہ کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔ توبہ کے بعد اس گناہ کو ختم کر دیتے ہیں۔ لیکن معصومیت کا درجہ صرف نبی کا ہوتا ہے، برخلاف ایک گمراہ فرقہ کے، ان کے نزدیک امام بھی معصوم عن الخطا ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہلسنت والجماعت کے عقیدہ میں اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں نبوت عطا فرما دیتے ہیں۔ نبوت کسی کو محنت، عبادت، ریاضت و مجاہدہ سے نہیں ملتی۔ نبوت خالصتاً اللہ تعالیٰ کے ارادے، قضا و منشا سے ملتی ہے۔ میرے اللہ نے اس کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع فرمایا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر ختم کر دیا۔

نبی کے مخصوص من اللہ ہونے کا معنیٰ:

نبی کے لیے مخصوص من اللہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن کو نبوت تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے سے عطا فرمائی، لیکن دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منظور فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے بھائی کے لیے عرض کیا تو اللہ تعالیٰ نے دعا منظور فرمائی اور ان کو نبی بنا دیا، ورنہ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی کو محنت و ریاضت اور عبادت سے نبوت مل جائے، ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الانعام: ۱۲۴] اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ میری رسالت کا تاج پہننے کے لائق کون ہے؟ وہ جس کو چاہتے ہیں پہناتے ہیں۔ لیکن ایک فرقہ کے نزدیک امامت بھی مخصوص من اللہ ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنتا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ ایسا ہے کہ آج تک وہ اس کی دلیل پیش نہیں کر سکے۔

امامت کا انتخاب کیسے ہوتا ہے؟

نبوت، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخصوص ہوتی ہے، جبکہ نبوت کے بعد خلافت مخصوص من اللہ نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں انبیاء کی خلافت کے لیے کچھ صفات رکھی ہیں، کچھ شرائط رکھی ہیں، وہ صفات جن پر منطبق ہوتی رہیں، انہی شرائط و صفات کے مطابق صحیح خلفاء بنتے ہیں اور جن میں یہ صفات نہ پائی جائیں، وہ خلیفہ حق نہیں کہلاتے۔ نشانیاں اللہ نے عطا فرما دیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے مومنین کی نشانیاں بیان کر دیں کہ مومنوں کی صفت ایمان بالغیب، نماز قائم کرنا، انفاق فی سبیل اللہ، نماز میں خشوع اختیار کرنا، زکوٰۃ کا ادا کرنا، اپنی شرمگاہوں

کی حفاظت کرنا، اپنے وعدوں کو پورا کرنا اور امانتوں کی حفاظت کرنا وغیرہ۔ اب جن جن میں یہ صفات پائی جائیں گی، ہم کہیں گے کہ الحمد للہ ایمان والا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی صفات کا بھی ذکر فرما دیا کہ جب ایمان والوں کو ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں، جب اپنے شیاطین کو ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو مذاق ٹھٹھا کرنے گئے تھے، ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ آج ہم اگر کسی میں یہ علامت پائیں گے تو کہیں گے کہ منافق ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ منافق کی تین بڑی نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹی کرے، امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔ یہ منافق کی علامات ہیں۔ اب اگر یہ نشانیاں پائی جائیں گی تو کہا جائے گا کہ یہ منافق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی خلافت کے لیے بھی قرآن میں ایک وعدہ فرما دیا: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْــــًٔـا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ [النور: ۵۵] اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمارا وعدہ ہے کہ تم میں سے جو ایمان والے ہیں، ہم ان کو دنیا میں اپنی خلافت عطا فرمائیں گے۔ (اب سب سے پہلے تو یہ دیکھنا ہوگا) کہ جب یہ آیت اُتری تو اس وقت ایمان والے کون کون تھے؟ میرے مدنی ﷺ کے پاس کون لوگ موجود تھے؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین کے اندر حکومت دیں گے اور تمہارا کام کیا ہوگا؟ تم پسندیدہ دین کو قائم کرو گے، امن قائم کرو گے۔

دنیا کے اندر جب ہم یہ علامات دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ، عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ میں نظر آتی ہیں، اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تک اور ان کے بعد عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تک اور پھر ان کے بعد دنیا میں بادشاہ بھی گزرے ہیں، جن میں وہ نشانیاں ملتی گئیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوئے اور جن میں دین کے خلاف باتیں ملتی گئیں، وہ دین سے ہٹتے گئے۔ ہر چیز کے لیے علامات ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا۔

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى﴾ میں ابتلاء کے معنی:

آیت میں ﴿ابْتَلٰٓى﴾ کا معنی امتحان ہے، یعنی اپنے بندے ابراہیم کا امتحان لیا چند چیزوں کے ساتھ۔ سیدنا

ابراہیم علیہ السلام اس امتحان میں پورے اُترے تو اس کامیابی کے بعد سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے انعام دیا اور فرمایا: اے میرے خلیل! اگر آپ امتحان میں پورے ہو گئے تو ہم تمہیں لوگوں کے لیے امام بنائیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا مرتبہ بخشا تو ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ اے اللہ! آپ مجھے جو امامت کا مقام دیں گے وہ مقام میری ذرّیت میں بھی رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم! ہم تیری دعا کو قبول کرتے ہیں اور تیری اولاد میں بھی امامت آئے گی، لیکن جو ظالم ہیں، ان کو میرا عہد نہیں پہنچے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو ظالم ہوگا، وہ امامت وخلافت کا مستحق نہیں ہوگا۔ خلافت کے لیے عدالت اور تقویٰ کا ہونا ضروری ہے۔ جو آدمی عادل اور متقی ہوگا وہ امامت وخلافت کا مستحق ہوگا اور جو عادل اور متقی نہیں ہے، اس کا حق نہیں بنتا، نہ خلافت کا اور نہ ہی امامت کا۔

﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ کی تفسیر:

ظلم کا لفظ عدل کے مقابلے میں آتا ہے۔ پورے قرآن مقدس میں جہاں بھی آپ نظر ڈالیں گے، جیسے کذب کے مقابلے پر صدق آئے گا، باطل کے مقابلے میں حق آئے گا، اسی طرح ظلم کے مقابلے میں عدل آئے گا۔ کسی بھی جگہ قرآن میں ظلم کے مقابلے میں عصمت کا لفظ نہیں۔ اس لیے اگر امامت سے مراد نبوت لیں تو پھر وہ معصوم ہیں، اور اگر امام سے غیر نبی مراد لیں تو اس کے لیے عدالت وتقویٰ ضروری ہے، لیکن عصمت ضروری نہیں، یعنی خطا تو اس سے بھی ہو سکتی ہے۔

وہ کلمات کیا تھے جن سے اللہ کے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا گیا؟ اس سے قبل یہ جان لیں کہ یہ سنت اللہ ہے کہ ہر چیز کو جاننے کے باوجود امتحان لیتے ہیں، تاکہ اس شخص کو دنیا، ملائکہ اور اس زمانے کے لوگوں پر بھی واضح کر دیں کہ یہ امتحان میں کامیاب ہے اور یہ ناکام ہے اور پھر ہر ایک کے ساتھ اس کی صورت حال کے مطابق فیصلہ فرمائیں، ورنہ تو ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

﴿رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ﴾ کی وضاحت:

﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے لکھا ہے کہ کلمات سے مراد وہ امتحانات ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر گزرے۔ جیسے سب سے بڑا امتحان یہ گزرا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا اور اس سے بڑا امتحان کیا

ہو سکتا ہے؟

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے بڑے امتحان میں ثابت قدم نکلے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خود اجازت دے دی...... اگر ظاہری طور پر آپ فرشتوں سے مدد بھی پکڑیں تو کوئی شرک نہیں تھا۔ مثلاً میں مریض ہو گیا، کمزوری ہو گئی، کسی طالب دوست سے میں نے کہا کہ مجھے گھر پہنچا دو، میری مدد کرو اور میرے لیے دوا لا دو۔ یہ شرک نہیں ہے، بلکہ یہ تو نظام عالم ہے۔ شرک تو تب ہوتا ہے جب کسی غائب کو حاضر اور نفع ونقصان کا مالک جان کر پکارا جائے، وہ شرک ہے۔ جیسے ابھی کوئی جبرائیل علیہ السلام کو پکارے کہ یا جبرائیل! یہ شرک ہوگا، کیونکہ جبرائیل علیہ السلام کون سا موجود ہے یا تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہے جو ہماری بات سُن یا سمجھ رہا ہے؟ جب ہم اس غائب کو حرفِ ندا سے اس کو حاضر سمجھ رہے ہیں اور یہ بھی سمجھ رہے ہیں کہ جبرائیل ہماری بات بھی سمجھتا ہے، ہم جو زبان بول رہے ہیں، مثلاً انگریزی، اُردو وغیرہ وہ سب جانتا ہے تو اب شرک آئے گا۔ اگر حاضر آدمی کو کہیں کہ مجھے پانی پلا دو تو یہ شرک نہیں ہوتا...... اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خود بھیج دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے کہ حکم دیں، ابھی ہم بادل برسا دیتے ہیں آگ ختم، ابھی ہمیں حکم دیں ہم پہاڑوں کو یوں ملا دیتے ہیں اور آگ ختم۔ ابھی ہمیں حکم دیں اس آگ کو تیرے دشمنوں کے اوپر پلٹ دیں، وہ جل کر راکھ ہو جائیں گے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ حالانکہ اگر فرما دیتے تو (نعوذ باللہ!) یہ توحید کے خلاف بات نہیں تھی۔ آخر حضرت خلیل علیہ السلام کے پاس جب جبرائیل علیہ السلام آئے تو انہوں نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا: چلو ہمیں نہ کہو، اپنے اللہ سے تو دعا مانگو کہ آپ کو بچا دے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ خلیل مسکرائے اور فرمایا کہ جبرائیل! مجھے ایک بات بتاؤ۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا: فرمائیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ جو آگ جل رہی ہے، کیا یہ اللہ کے علم میں ہے، اللہ تعالیٰ کو اس کا پتہ ہے؟ انہوں نے کہا: پتہ ہے۔ خلیل بولے: کیا اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پتہ ہے کہ مجھے جلانے کے لیے جلائی گئی ہے؟ بولے: یہ بھی پتہ ہے۔ فرمایا کہ جب پتہ ہے تو یاد دلانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ یاد تو اس کو دلایا جائے جس کو پتہ نہ ہو، ہم کہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کو پتہ نہ ہو اور میں بتا دوں کہ میں جل رہا ہوں۔ جب ان کو پتہ ہے اور ان کی منشاء کے خلاف آگ جل نہیں سکتی۔ جب وہ سب جانتے ہیں، اگر وہ اپنے خلیل کو جلانے پر راضی ہیں تو ہم بھی راضی ہیں۔ پھر مانگنے کا کیا مطلب؟

بعض مفسرین نے فرمایا کہ جب بیٹے کے ذبح کا حکم دیا گیا، یہ دوسرا امتحان تھا۔ اپنے بچے کی گردن پر چھری

رکھنا، اس سے بڑا کوئی امتحان ہو سکتا ہے؟

اور بعض علماء نے فرمایا کہ پوری قوم حتیٰ کہ اپنے والد سے بھی ٹکراؤ ہو گیا۔ یہ بھی امتحان تھا کہ اپنا وطن اور ماں باپ سب کو اللہ تعالیٰ کی توحید کے لیے علاقے کو چھوڑا اور پھر جہاں ہجرت کی، وہاں نہ کوئی مقام، یہ وطن اور نہ گھر ہے نہ جگہ ہے۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ میں یہ چیزیں داخل ہیں اللہ تعالیٰ نے داڑھی رکھنے، مونچھیں کاٹنے، بغل صاف کرنے، زیر ناف بالوں کو صاف کرنے اور جوڑوں کی صفائی کرنے کا حکم دیا، اسی طرح ختنہ کا حکم ملا۔ یہ سب امتحان تھے اور سب سے پہلے یہ ابراہیم علیہ السلام پر آئے۔ سب سے پہلے ختنہ ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوا اور قیامت تک تمام انبیاء کی سنت رہا ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا ہے کہ ختنہ گویا ایک داغ اور علامت ہے، جس طرح جانوروں کے ریوڑ میں ہر شخص اپنے جانور کی شناخت کے لیے ایک علامت مقرر کر دیتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان والوں کے لیے ختنہ ایمان کی علامت بنایا ہے۔

اور بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس عضو کے کاٹنے کا حکم دیا، تا کہ تنبیہ ہو جائے کہ میں نے اس عضو کی حفاظت کرنی ہے، میں نے اس کو غیر شرعی مقام میں کبھی استعمال نہیں کرنا اور پھر ابراہیم علیہ السلام پر یہ ابتلاء بڑی عمر میں آئی، یہ بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش تھی۔

سنت نبوی پر عمل، مہلک و موذی امراض کا علاج ہے:

چودہ سو سال تو میرے مدنی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے گزر گئے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کو تقریباً چار ہزار سال گزر گئے، واللہ اعلم! آج سے چار ہزار سال کے بعد دنیا کی جدید سائنس اور جدید ڈاکٹر، پروفیسر جو کروڑوں روپے خرچ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر کسی نے کینسر جیسے موذی مرض سے بچنا ہے، ایڈز اور وہ گندی بیماریاں جن کا دنیا کے اندر علاج ہے، اس کو چاہیے کہ اسلام کے حکم پر عمل کرے۔ یعنی آج جو دنیا خود اس بات پر آ گئی، ورنہ پہلے سکھ بال نہیں کاٹتے تھے، بغلوں اور بدن کے دیگر حصوں کے بال کتنے ہی بڑے ہو جائیں۔ اسی طرح سکھوں سے ہندوؤں اور انگریزوں کے اندر اور پھر انگریزوں سے مسلمانوں کے اندر بھی یہ بلا آ گئی۔ اب وہ مسلمان جو زیادہ ماڈرن لوگ ہیں، ان کے بال ایسے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں کہ کپڑے اُتاریں تو

گویا جانور نظر آئیں۔

اسی طرح اسلام نے جو حکم دیا تھا کہ آپ کی مونچھیں کٹی ہوئی ہوں تو یہ بال پانی کے اندر داخل نہیں ہوں گے، آپ کی بغلیں صاف ہوں گی تو ان کے اندر کوئی بد بو اور گندگی پیدا نہیں ہوگی، اسی طرح زیر ناف کا مسئلہ ہے۔

اسلام کتنا عظیم ہے کہ چودہ سو سال پہلے عورت کو جو حکم دیا گیا کہ عورت جب حیض کے ایام سے فارغ ہو جائے تو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ کوئی کپاس کی کوئی چیز اندر رکھ لے، تا کہ تسلی ہو جائے کہ خون کا داغ نہیں لگا تو وہ صاف ہو جائے گی۔ دوسرا اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ خوشبودار چیز اپنے بدن کے اندر رکھے کہ اندر کی گندگی اور نجاست خوشبو کی وجہ سے نچڑ جائے اور کوئی بیماری پیدا نہ ہو۔ یہ بھی ایک رواج ہوتا تھا کہ جیسے عود کی لکڑی اور لوبان وغیرہ وہ انگارے پر ڈال دی اور کپڑوں کے ساتھ عورت اوپر کھڑی ہوگئی، تا کہ دھوئیں سے پورے بدن کی نجاست دھل جائے اور جب تک ان چیزوں پر عمل رہا تو کامیابی رہی۔

ماں کا بچے کو دودھ پلانے کی حکمتیں:

اسلام نے حکم دیا کہ ہر عورت اپنے بچے کو دودھ پلائے، حتیٰ کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں طلاق ہوگئی تو آپ ظلم نہ کریں اور بچے کو نہ چھینیں، ماں کو دودھ پلانے دیں اور اسلام نے اتنی بڑی پابندی بھی لگائی، مثلاً بیوی بچے کو دودھ نہیں پلانا چاہتی اور وہ کہتی ہے کہ میں تو دودھ پلانے کے پیسے لوں گی تو جو تم دایہ عورت کے دودھ پلانے پر خرچ کرو گے وہی اس کی ماں کو دے دو اور وہی دودھ پلا دے۔

اس دودھ میں کتنی حکمتیں تھیں؟ آج جدید سائنس کہتی ہے کہ ڈبہ کا دودھ نہ پلانا، اپنا دودھ پلاؤ، کیونکہ جن عورتوں نے دودھ پلانا چھوڑ دیا، ان کے سینے میں کینسر ہوگیا۔ کیونکہ جس چیز کو نکلنا تھا، وہ آپ نے روک دی۔ جب راستہ رک جائے تو تکلیف ہوتی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ دودھ کتنی پاکیزہ چیز ہے کہ برتن میں بند کر کے رکھ دو تو پھٹ جائے گا، خراب ہو جائے گا اور جب بچہ دودھ پیتا ہے تو خدا کی قدرت یہ ہے کہ فلٹر کے ساتھ اس کے سینے کو بھی صاف کر دیتا ہے اور وہاں کسی قسم کا کینسر نہیں ہوتا۔ عورتوں میں جو سب سے زیادہ کینسر ہے وہ سینے کا ہے۔ وجہ کیا ہے کہ ہم نے دودھ پلانے والی سنت سے انکار کیا اور پھر جو بچوں کے اندر بیماریاں آئیں، اس کی ذمہ دار مائیں ہیں۔ اگر بچہ ماں کا دودھ پیتا تو یہ بیماریاں نہ آتیں۔

اچھا پھر اللہ کا نظام دیکھیں! جب عورت کو آپ نے گھی، دودھ اور گوشت کھلایا، پلایا تو ساری قوت جو اس دودھ کے ذریعے بچے کے اندر منتقل ہو گئی اور جب ہم نے اس کو دودھ سے ہٹا دیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ دودھ ڈبے کا ہے اور تعلیم سرکار کی۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے، اکبر الہ آبادی اسی لیے رویا تھا کہ کیسے اب نُو آئے بچے سے ماں باپ کے اطوار کی؟ کہ پہلے اولاد بھی ماں باپ کے نقش قدم پر ہوتی تھی، اب والدین کے نقش قدم پر کیسے چلے؟ پھر جو دودھ ڈبے میں آ رہا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خنزیر کا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی حرام جانور کا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو محفوظ رکھنے کے لیے کسی حرام چیز کا کُور دیا گیا ہو، جس کی وجہ سے وہ سالہا سال تک خراب نہ ہو۔ بہر حال اسلام نے جو احکام رکھے ہیں، ان میں بہت ساری حکمتیں ہیں۔

﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ کی تفسیر:

جامع قول مفسرین کا یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پر جتنے بھی امتحان گزرے ہیں، وہ سب کلمات میں شامل ہیں۔ آگ میں ڈالا جانا، بیٹے کو ذبح کرنا، اہل وعیال کو مکہ کے وادیٔ غیر ذی زرع میں اکیلا چھوڑ دینا، وقت کے بادشاہوں سے ٹکرا جانا، اپنے باپ سے جدا ہو جانا، اپنے گھر کو چھوڑنا، ختنہ اور اپنے بدن کی صفائی کرنا وغیرہ۔ یہ سب امتحان ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک جامع لفظ فرما دیا: ﴿بِكَلِمٰتٍ﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاَتَمَّهُنَّ﴾ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام کو پورا کر دیا، یعنی تمام آزمائشوں کے ساتھ اللہ کے تمام اوامر کو پورا کیا۔

جب ابراہیم نے آزمائش کو پورا کر دیا تو ہم نے انعام دیا۔ میرے خلیل! اب ہم تمہیں دنیا والوں کے لیے امام بنا دیں گے، تمام دنیا تیری امامت کو مانتی ہے، چاہے عمل نہ کریں، لیکن دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں اور قیامت تک آپ کی امامت ہے اور پھر اس امامت کو اللہ تعالیٰ نے ایسا پکا کیا کہ آخری نبوت اور ختم نبوت کا جو مرتبہ تھا، وہ بھی سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا، جو ولد اسماعیل میں سے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے کعبہ بھی مقرر کیا جو ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ ہر لحاظ سے امامت کا مرتبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرما دیا اور اُمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک قیامت تک نمازیں پڑھے گی تو درودِ ابراہیمی پڑھے گی۔ اتنا بڑا انعام ملا!!

یہ دیکھ کر خلیل علیہ السلام نے فوراً دعا کی کہ اے اللہ! میری اولاد کو بھی محروم نہ کرو، میری اولاد میں بھی یہ شرف امامت رکھو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیری ذرّیت میں رکھیں گے، لیکن تیری ذرّیت میں جو ظالم ہوں گے، ان کو یہ مرتبہ

امامت نہیں ملے گا۔ ان کو ملے گا جو عادل، متقی ہیں۔ اللہ نے اس آیت سے ایک بات کو واضح فرما دیا کہ اے بنی اسرائیل! تم کیسے فخر میں مبتلا ہو؟ تم ظالمین بنو گے تو پھر مرتبہ امامت ختم۔ اس لیے کہ ہم نے تو ابراہیم سے وعدہ کیا ہے کہ صرف متقین کو امامت ملے گی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول مبارک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو مناسک حج کے امتحان میں ڈالا۔ طواف، صفا و مروہ، منیٰ، مزدلفہ، عرفات، ان سب مناسک کے پورا پورا ادا کرنے کا امتحان تھا۔

ایک قول حضرت ابن عباس کا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دس چیزوں کا حکم دیا۔ پانچ کا تعلق سر سے ہے اور باقی پانچ کا تعلق سارے بدن کے ساتھ ہے۔ سر کی مونچھیں کٹوانا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا اور بالوں کو تقسیم کر کے سیدھی مانگ نکالنا۔ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے سر کے ساتھ خاص رکھا ہے اور باقی پانچ چیزیں بدن سے متعلق ہیں۔ ناخنوں کا کاٹنا، زیر ناف بالوں کا صاف کرنا، ختنہ کرانا، بغلوں کے بال نکالنا، اگر قضائے حاجت کے لیے جائے تو پانی کے ساتھ صفائی کرے۔ ان دس چیزوں کے امتحان میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو ڈالا۔ یہ تمام سنن الانبیاء والمرسلین ہیں، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہزاروں انبیاء آئے۔ اس لیے آدمی ان کا پورا پورا خیال رکھے، کیونکہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ان کا تعلق فطرتِ انسانی کے ساتھ ہے۔

داڑھی کی سنت:

(حدیث) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں معراج کی رات بیت المعمور کے ساتھ پشت لگا کر خوبصورت شکل والا انسان بیٹھا ہوا دیکھا ان کی داڑھی مبارک سینے تک ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اتنا خوبصورت ہے اور اتنا جمال ہے کہ ان کی شکل میرے ساتھ ملتی تھی۔ میں نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ تو آپ کے ابا سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب میں نے معراج کی رات ہارون علیہ السلام کو دیکھا تو ان کی داڑھی مبارک تو ناف سے بھی نیچے تھی، یعنی اتنی لمبی تھی۔ اس لیے قرآن پاک میں آپ نے پڑھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توحید کے مقابلے میں غصہ آ گیا تو جلال والے تھے اور مسئلہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا تھا تو موسیٰ علیہ السلام سب کچھ بھول گئے اور پکڑ لیا بھائی کو اور مارنے لگے۔ بھائی نے کہا کہ بھائی! میری داڑھی پکڑ کر مجھے مت مارو کہ دشمن ہنسیں گے کہ

موسیٰ اپنے بھائی کو مار رہا ہے۔ تو اس کی دلیل موجود ہوئی تو ہارون علیہ السلام کی اتنی لمبی داڑھی تو تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں آ گئی (اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی کم از کم اتنی ہو کہ ہاتھ میں آ سکے اور وہ ایک مشت ہے)۔

حضور پاک ﷺ کی داڑھی مبارک کے بارے میں بھی آتا ہے کہ سینہ مبارک بھر دیتی تھی اور ایک حدیث مبارک میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور پاک ﷺ کی داڑھی مبارک کا حلقہ اتنا گول تھا جیسے چاند کا حلقہ ہو۔ اتنا خوبصورت جمال اور سینہ بھرا ہوا اور پھر جمیع انبیاء المرسلین اور جمیع صحابہ، جمیع تابعین، جمیع ائمہ مجتہدین، فقہاء، قراء کرام اور اللہ کے اولیاء، یعنی ایک بندہ ایک مثال بھی نہیں دے سکتا کہ عالم انسانیت میں نبی یا ولی ایسا گزرا ہے کہ جس کی داڑھی نہ تھی۔ لیکن دشمن نے ایسے راستے پر لگا دیا ہے کہ آج داڑھی رکھنا ایسے معلوم ہوتا ہے (اللہ تعالیٰ معاف فرمائے) کہ آدمی بڑا عجیب کام کر رہا ہے! یعنی داڑھی والا آدمی اب مسلمان معاشرے میں ایسے لگتا ہے جیسے کوئی اجنبی آدمی آ گیا ہو۔

اچھا پھر دلیل دیتے ہیں کہ دیکھو جی! داڑھی والے بھی گناہ کرتے ہیں۔ خدا کے بندے! تم نے کلمہ نبی ﷺ کا پڑھا ہے یا داڑھی والوں کا پڑھا ہے؟ یہ تو ایک شیطانی حملہ ہے کہ دیکھو جی! داڑھی والا بھی گناہ کرتا ہے۔ اس طرح تو کپڑے پہننے والا بھی گناہ کرتا ہے، لہٰذا کپڑے بھی نہ پہنو، شادی والا بھی گناہ کرتا ہے تو شادی بھی نہ کرو، کھانے کھانے والا بھی گناہ کرتا ہے، لہٰذا کھانا بھی نہ کھاؤ۔ یہ کوئی دلیل ہے؟ عقل ہے، منطق ہے کہ ایک آدمی داڑھی نہ رکھے اور دوسرا الزام بھی لگائے کہ داڑھی والے گناہ نہیں کرتے؟ داڑھی رکھنے سے کوئی آدمی پاک ہو جاتا ہے؟ کتنے داڑھی والوں کو ہم نے جھوٹ بولتے، بے ایمانی کرتے، سمگلنگ کرتے دیکھا ہے، سود کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ کوئی دلیل نہ ہوئی۔ اللہ کے بندو! داڑھی رکھنا سنت الانبیاء والمرسلین ہے اور نہ رکھنا سنت شیطان ہے۔ اب آپ کی مرضی جس کے راستے پر چلیں۔ شیطان کی داڑھی نہیں ہے، البتہ آپ مجھے داڑھی والا شیطان نہیں دکھا سکتے۔ اگر کسی نے دیکھا ہو تو مجھے دکھائے۔

قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو جماعتیں بنائیں: ایک رحمان والی اور ایک شیطان والی۔ حزب الرحمان یا حزب الشیطان، دو جماعتیں ہیں۔ حزب الرحمٰن والوں کی داڑھی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ حزب الشیطان والوں کی نہیں ہے۔ حزب الرحمٰن والے سچ اور حق پر ہیں اور حزب الشیطان والے جھوٹ اور باطل پر ہیں۔ یہ تو واضح سی بات ہے، لیکن یاد رکھو کہ دشمن نے سب سے پہلے اس سنت پر حملہ کیا کہ جس کی ابتداء سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے داد اکو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ داڑھی بڑھاؤ اور موچھیں کٹواؤ۔

دوسرا حکم یہ ملا تھا کہ جب وضو کرو تو کلی کرو، تاکہ آپ کے منہ کے اندر کی صفائی ہو جائے۔ تیسرا یہ کہ جب وضو کرو تو ناک میں پانی کھینچو۔ یاد رکھو کہ ہمارے ہاں جو لوگ وضو کرتے ہیں، ناک کو پانی سونگھاتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے، بلکہ پانی کھینچے۔ اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ پانی اتنا کھینچو کہ ناک کی نرم ہڈی تک چلا جائے یعنی پانی آپ باقاعدہ کھینچیں، ناک میں پانی جائے، ناک کو صاف کریں اور ناک کی نرم ہڈی تک جا پہنچے۔ جیسے سجدہ کرتے ہیں اسی طرح وضو کرتے ہیں، وہاں بھی ٹھونگیں اور یہاں بھی ٹھونگیں۔ اسی طرح سے فرض غسل نہیں ہوگا جب تک ناک میں پانی اچھی طرح سے نہیں ڈالے گا۔ استنشاق کا لغت میں بھی یہی معنی ہے کہ پانی کو کھینچ کر ناک میں چڑھانا۔ یہ سنت الانبیاء والمرسلین ہے۔ اچھا اس پر آپ عمل کریں۔ اسی پر مجھے ایک دوست نے قصہ سنایا۔

ایک انگریز کا واقعہ:

ایک انگریز افسر تھا۔ اس کا کھانا پکانے والا بابو جو مسلمان تھا...... چونکہ ہم لوگوں نے تو یہی کام سیکھا ہے تاکہ مالی بن گئے یا کھانا پکانے کے لیے بابو یا چپڑاسی بن گئے؛ کیونکہ اس سے بڑے کام تو کافر کرتے ہیں، وہ صاحب ہوگا اور ہمارا مسلمان چپڑاسی ہوگا...... خیر اس نے چھٹی مانگی کہ مجھے نزلہ اور زکام ہو گیا، لہٰذا مجھے چھٹی دے دی جائے۔ اسے بلایا اور کہا: چھٹی تو میں تمہیں دیتا ہوں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم نام کے مسلمان ہو، نماز نہیں پڑھتے ہو۔ اس نے کہا: سر! اس نے کہا: سر کی کیا بات ہے؟ سیدھی بات کرو، تم نماز نہیں پڑھتے ہو۔ اس نے کہا کہ کبھی کبھی پڑھتا ہوں۔ اس نے کہا: جھوٹ بولتے ہو، اگر تم مسلمان ہوتے اور اپنے مذہب کے مطابق فجر کی نماز کے لیے وضو کرتے، تین دفعہ ناک میں پانی کھینچتے اور نماز پڑھتے تو کبھی بھی تم کو نزلہ نہ ہوتا۔ تم نماز نہیں پڑھتے ہو، نہ وضو کرتے ہو۔ تم تو اپنے مذہب میں بھی سچے نہیں ہو۔ اس نے کہا: ہاں یہ ہو سکتا ہے وائرس لگ جائے، کسی دوسرے سے لگ جائے ہم مکمل مسلمان بنیں ناں۔ مکمل نہیں بنیں گے تو ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوگا، دوسرے سے رگڑا لگتا رہے گا۔

دس چیزیں فطرت میں سے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ: قَصُّ الشَّارِبِ وَ إِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ وَ السِّوَاكُ وَ اسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَ قَصُّ الْأَظْفَارِ وَ

غَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَ نَتْفُ الْإِبِطِ وَ حَلْقُ الْعَانَةِ وَ انْتِقَاصُ الْمَاءِ...قَالَ زَكَرِيَّا: قَالَ مُصْعَبٌ: وَ نَسِيتُ الْعَاشِرَةَ إِلَّا أَنْ تَكُونَ الْمَضْمَضَةَ." [صحیح مسلم، رقم: ۲۶۱]

دس چیزیں فطرت کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں: مونچھوں کا کٹوانا، داڑھی کا بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی کھینچنا، ناخنوں کا کاٹنا اور جوڑوں کے اندر جو چیز رہ جاتی ہے اس کو دھونا صاف کرنا اور بالوں کا صاف کرنا، بغلوں کا صاف کرنا اور زیر ناف بالوں کو حلق کرنا اور پانی کے ساتھ پاکی حاصل کرنا۔ حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ میں دسویں چیز بھول گیا، شاید مضمضہ یعنی کلی کرنا ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچ چیزوں کا فطرتِ انسانی سے تعلق ہے: ختنہ کرانا، زیر ناف بالوں کا استرے سے صفائی کرنا، مونچھوں کا کاٹنا اور ناخنوں کا کاٹنا اور بغلوں کے بالوں کو نوچنا۔ یہ سنت الانبیاء بھی ہے اور سنت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے۔ ان سب کا فطرت سے تعلق ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ دس چیزوں میں سے چھ چیزوں کا تعلق انسان سے ہے اور چار چیزوں کا تعلق مشاعر سے ہے۔ انسان کے اندر کی جو چیزیں ہیں، وہ یہ ہیں: زیر ناف بالوں کا صاف کرنا، بغلوں کے بالوں کو نوچنا، اور ختنہ۔ ابن بصیرہ فرماتے ہیں کہ اگر غور کرو تو یہ تینوں ایک چیزیں ہیں۔ ناخنوں کا کاٹنا، مونچھوں کا کاٹنا، مسواک کرنا، جمعہ کے دن غسل کرنا، ساری چیزیں بدن کی صفائی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور چار مشاعر ہیں: طواف کرنا، صفا و مروہ پر دوڑنا، کنکریاں مارنا اور طوافِ افاضہ کرنا۔

ایک قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بھی آتا ہے کہ دین کے متعلق جب کسی سے امتحان لیا گیا اور وہ امتحان میں پورا پورا اُترا ہو تو اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اُترے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے میں نے پوچھا: اس کا سائل کون؟ کہ وہ کون سے کلمات ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن میں غور کرو تو تیس صفات ہیں، ان تیس صفات پر عمل کرنے والا انسان پورا پورا مومن کہلانے کا حق دار بنتا ہے۔ دس اللہ نے سورۃ براءۃ میں ذکر کیے: ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ [التوبۃ: ۱۱۲]

اور دس صفات سورۃ مومنون میں موجود ہیں: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴿۲﴾ وَالَّذِيْنَ

هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۶﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۱۰﴾﴾ [المومنون: ۱تا۱۰] اور دس سورۃ احزاب میں ہیں: ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾﴾ [الاحزاب: ۳۵] ابراہیم علیہ السلام ان تیس صفات پر پورے پورے اُترے اور ان سب چیزوں پر عمل کر کے دکھایا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو اتنا بڑا مقام عطا کیا۔

ایک قول یہ ہے کہ آپ کو سخاوت اور مہمان نوازی کا حکم دیا کہ اپنا مال، اپنی ہر چیز اللہ کی راہ میں قربان کر دیجیے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی پورے عالم میں ضرب المثل ہے۔ آپ کے کرم اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی کھانے کے وقت کوئی مہمان نہ آتا تو حضرت باہر تشریف لے جاتے، مہمان کو ڈھونڈ کر لے آتے کہ میرے ساتھ کھانا کھائے اور اگر کوئی نہ ملتا تو ابراہیم علیہ السلام بھی بھوکے سو جاتے تو یہ بھی ایک امتحان تھا۔

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ ابتلاء یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو ستاروں کے ساتھ آزمائش میں ڈالا تو ابراہیم علیہ السلام پورے نکلے، یعنی اللہ تعالیٰ کو راضی کر لیا۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے۔

سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سب سے پہلا ابتلاء جو ابراہیم علیہ السلام پر آیا، وہ ختنے کا تھا۔ یہ سنت ان سے شروع ہوئی۔ اس کے ساتھ مہمان نوازی کی سنت، ناخنوں کا کاٹنا اور مونچھوں کا کاٹنا۔

سب سے پہلے سفید بال بھی ابراہیم علیہ السلام کی داڑھی مبارک میں آئے۔ آپ نے جب دیکھا کہ داڑھی مبارک میں سفید بال آئے ہوئے ہیں تو پوچھا کہ میرے اللہ! یہ تبدیلی کیوں ہو رہی ہے؟ یہ سفیدی کیوں آئی ہے؟ فرمایا: یہ وقار ہے، اس سے انسان کی عزت وعظمت میں اضافہ ہوتا ہے جب عمر زیادہ ہوگی تو عزت میں اضافہ ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی: یا اللہ! اگر یہ باعث وقار ہے تو میرے وقار و عزت میں اضافہ فرما۔

سب سے پہلے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے کی ابتداء بھی ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ برید کا تیز کرنا، یہ بھی سنت

ابراہیم سے ہے۔ اس سے مراد کاٹنے والی چیزوں کو تیز کرنا ہوتا ہے اور تلوار کے ساتھ جہاد کرنا یہ سنت ابراہیم ہے اور مسواک کی سنت بھی ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور پانی سے استنجے کی سنت بھی ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور شلوار کا استعمال ہمارے ہاں تو شلوار ایک خاص طرز ہے ورنہ عرب پاجامہ کو بھی شلوار کہتے ہیں، اس کی ابتداء بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔

اصل بات یوں سمجھیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک چند ہزار سال کا وقفہ ہے۔ یہ چیزیں پہلے باعتبار شریعت سنت نہیں تھیں، یعنی ہر آدمی اپنے اپنے طرز پر عمل کرتا تھا۔ منہ صاف کیا، کسی نے مسواک کیا اور کسی نے نہ کیا۔ یعنی یہ چیز شریعت میں سنت بن کر جب آئی جب سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام سے اس سنت کا اجراء ہوا اور پھر وہ سنت الانبیاء والمرسلین بن گئی۔ ورنہ یہ تو نہیں کہ آدم علیہ السلام سے لے کر ابراہیم علیہ السلام تک کسی نے مسواک بھی نہ کی ہو۔ یہ تو ناممکن سی بات ہے، آخر کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہوگا ناں۔ ہاں جہاں ختنے کے بارے میں آتا ہے تو اس سے پہلے ختنہ کا رواج ہی نہیں تھا۔ اچھا! اسی طرح بالوں میں سفیدی کا نہ آنا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ بال سفید ہی نہیں ہوتے تھے۔ اللہ کی قدرت تھی، اور یہ بات کوئی بعید بھی نہیں۔ اب دیکھیں ناں! آج سے پچاس یا سو سال پہلے کے لوگ ہیں، ان کے بال پچاس یا ساٹھ سال کی عمر میں سفید ہوتے تھے، اب بیس سال کے جوان بچے کے بال بھی سفید ہو جاتے ہیں تو اللہ بہتر جانتا ہے اس زمانے میں کیا عالم تھا اور کیا تقاضے تھے؟ اس لیے ابراہیم علیہ السلام سے یہ اُمور باعتبار شریعت کے سنت کے جاری ہوئے۔ ورنہ تلواریں پہلے بھی ہوتی ہوں گی اور کاٹنے والی چیزیں پہلے بھی ہوتی ہوں گی، لیکن ان کو باعتبار شریعت کے استعمال کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوا۔

حضور اکرم ﷺ کا لباس:

بعض روایات میں آتا ہے کہ شلوار، حضور اکرم ﷺ نے خریدی اور آپ ﷺ کو پسند بھی آئی۔ فرمایا کہ یہ بڑا اچھا لباس ہے کہ آدمی کے ستر کی ضمانت ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے استعمال نہیں کی، زندگی میں آپ ﷺ نے صرف چادر مبارک استعمال فرمائی۔ حضور اکرم ﷺ نیچے چادر مبارک پہنتے تھے اور اوپر لمبا کرتا پہنتے تھے اور اس کرتے کی طرز مبارک جو ہمیں حدیث مبارک سے ملتی ہے وہ یہ نہیں ہے جو آج کل ہم لوگ عرب میں پہنتے ہیں، بلکہ جیسے تبلیغی علماء لمبا کرتا پہنتے ہیں، ان سے ملتا جلتا، سو فیصد تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا اور اسی طرح حضور اکرم ﷺ کے

زمانے میں یہاں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض بدولوگوں کے بازو بڑے لمبے ہوتے ہیں، اسی میں سامان بھی باندھ لیتے ہیں۔ یہ بھی حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں لباس تھا اور زیادہ تر لباس دو چادریں ہوتی تھیں۔ ایک چادر نیچے باندھ لی اور ایک اوپر ڈال لی اور زیادہ مشہور چادریں بردیمانی کہلاتی تھیں، جو یمن کے علاقوں سے آتی تھیں۔

بہرحال حضور پاک ﷺ کو شلوار پسند تھی؛ اس لیے کہ اس میں بدن چھپ جاتا ہے اور آدمی رات کو سوتا ہے تو بدن کھلتا نہیں ہے۔ اصل مقصود تو ستر عورت ہے کہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک چھپا رہے، یہ مرد کے لیے ستر ہے۔ اور عورت کا سر سے لے کر پاؤں تک ہے۔ لہٰذا آدمی اپنے گھر میں بھی سوئے تو ایسا کپڑا ہونا چاہیے کہ جس سے ستر نہ کھلے؛ کیونکہ انسان کو سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ سے حیا کرنی ہے، اس کے بعد ملائکہ سے حیا کرنی ہے اور ہر گھر میں الحمد للہ! ملائکہ اور کراماً کاتبین تو موجود ہوتے ہی ہیں۔ اس لیے آدمی کوشش یہ کرے کہ جتنا ہو لباس ایسا پہنے کہ ستر قائم رہے۔

آج کل تو ہم لوگ مصیبت اور ابتلاء میں آگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہدایت فرمائے۔ ایسا رواج آگیا ہے کہ عربی توپ بھی بالکل باریک کپڑے کا ہوتا ہے اور نیچے ان لوگوں نے انڈرویئر پہنا ہوتا ہے۔ آپ نماز پڑھ رہے ہیں، رکوع میں ہیں، آپ کے سامنے بالکل ننگا پورا بدن نظر آ رہا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے تو کپڑا پہنا ہوا ہے۔ کپڑے پہننے کا معنی ہے: ستر چھپانا۔ جو کپڑا ستر چھپانے میں کام نہ آئے، اس کا پہننا اور نہ پہننا برابر ہے۔ اس لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ بہت سی عورتیں ایسی ہوں گی جو کپڑے پہنے ہوئے ہوں گی، لیکن ننگی ہوں گی۔ یعنی کپڑا تو ان پر بھی ہوگا، لیکن وہ ننگی کہلائیں گی۔ مطلب یہ کہ باریک کپڑا پہنا ہوگا کہ بدن نظر آئے یا کپڑا تو موٹا ہوگا، لیکن بدن پر ایسا ٹائٹ ہے کہ ہر عضو محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ بھی اس نے نہیں پہنا ہوا۔ یہ بھی اسی حکم میں آئے گا کہ کپڑا تو پہنا ہوا ہے، لیکن ہے ننگی۔

لہٰذا ستر کا معنی ہے کہ بدن کے وہ حصے جن کا شریعت نے چھپانے کا حکم دیا ہے کہ ایسا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے کہ بندہ کا پتہ نہ چلے کہ اس کے اعضاء کیسے ہیں؟ اگر وہ ہر عضو پر ٹائٹ ہے جیسے ہمارے ہاں بعض لوگ چوڑی دار پاجامے پہنتے ہیں، پورا بدن کا بدن ہی نظر آ رہا ہے تو اس کو ستر نہیں کہا جائے گا۔ ہاں اس کے اوپر کرتا ہے تو ٹھیک ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''إِنْ أَتَّخِذِ الْمِنْبَرَ فَقَدِ اتَّخَذَهُ أَبِي إِبْرَاهِيمُ، وَ إِنْ أَتَّخِذِ الْعَصَا فَقَدِ اتَّخَذَهَا أَبِي إِبْرَاهِيمُ'' میں نے جو منبر اختیار فرمایا، میرے ابا ابراہیم علیہ السلام نے بھی منبر پر خطاب فرمایا اور میں نے عصا ہاتھ میں لیا

تو میرے ابا ابراہیم علیہ السلام بھی عصا ہاتھ میں رکھتے تھے۔ لیکن مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ثابت نہیں۔ (جبکہ یہ حدیث باسند اخبار مکہ للفاکہی: ۳/۱۷۸، مسند بزار: ۷/۸۱، مسند شاشی: ۳/۲۶۷، معجم کبیر طبرانی: ۲/۱۶۷، جزء ابی سعید الاشج: ۲۵، اتحاف الزائر لابن عساکر: ۱/۸۳، الجامع الصغیر للسیوطی: ۸۶۳۸، فتح الباری لابن حجر: ۸/۲۴۲، جامع المسانید والسنن لابن کثیر: ۷/۹۷۷۲، مجمع الزوائد: ۲/۱۰۱۳ وغیرہ میں موجود ہے۔ انور)۔

ابو جعفر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو کلمات کے متعلق یہ تمام اقوال نقل کیے گئے ہیں، ممکن ہے کہ یہ سب کے سب مراد ہوں، یا ممکن ہے کہ بعض مراد ہوں اور بعض نہ ہوں۔ لیکن اگر ہم خود سے متعین کریں کہ کلمات سے مراد یہ ہیں اور یہ نہیں ہیں تو ٹھیک نہیں، جب تک کہ کسی حدیث مبارک یا اجماع سے اس کی تائید نہ ہو جائے۔ اس لیے اس کو عام رکھنا چاہیے اور قرآن مقدس نے بھی ایک عام لفظ فرمایا ہے، تعیین نہیں فرمائی۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن جریر رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے کہ تعیین نہ کرو کہ یہ دس مراد ہیں، جبکہ ہو سکتا ہے کہ بعض مراد ہوں اور بعض نہ ہوں اور ایسی کوئی متواتر روایت یا خبر واحد بھی نہیں ملی کہ جس کا ماننا بھی ضروری ہو، جس کی وجہ سے ہم کہیں کہ یہی متعین ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دو روایات ملی ہیں۔ سہل بن معاذ بن انس رضی اللہ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم لوگوں کو خبر نہ دوں کہ میرے پاک رب نے ابراہیم علیہ السلام کو یہ مرتبہ کیوں بخشا؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صبح کو بھی اور شام کو بھی یہ کلمات پڑھتے تھے: ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝﴾ [الروم: ۱۸] یعنی ایک تو ان آیات کا پڑھنا بھی فضیلت والا ہے کہ آدمی صبح و شام ان آیات کو پڑھا کرے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء کا پڑھنے کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اس طرح نہیں کہ ہماری طرح ایک آیت پڑھ لیں، لیکن عمل نہ کریں۔ وہ تو جب بھی کوئی اللہ تعالیٰ کا حکم آتا، اس پر باقاعدہ عمل کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی تقدیس و تسبیح اور حمد و ثناء صبح و شام اُٹھتے بیٹھتے کرتے تھے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ ہر وقت کوشش کرے کہ اللہ کے ذکر سے اس کی زبان تر رہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ﴿وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى﴾ کا

مرتبہ کیوں ملا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول جانیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ابراہیم علیہ السلام روزانہ دن میں چار رکعت ادا فرماتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم نے میرا پورا پورا حق ادا کر دیا۔

اب بھی اگر دیکھیں تو کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ ایک تو فرائض ہیں، وہ تو پڑھنے ہی پڑھنے ہیں۔ آدمی جب صبح کی نماز کے لیے اُٹھتا ہے، مثال کے طور پر چار بج کر دس یا بارہ منٹ پر صبح کی اذان ہوتی ہے، اور جس نے نماز پڑھنی ہے وہ چار بجے اُٹھے گا، تب ہی اتنا بڑا اجر حاصل ہوگا۔ نماز تو پڑھنی ہی ہے، اگر آپ چار بجے سے صرف دس منٹ پہلے اُٹھ جائیں کہ وضو بھی کر لیا اور دو رکعت تہجد بھی گھر میں پڑھ لی۔ نماز پڑھ کر گھر سے نکل آیا۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب گھر سے نکلے تو پڑھے: اگر آدمی تین دفعہ یا سات دفعہ یہ پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور پناہ میں آ جاتا ہے اور شیطان کے حملوں سے بچ جاتا ہے اور مسجد میں آ گئے، اب اذان ہوگئی اور آدمی نے دو رکعت سنت پڑھ لی۔ اس کے بعد آپ نے فجر پڑھ لی۔

اب اگر آپ کی ڈیوٹی ہے اور آپ نے جانا ہے تو آپ جائیں، غسل کریں اور تیاری و ناشتہ کریں۔ جاتے جاتے اشراق کا وقت ہو جائے گا تو اگر آپ وضو کر کے گھر میں کھڑے کھڑے دو رکعت نماز اشراق پڑھ لیں، چار نہ سہی تو یہ کون سا مشکل مسئلہ ہے؟ اگر آدمی رات کو دیر سے سوئے تو ڈیوٹی کے لیے تیار ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر آدمی ایک انسانی ڈیوٹی کے لیے اتنی محنت کرتا ہے تو کیا اپنے اللہ کو راضی کرنے کے لیے دس منٹ کی قربانی نہیں دے سکتا؟ صرف دس منٹ پہلے اُٹھ جائے، اس میں تہجد کی نعمت بھی مل گئی، فجر کی نماز بھی نصیب ہوگئی۔

دو رکعتیں جو پڑھی جاتی ہیں، اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اگر یہ ساری دنیا اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے، کسی شخص کو دیتے ہیں تو یہ دو رکعتیں اس سے بہتر ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ ہم تو دو ہزار ریال کے لیے بھاگتے رہتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ساری دنیا اور جو کچھ اس کے اندر ہے اور پھر وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ اللہ پاک دنیا کے آسمان پر نزول رحمت فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اس کا سوال پورا کروں؟ اس لیے آپ تھوڑی سی ہمت کر لیا کریں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دو احادیث نقل کرنے کے بعد ابن جریر رحمہ اللہ نے بحث کی ہے کہ یہ دونوں احادیث ضعیف ہیں۔

اُردو میں حدیث کی تصانیف لکھنے والوں کا حال:

ہمارے ہاں یہ رواج اور بہت بڑی کوتاہی ہے...... میں اعتراض تو نہیں کرسکتا علماء پر۔ علماء تو آخر علماء ہیں، ہم تو طالب علم ہیں...... لیکن ہمارے ملک میں ایک بہت بڑی غلط بات ہے، اور وہ یہ کہ جو بھی کتاب لکھیں گے اور اس میں حدیث نقل کریں گے تو کہیں گے کہ یہ حدیث پاک ہے۔ آگے یہ نہیں لکھیں گے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا حسن ہے یا ضعیف ہے۔ یہ حدیث آپ نے بخاری شریف سے یا ترمذی شریف سے یا کس کتاب سے نقل کی ہے۔ یہ ہمارے ہندو پاک میں ایک بہت بڑی مصیبت ہے، لیکن الحمدللہ! یہ بات عرب میں نہیں ہے، عرب میں آپ جتنی کتب دیکھیں گے چاہے متقدمین نے لکھی ہوں یا متاخرین نے، باقاعدہ حدیث کا حوالہ، اس کا مرتبہ اور کتاب کا حوالہ ہوگا اور اس کتاب کی جلد صفحہ نمبر ہوگا اور ساتھ یہ بھی ہوگا کہ طبع کس نے کی اور کب کی۔ اگر ایک آدمی کتاب کا حوالہ تو دیتا ہے، لیکن کتاب دوسرے ملک میں طبع ہوئی تو اس صورت میں وہ حوالہ تو نہیں ملے گا۔ اس لیے یہ پوری وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں۔ جبکہ ہمارے اندر یہ بہت بڑا نقص اور غلطی کی بات ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارا اُردو والا بھائی جب پڑھتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ یہ حدیث شریف ہے۔ اب وہ کہاں جائے؟ اب اس بیچارے کو تو یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ حدیث مبارک میں بھی مراتب ہیں... حدیث متواتر، حدیث صحیح، حدیث حسن یا حدیث ضعیف۔ مرسل ہے یا منقطع ہے اور اگر ضعیف ہے تو ضعف متن میں ہے یا سند میں ہے اور اگر متواتر ہے تو تواتر طبقات میں ہے یا اسناد میں ہے، کس چیز میں تواتر ہے۔ ان چیزوں کا ہر آدمی کو تو پتہ نہیں ہوتا۔ اس کے دماغ میں تو بس ایک بات آجاتی ہے کہ ایک کتاب میں نے پڑھی تھی اور فلاں بزرگ نے لکھی تھی۔ اس میں لکھا ہے کہ حضور پاک ﷺ کی حدیث مبارک ہے۔ اب وہ غریب کہاں جائے؟ اس کو آپ یہ کہیں کہ یہ بات غلط ہے تو وہ کہے گا کہ عجیب بات ہے! فلاں بزرگ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث مبارک ہے اور تم کہتے ہو کہ غلط ہے!!

حدیث کی تصنیف کے اُصول:

ہمارے ہاں شاید جدید طبقے میں تو کچھ رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ مجھے خود ایک آدمی نے رسالہ بھیجا۔ وہ میرے اپنے تعلق والے لوگ ہیں، ماشاءاللہ! بڑے صحیح العقیدہ لوگ ہیں اور بڑی خدمت اور دین کا بڑا کام کر رہے ہیں اور مدرسے چلا رہے ہیں۔ انہوں نے چہل حدیث کے نام سے ایک پمفلٹ شائع کیا اور مجھے بھیجا۔ اب میں دیکھ رہا

ہوں کہ آدمی احادیث اس میں غلط ہیں، ان کو ایک ایک کر کے حدیث پر نشان لگا کر بھیجا کہ یہ کیا بات ہے؟ انہوں نے بھی بس ایک کتاب سے دیکھا، دین کی بات سمجھی اور شائع کر دی۔ لکیر کے فقیر تو ہم لوگ ہیں ہی، جیسے کسی نے لکھا، ہم نے بھی لکھ دیا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر لکھتے چلے گئے، تحقیق کسی نے نہیں کی۔

اس لیے مفسر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لازمی بات ہے کہ جب حدیث پاک آئے تو آدمی یہ ضرور بیان کرے کہ اس حدیث کا مرتبہ کیا ہے، یہ حدیث کس کتاب میں ہے اور اس کا درجہ کیا ہے اور اس کے بارے میں محدثین کا فیصلہ کیا ہے؟ تاکہ کسی کو کسی قسم کا شبہ نہ رہے، جیسے مفسر رحمہ اللہ نے دو احادیث تو نقل کر دیں، لیکن ساتھ بیان بھی فرما دیا کہ یہ احادیث ضعیف ہیں، ان کے متن میں بھی ضعف ہے اور بعض راوی بھی ایسے پائے گئے ہیں جو ضعیف ہیں۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کلمات سے مراد یہی ہے جو بعد میں موجود ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو کعبۃ اللہ کی بناء کا حکم دیا اور کعبۃ اللہ کی پاکی کا حکم دیا، جس کو انہوں نے پورا کیا۔

تفسیر:

﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾

اللہ نے فرمایا: جو تیری ذریت میں ظالم لوگ ہوں گے، ان کو میرا عہد نہیں پہنچے گا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۃ عنکبوت، آیت ۲۷ میں آتا ہے: ﴿وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے وہ قبول فرمائی کہ جو ظالم نہیں ہوں گے ان کو کتاب اور نبوت ملے گی۔ چنانچہ اس کے بعد ہر کتاب اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہی نازل فرمائی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ تھا کہ ہم امامت تو آپ کی ذریت میں رکھیں گے، لیکن آپ کی ذریت میں ظالم بھی ہوں گے۔ بعض نے فرمایا کہ نہیں، آپ کی ذریت میں امامت تو ہوگی، لیکن یہ مرتبۂ امامت ان لوگوں کو نہیں ملے گا جو ظالم ہوں گے؛ کیونکہ ظالم کی کیسے اقتداء کی جائے؟ سفیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظالم شخص مرتبۂ امامت کا مستحق نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی ظالم حاکم بن جائے تو وہ امامت کا حق دار نہیں ہو جاتا۔

ایک بات یاد رکھیں کہ ایسے بڑے بڑے لوگ بھی آگئے جو بادشاہ بھی بنے، حکومت پہ آئے جب وہ ظالم تھے۔ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ شریعت اسلام کی نظر میں جو ظالم ہو، وہ امام بننے کا حق دار نہیں۔ شریعت کا تقاضا یہ

ہے کہ اس کو حکمران نہ بنایا جائے، مثلاً مسجد کا امام عالم ہو، اللہ کے قرآن وسنت کو جاننے والا ہو اور متقی، علم رکھنے والا ہو اور اگر دو ہوں تو جو عمر میں زیادہ بڑا ہو، لیکن کبھی کبھی ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو مصلائے امامت پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور انہیں نہ دین کا پتہ اور نہ قرآن کا پتہ، حتیٰ کہ ان کو نماز کے فرائض، واجبات اور مستحبات کا بھی پتہ نہیں ہوتا۔ ایک ہے مصلے پر کھڑے ہو جانا اور ایک ہے شریعت کا حکم ہونا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: ﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾ [النور:۲۶] پاک باز مردوں کے لیے پاک باز بیویاں اور خبیث مرد جو ہیں ان کے لیے خبیث عورتیں۔ یہ ایک عمومی قاعدہ ہے۔ ورنہ ایسا بھی ہوتا ہے مرد جو ہیں وہ بڑے فاسق وفاجر ہوتے ہیں اور ان کی بیویاں نیک ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرد عالم، متقی اور زاہد ہوتے ہیں بیوی پلید آجاتی ہے گھر میں۔ معنی یہ ہے کہ عموم اغلب یہ ہے، قاعدہ یہ ہے کہ پاک، پاک کو ملتی ہے، لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہو جاتا ہے دنیا میں۔ لہٰذا اصل یہ ہے کہ جو ظالم ہو وہ مرتبۂ امامت کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر کوئی زبردستی یا دھوکے سے حکومت یا مصلائے امامت پر آجائے تو اس کی اقتداء کی جائے گی۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین نے فرمایا کہ ظالمین سے مراد مشرک ہیں کہ آپ کی ذریت میں جو مشرک ہوں گے، وہ مقامِ امامت پر نہیں ہوں گے؛ کیونکہ سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔

﴿عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عہد سے مراد یہ ہے کہ میرا امر اور میرا حکم امامت ظالموں کو نہیں ملے گا۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کسی ظالم سے کوئی عہد نہیں ہوتا۔ اگر ہو تو اس کو ختم کر دو۔ باقی دنیاوی معاہدات اور معاملات جو کفار سے کیے گئے ہوں تو ان کا حکم یہ ہے کہ وہ پورے کیے جائیں۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے عہد کے حق دار آخرت میں ظالم نہیں ہوں گے۔ باقی دنیا میں تو بڑے ظالم بڑے حاکم بن جاتے ہیں، لیکن آخرت میں ان کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوگا۔

''عہد'' سے مراد: دین اسلام ہے۔ جو ظالم ہے، وہ اسلام پر کیسے پابند رہے گا؟ بعض حضرات نے فرمایا: اس میں اشارہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد حق پر نہ ہوگی، بلکہ ان میں محسن بھی ہوں گے اور ظالم بھی ہوں گے۔

ابوالعالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مقامِ اطاعت، اللہ کے ولیوں کو حاصل ہوتا ہے، ظالموں کو نہیں۔
سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "عہد" سے مراد "نبوت" ہے کہ آپ کے خاندان میں نبوت تو رکھیں گے، مگر نبوت کسی ظالم کو نہیں مل سکتی۔
مفسرین کے یہ اقوال ابن جریر رحمہ اللہ اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے نقل فرمائے ہیں۔
ابن خویز منداد المالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظالم، مسلمانوں کا خلیفہ اور حاکم نہیں بن سکتا اور وہ مفتی بھی نہیں بن سکتا اور ظالم گواہ بھی نہیں بن سکتا اور روایت بھی نہیں کر سکتا، اس کی روایت کا اعتبار بھی نہیں ہوتا۔

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۲۵]

"اور جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کے لیے اجتماع کی اور امن کی جگہ بنایا اور بنالو مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو حکم دیا میرے گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں کے لیے۔"

پہلا قبلہ:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مناسبت سے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس گھر یعنی بیت اللہ کی عظمت اور شان کو ذکر فرمایا ہے؛ کیونکہ اس کی بناء کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کا تعلق ہے۔
جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا کہ ہم نے ان کو مرتبۂ امامت عطا فرمایا اور امامت بھی اتنی بڑی کہ ﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾۔ اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم نے ان کو مرتبۂ امامت ﴿لِلنَّاسِ﴾ سے سرفراز فرمایا تو ہم نے ان کو ایسے کعبہ کا بانی بنایا جو ﴿وُضِعَ لِلنَّاسِ﴾... ﴿مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ ہے؛ کیونکہ امامت کے لیے ایک مرکز اور دار الخلافہ بھی ضروری ہے۔ سب سے پہلا کعبہ بھی یہی ہے اور سب سے آخری قبلہ بھی یہی ہے تمام مسلمانوں کے لیے، زندہ ہوں تب بھی اور مر جائیں تب بھی یہی قبلہ ہے قیامت تک۔ نصوص سے ثابت ہے کہ سب سے پہلے بھی یہی قبلہ بنایا گیا، بیت المقدس بعد میں بنا۔ بیت المقدس کو ہم قبلہ اول اس اعتبار سے کہتے ہیں کہ حضور

اکرم ﷺ کے زمانے میں اسلام کی ابتداء میں وہ قبلہ تھا، پھر اس کعبہ کا حکم آیا۔ اس اعتبار سے وہ قبلہ اوّل ہے، ورنہ اوّلیتِ حقیقیہ اسی قبلہ کو حاصل ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے نص فرمائی ہے: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ [آل عمران:۹۶]

بیت اللہ کی تاریخ:

میرے نبی! ہم نے آپ کی بات سمجھ لی۔ آپ بار بار جو تمنا کرتے ہیں کہ آپ کا قبلہ ابراہیمی ہو۔ ہم آپ کو اب اسی قبلے کی طرف پھیر رہے ہیں جو آپ کا پسندیدہ قبلہ ہے۔ پہلا قبلہ بیت اللہ ہی میں تھا، اگر اس کو قبلہ بعد میں بنایا گیا تو پہلے تو قبلہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دوسری یہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس کعبہ کو بنایا تھا اس وقت تو بیت المقدس کا زمین پر وجود تک نہیں تھا۔ اوّل بیت المقدس یہی کعبۂ ابراہیمی ہے۔

اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بنایا تو پہلے یہاں پانی تھا۔ پھر اس پانی کے اوپر جہاں اب کعبۃ اللہ کی عمارت ہے ایسے ہے جیسے ایک بلبلہ، لہٰذا سب سے پہلے یہاں پانی آیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ساتھ اس پانی کو گاڑھا کیا، پھر قدرت نے اس کو اسی حال میں چھوڑ دیا اور آسمان بنا دیئے۔ آسمان بنانے کے بعد پھر زمین کو پھیلا دیا گیا۔ ﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا﴾ [النازعات:۳۰] یوں سمجھیں کہ جیسے ہم گھروں میں روٹی پکاتے ہیں، پہلے آٹا گوندھتے ہیں۔ آٹا گوندھنے کے بعد جب روٹی پکنے کے قابل ہو جاتی ہے تو پھر گول گول پیڑے بنالیتے ہیں، پیڑے بنا کر رکھ دیئے جاتے ہیں، پھر جب روٹی پکانے کا وقت آتا ہے تو پیڑوں کو پھیلا دیا جاتا ہے۔ پہلے یہ پانی تھا، پھر اس میں زمین کا مادہ تیار کر کے اس میں رکھ دیا گیا کہ گوندھ کر یہ خمیرا اپنے اپنے مقام پر پہنچ جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اسی طرح پیدا فرمایا۔ اس کے بعد چونکہ اس کا خمیر تیار ہو چکا تھا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اس کو پھیلا دیا، لہٰذا جب زمین بھی نہیں بنی تھی، اس وقت بھی قبلہ موجود تھا تو اس کی اوّلیتِ حقیقیہ میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور آسمانوں سے اُتارا اور زمین پر تشریف لائے تو ان کو بھی حکم ہوا کہ اسی کعبہ کا طواف کریں۔ ان کو بیت المقدس کا حکم نہیں ملا تھا۔ آدم علیہ السلام نے جب سب سے پہلے کعبہ کا طواف کیا تھا، دل میں خوشی تو ہوئی ہوگی کہ میں سب سے پہلا انسان ہوں جو کعبہ کا طواف کر رہا ہوں۔ اس لیے اللہ

تعالیٰ نے فرمایا کہ اے جبرائیل! آدم کو بتادو کہ آپ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے گھر کا طواف کرتے تھے، گویا کہ پیدائش آدم سے پہلے بھی یہ کعبہ تھا۔

آپ زمین کے نیچے تک چلے جائیں تب بھی یہ کعبہ ہوگا اور آسمانوں تک چلے جائیں گے تب بھی یہ کعبہ ہوگا اور بیت المعمور ساتویں آسمان کا قبلہ ملائکہ ہے، وہ عین اسی کعبۃ اللہ کے اوپر ہے۔ اگر آج اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اس آسمانی قبلے کو اُتار دیں تو عین اسی کعبہ کے اوپر آکر عمارت بیٹھ جائے گی، آسمانوں پر قبلہ اسی کعبہ کے اوپر ہے، بیت المقدس کے اوپر نہیں ہے۔

پھر کعبہ اوّل تعمیر آدم علیہ السلام اور پھر حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانے میں تعمیر ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے طوفانِ نوح آیا تو کعبۃ اللہ بہہ گیا، صرف ایک جگہ اونچا سا ٹیلہ بچ گیا۔ طوفانِ نوح کے بعد پھر اس پر مدارج آئے، لیکن سب سے زیادہ اہمیت جس تعمیر کی ہوئی، وہ تعمیر بنائے ابراہیمی ہے، اس سے پہلے کی تعمیر کا ذکر قرآن میں نہیں ملتا۔ اتنا ملتا ہے کہ ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ [آل عمران:۹۶] اور سیدنا آدم علیہ السلام کے زمانے میں جو تعمیر ہوئی اس کا ذکر نہیں ملتا، اور جس کا ذکر ملتا ہے: ﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ﴾ [البقرۃ:۱۲۷]

اور اسی سے ایک بات معلوم ہوئی کہ سب سے پہلے ناخن کاٹنے، ختنہ، بغلوں کی اور زیر ناف بالوں کی صفائی وغیرہ یہ تمام چیزیں پہلے بھی کسی شکل میں موجود تھیں، لیکن اس کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے آکر شروع ہوا۔ اور پھر اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ آج اگر نوح علیہ السلام کے زمانے کی بات شروع کی جائے تو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کی تو کوئی قوم موجود ہی نہیں ہے، اگرچہ ان کی ذریت، اولادوں کی اولادیں ہیں، لیکن وہ لوگ جو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں تھے، وہ تو نہیں ہیں۔ اس لیے بہت ساری آیات میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کو زیادہ ذکر فرمایا؛ کیونکہ مشرکین مکہ، یہود و نصاریٰ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے تھے۔ اس لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم مانتے ہو، سچے ہو تو سب سے پہلے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ذریت ابراہیم پر اور ملت ابراہیم پر ہیں، توحید و عقائد سے لے کر بغلوں اور زیر ناف بالوں کی صفائی، ناخنوں کا کاٹنا، مونچھوں کا کاٹنا اور داڑھی بڑھانا وغیرہ، یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے تھے اور یہ سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں بھی موجود ہیں۔

ابوجہل کا کفر، فرعون کے کفر سے زیادہ سخت تھا:

جیسے ابراہیم علیہ السلام نے وقت کے نمرود سے ٹکر کھائی، اسی طرح میرے مدنی آقا ﷺ نے بھی وقت کے ابوجہل کو للکارا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے زمانے کا فرعون ابوجہل، موسیٰ علیہ السلام کے فرعون سے بھی زیاد سخت ہے۔ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون بڑا مضبوط تھا اور کئی صدیوں تک اس نے حکومت کی، لیکن جب پانی میں غوطہ لگا تو کہا کہ میں موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لایا۔ اس نے تو فوراً مان لیا۔ غوطہ کھانے کے بعد اس کا نشہ ٹوٹ گیا اور ساری اکڑ ختم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بدبخت! اب مانتے ہو، پہلے نافرمانیاں کرتے اور فساد پھیلاتے رہے، میرے انبیاء کے مقابلے پر خدائی کے دعوے دار بن بیٹھے۔ اب جب مرنے لگے تو مجھے مان رہے ہو، تمہارے ایمان کا کوئی اعتبار ہے!؟؟

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو! موسیٰ علیہ السلام کا فرعون تو ڈر گیا، لیکن میرا فرعون ابوجہل اتنا بدبخت ہے کہ مقام بدر میں گردن کٹی ہوئی ہے، ستر ستون کفر کے مارے گئے (یعنی بڑے بڑے سردار)، ساری عزت خاک میں مل گئی، بس ابوجہل کی چند رگیں بچی ہوئی ہیں، اس وقت بھی ایک صحابی نے ٹھوکر ماری تو کہنے لگا کہ کیا ہوگیا؟ کونسی بڑی بات ہے؟ تم نے مکہ تھوڑا فتح کرلیا کہ تم نخرے کر رہے ہو۔ بس ایک لڑائی تھی اور ہم ہار گئے، بس بات ختم۔ اس دن فخر کرنا جب مکہ فتح کرلو۔

جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا۔ بس ان کو غصہ تھا کہ اس بدبخت نے ان کو مارا تھا۔ جب وہ قتل کرنے کے لئے آئے تو ابوجہل اس حالت میں بھی ان سے کہتا ہے کہ ٹھہرو! تم بکریاں چرانے والے لوگ ہو، تمہیں کیا پتہ کہ سردار کی گردن کیسے کٹتی ہے؟ تمہاری تلوار سے میری گردن نہیں کٹے گی، میری تلوار نکال کر گردن کاٹو۔ ابوجہل کی آخری سانسیں تھیں، لیکن اس وقت بھی اس کو خیال نہیں آیا کہ فرعون کی طرح ڈر کر کلمہ پڑھ لے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے مدنی پاک کی شکل بھی ابراہیم علیہ السلام سے ملتی ہے، اس لئے کفر سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم تو ہر چیز میں ابراہیم علیہ السلام کے مخالف ہو اور یہ تو نہیں ہوسکتا کہ اس وقت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کعبہ بنا رہے ہوں اور اس وقت کے لوگوں نے ان کی مدد نہ کی ہو۔ حالانکہ اس وقت قبیلہ عمالقہ اور جرہم بھی مکہ میں آباد ہو چکا تھا تو اس کے بعد جب قریش کے زمانے میں جو تعمیر ہوئی، اس تعمیر میں سرکار مدینہ ﷺ بھی شامل ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی تمنا کے مطابق عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے زمانہ میں پھر سے تعمیر کرائی، یہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ بی بی اسماء رضی اللہ عنہا کے بیٹے ہیں اور بی بی اسماء رضی اللہ عنہا اور بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا بہنیں ہیں۔ انہوں نے یہ حطیم والا حصہ بھی کعبہ میں شامل کر دیا اور جس دیوار میں میزاب رحمت ہے وہ دیوار آگے لے آئے، تاکہ یہ سات ہاتھ کا حصہ بھی اندر آجائے۔ کعبۃ اللہ کے دروازے بھی دو رکھے: ایک دروازہ جہاں اب موجود ہے اور ایک دروازہ بالکل اس کے سامنے رکن یمانی کے نزدیک رکھا اور دروازے بھی دونوں نیچے زمین پر رکھے، تاکہ اس دروازے سے آدمی اندر داخل ہوں، اندر دو رکعت نماز پڑھیں اور دوسرے دروازے سے نکل جائیں۔ دراصل میرے آقا ﷺ کی تمنا تھی کہ کعبہ کے باہر کا حصہ بھی اندر آجائے اور دروازے بھی نیچے رکھے جائیں اور اونچے نہ ہوں، تاکہ جس کو چاہیں آنے دیں اور جس کو چاہیں دھکا دے دیں۔ نیچے دروازے ہوں گے تو ہر آدمی آرام سے داخل ہو جائے گا، لیکن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی تعمیر کے بعد حجاج کا دور آ گیا۔ چونکہ وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا قاتل ہے اور پھانسی چڑھانے والا ہے، حجاج بن یوسف کے دماغ میں یہ بات آگئی کہ اگر یہ کعبہ اسی طرح عبداللہ بن زبیر کی بنا پر قائم رہ گیا تو ایک تو عبداللہ بن زبیر کا نام قیامت تک زندہ رہے گا، دوسرا یہ کہ لوگ اس کو یاد کریں گے اور میرا نام ونشان مٹ جائے گا۔

چونکہ حجاج بن یوسف اس اُمت کا ظالم مشہور تھا، اس نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو جب سولی پر لٹکا دیا تو اس وقت بھی جواُن کی لاش کو دیکھتا تو کہتا کہ اے عبداللہ بن زبیر! اللہ تعالیٰ تجھ پر کروڑوں رحمتیں کرے اور تیرے قاتل پر لعنتیں کرے۔ چونکہ حجاج بن یوسف کے ظلم کے بارے میں وہ کھل کر تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ اب عبداللہ بن زبیر کے بارے میں یہ بات پہنچی اور آپ کی والدہ بی بی اسماء رضی اللہ عنہا نے جو کمال دکھایا، جس کا عبداللہ بن زبیر جیسا بیٹا ہو اور اس کو حرم کے باہر سولی پر لٹکا دیا گیا ہو تو اندازہ کریں! ان کے صبر کا کیا عالم ہوگا!! بی بی صاحبہ وہاں آئیں، بیٹے کو دیکھا اور فرمایا کہ میرا سوار ابھی تک سواری پر سوار ہے، ابھی تک سواری سے نہیں اُترا۔ اس کے بعد دعائیں دے کر چلی گئیں۔

حجاج کو جب پتہ چلا کہ ماں کے صبر کا یہ عالم ہے اور جو گزرتا ہے مجھ پر لعنتیں بھیجتا ہے تو اس نے کہا کہ جلدی اُتارو اور دفن کرآؤ۔ اس نے فوراً یہ فیصلہ کر دیا کہ کعبۃ اللہ جس طرح حضور پاک ﷺ کے زمانے میں تھا، اس کو اسی طرح لوٹا دیا جائے۔ پھر اسی طرح تعمیر کرا دیا، جیسا کہ قریش اور مدنی پاک ﷺ کے زمانے میں تھا، تاکہ عبداللہ

بن زبیر کی بناء باقی نہ رہے اور باقی تعمیر یا مرمت کا معاملہ ہے کہ اندر چھت مبارک بدلی گئی، وہ ہر دور میں بدلتے رہے۔ موجودہ حکومت نے بھی (اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے) جو تعمیرات ضروری تھیں، وہ بھی کرائیں، دروازے پر سونا بھی لگوایا۔ لہٰذا کعبۃ اللہ میں پہلی صفت تو یہ ہے کہ یہ سب سے پہلا قبلہ بنا اور دوسری یہ ہے کہ اسے لوگوں نے ٹھکانہ بنایا کہ بار بار لوٹ کر ادھر آئیں۔

ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں جب اس کی عمارت مکمل ہوئی تو کچھ عرصہ اس طرح رہا کہ دیواریں تھیں اور چھت مبارک نہ تھی۔ بیت اللہ کے اندر ایک چھوٹا سا کنواں بنا ہوا تھا، لوگ آتے تھے وہ سونا، چاندی یا پیسہ جو بھی دیتے تھے وہ اسی میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اسی طرح سب سے پہلا غلاف کعبہ یمن کا بادشاہ گزرا تھا، اس نے دیا تھا اور اس کے بعد پھر ہر دور میں غلاف چڑھتا رہا۔ میرے مدنی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی قریش چڑھاتے تھے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو باقی رکھا۔ اگر منع ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُتار دیتے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو بات کی جائے اور اللہ کے نبی اس کو نہ بدلیں تو وہ بھی اللہ کے حکم کے مطابق ہے؛ کیونکہ اگر کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو تو اللہ کے نبی فوراً بدل دیتے ہیں، وہ باقی نہیں رکھتے۔

اور غلاف بھی مختلف ہوتے تھے، کبھی سبز، کبھی سفید، کبھی سرخ اور کبھی مختلف چادریں باندھ کر غلاف بنا دیتے تھے۔ مختلف رنگ برنگ اور بڑی بڑی چادریں رسیوں سے باندھ دیتے تھے۔ بعد میں اس کی مکمل طور پر تدوین خلافت عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں شروع ہوئی اور باقاعدہ غلاف بنتا رہا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ خدمت خادم حرمین سے لی۔ (اللہ تعالیٰ قبول و منظور فرمائے) اب غلاف تیار بھی یہیں ہوتا ہے اور کعبۃ اللہ پر بھی یہیں چڑھایا جاتا ہے۔

ایک صفت کہ ﴿وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ﴾ [الحج:۲۷]. دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ میں کوئی حج نہیں رکھا۔ حج تو اللہ تعالیٰ نے اسی کعبہ کا رکھا کہ جب تک تم اس گھر میں نہیں آؤ گے تو حج ہو ہی نہیں سکتا۔ فرمایا: ابراہیم اتم ندا کرو، پھر دیکھو تو سہی کہ دنیا میرے گھر کی طرف کیسے آتی ہے؟ اطراف عالم سے دنیا کھچی چلی آئے گی۔ پھر اس زمانے کا اندازہ کریں! جب لوگ مہینوں اور سالوں کے سفر کر کے کعبہ میں پہنچتے تھے۔ حقیقت میں حج بھی انہی لوگوں کا تھا۔ دراصل جو چیز محنت کے بعد ملتی ہے، اس کی قدر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ہمیں چونکہ محنت نہیں کرنی پڑتی، اس لئے اللہ تعالیٰ کے گھر کی قدر بھی نہیں رہی کہ تین چار گھنٹے میں ہم کعبہ پہنچ جاتے ہیں۔ اب تو لوگ کہتے ہیں کہ سفر میں جدہ وغیرہ کے ہمیں کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں، مشکلات اُٹھانا پڑتی

ہیں، لہٰذا مولوی اکٹھے ہوں اور حج کے مسائل تبدیل کریں۔ آپ ان لوگوں کا اندازہ کریں جو ایک ایک سال پیدل چل کر یا بحری جہازوں میں دو دو ماہ، چھ چھ ماہ لگا کر بھی بمشکل پہنچ پاتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ کے انعامات دیکھو کہ چھ دن میں بحری جہاز سے کنارے پر اُترتا ہے اور چار گھنٹے ہوائی جہاز میں لگتے ہیں۔ اب اگر تم نے ایک ہزار آدمیوں کو سنبھالنا ہو تو خود بڑے بن کر سنبھال لو تو آپ کو پتہ لگ جائے پھر اعتراض کرو۔

اب مختلف زبان اور مختلف قلم کے لکھے ہوئے نام ہوتے ہیں، پھر ماشاء اللہ! ہمارے نام بھی ایسے ہوتے ہیں کہ جنگل خان۔ ایک عربی کو یہ نام پڑھنا ہو تو اس کا دماغ اُڑ جاتا ہے۔ حالانکہ بڑا ایئرکنڈیشنر ویٹنگ روم اور بسیں ہیں اور احرام بغیر میلے ہوئے ہم کعبۃ اللہ میں آجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کعبۃ اللہ کی صفات رکھی ہیں کہ اسے قبلۃ للناس بنایا ہے۔ کعبہ بھی ایک مکان ہی ہے، لیکن جس کے دل میں ایمان ہوگا، وہ کعبہ کے ایک ایک پتھر کی قدر کرے گا۔

اسی لئے محدثین نے لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے سے لے کر صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ محدثین، فقہاء، ائمہ مجتہدین اور اولیاء اللہ نے جتنی کتابیں لکھی ہیں، سب میں یہی لکھا ہے کہ ملتزم پر ہم نے جو دعائیں مانگی ہیں، کبھی خالی نہیں گئیں۔ وجہ یہ تھی کہ جتنا ایمان قوی اور مضبوط ہوگا اتنا ہی اس کا اثر ہوگا۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے: ﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝﴾ [الحج:۴۶] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، اصل اندھا پن تو دل کا ہے۔ جب دل اندھا ہو جائے تو پھر کیا نظر آئے گا؟ اسی لئے روایات میں آیا ہے کہ آدمی کی جب پہلی نظر کعبۃ اللہ پر پڑتی ہے تو جو دعا کرے، وہ منظور ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جو تڑپ ہوتی ہے وہ بعد میں نہیں رہتی۔

میں اگلے دن پڑھ رہا تھا کہ ایک دوست نے لکھا۔ مجھے اتفاق سے ایک مرتبہ افغانستان میں دورانِ جنگ ایک پہاڑ کے دامن میں نماز کا وقت آیا تو میں نے ایک افغان مجاہد کے پیچھے نماز پڑھی۔ اللہ کی قسم! اس نماز کا مزہ مجھے آج تک پھر کبھی نہیں ملا۔ ایک تو قالینوں پر نماز پڑھنا ہے اور ایک پتھروں پر نماز پڑھنا اور اوپر گولیوں کی بمباری کا ڈر۔

علماء نے فرمایا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے مقناطیس بنایا ہے کہ جو لوہے کو کھینچتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے کعبہ کو دلوں کا مقناطیس بنایا ہے کہ ایمان والوں کا دل کعبے سے بھرتا ہی نہیں اور اس کی ایک صفت یہ بھی فرمائی کہ اس کو امن والا گھر بنا دیا۔ واللہ اعلم۔

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾... "مَثَابَة" کا ایک ترجمہ ہے: اجتماع کی جگہ۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کو تمام لوگوں کے لیے ایک اجتماع کی جگہ بنایا۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ "مثابة"، "ثوب" سے ہے اور "ثوب" کا معنی ہے: کسی چیز کی طرف بار بار لوٹ کر آنا۔ اور "ثوب" اور "ثواب" کا مادہ بھی ایک ہے، یعنی بار بار لوٹ کر آنا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول مبارک بھی یہی ہے کہ لوگ بار بار اپنے مقصد براری کے لئے آتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بس ایک مرتبہ کعبہ کو دیکھ لیا اب اس کا دیکھنے کو دل نہ کرے، بلکہ اس کے برعکس ایسا ہوتا ہے کہ جن کو ایک مرتبہ اللہ نے کعبۃ اللہ نصیب کر دیا، ان کا دل تو بھرتا ہی نہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اس کو اجتماع کی اور امن کی جگہ بھی بنایا۔ امن کی جگہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے گھر میں آدمی اپنے دشمن پر بھی حملہ نہیں کرتا، حتیٰ کہ زمانہ جاہلیت کے اندر بھی حرم کے باہر تو لوگ ایک دوسرے کو قتل کرتے، ڈاکہ بھی مارتے تھے، لیکن حرم میں جو داخل ہو جاتا وہ امن میں آ جاتا، حتیٰ کہ حرم میں آ کر ہتھیار بھی پھینک دیتے تھے؛ کیونکہ حرم، امن کی جگہ ہے۔

اسی طرح مفسرین کرام نے بہت ساری روایات نقل کی ہیں کہ بعض لوگ اپنے والد کے قاتل کو بھی حرم میں دیکھتے تو کچھ نہیں کہتے تھے۔

اسی طرح بعض مفسرین کرام نے فرمایا کہ ایک ظاہری امن ہے کہ آدمی دشمن سے محفوظ ہو گیا اور ایک آدمی جو صحیح معنی میں اللہ کے حرم میں صحیح عقیدہ کے ساتھ آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے گھر میں آ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو گویا اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی آگ سے بھی امن میں لے آتے ہیں۔ اس لئے علماء نے فرمایا کہ کعبہ میں باطنی امن بھی نصیب ہوتا ہے، ظاہری اور باطنی امن دونوں اللہ کے کعبے میں نصیب ہوتے ہیں۔

اور حجاج بن یوسف نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو اس میں شہید کیا، اسی طرح اور بھی کئی حادثات مکہ مکرمہ میں ہوئے، تو ان حادثات اور اتفاقیہ واقعات کا اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اعتبار اغلب اور اکثری احوال کا ہوتا ہے اور اللہ کے کعبہ میں امن کا معاملہ ہی اغلب الاحوال ہے کہ پھر جس نے اس امن کو توڑنے کی کوشش کی تو یہ اس کی اپنی بدنصیبی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ لوگو! سن لو اور سمجھ لو کہ اللہ کا حرم امن کی جگہ ہے، اس کے اندر قتال حرام ہے اور اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے موقع پر چند گھنٹوں کے لئے مجھے رخصت عطا فرمائی اور اس کے بعد پھر اس کی حرمت کو ہمیشہ

کے لئے قائم ودائم فرمادیا۔اور اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اس میں بھی اللہ کی قدرت ہے کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو رخصت عطا فرمائی، لیکن کچھ ایسا قتال نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے مکہ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ ؓ کے رعب اور غلبہ سے عطا فرمایا۔

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ﴾ میں ''بیت'' سے مراد ''کعبہ'' ہے؛ کیونکہ ''الف لام'' یہاں عہد ذہنی کے لئے ہے، جیسے ''البیت'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا گھر ہے تو مقصد صرف کعبہ شریف کی عمارت نہیں، بلکہ اس سے مراد سارا حرم ہے؛ کیونکہ دوسری آیت میں فرمایا ہے:﴿حَرَمًا آمِنًا﴾ [العنکبوت:٦٧] کہ ان کے لئے ہم نے حرم کو امن والا بنایا کہ وہاں اللہ تعالیٰ نے پورے حرم کو امن والا قرار دیا۔ جیسے حکم ہے کہ اگر کوئی حج پر آتا ہے اور اس کے ذمہ تمتع یا قران کی ہدی یا کوئی اور ہدی ہے تو وہ کہاں ذبح ہوگی؟ فرمایا:﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدۃ:٩٥] کہ ہدی کا جانور کعبہ میں پہنچایا جائے۔اب یہ معنی تو نہیں ہوتا کہ کعبہ کے اندر جا کر جانور ذبح کیا جائے۔

امن والے سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ، یہاں کے رہنے والوں کو بھوک اور قحط سے امان میں رکھیں گے، جیسے فرمایا کہ ہم تمام دنیا کی مصنوعات اور پھل کھینچ کھینچ کر اس گھر میں پہنچادیں گے۔اللہ تعالیٰ تمہیں اس گھر کی عزت کرنے کے بدلے میں دو چیزیں عطا فرمائیں گے: ایک تو اللہ تعالیٰ تمہاری بھوک مٹادیں گے، یعنی قحط نہیں ہوگا اور دوسری بات اللہ تعالیٰ تمہیں خوف سے امن والا بنادیں گے کہ ساری دنیا میں خوف ہوگا، لیکن حرم کو اللہ تعالیٰ نے امن والا بنایا۔

حرم کی خصوصیت کہ وہاں کوئی بھوکا نہیں رہتا:

علماء کرام نے لکھا ہے کہ کوئی چاہے دنیا میں کہیں بھی ہو، ایسے حالات بھی دیکھے گا کہ اپنے گھر میں آئے تو رات کو بھوکا سو جاتا ہے، لیکن علماء نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی ایک خصوصیت رکھی ہے کہ باہر سے آنے والا کسی وقت بھی حرم میں آجائے تو اللہ اس کو بھوکا نہیں رکھتے، کوئی نہ کوئی نعمت اسے مل ہی جاتی ہے۔اگر کوئی اور نعمت نہ بھی ہے تو زمزم سے بڑی نعمت کیا ہوسکتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ زمزم ایک ایسی نعمت ہے جو کھانے کا فائدہ بھی پہنچاتی ہے اور بیماریوں سے شفاء کا فائدہ بھی پہنچاتی ہے۔اسی طرح آپ مشاہدہ کر کے دیکھیں کہ حرم کا ایک مزدور بھی دنیا کے دوسرے ممالک کے بڑے بڑے صنعتکار، تاجر اور زمیندار سے زیادہ آرام سے رہتا ہے، حالانکہ قرآن مقدس

کو نازل ہوئے چودہ سو سال گزر گئے، لیکن ابھی تک حرم میں ایک مزدور اور غریب کو امن وسکون ملتا ہے۔

سارا حرم امن کی جگہ ہے:

بعض علماء نے فرمایا: امن کا معنی یہ ہے کہ یہاں جنگ وقتال حتیٰ کہ جانور کا مارنا بھی منع فرما دیا گیا، تاکہ اللہ کے حرم کے اندر ایک امن کی فضاء قائم رہے۔ بعض ائمہ جن میں امام شافعی رحمہ اللہ کا قول بھی ہے کہ اگر کوئی مجرم جرم کے بعد حرم میں آ جائے تو فرماتے ہیں: اس کو تنگ کر دیا جائے کہ مجبور ہو کر باہر نکلے اور پکڑا جائے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ اسے حد حرم کے باہر سزا دی جائے؛ کیونکہ ظاہر آیات میں اللہ نے اس کو امن والا فرما دیا ہے۔

حرم میں قتال حرام ہے:

دنیا میں حادثات اور لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، حتیٰ کہ اللہ نے خود بھی قتال کا حکم دیا ہے: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٩١﴾﴾ [البقرة: ۱۹۱] اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مسجد حرام میں کسی کے ساتھ قتال نہ کرو، لیکن اگر وہ تم سے قتال کریں تو پھر تمہیں بھی قتال کرنا جائز ہے۔ اگر کوئی حرم میں آ کر فساد کرے گا تو اس کے ساتھ قتال کیا جائے گا؛ کیونکہ اس کو اللہ کے حرم سے نکالنا تو ہے۔ اور حضور پاک ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا: لوگو! سن لو! اللہ کا حرم، حرم ہے اور قیامت تک حرم رہے گا، اللہ نے فتح مکہ کے موقع پر مجھے چند گھنٹوں کے لئے حرم میں جنگ کرنے کی اجازت دی تھی، اس کے بعد پھر اس کو حرام کر دیا اور اس کی حرمت قیامت تک رہے گی۔ اسی لیے کہا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے گھر کی حرمت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی حرمت کریں گے اور جو اللہ تعالیٰ کے گھر کی حرمت کو توڑ دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی حرمت کو ختم کر دیں گے۔

اور اسی طرح بعض کتب سابقہ کی روایات میں بھی آتا ہے کہ جب آدم علیہ السلام زمین میں اُتارے گئے تو آدم علیہ السلام پوری زمین پر صرف اکیلے تھے؛ کیونکہ بیوی حوا تو دوسرے مقام پر اُتاری گئیں۔ حضرت آدم علیہ السلام بڑے پریشان تھے، کوئی بات کرنے والا، انس والا نہیں تھا تو اللہ سے درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: آدم! میرے گھر کے اندر آؤ۔ میں نے دنیا میں اپنا ایک ایسا گھر رکھا ہے جس کو میں نے نسبت دی ہے کہ وہ میرا گھر ہے اور اس گھر کے اندر میں ایسے لوگ پیدا کروں گا جو قیامت تک میرے ذکر کو بلند کریں گے۔ میں تیری اولاد میں ایسے انبیاء پیدا

کروں گا جو میرے ذکر کو بلند اور کعبے کی عمارت کو بلند کریں گے اور تیری اولاد میں جو اس کو آباد کرنے والا ہو گا، وہ خاتم الانبیاء ہوں گے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ پانچ میقات ہیں، میری اُمت یاد رکھ لے: یلملم، جحفہ، ذوالحلیفہ، قرن المنازل اور ذاتِ عرق۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم ان حدوں پر آجاؤ یا ان کے حدوں کے برابر جگہوں پر آجاؤ تو بغیر احرام باندھے ہوئے اللہ کے گھر میں داخل نہ ہو، ان کی حد سے آگے نہ بڑھو۔ وہاں سے آپ غسل کریں اور اپنے لباسِ فخر کو اُتار ڈالیں اور اب آپ کفن والی دو چادریں باندھ لیں اور دو رکعت سنت الاحرام پڑھیں اور اس کے بعد لبیک پڑھتے ہوئے اپنے آپ کو تیار کریں کہ اب آپ اللہ تعالیٰ کے کعبے میں داخل ہونے والے ہیں، اس گھر کے لئے یہ آداب مقرر کئے گئے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی احادیث میں ثابت ہے کہ ایک صحابی نے حضور پاک ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! سب سے اوّل گھر کونسا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کعبۃ المشرفۃ۔ پوچھا: اس کے بعد کونسا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: المسجد الاقصیٰ۔ حتیٰ کہ ایک حدیث مبارک میں ہے کہ صحابی نے پوچھا: ان کے درمیان کتنی مدت ہے؟ یعنی کعبے کے کتنے عرصہ بعد مسجد اقصیٰ بنی؟ چالیس سال بعد مسجد اقصیٰ کا وجود ہوا۔ لیکن یاد رکھیں! یہ چالیس سال سے مراد مسجد اقصیٰ کی تعمیر نہیں، بلکہ مرمت ہے۔ ورنہ اصل بنائے کعبہ جو ہے وہ تو اللہ تعالیٰ نے ابھی زمین نہیں بنائی تھی، پانی ہی پانی تھا تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ کے کعبے کا مقام موجود تھا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ مقامِ ابراہیم حطیم ہے کہ جہاں ابراہیم علیہ السلام نوافل پڑھا کرتے تھے اور بعض نے کہا کہ تعمیر کعبہ کے وقت جس پتھر پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے اور وہ پتھر حسب ضرورت اونچا بھی ہوتا تھا اور نیچے بھی ہوتا تھا اور اسی پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں بھی آگئے۔ یہی علماء کا راجح قول ہے اور اس کی تائید حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گزشتہ واقعہ سے ہوتی ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس جگہ کی تائید کے لئے متعدد روایات نقل کی ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو فتوحات عطا فرمائیں، بیت المال دولت سے بھر گئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ حضرت! اب تو مہربانی فرما کر مسجد نبوی کی تعمیر کروا دیں، پکی مسجد اور چھت بن جائے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس مقام کو بدلنے کی جرأت نہیں کر سکتا جس کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے بنایا ہے۔ حالانکہ مسجد کی تعمیر کرنا کوئی گناہ نہیں تھا، لیکن انہوں نے یہ کام نہ کیا۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ان آیت مبارکہ میں اس گھر کا شرف بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو ایسا بنایا کہ ارواح کا تعلق اس کے ساتھ ہے۔ مومنین کے دلوں کا تعلق اسی کے ساتھ ہے، جیسے جانور، شفقت اور محبت سے اپنے گھر کی طرف دوڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی محبت بھی ایسے ہی ڈال دی ہے کہ لوگ دور دور سے اس کی طرف آتے اور میلان کرتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ حرم کو اللہ تعالیٰ نے امن والا بنایا۔ اس لئے اگر حدود اللہ کا اجراء کسی پر کرنا ہے، ہاتھ کاٹنا یا قصاص وغیرہ تو اس کو حدودِ حرم سے باہر کیا جائے۔ لیکن باقی ائمہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے حرم کے اندر قتل کیا ہے تو اس کو سزا دینا بھی جائز ہے۔ وہ حضرات دلیل دیتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے حرم میں مکان خریدا اور قید خانہ بنایا، تاکہ جو لوگ زیادتی کریں، ان کو سزا دی جا سکے۔ لیکن امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ کا ایک خاص انداز ہے کہ وہ سب سے پہلے اللہ کے قرآن پر نظر ڈالتے ہیں، اگر قرآن مقدس میں کوئی بات نہ ملے تو پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعد اگر کوئی چیز نہ ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اگر ان سے نہ ملے تو پھر اجتہاد کا مرتبہ آتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: خدا نہ کرے، اگر لوگ اللہ کے کعبہ کا حج چھوڑ دیں تو اللہ تعالیٰ آسمانوں کو زمین پر گرا دیں گے، یعنی قیامت قائم ہو جائے گی۔

مقام ابراہیم کون سی جگہ ہے؟

اسی آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شرف کو مزید بلند فرما دیا اور حکم دیا کہ تم بھی اس جگہ جا کر نماز پڑھو، عبادت کرو، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوتے تھے۔ اس پتھر کو ''مقام ابراہیم'' کہا جاتا ہے۔ صحیح روایات میں آتا ہے کہ اسی پتھر پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کی تھی اور ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کے نشانات بھی اسی پتھر پر موجود ہیں، اب وہ کم ہو گئے ہیں۔

اور صحیح روایات میں ہے کہ مقام ابراہیم کا پتھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کعبہ کی دیوار کے ساتھ تھا۔ دروازہ مبارک کے ساتھ مقام ابراہیم تھا، پھر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بہت بڑا سیلاب اور بارشیں آئیں۔ پھر یہاں کی بارشوں میں تو پہاڑوں سے پانی گرتے ہیں تو وہاں سے بارش نے اس پتھر

کو ہٹادیا تو وہ کعبۃ اللہ سے دور ہوگیا۔ اور اب جس جگہ ہے، اس جگہ جا پہنچا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جہاں وہ پانی کی وجہ سے چلا گیا، اب وہیں رہنے دو اور اسی جگہ اس کے گرد پتھروں کی ایک دیوار بھی بنادی، تا کہ اگر دوبارہ کوئی سیلاب آئے تو اس پر زیادہ اثر نہ ہو سکے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب کعبۃ اللہ کی دیوار اونچی کی گئی تو آپ کا اب پتھر لگانا مشکل ہوا تو آپ اسی پتھر پر کھڑے ہوتے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر اُٹھا کر دیتے اور آپ اسی طرح رکھتے آئے۔ جب ایک جانب کی دیوار مکمل ہوگئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پتھر کو دوسری جانب منتقل کیا۔ پھر جب وہ دیوار مکمل ہوگئی تو پھر تیسری جانب مکمل کیا، جب وہ دیوار کمل ہوگئی تو پھر چوتھی جانب مکمل کیا، حتیٰ کہ کعبۃ اللہ کی دیواریں پوری ہوگئیں اور یہی واقعہ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ان شاء اللہ! مفصل پڑھیں گے، جب ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بناء کا ذکر کریں گے۔ اب مفسر رحمہ اللہ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مقامِ ابراہیم میں جو اقوال آئے تھے کہ مقامِ ابراہیم سے مراد حطیم یا حرم یا پورے مشاعر ہیں، یعنی جتنی روایات آئی ہیں، تمام روایات نے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مقامِ ابراہیم اسی پتھر کا نام ہے جس پر آپ علیہ السلام نے بنائے کعبہ کی تھی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے مقامِ ابراہیم کو دیکھا، وہاں ابراہیم علیہ السلام کی انگلیوں کے آثار بھی تھے۔ آپ کے پاؤں کے نیچے یہ درمیانی جگہ ہے، اس کا نشان بھی موجود تھا، ساری انگلیوں کے نشان بھی جو زیادہ واضح نشان تھے اور لوگوں کے ہاتھ لگانے سے ختم ہوگئے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مقامِ ابراہیم کے پیچھے کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم مقامِ ابراہیم کے پتھر کو ہاتھ لگاؤ، اس کو مس کر دیا چومو یا اس کو بوسہ دو۔

مقامِ ابراہیم کا مصداق:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مقامِ ابراہیم کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پورے حرم کو مقامِ ابراہیم فرمایا ہے۔ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا کہ مقامِ ابراہیم تو یہی ہے جو اس مسجد کے اندر ہے، لیکن مقامِ ابراہیم کا اطلاق اور بھی بہت ساری چیزوں پر ہوتا ہے، حتیٰ کہ تمام مناسک پر مقامِ ابراہیم کا اطلاق ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ عرفات کے اندر دو نمازوں کا پڑھنا، مزدلفہ، منیٰ، طواف

اور صفا و مروہ کے درمیان میں دوڑنا، سب مقامِ ابراہیم کہلاتا ہے۔ میں نے یہ پوچھا کہ کیا یہ تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کی تھی؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، انہوں نے تو بیان نہیں کی، لیکن حضرت نے جب یہ فرمایا کہ حج سارا کا سارا مقامِ ابراہیم ہے تو حج کے اندر پھر تمام مناسک ہیں۔ فرمایا: یہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا ہے کہ ان تمام چیزوں پر حج کا اطلاق ہوتا ہے۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقامِ ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کی بیوی اور ابراہیم علیہ السلام کی بہو نے آپ کے لئے یہ پتھر رکھا کہ آپ اس پر بیٹھ جائیں اور آپ کا سر مبارک دھولے؛ کیونکہ وہ سفر سے تشریف لائے تھے۔

قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: یہ قول بھی ضعیف ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حج مبارک بیان فرماتے ہیں، اس کے بعد آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف فرمالیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ پتھر وہی جگہ ہے جہاں ہمارے ابا ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! یہ وہی پتھر ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا ہم اس کو نماز پڑھنے کی جگہ نہ بنائیں؟ یعنی ہم یہاں نماز پڑھیں۔

اب مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض سند میں یوں بھی آتا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، آپ نے جب عمرہ کا پہلا طواف فرمایا تو پہلے تین چکروں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمل فرمایا۔ رمل کا معنی ہوتا ہے کہ جیسے پہلوان اکھاڑے میں اپنی قوت کا مظاہر کرتے ہیں تو اکڑ کر چلتے ہیں اور چار چکروں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چل کر چکر مکمل فرمائے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات چکر مکمل کر لیے تو مقامِ ابراہیم کی طرف تشریف لائے۔ آپ کے لیے وہاں دو رکعت نماز ادا کی اور یہ آیت پڑھی۔

اب مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ آپ نے حجرِ اسود کو استلام فرما کر تین چکروں میں رمل کیا اور چار چکر چل کر مکمل کئے اور اس کے بعد آپ مقامِ ابراہیم پر تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز کے بعد یہ آیت پڑھی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز اس طرح پڑھی کہ کعبہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان مقامِ ابراہیم تھا اور یہ طویل حدیث میں سے ایک حصہ ہے، جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سند میں یہ ذکر بھی فرمایا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

تشریف لے آئے اور آنے کے بعد آپ ﷺ نے سات چکر پورے فرمائے اور بعد میں مقامِ ابراہیم کے پیچھے آ کر دو رکعات نماز پڑھی۔

اب مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک تو ساری احادیث مبارکہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مقامِ ابراہیم سے وہ پتھر مراد ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ بنایا اور اس پر ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کے نشانات بھی بڑے ظاہر تھے۔ حتیٰ کہ زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ جانتے تھے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں ہیں۔ اسی لئے ابوطالب نے جو قصیدہ لکھا تھا، اس میں اس نے کہا کہ وہ جگہ جہاں ابراہیم علیہ السلام کے قدم رکھے ہوئے ہیں، آج تک باقی ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام نے اس پتھر پر جو قدم رکھے ہیں، وہ بغیر جوتے کے ہیں۔ اس لئے وہ نشان بھی ننگے پاؤں کے ہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تمام اسناد اور تمام روایات مبارکہ دلالت کرتی ہیں کہ مقامِ ابراہیم سے مراد وہی پتھر ہے جس پر بنائے کعبہ کے لئے ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے۔

شبہ اور اس کا ازالہ:

ہمارے بعض لوگ مسلمانوں کے عقیدوں کو خراب کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ایک پتھر پر اللہ تعالیٰ کے نبی کھڑے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی سجدہ گاہ بنا دیا تو نبی کی قبر پر ہم سجدہ کیوں نہ کریں؟ لوگوں کو اللہ پاک ہدایت دے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مقامِ ابراہیم کو مصلیٰ بناؤ۔ اگر اللہ کسی نبی کی قبر کا حکم دیا تو ہم بھی مان لیتے، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

"لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَ النَّصَارٰى، اتَّخَذُوا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ." [صحیح بخاری، رقم:۴۳۵]

"اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ جنہوں نے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔"

وہاں تو حضور اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی اور فرمایا کہ یا اللہ! میری قبر کو سجدہ گاہ نہ بنا دینا کہ لوگ وہاں چومتے رہیں اور رکوع، سجود کرتے رہیں۔ اے اللہ! میری قبر کو محفوظ رکھنا۔ اللہ نے حضور اکرم ﷺ کی دعا قبول فرما کر آپ ﷺ کی قبر کو ایسا محفوظ فرما دیا کہ شرک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسرا شبہ یہ کرتے ہیں کہ اصحاب کہف اللہ کے ولی تھے، ان کی قبروں پر مسجد بنائی گئی تو ہم بھی تو ولیوں کی قبروں پر مسجد بنواتے ہیں۔

جواب: سب سے پہلے تو یہ دیکھیں کہ اصحابِ کہف کا غار جہاں ان کی وفات ہوئی، وہاں مسجد بنانے والے کیا انبیاء تھے یا اس مسجد کے بنانے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا تھا؟ پھر اس مسجد کی عبادت کا کوئی حکم ہوتا تو اللہ تعالیٰ منع فرماتے کہ وہاں دیکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ آپ دیکھیں! حضور اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین کا زمانہ بھی گزر گیا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں صحابہ کا لشکر وہاں سے گزرا تو کچھ صحابہ نے کہا کہ ہم اس جگہ سے گزر رہے ہیں، وہ غار ہے جس میں اصحابِ کہف دفن ہیں، چلو وہ جگہ تو ہم دیکھیں تو اس وقت بھی صحابہ نے منع کیا کہ مت جاؤ، دیکھنے کا حکم نہیں ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خود فرمادیا ہے کہ دیکھو گے تو تم ڈر جاؤ گے، ہم نے وہاں ایسی ہیبت طاری کردی۔ صحابہ نے منع کیا، لیکن کچھ صحابہ وہاں دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ خدا کی شان ہے! وہ کہتے ہیں کہ ابھی ہم پہاڑ کے نزدیک نہیں پہنچے تھے کہ شدید آندھی کا طوفان آیا، ہم خود گم ہوگئے اور بڑی مشکل سے ہم واپس قافلے میں پہنچے۔ واپس آئے تو صحابہ نے پوچھا: کیا ہوا؟ ہم نے کہا: آندھی آگئی۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم نے تو کہا تھا کہ مت جاؤ۔ اب اس کے لیے یہ دلیل جائز نہیں کہ اصحابِ کہف اولیاء اللہ تھے، لہٰذا اولیاء اللہ کے مزار پر مسجد بنانا جائز ہے۔

اب اس گھر کے طواف کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا اور اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو کبھی کوئی نبی طواف نہ کرتے۔ اب کعبہ کو کوئی دیکھ کر یہ کہے کہ کعبہ تو اندر سے خالی ہے، اس کے اندر تو خدا نہیں بیٹھا۔ یہ کعبہ تو اس لئے ہے کہ یہ میرے اللہ کا گھر ہے، اس کا طواف ہوسکتا ہے تو محمد مصطفیٰ ﷺ تو روضۂ اقدس کے اندر موجود ہیں، اس کا طواف کیوں نہ کریں؟ ایسا کہنا اور کرنا جاہلیت ہے۔

باطنیہ فرقے کا نظریہ:

عقل لڑانا تو ایسا ہے جیسے فرقہ باطنیہ تھا اور اس کا بہت بڑا سربراہ تھا۔ فرقہ باطنیہ بھی شیعہ کا ایک فرقہ ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے مریدین کو ایک فتویٰ جاری کیا۔ اگر عقل سے سوچنا ہے تو عقل کے مطابق اس کی بات بھی ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے گھر میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں تو ہم ان دو بہنوں کے لئے غیروں کا رشتہ ڈھونڈتے ہیں، اپنے دو لڑکوں کے لئے ہم لوگوں کی لڑکیاں ڈھونڈتے ہیں جن کا ہمیں پتہ ہوتا اور ہماری لڑکیوں کو بھی ان لڑکوں کا پتہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ گھر میں پلے اور ایک ماں کے پیٹ سے نکلے ہیں، پھر جتنے یہ ایک دوسرے کے ہمدرد ہوسکتے ہیں، باہر کے لوگ اتنے ہمدرد نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا آج کے بعد بہن، بھائیوں کی آپس میں

شادیاں کر دیا کرو۔ اس نے کہا: سب سے زیادہ بہن کا حق دار اس کا بھائی ہے، ایک گھر میں پیدا ہوئے، پھر بہن اس کا کھانا پکاتی، کپڑے دھوتی ہے، باقی اگر ایک جنسی فائدہ اپنے بھائی کو پہنچادے گی تو کیا فرق پڑے گا؟ اور پھر معاملہ گھر کا گھر میں رہے گا۔ رشتے ڈھونڈنے اور دولت بھی خرچ نہیں کرنا پڑے گی۔ تو اب عقل تو یہی کہتی ہے کہ ٹھیک ہے۔ حالانکہ دین کہتا ہے کہ جہاں ہماری عقل کی حدیں ختم ہوتی ہیں وہاں سے اللہ کی وحی اور دین شروع ہوتا ہے۔ جب اللہ نے خود قرآن میں ماں، بہن اور بیٹی سے نکاح حرام کر دیا تو اس کے اندر لازماً کوئی حکمت ہے۔ اب جدید سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ زیادہ آپس میں رشتے نہ کیا کرو؛ کیونکہ بعض بیماریاں موروثی ہوتی ہیں کہ آدمی ان سے بچ نہیں سکتا۔

دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو ماں کو عزت دی ہے، اگر ماں، بیوی بن جائے تو پھر عزت کہاں جائے گی؟ اسی طرح بہن کے ساتھ احترام وانساب ختم ہو کر رہ جائے گا، آنے والے چند سالوں کے بعد پھر تو کوئی نسل ہی نہیں ہوگی؛ کیونکہ جتنا عقل کا اندھا ہو وہ پتھر کو نفع ونقصان کا مالک نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن اگر کوئی ولی کی قبر ہوگی تو لازماً نفع ونقصان کی طرف ذہن جائے گا، پھر شرک آئے گا۔ اور جہاں بھی شرک کا شائبہ آئے گا وہاں اللہ تعالیٰ منع فرمادیں گے۔ مقامِ ابراہیم کے پیچھے تو رکوع کرتے ہو، لیکن اگر میت سامنے ہو تو رکوع کرنا منع ہے۔ پھر بعض کہتے ہیں کہ دین عقل کے خلاف تو نہیں ہو سکتا تو پھر عقل کس کی ہو؟ مکہ والوں کی یا مدینہ والوں کی؟ عرب والوں کی یا عجم والوں کی؟ کس کی عقل کو ہم پہلے معیار بنائیں؟ یہ فیصلہ پہلے کریں۔ پھر عقل میں تو جنون بھی آجاتا ہے جس سے عقل ختم ہو جاتی ہے۔

خلفائے راشدین کی اتباع کا حکم:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بھی روایات میں ہے کہ یہ پتھر کعبۃ اللہ کی دیوار کے ساتھ تھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کعبہ کی دیوار سے ہٹا کر دور کیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کی اتباع کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے میری اُمت! میرے بعد ابوبکر اور عمر فاروق کی پیروی کرنا، ان کے نقش قدم پر چلنا۔ اس لیے کسی نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پتھر کو ہٹانے پر انکار نہیں کیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ بڑھ گئے تھے اور مقام ابراہیم کی وجہ سے

ان کو طواف میں تکلیف ہوئی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کی اصل جگہ سے جہاں اب ہے، اس جگہ پر رکھ دیا۔

آج کل خود کو اہلسنت والجماعت کہلانے کے باوجود بعض لوگ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فرمان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ حالانکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی کوئی بات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف نہیں ہو سکتی اور یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسا رعب والا شخص بھی اپنی خلافت کے دوران صحابہ سے پوچھے کہ تم لوگ کب تک میری اتباع کرو گے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ جب تک آپ قرآن وسنت پر چلیں گے۔ اگر تم نے قرآن وسنت سے اِدھر اُدھر قدم رکھا تو ہم تیری تلوار سے تجھے سیدھا کر دیں گے۔ اس لئے اگر کسی وجہ سے کسی صحابی کے قول پر کوئی شخص عمل نہ کرے تو اس کی گنجائش ہے، لیکن ایسا لفظ تو نہ کہے جس سے دشمن کو فائدہ ہو۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا باہمی احترام:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ تھا اور ایک حضرت زید رضی اللہ عنہ کا فتویٰ تھا، آپس میں دونوں فتاویٰ متعارض تھے۔ کسی نے جا کر حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کہا تو وہ ناراض ہو گئے۔ لیکن ایک دن جناب کیا دیکھا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ سوار ہو رہے ہیں تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آگے سے رکاب پکڑ لی، سواری کی رکاب پکڑ کر سوار کرایا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا کر رہے ہو؟ عرض کیا کہ ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے کہ اپنے علماء کی عزت کرو۔ تم صحابہ میں عالم ہو، میں کیسے آپ کا احترام نہ کروں؟ اسی طرح کتابوں میں موجود ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رکاب پکڑا اور احترام کیا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اچھا ابن عباس! اپنا ہاتھ مجھے دکھاؤ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ہاتھ دکھایا تو انہوں نے فوراً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ مجھے بھی یہی حکم ہے کہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت رکھے، اس کا احترام کرو۔

اب مسئلہ میں دونوں ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہیں، لیکن وہ رکاب پکڑ رہے ہیں اور وہ ہاتھ کو بوسہ دے رہے ہیں۔ اسی طرح زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھ لیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جب اپنی مجلس میں ہوتے اور کوئی مجلس میں آتا تو کہتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی بات سناؤ، ان کا خطبہ سناؤ اور جب صحابہ سنانا شروع کرتے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ رونا شروع کر دیتے۔

موافقات عمر رضی اللہ عنہ:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تین باتوں میں میری بات کی لاج رکھ لی اور میری بات کو منظور

فرمالیا: ایک تو میں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا تھا: یارسول اللہ! آپ مقام ابراہیم کو مصلی بنالیں۔ حضور اکرم ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل کی۔

دوسرا میں نے یہ عرض کیا تھا کہ آپ کے پاس ہر قسم کے لوگ حاضر ہوتے ہیں، اگر آپ اپنی بیویوں کو پردے کا حکم دے دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے مطابق قرآن میں پردہ کی آیت اُتار دی۔

اور تیسرا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ اپنی بیویوں سے ناراض ہو گئے تو میں نے جا کر حضور اکرم ﷺ کی بیویوں سے کہا کہ تم کیوں ایسی باتیں کرتی ہو کہ حضور اکرم ﷺ ناراض ہو جاتے ہیں؟ خبردار! خیال رکھو! حضور اکرم ﷺ کو راضی رکھا کرو، ایسا نہ ہو کہ کہیں اللہ تعالیٰ حکم دے دیں کہ ان کو طلاق دے دو۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کو تم سے بہتر بیویاں عطا فرما دیں۔ بیویوں نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ ہمیں نصیحت فرماتے ہیں، وہ کافی ہے، تم ہمیں وعظ نہ کرو۔ تم کیا حضور اکرم ﷺ سے بہتر ہمیں نصیحتیں کر سکتے ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمادیا۔

اسی طرح بدر کے قیدیوں کے متعلق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے موافق فیصلہ کیا گیا۔

امام احمد رحمہ اللہ نے یہ بات باسند نقل کی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین چیزوں میں میرے رب نے میری موافقت فرمائی۔

ویسے ان احادیث مبارکہ میں تو تین چیزوں کا ذکر ہے، اصل میں محدثین اور علماء کرام نے تمام روایات کو جب جمع کیا ہے پندرہ مقامات تقریباً ایسے ہیں کہ جہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے کو اللہ تعالیٰ نے منظور فرمایا اور اس کے مطابق حکم جاری فرمادیا۔

یہ بہت بڑی عظمت اور شرف کی دلیل ہے کہ جس کی رائے کو اتنی اہمیت ملے کہ اللہ قبول فرما کر اس کے مطابق قرآن نازل فرمادیں اور اس پر پھر قیامت تک عمل باقی رہے۔

ان پندرہ مقامات میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مقام ابراہیم کو مصلی بنانے کا کہا تھا اور یہ آیت نازل ہوئی۔ اس لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر کسی آدمی نے دنیا میں اچھے کام کی ابتداء کی اور اس کام کو اللہ تعالیٰ نے منظور فرمایا اور وہ قیامت تک کام ہوتا رہے گا تو اس بنیاد رکھنے والے کو ثواب ملتا رہے گا۔ آپ نے ایک مدرسہ، ہسپتال یا اچھی جماعت کی بنیاد رکھی تو جب تک وہ رہے گا، آپ کو ثواب ملتا رہے گا۔ یہی مثال مقامِ

ابراہیم پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ (نعوذ باللہ) اگر کسی نے برائی کی بنیاد رکھی اور جوں جوں وہ لعنت پھیلتی چلی گئی تو اس کا گناہ پہلے شخص کو بھی ملے گا۔ جیسے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر کے قتل کی بنیاد رکھی تو قیامت تک جتنے ناحق قتل ہوں گے، قابیل پر بھی ان کا گناہ لکھا جائے گا۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جس دن اسلام لائے، فرمایا: یارسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل ہم حق پر ہیں۔ عرض کیا: حضور! میرا ضمیر یہ برداشت نہیں کرتا کہ بتوں کے پجاری کعبے میں جا کر عبادت کریں اور ہم سچے خدا کو ماننے والے چپ کر کے بیٹھے رہیں۔ چلیں! آج ہم اللہ کے کعبے میں کھلی عبادت کریں گے، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے مقامِ ابراہیم پر جورائے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی منظور کی، وہ اس کا صلہ تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین مر گیا تو حضور اکرم ﷺ نے اس کا جنازہ پڑھانے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض: یارسول اللہ! آپ اس کافر اور منافق کا جنازہ پڑھا رہے ہیں؟ جس نے ساری زندگی اسلام کو نقصان پہنچایا۔ یہ دشمن اسلام ہے، آپ اس کا جنازہ نہ پڑھائیں۔ حضور اکرم ﷺ نے میری بات نہ مانی اور جنازہ پڑھا دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کر دیا کہ میرے نبی! ان منافقین کا کبھی آپ جنازہ نہ پڑھیں، اگر ان میں سے کوئی مر جائے اور اس کی قبر پر آپ کھڑے بھی نہ ہوں۔ یہ آپ کے جنازہ پڑھنے کے مستحق نہیں ہیں۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے میری رائے کو منظور فرمالیا۔

یہ پانچ مقامات ہو گئے۔ اس لیے مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ساری روایات ٹھیک ہیں اور کسی جگہ کوئی تعارض نہیں ہے۔

لیکن یاد رکھو کہ علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا، لیکن حضور اکرم ﷺ کی بیویوں کو بدلنے کا حکم نہیں دیا تو معلوم ہوا کہ ان سے بہتر کوئی بیوی دنیا میں تھی ہی نہیں، اگر کوئی ہوتی تو اللہ تعالیٰ بدل دیتے۔ اس لئے یہ معنی ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کے لیے خیر ہیں۔ اور یہ بات یاد دیکھیں کہ وہی تربیت اسلام والی، ایمان والی، عبادت والی، توبہ کرنے والی، روزہ رکھنے والی، عورتیں ایسی بھی ہوں گی کہ بیوہ اور شادی شدہ بیوہ بیوی کا ذکر پہلے اور کنواری کا ذکر بعد میں ہے۔ وہی ترتیب ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے پہلے شادی بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کی اور کنواری سے شادی بعد میں کی۔ اس لئے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ کی بیویوں کی ساری صفات اللہ تعالیٰ نے ذکر

فرمادیں۔ واللہ اعلم۔

قیامت کے دن سب سے پہلے لباس کسے پہنایا جائے گا؟

ایک حدیث مبارک ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب سارے لوگ قبروں سے اُٹھیں گے تو سب سے پہلے جنت کی پوشاک اور جوڑا میرے ابا ابراہیم علیہ السلام کو پہنایا جائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ! آپ سے بھی پہلے؟ حالانکہ آپ کی شان تو ان سے زیادہ بلند ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! مجھ سے بھی پہلے ملے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں دنیا میں سب سے پہلے ان کا لباس اُتارا گیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ان کو جب آگ میں ڈالا گیا تھا تو اللہ کی توحید کے لئے ان کے کپڑے تو جل گئے تھے، اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دیں گے کہ آج سارے میدانِ حشر میں تمام انبیاء میں کھڑے ہیں، لیکن ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا۔

﴿لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ﴾ کی تفسیر:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ [البقرۃ:١٢٥] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ بتوں کو توڑا اور مندر کو برباد کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نے شرک کو برباد کیا تھا، اس لیے تیری عظمت کے لیے میں کعبے کی بناء تیرے سپرد کرتا ہوں، تاکہ توحید کا گھر بنانے والا بھی میرا ابراہیم بنے۔

اس گھر کو پاک کرنے کا کیا مطلب ہے؟ بعض علماء نے فرمایا کہ حکم یہ تھا کہ گندگی اور نجاست سے پاک کرو، لیکن یہ قول بھی راجح نہیں ہے، کیونکہ جب ابراہیم علیہ السلام نے نیا گھر بنا دیا تو اب گندگی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے علماء نے فرمایا کہ معنی یہ تھا کہ اب توحید کا ڈنکا بجائیں، اس کو معنوی طور پر بھی پاک کر دیں، تاکہ لوگ شرک اور شرک والے عقیدوں سے پاک ہوں۔

''طائفین'' اور ''عاکفین'' کے درمیان میں ''واؤ'' سے معلوم ہوا کہ طواف علیحدہ عبادت ہے اور وقوف علیحدہ عبادت ہے۔ ''عاکفین'' سے مراد علماء نے وہ لوگ لئے ہیں جو مستقل مکہ میں رہتے ہیں، اور بعض علماء کے نزدیک ''طائفین'' سے مراد طواف کرنے والے ہیں، ''عاکفین'' سے مراد حرم میں بیٹھنے والے ہیں۔ ''وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ''

نماز پڑھنا ایک علیحدہ عبادت ہے، رکوع اور سجود سے مراد نمازی ہیں۔

''طائفین'' سے مراد طواف کرنے والوں کے لئے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ ﴿لِلطَّآئِفِیْنَ﴾ سے مراد باہر سے آنے والوں کے لیے اور ﴿وَالْعٰکِفِیْنَ﴾ سے مراد مکہ میں رہنے والوں کے لئے۔ اصل میں ''عاکفین'' کا معنی ہے: بیٹھنے والے۔ لیکن بعض علماء نے کہا کہ طواف کرنے والے اور نماز پڑھنے والے مراد ہیں۔

دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہے کہ یہاں باہر سے آنے والا اور اندر رہنے والا سب برابر ہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو بھی مکہ میں بیٹھا ہو، وہ ''عاکفین'' کے معنی میں داخل ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتیں ہوتی ہیں تو ساٹھ رحمتیں طواف والوں کو اور چالیس رحمتیں نماز پڑھنے والوں کو ملتی ہیں اور بیس رحمتیں بیٹھ کر اللہ کے کعبے کو نظر کرنے والوں کو ملتی ہیں۔

﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ﴾ حضرت حسن بصری، ابن جریج اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم بھی ﴿عَهِدْنَآ﴾ کا معنی ''أمرنا'' فرماتے ہیں۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ بات ہے کہ یہ حرف متعدی ہے ''إلیٰ'' کے ساتھ، جس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی طرف وحی نازل فرمائی۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ﴾ کے معنی ہیں کہ اس گھر کو ایسا پاکیزہ بناؤ کہ اس کے اندر شرک، بت پرستی، شہوت کی باتیں اور بدنظری کرنا، ان تمام چیزوں اور نجاسات باطنیہ اور ظاہریہ سب دور ہو جائیں اور اس گھر کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھا دو۔

ایک روایت میں آتا ہے: ہم نے عبداللہ بن عمیر سے کہا کہ ہم اُمید کرتے ہیں کہ تم امیر سے یہ بات کرو کہ لوگوں میں بات کہلوائیں کہ اللہ کے گھر (مسجد حرام) میں نہ سویا کریں، کیونکہ سونے کی حالت میں آدمی کو جنابت بھی ہو جاتی ہے، احتلام ہو سکتا ہے اور وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، ایسا نہ کریں۔ ''عاکفین'' میں تو سب آجاتے ہیں اور یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب غیر شادی شدہ تھے تو آپ مسجد الحرام میں سوتے تھے۔ جو اللہ کے گھر میں نماز پڑھنے والے ہیں، ﴿الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ سے مراد وہی ہیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ بتوں سے پاک کرو۔ اس کا کیا معنی کہ ابراہیم علیہ السلام کی بناء سے پہلے یہاں کوئی بت پرستی ہوتی تھی؟ اس کا جو حکم دیا گیا ہے تو اس کے انہوں نے دو جواب دیے ہیں۔

پہلا جواب: یہ حکم دیا گیا کہ اس گھر کو پاک کردو، کیونکہ قوم نوح کے زمانے سے بت پرستی ہوتی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کا حکم اس لیے دیا، تاکہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ عمل بعد والوں کے لیے ایک طریقہ اور سنت بن جائے اور وہ بھی بت پرستوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں جیسا سلوک ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو امام بنایا تھا، تاکہ لوگ آپ کی اقتداء کریں، یعنی ان بتوں سے اس گھر کو پاک کریں جن کی مشرکین عبادت کرتے تھے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس جواب کو تو ہم مان لیتے ہیں، لیکن اس پر کوئی دلیل ہونی چاہیے؛ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے جب یہاں گھر ہی نہیں تھا تو کوئی ایسی قوم تھی جو بتوں کی عبادت کرتی تھی۔ تو اس کے لیے دلیل ہو اور دلیل بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہو۔

دوسرا جواب ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ نقل فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے گھر کو پاک کرو، یعنی خالص اللہ تعالیٰ کے لیے گھر کو بناؤ، اس میں کسی قسم کا شرک نہ ہو۔

دراصل اللہ تعالیٰ کا یہ حکم انبیاء کو ہوتا ہے اور امت کو ہدایت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو فرما رہے ہیں، تاکہ بعد میں مسلمان مساجد بنائیں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لیے بنائیں، مسجدوں میں بدعات نہ ہوں اور صحابہ رضی اللہ عنہم اس بارے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک مسجد میں دیکھا کہ مؤذن اذان دے کر آیا تو اس نے مسجد کی دیوار کے ساتھ لکڑی مار کر اُٹھانا شروع کیا، انہوں نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ اس مؤذن نے کہا کہ جو غفلت میں بیٹھے یا لیٹے ہوتے ہیں، ان کو جگا رہا ہوں، تاکہ لوگ اُٹھ جائیں۔ انہوں نے کہا کہ بس جب اذان ہوگئی تو اس کے بعد اور اعلان کی کیا ضرورت ہے؟ اگر اذان کے بعد ان لوگوں کو احساس نہیں ہے تو پھر اُٹھانے کی کیا وجہ؟

جماعت سے پہلے مسجد میں اجتماعی ذکر:

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دیکھا کہ ایک مسجد میں امام صاحب بیٹھ گئے، لوگوں نے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ امام صاحب اور لوگ پڑھ رہے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہیں، امام صاحب کلمہ پڑھتے ہیں اور تمام مقتدی ان کے ساتھ مل جاتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے،

کوئی غلط چیز نہیں ہے۔ فرمایا: یہ تو بدعت ہے۔ آپ کی آنکھیں مبارک اس وقت چلی گئی تھیں، آپ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھے جلدی اس مسجد سے نکالو، یہ تو بدعتی ہیں، حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اور اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں فروعی مسائل میں اختلاف ہوا ہے تو وہ بھی اس لئے کہ دو روایات مل گئیں۔ کسی نے ایک روایت پر عمل کیا اور کسی نے دوسری روایت پر عمل کیا؛ یہ اس لئے ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کے دو عمل مل گئے۔

کیونکہ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام تو نبی ہیں اور شرک سے پاک ہیں۔ ان کو حکم دیا کہ خالص میری عبادت کے لئے گھر بناؤ، اس میں صرف میری عبادت ہو، کسی اور کا ذکر نہ ہو۔ جیسے دوسری آیت میں فرمایا: ﴿وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآىِٕفِيْنَ وَالْقَآىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ [الحج:۲۶]

مکی صاحب کا واقعہ:

پچھلے سفر میں سردیوں کے دن تھے اور صبح کی نماز کا ٹائم ہو گیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مسجد دیکھیں اور نماز پڑھیں کہ کہیں فجر کا وقت ہی نہ نکل جائے۔ خیر سڑک کے کنارے مسجد آگئی۔ ہم رُکے، مسجد میں داخل ہوئے تو امام صاحب نے سلام پھیر دیا تھا۔ ہم ساتھیوں نے برآمدے میں اپنی جماعت شروع کر دی تو کچھ لوگ کہنے کہ دیکھو جی! یہ مولوی مکی ہے، دوسرے نے کہا: وہابی ہماری مسجد میں کیسے آگئے؟ اور ایک صاحب نے کہا کہ زور زور سے صلوٰۃ وسلام پڑھ کر انہیں جلاؤ، ستاؤ۔ جب تک ہم نماز پڑھتے رہے تو وہ بھی زور زور سے صلوٰۃ وسلام پڑھتے رہے۔ میں نے نماز کے بعد امام صاحب سے سلام ودعا کی اور پوچھا کہ آپ کہاں سے اور کس مدرسے سے پڑھے ہیں اور کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟ وہ امام صاحب تو بُرا مان گئے۔ میں نے کہا: میں تو صرف تعارف پوچھ رہا ہوں کہ آپ بھی مولوی ہیں اور ہم بھی مولوی ہیں۔ لیکن پھر ہم نے ان سے بحث ہی نہ کی کہ ایسے آدمی کو بندہ کیا نصیحت کرے؟

طواف افضل ہے یا نماز؟

اس میں اختلاف ہے کہ کعبۃ اللہ میں نفل نماز افضل ہے یا طواف؟ اور یہ اختلاف نفل عبادت میں ہے، فرض نماز میں نہیں۔ اگر فرض نماز ہو رہی ہو اور ایک آدمی یہ کہے کہ میں طواف کروں تو یہ غلط بات ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ باہر سے آنے والوں کے لئے طواف افضل ہے اور مکہ میں جو مستقل رہنے والے ہیں ان کے لئے نفلی

نماز افضل ہے؛ کیونکہ باہر والوں نے تھوڑے دن رہنا ہے اور پھر چلے جانا ہے، انہیں پھر طواف کی عبادت تو میسر نہیں آسکتی۔ مکہ والا آدمی تو کر ہی لیتا ہے، لیکن باہر سے آنے والے کے لیے طواف افضل ہے، لیکن جمہور کے نزدیک مطلقاً طواف افضل ہے، چاہے مکہ میں رہنے والا ہے یا باہر سے آنے والا۔ اس لیے ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاں بنائے کعبہ کا ذکر آیا، وہاں حج، طواف، نماز اور رکوع و سجود کا ذکر آیا۔ اس میں جہاں مشرکین کا رد ہے وہاں یہود و نصاریٰ کا بھی رد ہے۔

اتباعِ سنت کا واقعہ:

حضور اکرم ﷺ سے محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں، لیکن عمل نہیں ہے تو یہ دعویٰ کیسے سچا ہو سکتا ہے؟ اگر لوگ اپنے پیر کی محبت میں اس جیسا لباس، پگڑی اور ٹوپی استعمال کر سکتے ہیں تو حضور اکرم ﷺ کی محبت میں حضور اکرم ﷺ جیسی شکل کیوں اختیار نہیں کرتے؟ اور زندگی کا ہر عمل حضور اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق کرے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر یہ بات تھی کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حج کے دوران عرفات سے آرہے تھے، عرفات اور مزدلفہ کے درمیان آپ نے اپنی اونٹنی روک دی، پانی لیا اور وہاں سے ہٹ کر تھوڑا دور چلے گئے۔ وہاں ایسے بیٹھ گئے جیسے آدمی رفع حاجت کے لئے بیٹھتا ہے اور کچھ دیر بعد اُٹھ کر آگئے۔ جو خادم دیکھ رہا تھا، اس نے کہا کہ حضرت! ہمیں تو آج مسئلہ سمجھ نہیں آیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ خادم نے عرض کیا کہ آپ تو پیشاب کے لیے گئے اور آپ نے پانی بھی لیا، لیکن وہاں جا کر آپ بیٹھ گئے اور رفع حاجت کے لیے کپڑے بھی نہیں ہٹائے اور اُٹھ گئے تو بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب حج کر کے آرہے تھے تو اسی جگہ میرے مدنی پاک ﷺ نے سواری روکی اور قضائے حاجت کے لیے اُترے تھے۔ مجھے ضرورت تو نہ تھی، لیکن محبوب ﷺ کی اقتداء میں ایسا کیا۔

کیونکہ یہود و نصاریٰ جانتے ہیں کہ یہ گھر ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر بنایا تھا کہ اس گھر کا حج، عمرہ اور اعتکاف کیا جائے اور نماز پڑھیں اور یہود و نصاریٰ تو ان میں کچھ بھی نہ کرتے تھے تو وہ کیسے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے مقتدی ہیں؟ حالانکہ ابراہیم علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت پر عمل بھی نہیں کرتے۔ اس گھر کا حج تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی کیا ہے، اگر تم یہودی موسیٰ علیہ السلام کے دین پر چلتے ہو تو تم حج کیوں نہیں کرتے ہو؟

﴿وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ ہٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارۡزُقۡ اَہۡلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ مِنۡہُمۡ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ
الۡاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاُمَتِّعُہٗ قَلِیۡلًا ثُمَّ اَضۡطَرُّہٗۤ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۲۶﴾ وَ اِذۡ یَرۡفَعُ
اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا
مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَ تُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ
الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۸﴾﴾ [البقرۃ: ۱۲۶تا۱۲۸]

''اور جب عرض کیا ابراہیم نے: اے میرے پروردگار! اس (مکہ) کو امن کا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق دے جو اِن میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے۔ (اللہ نے) فرمایا: اور جو کافر ہوگا میں اس کو بھی اس کی زندگی میں دنیا کا فائدہ دوں گا، پھر اس کو جہنم کے عذاب کی طرف کھینچوں گا اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔ اور یاد کیجیے! جب ابراہیم خانہ کعبہ کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے اور اسماعیل (بھی، انہوں نے دعا کی) اے ہمارے رب! ہماری طرف سے قبول فرما، بے شک تُو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنا تابعدار کر دے اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے سکھا اور ہمیں معاف کر، بے شک تُو ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔''

ربطِ آیات:

ان آیات مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے گھر ہیں، ان کو ظاہراً بھی پاک ہونا چاہیے اور باطناً بھی پاک ہونا چاہیے۔ باطناً پاکی یہ ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کا گھر بنایا جائے تو خاص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہو۔ دوسرا اس کے اندر جو مال خرچ کیا جائے، وہ خالص حلال ہو؛ کیونکہ وہ بھی پاکی کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ مسجد کے اندر کوئی پیسہ حرام، چوری یا سود کا نہ لگایا جائے۔ اسی طرح وہ زمین جس پر مسجد بنائی جائے، خالص حلال پیسے سے شرعی طریقہ سے خریدی جائے یا کوئی آدمی اللہ کے لیے وقف کرے اور وہ زمین غصب کی نہ ہو، زبردستی چھینی ہوئی نہ ہو۔

ظاہری پاکی یہ ہے کہ مسجد کو صاف رکھیں، مسجد کے اندر کوئی ناک صاف نہ کرے، کوئی تھوک نہ ڈالے۔ یہ بہت

بڑا گناہ ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ فوراً اس کا ازالہ کیا جائے۔ مساجد کے اندر خوشبو کرنا سنت ہے، مساجد میں روشنی کا انتظام کرنا، مساجد کے لیے غسل خانے، وضو خانے اور ان کی باقاعدہ صفائی کا اہتمام کرنا چاہیے؛ کیونکہ اگر ان کی صفائی نہیں کریں گے تو وہ قابلِ استعمال ہی نہیں رہیں گے۔ ان تمام چیزوں کا خیال رکھا جائے۔ الغرض ہر لحاظ سے مساجد کو پاک رکھنا ضروری ہے۔

کعبہ کی سب سے پہلی تعمیر:

اس میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا کعبہ کس نے بنایا؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے ملائکہ نے بنایا۔ یاد رکھیں! یہ اختلاف ایسا نہیں کہ اس پر جھگڑا کیا جائے؛ کیونکہ آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک کسی کے پاس تاریخ ہے؟ لازمی بات ہے کہ کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، کچھ مٹ گئیں، کسی کو کوئی روایت ملی اور کسی کو کوئی روایت ملی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ کے کعبہ ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا اور ان پانچ پہاڑوں سے ان پر پتھر لگائے... حراء، طورِ سینا، طورِ زیتا، جبل لبنان اور جبل جودی، لیکن یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت شعیب علیہ السلام نے کعبہ بنایا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ساری روایات اسرائیلیہ ہیں جو سابقہ کتابوں سے لی گئی ہیں۔ اور سابقہ کتابوں کا حال یہ ہے کہ ہم نہ ان کی تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب کر سکتے ہیں اور نہ ان پر کوئی اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ہاں! اگر اس کے بارے میں کوئی صریح حدیث مل جائے تو سر آنکھوں پر ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! اس شہر کو امن والا بنا اور اس میں رہنے والوں کو پھلوں سے رزق عطا فرما، جو تجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور یومِ آخرت پر ایمان لانے والے ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ بَيْتَ اللهِ وَ أَمَّنَهُ، وَ إِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ، فَحَرَامٌ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا، لَا يُصْطَادُ صَيْدُهَا، وَ لَا يُقْطَعُ عِضَاهُهَا." [السنن الکبریٰ للنسائی، رقم: ۴۲۸۴]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے حرام ہونے کے لئے دعا کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں مدینہ پاک

کے حرم ہونے کی دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ اس کے دونوں کناروں کے درمیان کو حرم بنا دے۔ لہٰذا یہاں کوئی اشکال نہ کرے، یہاں حدِ حرم میں درخت کی کوئی ٹہنی نہ کاٹی جائے۔

ائمہ کرام نے فرمایا: اس میں تو اتفاق ہے کہ مکہ کے حرم ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے؛ کیونکہ قرآن میں آ گیا: ﴿وَمَنْ دَخَلَہٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ [آل عمران: ۹۷] البتہ مدینہ منورہ کے حرم ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کا حرم بنانا اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا، اس لئے اس کا بھی وہی حکم ہے جو حرم کا حکم ہے، جبکہ بعض ائمہ کرام فرماتے ہیں: اس کا ادب و احترام بھی اس طرح کیا جائے گا جیسا کہ حرم کا ہے، لیکن اس پر احکام اس طرح مرتب نہیں ہوں گے جو حرم مکہ میں مرتب ہوتے ہیں۔

یہاں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روایات کثیرہ میں ہے کہ پورے حرم مکہ میں ایک نماز کے بدلے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے، جبکہ مدینہ منورہ میں یہ فضیلت مسجد نبوی کے ساتھ خاص ہے۔ اگر مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ کی کسی جگہ نماز پڑھی تو وہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔ نیز یہ فضیلت بھی پچاس ہزار نمازوں کے ثواب ملنے کی ہے، نہ کہ ایک نماز کی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ عَبْدُاللّٰهِ وَ خَلِيلَهُ وَ إِنِّي عَبْدُاللّٰهِ وَ رَسُولُهُ وَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَ إِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا عِضَاهَهَا وَ صَيْدَهَا لَا يُحْمَلُ فِيهَا سِلَاحٌ لِقِتَالٍ وَ لَا يُقطع مِنْهَا شَجَرَةٌ إِلَّا لِعَلَفِ بَعِيرٍ." [تفسیر طبری، رقم: ۲۰۳۰ / کنز العمال، رقم: ۳۸۱۵۶]

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے بندے اور اللہ کے خلیل ہیں اور میں بھی اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا، میں مدینہ منورہ کے بارے میں کہتا ہوں کہ یہ بھی حرم ہے دونوں کناروں کے درمیان میں۔ یہاں بھی شکار نہ کھیلا جائے اور یہاں بھی کسی کے قتل کے لئے ہتھیار نہ اُٹھایا جائے، یہاں بھی کوئی درخت نہ کاٹا جائے۔ ہاں! اگر کوئی ایسے چھوٹے درخت ہیں جو جانوروں کے گھاس کے لئے ضروری ہیں تو اس کے کاٹنے کی اجازت ہے۔ جیسا کہ حرم مکہ کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہاں کوئی ہتھیار نہ اُٹھائے، کوئی قتال نہ کرے؛ کیونکہ یہ امن کی جگہ ہے۔ اور یہاں نہ کوئی شکار کھیلے اور یہاں نہ کوئی لقطہ کا مال اُٹھائے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اذخر، جو چھوٹا سا درخت ہے، یہ تو ہر وقت ہمارے استعمال میں آتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے

اس کے استعمال کی اجازت دے دی۔

مکہ کی طرح مدینہ میں بھی برکتیں ہیں:

اگر کسی آدمی نے حرم میں خود گھاس لگایا ہے تو اس کا کاٹنا جائز ہے، اسی طرح اس نے حد حرم میں کوئی درخت لگایا ہے تو اس کا پھل توڑنا بھی جائز ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ قدرت کی طرف سے جو خودرو چیزیں ہیں، ان میں کوئی تصرف نہ کرے۔

مسلم کے اندر صحیح حدیث مبارک ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں جو نیا پھل آتا تھا صحابہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لے آتے تھے، آپ ﷺ اس پھل کو لے کر یوں دعا فرماتے تھے:

''أَللّٰهُمَّ! بَارِكْ لَنَا فِي ثَمَرِنَا، وَ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا، وَ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا، وَ بَارِكْ لَنَا فِي مُدِّنَا، أَللّٰهُمَّ! إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَبْدُكَ وَ خَلِيلُكَ وَ نَبِيُّكَ، وَ إِنِّي عَبْدُكَ وَ نَبِيُّكَ، وَ إِنَّهُ دَعَاكَ لِمَكَّةَ، وَ إِنِّي أَدْعُوكَ لِلْمَدِينَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ لِمَكَّةَ، وَ مِثْلِهِ مَعَهُ.'' [صحیح مسلم، رقم: ۱۳۷۳]

''یا اللہ! ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما، اے اللہ! ہمارے مدینہ میں برکت عطا فرما، ہمارے صاع میں برکت عطا فرما، ہمارے مد میں برکت عطا فرما، اے اللہ! سیدنا ابراہیم علیہ السلام تیرا بندہ اور تیرا خلیل تھا، اس نے مکہ کے لئے دعا مانگی تھی، میں مدینہ منورہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ یا اللہ! جو تُو نے مکہ میں برکتیں رکھی ہیں، مدینہ میں بھی وہی برکتیں عطا فرما، اے اللہ! اس کے ساتھ اتنی اور برکتیں بھی عطا فرما۔''

اس کے بعد وہ پھل کسی چھوٹے بچے کو دے دیتے تھے۔ یہ حضور اکرم ﷺ کا تفاؤل خیر تھا کہ ادھر پھل نیا ہے اور ادھر بچہ بھی نئی نئی زندگی لے کر آیا ہوتا ہے، جیسے وہ پھل مبارک ہے، اس طرح یہ بچہ بھی مبارک ہے اور معصوم ہے۔

مسلم شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَبِي طَلْحَةَ: إِلْتَمِسْ لِي غُلَامًا مِنْ غِلْمَانِكُمْ يَخْدُمُنِي، فَخَرَجَ بِي أَبُوطَلْحَةَ يُرْدِفُنِي وَرَاءَهُ، فَكُنْتُ أَخْدُمُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلَّمَا نَزَلَ، وَ قَالَ فِي الْحَدِيثِ: ثُمَّ أَقْبَلَ حَتّٰى إِذَا بَدَا لَهُ أُحُدٌ، قَالَ: هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَ نُحِبُّهُ، فَلَمَّا أَشْرَفَ عَلَى الْمَدِينَةِ، قَالَ: أَللّٰهُمَّ! إِنِّي أُحَرِّمُ مَا بَيْنَ جَبَلَيْهَا مِثْلَ مَا حَرَّمَ بِهِ إِبْرَاهِيمُ مَكَّةَ، أَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِي مُدِّهِمْ وَ صَاعِهِمْ.''

[صحیح مسلم، رقم: ۱۳۶۵]

حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم اپنے لڑکوں میں سے کوئی لڑکا تلاش کرو جو میری خدمت میں رہے اور میرے کام کرے۔ ابوطلحہ اپنی سواری کے پیچھے مجھے بٹھا کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لے آئے اور عرض کیا: یہ خادم قبول فرمائیں۔ جب بھی حضور اکرم ﷺ سفر میں راستے میں اُترتے تو میں آپ کی خدمت کرتا۔ جب حضور اکرم ﷺ کی دور سے جبلِ اُحد پر نظر پڑتی تو آپ ﷺ فرماتے تھے: یہ وہ پہاڑ ہے جو ہمیں دوست رکھتا ہے اور ہم اسے محبوب رکھتے ہیں۔ اور جب حضور اکرم ﷺ مدینہ آجاتے تو یہ فرماتے تھے: یا اللہ! ان دو پہاڑوں کے درمیان جو جگہ ہے میں اس کو حرم قرار دیتا ہوں، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا۔ اور فرماتے: اے اللہ! ان کے کیل میں، ان کے مد میں اور ان کے صاع کے اندر برکت عطا فرما۔ حضور اکرم ﷺ یہ بھی فرماتے: اے اللہ! تُو نے جتنی مکہ کے حرم میں برکت رکھی ہے، مدینہ میں اس سے دوگنی عطا فرما۔

محدثین وعلماء نے لکھا ہے کہ ہمارا تجربہ ہے کہ اگر مکہ میں دو کلو سے ایک گھرانے کا گزر ہوتا ہے تو مدینہ میں ایک کلو سے گزارا ہو جاتا ہے، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے واقعی اس کے اندر دوگنی برکتیں رکھی ہیں۔

مکہ ومدینہ کے پہاڑ سرسبز کیوں نہیں؟

مکہ اور مدینہ کے پہاڑ خشک ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھے کہ وہ مکہ ومدینہ کے پہاڑوں کو سرسبز بنا دیتے، ان پر باغات اور پھول کھل جاتے، ٹھنڈا موسم بن جاتا، لیکن پروردگار عالم یہ چاہتے ہیں کہ جو میرے گھر میں آئے تو خالص میرے گھر کے لئے آئے، اس کا کوئی دوسرا ارادہ نہ بن سکے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہاں کا کانٹے دار درخت بھی نہ کاٹا جائے، یعنی کانٹے دار درخت کو تو کوئی بھی نہیں کاٹتا، ثمر دار درخت کو کاٹتے ہیں، لیکن جب کانٹے دار کا کاٹنا منع ہے تو ثمر دار کا بطریق اولیٰ منع ہو گیا۔

مکہ اور مدینہ میں کون افضل ہے؟

مکہ افضل ہے یا مدینہ افضل ہے؟ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جمہور ائمہ کی رائے یہ ہے کہ مکہ افضل ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور ان کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مدینہ افضل ہے۔

بعض جاہل لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ مدینہ کی فضیلت کو نہیں مانتے۔ مکہ بھی اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور مدینہ میں اللہ کے حبیب اور رسول ﷺ مدفون ہیں۔ علمی اعتبار سے بحث ہے کہ افضلیت کا مرتبہ کس کو ملا ہے؟ جیسا کہ

حضرت آدم علیہ السلام بھی افضل ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی افضل ہیں، لیکن سب سے افضل کون ہیں؟ سب سے افضل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اب بعض لوگ کہیں گے کہ باپ سے بھی افضل ہیں تو ہم کہیں گے کہ ہاں! کبھی بیٹا باپ سے بڑھ جاتا ہے، اس طرح مدینہ بھی شان والا اور مکہ بھی شان والا ہے، باقی سب سے افضلیت کس کی ہے؟ تو جمہور کی رائے ہے کہ مکہ افضل ہے۔

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی: اے اللہ! اس بلد کو امن والا بنا، اس میں رہنے والوں کو کوئی ڈرائے نہیں اور وہ امن وعزت سے رہیں۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی کہ حرم کو عزت کے لحاظ سے بھی امن والا بنایا اور شرف کے لحاظ سے بھی امن والا بنایا۔

اشکال:

کسی کے دماغ میں اب اشکال آرہا ہوگا کہ یہاں تو پولیس والے ہتھیار لے کر کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ قرآن و حدیث کے خلاف ہے۔

جواب:

یہ غلط بات ہے۔ حدیث میں جو ہتھیار اُٹھانے سے منع فرمایا گیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ فساد کی نیت سے نہ چلے، امن کے لیے جو ہتھیار لے کر پھرے وہ تو اُلٹا ثواب میں آئے گا، تاکہ کوئی ڈاکو ڈاکہ نہ مار سکے اور کوئی چور چوری نہ کر سکے۔

اللہ کی طرف سے مکہ کی آبادی کا انتظام:

﴿هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ اس پر ''الف لام'' نہیں ہے، آگے ایک جگہ اس جگہ کا ذکر کیا تو وہاں ﴿هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا﴾ فرمایا، اس پر ''الف لام'' ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کعبہ کے بننے سے پہلے کی دعا ہے اور ایک کعبہ تعمیر ہو جانے کے بعد کی دعا ہے۔ بعد کی دعا میں آپ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی: اے اللہ! اس گھر کو اور اس کے اندر رہنے والوں کو قرار اور امن عطا فرما۔ اور یہ اس وقت کی دعا ہے جب حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہو گئے تھے تو حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام سے چھوٹے ہیں۔ اس وجہ سے دعا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ﴾ [ابراہیم:۳۹] کہا: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ مجھے بڑھاپے میں اولاد عطا فرمائی، اسماعیل بھی عطا فرمائے اور اسحاق بھی عطا فرمائے۔

﴿وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی۔ گویا کہ وہ رزق اور نعمتیں مومن کے ساتھ خاص کرنا چاہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا کہ دنیا کی نعمتیں تو ہم کافر کو بھی دیتے ہیں، جبکہ آپ جو دعا مانگ رہے ہیں کہ جو مومن ہوں، ان کو رزق ملے۔ کافر بھی تو میری مخلوق تھا، ان کو بھی میں نے پیدا کیا ہے، ان کو بھی تو میں رزق دوں گا، پھر ہم ان کو جہنم میں ڈالیں گے۔

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾

[البقرة:۱۲۷]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''القواعد''، قاعدۃ کی جمع ہے، یعنی بنیادیں جن پر عمارت بنائی جاتی ہے۔ ان آیات میں ہمیں یہ سبق مل رہا ہے کہ اگر آدمی اچھے کام کر رہا ہے، نماز پڑھ رہا ہے، روزہ رکھ رہا ہے اور خیرات کر رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے: اے اللہ! اس کو قبول فرمالے! کیونکہ کوئی نہ کوئی کمی تو ضرور ہوتی ہے، وہ بادشاہوں کے بادشاہ ہیں، انہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، اگر وہ ساری دنیا کی دعائیں رد کر دیں تو کون پوچھ سکتا ہے؟ اور اگر قبول فرمانے پر آئیں تو ہماری ایک معمولی سی بات بھی قبول فرمالیں۔ اس لئے اس سے سبق ملتا ہے کہ انسان کوئی بھی کام کرے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ اے اللہ! اس کو قبول فرما، تو ہی ہماری دعاؤں کو سننے والا ہے۔ دوسرا اس سے یہ سبق ملا کہ اچھے کام کے بعد دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔ اس لئے ترغیب ہے کہ نماز کے بعد دعا کرو، اذان اور اقامت کے درمیان دعا کرو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ سب سے پہلے منطق (چادر اس طرح باندھنا کہ پاؤں کے نشانات مٹ جائیں) بی بی صاحبہ نے اختیار کیا تھا، تا کہ دوسری بی بی کو پتا نہ چلے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو لے آئے اور گھر کے قریب جہاں زمزم ہے، اس مقام پر اپنے بیٹے اور بیوی کو اُتارا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ اس زمانہ کی بات ہے جب مکہ میں کوئی بندہ بھی نہیں تھا اور گھر بھی نہیں تھا اور پانی بھی نہیں تھا اور ایک چھوٹی بوری جس میں کھجوریں اور ایک مشکیزہ پانی کا تھا، وہاں رکھ دیا، اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام واپس چل پڑے۔ آپ کی بیوی آپ کے پیچھے چلیں اور کہہ رہی تھیں: آپ ہمیں یہاں چھوڑ کر کہاں

جا رہے ہیں؟ ایک ایسی وادی میں ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں جہاں کوئی انسان بھی نہیں، کوئی آبادی بھی نہیں ہے۔ بی بی صاحبہ نے یہ بات کئی دفعہ کہی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام مڑ کر پیچھے بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔ بی بی نے پوچھا: کیا یہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ہاں! اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ بی بی نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہے تو اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائیں گے۔ اس کے بعد بی بی صاحبہ واپس آگئیں۔ جب حضرت ابراہیم مقامِ ثنیہ پر پہنچے تو رخ قبلہ کی طرف کر کے ہاتھ اُٹھائے اور اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی: ﴿رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ﴾ [ابراہیم: ۳۷] بی بی صاحبہ اس مشکیزہ کے پانی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی پانی دیتیں اور خود بھی پیتی رہیں۔

جب پانی ختم ہو گیا تو بی بی صاحبہ بھی پیاسی ہو گئیں اور بچہ بھی پیاسا ہو گیا۔ بچہ تڑپنے لگا تو بی بی صاحبہ نے دیکھا کہ قریبی پہاڑ صفا ہے۔ اس پر چڑھیں کہ شاید کوئی پرند کسی جگہ نظر آ جائے، کوئی آدمی یا کوئی آبادی نظر آئے، کوئی پانی کا نشان ملے، اللہ تعالیٰ پانی کا کوئی ذریعہ بنا دیں۔ بی بی صاحبہ صفا سے اُتریں، وادی کے اندر اُتریں، کپڑے اونچے کیے اور تیز تیز چلیں، تاکہ اونچائی پر چڑھوں، تو مروہ پر چڑھیں۔ اس طرح بی بی صاحبہ سات دفعہ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صفا و مروہ کی سعی کو لازمی قرار دیا۔

بی بی صاحبہ جب مروہ پر چڑھیں تو آواز سنی تو اپنے آپ سے کہنے لگیں: کیا ہے؟ یہ آواز کہاں سے آئی ہے؟ اس کے بعد جب دوبارہ آواز آئی تو فرمایا: کون ہے جو آواز دے رہا ہے؟ تمہارے پاس کوئی مدد کا ذریعہ ہے تو ہماری مدد کرو۔ تم ایسے آواز دے رہے ہو اور نظر نہیں آتے ہو۔ دیکھا اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑیاں تھیں وہاں اپنا پر مارا تو وہاں سے اللہ تعالیٰ نے پانی ظاہر فرما دیا۔ بی بی صاحبہ اس پانی کو روکنے اور بھرنے لگیں، لیکن نیچے سے پانی اور نکل آتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحمت فرمائے، اگر وہ پانی نہ روکتیں تو اللہ تعالیٰ اس کو جاری ہونے والا چشمہ بنا دیتے۔

اس کے بعد اس فرشتے نے کہا: بی بی! مت گھبرائیں، یہاں اللہ تعالیٰ کا ایک گھر ہے، یہی لڑکا بڑا ہو کر اور اس کا ابا اس گھر کو بنائیں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ضائع نہیں کریں، ان کی حفاظت فرمائیں گے، آپ فکر نہ کریں۔

کعبۃ اللہ اس وقت ایک ٹیلہ کی شکل میں تھا، جب بارشوں کی وجہ سے سیلاب آتا تو پانی اس سے اِدھر اُدھر بہہ

جاتا اور یہ جگہ باقی رہتی تھی۔

کعبہ کے قریب قبیلہ جرہم کا پڑاؤ:

اس کے بعد قبیلہ جرہم کے لوگوں نے اَسفل مکہ کداء کے مقام پر اتر کر دیکھا کہ وہاں پرندہ اُڑ رہا ہے۔ یہ علامت ہوتی تھی کہ پرندہ کسی پانی والی جگہ پر ہی ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ لازمی بات ہے کہ یہ پرندہ کسی پانی کے چکر لگا رہا ہے۔ ہمیں تو ایک زمانہ گزر گیا، لیکن ہم نے کبھی اس وادی میں پرندہ نہیں دیکھا۔ الغرض انہوں نے ڈول کھینچنے والوں کو بھیجا، انہوں نے پانی دیکھا۔ بی بی صاحبہ بھی وہاں موجود تھیں، وہ ان کے پاس آئے اور کہا: اگر آپ اجازت دیں تو ہم اس پانی کے قریب اپنا پڑاؤ ڈال دیں۔ بی بی صاحبہ نے کہا: رہنے سے کوئی منع نہیں، لیکن پانی پر تمہاری ملکیت نہیں ہوگی۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ اور سب آکر وہیں ٹھہر گئے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پہلی شادی اور ابراہیم علیہ السلام کی ملاقات کا واقعہ:

حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی جوان ہونے لگے تو قبیلہ جرہم سے انہوں نے عربی سیکھی۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہوئے تو بڑے خوبصورت تھے، قبیلہ جرہم کے لوگوں نے اپنے قبیلے کی ایک عورت سے آپ کی شادی کر دی۔ اُمِ اسماعیل فوت ہوگئیں (اور حطیم میں مدفون ہیں)۔

مدتوں کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے، تاکہ اپنے بچوں کی خبر معلوم کریں۔ جب آپ آئے تو اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے گھر میں نہیں تھے، آپ کی بیوی موجود تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ اسماعیل کہاں ہیں؟ اس نے کہا: وہ شکار کرنے گئے ہیں، تاکہ کچھ کھا سکیں۔ ان کی بیوی نے کہا: ہم بڑے برے حال میں ہیں، بس ایک پانی ہے یا کوئی پرندہ کھا لیا، اور تو کوئی چیز ملتی نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اچھا! میں تو جا رہا ہوں، لیکن جب تیرا خاوند آجائے تو ان کو کہنا کہ ایک بزرگ آئے تھے، آپ کو سلام کہتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل ڈالو۔ نبی کے گھر میں ایسی عورت کیسے زیب دے سکتی ہے جو اللہ کا شکر نہ کرے؟ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو ان کو بھی لگا کہ گھر میں کوئی آیا ہے۔ اس لیے آپ نے پوچھا کہ گھر میں کوئی آیا تھا؟ ان کی بیوی نے کہا: ایک بزرگ آئے تھے اور ان کی ایسے ایسے شکل تھی، انہوں نے آپ کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتا دیا۔ انہوں نے پوچھا کہ تمہارا گزر اوقات کیسے ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ ہم تو بڑی تنگی

میں ہیں۔ آپ نے فرمایا: پھر انہوں نے کچھ حکم بھی دیا؟ ان کی بیوی نے کہا: انہوں نے آپ کو سلام کہا تھا اور کہا تھا کہ دروازے کی چوکھٹ بدل ڈالو۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا: وہ آنے والے میرے ابا ابراہیم علیہ السلام تھے اور وہ مجھے حکم دے گئے ہیں کہ میں تجھے چھوڑ دوں۔ چنانچہ اسماعیل علیہ السلام نے اس عورت کو طلاق دے دی۔

اس کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام نے دوسری شادی کر لی۔ پھر دوبارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے، انہوں نے اسماعیل علیہ السلام کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے؟ بیوی نے کہا: ہم تو بڑے مزے میں ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: تم کیا کھاتے ہو؟ اس نے کہا: گوشت کھاتے ہیں۔ پوچھا: تمہارا پینا کیا ہے؟ کہا: پانی ہے۔ آپ نے دعا فرمائی: اے اللہ! ان کے گوشت اور پانی میں برکت دے...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس زمانے میں دانے تو نہیں ہوتے تھے، اگر ہوتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے لیے بھی دعا فرما دیتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی برکت ہے کہ آدمی مکہ میں جتنا گوشت کھاتا ہے، اس کو نقصان نہیں دیتا۔ ورنہ اگر اتنا گوشت دوسری جگہ کھائے تو کبھی اس کے موافق نہ آئے اور کوئی نہ کوئی نقصان ہو جائے...... حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی بیوی سے فرمایا: جب تمہارے خاوند آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ اپنے گھر کے دروازے کی چوکھٹ کو ثابت قدم رکھو۔ اتنا کہہ کر آپ چلے گئے۔ جب اسماعیل علیہ السلام آئے تو پوچھا: کچھ لوگ آئے تھے؟ بیوی نے کہا: بڑے خوبصورت چہرے والے ایک بزرگ آئے تھے۔ آپ نے فرمایا: وہ میرے ابا تھے اور دروازے کی چوکھٹ تم ہو۔ وہ مجھے حکم دے گئے ہیں کہ میں تمہیں اپنے نکاح میں برقرار رکھوں۔

کچھ مدت بعد زمزم کے چشمے کے قریب حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے تیروں کو ٹھیک کر رہے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لے آئے۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دیکھا، اُٹھے اور ایک دوسرے کو ملے، جیسا کہ باپ بیٹا ملتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: بیٹا! اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عرض کیا: جو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اس کو پورا کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ کیا تم میری مدد کرو گے؟ کہا: میں آپ کی مدد کروں گا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ یہاں گھر بناؤ۔ یہ جو ٹیلہ ہے، اس جگہ اللہ تعالیٰ کا گھر بنانا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر اُٹھا کر لا رہے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کر رہے ہیں۔ جب بنیادیں بن گئیں تو (مقامِ ابراہیم والے) پتھر کو لا رہے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر کھڑے ہو گئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر

دیے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام لگاتے تھے اور دونوں اس وقت دعائیں بھی مانگ رہے تھے: ﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝﴾ [البقرة: ۱۲۷]

ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں آئے تو جس جگہ اللہ تعالیٰ کا کعبہ ہے، یہاں ایک بدلی دیکھی۔ اس سے آواز آئی کہ اے ابراہیم! جہاں سایہ ہے وہاں نشان لگا کر اللہ کا گھر بناؤ، نہ بڑھاؤ اور نہ گھٹاؤ۔ اس روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا گھر ہی بنانے آئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کا گھر بنا تو بیوی اور بیٹے کو چھوڑ گئے۔ اور پہلی روایت میں پڑھا کہ پہلے بیوی کو چھوڑ گئے، پھر بعد میں اللہ کا کعبہ بنایا۔ پہلی روایات صحیح ہیں، ان کو امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان دونوں اقوال جو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ پہلے آپ نے پتھر پر رکھ کر نشان بنا لیا اور باقی عمارت بعد میں آ کر بنائی۔

ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور پوچھا: یہ خانہ کعبہ پہلا گھر ہے جو زمین پر مکرر کیا گیا؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: برکت کے اعتبار سے یہ پہلا گھر ہے اور میں تجھے بتاؤں، واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ جا کر میرا گھر بنائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تنگی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے سکینت اُتاری، جو ایک ہوا کی شکل میں تھی اور اس کے دو سر بھی تھے، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آ کر اس گھر کے اوپر کھڑی ہوگئی کہ جہاں سایہ ہے، اس جگہ بناؤ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کر رہے تھے حجر اسود والی جگہ باقی تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام تلاش کرنے کے لیے گئے۔ جب واپس آئے تو دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حجر اسود اس مقام پر لگا چکے تھے۔ انہوں نے پوچھا: اباجان! میں تلاش کرتا رہا، مجھے تو نہیں ملا۔ انہوں نے کہا: یہ میرے پاس جبرائیل علیہ السلام لائے ہیں۔

قاعدہ ہے کہ جو واقعات ہزاروں سال قبل پیش آئے ہیں، ان میں محدثین، مفسرین کو جتنی زیادہ معلومات مل سکیں، وہ سب جمع کر دی ہیں، تا کہ آدمی کو کامل معلومات مل جائیں۔ باقی جتنی صحیح روایات میں ہوں، ان کو آدمی لے لے اور جتنی غلط ہوں، ان کو چھوڑ دے۔

حضرت کعب الاحبار سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پانی پیدا فرمایا تو زمین، پانی کے اوپر جھاگ جیسی تھی، اسی جگہ سے زمین کو بچھایا اور پھیلایا گیا۔

کعبہ کے بناء کے پتھر بڑے بڑے تھے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ارمینیہ سے کعبہ شریف بنانے کے لئے یہاں تشریف لے آئے تو آپ کے ساتھ سکینہ (بادل کا ٹکڑا) بھی آیا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتاتا تھا کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ کا گھر بناؤ، جیسا کہ عنکبوت (مکڑی) اپنا جال بناتی ہے۔ جب آپ نے اس جگہ کو کھولا تو ایسے بڑے بڑے پتھر پائے گئے کہ ایک پتھر کو تیس تیس آدمی اُٹھا سکتے تھے۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ قرآن میں تو آیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کی تعمیر کر رہے تھے، جبکہ آپ فرمار ہے ہیں کہ اس کا ایک ایک پتھر اتنا بھاری تھا کہ اس کو تیس آدمی بھی نہیں اُٹھا سکتے تھے؟ آپ نے فرمایا: یہ تو بعد کی تعمیر ہے، لیکن جو پہلے تعمیر تھی، اس کے پتھر اتنے بڑے تھے۔ یا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے لئے پتھروں کا معجزۃً اُٹھانا آسان کر دیا ہو تو کوئی بعید بات نہیں ہے۔

کعبہ کی جگہ کا تعین کیسے ہوا؟

حضرت سدی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ میرا گھر بناؤ طائفین کے لیے، رہنے والوں کے لئے اور نماز پڑھنے والوں کے لئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام چل پڑے۔ جب مکہ آئے تو آپ نے پھاوڑا (کَسّی) ساتھ لیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام دونوں کو علم نہیں تھا کہ اللہ کے گھر کا طول وعرض کتنا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی، اس کا نام خجوج تھا، اس کے دو پَر اور ایک سر تھا۔ سانپ کی شکل میں وہ آئی اور اس نے آکر وہ جگہ بتائی کہ جہاں آج کعبۃ اللہ کی بنیاد ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے اوزاروں کے ساتھ وہاں کھدائی شروع کی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی بنیادیں کھودی گئیں، اس کی دیواریں اُٹھالیں اور اس مقام پر پہنچ گئے جہاں حجرِ اسود نصب کیا گیا ہے۔

اسماعیل علیہ السلام کو حجرِ اسود کی تلاش کا حکم:

جب حجرِ اسود کی جگہ دیواریں تعمیر کرلیں تو انہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا: جا کر کوئی خوبصورت پتھر لے آؤ۔ انہوں نے کہا: اب مجھ میں جانے کی ہمت نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اس کو پورا کرنا ہے، تم جا کر تلاش کرو۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام تلاش کرنے کے لیے نکلے تو اتنی دیر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام

حجر اسود ہندوستان سے لے آئے۔ حجر اسود کو اصل میں جنت سے اُتارا گیا تھا۔ اس کے اندر سفیدی تھی، لوگوں کے ہاتھ لگانے اور ان کے گناہوں کی وجہ سے سیاہی آگئی، ورنہ یہ بے حد روشن تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے اور دیکھا کہ بڑا خوبصورت پتھر لگ گیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کون لے کر آیا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: وہ لے آیا ہے جو بہت زیادہ نشاط والا ہے، اس کو تھکن نہیں ہوتی۔

کعبہ کی بنیادیں:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان روایات کو اگر سامنے رکھیں تو یہ بات سمجھ آتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بھی کعبہ کی بنیاد موجود تھی۔ حضرت عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اُتارا تو ان کو اتنا طول عطا فرما دیا کہ آپ کا سر آسمانوں میں تھا اور پاؤں زمین میں تھے، آپ ملائکہ کی دعائیں اور ان کی تسبیحات سنتے تھے تو آپ کو تسلی اور اطمینان رہتا تھا، لیکن ملائکہ پر ایک قسم کی ہیبت اور خوف طاری رہتا تھا۔ انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا مانگی کہ ہمارے اس خوف کو زائل کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے قد کو کم کر دیا، جس کی وجہ سے فرشتوں کا ذکر نہیں سن سکتے تھے۔ اب آدم علیہ السلام اُداس ہو گئے کہ دنیا میں اکیلے ہیں اور کسی سے بات نہیں ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اب میں اکیلا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ میرے گھر کی طرف آؤ اور وہاں آ کر میرا گھر بناؤ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ساٹھ ہاتھ کا اتنا بڑا قد عطا فرمایا تھا کہ بہت جلد زمین کا فاصلہ طے کر لیتے تھے۔ اس طرح آپ چلتے چلتے مکہ مکرمہ تشریف لے آئے اور اللہ کے گھر کی تعمیر فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے جنت سے ایک یاقوت بھی اُتارا جو اس گھر میں رکھا گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے اس گھر کا طواف ہوتا رہا، حتیٰ کہ جب طوفانِ نوح آیا تو یہ گھر بہہ گیا اور اس میں حجر اسود بھی بہہ گیا، وہاں ایک ٹیلہ سا رہ گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا اور انہوں نے کعبہ بنایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: میری قوم نے کعبۃ اللہ کو چھوٹا کر دیا، بنائے ابراہیمی پر نہیں رکھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: آپ پھر بنائے ابراہیمی پر کعبہ بنا دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لَوْلَا حَدَاثَةُ عَهْدِ قَوْمِكِ بِالْكُفْرِ لَنَقَضْتُ الْكَعْبَةَ، وَ لَجَعَلْتُهَا عَلَى أَسَاسِ إِبْرَاهِيمَ، فَإِنَّ قُرَيْشًا حِينَ بَنَتِ الْبَيْتَ اسْتَقْصَرَتْ، وَ لَجَعَلْتُ لَهَا خَلْفًا.'' [صحیح مسلم، رقم: ۳۲۳۳]

یعنی تیری قوم ابھی نئی نئی اسلام میں آرہی ہے، اگر میں نے کعبۃ اللہ کو توڑ کر رد و بدل کیا تو ان کے لیے فتنہ اور امتحان نہ بن جائے، لوگ کہنے لگ جائیں کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ کے نبی نے کعبہ توڑ دیا۔ اس لیے علماء اور فقہاء نے لکھا ہے کہ بعض اوقات ایک مسئلہ صحیح ہوتا ہے، لیکن بیان کرنے میں فتنہ کا اندیشہ ہو تو آدمی بیان نہ کرے، بلکہ چپ کر جائے اور آہستہ آہستہ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی روایت ہے کہ تیری قوم ابھی جاہلیت سے نکل کر اسلام میں آرہی ہے، اگر ایسی بات نہ ہوتی تو اللہ کے کعبہ کے اندر جو خزانہ ہے، اس کو میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں لٹا دیتا...... پہلے زمانہ کے اندر کعبہ شریف کے اندر کنویں کی طرح ایک جگہ بنی ہوئی تھی، جو لوگ صدقہ کرتے تھے تو درہم، دینار، سونا، چاندی اس میں ڈال دیتے تھے، اس طرح خزانہ جمع ہوتا رہتا تھا...... لیکن لوگ ابھی نئے نئے اسلام میں آئے ہیں، اعتراض کریں گے اور پھر سے کفر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بھی میرا ارادہ ہے کہ میں کعبۃ اللہ کو بنائے ابراہیم پر بناؤں کہ حطیم کا حصہ بھی اندر داخل کر دوں اور کعبۃ اللہ کا دروازہ زمین پر رکھوں۔

حضرت اسود رحمہ اللہ سے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا آپ سے بڑی راز کی باتیں کہتی تھیں، بتاؤ انہوں نے کعبہ کے بارے میں کیا فرمایا؟ انہوں نے کہا کہ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ کا ارادہ تھا کہ اس کے دو دروازے رکھے جائیں اور دونوں دروازے زمین پر ہوں، تاکہ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوں اور دوسرے دروازے سے آسانی سے نکل جائیں۔

اب آگے ان روایات و واقعات کا بیان ہے۔ قریش نے جو کعبۃ اللہ کی تعمیر کی تھی، اس کا ذکر ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کے ساتھ مل کر کعبہ کے پتھر بھی اُٹھائے ہیں، اس وقت آپ ﷺ کی عمر پینتیس سال تھی...... اللہ تعالیٰ کے آپ پر کروڑوں صلوٰۃ و سلام ہوں...... جب حضور اکرم ﷺ کی عمر پینتیس سال تھی، قریش اکٹھے ہوئے، تاکہ اللہ تعالیٰ کے کعبہ کو بنائیں اور اس کے اوپر چھت بھی ڈالیں؛ کیونکہ پہلے چھت بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ ڈرتے تھے کہ اس کو کیسے توڑیں!؟ اس وقت انسان کے قد کے برابر دیواریں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں کسی نے اللہ کے کعبہ کے خزانے سے مال چوری کر لیا تھا، اس لیے انہوں نے سوچا کہ اس طرح تو کوئی بھی دیوار پھلانگ کر چوری کر لیتا ہے تو یہ چوری کرنے والا دویک تھا جو بنو ملیح کا غلام تھا جو قبیلہ خزاعہ کی شاخ تھا۔ وہ پکڑا گیا تو قریش نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ حالانکہ اس وقت اسلامی قوانین نازل نہیں ہوئے تھے، لیکن قریش کو بھی سمجھ تھی کہ

جو ہاتھ اتنا لمبا ہو جائے کہ جو اپنے گھر کی بجائے دوسرے کے گھر میں داخل ہو جائے، اپنی جیب کی بجائے دوسرے کی جیب میں داخل ہو جائے تو اس کو چھوٹا کر دو، تا کہ اپنی حد پر آ جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اصل وجہ یہ تھی کہ چوری تو کسی اور نے کی تھی اور چوری کے بعد وہ دو یک کے پاس چھوڑ آئے۔ تجار روم میں سے کوئی تاجر تھا، اس کا کشتی پر سامان جا رہا تھا، دریا میں جوش آیا تو اس طوفان نے اس کشتی کو جدہ کے کنارے پٹخ ڈالا، وہ کشتی ٹوٹ پھوٹ گئی۔ قریش مکہ نے اس کشتی کی لکڑی خریدی، تا کہ کعبۃ اللہ کی چھت ڈالی جائے۔ مکہ میں قبط کے علاقہ کا ایک ترکھان بھی تھا، اس کو تیار کیا گیا کہ ان لکڑیوں کو ٹھیک کرے۔

کعبۃ اللہ کے خزانے کے اندر ہر دن ایک سانپ نکل آتا تھا، وہاں رہتا اور چکر لگاتا تھا اور کبھی کبھی وہ کعبہ کی دیوار کے اوپر چڑھ جاتا تھا۔ قریش اس کو دیکھ کر ڈرتے تھے۔ اگر کوئی آدمی اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا یا خزانے کے قریب جانے کی کوشش کرتا تو وہ سانپ اپنا منہ کھولتا اور اس پر حملہ کرتا۔ قریش نے ایک دن دیکھا کہ وہ سانپ اللہ کے کعبہ کی دیوار پر بیٹھا ہے، اللہ نے ایک بڑا پرندہ بھیجا، وہ سانپ کو اُٹھا کر لے گیا۔ قریش کہنے لگے: معلوم ہوتا ہے کہ اللہ راضی ہو گیا ہے ہم جو کعبہ بنانا چاہتے ہیں، ہمارے پاس ایک ترکھان بھی ہے اور ہمارے پاس لکڑی بھی جمع ہے اور اللہ تعالیٰ نے سانپ کو بھی ہٹا دیا ہے۔ یہ ساری اس بات کی علامات ہیں کہ اب ہم اللہ کا کعبہ بنائیں۔

جب انہوں نے تیاری کر لی کہ کعبۃ اللہ کی دیوار کو گرانے کے بعد بنائیں تو ابو وہب بن عمرو بن عائذ بن عبد بن عمران بن مخزوم کا ایک آدمی تھا، اس نے کعبہ شریف کا ایک پتھر اُٹھایا تو پتھر اس کے ہاتھ سے نکل کر وہاں لگ گیا جہاں سے اس نے اُٹھایا تھا۔ اس نے کہا: قریشیو! ٹھہر جاؤ، پہلے تم یہ فیصلہ کر لو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کعبہ میں کوئی حرام کا پیسہ نہیں لگاؤ گے، خالص حلال کا پیسہ لگاؤ گے، ورنہ تم کعبہ نہیں بنا سکتے۔ انہوں نے کہا: یہ بات ٹھیک ہے۔

جب کعبۃ اللہ کو بنانے کے لیے قریش جمع ہوئے تو انہوں نے کہا کہ کعبۃ اللہ کو بنانے کے لیے سب قبائل کو تقسیم کر لو، تا کہ سب شریک ہو جائیں۔ دروازے والی جانب بنو عبد مناف اور زہرہ کے حصہ میں آئی، حجر اسود سے لیکر رکن یمانی تک بنو مخزوم اور قریش کے دیگر قبائل کے حصے میں آئی، کعبہ کی پشت بنو جمح اور بنو سہم کے حصہ میں آئی، حطیم والی دیوار بنو عبد الدار بن قصی اور بنو اسد بن عبد العزیٰ بن قصی اور بنو عدی بن کعب بن لوی کے حصہ میں آئی۔

اب لوگ ڈرے کہ اللہ کے کعبہ کو کیسے گرائیں؟ ولید بن مغیرہ کہنے لگا: میں ابتداء کرتا ہوں۔ تاریخ مکہ میں ہے کہ ولید بن مغیرہ جب توڑنے کے لیے کھڑا ہوا تو اس نے کہا: اے اللہ! ہمیں ڈرانا نہیں، یا اللہ! ہم بھلائی کا کام کرنا

چاہتے ہیں، تُو جانتا ہے کہ ہم تیرا گھر بنانا چاہتے ہیں، ورنہ ہمارا کوئی توہین کا ارادہ نہیں ہے۔ اور اس نے رکنین کی جانب سے توڑا اور کہا: اب رات کا انتظار کرو، اگر رات کو کوئی عذاب آ گیا تو پھر ہم کعبہ کو نہیں توڑیں گے، جو توڑا ہے اس کو پھر بنا دیں گے اور اگر عذاب نہ آیا تو ہم سمجھیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کعبہ کے بنانے پر راضی ہے۔

دوسرے دن پھر تیار ہو کر آ گیا۔ لوگوں نے دیکھ لیا کہ اس کو کچھ نہیں ہوا تو لوگ بھی اس کے ساتھ مل گئے کہ ہم بھی توڑتے ہیں اور اس کو بناتے ہیں۔ توڑتے توڑتے وہ اس بنیاد پر پہنچے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھی تھی۔ دیکھا کہ سبز رنگ کے پتھر ہیں جیسے انہوں نے ایک دوسرے کو پکڑا ہوا ہے۔

بعض لوگوں نے یہ روایت کی کہ ایک آدمی نے لوہے کا کدال اس پر مارا، تاکہ پتھر علیحدہ ہو جائیں تو پورا مکہ ہل گیا، لوگ ڈر گئے اور انہوں نے کہا: اب اس میں اور کچھ نہ کرو۔ پھر انہوں نے اس سے نیچے جانے کی کوشش نہیں کی۔ قریش کے سب قبائل نے علیحدہ علیحدہ پتھر اکٹھے کیے اور بنیادیں تعمیر کرتے رہے۔

جب حجر اسود کے مقام پر آ گئے تو حجر اسود کے لگانے میں اختلاف ہو گیا، ہر قبیلہ کی خواہش تھی کہ میں لگاؤں، تاکہ قیامت تک میرا نام زندہ رہے۔ اس کا نتیجہ لڑائی تک آ گیا کہ جو جیت جائے گا وہی حجر اسود کو رکھے گا۔ بنو عبد الدار نے ایک بڑا تھال خون کا بھرا اور بنو عدی بن کعب بن لوی کو بلایا کہ آ کر اس خون میں ہاتھ ڈال کر وعدہ کرو کہ ہم مر جائیں گے، لیکن حجر اسود کو ہم رکھیں گے۔ چار پانچ راتوں تک یہ جھگڑا چلتا رہا، پانچ راتوں کے بعد مسجد الحرام میں اکٹھے ہوئے اور مشورہ کیا کہ اس وقت ان سب سے عمر میں بڑا ابواُمیہ بن المغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخذوم تھا، جو اُن میں سب سے بڑی عمر کا تھا، اس نے کہا: اے بنو قریش! لڑائی نہ کرو، اس دروازے سے جو آدمی سب سے پہلے داخل ہوگا، اس کو تم اپنا حاکم بنا لو، وہ جو فیصلہ کرے اس کو تم قبول کر لینا۔

چنانچہ سب سے پہلے جو داخل ہوئے، وہ سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ تھے۔ جب قریش نے آپ ﷺ کو دیکھا تو سارے خوش ہو گئے اور کہا: یہ امانت والا ہے، اس کے فیصلے پر ہم سب راضی ہیں۔ اس طرح انہوں نے حضور اکرم ﷺ کو فیصل بنا لیا۔ حضور اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: ایک کپڑا لے آؤ۔ وہ کپڑا لے آئے تو حضور اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک سے حجر اسود کو اس کپڑے میں رکھا اور فرمایا: جتنے قبیلے والے سردار ہیں، وہ سب کپڑے کو پکڑ لیں اور اس کو لے چلیں۔ سب قبیلے والوں نے پکڑ لیا اور کعبۃ اللہ کے قریب آ گئے تو حضور اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ سے حجر اسود کو اُٹھا کر وہاں لگا دیا، جہاں آج موجود ہے۔ وحی اُترنے سے پہلے قریش، آپ ﷺ کو

امین کہتے تھے۔ جب آپ ﷺ نے ان کو دین کی دعوت دی تو پھر دشمنی پر اُتر آئے۔

کعبۃ اللہ کو بنانے کے وقت جو سانپ کا واقعہ پیش آیا اور جو حالات پیش آئے، اس کے بارے میں حضرت زبیر بن عبدالمطلب نے ایک قصیدہ لکھا تھا:

عَجِبْتُ لِمَا تَصَوَّبَتِ الْعُقَابُ
إِلَى الثُّعْبَانِ وَ هِيَ لَهَا اضْطِرَابُ
وَ قَدْ كَانَتْ يَكُونُ لَهَا كَشِيشٌ
وَ أَحْيَانًا يَكُونُ لَهَا وِثَابُ
إِذَا قُمْنَا إِلَى التَّأْسِيسِ شَدَّتْ
تُهَيِّبُنَا الْبِنَاءَ وَ قَدْ تُهَابُ
فَلَمَّا أَنْ خَشِيْنَا الزِّجْرَ جَاءَتْ
عُقَابٌ تَتْلَئِبُ لَهَا انْصِبَابُ

(اس قصیدے کے مزید چھ اشعار بھی مفسرین نے کرام نے اپنی تفاسیر میں شامل کیے ہیں۔ انور)

میں نے اس وقت بہت تعجب کیا تھا جب عقاب نے آکر اس سانپ کو اُٹھالیا اور وہ تڑپ رہا تھا، حالانکہ وہ اس سے پہلے دانت پیستا تھا اور لوگوں کی طرف جھپٹتا تھا اور جب ہم کعبہ کو بنانے کا ارادہ کرتے تھے تو وہ ہمیں ڈراتا تھا۔ جب ہم اس سے ڈر گئے تو اللہ تعالیٰ نے عقاب کو بھیجا، اس نے آکر اس سانپ کو اپنے جبڑوں میں لیا اور اس کو اُٹھا کر لے گیا۔ اب ہمیں کعبہ بنانے میں درمیان میں رکاوٹ باقی نہ رہی۔ اس کے بعد ہم تیار ہوکر اس بناء کی طرف بڑھے، اس کے بعد ہم نے اس کی مٹی، اس کی بنیاد کو ٹھیک کیا، ہم صبح کو آئے اور اس کی بناء میں شریک ہوئے اس عالم میں کہ ہم پر کوئی کپڑا نہیں تھا اور ہم پتھر اُٹھا رہے تھے۔ سب سے بڑا شرف بنولؤی کو ملا، ان کی ایسی بنیاد ہے جو نہ مٹنے والی ہے۔ بنوعدی، بنومرہ اور بنوکلاب سب اس میں شریک تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس گھر کو بنانے کا ہمیں شرف بخشا اور اللہ تعالیٰ سے ہی ہم اس کے ثواب کی امید کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ثواب عطا فرمائیں گے۔

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں کعبۃ اللہ کی بلندی اٹھارہ ہاتھ تھی اور قباطی کپڑے کا غلاف ڈالا جاتا تھا، اس کے برود کا غلاف ڈالا گیا، ریشم کا غلاف سب سے پہلے حجاج بن یوسف نے ڈالا۔

قریش نے جیسے کعبۃ اللہ کی بناء کی تھی، اسی پر بناء قائم رہی، حتیٰ کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اوّل زمانہ میں جب وہ امیر بنے (اور ان کی امارت کے مقابلے میں یزید کی ملک شام میں امارت وحکومت قائم تھی)، اس نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑنے کے لیے مکہ میں فوج بھیجی، جس نے جبل ابوقبیس پر چڑھائی کردی، وہاں سے منجنیق کے ذریعے پتھر پھینکے، جن سے کعبہ شریف کی دیواریں بھی گر گئیں اور کعبہ بھی جل گیا۔ اتنے میں یزیدی لشکر کو یزید کی ہلاکت کی خبر پہنچی تو اس نے جنگ بندی کردی، بلکہ امیر لشکر نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت کا ہاتھ بڑھایا، مگر انہوں نے خدشہ کی بنیاد پر قبول نہ کیا۔

پھر خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں حجاج بن یوسف نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف مکہ میں جنگ کی اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا اور ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے تعمیر کیے ہوئے کعبے کو شہید کرکے قریش کی تعمیر کے مطابق دوبارہ تعمیر کیا، اب کی تعمیر کعبہ قریش کی تعمیر کے مطابق ہے۔ (انور)

جب ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی تو انہوں نے پورے کعبۃ اللہ کی عمارت کو گرایا اور پھر اس بناء پر قائم کیا جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی اور حطیم کے حصے کو کعبۃ اللہ کے اندر داخل کیا اور کعبۃ اللہ کے دو دروازے رکھے: ایک مشرق کی جانب اور دوسرا مغرب کی جانب اور یہ دونوں دروازے زمین کے ساتھ رکھے، جیسا کہ انہوں نے اپنی خالہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمنا تھی کہ کعبۃ اللہ کو بنائے ابراہیم پر بنایا جائے۔ اس لئے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کو پورا کیا۔

جب تک حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ امیر رہے، کعبۃ اللہ کی بناء اسی طرح قائم رہی، پھر حجاج بن یوسف نے آپ کو شہید کیا، عبدالملک بن مروان کی اس وقت حکومت تھی۔ حجاج نے اس سے اجازت لے کر کعبۃ اللہ کو پہلے کی طرح بنا دیا۔ خانہ کعبہ کے غلاف کا جو حصہ جل گیا تھا، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اسی حالت میں رہنے دیا کہ جب لوگ موسم حج میں آئیں گے اور وہ دیکھیں گے کہ اللہ کے گھر کے ساتھ اس طرح زیادتی ہوئی ہے۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور لوگوں کو جمع کرکے کہا کہ اے لوگو! مجھے مشورہ دو کہ میں اللہ کے کعبہ کی پوری عمارت کو گرا کر نئی عمارت بناؤں یا جو عمارت موجود ہے اس کی اصلاح کردوں اور اس کو قائم رہنے دوں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میری رائے یہ ہے کہ اس کی اصلاح کردو؛ کیونکہ یہ وہ پتھر ہیں جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لگے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس عمارت کے بنانے میں شریک تھے۔ اس لیے

اس کو اسی طرح رہنے دو، اس کی اصلاح کر دو۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ دیکھو! اگر کسی آدمی کا گھر جل جاتا ہے تو وہ گھر کو توڑ کر از سرِ نو بناتا ہے اور یہ تو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ میں استخارہ کرتا ہوں اور جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا۔

جب تین راتیں گزر گئیں تو ان کے ذہن میں یہی بات آئی کہ کعبۃ اللہ کو از سرِنو تعمیر کیا جائے گا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا، لیکن لوگ اس بات سے ڈرنے لگے کہ ہم اللہ کے کعبہ کو توڑنے میں شریک ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عذاب آجائے۔ بہرحال ایک آدمی نے جا کر کعبۃ اللہ کا پتھر توڑا اور لوگ انتظار کرتے رہے۔ جب اس آدمی کو کوئی نقصان نہ ہوا تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے کہ کعبۃ اللہ کو دوبارہ بنایا جائے۔

سارے لوگوں نے جمع ہو کر کعبۃ اللہ کی بناء کو ختم کر دیا اور زمین تک آ گئے اور اس کے بعد جدید تعمیر کی اور جو ستون کھڑا ہو جاتا، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اس پر پردہ لٹکاتے جاتے اور بناتے بناتے گئے اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ قوم نئی نئی جاہلیت سے نہ نکلی ہوتی اور میرے پاس کچھ دولت بھی ہوتی تو میں کعبہ کو از سرِنو بناتا اور حطیم کی طرف جو پانچ ہاتھ کا حصہ ہے، اس کو بھی کعبہ میں داخل کرتا اور دو دروازے رکھتا، تاکہ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوں اور دوسرے دروازے سے نکلا کریں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: الحمدللہ! اب اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا پیسہ بھی دیا ہے کہ میں اس کی عمارت بنا سکتا ہوں اور اب لوگوں کا کوئی ڈر نہیں کہ وہ اس کو غلط سمجھیں۔ چنانچہ انہوں نے حطیم کی جانب کو بنیاد تک کھود کر پانچ ہاتھ کعبہ میں شامل کیے اور کعبہ کا طول اٹھارہ ہاتھ رکھا۔ جب آپ نے دیکھا کہ اونچائی کم ہے تو فرمایا: دس ہاتھ مزید اونچا کیا جائے اور اس کے دو دروازے رکھے۔

جب ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو حجاج بن یوسف نے شہید کیا اور اس نے عبدالملک بن مروان کو لکھا کہ کعبۃ اللہ کی موجودہ بناء عبداللہ بن زبیر نے کی ہے، مکہ کے بہت سے عادل اور ثقہ لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر نے جو حطیم کی جانب بڑھائی ہے اور اساسِ ابراہیمی لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے، اب آپ بتائیں کہ میں کیا کروں؟ اس کو ایسے رہنے دوں یا اس میں ردّ و بدل کر دوں؟ عبدالملک بن مروان نے لکھا کہ ہم عبداللہ بن

زبیر کی بناء کو قائم نہیں رکھنا چاہتے۔ لہٰذا جو اس نے اونچائی کی ہے اس کو ختم کر دو اور حطیم والی جانب کو پھر باہر نکال دو۔ تو حجاج بن یوسف نے اس کو قریش والی بناء پر کر دیا۔

سنت یہی بناء تھی، جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کی: کیونکہ حضور اکرم ﷺ کی یہی تمنا تھی کہ کعبۃ اللہ اس طرح بنایا جائے اور یہ بناء ابراہیمی بھی تھی، لیکن شاید عبدالملک بن مروان کو اس حدیث اور اس سنت کی خبر نہ ہوئی ہو۔ اس لئے روایات میں آتا ہے کہ جب دوبارہ اس نے کعبہ بنا دیا تو اس کو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا والی روایت پہنچی تو اس نے کہا: کاش! ہم اس پر رہنے دیتے، لیکن اب تو ہم نے تبدیلی کر دی ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ بادشاہوں نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ اب دولت، پیسہ اور ذرائع بہت ہو گئے ہیں، کیا ہم اللہ تعالیٰ کے کعبہ کو دوبارہ تعمیر کریں اور بڑے اعلیٰ انداز میں تعمیر کریں؟ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، اس کو بادشاہوں کے لئے کھیل نہ بنا دو، اس کی جو تعمیر ہے اس کو رہنے دو اور اس کے اندر ہی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں۔

مرمت کی ضرورت تو ہوتی رہے گی، لیکن روزانہ ردّ و بدل نہ کیا جائے۔ اس لئے ہر سال حسب ضرورت کعبۃ اللہ میں ترامیم ہوتی رہتی ہیں، کبھی چھت تبدیل ہوئی، کبھی اس کے شہتیر تبدیل ہوئے، اسی طرح کبھی اندر کچھ چیزوں کی اصلاح کی ضرورت پیش آئی، کبھی دروازہ نیا لگا دیا گیا۔ ترمیم اور اصلاح کا سلسلہ الحمدللہ! ہر دور میں رہا، لیکن جہاں تک بناء کا تعلق ہے تو پہلے بناء ابراہیم تھی، اس کے بعد بناء قریش تھی، اس کے بعد بناء عبداللہ بن زبیر تھی، اس کے بعد عبدالملک بن مروان کے حکم سے اسی طرح ہو گئی جیسا کہ قریش کے زمانہ میں تھی۔ اللہ کو یہی منظور تھا اور یہی بناء آخر تک رہے گی، حتیٰ کہ وہ وقت آئے گا جس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''يُخَرِّبُ الْكَعْبَةَ ذُو السُّوَيْقَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ.'' [صحیح بخاری، رقم:۱۵۹۱]

دو باریک پنڈلیوں والا، حبشہ کے علاقہ کا سیاہ فام ایک بادشاہ ہوگا، اس کی زبان ایسے ہوگی جو سمجھ میں نہ آنے والی ہوگی، وہ آکر اللہ کے اس کعبہ کو گرائے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: گویا وہ منظر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں جو کعبہ کو پتھر پتھر کر کے گرا دے گا۔

والد کے ایمان کے سوا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سب دعائیں قبول:

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ

الرَّحِيمُ ﴿۱۲۸﴾ [البقرة:۱۲۸]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنائے کعبہ کے وقت جو دعائیں مانگی تھیں، ان کا بیان ہو رہا ہے۔ قرآن مقدس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جتنی دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو قبول فرمایا۔ صرف ایک دعا کے بارے میں آتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے منظور نہیں فرمائی، وہ یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے لئے ایک وقت تک بخشش مانگی، لیکن جب اس کی موت کفر و شرک پر آگئی اس کے بعد دعا کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے دائمی جہنم ہے، اس کی نجات کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تو دعا سے روک دیئے گئے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی کروڑوں حکمتیں ہیں۔ کسی کے دل کو پھیر دینا میرے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنو آدم کے دل اللہ کی انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جدھر چاہیں پھیر دیں، چاہیں تو ہدایت دے دیں یا ہدایت نہ دیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو ابراہیم علیہ السلام کے ابا آزر کو بھی ہدایت دے سکتے تھے، لیکن اس کے اندر حکمتیں ہیں:

ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے فیصلے کبھی بدلا نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کی تقدیر جب یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ آزر کی موت کفر و شرک پر ہوگی تو اب اس میں تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جس تقدیر کے بدلنے کے بارے میں باتیں آتی ہیں، وہ دراصل لوحِ محفوظ میں شرط کے ساتھ معلق ہوتی ہیں کہ اگر میرے بندے نے یہ کام کیا تو میں دوں گا اور اگر یہ کام نہ کیا تو نہیں دوں گا۔

دوسرا سبق اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ کسی کا ایمان یا کفر میرے ہاتھ میں ہے کہ ابراہیم نے شرک مٹا ڈالا، لیکن اپنے ابا آزر کو ہدایت نہ دے سکے۔ اس لئے اللہ پاک نے ایک فیصلہ فرما دیا کہ ہدایت میرے ذمہ ہے، انبیاء کے ذمہ، صحابہ کے ذمہ، اولیاء کے ذمہ اور علماء کے ذمہ دعوت ہے کہ تبلیغ کرتے رہیں۔

بعض علماء نے یہاں ایک نکتہ لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو ابوالانبیاء والمرسلین اور امام الموحدین ہیں، آزر کو ہدایت نہ ملنا اور اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو قبول نہ کرنا۔ اس سے توحید کا سبق ملتا ہے۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہر دعا قبول ہو جاتی اور کوئی دعا بھی خالی نہ جاتی تو ایک وہم ہو سکتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعا کو نہیں ٹالتے اور ضرور قبول کرتے ہیں، جیسا کہ ہمارے بعض جہلاء کا یہی عقیدہ ہے کہ ہمارے پیر و مرشد کا کہنا اللہ تعالیٰ نہیں موڑ سکتے۔ یہی شرک ہے۔

اسی طرح علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے والد ابو طالب جو حضور اکرم ﷺ کے چچا تھے، ایمان نہ لائے، حالانکہ وہ آپ ﷺ پر قربان ہو جاتے تھے، آپ کے لئے پورے قبائل سے ٹکر لے لی اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد ہیں، لیکن ایمان نہ ملا۔

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ کی تفسیر:

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام نبی ہیں، لیکن پھر بھی دعا مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں مسلمان بنا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں اپنے حکم کا ہمیشہ کے لئے تابع بنا اور اس پر استقامت نصیب فرما، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا﴾ [النساء: ۱۳٦] اے ایمان والو! ایمان لاؤ، اس کا مطلب ہے کہ ایمان پر ثابت قدم رہو۔ اور جیسا کہ نمازی کہتا ہے: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝﴾ یا اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما، حالانکہ نماز پڑھ رہا ہے، صراطِ مستقیم پر کھڑا ہے۔ اس لیے معنی یہ ہوتا ہے کہ یا اللہ! جیسے تُو نے ہدایت دی ہے، اس پر ہمیشہ ثابت قدم فرما۔

بعض علماء نے فرمایا کہ انبیاء کی دعاؤں میں اُمت کے لئے سبق ہوتا ہے کہ ہم نبی ہو کر جب یہ دعا مانگ رہے ہیں تو تم بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ ﴿مُسْلِمَيْنِ﴾، استسلام سے ہے کہ بندہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے، جیسے مرنے کے بعد مردہ غسل کرانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اس کی مرضی ہے اس کو اِدھر کرے یا اُدھر کرے۔ اسلام کا معنی بھی یہی ہے کہ جب تم مسلمان ہو گئے تو تم نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا، اس کا جو حکم ملے گا اس کی تعمیل کرنی ہے۔

﴿رَبَّنَا﴾: روایت کے اندر آتا ہے: جب آدمی گھٹنے ٹیک کر تین دفعہ دل سے رَبَّنَا، رَبَّنَا، رَبَّنَا کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا منظور کر لیتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ (دل سے) دعا نکلے۔ پورے قرآن کی دعاؤں پر غور کریں، ربوبیت ایسی صفت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ وہ سارے جہانوں کا پالنے والا ہے، اور جو پالنے والا ہوتا ہے اس کو کتنا رحم ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمان جب اس کی صفت ربوبیت کا ذکر کرتا ہے تو اس کی رحمت جوش میں آ جاتی ہے۔

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ اے ہمارے رب! ہمیں صحیح معنی میں اپنے امر پر چلنے والا بنا اور اخلاص والا

بنا۔ اور اس سے آگے یہ سبق دیا کہ جب دعا مانگو تو صرف اپنے لئے نہ مانگو، بلکہ دوسرے مسلمانوں کو شریک کرو۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آگے دعا مانگی: ﴿وَمِن ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ اے اللہ! میری ذریت میں ایک ایسی اُمت پیدا فرما جو تیری فرمانبردار ہو۔ اس لئے جب بھی دعا کریں تو سارے عالم کے مسلمانوں کے لئے کریں۔ جب ایک عاجز بندہ سب کے لئے دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے کہ میرا بندہ میرے بندوں کے لئے رحمت طلب کر رہا ہے، اس پر ہم رحمت کر دیتے ہیں۔

ایک بدوی (دیہاتی) صحابی نے اپنی نماز میں یہ دعا مانگی: "اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِي وَ مُحَمَّدًا، وَ لَا تَرْحَمْ مَعَنَا أَحَدًا" [صحیح بخاری، رقم: ۶۰۱۰] (اے اللہ! مجھے بخش دے اور میرے مدنی پاک کو بخش دے اور کسی کو نہ بخشا)۔ جب حضور ﷺ نے نماز سے سلام پھیرا تو فرمایا: تُو نے اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو چھوٹا کر دیا۔

﴿وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا﴾ یا اللہ! اس بیت اللہ کے جو مناسک ہیں، وہ ہمیں سکھا دے، ﴿وَتُبْ عَلَيْنَا﴾ اور ہماری توبہ قبول فرما اور رحم فرما! کیونکہ توبہ قبول کرنے والی بھی تیری ذات ہے اور رحم کرنے والی بھی تیری ذات ہے۔ اے اللہ! ہم پر بھی رحم فرما اور عالم اسلام کے تمام مسلمانوں پر رحمت فرما۔

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس دعا کا مقصد یہ تھا کہ اے پروردگار عالم! ہمیں اپنے حکم کو ماننے اور اس پر اپنے آپ کو سونپنے والا بنا دے کہ جہاں تیرا حکم آ جائے، ہمہ تن ہم اس کے سپرد ہو جائیں اور تیری فرمانبرداری کے آگے جھکنے والے ہو جائیں اور تیری اطاعت میں کسی کو شریک نہ کریں اور نہ تیری عبادت میں کسی غیر کو شریک کریں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو شرک سے محفوظ رکھا، لیکن وہ ایسی دعائیں مانگتے ہیں، جن میں اُمت کے لیے ایک بہت بڑا درس ہوتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا استغفار کرنے کی وجہ:

حدیث مبارک میں آتا ہے، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں ایک دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ حالانکہ آپ ﷺ گناہوں سے پاک ہیں، لیکن اس کے باوجود استغفار کرنے کی دو وجہ ہیں: ایک وجہ اس کا رفع درجات کا باعث ہے؛ کیونکہ جب گناہ نہ ہوں اور آدمی پھر بھی استغفار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے درجات کو بلند فرما دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو اخلاص کے ساتھ عرفات کی حاضری نصیب کردی تو اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہ معاف کردیتے ہیں۔ اسی طرح جب طوافِ زیارت کرے، جب رمئ جمار کرے تو سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ جب ایک مرحلے میں سارے گناہ معاف ہوگئے تو دوسرے مرحلے جب طے کریں گے تو قاعدہ یہ ہے کہ اگر گناہ ہیں تو اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹادیتے ہیں، اگر گناہ نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ درجات کو بلند فرمادیتے ہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ کے استغفار فرمانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اُمت کو سبق مل گیا کہ میں معصوم ہو کر اللہ تعالیٰ کے آگے استغفار کرتا ہوں اور تم خطاوار ہو کر بھی استغفار نہیں کرتے ہو؟ نبی ہونے کے باوجود آپ ﷺ دعا کہہ رہے ہیں، ہمیں تو اور زیادہ استغفار کا اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ﴾ اس کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں خالص اپنی بندگی کرنے والا بنادے، ﴿مُسۡلِمَةً لَّكَ﴾ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک اُمت پیدا فرما، جو مخلص ہو اور خالص تیری عبادت کرنے والی ہو۔

سلام بن مطیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ تو پکے مسلمان، بلکہ اللہ کے نبی ہیں، لیکن بار بار یہ دعا مانگتے ہیں: ﴿وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ﴾ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں اسلام پر قائم فرما اور اس پر دوام نصیب فرما۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: ﴿رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تمہاری دعا منظور کرلی۔

حضورِ اکرم ﷺ کی دعا سے بارش:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کئی واقعات ذکر فرمائے ہیں، جیسا کہ ایک مرتبہ حضورِ اکرم ﷺ مسجدِ نبوی میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک صحابی کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے: یارسول اللہ! ہمارے تو مال برباد ہوگئے، ہمارے تو جانور مرنے والے ہیں، مدتوں سے بارش نہیں ہوئی۔ مہربانی فرما کر اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ اللہ رحمت کی بارش عطا کرے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: اس وقت آسمان پر بادل کا کوئی نام ونشان نہیں تھا، لیکن جب حضورِ اکرم ﷺ نے دعا فرمائی تو بادل آنے شروع ہوگئے۔ ہم جمعہ کی نماز سے فارغ ہوئے تو بارش شروع ہوگئی اور پانی میں چل کر ہم اپنے گھروں میں پہنچے۔

کبھی انبیاء کی دعائیں منہ سے نکلیں اور منظور ہوگئیں اور کبھی ایسے ہوتا ہے کہ انبیاء مدتوں دعا کرتے ہیں اور

منظور ہونے کا اثر عرصہ بعد ظاہر ہوا؛ کیونکہ سارا نظام اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فراقِ یوسف میں دعائیں کیں۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ سے مراد صرف عرب ہیں، لیکن ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ عرب اور غیر عرب دونوں کو شامل ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن جریر کا حضرت سدی کی تردید کرنا ٹھیک نہیں ہے؛ کیونکہ حضرت سدی رحمہ اللہ نے عرب کا لفظ نقل کیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باقی کی نفی ہوگئی۔ حضرت سدی رحمہ اللہ نے عرب کا ذکر اس لئے فرمایا کہ سیاق وسباق کا تقاضا یہی تھا؛ کیونکہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں تشریف لائے تو قوم جرہم یہاں آباد تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ان میں شادی ہوئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کعبہ یہاں پھر سے تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعائیں مانگیں۔ اس سارے سیاق کا تقاضا عرب تھا۔ اس لئے دونوں حضرات کے اقوال صحیح ہیں، ایک دوسرے کا رد کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

تین اعمال صدقہ جاریہ ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ." [صحیح مسلم، رقم: ۱۶۳۱]

جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے ذاتی عمل رُک گئے، مگر تین چیزیں ایسی ہیں جو مرنے کے بعد بھی اس کے لئے باعث نفع ہیں۔ ایسا خیراتی ادارہ بنوا گیا جو اس کے بعد بھی جاری ہے، کوئی مسجد، مدرسہ یا ہسپتال بنا گیا یا کسی کو علم پڑھا گیا، اس سے لوگ نفع اُٹھا رہے ہیں یا نیک بیٹا چھوڑ گیا جو باپ کے مرنے کے بعد بھی اس کے لئے دعائیں کر رہا ہے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مناسکِ حج سکھانا:

﴿وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا﴾ یا اللہ! ہمیں قربانی کی جگہ اور قربانی کا طریقہ سکھا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی جگہ لے آئے اور کہا: یہاں اللہ کے گھر کی تعمیر کرو۔ اس کے بعد صفا ومروہ پر لے گئے اور کہا: یہ شعائر میں سے ہے۔ منیٰ میں لے گئے تو وادی عقبہ میں ابلیس، ایک درخت کے قریب راستہ روکنے کے لئے

کھڑا تھا، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: "بِسْمِ اللهِ، اَللهُ أَكْبَر" کہہ کر اس کو پتھر ماریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو مارا تو وہ بھاگ گیا۔ ابلیس چاہتا تھا کہ میں حج کے مناسک میں بھی کوئی غلط چیز داخل کر دوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ جگہیں دکھائی گئیں تو صفا پر بھی شیطان نے کوشش کی، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے منیٰ میں لے جا کر بتایا کہ یہ منیٰ ہے، یہاں لوگ آ کر قیام کریں گے۔ وہاں بھی شیطان نے "جمرة العقبة" کے موقع پر آپ کا راستہ روکا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سات کنکریاں "بِسْمِ اللهِ، اَللهُ أَكْبَر" کہہ کر ماریں، پھر اس نے "جمرة الوسطىٰ" کے مقام پر آ کر راستہ روکا تو آپ نے پھر اس کو سات کنکریاں ماریں، پھر وہ "جمرة الصغرىٰ" کے مقام پر آیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سات کنکریاں ماریں تو وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ اس کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ کو مزدلفہ میں مشعر الحرام لے کر آئے اور پھر عرفات کے میدان میں لے کر آئے اور وہ دکھایا۔ اس کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: اب آپ سمجھ گئے کہ کہاں کہاں حج کے احکام ادا ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: جی ہاں۔

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾﴾ [البقرة:١٢٩]

"اے ہمارے رب! اور ان بیت اللہ والوں میں ایک رسول انہی میں سے بھیج دے جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب (قرآن) کی اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے، بے شک تُو ہی غالب دانشور ہے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں دوسری دعائیں مانگیں، ان میں سے ایک یہ بھی دعا مانگی: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا﴾ صحیح احادیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أَنَا دَعْوَةُ إِبْرَاهِيمَ، وَ بُشْرَى عِيسَى، وَ رُؤْيَا أُمِّي الَّتِي رَأَتْ." [مجمع الزوائد، رقم:١٣٨٤٥]

میں ابا ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں اور اپنے بھائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری ہوں اور اپنی ماں کا خواب ہوں جو انہوں نے دیکھا تھا۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جتنے انبیاء گزرے ہیں، ان کی ماؤں کو اللہ تعالیٰ انبیاء کی

ولادت سے پہلے ایک خواب دکھاتے ہیں۔

مسئلہ تقدیر کے متعلق کچھ وضاحت:

حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمانا کہ میں اپنے ابا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں۔ اس سے یہ نہ سمجھیں کہ آدمی دعاؤں سے مقامِ نبوت تک پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ نبوت وہبی چیز ہے، اللہ جس کو چاہیں عطا فرمائیں۔ محنت اور مانگنے سے کوئی اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

دوسری بات یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کی بعثت، آپ کی نبوت، رسالت، آپ کا وقت بعثت، ختم نبوت یہ ساری باتیں تو اس وقت لکھ دی تھیں جب آسمان وزمین بھی نہیں بنے تھے اور وہ لوحِ محفوظ میں محفوظ ہو گئیں۔ اس سے عام طور پر مغالطہ لگتا ہے کہ جب یہ سارا کچھ لکھا جا چکا تو دعا کا کیا معنی ہے؟

یاد رکھیں! یہ جتنے فیصلے ہو چکے اللہ کے علم میں ہیں اور کسی کے علم میں یہ بات نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں ارواح سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا تھا، اسی طرح انبیاء علیہم السلام سے حضور اکرم ﷺ کی اعانت، اتباع اور آپ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا۔ اس کا تو کسی کو پتہ نہیں تھا کہ آپ کب آئیں گے؟ اس لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا اپنی جگہ دعا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے نبوت کی دعا کی۔ لیکن اللہ کے علم میں یہ فیصلہ پہلے ہو چکا تھا، موسیٰ علیہ السلام کو اس فیصلے کا علم نہ تھا۔ انہوں نے اپنے عجز کا اعتراف کیا کہ پروردگارِ عالم! زمانہ کے فرعون سے میرا مقابلہ ہے اور پہلے اس کے ساتھ اختلافات بھی ہیں، آپ میرے بازو کو مضبوط کریں اور میرے بھائی کو بھی نبی بنا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے دعا منظور کر لی۔ لیکن اللہ کے علم میں یہ سب کچھ پہلے سے تھا۔

بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ جب سب کچھ پہلے سے ہے کہ ایک یہ کافر ہے اور یہ مسلمان، آدمی چوری کرے گا، ڈاکہ مارے گا تو پھر ہمیں سزا کیوں ملتی ہے؟ سب سے پہلے مسئلہ سمجھ لیں کہ جب بھی تقدیر کا کوئی معاملہ ہو تو آدمی بحث نہ کرے، بس "آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا" کہے، جو اللہ ورسول کا حکم ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے۔

دوسری بات یہ سمجھیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے علم محیط کے باعث جو کچھ لکھا ہے وہ حق ہے کہ یہ بندہ مومن بنے گا اور یہ بندہ کافر بنے گا۔ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جبراً لکھ دیا ہے اور بندوں کو مجبور کر دیا ہے کہ ایسے بنو۔ اگر اس

طرح ہو تو پھر جزاء وسزا کا کوئی مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مجبور کر دیا ہو تو انبیاء ورسولوں کو بھیجنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کتابیں اُتارنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

فرق صرف اتنا ہے کہ جب وہ اسلام لاتا ہے تو ہمیں اس وقت پتہ چلتا ہے کہ فلاں مسلمان ہو گیا، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ سب کچھ پہلے سے ہوتا ہے۔ جو لکھا ہے وہ بالکل حق اور عدل وانصاف ہے جو اس نے کرنا ہے وہ پہلے سے ہے اور بندہ اسے اپنے اختیار سے کرتا ہے، اسی کرنے اور نہ کرنے پر جزا وسزا مرتب ہوگی۔

مثلاً مشتری ستارے پر بڑے حوادث کا اظہار ہو رہا ہے، ہمیں پتہ نہیں ہے، لیکن جن کے پاس آلاتِ رصد ہیں، دوربین ہیں، وہ دیکھ رہے ہیں۔ اگلے دن جب اخبار میں آ گیا تو ہمیں کچھ معلومات حاصل ہو گئیں۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ خداوند قدوس کتنا بڑا عالم ہے کہ اتنی بڑی دنیا کے لئے تو ایک چاند ہے اور اس کرہ کے اوپر کئی چاند ہیں تو وہ کرہ کتنا بڑا ہوگا۔

تمام انبیاء ورسول انسان کیوں ہیں؟

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ﴾ مسئلہ سمجھ لیں! اگر اللہ کے رسول بشر نہ ہوتے، اولادِ آدم نہ ہوتے تو کیا جنوں میں سے آتے؟ جبکہ جنات کا اتنا مرتبہ نہیں کہ ان کو نبوت دی جائے، باقی فرشتے رہ گئے تو اللہ تعالیٰ ان کو بھیجتے تو نوری رسول بھیجتے۔ اس میں دو صورتیں تھیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجتے اور وہ اپنی اصلی حالت وصورت میں آتے تو کوئی بندہ ان کو دیکھنے کی طاقت نہ رکھتا۔

اندازہ کریں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نے بھی حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں نہیں دیکھا، مگر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اصلی حالت میں دیکھا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی خوف کی وجہ سے غشی طاری ہوگئی۔ حدیث پاک میں موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر بیٹھ گئے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے جلدی جلدی اپنی شکل بدلی اور عرض کیا: حضور! آپ گھبرا رہے ہیں؟ آپ اللہ کے رسول ہیں، میں جبرائیل ہوں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جب حضرت جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا کہ ان سے سارا اُفق بھر گیا۔ اور فرمایا: ان کے چھ سو پَر تھے، جب اللہ کے نبی نے دیکھا تو اغماء ہو گیا، دوسروں کی کیا طاقت ہے۔ لہٰذا یہ بات طے ہوگئی کہ اگر اللہ تعالیٰ نوری نبی بھیجتے تو کوئی دیکھنے کی طاقت ہی نہ رکھتا۔

دوسرا یہ کہ وہ فرشتہ اگر انسان کی شکل میں آتا تو پھر بھی لوگ دھوکہ میں پڑ جاتے، جیسا کہ بی بی مریم علیہا السلام نے دیکھا کہ ایک انسان آ رہا ہے تو کہنے لگیں: میں تو رحمٰن کے نام کے ساتھ پناہ پکڑتی ہوں، اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے مرد ہو۔ میرے پاس کیوں آ رہے ہو؟ دور ہو جاؤ۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے وضاحت کر دی کہ خدا کی بندی! میں تو خدا کا بھیجا ہوا قاصد ہوں، تمہاری طرف خوشخبری دینے آیا ہوں کہ اللہ پاک تجھے ایک پاکیزہ بچہ عطا فرمائیں گے۔ جب بی بی مریم علیہا السلام نہ پہچان سکیں تو عام آدمی کی کیا طاقت ہے؟

یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ نے تمام نبی جنس بشر سے بھیجے، اولادِ آدم سے بھیجے۔ وہ کھانے والے، پینے والے، دکھ، تکلیف، بخار اُٹھانے والے اور شادی کرنے والے تھے، موت و حیات ان پر آنے والی، لیکن اس کے باوجود بھی لوگوں نے ان کو خدا بنا ڈالا۔ اگر نبی فرشتہ ہوتا اور وہ کھاتا پیتا بھی نہ اور نہ ہی شادی کرتا تو لوگ اس کو پہلے دن ہی خدا بنا لیتے۔ یا پھر وہی اعتراض کرتے کہ نبی ہم میں سے کیوں نہیں بھیجا؟

نبی کا کام قرآن کی وضاحت:

سب سے بڑی نعمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے اور جنس آدم سے بھیجے جس کی ہدایت مطلوب ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ﴾ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ اُمور مانگے جو انبیاء کے ذمہ ہوتے ہیں اور وہ چار فریضے ہیں: ایک یہ کہ تیرا قرآن پڑھ پڑھ کر اُمت کو سنائے۔ لفظ قراءت عام ہے کہ آپ کچھ بھی پڑھیں، لیکن لفظ تلاوت کا اطلاق صرف اس وقت ہوتا ہے جب کوئی مقدس کتاب پڑھی جائے، جس کے پڑھنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب مرتب ہو۔ تلاوت کرنا بھی فریضۂ نبوت ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو قرآن پڑھ رہے ہیں اور وہ نبی کے ایک وظیفہ پر عمل پیرا ہیں۔

نبی کا دوسرا وظیفہ ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ﴾ کہ قرآن کی ان کو تعلیم دے۔ یہ نہیں کہ وہ خود عربی لوگ ہیں، سمجھ لیں گے۔ بلکہ جب تک اللہ کا نبی قرآن نہیں پڑھائے گا، اس وقت تک قرآن سمجھ نہیں آئے گا۔ اس لئے جو لوگ قرآن کو اپنی عقل سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ اُلجھ جاتے ہیں اور ٹھوکریں کھاتے ہیں، ان کے لئے حقیقت تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن بھی عربی اور مکہ والے بھی عربی ہیں اور قرآن لغت قریش میں نازل ہوا ہے، لیکن ان کے لئے بھی نبی کا ہونا لازم ہے، جو اُن کو بتائے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن بھی سن لیا، جیسا کہ آیا: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴾ [البقرۃ: ۱۸۷] رمضان میں اس وقت تک کھاتے پیتے رہو، جب تک سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے علیحدہ نہ ہوجائے۔ ایک صحابی نے اپنے تکیہ کے نیچے دو دھاگے رکھ لیے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو جب پتہ لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا سرہانہ بڑا لمبا چوڑا ہے کہ سیاہ دھاگہ بھی اس کے نیچے آ گیا اور سفید دھاگہ بھی اس کے نیچے آ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سیاہ ڈورے سے مراد رات ہے اور سفید دھاگے سے مراد صبح صادق ہے۔ یہ مقصد نہیں کہ سیاہ اور سفید دھاگے رکھ لو اور انہیں دیکھتے رہو۔ بہر حال یہ مسئلہ اس وقت سمجھ آیا، جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا۔

اسی طرح نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو دیکھ لیں۔ ان کی ساری تفصیل ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اعمال صحابہ نے پہنچائے، ان کے بعد تابعین نے، پھر تبع تابعین، محدثین اور علماء نے پہنچائے۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ" [سنن ابی داود، رقم: ۳۶۴۱] (علماء، انبیاء کے وارث ہیں)۔ اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ ان کو جائیداد ملے گی، بلکہ معنی یہ ہے کہ وہ علم کے وارث ہیں۔

حکمت کی تفسیر:

علماء نے فرمایا: ﴿الْحِكْمَةَ﴾ سے مراد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: حکمت سے مراد فہم دین ہے کہ اس نبی کو دین کی فہم عطا فرما، جس سے دین کا سمجھنا آسان ہو۔

بعض علماء نے فرمایا: حکمت سے مراد خیر کے کام ہیں، یعنی اللہ کا نبی اُمت کو بتادے اور سمجھادے کہ یہ کام کرنے والے ہیں، اور جو شر کے کام ہیں ان سے منع فرمادیں کہ یہ کام نہ کریں۔ یہ سارے اقوال متقاربۃ المعنی ہیں۔

﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ تزکیہ کا معنی ہے: مانجھنا۔ جیسے کسی چیز پر زنگ لگ جائے تو ہم اس کو مانجھتے ہیں، صاف کرتے ہیں، اسی طرح دلوں پر گناہوں کا زنگ لگ جاتا ہے، کفر کا زنگ لگ جاتا ہے، اس لئے قرآن میں آتا ہے کہ کافروں کے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں، اسی طرح آیا کہ ان کافروں کے دلوں پر پردہ ہے۔ یہ کافروں کا حال ہے۔ کبھی کبھی ایمان والوں کے دلوں پر بھی معاصی کا اور اللہ کے ذکر سے غفلت کا اثر آجاتا ہے، اس لئے دعا فرمائی کہ اللہ کے نبی ان کا تزکیہ کریں۔

تزکیہ نفس بالسنۃ معتبر ہے:

جن صوفیاء کرام کا کردار اور عمل سنت کے مطابق ہے، سبحان اللہ! ان کے اندر سنت بھی آ گئی اور تزکیہ والا عمل بھی سنت کی روشنی میں آ گیا۔ ایک یہ ہوتا ہے کہ دل کی صفائی تو کر رہے ہیں، لیکن طریقہ کتاب وسنت والا نہیں ہوتا۔ جیسے بڑے بڑے جوگی مجاہدے کرتے ہیں، بڑے بڑے پنڈت مجاہدے کرتے ہیں، ہندو بیس بیس سال تک گوشت نہیں کھاتے، اچھی غذائیں نہیں کھاتے، بیس بیس اور پچاس پچاس سال تک جنگل میں بیٹھے رہتے ہیں اور چلے کاٹتے رہتے ہیں، لیکن وہ منزل پر نہیں پہنچتے؛ کیونکہ ان کا تزکیہ قرآن وسنت کی روشنی میں نہیں ہوتا۔

مثلاً آپ نے مدینہ منورہ جانا ہو اور آپ جدہ والی سڑک پکڑلو۔ اب آپ گاڑی دوڑا رہے ہیں، بھگا رہے ہیں، محنت کر رہے ہیں، راستے میں آرام نہیں کر رہے، کھانا نہیں کھا رہے، چائے نہیں پی رہے اور زیادہ سے زیادہ تیز چل رہے ہیں کہ میں نے مدینہ جانا ہے۔ اس طرح آپ مدینہ سے دور تو ہوتے چلے جائیں گے، لیکن مدینہ نہیں پہنچیں گے؛ کیونکہ آپ سیدھے راستے پر نہیں چلے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ قرآن وسنت کی روشنی سے ہٹ جاتے ہیں، وہ بجائے منزل مقصود پر لے جانے کے اپنے مریدوں کو دوزخ کے گڑھے میں ڈال دیتے ہیں۔ ورنہ ان بیچاروں کا مقصد بھی تزکیہ ہوتا ہے۔ لیکن کتاب وسنت کی روشنی نہیں ہوتی، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب کوئی ایسی بات کہہ دی جو (نعوذ باللہ!) کفر تک لے گئی۔ جیسے بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ چھوڑو، اب کیا نماز پڑھنی ہے؟ اللہ سے تو مل گئے۔ اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ گناہ اور ثواب کا کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو بانسری سے آواز آ رہی ہے، تم سمجھ رہے ہو کہ یہ بانسری سے آواز آ رہی ہے، حالانکہ آواز تو اسی کی ہے۔ وہ اس دھوکے کے اندر گمراہ ہو جاتے ہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بجائے منزل مقصود پر پہنچنے کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ مثلاً اللہ پاک نے کسی بزرگ پر اپنی رحمت سے کوئی بات واضح کر دی تو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگ کو تو ہر چیز کا پتہ ہے۔ آپ جا کر بیٹھیں، وہ آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیں گے۔

تزکیہ نفس کے مراتب:

پہلے تلاوتِ کتاب، پھر تعلیم کتاب، پھر حکمت اور پھر تزکیہ ہے۔ تزکیہ تب حاصل ہوگا جب پہلی تین چیزیں موجود

ہوں گی۔ اگر یہ نہیں ہوں گی تو تزکیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ مقامِ احسان پر پہنچنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ تلاوتِ کتاب، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور اللہ تعالیٰ کے فرائض بجالائیں۔

اس لئے جو صحیح بزرگ ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ روزانہ دس پارے قرآن شریف پڑھو، نماز کی تکبیر اُولیٰ تمہاری نہیں چھوٹنی چاہیے، تمہاری تہجد، اوّابین، اشراق نہ چھوٹنے پائے اور تیری زبان اللہ کے ذکر سے ہر وقت تر رہنی چاہیے۔ جب وہ اس طرح محنت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ دلوں کی اصلاح فرمادیتے ہیں۔

تزکیہ نفس کرنے والے صوفیاء کی اقسام:

اس لئے بڑے بڑے علماء، علم حاصل کرنے کے بعد ایسے بزرگوں کی خدمت میں چلے جاتے تھے جو علم کے اندر رسوخ پیدا کریں، کتاب وسنت کی روشنی میں چلا کر ان کا تزکیہ کریں اور مقامِ احسان تک پہنچائیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ نے لکھا ہے کہ ایک صوفی وہ ہوتے ہیں جن کا دل صاف ہوتا ہے اور صوفی کا معنی ہوتا ہے: قرآن وسنت کا پیروکار۔ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں سنت ہوتی ہے، اس کا کوئی قدم سنت کے خلاف نہیں اُٹھتا، اصل میں یہ صوفیاء کرام ہیں۔

اور بعض صوف والے صوفی ہوتے ہیں، یعنی گرم اور موٹے کپڑے پہن لیے، موٹی تسبیح گلے میں ڈال لی، ایک دو عصا اپنے ہاتھ میں رکھ لئے۔

اور بعض صوفی صفا سے ہوتے ہیں، یعنی نہ شریعت ہے، نہ قرآن ہے اور نہ حکمت ہے۔ وہ بھی صوفی کہلاتے ہیں۔

اصل صوفی وہ ہے جو قرآن وسنت کا پابند ہو، قرآن وسنت پر چلنے والا ہو۔

حضرت امداد اللہ مہاجر مکی ؒ کی عاجزی:

حضرت امداد اللہ مہاجر مکی ؒ بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ علماء دیوبند ان کے مرید تھے۔ اگر ان سے کوئی مسئلہ پوچھنے کے لئے آتا تو فرماتے: مسئلہ رشید احمد سے پوچھو، محمد قاسم سے پوچھو۔ کسی نے کہا کہ وہ آپ کے مرید ہیں۔ فرمایا: وہ علماء ہیں، شریعت کا مسئلہ وہ جانتے ہیں، ہم تو ''اللہ اللہ'' کرنا سکھاتے ہیں، ہمیں کیا پتہ کہ شریعت کے احکام کیا ہیں؟

اس لیے یاد رکھیں! تزکیہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوگا جب تک پہلی تین چیزیں نہیں ہوں گی۔ سب سے بہتر

عمل یہ ہے کہ قرآن پڑھا کرو، کوشش کرو اگر اللہ نے علم دیا تو الحمد للہ! نہیں دیا تو صرف تلاوتِ قرآن بھی بڑی چیز ہے۔ تلاوتِ قرآن صحیح لفظوں کے ساتھ کرو، اگر کہیں غلطی ہوتی ہے تو کسی قاری سے ٹھیک کرالو۔ اگر اللہ نے علم دیا تو قرآن میں تدبر بھی کرو۔ جہاں مسئلہ سمجھ نہ آئے، وہاں ہلکی پنسل سے نشان لگالو، پھر کسی عالم کے پاس جا کر بات سمجھ لو۔

اللہ تعالیٰ کی صفات اوران کی حکمتیں:

﴿إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ اے پروردگارِ عالم! غالب بھی تُو ہے اور حکمت والا بھی تُو ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر قرآن میں اوّل سے لے کر آخر تک اللہ کی جن صفات کا قرآن میں ذکر آیا ہے، ان پر غور کرو تو حیران ہو جاؤ گے کہ اس میں کیا کیا حکمتیں ہیں؟ جہاں اللہ تعالیٰ کی یہ صفات آئیں، اس سے پہلی آیات پر غور کریں اور بعد والی آیات پر غور کریں تو بات سمجھ آئے گی کہ یہاں ان صفات کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ انہی دو صفات پر جو آئی ہیں، غور کریں۔

﴿الْعَزِيزُ﴾ کا معنی ایسا غالب کہ جس کو کوئی طاقت مغلوب نہ کر سکے، جس کے حکم کو کوئی ٹال نہ سکے، جس کے فیصلے کو کوئی بدل نہ سکے۔ عزیز وہ عزت والا غلبہ والا ہے۔ میرے مولا! اگر تُو ان میں اپنا رسول بھیجے تو تُو غالب ہے، تیرے حکم کو یہ بدل نہیں سکتے، تیرے حکم کو یہ ٹال نہیں سکتے۔

﴿الْحَكِيمُ﴾ کا معنی ہے کہ جس کا ہر قول وفعل حکمت سے خالی نہ ہو۔ مثلاً کسی شخص کے پیٹ میں درد ہو، آپ نے کہا: سونٹھ لے کر کھالیں۔ اس نے کھالیا اور وہ ٹھیک ہو گیا تو آپ کو حکیم نہیں کہیں گے؛ کیونکہ یہ تو آپ نے سن رکھا تھا اور بتا دیا تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ اسی طرح کوئی چیز اتفاق سے صادر ہو جائے تو وہ حکیم نہیں کہلاتا، بلکہ حکیم یہ ہے کہ ہر چیز جیسے وہ چاہے اس کے علم کے مطابق بنے۔ پھر جب وہ بنے تو اس کے علم کے عین مطابق ہو، ذرہ بھر اختلاف نہ ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں: اے اللہ! اس وادی غیر ذی زرع میں تیرا کعبہ بنانا اور پھر میرے بچوں کا یہاں بھیجنا اور پھر مجھے یہاں بھیجنا، مجھے معمارِ کعبہ بنانا اور مجھے حکم دینا کہ اس گھر کو آباد کرنے کے لئے لوگوں کو بلاؤ اور مجھے مناسکِ حج کی تعلیم دینا، یہ ساری چیزیں حکمت سے خالی نہیں ہیں۔ تُو بڑا حکمت والا ہے، لہٰذا اگر میری

دعائیں بھی قبول فرمالے تو کوئی مشکل نہیں، کیونکہ تُو عزیز ہے۔ پھر جو تیرا حکم ہوگا وہ حکمت سے خالی نہیں ہوگا، کیونکہ تُو حکیم ہے۔ آدمی اگر اللہ تعالیٰ کی ان صفات میں غور کرے تو علم کا ایک سمندر ہے جو اس میں چھپا ہوا ہے۔

آپ قرآن مقدس میں موجود تمام دعاؤں پر غور کرلیں۔ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھیجے، انہوں نے جب بھی دعا مانگی تو صرف اللہ تعالیٰ سے مانگی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنا عقیدہ صحیح کرنا چاہیے کہ غیر سے دعا مانگنا شرک ہے۔

قبر پر مٹھی بھر مٹی ڈالنے سے بخشش کا واقعہ:

صحیح حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی کے نامہ اعمال کو جب تولا گیا تو اس کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا اور گناہوں کا پلڑا بھاری تھا۔ اس آدمی کے دل میں یہ گمان اور یقین پیدا ہوگیا کہ میرا فیصلہ تو ہوگیا چونکہ میزان میں اللہ نے ایک نظام رکھا ہے تو اس سے بات صاف ہے کہ مجھے جہنم میں ڈال دیا جائے گا؛ کیونکہ گناہوں کا پلڑا بھاری ہے۔ بندہ اسی خوف و دہشت میں مبتلا تھا کہ اوپر سے ایک چھوٹی سی تھیلی کو آتے دیکھا کہ میری نیکیوں کے پلڑے میں گرگئی، اس سے نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگیا اور گناہوں کا پلڑا ہلکا ہوگیا۔ اللہ پاک نے فرمایا: میرے بندے کو جنت میں داخل کردو۔ اس بندے نے کہا: مولا! تیرا بڑا کرم ہے، میں تیرے کرم کا شمار بھی نہیں کرسکتا۔ اس تھیلی میں کیا چیز تھی؟ اللہ پاک نے فرمایا: میرے بندے! دیکھ لو۔ جب اس نے جاکر دیکھا تو اس کے اندر مٹی ہے۔ بندے نے کہا: میرے مولا! تیری قدرت کے عجیب فیصلے ہیں، مجھے بات سمجھ نہیں آرہی ہے کہ اس کے اندر تو مٹی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ایک مومن فوت ہوگیا، تُو نے اس کا جنازہ پڑھا اور جنازے کے ساتھ قبر تک گیا اور اس کی قبر پر مٹی ڈالی تھی۔ میں نے تیرا وہی عمل قبول کرلیا اور آج اسی وجہ سے تیرا پلڑا بھاری ہوگیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اتنے کریم اور اتنے رحیم ہیں کہ ہمارے معمولی سے عمل کو قبول کرنے کے بعد اتنے بڑے انعام سے نواز دیتے ہیں، جس کا آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔

ایمان کی مٹھاس پانے کا واقعہ:

صحیح حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ایک آدمی بازار، شہر یا کسی مقام پر گزر رہا تھا، سامنے سے کچھ عورتیں آرہی تھیں تو اس نے فوراً اپنی نظر نیچے کرلی کہ کسی غیر محرم کے چہرے پر میری نظر نہ پڑے۔ بظاہر یہ عمل اتنا بڑا نہیں ہے،

لیکن حدیث پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس عمل کے بدلے ایک ایسی نعمت عطا فرمائیں گے کہ اس کے دل میں حلاوتِ ایمان پیدا ہو جائے گی۔ مُلّا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس حلاوتِ ایمان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ اس بندے کا خاتمہ ایمان پر فرما دیتے ہیں۔

اللہ کی رحمت بندوں کے گناہوں سے زیادہ وسیع ہے:

ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا: انسان کے بدن کے اندر دل بادشاہ کی مانند ہے، اس کے حکم پر جوارح کام کرتے ہیں۔ دل نے چاہا کہ میں عورت کا جمال دیکھوں، لیکن جب اس بادشاہ (دل) نے اپنے غلام (آنکھ) کو حکم دیا کہ دیکھو، لیکن اس نے آنکھ موڑ دی اور بادشاہ کی بات کو ٹھکرا دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہارا خاتمہ ایمان پر کر کے اپنے قریب لے آؤں گا۔

جو مولا اتنا بڑا رحیم و کریم ہو، اس کے بارے میں آدمی یہ عقیدہ رکھے کہ وہ ہماری دعائیں تو سنتا نہیں ہے، اس لئے ہم بزرگوں کے مزاروں پر جاتے ہیں، ان بڑے بڑے قبر والوں کے دربار پر حاضر ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ پھر بھی ان کی بات کو موڑتا نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی کفر تک پہنچ جاتا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ۚ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ﴾ [ھود: ۱۱۴] کہ تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کے بعد فوراً نیکی کر لو، کیونکہ نیکی گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ اس لئے روایات میں آتا ہے کہ آدمی جب وضو کرتا ہے اور ہاتھ دھوتا ہے تو اس سے ہاتھ کے گناہ جھڑ جاتے ہیں اور جب چہرہ دھوتا ہے تو چہرے کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ اس طرح پورے وضو کو دیکھ لیں۔ پھر جب وہ نماز پڑھتا ہے تو اگلی نماز تک صغیرہ گناہ دھل جاتے ہیں، ایک عمرہ کرتا ہے تو دوسرے عمرہ کے درمیان تک کے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔

''نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں'' کا مطلب:

بعض محدثین وعلماء نے لکھا ہے کہ نامۂ اعمال میں جو گناہ لکھے جا چکے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو مٹا دیتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ گناہوں کو مٹا کر نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور کراماً کاتبین فرشتوں کو بھی اس کے وہ گناہ بھلوا دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک تحریر ہو، وہاں سے آپ کوئی چیز مٹا دیں تو دیکھنے والے کو شبہ ہوتا ہے کہ یہاں کوئی چیز تھی، لیکن اس کو مٹا دیا گیا ہے۔ اللہ اتنا بڑا رحیم و کریم ہے کہ ملائکہ کے سامنے اپنے بندے پر پردہ ڈال رہے ہیں

کہ میرے بندے کا جب نامۂ اعمال دیکھیں تو یہ نہ کہیں کہ یہاں کچھ تھا اس لیے وہاں نیکیاں لکھ دو۔

بعض محدثین کرام نے فرمایا: گناہوں کو مٹا دینے کا مطلب ہے کہ گناہ معاف ہو گئے اور آگے مستقبل میں جو اس نے نیکیاں کرنی ہیں، وہاں لکھ دی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک آدمی گانے کا رسیا ہے، فلموں اور وی سی آر کا رسیا (عادی) ہے، اللہ نے اس کو اعمالِ صالحہ کی اور توبہ کی توفیق دی۔ اس نے ارادہ کیا کہ میں حج کروں گا تو اس کے گناہوں کو مٹا دیا گیا اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وہاں اس کی اگلی نیکیاں لکھ دو، اس نے کرنی ہیں۔

بعض محدثین نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اس کے اندر گناہ کرنے کا ملکہ تھا کہ غیر عورت کو دیکھا تو اس کو رام کر دیا، کسی غیر لڑکے سے باتیں کیں اور اسے پھانس لیا، کسی شریف آدمی کو دیکھا تو اس سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے پیسے ہڑپ کر لئے۔ اب جب وہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ برائی کا ملکہ مٹا کر نیکی کا ملکہ پیدا کر دیتے ہیں، اس میں اعمالِ صالحہ کا ملکہ آجاتا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ حدیث مبارک کا ظاہری معنی یہ ہے کہ ایک بندہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوگا، اللہ تعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ اس کے گناہ مٹا دو۔

دوسری حدیث میں تفصیل ہے کہ اس نے جو چھوٹے چھوٹے گناہ کئے تھے، وہ سارے اس کو دکھاؤ۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے بندے! یہ گناہ تُو نے کئے تھے؟ وہ اقرار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے حکم دیں گے کہ اس کے گناہ مٹا دو اور ہر گناہ کے بدلے ایک نیکی لکھ دو۔ پھر اس کو دوبارہ نامۂ اعمال دکھایا جائے گا اب پڑھو۔ وہ جب دیکھے گا کہ میرے گناہ بھی ختم ہو گئے اور گناہوں کے بدلے میں بھی نیکیاں لکھی ہوئی ہیں تو وہ خوش ہو جائے گا اور عرض کرے گا: اے اللہ! میرے تو اور بڑے بڑے گناہ تھے، وہ تو یہاں نہیں لکھے ہوئے۔ حضور اکرم ﷺ ہنس پڑے اور فرمایا: دیکھو! بندہ کتنا عجلت پسند ہے!!!

جو اللہ اتنا رحیم و کریم ہو، آدمی اس سے دعا نہ مانگے، بلکہ غیر اللہ سے مانگے تو یہ شرک ہے، اور یہ ایسا گناہ ہے جس کی سزا جہنم ہے۔

اعمالِ صالحہ کرنے کے بعد دعائیں قبول ہوتی ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد دعائیں کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعمالِ صالہ کرنے کے

بعد دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔ اس لیے حکم ہے کہ نماز کے بعد دعا مانگا کرو، اذان اور تکبیر کے درمیان جو وقت ہے اس میں دعا مانگا کرو، قرآن مقدس پڑھنے کے بعد دعا کرو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو یہ دعائیں مانگی ہیں، ان کے اندر پوری اُمت کے لئے بھلائی ہے۔ اس سے سبق ملا کہ آدمی جب دعا مانگے تو صرف اپنے لئے نہ مانگے، بلکہ اپنے لئے، بچوں کے لئے، والدین اور عالم اسلام کے لئے بھی مانگے۔

آپ ﷺ سب سے پہلے نبی بنے اور آخر میں مبعوث ہوئے:

بعض لوگ جب ایسی احادیث مبارکہ پڑھتے ہیں تو وہ غلط فہمی یا محبت کے غلو میں ایسے آگے بڑھ جاتے ہیں اور کہنے لگ جاتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ تو حضرت آدم علیہ السلام سے بھی پہلے نبی ہیں، لہٰذا آپ ﷺ کا آدم علیہ السلام کی جنس سے (نعوذ باللہ!) تعلق نہ رہا۔ یہ بات شانِ پیغمبر میں گستاخی اور بے ادبی ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرما دیا: ''أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ'' میں آدم علیہ السلام کی اولاد ہوں اور تمام اولاد کا سردار ہوں۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ کا سلسلۂ نسب مبارک ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں آدم علیہ السلام سے پہلے تھا، جب آسمان و زمین بھی نہیں بنے تھے۔ اس فرمان کا یہ مطلب نہیں کہ جنس آدم علیہ السلام یا جنس بشریت سے تعلق نہیں ہے، بلکہ آپ سید البشر اور افضل البشر ہیں، آپ امام الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہیں۔

اگر ہمیں کوئی مشکل یا کوئی حاجت میں پیش آگئی اور ہم نے کسی بزرگ یا کسی عالم یا کسی متقی، پرہیزگار انسان سے کہا کہ میری یہ مشکل ہے، آپ میرے لئے دعا کر دیں۔ اس نے دعا کر دی۔ ہم کہتے ہیں: فلاں بزرگ نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے میری مشکل حل کر دی۔ ورنہ اللہ کے قضاء وقدر میں تو ابھی ہم پیدا نہیں ہوئے تھے اور لکھا جا چکا تھا کہ میرے بندے کو یہ مشکل پیش آئے گی، یہ فلاں کے پاس جا کر دعا کرائے گا، اس کے بعد ہم اس کی مشکل کو آسان کر دیں گے۔ اور ہم جو کر رہے ہیں، یہ اس کی عین قدرت اور منشاء کے مطابق ہے۔ باقی یہ نہیں کہ ہم ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جائیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس آدمی کو توفیق دی ہے، اگر وہ اہل جنت میں سے ہے تو جنت کے اعمال کی طرف جائے گا، اگر وہ نااہل ہے تو جہنم کے اعمال کی طرف جائے گا اور دونوں شخص اعمال اپنے اختیار سے کریں گے، اللہ کی طرف سے کوئی بھی مجبور محض نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جتنے انبیاء علیہم السلام کی مائیں ہیں، ان سب کو اللہ تعالیٰ خواب دکھاتے ہیں؛ کیونکہ اللہ

تعالٰی ان کی ماؤں کو ذہنی طور پر تیار کرتے ہیں کہ تمہارے ہاں جس بچہ کی ولادت ہونے والی ہے، وہ شان والا بچہ ہوگا۔ حضور پاک ﷺ کی والدہ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کی ولادت سے پہلے ایسے ایسے عجیب واقعات میرے سامنے آئے کہ میں حیران ہوتی تھی کہ اس قسم کے واقعات تو پہلے کبھی پیش نہیں آئے۔

"أوّل بدء" کی تفسیر:

امام احمد رحمہ اللہ نے ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ہمیں اپنے ابتداء امر کے بارے میں ذکر فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اپنے ابا ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اوّل بدء کا معنی ہے کہ جس نے دنیا میں حضور اکرم ﷺ کے تعارف کو زیادہ کھولا۔ وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں، ورنہ آپ ﷺ کی نبوت کے فیصلے پہلے ہو چکے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں، ان کے بارے میں ذکر کیا کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، میں اپنے سے پہلی والی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں اور ایک رسول پاک کی بشارت دینے والا ہوں، ان کا نام احمد ہوگا علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

مفسر رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں: جب حضور پاک ﷺ کے حمل نے قرار پکڑا اور آپ اپنی اماں مبارک کے پیٹ میں آئے تو آپ کی والدہ نے ایک خواب دیکھا اور اس کو اپنی قوم سے ذکر کیا کہ میں نے ایسا خواب دیکھا ہے۔ یہ بات پھیل گئی اور مشہور ہوگئی۔ گویا یہ حضور پاک ﷺ کی ولادت کی تمہید تھی۔ یہ اللہ تعالٰی کی قدرت ہے کہ آپ ﷺ کی والدہ کو اس نور کی روشنی میں شام کے محلات کیوں دکھائے، کوئی دوسرا علاقہ نہیں دکھایا گیا؟ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے اشارہ تھا کہ آپ کا دین اور نبوت شام کے اندر بھی قرار پکڑے گا، اور یہ بھی اشارہ تھا کہ یہی شام آخری زمانہ میں اسلام کا مرکز اور ٹھکانہ بنے گا۔ بعض روایات میں ہے کہ میدانِ حشر بھی شام میں بنے گا، نزولِ عیسیٰ بھی وہیں ہوگا، کیونکہ آپ دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی مینار پر اُتریں گے۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی کہ میری اُمت میں ہمیشہ ایک جماعت رہے گی جو ہمیشہ حق کے اوپر ثابت قدم رہے گی، جو اُن کی مخالفت کرے گا ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ بخاری شریف کے الفاظ ہیں کہ وہ جماعت شام کے اندر ہوگی۔ لہٰذا شام، اسلام اور مسلمانوں کا مرکز ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ

سانپ اپنے بل سے جیسے نکل جاتا ہے پھر سارا دن پھرتے پھرتے اپنی بل میں آجاتا ہے، اسی طرح اسلام پوری دنیا پر پھیلے گا، لیکن پھر لوٹتے لوٹتے مدینہ منورہ کی طرف آجائے گا۔

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۳۰ تا ۱۳۲]

"اور ابراہیم کے مذہب سے نہیں پھرتا، مگر وہی جس نے اپنے آپ کو احمق بنایا۔ بے شک ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چن لیا تھا اور وہ آخرت میں صالحین میں سے ہیں۔ یاد کرو جب ان سے ان کے رب نے کہا: تابع فرمان ہو جا۔ عرض کیا: میں سب جہانوں کے رب کا فرمانبردار ہوں۔ اور ابراہیم نے اپنی اولاد کو اور یعقوب نے بھی وصیت کی تھی اے میری اولاد! اللہ نے تمہارے لیے دین اسلام پسند کیا ہے، پس تم نہ مرنا، مگر حالت اسلام میں۔"

آیات کا ربط:

ان آیات مبارکہ میں مشرکین مکہ، یہود و نصاریٰ یا دیگر کفار جو قیامت تک ان لوگوں کے طریقے پر چلنے والے ہیں، سب کا اللہ تعالیٰ نے ردّ فرمایا ہے۔ یہودیوں کا یہ زعم تھا کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں؛ کیونکہ ہم حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ نصاریٰ کہتے تھے کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں؛ کیونکہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں۔ مشرکین مکہ کہتے تھے کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں؛ کیونکہ کعبہ انہوں نے بنایا اور ہم اس کے مجاور ہیں، اس کی حفاظت کرنے والے، زمزم پلانے والے، کعبۃ اللہ کے دروازے کے کلید بردار، کعبہ کا طواف کرنے والے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کے مطابق حج کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں سب کا ردّ فرمایا ہے کہ اے یہود! اگر تم ملت ابراہیمی پر ہوتے تو حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا قرار نہ دیتے۔ اے نصاریٰ! اگر تم ملت ابراہیمی پر ہوتے تو عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار نہ دیتے۔ اے مشرکین مکہ! اگر تم ملت ابراہیمی پر ہوتے تو بتوں کو خدا نہ بناتے؛ کیونکہ ابراہیم تو

بتوں کو توڑنے والے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر اتنے ثابت قدم تھے کہ پہاڑ تو ہل سکتا تھا، مگر وہ نہیں ہلے۔ لہٰذا تم میں سے کوئی بھی ملت ابراہیم پر نہیں۔

کلمہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ آلہہ باطلہ کی تردید ضروری ہے:

علماء نے لکھا ہے کہ جب آدمی کلمہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ" پڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے تمام فرق باطلہ کی نفی کردی اور ایک اللہ کی ذات کا اثبات۔ دنیا کیا ہے؟ جس میں سارے دعوے مثبت ہوتے ہیں، مثلاً یہ کتاب میری ہے، یہ زمین میری ہے، یہ مکان میرا ہے... لیکن دعویٰ توحید کی ابتداء نفی سے ہے۔ اس سے یہ سبق پڑھایا کہ اگر خدا کو بھی مانتے رہو اور غیروں کو بھی مانتے رہو تو کام نہیں چلے گا، بلکہ پہلے آلہہ باطلہ کی نفی کرو، ورنہ اثبات کا جو صحیح مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہوگا۔ ایمان کی حلاوت، روشنی اس وقت تک حاصل نہیں ہوگی جب تک لا الٰہ سے آلہہ باطلہ کی نفی نہ کرو گے۔ توحید کا معنی یہ ہے کہ خدا کو بھی مانو اور خدا کے غیر سے براءت کا کھلا اعلان کرو۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کو مانو تو اللہ سے سب سے زیادہ محبت ہو اور غیر اللہ سے نفرت ہو۔ یہ دھوکہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے بھی محبت ہے اور غیر اللہ سے بھی محبت ہے۔ یہ توحید نہیں ہے۔

"لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ" علماء نے لکھا ہے کہ باہ کی نفی کرو اور جاہ کی بھی نفی کرو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا: ﴿أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰىهُ ۖ أَفَأَنتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا﴾ [الفرقان: ۴۳] آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو خدا بنا رکھا ہے؟ جیسے طبیعت میں خیال آ گیا تو اسی طرف چل پڑے۔ بعض آدمی اپنی خواہش نفسانی کے تابع ہو کر کسی عورت سے محبت کر بیٹھے ہیں، اس کی محبت میں سرگرداں پھرتے ہیں۔

علماء نے فرمایا: غیر کی محبت سے توحید باقی نہیں رہتی، بلکہ یہ شرک ہے؛ کیونکہ محبت کا مقام الٰہ کا تھا۔ اس لئے جو لوگ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف جاتے ہیں یہ چیزیں قرآن وحدیث کے خلاف ہیں۔ (نعوذ باللہ) کیا غیر لڑکی سے عشق کرنے کی بھی شریعت اجازت دیتی ہے؟ تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حرام کے راستے سے خدا ملے؟ جب غیر پر نظر ڈالنا، اس کے ساتھ علیحدہ بیٹھنا اور اس سے ملنا حرام ہے تو اس سے عشق کرنا کیسے ٹھیک ہوگا؟ "الٰہ" کا معنی ہوتا ہے جس کو آدمی اپنے نفع ونقصان کا مالک سمجھے۔ چاہے اگر وہ انسان کو یا بزرگ مالک کو سمجھے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا اللہ پر ایمان نہیں ہے۔

سائنسدانوں نے کہا ہے کہ مشتری پر دھماکے ہوں گے اور وہ اتنے شدید ہوں گے۔ مسلمانوں نے اذانیں دینا

شروع کر دیں کہ قیامت آگئی ہے۔ اس سے اندازہ فرمائیں۔ ان کو کہا جاتا ہے تم مسلمان کلمہ پڑھنے والے ہو، تمہیں تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات پر ایمان رکھنا چاہیے۔ پیغمبر اسلام نے قیامت کی آخری نشانیاں اور علامات بتائی ہیں کہ دابۃ الارض کا خروج ہوگا، یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا، دجال کا خروج ہوگا، عیسیٰ بن مریم کا نزول ہوگا، وہ دجال کو قتل کریں گے۔ جب تک یہ علامات پوری نہیں ہوں گی، اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی۔ لیکن جیسے کسی نے کچھ کہہ دیا مسلمان اُدھر چل پڑے۔

ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ مشتری کا ٹکراؤ نہیں ہوگا، وہ تو کروڑوں میل آپ کے کرہ سے دور ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے۔ جیسے آپ کا علم بڑھتا جا رہا ہے ویسے اللہ تعالیٰ کے کمالات اور قدرت کی نشانیاں نظر آتی جا رہی ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ سب سے بڑی دُوربین جو ان سیارات کے دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہے، وہ پوری تصویریں مہیا کرتی ہے، اس کا نام "ہُبل" رکھا ہے؛ کیونکہ کافروں کا بت تھا اور تم بھی اس کی رپورٹ پر اعتبار کرو۔ حالانکہ اس کا کوئی اور نام بھی رکھا جا سکتا تھا، لیکن کفر ہر بات میں آپ کو کفر کی تعلیم دینا چاہتا ہے اور ہم اپنے عقیدے سے اتنے بے بہرہ ہیں کہ کسی ایک عالم نے بھی نہیں کہا کہ یہ چیزیں قرآن و حدیث کے خلاف ہیں، بلکہ اس کے ساتھ قیامت کا تعلق ہے۔

پتہ نہیں ہم کیوں ان چیزوں سے مرعوب ہو گئے ہیں؟ حالانکہ دعویٰ اسلام نے کیا ہے اور ہم پہنچتے پہنچتے اس دعویٰ کے قریب پہنچ گئے اور اسلام کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کر رہے ہیں۔ ان کا تو کوئی نیا انکشاف نہیں ہے، بلکہ دعویٰ تو ہمارا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو تخت اُڑاتا تھا۔ اتنا بڑا تخت تھا کہ اس کے اوپر چار لاکھ کرسیاں رکھی جاتی تھیں اور درمیان میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی ہوتی تھی اور آپ اپنے پاؤں دو شیروں کے اوپر رکھتے تھے اور آپ کے اوپر سایہ کرنے کے لیے پرندے ہوتے تھے۔ انسانوں، وزراء کی کرسیاں ہوتی تھیں، ان کے بعد جنات کی کرسیاں ہوتی تھیں۔ وہ (تخت) پہلے دن میں ایک مہینے کا سفر کرتا اور شام سے لے کر صبح تک ایک مہینے کا سفر کرتا تھا۔ اسلام نے ہمیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو تخت دیا تھا۔ آج اگر طیارے بن گئے، اس طرح وہ ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہ تمہارا دعویٰ ہو اور ہم اس پر چل رہے ہوں۔

اسلام نے ہمیں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پرندے بھیجے تھے، ان کی چونچ میں تین پتھر تھے، جب وہ ڈالتے تھے تو وہ ہاتھی اور ہاتھی پر سوار سب کو برباد کر دیتے تھے اور ان کو ایسے بنا ڈالا، جیسے جانوروں کے پاؤں کے نیچے

روندا ہوا گھاس ہو اور سائنسدان اب اس ذرّے پر پہنچ رہے ہیں۔ اس کے اندر ان کا کوئی کمال نہیں۔

اسلام نے ہمیں بتایا کہ حضور اکرم ﷺ رات کے بعض حصہ میں مکہ سے مسجد اقصیٰ پہنچے اور اس کے بعد سات آسمانوں پر تشریف لے گئے اور اسلام نے ہمیں بتایا کہ اس سفر سے پہلے حضور اکرم ﷺ کا سینہ مبارک کھولا گیا۔ اگر تم آج دل کے آپریشن کر رہے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ چودہ سو سال پہلے ہمیں اسلام نے بتا دیا ہے۔ اس لیے ان کی خبر سے مرعوب ہو جانا کہ انہوں نے خبر دی ہے، ٹھیک نہیں۔

ایک ماہر فلکیات کا دینی مدرسہ کا سائنس کا سبق سننا:

ایک ماہر فلکیات ہندوستان میں آیا، اس کے دل میں خیال آیا کہ یہاں ایک دیوبند مدرسہ ہے، چلو اس مدرسہ کو دیکھ لیں۔ وہ مدرسہ میں آیا، ایک نابینا عالم تھے، اتفاق کی بات ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو فلکیات کا سبق پڑھا رہے تھے، ان کے سامنے نہ دنیا کا نقشہ ہے، نہ آلات ہیں اور نہ رصدگاہیں ہیں۔ انہوں نے ہاتھ کی مٹھی بند کی ہوئی ہے اور طلبہ کو کہا: یوں سمجھو کہ یہ دنیا ہے اور اس پر وہ بحث کر رہے تھے۔

اس پر اس ماہر فلکیات نے کہا: خدا کی قسم ہے! جب میں نے اس عالم کی بحث سنی تو میں نے محسوس کیا کہ میں نے جو کچھ پڑھا ہے، میں بالکل جاہل ہوں، مجھے علم تو آج حاصل ہوا ہے۔ نابینا مولوی جو پڑھا رہا تھا وہ تو ہماری کتابوں میں بھی نہیں ہے۔ وہ اس عالم سے جا کر بعد میں ملا اور کہا: آپ کے اسلامی علوم میں بھی یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں؟ ان عالم نے فرمایا: بالکل پڑھائی جاتی ہیں، یہ تو ہماری ابتدائی کتاب ہے، اس علم پر تو سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، اگر تم نے پڑھنی ہیں تو آؤ دیکھو۔

لیکن آج کا مسلمان ان سے اتنا مرعوب ہو جائے اور اپنے بیان میں وضاحت بھی نہ کرے کہ حقیقت حال کیا ہے؟ یہ افسوس کی بات ہے۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ نے کہا:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

ان انگریزوں کے جلوے مجھے نابینا اور مرعوب نہیں کر سکتے، میں نے تو مدینہ کی مٹی کا سرمہ پہنا ہوا ہے، یعنی میرے سامنے تو حضور اکرم ﷺ کی سنت، دنیا جہان کی دانش، اہلبیت، رسول کے جہاد، ان کی قربانیاں، ان کی کرامات ہیں۔ جب میں معجزات اور کرامات کو ماننے والا بندہ ہوں تو ان کے جلوے مجھے کیا خیرہ کریں؟

توحید اس وقت آئے گی جب تمام معبودانِ باطلہ کی نفی کرو اور اپنی خواہش کی بھی نفی کرو، غیر اللہ کی محبت کی بھی نفی کرو، اللہ کے سوا جس جس کی بھی عبادت کی جائے، سب کی نفی کرو اور سب سے براءت کا اعلان کرو کہ ﴿إِنَّنِي بَرِيٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ﴾ [الانعام:۱۹] یہ نہیں کہ دل میں تو نفی کرتے رہو، لیکن کھل کر بات نہ کرو، جیسا کہ جن لوگوں کا ہندوؤں سے تعلق ہے، ماشاء اللہ! ویسے تو پکے مسلمان ہیں، لیکن کبھی کبھی ان کے مندر کا پرشاد بھی کھا لیتے ہیں، اسی طرح جو لوگ یہود و نصاریٰ کے ساتھ رہتے ہیں وہ ان جیسا لباس بھی پہن لیتے ہیں اور ان کے گرجا گھر میں بھی چلے جاتے ہیں۔

اگر ان کو کوئی سمجھائے تو کہتے ہیں کہ اسلام وسیع مذہب ہے، وہ ہمیں منع نہیں کرتا، ہمیں جانا چاہیے، تاکہ دیکھیں کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ ضرور دیکھو! لیکن یہ نہیں کہ دیکھتے دیکھتے تم ان کے تابع بن جاؤ، تم ان کا ایک آدمی بھی کبھی راہِ راست پر نہیں لے آئے۔ دیکھیں! انہوں نے سگریٹ شروع کی اور تم سب کے ہاتھ میں سگریٹ پکڑوا دی، انہوں نے چائے شروع کی اور ہر آدمی کو چائے کا رسیا کر دیا۔ اس لئے ان سے پوری براءت بھی ہو۔

ہاں! دنیاوی لین دین علیحدہ بات ہے، وہ جائز ہے، بشرطیکہ جو تمہارا تعلق اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ﷺ سے ہے، اس کے اندر کوئی کمی نہ آئے۔ ایسے نہ ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کو فرمایا کہ میرے کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بتوں کو رکھا ہوا ہے اور پھر کہتے ہو: ہم ملت ابراہیمی پر ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام تو امام الحنفاء تھے۔ بعض لوگوں نے جو لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے ایمان کے مراحل میں پہنچے، ان کو دھوکہ لگا ہے۔ بڑے سے بڑے عالم کو بھی غلطی ہو سکتی ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے وضاحت کر دی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیدا ہونے کے بعد سے وفات تک پلک جھپکنے کے برابر بھی شرک نہیں کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم، برادری اور ابا سے کہا: ﴿إِنَّنِي بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ﴾ [الزخرف:۲۶] جن کی تم عبادت کرتے ہو اور ان کو حاجت روا اور مشکل کشا جانتے ہو، میں ان سے بری ہوں۔ میں تو صرف اسی کو حاجت روا، مشکل کشا اور نفع و نقصان کا مالک مانتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی مجھے راستہ دکھانے والا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا شکر کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو چن لیا اور صراط مستقیم کی ہدایت دی اور ہم نے دنیا میں بھی ابراہیم کو اچھائی دی کہ ان کی ذریت سے انبیاء پیدا کیے، ان کو عظمت والا بنایا، ان کو معمار کعبہ بنایا اور ان کی شان کو بلند کیا اور آخرت میں بھی وہ صالحین میں سے ہوں گے۔ صلاح کے کئی مراتب ہیں، اللہ کے نیک

بندے بھی صالحین ہوتے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو "عبادی الصالحین" میں شمار کیا تو معلوم ہوا کہ صلاح کے سب سے اعلیٰ مقام پر صرف نبی پہنچتے ہیں اور کوئی نہیں پہنچتا۔

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [البقرۃ:١٣١] اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسلام، استسلام اور انقیاد کا حکم دیا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس کو قبول کیا اور اللہ تعالیٰ نے جیسے حکم فرمایا اس کی تعمیل فرمائی۔

﴿وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ:١٣٢]

جو آیات شروع میں تلاوت کی گئیں، ان کا مقصد اثباتِ رسالت اور حقانیت اسلام ہے اور مشرکین و یہود و نصاریٰ کا رد ہے۔ یہ لوگ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے اور ان تمام کا دعویٰ تھا کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں تو ہم اپنے دین کو کیوں چھوڑیں؟ مگر اللہ تعالیٰ نے واضح بیان فرما دیا کہ ملت ابراہیمی پر اگر کوئی جماعت قائم ہے تو وہ اُمت محمدیہ ہے۔

یہودی یہ بہانہ بھی بناتے تھے کہ ہم تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، انہی کو نبی مانتے ہیں اور ان کی شریعت پر قائم ہیں۔ ہمیں تو یعقوب علیہ السلام نے کی وصیت فرمائی تھی کہ ہمارے دین کو نہ چھوڑنا تو ہم کیوں چھوڑیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ اگر تم وصیت پر قائم ہو تو ابراہیم اور یعقوب کی وصیت ہم تمہیں سناتے ہیں کہ انہوں نے اپنی اولاد اور اپنی اولاد کی اولاد سب کو یہ وصیت کی تھی کہ اسی ملت ابراہیمی پر اور دین اسلام پر قائم رہنا، اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ ماننا، اللہ تعالیٰ کی عبادت کے سوا کسی غیر کی عبادت نہ کرنا۔ اس وصیت پر تو محمد رسول اللہ ﷺ قائم ہیں، تم نے اس وصیت کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے فرمایا تھا: ایک الٰہ کی عبادت کرنا، جبکہ عیسائیوں نے تین خدا بنا لئے اور تثلیث کے قائل ہو گئے، انہوں نے تو وصیت کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی تمام صفات کے ساتھ ماننا اور اس کی صفت ﴿لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ﴾ [الاخلاص:٣] ہے، جبکہ تم نے اللہ کے بیٹے بنا ڈالے۔

یاد رکھیں! جو بھی نبی اپنے زمانہ میں آئے وہ لازماً یہ وصیت فرما گئے کہ میرے دین پر جمے رہو، اس کو نہیں چھوڑنا۔ ان کے بعد جو اللہ کے نبی آئیں گے تو ان کی بھی تو وہی دعوت ہے جو پہلے نبی کی دعوت ہے، جیسا کہ ہمارا ایمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ہے، لیکن ہم تمام انبیاء پر بھی ایمان رکھتے ہیں، ﴿لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ

لَہٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۳۶] حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک جتنے انبیاء گزرے ہیں سب پر ہمارا ایمان ہے کہ سب انبیاء برحق ہیں، سب رسول برحق ہیں، ان کی شریعتیں اپنے اپنے زمانہ کے لئے برحق تھیں۔ اس لئے ہر نبی جو وصیت کرے، اس کی وصیت کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ اس نبی کے بعد جو نبی آئے اس پر ایمان نہ لے آؤ۔ باقی مشرکین مکہ کے پاس تو کوئی چھوٹی سی دلیل بھی نہیں ہے: ﴿وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ﴾ [سبا:۴۴] کیونکہ ان جاہلوں کو تو ہم نے پہلے کوئی کتاب نہیں دی کہ یہ پڑھیں، اور نہ ہم نے پہلے ان کے پاس کوئی رسول یا نبی بھیجا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک چھ سو سال تک کوئی پیغمبر بھی نہیں آیا تو یہ مشرکین کس کی وصیت پر قائم ہیں؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات کے بعد یہاں کوئی نبی نہیں آیا، یہ تو عناداً اور جہلاً اپنے آباء کی محض تقلید جامد کر رہے ہیں کہ ہمارے باپ دادا اسی طریقہ پر تھے۔

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیاتِ مبارکہ میں اس وصیت کا ذکر فرمایا، تا کہ یہود ونصاریٰ کا رد ہو جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ملت اسلام کی وصیت کی تھی کہ تم اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر دو۔

﴿وَوَصّٰى بِهَآ﴾ میں ضمیر لفظ ''اللہ'' کی طرف راجع ہے یا پھر ماقبل والی آیات کی طرف راجع ہے کہ ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ یعنی میں نے اپنے آپ کو اللہ کے تابع کر دیا، اللہ کے حکم کے بعد چوں چراں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اگر ایک آدمی دعویٰ کرے کہ میں مسلمان ہوں تو اب اللہ کا جو حکم ہوگا، اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوگا۔ یہ نہیں کہ آدمی اسلام کا دعویٰ کرے اور صرف ان احکام پر عمل کرے جو اس کے مفاد میں ہوں۔

کعب بن اشرف یہودی کے قتل کا واقعہ:

کعب بن اشرف جو معاہدے میں شریک تھا، اس نے کوئی ایسی دشمنی نہیں چھوڑی جو اس نے حضور اکرم ﷺ کے خلاف نہ کی ہو، حتیٰ کہ ایک جگہ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک یہودیہ عورت سے چکی کا پتھر ایک صحابی پر گرا کر انہیں شہید کر دیا۔ اللہ کے نبی جیسی ذات کو بھی آخر یہ کہنا پڑا کہ کون ہے جو اس بدبخت (کعب بن اشرف) سے میرا بدلہ لے؟ محمد بن مسلمہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: میں بدلہ لوں گا۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ اس سے ایسی باتیں کروں کہ جس سے اس کو اپنی دوستی کا اعتماد دلاؤں۔ آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ دو تین آدمیوں کو لے کر کعب بن اشرف سے ملے اور کہا: جب سے حضور اکرم ﷺ آئے ہیں ہمارا تو کوئی نام نہیں رہا۔ اس نے کہا: تم تو مسلمان ہو۔ انہوں نے کہا: جان بچانے کے لیے ملے ہوئے ہیں، تم

ہماری امداد کرو، تا کہ ہم لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں۔ اس نے کہا: میں امداد کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن ایک شرط پر قرض دوں گا کہ تم میرے پاس رہن رکھو۔ محمد بن مسلمہ نے کہا: ہم تیار ہیں، کیا چیز رہن رکھیں؟ یہودی نے کہا: اپنی عورتیں میرے پاس رہن رکھ دو۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے جوش تو بڑا آیا، لیکن میں نے صبر کے ساتھ کہا: ہم عورتیں رہن نہیں رکھ سکتے، اس لیے کہ تم بڑے خوبصورت جمال والے ہو، ہماری عورتیں فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گی، تم پر عاشق ہو جائیں گی تو ہم لوگ مصیبت میں آ جائیں گے۔ اس نے کہا: یہ بات ہے تو تم اپنے لڑکے میرے پاس رہن رکھ دو۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ سردار آدمی، دولت مند آدمی ہو، ہم نے تمہارے پاس بچے رہن رکھ دیئے تو ساری دنیا ہمارے بچوں کو طعنے دے گی کہ تمہارے باپ دادا نے پیسوں کے لیے تمہیں رہن رکھا تھا۔ اس نے کہا: بات تو تمہاری ٹھیک ہے، پھر تم کیا چیز رہن رکھو گے؟ ایسے تو میں تمہیں قرض نہیں دیتا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم تمہارے پاس اپنے ہتھیار رکھ دیتے ہیں۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے...... وہ صحابہ کرام کو سمجھ نہ سکا؛ کیونکہ انہوں نے سوچا کہ اگر ہم ایسے اسلحہ لے کر آئیں تو یہ بدبخت ہمیں کہاں چھوڑیں گے؟ اب یہ خود کہہ رہا ہے، اس لئے ہتھیاروں کے ساتھ اندر پہنچ جائیں گے۔ آگے دیکھا جائے گا...... محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کس وقت لے آئیں؟ اگر ہم دن کو ہتھیار رکھیں تو بے عزتی ہے، رات کا کوئی وقت دے دو، ہم چوری چوری لے آئیں گے۔ کعب بن اشرف نے کہا: ٹھیک ہے، رات کو آ جانا۔

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: بات سنو! یہ بڑا بدبخت ہے، یاد رکھو! جب میں اس سے ملنے کے بہانے ماتھے پر بوسہ دوں گا تو میں اس کو قابو کر لوں گا، تم اس کو نیچے سے کاٹ دینا، اس کو چھوڑنا نہیں ہے۔ رات کے وقت سب ہتھیار لے کر پہنچ گئے۔ کعب بن اشرف اپنے محل میں تھا، انہوں نے جا کر آواز دی۔ ملازمین نے پوچھا: کیا بات ہے؟ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اس نے ہمیں خود بلایا ہے۔ ملازمین اسی کشمکش میں تھے کہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اس کو زور سے آواز دی کہ ہم تمہارے دروازے پر کھڑے ہیں۔ وہ آواز سن کر نیچے اُترنے لگا تو بیوی نے کہا: مت جاؤ، اس آواز سے خون کی بُو آتی ہے۔ کعب بن اشرف نے کہا: یہ تو محمد بن مسلمہ ہے، میرا دوست ہے، وہ رہن رکھنے کے لئے سامان لایا ہے، ہم ان کے ہتھیار لے لیں گے، پھر ان کو ذلیل کریں گے۔ بیوی نے کہا: تمہاری مرضی ہے۔

کعب بن اشرف باہر آیا اور صحابہ نے ہتھیار نیچے رکھے ہوئے تھے۔ جب قریب آیا تو محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

آج تجھ سے ایسی عطر کی خوشبوئیں آ رہی ہیں کہ ایسا عطر تو میں نے کبھی نہیں سونگھا۔ اس نے کہا: تمہیں پتہ نہیں کہ میری بیوی عرب قبائل میں سب سے زیادہ عطر استعمال کرنے والی عورت ہے۔ جب میرے گھر میں ایسی بیوی ہوگی تو میں بھی عطر استعمال کروں گا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اس کے سر پر بوسہ دے کر ہٹ گیا اور پھر کہا: اگر مجھے اجازت دو تو میں ایک دفعہ پھر خوشبو سونگھ لوں۔ اس نے کہا: کوئی بات نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے اس کو پکڑ لیا اور ساتھی نے حملہ کر دیا اور اس کو مارنے کے بعد میرے ساتھی بھاگ گئے۔ میں نے اس بد بخت کو اس وقت تک قابو رکھا جب تک وہ زمین پر نہیں گر گیا اور پھر میں قلعہ کی اوٹ میں بیٹھ گیا، تاکہ میں سن لوں کہ وہ مر گیا ہے۔ کچھ دیر گزری تو اس قلعہ پر نوحہ، رونا، چیخنا پکارنا شروع ہو گیا کہ کعب بن اشرف قتل ہو گیا۔

ہر شخص اپنی اولاد کو عقیدہ کی وصیت کرے:

﴿وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ﴾ اس آیت میں ذکر کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وصیت کی اور یعقوب علیہ السلام کو بھی وصیت کی، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں۔ راجح قول یہی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بھی وصیت میں موجود تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ موجود نہیں تھے، لیکن یہ قول راجح نہیں ہے؛ کیونکہ قرآن مقدس میں جب موجود ہے: ﴿وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴾ [ھود:۷۱] ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوشخبری دی کہ آپ کو ایسا بیٹا ملے گا اور پھر بیٹے کا بیٹا بھی ملے گا۔ لہٰذا حضرت یعقوب علیہ السلام بھی پیدا ہو چکے تھے۔

اس سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کے لئے عقیدہ کی وصیت کرے۔ توحید پر رہنا، شرک نہ کرنا، بدعت میں نہ پڑنا، صحابہ رضی اللہ عنہم کی دشمنی نہ کرنا، قادیانی نہ بن جانا، فرقِ باطلہ سے بچنا اور دین اسلام پر قائم رہنا۔

دوسری وصیت اپنے مال کی کرے کہ میں نے فلاں کا قرضہ دینا ہے اور فلاں سے قرضہ لینا ہے۔ میرے بعد جائیداد وصیت کے احکام کے مطابق تقسیم ہو۔ اس لئے حکم ہے کہ آدمی نہ سوئے جب تک وصیت لکھی ہوئی اس کے سرہانے کے نیچے موجود نہ ہو؛ کیونکہ موت کا کوئی پتہ نہیں ہے۔

﴿وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ﴾ [الانبیاء:۷۲]

ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق عطا فرمایا اور ان کے بعد پوتا یعقوب بھی عطا فرمایا۔ آدمی کو اولاد بڑی

پیاری ہوتی ہے، لیکن جب اولاد کی اولاد ہو جائے تو وہ اور زیادہ پیاری لگتی ہے۔ ان کے لئے آدمی پھر رہا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کو نفع پیارا ہوتا ہے؛ کیونکہ اولاد تو اصل ہوئی۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات میں پیدا ہو چکے تھے۔ پہلی کتابوں میں ہے کہ بیت المقدس کے بانی بھی وہی تھے۔

سب سے پہلے کون سی مسجد کی بنیاد رکھی گئی؟

صحیحین کی حدیث میں موجود ہے، ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ نے سب سے پہلے کس مسجد کی بنیاد رکھوائی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامُ، قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: اَلْمَسْجِدُ الأَقْصَى، قُلْتُ: كَمْ كَانَ بَيْنَهُمَا؟ قَالَ: أَرْبَعُونَ سَنَةً." [صحیح بخاری، رقم:۳۳۶۶]

مسجد حرام۔ میں نے کہا: مسجد حرام کے بعد پھر دوسری مسجد کون سی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیت المقدس۔ میں نے کہا: مسجد حرام کے بعد بیت المقدس کی بنیاد کے درمیان کتنی مدت ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چالیس سال ہے۔

ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت المقدس کے بانی ہیں کہ انہوں نے اس کی دوبارہ تعمیر کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام اس کے مجدد ہیں۔ لیکن ابن حبان کی یہ بات کوئی مضبوط نہیں ہے۔ علماء نے فرمایا: ان کے درمیان تو ہزاروں سال کا فاصلہ ہے، نہ کہ چالیس سال کا۔

﴿يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۳۲] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وصیت فرمائی کہ اپنی زندگی میں اچھے اچھے کام کرو، تمہیں نہ موت آئے مگر اس حال میں کہ تم اسلام پر رہو۔ یعنی اچھے کام کرتے رہو، تاکہ موت بھی اچھے کاموں پر آئے؛ کیونکہ عموماً آدمی جس لائن پر پڑا ہوا ہو، موت بھی اسی حال میں آتی ہے۔

یہود و نصاریٰ کا دین یعقوبی پر قائم رہنے کا دعویٰ:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل کی بہت بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔ انسان اپنی عقل سے خیر اور شر میں امتیاز کرتا ہے

اور یہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ چیز مجھے نفع پہنچانے والی ہے اور یہ چیز نقصان پہنچانے والی ہے۔ آپ آگ میں پاؤں نہیں ڈالتے، کانٹے کے اوپر پاؤں نہیں رکھتے، کوئی تیز ندی بہہ رہی ہو تو اس میں نہانے کی کوشش نہیں کرتے؛ کیونکہ عقل منع کرتی ہے کہ ڈوب جاؤ گے، جل جاؤ گے اور جہاں تمہیں صاف راستہ ملتا ہے وہاں قدم رکھتے ہو۔ عقل، اللہ کی عظیم نعمت ہے، آپ ان لوگوں کو دیکھیں جن سے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت چھین لی ہے۔ خوبصورت نوجوان ہوتے ہیں، صحت وتندرستی بھی ہوتی ہے، چلتے پھرتے ہیں، لیکن عقل نہیں ہوتی۔ اس لئے قاعدہ ہے کہ تو عقل سے دلائل دے گا آدمی جب بھی دعویٰ کرتا ہے، مثلاً غلاف کعبہ کالا ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ سامنے ہے، دیکھ لو۔ آپ نے دعویٰ کیا کہ رات ہے۔ دلیل یہ ہے کہ چاند، تارے نکلے ہوئے ہیں۔ یا پھر نقل سے دلیل دے گا، یعنی کسی کتاب کا حوالہ ہو گا۔ جب یہود و نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ ہمیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے وصیت کی ہے کہ تم میرے دین پر قائم رہو اور میرے سوا کسی کا دین قبول نہ کرنا۔ اس دعویٰ پر وہ بھی کوئی دلیل تو دیں۔ ہم عقل کے اعتبار سے دیکھتے ہیں تو بھی ہمیں یہ بات غلط لگتی ہے؛ کیونکہ اگر ایک پیغمبر کا زمانہ ختم ہوا تو دوسرے پیغمبر آگئے۔ ایسا تو نہیں تھا کہ ایک کے بعد اللہ دوسرا پیغمبر بھیجیں تو اس کی بات کو نہ مانو۔ یہ ایک واضح بات ہے کہ کوئی عقل والا اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ بادشاہ نے اگر ایک سفیر کے بعد دوسرا سفیر بنایا ہے تو ہم نے اس سفیر کا حکم بھی ماننا ہے۔ جب ہم نقل کی طرف آئیں تو قرآن مقدس کے اندر یہ بات موجود ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام انبیاء اور رسولوں سے یہ عہد لیا تھا کہ محمد مدنی کا زمانہ ملے تو ان پر ایمان لے آنا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو پتہ تھا کہ ان انبیاء کو حضور اکرم ﷺ کا زمانہ ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ اپنی اپنی امتوں کو کہتے جاؤ، تاکہ شانِ مصطفیٰ ﷺ کا اظہار ہو کہ اتنی شان والا نبی آ رہا ہے کہ اللہ نے تمام نبیوں سے پابندی اور عہد لے لیا: ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ﴾ [آل عمران: ۸۱] حالانکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ہم نے ان کو آخر میں بھیجنا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور گزرے ہوئے چھ سو سال گزر گئے اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے آسمان پر اُٹھا لیا۔ جب تمام انبیاء یہ بات کہتے چلے آئے تو یہ دعویٰ کرنا کہ یعقوب علیہ السلام نے وصیت کی تھی کہ میرے بعد کسی کو نہ ماننا، یہ نقل کے خلاف ہے؛ کیونکہ یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے ہیں اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تو حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں اور ان کی دعاؤں کا اللہ نے اظہار فرمایا اور تم اس کا انکار کر رہے ہو اور دعویٰ کرتے ہو کہ یعقوب علیہ السلام نے وصیت کی تھی۔ یہ ایسی بات تھی کہ ان

کے پاس نہ عقلاً دلیل تھی اور نہ نقلاً دلیل تھی۔ (اور اگر ایسی ہی بات ہے جیسے یہودی کہتے ہیں تو وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ، حضرت یوشع، حضرت سموئیل، حضرت داوٗد علیہم السلام کو کیوں مانتے ہیں)؟

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۳۳، ۱۳۴]

”کیا تم موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا؟ جب انہوں نے اپنی اولاد سے کہا: میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ کہا: ہم آپ کے معبود اور آپ کے آباء ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے، جو تنہا معبود ہے اور ہم اس کے تابعدار رہیں گے۔ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے (عمل) کیا اور تم (یہودیوں) کے لیے وہ ہے جو تم نے کیا اور تم سے نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا عمل کرتے تھے۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام کا وفات کے وقت وصیت کرنا:

جب حضرت یعقوب علیہ السلام پر وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے ایک ہی وصیت فرمائی کہ خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ اور اس بات کو مزید پکا اور مستحکم کرنے کے لئے یعقوب علیہ السلام نے ان سے ایک سوال کیا: ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ﴾ کہ تم میری وفات کے بعد کس دین پر قائم رہو گے؟ کس کی عبادت کرو گے؟

ان کے بیٹوں نے جواب میں کہا: ﴿نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ [البقرۃ: ۱۳۳]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے نہیں تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ان کے چچا ہیں۔ یہ تغلیب کے طور پر ہے کہ تغلیباً ”عم“ پر ”اب“ کا اطلاق بھی کر دیا جاتا ہے، یعنی چچا باپ کی جگہ ہے اور دادا بھی باپ ہے، کیونکہ وہ باپ کا باپ ہے۔ بعض صحابہ نے اس سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ دادا وہ بھی گویا باپ ہے۔ اگر دادا موجود ہے تو بھائی وراثت نہیں لیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا رجحان اسی قول پر تھا۔ اس کی مزید تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی۔

اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ اصل تو یہی توحید اُلوہیت ہے؛ کیونکہ توحید ربوبیت کے تو سب قائل ہیں کہ اللہ ہی پالنے والے، کھلانے والے، آسمان وزمین پیدا کرنے والے ہیں۔ توحید کا اصل مقام یہ ہے کہ عبادت خالص اسی کی ہو۔ عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور اس سے بڑا کوئی شرک نہیں ہے کہ آدمی اللہ کے سوا غیر کو پکارے، اس سے استغاثہ کرے۔ ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۳۳] اور ہم اسی کے سامنے جھکنے والے اور اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ ﴿وَاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ﴾ [الانعام:۳۶] لاکھ انکار کریں، لیکن مرنے کے بعد اللہ کے دربار میں جانا پڑے گا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جتنے انبیاء ورسل گزرے، ان سب کی ملت اسلام تھی۔ ہاں! شریعت مختلف تھی، یعنی بعض فروعی احکام مختلف تھے، مثلاً ہم پر پانچ نمازیں ہیں، موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تین نمازیں تھیں، ہمارے لئے ایک مہینہ کے روزے ہیں، کسی شریعت میں دو مہینے کے روزے تھے، رات کو کھانا ناجائز تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت کو علیحدہ علیحدہ ان کے حالات کے مطابق شریعت دی، لیکن عقیدہ اور اسلام ایک ہی تھا۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ [الانبیاء:۲۵] اس بارے میں قرآن کی متعدد آیات اور کثیر احادیث موجود ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم سب نبی علاتی بھائی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کا زمانہ علیحدہ بنایا، شریعتیں الگ الگ بنائیں، لیکن عقیدہ، اُصول سب کا ایک ہے۔

﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۳۴] اس آیت میں پھر مشرکین اور کفار کا رد فرمایا کہ اے مشرکین مکہ! اے یہود ونصاریٰ! اگر تم پہلی اُمتوں کی باتیں کرتے ہو تو وہ اُمتیں تو گزر گئیں۔ اس اُمت نے جو کیا ہے اس کو اس کا پھل ملے گا اور تم جو کرو گے تمہیں اس کا پھل ملے گا۔ تو تم کیوں بلاوجہ یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ہم نے پہلے دین ہی پر رہنا ہے۔ تم یہ دعویٰ نہ کرو کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں، ہم یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ یہ نسبت تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی، جب تک تم خود کوئی بھلائی کا کام نہ کرو۔ اگر صرف رشتہ داری بچا سکتی تو نوح علیہ السلام کا بیٹا اور لوط علیہ السلام کی بیوی جہنم میں نہ جاتی۔

﴿وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا ۚ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾
[البقرۃ:۱۳۵]

''اور کہتے ہیں کہ یہودی بن جاؤ یا عیسائی، ہدایت پا جاؤ گے۔ آپ (ان سے) کہہ دیجیے: بلکہ ہم ملت ابراہیم کی اتباع کریں گے جو موحد تھے اور ابراہیم مشرکین میں سے نہیں تھے۔''

شانِ نزول:

عبداللہ بن سوریا حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: ہم یہود ہدایت پر ہیں۔ اے محمد! آپ بھی ہماری اتباع کریں اگر آپ ہدایت چاہتے ہیں۔ اور نصاریٰ کہتے: ہمارے دین پر آ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے نبی! یہ یہود و نصاریٰ آپ سے کبھی بھی راضی نہ ہوں گے، چاہے آپ ان کے ساتھ تعلقات رکھ لیں جب تک کہ آپ یہودی یا نصرانی نہ بن جائیں۔

﴿حَنِيفًا﴾ کی مختلف تفاسیر:

1 ...... بعض علماء نے فرمایا: ''حَنِيفًا'' کا معنی ''مُسْتَقِيمًا'' ہے، یعنی بالکل سیدھا چلنے والا۔

2 ...... بعض علماء نے فرمایا: ''حَنِيفًا'' کا معنی ہے کہ خالص اللہ کی عبادت کرنے والا۔

3 ...... بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے اللہ کے لئے حج کرنے والا۔

4 ...... ابوالعالیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''حنیف'' اس کو کہتے ہیں جو نماز میں اللہ کے کعبہ کی طرف رخ کرنے والا ہو اور اگر اللہ مال دے تو اس کے گھر کا حج بھی کرے۔

5 ...... حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حنیف'' کا معنی ہے: اللہ کی اتباع کرنے والا۔

6 ...... حضرت ابوقلابہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''حنیف'' کا معنی ہے کہ اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لے آئے، جو پہلے آئے یا بعد میں آئے۔

7 ...... حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''حنیف'' کا معنی ہے اللہ کی توحید کا اقرار کرنے والا، تمام آلہہ باطلہ کی نفی کرے اور جب وہ اللہ کی اطاعت کرنے والا ہے تو اللہ نے ماں، بیٹی، خالہ، بہن کے ساتھ نکاح حرام کیا ہے اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں ان کو حرام جانے اور اللہ نے ختنے کا حکم دیا ہے، اس کی بھی تعمیل کرے۔

یہ سارے اقوال متقاربۃ المعنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں حضور اکرم ﷺ سے فرمایا کہ آپ اعلان کر دیں کہ ہم ملت ابراہیم پر ہیں۔ وہ توحید پر تھے، ہم بھی توحید پر ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کعبہ بیت اللہ تھا اور

ہمارا کعبہ بھی وہی ہے۔ ان کے بھی مناسک حج تھے، ہمارے بھی مناسک حج ہیں۔ اصل ملت پر تو ہم ہیں، تم نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہو اور نہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے دین پر ہو، بلکہ تم صرف اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہو۔

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۳۶]

"(اے مومنو! تم) کہہ دو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہم پر اُترا اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اس کی اولاد پر اُترا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو ملا اور جو دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے ملا، ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی پروردگار کے تابعدار ہیں۔"

ربط آیات:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے گزشتہ بات کو دوسرے انداز میں بیان فرمایا ہے کہ تم اُمت مصطفیٰ کا اعلان کر دو کہ ہم حضور پاک ﷺ پر ایمان لاتے ہیں، اجمالاً وتفصیلاً۔ اجمالاً جتنے پہلے اللہ کے نبی اور رسل گزرے ہیں ان پر ہمارا ایمان ہے اور تفصیلاً ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خاتم الانبیاء بنا کر بھیجا، آپ ﷺ پر نبوت ختم ہوگئی، اب قیامت تک کوئی نبی و رسول نہیں ہوگا، شریعت نہیں ہوگی، صرف شریعت اسلام ہوگی، دین اسلام ہوگا۔ جیسا کہ قرآن میں بیان فرمادیا: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ [الاحزاب:۴۰] میرے رسول پاک ﷺ سب سے آخری نبی ہیں۔

نبوت عام ہے اور رسالت خاص ہے۔ ہر رسول، نبی ہوتا ہے، لیکن ہر نبی، رسول نہیں ہوتا۔ جب آپ ﷺ کو خاتم النبیین بنا دیا گیا تو جو نبوت عام تھی، وہ ختم ہوگئی تو رسالت خود بخود ختم ہوگئی؛ کیونکہ جب خاتم عموم کے لیے آجائے تو خصوص اس میں خود بخود داخل ہوگیا۔ لہٰذا اب حضور اکرم ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے۔

اسلام کو کھوکھلا کرنے والی دیمک:

بعض گمراہ لوگ اسلام کو نقصان پہنچانے میں یہود و نصاریٰ سے کسی طرح کم نہیں ہیں، بلکہ ان سے زیادہ

ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کو پتہ ہے کہ فلاں یہودی ہے یا نصرانی ہے تو آپ اس سے بچتے ہیں، لیکن کتنے مسلمان ہیں؟ جو یہودیوں کے عبادت خانے میں جاتے ہیں، بلکہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا الا یہ کہ جو صرف نام کے مسلمان ہیں، ان کا مذہب وغیرہ کوئی نہیں ہوتا وہ چلا جائے تو اور بات ہے، لیکن ان یہود و نصاریٰ سے زیادہ اسلام کو نقصان پہنچانے والے وہ گمراہ فرقے ہیں جو اسلام کا نام لے کر اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر ہیں۔

بہرحال ہم مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام انبیاء برحق ہیں، تمام رسول برحق ہیں۔ ہمارا اُن پر اجمالاً ایمان ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ خاتم الانبیاء سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، ہمارا مفصل ایمان شریعت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ہے، ان کے آنے سے پہلی شریعتیں بھی ختم، پہلی کتابیں بھی ختم، پہلے احکام بھی ختم ہو گئے۔ اب قیامت تک کتاب شریعت وہ حضور اکرم ﷺ کی ہے۔

تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے:

ہمارا تو اس کتاب پر بھی ایمان ہے جو ہماری طرف اُتاری گئی اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد پر اُتارا گیا، سب پر ہمارا ایمان ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا ہمارا اس پر بھی ایمان ہے، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا ہمارا اس پر بھی ایمان ہے۔ ہم نبیوں میں فرق نہیں کرتے کہ اس کو مانتے ہیں اور اس کو نہیں مانتے، بلکہ ہم سب کو مانتے ہیں اور حضور اکرم ﷺ کی شریعت کے تابع ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی ختم نبوت:

''خاتم'' میں دو قراءتیں ہیں: ایک زبر کے ساتھ اور ایک زیر کے ساتھ۔ دونوں صورتوں میں معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

''خاتَم'' کا معنی مہر ہے، یعنی جیسے ساری درخواست لکھ کر، خط لکھ کر اس کے اوپر مہر کر کے سیل لگا دیتے ہیں کہ اب اندر کی چیز باہر نہ آئے اور باہر کی چیز اندر نہ داخل ہو سکے تو معنی ہوا کہ انبیاء اور رسولوں پر حضور اکرم ﷺ مہر ہیں، اب سلسلہ نبوت کے اندر نہ کوئی چیز کم ہوگی اور نہ زیادہ ہوگی اور اگر ''خاتِم'' بمعنی مہر لگائی جائے تو معنی ہوگا کہ

حضور اکرم ﷺ انبیاء پر گویا مہر لگانے والے ہیں۔

''خاتم'' بمعنی آخری۔ یعنی حضور اکرم ﷺ آخری نبی ہیں اور یہ ترجمہ حضور پاک ﷺ نے خود فرمایا کہ اے میری اُمت! تمام انبیاء پر اللہ تعالیٰ نے مجھے فضیلت دی ہے اور کچھ چیزیں مجھے ایسی ملی ہیں جو اور کسی کو نہیں ملیں۔ فرمایا: مجھے اللہ نے جوامع الکلم عطا فرمائے، یعنی ایسے کلمات عطا فرمائے جن کے لفظ تھوڑے ہیں، لیکن ان میں معانی کے سمندر بہہ رہے ہیں۔ میں جب دشمن کے خلاف قتال کروں تو دو مہینہ کی مسافت سے اللہ دشمنوں کے دلوں کے اندر میرا رعب ڈال دیتے ہیں اور تمام سرزمین اللہ نے میرے لیے پاک بھی کر دی اور مسجد بھی بنا دی۔ آخری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نبیوں کو ختم کرنے والا بنایا ہے، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے واضح طور پر فرمادیا:

''أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي.'' [جامع ترمذی، رقم:۲۲۱۹]

میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں جو صحابہ کا اجماع ہوا، سارے صحابہ متفق ہوئے، یہی ختم نبوت کا مسئلہ تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی پر مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑائی لڑی اور اس فتنہ کو ختم کیا۔

''خاتم'' کا ایک معنی یہ بھی ہے جس پر کمالات کی انتہاء ہو جائے۔ قادیانی مسلمانوں کے عقیدے کو توڑنے کے لئے کبھی ''مثنوی'' کے شعر لے آتے ہیں اور کبھی ''تحذیر الناس'' لے کر آتے ہیں کہ مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے یہ بات لکھی ہے کہ ''خاتم'' کا معنی کمالات اور شرف کی جامعیت ہے۔ حالانکہ یہ ان کی جہالت ہے اور یہ ان کی بات کو سمجھ نہیں سکے۔ مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ''خاتم'' کا ایک معنی ''مہر'' ہے اور ایک معنی ''آخر'' آتا ہے، آخر اور مہر کے معنی میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اسی طرح اس کا ایک معنی جامعیت باعتبار انتہاء کمال کے آتا ہے، لیکن نبوت کے اندر جتنے کمالات ہو سکتے تھے، اللہ تعالیٰ نے تمام کمالات کی حضور اکرم ﷺ پر انتہاء کر دی۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیں کہ نبوت کے کمالات سو تھے، اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر کو دس دیئے، کسی کو پندرہ دیئے۔ جب حضور اکرم ﷺ آئے تو آپ پر تمام کمالات کی انتہاء ہو گئی، شاہکار نبوت مکمل ہو گیا، اس میں کوئی نقص نہ رہا اور کمی باقی نہ رہی۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ آپ ﷺ خاتم ہیں باعتبار زمانہ کے کہ جس طرح آپ ﷺ آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اسی طرح آپ رُتبہ میں بھی ایسے نبی ہیں جن سے اوپر کسی کا رُتبہ نہیں ہے۔ ان

کا مقصد تو یہ تھا، لیکن قادیانیوں نے ختم نبوت کا اپنی مرضی والا معنی کر کے مسلمانوں کو غلطی میں ڈالنے کی کوشش کی۔

یاد رکھیں! ایک چیز کا ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ ظاہر ہوگا تو باطن رہے گا۔ اسی طرح اگر ''خاتم'' کا ظاہری معنی اُڑا دیں تو معنی باقی نہیں رہے گا۔ بعض لوگوں کو سمجھ نہیں ہوتی تو باتیں کرتے ہیں، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے۔ قادیانی نے یہ بہانہ بنا کر کہہ دیا کہ خواب باقی ہے، لہٰذا نبوت بھی باقی ہے۔ یہ بھی ایک دھوکہ ہے۔ سمجھیں کہ ہاتھ، ٹانگ انسان کے جزو ہیں، اگر ہاتھ کو کاٹ کر کہیں ڈال دو گے تو کہیں گے: ہاتھ پڑا ہے، یہ نہیں کہیں گے کہ بندہ پڑا ہے یا کہو گے: بندے کا ہاتھ پڑا ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ بندہ پڑا ہے؛ کیونکہ ایک جزء ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو نبوت ملنے سے پہلے اللہ تعالیٰ خواب دکھاتے ہیں۔ خواب رحمانی بھی ایک مقام ہے اللہ تعالیٰ نے مؤمنین، متقین کے جو خواب باقی رکھے تو گویا انبیاء علیہم السلام کے ایک جزء علم کو باقی رکھا گیا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کل یعنی نبوت بھی باقی ہے۔ اگر کسی کی ایک آنکھ نہ ہو تو تم اس کو کانا کہتے ہو، دونوں نہ ہوں تو اندھا کہتے ہو۔ ٹانگیں نہ ہوں تو لنگڑا کہتے ہو، جبکہ ادھر ایک جزء کی وجہ سے والے کو نبی مان لو گے۔ یہ ایک دھوکہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ فرمائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں: اہل کتاب، تورات کو عبرانی لغت میں پڑھتے تھے اور اس کا ترجمہ عربی میں کرتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''لَا تُصَدِّقُوا أَهْلَ الْكِتَابِ وَ لَا تُكَذِّبُوهُمْ'' [صحیح بخاری، رقم:۴۴۸۵] (نہ تم ان کی بات کو سچا سمجھو اور نہ ان کی بات کو جھوٹا جانو، بلکہ کہو ہمارا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے اور اللہ نے جو اُتارا ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضور اکرم ﷺ صبح کی نماز سے پہلے جو دو رکعتیں پڑھتے تھے اور آپ ﷺ زیادہ تر ان کی پہلی رکعت میں ﴿قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَمَآ اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ﴾ پڑھتے تھے۔ [صحیح مسلم، رقم:۷۲۷] حضور اکرم ﷺ کو صبح کی یہ دو رکعتیں بڑی محبوب تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ بھی علامتِ قیامت ہی ہے کہ وقت گزرتے ہوئے پتہ ہی نہیں چلتا رات ختم ہوگئی اور صبح ہوگئی، دن ختم ہوگیا اور رات آگئی۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اس پر زور دیا کہ کفر سے براءت کا اعلان اور اللہ کی توحید کا اعلان کرو۔

آپ تمام احادیث مبارکہ پر نظر ڈالیں کہ جو جو آیات جہاں جہاں حضور اکرم ﷺ نے نماز میں پڑھی ہیں۔

مناسبت کے ساتھ پڑھی ہیں، ورنہ آپ کہیں سے بھی تین آیات پڑھ لیں تو نماز ہو جائے گی، لیکن وہ سورتیں جو حضور پاک ﷺ نے پڑھی ہیں، اگر ان کی اتباع کی جائے تو نور علیٰ نور ہے۔ اس میں قرآن بھی پڑھا جائے گا اور سید الانام کی اتباع بھی ہو جائے گی۔

قرآن پڑھنے کا ذوق رکھنے والے شخص کا واقعہ:

ہمارے ہاں ایک شخص تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآن پر ایسا عبور دیا تھا کہ جب بھی کوئی بات ہوتی تو فوراً اسی کے مطابق قرآن کی آیت پڑھتے تھے۔ ایک آدمی نے ان کو ہاتھ والا پنکھا جھلنا شروع کیا، انہوں نے منع کیا تو قاضی صاحب نے کہا: "لَا بَأْسَ بِهٖ" (اس میں کوئی حرج نہیں)۔ انہوں نے کہا: ﴿فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ﴾ [النمل:۲۵] اس طرح انہوں نے فوراً قرآن پاک کے لفظ سے جواب دے دیا۔

اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو اس طرح کا ذوق نصیب فرماتے ہیں۔ آپ بھی اپنے اندر ایسا ذوق پیدا کریں کہ اگر آپ حج کرنے کے لیے آئے ہیں، لوگوں کو نماز پڑھا رہے ہیں اور آپ عالم ہیں تو حج والی آیات کی تلاوت کریں تو حج کے احکام تازہ ہوتے رہیں گے۔

﴿وَالْأَسْبَاطِ﴾ کی مختلف تفسیریں:

1 ...... حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ، حضرت ربیع رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿اَلْأَسْبَاط﴾ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے بارہ آدمی تھے، جیسے بنی اسماعیل میں بڑے بڑے قبیلے ہیں، اسی طرح وہ بھی قبیلے تھے۔

2 ...... زمخشری رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ﴿اَلْأَسْبَاط﴾ سے مراد یعقوب علیہ السلام کے پوتے اور ان کی اولاد کی اولاد جو اُن بارہ سے پیدا ہوئی۔ امام رازی رحمہ اللہ نے بھی اسی کو نقل کیا اور کوئی رد نہیں کیا۔

3 ...... امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿اَلْأَسْبَاط﴾ سے مراد بنی اسرائیل کے قبائل ہیں۔

4 ...... مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿اَلْأَسْبَاط﴾ سے مراد بنی اسرائیل کے قبائل اور شاخیں ہیں جو بنی اسرائیل میں پیدا ہوئیں، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [المائدۃ:۲۰] جرھم نے ان کو بارہ قبائل میں تقسیم کیا تھا۔

5 ...... قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "سبط" کا معنی ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے۔

⑥......بعض نے کہا: اس کا معنی ''درخت'' ہے۔ جیسے ایک درخت ہوتا ہے اور اس کی کئی شاخیں ہوتی ہیں۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تمام انبیاء بنی اسرائیل سے آئے، مگر دس پیغمبر بنی اسرائیل سے نہیں تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ھود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

[ابن کثیر: ۱۷۸]

﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؁ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ؁ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ؁﴾

[البقرۃ: ۱۳۷ تا ۱۳۹]

''پس اگر (یہود و نصاریٰ) بھی ایمان لاتے جس طرح سے تم ایمان لائے ہو تو ہدایت پاتے اور اگر انہوں نے اعراض کیا تو پھر وہی ضد پر ہیں، پس اب آپ کی طرف سے بھی ان کو اللہ کافی ہے اور وہی سننے والا جاننے والا ہے۔ ہم نے اللہ کا رنگ قبول کیا اور اللہ کے رنگ سے زیادہ کس کا رنگ بہتر ہے؟ ہم تو اسی کی بندگی کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے: کیا تم ہمارے ساتھ اللہ کے متعلق جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال اور ہم تو خالص اسی کے لیے ہیں۔''

آیتِ مبارکہ سے یہود و نصاریٰ کا ردّ:

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ملت ابراہیم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے اور قرآن پاک نے یہ بات واضح بیان فرمادی ہے کہ ملت ابراہیمی صلی اللہ علیہ وسلم اور ملت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہیں۔ اور واضح دلائل کے ساتھ مشرکین، یہود و نصاریٰ کا بھی رد فرمادیا۔ وہ دعویٰ کرتے تھے: ہم ملت ابراہیمی پر ہیں۔ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے تھا، اس لیے ان کا نام لے لیا جاتا ہے، ورنہ کفر سے سارے کفار مراد ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ہندو ہوں، بدھ مت ہوں، سکھ ہوں، مجوسی ہوں یا دہریے ہوں؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرمان

میں وضاحت فرمادی ہے: "اَلْکُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ" کفر ایک ہی ملت ہے، چاہے وہ کسی شکل میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا: اے میرے نبی! آپ یہود و نصاریٰ، مشرکین اور پورے عالم کے کافروں کو بتادیں کہ تم ایمان لے آؤ اس طرح جس طرح میرے صحابہ مومنین کی جماعت ایمان لائی ہے، تم ہدایت کو پالو گے۔ ایمان کا نمونہ محمد رسول اللہ ﷺ اور اصحاب رسول اللہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

چار بڑے بتوں کا ذکر:

حرم میں چار بڑے بت تھے: اساف، نائلہ، ہبل اور لات۔ کتابوں میں ان کا ذکر موجود ہے۔ لات ایک بندہ تھا، وہ ستو بنا کر حاجیوں کی خدمت کرتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو اس کا بت بنا دیا گیا۔ بعض لوگوں نے فرشتوں کی شکل پر بت بنائے تھے۔ ان کے دماغ میں یہ تھا کہ (نعوذ باللہ) فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اس لیے آج بھی مندروں کے اندر کچھ بت مردوں کی شکل میں ہوتے ہیں اور کچھ عورتوں کی شکل میں ہوتے ہیں؛ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اس لیے اللہ نے ان کو آسمانوں میں چھپا کر رکھا ہے۔ اگر لڑکے ہوتے تو سب کے سامنے آتے، لیکن لڑکیاں ہونے کی وجہ سے اللہ نے پردے میں رکھا ہوا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں جس طرح صحابہ کرام ایمان لائے، تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے۔ اگر یہ اس طرح ایمان نہ لے آئیں اور اعراض کریں تو ان کو چھوڑ دیں۔ یہ جھگڑے میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ میری توحید کو لے کر جب مشرکین سے اور یہود و نصاریٰ سے ٹکرائیں گے تو دل میں خیال آئے گا کہ مسلمانوں کی جماعت کمزور ہے، وہ ان کا مقابلہ کیسے کرے گی؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ بالکل غم نہ کریں، آپ کا رب آپ کو کافی ہے، وہی آپ کی نصرت و مدد کرے گا، آپ کو عزت دے گا۔ ساری دنیا میں شرک ہو، لیکن آپ توحید پر ثابت قدم رہیں، اللہ تعالیٰ ہی دعاؤں کو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا رنگ سب سے بہترین رنگ ہے:

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۳۸]

نصرانیوں کے اندر ایک رسم تھی کہ جب ان کا کوئی بچہ پیدا ہوتا تو وہ ایک حوض بنا کر اس کے پانی میں رنگ ڈال دیتے اور بچے کو اس کے اندر غوطہ دیتے تھے۔ آج بھی ان میں یہ رسم باقی ہے، اس کو وہ "بپتسمہ" کہتے ہیں۔ آج

بھی اگر کوئی نصرانی ہو جائے تو اس کو گرجا گھر میں لے جاتے ہیں اور پادری اس پر پانی چھڑکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کو کہو کہ رنگ دینے سے رنگ چڑھ جاتے ہیں، اصل رنگ تو توحید کا رنگ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر اسلام کا رنگ چڑھایا ہے، اگر رنگ دینا ہے تو جو رنگ کا خالق ہے، اس سے بہتر رنگ دینے والا کون ہوسکتا ہے اور اسی رنگ کا اثر ہے کہ ہم تو صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں اور کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ اگر پھر بھی یہ جھگڑا کریں تو ان کہہ دیں کہ ہم تو صرف اس ہی کی عبادت کرنے والے ہیں۔

اس سے سمجھ آیا کہ مسلمان آدمی تب بنے گا جب خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گا، اسلام تب آئے گا جب خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا۔

﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ایمان والے تب بنو گے جب اپنے ایمان کو صحابہ کے ایمان والی کسوٹی پر پرکھ لو۔ اگر ان کی کسوٹی پر تمہارا ایمان پورا اُترتا ہے تو الحمد للہ! اور اگر ان کی طرح ایمان نہیں ہے تو تم ہدایت پر نہیں ہو۔

اب جو لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم کو نہیں مانتے یا ان کے اعداء ہیں، وہ چاہے لاکھ کہتے پھریں کہ ہم حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مانتے ہیں؛ کیونکہ جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مانے وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دشمن نہیں ہوسکتا؛ کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ محسن بلال ہیں، انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو غلامی سے چھڑوایا۔ اسی طرح اگر کوئی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ پر ایمان رکھتا یا حضرت مقداد رضی اللہ عنہ پر ایمان رکھتا ہے یا اہل بیت رسول پر ایمان رکھتا ہے تو ناممکن ہے کہ وہ دوسرے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ رکھے؛ کیونکہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ایمان ہے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر بھی ایمان رکھنا پڑے گا؛ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ان سب سے محبت کا تعلق ہے۔

عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا گواہ:

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے نافع بن نعیم رحمہ اللہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا جو مصحف تھا، جس میں وہ تلاوت فرماتے تھے، وہ ہمیں مل گیا۔ جب میں نے اس بات کا ذکر کیا تو لوگوں نے کہا: ہم نے سنا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی گود میں قرآن تھا، جب ان کو شہید کیا گیا وہ تلاوت فرما رہے تھے، ان کا خون قرآن مقدس کے صفحات پر گرا تھا۔ یہ بات کس حد تک صحیح ہے؟ حضرت نافع رحمہ اللہ نے فرمایا: اللہ کی قسم ہے! میں نے وہ خون اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جب مجھے وہ مصحف بھیجا گیا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، یہی آیت ﴿فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ﴾،

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ تھی جس پر آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا اور آپ رضی اللہ عنہ کا خون مبارک اس آیت پر گرا تھا۔

شبہ اور اس کا ازالہ:

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ ان کو کافی تھے تو وہ کیوں شہید ہوئے؟ کافی ہونے کا معنی یہ ہے کہ ان کو مرتبہ شہادت نصیب کیا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے، دنیا تو عارضی ٹھکانا ہے۔ اس سے بڑی کامیابی کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیاب فرمایا، وہ حضور اکرم ﷺ کے فرمان پر قائم رہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بشارت دی تھی کہ اے عثمان! تم بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید کیے جاؤ گے۔

اُحد پہاڑ کا خوشی سے جھومنا:

حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور حضور اکرم ﷺ بھی اُحد پہاڑ پر موجود تھے، پہاڑ میں زلزلہ آنے لگا۔ آپ ﷺ نے اپنے قدم مبارک کو اُحد پہاڑ پر مارا اور فرمایا: تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ حالانکہ تمہارے اوپر ایک اللہ کا نبی ہے، ایک صدیق ہے اور دو شہید ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بشارت دی کہ عثمان! تجھے جنت کی مبارک دیتا ہوں، لیکن تم پر ایک امتحان آئے گا، ایک مصیبت آئے گی، جس میں تم آزمائے جاؤ گے۔

حدیث مبارک میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے عثمان! اللہ تجھے جو قمیص پہنائیں گے، اس کو لوگ اُتارنے کی کوشش کریں گے، لیکن تم خیال رکھنا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو جو خلافت کی قمیص پہنائیں گے، لوگ اس کو اُتارنے کی کوشش کریں گے اور لوگوں نے اُتارنے کی کوشش کی بھی، لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ آخری وقت تک اپنے مقام (اپنی خلافت) پر قائم ودائم رہے۔

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ کی تفسیر:

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ سے مراد اللہ کا دین ہے۔ جب آدمی کسی کا تبع ہو جائے، کسی کی اطاعت کے اندر پورا پورا داخل ہو جائے تو کہتے ہیں: ''فلاں پر فلاں کا رنگ چڑھ گیا ہے۔'' ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ منصوب ہے اور اس کا عامل ناصب محذوف ہے، یعنی ''اِلْزَمُوْا صِبْغَةَ اللّٰهِ'' کہ اللہ کے رنگ کو لازم پکڑو۔ بعض نے کہا: یہ ﴿مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ﴾ کا بدل ہے، اس وجہ سے منصوب ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا: مصدر ہے، اس لیے منصوب مؤکدہ ہے۔

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ایک روایت نقل کی ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل نے اپنے زمانہ میں موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا تمہارے رنگ بھی تمہیں اللہ دیں گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو، کیا کہہ رہے ہو؟ اللہ پاک نے فرمایا: ان کو کہو: بالکل تمام رنگوں کو حقیقت میں رنگ دینے والا میں ہوں۔

﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۴۰، ۱۴۱]

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور یعقوب کی اولاد یہودی تھے یا عیسائی؟ آپ کہہ دیجیے: کیا تمہیں زیادہ خبر ہے یا اللہ کو؟ اس سے بڑا کون ظالم ہے جو اس گواہی کو چھپائے جو اس کے پاس (تورات میں) اللہ کی طرف سے ثابت ہو چکی ہے؟ اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں ہے۔ وہ ایک اُمت تھی جو گزر چکی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کہا اور تم (یہودیوں) کے لیے وہ ہے جو تم نے کیا۔ اور تم سے نہیں پوچھا جائے گا ان اعمال کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے۔"

ان آیات میں تفصیل کے ساتھ مشرکین اور یہود و نصاریٰ کا ردّ ہے؛ کیونکہ اس وقت حضور اکرم ﷺ کے مخاطب مشرکین اور یہود و نصاریٰ تھے۔ یہ اصول اور قاعدہ ہے کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کی عبادت کرے، چاہے بت کی عبادت کرے یا چاند سورج کی عبادت کرے، اللہ کے فرشتوں کی عبادت کرے، اللہ کے انبیاء و اولیاء کی عبادت کرے یا زندہ و مردہ کی عبادت کرے، ایک ہی بات ہے اور سب شرک میں داخل ہے۔ فرق اتنا ہوتا ہے کہ جن علماء کا مقابلہ مثلاً ہندوؤں سے ہے، وہ بت پرستی کے خلاف زیادہ زور دیں گے اور جن علماء کا مقابلہ آتش پرستوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ ان کا زیادہ رد کریں گے اور جن علماء کا مقابلہ ان لوگوں سے ہوا جو چاند، سورج، سیارات کو نظام عالم کا چلانے والا سمجھتے ہیں، وہ اس کا زیادہ رد کریں گے۔ ورنہ بات ایک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر کسی غیر کی عبادت کرنا شرک ہے۔

حضور اکرم ﷺ ان کا مقابلہ ان تینوں کے ساتھ تھا اور ان سب کا دعویٰ تھا کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں اور انہوں

نے چند رسومات کو ادا کرنے کا نام ملت ابراہیمی رکھ دیا تھا اور عقیدہ کی پرواہ نہ کی۔ اور یہی وہ بنیادی دھوکہ ہے جس میں آج مسلمان بھی مبتلا ہیں کہ عقیدے کی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

﴿سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ یَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَیْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۳﴾﴾ [البقرۃ: ۱۴۲، ۱۴۳]

"عنقریب بیوقوف لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے مسلمانوں کو ان کے قبلہ (بیت المقدس) سے پھیر دیا جس پر وہ تھے؟ آپ کہہ دیجیے: مشرق و مغرب (سب جہتیں) اللہ کی ہیں۔ وہ جس کو چاہے سیدھی راہ چلائے۔ اور اسی طرح ہم نے اے اُمت (محمدیہ)! تمہیں معتدل اُمت بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو (کہ انبیاء نے تبلیغ کر دی تھی) اور رسول تم پر گواہی دینے والا ہو۔ اور ہم نے وہ قبلہ جس پر آپ تھے اس کو مقرر نہیں کیا تھا، مگر اس لیے کہ ہم جان لیں کہ کون رسول کا تابعدار رہے گا اور کون اُلٹے پاؤں پھر جائے گا؟ اور یہ قبلہ (کعبہ) کی طرف پھیرنا بھاری ہے، مگر ان پر جن کو اللہ نے ہدایت دی اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارا ایمان (نمازیں) ضائع کر دے۔ بے شک اللہ لوگوں پر بہت شفیق، نہایت مہربان ہے۔"

تحویل کعبۃ اللہ:

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کا مسئلہ ذکر فرمایا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پوری زمین اور پوری کائنات پیدا فرمائی تو تمام زمین میں افضل حصہ کعبۃ اللہ تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو حکم دیا کہ تم میری اطاعت کرو، چاہے تم میری اطاعت اپنی رضا سے کرو یا جبر سے کرو تو سب سے پہلے کعبۃ اللہ کی زمین کے ٹکڑے نے جواب دیا کہ یا اللہ! ہم آپ کے ہر حکم کی اطاعت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ جب زمین کو بچھایا گیا تو کعبہ والی جگہ سے بچھایا اور پھیلایا گیا۔ گویا یہ پوری زمین کا مرکزی نقطہ ہے، کیونکہ ہر دائرے

کے لئے ایک مرکز کی ضرورت ہوتی ہے، مرکز کے بغیر دائرہ نہیں بنتا اور وہی مرکز اصل ہے، اس کے ذریعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ دائرہ غلط ہے یا صحیح ہے۔ دائرہ تب مکمل ہوتا ہے جب اس کے دونوں سرے برابر ہوں۔ اگر ایک خط بڑا اور ایک چھوٹا ہو تو دائرہ مکمل نہیں ہوگا اور اگر وہ آپس میں نہ ملیں تو تب بھی دائرہ مکمل نہیں ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کا قبلہ بھی یہی کعبہ بنایا۔ لوگوں کے ہاں جو مشہور ہے کہ قبلہ اوّل مسجد اقصیٰ ہے، یہ درست نہیں، بلکہ قبلہ اوّل یہی اللہ کا کعبہ ہے۔ جب آدم علیہ السلام کو زمین پر اُتارا گیا تو انہوں نے سب سے پہلے اسی کعبہ کا حج کیا، اسی کعبہ میں حاضر ہوئے اور اسی کعبہ کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھیں اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک قبلہ یہی کعبہ رہا۔ قرآن میں آتا ہے: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [آل عمران:۹۶] سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا، کعبۃ اللہ ہے۔

علماء نے اس کی تاریخ میں لکھا ہے کہ ابھی زمین بھی نہیں بنی تھی، صرف پانی ہی پانی تھا، پانی کے اوپر کعبۃ اللہ والی اسی جگہ پر بلبلہ پہلے بھی موجود تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ یہیں اللہ کا گھر کعبہ ہوگا۔ اللہ کے حکم سے اس کعبہ کو ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے آسمانوں سے اُترنے سے ایک ہزار سال پہلے بنایا تھا؛ کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے زمین پر جنات آباد تھے۔ یہی وہ کعبۃ اللہ ہے جو عین اس کعبہ کے نیچے ہے جو ساتویں آسمان پر ہے۔

بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان بنائے، ساتویں آسمان پر بیت المعمور ہے اور ساتویں آسمان کے اوپر کرسی ہے جو سات آسمانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے، اور اس کرسی کے اوپر عرش ہے۔ علماء نے فرمایا: کرسی اور عرش بھی اسی کے اوپر ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا۔ چونکہ انبیاء کا مولد اور مرکز شام تھا، یہ ایسی جگہ تھی جہاں اللہ تعالیٰ نے ظاہری اور باطنی برکتیں رکھی تھیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جگہ کو میدانِ حشر کا بھی شرف بخشا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو تمام انبیاء علیہم السلام کے جمع ہونے کی جگہ بھی بنانا تھا، اس لئے کچھ عرصے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ کے بعد بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ تم بیت المقدس کی طرف نمازیں پڑھو۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کو کیسے اختیار کیا؟ یہ بحث آگے ذکر ہوگی۔ بہرحال آپ ﷺ کافی عرصہ بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ بعض رُواۃ نے فرمایا کہ سولہ مہینے اور بعض علماء نے فرمایا: سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے اور دل میں اللہ پاک سے تمنا بھی کرتے رہے کہ قبلہ تحویل ہو جائے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی

آرزو کو پورا فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ اب مسجد اقصیٰ کی طرف سے اپنا رخ مبارک پھیر لیں، اب آپ مسجد الحرام کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھیں۔ اب قیامت تک یہی قبلہ رہے گا جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا۔ درمیان میں جو مسجد اقصیٰ کا عارضی حکم تھا، اس کو ہم نے منسوخ کر دیا ہے۔ جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیامت تک ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید قیامت تک ہے، اسی طرح اب یہ قبلہ بھی مسلمانوں کے لئے قیامت تک ہے۔

ان آیات میں یہودیوں، نصرانیوں اور مشرکین مکہ کا رد فرمایا گیا کہ ہر مذہب والے اپنے مذہب کی تائید میں اسلام کے خلاف اعتراض کرتے تھے، بیت اللہ المقدس کا احترام کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ نصرانی اور یہودی، لوگوں کے دلوں میں شکوک ڈالتے تھے کہ اصل چیز عبادت ہے اور اللہ کے نبی ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے عبادت کرتے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے دین کو اچھا سمجھتے ہیں، لیکن قبول نہیں کر رہے، ظاہر نہیں کر رہے۔

میاں بیوی کے درمیان شیطان کا مکر:

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی عزت کو محفوظ رکھے۔ مثال کے طور پر آپ کی شادی کو دس یا پندرہ سال گزر گئے، آپ اور آپ کی بیوی بچے سب اطمینان سے زندگی گزار رہے ہیں، لیکن ایک شیطان آ کر رخنہ ڈال دیتا ہے۔ خاوند سے کہتا ہے کہ میں نے آپ سے ایک بات کہنی تھی۔ وہ کہے گا: بتائیں۔ یہ کہے گا: چھوڑیں آپ ناراض ہو جائیں گے۔ تو اب اس آدمی کو اُلجھن میں ڈال دیا، اب یہ آدمی اس سے ضرور پوچھے گا کہ مجھے بتاؤ! میں ناراض نہیں ہوں گا۔ کئی دن تک اس کے دماغ کو الجھن میں مبتلا کرنے کے بعد وہ کہے گا کہ آپ نے یہ بات ظاہر نہیں کرنی۔ جب بات پکی ہو جائے گی تو وہ کہے گا: کل میں نے دیکھا تھا کہ جب تم نوکری پر چلے جاتے ہو تو تیری بیوی دروازہ کھول کر پتہ نہیں کس کس کو دیکھتی رہتی ہے۔ اس طرح خاوند کے دماغ میں ایک شکوک کا گھیرا ڈال دیتا ہے اور بیوی کے دماغ میں بھی کیڑا ڈال دیا کہ آپ میری بہن ہیں، ہم آپ کے گھر میں کھانا کھاتے ہیں اور شرم آتی ہے۔ میں کیا کروں! تمہارا خاوند بھی میرا بھائی ہے، وہ بڑی مہربانی کرتا ہے، میں آپ سے کہنا تو نہیں چاہتا تھا، لیکن میں مجبور ہو گیا ہوں، تمہارے خاوند کو چھٹی چھ بجے ہوتی ہے، یہ آٹھ بجے آتا ہے، یہ دو گھنٹے آپ کو پتہ نہیں کہاں رہتا ہے؟ اس نے فلاں جگہ معاشقہ کیا ہوا ہے۔ اس طرح بیوی کے دماغ میں بھی خلل ہو گیا۔ اب اس نے دیکھنا شروع کیا کہ میرا خاوند کہاں جاتا ہے؟ اس طرح وہ اس کو دیکھنے کے لئے دروازہ تو کھولے گی ادھر خاوند نے بھی دیکھنا شروع کر دیا کہ

کھڑکی، دروازہ کھلا ہے یا بند ہے؟ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہنستا بستا گھر برباد ہوگیا اور درمیان میں ایک شیطانی کر کے چلا گیا اور وہ اپنی جگہ ان دونوں کا خیر خواہ بھی بنا رہا، لیکن اس کا انجام یہ ہوا کہ لڑائیاں ہوئیں، طلاقیں ہوگئیں، بچے برباد ہوگئے۔

باطل بھی اسی طرح دلوں میں فتنہ اور خلل ڈالتا ہے کہ آپ سچ کہتے ہیں، آپ کا عقیدہ بھی ٹھیک ہے، قرآن شریف بھی برحق ہے، اللہ کے نبی بھی برحق ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم بھی برحق ہیں، لیکن بات یہ ہے کہ اگر آپ کی لڑکی کی کوئی جائیداد چھین لے آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ آپ کی ساری باتیں ٹھیک ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے ایمان لے آئے، اسلام کے لئے بہت خرچ کیا، لیکن انہوں نے نبی کی بیٹی کو میراث سے محروم کر دیا۔ اس طرح دل کے اندر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف کیڑا ڈال دیا۔ اب تو کوئی علم والا عالم ہی اس مسئلہ کو حل کر سکتا ہے۔ پہلے یہ تو سوچیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی جائیداد کتنی تھی؟ اور دوسرا یہ کہ باغ فدک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں بھی تھا یا نہیں تھا؟ خمس تھا، مالِ غنیمت تھا یا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر میں خریدا تھا۔ یہ عالم کا کام ہے، لیکن ایک جاہل کے دماغ میں اتنا کیڑا کافی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کو محروم کر دیا۔

یہود و نصاریٰ کے اعتراضات اور ان کے جوابات:

یہودی اور نصرانی بھی کہتے اسی طرح تھے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ملت ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، جبکہ ان کا قبلہ تو انہوں نے چھوڑا ہوا ہے اور بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے لوگوں کے دماغ میں ایک شبہ ڈال دیا۔ دوسرا شبہ یہ ڈالا کہ اگر ہم غلط ہیں تو ہمارا کعبہ بھی غلط ہے تو پھر اس کی طرف رخ کر کے نماز کیوں پڑھتے ہیں؟

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ﴾... ''س'' اور ''سَوْفَ'' کا استعمال، استقبال کے لیے ہوتا ہے۔ یعنی زمانہ مستقبل میں کہیں گے۔ اس لیے بعض علماء نے فرمایا: ابھی قبلہ کے بدلنے کا حکم نہیں آیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت پہلے اُتار دی تھی اور اپنے پیغمبر علیہ السلام کو فرما دیا کہ تمہاری تمنا کو بھی ہم جانتے ہیں، ہم تمہیں قبلہ کی طرف بھی پھیر دیں گے، لیکن جب ہم پھیر دیں گے تو یہ جاہل کہیں گے کہ اب کیوں پھیرا ہے؟ اللہ کے علم میں تھا کہ انہوں نے یہ کہنا ہے، اس لیے تحویلِ قبلہ کے حکم سے پہلے اپنے پیغمبر علیہ السلام کو خبر دے دی۔

علماء نے فرمایا: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زمانہ مستقبل کی بات ہوتی ہے، لیکن قرآن میں اس کو ماضی کے صیغہ کے

ساتھ ذکر فرما دیتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ﴾ [الاعراف: ۴۴] جنت والوں نے پکارا دوزخ والوں کو۔ حالانکہ جنت والے تو اس وقت پکاریں گے جب جنت میں چلے جائیں گے اور دوزخ والے دوزخ میں چلے جائیں گے، لیکن ماضی کا صیغہ اس لئے استعمال کیا، کیونکہ یہ خبر اتنی پکی ہے کہ گویا جنت والے جنت میں چلے گئے اور جہنم والے جہنم میں چلے گئے۔

بعض علماء نے فرمایا: یہاں ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ﴾ میں صیغہ مضارع کا استعمال کیا گیا، لیکن مراد ماضی ہے، یعنی کہا ان لوگوں نے جو بے وقوف تھے۔ اور یہ آیت تحویل قبلہ کے بعد اُتری ہے۔

اعتراض: ان کو کس چیز نے مسجد اقصیٰ سے پھیر کر مسجد حرام کی طرف کر دیا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے دو جواب دیئے ہیں:

پہلا جواب: حاکمانہ ہے کہ مالک الملک اللہ کی ذات ہے، اس لئے فرمایا: ﴿قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ ان کو کہہ دو کہ مشرق بھی میرا ہے، مغرب بھی میرا ہے، تم اعتراض کرنے والے کون ہو؟ میں چاہوں تو مشرق کی طرف پھیر دوں اور چاہوں تو مغرب طرف پھیر دوں۔

دوسرا جواب: حکیمانہ کہ ﴿يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ مقصد صراطِ مستقیم تک پہنچانا ہے۔ اب مالک کی مرضی ہے جس راستے سے چاہے صراطِ مستقیم تک پہنچا دے۔ ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ اس آیت میں دوسرا حکیمانہ جواب ہے کہ جیسے کعبہ ساری دنیا کی زمین سے افضل ہے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا: مجھے اللہ کی قسم ہے! اے سرزمین کعبہ! تو اللہ کی زمین میں سب سے افضل اور بہتر ٹکڑا ہے۔ اسی طرح یہ اُمت بھی تمام اُمتوں سے افضل ہے، اس لیے افضل سرزمین کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا۔

کعبہ پر اللہ کی رحمتوں کا نزول:

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک سو چالیس رحمتیں اس کعبہ پر نازل ہوتی ہیں: ساٹھ رحمتیں ان کو ملتی ہیں جو اللہ کے کعبہ کا طواف کر رہے ہوتے ہیں اور چالیس رحمتیں جو نوافل میں مشغول ہوتے ہیں ان کو ملتی ہیں اور بیس رحمتیں ان کو ملتی ہیں جو کعبہ شریف کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

﴿وَسَطًا﴾ کی تفسیر:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس طرح کعبہ زمین کا وسط ہے، اسی طرح میں نے آپ کی اُمت کو بھی وسط بنایا ہے۔ وسط

کا معنی ''درمیان'' ہے، نہ حد سے زیادہ تجاوز کرنے والے اور نہ حد سے زیادہ نیچے گرنے والے، نہ افراط میں پڑنے والے اور نہ تفریط میں پڑنے والے۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں بربادی کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس لئے وسط اُمت وسطاً زمین کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا۔

حضرت علی ؓ کی عداوت اور محبت میں دو گروہ:

حضرت علی ؓ نے ارشاد فرمایا: میرے بارے میں دو جماعتیں برباد ہو جائیں گی: ایک میری محبت میں بہت آگے بڑھ جانے والے، یہ بھی برباد ہوں گے اور ایک میری عداوت میں بڑھ جانے والے، یہ بھی برباد ہوں گے اور کامیاب وہ ہوں گے جو اعتدال پر رہیں گے۔ بعض لوگوں نے حضرت علی ؓ کو اتنا بڑھایا کہ ان کو خدا بنا دیا، بعض نے کہا: اللہ تعالیٰ حضرت علی ؓ میں اُتر آیا، بعض نے کہا: بادلوں میں بھی حضرت علی ؓ ہیں، بعض نے کہا: اللہ نے حضرت علی ؓ کو مرتبہ امامت دیا تھا، ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی حضرت علی ؓ کی امامت کی بیعت کریں گے، یعنی وہ نبیوں سے بھی افضل ہیں اور ان میں کئی قسمیں بن گئیں، کوئی امامی، کوئی آغا خانی، کوئی اسماعیلی اور کوئی بہائی کہلائے۔ یہ سب غلو کرنے والوں کی قسمیں ہیں پھر ان کے اندر تقسیم ہے۔ دوسری طرف خوارج اور نواصب تفریط میں پڑ گئے اور کہا کہ حضرت علی ؓ (نعوذ باللہ!) مسلمان ہی نہیں ہیں۔ ان کی قوم میں جب کوئی خوبصورت لڑکی ہوتی اور لوگ اس کا رشتہ مانگتے کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں تو وہ کہتی: ایک شرط ہے کہ حضرت علی کا سر کاٹ کے لے آؤ تو میں شادی کروں گی۔

اُمت وسط کا معنی:

یعنی یہ اُمت اعتدال والی ہے۔ توحید، رسالت اور حقانیت پر قائم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز اس لئے دیا کہ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا پر گواہ بنانا ہے اور گواہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ دیانت، صداقت اور اعتدال والا ہو۔ ایسا گواہ نہ ہو جو چھوٹی سی بات پر ناراض ہو کر گواہی کو بڑھا دے یا گھٹا دے۔ جب قیامت والے دن سارے انبیاء آئیں گے، اللہ تعالیٰ اُن سے پوچھیں گے کہ تم نے اپنی اپنی اُمت کو تبلیغ کر دی تھی؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں، لیکن اس کا دنیا والوں پر اظہار کرنے کے لئے ایسا کریں گے۔ اس وقت یہ اُمتیں انکار کریں گی تو اُمت محمد یہ اُن (انبیاء) کے حق میں گواہی دینے والی ہو گی اور اس اُمت کی امانت، دیانت، صداقت کے گواہ

حضور اکرم ﷺ ہوں گے۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ﴾ [البقرۃ: ۱۴۳]

بندے کا کام یہ ہے کہ جونہی حکم دیں اس کی اطاعت کرے؛ کیونکہ وہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں دیتے۔ جب اس کا حکم ہوا کہ مسجد اقصیٰ کی طرف نماز پڑھو تو آپ ﷺ نے اس حکم کی اتباع کی اور جب حکم آیا کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھو تو آپ ﷺ نے اس حکم کی بھی اتباع کی۔ لہٰذا ہندوؤں کو بھی اسی طرح اتباع کرنی چاہیے۔

﴿اَلسُّفَهَاءُ﴾ سے مراد کون ہیں؟

''سُفَہاء''، ''سفیہ'' کی جمع ہے، اس کا معنی بے وقوف اور کم عقل ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا: اس سے مشرکین عرب مراد ہیں، اور بعض نے فرمایا: یہود مراد ہیں کہ ان کو تورات کا علم تھا، اس کے باوجود وہ اعتراض کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے فرمایا: اس سے مراد منافق ہیں۔ لیکن آیت میں عموم ہے کہ ''سُفَہاء'' چاہے مشرکین عرب ہوں یا احبار یہود ہوں یا منافقین ہوں، جو بھی آدمی اللہ تعالیٰ کے اوامر اور احکام پر اعتراض کرتا ہے اور جو بھی تحویل قبلہ پر اعتراض کرتا ہے، اس کی سفاہت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت فرمائی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بیت المقدس کی طرف سولہ یا سترہ مہینے نماز پڑھی اور حضور پاک ﷺ کو یہ بات پسند تھی کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ ہو اور جب اللہ تعالیٰ نے قبلہ ابراہیمی کا حکم عطا فرمایا تو سب سے پہلی نماز جو اس طرف پڑھی گئی، وہ عصر کی نماز تھی۔ ایک صحابی جس نے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تھی، وہ جب وہاں سے روانہ ہوئے تو ایک مسجد پر ان کا گزر ہوا، اس میں لوگ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے اور وہ رکوع کی حالت میں تھے۔ اس صحابی نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام کے ساتھ کہ میں نے خود حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہے، یعنی قبلہ کا حکم بدل گیا ہے، اب قبلہ کعبۃ اللہ ہے۔ وہ صحابہ کرام رکوع کی حالت میں ہی کعبہ کی طرف پھر گئے۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آ گیا اور خبر دینے والے صحابی ہیں اور سارے صحابہ عدول ہیں، سچے ہیں، اس لئے صحابہ نے رکوع کی حالت میں ہی قبلہ کا رخ بدل لیا۔

شریعت کے کسی حکم پر عمل سے ثواب ضائع نہیں ہوتا:

صحابہ ﷺ کہتے تھے کہ ہمیں ان لوگوں کے بارے میں فکر لاحق ہوگئی جو تحویل قبلہ سے پہلے فوت یا شہید ہو گئے تھے؛ کیونکہ انہوں نے نمازیں مسجد اقصیٰ کی طرف پڑھیں، کعبہ کی طرف نمازیں نہیں پڑھیں تھیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہاری عبادت اور تمہاری نمازوں کو ضائع نہیں فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ تو بندوں پر رحمت فرمانے والے ہیں۔

مسلم شریف میں حضرت براء رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے اور آسمان کی طرف نظریں اُٹھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے اور میں اس قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة:۱۴۴]

صحابہ ﷺ میں سے بعض آدمیوں نے کہا: کاش! ہمیں یہ پتہ چل جاتا کہ جو لوگ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے اور ان کی وفات ہوگئی اور جو نمازیں ہم نے بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں، ان کے بارے میں کیا ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ اللہ پاک تمہاری وہ نمازیں ضائع نہیں فرمائیں گے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ بیت المقدس کے بارے میں جو حکم ہے، وہ قرآن میں آیا تھا یا اللہ تعالیٰ نے ویسے حکم فرمادیا اور قرآن پاک میں نازل نہیں فرمایا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں حضرت عکرمہ رحمہ اللہ، حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول نقل فرمایا ہے کہ یہ حضور پاک ﷺ کا اجتہاد تھا، یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیت المقدس کا حکم نہیں دیا تھا، حضور اکرم ﷺ کا اپنا اجتہاد تھا، تا کہ یہ کعبہ بھی درمیان میں آجائے اور بیت المقدس کی طرف رخ بھی ہوجائے۔ چونکہ آپ ﷺ سے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کا قبلہ بیت المقدس تھا تو آپ ﷺ مکہ میں رہتے ہوئے دونوں کعبوں کی طرف رخ فرمارہے تھے۔ صرف بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا ہجرت کے بعد ہوا، کیونکہ اب یہ قبلہ

سامنے نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، لیکن آپ ﷺ کثرت سے دعائیں فرماتے، اللہ تعالیٰ کے آگے تضرع فرماتے کہ اللہ تعالیٰ قبلہ ابراہیمی کا حکم دیں۔ آخر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا منظور فرمائی اور حکم آ گیا کہ کعبہ کی طرف رخ کرو۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آیا تو آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور لوگوں کو اس کی خبر دی۔ حضور اکرم ﷺ نے مدینہ میں سب سے پہلے جو نماز اس کعبہ کی طرف پڑھی، وہ عصر کی نماز تھی، جیسا کہ پہلے حضرت براء ؓ کی روایت گزر چکی ہے۔ امام نسائی ؒ نے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم حضور ﷺ پر اس وقت نازل ہوا جب آپ ظہر کی دو رکعتیں مسجد بن سلمہ میں پڑھ چکے تھے، اب جب حکم آیا تو باقی دو رکعتیں بیت اللہ طرف پڑھیں۔ اس لئے اس مسجد کو ''مسجد قبلتین'' بھی کہا گیا ہے۔

نویلہ بنت مسلم سے روایت ہے کہ وہ ظہر کی نماز میں تھیں کہ ان کو تحویل قبلہ کی خبر پہنچی۔ جب لوگوں نے رخ بدلا تو عورتیں پہلے پیچھے تھیں، مرد آگے تھے۔ اب جب قبلہ بدلا تو عورتیں مردوں کی جگہ پر آ گئیں اور مرد عورتوں کی جگہ پر آ گئے۔ اہل قباء کو اس دن خبر نہیں پہنچی، ان کو دوسرے دن صبح کی نماز کے وقت خبر پہنچی۔

حضرت ابن عمر ؓ سے روایت ہے کہ لوگ مسجد قباء میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے، ایک آنے والے نے آ کر خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے رسول پر قرآن اُترا ہے اور اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مکہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔ انہوں نے اس طرف رخ پھیر دیا۔

ابن کثیر ؒ نے یہاں ایک فقہی مسئلہ ذکر کیا ہے کہ حضور پاک ﷺ کو قبلہ کا حکم ملا اور آپ ﷺ نے پہلی نماز عصر کی بیت اللہ کی طرف رخ کر کے پڑھی، لیکن قبا والوں کو فجر کی نماز میں حکم پہنچا تو اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر حکم ناسخ بھی آ چکا ہو، لیکن جب تک ہمیں اس کی اطلاع نہ ملے، اس وقت تک ہم ناسخ حکم پر عمل کرنے کے مامور نہیں، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے کبھی قبا والوں کو نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔

جب یہ حکم اُترا تو یہود اور منافقوں کے دلوں میں شکوک اور اعتراضات بڑھتے گئے کہ دیکھیں! کبھی یہ قبلہ ہے اور کبھی وہ قبلہ ہے۔ (نعوذ باللہ!) جب چاہتے ہیں اُدھر رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور جب چاہتے ہیں ادھر رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے وہ کعبہ چھوڑ دو۔ لیکن جو ایمان والے لوگ تھے، ان کا ایمان اور بڑھتا گیا کہ حضور پاک ﷺ نے جب اللہ پاک سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا منظور فرمائی اور کعبہ شریف کو قبلہ بنانے کا حکم دے دیا گیا۔

یہودی اُمتِ محمدیہ پر تین چیزوں میں حسد کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اہل کتاب ہمارے ساتھ تین چیزوں پر حسد کرتے ہیں:

1 ......ایک اللہ پاک نے ہمیں جمعہ کا دن عطا فرمایا، جو سید الایام ہے۔

2 ......دوسرا ان کو بڑا حسد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اشرف کعبہ ملا اور ہمیں نہ ملا۔

3 ......اور تیسرا جب ہم امام کے پیچھے آمین کہتے ہیں تو اس پر بھی وہ بڑا حسد کرتے ہیں کہ ایک آدمی تو ساری دعا مانگ رہا ہے اور ایک آدمی اس کے پیچھے آمین کہہ دے تو وہ بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔

اُمتِ محمدیہ سابقہ اُمتوں کی گواہی دے گی:

﴿لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾[الحج:۷۸]

جب آپ ﷺ کی اُمت گواہی دے گی تو پہلے والی اُمتیں اعتراض کریں گی: یا اللہ! ان لوگوں نے تو ہمیں دیکھا بھی نہیں تو یہ کیسے گواہ بن گئے؟ تو اُمت محمدیہ کے لوگ جواب میں کہیں گے: یا اللہ! ہمیں ہمارے پاک نبی ﷺ نے بتایا ہے، جب ہمیں حضور اکرم ﷺ نے خبر دی تو ہم ان کے فرمان پر گواہی دے رہے ہیں۔ ہمارا نبی سچا ہے، انہوں نے فرمایا تھا کہ تمام انبیاء نے دعوتِ توحید دی ہے، اس لئے ہم اپنے پیغمبر کی گواہی پر گواہی دے رہے ہیں۔ یہ شرف حضور اکرم ﷺ کی اُمت کو ملا ہے۔

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن حضرت نوح علیہ السلام کو پکاریں گے اور ان سے فرمائیں گے: کیا تُو نے میری دعوتِ توحید پہنچا دی تھی؟ وہ عرض کریں گے: اے میرے اللہ! میں نے دعوتِ توحید پہنچا دی تھی۔ ان کی قوم کو بلایا جائے گا، ان سے پوچھا جائے گا کہ نوح علیہ السلام نے تمہیں دین پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: ہمارے پاس تو کوئی بھی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام سے فرمائیں گے: تمہاری گواہی کون دے گا؟ وہ فرمائیں گے: میری گواہی اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ دے گی۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"أَنَا وَ أُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى كَوْمٍ مُشْرِفِينَ عَلَى الْخَلَائِقِ، مَا مِنَ النَّاسِ أَحَدٌ إِلَّا وَدَّ أَنَّهُ مِنَّا وَ مَا مِنَ

نبِيٍّ كَذَّبَهُ قَوْمُهُ إِلَّا وَ نَحْنُ نَشْهَدُ أَنَّهُ قَدْ بَلَّغَ رِسَالَةَ رَبِّهِ عَزَّوَجَلَّ۔" [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۷۹، در منثور: ۱/ ۱۴۴]

میں اور میری اُمت قیامت والے دن ایک ٹیلہ کے اوپر ہوں گے، ساری مخلوقات کو دیکھنے والے ہوں گے، قیامت والے دن کوئی بندہ بھی ایسا نہیں ہوگا جو یہ تمنا نہ کرے کہ کاش! میں بھی اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ میں ہوتا۔ اور کوئی نبی، پیغمبر ایسا نہیں گزرا جس کی قوم نے اس کو جھٹلایا نہ ہو، قوم اس کی تکذیب کرنے والی ہوگی اور میں اور میری اُمت اس کی گواہی دیں گے کہ یا اللہ! تیرے یہ نبی سچے ہیں، انہوں نے تیرا دین، تیری توحید پہنچائی، لیکن یہ قوم جھوٹی ہے، انہوں نے پیغمبروں کی بات پر لبیک نہ کہا، ان کی بات کو تسلیم نہیں کیا۔

ہاتھ نہ پھیلانے والے شخص کو جنت کی بشارت:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ بنوسلمہ میں ایک آدمی کے جنازے پر تشریف لے گئے۔ جب آپ ﷺ جنازے سے فارغ ہوئے تو ایک صحابی نے کہا: حضور! آپ نے جس کا نماز جنازہ پڑھا ہے، اس نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا اور اس کی لوگوں نے بڑی تعریف کی تو حضور اکرم ﷺ نے اس آدمی سے پوچھا کہ جو کچھ بھی تم تعریف کر رہے ہو، کیا یہ ٹھیک ہے؟ اس نے عرض کیا: ظاہر بات تو اسی طرح ہے، دلوں کا مالک تو اللہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "وَجَبَتْ" یعنی اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ ایک دوسرے جنازے پر تشریف لائے، میں حضور اکرم ﷺ کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ لوگوں نے کہا: یہ آدمی بڑا بدگو تھا، بدزبان تھا، اور ان لوگوں نے اس کے بارے میں بیان کیا کہ بُرا آدمی تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: تم جو کچھ کہہ رہے ہو، کیا ٹھیک ہے؟ انہوں نے کہا: ظاہر میں تو وہ بُرا تھا، لیکن باطن کا اللہ تعالیٰ کو پتہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "وَجَبَتْ" یعنی (نعوذ باللہ) اس کے لئے جہنم واجب ہوگئی ہے۔ [مستدرک الحاکم، رقم: ۳۰۶۱]

محمد بن کعب رحمہ اللہ نے اس کے بعد قرآن کی یہ آیت مبارکہ تلاوت کی: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرۃ: ۱۴۳] اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی اُمت کو لوگوں پر گواہ بنایا ہے۔ جب اُمت کے اتنے آدمی گواہی دیں تو سمجھ لو کہ وہ اچھا ہے اور اگر کسی کی برائی کی گواہی دیں تو سمجھ لو کہ یہ بُرا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو بچہ روتا ہے اور عالَم ہنستا ہے کہ مبارک ہو، بچہ ہوگیا اور جب تمہاری

موت کا وقت آئے تو ایسے حالات پیدا کرو کہ عالم رو رہا ہو اور تم ہنس رہے ہو۔

تاریخ عالم اُٹھا کر دیکھ لیں! کروڑ ارب پتی مر گئے، کوئی ان کا نام لینے والا نہیں ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھیں! جب فوت ہوئے تو کچھ میسر نہیں، ایک بستی میں فوت ہوئے، لیکن ایک دن کے اندر کتنے لاکھ لوگ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیتے ہیں۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی موت جیل میں ہوئی۔ بعض حضرات نے کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو زہر دیا گیا۔ حجۃ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو قید خانہ میں موت آئی۔ اور محدثین میں بعض ایسے بھی گزرے ہیں کہ ایک وقت کھانا ہوتا تھا اور دوسرے وقت کا نہیں ہوتا تھا۔ اور بعض ایسے بھی گزرے ہیں جو دو دو، تین تین دن تک فاقے سے رہتے تھے، لیکن آج کروڑوں آدمی ان کے لئے رحمۃ اللہ علیہ کی دعا کر رہے ہیں۔

جنتی اور دوزخی کی پہچان:

حضرت ابوالاسود رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں مدینہ منورہ میں حاضر ہوا اور میں ایسے موقع پر آیا کہ مدینہ منورہ میں ایک بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ اس بیماری کی وجہ سے لوگ کثرت سے مر رہے تھے۔ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی کا جنازہ گزرا، لوگوں نے تعریف کی کہ ماشاءاللہ! بڑا اچھا آدمی تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وَجَبَتْ''۔ اس کے بعد دوسرا جنازہ گزرا، لوگوں نے کہا: یہ بُرا آدمی تھا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وَجَبَتْ''۔ میں نے پوچھا: امیر المومنین! کیا واجب ہوا؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے تو وہ بات کی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مسلمان بندہ مر جائے اور لوگ اس کے بارے میں بہتری اور خیر کی گواہی دیں تو سمجھ لو کہ ان شاءاللہ! وہ جنت میں داخل ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اگر تین آدمی گواہی دے دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تین بھی گواہی دے دیں تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا: اگر دو آدمی گواہی دے دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ دو کی بھی قبول فرمائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی جگہ آدمی کم ہوتے ہیں اور کہیں لاکھوں لوگ گواہی دیتے ہیں۔

قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا بار بار کلمہ پڑھنے کا واقعہ:

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا جنازہ جیل سے اُٹھا تو ساٹھ یا نوے ہزار کے قریب کافروں نے کلمہ پڑھا۔ انہوں نے لکھا کہ ایک عالم کے اتنے جنازہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مذہب بھی

اللہ کو قبول تھا۔ حضرت قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: میں چھوٹا سا بچہ تھا، قاعدہ پڑھ کر جب گھر آتا تو ماں کہتی تھی: بیٹا! کلمہ پڑھو: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اور جب میں سونے لگتا تو ماں کہتی: کلمہ پڑھو، میں کلمہ پڑھتا تھا۔ جب نیند سے اُٹھتا تو کہتی: کلمہ پڑھو، میں کلمہ پڑھتا تھا۔ اس طرح دو چار دن میں نے برداشت کیا، اس کے بعد اپنی امی سے کہا: آپ ہر وقت کہتی ہیں: کلمہ پڑھو۔ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کا بیٹا ہوں۔ انہوں نے کہا: بیٹا! ناراض نہ ہو، جس بات کی عادت ہو جاتی ہے، پھر وہی بات زبان سے نکلتی ہے۔ جب کلمہ پڑھنے کی عادت ہو جائے گی اور موت والی نیند آئے گی تو زبان پر کلمہ ہوگا۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ تیری زبان پر یہ کلمہ چڑھ جائے۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر وقت زبان پر کلمہ ہو۔ کیا پتہ انسان بیمار ہو جائے اور زبان بند ہو جائے۔ اگر عادت ہوگی تو دل میں پڑھ رہے ہوں گے، اللہ تو جانتے ہیں۔

اعمال کا دار و مدار خاتمہ پر ہے:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ." [صحیح بخاری، رقم: ٦٦٠٧]

آدمی کے اعمال کا دار و مدار خاتمہ پر ہے۔ ایک آدمی بڑے اچھے کام کرتا ہے، یہاں تک کہ جنت ایک ہاتھ کے فاصلے پر رہ جاتی ہے، قدرت کی تقدیر یہاں تک غالب آتی ہے کہ اس سے کوئی ایسا کام ہو جاتا ہے کہ سیدھا جہنم میں چلا جاتا ہے اور بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ بُرے کام کرتے رہتے ہیں کہ جہنم ایک ہاتھ رہ جاتی ہے، لیکن اللہ کی تقدیر کے فیصلے آتے ہیں، وہ اپنے کسی عمل کے ذریعہ جنت میں چلا جاتا ہے۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: حضور! کیا ہم عمل نہ کریں جو تقدیر میں ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی عمل جو کر رہا ہے، سمجھ لے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اسی راستے کے لئے پیدا کیا ہے۔

کسی مقام پر اللہ تعالیٰ تقدیر کا مظاہرہ فرماتے ہیں، ورنہ جو صراطِ مستقیم پر چل رہا ہے، یقینی بات ہے کہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔

کسی کے اچھے بُرے کا اندازہ کیسے ہوگا؟

حضرت ابوبکر بن ابی زہیر الثقفی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مقام پر

یہ فرماتے ہوئے سنا:

''يُوشِكُ أَنْ تَعْلَمُوْا خِيَارَكُمْ مِنْ شِرَارِكُمْ، قَالَ: بِمَ يَارَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ: بِالثَّنَاءِ الْحَسَنِ وَالثَّنَاءِ السَّيِّءِ أَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللهِ فِي الْأَرْضِ.'' [درمنثور:١/٣٥١/تفسیر ابن کثیر:١/٢٧٧]

قریب ہے کہ تم لوگوں میں سے اچھے اور بُروں کی پہچان کرلو۔ صحابہ ﷡ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیسے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں کی تعریف کرنے سے کہ جس کو لوگ اچھا کہیں تو سمجھ لو وہ اچھا ہوگا اور جس کو لوگ بُرا کہیں گے تو سمجھ لو وہ بُرا ہوگا، تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔

کس کی تعریف اور مذمت معتبر ہے؟

آج سب گانے والوں کو اچھا کہتے ہیں، اگر وہ مرجائیں تو کئی لوگ ان کے فراق میں مرجاتے ہیں۔ یادرکھیں! اسلام اور کفر کے نظام میں یہی فرق ہے کہ کفر میں عدد گنا جاتا ہے، جبکہ اسلام میں تولا جاتا ہے، گنا نہیں جاتا۔ ورنہ فاسق، فاسق کی تعریف کرے گا، خبیث خبیث کی تعریف کرے گا، زانی زانی کی تعریف کرے گا، شرابی شرابی کی تعریف کرے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ ورنہ آپ جمہوریت کے اصولوں کو سامنے رکھیں تو سب سے زیادہ کرسی پر بیٹھنے کا حق دار یزید تھا؛ کیونکہ سب سے زیادہ ووٹ یزید نے حاصل کئے تھے، تمام علاقے والوں نے یزید کی بیعت کرلی تھی، لیکن اس کی خلافت کو اس لیے نہیں مانا گیا کہ مکہ اور مدینہ والوں نے اس کی بیعت نہیں کی تھی اور اربابِ حل وعقد کے مکہ اور مدینہ کے لوگ تھے۔ اس لیے عامۃ الناس کی بیعت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ [البقرة:١٤٤]

''ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا دیکھ رہے ہیں، ہم آپ کو اس کی طرف ضرور پھیریں گے جس قبلہ کی طرف آپ راضی ہیں۔ اب آپ (نماز میں) مسجد حرام کی طرف رخ کرلیں اور (اے اُمت محمد یہ!) تم جہاں بھی ہو اپنے رخ (نماز میں) اس کی طرف کرلو اور جن لوگوں کو کتاب (تورات یا انجیل) ملی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ (کعبہ کا قبلہ ہونا) ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ غافل نہیں ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ ظاہری طور پر یہ حکم خاص حضور اکرم ﷺ کے لئے ہے کہ آپ نے اپنے چہرے کو پھیر لیں، لیکن یہی حکم قیامت تک آپ کی اُمت کے لئے بھی ہے، کیونکہ جدھر آپ ﷺ رخ فرمائیں گے، ہم نے بھی اسی طرف کرنا ہے۔

صحیحین کی حدیث مبارک میں ہے کہ سب سے پہلے جب یہ حکم نازل ہوا تو پہلی نماز عصر کی تھی جو آپ ﷺ نے بیت المقدس کے بجائے کعبہ شریف کی طرف پڑھی۔ (خدا کی قدرت دیکھیں کہ یہ اُمت وسطاً ہے اور کعبہ بھی پورے روئے زمین کے وسط میں ہے اور عصر کی نماز بھی صلوٰۃ وسطیٰ ہے)۔ اور یہ عصر کی نماز آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں اور مسجد نبوی میں پڑھی تھی، قبا اور مسجد قبلتین میں نہیں پڑھی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: سب سے پہلا نسخ والا حکم یہی تحویل قبلہ والا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس آیت سے اشارہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ یعنی جب ادھر سے مڑنے کا حکم دیا گیا تو مسجد اقصیٰ کا حکم خود بخود معلوم ہو گیا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام اپنی خواہش سے قبلہ نہیں بناتے، بلکہ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہوتے ہیں۔ اس حکم سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے سر اسی کی طرف نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔

تدریجاً اسلام میں نرمی آگئی:

پہلے دو رکعت کا حکم ملا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے چار رکعت کا حکم عطا فرمایا اور پھر فیصلہ فرما دیا کہ اگر تم سفر میں ہو تو دو رکعت پڑھو اور اگر تم حضر میں ہو تو چار رکعت پڑھو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو بھیج کر ہر نماز کے دو وقت بتا دیئے کہ ایک اوّل وقت ہے، دوسرا آخری وقت ہے۔ دونوں حدیث رسول پاک ﷺ سے ثابت ہیں،

اس کے اندر اُمت کے لئے کتنی بڑی رعایت ہے؟

اسی طرح روزے کے احکام دیکھ لیں! پہلے حکم تھا کہ جب آدمی رات کو سو جائے تو کھانا پینا منع ہو جاتا تھا، چاہے وہ مغرب کے بعد سو جاتا یا عشاء کے بعد سو جاتا، تھوڑی نیند سو جاتا یا لمبی نیند سو جاتا تو کھانا پینا بند ہو جاتا تھا۔ اسی طرح روزہ کی راتوں میں میاں بیوی کا مباشرت کرنا منع تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے رحمت فرما کر یہ حکم ارشاد فرمایا کہ رات کو کھاؤ پیو، جب صبح صادق ہو جائے تو رُک جاؤ اور نیز اس کے ساتھ رات کو میاں بیوی کو ملنے کی اجازت بھی مل گئی۔

احکامات کی تبدیلی کی حکمتیں:

احکامات میں جتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان میں ایک تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے دوسرا بندوں کی آزمائش ہوتی ہے کہ وہ شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتے ہیں یا میرے احکام کی تعمیل کرتے ہیں؟ تحویل قبلہ کے اندر یہ بات بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی عظمت کا اظہار کر دیا کہ اے میرے نبی! آپ کے چہرے کا آسمانوں کی طرف اُٹھنا اور پھر جھک جانا ہم نے دیکھ لیا ہے اور ہم نے آپ کی آرزو پوری کر دی۔ اس سے اندازہ لگا لیں کہ اللہ تعالیٰ کو میرے نبی پاک ﷺ کتنے محبوب ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کے لیے قبلہ کا حکم بدل دیا۔

چونکہ تحویل قبلہ کا حکم مدینہ میں نازل ہوا تو یہودیوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ انہوں نے ہماری دشمنی میں آ کر قبلہ بیت المقدس کو چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ جاہل ہیں۔ حالانکہ ان کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جب نبی آخر الزمان پیدا ہوں گے تو ان کا قبلہ ایسا ہی ہوگا، اس لئے ان لوگوں کو بلاوجہ اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

اگر آدمی مسجد حرام میں ہے تو اس کا رخ عین کعبہ کی طرف ہونا ضروری ہے، ورنہ اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اس لئے حرم کے اندر گول صفیں بنائی جاتی ہیں، تاکہ ہر بندے کا رخ کعبہ کی جانب ہو اور جو لوگ مکہ شہر کے اندر رہنے والے ہیں، ان کے لئے مسجد الحرام قبلہ ہے، اور جو لوگ دوسرے ملکوں میں رہنے والے ہیں ان کے لئے پورا حرم قبلہ ہے۔

بیت اللہ میں آنے کے آداب:

جب آپ مسجد حرام میں آئیں تو اس کے کچھ احکامات ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کے کعبہ پر نظر پڑے تو جو دعا کریں، وہ منظور ہوتی ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ صحابہ کی جب کعبۃ اللہ پر نظر پڑتی تو "اللہ اکبر، اللہ اکبر" کہتے تھے اور بعض روایات میں آتا ہے کہ جب کعبہ پر نظر پڑے تو دعا کریں: "اَللّٰهُمَّ زِدْ بَيْتَكَ هٰذَا تَشْرِيْفًا وَّ تَكْرِيْمًا وَّ

تَعْظِیْمًا وَّ مَهَابَةً وَّ بِرًّا وَّ تَقْوٰی" اگر عربی میں دعا یاد نہ ہو تو آپ اپنی زبان میں کہہ سکتے ہیں: یا اللہ! اس گھر کی عظمت میں، اس گھر کی کرامت میں، اس گھر کی شرافت میں، اس گھر کی عزت و ہیبت میں، اس کی تکریم میں اضافہ فرما اور اے اللہ! جو اس کی عزت کرے، اس کو عزت عطا فرما اور جو کعبہ کی اہانت کرے، یا اللہ! اپنی قدرت سے اس کو دفع فرما۔

جب آپ کسی بھی مسجد میں داخل ہوں تو دو رکعت نماز پڑھیں، جسے "تحیۃ المسجد" کہتے ہیں، البتہ وہ اوقات جن میں نماز نہیں پڑھی جاتی تو اس میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ آپ اگر اوقاتِ مکروہہ میں مسجد میں داخل ہوتے ہیں تو تحیۃ المسجد نہ پڑھیں۔ لیکن بعض ائمہ اُس حدیث مبارک کو لیتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں جب کوئی مسجد میں آئے تو اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک کہ دو رکعت نہ پڑھ لے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جب حدیث پاک میں ان اوقات میں نماز پڑھنے سے ممانعت آگئی ہے تو آپ باقی اوقات میں تحیۃ المسجد پڑھیں، ان اوقات میں نہ پڑھیں، تاکہ اس حدیث پر بھی اور اُس حدیث مبارک پر بھی عمل ہو جائے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث پر عمل ہو جائے اور تمام فرامین پاک جمع ہو جائیں، تاکہ کسی دشمن کو اعتراض کرنے کا موقع نہ مل سکے اور فرمانِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی کوئی تعارض نہ رہ سکے۔

مسجد حرام میں ایک لاکھ نماز کا ثواب:

لیکن اس مسجد حرام کے لئے علیحدہ حکم ہے، اور وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو اس میں داخل ہونے کی توفیق دیں تو طواف کریں، اس کا تحیہ طواف ہے۔ اگر کوئی آدمی طواف نہیں کر سکتا تو پھر وہ دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرے۔ اگر آپ نے نماز سے پہلے سنت مؤکدہ پڑھنی ہیں، اگر وہ پہلے پڑھیں تو اس میں تحیۃ المسجد خود بخود ادا ہو جائے گا اور اگر آپ کے پاس وقت ہے تو تحیۃ المسجد بھی پڑھ لیں اور چار رکعت مؤکدہ بھی پڑھ لیں تو سبحان اللہ! جتنی زیادہ عبادت کریں، اتنا آپ کو زیادہ ثواب ملے گا۔

پوری روئے زمین کے اندر کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جس میں ایک نماز کا بدلہ ایک لاکھ نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہو، صرف مسجد حرام کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہاں جب تم ایک نماز پڑھتے ہو تو ایک لاکھ نماز کا

ثواب لکھا جاتا ہے، یعنی ایک لاکھ نماز کے ثواب جتنا ثواب ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ایک نماز پڑھنے سے ایک لاکھ نماز ادا ہو جائے گی۔ جیسا کہ قرآن مقدس میں آتا ہے کہ لیلۃ القدر کی رات ایک ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب لیلۃ القدر کی رات آئے تو تمہارا ایک ہزار مہینہ گزر جاتا ہے۔ اس طرح تو کوئی بندہ زندہ بھی نہ رہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہزار مہینے میں عبادت کر کے جتنا ثواب ملتا ہے، اتنا اللہ تعالیٰ تمہیں ایک لیلۃ القدر میں عطا فرما دیتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: مسجد الحرام میں ایک لاکھ کی فضیلت صرف نماز کے لئے ہے۔ روزہ، حج، زکوۃ اور نفقات کے بارے میں یہ حکم نہیں ہے، لیکن جمہور ائمہ فرماتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک عبادت کو ذکر کر دیا جاتا ہے تو باقی عبادات اس کے ضمن میں آجاتی ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں، ان کو آگاہ کرنے کے لئے صرف نماز کا ذکر کیا۔ یہاں تو نماز کا ذکر آیا ہے، اگر کوئی روزے سے غافل ہے یا کوئی شخص صاحب استطاعت ہونے کے بعد حج سے غافل ہے تو یہ بھی اس میں داخل ہے۔ جب قیامت والے دن پوچھا جائے گا: ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝﴾ [المدثر:۴۲] آج کون سی چیزیں تمہیں جہنم میں لے جارہی ہیں؟ وہ کہیں گے: ﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝﴾ [المدثر:۴۳] ہم ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو نماز پڑھنے والے تھے، ﴿وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝﴾ [المدثر:۴۴،۴۵] ان آیات میں روزے اور حج کا ذکر نہیں ہے، لیکن وہ بھی اس کے اندر داخل ہیں۔ اس لئے راجح قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر بھی عطا فرماتے ہیں اور دوسری ساری عبادتوں پر بھی ایسا ہی ثواب عطا فرماتے ہیں۔

کعبۃ اللہ کے شرف میں علماء نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ اگر آپ اکیلے مسجد حرام میں نماز پڑھیں گے تو آپ کو ایک لاکھ گنا ثواب ملے گا اور اگر محلے کی مسجد میں نماز پڑھیں گے تو ایک کا پچیس درجہ ثواب ملے گا اور اگر آپ مسجد حرام میں جماعت کے ساتھ پڑھیں گے تو ستائیس درجہ ثواب بڑھ جائے گا، ایک کا ستائیس لاکھ ملے گا۔

بعض محدثین نے فرمایا: آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھے، اس کو پانچ سو نمازوں کا ثواب ملتا ہے، جو مسجد نبوی ﷺ میں نماز پڑھے، اس کو ایک ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے اور جو مسجد حرام میں نماز پڑھے، اس کو ایک لاکھ کا ثواب ملتا ہے۔ اس لیے بعض علماء نے فرمایا: یہاں ایک لاکھ بمقابلہ ایک ہزار ہے۔ ان کو ضرب دو تو جو عدد نکلے گا، وہ یہاں ایک نماز پڑھنے کا ثواب ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کعبہ میں داخل ہونے والوں کو امن کی بشارت سنائی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ظاہری امن بھی ہے کہ اس کو قتل نہیں کیا جاتا اور اس سے مراد باطنی امن بھی ہے کہ اگر وہ ایمان سے داخل ہوگا تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو جہنم کے عذاب سے امان عطا فرمائیں گے۔ آپ ﷺ نے حلف اُٹھا کر کعبۃ اللہ کے بارے میں فرمایا کہ اے سرزمین حرم! مجھے اللہ کی قسم ہے! تمام دنیا کی زمین میں سب سے بہتر زمین تم ہو اور فرمایا: اے سرزمین حرم! اگر میری قوم نے ہجرت کے لیے مجبور نہ کیا ہوتا تو میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔

حضور اکرم ﷺ کا مقام ادب:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ آپ کے چہرے کا اُٹھنا اور جھکنا ہم نے دیکھ لیا ہے۔ حضور ﷺ کی زبان سے حرف نہیں نکلے، یہ بھی مقام ادب ہے۔ حضور اکرم ﷺ مانگنا چاہتے ہیں، دل میں آرزو ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی عظمت وہیبت کا تقاضا ہے کہ ان کے سامنے سوال نہیں کرنا چاہتے۔ یہ مقام ادب ہے، اللہ تعالیٰ انبیاء ﷩ کو سب سے زیادہ ادب والا بناتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ زبان سے نہیں، بس دل سے تمنا کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دلوں کے بھید جاننے والا اللہ ہے، حضور اکرم ﷺ کے دل کے بھید کا جاننے والا بھی اللہ ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کے بھید جاننے والا بھی اللہ ہے، ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝٢٣﴾ [لقمان: ۲۳] بے شک اللہ تعالیٰ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

علامہ اقبال نے بڑی عجیب بات کہی ہے کہ اے میرے اللہ! مجھے پتہ ہے کہ آپ سب سے بڑے غنی ہیں اور میں سب سے بڑا فقیر ہوں، اللہ! مجھے پتہ ہے کہ آپ گناہوں سے پاک اور منزہ ہیں اور میں سراپا گناہ گار ہوں، اے میرے اللہ! اگر قیامت میں بغیر حساب کے بخش دیں تو تیرا کرم ہے، لیکن اگر حساب لینا ضروری ہے تو کم سے کم حضور اکرم ﷺ کے سامنے میرا حساب نہ لینا، کیونکہ میں ان کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ تیرا اُمتی ہو کر کیا عمل کر کے لایا ہوں۔ یہ مقام ادب ہے۔

کعبہ کے قبلہ ہونے کی حضور اکرم ﷺ کی تڑپ:

﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا﴾ ہم آپ کو پھیریں گے اس عظمت والے قبلہ کی طرف جو آپ کا پسندیدہ اور محبوب ہے۔ یہاں خداوند قدوس کا مقام رحمت ہے۔ نبی کا مقام ادب یہ تھا کہ دل کے اندر ایک بات تھی، لیکن زبان پر

نہیں لائے کہ شاید اللہ ناراض نہ ہو جائیں۔ اور یہاں مقامِ رحمت ہے کہ میرے مدنی! ہم آپ کو اس کعبہ کی طرف پھیر دیں گے جو تیرا پسندیدہ۔ حالانکہ یہ کعبہ میرے اللہ کا بھی محبوب ہے اور اس کا اپنا گھر ہے۔ اللہ کی رحمت دیکھیں! یہ نہیں فرمایا کہ ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جو ہمارا اول گھر ہے یا ہمارا پسندیدہ کعبہ ہے، بلکہ فرمایا: اس کی طرف پھیر دیں گے جو آپ کو پسند ہے اور فوراً فرمایا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ اس سے باقی امت کو بھی حکم ہو گیا کہ تم بھی اپنا رخ کعبہ کی طرف پھیر دو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے کہ آپ نے تو قبلہ مانگا تھا اور ہم نے پوری مسجد حرام کو آپ کے لیے قبلہ بنا دیا ہے۔ اس میں کتنی بڑی رحمت ہے کہ قیامت تک اُمت محمد یہ پریشان نہ ہو۔

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ یہ حکم صرف مدینہ والوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ جہاں کہیں بھی ہو گے تو نماز اسی قبلہ کی طرف پڑھو گے، چاہے بیت المقدس کے اندر ہی موجود ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے میری اُمت! زندوں کے لیے بھی یہی کعبہ ہے اور مرنے کے بعد بھی یہی کعبہ ہے۔ اس لیے حکم ہے کہ قبر میں میت کا رخ بھی کعبہ کی طرف کرو۔

حضرت ابو سعید بن المعلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم دن میں حضور اکرم ﷺ کی مسجد میں آجاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ آپ کعبہ کی طرف رخ کریں تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا: جلدی کرو، جب حضور اکرم ﷺ منبر سے اُترتے ہیں ہم دو رکعت کعبہ کی طرف پڑھ لیں، تاکہ ہم سب سے پہلے تعمیل کرنے والوں میں سے ہو جائیں تو ہم نے علیحدہ ہو کر دو رکعت پڑھ لیں۔ اس کے بعد ہم نے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ظہر کی نماز کعبہ کی طرف رخ کر کے پڑھی۔ (ابن کثیر: ۱۸۳)

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اب آدمی چاہے مشرق میں ہو یا مغرب میں ہو، جہاں کہیں بھی ہو کعبہ کی طرف رخ کرے گا۔ ہاں اگر اس کو کعبہ کا پتا نہیں کہ کس طرف ہے اور اپنے اندازے سے نماز پڑھ لے تو اس کی نماز ٹھیک ہو جائے گی۔

ہوائی جہاز میں نماز:

ایک بات یاد رکھیں! بعض حضرات ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوتے ہیں تو کرسی پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لیتے ہیں

یہ مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اگر آدمی کھڑے ہونے پر قدرت رکھتا ہے تو اس کے لئے کھڑا ہونا ضروری ہے اور اگر کھڑا نہیں ہو سکتا تو معذور ہے۔

اسی طرح اگر جہت قبلہ معلوم ہونے کا ذریعہ موجود ہے تو وہ معلوم کریں، جیسے جہازوں کے اندر آسانی ہے، خاص طور پر سعودی جہازوں کے اندر کمپاس لگا ہوتا ہے، ان کو کہیں تو چالو کر دیتے ہیں، اس سے قبلہ معلوم ہو جاتا ہے اور اگر جہازوں میں نہ بھی ہو تو لوگ مسلمان ہوتے ہیں تو پائیلٹ کے آگے کمپاس لگا ہوا ہوتا ہے تو کسی واسطہ سے معلوم کر سکتے ہیں کہ کعبہ شریف کس طرف ہے؟ لہٰذا جب قبلہ معلوم ہو سکتا ہے تو معلوم کریں۔ (لیکن یہ نمازی کے لئے کسی سے قبلہ کا معلوم کرنا ضروری نہیں، اگر بغیر پوچھے کوئی اپنی سمجھ کے مطابق کسی غلط سمت کو قبلہ سمجھ کر نماز میں رخ کر لے تو اس کی نماز ہو جائے گی اور اگر کوئی نماز میں درست سمت معلوم ہو تو نماز میں ہی نمازی اپنا رخ بدل لے، ورنہ اس کی نماز نہ ہوگی)۔ دوسرا اگر آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے ہیں تو بلاوجہ سیٹ پر بیٹھ کر نماز نہ پڑھیں، بلکہ کھڑے ہو کر پڑھیں۔ ٹرین میں، بحری جہاز میں ہیں تو قبلہ کی سمت معلوم کریں اور نماز پڑھیں۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ نفل نماز کے اندر اتنی وسعت ہے کہ سواری جدھر جارہی ہے، آپ اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر دشمن کے سامنے آپ کی صفیں ہیں تو اب آپ یہ تو نہیں کر سکتے کہ دشمن کو پشت دے دیں، بلکہ اس موقع پر جیسے بھی رخ ملتا ہے نماز اس حالت میں ادا کرنا چاہیے۔ اسی طرح جس کو قبلہ کا پتا نہ چلے تو وہ اپنی طرف سے کوشش کرے، نماز پڑھ لے تو جائز ہے، چاہے اس نے غلط سمت پڑھ لی ہو۔

مالکیہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ مصلّی سامنے دیکھے، سجدے والی جگہ کو نہ دیکھے۔ اگر سجدے والی جگہ دیکھے گا تو لازمی بات ہے کہ گردن نیچے کرے گا، جبکہ حکم ہے: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾

قاضی شریح رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کھڑا ہے تو سجدے والی جگہ نظر ڈالے۔ جمہور بھی اس کے قائل ہیں، کیونکہ یہی بات حدیث مبارک میں موجود ہے اور اسی کے اندر خشوع وخضوع ہے۔ اصل حکم جہت کا ہے، یہ ضروری نہیں کہ آدمی گردن اُٹھالے، بلکہ اگر وہ نظر نیچی کرے گا تو اس کے اندر زیادہ عاجزی ہے۔ اگر آپ رکوع کے اندر ہیں تو پاؤں والی جگہ پر نظر ڈالیں اور اگر سجدے میں ہیں تو ناک پر نظر ڈالیں اور ''اَلتَّحِيَّات'' میں بیٹھے ہیں تو گود میں نظر ڈالیں۔

﴿وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ۝ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۴۵، ۱۴۶]

''اور اگر آپ اہل کتاب کے پاس سب نشانیاں بھی لائیں (تب بھی) یہ آپ کے قبلہ کو نہ مانیں گے اور نہ آپ ان کے قبلہ کو مانیں گے اور ان میں سے بعض ایک دوسرے کے قبلہ کو نہیں مانتے اور اگر (بالفرض) آپ ان کی خواہشات پر چلیں بعد اس کے آپ کے پاس علم آچکا تھا تو آپ بھی بے انصافوں میں سے ہوں گے۔ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب (تورات اور انجیل) دی ہے وہ آپ ﷺ کو پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں سے ایک فریق جان کر حق چھپاتا ہے۔''

بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے سے یہودی مسلمان ہو سکتے تھے؟

دل میں خیال آتا ہے کہ وہ بھی بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے تو ہو سکتا تھا کہ یہودی اسی وجہ سے ایمان لے آتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم جانتے ہیں کہ یہ اہل کتاب ضدی اور خودسر ہیں۔ یہ حسد، بغض اور عناد میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ آپ ان کے پاس بڑی سے بڑی نشانی لے آئیں، لیکن یہ آپ کے قبلہ کی اتباع نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب ہم نے بیت المقدس کو منسوخ کر کے آپ کے لیے کعبہ کو قبلہ بنا دیا ہے اب آپ بھی ان کے قبلہ کی اتباع نہیں کریں گے اور یہ آپ کے قبلہ کی اتباع نہیں کریں گے ضد کی بناء پر اور آپ حق کی بناء پر نہیں کریں گے۔ اور ان یہود و نصاریٰ کی یہ حالت ہے کہ یہ ایک دوسرے کے قبلہ کی بھی اتباع نہیں کرتے۔ پھر یہودیوں اور نصرانیوں میں کئی جماعتیں ہیں، یہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں بظاہر آپ کو کتنے ہی اکٹھے نظر آئیں، اسلام کی دشمنی میں یہ کافر اگرچہ آپ کو اکٹھے نظر آتے ہیں، مگر یہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

﴿وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ﴾ اگر آپ ان کی

خواہشات کی اتباع کریں علم آنے اور حق پہنچنے کے بعد تو آپ بھی ان لوگوں میں سے ہو جائیں گے جو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔ اس آیت میں خطاب تو حضور اکرم ﷺ کو ہے، لیکن مقصود ساری اُمت ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی مقصود اُمت کو تنبیہ ہوتی ہے، لیکن بظاہر خطاب اللہ کے نبی کو ہوتا ہے۔ ورنہ اللہ کے نبی کریم ﷺ تو کبھی یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی پیروی نہیں کرتے، وہ تو اللہ کے رسول اور معصوم ہیں۔

مسیلمہ کذاب کا آپ ﷺ سے خلافت کا تقاضا:

مسیلمہ کذاب نے حضور پاک ﷺ سے ایک مطالبہ کیا (اس وقت اس کے پاس ستر ہزار فوج تھی) کہ میں آپ کی نبوت اور ختم نبوت کا اقرار کرتا ہوں، اسلام لے آتا ہوں، آپ کے تابع بن جاتا ہوں، آپ صرف اتنی مہربانی کریں کہ اپنی وفات کے بعد مجھے خلافت دے دیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میرے ہاتھ میں جو چھڑی ہے، اگر یہ تم مانگنا چاہو تو میں یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر تمہیں نہیں دے سکتا اور تم خلافت کی بات کر رہے ہو۔ کیونکہ جو آدمی حضور اکرم ﷺ کی اہانت کرے، وہ مرتد اور واجب القتل ہے۔

حضور اکرم ﷺ سے مشرکین نے کہا: ہم آپ سے سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایک سال ہم آپ کے طریقے پر چلتے ہیں اور ایک سال کے لئے آپ ہمارے طریقے پر چلیں۔ آپ ﷺ نے واضح فرمادیا: ﴿قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْكَٰفِرُونَ ① لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ②﴾ [الکافرون:۱،۲] آدمی کی حق والوں کے ساتھ صلح ہو سکتی ہے، باطل والوں کے سامنے آدمی کبھی نہیں جھک سکتا۔ کفر کے ساتھ معاملات میں صلح ہو سکتی ہے، لیکن یہ تو ہین ہے کہ ایک سال کے لئے اپنا دین چھوڑ دیں اور ان کے دین پر چلیں۔ یہ تو دین نہ ہوا، بلکہ مذاق ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ یہ نہ سمجھیں کہ ان کو آپ کا پتہ نہیں ہے یا آپ کی نبوت و رسالت میں ان کو شبہ ہے، بلکہ یہ تو آپ کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے کسی بندے کو اپنی اولاد کو پہچاننے میں شبہ نہیں ہوتا کیونکہ اس نے اپنی اولاد کو بچپن سے لے کر جوانی تک تمام اَدوار میں دیکھا ہوتا ہے تو وہ کیسے غلطی کر سکتا ہے؟ اسی طرح یہ لوگ آپ کو جانتے ہیں کہ آپ سچے نبی ہیں، ان کو کوئی شبہ نہیں۔

﴿لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ﴾ کی تفسیر:

پورے قرآن میں غور کریں! اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو ہدایات دی ہیں آج ہم نے ان کو چھوڑ دیا، اسی وجہ سے

ہم ذلیل ہو رہے ہیں۔ فرمایا: اے نبی! اگر آپ نے ان یہود و نصاریٰ کی اتباع کی تو آپ ظالمین میں سے ہو جائیں گے۔ اگر نبی کے لئے اتنا تشدیدی حکم ہے تو ہم اگر یہود و نصاریٰ کی پیروی کریں گے تو ہم کیا ہو جائیں گے؟

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: ﴿لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ [المائدۃ:۵۱] اے ایمان والو! تم کبھی بھی یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ۔ یہ تو ایک دوسرے کے دوست و مددگار بن سکتے ہیں۔ آج چودہ سو سال کے بعد اللہ کے قرآن کا حکم کیسے سامنے آگیا ہے؟ ورنہ یہود و نصاریٰ کی آپس میں عداوت ضرب المثل ہے کہ ایک ایک دن میں لاکھوں یہودیوں کو انہوں نے قتل کیا، ٹکڑے ٹکڑے کیا، چھ لاکھ یہودیوں کو قیدی بنایا، یہودیوں اور ان کی عورتوں کو اپنی کنیزیں بنایا اور ان کو زنجیریں ڈال کر اور کھینچ کھینچ کر اپنے ملکوں تک لے گئے۔ اور یہودیوں کی عداوت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش کی۔ آج اسلام کے ساتھ ان دونوں کی عداوت واضح ہے کہ اس کے پوپ نے باقاعدہ اعلان کیا کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دینے کا جرم کیا تھا، ہم نے ان کو معاف کر دیا۔ اب ان کی دوستی اور محبت کا یہ عالم ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا جرم بھی معاف کر دیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اتنی جہالت ہے کہ جرم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہو اور معاف کرنے والا پوپ ہو؟ نہ یہ انجیل میں ہے نہ کتب سابقہ میں ہے۔

آپ ﷺ کی نبوت میں عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا مؤقف:

﴿وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ [البقرۃ:۱۴۶]

ان میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق کو چھپانے والے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ﴾ تم مجھے بتاؤ کہ کیا یہ حقیقت ہے کہ تم محمد عربی ﷺ کو ایسے پہچانتے تھے؟ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اولاد میں تو شک ہو سکتا ہے کہ شاید بیوی نے خیانت کی ہو، کوئی گناہ کیا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے نبی میں کوئی شک نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کی ساری نشانیاں تورات میں موجود ہیں۔

حدیث مبارک میں آیا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا، اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

"اِبْنُكَ هٰذَا؟ قَالَ: نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللهِ! أَشْهَدُ بِهِ، قَالَ: أَمَا أَنَّهُ لَا يَخْفٰى عَلَيْكَ وَ لَا تَخْفٰى عَلَيْهِ."

[تفسیر ابن کثیر: ۲/۴۲۶]

یہ تمہارا بیٹا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بات بڑی واضح ہے، نہ تجھ پر چھپی ہے اور نہ اس پر چھپی ہے۔

﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۚ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝﴾ [البقرة: ۱۴۷تا۱۵۰]

"حق وہی ہے جو آپ کا رب کہے، آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔ اور ہر (اُمت) کے لیے ایک قبلہ تھا جس کی طرف وہ رخ کرتی تھی پس تم نیکیوں میں سبقت کرو، جہاں بھی ہو گے اللہ تم سب کو (قیامت میں) جمع کرے گا، بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ اور آپ جہاں سے بھی نکلیں اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور یہی آپ کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ غافل نہیں ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور آپ جہاں سے نکلیں اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کر لیں اور (اے مسلمانو!) تم جہاں (بھی) ہو اپنے رخ اس کی طرف پھیر لیا کرو، تا کہ لوگوں کے لیے تم پر جھگڑے کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ مگر وہ لوگ ان میں سے ظالم ہوئے ان سے نہ ڈرنا، بلکہ مجھ سے ڈرنا، تا کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور تا کہ تم ہدایت پاؤ۔"

کعبہ کے متعلق یہود کے شبہات:

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے شکوک و شبہات کا دوسرے انداز سے جواب دیا گیا ہے کہ اے میرے نبی! ہر کسی کے لئے ایک جہت ہے، اس نے کسی نہ کسی طرف رخ کرنا ہے۔ بعض نے بیت المقدس کی طرف رخ کر لیا،

بعض نے کعبہ شریف کی طرف رخ کرلیا۔ اصل بات اس جہت کی طرف رخ کرنا نہیں ہے، اصل چیز تو نماز، روزہ، عبادات ہیں۔ کسی طرف رخ کرنا یہ تو عبادت کو ادا کرنے کا ایک ذریعہ ہے، ورنہ صرف جہت اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ مثلاً اگر ایک آدمی ہر وقت صرف کعبہ کی طرف منہ کرکے کھڑا رہے، نماز نہ پڑھے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ لہٰذا عبادت کا ذریعہ اللہ چاہیں تو بیت المقدس کو بنادیں اور چاہیں تو کعبہ شریف کو بنادیں۔

آگے فرمایا: ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ جدھر بھی تم نکلو، اللہ تعالیٰ کے اس گھر کی طرف رخ کو پھیرو اور جہاں بھی تم ہو اپنے چہرے کو اسی کعبہ کی طرف پھیر دو، تاکہ لوگوں کے لئے تم پر کوئی الزام باقی نہ رہ جائے۔ یعنی جب اللہ کے نبی بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے تو مشرکین مکہ الزام دیتے کہ اللہ کے نبی مکہ میں پیدا ہوئے اور اولادِ اسماعیل سے ہیں اور خود فرماتے ہیں کہ میں ملت ابراہیم پر ہوں، لیکن کعبہ ابراہیمی کی طرف رخ کرکے نماز نہیں پڑھتے، بلکہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور پاک ﷺ کی تمنا پوری فرمادی اور اکمل نبی کو اکمل قبلہ کی طرف بھی پھیر دیا تو اب یہود اعتراض کرنے لگ گئے کہ دیکھو! پہلے تو ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھ رہے تھے، اب ہمارے ساتھ جھگڑے کی وجہ سے ہمارا قبلہ چھوڑ دیا ہے اور اسی قبلہ کی طرف پھر گئے ہیں جو مکہ والوں کا قبلہ ہے۔ اس طرح یہودیوں کا الزام تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے قبلہ کعبہ کو قرار دے دیا تو دونوں کا الزام ختم ہوگیا کہ ہم تو کسی کے گھر کے تابع نہیں، بلکہ ہم تو اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ ہمیں بیت المقدس کا حکم دیتے ہیں تو ہم اس کی تعمیل کرتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ قبلہ ابراہیمی کا حکم دیتے ہیں تو ہم اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ اصل میں ہم اپنے اللہ کے حکم کے پابند ہیں، کسی مکان اور جہت کے پابند نہیں۔ اگر ہم کسی ایک مکان کے پابند ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ (نعوذ باللہ!) ہم ان پتھروں کو سجدہ کرتے ہیں اور خدا نہ کرے کعبہ شریف کی عمارت نہ ہو تو کیا ہمارے سجدے بھی ختم اور ہماری عبادت بھی ختم؟ بلکہ ہم تو اپنے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ ہاں! اگر وہ لوگ جو کافر ہیں وہ تو پھر اعتراض سے باز نہیں آئیں گے، وہ ہمیشہ شبہات پیدا کرتے رہیں گے۔ آپ ان ظالموں کے اعتراض سے کبھی نہ گھبرائیں، آپ میری ذات سے ڈریں، دنیا تو کہتی رہتی ہے۔

﴿وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ اس تحویل قبلہ میں اللہ کی رحمت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب میں نے دین کو کامل کردیا، نبوت کو مکمل کردیا تو اب میرا یہ فیصلہ ہے کہ میں تم پر کعبہ کی یہ نعمت بھی پوری کردوں، تاکہ

سب سے افضل نبی کا کعبہ بھی سب سے افضل ہو، اس کا دین بھی سب سے افضل ہو اور جو اُن پر کتاب اُتاری، وہ بھی سب سے افضل ہو اور اس کی شریعت بھی سب سے افضل ہو۔ اس حکم میں تکرار اس لئے ہے کہ یہ سب سے پہلا نسخ والا حکم تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو بار بار بیان فرمایا، کیونکہ لوگوں کو پتہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں بھی تبدیلی ہوگی۔ بار بار اس لئے فرمایا، تا کہ مومنوں کے دلوں میں ایمان و ایقان بڑھ جائے اور دشمنوں کو کسی قسم کا شبہ نہ رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ احوال مختلف ہیں کہ بعض اوقات آدمی کعبہ کے سامنے کھڑا ہے اور بعض اوقات مکہ میں کعبہ نظر نہیں آرہا اور بعض اوقات دوسرے علاقوں میں ہے تو اللہ تعالیٰ نے تین دفعہ بیان فرمایا کہ سب کا حکم ایک ہے، مکہ کے اندر ہیں تو یہی قبلہ ہے، مکہ سے باہر ہیں تو بھی یہی قبلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے آپ کو اس قبلہ کا اس لئے حکم دیا ہے: ﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ﴾ تا کہ لوگوں کا تم پر کوئی الزام باقی نہ رہے، کیونکہ تورات اور سابقہ کتابوں میں لکھا ہوا تھا کہ حضور اکرم ﷺ کی اُمت کعبہ ابراہیمی کی طرف نماز پڑھے گی۔ اللہ تعالیٰ یہ قبلہ نہ بناتے تو وہ کہتے: یہ تو وہ نبی نہیں ہے، کیونکہ ہماری کتابوں میں ان کی صفات میں لکھا ہوا ہے کہ وہ قبلہ ابراہیمی کی طرف توجہ کرے گا، جبکہ یہ نبی تو بیت المقدس کی طرف رخ کرتے ہیں تو تحویل قبلہ کے حکم نے ان کے الزام کو ختم کر دیا۔

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝﴾ [البقرة:۱۵۱،۱۵۲]

”جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول (محمد ﷺ) تمہیں میں سے بھیجا جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور احکام کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ پس تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور ناشکری نہ کرو۔“

انسان کی مجموعی قوتیں اور نبوت کی اہلیت:

تحویل قبلہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے بارے میں ذکر فرمایا کہ اس اُمت کو جیسے ہم نے عظیم کعبہ دیا جو ”ھدی للعالمین“ ہے، ان کو پیغمبر بھی ”رحمۃ للعالمین“ دیا، فرمایا: ہم نے تمہارے پاس رسول

بھیجا جو تم میں سے ہے۔ یہ اللہ پاک کا انعام ہے کہ اللہ نے جو نبی بھیجے وہ انسانوں میں سے بھیجے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو بشر کے اندر قوتیں رکھی ہیں وہ کسی اور مخلوق میں نہیں رکھیں۔ فرشتوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے قوائے عقلیہ اور قوائے ملکیہ رکھی ہیں، لیکن قواتِ شہوانیہ وحیوانیہ سے وہ پاک ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید اور اللہ کے حکم کی اطاعت میں ہمہ تن مشغول رہتے ہیں۔ حیوانات کے اندر قوتِ شہوانیہ تو ہے لیکن قوتِ عقلیہ نہیں ہے۔ اللہ نے یہ شرف صرف بشر کو دیا ہے کہ اس کے اندر تمام قوتیں قوتِ ملکیہ، قوتِ عقلیہ، قوتِ شہوانیہ اور غضبیہ وغیرہ رکھی ہیں تو ان تمام قوتوں کے مجموعے کا نام انسان ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے رسول بھیجے، وہ سب بشر اور سید البشر تھے، اولادِ آدم میں سے تھے، اس لئے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر سے فرمایا: "أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ، أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ" میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں اور فرمایا: "أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ" میں آدم علیہ السلام کی اولاد کا سردار ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سید البشر ہیں، اگر کوئی آپ کی بشریت کا انکار کرے تو وہ اللہ کے قرآن اور اللہ کے نبی کے فرمان کا منکر ہو جاتا ہے۔ انسانیت کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ملا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہمارا احسان مانو کہ ہم نے تمہارے پاس تم میں سے رسول بھیجا ہے، لیکن تم پھر بھی میرا احسان نہیں مانتے ہو۔ اگر اللہ پاک فرشتوں کو نبی بنا کر بھیجتے اور وہ تمہیں روزہ کا حکم دیتے تو لوگ کہتے کہ تمہیں تو بھوک نہیں لگتی۔ وہ کہتے: خبردار! غیر محرم عورت پر نظر نہ ڈالنا تو لوگ کہتے آپ کو گناہوں سے پاک ہیں، تمہارے اندر تو مادہ شہوانیت نہیں ہے، اگر تمہارے اندر مادہ شہوانیت ہوتا تو پھر ہم دیکھتے کہ کیسے بچا جاتا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ اگر فرشتوں کو نبی بنا کر بھیجتے تو وہ دو حالتوں میں سے ایک حالت پر آتے یا اپنی اصلی حالت پر آتے تو کس کے اندر ان کو دیکھنے کی طاقت ہوتی؟ اور اگر انسان کی شکل میں آتے تو لوگ کہتے لباس بشر کا پہنا ہوا ہے، لیکن کھاتا پیتا نہیں ہے، شادی نہیں کرتا، اولاد نہیں ہے۔

آگے فرمایا: میرے رسول کا وظیفہ یہ ہے کہ تم کو میرا قرآن پڑھ پڑھ کر سنائے۔ اور دوسرا وظیفہ یہ ہے کہ تمہیں پاکیزہ بنا دے گا، تمہیں مرتبۂ احسان پر پہنچائے گا۔ تزکیہ کا مقصد ہوتا ہے انسان کامل، مکمل، پاک اور اندر باہر سے ٹھیک ہو کر اللہ تعالیٰ کا مطیع بن جائے اور تمہارے اخلاق کی اصلاح کر دے، تمہیں طمع سے بچائے، حرص سے بچائے، گناہوں سے بچائے اور تمہارے اندر قویٰ ملکیہ پیدا کر دے۔ اور تیسرا وظیفہ یہ ہے کہ تمہیں میرے قرآن کی تعلیم دے، دانائی اور حکمت کی باتیں تم کو سکھائے اور تم کو ان چیزوں کی تعلیم دے جو تم نہیں جانتے اور تمہیں دنیا کے اندر جینے

کے سلیقے سکھائے، تمہیں حلال وحرام کی تعلیم دے اور وہ مسائل جن کو تم نہیں جانتے، ان کی تعلیم دے۔

کثرتِ ذکر اللہ کا حکم:

میری اتنی بڑی نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔ فرشتوں سے کہوں گا کہ دیکھو! مجھے میرے بندے نے یاد کیا ہے۔ نماز، قرآن، تسبیح، تحمید کرو، تکبیر سب اللہ کا ذکر ہے تم مجھے ہر وقت یاد رکھو کیونکہ ہر عمل کی حد ہے، لیکن میرے ذکر کی کوئی حد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: تم میرا ذکر بندوں میں کرتے ہو تو میں تمہارا ذکر ملائکہ میں کرتا ہوں کہ دیکھو! میرا بندہ ہر وقت میری تسبیح وتہلیل میں مشغول ہے۔ حدیث میں آتا ہے: اتنا ذکر کرو کہ لوگ کہیں یہ دیوانہ ہو گیا ہے، اس کو نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا ہوش ہے۔ جب تک انسان اپنے مشن کے ساتھ اس حد تک مخلص نہ ہو جائے اس وقت تک ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب آدمی غافل ہو جاتا ہے تو اس سے نماز چھوٹ گئی، اللہ کا ذکر چھوٹ گیا، تلاوت قرآن چھوٹ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شیطان دل پر ڈیرہ ڈال لیتا ہے۔ بعض احادیث میں آیا ہے کہ جب ذکر کرنے والے کا جہنم سے گزر ہو گا تو جہنم چیخ پڑے گی کہ مومن! جلدی کرو، گزر جاؤ، ورنہ میں تو بجھ جاؤں گی۔ حدیث میں آتا ہے کہ حشر کے میدان میں جب پچاس ہزار سال یا ایک ہزار سال کا دن ہو گا تو مومن پر یہ عرصہ کیسے گزرے گا جیسے اس نے عصر کی نماز سے مغرب تک کا وقت گزارا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن اللہ کے ذکر میں ایسا مستغرق ہو گا کہ اسے پتہ ہی نہیں لگے گا اور کافروں کے لئے پچاس ہزار سال بڑا اس لئے ہو گا کیونکہ جتنا عذاب بڑا، اتنا بڑا دن محسوس ہو گا۔

اللہ کا شکر کیسے کیا جائے؟

﴿وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ﴾ [البقرۃ:۱۵۲]

''تم میری نعمتوں کا شکر کرو اور کفر نہ کرو۔''

سب سے پہلا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ۔ قرآن نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ [الدھر:۳] ہم نے کھلا راستہ دیا ہے، اب بندے یا تو شکر والے مومن بندے بنیں گے یا کافر بنیں گے۔

دوسرا شکر یہ ہے کہ اللہ کے احکام پر چلو۔ اللہ نے جو نعمتیں دی ہیں، انہیں اسی کام میں صرف کرو۔ مثلاً کان کا

کام سننا ہے، آنکھوں کا کام دیکھنا ہے، ناک کا کام سونگھنا ہے، پاؤں کا کام چلنا ہے، ہاتھوں کا کام پکڑنا ہے۔ ہر عضو اپنی اپنی ڈیوٹی میں لگا ہوا ہے، دوسری ڈیوٹی نہیں کرسکتا تو اے انسان! تجھے میں نے جس ڈیوٹی کے لئے پیدا کیا ہے تم اگر وہ ڈیوٹی نہ کرو تو تمہارے جیسا دنیا میں کوئی حیوان نہیں ہے تو شکر کا دوسرا درجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو اعضاء دیئے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگائیں۔ زبان کا شکر یہ ہے کہ زبان سے کہو: "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ، سُبْحَانَ اللّٰہِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" ورنہ اصل شکر دل کا شکر ہے۔

"مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ." [جامع ترمذی، رقم:۱۹۵۵]

جو آدمی کسی بندے کا شکر نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر نہیں کرتا۔ حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا ہے کہ اگر کوئی آدمی تمہیں ہدیہ دیتا ہے، کوئی چیز لے کر آیا ہے تو اس کا بدلہ دو۔ اگر امیر ہو تو تم بھی اس کے لیے ہدیہ بھیجو اور غریب ہو تو اپنی زبان سے بدلہ ادا کرو، "جَزَاکَ اللّٰہُ خَیْرًا" کہو، اس کے لیے دعا کرو۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: یا اللہ! آپ نے جو حکم دیا ہے کہ میرا شکر کرو تو ہم تیرا شکر کیسے کریں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! جب تم مجھے یاد کرو گے تو گویا تم نے میرا شکر کیا اور جب تم مجھے بھول گئے تو گویا تم نے میری نعمتوں کی ناشکری کی۔ شکر کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ صرف زبان سے "سبحان اللہ" یا "اللہ اکبر" کہہ دیا، بلکہ شکر یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو یاد رکھے اور ان پر عمل کرے۔ اگر احکامات پر عمل نہیں کرتا تو درحقیقت اس نے یاد بھی نہیں کیا، کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا وہ نافرمانی نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی تو توبہ کرکے اللہ کے دروازے پر رونے لگ جائے تو اللہ تعالیٰ بھی معافی دے دیتے ہیں۔ جب اس مقام پر انسان آجاتا ہے تو پھر وہ زبان سے بھی شکر اور دل سے بھی شکر بجالاتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ، حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ، حضرت سدی رحمہ اللہ، حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ اس کو یاد فرماتے ہیں جس نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا اور اللہ تعالیٰ اس کی نعمتوں میں اضافہ فرماتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے، شکر بجا نہ لائے تو اللہ اس کو عذاب دیتے ہیں۔

شکر نعمتوں میں اضافے کا سبب ہے:

سابقہ روایات میں آتا ہے کہ ایک آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: آپ اللہ کے

رسول ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے اتنی نعمتیں دی ہیں، صحت وعافیت بھی دی ہے، فرمانبردار بیوی بچے بھی دیئے ہیں، اللہ نے دولت سے بھی نوازا ہے، اللہ کی اتنی ساری نعمتیں ہیں، اب میں ان کا متحمل نہیں ہوں، اللہ پاک سے عرض کریں کہ اللہ پاک مجھے اور نعمتیں نہ دے، یہی کافی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے عرض کیا: مولا! تیرے بندے کو وہ نعمتیں کافی ہیں اور وہ کہتا ہے کہ مجھے اور نعمتیں نہیں چاہئیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے کو کہہ دو، تم میرا شکر کرنا بند کر دو، میں بھی نعمتیں دینا بند کر دوں گا، اگر میرا شکر کرنا بند نہیں کرے گا تو میں نعمتیں دینا بند نہیں کروں گا۔ میرا وعدہ ہے جو شکر کرے گا اس کو دیتا چلا جاؤں گا۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ [سبا:۳۹] جو تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس کو لوٹاتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کبھی کسی انسان کا مال خیرات کرنے سے کم نہیں ہوتا۔ بظاہر تو لگتا ہے کہ کم ہو گیا، مگر اللہ تعالیٰ اس میں برکتیں عطا فرماتے ہیں اور اس تھوڑے کو اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ تم سمجھ نہیں سکتے۔

گناہ کرنے والے کا شکر قبول نہیں کیا جاتا:

حضرت مکحول الازدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ مجھے ایک بات سمجھ نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا: تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ ایک آدمی جو خودکشی کرنے والا، ایک آدمی کسی بندے کو قتل کرنے والا، ایک آدمی شراب پینے والا، ایک آدمی چوری کرنے والا، ایک آدمی زنا کرنے والا وہ بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اس کو بھی یاد کرتے ہیں؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کا حکم بالکل ٹھیک ہے، لیکن جب یاد کرتا ہے تو اللہ اس کو اپنی لعنت سے یاد کرتے ہیں کہ تم میرا نام بھی لیتے ہو اور گناہ بھی کرتے ہو، ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾ [البقرۃ:۱۵۲] جب تک وہ ان گناہوں کو نہیں چھوڑے گا، اللہ بھی اس کو لعنت سے یاد کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ بندے کو کیسے یاد کرتا ہے؟

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ﴾ مجھے یاد کرو، یعنی میری فرمانبرداری کرو، ﴿اَذْكُرْكُمْ﴾ میں تمہاری مغفرت کر کے تمہیں یاد کروں گا۔ حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي، وَ إِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ.''

[صحیح بخاری، رقم:۷۴۰۵]

اگر بندہ مجھے تنہا یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے تنہا یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے میں اس کو اس سے بہتر جماعت یعنی ملائکہ کی جماعت میں یاد کرتا ہوں۔ اس لئے بعض علماء جماعت کے ذکر کو افضل قرار دیتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''يَا ابْنَ آدَمَ! إِنْ ذَكَرْتَنِي فِي نَفْسِكَ ذَكَرْتُكَ فِي نَفْسِي وَ إِنْ ذَكَرْتَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرْتُكَ فِي مَلَإٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ أَوْ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ.'' [مسند احمد بن حنبل، رقم:۱۲۴۰۵]

اگر تم مجھے دل میں یاد کرو گے تو میں تمہیں دل میں یاد کروں گا اور اگر تم مجھے جماعت میں یاد کرو گے تو میں تمہیں ملائکہ کی جماعت میں یاد کروں گا۔

اگر تم میری طرف ایک بالشت بڑھو گے تو میں ایک ہاتھ بڑھوں گا اور اگر تم ایک ہاتھ بڑھو گے تو میں ایک گز سے بھی زیادہ بڑھوں گا اور اگر تم چل کر آؤ گے تو میں دوڑ کر آؤں گا، یعنی تم میری اطاعت کرو گے تو میری مغفرت تمہارے لئے آئے گی۔ (بخاری)

حضرت ابو رجاء العطاردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ ہمارے پاس آئے، انہوں نے ریشمی کپڑے کا عبا یا پہنا ہوا تھا، ایسی قیمتی چیز ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے ہم دیکھ کر حیران ہو گئے تو انہوں نے فرمایا: کیوں حیران ہوتے ہو؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مَنْ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَيْهِ نِعْمَةً فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يُحِبُّ أَنْ يُرىٰ أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَىٰ خَلْقِهِ.''

[مسند احمد بن حنبل، رقم:۱۹۹۳۴]

اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے کسی بندے پر نعمت کریں تو اللہ کو یہ محبوب ہے کہ اس نعمت کا اثر اس بندے پر بھی ظاہر ہو، یعنی اگر اللہ نے تم کو نعمت دی ہے تو اچھا پہنا کرو، اچھا لباس رکھو، تا کہ اللہ کی نعمتوں کا اثر تم پر ظاہر ہو۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۝ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۝﴾ [البقرۃ: ۱۵۳، ۱۵۴]

''اے ایمان والو! مدد حاصل کرو صبر اور نماز کے ساتھ بلا شبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور ان کو جو اللہ کی راہ میں مارے گئے، مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، تم نہیں جانتے۔''

اتباعِ شریعت اور مصائب پر صبر کی تلقین:

گزشتہ آیات میں حکم تھا کہ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ دوسرا حکم تھا میرے شکر گزار بندے بنو، کفرانِ نعمت نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا، اس پر عمل کرے اور جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ فرمایا ہے، ان سے رک جائے۔ حضور اکرم ﷺ سے محبت کرنے کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ کی سنت کے مطابق زندگی گزارے، اسی طرح اولیاء اللہ سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں انہوں نے اپنا جو مشن رکھا ہے اور جس طرح انہوں نے عبادت کی ہے، حرام کو چھوڑا، دنیا کی شہوات کو ترک کر کے اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ کے راستہ پر لگایا۔ اگر کوئی آدمی اس طرح اپنی زندگی گزارتا ہے تو یہ یاد کرنے والوں میں شمار ہوگا، ورنہ بے ادبی اور توہین کرنے والوں میں شمار ہوگا۔ چونکہ اس زندگی کو حاصل کرنا مشکل ہے تو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو علاج بتایا ہے کہ تم میرا شکر کرنا چاہو، میرے احکام پر عمل کرنا چاہو اور برائیوں سے بچنا چاہو، میری توحید لے کر کھڑے ہو جاؤ، مشرکین ستائیں گے، جب سنت پر عمل پیرا ہو گے تو بدعت والے آپ کے مخالف بنیں گے، جب آپ صحابہ و اہل بیت کے طرزِ زندگی کو اپناؤ گے تو ان کے مخالفین آپ کے دست و گریبان ہوں گے۔ جب آپ حلال پر چلیں گے تو حرام والے آپ کے مخالف ہوں گے، جب یہ مقابلہ ہوگا تو تکلیفیں اور پریشانیاں آئیں گی اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں ان سب تکالیف کا علاج بتا دیا ہے۔

اگر تم واقعی ایمان والے ہو اب کفر تمہارے مقابلے پر ہے کفر کے ساتھ جو مل جائیں اور مصالحت کر کے زندگیاں گزاریں تو سمجھ لو کہ ایمان نہیں ہے کیونکہ ایمان کی قوت ہو تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کفر کے ساتھ ایک لمحہ کے لئے بھی چل سکے۔ حضور اکرم ﷺ نے جب سرزمین مکہ میں کفر کو چیلنج کیا تو ایک منٹ کے لئے بھی کفر نے

آپ ﷺ کا ساتھ نہیں دیا، بلکہ وہ لوگ جو حضور اکرم ﷺ پر جان نچھاور کرتے تھے، جو آپ ﷺ کو صادق و امین کہتے تھے، سب دشمن بن گئے۔ آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھاتے، آپ ﷺ کے اوپر کوڑا کرکٹ پھینکتے، آپ ﷺ کے صحابہ کو گلیوں کے اندر گھسیٹتے، انگاروں پر لٹاتے۔ بالآخر ان کو مکہ سے نکالا گیا کیونکہ یہ لوگ ایمان لے آئے ہیں تو اب کفر کے ساتھ انہوں نے ٹکرانا ہوگا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ایمان والو! اگر تم ایمان والے بن گئے ہو کیا تمہارے اندر ایمان والی صفات آ گئی ہیں؟

مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر نصرانی عورت کا اسلام قبول نہ کرنا:

ایک نصرانی لڑکی نے کتاب لکھی اور اس میں تحریر کیا کہ میں نے تمام مذاہب کا مطالعہ کیا ہے، سب سے کامل مکمل اور سچا مذہب اسلام ہے، اسلام کے اندر اتنا کمال ہے کہ وہ ہر آنے والے دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرتا ہے، ہر آنے والی مشکلات کا حل بتاتا ہے، اسلام کے مقابلہ پر دنیا کا کوئی مذہب نہیں ہے، لیکن میں نے اسلام اس لیے قبول نہیں کیا کہ جب میں کتابوں میں پڑھتی ہوں تو اسلام جیسا مجھے سچا مذہب نظر نہیں آتا لیکن جب مسلمانوں پر نظر دوڑاتی ہوں تو ان میں ایک بھی مجھے مسلمان نظر نہیں آتا، ان میں مومنین و متقین کی صفات نظر نہیں آتیں۔ اس لئے میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ یا تو اسلام پر عمل کرنا مشکل ہے جو یہ مسلمان نہیں کر سکتے یا یہ سارے لوگ اسلام سے دھوکہ کر رہے ہیں تو میں اسلام لا کر کیا کروں گی؟ کیونکہ اسلام لانے کے بعد میں نے انہی کے ساتھ رہنا ہے تو میں بھی ایک منافق کی زندگی اختیار کروں گی اور اسلام کے اندر منافق کی سزا کافر سے بھی زیادہ ہے لہٰذا اس نفاق سے بہتر ہے کہ میں جس حالت پر ہوں اس پر اپنے آپ کو رکھوں۔

اس کا جواب واضح ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا، نہ کہ دوسروں کے اعمال کے بارے میں۔ اگر لوگوں میں بد دیانتی ہے تو وہ اسلام قبول کر کے ان خامیوں کو دور بھی کر سکتے ہیں، اسلام نہ لانا ہو تو اس کے لئے کئی بہانے ہیں۔ ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [البقرۃ: ۲۱۳]

قرآن کس کس پر لعنت کرتا ہے؟

جب قرآن پڑھیں تو اس میں غور و فکر کریں۔ یہ نہیں کہ قرآن ختم کر کے دعا کر لی کہ اے اللہ! اس کا ثواب فلاں کو پہنچا دے۔ کیونکہ پہلے تو یہ دیکھیں کہ ثواب ملا بھی ہے یا نہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری اُمت میں

ایسے لوگ آئیں گے، قرآن پڑھنے والے ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کا قرآن ان پر لعنت کر رہا ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کس طرح؟ آپ ﷺ نے فرمایا: قرآن میں ﴿لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ [ہود:۱۸] آیا ہے، اگر وہ قرآن پڑھتا ہے اور ظلم بھی کرتا ہے تو قرآن اس پر لعنت کر رہا ہے، اسی طرح اگر وہ جھوٹ بولتا ہے تو قرآن فرماتا ہے: "لَعْنَتُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ" جھوٹ بولنے والا قرآن پڑھے تو گویا قرآن لعنت کر رہا ہے، اس لئے جہاں قرآن میں خطاب آئے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ تو پہلے اپنے گریبان میں جھانکے، مولوی اپنے گریبان میں جھانکے، عام آدمی اپنے گریبان میں جھانکے، کیا ہمارے اندر وہ ایمان والی صفات موجود ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو کتنی ہیں؟ یا بالکل صفر ہیں، اگر نہیں ہیں تو نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟

﴿اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ اگر ہمارے اندر ایمان صحیح ہے اور ہمارے اوپر مشقت آجائے یا مصیبت آجائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ صبر کرنے کے ساتھ اور نماز پڑھنے کے ساتھ مدد پکڑیں۔

صبر کا معنی:

﴿بِالصَّبْرِ﴾ صبر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے فرمان پر عمل کرنا اور حرام سے رک جانا۔ صبر کا مشہور معنی یہ ہے کہ اگر کوئی غم اور مصیبت آئے تو اپنے آپ کو غیر شرعی فعل کرنے سے روکنا۔ اسی طرح گناہوں سے بچنے کا نام بھی صبر ہے۔

ایک صحابیہ کے صبر کا واقعہ:

ایک صحابی سفر پر تشریف لے گئے۔ جس دن واپس آرہے تھے ان کا چھوٹا لڑکا اس دن فوت ہوگیا۔ بیوی نے سوچا بچہ مر گیا، اتنا بڑا صدمہ آگیا اور اتنی مدت اور سفر کے بعد میرا خاوند گھر واپس آرہا ہے تو بیوی نے بچہ کو نہلایا اور کفن دے کر ایک کمرے میں لٹا دیا۔ اس کے بعد اس نے خود غسل کیا، کپڑے پہنے اور تیار ہو کر بیٹھ گئی۔ جب خاوند آیا تو بڑے خوش ہو کر اس کا استقبال کیا۔ خاوند نے پوچھا: بچے کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: الحمد للہ! بچہ مکمل خیر میں ہے (کیونکہ خیر حقیقی یہی ہے کہ وہ سارے دُکھوں سے بچ گیا، دنیا کے غموں سے دور ہوگیا)۔ بہر حال رات کو میاں بیوی نے حقوقِ زوجیت ادا کیے۔ پھر صبح کی نماز کے بعد بیوی نے خاوند سے کہا: میں نے آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔ اس نے کہا: کیا بات ہے؟ اس نے کہا: اگر کوئی آدمی امانت دے اور پھر کہے کہ میری امانت واپس کر دو تو وہ امانت واپس کر دینی چاہیے یا اسے واپس کرنے میں دُکھ ہونا چاہیے؟ خاوند نے کہا: واپس کرنی چاہیے، وہ اپنی چیز

لے گیا ہماری چیز نہیں لے گیا۔ بیوی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو بچہ ہمیں امانت دیا تھا، وہ اللہ نے واپس لے لیا ہے، اب تمہاری مرضی ہے، اللہ سے ناراض ہو جاؤ یا صبر کرو۔ انہوں نے کہا: ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴾۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، بی بی سارہ علیہا السلام اور ظالم بادشاہ کا واقعہ:

نیکی پر جمے رہنا بھی صبر ہے، جیسے سردی میں ہاتھ پاؤں ٹھٹھر رہے ہوں، فجر کی اذان ہو گئی تو جلدی سے نماز کی تیاری کرنا وغیرہ۔ اگر مصیبت پڑے تو دوسرا نسخہ نماز ہے۔ نماز، ہر غم کا علاج ہے، بارش نہ ہو، قحط پڑ جائے تو حکم ہے صلوٰۃ الاستسقاء پڑھو، نماز پڑھو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آئیں گی۔ اگر کوئی پریشانی آ جائے تو صلوٰۃ الحاجت پڑھو، دو رکعت نفل پڑھ لو اور نیت یہ کرو کہ اے میرے اللہ! جو میرے اوپر پریشانی ہے، اس کو ختم کر دے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جب بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی پریشانی آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے۔

صحیح احادیث میں مروی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بی بی سارہ علیہا السلام سفر کر رہے تھے تو راستے میں ایک ظالم بادشاہ تھا اور وہ عجیب تھا کہ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ سفر کر رہا ہوتا تو اس کی بیوی کو چھین لیتا، اس کی عصمت دری کرتا تھا اور اگر بہن یا بیٹی ساتھ ہوتی تو اس کو نہیں چھیڑتا تھا۔ بہرحال سیدنا ابراہیم علیہ السلام جا رہے تھے اور آپ کی بی بی ساتھ تھی۔ آپ کو پکڑ لیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو جواب سکھایا کہ اگر بادشاہ تم سے پوچھے کہ تم میری کیا لگتی ہو؟ تو تم کہہ دینا بہن ہوں، تاکہ عزت وعصمت بچ جائے۔ جب ان کو پکڑ کر لے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نماز پڑھنے لگے کہ یا اللہ! میں تجھ سے نماز ہی کے ذریعہ سے مدد مانگ سکتا ہوں۔ میں اکیلا آدمی تو بادشاہ سے نہیں لڑ سکتا تو اللہ پاک نے مہربانی کی کہ جب بی بی صاحبہ وہاں پہنچیں تو بادشاہ نے اپنے حرم سرا میں بلا لیا۔ اپنے کمرے میں جب انہیں بلایا اور وہ بری نیت سے بڑھنے لگا تو اللہ پاک نے اس کے ہاتھ پاؤں وہیں شل کر دیئے اور ایسا تین بار ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس بی بی پر میں حملہ نہیں کر سکتا تو اس نے ان کو عزت کے ساتھ واپس کر دیا۔

واقعہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر مصیبت آئی تو نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کی۔

حضرت جریج رحمہ اللہ پر تہمت کا واقعہ:

حضرت جریج رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے تھے، ان پر زنا کی تہمت لگائی گئی۔ قوم نے ان کو گھیر لیا، انہوں نے فوراً نماز شروع کر دی۔ ہر دکھ کا علاج نماز کے اندر موجود ہے، کیونکہ نماز کے اندر ذکر بھی ہے، قرآن بھی

ہے، نماز کے اندر معراج بھی ہے، نماز کے اندر بندے کا اللہ تعالیٰ سے تعلق بھی ہے، نماز کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع بھی ہے، دعا بھی ہے، تسبیح و تقدیس بھی ہے، نماز جامع عبادت ہے، اس لئے حکم ہے کہ اگر تم پر کوئی بھی مصیبت آجائے، کوئی مشکل آجائے، کوئی پریشانی آجائے تو دو ہتھیار مضبوطی سے پکڑ لو، ﴿اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ صبر اور نماز۔

جب اللہ تعالیٰ کے دروازے پر آگئے، جس کی شان یہ ہے ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [یٰسین:۸۲] کہ اللہ ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ سے سارے مسئلے حل کر دیتے ہیں۔ اگر کبھی دیر ہو جائے تو اس میں ہمارے گناہ حائل ہوتے ہیں، کیونکہ ہمارے اعمال خراب ہیں، ورنہ نماز ایک اکسیری نسخہ ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کے صابرین کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے یہ معیت علم ہوتی ہے اور کبھی معیت نصرت ہوتی ہے کہ اس بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد آجاتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ (نعوذ باللہ!) اللہ اس بندے میں آجاتے ہیں، جیسے بعض جاہل کہتے ہیں یہ فناء ہو گیا، خدا خود اس کے اندر آ گیا۔ یہ کفر و شرک ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن زید اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں یا تو صبر ان چیزوں میں ہوتا ہے جو اللہ کو محبوب ہیں، وہ چاہے بدن پر کتنی بھاری ہوں، لیکن آدمی برداشت کرے اور صبر کرے، جیسا کہ جہاد کرنا اللہ کو محبوب ہے، اس میں آدمی جان کو ختم کر دیتا ہے، اللہ کے لئے جان بھی قربان کر دیتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک ملک میں ہم دین پر قائم نہیں رہ سکتے، نماز نہیں پڑھ سکتے، شعائر اسلام پر قائم نہیں رہ سکتے تو ہجرت کریں۔ اپنے وطن کو چھوڑنا کوئی آسان بات نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور ایک ان چیزوں پر صبر ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتے ہیں۔ ہماری خواہش کہتی ہے کہ میں بھی اس طرح دولت مند بن جاؤں، لیکن اس سے رک جانا بھی صبر ہے۔ جس آدمی نے صبر کے ان دروازوں پر صبر کر لیا تو (ان شاء اللہ!) اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی اور رحمت ہے۔

صبر کرنے والوں کے لیے بلا حساب جنت کا انعام:

حضرت علی بن حسین زین العابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تبارک و تعالیٰ قیامت کے دن تمام مخلوقات کو جمع کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ صبر کرنے والے کہاں ہیں؟ تو بڑے لوگ

اُٹھیں گے، ان سے کہیں گے: کہاں جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے: جنت کی طرف جا رہے ہیں۔ لوگ کہیں گے: حساب سے بھی پہلے جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے: اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تمہارا کوئی حساب نہیں، جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ لوگ پوچھیں گے: یہ بدلہ تمہیں کس نعمت پر ملا ہے؟ وہ کہیں گے: ہمیں صبر پر یہ بدلہ ملا ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو گناہوں سے روکا، صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی فرمانبرداری کی، آج اسی صبر کا بدلہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے کہ لوگ ابھی حساب کتاب کی طرف متوجہ ہیں اور اللہ نے ہمیں جنت میں جانے کا حکم دیا ہے۔

صبر کے انعام کی کوئی حد نہیں:

دوسری حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ہر نیکی کے بدلے کی کوئی نہ کوئی حد ہے، لیکن صبر ایسی چیز ہے جس کا بدلہ اللہ تعالیٰ دیں گے اور اس کی کوئی حد بھی نہیں ہوگی اور حکم ہوگا کہ صبر کرنے والوں کو بلاؤ اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میری نعمتوں کے دروازے ان پر کھول دو۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب صبر کرنے والوں کو یہ بدلہ ملے گا تو وہ کہیں گے: کاش! دنیا میں ہمارے اوپر اللہ کے راستے میں اور مصیبتیں آتیں، ہمارے بدن کے چمڑوں کو قینچیوں سے کاٹا جاتا اور ہم صبر کرتے تو آج ہمیں اس سے بھی زیادہ بدلہ ملتا۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صبر کا معنی ہے بندہ اعتراف کر لے کہ اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں اور تیرا فیصلہ میرے حق میں بہتر ہے اور اسی پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی اُمید رکھے۔ بعض اوقات قوی لوگ ہوتے ہیں، لیکن وہ غم میں بہت جزع فزع کرتے ہیں، حالانکہ وہ صبر کرنے پر قادر ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی صبر نہیں کرتے۔

صبر کی آخری حد اللہ کے راستے میں شہید ہو جانا ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ﴾ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے شہید کی حیاتِ برزخی کا ذکر فرمایا ہے۔ صبر کی آخری حد یہ ہے کہ انسان اللہ کے راستے میں اپنی جان دے دے۔ علماء نے لکھا ہے کہ آج ہمارے اندر صورتِ اسلام تو ہے، لیکن حقیقت اسلام نہیں ہے۔ جب حقیقت اسلام ہو تو ہر چیز کو برداشت کرنا، اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنا، اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قربانی دینا آسان ہوتا ہے۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین میں حقیقت اسلام موجود تھی۔

ایک صحابی کا آپ ﷺ کے ساتھ محبت کا واقعہ:

ایک صحابی کو مشرکین مکہ لے گئے۔ انہیں پھانسی پر لٹکانے کے لئے کھڑا کر دیا۔ کسی کافر کو خیال آیا اور اس نے صحابی سے پوچھا: کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو (جیسے اب ہم آپ کو نیزوں سے چھلنی کر دیں گے اور پھانسی پر لٹکا دیں گے) اس جگہ تمہارے نبی ہوں، ہم تمہیں چھوڑ دیں اور ان کو قتل کر دیں؟ صحابی نے فرمایا: تم کیا کہہ رہے ہو؟ میرا اس پھانسی پر چڑھ جانا، نیزوں سے چھلنی ہو جانا بڑا آسان ہے، لیکن میں حضور اکرم ﷺ کے پاؤں کے تلوے پر ایک کانٹا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اندر حقیقت تھی، صرف شکل وصورت نہیں تھی۔

جس آدمی کے اندر حقیقت اسلام آگئی اور وہ اسلام کے لئے جان کی بازی لگا گیا، قرآن ان کے بارے میں ہمیں بتاتا ہے کہ ایسے لوگوں کا مرتبہ یہ ہے: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ [البقرة: ۱۵۴] حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مسلمان ہر حالت میں نفع میں ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! وہ کیسے؟ فرمایا: اگر اس پر مصیبت آئے تو صبر کرتا ہے اور اگر اس کو خوشی ملتی ہے تو شکر کرتا ہے، وہ دونوں حالتوں میں کامیاب ہے۔ فرمایا: نہ زندگی میں نقصان ہے اور نہ موت میں نقصان ہے۔ زندہ رہا تو غازی اور مجاہد اور اگر مارا گیا تو اللہ کے راستے میں شہید ہے۔

شہید کے درجات:

شہید کے بڑے درجات ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے، وہ ملائکہ کے ساتھ اُڑتے ہوئے جا رہے تھے اس لئے ان کا لقب جعفر طیار بن گیا۔ شہید کا سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ جو صحیح معنوں میں بادشاہ اسلام کی قیادت میں کفار کے ساتھ جنگ کرے اور اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنا ہو، اس حالت میں جو فوت ہو جائے وہ شہید ہے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا: اے مسلمانو! میں جب تک اللہ ورسول کا فرماں بردار رہوں تو میری فرمانبرداری کرنا، اگر میں اس سے ہٹ جاؤں تو میری کوئی فرمانبرداری نہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے خلیفہ بننے کے بعد یہی بات سوالیہ انداز میں کہی تھی کہ اے لوگو! اللہ نہ کرے، اگر میں اللہ و رسول کے حکم سے ہٹ جاؤں تو کیا کرو گے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم کھڑے ہو گئے، انہوں نے کہا: جب تک تم اللہ اور اللہ کے

رسول کے حکم پر چلو گے اس وقت تک تم ہمارے امیر اور خلیفہ ہو، ہم تمہارے حکم کے پابند ہوں گے اور اگر تم اللہ اور رسول کے حکم سے ہٹ گئے تو تیری تلوار سے تجھے سیدھا کر دیں گے۔

دوسرا شہید وہ ہے کہ اس کے گھر میں کوئی بدبخت آدمی گھس آئے وہ اپنی بیوی، بہن، بیٹی کی عزت بچانے کے لیے ان سے لڑا اور مارا گیا تو یہ بھی شہید ہے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ فرمایا: کوئی آدمی کسی کے گھر میں ڈاکہ مارنے کے لئے گیا۔ اب گھر والا اپنے مال کے تحفظ کے لیے لڑا اور مارا گیا تو وہ بھی شہید ہے۔

سب سے بڑا شہادت کا مرتبہ وہ ہے جو جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جائے۔ لیکن ان لوگوں کو بھی حضور پاک ﷺ نے شہادت کا مرتبہ دے دیا۔ گو اس مرتبہ پر نہ پہنچیں، لیکن ان پر بھی شہید کا اطلاق ہوتا ہے۔

اسی طرح اسلامی حکومت کا کوئی سپاہی ڈیوٹی پر مارا گیا، وہ بھی شہید ہے۔

کوئی مسلمان سپاہی بارڈر پر پہرہ دے رہا تھا، دشمن نے گولی ماردی تو وہ بھی شہید ہے۔

شہید حقیقی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو میرے راستے میں شہید ہو جائیں، تم ان کو مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں، تمہیں ان کی حیات کا شعور نہیں ہے۔ وہ بظاہر دنیا والوں کو مردہ و بے حس نظر آتے ہیں، جبکہ وہ حقیقت میں زندہ ہیں۔ اور حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی حیات، شہداء کی حیات سے افضل ہے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں نے موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اسی طرح دوسرے انبیاء بھی اپنی قبور میں نماز پڑھتے ہیں۔ مسند ابو یعلیٰ کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اَلْأَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِي قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ'' علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

﴿بَلْ أَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن ان کی زندگی کو تم سمجھ نہیں سکتے ہو۔ کیونکہ وہ ایسے عالَم کی زندگی ہے جس کو تم نے نہیں دیکھا ہے۔ ایک آسان سی بات یاد رکھ لیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مسئلے میں غلطی نہیں ہوگی۔ وہ یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جو ہمیں جسم دیا ہے، اس کے اندر روح ہے دنیا میں جتنے احکام ہوں گے جسد پر مرتب ہوں گے، مثلاً کسی نے چوری کی تو اس کا ہاتھ کٹے گا، کسی نے زنا کیا تو اس کے بدن پر کوڑے لگیں گے، شادی شدہ نے زنا کیا تو رجم ہوگا۔ یہ ساری سزائیں بدن پر جاری ہوں گی، لیکن روح خود بخود متاثر ہوتی ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی ہے۔ کیونکہ ہمیں جسد نظر آتا ہے، روح نظر نہیں آتی۔ جبکہ مرنے کے بعد تمام احکام روح پر

مرتب ہوں گے اور جسد اس سے متاثر ہوتا ہے چاہے ہمیں نظر نہ آئے جیسے خوشبو کے لیے آپ نے پھول توڑا اور اس کو سونگھا تو کہا: یہ اعلیٰ قسم کا گلاب ہے، اس سے بڑی پیاری خوشبو آرہی ہے۔ اب آپ خوشبو سونگھ تو رہے ہیں، لیکن اس کو دیکھ نہیں سکتے۔

شہداء کی اَرواح جنت میں کہاں ہوں گی؟

مسلم شریف میں ہے:

"أَنَّ أَرْوَاحَهُمْ فِي طَيْرٍ خُضْرٍ تَسْرَحُ فِي الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ، وَ تَأْوِي إِلَى قَنَادِيلَ مُعَلَّقَةٍ بِالْعَرْشِ."

[جامع ترمذی، رقم: ۳۰۱۱]

یعنی شہداء کی اَرواح سبز پرندوں کے پوٹوں کے اندر ہوتی ہیں، وہ جنت میں جہاں چاہتے ہیں کھاتے پھرتے ہیں، پھر آکر ان قنادیل میں آجاتے ہیں جو عرش کے نیچے معلق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف توجہ فرماتے ہیں اور پوچھتے ہیں: کیا چاہتے ہو؟ وہ کہتے ہیں: مولا! ہم اور کیا مانگیں؟ کون سی نعمت ہے جو ہمارے پاس نہیں؟ ہم جہاں چاہتے ہیں جنت میں سیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تین مرتبہ پوچھتے ہیں، مانگو کیا مانگتے ہو؟ وہ کہیں گے: اللہ! اگر آپ ضرور دینے پر آئے ہیں تو ہمیں دنیا کی طرف لوٹا دیں، تاکہ آپ کے راستہ میں ہم پھر جہاد کریں، پھر شہید ہوجائیں۔ جب دیکھیں گے کہ ان کی کوئی حاجت نہیں ہے تو اللہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں گے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے روایت نقل کی ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّمَا نَسَمَةُ الْمُسْلِمِ طَيْرٌ تَعَلَّقُ فِي شَجَرِ الْجَنَّةِ حَتَّى يُرْجِعَهَا اللهُ عَزَّوَجَلَّ إِلَى جَسَدِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ."

[مسند احمد بن حنبل، رقم: ۱۵۷۷۶]

اللہ تعالیٰ مومن کی روح کو ایک پرندے کی شکل دے دیتے ہیں اور وہ جنت کے درختوں کے اندر رہتی ہے، جب قیامت کا دن ہوگا تو اس کو اس کے بدن میں لوٹا دیں گے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت اور اس حدیث سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جو عام مومن ہے اللہ تعالیٰ اس کو بھی یہ عظمت دیں گے، باقی مومن کی روح علیین میں چلی جاتی ہے اور کافر کی روح سجین میں چلی جاتی ہے۔

سوال: جب روح علیین میں یا سجین چلی گئی تو قبر میں حساب کتاب کا کیا معنی ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ اس روح کا تعلق جوڑ دیتے ہیں، جیسے سورج اپنے مقام پر ہے، لیکن حرارت پہلی زمین پر موصول ہوتی ہے۔ چاند اپنی جگہ پر ہے، لیکن روشنی یہاں محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی بعید نہیں ہے کہ روح اپنے مقام پر ہو اور اس کا جسد کے ساتھ تعلق بھی قائم رہے۔

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾﴾ [البقرۃ: ۱۵۵ تا ۱۵۷]

"اور ہم تمہارا امتحان لیں گے کچھ (دشمن کے) خوف، اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے اور صابرین کا بشارت سنا دیجیے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم سب اسی کی طرف جانے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔"

صبر کا امتحان:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی خود آزماتے ہیں، تاکہ واضح ہو جائے کہ کون صبر کرنے والے ہیں؟ اور کون ناشکرے ہیں؟ بہت ساری آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ہم اپنے بندوں کا امتحان لیتے ہیں۔

قیامت کے دن انسان کے اعضاء اس کے خلاف گواہی دیں گے:

قیامت میں سب کو صحیفۂ اعمال دیا جائے گا اور ان کا وزن کیا جائے گا، پھر بھی اگر کوئی انکار کرے تو اس پر گواہ لائے جائیں گے۔ گواہوں کے بعد آدمی انکار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی زبان پر مہر لگا دیں گے اور اس کے بدن کے اعضاء گواہی دیں گے کہ میں نے یہ یہ کام کیا ہے یا نہیں؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے کیا تاکہ کسی بندے کو میرے انصاف پر اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے علم سے فیصلہ فرماتے تو مومن مان لیتے اور کافر اعتراض کرتے کہ یہ اس کی مرضی ہے جس کو چاہیں جہنم میں داخل کریں اور جس کو چاہیں جنت میں داخل کریں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان لانے میں اخلاص:

بندے کو اپنے مخلص دوست اور منافق دوست کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب بندے پر کوئی مصیبت آ جائے، مقروض ہو جائے، کھانے کے لئے کچھ نہ ہو تو وہ اپنے دوستوں کے پاس جائے گا۔ اس وقت پتہ چلے گا کہ کون مخلص دوست ہے؟ اور کون مخلص نہیں ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی ایسی تھی کہ جو لوگ کھرے تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کیونکہ وہ ایسا دور تھا جو بھی کلمہ پڑھتا تو مار کھانے کے لئے تیار ہو جائے، اپنے بیوی بچوں کو علیحدہ کرنے کے لئے تیار ہو جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس زندگی میں کسی کھوٹے کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اہلسنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کوئی سب سے افضل ہے تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، کیونکہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلے ساتھ دیا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مکہ پر حکومت نہیں تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تخت پر تشریف فرما نہیں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں پھول نہیں بچھائے جاتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ﴾ [التوبۃ:۱۰۰] میں سب سے پہلے ان مہاجرین کا ذکر فرمایا جنہوں نے میرے نبی کے لئے مکہ چھوڑا۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت وغلبہ دیا، غزوۂ بدر کی کامیابی ملی اور مشرکین مکہ کا زور ٹوٹ گیا۔ اب اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر لوگوں کے اندر خوف وہراس پیدا ہو گیا تو بعض لوگ اسلام میں منافقانہ طور پر بھی داخل ہو گئے کہ ظاہری طور پر کلمہ پڑھ لیا، لیکن اندر اسی طرح کفر رہا۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو بتا دیتے کہ فلاں منافق ہے، اس کو مار دو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو قتل کرا دیتے تو ساری دنیا یہی کہتی کہ جس کو چاہتے ہیں مار دیتے ہیں، حالانکہ وہ ان کے ساتھ نمازیں پڑھتا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے امتحان بھیجے کہ جنگ اُحد آگئی اور کفر اپنے پورے لاؤ لشکر کو لے کر بدر کا بدلہ لینے کے لئے اُحد آ پہنچا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ سے نکل کر دفاعی جنگ لڑنا پڑی تو منافقوں کا بھرم کھل گیا، انہوں نے کہا: ہم تو نہیں لڑتے اور وہ راستے سے واپس ہو گئے، اس طرح کھرے اور کھوٹے علیحدہ ہو گئے۔ غزوۂ تبوک کا وقت آیا تو آزمایا گیا اور پھر کھرے کھوٹے علیحدہ ہو گئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم اپنے بندوں کا امتحان لیتے ہیں، تاکہ واضح ہو جائے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے؟

انسانی فیصلے غلط بھی ہوتے ہیں:

انسان جتنے قانون بناتا ہے وہ پانچ سال، چھ سال، اور دس سال کے بعد ناکام ہو جاتا ہے، کیونکہ بنانے والے

ناقص ہیں، ان کو آنے والے حالات کا پتہ نہیں ہوتا، جبکہ میرے اللہ کا قانون کبھی غلط نہیں ہوتا۔ وہ جو فرماتے ہیں علم کی بنیاد پر فرماتے ہیں، نہ کہ گمان کی بنیاد پر۔ جیسا کہ جدید ملک کہہ رہے ہیں کہ اگر آبادی کی رفتار یہی رہی تو تیس سال کے بعد آبادی کا کیا حال ہوگا؟ اب ہم اتنی گندم پیدا کر رہے ہیں اور پوری نہیں ہو رہی تو جب آبادی بڑھ جائے گی تو پھر ہم کیا کریں گے؟ ہم تو مر جائیں گے، بھوک و افلاس ہوگا۔ اس لئے انہوں نے کہہ دیا کہ بچے جننا بند کرو اور ان کو زیادہ خطرہ مسلمانوں سے ہے کہ یہ زیادہ بچے جنتے ہیں۔ یہ عقل کے جتنے فیصلے ہیں، ان کے پس پردہ شیطانی قوتیں ہیں۔ جب آدمی دلائل ڈھونڈنا شروع کرتا ہے تو عقل عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چودہ سو سال پہلے فیصلہ فرما دیا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۚ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا﴾ [الاسراء: ۳۱] خبردار! اپنی اولادوں کو بھوک کی وجہ سے قتل نہ کرو، ان کو بھی میں رزق دیتا ہوں اور تمہیں بھی رزق دیتا ہوں۔ اس لیے انسانوں کے فیصلے غلط ہو سکتے ہیں، لیکن میرے اللہ کے فیصلے غلط نہیں ہو سکتے، کیونکہ اس کو ذرّے ذرّے کا علم ہے۔ فرعون موسیٰ علیہ السلام کو گولی اور طاقت سے نہیں روک سکا۔ جب سے تم نے بھی منصوبہ بندی شروع کی ہے تو ایک عورت چار پانچ بچے پیدا کر رہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کافروں کو مسلمانوں کی کثرت کا خوف ہے تم جس نئی تہذیب کو اپنا رہے ہو اندازہ کرو یورپ کی باقاعدہ رپورٹ موجود ہے کہ بارہ فیصد لڑکیوں کے ساتھ ریپ ان کے باپ نے کیا۔ کیا تم بھی اسلام میں ایسا معاشرہ پیدا کرنا چاہتے ہو اور تہذیب اپنانا چاہتے ہو جس میں باپ اور بیٹی کا کوئی تصور نہیں، بہن اور بھائی کا کوئی تصور نہیں، جہاں اولاد کو اپنے صحیح النسل ہونے کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ان ملکوں میں جو مسلمان رہتے ہیں، وہ مجھے ملے اور کہا: ہم نے بہت کچھ کما لیا ہے، ہم نے کوٹھیاں بنا لیں، لیکن ہمارا کچھ بھی نہیں رہا، ہم برباد ہو گئے۔ میں نے ان سے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ جس معاشرے میں نوجوان لڑکی اپنے باپ کو آ کر کہہ دے کہ آج فرینڈ کے ساتھ رات گزاروں گی، میرا انتظار نہیں کرنا تو اس معاشرے کا کیا حال ہوگا؟ میں نے ان کو کہا: اب تمہیں ہوش آ رہا ہے؟ اس نے کہا: جس معاشرہ میں ہم رہتے ہیں وہاں بیوی کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ چائے بنا کر دے۔ اور کہنے لگا: ہماری کوئی زندگی نہیں ہے، ہم تو اللہ کے عذاب میں آ گئے اور ہم اس زمانہ کو ترستے ہیں جب بیوی اپنے خاوند کو سر تاج سمجھتی تھی، اس کے لیے آنکھیں بچھاتی تھی۔ اور کہنے لگا: یہ مولوی جو مسجد میں امام ہے، یہ اس وقت تک ہے جب تک اس کو نیشنلٹی نہیں ملتی، جب وہ مل جائے تو یہ بھی چلا جائے گا۔ اس لیے یاد رکھیں! جتنے انسانی فیصلے ہوں گے، وہ غلط ہو سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے امتحان کیسے لیتا ہے؟

اللہ کے راستے میں جان دے دینا سب سے بڑی آزمائش ہے، لیکن اس سے کم درجہ کی بھی کچھ آزمائشیں ہیں کہ انسان کو قبل از وقت آنے والی مصیبت سے آگاہ کر دیا جائے تو مصیبت کچھ ہلکی ہو جاتی ہے۔ اگر اچانک مصیبت آ جائے تو بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے اور یہ بھی قاعدہ ہے کہ جتنی کسی کی شان بڑی ہوتی ہے، اتنا امتحان بھی بڑا ہوتا ہے۔ اس لئے سب سے زیادہ امتحان اللہ کے نبیوں پر آئے ہیں، کیونکہ انبیاء کی شان سب سے بڑی ہے۔ تمام انبیاء میں بڑی شان ہمارے آقا ﷺ کی ہے، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کے راستے میں جتنی مجھے تکلیفیں دی گئیں، مجھ سے پہلے کسی نبی پر اتنی تکلیفیں نہیں آئیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سب سے زیادہ امتحان اللہ کے نبیوں کے ہوتے ہیں، انبیاء کے بعد درجہ بدرجہ امتحان ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم اپنے بندوں کی آزمائش خوف سے کرتے ہیں کہ ان کو دشمن کا خوف لاحق کر دیتے ہیں اور کبھی اللہ تعالیٰ فقر و فاقہ مسلط کر دیتے ہیں کہ آسمانوں سے بارشیں بند کر دیتے ہیں، زمین غلے اُگانا بند کر دیتی ہے۔ فصلات، کھیتیاں نہیں ہوتیں۔ یہ بھی بہت بڑی آزمائش ہے۔

مکہ والوں پر قحط کا واقعہ:

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں جب مشرکین مکہ نے حضور اکرم ﷺ کو ستایا تو آپ ﷺ نے ان کے لیے بددعا کی: اے اللہ! ان مکہ والوں پر اسی قسم کا قحط نازل کر دے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں نازل کیا تھا تو ان پر ایسا قحط نازل ہوا کہ پرانے جوتوں کے چمڑے اُبال اُبال کر پیا کرتے تھے، لوگ مجبور ہو گئے اور ابوسفیان کو مدینہ منورہ بھیجا کہ حضور پاک ﷺ سے جا کر کہو کہ خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیں، اب ہماری قوت طاقت جواب دے چکی ہے۔ ابوسفیان نے مدینہ منورہ آکر حضور اکرم ﷺ سے کہا کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ ہمارا دین کا جھگڑا ہے، لیکن ہم آپ کے رشتے دار ہیں، مکہ والے قحط کی وجہ سے اتنا پریشان ہو گئے ہیں کہ اب انہیں دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کی امداد کی اور مختلف علاقوں سے انہیں غلہ بھجوایا۔ کسی کو قحط میں ڈالنا، یہ بھی بہت بڑا امتحان ہے۔

مجاہدین صحابہ کا مجاہدہ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے واقعات کے اندر یہ بھی واقعہ ذکر فرمایا ہے کہ بعض اوقات ہم جہاد کے لئے جا رہے ہوتے تو ہماری خوراک فی آدمی ایک یا دو کھجور کے دانے ہوتی تھی۔ ایک آدمی نے عرض کیا کہ آپ لوگ سارا دن ایک کھجور کے دانے پر کیسے گزارا کر لیتے تھے؟ تو انہوں نے کہا: ہمیں کھجور کے دانے کی اس دن قدر معلوم ہوئی جب کھجوریں کم ہوگئیں اور ہمیں آدمی آدمی کھجور ملتی تھی۔ ایک دوسرے سے گٹھلی لے کر منہ میں رکھ لیتے تھے اور اس کو چوس لیتے تھے، تاکہ ذہن کو تسلی ہو جائے کہ کچھ غذا ملی ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: خیبر فتح ہونے سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے کبھی پیٹ بھر کر کھجوریں نہیں کھائیں، فتح خیبر کے بعد کھجور پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی گھی لگی ہوئی روٹی نہیں کھائی تھی۔

﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ﴾ (اموال، جانوں اور پھلوں میں کمی کے ذریعے آزمائش)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کبھی اس طرح امتحان لیتے ہیں کہ ان کو مال میں گھاٹا دے دیتے ہیں، ﴿وَالْأَنفُسِ﴾ اور کبھی جانوں میں نقصان دے دیتے ہیں کہ کبھی بھائی مر گیا، کبھی چچا مر گیا۔ ﴿وَالثَّمَرَاتِ﴾ اور کبھی پھلوں کے اندر نقصان دیتے ہیں، کبھی باغات کے پھل لدے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی ایک پھل بھی نہیں لگتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو ان تمام آزمائشوں میں پورا اُترے اور صبر کرے، اس کے لئے خوشخبری ہے اور صابرین وہ لوگ ہیں جن کو مصیبت پیش آئے تو وہ ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ کہہ کر خود کو تسلی دیتے ہیں کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، جب سب کچھ اسی کا ہے تو وہ جب چاہے اپنی چیز لے لے۔

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ﴾ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں عجیب بات لکھی ہے کہ ﴿الْخَوْفِ﴾ سے مراد خوفِ خدا ہے، جس کے دل میں خوفِ خدا ہوگا وہ ڈرے گا کہ اگر میں نے نافرمانی کی تو اللہ مجھے سزا دیں گے، مجھے پکڑ لیں گے۔ ﴿الْجُوعِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے روزے فرض قرار دیئے ہیں۔ گھر کے اندر ہر قسم کے کھانے اور ٹھنڈے مشروبات موجود ہیں، لیکن وہ چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتا کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں گے۔ بعض اوقات اتنی پیاس لگتی ہے کہ آدمی کے ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں اور چپک

جاتے ہیں، سامنے ٹھنڈا پانی موجود ہے، لیکن نہیں پیتا کہ میرا اللہ پاک ناراض ہو جائے گا۔

بعض علماء نے فرمایا: ﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ﴾ سے مراد زکوۃ ہے، ﴿وَالْأَنفُسِ﴾ سے مراد شہادت ہے اور ﴿وَالثَّمَرَاتِ﴾ سے مراد عشر ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہے۔

ایک یہودی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں عزت دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں ذلت دیتے ہیں۔ ایک آدمی کو اللہ نے بڑی صحت دی، حسن و جمال دیا کہ لوگ مڑ مڑ کر اس کو دیکھتے ہیں اور دوسرے آدمی کو دیکھیں اللہ تعالیٰ نے اس کو لولا، لنگڑا بنا دیا، لوگ اس سے نفرت کر کے دور ہو کر گزرتے ہیں کہ خدا نہ کرے مجھے بھی یہ بیماری لگ جائے تو اس نے کیا نیکی کی؟ اور اس نے کیا بُرائی کی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے بتاؤ، اللہ تعالیٰ نے سب کچھ اپنے مِلک میں کیا ہے یا تمہارے مِلک میں کیا ہے؟ یہودی نے کہا: مِلک تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب ساری مِلک اللہ تعالیٰ کی ہے تو تم اعتراض کرنے والے کون ہو؟ اور طبعی تسلی کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سبق دیا: ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ کہ ہم سب نے بھی اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور اصل ٹھکانہ جنت ہے جو ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا گھر ہے۔

﴿الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم﴾ اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت کے بعد جو صبر کیا جائے، وہ حقیقی صبر ہے، بعد میں تو ہر کوئی صبر کر لیتا ہے۔ ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ کلمہ اس اُمت کی شان ہے، پہلی اُمتوں میں سے کسی کو یہ کلمہ نہیں ملا۔ لہٰذا جب بھی کوئی مصیبت آئے، بڑی مصیبت آئے یا چھوٹی مصیبت آئے، خوف آئے، ڈر آئے، مال میں نقصان آئے، جانوں میں نقصان آئے، کانٹا چبھ جائے، جوتی گم ہو جائے، کوئی چیز ٹوٹ جائے تو فوراً ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ پڑھیں۔

صحیح مسلم میں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: "مَا مِنْ عَبْدٍ تُصِيبُهُ مُصِيبَةٌ، فَيَقُولُ: ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي، وَ أَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا. إِلَّا أَجَرَهُ اللّٰهُ فِي مُصِيبَتِهِ، وَ أَخْلَفَ لَهُ خَيْرًا مِنْهَا" [صحیح مسلم، رقم: ۹۱۸] اے اللہ! جو چیز تُو نے مجھ سے لے لی، اس کا بہتر سے بہتر بدلہ اپنی رحمت سے عطا فرما۔

صبر کرنے والوں کے لیے تین انعامات:

﴿أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ صبر کرنے والوں کے لئے تین

انعامات ہیں: صلوات، رحمت اور ہدایت۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: صبر کرنے والو! تمہارے کیا کہنے؟ تمہیں اللہ تعالیٰ نے تین نعمتوں سے نوازا ہے۔ "صَلَوٰتٌ" سے مراد، عنایاتِ خاصہ ہیں کیونکہ رحمت تو سب پر ہوتی ہے مثلاً ہوا چلے تو یہ نہیں کہ آپ کو لگے اور کافر کو نہ لگے، بلکہ کافر تو دنیا کی نعمتوں سے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جو لوگ صبر کرتے ہیں وہی ہدایت والے ہیں کہ بڑی سے بڑی مصیبت پر صبر کرتے ہیں۔ خدا نہ کرے آدمی مصیبت کے وقت میں کبھی کبھی بہک جاتا ہے اور منہ سے ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جو کفر تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے ایمان والے بندوں کو دیکھو کہ جیسے ہی کوئی مصیبت آتی ہے تو بہکنے کی بجائے ان کے منہ سے ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ نکلتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ان کو ہدایت عطا کی ہے۔ یاد رکھیں! اصل مدار نیت پر ہے اگر مصیبت آئی اور زبان سے کوئی غلط لفظ نکل گیا، لیکن نیت نہیں تھی تو اللہ تعالیٰ نیتوں کو جانتے ہیں۔ ایک آدمی نے خوشی میں ایک ایسا لفظ کہا کہ وہ اگر کسی اور کے لئے کہتا تو کافر ہو جاتا، مثلاً واقعہ آتا ہے کہ ایک آدمی اونٹ پر سفر کر رہا تھا، ایک جگہ پر سویا تو اس کا اونٹ بھاگ گیا اور گم ہو گیا۔ اس بدو کا سارا سامان کھانا، پانی اونٹ پر تھا۔ جب وہ اُٹھا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر تنگ آ گیا جب اس پر گرمی اور پیاس کی شدت ہو گئی تو واپس آ کر اسی درخت کے نیچے سو گیا، اس کی آنکھ لگ گئی۔ خدا کی قدرت ہے جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اونٹ پاس کھڑا ہے، بدو خوش ہو کر کہنے لگا: تُو میرا بندہ اور میں تیرا خدا ہوں۔ حالانکہ اس کو کہنا یوں چاہیے تھا کہ اے اللہ! تُو میرا خدا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں، لیکن خوشی میں بہک کر یہ بات نکل گئی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ شخص جتنا اس وقت خوش ہوتا ہے، اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی توبہ سے خوش ہوتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہ گار بندہ جس کی ساری زندگی گناہوں میں گزری ہو، لیکن جب اس کو راستہ ملتا ہے اور وہ گڑگڑا کر سجدے میں گر جاتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ میرا بھٹکا ہوا بندہ پھر میرے دروازے پر آ گیا ہے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ نے صبر والوں کے بارے میں فرمایا: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ [الزمر: ۱۰] قیامت کے دن ہم صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیں گے۔

حدیث میں ہے جب اللہ تعالیٰ اوّلین و آخرین کو حشر کے میدان میں جمع کریں گے اور منادی آواز دے گا: "أَيْنَ الصَّابِرُونَ؟" صبر کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟ وہ لوگ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: لوگوں کا

حساب ہوتا رہے گا، ان کو حساب سے پہلے جنت میں پہنچا دو۔

آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ بڑے عبادت گزار ہوتے ہیں، لیکن ان کو بیماریاں لگی ہوتی ہیں، کوئی نابینا ہوگیا، کوئی لنگڑا ہوگیا، کوئی دونوں ٹانگوں سے معذور ہوگیا، ان کے شاگرد اُن کو ریڑھیوں پر اُٹھا کر پھرتے ہیں، حالانکہ وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی ساری زندگی میں تہجد بھی قضا نہیں ہوتی، جنہوں نے زندگی میں کبھی حرام نہیں کھایا، جنہوں نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، جب ان پر مصیبتوں کو دیکھتے ہیں تو بعض کم ایمان والے لوگ حیران ہوجاتے ہیں کہ دیکھو! اللہ کا بڑا پیارا ہے، لیکن مصیبت میں مبتلا ہے۔ فلاں آدمی فاسق فاجر ہے، دولت کے مزے لے رہا ہے، اس کے گھر کے معاملات بھی درست ہیں، باہر کے معاملات بھی درست ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری ایمان والی عینک نہیں، جب نظر والی عینک نہ ہو تو ایک لفظ نہیں پڑھ سکتے، اسی طرح جب ایمان والی عینک کمزور ہو تو ان تکلیفوں اور مشقتوں کو کیسے سمجھیں گے؟ حالانکہ اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان صالحین کے لئے بلند مرتبہ کا فیصلہ فرمایا ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے عمل کے ذریعہ وہاں نہیں پہنچ سکتے تو اللہ تعالیٰ ان پر مصیبت ڈال دیتے ہیں کہ صبر کریں اور اپنی منزل کو پالیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حضور اکرم ﷺ سے فرمایا: آپ دنیا کی زندگی اور اس کی ٹھاٹھ کو دیکھ کر تعجب نہ کریں، مجھے اگر اپنے بندوں کے بے ایمان ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو کافروں کو اتنا دیتا کہ کافر کے گھر کی چھت، سیڑھیاں، دروازے، پلنگ اور کرسیاں چاندی کی ہوتیں کیونکہ دنیا بڑی مبغوض چیز ہے اور دشمنوں کو مبغوض چیز ہی دی جاتی ہے۔

دنیا حقیر چیز ہے:

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اگر اس دنیا کی قیمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافروں کو ایک گھونٹ بھی پانی کا نہ دیتا۔ [جامع ترمذی، رقم: ۲۳۲۰] حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: دنیا کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی جانور مرجائے اور وہ گل سڑ جائے اور اس کو حاصل کرنے والوں کی مثال ایسے ہے جیسے اس مردار جانور پر کتے اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس دنیا کے طلبگار کتے ہوتے ہیں۔ جو اللہ کے بندے ہوتے ہیں وہ دنیا اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ دین کے کام آئے، حج، عمرہ کے کام آجائے، مساجد و مدارس کے کام آجائے، ایسے ادارے بنادیں جس کے ذریعے لاکھوں لوگ قرآن سے استفادہ کریں۔ وہ دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں باعث اجر ہوتی ہیں، لیکن جو

دنیا آدمی کو برباد کرنے اور کفر کا ذریعہ بن جائے اور بے حیائی کا ذریعہ بن جائے، اس سے بُری چیز کی کوئی مثال نہیں دی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ دونوں طرح سے آزماتے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر تم سے گناہ ہو جائے اور اس کے بعد تمہیں پیسہ ملنا شروع ہو جائے تو سمجھ لو کہ اب میری پکڑ کا وقت قریب آ چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو محفوظ فرمائے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے لیلۃ القدر کی رات نصیب کر دے تو میں اللہ تعالیٰ سے کیا مانگوں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دعا مانگو:

"اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عُفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي." [جامع ترمذی، رقم: ۳۵۱۳]

اے اللہ! آپ معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں، پس آپ مجھے بھی معاف کر دیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کبھی کوئی مصیبت نہیں اُتارتے، مگر کسی گناہ کی وجہ سے۔ اور وہ مصیبت بغیر توبہ کے نہیں ٹل سکتی۔ آج مشکل یہ ہے کہ ہمارے اوپر مصیبتیں آ رہی ہیں، ہم یہ نہیں سوچتے کہ ہمارے کون کون سے گناہ ہیں؟ جن کی وجہ سے یہ مصیبت پڑ رہی ہے اور اسباب کے اندر لگے ہوئے ہیں۔ اگر کسی نے بتا دیا کہ یہ مصیبتیں ہمارے گناہوں کی وجہ سے آ رہی ہیں تو پھر وہ علاج نہیں کرتے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔

جنت والوں کو اللہ کی رضا و دیدار نصیب ہوگا:

حدیث مبارک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کو جنت دیں گے اور جنت سے بھی زیادہ نعمت عطا فرمائیں گے۔ علماء سلف صالحین نے لکھا ہے کہ زیادہ کا معنی یہ ہے کہ جب جنت والے جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے مخاطب ہو کر فرمائیں گے: میرے بندو! تمہیں اور کچھ چاہیے؟ جنت والے کہیں گے: آپ کا اتنا بڑا اکرم اور رحمت ہے، کیا اور نعمت ہے جو ابھی ہمیں نہ ملی ہو؟ آپ نے تو ہمیں ایسی ایسی نعمتیں دے دی ہیں کہ جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، اتنی بڑی جنت آپ نے ہمیں عطا فرمائی ہے، اس کے علاوہ ہم آپ سے اور کیا مانگیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: آج تمہیں ایسی نعمت دیتا ہوں جو تمہیں ابھی نہیں ملی۔ اللہ پاک فرمائیں گے: میں تم پر آج اپنی رضا نازل کرتا ہوں کہ جس کے بعد کبھی تم پر میری ناراضگی نہیں ہوگی۔ بعض سلف وصالحین نے لکھا ہے کہ وہ زیادہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو اپنا دیدار کروائیں گے تو جنت کی ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ کے دیدار میں کچھ بھی نہیں ہیں۔

حدیث مبارک میں ہے کہ ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے اور چودھویں کا چاند سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ اس چودھویں کے چاند کے دیکھنے میں تمہیں کوئی شک ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: پہلی کے چاند تو شک ہوسکتا ہے کہ کسی کو نظر آیا اور کسی کو نظر نہ آیا، لیکن چودھویں کے چاند میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے؟ اس کو تو کمزور آنکھوں والا بھی دیکھ سکتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میرے صحابہ! خوش ہوجاؤ، تم قیامت میں اپنے رب کا دیدار کروگے جیسے آج تمہیں اس چاند کو دیکھنے میں کوئی شک نہیں ہے یعنی تمہیں یقینی اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔

احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ بعض خوش نصیب ایسے ہوں گے جنہیں مہینہ میں ایک بار زیارت ہوگی اور بعض خوش نصیب ایسے ہوں گے جنہیں ہفتہ میں ایک بار زیارت ہوگی اور بعض خوش نصیب ایسے ہوں گے جنہیں روزانہ زیارت نصیب ہوگی اور بعض خوش نصیب ایسے ہوں گے جن کو صبح وشام زیارت ہوگی اور بعض خوش نصیب ایسے بھی ہوں گے جنہیں ہر وقت اپنے اللہ کے دیدار کی اجازت ہوگی۔ اس سے بڑا اکرام اور نعمت بندہ نہیں سوچ سکتا۔

﴿الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ جو لوگ مصیبت کے وقت ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ پڑھتے ہیں، بہت ساری احادیث میں ان کے لئے بڑا ثواب اور بڑی فضیلت آئی ہے۔

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا صبر کا جملہ اور اس کا انعام:

امام احمد رحمہ اللہ نے روایت نقل فرمائی ہے کہ بی بی اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن میرے شوہر ابو سلمہ رضی اللہ عنہ حضور پاک ﷺ کی خدمت سے لوٹ کر آئے اور فرمانے لگے: میں نے آج حضور پاک ﷺ کا ایک قول مبارک سنا ہے جس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ میں نے کہا: وہ کیا ہے؟ کہا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان پر کوئی مصیبت پیش آئے تو فوراً اس کی زبان سے یہ کلمہ نکلے: ''﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي، وَ أَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا'' یا اللہ! اس مصیبت میں تُو مجھے ثواب اور اجر عطا فرما اور جو چیز میری ضائع ہوگئی، اس سے مجھے بہتر نعمت عطا فرما۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو آدمی یہ پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس سے بہتر نعمت عطا فرماتے ہیں۔

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے یہ حدیث مبارک یاد کرلی۔ جب میرے خاوند حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی

وفات ہوئی تو میں نے ان کی موت پر یہ پڑھا: ''﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي، وَ أَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا'' پھر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں نے دعا تو مانگی ہے، لیکن میرے شوہر ابو سلمہ سے اچھا شوہر کہاں ملے گا؟ وہ تو بڑے اچھے تھے۔ لیکن حضور اکرم ﷺ کا فرمان تھا، میں نے عمل کر لیا۔

جب میری عدت کے دن پورے ہو گئے تو حضور پاک ﷺ نے میرے گھر میں آنے کی اجازت چاہی، میں نے حضور پاک ﷺ کو اجازت دی۔ میں اس وقت کیکر کی چھال سے چمڑا رنگ رہی تھی، میں نے ہاتھ دھوئے اور ایک چمڑے کا گدا جس کے اندر کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے، حضور اکرم ﷺ کے لئے بچھایا، آپ اس پر بیٹھ گئے تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا: میں تم سے شادی کرنے کی رغبت رکھتا ہوں۔

جب آپ فارغ ہوئے تو میں نے کہا: آپ نے مجھے خِطبہ تو دیا ہے، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ میری بات سننے کے بعد آپ کو خواہش نہ رہے تو میں آپ کو اپنا نقص بتا دیتی ہوں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بڑی غیرت والی عورت ہوں، کہیں ایسا نہ ہو میں نبی کے گھر میں ہو کر کوئی ایسی بات کہہ بیٹھوں۔ دوسری بات یہ کہ میں ایسی عورت ہوں کہ بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو گئی ہوں۔ تیسری بات یہ ہے کہ میری ایک بچی بھی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: جہاں تک تمہارا غصہ والا مسئلہ ہے، میں دعا کروں گا تو اللہ تعالیٰ اس کو نکال دیں گے اور بچی کو تم سے مستغنی کر دیں گے۔ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اگر آپ کو یہ باتیں منظور ہیں تو مجھے بھی منظور ہے۔ بی بی صاحبہ کہتی ہیں کہ مجھے یاد آیا کہ یہ سارا بدلہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس دعا کی وجہ سے دیا ہے۔

اپنی مخطوبہ کو کس حد تک دیکھنا جائز ہے؟

اگر کوئی آدمی کسی عورت سے یا لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ مخطوبہ کو دیکھ سکتا ہے، تاکہ ابتداء میں ہی عورت یا لڑکی اس کو گوارا نہیں ہوئی یا لڑکی کو لڑکا پسند نہ آئے تو بات ختم کر دی جائے، کل کو جو فتنے ہیں وہ پیدا نہ ہوں اور صرف اتنی اجازت ہے۔

باقی جو آج کل کے رواج ہیں، اللہ پاک ان سے محفوظ فرمائے کہ ابھی خِطبہ (پیغام) نہیں ہوتا، صرف تجاویز ہوتی ہیں یا خِطبہ ہو جاتا ہے اب وہ آتا ہے تو کہتا ہے اب تو میری بیوی ہے، باہر ہوٹلوں میں جا رہے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کی انڈر اسٹینڈنگ ہو رہی ہے، یہ سب باتیں غلط ہیں۔ شریعت میں یہ ہے کہ جب نکاح ہو جائے،

قاضی خطبہ پڑھے، باقاعدہ گواہ ہوں، لوگوں کے اندر مشتہر ہوجائے کہ یہ نکاح ہوگیا تو اب یہ خاوند اس کا حقدار ہے یہ عورت اس کی بیوی ہے چاہے رخصتی ہو یا نہ ہو، شرعاً اس کی بیوی بن گئی۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں جو رواج ہے، مثلاً منگنی ہوگئی کہ لڑکے نے لڑکی کو انگوٹھی پہنادی تو سب کچھ ہوگیا۔ صرف انگوٹھی پہنانے سے بیوی نہیں بن جاتی۔

عدت کے اندر صراحتاً خطبہ نہ دے:

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ عدت گزرنے سے پہلے آدمی کسی عورت کو خطبہ نہیں دے سکتا۔ مثلاً ایک عورت کا خاوند فوت ہوگیا، ابھی چار ماہ دس دن نہیں گزرے، خطبہ دینا درست نہیں۔ کوئی آدمی اس سے شادی کرنا چاہے اور اس کی عدت کے اندر پیغام بھیجے، یہ شریعت کے اندر ناجائز ہے جب تک اس کی عدت نہ گزر جائے۔

کسی کی منگنی پر منگنی جائز نہیں:

یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ ایک عورت کا خاوند فوت ہوگیا، اس کی عدت گزر گئی اور اس کو ایک آدمی نے خطبہ دیا ہوا ہے کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو اسلام کہتا ہے کہ اب دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ تم بھی پیغام بھیج دو جب تک کہ اس کا پہلا رشتہ طے نہ ہوجائے یا انکار ہوجائے۔ خطبہ کے اندر انسان کو حق ہے کہ عورت بیوہ ہے اس کا کوئی وارث نہیں تو براہ راست بات کرسکتا ہے اور اگر کنواری لڑکی ہے اور اس کے ولی موجود ہیں تو آپ ولی سے بات کریں۔

ایک محدث کے چہرے کے مسخ ہونے کا واقعہ:

ایک بہت بڑے محدث تھے، درس میں اپنے چہرے کو چھپا رکھتے تھے۔ بعض طلبہ نے بڑی کوشش کی، لیکن انہوں نے موقع نہ دیا کہ کوئی ان کا چہرہ دیکھ سکے۔ ایک طالب کو بڑی جستجو ہوئی کہ اتنے بڑے عالم ہیں، لیکن کیا بات ہے کہ ان کے چہرے پر ہر وقت پردہ ہوتا ہے۔ اس نے موقع ڈھونڈھا اور ان سے عرض کیا کہ حضرت! کیا بات ہے تو انہوں نے بتایا کہ ایک حدیث مبارک میں آتا ہے کہ جو بندہ رکوع میں امام سے پہلے سر اٹھائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے چہرے کو گدھے کے چہرے سے بدل دیں۔ جب میں نے یہ حدیث مبارک پڑھی تو میرے دل میں بدقسمتی سے خیال آگیا کہ کیا اتنی چھوٹی سی غلطی سے انسان کا چہرہ گدھے کا چہرہ بن جائے گا تو میں نے جان بوجھ کر غلطی کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے میرا چہرہ بدل دیا۔ اب میں اپنا چہرہ کسی کو دکھانے کے قابل نہیں ہوں، اب توبہ کر رہا ہوں، معافیاں مانگ رہا ہوں۔

اس لئے کبھی دل کے اندر یہ خیال نہ لائیں کہ دیکھیں ہمیں حضور اکرم ﷺ نے حمام میں داخل ہونے کی بھی دعا سکھائی ہے اب وہاں جاتے ہوئے بھی دعا پڑھیں؟ ایسی بات دل کے اندر نہ لائیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آجاتا ہے۔

اس طرح کہا کہ میرا باپ فوت ہوگیا، اگر میں ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ پڑھوں گا تو کیا مجھے دوسرا باپ مل جائے گا؟ یہ جہالت ہے۔ اللہ تعالیٰ تو باپ سے بھی بہتر نعمت عطا فرما سکتے ہیں۔ جب بھی کسی سنت مبارک کا بیان آئے تو ادب واحترام اور یقین کے ساتھ اس پر عمل کرنا چاہیے۔

دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

اگر ہم کوئی عمل کریں اور وہ پورا نہ ہو تو اس میں بھی یہ سمجھیں کہ میری کوتاہی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک آدمی آیا، اس نے کہا: آپ کے ابا کے زمانہ میں جب ہمیں کوئی تکلیف ہوتی تو سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کرتے تھے تو آدمی ٹھیک ہوجاتا تھا۔ اب ہم ایک پارہ پڑھ کر دم کرتے ہیں، لیکن آدمی ٹھیک نہیں ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ کا قرآن بھی وہی ہے، سورۃ فاتحہ بھی وہی ہے، لیکن وہ پڑھنے والی زبان کہاں سے لے آئیں جو اللہ نے ان کو دی تھی؟ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ سے لے کر اس زمانہ تک جتنے محدثین گزرے ہیں، سب نے احادیث لکھیں اور اپنا تجربہ لکھا، مثلاً ملتزم پر ہم نے جو دعا مانگی وہ ضرور منظور ہوئی لیکن ہم مانگیں منظور نہیں ہوتی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ (نعوذ باللہ!) ملتزم کی برکت ختم ہوگئی یا (نعوذ باللہ!) اللہ کے کعبہ کے اثرات ختم ہوگئے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ مانگنے والی زبان ٹھیک نہیں ہے، ہمارا کھانا حرام کا ہے، کپڑے حرام کے ہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ جب بدن کے اندر حرام کا رزق چلا جائے تو پھر جتنی دعائیں مانگتے رہو، قبول نہیں ہوں گی۔

پرانی یاد آنے پر ﴿اِنَّا لِلّٰهِ﴾ کہنے کا اجر:

بی بی فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہما نے اپنے ابا حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"مَا مِنْ مُسْلِمٍ وَ لَا مُسْلِمَةٍ يُصَابُ بِمُصِيبَةٍ فَيَذْكُرُهَا وَ إِنْ طَالَ عَهْدُهَا، قَالَ عَبَّادٌ: قَدُمَ عَهْدُهَا، فَيُحْدِثُ لِذٰلِكَ اسْتِرْجَاعًا إِلَّا جَدَّدَ اللّٰهُ لَهُ عِنْدَ ذٰلِكَ فَأَعْطَاهُ مِثْلَ أَجْرِهَا يَوْمَ أُصِيبَ بِهَا."

[مسند احمد بن حنبل، رقم: ۱۷۳۴]

کوئی مسلمان مرد ہو یا کوئی مسلمان عورت، اس کو کوئی مصیبت آئی۔ پھر اس نے اس کو یاد کیا، اگرچہ وہ پرانی مصیبت تھی، اس نے اس وقت بھی پڑھا: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾، اس مصیبت کو مدت گزر گئی، لیکن اس کو وہ مصیبت دوبارہ یاد آ گئی تو اس نے دوبارہ بھی پڑھا، اس وقت اس کو اتنا ہی اجر عطا فرماتے ہیں، جتنا مصیبت والے دن ﴿اِنَّا لِلّٰهِ﴾ پڑھنے پر عطا کیا تھا۔

بچے کی وفات پر صبر کرنے کا اجر:

حماد بن سلمہ ابوسنان رحمۃ اللہ علیہ سے روایت فرماتے ہیں کہ میرا بیٹا فوت ہو گیا، میں اس کو قبر میں دفن کر رہا تھا تو ابوطلحہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور قبر سے نکالا اور کہا: میں تجھے خوشخبری نہ دوں؟ تجھے حضور اکرم ﷺ کی حدیث مبارک نہ سناؤں؟ میں نے کہا: مجھے سناؤ۔ انہوں نے کہا: حضور پاک ﷺ نے فرمایا: کسی کی اولاد فوت ہوتی ہے تو جب ملک الموت اللہ کی دربار میں جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے فرماتے ہیں: اے میرے فرشتے! آج تُو نے میرے بندے کا جگر نکال لیا، اس کا جو پھل تھا، وہ تم نے لے لیا۔ وہ کہتے ہیں: ہاں میرے اللہ! آپ کا حکم تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے بچے کی موت پر کیا کہا؟ ملک الموت کہتے ہیں: اے اللہ! اس نے ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ پڑھا اور تجھ سے دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے اس بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس پر لکھ دو کہ یہ شکر کرنے والے کا گھر ہے۔

﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۗ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۱۵۸]
”بلاشبہ صفا اور مروہ (دونوں پہاڑ) اللہ کی نشانیاں ہیں پس جس نے بیت اللہ کا حج کیا یا عمرہ کیا اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان کا طواف (سعی) کرے اور جس نے نفلی سعی کی تو بھی اللہ قدردان ہے، خبردار ہے۔“

آیات کا ماقبل سے ربط:

گزشتہ آیات میں صبر کا ذکر تھا، ان آیات میں صفا و مروہ کا ذکر ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک سبق دیا ہے کہ

اے صبر کرنے والو! ذرا ان پہاڑوں پر نظر ڈالو، ان کی تاریخ پر نظر ڈالو، جب یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ نے تڑپ تڑپ کر صبر کیا تھا۔ اللہ نے ان کی یادگاروں کو کیسے زندہ رکھا ہے؟ یہ صبر کا انعام ہے، ورنہ یہ تو صرف پہاڑ ہیں اور مکہ میں پہاڑوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

آیت کا شانِ نزول:

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے کہ شیاطین صفا و مروہ کے درمیان ہوتے تھے کیونکہ وہاں بت رکھے ہوتے تھے۔ جب اسلام آیا تو لوگوں نے وہاں سعی کرنے میں حرج محسوس کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ صفا و مروہ کی سعی میں کوئی حرج نہیں۔

امام شعبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صفا پر ایساف بت رکھا ہوا تھا اور مروہ پر نائلہ بت تھا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ایساف مرد تھا اور نائلہ عورت تھی، ان دونوں بدبختوں نے اللہ کے کعبہ کے اندر داخل ہو کر زنا کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو پتھر بنا دیا تو مکہ والوں نے ان کو کعبہ کے ساتھ رکھ دیا، تا کہ لوگ عبرت حاصل کریں کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کے گھر میں بدکاری کرے گا، اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔

لوگ عبرت پکڑتے رہے۔ جب کافی زمانہ گزر گیا تو لوگ بھول گئے اور کہنے لگے: کعبہ کے سامنے یہ جو بت رکھے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی خدا ہیں۔ پھر ان بتوں کو صفا پر رکھ دیا گیا جب لوگ صفا و مروہ پر دوڑنے جاتے تو پہلے ان کو چومتے تھے۔ جب اسلام آیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات گراں گزری کہ یہاں بت تھے اور کافر دوڑتے اور پوجا کرتے تھے تو ہم یہاں پر سعی کیسے کریں؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کا واقعہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنی بیوی اور بچے کو ﴿بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾ اس وادی میں چھوڑ دیں جہاں نہ پانی تھا، نہ آبادی تھی، نہ کھیتیاں تھیں اور نہ کوئی درخت تھا۔ اللہ نے ان کے صبر کا امتحان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا بچوں کو وہاں اُتار دو، لیکن بات نہیں کرنی۔ اس سے بڑا بھی کوئی صبر ہے کہ بیوی کو جنگل میں بٹھا کر آجاؤ اور ان سے بات بھی نہ کرو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب چھوڑ کر جانے لگے تو بی بی ہاجرہ علیہا السلام ان کے پیچھے دوڑیں کہ یہ تو بتائیں کہ کیوں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام خاموش رہے۔ اللہ تعالیٰ نے

حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا کہ اتنا بولنے کی اجازت ہے کہ بیوی کو جواب دیں۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی کو کہا کہ اللہ کا حکم ہے، اس لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جب یہ بات سنی تو بیوی کے وہیں قدم رُک گئے اور کہا: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ [آل عمران: ۱۷۳] اللہ کا حکم ہے تو آپ جائیں، ہمارا اللہ کافی ہے۔

اب پانی ختم ہو گیا، بیٹا پیاس سے نڈھال ہے، ماں کے سامنے سانس نکلنے والی ہے، ماں دوڑتی ہے، کبھی صفا پر چڑھ جاتی ہے اور کبھی مروہ پر چڑھ جاتی ہے، تاکہ کوئی پرندہ اُڑتا ہوا نظر آ جائے اور میں اندازہ کروں کہ وہاں پانی ہو گا، یا کوئی قافلہ گزرتا ہوا نظر آ جائے۔ جب آپ پہاڑی کے اوپر چڑھتیں تو بیٹے پر نظر رہتی اور جب نیچے اُترتیں تو نظر نہ آتے تو بی بی جلدی جلدی دوڑ کر اونچائی پر چڑھتیں، تاکہ بیٹے کو دیکھتی رہیں...... اب جہاں سبز بتیاں لگی ہوئی ہیں اور حکم ہے کہ تیز جھپٹ جھپٹ کر چلو، یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت ہاجرہ علیہا السلام تیز چلی تھیں...... اللہ کی قدرت ہے کہ انہوں نے صفا سے پانی کی تلاش شروع کی تھی اور مروہ پر ختم ہوئی تو وہاں فرشتے کی آواز آئی تھی کہ اے اُمّ اسماعیل! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، انتظام ہو گیا ہے۔ بی بی ہاجرہ علیہا السلام نے فرمایا: تم کون ہو؟ سامنے آ کر بات کرو۔ پھر دوبارہ آواز آئی۔ بی بی ہاجرہ نے پوچھا کہ کون ہو؟ اور کیا انتظام ہو گیا ہے؟ بی بی واپس آئیں تو دیکھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جس جگہ لیٹے ہوئے ہیں اور پاؤں رگڑ رہے ہیں، وہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پَر مارا تو زم زم کا چشمہ نکلا۔

زم زم کے معنی میں غور کرو تو اس میں بھی صبر کا معنی معلوم ہوتا ہے۔ صبر کا معنی ہے: اپنے آپ کو روک دینا۔ بی بی صاحبہ نے دیکھا کہ پانی نکل رہا ہے، انہوں نے پتھر رکھنا شروع کر دیئے، تاکہ پانی بہہ نہ جائے۔ اس چشمہ کے اردگرد دیوار بنانے لگیں، جب پتھر رکھتیں تو کہتیں: زم، زم، زم (ٹھہر جا، ٹھہر جا)۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اماں پر رحمت کرے، اگر وہ پانی نہ روکتیں تو پوری دنیا میں ایک دریا جاری ہو جاتا۔ یہ دونوں آیات میں ربط ہے۔

آبِ زم زم کا واقعہ:

علماء نے لکھا ہے کہ حوضِ کوثر سے زمزم کا پانی افضل ہے۔ محدثین نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ جس دن معراج کی رات تھی، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک کھولا گیا، جبرائیل امین جنت سے سارا سامان لے کر آئے، نور

سے بھرا ہوا طشت جنت سے لے آئے اور دھاگہ جس کے ساتھ سلائی کی گئی، وہ بھی جنت سے لائے...... صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: وہ ٹانکے بھی ہم نے دیکھے جو حضور پاک ﷺ کے سینہ مبارک پر لگے ہوئے تھے...... لیکن پانی جنت سے نہیں لائے، بلکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور اکرم ﷺ کے سینہ مبارک کو زمزم کے پانی سے دھویا۔

اس سے محدثین نے مسئلہ نکالا کہ جب جبرائیل علیہ السلام جنت سے ہر چیز لا سکتے ہیں تو پانی حوضِ کوثر سے کیوں نہیں لا سکتے تھے؟ لہٰذا اللہ نے حکم دیا تھا کہ زمزم کے پانی سے دھونا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زمزم کا پانی حوضِ کوثر کے پانی سے افضل ہے۔ حدیث میں واضح الفاظ میں یہ نہیں ہے، لیکن ان موتیوں کو حدیث سے نکالنے والے کا نام فقیہ ہے۔

آج دنیا اپنے اوپر بڑا ناز کرتی ہے کہ اب بڑی ترقی ہوگئی ہے، لیکن ایسی سرجری کوئی کر سکتا ہے جو جبرائیل علیہ السلام نے کی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوئی ہے۔ ایسا سرجن پیدا نہیں ہوا جو ایک سیکنڈ کے اندر آپریشن کر دے اور جس کا آپریشن ہو، اس کے بے ہوش بھی نہ کیا جائے اور اندر سے سب کچھ نکال کر دھویا جائے، پھر سیا جائے اور پتہ بھی نہ ہو کہ کیا ہو گیا ہے۔ اقبال نے کہا تھا:

؎ خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

کہ جب میں نے آنکھوں میں مدینہ کی مٹی کا سرمہ پہنا ہے تو ان انگریزوں کے جلوے مجھے کیا دکھائیں گے؟ میرے ساتھ تو محمد مدنی ﷺ کے معجزات ہیں۔ یہ تو ان کو بیوقوف بنا سکتے ہیں جنہوں نے انگریزوں سے پڑھا ہو اور کبھی قرآن کھول کر نہ دیکھا ہو کہ ان کے دماغوں میں کبھی بٹھا دیتے ہیں کہ زمین گھومتی ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ سورج گھومتا ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ دونوں گھومتے ہیں۔

میں ایک دفعہ لاہور کانفرنس کے لیے گیا۔ وہاں پانی لائے تو وہ گندا تھا۔ جب ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آج کل عوام کا رش ہے، جس کی وجہ سے پانی کنوئیں سے نیچے چلا گیا ہے اور بڑی مشکل سے یہ پانی ملا ہے۔ میں نے کہا: تم لوگ دریاؤں پر رہتے ہو اور یہ حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے صبر کرنے والوں کو جو کنواں دیا، وہ دیکھ لو! ہزاروں سال گزر گئے، لوگ پی بھی رہے ہیں اور لے کر بھی جا رہے ہیں، لیکن زمزم ختم نہیں ہوتا۔ جیسے یہ پانی ختم نہیں ہوتا، ایسے صبر کرنے والوں کا ثواب بھی ختم نہیں ہوگا۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ زمزم کے اندر انہوں نے دوسرا پانی ملایا ہوا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے

زمانہ میں کون سے پانی ملائے جاتے تھے؟ چلو اب تو ہم کہہ دیں کہ انڈر گراؤنڈ پائپ چھپا دیا ہوگا جو تمہیں نظر نہیں آتا، لیکن حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں پائپ کس نے ڈالا؟ یہ زمزم تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے چلا آرہا ہے اور یہ کئی دفعہ گم ہوگیا، کنواں بند ہوگیا، پھر اللہ کی شان کہ زمزم ظاہر تو وہاں ہو رہا ہے جہاں کنواں ہے، لیکن اس کا مرکز اصلی عین خانہ کعبہ ہے کہ اس کے نیچے سے پانی کی ایک چادر جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صفا و مروہ کو شعائر بنایا۔ شعائر، شعار کی جمع ہے، بمعنی نشانی۔ اسلام میں شعائر اس کو کہتے ہیں جو کفر اور اسلام کے درمیان واضح نشانی بن جائیں۔

زم زم پینے کے فوائد:

زمزم کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"طَعَامُ طُعْمٍ وَ شِفَاءُ سُقْمٍ." [السنن الکبریٰ للبیہقی، رقم: ۹۹۳۹]

زمزم کا پانی غذا کا کام بھی دیتا ہے اور بیماریوں سے شفا کا کام بھی دیتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ابتداء اسلام میں جب ہم پر غربت کا عالم تھا، کھانے کو کوئی چیز نہیں ہوتی تھی تو ہم صرف زمزم کا پانی پیتے تھے تو ہم موٹے ہوگئے۔ زمزم کو آپ جس نیت کے لیے پئیں گے، وہی حاجت پوری ہوگی۔

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ جو امام بخاری رحمہ اللہ کے استاد ہیں، وہ جب زمزم پینے کے لئے آئے تو کہا: اے میرے اللہ! تیرے نبی کا فرمان سچا ہے کہ جس غرض سے زمزم پیو گے، وہ اللہ تعالیٰ پوری کرے گا۔ اے اللہ! میں اس لئے پی رہا ہوں کہ قیامت کے دن حشر کے میدان میں مجھے پیاس سے بچالینا۔ ان بزرگوں کی نظر آخرت پر ہوتی تھی اور ہماری نظر دنیا پر ہوتی ہے کہ جب ہم زمزم پیتے ہیں تو یہ دعا کرتے ہیں: اے اللہ! پیسے عطا فرما، میرے رزق میں زیادہ برکتیں دے دے۔ ہماری ہر وقت درہم، دینار، روپیہ، ریال کی سوچ ہوتی ہے اور دنیا اللہ تعالیٰ کی مبغوض چیز ہے، اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ جبکہ ہم اللہ تعالیٰ سے وہی چیز مانگتے ہیں۔ دنیا کے بارے میں بہت سخت الفاظ آئے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کی مثال ایسے ہے جیسے مردار جانور پڑا ہو اور اس کے کھانے والے کتے ہوتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

"اَلدُّنْیَا جِیْفَةٌ فَمَنْ أَرَادَهَا فَلْیَصْبِرْ عَلٰی مُخَالَطَةِ الْكِلَابِ." [حلیۃ الاولیاء: ۸/۲۳۸]

اصل انعام آخرت کا ہے۔ اس لئے بزرگ دعا کرتے تھے: اے اللہ! ایمان پر خاتمہ ہو جائے۔ اے اللہ! قبر کے عذاب سے بچانا، حشر کے عذاب سے بچانا، اے اللہ! ہمیں آخرت کی نعمتیں نصیب فرمانا، جو ختم ہونے والی نہیں ہیں۔

صبر کرنے والوں کو آخرت میں اجر ملے گا:

صبر کرنے والوں کو اصل بدلہ اللہ تعالیٰ آخرت میں دیں گے کیونکہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء ہے۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کبھی اپنے نیک لوگوں کو ان کے اعمالِ حسنہ کا بدلہ دنیا میں بھی عطا فرما دیتے ہیں، جیسے کبھی کبھی اپنے مخالفین کو دنیا میں عذاب بھی دے دیتے ہیں۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام، بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے صبر کیا اور ہجرت کی مشقت برداشت کی اور اپنا وطن چھوڑا، اس وادی بے آب وگیاہ میں ایک عورت اور ایک چھوٹے بچے نے وقت گزارا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو صبر کا اس طرح بدلہ عطا فرمایا کہ اگر زمزم پر نظر پڑے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی یاد آئے گی اور صفا ومروہ پر نظر دوڑائیں تو بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے دوڑنے کی یاد آئے گی اور قیامت تک اللہ تعالیٰ نے اس کو عمل خیر بنا دیا کہ انبیاء نے بھی سعی کی اور اولیاء اور جتنے لوگ قیامت تک دوڑیں گے، اس کا ثواب بی بی ہاجرہ کو بھی جائے گا، کیونکہ ابتداء انہوں نے کی تھی۔

صفا ومروہ کی سعی کے مسائل:

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جیسے طواف فرض ہے اسی طرح ایک قول کے مطابق صفا ومروہ کے درمیان دوڑنا بھی فرض ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت بھی امام شافعی رحمہ اللہ کی طرح ہے اور امام مالک رحمہ اللہ بھی صفا ومروہ کی سعی کو حج کا رکن سمجھتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صفا ومروہ پر دوڑنا واجب ہے، رکن نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جو واجب کو چھوڑے گا، اس کو دَم دینا ہوگا۔ امام احمد رحمہ اللہ کا یہی ایک قول ہے اور اسی طرح ایک جماعت نے کہا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ مستحب ہے، جیسا کہ امام ثوری رحمہ اللہ اور امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

یاد رکھیں! ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف صفا ومروہ کے درمیان سعی کو مستحب قرار دینے کی نسبت کی ہے، جو درست نہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ ایک یہ دلیل دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شعائر اللہ فرمایا ہے، دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ [الحج:۳۲] لہٰذا یہ فرض ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایات سے استدلال فرمایا کہ صفا و مروہ کے درمیان دوڑ نا حج کا رکن ہے، لہٰذا اگر یہ نہ ہو تو حج مکمل نہیں ہوگا۔

ایک امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بی بی حبیبہ بنت تجراۃ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل فرمائی ہے کہ میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم صفا و مروہ کے درمیان دوڑ رہے تھے اور لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اتنی شدت سے چل رہے تھے کہ چادر آپ کے مبارک گھٹنوں کے اردگرد گھوم رہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: تیز چلو، اللہ تعالیٰ نے اس جگہ سعی کرنے کا حکم دیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری روایت حضرت صفیہ بنت شیبہ سے نقل کیا ہے کہ ایک عورت سے سنا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب صفا و مروہ پر دوڑ رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ پاک نے صفا و مروہ پر دوڑنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا دوڑو۔

جن حضرات نے فرمایا کہ صفا و مروہ پر دوڑنا مستحب ہے، ان کی دلیل ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ یعنی ان لوگوں پر کوئی حرج نہیں جو صفا و مروہ پر دوڑیں تو ﴿فَلَا جُنَاحَ﴾ کا مطلب ہے کہ دوڑیں تو بھی کوئی حرج نہیں اور اگر نہ دوڑیں تو کوئی حرج نہیں۔ لہٰذا صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا مستحب ہے۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ [البقرۃ:۱۵۸] اس کا معنیٰ تو یہی ہوا کہ جو دوڑے تو دوڑے اور جو نہ دوڑے تو نہ دوڑے۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم کیا کہہ رہے ہو؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوڑے ہیں، تم نے آیت کو سمجھا نہیں ہے۔ یہ آیت اس لئے نازل ہوئی تھی کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں نے اپنے بت تقسیم کئے ہوئے تھے، بعض قبائل لات کے پجاری تھے، بعض منات کے پجاری تھے، بعض عزیٰ کے پجاری تھے اور بعض ہبل کے پجاری تھے، اسی طرح انہوں نے دو بت صفا و مروہ پر بھی رکھ چھوڑے تھے، جب صفا و مروہ پر دوڑنے کے لیے آتے تو پہلے ان بتوں کو ہاتھ لگاتے، ان کا تبرک حاصل کرتے اور پھر صفا و مروہ پر دوڑتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور اسلام کو فتح مکہ کے ساتھ غلبہ نصیب فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے صفا و مروہ پر دوڑنے کا حکم فرمایا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی کہ یہ تو وہ جگہ ہے جہاں آکر مشرکین بتوں کی پوجا کرتے تھے، اگر ہم بھی اس جگہ دوڑیں گے تو لوگ کہیں گے کہ یہ بھی تو اسی جگہ دوڑ رہے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور

اکرم ﷺ کی خدمت میں یہ اشکال پیش کیا، اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا کہ آپ ان کو بتائیں، یہ صفا و مروہ میرے شعائر ہیں، اگر لوگوں نے وہاں کچھ دنوں کے لیے بت رکھ دیئے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے شعائر ختم ہو گئے۔ آپ اپنے صحابہ کو حکم دیں کہ وہ دوڑیں، کیونکہ وہ میرے حکم پر دوڑے ہیں۔ اگر ایسی بات کریں تو پھر مشرکین کعبہ کا طواف بھی کرتے تھے تو پھر کیا کعبہ کا طواف بھی چھوڑ دو گے؟ مشرکین تو منیٰ اور مزدلفہ بھی جاتے تھے، احرام بھی باندھتے تھے تو یہ ساری چیزیں ہم اس لیے چھوڑ دیں کہ یہ کام مشرکین کرتے تھے؟ بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ ان میں کون سی ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، وہ باقی رہیں گی اور جو چیزیں لوگوں نے خود بنائی تھیں، ان کو اسلام مٹا دے گا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے صفا و مروہ کی سعی کو واجب قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ ایسا عمل ہے جو حضور اکرم ﷺ نے کبھی اور کسی حالت میں نہیں چھوڑا اور حضور اکرم ﷺ نے بھی فرمایا:

''نَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهٖ، إِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ.'' [مسند ابی یعلی:۲/۳۶۲]

اس لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک حکم جو نص قطعی میں آجائے وہ اگر فرض کے مقام پر نہ پہنچے تو وہ واجب ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب ہم چاہیں صفا و مروہ پر نہیں دوڑ سکتے، جیسا کہ ہم طواف کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ شرط لگائی گئی ہے: ﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ﴾ جس نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا، وہ صفا و مروہ پر دوڑے۔

اس میں ائمہ کا وہ اختلاف ہے جس کو عالم لوگ پڑھ کر دعائیں دیتے ہیں اور جاہل اعتراض کرتے ہیں۔ اسی لئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''لَا خَيْرَ فِيْ عَمَلٍ لَا عِلْمَ فِيْهِ وَ لَا خَيْرَ فِيْ عِلْمٍ لَا عَمَلَ عَلَيْهِ'' عمل میں خیر نہیں جب تک علم نہ ہو، کیونکہ علم کے بغیر عمل کیسے کریں گے؟ اور اس علم میں بھی خیر نہیں جس پر عمل نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی فرماتے تھے کہ اس عمل میں بھی خیر نہیں جس میں تفقہ اور سمجھ نہ ہو۔ اور فرماتے تھے: اس قرآن و حدیث کے پڑھنے میں بھی خیر نہیں جس میں تدبر نہ کیا ہو۔ جاہل لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر یہ امام نہ ہوتے تو جھگڑے نہ ہوتے۔ ان سے پوچھا جائے کہ ان اماموں سے پہلے جو اتنے بڑے بڑے جھگڑے ہوئے اور صحابہ شہید ہوئے، اس وقت کس امام نے جھگڑا کروایا تھا؟

ایک اور مسئلہ کہ صفا و مروہ کی سعی بھی بغیر طواف کے نہیں ہو سکتی، کسی طواف سے قبل صفا و مروہ کی سعی نہیں ہوگی۔ جیسے حج کرنے کے لیے آپ آئیں تو پہلے طوافِ زیارت کریں گے، اس کے بعد صفا و مروہ پر دوڑیں گے اور اگر آپ عمرہ کے لئے آئے ہیں تو پہلے آپ اللہ تعالیٰ کے گھر کا طواف کریں گے، اس کے بعد صفا و مروہ پر دوڑیں گے۔ اس لئے اگر کوئی آدمی ذوالحلیفہ سے یا جدہ سے یا طائف یا تنعیم سے احرام باندھ کر اللہ تعالیٰ کے حرم میں آ گیا، طواف نہیں کیا اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑ لگا دی تو اس کا صفا و مروہ میں دوڑنا بیکار ہے۔ اب اس کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ پہلے طواف کرے، پھر دوبارہ صفا و مروہ پر دوڑے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایک آدمی نے احرام باندھا، طواف بھی کر لیا، صفا و مروہ پر دوڑنے کے لئے گیا تو اس نے مروہ سے سعی شروع کر دی اور پورے سات چکر لگا لیے تو اس کی سعی ادا نہیں ہوئی، اس کو دوبارہ دوڑنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک ابتداء صفا سے نہ ہو اور انتہاء مروہ پر نہ ہو تو سعی ادا نہیں ہوتی۔ اگر ہم صفا سے سعی شروع کر کے صفا پر ختم کریں تو سات چکر نہیں بن سکتے۔ اس لیے صفا سے شروع کریں گے اور جب مروہ پر جائیں گے تو ہمارا ایک چکر پورا ہو گیا اور پھر مروہ سے صفا پر آئیں گے تو یہ دوسرا چکر ہو گیا۔ اس طرح صفا سے ابتداء ہو اور انتہاء مروہ پر ہو تو ٹھیک ہے۔

ایک آدمی نے مجھے خود بتایا کہ میں نے طواف کیا، پھر حجر اسود پر گیا، پھر صفا پر گیا اور پھر مروہ پر گیا، پھر صفا پر آیا، صفا سے پھر میں حجر اسود پر آیا، حجر اسود سے پھر میں صفا پر گیا۔ میں نے اس سے کہا: کچھ نہیں ہوا، الحمد للہ! ٹانگیں بھی ٹوٹ گئیں اور ادا بھی نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا حاجی حج والا ہو یا عمرہ والا ہو، دین سیکھ کر نہیں آتا، صرف اعتراض کرنے کے لیے آتا ہے کہ یہاں بڑی گرمی ہے، بڑی تکلیف ہے۔ ہم عمرہ پر ایک سیر کرنے کے لیے آتے ہیں یہ تو ایسے ہو گیا جیسے ایک آدمی شادی نہ کرے اور کہے کہ اللہ قادر ہے، بچہ دے گا۔ اسی طرح ایک آدمی زمین میں ہل بھی نہ چلائے اور بیج بھی نہ ڈالے اور اس کے بعد کہے: مولوی صاحب! دعا کریں، اس دفعہ مجھے ایک ایکڑ سے پچاس مَن گندم ملے۔ اس سے پوچھیں کہ کیا تُو نے ہل چلائے؟ پھر وہ کہے کہ اللہ تو قادر ہے، بغیر ہل چلانے کے بھی دے سکتے ہیں۔ یہ جہالت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو اسباب پیدا کیے ہیں، ان پر عمل کرو اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ حضور اکرم ﷺ براق پر جب گئے، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنی انگلی سے پتھر میں سوراخ کر کے اس پتھر کے ساتھ اس کو باندھا۔ اس سے محدثین کرام نے مسئلہ نکالا ہے کہ انسان پہلے اسباب پر عمل کرے، پھر اللہ تعالیٰ پر

توکل کرے۔

صفا و مروہ کے درمیان مردوں اور عورتوں کے لئے دوڑنے کا حکم نہیں، بلکہ جہاں سبز بتی ہے وہاں تیز چلیں۔ صفا پر اتنا چڑھو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کا کعبہ نظر آجائے۔ یہ نہیں کہ پہاڑ کی آخری چوٹی پر چڑھ جاؤ۔ بعض بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم چوٹی پر چڑھ گئے تھے۔ یہ نہیں سوچتے کہ ہم نے سنت رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی ہے۔

جو ان سے زیادہ شریف آدمی ہوتے ہیں فوٹو بھی کھنچواتے ہیں، تاکہ اس جگہ کا ذرہ ذرہ ہماری اس لعنت کا گواہ بن جائے کہ وہ کام کیا جس پر اللہ کے نبی نے لعنت بھیجی ہے۔

بعض لوگ اپنا عمرہ پورا کر لیتے ہیں، لیکن اس کے بعد بھی اپنا کندھا ننگا رکھا ہوا ہوتا ہے۔ حالانکہ کندھا ننگا رکھنا صرف طواف کے پہلے تین چکروں میں ہوتا ہے۔

اسی طرح بعض حاجی حضرات نے احرام کو بکسوئے کے ساتھ یا لوہے کے بٹن کے ساتھ باندھا ہوا ہوتا ہے اور ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ اگر ہمارا احرام نیچے گر گیا تو ہمارا حج، عمرہ ختم ہو جائے گا۔ حالانکہ اس طرح کرنا احرام کی چادر کو سینے کے مترادف ہے، جس سے دَم واجب ہو جاتا ہے۔

بعض ایسے ہوتے ہیں جو ملتزم پر کھڑے ہو کر کہہ رہے ہوتے ہیں محبوب سبحانی! تیری مہربانی کہ تُو نے ہمیں کعبہ دکھا دیا۔ وہاں کھڑے ہو کر بھی شرک کر رہے ہوتے ہیں۔ پھر ہمارا مکہ کے اندر آنے کا کیا فائدہ ہوا؟ جس سے ہماری بدعت اور شرک نہ چھوٹے۔ جب تک تم کھیتی کے کانٹے وغیرہ صاف نہ کرلو، کھیتی صحیح نہیں اُگتی۔ اسی طرح جب تک تم شرک و بدعت کے کانٹے صاف نہیں کرو گے، اس وقت تک توحید والا درخت پیدا نہیں ہوگا۔

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا﴾ سے کیا مراد ہے؟

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا﴾ بعض علماء فرماتے ہیں کہ کسی نے سات چکروں کی بجائے آٹھ چکر کر لیے تو یہ بہتر ہے اور بعض علماء نے فرمایا: زندگی میں حج ایک دفعہ فرض ہے، لیکن جو آدمی ہر سال نفلی حج یا عمرہ کرتا ہے، صفا و مروہ پر دوڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو زیادہ ثواب عطا فرماتے ہیں۔ ﴿فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ﴾... ''شَاكِرٌ'' کا معنی تھوڑی چیز پر زیادہ بدلہ دینے والا کہ زندگی بھی اور عمل بھی ہمارا تھوڑا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ جنت کی صورت میں دیں گے جو ہمیشہ رہنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ کامل علم والے ہیں۔ ﴿عَلِيمٌ﴾ جتنا بدلہ بنتا ہے ہماری تھوڑی اس سے کم نہیں دیں

گے اس سے، بلکہ زیادہ ثواب دیں گے۔ایک کا دس گنا یا سات سو گنا دیں گے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۱۵۹تا۱۶۲]

’’بے شک جو لوگ ان صاف احکام اور ہدایت کو چھپائیں جسے ہم نے نازل کیا ہے اس کے بعد ہم نے اس کو لوگوں کے لیے کتاب (تورات) میں واضح کر دیا تھا ان پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔مگر وہ لوگ جو (اس حرکت سے) باز آئے اور درست ہو گئے اور حق بات کو بیان کر دیا، میں ان کو معاف کرتا ہوں، اور میں بڑا معاف کرنے والا مہربان ہوں۔ بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔(یہ) اس لعنت میں رہیں گے، ان سے عذاب کو ہلکا نہیں کیا جائے گا، نہ ان کو مہلت دی ملے گی۔‘‘

ان آیاتِ مبارکہ میں ان لوگوں کے لیے وعید شدید ہے جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی ان تعلیمات کو چھپائیں جو وہ لے کر آئے۔جن کی تعلیمات میں دلوں کو نفع دینے والی ہدایات ہیں۔حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو ان کتابوں کے اندر کھول کر بیان فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر اُتاری ہیں۔

دینِ حق کو چھپانا یا بدلنا موجبِ لعنت اور عذاب ہے:

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یہ آیت اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے تورات میں حضور اکرم ﷺ کی صفت کو چھپایا تھا۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ حق کو چھپانے والے ہیں ان پر صرف اللہ تعالیٰ کی لعنت نہیں ہوتی، بلکہ دنیا کی ہر چیز ان پر لعنت کرتی ہے۔جو لوگ حق کو چھپالیں، ان کے بارے میں وعید ہے۔وہ حق اُمتوں کے پاس پیغمبروں کے ذریعہ سے آیا ہو یا علماء کے ذریعہ سے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے بعد اللہ تعالیٰ نے نبوت کا سلسلہ ختم فرما دیا ہے، اب قیامت تک دین کی بات علماء کے ذریعے سے پہنچے گی۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب زمینوں میں قحط پڑتا ہے، بارشیں نہیں ہوتیں تو زمین پر جتنی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، وہ کہتی ہے کہ پانی اس لیے بند ہوا کہ انسانوں نے گناہ شروع کر دیئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ! بنو آدم کے ان انسانوں پر لعنت کر، جن کی وجہ سے ہم تیری رحمت سے محروم ہو گئے۔

حدیث مبارک میں آیا ہے: ''إِنَّ الْعَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَ مَنْ فِي الْأَرْضِ حَتَّى الْحِيتَانُ فِي الْمَاءِ'' [جامع ترمذی، رقم: ۲۶۸۲] عالم دین کے لیے ہر چیز اللہ سے بخشش مانگتی ہے حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں بھی عالم کے لیے معافی مانگتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو آدمی علم رکھنے کے باوجود حق بات کو چھپاتا ہے تو اللہ اس پر لعنت کرتے ہیں، ملائکہ بھی اس پر لعنت کرتے ہیں، مخلوق بھی اس پر لعنت کرتی ہے، ہر چیز بولنے والی اور نہ بولنے والی سب لعنت کرتے ہیں، چاہے وہ قول سے لعنت کرتے ہیں یا ان کی جو حالت ہے، لعنت پر دلالت کر رہی ہوتی ہے۔

اسی حدیث مبارک میں آتا ہے: ''إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ'' اگر کوئی عالم حالات کو شکار ہو کر یا اپنی خواہشات نفسانی کا شکار ہو کر حق کو چھپائے اور اس میں ایسی تاویلات کرے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور حضور اکرم ﷺ کے فرامین بدل جائیں تو ایسے لوگوں پر دنیا میں بھی لعنت ہے اور آخرت میں بھی لعنت ہے۔ ایک ہے حق کو چھپانا، جیسے اہل کتاب کو پتہ تھا کہ حضور اکرم ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں، لیکن جب ان سے کوئی پوچھتا کہ تمہاری کتابوں میں حضور اکرم ﷺ کا ذکر آیا ہے یہ وہی نبی ہیں تو کہہ دیتے کہ ان میں فرق ہے۔ اسی طرح مسئلہ کو چھپایا جاتا ہے۔

یہود کا رجم کا حکم چھپانے کا واقعہ:

جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے رجم کا فیصلہ فرمایا اور یہود کے علماء سے پوچھا کہ تمہاری کتاب تورات میں زانی کی کیا سزا ہے؟ انہوں نے کہا: ہماری کتابوں میں بس اتنی سزا ہے کہ اس کا منہ کالا کر کے اس کو گدھے پر بٹھا کر بازار میں پھرا دیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تورات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، اس میں بھی رجم کا حکم ہے، لیکن یہودیوں نے انکار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کتاب لے آؤ۔ وہ جب کتاب لے آئے تو اس حکم پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے چونکہ تورات عبرانی زبان میں تھی، اس کو ہر آدمی نہیں پڑھ سکتا تھا تو عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! اس کو فرمائیں یہ ہاتھ اُٹھائے۔ جب اس یہودی عالم نے ہاتھ اُٹھایا تو آیت رجم چمکنے لگی۔ یہ مسئلہ کو چھپانا ہے۔

جیسا کہ ہمارے ملک میں جب عورتوں کے زبردست احتجاجات ہوئے، انہوں نے مردوں کے ساتھ مساوات کے نعرے بلند کیے تو اس دور میں بھی کچھ ایسے لوگ تھے جنہوں نے اللہ کے قرآن کو بدل کر کہا کہ کوئی مرد چار

شادیاں نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ تم جتنا بھی زور لگاؤ، بیویوں میں عدل نہیں کرسکتے۔ اس لیے چار شادیاں نہیں کرسکتے۔

دوسرا مسئلہ یہ نکالا کہ اگر دوسری شادی کرنی ہے تو پہلی بیوی سے اجازت لو، کیونکہ دوسری بیوی کی زندگی اس پہلی بیوی کے ساتھ ہی گزرنی ہے۔ اگر وہ اجازت نہ دے تو آپ دوسری شادی نہیں کرسکتے۔ اس طرح لوگوں کو خوش کردیا کہ بعض اوقات اولاد نہیں ہوتی تو پہلی بیوی دوسری شادی کی اجازت دے دیتی ہے یا پہلی بیوی اتنی بیمار ہوجاتی ہے کہ خاوند کے حقوقِ زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہے تو اجازت دے دیتی ہے۔ اس کو انہوں نے اسلامی قوانین کے نام سے نافذ کیا۔ اس سے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ آدمی کفر کی بات کرے اور اس پر اسلام کا پردہ ڈالے اور اللہ تعالیٰ کے قرآن کو بدل دے۔ حضور اکرم ﷺ پر قرآن نازل ہوا، آپ ﷺ نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں اور کسی حدیث میں یہ نہیں آتا کہ آپ ﷺ نے پہلی بیوی سے اجازت لے کر دوسری شادی کی ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی ایک سے زائد شادیاں کیں، کسی صحابی سے یہ بات ثابت نہیں کہ اس نے پہلی بیوی سے اجازت لی ہو۔ قرآن کے اندر تو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تھی کہ اگر دو شادیاں کرنی ہیں تو عدل کرو۔ لباس، خرچ، رہائش اور وقت میں عدل کرو، سب کے برابر حقوق ادا کرو۔ باقی دل کا معاملہ ہے کہ کسی طرف میلان زیادہ ہوتا ہے تو تم اس میں نہیں پکڑے جاؤ گے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! میں عدل کرتا ہوں جو میرے بس میں ہے اور جو میرے بس میں نہیں ہے اس کا میں عدل نہیں کرسکتا۔

اطاعتِ رسول میں تمام مشکلات کا حل:

آپ ایک اُصولی بات سمجھ لیں تو ساری مشکلات حل ہوجائیں گی کہ اگر ہم نے قرآن کو اپنے عقل سے سمجھنا ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضور اکرم ﷺ کو نہ بھیجتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس نے میرے نبی ﷺ کی اطاعت کی اس نے میری اتباع کی اور جو آپ ﷺ کی زبان سے لفظ نکلے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ اُمت کے لئے قانون ہے، آپ ﷺ کا ہر قول، فعل اور عمل قانون ہے اور اسی طرح دوسرے آدمی نے حضور پاک ﷺ کے سامنے کوئی کام کیا، آپ ﷺ نے منع نہ فرمایا تو وہ بھی قانون ہے، کیونکہ اگر وہ کام غلط ہوتا تو اللہ کے نبی ﷺ اسے ضرور روک دیتے۔

منصوبہ بندی کا حکم:

ایک ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ منصوبہ بندی یعنی بچوں کی پیدائش کو روکنا ٹھیک ہے، کیونکہ بخاری شریف میں

ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں یہ چیز موجود تھی اور آپ ﷺ نے منع نہیں فرمایا کیونکہ صحابہ کہتے ہیں: ہم عزل کیا کرتے تے حضور اکرم ﷺ کا زمانہ تھا، اس سے اشارہ ہوا کہ اگر یہ چیز منع ہوتی تو آپ ﷺ روک دیتے۔ (عزل کہتے ہیں میاں بیوی ملیں، آخری وقت میں پانی باہر ضائع کر دیا جائے، تا کہ حمل نہ ٹھہرے)۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ اب اس کی جدید شکل یہ ہے کہ عورت سے اندر ٹیوب رکھ دیتے ہیں یا مردوں کے لیے کچھ چیزیں بنائی ہیں، مقصد وہی عزل ہے۔ لہٰذا یہ ٹھیک ہے۔ اس ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ: ﴿ذٰلِكَ أَدْنٰٓى أَلَّا تَعُوْلُوْا﴾ [النساء: ۳] اگر تم زیادہ بچے نہیں پیدا کرنا چاہتے تو ایک شادی کرو۔

اب جب ایک غریب آدمی اخبار یا کسی کتاب کے اندر یہ مضمون پڑھے تو اس بے چارے کو کیا پتہ کہ بخاری شریف کی اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ اور یہ عزل آزاد عورتوں سے تھا یا باندیوں سے تھا؟ ایک خاص ضرورت کے تابع تھا یا مطلق اجازت تھی؟ یہ کسی کو پتہ نہیں کہ وہ خاص ضرورت تھی، جس میں صحابہ نے عزل کیا کہ جنگ میں ان کو باندیاں ملیں۔ انہوں نے کہا: اگر ہم نے عزل نہ کیا تو ان کو حمل ٹھہر جائے گا اور پھر ان کو فروخت کرنا چاہیں گے تو قیمت نہیں ملے گی اور اگر ہم فروخت نہ بھی کرنا چاہیں تو پھر ہماری خدمت بھی نہیں کر سکتیں، کیونکہ وہ تو بچے کو سنبھالیں گی۔ دوسرا یہ تھا کہ اگر یہ ہمارے بچے کی ماں بن گئی تو یہ اُمّ ولد ہو جائے گی، اس کو آزاد کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک حدیث مبارک میں عزل سے منع بھی آیا ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: خبردار! جو نطفہ اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گا۔ لہٰذا جب حضور پاک ﷺ سے نہی آگئی تو مسئلہ ہی ختم ہو گیا۔ اب سابقہ حدیث کا حوالہ دے کر مسلمانوں کو گمراہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ حدیث بیان کرے کہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ شراب پی کر نشہ کی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اونٹنیاں کاٹ ڈالیں۔ یہ واقعہ بالکل ٹھیک ہے اور حدیث میں موجود ہے، لیکن یہ اس زمانہ کی بات ہے جب شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح کوئی آدمی یہ حدیث سنا دے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ آئے تو کسی کے گھر میں دس بیویاں تھیں اور کسی کے گھر میں آٹھ بیویاں تھیں اور کہے کہ چار سے زیادہ شادیاں جائز ہیں۔ حالانکہ یہ اس وقت تھا جب چار سے زیادہ شادیوں کو منع نہیں کیا گیا تھا۔ جب منع ہو گیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جتنی عورتیں تمہارے گھروں میں ہیں، ان میں سے چار رکھ لو، باقیوں کو طلاق دے دو۔ ڈاکٹر صاحب نے جو امام شافعی رحمہ اللہ کا حوالہ دیا ہے، ساری دنیا کی کتابوں میں دیکھ لیں، وہ روایت شاذ ہے، تمام دنیا نے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگردوں نے اس کا رد کیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: عزل کرنا وَأد

خفی ہے، یہ بھی گویا ایک قتل کی صورت ہے۔ فرق اتنا ہے کہ درگور روح کے آنے کے بعد کرتے ہیں اور یہاں روح والی اسٹیج آنے سے پہلے درگور کر رہے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ایسی عورتوں سے شادی کیا کرو جن سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہوں، تا کہ قیامت والے دن میں اپنی اُمت کی کثرت پر فخر کر سکوں۔ اب کوئی آدمی ان ساری احادیث کو چھوڑ کر اللہ کے دین کو بدلے تو اس سے بڑا ملعون اور کون ہو سکتا ہے؟

جو شخص دین کو بدلتا ہے وہ حق چھپانے سے بھی بڑا مجرم ہے کہ اس نے حرام کو حلال کر دیا یا حلال کو حرام کر دیا۔ یہ تو کفر کی حدوں کو پہنچ جاتا ہے۔ حق کو چھپانا دو وجہ سے ہوتا ہے: ایک لالچ کی وجہ سے حق کو چھپانا یا ڈر کی وجہ سے کہ مجھے نقصان ہو گا۔ کسی حال میں بھی حق کو چھپانا جائز نہیں۔ ایسا کرنا بڑا گناہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور بہت سارے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهُ ثُمَّ كَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ." [جامع ترمذی، رقم: ۲۶۴۹]

اگر کسی شخص سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا اور وہ اس مسئلہ کا علم رکھتا تھا، لیکن اس نے جاننے کے بعد حق کو چھپا دیا تو ایسے آدمی کو قیامت والے دن جہنم کی آگ کی لگام دی جائے گی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ فرماتے تھے: اگر اللہ تعالیٰ کے قرآن میں یہ آیت مبارکہ نازل نہ ہوتی تو میں کسی کو حدیث نہ سناتا۔ (اس لیے جو حدیث سنی ہے وہ لوگوں تک پہنچاتا ہوں)، وہ آیت یہ تھی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ﴾ [البقرة: ۱۵۹]

قبر کا عذاب:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم ایک جنازے میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّ الْكَافِرَ يُضْرَبُ ضَرْبَةً بَيْنَ عَيْنَيْهِ، يَسْمَعُهَا كُلُّ دَابَّةٍ غَيْرُ الثَّقَلَيْنِ، فَتَلْعَنُهُ كُلُّ دَابَّةٍ سَمِعَتْ صَوْتَهُ." [تفسیر ابن کثیر: ۲/۴۴۱]

کافر جب مر کر قبر میں جاتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کے فرشتے ایک ایسی ضرب مارتے ہیں جو دونوں آنکھوں کے

درمیان ماری جاتی ہے، اس کو مارنے کی آواز ہر جانور سن لیتا ہے، مگر انسان اور جن نہیں سن سکتے۔ ہر جانور جو اس کی آواز سنتا ہے اس پر لعنت کرتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کچھ قبروں کے پاس سے گزرے، ایک کو غیبت کی وجہ سے، دوسرے کو پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے اور تیسرے کو چغل خوری کی وجہ سے قبر کا عذاب ہو رہا تھا۔

[شعب الایمان، رقم: ۱۱۱۰۰]

اللہ تعالیٰ نے اس سے استثناء کیا کہ وہ لوگ بچ جائیں گے جو پہلے کتمان کرتے تھے بعد میں انہوں نے اس سے توبہ کر لی اور اپنے اعمال اچھے کر لیے اور لوگوں کو اپنے پہلے اعمال سے آگاہ کر دیا جس کو وہ چھپاتے تھے ان توبہ کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ مہربانی کر کے توبہ قبول کرتے ہیں۔ اس آیت میں یہ مسئلہ بھی سمجھ آ گیا کہ اگر کوئی آدمی کفر یا بدعت کی طرف بلانے والا ہے، لیکن پھر اس نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی منظور فرما لیتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پہلی اُمتیں جو گزری ہیں، ان میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی تھی۔ یہ حضور اکرم ﷺ کی برکت ہے، چونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین، نبی التوبہ اور نبی الرحمۃ بنا کر بھیجا، اس کی وجہ سے ہم پر یہ رحمت ہے کہ اگر ہم سچے دل سے توبہ کریں تو ہماری توبہ قبول ہو جاتی ہے۔

کفار پر لعنت بھیجنے کا حکم:

جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر پر جمے رہے، یہاں تک کہ موت آ گئی تو وہ قیامت تک لعنت میں رہیں گے اور پھر جہنم میں ڈالے جائیں گے اور وہ لعنت ان کے ساتھ ہوگی، نہ ان کا عذاب گھٹے گا اور نہ ان کو مہلت ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے عذاب سے بچائیں۔

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو کفر کی دعوت دینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو کھڑا کریں گے، اللہ تعالیٰ ان پر لعنت بھیجیں گے، پھر ملائکہ لعنت بھیجیں گے، پھر سارے لوگ بھی لعنت بھیجیں گے۔

کافروں پر لعنت کرنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ دعائے قنوت نازلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مطلقاً کافروں پر لعنت کرتے تھے۔ یہ مسئلہ ہے کہ کسی معین کافر پر لعنت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو بعض علماء نے منع کیا ہے، کیونکہ

ہمیں معلوم نہیں، شاید اللہ تعالیٰ اس کو مرنے سے پہلے مسلمان کر دے اور بعض علماء نے فرمایا کہ معین کافر پر لعنت کرنا جائز ہے۔ اس قول کو فقیہ ابوبکر ابن العربی المالکی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ انہوں نے بعض احادیث سے استدلال کیا ہے۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ احادیث ضعیف ہیں۔

ایک شرابی کو لایا گیا اور اس پر حد جاری کی گئی تو ایک آدمی نے کہا: "أَللّٰهُمَّ الْعَنْهُ" یعنی یہ کتنا لعنتی ہے کہ بار بار کوڑے کھاتا ہے، لیکن شراب نہیں چھوڑتا۔ اے اللہ! اس پر لعنت فرما۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا تَلْعَنْهُ فَإِنَّهُ يُحِبُّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ." [مسند البزار، رقم: ۲۶۹/ مصنف عبدالرزاق، رقم: ۱۷۰۸۲]

لعنت نہ کرو، کیونکہ بہر حال یہ مسلمان ہے، اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب رکھتا ہے۔ غلطی کی ہے تو سزا بھگت رہا ہے۔ اس سے علماء اور مفسرین نے استدلال کیا ہے کہ جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب رکھنے والا ہو، اس پر لعنت کرنا جائز نہیں۔

بعض احادیث مبارکہ میں آیا ہے گو وہ احادیث ضعیف بھی ہیں، لیکن کثرت طرق کی وجہ سے ایک دوسرے کو طاقت دیتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِذَا رَأَيْتُمُ الَّذِيْنَ يَسُبُّوْنَ أَصْحَابِيْ فَقُوْلُوْا: لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰى شَرِّكُمْ." [جامع ترمذی، رقم: ۳۸۶۶]

جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں تو کہو: تمہارے شر پر اللہ کی لعنت ہو۔

﴿وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٣﴾ إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿١٦٤﴾﴾ [البقرة: ۱۶۳، ۱۶۴]

''تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، کوئی معبود نہیں سوائے اس کے وہ بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے آنے جانے میں اور دریاؤں (اور سمندروں) میں چلنے والی کشتیوں میں جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہیں اور جو اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا پھر اس سے زمین کو زندگی دی اس کے بنجر ہو جانے کے بعد اور اس میں طرح طرح کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہے (ان میں) تدبر کرنے والی قوم کے لیے (اللہ کی توحید کی) نشانیاں ہیں۔''

آیت کا شانِ نزول:

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے نبی! یہ لوگ جو مطالبہ کرتے ہیں کہ صفا کو سونے کا پہاڑ بنا دیں۔ یہ اس سے بڑی بڑی نشانیاں دیکھ چکے ہیں، ان کو نہیں مانتے تو اس کو کیسے مانیں گے؟ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ پر یہ آیت مبارکہ اُتری: ﴿وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ﴾ تو کفار قریش کہنے لگے: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک الٰہ سارے کام کرے؟ (کوئی بچہ مانگ رہا ہے، کوئی روٹی مانگ رہا ہے، کوئی پیسے مانگ رہا ہے، کوئی شفاء مانگ رہا ہے)۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ بہت سارے خدا ہوں اور کام تقسیم ہوں۔ جیسا کہ ہمارے علاقہ میں بھی لوگوں نے کام تقسیم کر رکھے ہیں، اگر جانور بیمار ہوں تو ایک پیر کی قبر پر لے جائیں گے، اگر جنات ہوں تو دوسرے پیر کی قبر پر لے جائیں گے، بچے نہ ملتے ہوں تو تیسرے پیر کی قبر پر لے جائیں گے اور جس کی شادی نہ ہوتی ہو وہ ایک اور پیر صاحب کی قبر پر جاتا ہے۔ کفار قریش اس لئے کہتے تھے کہ ایک خدا سارے کام کیسے کر سکتا ہے؟ اس لئے انہوں نے تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، ہر قبیلے کا اپنا خدا تھا۔ اس جہالت کی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کو اپنے اوپر قیاس کرتے تھے کہ جب ایک بندہ بادشاہ بن جائے تو اکیلا کام نہیں کر سکتا، بلکہ وہ وزیروں، مشیروں اور بیوروکریسی کا محتاج ہوتا ہے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا کو بھی اسی طرح دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے، یہ نہ سوچا کہ مخلوق ناقص ہے اور اللہ کی ذات کامل ہے، اس کو ان کی کیا ضرورت ہے، ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَن يَقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ [یٰسین: ۸۲] جب اللہ تعالیٰ کے ارادہ میں کسی کام کا ہونا ہوتا ہے تو بس اس کو حکم ہوتا ہے کہ ہو جا تو ﴿فَيَكُونُ﴾ وہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ کو

وزیروں، مشیروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا کہ یہ جاہل لوگ اپنے اپنے اندازے لگاتے ہیں کہ ایک خدا کیسے کرے گا۔ یہ غور کریں کہ اس سارے نظام کو کون چلا رہا ہے؟ آسمانوں کو، زمینوں کو کس نے پیدا کیا؟ رات و دن کے اختلافات کس نے بنائے؟ تو جو خدا ان پر قادر ہے وہ باقی کاموں پر بھی قادر ہے۔

کچھ بنیادی عقائد اور مسائل:

عقائد میں تین مسائل اہم ہیں: 1 توحید 2 نبوت و رسالت 3 معاد۔ توحید کی متعدد اقسام ہیں: توحید رُبوبیت، توحید اُلوہیت، توحید فی الاسماء والصفات۔ ان سب اقسام میں اہم توحید اُلوہیت ہے، ویسے تو ساری اقسام اہم ہیں۔ توحید ربوبیت یہ ہے کہ ہمیں پیدا کرنے والا، روزی دینے والا، آسمانوں زمینوں کو پیدا کرنے والا، بارشیں اُتارنے والا، کھیتیاں اُگانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی الٰہ ہے اور وہی عبادت کا مستحق ہے، اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں۔ جب تک توحید کا یہ مقام حاصل نہیں ہوگا اس وقت تک عقیدہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ ہم نماز اللہ تعالیٰ کے لئے پڑھتے ہیں، رکوع و سجود اللہ کے لئے کرتے ہیں، صرف نماز پڑھنے کا نام توحید نہیں ہے، بلکہ توحید یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے غیر کی عبادت نہ کرے، اللہ کو سجدہ کرے غیر کو سجدہ نہ کرے، اللہ تعالیٰ کے آگے جھکے غیر کے آگے نہ جھکے، اللہ سے مانگے غیر سے نہ مانگے، اللہ کے گھر کا طواف کرے کسی غیر کے گھر کا طواف نہ کرے، اللہ کے نام کی منت مانے کسی غیر کی منت نہ مانے، اللہ کے نام کی نذر دے کسی غیر کی نذر نہ دے، اللہ کے نام پر قربانی کرے کسی غیر کے نام پر قربانی نہ کرے، اللہ کے سوا سب کی نفی کرنی ہوگی، تب جا کر توحید بنے گی۔ یہ نہیں کہ اللہ کو بھی سجدہ کر لیا اور قبر پر بھی سجدہ کر لیا۔ یہ توحید نہیں ہے، اللہ کو بھی پکارے اور اللہ کے علاوہ کسی نبی یا ولی کو بھی پکارے تو اس نے پکارنے میں غیر کو شریک کر لیا۔

ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ اس کا عقیدہ صحیح اور اس طرح ہو جیسے حضور اکرم ﷺ نے سکھایا اور بتایا ہے۔ فضائل، اعمال اور دوسرے مسائل میں کچھ وسعت اور تسامح بھی ہوتا ہے، لیکن عقیدہ کا مسئلہ بڑا سخت اور شدید ہے۔ ہماری بنیاد کلمہ طیبہ پر ہے، جب اس کو پڑھا تو صدقِ دل سے اعتراف کیا کہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد پاک ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ جب تک آدمی کا اس پر ایمان نہ ہو تو وہ

مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ جب معبودِ برحق اللہ تعالیٰ ہے تو عبادت صرف اسی کی ہوگی۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اسلام کی پہلی بنیاد "شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" ہے اور فرمایا: "مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهٖ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" جس کا خاتمہ اس عقیدہ پر ہوگا وہی جنت میں داخل ہوگا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا، پھر اس نے کسی چیز کو اللہ کا شریک نہیں بنایا، نہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں اور نہ اللہ تعالیٰ کی صفات خاصہ میں کسی کو شریک بنایا اور اسی حال پر اس کو موت آ گئی تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر جہنم کی آگ کو حرام کر دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو اس بات پر موت آ گئی کہ اس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، اللہ تعالیٰ اس پر جنت میں داخل ہونے کو حرام کر دیتے ہیں۔ اور عقیدہ اللہ کے قرآن سے ثابت ہوگا، قصے، کہانیوں اور قیاسات سے ثابت نہیں ہوتا۔ عقیدے کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام علیہم السلام کو بھیجا ہے۔

اور لڑکے دینے والے مسئلے کو قرآن نے کھول کر بیان کیا کہ ﴿يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُورَ ۝﴾ [الشوریٰ: ۴۹] جسے ہم چاہتے ہیں اس کو لڑکے دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں لڑکیاں دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں جوڑا یعنی لڑکے بھی دیتے ہیں اور لڑکیاں بھی دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں عقیم بنا دیتے ہیں، نہ لڑکی دیتے ہیں اور نہ لڑکا دیتے ہیں۔ لیکن ہم کلمہ پڑھ کر مسلمان بھی کہلائیں اور ہمارا عقیدہ یہ ہو کہ لڑکا ہمارے پیر نے دیا ہے۔ ہم نے اسلام کے بارے میں صرف تصور بنالیا ہے کہ ہم مسجدیں، مدرسے بنوا رہے ہیں، ہماری مسواک ایسی ہونی چاہیے، چادر پنڈلیوں پر باندھتے ہیں، ہم کوشش کرتے ہیں کہ ہماری پگڑی بھی حضور اکرم ﷺ کی طرح ہو، ہم تو قدم قدم پر حضور اکرم ﷺ کے عاشق اور غلام ہیں۔ لیکن جس ملک میں کفر کا نظام چل رہا ہو اور وہاں آپ صرف ان باتوں پر توجہ دیں اور جس کام کے لئے حضور اکرم ﷺ آئے تھے، اس کے لیے آپ نے کبھی ایک کانٹا بھی برداشت نہ کیا ہو تو کیا قیامت میں اللہ تعالیٰ کو یہی جواب دیں گے کہ نمازیں پڑھتے تھے؟ اگر ہم سے پوچھا جائے کہ آپ کی بیوی نماز پڑھتی تھی؟ تو جواب دیں کہ ہم نے کہا تو تھا، لیکن وہ بات نہیں مانتی تھی۔ تمہارے بچے جن رہی ہے، وہ بات مانتی ہے، لیکن نماز والی بات نہیں مانتی، یہ کیسا جھوٹ اور مکر ہے؟ اللہ کے ساتھ فریب کر رہے ہیں، اگر تیری بیوی کو یہ پتہ ہو کہ میں نے اگر نماز نہ پڑھی تو خاوند کے ساتھ میرا آخری دن ہوگا تو مجال ہے کہ وہ نماز

نہ پڑھے۔ تم اپنے چھ، سات سال کے بچے کو مسجد میں لے آؤ اور اس کو دکھاؤ کہ لوگ کیسے نماز پڑھ رہے ہیں؟ تو بڑا ہو کر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ نماز نہ پڑھے؟ بعض لوگوں کے نزدیک تو اسلام صرف چند عبادات کا نام ہے اور کہتے ہیں کہ نماز پڑھنا ہر آدمی کا ذاتی معاملہ ہے، کوئی نماز پڑھتا ہے تو پڑھ لے نہیں پڑھتا تو نہ پڑھے۔ اس طرح تو یورپ میں بھی آپ کو اجازت ہے، وہاں مسجد بنائیں، جماعت کے ساتھ نماز پڑھائیں، جمعہ پڑھائیں، کوئی منع نہیں کرتا۔ آج ہمیں کیا ہو گیا کہ نہ عقیدہ میں پکے رہے، نہ اعمال کے اعتبار سے پکے مسلمان بنے اور اتباع رسول میں بھی کسی حد تک ہم مسلمان بنے ہیں، بس روایتی مسلمان ہیں کہ مسلمان کے گھر کے اندر پیدا ہو گئے، دکھاوے کے مسلمان ہیں۔ کوئی نماز پڑھتا ہے اس لئے مسلمان ہے کوئی آدمی سال میں مکہ شریف ہو آتا ہے اس لئے مسلمان ہے اور کسی کے دماغ میں یہ ہے کہ سال میں جو مرضی آئے کرو، رمضان شریف مکہ میں گزار لو تو یوں سمجھ لو کہ گنگا نہا کر آ گئے۔ بڑے بڑے سود خور رمضان شریف میں باقاعدگی کے ساتھ مکہ میں آتے ہیں۔ اللہ کا کرم اور شکر ہے، سبحان اللہ! رمضان شریف کا روزہ اللہ کعبہ میں نصیب کر دیتا ہے۔ حالانکہ اس کا پیسہ حرام کا ہوتا ہے، کھانا حرام کا ہوتا ہے تو کس بات کی خوشی ہے کہ میرے گناہ بخشے جائیں گے۔ اگر ہم ٹھیک ہوتے تو آپ کا کیا خیال ہے کہ حج پر بیس لاکھ آدمی اکٹھا ہو، رمضان میں اکٹھا ہو، تہجد کا وقت ہو اور رو رو کر دعائیں مانگیں، لیکن ایک دعا بھی منظور نہ ہو؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اسلام کا نام لے کر اسلام کو بدنام کیا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہیں۔ کبھی کبھی تھوڑی رحمت آ جاتی ہے، وہ بھی جانوروں، کیڑے مکوڑوں کی وجہ سے آ جاتی ہے یا کسی اور مخلوق کی وجہ سے آ جاتی ہے۔

برنارڈ شاہ بڑا رائٹر گزرا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ میں جب قرآن پڑھتا ہوں تو اس سے اعلیٰ کتاب کوئی نہیں پاتا، لیکن جب ان مسلمانوں کو دیکھتا ہوں تو ان جیسی ذلیل قوم میں نے نہیں دیکھی۔ اخبارات میں لکھا آتا ہے کہ یہ یہودیوں کے ایجنٹ ہیں، یہ ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں، یہ فلاں کام کرا رہا ہے۔ آخر وہ کن سے کروا رہے ہیں اور کن کو خریدتے ہیں؟ انہی کلمہ پڑھنے والوں کو خرید کر کے مسجدوں میں گولیاں چلواتے ہیں۔ مسلمان بکتا ہے چاہے خریدار ہندو ہو یا یہودی ہو۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے اور ہمیں صحیح معنوں میں مسلمان بنا دے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے عقائد و اعمال درست فرما دیں اور ہمیں ہمت و قوت دیں کہ قرآن کو قرآن سمجھیں، صرف برکت اور تعویذوں کی کتاب نہ سمجھیں، بلکہ قرآن جو حکم دے، اس کی تعمیل کریں۔

علاجِ قرآنی:

اس لیے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلا سبق دیا کہ یہ عقیدہ رکھو کہ ﴿وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ﴾ تم سب کا معبود برحق ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور کہیں فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝١﴾ اور حضور اکرم ﷺ نے دعا سکھائی: "اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّيْ أَنْتَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ" کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ۔ لہٰذا اگر اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے تو وہ باطل ہے۔ جب معبود برحق اللہ ہے تو عبادت بھی اسی کی ہوگی۔ اس لئے ہم روزانہ پڑھتے ہیں: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝٤﴾ صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ آیا: ﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا﴾ [النساء: ۳۶] اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے نبی! آپ ان کو کھل کر کہہ دیں: ﴿يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝١ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝٢﴾ [الکافرون: ۱، ۲] عبادت کے لائق اللہ ہے، اس لئے کہ اسی نے ہمیں پیدا کیا ہے، جو خالق ہے، مالک ہے، ساری کائنات کا تصرف اسی کے ہاتھ میں ہے، پیدا کرنے والا، مارنے والا بھی وہی ہے، لہٰذا عبادت کا مستحق بھی وہی ہے۔ اور جن کی تم عبادت کرتے ہو، یہ نہ تو پیدا کرتے ہیں، نہ مالک ہیں اور نہ ان کے ہاتھ کوئی ذرّے کے برابر چیز ہے۔ اس لئے قرآن میں مشرکوں کو چیلنج ہے: ﴿أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ ۚ أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِنْهُ ۚ بَلْ إِنْ يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ۝٤٠﴾ [فاطر: ۴۰] میرے نبی! ان کافروں سے کہو کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو، مجھے بتاؤ تو سہی انہوں نے زمین کا تھوڑا سا ٹکڑا بنایا ہو مجھے دکھاؤ، یا آسمانوں کے بنانے میں ان کی کوئی شرکت ہو تو وہ بتائیں۔ میرے مدنی! جو میرے دروازے کو چھوڑ کر کبھی درختوں کو سجدے کرتے ہیں، کبھی دیوی کو سجدہ، کبھی دیوتا کو سجدہ، کبھی جمنا کو سجدہ، کبھی قبروں کو سجدہ، کبھی دلال کو سجدہ۔ ان سے کہو کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے؟ کیا اللہ نے کہا ہے کہ ان کو سجدہ کرو؟ یعنی تمہارے پاس کوئی عقلی یا نقلی دلیل ہے تو لے آؤ۔ اصل وجہ یہ ہے کہ یہ ظالم ایک دوسرے کو جھوٹے دھوکے میں مبتلا کئے ہوئے ہیں کہ جب تم بتوں کی پوجا کرو گے، جب تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا سمجھو گے، جب حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بناؤ گے، جب تم اولیاء اللہ کو حصہ دار مختار بناؤ گے، جب تم اہل بیت رسول اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مختار بنالو گے تو یہ اللہ

کے پیارے ہیں، یہ تمہیں وہاں چھڑا لیں گے، اللہ سے کہہ کر تمہارے سارے مسئلے حل کرا دیں گے۔ اس دھوکہ میں یہ مبتلا ہو گئے ہیں، ورنہ میرے پاس کسی مشرک کی سفارش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَىِٕنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ۝﴾ [فاطر: ۴۱] میرے مدنی! ان آسمانوں کو کس نے روکا ہوا ہے کہ بغیر ستون کے کھڑے ہیں؟ ہزاروں سال گزر گئے، آئندہ خدا جانے کتنے گزریں گے؟ کون سی طاقت ہے جس نے آسمانوں کو روکا ہے؟ اور اگر میں ان کو گرانا چاہوں تو کون روک سکتا ہے؟ اور روکنا چاہوں تو کون ہٹا سکتا ہے؟ جب ان کے پلے میں نہ آسمان میں کچھ ہے اور نہ زمین میں کچھ ہے تو پھر یہ میرے شریک کیسے بن گئے؟ جو خود خیرات کا مستحق ہے وہ کیسے خدا بن سکتا ہے؟ اگر خیرات کا مستحق نہیں تو کوئی شراکت تو ثابت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ۝﴾ میری شان یہ ہے کہ میں حلم والا اور بخشنے والا ہوں، ورنہ اگر میں چاہوں تو ان لوگوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لوں، زمین پر کوئی چیز چلتی ہوئی نظر بھی نہیں آئے گی۔ یہ تو میری رحمت ہے کہ ان کو مہلت دی ہوئی ہے شاید توبہ کر لیں اور بچ جائیں۔ معبود برحق اللہ ہے تو عبادت اسی کی ہوگی۔ سجدہ عبادت ہے، قربانی کرنا عبادت ہے، طواف کرنا عبادت ہے وغیر ذالک تو یہ ساری عبادات اللہ کے لیے ہوں گی، اگر اللہ کے سوا کسی غیر کی ہوگی تو یہ شرک ہے۔

سوچو! دریاؤں کو پیدا کرنے والا اور دریاؤں سے کشتیوں کو چلانے والا کون ہے؟ اگر تم لوہے کا ایک تولہ دریا میں ڈالو تو وہ نیچے چلا جائے گا، لیکن ہزاروں ٹن کی کشتیاں اوپر کھڑی رہتی ہیں، ڈوبتی نہیں ہیں۔ تم تو کہتے ہو کہ فلاں کمپنی اور ان کے آدمیوں نے جہاز بنایا ہے۔ ان بندوں کو کس نے پیدا کیا ہے؟ ہم نے کشتی اس لئے بنائی تا کہ لوگ اس سے نفع اٹھا سکیں، کشتیاں بھری ہوئی مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف جا رہی ہیں۔ ایسی جگہیں جہاں کوئی سواری نہیں جا سکتی، وہاں تیرے لئے دریاؤں کو مسخر کر دیا ہے، تا کہ تیری تجارت کا ذریعہ بنے۔

اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم:

(حدیث) حضرت شہر بن حوشب نے حضرت اسماء بنت یزید بن السکن سے روایت کی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

"اِسْمُ اللّٰهِ الْاَعْظَمُ فِي هَاتَيْنِ الْآيَتَيْنِ." [سنن ابی داؤد، رقم: ۱۴۹۶ / جامع ترمذی، رقم: ۳۴۷۸]

اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾
[البقرۃ:۱۶۳] اور ﴿الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ [آل عمران:۱،۲]

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے ایک ''اسم اعظم'' ہے، اس کی شان یہ ہے کہ جب اس نام کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مانگا جائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ قبول فرماتے ہیں اور وہ دعا قبول ہوجاتی ہے۔ علماء نے آیاتِ قرآنیہ کو جمع کیا ہے کہ ان میں اسم اعظم کون سا ہے؟ ''الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ'' اسم اعظم ہے۔ اسی طریقہ سے علماء کرام کے اور بھی اقوال ہیں، لیکن زیادہ اقوال اسی لفظ ''اللہ'' کے بارے میں آتے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ ان آیات مبارکہ کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرے۔

اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی عظمت:

﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُلوہیت اسی کے لئے ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ اگلی آیت میں اللہ نے اس کی دلیل ذکر فرمائی ہے کہ اس ذات پاک نے آسمانوں کو پیدا کیا، زمینوں کو پیدا کیا اور اس کے اندر جو مخلوق ہے اس کو پھیلایا اور بنایا۔ سب مخلوق پر نظر کریں تو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے کہ وہ وحدہ لاشریک لہ ہے۔ آسمان اور زمین کی دلیل اس لیے دی، کیونکہ ہر وقت ان کے ساتھ انسان کا واسطہ ہے، دوسری بات یہ کہ یہ دونوں عظیم کرے ہیں، اتنا ان کا طول وعرض ہے کہ آج تک کوئی جان نہیں سکا، کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکا کہ آسمان کتنا بڑا ہے؟ تیسری بات یہ کہ قدرت کی صناعت پر ایک عجیب دلیل اتنا بڑا آسمان ہے اور پھر اس کے اوپر چھ آسمان ہیں، ان میں سے ہر ایک کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے اور ہر آسمان پر اللہ کی مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان آسمانوں کو بغیر ستونوں کے روکا ہوا ہے، یہ اس کے کمال قدرت کی دلیل ہے۔ دنیا میں جو لوگ سورج کے پجاری ہیں، وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ سورج نے آسمان وزمین بنایا۔ وہ یہ تو کہتے ہیں کہ آسمان وزمین میں جو تصرف ہے وہ سورج، چاند اور تاروں کی وجہ سے ہے، لیکن دنیا میں کوئی ایسا احمق پیدا نہیں ہوا جو یہ کہے کہ سورج نے آسمان و زمین بنائے ہیں یا ان تاروں نے آسمان وزمین بنائے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں نے انبیاء کو خدا کا درجہ دے دیا ہے، وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آسمان وزمین انہوں نے بنائے ہیں۔ آج بھی اگر آپ دنیا میں دیکھیں جو لوگ شخصیت

پرستی کے بت میں مبتلا ہیں، زندہ، مردہ لوگوں کو خدا کا مقام دیئے ہوئے ہیں، ان کو بھی یہ دعویٰ کرنے کی ہمت نہیں ہوسکی کہ فلاں آسمان کا ٹکڑا فلاں شخصیت نے بنایا ہے، فلاں آسمان کا ٹکڑا فلاں شخصیت نے بنایا ہے۔ یہ کوئی دعویٰ نہیں کرتا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر فرمایا ہے: ﴿ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ﴾ [الواقعہ:۵۹] کیا ان چیزوں کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ﴿وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ [الزمر:۳۸] دونوں اتنی بڑی دلیلیں ہیں جن کا کوئی مشرک اور کافر بھی انکار نہیں کرسکتا، مگر کوئی معاند، جاہل ہو جو کہے میں نہ مانوں تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمایا کہ تم آسمانوں کی بلندی پر نظر ڈالو، آسمانوں کی لطافت پر نظر ڈالو، آسمانوں کی وسعت پر نظر ڈالو، ان موجود سیارات اور ستاروں پر نظر ڈالو۔ بعض سیارات چلنے والے ہیں اور بعض ایک مقام پر کھڑے ہیں، پھر زمین کی کثافت وغلظت پر نظر ڈالو، زمین میں پہاڑوں پر نظر ڈالو، زمین میں دریاؤں پر نظر ڈالو، اس کے جنگلوں پر نظر ڈالو، زمین کے بچھانے پر نظر ڈالو، زمین کے اندر جو تعمیرات کی ہیں ان پر نظر ڈالو، زمین میں جو منافع ہیں ان پر نظر ڈالو، ہر چیز دلالت کررہی ہے کہ وہی وحدہ لاشریک لہ ہے، ہر چیز اپنے حال میں باکمال ہے اور اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہیں۔ ان میں سے بعض فلاسفر آسمانوں کا انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دور سے جو نظر آتا ہے ایک نیلگوں سی چیز ہے ایک خلا ہے جو دور ہونے کی وجہ سے ایسے نظر آتا ہے، ورنہ آسمانوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یاد رکھیں! جب آسمانوں کا انکار ہوگا تو اس پر جو مخلوق ہے اس کا خود بخود انکار ہوگا اور کرسی کے انکار سے عرش کا انکار ہوجائے گا اور عرش کے انکار سے اللہ کا انکار ہوجائے گا۔ جدید فلاسفر کہتے ہیں کہ آسمان ہیں، لیکن ہمیں نظر نہیں آتے۔

﴿وَّاَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ﴾ وہ کون ہے جس نے فضاء میں سے پانی اُتارا، جس طرح زمین پر پانی ہے اسی طرح فضا میں بھی پانی ہے۔ پانی ثقیل چیز ہے، اس کا تقاضا تو ہے کہ نیچے گرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: دیکھو! اس کو کس نے تھام رکھا ہے؟ تمہارے سر سے بادل گزرتے ہیں، تم اگر چاہو تو ان سے پانی کا ایک گلاس بھی نہیں بھر سکتے۔ تم تو کہتے ہو کہ زمین کے اندر حرارت بڑھی اور بارش ہوئی تو اس زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ ﴿فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ پھر ہم زمین کو اس کے بنجر ہونے کے بعد زندہ کرتے ہیں کہ آسمانوں سے پانی بھیج کر ان کو آباد کیا۔ علماء فرماتے ہیں کہ یوں سمجھو کہ زمین ایک عورت اور آسمان ایک مرد کی حیثیت میں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ دو پانیوں سے

اولاد پیدا کرتے ہیں، اسی طرح آسمانوں سے پانی بھیج کر زمینوں سے نباتات اُگاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ زمین کے نیچے سے پانی ختم کردیں اور اوپر سے پانی نہ برسائیں تو کیا کرو گے؟ جو ملک مصنوعی بارش کرتے ہیں، ان سے پوچھو کہ ایک مربع زمین پر مصنوعی بارش کرنے کے لیے کتنے پیسے خرچ ہوتے ہیں؟ ﴿وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر چلنے والی چیزیں پیدا کی ہیں، بعض چیزیں توالد وتناسل سے پیدا ہوتی ہیں اور بعض چیزیں مٹی سے پیدا ہوجاتی ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے تولید رکھی ہے، توالد وتناسل نہیں رکھا۔

سائنس اور قرآن کا تقابلی جائزہ:

ان میں سے بعض لوگ آسمانوں کا بالکل انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صرف چاند، سورج گردش کررہے ہیں۔ جدید فلاسفہ کہتے ہیں کہ اصل گردش چاند نہیں کرتا، بلکہ زمین آفتاب کے گرد بڑی تیزی کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ آپ جو کہتے ہیں کہ چاند گرہن ہوگیا یا سورج گرہن ہوگیا، وہ کہتے ہیں کہ جب زمین چاند اور سورج کے گرد چکر کاٹ رہی ہوتی ہے تو زمین جب اس کے آگے آجاتی ہے تو اس کی روشنی ختم ہوجاتی ہے۔ اب جدید مفکرین کہتے ہیں کہ زمین بھی گردش کررہی ہے اور آفتاب بھی گردش کررہا ہے۔ یہ سب کے سب ان کے خیالات ہیں، توہمات ہیں۔ اصل بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اُتاری ہے اور ہمارے آقا ﷺ نے فرمائی ہے، آپ ساری تحقیقات کرلیں، لیکن لوٹ کر اسی پر آئیں گے جو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔

میں جدید معلومات کے بارے میں پڑھ رہا تھا۔ انہوں نے لکھا کہ سورج بوڑھا ہونا شروع ہوگیا ہے، ابھی اس کی عمر تقریباً 2.5 بلین سال باقی ہے، اس کے بعد یہ چالیس لاکھ ٹکڑوں میں بٹ کر ختم ہوجائے گا۔ حالانکہ قرآن نے پہلے بتادیا ہے کہ سورج پھٹ جائے گا، چاند گر جائے گا، ستارے گر جائیں گے: ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝١ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۝٢﴾ [التکویر:۱، ۲]... ﴿إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ ۝١ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝٢﴾ [الانشقاق:۱، ۲]... ﴿إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۝١ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝٢﴾ [الانفطار:۱، ۲] اللہ تعالیٰ نے جو قرآن میں فرمایا ہے، وہ حق ہے اور جو حضور پاک ﷺ نے فرمایا ہے وہ حق ہے۔ اس کے علاوہ آپ جتنا دماغ دوڑائیں گے، نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلے گا۔ صرف توہمات، تخیلات اور اپنی دولت کا ضیاع کرکے وہیں آجائیں گے جو قرآن نے فرمایا ہے۔ قرآن نے ہمیں اس مسئلے پر نہیں اُلجھایا۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے جو قائم ودائم ہے، ہمارا ایمان ہے اللہ تعالیٰ نے

کئی مقامات پر سماوات کا ذکر فرمایا ہے، ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ آسمانوں کے دروازے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴾ [القمر:11] کہ جب نوح علیہ السلام کی قوم پر ہم نے عذاب بھیجا تو آسمانوں کے دروازے ہم نے کھول دیئے۔ اسی طرح معراج والی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے لیے ہر آسمان پر دروازہ کھلا اور آپ ﷺ اوپر تشریف لے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ چاند، سورج اور تارے اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں اور زمین کے بارے میں دو لفظ آتے ہیں کہ زمین کو ہم نے ثابت بنایا، ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ﴾ [البقرة:22] اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین کو جمانے کے لیے ہم نے پہاڑوں کی میخیں لگا دیں، ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴾ [النبأ:6،7] دیکھو! کیا ہم نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا نہیں بنا دیا، کیا ہم نے اس میں پہاڑوں کی میخیں نہیں لگا دیں کہ زمین حرکت نہ کرے۔ اس لیے راجح یہ بات محل نظر ہے، کیونکہ زمین کی حرکت کا مشاہدہ ہے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کے مخالف بھی نہیں ہے۔ اقوال اسی طرف ہیں کہ زمین کے پھرنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

زمین کی گردش کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جواب:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ایک آدمی نے آکر سوال کیا کہ زمین گردش کر رہی ہے اور بہت تیزی سے گردش کرتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان سے فرمایا: تم کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا: میرا کھجوروں کا باغ ہے۔ آپ نے فرمایا: تمہارے کنویں کا پانی کبھی اُلٹا ہو کر آیا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: جس دن تیرے کنویں کا پانی اُلٹا ہو جائے اور تم سر کے بل ہو جاؤ تو مجھے آکر بتانا کہ زمین چکر کاٹ رہی ہے یا نہیں کاٹ رہی، ورنہ اپنی عقل کو مت دوڑاؤ اور اتنی بات پر رہو جتنی بات حضور اکرم ﷺ نے سمجھائی ہے۔ جو چیزیں سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی، ان میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں نہیں اُلجھایا، مثلاً اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے چاند کی تاریخ رکھی ہے، سورج کی تاریخ نہیں رکھی، ورنہ چاند بھی اسی کا ہے اور سورج بھی اسی کا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چاند کو ہر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ آج تیسری کا چاند ہے یا پہلی کا چاند ہے۔ اگر سورج کا معاملہ ہوتا تو اس کی رفتار اندازہ کرنا رصد گاہوں کے علاوہ ممکن نہ ہوتا۔ اس لئے جتنی چیزیں اللہ تعالیٰ نے بتائیں، ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' اور جتنی باتیں حضور اکرم ﷺ نے بتائیں ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا''۔ ان کے علاوہ جو معلومات ہیں وہ ٹھیک بھی ہو سکتی ہیں اور غلط بھی ہو سکتی ہیں، صرف اللہ تعالیٰ و رسول کی

بات غلط نہیں ہوسکتی۔

﴿وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ دن چلا گیا رات آگئی، رات چلی گئی دن آگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک دوسرے کا خلیفہ بنادیا، اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں کرسکتا۔ فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا﴾ [الفرقان: ۶۲] میں نے دن کو رات کا خلیفہ بنایا اور رات کو دن کا خلیفہ بنایا۔ خلیفہ کہتے ہیں جو کسی چیز کے بعد آئے۔

نکتہ:

علماء نے لکھا ہے کہ اصل خلیفہ اس کو کہتے ہیں جس کے ہوتے ہوئے وہ خلیفہ آجائے، مثلاً بیٹا باپ کا خلیفہ ہوتا ہے اور باپ کے ہوتے ہوئے بھی وہ آجاتا ہے اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ باپ کی زندگی میں حمل ٹھہر گیا، پھر باپ مر گیا، بچہ بعد میں پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے رات کو دن کا اور دن کو رات کا خلیفہ بنایا، دن جب آتا ہے تو رات کا کچھ حصہ باقی ہوتا ہے تو وہ خلیفہ (دن) آجاتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ آپ نے رمضان کا چاند دیکھا تو اسی رات تراویح شروع کردی، حالانکہ روزہ ابھی نہیں آیا، لیکن اس پر اثر قائم کردیا۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں: آج جمعرات ہے، حالانکہ جمعہ تو بعد میں آیا، لیکن اس کا اثر اس پر شروع ہوجاتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے اگر آپ تحقیق کریں چاروں صحابہ رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء ہیں، اگر حقیقی طور پر ''من جمیع الوجوہ'' دیکھا جائے تو خلافت کے حق دار صرف سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ تھے۔ اسی لیے جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ''خلیفۃ الرسول'' لکھا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے خلیفہ نہ لکھو، کیونکہ میں تو ابوبکر کا خلیفہ ہوں، اگر خلیفہ لکھو گے تو یوں لکھنا پڑے گا: ''خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ'' اور میرے بعد جو آئے گا اس کے لیے آپ کو ''خلیفۃ خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ'' لکھنا پڑے گا۔ اتنی لمبی بحث میں کیوں پڑتے ہو؟ صرف ''امیر المؤمنین'' لکھ دو، کافی ہے۔

ابھی عرض کیا تھا کہ خلافت کی شان یہ ہے کہ جس کا خلیفہ بننا ہے، اس کے ہوتے ہوئے آجائے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مصلّی پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آگئے اور یہ مقام صرف سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ملا۔ لہٰذا صحیح معنی میں جو مرتبۂ خلافت ہے، وہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اس لیے کہا جاتا

ہے: "خلیفة بلافصل" جس کے درمیان میں کوئی حائل نہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے فوراً بعد خلافت پر آنے والے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ جیسے دن کے بعد رات ہے اور رات، دن کی خلیفہ ہے، ان کے درمیان میں یہ نہیں ہوتا کہ ابھی رات ہے، درمیان میں کوئی اور چیز آجائے، پھر دن ہوگا۔ اور یہ نہیں کہ دن چلا جائے اور رات نہ آئے، یا رات تو چلی جائے اور دن نہ آئے، اس میں کچھ دیر ہو جائے، بلکہ جو اللہ تعالیٰ کا نظام ہے ویسے ہی ہوگا۔

﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۝﴾ [یٰسین: ۴۰]

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا نظام دیکھو کہ کبھی دن بڑا ہے اور کبھی رات بڑی ہے۔ کبھی اس سے لے کر اس میں ڈال دیتے ہیں اور کبھی اس سے لے کر اس میں ڈال دیتے ہیں اور کبھی ہم ان کو برابر کر دیتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؗ كُلٌّ يَّجْرِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۝﴾ [لقمان: ۲۹] کہ کبھی دن کا کچھ حصہ رات کو دے کر رات کو بڑھا دیتے ہیں اور کبھی رات کا کچھ حصہ دن کو دے کر دن کو بڑھا دیتے ہیں۔

﴿وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾

میرے بندو! غور کرو! میں نے زمین پر چلنے والی مخلوقات کی کتنی اقسام پیدا کی ہیں۔ صرف انسانوں میں دیکھو تو کتنے رنگ اور کتنی شکلیں ہیں؟ ایک ایک بندے کے اندر کتنے اعضاء ہیں؟ ایک ایک عضو پر نظر ڈالو تو قدرت کا کمال نظر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی کتنی قسمیں بنائی ہیں؟ اور پھر ان کے اندر رنگ دیکھو اور ان کے منافع دیکھو اور ان جانوروں میں کوئی بڑا ہے، کوئی چھوٹا ہے، کوئی سیاہ ہے، کوئی سفید ہے۔ کوئی گرم علاقوں میں ہے، کوئی ٹھنڈے علاقوں میں ہے۔ تم جب ان سب چیزوں پر نظر ڈالو گے تو تمہیں میری اُلوہیت اور وحدانیت کی دلیلیں نظر آئیں گی۔

ان کے رنگوں کو دیکھو کہ بعض رنگ ایسے ہوتے ہیں کہ ایک دم سے نظر نہیں آتے، بلکہ ضعف سے شدت کی طرف بڑھتے ہیں اور بعض شدت سے ضعف کی طرف بڑھتے ہیں اور بعض رنگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ ثابت رہتے ہیں، ان میں تبدیلیاں نہیں ہوتیں۔ مثلاً آپ گندم کا ایک دانہ ڈالیں، جب نکلے گا تو اس کا رنگ اور ہوگا اور جوں جوں گندم بڑی ہوتی جائے گی اس کا رنگ اور ہوتا جائے گا، جب اس پر دانے لگیں گے تو ان کا رنگ ہوگا اور جب دھوپ میں پک جائے گی تو اس کا رنگ بدل جائے گا۔ اسی طرح پھلوں اور درختوں کا رنگ ہے۔ لیکن بعض رنگ

ایسے ہوتے ہیں جو نہیں بدلتے، جیسا کہ انسانوں کا، حیوانوں کا، پہاڑوں کا رنگ، جو اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے وہی رنگ قائم رہے گا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کے منافع پر نظر ڈالو کہ ہر چیز کے اندر ہم نے منافع رکھے ہیں۔ پھر یہ ساری چیزیں تیری خدمت کے اندر مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جو انسانوں کے کام نہ آتی ہو۔ دیکھیں! دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک چیز سانپ ہے، لیکن اب وہ بھی فٹوں کے حساب سے بکتا ہے، بعض سانپ ایسے ہوتے ہیں کہ بیس ہزار روپے کا ایک فٹ ہوتا ہے، بعض سانپ ایسے ہیں جن کے چمڑے بکتے ہیں اور بعض سانپ ایسے ہیں جن کا زہر بکتا ہے۔ اس وقت دنیا میں سونا، چاندی، پلاٹینم سے مہنگا بکتا ہے، کیونکہ اس سے تریاق بن رہا ہے اور ایسی ایسی بیماریوں کے علاج کے لئے کام آرہا ہے جن کا کوئی علاج نہیں تھا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ساری چیزیں تیری خدمت کے لئے پیدا کی ہیں، یہ نہ ہو کہ تم میری زمین پر رہو، میرے آسمان کے نیچے رہو، میری پیدا کی ہوئی غذائیں استعمال کرو، میرے جانوروں کی سواری استعمال کرو، میرے جانوروں کا دودھ استعمال کرو اور پھر سجدہ غیروں کو کرو، نذر و نیاز دوسروں کی کرو اور میری ذات کے ساتھ شرک کرو تو دنیا میں اس سے بڑی کوئی بغاوت نہیں ہے۔ اس لیے جیسے دنیا میں بغاوت کی سزا موت ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی شرک کی سزا جہنم رکھی ہے کہ اس سے کبھی نکلنا نہیں ہوگا۔

میرے رب نے جتنی مخلوق پیدا کی ہے سب کو جاننا بھی اسی کا کمال ہے۔ پرندے ہیں، وہ اپنے اپنے گھونسلوں میں، کوئی جنگل میں ہے اور کوئی غاروں میں ہے، جس نے مٹی کھانی ہے اس کو مٹی ملتی ہے، جس نے گوشت کھانا ہے اس کو گوشت ملتا ہے اور پھر ہر جانور اور پرندے کو اس کے رزق اور نفع و نقصان کے بارے میں معلومات مہیا کرنا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کمال ہے۔ آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ شیر گھاس کھائے، بلکہ وہ گوشت کھاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیں کہ جب شیر بیمار ہو جاتا ہے تو اس کو پتہ ہے کہ جنگل میں فلاں بوٹی کا پتہ ہے، وہ کھالوں تو ٹھیک ہو جاؤں گا تو وہ جا کر وہی کھائے گا۔ اسی طرح بندر اور دوسرے جتنے جانور ہیں ان کو کہیں زخم آ جائے تو فوراً جا کر بوٹیوں کو لے آئیں گے اور کھا کر ٹھیک ہو جائیں گے اور بعض اوقات زخم کو چاٹتے ہیں، کیونکہ اس کے لعاب کے اندر جو اللہ نے مادہ رکھا ہے، وہ ان کے زخم کا علاج ہے۔

ایک مرغی کو انڈوں پر بٹھایا، اس کے بیس پچیس بچے نکل آئے اور قدرت کا کیا نظارہ ہے کہ مرغی آگے جا رہی ہوتی ہے اور چھوٹے چھوٹے بچے اس کے پیچھے جا رہے ہوتے ہیں۔ جب وہ بچے بلی کو دیکھیں گے یا اس کی آواز کو

سنیں گے تو فوراً ماں کے پروں کے نیچے جائیں گے، حالانکہ گھر کا مالک موجود ہے، مرغی کا بچہ اس کی طرف کبھی نہیں دوڑتا، بلکہ وہ فوراً ماں کے نیچے جائے گا کہ یہیں سے مجھے شفقت اور مدد کی اُمید ہے۔ چوہے کو پتہ ہے کہ بلی دشمن ہے، بلی گھر میں آجائے تو وہ رخصت ہو جاتے ہیں، بلی کو صندوق میں بند کر کے تالا لگا دیں اور اس کو بہت دور چھوڑ آئیں تو کچھ دنوں کے بعد دوبارہ تمہارے گھر میں ہوگی۔ اس کو کس نے یہ راستے سمجھائے؟ اس نے کس پیر کی منت مانی؟ وہ کہاں کہاں ٹو راتیں بیٹھی؟ اس نے کون سے غیروں کی مدد مانگی اور پکارا؟ یہ تو اللہ کا نظام ہے جسے اللہ تعالیٰ چلا رہے ہیں۔

ہوائیں بھی اللہ کی نعمت:

﴿وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ﴾ اور ان ہواؤں کے چلنے پر غور کرو کہ ان کا خالق اور ان ہواؤں کو چلانے والا اللہ تعالیٰ کبھی مشرق سے مغرب کی طرف اور کبھی مغرب سے مشرق کی طرف اور کبھی شمال سے جنوب کی طرف اور کبھی جنوب سے شمال کی طرف چلاتے ہیں۔ بعض ہواؤں سے اللہ تعالیٰ نے نزولِ رحمت کا کام لیا اور بعض ہواؤں سے نزولِ عذاب کا کام لیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"نُصِرْتُ بِالصَّبَا، وَ أُهْلِكَتْ عَادٌ بِالدَّبُوْرِ." [صحیح بخاری، رقم: ۱۰۳۵]

"اللہ تعالیٰ نے میری مدد بادِ صبا سے کی ہے اور قوم عاد کو اللہ تعالیٰ نے دبور کی ہوا سے ہلاک کر دیا۔"

اس میں کمالِ قدرت ہے کہ ہواؤں کو پیدا کیا اور پھر ہوا اتنی لطیف چیز ہے کہ نظر نہیں آتی، لیکن موجود ہے اور اس کی اتنی وسعت ہے کہ اس کے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب ہواؤں پر نظر ڈالیں تو اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت کی صفات نظر آئیں گی اور اس سے لوگوں کے لیے نفع کے سامان بنا دیے تو اس سے رحمان و رحیم کی صفت نظر آئے گی۔ اللہ تعالیٰ ان سے کبھی بادلوں کو جمع کرتے اور چلاتے ہیں اور ان ہواؤں سے کبھی ان بادلوں کو ہٹا دیتے ہیں۔

ہواؤں کے مختلف نام:

ريح الشمال، ريح الجنوب، ريح الأزيب، ريح الجربياء، ريح الصبا، ريح القبول، ريح الدبور.

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے ہوا کے اوپر بھی کتابیں لکھی ہیں اور اس کے اندر ہواؤں کے نام، ان کی اقسام، ان کے فوائد اور منافع ذکر کیے ہیں۔ ان کو یہاں ذکر کرنے سے بلا وجہ ایک طوالت ہوگی۔ اگر کسی نے اس

فن کو پڑھنا ہو تو علیحدہ کتابیں موجود ہیں، وہاں دیکھ سکتا ہے، جیسے (کتاب الریح لابن خالویہ، المتوفی: ۳۷۰ھ)۔

یاد رکھیں! یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک نظام ہے۔ دنیا میں جیسے ایک بادشاہ ہوتا ہے، اس کی رعایا کے اندر اس کے اپنے بھی ہوتے ہیں، اس کے قبیلے والے بھی ہوتے ہیں، اس کی تائید کرنے والے بھی ہوتے ہیں اور اس کی مخالفت کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سارے بادشاہوں کے بادشاہ ہیں اور تمام کائنات کے خالق و مالک ہیں۔

دوسری بات یہ یاد رکھیں کہ ایک ملک عارضی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی نے آپ کو کہا: یہ آپ عینک رکھ لیں اور اس سے فائدہ اُٹھائیں تو اب یہ آپ کی عارضی مِلک ہو گئی اور کچھ اس سے زیادہ ملک ہوتا ہے کہ آپ نے خرید لیا تو یہ آپ کا ملک ہو گیا، لیکن حقیقتاً یہ بھی عارضی ہے کسی وقت ٹوٹ جائے گی، گر جائے گی۔ میں مر گیا تو میری جائیداد تقسیم ہو گئی، میرے ورثاء کے بعد ان کے ورثاء کو چلی گئی۔ اسی طرح بات بڑھتی گئی اور آگے جا کر ضرب تقسیم ہوتی رہی اور پھر سب چلے گئے تو بات ختم ہو گئی۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا ملک حقیقی ملک ہے، کیونکہ وہ خالق ہے اور جو خالق ہوتا ہے حقیقت میں وہ مالک ہوتا ہے، باقی تو مجازی مالک ہیں۔ اس لئے آتا ہے: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ [آل عمران: ۲٦] اس ملک کا مالک اللہ ہے۔ فرمایا: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۝۱﴾ [الملک: ۱] اسی کے قبضۂ قدرت میں ملک ہے اور کہیں فرمایا: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [البقرۃ: ۱۰۷] اسی ہی کے لئے ہے ملک آسمانوں اور زمینوں کا، اور کہیں فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ [آل عمران: ۱۰۹] اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمینوں میں ہے۔ آپ جہاں جہاں نظر ڈالیں مالک حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، باقی سب دنیا قابلِ فنا ہے، قابلِ ہلاک ہے۔ دنیا کے اندر جتنے دعوے ہیں سب عارضی ہیں، محدود زمانے کے اور محدود مکان تک ہیں۔

﴿وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۱۶۴﴾

سحاب، بادل کو کہتے ہیں۔ اسی آیت میں پہلے آیا کہ پانی آسمانوں سے بھی اُترتا ہے اور بادلوں سے بھی اُترتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے زمین پر پانی کے خزانے تقسیم کیے ہیں کہ پہاڑوں کے اوپر برف جما دیتے ہیں، وہ پگھلتی ہے تو دریا چلتے رہتے ہیں اور بندوں کے کام ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی حفاظت بندے بھی نہیں کر سکتے اور ان

پہاڑوں کی رگیں ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں، ان رگوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کچھ پانی پھر زمین کے اندر داخل کر دیتے ہیں اور کچھ پانی اللہ تعالیٰ اوپر محفوظ رکھتے ہیں۔ ایسے ہی آسمانوں کے اوپر بھی اللہ تعالیٰ نے دریا رکھے ہوئے ہیں، جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو اس دریا کو حکم دے دیتے ہیں اور زمینوں کو بھی حکم دے دیتے ہیں، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ یا اللہ! اس قوم میں ایمان لانے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی، ان کو ہلاک و برباد کر دے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ آسمانوں کے دروازے بھی کھولو اور زمین کو حکم دیا کہ تم بھی اپنے چشمے باہر نکالو۔ یہ دونوں پانی جب ایک بن گئے تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ پورا ہو گیا کہ ساری زمین پر پانی کا طوفان آ گیا۔ آسمانوں سے بھی اللہ تعالیٰ بارش برساتے ہیں اور ان بادلوں سے بھی اللہ تعالیٰ بارش برساتے ہیں، لاکھوں ٹن پانی دے کر ان بادلوں کو آسمان و زمین کے درمیان بغیر کسی ستون کے معلق رکھتے ہیں اور اللہ کے حکم کے بغیر ان سے قطرہ بھی نہیں گرتا۔ ان ساری چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کی نشانیاں رکھی ہیں ان لوگوں کے لیے جن کو عقل ہے، اور جو شرک کر کے اپنی عقل ختم کر چکے ہیں، ان کے لئے نشانیاں نہیں ہیں، کیونکہ وہ آخرت کے علم سے غافل ہیں۔ یہ دنیا کے پیچیدہ مسئے حل کر رہے ہیں، لیکن میری توحید کو نہ سمجھ سکے۔

(حدیث) حافظ ابو بکر بن مردویہ رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے کہ قریش کے سردار حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے: اے محمد! ہم آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں کہ آپ اپنے رب سے دعا مانگیں کہ اللہ اس صفا پہاڑ کو سونے کا بنا دیں اور پھر ہم یہ سونا بیچیں گے، گھوڑے اور ہتھیار خریدیں گے اور پھر ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور پھر ہم آپ کے ساتھ مل کر آپ کے دشمنوں سے قتال کریں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر میں یہ دعا کروں اور اللہ تعالیٰ ایسا کر دیں تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ انہوں نے کہا: ہم ایمان لے آئیں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے دعا کی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو نازل فرمایا کہ میرے نبی (ﷺ) سے کہہ دیں کہ اگر آپ چاہتے ہیں تو ہم جبل صفا کو سونے کا بنا دیتے ہیں، لیکن پھر سنۃ اللہ یہ ہے کہ جو قوم اپنے منہ سے معجزہ مانگے اور وہ ہم دے دیں، اس کے بعد وہ ایمان نہ لے آئیں تو ہم ایسا عذاب دیں گے جو عالم میں کبھی کسی کو نہیں ہوا ہوگا۔ آپ چاہتے ہیں تو ہم صفا پہاڑ سونے کا بنا دیتے ہیں، اگر آپ کی قوم ایمان نہ لائی تو ہم عذاب نازل کریں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''رَبِّ لَا، بَلْ دَعْنِيْ وَ قَوْمِيْ، فَلْأَدْعُوْ يَوْمًا بِيَوْمٍ'' میرے اللہ! میری قوم کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، میں ان کو دعوت دیتا رہوں گا، جن کے مقدر میں دعوت

ہے وہ ایمان لے آئیں گے اور جن کے مقدر میں ایمان نہیں ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ تعالی نے قرآن پاک میں یہ آیات نازل فرمائیں کہ ان کو نشانیاں نہیں چاہئیں، یہ تو محض استہزاء کرتے ہیں، اگر انہوں نے نشانیاں دیکھ کر ایمان لانا ہوتا تو آسمان وزمین سے بڑی کوئی نشانی ہے؟ ''اختلاف اللیل و النھار'' سے بڑی بھی کوئی نشانی ہے؟

کافر اور مسلمان کی سوچ میں فرق:

اس سے یہ اشارہ ملا کہ کافر کی نظر دنیا پر ہوتی ہے کیونکہ اس کا مطمح نظر دنیا ہے۔ دنیا کے بعد والے عالم پر اس کا ایمان ہی نہیں ہے اور جس آدمی کا جس چیز پر ایمان ہو تو وہ اسی کے لئے محنت کرتا ہے، اس لئے کافر کہتے ہیں: ﴿إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ﴾ [الانعام:۲۹] بس یہی دنیا کی زندگانی ہے، اس میں ہم مرتے ہیں، اسی میں ہم پیدا ہوتے ہیں، اسی میں ہم مر جائیں گے، اس کے بعد ہم نہیں اُٹھائے جائیں گے، کوئی قیامت نہیں، کوئی آخرت نہیں، کوئی جنت جہنم نہیں ہے۔ اس لئے ان کی نظر دنیا پر ہوتی ہے، نبی سے مانگنے کے لیے آئے تو دنیا مانگنے آئے کہ صفا سونے کا پہاڑ بن جائے، اس سے گھوڑے اور ہتھیار خریدیں گے۔ کیونکہ یہ جنگجو قوم تھی، ان کا ہر وقت کام ہی ڈاکے، لوٹ مار اور قتل عام تھا۔

مومن اور کافر کی نظر میں دنیا کی حیثیت:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اَلْمُؤْمِنُ يَأْكُلُ فِي مِعًى وَاحِدٍ، وَ الْكَافِرُ يَأْكُلُ فِي سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ.'' [صحیح بخاری، رقم: ۵۳۹۳]

مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔ مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اس کا بظاہر معنی تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ کافر زیادہ کھاتا ہے، یعنی وہ دنیا میں کھانے وغیرہ میں بہت حریص ہے۔

جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہم آپ کے لیے ایک اچھا جوڑا بنا دیں کہ جب باہر کے لوگ آئیں تو آپ بھی اچھا لباس پہنیں۔ آپ بالکل سادہ لباس پہنتے ہیں تو باہر کے لوگوں پر اچھا تاثر نہیں ہوگا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندو! کیا کہتے ہو؟ اللہ کے فرشتے نے صور پر منہ رکھا ہوا ہے، آنکھیں اوپر ہیں اور حکم کا انتظار کر رہا ہے، جب آخرت اتنی قریب ہے تو ہمیں دنیا کے لباس کی کیا ضرورت ہے؟

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جب وفات کا وقت قریب آیا تو وصیت فرمائی کہ میری پرانی چادروں کو دھو ڈالو اور انہی میں مجھے کفن دینا۔ عرض کیا گیا: دو نئی چادریں لے لیں۔ فرمایا: نئی چادریں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے غریبوں کے کام آجائیں گی، مُردے کو نئی چادروں کا کیا فائدہ ہے؟ اگر میرے اعمال اچھے ہیں تو انہی پرانی چادروں میں جنت کا باغ ہوگا اور اگر اعمال بُرے ہیں تو چاہے ریشم کے کپڑوں میں کفن دو، بے فائدہ ہے۔

اس لئے یاد رکھیں! مومن کی نظر ہمیشہ آخرت پر ہوتی ہے، دنیا پر اس کی نظر نہیں ہوتی اور کافر کی نظر دنیا پر ہوتی ہے آخرت پر نہیں ہوتی۔

علماء نے قرآن وسنت کی روشنی میں لکھا ہے کہ دنیا میں علماء حق اور علماء سُوء کا امتیاز اس طرح کریں گے کہ علماء حق انبیاء کے وارث ہوں گے، ان کی نظر دنیا پر نہیں ہوتی اور جو علماء سُوء ہوتے ہیں، ان کی نظر ہمیشہ دنیا پر ہوتی ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام نے فرمایا: ﴿اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الشعراء: ۱۰۹] میں تو ثواب بھی رب سے مانگتا ہوں، آپ لوگوں سے تو شکریہ بھی نہیں مانگتا تو جب مجھے آپ سے لالچ نہیں ہے تو میں غلط بات کیوں کروں گا؟ اسی طرح علماء حق اللہ سے اجر مانگتے ہیں، ان کے مقابلہ پر دیکھیں کہ جب فرعون نے بڑے بڑے جادوگروں کو بلایا تو انہوں نے فرعون سے کہا: ﴿اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ﴾ [الاعراف: ۱۱۳] اگر ہم موسیٰ (علیہ السلام) سے جیت جائیں تو ہمیں کیا ملے گا؟ فرعون نے کہا: میں تمہیں بڑے بڑے انعام دوں گا، تم میرے کرسی نشین بنو گے، تمہیں بڑے بڑے خطابات سے نوازا جائے گا کہ کسی کو سر کا خطاب ملے گا اور کسی کو شمس العلماء کا خطاب ملے گا۔ تمہیں ہم بڑی بڑی ڈگریاں دیں گے، تم اللہ کے نبی کے ساتھ مقابلہ تو کرو۔ اللہ نے تو یہاں وادیوں کی وادیاں سونے کی بنادیں، وہ تمہیں بھی دے سکتے ہیں، بس اس کا ایک فیصلہ ہے: ﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓي اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ کہ بستی والے ایمان لے آئیں، میری توحید کا اقرار کرلیں اور متقی و پرہیزگار بن جائیں، نافرمانیاں چھوڑ دیں، میرے قانون پر عملدرآمد کرلیں تو میں آسمان وزمین کے خزانوں کے دروازے کھول دیتا ہوں، ﴿وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [الاعراف: ۹۶] لیکن جب انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے بھی انہیں عذاب میں پکڑلیا۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾﴾ [البقرۃ:۱۶۵ تا ۱۶۷]

''اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو غیر اللہ کو معبود بنا لیتے ہیں ان سے ویسی محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ سے محبت رکھنی چاہیے، اور جو ایمان لائے وہ اللہ سے انتہائی محبت رکھتے ہیں اور کیا خوب ہوتا اگر مشرک جب دنیا میں مصیبت کو دیکھتے تو سمجھ جاتے کہ سب قدرت اللہ کے پاس ہے اور اللہ سخت عذاب والا ہے۔ جب بیزار ہو جائیں گے وہ لوگ جن کی اتباع کی گئی تھی ان لوگوں سے جنہوں نے اتباع کی تھی اور عذاب (دوزخ) دیکھ لیں گے اور ان کے سب تعلق کٹ جائیں گے۔ اور اتباع کرنے والے (گمراہ) کہیں گے: کاش! ہم (دنیا میں) لوٹ جاتے اور ہم بھی ان سے ایسے بیزار ہوتے جس طرح وہ ہم سے بیزار ہوئے ہیں، اسی طرح سے اللہ ان کو ان کے اعمال ان پر حسرتیں بنا کر دکھائے گا اور وہ جہنم سے نہیں نکالے جائیں گے۔''

آیات کا شانِ نزول:

دوسری جگہ ''أَرْبَابٌ'' کا لفظ آتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے احبار کو خدا بنا رکھا ہے۔ جب یہ آیت اُتری تو ایک صحابی جو ابھی تازہ تازہ مسلمان ہوئے تھے، انہوں نے کہا: یارسول اللہ! ہم نے کبھی اپنے علماء کو رب نہیں بنایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے احبار، رہبان تھے، مولوی تھے اور قرآن کہہ رہا ہے کہ ان کو رب بنایا ہوا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ پیر اور تمہارے مولوی اگر کہہ دیتے کہ یہ چیز حلال ہے تو تم اس کو حلال سمجھتے تھے؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! یہ بات تو ٹھیک ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر انہوں نے کہہ دیا کہ یہ کام کرو تو کرتے تھے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: اگر انہوں نے منع کر دیا کہ یہ کام نہ کرو تو نہیں کرتے تھے؟ صحابی نے عرض کیا: جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: حرام، حلال کرنے والا تو رب ہے، جب تم بندوں کے

کہنے پر حلال حرام مان لو تو گویا تم نے خدا کے مقابلے میں ان کو رب بنالیا۔

''أَنْدَاد''، ''نِدٌّ'' کی جمع ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا جو شریک بنالیا اور ان سے ایسی محبت کی جیسے اللہ سے محبت کی جاتی ہے۔

آیات میں مشرکین مکہ کی حالت کا بیان:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ کے اندر مشرکین کا دنیا میں حال اور جو اُن کا آخرت میں انجام ہوگا، اس کا ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا: دنیا کے اندر مشرکین کا یہ حال ہے کہ انہوں نے چھوٹے چھوٹے خدا بنا رکھے ہیں، ان کی عبادت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنی چاہیے۔ آج لوگوں کو ایک بڑا دکھ ہے کہ جو لوگ اللہ کے سوا بتوں، دیوی، دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں اور جو لوگ سورج، چاند اور آگ کی پوجا کرتے ہیں، صرف وہ کافر ہیں۔ یہ بات نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَنْدَادًا﴾ [البقرۃ:۱۶۵] اور فرمایا: ﴿وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [الاحقاف:۵] تو اللہ نے ہر جگہ ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ فرمایا کہ اللہ کے سوا، اس کے اندر ساری مخلوق آگئی ہے اور اگر کوئی اللہ کے سوا انبیاء کو بھی عبادت کے لائق سمجھ لے تو وہ بھی مشرک ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی اللہ کے فرشتوں کو حاجت روا، مشکل کشا سمجھ لے، ان کی عبادت کرے اور ان کو پکارے، ان کی نذر و نیاز کرے تو یہ بھی شرک ہے۔ عبادت کے معنی کے اندر آج لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ نماز پڑھیں گے تو عبادت ہے۔ حالانکہ نماز بھی عبادت ہے، دعا اور پکارنا بھی عبادت ہے۔ جیسے اگر کوئی غیر اللہ کی نماز پڑھے تو کافر ہو جائے گا، اسی طرح غیر اللہ کو پکارے تو کافر ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک آدمی کسی کو پوجتا نہیں ہے۔ ایک طبعی محبت ہوتی ہے کہ ہر آدمی کو اپنی اولاد سے، اپنی بیوی، اپنے والدین سے محبت ہوتی ہے، یہ محبت غیر اختیاری ہے، اختیاری محبت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونی چاہیے۔ یوں سمجھیں کہ ایک آدمی کا ایک خوبصورت، سمجھدار بیٹا ہو، باپ کی جان ہر وقت بیٹے میں اٹکی ہوئی ہے، اگر وہی بچہ قرآن کو اُٹھا کر پھینک دے تو وہی باپ اُٹھ کر اس کو تھپڑ مارے گا کہ بدبخت! تو نے اللہ تعالیٰ کے قرآن کو پھینک دیا ہے۔ اب بچے کی محبت ختم ہوگئی اور اللہ کی محبت غالب آگئی۔ اس لیے جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت آجائے مومن وہاں سب کو چھوڑ دے گا۔ اس لیے فرمایا: ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَنْدَادًا﴾ جو اللہ کے علاوہ شریک بنائے، وہ مشرک ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی اپنے شاگرد کو نصیحت:

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ جو اللہ کے بہت بڑے ولی گزرے ہیں۔ ان کے پاس ایک شاگرد، خادم تھا۔ حضرت کا بڑا مطیع، فرمانبردار تھا۔ حضرت نے اس کو بعد میں خلیفہ بنادیا۔ جب وہ خلیفہ بن کر اپنی تربیت مکمل کر کے جانے لگا تو حضرت کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمادیں۔ حضرت نے فرمایا: ایک تو خدائی کا دعویٰ نہ کرنا اور ایک نبوت کا دعویٰ نہ کرنا، اپنے آپ کو انسان ہی رکھنا۔ اس نے کہا: حضرت! کمال ہوگیا، اتنا عرصہ میں نے آپ کی خدمت کی، علم حاصل کیا، میں نے اللہ اللہ سیکھا اور آپ نے میری تربیت کی، آپ نے میرا تزکیۂ نفس کیا۔ میں جب اس مرتبہ پر پہنچا تو آپ نے مجھے خلافت سے نوازا اور اب جا رہا ہوں تو آپ کو مجھ پر گمان ہے کہ میں خدائی کا دعویٰ کروں گا، پھر تو میں مسلمان بھی نہ رہا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے فرمایا: ٹھنڈے دل سے بات کو سمجھو کہ تم کبھی مثلاً ایسی بات شیخ بن کر کہہ دو کہ ہم نے کہہ دیا ہے آپ کو بچہ ملے گا۔ یہ بات خدا کہہ سکتا ہے، بندے کی طاقت نہیں ہے۔ اللہ چاہیں تو دے دیں اور اگر چاہیں تو نہ دیں۔ اس لئے ایسی باتیں نہ کرنا کہ جن سے خدائی کا دعویٰ نکلے۔ کبھی یہ نہ کہنا کہ آپ میری مخالفت کر رہے ہیں، میں آپ کو برباد کر دوں گا۔ یہ دعویٰ کرنا تو اللہ کی شان ہے۔ وہ کسی کو آباد کرے یا کسی کو برباد کرے۔ لہٰذا جب تم ایسی باتیں کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدائی کے دعوے کر رہے ہو۔ اور تم نبوت کا دعویٰ بھی نہ کرنا کہ کوئی آدمی تیرے پاس آ کر کہے کہ حضرت! آپ نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے، لیکن یہ مسئلہ صحیح نہیں لگتا اور تم کہو کہ میری بات تو غلط نہیں ہوسکتی، جس نے آپ کو کہا، وہ غلط ہے۔ کسی کی بات غلط نہ ہو، یہ نبی کی شان ہے، اللہ کے انبیاء معصوم ہوتے ہیں، ان کی بات وحی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے ایسی باتیں نہ کرنا اور اپنے آپ کو بندہ ہی سمجھنا۔

غیر اللہ کو پکارنا بڑا گناہ ہے:

''عَنْ عَبْدِاللّٰہِ، قَالَ: قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! أَیُّ الذَّنْبِ أَعْظَمُ؟ قَالَ: أَنْ تَجْعَلَ لِلّٰہِ نِدًّا وَ ھُوَ خَلَقَکَ.''

[صحیح بخاری، رقم: ۱۰۰۱]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ شریک کرو، جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔

﴿وَالَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ جو صحیح معنی میں مومن ہیں، وہ سب سے زیادہ محبت اپنے اللہ سے کرتے ہیں۔ لفظ "اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" آیا، یعنی تھوڑی تھوڑی محبت تو اوروں سے بھی ہو سکتی ہے، لیکن وہ اللہ کی محبت سے بڑھ نہیں سکتی کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو ٹال دے۔ مثلاً آدمی کو عورت سے محبت ہے، لیکن اس کو طلاق دے بیٹھا تو اب آدمی کہتا ہے کہ وہ مجھ پر حرام ہو گئی ہے، اللہ کا حکم ہے میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ اللہ کے ساتھ محبت ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم آ گیا کہ یہ حلال ہے تو اس کو حلال سمجھے اور جہاں حرام کا حکم آ گیا تو اس کو حرام سمجھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آج دوبارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو زندہ کر دیں، ہم جب ان کو دیکھیں گے تو ہم کہیں گے کہ یہ دیوانے لوگ ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم جب ہمیں دیکھیں گے تو کہیں گے: پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں؟ انہیں اسلام کے بارے میں دور کا پتہ نہیں۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی اور قرآن کے اندر یہ واقعہ آیا ہے کہ ان کو طلاق ہو گئی۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی بیٹی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لیے ان کا رشتہ مانگا، لیکن بی بی زینب رضی اللہ عنہا نے انکار کر دیا کہ میں زید سے نکاح نہیں کرنا چاہتی۔ زید ایک غلام ہے، میں ایک سردار زادی ہوں، نبی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بھائی نے بھی انکار کر دیا اور کہا: یا رسول اللہ! آپ کو حکم آنکھوں پر ہے، ہم نے تو سمجھا تھا کہ آپ نے اپنے لیے پیغام بھیجا ہے۔ آپ مہربانی کریں، وہ غلام ہے، اس کا نہ یہاں گھر ہے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرما دیا: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ [الاحزاب: ۳۶] یہ کیسے مومن مرد اور مومنہ عورتیں ہیں میرے نبی ایک فیصلہ کر دیں، پھر وہ کہتے ہیں کہ ہمیں منظور نہیں۔ جب یہ آیت اُتری تو بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے بھائی دوڑے ہوئے آئے کہ حضور! ہمیں نکاح منظور ہے، آپ زید کو بلائیں اور رشتہ کریں۔ بی بی کا نکاح ہو گیا، لیکن ذہن میں چھوٹے بڑے کا فرق تو رہتا ہے اس لئے ہر وقت خاوند اور بیوی کی نہ بنتی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت! میرا گزارا نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پہلے نکاح میں باتیں ہوئیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی کی بیٹی غلام کے نکاح میں دی، اب تم طلاق دے کر میرے لئے ایک اور مصیبت بنانا چاہتے ہو کہ سارا خاندان کہے گا کہ طلاق دلوا دی۔ تم صبر کرو، کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! میں اب برداشت نہیں کر سکتا تو تقدیر نے ایک مسئلہ حل فرمایا کہ منہ سے کہا

ہوا بیٹا اور ہوتا ہے اور حقیقی بیٹا اور ہوتا ہے۔ صلبی بیٹے کی بیوی سے تم نکاح نہیں کر سکتے، چاہے وہ طلاق دے دے اور اگر کسی کو منہ سے بیٹا کہا تھا تو کہنے سے بیٹا نہیں بن جاتا۔ جاہلیت میں اگر کسی کو بیٹا کہہ دیتے تو اس کو حقیقی بیٹے کے احکام دیتے تھے۔ بہر حال حضرت زید رضی اللہ عنہ نے بی بی کو طلاق دے دی تو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ آپ شادی کر لیں۔ اب یہ کتنا بڑا امتحان ہے!؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور فرمایا: اب میرے نکاح کا پیغام بھی تم بی بی زینب کے پاس لے جاؤ۔ آپ تو یہی کہیں گے کہ خود بیوی کو طلاق دے کر اس کا نکاح کراتا پھرتا ہے، اس لئے کہ تم قرآن نہیں جانتے کہ جب طلاق دے دی تو عورت اجنبی ہوگئی تو اب غیرت کا کیا مطلب ہے؟ غیرت تو اس وقت تھی جب وہ بیوی تھی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب میں پیغام لے کر آیا تو ان سے پشت کر کے کھڑا ہو گیا (کہ اب مجھے نظر ڈالنے کا حق نہیں ہے)، ان کو پکارا، انہوں نے پوچھا: کیا بات ہے؟ میں نے کہا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کا پیغام لے کر آیا ہوں تو اب بی بی نے بھی نہیں کہا کہ تم عجیب آدمی ہو، کل تم میرے خاوند تھے، مجھے طلاق دے دی، اب تم کسی اور کا پیغام لے کر آگئے ہو۔ اس میں بھی ہمارے لئے سبق ہے۔ بی بی زینب رضی اللہ عنہا نے کہا: تم اتنا بڑا رشتہ لے کر آئے ہو، لیکن میں جواب نہیں دیتی، جب تک اللہ تعالیٰ سے نہ پوچھوں، اللہ تو اُن سے بھی بڑا ہے۔ اس کے بعد میں جواب دوں گی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ واپس آگئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تو انہوں نے عرض کیا: بی بی نے کہا ہے کہ میں اپنے رب سے استخارہ کروں گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ ابھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غور فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیج کر قرآن نازل فرما دیا کہ اللہ کے نبی! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ ہم نے آپ کا نکاح خود کر دیا ہے، بی بی زینب آپ کی بیوی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا، تین دفعہ حکم پورا کر کے اندر گئے تو بی بی دوڑ کر اندر کمرے میں داخل ہو گئیں اور کہا: میرے گھر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بغیر اجازت کے کیسے آگئے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اللہ نے میرا تمہارے ساتھ نکاح کیا ہے اور یہ قرآن کی آیات ہیں۔ بی بی زینب نے جو حضرت زید رضی اللہ عنہ کو پسند نہیں کرتی تھیں، لیکن اللہ کے حکم سے نکاح کر لیا تو اللہ نے ان کو یہ بدلہ عطا فرمایا کہ ان کو محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی بنا دیا۔

یہ سارے اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ اب ایک آدمی کہے کہ میں نے دوسری شادی کرنی ہے، لیکن بیوی نہیں مانتی، وہ کب مانے گی؟ ہمارے ہاں اُلٹا چکر ہے، زنا کرتے رہیں گے، عشق بازیاں کرتے رہیں گے، دس پندرہ

عورتوں سے عشق معاشقے چلتے رہیں گے، وہ جائز ہے کہ چھوڑ و مردوں میں ایسے عیب ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ مرد کہے کہ میں شادی کرتا ہوں تو سارا خاندان تلوار لے کر کھڑا ہو جائے گا کہ تم نے شادی کی تو ہم تمہاری بہن کو طلاق دے دیں گے۔

سات شہیدوں کی بیوہ کے نکاح کا واقعہ:

یہ کہاں کا اسلام ہے؟ بس ہم نے اسلام کا نام رکھا ہوا ہے۔ میدانِ جنگ ہے، خیمے لگے ہوئے ہیں، ایک بی بی بیٹھی ہوئی ہیں، صحابی نے باہر آ کر بیٹھ کر سلام کیا، انہوں نے جواب دیا۔ صحابی نے کہا: آپ بیوہ ہیں، عدت گزر چکی ہے، میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور میری ایک بات سن بھی لیں کہ شادی بھی کرنا چاہتا ہوں اور کل میں شہید بھی ہو جاؤں گا۔ تمہاری مرضی ہے، میں تو حضور اکرم ﷺ کی سنت پوری کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: میرے سات خاوند پہلے شہید ہو گئے، آٹھویں آپ ہوں گے، گواہوں کو بلاؤ اور نکاح کر لو۔ ہمارے لوگ کسی ایسی عورت کو دیکھ لیں تو کہیں گے: یہ تو ڈائن ہے، جو بھی شادی کرتا ہے مر جاتا ہے۔ یہ ان کو پتہ نہیں کہ وہ شہادت کے مرتبہ پر چلا جاتا تھا اور وہ شہید کی بیوی کہلاتی تھی۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ شوہر مر گیا تو اب گھر بیٹھ جاؤ۔ یہ ہندوؤں کی باتیں ہیں، اسلام کی بات نہیں ہے۔ ہاں! اگر عورت صاحبِ اولاد ہے اور وہ خود نہیں چاہتی تو ٹھیک ہے، اس کی مرضی ہے۔ مومن کی شان یہ ہونی چاہیے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم آ جائے تو سب سے پیارا وہی حکم ہو۔

﴿اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ کی تفسیر:

اور جو لوگ اللہ کے سوا غیروں کی عبادت کرتے ہیں، ان کی منتیں مانتے ہیں، ان کے بارے میں فرمایا: ﴿وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ﴾ [البقرة: ١٦٥] اس آیت کا بعض علماء نے یہ معنی کیا ہے کہ جب مشرکین اللہ تعالیٰ کا عذاب چکھیں گے، جہنم کو دیکھیں گے، اس وقت یہ جان لیں گے کہ تمام قوت و طاقت کی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، تمام دنیا کا ذرہ ذرہ اس کے قہر، اس کی سلطنت اور اس کے غلبہ کے نیچے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا سب پر حکم چلتا ہے اور اللہ تعالیٰ مشرکین و کافرین کو سخت عذاب کرنے والے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اب جو اُن کے کاہن، علماء اور سردار تھے جن کے کہنے پر وہ شرک کیا کرتے تھے، آج (قیامت کے دن) وہ کہیں گے کہ ہمارا تم سے کوئی

تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس دن اَتباع متبوعین سے لڑیں گے اور متبوعین اَتباع سے لڑیں گے۔

مشرکین کی اقسام:

حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک جتنے رسول اور نبی گزرے ہیں، ان کی جو اُمتیں گزری ہیں، ان اُمتوں میں جو غیر اللہ کی عبادت کرتے رہے، ان کی اتنی اقسام ہیں کہ ہم نہیں گن سکتے کہ مشرک کتنے تھے اور ان میں شرک کی کتنی اقسام تھیں؟ لیکن مشرکین کی جو بڑی قسمیں تھیں، ایک وہ جو بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ بعض بتوں کے پجاریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ہمارا یہ بت فلاں فرشتے کی شکل میں ہے یعنی اصل وہ فرشتے کی عبادت کر رہے ہیں اور بت صرف نمونہ ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا: تم خود جا کر ان خداؤں سے پوچھ لو۔ انہوں نے کہا: تم ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہو، یہ کہاں بولتے ہیں؟ یہ کیسے بتا سکتے ہیں؟ تو ان کے دماغ میں یہ ہوتا تھا کہ یہ ملائکہ کی شکل ہے، ہم ان کی عبادت کریں گے تو گویا ملائکہ کی عبادت ہے۔

آج بھی دنیا کے اندر اگر کوئی کسی کا محبوب اور معشوق ہو تو آدمی اس کے فوٹو کو جیب میں رکھتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہی ہے کہ فوٹو والے سے محبت ہے، فوٹو سے محبت نہیں ہے، یہ تو صرف اس کی یادگار ہے کہ جب چاہا اس کو دیکھ لیا۔ میرے محبوب کو پتہ چلے گا کہ یہ تو میرے عشق میں اس حد تک دیوانہ ہو گیا ہے کہ میرا فوٹو ہر وقت اس کی جیب میں ہے۔

یہی ان مشرکین بت پرستوں کا عقیدہ تھا کہ یہ بت فرشتے کی شکل ہے اور یہ بت فلاں جنوں کے سردار کی ہے۔ کیونکہ جن ہماری مدد کرتے ہیں، جب ہم اس کو پوجیں گے تو وہ خوش ہو جائے گا۔ تیسرا ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جب اللہ والے فوت ہو جاتے تو ان کی صورت پر بھی وہ بت بنا لیتے تھے، کوئی اللہ کی صالحہ اور مقبول بی بی فوت ہو جاتی تو اس کی شکل بنا لیتے، جیسا کہ جب حضور اکرم ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی بت ہے اور بی بی مریم علیہا السلام کا بھی بت ہے۔ وہ اصل عبادت بی بی مریم علیہا السلام کی کر رہے تھے، یہ بت تو نمونہ تھے۔ آج بھی عیسائیوں کے گرجا گھر پر صلیب بنی ہوئی ہے، وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ صلیب کا نشان ہے۔ اصل تو ان کے نزدیک یہ ہے کہ یہ وہ صلیب ہے جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دی گئی، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اتنا پیار ہے کہ انہوں نے ان کی صلیب کو بھی علامت بنا رکھا ہے، اس لیے وہ جنگوں کے اندر بڑی بڑی سونے، چاندی کی صلیب آگے

گاڑھ دیتے کہ جب ہم اس صلیب کی عبادت کریں گے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پتہ لگے گا کہ میرے عاشق ہیں، جب عیسیٰ علیہ السلام راضی ہوں گے تو ہمارا کام ہو جائے گا۔ یہ ان کا اصل میں عقیدہ تھا، وہ پتھروں کے پجاری نہ تھے۔ آج بھی دیکھ لیں! ہند و پاک میں لوگوں نے اپنے بزرگوں کی بڑی بڑی تصویریں بنا کر گھر میں رکھی ہوئی ہیں، روزانہ ان پر پھول چڑھاتے ہیں، ان کا ادب کرتے ہیں۔

ڈاکوؤں کا بزرگ کی تصویر دیکھ کر سامان چھوڑ دینے کا واقعہ:

میں نے خود اخبار میں پنجاب کا ایک واقعہ پڑھا ہے کہ کچھ ڈاکوؤں نے ڈاکہ مارا، ایک بہت بڑے آدمی کے گھر میں داخل ہوئے، سارے گھر والوں کو ایک کمرے میں بند کر کے سارے گھر کی دولت سمیٹ لی، ایک کمرہ بچ گیا، ڈاکوؤں نے اس کو کھولا، تاکہ اس کمرہ میں جو مال ہے، وہ ہم نکالیں تو اس کے اندر ان کے پیر کی ایک قد آدم تصویر لگی ہوئی تھی۔ ڈاکو نے اس گھر والے سے پوچھا: اس بزرگ کی گھر میں تصویر کیوں لگائی ہوئی ہے؟ اس نے کہا: یہ ہمارے پیر و مرشد ہیں۔ ڈاکو نے باقی ڈاکوؤں کو بلایا اور کہا: جتنا سامان لوٹا ہے رکھ دو۔ ڈاکو نے کہا: اسی کے تو ہم مرید ہیں، یہ ہمارے پیر بھائی ہیں، ہم ان کے گھر میں تو ڈاکہ نہ ڈالیں۔

یہ بڑا مشہور واقعہ ہے۔ اب میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم نے جو گھروں میں تصویریں لگائی ہوئی ہیں، اگر کوئی ضعیف الاعتقاد مسلمان ہو تو وہ کہے گا: پیر نے بچا لیا ہے۔ یہ ایک اصولی بات ہے، جیسے ہندو کا بچہ ہو تو وہ کہتا ہے: بھگوان نے دیا ہے، اسی طرح عقیدے بگڑتے اور خراب ہوتے ہیں۔

بُراق کی تصویر بنانے والے:

اس لئے اب ہم لوگ اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ ہم نے براق کا فوٹو بنا کر بھی گھر میں لگایا ہوا ہے۔ اب یہ براق کا فوٹو تخیلات کی پرواز تو بنا سکتی ہے ورنہ جب معراج ہوئی مکہ والوں کو بھی پتہ نہیں، اس فوٹو کھینچنے والے کو کیسے پتہ لگ گیا؟ میں نے بعض فوٹو دیکھے، اللہ معاف کرے کہ اوپر سر عورت کی شکل کا ہے اور باقی گھوڑے یا خچر کی شکل میں ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے ایسی سواری بھیجی تھی جو عورت کی شکل رکھتی ہو؟ کیا یہ ادب ہے یا بے ادبی ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے کبھی غیر محرم عورت کو چھوا تک نہیں، جنہوں نے اسلام کی بیعت میں بھی کسی غیر محرم عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پردہ کراتے تھے، عورتیں دوسری طرف بیٹھ جاتی تھیں،

آپ ﷺ قرآن شریف پڑھتے، وہ کہتی جاتیں کہ ہم نے بیعت کی تو حضور اکرم ﷺ فرماتے: میں نے قبول کرلی۔ اب آپ لوگوں نے براق کی شکل عورت کی سی بنادی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک عورت اُڑ رہی ہے اور اس پر اللہ کا نبی بیٹھا ہوا ہے۔ معاذ اللہ! غیب کی چیزوں کے بارے میں ایسے تصورات قائم کر کے ایک چیز کا بنانا حرام ہے۔

ذی رُوح کے مصوّرین کو قیامت کے عذاب ہوگا:

دوسری بات یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جتنی ذی روح چیزیں ہیں، ان کی تصویر بلا وجہ بغیر کسی ضرورت کے کھینچنا موجب لعنت ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سب سے زیادہ عذاب قیامت کے دن مصوروں کو، فوٹو بنانے والوں کو دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم نے اس چیز کا فوٹو بنایا، اب تم ہی اس کے اندر روح ڈالو۔ بندہ کہے گا: اللہ میاں! میں روح نہیں ڈال سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: پھر نقل کیوں کی تھی؟ اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اس کو جہنم میں ڈال دو۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۡ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٦٨﴾
اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٦٩﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
قَالُوْا بَلْ نَتَّبِــعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿١٧٠﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٧١﴾﴾
[البقرۃ:۱۶۸ تا ۱۷۱]

''اے لوگو! زمین کی حلال پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ اور شیطان کے راستوں پر نہ چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تمہیں گناہ اور گندے کاموں کا ہی حکم کرتا ہے اور ان باتوں میں اللہ پر جھوٹ نہ لگاؤ جن کو تم نہیں جانتے۔ اور جب ان سے کوئی کہے اس کی اتباع کرو جس کو اللہ نے اُتارا ہے کہتے ہیں: بلکہ ہم اس کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے۔ کیا اگرچہ ان کے باپ دادے کچھ عقل نہ رکھتے ہوں اور ہدایت پر نہ ہوں۔ اور کفر کرنے والوں کی حالت اس شخص کی طرح ہے جو اس کو پکارے جو نہ سنے، مگر صرف پکار اور آواز، یہ (کافر) بہرے، گونگے، اندھے ہیں (نصیحت کو) نہیں سمجھتے۔''

ماقبل آیات کے ساتھ ربط:

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو توحید کا سبق دیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے توحید کے دلائل کا ذکر فرمایا اور اب ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب خالق اور مالک میں ہوں تو حلال اور حرام کرنے والا بھی میں ہوں تو ان آیات کا پچھلی آیات کے ساتھ اس طرح ربط بنا کہ مشرکین خود حلال کو حرام اور حرام کو حلال بناتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ایسا نہ کرو، بلکہ تم ان چیزوں کو کھاؤ اور پیو جو تمہارے لئے حلال ہیں اور طیب ہیں۔

﴿حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ کا معنی:

﴿حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ طیب کا معنی ہے: ''پاکیزہ''۔ علماء نے فرمایا: ایک چیز فی ذاتہٖ حلال ہے، مثلاً بکری حلال ہے، لیکن اگر کوئی اس کو چوری کر کے کھائے تو حرام ہو جائے گی۔ اس لئے فرمایا کہ وہ چیز حلال بھی ہو اور پاکیزہ بھی ہو کہ اس میں کسی دوسری چیز کا دخل بھی نہ ہو۔

بعض علماء نے فرمایا: طیب کے ساتھ ایک اور چیز کا بھی اضافہ ہوتا ہے کہ حلال بھی ہو، پاکیزہ بھی ہو، تمہیں اس میں رغبت بھی ہو کیونکہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ طبیعت ان کی طرف رغبت نہیں کرتی۔ اور وہ چیز بدن یا عقل کو نقصان پہنچانے والی نہ ہو، مثلاً خشیات چرس۔ یہ بھی زمین سے پیدا ہوتی ہیں، لیکن حرام ہیں اور اس سے یہ اشارہ بھی ہو گیا کہ جو چیزیں حرام کی گئی ہیں وہ عقل یا بدن کو نقصان دیتی ہیں، پاکیزہ نہیں ہیں، اس لئے حرام کی گئی ہیں۔

﴿حَلٰلًا﴾ حلال کا مادہ ''حَلَّ'' ہے، بمعنی کسی گرہ کو کھولنا۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لئے اس کی گرہ کو کھول دیا کہ تم اس کو کھا سکتے ہو۔ اور حلال وہ ہوتا ہے جو اللہ اور اللہ کا رسول حلال بتلائے۔ کیونکہ تمام چیزوں کا خالق و مالک اللہ ہے، ساری چیزیں اسی کی مِلک میں ہیں۔ اور جن کی دنیا میں کوئی مِلک ہی نہیں ہے، ان کو حلال و حرام کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

حلال اور حرام چیز کا معیار:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے لوگو! تمہارے لئے زمین کی چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، لیکن دو چیزوں کا خیال رکھنا ہے کہ وہ چیز اللہ کی شرع میں حلال اور پاکیزہ ہو اور ایسی چیز ہو جو نفس کو مرغوب ہو، ایسی چیز نہ ہو جو بدن یا عقل کو نقصان پہنچانے والی ہو کیونکہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا اثر بدن پر پڑتا

ہے تو وہ حرام ہیں، مثلاً منشیات، بھنگ، چرس (زہر) وغیرہ۔ یہ بھی زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ بظاہر ان کے کاشت کرنے والوں کو جتنا بڑا پیسہ ملتا ہے، لیکن یہ انسان کی عقل کو نقصان بھی پہنچاتی ہیں۔ عقل جب زائل ہو جائے تو انسان ایسے کام کرتا ہے جس سے بڑا خسیس بن جاتا ہے اتنا تو حیوان بھی نہیں ہے، انسان کو اس لئے اشرف المخلوقات کا شرف ملا ہوا ہے کہ انسان خیر اور شر میں تمیز کرتے ہیں، جیسا کہ جب آدمی قاتل بن جائے تو اس کو انسانی خون لگ جاتا ہے اس سے بڑا کوئی جانور نہیں کہ اس کو لوگوں کے قتل کرنے میں مزہ آتا ہے اور اس آیت سے اشارہ ہو گیا کہ اے میرے بندے! جو چیزیں میں نے تمہارے لئے حرام کی ہیں، ان کے اندر تمہارا نقصان ہے یا تیرے بدن کو نقصان پہنچے گا یا تیری عقل کو نقصان پہنچے گا۔

اسلام نے خنزیر اور کتے کو نجس اور حرام قرار دیا اور کفار نے اسلام کے مقابلہ میں اتنا ان دونوں جانوروں کو ترجیح دی ہے اور کتے کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اگر گھر میں چار بیٹے اور ایک کتا ہے تو یوں سمجھو کہ اس کے پانچ بیٹے ہیں، بلکہ کتا ان چار سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اس کے نزدیک زیادہ وفادار کتا ہے۔

اور اسی طرح خنزیر ہے کہ ہر چیز کے اندر اس کا استعمال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ معاف کرے، اب تو آپ کے جتنے بسکٹ وغیرہ بنتے ہیں یا عورتیں لپ اسٹک وغیرہ لگاتی ہیں، اس کے اوپر باقاعدہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اس کے اندر سور کی چربی ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے لکھ دیا ہے، اگر پھر بھی تمہارا مسلمان استعمال کرتا ہے تو اس کے اندر ہمارا کیا قصور ہے؟ اس طرح برش کے اندر خنزیر کے بال استعمال کرتے ہیں، اب ان کو بھی ماننا پڑ گیا ہے کہ خنزیر کے گوشت میں اور اس کی چربی میں یہ نقصان ہے۔

اس بات کو مان گئے ہیں کہ اگر کتا برتن میں منہ مارے تو اس کے منہ میں ایک ایسا جرثومہ ہوتا ہے جس کو آگ بھی نہیں جلاتی۔ اب ان کی تحقیق نے یہ بات مان لی ہے کہ وہ جرثومہ مٹی کے بغیر کسی چیز سے ختم نہیں ہوتا، جبکہ حضور اکرم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے فرما دیا تھا کہ جب کتا کسی برتن میں منہ مار جائے تو اس کو سات دفعہ پانی کے ساتھ اور ایک دفعہ مٹی کے ساتھ مانجو۔

اسی طرح یورپ والے اب خود کہتے ہیں کہ شراب نہ پیو۔ ان کے جو اچھے لوگ ہیں، وہ شراب نہیں پیتے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ ہم شراب سے بچیں۔ اس پر انہوں نے بڑے بڑے پوسٹر، لٹریچر چھاپے کہ خبردار! شراب نہ پینا، اس کے اندر خطرناک چیزیں ہیں۔ دیکھیں! جیسا کہ انہوں نے اس کو اتنا اپنایا کہ اپنا سب لٹا بیٹھے ہیں اور سب

کچھ شراب کے پیمانوں میں تباہ و برباد کر دیا ہے، اب ان کو سمجھ آئی ہے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے بندے! میں نے جو تیرے لئے حلال کیا ہے اس میں تیرے لئے بھلائی ہے اور میں نے جو چیزیں تیرے لیے حرام کی ہیں اس کے اندر تیرے لیے بھلائی نہیں ہے، تیرا کام یہ ہے کہ اپنے خالق و مالک کے حکم کی تعمیل کر، بلا وجہ دنیا کے اندر اپنی طرف سے نئی نئی چیزیں پیدا نہ کر۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ إِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾... "خطوات"، "خطوۃ" کی جمع ہے۔ دو قدموں کے درمیان جو جگہ ہوتی ہے اس کو "خطوۃ" کہتے ہیں۔

اللہ پاک وہ ذات ہے جس نے موت کو بھی پیدا کیا اور حیات کو بھی پیدا کیا، تاکہ تمہارا امتحان لیں کہ تم میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے؟ کون اللہ تعالیٰ کی توحید پر چلنے والا ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! شیطان کے پھندوں سے بچنا، وہ مختلف انداز میں حملہ کرتا ہے۔

مسجد کی طرف اُٹھنے والے قدم پر ثواب ملتا ہے:

(حدیث) اس لئے ایک حدیث مبارک میں آیا کہ بنو سلمہ انصار کا ایک قبیلہ تھا، ان کے گھر مسجد نبوی سے دور تھے، انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے اجازت طلب کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنے وہ گھر بیچ کر مسجد نبوی کے قریب آباد ہو جائیں، کیونکہ ہمیں بڑی دور سے آنا پڑتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "دِيَارَكُمْ دِيَارَكُمْ تُكْتَبْ آثَارُكُمْ" تم جتنے خطوات (قدم) اُٹھاتے ہو، ہر قدم پر نیکی ملتی ہے۔ اس لیے اپنے گھروں میں ہی رہو (اور وہیں سے مسجد نبوی میں نماز کے لئے آیا کرو) تو ہم نے مسجد نبوی کے قریب رہائش کو پسند نہ کیا۔ [مستخرج ابی عوانہ، رقم: ۸۹۴]

﴿خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ کی مختلف تفاسیر:

حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جتنے نافرمانی کے کام ہیں، سب شیطان کے راستے ہیں۔ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ شیطان کے وساوس کا مسئلہ ہے جو تجھ سے وسوسہ ڈالتا ہے اور تم اس پر چل پڑتے ہو۔

حضرت ابو مجلز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گناہوں کے اندر جو منتیں مانتے ہیں کہ فلاں کام ہو جائے، مثلاً فلاں عورت سے میرا تعلق پورا ہو جائے تو ایسی منت ماننا یہ سب شیطان کے راستے ہیں۔

حضرت شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک آدمی نے منت مانی کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کروں گا۔ اس آدمی نے حضرت مسروق رحمہ اللہ کی خدمت میں آکر کہا تو آپ نے فرمایا: جاؤ، ایک دنبہ ذبح کرو، بیٹے کو ذبح کرنا شیطان کا طریقہ ہے کیونکہ اولاد کا ذبح کرنا حرام ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا اور انبیاء کے خواب تو وحی ہوتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی بیٹا ذبح نہیں کرنے دیا اور تم اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی منتیں مان رہے ہو۔ یہ شیطان کا راستہ ہے، اس کو چھوڑ دو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ضرع اور نمک لایا گیا، آپ اس کو کھا رہے تھے تو ایک آدمی آپ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا: تم بھی کھاؤ۔ اس نے کہا: میں نہیں کھاتا۔ آپ نے فرمایا: کیا تمہیں روزہ ہے؟ اس نے کہا: میں نے اپنے اوپر اس چیز کو حرام کیا ہوا ہے، میں اس کو نہیں کھاؤں گا۔ آپ نے فرمایا: عقل کرو، یہ شیطان کا راستہ ہے کہ اللہ کے حلال کو بلا وجہ اپنے اوپر حرام کر رہے ہو۔ تم کھاؤ اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرنا۔ جیسا کہ بعض لوگ اپنے بھائی سے جھگڑ کر کہہ دیتے ہیں کہ آئندہ مجھ پر تیرے گھر کا پانی بھی حرام ہے۔ یہ خطوات الشیطان ہیں، آدمی کو ایسی قسم پر قائم نہیں رہنا چاہیے، بلکہ فوراً اس قسم کو توڑے اور دس مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

آج کل سب سے بڑے جھگڑے خاندانوں میں ہیں، کیونکہ سب لوگ شیطان کے راستے پر چل پڑے ہیں۔

حضرت ابورافع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک دن اپنی بیوی پر سخت غصہ آیا۔ اس نے کہا: اچھا ایک دن میں یہودیہ ہوں، ایک دن میں نصرانیہ ہوں اور جتنے میرے غلام ہیں سب آزاد ہیں اگر تُو نے مجھے طلاق نہ دی۔ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت آکر عرض کیا تو آپ نے فرمایا: یہ شیطان کے راستے ہیں۔

اور اسی طرح میں حضرت زینب بنت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا۔ یہ مدینہ منورہ میں بڑی فقیہہ عورت تھیں۔ انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ یہ خطوات الشیطان ہیں، اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح حضرت عاصم رحمہ اللہ کے پاس آیا تو انہوں نے بھی مجھے اسی طرح فرمایا۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ تم شیطان کے راستوں کی پیروی نہ کرو۔ علماء نے فرمایا: ''خُطُوٰت'' جمع کا صیغہ ہے اور قرآن میں جہاں جہاں کفر کا لفظ آیا ہے تو وہاں بھی جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ دنیا میں کفر کی کئی اقسام ہیں: کوئی سورج کے پجاری بن کر کافر ہو گئے، کوئی ستاروں کو متصرف مان کر کافر ہو گئے اور کوئی آگ کے پجاری بن کر کافر ہو گئے، کوئی بتوں کے پجاری بن کر کافر ہو گئے،

کوئی اللہ کے قرآن کا انکار کر کے کافر ہو گئے، بعض لوگ اللہ کے انبیاء کا انکار کر کے کافر ہو گئے، بعض لوگوں نے اللہ کے قرآن کو مانا، لیکن بعض احکامات کا انکار کر کے کافر ہو گئے۔ اسی طرح شیطان کے بھی گمراہ کرنے کے کئی راستے ہیں۔

قرآن میں آتا ہے کہ شیطان نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ میں تو راندۂ درگاہ بن گیا ہوں، لیکن میں تیرے بندوں کو بھی نہیں چھوڑوں گا، میں ان کو بھی گمراہ کروں گا، میں ان کے آگے سے بھی حملہ کروں گا، پیچھے سے بھی حملہ کروں گا، دائیں سے بھی حملہ کروں گا اور بائیں سے بھی حملہ کروں گا۔ یعنی آگے سے ان کو آخرت کا منکر کر دوں گا اور پیچھے سے ان کی دنیا کو ہلاک کر ڈالوں گا اور دائیں بائیں سے ان کے جوارح کو گناہوں میں مبتلا کر دوں گا۔ میں ان کو ہر معاملے کے اندر تیرا نافرمان بناؤں گا۔ تو شیطان کے کئی راستے ہیں، وہ ہر راستے سے لوگوں کو بھٹکاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ شیطان کے طرق سے ہمیں محفوظ رکھیں۔

شیطان کے بھٹکانے کے بڑے عجیب انداز ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اولاد کی محبت گمراہ کر دیتی ہے، بعض لوگوں کو بیوی کی محبت گمراہ کر دیتی ہے اور بعض لوگوں کو دوست گمراہ کر دیتے ہیں۔

ایک حدیث مبارک میں آیا کہ آدمی خود بڑا اچھا ہوگا، لیکن بیوی کی وجہ سے جہنم میں چلا جائے گا۔ بعض لوگ ایسے ہوں گے جو اولاد کی وجہ سے جہنم میں چلے جائیں گے اور بعض لوگ ایسے ہوں گے جو دوستوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔

شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے:

﴿إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾ تحقیق شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ ایک دشمن تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ہمیں علم نہیں ہوتا اور ایک دشمن ایسا ہوتا ہے جو کہہ دے کہ میں تمہارا دشمن ہوں۔ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام سے عداوت کی اور اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر ببانگ دہل یہ بات کہہ دی کہ اے اللہ! میں تیرے بندوں کو تیرا نافرمان کروں گا۔ اللہ نے بھی فرمادیا: مجھے بھی اپنی عزت وجلال کی قسم! جنات وانس میں سے جو تیری پیروی کرے گا، میں ان سے جہنم بھر دوں گا اور جو میرے حقیقی بندے ہیں، ان پر تم کوئی غلبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ شیطان کی عداوت حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور آج تک چلی آرہی ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اتنے بڑے دشمن سے احتراز

نہ کرے اور اس کے راستوں پر چلتا رہے تو اس جیسا بیوقوف کوئی نہیں ہوگا۔

﴿اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ﴾... ''اِنَّمَا'' حصر کے لئے ہوتا ہے، یعنی شیطان تو تم کو صرف ''سُوء'' اور ''فَحْشَاء'' کا حکم کرتا ہے۔ ﴿بِالسُّوْٓءِ﴾ کا معنی ہے ایسا کام جو شریف آدمی کو بُرا لگے۔ بعض نے فرمایا: ﴿بِالسُّوْٓءِ﴾ کا معنی بُرے افعال ہیں۔ ﴿وَالْفَحْشَآءِ﴾ کا معنی بے حیائی والا کام۔ قرآن نے زنا کو فاحشہ کہا ہے۔ اب دیکھیں! جتنے شیطانی کام ہیں، ان کے اندر ماسوائے برائی اور بے حیائی کے کچھ نہیں ملتا۔

شیطان کے حربے:

شیطان کہے گا فلم دیکھا کرو، فلم دیکھتے دیکھتے تمہیں کہے گا کہ ان کے اندر اچھی چیزیں بھی تو ہوتی ہیں، ان میں ہدایت کے سبق بھی تو ہوتے ہیں، جب تمہیں اس فلم کا عادی بنالے گا تو تم کو بلیو پرنٹ پر لے جائے گا، پھر کہے گا: دیکھنے کا کیا فائدہ؟ اگر تم اپنی بیوی سے خود ایسے نہ کرو اور وہی حرکات اپنی بیوی سے کرنی شروع کردے گا جو وہاں دیکھی ہوں گی اور اسی طرح کرتے کرتے وہ تمہیں زنا میں ڈالے گا۔ بے حیائی، برائی میں ڈالے گا، سود میں ڈالے گا، سٹہ میں ڈالے گا۔ دیکھو! یہ تو انعام ہے جس کے گلاس پر دس نمبر آیا، اس کو ہم دو ہزار روپے دیں گے۔ لیکن ہم نے یہ نہ سوچا کہ اس ایک نمبر کی تلاش پر کمپنیوں نے لاکھوں حاصل کرلئے اور لاکھوں میں سے ایک آدمی کو دو ہزار روپے دے دیا تو خوش ہوگئے۔ کیونکہ لوگوں کو تھوڑا تھوڑا لوٹا گیا، اس لئے احساس نہیں ہوتا۔

بدعت کے متعلق مسائل:

اور شیطان تم سے کہے گا: ﴿وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ تم اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرو جن کا علم بھی نہیں رکھتے کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے۔ حالانکہ حلال حرام کا اختیار اللہ کو ہے۔ علماء نے فرمایا: یہ تمہیں بدعت میں ڈالتا ہے کہ ایک ایسا کام جسے دین سمجھ کر کیا جائے اور ثواب کی اُمید سے کیا جائے حالانکہ اب اس کام پر ملتا ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ہمیں ساری خیر کی باتیں بتا دی ہیں، اپنی اُمت کو کامل دین پہنچا دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر مہریں لگا دی ہیں۔

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدة: ۳] اب دین میں کسی چیز کا اضافہ کرنا اور ایسے نئے نئے طریقے نکالنا، جن کی اصل نہ ہو، بدعت ہے۔ بعض کہتے ہیں: فلاں صحابی نے یہ

عمل کیا۔ انہوں نے اس لیے کیا کہ اس کی اصل موجود تھی، اور جب کسی حکم کی اصل موجود ہو تو وہ چیز بدعت نہیں ہوتی۔
مثال کے طور پر ہم کہتے ہیں کہ اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام یا اذان کے بعد پڑھنا بدعت ہے تو کوئی کہتا ہے کہ تراویح کو بھی بدعت کہو، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ بیس رکعات پڑھو اور ایک قاری کے پیچھے پڑھو۔ آپ دیکھیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح پڑھی ہیں چاہے جتنی رکعات پڑھی ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات، دوسری رات بھی پڑھی، تیسری رات صحابہ رضی اللہ عنہم انتظار کرتے رہے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ آئے۔ بہر حال اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رمضان میں تراویح پڑھنا ثابت ہوگیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جیسے میرا طریقہ سنت ہے اسی طرح میرے خلفاء راشدین کا طریقہ بھی سنت ہے:

"عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّينَ الرَّاشِدِينَ، تَمَسَّكُوا بِهَا وَ عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ."

[سنن ابی داؤد، رقم: ۴۶۰۷]

میرے طریقے کو اور میرے بعد خلفاء راشدین کے طریقے کو لازم پکڑو۔ پھر جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ کو جمع کیا تو کسی ایک صحابی نے بھی مخالفت نہ کی، اس طرح اجماع صحابہ ہوگیا، اس سے ہمیں اصل مل گیا۔ لیکن اذان سے پہلے جو درود کا مسئلہ ہے، نہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی کوئی اصل ملتی ہے، ہمیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا کوئی عمل ملتا ہے، نہ حضرت عبد اللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ سے، نہ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے، نہ خلفاء راشدین سے اور نہ اجماع صحابہ سے کوئی عمل ملتا ہے، اس لیے اپنے ایجاد کیے ہوئے کام کے ثبوت کے لیے ان حضرات کے عمل سے مثال دینا کھلی غلطی ہے۔ دونوں کے اندر زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: شیطان کے پھندے میں نہ آنا، کیونکہ یہ تمہیں کہے گا کہ اللہ پر ایسی ایسی باتیں کرو جن کا تمہیں علم بھی نہیں۔

حضرت عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کا شیطان سے مکالمہ:

حضرت عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک دن میں عبادت میں مصروف تھا، میں نے دیکھا کہ یکدم روشنی ہوگئی اور آواز آئی کہ عبد القادر! ہم تم سے بہت خوش ہوئے، ہم نے آج کے بعد تم سے عبادت کی تمام تکلیفیں اُٹھا لیں، اب تم عبادت کرو یا نہ کرو، بس میرے پیارے ہو۔ مجھے فوراً سمجھ آگئی اور میں نے پڑھا، "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ

الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم'' کہ یہ شیطان ہی ہوسکتا ہے۔ اللہ نے جب اپنے نبی سے عبادت معاف نہیں کی تو میں کون ہوں؟ صحابہ سے عبادت معاف نہیں ہوئی، میرا مقام اتنا بلند ہوگیا ہے کہ مجھ پر فرض بھی معاف کردیئے ہیں؟ شیطان ظاہر ہوا اور کہا: عبدالقادر! تم عالم آدمی تھے، تمہارے علم نے تمہیں بچالیا، ورنہ میں نے ایسے کئی بزرگوں کی گردنیں توڑ ڈالی ہیں۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ ''اعوذ باللہ'' پڑھ کر فرمایا: کمبخت! اب تُو مجھے اس طرح مارنا چاہتا ہے؟ مجھے تو میرے اللہ نے بچالیا ہے، علم نے نہیں بچایا۔ کتنے بڑے علم والے قادیانی بن گئے، صحابہ کے دشمن بن گئے، معتزلی بن گئے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ﴾ خبردار! شیطان کے طرق و وسائل کا شکار نہ ہوجانا، وہ دین والے کو دین کے طریقے سے مارتا ہے کہ عالم کو کہے گا تیرے جیسا اب تو عالم کوئی نہیں ہے، اگر کوئی تقریر اچھی ہوگئی تو شیطان دماغ میں ڈالے گا کہ کمال کردیا۔ اس طرح تکبر آیا تو انسان برباد ہوگیا۔ کسی عالم کے دماغ میں ڈال دیا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ یہ سب وساوس شیطانی ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے حفاظت فرمائے۔ اسی طرح اگر ایک انسان صف اوّل کا نمازی ہے تو شیطان دماغ کے اندر ڈال دیتا ہے کہ تو صف اوّل کا نمازی ہے، اگر کوئی آدمی صف اوّل میں آکر بیٹھنا چاہے تو اس کو کہتا ہے کہ میں یہاں پچاس سال سے بیٹھ رہا ہوں۔ اس کو خواہ مخواہ بتاتا ہے حالانکہ کیا اس نے رپورٹ مانگی تھی کہ مجھے اپنی پچاس سال کی رپورٹ بتا۔

ایک اللہ والے کی تہجد قضا ہونے کا واقعہ:

ایک اللہ والے کی تہجد قضا ہوگئی، وہ سارا دن روتے رہے، اشراق پڑھ رہے ہیں، چاشت پڑھ رہے ہیں، سارا دن ذکر کررہے ہیں، اور رو رہے ہیں کہ مولا! مجھ سے کونسا ایسا گناہ ہوگیا ہے کہ میں رات کی عبادت سے محروم ہوگیا ہوں؟ قاعدہ یہ ہے کہ آدمی جب عبادت سے محروم ہوتا ہے تو کوئی غلطی ہوتی ہے، جیسے آپ میرے ساتھ زیادتی کریں تو میں کہوں گا کہ آئندہ میرے گھر نہ آنا لیکن جب تک آپ غلطی نہیں کریں گے تو میں آپ کو منع نہیں کروں گا۔ بہرحال جب وہ اللہ والے رات کو سوئے تو مثلاً اگر تہجد کے ساڑھے تین بجے اُٹھتے تھے تو تین بجے شیطان نے آکر ان کو تہجد کے لئے اُٹھایا۔ جب وہ بزرگ بیدار ہوئے تو انہوں نے کہا: تم شیطان ہوکر مجھے نماز کے لئے جگا رہے ہو؟ شیطان نے کہا: آپ نے جو سارا دن اللہ کے آگے رو رو کر میرا ستیاناس کیا ہے، میں نے کہا: اس سے بہتر

ہے کہ تُو تہجد پڑھ لیا کرے، باقی عبادت نہ کرے۔ میں نے آپ کو ایک گھنٹے کی عبادت سے روکا، لیکن آپ نے بارہ گھنٹے اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگا دیئے۔ اس لئے بارہ گھنٹے سے ایک گھنٹہ بہتر ہے۔ شیطان ہر آدمی کو اس کے طریقے سے گمراہ کرتا ہے۔

بے نمازی پیر کا واقعہ:

ایک پیر صاحب ہمارے ساتھ شریک سفر ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک ان کا مرید تھا جو مجھے روزانہ پیر صاحب کی کراتیں سناتا تھا۔ کبھی اس کی سُن لیتے تھے اور کبھی ٹال دیتے تھے۔ ایک دفعہ اتفاق ایسا ہوا کہ صبح کی نماز کے وقت میں نے پیر صاحب کو دس دفعہ جھنجوڑا کہ حضرت! اُٹھیں، نماز جارہی ہے۔ وہ اوں آں کر کے پھر خراٹے لینے شروع کر دیتا تھا۔ میں وضو کر کے آیا، نماز کا وقت جارہا تھا، آخر میں نے بڑا ادب کرتے ہوئے حضرت کو گدے سے نیچے پھینک دیا، لیکن پھر بھی اس کی آنکھ نہ کھلی۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ حضرت کے لئے اب ایک طریقہ رہ گیا ہے کہ کوئی سوئی وغیرہ لے کر آؤں۔ آخر ہم دو آدمیوں نے نماز پڑھی اور ان بے چاروں نے پتہ نہیں پڑھی یا نہیں پڑھی، لیکن میرے سامنے نہیں پڑھی۔ کیونکہ میں نماز کے بعد چلا گیا تھا۔ جب ہم پیر اور مولوی یہ کریں گے تو لوگ کیسے نماز پڑھیں گے؟ ایک جلسہ یا جلوس شروع ہوگا، نمازیں ختم ہو جائیں گی، کوئی خدا کا خوف نہیں کرے گا کہ نماز کا وقت ہے۔

خان محمد کمتر کا واقعہ:

ایک شخص خان محمد کمتر نعت خوان ایسے گزرے ہیں، ایسے نماز پڑھتے تھے کہ ایسی نماز کسی مولوی کی بھی نہیں ہوگی۔ کئی دفعہ نماز کا وقت ہوا، گاڑی اسٹیشن پر رکی، حضرت نے نماز شروع کی، گاڑی چلی گئی، سامان بھی چلا گیا، لیکن انہوں نے نماز نہیں چھوڑی۔ یہ مجھے دوستوں نے بتایا ہے، میں نے ان کو نہیں دیکھا کہ وہ کالے رنگ کا لمبا تڑنگا آدمی تھا، مگر جب ان کو موت آئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کا چہرہ اتنا روشن کر دیا جیسے کوئی تارا چمک رہا ہے۔ سب نماز کی برکت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت کی برکت تھی۔

حلال رزق کی اہمیت:

مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إِنَّ كُلَّ مَالٍ نَحَلْتُهُ عِبَادِي فَهُوَ لَهُمْ حَلَالٌ.'' [مسند احمد، رقم:١٨٣٣٨]

کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نے اپنے بندوں کو جو مال دیا، ان کے لئے حلال کیا۔

اوران چیزوں کو حرام کیا جوان کے لئے نقصان دہ تھیں اور جب میں اپنے بندوں کو پیدا کرتا ہوں تو ہر آدمی دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، شیاطین آ کر ان کو گمراہ کرتے ہیں، ان کو ان کے دین سے ہٹا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت سے ہٹا دیتے ہیں اور ان پر ان چیزوں کو حرام کر دیتے ہیں جو میں نے ان کے لئے حلال کی تھیں۔ کہتے ہیں: یہ بھی حرام ہیں۔

(حدیث) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ آیت مبارک تلاوت کی گئی: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ﴾ [البقرۃ:١٦٨] حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! آپ میرے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے مستجاب الدعوۃ بنا دیں، جو بھی دعا کروں میری منظور ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''يَا سَعْدُ! أَطِبْ مَطْعَمَكَ تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَةِ، وَ الَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ إِنَّ الْعَبْدَ لَيَقْذِفُ اللُّقْمَةَ الْحَرَامِ فِي جَوْفِهِ مَا يُتَقَبَّلُ مِنْهُ عَمَلَ أَرْبَعِينَ يَوْمًا، وَ أَيُّمَا عَبْدٍ نَبَتَ لَحْمُهُ مِنْ سُحْتٍ فَالنَّارُ أَوْلَى بِهِ.''

[الترغیب والترہیب:٢/٥٤٧]

اے سعد! اگر یہ چاہتے ہو تو اپنے کھانے کو پاکیزہ کرو (کیونکہ جب تیرے اندر رزق حلال ہو جائے گا اور تیرا کھانا حلال کا ہوگا تو دعائیں منظور ہوں گی)۔ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری زندگی ہے بندہ کبھی ایک لقمہ حرام کا منہ میں ڈالتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی چالیس دن تک کی عبادت قبول نہیں ہوتی اور وہ بندہ جس کا بدن حرام سے پروان چڑھتا ہے اور سود سے پل رہا ہے اس کے لئے بہتر ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے۔

دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

دوسری حدیث مبارک میں ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا، وَ إِنَّ اللهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِينَ، فَقَالَ: ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَ اعْمَلُوا صَالِحًا، إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ وَ قَالَ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾، ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ، يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ، يَا رَبِّ، يَا رَبِّ، وَ مَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَ مَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَ مَلْبَسُهُ حَرَامٌ، وَ غُذِيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذَلِكَ؟" [صحیح مسلم، رقم:۱۰۱۵/جامع ترمذی، رقم:۲۹۸۹]

اے بندے! تیرا کھانا بھی حرام کا ہوتا ہے اور تیرا پینا بھی حرام کا ہوتا ہے، تیرا لباس بھی حرام کا ہوتا ہے، پھر کہتا ہے: یارب، یارب، یارب! اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تیری دعائیں کہاں سے منظور ہوں گی؟ جبکہ تیرے اندر حرام ہی حرام ہے، تیرا لباس حرام ہے، تیرا کھانا حرام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم لاکھوں مسلمان دعائیں مانگتے ہیں، لیکن نتیجہ کوئی نہیں نکلتا۔ بہت کم مسلمان ہوں گے جن کا کھانا حلال کا ہے، جو ایک ایک پیسے کی فکر کرتے ہیں کہ کہاں سے آیا ہے، کہاں جا رہا ہے؟ ورنہ دشمن نے اس دور میں ایسا جال پھیلایا ہے آدمی جتنا بھی بچنا چاہے، لیکن نصیب والا بچ سکتا ہے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری اُمت پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ لوگ سود تو نہیں کھائیں گے، لیکن سود کا دھواں ان کو بھی پہنچ جائے گا۔ صحابہ کے زمانہ میں ذرا بھی کوئی مشقت ہوتی، دعا کے ہاتھ اُٹھاتے تھے تو وہ تکلیف ختم ہو جاتی تھی۔

درد کے علاج کا نبوی نسخہ:

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، فرماتے ہیں کہ مجھے اتنا شدید درد تھا جس نے مجھے تقریباً بے کار ہی کر دیا تھا تو مجھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اپنا دایاں ہاتھ اپنے درد کی جگہ پر رکھو اور یہ کہو: "بِسْمِ اللهِ، أَعُوذُ بِعِزَّةِ اللهِ وَ قُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَ أُحَاذِرُ" سات دفعہ پڑھ کر پھونک مارو تو مجھے اللہ تعالیٰ نے شفاء دے دی۔

اب ہم میں سے کسی کو درد یا تکلیف ہو تو یہ دعا سات دفعہ پڑھ لو۔ لیکن ہم سو دفعہ پڑھتے ہیں، درد بڑھ جاتا ہے، کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ پڑھنے والی زبان گندی، ناپاک ہے تو کہاں سے اثر ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان برحق ہے، کلمات رسول اللہ ﷺ برحق ہیں، لیکن ہمارا کھانا اور لباس حرام ہے، صدقِ مقال اور اکل حلال نہیں ہے، اس لئے ہماری دعائیں منظور نہیں ہوتیں۔

قدرت کا امتحان ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے جو تمہارے دل کے اندر برائی کا خیال ڈالتا ہے کہ نماز نہ پڑھو، آؤ تفریح کرتے ہیں، کسی ہوٹل پر جا کر کوئی گانا سنتے ہیں تو سمجھو یہ شیطان کی طرف سے ہے اور جو

تمہارے دل میں اچھائی کا داعیہ پیدا کرے کہ نماز پڑھ لیں، پتہ نہیں پھر جماعت نہ ملے، یہ فرشتہ ہے جو تمہارے دل میں اچھی بات کا القاء کرتا ہے۔

چونکہ انسان کے اندر خیر کی طاقت بھی ہے اور شر کی طاقت بھی ہے، لیکن انسان اپنے اختیار سے ان دونوں میں سے ایک کو اختیار کرتا ہے۔ اگر خیر کا راستہ اختیار کرتا ہے تو ثواب کا مستحق بنتا ہے اور اگر کوئی برائی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو عتاب کا مستحق بنتا ہے۔

اس آیت کے اندر دوسری جگہ یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ اس سے ہوشیار رہے۔ اس کے دشمن ہونے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے۔ سب سے پہلے اس نے حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں وسوسہ ڈالا، جس سے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء علیہا السلام کو جنت سے نکلنا پڑا۔ یہ آج سے ہمارا دشمن نہیں، بلکہ ہمارے باپ سے دشمن ہوا اور اس نے قیامت تک ہمارے اندر وساوس ڈالنے ہیں۔ شیطان کی دشمنی کھلی ہے، لیکن وہ نظر نہیں آتا، ہم جنات و شیاطین کو نہیں دیکھ سکتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ تو ہمیں دیکھ سکتے ہیں، لیکن ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے تو ایسا دشمن بڑا خطرناک ہوتا ہے، اس سے بچنے کا علاج یہ ہے کہ ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھ کر اللہ کی پناہ پکڑو۔ اللہ کی ذات بڑی ہے، اس کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جب تم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آؤ گے تب ہی شیطان کے فتنے سے بچ سکتے ہو۔

شیطان سے بچنے کا دوسرا طریقہ ذکر اللہ ہے۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، نماز، قرآن پڑھنا، طواف کرنا، ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' یہ سب ذکر ہیں۔ جب تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہو تو شیطان دور ہو جاتا ہے اور جب تم اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو جاتے ہو تو شیطان اپنا ڈیرہ لگا لیتا ہے۔

طلاق ہر حال میں واقع ہو جاتی ہے:

طلاق مرد کا حق ہے اور یہ مسئلہ بڑا نازک ہے۔ طلاق کے لفظ سے بچنے کی کوشش کیا کرو۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کو بڑا ناپسند ہے، اگرچہ حلال ہے۔ کیونکہ کبھی ایسے حالات ہو جاتے ہیں کہ طلاق کے علاوہ راستہ نہیں ہوتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَ هَزْلُهُنَّ جِدٌّ: اَلنِّكَاحُ، وَ الطَّلَاقُ، وَ الرَّجْعَةُ.'' [جامع ترمذی، رقم: ۱۱۸۴]

تین چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت بھی حقیقت ہے اور مذاق بھی حقیقت ہے۔ نکاح، طلاق اور رجوع۔
اگر کوئی آدمی مذاق میں بھی بیوی کو کہہ دے کہ میں نے تجھے طلاق دی تو طلاق ہو جائے گی۔ کل اگر وہ کہے کہ میں تو مذاق کر رہا تھا، میں نے تو ڈرامے میں کہا تھا، حقیقت میں طلاق نہیں دی تھی، میری نیت بھی نہیں تھی، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا دنیا میں یہی ڈرامے رہ گئے تھے کہ میرے حلال کو حرام کرتے رہو اور جب چاہو شریعت کے الفاظ سے کھیلتے رہو۔ اس لئے اسلام ایسی باتوں کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے نکاح اور طلاق کے معاملہ میں احتیاط کریں۔
بعض لوگ کہتے ہیں: بچہ اور بچی چھوٹی تھی، دونوں کے والدین نے نکاح کر دیا تو وہ نکاح ہو گیا؟ جی ہاں! ہو گیا، کیونکہ دونوں کے ولی موجود ہیں اور کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے کہ لڑکی کا والد کہتا ہے: میں نے اپنی لڑکی آپ کے لڑکے کو دی، اس نے قبول کر لیا تو نکاح ہو گیا۔ اس کے لئے کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ اشٹام ہو، رجسٹر ہو۔ جیسے بعض لوگ آ کر کہتے ہیں کہ میں نے طلاق دی اور رجسٹری کر کے والدین کو پہنچائی کہ میری بیوی کو یہ پہنچا دیں۔ میرے والدین نے جب یہ دیکھا تو کہا: بڑا بیوقوف ہے۔ انہوں نے فوراً مجھے رجسٹری واپس کر دی تو کیا طلاق واپس ہو گئی؟ حالانکہ یہ مذاق نہیں، بلکہ جب تم نے طلاق لکھ دی تو واقع ہو گئی، اگرچہ وہ اس تحریر نامہ کو آگے نہ بھیجیں، تب بھی طلاق ہو گئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں نے طلاق بھیجی، میری بیوی نے وصول بھی نہیں کی حالانکہ اگر کسی آدمی کو بندوق سے گولی مارو تو وہ گولی وصول کرتا ہے؟ گولی، گولی ہے، وہ لگے گی، چاہے اس کو وصول کرو یا نہ کرو۔ بعض لوگ کہتے ہیں: میں نے جب طلاق دی تو عورت نہیں سن رہی تھی۔ حالانکہ طلاق تم دے رہے ہو، بیوی تو طلاق نہیں دے رہی۔ وہ طلاق سنے یا نہ سنے، اس کو طلاق ہو گئی۔
اس لیے اگر جھگڑا ہو جائے تو علیحدہ ہو جاؤ، غصہ کر لو، بیوی کو والدین کے گھر بھیج دو، اس سے بولنا چھوڑ دو، اس کے ہاتھ سے کھانا پینا چھوڑ دو، چار رشتہ دار درمیان میں ڈال کر کوئی حل نکالو، یہ نہیں کہ طلاق دے دو۔ ماشاء اللہ! ہمارے ہاں بعض ایسے لوگ بھی ہیں کہ کھانے میں ذرا نمک زیادہ ہو تو بیوی کو طلاق دے دی، اگر اس نے بھینسوں کا دودھ نہیں نکالا یا لیٹ ہو گئی تو تب بھی طلاق دے دی، اگر اس نے کپڑے دھوئے اور اچھے صاف نہ ہوئے تب بھی طلاق دے دی۔ اس طرح اگر جمع کریں تو مہینہ کی تقریباً دو اڑھائی ہزار طلاق بن جاتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

میاں بیوی میں لڑائی پر شیطان زیادہ خوش ہوتا ہے:

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ابلیس لعین باقاعدہ اپنے ماتحتوں سے رپورٹ لیتا ہے جو ماتحت کہے کہ میں نے

میاں بیوی کو لڑا دیا ہے تو شیطان اس کو اپنے پاس بٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ تُو نے اصل کام کیا ہے کہ اب دو خاندان لڑیں گے، قتل تک نوبت آجائے گی، لڑائیاں بڑھیں گی، جائیدادیں تقسیم ہوں گی، مرد علیحدہ گناہ کرے گا اور عورت علیحدہ گناہ کرے گی۔

طلاق دینے کا سنت طریقہ:

اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ تیری بیوی کے ساتھ گزر بسر نہیں ہوتی تو اپنے علاقے کے عالم کے پاس جا کر مسئلہ پوچھ کر طلاق دو۔ آدمیوں کے سامنے ایک طلاق دے دو۔ یہ نہیں کہ طلاقوں کی ایک لمبی چوڑی لسٹ لگا دو۔ اور وہ ایک طلاق بھی اس وقت دو جب عورت حیض سے پاک ہو اور تم نے اس سے ان پاکی کے دنوں میں جماع بھی نہ کیا ہو، کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ تم کسی طرح دوبارہ مل جاؤ، صلح ہو جائے۔ لیکن جب کوئی حل باقی نہ رہے تو اگلے ماہ دوسری طلاق دے دو، اگر پھر بھی طلاق دینی ہو تو اگلے تیسرے پاکی کے دنوں میں تیسری طلاق دو۔

زمانۂ جاہلیت کی رسمِ بد کی تردید:

یہ جاہلیت کی بات ہے کہ جب تم نے طلاق دے دی، پھر کہو کہ اگر تم نے آگے شادی کی تو تجھے قتل کر دوں گا۔ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اب طلاق کے بعد وہ تمہارے لئے ایک اجنبی عورت ہے اور تم اجنبی مرد ہو۔ اس کی مرضی ہے جہاں چاہے شادی کرے۔ اگر تم اس کا راستہ روکو گے تو وہ زنا کرے گی، اس کا گناہ تمہارے بھی حساب میں لکھا جائے گا۔

غصہ میں قسم یا منت ماننا بھی شیطانی دھوکہ ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ اگر کوئی آدمی غصے میں آ کر قسم کھا لیتا ہے یا منت مان لیتا ہے یہ بھی شیطان دھوکہ میں ڈالتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ وہ کفارہ ادا کرے، دس مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ بدبخت شیطان جب بھی تمہیں حکم کرے گا تو بُرے افعال کا حکم کرے گا، زنا کا حکم کرے گا، بُرائی کا حکم دے گا اور سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ یہ تمہیں ایسی باتوں میں ڈالے گا کہ اللہ نے یہ کہا ہے۔ حالانکہ وہ کام خود کرے گا۔ اس سے پوچھیں کہ یہ کہاں لکھا ہے؟ تو کہے گا: بزرگوں نے کہا ہے۔ یہ کون سے بزرگ ہیں تو نہیں بتائے گا تو یہ بھی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنا ہے، ہر کافر اور ہر بدعتی اس قول میں داخل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹی باتیں بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بدعات سے بچائے اور اتباعِ سنت کی توفیق دے۔

کوئی ایسا مسئلہ جو توحید سے تعلق رکھتا ہے یا نبوت و رسالت سے تعلق رکھتا ہے یا اِثباتِ معاد سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا مسئلہ بیان نہیں کیا کہ جس کی دلیل نہ دی ہو۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی دلیل تک آپ پہنچ سکے اور کسی پر آپ نہیں پہنچ سکے، اس میں عقل کا تو قصور ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم کا کوئی قصور نہیں ہے۔

مثلاً آج سے پچاس سال پہلے جب سادگی کا زمانہ تھا، پردہ کا زمانہ تھا، اس وقت جرائم کا کیا عالم تھا اور اب جب عورتیں سڑکوں پر نکل آئیں تو اب جرائم کا کیا حال ہے؟ پہلے دور میں دیہاتوں میں ایک رسم ہوتی تھی، کالی آندھی چلتی یا سرخ آندھی چلتی تو کہتے تھے کہ زمین پر کہیں قتل ہو گیا ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور کریں! جب آپ نے فلمیں دیکھیں، بچوں نے فلمیں دیکھیں کہ پچاس سال کے پہلے والے بچوں کے اندر کتنی حیاء تھی اور اب کے بچے کے اندر کتنی حیاء ہے؟ بہر حال اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی مسائل بیان فرمائے ہیں، ان کے دلائل بھی دیئے ہیں۔

مسئلۂ تقلید:

﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ [البقرة:۱۷۱] بعض حضرات اس آیت مبارکہ کو لے کر تقلید پر اعتراض کرتے ہیں کہ باپ دادا، بزرگوں کے طریقے پر چلنے کو اللہ نے شرک اور حرام قرار دیا ہے۔ یہ افراط و تفریط میں پڑنے والی بات ہے۔ ایک حق کی تقلید ہے اور ایک باطل کی تقلید ہے۔ باطل کی تقلید میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ کفر و شرک ہے۔ اسی آیت میں غور کریں جس آیت کو اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کے لئے اُتارا، اس کو مسلمانوں پر چسپاں نہ کرو۔ ﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾ [البقرة:۱۷۰] اس آیت کے اندر آ رہا ہے کہ ان کے باپ دادا میں عقل بھی نہیں ہے اور ہدایت بھی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر ماں باپ میں عقل بھی ہو اور ہدایت بھی، تب ان کی بات ماننی جائز ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ﴾ [یوسف:۳۷، ۳۸] میں نے اس قوم کے طریقہ کو چھوڑ دیا ہے جو کافر و مشرک ہیں، میں تو ان کی اتباع کرتا ہوں جو میرے آباء و اجداد گزرے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں باپ ہدایت والے ہوں اور ہدایت کی بات کریں تو ان کی بات ماننا قابل تعریف ہے۔

کیونکہ اس کا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ﴿فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ۴۳] اب ہر آدمی تو مقامِ مجتہد کو نہیں پہنچ سکتا تو مجتہدین سے پوچھنا ہوگا، علماء سے پوچھنا ہوگا، اس کے بعد عمل کرنا ہوگا۔ اس لیے افراط وتفریط کے اندر کبھی ہم قرآن کی وہ آیات جو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے بھیجی ہیں، وہ ہم مسلمانوں پر بھی لگا دیتے ہیں، حالانکہ سیاق وسباق دیکھنا چاہیے، اوّل سے آخر تک آیات کو دیکھیں۔ ﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا﴾ [البقرۃ: ۱۶۶] قیامت والے دن بڑے اور چھوٹے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں گے، یعنی کافر جو اتباع کرنے والے اور اتباع کرانے والے، ﴿وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ﴾ [البقرۃ: ۱۶۷] کافر جہنم سے کبھی نہیں نکلیں گے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: حلال وطیب کھاؤ۔ یہ مسلمانوں کو حکم ہے، نہ کہ ان لوگوں کو جو بتوں کے نام پر اپنے جانور چھوڑ کر حرام کر دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ پر ایسی باتیں کرنا جو اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی ہیں، یہ بھی کافروں کا شیوہ ہے، مسلمان اللہ پر ایسی بات نہیں کر سکتا۔ اور جب ان کافروں کو کہا جاتا ہے کہ تم میرے پاک پیغمبر کا کہا مانو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے باپ دادا کے طریقہ پر ہیں۔ لہٰذا ان تمام آیات کا سیاق وسباق مشرکین کے حق میں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اندھی تقلید جس میں کفر وشرک آ جائے، جس میں ہم باطل کی تقلید کریں، اللہ کے قرآن، احکام اور سارے مسائل کو چھوڑ کر اس کے خلاف چلیں، ایسی تقلید کے حرام ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔ اگر ایک آدمی جاہل ہے، قرآن بالکل نہیں پڑھ سکتا یا پڑھ تو سکتا ہے، لیکن اس سے جو مسائل اخذ ہوتے ہیں وہ ان کو نہیں سمجھ سکتا، اس کے لیے حکم ہے: ﴿فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ﴾ وہ علم والوں کے پاس جا کر مسائل پوچھے اور ان کی پیروی کرے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ۴۳] اگر تم مسئلہ نہیں جانتے تو اس سے پوچھو جو عالم ہے۔ اگر کسی عالم کے اندر استنباط کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں تو اس کو کسی کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اگر ایک آدمی اتنا علم نہیں رکھتا کہ قرآن کے مسائل کا استنباط کر سکے، وہ ناسخ اور منسوخ کا علم نہ رکھتا ہو، احادیث مبارکہ کی تاریخوں کا علم نہ رکھتا ہو تو ایسا آدمی لازماً کسی سے مسئلہ پوچھے گا۔ اگر یہ بات نہ ہو تو پورا نظام درہم برہم ہو جائے۔ بخاری شریف اور مسلم شریف میں احادیث آ جائیں تو ہم ہر حدیث پر ان سے دلیل نہیں مانگتے، بلکہ کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے، صحیح ہے۔ حالانکہ تحقیق تو انہوں نے فرمائی ہے، ہم نے ان کے لکھے ہوئے پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا، کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ انہوں نے تحقیق کر کے جو احادیث لکھی ہیں، کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جو قابلِ اعتراض ہو۔ جب فقہ کا مسئلہ آیا تو ہم نے امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ، امام

ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ کی طرف رجوع کیا، کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بھی مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے پاس غیر مقلد عالم مولانا ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے تھے کہ مسئلہ تقلید کا موضوع چل پڑا تو مولانا نے بڑی تقریر فرمائی، تاکہ اقبال کچھ سنے...... کیونکہ وہ حنفی آدمی ہے...... جب تقریر ختم کی تو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ سے مخاطب ہوئے کہ اقبال! تمہیں بھی کچھ میری تقریر سمجھ آئی ہے یا اپنے کسی شعر میں تحقیق کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: میں نے آپ کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا ہے۔ مولانا ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: پھر آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا: حضرت! مجھے تو بات سمجھ نہیں آئی، یوں سمجھ آتا ہے کہ اگر اماموں کا مسئلہ ہی ختم کر دیں تو جیسے بے امام نماز ہو تو کوئی رکوع میں پڑا ہوگا اور کوئی سجدے میں پڑا ہوگا، ان کو کسی بات پر جمع کرنے کے لئے کسی کا کہنا ماننا ہوگا، ورنہ نظام نہیں چل سکتا، نظام عائلی چلانے کے لئے بھی آپ کو گھر میں کسی کو بڑا بنانا پڑے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم سفر کرنے کے لیے نکلے ہو تو ایک آدمی کو اپنا امیر بناؤ اور اپنے امیر کے حکم پر چلو۔

نماز میں ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ [الفاتحہ] سے سبق ملا کہ اے اللہ! ہمیں ان لوگوں کے راستہ پر چلا جن پر تیرا انعام ہے۔ ان سے راستہ پر نہ چلانا جو گم کردہ راہ ہیں یا مغضوب ہیں۔ جن لوگوں پر تو نے انعام فرمایا، وہ لوگ یہ ہیں: ﴿فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾ [النساء: ٦٩] صرف انبیاء کا ذکر کافی تھا، لیکن آگے صدیقین، شہداء اور صالحین کا ذکر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر آدمی کو ان چار میں سے کسی نہ کسی سے تو رہنمائی لینی پڑے گی، اتباع کرنی پڑے گی۔

بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جو میدانِ جنگ سے تعلق رکھتے ہیں، وہ شہداء مجاہدین سے معلوم ہوں گے اور بعض مسائل ذکر و فکر اور علم سے تعلق رکھتے ہیں، وہ صالحین سے معلوم ہوں گے۔ اس لیے ائمہ مجتہدین کی تقلید یا ائمہ اربعہ کی تقلید یہ نہیں کہ وہ قرآن کے مخالف ہیں اور ہم ان کی تقلید کریں، بلکہ ان لوگوں نے قرآن وحدیث کو سمجھ کر عام لوگوں کے لئے قرآن وحدیث کے مسائل کو آسان کر دیا ہے۔ جیسے آپ کو کوئی آدمی حج کی کتاب لکھ کر دے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اسی مولوی کی بات کو مان رہے ہیں، بلکہ آپ نے کتاب تو مولوی کی لکھی ہوئی لی ہے، لیکن اس نے احکام جو نقل کئے ہیں وہ قرآن وسنت کے نقل کئے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قراءت کا کوئی

مسئلہ ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے: اُبی بن کعب بڑا قاری ہے، تفسیر قرآن کا مسئلہ ہے تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، فقہ کا مسئلہ ہے تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، قضاء کا مسئلہ ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ، اور اگر مجموعی مسائل ہیں، کوئی علم کا پہاڑ ہے تو وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، امتیاز بین الحق والباطل فاروق رضی اللہ عنہ، اس کے بعد میرے خلفاء راشدین میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس زمانے میں بھی لوگ ان بڑے بڑے صحابہ سے جا کر مسائل پوچھتے تھے۔ کتنی آیات اور کتنی احادیث رسول ہیں، جب لوگوں نے ان کے سامنے آ کر پڑھیں تو ان صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا: تم نے اس کو سمجھا ہی نہیں۔

لہٰذا اہل حق کے راستے پر چلنا، مجتہد سے راستہ کا پوچھنا، جاہل کا عالم سے پوچھنا، عین دین ہے، اس کے بغیر دین میں گزارا نہیں ہے۔ وہ تقلید حرام ہے جو کافر کرتے تھے کہ قرآن کو چھوڑ کر ماں باپ کی تقلید کرتے تھے اور یہ تقلید حرام ہے کہ آدمی کو اللہ کا قرآن ملے اور وہ کہے کہ مجھے میرے باپ نے یہ کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی اندھی تقلید سے بھی ہمیں بچائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق پر چلنے کی توفیق دے اور حق والوں کے ساتھ رکھے اور اسلام پر موت عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک دن میں پانچ وقت نماز کا پابند کیا اور حکم دیا کہ ایک امام کے پیچھے آ کر کھڑے ہو جاؤ اور کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ امام تھوڑا پڑھا لکھا ہوتا ہے اور پیچھے بڑے بڑے علماء آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کی نماز ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے سکھا دیا کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو (جب تک وہ کھڑا رہے تو تم بھی کھڑے رہو۔ تمہاری یہ جرأت نہیں ہونی چاہیے کہ تم اس سے پہلے اللہ اکبر کہہ دو اور رکوع میں چلے جاؤ)۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمادیا کہ جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث کے اندر ہے کہ جب وہ پڑھے تو تم چپ رہو۔ یہ سارا کام اس لیے سکھایا ہے کہ ایک کے پیچھے چلنے کا روزانہ پانچ دفعہ سبق دہرایا جائے اور غلطی نہ ہو۔

کافروں کی مثال:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات کے اندر کافروں کی مثال بیان فرمائی، جیسے کوئی جانور باہر چرنے والا ہو، وہ بھی کچھ نہیں سمجھ سکتا جب اس کو چرانے والا اس کو آواز دے کہ آگے گڑھا ہے یا راستہ خراب ہے، وہ جانور تو نہیں جانتا۔ بس آواز سن رہا ہے۔ یہی حال کافروں کا ہے کہ وہ سنتے تو ہیں، لیکن سمجھتے نہیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس مثال کا مقصد یہ ہے کہ جیسے یہ بتوں کو پکارتے ہیں حالانکہ بت نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے

ہیں کہ پہلی مثال راجح ہے کہ مشرکین کی مثال یہ ہے کیونکہ بت تو بالکل سنتے بھی نہیں ہیں اور نہ دیکھتے ہیں اور نہ پکڑ سکتے ہیں اور نہ ان میں کوئی زندگی ہے۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۷۲، ۱۷۳]

"اے ایمان والو! کھاؤ حلال چیزوں سے جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرنا چاہتے ہو۔ بلاشبہ تم پر حرام کیا ہے (کھانا) مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کا اور جو غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا۔ پس جو مجبور ہو جائے، نہ نافرمانی کرے اور نہ زیادتی تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔"

خطابِ مؤمنین:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو سمجھایا کہ کفار کی عادت تھی کہ خود ہی چیزوں کو حرام کر دیتے تھے۔ فرمایا: یہ غلط بات ہے، بلکہ ہم نے زمین میں جو کچھ تمہارے لیے پیدا کیا ہے، یہ ہماری نعمت ہے، ان کو کھاؤ لیکن شرط یہ ہے کہ دو چیزوں کا خیال رکھو۔ جو چیز استعمال کرو، وہ حلال ہو یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور وہ چیز پاکیزہ اور پسندیدہ بھی ہو۔ اس لیے اگر ایک چیز حلال تو ہے، لیکن اس کو ذبح نہ کیا گیا تو وہ طیب نہ رہی۔ اسلام دین رہبانیت نہیں، جیسے عیسائیوں نے رہبانیت کو دین بنالیا کہ غاروں میں بیٹھ جاؤ، کھانا چھوڑ دو گوشت نہیں کھاتے، دودھ نہیں پیتے، شادی نہیں کرتے، لوگوں کے ساتھ میل جول نہیں رکھتے۔ اسلام اس رہبانیت کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ اسلام کہتا ہے کہ آپ معاشرہ میں اللہ کے دین کے نائب اور مبلغ، داعی بن کر رہیں، لوگوں کو بھلائی کا حکم کریں، برائی سے ان کو منع کریں۔ یہ عقیدہ نہ رکھیں کہ جو نہیں کھاتا وہ بڑا بزرگ ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض اللہ والے اللہ کی عبادت میں اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ ان کو عبادت میں اتنی لذت ملتی ہے کہ وہ کھانے کے لیے وقت نہیں نکال سکتے یا ان کو کھانے کی طلب نہیں ہوتی۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ کھانے کو حلال نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر ہم نے

آپ کو کوئی نعمت دی ہے تو اس نعمت کا اثر آپ پر بھی ظاہر ہونا چاہیے، لیکن اس کے اندر فضول خرچی بھی نہ کرو۔ یہ نہیں کہ میک اپ سنگھار پر لاکھوں روپے خرچ کرو۔ یہ بھی منع ہے، اسی طرح بخل بھی منع ہے۔ قرآن نے اس کا نقشہ کھینچ کر فرمایا: ﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾ [بنی اسرائیل:۲۹] کہ ہاتھوں کو ایسے بھی نہ کرو بالکل گردن پر باندھ دو کہ کچھ خرچ بھی نہ کرو، اور نہ ایسا کرو کہ بالکل کچھ بھی نہ بچے کہ پھر اُداس اور غمزدہ ہو کر بیٹھے رہو۔ بلکہ میانہ روی اختیار کرو۔

ان آیاتِ مبارکہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں، ان نعمتوں سے انسان کو فائدہ اُٹھانا چاہیے اور پھر اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے۔

شکر کا معنیٰ:

﴿وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ﴾ جو ہم نے بنا رکھا ہے کہ روٹی کھا کر کہہ دیا کہ اللہ میاں! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے، یہ شکر نہیں ہے۔ ہم نے سنت کو ختم کر دیا ہے اسی طرح سود کا پیسہ زیادہ مل جائے یا رشوت کا پیسہ ٹھیک ٹھاک مل جائے اور اس سے پوچھا جائے کہ کیا حال ہے تو کہتا ہے کہ اللہ کا بڑا شکر ہے۔ یہ تو اللہ کے عذاب کو دعوت دینے والی بات ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ کوئی زنا کرے اور پھر کہے کہ اللہ! تیرا شکر ہے۔ سود تو ستر زناؤں کے برابر ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اپنی سگی ماں کے ساتھ ستر مرتبہ زنا کرنے کے برابر ہے۔

یاد رکھیں! سب سے پہلا شکر ایمان لے آنا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لایا، لاکھ شکر کرتا ہے، یہ کوئی شکر نہیں ہے۔ ایمان کے بعد شکر یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے نعمتیں دی ہیں ان کو اس کی رضا والے اعمال میں خرچ کرنا۔ مثلاً آنکھیں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ناک اور کان دیئے ہیں، یہ سب اعضاء اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، ان کو اس منعمِ حقیقی کی فرمانبرداری میں لگا دو تو یہ شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دیا، زکوٰۃ فرض تھی، زکوٰۃ دے دی تو یہ شکر ہے۔ یہ سارا شکر کرنے کے بعد زبان سے بھی الحمد للہ کہے تو یہ شکر ہے۔ یہ نہیں کہ عمل میں نافرمانی ہو اور زبان پر شکر ہو، دعویٰ تو حضور اکرم ﷺ سے محبت کا کرے، لیکن نافرمان ہو تو یہ اطاعت نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فقر کو پسند فرمایا ہے، لیکن اس کے باوجود آپ کو جو نعمت ملتی، آپ ﷺ اس کو استعمال فرماتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے شادیاں کیں، حضور اکرم ﷺ کو اچھا لباس ملا تو استعمال فرما لیا، اگر نہیں ملا تو صبر کر لیا۔ حضرت

سلیمان علیہ السلام جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ دولت بھی عطا فرمائی تھی، پوری دنیا کے اندر کون ہے کہ جو اللہ نے ان کو شرف دیا تھا، اس میں ان کا مقابلہ کر سکے؟

﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ﴾ اس لئے اسلام کہتا ہے کہ حلال اور پاکیزہ چیزوں سے فائدہ اُٹھاؤ، لیکن حرام نہ کھاؤ۔ آج ہمارا معاشرہ اس لئے خراب ہو گیا ہے کہ ہم حرام کی پروا نہیں کرتے اور حلال سے شرماتے ہیں، مثال کے طور پر ہر آدمی کو پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے لئے چار بیویاں حلال کی ہیں، لیکن دوسری شادی کرنے سے گھبراتا ہے اور اگر وہی آدمی (اللہ تعالیٰ معاف کرے) زنا کرتا رہے تو گھر والے بھی راضی ہیں، پہلی بیوی بھی راضی ہے، یعنی حرام پر راضی ہیں اور حلال پر ناراض ہیں۔

اگر ایک آدمی ملازم ہے، حلال پر گزارا کرتا ہے، بیوی ناراض ہے، بچے ناراض ہیں، سارا خاندان ناراض ہے کہ تم کیسے عجیب آدمی ہو کہ بچوں کے پاس گاڑی نہیں ہے، تم سے چھوٹے عہدے دار ہیں، انہوں نے گاڑیاں بنالی ہیں۔ یہ آدمی کہے کہ وہ تو رشوت لیتے ہیں۔ خاندان والے کہتے ہیں: تم پاگل ہو جو تنخواہ پر گزارا کر رہے ہو۔ یعنی اگر وہ حلال پر ہے سب ناراض ہیں اور اگر وہ حرام کھانا شروع کر دے تو سب خوش ہیں۔

احادیث مبارکہ میں دوسری چیزوں کا بھی ذکر ہے۔ لیکن ''إِنَّمَا'' حصر کے لئے ہوتا ہے، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے علاوہ کوئی اور چیز حرام بھی نہ ہو تو علماء نے فرمایا ہے کہ یہاں حصر اضافی ہے کہ مشرکین جن چیزوں کو چاہتے تو کہہ دیتے کہ یہ حلال ہیں اور جن کو چاہتے تھے تو کہہ دیتے کہ یہ حرام ہیں۔ مشرکین کی ان باتوں کا رد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حصر کر دیا۔ یہ حصر اضافی ہے، حقیقی نہیں ہے، کیونکہ ان کے علاوہ اور بھی چیزیں ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حرام کیا ہے۔

﴿الْمَيْتَةَ﴾ سے مراد وہ جانور ہے جو خود مر جائے۔ اس کا کھانا حرام ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ وضاحت فرمائی ہے: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ﴾ [المائدۃ:۹۶] کہ سمندر کی چیزیں تم پر حلال کر دی گئی ہیں۔ اگر مچھلی ہے تو ذبح کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن اگر کوئی مچھلی خود بخود پانی میں مر گئی اور خود بخود پانی کے اوپر مردہ حالت میں آ گئی تو اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔ اور ﴿الْمَيْتَةَ﴾ کے اندر یہ بھی شمار ہے کہ آپ نے کسی جانور کو پہاڑ کی چوٹی سے گرایا، وہ مر گیا یہ بھی حرام ہے، یا کسی جانور کو آپ نے لٹھ ماری اور وہ مر گیا تو یہ جانور بھی حرام ہے۔ اسی طرح کسی جانور کا گلا گھونٹ دیا اور وہ مر گیا تو یہ بھی حرام ہے۔ کیونکہ جانور کے حلال ہونے کا ذریعہ یہ ہے کہ اللہ کے حکم پر اللہ کا نام لے کر

اس کو باقاعدہ ذبح کیا جائے، جیسا کہ آیا: ﴿فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كُنتُم بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ﴾ [الانعام: ۱۱۸] وہ جانور کھاؤ جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے اور دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ﴾ [الانعام: ۱۲۱] وہ جانور بالکل نہ کھانا جس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے۔

بعض دشمنانِ اسلام یہ اعتراض کرتے ہیں کہ دیکھو! وہ جانور جن کو اللہ نے مار دیا ہے، اس کو تو یہ مسلمان نہیں کھاتے، لیکن جن جانوروں کو یہ خود مار دیتے ہیں، اس کو کھا لیتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: بندے کو بھی میں نے پیدا کیا اور اس جانور کو بھی میں نے پیدا کیا۔ دونوں کی موت وحیات کے اسباب وذرائع میں نے مقرر کئے ہیں۔ اگر ایک بندہ خود اپنے آپ کو چاقو مار کر مر جائے تو وہ حرام موت ہے، اور اگر وہی آدمی اللہ کے راستے میں لڑتے ہوئے مر جائے تو وہ شہید کے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے جانور کو ذبح کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اس کے اندر حکمتیں رکھی ہیں۔ ذبح کے وقت وہ خالق کے نام پر ذبح کیا جاتا ہے، دوسرا اس کے خون کا اخراج ہوتا ہے، اس کے اندر اللہ تعالیٰ کا حکمت ہے کہ جو دم غلیظ ہوتا ہے وہ نکل جاتا ہے اور جو باقی منافع والی چیز ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے لئے حلال کر دی۔

مشینی ذبیحہ کا حکم:

بعض لوگوں کو اس بات سے دھوکہ لگتا ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں کا ذبیحہ حلال ہے، لیکن ہندوؤں کا ذبیحہ حلال کیوں نہیں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جانور پر ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے اہل کتاب ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیتے ہیں، لیکن دہریہ اور جتنے منکرین خدا ہندو اور سکھ ہیں یا آج کل کرنٹ کے ساتھ ذبح کیا جاتا ہے، یہ سب طریقے حرام ہیں۔ لہٰذا اہل کتاب کا ذبیحہ اس وقت حلال ہے جب وہ ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیں، ورنہ حلال نہیں۔

آج کل تو انہوں نے بھی سارا ایسا سسٹم کر دیا ہے کہ مشینی ذبیحہ ہوتا ہے یا بعض جانور کٹتے ہیں تو ان کو بھی مشین کاٹتی ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس طرح جانور کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، مسلمان تو بڑی تکلیف دیتے ہیں۔ یہ جانور کے ساتھ بڑی ہمدرد قوم ہے اور ہیروشیما پر ایٹم بم گراتی ہے۔ اپنے دشمن سامنے ہوں تو تباہ و برباد کر دیں اور اگر مسلمانوں کی عزتیں لوٹی جائیں، ان کو مارا جائے تو وہاں ان کی اگر، مگر، چونکہ اور چنانچہ شرائط، معاہدات کی گنجائش

سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔ یہ اتنے بڑے سفاک ہیں کہ پوری دنیا کو سلو پوائزن (ہلکا ہلکا زہر) کھلا کر مار رہے ہیں اور ہمدردِ انسانیت بھی بنے ہوئے ہیں۔ ان کو اللہ کے قہر کا انتظار کرنا چاہیے۔ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب اور پکڑ آتی ہے تو دنیا کے جدید ذرائع ڈھیلے کے برابر بھی کام نہیں آتے۔

بندوق اور گولی سے شکار کا حکم:

موجودہ دور کے اندر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر ایک جانور ایسا ہے کہ اس کو پکڑ کر ذبح نہیں کر سکتے، وہ بھاگ جاتا ہے تو وہاں ہمیں شریعت نے اجازت دی ہے کہ تیر سے یا نیزے سے اس کا شکار کریں، اور جب تیر چھوڑیں تو بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھ لیں۔ اس سے جانور مر بھی جائے تب بھی حلال ہے۔ اگر وہ زندہ پکڑا جائے تو اس کا ذبح کرنا ضروری ہے۔ اب اس کے اندر قابلِ اُلجھن مسئلہ یہ ہے کہ بندوق کا کیا حکم ہے کیونکہ اُس زمانے کے اندر تیر اور نیزے سے شکار ہوتے تھے، بندوق نہیں ہوتی تھی۔ علماء نے لکھا ہے کہ بندوق کی گولی ضرب مارتی ہے اور اسلام کہتا ہے کہ ایسا آلہ جو جارحہ ہو، یعنی زخم لگانے والا ہو گولی زخم نہیں لگاتی، بلکہ پھاڑ دیتی ہے۔ جارحہ اور خارقہ میں فرق ہے۔ مثال کے طور پر آپ کو چوٹ لگتی ہے تو تب بھی چمڑا پھٹ جاتا ہے اور اگر نشتر سے کاٹیں تب بھی چمڑا کٹ جاتا ہے۔ پھٹنے اور کٹنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ بندوق کی گولی کا شکار حلال نہیں ہوگا۔ علماء متاخرین نے لکھا ہے کہ اب ایسی گولی بھی بنا دی گئی ہے جیسے نیزے کے پھل کی چونچ ہوتی ہے اور وہ نوک دار ہوتی ہے۔ اگر وہ ماری جائے اور بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھا جائے تو جانور حلال ہو جاتا ہے، لیکن اکثر علماء کا فتویٰ اس پر ہے کہ احتیاط کریں، نہ کھائیں۔ کیونکہ وہ گولی بھی جارحہ نہیں بنتی، بلکہ خارقہ بنتی ہے۔

سدھائے ہوئے کتوں کا شکار:

کتوں کے ساتھ شکار کھیلنے کی بھی اجازت ہے، مگر ایسے کتے ہوں جو سدھائے گئے ہوں۔ کتے کو شکار کی تعلیم دینے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم نے ایک ایسا کتا چھوڑ دیا اس نے شکار کو پکڑ لیا، اگر وہ شکار کو پکڑ کر مالک کے لئے بیٹھا ہوا ہے تو یہ سدھایا ہوا کتا ہے اور اگر اس نے شکار کو خود کھانا شروع کر دیا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کتا معلَّم نہیں ہے، سدھایا ہوا نہیں ہے۔

میتہ کے احکام:

جب میتہ حرام ہے تو اس کا بیچنا بھی حرام ہے، اس کی تجارت بھی حرام ہے۔ صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں شراب حرام ہوگئی، ایک صحابی نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: میرے پاس یتیم بچے ہیں، ان کا پیسہ میرے پاس تھا، شراب حرام نہیں تھی، میں نے ان یتیموں کے پیسوں سے شراب خریدی کہ بیچوں، لیکن مدینہ میں پہنچا تو اطلاع ملی کہ اللہ تعالیٰ نے شراب حرام کر دی ہے۔ یتیموں کا سارا مال اس شراب میں ڈوب گیا ہے، اب میں کیا کروں؟ کیا میں اس کو کسی دوسرے ملک میں لے جاؤں اور کافروں کو بیچ دوں؟ تاکہ ان یتیموں کا مال نہ ڈوبے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ثَمَنُ الْحَرَامِ حَرَامٌ'' حرام چیز کا بیچنا بھی حرام ہوتا ہے۔ لہٰذا یاد رکھیں! اگر کوئی آدمی مردار بیچتا ہے یا نجاست بیچتا ہے تو یہ بالکل حرام ہے۔ علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ نجاست تم اپنی مرضی سے جانور کو بھی نہ کھلایا کرو۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ تم نے کسی جگہ رکھی اور کتا، بلی آکر کھا گئے، لیکن تم اپنی نیت سے ان کو نہ کھلاؤ۔

مسئلہ:

میتہ کی ہڈیاں یا اس کا چمڑا یا اس کے بال وغیرہ نجس نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمادیا: ﴿وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ﴾ [النحل: ۸۰] کہ اگر تم ان کے بالوں سے، ان کے چمڑوں سے فائدہ اُٹھانا چاہو تو اُٹھا سکتے ہو۔ چونکہ جانوروں کے بال میں پلیدی نہیں لگتی، ان کو ویسے ہی بیچ سکتے ہیں، لیکن چمڑے میں چونکہ نجاست اثر کر جاتی ہے، اس لیے جب تک چمڑے کی دباغت نہ کریں، اس وقت تک نہیں بیچ سکتے۔

خنزیر کے احکام:

ہاں! خنزیر ایک ایسا پلید جانور ہے جو ذبح کرنے کے بعد بھی حرام ہے۔ ویسے مرجائے، تب بھی حرام ہے، اس کا گوشت، پوست، ہڈی، بال ہر چیز حرام ہے، ان کے پاک ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کے چمڑے کا دھاگہ بنا کر چمڑا سیا جائے تو گنجائش ہے، لیکن اس سے بھی اکثر فقہاء منع فرماتے ہیں۔

جانور کو ذبح کرنے کے لیے اللہ نے جو چار عروق (رگیں) بنائی ہیں، ان کا کٹنا ضروری ہے۔ افضل یہ ہے کہ گردن بالکل علیحدہ نہ ہو، لیکن اگر علیحدہ ہو جائے تو پھر بھی حلال ہے۔

یاد رکھیں! وہ پروردگار عالم جو ہمیں غسل کے مسئلے بھی سمجھاتے ہیں، عورتوں کے حیض کے مسئلے بھی سمجھاتے ہیں، اگر انہوں نے ہم پر کوئی جانور حرام کیا ہے تو اس کے اندر حکمتیں ہیں کہ وہ حرام چیز یا تو ہمارے جسم کو نقصان پہنچانے والی ہے یا وہ ہماری روح کو نقصان پہنچانے والی ہے۔ اگر اس کے اندر مضرت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ بلاوجہ کیوں کسی چیز کو اپنے بندوں پر حرام کرتے؟

مثال کے طور پر نکاح حلال ہے اور زنا حرام ہے۔ حالانکہ نکاح بھی ایک مرد اور عورت کی رضامندی کا معاملہ ہے اور زنا میں بھی (اللہ معاف کرے) عاشق معشوق راضی ہیں یا عورت پیشہ ور ہے تب بھی راضی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نکاح حلال ہے اور زنا فاحشہ اور حرام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تم بغیر نکاح کے برائی کرتے پھرو گے تو ایک تو یہ برائی آگے پھیلے گی اور پورے معاشرے کو گندا کرے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کہیں تمہارا نطفہ قرار پکڑ گیا تو وہ اولاد بالزنا کہلائے گی، محروم النسب ہوگی۔ آج جتنے ترقی یافتہ ممالک ہیں، ان میں لاکھوں کروڑوں ایسے بچوں کی تعداد ہے جن کو اپنے ماں باپ کا پتہ نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی حرام کی ہے، اس میں ہمارا فائدہ ہے۔

دو مُردار اور دو خون حلال ہیں:

دو مُردار حلال ہیں، کیونکہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَ دَمَانِ: فَأَمَّا الْمَيْتَتَانِ فَالْحُوتُ وَ الْجَرَادُ وَ أَمَّا الدَّمَانِ فَالْكَبِدُ وَالطِّحَالُ.''

[مسند احمد بن حنبل، رقم: ۵۷۲۳]

ہمارے لئے دو مُردار اور دو خون حلال ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: وہ کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک مچھلی ہے کہ اگر اس کو ذبح نہ کیا جائے تب بھی حلال ہے، دوسرا ٹڈی حلال ہے۔ اور دو خون ایک جگر اور ایک تلی حلال ہیں۔ دوسرے خون ہم پر حرام ہیں۔ یہاں آیت میں مطلقاً ﴿وَالدَّمَ﴾ آیا ہے، لیکن دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِلَّآ أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ﴾ [الانعام: ۱۴۵] وہ خون حرام ہے جو بہنے والا ہے کہ جانور کو ذبح کرنے کے وقت جو خون نکل رہا ہے، یہ حرام ہے۔ ہمارے بعض لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ جانور ذبح کرتے ہیں تو چھری کو دم مسفوح لگ جاتا ہے، اس چھری کو صاف نہیں کرتے اور دوسرے جانور کو ذبح

کر دیتے ہیں یا اسی چھری سے اس جانور کا گوشت بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ بقر عید اور شادیوں کے موقع پر یہ غلطی عام ہوتی ہے۔ جب دم (خون) حرام ہے تو اس کا بیچنا بھی حرام ہے، وہ نجاسات میں سے ہے جس کو لگے گا، وہ چیز نجس ہو جائے گی۔

انتقالِ خون کا مسئلہ:

سوال: جب خون حرام ہے، اس کا بیچنا اور خریدنا حرام ہے اگر کسی بندے کو خون کی ضرورت ہو تو کیا کیا جائے؟

جواب: بعض علماء اس طرف گئے کہ ناجائز ہے کیونکہ خون حرام ہے اور حرام کے اندر اللہ تعالیٰ نے شفا نہیں رکھی اور یہ تکریم انسانیت کے خلاف ہے۔ لیکن جمہور علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کی مثال دودھ کی سی ہے کہ ماں کے سینے سے نکلتا ہے اور اس کو بچے کی غذا بنا دیا گیا ہے حالانکہ اسی خون سے دودھ بنتا ہے تو جیسے اس دودھ کا انتقال صحیح ہے۔ خون کے لئے کیونکہ کانٹ چھانٹ کی ضرورت نہیں، بلکہ سرنج سے لیا اور سرنج سے دے دیا، اس سے انسانیت کی توہین نہیں ہے لیکن اس کے لئے شرط ہے کہ اگر انسان کا علاج اس خون کے بغیر نہیں ہو سکتا اس وقت خون دینا جائز ہے اور اگر خون دینے کے بغیر علاج ممکن ہے تو خون نہ دیں۔ فقہاء نے یہاں یہ بات لکھی ہے کہ اگر کوئی خون دے تو وہ عطیہ کر دے، خون کو کاروبار نہ بنائے۔ دوسرا یہ بھی کوشش کریں کہ آدمی کافر اور حرام کھانے والوں کا خون نہ لے۔

خنزیر کے متعلق مسائل:

﴿أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ﴾ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر خنزیر کا نام لو چالیس دن تک زبان پاک نہیں ہوتی۔ اللہ کے بندو! خدا کا خوف کرو۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایسی چیز کا نام قرآن میں کیوں ذکر کرتے؟ کیونکہ ان چیزوں کا ذکر آ رہا ہے جن کو وہ کھاتے تھے اور گوشت کھایا جاتا ہے، اس لیے خنزیر کے گوشت کا ذکر کر دیا گیا۔

بعض نے کہہ دیا کہ خنزیر کا گوشت تو حرام ہے، لیکن اس کی ہڈی، بال، چربی میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے گوشت کو حرام کیا ہے۔ اس لیے آج کل جتنے شیونگ برش ہیں سب سے قیمتی برش خنزیر کے بالوں کا ہوتا ہے۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے بیان فرما دیا کہ سور کی کھال، ہڈی، بال سب کچھ حرام ہے۔ جب اس آیت کی تفسیر حضور اکرم ﷺ نے بیان فرما دی ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اُتارا تھا تو خود سے قیاس ٹھیک نہیں ہے۔

جادوگر لوگ ہمیشہ اپنے پاس خنزیر کی ہڈی رکھتے ہیں، کیونکہ سحر کا تعلق شیطان سے ہے اور جتنا آدمی پلید ہوتا

ہے، شیطان اس سے اتنی دوستی بناتا ہے۔ خنزیر کی ہڈی پلید ہے، اس لیے اس کو جادوگر اپنے پاس رکھتے ہیں، تاکہ شیطان کے ساتھ دوستی پکی ہوجائے۔

خنزیر نجس العین ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ خنزیر کی سب سے مرغوب غذا بندے کا فضلہ ہے۔ دوسرا خنزیر کے اندر بے حسی، بے حیائی، بے غیرتی کا مادہ ہوتا ہے۔ اتنا طاقتور ہونے کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ مادہ ایک ہوگی، لیکن خنزیروں کی لائن لگی ہوگی۔ آج تجربہ شاہد ہے کہ جن ملکوں میں خنزیر کا گوشت کھایا جاتا ہے وہاں غیرت کا کوئی مسئلہ نہیں، کوئی پابندی نہیں ہے۔ بعض کمپنیاں جو بسکٹ بناتی ہیں، خاص طور جن میں کریم لگی ہوتی ہے، ان کو بھی پڑھ لیا کریں اور اگر اینیمل فیٹ لکھا ہوا ہو کہ جانور کی چربی سے بنایا گیا ہے تو وہ یقیناً حرام ہوتا ہے اور اگر اس میں ویجیٹیبل فیٹ ہو یعنی وہ چربی سبزیوں سے نکالی گئی ہے تو اس کا استعمال ٹھیک ہے۔

غیر اللہ کے نام کی چیزوں کا حکم:

﴿وَمَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ وہ چیزیں جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کی جائیں، غیر اللہ کے نام پر ان کو چھوڑا جائے، وہ چیز بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح خنزیر حرام ہے۔ اس کے اندر دو صورتیں ہیں: ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک جانور کو غیر اللہ کے نام پر چھوڑا اور ذبح کرنے کے وقت بھی غیر اللہ کا نام لیا، اس کے حرام ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔ اسی طرح ایک جانور ہم نے چھوڑا کہ فلاں پیر کے نام پر ہے اور جب ذبح کیا تو اس پیر کا نام لیا تو اس کے اندر بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ حرام ہے۔ کوئی ایک بندہ نہیں جو اس کو حلال کہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جانور کو غیر اللہ کے نام پر مخصوص کیا، لیکن ذبح کرنے کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا تو یہ بھی تمام علماء کے نزدیک حرام ہے، کیونکہ تقرب الی غیر اللہ کی نیت آگئی ہے۔ علماء نے فرمایا: زمانہ جاہلیت کے اندر عادت تھی کہ اگر کوئی بادشاہ یا کوئی بڑا آدمی آتا تو اس کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے۔ یہ بھی حرام ہے، کیونکہ یہ بھی غیر اللہ کے نام پر تقرب کیا گیا ہے۔

﴿أُهِلَّ﴾ کا اصل معنی آواز ہے۔ اس لیے چاند کو ہلال کہتے ہیں کیونکہ پہلی رات لوگ آواز لگاتے ہیں تو اس آیت کا معنی ہے کہ جس جانور پر اللہ کے سوا کسی غیر کے نام کی آواز لگائی گئی، وہ بھی خنزیر کی طرح حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ [المائدۃ:٣] جو جانور کسی نامور چیز پر ذبح کیا جائے کہ بت کے نام پر ذبح کردو یا ولی کے نام پر ذبح کرو۔ وہ بھی حرام ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ دیگیں، حلوہ

مٹھائی یہ تو ذبح نہیں ہوتیں تو اللہ تعالیٰ نے یہاں ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ فرمایا کہ جس چیز پر بھی میرے نام کے سوا کسی غیر کا نام لیا جائے چاہے وہ چیز جانور ہو یا مٹھائی ہو، وہ حرام ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک عورت آئی۔ اس نے کہا: ہمارے ہمسائے کافر ہیں، ان کے ہاں کبھی کوئی رسم ہوتی ہے جب وہ گوشت تقسیم کرتے ہیں تو ہمیں بھی دیتے ہیں۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: گوشت نہ کھایا کرو، اگر کوئی پھل وغیرہ ہو تو کھا لیا کرو۔

فرزدق بڑا شاعر گزرا ہے، اس کے باپ کا نام غالب تھا۔ اس نے ایک اونٹ ذبح کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حرام ہے۔ اگر کسی آدمی نے دربار یا پیر کے نام پر جانور چھوڑا ہوا ہے کہتا ہے وہیں ذبح کروں گا تو علماء نے لکھا ہے کہ اس جانور کو ذبح کرنے والا مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد کا ذبیحہ حرام ہے کیونکہ اس نے غیر اللہ کے نام پر اللہ کی چیز تقرب کر کے اسی نیت سے ذبح کیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں ہماری نیت تو ثواب کی ہوتی ہے تو ثواب پہنچانے کے لیے قبر پر لانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تم ثواب اپنے ہاتھ سے اندر پہنچاتے ہو یا اللہ تعالیٰ ثواب پہنچاتے ہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ ثواب پہنچاتے ہیں تو یہ جانور اگر تیرے گھر میں ذبح ہوتا تب بھی اللہ تعالیٰ ثواب پہنچا دیتے۔ لیکن تمہارے دربار پر لانے سے معلوم ہوا کہ تم نے اس کو غیر اللہ کے لیے مخصوص کیا ہے تو یہ بھی حرام ہے۔

حلال کھانے کا حکم:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حلال کا کھانا دعا اور عبادت کے قبول ہونے کا سبب ہے، جیسا کہ حرام کھانے سے دعا اور عبادت قبول نہیں ہوتی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور اللہ قبول نہیں فرماتے، مگر پاک کو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے تو پاک کو پاک چیز پسند ہوتی ہے لہٰذا اگر تمہارے کھانے یا لباس میں حرام ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ عبادت میں تاثیر ہوتی ہے اور نہ دعا میں اثر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ کے اندر اپنے ایمان والوں کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو حکم فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ؀﴾ [المومنون:٥١] رسول

ہمیشہ پاک ہیں اور پاک کھاتے ہیں، ان کا تو اللہ نے ایسا نظام بنایا تھا کہ حرام ان کے قریب ہی نہیں آتا تھا اور وہ کبھی خود بھی کسی حرام چیز کے قریب نہیں آتے تھے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے پیغمبر! پاک چیزیں کھاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کی اُمتوں کو تنبیہ ہو اس لئے اللہ تعالیٰ نے عباد مومنین کو بھی فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ﴾ [البقرۃ: ۱۷۲] (اے ایمان والو! ہم نے جو تمہیں پاکیزہ رزق دیا ہے، اس سے کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اگر تم خالص اس کی عبادت کرنے والے ہو)۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک آدمی لمبے لمبے سفر کرتا ہے، اس کے بال بھی کھلے ہوتے ہیں اور سفر کی وجہ سے مٹی کا اثر بھی ہوتا ہے، اس کے بعد وہ دعائیں مانگتا ہے: یارب، یارب! لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ ''مَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَ مَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَ مَلْبَسُهُ حَرَامٌ، وَ غُذِيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذَلِكَ؟'' [صحیح مسلم، رقم: ۱۰۱۵/ جامع ترمذی، رقم: ۲۹۸۹] اس کا کھانا بھی حرام سے ہے، اس کا پینا بھی حرام سے ہے اور اس کا لباس بھی حرام سے ہے اور اس کو حرام کی غذا دی گئی تو اس قسم کے آدمی کی دعا کیسے منظور ہوگی؟ ہمیشہ یاد رکھیں! جب بدن میں حرام آجائے تو دعاؤں میں اثر نہیں رہتا، عبادت میں لذت نہیں رہتی۔

تین مستجاب الدعوات کو حرام کھلانے کا واقعہ:

تاریخ کا مشہور واقعہ کہ جب حجاج بن یوسف گورنر بن کر بصرہ میں آیا تو اس نے آکر پوچھا کہ یہاں اچھے اللہ والے بھی رہتے ہیں؟ لوگوں نے ذکر کیا کہ یہاں تین چار افراد ہیں، ایک مسجد میں رہتے ہیں اور وہ صحیح معنوں میں اللہ والے لوگ ہیں۔ وہ لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں اور زیادہ کسی سے ملتے نہیں ہیں، وہ بڑے مستجاب الدعوات ہیں۔ حجاج نے حکم دیا کہ دعوت کا انتظام کرو اور ان کو کہو کہ میرا کھانا قبول کریں۔ ان کو دعوت دی گئی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ حجاج نے دوبارہ بلانے پر اصرار کیا اور آخر ان کو مجبور کر دیا کہ وہ دعوت پر آجائیں۔ جب وہ آگئے تو ان کو بڑے اکرام سے بٹھایا اور ان کو کھانا کھلایا۔ اس کے بعد کہا: آپ کی بڑی مہربانی آپ آئے، اب آپ تشریف لے جائیں۔ انہوں نے کہا: آپ نے ہماری بڑی عزت کی ہے، کوئی ہمارے ذمہ کام ہو تو بتائیں۔ حجاج نے کہا: میرا جو کام تھا، وہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا: ہمیں بات سمجھ نہیں آئی۔ اس نے کہا: میں نے سنا تھا کہ تمہاری دعائیں

منظور ہوتی ہیں اور میں بہت ظالم آدمی ہوں، میں نے ظلم کرنا ہے۔ لازماً تم مجھے بددعا کرتے، اس لئے اب تمہارے اندر حرام کا کھانا چلا گیا، اب جتنی مرضی میرے خلاف دعائیں کرو، تمہاری دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ کا تنخواہ بڑھانے پر انکار کا واقعہ:

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ جب دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے تو مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا، انہوں نے کہا: حضرت کو مدرسہ میں پڑھاتے اتنے سال گزر گئے، ہم نے آپ کی تنخواہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا، حالانکہ مہنگائی ہر سال بڑھتی چلی جارہی ہے، یہ انصاف نہیں ہے۔ لہٰذا شوریٰ کو غور کرنا چاہیے کہ حضرت کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔ ساری شوریٰ نے کہا: بات بالکل ٹھیک ہے، ہم نے اس طرف توجہ نہیں کی اور حضرت نے اضافہ مانگا بھی نہیں۔ لہٰذا اتنا اتنا اضافہ کیا جائے۔ بالاتفاق تمام مجلس شوریٰ کے ممبران نے منظوری دی اور ایک دوست کے ذمہ لگایا کہ آپ جاکر حضرت کو اس فیصلے سے مطلع کردیں۔ اس آدمی نے بہت خوش ہوکر حضرت کی خدمت میں آکر یہ بات سنائی۔ حضرت نے فرمایا: یہ تو بڑا غلط فیصلہ ہے۔ فوراً مجلس شوریٰ کو خط لکھا کہ جب تک میں جوان تھا، میں زیادہ محنت سے پڑھاتا تھا اور زیادہ وقت لگاتا تھا، اب میں اتنی محنت نہیں کرسکتا۔ میں تو یہ توقع کررہا تھا کہ میری تنخواہ سے پیسے کاٹے جائیں۔ لہٰذا مہربانی کرکے میری تنخواہ میں اضافہ کے بجائے اتنا کاٹا جائے، تاکہ میں قیامت کے دن اللہ کے ہاں حساب میں نہ پکڑا جاؤں۔

آج کوئی ملازم ایسا نہیں ہوگا جو اس طرح کرے۔ یہ تو ہر ایک کو یاد ہوتا ہے کہ مزدور کو پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دے دو، لیکن یہ یاد نہیں ہوتا کہ مالک کو جو وقت دیا تھا، اس میں صحیح معنوں میں کام کیا یا نہیں کیا؟ اس طرح ہم نے اپنے حلال کو حرام کرلیا۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں، لیکن ہم ان کا خیال نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر بغیر بیماری کے دوسرے بیمار کے نام پر ہم نے دوائی لے لی کہ اس کو کمپنی نے بل دینا ہے۔ اگر میں خریدنے جاؤں گا تو لازمی بات ہے پیسے دینے پڑیں گے تو میں اپنے ساتھی سے کہہ دیتا ہوں کہ آج ڈاکٹر صاحب نے یہ دوائی میرے نام پر پرچی لکھوالینا اور وہ پرچی مجھے دے دینا۔ اس طرح ہم نے اپنے حلال کو حرام کرلیا۔ قدرتی بات ہے کہ حرام میں زیادہ لذت ہوتی ہے اور وہ جلدی منہ کو لگ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں معاشرہ اُلٹ پلٹ ہوگیا ہے کہ بیوی اپنے خاوند کے حقوق کا لحاظ نہیں کرتی اور خاوند اپنی بیوی کے حقوق کا لحاظ نہیں

کرتا۔ اس کی وجہ یہی حرام ہے۔ حلال کے اندر برکت ہوتی ہے، حرام سے اللہ تعالیٰ برکتیں اُٹھا لیتے ہیں۔

یورپ میں مسلمانوں کا حال:

ہم یورپ کے دورے پر گئے تو مجھے کئی مسلمان دوستوں نے بتایا کہ ہمارے ہمسائے انگریز اور سب کافر ہیں، یہ سب ہمارے مقروض ہیں۔ کیونکہ ان کو حرام لگا ہوا ہے جب ان کو پیسہ ملا، چھٹی کا دن آیا تو شراب کی بوتلیں لے کر نکل گئے اور سارا پیسہ کھا پی کر ختم کر دیتے ہیں اور ہم مزدور لوگ ہیں، اپنا ایک ایک روپیہ بچاتے، ہیں ہماری زیادہ سے زیادہ تفریح یہ ہوتی ہے کہ مسجد میں چلے گئے، اللہ نے توفیق دی تو تبلیغ والوں کے ساتھ تین دن، سات دن، چالیس دن کے لیے چلے گئے اور ہم نے اپنا ایسا نظام الاوقات بنایا ہوا ہے کہ ہمارے بچے پہلے ٹائم انگریزی سکول میں پڑھتے ہیں، جب وہاں سے چھٹی ہوتی ہے تو دینی سکولوں میں پڑھ لیتے ہیں۔ عشاء کے بعد گھر آتے ہیں۔ اس طرح ہم لوگ اپنے آپ کو اتنا مصروف رکھتے ہیں اور ان کو قرض دیا ہوا ہے جن سے ہم مکان لے کر بیٹھے ہوئے تھے، آج وہ ہمارے مقروض ہیں۔ حرام کے اندر برکت نہیں ہوتی، اگر آدمی نے ایک لاکھ روپیہ کما لیا، لیکن بیٹا بے حیا بن گیا تو ساری زندگی کی کمائی ختم ہوگئی۔ تم نے ساری زندگی لوگوں پر ظلم کر کے جو پیسہ لوٹا تھا، ایک بچہ پیدا ہوا، اس نے سب اُڑا دیا۔

مُردار اور اس کے انڈے بھی حرام ہیں:

مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر میتہ کو حرام فرما دیا۔ بعض مردار ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر انڈے ہوتے ہیں، ان کا کیا حکم ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ پلید ہیں، ان کو بھی استعمال نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ میتہ کا جزء ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کی ایک روایت میں ہے کہ وہ چیز تو اصل میں پاک تھی، لیکن نجاست کی مجاورت کی وجہ سے نا قابلِ استعمال ہوگئی۔ اسی طرح انزائم کا مسئلہ ہے کہ معدہ کے اندر ایک ایسا جوہر ہوتا ہے جس کو دودھ میں ڈال کر اس سے جبن (پنیر) وغیرہ بناتے ہیں، اس کے بنانے میں بڑے جانور کے انزائم (جراثیم) استعمال ہوتے ہیں کہ یہاں تو گائے کا انزائم ہوگا اور یورپ وغیرہ میں خنزیر کا انزائم استعمال کرتے ہیں۔ اس انزائم کے مسئلہ میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ وہ بھی حرام ہے، کیونکہ خنزیر کا ایک جزء حلال میں شامل ہوگیا۔ بعض علماء نے اس پر محمول کیا کہ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں مجوسی لوگوں کے علاقہ سے جبن (پنیر) آتا تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم اس کا

استعمال کر لیتے تھے تو اب بھی کفار کے علاقوں سے آنے والے پنیر کو استعمال کر سکتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ پنیر میں انزائم کی اتنی قلیل مقدار ہوتی ہے اس کو کثیر مقدار میں ملایا جاتا ہے لہٰذا تھوڑی مقدار قابلِ معافی ہے۔ لیکن علماء متاخرین نے یہ تحقیق کی ہے کہ جس جبن میں خنزیر کے انزائم استعمال ہوں، وہ بالاتفاق حرام ہے۔ کیونکہ خنزیر نجس العین ہے۔ اس لیے آدمی جب جبن وغیرہ خریدے تو تحقیق کرے کہ کس ملک کا بنا ہوا ہے اور کون سی کمپنی کا بنا ہوا ہے؟ اگر وہ کافروں کے ملک کا بنا ہوا ہے تو اس سے بچے اور اگر مسلمان ملکوں کا ہے تو ان سے اچھا گمان رکھنا چاہیے کہ وہ خنزیر کے انزائم استعمال نہیں کرتے۔

اسی طرح دوائیں ہیں، ان کے بارے میں متاخرین علماء کا یہ حکم ہے کہ اگر متبادل دوائی ملتی ہے، مثلاً ایک آدمی کو کھانسی ہے، اس کو ایک سیرپ مل رہا ہے، اس کے اندر الکحل موجود ہے اگر اس کے متبادل کوئی دوائی موجود ہے اور اس کے اندر الکحل نہیں ہے تو الکحل والی دوائی استعمال نہ کرے۔ علماء متاخرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر اس مرض کے علاج کا کوئی متبادل موجود نہ ہو اور اس دوا کے استعمال میں نفع کا امکان ہے تو اس کو بطور مرض کے نہ کہ بطور لذت کے استعمال کر سکتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے حضرت ابو عثمان النہدی رحمہ اللہ کی سند سے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ یہ گھی، جبن، فراء (جبن کی ایک قسم ہے) آتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اَلْحَلَالُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ فِي كِتَابِهٖ، وَ الْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فِي كِتَابِهٖ، وَ مَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ مِمَّا عَفَا عَنْهُ." [جامع ترمذی، رقم:۱۷۲۶]

یاد رکھو! حلال وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اور جن چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کتاب میں بیان نہیں کیا، اس میں بندے کے لیے گنجائش ہے۔ لیکن احتیاط زیادہ بہتر ہے، جیسا کہ دوسری جگہ حضور اکرم ﷺ نے ایک جملہ میں سارے مسائل حل کر دیے، فرمایا:

"اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَ الْحَرَامُ بَيِّنٌ، وَ بَيْنَ ذٰلِكَ أُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ." [جامع ترمذی، رقم:۱۲۰۵]

حلال بھی واضح ہے، حرام بھی واضح ہے۔ حلال اور حرام کے درمیان میں بعض چیزیں ہیں جن میں شبہ ہے کہ حلال ہے یا حرام ہے؟ تو تم ان شبہ والی چیزوں کو بھی چھوڑ دو۔

اور اس کی آپ ﷺ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک آدمی نے کھیتی لگائی ہے اور اس کے ارد گرد اس نے باڑ لگا دی ہے اور تم بکریاں چرا رہے ہو۔ اگر تم باڑ کے قریب چراؤ گے تو خطرہ ہے کہ بکری اس کے اندر منہ ڈال لے، لیکن اگر تم باڑ کے قریب ہی نہیں آؤ گے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا کہ بکری منہ مارے۔ اس لیے جب آپ مشتبہ سے بچ جائیں گے تو آپ حرام کے قریب بھی نہیں جائیں گے اور اگر آپ مشتبہ چیزوں میں پڑنا شروع ہو گئے تو پتہ نہیں آہستہ آہستہ حرام تک بھی چلے جائیں گے۔ شریعت کے کافی سارے مسائل میں گنجائش ہوتی ہے، آج کل ہم گنجائش ڈھونڈتے ہیں، تاکہ حرام تک پہنچ جائیں، جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ تو نیتوں کو جانتے ہیں۔ اسلام کی باقی پابندیوں پر عمل کریں تو رعایت کا فائدہ بھی اُٹھالیں، لیکن ہم پابندیوں پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، صرف رعایتیں ڈھونڈ رہے ہیں۔

غیر اللہ کے نام پر ذبح ہونے والا جانور:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ ہمارے ہاں ایک عورت نے گڈے گڈی کی شادی کی ہے اور اس نے اونٹ ذبح کیا ہے اور ہمیں گوشت بھیجا ہے تو کیا ہم وہ گوشت کھا سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اس گوشت کو مت کھانا، وہ اونٹ اللہ کے سوا ایک غیر (بت) کے لیے ذبح ہوا ہے۔

بتوں کی پوجا کی وجہ:

اندازہ لگائیں کہ یہ تو ایک کھیل تھا، عبادت تو نہیں ہو رہی تھی، لیکن فرمایا کہ وہ اونٹ غیر اللہ کے لئے ذبح ہوا ہے، اس لیے حرام ہے۔ ساری کائنات کو پیدا کرنے والی اللہ کی ذات ہے جب جانوروں کا خالق و مالک اللہ ہے وہ جانور اپنے مالک کے نام پر ذبح ہوگا تو حلال ہوگا، کسی غیر کے نام لگائیں گے تو اس کے حلال ہونے کا تصور ہی نہیں ہوسکتا، وہ حرام ہوگیا ہے۔ آج کل لوگوں کے ذہن کے اندر ہے کہ وہ بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے اس لئے وہ جانور حرام تھے۔ ذرا سوچیں! وہ بت کیا تھے؟ جو لوگ آج بھی پتھر کا مجسمہ بنا کر پوجا کرتے ہیں تو کیا وہ اس پتھر کی پوجا کر رہے ہیں؟ اگر مکہ والے پتھروں کی پوجا کرنا چاہتے تو جبل ابوقبیس اتنا بڑا پہاڑ ان کے پاس موجود تھا، اس کی عبادت کرتے، صفا و مروہ بڑے پہاڑ تھے، جبل ثور، جبل نور ان کے پاس موجود تھا، اگر کوئی سونے کا بت بناتا ہے سونے کی عبادت مقصود ہوتی تو سونے کی ڈلی ویسے رکھ لے۔ اصل میں بت کی عبادت کی وجہ یہ تھی کہ پہلے جو اللہ والے بزرگ فوت

ہو گئے، ان کے نام پر ان کی شکلوں کے تخیلاتی مجسمے تیار کرتے تھے، جیسا کہ کعبہ شریف میں سب سے بڑا بت لات تھا، وہ ایک اللہ کا ولی گزرا، جو ستو گھول کر حاجیوں کو پلایا کرتا تھا، جب وہ فوت ہو گیا تو لوگوں نے اس کا ایک بت بنا لیا اور اس کی پوجا شروع کر دی۔ اسی طرح ہندوؤں کو دیکھیں! ان کے ہاں پینتیس کروڑ دیوی دیوتاؤں کا تصور ہے اور انہوں نے مختلف دیوی دیوتا بنائے ہوئے ہیں کہ یہ قہر کی دیوی ہے، یہ کالی دیوی ہے اور یہ فلاں ہے۔ اگر صرف پتھر کا پوجنا ان کا مقصد ہوتا تو مرد و عورت کی شکل بنانے کا کیا مطلب ہوا؟ اصل میں وہ بھی جنوں یا انسانوں کی عبادت کرتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے تقرب کے لئے جانور یا کوئی چیز تقسیم کرے، وہ حرام ہے۔

غیر اللہ کے نام کا جانور:

مسئلہ: ایک آدمی نے تقرب الی غیر اللہ کرتے ہوئے دس بکرے کسی بزرگ شخص یا جگہ کے نام پر لگا دیئے اور وہ آ کر ان مجاوروں کو دے دیئے۔ ان مجاوروں نے ان کو بیچا اور کسی نے خرید لیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ علماء نے لکھا ہے کہ جب تک اصل مالک کی ملک ختم نہ ہو، کسی دوسرے سے ان کو خرید کر ذبح کر کے کھانا بھی حرام ہے۔

اسی طرح ایک آدمی نے کہا کہ یہ اونٹ فلاں بزرگ کے نام پر ہے۔ اس کو کسی آدمی نے مسئلہ سمجھایا کہ غیر اللہ کے تقرب کرنے سے جانور حرام ہو جاتا ہے۔ اس نے کہا: میں توبہ کرتا ہوں، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اب وہ جانور حلال ہے، کیونکہ جب اس نے اپنی اس نیت سے توبہ کر لی تو بات ختم ہو گئی۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ اور محرمات کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر کوئی آدمی حالت اضطرار میں ہے، مثلاً کوئی شخص جنگل میں سفر کر رہا تھا، اس کا زادِ راہ ختم ہو گیا۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ حرام چیز تو ملتی ہے، لیکن حلال نہیں ملتی اور جان کو بھی خطرہ ہے۔ جان حرام کھانے سے بچ سکتی ہے، ورنہ مر جاتا ہے تو حرام کھانے کی دو شرطیں رکھی ہیں کہ جان لبوں پر آ جائے، دوسری شرط یہ ہے کہ نہ تو وہ حد سے نکلنے والا ہو، خوب پیٹ بھر کر کھانے والا نہ ہو اور نہ باغی ہو اور صرف اتنا کھائے جس سے جان بچ سکتی ہو، اس سے تجاوز نہ کرے اور لذت کے لیے نہ کھائے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نے مجبور ہو کر جان بچائی اور حرام کھایا تو تم پر گناہ نہیں ہوگا، البتہ حرام تو حرام رہے گا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [البقرۃ: ۱۷۳] اگر تم ان آیات سے پہلے کوئی غلطی کر چکے ہو تو توبہ کر لو، اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ان آیات کے نزول کے بعد اگر تم سے کوئی خطا ہو گئی ہے تو توبہ کا دروازہ

بند نہیں ہوا، تو بہ کرلو۔ ساتھ یہ بھی اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام کی ہیں، ان کے اندر بھی تیرا بھلا ہے، کیونکہ وہ چیزیں یا تو جسمانی طور پر ضرر پہنچانے والی ہیں یا روحانی طور پر ضرر پہنچانے والی ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے بندوں پر حرام کر دیا ہے۔

حلال میں ہر انسان کے لیے راحت ہے:

یورپ کے سفر میں ایک دوست نے دعوت کی اور کہا کہ ہم گھر میں کھانا نہیں کھاتے، بلکہ کسی ہوٹل میں کھانا کھلاتے ہیں۔ میں نے کہا: پتہ نہیں، یہاں ہوٹل کیسے ہوں گے؟ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مسلمان ساتھیوں نے ہوٹل بنایا ہوا ہے اور وہ حلال چیز استعمال کرتے ہیں۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ان کی ٹیبلوں پر انگریز بھی بیٹھے ہوئے تھے حالانکہ کھانے ہمارے ملک والے تھے، چٹخارے اور مرچ مسالے والے تھے۔ میں نے اس ہوٹل والے کو بلا کر پوچھا کہ کافر تو مرچیں مسالہ نہیں کھاتے، یہ تو اُبلی ہوئی سبزی اور اُبلا ہوا گوشت کھانے والے لوگ ہیں، یہ تمہارے ہوٹل پر کیسے آجاتے ہیں؟ اس نے کہا: سب سے زیادہ یہ کھاتے ہیں، ان کو بھی حلال میں مزہ آتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو بندے کے لیے حلال کیا ہے اس میں بندے کے لیے جسمانی راحت بھی ہے، روحانی راحت بھی ہے اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے، اس میں جسمانی مضرت بھی ہے اور روحانی مضرت بھی ہے۔

بعض علماء نے اس آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا ہے کہ وہ آدمی جس نے اپنے صالح بادشاہ کے خلاف بغاوت کی ہو، ایسا آدمی مر رہا ہے تو اس کو حرام کھا کر جان بچانے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ اس نے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑا ہے، یہ تو باغی ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کے لیے شرعاً اور عقلاً لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اپنے اُولوالامر کی اطاعت کرے۔

﴿أُولِي الْأَمْرِ﴾ کا مصداق ومعنیٰ:

﴿أُولِي الْأَمْرِ﴾ کے مصداق میں حاکم اور علماء دونوں شامل ہوتے ہیں۔ حاکم کی اطاعت کا اتنی شدت سے حکم ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تمہارے اوپر یہ بات لازم ہے کہ جب تمہیں تمہارا حاکم کوئی حکم کرے تو اس کی اطاعت کرو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر کبھی تمہارے اوپر کوئی سیاہ فام چھوٹے سر والا غلام افسر بن گیا تو تم اس کی

بھی اطاعت کرو۔

حضرت عطاء الخراسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ایسا نہ کرے کہ مردار جانور کا گوشت کاٹ کر اس کو بھونے یا اس کو تلے، بلکہ ایک آدھ لقمہ لے لے جس سے جان بچ جائے اور جب حلال ملے تو اس حرام کو پھینک دے، کیونکہ اگر آپ ان کو بھونیں گے، پھر تو آپ لذت کے لیے کھائیں گے جو کہ ٹھیک نہیں ہے۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ﴾ کے اندر مفسرین کا دوسرا قول یہ ہے کہ جس پر جبر کیا گیا ہو، مثلاً کوئی کافر ملک کے اندر پھنس گیا، انہوں نے کہا: حرام کھاؤ۔ شراب نہیں پیو گے تو گولی ماردیں گے۔ اس وقت اس نے حرام کھالیا یا پی لیا تو اللہ اس پر رحمت کرے گا، اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

ایک آدمی حالت اضطرار میں تھا، اس کے سامنے کسی دوسرے کی روٹی رکھی ہے، دوسرا اس کے سامنے میتہ پڑا ہے تو وہ کیا کھائے؟ تو وہاں پر دیکھنا پڑے گا کہ دونوں میں اخف چیز کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ دوسرے آدمی کی جو روٹی رکھی ہے، وہ کھالے۔ کیونکہ جب وہ آئے گا اس سے معافی بھی مل سکتی ہے، وہ بخش بھی سکتا ہے، لیکن میتہ سے تو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کے مال سے اتنا کھائے جس سے جان بچ جائے، یہ نہ ہو کہ سارا مال کھا کر کہو کہ میں مضطر تھا۔

اس روٹی کا معاوضہ اس کو ادا کریں گے یا ادا نہیں کریں گے؟ اس کے اندر دو قول ہیں: بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا حق ادا کرے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے اضطرار کی حالت میں اجازت دی ہے تو اس پر گناہ کوئی نہیں۔ بہر حال تقویٰ اس میں ہے کہ اس کو معاوضہ ادا کرے۔

قحط کی وجہ سے ایک صحابی کی بھوک:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے عباد بن شرحبیل العنزی کی سند سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ایک سال بڑا قحط آ گیا۔ میں مدینہ منورہ آیا۔ ایک باغ میں آیا، میں نے اس سے خوشے کاٹے اور ان کو کھانا شروع کر دیا اور کچھ کپڑے میں بھی رکھ لیا تو کھیت والا آدمی آ گیا۔ اس نے مجھے تھپڑ مارا اور میرا کپڑا بھی چھین لیا۔ میں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ حضور! میں تو بھوکا تھا...... حضور اکرم ﷺ نے اس آدمی کو بلایا اور فرمایا: تم عجیب آدمی ہو، جب وہ بھوکا تھا تو تم نے اس کو کھلایا نہیں۔ اور وہ بیچارا مسئلہ نہیں جانتا تھا، جاہل تھا، تم نے اس کو مسئلہ بھی نہیں سمجھایا، تم نے تو بڑی زیادتی کی ہے، اس کو کپڑا واپس کرو۔ حضور اکرم ﷺ نے مجھے وہ کپڑا

واپس دلا دیا اور نصف وسق یا ایک وسق غلہ دینے کا حکم دیا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ روایت صحیح ہے اور اس کے بہت سے شواہد ہیں۔

باغات کے رستوں میں پھل کھانے کا حکم:

(حدیث) ایک آدمی نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا کہ ہم باغات میں گزر رہے ہوتے ہیں، وہاں پھل لٹک رہے ہوتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: "مَنْ أَصَابَ مِنْهُ مِنْ ذِي حَاجَةٍ غَيْرَ مُتَّخِذٍ خُبْنَةً فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ" [جامع ترمذی، رقم: ۱۲۸۹] کسی نے اتنی مقدار لے لی کہ منہ میں لے کر کھا لے یہ نہیں کہ بوریاں بھرے یا اُٹھاتا پھرے۔ تھوڑی مقدار میں جو منہ میں ڈال لی، اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما دیں گے۔

حالت اضطرار میں حرام کھانے کا حکم:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جان بچانے کے لئے بھی تین لقمہ سے زیادہ نہ کھائیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جان بچانے کے لیے حرام کھانا، یہ عزیمت ہے، رخصت نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ نہیں کھائے گا تو مر جائے گا تو اس طرح یہ خودکشی شمار ہوگی۔ ہمارے ہاں اگر کوئی آدمی زیادہ بیمار ہو اور روزہ دار ہو، لوگ اس کو کھلانا چاہیں، لیکن وہ کہے کہ میں روزہ دار ہوں تو لوگ کہتے ہیں: بڑا نیک آدمی ہے۔ یہ کون سی نیکی ہے؟ وہ تو شریعت کی خلاف ورزی کر رہا ہے، کیونکہ شریعت نے حکم دیا تھا کہ اگر تم بیمار ہو تو روزہ نہ رکھو۔ اگر روزہ رکھ لیا تو شدت بیماری کے تقاضا کی وجہ سے روزہ توڑ دو اور بعد میں اس کی قضا کر لو۔ حضرت مسروق رحمہ اللہ نے فرمایا:

"مَنِ اضْطُرَّ فَلَمْ يَأْكُلْ وَ لَمْ يَشْرَبْ، ثُمَّ مَاتَ دَخَلَ النَّارَ." [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۹۵]

جس نے حالت اضطرار میں نہ کھایا اور نہ پیا، اگر ایسے میں آدمی مر گیا تو جہنم میں ڈالا جائے گا۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۷۴تا۱۷۶]

''جولوگ چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب (تورات) میں (حضور ﷺ کی صفت کو) اُتارا اور اس کے عوض معمولی سی دنیا کماتے ہیں، یہ لوگ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں، مگر آگ۔ نہ تو اللہ ان سے قیامت کے دن بات کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ یہی ہیں جنہوں نے ہدایت کی جگہ گمراہی کو لے لیا ہے اور مغفرت کے بدلے میں عذاب کو۔ پس کتنے صابر (جری) ہیں آگ سہنے پر۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ نے حق کے ساتھ کتاب (قرآن) کو اُتارا اور وہ لوگ جنہوں نے قرآن کے متعلق اختلاف کیا، وہ ضد میں دور جا پڑے ہیں۔''

جن کو پیغامِ رسالت نہیں پہنچتا، ان کی نجات کا حکم:

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے محرماتِ معنویہ کا بیان فرمایا ہے۔ اس سے پہلے محرماتِ حسیہ کا بیان تھا۔ ان آیات سے یہود مراد ہیں، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے آنے سے پہلے مشرکین مکہ کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی، بلکہ مشرکین مکہ کے پاس حضور اکرم ﷺ سے پہلے کوئی ڈرانے والا بھی نہیں آیا تھا۔

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ جو لوگ آپ کی بعثت سے پہلے وفات پا گئے، ان کے بارے میں ہم کوئی فیصلہ نہ کریں کہ وہ جنت میں جائیں گے یا جہنم میں جائیں گے۔

جمہور علماء فرماتے ہیں کہ نبی اور رسول کا نہ آنا اور تعلیماتِ نبوت و رسالت کے نہ آنے میں بڑا فرق ہے۔ ہندوستان میں ہمارے پاس بھی رسول نہیں آئے، لیکن اللہ کے نبی کی تعلیمات علماء کے ذریعہ وہاں تک پہنچ گئیں۔ اگر بفرضِ محال ہم مان لیں کہ ایک جماعت ایسی ہے کہ اس کو نہ اللہ کا رسول ملا اور نہ ان کی تعلیمات پہنچیں، مثلاً سائبیریا کا علاقہ ہے، منجمد شمالی کا علاقہ ہے، جہاں کوئی آدمی نہیں جا سکتا، اگر وہاں کوئی آدمی پائے جائیں تو ان کے بارے میں علماء نے فرمایا ہے کہ ان سے صرف توحید کے مسئلے کے بارے میں سوال ہوگا۔ اگر وہ اللہ کو مانتے ہوں گے تو جنت میں چلے جائیں گے۔ باقی ان سے شریعت کا مسئلہ نہیں پوچھا جائے گا۔ کیونکہ ان کے پاس شریعت نہیں پہنچی، لیکن توحید کا مسئلہ فطرتِ انسانی سے تعلق رکھتا ہے، ہر آدمی سوچ سکتا ہے کہ یہ آسمان و زمین بغیر کسی بنانے والے کے نہیں بن سکتے۔

تحریف تورات وانجیل:

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی یہاں تک مذمت بیان فرمائی ہے کہ یہ اہل کتاب ہونے کے باوجود کتنے بڑے کافر ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ خنزیر حلال ہے، مُردار جانور حلال ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جیسے حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنا بہت بڑا جرم ہے، لیکن اس سے بڑا جرم یہ ہے کہ کتاب میں مسئلہ موجود ہو اور اس کو چھپایا جائے۔ یہ بھی سب سے بڑا جرم ہے۔ اہل کتاب اللہ کی کتاب میں تحریف لفظی بھی کرتے تھے اور تحریف معنوی بھی کرتے تھے۔ یا تو اپنی طرف سے کسی جگہ کوئی لفظ ڈال دیا تو ترجمہ بدل گیا یا کسی جگہ اپنی طرف سے لفظ گھٹا دیا تو ترجمہ بدل گیا یا کسی جگہ ایک حرف کے دو معنی ہوتے تھے جو معنی مراد ہوتا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرا معنی کر دیتے تھے۔

تحریف قرآن:

سب سے پہلے تحریف کرنے والے یہود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں فرمایا: ﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ [النساء: ۴۶] کہ یہ ایسی بد بخت قوم ہے جو اللہ کے کلمات کو اپنی جگہ سے بدل دیتے ہیں۔ اور یہودیوں سے تحریف کا سلسلہ چلتا ہوا عبداللہ بن سبا کی جماعت میں آیا، کیونکہ اس کی بنیاد بھی یہودیت ہے، ان کا مؤسس اعلیٰ عبداللہ بن سبا اور حسن بن سبا ہیں، وہ دونوں یہودی النسل تھے تو یہودیت والی ساری بیماریاں ان میں بھی داخل ہو گئیں۔ انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کے قرآن کو بدل ڈالا۔ قرآن کہتا ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [آل عمران: ۱۱۰] لیکن انہوں نے کہا: یہاں ''خَيْرَ اَئِمَّةٍ'' کا لفظ تھا کہ تم بڑے بڑے امام بہت اچھے ہو، تم لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔ اسی طرح قرآن کی آیت ہے: ﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ﴾ [البقرۃ: ۵۹] اس جماعت نے وہاں ایک لفظ بڑھا دیا کہ ''فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (آل محمد) قَوْلًا'' وہ لوگ بڑے ظالم ہیں جنہوں نے آل محمد ﷺ پر بڑا ظلم کیا۔ حالانکہ یہاں آل محمد ﷺ کی بات نہیں تھی، یہاں تو یہودیوں کی بات ہو رہی تھی۔ یہ اللہ کے قرآن میں تحریف ہے اور کبھی لفظ وہی رہنے دیتے ہیں، لیکن ترجمہ بدل دیتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا﴾ [مریم: ۵۰] تو انہوں نے کہا: ﴿عَلِيًّا﴾ سے مراد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن تو حضور پاک ﷺ پر اُتارا ہے اور پھر حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کو ایک ایک حرف پڑھا دیا اور صحابہ نے پوری اُمت کو

پڑھا دیا اور پھر دیکھیں قرآن کے الفاظ ﴿وَجَعَلْنَا لَهُمْ﴾... ﴿لَهُمْ﴾ جمع کی ضمیر ہے، اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کیسے مراد ہو سکتے ہیں؟

اسی طرح کا ایک جاہل سنی تھا، اس نے کہا: ﴿عَلِيًّا﴾ سے پہلا صدق ہے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تو پہلے ہیں، اور اس نے کہا: میرے پاس اس کی تائید بھی ہے کہ قرآن میں ﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝﴾ [الزمر: ۳۳] سے مراد ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں تو یہاں بھی ابو بکر رضی اللہ عنہ پہلے ہیں۔ تمہارا مسئلہ پھر بھی حل نہ ہوا۔

جن لوگوں نے تحریف کی ہے، یہ اتنے بڑے خطرناک ہیں کہ ان کے مولوی اہلسنت والجماعت بن کر چھپے رہے، ساری دنیا ان کو اہلسنت سمجھتی رہی، لیکن وہ کہیں نہ کہیں اپنا زہر پھیلا گئے اور ایسا جملہ لکھ گئے کہ اپنے مذہب کا حق ادا کر دیا۔

فرزدق شاعر کا بادشاہ کے ساتھ واقعہ:

فرزدق ایک بڑا شاعر گزرا ہے۔ سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ کی بات ہے، جب وہ بادشاہ تھا۔ فرزدق نے بادشاہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھا کہ مجھے انعام ملے گا۔ لیکن اتفاق یہ ہوا کہ بادشاہ کو پسند نہ آیا۔ اس شاعر کے مخالفوں نے بادشاہ کو اس کے خلاف ورغلا دیا۔ بہرحال بادشاہ نے اس کو انعام نہ دیا۔ فرزدق کو بڑی چوٹ لگی کہ میری بڑی بے عزتی ہو گئی۔ اس نے غصہ میں آ کر ایک اور نظم لکھی، جس کا ایک شعر یہ بھی تھا:

لَقَدْ ضَاعَ شِعْرِيْ عَلَى بَابِكُمْ
كَمَا ضَاعَ دُرٌّ عَلَى خَالِصَةْ

میرے شعر تمہارے دروازے پر ایسے گندے ہو گئے جیسے موتی خالصہ پر کہ اس کی بدصورتی کی وجہ سے موتی بے قیمت ہو گیا۔ اس طرح تمہاری ہی بے وقوفی کی وجہ سے میرے شعر بے قیمت ہو گئے۔

(خالصہ، بادشاہ کی محبوبہ تھی)۔ وہ شعر خالصہ کو پہنچا۔ وہ بادشاہ کی منظورِ نظر تھی، اس نے بادشاہ سے کہا کہ یہ میری توہین کرتا ہے۔ بادشاہ نے کہا: اس کو گرفتار کر کے پیش کرو۔ شاعر کو زنجیروں میں جکڑ کر بادشاہ کی خدمت میں لایا گیا، خالصہ بھی پردے کے پیچھے اس کا حشر دیکھنے کے لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے غصہ میں کہا کہ یہ شعر تم نے کہا ہے؟ اور وہ شعر بادشاہ نے پڑھ دیا۔ فرزدق نے کہا: بادشاہ سلامت! شعر تو میں نے کہا ہے، لیکن اس میں میرے

دشمنوں نے ردّو بدل کیا ہے۔ بادشاہ نے کہا: وہ کیسے؟ اس نے کہا: میں نے "ضَاءَ" ہمزہ کے ساتھ کہا تھا کہ میرے شعر تمہارے دروازے پر آکر کیسے روشن ہو جاتے ہیں، جیسے موتی خالصہ پر جا کر چمک اُٹھتا ہے۔ دشمنوں نے میری بے عزتی کرانے کے لیے ہمزہ کو عین بنا دیا ہے۔ خالصہ سے صبر نہ ہو سکا، وہ پردے سے باہر نکل آئی اور پورے گلے کے ہار اس کو انعام میں دے دیئے اور بادشاہ نے بھی اس کا اعزاز و اکرام کیا۔ اس کی اُردو والے نے بھی مثال دی ہے:

ہم دُعا لکھتے رہے وہ دَغا پڑھتے رہے
ایک نقطہ نے ہمیں مُحرم سے مجرم بنا دیا

تحریف کرنے کی وجوہات:

﴿وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ یہ ساری تحریف و کتمان اس لئے کرتے ہیں، تاکہ مال و دولت ملے، بڑے آدمی کے لیے اور مسئلہ اور غریب کے لئے دوسرا مسئلہ بنا دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ نہیں ڈال رہے اپنے پیٹوں میں، مگر جہنم کی آگ۔ بظاہر تو حلوے، مٹھائیاں کھا رہے ہیں، لیکن اس کا انجام جہنم ہے۔ ایسے بدبختوں کے لئے تین سزائیں ہیں: قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ایسے بدبختوں سے کلام بھی نہیں فرمائیں گے، یعنی کلامِ رحمت نہیں فرمائیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: قیامت کا دن عدل کا دن ہے، اس دن اللہ تبارک و تعالیٰ سب سے بات فرمائیں گے، لیکن یہ ایسے بدقسمت ہیں کہ ان سے غصہ والی بات بھی نہیں ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرمائیں گے کہ ان کو کہہ دو: یہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ میں ان سے ہم کلام ہوں۔ اس تقابل سے معلوم ہوا کہ جو حق کہنے والے ہیں، جو اللہ کا قرآن صحیح بیان کرنے والے ہیں، ان سے اللہ تعالیٰ خود کلام فرمائیں گے۔

جیسا کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ جب قیامت والے دن جنت والے جنت میں چلے جائیں گے اور جنت میں بڑے مزے سے ہوں گے، ساری جنت میں روشنی بھر جائے گی، وہ سر اُٹھا کر دیکھیں گے کہ یہ روشنی کیسے ہوگئی؟ تو وہ دیکھیں گے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے اوپر نظر ڈالیں گے اور فرمائیں گے: السلام علیکم تو اللہ تعالیٰ ان سے خود کلام فرمائیں گے۔ تو مومن کو جب دیدار باری تعالیٰ نصیب ہوگا تو باقی ساری نعمتیں بھول جائیں گی۔

﴿وَلَا يُزَكِّيهِمْ﴾ اور اللہ تعالیٰ ان کو پاک بھی نہیں فرمائیں گے، جیسے ایک کپڑا خراب اور گندا ہو جائے تو اس کو دھو کر پاک صاف کر لیتے ہیں، اسی طرح بندہ بھی گناہوں سے پلید ہو جاتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ بھی تو اپنے بندوں

کو دنیا میں پاک کر دیتے ہیں کہ کوئی بیماری آگئی، کوئی پریشانی آگئی، نوکری چھوٹ گئی، گھر کے اندر نا چاقی ہوگئی، تاکہ میرا بندہ دنیا میں پاک ہو جائے اور بعض بندے ایسے ہیں جو گناہ لے کر مر گئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو جہنم میں گناہوں کے بقدر ڈال کر پاک کر دیں گے اور پھر ان کو جنت میں بھیجیں گے۔ البتہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام کو چھپاتے ہیں، اللہ کی کتابوں کو بدل ڈالتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام کو قلیل ثمن کے عوض بیچ ڈالتے ہیں، ان کو پاک نہیں کیا جائے گا اور ان کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈالا جائے گا اور ان کے لئے عذاب دردناک ہوگا، جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾﴾ [البقرة:۱۷۵] یہ ایسا تاجر ہے جس نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب خریدا۔ ان بدبختوں کی کتنی بہادری ہے کہ جہنم کی آگ سے جلنے کے لیے بھی تیار کھڑے ہیں۔

﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿١٧٦﴾﴾ [البقرة:۱۷۶]

خبردار! سُن لو جو اللہ تعالیٰ نے اُتارا ہے وہ حق ہے اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے قرآن میں اختلاف کیا، حلال کو حرام کر دیا اور حرام کو حلال کر دیا، جھوٹ کو سچ کر دیا اور سچ کو جھوٹ کر دیا، یہی لوگ ہیں جو دور گھاٹی میں جا پڑے ہیں۔

چونکہ حق کو چھپانے اور تحریف کرنے میں یہودی سب سے آگے تھے، لہٰذا اکثر آیات میں یہود کا ذکر آتا ہے، ورنہ حکم عام ہے کوئی بھی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کے قرآن کا مسئلہ چھپائے یا تحریف کرے، اس کے لیے بھی یہی عذاب ہے، کوئی آدمی صحیح حدیث مبارک کا مسئلہ چھپا دے تو اس کے لیے بھی یہی سزا ہے۔ قرآن میں مشرکین یا یہود و نصاریٰ کا ذکر اس لیے آتا ہے کیونکہ قرآن جب نازل ہوا تو یہی لوگ مخاطب تھے اور یہی لوگ مقابلہ میں تھے۔ اس لیے واقعہ تو ان کا ہوگا، لیکن حکم عام ہوگا۔ نماز پڑھنے کا حکم آیا تو یہ نہیں کہ حکم صرف صحابہ ﷺ کے لیے ہو، بلکہ سب کے لیے ہے۔

یہود کی عہد شکنیاں اور ان کا انجام:

پھر یہودیوں نے ایسی ایسی عہد شکنیاں کیں کہ حضور اکرم ﷺ جو رحمت للعالمین ہیں، ان کو بھی یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ ان کے ساتھ جنگ کی جائے، حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے تو کبھی اپنے دشمن کو اپنی ذات کے بدلہ میں سزائیں نہ دیں۔ آپ ﷺ کی یہودیوں سے دو دفعہ جنگ ہوئی۔ ایک دفعہ تو حکم دیا کہ اے یہود! مدینہ سے نکل جاؤ اور

جتنا سامان اپنا لے جاسکتے ہو لے جاؤ تو وہ مدینہ سے نکل کر خیبر میں پہنچ گئے۔ دوسرے قبائل نے وہی دشمنی جاری رکھی، پھر حضور اکرم ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو حکم بنایا تو یہ فیصلہ ہوا کہ ان کے مرد قتل کردیئے جائیں، عورتیں کنیزیں بنالی جائیں۔ اسی طرح یہودیوں کی قوت کو ختم کیا گیا۔ جب وہ خیبر میں آباد ہوئے تب بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے، حتیٰ کہ حضور اکرم ﷺ کو مدینہ سے فوج لے کر خیبر پر چڑھائی کرنی پڑی، کیونکہ انہوں نے خیبر کے اندر بیٹھے بیٹھے روم سے مل کر مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ بجائے اس کے کہ وہ ہم پر حملہ کریں، تم ان پر حملہ کرو...... پھر حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا:

"أَخْرِجُوا الْيَهُودَ وَ النَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ." [مسند البزار، رقم: ۲۳۰]

"یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس حکم کی تعمیل کی اور ان کو جزیرۂ عرب سے باہر کردیا۔ وہ دشمنی آج تک یہود کے رگ و پے میں چلی آرہی ہے۔

یہودی ذلیل ہیں یا نہیں؟

لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا کہ ان یہودیوں کی دنیا بھی برباد ہے اور آخرت بھی برباد ہے، لیکن یہودی تو دنیا میں بڑی طاقت میں ہیں، ساری دنیا کے سرمایہ پر وہ سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں، ساری دنیا کو گولڈ، ڈائمنڈ ان کے کنٹرول میں ہے، پھر وہ ذلیل تو نہ ہوئے، بلکہ ان کے مقابلہ پر ہم مسلمان ہر جگہ ذلیل ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ عزت و ذلت کے پیمانے کو سمجھنا چاہیے کہ عزت کس کو کہتے ہیں اور ذلت کس کو کہتے ہیں؟ جب یہ بات سمجھ آجائے گی تو آپ کو مسئلہ سمجھ آجائے گا۔ آپ لوگوں کی نظروں میں اس کی عزت ہے جس کے پاس پیسہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ عزت کا پیمانہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸﴾ [المنافقون: ۸] عزت تو اللہ کے لیے ہے، اللہ کے رسول کے لیے ہے، مومنین کے لیے ہے۔ اگر عزت کا پیمانہ دولت ہوتی تو دنیا میں سب سے بڑے امیر محمد مصطفیٰ ﷺ ہوتے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ سے زیادہ نہ کوئی شرف میں بڑا ہوا اور نہ قیامت میں کوئی بڑا ہوگا۔ جبکہ حضور اکرم ﷺ کے گھر میں کھانا بھی نہیں پکتا تھا، تین تین ماہ آگ نہیں جلتی تھی، آپ ﷺ نے کبھی دو تین جوڑے بنا کر گھر میں نہیں لٹکائے۔

عزت کا پیمانہ وہ نہیں جو ہماری نظروں میں ہے، ورنہ شیطان کے پاس اتنی قوت ہے کہ منٹ میں جو چاہے شکل بدلے اور ایک سیکنڈ میں لاکھوں لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈال کران کو گمراہ کر ڈالے۔ سمندر کے اوپر تخت لگا کر بیٹھا ہو، ایک ملک سے دوسرے ملک میں وہ سیکنڈوں میں منتقل ہو جائے تو پھر اس کا کیا مطلب ہے کہ شیطان بھی عزت والا ہے؟ اس لیے سمجھ لیں کہ ہم نے جو عزت کا پیمانہ بنایا ہوا ہے وہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایمان والا عزت والا ہے، چاہے اس کے پاس روٹی کا ٹکڑا بھی نہ ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑی شان رکھتا ہے۔

(حدیث) اس کی میرے آقا ﷺ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ بعض اوقات ایسا آدمی ہوتا ہے کہ اس کے بال کھلے ہوئے، اوپر مٹی پڑی ہوتی ہے، کسی سے رشتہ مانگے تو اس کو کوئی رشتہ بھی نہ دے، کسی سے جا کر کوئی بات کرے تو کوئی اس کی بات بھی نہ سنے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنی شان والا ہوتا ہے کہ اگر زبان سے کوئی بات نکال دے تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا کر دیتے ہیں۔ جب تمہیں عزت کا پیمانہ سمجھ میں آ جائے گا تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہود عزت میں نہیں ہیں، یہ تو ظاہری اور دنیوی باتیں ہیں اور دنیا کی عزت کوئی عزت نہیں ہے۔

دوسری بات سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جو عزت کا وعدہ کیا ہے، وہ وعدہ ایمان سے مشروط ہے، اگر ایمان نہ ہو تو وہ وعدہ خود بخود ختم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہیں عزت، غلبہ اور نصرت عطا کروں گا، شرط یہ ہے کہ تم میری عبادت کرو گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرو گے۔ فرمایا: اے میرے مدنی! یہ کتاب میں جو آپ کی صفات ہیں، ان کو اس لیے چھپا رہے ہیں کہ ان کی سرداری نہ چلی جائے۔ آپ ان کو دعوت دیں کہ آؤ، ہم اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اس کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے اور ہم اپنے بڑے بڑے پیروں، فقیروں کو خدا نہیں بنا ڈالیں گے اور ہم خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۔ وہ یہ وعدہ کریں تو ہم ان کو بھی عزت دینے کے لئے تیار ہیں۔

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ﴾ جن لوگوں نے حق بات کو ثمن قلیل کے عوض چھپایا، ان کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے اندر رُسوائی اور آخرت میں جہنم کا عذاب ہے۔ دنیا میں یہود اس طرح ذلیل ہوئے کہ انہوں نے یہ کوشش کی تھی کہ جب ہم یہ صفات چھپا دیں گے تو حضور اکرم ﷺ پر کوئی ایمان نہیں لے آئے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا کر دیا، اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو آیات اور دلائل دیئے اس کی وجہ سے یہ لوگ جلتے رہ گئے اور دوسرے لوگ حضور اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے اور آپ ﷺ کے مددگار بنے، صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت

ان ظالموں سے لڑتی رہی اور ان کا انجام یہ ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب پر عذاب لے کر لوٹے۔

صحیح حدیث پاک میں آیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ شَرِبَ فِي إِنَاءٍ مِنْ ذَهَبٍ، أَوْ فِضَّةٍ، فَإِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِي بَطْنِهِ نَارًا مِنْ جَهَنَّمَ."

[صحيح مسلم، رقم:٢٠٦٥]

جو آدمی بھی آج دنیا کے اندر سونے یا چاندی کے برتن میں پیے گا، قیامت والے دن اس کا پیٹ انگاروں سے بھرا جائے گا۔

سونے چاندی کا استعمال مردوں پر حرام ہے:

سونے چاندی کا استعمال اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی اُمت کے مردوں پر حرام فرمادیا ہے۔

حدیث مبارک میں ہے کہ آپ ﷺ نے دو ٹکڑے ہاتھ میں لیے، ایک ہاتھ میں ریشم کا ٹکڑا اور دوسرے ہاتھ میں سونے کا ٹکڑا لیا اور فرمایا: یہ دونوں چیزیں میری اُمت کے مردوں پر حرام ہیں۔ اس لیے سونے کا استعمال کسی بھی شکل میں ہو، مثلاً انگوٹھی کی صورت میں یا آج کل گھڑی کی چین سونے کی آجاتی ہے یا قلم سونے کا بنا ہوتا ہے، سونے کا استعمال کرنا مرد کے لیے حرام ہے۔ اس کے اندر اسراف اور تکبر کا اظہار ہے۔ البتہ عورت کے لیے سونے کے زیور کی اجازت ہے اور مرد کے لیے چاندی کے اندر اتنی گنجائش ہے کہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین ماشے جس سے انگوٹھی بن جائے، اس کا استعمال مرد کے لیے جائز ہے یا اس کا کوئی دانت ٹوٹ گیا اور اس نے سونے کا لگوالیا تو جائز ہے یا دانت خراب تھا، اس کے اوپر سونے کا خول چڑھادیا تو وہ بھی جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اس دھات میں بدبو پیدا نہیں ہوتی۔

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ ۚ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ ۚ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۚ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿١٧٧﴾﴾

[البقرة:١٧٧]

''نیکی کچھ یہی نہیں کہ تم اپنے رُخ (نماز میں) مشرق یا مغرب کی طرف کرلو لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے جو ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور انبیاء پر اور دے مال اس کی محبت پر رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کو اور طلبگاروں کو اور (غلاموں اور قیدیوں کی) گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم رکھے اور زکوٰۃ دیا کرے اور اپنے اقرار کو پورا کرنے والے جب عہد کریں، اور سختی میں اور تکلیف میں اور قتال کے وقت صبر کرنے والے، یہی لوگ سچے ہیں، اور یہی پرہیزگار ہیں۔''

آیات کا ربط:

اس آیت سے پہلے محرماتِ حسیہ اور محرماتِ معنویہ کا بیان تھا۔ یہاں تک سورۃ البقرۃ کا نصف ہو گیا، یہاں تک خطاب عام تھا یعنی تمام اُمتِ دعوت کو خطاب تھا۔ آگے اُمتِ اجابت کو خطاب ہوگا، یعنی اس امت کو خطاب ہوگا جو اُمت کلمہ پڑھنے والی ہے، حضور اکرم ﷺ کو ماننے والی ہے۔ پہلے اُصولیات یعنی توحید، نبوت و رسالت اور معاد کے مسئلے کا بیان تھا، اب فروعیات کے مسائل بیان ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ اصل بھلائی یہ ہے کہ اپنے دلوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع کردو۔

﴿اَلْبِرّ﴾ کا معنی ومفہوم:

حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ﴿اَلْبِرّ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں فرض کی ہیں، ان کو ادا کرو۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس آیت کے اندر بھلائی کی تمام انواع ہیں، یہ ساری اپنے اندر پیدا کرو، کیونکہ جس آدمی نے اپنے اندر یہ صفات پیدا کرلیں وہ اسلام کی چوٹی پر پہنچ گیا اور اس کو سب بھلائیاں مل گئیں۔

﴿اَلْبِرّ﴾ کا معنی بھلائی ہے... جبکہ ''اَلْبَرّ'' جنگل کو کہتے ہیں اور اگر سمندر ہو تو اس کو ''اَلْبَحْر'' کہتے ہیں۔ صحرا اور جنگل میں وسعت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خیر اور بھلائی میں وسعت ہوتی ہے۔

ایمانیات کی تفصیل:

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ پر اور اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر ایمان لانا، اللہ تعالیٰ کو معبود

برحق ماننا، اللہ تعالیٰ کو کامل فی العلم اور کامل فی القدرۃ ماننا، یہ اصل بھلائی اور ایمان ہے۔ اس کے بعد قیامت پر ایمان لے آنا نیکی ہے، کیونکہ اگر قیامت پر ایمان نہیں تو گویا اللہ تعالیٰ پر بھی ایمان نہیں ہے، قیامت پر ایمان نہیں تو گویا انبیاء پر بھی ایمان نہیں ہے، کیونکہ اگر قیامت پر ایمان نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف پر ایمان نہیں، تو اس کا مطلب ہوا کہ یہ دنیا اس لیے بنی تھی کہ کافر مزے کرتے رہیں اور مسلمان تکلیفیں اُٹھاتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ دنیا دار العمل ہے۔ اصل بدلہ دار الآخرت میں ملے گا، اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ جب تک آخرت پر ایمان نہ ہو، اس وقت تک اعمال کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے بکری حلال کر دی اور خنزیر حرام کر دیا۔ اب ہم بکری کو ذبح کرنے کے بعد اس کا گوشت کھاتے ہیں، لیکن خنزیر نہیں کھاتے۔ کیونکہ اگر ہم نے خنزیر کھالیا تو قیامت میں پکڑے جائیں گے اور ہمیں ہر چیز کا حساب دینا ہے اور ہم اس لیے حلال کھاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آخرت میں بدلہ عطا فرمائیں گے۔

اور ملائکہ پر بھی ایمان ہو کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے برحق ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی نوری مخلوق ہیں، ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے اور ان کا عدد بھی نہیں جان سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کی ڈیوٹیاں تقسیم کی ہوئی ہیں، بعض فرشتے ہمیں القاء کرنے کے لیے ہیں، بعض فرشتے کراماً کاتبین ہیں، بعض فرشتے دنیا میں سیاحت کرنے والے ہیں اور بعض فرشتے بندوں کے اعمالِ صالحہ کو لے جانے والے ہیں، بعض فرشتے روحوں کو قبض کرنے والے ہیں، بعض فرشتے اللہ کے عرش کو اُٹھانے والے ہیں۔ اور اللہ نے جتنی کتابیں اُتاری ہیں ان پر بھی ایمان ہو، تفصیلی ایمان ہو، اللہ تعالیٰ کے قرآن پر جو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ پر اُتارا ہے، اور اللہ کے تمام نبیوں پر ایمان ہو کہ اللہ نے جتنے نبی بھیجے ہیں سب برحق ہیں، یہ نہیں کہ ایک نبی پر ایمان لے آئے اور ایک نبی پر ایمان نہ لے آئے۔ کیونکہ ایک نبی پر ایمان لانا تمام انبیاء پر ایمان لانا ہے اور ایک نبی کا انکار کرنا سب نبیوں کا انکار کرنا ہے۔ ایمان تمام نبیوں پر لائیں گے، لیکن تعمیل حکم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی کریں گے۔ یہ ایمان کے اصولوں کا بیان تھا۔ اب آگے فروعات کا بیان ہے۔

﴿وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ﴾ کی تفسیر:

﴿آتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ﴾ انسان مال کو اس وقت مسکینوں پر خرچ کرے جب اسے وہ چیز محبوب بھی ہے مرغوب

بھی ہے اور اس کو خود بھی حاجت ہے۔ اگر ایک ایسی چیز خرچ کر دی، جس کی اس کو ضرورت نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر بھی ثواب کو ضائع نہیں فرمائیں گے، لیکن ثواب کا اعلیٰ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝﴾ [آل عمران: ۹۲] وہ چیز اللہ کے راستہ میں خرچ کرو جو تمہیں سب سے پیاری ہو۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک آدمی موت کے قریب آ کر خیرات کرتا ہے، اس کی مثال ایسے ہے کہ جب خود پیٹ بھر گیا اور جو بچ گیا، اس کے بارے میں کہا کہ غریبوں کو دے دو۔ کیونکہ موت قریب آ گئی ہے تو اب وہ رکھ کر کیا کرے گا۔ اصل خیرات اللہ تعالیٰ کو اس وقت محبوب ہے کہ جب پیسہ خود مرغوب ہو، اس وقت تم اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے بندوں پر خرچ کرو تو یہ مال اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت قدر والا ہے۔

حالانکہ اس کو مال سے محبت بھی ہے، لیکن پھر بھی وہ مال قریبی رشتہ داروں کو دیتا ہے۔ آپ چاہے زکوٰۃ نکالو یا صدقات نکالو، خیرات کرو یا ہدیہ کرو، سب سے زیادہ مستحق آدمی کے رشتہ دار ہیں۔ کیونکہ رشتہ داروں میں خیرات کرنے کے دو فائدے ہیں، ایک فائدہ تو یہ ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے لیے خیرات کی اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ صلہ رحمی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو رحم کا صلہ بڑا محبوب ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو فرما دیا تھا کہ جس نے صلہ رحمی کو توڑ ڈالا، میں بھی اس کو توڑ ڈالوں گا اور جس نے صلہ رحمی کی اور اپنے رشتہ داروں کا خیال رکھا، میں اس کو اپنی رحمت سے جوڑ دوں گا۔

رحم، رحمت کے مادہ سے ہے۔ رشتہ داروں میں خیرات کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو رشتہ دار ہوتے ہیں ان کے بارے میں آدمی کو پتہ ہوتا ہے مثلاً زکوٰۃ کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ہم صحیح مستحق کو زکوٰۃ ادا کریں اور زکوٰۃ کے مال کا زکوٰۃ کی نیت سے اس بندے کو مالک بنا دیں، تب جا کر زکوٰۃ ادا ہوتی ہے۔ رشتہ داروں کے اندر ہر آدمی کو پتہ ہوتا ہے کہ کون غریب ہے؟ اس لیے حکم ہے کہ رشتہ داروں کو زکوٰۃ و خیرات دیں اور رشتہ داروں میں زیادہ مستحق وہ ہے جو زیادہ قریب ہے۔

عمل کے قبول ہونے کی شرائط:

حدیث مبارک میں ہے کہ کوئی عمل اس وقت تک قبول نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں دو شرطیں نہ ہوں۔ ایک تو

عمل خالص اللہ کی رضا کے لئے ہو۔اس کے اندر دکھاوانہ ہواور نہ کوئی اس میں شریک ہو،یعنی کسی بت یا غیر اللہ کے نام نہ ہو۔دوسری شرط یہ ہے کہ جو عمل کر رہے ہیں وہ حضور ﷺ کی شریعت کے موافق ہو۔اگر کسی کے عمل میں یہ دو شرطیں نہیں ہوں گی تو وہ عمل کبھی قبول نہیں ہوگا۔بظاہر وہ عمل کتنا خوبصورت کیوں نظر نہ آتا ہو،لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا مچھر کے برابر بھی وزن نہیں ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جو بھی عمل کرو،اس کے لئے ایک تو علم ہونا چاہیے،دوسری نیت ہو،تیسرا اخلاص ہونا چاہیے، چوتھا اس عمل پر استقامت ہونی چاہیے،کیونکہ اگر علم نہ ہو تو عمل مفید نہیں ہوتا اور اگر نیت نہ ہو تو عمل قبول نہیں ہوتا "إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کی وجہ سے اور اگر وہ عمل خالص اللہ کے لئے نہیں ہے تب بھی عمل قبول نہیں اور اگر حضور ﷺ کی سنت کے مطابق نہیں تو تب بھی وہ عمل قبول نہیں اور اگر اس عمل پر استقامت نہیں ہے تو اس عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ایک رات تو آدمی سو رکعت نفل پڑھ لے،پھر سارا سال تہجد نہ پڑھے،اس سے تو بہتر ہے کہ آدمی دو رکعت پڑھے،لیکن ہمیشہ پڑھے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

"لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي." [صحیح بخاری،رقم:۳۶۷۳]

"خبردار!میرے صحابہ کو گالی نہ دینا۔"

اس سے اشارہ ہوا کہ ایک وقت آئے گا جب لوگ صحابہ کو برا کہیں گے۔اور آپ ﷺ نے فرمایا:تم اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو اور میرا صحابی چلو بھر دانے خیرات کردے تو تم اس کے ثواب کو نہیں پہنچ سکتے۔صحابہ نے جس اخلاص سے خرچ کیا،وہ اخلاص تم پیدا ہی نہیں کر سکتے۔اس لئے جب کوئی چیز دیں تو دل سے دیں۔

افضل صدقہ کا بیان:

اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور سلف وخلف نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اس وقت مال اللہ کے راستے میں دے،جب مال اس کو پیارا اور مرغوب ہو۔صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صحابی نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا:کون سا صدقہ بہتر ہے؟حضور ﷺ نے فرمایا:

"أَنْ تَصَدَّقَ وَ أَنْتَ صَحِيحٌ شَحِيحٌ تَخْشَى الْفَقْرَ، وَ تَأْمُلُ الْغِنَى."

[صحیح بخاری،رقم:۱۴۱۹/صحیح مسلم،رقم:۱۰۳۲]

سب سے بہتر صدقہ یہ ہے کہ تُو اس وقت صدقہ کرے جب تُو تندرست ہو اور تجھے اس کی ضرورت بھی ہو اور تجھے غنیٰ کی خواہش بھی ہے، تمھیں یہ بھی ڈر ہو کہ اگر میں نے سارا خرچ کر دیا تو میں فقیر بھی ہو سکتا ہوں، لیکن پھر بھی اللہ کے راستہ میں خرچ کرے۔ یہ اللہ کو زیادہ پیارا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک جنگ میں صحابی کی شہادت کا وقت قریب تھا، پانی مانگا تو ایک صحابی نے چھاگل پیش کی اور دوسرے زخمی نے پانی مانگا تو انہوں نے کہا: پہلے اس صحابی بھائی کو پلا دو، اس کو زیادہ ضرورت ہے۔ جب پلانے والا دوسرے صحابی کے پاس گیا تو تیسرے صحابی نے آواز لگائی۔ دوسرے صحابی نے کہا: ان کو پانی دے دو، ان کو زیادہ ضرورت ہے۔ تین صحابہ تک پانی پہنچا، لیکن ایک دوسرے کی خاطر کسی نے نہیں پیا اور تینوں ہی پیاسے شہید ہو گئے۔ اس کا قرآن نے نقشہ کھینچا ہے: ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [الحشر:۹] جو اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ خود بھی محتاج ہیں۔ اسلام کے اندر تو یہاں تک حکم ہے کہ اتنا اونچا مکان نہ بناؤ کہ تیرے ہمسائے سے سورج کی دھوپ رک جائے۔

کھانے پینے میں بھی ہمسائے کا خیال:

اسلام تو یہ بھی حکم دیتا ہے کہ اگر پھل فروٹ کھاؤ تو چھلکے باہر نہ پھینکو، تا کہ کسی غریب کا دل دیکھ کر پھٹ نہ جائے اور تیرے لئے بددعا نکلے تو تجھ پر کہیں اللہ تعالیٰ کا عذاب نہ آجائے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: اگر تم اپنے ہمسائے کو گوشت نہیں دے سکتے ہو تو پانی زیادہ بڑھا کر شوربا بھیج دو، تا کہ تیرے ہمسائے بھوکے نہ سوئیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آدمی کو مال کی خواہش و تمنا ہے، لیکن خیرات کر دی اور اس سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ خود بھوکا ہے، لیکن دوسروں کو کھلا دیا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کا نوجوان سے ملاقات کا واقعہ:

حضرت بایزید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے پاس بلخ سے ایک نوجوان آیا اور ہمارے لنگر میں کچھ دن ٹھہرا، ذکر و عبادت میں شریک ہوتا رہا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا: اتنے دن ہو گئے ہیں تم ہمارے پاس آئے ہو، تمہارا کیا حال احوال ہے؟...... اس نوجوان سے میں جتنا شرمندہ ہوا، پوری زندگی میں کبھی اتنا شرمندہ نہیں ہوا...... اس

نے کہا: آپ کا کیا حال احوال ہے؟ میں نے کہا: اللہ کا شکر ہے۔ مل جاتا ہے تو کھا لیتے ہیں، نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں۔ نوجوان ہنس پڑا۔ میں حیران ہوا اور اس سے پوچھا: ہنستے کیوں ہو؟ کہنے لگا: ہمارے بلخ کے جو کتے ہیں، ان کا یہی حال ہے کہ کوئی ہڈی ڈال دے تو کھا لیتے ہیں، نہیں تو مالک کے دروازے پر پڑے رہتے ہیں۔ مجھے اس بات سے بڑی چوٹ لگی۔ میں نے پوچھا: وہاں کے بزرگوں کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: مل جائے تو دوسروں کو کھلا دیتے ہیں، نہ ملے تو شکر کرتے ہیں کہ اے اللہ! تو نے نہیں دیا، اس کے اندر تیری کوئی حکمت ہے۔ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے اس کو کہا: تم تو بہت بڑے مقام کے آدمی ہو!!

﴿وَالْيَتٰمٰى﴾...یتیم کی تعریف:

جو بالغ نہیں ہوئے اور ان کے باپ فوت ہو گئے، ان کے لئے کوئی کمانے والا نہیں ہے، وہ یتیم ہوتے ہیں، ان کی مدد کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشخبری سنائی:

"أَنَا وَ كَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ." [جامع ترمذی، رقم:۱۹۱۸]

قیامت کے دن میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا اکٹھے ہوں گے۔ اس لیے جس کے گھر میں یتیم ہیں، وہ ان کو بوجھ نہ سمجھیں، بلکہ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جنت میں جانے کا ذریعہ دیا ہے۔

(حدیث) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا يُتْمَ بَعْدَ حُلُمٍ." [مسند البزار، رقم:۶۲۴۳]

"جب یتیم بالغ ہو جائے تو وہ یتیم نہیں رہتا۔"

مسکین کی تعریف:

﴿وَالْمَسٰكِيْنِ﴾، مساکین سے مراد وہ ہیں جن کے پاس اتنا مال نہیں ہے کہ وہ کھانا پینا بھی کر سکیں اور رہائش بھی حاصل کر سکیں۔ اگر رہائش اور ہر روز کی روٹی موجود ہے تو وہ مسکین نہیں ہے۔ مسکین وہ ہوتا ہے جس کے پاس ایک دن کا کھانا بھی، رہنے کے لیے جگہ نہ ہو۔

(حدیث) صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَيْسَ الْمِسْكِينُ الَّذِي يَطُوفُ عَلَى النَّاسِ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَ اللُّقْمَتَانِ، وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ، وَ لٰكِنِ

الْمِسْكِينُ الَّذِي لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيهِ، وَ لَا يُفْطَنُ بِهِ، فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ وَ لَا يَقُومُ فَيَسْأَلُ النَّاسَ."

[صحیح بخاری، رقم:۱۴۷۹/صحیح مسلم، رقم:۱۰۳۹]

یہ پھرنے والا مسکین نہیں ہوتا کہ کبھی اس کو ایک کھجور مل گئی اور کبھی دو کھجوریں مل گئیں، کبھی ایک لقمہ مل گیا اور کبھی دو لقمے مل گئے (یہ تو بھکاری ہے)۔ مسکین وہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس اتنا نہیں جو اس کو بے پروا کر دے اور پھر وہ ظاہر بھی نہیں ہوتا کہ لوگ سمجھیں کہ یہ مسکین ہے۔ پھر اس پر صدقہ کریں ایسے لوگ مستحق ہیں، ان کو ڈھونڈ کر پہنچانا چاہیے، تاکہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا اجر عطا فرمائیں۔ صحیح حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ روزانہ آسمان سے فرشتے اُتارتے ہیں، ان کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ صبح سے لے کر شام تک دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے اللہ! ہر خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما اور جو بخل کر رہا ہے، اس کے مال کو برباد کر دے۔ اس لیے آدمی جتنا اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے، اس کے مال میں برکت ہوتی ہے۔

مسئلہ:

زکوۃ اپنے اُصول یعنی باپ دادا کو نہیں دے سکتے اور اپنے فروع یعنی بیٹے اور پوتے کو بھی نہیں دے سکتے۔ البتہ بہن، بھائی، چچا، ماموں باقی رشتہ داروں کو زکوۃ دے سکتے ہیں۔ والدین کو زکوۃ نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ زکوۃ، مال و دولت کی مل کچیل ہے، ہمارے والدین میل کچیل کے لئے تو نہیں ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ زکوۃ اڑھائی فیصد ہے، والدین کا تو ہم پر اتنا حق ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"أَنْتَ وَ مَالُكَ لِأَبِيكَ." [سنن ابن ماجہ، رقم:۲۲۹۱]

تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کا ہے۔ (اگر وہ ضرورت مند اور محتاج ہو تو بقدرِ ضرورت لے سکتا ہے، اگر ضرورت سے زائد لیا تو اس پر قرض ہے)۔ اسی طرح بیٹا، بیٹی کو زکوۃ نہیں دے سکتے، کیونکہ ان کا خرچ والدین کے ذمہ ہے۔

(حدیث) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے، حضور اکرم ﷺ تشریف لے آئے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ انہیں بڑی تکلیف تھی اور ایک روایت میں ہے کہ بالکل موت کے کنارے پر پہنچ گئے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے وضو فرمایا اور جو پانی بچا، فرمایا: اس کے اوپر چھڑک دو اور حضور اکرم ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو

دعا دی کہ اللہ تجھے شفا دیں گے اور اللہ تبارک و تعالیٰ تجھ سے بڑے خیر کے کام لیں گے اور تم سے اللہ تعالیٰ دشمنوں کی ہلاکت کا کام لیں گے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ایسی دعا لگی کہ وہ ۵۰ ہجری تک زندہ رہے۔ اس بیماری میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بہت مال دیا ہے، میری ایک بیٹی ہے، اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سارا مال خیرات کر دوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرنا۔ انہوں نے عرض کیا: حضور! مجھے اجازت دے دیں کہ میں آدھا مال خیرات کر دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدھا بھی نہ کرو۔ انہوں نے پھر عرض کی کہ مجھے اجازت دیں، میں دو ثلث (دو تہائی) خیرات کر دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور! مجھے اجازت دیں کہ میں تیسرا حصہ خیرات کر دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیسرا حصہ تمہیں خیرات کرنے کی اجازت ہے، لیکن تیسرا حصہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہتر ہے کہ تم اپنے بچوں کو امیر چھوڑ کر مر جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ تیرے مرنے کے بعد تیرے وارث لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر سوال کرتے پھریں۔ لہٰذا اپنی اولاد کو دینا ہماری ذمہ داری ہے، ہم ان کے لیے کچھ جمع کریں اور ان کے لیے کچھ بنائیں، تاکہ ہماری موت کے بعد اولاد محتاج نہ ہو۔ حتیٰ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی آدمی ایک لقمہ اُٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو خیرات اور صدقہ کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

جتنی مال کی محبت ہو اور پسندیدہ مال اللہ کے راستے میں دے، نیکی ملے گی۔ رشتہ داروں کے بعد ان لوگوں کا حق ہے جو یتیم ہیں، جن کے ماں باپ مر گئے ہیں، ان پر کوئی شفقت کا ہاتھ پھیرنے والا نہیں ہے۔ مساکین سے مراد غرباء اور فقراء ہیں، مساکین سکون سے ہے جیسے آدمی سکون میں بیٹھ گیا کہ کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے، ہر چیز سے تھک ہار کر بیٹھ گیا ہے۔ اسی طرح سے بیوہ محتاج کا حق ہے۔

گردن چھڑانے کے کیا معنی ہیں؟

﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾ اگر اللہ تمہیں مال دے تو گردن چھڑانے میں مال خرچ کرو۔ اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ ڈرائیور سے گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا، اس کے لئے دیت مقرر ہو گئی، مثلاً وہ ایک لاکھ چالیس ہزار ریال دیت دے۔ ایک ڈرائیور کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آسکتے ہیں؟ اور جب تک دیت نہ دے، اس کی ضمانت بھی نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی ضامن دے گا تو وہ اس چیز کی ضمانت دے گا کہ میں اس کو حاضر کر دوں گا۔ اب دیت ایک لاکھ

چالیس ہزار ہے اگر مثلاً ایک سو چالیس آدمی ایک ایک ہزار ریال دے دیں تو دیت ادا ہو جائے گی اور بندہ بھی چھوٹ جائے گا۔

غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا، یہ گردن کا چھڑانا ہے، جیسا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ غلام تھے، کافر ان کو مارتے تھے اور ان پر ظلم کرتے تھے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جا کر ان کے مالک سے بات کی کہ جتنے پیسے لینے ہیں، لے لو اور ان کو آزاد کر دو۔

علماء نے لکھا کہ ایک آدمی پر قرضہ آ گیا۔ اس کی گردن بھی گویا کہ پھنسی ہوئی ہے، آپ اس کی مدد کر رہے ہیں کہ وہ قرضہ ادا کر دے اور اس کی گردن چھوٹ جائے تو یہ بھی ﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾ میں شامل ہے۔ یہ مالی مسائل کا بیان تھا۔

آگے فرمایا: ﴿وَأَقَامَ الصَّلَوٰةَ وَآتَى الزَّكَوٰةَ﴾ کہ نماز قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے۔ کسی کے ذہن میں یہ آ سکتا تھا کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں، آخرت کو مانتے ہیں، غریبوں اور مسکینوں میں بڑی خیرات کرتے ہیں، یہ کافی ہے۔ اللہ نے فرمایا: اس میں خوش نہ رہے کہ نماز چھوڑ دے۔ اس نے حقوق مالی ادا کئے اور حقوق بدنی ادا نہ کئے تو وہ کامل مسلمان نہ بنا۔ جیسا کہ آج کل کئی لوگ خیرات تو کرتے ہیں، حج پر بھی لوگوں کو بھیج دیتے ہیں، لیکن نماز نہیں پڑھتے۔ ایسی خیرات کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا کہ نماز چھوڑنے کے عذاب سے بچ جائے۔ نماز، ایمان اور کفر میں فرق کرتی ہے، نماز اللہ اور بندے کو جوڑنے والی ایک رسی ہے، جس نے اس کو توڑ ڈالا تو گویا اس نے اللہ سے رشتے کو توڑ ڈالا۔

بے نمازی کا حکم:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور کئی علماء نے فتویٰ دیا کہ کوئی آدمی اگر ایک نماز بھی جان بوجھ کر چھوڑ دے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور اس کا نکاح بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ مر جائے تو اس کا جنازہ نہ پڑھیں اور مسلمانوں کے قبرستان میں اس کو دفن بھی نہ کریں۔ باقی ائمہ فرماتے ہیں کہ بے نمازی فاسق اور فاجر ہوتا ہے، لیکن اس نے ایسا کام کیا ہے جو بھی اس کو کفر تک لے جائے گا۔

یہ بھی نہ کرے کہ وہ صدقہ، خیرات، مسکینوں یتیموں کو کھلانے میں مگن ہو جائے اور زکوۃ ادا نہ کرے، بلکہ فرض عبادت (زکوۃ) تو ضروری ہے۔

﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ کی تفسیر:

مومن کی نشانی ہے کہ اگر وہ عہد کرے تو اس کو پورا کرے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قیامت والے دن پوچھا جائے گا کہ تم نے وعدہ کیا تھا تو اس کو پورا کیوں نہیں کیا تھا؟

وعدہ پورا کرنا اور اس کی میعاد:

کسی شخص نے دوسرے کے ساتھ وعدہ کیا اور وعدہ کرنے کے وقت نیت بھی ہو کہ میں وعدہ پورا کروں گا۔ اگر پھر خدانخواستہ پورا نہ کر سکا، لیکن اپنی طرف سے کوشش کی تو اللہ تعالیٰ معافی دے دیتے ہیں۔ اور اگر وعدہ کرتے وقت ہی یہ نیت کر رہا ہے کہ میں پورا تو نہیں کروں گا، بس اس کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ یہ بھی نفاق ہے، یہ مومن کی صفت نہیں ہے۔

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ﴾ ہر تنگی، ہر بیماری میں، ہر دُکھ سکھ میں صبر کرنے والا مومن ہے اور جب عین جنگ کا وقت ہو تو جمنے والا ہو۔ یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قول کو سچا کیا اور یہی لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔

''أبواب البر و الصلة'' صفاتِ ایمان:

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بڑے عظیم جملے اور عام قاعدے جو سب کو شامل ہیں اور ایسے اصول بیان فرمائے ہیں جو ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔ اس لئے علماء نے اس آیت کا عنوان ''أبواب البر و الصلة'' تجویز فرمایا ہے۔

(حدیث) ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت بیان فرمائی کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی، یعنی جن کے اندر یہ صفات ہوں گی، وہ مومن ہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پھر پوچھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی آیت تلاوت فرمائی۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ حضور! مجھے ایمان کی تعریف بتلائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی یہی آیت مبارکہ تلاوت فرمائی اور اس کے بعد فرمایا:

''إِذَا عَمِلْتَ حَسَنَةً أَحَبَّهَا قَلْبُكَ، وَ إِذَا عَمِلْتَ سَيِّئَةً أَبْغَضَهَا قَلْبُكَ.'' [مستدرک الحاکم، رقم: ۳۰۷۷]

جب تم کوئی بھلائی کا کام کرو اور وہ تمہارے دل کو پیارا لگے تو سمجھو ایمان کی نشانی ہے اور اگر گناہ ہو جائے اور تیرا

دل نفرت کرے کہ میں نے غلطی کی ہے تو یہ بھی ایمان کی علامت ہے۔

دوسری حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ خدانخواستہ اگر تم سے کوئی گناہ ہو جائے اور تم یوں محسوس کرو کہ میرے اوپر تو پہاڑ گر پڑا، تم رو رہے ہو، ڈر رہے ہو، اللہ تعالیٰ سے فریادیں کر رہے ہو اور بار بار نیکی کے عمل کر رہے ہو کہ میں کسی طرح اس گناہ کی میل کچیل کو دھو ڈالوں تو سمجھ لو کہ ایمان ہے۔ اور اگر تم سے گناہ کا کام ہو جائے اور تم ایسے سمجھو کہ جیسے مکھی ناک پر بیٹھی تھی اور اس کو اُڑا دیا کہ انسان سے تو گناہ ہوتے رہتے ہیں تو سمجھ لو کہ اندر سے ایمان کمزور ہو چکا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور کہا: ہمیں ایمان کے بارے میں بتلائیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ اس نے کہا: میں نے آپ سے ابواب البر نہیں پوچھے، میں نے تو آپ سے ایمان کے بارے میں پوچھا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے بھائی! اسی طرح جیسے تُو نے سوال کیا ہے میں نے حضور ﷺ سے سوال کیا تھا کہ ایمان کیا ہے تو حضور ﷺ نے یہی آیت تلاوت فرمائی تھی کہ یہ ایمان کی صفات ہیں، اور میں بھی اسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا، جیسے تم میری بات پر راضی نہیں ہو رہے۔ حضور ﷺ نے اپنی انگلی سے سمجھایا اور فرمایا:

"اَلْمُؤْمِنُ إِذَا عَمِلَ حَسَنَةً سَرَّتْهُ وَ رَجَا ثَوَابَهَا، وَ إِذَا عَمِلَ سَيِّئَةً أَحْزَنَتْهُ وَ خَافَ عِقَابَهَا."

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۹۷]

مومن وہ ہوتا ہے کہ جب اس سے اچھا کام ہو جائے تو خوش ہو اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید کرے اور جب اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کو برا محسوس کرے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرے۔ یہ اس کے ایمان کی علامت ہے۔

ایمان اطاعتِ الٰہی و اطاعتِ رسول کا نام ہے:

مفسر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھو اور پھر حکم دیا کہ بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ شریف کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو۔ یہ بات اہل کتاب کو بڑی عجیب لگی کہ پہلے تو ہمارے کعبہ کی طرف پڑھتے تھے، اب حضور ﷺ نے قبلہ بھی بدل دیا اور بعض مسلمانوں کو بھی

یہ بات بڑی مشکل لگی کہ کعبہ شریف کا حکم کیوں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ آیت مبارکہ نازل فرما کر حکمت بیان فرمائی کہ مومن بندے کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع کر دے۔ اللہ جس طرف رخ کرنے کا حکم دے، اس طرف پھر جائے اور جس طرف رخ کرنے سے روکے، اس طرف سے رک جائے، اسی کا نام ایمان کامل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ قربانی کی عید پر جانور ذبح کریں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو نہ بکری کا گوشت چاہیے اور نہ اس کے خون کی ضرورت ہے، بلکہ اللہ پاک تو یہ دیکھتے ہیں کہ میرے بندے کتنی پرہیزگاری سے میرے حکم کی اطاعت کرتے ہیں۔

﴿ابْنُ السَّبِيْلِ﴾ کون لوگ ہیں؟

﴿وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ کے معنی میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد مسافر ہیں، مثلاً ایک آدمی سفر پر جاتا ہے، اپنے ملک میں لاکھوں پتی ہے، لیکن سفر میں اس کے پیسے گر گئے یا چوری ہو گئے یا ختم ہو گئے تو اس کا کیا حال ہوگا؟ اب وہ کسی آدمی سے سوال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جس نے ساری زندگی سوال نہ کیا ہو، اس کے لئے سوال کرنا موت ہے اور جن کو سوال کی عادت پڑ گئی ہے، ان کے لیے سوال کو چھوڑ دینا موت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول ہے کہ ﴿وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ کا معنی مہمان ہے، کیونکہ وہ بھی مسافر ہوتا ہے۔ اگر تمہارے گھر میں کوئی مہمان آئے تو اس کو تین دن تک ضیافت دینا سنتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ آج کل تو آدمی اسی کی ضیافت اور اس کو کھلاتا ہے جو مالدار ہو۔ حالانکہ اسلام کا قاعدہ یہ ہے کہ جو جتنا غریب ہے وہ تیری ہمدردی کا زیادہ مستحق ہے۔ بڑے آدمی کو تو ریسٹورنٹ میں جگہ مل جائے گی، اصل تو وہ مسافر ہے کہ جس کو کوئی دعوت دینے والا نہیں ہے۔

﴿وَالسَّآئِلِيْنَ﴾ مانگنے والا کوئی آ گیا تو اس کو بھی دیں۔ مانگنا اتنی بڑی ذلت ہے کہ اس سے بڑی کوئی ذلت نہیں ہے تو قرآن میں اس لیے آ گیا کہ کوئی اس وقت مانگنے جائے گا کہ اس کے پاس کوئی حل نہیں ہوگا، تب وہ جا کر ذلت برداشت کرے گا اور تیرے آگے ہاتھ پھیلائے گا، ورنہ کون ہے جو ذلت کا سوال کرے۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مانگنے والے کا ایک حق ہوتا ہے، کوئی بھی مانگے تو اس کو دے دو، چاہے وہ سواری پر سوار ہو کر کیوں نہ آئے۔ اگر وہ غلط مانگ رہا ہے تو قیامت میں خود پکڑا جائے گا۔ اگر کچھ نہیں کر سکتے تو سائل کو محبت سے ٹال دو کہ اللہ تیرے لیے بھلا کرے، اللہ ہمارے لیے بھی بھلا کرے۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر مانگنے والا گھوڑے پر بھی آرہا ہے پھر بھی وہ مانگتا ہے تو اس کو دے دو، اس کو خالی نہ لوٹاؤ۔ قیامت میں فیصلہ ہوگا کہ اس نے ضرورت کے مطابق مانگا تھا یا عادت بنالی تھی۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٧٨﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٧٩﴾﴾ [البقرة: ١٧٨، ١٧٩]

"اے ایمان والو! مقتولوں کے متعلق تم پر قصاص فرض ہے، آزاد آزاد کے بدلے میں، غلام غلام کے بدلے میں، عورت عورت کے بدلہ میں (قتل کی جائے)، پس جس کو معاف کردیا گیا اس کے بھائی (یعنی مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ، پس دستور کے مطابق تابعداری کرنی چاہیے اور اس (دیت) کو خوبی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے، یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے، پھر جو اس فیصلہ کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور تمہارے لیے قصاص میں بقائے عظیم ہے اے عقل والو کہ تم (قصاص کے خوف سے خون ریزی سے) بچے رہو۔"

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ قصاص کو بیان فرمایا ہے۔ اس کے اندر "أبواب البر و الصلة" کی فروع کا حکم بیان ہوگا۔

قصاص کا معنی:

مماثلت، برابری۔ یعنی کسی نے آپ کو کوئی نقصان پہنچایا ہے تو بالکل عین اس کے برابر نقصان دینا قصاص ہے۔ پھر یہ لفظ بدلہ میں استعمال ہوا۔

تمام احکامِ الٰہی کو تسلیم کرنا فرض ہے:

اللہ تعالیٰ نے جتنے احکام، حدود کو بیان کیا ہے وہ سراپا عدل وانصاف ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی کتاب پر، اللہ

کی توحید پر، رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے تمام شرائع، حدود کو ماننا اور ایمان لانا دلیل اسلام ہے اور ان پر اعتراض کرنا کفر کی دلیل ہے۔ اگر آج کوئی آدمی یہ دعویٰ کرے کہ میں مسلمان ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں، قرآن پر، حضور پاک ﷺ پر ایمان بھی رکھتا ہوں، لیکن ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام کی بعض سزائیں بڑی سخت ہیں، جیسے چور کا ہاتھ کاٹ دینا، رجم (سنگسار کرنا)، شرابی کو کوڑے مارنا، تہمت لگانے والے کو کوڑے مارنا، جھوٹی گواہی دینے والے کو کوڑے مارنا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ سزائیں اس دور میں تو مناسب تھیں جس دور میں قرآن پاک نازل ہوا تھا کیونکہ وہ جاہلیت کا دور تھا، کوئی امن وامان نہیں تھا اور کوئی نظام قائم نہیں تھا، کوئی پولیس اور کوئی چوکیاں نہیں تھیں۔ اس لئے اس دور میں عبرتناک سزائیں رکھی گئیں، تاکہ کوئی آدمی جرم پر جرأت نہ کر سکے، لیکن آج متمدن اور ترقی یافتہ دور ہے، اس دور میں چودہ سو سال پہلے والی سزاؤں کا اجراء کیسے کیا جا سکتا ہے؟

کوئی آدمی یہ عقیدہ رکھے تو وہ کافر ہے کیونکہ اگر کسی نے یہ عقیدہ رکھ لیا تو کافر کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ حضور ﷺ کی نبوت بھی اس زمانے کے لئے تھی، اب ہمیں کیا ضرورت ہے؟ ہم تو خود پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ دوسرا آدمی اُٹھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ ہمیں حضور ﷺ کی نبوت ورسالت اور شریعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ دنیا میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے کہا کہ اب ہمیں نماز کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ نماز بندے کو فٹ رکھنے کے لئے ایکسرسائز تھی، اب ورزش کے اور کئی طریقے نکل آئے ہیں، اس لیے نماز کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ اس طرح تو دین بازیچۂ اطفال بن جائے گا کہ جس نے جیسے چاہا توڑ دیا، کھیل بنا دیا۔

عقلی اور فطری بات ہے کہ اگر آپ کسی ملک میں ویزہ لے کر جاتے ہیں، اس ملک میں داخل ہونے کے بعد آپ کو اس کے قوانین کا احترام کرنا پڑتا ہے، وگرنہ آپ اس ملک میں داخل ہی نہ ہوں۔ آپ کو کسی نے بلایا تو نہیں ہوتا، آپ اپنی خواہش اور مرضی سے جاتے ہیں۔ آپ دنیا کے کسی ملک میں چلے جائیں اور اس کے شہری بن جائیں تو اس ملک کے قوانین آپ پر لاگو ہو جائیں گے یا پھر آپ اس ملک کی شہریت اختیار نہ کریں، خدا کے لئے ذرا تم غور کرو کہ تم ٹریفک قوانین کے پابند ہو، ڈاک خانے کے بنے ہوئے قواعد کے پابند ہو کہ لفافے میں جو وزن مقرر ہے، اس سے زیادہ وزن ڈالو تو وہ اس پر جرمانہ کریں گے یا پھر آپ کی ڈاک واپس آجاتی ہے۔ ہم ان ساری چیزوں پر پابندی ضروری سمجھتے ہیں تو کیا صرف دین محمد مصطفیٰ ﷺ ایسا ہے کہ کلمہ پڑھو، پھر جو مرضی آئے، کرتے رہو؟

یاد رکھیں! مسلمان کا سب سے پہلا بنیادی فرض یہ ہے کہ جب ہم نے کلمہ پڑھ لیا تو ہم نے اللہ اور اللہ کے رسول کے دین کو بطور دین قبول کر لیا۔ اب ہم پر اس کے بندے بن کر اور اس کے تابع ہو کر چلنا ضروری ہے۔ اگر بد قسمتی سے کسی ملک میں اسلام کا قانون نہیں ہے تو جہاں تک ہم اسلام پر کار بند رہ سکتے ہیں، رہنا ہوگا اور دعا کرنی ہوگی کہ اللہ وہاں اسلام کو بطور دین نافذ کر دے اور جہاں نافذ ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قائم و دائم رکھے۔

دوسری بات یہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات ہیں اور یہ دنیا کا مسلّم قاعدہ ہے کہ جو خالق ہے، وہ مالک ہے۔ لہٰذا یہ مخلوق اللہ کی ہے تو حکم بھی اسی کا چلے گا۔

انگریزی قانون ناقص ہے:

تیسری بات یہ یاد رکھیں کہ پوری دنیا میں جتنے قانون ہیں، سب ناقص ہیں، صرف اللہ کا قانون کامل ہے۔ انگریز کو اپنے قانون پر بڑا ناز ہے، انہوں نے جب سب سے پہلے قانون بنایا اس میں انہوں نے قتل کے بارے میں لکھا کہ اس آدمی کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ بات موجود ہے کہ بیرسٹر محمود کے پاس ایک مقدمہ آیا، انہوں نے فائل کے اندر دیکھا کہ فائل بڑی مضبوط تھی، ایف آئی آر سے قتل تک ملزم کے چھوٹ جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بہرحال انہوں نے فائل کا مطالعہ کیا اور ان کے دماغ میں ایک نکتہ آ گیا تو انہوں نے کہا کہ میں اتنی فیس لوں گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ کسی ماتحت کورٹ میں بھی نہیں آؤں گا پہلے جو میرے جونیئر وکیل پیشیاں بھگتتے رہے بہرحال وہ عدالت کے آخری فیصلے پر گئے، مجرم کو سزائے موت ہوگئی۔ وکیل صاحب نے صرف اتنی درخواست دائر کر دی کہ ہمیں فلاں دفعہ کے تحت حق حاصل ہے کہ میرے مؤکل کو پھانسی پر لٹکایا جائے، وہاں مجھے بھی حاضر ہونے کی اجازت دی جائے جج نے اجازت دے دی۔ جب مجرم کو پھانسی پر لٹکایا جانے لگا تو وکیل صاحب نے مجسٹریٹ سے کہا کہ آپ کا قانون یہ کہتا ہے کہ زیر دفعہ تین سو دو اس آدمی کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ میرا مؤکل لٹک چکا ہے اور یہ نہیں لکھا ہوا کہ اس کو لٹکا کر موت دی جائے۔ اب اگر آپ نے اس کو مار ڈالا تو میں آپ پر فلاں کیس کروں گا۔ جب انہوں نے قانون کو دیکھا تو ان کو بھی حیرت ہوئی اور ان کا دماغ ہلا۔ انہوں نے اپنے بڑے افسران سے رابطہ کر کے بتلایا تو انہوں نے کہا: فی الحال پھانسی روک دو اور اس کو کوٹھڑی میں بھیج دو۔ مغز مار مار کر اس نتیجہ پر پہنچے کہ وکیل سچ کہتے ہیں، اس ملزم کو بری کیا جائے اور آئندہ قانون میں یہ اضافہ کر دو کہ موت تک

لٹکا رہنے دیا جائے۔ تو جو سب سے مایہ ناز ان کا قانون تھا، اس کے لفظ بھی غلط ہو گئے۔

اور میں نے خود کافی سارے ججوں کے ریمارکس پڑھے ہیں کہ ملزمان نے کورٹ میں آ کر زیادتی کی، جس سے جج کی توہین ہوئی۔ ان ججوں نے ریمارکس دیئے کہ توہین عدالت کا قانون اتنا نامکمل اور ناقص ہے کہ ہم اس ملزم کو کوئی سزا نہیں دے سکتے، مہربانی کر کے اس میں ترمیم کی جائے۔ لیکن اسلام کا قانون ایسا ہے کہ اس کا بنانے والا اللہ ہے اور یہ قانون کامل ہے۔ جس کی ذات میں کوئی نقصان نہیں، اللہ بھولنے سے پاک ہے، غلطی سے پاک ہے اور اس قانون کو لے آنے والا اپنی حدود میں کامل ہے اور پھر جس پر قانون اُتارا گیا وہ مخلوق میں کامل ہے۔ لہٰذا یہ قانون کامل مکمل ہے، جس میں ایک زبر زیر کے اضافہ کی ضرورت نہیں ہے۔ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود پوری دنیا قرآن کے مقابلہ پر ایک آیت بھی نہیں لا سکی اور آج بھی قرآن کا چیلنج موجود ہے اور قیامت تک رہے گا۔

قتل کی اقسام اور ان کے احکام:

قتل کی دو قسمیں ہیں: 1 قتل عمد 2 قتل خطا۔

قتل عمد: جان بوجھ کر کسی تیز دھار آلہ سے یا ایسے آلہ سے جس سے بدن کٹ جاتا ہو، اس سے ضرب لگا کر بندہ کو مار دے۔ اسلام نے قتل عمد کی سزا قتل رکھی ہے، لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء میں کوئی ایک بھی دیت پر راضی نہ ہو۔ مثال کے طور پر ایک آدمی قتل ہو گیا، اس نے چار بیٹے چھوڑے۔ اگر مقتول کے سارے کے سارے ورثاء اس بات پر بضد ہیں کہ اس نے ہمارے باپ کو قتل کیا ہے ہم بدلہ لیں گے، اس کے لیے کوئی رعایت نہیں اور اگر وارثوں میں سے کسی نے کہا کہ میں معاف کرتا ہوں یا میں دیت پر راضی ہوں تو اب وہ آدمی قتل نہیں کیا جائے گا، اس سے دیت لی جائے گی۔

قتل خطا: غلطی سے کوئی مارا گیا، مثلاً گاڑی چلا رہے تھے کوئی آدمی نیچے آ گیا، شکار کھیل رہے تھے اتفاق سے کسی انسان کو گولی لگ گئی، کسی کو تھپڑ مارا اور وہ مر گیا عموماً لوگ تھپڑ سے مرتے نہیں ہیں، تو یہ سب چیزیں قتل خطا میں آ جاتی ہیں۔ قتل خطا کی سزا دیت ہے اور دیت ایک سو اونٹ یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہیں اور ان چیزوں کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، قتل خطا میں ماسوائے دیت کے قتل کی سزا نہیں دے سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے اوپر قصاص لکھا ہے برابر کا بدلہ لینا ہے اس میں کسی قسم کی زیادتی نہیں کرنی، جیسا

کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیات میں ارشاد فرمایا کہ نفس کے بدلہ میں نفس لیا جائے گا اور فرمایا:

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۝﴾

[البقرة:۱۹۴]

اگر تمہارے ساتھ زیادتی کرے تو تم بھی اتنی زیادتی کر سکتے ہو جتنی اس نے کی ہے اگر تمہیں کسی نے عذاب پہنچایا ہے تو تم بھی اسی کے بقدر عذاب اور تکلیف پہنچا سکتے ہو۔

لیکن یاد رکھیں اگر آپ کو کسی نے مارا ہے تو تم یہ نہ کرو کہ خود اس کو مارنے لگ جاؤ، بلکہ تم متعلقہ قاضی اور محکمے سے شکایت کرو اگر کسی نے تمہارا قتل کیا ہے تو تم جا کر خود قتل نہ کر دو، شریعت اس چیز کی اجازت نہیں دیتی۔ جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے وہاں صبر کرنا ہے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے ورنہ تو ایک فساد شروع ہو جائے گا۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''عَلَيْكُمْ بِالسَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ لِمَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ أَمْرَكُمْ وَ إِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا.'' [شعب الایمان، رقم:۷۵۱۵]

اپنے اُولوالامر کی سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔

ہمارے قبائل میں ایک مصیبت ہے کہ اگر ایک قتل ہو جائے تو چار قتل کرتے ہیں، یہ بھی ظلم ہے اسی طرح اگر ان کی عورت ماری گئی تو وہ ان کے مرد ماریں گے یہ بھی ظلم ہے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک قبیلہ مضبوط ہے اس کا آدمی مارا گیا اس نے کمزور قبیلے کے چار بندے مار دیے، پھر جب صلح کا مطالبہ ہوا تو انہوں نے کہا: ہم اس وقت صلح کریں گے جب یہ قبیلہ ہم کو دو لڑکیاں دے یہ بھی ظلم ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، یہ کافروں کے قواعد ہیں ڈنڈے کا قانون ہے اسلام انصاف کا حکم دیتا ہے۔

قصاص میں برابری:

مفسر ؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں دو قبیلے آباد تھے، اکثر ان میں لڑائی رہتی تھی۔ ایک دفعہ بنونضیر بنوقریظہ پر غالب آ گئے اگر بنونضیر بنوقریظہ کا کوئی بندہ مار دیتے تو بدلہ میں وہ قتل نہیں کیے جاتے تھے کیونکہ وہ طاقتور تھے بلکہ وہ ایک سو وسق کھجور دے دیتے تھے کہ تم دیت لے لو ہمارا بندہ قتل نہیں ہوگا کیونکہ ہم بڑے لوگ ہیں اور اگر بنوقریظہ کے کسی بندے نے بنونضیر کا بندہ مار دیا تو وہ قتل ہوتا تھا اگر بنونضیر والے ناراض ہو گئے کہ ہم قتل کا بدلہ نہیں لیتے لیکن

تم دیت ادا کرو۔ تمہاری دیت سو وسق کھجور تھی ہماری دیت دو سو وسق کھجور ہوگی کیونکہ ہم تم سے زیادہ عزت والے لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ قصاص کے اندر عدل و انصاف ہوگا تم ہرگز پیروی نہ کرو ان لوگوں کی جو فساد کرنے والے ہیں جو تحریف کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت کرنے والے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا غلام مارا گیا اس کے بدلہ میں ہم تمہارا آزاد ماریں گے۔ اگر عورت ماری گئی تو ہم اس کے بدلہ میں تمہارا مرد ماریں گے وگرنہ تمہاری اور ہماری صلح نہیں ہوسکتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ آیات نازل فرمائیں کہ تم کیا کر رہے ہو؟ قصاص کا معنی تو برابری ہے اس وجہ سے آیت میں آزاد کی قید آ گئی جس سے بعض حضرات نے اس سے آیت کا مخالف مفہوم لے لیا کہ اگر کوئی آزاد غلام کو قتل کر دے تو غلام کے بدلہ میں آزاد قتل نہیں ہوگا۔ لیکن راجح قول ﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِۦ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُۥ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ﴾ [المائدۃ:۴۵] ہے اگر عورت نے قتل کیا ہے تو بدلہ میں وہی عورت قتل ہوگی۔

اسی طرح اسلام نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جب کافروں کے ساتھ مقابلہ ہو تو ان کی عورتوں کو قتل نہ کرو، لیکن جو عورت بندوق لے کر لڑنے کے لئے آ جائے تو اس کو قتل کیا جائے گا، کیونکہ اس نے خود مرنا قبول کیا ہے۔

اسی طرح کافروں کے جو پنڈت، پادری ہیں ان کو بھی قتل نہ کیا جائے لیکن اگر وہ لڑنے کے لئے آ جائیں تو ان کو بھی قتل کیا جائے گا، کیونکہ حکم ہے: ﴿فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُۥ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ [البقرۃ:۱۷۸]

بعض مفسرین فرماتے ہیں: اس آیت کا حکم ﴿النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ والی آیت کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔

﴿وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آزاد نے غلام کو قتل کیا تو بدلہ میں آزاد قتل ہوگا کیونکہ سورۃ المائدہ والی آیت عام ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ، ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ اور امام داؤد رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ، علی بن المدینی رحمہ اللہ، ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر کسی سردار نے اپنے غلام کو قتل کر دیا تو سردار کو قتل کیا جائے گا اس حدیث کے عام ہونے کی وجہ سے کہ جس میں ہے:

"مَنْ قَتَلَ عَبْدَهُ قَتَلْنَاهُ، وَ مَنْ جَدَعَهُ جَدَعْنَاهُ، وَ مَنْ أَخْصَاهُ أَخْصَيْنَاهُ." [سنن النسائی، رقم:۴۷۳۶]

جس نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اس کو قتل کریں گے، جس نے غلام کا کان، ناک کاٹا ہم اس کا کان، ناک کاٹیں گے اور اپنے غلام کو خصی کیا تو ہم اس کو بھی خصی کریں گے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں: آزاد کو غلام کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ غلام ایک مال ہے اگر عبد خطأ مارا جائے تو اس میں دیت بھی نہیں ہوگی، بلکہ اس کی جو قیمت ہے وہ دی جائے گی جب اس کا قصاص نہیں لیا جاتا تو نفس کے معاملہ میں بھی نہیں لیا جائے گا۔

ذمی کافر کے بدلہ میں مسلمان کا قتل:

بعض علماء نے فرمایا: مسلمان کو ذمی کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کو ذمی کافر کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔

امام صاحب رحمہ اللہ کا ایک اصول ہے۔ وہ سب سے پہلے کتاب اللہ کو لیتے ہیں، پھر سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لیتے ہیں اور اگر دو احادیث بظاہر متعارض ہوں اور دونوں حدیثیں صحیح ہوں تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ دیکھو! ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم نے کس پر عمل کیا ہے؟ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تھا کہ میرے اور خلفائے راشدین کے عمل کو پکڑنا، خلفاء راشدین سب سے زیادہ علم والے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ قریب تھے۔ انہوں نے اگر کسی ایک حدیث پر عمل کیا ہے تو ان کے علم میں کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ اگر خلفاء راشدین کا عمل نہ ملے تو عشرہ مبشرہ کے عمل کو دیکھتے ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں جنت کی خوشخبری سنائی تھی، کیونکہ ان سے غلطی نہیں ہوگی اور اگر ان کے عمل میں نہ ملے تو بیعت رضوان میں شریک صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کو دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی فقہ کو پذیرائی ملی ہے۔ پوری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد دیکھ لیں، ان میں دو تہائی آپ کو فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کیا جائے گا:

﴿وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى﴾ بعض حضرات سورۃ البقرۃ کی اس آیت مبارکہ کو لے کر فرماتے ہیں کہ اگر مرد نے عورت کو قتل کر دیا تو مرد کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور نے ان کی مخالفت کی ہے۔ کیونکہ آیت المائدۃ میں موجود ہے کہ مرد کو

عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا:

''اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ.'' [سنن ابی داود، رقم: ۲۷۵۱]

تمام مسلمانوں کا خون برابر ہے۔

ایک آدمی نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تو کیا اس کو بیوی کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ قتل نہیں کیا جائے گا، لیکن جمہور فرماتے ہیں کہ اس کو قتل کیا جائے گا۔ ہمارے ہاں عام رواج ہے کہ بیوی پر شبہ ہو تو اس پر تیل ڈال کر جلا دیا یا قتل کر دیا۔ حالانکہ مرد کو اس چیز کا حق نہیں ہے۔ اگر اس کو شبہ ہے تو اس کو طلاق دے دے، اس کو قتل نہیں کر سکتا۔ اگر تم اس کو قتل کرو گے تو شریعت میں تمہیں قتل کیا جائے گا۔

قاتل زیادہ ہوں تو ان کا حکم:

ایک آدمی کے قتل میں مثلاً دس آدمی شریک تھے تو کیا اب دس کے دس قتل ہوں گے یا ایک قتل ہو گا؟ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور جمہور علماء اس طرف گئے ہیں کہ دس کے دس آدمی شریک تھے مثلاً آٹھ آدمیوں کے ہاتھوں میں لکڑیاں تھیں اور دو کے ہاتھ میں کلہاڑیاں تھیں، مقتول کے جسم پر کلہاڑی کی ضرب ہے اور لاٹھی کی ضرب نہیں ہے تو موجودہ قانون کہتا ہے کہ اس کے جسم پر کلہاڑی کی ضرب ہے، لاٹھی کی ضرب نہیں ہے لہٰذا یہ مارنے میں شریک نہیں۔ جبکہ اسلام کہتا ہے کہ جب یہ سارے نیتِ قتل کے ساتھ چل پڑے ہیں، اگرچہ انہوں نے نہیں مارا، لیکن یہ معاون جرم ہیں، اس لیے سب کو قتل کیا جائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اگر بستی والے اکٹھے ہو کر ایک آدمی کو ماریں تو کیا کیا جائے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پوری بستی کو قتل کر دو۔ آخر انہوں نے ایک انسان کو کیوں قتل کیا ہے؟ لیکن آج ہمارے بعض ملکوں میں یہ حال ہو گیا ہے کہ کتے کے مرنے پر جتنا غم ہوتا ہے انسان کے مرنے پر اتنا غم نہیں ہوتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مقدمہ آیا کہ سات آدمیوں نے مل کر ایک غلام کو قتل کر دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان سب کو قتل کر دو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب فیصلہ فرمایا تو کسی صحابی نے مخالفت بھی نہیں کی تھی تو گویا یہ اجماع ہو گیا۔ اور یہی بات امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جیسے بیس تراویح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقرر فرمائیں اور کسی صحابی نے انکار نہیں کیا تو اس پر بھی اجماع ہو گیا، لیکن کچھ لوگ اس کو نہیں مانتے۔

معاف کرنے پر قاتل کی رضا کا حکم:

﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ﴾ امام مالک رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ان سب کا یہ قول ہے کہ ایک آدمی نے قتل عمد کیا۔ اسلام کہتا ہے کہ اس کو قتل کرو۔ مقتول کے وارثوں نے کہا: ہم نے اس کو معاف کیا، یہ دیت ادا کرے۔ اب دیت میں سے وارث کہیں کہ ہم اتنا معاف کرتے ہیں تو سارے ائمہ فرماتے ہیں: اس کے اندر قاتل کی رضا بھی ضروری ہے۔ پہلے دور کے اندر لوگ شریف اور بااصول ہوتے تھے کہ جب انہوں نے مجھے قتل سے بچالیا اور اب میں ان کو کہوں کہ دیت میں کچھ معاف کرو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ انسان زندہ ہو تو پیسہ کما سکتا ہے دولت تو آنی جانی چیز ہے تو ضمیر والا آدمی کبھی یہ برداشت نہیں کرتا کہ مجھے پیسوں کی بھی معافی دی جائے۔ اور اگر وہ راضی ہو کہ میں تو اتنے پیسے ادا نہیں کر سکتا مجھے معاف کر دو میں راضی ہوں تو معاف کرنا ٹھیک ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: معاف کرنے میں قاتل کی رضا کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ مالک کی مرضی ضروری ہے۔

ایک آدمی کو قتل کیا گیا اور دیت طے ہوگئی۔ مقتول کے وارثوں میں عورت بھی ہے تو کیا عورت بھی معافی دے سکتی ہے یا نہیں؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ عورت کو معاف کرنے کا حق نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا: جتنے وارث ہیں، ہر ایک کو معاف کرنے کا برابر حق ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت ہو۔

﴿ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ﴾ کی تفسیر:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قتل عمد کے اندر ہم نے دیت رکھی، یہ ہماری رحمت ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں قتل کا کوئی بدلہ نہیں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں قتل کا بدلہ قتل تھا، دیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو معتدل بنا دیا کہ اگر قتل عمد ہے اور ورثاء مقتول معاف نہیں کرتے تو قصاص ہوگا اور اگر ورثاء مقتول معاف کرتے ہیں تو دیت ہوگی، اور اگر قتل خطاء ہے تو صرف دیت ہوگی۔

ایک آدمی نے قتل کیا، مقتول کے ورثاء نے دیت مانگی کہ دیت ادا کرو، ہم تمہیں چھوڑتے ہیں۔ اس نے دیت دے دی۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اس نے ہمارے باپ کو قتل کیا تھا، اس کو قتل کرو تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر میں عذاب دوں گا۔

ہمارے ہاں یہی بہت بڑی غلطی ہے کہ ایک آدمی سے قتل ہو گیا، مقتول کے ورثاء نے معاف کر دیا تو دل سے معاف کریں اور سب کچھ بھول جائیں۔

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۷۹] کیونکہ جب قاتل کو پتہ ہو گا کہ اگر میں نے قتل کیا تو مجھے بدلہ میں قتل کر دیا جائے گا تو قتل کرنے سے رک جائے گا۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۞ فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۞ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞﴾

[البقرۃ:۱۸۰ تا ۱۸۲]

”تم پر فرض ہے جب تم میں سے کسی کو موت (کے آثار) ظاہر ہوں اگر اس نے مال چھوڑا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے شریعت کے مطابق وصیت کرے۔ یہ حکم پرہیزگاروں پر لازم ہے (یہ حکم بعد میں منسوخ ہو گیا تھا)۔ پس جس نے (اس کی) وصیت کو سننے کے بعد بدل دیا تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہو گا جو اس کو تبدیل کریں گے۔ بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ پس جس کو وصیت کرنے والے سے طرفداری یا گناہ کا خوف ہو پھر ان میں باہم (عدل کر کے) صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

آیات کا باہمی ربط:

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے موت سے قبل والدین اور رشتہ داروں کے بارے میں وصیت کرنے کا حکم دیا ہے۔ جب تک میراث کی آیات مبارکہ نازل نہیں ہوئی تھیں اس وقت تک اپنے اموال میں ورثاء کے لیے وصیت کرنا فرض وواجب تھی، لیکن میراث کا حکم نازل ہوا تو وصیت کی فرضیت کا حکم ختم ہو گیا۔ اب ان کے لیے وصیت فرض ہے جن کا لوگوں سے لین دین ہے یا ان پر قرض ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت مبارکہ کو تلاوت کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ حضرت

ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ پہلے والدین اور رشتہ داروں کے لیے وصیت ہوتی تھی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے والدین کے لیے جب میراث میں حصہ مقرر فرما دیا اور وہ قریبی رشتہ دار جن کا حصہ میراث میں مقرر نہیں ہے ان کے لیے وصیت باقی رہ گئی لیکن مرنے والا ان کے لیے بھی اپنے کل مال کے ایک تہائی ۳/۱ حصہ میں وصیت کر سکتا ہے، اس سے زیادہ کی وصیت نہیں کر سکتا۔

آیت سے متعلق امام رازی ؒ کی تفسیر کا جواب:

مفسر ابن کثیر ؒ فرماتے ہیں: مجھے ابوعبداللہ محمد بن عمر الرازی پر تعجب ہے کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں یہ بات کہہ دی کہ یہ آیت منسوخ نہیں، بلکہ یہ آیت المیراث کی تفسیر اور بیان ہے اور انہوں نے لکھا کہ اس طرف بہت سارے علماء کا بھی یہی قول ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ تعجب اس وجہ سے ہے کہ جلیل القدر صحابہ وتابعین اور سلف صالحین نے فرمایا ہے کہ یہ منسوخ ہے۔ البتہ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں منسوخ ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے میراث میں حصہ مقرر کر دیا۔ لیکن جن کا حصہ میراث میں مقرر نہیں ان کے لیے وصیت کا حکم اب بھی باقی ہے۔ تو پھر امام رازی ؒ نے کیسے کہہ دیا کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے؟

(حدیث) حضرت عمرو بن خارجہ ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا:

"إِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى قَدْ أَعْطَى لِكُلِّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ، فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ." [جامع ترمذی، رقم: ۲۱۲۰]

اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کے حق کو بیان فرما دیا ہے، اب وارث کے لیے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ مدینہ منورہ میں ایک آدمی نے جائیداد لی، رجسٹری کے کاغذ کو لوہے کے رول میں رکھ کر اس بلڈنگ کی ایک دیوار میں دفن کر دیا۔ اللہ کی شان ہے کہ اس نے اپنے وارثوں کو بتا دیا کہ میں نے جائیداد خریدی تھی وہ فلاں جگہ ہے اور فلاں جگہ اس کے کاغذات ہیں۔ دوسرے لوگ اس پر قابض ہو گئے اور کہا کہ یہ ہماری جائیداد ہے۔ مقدمہ چلا تو ان سے پوچھا گیا کہ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ انہوں نے کہا: مجسٹریٹ موقع پر جا کر دیوار توڑ دیں، اگر اندر سے کاغذات نکل آئیں تو جگہ ہماری ہے اور اگر کاغذات نہ نکلیں تو وہ ہماری جائیداد نہیں ہے۔ مجسٹریٹ نے موقع پر کھڑے ہو کر وہ دیوار گروائی تو اندر سے وہ کاغذات برآمد ہو گئے۔

بزرگوں نے فرمایا کہ لکھا ہوا کبھی نہ کبھی کام آجاتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اگر اس کی کوئی جائیداد ہے

معاملات ہیں، لین دین ہے تو اس کو لکھ کر اپنے پاس رکھے۔ اگر اپنی اولاد سے چھپانا چاہتا ہے تو اس کا جو قانونی وکیل ہے اس کے پاس محفوظ کروادے یا کوئی امانت دار دوست ہیں تو ان کو دے دے کہ یہ میرے معاملات ہیں۔ اس طرح آدمی جھگڑوں سے بچ جاتا ہے۔

یہ بات بالاجماع ثابت ہوگئی کہ جن وارثوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے حصے مقرر کر دیئے ان کے لیے کوئی وصیت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا حصہ خود اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کا حق مقرر فرمادیا، اس کو حق ملے گا اب وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔

صحیحین میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"مَا حَقُّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ لَهُ شَيْءٌ يُوصِي فِيهِ، يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إِلَّا وَ وَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ."

[صحیح بخاری، رقم:۲۷۳۸/صحیح مسلم، رقم:۱۶۲۷]

اگر مسلمان کا کوئی لین دین ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس پر دو راتیں نہ گزریں، مگر اس کے پاس وصیت لکھی ہوئی ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے یہ سنا تو میری کوئی رات ایسی نہیں گزری، مگر میرے پاس اس کے متعلق وصیت لکھی ہوتی ہے۔

یہ عمل کا جذبہ تھا کہ صحابہ جو حضور پاک ﷺ سے سنتے تھے اس پر عمل کرتے تھے اور یہی ان کی کامیابی کی دلیل تھی اور ہماری ناکامی اور پریشانی کی یہی وجہ ہے کہ ہم اللہ اور اللہ کے رسول کے حکموں پر عمل نہیں کرتے اور اگر ہمیں کوئی حکم سنایا جائے تو اپنی عقل سے اس کا توڑ ڈھونڈتے ہیں، جبکہ اسلام کا معنی ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کر دیا۔ لہٰذا پھر اللہ کے کسی حکم کے اندر اگر، مگر، چونکہ اور چنانچہ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

عبد بن حمید نے اپنی سند سے حدیث قدسی بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"يَا بْنَ آدَمَ! اِثْنَتَانِ لَمْ تَكُنْ لَكَ وَاحِدَةٌ مِنْهُمَا: جَعَلْتُ لَكَ نَصِيبًا مِنْ مَالِكَ حِينَ أَخَذْتُ بِكَظْمِكَ لِأُطَهِّرَكَ بِهِ وَ أُزَكِّيَكَ، وَ صَلَاةُ عِبَادِي عَلَيْكَ بَعْدَ انْقِضَاءِ أَجَلِكَ." [سنن ابن ماجہ، رقم:۲۷۱۰]

اے ابن آدم! میں نے دو ایسی چیزیں عنایت کیں جن میں سے ایک پر بھی تمہارا حق نہیں بنتا تھا۔ جس وقت تمہاری سانس روکوں اس وقت تمہیں مال کے ایک حصہ (یعنی تہائی مال کے صدقہ کرنے) کا اختیار دیا۔ جب کسی

بندے کو موت آتی ہے تو اس کا سارا مال غیر (ورثاء) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، مگر میں نے تیرے لیے اس میں ایک تہائی میں بصورت وصیت کے تصرف باقی رکھا ہے، تاکہ اس کے ذریعے سے میں تمہیں پاک کروں اور تمہارا تزکیہ کروں، دوسری چیز تمہارے مرنے کے بعد میرے بندوں کا تم پر نماز (جنازہ) پڑھنا۔

﴿اِنْ تَرَكَ خَيْرًا﴾... خیر کا معنی یہاں مال ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اگر مال زیادہ ہو تو وصیت کرے، وگرنہ وصیت نہ کرے۔ اب مال کی مقدار میں اختلاف ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ ایک آدمی مر گیا ہے، اس نے تین سو دینار یا چار سو دینار چھوڑے ہیں اور اس نے وصیت نہیں کی ہے۔ آپ نے فرمایا: تین یا چار سو دینار کی کوئی بات نہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿اِنْ تَرَكَ خَيْرًا﴾... ﴿خَيْرًا﴾ کی تنوین عظمت کے لیے ہے کہ اگر وہ بہت زیادہ مال چھوڑے تو وصیت کرے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی قریبی رشتہ دار بیمار ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس آدمی کو کہا گیا کہ وصیت کر دو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تمہارے پاس بہت سارا مال ہے تو وصیت کر دو اور اگر تھوڑا سا ہے تو اس کو اپنی اولاد کے لیے چھوڑ دو۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول مبارک ہے کہ جس نے ساٹھ دینار چھوڑے اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا: اسی درہم اور بعض نے فرمایا: ایک ہزار یا اس سے بھی زیادہ چھوڑے گا تو وصیت ہے وگرنہ نہیں ہے۔

علماء نے یہاں ایک مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ اگر وصیت کرنا ضروری ہے تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی؟ صحابہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت نہیں فرمائی تھی۔ علماء نے اس کا جواب یہ لکھا ہے کہ وصیت یا تو دین کے معاملہ میں ہو گی یا دنیا کے معاملہ میں ہو گی۔ اگر دینی اُمور کی بات ہے تو اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ اے میری اُمت! میں تمہیں دو چیزیں دے رہا ہوں، ان کو پکڑ لو کبھی گمراہ نہیں ہو گے، ایک اللہ کا قرآن اور دوسری میری سنت۔ اور جہاں تک دنیا کا تعلق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم جتنے بھی انبیاء گزرے ہیں ہماری میراث درہم و دینار نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ہم نے کوئی مال چھوڑا بھی ہو تو وہ اللہ کے راستہ میں خیرات ہے۔ ہماری میراث تو علم ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی جائیداد نہیں، کوئی چیز تقسیم نہیں ہونی تو وصیت کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے ہاں ایسا رواج ہے کہ اگر کسی کو وصیت لکھنے کے لیے بلائیں تو وہ کہتا ہے کہ اللہ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے۔ حالانکہ جتنی لمبی عمر ہوتی جائے گی آدمی اتنا ذلیل ہوتا جائے گا، چلنے کے قابل نہیں رہے گا، لوگوں کا محتاج ہوگا کہ اُٹھائیں، پکڑیں، کھلائیں، ﴿وَمَنۡ نُّعَمِّرۡهُ نُنَكِّسۡهُ فِي الۡخَلۡقِ ؕ اَفَلَا يَعۡقِلُوۡنَ﴾ [یٰسین:۶۸]...اللہ پاک نے جتنی عمر دی ہے اللہ ایمان پر رکھے، ایمان کی موت دے اور کسی کا محتاج نہ کرے، ورنہ جس دور میں ہم گزر رہے ہیں کوئی بیٹا پانی پلانے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ایک واقعہ:

مجھے ایک دوست نے واقعہ سنایا کہ آج کل فرمانبرداری کا یہ عالم ہے کہ ایک آدمی نے اپنے بیٹوں کے لئے کروڑوں کی جائیداد چھوڑی ہے، لیکن اولاد نافرمان ہے۔ جب باپ بیمار ہوا اور اس کو ہسپتال میں داخل کیا گیا اس کی حالت بڑی خراب تھی اس کو ڈاکٹروں نے آکسیجن لگادی۔ ایک بیٹا باپ کو دیکھنے کے لئے آیا اور پلنگ کے قریب کھڑے ہوکر کہتا ہے: اباجان! آپ میری غلطی معاف کردیں اور جو حکم ہو وہ فرمائیں۔ باپ نے کہا: پہلے یہ مہربانی کرو کہ پائپ سے پاؤں اُٹھادو۔ آکسیجن روک رہے ہو، تاکہ میں جلدی مرجاؤں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بیمار تھے، ان کو ایک دوست ملنے آئے اور کہا کہ آپ ماشاءاللہ! خلیفہ ہیں، اللہ نے آپ کو بڑی عظمت دی ہے۔ آپ نے ساری جائیداد خیرات کردی، اولاد کے لیے کچھ نہیں رکھا، آپ اپنی اولاد کے لیے کچھ وصیت کردیں، وگرنہ آپ کے بعد آپ کی اولاد کیا کرے گی؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مسکرائے اور فرمایا: تمہاری خیر خواہی کا شکریہ کہ تم نے میرے بیٹوں کے لیے اچھی بات سوچی ہے، لیکن یاد رکھو! میرے بیٹے اچھے بنیں گے یا برے بنیں گے، اس کے علاوہ تیسری قسم نہیں ہوسکتی۔ اگر میرے بچے اچھے بن گئے تو قرآن میں موجود ہے: ﴿اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيۡ نَزَّلَ الۡكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيۡنَ﴾ [الاعراف:۱۹۶] کہ جو میرے صالح بندے ہیں ان کا میں خود نگہبان ہوں۔ اگر میری اولاد صالح ہوئی تو مجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر میری اولاد بری بن گئی تو قرآن میں ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ﴾ [المائدۃ:۲] بھلائی میں مدد کرو، برائی میں مدد نہ کرو۔ میں جائیداد کیوں چھوڑ جاؤں؟

میری اولاد شراب پیے تو میں قیامت میں پکڑا جاؤں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا ملفوظ:

یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا مقام تھا، تم ایسے نہ بننا، تم اولاد کے لئے کچھ چھوڑ جانا۔ وہ اللہ والے لوگ تھے، ان کا مزاج الگ تھا۔ اب ہر آدمی ابوذر رضی اللہ عنہ نہیں بن سکتا۔ وہ فرماتے تھے کہ شام کو جو روٹی بچے، اس کا گھر میں رکھنا گناہ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: آپ مہربانی کریں اور مدینہ سے باہر چلے جائیں، کیونکہ اس طرح تو نظام نہیں چل سکتا۔

اللہ نے قرآن میں میراث کے احکام نازل فرمائے ہیں، وہ اس وقت ہی ہوگا جب مال و جائیداد موجود ہوگی۔

﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ کی تفسیر:

﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾... معروف کا معنی نرمی اور احسان ہوتا ہے یا معروف کا معنی ہے کہ ہر وہ چیز جو شریعت کے حکم کے مطابق ہو اور جو شریعت کے مخالف یا شرعی ممنوعات میں سے ہو، وہ منکر ہے۔

وصیت کب کرے؟

حضرت حسن رحمہ اللہ نے جب یہ آیت تلاوت فرمائی تو فرمایا کہ وصیت کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جب علاماتِ موت آجائیں تو وصیت کرے۔

علماء نے فرمایا: جب آدمی کی ساٹھ سے ستر سال عمر ہو جائے تو وہ یوں تصور کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق میرے دن پورے ہو گئے ہیں۔ اب جو دن ہیں، اللہ کی رحمت سے مجھے ملے ہوئے ہیں اور وہ اپنی تیاری شروع کر دے۔

علماء نے فرمایا کہ قرآن میں آیا: ﴿جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ﴾... ﴿النَّذِيْرُ﴾ کا ایک ترجمہ تو یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی ڈرانے والے آئے، پھر پیغمبروں کے وارث علماء اُمت ڈرانے والے آئے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ جب انسان کی داڑھی یا سر میں سفید بال آجائیں تو سمجھو کہ ڈرانے والا آگیا۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ اس کے بعد اپنی آخرت کی تیاری شروع کر دے اور قاعدہ ہے کہ جو آدمی وقت پر تیاری کرے، اس کو سفر میں تکلیف نہیں ہوتی۔ اس لئے ایسا آدمی جس کی عمر ساٹھ سے ستر سال ہو جائے تو وہ اپنی

آخرت کی تیاری کرے۔ وصیت کرے، کسی کا حق دینا ہے تو ادا کرے، کسی کا قرضہ دینا ہے تو ادا کرے، اگر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو اس سے جا کر معافی مانگے کہ خدا کے لیے مجھے بخش دو، اللہ تعالیٰ تجھے کسی اور جگہ سے عطا فرمادے گا۔ اب جب یہ تیار ہوگا اور اس کو موت آئے گی تو اس کو کوئی فکر نہیں ہوگی اور وہ خوش ہو کر موت کا استقبال کرے گا کیونکہ موت ہی ہمارے اور اللہ کے درمیان ملاقات میں رکاوٹ ہے۔ اس لیے جب انسان پر موت کی علامات آجائیں تو وہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کے لیے وصیت نہ کرے اور یہ بھی نہ کرے کہ سب کچھ لٹادے اور خاندان بھوکا بیٹھا رہے۔ اس لیے فرمایا: احسان کے ساتھ وصیت کرے۔

تہائی مال کی وصیت کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد:

صحیحین کی حدیث ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ نے مجھے بہت مال دیا ہے اور میرا کوئی وارث نہیں ہے، صرف ایک بیٹی ہے جو وارث ہے۔ اس لیے آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے مال کے دو حصے خیرات کر دوں اور ایک حصہ بچی کو دے جاؤں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ تو بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا: حضور! مجھے اجازت دیں کہ میں آدھا مال خیرات کر دوں اور آدھا بچی کے لیے چھوڑ دوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ بھی زیادہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا: آپ مجھے تیسرے حصہ کی خیرات کرنے کی اجازت دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"اَلثُّلُثُ، وَ الثُّلُثُ كَثِيرٌ، إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ، خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ."

[صحیح بخاری، رقم:۱۲۹۵/صحیح مسلم، رقم:۴۲۱۶]

چلو تم تیسرا حصہ خیرات کر دو، لیکن یہ بھی زیادہ ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا: بہتر ہے کہ تم اپنی اولاد کو غنی چھوڑ دو۔ یہ نہ ہو کہ وہ تمہارے بعد لوگوں کے دروازے پر ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

اس حدیث مبارک سے اندازہ لگاؤ کہ اسلام نے عورت کے لئے کتنا حق رکھا ہے۔ اسلام تو صرف یہ چاہتا ہے کہ مرد اپنے حقوق و حدود میں رہے اور عورت اپنی حدود میں رہے، وگرنہ اسلام نے کبھی عورت کو علم سے نہیں روکا، کبھی عورت کو کام سے نہیں روکا، لیکن اس کی حدود ہیں۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لوگوں کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ اپنے مال کے تیسرے حصہ کے بجائے چوتھے میں وصیت کریں، کیونکہ حضور ﷺ نے تیسرے حصہ کو بھی زیادہ سمجھا۔

منہ بولے بیٹے کی وصیت کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد:

مسند امام احمد بن حنبل میں حنظلہ بن حذیم بن حنیفہ سے روایت ہے کہ ان کے دادا حنیفہ نے اپنی گود میں ایک بچہ لیا ہوا تھا، انہوں نے اس کے لیے ایک سو اونٹ کی وصیت کی کہ میرے بعد اس کو ایک سو اونٹ دیئے جائیں۔ ان کی اولاد کو یہ بات ناگوار گزری کہ یہ منہ بولا بیٹا ہے کوئی حقیقی بیٹا تو نہیں ہے، تو حضرت حنیفہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹوں کو ساتھ لیا اور حضور ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے ایک یتیم بچے کو بیٹا بنایا تھا، میں نے وصیت کی ہے کہ میرے بعد اس بچے کو ایک سو اونٹ دیئے جائیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

"لَا، لَا، لَا. اَلصَّدَقَةُ خَمْسٌ وَ إِلَّا فَعَشْرٌ وَ إِلَّا فَخَمْسَ عَشْرَةَ وَ إِلَّا فَعِشْرُونَ وَ إِلَّا فَخَمْسٌ وَ عِشْرُونَ وَ إِلَّا فَثَلَاثُونَ وَ إِلَّا فَخَمْسٌ وَ ثَلَاثُونَ، فَإِنْ كَثُرَتْ فَأَرْبَعُونَ."

[مسند احمد بن حنبل، رقم: ۲۰۶۶۵]

ایک سو اونٹ تو بہت زیادہ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، زیادہ سے زیادہ تم وصیت کرنا چاہتے ہو تو پانچ اونٹوں کی وصیت کردو، دس اونٹ کی کردو، یا پندرہ اونٹ کی کردو، یا بیس کی کردو یا تیس کی کردو یا پینتیس کی کردو، اور اگر صدقہ زیادہ کرنا ہو تو چالیس اونٹ کی وصیت کردو، اس سے زیادہ نہ کرو۔

وصیت کے بعد اس میں کمی بیشی کرنا:

﴿فَمَنۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اگر کوئی شخص وصیت کر گیا، اس کے بعد جس کے پاس وہ وصیت تھی، اس نے اس میں تحریف وتبدیلی کی اور اس کے حکم کو بدل ڈالا، کچھ اپنی طرف سے بڑھا دیا یا کچھ کم کردیا۔ یہ سب سے بڑا کاتم (چھپانے والا) ہے جو حق کو چھپانے والا ہے۔ اب گناہ ان لوگوں پر ہوگا جنہوں نے وصیت میں تبدیلی کی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اگر کوئی آدمی وصیت کر گیا کہ میری موت کے بعد ایک سو ریال خیرات کیے جائیں، لوگوں نے سو کو بدل کر دس ریال کر دیا۔ اللہ اس میت کو تو سو کا ثواب دیں گے، لیکن گناہ ان پر ہوگا جنہوں نے وصیت میں تغیر وتبدل کیا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اللہ سننے والے اور جاننے والے ہیں۔ اللہ نے سن لیا کہ وصیت کرنے والے نے کیا

وصیت کی اور جنہوں نے بدلا، ان پر گناہ ہوگا۔

﴿فَمَنْ خَافَ مِن مُّوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ﴾ کہتے ہیں کہ کسی جانب زیادہ میلان ہو جائے۔ ﴿إِثْمًا﴾ کا معنی گناہ ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا: ﴿جَنَفًا﴾ تمام قسم کی غلطیوں کو شامل ہے، یہ بھی خطا ہے کہ کسی وارث کو زیادہ دیا اور کسی کو کم کر دیا کہ بیٹے کے بیٹے کو حصہ دے دیا کیونکہ پوتے کو دینا بھی بیٹے کو دینا ہے۔ اور کبھی خطاً ایسا کر بیٹھا کہ پوتے سے محبت تھی، جان کر اس طرح نہیں کیا۔

جس آدمی کو وصیت کی گئی ہے اگر وہ چاہتا ہے کہ شریعت کے مطابق تبدیلی کر دی جائے تو تبدیل کر دے، جیسے شریعت نے درجہ رکھا ہے اسی طرح تبدیل کر دے۔ اللہ تعالیٰ نیتوں کو جانتے ہیں کہ اس تبدیلی کرنے والے کی نیت اصلاح کی تھی یا تحریف و تبدیلی کی تھی۔

وصیت کرنے والوں کے لیے بشارتِ نبوی:

حضور ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْخَيْرِ سَبْعِيْنَ سَنَةً، فَإِذَا أَوْصَى حَافَ فِيْ وَصِيَّتِهِ، فَيُخْتَمُ لَهُ بِشَرِّ عَمَلِهِ فَيَدْخُلُ النَّارَ، وَ إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الشَّرِّ سَبْعِيْنَ سَنَةً، فَيَعْدِلُ فِيْ وَصِيَّتِهِ فَيُخْتَمُ لَهُ بِخَيْرِ عَمَلِهِ فَيَدْخُلُ الْجَنَّةَ." [سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۷۰۴]

بعض لوگ ایسے ہیں جو ستر سال اچھے عمل کرتے رہے، جب موت قریب آگئی تو وصیت میں ظلم کر دیا تو جہنم کا حق دار بن گیا۔ اور ایک آدمی ستر سال تک گناہ کرتا رہا، جب موت کا وقت آیا تو شریعت کے مطابق وصیت کی تو اس وجہ سے اللہ نے اس کو معاف کر دیا اور جنت میں چلا گیا۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامٗا مَّعۡدُودَٰتٖۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوۡ عَلَىٰ سَفَرٖ فَعِدَّةٞ مِّنۡ أَيَّامٍ أُخَرَۚ وَعَلَى ٱلَّذِينَ يُطِيقُونَهُۥ فِدۡيَةٞ طَعَامُ مِسۡكِينٖۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيۡرٗا فَهُوَ خَيۡرٞ لَّهُۥۚ وَأَن تَصُومُواْ خَيۡرٞ لَّكُمۡ إِن كُنتُمۡ تَعۡلَمُونَ ۝﴾
[البقرۃ:۱۸۳، ۱۸۴]

’’اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کر دیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔ گنتی کے چند دن روزے رکھ لو، پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر ہو تو اس پر دوسرے دنوں میں (قضا) رکھنی ہے، اور ان لوگوں پر جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے، فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا، اور جو اس سے بھی زیادہ دے وہ اس کے لیے بہتر ہے، لیکن اگر (روزہ چھوڑنے اور فدیہ کی بجائے) روزہ رکھو تو تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔‘‘

ربط آیات:

اللہ پاک نے اس سے پہلے قتل سے بچنے کا حکم دیا، پھر وصیت میں ظلم کرنے سے بچنے کا حکم دیا ہے، ان چیزوں سے بچنا تقویٰ ہے۔ اب تقویٰ تک پہنچنے کے اور اسباب وذرائع کا بیان ہے کہ تقویٰ کا ذریعہ روزے ہیں۔

روزے کی فرضیت کیوں ہوئی؟

قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں اللہ کے نظام کو چلانے کے لیے بنیادی چیز تقویٰ ہے۔ قرآن و احادیث کیوں پڑھائی جاتی ہیں؟ تاکہ بندے کے دل کے اندر اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا ہو تو پھر اس کو جرم سے روکنے کے لیے نہ کسی فوج کی ضرورت ہے اور نہ پولیس کی ضرورت ہے اور نہ انٹیلی جنس اداروں کی ضرورت ہے، بلکہ جب اس کے دل کے اندر اللہ کا خوف پیدا ہو گیا تو اس کے اعمال خود بخود ٹھیک ہوتے چلے جائیں گے۔

مثال کے طور پر ایک آدمی رات کو اپنے گھر میں آرام سے سویا ہوا ہے، رات کے آخری حصہ میں جو سب سے زیادہ مزے دار ہوتا ہے کہ اس میں خوب سناٹا ہو جاتا ہے، آدمی مزے کی نیند میں ہوتا ہے، لیکن اس وقت وہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ میری تہجد نہ چلی جائے، وضو کر کے علیحدہ کمرہ میں نماز پڑھتا ہے اور اس طرح اُٹھتا ہے کہ میرے اُٹھنے کا میرے گھر والوں کو بھی احساس نہ ہو۔ آخر کس سپاہی نے جگایا ہے؟ یہ اس کے دل کا خوف ہے جو اس کو آرام نہیں

کرنے دیتا۔ اس کو پتہ ہے کہ میں نے مرنے کے بعد قبر میں جانا ہے اور پھر آخرت کے اندر آرام ہی آرام ہے، یہ زندگی کے چند دن ہیں، اس کے اندر محنت کرلوں تا کہ اپنی آخرت کی زندگی کو سنوار سکوں۔ اس کے مقابلہ پر ایک دوسرا آدمی ہے جو جاگ رہا ہے، تندرست ہے، جوان ہے، فجر کی اذان کو سنتا ہے، اُٹھ کر سگریٹ پی کر سو جاتا ہے، اس کے دل میں اللہ کا خوف نہیں ہے۔ اسلام میں بنیادی سبق تقویٰ کا پڑھایا جاتا ہے اور یہی حکمت اور مقصود روزے کی فرضیت سے ہے اور اس لیے بھی کہ روزہ کے اجر میں آدمی جہنم کی آگ سے بچ جائے۔

صوم کا لغوی اور شرعی معنیٰ:

صیام، صوم کی جمع ہے۔ لغت میں اس کا معنیٰ ہے: منع کرنا، رکنا۔ اور شریعت میں صوم کا معنیٰ ہے طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور جماع سے رکنا۔

﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ﴾ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ کہنا کہ روزے اس اُمت کے ساتھ خاص ہیں، یہ قرآن کے عموم کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو تم سے پہلے گزرے ہیں یعنی حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر ہمارے آقا ﷺ تک ہر شریعت میں روزہ تھا، لیکن ان کے روزوں کے دن مختلف تھے، شرائط و ارکان مختلف تھے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ نصاریٰ کے لیے روزے ہر ماہ میں تین دن کے تھے، یہود کے لیے ہر مہینے میں تین دن اور ایک عاشورا کا روزہ تھا۔

رمضان سے پہلے کون سے روزے فرض تھے؟

بعض روایات میں آتا ہے کہ پہلی اُمتوں پر بھی ایک مہینے کے روزے تھے۔ اگر تین دن کو بھی جمع کیا جائے تو بات تقریباً وہیں جا کر بنتی ہے۔

ابتداء اسلام میں ہمارے لیے بھی روزے کے احکام مختلف تھے، پہلے اس اُمت پر بھی تین دن کے روزے فرض تھے جسے ایام بیض کہتے ہیں، یعنی ہر ماہ تیرہ، چودہ و پندرہ کے دنوں اور راتوں میں چاند اپنے پورے جوبن پر آجاتا ہے اور ایک یومِ عاشوراء کا روزہ فرض ہوتا تھا۔ یومِ عاشوراء کے روزے کی وجہ کے بارے میں احادیث کے اندر آتا ہے کہ جب حضور ﷺ مدینہ منورہ میں آئے اور آپ نے دیکھا کہ یہودی یومِ عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں حضور ﷺ نے ان سے پوچھا: دس محرم کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: یومِ عاشوراء ایک دن ہے کہ

اس میں اللہ نے اپنے کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا عبور کرایا تھا اور دشمن فرعون کو غرق کیا تھا تو اس خوشی میں ہم روزہ رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم سے زیادہ تو موسیٰ علیہ السلام کے ہم حق دار ہیں، کیونکہ ہم تو ان کے صحیح ماننے والے ہیں، تم تو ماننے والے نہیں ہو، تم تو زبانی کلامی ان کا نام لیتے ہو۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو حکم دیا کہ اگلے سال جب محرم آجائے تو تم بھی عاشوراء کا روزہ رکھو، لیکن ایک بات کا خیال کرو یا تو اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد روزہ رکھو، تاکہ عاشوراء کا روزہ بھی ہوجائے اور لوگ یہ بھی نہ سمجھیں کہ ہم وہ عمل کررہے ہیں جو یہودیوں نے کیا ہے۔ لیکن جب قرآن پاک کی یہ آیت اور دوسری آیت: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ نازل ہوئی تو اب پہلے والے روزے فرض نہ رہے، اب وہ نفل کی حیثیت میں آگئے۔ اگر کوئی آدمی رمضان المبارک کے روزوں کے علاوہ ایام بیض کے روزے رکھنا چاہے تو بہت اچھا ہے، اسی طرح اگر کوئی آدمی ہفتہ میں سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھنا چاہے تو یہ بھی مستحب ہے۔ اگر اس کو اس سے بھی زیادہ اہمیت دیتا ہے تو جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم نے نفلی روزوں میں بڑھنا ہے تو داؤد علیہ السلام کا روزہ سب سے بہتر ہے، وہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن چھوڑ دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر بندہ کے اندر مختلف قویٰ اور ملکات رکھے ہیں، ہر بندے کے اندر قوتِ حیوانیہ بھی ہے کہ اچھا بھلا انسان جنگلی جانوروں سے بڑا حیوان بن جاتا ہے اور انسانوں کا خون بہادیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قوتِ حیوانیہ غالب آجاتی ہے اور قوتِ ملکیہ دب جاتی ہے، اور جب آدمی عبادت کرتا ہے، روزے رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو قوتِ حیوانیہ دب جاتی ہے اور قوتِ ملکیہ غالب آجاتی ہے اور آدمی زیادہ سے زیادہ تقویٰ کے قریب ہوجاتا ہے۔

روزہ گناہوں کی ڈھال ہے:

بخاری و مسلم کی حدیث ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

''يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ البَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ.'' [صحیح بخاری، رقم: ۵۰۶۵/صحیح مسلم، رقم: ۱۴۰۰]

اے نوجوانو! جو تم میں سے شادی کی طاقت رکھتا ہو وہ شادی کرلے اور جو غریب ہے، شادی کی طاقت نہیں رکھتا وہ (کثرت سے) روزے رکھے، کیونکہ روزہ گناہوں سے ڈھال ہے۔

خصوصی طور پر روزے کا بدلہ اللہ تعالیٰ دیں گے:

صحیح حدیث مبارک میں آتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اَلصَّوْمُ لِي وَ أَنَا أَجْزِيْ بِهٖ." [صحیح بخاری، رقم: ۷۴۹۲]

روزہ میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ بھی میں خود دوں گا۔

حالانکہ باقی عبادات بھی تو اللہ کے لیے ہیں، لیکن روزہ کے بارے میں بطور خاص فرمایا کہ یہ میرے لیے ہے۔ علماء نے لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عبادت میں ریا کا احتمال ہے، مگر روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے جسے کوئی دیکھنے والا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ اتنی بڑی چیز ہے کہ اس سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔

روزے کے چند احکام:

روزہ چاند دیکھنے سے شروع ہوگا اور افطار بھی چاند دیکھنے سے ہوگا۔ یاد رکھیں! اسلام میں وجودِ ہلال کی ضرورت نہیں ہوتی، وگرنہ تو ہم چاند کے پجاری ہو گئے، اسلام یہ نہیں کہتا کہ چاند ڈھونڈو، اس کے پیچھے پڑو، بلکہ میں نے تمہارے اوقات کے لیے چاند کا سلسلہ رکھا ہے، اگر تین شعبان کو چاند نظر آ گیا تو ٹھیک ہے، نہیں نظر آیا تو تب بھی ٹھیک ہے، حتیٰ کہ حضور ﷺ نے فرمایا: چاند تو تھا، لیکن بادلوں میں چھپ گیا نظر نہیں آیا تو تم تیس دن پورے شمار کرلو۔ کیونکہ مقصود شہودِ ہلال ہے وجودِ ہلال نہیں ہے۔ باقی یہ بات کہ ہم چودہ سو سال سے لکیر کے فقیر ہیں، ہم تو اپنی نجات کا ذریعہ ہی یہی سمجھتے ہیں۔ ہم نے تو آج تک اپنا باپ نہیں بدلا، نبی کیسے بدلیں گے؟ ہزاروں سال پہلے جو ہمارا باپ بابا آدم تھا، ہم نے تو اس کا بھی انکار نہیں کیا، ہم نے تو اپنی اماں بی بی حواء کا انکار نہیں کیا تو اللہ کے نبی کا کیسے انکار کر سکتے ہیں؟ ہم تو اسی لکیر کے محتاج ہیں اور روزانہ دعا مانگتے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ [الفاتحۃ: ۵] کہ اے اللہ! ہمیں سیدھے اسی راستہ پر چلا جس پر ہمارے محمد مدنی ﷺ تھے۔ تم آزاد ہو کر بطلیموس کے نظریات کو لے لو یا فیثا غورث کے نظریات کو لے لو، اور ہم محمد مدنی ﷺ کو ماننے والے ہیں یہ تو اپنی اپنی نظر اور پہچان ہے۔ ہر کسی کو آزادی ہے تو ہمیں بھی آزادی دیں کہ ہم محمد مدنی ﷺ کے غلام رہ سکیں۔

﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نہ ہم نے اتنے روزے رکھے ہیں کہ عبادت سے عادت بن جائے اور نہ اتنے تھوڑے رکھے کہ نفس کی کچھ اصلاح نہ ہو سکے۔

ابتدء اسلام میں یہ بات ضروری تھی، مثلاً روزہ افطار کرلیا تو رات کو اس وقت تک کھا پی اور جماع کر سکتے تھے جب تک جاگ رہے ہیں، اگر عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سو گئے تو کھانا، پینا، جماع بند ہو گیا اس طرح غروب آفتاب تک رہنا ہوتا تھا اس سے لوگوں کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، کیونکہ وہ سارا دن محنت کرتے تھے۔ عرب کی زمین میں گرمیوں کے دنوں میں کام کرنا ان کو پتہ ہے جو اس گرمی میں مزدوری کرتا ہے اور جو اے سی میں بیٹھ کر حکم چلاتا ہے اسے کیا معلوم؟ جو اے سی کاروں سے نکل کر اے سی کمروں میں آجاتے ہیں۔ ان کے بس میں نہیں ہے، ورنہ یہ اپنی قبروں میں بھی اے سی لگوالیں۔ لیکن وہاں کا جزیرۃ اللہ کے ہاتھ میں ہے، اگر یہ لگوا بھی دیں تو بند ہو جائے گا اور جن کی قبروں کو اللہ نے ٹھنڈا رکھا ہے، ان کی قبریں ویسے ہی جنت کے باغ بن جاتے ہیں۔ بہر حال اللہ تعالی نے پھر ان کو حکم دے دیا: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ﴾ میرے مدنی! اپنی اُمت سے کہہ دو کہ اب ہم نے حلال کر دیا کہ رات کو کھائیں، پئیں، بیوی سے مل سکتے ہیں، لیکن صبح صادق ہو جائے تو رک جائیں۔

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ فرمایا: اگر تم میں کوئی شخص بیمار ہو گیا ہے۔ بیمار سے مراد وہ بیمار ہے جس کو روزہ رکھنے سے نقصان ہو یا روزہ رکھنے سے بیماری بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ اگر نزلہ زکام ہو جائے تو یہ بیماری نہیں ہے، تو جو بیمار ہو اس کو اسلام نے اجازت دی ہے کہ روزے چھوڑ دے اور جب اللہ تعالی صحت عطا فرمادے جتنے دن کے روزے رہ گئے تھے اتنے دن کی قضا کر لے۔

﴿أَوْ عَلَى سَفَرٍ﴾ قرآن نے مسافر نہیں فرمایا، بلکہ "عَلَى سَفَرٍ" فرمایا ہے یعنی جو سفر کے اوپر سوار ہو۔ لہٰذا اگر کوئی دو چار میل سفر میں چلا جائے تو یہ مسافر نہیں ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ کم از کم تین منزلوں کا سفر ہو یعنی اڑتالیس میل کا سفر ہو اور جہاں پندرہ دن اقامت کا ارادہ کرلیا وہاں مسافر نہیں رہتے۔

﴿عَلَى سَفَرٍ﴾ سے معلوم ہوا کہ اکثر سفر اڑتالیس میل سے بھی زیادہ ہوتے ہیں، لیکن اب گاڑیاں ائر کنڈیشنڈ ہیں، آدمی آرام سے اس کے اندر بیٹھتا ہے تو اب سفر میں مشقت کی وہ کیفیت نہیں جو پہلے زمانے کے اندر تھیں گو گنجائش تو ہے کہ یہ سفر ہے تو لفظ "عَلَى سَفَرٍ" کے تقاضوں کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔

﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ فرمایا ہے، "فَعَلَيْهِ الْقَضَاء" نہیں فرمایا۔ اس سے اشارہ ہو گیا کہ مریض و مسافر پر فوت شدہ روزوں کی قضاء صرف اس صورت میں واجب ہو گی، جبکہ مریض صحت کے بعد اور مسافر مقیم ہونے کے بعد اتنے دنوں کی مہلت پائے، جنہیں قضاء کر سکے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اتنے دن سے پہلے ہی مر گیا تو اس پر

روزوں کی قضاء یا ان کے فدیہ کی وصیت کرنا لازم نہیں ہوگا۔ ہاں اگر زندہ رہے تو ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ وہ دن گنے گا یعنی اتنے دن کے روزے رکھے گا۔ اور دوسرا اس سے معلوم ہوا کہ ترتیب ضروری نہیں ہے، مثلاً رمضان المبارک کے دس روزے رہ گئے، ہم تو دس روزے رکھتے ہیں یہ نہیں کہ مہینہ کے اول دس روزے چھوٹے تھے تو مہینے کے اول میں پورے کریں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ لگاتار پورے رکھیں بلکہ اس گنتی کو پورا کرنا ہے۔

رمضان المبارک میں عورت کے حیض کے دن ہیں وہ روزے نہیں رکھے گی۔ جب رمضان المبارک گزر جائے گا تو ان کی قضا کرے گی۔ اسی طرح اگر اللہ نے عورت کو اولاد دی اور نفاس کے دن رمضان میں آگئے اس میں بھی وہ روزے نہیں رکھے گی، جب وہ پاک ہو جائے گی تو اس کو روزے قضا کرنے ہوں گے۔ عورت کے حیض و نفاس کے اندر جو نمازیں قضا ہوتی ہیں ان کی قضا نہیں لیکن جو روزے چھوڑے ہوں گے ان کی قضا ہے۔

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ﴾ ترجمہ: ''جو طاقت رکھتے ہیں وہ ایک دن کا فدیہ دیں۔'' اس کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں جب روزے فرض ہوئے تھے لوگوں کو روزہ رکھنے کی عادت نہیں تھی اللہ نے رعایت دے دی کہ اگر کوئی بندہ روزہ نہیں رکھ سکتا لیکن اس کے پاس پیسے ہیں تو وہ ایک مسکین کو ہر روز کھانا کھلا دیا کرے روزہ نہ رکھے، یہ ابتداء اسلام میں حکم تھا، لیکن جب حکم آگیا: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ کہ روزے رکھنے ہیں تو فدیہ والا حکم ختم ہو گیا۔

دوسرا قول بعض علماء نے فرمایا یہ حکم ختم نہیں ہوا۔ اصل میں یہ حکم یوں ہے: ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ﴾ کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے مثلاً ایک آدمی بوڑھا ہے روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ اپنے روزے کے بدلہ میں ایک مسکین کو فدیہ دے۔ جو کہ احناف کے ہاں پونے دو سیر گندم ہوگی یا اس کی قیمت دے۔ اسی طرح ایک ایسا بیمار ہے اس کا مرض نہیں چھوٹتا مثلاً فالج کے اندر پڑا ہوا ہے یا کوئی ایسی بیماری ہے جس سے تندرست نہ ہوگا اس کی بجائے کہ میں اس حال میں پڑا رہوں گا تو اس کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ وہ فدیہ دے۔ اگر تم نے زیادہ روزوں کا فدیہ دینا ہے تو ایک مسکین کی بجائے دو کو یا چار کو یا دس کو تقسیم کر کے دو تو زیادہ مسکینوں کو پہنچے گا اور اگر شفاء سے مایوس مریض فوت نہ ہوا بلکہ صحت یاب ہو گیا تو روزوں کا وہ فدیہ دیا ہوا کام نہیں آئے گا ان دنوں کے روزے پر قضاء کرنا لازم ہوں گے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تم کو یہ رعایت تو دے دی ہے، لیکن یاد رکھو، ﴿وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ

كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۱۸۴﴾ اگر تم روزہ رکھا کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے کیونکہ اگر رمضان کا روزہ رہ جائے تو قضا کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے، وہ لوگ قضا کرتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم شوال، ذی قعدہ یا کسی دوسرے مہینے میں قضا کریں گے رمضان والی برکت نہیں ملے گی۔

اسلام نے یہ بھی اجازت دی ہے مثلاً آپ بھی روزے سے ہیں اور بیوی بھی روزے سے ہے لیکن میاں بیوی ایک بستر پر اکٹھے لیٹے ہوئے ہیں ایک دوسرے کے بدن سے بدن لگ رہا ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن جماع کرنا منع ہے۔ شریعت نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ اگر دونوں نوجوان ہیں تو ایک دوسرے کے قریب نہ آئیں، تاکہ خطا نہ ہو جائے اور اگر بوڑھے ہیں خوف نہیں ہے تو ان کے لیے اجازت ہے۔

روزہ ہمیں کیا درس دیتا ہے؟

یاد رکھیں! ہم سارا دن تو روزہ رکھ لیتے ہیں لیکن شام کو اتنا کھا لیتے ہیں کہ اتنا کوئی چار دن میں بھی نہ کھائے حالانکہ روزہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی کھانے پینے کو کم کرے اور عبادت کو بڑھائے لیکن ہمارے روزے بڑے مزے دار ہیں، صبح کی نماز پڑھ کر ہم سو جاتے ہیں اور دوپہر کو اُٹھتے ہیں آدھا دن سونے میں گزر گیا ظہر کی نماز پڑھ کر لیٹ گئے، عصر کو اُٹھے غسل کیا کپڑے پہن کر مسجد میں آ گیا اور روزہ ختم ہو گیا ہمارا روزہ تو سونے میں گزر جاتا ہے نہ تلاوت ہے، نہ عبادت ہے، نہ نماز ہے، نہ محنت و مشقت ہے اور نہ تکلیف ہے۔ آج دنیا میں ڈائٹنگ کا بڑا رواج ہے کہ اپنے آپ کو موٹا ہونے سے بچاؤ۔ کھانا بند، گھی بند، چربی بند، اچھی غذائیں بند یہ سب کچھ ڈاکٹر کے کہنے پر کرتے ہیں اور اللہ نے جو ہمارے لیے روزہ جیسی نعمت رکھی ہے، جو عبادت کی عبادت ہے اور صحت کی صحت ہے۔ روزے کے اندر افضل یہ ہے کہ آدمی کھجور پر افطار کرے اور کھجور اگر تازہ ملے تو وہ سب سے افضل ہے، اسی طرح سحری کھجور کے ساتھ کرنا افضل ہے۔

روزہ صرف کھانے پینے سے رکنے کا نام نہیں:

صحیح حدیث میں آتا ہے اگر کوئی آدمی روزہ رکھنے کے بعد جھوٹ بولتا ہے، گالیاں بکتا ہے، لوگوں سے لڑتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس کو کہہ دو مجھے تیرے بھوکے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جب تم نے اپنی زبان کو نہیں روکا جب تم نے اپنی آنکھوں کو، جب تم نے اپنی برائیوں کو نہیں روکا تو روزہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمارے

بعض لوگ تو روزہ لڑنے کے لیے رکھتے ہیں کہ جس دن روزہ ہو کبھی اس سے لڑ رہا ہے اور کبھی اس سے لڑ رہا ہے، یہ روزہ نہیں ہوتا بلکہ روزہ تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو بُری باتوں سے روکنا اور اچھی باتوں پر لگا دینا۔ جب اللہ تعالیٰ نے کھانا پینا روک دیا ہے تو گالی گلوچ کا کیا مطلب ہے؟

بعض لوگوں کا روزہ بڑا مزے دار ہوتا ہے، وہ روزہ رکھنے کے بعد فلم چلا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ تین گھنٹے اسی شغل میں گزر جائیں گے۔ یہ کتنی غلط بات ہے اور روزہ کا ثواب بھی کم ہوا۔ کیونکہ روزے کے ساتھ فلم دیکھنے سے فلم کا گناہ اور زیادہ بڑھ گیا، حالانکہ روزہ کا مقصد تھا تقویٰ کہ تم برائی سے رکو اور تم روزے کو برائی سے شروع کر رہے ہو۔

بعض لوگ تاش کھیلنا شروع کر دیتے ہیں کہ وقت گزر جائے گا اور بعض کیرم بورڈ کھیلنا شروع کر دیتے ہیں، یہ سب چیزیں اسلام میں حرام ہیں، ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے روزہ لہو ولعب کا نام نہیں ہے، روزہ کے اندر زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت کرو کیونکہ رمضان المبارک کے مہینے اور قرآن پاک میں ایک تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی صحیح معنی میں روزہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں اور اللہ پاک ہمیں اس کے برکات وثمرات سے نوازیں۔

اکابر کے روزوں کی مثال:

ہمارے شیخ تھے۔ ان کا روزہ یہ تھا کہ افطار کے وقت تین کھجور کے دانے ہوتے تھے اور ایک پانی کا گلاس ہوتا تھا اس کے بعد نہ روٹی ہے نہ چائے ہے، جب سحری کا وقت آیا تو اس وقت بھی تین دانے کھجور کے کھا لیے اور آدھا گلاس دودھ کا پی لیا اور پندرہ پارے روزانہ قرآن کی منزل پڑھتے بیس تراویح اور تہجد پڑھتے تھے اس کے بعد بھی جو وقت بچا ہے اس میں اللہ کا ذکر کرتے تھے، ایسے روزوں کے برکات وثمرات ہوتے ہیں، ہمارے روزے تو میلہ ہیں کہ کئی قسم کے سموسے بنواؤ، کباب بنواؤ، دہی بھلے، چٹنیاں، پکوڑے پتہ نہیں کیا کچھ ہوتا ہے نیک لوگ نہ کھانے کے لیے روزہ رکھتے ہیں اور ہم کھانے کے لیے روزہ رکھتے ہیں۔

اللہ پاک نے بیان فرمادیا کہ روزہ سارا سال نہیں رکھنا ہے، تاکہ تم مشقت سے ڈر نہ جاؤ بلکہ چند گنے چنے دن ہیں یعنی ایک مہینہ ہے خدا کی قدرت ہے جو آدمی دن گنے وہ جلدی گزر جاتے ہیں کیونکہ رمضان المبارک کا مہینہ ہر آدمی گنتا ہے کہ آج پہلا روزہ ہو گیا، آج دوسرا روزہ ہو گیا، اس طرح پورا مہینہ گزر جاتا ہے اور جس دور میں ہم بیٹھے ہیں یہ قیامت کی علامت ہے۔

وقت کا جلدی گزر جانا قیامت کی علامت ہے:

(حدیث) حضور ﷺ نے فرمایا: علاماتِ قیامت میں ایک علامت یہ بھی ہے کہ سال ایسے گزرے گا جیسے مہینہ گزرتا ہے اور مہینہ ایسے گزرے گا جیسے ہفتہ گزرتا ہے اور ہفتہ ایسے گزرے گا جیسے ایک دن گزرتا ہے اور ایک دن ایسے گزرے گا جیسے ایک گھڑی گزرتی ہے۔ آج وہی عالم ہے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی ابھی آگئے ہیں اور کل جانا شروع ہو جائیں گے اس طرح عمر گھٹ رہی ہے کہ آدمی کو پتہ ہی نہیں لگ رہا کہ وقت کہاں جا رہا ہے، آدمی خوش ہوتا ہے کہ میرا بیٹا بڑا ہو رہا ہے، حالانکہ اس کی عمر تو کم ہو رہی ہے، وہ تو چھوٹا ہوتا جا رہا ہے کیونکہ وقت گزر رہا ہے، لیکن ہم پھر بھی غافل ہیں نہ اللہ کی یاد ہے اور نہ اللہ کے دروازے پر آتا ہے۔

نماز میں تین تبدیلیاں ہوئیں:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز پر بھی تین حالات گزرے اور روزے پر بھی تین حالات گزرے یعنی تبدیلیاں آئیں۔ پہلے آپ ﷺ مکہ میں نماز بیت اللہ اور بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھتے تھے۔ حضور ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو آپ سترہ مہینہ تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے، پھر اللہ نے حکم دیا کہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔

پہلے یہ ہوتا تھا کہ نماز کے لئے ایک دوسرے کو اطلاع دی جاتی تھی کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا اور انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا، میرا خواب ایسا ہے کہ اگر میں کہوں کہ میں نیند میں نہیں بلکہ جاگ رہا تھا پھر بھی میں سچا ہوں، میں نے دیکھا کہ ایک آدمی ہے جس پر سبز رنگ کی دو چادریں ہیں، اس نے کعبہ کی طرف رخ کر لیا اور اس کے بعد اس نے کہا: "اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ..." (جیسے اذان دی جاتی ہے ویسے پوری اذان کہی۔) پھر کچھ دیر گزرنے کے بعد اس نے اقامت کہی، وہ بھی اذان کی طرح تھی، لیکن اس کے اندر یہ دو لفظ زیادہ تھے، "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ، قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ"، حضور ﷺ نے اس صحابی نے فرمایا:

"عَلِّمْهَا بِلَالًا فَلْيُؤَذِّنْ بِهَا." [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۲۲۱۲۴]

بلال کو سکھا دو، اس طرح نماز کے لئے بلایا کرے تو سب سے پہلے مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے

اذان شروع کی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے بھی (اسی طرح) ایک خواب دیکھا ہے کہ آدمی آیا اور اس نے اذادی لیکن مقدر کی بات ہے کہ صحابی مجھ سے پہلے پہنچ گئے، ورنہ خواب میں نے بھی دیکھا ہے، اسی طرح معاذ رضی اللہ عنہ نے بھی دیکھا اور ان کے خواب کی تصدیق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدیق فرمادی تو وہ سنت ہوگئی۔

تیسری حالت نماز کی یہ تھی کہ اگر امام نماز پڑھا رہا ہے اور ایک آدمی بعد میں آیا وہ آ کر پوچھتا تھا کہ کتنی نماز پڑھ لی ہے، وہ بتاتے کہ تین رکعت پڑھ لی ہیں یعنی نماز کے اندر بات کر سکتے تھے، بعد میں اللہ تعالیٰ نے نماز میں بولنا بالکل منع کر دیا۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نماز میں آیا اور چپ کر کے کھڑا ہو گیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ لی تو میں نے اپنی بقیہ نماز پوری کر لی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جیسے معاذ نے کیا ہے تم بھی اسی طرح کیا کرو۔

روزے میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں:

اسی طرح روزے پر بھی تین حالات گزرے ہیں۔ پہلے یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہینہ میں صرف تین روزے رکھتے تھے جسے ایام بیض کہتے ہیں پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو آپ نے عاشوراء کا روزہ بھی رکھا، نو اور دس محرم یا دس اور گیارہ محرم کو روزہ رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ آیت نازل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کر دیئے ہیں، لیکن ان روزوں کے اندر اللہ نے اجازت دے دی کہ اگر کوئی آدمی روزہ نہ رکھنا چاہے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے تو اس پر گناہ نہیں ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت نازل فرمائی: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ جس آدمی کو بھی رمضان کا چاند نظر آئے اس پر روزہ فرض ہے۔ اب روزہ کی بجائے مسکین کو کھانا کھلانے والا مسئلہ ختم ہو گیا۔

روزہ کی تیسری حالت یہ تھی کہ پہلے حکم یہ تھا کہ جب روزہ مغرب کو افطار کر لیا تو آپ کھائیں پئیں، بیوی سے ملیں لیکن شرط یہ ہے کہ جب تک تم سو نہ جاؤ اگر کوئی آدمی عشاء کی نماز پڑھ کر سو گیا تھکا ہوا تھا اس کو نیند آ گئی اب چاہے اس کی نیند آدھی رات کو بھی کھل جاتی اس کے لیے کھانا، پینا، بیوی سے ملنا بند ہو جاتا جب آنکھ کھلی اس وقت سے روزہ شروع ہو جاتا تھا یہ مسئلہ اس طرح چلتا رہا۔

حضرت صرمہ بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ بڑی محنت و مشقت کر کے آئے تو سو گئے اب نیند کے بعد کھانا نہیں کھا سکتے تھے اگلے دن دوپہر کو بے ہوش ہو گئے۔ اگلے دن بیوی سے کھانے کا پوچھا اس نے کہا گھر میں تو کچھ نہیں کہیں سے پوچھ آتی ہوں چونکہ وہ محنت مزدوری سے تھکے ہوئے تھے تو نیند آ گئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرمایا میں دیکھ رہا ہوں تم تو بڑی تکلیف میں ہو یا تم پر روزے کا اثر ہے انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں مزدور آدمی ہوں محنت کرنے والا آدمی ہوں، عشاء کے بعد جلدی سو گیا، میری ابھی پہلے دن کی مشقت بھی نہیں اُتری تھی، پھر میرا دوسرا روزہ شروع ہو گیا اس لیے مجھے زیادہ تکلیف ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے رعایت دی کہ سونے سے کچھ نہیں ہوتا ایک وقت مقرر ہے تم ساری رات کھا پی سکتے ہو، جب تک کہ صبح صادق نہ ہو۔

اسی طریقہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی واقعہ پیش آ گیا کہ وہ بھی عشاء کے بعد سو گئے آنکھ کھلی تو اپنی بیوی سے مل بیٹھے (اور ایک روایت میں ہے کہ وہ نہیں سوئے تھے بلکہ ان کی بیوی سو گئی تھیں جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خواہش ظاہر کی تو بیوی نے کہا کہ میں تو سو چکی ہوں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ یہ مجھے ٹالنا چاہتی ہے اور اس سے مل بیٹھے) حالانکہ نیند کے بعد ملنا منع تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا حضور! میں تو برباد ہو گیا، مجھ سے تو غلطی ہو گئی میں سو گیا تھا، لیکن جب آنکھ کھلی تو بیوی سے مل لیا، تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر رعایت فرما دی:

﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ [البقرۃ:۱۸۷]

روزے کی نیت کب سے کرنی ہے؟

رمضان المبارک کے قضا روزے کے لیے ضروری ہے رات سے ہی روزے کی نیت ہو، اگر نیت نہ کی تو روزہ ادا نہیں ہوگا، کیونکہ کوئی عمل بغیر نیت کے ادا نہیں ہوتا ہے۔ رمضان کے مہینے میں رات کے وقت نیت ضروری نہیں دوپہر سے پہلے تک نیت کر سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ.'' [صحیح بخاری، رقم:۱]۔

''تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔''

اصل نیت دل میں ہوتی ہے زبان سے نیت نہیں، زبان سے تو صرف آدمی کو خوابِ غفلت سے جگانے کی بات ہے۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۚ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۚ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۚ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾
[البقرۃ:۱۸۵]

''ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اُتارا گیا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور ہدایت حق و باطل میں فرق کرنے کی واضح ہدایات ہیں، پس تم میں سے جو بھی اس مہینہ کو پائے تو اس کے روزے رکھے، اور جو مریض ہو یا جو سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں قضا کرے، اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمہارے ساتھ دُشواری کا ارادہ نہیں رکھتا، تا کہ تم رمضان کے روزوں کی تعداد پوری کرو اور اس بات پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تا کہ تم احسان مانو۔''

(حدیث) رمضان المبارک کا مہینہ رحمتوں، برکتوں اور عظمتوں کا مہینہ ہے پہلے چند انعامات کا ذکر کیا تھا یہاں سے بھی انعامات کا ذکر ہو رہا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ رمضان کے مہینے کا پہلا عشرہ رحمت ہے دوسرا عشرہ مغفرت اور تیسرے عشرہ میں جہنم سے آزادی ملتی ہے، رمضان کا پورا مہینہ رحمت ہے، اس کے دن بھی رحمت ہیں اور راتیں بھی رحمت ہیں۔

روزہ دار کے لیے دو خوشیاں:

حضور ﷺ نے فرمایا: ہر روزہ رکھنے والے کو اللہ تعالیٰ دو خوشیاں نصیب فرماتے ہیں، ایک خوشی اس کو افطار کے وقت ہوتی ہے اور دوسری خوشی تب ہوگی جب اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو کہیں گے میرے بندوں کو کہہ دو اے ایمان والو! اب جنت کی نعمتیں کھاؤ پیو، اب نہ پابندیاں ہیں نہ تکلیف، جو پابندیاں تم نے گزار لی ہیں آج تمہیں ان کا بدلہ مل رہا ہے۔

رمضان اور آسمانی کتابوں کے نزول کا خصوصی تعلق:

رمضان کے مہینہ کو اللہ کی کتابوں سے خصوصی تعلق ہے اللہ نے جتنی کتابیں اُتاری ہیں وہ سب رمضان کے مہینے

میں اُتاری ہیں۔ بعض روایات میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ اللہ نے چوبیسویں کی رات کو قرآن اُتارا۔ اس لیے بعض علماء کرام کا یہ خیال ہے کہ چوبیسویں کی رات ہی دراصل لیلۃ القدر کی رات ہے، کیونکہ اسی رات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن اُتارا ہے۔ قرآن تیئیس سال کی مدت میں اُترا تو پھر رمضان کے مہینہ میں قرآن اُتارنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے لوحِ محفوظ سے قرآن کو آسمانِ دنیا پر ایک جگہ ہے جس کا نام بیت العزت ہے وہاں پورا قرآن اُتارا گیا پھر بیت العزت سے حضور ﷺ پر تیئیس سال کی مدت میں اُترا۔

رمضان کے مہینے کو قرآن سے خصوصی تعلق ہے اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ رمضان کے مہینہ میں افضل عبادت قرآن کا پڑھنا ہے جیسا کہ مکہ کے اندر نفلی عبادتوں میں افضل طواف ہے کیونکہ آپ کو باقی عبادات دنیا میں مل سکتی ہیں لیکن طواف نہیں مل سکتا۔ مدینہ منورہ کے اندر نفلی عبادتوں میں افضل کثرت سے درود شریف پڑھنا ہے کیونکہ آپ اس مقام پر، ان گلیوں اور اس شہر میں ہیں جو مقامِ ہجرت، مقامِ مسجد نبوی اور مقامِ محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مہینہ کو قرآن کی حفاظت کا ذریعہ بھی بنا دیا کہ جو حافظ سارا سال قرآن نہ پڑھے، رمضان شریف میں وہ بھی پڑھتا ہے، رمضان میں ہر مسجد اور ہر منبر و محراب میں اللہ کا قرآن پڑھا جاتا ہے۔ حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے۔

آسمانی کتابوں کا نزول رمضان میں ہوا:

اللہ تعالیٰ نے تمام آسمانی کتابیں رمضان کے مہینہ میں نازل فرمائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

"أُنْزِلَتْ صُحُفُ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي أَوَّلِ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ، وَ أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ لِسِتٍّ مَضَيْنَ مِنْ رَمَضَانَ، وَ الْإِنْجِيلُ لِثَلَاثَ عَشْرَةَ خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ، وَ أُنْزِلَ الْفُرْقَانُ لِأَرْبَعٍ وَ عِشْرِينَ خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ." [مسند احمد بن حنبل، رقم: ۱۶۹۸۴]

صحفِ ابراہیم رمضان کی پہلی رات میں اُتارے گئے اور تورات ۷ رمضان کو اُتاری گئی اور زبور ۹ رمضان میں اُتاری گئی اور انجیل ۱۳ رمضان کو اُتاری گئی اور قرآن مقدس رمضان المبارک کی پچیس کو اُتارا گیا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ زبور تیرہ رمضان کو، انجیل اُنیس رمضان المبارک کو اُتری۔

باقی حدیث اسی طرح ہے۔

پہلے جتنی کتابیں اُتاری گئیں وہ ایک دم اُتاری جاتی تھیں، قرآن پاک کی شان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تیس سال کی مدت میں اُتارا، جیسے کوئی واقعہ پیش آیا قرآن اُترتا گیا۔

قرآن پاک کو ایک بار میں نازل کیوں نہ کیا گیا؟

علماء نے لکھا ہے اس میں کئی حکمتیں تھیں اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ہم نے پہلی کتابوں کو قیامت تک باقی نہیں رکھنا لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ حضور ﷺ آخری نبی ہیں اور قرآن آخری کتاب ہے۔ آپ ﷺ کے بعد نبوت اور وحی کا دروازہ بند ہے لہٰذا اللہ نے تھوڑا تھوڑا قرآن اس لئے نازل فرمایا، تا کہ یاس ہوتا جائے اور سینوں میں محفوظ ہوتا جائے، کیونکہ قیامت تک اللہ تعالیٰ نے اس کو باقی رکھنا ہے۔

دوسرا اس کے اندر حضور ﷺ کی عظمت کی دلیل بھی تھی کہ ایک تو یہ ہے کہ آپ کے پاس کتاب موجود ہے اور آپ نے اس میں مسئلہ تلاش کرنا ہے اس کے اندر وقت تو لگے گا۔ اللہ نے حضور ﷺ کو اتنی بڑی شان دی کہ اگر کوئی مسئلہ پیش آئے تو میرے نبی نہ ڈھونڈتے رہیں، بلکہ ہم جبرائیل علیہ السلام کو بھیج کر اسی وقت بتلا دیں۔

اور یہ حکمت بھی تھی کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام آتے اور اللہ کے نبیوں کو ملتے تھے تو دو رسولوں کا لقاء ہوتا تھا، ایک اللہ کا نبی اور ایک حضرت جبرائیل علیہ السلام جو نوری مخلوقات میں سے ہیں اور نبی بشر تھے دونوں رسولوں کے لقاء سے اللہ تعالیٰ برکات وثمرات نصیب فرماتے ہیں، جس سے انبیاء کے مدارج میں ترقی ہوتی تھی۔ تو باقی انبیاء کے پاس جبرائیل علیہ السلام ایک دفعہ آئے اور کتاب دے دی، لیکن حضور ﷺ کے لیے حضرت جبرائیل علیہ السلام آسمانوں سے کئی مرتبہ اُترے اور جوں جوں قرآن اُترتا تھا تو ایمان والوں کا ایمان بڑھتا گیا اور کافر کفر میں بڑھتے گئے۔

حضرت عطیہ بن الاسود رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میرے دل میں ایک شک پیدا ہوا کہ قرآن پاک میں آیا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ ہم نے قرآن رمضان کے مہینہ میں اُتارا ہے اس طرح قرآن کہتا ہے کہ قرآن لیلۃ القدر میں اُتارا گیا مجھے شک پڑ گیا کہ یہ کیا بات ہے قرآن تو محرم، صفر، ربیع الاول بلکہ سال کے ہر ماہ میں اُترا ہے اور ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن صرف رمضان میں اُترا ہے، میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا، آپ نے فرمایا: تم نے سمجھا نہیں، پورا قرآن جب لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اُتارا گیا تو رمضان المبارک کا مہینہ تھا، اس کے بعد جیسے جیسے حالات پیش آتے گئے قرآن اُترتا گیا،

کبھی قرآن مکہ میں اُترا، کبھی مدینہ میں اُترا، کبھی تبوک میں اُترا۔ اس طرح مجھے بات سمجھ آگئی۔

﴿هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ اس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مدح بیان فرمائی کہ اللہ نے قرآن اُتارا ہے تاکہ بندوں کو ہدایت نصیب ہو لیکن ہدایت اس کو ملے گی جو قرآن پر ایمان لایا اور اس کی تصدیق کی۔

﴿بَيِّنٰتٍ﴾ سے مراد دلائل ہیں کہ قرآن میں اگر کوئی بات بیان ہوتی ہے تو اس کی دلیل دیتے ہیں اور ایسے روشن دلائل ہیں کہ اگر کوئی آدمی تھوڑا سا بھی تدبر کرے تو سمجھ آجائے کہ اللہ کے قرآن کا جو بھی حکم ہے وہ حق ہے، سراپا خیر و برکت ہے۔ ﴿اَلْفُرْقَانِ﴾ کا معنی ہے: فرق کرنے والا، حلال و حرام کو علیحدہ کرنے والا، حق و باطل کو علیحدہ کرنے والا۔

بعض علماء نے فرمایا: رمضان کے مہینہ کو صرف رمضان نہ کہا کرو کیونکہ اللہ نے بھی قرآن میں شہر رمضان فرمایا ہے، رمضان اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس لیے شہر رمضان کہا کرو۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صرف رمضان کہنا بھی جائز ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلا قول نجیح بن عبدالرحمٰن کا ہے جو سیر اور مغازی میں امام ہیں، لیکن حدیث کے معاملہ میں ضعیف ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں باقاعدہ باب باندھا ہے کہ "باب يقال رمضان" لہٰذا رمضان کہنا بھی جائز ہے۔ جن لوگوں نے منع کیا ہے ان کا استدلال قوی نہیں ہے، ان کی حدیث ضعیف ہے، حدیث میں آتا ہے:

"مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، إِيمَانًا وَّ احْتِسَابًا، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ." [صحیح بخاری، رقم: ۳۸]

جس شخص نے بھی رمضان المبارک کے روزے رکھے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی اُمید کرتے ہوئے اس کے پہلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

حالتِ سفر میں روزہ رکھے یا چھوڑ دے؟

بعض حضرات نے کہا ہے کہ ایک آدمی اپنے گھر میں تھا رمضان المبارک کا چاند نظر آ گیا اس کے بعد اس نے روزے شروع کر دیئے، پندرہ رمضان کو وہ سفر پر جائے تو اس کو روزہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ جو مقیم ہے اس نے چاند دیکھا اس پر لازم ہے کہ روزہ رکھے۔ یہ اجازت تو اس کے لئے ہے کہ وہ سفر پر تھا اور چاند سفر میں دیکھا تو اس کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ لیکن یہ قول بہت عجیب

وغریب ہے۔ اصل بات وہی ہے کہ اگر مقیم ہے تو روزے رکھے اور اگر مسافر ہے تو چاہے چاند سفر میں نظر آئے یا گھر میں نظر آئے، وہ حالت سفر میں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اجازت دی ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور اس کے بدلے میں قضا کرے۔

اللہ نے فرمایا: ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ تو بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر سفر پر ہے تو آدمی پر واجب ہے کہ وہ روزہ چھوڑ دے، کیونکہ اللہ نے فرمادیا ہے کہ بعد میں رکھے۔ لیکن جمہور کا قول یہ ہے کہ اس پر واجب نہیں ہے، بلکہ اس بندے کی اپنی مرضی ہے سفر میں اللہ تعالیٰ نے اس کو روزہ چھوڑنے کی اجازت دی ہے، چاہے تو وہ روزہ رکھ لے کیونکہ حدیث میں موجود ہے، صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رمضان میں حضور ﷺ کے ساتھ سفر کیا، بعض روزے والے ہوتے تھے اور بعض روزہ چھوڑنے والے ہوتے تھے، روزے والے بغیر روزہ والوں پر عیب نہیں لگاتے تھے اور وہ ان پر عیب نہیں لگاتے تھے۔

دوسری حدیث میں آتا ہے، حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں نکلے، رمضان المبارک کا مہینہ تھا، اتنی شدید گرمی تھی کہ ہم ہاتھوں کو سر پر رکھ لیتے تھے تاکہ گرمی سے اپنے سروں کو بچالیں۔ اس حالت میں تمام لوگوں نے روزہ چھوڑا ہوا تھا، لیکن حضور ﷺ روزے کے ساتھ تھے اور عبد اللہ بن رواحہ نے بھی روزہ رکھا ہوا تھا۔

مریض اور مسافر کے روزے کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے مریض اور مسافر کو اجازت دی ہے کہ اگر وہ رمضان میں روزہ نہ رکھ سکیں تو بعد میں قضا کرلیں۔
اگر آدمی سفر میں ہے تو امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے لیے روزہ رکھنا بہتر ہے ایک تو یہ ہے کہ ایسا سفر ہو کہ جس میں مشقت کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا تو سب کے نزدیک یہ ہے کہ روزہ نہ رکھے۔ اور ایک یہ ہے کہ اگر روزہ رکھ سکتا ہے تو روزہ رکھنا افضل ہے یا چھوڑنا افضل ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ روزہ رکھنا افضل ہے جیسا کہ حدیث میں آپ نے پڑھ لیا کہ حضور ﷺ سفر میں تھے اور روزے کی حالت میں تھے۔

علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ سفر میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے یعنی افطار کرنا افضل ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک رخصت دی ہے تو اس سے فائدہ اُٹھانا زیادہ بہتر ہے جیسا کہ ایک حدیث مبارک میں حضور ﷺ

سے پوچھا گیا کہ سفر میں روزہ رکھنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: سفر میں روزہ نہ رکھنا بہتر ہے اور اگر کسی نے سفر میں روزہ رکھا تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ پاک نے جو رخصت دی ہے اس سے فائدہ اُٹھاؤ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سفر میں نماز دو رکعت کر دی، اسی طرح روزہ نہ رکھنے کی اجازت بھی دی ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ دونوں برابر ہیں سفر میں روزہ رکھے تو مرضی ہے اور روزہ نہ رکھے تو مرضی ہے۔ ایک صحابی حضرت حمزہ بن عمرو الاسلمی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! میں ایسا آدمی ہوں جو کثرت سے نفلی روزے رکھتا ہوں، مجھے اجازت ہے کہ میں سفر میں روزہ رکھ لوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: چاہو تو رکھ لو، چاہو تو چھوڑ دو۔

رخصت پر عمل نہ کرنے کی وعید:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کوئی آدمی یہ عقیدہ رکھ لے کہ مجھ پر سفر میں روزہ رکھنا لازم ہے تو اس کو روزہ افطار کرنا لازم ہے کیونکہ یہ اللہ کی رخصت کا انکار کر رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو رخصتیں دی ہیں، ان کو جو قبول نہ کرے اس پر اتنا بڑا گناہ ہے جیسے عرفات کے بڑے بڑے پہاڑ ہیں۔

اس لیے یاد رکھیں! کسی امام یا کسی محدث کے قول کو اس وجہ سے رد نہ کر دو کہ میرے مسلک کے مطابق نہیں اس لیے غلط ہے، ایسا کرنا غلط ہے کیونکہ جتنے ائمہ کرام ہیں ان سب کا مأخذ اللہ کا قرآن اور حدیث رسول اللہ ﷺ ہے۔ علماء کا فیصلہ ہے کہ کسی امام کے بارے میں غلط قسم کا لفظ نہ کہیں اور کسی امام کا قول لینے والے کو برا نہ کہیں۔ سب کے بارے میں یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ سب پر رحمتیں نازل فرمائے۔

ائمہ کرام کا اختلاف کے باوجود باہمی ادب واحترام:

ائمہ کرام کا آپس میں اتنا ادب واحترام ہوتا تھا، اگرچہ مسئلہ میں اختلاف ہے کہ ان کی رائے ایک ہے اور ان کی رائے دوسری ہے، لیکن جب ان کے پاس دوسرے امام کی رائے پہنچتی تو کہتا اللہ میرے بھائی پر رحمت کرے، اس نے بات سمجھی نہیں، اصل بات یوں تھی۔ اور پہلے امام کو جب ان کا قول پہنچا تو کہا اللہ میرے بھائی پر رحمت کرے، اچھا ہوا کہ مجھ تک حق بات پہنچا دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اندر علم تھا اور ان کے اتباع رسول ﷺ تھی، ان

کے اندر کوئی ذاتی تفاخر اور تکبر نہیں تھا۔ آج جھگڑے اس لیے ہیں کہ ہر آدمی میں انا ہے، وہ بڑا بننا چاہتا ہے، وہ حق کا متلاشی نہیں ہے۔ اگر حق کا متلاشی ہو تو جھگڑا نہ ہو۔ آج ایک آدمی اگر غلط مسئلہ بتائے تو اسی پر اَڑ جاتا ہے کہ میں نے جو کہا بس وہ ٹھیک ہے۔ یہ سب سے بڑی غلطی ہے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے اور اللہ ہم سب کو احترام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ امام ابو یوسف ﷫، امام محمد ﷫، امام زفر ﷫ یہ تینوں امام ہیں، لیکن امام ابو حنیفہ ﷫ کے شاگرد ہیں اور کتنے مسئلے ہیں کہ انہوں نے اپنے استاد کے قول سے اختلاف کیا کیونکہ جب ان کی سمجھ میں ایک مسئلہ آ گیا تو انہوں نے اس کو لے لیا۔ وہ خود بھی مجتہد کے درجہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ علماء نے لکھا ہے کہ بعض صوفیاء کرام، اولیاء اللہ گزرے ہیں جن کی زندگی تصوف اسلامی میں گزری ہے، ان کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ ان بزرگوں کی باتوں پر کبھی بحث نہ کرو۔ ایک قول یاد رکھو کہ صوفیاء حضرات کے قول شریعت میں حجت نہیں ہوتے۔ شریعت میں قرآن وسنت کے مطابق جو فیصلے ہیں وہ حجت ہیں۔ باقی اگر بعض صوفیاء نے کوئی بات کی ہے جو سمجھ نہیں آ رہی تو سمجھنے کی کوشش کر کے اس کو ایسے محل پر لوٹائیں کہ اچھی بات بن جائے اور کوئی ایسی تاویل نہیں کر سکتے تو چپ کر جائیں، ان کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دیں۔ پتہ نہیں کہ جب انہوں نے یہ بات کہی تھی تو ان کا مقصد اور حالات کیا تھے؟

معرفتِ الٰہی کیسے حاصل ہوتی ہے؟

میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی ﷫ نے لکھا کہ اس آدمی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوتی جو اپنے آپ کو کافر سے بھی اچھا سمجھے۔ جب میں نے قول پڑھا تو مجھے سمجھ نہ آیا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ہم اپنے آپ کو کافر سے بھی اچھا نہ سمجھیں۔ والد صاحب زندہ تھے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ حضرت حاجی صاحب کو اپنا پیر ومرشد مانتے ہیں، یہ ان کی بات ہے، مجھے سمجھ نہیں آتی ہے۔ اس وقت والد صاحب کی نظر بہت زیادہ کمزور ہو گئی تھی، فرمایا: مجھے پڑھ کر سناؤ کہ کیا لکھا ہے؟ میں نے پڑھ کر سنایا تو کہا: شیخ نے تو ٹھیک لکھا ہے، اگر تم جاہل ہو تو ہم کیا کریں؟ میں نے کہا: کیسے ٹھیک لکھا ہے؟ فرمایا: بات کو سمجھو کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تم کو کافر کر کے مار دے۔ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ قادر ہیں۔ فرمایا: کیا اللہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ کافر کو مسلمان کر دے اور اس کو سعادت کے مرتبہ پر پہنچا کر اونچا کر دے۔ فرمایا: یہی سبق دے رہے ہیں کہ اپنے آپ کو حقیر

سمجھو، دوسرے کو گندا نہ سمجھو، کہیں اللہ تعالیٰ ناراض نہ ہو جائے۔

اس لیے علماء کرام نے فرمایا: بعض اوقات اولیاء کرام کی بات بڑی مشکل ہوتی ہے، بڑی پیچیدہ ہوتی ہے، ان کی بات کو سمجھ لیا تو اس کی تاویل کر دو اور اگر بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تو چپ کر جاؤ اور اپنی زبان سے کوئی اچھا لفظ نکالو۔

ایک گنہگار کا ایک بزرگ سے بیعت کا واقعہ:

میں نے پڑھا کہ ایک آدمی ایک بزرگ کی خدمت میں بیعت ہونے کے لیے آیا، وہ کوئی امیر زادہ تھا، بڑی مشکل سے اس کو کھینچ کر بزرگ کی خدمت میں لے آئے کہ یہ ہمارا بگڑا ہوا شہزادہ ہے، مہربانی کر کے اس کو بیعت کر لیں اور اس کا علاج بھی کریں۔ بزرگوں نے اس آدمی سے پوچھا: تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اس نے کہا: حضرت! میں بیعت ہونے کے لیے نہیں آیا، یہ تو مجھے پکڑ کے لے آئے ہیں۔ بزرگ نے فرمایا: اگر تم نہیں چاہتے تو کوئی زبردستی نہیں ہے۔ اس آدمی نے کہا: میں ایک شرط پر بیعت ہوں گا۔ پوچھا تو اس نے کہا: میں گانا نہیں چھوڑ سکتا، مجھے طوائفوں کا گانا سننے کی عادت ہے اور زنا، شراب بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں بڑے آدمی کا بیٹا ہوں، پوری زندگی ان گانوں میں گزری تو یہ میری زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے، میں طوائف کے گانے کے بغیر رات کو نہیں سو سکتا۔ اگر اس شرط پر بیعت کرنی ہے تو کر لیں۔ بزرگوں نے فرمایا: تمہاری شرط منظور ہے۔ اب اس بات کو اگر کوئی آدمی پڑھے تو وہ کہے گا: یہ اچھا پیر ہے جو کہہ رہا ہے کہ زنا کرتے رہو۔ بزرگوں نے فرمایا: ایک ہماری شرط ہے کہ نماز پڑھ لیا کرو، نماز جماعت کے ساتھ پڑھا کرو۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، اور بیعت ہو کر چلا گیا۔ اللہ والے کی نظر تو اپنی جگہ پر تھی کہ نماز صحیح معنی میں پڑھی جائے تو یہ بُرے کاموں سے اور منکر سے روکنے والی ہے۔ یہ نہیں کہ ان کو زنا کی اجازت دے دی۔ وہ لڑکا اپنے گھر میں واپس آیا۔ عصر کے بعد اس کی محفل کا وقت شروع ہو جاتا تھا اس نے غسل کیا اور تیار ہوا تو اس کے ساتھیوں نے کہا مجلس تیار ہے، اس نے کہا مجلس عشاء کے بعد بناؤ کیونکہ میں نے اپنے مرشد سے نماز پڑھنے کا وعدہ کیا ہے عصر کے بعد مغرب آ جائے گی اور اس کے بعد عشاء آ جائے گی اگر عصر کے بعد محفل شروع کر دی تو مغرب اور عشاء کی نماز چلی جائے گی اور میرا وعدہ پورا نہیں ہوگا۔ اس نے عصر، مغرب اور عشاء بھی پڑھ لی اور بجائے اپنے ڈیرے پر آنے کے گھر میں چلے گئے نوکروں نے کہا، مجلس لگی ہوئی ہے اس نے کہا آج میرا جی نہیں چاہتا، کل عشاء کے بعد محفل کریں گے دوسرے دن لوگ پھر آئے، اس نے کہا اب اللہ نے اپنے گھر بلا

لیا ہے شرم آتی ہے، ادھر میں قرآن پڑھوں اور پھر اس زبان سے گانے گاؤں اور اس سے شراب پیوں۔ بزرگوں کی بات کے انجام کو ہم دیکھتے اور سمجھتے نہیں پہلے اعتراض کر دیتے ہیں۔

(حدیث) حالانکہ یہ بات حدیث میں بھی موجود ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر کہا کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں لیکن مجھے زنا کی عادت ہے میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا، حضور ﷺ نے فرمایا: کلمہ تو پڑھو۔ اس نے کلمہ پڑھ لیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ کوئی تمہاری ماں سے زنا کرے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری بہن سے کوئی زنا کرے؟ اس نے کہا: میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری بیٹی سے کوئی زنا کرے، حضور ﷺ نے فرمایا: جس سے تم زنا کرتے ہو وہ بھی تو کسی ماں، بہن، بیٹی ہے۔ اس نے کہا: حضور! مجھے مسئلہ سمجھ آ گیا ہے، میری زنا سے توبہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جس نے کلمہ پڑھ لیا، اس کے پہلے سارے گناہ مٹ گئے۔ اس نے کہا: آئندہ بھی میرا وعدہ ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں ہوگی۔

قضاء روزوں کی ادائیگی کا طریقہ:

سفر یا بیماری کی وجہ سے پانچ چھ روزے چھوڑ دیئے تو ان کی قضا لگا تار کریں یا وقفہ چھوڑ کر کریں، مثلاً ایک روزہ رکھ لیا، دو دن چھوڑ کر پھر دو روزے رکھ لیے۔ اس بارے میں ائمہ کے دو قول ہیں۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ لگا تار قضا کرے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ لگا تار روزے رکھے تا کہ آرام بھی ملتا رہے روزے بھی قضا ہوتے رہیں۔ اصل اس کے اپنے بھی حالات پر محمول ہے اگر آدمی لگا تار روزے رکھ سکتا ہے تو لگا تار قضا کر لے، وگرنہ وقفہ وقفہ سے قضا کر لے۔

ایک دن روزہ، ایک دن افطار:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتے۔ حدیث پاک میں آیا ہے:

"إِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ." [صحیح بخاری، رقم:۳۹]

دین سب کا سب آسان ہے۔ اللہ پاک نے دین میں کوئی حکم ایسا جاری نہیں فرمایا جو اس کے بندوں کے لئے

نا قابلِ عمل ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہیں وہ اپنی مخلوق کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں کہ میرے بندے کس عمل کی طاقت رکھتے ہیں اور کس عمل کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس لیے فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرۃ:٢٨٦] حضور ﷺ نے ایک اعرابی کو فرمایا:

''إِنَّ خَيْرَ دِينِكُمْ أَيْسَرُهُ، إِنَّ خَيْرَ دِينِكُمْ أَيْسَرُهُ.'' [مسند احمد بن حنبل، رقم:١٥٩٣٦]

تمہارے دین کی سب سے بڑی بھلائی اس کا آسان ہونا ہے۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جو سب کے لئے قابلِ عمل ہے۔ بچے کے لیے، بوڑھے کے لئے، جوان کے لئے، عورت کے لئے سب کے لئے قابل عمل ہے اور ہر دور میں قابلِ عمل رہا ہے۔ اگر کوئی عمل نہ کرنا چاہے تو اس کے لیے بہانے بڑے ہیں۔

حضرت ابوعروہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کی انتظار میں بیٹھے تھے، حضور ﷺ تشریف لائے اور آپ کے سر کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ حضور ﷺ تازہ غسل فرما کر آرہے تھے یا حضور اکرم ﷺ نے مسح فرمایا تو بالوں پر پانی زیادہ لگایا، اس لئے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ حضور ﷺ نماز پڑھانے کے بعد بیٹھ گئے اور لوگوں نے سوالات کرنے شروع کئے کہ اگر ہم یہ کام کریں تو گناہ ہوگا اگر ہم یہ کام کریں تو ہم پر کیا حرج ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا دین آسان ہے، اللہ تعالیٰ کے دین کے اندر کوئی مشکلات نہیں ہیں، اللہ پاک نے اپنے بندوں کے لئے بڑی آسانیاں پیدا فرمادی ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''يَسِّرُوا وَ لَا تُعَسِّرُوا، وَ سَكِّنُوا وَ لَا تُنَفِّرُوا.'' [صحیح بخاری، رقم:٦١٢٥]

لوگوں کو آسانی والے احکام بتایا کرو، مشکلات میں نہ ڈالا کرو۔ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی باتیں سنایا کرو جن سے ان کو اطمینان حاصل ہو۔ ایسی باتیں نہ سنایا کرو کہ ان کو نفرت ہو جائے کہ اسلام پر چلنا بہت مشکل ہے۔

حضور ﷺ نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو یمن کے علاقے میں قاضی بنا کر بھیجا اس وقت حضور ﷺ نے فرمایا: لوگوں کو اسلام کے اندر جو خوشخبریاں ہیں وہ سنانا، ایسے نہ ہو کہ جہنم کی باتیں تو سناؤ، جنت کی خوشخبریاں اور رحمت کی باتیں نہ سناؤ، لوگوں کو مشکلات میں تو ڈالو اور آسانی پیدا نہ کرو بلکہ ان کے لیے آسانی پیدا کرنا مشکلات میں نہ ڈالنا اور ایک دوسرے سے اتفاق کرنا اختلاف نہ کرنا ایک دوسرے کی اطاعت

کرنا اور آپس میں جھگڑے نہ کرنا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا عدل چرواہے کی زبانی:

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تاریخ شاہد ہے کہ ایک دن چرواہا صبح کو اپنی بکریاں لے کر جنگل میں گیا تو دوسرے چرواہے سے کہنے لگا: معلوم ہوتا ہے کہ آج ہمارا بادشاہ کوئی اچھا آدمی آگیا ہے۔ اس نے کہا: میں نے بکریاں چرائی ہیں اور آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں، ہمارا بادشاہوں سے کیا تعلق ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ آج بھیڑیے آئے، بکریوں کے ریوڑ کے قریب پھرتے رہے، لیکن کسی بکری کو نہیں چھیڑا اور چپ کر کے چلے گئے۔ بھیڑیوں نے ظلم چھوڑ دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عدل والا بادشاہ آگیا ہے۔ کچھ دن گزرے تو ان کو پتہ چلا کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اس تاریخ کو تخت پر بیٹھے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو حکم دے دیتے ہیں کہ میرے بندوں کی غلامی کرو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک جنگل میں پڑاؤ ڈالنے کا واقعہ:

صحابہ کرام ایک جہاد کے لئے تشریف لے جا رہے تھے ایک جگہ بڑا جنگل تھا جب وہاں پہنچے تو قافلہ تھکا ہوا تھا متواتر سفر کر کے آ رہے تھے امیر نے حکم دیا کہ یہاں پڑاؤ کرو کل دوبارہ سفر شروع کیا جائے گا ابھی سامان اُتار رہے تھے کہ بستی کے کچھ لوگ ان کے پاس آئے اور پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟ صحابہ نے کہا ہم مسلمان ہیں انہوں نے پوچھا تمہارا بڑا کون ہے؟ مسلمانوں نے کہا وہاں خیمے میں ہیں بستی والے ان کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کا اور ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن آپ بھی انسان ہیں اور ہم بھی انسان ہیں۔ یہ جنگل اتنا خطرناک ہے کہ ہم رات کو اپنی بستی کی حفاظت کے لئے آگ جلاتے ہیں تاکہ جنگل کا کوئی درندہ ہم کو نقصان نہ پہنچائے اور آپ تو جنگل کے سرے پر اپنا پڑاؤ ڈال رہے ہیں، رات کو جنگلی جانور آپ کا نقصان کر دیں گے، امیر نے کہا آپ نے اطلاع دے دی ہے اللہ تمہیں اس کی اچھی جزا دے گا۔ ہم بڑے تھکے ہوئے ہیں سامان اُتر چکا ہے، خیمے لگ گئے ہیں، اب تو ہم یہیں رات گزاریں گے، جو ہمارے اللہ کو منظور ہے دیکھا جائے گا، بستی والے چلے گئے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہمارے امیر نے عصا پکڑا اور کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا کہ اے جنگل کے درندو خبردار! ہم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اللہ کے دین کے لیے نکلے ہیں خبردار! اگر تم نے ہماری کسی چیز کو چھیڑا۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم سن رہے ہیں کہ ہمارے

امیر صاحب کھڑے تقریر کر رہے ہیں یہ باتیں کہنے کی نہیں ہیں بلکہ جب یہ باتیں سامنے آتی ہیں تو حقیقت کھل جاتی ہے۔ کہتے ہیں جوں جوں اندھیرا ہوتا گیا ہم نے دیکھا کہ جنگل میں شیر، لومڑی، گیدڑ سارے جنگل چھوڑ کر جا رہے ہیں تا کہ رات کو ہمارے چلنے پھرنے سے حضور ﷺ کے صحابہ کی نیند میں خلل نہ آئے، جب تک صحابہ وہاں رہے وہ جنگل میں نہیں آئے۔ ان کو کس نے حکم دیا تھا اور کس نے انسانوں کی بولی سکھا دی تھی؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دریائے نیل کو خط لکھنے کا واقعہ:

کیا دنیا کا مؤرخ اس کا انکار کر سکتا ہے کہ سیدنا امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب نے دریا کو خط لکھا تھا؟ کیا تمہارے ملک میں دریا خط پڑھتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خط لکھا تھا کہ اے دریا! اگر چلنا ہے تو اللہ کے حکم سے چلو، اگر نہیں چلنا تو میرا اللہ دوسرے طریقہ سے بھی ہمیں رزق دینے پر قادر ہے ہمیں تیری کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میرا خط لے جاؤ اور دریائے نیل کو وسط میں رکھ دو۔ گورنر نے خط دیکھا اور کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے تو ٹھیک ہے جس کی رائے کے مطابق بعض دفعہ عرش سے قرآن اُتر پڑتا ہے تو دریا کی کیا طاقت ہے؟ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دریائے نیل کے وسط میں خط رکھا اور باہر نکل آئے تو اسی رات میں دریا اپنی پوری طغیانی سے چڑھ گیا اور آج تک اس سطح سے نیچے نہیں اُترا۔

یہ بات ہماری سمجھ میں اس وقت آئے گی جب اس دل میں اللہ پر ایمان، یقین کامل ہو جائے گا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ بموں کو، میزائلوں کو روک سکتا ہے اور بغیر سود کے روٹی دے سکتا ہے۔

عبادت بھی کرو، معاملات میں بھی حصہ لو:

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ آپ ﷺ اس کو کافی دیر تک دیکھتے رہے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: کیا اس آدمی کو دیکھا ہے کیا یہ سچے دل سے اتنی لمبی نمازیں پڑھ رہا ہے؟ صحابہ نے کہا: یہ مدینہ منورہ میں نماز کا بہت بڑا عاشق ہے لمبی لمبی نمازیں پڑھتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: زور سے باتیں نہ کرو، کہیں وہ تعریف سن کر خوش ہو جائے اور ریاء میں نہ مبتلا ہو جائے اور یہی بات اس کی ہلاکت کا باعث نہ بن جائے۔

اللہ تعالیٰ نے مشقت میں بھی نہیں ڈالا تھا کہ آدمی چوبیس گھنٹے اس کی عبادت میں رہے بلکہ دنیا کے بھی کام کرو اور

دین کے بھی کام کرو۔ اسلام کے اندر رہبانیت نہیں ہے بلکہ اسلام سبق دیتا ہے کہ نماز بھی پڑھو، تجارت بھی کرو، لیکن عبادت کو تجارت پر مقدم کرو۔ یہی وجہ ہے کہ جمعہ کی نماز اہم نماز ہے، اگر کسی کے تین جمعہ جان بوجھ کر چھوٹ جائیں تو اس پر مہر لگ جاتی ہے کہ یہ بندہ منافق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے بارے میں فرمایا کہ جب تمہیں نمازِ جمعہ کے لئے پکارا جائے تو فوراً چل پڑو، تجارت میں بیٹھے رہو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ عمل ہوتا تھا کہ اگر کسی چیز کا وزن کر رہے ہیں اذان آگئی تو معاملہ روک دیا کہ اب اللہ کے قرآن کے خلاف ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب نماز ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا رزق تلاش کرو۔ یہ نہیں کہ مسجد میں بیٹھے رہو اور رہبانیت اختیار کرلو۔ اس لیے صحابہ کرام کوئی رومال وغیرہ لے لیتے تھے جب جمعہ پڑھ لیتے اور باہر نکلتے تو اس رومال کو بیچنا شروع کر دیتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رزق حاصل کرو تو ضرور اس میں برکت ہوگی اس لیے کوئی تھوڑی چیز ہی بیچ لوں۔

اسلام کہتا ہے کہ تم حرام نہ کھاؤ، چوری، ڈاکہ نہ ڈالو۔ اسلام نے حلال رزق سے منع نہیں کیا۔ اندازہ کریں کہ کچھ صحابہ کرام اکٹھے ہوئے اور اُمّ المومنین کے پاس آکر سوال کرنے کے بعد کہنے لگے: ہم ساری زندگی روزہ رکھیں گے، رات کو جاگیں گے اور بعض نے کہا: ہم شادی نہیں کریں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آگیا اور فرمایا کہ کون ہے جو میرا مقابلہ کرے۔ میں رات کو جاگتا بھی ہوں سوتا بھی ہوں، میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، میں شادیاں بھی کرتا ہوں اور بیویوں کے حقوق بھی ادا کرتا ہوں۔ فرمایا: تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے، تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے، تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے، تیرے بیوی بچوں کا بھی تجھ پر حق ہے، تیری اولاد کا بھی تجھ پر حق ہے، جب تک ہر حق والے کو حق نہ دو، دین کا دعویٰ نہ کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے دنیا کی تمام چیزوں میں سب سے محبوب خوشبو، پاک بیوی پسند ہیں اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ کوئی بزرگی نہیں ہوتی کہ بیوی کئی سال بیٹھی رہے اور کہا جائے کہ حضرت تو اپنی بیوی کی طرف بھی نظر نہیں اُٹھاتے ہیں، حضرت اللہ سے مل گئے۔ کیا نبی سے بھی بڑھ گئے ہیں؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم تو ہر روز اپنی بیویوں کے گھر میں تشریف لے جاتے تھے، ان سے بات کرتے، حال پوچھتے، پھر جس بیوی کا نمبر ہوتا اس کے گھر میں رات گزارتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر کے لئے جاتے تو بیویوں کا بلا کر قرعہ اندازی کرتے، جس بیوی کا نام نکلتا، سفر میں انہیں اپنے ساتھ لے جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس بیماری میں جس میں آپ کی وفات ہوئی تھی، اس میں بھی آپ حکم دیتے کہ آج میری جس بیوی کی باری ہے مجھے اس کے گھر میں لے جاؤ، مگر آخر میں سب بیویوں

کے اتفاق اور رضا مندی سے آپ ﷺ نے بیماری کے ایام اپنی بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں گزارے۔

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾﴾ [البقرة:۱۸۶]

''اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو میں (ان کے) قریب ہوں، میں دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ پس چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں شاید کہ وہ نیک راہ پر آجائیں۔''

شانِ نزول:

بعض احادیث میں آتا ہے کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ ہمارا رب دور ہے یا ہمارا رب قریب ہے؟ اگر ہمارا رب دور ہو تو ہم اس کو زور سے پکاریں اور اگر ہمارا رب قریب ہے تو ہم آہستہ پکاریں اور دعا کریں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ان کو بتا دیں کہ میں تمہارے قریب ہوں، دور نہیں ہوں۔

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾﴾ [المومن:۶۰]

جب قرآن کی یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو صحابہ نے کہا کہ کس وقت مانگیں؟ کیا کوئی خاص گھڑی ہے جس میں ہم اللہ تعالیٰ سے مانگیں تو وہ سنے گا؟ اللہ نے فرمایا: جس وقت بھی مجھے کوئی پکارے، رات ہے، دن ہے، اندھیرا ہے، روشنی ہے، عرب ہے، عجم ہے، مکہ ہے، مدینہ ہے، جب دل سے پکارو گے تو میں فوراً جواب دوں گا۔

اللہ نے فرمایا: میرے بندے تو سو جاتے ہیں لیکن میں سونے سے پاک ہوں، میں تو غفلت سے پاک ہوں اور لوگوں کو دینے سے میرے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی، میں تو ایسا رب ہوں مجھ سے شیطان نے بھی مانگا تو میں نے اس کو بھی دیا، کیونکہ یہ اس کا بھی عقیدہ تھا کہ مجھے اللہ کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ اب جو لوگ خدا کو چھوڑ کر غیر خدا سے مانگیں، ان کے بارے میں خود سوچیں کہ وہ کتنے کم عقل ہیں۔

ربط آیات:

اس آیت سے پہلے اور بعد میں روزے کا حکم ہے، درمیان میں یہ آیت کیوں آئی ہے؟ علماء نے فرمایا اور بعض روایات میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس بات کو نقل کیا گیا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ نے اشارہ کیا کہ رمضان کا مہینہ اتنی برکتوں والا ہے کہ اس میں کئی خاص اوقات ہیں، جن میں بندے کی دعا قبول کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ دار کے لیے جب روزہ کو افطار کرنے کا وقت آتا ہے اس وقت اس کے لیے میں نے ایسی گھڑی رکھی ہے کہ جو دعا مانگتا ہے میں قبول کرتا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے کہ جب افطار کا وقت آتا اور آپ اپنے گھر میں موجود ہوتے تو سارے گھر والوں کو اکٹھا کر لیتے کہ دعا مانگو، اس گھڑی میں اللہ تعالیٰ دعا کو قبول فرماتے ہیں۔ اسی طرح لیلۃ القدر کی رات بھی ایسی رات ہے وہ بھی رمضان المبارک کے اندر ہے جس میں ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بڑھ کر ہے، اس کے اندر ایسی رحمت کی گھڑیاں ہیں کہ جو بھی مانگو وہ ملتا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو تو وہ دعا فوراً منظور ہو جاتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں اگر لیلۃ القدر کو پالوں تو مجھے بتائیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے کیا مانگوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دعا مانگنا:

''اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عُفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي.'' [جامع ترمذی، رقم: ۳۵۱۳]

اے اللہ! آپ بخشنے والے ہیں، بخشنے کو پسند کرتے ہیں، پس مجھے بھی بخش دیں۔

علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول مبارک سے یہی اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لیلۃ القدر کو اپنے بندوں پر کچھ واضح کر دیتے ہیں، ان کو کچھ اشارات مل جاتے ہیں کہ آج لیلۃ القدر ہے۔ بہر حال چونکہ رمضان المبارک کو دعاؤں کے قبول ہونے میں ایک خصوصی تعلق تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے روزوں کی آیات کے بیان کے درمیان میں یہ آیت بھی نازل فرمادی۔

دعا مانگنے کا صحیح طریقہ:

اس آیت مبارکہ اور دیگر آیات مبارکہ سے علماء کرام، فقہاء عظام نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ آدمی جب اللہ تعالیٰ

سے دعا مانگے تو آہستہ مانگے۔ چیخ چیخ کر دعا مانگنا اور شور کرنا یہ شریعت کے اندر منع ہے جیسا کہ حاجی حضرات جب طواف میں دعائیں مانگتے ہیں یا صفا و مروہ میں دوڑتے ہوئے دعائیں مانگتے ہیں تو چیخ چیخ کر دعائیں مانگتے ہیں، یہ منع ہے۔

اللہ بندے کے کتنا قریب ہے؟

دعا کا فلسفہ ہی یہ ہے کہ دعا آہستہ مانگی جائے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جہاں زور سے کہنے کا حکم ہے، جیسا کہ تلبیہ زور زور سے کہا جائے۔ دوسری آیت میں آیا ہے: ﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ [الاعراف: ۵۵] دعاؤں میں حد سے نکل جانے والوں کو اللہ تعالیٰ محبوب نہیں رکھتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی دعائیں بھی نقل فرمائی ہیں، ﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا﴾ [مریم: ۳] کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا، حالانکہ لفظ ﴿نِدَآءً﴾ ہے لیکن اس کے آگے لفظ ﴿خَفِيًّا﴾ لگا دیا کہ مجھے چیخ چیخ کر نہیں پکارا، بلکہ چپکے چپکے سے پکارا کہ تہجد کا وقت اور رات کا اندھیرا ہے، پیغمبر اکیلا ہے لیکن پھر بھی آہستہ آہستہ پکار رہے ہیں۔ جہر کا معنی آواز بلند کرنا کے ہیں مگر جو تم سن رہے ہو یہ بھی خفی ہے اور اگر تم اتنا آہستہ مانگ رہے ہو گویا وہ الفاظ تمہیں بھی سنائی نہیں دے رہے تو یہ بھی دعائے خفی ہے۔

اس لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فاتحہ کے بعد آمین آہستہ کہنے کے حق میں ہیں، کیونکہ آمین بھی دعا ہے کہ یا اللہ! امام صاحب نے جو دعا مانگی ہے، اس کو قبول فرمائیں۔

اور بعض ائمہ کرام جہر پر عمل فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

یہاں تو فرمایا: میں قریب ہوں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ [ق: ۱۶] ہم اپنے بندے کے بہت زیادہ قریب ہیں جو اس کی شہ رگ ہے اس سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ شہ رگ جس میں انسان کا سانس اور مدار زندگی ہے وہ ہر آدمی کے اندر ہے، باہر نکلی ہوئی نہیں ہے اس کے بغیر زندگی ممکن ہی نہیں ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ [الحدید: ۴] اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہیں، تم جدھر بھی ہو۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے بھائی کو لے کر فرعون کی طرف جاؤ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

عرض کیا: یا اللہ! ہمیں ڈر ہے وہ بڑا ظالم ہے اس کے پاس قوت اور طاقت ہے اور میرے پاس تو ماسوائے تیری ذات کے سہارے کے کچھ بھی نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تَخَافَآ إِنَّنِي مَعَكُمَآ أَسْمَعُ وَأَرَىٰ﴾ [طٰہٰ:۴۶] تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں فرعون کو جا کر دعوتِ توحید دو میں تمہارے ساتھ ہوں سننے والا ہوں اور دیکھنے والا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ایک اور مقام پر آیت آتی ہے کہ جب وہ بنی اسرائیل کے لشکر کو لے کر چل پڑے آگے دریا آ گیا اور پیچھے فرعون آ گیا تو قوم گھبرا کر کہنے لگی کہ ہم تو مارے گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿كَلَّا ۖ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ﴾ [الشعراء:۶۲]

میری قوم! مت ڈرو، میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ مجھے راستہ دکھلائے گا۔

قرآن مقدس میں ایک اور مقام پر بھی آیا ہے کہ حضور ﷺ ہجرت والی رات غارِ ثور میں تشریف لے گئے اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔ اب قریش مکہ آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس غار پر جا پہنچے جہاں آپ تشریف فرما تھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر ہمیں دشمنوں نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا اور آپ ﷺ نے وہ آیات پڑھیں: ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ [التوبۃ:۴۰] میرے مدنی! اپنے ساتھی سے کہہ دو کہ غم اور فکر نہ کرے، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا انکار کفر ہے:

اس لیے علماء نے یہاں ایک مسئلہ بھی لکھا ہے کہ "مَنْ أَنْكَرَ صُحْبَةَ أَبِي بَكْرٍ فَهُوَ كَافِرٌ" جو آدمی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صحابیٔ رسول ہونے کا انکار کرے تو وہ کافر ہے، کیونکہ ان کا صحابی ہونا قرآن کی آیت سے ثابت ہے۔ روافض بھی اس بات کا انکار نہیں کرتے اور انہوں نے یہ بات مان لی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے البتہ انہوں نے بغض باطن کی وجہ سے اس بات کو ایک اور رنگ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اس لیے اُتارا تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہاں (معاذ اللہ) شور مچانا شروع کر دیا تھا تاکہ مشرکین مکہ آواز سن لیں اور اللہ کے نبی کو پکڑ لیں۔

حالانکہ وہ یہ نہیں سوچتے کہ حضور پاک ﷺ مکہ سے مدینہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جا رہے ہیں جب یہ سفر حکم خداوندی ہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو ساتھ لے کر جا رہے ہیں وہ بھی اللہ کا حکم ہے تو کیا (نعوذ باللہ) اللہ کو بھی پتہ

نہیں چلا؟ نبی کے ساتھ دشمن لگا دیا؟ تم اور تمہارے وڈیروں کو جہاں خطرہ ہو تو وفادار ملازم ساتھ رکھتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے ایسا ساتھی چنا جو غارِ ثور میں شور کرنے لگ گیا؟

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکہ سے حضور ﷺ کے ساتھ گئے یا غار میں اکٹھے ہوئے؟ تو غار میں شور مچانے کی کیا ضرورت تھی؟ راستے میں شور کیوں نہیں کیا؟ تیسری بات کہ اس واقعہ کو چودہ سو سال گزر گئے بقول ان کے جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شور مچایا تو کیا چودہ سو سال گزرنے کے بعد انہوں نے یہ شور سن لیا؟ لیکن جو چودہ سو سال پہلے وہاں موجود تھے انہوں نے یہ شور نہیں سنا؟ کیونکہ اگر انہوں نے شور سنا ہوتا تو وہ کیا حضور ﷺ کو چھوڑ دیتے؟

قرآن میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جب تم تین شخص سرگوشی کر رہے ہو تو چوتھا میں ہوتا ہوں اور جب تم پانچ لوگ سرگوشی کرتے ہو تو چھٹا میں ہوتا ہوں۔

ان آیات کو دیکھ کر بعض لوگوں نے یہ عقیدہ بنا لیا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اللہ ہمارے قریب ہے انہوں نے کہا: بندہ عبادت کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اللہ اس کے اندر داخل ہو جاتا ہے یعنی حلول کر جاتا ہے اب وہ خود (معاذ اللہ) خدا بن جاتا ہے۔

حلولی فرقے:

یاد رکھیں! اس عقیدے کی بنیاد بھی یہود و نصاریٰ نے رکھی تھی، ان کے بعد یہ عقیدہ روافض میں آ گیا انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اندر حلول کر گئے۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ صرف علی نہیں، بلکہ مولا علی ہیں اور یہ بات ان کی کتابوں میں موجود ہے۔

حالانکہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے تیس چالیس آدمیوں کا وفد لایا گیا جو یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں (نعوذ باللہ) خدا حلول کر گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ تم میرے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: آپ خدا ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ ان کو جیل میں ڈال دو، بھوکے پیاسے پڑے رہیں، اگر یہ توبہ کریں تو ان کو چھوڑ دو اور اگر توبہ نہ کریں تو میرے سامنے پیش کر دو۔ تین دن کے بعد پھر ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: آپ خدا ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ ان کو قتل کر کے آگ میں جلا دو۔ جب

ان کو لے جانے لگے تو آپ نے سمجھا شاید یہ ڈر گئے۔ آپ نے پوچھا: اب تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ انہوں نے کہا: پہلے تو کچھ شک تھا، اب تو پکا یقین ہو گیا کہ آپ خدا ہیں، کیونکہ آگ کا عذاب خدا دیتا ہے، خدا کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو قتل کرنے اور جلانے کا حکم دیا۔

جب یہ عقیدہ ان لوگوں سے آگے پھیلا تو بعض لوگوں میں اس عقیدے نے جگہ بنائی کہ حضرت منصور حلاج کو جب سولی پر چڑھایا گیا اور وہ "أنا الحق" کہہ رہے تھے تو بعض لوگوں نے کہنا شروع کر دیا وہ ظاہر میں منصور تھا لیکن اندر سے خدا تھا۔

اس سے آگے بڑھ کر بعض جاہلوں نے کہہ دیا کہ ہمارا ایمان ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس بشر والا ہے، لیکن اندر سے وہ خود خدا ہیں۔

؎ خدا کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ میں نے لینا ہے لے لوں گا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے

اور اس طرح انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خدا بنا دیا اور اس سے آگے بڑھ کر کہہ دیا کہ میرا پیر و مرشد ذی تصرف ہے، سب دنیا کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ میاں چھٹی پر ہیں (نعوذ باللہ) اس طرح وہ آگے بڑھے اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے ان آیات کا سہارا لیا کہ خدا خود کہتا ہے میں قریب ہوں، میں شہ رگ سے بھی قریب ہوں، شہ رگ اندر ہے تو اس کا مطلب ہے خدا اندر ہے۔ ان وہابیوں کو تو قرآن سمجھ نہیں آتا تو یہاں سے حلول کے مسائل نکلے اور اس طرح انہوں نے لوگوں کو گمراہ کر دیا اور خود بھی گمراہ ہوئے۔

معیتِ خداوندی کا معنی:

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا کیا معنی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ و ہارون! میں تم دونوں کوئی خوف نہ کرو، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں اور آگے ساتھ ہونے کی وضاحت کر دی کہ میں سننے والا اور دیکھنے والا ہوں یعنی میرا علم اتنا وسیع اور اتنا محیط ہے کہ کوئی چیز میرے علم سے باہر نہیں ہے۔ ہر چیز میرے علم میں اور میرے سامنے ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اس سے اللہ کی معیت علمی مراد ہے کہ اللہ کا علم اتنا کامل ہے کہ کوئی چیز اس کے احاطۂ علم سے باہر نہیں ہے۔ اور آدمی جو چیز جانتا ہو وہ قریب ہوتی

ہے اور جس کا علم نہ ہو وہ دور ہوتی ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اس لیے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿٥﴾﴾ [آل عمران: ۵] اور فرمایا: ﴿اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۖ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿٢٥٥﴾﴾ [البقرة: ۲۵۵] تو یہ معیت علمی ہے لہٰذا اگر عقیدہ رکھا جائے خدا نبی میں ہے تو کیا ایک نبی میں ہے یا ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں ہے؟ اگر ایک میں ہے تو باقیوں نے کیا گناہ کیا ہے؟ اور اگر سب میں ہے تو ﴿وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٣﴾﴾ [البقرة: ۱۶۳] اور ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ﴿١﴾﴾ [الاخلاص: ۱] کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ﴿أَحَدٌ﴾ ہے، ﴿الصَّمَدُ﴾ ہے، ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ﴾ ہے اور اگر (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ ہر بندے میں حلول کرتے ہیں تو کیا اس کے پیدا ہونے کے بعد حلول کرتے ہیں یا اس سے پہلے حلول کرتے ہیں؟ اس لیے کوئی عقل کی بات کرو اللہ تعالیٰ نے ہمیں سمجھنے کے لیے عقل دی ہے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حق اور باطل کے سمجھنے کے لیے سیدھے راستے دیئے ہیں۔ جب خدا خود اندر ہو تو کیا بھوک لگ سکتی ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو کھانے پینے سے پاک ہے اور پیر صاحب تو کھاتے بھی ہیں اور پیتے بھی ہیں۔ جب حضرت کا کوئی بچہ قرار پکڑے گا تو اس کے اندر کیا ہوگا؟

﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾﴾ [البقرة: ۱۸۶] دوسرا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب بادشاہ کے پاس جانا ہو تو آدمی پہلے سیکرٹری کو، وزیر کو ملتا ہے یا کسی افسر کو ملنا ہو تو پہلے چپڑاسی کو ملتا ہے پھر اجازت ملتی ہے اور بندہ پہنچتا ہے۔ جب بندے تک پہنچنے کے لیے سیڑھیوں کی ضرورت ہے تو ہم خدا تک بلا واسطہ کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ ہم بھی ان کے پیاروں کے پاس جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہیں سیڑھیوں کی ضرورت تو اس وقت ہو کہ جب میں دور ہوں جبکہ میں تمہارے قریب ہوں۔ اگر کوئی کہے اللہ میاں! آپ تو اپنے پیاروں کی سنتے ہیں، گناہ گاروں کی کہاں سنتے ہیں؟ اللہ نے فرمایا: میں تو ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب بھی مجھے پکارے، پکارنے والا گناہ گار ہو تب بھی میں سنتا ہوں، پکارنے والا نیکو کار ہو تب بھی میں سنتا ہوں۔ شیطان نے کہا: اللہ میاں! مہلت دے دو، اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دے دی۔ اللہ شیطان کی سن لیتا ہے تو کیا ہماری نہیں سنتا؟ ﴿فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾﴾ جب قریب میں ہوں اور تیری پکار کو

سننے والا بھی میں ہوں تو اب تجھ پر لازم ہے کہ تُو میری اطاعت کر، میری فرمانبرداری کر۔ تُو ان کے حکم پر کیوں چلتا ہے جو تیری سنتے بھی نہیں ہیں، تیری مدد بھی نہیں کرتے اور جو ذرّے کے برابر بھی کسی چیز کے مالک نہیں ہیں؟

دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

اگر دعا شریعت کے مطابق ہو اور انتہائی تضرع وزاری اور یقین کے ساتھ ہو کہ میں جو اللہ سے مانگ رہا ہوں مجھے ضرور ملے گا۔ جب ہم مانگتے ہیں تو اللہ وہ دے دیتے ہیں یا کبھی ہم جو دعا مانگتے ہیں وہ چیز تو نہیں ملتی لیکن ایک بہت بڑی مصیبت آرہی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس دعا کے بدلے اس کو ٹال دیتے ہیں اور ہمیں پتہ بھی نہیں ہوتا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے کی دعا روک دو، تاکہ اس کا بدلہ قیامت کے دن دوں۔

حدیث مبارک میں ہے کہ جب قیامت کا دن آئے گا اور آدمی کو دعاؤں کا بدلہ ملے گا تو وہ بندہ خوش ہو کر کہے گا: اے اللہ تعالیٰ! اگر مجھے پتہ ہوتا تو میں وہاں یہی دعا کرتا کہ اللہ تعالیٰ مجھے دنیا میں کچھ نہ دو اور سب ادھر ہی دے دو۔

دعا کے لئے ضروری ہے کہ غافل دل سے نہ ہو کہ خود کو بھی پتہ نہ ہو کہ میں کیا مانگ رہا ہوں۔ جب بھی دعا مانگو تو دل، ذہن، فکر سب اس کی طرف متوجہ ہوں تاکہ بندے کو معلوم ہو کہ میں اپنے اللہ پاک سے کیا مانگ رہا ہوں۔

دعا مانگنے میں یہ نہ کہو کہ بڑی مدت ہوگئی ہماری دعا منظور نہیں ہوئی، پتہ نہیں کیا بات ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تم مایوس ہونا شروع نہ ہو جاؤ، کیونکہ مایوس ہونا کافروں کی عادت ہے، اللہ کے مومن بندے کبھی نا اُمید نہیں ہوتے۔

باقی یہ بات کہ ہماری دعا جلدی منظور نہیں ہوتی، یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے، بعض انبیاء کرام ستر سال دعائیں مانگتے رہے تب جا کر ان کی دعا منظور ہوئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق میں سفید پڑ گئیں لیکن کافی عرصہ کے بعد جا کر دعا منظور ہوئی۔ اس لیے یہ کہنا کہ میں نے دعا مانگی تھی اور منظور نہیں ہوئی، یہ باتیں بندوں کو زیب نہیں دیتیں۔

آخری بات حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جب بندے کا کھانا حرام سے ہو، کپڑے حرام سے ہوں، پینا حرام سے ہو، اس کے بدن میں جو گوشت پروان چڑھ رہا ہے وہ بھی حرام سے ہو تو پھر دعائیں منظور نہیں ہوں گی۔ بڑا چیخو گے کہ یارب یارب! لیکن کہاں سے تمہاری دعائیں سنی جائیں گی؟

چاروں ائمہ کرام سے پوچھ لیں کہ ہمارے ہاں جو رواج ہے کہ باغ بیچتے ہیں ابھی بور لگتا ہے اور باغ بک

جاتے ہیں اور بعض باغ پانچ پانچ سال پیشگی بکے ہوئے ہیں حالانکہ یہ شریعت میں حرام ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کوئی پھل اس وقت تک نہیں بیچا جا سکتا جب تک کہ وہ تیار نہ ہو جائے اس وقت تک بیچنا حرام ہے۔ اب اس باغ کا پھل جس کو پیشگی لے لیا تھا جہاں بھی بکے گا تم لاکھ خریدو گے وہ حلال نہیں ہے، اس کا مطلب ہوا کہ اگر خنزیر کا گوشت یہودی بیچے تو حرام ہے اور اگر مسلمان بیچے تو کیا حلال ہو جائے گا؟ حالانکہ حرام تو حرام رہے گا چاہے کتنے ہاتھ بدل جائیں۔ تو اب آپ کیسے تقویٰ اختیار کریں گے؟

پہلے زمانہ میں تو یہ عالم تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک آدمی نے کہا کہ میری بکری چوری ہوگئی۔ امام صاحب نے اپنے نوکروں سے کہا کہ خبردار! باہر سے کوئی بکری کا گوشت نہ خریدے۔ ہو سکتا ہے وہ چوری والی بکری بکنے کے لئے آ جائے اور ہم کھالیں۔

ایک کافر کی پکار پر اللہ کی طرف سے جواب:

روایات اسرائیلیہ میں ایک واقعہ ہے کہ ایک کافر اپنے بت کا وظیفہ پڑھ رہا تھا، زبان سے غلطی سے "یا صنم" کی جگہ "یا صمد" نکل گیا تو اللہ نے فوراً فرمایا: مانگو بندے! کیا مانگتے ہو؟ ملائکہ نے عرض کیا: اے اللہ! یہ بدبخت کافر ہے، اس نے آپ کو تو نہیں پکارا۔ اللہ نے فرمایا: میں جانتا ہوں، میرے آگے کچھ نہیں چھپا ہوا۔ یہ جھوٹے کو پکارے، جواب نہ ملے اور سچے کو پکارے، جواب نہ ملے تو جھوٹے اور سچے میں کیا فرق رہ جائے گا؟

ایک کلمہ جو جنت کے خزانوں میں سے ایک ہے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں شریک تھے۔ ہم جب کسی اونچائی پر چڑھتے یا کسی وادی میں اُترتے تو ہم زور زور سے اللہ اکبر اللہ اکبر کے نعرے لگاتے، ہم یہی کرتے جا رہے تھے حضور ﷺ ہمارے قریب آئے اور فرمایا:

"أَيُّهَا النَّاسُ! ارْبَعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ فَإِنَّكُمْ لَا تَدْعُونَ أَصَمَّ وَ لَا غَائِبًا، إِنَّمَا تَدْعُونَ سَمِيعًا بَصِيرًا، إِنَّ الَّذِي تَدْعُونَ أَقْرَبُ إِلَى أَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهِ، يَا عَبْدَاللهِ بْنَ قَيْسٍ! أَلَا أُعَلِّمُكَ عَلَى كَلِمَةٍ هِيَ مِنْ كُنُوزِ الْجَنَّةِ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ." [السنن الکبریٰ للنسائی، رقم: ۷۶۸۰]

اے لوگو! اپنی جانوں پر رحم کرو، اپنی جانوں پر نرمی کرو، تم ایسی ذات کو نہیں پکار رہے ہو جو بہری ہو یا نہ دیکھنے

والی ہو، تم تو اس ذات کو پکار رہے ہو جو سننے والا بھی ہے اور دیکھنے والا بھی ہے، آہستہ آہستہ کہو، زور سے نہ کہو۔ تم جس اونٹنی پر سوار ہو اللہ پاک تو اس سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے تو زور لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور آپ ﷺ نے فرمایا: اے عبداللہ بن قیس! کیا میں آپ کو جنت کے خزانوں میں سے ایسا کلمہ نہ بتاؤں جو جنت کا خزانہ ہے؟ صحابی نے عرض کیا: جی ہاں یارسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: ''لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ'' یہ جنت کے خزانوں میں سے ہے۔

دعا کی قبولیت کا ایک راز:

ایک حدیث مبارک میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''إِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ: أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي وَ أَنَا مَعَهُ إِذَا دَعَانِي.'' [صحیح مسلم، رقم:۲۶۷۵]

اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوں جب وہ مجھے پکارے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔

معنی یہ ہے کہ جیسے بندہ اپنے اللہ کے ساتھ یقین رکھتا ہے اور اپنا رجحان رکھتا ہے اللہ پاک بھی اسی طرح اس کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں کیونکہ اللہ غنی ہیں اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے تو جب اللہ تبارک وتعالیٰ سے آپ کو رجاء کامل اور اُمید کامل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے؟

دوسرا فرمایا کہ ''أَنَا مَعَهُ'' میں اس کے ساتھ ہوں یعنی معیت علیہ یعنی جب بھی وہ مجھے یاد کرے جب بھی مجھے پکارے میں اپنے بندے کی پکار کو سنتا ہوں۔ فرق صرف یہی ہوتا ہے کہ پکارنے والے نے کتنے اخلاص سے پکارا ہے اور پکارنے والے نے کتنے صحیح طریقے سے پکارا ہے۔ اب دیکھیں ہم اس کے کتنے فرمانبردار ہیں کیا ہم واقعی اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں؟ اگر ہیں تو ٹھیک ہے وہ ہماری ہر بات کو سنیں گے اور ہماری ہر بات کو قبول بھی فرمائیں گے اور اگر ہم سر سے لے کر پاؤں تک اللہ پاک کے احکام کے نافرمان ہیں تو پھر تو اس کا کرم ہے کہ کبھی سن لی اور کبھی نہ سنی، کبھی دے دیا اور کبھی نہ دیا، ورنہ ہمارا حق تو کسی طرح بھی نہیں بنتا۔

پس آپ ایک اصولی بات کو یاد رکھیں کہ اگر آپ اپنے نافرمان بیٹے کو نہیں دیتے تو وہاں تو مسئلہ ہی بندے کا ہے کہ تم اس کے بندے اور اس کی مخلوق ہو اور وہ خالق ہے، تم اس کے مملوک، اس کے غلام ہو اور وہ تمہارا مالک ہے۔ مالک اور غلام کا تو معاملہ ہی علیحدہ ہوا کرتا ہے تو اگر بیٹا بھی نافرمان ہے، بیوی بھی نافرمان ہے، شاگرد بھی نافرمان

ہے اور وہ آپ سے ایک ریال بھی مانگے تو آپ کو گولی لگتی ہے کہ کیا کرتے ہو کیوں مانگتے ہو بیس باتیں آپ اسے سنا دیتے ہو اور کبھی کبھی دے بھی دیتے ہو تو جب ہم اپنے اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ ہاتھ جو ہم نے اُٹھائے ہیں تو کیا یہ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں لگے رہتے ہیں؟ کیا یہ گناہ میں تو نہیں لگتے ؟ کیا ہمارا چہرہ ہماری صورت ہماری شکل اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہے؟ کیا ہمارا کھانا پینا، ہمارا لباس، ہمارا اُٹھنا بیٹھنا، ہماری زندگی اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا تو کیا ہم اتنی عبادت کرتے ہیں؟ جس سے ہمارا اللہ راضی ہو جائے، ہم کم از کم فرائض ادا کرتے ہیں؟ تو جب ہمارا سر سے پاؤں تک معاملہ نافرمانی کا ہو اور مطالبہ یہ ہو کہ جب ہم مانگیں ہمیں مل جائے تو پھر خود سوچیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو کیا مانگ رہے ہو۔ اس کے مقابلے میں آپ دیکھ لیں کہ جتنے انبیاء وصالحین اور اولیاء اللہ گزرے ہیں انہوں نے مانگا تو اللہ تعالیٰ نے دے دیا۔ اگر کبھی انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں میں دیر لگی ہے تو اس میں بھی حکمتیں تھیں کہ کبھی جلال کا بھی اظہار ہوتا ہے کبھی اس کی عظمت، حکمت اور ہیبت کا اظہار ہوتا ہے کہ میں کوئی محتاج تو نہیں ہوں کہ جو بھی وہ مانگیں ہر شکل میں مجھے دینا پڑے میری مرضی ان کی دعا اس وقت قبول کروں یا دیر سے قبول کروں یا اس کو آخرت کے لیے ذخیرہ رکھ دوں۔ آدمی جب اللہ تعالیٰ سے مانگے تو مانگنے والا بھی تو سوچے کہ کیا میرا معاملہ اپنے رب کے ساتھ صاف ہے؟

دنیا میں آپ اپنے معاملات کو دیکھ لیں کہ مثلاً کوئی آدمی آپ کو ملازم رکھتا ہے اور مثلاً ۲۰۰۰ ریال دیتا ہے آپ پورا مہینہ غائب رہیں اور مہینہ گزرنے کے بعد یکم تاریخ آجائے تو آپ پورے مہینے کی تنخواہ لینے آجائیں دفتر والے پوچھیں کہ کیا بات ہے جی؟ آپ کہیں کہ جناب تنخواہ چاہیے وہ کہے گا کہ بڑے بدبخت آدمی ہو پورا مہینہ تو دفتر میں آئے نہیں کوئی کام بھی نہیں اور تنخواہ لینے بھی آگئے ہو؟ تو جب تم اللہ کے حضور ہاتھ اُٹھاؤ تو ذرا سوچ لیا کرو کہ آج میں نے کتنے جھوٹ بولے ہیں جس زبان سے میں کلمہ پڑھتا ہوں اس زبان سے کتنی گالیاں دی ہیں کتنے لوگوں کا میں نے گلہ شکوہ کیا ہے، کتنی غیبت کی ہے، کتنے لوگوں کو میں نے برا کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو مجھے آنکھیں دی ہیں ان سے میں نے کتنی مرتبہ قرآن دیکھا ہے یا لوگوں کی بیٹیوں کو دیکھتا رہا ہوں اللہ تعالیٰ نے جو پاؤں چلنے کے لئے دیئے ہیں ان سے چل کر میں مسجد کی طرف گیا تھا یا گناہوں کی طرف گیا تھا۔ اس لیے مانگتے ہوئے آدمی ذرا اپنے اوپر تجزیہ کر لے، غور وفکر کر لے جب تجزیہ کر لیتا ہے تو پھر اعتراف ذنب کی شکل آتی ہے کہ میں گناہگار ہوں اور

جب اعتراف آتا ہے تو وہ رحیم وکریم ہے معاف بھی کر دیتا ہے اس لئے فرمایا کہ مجھے جب پکارو تو میں ساتھ ہوں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے آقا سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، فرماتے ہیں:

"قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: أَنَا مَعَ عَبْدِي حَيْثُمَا ذَكَرَنِي وَ تَحَرَّكَتْ بِي شَفَتَاهُ."

[صحیح بخاری، بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى: "لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ"]

میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ اپنے ہونٹ ہلاتا ہے مجھ سے مانگتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوں میں اس کی ہر ضرورت کو پورا کرنے والا ہوں اس کی ہر بات کو سننے والا ہوں۔ اس لیے خدا فرماتے ہیں: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۵۲] میرے بندو! تم مجھے یاد کرو، تاکہ میں تمہیں یاد کروں۔

ایک اور حدیث مبارک میں آتا ہے کہ میرے بندو! جب تم مجھے علیحدہ یاد کرتے ہو تو میں بھی تمہیں علیحدگی میں یاد کرتا ہوں اور جب تم مجھے کسی جماعت میں یاد کرتے ہو تو میں تم سے بہتر جماعت ملائکہ کی جماعت میں تمہیں یاد کرتا ہوں اور اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَاشْكُرُوْا لِيْ﴾ میرا شکر کرو، ﴿وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾ [البقرۃ: ۱۵۲] اور میری نعمتوں کا کفر نہ کرو۔

شکر اور کفر کی تفسیر:

شکر کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرو، اللہ تعالیٰ نے جتنے تمہیں اعضاء دیے ہیں اللہ کے کام میں لگاؤ، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ان کو بچاؤ۔ یہ معنی ہوتا ہے شکر کا۔

شکر کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ زبان سے کہتا رہے اللہ میاں! تیرا شکر ہے ویسے میں نماز تو نہیں پڑھتا، لیکن تیرا بڑا شکر ہے اور روزہ بھی کبھی کبھی میں رکھتا ہوں، سال میں ایک آدھ روزہ رکھ لیتا ہوں لیکن تیرا بڑا شکر ہے تیرا لاکھ شکر ہے۔ سارا دن میں سود کھاتا ہوں، حرام کھاتا ہوں لیکن تیرا لاکھ شکر ہے کہ تُو نے بہت کچھ ہمیں دیا ہے، بڑا رشوت کا دور دورہ ہے، ٹھیک ٹھاک پیسے بچ رہے ہیں تیرا شکر ہے۔ یہ شکر نہیں، کفر ہے۔

شکر کا معنی یہ ہے: ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ [الدھر: ۳] اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے شکر گزار بندے وہ ہیں جو

مجھ پر ایمان لے آتے ہیں اور جو ایمان نہیں لاتا وہ شکر گزار بھی نہیں ہوتا اور شکر یہ ہے کہ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ جو چیزیں میں نے تمہیں دی ہیں وہ میری فرمانبرداری میں خرچ کرو جو میں نے تمہیں عقل دی، تمہیں دماغ دیا، تمہیں قلم دیا، تمہیں زبان دی، تمہیں پاؤں چلنے کے لیے دیئے ان سب کو میری فرمانبرداری میں لگادو یہ ہے شکر۔ اب اس کے بعد زبان سے بھی کہو:

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ.''

ورنہ صرف زبان سے شکر کرے اور دل سے کفر کرے، زبان سے شکر کرے اور اعضاء سے کفر کرے تو یہ شکر نہیں ہوتا، بلکہ ناشکری ہوتی ہے اور استہزاء ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہوتا ہے۔ جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ رشوت کے پیسے لے کر بڑی بڑی کوٹھیاں بنا دیتے ہیں، سود کے پیسے لے کر بڑی بڑی کوٹھیاں بنا لیتے ہیں، سمگلنگ اور منشیات کے پیسوں سے بڑی بڑی کوٹھیاں بنا کر اس کے اوپر لکھتے ہیں: ''هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ'' کہ میں نے جو یہ حرام کمایا ہے کیا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے؟

یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہے کہ ایک تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرو اور دوسرا کہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جی، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ مجھ کو ایسی کرسی پر بٹھایا ہے کہ پیسے ملتے ہیں۔ تجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں ہے تم جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہو حالانکہ یہ نہیں سمجھتے کہ اصل فضل اس پر ہے جو حرام سے بچا ہوا ہے، اصل فضل یہ ہے کہ اس کے پاس ایک وقت کا کھانا ہے اور دوسرے وقت کا کھانا نہیں ہے، لیکن کبھی پیٹ میں حرام کا لقمہ نہیں جانے دیا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام سے بچایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو گناہوں سے اور اپنی نافرمانی سے بچایا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

اُصولی بات یہ ہے کہ اگر آپ کا کوئی بہت ہی پیارا دوست ہو تو کیا آپ یہ گوارا کریں گے کہ اس کو کسی گندے کام میں لگا دیں؟ دیکھیں کہ آپ کا کوئی بہت ہی گہرا دوست ہو وہ آپ کے گھر میں آئے تو آپ اسے حمام میں سلائیں گے یا بیڈ روم میں سلائیں گے؟ آپ اسے گندی جگہ پر سلائیں گے یا اچھی جگہ پر سلائیں گے؟ یہ عقل کی بات ہے تو اگر خدا کا بندہ اس کا محبوب ہو اور وہ حرام کمانے میں لگا ہوا ہو تو سمجھ آ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ٹھکرا دیا ہے اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے اسے گندے کاموں میں لگا دیا ہے کہ تم اسی لائق ہو، اسی میں پڑے رہو۔ اب ایک آدمی بیچارہ بڑی غربت میں ہے، فاقہ میں ہے، بڑی تنگدستی میں ہے، لیکن اس کے پیٹ میں حرام نہیں گیا تو سمجھو کہ مالک

اس سے راضی ہے، اس کو گندی چیزوں سے پیٹ کو ناپاک کرنے کی توفیق نہیں دے رہا۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان کو سمجھیں، ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ﴾ [النحل:۱۲۸] اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو مجھ سے ڈرنے والے ہیں اور جو اچھا کام کرنے والے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے ارشاد فرمایا:

﴿لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ﴾ [طٰہٰ:۴۶]

تم مت ڈرو، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔

یعنی معیت علمی مراد ہے۔ اس آیت سے ہمیں یہ خلاصہ ملا کہ اللہ پاک پکارنے والے کو نامراد نہیں کرتے، ناامید نہیں کرتے، اس کی پکار کو سنتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ ہمارے کروڑوں اربوں بندے دعا مانگیں تو یہ نہیں ہے کہ وہ کسی کی دعا کو نہ سن سکے۔ آپ دیکھیں کہ دنیا میں بڑے سے بڑا آدمی ہو تو بیس آدمی اس کو پکاریں گے تو اس کو ایک کی سنائی دے گی اور دس کی نہیں سنائی دے گی۔ فرمایا کہ ساری کائنات مجھے پکارے تو میں سب کی پکار سنتا ہوں، سب کی پکار کو جانتا ہوں، سب کی پکار کو سمجھتا ہوں اور سب کی امیدیں پوری بھی کرتا ہوں۔ آپ نے کعبہ شریف میں نہیں دیکھا کہ کوئی فارسی میں مانگ رہا ہے، کوئی عربی میں، کوئی امریکی زبان میں، کوئی انگریزی میں، کوئی ہندی میں، کوئی سندھی میں، کوئی برمی میں، سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں اور مالک سب کی سمجھ رہا ہے، سب کی سن رہا ہے اور سب کی فریادیں جان رہا ہے۔

اس کے بعد مفسر رحمہ اللہ حدیث لائے ہیں کہ حدیث پاک میں آتا ہے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”إِنَّ اللهَ لَيَسْتَحْيِي أَنْ يَبْسُطَ العَبْدُ إِلَيْهِ يَدَيْهِ يَسْأَلُهُ فِيهِمَا خَيْرًا فَيَرُدُّهُمَا، خَائِبَتَيْنِ.“

[تفسیر ابن کثیر: ۲/۱۰۷]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے حیا آتی ہے کہ میرا بندہ میرے سامنے ہاتھ پھیلائے، میرے سامنے سوال کرے اور میں اس کو اسی طرح نامراد ہاتھ لوٹا دوں میری رحمت کے خلاف ہے میری رحمت ہے کہ میں رحیم ہوں، میں کریم

ہوں، میں پکارنے والے کو اپنے دروازے پر ہاتھ پھیلانے والے کو کچھ نہ کچھ دے دیتا ہوں خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہی تو شان کرم ہے ورنہ ہم تو اپنے اعمال کے حوالے سے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے کہ اگر ہم حضور اکرم ﷺ کی امت نہ ہوتے تو شاید عذاب خسف (زمین میں غرق ہونا) آچکا ہوتا کہ پوری امت غرق ہو چکی ہوتی یا عذاب مسخ آچکا ہوتا کہ شکلیں تبدیل ہو چکی ہوتیں۔ یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہیں کہ ہمارے بڑے کروڑوں گناہ ہیں لیکن پھر بھی وہ ہمیں مہلت دیتا ہے پھر بھی وہ ہمیں معافی دیتا ہے پھر بھی وہ ہمیں مانگنے کی گنجائش دیتا ہے یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ایک بندے کے دل میں خیال آیا کہ (نعوذ باللہ) آج میں برائی کروں گا تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میرے بندے کے دل میں خیال ہے ارادہ ہے نہ لکھو کہ اگر وہ اس برائی پر عمل کرے تو پھر بھی ایک لکھو اور بندے کے دل میں خیال آیا کہ آج تو بھئی! درس کے بعد ان شاء اللہ طواف کریں گے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے نیکی کا ارادہ کیا ہے چاہے اس نے نہیں کی مگر تم لکھ لو اور جب وہ میرا بندہ نیکی کرے تو اس کے بعد دس گنا لکھ دو، اور اگر وہ مسجد حرام میں نیکی کرے تو ایک کا بدلہ ایک لاکھ لکھ دو۔ اللہ نہ کرے اللہ نہ کرے بندے نے گناہ کیا تو دو فرشتے ہیں، ایک ہمارے یمین میں ہے اور ایک ہمارے شمال میں ہے، جو یمین میں ہے اس کے ذمہ ہے کہ وہ ہماری حسنات کو لکھتا جائے اور جو ہمارے شمال میں ہے اس کے ذمہ ہے کہ وہ ہماری برائیاں لکھتا جائے تو جب ہم سے کوئی برائی یا گناہ ہوتا ہے تو فرشتہ اس کو لکھنا چاہتا ہے تو دائیں والا اس کو کہتا ہے کہ ٹھہرو ٹھہرو، ابھی لکھنے میں جلدی نہ کرو، کیا پتہ وہ توبہ کر لے تو توبہ بھی لکھ دو اور اللہ تعالیٰ معافی دے دے اس کو ذرا مہلت تو دو یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے ساتھ کتنا رحم کا معاملہ فرمایا ہوا ہے۔ پھر آپ دیکھیں کہ ستر سال سے کوئی بندہ شرک میں مبتلا ہے، زنا میں مبتلا ہے، شراب میں مبتلا ہے، حرام میں مبتلا ہے، ستر سال کے بعد دل میں خیال آیا کہ میں کیا کر رہا ہوں، میں تو بڑی غلطی میں ہوں، اب ذرا سر سجدہ میں ڈال کر رو پڑا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تو نے توبہ کی، میں نے تیرے ستر سال کے گناہ معاف کر دیئے، ستر سال کا شرک میں نے معاف کر دیا، تم نے میرے خلاف ستر سال بغاوت کی، میرے سوا تم غیروں کو پکارتے رہے ہو، میرے سوا تم غیروں کے لیے نذریں نیازیں چڑھاتے رہے ہو، میرے سوا تم غیروں سے سوال کرتے رہے، اولادیں مانگتے رہے، تم ان کو نفع نقصان کا مالک سمجھتے رہے، لیکن تم نے ایک مرتبہ بھی توبہ کی ہے تو میں نے ستر سال کے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ اب اتنی بڑی

رحمت کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے اور اس کے بعد بھی ہم لوگ ہدایت حاصل نہ کر سکیں تو ہماری بدقسمتی ہے، پھر ہماری محرومی ہے کہ جیسے دریا کسی کے گھر کے سامنے بہہ رہا ہو پھر بھی وہ ہاتھ منہ نہ دھوئے اور گندگی میں پڑا رہے تو یہ اپنی ہی بدنصیبی ہے۔

اب دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا میں کتنے مواقع عطا فرمائے ہیں کہ غریب سے غریب آدمی بھی حرم کے چاروں اطراف اتنے حمام ملتے ہیں جو ان کے گھروں میں بھی نہیں ہیں کپڑے بھی دھو سکتا ہے، غسل بھی کر سکتا ہے، نہا بھی سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کو گندا رہنے کی عادت ہے، اگر اس نے کپڑا بدلنا ہی نہیں ہے کہ میں نے ایک مرتبہ کپڑا بدلا تھا اگلی مرتبہ مولوی صاحب ہی بدلیں گے جب مریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ! اور اس نے کبھی اپنی بنیان کو دھویا بھی نہیں ہے اور اگر کبھی دھویا بھی ہے تو اوپر والا کپڑا دھولیا، لیکن نیچے والا کپڑا اسی طرح ہے کہ کسی کے ساتھ نماز میں کھڑا بھی ہو تو پوری صف بیچاری پریشان ہوتی ہے کہ یہ کون سی بلا آگئی ہے؟ اس کا کسی کے پاس کیا علاج ہے؟ خود گندا رہنا چاہتا ہے تو کوئی اور کیا کرے؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو دریا کی موجوں سے بھی زیادہ چل رہی ہے، لیکن ہم رحمت کو نہ لینا چاہیں تو اس میں کسی کا کیا قصور ہے؟

ابلیس کا ایک آیت سے غلط استدلال:

بعض بزرگوں نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شیطان ایک اللہ والے نیک بزرگ (حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ جو اپنی عبادت میں مشغول تھے) کے پاس گیا۔ جب وہ آیا تو انہوں نے فرمایا کہ اچھا میں نے تمہیں پہچان لیا ہے، تم ابلیس ہو ناں؟ اس نے کہا کہ ہاں۔ انہوں نے فرمایا کہ کیوں آئے ہو؟ اس نے کہا کہ آج میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا: ابلیس کو مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پیش آگئی ہے؟ اس نے کہا کہ آپ بزرگ آدمی ہیں، اللہ کے نیک بندے ہیں، کچھ میرا مسئلہ بھی حل کریں۔ اس نے کہا کہ مجھے آپ یہ بتائیں کہ میں کچھ شے ہوں کہ نہیں ہوں؟ آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں شیء ہوں یا لاشیء ہوں؟ انہوں نے فرمایا کہ تم ابلیس ہو پھر تو شے تو ہو۔ اس نے کہا کہ اگر میں شیء ہوں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ [الاعراف:۱۵۶] (میری رحمت ہر شے پر وسیع ہے) تو تم مولویوں نے مجھے رحمت سے باہر کیوں نکالا ہوا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت جب برسنے پر ہے تو میں بھی شیء ہوں تو لہٰذا مجھ پر بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگی۔ اللہ والے نے فرمایا کہ تم نے قرآن

پاک کی آدھی آیت پڑھی ہے، پوری آیت نہیں پڑھی۔ پوری پڑھتے تو تمہیں مسئلہ سمجھ میں آ جاتا تم نے تو اتنی پڑھی ہے آگے تو تم نے پڑھا ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ﴾ [الاعراف:۱۵۶] میری رحمت اس کے لیے ہے جو مجھ سے ڈرنے والے ہیں اور تُو تو خود میری رحمت سے نکل گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو ہر شے پر وسیع ہے، لیکن یہ رحمت ان لوگوں کے لیے ہے جو اس سے ڈرنے والے ہیں، لیکن تم تو متقین میں نہیں ہو، تم نے نافرمانی کی، فاسقین میں آ گئے تو تم نے تو خود اپنے آپ کو رحمت سے نکالا ہے۔

یاد رکھو کہ ابلیس اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہمارے ابا (حضرت آدم علیہ السلام) کو سجدہ نہ کرے اس پر تو قیامت تک لعنت ہو اور تم اگر اللہ کے قرآن میں سیکڑوں احکام اور مدنی سرکار کے لاکھوں فرمان کے مطابق بھی سجدہ نہ کرو تو تم کون ہو؟ اب تم خود فیصلہ کرو کہ ابلیس نے تو صرف ایک تیرے ابا جان کو سجدہ نہیں کیا اور وہ بھی ایک بار، کوئی پانچ دفعہ سجدے کا حکم نہیں تھا کہ دن میں پانچ مرتبہ سجدہ کیا کرو، ساری زندگی کرنے کا حکم بھی نہیں تھا، صرف یہ تھا کہ ﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ [البقرۃ:۳۴] اے فرشتو! آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ سب نے سجدہ کیا اور اس نے نہ کیا تو تیرے ابا جان کو ایک سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے وہ ملعون، مردود، لعنتی اور جہنمی ہو گیا وہ تو قیامت تک جہنم میں پڑا رہے گا اور تم اگر خدا کو سجدہ نہ کرو تو تم کیا بن جاؤ گے؟

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُو بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيهَا إِثْمٌ وَ لَا قَطِيعَةُ رَحِمٍ إِلَّا أَعْطَاهُ اللَّهُ بِهَا إِحْدَى ثَلَاثٍ إِمَّا أَنْ تُعَجَّلَ لَهُ دَعْوَتُهُ وَ إِمَّا أَنْ يَدَّخِرَهَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ وَ إِمَّا أَنْ يَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوءِ مِثْلَهَا.''

[مسند احمد بن حنبل، رقم:۱۱۱۳۳]

جب کوئی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کی دعا میں کوئی ایسی دعا نہ ہو جو گناہ کی ہو، مثلاً کوئی دعا کرے کہ فلاں لڑکی سے مجھے عشق ہے، اللہ تعالیٰ اس لڑکی کو آج رات میرے پاس لے آئے اور نہ ہی ایسی دعا کہ جس میں قطع رحمی ہو (کہ اللہ ان دو بھائیوں کو آپس میں لڑا دے) تو اس کی دعا تین صورتوں میں سے ایک صورت میں قبول ہو جائے گی۔ ''إِمَّا أَنْ تُعَجَّلَ لَهُ دَعْوَتُهُ'' جو مانگا تھا وہ عطا کر دیا، ''وَ إِمَّا أَنْ يَدَّخِرَهَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ'' اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو محفوظ رکھا کہ روزِ قیامت اس کا بدلہ دوں گا، ''وَ إِمَّا أَنْ يَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوءِ مِثْلَهَا''

اللہ تعالیٰ نے اس دعا کی برکت سے کوئی اس طرح کی مصیبت ٹال دی۔

جتنا مانگو، اللہ تعالیٰ کی رحمت تو اس سے بھی زیادہ ہے:

اس حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کا مسلمان بندہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے یا تو اللہ تعالیٰ اس کو دے دیتے ہیں یا اس دعا کے بدلے کوئی مصیبت دفع فرما دیتے ہیں۔

"يُسْتَجَابُ لِأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يَعْجَلْ، يَقُولُ: دَعَوْتُ فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِي." [صحیح بخاری، رقم: ۶۳۴۰]

اس حدیث پاک میں آیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں قبول فرماتے ہیں جب تک کہ وہ جلدی نہ کرے۔ جلدی کا کیا معنی ہے؟ کہ میں نے تو دعا کی، لیکن میری دعا منظور نہیں ہوئی۔

او اللہ کے بندے! بندے کا کام تو مانگنا ہوتا ہے اس کی مرضی چاہے تیری زبان سے نکلے اور وہ تمہیں عطا کر دے یا دیر سے عطا کر دے۔

اور چاہے تو وہ تمہیں عطا نہ کرے پھر بھی ستر سال مانگتے رہیں تیرا کام تو مانگنا ہے اور یقین کامل کے ساتھ مانگتے رہو اور اس کی رحمت سے یقین ہو تو ضرور ملتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لَا يَزَالُ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ، مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيعَةِ رَحِمٍ، مَا لَمْ يَسْتَعْجِلْ، قِيلَ: يَارَسُولَ اللهِ! مَا الِاسْتِعْجَالُ؟ قَالَ: يَقُولُ: قَدْ دَعَوْتُ وَ قَدْ دَعَوْتُ، فَلَمْ أَرَ يَسْتَجِيبُ لِي، فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذَلِكَ وَ يَدَعُ الدُّعَاءَ." [صحیح مسلم، رقم: ۲۷۳۵]

آدمی کی دعا منظور ہوتی رہتی ہے جب تک کہ وہ کوئی گناہ کی دعا نہ مانگے، قطع رحمی کی دعا نہ مانگے اور جلدی نہ کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! جلدی کا کیا معنی ہے؟ حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ کہتا ہے کہ میں نے مانگا اور اتنا عرصہ ہو گیا ہے مانگتے مانگتے میری دعا منظور نہیں ہوئی۔ پھر وہ مانگ مانگ کر اُکتا جاتا ہے اور دعا کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

بس وہ محروم ہو گیا کیونکہ اصل میں اس کا کام یہ ہے کہ مانگتا رہے مانگتا رہے باقی کب ملے گا؟ یہ میرے مالک

کے علم میں ہے بندے کا کام یہ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوجائے کیونکہ قرآن مقدس کی ایک آیت میں بھی آتا ہے، فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ ۚ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ ۝٢٨﴾ [الشوریٰ:۲۸]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری وہ ذات ہے۔ جب بندے مایوس ہوجاتے ہیں کہتے ہیں بس جی اب تو مانگ مانگ کر تھک گئے ہیں سال ہوگیا بارش آتی ہی نہیں مانگ مانگ کر جب بالکل نااُمید ہوگئے تو پھر میں اپنی رحمت بھیج دیتا ہوں۔ اس لیے فرمایا کہ تم میری رحمت سے نااُمید نہ ہوا کرو، تمہارا کام ہے کہ تم اپنے اللہ سے مانگو۔

نیک آدمی کی تحنیک کی برکت:

اور ایک بات یاد رکھو کہ بزرگوں نے ایک مثال دی ہے کہ کسی بزرگ کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی، اس کے پاس اس کے استاد بہت بڑے عالم، محدث، بڑے بزرگ اور اللہ والے تھے وہ مہمان تھے۔ لڑکی جو پیدا ہوئی تو گھر والے نے اس بچی کو اُٹھایا اور تحنیک کے لیے ان کے پاس لے آیا۔

تحنیک کہتے ہیں کہ کوئی کھجور یا کوئی میٹھی چیز اُنگلی لگا کر اس کے منہ میں دے دی جائے تاکہ وہ کچھ چاٹ لے، یہ سنت ہے۔ انہوں نے کہا کہ اتنے بڑے عالم اور بزرگ ہیں بڑی اچھی بات ہے کہ بس ان سے تحنیک کروالوں بجائے اس کے کہ میں کوئی بوڑھا آدمی ڈھونڈوں اور تلاش کروں۔ جب لے آیا تو حضرت نے کھجور لی اور سنت کے مطابق تحنیک کی۔ جب لڑکی بڑی ہوئی تو لڑکی بڑی شرارتیں کرتی۔ اس کی ماں یعنی اس کی بیوی نے ایک دن اپنے شوہر سے کہا کہ تمہارے استاد نے اچھی تحنیک کی تھی، یہ تو بڑی شرارتی بچی ہے۔ اس نے کہا کہ بی بی! تُو نہیں سمجھی، اگر وہ تحنیک نہ کرتے تو یہ کیا بنتی؟ تم اس کی فکر کرو۔ یہ تو پتہ نہیں کہ اس نے کیا بننا تھا؟ یہ تو شکر ہے کہ ہوسکتا ہے اس کی دعا سے یہ بچ گئی ہو۔

دعا مانگنے کے فائدے:

اس لیے یاد رکھا کرو کہ تم جو دعائیں مانگتے ہو تم سمجھتے ہو کہ جی میں نے اتنا عرصہ دعا مانگی اور جناب میری دعا منظور نہیں ہو رہی، لیکن تمہیں کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی بلائیں تم سے روکی ہوئی ہیں اور اگر تم دعا نہ مانگتے تو تمہارا کیا حشر ہوتا؟ تم دعا نہ مانگتے تو نہ معلوم کس مصیبت پر پہنچے ہوئے ہوتے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ سے مانگنے میں نااُمید نہ ہوا

کریں یعنی ایک تو یقین سے مانگا کریں کہ ہم مانگ رہے ہیں اور تیرے دروازے کے علاوہ اور کوئی دروازہ بھی نہیں ہے اور پھر مولا! تُو نے حکم دیا ہے کہ مجھ ہی سے مانگو اور تیرے حکم پر تجھ سے مانگ رہے ہیں اور تیرے دروازے کو چھوڑ کر ہم نے کہیں اور جانا بھی نہیں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا يَزَالُ الْعَبْدُ بِخَيْرٍ مَا لَمْ يَسْتَعْجِلْ" [مسند احمد بن حنبل، رقم:۱۳۱۹۸]

"بندہ خیر میں رہتا ہے جب تک وہ جلدی نہ کرے۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ حضور! جلدی کا کیا معنی ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قَدْ دَعَوْتُ رَبِّي فَلَمْ يَسْتَجِبْ لِي" بڑی دعا کی، بڑی دعا کی، یار! میری دعا تو سنی نہیں جاتی۔ یہ جلد بازی ہے جلدی نہ کرے، بلکہ مانگتا رہے اور اسی مانگنے میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں ہیں۔

دعا جلد قبول نہ ہونے میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں:

بعض علماء کرام نے ایک اور فلسفہ بیان کیا ہے، فرمایا ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گناہ گار مانگتا ہے تو فوراً بات بن جاتی ہے اور ایک اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ مانگتا ہے تو دعا منظور نہیں ہوتی، کبھی دیر لگ جاتی ہے اور وہ مانگتے رہتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی فاسق وفاجر بندہ ہو تو اللہ تعالیٰ چاہتے بھی نہیں کہ یہ مجھ سے ہمکلام ہو اس نے مانگا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسے دے دو دفع کرو چھوڑو بس دے دو اور بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ہمکلام ہونا اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۲۲]

اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔ تو پھر جب اس کے محبوب بندے ہوتے ہیں تو اللہ پاک کو ان کا مانگنا بھی محبوب ہوتا ہے، اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اسے مانگنے دو، اسے مانگنے دو۔ اس کے مانگنے میں بھی ایک لطف ہے، یہ مانگنے میں بھی لطف اُٹھا رہا ہے اور میں مالک ہوں، میں اس کی درخواست سن رہا ہوں۔ میری مرضی جب آئے گی تو میں اس کو اتنا دوں گا کہ اس کے تصور سے بھی بالاتر ہوگا۔ تو اس لیے کبھی مایوس نہ ہو جایا کریں

کہ میں نے تو بہت دعا کی ہے، لیکن قبول نہیں ہوتی۔

اچھا کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ ہم جو مانگ رہے ہوتے ہیں ہمارے علم میں بھی نہیں ہوتا ہم تو مانگتے ہیں کہ اے اللہ! اولاد عطا فرما، اے اللہ! اولاد عطا فرما۔ نہ معلوم کہ وہ اولاد کوئی امتحان بنتی۔ تو ہمیں پتہ نہیں ہوتا، ہم سمجھتے نہیں ہیں، ہمارے علم میں نہیں ہوتا۔

آپ دیکھیں کہ کتنے بڑے بڑے علماء گزرے ہیں جن کی اولادیں جاہل ہو گئیں، کتنے بڑے بڑے اللہ کے بندے گزرے اور بیوی کافر اور کتنے بڑے بڑے ظالم فاسق و فاجر حتیٰ کہ فرعون گزرے اور بیوی آسیہ جیسی نیک۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے شوہر تو فرعون ہو، خدائی کا دعویٰ کرے، نبیوں سے مقابلہ کرے اور بیوی کون ہے؟ بیوی آسیہ اور ایمان والی، جنت کی سردار اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اتنی بڑی عظمت دی کہ جنت میں اللہ تعالیٰ اسے ہمارے مدنی سرکار ﷺ کی بیوی بنائیں گے، اس سے بڑی کوئی عظمت ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی بیوی بنے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے ہم اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس لیے کبھی اپنی عدم سمجھ کی بناء پر اللہ تعالیٰ سے دعا کو نہ چھوڑیں، بلکہ مانگتے رہیں، مانگتے رہیں اور یقین کامل سے مانگیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''مَا مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يَدْعُو اللهَ بِدَعْوَةٍ فَتَذْهَبُ، حَتَّى تُعَجَّلَ لَهُ فِي الدُّنْيَا أَوْ تُدَّخَرَ لَهُ فِي الْآخِرَةِ، إِذَا لَمْ يَعْجَلْ أَوْ يَقْنَطْ.'' [تفسیر ابن کثیر: ۲/۳۹۱]

کوئی بھی بندہ اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دے دیتے ہیں یا اس کی دعا کو اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ بنا دیتے ہیں جب تک کہ وہ جلدی نہ کرے اور نا اُمید نہ ہو جائے۔ حضرت عروہ نے پوچھا کہ اماں جان! اس کے جلدی کرنے اور نا اُمید ہونے کا کیا معنی ہے؟ تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ بیٹا! وہ یوں کہے کہ میں نے بڑی دعا کی، میں نے بڑی دعا کی تھی، کتنے دن ہو گئے ہیں میں دعا مانگ رہا ہوں میری دعا تو منظور نہیں ہو رہی ہے، میری تو دعا ہی منظور نہیں ہوتی چھوڑو جی کیا دعا مانگیں ہم تو گناہ گار ہیں ہماری تو دعا منظور نہیں ہوتی دماغ میں ایسا تصور کر لینا مایوسی اور قنوط ہے اور یہ ناجائز ہے۔ آدمی کا کام ہے کہ ملے یا نہ ملے مگر اللہ تعالیٰ سے مانگتا رہے کیونکہ اگر دنیا میں نہ ملا تو آخرت میں تو ملے گا ہی۔ جب یہ دو چیزیں نہ آئیں تو اللہ تعالیٰ اس پر رحمت فرماتے ہیں اس کو کبھی دنیا میں دعا کا بدلہ عطا فرما دیتے ہیں اور کبھی اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ بنا دیتے ہیں کہ اس کی دعا کا

بدلہ آخرت میں ملے گا۔

اللہ پاک ہمیں ان لوگوں میں نہ بنائے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے مایوس ہونا کافروں کی صفت ہے اللہ تعالیٰ کے نیک بندے کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں اپنے سے معافی مانگنے کی توفیق عطا فرمائیں اور ہمیں کامل یقین عطا فرمائیں۔ بس ہمارا یقین ہونا چاہیے کہ جو اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں فیصلہ کیا ہے وہی ہمارے لیے بہتر ہے، ہم اس کی رضا پر راضی ہیں، اس کی رضا اور اس کے فیصلوں پر راضی ہیں۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنی ذات سے مانگنے کی توفیق دے دے تو یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا کرم ہے یعنی آپ دنیا میں دیکھیں کہ کتنے لوگ ہیں جن کو کبھی خیال ہی نہیں آتا کہ خدا سے مانگنا بھی ہے، ان پر بڑی بڑی مصیبتیں بھی آجائیں تو کبھی نماز نہ پڑھیں گے، بڑی سے بڑی مصیبت آجائے تو کبھی خیرات نہیں کریں گے، صدقہ نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگیں گے اور اسلام اور دین کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔ یہ کتنی بڑی بدنصیبی ہے۔

اور یہ سب سے بڑا انعام ہے کہ بندے پر مصیبت تو آگئی، لیکن بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گیا یہ سب سے بڑا انعام ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ علماء کرام نے ایک فلسفہ بھی بیان کیا ہے، انہوں نے کہا کہ دیکھیں کہ اگر آپ کو کسی سے چھوٹا کام ہو اور بڑے کو بات کرنے کا موقع مل جائے تو آدمی بڑا مطمئن ہو جاتا ہے کہ بھئی! یہ تو بڑا افسر ہے، چھوٹے کو کہے گا۔ جب آدمی اپنے اللہ تعالیٰ سے کہنا شروع کر دے تو اس سے بڑا تو کوئی ہے ہی نہیں، وہ تو ہر چیز پر قادر ہے، ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۝١٦﴾ [البروج:١٦] "يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ" جو چاہے کر دے۔

واقعہ:

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتے تھے کہ میری جو دعا منظور ہو جاتی ہے میں سمجھ جاتا ہوں کہ وہ منظور ہو گئی ہے اور میری جو دعا منظور نہیں ہوتی اس کا بھی مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ منظور نہیں ہوئی۔ شاگرد بڑے حیران ہوئے کہ یہ تو غیب کا معاملہ ہے، آپ کو کیسے علم ہو جاتا ہے؟ فرمایا کہ بات یہ ہے کہ کسی چیز کے اثرات اس چیز پر دلالت کرتے ہیں، جیسے بادل گرج رہے ہوں اور بجلی کڑک رہی ہو بادل سیاہ ہو جائیں ٹھنڈی ہوا چل پڑے تو آدمی سمجھ جاتا ہے کہ بارش ہو گی۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ علم غیب ہے تو آپ نے فرمایا کہ جب میں اللہ تعالیٰ

سے دعا مانگوں اور میرا دل لگ جائے کہ اور مانگوں اور مانگوں اور مانگنے میں مزہ آرہا ہو اور آنسو بہہ رہے ہوں اور بدن اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپ رہا ہو اور بدن کے بال اللہ تعالیٰ کے ڈر سے کھڑے ہو رہے ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ دعا منظور ہوگئی اور جب میں دعا مانگ رہا ہوں لیکن دل نہیں لگ رہا اور مانگ رہا ہوں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کیا مانگ رہا ہوں بس رٹے رٹائے الفاظ پڑھتا جا رہا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ دعا منظور نہیں ہوئی۔

اور اسی طرح علماء نے لکھا ہے کہ ایک ہوتا ہے دعا کا پڑھنا اور ایک ہوتا ہے دعا کا مانگنا۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے، جیسے کتاب پر لکھا ہوا ہے ''رَبَّنَا''، آپ پڑھیں: ''رَبَّنَآ اٰتِنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ'' آپ پڑھتے ہیں: ''وَ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً حَسَنَةً وَّقِنَا وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ عَذَابَ النَّارِ'' یہ پڑھنا ہوا، یہ مانگنا نہیں ہوا، یہ تو پڑھنا ہوا۔

ایک ہے دعا کا مانگنا کہ آدمی زاری کر رہا ہے، رو رہا ہے، عاجزی کر رہا ہے، اللہ کے آگے تذلل کر رہا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم رو نہیں سکتے تو کم از کم رونے کی شکل بناؤ۔ رونا اپنے ہاتھ میں نہیں، لیکن رونے کی شکل بنانا تو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ عاجزی کر رہا ہے، گڑگڑا رہا ہے اور رو رہا ہے اور اپنے اللہ کے ساتھ ایسے مشغول ہے جیسے اللہ تعالیٰ سے باتیں کر رہا ہے تو پھر یہ ہوتی ہے دعا، جو دل سے نکلتی ہے اور قلب و قالب دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ایک دعا ہے کہ غافل دل سے دعا مانگی جائے کہ کہے ''رَبَّنَا رَبَّنَا رَبَّنَا'' کوئی پتہ نہیں کہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ دعا نہیں ہوتی، یہ تو پڑھنا ہوتا ہے جیسے طواف میں ہمارے لوگ دعا پڑھتے ہیں جو دعا مانگتے نہیں ایک آدمی نے کتاب ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہے اور مسئلہ پڑھ رہا ہے یہ پڑھنے والی بات ہے دعا نہیں۔

اور اسی طرح علماء نے لکھا ہے کہ جب تک دعا میں یقین کامل نہ ہو دعا قبول نہیں ہوتی۔ دعا مانگنے والا خود متشکک ہے کہ نہ معلوم دعا منظور ہوگی یا نہیں تو پھر بھی منظور نہیں ہوتی۔ دعا اتنے یقین کامل سے مانگے کہ جب اللہ کے علاوہ دروازہ کوئی نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مجھ سے مانگو میں خود دوں گا پس اللہ تعالیٰ کی بات کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے تو جب اس نے وعدہ فرمایا ہے اور پھر میں بالکل صدقِ دل سے مانگ رہا ہوں اور کوئی دروازہ نہیں ہے تو کیسے قبول نہیں ہوگی۔

واقعہ:

ایک اللہ کے بہت بڑے ولی اللہ تھے وہ حج کے لیے تشریف لے گئے تو میدان عرفات میں جب بیٹھے تھے تو

اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ عرفات میں یہ جتنے لوگ ہیں اگر یہ سب اکٹھے ہو کر سخی کے دروازے پر چلے جائیں اور اس کے پاس سوال کریں کہ ہم سب تمہارے دروازے پر آئے ہیں کہ آپ ہمیں ایک پیسہ دے دیں تو کیا وہ سخی انکار کرے گا؟ انہوں نے کہا کہ حضرت! کیوں انکار کرے گا؟ ایک پیسہ دینے سے اس کا کیا بگڑے گا کہ اتنی مخلوق کو وہ واپس کرے اور ایک پیسہ نہ دے تو فرمایا کہ دیکھو! جتنے بھی عرفات میں لوگ ہیں اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں اگر اللہ تعالیٰ ان سب کو دے دے تو اس کے خزانے میں ایک پیسے جتنی بھی کمی نہ ہوگی کیونکہ اگر سخی دے دے اس کا پیسہ تو پھر بھی کم ہو گیا لیکن خدا کے نزدیک ایک پیسہ کی بھی کمی نہیں ہوگی تو جب اس کے خزانے میں کمی نہیں ہوگی تو کیا وہ اپنے بندوں کو دھکا دے دے گا کہ میں نہیں دیتا؟ انہوں نے فرمایا کہ اتنے یقین کے ساتھ مانگو۔

حتیٰ کہ بعض علماء نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ آدمی اگر عرفات میں ہو اور وہ دعا مانگے اور اس کو شک ہو کہ پتہ نہیں کہ آج میری دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں ہوتی تو کہتے ہیں کہ وہ آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے۔ اس لیے جب حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو یہاں مانگتا ہے تو میں اس کی بخشش کر دیتا ہوں تو شک کا کیا معنی؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کی زبان پر شک کر رہا ہے اور حضور پاک ﷺ کے فرمان پر شک کرنا تو کفر ہے حضور اکرم ﷺ کا فرمان تو حق ہے وہ تو کبھی قیامت تک اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے دعا کو یقین سے مانگیں، اپنے اللہ سے عاجزی سے مانگیں، تضرع سے مانگیں، گڑگڑا کر مانگیں، اس کے اوّل و آخر میں درود شریف پڑھیں، دعا گناہ کے بارے میں نہ کریں، اسلام کے احکام کے خلاف کوئی دعا نہ کریں اور قطع رحم کی دعا نہ کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرماتے ہیں اور دعا کا بدلہ مل جاتا ہے یا تو دنیا میں یا آخرت میں۔

ابن قسیط کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے سنا کہ وہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کی طرح فرما رہے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

''اَلْقُلُوْبُ أَوْعِيَةٌ وَ بَعْضُهَا أَوْعَى مِنْ بَعْضٍ، فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ أَيُّهَا النَّاسُ! فَاسْأَلُوْهُ وَ أَنْتُمْ مُوقِنُوْنَ بِالْإِجَابَةِ، فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ لِعَبْدٍ دَعَاهُ عَنْ ظَهْرِ قَلْبٍ غَافِلٍ.'' [مسند احمد بن حنبل، رقم: ٦٦٥٥]

اللہ تعالیٰ نے جو دل بنائے ہیں گویا کہ یہ بھی برتن ہیں، ظرف ہیں۔ کسی کا بڑا، کسی کا چھوٹا۔ اور فرمایا کہ جب تم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو تو اس یقین سے مانگو کہ میں مانگ رہا ہوں اور مجھے ملے گا۔ اللہ پاک اس بندے کی دعا منظور

نہیں فرماتے جو اپنے رب سے مانگے، لیکن اس کا دل غافل رہے، دل کہیں اور لگا ہوا ہے لیکن مانگ خدا سے رہا ہے یعنی پورے یقین سے مانگے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگ رہا ہوں اور ملے گا۔

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [یٰسین: ۸۲] اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہے، کر گزرتا ہے۔

﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۱۸۷]

”تمہارے لیے حلال ہے روزے کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا، وہ تمہارا لباس ہیں تم اُن کا لباس ہو، اللہ جانتا ہے تم (شب باشی کر کے) اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے، اللہ نے تمہاری توبہ کو قبول کیا اور تمہیں معاف کیا، اب ان سے مباشرت کرو اور (اولاد) طلب کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھی ہے اور کھاؤ اور پیو (تمام رات) جب تک کہ تمہارے لیے سفید دھاری صبح کی سیاہ دھاری سے فجر کے وقت صاف ظاہر ہو جائے، پھر روزہ کو رات (غروب) تک پورا کرو، اور تم ان سے مباشرت نہ کرو جب تک کہ تم مسجدوں میں اعتکاف کرو، یہ (احکام) اللہ کی حدود ہیں، ان کے (توڑنے کے) قریب نہ جاؤ۔ اسی طرح اللہ اپنی آیات کو لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے، تاکہ وہ (محرمات سے) بچتے رہیں۔“

ان آیاتِ مبارکہ میں روزہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کچھ احکام بیان فرمائے ہیں۔

﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے حلال کر دیا روزے کی راتوں میں جماع کرنا اپنی عورتوں سے۔

﴿اُحِلَّ لَكُمْ﴾ (حلال کر دیا گیا تمہارے لیے) سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے وہ چیز حرام تھی، اب

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کر دی۔ تو اب یوں سمجھیں کہ ابتداء اسلام میں جب روزے کا حکم آیا تو دن میں کھانا پینا اور مباشرت کرنا منع ہی تھا، لیکن رات کو یہ حکم تھا کہ جب تک تم جاگ رہے ہو اس وقت تک کھانا پینا اور بیوی سے ملنا جائز ہے، لیکن اگر تم سو گئے تو سونے کے بعد نہ کھانا جائز، نہ پینا جائز اور نہ ہی بیوی سے ملنا جائز۔ کوئی آدمی عشاء کی نماز پڑھ کر سو گیا تو اب سونے کے بعد اس کی مثلاً آدمی رات کو نیند کھل گئی تو اب روزہ شروع ہے۔ ابتداء اسلام میں یہ حکم تھا تو اس کے بارے میں یہ ہوا کہ لوگ بڑی تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔

تبدیلی حکم کا سبب:

ایک صحابی جن کا نام قیس بن صرمۃ (اور ایک روایت میں قیس بن ابی صرمۃ ہے) جو انصاری صحابی ہیں حضور اکرم ﷺ نے دیکھا کہ وہ روزے کی حالت میں بیہوش ہو گئے اور ان پر پانی ڈالا گیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ حضور! روزے کی وجہ سے بیہوش ہو گئے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ بیچارے سارا دن باغ میں کام کرتے رہے اور وہ باغ میں کام کرنے والے محنتی مزدور آدمی تھے۔ سارا دن تھکے ہوئے آئے تو گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا، بیوی پڑوسیوں کے گھر کچھ لینے گئی تو اتنے میں ان کی آنکھ لگ گئی۔ بیوی جب واپس آئی تو اس نے کہا کہ ہائے تیرا ناس ہو جائے تیرا تو روزہ شروع ہو گیا اور تیرے لیے کھانا پینا حرام ہو گیا۔ اب دوسرے دن کا روزہ شروع ہو گیا۔ اب پورا دن محنت و مشقت کی اور دوسرے دن بھی بغیر کھائے پیے روزہ رکھ لیا، اس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئے اور ان کا روزہ بیس گھنٹے کا ہو گیا۔ لہٰذا اس میں مشقت تھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں رخصت دے دی۔

اسی طرح بعض صحابہ کے ساتھ اس طرح کا واقعہ پیش آیا کہ رات کو جب نیند کھلی تو میاں بیوی آپس میں مل بیٹھے تو انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ احکام نازل فرمائے: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ تک نازل ہوئی، ''فَفَرِحُوا بِهَا فَرَحًا شَدِيدًا'' اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ یہ لفظ طبرانی کے ہیں۔

[تفسیر طبری: ۲/۲۹۵]

اور اگلی آیت بھی نازل ہوگئی۔اب رات میں بالکل کھانا پینا اور میاں بیوی کا ملنا بھی حلال ہوگیا صبح صادق تک۔

یہ ہم نے اپنے بندوں کے ساتھ رعایت کردی پس میرے بندوں کو کہہ دو کہ پہلے جو چیز حرام تھی، اللہ پاک نے اس کو حلال کر دیا۔اسی میں ایک مسئلہ یہ بھی سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تو فرمادیا: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ ہم نے حلال کر دیا لیکن حرام کرنے والا حکم قرآن میں موجود ہی نہیں۔مسئلہ سمجھو کہ قرآن مجید میں یہ مسئلہ نہیں کہ رمضان المبارک میں میاں بیوی کا ملنا حرام ہے اور رمضان کی رات کو کھانا پینا حرام ہے۔یہ پورے قرآن میں کہیں بھی نہیں تو جب وہ قرآن پاک میں نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابتداء اسلام میں رات کو میاں بیوی کا ملنا حرام ہے یہ مسئلہ احادیث مبارکہ میں موجود ہے کہ ملنا حرام تھا اور سونے کے بعد کھانا پینا بھی حرام تھا۔

پس مسئلہ یہ نکلا کہ جو میرے مدنی ﷺ کا فرمان ہے وہ بھی اللہ پاک کا حکم ہے کیونکہ اس کا مرتبہ اگر حکم خداوندی کا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرماتے کہ پہلے تو کوئی حکم تھا ہی نہیں بلکہ اللہ پاک نے فرمایا کہ ٹھیک ہے پہلے حرمت کا حکم تھا، اب ہم نے حلال کر دیا یعنی گویا جو حضور پاک ﷺ نے حکم دیا ہے وہ بھی میرا ہی حکم ہے کیونکہ میرا مدنی ﷺ اپنی طرف سے کوئی حکم جاری نہیں کرتا۔

یعنی حکمِ رسول بھی حکمِ خداوندی ہوتا ہے، اس لیے فرمادیا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء:۸۰] جس نے بھی میرے مدنی کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی۔فرمایا: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر:۷] جن چیزوں کا تمہیں اللہ تعالیٰ کا رسول حکم دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔اس لیے کہ اللہ کا رسول کبھی اپنی طرف سے حکم نہیں دیتا۔اس سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آگیا کہ وہ لوگ جو ہر مسئلے کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ مسئلہ قرآن پاک میں تو نہیں ہے۔

اگر یوں کہا جائے کہ یہ مسئلہ قرآن پاک میں ہے تو یوں سمجھو کہ محمد عربی ﷺ بھی تو قرآن پاک کی عملی تفسیر ہیں۔اس نے قرآن پاک میں جو الفاظ نازل کیے ان کی عملی تصویر اگر دیکھنی ہو تو وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں کہ قرآن تو یہ ہے جو اللہ پاک نے اپنے الفاظ میں اُتارا ہے اور محمد پاک ﷺ نے اپنے عمل سے جو نمونہ دکھایا ہے وہ عملی قرآن ہے۔

تیسرا مسئلہ ناسخ اور منسوخ کا ہے کہ قرآن میں پہلے اور حکم تھا پھر دوسرا حکم آگیا اور پہلا حکم منسوخ ہوگیا، جیسے اللہ

پاک نے فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝﴾ [المزمل: ۱تا۴] اللہ پاک نے حکم دیا کہ رات کو تہجد کے لیے جاگیں، ﴿قُمِ الَّيْلَ﴾ ساری رات جاگیں اور تھوڑا سا آرام بھی کرلیں کہ آدھی رات آرام اور آدھی رات عبادت۔ پھر یہ کہ دو حصے آرام کرلیں اور ایک حصہ عبادت کرلیں۔ تو پہلے یہ حکم تھا، لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے رعایت فرمادی: ﴿عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ڮ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ [المزمل: ۲۰] اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم جانتے ہیں کہ تم میں بیمار اور کمزور بھی ہوں گے اور ایسے بھی ہوں گے جو اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے اور ایسے بھی ہیں جو تجارت کرنے والے ہیں اور رات کے دو حصے جاگنا اور آدھی رات جاگنا بہت ہی مشکل ہے، اس لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ اے نبی! میں نے پہلا حکم ختم کردیا، اب ہم نے اپنے بندوں پر رعایت کردی: ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ اب ساری رات میں اللہ پاک تم کو تہجد پڑھنے کی جتنی بھی توفیق دے دیا کرے پڑھ لیا کرو چاہے دو رکعت پڑھ لو، چار پڑھ لو، چھ پڑھ لو، آٹھ پڑھ لو، دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ، جتنا تم سے ہوسکے۔ اب پہلا حکم بھی قرآن میں تھا اور دوسرا حکم بھی قرآن میں تھا۔ لیکن یہاں ایک مسئلہ یہ بھی سمجھ میں آیا کہ پہلا حکم تو قرآن پاک میں نہیں ہے وہ حکم تو حدیث پاک میں ہے تو بھی اللہ پاک اسی حکم کو جو قرآن پاک میں نہیں ہے اور احادیث پاک میں ہے اسے بھی قرآن پاک کی آیت بھیج کر منسوخ فرمادیتے ہیں۔ اب پہلا حکم جو حدیث پاک میں تو تھا لیکن قرآن پاک میں نہیں تھا لیکن نسخ قرآن پاک میں آگیا جو چیز پہلے حرام تھی، اب ہم نے تمہارے لیے حلال کردی ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن پاک سے بھی وہ احکام منسوخ ہوجاتے ہیں جو حدیث پاک میں موجود ہوں۔

اب مسئلہ سمجھو کہ ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآىِٕكُمْ﴾ ہم نے تمہارے لیے جماع کو حلال کردیا۔ کیوں حلال کردیا؟ اس لیے کہ ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ لباس کا معنی کیا ہے؟ یہ جو آپ نے پہنا ہوا ہے یہ لباس ہے؟ اب یہ بات سمجھ لو کہ لباس کیوں کہا گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں عورتوں کو لباس بھی کہا ہے اور حرث بھی کہا ہے۔ ''حَرْث'' کا معنی کھیتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس

آیت مقدسہ میں فرمایا ہے: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ﴾ [البقرۃ:۱۸۷]

دوسری جگہ اللہ پاک فرماتے ہیں: ﴿فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ﴾ [البقرۃ:۲۲۳] تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں جیسے چاہو اور جس طرح چاہو۔ وہاں لفظ ''حرث'' آیا ہے کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مرد کے لیے کھیتی بنایا ہے۔ اسی طرح لفظ ''الفِرَاش'' بھی آیا ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے:

''اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَ لِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ.'' [صحیح بخاری، رقم:۲۰۵۳]

یعنی بچہ تو صاحب فراش کا ہے یعنی صاحب نکاح کا ہے تو وہاں لفظ ''الفِرَاش'' ہے۔ اس لیے علماء کرام نے فرمایا ہے کہ دراصل یہ کنایات ہیں تاکہ تم بات کو سمجھو کہ اللہ پاک نے مرد اور عورت کو آپس میں ایک دوسرے کے قریب رکھا ہے اور ان میں اتنا اتصال ظاہری اور باطنی ہے جیسے لباس کا اتصال ہے جیسے لباس بدن کے ساتھ لگا ہوا ہے یہ اتصال ظاہری باطنی اور معنوی پر ہے۔ یہ قرب صرف میاں بیوی کو حاصل ہو سکتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو لباس فرما دیا ہے اور دوسری بات ﴿حَرْثُكُمْ﴾ فرمائی ہے، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہو گیا ہے کہ جیسے زمینوں سے اللہ پاک نے تمہارے لیے کھیتی پیدا کی ہے اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہاری بیویوں کو تمہاری نسل کا ذریعہ بنایا ہے کہ اس سے ہم تمہیں اولاد دیتے ہیں اور پھر جو آگے اولاد ہے اور اولاد در اولاد نسل چلتی ہے تو یہ تمہارے لیے کھیتی بھی ہیں۔ اسی طرح عورت کو لباس فرمایا ہے، مثلاً آپ نے شلوار پہنی ہوئی ہے اور قمیض اور ٹوپی نہیں پہنی ہوئی اور باہر کوئی معزز آدمی آپ سے ملنے آ جائے تو آپ کہیں گے کہ ٹھہرو، میں اپنے کپڑے پہن لوں اور باہر آنے کے قابل تو بن جاؤں۔ حالانکہ آپ نے شلوار تو پہنی ہوئی ہے، ستر تو چھپایا ہوا ہے آپ ننگے تو نہیں ہیں لیکن عورت کو لباس فرمایا کہ لباس کا معنی ستر ہوتا ہے وہ تمہارا لباس ہیں، تمہارا ستر ہیں اور تم اس کا ستر ہو۔ کیا معنی ہوا کہ تم اس کو چھپانے کا ذریعہ بنو اور وہ تمہیں چھپانے کا ذریعہ بنے۔ یہ نہ کہ تم اسے نچانے کا ذریعہ بنو اور وہ تمہیں بے غیرت بنانے کا ذریعہ بنے۔ اسلام نے عورت اس لیے نہیں رکھی کہ تم عورت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس کو ٹیبل پر لے آؤ، فلور پہ لے آؤ اور بازاروں میں لے آؤ، اسے کلبوں اور پارکوں میں لے آؤ، اور عورت تمہیں اتنا ذلیل کرے کہ ساری دنیا انگلیاں اُٹھا اُٹھا کر تمہاری طرف اشارہ کرے کہ دیکھو وہ دیوث جا رہا ہے جو اپنی بیوی کو بازاروں میں بے پردہ کر کے لے جاتا ہے۔ بلکہ تم اس کا لباس بنو اور وہ تمہارا لباس بنے، تم اس کو چھپاؤ اور وہ تمہیں چھپائے۔

اور علماء کرام نے یہ بھی فرمایا ہے کہ لباس میں ایک یہ اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ جیسے لباس بدن کو چھپا لیتا ہے مرد عورت کو گناہوں سے چھپالے اور عورت اپنے مرد کو گناہوں سے چھپالے یعنی بچالے۔ اور ہمیشہ اُصول کی بات ہے کہ جب حلال کے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو حرام کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور بعض لوگ دولت اور دنیا کمانے کے لالچ چار چار سال باہر مکہ شریف میں رہتے ہیں اور بیوی اپنے ملک میں ہے تو اس کے پاک رہنے کا ذمہ دار کون ہے؟ دیکھو بھئی! تم بیوی والے ہو، تمہارا دل تمنا کرتا ہے تو عورت کا دل بھی اسی طرح تمنا کرتا ہے، اگر تمہیں خواہش ہوتی ہے تو عورت کو بھی اسی طرح خواہش ہوتی ہے، بلکہ بعض اطباء کے نزدیک تو عورت میں شہوت کا مادہ مرد سے بھی زیادہ ہوتا ہے، یہ تو علیحدہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں شرم کا مادہ رکھ دیا ہے، ورنہ تو خدا رحم کرے کہ انجام کیا ہوتا۔ تو اس لئے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ کہ تم عورت کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو اور عورت تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہے۔

اور اسی لئے علماء کرام نے فرمایا: ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ [الروم: ۲۱] اللہ پاک نے فرمایا کہ میں نے تمہاری جنس میں سے تمہارے لئے بیویاں بنائی ہیں، تا کہ تم ان سے سکون حاصل کر سکو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا ہو سکے۔ اس لئے علماء کرام نے فرمایا کہ جس عورت سے خاوند کو سکون نہ ملے، وہ عورت، عورت کہلانے کی حق دار نہیں اور جس میاں اور بیوی کے درمیان میں مودت اور رحمت نہیں ہے وہ بھی میاں بیوی کہلانے کے حق دار نہیں۔ کیونکہ اللہ پاک نے عورت پیدا ہی اس لیے فرمائی ہے۔

اس لئے فرمایا: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ یہاں سے یہ بھی اشارہ نکلا کہ جیسے تیرا اُن پر حق ہے، اسی طرح ان کا بھی تجھ پر حق ہے۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [البقرۃ: ۲۲۸] اللہ پاک نے فرمایا: یہ نہ سمجھو کہ صرف مرد کا عورت پر حق ہے، بلکہ عورت کا بھی اسی طرح حق ہے کہ اس کے لیے رہائش اور نفقہ کا انتظام کرے، اس کے خرچے کا انتظام کرے اور اس کو ان کاموں سے بچائے جو ذلت و رُسوائی کا سبب بنیں۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے، اس لئے کہ ﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ [النساء: ۳۴] اللہ تعالیٰ نے قوامیت والی صفت مرد کے لیے رکھی ہے۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ اللہ پاک نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ رمضان المبارک میں تم اپنے متعلق خیانت کرتے ہو کیونکہ انسان ہے اب وہ تھکا ہوا ہے اور نیند سے اُٹھا بھوک لگی ہوئی ہے غلطی سے کھا بیٹھا یا اسی طرح سے آدمی ہے جوانی ہے اور صحت ہے اور گھر ہے آدمی رات کو نیند کھل گئی جوان بیوی ہے اور جماع کر بیٹھا ہے، جیسے بعض صحابہ کرام سے ایسی بات واقع ہوگئی، حتیٰ کہ ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں تو برباد ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا ہوگیا؟ تو انہوں نے کہا: حضور! رمضان کی رات میں اپنی بیوی سے مل بیٹھا اور یہ تو منع تھا، اس لیے میں ہلاک ہوگیا۔ (ہوا یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی سو چکی تھی، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا: میں تو سو چکی ہوں، فرمایا: بہانہ کرتی ہو اور اپنی خواہش کو پورا کرلیا۔ حالانکہ میاں بیوی میں سے کوئی بھی سو چکا ہوتا تو اس کا روزہ شروع ہوجاتا)۔ آپ اندازہ کریں حالانکہ بیوی تھی، لیکن شریعت میں ملنے کی اجازت نہیں تھی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اتنے گھبرائے کہ میں تو برباد ہوگیا، میں ہلاک ہوگیا۔ اس لیے مقامِ صحابہ کو سمجھو کہ مقامِ صحابہ اتنا عظیم ہے، اتنا عظیم ہے کہ تم تصور نہیں کرسکتے۔ مگر جو اُن سے غلطی ہوئی، وہ قیامت تک کے لیے دین بن گیا۔ اگر ان سے غلطی نہ ہوتی تو قیامت تک اُمت اس رعایت سے فائدہ کیسے اُٹھاتی؟ اللہ پاک نے قرآن نازل کردیا کہ رات کو ملنے کی تمہیں اجازت ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ اللہ پاک نے تم پر مہربانی کردی اور اللہ پاک نے معاف کردیا۔ ﴿فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ اب تم روزے والی رات میں جماع کرسکتے ہو، لیکن یہ حکم نہیں کہ کرو، بلکہ معنی یہ ہے کہ جماع کرنے کی اجازت ہے، کوئی نہ کرے تو ٹھیک ہے۔ اور رات کو عبادت میں زیادہ وقت گزارے، جیسے حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب آخری عشرہ آجاتا تھا تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چادر کس کے باندھ لیا کرتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگا کر رکھتے تھے۔ چادر کا کس کے باندھ لینے سے یہ اشارہ تھا کہ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے قریب نہیں آتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں اجازت دے دی۔

خیطِ ابیض و خیطِ اسود کے معنی:

اب اگلا مسئلہ سمجھیں۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ

الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ کہ رمضان کی راتوں میں کھاؤ پیو۔ اب تو کھانا بھی حلال، پینا بھی حلال۔ سوال یہ ہے کہ کب تک کھاتے پیتے رہیں؟ تو فرمایا: ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ جب سفید دھاگا کالے دھاگے سے بالکل علیحدہ ہو کر واضح ہو جائے۔ اب یہ معنی یاد رکھو کہ سفید خیط اور سیاہ خیط، سفید ڈور اور سیاہ ڈور، اس سے مراد صبح کاذب اور صبح صادق ہے۔ صبح کاذب یہ ہوتی ہے کہ ایک روشنی ایسے سیدھی اوپر چلی جاتی ہے پھیلتی نہیں ہے، یہ ہے صبح کاذب۔ اور صبح صادق وہ ہوتی ہے جس سے روشنی پھیلنی شروع ہو جائے۔

اچھا یہ مسئلے اس وقت ہیں جب آپ کسی ویرانے میں ہیں اور وہاں کوئی ٹائم یا وقت کے اندازے کے لیے کوئی چیز نہیں تو اس صورت میں آپ کے سامنے اُفق ہے اور آپ صبح صادق دیکھ سکتے ہیں تو وہاں آپ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن جب ہم شہروں اور مکانوں میں ہیں تو بادل ہیں اور ہمیں نظر نہیں آتا تو اب جو گھڑیاں جو چیزیں بن گئی ہیں ان کے مطابق آدمی عمل کرلے کہ صبح صادق فلاں منٹ پر ہو جاتی ہے۔

علماء کرام نے فرمایا کہ فجر کی قید اس لیے لگائی گئی کہ یہ معنی نہیں ہے کہ بعض لوگوں کو بڑی غلط فہمی لگی، انہوں نے حدیثوں کو پڑھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سحری کھاتے رہے، کھاتے رہے کہ صبح ہو گئی۔ بعض لوگوں نے یہ مسئلہ سمجھ لیا کہ صبح ہو جائے تب بھی کھانا جائز ہے، فجر کی اذان ہو جائے تب بھی جلدی جلدی کھانا جائز ہے۔ بعض لوگوں نے یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ آدمی سو گیا تھا اور اذانِ فجر ہو رہی ہے اور نیند کھل گئی تو جب تک اذان ہو رہی ہے کھاتے رہو۔ یہ بات نہیں ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر یہ بات ہوتی تو حضور اکرم ﷺ یہ نہ فرماتے جو آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَمْنَعَنَّ أَحَدَكُمْ أَذَانُ بِلَالٍ مِنْ سَحُورِهِ، فَإِنَّهُ يُؤَذِّنُ لِيَرْجِعَ قَائِمَكُمْ، وَيُنَبِّهَ نَائِمَكُمْ))

[صحیح بخاری، رقم: ۷۲۴۷]

((كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يُؤَذِّنَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ، فَإِنَّهُ لَا يُؤَذِّنُ حَتّٰى يَطْلُعَ الْفَجْرُ))

[صحیح بخاری، رقم: ۱۹۱۸]

تم کو بلال کی اذان منع نہ کرے بلال جب اذان دے چونکہ وہ رات میں اذان دیتے ہیں حتیٰ کہ ابن اُمِّ مکتوم جب اذان دیں تو سحری کھانا بند کر دو۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن اُمِّ مکتوم صبح صادق ہونے کے بعد اذان دیتے تھے۔

ایک صحابی عدی بن ابی حاتم رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے دو دھاگے لیے ایک سیاہ اور ایک سفید اور انہیں سرہانے کے نیچے رکھ لیا اور صبح کے وقت انہیں دیکھ رہے ہیں اور کھا بھی رہے ہیں۔ اب وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں

حاضر ہوئے کہ میں نے تو اس طرح کیا تھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟ تو انہوں نے کہا کہ جی! قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ سیاہ ڈورا جب سفید ڈورے سے جدا ہو جائے تو میں تو دونوں طرح کے ڈورے لے آیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إِنْ كَانَ وِسَادُكَ إِذًا لَعَرِيضٌ، إِنَّمَا ذٰلِكَ بَيَاضُ النَّهَارِ مِنْ سَوَادِ اللَّيْلِ."

[مسند احمد بن حنبل، رقم: ۱۹۳۷۰]

تمہارا سرہانہ تو بڑا ہی لمبا ہے کہ دونوں ڈورے اس کے نیچے آگئے۔

دوسری جگہ یہ الفاظ آئے ہیں:

"إِنَّكَ لَعَرِيضُ الْقَفَا، إِنْ أَبْصَرْتَ الْخَيْطَيْنِ، ثُمَّ قَالَ: لَا، بَلْ هُوَ سَوَادُ اللَّيْلِ وَ بَيَاضُ النَّهَارِ."

[صحیح بخاری، رقم: ۴۵۱۰]

تمہاری گردن چوڑی ہے (کہ اس میں پوری مشرق آجاتی ہے)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد صبح صادق اور صبح کاذب ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ تم سیاہ اور سفید ڈورے لاکر ان کے رنگ دیکھتے رہو۔ یہ تو اللہ پاک نے ہمیں مثال دی ہے۔

دوسرا علماء کرام نے فرمایا کہ یہاں پر لفظ ﴿الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ﴾ فرمایا۔ "خَيط" دھاگے کو کہتے ہیں، معنی یہ ہے کہ صبح صادق کا ذرا سا حصہ بھی واضح ہو گیا تو بس کھانا پینا بند یعنی دھاگے کے برابر بھی صبح صادق ہو جائے۔ اس لیے "خَيط" (یعنی دھاگے) کا لفظ لانے میں بھی اللہ پاک کی حکمتیں ہیں۔

اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ معنی یہ ہے کہ ایسا بھی نہ کرو کہ صبح صادق میں ابھی بیس منٹ باقی ہیں اور کہیں کہ ابھی کھانا بند کر دو اور یہ زیادتی بھی نہ کرو کہ اذان ہو جائے، صبح صادق ہو جائے اور تم کھاتے رہو۔ جہاں جہاں صحابہ کرام کے واقعات ہیں وہ اسی حدیث پر محمول ہیں کہ بعض اکھاتے رہے حتیٰ کہ صبح ہوگئی۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ صبح صادق تک کھاتے رہے، بلکہ معنی یہ ہے کہ وہ زیادہ سختی نہیں کرتے تھے جب تک کہ صبح صادق نہ ہو جائے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرما دیا کہ افطاری میں جلدی کرنا اور سحری میں تاخیر کرنا سنت ہے یعنی افطار میں سورج ڈوبا اور افطار ہو گیا۔ اب تو ہم اذان کا اس لیے انتظار کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں سورج ڈوبتے ہی اذان ہو جاتی ہے، ورنہ روزے کے افطار

کرنے کا تعلق اذان سے نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی جگہ ہو کہ اذان نہ ہوتی ہو اب اگر کوئی اذان دے تو افطار کریں۔ اب مولوی صاحب کو نیند آجائے اور وہ ایک گھنٹے کے بعد اذان دے تو ہمارا روزہ ایک گھنٹہ اور رہ جائے گا؟ نہیں، معنی یہ ہے: ﴿ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴾ غروب شمس کے ساتھ ہے کہ سورج ڈوبا اور افطار۔ (اگر کوئی افطار کے وقت نہ کھائے پیے تب بھی اس کا روزہ مکمل ہو جائے گا)۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَلَا تَقْرَبُوهَا﴾ اللہ پاک نے فرمایا کہ قریب بھی مت جاؤ۔ اس لیے علماء کرام فرماتے ہیں کہ صبح صادق سے بھی ایک دو منٹ پہلے بند کر دو۔ اس لیے کہ حکم یہ ہے کہ قریب بھی مت جاؤ۔ یہ حدیں ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ۔ ﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ﴾ یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اسی طرح فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ﴾ زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ جب تم غیر عورت سے ملو گے ہی نہیں، غیر عورت سے باتیں ہی نہیں کرو گے تو زنا کا خطرہ تو خود بخود ختم ہو گیا ناں۔ اب اگر تم یوں کہو کہ ہم زنا تو نہیں کرتے، لیکن ملنا ملانا تو آج کل کا معاشرہ ہے، اس کے بغیر تو حضرت! گزارہ نہیں ہو سکتا۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے تم اپنے کھیت کے گرد باڑ لگا دیتے ہو کہ جانور وغیرہ میرا گھاس نہ چریں تو جو بکریاں اس باڑ کے قریب ہوتی ہیں کبھی کبھی وہ اندر بھی منہ مار لیتی ہیں، لیکن اگر باڑ کے قریب بھی نہ آئیں تو وہ باڑ کے اندر گھاس نہیں چھوئیں گی۔ اسی طرح مرد بھی روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے نہ ملے، اختلاط پیدا نہ ہو یا نامحرم کو ہاتھ نہ ملائے، اتفاق سے سامنے آجائے تو مرد اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور عورتیں اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور بغیر ضرورت کے باہر نہ نکلیں، بغیر ضرورت کے بات نہ کریں۔ اگر کوئی اجنبی بات کرے تو نرم لہجے میں بات نہ کرے، بلکہ سختی سے جواب دے، تا کہ اس کے دل میں کوئی شک وشبہ پیدا نہ ہو۔

اب تو یہاں بھی یہی حکم ہے کہ تمہیں کھانا پینا سب جائز ہے، بیوی سے ملنا بھی جائز ہے، لیکن کب تک؟ جب تک صبح صادق نہ ہو جائے۔ جب صبح صادق ہو جائے تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ بفرض محال اگر ہم نے روزہ رکھا اور دیکھا کہ بادل ہیں تو ہم نے تحقیق کی، تصور کیا کہ سورج ڈوب گیا، پس ہم نے افطار کر لیا۔ جب افطار کر کے بیٹھ گئے تو سورج نکل آیا تو اب کیا حکم ہے؟ اب ہم گناہ گار تو نہیں ہوں گے، لیکن روزہ قضا کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ سورج موجود تھا اور ہم نے روزہ توڑ دیا، لیکن گناہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ ہم نے تو کوشش کی تھی۔

اسی طرح مثال کے طور پر ہم سحری کھاتے رہے اور ہم نے کہا کہ سحری چار بجے بند ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ

ہماری گھڑی میں ساڑھے تین بجے تھے، ہم نے کہا کہ ابھی آدھا گھنٹہ ہے کھاؤ پیو۔ اب آرام سے کھاتے رہے، کھاتے رہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آدھا گھنٹہ گھڑی ہی غلط تھی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تو صبح صادق کے بعد کھایا تو نتیجہ کیا نکلے گا کہ ہم گناہ گار تو نہیں ہوں گے، لیکن روزہ بھی نہیں ہوگا، ہمیں روزہ قضا کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ ہم نے صبح صادق کے بعد کھالیا ہے، جبکہ صبح صادق کے بعد کھانا پینا منع تھا۔ اسی طریقے سے یہ بات بھی سمجھیں کہ میاں بیوی آپس میں ملے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ جب وہ دونوں فارغ ہوئے تو صبح صادق ہوگئی۔ اب دونوں نے غسل بھی نہیں کیا اور کچھ بھی نہیں کھایا تو اسی حالت میں وہ روزے کی نیت کرلیں اور غسل بعد میں کرلیں تو روزہ درست ہوجائے گا۔ شریعت کے اندر اتنی رعایت ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں بڑی بڑی رعایتیں دی ہیں۔

دوسرا مسئلہ ﴿ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ﴾ کہ دن میں کھانے پینے سے رُکے رہو اور اب تمہارا روزہ پورا ہوگیا۔ کہاں تک پورا ہوگا؟ سورج ڈوبنے تک۔ جب سورج ڈوب جائے گا تو بس روزہ افطار کرلیں گے چاہے تم باہر نکل آئے ہو، لیکن حکم میں تم اعتکاف کے ہو یا تم مسجد میں ہو۔

﴿وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَٰكِفُونَ فِي الْمَسَٰجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَٰتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾ [البقرۃ:۱۸۷]

اعتکاف کے مسائل:

اللہ پاک نے فرمایا کہ رمضان کی راتوں میں میاں بیوی کا ملنا اور جماع کرنا حلال ہے، لیکن جب تم حالتِ اعتکاف میں ہو تو ملنا جلنا اور جماع نہ کرنا۔

یعنی اعتکاف کا معنی کیا ہوتا ہے؟ اعتکاف کا معنی یہ ہے کہ آدمی گھر بار چھوڑ کر مسجد میں آکر دس دن ڈیرہ لگالے، اسے اعتکاف کہتے ہیں۔ بغیر ضرورت کے باہر بھی نہ جائے اور بغیر ضرورت کے کسی سے باتیں بھی نہ کرے، اور اگر ضرورت ہے، مثلاً پیشاب، پاخانہ، استنجاء وغیرہ کی ہے تو اس کے لئے جاسکتا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ جب تم اعتکاف کر بیٹھو تو پھر بیوی سے مجامعت نہیں کرسکتے۔

اچھا اعتکاف کہاں بیٹھے ہو؟ مسجد میں۔ تو بتائیں کہ کیا کوئی مسجد میں بھی جماع کرسکتا ہے؟ تو پھر ﴿وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَٰكِفُونَ فِي الْمَسَٰجِدِ﴾ کا کیا معنی ہے؟ جب تم حالتِ اعتکاف میں مسجد میں بیٹھے ہو تو بیوی

جماع نہ کرو۔ کیا مسجد میں کوئی بیوی سے جماع بھی کر سکتا ہے؟ تو معنی یہ ہوا کہ تم مسجد میں اعتکاف کی حالت میں تھے تو کھانے پینے یا پیشاب پاخانہ وغیرہ کی غرض سے نکلے تو کسی آدمی کا مثلاً مسجد کے قریب گھر ہے، وہاں قضائے حاجت کی، آگے اس کی بیوی بھی موجود تھی، اس نے سوچا کہ رات کو بیوی سے ملنا جائز ہے، جیسے رمضان کی راتوں میں جائز تھا۔ تو فرمایا کہ اب بھی بیوی سے ملنا جائز نہیں ہوگا۔ ملنے کا کیا معنی؟ جماع جائز نہیں ہوگا۔ جب کوئی اور معتکف کی خدمت کے لئے نہ ہو اور بیوی مسجد میں آجائے، کھانا، کپڑا وغیرہ پہنچا دے، خاوند نے اس کو برتن وغیرہ دے دیئے اور کوئی بات وغیرہ کر لی تو یہ منع نہیں ہے۔ اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ کی بیویاں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں مسجد میں آتی تھیں، حالانکہ آپ ﷺ اعتکاف کی حالت میں ہوتے تھے اور حضور پاک ﷺ مسجد سے اُٹھ کر مسجد کے دروازے تک اپنی بیوی کو چھوڑنے کے لئے آتے تھے اور پھر مسجد میں تشریف لے جاتے تھے۔ صرف ملنا منع ہے۔

لیکن بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ مسجد سے مراد وہ مسجد ہے جہاں جمعہ ہوتا ہے، مسجد سے مراد وہ مسجد ہے جہاں جماعت ہوتی ہے۔ اعتکاف ہر مسجد میں جائز ہے اور عورت اپنے گھر میں جگہ مقرر کر کے وہاں اعتکاف میں بیٹھ سکتی ہے۔ سنت اعتکاف رمضان المبارک کا آخری عشرہ ہے اور اگر کوئی شخص پورا مہینہ اعتکاف میں بیٹھنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے، اور اگر بیس دن بیٹھنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے۔ یہاں تک علماء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی مسجد میں داخل ہوتا ہے اور دعا پڑھتا ہے: "بِسْمِ اللّٰهِ وَ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ" تو اگر کوئی شخص وہیں پر یہ نیت بھی کر لے کہ اے اللہ! جتنی دیر مسجد میں رہوں گا، اتنی دیر کے لیے میری اعتکاف کی نیت ہے تو اللہ پاک اس کو بھی اعتکاف کا ثواب عطا فرما دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کچھ وقت کے لیے مسجد میں داخل ہوا اور وہ اتنے وقت کے لیے اعتکاف کی نیت بھی کر لے تو وہ بھی جائز ہے۔

یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ یہ تو سنت اعتکاف ہے، لیکن ہمارے محلے میں سے کوئی ایک دو آدمی بھی رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف بیٹھ گئے تو باقی لوگوں پر اعتکاف چھوڑنے کا گناہ نہیں ہوگا اور اگر کوئی بھی اعتکاف نہ بیٹھے تو ترک سنت کا گناہ ہوگا۔

اب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ یہ جتنے بھی احکام بیان کیے، یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، ﴿فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ ان حدوں کو نہ توڑنا اور نہ ہی ان حدوں کے قریب جانا، تا کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے۔ ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ

ایٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام کو لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ تقویٰ اور پرہیزگاری حاصل کر سکیں اور روزہ زیادہ تقویٰ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۸۸]

''اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کے اموال آپس میں ناحق اور نہ ڈالو ان کو حکام کے ہاں (رشوت میں) تاکہ کھا جاؤ لوگوں کے اموال میں سے کوئی حصہ ظلم کر کے اور تمہیں معلوم ہے۔''

ماقبل آیات سے ربط:

اللہ پاک نے پہلے تو روزہ کا حکم دیا اور فرمایا کہ روزہ اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ پر فرض ہے اور روزہ ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن ہے اور اس کے بعد اللہ پاک نے فرمایا کہ روزہ صرف ایک ماہ کے لئے فرض ہے اور وہ رمضان المبارک کا مہینہ ہے، جس میں تمام کتابیں نازل ہوئیں اور سب سے افضل کتاب یعنی قرآن پاک بھی اسی مہینہ میں نازل ہوا اور اسی مہینہ میں لیلۃ القدر ہے اور اسی مہینہ میں اللہ تعالیٰ نے روزے فرض کئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے روزہ کے متعلق احکامات بیان فرمائے۔ اللہ پاک نے روزہ کے احکام میں اپنے بندوں سے رعایت فرمائی۔ اس کے آخر میں اللہ پاک نے اعتکاف کا حکم بیان فرمایا کہ اعتکاف بیٹھنا سنتِ محمد مصطفیٰ ﷺ ہے اور سب سے افضل اعتکاف رمضان المبارک کے آخری دس ایام ہیں۔ اور اعتکاف کے دنوں میں مزید حکم یہ تھا کہ جیسے رمضان کے دیگر ایام کی راتوں میں معتکف کے لیے بیوی سے ملنا جائز نہیں ہے اعتکاف کی باقی راتوں میں بیوی سے ملنا بھی جائز نہیں۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کھول کھول کر یہ احکامات بیان فرمائے ہیں، تاکہ تم پرہیزگاری حاصل کر سکو اور متقین کی صفوں میں شامل ہو سکو۔ اور روزہ میں چونکہ صبر کی تعلیم ہے اور اپنے آپ کو روکنے کی تعلیم ہے اور قوائے شہوانیہ کے توڑنے کی تعلیم ہے اور قوائے ملکیہ کے اُبھارنے کی تعلیم ہے تو تقویٰ کے لئے روزہ بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ اور روزہ ایسی عبادت ہے جس میں ریا نہیں ہے، ہر عبادت میں ریاء ہو سکتی ہے، جیسے آپ

نماز پڑھ رہے ہوں، دیکھنے والے دیکھتے ہیں۔ اب خیرات کریں تو آپ کسی کو تو دیں گے تو وہ دیکھے گا، لیکن روزہ ایسی عبادت ہے جس کا تعلق اللہ اور بندے کے ساتھ ہے اور کوئی نہیں جان سکتا کہ آپ روزے سے ہیں کہ نہیں ہیں، اگر روزے سے ہیں تو کتنی مشقت میں ہیں؟ کسی دوسرے شخص کو اس کا احساس نہیں ہو سکتا۔ جیسے خدانخواستہ کوئی آدمی روزہ نہ رکھے اور گھر میں جا کر پانی پیتا رہے تو کسی کو کیا پتہ چلے گا اور اگر آپ نے روزہ رکھا ہوا ہے تو دیکھنے والے کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ روزے سے ہے کہ نہیں ہے۔ اس آیت کا گزشتہ آیات کے ساتھ بظاہر کوئی تعلق اور جوڑ معلوم نہیں ہوتا۔

﴿وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دھوکے سے مال کھانا، اس میں تمام بیوع فاسدہ آگئیں، جتنی بیوع حرام ہیں وہ سب آگئیں۔ کتب فقہ میں ان کی تفاصیل موجود ہیں۔ ان کے ذریعہ سے مال کھانا، یہ بھی باطل ہے۔ اسی طرح جوا، سٹہ، قمار بازی وغیرہ سب باطل ہیں کہ ہزاروں آدمیوں کو لوٹ کر ایک آدمی کا گھر بھرا جاتا ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ مثلاً جوا کہ آپ ایک پرچی ڈالتے ہیں اور وہ تمہارے نام نکل آتی ہے اور آپ جیت جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جی! یہ تو قسمت کا کھیل ہے۔ قسمت تو تب ہو کہ اللہ پاک نے اس کی اجازت بھی دی ہو، جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے تو وہاں پر قسمت کا کیا تعلق ہے؟ وہاں قسمت آزمانے کا کیا مسئلہ ہے؟ اسی طرح رشوت کا مال، ڈاکہ، چوری، یتیموں کا مال، دھوکے سے کسی کا مال حاصل کرنا، اسی طرح پاسپورٹ بیچنا، بندوں کو بیچنا، ویزے بیچنا، غلط اور حرام چیزوں کو بیچنا سب اموال بالباطل ہیں۔

مال حرام کی اقسام و احکام:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع فرما دیا: ﴿وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾ یہاں پر ﴿أَمْوَالَكُم﴾ فرمایا، کیا معنی کہ تمہارا مال۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو تم اپنے بھائی کا مال لوٹ رہے ہو یا دھوکے سے کھا رہے ہو در اصل یہ تمہارے بھائی کا مال گویا تمہارا مال ہے اس لیے کہ تم مسلمان ہو اور مسلمان تو ایک دوسرے کے بھائی ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے اُخوتِ ایمانی رکھتے ہیں۔ اب جیسے تم اس کا مال لوٹ رہے ہو، ایسے کوئی دوسرا آدمی آ کر تمہارا مال لوٹ لے گا۔ لہٰذا تم کسی دوسرے کا مال نہیں لوٹ رہے، بلکہ حقیقت میں اپنا مال لوٹ رہے ہو، تم اپنے مال کو حرام کر کے کھا رہے ہو۔

اگر ہم حرام مال کی ان تمام اقسام سے بچ جائیں تو دنیا کے سارے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے چونکہ ہم معاشیات کے طالب علم نہیں ہیں لیکن جو لوگ اس کو سمجھتے ہیں تو دیکھیں کہ جب آپ دنیا کے کافروں سے کسی قسم کا کوئی قرض لیتے ہیں تو آپ کو بظاہر ایک سنہرا خواب نظر آتا ہے کہ جی! ہم کو اتنا قرضہ مل گیا۔ لیکن اگر آپ بیٹھ کر اس کا تجزیہ کریں کہ انہوں نے آپ کو قرضہ نہیں دیا، بلکہ وہ تو آپ کا خون بھی نچوڑ لیتے ہیں۔ اگر آپ اس کا تجزیہ کریں گے کہ انہوں نے جو قرضہ دیا ہے وہ قرضہ نہیں دیا، بلکہ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ تمہارا خون نچوڑ کر وہ اپنی تجوریاں بھر ڈالیں اور تم اسی طرح غریب تر ہوتے چلے جاؤ، ان کے مقروض ہونے کے بعد دیتے چلے جاؤ۔

جیسے ہمارے ملک میں بے چارے لوگ سودی قرضہ لیتے ہیں کہ اگر باپ نے قرضہ لیا تھا تو بیٹے بیچارے جائیدادیں بیچ کر قرضہ ادا کرتے ہیں، جائیدادیں اور زمینیں بک گئیں اور بعض لوگوں نے اس سودکاری کے چکروں میں اپنی بیٹیوں کی عزتیں اور عصمتیں بیچ ڈالیں۔ اپنی لڑکیاں بوڑھوں کو دینی پڑیں کہ کسی طریقے سے ہماری قرض سے جان چھوٹ جائے لیکن قرضہ پھر بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایسی آکاس بیل ہے، ایسی لوط کی ٹہنی ہے کہ جس درخت پر ڈال دو، اس کو کھا جاتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تمام چیزوں کو منع فرما دیا کہ ایسے طریقے اختیار کرنا اسلام کے اندر جائز نہیں، بلکہ تم خالص حلال طریقے سے کام کرو۔

حرام طریقہ سے مال کھانے کے مسائل:

اگلا مسئلہ اللہ پاک نے بیان فرمایا: ﴿وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٨﴾﴾ اب مسئلہ یہ ہے کہ مثلاً ایک آدمی جھوٹا ہے، لیکن وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرے پاس ایسے ذرائع موجود ہیں کہ اگر میں کورٹ میں جا کر دعویٰ کروں اور میرے پاس جھوٹے گواہ بھی ہیں، جھوٹی دستاویزات بھی بنا سکتا ہوں اور یہ آدمی جاہل ہے اور اس کی جائیدادیں قانوناً قبضہ میں کر سکتا ہوں۔

جیسے بعض لوگ بے چارے فوت ہو گئے۔ انہوں نے اپنی جائیداد مثلاً مکان، دکان وغیرہ آپ کو کرائے پر دی تھی۔ اب جب مالک مر گیا تو جو کرایہ دار تھا، وہ بڑا تیز اور شرارتی تھا، اس نے مرنے والے کا انگوٹھا بھی لگا لیا اور دو گواہ بھی بنا لیے اور عدالت میں جا کر دعویٰ کر دیا کہ یہ مکان میرا ہے، یہ تو اس آدمی نے مجھے بیچا تھا۔ اب انگوٹھے کی

شناخت کیسے کروائیں کہ وہ تو قبر میں چلا گیا ہے؟ اس کا بیان کیسے لیں کہ وہ تو مر چکا ہے؟ اب جو دو گواہ ہیں، وہ بھی اس کی اپنی پارٹی کے ہیں اور وہ گواہی دیتے ہیں کہ جناب! بالکل ٹھیک ہے، وہ آدمی آیا تھا اور اس نے ہمارے سامنے پیسے لئے اور اس مکان کو بیچا تھا اور یہ کہا تھا کہ میرے بچوں کو نہ بتانا کہ وہ پریشان ہوں گے۔ وہ تو جناب! کورٹ اس کے حق میں فیصلہ کر دیتی ہے کہ مکان اس کا ہے۔

تو اللہ پاک نے منع فرمایا ہے کہ تم جھوٹے ہونے کے باوجود تم جانتے ہو کہ میں جھوٹا ہوں، میری دستاویزات جھوٹی ہیں، تم جانتے ہو کہ میرے گواہ جھوٹے ہیں، لیکن تم عدالت کے ذریعے اس کو حلال کر کے جو کھا رہے ہو، یہ حلال نہیں ہوتا، عدالت حلال نہیں کر سکتی۔

عدالت نے اگر جھوٹی شہادت کی بناء پر فیصلہ کر دیا ہے تو تمہارے لئے قیامت کے دن اسی طرح جہنم کا ٹکڑا بنے گا۔ تم یہ نہ سمجھو کہ قانون نے میرے لیے حلال کر دیا۔ مجھے تو جی! کورٹ نے کہہ دیا ہے کہ آپ کا ہے، یہ میرے لیے حلال ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ تم تو جانتے ہو کہ یہ میرے لیے حرام ہے۔ اسی لئے میرے آقا خاتم الانبیاء سرکار مدینہ ﷺ نے فرمایا کہ اے لوگو! دیکھو، میرے پاس مدعی اور مدعا علیہ آتے ہیں اور ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو بات کرنی آتی ہے کہ جھوٹے ہونے کے باوجود ایسے لگتا ہے کہ وہ سچا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس کی بات میں آ کر میں کوئی فیصلہ کر دوں، حالانکہ وہ حق پر نہ ہو تو یہ نہ سمجھنا کہ اللہ کے نبی نے مجھے دے دیا ہے، بلکہ وہ جہنم کا ایک ٹکڑا ہو گا جو تیرے لیے عذاب کا باعث بنے گا۔ اس لیے کہ اس نے تو اپنی چالاکی سے اپنی ملکیت کو ثابت کر دیا ہے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ہے کہ ایک آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے دعویٰ کیا کہ یا رسول اللہ! فلاں چیز میری ہے اور اسلام کا ایک واضح اُصول ہے کہ آپ نے دعویٰ کیا ہے تو گواہوں کے ذریعے ثبوت آپ کے ذمہ ہے اور مدعا علیہ اگر مان لے تو بات ختم۔ اور اگر وہ انکار کرنے والا ہے اور مدعی کے پاس گواہ بھی نہیں ہیں تو مدعا علیہ قسم کھالے تو بھی آپ کو بات تسلیم کرنی ہو گی۔ پس حضور اکرم ﷺ نے مدعی کو بلایا اور فرمایا کہ ثبوت پیش کرو تو اس نے کہا کہ حضور! ثبوت تو کوئی نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں سچا ہوں، لیکن اتفاق کی بات یہ ہے کہ میرے پاس گواہ نہیں ہیں اور حالات ایسے ہیں کہ اس واقعہ کو جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کا

تو بڑا واضح حکم ہے کہ اگر تمہارے پاس ثبوت نہیں ہیں تو ہم مدعا علیہ کو قسم دیتے ہیں اور تم اس کی قسم پر اعتبار کر لینا۔ اس نے کہا: حضور! ٹھیک ہے، شریعت جو حکم دیتی ہے وہ میری آنکھوں پر۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قسم کھانے سے پہلے سوچ لو کہ اللہ پاک کا قرآن ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ [آل عمران: ۷۷] کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، ان کے لیے جہنم کا بڑا دردناک عذاب ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں جھوٹی قسم کھا کے نکل گیا اور آگے کوئی نہیں پوچھے گا تو پھر ایک ایک ذرّے کا حساب ہوگا، پھر اس وقت تو دنیا کا عذاب نہیں، بلکہ جہنم کا عذاب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کے پاک پیغمبر ﷺ نے جب یہ آیت پڑھی تو اس نے کہا: حضور! اگر معافی دیں تو میں عرض کروں۔ فرمایا: بتاؤ، کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ میں تو جھوٹی قسم کھا رہا تھا، مدعی سچا ہے اور یہ چیز اسی کی ہے۔ اس پر بھی اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

تنسیخ نکاح کے بعد دوسری جگہ شادی:

اسی طرح جیسے ہمارے ملک میں رواج ہے کہ جیسے کوئی آدمی عرب ممالک میں یا کسی ملک میں نوکری کے لیے چلا گیا۔ اب اس کی بیوی کے ساتھ کسی شیطان نے ناجائز تعلقات پیدا کر لیے، اس کو راضی کر کے کورٹ میں جا کر تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کر دیا۔ اب تنسیخ نکاح کے دعویٰ کے بعد لازمی بات ہے کہ کورٹ اس کے شوہر کو طلب کرے گی، وہاں سے باقاعدہ سمن نکالے گی اور ان کی رجسٹری ایسے انداز سے کی گئی کہ رجسٹری بھیج دی گئی اور یہاں اپنے بندے سے اس پر تعمیل کے دستخط کروا کر واپس منگوا لیے اور شوہر کو بتایا ہی نہیں یا سمن کورٹ سے تو نکلتے ہیں، لیکن باہر جاتے ہی نہیں اور تعمیل کرانے والوں کو پیسے دے دیے گئے اور انہوں نے لکھ دیا کہ تعمیل سمن کرانے کے لیے بندہ گیا تھا لیکن شوہر چھپ جاتا ہے، وہ ہمیں مل نہیں رہا۔ اب ایک رپورٹ آئی، دوسری رپورٹ آئی اور اس کے بعد یکطرفہ ڈگری مل گئی اور عورت کو تنسیخِ نکاح مل گئی۔ شوہر بے چارا یہاں بیٹھا ہوا ہے اور عورت نے تنسیخ نکاح کی ڈگری لے لی اور نکاح کر لیا اور کسی نے کہا تو جواب دیا کہ ہم نے تو عدالت سے فیصلہ لیا ہے۔ ایسی عدالت سے حرام تو حلال نہیں ہوتا اور نہ کوئی حلال حرام ہو جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ تم جانتے ہو کہ تم جھوٹے ہو۔ جب تمہیں پتہ ہے کہ اس بات پر میرا حق نہیں بنتا ہے تو پھر تم دھوکہ دے کر لے رہے ہو تو یہ تمہارے لیے حرام ہے۔

دودھ روکے ہوئے جانور کا بیچنا اور اس کی قیمت کا حکم:

اسی طرح مثلاً ایک آدمی نے گائے خریدی ہے، بھینس خریدی ہے اور دودھ والے جانوروں کی قیمت دودھ سے لگتی ہے جتنا دودھ زیادہ ہوگا اتنی ہی زیادہ قیمت لگے گی۔ مثلاً ایک گائے دس کلو دودھ دیتی ہے تو قیمت بھی دس ہزار ہوگی اور اگر وہی گائے دو کلو دودھ دیتی ہے تو اس کی قیمت دو ہزار ہو جائے گی۔ تو بعض لوگ اس کو اچھا چارہ کھلاتے ہیں اور ایک دو دن اس کا دودھ نہیں نکالتے، اب کے تھن بھر گئے اور دودھ جمع ہے اور لینے والے کو بلایا کہ جی! آپ اپنے ہاتھ سے دودھ نکالیں۔ اس نے جب دودھ نکالا تو دس کلو نکل آیا تو اس نے کہا: ٹھیک ہے جی! یہ لو دس ہزار اور اس نے کہا کہ جی! آپ نے خود دیکھ لیا ہے کہ دس کلو دودھ ہے اور آپ نے اپنے ہاتھوں سے نکالا ہے۔ لیکن اللہ پاک فرماتا ہے کہ میں تو جانتا ہوں کہ تم نے کیا کیا ہے تو یہ بیع بھی حرام ہے۔

اسی لیے اسلام نے ایسی بیوع کہ مثلاً آپ کے باغ میں پھل نہیں پکے اور آم نہیں آئے، ابھی اس کا تھوڑا تھوڑا بور لگا ہوا ہے اور آپ نے سودا کر لیا ہے، یہ بیع بھی حرام ہے۔ اس لیے کہ پتہ نہیں کہ کل کو پھل لگے گا یا نہیں لگے گا۔ پس شریعت میں اس بیع کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ جاہلیت کی خرید و فروخت:

اسی طرح زمانہ جاہلیت میں ایک رواج تھا کہ کپڑا لے کر کھڑے ہو جاتے تھے اور آواز لگاتے تھے کہ دس ریال، دس ریال، دس ریال۔ پس خریدار نے کہا کہ ٹھیک ہے بس کپڑا پھینک دیا کہ ٹھیک ہے دس ریال میں قبول ہو گیا۔ اب گھر جا کر کھولا تو دیکھا کہ دس جگہوں سے پھٹا ہوا ہے تو یہ بیع بھی شریعت میں حرام ہے۔

اسی طرح زمانہ جاہلیت میں کنکری کے پھینکنے کے بعد سودے ہوا کرتے تھے کہ مثلاً کنکری اُٹھا کر پھینک دی کہ میری کنکری جس کپڑے پر پڑ جائے تو وہ میرا ہو گیا۔ یہ بھی حرام ہے۔

اسی طرح آپ کوئی چیز بیچتے ہیں اور آپ کو اپنی چیز کے عیب کا پتہ ہے اور آپ دھوکے سے اس کے عیب پر پردہ ڈال دیتے ہیں تو یہ بھی حرام ہے۔ تجارت کرنا کوئی عیب نہیں، بلکہ سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال سے تجارت کی اور قرآن و حدیث میں تجارت کا تذکرہ ہے، بلکہ بعض علماء کرام نے تو یہ بھی فرمایا ہے کیونکہ قرآن و حدیث میں تجارت کا تذکرہ ہے، اسی لیے تجارت میں بندے کے لیے

بہت برکت اور زیادہ نفع ہے۔ لیکن یہ کہ تجارت سود، دھوکہ اور حرام اُمور سے پاک ہو۔

قیامت کے دن تین سوالات سے پہلے کوئی نہیں ہل سکے گا:

اس لیے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهِ حَتَّى يُسْأَلَ." [جامع ترمذی، رقم:۲۴۱۶]

قیامت کے دن میدانِ حشر میں کسی بندے کے پاؤں نہیں ہلیں گے جب تک کہ ان پانچ چیزوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا کہ زندگی اور جوانی کہاں خرچ کی؟ مال کہاں سے حاصل کیا اور کہاں کہاں خرچ کیا؟ اور اسی طرح سوال کیا جائے گا کہ میں نے تجھے جو علم دیا تھا، اس پر تُو نے خود بھی عمل کیا کہ نہیں؟

حرام کھانے کا نتیجہ:

حرام کھانے سے دعا قبول نہیں ہوتی، آدمی گناہوں کی طرف مائل ہوگا، عبادت میں لذت نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ کا خوف جاتا رہے گا اور اولاد بھی بد ہوگی۔ حرام سے بدن میں جو دودھ پیدا ہوا وہ بھی مال حرام کی پیداوار ہے، جب حرام چیزوں سے بچوں کو جوان کیا تو ان سے کیا توقع ہوگی کہ وہ قرآن وسنت پر عمل کرنے والے بنیں گے؟

حلال رزق کی برکات وثمرات:

حلال کی سوکھی روٹی سے پلنے والا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تھا۔ جب حلال روٹی اندر جاتی تھی تو مولوی الیاس بنتا تھا جس نے پوری دنیا میں تبلیغ کو پھیلا دیا۔ جب حلال کی روٹی اندر جاتی تھی تو شیخ الہند بنتا تھا، انور شاہ کشمیری بنتا تھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس نہ تو تیر وتلوار تھے نہ کوئی نئی ٹیکنالوجی، میزائل اور راکٹ وغیرہ تھے، کیا بات تھی کہ عمر مدینہ میں بیٹھا ہے اور دریاؤں کو خط لکھتا ہے کہ چلتے ہو تو چلو، ورنہ بند ہو جاؤ۔ آج ہمیں ہندو ڈراتا ہے اور کافر ہم پر ہنستا ہے اور بتوں کا پجاری ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مذاق اُڑاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر سب کچھ ہے، لیکن اسلام نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں اکلِ باطل سے بچنا چاہیے اور اکلِ حلال کا اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِھَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۱۸۹]

"آپ سے نئے چاند کا حال پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے یہ (تغیر) لوگوں کے اوقات (معلوم کرنے) اور حج کے لیے ہیں اور یہ نیکی نہیں کہ تم (احرام کی حالت میں) گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ، بلکہ نیکی وہ ہے جو اللہ سے ڈرے، اور اپنے گھروں میں (احرام کی حالت میں) ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرو، تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔"

شانِ نزول اور چاند سے متعلقہ شرعی احکام:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے ابتدائی دنوں کے بارے میں پوچھا کہ سورج ایک حالت میں ہے اور چاند بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے تو اس میں ہمارے لئے کیا مصلحتیں اور کیا مفادات ہیں؟ تو اللہ پاک نے قرآن پاک میں یہ آیات نازل فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے چاند کا گھٹنا اور بڑھنا اس لیے بنا دیا ہے کہ وہ اپنے دین کے مسائل کو سمجھ سکیں اور اپنی عورتوں کی عدت کے معاملات اور ان کے آپس کے معاہدات کا تعلق چاند اور قمری تاریخوں کے ساتھ ہے۔ نیز روزوں کے متعلق کہ کب روزہ شروع ہوگا اور کب ختم ہوگا؟ ان سب کا تعلق چاند کے ساتھ ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ اللهَ قَدْ جَعَلَ الْأَهِلَّةَ مَوَاقِيتَ فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَصُومُوا وَ إِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَأَفْطِرُوا، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ." [مستدرک الحاکم، رقم: ۱۵۳۹]

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے چاند مقرر کر دیا ہے، اس کو دیکھ کر روزے شروع کرو اور اسے دیکھ کر روزہ کو افطار کرلو۔ مطلب یہ ہے کہ روزہ کا فیصلہ بھی چاند پر ہوگا اور عید کا فیصلہ بھی چاند پر ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر ایک سوال کے جواب میں قرآن پاک اُتارا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال پوچھا کہ یہ چاند ابتداء میں باریک ہوتا ہے، پھر بڑھتا ہے اور بڑھتے بڑھتے مکمل ہو جاتا ہے اور پھر گھٹنا شروع ہو جاتا ہے، لیکن سورج اپنی ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ایسی پاکیزہ جماعت تھی کہ جنہوں نے صرف چودہ سوالات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے ہیں، حالانکہ پہلی کئی اُمتیں کثرتِ سوال کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔ صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم کا کمال ادب تھا کہ وہ زیادہ سوالات نہیں پوچھتے تھے، بلکہ وہ سوالات پوچھتے تھے جن سے اُمت کو کوئی فائدہ ہوتا تھا۔ ان چودہ سوالات میں سے چھ سوالات تو سورۃ البقرہ میں مذکور ہیں اور باقی آٹھ سوالات باقی سورتوں میں ہیں۔

پہلا سوال: ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ﴾ (اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں)۔

دوسرا سوال: ﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ﴾ (آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ہم کتنا خرچ کریں)۔

تیسرا سوال: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ (آپ سے سوال کرتے ہیں کہ حرمت والے مہینے کون سے ہیں اور حرمت سے کیا مراد ہے؟)۔ ان کو جواب دیا گیا کہ حرمت والے مہینے چار ہیں۔ ان کی حرمت یہ ہے کہ ان میں جنگ نہ کی جائے۔ وہ چار مہینے یہ ہیں: (۱) ذی القعدہ، (۲) ذی الحجہ، (۳) محرم الحرام، (۴) رجب۔

چوتھا سوال: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ﴾ (انسان کی بیوی حیض کی حالت میں ہو تو کیا حکم ہے کہ میاں بیوی حیض کی حالت میں مل سکتے ہیں یا نہیں؟ تو حکم یہ ہے کہ نہیں مل سکتے۔ اس لیے کہ یہ پلید ہے اور گندگی ہے۔ اس لیے مرد ایامِ حیض میں اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کرنے سے دور رہے اور بالکل اس کے قریب بھی نہ جائے، حتیٰ کہ بیوی پاک ہو کر غسل کرلے اور صاف ہو جائے تو ان کے لیے بیوی حلال ہے۔

پانچواں سوال: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ (آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں)۔

چھٹا سوال: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ﴾ اس سوال کے اندر تو یہ ہے کہ اس کے گھٹنے اور بڑھنے میں ہمارے لیے مصلحت ہے اور ایک یہ ہے کہ اس کے گھٹنے اور بڑھنے کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کیوں اور کیسے گھٹتا اور بڑھتا ہے؟ یہ سوال تو فضول ہے، اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کو فضول باتوں میں ڈالنا چاہتا ہی نہیں ہے۔ آج تک لوگوں نے چاند تاروں کے بارے میں جو بھی بحثیں کی ہیں، ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ان چیزوں کی تحقیقات پر جو پیسہ خرچ کیا گیا، اگر اس کا حساب کیا جائے تو اتنا پیسہ بنتا ہے کہ اگر اسے ساری دنیا پر تقسیم کیا جائے تو دنیا میں کوئی غریب باقی نہ رہے۔ اللہ پاک نے ہمارے لئے واضح کر دیا کہ ہم نے ستارے آسمانوں کی زینت کے لیے بنائے ہیں، ﴿وَعَلَامَاتٍ ۚ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ﴿١٦﴾﴾ [النحل: ۱۶] اور تیرے لئے راستہ دکھانے کے لئے ایک ذریعہ ہیں، اور پھر آسمانوں کی

حفاظت کے لئے شہاب ثاقب بنائے ہیں، تا کہ شیاطین آسمانی باتیں نہ سن سکیں۔ یہ جو چیزیں اللہ پاک نے بتادی ہیں، وہ کافی ہیں۔ اس لئے یہ بات سمجھیں کہ ان کا سوال اگر مصالح کے بارے میں ہے تو یہ ٹھیک ہے اور اگر مثال کے طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی حقیقت کے بارے میں سوال کیا تھا تو یہ بات اگر چہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مزاج سے بعید ہے، پھر بھی جواب مصلحت کے بارے میں دیا گیا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم اس چکر میں نہ پڑو۔ جیسے کسی آدمی کو پیاس لگی ہو اور وہ پانی پانی کی آواز لگائے، اب کوئی آدمی پانی لے کر حاضر ہو جائے تو اس کا کام یہ ہے کہ وہ چپ کر کے پانی پی لے اور اپنی پیاس بجھالے اور اس چکر میں نہ پڑے کہ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ پانی کیسے بنتا ہے؟ اس میں ہائیڈروجن کی کتنی مقدار ہوتی ہے اور فلاں فلاں چیز کی کیا نسبت ہے؟ اس طرح کرے گا تو پانی پینے سے پہلے مر جائے گا۔ بھئی! حقیقت کو کیوں دریافت کر رہے ہو؟ تم اپنی غرض پوری کرو کہ جس مقصد کے لئے اللہ پاک نے تم کو پانی دیا ہے تم پانی پی لو ٹھیک ہے۔ پس اللہ پاک نے جواب یہ دیا: ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ [البقرۃ:۱۸۹]

﴿الْأَهِلَّةِ﴾، ہلال کی جمع ہے۔ ہلال کا معنی یہ ہے کہ جو پہلی چند راتیں ہوتی ہیں، مثلاً پہلی، دوسری اور تیسری رات، ان میں جو چاند ہوتا ہے اسے ہلال کہتے ہیں اور اس کے منازل بدلتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ بدر کامل بن جاتا ہے اور چودھویں کی رات میں آکر اس دائرہ مکمل ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد گھٹتے گھٹتے ایسے ہو جاتا ہے: ﴿كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝﴾ [یٰسین:۳۹] جیسے کھجور کی ٹہنی سوکھ کر ٹیڑھی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے چاند کا گھٹنا بڑھنا تمہارے لئے اوقات کار کی تقسیم کے لئے اور حج کے لئے بنایا ہے۔

معنی یہ ہے کہ بعض معاملات اختیاری ہوتے ہیں اور بعض معاملات غیر اختیاری ہوتے ہیں۔ مثلاً میں نے آپ سے قرضہ لیا اور کہا کہ میں آپ کو ایک ماہ کے بعد دوں گا تو اب وہ ایک ماہ کا حساب چاند کی تاریخ سے کریں گے۔

اسی طرح اگر ہم یہ معاہدہ کریں کہ ہم یہ کام اکٹھے کر لیتے ہیں اور سال کے بعد حساب کریں گے۔ تو اب معاہدے کا وقت کیسے متعین کریں گے؟ چاند سے یہ معاملات اختیاری ہوئے۔

اسی طرح بعض معاملات ہمارے اختیار میں نہیں ہوتے، بلکہ ان کا نظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، جیسے حج ہے کہ وہ سال میں ایک دن آئے گا، چنانچہ نو ذی الحجہ کو ہم نے حج کے لئے عرفات میں جانا ہے، اس کا حساب بھی چاند سے ہوگا۔

اسی طرح رمضان المبارک کے روزوں کا حساب بھی چاند سے ہوگا۔

اسی طرح ایام حیض کے دنوں کا شمار بھی چاند کی تاریخوں کے حساب سے ہوگا۔ اور اسی طرح کسی عورت کا خاوند مرجائے تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہوتی ہے، وہ بھی چاند کے حساب سے شمار ہوگی۔ پس اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا کہ اس کے گھٹنے اور بڑھنے میں آپ کے لیے فائدہ ہے کہ میقات، عدتیں، معاہدے، حج، روزہ وغیرہ تمام کا مسئلہ چاند کے حساب پر موقوف ہے۔

لیکن یاد رکھیں کہ حساب چاند سے بھی ہوتا ہے اور سورج سے بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورج کا بھی قرآن پاک میں ذکر فرمایا ہے۔ اللہ پاک نے جہاں ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ فرمایا ہے، اسی طرح ﴿فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ﴾ [الاسراء: ۱۲] (پھر ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی روشن نشانی کو باقی رکھا، تاکہ تم اپنے رب کا رزقِ حلال حاصل کرسکو اور سالوں اور مہینوں کے حساب کو جان سکو)۔

اب قرآن پاک نے یہ بتا دیا کہ حساب چاند سے بھی ہوسکتا ہے اور سورج سے بھی ہوسکتا ہے، لیکن ان دونوں کے دورے میں فرق ہے کہ چاند کا دورہ اٹھائیس راتوں میں مکمل ہوجاتا ہے اور سورج کا دورہ تقریباً تین سو ساٹھ دنوں میں مکمل ہوتا ہے۔ اب یہ چاند اٹھائیس راتوں میں اپنا دورہ مکمل کرلیتا ہے تو پھر جب وہ ڈوب جاتا ہے تو اگر وہ دو راتیں ڈوب جاتا ہے تو مہینہ تیس کا ہوگا اور اگر ایک رات ڈوبتا ہے تو مہینہ اُنتیس دن کا ہوگا تو اس سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے حساب رکھا ہے۔ لیکن اسلام میں حساب کا زیادہ دارومدار چاند کا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ چاند کے منازل کو دیکھ کر حساب لگانا اتنا آسان ہے کہ جنگل میں رہنے والا بدو بھی چاند کو دیکھ کر بآسانی حساب لگا سکتا ہے کہ آج پہلی کا چاند ہے، آج دوسری کا اور آج تیسری کا چاند ہے، آج تیرھویں ہیں، آج چودھویں ہے وغیرہ وغیرہ، یہ حساب آسان ہے۔ اور سورج کا حساب آلاتِ رصدیہ کے سوا اس کو دیکھا اور سمجھا نہیں جاسکتا، گو اس کا حساب رکھنا بھی جائز ہے، لیکن شریعت کے احکام کا مدار چاند کے حساب پر ہے۔ لہٰذا علماء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی چاند کے حساب کو بالکل چھوڑ دے اور اپنے معاملات کو صرف شمسی تاریخوں کے حساب پر رکھے جیسے آج کل عام رواج ہوگیا ہے کہ مسلمانوں کو بالکل پتہ ہی نہیں ہوتا کہ آج اسلامی مہینہ کون سا ہے تو یہ جائز ہے، لیکن وہ گناہ گار ہوگا۔ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ نظام کو چھوڑنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔ البتہ آپ نے غیر ملک سے معاملات

کرنے ہیں تو علیحدہ بات ہے۔ لیکن اپنے پاس کوئی عربی تاریخوں کے محفوظ رکھنے کا ذریعہ تو بنائیے، تاکہ تمہیں پتہ چلے کہ اسلام کیا کہتا ہے کہ اسلام کے مہینے کون کون سے ہیں؟ اسلام کے مہینوں کی ابتداء وانتہاء کہاں سے ہوتی ہے؟ تاکہ آپ کو پتہ ہو کہ محرم الحرام کیا ہے؟ نیز صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ کیا ہیں؟

مسلمانوں کو کم از کم ان کا حساب رکھنا بھی ضروری ہے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین سے متعلق رہیں۔ اور جیسے ہمارے حساب کا دارومدار چاند پر ہے تو ہماری تاریخ کی ابتداء بھی ہجرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے ہے، اس لئے مسلمانوں کی تاریخ کو ہجری کہا جاتا ہے، جیسے آپ دیکھیں گے کہ ۱۴۱۵ھ۔ تو دوسروں کی یعنی عیسائیوں کی تاریخ کو میلادی کہا جاتا ہے، جیسے آج کل لکھا جاتا ہے ۱۹۹۴ء۔ تو جو انیس سو چورانوے ہے وہ میلادی ہے۔ میلادی کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تاریخ کی بنیاد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی میلاد سے رکھی ہے۔

اس لئے میلاد منانا جیسے آج کل مالدار لوگ اپنی سالگرہ مناتے ہیں، یہ اسی عیسائیت کی اور انگریزوں کی اتباع اور تقلید ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مشورہ کیا کہ ہم اپنی تاریخ کی ابتداء کہاں سے کریں تو لوگوں نے کہا کہ جس دن آپ ﷺ پیدا ہوئے، ہم بھی اپنی تاریخ کی ابتداء اسی دن سے کریں گے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ پھر ہمارے اور نصاریٰ کے درمیان کیا فرق رہا؟ وہ بھی میلادی اور ہم بھی میلادی، وہ بھی سالگرہ والی پارٹی اور ہم بھی سالگرہ والی پارٹی۔

پھر یہ بھی ہے کہ کتنے بڑے مسلمان کا گھر کیوں نہ ہو، وہ سالگرہ مناتے بھی نصاریٰ کے طریقے پر ہیں اور من وعن ایسی نقل کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ واقعی نصاریٰ کی اولاد ہیں (اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ)۔ اگر ہم نے حضور اکرم ﷺ سے محبت کی ہوتی تو کیا آپ ﷺ نے اپنی، اپنے بیٹوں یا بیٹیوں وغیرہ کی سالگرہ منائی؟ اور اگر حضور اکرم ﷺ نے نہیں منائی اور ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے کروڑوں بیٹے حضرت محمد عربی ﷺ کے ایک بیٹے کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہو سکتے تو اگر ان کے لیے نہیں تو ہم نے یہ کس کی اتباع کی ہے؟ نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے منائی، نہ تابعین نے اور نہ ہی اہل بیت نے تو ہم کس کی اتباع میں منا رہے ہیں؟ کہتے ہیں: جی! یہ خوشی ہے۔ کیا خوشی؟ اور غیر اسلامی؟ پس اسلام نے میلاد کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ کہا کہ ہم اپنی تاریخ کی ابتداء اس دن سے رکھیں جس دن قرآن اُترا۔ انہوں نے

کہا کہ قرآن تو تیئس (23) برس اُتر تا رہا۔ پھر انہوں نے کہا کہ نہیں، بلکہ ہم اپنی تاریخ کی ابتداء اس دن سے رکھیں جس دن حضور اکرم ﷺ کی ہجرت سے اسلام چمکا ہے کہ جب اللہ پاک کے نبی ﷺ نے اسلام کے لئے گھر چھوڑا، اسلام کے لیے قربانیاں دیں اور اپنا محبوب وطن چھوڑا، اللہ تعالیٰ کا گھر چھوڑا، غاروں میں پناہ لی، چھپ چھپ کر سفر کئے اور اسلام کو اللہ تعالیٰ نے پھر چار چاند لگا دیئے کہ اسلام ہجرت کے بعد چڑھتا گیا، چڑھتا گیا اور پھیلتا گیا تو انہوں نے کہا کہ تاریخ کی ابتداء ہجرت سے ہی رکھو۔ اس لئے ہماری تاریخ بھی ہجری ہے اور ہماری تاریخ کا مدار بھی چاند پر ہے۔

اور یاد رکھیں کہ جو لوگوں کی فلسفیانہ بحثیں ہیں کہ زمین گھومتی ہے یا چاند گھومتا ہے یا دونوں گھومتے ہیں یا یہ بالعرض گھومتے ہیں یا بالطول گھومتے ہیں، ان کے چکر مستوی ہیں یا قمقری ہیں، یہ سب فضول بحثیں ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں ان بحثوں میں ڈالا ہی نہیں، بس اللہ پاک نے فرمایا کہ تمہارا کام عبادت کرنا ہے اور میری ان نعمتوں اور صنعتوں میں غور کر کے اپنے خالق اور مالک کو پہچانو۔ تم ان اُلجھنوں میں زیادہ نہ پڑو کہ زمین چکر لگاتی ہے یا چاند چکر لگاتا ہے۔

قرآن پاک میں ایسے الفاظ ملتے ہیں ان سے ان دونوں کی نہ نفی ملتی ہے اور نہ ہی اثبات ملتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس اُلجھن میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اب جب "اَهِلَّه" (چاند) کے بارے میں سوال ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مصلحتیں بتائیں کہ اس میں بحث نہ کرو کہ چاند بڑھتا کیوں ہے؟ بس یہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تمہارے لئے فائدے رکھے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ان کی منازل مقرر کی ہیں:

﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ [یٰسین: ۳۹، ۴۰]

سورج غروب ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرتا ہے اور پھر اجازت مانگتا ہے کہ یا اللہ! مجھے اجازت دے تو حکم ہوتا ہے کہ تم جہاں سے چلے تھے وہاں سے طلوع ہو جاؤ۔ اسی طرح وہ چلتا رہے گا، حتیٰ کہ ایک وقت آئے گا کہ قیامت قریب آئے گی تو سورج اجازت مانگے گا کہ یا اللہ! مجھے اجازت فرمائیں۔ اللہ پاک فرمائیں گے کہ آج تمہیں اجازت نہیں، بلکہ آج تم مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو جاؤ تو پھر سورج مشرق سے نکلنے کی بجائے مغرب سے نکلے گا، اور جب سورج کا طلوع مغرب سے ہو جائے گا تو توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے، پھر ہم لاکھ توبہ کریں تو توبہ قبول

نہیں ہوگی۔ یہ قیامت کی آخری نشانی ہوگی، "إِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا أُغْلِقَتْ أَبْوَابُ التَّوْبَةِ" جب سورج مغرب سے نکلے گا تو توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے، پھر توبہ قبول نہیں ہوگی۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے چاند میں تمہارے لئے آسانی رکھی ہے کہ وقت معلوم کرو حج کا، عبادت کا، روزے کا، صوم کا، معاہدات وغیرہ کا۔ سب تمہارے لئے "أهله" میں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرا مسئلہ بھی بیان فرمادیا۔

زمانۂ جاہلیت کی بری رسمیں:

﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ زمانۂ جاہلیت میں رسم تھی کہ جب حج کے لئے احرام باندھ لیا جاتا تھا تو احرام باندھ کر جب گھر سے نکل آئے تو اب پھر گھر میں دوبارہ جانے کی کوئی ضرورت پیش آگئی تو اب گھر میں دوبارہ کیسے جائیں کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پیچھے سے دیوار توڑ کر یا دیوار پھلانگ کر چلے جاؤ تو یہ جائز ہے، لیکن دروازے سے نہ جاؤ۔

یعنی ہمارے مسلمان بھی بڑے سمجھدار ہیں کہ منگل اور بدھ کے دن سفر نہ کیا کرو کہ یہ منحوس دن ہیں۔ اگر ان دنوں میں بیٹا پیدا ہو تو کیا اسے پھینک دیتے ہیں؟ وہ بھی تو پھر منحوس ہوگا۔

اسی طرح کوئی کسی کام کے لئے جا رہا تھا اور کسی دوسرے نے پیچھے سے آواز دے دی تو جی یہ تو بڑا منحوس کام ہو گیا۔ اب تو یہ کام نہیں ہوگا۔ یعنی آواز دینے والے نے آواز دے کر تقدیر ہی بدل دی۔ کیا آواز دینے والے کے ہاتھ میں تقدیر ہے؟

اب جا رہے ہیں اور آگے کالے رنگ کی بلی آگئی اور کہا کہ بس کام برباد ہو گیا، اس لئے کہ بلی نے راستہ کاٹ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جسے فی احسن تقویم بنایا، اس کی تقدیر بلی نے بدل ڈالی، سبحان اللہ! یہ کیا عقل کی بات ہے؟ کتا گزر جائے تو تقدیر خراب نہیں ہوتی، اس لیے کہ کتا تو انگریز کو پیارا ہے، وہ تقدیر کو کیسے خراب کر سکتا ہے؟ اور آج کل مسلمان بھی بطور فیشن اس (کتے) کو کاروں میں بٹھاتے ہیں، سیٹ پر بٹھاتے ہیں، رات کو اکٹھے سلاتے ہیں، اس کو باقاعدہ شیمپو سے نہلاتے ہیں، مکھن کھلاتے ہیں۔ غریب کا بچہ بھوکا مر جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا، مرتا ہے تو مر جائے، لیکن ہمارا ٹونی بھوکا نہ رہے۔ کبھی سوچا کہ یہ کیا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمارا حشر کتے کے ساتھ کر دیا تو ہمارا

حشر کیا ہوگا؟ کیونکہ جس سے محبت کرتا ہے، جس کی نقل اُتارتا ہے، اس کا اسی کے ساتھ حشر ہوگا۔
زمانہ جاہلیت میں بھی یہ رسم تھی کہ گھر جانا ہے تو پیچھے سے نقب لگا کر داخل ہو جاؤ لیکن دروازے سے داخل نہ ہو۔ اس لیے کہ ہم تو گھر سے نکل آئے اور احرام باندھ لیا۔ اگر ہم واپس چلے گئے تو ہمارا حج تو خراب ہو جائے گا۔ دیکھا نہیں کہ ہمارے کئی بھائی گھر سے آجاتے ہیں تو ٹکٹ میں اگر گڑ بڑ ہو جائے یا کسی بھی وجہ سے وہ نہ آسکیں تو وہ کراچی میں ہی رہ جاتے ہیں کہ جب حاجی واپس ہوتے ہیں تو وہ بھی ہار پہن کر گھر چلے جاتے ہیں۔ اگر پہلے چلے جائیں تو لوگ کہیں گے کہ دیکھو جی! یہ وہابی تھا، آ گیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آنے ہی نہیں دیا۔ اس لیے سمجھدار آدمی کراچی رہ جاتے ہیں جب حاجی واپس جائیں گے تو ہم بھی گلے میں ہار ڈال کر واپس چلے جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ گلے میں ہار ہی ڈالنا ہے اور کیا ڈالنا ہے تو حج پڑھ کر آرہے ہیں ماشاء اللہ! دین اس کو بھی نہیں آتا، مسئلے کا اسے بھی نہیں پتہ، مجھے بھی نہیں پتہ، جیسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہ خالی واپس آرہا ہے، میں بھی خالی ہوں تو ہم دونوں برابر ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ سمندر کے اُدھر سے آرہا ہے اور میں اِدھر سے آرہا ہوں، دونوں برابر۔
بہت سے لوگ بیس سال سے کعبہ کا طواف کر رہے ہوتے ہیں، لیکن ایک دفعہ بھی صحیح نہیں کرتے۔ اس لئے کہ کبھی کسی سے پوچھنا چاہتے بھی نہیں، علم کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کئی لوگ ہر سال حج پڑھتے ہیں اور ہر سال غلطی کرتے ہیں اور پھر آکر مسئلہ پوچھتے ہیں، اس لئے کہ ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہمارے بڑے بڑے کالجوں میں سب سے غیر ضروری پرچہ اسلامیات کا ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام کو سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔
اسی طرح اللہ پاک نے فرمایا کہ یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ دیواریں توڑ کر پیچھے سے داخل ہو جاؤ۔ اصل نیکی تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے ڈر گیا، وہی کامیاب ہو گیا۔ اپنی عقل نہ چلاؤ، اپنی طرف سے غیر ضروری چیزوں کو ضروری نہ بنادو۔ بس اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اپنی طرف سے غیر دینی چیزوں کو دین نہ بناؤ۔ اسی کا نام بدعات ہے۔ ہم نے غیر ضروری چیزوں کو ضروری بنا ڈالا ہے۔ وہ احکام جن کا قرآن وسنت میں ذکر تک نہیں ہے وہ ہمارے نزدیک فرض کے برابر بن گئے، فرض ہم سے چھوٹ گیا ہے، لیکن یہ چیزیں ہم سے نہیں چھوٹتیں۔ بجائے ثواب کے اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ نصیب فرمائے۔

تفسیرِ مکی

[illegible]

تفسیر مکی

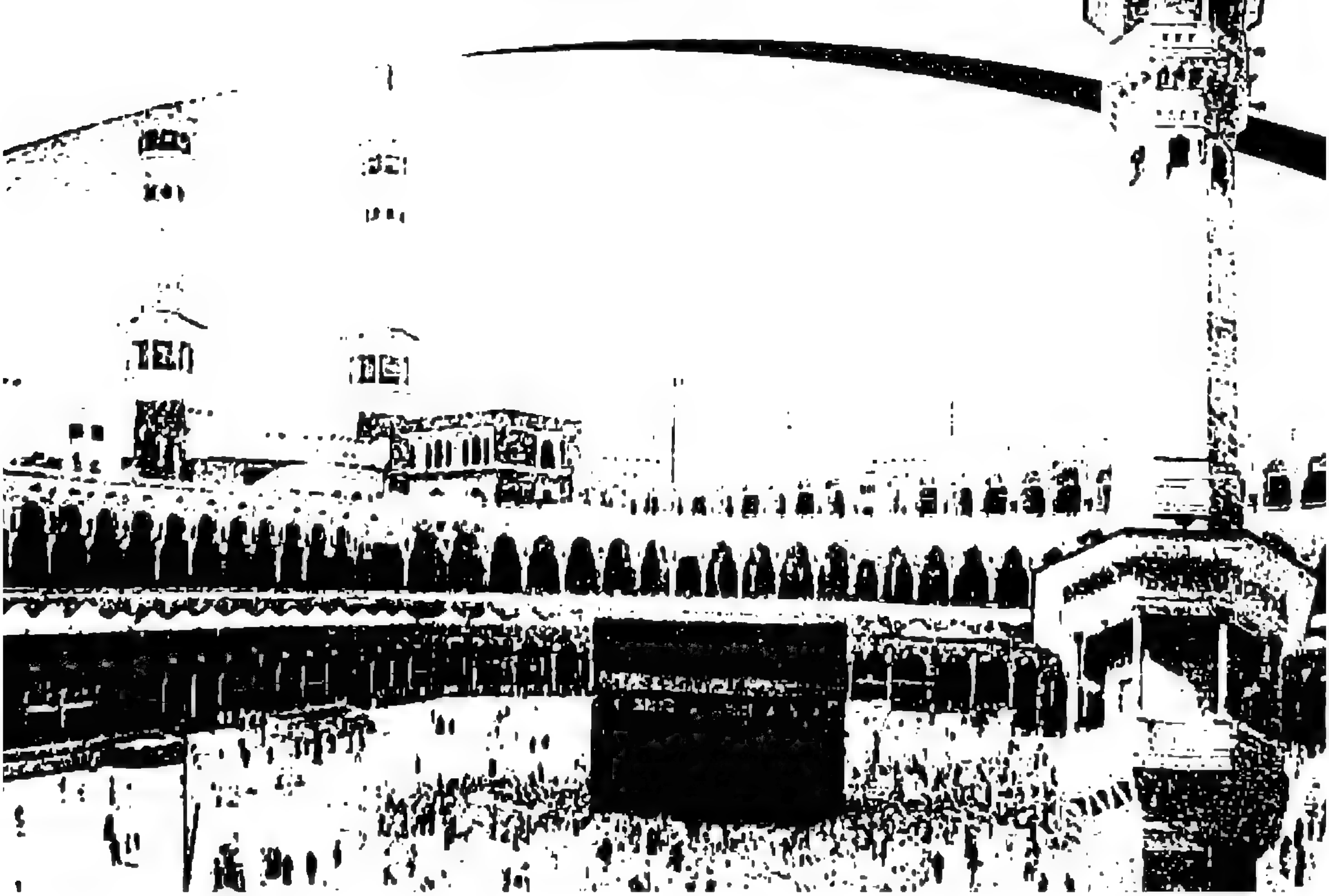
جلد 5

استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم

المدرس بالمسجد الحرام بمکة المکرمة

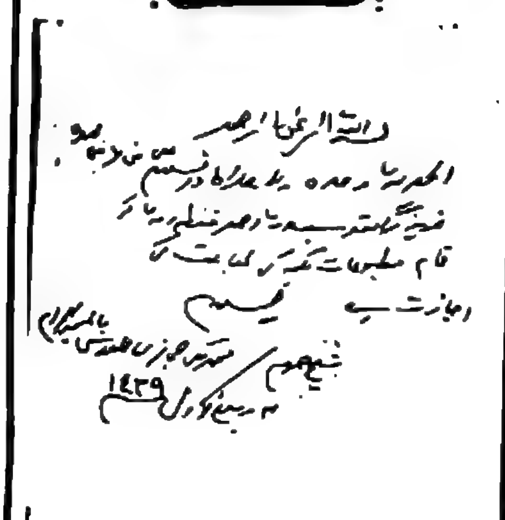
تحقیق و ترتیب | مولانا امداد اللہ انور

استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان



نام کتاب	—	تفسیر مکی جلد 5
صاحب خطبات	—	استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ
تحقیق وترتیب	—	مولانا امداد اللہ انور استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان
کمپوزنگ	—	دارالتصنیف معہد الفقیر الاسلامی جھنگ
اشاعت اول	—	اکتوبر 2019ء
تعداد	—	1100

اجازت طباعت



ناشر

مکتبۃ الفقیر

www.Tasawwuf.org

0300-9652292,03228669680
0335-7873390,03101702690
E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com



بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

- عرض ناشر 29

تفسیر سورۃ البقرۃ 31

- اسباب نزول 31
- گزشتہ آیات سے ربط 33
- آیاتِ مبارکہ کا شانِ نزول اور عمرۃ القضاء 33
- خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی پر اعتراض اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا جواب 35
- تجاوز کا معنی 38

فہرست مضامین

- مسلمانوں کی شکست کے اسباب 40
- جنگ میں عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرو 41
- فتنہ......قتل سے زیادہ سخت کیوں ہے؟ 42
- مکہ کی حرمت کے احکام 42
- صلح حدیبیہ کی حکمت 43
- جہاد میں اخلاص نیت 44
- مسلمانوں کی باہمی جنگ میں کنارہ کشی کی جائے 44
- ربطِ آیات 46
- ایک اشکال کا جواب 46
- حرمت والے مہینے اور جنگ کے احکام 47
- عدالتِ فاروقی 48
- اسلام کا داخلی اصلاحی نظام 48
- ہلاکت میں ڈالنے کی مختلف تفسیریں 50
- عبادت میں احسان کا معنی 51
- معاملات میں احسان کا معنی 52
- شانِ نزول 52
- بیعت الرضوان اور صلح حدیبیہ 53
- ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی جہاد میں بہادری 54
- جہاد جاری رکھنے میں حکمت 54
- غزوۂ تبوک پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مال نثاری 55
- حج کی اہمیت 58
- حج کے بعض احکام 59
- حج کی اقسام 60
- حجِ افراد 60

نماز کے طریقے میں بھی اختلاف	120
یہود و نصاریٰ و مسلمانوں کے روزوں میں فرق	120
حضرت ابراہیم علیہ السلام ملتِ حنیف پر تھے	120
امتِ محمدیہ ﷺ ہدایت پر	120
آیات کا ماقبل سے ربط	121
جنت کی وسعت	122
اتنی بڑی جنت کہاں ہے؟	122
کائنات کے عجائبات	123
امتوں کی آزمائش	123
حضور ﷺ کو سب سے زیادہ تکالیف پہنچائی گئیں	124
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آزمائش اور "رضی اللہ عنہم" کا پروانہ	125
امتحان اور آزمائش کی صورتیں	126
شریف لوگ پریشان اور دوسرے خوش کیوں؟	127
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر مشکلات	128
اللہ تعالیٰ امتحان کیوں لیتے ہیں؟	129
انفاق فی سبیل اللہ کی مقدار اور مواقع	130
صدقہ وزکوٰۃ کی برکت سے مال بڑھتا ہے	133
مال میں برکت کی صورتیں	133
داعی کی صفات	135
مکہ سے حضور ﷺ کی ہجرت کی وجہ	137
مدنی زندگی میں جہاد کا حکم	137
جہاد کا معنی اور فوائد	137
جہاد کا حکم	139
ربطِ آیات	142

حرام کے دو معنی	142
صحابہ رضی اللہ عنہم کے جہاد پر کفار کے اعتراض	143
آیت کا شانِ نزول...... پہلا واقعہ	143
شانِ نزول کا دوسرا واقعہ	144
کیا اشہرِ حرم میں جہاد ہمیشہ کے لیے حرام ہے؟	145
مسئلۂ ارتداد	146
مرتد مسلمان ہونے کے بعد حج دوبارہ کرے	146
شراب اور جوئے کی حرمت	148
حرمتِ شراب پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آراء	150
نشہ کی حالت کا ایک واقعہ	150
حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اونٹنی کاٹنے کا واقعہ	150
حرمتِ شراب کا واضح حکم	151
حرمتِ شراب کے اعلان پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تاثرات	152
شراب کا نام بدل کر پینے والی قوم کا حال	152
شراب تھوڑی بھی حرام...... زیادہ بھی حرام	153
شراب پینے پلانے، بنانے اور بیچنے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت	154
الکحل کا حکم	154
نبیذ کا مسئلہ	155
شراب کے برتنوں کا حکم	155
جوئے کا معنی اور اقسام	156
جوئے اور انعام میں فرق	157
انشورنس اور بیمہ پالیسی کا حکم	158
یتیموں کے مال کا حکم	160
مرد کے نکاح میں چار عورتوں کا جواز	162

- کن عورتوں سے نکاح جائز نہیں؟ 162
- چار سے زائد نکاح انبیاء کرام علیہم السلام کی خصوصیات 163
- مشرک عورت سے نکاح کیوں منع ہے؟ 164
- مسائل حیض 169
- حیض کی مدت 169
- حیض کی حالت کے احکام 169
- ایام مکمل ہونے کے بعد غسل میں تاخیر نہ کرے 170
- نفاس کے مسائل 170
- حیض کے ایام میاں بیوی کے مسائل 171
- حیض کے غسل سے قبل حقوقِ زوجیت ادا کرنا 174
- اَنّٰی شِئْتُمْ کا معنی 175
- صحبت کے وقت کی دعا 176
- قسم کے مسائل 177
- قسم کا کفارہ 179
- لغو قسم کے مسائل 179
- ظالم کو سانپ کھا گیا 180
- غیر اللہ کی قسم کھانے کا حکم 180
- ربط آیات کی اہمیت 181
- عہدہ طلب نہ کرو 184
- قطع رحمی اور گناہ کی قسم کھانا 186
- لات اور عزیٰ اور پیر کی قسم کھانا 186
- ایلاء کی صورت 188
- ایلاء کے چار ماہ گزرنے کے بعد رجوع کے لیے صرف نکاح کافی ہے 188
- غیر معین مدت تک ایلاء کا حکم 188

◆ واقعۂ ایلاء 189
◆ طلاق ناپسندیدہ عمل ہے 190
◆ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گشت کا واقعہ 191
◆ کیا ایلاء کی مدت پوری ہونے کے بعد بھی کفارہ ہے؟ 192
◆ مدتِ ایلاء ختم ہونے پر خود بخود طلاق ہو جاتی ہے 193
◆ مدت گزارنے پر کونسی طلاق واقع ہوگی؟ 194
◆ کیا ایلاء کے بعد طلاق کی عدت گزارنا ضروری ہے؟ 194
◆ طلاق دینے کا سنت طریقہ 196
◆ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام 197
◆ تین چیزیں مذاق میں بھی واقع ہو جاتی ہیں 198
◆ عدتِ طلاق 199
◆ مدخول بہا عورت کی عدت کے مسائل 200
◆ تین طلاقوں کا مسئلہ 202
◆ تین طلاقوں کے بعد صلح کا حکم 203
◆ رجوع کا حق کس کو ہے؟ 204
◆ میاں بیوی جیسے بھی ہوں عمل نیک ہونے چاہئیں 204
◆ بیویوں پر شوہر کے حقوق 205
◆ بیوی کے حقوق 207
◆ طلاق کے مسائل 209
◆ بیویوں میں عدل نہ کرنے پر سزا 211
◆ نکاح کی غرض سے ہونے والی بیوی کو دیکھنا 212
◆ طلاق کا ہونا بھی حکمت ہے 213
◆ بیوی اور مطلقہ عورتوں سے نکاح سنتِ رسول ہے 213
◆ نکاح میں ایجاب و قبول 213

- طلاق صرف خاوند کے اختیار میں ہے 214
- خلع کے متعلق مسئلہ 215
- تین طلاقوں کے بعد دوسرے مرد سے نکاح کیوں؟ 216
- نکاح وطلاق مذاق اور بغیر نیت کے بھی ہو جاتے ہیں 217
- طلاق صریح اور طلاق کنائی 219
- زمانہ جاہلیت کے رواج کی تردید 221
- عورت کے دوبارہ نکاح کرنے کے مسائل 222
- آیات کا شان نزول 223
- بچوں کی شادی اور والدین کا لمحہ فکریہ 224
- بچوں کی پرورش میں والدین کا ظلم 225
- اللہ تعالیٰ کی آیات کو مذاق بنانے کا کیا مطلب؟ 227
- عورت کے نکاح کے اولیاء 228
- ایک عجیب واقعہ! 229
- ماقبل آیات سے ربط 231
- مدت رضاعت کتنی ہے؟ 232
- آپ ﷺ کا رضاعی ماں کے ساتھ برتاؤ 233
- اڑھائی سال کے بعد بچہ کے دودھ پینے سے رضاعت ثابت نہ ہوگی 234
- بچے کا نسب باپ سے ہے 234
- قیامت میں آدمی کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا یا ماں کے؟ 234
- نسبت کس کی طرف؟ 235
- ماں کے دودھ کا اثر 236
- بچے کو دودھ پلانے کا خرچہ کس کے ذمہ ہے؟ 237
- طلاق دینے کے بعد بچے کی ماں نہ چھینو 237
- والد کے بعد وارث پر بچہ کا خرچہ ہے 239

- متوفی عنہا زوجہا کی عدت 240
- عدت کے مسائل 242
- تقویٰ اختیار کرو 243
- عدت کے دوران نکاح کرنا جائز نہیں ہے 243
- بیوہ عورت کی جلدی شادی کردو 244
- گناہ ہو جائے تو توبہ کرلو 246
- حاملہ کی عدت وضع حمل ہے 248
- ربط آیات 249
- "غیر مدخول بہا جس کا حق مہر مقرر نہ ہو" کا حکم 251
- مسئلہ 253
- گھریلو معاملات اور میل ملاپ میں احتیاط 254
- گزشتہ آیات سے ربط 255
- محافظت صلوٰۃ کا معنی 256
- قانتین کی تفسیر 257
- نماز کو اطمینان سے ادا کرو 258
- نماز نہ پڑھنے والوں کے بارے میں حکم 258
- جماعت میں سستی کرنے والے کی مثال 260
- صلوٰۃِ وسطیٰ کا مصداق 261
- نماز کسی حالت میں معاف نہیں 263
- ہوائی جہاز میں نماز کا حکم 265
- عورت کب؟ کہاں؟ اور کتنی عدت گزارے؟ 266
- شریعت کے مسائل کی پابندی 267
- عدت لازم کیوں؟ 268
- عدت پر اعتراض اور اس کا جواب 268

خاوند کے گھر میں عدت گزارنا لازمی ہے	269
فی زمانہ جہاد سے ڈرنے اور جہاد نہ کرنے کی وجہ	271
صدقہ وخیرات کے کچھ واقعات	272
دس ہزار کا لشکر موت سے ڈر کر بھاگا، سب مرگئے	274
طاعون زدہ بستی میں جانے کا حکم	275
وباوالی بستی میں داخل ہونے کا حکم	276
حدیث	277
یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا کی تفسیر	278
اعتراض وجواب	279
جہاد کی دو اقسام	279
اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا معنی	280
جنت میں درخت لگانے کا مطلب	282
بازار میں داخل ہونے کا عمل اور بیش بہا ثواب	283
تفصیل واقعہ	285
حضرت شمویل علیہ السلام کی پیدائش	288
باطل کے مقابلہ میں ہمیشہ حق والے تھوڑے رہے ہیں	300
حضرت داؤد علیہ السلام کا جالوت کو مارنے کے لیے تین پتھر اٹھانے کی روایت	301
افضلیت حضرت محمد ﷺ	304
حضور اکرم ﷺ کی سچائی کا بیان	307
نبی اور رسول کے معنی میں فرق	309
آیت الکرسی کی تاثیر	311
دوسرا قصہ	312
واقعات	313
خط ابودجانہ کا اثر	313

- جنات کے حملہ کی بعض وجوہات 314
- کم ذات کو علم نہ سکھاؤ 315
- آیت الکرسی کے دس جملوں کی تشریح 317
- کیا بداعمالیوں پر ہمیں پیر فقیر چھڑا دیں گے؟ 320
- شفاعت کس کی کن کے لیے ہوگی؟ 322
- کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟ 326
- دوسرا اعتراض 328
- جہاد کا مقصد 329
- کفار کا مسلمانوں پر ظلم 330
- کیا اسلام کی سزائیں سخت ہیں؟ 331
- دنیا کے قوانین کی کمزوریاں 331
- شان نزول 332
- عروۃ وثقیٰ کی تفسیر 335
- ایک جنتی مسلمان کا واقعہ 335
- ربط آیات 338
- دنیا کے چار بڑے بادشاہ 339
- مناظرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے 339
- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مناظرہ 340
- نمرود کا نسب نامہ 342
- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ 342
- نمرود کا انجام 342
- دوسرا قصہ 343
- کیا صاحب واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے؟ 343
- بستی کی تعیین 344

- عقیدہ حیات الانبیاء 344
- دونوں واقعات میں فرق کیا ہے؟ 345
- عجائبات قدرت 346
- عجائبات بیت المقدس 346
- موت اور نیند میں فرق 347
- اصحاب کہف کی نیند کی حالت 347
- بیت المقدس کی ویرانی اور آبادی 347
- حضرت عزیر علیہ السلام کا مشاہدہ 348
- تیسرا واقعہ 348
- شیخ عبد القادر رحمہ اللہ کی کرامت کا ایک جھوٹا قصہ 349
- حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا مقصد 350
- اطمینان قلب سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ 351
- اشکال 351
- جواب 351
- مردوں کو زندہ کرنے کی ایک صورت 352
- اب خدا کیا کر رہا ہے؟ 353
- وہ پرندے کون سے تھے؟ 353
- سوال کی وجوہات 356
- ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کے اہل ہیں؟ 357
- قرآن میں ارجیٰ آیت 357
- انفاق فی سبیل اللہ کی مثال 358
- انفاق فی سبیل اللہ کا ثواب 358
- پورے دین کا خلاصہ 360
- نکات 360

فہرست مضامین

- مقام کی وجہ سے نیکی کی فضیلت 362
- اوقات کے اعتبار سے نیکی کی فضیلت 362
- نیت کی وجہ سے نیکی کی فضیلت 362
- ایک ڈاکو کا واقعہ 363
- ثواب کیسے بڑھتا ہے؟ 364
- قاضی احسان احمد رحمہ اللہ کا تقویٰ 365
- حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی بیماری کا واقعہ 366
- نیک لوگ کیوں بیمار ہوتے ہیں؟ 366
- نیکیوں کا بڑا انعام 367
- روزہ کا ثواب 367
- جہاد میں خرچ کرنے کا ثواب 368
- صدقہ خیرات کرنے کا ادب 370
- حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی پرہیزگاری 370
- حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی پرہیزگاری 371
- بہترین صدقہ 372
- امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی غیبت سے پرہیز 372
- تین قسم کے لوگ اللہ کی رحمت سے محروم 372
- مسلمان کے لیے سخت وعید کا مطلب 373
- غریب لوگ اللہ کے ہاں تمہارے قاصد ہیں 374
- اللہ کے لیے دین کی پہچان 375
- اہل بیت پر خرچ کرنے کا عجیب واقعہ 376
- صدقات کے فضائل 377
- زکوۃ کے مستحقین کی ترتیب 379
- مسجد بنوانے میں احتیاط 380

کھجور اور انگور کے فوائد	383
حلال اور طیب میں فرق	384
خیرات کرنے کی چند شرائط	385
جدید مالیاتی سکیمیں	385
پاکیزہ کو پاکیزہ چاہتا ہے	387
مثال	388
صدقات میں عمدہ چیز خرچ کرو	388
اللہ تعالیٰ رزق سب کو دیتے ہیں، ایمان نہیں	390
اللہ تعالیٰ اپنا دین کس کو دیتے ہیں؟	391
ایک مدرسہ کے مہتمم کی اعلیٰ ظرفی	391
مواخات مدینہ	392
پرانے اکابر کا مقام	393
شیخ گمانی رحمہ اللہ کا مقام	394
صدقہ میں اچھی چیز دو	395
صدقہ کا ثواب تمہیں ہی لوٹتا ہے	395
نیک لوگوں پر اعتراض	396
حکمت کا معنی	397
مولانا رسول خان صاحب کا واقعہ	398
حفظ قرآن کی فضیلت	399
دو چیزوں میں حسد جائز ہے	399
تفسیری آیات	400
افضل صدقہ	402
آہستہ دعا کا حکم	402
عرش کے سائے میں جگہ پانے والے	403

- مظفر علی شمسی رحمہ اللہ اور حضرت لاہوری رحمہ اللہ 405
- خفیہ صدقہ کی طاقت 405
- میرے استاذ کا واقعہ 407
- دینی کام اللہ کی توفیق سے ہوتے ہیں 409
- صدقہ کا فائدہ خود صدقہ کرنے والے کو پہنچتا ہے 409
- اللہ کے خزانے بہت ہیں 410
- مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ 411
- چھپا کر صدقہ کرنا 411
- کافر پر خرچ کرنا جائز ہے 412
- صدقہ خیرات میں زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں ہے 412
- دار الکفر سے ہجرت کا حکم 414
- کفار کے ملک میں رہنے کے مسائل 414
- مانگنے والوں کے متعلق مسائل 415
- واقعہ 417
- مانگنے کے لیے لپٹ جانا 418
- حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا صدقہ کی اشرفیاں قبول کرنے کا واقعہ 419
- حدیث قدسی 419
- دنیا کی حقیقت اور بادشاہ کی حکایت 421
- حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ کا ایک اللہ والے نوجوان سے ملاقات کا واقعہ 422
- حدیث 423
- ربط آیات 424
- سود کی اقسام 424
- سود کا حکم 425
- سود کھانے کا معنی 425

- سود خور کی سزا 425
- سود یہودیوں کی عالمی سازش 426
- کیا سود بیع کی طرح ہے؟ 429
- (۱)...... حاکمانہ جواب 429
- (۲)...... حکیمانہ جواب 429
- سود اور بیع میں فرق 430
- امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ 431
- آخرت کا عذاب 431
- کیا خیرات سے مال کم اور سود سے بڑھتا ہے؟ 433
- اسلام میں گورے کالے کا کوئی فرق نہیں 433
- سود خوروں کے لیے آخرت میں عذاب 434
- ربوا کا مسئلہ بہت مشکل ہے!! 434
- اعتراض 435
- جواب 435
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان کا مطلب 437
- بیع مزابنہ 437
- بیع محاقلہ 438
- شراب نوشی کی حد 438
- سودی نظام کے مقابلہ میں اسلام کا نظام 439
- سودی نظام کی برائی وغیرہ 440
- امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط 442
- پھلوں والے باغات کی بیع 442
- اندازہ کر کے فصل بیچنا خریدنا 443
- امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کپڑے کی تجارت میں احتیاط 443

فہرست مضامین

◆ حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ کا واقعہ 443

◆ مال غنیمت میں احتیاط 444

◆ سود کی ہولناکی 444

◆ فقہ حنفی پر تہمت اور اس کی حقیقت 445

◆ سود کی مذمت 447

◆ سود کا انجام ہلاکت اور قلتِ مال ہے 447

◆ غلہ کی ذخیرہ اندوزی کا حکم 448

◆ ہر قسم کے صدقات اور ان کا ثواب 449

◆ ایصال ثواب 450

◆ سوال و جواب 450

◆ صدقہ کرنے کی فضیلت 451

◆ سود کا انجام اور مومنین کی تعریف 451

◆ تقویٰ کا حکم 452

◆ اطاعت کے لیے دو چیزیں شرط ہیں 452

◆ بیعت کی اقسام 453

◆ سود کی حرمت کا اعتقاد رکھنے کا حکم 453

◆ آیات مبارکہ کا شان نزول 454

◆ روس کا باطل نظام کمیونزم 455

◆ سودی نظام کی خرابیاں 455

◆ فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ کے تفسیری اقوال 456

◆ سود سے بچنے پر رزق میں کشادگی کا واقعہ 457

◆ فقر و فاقہ سے نجات کے وظائف 458

◆ کسی صاحب کے والد گرامی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا واقعہ 458

◆ حجۃ الوداع کے موقع پر سود کی حرمت کا اعلان 459

- مسئلہ 460
- صدقات کی فضیلت پر احادیث 461
- قرض معاف کرنے کے بدلہ میں جنت 462
- مقروض کی مدد کرنے والا عرش کے سایہ میں ہوگا 463
- صحابی رسول کا قرض معاف کرنے کا واقعہ 464
- قرض معاف کرنے کا ایک اور واقعہ 465
- ربط آیات 468
- آخرت میں سودی لین دین والے کی سزا 469
- قرض کی اقسام 470
- قرض کا معاملہ لکھنے کا حکم 471
- گواہی کا حکم 472
- مرد کے مقابلے میں عورت کی گواہی آدھی کیوں؟ 472
- لین دین لکھنے کے فوائد 474
- حضرت آدم علیہ السلام کی حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی کچھ عمر دینے کی روایت 475
- حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی حسین تلاوت 477
- حضرت آدم علیہ السلام کے بھولنے سے مسلمانوں کے فوائد 478
- لین دین نہ لکھنے پر نقصان کا واقعہ 479
- اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر قرض لینے کا واقعہ 480
- لکھنے سے انکار کرنے پر وعیدات 481
- معاملہ لکھنے والا زیادتی کرے گا تو مجرم ہوگا 482
- مسئلہ 483
- لین دین میں گواہی ہونے چاہیے 484
- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ خریدنے پر گواہ کا واقعہ 484
- تین آدمیوں کی دعا قبول نہیں ہوتی 485

آیت کا شانِ نزول	486
حدیث	488
برے وسوسے پر عمل کرنے پر پکڑ ہے	489
بزرگ کی تہجد قضا ہونے کا واقعہ	491
نماز میں شیطان کے وساوس سے بچنے کا حیلہ	491
ربط	494
آیات کا شانِ نزول	494
''مولٰنا'' کا لفظ استعمال	499
ابتدائے بقرہ اور انتہائے بقرہ میں ربط	499
سورۂ بقرۃ عرش کا خزانہ ہے	500

تفسیر آلِ عمران 501

تمہید	501
سُور	502
عیسائیوں کا ایک بڑا گروہ حضور ﷺ کی خدمت میں	503
قرآن کی سچائی	507
قرآن کی صفات	508
مخلوقات کا علم	508
اللہ کا کمال علم	509
مخلوق کے سامنے بے بس ہے	510
عقیدہ کی خرابی	511
اللہ کی تخلیق کا کمال	512
قرآنی آیات کی اقسام	513

◆ ایک شبہ اور جواب 514
◆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا خوارج سے مناظرہ 514
◆ آیاتِ متشابہات کی تشریح کا طریقہ 515
◆ مذکورہ مسئلہ کی دوسری تعبیر 516
◆ متشابہات حقیقی اور متشابہاتِ اضافی 517
◆ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت 517
◆ گمراہی کی ایک اور مثال 519
◆ "راسخین فی العلم" کا طریقہ کار 520
◆ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کی تفسیر 520
◆ غلط تاویلوں سے بچنے کے لیے دعا 521
◆ محکمات کی ایک اور تفسیر 522
◆ متشابہات کی مثالیں 522
◆ پہلی مثال 522
◆ دوسری مثال 524
◆ تیسری مثال 525
◆ چوتھی مثال 525
◆ خوارج کا رد 527
◆ خوارج کے آغاز کی تاریخ 528
◆ نجران کے وفد کے فرد کا واقعہ 530
◆ کفار کو مال واولاد فائدہ نہ دے گی 532
◆ مسلمانوں کو ماں، باپ اور اولاد سے فائدہ پہنچے گا 532
◆ زکوۃ دینے والے لوگوں کی حکایت 533
◆ آخیر زمانہ کے لوگوں کے متعلق حدیث 534
◆ کافر مغلوب ہوں گے اسلام فتح یاب ہوگا 535

کافرانی طاقت کے باوجود کیسے مغلوب ہوں گے؟ 535

یہود کی شکست کی پیش گوئی 537

روافض کا شبہ اور جواب 537

مسلمانوں اور کافروں کی تعداد میں شبہ اور جواب 538

رب مسلمانوں کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ 539

مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ 540

عورتوں کا فتنہ 541

فیشن اور سنگھار والی تتلیاں 542

فیشن پرست مردوں کا خراج 543

بچے زیادہ جننے والی عورت 543

قنطار کا معنی 544

عربی گھوڑے کی دعا 546

بارش کے لیے چیونٹیوں کی دعا 546

انسانوں کی روزی کا ایک سبب 546

''وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ'' کی تفسیر 546

صبر کا معنی 549

ایک صحابی کا واقعہ 550

صداقتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ 550

عبادت میں خشوع وخضوع 550

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ 551

''وَالْمُنْفِقِيْنَ'' کی تفسیر 551

''وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْأَسْحَارِ'' کی تفسیر 552

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا عجیب واقعہ! 552

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں 554

عیسائی نظریہ کفریہ 555
بد عمل بد عقیدہ عالم کی حیثیت 556
اسلام کس چیز کا نام ہے؟ 556
اسلام کا معنی 557
ایک یہودی اور منافق کا واقعہ 558
ایک انگریز کی تصدیق 558
رات کی عبادت 559
ذکر کا فائدہ 560
عقیدۂ توحید 562
علماء کا مقام 563
آیت پر حضور ﷺ کی تائید 563
قرآن کی تلاوت کے آداب 564
مختلف مذاہب کا حکم 565
اہل کتاب کے ذبیحہ اور ہندوؤں کے ذبیحہ میں فرق 566
یہودی اور عیسائی لڑکی سے نکاح کیوں جائز؟ 566
اسلام میں بدعات کی گنجائش نہیں 567
یہود و نصاریٰ وغیرہ کے اختلافات 568
قبر کے متعلق مسائل 569
یہود و نصاریٰ کا اسلام سے اختلاف 570
حضور ﷺ کی تصدیق کے لیے ایک راہب کا واقعہ 571
اللہ کی صفات 572
دعا بھی اللہ سے 572
دین کی طرف حضور اکرم ﷺ کی دعوت 572
ہدایت دینے کا اختیار اللہ کے پاس 573

حضور ﷺ کی نبوت تمام دنیا کے لیے	573
یہودیوں کا انبیاء اور علماء پر ظلم	576
یہودیوں کی سزا	576
کافروں کے قیامت کے متعلق نظریات	576
فلاسفہ کا اشکال	577
فلاسفہ کے اشکال کا جواب	577
آیات کی تفسیر	578
آخرت میں سب سے سخت عذاب کس کو؟	578
شانِ نزول	580
اللہ کا اسم اعظم	581
حضور اکرم ﷺ کے حق میں دلیل	581
اللہ کا بے حساب رزق	581
قرضہ دور کرنے کی دعا	582
اللہ تعالیٰ کی توحید	582
حضور ﷺ کے کمالات	583
ساری مخلوقِ خدا اللہ کی ملک ہے	584
شانِ نزول	586
موالات کی اقسام	586
حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ	587
ایک صحابی کی عالی ہمتی کا واقعہ	589
ایک اور صحابی کا واقعہ	589
کافروں سے دفاعی معاہدہ کی اجازت	590
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شانِ بے نیازی کا واقعہ	591

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

أَطِيعُوا اللَّهَ

وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ



عرضِ ناشر

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: (۱)...... بیت اللہ، (۲)...... کتاب اللہ، (۳)...... اہل اللہ۔

اور اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، رمضان ہو یا شوال، حج کا موسم ہو یا عمرے کا، حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کا درسِ قرآن مسجدِ حرام میں بلا ناغہ ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں دوسرے مشائخ کے دروس بھی ہوتے ہیں، تاہم جس کثرت سے اور ذوق شوق سے لوگ حضرت مکی مدظلہ کے درس میں شرکت کرتے ہیں، دوسرے دروس میں یہ کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ چنانچہ برِ صغیر پاک و ہند، بلکہ پوری دنیا میں جہاں بھی اردو دان طبقہ حرم شریف میں آتا ہے، حضرت مکی مدظلہ کے درس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحیدِ خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت واحترام پر حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمالِ مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔

حضرتِ اقدس کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص وتقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت وکردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

زیر نظر تفسیر ''انوار الحرم'' المعروف ''تفسیر مکی'' ''حضرت اقدس کے چند دروس کا مجموعہ ہے۔ جسے اس سے قبل اک اور ادارہ نے شائع کیا تھا اب اسے حضرت اقدس ہی کے حکم پر ''مکتبۃ الفقیر'' شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اللہ رب العزت اس کتاب اور ''مکتبۃ الفقیر'' دونوں کو شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین ﷺ

اجازت ہو تو آکر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجوم عاشقاں ہو گا

قارئینِ کرام! گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی، کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تازیست اپنی رضا کے لیے یہ خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ہماری آخرت کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

دعاؤں کا طالب:

فقیر سیف اللہ احمد نقشبندی مجددی

مکتبۃ الفقیر

تفسیر سورۂ بقرہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ۝ وَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَیۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ وَاَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ اَخۡرَجُوۡکُمۡ وَالۡفِتۡنَةُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوۡهُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوۡکُمۡ فِیۡهِ ۚ فَاِنۡ قٰتَلُوۡکُمۡ فَاقۡتُلُوۡهُمۡ ؕ کَذٰلِکَ جَزَآءُ الۡکٰفِرِیۡنَ ۝ فَاِنِ انۡتَهَوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۹۰تا۱۹۲]

''اور جہاد کرو اللہ کے راستہ میں ان (کافر) لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں اور کسی پر زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو قتل کرو جہاں بھی پاؤ اور ان کو نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا۔ اور فساد قتل سے زیادہ سخت ہے۔ اور ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو جب تک کہ وہ تم سے اس جگہ نہ لڑیں۔ پس اگر وہ خود لڑیں تو تم ان کو مارو۔ یہی کافروں کی سزا ہے۔ پس اگر یہ کفر سے باز آ کر اسلام لائیں تو اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔''

اسبابِ نزول:

سورۃ البقرۃ کی ان آیات میں قتال کے مسائل بیان کیے ہیں اور ان کے بعد قتال المسجد الحرام کا مسئلہ ہے۔ ابتداء میں جب اسلام آیا تو سرکار مدینہ ﷺ پر اللہ پاک نے وحی نازل فرمائی، قرآن مقدس نازل فرمایا اور آپ ﷺ نے اعلانِ نبوت فرمایا تو اس وقت مسلمانوں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صبر اور خالص صبر کا حکم تھا کہ دشمن جو

چاہے کرے، لیکن تم نے صبر کرنا ہے۔ اس لیے آپ جتنی بھی مکی آیات دیکھیں گے جو ہجرت سے قبل نازل ہوئیں، کسی میں بھی اللہ تعالیٰ نے قتال کا حکم نہیں دیا۔ سب سے پہلے قتال کا حکم مدینہ منورہ میں آیا۔ جب آپ ﷺ نے دعوتِ توحید دی اور کفار نے پوری قوت اور شدت کے ساتھ نبی پاک ﷺ کا مقابلہ کیا، انہوں نے اسلام کو روکا اور نبی پاک ﷺ کے راستے میں مشکلات پیدا کیں اور آہستہ آہستہ لوگ اسلام لانا شروع ہو گئے۔ عورتوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں، کامل مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

بہر حال! یہ اسلام کا ابتدائی دور تھا اور بڑا مشکل دور تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اتنے ظلم توڑے گئے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ، حضرت خباب رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور بی بی سمیہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ اگر آج کوئی آدمی آنکھیں بند کر کے سرزمینِ مکہ پر غور کرے تو کوئی گھاٹی یا پہاڑ ایسا نظر نہیں آتا جہاں میرے مدنی ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خون کے چھینٹے نہ پڑے ہوں۔ یہ گلیاں اور پہاڑ ان کی قربانیوں کے گواہ ہیں۔ مکہ کی وادیاں اور ان کی اذانیں اسلام پر ثابت قدم رہنے کی گواہ ہیں کہ انہوں نے اتنی بڑی قربانیاں دی ہیں کہ تاریخ میں کوئی ان کی مثال قائم نہیں کر سکتا۔

آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایک عورت کو ڈرایا اور دھمکایا جائے اور اس سے اتنا ظلم کیا جائے اور پھر بھی وہ ثابت قدم رہے اور اپنے ایمان کو نہ چھوڑے! وہ کیسی ثابت قدمی ہوگی کہ ابوجہل نے کفارِ مکہ کو جمع کر لیا اور بی بی سمیہ رضی اللہ عنہا کو دونوں ٹانگوں سے رسے بندھوا کر اونٹوں سے بندھوا دیئے۔ اور ان کو کہا کہ دیکھو! اب بھی کلمہ چھوڑ دو، ورنہ جب اونٹ دوڑیں گے تو تم دو ٹکڑے ہو جاؤ گی۔ انہوں نے کہا کہ دنیا کا عذاب منظور ہے، لیکن آخرت کا عذاب قبول نہیں ہے کہ یہ تو دنیا کی تکلیف خود بخود ختم ہو جائے گی، لیکن کافر کو جو آگے جہنم کی سزا ملنی ہے، اس سزا کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ پس اس ظالم نے مخالف سمت میں اونٹوں کو دوڑایا اور نیزہ لے کر بی بی کی شرم گاہ میں مارا، حتیٰ کہ وہ دو ٹکڑے ہو گئیں، لیکن اس وقت بھی زبان پر کلمہ تھا: ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ''۔

اتنی بڑی بڑی تکلیفیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انگاروں پر لٹایا گیا اور ان کے جسموں میں بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے اور کوئی چھڑانے والا بھی نہیں تھا اور کوئی ان تڑپتے ہوئے لوگوں پر پانی ڈالنے والا بھی نہیں تھا۔ جب یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ۴۰ ہو گئی، ۴۸ ہو گئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ حضور! اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ کیونکہ ظلم حد سے تجاوز کر

گیا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ نہیں! بلکہ تم صبر کرو، جواب نہ دو۔ جو تمہیں ستا سکتا ہے ستا لے، مگر تم صبر کرو۔

پس علماء کرام نے لکھا ہے کہ اگر تمہیں منہجِ نبوی ﷺ کے مطابق زندگی میں انقلاب لانا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک داعی ہو، وہ جماعت بنائے تو شروع میں وہ صبر کرے، اور جب جماعت پختہ کار ہو جائے تو پھر ہر باطل سے ٹکرا جائے؛ اس لیے کہ جب تک جماعت ہی پختہ نہیں ہوگی، افراد کار ہی پختہ نہیں ہوں گے، ان میں نظم نہیں ہوگا اور ان میں اپنے امیر کی اطاعت کا جذبہ نہیں ہوگا تو وہ کیا مقابلہ کریں گے؟

اب جب ظلم بالکل حد سے بڑھ گیا تو صرف اتنی اجازت ملی کہ مکہ چھوڑ دیں اور ہجرت کر لیں۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے، پھر حبشہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کر گئے۔ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی۔ میرے آقا ﷺ مدینہ پاک تشریف لے گئے، اسلام پھیلنا شروع ہو گیا، انصاری مسلمان ہو گئے، قبیلہ اوس وخزرج والے مسلمان ہو گئے، دیگر کئی قبائل مسلمان ہو گئے، اسلام کی طاقت میں اضافہ ہو گیا تو اب اللہ پاک نے قتال کی اجازت دے دی کہ اب تم کافروں کے ساتھ قتال کر سکتے ہو، لیکن اللہ پاک کے ہر حکم میں حکمتیں ہیں اور اس میں حدود اور قیود ہیں۔ جیسے آپ نے روزہ میں پڑھا ہے کہ دن میں روزہ ہے اور رات کو اجازت ہے کہ کھائیں، پئیں اور بیوی سے ملیں۔ اب رعایت ہے۔

گزشتہ آیات سے ربط:

پہلے حج کا مسئلہ تھا اور اب قتال کا مسئلہ ہے۔ ان میں ربط یہ ہے کہ آپ ﷺ عمرہ کے لیے تشریف لے آئے اور آپ ﷺ نے خواب میں دیکھا تھا، جس کا ذکر اللہ پاک نے قرآن پاک میں بھی فرمایا ہے: ﴿لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ ۙ مُحَلِّقِيۡنَ رُءُوۡسَكُمۡ وَمُقَصِّرِيۡنَ ۙ لَا تَخَافُوۡنَ ؕ﴾ [الفتح:۲۷]

آیاتِ مبارکہ کا شانِ نزول اور عمرۃ القضاء:

آپ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ ﷺ اطمینان سے مسجد حرام میں جا رہے ہیں، عمرہ کر رہے ہیں، کوئی بالوں کو کٹوا رہا ہے اور کوئی بالوں پر استرا پھروا رہا ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے تیاری فرمائی اور تقریباً ۱۵۰۰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر عمرے کے لیے تشریف لے گئے۔ اللہ کے نبی کا خواب ایسے ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے، یعنی عین حق ہوتا ہے۔ اللہ کے نبی کی وحی جاگتے ہوئے بھی سچی اور نیند میں بھی سچی ہوتی ہے؛ اس

لیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام مجسمہ صداقت و امانت ہوتے ہیں اور ان پر ایسا پہرہ ہوتا ہے کہ شیاطین ان پر حملہ کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن خواب میں تاریخ متعین نہیں تھی کہ آپ ﷺ مسجد حرام عمرہ کے لیے جائیں گے، لیکن کب؟ یہ متعین نہیں تھا کہ آپ اسی سال جائیں گے، اسی مہینہ میں جائیں گے، یا سال دو سال کے بعد جائیں گے، کب جائیں گے؟ یہ بات نہیں تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ تشریف لے آئے۔ اور مکہ والوں کو پتہ چلا کہ ۱۵۰۰ کا لشکر ان کے ساتھ ہے تو مکہ والوں نے اپنے آدمی بھجوا دیے اور حضور ﷺ کو راستے میں روک دیا۔ مکہ میں حدیبیہ مقام پر آپ ﷺ نے پڑاؤ کیا ہوا تھا۔ مکہ والے پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے تو آپ رک گئے۔ بہر حال آپ نے عمرہ نہیں کیا اور صلح ہوگئی اور آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ واپس مدینہ تشریف لے گئے۔ اور صلح میں یہ بات طے ہوگئی کہ آپ ابھی تو واپس جائیں، اگلے سال آپ کو عمرہ کرنے کی اجازت ہوگی۔ ہم آپ کے لیے تین دن کے لیے حرم خالی کر دیں گے۔ آپ تین دن طواف کریں، صفا و مروہ دوڑیں، مکہ میں رہیں اور تین دن کے بعد آپ تشریف لے جائیں۔ تین دن کے اندر ہم آپ کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کریں گے۔ یہ بات طے ہوگئی اور آپ ﷺ تشریف لے گئے۔

اور اگلے سال عمرہ کے لیے تشریف لے آئے؛ کیونکہ آپ ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد اسے چھوڑ دیا تھا۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو اسے قضاء کرنا پڑتا ہے۔ اب جب حضور اکرم ﷺ عمرۃ القضاء کے لیے تشریف لانے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مکہ کے کفار پر اعتبار نہیں ہے جیسے انہوں نے ہمیں بلاوجہ عمرہ سے روک دیا اور ۱۵۰۰ کا لشکر واپس آ گیا۔ اب اندیشہ یہ ہے کہ یہ ابھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم مکہ جائیں اور یہ لڑنا شروع کر دیں اور ہمیں نقصان پہنچائیں، ان کا کیا اعتبار ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ آیتیں نازل فرمائیں۔ تو ان کا حج وعمرہ کے ساتھ بھی تعلق تھا کہ آپ ﷺ عمرۃ القضاء پر تشریف لا رہے تھے۔ تو پہلے بھی حج کا ذکر چل رہا تھا۔ اب مسئلہ بھی ضروری تھا کہ اگر ہم عمرہ کے لیے آئیں اور خدانخواستہ حرم میں کوئی آدمی ہم سے لڑ پڑے تو ہمارے لیے کیا حکم ہوگا؟ اس لیے کہ ہم تو حج کے لیے آئے ہیں، عمرہ کے لیے آئے ہیں، لیکن ایسے شریر بھی تو موجود ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حرم کا بھی حیا نہیں کرتے، پھر بھی لڑتے ہیں۔ بہر حال ان حالات کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اور فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿١٩٠﴾﴾ [البقرة: ۱۹۰] (اور تم (بھی) اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال

کرو، (لیکن) ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑائی کریں)۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی پر اعتراض اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا جواب:

یہی وجہ تھی کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسا عظیم سپہ سالار اور عظیم کمانڈر...... کہ جس کی کمانڈری کے بارے میں لوگوں نے سینکڑوں کتابیں لکھ ڈالیں اور دشمنوں، انگریزوں اور کافروں نے اعتراف کیا ہے کہ اگر خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) جیسے دو جرنیل مسلمانون کو اور مل جاتے تو پوری زمین پر اسلام کا پرچم بلند ہو جاتا۔ تو اتنے بڑے جرنیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فتح ان کے نام لکھ دی تھی کہ خالد کا نام آیا اور جنگ کا پانسا بدل گیا۔...... ان کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خط لکھا کہ آپ کو عہدے سے ہٹایا جاتا ہے، آپ اپنا چارج ابوعبیدہ بن الجراح کے سپرد کر دیں اور آپ فقط ایک سپاہی بن کے رہیں۔ اب ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مجھے انچارج بنایا ہے اور آپ کو معزول کر دیا ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مسکرائے اور فرمایا کہ اچھی بات ہے ابوعبیدہ!! عام سپاہی کی حیثیت سے لڑنا مجھے منظور ہے، میری جنگ کوئی ذاتی اقتدار کی خاطر تو نہ تھی، میں مارشل لاء لگا کر تو نہیں بیٹھا تھا، میں تو اللہ کے دین کے لیے لڑ رہا تھا۔ اب میں تمہاری قیادت میں ایک سپاہی کی حیثیت سے لڑوں گا۔

دشمنوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آدمی بھیجا کہ ہم تمہیں آدھا ملک دیتے ہیں کہ اسلام نے تمہاری کتنی بے عزتی کی ہے!؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تمہاری کتنی توہین کی ہے!؟ ہمارے ملک میں آجاؤ، ہم تمہیں آدھا ملک دے دیں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ خبردار! خالد نہ تو پہلے ملک کے لیے لڑا ہے اور نہ اب ملک کے لیے لڑتا ہے۔ خالد پہلے بھی اللہ تعالیٰ کے لیے لڑتا تھا اور اب بھی اللہ تعالیٰ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے لڑے گا۔ یہ نہ سمجھو کہ اب خالد نہیں لڑے گا۔ جنگ تو اب بھی میں اسی طرح لڑوں گا، صرف نام ابوعبیدہ کا ہوگا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر رحم کر دیا ہے اور ذمہ داریوں سے بچا لیا ہے کہ پہلے پورے لشکر کی ذمہ داری مجھ پر تھی اور اب میں...... الحمدللہ!...... آزاد ہوں کہ لڑوں گا بھی اور ذمہ داری بھی کچھ نہیں ہے۔ میں تو بڑا خوش ہوں کہ اللہ پاک نے مجھے ایک فرض کی ذمہ داری سے ہٹا دیا تو یہ جہاد ہے۔

اسی طرح آپ اپنی عزت کو بچانے کے لیے لڑ گئے۔ مثلاً: آپ گھر میں تھے کہ کسی نے تمہاری بیوی، بیٹی، بہن

وغیرہ پر حملہ کیا تو اس کے دفاع میں تم لڑو گے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے لیے لڑنا ہے۔ اسی طرح تمہاری جائیداد ہے، تمہارا حق ہے، لیکن کوئی ظالم زبردستی چھیننا چاہتا ہے اور تم دفاع میں لڑ رہے ہو تو یہ بھی حق ہے، تمہیں دفاع میں لڑنے کا حق ہے۔ اگر تم مارے جاؤ گے تو شہید ہو گے اور وہ مرے گا تو جہنمی ہوگا۔

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان سے لڑو جو تمہارے ساتھ لڑتے ہیں۔ اور زیادتی مت کرو اور حد سے نہ نکلو۔ مطلب یہ ہے کہ تم کسی کی لاش کے ٹکڑے نہ کرو۔ خبردار! تم کسی کی عورتوں کو بلا وجہ قتل نہ کردو، جبکہ وہ لڑ نہ رہی ہوں، یہ بھی تجاوز ہے۔ یا تم دشمن کو قتل کر کے اس کی بے حرمتی کرو اور ان کی خواتین کی بے عزتی کرو، یہ بھی حد سے تجاوز ہے۔ تم صرف قتال والوں سے قتال کر سکتے ہو۔

اب اللہ تعالیٰ نے دوسرا حکم دیا: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ [البقرۃ:۱۹۱] (قتل کرو ان کافروں اور مشرکوں کو جہاں پر بھی ان کو پاؤ۔ اور ان کو [اس مسجد حرام سے] نکالو جہاں سے تمہیں انہوں نے نکالا تھا)۔ جہاں سے انہوں نے تمہیں ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب ان سے لڑائی کی اجازت ہے کہ اگر تم ان کو اللہ تعالیٰ کے حرم سے نکال سکتے ہو تو نکال دو۔

﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ﴾ [البقرۃ:۱۹۱]

''اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ برا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ آپس میں لڑنا، اختلاف کرنا، مسلمانوں کو روکنا، مسجد حرام کو بند کر دینا، عمرے والوں کو عمرے سے روک دینا اور مسلمانوں کے اندر ایسے حالات پیدا کرنا کہ وہ ایک دوسرے سے لڑ پڑیں، یہ فتنہ تو قتل سے بھی زیادہ برا ہے؛ اس لیے کہ قتل میں تو ایک آدمی سے ٹکرانا ہے، اور فساد میں پوری قومیں آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گی۔

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۱۹۲]

اگر وہ رک جائیں (یعنی اتنا بڑا کفر ہے کہ نبی پاک ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ لڑتے رہے، لیکن اس کے باوجود اگر وہ اپنے ظلم سے رک جائیں)، توبہ کر لیں اور ایمان میں آجائیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ مہربانی فرمانے والے ہیں۔ اتنے بڑے جرم، اتنی بڑی خطائیں اور اتنے بڑے کفر کو اللہ پاک معاف فرما دیں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مطلقاً فرمایا:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ﴾ [البقرۃ:۱۹۳]

تم کفار کے ساتھ لڑو اور اس وقت تک لڑتے رہو جب تک دنیا سے فتنہ فساد ختم نہ ہو جائے۔ اللہ کے دین کے اعلاء کے لیے لڑتے رہو۔

مسلمانوں نے جب سے جہاد چھوڑا ہے عزت ختم ہو گئی ہے۔ جب سے مسلمانوں نے جہاد کا جذبہ نکال دیا ہے اس وقت سے اسلام کی عزت وعظمت ختم ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک وقت آئے گا کہ میری امت کے دلوں سے جہاد کا جذبہ مر جائے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ وجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ دنیا کی حرص پیدا ہو جائے گی اور موت کی کراہیت پیدا ہو جائے گی۔ یعنی وہ لوگ موت کو پسند نہیں کریں گے، اس لیے ان کے دلوں میں جذبہ جہاد باقی نہیں رہے گا۔ اور جس قوم میں جذبہ جہاد باقی نہ رہے وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی۔

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ [البقرۃ:۱۹۳]

پھر اگر کفار رک جائیں تو پھر تجاوز کی اجازت نہیں، مگر ان لوگوں کے ساتھ جو اپنی جانوں پر خود ظلم کرنے والے ہیں۔ یعنی اگر وہ ظلم کریں اور حد سے تجاوز کریں تو ان کو سزا دینے کی اجازت ہے۔

ابو جعفر رازی رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جو مدینہ منورہ کے اندر قتال کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور پاک ﷺ اس سے قتال کرتے تھے جو آپ ﷺ سے قتال کرتا تھا۔ پس جو آپ ﷺ سے لڑتا آپ ﷺ بھی اس سے لڑتے تھے اور جو رک جاتا آپ ﷺ بھی اس پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سورۃ البراءۃ نازل ہوئی۔

بعض علماء کرام نے یہ فرمایا ہے کہ اس آیت میں جو الفاظ آئے ہیں ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ [البقرۃ:۱۹۰] (تم اللہ کے راستے میں ان سے لڑو جو آپ سے لڑیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ہم سے نہ لڑیں ہم بھی ان سے نہ لڑیں۔

بعض علماء کرام نے فرمایا کہ پہلے یہی حکم تھا، لیکن جب سورۂ براءت کی آیت ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۗفَّةً ۭ﴾ [البراءۃ:۳۶] (اور تم سب لڑو مشرکوں سے جیسا کہ وہ سب تم سے لڑتے ہیں) نازل ہوئی تو پہلا

حکم منسوخ ہو گیا۔

اب مفسر ﷫ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا کہ ''پہلا حکم منسوخ ہو گیا'' یہ کوئی اتنی راجح بات نہیں ہے۔ پہلا حکم بھی یہی ہے کہ جب وہ کفر پر ہوتے ہوئے لڑتے ہیں اور تم حق پر ہوتے ہوئے بھی نہیں لڑتے ہو۔ جیسے فرمایا کہ جن کافروں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کے حرم سے نکال دیا تو تم ان کافروں کو اللہ کے حرم سے نکال دو۔ اس لیے مفسر ﷫ نے فرمایا کہ منسوخ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ فرمایا کہ کافروں سے قتال کیا جائے۔ چونکہ آپ ﷺ نے جو مکی زندگی گزاری ہے، آپ ﷺ پر ۴۰ سال کے بعد قرآن نازل ہوا، پھر آپ ﷺ تیرہ سال مکہ مکرمہ میں رہے، لیکن مکی زندگی کے اندر اللہ پاک نے جہاد اور قتال کا حکم نہیں دیا، لیکن جب آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو آپ ﷺ کو ۲ ہجری میں اللہ پاک نے قتال کا حکم فرمادیا۔ چونکہ ابتداء میں اسلام کمزور تھا، مسلمانوں کی تعداد معمولی سی تھی۔ جب ہجرت فرمائی اور مسلمانوں کی تعداد بڑھی اور اللہ تعالیٰ نے قوت اور طاقت دے دی تب اللہ پاک نے فرمایا کہ اب جہاد کیا جائے۔ اس لیے فرمایا کہ ان آیات میں مسلمانوں کے لیے اِغراء ہے کہ وہ تمہارے ساتھ لڑتے ہیں اور تم حق پر ہوتے ہوئے بیٹھ گئے ہو، اس لیے حکم فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً﴾ [التوبۃ:۳۶] جیسے تمہارے ساتھ لڑنے کے لیے تمام مشرکین تیار ہوتے ہیں اسی طرح تم بھی ان کے ساتھ اکٹھے ہو کر قتال کرو۔

اور فرمایا: ''وَلَا تَعْتَدُوا'' (اور تم حد سے نہ گزر جانا)۔ اسلام ایک عادلانہ دین ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے قتال کا حکم دیا تو فرمایا کہ قتال کا حکم تو ہے، لیکن تم حد سے نہ گزر جانا۔ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔

تجاوز کا معنیٰ:

تجاوز کا معنیٰ یہ ہے کہ تم ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دو، ان کی عورتوں کو قتل کر ڈالو اور چھوٹے بچوں کو قتل کر ڈالو۔ یہ حرام ہے۔ چاہے وہ کافروں کی عورتیں ہیں، ان کے بچے ہیں، ان کے مندر ہیں اور ان کے کلیسا ہیں، لیکن ان کو نہ توڑو، ان کے پنڈت راہب پادری وغیرہ کو قتل مت کرو۔ اسی طرح ان کے درختوں کو آگ مت لگاؤ، ان کی فصلوں کو آگ مت لگاؤ۔ یہ تجاوز ہے۔ تمہیں تو بس قتال کا حکم ہے، البتہ اگر کوئی عورت دشمن کے ساتھ مل کر لڑائی میں

شریک ہے تو اس کو قتل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ان کا کوئی پنڈت، راہب یا پادری وغیرہ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کے خلاف لڑ رہا ہے تو اس کو بھی قتل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ مثلاً: قلعہ بند ہو گیا، ان کو نکالنے کے لیے یا دباؤ بڑھانے کے لیے ان کی دیواریں توڑی جاتی ہیں تو یہ کوئی بات نہیں ہے، ورنہ بلا وجہ تجاوز کرنا ناجائز ہے کہ دشمنوں کے حیوان قتل کر ڈالو، درختوں کو آگ لگا دو اور فصلوں کو تباہ کر دو۔ اسلام نے ان چیزوں سے منع کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرو اللہ کے دین کے لیے اور اللہ کے کلمے کے لیے۔ یاد رکھو مثلاً: جو لوگ قومیت کی بنیاد پر لڑتے ہیں، جو لوگ عصبیت کی بنیاد پر لڑتے ہیں، صوبائی عصبیت کی بنیاد پر لڑتے ہیں یا قبائلی نفرتوں کی بنیاد پر لڑتے ہیں، یہ جہاد نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو فساد ہوتا ہے۔ جہاد تو وہ ہوتا ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے ہو کہ جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا دین نافذ ہو جائے، اللہ تعالیٰ کا قرآن اور اللہ تعالیٰ کی شریعت نافذ ہو جائے، اللہ تعالیٰ کا دین سر بلند ہو جائے اور کفر کے قانون مٹ جائیں، وہ جہاد ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی اقتدار یا کسی قومیت کے لیے لڑ رہے ہیں کہ یہ مہاجر ہے، یہ سندھی ہے، یہ پختون ہیں، یہ بلوچ ہے اور یہ افغان ہے۔ یہ لڑائیاں تو فتنہ ہیں، یہ لڑائیاں جہاد نہیں ہیں۔

اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ قومیت کے نعرے لگاتے ہیں کہ جیسے آپ ﷺ کے زمانے میں اوس اور خزرج کے درمیان لڑائی ہو گئی تو جب انہوں نے یہ نعرہ لگایا ''یَا مَعْشَرَ الْأَوْسِ!'' (اے اوس کی جماعت!) ''یَا مَعْشَرَ الْخَزْرَجِ!'' (اے خزرج والو!) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کیا قبیلوں کے نعرے لگا رہے ہو!؟ یہ نعرے تو بڑے بدبودار ہیں، اسلام سے ان کا کیا تعلق ہے!؟ مسلمان تو مؤمن ہوتا ہے۔ مسلمان کا خدا ایک ہوتا ہے، رسول ایک ہوتا ہے، قرآن ایک ہے اور شریعت ایک ہے۔ اسلام تو ان کو مٹانے کے لیے آیا ہے۔ کسی عربی اور عجمی کا کوئی فرق نہیں ہے، کسی گورے اور کالے کا کوئی فرق نہیں ہے، کسی چھوٹے اور بڑے کا کوئی فرق نہیں ہے اور کسی زبان کا فرق نہیں ہے۔ جس نے کلمہ پڑھا: ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' تو وہ سب بھائی ہو گئے۔

لہٰذا آج مسلمانوں کے ملک میں جو لڑائیاں ہو رہی ہیں یہ تو فتنے ہیں۔ اور دشمن نے اس لیے کروائی ہیں کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح ہے کہ مسلمانوں کو کبھی کافر آ کر مٹا نہیں سکتا۔

آپ ﷺ نے اپنی امت کے لیے تین دعائیں مانگی ہیں: دو تو اللہ پاک نے منظور فرمالیں، لیکن ایک دعا سے اللہ پاک نے منع فرما دیا۔

1 ......ایک دعا تو یہ مانگی تھی کہ اے اللہ! میری امت قحط سے ہلاک نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ دعا منظور ہے۔

2 ......اور دوسری دعا آپ ﷺ نے یہ مانگی: یا اللہ! میری امت پر باہر سے کوئی ایسا دشمن مسلط نہ کر دینا کہ وہ میری امت کو بالکل ختم کر ڈالے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ پاک نے میری یہ دعا بھی منظور فرمالی۔

3 ......اس کے بعد آپ ﷺ نے دعا مانگی کہ ان میں آپس میں اتحاد و اتفاق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا کہ یہ دعا مت مانگو۔ یہ آپس میں لڑیں گے۔ یہ جب میرے نافرمان ہو جائیں گے تو میں ان کا آپس میں قتال کرادوں گا کہ یہ ایک دوسرے کو قتل کریں گے۔

مسلمانوں کی شکست کے اسباب:

اسی طرح تاریخِ اسلام کا آپ مطالعہ کر کے دیکھ لیں کہ اسلام کو کبھی شکست نہیں ہوئی کہ کافروں نے، مجوسیوں نے یا غیر قوموں نے مسلمانوں کو شکست دی ہو۔ کبھی تاریخ میں ایسا واقعہ نہیں ملتا۔ شکست کب ہوئی ہے؟ سب سے پہلی فتح بدر میں ہوئی اور سب سے پہلی شکست احد میں ہوئی۔ احد میں کیوں شکست ہوئی؟ ایک تو یہ کہ منافقوں نے اپنی جماعتوں کو نکال لیا کہ پہلے تو کلمہ پڑھتے تھے، حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھے، لیکن جب جہاد کے لیے جانے لگے تو علیحدہ ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو نہیں لڑتے۔ یہ جنگ نہیں ہے۔ یہ تو اپنے آپ کو قتل کرنے والی بات ہے اور خودکشی کی بات ہے، ہم نہیں لڑ سکتے۔ تو انہوں نے انکار کر دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے امیر کے حکم کی اطاعت نہیں کی۔ اور وہ بھی نافرمانی نہیں تھی، بلکہ اجتہادی غلطی تھی۔ یعنی سوچ اور فکر کی غلطی تھی، نافرمانی نہیں تھی۔ اسی طرح پوری تاریخ کو پڑھ لیں! اگر مسلمانوں کو شکست ہوئی ہے تو اندر کی کسی وجہ سے ہوئی ہے۔ آپ کے مسلمانوں نے منافقت کی ہوگی، کہیں انہوں نے غداری کی ہوگی، کہیں فروخت ہوئے ہوں گے، کہیں دشمن کے ہاتھوں ان کے آلہ کار بنے ہوں گے، پھر مسلمان آپس میں ٹکرا گئے اور آپس میں تباہیاں اور بربادیاں ہوگئیں۔

اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے! دشمن بڑا سمجھ دار ہے، ہر کام بڑے منصوبے سے کرتا ہے۔ کافر برائی بھی ضابطے سے کرتے ہیں اور مسلمان نیکی بھی ضابطے سے نہیں کرتا۔ دشمنوں نے مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا۔ یہ فتنے ہیں اور فتنہ قتل سے بھی برا ہوتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کو جب شکست ہوئی فتنوں کی وجہ سے ہوئی۔ مسلمان کو کافر نہیں مار سکتا، مسلمان کو مسلمان ہی مارتا ہے۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے آج بھی مسلمان اکٹھے ہو کر ایک نعرہ تکبیر لگائیں تو کافر ڈر کر بھاگ جائیں گے۔ کافر کی کیا طاقت ہے!!؟ مسلمان ہمیشہ مسلمان کی وجہ سے مرتا ہے۔

جب آپ ﷺ جہاد کے لیے لشکروں کو روانہ کرتے تو فرماتے کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے نکلو اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان لوگوں سے جہاد کرو جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے کفر کیا۔ کیا آج مسلمان کافر سے لڑتا ہی نہیں، بلکہ اگر مؤذن لڑ رہا ہے تو امام کے ساتھ اور مولوی مولوی کے ساتھ۔ اگر گاؤں میں چار مسجدیں ہیں تو وہ چاروں ایک دوسرے کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ ایک مسجد میں دو قاری ہیں، وہ آپس میں قطعاً متفق نہیں ہوں گے۔ امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر قاریوں کا آپس میں جھگڑا ہو جائے تو ایک قاری کی دوسرے قاری پر گواہی قبول نہ کرنا؛ اس لیے کہ یہ تو مینڈھے سے بھی زیادہ بغض رکھتے ہیں کہ جیسے ہی موقع ملے تو ٹکر مار کر ایک دوسرے کو گرا ڈالیں۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ قراء بہت ہو جائیں گے، لیکن علم ختم ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

جنگ میں عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرو:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کسی جنگ میں آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک عورت قتل ہوئی پڑی ہے تو آپ ﷺ غصہ میں آ گئے اور فرمایا:

((لَا تَقْتُلَنَّ امْرَأَةً وَّلَا صَغِيْرًا ضَرَعًا)) [تاریخ ابن عساکر:۱/۹۵]

عورتوں کو کیوں قتل کرتے ہو؟ چاہے عورت دشمن کی ہو، کسی کی بھی ہو، عورت تو عورت ہی ہوتی ہے۔ اس کے قتل کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ جیسے معصوم بچہ ہوتا ہے۔ بچہ تو بچہ ہی ہوتا ہے، کسی کا بھی بچہ ہو۔ کافر کا ہو، چاہے دشمن کا ہو۔ آپ ﷺ نے منع فرما دیا کہ خبردار! جنگ میں بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرو۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ...... جو آپ ﷺ کے راز دار ہیں وہ...... فرماتے ہیں کہ ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ نے

بہت سی مثالیں بیان فرمائیں، پھر آپ ﷺ نے ایک مثال بیان فرمائی:

((إِنَّ قَوْمًا كَانُوا أَهْلَ ضُعْفٍ وَ مَسْكَنَةٍ، قَاتَلَهُمْ أَهْلُ تَجَبُّرٍ وَ عَدَاءٍ فَأَظْهَرَ اللّٰهُ أَهْلَ الضُّعْفِ عَلَيْهِمْ فَعَمَدُوْا إِلَى عَدُوِّهِمْ فَاسْتَعْمَلُوْهُمْ وَسَلَّطُوْهُمْ فَأَسْخَطُوا اللّٰهَ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ))

[مسند احمد بن حنبل: ۵/۴۰۷، مجمع الزوائد: ۵/۲۳۲]

ایک بڑی کمزور قوم تھی۔ ان کی ایک ایسے قبیلے کے ساتھ لڑائی ہوگئی جو بڑی سخت، بڑی قوت اور طاقت والا قبیلہ تھا۔ اللہ پاک نے ان کمزوروں کو فتح دی اور طاقت والے مغلوب ہو گئے اور شکست کھا گئے۔ اب جب یہ کمزور ان پر غالب آ گئے تو کمزوروں نے ان پر وہ ظلم کیا کہ وہ حد سے نکل گئے تو ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب غالب آ گیا۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں فتح اس لیے نہ دی تھی کہ اب تم بھی ان سے زیادہ ظالم بن جاؤ۔ یہ مطلب تو نہیں کہ اگر ہم تمہیں کامیاب کر دیں اور فتح دے دیں تو تم حد سے نکل جاؤ۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی ناراضگی کا شکار ہو گئے۔ کیونکہ یہ کمزور جو تھے، جب اللہ تعالیٰ نے ان کو قوی لوگوں پر طاقت دے دی تو انہوں نے حد سے تجاوز کیا اور ان سے ایسے ایسے کام لیے جو وہ کبھی نہ لیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اس تجاوز سے ان پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ مقصد یہ ہے کہ جب تمہیں اللہ تعالیٰ نے قوی لوگوں کے مقابلے کی طاقت دے دی ہے تب طاقت کے زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو، حد سے نہ نکلو اور زیادتی نہ کر بیٹھو۔

فتنہ......قتل سے زیادہ سخت کیوں ہے؟

کیونکہ جہاد میں جانوں کا نکلنا، مردوں کا قتل ہو جانا جہاد میں بہت بڑی قربانی ہوتی ہے۔ لیکن اللہ پاک نے تنبیہ فرمائی کہ شرک تو قتل سے بھی بڑا فتنہ ہے۔ تم جو شرک پر اَڑے ہوئے ہو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہو یہ تو اس سے بھی زیادہ فتنہ ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ﴾ [البقرۃ: ۱۹۱] حرم کے اندر قتال نہ کرو؛ اس لیے کہ یہ تو امن کی جگہ ہے۔

مکہ کی حرمت کے احکام:

صحیحین میں روایت آئی ہے:

((إِنَّ هٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَهُ اللّٰهُ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ، فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللّٰهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ))

[صحیح مسلم: ۹۸۶]

''اس شہر کو اللہ پاک نے اس دن سے حرمت اور عظمت والا بنایا ہے جس دن سے آسمان وزمین کو پیدا کیا۔ یہ قیامت تک حرمت والا رہے گا۔''

اس میں کسی کو لڑائی اور قتال کی اجازت نہیں ہے، مگر اللہ پاک کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے موقع پر چند گھنٹوں کے لیے مجھے اجازت دی ہے۔ خبردار! حرم کے اندر جو درخت بھی ہو اسے نہ کاٹا کرو، کسی چیز کو نقصان نہ پہنچایا کرو، نہ کسی چیز کو بھگایا کرو اور نہ ایذاء پہنچایا کرو۔ حضور اکرم ﷺ نے منع فرمادیا اور یہ بھی فرمادیا کہ اگر تم میں سے کوئی یہ کہے کہ حضور پاک ﷺ نے تو فتح مکہ کے موقع پر لڑائی کی تھی تو لہٰذا اجازت ہے تو اسے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے رسول ﷺ کو چند گھنٹوں کے لیے اجازت دی تھی، لیکن تمہیں اجازت نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے حرم میں امن ضروری ہے، حتیٰ کہ کوئی جانور سائے میں بھی بیٹھا ہوا ہے، اسے بھی چھیڑنا منع ہے۔ درخت سے مسواک تک کاٹنا منع ہے، اسی طرح کوئی چیز حرم میں پڑی ہو...... جسے لقطہ کہتے ہیں...... اس کا اٹھانا بھی منع ہے۔ کسی کو ایذاء دینا بھی منع ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے حرم کے آداب کا پورا پورا خیال رکھنا ضروری ہے۔

صلح حدیبیہ کی حکمت:

فتح مکہ کے دن اجازت دی گئی تھی۔ اس لیے بعض لوگ خندمہ (پہاڑ کا نام) میں قتل کیے گئے تھے۔ اور بعض نے کہا کہ مکہ صلح کے طور پر فتح ہوا، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو اپنا دروازہ بند کرے تو اس کو امن ہے، جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے تو اس کو بھی امن ہے اور جو حضرت ابوسفیان کی حویلی میں چلا جائے اس کو بھی امن ہے۔

﴿فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿١٩١﴾﴾ [البقرۃ:۱۹۱]

تم مسجد حرام میں قتال نہ کرو، البتہ اگر وہ خود قتال کریں تو تم دفاعی جنگ لڑ سکتے ہو اور ان سے قتال کر سکتے ہو۔ جیسے آپ ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر درخت کے نیچے قتال پر بیعت لی تھی، کیونکہ کفار مکہ لڑائی کے لیے تیار ہو گئے تھے اور بعض قبائل بھی تیار ہو گئے تھے۔ حضور پاک ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لڑائی کی بیعت لی کہ ہم بھی لڑیں گے، لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تم کو حدیبیہ کے موقع پر جنگ سے منع کر دیا، یہ میری حکمت تھی، میں جانتا ہوں۔ اس لیے کہ مکہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو بے چارے مسلمان تھے، لیکن چھپے ہوئے تھے۔ اگر لڑائی ہو جاتی تو وہ مسلمان بھی مارے جاتے۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ جب ہم نے ان کو علیحدہ کر دیا، پھر تمہیں

ہو گئیں، سب مدینہ میں جمع ہو گئے تو اب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غلبہ دیا اور فتح مکہ کے موقع پر فتح عطا فرمائی۔

اللہ پاک نے فرمایا کہ اگر وہ جنگ اور قتال چھوڑ دیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور توبہ کریں تو اللہ پاک معاف کرنے والا ہے۔ کتنے بڑے گناہ کیوں نہ ہوں، اس کی عظمت کے سامنے کوئی بڑا نہیں ہے۔ آدمی کی ساری زندگی کفر وشرک میں گزر جائے، گناہوں میں گزر جائے، لیکن سچے دل کے ساتھ ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے دروازے پر توبہ کرے تو اللہ پاک ایک منٹ میں اس کے گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ [البقرۃ: ۱۹۳]

اس وقت تک جہاد کرتے رہو جب تک کہ دنیا سے کفر وشرک مٹ نہ جائے اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ ہو جائے۔

جہاد میں اخلاصِ نیت:

حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ یا رسول اللہ! بعض لوگ اس لیے لڑتے ہیں کہ پتہ چلے کہ یہ بہادر ہیں، یا برادری اور قوم کے لیے (یعنی ریا کے طور پر) لڑتے ہیں کہ لوگ کہیں کہ یہ بڑا مجاہد ہے۔ کیا یہ جہاد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جہاد نہیں، بلکہ جہاد صرف اس شخص کا ہے جس نے صرف اس لیے جہاد کیا، تا کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو جائے۔

بخاری ومسلم میں حدیث آئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ پاک نے حکم دیا ہے کہ اس وقت تک کافروں سے جنگ لڑتا رہوں جب تک کہ وہ اقرار نہ کرلیں، توحید کا اور دین کا غلبہ نہ ہو جائے اور وہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' نہ کہہ دیں۔ جب انہوں نے اقرار کرلیا تو اب ان کا خون محفوظ ہو گیا، البتہ اب اگر وہ غلطی کریں گے تو ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اگر وہ شرک سے توبہ کرلیں تو کوئی لڑائی نہیں ہے۔ ظالم وہ ہے جو کلمۂ توحید کا انکار کرے؛ لہٰذا کافر اور مشرک ظالم ہے۔

مسلمانوں کی باہمی جنگ میں کنارہ کشی کی جائے:

جب ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں لڑائی ہو رہی تھی اور جب ان کو مکہ میں شہید کیا گیا اور قتال ہو رہا تھا تو ایک

آدمی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ حضرت الوگ قتل ہو رہے ہیں اور آپ گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں!؟ آپ کسی کی مدد کریں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں! مجھے منع کیا گیا ہے، میں کسی سے قتال کے لیے نہیں نکلوں گا۔ اس نے کہا کہ آپ کمال کرتے ہیں! حالانکہ آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم لوگ اس وقت تک قتال کرو جب تک کہ فتنہ ختم نہ ہو جائے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بڑا ہی پیارا جواب دیا!! فرمایا کہ ہم نے تو اس وقت جہاد کیا ہے کہ فتنہ بھی مٹ جائے، کفر بھی مٹ جائے اور دین اللہ کا ہو جائے اور اب تو تم مسلمان آپس میں لڑ رہے ہو، تا کہ فتنہ قائم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کا دین مٹ جائے۔ تم تو لڑ کر دین کو مٹا رہے ہو، ہم تمہاری مدد کو کیوں نکلیں؟ ہم نے تو اس وقت جہاد کیا جب کافروں کے ساتھ جہاد تھا اور تم تو مسلمان کے ساتھ لڑ رہے ہو۔ تمہارے ساتھ مل کر لڑنے کا کیا فائدہ ہوگا؟ اب وہ لوگ آئے اور انہوں نے کہا کہ یا ابا عبد الرحمن!...... یہ کنیت ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی۔ انہوں نے کہا کہ...... عجیب بات ہے کہ آپ ہر سال حج پر جاتے ہیں اور فلاں فلاں عمل کرتے ہیں اور اب آپ نے جہاد بھی چھوڑ دیا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی بنیاد ایمان، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج پر رکھی ہے۔ یہ تمام اعمال میں کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اللہ پاک نے قرآن پاک میں یہ بھی فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو اس کی صلح کرا دو۔ اگر صلح کی کوئی صورت نہ ہو سکے تو جو باغی ہے اس کو قتل کر دو اور اس وقت تک لڑتے رہو جب تک کہ اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ ہو جائے تو آپ اس پر عمل کیوں نہیں کر رہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے تو حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں کفار کے ساتھ جنگیں لڑی ہیں، اب مسلمانوں کے درمیان فساد ہو گیا ہے، اب میں ان کی لڑائی میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اس زمانے میں اسلام کی قوت کم تھی اور لوگ آزمائے جاتے تھے۔

﴿اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾﴾

[البقرة: ۱۹۴، ۱۹۵]

''حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے مقابل ہے اور ادب رکھنے میں بدلہ ہے۔ پس جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو، جیسے اس نے تم پر زیادتی کی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو! اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے (۱۹۴)۔ اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور مت ڈالو اپنے آپ کو ہلاکت میں۔ اور نیکی کرو اللہ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے (۱۹۵)۔''

ربطِ آیات:

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بھلائی کے احکامات کا ذکر فرمایا ہے اور گزشتہ آیات میں جہاد کا حکم بیان ہوا۔ لیکن اس میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہر کافر سے جہاد کرنے کا حکم علیحدہ ہے اور مشرکینِ مکہ کے بارے میں حکم علیحدہ ہے۔

ایک اشکال کا جواب:

اب جو آیت ہم نے تلاوت کی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے اشکال کا جواب دیا ہے۔ ''اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ... الخ'' مسلمانوں کے دلوں میں ایک شبہ پیدا ہوا کہ ایک تو مسجد میں قتال منع ہے۔ اس کا جواب آ گیا کہ اگر وہ لڑیں تو تم لڑو اور اگر وہ نہ لڑیں تو تم بھی نہ لڑو۔ مسلمانوں کو دوسرا اشکال یہ پیدا ہوا کہ جب ہم عمرہ پر جا رہے تھے تو وہ مہینہ ذی القعدہ کا تھا اور ذی القعدہ کا مہینہ ''اشہرِ حرم'' یعنی ان مہینوں میں سے ایک مہینہ ہے جو حرمت والے ہیں۔ اور ان میں لڑائی منع ہے۔

۴ ماہ ہیں جنہیں ''اشہرِ حرم'' کہا جاتا ہے۔ وہ ۴ ماہ: ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم...... یہ تینوں متواتر ہیں...... اور چوتھا مہینہ علیحدہ ہے، یعنی رجب کا مہینہ۔ یہ ۴ ماہ ہیں، جنہیں ''اشہرِ حرم'' کہتے ہیں۔ ان میں قتال منع ہے۔ حتیٰ کہ زمانہ جاہلیت میں کافر بھی ان میں قتال نہیں کرتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں تقریباً ۸ ہجری تک یہ معاملات چلتے آئے کہ کافر بھی اس بات پر کاربند تھے کہ ان مہینوں میں قتال نہیں کرنا۔ پھر کافروں نے کچھ بدنیتی کی تھی۔ وہ اس طرح کہ اگر کسی قبیلے پر چڑھائی کا وقت آ گیا اور مہینہ محرم کا ہے تو وہ کہتے تھے کہ چلو اس محرم کو صفر کا مہینہ سمجھ لو اور لڑائی کر لو اور اس کے بعد والے مہینہ کو محرم بنا لیں گے، یعنی وہ خود مہینوں کو آگے پیچھے کر دیتے تھے کہ اب تو ہماری

دشمن سے لڑائی ہے اور موقع اچھا ہے۔ وہ ایسی حرکتیں کرتے تھے۔ لیکن بہر حال مسلمان تو ایسی باتیں نہیں کرتے، کیونکہ مہینے تو اللہ کے ہیں۔ اللہ پاک نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے چاند کا نظام بنایا ہے کہ ۲۸ (اٹھائیس) دنوں کا ایک دورہ رکھا ہے اور سورج کا ۳۶۰ (تین سو ساٹھ) دنوں کا۔ ایک دورہ رکھ دیا ہے تو یہ نظامِ خداوندی ہے۔

مسلمان تو کبھی اللہ تعالیٰ کے قانون کو نہیں توڑتا۔ اس لیے مسلمانوں کو یہ ڈر ہو گیا کہ اب ایک عجیب مسئلہ بن جائے گا کہ مہینہ تو ذی القعدہ کا بنتا ہے۔ اگر ہم ذی القعدہ میں چلے گئے تو ہم کیسے لڑیں گے؟ اب تو ہمارے لیے مشکل آجائے گی۔ تو اللہ پاک نے یہ جواب نازل فرمایا، تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے یہ اشکال دور ہو جائے۔

فرمایا: ﴿اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ﴾۔

حرمت والے مہینے اور جنگ کے احکام:

فرمایا: ﴿اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ﴾ (حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کا بدلہ ہے)۔ معنی یہ ہے کہ حرمت والے مہینے ٹھیک ہیں، لیکن اس وقت کہ جب دوسرا بھی تو احترام کرے۔ اگر دوسرا تلوار لے کر لڑنے کے لیے آجائے اور میں کہوں کہ نہیں! یہ تو ذی القعدہ کا مہینہ ہے۔ وہ بات تو نہیں سنے گا، وہ تو مار کر چلا جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حرمت والا مہینہ حرمت کے بدلے میں ہے جو اس کا احترام کرے اس کے لیے احترام ہے۔ اور اگر کسی دوسرے نے حرمت کو توڑا ہے تو پھر ہمارا کیا گناہ ہے؟ ہم تو دفاعی جنگ لڑ رہے ہیں، ہم نے عمداً حملہ تو نہیں کیا اور ہم نے تو لڑائی کی ابتداء نہیں کی۔

اس لیے فرمایا: ﴿وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ﴾ اور ''حُرُمَاتٌ'' حُرْمَةٌ کی جمع ہے۔ حُرْمَةٌ کا معنی ادب اور احترام ہے۔ اور ادب و احترام تب قائم ہو سکتا ہے جب دونوں جانب سے ہو۔ اگر دونوں جانب نہ ہو تو پھر ادب کیسے قائم ہوگا؟ حرمت اور ادب تو برابر ہے۔ جب تم میرا ادب کرو گے تو میں بھی ادب کروں گا، تم میرا احترام کرو گے تو میں بھی تمہارا احترام کروں گا، تم میرے دین کا لحاظ رکھو گے تو میں بھی تمہارے دین کا لحاظ رکھوں گا اور تم میرے امام کے بارے میں اچھے الفاظ کہو گے تو میں بھی اچھے الفاظ کہوں گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ گھبرائیں نہیں! آپ تو لڑنے کے لیے نہیں جا رہے۔ اگر لڑائی کی ابتداء مشرکین نے کر دی ہے تو آپ کی جوابی جنگ ہوگی، آپ کو اجازت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کا قانون کیسے عادلانہ ہے! ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۹۴] ہم نے اشہرِ حرم میں دفاع کرنے کی اجازت دے دی ہے، لیکن خبردار! ان کو اتنا ہی نقصان پہنچایا جائے جتنا انہوں نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ یعنی گو کہ تم نے ابتداء نہیں کی، پھر بھی اگر ذی القعدہ میں مشرکینِ مکہ نے زیادتی کی، تو جتنی زیادتی انہوں نے کی تم بھی اتنی ہی زیادتی کر سکتے ہو، اس سے آگے نہیں بڑھنا۔ جیسے اللہ پاک نے پچھلی آیات میں جہاد کا حکم دیا تھا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا تھا: ﴿وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾۔ خبردار! جہاد کی اجازت تو ہے، لیکن تجاوز کی اجازت نہیں ہے کہ تم دشمنوں کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کر دو، یا ان کی نعشوں کی بے حرمتی کرو یا ان کے مندر و کنیسہ اور ان کے عبادت خانوں کی بے حرمتی کرو، اس کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ پاک نے یہاں پر بھی حکم دے دیا کہ اگر کوئی تم سے زیادتی کرے تو تم بھی ان کے ساتھ اتنی ہی زیادتی کر سکتے، جو جتنی تم پر اس نے کی ہے۔

عدالتِ فاروقی:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دربار میں ایک شخص کی شکایت آئی۔ ایک غریب نے کہا کہ اس نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔ آپ نے اسے بلالیا اور اس غریب کو کہا کہ اس کو تھپڑ مارو، جیسے اس نے تمہیں تھپڑ مارا تھا۔ جب وہ مسلمان تھپڑ مارنے کے لیے تیار ہوا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خبردار! جتنی زور سے اس نے تمہیں تھپڑ مارا ہے تم بھی اتنے زور سے ہی مار سکتے ہو۔ اس سے زیادہ زور سے مارا تو قیامت میں اپنا جواب خود دینا۔ اس نے کہا کہ حضرت! کون ہے جو پیمائش، پیمانے لائے؟ اور کون ہے جو تول سکتا ہے؟ ایسا نہ ہو کہ (قیامت کے روز) میں پکڑا جاؤں۔ تو اس نے کہا کہ میں چھوڑتا ہوں۔ میں تو مارتا ہی نہیں ہوں۔

اس لیے اسلام نے اجازت تو دی ہے، لیکن فرمایا: ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ﴾ (اگر کسی نے تم سے بدلہ لیا ہے تو تم بھی اس سے اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہو، اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن اگر تم صبر کر لو تو یہ زیادہ بہتر ہے)۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔

اسلام کا داخلی اصلاحی نظام:

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (اللہ پاک سے ڈرو)۔ اسلام اور دوسرے نظام کا یہی فرق ہے کہ اسلام

ہمارے اندر روشنی پیدا کرتا ہے اور وہ روشنی ہمارے اندر نور ایمان کی ہے۔ جب ہمارا اندر ٹھیک ہوجاتا ہے تو باہر خود بخود ٹھیک ہوجاتا ہے۔ اور دوسرے مذاہب باہر کا تھوڑا سا علاج تو کرتے ہیں، لیکن اندر کی قوت کو بھی اجاگر نہیں کرتے۔ یہ ان میں اور ہم میں ایک فرق ہے۔

اس کی مثال یہ سمجھ لو کہ ایک آدمی کو پھوڑا نکل آیا، اوپر پٹی باندھ دو، اوپر مرہم لگا دو اور ٹکوریں وغیرہ کرلو۔ بعض اوقات وہ پھوڑا ٹھیک ہوجائے گا، بیٹھ جائے گا۔ لیکن اگر کوئی ماہر طبیب ہے تو وہ کہے گا کہ جناب! یہ پھوڑا پیدا کیوں ہوا ہے؟ پہلے اس کا سبب تو دور کرو۔ اگر یہ پھوڑا پٹی و مرہم وغیرہ سے ٹھیک بھی ہوگیا تو اور نکل آئے گا تو یہ بات ختم نہیں ہوگی۔ اصل علاج تو تب ہے جب ہم اس کے سبب کو تلاش کریں کہ اس کا سبب فساد فی الدم ہے، یہ خون کی خرابی ہے اور یہ سوداویت کا غلبہ ہے۔ اور یہ کون سی بیماری ہے؟ وہ اس کا علاج بھی کرے گا اور مرہم پٹی وغیرہ بھی کرے گا۔ اب اگر ایسے علاج کرے گا تو وہ ہمیشہ کے لیے ٹھیک ہوجائے گا۔ اسلام ہمارے اندر کو جگاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر پیدا کرو۔ جب دلوں کے اندر اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا ہوجائے تو اب کسی پہرے کی ضرورت نہیں ہے اور ہمیں کسی چوکیدار کی ضرورت نہیں ہے۔

اور جب اللہ پاک کا ڈر دلوں کے اندر پیدا ہوجائے تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی گناہ ہوجائے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ امرأۃ العزیز (عزیزِ مصر کی بیوی) نے کتنا بڑا اہتمام کیا کہ محل کے دروازے بند کردیئے۔ اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت اس وقت ایک غلام کی سی ہے، خریدا ہوا غلام، نوکری والا غلام نہیں۔ خریدا ہوا غلام تو بول بھی نہیں سکتا۔ اتنے اہتمام کے باوجود جب بی بی نے کہا: ﴿هَيْتَ لَكَ﴾۔ اس نے جب اپنی طرف دعوت دی تو اللہ کے نبی علیہ السلام نے فوراً فرمایا: ﴿مَعَاذَ اللّٰهِ﴾ کہ میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیتا ہوں اور اپنے رب سے ڈرتا ہوں۔ ﴿إِنَّهُ رَبِّيْٓ أَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾ میرا خدا اور رب وہ ذات ہے جس نے مجھے پالا پوسا ہے، جوان کیا ہے اور جس نے میرے ٹھکانے کا انتظام کیا ہے۔ اگر میں اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑ دوں تو میں ظلم کرنے والا اور حد سے تجاوز کرنے والا ہوجاؤں گا۔ یہ اندر کا تقویٰ اور اندر کی روشنی تھی جو بتا رہی تھی کہ یہ بات مجھ سے نہیں ہوسکتی۔

اس لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو)۔ اگر اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم زیادتی کرو۔ ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (اور یہ بھی جان لو کہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے)۔ اور اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی ڈرنے والوں کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ کی معیت بھی ڈرنے والوں کے

ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت بھی ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اب اگلی آیت میں فرماتے ہیں:

﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَاَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾

[البقرۃ:۱۹۵]

اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو۔ اس خرچ کرنے سے مراد زکوۃ نہیں، بلکہ زکوۃ کے علاوہ مال ہے۔

ہلاکت میں ڈالنے کی مختلف تفسیریں:

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ﴾

''اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں ڈالنے کے کیا معنی ہیں؟ اس کے بارے میں مفسرین کرام رحمہم اللہ نے بہت سے تفسیری اقوال نقل فرمائے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو سب نے اپنی اپنی زبان سے سمجھایا ہے اور بات سب کی ٹھیک ہے۔

بعض علماء کرام رحمہم اللہ نے یہ فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت اس بات کا حکم نہیں دیتی کہ تم سارا کا سارا خرچ کر ڈالو اور بیوی بچے بھوکے بیٹھے رہیں۔

اور بعض علماء کرام رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب ترکِ جہاد ہے کہ جہاد چھوڑ بیٹھو۔ بس جہاد کا چھوڑنا بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ میزبانِ رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ یہ آیت ہم میں اتری اور ہم اس کے ترجمہ کو سمجھنے والے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن پاک ہماری موجودگی میں نازل ہوا اور ہم نے ہی اس کو سمجھا ہے۔ تو وہ فرماتے تھے کہ اس کا معنی ترکِ جہاد ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو اور جہاد کو نہ چھوڑنا۔ جہاد کا چھوڑنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ اسی لیے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ ساری زندگی جہاد میں رہے اور ساری زندگی جہاد کرتے رہے، حتیٰ کہ آپ قسطنطنیہ میں جاکر شہید ہوئے اور وہیں آپ کی قبر بنی، یعنی مدینہ منورہ سے بھی باہر۔ آپ کو شہادت کی موت نصیب ہوئی اور وہیں مدفون ہوگئے، لیکن جہاد نہیں چھوڑا۔ اس لیے علماء کرام نے فرمایا کہ جہاد کو چھوڑنا بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

اسی لیے آپ دیکھ لیں کہ پوری دنیا میں جتنے بھی اسلامی ملک ہیں سب کے سب اَدبار، ذلت، کمزوری، بالکل بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں ہیں۔ یعنی جہاں بھی نظر ڈالیں! مسلمانوں میں کوئی ایسی قوت اور طاقت نہیں رہی کہ سر اٹھا کر چل سکیں۔ اس کی وجہ ترکِ جہاد ہے، یعنی انہوں نے جہاد کو بھلا دیا ہے۔ جس دن سے انہوں نے جہاد کو بھلایا اس دن سے اللہ تعالیٰ نے ان پر سے اپنی رحمتیں، اپنی نصرتیں اور اپنی برکتیں اٹھالیں۔ کہاں وہ مسلمان کہ جن کا نام سن کر کافر تھر تھر کانپتے تھے!؟ اور کہاں ہم مسلمان کہ کافروں کا نام سنتے ہیں تو تھر تھر کانپنے لگ جاتے ہیں اور فوراً میڈیکل رپورٹ بنوا کر گھر میں لیٹ جاتے ہیں!؟

مسلمان ہونے کے باوجود ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ فلاں سپر پاور ہے، فلاں سپریم پاور ہے اور فلاں کیا کیا بلا ہے۔ حالانکہ مسلمان تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سپر طاقت مان ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا: ﴿أَيَبْتَغُونَ عِندَهُمُ الْعِزَّةَ﴾ کہ تم کافروں سے دوستی رکھ کر ان سے عزت اور غلبہ اور اپنا شرف ڈھونڈنا چاہتے ہو، حالانکہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ [النساء:۱۳۹] (بے شک تمام عزتیں اللہ پاک کے پاس ہیں) فرمایا کہ خبردار! تمہیں کافروں سے عزت نہیں ملے گی، بلکہ عزتوں کا مالک تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ فرمایا کہ: ﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾ [المنافقون:۸] (اور عزت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، اس کے رسول کے لیے ہے اور ایمان والوں کے لیے ہے)۔ پس ترکِ جہاد سب سے بڑی ہلاکت ہے۔ اللہ پاک نے حکم دیا کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دنیاوی معاملات کے اندر الجھ کر رہ جاؤ اور بس کھانا پینا، پیسہ دولت وغیرہ مقصود بن جائے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ہر چیز میں، ہر معاملے میں، اقتصادی طور پر، قوت اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے، ہر لحاظ سے کافروں کے محتاج ہو گئے۔ ورنہ اگر ہم غور کریں کہ جتنی جدید ٹیکنالوجی اور ایجادات ہیں ان کے موجد اصلی مسلمان ہیں، لیکن مسلمانوں نے اب قرآن پاک کو قسم اٹھانے کے لیے اور تعویز لکھنے کے لیے رکھ لیا ہے۔ قرآن سے ایمان حاصل نہ کرنا اور شفا وغیرہ طلب کرنا، یہ بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

عبادت میں احسان کا معنیٰ:

﴿وَأَحْسِنُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ [البقرۃ:۱۹۵]

احسان کا مطلب کیا ہے؟ ایک تو احسان ہے عبادت میں اور ایک احسان ہے معاملات میں۔

عبادات میں احسان کا مطلب ہے جیسا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے خود ترجمہ فرمایا کہ جب آپ ﷺ سے حضرت جبرئیل نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ'' کہ تم اس مقام پر پہنچ جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرو کہ گویا تم اللہ پاک کو دیکھ رہے ہو۔ اگر اس مقام پر نہیں پہنچ سکتے تو کم از کم اتنی بات تو پیدا کرو کہ وہ خود تجھے دیکھ رہا ہے، میں اس کے سامنے ہوں اور وہ میری حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ یہ ہے عبادت میں احسان۔

معاملات میں احسان کا معنی:

اور معاملات اور معاشرت میں احسان کا مطلب یہ ہے کہ تم جو چیز اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی چیز اپنے بھائی کے لیے پسند کرو۔ جو تمہیں ناپسند ہو سمجھو کہ وہ تمہارے بھائی کو بھی ناپسند ہوگی۔ تم اپنے لیے اچھے القاب پسند کرتے ہو تو دوسروں کے بھی اچھے القاب کے ساتھ پکارو، اگر تم کسی چیز کو اپنے لیے اچھا سمجھتے ہو تو اپنے بھائی کے لیے بھی اچھا سمجھو اور اگر کسی چیز کو اپنے لیے برا سمجھتے ہو تو اپنے بھائی کے لیے بھی برا سمجھو۔ اگر مرتبہ احسان مل جائے تو اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔ فرمایا کہ ﴿وَأَحْسِنُوا ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ [البقرۃ:۱۹۵]

شانِ نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ضحاک، سدی اور حضرت قتادہ رحمہم اللہ نے ان آیات کا شانِ نزول اس طرح بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ جب ۶ ہجری میں عمرہ کے لیے تشریف لے آئے اور مشرکین نے آپ ﷺ کو روک لیا کہ آپ حرم میں داخل نہیں ہو سکتے اور جو بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھے سب کو روک دیا۔ تو فرماتے ہیں کہ یہ ذی القعدہ کا مہینہ تھا اور ذی القعدہ کا مہینہ حرمت والے مہینوں میں سے ہے، جس میں قتال اور جنگ حرام تھی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور قضاء کے ارادے سے آپ اگلے سال عمرہ کے لیے تشریف لے آئے۔ اب سوال یہ پیدا ہو گیا کہ اب ہم جائیں اور کافر لڑیں اور ذی القعدہ کا مہینہ ہوگا اور مسجد الحرام بھی ہوگی تو پھر قتال کیسے ہوگا؟

تو آپ ﷺ نے فرمادیا کہ تم مسجد حرام میں نہ لڑو، لیکن اگر کافر ابتداء کریں تو پھر دفاع کرنا جائز ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے آقا ﷺ کبھی اشہرِ حرم میں چڑھائی نہ کرتے تھے، البتہ

آپ ﷺ پر کوئی چڑھائی کرتا تو آپ ﷺ دفاع کرتے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ جہاد کے لیے نکل جاتے اور راستے میں اشہرِ حرم میں سے کوئی مہینہ آجاتا تو آپ ﷺ قتال سے رک جاتا تھے۔ یہاں تک کہ وہ مہینہ گزر جاتا پھر آپ ﷺ قتال شروع کر دیتے تھے۔

بیعت الرضوان اور صلح حدیبیہ:

جب آپ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر خیمے لگائے ہوئے تھے اور جب آپ ﷺ کو کافروں نے روک دیا تھا تو مقامِ حدیبیہ پر آپ ﷺ نے پڑاؤ کیا اور آپ ﷺ کے ساتھ ۱۴۰۰ (چودہ سو) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر تھا تو آپ ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ مکہ والوں کے ساتھ جا کر بات کریں کہ ہم عمرہ کے لیے آئے ہیں، قتال اور لڑائی کے لیے تو نہیں آئے۔ آپ ﷺ نے ہر ممکن کوشش فرمائی اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے اور آپ کو آنے میں اور مختلف سرداروں سے بات چیت کرنے میں دیر ہوگئی تو اسی اثنا میں ایک افواہ اُڑ گئی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مشرکین نے مار ڈالا ہے۔ اب آپ ﷺ بھی جوش میں آئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی جوش میں آگئے کہ ایک تو ہمیں حرم میں نہیں آنے دیا اور پھر ہم مصالحت کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں تو وہ ہمارے قاصد کو بھی قتل کر دیتے ہیں، لہٰذا اب تو ہم جہاد کریں گے۔ تو ۱۴۰۰ (چودہ سو) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے درخت کے نیچے آپ ﷺ کے ہاتھ پر قتالِ مشرکین پر بیعت کی کہ اب ہم مشرکین سے بدلہ لیں گے، لیکن حضور ﷺ کی خدمت میں یہ بات پہنچ گئی کہ پہلی خبر غلط تھی اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ زندہ ہیں، ان کو قتل نہیں کیا گیا۔ تو آپ ﷺ نے لڑائی کا ارادہ ترک کر دیا اور پھر مصالحت اور صلح کی طرف مائل ہوئے۔ اور اس کے بعد صلح حدیبیہ کے واقعہ کے مطابق صلح ہوگئی۔

جب آپ ﷺ قتالِ ہوازن سے فارغ ہوئے، اس کے بعد آپ ﷺ نے طائف پر چڑھائی کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے جب طائف پر چڑھائی کی تو وہ لوگ قلعہ میں بند ہو گئے تو آپ ﷺ نے باہر سے ان کا محاصرہ کر لیا اور اس کے بعد پتھر پھینکنے کے لیے منجنیقیں تیار کی گئیں، تاکہ قلعہ توڑ دیا جائے، لیکن حرمت والا مہینہ داخل ہو گیا تو حضور اکرم ﷺ نے تقریباً چالیس دن تک وہاں محاصرہ قائم رکھا، لیکن قتال نہ ہوا، اس لیے کہ وہ قلعہ بند تھے، لیکن بڑے تیر انداز تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان سے بہت سے افراد شہید ہونے لگے تو آپ ﷺ نے وہ

محاصرہ بھی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد پھر آپ ﷺ مکہ کی طرف لوٹ آئے۔ جب آپ ﷺ طائف سے مکہ کی طرف لوٹ آئے تو آپ ﷺ نے جعرانہ سے احرام باندھا، جسے آج کل ''بڑا عمرہ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی تنعیم کو ''چھوٹا عمرہ'' کہتے ہیں اور جعرانہ کو ''بڑا عمرہ'' کہتے ہیں؛ اس لیے کہ جعرانہ سے آپ ﷺ نے خود عمرہ فرمایا ہے اور تنعیم سے آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو احرام باندھنے کا حکم فرمایا اور انہوں نے احرام باندھا تھا۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی جہاد میں بہادری:

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے مراد ترکِ جہاد ہے۔ اس پر دلیل کے طور پر ایک اور روایت ہے جو ابوداود رحمہ اللہ نے اسلم ابو عمران رحمہ اللہ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم قسطنطنیہ پر تھے اور مصر پر حاکم حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ تھے اور شام پر یزید بن فضالہ بن عبید رحمہ اللہ تھے، شہر سے رومیوں کی ایک بہت بڑی جماعت نکلی اور باہر مقابلے کے لیے صف آراء ہوگئی، پس ہم نے بھی ان کے مقابلے میں صف باندھ لی۔ پھر اس کے بعد ہم مسلمانوں میں سے ایک مجاہد تیزی سے نکلا اور اکیلا ان کی صفوں میں گھس گیا۔ اور اس کے بعد لڑتے لڑتے وہ خیر و عافیت کے ساتھ واپس بھی آ گیا۔ اللہ پاک نے اس کی حفاظت فرمائی اور وہ بچ گیا۔ جب وہ واپس آیا تو لوگ چیخنے لگے: دیکھو! عجیب بات ہے! اس نے تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا! اکیلا آدمی دشمنوں کی صف میں گھس جائے، یہ کون سی عقل کی بات ہے!؟

جہاد جاری رکھنے میں حکمت:

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا کہ لوگ اس طرح کہہ رہے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ قرآن پاک کی آیت کی غلط تاویل نہ کرو؛ کیونکہ جب قرآن اترا ہے تو ہم لوگوں میں ہی اترا ہے اور اس کے اوّلین مخاطب ہم لوگ ہی تو ہیں۔ ہم نے یہ قرآن اللہ کے رسول ﷺ سے سمجھا ہے۔ فرمایا کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ترکِ جہاد نہ کرو۔ ہم صحابہ کرام نے یہ سوچا تھا کہ اب دین کو غلبہ مل گیا ہے، اب ہم پھر مدینہ میں اپنے باغوں میں کام کریں اور اپنی زمینوں میں کام کریں تو اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی کہ خبردار! اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ اتارو۔ اگر تم مال میں لگ گئے اور جہاد کو چھوڑ دیا تو تمہاری عزت ختم ہو جائے گی۔ تم اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت ہم میں نازل ہوئی تھی، اس کے ہم ہی گواہ ہیں اور اس آیت کے مطلب کے گواہ ہیں۔

ابوبکر بن عیاش رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اگر میں نے اکیلا دشمن پر حملہ کر دیا اور اس نے مجھے مار ڈالا تو میرا اس دشمن پر اکیلا حملہ کرنا اس آیت ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ کی وعید کے تحت داخل ہو جائے گا؟ تو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں! تم اس وعید کے تحت داخل نہیں ہو گے؛ اس لیے کہ اللہ پاک نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا: ﴿فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ﴾ [النساء: ۸۴] (اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال کریں اور آپ ذمہ دار نہیں، مگر اپنے آپ کے)۔ لہٰذا اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ اس آیت کا تعلق نفقہ کے بارے میں ہے کہ آدمی اس قدر بھی خرچ نہ کر دے کہ اپنی ساری جائیداد خرچ کر دے اور اس کی بیوی بچے بھوکے بیٹھے ہوئے ہوں۔ اللہ پاک نے جہاں صدقہ کا حکم دیا ہے وہاں اعتدال کا حکم بھی دیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے تو ہر چیز میں اعتدال کا حکم دیا ہے: "خَيْرُ الْأُمُوْرِ أَوْسَطُهَا" لیکن احادیث میں ایسے واقعات بھی موجود ہیں۔

غزوۂ تبوک پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مال نثاری:

مثلاً: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب غزوۂ تبوک کے موقع پر چندہ فرمایا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی آدھی جائیداد پیش کر دی اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پورے گھر میں جو کچھ بھی موجود تھا سب کا سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا: اے عمر! تم نے کیا دیا؟ انہوں نے عرض کیا: میں نے آدھا بچوں کے لیے چھوڑا ہے اور آدھا اللہ تعالیٰ کے راستے میں دے دیا ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہو گئے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم نے کیا دیا؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور! اللہ کا نام ہی چھوڑا ہے۔ جو گھر میں تھا سب ہی اٹھا کر لے آیا ہوں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما لیا اور انکار نہیں فرمایا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ خیرات میں جب سارا مال دینے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرما دیا کہ تیسرے حصے سے زیادہ نہ دو۔ اسی طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابی آئے اور سونے کی ایک ڈلی پیش کی کہ حضور! میں یہ صدقہ کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ میں آ کر ایسے زور سے پھینکا کہ راوی فرماتے ہیں کہ اگر وہ صحابی کے سر میں لگ جاتا تو وہ زخمی ہو جاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کر دیا۔

اصل بات یہ ہے کہ ان حالات میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ مقام ہے کہ وہ سب کچھ لٹانے کے بعد بھی

مطمئن تھے، ان کو اللہ تعالیٰ سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اور جس کا حضور پاک ﷺ نے واپس کر دیا وہ ایسا آدمی تھا کہ جذبے میں آ کر اس نے خیرات تو کر دی، لیکن بعد میں وہ بے چارہ چیختا رہتا کہ یار! اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تو غریب اور بھوکا ہو گیا ہوں۔ اصل میں یہ احوال مختلف ہوتے ہیں۔

اسی طرح ہم جیسے کمزور لوگوں کو یہ اجازت نہیں ہے کہ دشمن 10000 (دس ہزار ہو) اور ہم جا کر اس سے لڑ پڑیں، لیکن سیدنا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ رومیوں کے عربی نصاریٰ کے لشکر کی تعداد 60000 (ساٹھ ہزار) تھی، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ساتھیوں سے کہا کہ میرا دل تو کرتا ہے کہ ان پر 60 (ساٹھ) صحابیوں کے ساتھ ٹوٹ پڑوں۔ انہوں نے کہا کہ جناب! ہم 60 (ساٹھ) آدمی ہیں اور آگے 60000 (ساٹھ ہزار) کا لشکر ہے۔ ہم 60 (ساٹھ) آدمی بہادری کے ساتھ لڑ بھی پڑے تو کیا کریں گے!؟ ان کا 200 (دو سو) آدمی مار ڈالیں گے، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم 60000 (ساٹھ ہزار) کو شکست دے کر جنگ جیت لیں یا ہماری لڑائی کا کوئی فائدہ بھی ہوگا؟ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تو کبھی فائدے کے لیے لڑا ہی نہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے لڑنا ہے۔ مر گئے تو شہید، اگر بچ گئے تو غازی۔ بس اللہ تعالیٰ کا نام لیں اور ٹوٹ پڑیں۔ چنانچہ صحابہ نے دن بھر 60000 (ساٹھ ہزار) کے ساتھ جنگ کی اور شام کو فاتح ہو کر اپنے لشکر میں لوٹے۔

ایک اور موقع پر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے لشکر کی کمان کر رہے تھے۔ وہ خیمہ میں سوئے ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی آواز آتی ہے کہ اے ابوعبیدہ! تم سوئے ہوئے ہو اور خالد دشمنوں سے لڑ رہا ہے!!؟ جلدی کرو اور ان کی مدد کو پہنچو۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ لشکر لے کر فوراً پہنچے اور انہوں نے نقشہ کھینچا کہ اتنا گھمسان کا منظر ہے کہ اندھیرے میں کوئی تلوار چمک پڑے تو نظر آ جائے، ورنہ کچھ نظر نہیں آتا تھا کہ ۱۰ (دس) آدمی تقریباً پوری فوج میں کیسے ڈھونڈیں؟ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ!'' کا نعرہ لگایا تو پتہ چلا کہ مسلمان اس طرف ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے مدد کی اور بہت بڑا لشکر شکست کھا گیا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کامیاب ہو گئے۔

یہ معاملات تو ہر ایک کے حالات پر مبنی ہیں کہ ایک آدمی نے ساری جائیداد پیش کر دی اور حضور پاک ﷺ نے قبول فرمالی۔ اور ایک نے تھوڑی سی پیش کی، لیکن حضور اکرم ﷺ نے رد کر دی۔ یہ سارے واقعات احادیث کا ذخیرہ سامنے رکھتے ہوئے سمجھ میں آتے ہیں۔

انہوں نے فرمایا کہ یہ معنی نہیں کہ اگر تم اکیلے ہو تو نہ لڑو، بلکہ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ کوئی آدمی گناہ کرے اور گناہ میں لگا رہا اور توبہ نہیں کی تو اس نے اپنے آپ کو برباد کر دیا۔ تو یہ معنی ہے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا، ورنہ آدمی سے اگر گناہ ہو جائے اور وہ گڑگڑا کر توبہ کرے تو اللہ پاک اس کو ہلاکت سے بچالیں گے۔

حضرت عبدالرحمٰن الاسود بن عبد یغوث ﷫ فرماتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کر لیا تو ازدشنوءہ کا ایک آدمی دشمن کی طرف جانے لگا، تاکہ میں دشمن پر اکیلا حملہ کروں۔ مسلمانوں نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ اتنے دشمنوں سے اکیلے لڑنا عقل کی بات نہیں ہے۔ انہوں نے جا کر اپنے کمانڈر حضرت عمرو بن العاص ﷛ سے شکایت کی کہ یہ آدمی اکیلا جا رہا تھا، ہم نے منع کیا ہے۔ انہوں نے بلایا اور سمجھایا کہ ایسا نہ کرو۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)۔ اب یہاں پر صحابی نے منع فرما دیا۔ یہ اپنے اپنے حالات کے موافق احکام ہیں۔

حضرت ابن عباس ﷛ نے فرمایا کہ اس آیت کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں؛ اس لیے کہ قرآن پاک کی پہلی آیت خود دلالت کر رہی ہے کہ یہ انفاق کا مسئلہ ہے: ﴿وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو)۔ لیکن خرچ کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب کچھ لٹا کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دو۔ یا ترجمہ یوں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد میں خرچ کیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنے ہاتھ روک کر بیٹھ جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہ کرو اور جہاد رک جائے۔ یعنی جہاد بالمال بھی ہوگا اور جہاد بالنفس بھی ہوگا۔ یعنی اگر تمہارے پاس لڑنے کی طاقت نہیں ہے تو مجاہدین پر اپنا مال خرچ کرو، ورنہ مجاہدین کب تک لڑتے رہیں گے؟ وہ تو کمزور ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تم سب ہلاکت اور بربادی کا شکار ہو جاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے جہاد کا چھوڑنا ہلاکت ہے، اسی طرح مجاہدین پر خرچ کرنے سے رکنا بھی ہلاکت ہے۔

حضرت ضحاک ﷫ فرماتے ہیں کہ مدینہ کے انصار اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیرات کرتے تھے۔ ایک سال قحط پڑ گیا اور باغات میں پھل نہ آیا تو وہ بھی خرچ کرنے سے رک گئے۔ اللہ پاک نے یہ آیت نازل فرمائی، یعنی اس آیت کا تعلق اس واقعہ سے ہے۔

حسن بصری ﷫ نے فرمایا کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم بخل نہ کرو۔ یعنی بخل کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٝ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝١٩٦﴾

[البقرة:۱۹۶]

''اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے لیے۔ پھر اگر روک دیے جاؤ تو جو کچھ میسر ہو قربانی سے۔ اور نہ منڈاؤ اپنے سر، حتیٰ کہ ہدی (قربانی کا جانور) اپنے محل (موقع حرم) پر پہنچ جائے۔ پھر تم میں سے جو مریض ہو یا اس کے سر میں بیماری ہو تو (تین) روزوں کا فدیہ یا خیرات یا قربانی کرے، پھر جب تمہیں امن حاصل ہو تو جو کوئی فائدہ اٹھائے عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر اس پر ہے جو قربانی میسر ہو اور جس کو قربانی نہ ملے تین دن کے روزے رکھے حج کے دنوں میں اور سات روزے جب واپس لوٹو۔ یہ دس روزے ہوئے پورے۔ یہ (حکم) اس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ رہتے ہوں۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ کا عذاب (مخالفین کے لیے) سخت ہے (۱۹۶)۔''

حج کی اہمیت:

حج کا مسئلہ قرآن پاک میں کئی مقام پر آیا ہے۔ اور حج کی فرضیت، جیسے: نماز، روزہ اور زکوٰۃ اسلام کے ارکان ہیں، اسی طرح حج بھی اسلام کا ایک رکن ہے اور اسلام کی بنیاد ہے، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ نماز اور روزہ ہر امیر اور غریب پر ہیں لیکن زکوٰۃ اور حج صرف امیر پر ہیں۔

امیر سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس اپنے ذاتی اخراجات کے بعد اتنے پیسے ہیں کہ حرم میں آئے اور خیریت کے ساتھ واپس اپنے ملک میں پہنچ جائے، اس پر حج فرض ہے۔ اور زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے۔

انسانوں میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے حج کیا ہے۔ اور ضعیف روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت

آدم علیہ السلام نے چالیس حج کیے اور سب سے پہلا حج سرزمین ہند سے کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور ''عرفات'' کو ''عرفات'' اس لیے کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب حج کے تمام احکام اور مناسک سمجھائے گئے تو اسی میدان میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پوچھا: ''عَرَفْتَ؟'' (کیا آپ نے سمجھ لیا ہے؟)۔ انہوں نے فرمایا: جی ہاں! سمجھ لیا۔ تو یہ ''عرفہ'' ہو گیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حج کے احکام و مناسک سمجھائے گئے تو ان سے بھی پوچھا گیا: ''عَرَفْتَ؟'' تو انہوں نے کہا: جی ہاں! سمجھ لیا۔

حج کے بعض احکام:

حج کا لغوی معنی: قصد (ارادہ)۔ اور شرعی معنی: چند مخصوص دنوں میں، مخصوص مقامات پر مخصوص افعال کا سرانجام دینا۔

حج کی شرائط:

1 ...... مسلمان ہونا۔

2 ...... عاقل و بالغ ہونا۔ اگر کوئی بچپن میں حج کرے اس کو نفلی حج کا ثواب ملے گا، اگرچہ وہ گود میں ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اس کے والدین نے اس کے حج کی نیت بھی کر لی اور اپنے حج میں اس کو اپنے ساتھ ساتھ رکھا تو اس کا بھی نفل حج ہو جائے گا۔

3 ...... عورت کے لیے محرم کا ہونا۔ محرم اسے کہتے ہیں جس سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو، مثلاً: باپ، بیٹا اور بھائی وغیرہ۔ جس کے ساتھ نکاح جائز ہے اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتی۔ اگر ایک عورت مالدار اور غنی ہے، لیکن اس کو محرم نہیں ملا تو اسے حج کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی صورت نہیں ہے تو کسی اور کو حج کروا دے، لیکن خود باہر نہ نکلے۔

4 ...... کوئی شرعی رکاوٹ نہ ہو، مثلاً: آپ کے راستے میں کوئی کافر ملک ہے اور وہ آپ کو گزرنے نہیں دیتے۔ اگر خدانخواستہ راستے میں کوئی بھیڑیا یا کوئی ایسا جانور ہے جس کی وجہ سے جان کو خطرہ ہے تو پھر بھی حج فرض نہیں ہے۔

بعض لوگوں سے اگر پوچھا جائے کہ آپ کے پاس پیسے ہیں تو آپ نے حج کیوں نہیں کیا؟ تو وہ کہہ دیتے ہیں: جناب! میری بیٹیاں جوان ہیں اور بہنیں جوان ہیں۔ جب تک ان کا فرض ادا نہ ہو جائے میرا حج نہیں ہو گا۔ یہ بے وقوفی والی باتیں ہیں۔ شادی کرنا علیحدہ مسئلہ ہے اور حج علیحدہ مسئلہ ہے۔

ایک آدمی جوان ہے جو حج پر جانا چاہتا ہے، اس کے ماں باپ بوڑھے ہیں، اور ماں باپ کہتے ہیں کہ اگر تم حج پر جاتے ہو تو پیچھے ہمیں سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے تو ایسے شخص کو اسلام اجازت دیتا ہے کہ وہ ماں باپ کی خدمت کرے اور حج کو نہ جائے۔ جب اللہ تعالیٰ موقع دے تو حج پر چلا جائے۔

ایک آدمی اتنا بوڑھا ہو گیا ہے کہ وہ سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ خود حج کو نہ جائے، لیکن اپنی جگہ کسی اور کو حجِ بدل کے لیے بھیج دے۔ اور اس آدمی کو بھیج دیا جائے جو شرعاً مسائلِ حج کو جانتا بھی ہو۔ اور جو مسائل کو نہیں جانتا اس کو حج پر نہ بھیجا جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ توفیق اور طاقت عطا فرما دے تو حج جوانی کے اندر کرنے کی کوشش کی جائے۔

اور حجِ بدل کرنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ملاحظہ فرمائیں کہ جس آدمی کا حج کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بھی پورے حج کا ثواب عطا فرمائیں گے اور جو حجِ بدل کرنے والا ہے اس کو بھی حج کا پورا پورا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ نہ حج کرنے والے کے حج کا ثواب کم ہوتا ہے اور نہ ہی حج کروانے والے کے حج کے ثواب میں کمی آتی ہے۔

حج کی اقسام:

حج کی تین اقسام ہیں: 1 ...... حجِ افراد، 2 ...... حجِ قران اور 3 ...... حجِ تمتع۔

حجِ افراد:

حج کے دنوں میں میقات سے صرف حج کا احرام باندھ کر حج کے لیے چلے جانا۔

حجِ قران:

قران کا معنی: دو چیزوں کو ملانا ہے۔ اصطلاحی معنی یہ ہے کہ حج اور عمرہ دونوں کو ملا کر اکٹھے نیت کرنا۔ یعنی جب میقات پر آئے تو کہے کہ یا اللہ! حج اور عمرہ دونوں کو ملا کر کروں گا۔ اب وہ پہلے عمرہ کرے گا، لیکن احرام نہیں کھولے گا، اسی احرام میں رہے گا، پھر حج کرے گا؛ اس لیے کہ اس نے دونوں کو ایک احرام میں جمع کیا ہے۔ پس وہ احرام آخر میں کھولے گا، یعنی جب وہ حج میں کنکری مارے گا، قربانی کرے گا اور بال منڈوائے گا پھر جا کر احرام کھولے گا۔ اس کا نام ''حجِ قران'' ہے۔

حجِ تمتع:

تمتع کا معنی نفع اٹھانا ہے۔ اصطلاحی معنی یہ ہے کہ آپ نے میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھا۔ مکہ میں آ کر

طواف کیا، صفا مروہ پر دوڑے، بال منڈوائے، احرام کھول لیا، کپڑے پہن لیے، کھاتے پیتے رہے اور منافع حاصل کرتے رہے۔ پھر جب حج کے دن آئے تو دوبارہ احرام باندھ لیا۔ اس درمیان میں جو نفع اٹھالیا اس کا نام ہی تمتع ہے۔

قرآن میں جہاں بھی حج فرض کا حکم ہے وہاں صرف حج کا ذکر ہے، عمرہ کا ذکر نہیں ہے، جیسے: ﴿وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ؕ﴾ [آل عمران:۹۷] لیکن یہاں پر اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرہ دونوں کا اکٹھے ذکر فرمایا ہے: ﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ لِلّٰہِ ؕ﴾ [البقرۃ:۱۹۶] (اللہ تعالیٰ کے لیے حج اور عمرہ پورا کرو)۔ مطلب یہ ہے کہ فرض تو حج ہی ہے، لیکن اگر عمرہ کو شروع کرلیا جائے تو اس کا پورا کرنا بھی واجب ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ حج اور عمرہ دونوں کو پورا کرو۔ وہاں پر صرف حج تھا اور یہاں پر حج اور عمرہ دونوں کا ذکر ہے۔

حج نہ کرنے کی شدید وعید:

ایک یہ ہے کہ انکار تو نہیں کرتا، لیکن دولت مند اور صاحب استطاعت ہونے کے باوجود بھی حج پر جانے کی خواہش اور کوشش نہیں کرتا۔ تو اس کے لیے بھی حضور پاک ﷺ نے اتنا سخت لفظ استعمال کیا ہے کہ گویا اس کا یہ کام بھی کافروں والا ہے۔ جیسے کہ اس کی تفصیل حدیث مبارکہ میں بھی آگئی کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ لَمْ یَحْبِسْہُ مَرَضٌ أَوْ حَاجَۃٌ ظَاهِرَۃٌ أَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ وَلَمْ یَحُجَّ فَلْیَمُتْ إِنْ شَاءَ یَهُوْدِیًّا أَوْ نَصْرَانِیًّا)) [بیہقی:۲/۸۹۶۲]

تم میں سے جو طاقت رکھتا ہے اور (اس کے باوجود) حج نہیں کرتا، چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ یعنی اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ حج اتنا ضروری حکم ہے کہ اس میں تساہل اور تغافل اتنا شدید ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

اور جمہور کا قول یہ ہے کہ وہ کافر تو نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے الفاظ ایسے استعمال فرمائے ہیں گویا کہ اس کا یہ عمل کافروں والا ہے۔ اس کے بغیر اگر موت آئی تو گویا ایسے موت آئی ہے جیسے یہودیت اور نصرانیت پر موت آتی ہے۔

اور یہ بھی سمجھ لیں کہ حج اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ جیسے نماز، روزہ الخ۔ حج فرض ہے اور عمرہ

سنت ہے۔ عمرہ کا بھی بہت بڑا ثواب ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ عمرہ گویا کہ چھوٹا حج ہے۔ خصوصاً وہ عمرہ جو رمضان المبارک میں نصیب ہو جائے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے رمضان المبارک میں عمرہ کیا گویا کہ اس نے میرے ساتھ حج کیا۔ کتنی بڑی سعادت ہے۔ تو عمرہ نفلی عبادت ہے۔ زندگی میں کبھی بھی نفلی عبادت ہو سکتی ہے اور کئی بار ہو سکتی ہے۔ اور حج زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے، اس کے بعد جتنی مرتبہ بھی ہو وہ نفل ہوگا۔

احرام، نیت اور تلبیہ کے مسائل:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ﴾ (حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے لیے پورا کرو) یعنی حج اور عمرے کا احرام جب باندھ لیا ہے تو اسے پورا کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ جب چاہا باندھ لیا اور جب چاہا کھول لیا۔ جب نیت کر لی ہے تو اسے پورا کرنا فرض ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دل کے ساتھ ساتھ زبان سے تلبیہ کہنا بھی ضروری ہے؛ اس لیے کہ ایک حدیث میں احرام کی بجائے کہ احلال کا لفظ ہے اور احلال کا معنی ہی تلبیہ ہے۔ اور عملِ رسول ﷺ بھی یہی ہے کہ آپ ﷺ نے بھی زبان سے تلبیہ فرمایا، جبکہ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک قلبی نیت کافی ہے، زبان سے تلبیہ کہنا کوئی ضروری نہیں ہے۔

﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ﴾ مثلاً: اگر تم نے احرام باندھا ہے اور احرام کے بعد تم چل پڑے، لیکن روک دیا گیا تو ﴿فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۖ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ﴾ [البقرۃ:۱۹۶] اب تم احرام نہیں کھول سکتے، جب تک کہ تم قربانی نہ کرو (اعلیٰ درجہ میں اونٹ ہے، درمیانی درجہ میں گائے ہے اور ادنیٰ درجہ میں بکری ہے) اور وہ بھی حرم کی حد میں آ کر ذبح ہو۔ مثلاً: اگر آپ کو ایئرپورٹ پر روک دیا گیا تو آپ کسی ساتھی کو پیسے دیں گے کہ مجھے روک دیا گیا ہے، آپ مہربانی فرما کر میری طرف سے مکہ شہر میں جا کر قربانی کرو۔ مجھے فون کر کے اطلاع دو۔ اس اطلاع کے بعد سر منڈا کر احرام کھولو گے۔ یہ نہیں کہ جب چاہو احرام باندھ لو اور جب چاہو کھولو کہ جی! ہم تو جہاز پر آئے تھے، ہماری فلائٹ کینسل ہوگئی ہے تو ہم نے کھول دیا۔ یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے احکام و مسائل ہیں۔

اور یہ بھی حکم ہے کہ آپ احرام اس وقت باندھیں جب آپ کو یقین ہو جائے کہ اب ہم جانے والے ہیں...... اِنْ

شَاءَ اللّٰہ!......۔ مثال کے طور پر: آپ غسل بھی کر لیں، چادر بھی باندھ لیں، لیکن نیت نہ کریں۔ جب جہاز میں بیٹھ جائیں تو جہاز میں بیٹھے بیٹھے نیت کر لیں۔ کوئی دو رکعت پڑھنا ضروری نہیں ہوتا، احرام کی دو رکعت نفل ہوتی ہیں۔ بس میں بیٹھے بیٹھے نیت کر کے تلبیہ کہہ دو، بس احرام ہو گیا۔ اگر تم نے مسجد میں امام کے ساتھ نماز پڑھی، امام نے سلام پھیرا اور تم نے تلبیہ کہہ لیا تو بھی احرام ہو گیا۔ اب کوئی علیحدہ سے دو رکعت پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح مثلاً: آپ لاہور یا کراچی سے جہاز میں بیٹھ گئے۔ جہاز والوں نے بتایا کہ ابھی 20 (بیس) منٹ بعد میقات آنے والا ہے تو آپ نے دیکھا کہ میرے پاس تو چادر نہیں ہے اور میں نے احرام بھی باندھنا ہے تو اسلام اتنی رعایت دیتا ہے کہ وہیں بیٹھے بیٹھے قمیص اتار دو، شلوار میں بیٹھے رہو، قمیص کو چادر کی طرح کندھے پر ڈال دو اور وہیں بیٹھے بیٹھے نیت کر کے تلبیہ کہہ لو۔ اور اتر کر چادر باندھ لو، کوئی مسئلہ نہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ جب تک قربانی اپنی جگہ یعنی ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدۃ:۹۵] کعبہ شریف تک نہ پہنچے۔ لیکن باقی آئمہ کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ جب وہ احرام باندھ رہا ہے اور اسے اِحصار کا خوف ہے تو وہیں وہ یہ کہہ دے کہ اے اللہ! احرام تو باندھ رہا ہوں، لیکن جہاں مجھے روک دیا گیا تو مجبوراً میں رک جاؤں گا۔ تو یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اگر وہ وہیں قربانی ذبح کر دے تو وہ احرام کھول سکتا ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہیں! قرآن پاک میں ہے: ﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ﴾ جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچے اور قرآن پاک میں ہے: ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدۃ:۹۵] یعنی حرم کے اندر پہنچے۔

جب آپ ﷺ عمرہ کے لیے تشریف لے آئے اور حدیبیہ میں کافروں کے مقام پر آپ ﷺ کو روک دیا گیا اور صلح ہو گئی کہ اگلے سال عمرہ قضا کریں تو آپ ﷺ جو جانور ساتھ لائے تھے وہیں پر ذبح کر دیئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی ذبح کرنے کا حکم دے دیا۔ اور سر منڈایا اور احرام کھول دیا۔ تو وہ حضرات فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو یہ حکم نہیں فرمایا کہ مکہ جا کر جانور ذبح کرو، بلکہ وہیں ذبح کر دیئے۔ اس لیے حکم یہ ہے کہ جہاں آپ روک دیئے جائیں وہیں ذبح کر کے بال منڈوا لیں اور احرام کھول سکتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ جگہ جا کر دیکھو جس جگہ آپ ﷺ روک دیئے گئے تھے وہ حدِ حرم کا کنارہ ہے۔ لہٰذا حدِ حرم کے اندر ہی ذبح ہوا۔ جیسے کوئی منیٰ میں ذبح کرے تو اس نے حدِ حرم میں ذبح کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیں اور اس کے بعد روک دیئے جائیں تو آپ اس وقت تک احرام

نہیں کھول سکتے، جب تک کہ قربانی اپنے مقام پر ذبح نہ ہو جائے۔

بعض فقہاء نے یہ بھی اندازہ کیا ہے کہ مثلاً: آپ رک گئے اور آپ نے کسی کو پیسے دے دیئے کہ میری طرف سے وہاں جا کر بکری وغیرہ ذبح کردے۔ اور آپ نے اندازہ لگا لیا کہ وہ مثلاً: ایک دن اور رات کے بعد فلاں وقت تک وہاں پہنچ کر ذبح کردے گا تو آپ اندازے سے وقت کی تعیین کر کے اس وقت احرام کھول سکتے ہیں۔

احرام میں اگر بیمار ہو جائیں:

احرام باندھنے کے بعد بیمار ہو گئے یا کوئی تکلیف ہو گئی یا آپ کے سر میں اتنی جوئیں پڑ گئیں کہ وہ گر رہی ہیں اور تکلیف ہے تو اللہ تعالیٰ نے رعایت دی ہے کہ اس میں تین طریقے ہیں: 1 ...... یا تو روزے رکھ لو 2 ...... یا صدقہ کے ذریعے فدیہ دے دو 3 ...... یا قربانی کرلو۔ اب کتنے روزے رکھنے ہیں؟ اس کے لیے تفصیل حدیث مبارک میں آئی کہ روزے رکھو تو تین اور اگر فدیہ دے تو چھ مسکینوں کو صدقۂ فطر کی مقدار دے گا، یعنی آپ کے حساب کے مطابق پونے دو سیر غلہ (گندم)۔

حج تمتع، قِران اور اِفراد کے مسائل:

﴿فَإِذَآ أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ﴾ اب تمہارا دشمن چلا گیا اور اب تم امن میں آگئے تو اب تم حج پر چلو۔ پس جس آدمی نے ایک سفر میں حج اور عمرہ دونوں کا نفع اٹھایا، مثلاً: اگر کسی نے حج کا احرام باندھا یا حجِ تمتع کا احرام باندھا تو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ﴾ شکر کے طور پر بکری ذبح کرو کہ اللہ پاک نے مجھے دونوں نعمتیں عطا کی ہیں۔

﴿فَمَن لَّمْ يَجِدْ﴾ اس کے پاس بکری کے پیسے نہیں ہیں اور اس کے پاس دمِ قران یا تمتع وغیرہ دینے کی طاقت نہیں ہے: ﴿فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ﴾ [البقرة:۱۹۶] تو تم تین روزے ایامِ حج میں رکھ لو۔ اور اس میں بہتر یہ ہے کہ آخری روزہ ۹ ذی الحجہ کو بن جائے اور چاہے تو اس سے پہلے بھی رکھ لو اور ۷ (سات) روزے گھر جانے کے بعد جب چاہو رکھ لو۔ ﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ﴾ یہ ۱۰ (دس) روزے رکھنے سے تمہارے ذمہ جو ہدی (قربانی) تھی، اللہ پاک نے اس کا بدل عطا فرما دیا۔ مثلاً: ایک آدمی نے حج کے ایام میں ۳ روزے نہیں رکھے تو اب وہ روزے نہیں رکھ سکتا، اب اس کو بکری دینا لازمی ہے جب بھی استطاعت ہو جائے۔

وہ لوگ جو میقات کے اندر رہتے ہیں وہ تمتع اور قران نہیں کر سکتے، مثلاً: تمہارا میقات یلملم ہے، مدینہ کا میقات ذوالحلیفہ ہے، ادھر میقات طائف ہے اور جو لوگ میقات سے باہر رہتے ہیں وہ تمتع اور قران کر سکتے ہیں اور جو میقات کے اندر رہتے ہیں وہ حجِ افراد کریں گے۔ ﴿ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة:١٩٦] وجہ یہ ہے کہ وہ تو مکہ میں رہتے ہیں۔ وہ سال میں جب چاہیں عمرہ کر لیں گے، لیکن جو لوگ باہر سے آرہے ہیں، معلوم نہیں کہ زندگی میں دوبارہ ان کو سفر نصیب ہوگا یا نہیں، اس لیے ان کو تمتع اور قران کی اجازت ہے۔

حنابلہ اور اہل حدیث حضرات کے نزدیک قران وہ شخص کر سکتا ہے جو قربانی کا جانور ساتھ لایا ہو۔ ان حضرات کے نزدیک بغیر جانور لائے حجِ قران ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جب حجِ قران کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ نے حجِ قران کیا تھا، لیکن آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں یہ حکم دیا تھا کہ تم عمرہ کر کے احرام کھول دو، اور پھر ۸ ذی الحجہ کو دوبارہ احرام باندھو۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جانور کا ساتھ لانا شرط نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ذبح کرنا مقصود ہے، ساتھ لانا مقصود نہیں۔ دوسرا وہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ تو جب عمرہ کے لیے آئے تھے تب بھی جانور ساتھ تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کہ اس وقت جانور لانا آسان تھا اور جن کے پاس جانور موجود نہیں تھے ان کو یہ رعایت دے دی، تا کہ لوگوں کو یہ مسئلہ بھی سمجھ آجائے کہ تمتع بھی ہو سکتا ہے اور قران بھی ہو سکتا ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [البقرة:١٩٦] یہ نہ سمجھ لینا کہ اب تو میں حاجی ہو گیا ہوں، جو چاہوں کرتا پھروں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ حج میں بڑے خطرے ہوتے ہیں، عورتوں اور مردوں کا آپس میں اختلاط کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پیسے ہیں، یعنی آدمی بدنظری، ڈاکہ، زنا اور چوری وغیرہ جیسے گناہوں میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو۔ حج پر آرہے ہو، اگر تم نے میرے گھر میں آنے کے بعد اور حج کی نیت کے بعد بھی حیا نہ کی تو پھر میرا عذاب بھی سخت ہے، اس کے لیے تیار ہو جاؤ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سعید بن جبیر اور سفیان بن سعید ثوری رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ حج اور عمرے کے اِتمام کا مقصد یہ ہے کہ تم اپنے گھر سے احرام باندھو، یعنی اپنے گھر سے صرف اسی نیت سے چلو۔ اور جب میقات پر پہنچو تو تلبیہ کہو، یعنی ابتداء تو آگے ہوگی، لیکن گھر سے جب نکلو تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے حج اور عمرہ کی نیت سے نکلو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی مقصد نہ ہو۔

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ [البقرۃ: ۱۹۷]

"حج کے چند مہینے متعین ہیں جس نے ان میں (احرام باندھ کر) اپنے پر حج لازم کرلیا تو نہ حج کے زمانہ میں مباشرت جائز ہے اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا۔ اور جو تم صدقہ دو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔ اور زاد راہ لے لیا کرو؛ کیونکہ بہتر زاد راہ سوال کرنے سے بچنا ہے۔ اور اے عقلمندو! مجھ سے ڈرتے رہو۔"

(۱) حج کا موسم:

حج کے مہینے جانے پہچانے ہیں؛ اس لیے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی انہی مہینوں کو حج کے مہینے کہتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اس میں بھی وہی مہینے رہے، اس لیے فرمایا: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ﴾۔ "اَشْهُر" "شَهْر" کی جمع ہے۔ پس "اَشْهُر" کا معنی ہوا مہینے۔ اور وہ مہینے: شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن ہیں۔ چونکہ یہ تین ماہ تو نہیں لیکن جمع کا صیغہ ہے تو عربوں کے نزدیک کبھی کبھی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ ذی الحجہ کے بھی دس دن شامل ہیں، اس لیے اس کو بھی تقریباً اس میں بطور تیسرے مہینے کے شامل کر دیا۔ یہ ایک محاورے کی بات ہے۔ بہر حال اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اشہر حج: شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ ہیں۔ لیکن امام مالک رحمہ اللہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ذی الحجہ کا پورا مہینہ اشہر حج میں شامل ہے۔ یعنی رمضان المبارک کے ختم ہونے کے بعد اشہر حج شروع ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کا نظام دیکھو کہ پہلے رمضان المبارک میں ہمیں صبر کی تعلیم دے دی۔ دن میں روزے رکھوا دیئے، رات کو تراویح میں کھڑا کر کے قرآن پڑھوا دیا۔ اور جب مہینہ ختم ہو گیا تو فرمایا کہ اے میرے بندے! اب تو اس قابل ہو گیا ہے کہ تم میرے گھر کی طرف دوڑ کے آئے اور میں تجھے حج نصیب کروں۔

(۲) حج کا احرام باندھنے کا وقت:

قواعدِ عربیہ کے اعتبار سے معنی یوں ہوگا: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ﴾ کہ حج وہ حج ہے جو ان معلوم مہینوں میں ہو۔ اس طرح معنی یہ ہوگا: "اِحْرَامُ بِالْحَجِّ فِيْهَا اَكْمَلُ مِنَ الْاِحْرَامِ فِيْمَا عَدَا" یعنی حج کے مہینوں میں حج کا احرام

باندھنا تو اکمل، کامل اور افضل ہوگا، البتہ ماسوا میں بھی اس ترکیب کے مطابق جائز ہو جائے گا۔

"وَالْقَوْلُ بِصِحَّةِ الْإِحْرَامِ فِيْ جَمِيْعِ السَّنَةِ" کہ سارے سال میں کوئی آدمی حج کا احرام باندھ لے تو کیا اس کا احرام صحیح ہوگا؟ مگر حج تو انہی دنوں میں ہوگا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اشہرِ حج سے پہلے بھی کوئی آدمی حج کا احرام باندھ سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حج کسی اور تاریخ میں بھی ہو سکتا ہے۔ حج تو نو (۹) ذی الحجہ کو عرفات میں ہی ہوگا۔ کوئی آدمی مثلاً: رمضان المبارک سے احرام باندھ لے، ابھی سے میں نے نیت کر لی ہے اور وہ حج تک اسی طرح احرام ہی میں رہے تو کیا اس کا احرام باندھنا درست ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تو حج سے پہلے احرام باندھنا درست ہی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ احرام منعقد ہی نہیں ہوگا؛ اس لیے کہ حج کے دن شروع ہی نہیں ہوئے۔ اور باقی ائمہ کرام: امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راھویہ اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ وغیرہ سب کے نزدیک احرام تو صحیح ہے، لیکن اشہرِ حج میں احرام باندھنا افضل ہے؛ اس لیے کہ اللہ پاک نے سارے سال میں میقات بنائے ہیں، تو کسی وقت بھی احرام باندھا جا سکتا ہے۔

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ﴾ کا معنی یہ ہے کہ "وَقْتُ الْحَجِّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ" یعنی حج کا وقت گنے ہوئے مہینے ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ باقی مہینوں میں سے انہیں مہینوں کو اللہ پاک نے حج کے لیے خاص کیا ہے۔ جیسے نماز کا وقت نہ ہو اور کوئی آدمی نماز کی نیت کرے تو نماز منعقد نہیں ہوگی، اسی طرح حج کے مہینے ہی شروع نہ ہوں تو کوئی احرام باندھ لے تو اس کا حج بھی نہیں ہوگا۔ "لَا يَنْبَغِيْ لِأَحَدٍ أَنْ يُّحْرِمَ بِالْحَجِّ إِلَّا فِيْ شُهُوْرِ الْحَجِّ مِنْ أَجْلِ قَوْلِهٖ تَعَالٰى" (نہیں لائق کسی کو کہ حج کا احرام باندھے، مگر اشہرِ حج میں ہی اللہ تعالیٰ کے فرمان کی وجہ سے)۔ یعنی حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھنا درست نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کوئی امام بھی یہ نہیں فرماتے کہ تم حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھو، تمام ائمہ کرام رحمہم اللہ اس بات پر متفق ہیں کہ حج کے مہینے میں حج کا احرام باندھا جائے۔

رفث، فسوق اور جدال کا معنی:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس پر حج فرض ہو جائے احرام باندھے تو اس کو چاہیے کہ تین چیزوں سے بچے: ایک رفث، دوسرا فسوق اور تیسرا جدال۔

"رَفَثٌ" کا معنی میاں بیوی کا ملنا یا شہوت انگیز بات یا کوئی شہوت انگیز کام کرنا ہے۔

''فُسُوْق'' کا معنی نافرمانی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والے سارے کام منع ہو گئے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی تو پہلے سے ہی حرام ہے، لیکن یہاں پر ''فُسُوْق'' کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں حج کے احکام دیئے ہیں، مثلاً: احرام باندھنا، احرام کی حالت میں بال نہ کٹوانا، خوشبو نہیں لگانی، بیوی سے مباشرت نہیں کرنی، ناخن نہیں کاٹنے اور سلے ہوئے کپڑے نہیں پہننے، یہ سارے کام ممنوع ہیں۔ اگر کرو گے تو نافرمانی ہے، لہٰذا ان احکام میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرو جو حج سے تعلق رکھتے ہیں۔

''جِدَال'' کا معنی یہ ہے کہ جیسے مکہ والوں نے کیا کہ وہ پہلے حج کرتے تھے تو عرفات جاتے تھے، لیکن بعد میں کہنے لگے کہ چھوڑو! یہ سارے لوگ حج کرتے ہیں اور عرفات میں جاتے ہیں اور ہم تو صرف مزدلفہ جائیں گے۔ وہ مزدلفہ میں جا کر ٹھہر جاتے، لوگ عرفات سے واپس آ جاتے، وہ بھی مزدلفہ سے واپس آ جاتے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مکہ والے ہیں، کعبۃ اللہ کے مجاور ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ کے گھر کے رکھوالے ہیں تو ہمارا لوگوں سے کوئی علیحدہ اعزاز تو ہونا چاہیے کہ لوگ بھی عرفات میں حج کریں اور ہم بھی تو دیگر لوگ اور ہم برابر ہو گئے، حالانکہ ہم تو خاص اللہ تعالیٰ کے دربار کے مجاور ہیں، لہٰذا ہم تو مزدلفہ میں رہیں گے، عرفات میں نہیں جائیں گے۔ پھر اس پر جھگڑے ہوتے تھے اور فسادات ہوتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حج میں جھگڑے نہ کرو، جیسے زمانہ جاہلیت میں عادت ہوتی تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو پورا کرو۔

بعض علماء نے فرمایا کہ قدرتی بات ہے کہ ایک آدمی سفر میں تھک جاتا ہے، چڑچڑا ہو جاتا ہے اور سفر میں لڑائی کا امکان زیادہ ہوتا ہے، اور سفر کو سفر اس لیے کہتے ہیں کہ سفر کا معنی ''بند چیز کو کھولنا'' ہے؛ کیونکہ سفر میں آدمی کی اہلیت کھل جاتی ہے۔

اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی سے پوچھا کہ تم فلاں بندے کو جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ جی ہاں! میں جانتا ہوں، اچھا آدمی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ تمہارا ہمسایہ ہے؟ اس نے کہا کہ ہمسایہ تو نہیں ہیں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی سفر بھی کیا ہے؟ اس نے کہا کہ سفر بھی نہیں کیا۔ فرمایا کہ پھر تم کیا جانتے ہو!؟ آدمی کا پتہ تو تب چلتا ہے جب کچھ عرصہ ہمسایہ رہا ہو اور اسی طرح جب تک آدمی کسی کے ساتھ سفر نہ کرے تو اس کے بارے میں کیا پتہ چلتا ہے؟ سفر میں بڑے بڑے راز کھل جاتے ہیں۔

تو اس لیے حکم تھا کہ جب سفر کرو گے تو لازمی بات ہے کہ حاجی حاجی کے ساتھ لڑ سکتا ہے اور چونکہ سیٹ پر، کرسی

پر، جہاز میں، بس میں، خیمے میں اور منیٰ میں حاجیوں کے لیے ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں...... اللہ تعالیٰ معاف فرمائے...... بڑا امتحان ہوتا ہے کہ بندہ جھگڑے سے بچ سکے۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ حج میں لڑائی نہ کرو، برداشت کرو اور حلم سیکھو۔ وہ جو رمضان مبارک میں ہم نے تمھیں سبق پڑھایا تھا کہ سامنے پانی رکھا ہے، شربت رکھا ہے جب تک میرا حکم نہ ہو جائے، یعنی سورج نہ ڈوب جائے تو نہ پینا۔ تو کیا وہ صبر بھول گئے ہو؟ لہٰذا صبر پر عمل کرو اور لڑائی نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ نے نفی کے الفاظ استعمال کیے، نہی کے الفاظ استعمال نہیں کئے، یعنی ﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ فرمایا کہ رفث نہیں، فسوق نہیں اور جدال نہیں۔ ''لَا تَرْفُثُوا'' نہیں فرمایا، ''لَا تَفْسِقُوْا'' نہیں فرمایا اور ''لَا تُجَادِلُوْا'' نہیں فرمایا۔ تو یہ نفی، نہیں کے معنی میں ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو باہر بھی منع ہیں، لیکن حج کے دنوں میں تو ان چیزوں کا وجود ہی نہیں ہونا چاہیے۔ گویا کہ یہ چیزیں تم سے اتنی دور ہو جائیں کہ یہ پائی ہی نہ جائیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ نہیں فرمایا کہ جھگڑا مت کرو، نافرمانی مت کرو اور شہوت والے کام مت کرو، بلکہ فرمایا کہ ایسے حالات ہی پیدا نہ کرو کہ جھگڑا ہو جائے۔ یا بیوی سے باتیں کرتے کرتے شہوت اٹھ جائے۔ فرمایا: ایسی بات ہی نہ کرو، ایسا موقع ہی نہ آنے دو کہ پھر خوامخواہ پریشان ہوتے پھرو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے منع فرمادیا ہے۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ﴾ تمہاری ایک ایک حرکت اور سکون اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

حج میں سفر خرچ کا انتظام:

﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ﴾ [البقرۃ:۱۹۷]

''اور زادِ راہ لے لیا کرو اور بہترین زادِ راہ سوال کرنے سے بچنا ہے۔ اور اے عقلمندو! مجھ سے ڈرتے رہو۔''

''وَتَزَوَّدُوا'' کا معنی حج کے لیے سامانِ سفر بھی ساتھ رکھو۔ اصل وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کے زمانے میں یمن کے کچھ لوگ جب حج پر آتے تھے تو کوئی سامان وغیرہ ساتھ نہیں لاتے تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم حج پر جا رہے ہو، سامان لے کر کیوں نہیں جا رہے؟ تو وہ کہتے کہ بھئی! کمال ہے! اللہ تعالیٰ کے گھر میں جا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مہمان بن کر جا رہے ہیں تو سامان رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ گھر سے تو یہ خوش ہو کر آتے اور جب مکہ مدینہ

پہنچتے تو بھیک مانگ کر گزارہ کرتے۔ یہ چیزیں بھی شریعت میں حرام ہیں۔

اس سے یہ مسئلہ بھی نکلا کہ آدمی یہ کہے کہ میں اسباب پر عمل نہیں کروں گا، میں توکل والا ہوں، بڑا متوکل ہوں۔ یہ اسلام کا مخالف ہے۔ یہ کوئی توکل نہیں کہ تم بیٹھے رہو کہ میں پانی نہیں پیوں گا یا آپ کہیں کہ ہم نے کھانا نہیں کھانا، ہمارا تو اللہ تعالیٰ پر توکل ہے، اللہ تعالیٰ خود کھلائے گا۔ تو...... ان شاء اللہ...... آپ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے 48 گھنٹوں بعد فوت ہو جائیں گے۔ کبھی یہ توکل کر کے دیکھ لو یہ اسلام کے خلاف ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ یہ توکل بزرگی نہیں ہوتی، یہ ناجائز ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ اسباب اختیار کرلو، پانی پی لو، لیکن یہ عقیدہ رکھو کہ پیاس بجھانے والا اللہ ہے۔ کھانا کھا لو، لیکن یہ عقیدہ رکھو کہ روٹی پیدا کرنے والا اللہ ہے اور اس کے منافع دینے والا بھی اللہ ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو میں غذا کھاؤں اور بیمار ہو جاؤں، میں غذا کھاؤں اور بدہضمی پیدا ہو جائے یا میرے لیے الٹا نقصان کا ذریعہ بن جائے۔

اسلام نے حکم دیا ”وَتَزَوَّدُوْا“ اپنے سفر کے لیے اسباب رکھو اور ضرورت کی سب چیزیں اپنے ساتھ رکھو۔

البتہ یہ یقین رکھو کہ اصل زادِ راہ تو اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے۔ اگر تقویٰ ہوگا تو تمہارے لیے ہم سارے مسئلے آسان کر دیں گے۔ ﴿وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ اگر تم عقل والے ہو اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ ہر وقت ڈرنے کا حکم کیوں دیا ہے؟ اس لیے کہ حج میں مرد اور عورت نہ بھی چاہیں تو اکٹھے ہو جاتے ہیں، کبھی کمرے میں اکٹھے، کبھی طواف میں اکٹھے، صفا اور مروہ میں اکٹھے، منیٰ میں اکٹھے اور بسوں میں اکٹھے۔ اس لیے اللہ پاک بار بار فرماتے ہیں ”وَاتَّقُوا اللّٰهَ...... وَاتَّقُوا اللّٰهَ“ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو!) اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا کرو! اس لیے کہ حالات ایسے ہیں کہ عورتیں اور مرد اکٹھے ہوتے ہیں، پھر حاجی بے چارے نئے نئے آتے ہیں، کسی کا پرس بھول گیا، کسی کے پیسے بھول گئے تو چوری کا بہت اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے بار بار ڈرایا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ میرا ڈر پیدا کرو۔ جب دل میں میرا ڈر پیدا ہو جائے گا تو گناہوں سے خود بخود بچ جاؤ گے۔ اللہ پاک آپ کو اور مجھے بھی اپنا ڈر نصیب فرمائے (آمین)۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ﴾

[البقرة:١٩٨]

''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ (زمانہ حج میں تجارت کر کے) اپنے رب سے رزق طلب کرو۔ پھر جب عرفات سے لوٹ کر (مزدلفہ) آؤ تو مشعر حرام کے پاس اللہ کو یاد کرو اور اس کو ویسا یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں طریقہ سکھایا ہے۔ اور اگرچہ تم اس سے پہلے ناواقف تھے۔''

آیت کا شانِ نزول اور حج میں تجارت و ملازمت:

اسلام سے قبل اور آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے جاہلیت میں جہاں اور قسم کی چیزوں کو ایجاد کیا تھا وہاں ایک رواج یہ بھی تھا کہ انہوں نے حج کی عبادت کو میلا بنالیا تھا۔ چونکہ لوگوں کا بہت بڑا اجتماع ہوتا تھا تو وہ منیٰ میں بڑے بڑے بازار اور تجارتی میلے وغیرہ لگا لیتے تھے۔ اب اسلام نے جہاں جاہلیت کے تمام آثار کو مٹا ڈالا، ان کے عقائد سے لے کر ان کے اعمال تک کو ختم کر ڈالا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل میں خیال آیا کہ یہ منڈیاں، دکانیں، کاروبار اور تجارت وغیرہ تو زمانہ جاہلیت میں ہوتی تھی، اب اسلام کے اندر کیا ہوگا؟ ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب ہم حج کے دنوں میں تجارت وغیرہ کریں تو یہ جائز ہوگی یا نہیں؟

اسی طرح ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک آدمی آیا۔ اس نے پوچھا کہ ہمارے پاس اونٹ ہیں، ہماری یہ عادت اور کاروبار ہے کہ حج کے دنوں میں ہم اونٹ سواری کے لیے اور مال برداری کے لیے کرائے پر دیتے ہیں تو کیا ہم دے سکتے ہیں یا نہیں؟ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کیا تم عام حاجیوں کی طرح احرام نہیں باندھتے، طواف نہیں کرتے، رمی نہیں کرتے؟ اس نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: تم حاجی ہو۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ نبی کے پاس ایک آدمی آیا تھا اور اس نے یہی سوال کیا تھا تو آپ ﷺ خاموش رہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اونٹ کرایہ پر دے سکتے ہو، اس پر کوئی گناہ نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی آدمی حج کے دنوں میں ملازم ہے اور اس کی ڈیوٹی اور مزدوری بھی منیٰ میں ہے تو کیا وہ حج کے دنوں میں ڈیوٹی کر سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ کوئی منع نہیں ہے، اس کے حج میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔

اسی طرح اگر کوئی آدمی حج کے دنوں میں، مثلاً: مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، عرفات یا منیٰ وغیرہ میں کوئی چیز لے کر بیچ لیتا ہے کہ میں حج بھی کرلوں اور روزی بھی کما لوں تو یہ بھی شریعت کے اندر منع نہیں ہے، لیکن اس کا ایک مسئلہ سمجھ لیں

کہ جب تم اپنے وطن سے آرہے ہو تو دیکھیں کہ سب سے پہلے تمہاری نیت کیا ہے؟ اگر تمہاری نیت کاروبار، تجارت یا مزدوری کی ہے اور حج آپ نے ضمناً کرلیا، یعنی آئے تو پیسے کمانے تھے، لیکن حج کے دن آگئے اور آپ نے حج بھی کرلیا، یعنی تمہارا مقصود حج پر آنا نہیں تھا۔ ایک صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے ملک سے حج کے دنوں میں آرہا ہے۔ صرف حج کے دنوں میں یہاں اس کی کوئی نوکری، کوئی کنٹریکٹ، کوئی سروس نہیں ہے، اب وہ آرہا ہے، لیکن اس کی غالب نیت یہ ہے کہ میں تجارت کروں گا، پیسے کماؤں گا اور حج بھی پڑھ لوں گا۔ تو علماء نے فرمایا کہ حج تو ہو جائے گا، لیکن وہ ثواب مرتب نہیں ہوتا جو کہ ہونا چاہیے؛ کیونکہ اس کی نیت میں کمانا حج سے مقدم ہے اور حج مؤخر ہے۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ دونوں برابر برابر ہیں کہ تجارت بھی کرلیں گے اور حج بھی کرلیں گے تو اب بھی حج تو ہو جائے گا، لیکن پھر بھی وہ فضیلت اور ثواب مرتب نہیں ہوگا۔

اور ایک آدمی اپنے گھر سے خالص حج کے لیے چلا ہے، اس کی تجارت وغیرہ کی کوئی نیت نہیں ہے، لیکن حج میں آنے کے بعد یعنی جب یہاں پہنچا تو ضرورت پڑگئی، پیسے کم ہوگئے۔ تو اس نے کہا کہ بجائے سوال کرنے کے بہتر ہے کہ میں مزدوری کرلوں۔ تو اب اس کا اصل مقصد حج تھا، لیکن وہ کام ضمناً کر رہا ہے، مجبوری کے پیش نظر یا مجبوری تو نہیں آئی، لیکن اس نے سوچا کہ مجھے یہاں پر کافی دن ٹھہرنا ہے اور وہ تاجر ہے، کاروباری تجربہ بھی ہے۔ اگر وہ آدمی چند کاروبار کرلے گا تو کوئی حرج نہیں ہے، اس کی بھی اجازت ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ تمہاری اصل نیت حج ہو اور مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہو، البتہ ضمناً تجارت وغیرہ بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ علماء کرام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم تجارت کرو، بلکہ فرمایا ہے: ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ [البقرة:١٩٨] اگر تم کچھ روزی کما لو تو کوئی گناہ نہیں ہے، کوئی تم پر حرج نہیں ہے، لیکن بہتر یہ تھا کہ تم حج کو خالص حج ہی رکھتے اور کوئی نیت اس میں شامل نہ کرتے۔

علماء نے ایک مسئلہ اور بھی بیان فرمایا ہے کہ کم از کم پانچ دن جو حج کے ہیں ان کو تو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے رکھ لو، ان میں کوئی اور مقصود نہ ہو، تا کہ توجہ خالص عبادت کی طرف لگ سکے۔ بہرحال جو لوگ اپنے گھروں سے خالص حج کے لیے آتے ہیں ان کے مرتبوں کا کیا کہنا!!

خلاصہ یہ ہے کہ اگر تمہارا مقصود حج ہے اور ضرورت پیش آنے کی وجہ سے کوئی چیز خرید لی یا بیچ لی تو کوئی منع نہیں ہے اور اگر مقصود کمانا ہے اور حج ضمناً کرنا ہے تو حج تو ہو جائے گا، مگر حج پر وہ ثواب مرتب نہیں ہوگا اور وہ درجات

نہیں ملیں گے جو حج پر ملتے ہیں۔

میدانِ عرفات:

﴿فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ﴾

عرفات کو عرفات کیوں کہتے ہیں؟ اس میں علماءِ کرام کے مختلف اقوال ہیں، لیکن راجح بات یہ ہے کہ اس میں بندے کو اپنے رب کی معرفت حاصل ہوتی ہے کہ اپنے رب کے حکم کے لیے دو چادریں باندھ کر، اپنے تکبر، دولت، غنا، اقتدار اور حاکمیت وغیرہ ہر چیز کو چھوڑ چھاڑ کے مٹی پر آ کر بیٹھا ہوا ہے، ورنہ عرفات میں جانے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ اور یہی وہ حکمتیں ہیں کہ اگر آپ غور کریں تو سارا مکہ پہاڑوں میں ہے، کالے کالے پہاڑ اور پہاڑ بھی ایسے کہ بالکل خشک، یعنی جن پر کوئی پتا، بوٹا، درخت اور سبزہ وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پہاڑ بھی سارے گرم، کوئی ٹھنڈا بھی نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کیا مشکل تھا!؟ یہاں سے ۱۰۰ کلومیٹر بعد طائف ہے۔ وہ کتنا ٹھنڈا ہے! ھدا کتنا ٹھنڈا ہے! شفا کتنا ٹھنڈا ہے!۔ جیسے جیسے آپ آگے بڑھتے جائیں گے، حتیٰ کہ بعض ایسی جگہیں ہیں، جیسے طائف کے انگور، انار اور گلاب کا پھول وغیرہ۔ پوری دنیا میں ان چیزوں کے مقابلے کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اتنی چیزیں ہیں! موسم ٹھنڈا ہے، سب کچھ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مکہ کی وادی کو عین گرم، خشک، کالے سیاہ پہاڑ۔ جدھر بھی آپ نظر ڈلیں آپ کو خشک پہاڑ نظر آئیں گے۔ پھر میدانِ عرفات کیا ہے؟ چٹیل میدان ہے بس۔ اس کے اندر کوئی اور دلچسپی کا سامان نہیں ہے۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ یہاں پر جو بھی آئے سوائے میری رضا کے اور کوئی نیت کرنا بھی چاہے تو نہ کر سکے۔ پس علماء کرام نے فرمایا کہ وہاں پر آدمی کو رب کی معرفت حاصل ہوتی ہے کہ اے ربِ کریم! تیری کیسی شان ہے کہ تو نے بے آب وگیاہ میدان میں ۲۰ لاکھ افراد کو جمع کر دیا ہے کہ شاہ ہیں، گدا ہیں، وزیر ہیں، گورے ہیں، کالے ہیں اور عرب ہیں، عجم ہیں۔ سب کا ایک لباس ہے، ایک ہی ترانہ اور ایک ہی مقصد ہے اور سب مٹی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس لیے علماءِ کرام نے فرمایا کہ ہر بات چونکہ معرفت کا مقام ہے، اس لیے اس کو ''عرفات'' کہتے ہیں۔

''عرفات'' کی وجہ تسمیہ:

اور بعض علماء نے یہ وجہ بھی لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو حج نصیب فرمایا، حضرت آدم علیہ السلام

کو حج کی تعلیمات دی گئی اور ان کو سارے واقعات سمجھانے گئے تو ان کو کہا گیا کہ "عَرَفْتَ؟" (کیا تو نے جان لیا؟)۔ انہوں نے فرمایا کہ ہاں! میں نے سمجھ لیا اور مجھے پتہ چل گیا کہ کعبہ یہ ہے، منیٰ یہ ہے، عرفہ یہ ہے اور مزدلفہ یہ ہے۔ اس لیے بھی اس کو "عرفات" کہا جاتا ہے۔

اور بعض علماء کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے جنت سے نکالا تھا تو بی بی حواء رضی اللہ عنہا کو علیحدہ اتارا گیا اور آدم علیہ السلام کو علیحدہ اتارا گیا، پھر ان کا اللہ پاک نے لقا بھی میدانِ عرفات میں کروا تھا۔

لیکن یہ ساری باتیں ایسی کتب متقدمہ سے ہیں جن کی تصدیق نہیں کی جاسکتی؛ اس لیے کہ یہ قرآن میں ہیں اور نہ ہی ہمارے آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں۔

وقوفِ عرفات کی اہمیت:

یہ بھی یاد رکھیں کہ عرفات حج کا ایسا عظیم رکن ہے جس کے بغیر حج نہیں ہوسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نے احرام باندھ لیا، طواف کرلیا، صفا و مروہ دوڑ لیے اور منیٰ و مزدلفہ چلے گئے، سارے کام کر لیے، لیکن عرفات نہیں گئے تو حج نہیں ہوگا۔ اس لیے حدیث پاک میں بھی آ گیا کہ میرے آقا سرکارِ مدینہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: "مَا الْحَجُّ؟ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!" (اے اللہ رسول! حج کس چیز کا نام ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلْحَجُّ عَرَفَاتٌ" کہ حج تو عرفات میں حاضری کا نام ہے۔

جو لوگ وہاں پر زوال سے پہلے یا زوال کے بعد چلے جائیں ان کو عرفات میں ۹ تاریخ کو سورج ڈوبنے تک رہنا ہے۔ جب تک سورج غروب نہ ہو وہاں عرفات کے میدان سے نہیں نکل سکتے اور جب سورج غروب ہو جائے، اب عرفات کے میدان سے چل پڑیں اور مشعر الحرام کی طرف آئیں۔

مشعر کا معنیٰ: شعار بمعنیٰ علامت کے ہیں اور حرام کا معنیٰ حرمت کا ہے، یعنی یہ پہاڑ بڑی عظمت والا ہے۔ اس مسجد کے ساتھ جو اونچی جگہ ہے یہ مشعر الحرام ہے، لیکن اب اس کے ساتھ جتنا بھی میدان ہے وہ سارا اس کے تابع ہے، یعنی اگر آپ مزدلفہ میں کسی مقام پر چلے جائیں تو گویا آپ مشعر الحرام میں آ گئے ہیں۔

اب آپ سمجھ لیں کہ آپ نے عرفات سے مزدلفہ میں آنا ہے۔ ﴿وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ﴾ اللہ پاک نے فرمایا کہ تم میرا ذکر کرو، لیکن اس طرح جس طرح تم کو بتایا اور سمجھایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ

چاہے کوئی کام کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہماری رہنمائی فرمائی ہے اس طرح نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ کو قبول نہیں فرمائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اب حکم دیا ہے کہ تم دونوں نمازیں: مغرب اور عشاء مزدلفہ میں ادا کرو۔ حالانکہ حکم کا ظاہری تقاضہ یہ تھا کہ ہم مغرب کی نماز مغرب کے وقت میں پڑھتے؛ کیونکہ ہمارا وقت تو عرفات میں ہو گیا تھا۔ اور عشاء کی نماز عشاء کے وقت میں پڑھتے، لیکن اللہ پاک نے فرمایا: اگر تم اب اپنی عقل سے فیصلہ کرو گے تو میں تمہاری عبادت کو قبول نہیں کروں گا۔ تم پڑھ تو مغرب کے وقت میں رہے ہو، لیکن میرا حکم یہ ہے کہ تم مزدلفہ میں جا کر پڑھو۔ اگر تم راستے میں بھی پڑھو گے تو میں تمہاری نماز قبول نہیں کروں گا۔ اب آپ نے دونوں نمازیں مزدلفہ میں آ کر پڑھنی ہیں۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے تجاوز کرو گے تو وہ قبول نہیں ہوگی۔

﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ [البقرة:۱۹۹]

''پھر طواف کے لیے چلو جہاں سے لوگ چلیں اور اللہ سے مغفرت طلب کرو۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

''ثُمَّ'' عطف اور ترتیب کے لیے ہے، یعنی جب آپ مزدلفہ میں آ گئے تو دو نمازیں: مغرب اور عشاء مزدلفہ میں پڑھیں۔ اذان ایک ہوگی اور ہر نماز کی تکبیر علیحدہ ہوگی۔ اور رات مزدلفہ میں گزاریں، پھر صبح کی نماز مزدلفہ میں پڑھیں، صبح کے بعد لمبی دعا مانگیں اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے منیٰ کی طرف چل پڑیں۔ ﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں، جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہو گئیں اور جو زمانہ جاہلیت میں غلط باتوں پر عمل ہوتا رہا۔ اللہ پاک بخشنے والا اور مہربان ہے۔

﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ﴾ اصل میں یہ زمانہ جاہلیت کی ایک رسم کا رد ہے کہ مشرکین مکہ جب حج کو جاتے تھے تو وہ مزدلفہ میں رک جاتے تھے اور عرفات میں حج کو نہیں جانتے تھے؛ اس لیے کہ ان کو تکبر تھا کہ ہم مکہ والے ہیں، ہمارے قریش ہیں اور حمس ہیں، لہٰذا ہم عرفات میں نہیں جائیں گے، جہاں عام لوگ جاتے ہیں۔ کیا ہم ان لوگوں کے ساتھ کھڑے ہوں؟ ہماری تو شان علیحدہ ہے، ہم تو کعبۃ اللہ کے مجاور ہیں، ہم قریش ہیں اور یہاں کے سردار ہیں۔ اس لیے وہ مزدلفہ میں ٹھہر جاتے تھے اور عرفات میں جاتے ہی نہیں تھے۔ تو

اللہ تعالیٰ نے ان کی رسم جاہلیت کو مٹایا اور فرمایا: ﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ﴾ تم وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلتے ہیں، یعنی حج کا مقام عرفات ہے، یہ نہیں کہ کوئی مزدلفہ میں ٹھہر جائے اور کہے کہ میرا حج ہو گیا۔ عرفات سے چلو اور مزدلفہ میں آؤ۔ اس لیے فرمادیا گیا اور ساتھ یہ بھی حکم دیا گیا۔

استغفار کی فضیلت:

﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۚ﴾ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والے بھی ہیں اور نہایت مہربان بھی ہیں۔ استغفار بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاک پیغمبر حبیب کبریا حضرت محمد مصطفی ﷺ معصوم اور گناہوں سے پاک ہیں، لیکن پھر بھی فرماتے ہیں کہ میں روزانہ سو (۱۰۰) مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ تو جو گناہوں سے معصوم ہیں وہ تعلیم امت کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ اور سید الاستغفار جو احادیث میں آتا ہے، بخاری شریف میں حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّي لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي؛ فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ)) [صحیح البخاری، رقم: ۶۳۰۶، باب: أَفْضَلِ الاسْتِغْفَارِ]

اسی طرح آتا ہے:

((أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ، وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ))

اسی طرح آتا ہے:

((أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ الْعَظِيْمَ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ)) [کنز العمال: ۲۱۱۹۱،۳۵۳۶]

اور اگر یہ سارا یاد نہ ہو تو "أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ...... أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ" کہتے رہیں۔

استغفار کے فوائد:

استغفار گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور غربت کو بھی مٹا دیتا ہے۔ استغفار کی وجہ سے اللہ پاک رزق میں برکت عطا فرماتے ہیں، اولاد میں بھی برکت عطا فرماتے ہیں، فصلوں میں برکت عطا فرماتے ہیں اور کاروبار میں برکت عطا فرماتے ہیں۔

اس لیے اللہ پاک نے حکم دیا کہ اب تم استغفار کرو، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ شاید حج کے اندر یا مناسک کے اندر تم سے کوئی کمی رہ گئی ہو یا کوئی غلطی ہو گئی ہو تو اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والے اور مہربانی کرنے والے ہیں۔

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾﴾ [البقرۃ: ۲۰۰ تا ۲۰۲]

"پھر جب حج کے کام (رمی، جمرہ عقبہ اور طواف) پورے کر چکو (اور منیٰ میں ٹھہرو) تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جیسے تم اپنے آباء و اجداد کو یاد کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔ پھر کوئی آدمی تو کہتا ہے: اے ہمارے رب! ہمیں (ہمارا حصہ) دنیا میں دے دے۔ اس کے لیے آخرت (کے ثواب) میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور کوئی ان میں سے کہتا ہے: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں نعمت دے اور آخرت میں جنت اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ ایسے لوگوں کے لیے ثواب ہے، جو وہ (حج میں عمل اور دعا) کرتے تھے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔"

مزدلفہ میں کثرت سے ذکر کا حکم:

اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ تم منیٰ اور عرفات میں بھی پہنچے اور عرفات کے بعد تم مزدلفہ میں بھی آئے۔ اب جب تم نے حج کے مناسک پورے کر لیے ہیں تو اس کے شکر کا تقاضا یہ ہے کہ اب تم اس کا ذکر کرو۔ وجہ یہ ہے کہ حج کا ادا کرنا ایک بہت بڑا مقصد ہے۔ آدمی اپنے وطن کو، اپنے بچوں اور اپنے گھر کو چھوڑتا، پھر بدن، مال و دولت اور پیشہ وغیرہ، سب کچھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے۔ اتنی بڑی محنت کے باوجود شاید کوئی کمی ہم سے رہ جائے یا ہم سے کوئی غلطی ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم نے تمہارے سارے مراحل طے کر دیے، اب اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اب تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔

یاد رکھیں! ہر عبادت کی ایک حد اور مقدار ہے، جیسے 24 گھنٹے میں پانچ نمازیں فرض ہیں، چھ نمازیں فرض نہیں

ہیں۔ ہم اس کو چھ یا چار نہیں بنا سکتے۔ اسی طرح رمضان المبارک کے روزے سال میں صرف ایک مہینہ فرض ہیں، ہم دو ماہ فرض نہیں بنا سکتے۔ اسی طرح حد مقدار زکوٰۃ مقرر ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو دولت عطا فرمائیں، وہ اپنے تمام اخراجات اور حسابات کے بعد وہ حساب کر کے اڑھائی فیصد ادا کرے۔ اب اڑھائی فیصد کو تین فیصد بھی نہیں بنا سکتے اور دو فیصد بھی نہیں کر سکتے۔ تو ہر عبادت کی ایک حد اور مقدار ہوتی ہے، جس کو آپ کم وبیش نہیں کر سکتے، لیکن اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں ہوتی، فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴾ [الاحزاب:۴۱]

''اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو اور ڈھیر سارا ذکر کرو۔''

اسی طرح:

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ [طٰہٰ:۱۴]

اور نماز بھی ذکر ہے، کلمہ بھی ذکر ہے، عبادت بھی ذکر ہے اور قرآن پاک بھی ذکر ہے، بلکہ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے''أَفْضَلُ الذِكْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' تو یہ سب ذکر ہیں، ان کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس لیے قرآن پاک کہتا ہے کہ میرے مومن بندے ﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [آل عمران:۱۹۱] میرے مومن بندے کھڑے ہیں تو میرا ذکر کرتے ہیں، بیٹھے ہیں تو میرا ذکر ہے اور لیٹے ہیں تو میرا ذکر ہے۔ یعنی کبھی قیام میں، کبھی رکوع میں اور کبھی سجدہ میں ہیں۔ اور اگر کبھی لیٹے ہوئے ہیں تو پھر بھی میری صناعتوں میں فکر کرتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ [آل عمران:۱۹۱]۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا: تم اللہ پاک کا اتنا ذکر کرو کہ ہر وقت تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر دلوں کے لیے ایک صیقل ہے، یعنی دلوں پر جو زنگ لگ جاتا ہے اس کو ہٹانے کا طریقہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ اور جب دلوں پر میل جم جائے تو اس کا علاج بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ اگر انسان کسی مصیبت یا کسی الجھن میں پڑ جائے تو اس کا علاج بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام پر جب مصیبت آئی تو انہوں نے کہا ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ

الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الانبیاء:۸۷]۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جب مشکل وقت آیا تو انہوں نے کیا کہا؟ ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ [آل عمران:۱۷۳]۔ ہاں! جہاں بھی آپ نظر ڈالیں گے۔ یاد رکھیں کہ جب تمہیں اللہ تعالیٰ کا ذکر نصیب ہو جائے تو سمجھو کہ اللہ پاک راضی ہو گئے۔

﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾ [البقرۃ:۱۵۲] تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا۔ تم میرا ذکر بندوں میں کرو گے، میں تمہارا ذکر ملائکہ میں کروں گا۔ تو جب تم اللہ تعالیٰ کو یاد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو یاد کرے گا۔ تو جب اللہ تعالیٰ کو یاد کریں گے تو صاف بات ہے کہ یہ اس کی رضا کی نشانی ہے۔ اس لیے سمجھیں کہ نماز میں آنا ذکر ہے۔ اللہ پاک نے اپنے گھر میں آنے دیا، نماز پڑھنے اور قرآن سننے دیا تو معنی یہ ہے کہ اللہ پاک ہم سے راضی ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ ذکر کرو، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور جتنا اللہ پاک کا ذکر کر سکتے ہو کرو۔

لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ ہمارے بہت سے بھائی ہیں...... اللہ تعالیٰ ان کو بھی اور ہمیں بھی ہدایت عطا فرمائے کہ...... ان کا مقصد تو ذکر و عبادت ہوتا ہے، لیکن ان کو جیسے کسی آدمی نے بتا دیا کہ یہ فلاں کتاب ہے، یہ فلاں کتاب ہے۔ اس میں مجموعہ اذکار ہیں، اس میں فلاں فلاں ذکر ہے۔ وہ بے چارہ کرتا تو اللہ تعالیٰ کا ذکر چاہتا ہے، لیکن اس کو پتہ نہیں ہوتا کہ جو بس میں پڑھ رہا ہوں، کیا یہ صحیح بھی ہے یا کہ نہیں؟ اور جو میں پڑھ رہا ہوں یہ احادیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت بھی ہے یا نہیں؟ کیا جو میں ذکر کر رہا ہوں کہیں بجائے ذکر کے اور بجائے ثواب حاصل کرنے کے میں کوئی ایسی الفاظ تو ادا نہیں کر رہا جس سے بجائے ثواب کے مجھے گناہ حاصل ہو رہا ہے؟

ہمیشہ یاد رکھیں کہ ذکر بھی ان الفاظ کے ساتھ کیا کریں جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں۔ اپنی طرف سے لوگوں نے بہت ساری چیزیں لکھی ہیں۔ ان میں سے بعض صحیح ہوتی ہیں اور بعض غلط ہوتی ہیں۔ اس لیے عام آدمی کو پتہ نہیں چل سکتا کہ ان کلمات سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ لیکن جو چیز قرآن و حدیث میں ثابت ہے اس کے غلط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمیشہ جب بھی ذکر کریں یا ذکر کی کوئی کتاب اٹھائیں تو کتاب لینے سے پہلے تسلی کر لیا کریں کہ یہ کس ذمہ دار آدمی کی لکھی ہوئی ہے؟ اور اس کے اندر اس نے کن احادیث مبارکہ کے حوالے دیئے ہیں؟ اور اس پر کتنا اعتماد کر سکتے ہیں؟ اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے علاقے کے کسی عالم سے اور کسی معتمد علم والے سے اس کے بارے میں تسلی کر لیا کریں۔

﴿كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ [البقرۃ:۲۰۰] اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جیسے تم اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہاں پر رسمِ جاہلیت کو مٹایا گیا کہ کفر کے زمانے میں انہوں نے حج کو بھی ایک کاروبار بنایا ہوا تھا کہ حج میں بازار اور منڈیاں لگتی تھیں اور دنیا کے بڑے بڑے تاجر آ کر اپنا تجارتی سامان بیچا کرتے تھے، تو لوگ اسی میں کھو جاتے تھے۔ اور دوسری بات یہ ہوتی تھی کہ وہ لوگ مزدلفہ اور عرفات سے واپس آ جاتے اور منیٰ میں آ جاتے اور منیٰ میں تین دن کا قیام ہوتا۔ اب وہ سارے عرب کے شعراء کو جمع کرتے اور مشاعرے ہوتے اور وہاں ادباء کو بلایا جاتا۔ ہر آدمی پھر اپنے باپ دادا کا حسب و نسب بیان کرتا کہ میں فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور میں فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا باپ اور میرا دادا اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ اور اپنے باپ دادا کے محاسن اور اوصاف کو ایسے طریقے سے بیان کرتے کہ اس سے مبالغہ اور تکبر ظاہر ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے مسلمانو! تم ان جاہلیت کی رسموں سے بچ جاؤ۔ تم جب اللہ پاک کے احکام پورے کر لو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ یہ نہیں کہ تم اپنے باپ دادا کا ذکر کرو اور اسی طرح فخر و مباہات میں اسی طرح مبتلا ہو جاؤ جیسے زمانہ جاہلیت میں لوگ مبتلا ہو جاتے تھے، بلکہ تم اپنے باپ دادا کی بجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔

اور اس میں بھی ایک سبق یہ ملا ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنے خاندان پر بلا وجہ فخر کرتا ہے اور اس کا اظہار کرتا ہے تو شریعت میں یہ ممنوع اور ناجائز ہے۔ اصل میں وجہ یہ ہے کہ عزت والا تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت والا ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت کا مدار تقویٰ ہے اور اعمال صالحہ ہیں، حسب و نسب نہیں ہے۔ ﴿اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ ؕ﴾ [الحجرات: ۱۳] تو اللہ پاک نے فرمایا کہ تم اصل بات یعنی اللہ پاک کا ذکر کرو یہ نہیں کہ صرف اپنے باپ دادا کے ذکر میں پڑ جاؤ۔

﴿کَذِکۡرِکُمۡ اٰبَآءَکُمۡ اَوۡ اَشَدَّ ذِکۡرًا ؕ﴾ [البقرۃ: ۲۰۰] لیکن علماء کرام نے اس کی اور توجیہ بھی بیان فرمائی ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو جب وہ آہستہ آہستہ بڑا ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ کہے گا: بابا! بابا! بابا!۔ یعنی عربی میں کہیں گے ''اَبٌ اَبٌ اَبٌ''۔ وجہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اب میری ضروریات کا مجازی طور پر متکفل میرا باپ ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ جب تم چھوٹے ہوتے ہو تو تمہاری نظر تمہارے ''اَب'' پر پڑتی ہے، اب میں تمہیں سبق دیتا ہوں کہ تمہاری ضروریات کا حقیقی متکفل چونکہ میں ہوں تو بجائے ''اَبٌ اَبٌ'' کرنے کے ''یا رب!'' پڑھو، تا کہ تم اصل منزل پر پہنچ جاؤ۔ اس لیے فرمایا کہ ﴿فَاِذَا قَضَیۡتُمۡ مَّنَاسِکَکُمۡ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَذِکۡرِکُمۡ اٰبَآءَکُمۡ اَوۡ اَشَدَّ ذِکۡرًا ؕ﴾ [البقرۃ: ۲۰۰]

یہ نہیں کہ والدین کا ذکر منع ہے۔ والدین کا ذکر کرنا نعمت ہے۔ والدین کے لیے دعا کرنا، والدین کے لیے اچھے اچھے صدقات کا اہتمام کرنا بہت بڑی نعمت ہے۔ اور اولاد بھی اچھی وہی ہوتی ہے جو والدین کے بعد ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے لیے دعا کرے، ان کے لیے مغفرت کے اسباب پیدا کرے، صدقاتِ جاریہ بنوا دے، مساجد مدارس میں پانی کے انتظامات اور خیرات و صدقات وغیرہ۔ اسی لیے فرمایا گیا ''وَلَدٌ صَالِحٌ یَدْعُوْ لَهٗ'' [مسلم، رقم: ۱۶۳۱] کہ سب سے بڑی نعمت انسان کی صالح اولاد ہے جو اپنے والدین کے مرنے کے بعد دعائیں کرتی ہے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگتی ہے: ﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ [الاسراء: ۲۴] اور ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ﴾ [ابراہیم: ۴۱]۔ اس لیے اصل یہ ہے کہ یہاں پر جو منع کیا گیا ہے وہ رسمِ جاہلیت کو توڑا گیا ہے کہ حج کے بعد صرف مشاعرے، مفاخر اور اپنے باپ دادے کے قصے کہانیوں میں وقت گزارتے تھے، اللہ پاک نے فرمایا کہ نہیں! تم صرف اپنے اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گزارو۔

اللہ سے مانگنے والوں کی اقسام:

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ [البقرۃ: ۲۰۰]

بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ سے دنیا تو مانگتے ہیں، یعنی مال و اولاد سب دنیا کی چیزیں مانگتے ہیں، لیکن ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، یعنی آخرت کی طرف دھیان اور فکر نہیں ہے۔ صرف غرض ہے تو دنیا دنیا دنیا بس۔ ہر وقت اسی کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اور اسی میں غور کریں۔ تو ''فِي الدُّنْيَا'' کے ساتھ ''حَسَنَةً'' بھی نہیں ہے، یعنی وہ بس دنیا ہی مانگتے ہیں، چاہے جیسے بھی ملے، چاہے حرام ہو؛ کیونکہ ان کی نظر آخرت پر نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کا آخرت میں ذرے کے برابر بھی کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

اس لیے علماء نے کرام نے فرمایا کہ کافر ایک تو وہ کافر ہیں جن کا آخرت پر کوئی عقیدہ ہی نہیں ہے۔ یعنی ان کا تو عقیدہ یہ ہے کہ جب تک ہم زندہ ہیں تو زندہ ہیں، سب کچھ اسی زندگی میں ہے۔ جب ہم مر جائیں گے تو ختم۔ مرنے کے بعد اگلا جہان نہیں ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے ﴿وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ﴾ [الانعام: ۲۹] وہ کہتے ہیں کہ یہ دنیا ہی ہمارا جینا اور مرنا ہے۔ کوئی مر گیا اور کوئی پیدا ہو گیا۔ مرنے کے بعد ہم دوبارہ قبروں سے نہیں اٹھائے جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی عالمِ آخرت نہیں ہے۔ چلو وہ تو کافر ہیں، ان کا آخرت پر کوئی عقیدہ

نہیں ہے۔لیکن علماء نے لکھا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان بھی رکھتے ہیں، آخرت پر بھی یقین ہے، ان کا مقصد کیا ہے صرف دنیا۔حج کر رہے ہیں تو کیا کہتے ہیں کہ یا اللہ! رزق میں برکت عطا فرما، مال عطا فرما، پیسے عطا فرما، تجارت میں برکت عطا فرما، دکان میں برکت عطا فرما اور میرے بچے کو رزق اور نوکری عطا فرما۔اور کوئی غم نہیں، کوئی غم ہے تو صرف دنیا دنیا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔تو یہ لوگ بھی اللہ پاک کے ہاں ناپسندیدہ ہیں۔

اس لیے علماء کرام نے لکھا ہے کہ کوئی آدمی صرف اس لے سورۂ واقعہ پڑھ رہا ہے کہ مجھے پیسے ملیں، اس لیے قرآن پاک کی کوئی آیت یا کوئی وظیفہ کسی بزرگ سے پوچھتا ہے کہ مجھے وظیفہ بتادیں اور پڑھنے کا مقصد صرف دنیا ہے کہ مجھے دولت اور پیسہ وغیرہ ملے، یا کسی کو پیر اسی لیے بناتا ہے کہ اس سے کوئی دعا کراؤں گا، مجھے پیسے مل جائیں گے، یا کوئی وظیفہ لے لوں گا تو میرا کاروبار چل پڑے گا تو علماء کرام نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ چیزیں بھی پسند نہیں ہیں۔آدمی کو چاہیے کہ دنیا ہے تو اس میں بھی ''حَسَنَۃً'' کو تلاش کرے اور آخرت کے لیے بھی ''حَسَنَۃً'' کو تلاش کرے۔

اب دیکھیں کہ اللہ پاک نے فرمایا کہ انسانوں میں دو گروہ ہو گئے ہیں: ﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝﴾ [البقرۃ:۲۰۰،۲۰۱]

مؤمن کی جامع دعا:

اللہ پاک نے فرمایا کہ جو میرے ایمان والے نیک بندے ہیں وہ تو ہر وقت جب مانگتے ہیں تو دنیا میں بھی بھلائی مانگتے ہیں۔دنیا میں بھلائی کا معنی یہ ہے کہ صحیح عقیدہ عطا فرما، صراطِ مستقیم پر چلنا نصیب فرما، بدن میں صحت وقوت عطا فرما، صالح اور فرمانبردار اولاد عطا فرما۔یہ رزق، مال ودولت سب کچھ دنیا میں آ گیا، ''اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً'' میں آ گیا۔اور آخرت میں ہمیں بھلائیاں اور خوبیاں عطا فرما، یعنی جنت اور جنت کی نعمتیں عطا فرما، یعنی وہ دنیا میں بھی مانگ رہے ہیں اور آخرت کے لیے بھی مانگ رہے ہیں۔پھر دنیا میں بھی صرف دنیا نہیں مانگی، بلکہ ''فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً'' دنیا میں بھلائی مانگی اور آخرت میں بھی بھلائی مانگی۔اللہ پاک نے فرمایا کہ یہ میرے بندے ہیں۔اس لیے علماء کرام نے لکھا ہے کہ یہ دعا بڑی جامع ترین دعا ہے کہ جس میں دنیا وآخرت کی سب بھلائیاں آ جاتی ہیں۔

اس لیے میرے آقا حبیب کبریا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے طواف کے دوران رکنِ یمانی سے لے کر حجرِ اسود تک جب بھی دعا کی تو یہی دعا کی: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝﴾ [البقرۃ:۲۰۱]

رکنِ یمانی کو بوسہ نہ دیں:

اور ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب آپ طواف کریں اور رکنِ یمانی پر پہنچ جائیں، اللہ پاک موقع دے تو دایاں ہاتھ لگائیں؛ اس لیے کہ رکنِ یمانی کو بوسہ دینا حدیث پاک میں ثابت نہیں ہے۔ اور بعض روایات میں جو آتا ہے وہ روایت درجۂ صحت کو پہنچی ہوئی نہیں۔ بعض علماء کے اقوال بھی نقل کیے گئے ہیں۔ صحیح روایات یہی ہیں کہ رکنِ یمانی کو آپ داہنے ہاتھ سے مس کرتے تھے۔ اور جو دعا ہے وہ یہی ہے: ''بِسْمِ اللهِ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ، اَللّٰهُمَّ! إِنِّيْ أَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ''۔ اس کے بعد ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝﴾ [البقرۃ:۲۰۱]۔ یہ دعا بڑی جامع ترین دعا ہے۔ دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کے لیے یہ دعا بڑی تریاقِ اکبر ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ حدیث پاک کی روشنی میں ثابت ہے کہ آدمی جب دعا کرے تو اسے کم از تین مرتبہ دہرائے۔ یہ بھی احادیث میں آتا ہے کہ ''إِنْ لَمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكُوْا'' اگر تمہیں رونا نہیں آرہا تو عاجزانہ اور رونے والی شکل پیدا کرو۔ چونکہ جب تک عاجزی اور انکساری پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی رحمت نصیب نہیں ہوتی۔

عمرہ اور طواف میں ریا:

اگر کسی آدمی کو حج یا عمرہ نصیب ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کہتا پھرے کہ ہم نے تو بیس عمرے کیے ہیں، دس طواف کیے ہیں اور...... ماشاء اللہ...... میں تو ۱۹۷۰ء سے ہر سال حج کر رہا ہوں۔ یہ تکبر اور ریا ہے، جس سے عمل برباد ہو جاتا ہے اور دھیلے کا ثواب بھی نہیں ملتا۔ بلکہ آدمی کے اندر مزید انکساری اور تواضع آنی چاہیے کہ میرے مولا! اگر میں پہلے گناہگار تھا تو میں ایک تیرا عام بندہ تھا۔ اب تو نے مجھے کعبہ دکھا دیا، حج کروا دیا اور اب میں حاجی بن گیا ہوں، اب اگر میں گناہ کروں گا تو مولا! تیرے نام پر بڑا داغ لگے گا، اس لیے مجھے توفیق دے کہ میں نیکی کے کام کروں۔ ایسا نہ ہو کہ میں تجھے بدنام کرنے والا بن جاؤں۔ اگر میں مکہ اور کعبہ میں آکر بھی ٹھیک نہ ہوا اور مدینہ منورہ میں آکر بھی ٹھیک نہ ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تو تیرے گھر کے لیے ایک داغ بن گیا کہ عجیب بات ہے کہ شاید مکہ مدینہ میں کچھ نہیں رہا۔ اگر کچھ ہوتا تو ان سے تبدیلی کیوں نہ ہوتی؟ لوگ یورپ

میں جا کر واپس آتے ہیں تو آدھے انگریز نظر آتے ہیں۔ اگر وہاں کی یونیورسٹی میں ڈگری لے لیں تو پہچانے نہیں جاتے کہ نقلی کون ہیں اور اصلی کون ہیں؟ لیکن اگر ہم مکہ مدینہ حج کے لیے آئیں اور حج کے بعد ہمارے اوپر کوئی اثرات مرتب نہ ہوں اور زندگی میں کسی چیز کا کوئی فرق نظر نہ آئے تو مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے ہمیں الٹا محروم کر دیا۔ اس لیے حکم یہ ہے کہ جب بھی آپ دعا کریں تو عاجزی اور انکساری سے کریں، اللہ تعالیٰ کے آگے آپ گڑگڑائیں۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہیں رونا نہیں آتا تو رونے کی شکل تو بنا سکتے ہو۔

اصل کامیابی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جہنم کے عذاب سے بچائے؛ کیونکہ جو جہنم سے بچ گیا اور جنت میں داخل ہو گیا، وہ کامیاب ہے۔

اللہ کا کمال علم:

وہ لوگ جو دنیا اور آخرت کی بھلائی مانگتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا حصہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سب سے جلد حساب لینے والے ہیں؛ اس لیے کہ اس کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ حساب تو اس کے لیے مشکل ہوتا ہے جس کو کوئی چیز یاد رہ گئی، کوئی چیز بھول گئی، کوئی لکھی گئی اور کوئی نہ لکھی گئی، کسی میزان میں بھول گیا یا کسی ضرب و تقسیم میں بھول گیا۔ اللہ کی ذات مبارک تو بھولنے سے پاک ہے۔ ﴿لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی﴾ جو بھٹکنے سے بھی پاک ہے اور بھولنے سے بھی پاک ہے۔ اس کا علم ذرے ذرے کو محیط ہے، کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

﴿لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴾

کہ مثقالِ ذرہ بھی آسمانوں اور زمینوں میں خدا سے چھپا ہوا نہیں ہے، نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز اور نہ کوئی بڑی چیز۔

حساب میں جلدی کا یہ عالم ہوگا جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ ساری کائنات کے اولین و آخرین جب جمع ہوں گے تو آدھے دن میں ان کا حساب پورا ہو جائے گا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ذات سریع الحساب ہے کہ تم وہ عمل کرو اور ہر وہ قدم اٹھاؤ جو شریعت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہو۔

سابقہ امتوں میں صدقات قبول ہونے کی علامات:

علماء کرام نے کچھ ہدایات اور علامات لکھی ہیں۔ فرمایا کہ مثلاً: ہم نے عمرہ کیا یا ہم نے حج کیا تو ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ ہماری یہ عبادت قبول ہوئی یا نہیں؟ کیونکہ پہلے دور میں یہ قاعدہ تھا کہ مثلاً: آپ خیرات کرتے تو طریقہ یہ

تھا کہ ایک بکرا ہے یا چاول ہیں یا کچھ بھی ہے، اس کو جا کر پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دیا جاتا تھا۔ قدرت کی طرف سے ایک آگ آتی تھی، وہ آکر اس کو جلا دیتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خیرات منظور کر لی ہے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ ﷺ پر رحمت کے ذریعے ایک پردہ ڈال دیا؛ اس لیے کہ پہلے جس کی خیرات پڑی رہتی تھی اور اسے آگ نہیں جلاتی تھی وہ رسوا ہو جاتا تھا اور لوگ اس کو کہتے تھے کہ تم تو کتنے گندے آدمی ہو کہ تمہاری خیرات تک قبول نہیں ہوئی!؟ اور جس کی خیرات قبول ہو جاتی تو سمجھ لیا جاتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا مقرب بندہ ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ کی امت پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال دیا کہ اس کی خیرات قبول ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ کو پتہ ہے۔ لیکن علماء کرام نے فرمایا کہ اس کی کچھ علامات ہیں، جیسے بادلوں کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ بارش برسے گی، لیکن بعض اوقات بارش نہیں برستی اور ہمارے اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح علماء کرام نے فرمایا کہ یہ بھی محض اندازے ہی ہیں کہ اگر حج کرنے کے بعد یا عمرہ کرنے کے بعد تیرے اندر نیکی بڑھ گئی ہے اور تیرے اندر کوئی انقلاب آیا ہے کہ تو بے نمازی تھا تو اب نمازی بن گیا ہے، بے روزہ تھا تو اب روزے رکھنے والا بن گیا ہے، بے حیا تھا تو اب باحیا بن گیا ہے، بے شرم تھا تو اب شرم والا بن گیا، شرابی تھا تو شراب چھوڑ دی، زانی تھا تو زنا چھوڑ دیا اور توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف اور آخرت کی طرف ہو گئی تو سمجھو کہ میری حاضری منظور ہو گئی۔ اور فرمایا کہ حج کرنے کے بعد اگر تو اسی طرح رہا جیسے پہلے تھا تو سمجھو کہ میں ٹھکرا دیا گیا۔ اس لیے علماء کرام نے لکھا ہے کہ ہر عبادت کے بعد اپنے عمل پر خود نظر ڈالو کہ کیا میرے افعال و اقوال میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟ اگر آ گئی ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور اگر نہیں ہوئی تو پھر توبہ کرے اور اللہ تعالیٰ کے دروازے پر گر جائے کہ رحمت کا دروازہ بند نہیں ہوا اور توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا۔

قبولیتِ دعا پر مالک بن دینار رحمہ اللہ کا قول:

جیسا کہ مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میری جو دعا قبول ہوتی ہے مجھے پتہ چل جاتا ہے۔ ان کے شاگردوں اور مریدوں نے پوچھا کہ حضرت آپ کو کیسے پتہ چل جاتا ہے؟ فرمایا کہ دعا کرنے میں جب میرا دل لگ جائے اور دعا مانگنے میں مزہ آنے لگے اور دل چاہے کہ اور مانگوں، اور مانگوں، اور میرے آنسو بہنے شروع ہو جائیں اور بدن پر کپکپی طاری ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے ڈر سے میرے بال کھڑے ہو جائیں تو میں سمجھ لیتا ہوں

کہ اللہ پاک راضی ہوگیا ہے اور میری دعا منظور ہوگئی ہے۔ اور اگر میں دعا کر رہا ہوں اور زبان "رَبَّنَا! رَبَّنَا!" کہہ رہی ہے، لیکن دل نہیں لگ رہا، اس میں کوئی کشش پیدا نہیں ہو رہی اور کوئی لطف نہیں آ رہا تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ میری یہ دعا منظور نہیں ہوئی۔

دعا کی قبولیت کی دوسری نشانی:

اور بعض علماء کرام نے ایک دوسری علامت بھی لکھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر ایک نیکی کے کرنے کے بعد تجھے ایک اور نیکی کی توفیق مل جائے تو سمجھو کہ پہلی نیکی قبول ہوگئی ہے۔ اور اگر ایک نیکی کے کام کرنے کے بعد خدانخواستہ کوئی گناہ کا کام ہو جائے تو سمجھو کہ پہلی نیکی مردود ہے، لیکن اگر گناہ بھی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوں کہ یہ یقین رکھیں کہ ہمارا رب غفور ورحیم ہے۔

جتنے بھی بندے ہیں اگر ہمارے سارے گناہ بھی اکٹھے کر لیے جائیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ایک قطرے کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ جب وہ بخشنے پر آئے تو کوئی دیر نہیں لگے گی، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔ مومن لاکھ گناہ گار ہو، لیکن اُس کی رحمت پر یقین ہوتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں جاؤں گا، اللہ پاک مجھے معاف فرما دیں گے۔ اس لیے ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار سمجھنا چاہیے اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۰۳]

"اور اللہ کو یاد کرو گنے ہوئے (ایامِ تشریق کے تین) دنوں میں اور جس نے جلدی کی دوسرے دن میں تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے واپسی میں تاخیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم سب اس کے ہاں جمع ہو گے۔"

آیت کا شانِ نزول اور قیامِ منیٰ:

اس آیت مبارکہ میں ایک اور جاہلیت کی تردید ہے کہ ۱۰ تاریخ کو منیٰ میں آنے کے بعد بعض لوگ تو ۱۲ کو منیٰ

سے لازماً چلے جاتے تھے، یعنی ۱۰ کو بھی منیٰ میں اور ۱۱ اور ۱۲ کو بھی منیٰ میں اور ۱۲ کی شام کو منیٰ سے نکل آتے تھے۔ اور بعض لوگ ۱۳ کو بھی رہتے اور ۱۳ کی شام کو نکلتے۔ اب جو لوگ ۱۲ کو نکل آتے وہ کہتے کہ جو ۱۳ کو رہ رہے ہیں یہ گناہگار ہیں اور یہ لوگ بلاوجہ ۱۳ کو منیٰ میں رہ رہے ہیں۔ اور جو لوگ ۱۳ کو آتے وہ فتویٰ دیتے تھے کہ جو ۱۲ کو گئے ہیں انہوں نے بڑا گناہ کیا کہ حج کو نامکمل چھوڑ کر چلے گئے۔ تو اب ان قبائل میں جھگڑا ہوتا تھا کہ بارہ والے تیرہ والوں کو غلط کہتے اور تیرہ والے بارہ والوں کو غلط کہتے کہ یہ گناہ گار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ﴾ جو آدمی دو دنوں میں جلدی کرے یعنی ۱۲ کو کنکری مار کر چلا آئے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔ ﴿وَمَنْ تَاَخَّرَ﴾ اور جو آدمی دیر کر دے، تاخیر کر دے، یعنی تیرہ کو کنکری مار کر آئے ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ﴾ ان پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ رخصت ہے کہ اگر آپ ۱۲ کو آنا چاہیں تو آسکتے ہیں اور اگر ۱۳ کو آنا چاہیں تو آسکتے ہیں۔ اصل بات اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے اور اپنی طرف سے مسائل پیدا کرنا نہیں ہے۔

اب مسئلہ سمجھیں کہ جب آپ نے ۱۲ تاریخ کو کنکریاں مار لیں تو اب اسلام میں اجازت ہے کہ آپ واپس مکہ آجائیں، آپ کا حج الحمدللہ مکمل ہو گیا۔ لیکن علماء نے یہ فرمایا کہ اگر ۱۲ کا سورج منیٰ میں ڈوب جائے تو افضل یہ ہے کہ آپ ۱۳ کی کنکریاں مار کر آئیں اور اگر آپ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے حدِ منیٰ سے نکل گئے تو اب آپ کے لیے ۱۳ کے دن کی کنکریں مارنی ضروری نہیں ہیں۔ اور اگر ۱۳ کے دن میں کنکریاں ماریں تو زوال کے انتظار کی بھی ضرورت نہیں ہے، رات کو منیٰ میں رہ جائیں، صبح کو ۱۳ کے زوال سے پہلے ہی حسب سابق آپ تینوں جمرات کو کنکریاں مار کر واپس آئیں۔ لہٰذا قرآن مقدس نے بھی بات واضح فرما دی: ﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ﴾ کہ اگر وہ دو دنوں کے بعد یعنی ۱۰ کا دن تو یوم النحر یعنی عید کا دن ہو گیا، اس کے بعد دو دن ۱۱ اور ۱۲ ہوئے تو اگر وہ ۱۲ کو چلا آئے تو کوئی گناہ نہیں ہے اور ﴿وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ﴾ اگر کوئی شخص ۱۳ کو بھی رک جائے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ جاہلیت والے جو ایک دوسرے پر غلط الزام لگاتے ہیں کہ ۱۲ کو آنے والے گناہ گار ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ۱۳ کو رہنے والے گناہگار ہیں، یہ غلط بات ہے۔

اور آخر میں اللہ تعالیٰ نے پھر ہدایت کی: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾۔ اصل بات یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ کا ڈر دلوں میں پیدا کرو۔ ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ کہ جان لو! سب نے اسی کی طرف اٹھنا ہے اور جمع ہونا

ہے۔ تو وہ رب کریم جس نے تمہیں عرفات میں جمع کیا، جس نے تمہیں مزدلفہ میں جمع کیا اور جس نے تمہیں منیٰ میں جمع کیا اسی طرح وہ تمہیں دوبارہ میدانِ حشر میں جمع کرے گا۔ اس حشر والے دن کو سامنے رکھو، پرہیزگاری اختیار کرو، چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑے نہ کرو اور ہر وقت اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے اندر مشغول رکھو؛ کیونکہ ذی الحجہ کے دس دن بڑے مبارک دن ہیں، یعنی انسان کو اعمالِ صالحہ کا ان دس دنوں میں جو ثواب ملتا ہے وہ کسی اور دنوں میں نہیں ملتا، لہٰذا ہر آدمی کو چاہیے کہ جب ایامِ حج آ جائیں تو ان کے لیے پوری پوری تیاری کرے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ'' سے مراد ذی الحجہ کے دس دن ہیں اور یہ ایامِ تشریق ''أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ'' ہیں۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان دنوں کے اندر اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو، جیسے ہر نماز کے بعد ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ'' یہ ''تکبیراتِ تشریق'' کہی جاتی ہیں، اسی کا نام اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

ایامِ تشریق اور ایامِ قربانی:

امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''يَوْمُ عَرَفَةَ وَ يَوْمُ النَّحْرِ وَ أَيَّامُ التَّشْرِيقِ عِيدُنَا أَهْلَ الْإِسْلَامِ، وَهِيَ أَيَّامُ أَكْلٍ وَ شُرْبٍ وَ ذِكْرُ اللّٰهِ'' عرفات کا دن نحر، یعنی دسویں کا دن اور ایامِ تشریق، یعنی: گیارہ بارہ اور تیرہ، ہمارے مسلمانوں کے لیے عید کے دن ہیں۔ یہ دن اللہ تعالیٰ نے ہماری خوشی اور عید کے دن بنائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دن مسلمانوں کے کھانے اور پینے کے لیے بنائے ہیں کہ ہر غریب کے گھر بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے گوشت پہنچ جاتا ہے۔

آپ ﷺ نے عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو ایامِ تشریق کے دن بھیجا۔ انہوں نے اونچی آواز میں صدا لگائی: ''إِنَّ هٰذِهِ أَيَّامُ أَكْلٍ وَ شُرْبٍ وَ ذِكْرُ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ كَانَ عَلَيْهِ صَوْمٌ مِنْ هَدْيٍ'' کہ یہ کھانے اور پینے کے دن ہیں۔ ہاں اس شخص کو اجازت ہے جس نے قربانی کے بدلے روزہ رکھنا ہے، یعنی اگر کوئی بکری نہیں دے سکا تو اس کے لیے آپ ﷺ نے پڑھا تھا: ﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ﴾ کہ تین دن ایامِ حج میں روزہ رکھے اور سات دن بعد میں روزہ رکھے۔

اس میں افضل تو یہ ہوتا ہے کہ چھ، سات اور آٹھ کو روزہ رکھ لے، لیکن اگر کوئی آدمی پہلے روزہ نہیں رکھ سکا تو بعض ائمہ کرام کے نزدیک ایامِ تشریق میں بھی اس کو اجازت ہے کہ وہ گیارہ، بارہ اور تیرہ کو روزہ رکھ کر اپنے تین روزے پورے کرے۔ صرف اس کے لیے اجازت ہے، ورنہ کسی کو بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ ان ایام میں روزہ رکھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین دن ہیں: ایک دس کا دن اور دو دن بعد میں، یعنی گیارہ اور بارہ۔ ان تین دنوں میں جب چاہو ذبح کرلو، لیکن افضل یہ ہے کہ پہلے دن ذبح کرو، لیکن مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلا قول زیادہ مشہور ہے کہ دسویں کا دن اور اس کے بعد تین دن: گیارہ، بارہ اور تیرہ۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول زیادہ مشہور ہے اور آیت سے بھی تقریباً یہی واضح ہوتا ہے۔ اور علماء کرام نے یہ بھی فرمایا کہ تین دن میں ذکر سے مراد یہ ہے کہ جب آدمی اپنی قربانی کا جانور ذبح کرتا ہے تو کہتا ہے: ''بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

اسی طرح تشریق کی تکبیریں، جو ہم نے ہر نماز کے بعد کہنی ہیں، بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ صبح کی نماز عرفات والے دن، یعنی نویں تاریخ کو آدمی شروع کرے اور ایامِ تشریق کے آخری تین دن، یعنی تیرہ تاریخ کی عصر کو ختم کردے۔

ایک حدیث بھی اس کے بارے میں آئی ہے، لیکن اس کا مرفوع ہونا ثابت نہیں ہے کہ سیدنا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جب اپنے خیمہ میں کھڑے ہوکر تکبیر کہتے تھے تو باقی خیمے والے لوگ جب سنتے تھے تو وہ بھی سب کے سب اپنے خیموں میں تکبیر کہتے: ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' اور پورا منیٰ ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' کی تکبیروں سے گونج اٹھتا تھا۔

اور اسی طرح جب آپ کنکریاں ماریں گے تو ہر کنکری کے ساتھ ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' کہیں گے۔ یہ بھی ذکر ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے طواف اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا مقرر فرمایا اور اسی طرح کنکریاں مارنا مقرر کیا۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر قائم ہو اور ہر حال میں آدمی ذاکر وشاکر ہو۔ جتنا ذکر میں آگے بڑھو گے اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنا ہی تقرب زیادہ ہوجاتا ہے۔ جب آدمی حج کے تمام افعال پورا کرنے کے بعد منیٰ میں آگیا، اس نے یوم النحر بھی گزار لیا، کنکریاں بھی مارلیں اور اب ۱۲ اور ۱۳ کو فارغ ہوکر اپنے ملک واپس لوٹ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تقویٰ اختیار کرو۔ تم سب نے لوٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف جانا ہے، ایسا نہ ہو کہ حج پڑھنے کے بعد اس کے دل میں کوئی تکبر پیدا ہوجائے کہ میں تو جناب! حاجی ہوگیا ہوں، نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝﴾

[البقرۃ:۲۰۴،۲۰۷]

"اور ایک وہ شخص ہے کہ اس کی بات دنیا کی زندگی کے کاموں میں آپ کو بہت پسند آتی ہے اور وہ اللہ کو اپنے دل کی بات پر گواہ بناتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔ اور جب وہ (آپ ﷺ سے) پھر کر جاتا ہے تو زمین میں فساد کرتا ہے اور کھیتیاں اور جانیں ہلاک کرتا ہے۔ اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب اس سے کہا جائے اللہ سے ڈرو تو اس کو غرور گناہ پر کھینچ لاتا ہے۔ اس کو جہنم کافی ہے اور وہ بری آرام گاہ ہے۔ اور لوگوں میں سے ایک وہ ہے جو اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی میں بیچتا ہے (اور کھپاتا) ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔"

شانِ نزول اور منافق کا معنی:

اس آیت میں مخلصین اور منافقین کا نمونہ بیان کیا ہے کہ ایک تو خالص مسلمان ہے اور ایک منافق ہے، لیکن یاد رکھیں کہ ایک تو منافقوں کی وہ جماعت ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے وہ تو عقیدے کے منافق تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہراً کلمہ پڑھتے تھے اور اندر کلمہ نہیں تھا، بلکہ پکے کافر تھے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا:

﴿اِذَا جَاۗءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝﴾ [المنافقون:۱]

جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں: آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ آپ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ کہنے والے جھوٹے ہیں، زبان سے کہہ رہے ہیں اور اندر ایمان اسلام وغیرہ کوئی نہیں ہے۔ یہ منافق حضور اکرم ﷺ کے مطلق اعتقادی منافق تھے، یعنی

عقیدے کے منافق تھے، یعنی ظاہراً زبان پر کلمہ ہے اور اندر سرے سے ایمان ہی نہیں ہے۔

کسی کو کافر و منافق کہنے میں احتیاط:

اور ایک وہ منافق ہیں جو موجودہ دور میں ہیں یا حضور اکرم ﷺ کے زمانے کے بعد کے منافقین ہیں۔ آپ ﷺ کے زمانے میں تو قرآن کا نزول اور وحی کا اترنا تھا، اللہ پاک اپنے پیغمبر ﷺ کو بتا دیتے تھے کہ یہ منافق ہیں۔ لیکن ہمیں تو پتہ نہیں چل سکتا کہ کون مومن اور کون منافق ہے؟ کیونکہ دلوں کے بھید کو جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اب علماء نے فرمایا کہ ہم اس طرح کا فیصلہ تو کسی کے بارے میں نہیں کر سکتے کہ یہ منافق ہے یا یہ کافر ہے؛ کیونکہ ہمیں لوگوں کے دلوں کا کیا پتہ؟ یہی وجہ تھی کہ پہلے لوگ کفر کا فتویٰ دینے میں احتیاط کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ ہم کسی کو کافر کہہ بیٹھیں اور اللہ کے ہاں وہ کافر نہ ہو تو یہ بہت بڑا جرم ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور اس نے آ کر کہا کہ اے علی! خوارج کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟...... حالانکہ خارجی بڑا گمراہ فرقہ ہے۔ اللہ کے قرآن کو بدل ڈالا، اہلِ بیتِ رسول کے دشمن ہیں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگیں لڑتے رہے اور...... نعوذ باللہ...... سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مسلمان ماننے کو بھی تیار نہیں تھے۔ اتنا بڑا فتنہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے باقاعدہ جنگیں لڑیں، لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ خوارج کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ وہ کافر ہیں یا مسلمان؟...... آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''هُمْ مِنَ الْكُفْرِ فَرُّوْا'' کہ وہ کفر کی طرف سے تو اسلام کی طرف بھاگ کر آئے ہیں، ان کو کافر کیسے کہہ دوں؟...... پوچھنے والا بھی سمجھدار تھا...... عرض کیا: اگر وہ کافر نہیں تو منافق ہوں گے؟ ''ءَ هُمْ مِنَ الْكُفَّارِ أَمْ هُمْ مِنَ الْمُنَافِقِيْنَ؟'' تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ منافق بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ منافق بھی نہیں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جی ہاں! وہ منافق بھی نہیں ہیں۔ ﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَإِذَا قَامُوْٓا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾﴾ [النساء: ۱۴۲] کہ منافق کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہے تو تھوڑا سا۔ لیکن ان کی زبانیں تو ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر ہیں۔ تو میں ان کو کیسے منافق کہہ دوں کہ یہ تو ہر وقت قرآن پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا عجیب بات ہے کہ کافر بھی نہیں اور منافق بھی نہیں تو پھر آپ رضی اللہ عنہ جنگیں بھی لڑ رہے ہیں، تلواریں بھی چل رہی ہیں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''إِخْوَانُنَا بَغَوْنَا فَاتَلُوْنَا فَقَتَلْنَاهُمْ''۔ تھے تو

ہمارے بھائی، کلمہ پڑھنے والے، لیکن ہمارے خلاف تلوار اٹھائی تو ہم نے بھی تلوار اٹھائی ہے تو کیا کریں؟ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی احتیاط تھی کہ چونکہ ان سے دشمنی تھی، ان کے ساتھ قتال تھا سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اتنی احتیاط کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا فتویٰ غصہ دشمنی کی بنا پر تصور کر لیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جھگڑا تھا، اس لیے ان کو کافر کہہ دیا تھا۔ اتنی احتیاط کرتے تھے۔

نفاقِ اعتقادی و نفاقِ عملی کا بیان:

اب بھی علماء کرام نے فرمایا کہ وہ منافق اعتقادی تو تقریباً باقی نہیں رہے۔ اب منافق ہیں، لیکن نفاقِ عملی والے منافق ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زبان پر کلمہ ہے اور کام کافروں والا ہے۔ مثلاً: نماز نہیں پڑھتے۔ پس نماز نہ پڑھنا یہ تو کفر کی علامت ہے۔ اس لیے صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ جو آدمی جماعت میں نہیں آیا تو ہم یہ اندازہ کر لیتے تھے کہ یا تو وہ بیمار ہے یا وہ منافق ہے۔

اب ایک آدمی تقریر تو لچھے دار کرتا ہے، اسلام اسلام کی آوازیں لگاتا ہے۔ جب نماز کا وقت آئے تو نماز غائب، زکوٰۃ کا وقت آئے تو زکوٰۃ غائب، صدقات کا وقت آئے تو صدقات غائب، حج کا وقت آئے تو حج غائب، بلکہ بیٹھ کر ایسی ایسی باتیں بھی کرتا ہے کہ ہمیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولویوں کا فلسفہ کہ بیس لاکھ آدمیوں کو منیٰ میں لے جاتے ہیں، ایک بکری بھی لگا لو تو بیس لاکھ بکری ذبح کر کے پھینک دیتے ہیں۔ یہ کوئی عقل کی بات ہے کہ اتنا بڑا پیسہ ضائع کر دیا جاتا ہے۔ الٹا اسلام کے خلاف محاذ اور ٹھٹھا بناتے ہیں تو ان جیسے لوگوں کے بارے میں علماء کرام نے فرمایا کہ ان لوگوں کا نفاق نفاقِ عملی ہوگا کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا عمل تو منافقوں والا ہے۔ اسلام کا نام لیتا ہے اور کام کافروں والا کرتا ہے۔

ایک منافق کا واقعہ:

ایک منافق کا واقعہ پیش آیا کہ اخنس بن شریک ایک آدمی تھا۔ وہ بڑی لچھے دار تقریریں کرتا تھا، بڑا فصیح اللسان تھا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتا تو بس جناب! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر صدقے قربان ہو جاتا کہ حضور! میں تو غلام ہوں اور میں تو جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر نظر نہ پڑے تو مجھے چین نہیں ملتا۔ اور ایسی ایسی باتیں کرتا کہ سننے والے حیران ہو جاتے کہ یہ تو بالکل پکا عاشقِ رسول ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ اے میرے مدنی! اس

کے دل کی کیفیت کا میں گواہ ہوں کہ یہ تو جھگڑالو اور دشمنِ اسلام ہے کہ جب آپ سے باہر جاتا ہے تو فساد کرتا ہے۔ ظاہراً تو آ کر بڑی لچھے دار تقریریں کرتا ہے کہ ہم حضور پاک ﷺ پر قربان ہیں، لیکن اللہ پاک نے فرمایا کہ ہم جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے؟ فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾

[البقرۃ:۲۰۴]

اے میرے مدنی! بعض لوگ ایسے ہیں کہ جن کی باتیں آپ کو دنیوی زندگی میں بڑی اچھی لگتی ہیں اور پسند آتی ہیں۔ اور اللہ پاک گواہی دیتے ہیں کہ اس کے دل میں نفاق ہے اور وہ سخت جھگڑالو قسم کا آدمی ہے۔ یہ جھگڑالو اور فتنہ پرور ہے۔ صرف زبانی گفتار کے ذریعے آپ کی خدمت میں آ کر ایسی باتیں کرتا ہے۔ یہ مخلص مسلمان نہیں ہے، بلکہ اس کا ایمان ہی نہیں ہے:

﴿وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾[البقرۃ:۲۰۵]

جب آپ سے یہ پھر کر جاتا ہے، آپ سے اعراض کر کے واپس جاتا ہے، یہ تو اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے اور یہ تو زراعت، نسل، یعنی مال مویشی کو تباہ و برباد کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتا۔ یہ تو فسادی ہے، یہ تو موقع کی تلاش میں ہوتا ہے کہ اگر مسلمان کے مال مویشی مل جائیں تو انہیں مار ڈالتا ہے، مسلمانوں کے باغات مل جائیں تو ان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے کہ ان کا پانی کاٹ دیا جائے۔ اس لیے کہ منافق کا تو معنی یہی ہے کہ جس کے دو رخ ہیں کہ ایک رخ ادھر ہے اور ایک رخ ادھر ہے۔ ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ﴾[البقرۃ:۱۴] یہ منافق ایسے ہیں کہ جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو پکے ایمان والے ہیں اور جب واپس چلے جائیں اور کافروں میں جا کر جماعت میں علیحدہ بیٹھیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو مسلمانوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں، ہم تو آپ کے ساتھ ہیں۔ ہمارا ایمان سے کیا تعلق ہے؟ ہم تو ویسے ہیں ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان اقتدار پر آ جائیں تو ہم فائدہ اٹھا لیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے اور اصل میں تو ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔

﴿وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾[البقرۃ:۲۰۴]

یہاں سے یہ مسئلہ پتہ چلا کہ دل کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ جب اللہ پاک اپنے نبی ﷺ کو خبر نہ دیدے کہ میرا

مدنی بھی ظاہری بات سن کر اچھے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے خیر خواہ اور ٹھیک لوگ ہیں کہ یہ نماز کلمہ وغیرہ پڑھ رہے ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ اے میرے مدنی! آپ تو ظاہری بات جانتے ہیں، لیکن دلوں کا علم تو ہمارے پاس ہے۔ علمِ غیب اور دلوں کا بھید جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

''اَلَدُّ الْخِصَامِ'' جو انتہائی جھگڑا کرنے والا ہو تو اس کو عربی میں ''اَلَدُّ الْخِصَامِ'' کہتے ہیں۔

''وَاِذَا تَوَلّٰی'' جو آدمی لوگوں میں فساد مچائے، جو آدمی لوگوں کے کھیتوں کو برباد کرے اور جو آدمی لوگوں کے مال کو تباہ کرے تو سمجھ لو کہ وہ منافق ہے۔ کبھی بھی مسلمان ایسا نہیں کر سکتا۔

﴿وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ جب اس منافق کو کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو اس کا غرور اس کو اور گناہوں کی طرف دھکیلتا ہے کہ اچھا تم مجھے سمجھاتے ہو کہ میں غلط ہوں؟ اللہ پاک نے فرمایا کہ اے میرے مدنی! فکر نہ کرو۔ بس اسے جہنم ہی کافی ہے، ان کا علاج آگ ہے۔ اور یہ کتنا برا ٹھکانہ ہے اور کتنا برا بچھونا ہے کہ نیچے سے بھی آگ اور اوپر سے بھی آگ۔ اور آگ بھی...... نعوذ باللہ...... جہنم کی تہہ کی آگ۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو جہنم سے بچائے۔

ایمان والے کی نشانی:

یہ تو منافق کی کہانی تھی اور اس کے مقابلے میں ایک بڑے ایمان والے مومن بندے کی بات بتاتے ہیں:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ [البقرۃ: ۲۰۷]

بعض لوگوں میں جو مومن بندے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنی جان بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں وہ مومن ہیں کہ جن کو جان کی بھی فکر نہیں ہے۔

محدثین اور مفسرین کرام رحمہم اللہ نے یہاں پر ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس، حضرت انس، حضرت سعید بن المسیب اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بہت بڑی جماعت فرماتی ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتری ہے۔ حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت فرماتے ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ جب مکہ شریف سے باہر گئے تو کفار قریش اکٹھے ہو گئے۔ ان کو پتہ چل گیا کہ صہیب جا رہا ہے۔ انہوں نے گھیر لیا کہ ہم تم کو نہیں جانے دیں گے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے ترکش سے سارے تیر نکالے، کمان ہاتھ میں لی اور آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے قریشیو!

جہاں کھڑے ہو وہیں کھڑے ہو جاؤ۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ اے قریشیو! تم جانتے ہو کہ میں کتنا بڑا تیر انداز ہوں، میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ اور مجھے اس رب جلال کی قسم ہے جس کا میں نے کلمہ پڑھا ہے! جب تک ایک بھی تیر میرے ترکش میں باقی ہے تم میرے قریب نہیں آ سکتے۔ اس کے بعد پھر میں تلوار سے لڑوں گا۔ جب تک میری زندگی ہے میں لڑوں گا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا دین قبول کیا ہے، میں اس سے کسی شکل میں ہٹ نہیں سکتا۔ اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہتے ہو تو آؤ اور ایک تجارت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے جو ساری زندگی کمایا ہے وہ سارا کا سارا مکہ میں ایک جگہ دفن کر دیا ہے کہ جب مجھے موقع ملے گا، جب میں مکہ آؤں گا تو اپنی دولت نکال لوں گا، لیکن تم جو دنیا کے بھوکے ہو تو آج میرے ساتھ تجارت کا فیصلہ کرو۔ میرا راستہ چھوڑ دو، میں تمہیں اپنے مال کی جگہ بتا دیتا ہوں، تم جا کر دولت نکال لو۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں قبول ہے۔ آپ ہمیں جگہ بتا دیں، ہم آپ کا مال لے لیں گے اور آپ جائیں۔ انہوں نے کہا کہ فلاں جگہ میں نے مال دفن کیا ہے۔ تو ساری زندگی جو کمایا تھا وہ ان کو بتا دیا۔ انہوں نے جا کر سارا مال نکال لیا۔ جب آپ ﷺ کو اس بات کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "رَبِحَ يَا صُهَيْبُ! رَبِحَ يَا صُهَيْبُ!" اے صہیب! تیرا سودا بڑا کامیاب ہو گیا۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ اے میرے مدنی! دیکھو کہ سب کچھ لٹا کر آ گیا ہے کہ ساری زندگی کی کمائی جانے دی۔

اس سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ سامنے قریش ہیں، قاتل ہیں، لیکن ان کو بھی پتہ ہے کہ صہیب مسلمان ہے، جھوٹ نہیں بولے گا۔ دیکھو جی کہ اگر آپ کو کوئی کہے تو آپ تو حرم شریف میں بھی تین جگہ جھوٹ بول کر اپنا خزانہ چھپا لیں گے، لیکن وہ دشمن اور کافر ہیں، لیکن جانتے ہیں کہ صہیب جھوٹ نہیں بول سکتا۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ تم یہاں کھڑے رہو، ہم تمہیں گرفتار کرتے ہیں۔ اور ہمارا آدمی جائے گا، پہلے مال نکال لے گا۔ پتہ نہیں کہ تم صحیح کہہ رہے ہو یا غلط کہہ رہے ہو؟ تم ہم سے نکل جاؤ اور ادھر مال بھی نہ نکلے۔ بلکہ ان کو پتہ تھا کہ کلمہ پڑھنے والے کی زبان کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔

ابوجہل سے بڑا بھی کوئی دشمن ہے!؟ ایک مرتبہ طواف کر رہا تھا۔ اس کا ایک دوست اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ مکہ میں کوئی نبی پیدا ہوا ہے، جس کا نام محمد (مصطفیٰ ﷺ) ہے، کیا آپ اس کو جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ وہ تو ہمارے خاندان کا آدمی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ بتاؤ کہ کیا وہ نبی سچا ہے؟ ابوجہل نے ادھر ادھر دیکھا اور اس کے بعد بولا کہ سنو! ہے تو سچا، یعنی طواف کرتے ہوئے ابوجہل بھی جھوٹ نہ

بول سکا اور مسلمان؟ خود فیصلہ کرلو۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ فَإِن زَلَلْتُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝﴾
[البقرة:۲۰۸، ۲۰۹]

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ پھر اگر تم واضح دلائل آ جانے کے بعد پھسل گئے تو جان لو! اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

اسلام کی مکمل اتباع کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے مومنین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے۔ یہاں پر لفظ ''سلم'' ''سِلْمٌ'' یا ''سَلْمٌ'' دونوں کا معنی ملتا جلتا ہے۔ اس کا معنی صلح میں بھی آتا ہے اور اسلام میں بھی آتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: ﴿وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ [الانفال:۶۱] اے میرے نبی! کافر صلح کی طرف نرم ہوں تو آپ بھی نرم ہو جائیں اور صلح کر لیں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کریں۔ ''سَلْمٌ، سِلْمٌ، سَلَامٌ'' اور ''إِسْلَامٌ'' سب کا مادہ سلامتی سے ہے۔ اسلام بھی اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا جامع مانع، کامل اور مکمل دین ہمیں عطا فرمایا ہے کہ جو اپنے اندر ہر قسم کی سلامتی رکھتا ہے۔ پس یہاں پر لفظ ''سِلْمٌ'' ہے، ''سَلْمٌ'' نہیں تو یہاں پر مراد جمہور مفسرین کے نزدیک اسلام ہے۔ اور ''كَافَّةً'' کا معنی ''جَمِيعًا'' ہے۔

لیکن مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس کے دو ترجمے کیے ہیں: ایک ترجمہ تو یہ ہے کہ اللہ پاک نے حکم دیا ہے کہ اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہونے کا کیا معنی ہے؟ یوں سمجھو کہ اگر کسی آدمی کے اعضاء وجوارح تو اسلام کی تابعداری کر رہے ہیں، لیکن دل و دماغ مطمئن نہیں ہیں، یعنی جیسے انسان نماز بھی پڑھ رہا ہے، روزہ بھی رکھ رہا ہے، زکوٰۃ بھی دے رہا ہے اور اچھے کام بھی کر رہا ہے، لیکن بعض مسائل میں اس کے دل و دماغ مطمئن نہیں ہے۔ جیسے...... نعوذ باللہ...... آج کل بڑے بڑے لوگوں کی اکثریت ایسی ہے کہ نماز بھی ہے اور روزہ بھی ہے، لیکن سود کے مسئلہ میں وہ دل و دماغ کے ساتھ مطمئن نہیں ہیں۔ وہ

کہتے ہیں کہ جی! سود کے بغیر تو کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ یا ایک آدمی نماز بھی پڑھتا ہے، روزہ بھی رکھتا ہے، قرآن پاک بھی پڑھتا ہے، چومتا ہے اور بڑا احترام کرتا ہے، لیکن اس کا دل و دماغ اس بات پر مطمئن نہیں ہوتا کہ چودہ سو سال کے بعد آج بھی اسلام کے قوانین لاگو ہو سکتے ہیں۔ وہ مطمئن نہیں ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام میں پورا پورا داخل نہیں ہوا۔

اللہ پاک نے حکم دیا کہ اسلام میں داخل ہوتے ہو تو پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، یہ نہیں کہ دل و دماغ سے تو سمجھتا ہو کہ اسلام ایک سچا مذہب ہے، کلمہ بھی پڑھتا ہے، لیکن نماز نہیں پڑھتا، روزہ نہیں رکھتا، حج نہیں کرتا اور زکوۃ نہیں دیتا اور جب پوچھو تو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور مجھے حضور اکرم ﷺ سے بڑی محبت ہے، کعبۃ اللہ سے بڑی عقیدت ہے اور مدینہ منورہ سے بڑا پیار ہے، لیکن نہ نماز اور نہ روزہ۔ تو یہ بھی اسلام میں پورے کا پورا داخل نہیں ہوا کہ زبان اور دل و دماغ میں تو اسلام ہے، لیکن اعضاء جوارح اسلام پر دلالت نہیں کر رہے۔ اس لیے اللہ پاک نے حکم دیا: اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے۔ یعنی تمہارا دل و دماغ، اعضاء و جوارح، قلب و نظر اور فکر و یقین سب اسلام کو کامل طور پر ماننے بھی اور جانے بھی اور عمل بھی کرے۔

اسلام اور ایمان کیا ہے؟

اسلام اور ایمان کی جامع ترین تعریف یہ ہے کہ دل میں بھی تصدیق ہو اور زبان پر بھی اقرار ہو اور اعمال اور ارکان اور جوارح بھی گواہی دیں، تب اسلام مکمل ہوگا۔ دل میں بھی اسلام پر عین پکی تصدیق ہے اور زبان پر بھی شہادتین ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ'' کا اقرار ہے، جوارح اور ارکان، یعنی سر سے لے کر پاؤں تک سب اس کے مطابق عمل کر رہے ہیں تو اب اسلام مکمل اسلام ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ہم اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔

اور بعض علماء کرام نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا کہ ہم اسلام کو پورا پورا مان لیں۔ یہ نہیں کہ اسلام کے کچھ احکام تو مان لیں اور کچھ احکام نہ مانیں۔ اگر اپنی بیٹیوں کو جائیداد میں سے حصہ دینا پڑے تو اب جناب! ہم قرآن کا حکم نہ مانیں، اگر ہمیں سال بعد زکوۃ دینی پڑے تو اب ہم بہانے بنائیں اور اگر ہمیں زمین کا عشر دینا پڑے تو اب ہم بہانے بنائیں کہ جناب! ہم تو اتنا ٹیکس دیتے ہیں، ہمارے اوپر اتنے ٹیکسز ہیں۔ اور فلاں چیز اتنی مہنگی ہو گئی تو اب ہم

وہ ٹیکس ادا کریں یا زکوۃ ادا کریں؟

اور اسی طرح بعض آدمی سارے اسلام کو مانتے ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ اسلام نے معاشی مسئلہ حل نہیں کیا، یا اسلام نے ہمیں نظامِ حکومت چلانے کے بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کی، یا اسلام نے ہماری اس بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کی کہ ہمارے سیاسی مقاصد کیا ہونے چاہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسلام کو پورا تسلیم نہیں کیا کہ ہم نے اسلام کی کچھ باتیں مانی ہیں اور کچھ نہیں مانی۔ فرمایا کہ اسلام اس طرح مکمل نہیں ہوتا، بلکہ اسلام کو پورے کا پورا مانو، یعنی "الف" سے لے کر "یاء" تک اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی احکام ہیں، اللہ تعالیٰ شریعت ہے اور اوامر و نواہی ہیں سب پر ایمان رکھو۔ اور ایمان بھی ایسا کہ پھر دل میں کوئی الجھن باقی نہ رہے۔

ایک تو یہ ہے کہ آدمی یہ کہے کہ چلو جی! ہم مسلمان ہیں، کیا کریں کہ جی! آخر قرآن پاک کا انکار تو نہیں کر سکتے، لیکن جناب! دل مطمئن نہیں ہوتا کہ اسلام نے ایک مرد کو چار عورتوں کے ساتھ شادی کی اجازت دی ہے۔ یہ بات کوئی دل کو لگتی نہیں ہے۔ یورپ کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر کبھی وہ تعددِ ازدواج پر اعتراض کرے اور کبھی یہ اعتراض کرے کہ جناب! ٹھیک ہے کہ سود حرام ہے، لیکن یہ اس زمانے کا سود ہے جو مہاجنی سود تھا۔ اب تو دونوں طرف سود ہوتا ہے، بینک دیتے بھی ہیں اور لیتے ہیں بھی ہیں۔ یہ تو تجارت ہے، سود تو نہیں ہے۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ اس طرح تمہیں مسلمان کہلانے کا حق نہیں پہنچتا۔

عمل میں ناقص مسلمان:

جیسے علماء کرام نے ہمیں مثال سے یہ بات سمجھائی ہے کہ ایک آدمی بڑا خوبصورت ہو، لیکن آنکھ ایک ہو تو آپ کہیں گے کہ بے چارہ کانا ہے۔ اور ایک آدمی بے انتہا خوبصورت ہو، لیکن ٹانگ ایک ہو تو آپ کہیں گے کہ یہ لنگڑا ہے۔ اور ایک آدمی بہت خوبصورت ہو، لیکن اس کا دماغ کام نہیں کرتا تو آپ کہیں گے کہ یہ پاگل ہے۔ دونوں آنکھیں کام نہیں کرتیں تو آپ کہیں گے کہ یہ اندھا ہے۔ اسی طریقہ سے آج کل ہمارا جو حال ہے وہ یہی ہے کہ ایک آدمی نماز تو پابندی سے ادا کرتا ہے، لیکن زکوۃ نہیں دیتا۔ اور ایک آدمی نماز بھی پابندی سے پڑھتا ہے اور زکوۃ بھی پابندی سے دیتا ہے، لیکن حج کی بات کرو تو کہتا ہے کہ جی! سمجھ میں نہیں آیا، کیا ضرورت ہے کہ آدمی سال بعد جا کر لاکھوں روپے خرچ کر دے؟ غریبوں مسکینوں کو دے دو، کسی غریب مسکین کی مدد کر دو، کسی بچی کی شادی کرا دو اور

کوئی ضروری تو نہیں کہ ہم حج پر ہی جائیں۔ اسی طرح ایک آدمی نماز بھی پڑھتا ہے، روزے بھی رکھتا ہے، حج بھی کرتا ہے اور زکوۃ بھی دیتا ہے، لیکن سارا کاروبار سود پر ہے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ جیسے ایک آدمی ہاتھ نہ ہو، ٹانگ نہ ہو اور آنکھ نہ ہو تو جیسے وہ اندھا، کانا اور لنگڑا ہوتا ہے۔ ہمارا اسلام بھی اسی طرح اندھا اور کانا ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی لنگڑا ہے، کوئی اندھا ہے، کوئی کانا ہے اور کوئی دیوانہ ہے۔ صحیح معنی میں اسلام پر چلنا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے کہ تمام احکام پر عمل ہو جائے۔

اب آپ دیکھیں کہ بہت سے لوگ اسلام پر بھرپور کاربند ہیں، لیکن بیٹھ کر کبھی اس کا گلہ، کبھی اس کی غیبت شروع کر دیتے ہیں۔ اور پھر اگر اللہ تعالیٰ کے حرم میں ہوں تو اور بعض لوگ ہر لحاظ سے پکے مسلمان ہوتے ہیں، لیکن گھر کے اندر نہ نماز، نہ روزہ، نہ پردہ، نہ شرافت اور نہ شرم، اور باہر...... ماشاء اللہ...... نماز اور روزہ سب کچھ ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ابھی پورے کے پورے اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔

شانِ نزول:

اس پر مفسرین نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور دیگر لوگ تھے، بعض یہودیوں کے بڑے بڑے علماء جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام میں داخل کر دیا رضی اللہ عنہم۔ جب وہ اسلام میں آ گئے تو ان کے ذہن میں ایک وسوسہ داخل ہو گیا کہ جب ہم یہودی مذہب پر تھے تو ہم ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے اور اونٹ کے گوشت کو حرام سمجھتے تھے؛ اس لیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کر دیا تھا تو ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جب یہودیت میں ہفتہ کے دن کی تعظیم موجود ہے اور اسلام میں ہمیں یہ حکم نہیں ملا کہ اسلام کی تعظیم کرو۔ اسی طرح جیسا کہ یہودیت میں ہم اونٹ کے گوشت کو حرام سمجھتے تھے اور اسلام میں ہمیں اونٹ کا گوشت کھانا فرض قرار نہیں دیتا تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم اسلام لانے کے بعد بھی ہفتہ کی تعظیم کریں اور اونٹ کا گوش بھی نہ کھائیں تو کیا حرج ہے؟ جب ذہن میں یہ وسوسہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی کہ اے میرے مدنی! ان لوگوں سے کہہ دو کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ یہ نہیں کہ اپنے دماغ میں بیٹھ کر تاویلیں کرتے رہو اور اپنے دماغ میں بیٹھ کر دین کے مسائل خود گھڑتے رہو۔ اللہ پاک نے جب ایک چیز کو حلال کیا ہے، اس کے حلال کو عمداً چھوڑ دینا اس کے حلال ہونے کا انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ہم کو حکم دیا ہے کہ اس امت محمدیہ کے لیے سید الایام جمعہ کا دن ہے،

پھر ہفتہ کو وہی تعظیم دینا جو جمعہ کے دن کے برابر ہے، یہ کہنا کہ اسلام نے چونکہ منع نہیں کیا، یہ بات ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں اور اسلام کی پوری تعمیل کریں۔ اور اپنی طرف سے کوئی راستہ پیدا کر کے ذہن میں بلا وجہ تردد کو نہ آنے دیں۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ تم اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے راستے پر نہ چلو۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

شیطان کی انسان سے عداوت:

سب سے بڑا دشمن شیطان ہے۔ پھر وہ کھلا دشمن ہے؛ اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک وہ ہمیں ہر قسم کی غلطیوں میں ڈالتا آیا ہے۔ اور کھلا اس لیے کہ اس نے کہہ دیا تھا: ﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾﴾ [ص: ۸۲، ۸۳] اے اللہ! مجھے تیری عزت وجلال کی قسم! میں تیرے سب بندوں کو گمراہی میں ڈال دوں گا، مگر جو تیرے خاص چنے ہوئے بندے ہیں ان پر میرا زور نہیں چل سکے گا۔ اس نے تو دشمنی کا کھلا اعلان کر دیا تھا اور اس کی دشمنی کوئی چھپی ہوئی تو ہے نہیں۔ اور یہ بھی کہہ دیا: ﴿ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ﴿١٧﴾﴾ [الاعراف: ۱۷] میں آگے سے بھی حملہ کروں گا اور پیچھے سے بھی حملہ کروں گا، دائیں سے بھی حملہ کروں گا اور بائیں سے بھی حملہ کروں گا۔ مطلب یہ ہے کہ میں بندوں کو زبان کے گناہوں میں مبتلا کر دوں گا، چہرے کے گناہوں میں مبتلا کر دوں گا، نظر کے گناہوں میں مبتلا کر دوں گا، ہاتھوں کے گناہوں میں مبتلا کر دوں گا، پاؤں کے گناہوں میں مبتلا کر دوں گا اور ہر طرف سے انہیں گناہوں میں گھیر لوں گا۔ اور میرے اللہ! تیرے بندوں کی اکثریت تیرا شکر کرنے والی نہیں ہوگی، بلکہ کفران (ناشکری) کرنے والی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ کبھی کبھی دین کے نام پر دھوکا دیتا ہے؛ اس لیے کہ شیطان کے حملے کرنے اور گمراہ کرنے کے راستے بھی عجیب ہوتے ہیں۔

شیطان کے گمراہ کرنے کے ڈھنگ:

دیکھیں! ایک عالم دین ہے اور وہ دین پڑھ رہا ہے تو شیطان اس کو اسی راستے سے دھوکہ دیتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں یہ بات ڈال دیتا ہے کہ تم تو بڑے مفسر قرآن ہو، تمہاری جو خدمات ہیں تمہارا تو مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ بس دماغ میں تکبر اور ریاء آیا اور سارا عمل برباد ہو گیا۔ کوئی آلِ رسول ہے تو اس کے دماغ میں یہ بات ڈال دی کہ

کوئی لاکھ عابد وزاہد بن جائے، لیکن نبی کی اولاد تو تم ہو۔تم چاہے نماز بھی نہ پڑھو، تم آلِ رسول ہو، اس کو اس بات میں گمراہ کر دیا۔ دیکھیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے نبی پاک ﷺ نے کبھی نماز نہیں چھوڑی تو آلِ رسول کا کیا مطلب ہے کہ وہ نماز کو چھوڑ دے!؟ پس وہ (شیطان) کسی کو نسب کے اعتبار سے، کسی کو علم کے اعتبار سے اور کسی کو عبادت کے اعتبار سے گمراہ کر دیتا ہے۔ علماء کرام نے لکھا ہے کہ ابلیس کے ستر ہزار تو نورانی داؤ ہیں کہ ظاہر میں تو نورانی اور اچھی بات ہے، لیکن حقیقت میں گمراہ کرنے کا پھندا ہے۔

کیا آپ نے دیکھ نہیں لیا کہ چودہ سو سال کے بعد جہاد میں ایسے کارنامے انجام دے دیئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارنامے زندہ ہو گئے۔ اتنی بڑی قربانیاں دیں، اتنا بڑا کمال کیا اور اتنے بڑے اخلاص کے ساتھ جہاد کیا کہ جو واقعات ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق پڑھا کرتے تھے کہ کھانے کو بھی نہیں ملتا تھا، پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہوتے تھے، خندقیں بھی کھودتے تھے اور کفر کی طاقتوں کے ساتھ بھی لڑ رہے ہوتے تھے۔ عین وہی نقشہ پیش کیا کہ کھانا مل گیا تو ٹھیک ہے، نہیں ملا تو ٹھیک ہے۔ غاروں میں پڑے ہوئے ہیں، بم پھٹ رہے ہیں، نمازیں پڑھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کو بھی یاد کر رہے ہیں اور عین اس مقام پر یعنی جب کامیابی کے آخری کنارے پر پہنچ گئے تو (شیطان نے ان کو) آپس میں لڑوا دیا تو شیطان تو ہمارا کھلا دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ خبردار! شیطان کے راستوں کی ہرگز پیروی نہ کرنا! کیونکہ شیطان کا کوئی ایک راستہ نہیں ہے۔ اور یہ بھی واضح فرما دیا کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

﴿فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٠٩﴾﴾ [البقرة:٢٠٩] ''زَلَلْتُمْ'' کا معنی پھسلنا کہ اگر تم پھسل گئے اور راستے سے ہٹ گئے تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ غالب بھی ہیں اور حکمت والے بھی ہیں۔ ان آیات میں کفار کے لیے تہدید ہے۔

﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ ۚ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٢١٠﴾﴾ [البقرة:٢١٠]

''کیا لوگ یہی انتظار کرتے ہیں کہ ان پر اللہ بادلوں کے سائبانوں میں آئے اور فرشتے (بھی) اور (ان کی) ہلاکت کا فیصلہ ہو جائے؟ اور سب کام اللہ کی طرف لوٹتے ہیں۔''

﴿هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ﴾

میں نے اپنا مدنی محمد مصطفیٰ ﷺ بھی بھیجا، قرآن پاک بھی اتارا، میں نے اپنے نبی کو معجزے بھی دیئے اور میں نے اپنے نبی کو کھلی نشانیاں بھی دے کر بھیج دیا، تا کہ کسی کو اسلام کی سچائی میں شبہ باقی نہ رہے، لیکن جو لوگ اب بھی اسلام نہیں لے آتے تو کیا وہ اس انتظار میں ہیں کہ میرا اللہ آئے؟ کیا وہ اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب اللہ پاک بادلوں میں، سائبانوں میں اور ملائکہ کی جماعتوں میں خود تشریف لائیں گے فیصلہ کرنے کے لیے؟ کیا تم اس دن کا انتظار کر رہے ہو، یعنی قیامت کا؟

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق محفوظ ترین عقیدہ:

یادرکھو کہ قرآن پاک میں جہاں تک اللہ تعالیٰ کے آنے کا تعلق ہے کہ اللہ پاک تشریف لائیں گے یا قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے چہرے کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر ہے، اس میں سب سے محفوظ طریقہ یہ ہے کہ ہمارا اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ اور تمام صفات پر ایمان ہے بغیر کسی تشبیہ کے، بغیر تمثیل کے اور بغیر کسی تکلیف کے۔ جو اللہ پاک نے فرمایا "آمَنَّا" (ہم اس پر ایمان لائے)۔ جیسے اس کی ذات کی کوئی مثل نہیں ہے، اسی طرح اس کی صفات کی بھی کوئی مثل نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ عرش سے آسمانِ دنیا پر تشریف لاتے ہیں اور جب رات کا آخری حصہ ہوتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ آسمانِ دنیا پر تشریف لا کر فرماتے ہیں: "هَلْ مِنْ سَائِلٍ؟ فَأُعْطِيَهُ" کیا ہے کوئی مانگنے والا جس کا میں سوال پورا کروں ہے؟ کوئی رزق مانگنے والا ہے؟ کوئی اولاد مانگنے والا ہے؟ اور کوئی خیرات مانگنے والا؟ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ رحمت والا وقت رات کا آخری حصہ ہے، یعنی رات کو اگر چھ حصوں میں تقسیم کر دو تو جو سدس الاخیر ہے، وہی رحمت کی گھڑی، تہجد کا وقت ہے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا وقت ہے۔ اب جب حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر تشریف لاتے ہیں اور قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قضائے فصل کے لیے آسمانِ دنیا پر تشریف لائیں گے تو اب مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ پاک کا قرآن بھی حق ہے اور فرمانِ رسول بھی حق ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کیسے تشریف لاتے ہیں؟ تو اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی رحمت انسانوں کے بہت زیادہ قریب ہوتی ہے۔

اس لیے علماء کرام نے فرمایا کہ آدمی کو یوں کہنا چاہیے کہ اے اللہ! تیری ذات اور صفات پر ہمارا ایمان ہے۔ جو تو نے اپنی صفات قرآن میں بیان فرمائی ہیں یا فرمانِ رسول میں بیان فرمائی ہیں، ہم اس کی کوئی مثال بھی نہیں دیں گے، کوئی تشبیہ بھی نہیں دیں گے اور انکار بھی نہیں کریں گے، بلکہ جو تو نے ذکر کیا اس پر ہمارا ایمان ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جیسے بعض لوگ انہی الجھنوں کا شکار ہو کر گمراہ ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصے میں تشریف لاتے ہیں۔ رات آخری حصہ تو ہر ملک کا علیحدہ ہے، جیسے مثال کے طور پر مکہ میں چار بجے ہیں تو پاکستان میں چھ بجے ہوں گے۔ اور کسی ملک میں ابھی دو ہوں اور کہیں آٹھ بجے ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ جی! رات کا آخری حصہ تو ہر ملک میں علیحدہ ہے، پھر اللہ پاک کس وقت تشریف لاتے ہیں؟ اور انہوں نے کہا کہ جب عرش سارے آسمانوں پر محیط ہے، جب کرسی سب آسمانوں سے بڑی ہے اور عرش کرسی سے بھی بڑا ہے اور تمام آسمانوں کو اس نے اپنے اندر لیا ہوا ہے تو آسمانِ دنیا پر تشریف لانے کا کیا مطلب؟ اور وہ لوگ الجھنوں میں پھنس گئے کہ جب اللہ تعالیٰ ہر چیز سے اعلیٰ اور بلند یعنی عرش پر ہیں تو جب وہ نیچے تشریف لے آئیں گے تو عرش ان کے اوپر آجاتا ہے یا نیچے آتا ہے۔ یہ تمام بحثیں ایسی ہیں کہ انہی کی وجہ سے لوگ کفر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے قرآن سے ہٹ جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم انسان ہیں، بندے ہیں اور ہم ناقص العقل ہیں۔ میں اگر پرائمری پڑھا ہوا ہوں اور آپ مجھے ایم اے کا کوئی سوال کریں تو میں اس کو کیسے حل کر سکتا ہوں؟ جب ساری مخلوق کی عقول ناقص ہیں، ہم مخلوق ہیں تو خالق کے بارے میں ہم کیسے بحث کر سکتے ہیں؟ ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۖ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾ [الانعام:۱۰۳]۔

ہم تو ابھی تک مخلوق کی باتیں بھی نہیں سمجھ سکے۔ کتنے علماء پیدا ہوئے کہ ان کی کتابیں ابھی تک بھی نہیں سمجھی جا سکیں۔ یعنی آپ حیران ہوں گے کہ حضرت قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے ایک کتاب ''آبِ حیات'' لکھی ہے اور ایک کتاب ''تحذیر الناس'' لکھی ہے، اسی طرح ان کی اور کتابیں بھی ہیں جو کہ اردو میں لکھی ہوئی ہیں۔ آپ یقین فرمائیں کہ بڑے بڑے علماء ان کی اردو کی لکھی ہوئی کتابیں بھی اگر دس مرتبہ پڑھ لیں تو ایک حصہ بھی سمجھ نہیں آتا جب تک کہ وہ اس آدمی سے نہ پڑھی جائے کہ جس نے خود اپنے استاذ یعنی حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے نہ پڑھا ہو، یعنی جس نے ان سے پڑھا اور سمجھا تھا، وہ تو سمجھا سکتا ہے؛ کیونکہ اس کے پاس تو وہ علم تھا کہ اس نے سمجھا دیا، لیکن صرف اس بنا پر کہ میں اردو پڑھا لکھا ہوں، سمجھ لوں گا، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور آپ اندازہ کریں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بخاری شریف لکھی اور اس کے ابواب لکھے۔ اب ان ابواب کے

تراجم ایسے ہیں کہ محدثین کی زندگیاں گزر گئیں کہ علماء کرام نے بخاری کے تراجم پر کتابیں لکھ ڈالیں، پھر بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ہم بخاری کے تراجم میں جو مقصد امام بخاری کے دل میں تھا اس تک پہنچے ہیں یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ تو ہمیں انسانوں کی لکھی ہوئی کتابیں سمجھ نہیں آتیں۔

بعض شعراء کے اشعار ایسے ہوتے ہیں...... اقبال کے اشعار نہیں دیکھتے کہ اس کے کلام کی کتنی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ اقبالیات پر کتنی اکیڈمیاں بن گئیں، مختلف لوگوں نے تشریحات کی ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی وہ کہتے ہیں کہ علامہ صاحب کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ اتنی محنت کے باوجود بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ صحیح معنوں میں علامہ صاحب کا بھی یہ مطلب اور مقصد تھا جو ہم نے بیان کیا ہے۔ تو اگر ہم بندے کا کلام سمجھنے سے قاصر ہیں تو اللہ تعالیٰ کی ذات میں ایسی بحثیں کر کے نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم خود جہنم اور ہلاکت میں گر جائیں گے۔ ورنہ سیدھی بات ہے کہ اس کی ذات بھی بے مثل اور بے مثال ہے اور اس کی صفات بھی بے مثل اور بے مثال ہیں۔

﴿وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ﴾ [البقرۃ: ۲۱۰] سب کے سب کام اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ فرمایا کہ اگر ایمان لانا ہے تو دنیا میں ایمان لے آؤ۔ یہ دنیا دار العمل ہے۔ تم اس گھڑی کا انتظار کر رہے ہو جب قیامت آئے گی؟ وہ تو دار الجزاء ہے، پھر تمہارے ماننے یا نہ ماننے کا کیا فائدہ ہے؟ قیامت آنے کے بعد تو تمام کافر مان لیں گے، تمام مشرکین اور تمام یہود بھی مان لیں گے۔

لہٰذا ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ ہم سر سے پاؤں تک پورے کے پورے احکامِ اسلام میں داخل ہو جائیں اور پورے کے پورے اسلام کو قبول کر لیں اور شیطان کے راستے سے بچ جائیں۔ تب ہم کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ اگر ہم یہ کریں کہ ''آدھا تیتر اور آدھا بٹیر'' نماز بھی پڑھ لی اور شراب بھی پی لی، کلمہ بھی پڑھ لیا اور زبان سے گالیاں بھی دے دیں۔ اسلام تو کہتا ہے کہ ''یا سراسر موم ہو جاؤ یا سراسر سنگ ہو جاؤ'' یا پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ یا پورے کے پورے اسلام سے نکل جاؤ۔ اسلام کے لیے بدنامی کا باعث نہ بنو۔

حضرت شاہ جی رحمہ اللہ ایک جملہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر غور کرو! ایمان ہو تو صدیق کا ہو اور اگر کفر ہو تو ابو جہل کا ہو۔ یہ درمیان میں آدھا ایمان اور آدھا کفر، آدھا یہودی اور آدھا مسلمان، یہ اسلام نہیں ہے۔ یا پورا اسلام مان لیں یا پورا اسلام چھوڑ دیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیوں کامیاب ہو گئے!؟ اللہ پاک نے فرمایا کہ اے میرے مدنی! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی میں گواہی دیتا ہوں ﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا﴾ [الانفال: ۴] یہ پکے مومن ہیں، اندر باہر سے

ایمان والے ہیں، یہ ایمان کا نمونہ ہیں، یہ حزب اللہ ہیں اور یہ کامیاب ہیں۔ اسی لیے ان کو سرٹیفکیٹ مل گیا" رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ" کا (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی)۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے نمونہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور پورے کا پورا اسلام میں داخل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

﴿سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰہِ مِنْۭ بَعْدِ مَا جَآءَتْہُ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَیَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝﴾ [البقرۃ:۲۱۱،۲۱۲]

"(اے محمد ﷺ!) بنی اسرائیل سے پوچھ لیجیے! ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں دی تھیں!؟ اور جو اللہ کی نعمت کو اس کے پہنچنے کے بعد (کفر کی صورت میں) بدل ڈالے تو اللہ کا عذاب سخت ہے۔ کافروں کو دنیا کی زندگی پر فریفتہ کر دیا گیا ہے۔ یہ مومنین پر ہنستے ہیں، حالانکہ جو لوگ پرہیزگار ہیں قیامت کے دن ان سے اوپر ہوں گے۔ اور اللہ جس کو چاہے بے شمار رزق دیتا ہے۔"

بنی اسرائیل کے لیے نصیحت اور فضیحت:

(اے نبی ﷺ!) ان بنی اسرائیل سے پوچھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کتنی بڑی نشانیاں عطا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا، حضرت ہارون علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بڑے بڑے معجزات عطا فرمائے: تورات عطا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے عصا عطا فرمایا، فرعونیوں کو دریا میں غرق کر دیا اور ان کے لیے دریا میں راستے بن گئے اور اللہ پاک نے ان پر اتنا انعام کیا اتنا انعام کیا کہ تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں بھیجے۔ تو اتنا بڑا انعام کہ کسی قوم میں اللہ پاک نے اتنے زیادہ انبیاء کرام نہیں بھیجے۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا ۖۗ وَّاٰتٰىکُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ [المائدۃ:۲۰] اے بنی اسرائیل! ہم نے تمہارے لیے اتنی کھلی نشانیاں اور اتنی آیات بینات دیں، جن کے دیکھنے کے بعد تم حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے مخالف بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پھر ہم نے ان کو کتنی نعمتیں عطا فرمائیں کہ بنی اسرائیل فرعون کی قید میں تھے، فرعون ان کے بچوں کو قتل کرتا تھا، ان کی لڑکیوں سے خدمت اور

بے گار لیتا تھا اور ان کو ذلیل کرتا تھا اور ان کو غلام بنا کر رکھتا تھا۔ ہم نے ان کو ان کی غلامی سے چھڑایا۔ اور اللہ پاک نے فرمایا کہ انہوں نے نافرمانی کی تھی، ہم نے ان کو معافی عطا کی۔ آسمان سے من وسلویٰ اتارا۔ اتنی نعمتیں عطا فرمائیں، لیکن انہوں نے ان نعمتوں کا جواب کفر اور ناشکری سے دیا؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر جب کوئی ناشکری کرے تو وہ نعمت چھین لیتے ہیں۔ اس لیے فرمایا: ﴿سَلْ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ كَمْ آتَيْنَٰهُم مِّنْ ءَايَةٍۭ بَيِّنَةٍ ۗ وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَإِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ﴾ [البقرۃ:۲۱۱] ایسی کھلی نشانیاں ان کو دکھائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایسے کھلے معجزات تھے، جیسا کہ ید بیضا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قبطیوں پر ایسے ایسے عذاب بھیجے کہ کبھی ''جَرَاد''، کبھی ''قُمَّل''، کبھی ''ضَفَادِع'' اور کبھی ''دَم'' بھیجے۔ اور یہ ساری کھلی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی انہوں نے شکر ادا نہیں کیا۔ اور فرمایا: اے میرے مدنی! ﴿وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَإِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ﴾ جو شخص میری نعمت کے ملنے کے بعد اس کو بدل ڈالے، یعنی شکر ادا نہ کرے، کفر کرے کہ اللہ تعالیٰ نے صحت دی تھی کہ تو اس سے عبادت کر اور وہ اس (صحت) کا فائدہ نافرمانی سے اٹھا رہا ہے۔ اللہ پاک نے آنکھیں دیں کہ تو حق کا راستہ دیکھے، تو آنکھوں سے گندی فلمیں دیکھتا ہے۔ اللہ پاک نے ذکر کرنے کے لیے زبان دی تھی اور تو زبان سے گندی گالیاں نکالتا ہے۔ اللہ پاک نے پاؤں دیئے تھے کہ تو میرے راستے پر چل اور تو شراب خانے کی طرف چلتا ہے۔ اللہ پاک نے دماغ دیا تھا کہ میری تقدیر اور میری آیات میں غور کر، تو نے اس دماغ کو حرام کھانے اور رشوت کمانے اور ظلم کرنے میں صرف کیا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ جو میری نعمت کو بدلتا ہے تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔

اپنے اوپر خرچ کرنا بھی اسلام کا حکم ہے:

لہٰذا جب نعمت کا شکر کرو۔ اور شکر کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ زبان سے کہہ دو کہ اللہ تیرا شکر ہے۔ شکر کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اس نعمت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو دولت دی ہے تو زکوٰۃ دو، غریبوں کی مدد کرو، مساجد و مدارس میں خرچ کرو اور دین کے کاموں میں خرچ کرو۔

میرے آقا سرکارِ مدینہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا کہ میاں بیوی جب ملتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ صدقہ کا ثواب دیتے ہیں۔ اور اگر وہ غیر عورت پر خرچ کرتا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ملتی یا نہ

ملتی؟اس نے کہا: حضور پھر تو زنا ہے، ضرور سزا ملتی۔ فرمایا: اس طاقت کو جب حلال پر خرچ کیا تو اللہ تعالیٰ اس پر اجر عطا فرمائیں گے۔

اب یہ مسئلہ سمجھو کہ اگر تم نے اپنی طاقت اور جوانی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں استعمال کی، تم کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی، تم نے کہا کہ بالکل۔ اللہ پاک نے یہ تو نہیں فرمایا کہ آپ کھائیں پئیں نہیں، صاف کپڑے نہ پہنیں، اچھے نہ رہیں۔ یہ تو کبھی بھی اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا، بلکہ حضور اکرم ﷺ نے تو جب ایک صحابی کو دیکھا کہ میلے کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ادھر آؤ!۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تم غریب آدمی ہو؟ اس نے کہا: یارسول اللہ! میں غریب آدمی تو نہیں ہوں، مجھے تو اللہ پاک نے ہر قسم کی نعمتیں دی ہیں۔ میرے پاس اونٹ ہیں، بکریاں اور گائیں ہیں اور...... ماشاء اللہ!...... ہر قسم کا مال میرے پاس ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''فَلْيُرَ أَثَرُ نِعْمَةِ اللهِ عَلَيْكَ'' [سنن ابی داود، رقم: ۴۰۶۳]۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اثر تیرے اوپر نظر تو نہیں آتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی نعمتیں دی ہیں تو پھر یہ کیا ہے کہ تم فقیر بنے ہوئے ہو؟ اللہ پاک اس بات سے منع نہیں کرتا ہے کہ تم اچھا کھاؤ، اچھے کپڑے پہنو اور بیوی بچوں کو اچھے کپڑے پہناؤ۔ اسلام تو حکم دیتا ہے کہ اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرو، گھر پر خرچ کرو اور مہمانوں پر خرچ کرو، لیکن معصیت اور گناہ میں نہیں، بلکہ خیر میں خرچ کرو۔ بس اتنا ہی فرق ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری نعمتوں کو نہ بدلنا۔ اگر میری نعمتوں کو بدلو گے تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔

﴿زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا﴾ [البقرۃ: ۲۱۲] کافروں کے لیے دنیا کی نعمتیں ان کی آنکھوں میں مزین کر دی گئیں۔ انہیں دنیا کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ان کا مقصد ہی دنیا، زندگی بھی دنیا اور موت بھی دنیا، ہر وقت دنیا دنیا۔ وہ اسی چکر میں یا لباس میں یا مکان میں یا کھانے پینے میں۔

مسلمان کفار پر غالب ہوں گے:

﴿وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ [البقرۃ: ۲۱۲] (وہ ایمان والوں سے ٹھٹھا اور مخول ہوتے ہیں)۔

ایک صحابی تلوار بنانے کا کام کرتے تھے، یعنی لوہار تھے۔ انہوں نے ایک کافر سردار کو تلوار بنا کر دی۔ پھر اس کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کے ذمہ میری مزدوری کے اتنے پیسے ہیں۔ مہربانی کر کے میری مزدوری کے پیسے دے دیجیے۔ تو وہ ہنسنے لگ گیا اور کہنے لگا: عجیب بات ہے کہ تم تو کہتے ہو: اگلی دنیا میں ایک لاکھ ملے گا، تو تم وہیں مجھ سے

ملتا، میں وہاں آپ کو دے دوں گا۔ یعنی مزاق کر رہا تھا، آخرت پر ایمان تو ہے نہیں۔ اور اس کے بعد یہ مذاق کرتے ہیں کہ جہاں سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ گزرتے، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ گزرتے تو یہ کافر دیکھ کر ٹھٹھا اور مخول کرتے: دیکھو جی کہ نبی (پاک صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھیوں کی حالت تو دیکھو کہ لباس نہیں، کپڑے نہیں، ٹوپی نہیں، شلوار نہیں، یہ چلے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم پوری دنیا پر حکومت کریں گے۔ کھانے کو ملتا نہیں اور یہ پوری دنیا پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

اللہ پاک نے فرمایا: میرا بھی فیصلہ ہے ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾ [البقرۃ:۲۱۲] جو مجھ سے ڈرنے والے ہیں آج وہ دنیا میں جتنے بھی غریب اور بدحال ہوں، لیکن قیامت میں ان کو اونچا کر دوں گا۔ وہ جنت کے محلات میں رہیں گے اور یہ کافر جہنم میں پڑے ہوئے ہیں گے۔ اس دن پھر یہ عالم ہوگا کہ جنت والے جن سے یہ مذاق کرتے تھے وہ مومن ان کو پکار پکار کر کہیں گے: ﴿وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ﴾ جنت والے پکار کر کہیں گے: او جہنمیو! او کافرو! او مشرکو! ﴿فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ﴾ [الاعراف:۴۴] کیا تم کو وہ مل گیا جو اللہ پاک نے تم سے وعدہ کیا تھا؟ جو میرے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سنایا تھا پورا ہو گیا؟ اور پھر یہ عالم ہوگا کہ مومن جنت میں ہوں گے اور کافر جہنم میں پڑے ہوں گے۔ اللہ پاک پردے ہٹا دیں گے کہ مومن جنت میں ہیں: ﴿وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ﴾ جہنم والے چیخ چیخ کر کہیں گے: اے جنت والو! مہربانی فرما کر اگر ہمیں برتنوں میں نہ سہی اوپر سے ہمارے اوپر پانی کا کوئی قطرہ ٹپکا دو کہ ہم پانی تو پی لیں۔ کوئی روٹی کا ٹکڑا پھینک دو کہ ہم کھا لیں۔ ﴿قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ [الاعراف:۵۰] وہ کہیں گے: بدبختو! یہ جنت کی نعمتیں ہیں۔ اللہ پاک نے کافروں پر حرام کر دی ہیں، تمہیں نہیں مل سکتیں۔ اور قرآن پاک کہتا ہے کہ آج تم ایمان والوں سے مخول کرتے ہو، لیکن قیامت کے دن پھر یہ تمہارے ساتھ وہی کریں گے۔ اس لیے فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ [البقرۃ:۲۱۲]۔ اللہ پاک جس کو چاہتے ہیں بغیر حساب کے دنیا میں رزق عطا فرما دیتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ ﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ﴾ [العنکبوت:۶۲] اللہ تعالیٰ جس کا رزق چاہیں کھول دیں اور جس کا رزق چاہیں تنگ کر دیں۔ دینے پر آئے تو آدمی مٹی میں ہاتھ ڈالے تو وہ سونا بن جائے اور اگر لینے پر آئے تو سونے میں ہاتھ ڈالے تو مٹی بنا دے؛ اس لیے کہ رزق کے خزانے اللہ پاک کے ہاتھ میں ہیں۔ اور اللہ پاک جب جنت میں دینے پر

آئیں گے تو جس کو چاہیں رزق عطا فرمائیں گے اور اتنا رزق عطا فرمائیں گے کہ جس کا کوئی حساب نہیں کر سکتا اور نہ ہی ہوسکتا ہے۔ اللہ پاک ہمیں بھی دنیا میں آسانی اور مبارک رزق اور بغیر حساب کے جنت الفردوس عطا فرمائے۔ (آمین)

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ إِلَّا الَّذِيْنَ أُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢١٣﴾﴾ [البقرۃ: ۲۱۳]

''لوگ ایک دین پر تھے، پھر اللہ نے خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (پیغمبر) بھیجے اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری، تاکہ لوگوں میں جس بات میں وہ جھگڑا کریں فیصلہ کرے۔ اور کتاب میں جھگڑا نہ ڈالا، مگر ان لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی، ان کے بعد کہ ان کو صاف حکم پہنچ چکے تھے آپس کی ضد کی وجہ سے۔ پھر اللہ نے اپنے حکم سے ایمان والوں کو ہدایت دی اس سچی بات کی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے۔ اور اللہ جس کو چاہے سیدھی راہ بتاتا ہے۔''

امت کا معنی و مفہوم:

ان آیات مبارکہ میں اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں کہ لوگ ایک امت تھے۔ امت کا معنی جماعت ہوتا ہے۔ اگر کافی لوگ ایک نظریے پر جمع ہوجائیں گے تو یہ بھی ''امت'' کہلاتے ہیں، چاہے وہ نظریہ کیسا بھی ہو، ان پر ''امت'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر بعض لوگ ایک قومی لحاظ سے جمع ہوجائیں تو ان پر بھی ''امت'' کا اطلاق ہوتا ہے، یعنی عقائد وافکار کی بنا پر اگر ایک طریقے پر جمع ہوجائیں تو وہ بھی ''امت'' کہلاتے ہیں۔ قومی، وطنی اور نسبی لحاظ سے اگر ایک ہوجائیں گے تو ان پر بھی ''امت'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایک فرد پر بھی ''امت'' کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿إِنَّ إِبْرٰهِيْمَ كَانَ أُمَّةً﴾ [النحل: ۱۲۰] ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات میں گویا ایک ''امت'' تھے۔

اب اللہ پاک نے ان آیات میں بتادیا کہ امت پر لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا کہ وہ ایک ہی طریقے پر تھے، ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ اب ایک طریقہ پر ہونے کا کیا معنی ہے؟ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ سب کا ایک رنگ تھا اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ سب کی صورت اور شکل ایک تھی۔ تو ایک ہونے کا معنی یہ ہے کہ ایک دور ایسا بھی تھا کہ وہ عقیدے اور نظریے کے اعتبار سے ایک تھے، ان میں کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ جس نظریے پر تھے کیا وہ نظریہ حق تھا یا باطل تھا؟ تو قرآن پاک کی آیات مبارکہ سے مفسرین اور سلف صالحین نے جو سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ ایک عقیدے، ایک طریقے اور ایک نظریے پر تھے باعتبار حق کے، یعنی حق پر تھے اور ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا اور کوئی جھگڑا بھی نہیں تھا۔ اب سمجھیں کہ وہ کونسا دور تھا؟

❁...... حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جو قرآن پاک کے بہت بڑے قاری اور جلیل القدر صحابی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے اس آیت میں فرمایا کہ ایک امت ہونے سے اس دور کی طرف اشارہ ہے جب اللہ پاک نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی تمام اولاد کی ارواح کو نکالا اور ان سے یہ ارشاد فرمایا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ﴾ [الاعراف:۱۷۲] (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کہ آپ بالکل ہمارے رب ہیں)۔ ان میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں تھا، سب کے سب ربوبیتِ خداوندی پر متفق تھے۔ اب یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے، اس وقت حضرت حواء بھی پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ صلبِ آدم میں جتنی بھی اولاد تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی پشت سے تمام ارواح کو نکالا۔ یہ عالَم "عالم ارواح" کہلاتا ہے، جس میں تمام مخلوق کی ارواح کو اللہ پاک نے جمع کیا...... چونکہ کئی قسم کے عالَم ہیں: جیسے "عالمِ ارواح" ہے، اسی طرح "عالمِ دنیا" ہے، جس میں آپ موجود ہیں، اس کے بعد ایک "عالمِ برزخ" ہے، یعنی دنیا اور آخرت کے درمیان جو مرنے کے بعد ہم قبر میں رہیں گے وہ "عالمِ برزخ" کہلاتا ہے۔ "عالمِ برزخ" کے بعد پھر ایک عالَم "عالمِ آخرت" ہے۔ اور وہ عالم ایسا عالم ہے جس کے بعد فنا نہیں آئے گی، وہ عالم ہمیشہ رہے گا۔ اللہ پاک جب مردوں کو دوبارہ زندہ کریں گے تو پھر ان پر موت نہیں آئے گی...... تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق یہ ہے کہ یہ "عالم ارواح" کی طرف اشارہ ہے کہ اس عالم میں تمام ارواح ایک عقیدہ پر تھیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

اور اس کی تائید ایک حدیث مبارکہ اور قرآن پاک کی ایک آیت سے بھی ہوتی ہے۔ اللہ پاک نے قرآن پاک میں فرمایا: ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ﴾ [الروم:۳۰] اور حدیث پاک میں آتا ہے:

"كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ" ہر بچہ دینِ حق اور فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ "فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ" [بخاری، رقم:۱۳۸۵] تو اس کے ماں باپ اگر یہودی ہیں تو اس بچے کو یہودی بنا دیتے ہیں، نصرانی ہیں تو نصرانی بنا دیتے ہیں، اگر مجوسی ہیں تو مجوسی بنا دیتے ہیں اور اگر ہندو ہیں تو ہندو بنا دیتے ہیں۔ ورنہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی پیدا ہونے کے بعد اگر اس کو کوئی مسخ نہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر قائم ہوگا اور مسلمان ہوگا۔

اس لیے ایک قول تو یہ ہو گیا کہ عالمِ ارواح میں سب امتیں ایک تھی، ان میں کوئی جھگڑا نہیں تھا، وہ سب ایک عقیدے پر تھیں کہ اللہ پاک ہی الٰہ ہے، اس کی ربوبیت کاملہ ہے اور اسی کی الوہیت کاملہ ہے۔ اس کے سوا کوئی رب اور کوئی پالنے والا اور کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ تو یہ سارا مسئلہ ایک لفظ میں آ گیا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ﴾ [الاعراف:۱۷۲]

❁......ایک قول تو یہ ہو گیا، لیکن حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: اس سے مراد "عالمِ ارواح" نہیں ہے؛ اس لیے کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ﴾ [البقرۃ:۲۱۳] اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ تو اللہ پاک نے انبیاء کرام کو "عالمِ ارواح" میں تو نہیں بھیجا۔ قرآن پاک کی آیت خود دلالت کر رہی ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ جب انبیاء کرام "مُبَشِّرِينَ" اور "مُنذِرِينَ" بن کر ہماری دنیا والے عالم میں آئے ہیں تو پھر اس سے "عالمِ ارواح" کا کیا تعلق ہے؟ روزہ بھی نہیں ہے۔ "عالمِ ارواح" میں تو صرف روح تھے اور اللہ پاک نے ہم سے اقرار لے لیا، لیکن "عالمِ ارواح" میں کوئی عالم تکلیف تو نہیں تھا۔ عالمِ تکلیف تو فقط عالمِ دنیا ہے۔ تو ان کے قول کے مطابق لوگوں کے ایک امت ہونے سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کا زمانہ ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام تک کے زمانے میں سب لوگ ایک عقیدے پر تھے، توحید کو ماننے والے تھے اور حضرت آدم علیہ السلام کے عقیدے پر تھے، سوائے قابیل یا چند قابلِ ذکر لوگوں کے، جن کے ذکر کی کوئی حیثیت نہیں تھی، باقی سب لوگ ایک عقیدے پر تھے۔

جب سب لوگ ایک عقیدے اور ایک نظریے پر تھے تو یہ تقریباً حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح تک کوئی دس قرن کا زمانہ گزرا ہے۔ دس قرن کا مطلب دس صدیاں ہیں۔ یعنی ایک قرن ایک صدی ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ایک ہزار سال۔ یعنی ایک ہزار سال تک کوئی اختلاف نہیں تھا، سب کے سب توحید کے علمبردار تھے، سب اللہ پاک

کی الوہیت کے قائل تھے، اسی کی ربوبیت کے قائل تھے، اس کے علاوہ کسی کی عبادت کو روا نہ سمجھتے تھے، پوری اولادِ آدم ایک نظریے اور ایک عقیدے پر تھی۔ جب وہ ایک عقیدے پر تھے تو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ [البقرة: ۲۱۳] اللہ پاک نے نبی بھیجے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے۔

﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ﴾ پھر ان لوگوں نے اختلاف کیا، اعتراض کیا۔

سوال: آپ کے دماغ میں تو یہ بات آتی ہے کہ پہلے وہ ایک عقیدے پر تھے، نبی آئے تو ان میں اختلاف پڑ گیا۔ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ لوگ ایک عقیدے پر تھے، اللہ پاک نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے نبی بھیجے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری، تا کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اور نہ جھگڑے میں پڑے، مگر وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی۔ جب آ گئی ان کے پاس کھلی نشانیاں باعتبار حسد کے تو اب بظاہر...... نعوذ باللہ...... یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ تو ایک عقیدے اور ایک طریقے پر تھے، لیکن جب نبی بھیجے گئے تو اس کے بعد اختلاف ہوا۔

جواب: یہ بات نہیں۔ اصل میں قرآن پاک کا اسلوبِ بیان کچھ اس طرح سے ہے کہ جب تک تمام سلف صالحین کے طرز پر سمجھنے کی کوشش نہ کرے تو قرآن پاک سمجھ میں نہیں آ سکتا؛ اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، بندے کی کتاب نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا شانِ نزول، پسِ منظر، سببِ نزول اور وہ زمانہ اور اس زمانے کے لوگوں کے بارے میں سمجھنا ضروری ہے۔ یہ کوئی تاریخ اور جغرافیائی کتاب تو نہیں ہے۔ یہ تو ایک ہدایت کی کتاب ہے اور ایک ایسی جامع اور مانع کتاب ہے جو قیامت تک کے لیے سراپا ہدایت ہے۔ اس کا اپنا ایک اسلوبِ بیان ہے۔ اس میں صرف اتنی بات ذکر کی جاتی ہے جتنی ضرورت ہوتی ہے اور جس بات کی ضرورت نہیں ہوتی اور جو بات آیات سے خود بخود مفہوم ہو رہی ہوتی ہے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔

مثال کے طور پر: حضرت یوسفؑ جب قید میں چلے گئے، مدت گزر گئی۔ اس زمانہ کے بادشاہِ مصر نے خواب میں دیکھا، موجودہ لوگوں سے خواب کی تعبیر پوچھی، لیکن بادشاہ کو اطمینان نہ ہو سکا تو جو آدمی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید میں تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر دی تھی کہ کل تم رہا ہو جاؤ گے، اس کو یاد آیا کہ تعبیر کا بہت بڑا عالم جیل میں بیٹھا ہوا ہے۔ تو قرآن پاک صرف اتنی بات ذکر کرتا ہے ﴿يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ﴾ [يوسف: ۴۶] (وہ آدمی آیا اور اس نے کہا کہ) اے یوسف! آپ مہربانی فرمائیں اور ہمیں اس

بات کی تعبیر دیں۔ اب باقی قصہ کو ذکر نہیں کیا گیا؛ اس لیے کہ باقی سارا قصہ سمجھ میں آ رہا ہے۔

اسی طرح سے اللہ پاک نے فرمایا: ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً﴾ لوگ ایک عقیدے پر تھے۔ جب ایک عقیدے پر تھے تو نبیوں کے بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۱۳] مطلب یہ ہے کہ وہ ایک عرصہ تک ایک عقیدے پر رہے، لیکن ایک مدت گزرنے کے بعد ان میں اختلاف شروع ہو گیا۔ اب اس اختلاف کا قرآن پاک نے ذکر نہیں فرمایا؛ اس لیے کہ بات واضح تھی اور ضرورت ہو تو اللہ پاک نبی بھیجے گا اور اگر ضرورت نہ ہو تو اللہ پاک نبی کیوں بھیجے گا؟ اور اللہ کے نبی کیوں آتے ہیں؟ جب قومیں بگڑ جاتی ہیں اور کفر وضلالت کے اندھیروں اور گمراہیوں میں ہوتی ہیں اور بھٹک جاتی ہیں تو اللہ پاک اپنے نبی، اپنے رسول اور اپنے داعیوں کو بھیج دیتے ہیں۔ یہ کھلی بات ہے۔

اللہ پاک نے فرمایا کہ امت ایک تھی، پھر ایک ہزار سال کے بعد ان میں اختلاف پیدا ہونے شروع ہوئے اور طرح طرح کے افکار پیدا ہو گئے۔ بت پرست کہتا ہے کہ میں حق پر ہوں، سورج کا پجاری کہتا ہے کہ میں حق پر ہوں، آگ کا پجاری کہتا ہے کہ میں حق پر ہوں۔ اسی طرح سے جتنے بھی افکار پیدا ہوتے گئے اللہ پاک نے ان سب کی اصلاح کے لیے انبیاء کرام اور رسولوں کو بھیجا، تاکہ یہ حضرات ان لوگوں کے اختلاف کو مٹا دیں کہ یہ اللہ پاک کا فرمان ہے۔ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے، یہ صدق ہے اور یہ کذب ہے، یہ نور ہے اور یہ ظلمت ہے اور یہ دن ہے اور یہ رات ہے۔ اس طریقے سے انبیاء ورسل نے قوموں کے درمیان محنت کی، تاکہ اللہ پاک ان لوگوں کو ہدایت عطا فرما دیں۔

گمراہ کرنے کے شیطان کے حربے:

بعض حضرات نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام تک تو امت ایک تھی، ان میں کوئی جھگڑا اور اختلاف نہیں تھا، سب کے سب اللہ پاک کی توحید کے ماننے والے تھے۔ اب حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے لوگ بدلنے شروع ہوئے اور سب سے پہلے شیطان نے لوگوں کو بت پرستی کے ذریعے گمراہ کرنا شروع کیا۔ جو اچھے اچھے اللہ والے لوگ تھے، جن کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ فلاں اللہ تعالیٰ کا ولی ہے، وہ فوت ہو گیا ہے۔ اس نے لوگوں کے دماغوں میں یہ بات ڈالی کہ دیکھو! یہ اللہ والے جب فوت ہو گئے تو تم کو

ان کی یاد آئے گی تو تم ان کو دیکھ نہیں سکو گے تو تم کیسے کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ بات تو ٹھیک ہے، پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ تو اس نے کہا کہ ایک طریقہ ہے کہ ہم ان کی صورتیں بنا لیتے ہیں اور ان کا ایک مجسمہ بنا لیتے ہیں، چاہے وہ لکڑی کا ہو یا مٹی کا پتھر کا، تا کہ ہمیں پتہ چل سکتے کہ یہ فلاں بزرگ کا مجسمہ ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو بنانا نہیں آتا۔ اس نے کہا: پھر میں ہی محنت کر کے تمہیں بنا دیتا ہوں۔ تو اس نے ان کو ان بزرگوں کی صورتیں بنا کر ان کے گھروں میں رکھوا دیں۔ تو اللہ تعالیٰ کا قرآن فرماتا ہے: ﴿وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا﴾ [نوح: ۲۳] لگتا ہے یہ بھی پنجتن پاک تھے، یہ کوئی لکڑی نہیں تھے، بلکہ یہ اللہ والے لوگ تھے۔ جب یہ مر گئے تو شیطان نے ان کی صورتیں بنا کر گھروں میں رکھوا دیں کہ بھئی! ان کو دیکھا کرو، تا کہ یہ تمہیں یاد آئیں اور عبادت اللہ ہی کی کیا کرو، بس ان کو دیکھا کرو کہ......سبحان اللہ!......دیکھو جی کہ یہ بزرگ تھے۔ یہ رات کو سو نوافل پڑھا کرتے تھے۔ تو چلو میں بھی پڑھوں۔

جب ان کی وہ نسل ختم ہوگئی اور ان کی اولاد پیدا ہوئی تو ان کے دماغوں میں یہ بات ڈالی کہ بے وقوفو! یہ جو کچھ دولت، دنیا اور پیسہ وغیرہ تمہارے ماں باپ کو ملا تھا وہ سب ان کی عبادات کی وجہ سے ملا تھا۔ اگر ان کی عبادت کرو گے تو تمہیں بھی سب کچھ ملے گا اور اگر ان کو ناراض کر دو گے تو تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ تو ابتدا یہاں سے شروع ہوتی ہے، جیسا کہ جب آپ کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کا فوٹو جیب میں رکھتے ہیں ناں! ابتدا ہمیشہ فوٹو سے ہوتی ہے۔

اب لوگ اتنے بڑھ گئے کہ قرآن مقدس کے پہلے صفحہ پر اپنے پیر کا فوٹو لگایا ہوتا ہے اور پہلے اس کی زیارت کرتے ہیں اور پھر تلاوت شروع کرتے ہیں۔ کوٹھیوں اور گھروں میں فوٹو لگانا تو عام بات ہے اور پھر عقیدہ یہ ہے کہ اس پیر کے فوٹو کی برکت سے ہمارے گھر میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ ان کے گھروں میں قرآن پاک کی برکت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا نام لکھ دیں تو اس کی برکت نہیں ہوتی، لیکن کسی بزرگ کا فوٹو لگا دو تو اس کی برکت ہو جاتی ہے اور اس کی برکت سے سارے حوادث اور مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔

یہ عقیدے قوم میں داخل ہوئے تو قوم شرک میں مبتلا ہوگئی۔ جب قوم شرک میں مبتلا ہوگئی تو اللہ پاک نے پہلا رسول حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا۔ سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام آئے اور حضرت نوح علیہ السلام نے (۹۵۰) ساڑھے نو سو سال تک قوم کو توحید کی دعوت دی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ایک ہزار پچاس سال (۱۰۵۰) تھی۔ یہ جو قرآن پاک میں ارشاد ہے: ﴿اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا﴾ [العنکبوت: ۱۴] پچاس کم ایک ہزار سال تو یہ (۹۵۰)

ساڑھے نوسو سال کی مدت دعوت ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت سنائی، لیکن قوم شرک میں مبتلا رہی۔ حضرت نوح علیہ السلام جب مایوس ہو گئے تو آخر میں انہوں نے اللہ پاک سے دعا مانگی: اے اللہ! میں نے اس قوم کو ظاہر میں، باطن میں، کھلے میں، گھروں میں، محفلوں میں اور مجلسوں میں، ہر جگہ تیری توحید پہنچائی ہے، لیکن یہ قوم ہدایت پر آنے والی نہیں ہے، میں ان سے مایوس ہو چکا ہوں۔ ﴿رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا﴾ [نوح:۲۶] اے میرے رب! ان کا کوئی گھر زمین پر نہ بچے۔ ﴿إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ﴾ [نوح:۲۷] اگر آپ نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو مزید گمراہ کریں گے۔ تو حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قبول ہو گئی اور حضرت نوح علیہ السلام کی ساری کی ساری قوم ختم ہو گئی۔ باقی وہ لوگ بچے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے۔ وہ تقریباً اسی آدمی تھے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں میں سے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے: حام، سام اور یافث۔ آگے پھر ان تینوں کی نسل ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اب جتنے بھی لوگ ہیں: کوئی حامی ہے، کوئی سامی ہے اور کوئی یافثی ہے۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے رشتے سے بھی ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام کے رشتے سے بھی ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ باقی لوگوں کی اولاد نہیں ہوئی۔

لیکن لوگوں کو پتہ نہیں کیا ہو گیا کہ آج بھائی بھائی کا دشمن ہے، باپ بیٹے کا دشمن ہے، ماں بیٹی کی قاتلہ ہے اور خونِ مسلم کی ارزانی ہے۔ جہاں نظر ڈالو وہاں مسلم کا ہی خون بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ سب ہمارے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ پاک کی ناراضگی ہے۔

جب ساری قوم غرق ہو گئی اور کشتی میں حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھ ایمان والے بچ گئے تو اب پوری دنیا میں ایک امت بچ گئی اور وہ بھی ساری ایک عقیدے پر تھی۔

اصل میں اگر غور کریں تو تمام اقوال اپنی اپنی جگہ درست ہیں، اس لیے کہ عالمِ ارواح میں بھی ہم سب ایک عقیدے پر تھے اور آدم علیہ السلام کے زمانے سے حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک اختلاف نہ ہوا۔ پھر کفر و شرک آیا، اللہ پاک نے پہلا رسول حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا، لیکن قوم نہ مانی۔ اللہ پاک کا عذاب آیا، قوم غرق ہو گئی۔ پھر جو بچے حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے بھی ایک عقیدے پر، ایک امت اور ایک جماعت تھی۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ تو اب جب وہ اختلاف میں پڑے تو اللہ پاک نے انبیاء کرام کو بھیجا، تاکہ ان کے اختلاف کو ختم کیا جائے۔

﴿وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾ ہم نے صرف انبیاء کرام ہی نہیں بھیجے، بلکہ ان کے ساتھ کتابیں بھی بھیجیں۔ اللہ تعالیٰ نے تورات، انجیل بھیجی اور صحائف بھیجے اور سب سے آخر زمانہ میں سب سے آخری دور آیا تو اللہ پاک نے نبی بھی آخری بھیجا اور کتاب بھی آخری بھیجی، جو قیامت تک کے لیے کافی ہے، لیکن فرمایا: ﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ﴾ سب سے پہلے جھگڑے میں وہ لوگ پڑے جو علم والے تھے، جن کو کتاب دی گئی تھی، لیکن انہوں نے سب سے پہلے اختلاف کیا اور اَن پڑھ جاہل ان کے پیچھے چلتے رہے؛ کیونکہ اختلاف تو پڑھے لکھے ہی کرتے ہیں اور ہر کسی کا ایک حلقہ ہوتا ہے، جو ان کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ اور ان کے اختلاف کی وجہ عناد پرستی اور ذاتی جاہ تھی کہ میں بڑا اور میں بڑا ہوں۔ وہ حبِ جاہ میں مبتلا ہو گئے۔

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ﴾ پھر اللہ پاک نے ان لوگوں کو ہدایت دی جو ایمان لے آئے اس اختلاف کے بعد، اس لیے کہ ہدایت دینے والا اللہ پاک ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [البقرة: ۲۱۳] اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتے ہیں، اس لیے کہ ہدایت دینا اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے۔ پھر اللہ پاک جن لوگوں سے راضی ہوئے ان کو ہدایت اور ایمان نصیب فرمایا اور وہ صراطِ مستقیم پر آ گئے اور جن کے مقدر میں گمراہی تھی انہوں نے انبیاء کرام کی مخالفت کی۔

اب سمجھیں کہ جس سے نبوت کا سلسلہ شروع ہوا تو قوم دو حصوں میں منقسم ہوگئی: ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ﴾ [التغابن: ۲] ہم نے مخلوق کو پیدا کیا اور وہ دو حصے بن گئے: ایک مومن اور ایک کافر۔ اسی طرح ایک نبیوں کو ماننے والا اور دوسرا انکار کرنے والا۔ اور یہ سلسلہ چلتا آیا۔

اصل بات یہ ہے کہ دعوت بھی ایک اور داعی بھی ایک تھا، لیکن انبیاء کرام علیہم السلام مختلف اور کتابیں مختلف آئیں۔ وجہ یہ تھی کہ جیسا کہ تندرستی ایک ہوتی ہے، آگے شرک و کفر کی بیماریاں علیحدہ ہوتی ہیں۔ جس طرح ہر بیماری کا علاج علیحدہ ہے، اسی طرح اللہ پاک نے ہر بیماری کے علاج کے لیے نبی اور کتابیں مختلف بھیجیں۔ اور جب آخری زمانہ آ گیا تو اللہ پاک نے کامل نسخہ شفا بھیج دیا، جو اللہ پاک کا قرآن ہے اور اللہ پاک نے کامل نبوت اور رسالت بھیجی جو رسالت و نبوت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اللہ پاک نے اپنا آخری نبی خاتم الانبیاء امام الرسلین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سلسلہ خلفاء اور علماء کے ذریعے قیامت تک چلتا رہے گا۔ تو اللہ پاک نے اس آیت کے ذریعے فرمایا کہ جیسے پہلے عقیدہ اور امت ایک تھی تو اب چاہیے کہ پھر اسی طریقہ پر لوٹ جائیں اور

پھر ایک ہی عقیدے اور راستے پر رہیں، جو انبیاء کرام نے بتایا ہے، جس کی ہدایت اللہ پاک نے قرآن پاک میں فرمائی ہے۔

ایک تو ہدایت یہ ہوتی ہے کہ آپ کسی کو دین کے بارے میں ہدایت کر دیں، جیسے آپ تقریر کر دیں، دعوت دے دیں یا وعظ کر دیں۔ اور ایک ہدایت یہ ہے کہ اس کو اللہ پاک توفیق بھی دے دے۔ یہ ہدایت اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے۔ جتنے بھی انبیاء کرام تشریف لائے اور ان کے بعد خلفاء تشریف لائے، تابعین اور علماء کرام تشریف لائے، ان کی ذمہ داری دعوت، تبلیغ، وعظ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے، لیکن کسی کو ہدایت دینا اور اس کو ہدایت نصیب ہو جائے یہ اللہ پاک کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں ہدایت عطا فرما دیں اور جس کو چاہیں ہدایت عطا نہ فرمائیں۔ ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [البقرۃ: ۲۱۳]

اس لیے اللہ پاک نے دوسرے مقام پر واضح طور پر ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ [القصص: ۵۶] اے نبی پاک! توفیق ہدایت آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ آپ جس کو چاہیں ہدایت عطا فرما دیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ جس کو چاہیں ہدایت دے دیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ پاک نے فرمایا: ''فَهَدَى اللّٰهُ'' ایمان والوں کو ہم نے ہدایت دی۔

ایک شبہ اور اس کا جواب:

لیکن یاد رکھو کہ ایک تو اللہ پاک کی صفت ہے: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [الحدید: ۳] وہ ایسا اوّل ہے کہ اس سے پہلے کوئی چیز نہیں ہے، ''لَيْسَ قَبْلَهُ شَيْءٌ''۔ اور ایسا آخر ہے کہ اس کے بعد کوئی چیز نہیں، ''لَيْسَ بَعْدَهُ شَيْءٌ''۔ اس لیے بعض لوگ بے چارے اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ دیکھو جی! حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی تو آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اوّل بھی میں ہوں اور آخر بھی میں ہوں۔ تو لہٰذا اللہ پاک کی صفت بھی آ گئی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بھی آئی ہے۔

لیکن بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ﴾ جیسے سمیع اور بصیر اللہ پاک کی بھی صفت آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت جیسے: ﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] اور بندے کی صفت: ﴿فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ [الانسان: ۲] (ہم نے اس کو سننے اور دیکھنے والا بنایا)، لیکن کہاں عام مخلوق کا سننا اور دیکھنا اور کہاں خالق کا سننا اور دیکھنا!!؟ اس لیے اللہ پاک کی جو صفت ہے: ''اَلْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ'' وہ اس کی شان کو

زیبا ہے۔ اور مدنی پاک کے بارے میں جو آیا ہے ہم تمام امت میں اوّل بھی ہیں اور آخر بھی ہیں تو صحابہ کرام علیہم السلام نے عرض کیا: ہم کیسے اوّل بھی ہیں اور آخر بھی؟ تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا: آخر تو اس اعتبار سے کہ ہم آئے تمام انبیاء اور تمام امتوں کے بعد ہیں اور اوّل اس اعتبار سے کہ جنت میں اللہ پاک سب سے پہلے میری امت کو داخل فرمائیں گے۔ لہٰذا ''نَحْنُ الْأَوَّلُوْنَ وَالْآخِرُوْنَ'' تو یہ مطلب ہے اوّل و آخر ہونے کا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ امت بھی اوّل آخر ہو جائے اور خدا بھی اوّل و آخر ہو جائے اور نبی بھی اوّل و آخر ہو جائے۔ اور خدانخواستہ آدمی شرک تک پہنچ جائے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہم سب سے آخر میں بھی ہیں اور سب سے اوّل بھی ہیں۔ یعنی ہم آئے تو دنیا میں سب سے آخر میں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے۔ حالانکہ ان کو اللہ پاک کی کتابیں ہم سے پہلے ملی تھیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی کتاب سب سے آخر میں ملی، لیکن اللہ پاک نے ہمیں ہدایت عطا کر دی اس چیز کے بارے میں جس میں وہ جھگڑا کرتے رہے۔ تو یہ دن دیکھو! جس میں پہلی قوموں نے جھگڑا کیا اور اللہ پاک نے ہمیں ہدایت نصیب فرما دی، حالانکہ ہم سب سے آخر میں آئے۔

اور اللہ پاک نے ہمیں فضیلت کا دن سب سے پہلے نصیب فرمایا، یعنی جمعہ کا دن۔ اور فرمایا کہ جمعۃ المبارک اللہ پاک نے ہمیں عطا فرمایا اور ہمارے بعد والا دن یہود کے لیے اور اس کے بعد والا دن یعنی اتوار نصاریٰ کے لیے ہے۔ تو یہاں پر بھی اللہ پاک نے ہمیں صحیح دن پر پہنچا دیا۔ اس لیے علماء کرام نے فرمایا کہ ہفتہ میں سب سے افضل دن جمعہ کا دن ہے اور سال میں سب سے افضل دن عرفات کا دن ہے اور اگر اللہ پاک ان دونوں کو جمع کر دے تو سبحان اللہ!! دو برکتیں اور دو رحمتیں جمع ہو جائیں گی۔

باقی لوگوں نے جو حج اکبر کا مسئلہ بنایا ہے، اس کا قرآن و حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے کہ جمعہ کے دن تو حج اکبر ہوتا ہے اور اگر جمعہ کا دن نہ ہو تو حج چھوٹا ہو جاتا ہے۔ یہ لوگوں کی طرف سے رواج بن گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے دو عیدیں اکٹھی ہو گئی ہیں: ایک جمعہ کے دن کی عید اور ایک عرفات کے دن کی عید۔ ایک عرفات کے دن کی فضیلت اور ایک جمعہ کے دن کی فضیلت۔

ہفتے کے دنوں کی ترتیب:

ایک روایت میں آتا ہے کہ ان لوگوں نے اختلاف کیا کہ ہم کونسا دن اختیار کریں؟ یہود نے سبت یعنی ہفتہ کے

دن کو چن لیا اور نصاریٰ نے اتوار کا دن۔ اصل میں یہ لوگ کہتے تھے کہ اللہ پاک نے آسمان وزمین کو چھ دنوں میں بنایا۔ سب سے پہلے جس دن کام شروع کیا وہ یوم الاحد یعنی اتوار کا دن تھا، اس کے بعد یوم الاثنین یعنی پیر کا دن، اس کے بعد یوم الثلاء (منگل) تیسرا دن ہے، اس کے بعد یوم الاربعاء (بدھ) چوتھا دن، اس کے بعد یوم الخمیس (جمعرات) پانچواں دن آگیا، پھر یوم الجمعہ (جمعہ) چھٹا دن آگیا، تو چھٹے دن اللہ پاک نے ساری کائنات پیدا کر دی اور فارغ ہوگیا، لہٰذا اللہ پاک نے چھ دن کام کیا اور ساتویں دن یوم السبت چھٹی ہوگئی، اس لیے انہوں نے اپنی عقل کے مطابق یہ بات سمجھی کہ ہفتہ کے دن اللہ پاک نے چھٹی کی تھی تو مخلوق کو بھی چھٹی کرنی چاہیے...... اگر خالق کائنات اور اس کائنات کا رکھوالا بھی چھٹی کرے تو کائنات برباد ہو جائے۔ آپ اگر دفتر میں ایک چھٹی کر لیں تو اگلے دن آدھا کام غبن ہوتا ہے۔ یہ تو اس کی شان ہے: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ﴾ [البقرۃ:۲۵۵] وہ ایسا زندہ ہے جس پر کبھی موت نہیں آئے گی اور وہ ایسی ذات ہے جو سب کو سنبھالنے والی ہے۔ وہ ایسی ذات ہے جو اونگھ اور نیند سے بھی پاک ہے۔ یہ اس کی صفات ہیں...... بہرحال یہود کا فلسفہ تھا کہ اللہ پاک نے چھ دن کام کیا اور ساری مخلوق کو بنایا اور پھر ساتویں دن چھٹی ہوگئی، لہٰذا انہوں نے ہفتہ کے دن کو چن لیا۔

مسلمانوں کا افضل دن جمعہ ہے:

اور نصرانیوں نے کہا کہ نہیں، بلکہ ابتداءِ عالم اور تخلیقِ کائنات یوم الاحد (اتوار) سے شروع ہوئی تو ہم ابتدا والے دن سے چھٹی کرتے ہیں۔ لیکن خدا کی قدرت دیکھیں کہ ان چھ دنوں میں جو سب سے افضل دن تھا اس کی ان کو ہدایت نہ ہوئی۔ اس کو نہ یہود نے چنا اور نہ نصاریٰ نے چنا۔ اللہ پاک نے وہ دن امتِ محمد مصطفیٰ ﷺ کے لیے باقی رکھ لیا؛ اس لیے کہ ''خَيْرَ اُمَّةٍ'' امتِ محمدیہ ﷺ ہے۔

یہود ونصاریٰ اور مسلمانوں کے قبلہ میں فرق:

اسی طرح انہوں نے نماز میں بھی اختلاف کیا۔ بعض نے کہا کہ ہم رکوع تو کریں گے، لیکن سجدہ نہیں کریں گے۔ اور بعض نے کہا کہ ہم سجدہ کریں گے، لیکن رکوع نہیں کریں گے۔ اللہ پاک نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت کو ایسی نماز عطا فرمائی کہ جس میں رکوع بھی ہے، سجدہ بھی ہے اور قیام بھی ہے۔ پس آپ ﷺ کی امت کو جامع ترین نماز نصیب ہوئی۔

نماز کے طریقے میں بھی اختلاف:

اور نماز کے طریقے میں بھی اختلاف ہوا۔ بعض لوگ نماز پڑھتے تھے اور باتیں بھی کرتے تھے۔ اور بعض لوگ نماز بھی پڑھتے تھے اور چلتے پھرتے بھی رہتے تھے۔ لیکن اللہ پاک نے امتِ محمدیہ ﷺ کو سب سے افضل ترین طریقہ نماز کا طریقہ عطا فرمایا کہ جب نماز پڑھیں گے تو قبلہ بھی ابراہیمی اور نماز میں قیام، رکوع، سجود، خشوع، خضوع اور قرآن پاک بھی ہے۔ اللہ پاک کا ذکر بھی ہے، نبی پاک ﷺ پر درود وسلام بھی ہے اور آخر میں دعا بھی ہے۔

یہود و نصاریٰ و مسلمانوں کے روزوں میں فرق:

انہوں نے روزوں میں بھی اختلاف کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم آدھا آدھا دن روزہ رکھیں گے اور پچھلے آدھا دن روزہ نہیں رکھیں گے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ پہلا آدھا دن کھاتے پیتے رہو اور پچھلے آدھے دن روزہ رکھ لو۔ اور بعض نے کہا کہ روزہ کا معنی ہے بند ہونا ہے تو ٹھیک ہے، ہم فلاں چیز کھائیں گے اور فلاں چیز نہیں کھائیں گے۔ مگر روزہ کا افضل ترین طریقہ اللہ پاک نے امت محمدیہ ﷺ کو عطا فرمایا: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ﴾ [البقرة:۱۸۷]

حضرت ابراہیم علیہ السلام ملتِ حنیف پر تھے:

اللہ پاک نے فیصلہ فرما دیا: ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾ [آل عمران:۶۷] حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودیت پر تھے، نہ ہی نصرانیت پر تھے اور نہ مشرکین کے ساتھ تھے، بلکہ وہ تو سب کو چھوڑ کر خالص مسلمان تھے، اسلام اور ایمان پر تھے۔ لہٰذا اس پر بھی امت محمدیہ مصطفیٰ ﷺ کو ہدایت ملی۔

امتِ محمدیہ ﷺ ہدایت پر:

پہلی قوموں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی اختلاف کیا، یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور کہا کہ وہ...... نعوذ باللہ...... یوسف نجار کی اولاد ہیں اور ان کی والدہ محترمہ پر زنا کی تہمت لگائی۔ اور نصرانیوں نے آپ کو اتنا بڑھایا کہ...... نعوذ باللہ...... آپ کو اللہ کا بیٹا بنا دیا۔ حالانکہ اللہ پاک نے تو فرمایا کہ ہم نے تو ان کو "کلمۃ اللہ" اور "روح اللہ" ہونے کا لقب دیا ہے، وہ اللہ کا رسول اور نبی ہے۔ ہم نے اس کو بغیر باپ کے پیدا کیا ہے۔

اس میں بھی امت محمدیہ ﷺ کو ہدایت کا راستہ ملا کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رسول ہونے کے قائل ہیں اور آپ کے نبی ہونے کے قائل ہیں۔ تو یہ حق کا راستہ بھی ملا ہے تو امت محمدی مصطفیٰ ﷺ کو ملا ہے۔ یہودی بھی بھٹک گئے، نصرانی بھی بھٹک گئے اور ہدایت ملی تو امت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملی۔

یہ عظمت اور شان بھی امت محمدیہ ﷺ کو ملی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بات میں ان کو اس طریقہ پر رکھا جو سب سے پہلا طریقہ تھا، یعنی اللہ پاک کے دین پر چلنا۔ ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً﴾ [البقرۃ: ۲۱۳] اللہ پاک نے جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں سب کو ہدایت پر رکھا تھا، اسی طریقے سے اللہ پاک نے امت محمدیہ ﷺ کو بھی وہی ہدایت عطا فرمائی اور باقی لوگ اختلاف میں الجھتے چلے گئے۔ حالانکہ یہود بھی اہلِ کتاب اور نصاریٰ بھی اہلِ کتاب، ان کے پاس بھی ستر ہزار انبیاء کرام تشریف لائے، لیکن وہ اِفراط وتفریط کا شکار ہوتے چلے گئے اور بھٹک گئے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے امت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ہدایت عطا فرمائی۔

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۱۴]

''کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے جیسے تم سے پہلے کے لوگوں پر آئے تھے کہ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور ہلا دیئے گئے، یہاں تک کہ پیغمبر اور جو اس کے ساتھ ایمان والے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ یاد رکھو! اللہ کی مدد نزدیک ہے۔''

آیات کا ماقبل سے ربط:

اللہ پاک نے ان آیات میں یہ بیان فرمایا کہ پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کو ایمان کے مقابلے میں کتنے امتحانات تکالیف اور مشقتیں آئیں۔ ان آیات میں مومنین کے لیے ایک طرح کی تسلی کا ذکر ہے کہ حضور اکرم ﷺ پر ایمان لانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت جو شمع رسالت کے سب سے پہلے پروانے ہیں، جب وہ ایمان لے آئے تو ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اپنے بھی مخالف اور بیگانے بھی مخالف۔ اور پھر ایمان

لانے والے چند ایک افراد ہیں، کفر کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے اور لڑائی بھی نہیں کر سکتے تو جب ظلم و ستم سہنے کا وقت پڑے تو لازمی بات ہے کہ انسان کے دل میں ایک غم اور پریشانی آتی ہے۔

جنت کی وسعت:

تو ان آیات میں اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا کہ اے مدنی! آپ اپنی امت کو سمجھا دیں کہ کیا آپ کی امت نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم ایسے ہی جنت میں چلے جائیں گے اور ہم پر کوئی امتحان نہیں آئے گا؟ یعنی اتنی بڑی نعمت کہ جنت جیسی عظیم نعمت، جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ کیا چیز ہے؟ اور جس جنت کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اگر سات آسمانوں کو بچھا دیا جائے اور سات زمینوں کو بچھا دیا جائے تو ایک جنت کا عرض بنے گا، باقی طول کا علم تو اللہ پاک کو ہی ہے۔ اور پھر ایک جنت بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں تو کئی جنتیں ہیں۔ جیسے قرآن مقدس میں کہیں جنت الفردوس کا ذکر ہے، کہیں جنت الماوٰی کا ذکر ہے، کہیں جنت النعیم کا ذکر ہے اور کہیں جنت الخلد کا ذکر ہے۔

اتنی بڑی جنت کہاں ہے؟

سوال: اتنی بڑی جنت جو آسمانوں سے بھی بڑی ہے اور زمین سے بھی بڑی ہے، وہ کہاں ہے؟

جواب: حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ تشریف فرما تھے کہ آپ کی خدمت میں ایک یہودی آیا۔ اس نے بھی یہی اعتراض کیا: آپ کا عقیدہ ہے کہ اللہ پاک نے جو جنت بنائی ہے وہ آسمانوں اور زمینوں سے بھی بڑی ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بالکل ہمارا ایمان ہے۔ اس نے کہا: پھر وہ کہاں ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے یہ بتاؤ کہ اب اس وقت دن ہے یا رات؟ اس نے کہا: دن ہے۔ آپ نے فرمایا: پھر رات کہاں ہے؟ اب وہ چپ کر کے بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا: رات کہاں چلی گئی؟ اگر رات آجاتی تو پھر دن کہاں چلا گیا۔ اور خداوند قدوس کلام پاک میں فرماتے ہیں: ﴿يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ [الحج:٦١] ہم رات کو دن میں داخل کر دیتے ہیں اور دن کو رات میں داخل کر دیتے ہیں۔ تو اگر رات ہے اور دن نہیں ہے اور دن ہے تو رات نہیں ہے۔ تو جو اس بات پر قادر ہے وہ جنت پر بھی قادر ہے۔ انہوں نے فرمایا: تم عجیب آدمی ہو! تمہارے اور ہمارے سامنے تو فقط کرۂ ارض ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو پتہ نہیں کتنی مخلوقات ہیں!! جن تک ہمارا علم نہیں پہنچا۔

کائنات کے عجائبات:

یعنی اتنی ترقی کے باجود، اتنے کمالات کے بن جانے کے باوجود اب بھی جدید ماہرینِ فلکیات یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ایسے ایسے ستارے بھی موجود ہیں، جن کی روشنی ابھی تک زمین پر بھی نہیں آئی۔ اور پھر یہ کرہ مشتری ہے، کرہ زحل ہے، عطارد ہے۔ اتنے بڑے کرات ہیں کہ آپ جیسی سات زمینیں بھی ان کے اندر آجائیں۔ اور بعض کرات تو اللہ پاک نے ایسے بھی بنائے ہیں کہ دیکھیں کہ سارا آسمان وزمین کے لیے ایک چاند ہے اور بعض کرات ایسے ہیں جہاں پر اس جیسے سینکڑوں چاند ہیں۔ تو پھر یہ اعتراض تو ہم اس لیے کرتے ہیں کہ ہم جاہل ہیں اور ہمارا علم ناقص ہے، ہماری معلومات وہاں تک نہیں جاسکتیں۔ ورنہ جنت بھی حق ہے اور جہنم بھی حق ہے۔ اور جنت کی اللہ پاک نے صرف خبر ہی نہیں دی، بلکہ نبی پاک ﷺ تو خود جنت کے اندر جا کر دیکھ آئے، یعنی اللہ پاک نے قرآن پاک میں فرمادیا اور نبی پاک ﷺ نے آنکھوں سے سیر بھی کرلی۔

تو کیا اتنی بڑی نعمت بغیر مشقت کے مل جائے گی؟ اب دنیا میں چھوٹا سا گھر بنانے کے لیے اتنی محنت ومشقت پڑے گی تو کیا تم بغیر محنت کیے جنت میں چلے جاؤ گے؟ تم ایک چھوٹی سی دنیا آباد کرنے کے لیے اور چھوٹا سا باغ لگانے کے لیے اتنی محنت کرتے ہو۔ ایک مربع زمین میں باغ لگانے کے لیے ہزاروں روپے خرچ کرتے ہو، مالی رکھتے ہو، بیلدار رکھتے ہو، دیواریں بناتے ہو، پودے لگواتے ہو، مٹی بدلتے ہو، زمین میں کھاد دیتے ہو، نالیاں بناتے ہو، سردی اور گرمی سے بچانے کے انتظامات کرتے ہو۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ ایک چھوٹا سا باغ اور وہ بھی دنیا کا حقیر سا باغ! اس کے لیے اتنی محنت کرتے ہو تو وہ جنت کا باغ ہے جس کی کوئی مثال ہی نہیں ہے، وہ تمہیں بغیر کسی محنت اور ابتلاء کے کیسے حاصل ہو جائے گا؟

امتوں کی آزمائش:

بہر حال اللہ پاک نے اس آیت میں فرمایا کہ کیا تم گمان کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تم پر وہ حالات نہیں گزریں گے جو تم سے پہلے لوگوں پر گزرے؟ یعنی جو امتیں پہلے گزر چکی ہیں ان کو ایسا فقر وفاقہ پہنچا اور ایسی شدید بھوک آئی اور ابتلاء آیا کہ کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا اور اس کے بعد ایسی ایسی بیماریاں اور تکلیفیں آئیں اور وہ امتحان میں ایسے ہلائے گئے اور ایسے جھنجوڑے گئے کہ اللہ پاک کے رسول اور ایمان لانے والے کہنے لگے: اللہ

پاک کی مدد کب آئے گی؟ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔ یعنی یہ امتحان کی آخری حد ہے کہ اللہ پاک کے رسول بھی گھبرا جائیں اور ایمان والے بھی گھبرا جائیں اور گھبراہٹ میں اور شدتِ اضطراب میں یہ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد پتہ نہیں کب آئے گی؟ یہ اعتراض نہیں تھا، بلکہ یہ انتہائی مجبوری کا کمال تھا کہ مجبوری کی ان آخری حدود کو پہنچ گئے، ورنہ وہ اللہ پاک کی مدد میں کوئی شک تو نہیں کرتے۔ اللہ کی مدد میں شک کرنا تو...... نعوذ باللہ...... کفر ہے۔ اللہ پاک کا تو وعدہ ہے کہ میں مومنین کی مدد کروں گا اور میں رسولوں کی مدد کروں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ آخری حد ہوگئی۔ یعنی اس سے بڑا کام اور کیا ہوگا کہ اللہ پاک کا پیغمبر ایک درخت کی اوٹ میں آجائے اور دشمن سر پر آرا رکھے اور سر پر آرا چل کر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائیں، اس سے بڑا ابتلاء اور کیا ہو سکتا ہے!؟

حضور ﷺ کو سب سے زیادہ تکالیف پہنچائی گئیں:

آپ ﷺ نے فرمایا:

((أَشَدُّ بَلَاءً ٱلْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ)) [کنزالعمال:۳۲۵۵]

سب سے زیادہ مصیبتیں اور امتحان انبیاء کرام پر آئے ہیں اور انبیاء کے بعد پھر جیسے کسی کی شان بڑی ہوتی ہے اتنا ہی اس کا بھی امتحان ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وَلَقَدْ أُوذِيتُ فِي اللهِ وَمَا يُؤْذَى أَحَدٌ'' [سنن الترمذی، رقم:۲۴۷۲] (اللہ کے راستے میں اتنی تکلیفیں مجھے پہنچائی گئی ہیں کہ کسی کو اتنی تکلیفیں نہیں پہنچیں)۔

سب سے زیادہ شان محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے، اس لیے سب سے زیادہ امتحان بھی محمد رسول اللہ ﷺ کا ہوا۔ اور تصور کریں کہ نبی پاک ﷺ کعبہ شریف کے اندر ہوں اور کافر نے گلے کے اندر کپڑا ڈال کر کھینچا کہ آپ ﷺ کی آنکھیں مبارک باہر کو نکل آئیں۔

تصور کریں کہ آپ ﷺ سجدے میں گئے اور سر مبارک سجدہ میں ہے اور ابو جہل نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر باہر سے ایک مردہ جانور کا اوجھ اٹھا کر حکم دیا کہ آپ ﷺ کے گردن پر رکھ دو۔ اور آپ ﷺ سجدہ میں ہیں اور کسی کو جا کر اسے ہٹانے کی جرأت بھی نہیں ہو رہی؛ اس لیے کہ سامنے کفار کے بڑے بڑے سردار کھڑے ہیں، غریب مسلمان کی کیا جرأت ہو سکتی ہے کہ ان سے مقابلہ کرے؟ آخر ایک انسان کو اتنا جذبہ ہوا کہ اس نے جا کر چپکے سے آپ ﷺ کے گھر میں اطلاع دے دی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو چھوٹی بچی تھیں وہ دوڑ کر آئیں اور انہوں

نے آ کر اس اوجھ کو ہٹایا۔ اس کے بعد دعا کی کہ یا اللہ! ان لوگوں پر لعنت کر جن لوگوں نے محمد مصطفیٰ ﷺ کا حیا بھی نہ کیا، انہوں نے تیرے نبی پاک ﷺ کے ساتھ اتنا ظلم کیا۔ اور جس راستے سے آپ ﷺ گزرتے تھے اس راستے پر کانٹے بچھا دیئے جاتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آزمائش اور ''رضی اللہ عنہم'' کا پروانہ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انگاروں پر لٹا دیا گیا۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی ٹانگوں میں ابو جہل بد بخت نے رسے ڈالے اور ایک رسا اونٹ کو باندھا اور دوسرا رسا دوسرے اونٹ کو باندھا اور دو مختلف سمتوں میں اونٹ کھڑے کیے اور وہ ظالم سامنے کھڑا ہے۔ ادھر اونٹوں کو دوڑانے کا حکم دیا اور ادھر حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے بدن میں نیزہ مارا۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ بغیر آزمائش اور امتحان کے ویسے جنت حاصل نہیں ہو جاتی، البتہ اللہ پاک اپنی شانِ رحمت کا نظارہ کر کے بعض لوگوں کو بغیر مشقت کے بھی جنت دے دیتا ہے کہ کوئی عمل بھی نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا۔ کلمہ پڑھا اور موت آ گئی، نماز پڑھنے کا اور روزہ رکھنے کا موقع بھی نہیں ملا اور جنت میں چلے گئے۔ یہ واقعات استثنائیہ ہوتے ہیں، ورنہ سنت الٰہی یہ ہے کہ یہ دنیا دار العمل اور دار الامتحان ہے۔ یہاں پر قدم قدم پر آزمائش ہو گی۔ جتنا ایمان بڑا ہو گا اتنا ہی امتحان بڑا ہو گا۔

اللہ پاک نے قرآن میں یہ نقشہ کھینچا کہ اے میرے محبوب! یہ اتنی تکالیف آپ پر ہی نہیں آئیں، آپ سے پہلے جو ایمان والے گزرے ہیں ان پر بھی تکالیف اور امتحانات آئے ہیں۔ اور ان کو تو امتحانوں نے اتنا جھنجھوڑ ڈالا کہ اضطراب میں وہ یہ الفاظ کہنے لگے: ﴿مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ﴾ (اللہ کی مدد کب آئے گی؟) جواب ملا: ﴿اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾

لیکن جو امتحانوں میں پاس ہو کر گزر جائے، ایمان پر قائم رہے تو ان کا مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے بلال! معراج کی رات میں نے تمہارے چلنے کی آواز جنت میں سنی ہے۔ آپ کو انگاروں پر لٹایا گیا اور توحید پر ثابت قدم رکھا گیا تو اللہ پاک نے انہیں بھی مرتبہ عطا کیا۔ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عمر! میں نے جنت میں ایک سفید موتیوں کا محل دیکھا۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا ''لِمَنْ هٰذَا؟'' یہ کس کا محل ہے؟ تو جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: حضور! یہ آپ کے ساتھی عمر کا محل ہے۔ پھر جو لوگ

آزمائشوں اور امتحانات میں ثابت قدم رہتے ہیں اللہ پاک ان کو مرتبہ بھی ایسے ہی عطا فرماتے ہیں اور ان کو اسی طرح کے بدلے بھی عطا کرتے ہیں۔

امتحان اور آزمائش کی صورتیں:

﴿اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر:۱۰] وہ کبھی تو شدید قسم کی بیماری دے کر امتحان لیتا ہے، کبھی درد اور کبھی مصائب۔ تو یہ آزمائش کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اللہ پاک نے جیسے اس دنیا کو دار العمل اور دار الامتحان بنایا، اسی طرح وہ اپنے بندوں کا بھی امتحان لیتے ہیں۔ تو امتحان میں جو پاس ہو گیا وہ کامیاب ہو گیا اور جو فیل ہو گیا وہ ناکام ہو گیا۔ اب اس امتحان اور آزمائش کے کئی طریقے ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ﴾
[البقرة:۱۵۵]

ہم تمہاری آزمائش کرتے ہیں خوف سے بھی کہ دشمن چڑھ دوڑا، ہر وقت خوف ہے، جنگ ہے اور قتل ہے۔ تو آدمی خوف وعذاب میں مبتلا ہے۔ اور کبھی فصلیں برباد ہو گئیں، کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ اور کبھی مال میں بیماری آ گئی، مال ختم ہو گیا۔ کبھی باغات میں بیماری آ گئی، باغات ختم ہو گئے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے امتحان کے مختلف طریقے ہیں، لیکن ان امتحانات میں کھرا ہو کر جو نکل جائے، یعنی جس نے صبر کیا اور جزع فزع نہیں کی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہا تو فرمایا کہ ان کو خوشخبری دے دو جنہوں نے صبر کیا۔ اور اللہ پاک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: ﴿اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر:۱۰] جو مصائب پر صبر کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو قیامت میں بغیر حساب کے بدلہ عطا فرماتے ہیں، یعنی اس کا کوئی حساب اور کوئی حد نہیں ہوگی۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ہر عمل کے لیے کوئی میزان ہوگا، نماز کے لیے علیحدہ میزان، روزہ کے لیے علیحدہ میزان اور خیرات کے لیے علیحدہ میزان۔ سب کو اس کے میزان کے مطابق اجر ملے گا۔ ہر چیز کی ایک حد اور حساب ہے، لیکن جب صبر والے آئیں گے تو اللہ پاک فرمائیں گے کہ صبر والوں کو بلاؤ اور حکم ہوگا کہ ان پر میرا ثواب انڈیل دو، ان سے کوئی حساب نہیں۔ اس لیے حدیث پاک میں آتا ہے: کل جب صبر والے دیکھیں گے

کہ ان کو اتنا ثواب مل گیا تو وہ کہیں گے کہ ہائے کاش! دنیا میں ہمارے بدنوں کو مقراض (قینچیوں) کے ساتھ کاٹ دیا جاتا اور ہمارے بدنوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے تو آج ہمیں اس کا اور بھی زیادہ اجر ملتا۔

اللہ پاک کبھی دولت دے کر آزماتے ہیں اور کبھی دولت چھین کر آزماتے ہیں۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم پر پہلے تو فقر و فاقہ کا امتحان آیا کہ غربت اور تکلیف کہ اسلام میں چند لوگ ہوتے تھے، کھانے کو نہیں مل رہا، تکلیفیں ہیں اور پریشانیاں ہیں۔ اندازہ کریں کہ ہم لوگوں کو تو ایک دن بھی کھانا نہ ملے تو ہمارا اگلا پچھلا سارا ختم ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں کہ کیا قیامت ٹوٹ گئی کہ تقدیر ہمارے ہی گلے میں پڑ گئی ہے؟ اور وہاں یہ عالم تھا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ" حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے کبھی پیٹ بھر کھجوریں بھی نہیں کھائیں جب تک خیبر فتح نہیں ہوا۔ اسی طریقہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: دو دو مہینے گزر جاتے کہ میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اماں جان! اس کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا: کچھ ہو تو پکائیں گے۔ آگ کس کے لیے جلائیں؟ گھر میں نہ گوشت ہے، نہ سالن ہے اور نہ دال ہے تو آگ کس کے لیے جلائی جائے؟ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: پھر گزر کیسے ہوتا تھا؟ تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کھجور کے دو دانے مل گئے، ان کو کھا لیا اور پانی پی کر شکر ادا کیا۔

میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا یہ عالم تھا اور ابتلاء کا یہ عالم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ ایک صحابی گزرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم رونے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو مبارک آ گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: حضور! کیا بات ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ آدمی ہے کہ جب تک کافر تھا تو ایک ایک دن میں دو دو تین تین جوڑے بدلتا تھا اور جب مسلمان ہوا تو یہ اس حالت میں آپ کے سامنے ہے۔ اور یہ امتحان ہے کہ لباس پہننے کو بھی کچھ نہیں ملتا تھا۔ یہ امتحان کی حالت ہے کہ میں اس کی سابقہ حالت کو دیکھ کر رو پڑا۔

شریف لوگ پریشان اور دوسرے خوش کیوں؟

جتنا ایمان مضبوط ہوگا اتنا ہی امتحان بھی سخت ہوگا اور جتنا ایمان کمزور ہوگا اور جتنا اسلام سے دور ہوگا اس پر کوئی مشقت نہیں آتی۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ کفار کتنے مزے کر رہے ہیں؟ کھانا، پینا، دولت اور اقتدار کی کرسی، سب کچھ ان کے پاس ہے۔ اور پھر مسلمانوں کو دیکھو کہ ہر مقام میں ابتلاء اور پریشانی میں ہیں۔ اور جو جتنا زیادہ پکا مسلمان ہے اتنی بڑی پریشانی ہے، یعنی آپ گھر میں دیکھ لیں کہ وہ لڑکیاں جن کا کردار ٹھیک نہیں ہے، جو عریانیت

کی عادی ہیں، موجودہ ماڈرنائز طبقے میں گھل مل گئی ہیں، نہ ان میں حیا ہے، نہ ہی شرم اور نہ ہی شرافت ہے، جینز پہنتی ہیں، ڈانس کرتی ہیں، غیر محرم مردوں کے ساتھ کلبوں میں جا کر کھیلتی ہیں، ان کے گھر بڑے آباد ہیں، شوہر بھی ان کے بڑے فرمانبردار ہیں، ان کی سوسائٹی میں بھی بڑی تکریم ہے۔ اور جو عورت نماز، روزہ اور قرآن پاک کی پابند ہے، وہ ماں باپ کے گھر میں بیٹھی رو رہی ہے۔ تجربہ کرلو جو جتنا بے حیا ہے وہ اتنا مزے میں ہے۔ جتنا ایمان ہے اتنا ابتلاء ہے۔ اسلام پر کوئی مضبوط ہے اتنا ہی امتحان ہے۔ یہ اللہ پاک کی حکمتیں ہیں۔

لیکن یاد رکھیں! یہ بھی تو عذاب میں رگڑے جاتے ہیں؛ کیونکہ جب آگ جلتی ہے تو جب سوکھی لکڑیاں جلتی ہیں تو گیلی لکڑیاں بھی ساتھ جل جاتی ہیں۔ تو پھر قیامت کے دن ہر کوئی اپنے عمل پر کھڑا ہوگا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی بڑا مؤمن اور بڑا صالح اور عابد ہے، لیکن امتحان ہے، جیسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ پر امتحان آیا۔ قید میں ڈالے گئے، کوڑے مارے گئے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر کتنے امتحان آئے کہ جیل میں موت آئی۔ امام بخاری رحمہ اللہ کہ جن کی کتاب کو اللہ تعالیٰ نے یہ مرتبہ دیا کہ اللہ پاک کے کلام کے بعد ان کی کتاب کو روایت حدیث میں اصح الکتب کہا جاتا ہے۔ ان (امام بخاری رحمہ اللہ) کا یہ عالم تھا کہ وہ اللہ پاک سے دعا مانگنے لگے: یا اللہ! تیری زمین مجھ پر تنگ ہوگئی ہے، میں کہاں جاؤں؟ کسی ملک میں مجھے پناہ نہیں ملتی، کوئی ملک مجھے رہنے نہیں دیتا۔ جس ملک میں جاتا ہوں مجھے نکال دیتے ہیں۔ اب میں مبتلا ہو گیا ہوں، اے اللہ! کیا تیری زمین مجھ پر تنگ ہوگئی ہے؟ یا اللہ! تو مجھے اٹھا لے اور مجھے موت دے دے، تاکہ میں اطمینان سے قبر میں تو آ جاؤں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر مشکلات:

اہل بیت رسول پر کتنے امتحانات آئے!؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں پر کتنے امتحانات آئے!؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خلفائے راشدین پر کتنے امتحانات آئے!؟ آپ اندازہ کریں کہ مدینہ منورہ کا شہر ہو اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت ہو اور پورے شرقاً غرباً اسلام کا جھنڈا لگ چکا ہو اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو پینے کے لیے پانی نہ ملے، حالانکہ وہ خلیفۃ المسلمین ہیں، خلافت ان کی ہے۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتوحات بڑی ہوئیں کہ اسلام نے کتنے ملک فتح کیے!؟ اور ان کے پاس فوج ہے، قوت ہے اور طاقت ہے، لیکن یہودیت کی ایک لابی نے ایک سازش کی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بغیر کسی گناہ کے الجھا دیا اور آپ کو گھیر لیا۔ اور گھر کے باہر باغی

کھڑے ہیں، کھانا بند ہے، پانی بند ہے، خوراک بند ہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ گھر میں محصور ہیں۔ اور وہ ایسے مظلوم ہیں کہ دیوار سے سر نکال کر خطاب کیا کہ اے لوگو! تمہیں یاد ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: مدینے میں میٹھا پانی نہیں ملتا۔ اگر کوئی اس یہودی سے کنواں خرید کر مدینہ والوں کے لیے وقف کر دے تو میں اس کی جنت کا ذمہ دار ہوں؟ کیا تم لوگوں کو یہ بات یاد ہے؟ انہوں نے کہا: بالکل یاد ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کنویں کو کس نے خریدا تھا؟ تو انہوں نے کہا کہ آپ نے خریدا تھا۔ آپ نے فرمایا: میں نے خرید کر پورے مدینے والوں کو پانی پلایا، کیا تم مجھے پانی نہیں دیتے ہو؟ اس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک ایک بات گنوادی۔ فرمایا: جس دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فوت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دوسری بیٹی کا نکاح دے دیا۔ جب دوسری بیٹی کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عثمان! کاش! اگر آج میری کوئی اور لڑکی بھی ہوتی تو میں تجھ سے اس کو بیاہ دیتا۔ لیکن پانی بند ہے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ قرآن پڑھ رہے ہیں اور قرآن پاک کی تلاوت کے دوران انہیں شہید کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ امتحان ہے۔

اللہ تعالیٰ امتحان کیوں لیتے ہیں؟

اللہ پاک امتحان کیوں لیتے ہیں؟ حالانکہ اللہ پاک کو پتہ ہے کہ یہ کھوٹا ہے یا کھرا ہے؟ امتحان تو وہ آدمی لیتا ہے، جس کو پتہ نہ ہو۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: مجھے تو پتہ ہے کہ میں دنیا والوں پر یہ بات کھولنا چاہتا ہوں، تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ میرا دوست کون ہے اور دشمن کون ہے؟ ایمان والا کون ہے اور کافر کون ہے؟ میرے علم میں تو سب کچھ ہے، چاہے میں امتحان لوں یا نہ لوں۔ (اور اس لیے بھی امتحان ہوتا ہے کہ ایسے حضرات کے اخروی درجات مزید بڑھا دیئے جائیں)۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢١٥﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ
وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـــًٔا
وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾﴾ [البقرۃ: ۲۱۵، ۲۱۶]

''آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں: کیا چیز خرچ کریں؟ آپ فرما دیجئے: جو مال بھی تم خرچ کرو تو ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے۔ اور تم جو بھلائی کرو گے بے شک وہ اللہ کو معلوم ہے۔ جہاد کرنا تم پر فرض ہے، حالانکہ وہ تمہیں ناگوار ہے۔ شاید کہ تمہیں ایک چیز بری لگے اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور شاید کہ تم کسی چیز کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

انفاق فی سبیل اللہ کی مقدار اور مواقع:

ان آیات مبارکہ میں انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کا بیان ہے کہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ اس میں علماء کرام نے فرمایا کہ اب سوال کا یا تو آپ یوں کہیں گے کہ گویا کہ ان سوالات کے بارے میں فتویٰ دینے والی ذات اللہ پاک ہے کہ اللہ پاک نے اپنے عرش سے فتویٰ جاری کیا، یا یوں کہیں کہ اللہ پاک نے وحی کے ذریعے مدنی پاک ﷺ کے دل میں القاء کیا اور فتویٰ دینے والی ذات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ہے اور حکم دینے والی ذات رب العلٰی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ﴿مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ اب چند آیتوں کے بعد پھر یہی سوال آئے گا۔

گویا کہ یہاں چند سوالات اور ان کے جوابات کا ذکر ہے۔ سوال ایک ہے اور اس کے دو جز ہیں: پہلا جز یہ ہے کہ کیا خرچ کریں؟ اور دوسرے جز کا مطلب یہ ہے کہ کہاں خرچ کریں؟ اس آیت مبارکہ میں تو اس جز پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ کہاں خرچ کریں؟ اور کیا خرچ کریں اس کے بارے میں اشارہ آگیا کہ ﴿مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۱۵]۔ اور دوسری جگہ پر اللہ پاک نے فرمایا: ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ [البقرۃ:۲۱۹] کہ جو کچھ زیادہ ہے وہ خرچ کرو۔

تو اب یہ سمجھیں کہ کیا خرچ کریں؟ کونسا مال خرچ کریں؟ اور کہاں خرچ کریں؟ جہاں تک پہلے سوال یعنی مال میں سے کیا خرچ کرنے کا ہے، اس کا تو بڑا اجمالی جواب ہے کہ جو بھی تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں بھلائی اور اچھے کام کرو گے اللہ پاک جانتے ہیں، یعنی چاہے تم پیسہ خرچ کرو، سونا خرچ کرو، چاندی خرچ کرو، کپڑا خرچ کرو، مال خرچ کرو، جو بھی خرچ کرو۔ اس میں ایک تو عموم آگیا اور دوسری آیت مبارکہ میں یہ آگیا کہ خرچ تو کرو، لیکن وہ خرچ کرو جو زائد ہو، یعنی تمہاری ذاتی ضروریات اور گھر کے خرچ سے جو زیادہ بچی ہوئی ہو۔ یہ معنی نہیں کہ تمہارے بیوی بچے

بھوکے بیٹھے ہوئے ہوں اور تم ان کو کہو کہ ہم نے خیرات کر دیا ہے۔ یہ شریعت میں حرام ہے۔ شریعت اس کی کوئی اجازت نہیں دیتی۔ شریعت جہاں ہمیں توکل کا سبق دیتی ہے وہاں اسباب پر عمل کرنے کا بھی سبق پڑھاتی ہے کہ اسباب پر عمل کرو، لیکن توکل میری ذات پر کرو۔ اونٹ کو رسی سے بھی باندھو، پھر بھروسہ بھی اللہ پاک کی ذات پر کرو۔ اپنی طرف سے محنت، مزدوری اور نوکری کرو، لیکن توکل اللہ پاک کی ذات پر کرو۔ اگر اللہ کے نبی پاک ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو سال کا خرچہ دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت میں یہ حکم ہے کہ آدمی اپنے بیوی بچوں کے لیے خرچ کا پورا پورا انتظام کرے اور اپنی ذاتی ضروریات سے جو چیز بچ جائے اس میں سے خیرات کرے۔

اور یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ مثلاً: ایک آدمی پر قرضہ ہے اور اللہ پاک نے اس کو پیسے دے دیئے، وہ خیرات کر رہا ہے تو یہ ناجائز ہے۔ اس کے ذمے ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنا قرضہ ادا کرے، پھر اس کے بعد خیرات کرے، اس لیے کہ قرضہ حقوق العباد میں سے ہے، جو توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا، جب تک کہ قرضہ لینے والا معاف نہ کرے۔ تو قرضہ سر پر موجود ہو اور کوئی خیرات کرے تو یہ نیکی شمار نہیں ہوگی۔ اسلام نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ خرچ کرو، لیکن جو تمہارے پاس زیادہ بچے، پہلے بیوی بچوں کا اور اپنا خرچہ قرضہ ادا کرنے کے بعد زائد مال بچ جائے، اس سے خرچ کرو وغیرہ۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تو یہ عالم تھا کہ جیسے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور بھی بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے تھے کہ ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ کا معنی یہ ہے کہ جو تمہارے خرچ سے زائد بچے وہ سب خیرات کر دو۔ مثلاً: اگر تمہارے پاس کپڑوں کے دو جوڑے ہیں تو ایک پہن لو اور دوسرا خرچ کر دو، اسے رکھنے کا تمہیں حکم نہیں ہے۔ اگر تم نے کھانا کھایا ہے اور ایک روٹی بچ گئی ہے تو اسے فوراً خیرات کر دو، اسے رکھنا نہیں ہے۔ لیکن یہ ان کا اپنا اجتہاد تھا، فتویٰ اس پر نہیں ہے۔ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم، جمہور تابعین اور جمہور علماء رحمہم اللہ کا فتویٰ یہ ہے کہ انسان اللہ کے حق اور بندوں کے حق ادا کرنے کے بعد اگر جائداد رکھے تو یہ جائز ہے، کوئی منع نہیں ہے۔

اللہ پاک نے ہمیں حکم دیا کہ خرچ کرو اور کہاں کرو؟

❁.....اللہ پاک نے فرمایا کہ سب سے زیادہ حق والدین کا ہے۔ اور علماء کرام فرماتے ہیں کہ دادا دادی اور نانا نانی وغیرہ سے بھی زیادہ حق والدین کا ہے۔ اور علماء کرام فرماتے ہیں کہ دادا دادی اور نانا نانی وغیرہ سب والدین

کے ضمن میں آجاتے ہیں۔

۞......سب سے زیادہ حق والدین کا ہے اور والدین کے بعد رشتہ داروں کا حق ہے۔ اور رشتہ دار جتنا زیادہ قریبی اتنا زیادہ حق رکھتا ہے۔

۞......اور اس کے بعد یتیم تمہاری خیرات کے حق دار ہیں۔

۞......اور اس کے بعد مساکین، یعنی محتاج، لیکن ایسے محتاج جو کسی سے سوال نہیں کرتے اور ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی حاجت کو اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھتے ہیں۔

۞......اور اس کے بعد مسافر یعنی سفر میں آنے والے، چاہے سفر میں کوئی امیر ہے، لیکن پیسے گر گئے یا جیب کٹ گئی، نقصان ہو گیا تو وہ بھی تمہارے خرچ کے حق دار ہیں۔

ان باتوں کو سمجھیں کہ پہلا ذکر والدین کا، دوسرا رشتہ داروں کا، تیسرا یتیموں کا، چوتھا مساکین کا اور اس کے بعد مسافروں کا آیا ہے۔ اسی بات سے یہ مسئلہ سمجھیں کہ ایک تو اللہ پاک نے ہم پر زکوۃ فرض کی ہے کہ ہم اپنے مال میں سے سالانہ زکوۃ ادا کریں، لیکن ان آیات میں زکوۃ کا مسئلہ نہیں ہے۔ زکوۃ آدمی اپنے والدین کو نہیں دے سکتا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ زکوۃ تیرے مال کی صفائی کا ایک ذریعہ ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ کیا تم اپنے والدین کو اپنے مال کی میل کچیل کھلاؤ گے؟ اور دوسری بات فقہاء کرام نے یہ لکھی ہے کہ ''أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيْكَ'' (تم اور تمہارا مال تمہارے والد کا ہے)۔ وہ چاہیں تو تمہارا مال بقدر احتیاج لے سکتے ہیں، چہ جائے کہ تم ان کو زکوۃ دو، لہٰذا والدین کو تو تم زکوۃ نہیں دے سکتے، لیکن والدین کو اپنی خدمت کی مد سے ادائیگی کرو، زکوۃ اپنی اولاد کو بھی نہیں دے سکتے، اسی طرح نابالغ بچے کو بھی نہیں دے سکتے اور نہ ہی نابالغ بچے پر زکوۃ فرض ہے، اسی طرح خاوند اپنی بیوی کو زکوۃ نہیں دے سکتا۔ اگر خاوند محتاج ہو تو بیوی اس کو زکوۃ دے سکتی ہے، باقی رشتہ داروں کو تم زکوۃ دے سکتے ہو۔

اسی طرح ائمہ کا اختلاف ہے کہ کیا خاوند اپنی بیوی کو زکوۃ دے سکتا ہے یا بیوی اپنے خاوند کو زکوۃ دے سکتی ہے؟ لیکن اکثر اسی پر ہیں کہ اگر بیوی مالدار ہے اور شوہر غریب ہے تو بیوی دے سکتی ہے، لیکن اگر بیوی غریب خاندان سے ہے اور شوہر مالدار ہے تو وہ اپنی بیوی کو زکوۃ نہیں دے سکتا؛ اس لیے کہ بیوی کا خرچہ شوہر کے ذمہ ہے، لیکن بیوی کے ذمہ شوہر کا خرچہ نہیں ہے، اس لیے بیوی اپنے شوہر کو زکوۃ دے سکتی ہے۔ اور والدین کو زکوۃ نہیں دے سکتا، البتہ والدین اور اولاد کے علاوہ جتنے بھی رشتہ دار ہیں سب کو زکوۃ دے سکتا ہے۔

صدقہ وزکوٰۃ کی برکت سے مال بڑھتا ہے:

اس لیے علماء کرام نے فرمایا کہ ان آیات میں جو حکم ہے وہ زکوٰۃ کے علاوہ صدقاتِ نافلہ کا حکم ہے۔ اور جو خرچ ہم اللہ کے راستے میں کرتے ہیں، والدین پر خرچ کرتے ہیں، رشتہ داروں، غریبوں اور فقیروں پر یعنی کسی قسم کا خرچ بھی ہم کرتے ہیں اللہ پاک کا قرآن پاک میں وعدہ ہے: ﴿وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُۥ﴾ [السبا:۳۹] کہ جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا بدل میں دوں گا۔ اس کے بدلے کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ بدلہ دیں گے تو جیسے تم کسی بادشاہ کے پاس مثلاً: کوئی ہدیہ لے کر جاؤ تو تم ہدیہ اپنی طاقت کے بقدر لے کر جاؤ گے، بادشاہ اپنی شان کے مطابق بدلہ عطا کرے گا۔ یہ نہیں دیکھے گا کہ یہ تو ایک گلاس لے کر آیا ہے، میرے پاس بیس روپے کا، چلو بھئی! اس کو پچاس روپے دے دو۔ نہیں! بلکہ وہ اپنی شان کے مطابق بدلہ دے گا۔ اب جب اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے تو جو تم خرچ کرو گے ﴿فَهُوَ يُخْلِفُهُۥ﴾ وہ بدلہ دے گا تو وہ بدلہ بھی اپنی شان کے مطابق عطا فرمائے گا۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''مَا نَقَصَ مَالٌ مِنْ صَدَقَةٍ قَطُّ''[1] (اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیرات کرنے سے مال کبھی کم نہیں ہوتا)۔ یعنی بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہزار روپے میں سے مثلاً: سو روپے کم ہو گئے، لیکن اللہ پاک ایسی برکت عطا فرماتے ہیں کہ صدقہ کرنے والے کا مال کم نہیں ہوتا۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ پاک روزانہ دو فرشتے بھیجتے ہیں۔ جن کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ یہ دعا کرتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ! أَعْطِ كُلَّ مُنْفِقٍ خَلَفًا وَأَعْطِ لِكُلِّ مُمْسِكٍ تَلَفًا''[2] (اے اللہ! جس نے بھی تیرے راستے میں خرچ کیا اس کو اور زیادہ عطا فرما اور جس نے بخل کیا اے اللہ! اس کے مال میں ہلاکت و بربادی ڈال دے)۔

مال میں برکت کی صورتیں:

1 ...... اب بدلہ دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کبھی تو آپ نے مثلاً: ایک سو ریال خیرات کیے اور ہزار ریال مل گئے۔

2 ...... اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ نے مثلاً: ایک سو ریال خرچ کیے، جو باقی آپ کے پاس پیسے بچے اللہ پاک اس میں برکت ڈال دیتے ہیں کہ چیز تو بظاہر تھوڑی ہوتی ہے، لیکن اللہ پاک اسی تھوڑے میں برکت ڈال دیتے

[1] [مجمع الزوائد: ۳/ ۲۷۵، معجم صغیر للطبرانی: ۱/ ۵۲، ۱۰۲]
[2] [الجامع الصغیر: ۱/ ۱۱۸]

ہیں۔ جیسے ہم نے ہزار ریال میں سے سو روپے صدقہ کیے، باقی نو سو بچ گئے۔ اب بظاہر ایک سو روپے کم ہو گئے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان میں ایسی برکت ڈال دیتے ہیں کہ وہ ختم ہی نہیں ہوتے۔

۔۔۔۔۔۔اور بعض اوقات اللہ تعالیٰ صدقہ کا بدلہ یوں عطا فرماتے ہیں کہ کوئی آنے والی مصیبت یا بیماری ٹال دیتے ہیں کہ اگر ہم اس کا علاج کرواتے تو بہت سا مال لگ جاتا تو اللہ پاک اس بیماری کو ٹال دیتے ہیں۔ تو یہ بھی ایک بدلہ ہوتا ہے، لیکن بظاہر ہمیں نظر نہیں آتا، ہمیں سمجھ نہیں آتی، لیکن مولا اس کا ہمیں بدلہ دے چکا ہوتا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو تم نے کھا لیا فنا ہو گیا، جو تم نے پہن لیا وہ بوسیدہ ہو گیا اور جو تم نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر دیا وہ تمہارا اللہ تعالیٰ کے ذخیرہ میں محفوظ ہو گیا۔

۔۔۔۔۔۔اللہ پاک نے ان آیات میں سب سے پہلے فرمایا: ''فَلِلْوَالِدَيْنِ'' والدین پر خرچ کرو۔

۔۔۔۔۔۔پھر فرمایا: ''وَالْأَقْرَبِينَ''۔ رشتہ داروں کو دینے میں دو ثواب ہیں: صدقہ کا ثواب اور دوسرا صلہ رحمی کا ثواب۔

اور اس کے بعد فرمایا: ﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴾ اور جو بھی تم بھلائی کا کام کرتے ہو اللہ پاک اس کو جاننے والے ہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ تم نے کیا ہو اور اللہ پاک کو پتہ بھی نہ ہو نہیں، بلکہ ہر چیز اللہ پاک کے علم میں ہے۔ تو اللہ پاک اس کا تمہیں پورا بدلہ دیں گے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾ [البقرۃ:۲۱۶] تم پر جہاد فرض کر دیا گیا۔ ابتدائے اسلام میں خاتم الانبیاء سرکار دو جہاں ﷺ کی زندگی پر نظر ڈالیں تو آپ ﷺ کی پہلی زندگی جب آپ ﷺ نے دعوت کی ابتدا کی، لوگ اسلام لانے لگے تو ابتدائے اسلام میں صبر کا حکم تھا۔ اور صبر بھی اتنا کہ اگر کافر ایذاء اور تکالیف بھی پہنچائیں تو ان کا کچھ دفاع بھی نہیں کرنا، بلکہ برداشت کرنا ہے۔ اور یہ عالم رہا کہ آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپ ﷺ نے صبر فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شہید کیا گیا، پھانسیوں پر لٹکایا گیا اور انگاروں پر لٹایا گیا، لیکن صبر کیا۔ یہ ابتدائے اسلام کی کیفیات کا ذکر ہے۔ اور اسی صبر میں آپ ﷺ کی پوری مکی زندگی گزری ہے۔ اس لیے اگر آج بھی کوئی مصلح اور کوئی انقلابی انسان اگر کسی ملک یا کسی خطے میں، کسی قوم میں انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے تو حضور اکرم ﷺ کے منہج سے ہٹ کر اور حضور پاک ﷺ کے طریقے سے ہٹ کر کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

کسی بھی ملک پر آپ نظر ڈالیں! آپ کو مسلمانوں کے ملک تو نظر آئیں گے، لیکن آپ اس کو اسلام کا ملک یا اسلامی ملک نہیں کہہ سکتے۔ اگر کہتے ہیں تو رسمی بات ہے۔ چونکہ اس میں مسلمان رہتے ہیں، لہٰذا اسلامی ملک کہلائے

گا۔اس لفظ کا اطلاق اس زمانے میں اگر ہوسکتا ہے تو صرف سعودی عرب پر ہوسکتا ہے کہ یہاں اسلامی ملک بھی ہے اور اسلامی حکومت کا قیام بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب اور حضور اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق فیصلہ اور قضا بھی ہے اور حدود اللہ کا اجرا بھی ہے۔

داعی کی صفات:

اب حضور اکرم ﷺ کا طریقہ کیا تھا کہ سب سے پہلے تو آپ ﷺ نے دنیا کے سامنے یہ بات رکھی کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ میری دعوت اور میرا پروگرام کیا ہے؟ اور اس کے ساتھ اپنی زندگی کو بطور نمونہ پیش کیا اور فرمایا: اے مکہ والو! میں نے پوری زندگی تمہارے سامنے گزاری ہے۔ میری ولادت کے دور سے لے کر چالیس سال کی عمر تک جو عین قوت کی عمر ہے، یعنی ولادت، رضاعت، بچپن، جوانی اور سارا دور تم لوگوں کے سامنے ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے ان کو چیلنج کیا کہ اگر میں تم کو خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے تمہارا دشمن آرہا ہے جو تم پر حملہ کردے گا تو کیا تم میری بات نان لوگے؟ تو انہوں نے کہا کہ کیسے نہیں مانیں گے؟ ہمارے تجربے میں آپ سچے بھی ہیں، امانتدار بھی ہیں اور آپ تو کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ تو ہمیں کیا سبق ملا کہ جب کوئی مبلغ، واعظ، مرشد، مصلح اور لیڈر قوم کے سامنے کوئی مقصد لے کر کھڑا ہو تو سب سے پہلے اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر دکھائے کہ اس کی زندگی خود بھی اس کی دعوت کے مطابق مطابقت رکھتی ہے یا نہیں؟ یہ بنیادی بات ہے۔ آپ پورے قرآن مقدس کا مطالعہ کریں کہ اللہ پاک نے جتنے بھی انبیاء کرام بھیجے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے کر آقا خاتم الانبیاء ﷺ تک جتنے بھی انبیاء کرام تشریف لائے، جب تک داعی کی زندگی کامل نہیں ہوگی اس وقت تک دعوت بھی کامیاب نہیں ہوگی۔ اس لیے اللہ پاک نے اپنے نبیوں کو پاک بنایا کہ کوئی شخص میرے انبیاء کرام کی طرف انگلی نہ اٹھا سکے، کوئی شخص میرے نبی پر اعتراض نہ کرسکے۔ تو سب سے پہلے داعی کا خود باکردار اور باعمل ہونا ہے۔ دوسرا یہ کہ مقصد واضح ہونا چاہیے کہ تم کیا چاہتے ہو؟

جیسے ہمارے ہاں (پاکستان میں) دیکھ لو کہ ۶۹ سال ہوگئے سب کچھ آیا، لیکن نہیں آیا تو اسلام نہیں آیا! کیونکہ ایک کہتا ہے کہ نظامِ مصطفیٰ آنا چاہیے۔ دوسرا کہتا ہے کہ نظامِ مصطفیٰ نہیں، بلکہ اسلامی نظام۔ ایک کہتا ہے کہ نہیں، نظامِ اسلامی۔ چوتھا اٹھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ نہیں، بلکہ اسلامی دستور۔ ایک اور اٹھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ نہیں، یہ سارے جھوٹ بول رہے ہیں، بلکہ آئین و شریعت۔ ۶۹ سال سے یہ اپنی دعوت کا فیصلہ نہ کرسکے کہ تم کیا چاہتے ہو؟ جب تم

الفاظ کے جھنجھٹ میں پڑے ہو تو دعوت کیسے دو گے؟ اور پھر جو اسلام کا نام لیتا ہے اس کے اپنے گھر میں اسلام نہیں ہے، اس کے اپنے چھ فٹ کے بدن پر اسلام نافذ نہیں ہے۔ جب ہم اپنے چھ فٹ کے بدن پر اسلام نافذ نہیں کر سکے تو پھر ہم پورے ملک میں کیسے اسلام نافذ کر لیں گے؟

لہٰذا سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اگر کامیابی چاہتے ہو تو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دروازے پر آؤ کہ سب سے پہلے حضور پاک ﷺ اٹھے تو ابو جہل جیسا دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یعنی جو نبی کریم ﷺ کا سب سے بڑا دشمن ہے، وہ کعبہ شریف کا طواف کر رہا ہے اور ایک آدمی نے آکر پوچھا کہ ہم نے سنا ہے کہ یہاں پر اللہ کے ایک نبی مبعوث ہوئے ہیں، تمہارا ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی آدمی بات تو نہیں سن رہا۔ اس نے کہا: تم میرے دوست ہو، سچی بات پوچھتے ہو تو وہ اللہ کا سچا نبی ہے۔ اس نے کہا کہ اچھا! کیا وہ سچا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! وہ بالکل سچا ہے۔ اس نے کہا کہ تمہیں کیسے پتہ کہ وہ سچا ہے؟ اس نے کہا کہ عجیب بات کرتے ہو! اس کے ایام ولادت سے لے کر چالیس سال تک ہمارے سامنے گزرے ہیں۔ عبد اللہ کے گھر پیدا ہوا، عبد المطلب کے گھر میں تربیت لی، ابو طالب کے گھر میں جوانی گزاری اور ساری زندگی ہمارے سامنے ہے۔ جس نے کبھی کسی بندے پر جھوٹ نہیں بولا وہ خدا پر کیسے جھوٹ بول سکتا ہے؟ اس نے کہا: جب وہ سچا ہے تو کلمہ پڑھ لو!! اس نے کہا کہ یہ ہمارا خاندانی جھگڑا ہے۔ کبھی ان کا امیر بنتا ہے اور کبھی ہمارے خاندان کا امیر بنتا ہے۔ کبھی ان کا وزیر بنتا ہے اور کبھی ہمارا وزیر بنتا ہے۔ یہ ہمارا خاندانی مسئلہ ہے۔ ویسے وہ سچا ہے۔

لہٰذا سب سے پہلے داعی کی اپنی زندگی پاک ہونی چاہیے۔ دوسرا یہ کہ دعوت واضح ہونی چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''يَا أَيُّهَا النَّاسُ، قُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا'' [المستدرک علی الصحیحین للحاکم، رقم: ۳۹] فرمایا کہ میں تمہیں صرف کلمۂ توحید کی دعوت دیتا ہوں اور کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل بن جاؤ، میری رسالت کے قائل بن جاؤ، اللہ تعالیٰ کے احکامات کی فرمانبرداری کر لو، جو تمہارا خالق بھی ہے، مالک بھی ہے، رازق بھی ہے اور آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا بھی ہے۔ یہ دعوت کتنی واضح ہے!!

اور پھر حکم ہے کہ صبر کرو۔ تکلیفیں اور مشقتیں آئیں گی برداشت کرو۔ اسی لیے آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی میں اوّلاً اعلان ہے، پھر دعوت ہے اور پھر صبر ہے۔ یعنی اتنی تکالیف ہوئیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انگاروں پر لٹا دیا گیا، پھانسیوں پر لٹکایا گیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیویوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، گھسیٹا گیا، مارا گیا، ستایا گیا اور حضور

پاک ﷺ کو حرم میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا، لیکن اللہ پاک نے فرمایا کہ میرے مدنی! صبر ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الاحقاف:۳۵] (آپ بھی صبر کریں، جیسے پہلے عظمت والے رسولوں نے صبر کیا ہے)۔

مکہ سے حضور ﷺ کی ہجرت کی وجہ:

پس جب صبر والا مرحلہ گزر گیا تو حکم ملا کہ اب ہجرت کریں؛ اس لیے کہ اب مکی زندگی میں رہنے کے بعد کامیابی نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وطن نہ چھوڑیں، گھر اور اولاد نہ چھوڑیں۔ آپ ﷺ جب جانے لگے تو مکہ کے سامنے کھڑے ہو کر رونے لگے، فرمایا: ''وَاللّٰهِ! إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ وَأَحَبُّ أَرْضِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ، وَلَوْلَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ''[1] اللہ کی قسم! تو روئے زمین میں سب سے بہترین زمین ہے۔ اگر میری قوم مجھے مجبور نہ کرتی تو میں کبھی بھی تجھے چھوڑ کر نہ جاتا۔ کیونکہ سبق ملا ہے کہ اگر کسی ملک میں تم اسلام کے فرائض کو ادا نہیں کر سکتے ہو تو پھر حکم ہے کہ ہجرت۔ اگر نماز نہیں پڑھ سکتے، روزہ نہیں رکھ سکتے اور شریعت پر عمل نہیں کر سکتے تو پھر اس ملک کو چھوڑ دو۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ میری زمین بہت وسیع ہے۔ جب تم میرے لیے سب کچھ چھوڑ دو گے تو آگے میں تمہارے لیے انتظام کروں گا، لیکن ہجرت اللہ کے لیے ہو، پیسے کے لیے نہیں۔

مدنی زندگی میں جہاد کا حکم:

مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد جب جماعت بن گئی، انصار مل گئے اور طاقت مل گئی تو اللہ پاک نے حکم دیا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ [البقرۃ:۲۱۶] کہ اے میرے مدنی! اب ہم آپ کو قتال کا حکم دیتے ہیں۔ اب وہ مرحلے گزر گئے، اب آپ پختہ ہو گئے اور کھری جماعت مل گئی۔ جنہوں نے بچے بھی چھوڑ دیئے، وطن بھی چھوڑ دیا اور مکہ جیسی سرزمین بھی چھوڑ دی۔ اور آگے انصار جیسے کھرے ساتھی مل گئے، جنہوں نے اپنا سب کچھ مکے کے مہاجرین پر قربان کر دیا۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ یہ پکے اور سچے مومن ہیں: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ [الانفال:۴] کہ ان کے ایمان کی گواہی عرشِ معلیٰ سے میں دیتا ہوں۔ تو اب جہاد کا حکم ہے۔ تو اللہ پاک نے جہاد کو بھی فرض کیا۔

جہاد کا معنی اور فوائد:

جہاد کا معنی یہ ہے کہ انسان خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کفار سے جہاد کرے اور تمام

[1] [السیرۃ الحلبیۃ: ۳/ ۱۹۵، الخصائص الکبریٰ: ۲/ ۳۰۲]

شرائط کے مطابق، یعنی ایک امیر المومنین ہو، اس کی قیادت ہو اور کفار کو باقاعدہ یہ لکھا جائے کہ اگر تم اسلام قبول کرتے ہو تو ٹھیک ہے، نہیں کرتے تو جزیہ دو اور اگر جزیہ بھی نہیں دیتے تو پھر جہاد ہوگا۔ اور سیف اور جہاد میں کوئی ذاتی غرض نہ ہو کہ ہمیں اقتدار مل جائے یا ہمیں ملک مل جائے اور زمین ہمیں مل جائے۔ تو وہ اسلام کے نقطۂ نظر میں جہاد نہیں ہوتا۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے جہاد وہ ہوتا ہے جو صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہو۔ اور جب یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت آجاتی ہے۔

اور مجاہدین کا بہت بڑا درجہ ہے کہ اگر وہ زندہ رہیں تو غازی اور مر جائیں تو شہید ہیں۔ اور شہید کا اتنا بڑا مقام ہے کہ نصِ قطعی میں فرمایا کہ اسے مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، تم ان کی حیات کو سمجھ نہیں سکتے ہو۔ چونکہ وہ حیات عالمِ برزخ سے تعلق رکھتی ہے اور اس عالم کو ہم نے دیکھا ہی نہیں ہے تو اس پر تو فقط ایمان بالغیب ہی ہوگا۔ جیسے عالمِ ارواح ہم نے نہیں دیکھا، عالمِ مثال ہم نے نہیں دیکھا، عالمِ برزخ ہم نے نہیں دیکھا اور عالمِ آخرت ہم نے نہیں دیکھا تو ہمارا تو بس اتنا ہی ایمان ہوگا جتنا اللہ اور اس کے رسول کا فرمان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد اس لیے فرض کیا تھا کہ مسلمانوں کی حفاظت، مسلمانوں کی عزت اور مسلمانوں کی شوکت اسی (جہاد) کے اندر ہے۔

اب امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اَلْجِهَادُ وَاجِبٌ" جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے، چاہے وہ جہاد کرے اور غازی بنے یا بیٹھا رہے، تب بھی اس پر فرض ہے، لیکن اس بیٹھنے والے پر ضروری ہوگا کہ جب مجاہد کو مدد کی ضرورت پڑے تو اس کی مدد کرے، جب اس کو بلائے تو اس کے بلانے پر پہنچے اور اگر اس کی ضرورت نہ پڑے تو پھر گھر میں بیٹھا رہے، لیکن جہاد فرض ہے اور سب کے لیے ہے۔

صحیح حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِالْغَزْوِ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقِ الْجَاهِلِيَّةِ))[1] (جو شخص اس حال میں مر گیا کہ اس نے جہاد نہیں کیا اور نہ ہی اس کے دل میں جہاد کا خیال آیا (یعنی کبھی خیال بھی نہیں گزرا کہ میں جہاد کروں) تو وہ ایسے مرا گویا کہ وہ جاہلیت اور کفر پر مر گیا)۔

یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان اسی وجہ سے مر رہا ہے کہ اس نے جہاد کے سبق کو بھلا دیا، ورنہ جب مسلمان جہاد کا سبق یاد کر لیتا ہے تو کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ مجاہدین اسلام نے جہاد کا سبق یاد کیا تو اللہ پاک نے پھر کیسے مدد کی؟ کہ اتنی بڑی طاقت اور مقابلہ کرنے والے کون تھے؟ یہی مجاہد تھے اور جناب ...... ماشاء اللہ...... خالص مذہبی

[1] [الجامع الصغیر للالبانی: ۳/۷۵، مستدرک حاکم: ۲/۸۸، ۲۴۴۶]

لوگ۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کے نام سے اپنے پرائے سب ڈرتے ہیں کہ پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں؟ وہ جذبہ جہاد پر آئے تو اللہ پاک نے کفر کو شکست دی اور کفر کی دیواریں ٹوٹ گئیں۔ بہر حال جہاد ایسی چیز ہے کہ آدمی ہر وقت نیت رکھے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ''[1] (فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے)، لیکن جہاد قیامت تک باقی ہے، اس کی نیت جاری رکھو۔ مطلب یہ ہے کہ دل میں پکا ارادہ رکھو کہ جب ہمیں جہاد کے لیے بلایا گیا تو فوراً نکلیں گے۔

جہاد کا حکم:

جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟ تو جمہور کا مذہب یہ ہے کہ یہ فرضِ کفایہ ہے، یعنی اگر امت میں سے ایک جماعت جہاد کر رہی ہے تو باقی امت گناہگار نہیں ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں تو ہے ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ [البقرة:۲۱۶] اور دوسری آیت میں ہے ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾ [التوبة:۱۲۲] کیوں نہیں تم میں سے ایک جماعت ایسی کہ باقی اگر جہاد پر چلے جائیں تو ایک جماعت دین حاصل کرے اور دین کی سمجھ حاصل کرے۔ یعنی اگر ہر بندے پر جہاد فرض ہوتا تو اس جماعت کو نہ کہا جاتا کہ تم دین پڑھنے کے لیے رک جاؤ۔

اور اس طرح بخاری اور مسلم کی روایت میں موجود ہے کہ ایک آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا کہ حضور! آپ میرا نام جہاد میں لکھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''هَلْ مِنْ اَبَوَيْكَ حَيٌّ؟''۔ (کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟) تو اس نے کہا کہ ہاں! حضور! میرے والدین زندہ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وَجَاهِدْ فِيْهِمَا'' (جاؤ اپنے والدین کی خدمت والا جہاد کرو)۔ تو آپ ﷺ نے اس کو اجازت دے دی کہ والدین کی خدمت کرو اور جہاد پر نہ جاؤ۔ تو اس لیے علماء کرام نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص جہاد پر جانا چاہے تو والدین کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا۔ اسی طرح اگر کسی عورت کا خاوند چاہتا ہے کہ جہاد کے لیے جائے تو وہ اپنی بیوی سے بھی پوچھے (یعنی اس کے گھریلو اور ذاتی ضروریات کا انتظام کر کے جائے) گا؛ اس لیے کہ اس کے بھی حقوق کی ادائیگی کے مسائل ہیں۔

تو علماء کرام نے فرمایا کہ جہاد تو جاری ہے: ''اَلْجِهَادُ مَاضٍ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ''[2] لیکن فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین

---

[1] [الادب المفرد: ۵۷ / ۴۴۴، کنز العمال: ۶ / ۱۷۰]

[2] [سنن ابی داؤد: ۱ / ۳۴۳، کتاب الجهاد، باب الغزو مع ائمة الجور]

نہیں ہے۔

اور بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ جہاد فرضِ کفایہ اس وقت تک ہے جب تک کوئی کافر ہم پر حملہ نہ کردے۔ اگر کوئی کافر ہم پر چڑھ آئے اور نفیرِ عام ہو جائے تو ہر آدمی پر فرضِ عین ہے، پھر تو ہر مرد و عورت اور ہر بچے کو جہاد کرنا پڑے گا۔

اور جہاد ایسی نعمت ہے کہ بظاہر تو بڑی مشقت والا کام لگتا ہے، لیکن تمہیں پتہ ہے کہ تمہاری اصلی عزت اسی جہاد کے ساتھ ہے؟ جس دن تم جہاد چھوڑ دو گے تمہاری عزت ختم ہو جائے گی۔ آپ اندازہ کریں کہ مسلمانوں میں خیر القرون میں اللہ پاک نے جو اسلام کو عزت اور عظمت دی تھی وہ اس لیے تھی کہ وہ جہاد کا سبق یاد دلا رہے تھے۔ اللہ پاک نے ان کو اتنی عزت اور عظمت دے دی کہ مسلمانوں کا نام سن کر کافر کانپتا تھا۔ آج دیکھیں کہ پورے عالم میں اور پوری دنیا میں تمام کفر اکٹھا ہو رہا ہے۔ اس کو اگر خطرہ ہے تو صرف اسلام سے ہے۔ ان کو پتہ ہے کہ یہ شیر ہیں، لیکن ابھی یہ سرکس کا شیر بنا ہوا ہے۔ اس کو اپنی قوت کا پتہ نہیں ہے، لیکن جس دن مسلمان جاگ جائے گا اور اس کو پتہ چل جائے کہ اچھا میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اولاد ہوں، میں تو حضرت ابوبکر صدیق، عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی اولاد ہوں تو میں اپنے اسلاف کے کارنامے زندہ کرنے والا ہوں۔ تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ اس لیے وہ خائف ہیں، وہ سازشیں کرتے ہیں اور وہ ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں، لیکن ہم بھٹکے ہوئے ہیں اور آپس میں لڑتے ہیں، لیکن اس کے باوجود کفر ڈر رہا ہے اور کانپ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ ہمارے ماضی پر نظر ڈالتا ہے اور ہماری تاریخ پر نظر ڈالتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دریاؤں پر گھوڑے دوڑا ڈالے، یہ وہ لوگ ہیں جو ہواؤں اور طوفانوں میں بھی گزر گئے، انہوں نے تو کسی چیز کو نہیں دیکھا اور یہ تو وہ لوگ ہیں کہ اگر ان کو کوئی مظلوم لڑکی پکارے تو عرب سے سندھ تک کفر کو تہس نہس کر دیتے ہیں، لیکن ابھی یہ سوئے ہوئے ہیں، پتہ نہیں کہ کب جاگ جائیں؟ اور جب ہم خوابِ غفلت سے اٹھ جاتے ہیں تو کفر کی کوئی طاقت ہمارے سامنے کھڑی نہیں ہو سکتی۔

کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ اسلام کے نوجوانوں نے کیا کر دکھایا!؟ سرخ ریچھ (یعنی روس) کو مار کر بھگا دیا۔ اب دیکھ لو کہ شیشان میں کیا ہو رہا ہے؟ جتنا ہی اندر جاتے ہیں ان کا قبرستان بن جاتا ہے، حالانکہ لڑنے والوں کے پلے میں کچھ بھی نہیں، لیکن نعرہ تکبیر ہے، اللہ پاک کا نام ہے اور دل میں یقین ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ تم نہ ڈرا کرو، ہم نے جہاد تمہاری عظمت کے لیے لکھا ہے۔ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ؕ﴾

[البقرۃ:۲۱۶] یہ تمہارے لیے مشقت ہے۔

اور فرمایا: ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ﴾ [البقرۃ:۲۱۶] ایک چیز کو تم اپنے لیے بظاہر برا سمجھتے ہو، لیکن اس میں تمہارے لیے بھلائی ہوتی ہے۔ جیسے تمہیں پھوڑا ہو جائے تو ڈاکٹر کہتا ہے کہ اس کو کاٹو۔ بظاہر یہ کتنا برا لگتا ہے! لیکن جب وہ کاٹ دیتا ہے اور پٹی باندھ دیتا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ بڑا اچھا ہو گیا۔ اسی طرح اللہ پاک نے فرمایا کہ یہ جو جہاد ہے، اس میں ڈرا نہ کرو کہ ہم مر جائیں گے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ اسی میں تو ہم نے تیری عظمت چھپائی ہوئی ہے کہ یہ ایسا لفظ ہے جہاد کا کہ یہ لفظ سن کر کافروں کی نیندیں اڑ جاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پتہ نہیں یہ جہاد کیا بلا ہے!؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہے کہ اگر میں مر گیا تو شہید ہو جاؤں گا اور واپس آیا تو غازی کہلاؤں گا تو ایسے آدمی کو کون شکست دے سکتا ہے جو موت کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہو؟ موت کو اپنے لیے حیات سمجھتا ہو؟ اور موت کو اپنے لیے زندگی سمجھتا ہو؟ تو اس کو کون شکست دے سکتا ہے؟ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم کسی چیز کو محبوب سمجھتے ہو، لیکن وہ تمہارے لیے بری ہوتی ہے۔ تم گھر بیٹھنے کو محبوب سمجھتے ہو، دولت، پیسہ اور دنیا کو محبوب سمجھتے ہو، لیکن اسی دولت کی کثرت نے تمہیں ذلیل کر دیا ہے اور اسی مال کی کثرت نے تمہیں کمزور کر دیا ہے، انہی محلات میں رہ رہ کر تم اپنی قوت کو ختم کر چکے ہو۔ فرمایا کہ بعض اوقات ایک چیز تم اپنے لیے پسندیدہ سمجھتے ہو، لیکن وہ تمہارے لیے بری ہوتی ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝﴾ [البقرۃ:۲۱۶] (اللہ پاک جاننے والے ہیں اور تم نہیں جانتے ہو)۔ جب اللہ پاک نے جہاد کا حکم دیا ہے تو تمہاری بہتری اور تمہاری بھلائی اسی کے اندر مضمر ہے۔

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ كَبِیْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى یَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِیْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝﴾ [البقرۃ:۲۱۷،۲۱۸]

''وہ آپ سے حرمت والے مہینہ میں لڑائی کرنے کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے: اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اللہ کا انکار اور مسجد حرام سے (روکنا) اور مسجد حرام کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہیں اور لوگوں کو دین سے پھیرنا قتل سے بڑھ کر ہے۔ اور یہ تم سے جنگ کرنے میں ہی لگے رہیں گے، حتیٰ کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کا بس چلے۔ تو تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھرے گا اور پھر کفر مرے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور وہ دوزخ میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا یہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

ربطِ آیات:

ماقبل آیات میں جہاد کا حکم دیا تھا، اب یہاں چند مہینوں میں جہاد کی ممانعت کا ذکر ہے کہ ان مہینوں میں جہاد نہ کرنا۔ اللہ پاک نے چار مہینے ایسے رکھے ہیں جن میں قتال بند ہے۔ وہ چار مہینے ''اشہرِ حرم'' کہلاتے ہیں۔ ﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ان اشہرِ حرم میں قتال کرنا کیسا ہے؟ وہ چار مہینے جن میں قتال کرنا منع ہے تین تو مسلسل ہیں ایک جدا ہے۔ وہ یہ ہیں: ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب۔

حرام کے دو معنیٰ:

ان چار مہینوں میں قتال منع ہے۔ یہ چار مہینے اللہ تعالیٰ نے حرمت والے بنائے ہیں، یعنی عزت اور عظمت والے۔ جیسے حرم کو حرم کہتے ہیں۔ اب جو حرم ہے مادہ تو وہی حرم والا ہے جیسے اِحْرَام، حَرَمْ، حُرِمَ، مُحْرِم، مُحْرَم۔ سب کا مادہ ایک ہے، ان سب کا مادہ وہی ہے، یعنی حرام۔

مطلب یہ ہے کہ حرام دو وجہ سے ہوتا ہے: یا تو حرام ہوتا ہے خست و دناءت کی وجہ سے، جیسے خنزیر حرام ہے۔ یا عظمت کی وجہ سے حرام ہے، جیسے انسان کا گوشت عظمت کی وجہ سے حرام ہے۔ اب خنزیر بھی حرام ہے، لیکن دونوں کی حرمت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جیسے احرام کو احرام کہتے ہیں کہ جو چیز تیرے حلال تھی وہ ہمارے لیے حرام ہو گئی، اس لیے اس کو ''احرام'' کہا گیا۔ اور ''حرم'' کو بھی اس لیے حرم کہا گیا کہ جو چیزیں حرم کے باہر جائز

ہیں وہ حرم میں جائز نہیں ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے جہاد پر کفار کے اعتراض:

اشہرِ حرم میں ابتدائے اسلام میں اور زمانہ جاہلیت میں حضور اکرم ﷺ کے تشریف لانے سے قبل جو لوگ تھے وہ بھی ان مہینوں میں قتال نہیں کرتے تھے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ نبی پاک ﷺ کے صحابہ کرام کی کافروں سے لڑائی ہوگئی۔ صحابہ کرام نے یہ سمجھا کہ آج جمادی الثانی کی تیس تاریخ ہے، حالانکہ وہ رجب کی پہلی تاریخ تھی، اس لیے کافروں سے لڑائی ہوگئی، لیکن حقیقت میں وہ رجب کی پہلی تاریخ تھی۔ اب کافروں کو موقع ملا اسلام پر اعتراض کرنے اور مسلمانوں کو طعنہ دینے کا کہ دیکھو! یہ کیسے مسلمان ہیں جو اشہرِ حرم میں بھی قتال کرتے ہیں؟ حالانکہ ان مہینوں میں قتال بند ہے۔ اصل جواب تو یہ تھا کہ مسلمانوں نے یہ غلطی عمداً نہیں کی تھی۔ انہوں نے تو جمادی الثانی کی آخری تاریخ سمجھی تھی تو اگر انسان بھول جائے تو اللہ پاک معاف فرما دیتے ہیں اور خاص طور پر چاند کے معاملے میں تو عام طور پر انسان سے غلطیاں ہو جاتی ہیں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مدار چاند پر رکھا ہوا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کئی دفعہ عید میں جھگڑا ہو جاتا ہے اور یہ کوئی بڑے اختلاف نہیں ہیں۔

آیت کا شانِ نزول...... پہلا واقعہ:

تفسیر ابن کثیر میں واقعہ اس طرح سے لکھا ہے کہ حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے ایک جماعت بھیجی اور ان پر امیر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو بنا کر بھیجا۔ اس کے بعد وہ ابھی اس مقام پر نہیں پہنچے تھے کہ حضور اکرم ﷺ نے ان کو روکا اور آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو دوسرا امیر مقرر کر کے بھیجا اور ان کو لکھ کر حکم نامہ بنا کر دیا کہ یہ بھی حکم دیا کہ میرے اس خط کو نہ پڑھنا جب تک کہ فلاں مقام پر نہ پہنچ جاؤ۔ جب انہوں نے وہاں جا کر پڑھا اور ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ اپنے ساتھیوں کو مجبور نہ کرنا کہ سب میرے ساتھ چلو۔ جو جائے خوشی کے ساتھ جانا، اگر کوئی مجبور ہے تو اس کو مجبوری کے ساتھ مت لے جانا۔ جب انہوں نے جا کر خط پڑھا تو بہرحال انہوں نے ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھا اور یہ کہا: ''سَمْعًا وَّطَاعَةً لِّلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ'' اللہ اور اس کے رسول کا جو حکم ہے ہم نے اس کی تعمیل کرنی ہے۔ اور اس کے بعد انہوں نے اپنی جماعت

کو خبر دی اور ان کے سامنے حضور پاک ﷺ کا فرمان پڑھا تو دو آدمی تو واپس آ گئے اور باقی جو تھے وہ ان کے ساتھ رہ گئے۔ پس وہ ابن الحضرمی کو ملے تو اس کو قتل کر دیا۔

اصل میں خط اس کے بارے میں تھا۔ اس شخص نے جو عمل کیا تھا اس کا پتہ صرف حضور اکرم ﷺ کو ہی تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پتہ نہیں تھا۔ جب انہوں نے اس کو قتل کر دیا اور ان کو یہ بھی نہ پتہ چل سکا کہ یہ رجب کا پہلا دن ہے یا جمادی الثانی کا آخری دن ہے۔ اصل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سمجھا کہ یہ جمادی الاخریٰ کا آخری دن ہے اور وہ رجب کا پہلا دن تھا۔ تو اب مشرکین کو اعتراض کرنے کا موقع ملا کہ دیکھو! تم اسلام اور دین کا دعویٰ کرتے ہو اور تم نے تو اشہرِ حرم میں قتل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیات نازل فرمائیں۔

شانِ نزول کا دوسرا واقعہ:

حضور پاک ﷺ نے ایک جماعت بھیجی، اس میں سات آدمی تھے اور ان کے امیر حضرت عبداللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہ تھے، اس میں حضرت عمار بن یاسر، حضرت ابوحذیفہ، حضرت عتبہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عتبہ بن غزوان السلمی، حضرت عامر بن فہیرہ، حضرت واقد بن عبداللہ الیربوعی رضی اللہ عنہم، یہ سب حضرات ساتھ تھے۔ حضور پاک ﷺ نے ابن جحش رضی اللہ عنہ...... جو امیر تھے...... کو خط لکھ کر دیا اور فرمایا کہ جب تک تم بطنِ نخلہ نہ پہنچ جاؤ اس وقت تک تم اس خط کو نہ پڑھنا۔ جب وہاں اترے تو اس کے بعد حکم ملا کہ تم بطنِ نخلہ میں جاؤ اور ساتھیوں سے کہا کہ مجھے حضور پاک ﷺ کا حکم ہے اور یہ بڑی خطرناک مہم ہے جس پر ہم جا رہے ہیں۔ پس جو میرے ساتھ جانا چاہے اور جو وصیت کرنا چاہے کرے کہ پتہ نہیں کہ ہم زندہ واپس لوٹیں گے یا نہیں۔ تو جو واپس جانا چاہے اسے اجازت ہے، وہ واپس جا سکتا ہے، لیکن میں تو جاؤں گا؛ اس لیے کہ حضور پاک ﷺ کا حکم ہے۔ دو صحابی پیچھے رہے: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔ اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ بھی اس لیے پیچھے رہ گئے، کیونکہ ان کی اونٹنی گم ہو گئی تھی، اس کو تلاش کرتے کرتے ان کو دیر ہو گئی۔ تو باقی جو اصحاب تھے وہ پہنچ گئے۔ جب وہاں پر پہنچے تو وہاں جا کر عمرو کو قتل کیا۔ اس کو حضرت واقد بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔ بہر حال یہ پہلی لڑائی اور پہلا سریہ تھا جو حضور اکرم ﷺ نے بھیجا تھا۔ اس میں...... الحمد للہ!...... اللہ پاک نے مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی۔ کافر قتل ہوئے، مالِ غنیمت ملا اور یہ سب کچھ لے کر وہ واپس مدینہ منورہ آ گئے۔ تو اب مشرکین نے سوچا کہ ہمارے جو دو قیدی ہیں ان کو ہم مسلمانوں کو فدیہ دے کر چھڑا لیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے ساتھ میں یہ اعتراض بھی کیا کہ حضور پاک ﷺ تو کہتے ہیں

کہ میں اللہ پاک کے حکم کا تابع ہوں اور اشہر حرم میں تو اللہ پاک نے قتال بند کیا ہوا ہے، لیکن انہوں نے اشہر حرم میں قتال کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیات مبارکہ نازل فرمائیں۔

اللہ پاک نے ایک تو یہ جواب دیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے غلطی ہوئی، ہم نے معاف کر دی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ بدبختو! تم جو یہ اعتراض کرتے ہو کہ مسلمان اشہر حرم میں قتال کرتے ہیں تو اشہر حرم میں قتال کرنا زیادہ جرم ہے یا اللہ تعالیٰ کی مسجد حرام میں بت خانہ بنانا زیادہ جرم ہے؟ یا جو مسلمانوں نے غلطی کی وہ بڑا ظلم ہے؟ تم کعبہ میں ظلم کرو یہ زیادہ ظلم نہیں ہے اور جو ان سے باہر غلطی ہو جائے وہ بڑا ظلم کیسے ہو سکتا ہے؟

کیا اشہر حرم میں جہاد ہمیشہ کے لیے حرام ہے؟

اب مسئلہ یہ ہے کہ اشہر حرم میں قتال ہمیشہ کے لیے منع ہے یا نہیں؟ بعض علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ اشہر حرم میں قتال ہمیشہ کے لیے منع ہے، یعنی کبھی بھی قتال نہیں کیا جائے گا۔ اور جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم پہلے تو تھا، لیکن جب اللہ پاک نے حکم دیا: ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ [التوبۃ: ۵] (کافروں اور مشرکوں کو قتل کرو جہاں بھی اور جب بھی تم ان کو پاؤ)۔ اس میں حکم مکان اور زمان سب کے لیے آ گیا تو لہٰذا پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اب چاہے وہ چار مہینے بھی ہوں تو قتل کرنا، لڑائی کرنا سب کچھ جائز ہو گیا۔ اسی طرح بعض علماء کرام نے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ذی القعدہ میں طائف کا محاصرہ کیا تھا، لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ قتال کے منع کا حکم منسوخ ہو گیا اور قتال جائز ہو گیا۔

لیکن بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ حکم تا حال ابھی باقی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک کے لفظوں میں یہ بات ملتی ہے ﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ اللہ پاک نے جب سے آسمان و زمین کو پیدا فرمایا ہے، بارہ مہینے بنا دیئے۔ محرم سے ابتدا ہو گئی اور ذی الحج پر ان کی انتہا ہو گی۔ اور اسی آیت میں ہے: ﴿مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ﴾ [البقرۃ: ۳۶] ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرم والے ہیں۔ تو بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر بھی حضور پاک ﷺ نے اشہر حرم کی حرمت کو برقرار رکھا۔ اور پھر اسی آیت میں ہے جو نظامِ عالم اور نظامِ کل پر دلالت کر رہی ہے کہ بارہ مہینے اور ان میں چار حرمت والے مہینے ہیں۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ ان چار مہینوں کا حکم اب بھی یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں جہاد قتال وغیرہ بند ہے۔ وہ کہتے

ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے طائف کا جو محاصرہ کیا تھا وہ ذی القعدہ میں نہیں کیا تھا، بلکہ شوال میں کیا تھا اور شوال تو اشہر حرم میں شامل ہی نہیں ہے۔

البتہ ایک مشکل ہے کہ اگر ان چار مہینوں میں کوئی کافر ہم پر چڑھ آئے تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اشہر حرم ہیں، بلکہ اس وقت تو ہماری طرف سے دفاع ہوگا۔ پھر ہم مہینے نہیں دیکھیں گے، بلکہ ہمیں اجازت ہے کہ ہم اپنا بھرپور دفاع کرنے کے لیے لڑائی کریں۔

بہر حال جمہور کا مذہب یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ اب اللہ پاک نے اجازت دے دی ہے کہ مسلمان ہر مہینے میں جہاد کر سکتے ہیں۔

مسئلہ ارتداد:

ارتداد کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان ہونے کے بعد کافر ہو جائے، یعنی اسلام سے نکل جائے، اس کو "مرتد" کہتے ہیں۔ مرتد کی سزا یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ"[1] جو شخص مسلمان ہونے کے بعد کافر ہو جائے تو اسے قتل کر دو۔ لہٰذا مرتد کی سزا قتل ہے۔

مرتد مسلمان ہونے کے بعد حج دوبارہ کرے:

مسئلہ: ایک آدمی مسلمان تھا، اس نے حج کیا، نمازیں پڑھیں، روزے رکھے اور سب کچھ کیا، پھر مرتد ہو گیا۔ اب مرتد ہونے کے بعد پھر مسلمان ہو گیا تو اب اس کا پہلا حج باقی ہے یا نہیں؟ اس پر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہیں، اب وہ دوبارہ حج کرے گا، اس کا پہلا حج برباد ہو گیا؛ اس لیے کہ قرآن کہتا ہے: ﴿فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ [البقرۃ: ۲۱۷] کہ ہم اس کے اعمال دنیا اور آخرت میں برباد کر دیتے ہیں، لہٰذا وہ حج بھی دوبارہ کرے اور اپنے فرائض دوبارہ ادا کرے، اس کے پہلے والے اعمال کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے دو قول ہیں: ایک قول میں امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کو دوبارہ کرنا چاہیے۔ اور دوسرے قول کے مطابق فرماتے ہیں کہ اس کا وہی پہلا حج کافی ہو جائے گا۔

مسئلہ: ایک آدمی کافر ہے اور کفر کی حالت میں اس نے خیراتیں کیں، مدرسے بنوائے، مسجدیں بنوائیں اور

---

[1] [سنن النسائی: ۴۰۶۰، ۴۰۶۵، ۴۰۶۹، حاکم: ۶/ ۳۲۲]

بڑے بڑے کام کیے۔اب مسلمان ہو گیا تو اس کے پہلے جو اعمال ہیں اللہ پاک اس کے تمام اعمال قبول فرمالیں گے اور سب کا اس کو ثواب عطا فرمادیں گے۔

اگر کوئی مرتد ہو جائے اور ارتداد کی حالت میں اس کو موت آجائے تو ﴿فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾[البقرۃ:۲۱۷] اس کے اعمال برباد ہو گئے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں کیسے برباد ہو گئے؟ کہ اگر دنیا میں مثلاً بیوی مسلمان ہے تو اس کا نکاح نہیں رہا؛ اس لیے کہ وہ مرتد اور کافر ہو گیا تو اس کا نکاح ختم ہو گیا۔ اور نہ مسلمان اس کا وارث بنے گا اور نہ یہ مسلمان کا وارث بنے گا۔ دنیا میں بھی اس کے اعمال برباد ہو گئے اور آخرت میں بھی اس کے سابقہ اعمال کی بھی کوئی جزا نہیں ملے گی، بلکہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾[البقرۃ:۲۱۸]

اصل میں اس آیت کی وجہ وہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی غلطی تھی کہ انہوں نے تیس تاریخ سمجھی تھی، جبکہ وہ رجب کی پہلی تاریخ تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرائے ہوئے تھے کہ ایک جواب تو آ گیا کہ اے ظالمو! تم جو اشہر حرم والا اعتراض کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی مسجد سے روکنا، اللہ والوں کو مسجد حرام سے نکالنا اور مسلمانوں سے جنگ لڑنی تو سب سے بڑا جرم ہے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرائے ہوئے تھے کہ دشمن کو جواب تو مل گیا، لیکن ہماری غلطی کے بارے میں کوئی وضاحت نہ آئی کہ ہمارا کیا ہوگا؟ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ﴾ (جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے ہجرت کی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ راستے میں جہاد کیا وہی لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہیں)۔ ﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (اللہ تعالیٰ بخشنے والے مہربان ہیں)۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ اگر تم سے ایک دن کی تاریخ میں جو غلطی واقع ہوئی ہے تو تم ایمان والے ہو، مہاجر ہو اور تم جہاد کرنے والے ہو تم میری رحمت کے امیدوار ہو اور میں غفور و رحیم ہوں، تم کیوں فکر کرتے ہو؟ میں نے تو تم کو معاف کر دیا۔ تو ان آیات مبارکہ میں گویا ان کی اس بات کا بھی اللہ تعالیٰ نے جواب عطا فرما دیا، تاکہ مسلمان بھی اس میں مطمئن ہو جائیں۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰي ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۲۱۹،۲۲۰]

''اور وہ آپ سے شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں۔فرما دیجیے: ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں۔اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔اور آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کرے؟ فرما دیجیے: جو ضرورت سے زائد ہو۔اسی طرح سے اللہ تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے، تاکہ تم فکر کرو دنیا اور آخرت کی باتوں میں۔اور آپ ﷺ سے یتیموں کا حکم پوچھتے ہیں۔فرما دیجیے: ان کے کام کا سنوارنا بہتر ہے۔اگر تم ان کا خرچ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔اور خرابی کرنے والے اور سنوارنے والے کو اللہ جانتا ہے۔اور اگر اللہ چاہتا تو تم پر مشکل ڈال دیتا۔اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔''

شراب اور جوئے کی حرمت:

ان آیات میں اللہ پاک نے خمر (شراب) اور جوا کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔اس کے بعد پھر وہی سوال جو پیچھے گزرا کہ ہم کیا خرچ کریں؟ اس کا جواب بھی اسی آیت مبارکہ میں اللہ پاک نے ذکر فرما دیا۔اور یتامیٰ کی ہمدردی کے بارے میں بھی ارشاد ہے۔ان تمام احکامات پر آیت مبارکہ مشتمل ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور پاک ﷺ سے جو سوالات پوچھے، ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ شراب اور جوئے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ کی شریعت کو اللہ تعالیٰ نے اتنا کامل اور مکمل بنا دیا ہے کہ قیامت تک کے لیے جتنی ضرورتیں ہمیں پیش آ چکی ہیں یا آئندہ آئیں گی، ان کا حل بھی اللہ پاک نے اپنے قرآن اور اپنے دین میں رکھ دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ عالمِ انسانیت کے جتنے بھی ملک ہیں ان کے قوانین پر نظر ڈالیں تو اگر آپ منصف مزاج ہیں، کسی تعصب کا شکار نہیں ہوئے تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ اسلام سے زیادہ جامع دین کوئی نہیں آیا ہے اور نہ ہی آئے گا۔

مثلاً: یہی آیت مبارکہ ہے کہ جس میں اللہ پاک نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ اب اسی کو دیکھ لیں کہ وہ ملک جنہوں نے شراب پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی اور جن کے ہاں شراب ایک عام مشروب اور ایک عام چیز ہے، جن کے معاشرے میں اس کا پینا اور استعمال کرنا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا اور وہ اس پر بڑا فخر کرتے ہیں، وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں اور ان کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے کہ شراب بری چیز ہے، یہ نہیں پینی چاہیے۔ وہ بھی مجبور ہو گئے۔ اب آپ کافر کے ملکوں میں جائیں تو آپ کو قدم قدم پر بورڈ لگے نظر آئیں گے، جن کے ذریعے وہ آپ کو اس کے نقصانات بتائیں گے کہ یہ بڑی خطرناک چیز ہے!! اس سے بچیں!

زمانہ جاہلیت میں شراب ایک عام مشروب اور ایک عام چیز سمجھی جاتی تھی۔ اس کے پینے اور اس کے استعمال کرنے کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور ظاہری طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جوئے اور شراب میں کچھ فائدہ اور نفع بھی معلوم ہوتا تھا۔ مثلاً: شراب پینے سے طاقت آ گئی اور کچھ گرمی آ گئی اور پینے کے بعد کچھ سرور اور نشہ آ گیا اور پریشانی بھول گئے۔ اور جوا کھیلنے سے بعض اوقات وہ جیت جاتے تھے اور بغیر مشقت و تکلیف کے کچھ پیسہ آ جاتا تھا۔ کچھ ایسی چیزیں تھی جو انہیں بظاہر فائدہ مند نظر آتی تھیں، لیکن جو عقل سلیم اور قلب سلیم رکھتے تھے ان کو بہر حال یہ ناگوار گزرتی تھی۔ پس وہ کافر ہونے کے باوجود شراب نہیں پیتے تھے، کافر ہونے کے باوجود وہ زنا نہیں کرتے تھے اور کافر ہونے کے باوجود وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔

لیکن جو شراب اور جوئے میں پڑے ہوئے تھے، وہ اتنے عرصے سے سمجھتے تھے کہ اس میں ہمارا فائدہ ہے، ہمارے لیے قوت ہے، طاقت ہے، ہمیں چستی آ جاتی ہے، کھانا ہضم ہو جاتا ہے، ہمیں نیند صحیح آ جاتی ہے۔ جوئے میں بیٹھے بیٹھے اتنا پیسہ مل جاتا ہے کہ ہم مہینے میں اتنا پیسہ نہیں کما سکتے، لیکن اللہ پاک نے فرمایا کہ اس میں فائدے تو ہیں جو تم نے سوچے ہوئے ہیں، لیکن فائدے سے نقصان والا پہلو بھی غور کریں کہ وہ تو اس سے بھی زیادہ ہیں۔ تم صرف منافع پر نظر رکھ رہے ہو، لیکن مضرت پر نظر نہیں رکھ رہے۔ تو اسلام نے ایک ایسی بات کی جو اس کے دماغ میں اتر جائے۔

اسلام نے سب سے پہلا حکم دیا کہ شراب میں تمہیں کچھ فوائد نظر آتے ہیں، لیکن اس کے مضرات اس سے زیادہ ہے۔ کچھ لوگوں نے تو اسی آیت کے آنے کے بعد شراب چھوڑ دی کہ جب گناہ بڑا ہے تو کیا فائدہ ہے؟ کہ چھوٹے سے فائدے کے لیے گناہ سامنے رکھیں۔ ایک دفعہ اتفاق ایسا ہوا کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک دعوت کی اور اس میں ان کے دوست تشریف فرما تھے۔ دوستوں نے بیٹھ کر شراب پی۔ جب نماز کا وقت آ گیا تو انہوں

نے کہا کہ نماز پڑھاؤ۔ سب نے ایک کو امام بنایا۔ وہ جب مصلے پر کھڑے ہوئے تو سورۃ الکافرون پڑھی تو ﴿لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ﴾ [الکافرون: ۲] کی بجائے ﴿أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ﴾ پڑھا، ''لَآ'' بھول گئے، اسی حالت میں نماز پڑھادی۔ امام بھی نشہ والا اور مقتدی بھی۔ اب حالت ایسی ہوگئی کہ امام نشے میں اور مقتدی بھی نشے میں۔ اب غلطی کون نکالے؟ نماز اسی حالت میں پڑھی تو دوسرا حکم آ گیا۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ [النساء: ۴۳] اس حال میں نماز نہ پڑھو جب تم نشہ میں ہو۔ اب یہ دوسری آیت نازل ہوگئی کہ نشہ کی حالت میں عقل کرو، اللہ کا کلام پڑھ رہے ہو۔ اور پھر آدمی نشہ میں تو پتہ نہیں لگتا کہ ہاں کہہ رہا یا نہ کہہ رہا ہے، زبر کی زیر کہہ رہا ہے۔ عقل تو نہیں ہے۔ اس لیے ایسی حالت میں نماز نہ پڑھا کرو۔ اب کچھ لوگ اس آیت کی وجہ سے رک گئے کہ چھوڑو کہ جب نماز جیسی عبادت اس بلا کی وجہ سے صحیح نہیں ہوسکتی تو اس کے استعمال کی کیا ضرورت ہے؟

حرمتِ شراب پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آراء:

لیکن کچھ لوگوں نے کہا کہ حکم یہ ہے کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ ٹھیک ہے، ہم نماز کے وقت نہیں پئیں گے، عشا کے بعد پی کر سو جائیں گے، صبح نماز کے وقت نشہ اتر جائے گا۔ لہٰذا وہ پیتے رہے۔ اب دو مقامات آگئے: کچھ لوگ تو پہلی آیت پر رک گئے، کچھ لوگ دوسری آیت کے وقت رک گئے اور کچھ لوگ ابھی اسی حال پر باقی رہے۔

نشہ کی حالت کا ایک واقعہ:

اب ایک صحابی نے دعوت کی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس میں اکٹھے ہوئے۔ جب نشہ کیا گیا تو ایک انصاری آدمی نے ایک اونٹ کی ہڈی پڑی تھی، اٹھا کر ایک صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سر پر ماردی اور وہ زخمی ہوگئے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا تو اس نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ یہ بھی نشہ میں تھا اور وہ بھی نشہ میں تھا۔ جان بوجھ کر تو نہیں مارا ہے، نشہ کی حالت میں بات بڑھ گئی۔ تو اس نے شراب کی حالت میں...... جس سے انسان کو عقل و شعور باقی نہیں رہتا اسی حالت میں...... حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو مارا۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اونٹنی کاٹنے کا واقعہ:

آپ دیکھیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دو اونٹنیاں پالی ہوئی تھیں اور میرا ارادہ تھا کہ ان اونٹوں پر

میں لکڑیاں لاؤں گا اور بازار میں بیچوں گا اور فاطمہ الزہراہ رضی اللہ عنہا کی شادی میں خرچ کروں گا، لیکن میں نے اپنی دونوں اونٹنیاں بٹھائیں اور اپنے گھر کی طرف چلا گیا، تاکہ میں رسے وغیرہ لے آؤں، تاکہ جنگل سے لکڑیاں باندھ کر لے آؤں۔ حضرت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں، وہ بیٹھے شراب پی رہے تھے، محفل جمی ہوئی تھی اور ایک لڑکی گا رہی تھی۔ تو اس نے گاتے گاتے کہہ دیا کہ پہلے زمانے میں جو سردار ہوتے تھے وہ اپنے دوستوں کو اونٹنیوں کی زبان کاٹ کر کباب بنا کر کھلاتے تھے...... چونکہ اونٹ کا گوشت عرب میں بڑا مرغوب ہے۔ عرب لوگوں کو اونٹ کے گوشت سے بڑی محبت ہے۔ خاص طور پر چھوٹا اونٹ اور پھر اس کی کوہان کا گوشت ہو تو لازمی بات ہے کہ وہ نرم ہوتا ہے اور پھر اس کے کباب بنے ہوئے ہوں...... تو اس لڑکی نے گانے میں ترنگ میں آکر ایک شعر کہہ دیا تو سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ چونکہ نشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ اٹھے اور جا کر تلوار سے اونٹنیوں کی کوہان کاٹ لائے۔ یہ اونٹنیاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تھیں، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اونٹنیوں کی کوہان کاٹ کر حکم دیا کہ سب کو کباب بنا کر کھلاؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب واپس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ اونٹنیاں ذبح ہو چکی ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ذبح کی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رونے لگ گئے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا ہوا؟ فرمایا: کمال ہے! نشہ میں میری اونٹنیاں ذبح کر ڈالیں اور اس کے کباب بن رہے ہیں اور ان کو پکا کر لوگوں کو کھلا رہے ہیں اور میں تو لٹ گیا۔ آپ مہربانی فرمائیں کہ مجھے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے اونٹنیاں لے کر دیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم چلے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے اور صحابہ بھی ساتھ تھے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اسی طرح نشہ کی حالت میں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور حمزہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: حمزہ! ''مَا ذَا فَعَلْتَ؟'' تم نے یہ کیا کیا؟ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نشہ کی حالت میں تھے تو سر اٹھا کر کہنے لگے: ''هَلْ أَنتُمْ إِلَّا عَبِيْدُ آبَائِيْ'' اچھا! تم تو میرے باپ کے نوکر اور غلام تھے۔ اب آ گئے ہو ہمارے اوپر رعب ڈالنے کے لیے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس مڑ گئے کہ وہ عقل میں ہی نہیں ہے، اس سے کیا بحث کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی! واپس آ جاؤ اور تمہاری اونٹنیاں میں ادا کروں گا۔ میں اپنے چچا کو کیا کہوں؟

یہ بات اس زمانے کی ہے جب شراب حرام نہیں تھی تو کوئی آدمی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض نہیں کر سکتا۔

حرمتِ شراب کا واضح حکم:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی: ''اَللّٰهُمَّ! بَيِّنْ لَنَا بَيَانًا شَافِيًا'' اے اللہ! شراب کے بارے میں واضح فیصلہ فرما

دیجیے۔ اور امیر المومنین نے بھی اسی طرح دعا فرمائی ''اَللّٰھُمَّ! بَیِّنْ لَنَا بَیَانًا وَاضِحًا شَافِیًا'' اے اللہ! شراب کے بارے میں مہربانی فرما اور ہمارے لیے واضح حکم عطا فرما۔ تو اللہ پاک نے تیسری آیت نازل فرمائی: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝﴾ [المائدۃ:۹۰] (اے ایمان والو! شراب، جوا، بت اور وہ تیر جو تم بتوں پر جا کر ڈالتے ہو یہ سب نجس ہیں، یہ شیطانی عمل ہیں۔ ان سے بچ جاؤ، ہٹ جاؤ اور ان کو چھوڑ دو)۔

حرمتِ شراب کے اعلان پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تاثرات:

اب جب حکم آیا تو بات واضح ہوگئی کہ شراب حرام ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا: ''مُنَادِیٌ یُّنَادِیْ فِیْ سِکَکِ الْمَدِیْنَۃِ'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ مدینہ کی گلیوں میں آواز اور ندا لگاؤ کہ اللہ پاک نے شراب حرام کردی۔ تو جب شراب کی حرمت کا حکم آیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بارش میں ندیاں بہتی ہیں، ایسے شراب مدینہ کی گلیوں میں بہہ رہی تھی۔ اور کئی دن تک اس کے پانی کے اثرات گلیوں میں باقی رہے۔ اگر کسی کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ تھا تو وہیں پھینک دیا، بس اب حکم آگیا، آج کے بعد شراب نہیں۔ تو اللہ پاک نے ایک تدریجی حکم نازل کیا؛ اس لیے کہ ایک عادت کو ایک دم بدلنا مشکل تھا۔ تو جب حکم آیا تو شراب ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی اور قیامت تک کے لیے حرام ہے۔

شراب کا نام بدل کر پینے والی قوم کا حال:

شراب کا معنی نشہ دینے والی چیز ہے، چاہے قلیل ہو یا کثیر ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمادی۔ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ اللہ پاک کے قرآن میں بہانے بنائیں گے، تاویلات کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت پر ایک وقت آئے گا کہ وہ ریشم کو حلال بنالیں گے اور لوگ شراب کے نام بدل ڈالیں گے اور کہیں گے کہ یہ حلال ہے۔ یعنی کہیں گے کہ جو حرام ہے وہ تو خمر ہے اور خمر اس کو کہتے ہیں جو انگوروں سے نچوڑا جائے اور خمر کہتے ہیں کہ ''مَا خَامَرَ الْعَقْلَ'' جو عقل کو اپنے راستے سے ہٹا دے۔ ہم تو جناب! انگوروں کی بجائے گڑ سے بناتے ہیں، ہم تو گندم سے بناتے ہیں اور ہم تو سیب سے بناتے ہیں۔ ہم انگور سے تو نہیں بناتے۔ اور حرام تو وہ تھا جو انگور سے بنایا جاتا تھا اور جو خمر کہلاتا تھا۔ اور ہم جو بناتے ہیں یہ

تو بیئر کہلاتا ہے، وسکی کہلاتا ہے۔ اس کے تو نام علیحدہ ہیں، یہ تو شراب نہیں ہے۔ تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ میری امت پر ایک وقت آئے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حرام کو حلال بہانے بنا کر بنائیں گے، لیکن فرمایا: یاد رکھو! اور مسئلہ سمجھ لو! ''کُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ'' ہر وہ چیز جو نشہ آور ہو...... چاہے وہ انگور سے پیدا ہو یا گڑ سے پیدا ہو، چاہے وہ گندم سے پیدا ہو چاہے، وہ سیب سے پیدا ہو یا کھجور سے پیدا ہو، کسی بھی چیز سے پیدا ہو جب مسکر ہو جائے، یعنی نشہ آور ہو جائے...... تو وہ حرام ہو جائے گی۔ ''قَلِیْلُہٗ وَ کَثِیْرُہٗ حَرَامٌ''۔

شراب تھوڑی بھی حرام...... زیادہ بھی حرام:

میرے آقا ﷺ نے وضاحت فرمادی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کہے کہ جناب! میں نے شراب بنائی ہے، لیکن ہم نے تو بڑی لائٹ چیز بنائی ہے۔ اگر دو گلاس پی لی جائے تو نشہ آتا ہے، اگر تھوڑی سی پی لی جائے تو نشہ نہیں آتا۔ اور ایسی شرابیں بھی عورتوں کے لیے علیحدہ ہے اور مردوں کے لیے علیحدہ ہیں۔ پھر شرابوں کی اپنی اپنی حیثیتیں ہیں اور اس میں اتنی طاقت ہے اور اس میں اتنی طاقت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، نشہ تو نہیں ہو رہا۔ جب نشہ کی حد تک پہنچے گا تو حرام ہوگا، لہٰذا معمولی سا سرور تو جائز ہے۔ ہم تو شراب پئیں گے جس میں سرور آئے اور نشہ نہ آئے۔ لیکن حضور اکرم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے سارے دروازے بند کر دیئے۔ ایک تو قاعدہ یہ فرمایا: ''کُلُّ مُسْکِرٍ حَرَامٌ'' (ہر نشہ آور چیز حرام ہے)۔ اور فرمایا: ''قَلِیْلُہٗ وَ کَثِیْرُہٗ حَرَامٌ'' (تھوڑی بھی حرام اور اس سے زیادہ مقدار بھی حرام ہے)۔ اگر دو پیالے حرام ہیں تو ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی پیشاب کا گلاس بھر کر پئے تو حرام ہو اور دو قطرے حلال ہوں، چونکہ تھوڑا ہے۔ جب وہاں تھوڑے اور زیادہ کا فرق نہیں کرتے تو حرام میں تھوڑے اور زیادہ کا فرق کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بعض لوگ بہانہ بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شراب تو حرام ہے جب نشہ کرے۔ جو لوگ عادی ہو جاتے ہیں، ان کو آپ ایک بوتل، دو بوتل اور تین بوتلیں بھی پلا دیں وہ ٹھیک ٹھاک رہتے ہیں۔ کوئی بات نہیں گاڑی چلا کر گھر چلا جائے گا۔ اس کے مقابلے میں اگر آپ وہی کسی اونٹ کو پلا دیں تو وہ مرجائے گا۔ تو وہ پیتے پیتے بدن کے اندر قوت مدافعت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے سرد ملکوں کے لوگ سردی برداشت کر لیتے ہیں اور گرم علاقوں کے لوگ گرمیوں میں گرمی برداشت کر لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جی! اس کو نشہ نہیں ہوتا۔ نہیں، بلکہ شریعت یہ کہتی ہے کہ اگر ایک عام آدمی کو دیا

جائے اور اس کو نشہ آجائے تو وہ سب کے لیے حرام ہے۔ یہ نہیں کہ ہم تمیز کریں گے کہ یہ عادی ہے اور یہ غیر عادی ہے۔ دو بوتلوں سے اس کو نشہ ہوتا ہے۔ جب چیز حرام ہے تو اس کی قلت بھی حرام ہے اور کثرت بھی حرام ہے۔

شراب پینے پلانے، بنانے اور بیچنے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت:

اور پھر یاد رکھیں کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ شراب بنانے والے پر بھی لعنت ہے، بیچنے والے پر بھی لعنت ہے، لانے والے پر بھی، لاد کر لے جانے والے پر بھی اور اس کو رائج کرنے والے پر بھی۔ جیسے حضور پاک ﷺ نے سود کے معاملے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے، اسی طرح شراب کے معاملے میں بھی آپ ﷺ نے دس آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے۔ ایک آدمی خود تو نہیں پیتا، لیکن دوسرے کو لا کر پہنچا دیتا ہے۔ یہ بھی اتنا ہی مجرم ہے۔ ایک آدمی دوسرے ملک سے لا کر پہنچا رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم تو جی بزنس کر رہے ہیں، ہم تو کوئی شراب وغیرہ نہیں پیتے، ہمارا تو ایک بزنس ہے۔ آرڈر ہوا تو ہم نے وہاں سے مال بھیج دیا۔ تو یہ بھی اسی طرح کا برابر کا مجرم ہے، اسی طرح برابر کی لعنت کا حقدار ہے کہ وہ حرام کے پھیلانے میں مدد کر رہا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ﴾ [المائدۃ: ۲] نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہوں اور ظلم کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ تو شراب ہر لحاظ سے حرام ہے۔

الکحل کا حکم:

اب شراب کی جتنی بھی اقسام ہیں سب حرام ہیں، البتہ ایک بحث باقی ہے کہ جو دواؤں میں الکحل کا استعمال ہوتا ہے اس میں علماء کرام نے اتنی گنجائش رکھی ہے کہ اگر کوئی طبیب یعنی مسلمان ڈاکٹر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس مرض میں اس کے علاوہ کوئی متبادل دوا نہیں ہے تو بطور مجبوری مرض اتنی مقدار استعمال کرنی جائز ہوگی، لیکن اگر مجبوری نہ ہو اور متبادل دوا مل رہی ہو تو پھر اس کا استعمال کرنا ناجائز ہے۔ اور بلکہ ایک حدیث پاک میں وضاحت بھی آئی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ پاک نے حرام میں شفا نہیں رکھی۔ پھر کوئی کہے کہ ان حرام دواؤں سے فائدہ ہوتا ہے تو جواب یہ ہے کہ ان دواؤں میں حلال چیزیں بھی تو ہوتی ہیں، سارا حرام تو نہیں ہوتا۔ تو اصل بات یہ ہے کہ ایسی ادویات سے بچنا چاہیے جن میں الکحل یا شراب یا اس کی کوئی قسم ہے؛ اس لیے کہ یہ تمام چیزیں لوگوں کو اس کا عادی بنا دیتی ہیں۔

نبیذ کا مسئلہ:

نبیذ کا معنی یوں سمجھیں کہ عرب میں ایک رواج تھا اور ہے بھی۔ وہ ایسا کرتے ہیں کہ جیسے کھجور ہے، اس کی گٹھلی وغیرہ نکال کر اس کو اچھی طرح سے ہاتھوں سے مل لیتے ہیں اور بھگو دیتے ہیں۔ اب وہ دس بارہ گھنٹے پڑی رہے گی۔ اس کے بعد اس کو صاف کیا اور اس کا شربت پی لیا۔ اس کو ''نبیذ'' کہا جاتا ہے۔ کبھی کبھی لوگ ایسا بھی کرتے ہیں کہ اس کو پانی میں بھگو دیا جیسے املی ہوتی ہے، کھجور ہوتی اور چیزیں بھی ہوتی ہیں، بہرحال ان کو بھگو دیا اور دس بارہ گھنٹے کے بعد اس کو آگ پر گرم کرنے کے بعد اس کو صاف کر لیا اور صاف کر کے پی لیا۔ اس کو ''نبیذ'' کہا جاتا ہے۔

اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر اس میں شدت پیدا ہو جائے، یعنی نشہ کے اثرات پیدا ہو جائیں تو یہ بھی حرام ہے۔ اگر نشہ کے اثرات نہ ہوں تو جیسے کھجور کو ویسے بھگو دیں اور اس کا شربت بن جائے یا کسی کشمش املی وغیرہ کا تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اصل بات سکر ہے، نشہ ہے۔ اگر وہ نشہ کی حد تک پہنچ جائے تو میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس میں شدت معلوم ہوتی ہو تو اس میں پانی اور زیادہ کر دو، تاکہ وہ شربت کا پانی رہ جائے۔ اب اگر آپ مثلاً: کھجور کو بھگو کر رکھ دیں اور دو تین دن تک رکھا رہنے دیں تو لازمی بات ہے کہ اس میں خمر پیدا ہو جائے گا اور اس میں نشہ پیدا ہو جائے گا، اس لیے پھر اس حد تک پہنچ جائے تو وہ حرام ہو جائے گا۔

شراب کے برتنوں کا حکم:

پہلے تو اسلام نے اتنی پابندی لگائی ہے کہ جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی تو حکم یہ تھا کہ ان برتنوں کو بھی توڑ ڈالو، ان برتنوں کو بھی استعمال نہ کرو۔ بعض برتن ایسے ہوتے تھے کہ وہ مٹی کے بنے ہوتے تھے اور اندر سے ان پر روغن چڑھا ہوا کرتا تھا، جیسے عام طور پر پنجاب میں مٹی کے برتن ہوتے ہیں اور وہ روغنی ہوتے ہیں، جن میں آپ کھانا وغیرہ پکاتے ہیں۔ اور ہندوستان میں بھی ایسے برتن ہوتے ہیں۔ ان میں کھانا بڑا لذیذ بنتا ہے۔ وہ خالص مٹی ہوتی ہے اور اندر بس روغن لگا ہوتا ہے کہ وہ خراب نہیں ہوتا۔ تو ایسے مٹکے خاص طور پر شراب کے لیے بنائے جاتے تھے، ان میں شراب رکھی جاتی تھی۔ اسی طرح کھجور کے درخت کو بھی اندر سے کاٹ کر مٹکے کی شکل بنا دیتے تھے اور اس میں شراب بند کرتے تھے۔ تو ان سب چیزوں کے بارے میں اسلام نے حکم دیا کہ ان کو توڑ ڈالو۔ یہ برتن بھی استعمال نہ کرو، تاکہ خواہ مخواہ کسی کا ذہن شراب کی طرف نہ جائے، لیکن جب حرمت معلوم ہو گئی اور شراب اسلام سے

نکل گئی تو پھر ان برتنوں کے استعمال کی اجازت ہوگئی کہ بھئی! یہ برتن ہیں، پاک ہیں، حلال ہیں۔ دھو کر استعمال کرلو کوئی بات نہیں ہے، کوئی منع نہیں ہے۔

اسی طرح بعض لوگ دشمنانِ اسلام اور ہمارے بعض نئے پڑھے لکھے نوجوان ان کے دماغ میں ایک بڑی خلش ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ دیکھو جی! مولوی انگور تو کھا جاتے ہیں اور اس کی شراب کو منع کرتے ہیں۔

تمہاری بیٹی بھی ایک عورت سے پیدا ہوئی ہے اور تمہاری بیوی بھی ایک عورت سے پیدا ہوئی ہے تو پھر فرق کیا ہے؟ تمہاری بیٹی بھی ایک ماں کے بطن سے پیدا ہوئی ہے اور تمہاری بیوی بھی ایک ماں کے بطن سے پیدا ہوئی ہے، دونوں عورتوں میں یہ حلال ہے، یہ حرام ہے کیوں؟ یہ حلال و حرام مولوی نے کیا ہے؟ اگر تم بہن اور بیوی میں تمیز نہیں کر سکتے تو یہاں بھی انگور اور شراب میں تمیز کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ اگر تم وہاں تمیز کرو گے جو اللہ پاک نے حکم دیا ہے کہ بہن بہن ہے، ماں ماں ہے، بیٹی بیٹی ہے اور بیوی بیوی ہے۔ اور بیوی بھی اس وقت تک حلال ہے جب تک نکاح ہے اور شرعاً تعلق قائم ہے، طلاق نہیں ہوئی۔ اب طلاق ہو جائے تو وہی حلال حرام ہو جاتا ہے۔

اب انگور کھانا علیحدہ بات ہے اور اس سے شراب نکالنا علیحدہ چیز ہے۔ کھجور کھانا علیحدہ بات ہے اور کھجور سے شراب بنانا علیحدہ بات ہے۔ یہ سب اسلام کے احکام ہیں، ان میں مذاق اڑانا اور استہزاء کرنا آدمی کو کفر تک پہنچ دیتا ہے۔ ایک آدمی ہے، گناہگار ہے، اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی تعمیل نہیں کر رہا۔ اور ایک ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا مذاق اڑا رہا ہے کہ دیکھو! جناب! انگور حلال ہے تو شراب کیوں حرام ہے؟ کھجور حلال ہے تو پھر شراب کیوں حرام ہے؟ یہ استہزاء ہے، جو کفر ہے۔

اب تو وہ لوگ بھی جن کو شراب کی گھٹی لگائی گئی ہے وہ بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ شراب بڑی خطرناک چیز ہے۔ وہ یہ بات بھی مانتے ہیں کہ شراب کا عادی آدمی زیادہ بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔ اور یہ بات بھی مانتے ہیں کہ شراب کی وجہ سے کئی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ بہر حال ہم تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔

جوئے کا معنی اور اقسام:

دوسرا مسئلہ "مَیْسِر" کا ہے۔ "مَیْسِر" کا معنی جوا ہے۔ جوئے کی کئی شکلیں تھیں: کوئی تاش پر جوا کھیلتا تھا،

کوئی شرط لگائی کہ یہ گھوڑا دوڑ رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ جیتے گا اور وہ کہتا ہے کہ یہ نہیں جیتے گا، اس نے کہا کہ اگر یہ جیتے گا تو اتنا اور اگر یہ جیتے گا تو اتنا۔ یا کسی نے مشین لگائی کہ جناب! اس کو چکر دو۔ اگر یہ فلاں نمبر پر رک جائے تو فلاں جیت گیا اور اگر فلاں نمبر پر رک جائے تو فلاں جیت گیا۔ یہ سب جوا ہے۔ بعض لوگ انعام مقرر کر دیتے ہیں کہ اگر یہ گلاس خریدو اور اگر تیرے پاس دس نمبر نکل آیا تو تجھے ایک لاکھ روپے ملے گا۔ یہ بھی جوا ہے۔ اور بعض لوگ معمے حل کراتے ہیں کہ یہ معمہ ہے، سوال ہے، اس کو حل کرو گے تو اتنا انعام ہے۔ یہ سب جوئے کی اقسام ہیں، بری ہیں۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ کوئی معزز جوا ہے، جو کلبوں میں کھیلا جاتا ہے اور کوئی عام گندا جوا ہے، جو غریب سڑک پر بیٹھ کر کھیل رہے ہوتے ہیں۔ یہ بڑا پلید جوا ہوتا ہے، وہ بڑا پاک جوا ہے جو کلبوں میں بیٹھ کر بڑے بڑے سرمایہ دار، صنعت کار، جاگیردار اور بڑے بڑے آفیسر کھیل رہے ہوتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: جی! وہ تو جوا نہیں ہے، وہ تو کلب میں بیٹھ کر انجوائے کرتے ہیں۔ کیونکہ رشوت کا مال جو ہے، آخر اس کو کہیں تو خرچ کرنا ہے ناں!؟ اب ایک آدمی بیٹھے بیٹھے دس لاکھ روپے کمائے، اس کو کیسے خرچ کرے گا؟ وہ پھر اسی طرح خرچ ہوتا ہے: کچھ جوئے میں، کچھ مجرے میں، کچھ گانے میں اور کچھ شراب میں۔ آدمی کے پاس لعنت ہی لعنت رہ جاتی ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ حرام سے لعنت ہی مل سکتی ہے، کبھی رحمت نہیں ملے گی۔ حرام کا انجام حرام ہی ہوگا، حلال نہیں ہو سکتا۔ تو یہ جتنی قسمیں ہیں یہ ''مَیْسِر'' اور جوا ہی ہیں۔ اللہ پاک نے اس کو بھی حرام قرار دیا ہے۔

جوئے اور انعام میں فرق:

البتہ ایک ہوتا ہے انعام۔ انعام ایک طرف ہوتا ہے، دو طرف نہیں ہو سکتا۔ جیسے کوئی کہے کہ جو لڑکا ہماری کلاس میں فرسٹ آئے گا ہم اس کو ایک ہزار روپے ریال انعام دیں گے۔ تو یہ انعام ہے، یہ جوا نہیں ہوتا! اس لیے کہ اگر وہ فرسٹ بھی آتا تو اس کو تو کچھ بھی نہیں دینا پڑتا۔ جوئے میں تو یہ ہے کہ دونوں طرف سے رقم متعین ہوتی ہے کہ اگر میں جیت گیا تو تم پیسے دو گے اور اگر تم جیتے تو میں تمہیں پیسے دوں گا۔

اب آپ اس کو مثال سے سمجھیں کہ مثلاً: آپ نے ایک گلاس ایک ریال میں خریدا۔ جس کو انعام ملا اس نے بھی ایک ریال کا خریدا ہے، اس کو ایک لاکھ مل گیا اور جی ہمارا کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔ اللہ کے بندے! یہ ایک لاکھ کا گلاس جو بکا ہے تو دو لاکھ والوں کا نقصان ہو گیا! کیونکہ انہوں نے تو اسی لیے لیا ہے ناں کہ انعام نکلے!؟ انہوں نے

اپنے استعمال کے لیے تو نہیں خریدا۔ اور جو تمہارے لیے انعام رکھتے ہیں وہ پاگل تو نہیں ہوتے؟ انہوں نے مثلاً: ایک لاکھ کا انعام رکھا ہے تو پہلے وہ...... ان شاء اللہ...... دس لاکھ کے گلاس بیچیں گے تو پھر ایک نمبر نکلے گا، تا کہ ان کو نو لاکھ کا فائدہ ہوا اور ایک لاکھ کا انعام میں دیں گے۔ ان کا کوئی دماغ تو خراب نہیں ہو گیا کہ اپنے گھر سے تمہیں ایک لاکھ روپے ریال دے دیں؟ وہ اتنے پاگل تو نہیں ہوتے؟ وہ تو ضرب و تقسیم والے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ تو اپنے چیزوں کو بیچنے کا ایک طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ مثلاً: ہماری ایک چیز پرانے ماڈل کی ہو گئی ہے۔ ہم نے لیا تھا ترانوے میں اور اب پچانوے آ گیا ہے۔ اور جوں جوں پیچھے جائے گا تو یہ ٹیپ کوئی خریدا گا نہیں۔ تو وہ انعام میں رکھ دیتے ہیں: اچھا بھئی! ایک لاکھ نمبر نکل آئے تو ایک لاکھ ریال انعام نکلے گا، تا کہ ان کے سارے ٹیپ بک جائیں، نقصان سے بچ جائیں۔ دس لاکھ کما لیا اور تمہاری کمائی سے تمہارے منہ پر تھپڑ مار کر ایک بھائی کو ایک لاکھ ریال انعام دے دیا تو اب جو اس نے لاکھ لوٹا ہے وہ کہاں گیا؟ اس لیے اسلام نے ایسی ساری صورتوں کو حرام قرار دیا ہے کہ یہ سب چیزیں جوے کے اندر آ جاتی ہیں۔

اور جوئے کی کئی اقسام ہیں۔ اور جوئے کی جتنی اقسام ہیں سب کی سب حرام ہیں اور ان کے حلال ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

انشورنس اور بیمہ پالیسی کا حکم:

اسی طرح ہمارے ہاں جو انشورنس کمپنیاں ہوتی ہیں کہ جناب! آپ کی دس لاکھ کی پالیسی ہے، میں نے دس ہزار روپے سالانہ قسط دینی ہے۔ میں نے دس ہزار روپے قسط دی اور مر گیا تو میرے بچوں کو دس لاکھ مل گئے اور کہتے ہیں: جی! یہ تو اس لیے بنائی ہے کہ کل کو اگر آپ مر گئے تو آپ کے بچوں کا کیا ہو گا؟ تو ان کے لیے ہم نے یہ پالیسیاں بنائی ہیں کہ آپ کی بیوی بے چاری بیوہ ہو گئی، آپ کے بچے یتیم ہو گئے، ان کے لیے نہ سکول کے پیسے ہوں گے اور نہ ہی مکان کا کرایہ ہو گا۔ یہ تو ہم نے آپ کی مدد کے لیے بنایا ہے۔

ان ظالموں سے پوچھیں: آپ بوسنیاں اور شیشان میں مدد کیوں نہیں کرتے جہاں پر مسلمانوں کے بچے مر رہے ہیں؟ اگر ان کو مدد کا بڑا شوق ہے تو یہ سارا پیسہ وہاں لگا دیں۔ یہ مدد نہیں کرتے، یہ ڈاکو ہیں، لیکن بڑے خوبصورت انداز میں ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ ایک ڈاکو وہ ہوتا ہے جس نے تالا توڑ دیا، تمہارے گھر میں گھس گیا، دیواریں توڑ

ڈالیں۔ پکڑا گیا تو جوتے کھائے، جیل میں چلا گیا۔ اور ایک یہ بڑا مہذب ڈاکو ہے کہ ان کو تو کوئی پکڑ نہیں سکتا؛ کیونکہ یہ آپ کی خدمت میں بچھے جا رہے ہیں ناں! یہ سب کچھ آپ کے لیے کر رہے ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ مثلاً: میری پالیسی دس لاکھ کی ہے۔ انہوں نے ایک لاکھ آدمی سے دس دس ہزار روپے لیا ہوا ہو تو ان کے پاس سال میں کتنا آیا؟ اور سال میں کتنے مریں گے؟ دو چار پانچ دس۔ اور پھر بھی یہ انکوائری کریں گے کہ کس کا کتنا بنتا ہے؟ حقدار بھی ہے کہ نہیں؟ اصل میں تو کہہ دیں گے کہ بنتا ہی نہیں۔ غلط بات ہے، کوئی کیڑا نکال دیں گے ٹیکنیکل طور پر۔ اور اگر آپ کی مان بھی لیں تو سال میں ایک لاکھ آدمی سے پیسے لیے اور دس آدمیوں کو واپس کیے تو ننانوے ہزار نو سو نوے آدمیوں کی کمائی ان کی جیب میں گئی۔ اور ایک آدمی کو دے دیے تو فرق کیا پڑ گیا؟۔ تو یہ سب جوا ہے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے اپنے بچوں کے لیے آخر کچھ تو کرنا ہے! تو آپ ان کے لیے کوئی پلاٹ لے کر ڈال دیں، آپ ان کے لیے سونا خرید کر کے دے دیں اور وہ حفاظت کے ساتھ کہیں رکھ دیں۔ اور کئی حلال کے ذریعے بھی ہو سکتے ہیں۔ کوئی ضروری تو نہیں ہوتا کہ آپ بچوں کے لیے حرام ہی چھوڑ کر جائیں کہ مرنے کے بعد بھی لوہے کے گرز آپ کو لگتے ہی رہیں کہ پیسے وہ کھائیں اور عذابِ قبر آپ بھگتیں۔ ایک تو زندگی میں آپ نے بھگتا کہ شریف بیٹے ہوتے تو انشورنس کیوں کرواتے؟ اللہ پاک پر یقین رکھتے اور پھر مرنے کے بعد بھی عذاب آپ نے بھگتا۔ تو وہ مزے کر رہے ہیں، ان کو تو دس لاکھ مل گیا ہے، وہ تو جناب! عیش اڑا رہے ہیں اور آپ قبر میں لوہے کے گرز کھا رہے ہیں اور آخرت میں بھی لوہے کے گرز کھا رہے ہیں۔ تو اس کے لیے حلال کے ذرائع بھی ہو سکتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک دوست نے مشورہ دیا کہ آپ نے تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں سب کچھ لٹا دیا، آپ کے بچے آپ کے بعد کیا کریں گے؟ آپ مہربانی کریں، آپ خلیفۃ المسلمین ہیں، اپنے بیٹوں کے لیے کوئی جاگیر، کوئی جائیداد اور کوئی چیز تو دے دیں کہ بادشاہ کے بیٹے اور کل کو بھیک مانگیں گے؟ ان کے پلے میں تو دو دو ریال بھی نہیں ہیں۔ حضرت عمر بن العزیز رحمہ اللہ مسکرائے اور فرمایا کہ تمہارے مشورے کا شکریہ! لیکن میری اولاد یا تو صالح ہوگی یا طالح ہوگی۔ اگر بری ہوگی تو ان کے گناہوں کا میں ذمہ دار ہوں اور اگر اچھی ہوگی تو اللہ پاک کا وعدہ ہے کہ میں اچھوں کا ذمہ دار ہوں۔ ﴿وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ﴾ [الاعراف:۱۹۶] ان کی حفاظت میرا رب کرے گا۔

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ اے میرے مدنی! آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ اللہ پاک نے

فرمایا: ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ [البقرۃ:۲۱۹] وہ خرچ کرو جو تمہارے پاس زائد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی سخاوت نہیں کہ تمہارے بیوی بچے تمہارے گھر میں بھوکے بیٹھے ہوئے ہوں اور تم عمرے پر چل پڑو، تمہارے بیوی بچوں کے پاس کپڑے نہ ہوں اور تم غریبوں کو کپڑے دے رہے ہو، تمہارے گھر والے محتاج ہیں اور تم لوگوں کو خیرات کر رہے ہو۔ شریعت یہ حکم نہیں دیتی۔ سب سے پہلے اپنے گھر کو سنبھالو اور اپنے گھر والوں کا خیال کرو۔ ﴿فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ﴾ [البقرۃ:۲۱۵] پھر خیرات کے مراحل ہوتے ہیں۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ جو تم سے زیادہ بچے۔ جو تم سے نہ بچے تمہارا آپس میں پورا ہو جاتا ہے، تمہارا کھانا پینا، تو تمہیں آگے دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جیسا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ وہ اتنے بڑے زاہد تھے! وہ فرماتے تھے کہ اللہ پاک کا حکم ہے: ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ [البقرۃ:۲۱۹] جو زیادہ ہے وہ دے دو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس دو کپڑے ہیں: ایک ہم نے پہن لیا اور ایک زیادہ ہے تو وہ دے دو۔ اور دو روٹیاں تھیں: ایک کھالی اور دوسری بچ گئی تو اسے دے دو۔ وہ تو اس بات کے قائل تھے کہ کوئی زیادہ چیز گھر میں رکھنی ہی ناجائز ہے، مطلقاً حرام ہے۔ وہ تو ڈنڈا لے کر آجاتے تھے کہ پتہ لگا ہے کہ اس کے پاس دو کپڑے ہیں۔ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے منت کی کہ آپ مدینہ منورہ سے باہر بیٹھیں، آپ کا فتویٰ تو بڑا سخت ہو گیا ہے۔ ہر آدمی اس مقام پر گزر راہ نہیں کر سکتا۔

بہر حال جمہور کا مسلک ہے کہ جائیداد رکھنی جائز ہے، حلال سے کمائی ہوئی چیز ضرورت سے زائد رکھنی جائز ہے۔ جب تم زکوٰۃ ادا کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرتے ہو تو تمہارے لیے جائیداد رکھنی جائز ہے۔ اور خرچ اتنا کرو جتنا تم سے زیادہ ہو سکے، جو بچے۔ اور اگر نہیں بچتا ہے تو کوئی ضروری نہیں ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ وہ ہے کہ سارے خرچے کے بعد، سارے اخراجات کے بعد اور قرضے ادا کرنے کے بعد، مثلاً: میرے اوپر ایک لاکھ کا قرضہ ہو اور میں خیرات کرتا پھروں تو یہ تو بے وقوفی ہے۔ سب سے پہلے حکم ہے کہ میں پہلے قرض ادا کروں۔ مجھے خیرات کرنے کا حکم نہیں ہے۔ میں تو خیرات تب کروں گا جب میرے ذمہ کسی کی کوئی چیز نہ بچتی ہو۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ﴾ [البقرۃ:۲۱۹]۔

یتیموں کے مال کا حکم:

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ﴾ [الانعام:۱۵۲] (یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ)۔ ﴿اِنَّ

﴿اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ﴾ [النساء:۱۰] (جو لوگ زیادتی کر کے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ جہنم کی آگ سے اپنے پیٹ کو بھر رہے ہیں)۔ تو جب یہ حکم آ گیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارے پاس یتیم بچے بھی ہیں، ان کی جائیدادیں بھی ہیں اور ان کا کھانا پینا بھی ہے۔ ہم تو بڑی مشکل میں آ گئے کہ خدانخواستہ ہم ایک نوالہ بھی اپنے حق سے زیادہ کھا گئے تو ہم نے تو اپنے پیٹ میں جہنم کے انگارے بھر لیے۔ اب ہم کیا کریں؟ لہٰذا ہم اب یتیموں کو علیحدہ کر لیں کہ ان کا کھانا الگ، پینا الگ، آٹا اور دال الگ، الگ برتن، ہر چیز الگ...... اور یہ بھی بڑا مشکل مسئلہ تھا کہ ایک گھر میں اگر ایک یا دو یتیم بچے ہیں تو ان کے لیے ہر چیز علیحدہ کرو، آٹا علیحدہ، پانی علیحدہ اور روٹی کپڑا علیحدہ، سب علیحدہ کرو......

تو اللہ پاک نے اجازت دے دی اور فرمایا کہ یتیم تمہارے بھائی ہیں، ان کو اپنے ساتھ ملا لو، اپنے کھانے پینے میں ملا لو، کوئی بات نہیں۔ اللہ پاک نیتوں کو جانتے ہیں کہ کس کی نیت اچھی ہے اور کس کی نیت بری ہے؟ کون ہے جو ملا کر یتیم کے مال کو کھانا چاہتا ہے اور کون ہے جو ملا کر یتیم کی مدد کرنا چاہتا ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں جو اچھے لوگ ہیں۔ مثلاً: آپ کے مہینے کا خرچ دس سیر آٹا ہے اور یتیم کے ذمے میں ایک سیر بنتے تھے اور یتیم کے پاس آدھا سیر تھا تو آپ نے کہا کہ کوئی بات نہیں، آدھا سیر اسی میں ڈال دو کوئی بات نہیں، اللہ پاک اسی میں برکت ڈال دے گا۔ تو اللہ پاک یہ بھی جانتے ہیں۔ اور اللہ پاک یہ بھی جانتے ہیں کہ تمہارا خرچہ تو ہے دس سیر اور یتیم کا خرچہ ہے ایک سیر۔ تو تم نے کہا کہ جناب! پانچ سیر تم کھاتے ہو، لہٰذا پانچ سیر تمہارے ذمے اور پانچ سیر ہمارے ذمہ۔ تو اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ﴾ [البقرۃ:۲۲۰] اللہ پاک مفسد کو بھی جانتے ہیں اور مصلح کو بھی جانتے ہیں۔ یہ اللہ پاک نے مہربانی کر دی۔ ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ﴾ [البقرۃ:۲۲۰] اگر اللہ پاک چاہتے تو تمہیں بڑی مشقت میں ڈال دیتے کہ ہر چیز علیحدہ کرو۔ اب ہر چیز علیحدہ کرنا تو بڑی مشقت ہے، لیکن اللہ پاک غلبے والے ہیں، اللہ تعالیٰ حکمت والے ہیں۔

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾﴾ [البقرۃ:۲۲۱]

''اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں اور البتہ مسلمان لونڈی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں اچھی لگے۔ اور مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائے، البتہ غلام مسلمان بہتر ہے کسی بھی مشرک سے، اگرچہ وہ تمہیں اچھا لگے۔ وہ لوگ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور لوگوں کو اپنے احکام بتاتا ہے، شاید کہ وہ چوکس ہو جائیں۔''

مرد کے نکاح میں چار عورتوں کا جواز:

اس آیت میں مشرک عورت سے نکاح کے بارے میں مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ نکاح مسلمانوں کے لیے حلال بھی ہے، سنت الانبیاء والمرسلین بھی ہے، توالد و تناسل کا ذریعہ بھی ہے اور انسانوں کے سکون اور طمانیت حاصل کرنے کے لیے سب سے اہم ترین ذریعہ بھی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تو اللہ پاک نے اپنے بندوں کو حکم دیا: ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ﴾ [النساء: ۳] تم نکاح کرو اور نکاح میں بھی اللہ پاک نے اجازت دے دی کہ تم چاہو تو ایک سے، دو سے، تین سے اور چار سے، یعنی ایک آدمی بیک وقت چار عورتوں تک کو نکاح میں رکھ سکتا ہے۔

کن عورتوں سے نکاح جائز نہیں؟

اور کن عورتوں سے نکاح ہو سکتا ہے اور کن سے نکاح نہیں ہو سکتا؟ سورۃ النساء میں تفصیل کے ساتھ یہ آیت آ گئی کہ:

1 ......ماں سے نکاح حرام ہے،

2 ......بیٹی سے نکاح حرام ہے،

3 ......بہن سے نکاح حرام ہے،

4 ......خالہ سے نکاح حرام ہے،

5 ......پھوپھی سے نکاح حرام ہے،

6 ......ان عورتوں سے جنھوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، یعنی رضائی ماں کے ساتھ نکاح حرام ہے،

7 ......جس بچی کے ساتھ تم نے دودھ پیا ہے وہ بھی تمہاری رضاعی بہن ہے، اس کے ساتھ نکاح حرام ہے،

8 ......اور اسی طرح ایک وقت دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے، یعنی ایک آدمی دو بہنوں سے اکٹھی شادی کر لے یہ حرام ہے۔

البتہ ایک بہن سے شادی کر لی، اس کی موت ہوگئی یا طلاق ہوگئی، اس کی عدت گزرنے کے بعد اگر اس کی دوسری بہن کے ساتھ نکاح کرنا چاہا تو یہ جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنی ایک بیٹی کی شادی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے کرائی۔ اس کے بعد جب وہ فوت ہوگئیں تو آپ ﷺ نے دوسری بیٹی بھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو عطا فرمادی۔

حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی نکاح کرتا ہے تو یا تو دین کی وجہ سے کرتا ہے، یا اس عورت کے حسن و جمال کی وجہ سے کرتا ہے، یا اس عورت کے خاندان کی وجہ سے کرتا ہے اور یا دولت مندی کی وجہ سے کرتا ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ''فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ'' دین والی لڑکی اختیار کرو، چاہے وہ شکل وصورت میں اتنی اچھی نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں ایک بڑی خوبصورت لڑکی ہے، لیکن دین دار نہیں ہے تو دین والی کو ترجیح دو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اسی دین کے اندر تم کو برکت عطا فرمائیں گے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم فقیر ہو تو شادی کرو ''اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ'' اللہ پاک تمہیں برکت عطا فرمادیں گے۔

چار سے زائد نکاح انبیاء کرام علیہم السلام کی خصوصیات:

انبیاء کرام علیہم السلام کے کچھ خصائص ہوتے ہیں، جیسے حضور پاک ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے چار سے بھی زیادہ نکاح کی اجازت دی ہے۔ آپ ﷺ کے گیارہ نکاح ہوئے، لیکن آپ ﷺ کے گھر میں بوقتِ وفات نو بیبیاں موجود رہیں۔ تو یہ خصوصیتِ انبیاء ہے۔ اس سے کوئی حجت نہیں پکڑ سکتا کہ......نعوذ باللہ...... نبی کی نو بیبیاں ہیں تو میں بھی نو نکاح کرلوں۔ اللہ پاک نے قرآن پاک میں اجازت دے دی، وہاں نو کے بعد پابندی لگادی: ﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ﴾ [الاحزاب: ۵۲] کہ بس اب اس کے بعد آپ اور کسی عورت سے نکاح نہیں کر سکتے اور نہ یہ کر سکتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک عورت کو طلاق دے کر ایک اور نکاح کرلیں۔

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۚ﴾[البقرۃ:۲۲۱] اب لفظ ''الْمُشْرِكٰتِ'' کو اپنے عموم پر لیں تو پھر اس سے اہل کتاب مستثنیٰ کریں گے؛ کیونکہ اہل کتاب کی لڑکیوں سے نکاح جائز ہے، لہٰذا ''الْمُشْرِكٰتِ'' اگر اپنے عموم پر رہے تو ان میں اہل کتاب کی لڑکیاں مستثنیٰ ہوں گی۔

دوسری آیت کے ساتھ اللہ پاک نے مسلمانوں کو اجازت دی دے کہ اہل کتاب کی لڑکیوں کے ساتھ نکاح جائز ہے، لیکن یہ مسئلہ سمجھ لیں کہ اہل کتاب کی لڑکیوں سے شادی کی اجازت ہے، حکم نہیں ہے۔ حکم یہ ہے کہ تم مسلمان کے ساتھ نکاح کرو اور مومنہ عورت کے ساتھ نکاح کرو۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ جیسے آج کل بعض لوگ یورپ کی عورتوں سے شادی کر لیتے ہیں۔ یہ شادی نہیں ہوتی، یہ تو بالکل حرام اور ناجائز ہے؛ کیونکہ آج کل تو وہاں پر نہ کوئی عیسائی ہے اور نہ کوئی یہودی ہے۔ وہ تو مذہب ہی بھول گئے ہیں کہ نہ کسی کتاب پر ایمان، نہ ہی کسی مذہب پر ایمان ہے اور نہ ان کا اپنے نبی پر کوئی ایمان ہے۔ یہ تو ملحد لوگ ہیں، زندیق لوگ ہیں۔ ان پر تو ''اہل کتاب'' کا اطلاق بھی نہیں ہوتا، لہٰذا ان لڑکیوں سے شادی کرنا حرام ہے۔

اہل کتاب کا معنی یہ ہوتا ہے کہ کم از کم اس کا تورات پر ایمان ہو، اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تو اس کا ایمان ہو اور آخرت پر اس کا ایمان ہو۔ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتا، لیکن اپنے نبی کو تو مانے۔ جو آدمی تورات کو بھی نہیں مانتا، انجیل کو بھی نہیں مانتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی نہیں مانتا تو ان سے نکاح کرنے کی شریعت نے کوئی اجازت نہیں دی۔ ان کی اجازت بھی کیوں دی گئی؟ اس لیے کہ ان کا آخرت پر ایمان ہے، اللہ پاک کے ایک نبی پر ایمان ہے اور اللہ پاک کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان ہے تو معاملہ نرم ہے۔

ایک آدمی بظاہر مسلمان ہے، لیکن وہ قبروں پر سجدہ بھی کرتا ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب بھی سمجھتا ہے تو وہ بھی مشرک ہے، چاہے لاکھ وہ کہتا رہے کہ میں مسلمان ہوں، اس کے ساتھ بھی نکاح جائز نہیں ہے۔

مشرک عورت سے نکاح کیوں منع ہے؟

پہلا سوال: یہ ہے کہ قرآن پاک میں حکم آیا کہ مشرکہ عورتوں اور مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو، تاکہ وہ تمہیں مشرک نہ بنادیں، لیکن ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم نکاح کرو، تاکہ تم ان کو موحد بنادو۔

اور دوسرا سوال: مستشرقین کی طرف سے ہے کہ یہ خطرہ تو لڑکی والوں کو بھی ہونا چاہیے کہ ہم جو اپنی لڑکی

مسلمان کو دے رہے ہیں، کہیں یہ مسلمان نہ ہو جائے۔ جب وہ خطرہ محسوس نہیں کر رہے ہیں تو تم کیوں ڈر رہے ہو؟ بلکہ نکاح کرنے کے بعد تم ان کو مسلمان کر لو، لہٰذا اسلام نے یہ پابندی کیوں لگائی ہے؟

جواب: یہ ہے کہ اصول یہ ہوتا ہے کہ ایک دفعِ مضرت ہوتی اور ایک جلبِ منفعت ہوتی ہے۔ مثلاً: ہم نے دکان شروع کی اور اس میں ایک لاکھ ریال ڈال دیئے۔ اب سب سے پہلے عقل مند تاجر نقصان سے بچنے کی فکر کرے گا۔ وہ پہلے یہ کوشش کرے گا کہ جو میں نے ایک لاکھ ریال ڈالا ہے وہ تو آئے ناں! تا کہ میرا اصل سرمایہ نہ ڈوبے۔ اپنے کاروبار کو نقصان سے بچانے کے بعد نفع کی سوچے گا۔ لہٰذا نقصان سے بچنا پہلے ہوتا ہے، نفع کے بارے میں سوچنا بعد میں ہوتا ہے۔ اب نقصان سے بچنے کو ''دفعِ مضرت'' کہتے ہیں اور نفع حاصل کرنے کی کوشش کو ''جلبِ منفعت'' کہتے ہیں۔ اچھا ایک نفع کی امید تو تھی کہ مشرکہ نکاح کے بعد مومن بن جائے، لیکن خطر یہ ہے کہ وہ تمہیں مشرک نہ بنا دے۔ تو خطرہ سے بچنا مقدم ہوتا ہے نفع کی امید کرنے سے۔

جیسا کہ بزرگوں نے مثال دی ہے کہ تریاق تو آدمی یقین کے ساتھ پی لیتا ہے اور جس چیز میں زہر کا اندیشہ ہو اور ذرا سا شک بھی ہو تو اس کو نہیں پیتا۔ تو جہاں ضرر کا شبہ ہو جائے وہ لوگ استعمال نہیں کرتے۔ جیسا کہ بزرگ کہتے ہیں کہ حکیموں کے کشتے نہ کھایا کرو کہ کہیں تم خود کشتہ نہ کھاؤ۔ کیا پتہ کوئی زہر ہو؟ نفع کا سوچتے رہو اور مصیبت تمہارے گلے میں پڑ جائے۔ تو مشرکہ عورتوں کو گھر میں لانے کا نقصان یقینی ہے اور اس کا اسلام لانا صرف ایک امید ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس راستے کو بھی بند کر دیا ہے کہ بجائے اس کے کہ تم اس کو پتہ نہیں اسلام سکھاؤ گے؟ وہ تمہارے گھر میں شرک کا گڑھ نہ بنا ڈالے، وہ تیرے گھر کے اندر مشرکانہ رسوم نہ داخل کر دے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھ لیں کہ کوئی ایسے نوجوان ہیں جنہوں نے ہندو لڑکیوں سے شادی کر لی اور اب اسلام کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اور کتنی لڑکیاں ایسی ہیں کہ جو عائشہ سے عوشہ بن گئیں، نام بدل ڈالے، اسلام ختم ہو گیا اور ان میں اور ہندو لڑکی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ایک پابندی لگائی ہے کہ اللہ پاک جس چیز سے منع فرماتے ہیں اس میں بندے ہی کا فائدہ ہے۔

﴿وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ﴾[البقرۃ:۲۲۱] مومنہ باندی، مشرکہ سے زیادہ بہتر ہے، یعنی مومنہ کنیز ہے اور اس کے مقابلے میں حرہ (آزاد عورت) ہے، لیکن وہ مشرکہ ہے تو کنیز بہتر ہے۔

اس آیت مبارکہ کا سببِ نزول یہ تھا کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی ایک باندی تھی اور سیاہ رنگ کی تھی۔ کسی

بات پر غصہ آیا تو آپ نے تھپڑ مار دیا اور اس کے بعد گھبرائے اور حضور پاک ﷺ کی خدمت میں آ کر سارا واقعہ بتایا کہ یا رسول اللہ! میری ایک کنیز ہے۔ اس نے ایسی بات کی کہ میں نے اس کو غصہ میں تھپڑ مار دیا۔ اور میری باندی نماز پڑھتی ہے، روزہ بھی رکھتی ہے، وضو بھی کرتی ہے اور گواہی بھی دیتی ہے: ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کی۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''هٰذِهٖ مُؤْمِنَةٌ'' وہ تو مومنہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ گواہ ہو جائیں کہ میں اس کو آزاد بھی کرتا ہوں اور اس کے ساتھ شادی بھی کرتا ہوں۔ جب آپ رضی اللہ عنہ نے شادی کر لی تو لوگوں نے طعنہ زنی شروع کر دی کہ دیکھو جی! کالی باندی تھی، اپنی کنیز تھی، سیاہ رنگ کی لڑکی تھی اور اس سے شادی کر لی۔ مطلب یہ تھا کہ اس کے بجائے کوئی حسب نسب میں مشرکین کی لڑکیاں بھی مل سکتی تھیں تو کیا ضرورت تھی ایک سیاہ فام لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی؟ اللہ پاک نے فرمایا کہ وہ سیاہ فام لڑکی ان مشرکہ عورتوں سے زیادہ بہتر ہے۔ اس کو جو اللہ پاک نے ایمان کی دولت عطا کی ہے، اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ رنگ و روپ تو عارضی ہیں اور یہ تو اس دنیا تک ہیں، مرنے کے بعد سارے رنگ و روپ ویسے ہی اڑ جائیں گے، قبر میں جا کر کسی کا رنگ و روپ کیا بچے گا؟ ان کی ہڈیاں بھی مٹی ہو گئیں، پتہ نہیں کہ کیا حال گزرے گا؟ جسم صحیح سالم رہتا ہے یا نہیں؟ اور جب قیامت میں آئیں گے تو اللہ پاک ان عورتوں کو حوروں سے بھی زیادہ حسن عطا فرمائیں گے۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لَا تَنْكِحُوا النِّسَاءَ لِحُسْنِهِنَّ فَعَسٰى حُسْنُهُنَّ أَنْ يُّرْدِيَهُنَّ وَلَا تَنْكِحُوهُنَّ عَلٰى أَمْوَالِهِنَّ فَعَسٰى أَمْوَالُهُنَّ أَنْ تُطْغِيَهُنَّ وَانْكِحُوهُنَّ عَلَى الدِّيْنِ فَلَأَمَةٌ سَوْدَاءُ خَرْمَاءُ ذَاتُ دِيْنٍ أَفْضَلُ''[1] تم صرف حسن سے نکاح نہ کیا کرو کہ جی بڑی حسین ہے، آخر وہ حسن ڈھل جائے گا؛ اس لیے کہ جب وہ حسین ہو گی تو لوگوں کی نظریں بھی تو اس کی طرف اٹھیں گی۔ تو وہی حسن اس کی ہلاکت کا باعث بن جائے گا۔ تم دولت کی وجہ سے شادی نہ کیا کرو کہ وہ دولت ان کو سرکش بنا دیتی ہے کہ میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں اور تم کیا ہو؟ تم تو میرے نوکروں کی طرح ہو، تمہارا باپ تو ہمارے باپ کا نوکر تھا۔ میں تو اتنی دولت اور مال والی ہوں۔ فرمایا کہ دین والی عورت سے شادی کرو، اگرچہ وہ بے چاری سیاہ فام ہی کیوں نہ ہو، لیکن وہ زیادہ بہتر ہے؛ کیونکہ ایمان والی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا

[1] [سنن کبریٰ للبیہقی: ۷/ ۸۰، در منثور: ۱/ ۲۵۷]

وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ " [1] جب عورت کے ساتھ نکاح کیا جاتا ہے تو چار چیزیں دیکھی جاتی ہیں: یا تو مال دیکھا جاتا ہے، یا اس کا حسب ونسب دیکھا جاتا ہے، یا حسن دیکھا جاتا ہے یا دین دیکھا جاتا ہے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: تم دین والی عورت کو ترجیح دو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تیرے ہاتھ مٹی میں ہوں۔ یہ پیار کا کلمہ ہے۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا: "اَلدُّنْيَا مَتَاعٌ ، وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ" [2] دنیا سب نفع اٹھانے کا سامان ہے اور سب سے بہتر نفع اٹھانا یہ ہے کہ اللہ پاک پاکباز اور صالحہ عورت عطا فرمائے۔

اللہ پاک نے حکم دیا کہ مشرکین کے مرد مومن عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کریں، اگرچہ مشرک بڑا سردار ہی کیوں نہ ہو، حسب نسب والا کیوں نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں غلام چاہے غریب سیاہ فام ہو وہ زیادہ بہتر ہے؛ کیونکہ کافر جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ آؤ جہنم چلو! آؤ جہنم چلو! بلکہ ایسے اعمال کرواتے ہیں جو تمہیں جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ ان سے جب تمہارا اٹھنا بیٹھنا ہوگا، شراب خنزیر سب ہوں گے تو نتیجہ کیا نکلے گا......؟ جہنم۔ جب تم دنیادار کافروں کے ساتھ بیٹھو گے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ آخرت بھول جاؤ گے اور پھر انجام بڑا خطرناک اور خراب ہوگا۔ ﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بلاتے ہیں۔ "بِاِذْنِهٖ" کا معنی اپنی شریعت ہے کہ اللہ پاک نے ایسی شریعت نافذ کی، ایسے اوامر نافذ فرمائے اور ایسے نواہی نازل فرمائے کہ جن پر عمل کرو تو جنت ملے گی اور جہنم سے دور ہو جاؤ گے۔ ﴿وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۲۱] اللہ پاک اپنے احکام کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، تاکہ تم اللہ کے حکموں سے نصیحت پکڑ سکو۔

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ؀ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؀﴾ [البقرۃ:۲۲۲،۲۲۳]

[1] [صحیح البخاری، رقم: ۵۰۹۰، باب: الأکفاء في الدین، صحیح مسلم: ۱۴۶۶، باب: استحباب نکاح ذات الدین]
[2] [صحیح مسلم: ۱۴۶۷، باب: خیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ]

''اور آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں۔ فرما دیجیے: وہ گندگی ہے۔ تم عورتوں سے حیض کی مدت میں الگ رہو اور ان کے نزدیک نہ جاؤ، جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں۔ پس جب وہ اچھی طرح پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور گندگی سے بچنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں۔ جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو۔ اور اپنے لیے آگے کی تدبیر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تم نے اس سے ملنا ہے۔ اور ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجیے۔''

یہ حیض کی حالت کے بارے میں سوال ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ارشاد فرماتے تھے: سب سے بہتر جماعت کائنات میں اصحاب رسول اللہ رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے کہ انہوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے سوالات نہیں کیے جو مشکلات کا باعث بن جائیں، بلکہ انہوں نے ایسے سوالات کیے ہیں جو تقریباً بیس یا اکیس سوالات بنتے ہیں اور وہ سوالات ایسے ہیں جن کا پوری امت کو قیامت تک فائدہ ہوگا۔

- ......ان میں سے ایک سوال یہ ہے: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ﴾ [البقرۃ:۲۱۹] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شراب کے بارے میں اور جوئے کے بارے میں سوال کیا کہ ان کا کیا حکم ہے؟
- ......اسی طرح سوال کیا: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ:۲۱۷] کہ حرمت والے چار مہینوں کا کیا حکم ہے؟
- ......اسی طرح: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ﴾ [البقرۃ:۱۸۹] کہ چاند کا چھوٹا ہونا یا بڑا ہونا، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے کیا احکام ہیں؟
- ......اسی طرح سوال کیا: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ﴾ [البقرۃ:۲۱۹] کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کیا خرچ کریں؟

اسی طرح: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ﴾ [البقرۃ:۲۲۰] یتیموں کے بارے میں سوال کیا۔

اسی طرح اگر سارے قرآن پاک میں اسئلۂ صحابہ پر غور کیا جائے تو وہ ایسے سوالات ہیں کہ قیامت تک پوری امت کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہیں۔

اسی طرح ان سوالوں میں سے یہ ایک سوال تھا: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ﴾ [البقرۃ:۲۲۲] حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ عورت جب حیض کی حالت میں ہو تو اس وقت اس کے ساتھ مباشرت کرنے کا کیا حکم ہے؟

مسائلِ حیض:

سب سے پہلے یہ سمجھیں کہ عورتوں کو دو قسم کے خون آتے ہیں: ایک حیض کہلاتا ہے اور ایک نفاس کہلاتا ہے۔ حیض اس خون کو کہا جاتا ہے جو ہر مہینہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نظامِ قدرت سے عورت میں رکھا ہے کہ عورت جب بالغہ ہوتی ہے تو اس کو حیض آتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلٰى بَنَاتِ آدَمَ" اللہ تعالیٰ نے بناتِ آدم پر یہ چیز لازم کر دی ہے۔ اس میں اس کی بہت بڑی حکمتیں ہیں۔ آپ دیکھیں کہ اگر ایامِ حیض بند ہو جائیں تو عورتوں کے لیے بہت ساری تکالیف پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب عورت کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے تو اس کے ایام منقطع ہو جاتے ہیں اور اس کا پورا نظام تبدیل ہو جاتا ہے اور جسم ناکارہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

حیض کی مدت:

حیض کی مدت کے بارے میں کئی اقوال ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک کم سے کم تین دن ہے، یعنی تین دن سے کم حیض نہیں ہو سکتا۔ اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے۔ اگر دس دن کے بعد بھی خون نہ رک رہا ہو تو وہ استحاضہ کا خون ہوگا، بیماری ہوگی۔ اکثر عورتوں کی عادت مختلف ہوتی ہے، یعنی کسی عورت کی عادت پانچ دن کی اور کسی کی چھ دن کی عادت ہوتی ہے۔

حیض کی حالت کے احکام:

حالتِ حیض کے اندر عورت نہ تو نماز پڑھ سکتی ہے، نہ مسجد کے اندر داخل ہو سکتی ہے، نہ تلاوت کر سکتی ہے، نہ قرآن کو ہاتھ لگا سکتی ہے اور اسی طرح روزہ رکھنا بند ہو گیا، مگر باقی ذکر اذکار کر سکتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: اس کے اندر یہ احتیاط ہے کہ عورت ایامِ حیض میں اللہ تعالیٰ کے مفرد اسماء کا ذکر کرتی رہے؛ کیونکہ وہ ان دنوں میں پاک نہیں۔ اگر کوئی پڑھانے والی استانی ہے۔ اگر کوئی بچہ غلط پڑھ رہا ہو تو آیت کا کوئی حرف بتا سکتی ہے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں: اگر زبانی یاد ہو تو ہاتھ لگائے بغیر پڑھ سکتی ہے؛ اس لیے کہ حیض سے نکلنا اس کے اپنے ہاتھ میں تو نہیں۔ جنابت کی حالت میں عورت قرآن نہیں پڑھ سکتی اور مرد بھی جنابت کی حالت میں قرآن نہیں پڑھ سکتا جب تک غسل نہ کر لیں۔ کیونکہ جنابت سے نکلنا مرد اور عورت کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا حیض کی حالت میں عورت اللہ تعالیٰ کا

---

[1] [مسند احمد: ۲۶۵۳۸۵، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۹۵۰۷]

ذکر کر سکتی ہے، دعائیں بھی مانگ سکتی ہے، حتیٰ کہ ایامِ حج آجائیں تو وہ احرام بھی باندھ سکتی ہے۔ صرف نماز نہیں پڑھے گی اور طواف نہیں کرے گی؛ کیونکہ طواف بھی نماز کے حکم میں ہے۔ اور دوسرا یہ کہ طواف مسجد الحرام کے اندر ہوتا ہے اور عورت ناپاکی میں مسجد میں داخل نہیں ہوسکتی۔

حالتِ حیض میں عورت روزے بھی نہیں رکھ سکتی اور نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت یہ ہے کہ عورت روزے کی قضا کرے گی، لیکن نماز قضا نہیں کرے گی؛ کیونکہ زیادہ ہونے کی وجہ سے نمازوں کی قضا مشکل تھی تو اللہ تعالیٰ نے وہ معاف کر دیں۔

ایام مکمل ہونے کے بعد غسل میں تاخیر نہ کرے:

ایک عورت کی عادت پانچ دن کی تھی۔ پانچ دن گزر گئے، خون بند ہوگیا اور نماز کا وقت موجود تھا۔ اب وہ عورت سستی اور غفلت کر رہی ہے کہ کام سے فارغ ہو کر ایک ہی دفعہ نہالوں گی۔ یہ غلط بات ہے۔ جب عورت کے دن مکمل گزر جائیں، نماز کا وقت آئے تو فوراً غسل کرے؛ کیونکہ اگر اس نے نماز چھوڑ دی تو ترکِ صلوٰۃ کی مرتکب ہوجائے گی۔ اور اس سے بڑا گناہ اور وعید میں آجائے گی کہ جب بلیڈنگ بند ہوگئی تو اس پر فرض ہے کہ فوراً غسل کر کے نماز ادا کرے، تاکہ ذمہ سے نماز رہ نہ جائے اور قضا نہ ہوجائے۔ اسی طرح مثلاً: ایک عورت رات بارہ بجے پاک ہوگئی، اب وہ سستی کر رہی ہے کہ ابھی میں نے خاوند کے لیے سحری پکانی ہے، بچوں کے لیے کھانا بھی پکانا ہے، اس لیے میں صبح نہا دھولوں گی۔ یہ غلط بات ہے۔ اگر یہ روزہ چھوڑ دے گی تو گناہ گار ہوگی؛ کیونکہ اب وہ مجبور نہیں ہے، اس پر بھی قضا ہوگی اور گناہ بھی ہوگا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بلاوجہ چھوڑ دیا۔ اس لیے اس پر لازم ہے کہ وہ رات کو پاک ہوئی تو وہ روزہ کی نیت کر لے، اگرچہ صبح ہونے کے بعد غسل کرے۔

نفاس کے مسائل:

نفاس اس خون کو کہتے ہیں جو بچہ پیدا ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ اسقاطِ حمل ہوگیا تو خون جاری ہوگیا تو اس کو نفاس کہتے ہیں۔ اس کی اقل مدت متعین نہیں ہے۔

آج اغلاط العوام سے ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اگر عورت کے ہاں بچہ پیدا ہو تو چالیس دن گزارنا ضروری ہے، چالیس دن کے بعد وہ پاک ہوگی۔ یہ بالکل جہالت ہے۔ لوگوں نے یہ مسئلہ اپنی عقل سے خود گھڑا ہوا ہے۔ اصل

مسئلہ یہ ہے کہ بچہ ہونے کے بعد جب خون بند ہو جائے، چاہے ایک دن کے بعد بھی خون بند ہو جائے تو وہ عورت پاک ہو جائے گی، نماز پڑھے گی، روزے رکھے گی اور میاں بیوی ملیں، کوئی پابندی نہیں۔

چالیس دن کا مسئلہ یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد خون آرہا ہے، اسی طرح چالیس دن تک ہم انتظار کریں گے۔ اگر چالیس دن کے اندر خون بند ہو جائے تو عورت پاک ہو جائے گی اور اگر خون بند نہ ہو تو چالیس دن تک دیکھیں۔ اگر چالیس دن کے بعد بھی خون بند نہ ہوا تو چالیس دن کے بعد عورت غسل کر کے پاک ہو جائے، چاہے خون آرہا ہو۔ اب وہ خون نفاس کا نہیں ہے، بلکہ یہ بیماری کا خون ہے۔

صحابہ ؓ فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں بعض عورتیں ایسی تھیں کہ غسل کرنے کے لیے برتن میں بیٹھتیں تو برتن خون سے بھر جاتے تھے، لیکن چالیس دن کے بعد وہ روزہ رکھتی اور نماز پڑھتی تھیں، چاہے اس کے بعد خون آرہا ہو؛ کیونکہ وہ خون بیماری کا ہے، نفاس کا نہیں ہے۔ جیسے مرد کو اگر بواسیر کا خون آرہا ہو تو وہ نماز نہیں چھوڑ سکتا، اسی طرح کسی عورت کو بیماری ہو گئی تو فرق کیا جائے گا ایامِ حیض کے احکام کا، ایام نفاس کا اور استحاضہ کے احکام کا کہ اگر دس دن گزرنے کے بعد بھی خون آرہا ہو تو اب نماز بھی پڑھے گی اور روزہ بھی رکھے گی۔ اگر عورت کو ایامِ حیض میں دس دن گزرنے کے بعد بھی خون آرہا ہو تو وہ بیماری شمار ہو گی، حیض شمار نہیں ہو گا؛ کیونکہ دس دن سے زیادہ حیض نہیں ہو سکتا اور تین دن سے کم بھی حیض نہیں ہو گا۔

حیض کے ایام میاں بیوی کے مسائل:

سوال کرنے کی وجہ کیوں پیش آئی؟ جب حضور اکرم ﷺ کے صحابہ مدینہ منورہ میں تشریف لے آئے۔ حضور پاک ﷺ کے آنے سے پہلے مدینہ کے اندر یہودی آباد تھے: بنونضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع وغیرہ۔ ان کے بڑے قبائل آباد تھے، جو شام سے ہجرت کر کے مدینہ آباد ہوئے تھے۔ (کیونکہ انہوں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ ایک نبی پیدا ہوں گے، جن کا نام محمد رسول اللہ ﷺ ہو گا وہ یہاں ہجرت کر کے تشریف لائیں گے تو وہ اس لیے شام سے مدینہ آئے، تاکہ ہم ان کے ہاتھ پر بیعت ہو کر مسلمان ہو جائیں اور اسلام لے آئیں، لیکن جب حضور اکرم ﷺ تشریف لائے تو یہودی حسد کا شکار ہو گئے کہ نبوت بنی اسرائیل سے نکل گئی۔ بہر حال یہ یہودی مدینہ منورہ کے اندر رہتے تھے اور یہ اقتصادی طور پر مضبوط تھے۔) یہود کی یہ عادت تھی کہ جب عورت کو حیض آ جاتا تو

یہود عورت کو بالکل علیحدہ کر دیتے تھے کہ اس کا کمرہ بھی الگ، اس کے برتن بھی الگ، اس کا کھانا پینا بھی الگ اور اس کا لباس وغیرہ ہر چیز الگ کر دیتے تھے کہ یہ عورت ناپاک ہوگئی ہے۔ اس کا کسی چیز کو ہاتھ لگ گیا تو وہ چیز بھی ناپاک ہوجائے گی۔ جب عورت پاک ہوجاتی تو اس کی استعمال شدہ ہر چیز پھینک دی جاتی تھی اور عورت گھر میں آجاتی تھی۔

ہندوؤں میں بھی اب تک ایسی باتیں موجود ہیں۔ اور بعض مسلمانوں میں بھی کہ بچوں کو چیچک نکل آتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس کے بچے کو سامنے نہ آنے دو، ورنہ اس کی بیماری بڑھ جائے گی۔ یہ ساری باتیں مسلمانوں کے اندر ہندوؤں سے آئی ہیں؛ کیونکہ ہندو اور مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ مسلمانوں کی تہذیب نے ان پر اثر نہیں کیا؛ کیونکہ کچھ لوگ تو نام کے مسلمان تھے، لیکن ان ہندوؤں کی تہذیب ان کے اندر داخل ہوگئی۔ ہندوؤں کا آج بھی یہی عقیدہ ہے کہ حیض والی عوت کو دور کر دو، اب عورت سامنے نہ آئے۔ اس کے برتن علیحدہ، کھانا علیحدہ، کپڑے علیحدہ، اٹھنا، بیٹھنا اور لیٹنا سب علیحدہ ہو؛ کیونکہ اب وہ عورت ناپاک ہے۔

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ پہنچے تو اب دو خیال پیدا ہوئے کہ ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں تھے وہاں زیادہ توحید کا درس ہوتا رہا۔ مدینہ منورہ جانے کے بعد شریعت کے احکام آئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ حالتِ حیض میں ہم اپنی عورتوں کے ساتھ کیا برتاؤ کریں؟ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم یہودیوں کے دشمنی میں اتنے سخت ہوگئے تھے کہ انہوں نے کہا: یہ یہودی حالتِ حیض میں عورت کو بالکل علیحدہ کر دیتے ہیں، ہم ان کی مخالفت کرتے ہیں، اس لیے ہم حالتِ حیض میں اپنی بیویوں سے جماع کرلیا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی! اپنے صحابہ کو بتادو: یہودیوں کی دشمنی کا معنی یہ نہیں کہ اپنی شریعت بدل ڈالو۔ اگر عورت حیض میں ہے تو اس کے ساتھ کھانا جائز، لیٹنا جائز، بیٹھنا جائز، میاں بیوی کا پیار کرنا اور محبت کرنا جائز اور ایک رضائی کے اندر لیٹنا جائز ہے، لیکن جماع نہیں کر سکتے۔ "قُلْ هُوَ اَذًى" کیونکہ وہ خون گندگی ہے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو گندگی سے دور رکھا ہے۔ اور اس کا معنی یہ بھی نہیں کہ یہودیوں کی طرح عورت کو نکال دو کہ ناپاک ہوگئی۔

اب جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ پہنچے تو ان کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ ایک تو خیال یہ پیدا ہوا کہ انہوں نے سوال کیا: ہم کیا کریں؟ ہمارے لیے کیا حکم ہے کہ جب عورت حیض میں آجائے تو ہم اپنی عورتوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کریں؟ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہودیوں کی دشمنی میں اتنا سخت ہوگئے تھے کہ انہوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے

سوال کیا کہ یہ یہود حالتِ حیض میں عورتوں کو بالکل علیحدہ کر دیتے ہیں، ہم ان کی مخالفت کیوں نہ کریں؟ اور ہم حالتِ حیض میں ان کے ساتھ جماع بھی کرلیا کریں، حالتِ حیض میں میاں بیوی مجامعت کر سکتے ہیں یا نہیں کر سکتے؟

اب دیکھیں کہ اسلام کتنا پاک مذہب ہے کہ اس کی ہر چیز میں پاکی ہے کہ عورت کے ایامِ حیض جب ختم ہو گئے، مثلاً: چھ دن کی عادت ہے اور رات پوری ہونے پر پاک ہونے والی ہے۔ رات گزرے گی تو وہ فارغ ہو جائے گی، تو آخر میں حکم یہ ہے کہ عورت کپاس اپنے بدن میں رکھے، تاکہ تسلی ہو جائے کہ کوئی خون یا سفید رنگ کے علاوہ کا پانی باقی تو نہیں۔ اور اس کے بعد پھر خوشبو والی کپاس رکھے، تاکہ اندر کی بدبو نچڑ جائے اور اس کا بدن صاف ہو جائے۔ اسی طرح جیسے عرب کے اندر رواج ہے کہ انگارے جلا کر اس پر عود یا لوبان وغیرہ رکھتے ہیں، اس سے خوشبو دار دھواں پیدا ہوتا ہے تو یہ جلا کر عورت اس کے اوپر کھڑی ہو جائے، تاکہ پورے بدن کے اندر خوشبو آ جائے اور عورت کا گندا پانی نیچے گر جائے اور عورت پاک ہو جائے۔ تو اسلام نے کتنا نظافت والا انظام دیا ہے۔

اللہ پاک نے فرمایا کہ اے میرے محبوب! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتا دو کہ یہودیوں کی دشمنی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی شریعت بدل لیں، بلکہ وہ اِفراط میں پڑ گئے ہیں۔ اگر عورت حیض میں ہے تو اس کے ساتھ کھانا جائز، لیٹنا جائز، بیٹھنا جائز، میاں بیوی کا محبت پیار کرنا جائز، ایک رضائی کے اندر اکٹھے لیٹنا جائز اور بوسہ دینا جائز، صرف جماع نہیں کر سکتے۔ حالتِ حیض میں میاں بیوی ہر عمل کر سکتے ہیں، لیکن جماع نہیں کر سکتے؛ کیونکہ وہ خون ہے، گندگی ہے اور اللہ پاک نے مسلمانوں کو گندگی سے دور رکھنا ہے۔ اور یہ معنی بھی نہیں کہ یہودیوں کی طرح عورت کو گھر سے نکال دو کہ جی! ناپاک ہو گئی۔ اگر عورت حیض میں ہے اور اس نے کھانا پکایا ہے تو کھاؤ؛ کیونکہ اس کے ہاتھوں میں حیض تھوڑی ہے۔

حدیث: حضور سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ مجھے مصلّی دے دو۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: "أَنَا حَائِضٌ"۔ یا رسول اللہ! میں حیض میں ہوں، تو میں مسجد سے مصلّی کیسے اٹھاؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تمہارے ہاتھوں میں حیض ہے؟ کمرے میں بیٹھے بیٹھے مصلّی اٹھا لو (کیونکہ کمرہ مسجد کے قریب تھا)۔ اسلام نے عدل والا حکم دیا ہے کہ نہ تو یہودیوں کی طرح حالتِ حیض میں عورت سے نفرت کرو اور نہ حد سے تجاوز کرو کہ حالتِ حیض میں بھی جماع کرلو۔

اگر حالت حیض میں جماع کرلیا تو توبہ کریں اور ایسے گناہ سے بچنے کی کوشش کریں جس سے اللہ تعالیٰ نے قرآن

میں منع کیا ہے۔ اور فرمایا کہ گندگی ہے، اس سے بچو۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر میاں بیوی نے غلطی کی تو توبہ بھی کریں اور کچھ صدقہ بھی کریں، حتیٰ کہ بعض علماء نے بعض احادیث کے پیشِ نظر یہ بھی لکھا ہے کہ دیکھا جائے کہ انہوں نے غلطی کب کی ہے؟ جب حالتِ حیض کا زور تھا یا ختم ہونے والا تھا؟

حیض کے غسل سے قبل حقوقِ زوجیت ادا کرنا:

عورت کا حیض رات کو پورا ہو گیا، لیکن ابھی عورت نے غسل نہیں کیا۔ میاں بیوی کہتے ہیں کہ غسل تو ویسے بھی کرنا ہے، چلو مجامعت بھی کر لیں، صبح غسل حیض والا بھی ہو جائے گا اور مجامعت والا بھی ہو جائے گا۔ یہ بھی حرام ہے۔ جب تک وہ پاک نہ ہو جائے میاں بیوی کا لیٹنا حرام ہے: کیونکہ حکم ہے کہ ﴿فَإِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ [البقرۃ:۲۲۲] جب عورتیں پاک ہو جائیں۔ اور وہ غسل کریں گی تو پاک ہوں گی۔

ہاں! اگر عورت کا حیض اس کی پوری مدت پر ختم ہوا ہے تو غسلِ حیض سے پہلے بھی جماع کرنا جائز ہے۔ ویسے بھی طبی نقطۂ نظر سے باقاعدہ کتابوں میں یہ بات ثابت ہے کہ اگر حالتِ حیض میں میاں بیوی ملیں تو دونوں کو ایک خطرناک بیماریاں ہو جاتی ہیں، مثلاً: سوزاک آتشک ہو جاتی ہیں، کبھی ایسی بیماریاں ہو جاتی ہیں کہ عورت بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ مجامعت کے وقت اگر کچھ گندا خون مرد کے عضوِ تناسل میں داخل ہو گیا تو اس سے سوزاک ہو جاتی ہے۔ اس لیے اسلام نے اس سے منع فرما دیا کہ ایسا کام نہ کریں۔ اور اس کے بعد صدقہ خیرات بھی کر دیں اور آئندہ ایسی حرکت بالکل نہ کریں۔

مسئلہ: ﴿فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ﴾ [البقرۃ:۲۲۲] جب وہ عورت پاک ہو جائے تو اب تم اپنی بیوی سے جماع کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم کو حکم دیا ہے۔ آگے اس حکم کی وضاحت فرما دی: ﴿نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ﴾ [البقرۃ:۲۲۳] کہ تمہاری بیویاں تمہارے لیے ایسی ہیں جیسے کھیتی ہوتی ہیں۔ جیسے کھیتی میں بیج ڈالتے ہو اور پھل آتا ہے، اسی طرح نطفہ تخمِ انسانی ہے۔ اور جب اس سے بچہ بچی ہو گی تو وہ پھل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اپنی کھیتی والی جگہ سے تم اپنی عورت سے جماع کرو جس طرح چاہو۔

اس سے بعض لوگوں نے یہ لے لیا ہے کہ دبر میں بھی جماع جائز ہے۔ وہ لفظ ''أَنَّىٰ'' سے دلیل پکڑتے ہیں، حالانکہ اسی آیت کے اندر دو لفظ ہیں: ایک ﴿فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ﴾ اور دوسرا لفظ: ﴿حَرْثٌ

لَّكُمْ﴾ ہے۔ الٹی طرف کھیتی کی جگہ ہی نہیں، وہاں سے تو بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ تو الٹی جگہ جانا بھی حرام ہے۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''مَلْعُوْنٌ مَنْ أَتَى امْرَأَةً فِيْ دُبُرِهَا''[1] وہ آدمی لعنتی ہے جو اپنی عورت سے الٹی طرف سے جماع کرتا ہے۔

اسی طرح حضور پاک ﷺ نے فرمایا: یہ عمل قوم لوط کا ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ فاعل و مفعول دونوں کو قتل کر دو۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں: قتل کرنے کے بعد آگ میں ڈال دو۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی لواطت کرے یا خاوند اپنی عورت کے دبر میں لواطت کرے تو اس پر تعزیر یعنی شریعت میں کوئی مقرر سزا نہیں ہے، حاکم جو مناسب سمجھے سزا دے سکتا ہے اور اس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔

﴿أَنّٰى شِئْتُمْ﴾ کا معنی:

باقی ﴿أَنّٰى شِئْتُمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ یہ تمہارے لیے پابندی نہیں ہے کہ تم لیٹ کر مجامعت کرو، تم کروٹ کے بل مجامعت کرو، تم کھڑے ہو کر مجامعت کرو، تم بیٹھ کر مجامعت کرو اور عورت کو اپنے اوپر لٹا کر مجامعت کرو، وہ تمہاری مرضی ہے جس طرح تم چاہو اس سے لذت حاصل کرو۔ خبردار! جگہ وہی استعمال کرنی ہے جو کھیتی والی ہے۔ اگر اس کے علاوہ تم نے تجاوز کیا تو تم پر لعنت بھی ہوگی اور تم عذاب کے مستحق بھی ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر بات ہمیں سمجھا دی ہے، تاکہ ہم قیامت تک کسی غلطی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

آج کل جو فلمیں اور بلیو پرنٹ کے عذاب آئے ہیں...... دعا کریں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے گھرانوں کی حفاظت فرمائے! اللہ تبارک و تعالیٰ مسلمانوں کے بچوں اور بچیوں سب کی حفاظت فرمائے! ان کو ہدایت دے اور قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق دے...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... اب تو ایسے ایسے طریقے ایجاد کئے جاتے ہیں، شیطان وہاں سے خود بھی بھاگ جائے کہ یہ تو میرے بھی باپ ہیں، مجھے یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے!!

بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ لوگ فسق و فجور میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ پہلے شیطان ان کو بہکانے کا انتظار کرتا تھا، لیکن اب شیطان ان کے پاس روزانہ حاضر ہو کر کام سیکھتا ہے کہ مجھے حکم دو: آج میں کیا ڈیوٹی دوں؟ اب تو انسان اتنا آگے جا چکا ہے...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... ایسی ایسی باتیں ہیں سن کر شرم آتی ہے کہ کتنے لوگ

[1] [سنن ابی داود، رقم: ۲۱۶۲، باب: فِي جَامِعِ النِّكَاحِ]

آکر مسئلہ پوچھتے ہیں کہ اگر بیوی کا دودھ حلق میں چلا جائے تو اس کا کیا مسئلہ ہے؟ جبکہ آج سے تیس سال پہلے اگر خاوند ایک برتن میں دودھ پیا ہوتا اس برتن میں بیوی کو دودھ بھی نہیں پینے دیتے تھے، (حالانکہ یہ شریعت کے اندر حرام نہیں تھا) وہ اتنا ڈرتے تھے کہ میں کیسے پی لوں؟

یاد رکھیں! لذت بھی حلال میں ہے اور اسلام کے طریقوں کے اندر ہے۔ اگر آپ عورت کو عریان کر کے بٹھا دو تو اس کو کتنی دیر تک دیکھو گے؟

حضرت بلھے شاہ فرماتے تھے: اگر عورت تجھ پر مہربان ہو جائے تو آخری مہربانی یہی کرے گی کہ پیشاب کا برتن تمہیں دے گی کہ آؤ! تم بھی اس سے جو حاصل کرنا چاہو حاصل کر لو۔

صحبت کے وقت کی دعا:

﴿وَقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ﴾ یعنی جب تم میاں بیوی مجامعت کرو تو اس وقت دعا کرو: ''بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ! جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا'' [بخاری، رقم: ۱۴۱] اے اللہ! شیطان کے حملے سے ہمیں بچانا اور اس سے جو اولاد پیدا ہو اس کو بھی شیطان کے حملہ سے بچانا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ﴾ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جان لو کہ تم نے اپنے اللہ کے آگے جانا ہے۔ تیری ہر حرکت اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تم بیوی کو کیسے استعمال کرتے ہو کہ تم نے اس کو بیوی بنایا ہوا ہے یا گھر میں طوائف اور کنجری بنایا ہوا ہے؟

آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۲۳] کہ میرے مدنی! ایمان والوں کو خوشخبری دے دو۔ دعا کریں! اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایمان والا بنائے، اللہ تعالیٰ ہمارے بچوں کو بھی ہدایت دے اور اللہ تعالیٰ سب کو اطاعتِ والدین نصیب فرمائے۔

﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۲۴، ۲۲۵]

"اور اللہ کو اپنی قسمیں کھانے کا نشانہ نہ بناؤ کہ نیکی کرنے سے اور پرہیزگاری سے اور لوگوں کے درمیان صلح کرانے سے بچ جاؤ۔ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ اللہ تمہاری ناکارہ قسموں پر مؤاخذہ نہیں کرے گا، لیکن اس قسم پر مؤاخذہ کرے گا جس کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا ہے۔ اور اللہ بخشنے والا تحمل والا ہے۔"

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور مسئلہ سمجھایا ہے کہ تم اپنی قسموں کو ڈھال نہ بناؤ جو تمہاری نیکی سے اور اصلاح کرنے سے حجاب نہیں۔ اللہ تعالیٰ سننے والے اور جاننے والے ہیں۔

قسم کے مسائل:

بعض اوقات آدمی قسم کھا بیٹھتا ہے کہ میں اپنی بیوی سے بات نہیں کروں گا، حالانکہ بیوی کے ساتھ بات کرنے کا حکم ہے، جیسا کہ عورت کے ذمہ مرد کے حقوق ہیں کہ مرد کی اطاعت کرے۔ جب اس پر مرد کی نظر پڑے تو مرد کو خوشی حاصل ہو، یعنی وہ اپنے لباس کو اور اپنی شکل کو اچھا رکھے، تا کہ مرد کو خوشی میسر ہو۔ اور اگر مرد غائب ہو جائے تو اس کے مال کی حفاظت کرے، بچوں کی نگرانی کرے، ان کو وقت پر مدرسہ کے لیے، سکول کے لیے تیار کرتا ہے۔ اسی طرح خاوند کے ذمہ ہے کہ بیوی کے نان نفقہ کا خیال رکھے، اس کے لباس کا خیال رکھے، اس کی رہائش کا خیال رکھے اور اس کے جائز اخراجات ادا کرے۔

اگر کوئی آدمی قسم کھالے کہ میں بیوی سے بات نہیں کروں گا، یا قسم کھالے کہ میں بھائی کے گھر نہیں جاؤں گا، یا قسم کھالے کہ میں اپنے فلاں بھائی کی مدد نہیں کروں گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھا کر نیکی سے رکنا چاہتے ہو اور قسموں کو ڈھال بنانا چاہتے ہو کہ اب میں نے تو قسم کھالی ہے، اب میں کیا کروں؟ اگر کوئی آدمی اسے کہے کہ تم ہمیشہ غریب کی مدد کرتے تھے، اب کیا وجہ ہے کہ تم نے اس کی مدد کرنا چھوڑ دی ہے تو وہ کہے کہ مجھے اس سے تکلیف ہوئی تو میں نے قسم کھالی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قسموں کو ڈھال مت بناؤ کہ اس کی وجہ سے تم نیکی کے کام چھوڑ دو۔

روایات میں آتا ہے جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر یہودیوں نے تہمت لگائی تو اس زمانہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس پروپیگنڈا کا شکار ہو کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے، جیسے حضرت مسطح رضی اللہ عنہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ شریک ہو بیٹھے، حالانکہ وہ عدول صدوق ہیں، "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" ہیں، لیکن یہ فطری بات ہے کہ جب آپ کوئی بات چھیڑ دیں،

چاہے وہ بات جھوٹی ہے، لیکن اس کے اثر میں بعض لوگ آجاتے ہیں۔ بہر حال...... الحمدللہ...... بات ختم ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل کردی جو قیامت تک قرآن میں پڑھی جائے گی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کی مدد فرماتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غصہ میں آگئے کہ آج کے بعد ان کی مدد نہیں کروں گا؛ کیونکہ وہ میری بیٹی پر تہمت لگانے میں شریک ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں۔

احادیث میں ایک اور واقعہ بھی آتا ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاں مہمان آئے، مگر آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دیر ہوگئی۔ گھر والوں نے مہمانوں کو کھانا بھجوایا تو انہوں نے کہا: ''لَا نَأْكُلُ حَتّٰى يَأْتِيَ أَبُوْبَكْرٍ'' (ہم کھانا نہیں کھائیں گے جب تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نہ آجائیں)۔ گھر والوں نے کہا: ان کو دیر ہوسکتی ہے؛ کیونکہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہیں۔ آدمی جب اپنے محبوب کی خدمت میں ہوتا ہے تو کیسے دل چاہے گا کہ اس کو چھوڑ کر چلا جاؤں؟ مہمانوں کو جب اصرار کیا گیا تو انہوں نے کہا: ''وَاللّٰهِ! لَا نَأْكُلُ'' ہمیں اللہ تعالیٰ کی قسم ہے! ہم اس وقت تک کھانا نہیں کھائیں گے جب تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف نہ لائیں گے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گھر میں تشریف لائے تو گھر والوں سے سب سے پہلے یہی پوچھا کہ کیا مہمانوں کو کھانا مل گیا؟ انہوں نے عرض کیا: مہمان نہیں کھاتے، ہم نے بڑا زور لگایا، لیکن انہوں نے قسم کھالی کہ اللہ کی قسم ہے! ہم نہیں کھائیں گے جب تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف نہ لے آئیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی غصہ میں آگئے، کہنے لگے: میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھا۔ یہ اچھے مہمان ہیں کہ قسم کھالی۔ میں ان کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر آجاتا؟ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی قسم کھا کر فرمایا: مجھے اللہ کی قسم ہے! میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اگر میری وجہ سے نہیں کھاتے تو میں بھی نہیں کھاتا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیوی نے بھی قسم کھالی کہ جب مہمان بھی کھانا نہیں کھاتے، گھر کا مالک بھی کھانا نہیں کھاتا، لہٰذا مجھے بھی اللہ کی قسم ہے! میں بھی کھانا نہیں کھاؤں گی۔ تھوڑی دیر گزرنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو احساس ہوا کہ یہ عجیب بات ہوگئی کہ میں بھی بھوکا رہوں، گھر والے بھی بھوکے رہیں اور مہمان بھی بھوکے رہیں، لہٰذا میں قسم توڑتا ہوں۔ کھانا لے آؤ، کھانا کھاتے ہیں۔ مہمانوں کے پاس کھانا لے آئے اور کھانا کھایا۔ صبح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر یہ سارا واقعہ عرض کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے اچھا کیا۔ اگر کوئی آدمی ایسے قسم کھا بیٹھے تو اس کو ایسی قسم توڑ

دینی چاہیے۔

قسم کا کفارہ:

ایسی قسم توڑنے کی صورت میں اسلام نے کفارہ رکھا ہے۔ یاد رکھیں! بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے مرضی آئے قسم کھالیں، بعد میں کفارہ دے دیں گے۔ یہ غلط بات ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ......نعوذ باللہ...... استہزاء اور کھیلنے والی بات ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی بات ہے۔ قسم توڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ایسی قسم کھائی، اس کام کے متعلق جس کا کرنا ضروری تھا اور تم نے بے وقوفی کر کے قسم کھالی کہ میں نہیں کروں گا، مثلاً: قسم کھالی کہ میں باپ کے گھر میں نہیں جاؤں گا۔ اگر کوئی آدمی ایسی غلطی کر بیٹھے تو اسلام نے اس سے نکلنے کا حل رکھا ہے: ﴿فَكَفَّارَتُهُۥٓ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَٰكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ﴾ [المائدۃ:۸۹] کہ تم دس مسکینوں کو کھانا کھلا دو اور آئندہ ایسی بات نہ کرو۔

لغو قسم کے مسائل:

ان آیات کے اندر دوسرا مسئلہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ﴿لَّا يُؤَاخِذُكُمُ ٱللَّهُ بِٱللَّغْوِ فِىٓ أَيْمَٰنِكُمْ﴾ آدمی کی قسم کھانے کی نیت نہیں تھی، لیکن بلاوجہ قسم کھالی، یا ایسے کام پر قسم کھالی یا قسم کھانے کا ارادہ نہیں ہے، لیکن قسم کھا بیٹھا اور یہ سمجھتا تھا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں، حالانکہ وہ حقیقت میں سچ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ ایسی قسموں پر تمہیں نہیں پکڑیں گے، سزا نہیں دیں گے: ﴿وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ لیکن وہ قسمیں جو تم نے دلی طریقے سے عزم کے ساتھ کھائی ہیں کہ جان بوجھ کر تم نے جھوٹی قسم کھائی، اس پر اللہ تعالیٰ پکڑتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ سمجھیں کہ قسم کھانے سے بچیں، بلاوجہ بھی قسم نہ کھائیں، لغو قسموں پر چاہے اللہ تعالیٰ نہ پکڑیں؛ کیونکہ یہ پسندیدہ عمل نہیں ہے۔

اگر کسی بات پر قسم کھائی ہے اور وہ بھلائی کا کام ہے تو اس قسم کا کفارہ ادا کریں اور بھلائی کا کام نہ چھوڑیں۔ جیسا کہ کسی کو کہا جائے کہ مسجد میں نماز کے لیے جاؤ تو وہ کہے گا: میں نہیں جاتا؛ کیونکہ میرا اس مولوی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں نے قسم کھائی تھی، میں اس مسجد میں نہیں جاؤں گا۔ یعنی قسم سے ڈر رہا ہے اور نماز کا تارک بن رہا ہے۔ جیسا کہ آج کل لوگ بعض چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تو بچتے ہیں اور بڑی چیزوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو ایسی قسم کو توڑ

دے، اس کا کفارہ ادا کرے اور نماز کے لیے مسجد میں جائے۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ [البقرة:۲۲۵] اللہ تعالیٰ بخشنے والے بھی ہیں اور حلم والے بھی ہیں، یعنی جلدی سے ہمیں گناہوں پر سزا نہیں دیتے۔ اگر ہمیں ہر گناہ کی سزا دیں تو کوئی آدمی ہمیں زمین پر چلتا پھرتا ہوا نظر نہ آئے۔

قسم کھانے سے ہمیشہ بچیں! ہمارے دیہاتوں میں ایک مسئلہ بڑا مشہور ہے کہ قسم نہ کھا نا حق لگی ہے۔ یہ خدا پر کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ وہ تو لغو قسم پر نہیں پکڑتے تو اگر ہم سچی بات پر قسم کھائیں تو وہ کیوں ناراض ہوں گے؟ بلکہ اس میں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت آتی ہے کہ ہم نے سچی بات کی ہے۔ جھوٹی قسم پر اللہ تعالیٰ پکڑتے ہیں اور پکڑنے میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ آدمی نے جھوٹی قسم کھائی اور اسی وقت ہلاک ہوا اور بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ آدمی نے جھوٹی قسم کھائی، مدت گزر گئی، بندہ بھول گیا، اس وقت اس کو سزا ملی اور اس کو یاد بھی نہیں کہ مجھے اس کی سزا مل رہی ہے۔

ظالم کو سانپ کھا گیا:

(واقعہ) ہمارے اپنے علاقے کی عدالت میں قتل کا مقدمہ پیش ہوا، چونکہ مثل میں کچھ نہیں تھا، عدالت مجبور ہوتی ہے؛ کیونکہ وہ آن ریکارڈ فیصلہ کرتی ہے کہ گواہ کیا کہتے ہیں؟ جج نے سب وکلاء کے سامنے کہا: چونکہ ریکارڈ میں اس قاتل کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میں اس کو سزا دے سکوں، لیکن میری تحقیق میں یہ قاتل ہے۔ اور اس قاتل کو کہا: میں تجھے بری کر رہا ہوں، تمہارا مقدمہ ختم ہو گیا، لیکن ایک بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ مظلوم کا بدلہ خود لیتے ہیں۔ جب تک ورثاء مقتولین معاف نہ کر دیں۔ بہر حال وہ تو اس قسم کا آدمی تھا، وہ بری ہو گیا۔ عدالت کے باہر اس کے دوست اس کا شاندار استقبال کرتے ہوئے اسٹیشن پر لے آئے۔ جہاں اترے وہاں دو میل کے فاصلے پر ان کا گھر تھا۔ رات کو ٹرین پہنچی۔ وہاں مشورہ ہوا کہ ساری پارٹی پیدل چلے۔ کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ سانپ نے اس کو ڈس لیا اور وہ قاتل موقع پر ہی مر گیا۔

غیر اللہ کی قسم کھانے کا حکم:

قسم صرف اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے ساتھ کھا سکتے ہیں، اس کے علاوہ کی کوئی قسم کھائے تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ شرک کیا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں بعض جاہل لوگ پیر کی قسم، پیر کے آستانے کی قسم کھاتے

ہیں، یا اپنی اولاد کی قسم کھاتے ہیں۔ اور یہ بات تو عام ہے کہ مجھے اپنے رزق کے اڈے کی قسم ہے! یہ شرک ہے، چھوٹا گناہ نہیں ہے۔

"مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ كَفَرَ" اور ایک روایت میں ہے "أَشْرَكَ"[1] کہ شرک بن جاتا ہے؛ کیونکہ قسم اس چیز کی کھائی جاتی ہے جس کی دل میں عظمت ہو۔ اگر دل میں عظمت نہ ہو تو آدمی اس کی قسم نہیں کھاتا۔ آپ نے کبھی پلاسٹک کے گلاس کی قسم نہیں کھائی، آپ کعبہ کی قسم کھائیں گے؛ کیونکہ اس کی دل میں عظمت ہے۔ آپ قرآن کی قسم کھائیں گے کہ دل میں اس کی عظمت ہے۔

جب آدمی قسم کھاتا ہے اس کے دل میں یقین ہوتا ہے کہ اگر میں نے جھوٹی قسم کھائی تو لازماً مجھے نقصان ہوگا۔ اور نفع ونقصان دینے والا اللہ ہے۔ اب اگر کسی نے پیر کے مزار کی قسم کھائی، پیر کی قسم کھائی تو اس کا عقیدہ یہ بن گیا کہ اگر میں نے جھوٹی قسم کھائی تو پیر نقصان دے گا۔ اور بعض لوگوں کا تو...... نعوذ باللہ...... یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جھوٹی قسم کھالو، پھر بھی کچھ نہیں ہوتا، پیر کے نام کی جھوٹی قسم نہ کھانا وہ فوراً ماردیتا ہے۔ اندازہ لگائیں کہ اگر ایک آدمی کو کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کی قسم کھاؤ وہ دس قسمیں کھالے گا اور اگر اس کو کہا جائے کہ بیٹے کے نام کی قسم کھاؤ تو نہیں کھائے گا کہ میرا بیٹا مر جائے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ بیٹے کی عظمت خدا کی عظمت سے بڑھ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تو آدمی نے جھوٹی قسم کھالی اور دوسرا کافر و مشرک بن گیا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان چیزوں سے منع فرمادیا۔

ربطِ آیات کی اہمیت:

اس سے پہلے حیض کا مسئلہ تھا اور اب قسم کا مسئلہ ہے۔ اصولی بات یاد رکھیں کہ قرآن ایک دن میں نہیں اترا، بلکہ تئیس سال کی مدت میں قرآن اترا ہے اور اس انداز میں اترا ہے کہ جہاں جہاں کوئی واقعہ پیش آیا اللہ تعالیٰ نے قرآن اتار دیا۔ اس لیے ہمیں ربط کے ڈھونڈنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قرآن میں اوامر ہیں، اس میں نواہی ہیں۔

دیکھیں! ایک بادشاہ کے دربار میں سارا دن بہت سارے احکامات جاری ہوتے ہیں۔ اب اگر شام کو کوئی ان سارے احکامات کی لسٹ بنا کر ربط بنا تا رہے تو وہ کہے گا: عجیب بات ہے کہ ایک آرڈر میں ہے کہ اس کو قتل کر دو اور

[1] [جامع الترمذی: ۱/ ۲۹۰، سنن ابی داود، رقم: ۳۲۵۱]

دوسرے میں ہے کہ اس کو بلڈنگ دے دو، جبکہ سمجھدار آدمی کہے گا کہ یہ تو بادشاہ کا آرڈر ہے۔ جیسے جیسے فائلیں پیش ہوتی گئیں، حکم آتا گیا۔ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جیسے جیسے واقعات آتے گئے اللہ تعالیٰ ان کا حل بیان فرمادیا۔ علماء نے لکھا ہے کہ پہلے تو ہمیں ایسے واقعات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ ایک صحابی نے آکر پوچھا: ﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة:۲۱۷] کہ شہر حرام میں جہاد کے کیا معنیٰ ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے وہ آیت اتار دی۔ اور کسی صحابی نے پوچھا: ﴿يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ﴾ [البقرة:۲۱۵] کہ ہم کتنی خیرات کریں؟ اور کسی نے پوچھا: ﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ﴾ [البقرة:۱۸۹] کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں کیا حکمت ہے؟

قرآن کی ایک ترتیب نزولی ہے اور ایک ترتیب قراءت ہے۔ نازل ہونے کی ترتیب الگ ہے اور پڑھنے کی ترتیب الگ ہے۔ لیکن بعض علماء نے ربط کی کوشش کی ہے؛ کیونکہ مستشرقین اعدائے اسلام، خاص طور پر: یہودی، نصرانی، ہندو، بڑے بڑے دہریے اور بڑے بڑے شیوعین جو اللہ تعالیٰ کے قرآن کے دشمن ہیں، اسلام کے دشمن ہیں وہ ایسی باتیں کر کے نوجوان نسل کے دماغوں کو خراب کرتے ہیں کہ قرآن اگر اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس میں تو ربط ہی نہیں ہے۔ پہلے حیض والی عورتوں کا قصہ جارہا تھا، آگے قسم کے بارے میں آگیا ہے۔ حالانکہ ایک عالم آدمی ہو، اس کے کلام میں بھی جوڑ ہوتا ہے۔ اور مسلمان کہتے ہیں: قرآن خدا کا کلام ہے تو اس میں ربط کیوں نہیں ہے؟ اس لیے بعض علماء نے محنتیں فرمائی ہیں اور اس پر باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں اور ایک سورت کا دوسری سورت کے ساتھ ربط پیدا کیا ہے اور اسی طرح اوّل سورت کا آخری سورت کے ساتھ ربط کیا ہے؟ اور آیات میں آپس میں کیا تعلق ہے؟ اس پر علماء نے تفسیریں لکھی ہیں۔ جیسے ایک مشہور حدیث ہے: ''نَظْمُ الدُّرَرِ فِي رَبْطِ الْآيَاتِ وَالسُّوَرِ'' اب طبع ہو چکی ہے، جو کبھی نادر تھی۔

علماء نے یہاں بھی ربط بیان فرمایا کہ جب ایامِ حیض ہوتے ہیں تو میاں بیوی میں وہ قربت نہیں ہوتی جو حالتِ طہارت میں ہوتی ہے۔ اور آگے قسم کا بیان ہے۔ اس میں آگے جب آپ پڑھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ مسئلہ ایلاء عورتوں کے متعلق آرہا ہے اور حیض کے مسئلے کا تعلق بھی عورت کے ساتھ ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا قرآن آپس میں جڑا ہوا ہے، جیسے موتی جڑے ہوئے ہوں۔ ان کے اندر تو کسی نقص کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح علماء نے بیان فرمایا کہ عام طور پر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایامِ حیض میں میاں بیوی کی قربت نہیں ہورہی ہوتی تو کبھی کبھی وہ قسمیں کھا بیٹھتے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ نہیں سوؤں گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان قسموں کا مسئلہ بیان

فرمایا، تاکہ اگر کوئی قسم کھا بیٹھے کہ بیوی سے بات نہیں کروں گا یا کوئی قسم کھا بیٹھے کہ بیوی کے ساتھ نہیں لیٹوں گا، یہ غلط بات ہے۔

اسی طرح آدمی لغو قسمیں بھی کھاتا رہتا ہے۔ ان کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے سمجھا دیا کہ اگر تم نے قسم کھائی جو تم نے اپنے دل کے ارادے سے قسم کھائی اس پر تمہارا مواخذہ ہوتا ہے، لیکن اگر توبہ کرلو اللہ تبارک وتعالیٰ بخشنے والے بھی ہیں اور رحم فرمانے والے بھی ہیں۔

حدیث: امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نَحْنُ الْآخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''[1] کہ اللہ تعالیٰ نے باعتبار زمانہ کے سب سے آخر میں ہمیں بھیجا، لیکن اللہ تعالیٰ قیامت والے دن جنت میں سب سے پہلے ہمیں بھیجیں گے۔ اور فرمایا: اگر کوئی آدمی قسم کھا لیتا ہے کہ میں بیوی سے بات نہیں کروں گا۔ اور یہ قسم اس کو الجھانے والی بن جائے کہ میں اپنی بیوی سے کیسے بات کروں؟ میں نے قسم کھائی تھی کہ میں بیوی سے نہیں بولوں گا۔ یہ نہیں ہوتا کہ اگر تم نے کسی نیکی کے کام پر قسم کھالی ہے تو اس پر جمے رہو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے قسم کا جو کفارہ فرض کیا ہے، کفارہ ادا کرنے کے بعد اس بھلائی کے کام کو اختیار کرو۔ اور وہ کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائیں، چاہے دس مسکینوں کو اکٹھا بلا کر کھانا کھلا دیں یا آپ چاہیں ایک ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ نہ تو اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا ہو اور نہ ایسا ہو کہ ایک ایک روٹی ان کو پکڑا دو، بلکہ درمیانہ کھانا جو تمہاری حیثیت ہے کھلا دو۔

حدیث: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر کسی آدمی نے کھائی کہ اپنے اہل خانہ کے پاس نہیں جاؤں گا، والدین کی خدمت پیش کروں گا۔ تو اس نے غصہ کے اندر ایسی کوئی قسم کھالی تو گناہ گار ہوا اور کفارہ بھی اس کی معافی کا ذریعہ نہیں بنے گا، بلکہ وہ توبہ اور استغفار بھی کرے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ والدین سے احسان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد ان کا ذکر کیا: ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [النساء: ٣٦] میری عبادت کرو اور اس کے ساتھ شرک نہ کرو اور والدین کے ساتھ بھلائی کرو۔ اب آدمی اس حکم کو بھول جائے کہ میں نے تو قسم کھائی ہے کہ باپ کے پاس نہیں جاؤں گا، میں قسم کیسے توڑوں؟ یعنی اللہ کی قسم کو بہانہ بنا کر اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑ رہا ہے۔

---

[1] [صحیح البخاری، رقم: ۱/ ۲۹۹، صحیح مسلم: ۲/ ۵۸۶]

ہماری زندگیوں میں جو اکثر خلا اور ناکامیاں ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ بنیادی چیزوں کو تو ہم نے چھوڑ دیا ہے اور جو غیر ضروری چیزیں ہیں ان کو ہم نے مضبوطی کے ساتھ پکڑا ہوا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا، امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وہ کافر ہے، باقی ائمہ کے نزدیک وہ فاسق وفاجر ہے۔ اب یہ ہے کہ ہم نماز کے مسئلے کو ایک طرف رکھ دیں اور اولی، اعلیٰ، راجح اور مرجوح مسئلے پر لڑتے رہیں۔

اصل مسئلہ تو یہ ہے بے نمازی کو نمازی بنائیں، عقیدے کی اصلاح کریں۔ اب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: والدین سے اچھا سلوک کرو، بیوی کے حقوق ادا کرو۔ اب کوئی آدمی کہے: میں نے تو قسم کھائی ہے، میرا بیوی سے جھگڑا ہے، میں کیسے قسم توڑ دوں اور بیوی سے بات کروں؟

(حدیث) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''إِنِّي وَاللهِ! إِنْ شَاءَ اللهُ لَا أَحْلِفُ عَلَى يَمِينٍ فَأَرَى غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا إِلَّا أَتَيْتُهُ'' میں کبھی کسی اچھے کام سے رکنے کی قسم کھالوں اور پھر مجھے یقین ہو کہ اس کام کا کرنا بہتر ہے تو میں کفارہ دے کر اس کام کو کردوں گا۔ (بخاری ومسلم) یعنی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات گرامی کی مثال بیان فرمادی، اس کے بعد کسی کو سوچنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

عہدہ طلب نہ کرو:[1]

حدیث: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: اے عبدالرحمن! تم اپنی طرف سے سوال نہ کرنا کہ مجھے حاکم بنادو، مجھے قاضی بنادو؛ کیونکہ اگر تمہیں یہ عہدہ تمہارے سوال کے بغیر مل گیا تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کریں گے اور اگر تم نے سوال کر کے حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے حوالے کر دیتے ہیں کہ تم جانو اور تمہارے کام جانے؛ کیونکہ تم نے خود مانگا ہے، اب خود ہی اس سے نکلو۔ اور جب آدمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد نہ ہو تو کیسے کامیاب ہو سکتا ہے؟

موجودہ دور میں جو ہمارے ملکوں میں کافروں کا نظام چل رہا ہے، ہم...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... اس میں صرف درخواستیں نہیں دیتے، بلکہ کروڑوں روپے خرچ کر کے اس عہدے کو حاصل کرتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ آنے کے بعد سب سے پہلے وہ اپنا حساب پورا کرے گا، پھر آئندہ آنے والے کے لیے بھی تیاری کرنی ہوتی ہے وہ بھی جمع کر کے رکھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ لوٹ کھسوٹ ہے۔ جو بندہ بھی کرسی پر بیٹھتا ہے، بہت کم لوگ ہیں، جو اللہ

[1] مسند احمد: رقم: ۱۹۳۵۳۸، کنز العمال: رقم: ۱۲۳۰۳۰

تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں، ورنہ یہی ہے کہ چپڑاسی سے لے کر اوپر تک چلے جائیں سب کا مقصد صرف اپنے مفاد حاصل کرنا ہے۔ جبکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ تم عہدے کے متلاشی نہ بنو۔ ہاں اگر علاقے کے لوگوں نے اور برسر اقتدار لوگوں نے سمجھا کہ یہ بندہ عہدے کے قابل ہے اور انہوں نے تمہاری طلب کے بغیر عہدہ دیا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ مدد کرتے ہیں۔ اور صاف ظاہر ہے کہ ایسا آدمی عدل بھی کرے گا؛ کیونکہ اس نے اس عہدے کے لیے کچھ خرچ نہیں کیا اور کسی کا احسان نہیں لیا۔ اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بغیر مانگے ہوئے عہدہ دیا ہے۔

اس لیے دیکھیں کہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں جن لوگوں کو عہدے ملتے تھے وہ کئی کئی دن تک روتے رہتے تھے۔ ہم تو امتحان میں آ گئے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا حساب بھی ہمارے سر پر آ گیا، ہم قیامت میں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟

آپ اندازہ کریں! سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ...... جن کے عدل وانصاف کا ڈنکا آج بھی ساری دنیا میں بج رہا ہے، جن کا انصاف ضرب المثل ہے اور جن کے فیصلے ایسے ہوتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے قرآن اتار کر کے تائید فرمادی، لیکن...... جب خلافت کا آخری وقت آیا تو وہ کہتے تھے کہ یا اللہ! میں نے جو یہ دس سال حکومت کی ہے، اس میں نہ مجھے ثواب ملے اور نہ عذاب ملے، برابر کر کے چھوڑ دیں تو میں راضی ہوں۔

اس لیے یاد رکھیں کہ یہودیت اور نصرانیت نے ایک ایسا کھیل کھیلا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے کافرانہ نظام میں ایسے الجھا دیا ہے کہ اب آپ اس سے کبھی کوئی خیر اور بھلائی کی توقع نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسا جال ہے کہ اس سے کوئی آدمی بچ کر نہیں نکل سکتا۔ مثلاً: آپ الیکشن میں کھڑے ہوں، ایک آدمی نے آپ کو ووٹ دیا۔ اب وہ آدمی جرم کرے گا تو آپ اس کو کیسے پکڑیں گے؟ کیونکہ وہ آپ کا سپورٹر ہے۔ اور انہوں نے مسلمانوں کو ایسا نعرہ دے دیا ہے کہ ہر آدمی اس کے پیچھے دیوانہ ہو کر بھاگ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان اسلام سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں اور جہاں جہاں یہ لعنت مسلط کی گئی ہے وہاں نہ سکون ہے، نہ امن واحترام ہے، نہ لوگوں کو معاش ملتی ہے اور نہ برکات ہیں۔ چوبیس گھنٹے ہر آدمی ایک عذاب میں مبتلا ہے۔ جس کے پاس کرسی ہے وہ مزے میں ہے اور جو غریب ہے وہ روز بروز غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کا زندگی گزارنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو وقت کے بادشاہ نے قضا کا بڑا عہدہ دینا چاہا، لیکن آپ نے انکار کر دیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کو دوسری نصیحت یہ فرمائی کہ اگر تم کبھی قسم کھا بیٹھے اور پھر تمہیں بعد

میں سمجھ آیا کہ میں نے جو قسم کھائی ہے کہ یہ کام نہیں کروں گا اس کا کرنا بہتر ہے تو قسم پر نہ جمے رہنا، بلکہ قسم کا کفارہ ادا کر کے اس بھلائی والے کام کو ضرور سرانجام دے دینا۔

حدیث: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی آدمی قسم کھا بیٹھے اور پھر بعد میں دیکھے کہ اس کام کے کرنے میں تو بھلائی ہے تو وہ اس قسم کا کفارہ ادا کر کے اس بھلائی کے کام کو کرے۔

ایک روایت میں ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ابن آدم کی کوئی ایسی قسم یا منت جو اس کے اپنے ہاتھ میں نہ ہو وہ قسم اور منت نہیں ہے۔ مثلاً: ایک آدمی کہے کہ میں منت مانتا ہوں کہ دس لاکھ طواف کروں گا، اسی طرح کوئی کہے کہ میں منت مانتا ہوں کہ میں دس کروڑ ریال خیرات کروں گا اور اس کے پلے میں دس ریال بھی نہیں تو یہ منت نہیں ہوگی۔

قطع رحمی اور گناہ کی قسم کھانا:

اسی طرح اگر کسی نے قسم کھائی کہ میں فلاں کی چوری کروں گا، ایک تو یہ نافرمانی ہے اور دوسرا قسم بھی خدا کی کھا رہا ہے۔ اور اسی طرح قطع رحمی کی قسم کھائے، یہ بھی گناہ ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کا حکم دیا ہے۔ ایسی قسموں کے کھانے سے اللہ کے رسول نے روکا ہے۔

حدیث: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو گناہ پر قسم کھائے اس کی بھلائی یہ ہے کہ وہ قسم توڑ ڈالے اور گناہ سے واپس لوٹ آئے۔

ایک آدمی نے قسم کھائی: مجھے اللہ کی قسم ہے! اگر مجھے فلاں آدمی نے نقصان پہنچایا تو میں اس کی چوری کروں گا۔ یہ معصیت ہے۔ کیا اب یہ قسم ہوگی؟ کیا اس کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا؟ بعض ائمہ فرماتے ہیں: ایسی قسم نہیں ہوتی؛ کیونکہ قسم وہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہو، معصیت کی قسم قسم نہیں ہوتی، اس پر کوئی کفارہ نہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اگر ایسی قسم کھا بیٹھا ہے تو اس کا کفارہ دے گا۔

لات اور عزّیٰ اور پیر کی قسم کھانا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی آدمی لات وعزّیٰ کی قسم کھا بیٹھے تو اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً کہے: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ''۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے ان کی زمانہ جاہلیت میں

عادت تھی کہ وہ لات اور عزیٰ کی قسمیں کھاتے تھے اور وہ قسمیں ان کی زبانوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اس لیے کبھی کبھی بلا اختیار ان کی زبانوں پر وہ قسمیں آجاتی تھیں۔ تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً کلمہ پڑھے۔ اور اگر کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کے سوا غیر اللہ کی جان بوجھ کر قسم کھائے تو وہ کافر ہو جاتا ہے، یعنی اگر کوئی آدمی یہ عقیدہ رکھے کہ اگر میں پیر کے مزار کی قسم کھاؤں گا یا پیر کے وجود کی قسم کھاؤں گا اور یہ عقیدہ رکھے کہ اگر میں غلط قسم کھاؤں گا تو مجھے نقصان پہنچے گا تو یہ کفر و شرک ہے۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی سمجھ لو کہ اگر کبھی زبان سے کفر و شرک کا کلمہ نکل گیا تو اس کا علاج بھی یہی ہے کہ فوراً کلمہ پڑھ لے۔

کتابوں میں آتا ہے کہ بی بی رابعہ بصریہ رحمہا اللہ نے دیکھا کہ ان کے ساتھی مجلس میں بیٹھ کر شیطان کی مذمت کر رہے ہیں۔ بی بی صاحبہ نے ان کو فرمایا: تم لوگ کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے کہا: شیطان کا ذکر آگیا تھا تو ہم اس پر لعنت بھیج رہے تھے۔ بی بی صاحبہ نے فرمایا: تم نے جتنی دیر دشمن کا ذکر کیا ہے اتنی دیر دوست کو یاد کر لیتے۔ بی بی صاحبہ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ شیطان کو لعنت نہ کرو، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ شیطان تو ملعون ہے ہی، لیکن ایک دوست ہے اور ایک دشمن ہے۔ جتنی دیر آدمی دشمن کا ذکر کرے اتنی دیر دوست کا ذکر کیوں نہ کرے؟ لازمی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں زیادہ فضیلت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہم منفی پہلو پر زیادہ چلتے ہیں اور برائی ڈھونڈیں گے، لیکن اگر اس میں کوئی اچھائی ہے تو اس کا کبھی ذکر نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مثبت پہلو پر کام کرنے کی توفیق عطا دے۔

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرة:۲۲۷]

''جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسمیں کھا بیٹھتے ہیں ان کے لیے چار مہینے تک مہلت ہے۔ پھر اگر وہ باہم مل جائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر طلاق کا ارادہ کر لیا ہے تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایلاء کے بارے میں ذکر فرمایا ہے۔ چونکہ یہ بھی ایک قسم ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قسم کی آیات کے بعد ایلاء کا ذکر کیا ہے کہ ایک آدمی قسم کھاتا ہے: میں اپنی بیوی سے صحبت نہیں کروں گا۔ تو اس قسم کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

ایلاء کی صورت:

زمانہ جاہلیت میں یہ ہوتا تھا کہ لوگ بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے تھے۔ اس طرح بیوی درمیان میں لٹک جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک حکم جاری فرمادیا کہ اگر کوئی آدمی یا تو یہ قسم کھائے کہ میں کبھی اپنی بیوی سے نہیں ملوں گا اور اس نے مدت متعین نہیں کی، یا وہ کہے کہ میں چار مہینے تک بیوی سے نہیں ملوں گا، یا یہ کہے کہ میں تین مہینے تک بیوی سے نہیں ملوں گا۔

ایک صورت میں مدت متعین نہیں کی، دوسری صورت میں چار مہینے یا زیادہ کی مدت متعین ہے اور تیسری صورت میں چار مہینے سے کم کی مدت متعین ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ اگر کسی نے قسم کھائی اور چار مہینے سے کم کی کھائی، مثلاً: کہا کہ میں تین مہینے تک اپنی بیوی سے نہیں ملوں گا۔ اور تین مہینے تک وہ اپنی بیوی سے نہیں ملا۔ تین ماہ گزرنے کے بعد اس نے ملنا شروع کر دیا تو ٹھیک ہے۔ نہ اس پر قسم کا کفارہ ہے اور نہ اس پر کوئی اور گناہ ہے۔

ایک آدمی نے قسم کھائی کہ میں چار مہینے تک اپنی بیوی سے نہیں ملوں گا۔ اگر چار مہینے کے اندر اندر اس نے رجوع کر لیا تو قسم کا کفارہ ادا کرے اور اس کی بیوی پہلے کی طرح حلال ہے۔ اس نے چار ماہ کی قسم کھائی تھی اور ابھی چار مہینے نہیں گزرے تھے اور وہ پہلے بیوی سے مل گیا۔ قسم کا کفارہ ادا کرے گا اور کسی قسم کا اس پر جرمانہ نہیں آئے گا۔

ایلاء کے چار ماہ گزرنے کے بعد رجوع کے لیے صرف نکاح کافی ہے:

قسم کھائی کہ میں چار مہینے تک اپنی بیوی سے صحبت نہیں کروں گا۔ اب چار مہینے گزر گئے اور صحبت نہیں کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کی بیوی کو طلاق بائن ہو جائے گی۔ اب اس مرد پر عورت حرام ہو گئی۔ اب اگر یہ چاہتا ہے کہ یہ عورت پھر سے میرے نکاح میں آجائے تو اس سے دوبارہ نکاح کرے گا، حلالہ کی ضرورت نہیں ہو گی۔

غیر معین مدت تک ایلاء کا حکم:

ایک آدمی نے قسم کھائی تھی کہ میں بیوی سے صحبت نہیں کروں گا اور مدت متعین نہیں کی ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ سے پہلے پہلے رجوع کر لیا تو کفارہ ادا کرے گا اور بیوی بیوی رہے گی۔ اگر چار ماہ گزر گئے اور رجوع نہیں کیا تو طلاق پڑ جائے گی۔ اس کے بعد رجوع کرنا چاہے گا تو نکاح کرنا پڑے گا اور کسی قسم کا کفارہ ادا نہیں کرنا

پڑے گا۔

اگر کسی نے قسم کھائی کہ میں چار مہینے اپنی بیوی کے ساتھ صحبت نہیں کروں گا۔ چار مہینے گزر گئے تو کیا اب اس کو طلاق دینی ہوگی یا خود بخود طلاق ہو جائے گی؟ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ فرماتے ہیں: طلاق دینی پڑے گی۔ اگر وہ مرد طلاق نہیں دیتا تو عورت قاضی کے پاس جائے، قاضی مرد کو بلا کر جبر کرے کہ تم اس کو طلاق دو تو اس طرح طلاق واقع ہوگی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: چار مہینے کی قسم کھائی تھی۔ جب چار مہینے گزر گئے تو قسم خود بخود واقع ہو جائے گی اور اس کو دوبارہ طلاق دینے کی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے: ﴿فَإِنْ فَاءُوْ فِيْهِنَّ﴾ قراءتِ شاذہ ہے۔ قاعدہ ہے کہ اگر قراءت شاذہ قراءتِ متواترہ کی تفسیر ہو تو اس قراءت پر اعتماد کیا جاتا ہے، لہٰذا اس کا معنی یہ ہے کہ اگر چار مہینے کے اندر اندر رجوع کر لیا تو ٹھیک، طلاق نہیں ہوگی، ورنہ چار مہینے گزرنے کے بعد خود بخود طلاق واقع ہو جائے گی۔

واقعۂ ایلاء:

حدیث پاک میں ایک بہت بڑا مشہور واقعہ گزرا ہے۔ آقائے نامدار، خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء ﷺ ایک دفعہ اپنی ازواجِ مطہرات سے ناراض ہو گئے، آپ نے قسم کھالی اور آپ ﷺ نے ازواج سے ملنا بند کر دیا۔ اور مدینہ میں افواہ اڑ گئی کہ آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ جب یہ بات اڑی تو سب سے پہلے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بڑا صدمہ گزرا!! کیونکہ ان کی بیٹیاں حضور اکرم ﷺ کے گھر میں تھیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں سیدھا اپنی بیٹی کے گھر گیا اور کہا کہ میں تمہیں کہا کرتا تھا کہ حضور اکرم ﷺ کو تنگ نہ کیا کرو۔ تم بار بار حضور اکرم ﷺ سے خرچے مانگتی ہو تو اب نتیجہ نکل آیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے مسجد نبوی میں آکر دیکھا کہ سب صحابہ پریشان ہیں، کوئی گھٹنوں میں سر دے کر رو رہا ہے، کوئی غم میں مبتلا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھ سے بھی صبر نہ ہوا، میں سیدھا آیا۔ حضور اکرم ﷺ بالا خانہ میں موجود تھے۔ میں نے اطلاع دی، اجازت نہ ملی۔ مجھ سے صبر نہ ہو سکا، میں نے تھوڑی دیر بعد پھر اجازت مانگی، لیکن پھر بھی اجازت نہ ملی۔ تیسری دفعہ جب میں نے اجازت مانگی تو اجازت ملی۔ میں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آکر سب سے پہلے سوال کیا:

یارسول اللہ! کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے تو طلاق نہیں دی ہے۔ میں نے تو قسم کھائی ہے کہ بیویوں سے نہیں ملنا ہے ایک ماہ کے لیے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خوش ہو کر اللہ تعالیٰ کی تکبیر کا نعرہ بلند فرمایا۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو جب اطلاع ملی تو سب خوش ہو گئے اور الحمد للہ کہا کہ حضور اکرم ﷺ نے قسم کھائی ہے، طلاق نہیں دی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اس کے بعد مناسب سمجھا کہ کوئی ایسی بات کروں کہ حضور اکرم ﷺ خوش ہو جائیں تو میں نے عرض کیا: حضور! عورتوں کو تو آپ نے سر پر چڑھا دیا ہے۔ ہم مکہ والے تو ان کو سیدھا کر کے رکھتے تھے، کوئی چیز مانگتیں تو ان کو بید مار مار کر ان کی پسلیاں توڑ ڈالتے تھے۔ جب سے ہم مسلمان ہوئے ہیں یہ تو ہمارے سر پر بیٹھ گئی ہیں۔ اسلام نے ان کو اتنے حقوق دے دیے ہیں کہ یہ تو ہماری بات بھی نہیں سنتی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ مسکرا دیئے۔ جو غصہ تھا وہ نکل گیا۔

رجوع کرنے کے دو طریقے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بیوی کو صرف اتنا کہہ دے کہ میں نے رجوع کر لیا، بیوی سے میاں بیوی والا عمل کیا یا لوگوں کے سامنے رجوع کا اقرار کر لیا وغیرہ تو رجوع ہو جائے گا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رجوع میں صحبت شرط ہے کہ عورت سے جماع کرے؛ کیونکہ بیوی سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، اس لیے اب وہ صحبت بھی کرے۔

اصل میں یہ علمی مباحث ہیں اور آج جو میری طرح میرے بھائی پانچ پڑھے ہوئے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قدوری کا ترجمہ بھی نہ آئے وہ ائمہ اربعہ پر اعتراض کرتے ہیں۔

اصل علمی بحث یہ ہے کہ کیا قولِ رسول افضل ہے یا فعلِ رسول افضل ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک فعلِ رسول افضل ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ساری شریعت قولِ رسول کا نام ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ ہر عمل حضور اکرم ﷺ خود کریں؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ صاحبِ نصاب نہیں تھے، کبھی زکوٰۃ نہیں دی۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب قسم کھائی تو کیا زبان سے کھائی تھی؟ یا وہ بھی کوئی فعل تھا؟ صاف ظاہر ہے قول ہے۔ جب قول سے قسم ہو جاتی ہے تو اسی طرح قول سے رجوع بھی ہو جائے گا۔

طلاق ناپسندیدہ عمل ہے:

اللہ تعالیٰ کو سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جب کوئی مرد اپنی عورت کو بلاوجہ طلاق دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا عرش ہل جاتا ہے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ یہ کتنا ناپسندیدہ عمل ہے!! اسی لیے اسلام

نے یہ پابندی لگائی ہے کہ اگر تم نے ایلاء کرلیا ہے تو رجوع کرلو۔ اگر تم نے طلاق دے دی ہے تو مدت کے اندر رجوع کرلو، یا عورت کو عزت کے ساتھ فارغ کردو، تاکہ عورت جہاں چاہے دوسرا نکاح کرلے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ تجھ سے بہتر شوہر عطا فرما دے۔ اور تم بھی شادی کرلو گے تو ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے اور اچھی بیوی عطا کردیں۔ اسی طرح دونوں کے گھر آباد ہوجائیں گے۔

لیکن یہ ہماری جاہلیت ہے کہ طلاق بھی نہیں دیتے اور آباد بھی نہیں کرتے، حقوق بھی ادا نہیں کرتے اور طلاق بھی نہیں دیتے، بیوی کو خرچہ بھی نہیں دیں گے اور حقوق بھی ادا نہیں کریں گے، والدین مجبور ہوکر اس کو اپنے پاس بٹھائیں گے اور جب اس کو واپس گھر بھیجیں گے تو خاوند کی وہی نفرت اور وہی طعنے ہوں گے۔ ان سب چیزوں کو اسلام ناجائز سمجھتا ہے کہ اگر بیوی کو ساتھ رکھنا ہے تو عزت کے ساتھ رکھو۔ اگر تمہاری نہیں بن سکتی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر چھوڑنا ہے تو ان کو احسان کے ساتھ چھوڑو۔ اگر کوئی آپس میں جھگڑا ہوگیا تھا، اب صلح ہوگئی ہے تو سابقہ باتوں کو مت دہراؤ، ان کو زبان پر مت لے آؤ۔ بس ایک بات تھی اس کو بھول جاؤ؛ کیونکہ اگر تم زبان پر لاؤ گے تو وہ فتنے دوبارہ زندہ ہوں گے۔

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ﴾ اس سے ایک اور مسئلہ نکلا کہ آدمی اپنی بیویوں سے ایلاء کرسکتا ہے، باندیوں سے نہیں کرسکتا۔ اب باندیوں کا قصہ بھی ختم ہوگیا ہے۔ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞﴾ [البقرة:۲۲۶] تم نے جو چار ماہ کی قسم کھالی یہ زیادتی ہے۔ تو اس چار مہینے میں جو مرد نے عورت کو تکلیف پہنچائی، لیکن اگر تم رجوع کرلو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کردیں گے؛ کیونکہ جیسے مرد کا حق ہے اسی طرح عورت کا بھی حق ہے۔ جس طرح مرد میں اللہ تعالیٰ نے جماع کی خواہش رکھی ہے اسی طرح عورت کے اندر بھی خواہش رکھی ہے۔ تم نے چار مہینے کی قسم کھا کر اس کو اس تقاضے کو پورا کرنے سے روک دیا۔ اب اگر اس کے بعد تم نے رجوع کرلیا تو اللہ تعالیٰ بخشنے والے اور مہربان ہیں۔ اس سے اشارہ کردیا کہ یہ بھی غلطی ہے، اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گشت کا واقعہ:

حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک دفعہ رات کو گشت کررہے تھے اور ایک مکان کے قریب سے گزرے تو ایک عورت خاوند کی جدائی میں عربی میں اشعار پڑھ رہی تھی۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ میں آج اکیلی سوئی

ہوں اور میرا خاوند مجھ سے دور ہے۔ اگر مجھے اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہوتا تو میری چار پائی پر آج کوئی اور سویا ہوا ہوتا۔
جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار سنے تو تڑپ گئے۔ آپ نے فوراً اپنی بیٹی سے رجوع کیا اور ان سے پوچھا:...... دین کا سوال پوچھنے میں شرم نہیں ہونی چاہیے۔ اور چونکہ وہ زوجہ محمد ﷺ تھیں، جتنا ان کو علم ہو سکتا ہے وہ زوجہ عمر کو نہیں ہو سکتا تھا...... میری بیٹی! مجھے بتاؤ کہ ایک عورت بغیر خاوند کے کتنے دن گزار سکتی ہے؟ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے بڑا اچھا جواب دیا: کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟ فرمایا: اللہ کے قرآن میں تو کہیں نہیں لکھا ہوا کہ اتنے دن عورت علیحدہ رہ سکتی ہے۔ فرمایا: ایک خاوند مر جائے تو متوفی کی کتنی مدت ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: چار ماہ اور دس دن کی عدت ہوتی ہے۔ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے اتنے دن عدت رکھی ہے تو اسی میں حکمت ہے کہ اس سے زیادہ عورت کو مرد سے علیحدہ نہیں رہنا چاہیے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ بات سمجھ آ گئی اور آپ نے ایک حکم جاری فرما دیا کہ اب مجاہدین جب جہاد پر جائیں، ان کا سلسلہ اس طرح جوڑا جائے کہ ایک مجاہد گھر سے چار ماہ سے زیادہ غائب نہ رہے، تاکہ وہ اپنی بیویوں کے حقوق ادا کر سکیں اور بیویاں اپنے حقوق کا صحیح استفادہ کر سکیں۔

وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے مدت چار ماہ اور دس دن رکھی ہے اور یہاں بھی ایلاء کی آخری حد چار ماہ ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ لگائیں کہ کتنے لوگ ہیں جن کے گھر میں بیوی موجود ہے اور اپنی خواہشاتِ نفس اپنی بیوی سے بھی پورا کرتے ہیں، لیکن کتوں کی طرح دوسروں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے۔

کیا ایلاء کی مدت پوری ہونے کے بعد بھی کفارہ ہے؟

ایک آدمی نے چار مہینے کے بعد رجوع کیا تو کیا اس پر کفارہ ہے یا نہیں؟

یہاں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب چار مہینے پورے ہو گئے تو طلاق ہو گئی۔ چار مہینے کے اندر اس کو رجوع کرنے کا حق تھا، لیکن چار مہینے گزرنے کے بعد رجوع کرنے کا حق نہیں، اب مدت پوری ہو گئی۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور باقی ائمہ کا ایک قول ہے کہ چار مہینے گزرنے کے بعد بھی اگر جلدی جلدی رجوع کر لے تو رجوع ہو جاتا ہے اور اس پر کوئی کفارہ وغیرہ بھی نہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر چار مہینے کے بعد بھی وہ بات باقی ہے تو پھر قرآن میں چار مہینے کے ذکر کی

ضرورت ہی کیا ہے؟ جبکہ قرآن نے چار ماہ کی پابندی لگائی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ﴿فَإِنْ فَاؤُا فِيهِنَّ﴾ کہ اگر وہ رجوع کریں ان چار ماہ کے اندر اندر تو ٹھیک ہے۔ اگر چہ یہ قراءتِ شاذہ ہے، لیکن اصول ہے کہ اگر قراءتِ شاذہ قراءتِ متواترہ کی تفسیر ہو تو وہ قابل حجت ہوتی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا قولِ قدیم ہے کہ اگر چار ماہ کے بعد بھی رجوع کیا تو اس پر کفارہ نہیں۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی شخص قسم کھالے اور دیکھے کہ اس طرح کرنا نہ کرنے سے بہتر ہے تو قسم توڑ دے۔ اور اس نے بھی قسم کھائی تھی۔ اور بیوی سے ملنا نہ ملنے سے بہتر ہے۔ لہٰذا رجوع کرلے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں مطلق قسم کا ذکر ہے، چار ماہ کی قید نہیں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے پھر خود یہ قول چھوڑ دیا۔ اور ان کا قولِ جدید یہ ہے اور یہی جمہور کا قول ہے کہ وہ کفارہ دے گا؛ کیونکہ مطلقاً قسم پر کفارہ ہے، لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: چار ماہ گزرنے کے بعد طلاق ہوگئی، اب وہ رجوع نہیں کرسکتا اور اس پر کفارہ نہیں؛ کیونکہ اس نے اپنی قسم پوری کرلی۔

مدتِ ایلاء ختم ہونے پر خود بخود طلاق ہوجاتی ہے:

﴿وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ [البقرۃ: ۲۲۷]۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ لفظ دلالت کرتا ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد طلاق خود بخود واقع نہیں ہوجاتی؛ کیونکہ اگر خود بخود طلاق ہوجاتی تو ﴿وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ اس لیے چار ماہ گزرنے کے بعد عورت خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ چونکہ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف مائل ہیں تو لکھ دیا کہ چار ماہ گزرنے کے بعد خود بخود طلاق واقع نہیں ہوگی، بلکہ چار ماہ گزرنے کے بعد اس سے طلاق کا مطالبہ کیا جائے گا اور دلیل یہی آیت دی۔

اور آگے فرمایا: کچھ حضرات اس طرف بھی گئے ہیں کہ چار مہینے گزرنے سے طلاق ہوجائے گی۔ اور وہ حضرات یہ ہیں: حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور اس کے بعد تابعین میں ابن سیرین، مسروق، قاسم، سالم، حضرت ابوسلمہ، قتادہ، شریح، عطاء، ابراہیم نخعی اور حضرت سدی رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ چار ماہ گزرنے کے بعد طلاق خود بخود ہوجائے گی۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک آدمی نے چار مہینے کے لیے قسم کھائی۔ اب چار ماہ میں رجوع کرلیا تو ٹھیک ہے تو گویا

عزمِ طلاق اس کا نہیں ہے؛ کیونکہ اگر عزمِ طلاق ہوتا تو وہ رجوع نہ کرتا۔ اتنے بڑے صحابہ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم جنہوں نے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پڑھا ہے، ان کا بھی یہی قول ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ سب پر رحمتیں کرے؛ کیونکہ فہم میں خطا ہو سکتی ہے، لیکن ان کی نیتوں میں خطا نہیں تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اجر دیا ہے۔

اگر مجتہد نے اجتہاد کیا اور وہ قرآن وسنت کے مطابق نکلا تو اس کو دوہرا ثواب ہوگا اور اگر اجتہاد غلط نکلا تب بھی اس کو اجتہاد کرنے کا ثواب ملے گا؛ کیونکہ اس نے دین تک پہنچنے کی جد وجہد کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

مدت گزارنے پر کونسی طلاق واقع ہوگی؟

چار ماہ گزرنے کے بعد کونسی طلاق واقع ہوگی؟ رجعی ہوگی یا طلاقِ بائن ہوگی؟ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: طلاقِ بائن ہوگی۔ یعنی جب تک اس عورت سے دوبارہ نکاح نہ کرے اس وقت تک وہ عورت اس کی بیوی نہیں بن سکتی۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض حضرات فرماتے ہیں: یہ طلاق رجعی ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں: طلاق بائن ہو جائے گی۔ یہ قول حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عثمان غنی، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور اسی قول کو حضرت عطا، حضرت مسروق، حضرت عکرمہ، حضرت حسن، حضرت محمد بن الحنفیہ اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ بھی فرماتے ہیں۔

اب دیکھیں کہ امام صاحب کا پلڑا کتنا بھاری ہے کہ ان کے ساتھ سارے خلفاء موجود ہیں اور سارے صحابہ موجود ہیں۔ اب اگر کوئی آدمی امانت دیانت کے ساتھ اور دل میں تعصب نہ ہو کوئی مسئلہ لے لے تو سب سے زیادہ وزن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پاس ہوگا۔

کیا ایلاء کے بعد طلاق کی عدت گزارنا ضروری ہے؟

چار ماہ گزرنے کے بعد چاہے خود بخود طلاق ہوگئی یا خاوند سے طلاق لی گئی بہر حال طلاق ہوگئی، اب عورت پر عدت ہے۔ لیکن ایک قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ ہے کہ ان چار ماہ کے اندر اگر تین حیض گزر چکے ہیں تو اب مزید عدت گزارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ باقی ائمہ فرماتے ہیں: اس عورت کو عدت گزارنی ہوگی؛ کیونکہ عدت طلاق کے بعد ہوتی ہے، طلاق سے پہلے نہیں ہوتی۔ ...... واللہ تعالیٰ اعلم......

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۲۲۸]

''اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (دوسری جگہ نکاح کرنے سے) روکے رکھیں۔ اور ان کے لیے حلال نہیں کہ چھپائیں جو اللہ نے ان کے پیٹ میں پیدا کیا ہے اگر وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے خاوند کو اپنی بیویوں کے پھیر لینے کا حق ہے اس عرصہ (تین حیض) میں اگر وہ صلح کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اور دستور کے موافق عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ ان پر مردوں کا حق ہے۔ اور مردوں کا ان سے کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے۔ اور اللہ زبردست ہے، تدبیر کرنے والا ہے۔''

ان آیات میں احکامِ طلاق کا بیان ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھیں کہ طلاق کی اقسام پر بناء احادیث مبارکہ جو فقہاء کرام نے نقل فرمائی ہیں قرآن وسنت کی روشنی میں وہ یہ ہیں کہ طلاق یا تو رجعی ہوگی یا بائن ہوگی یا مغلظہ ہوگی۔ یہ تین قسم کی طلاقیں ہیں۔ یہ نہیں کہ فقہاء نے خود بنائی ہیں، بلکہ قرآن وحدیث کی ساری آیات ان کے سامنے ہوتی ہیں۔

طلاقِ رجعی: کا معنی یہ ہے کہ خاوند نے اپنی بیوی کو ایک رجعی طلاق دی۔ اب اگر ایک رجعی طلاق دینے کے بعد خاوند رجوع کرنا چاہے تو بغیر نکاح کے رجوع کر سکتا ہے۔

اور ایک طلاقِ بائن ہے، اگر خاوند اس کو دوبارہ اپنے پاس رکھنا چاہے تو تجدید نکاح کر کے رکھ سکتا ہے، اس میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

طلاق مغلظہ: کا معنی ہے کہ خاوند نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ اب خاوند کو بعد میں ہوش آیا، یا حالات آئے، اب وہ چاہتا ہے کہ میں دوبارہ اپنی بیوی کو گھر میں لے آؤں تو اللہ تعالیٰ کے قرآن نے واضح مسئلہ بیان فرما دیا: ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ﴾ [البقرۃ:۲۳۰]۔ اب وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہوگی جب تک کہ وہ عورت عدت گزارنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کرے اور وہ مرد جو اس سے شادی کرے باقاعدہ نکاح ہو، عورت اس کے عقد میں جائے اور وہ خاوند اس سے جماع کرے اور اس کے بعد

طلاق دے دے۔

حضور اکرم ﷺ کی حدیث مبارک ہے: ''لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَ الْمُحَلَّلَ لَهٗ'' [ابوداود، رقم: ۲۰۷۶] کہ جو لوگ صرف یہ کاروبار بنائیں گے کہ کسی نے طلاق دے دی تو اگر کسی نے حلالہ کرانا ہے تو وہ تیار بیٹھے ہوں، ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ یہ انسان نہیں، بلکہ سانڈھ اور کرائے کے جانور ہیں۔ اس لیے اللہ کے نبی ﷺ نے ان پر لعنت کی ہے۔ اور اسی طرح اس پر بھی لعنت بھیجی ہے جو شخص ایسے لوگوں کے پاس آئے اور کہے کہ میں نے چونکہ تین طلاقیں دے دی ہیں، میں نے بیوی کو حلال کرانا ہے، میں اس کو پھر رکھنا چاہتا ہوں۔ مہربانی کریں! آپ اس سے ایک رات کے لیے شادی کر لیں۔ اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ (یہ طریقہ شریعت میں ناپسندیدہ ہے، لیکن اگر اس طرح سے کسی نے معاملہ کر لیا تو اس کے لیے وہ عورت پھر سے حلال ہو جائے گی، جیسا کہ اس آیت کی رو سے ثابت ہوئی ہے۔ انور)

طلاق دینے کا سنت طریقہ:

طلاق دینے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ عورت حیض کے بعد طہر میں ہو اور اس طہر میں میاں بیوی نے آپس میں جماع نہ کیا ہو تو آدمی طلاق دے۔ یہ صحیح طریقہ ہے کہ عورت حیض میں بھی نہ ہو اور اس طہر میں خاوند نے جماع بھی نہ کیا ہو اور ایک طلاق دے۔ اب اگر...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... تین طلاقیں دینا چاہتا ہے تو علماء نے فرمایا: وہ اسی طرح انتظار کرے، دوسرے طہر میں اس کو دوسری طلاق دے، اسی طرح پھر انتظار کرے اور تیسرے طہر میں جا کر اس کو تیسری طلاق دے۔ چونکہ منشائے اسلام یہ ہے کہ جھگڑا نہ ہو اور صلح ہو جائے؛ کیونکہ میاں بیوی کا ایک ایسا رشتہ ہے کہ اس سے زیادہ قریبی رشتہ بے حجابانہ تعلق کسی سے بھی قائم نہیں ہو سکتا۔ ماں کا بڑا مقام ہے! بہن کا بڑا مقام ہے! بیٹی کا بڑا مقام ہے! لیکن وہ بے تکلفی اور بے حجابی جو میاں بیوی میں ہو سکتی ہے وہ کسی میں نہیں ہو سکتی۔ اب اسلام یہ چاہتا ہے کہ ایک عورت سے تم نے نکاح کیا ہے، اب اس عورت نے اپنا سب کچھ تمہارے سپرد کیا ہے، اب تم طلاق دو اور وہ کسی دوسرے گھر میں جائے، ایسی بات نہ کرو۔ اسلام اس سے روکتا ہے۔

پرانے لوگوں کی پرانی باتیں ہوتی ہیں، لیکن اس میں سبق ہوتے ہیں۔ ایک مثل ہے کہ کسی بزرگ کا مٹی کا لوٹا وضو کرنے کے لیے تھا۔ وہ ٹوٹ گیا تو وہ بزرگ بہت اداس بیٹھے تھے کہ میرا لوٹا ٹوٹ گیا۔ کوئی شاگرد آیا، اس نے

کہا: حضرت! مٹی کا لوٹا ٹوٹ گیا، کوئی سونے کا تو نہیں تھا۔ جو ٹوٹ گیا میں آپ کے لیے اور دو مٹی کے لوٹے لے آتا ہوں۔ بزرگ نے فرمایا: لوٹے کی کوئی بات نہیں۔ لوٹے مجھے اور بھی مل جائیں گے، مگر میں نے اس لوٹے کو اتنا عرصہ استعمال کیا تھا، اس نے ہمارا ننگ دیکھا ہوا تھا۔

ان باتوں میں ہدایتیں ہوتی ہیں، ورنہ مٹی کے لوٹے نے کیا دیکھنا ہے!؟ اور انہوں نے اس کو کیا دکھانا ہے؟ جن لوگوں کو مٹی کے لوٹے سے اتنا انس پیدا ہو جائے۔ یہ مقام کی باتیں ہیں، ہر کسی کو سمجھ نہیں آسکتیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جب کسی کو وہ مقام نصیب فرماتے ہیں تو ہر آدمی کے عقل میں آنے والی بات نہیں ہوتی۔

قرآن اور نبی ﷺ کا احترام:

میرے اپنے استاذ تھے، بہت بڑے اللہ والے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر رحمت فرمائے۔ جب وہ قرآن پڑھتے تو ہاتھ پر اچھی طرح کپڑا لپیٹ کر ورق پلٹتے تھے۔ ہم تو طالب علم تھے، کئی دفعہ ہم دیکھتے، ہمیں یہ عجیب سی بات لگتی تھی کہ دیکھو! اتنے بڑے شیخ ہیں، اتنی بڑی ان کی دین کی خدمات ہیں، پاک ہاتھ پر بھی کپڑا چڑھاتے ہیں۔ یہ بلا وجہ تکلف ہے۔ ایک دن میں نے عرض کیا: اتنا تکلف کیوں کرتے ہیں؟ فرمانے لگے: آپ ٹھیک کہتے ہیں، آپ اچھی بات کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے بھی سمجھنے کی توفیق دے۔ میں نے عرض کیا: حضرت! اللہ معاف کرے، میں اعتراض نہیں کر رہا، بلکہ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آرہی۔ فرمایا: حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وَاللّٰہِ! مَا مَسَسْتُ ذَکَرِیْ بِیَمِیْنِیْ مُنْذُ...... بَایَعْتُ بِهَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ''[1] کہ جس دن سے میں نے اپنا دایاں ہاتھ حضور اکرم ﷺ کے ہاتھ میں بیعت کے لیے دیا تھا، اس کو میں نے زندگی بھر فرج پر نہیں لگایا۔ یہ مقامِ ادب ہے۔ حکم نہیں تھا کہ ہاتھ مت لگانا۔ یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا مقامِ حیا تھا۔ جب ادب نصیب ہوگا تو پھر پتہ چلے گا کہ قرآن کیا ہے؟ حدیث کیا ہے؟ اور حضور اکرم ﷺ سے محبت کا کیا مقام ہے؟

آج تو...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... سب سے بڑا موحد وہ ہوتا ہے جو قرآن کو ایک ہاتھ میں لے کر پھینک دے کہ بڑا عقیدے کا مضبوط ہے، اس کو قرآن کی قدر نہیں ہے۔ مرضی آئے جوتے پر رکھ دے، مرضی آئے تو سرہانہ بنا کر سو جائے۔ یہ سوچنے اور مقام کی بات ہے۔ آخر کیا بات تھی جب قرآن اترتا تھا تو حضور اکرم ﷺ کی اونٹنی بیٹھ جاتی تھی اور ہمارا تو بندے کے سر پر تیس سپارے قرآن رکھ دو نہیں بیٹھتا۔ حضور اکرم ﷺ سردی کی رات

[1] [مسند ابی یعلیٰ موصلی، احیاء العلوم: ۵/۸۵]

میں پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سب کو ادب عطا فرمائے۔ بزرگوں نے ایک بات لکھی ہے اور وہ بڑی پکی بات ہے۔ انہوں نے فرمایا:

بے ادب محروم گشت از فضلِ رب

"جو آدمی بے ادب ہو جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔"

ان کو استاذ کا، کعبہ کا اور حرم کا ادب نہیں رہتا۔ خالی خولہ بندہ ہوتا ہے، اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو صحیح معنی میں ادب نصیب فرمائے۔ قرآن فرماتا ہے: ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ [الحج: ۳۲] شعائر اللہ کی تعظیم و عظمت دل کا تقویٰ ہے۔ اب دل کا تقویٰ نصیب ہو تو ادب آئے۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان فرقت نہ ہو۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک دوسرے کا پردہ اور لباس بنایا ہے وہ قائم رہے۔ اور اگر مجبوراً طلاق دینی پڑی، عورت حیض میں ہے تو اس کے پاک ہونے کا انتظار کرو۔ جب وہ پاک ہو جائے تو اس طہر (پاکی کے ایام) میں اس کے ساتھ مجامعت بھی نہ کرو۔ یہ پابندی اس لیے لگائی کہ طبیعت کے اندر خواہش ہو، طلاق نہ ہو، ورنہ ماہواری کے ایام میں بھی طلاق واقع ہو جائے گی اور تین طلاقیں اکٹھی بھی واقع ہو جائیں گی۔

تین چیزیں مذاق میں بھی واقع ہو جاتی ہیں:

لفظ طلاق سے بچا کرو؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت بھی حقیقت ہے اور مذاق بھی حقیقت ہے۔ ان تین چیزوں کے ساتھ کبھی کھیلا نہ کرو۔ "ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَ هَزْلُهُنَّ جِدٌّ: اَلنِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ." [سنن الترمذی، رقم: ۱۱۸۴] نکاح، طلاق اور رجوع۔ یہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ مذاق بھی کرو تو حقیقت ہے۔

مثلاً: ایک آدمی نے مذاق میں کہا کہ میں نے اپنی لڑکی آپ کے نکاح میں دے دی اور سامنے والے نے کہا: میں نے قبول کر لی تو نکاح ہو جائے گا، اگرچہ بعد میں وہ کہیں گے کہ ہم تو مذاق کر رہے تھے، نہ میں لڑکی دے رہا تھا اور نہ وہ لڑکی لے رہا تھا۔ اسی طرح طلاق ہے کوئی آدمی کہے کہ میں نے تو غصہ میں دی تھی، مجھے جوش آ گیا تھا، یا کہے کہ بیوی کو ڈرانا چاہتا تھا۔ اسی طرح کوئی کہے کہ میں نے تو طلاق لکھی ہے، مگر وہ لکھی ہوئی میری بیوی کو نہیں ملی۔ یہ

سب بہانے ہیں طلاق ہوگئی۔ گولی نکلی تو لگ گئی۔ اب یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ گولی تم نے وضو کر کے پکڑی تھی یا بغیر وضو کے پکڑی تھی۔

اس لیے ان تین چیزوں سے بچنا چاہیے۔ دنیا کے اندر کونسا گھر ہے جہاں جھگڑا نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے حضرات کے گھروں میں ازواج کے اختلاف ہوجاتے تھے۔ یہ فطری اور طبعی بات ہے کہ جہاں تعلق ہوتا ہے وہاں جھگڑے ہوتے ہیں۔ اور پھر قدرتی چیز ہے جتنی محبت اور پیار زیادہ ہو جھگڑے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر تم سنت پر چلو تو پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہ پڑے؛ کیونکہ یہ مسئلے اتنے خوف والے ہیں کہ بعض اوقات علماء اس میں احتیاطی طور پر سخت الفاظ استعمال فرماتے ہیں، تاکہ بندہ ان سے بچے۔

عدتِ طلاق:

اگر عورت کو طلاق دے دی تو اس کی عدت کتنی ہے؟ اللہ تعالیٰ کے قرآن نے فرمایا: ﴿ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ [البقرة:۲۲۸] اس کے لیے تین قروء عدت ہے۔ لفظ ''قُرُوْٓءٍ'' اضداد میں سے ہے۔ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے: حیض کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور طہر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جب اس نے عورت کو طلاق دی تو عورت کی عدت تین حیض ہوگی۔ وہ ''قُرُوْٓءٍ'' سے حیض کا معنی لیتے ہیں۔ جب تین حیض گزر گئے تو عدت گزر گئی۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تین طہر عدت ہے کہ عورت تین طہر یعنی پاکی کے دن گزارے، مثلاً: آٹھ دن حیض کے ہیں اور پھر آگے طہر کے دن ہیں۔ اس طرح جب تین طہر گزریں گے تو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک عدت پوری ہوجائے گی۔

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ﴾ کا لفظ تو عام ہے کہ طلاق والی عورتیں، لیکن یہ حکم اس کے لیے جو عورت بھی ہو اور آزاد بھی ہو، لونڈی نہ ہو۔ اگر لونڈی ہے تو اس کی عدت دو حیض ہے، تین حیض نہیں۔ یہ طلاق والی وہ عورت ہے جس کی عدت تین حیض یا تین طہر ہے، جو بالغہ ہے، حرہ ہے اور جس کی اپنی خاوند کے ساتھ صحبت ہوچکی یا خلوت صحیحہ ہوچکی۔ مثلاً: ایک آدمی کا نکاح ہوا، عورت خاوند کے گھر میں آگئی اور میاں بیوی نے صحبت بھی کرلی تو اب طلاق دی تو اس عورت کی عدت تین حیض ہے۔

خلوت صحیحہ بھی صحبت کے قائم مقام ہے کہ بیوی رات کو خاوند کے کمرے میں آگئی۔ میاں بیوی نے جماع تو نہیں

کیا، لیکن دروازہ بند ہے، کمرہ محفوظ ہے، ان کو کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے، کسی کے آنے کا کوئی خطرہ بھی نہیں ہے اور میاں بیوی اکٹھے لیٹے رہے تو خاوند سے خلوت صحیحہ ثابت ہوگئی۔ اب اگر اس عورت کو طلاق دی گئی تو اس عورت کو بھی عدت گزارنی پڑے گی اور وہ عدت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تین حیض ہوگی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تین طہر ہوگی۔

ایک آدمی نے ایک عورت سے نکاح کیا، لیکن وہ عورت خاوند کے گھر میں نہیں آئی، میاں بیوی آپس میں نہ ملے، نہ جماع کیا ہے اور نہ خلوت صحیحہ ہوئی ہے، اس عورت کو غیر مدخول بہا کہا جاتا ہے۔...... اب خدانہ کرے!...... کوئی ناچاقی ہوگئی اور خاوند نے طلاق دی تو اب عورت پر کوئی عدت نہیں؛ کیونکہ نہ عورت مدخول بہا ہے، نہ صحبت ہوئی اور نہ خلوت صحیحہ ہوئی۔ وہ عورت طلاق کے بعد عدت کے بغیر دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے، چاہے ایک طلاق ہوئی یا تین۔

یہ حرام حلال کے مسائل ہیں۔ ان کو ذہن میں رکھیں! اگر کبھی سابقہ پڑ جائے تو علماء سے باقاعدہ رجوع کریں۔ یہ ایسے مسائل نہیں ہوتے کہ آدمی صرف اردو کی کتابیں پڑھ کر سمجھ لے۔ اگر گاڑی کے لیے مکینک کے پاس جانا ضروری ہے۔ جیسے کوئی صرف کتاب پڑھ کر گاڑی کو درست نہیں کرسکتا اور کپڑے کے لیے درزی کے پاس جانا ضروری ہے تو دین کے لیے بھی عالم کے پاس جانا ضروری ہے۔ ورنہ تو کپڑا سلائی ہوتے ہوئے آپ نے بھی دیکھا ہے۔ جب خود سلائی کریں گے تو وہ نمونہ ہوگا۔ جب تم تین میٹر کا ایک کپڑا نہیں سی سکتے ہو تو اب اس کے بعد تم محمد مدنی ﷺ کے دین کو کاٹو پھانٹو تو تمہاری مرضی ہے۔ تو نتیجہ وہی نکلے گا جو دیکھ رہے ہو کہ آج دین کا کیا حال ہے؟ ﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ﴿١٣﴾﴾ [السبا: ۱۳] تھوڑے لوگ ہیں جن کے پاس دین ہے، ورنہ...... ماشاء اللہ...... ہر آدمی شتر بے مہار ہے۔ اس لیے ایسے مسائل میں مہربانی کیا کریں، علماء سے جا کر پوچھا کریں۔

مدخول بہا عورت کی عدت کے مسائل:

عورت بالغہ ہے، حرہ ہے، میاں بیوی کی صحبت ہوچکی ہے، یا خلوت صحیحہ ہوچکی ہے۔ اب طلاق دی تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی عدت پورے تین حیض ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تین طہر ہوگی۔

عورت کو طلاق ہوئی اور وہ حاملہ ہے تو اب اس کی عدت وضع حمل ہوگی؛ کیونکہ اس کو حیض نہیں آتا، چاہے طلاق کے ایک گھنٹہ بعد بچہ پیدا ہوا ہو یا نو ماہ بعد۔

اسی طرح ایک عورت کے ساتھ آپ کا نکاح تو ہے، لیکن وہ عورت اتنی چھوٹی ہے کہ اس کو ابھی حیض شروع نہیں ہوا، اس کو طلاق دے دی تو اس کی عدت چاند کے مطابق تین ماہ ہوگی۔

عورت بوڑھی ہوگئی، حیض نہیں آتا۔ اس وقت...... اللہ نہ کرے...... خاوند نے طلاق دے دی تو اس کی عدت بھی تین ماہ ہوگی۔ خاوند مر جائے تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہوگی۔ خاوند کے علاوہ بھائی ہے، یا کوئی اور رشتہ دار ہے، وہ مر جائے تو اس کا سوگ تین دن ہوگا۔

حیض کی مدت کیوں رکھی؟ یہ قرآن نے خود بتا دیا۔ فرمایا: طلاق والی عورتیں حیض کا انتظار کریں: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ [البقرۃ:۲۲۸] کہ عورتوں کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ چھپائیں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ان کے ارحام میں اگر وہ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان لانے والی ہیں۔ یعنی جب عورت کو طلاق دی گئی اور اس کے رحم میں حمل ہے تو اس کو چاہیے کہ اس کو نہ چھپائے اور سیدھی بات کرے کہ میں حاملہ ہوں۔ اگر عورت حیض کی حالت میں ہے، لیکن چھپا رہی ہے، خاوند طلاق دے رہا ہے اور وہ اپنے حیض کو چھپا رہی ہے، تاکہ میری عدت جلدی ختم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تمہارے رحم میں حیض ہے، تب بھی بات واضح بتا دو اور اگر بچہ ہے تو بتا دو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ عدت اس لیے رکھی گئی ہے، تاکہ اگر حمل ہے تو واضح ہو جائے۔

اسی لیے مرنے کے بعد چار مہینے دس دن کی عدت رکھی گئی ہے کہ خاوند مر گیا تو ہو سکتا ہے کہ عورت حاملہ ہو تو چار ماہ دس دن کے بعد نفخ روح ہو جاتی ہے اور بچہ پیٹ میں حرکت کرتا ہے، معلوم ہو جاتا ہے۔ اب اگر حمل ہے اور تم نے نہیں بتایا یا دوسری جگہ شادی ہوگئی تو دوسرے خاوند کا پانی اس کو لگے گا۔ ایک کے بیج کو دوسرا سیراب کرے گا۔ اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

حیض کی عدت اس لیے رکھی گئی ہے، تاکہ پتہ لگ جائے کہ عورت کو حمل ہے یا نہیں۔ اس لیے عدت حیض بنے گی (اگر حمل ہوگا تو حیض نہیں آئے گا اور عورت وضعِ حمل تک عدت گزار کر اس خاوند سے فارغ ہو جائے گی اور اگر موت کی عدت گزار رہی ہے تب بھی وضع حمل سے اس کی عدت پوری ہو جائے گی)۔

﴿وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا﴾ [البقرۃ:۲۲۸] خدا نہ کرے اگر کسی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ عورت عدت میں ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کا خاوند اس کو لوٹانے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ یعنی

عدت کے اندر اگر خاوند رجوع کرنا چاہے تو یہ خاوند کا زیادہ حق ہے۔ عورت یا اس کے ورثہ یہ نہیں کہہ سکتے: چونکہ تم نے مجھے طلاق دے دی ہے، اب تم رجوع نہیں کر سکتے۔

ایک بات یاد رکھیں! یہ اس صورت میں ہے جب خاوند نے طلاقِ رجعی دی ہو۔ اور اگر طلاق بائن دی تو تجدیدِ نکاح کر کے خاوند اپنی بیوی کو لوٹا سکتا ہے۔ اور اگر خاوند نے تین طلاقیں دے دیں تو جب تک کہ وہ عورت کسی اور سے شادی کرے اور دوسرا خاوند یا تو قدرتاً مر جائے یا وہ اپنی ناچاقی کی بنا پر خود اپنی منشا سے طلاق دے دے تو وہ پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔

تین طلاقوں کا مسئلہ:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: چونکہ لفظِ ''طلاق'' واضح اور صریح ہے، اس میں کوئی کنایہ نہیں ہے، لہٰذا ایک دفعہ لفظ ''طلاق'' کہا تو ایک طلاق ہوگی، دو دفعہ کہا تو دو دفعہ طلاق واقع ہوگی اور اگر تین دفعہ کہا تو تین دفعہ طلاق ہوگی۔ یہ سب ائمہ کے نزدیک اتفاقی مسئلہ ہے؛ کیونکہ جو مسئلہ منصوص ہو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اختلاف وہاں ہوتا ہے جو مسئلہ منصوص نہ ہو۔ یہ مسئلہ بھی منصوص ہے: ﴿فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ [البقرۃ: ۲۳۰] کہ اگر تین طلاقیں ہو گئیں تو عورت خاوند کے لیے حلال نہیں جب تک کہ دوسرے خاوند سے نکاح نہ کر لے اور وہ اس کو طلاق دے کر فارغ نہ کرے۔

اگر ایک طلاق دی تھی تو اللہ تعالیٰ نے خاوند کو یہ حق دیا ہے کہ وہ عدت کے اندر اندر رجوع کر لے۔ رجوع کا معنی یہ ہے کہ دو گواہوں کے سامنے یہ کہہ دے کہ میں نے بیوی کو طلاق دی تھی، میں اب رجوع کرتا ہوں۔ یا کسی ایک کے سامنے کہہ دے یا بیوی سے کہلائے یا بیوی سے میاں بیوی والا عمل کر لے تو وہ بیوی اس کی اسی طرح رہے گی۔

لیکن ایک بات یاد رکھیں! اسلام نے ایک مرد کو تین طلاقوں کا حق دیا ہے۔ اگر..... خدا نہ کرے..... ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی دے دی، پھر رجوع کر لیا تو اس آدمی کا ایک حق ختم ہو گیا (یہ نہیں کہ وہ روز نئے تیر برساتا رہے)۔ اب اگر اس نے کچھ عرصہ کے بعد دوسری طلاق دے دی تو دو کا حق ختم ہو گیا۔ اب جب تیسری طلاق دے گا تو خود بخود تین طلاقیں ہو جائیں گی۔ اب وہ یہ نہیں کہہ سکے گا کہ وہ تو میں نے ایک دفعہ طلاق دی تھی اور صلح ہو گئی تھی۔ اسلام کہتا ہے کہ تمہارے پاس جو تین طلاقوں کے اختیارات تھے وہ تم استعمال کر چکے ہو۔ اب وہ

عورت تمہاری بیوی نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ دوسری جگہ نکاح نہ کر لے۔

بہر حال یہ مسئلے بڑے سخت ہیں۔ ہمارے بعض لوگوں میں ایسی بری بیماری ہے...... اللہ پاک ہر مسلمان کی حفاظت فرمائیں، ہر گھر کی حفاظت فرمائیں...... کہ چھوٹے چھوٹے مسئلے پر عورتوں کو طلاق دے دیتے ہیں۔ اگر حساب کریں تو دو تین سو طلاقیں ہو جائیں گی؛ کیونکہ نمک زیادہ پڑ گیا تو طلاق، مرچ زیادہ پڑ گئی تو طلاق، گھر میں گیا، کپڑا دھلا ہوا اچھا نہیں تھا، بس یہ تماشہ ہے جو لگا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کی تھی اس کو اپنی زبان سے جوش میں آ کر حرام کر رہے ہو۔

تین طلاقوں کے بعد صلح کا حکم:

بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ خاوند نے مثلاً: ایک دفعہ طلاق دی، برادری والوں نے آ کر کہا: اچھی بات نہیں ہے، تمہارے بچے ہیں۔ اور ان برادری والوں نے عورت کو سمجھایا اور مرد کو بھی سمجھایا، اب دونوں میں صلح ہوگئی۔ چھ ماہ یا سال گزرنے کے بعد پھر طلاق ہوگئی۔ اب پھر برادری والے آگئے اور انہوں نے پھر صلح کرادی۔ اب سال کے بعد اس نے پھر طلاق دے دی، اب پھر برادری والے آگئے۔ مرد کہتا ہے کہ میں تین طلاقیں دے چکا ہوں۔ برادری والے کہتے ہیں: پہلے والی طلاقوں سے تم رجوع کر چکے ہو، مولویوں کی بات چھوڑو، کیوں اپنا گھر برباد کرتے ہو؟ اور عورت کو بہکاتے ہیں کہ دیکھو! تمہارے چار بچے ہیں۔ اگر تم خاوند کے گھر سے چلی جاؤ گی تو کب تک بھائی خرچہ برداشت کریں گے؟ بس اس بات کو کس نے سنا ہے؟ چپ کر کے گھر میں رہو۔

یاد رکھیں! یہ عورت کسی کے نزدیک بھی حلال نہیں، پوری زندگی...... نعوذ باللہ...... زنا کرتے رہیں گے۔ کتنی ایسی عورتیں ہیں جن کو تین طلاقیں ہو چکیں، لیکن برادری والوں نے صلح کرا کے ان کو گھر بٹھا دیا، لیکن شریعت کی نظر میں دونوں زنا کر رہے ہیں۔ آئندہ جو اولاد ہوگی وہ ولد الزنا ہوگی؛ کیونکہ شریعت کا نکاح باقی نہ رہا تو کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اللہ نہ کرے کبھی گھر میں ایسی بات ہو جائے تو اپنے علاقے کے ذمہ دار اہل سنت مسلک کے عالم کی خدمت میں جا کر مسئلہ پوچھیں، جن کے بارے میں یہ تسلی ہو کہ واقعی یہ عالم ہے، مفتی ہے۔ اس کو جا کر سیدھی بات بتائیں۔ اب جو اللہ اور اللہ کے رسول نے حکم دیا ہے مجھے سمجھا دیں، تا کہ اللہ پاک مجھے حرام سے بچائے اور حلال پر قائم رکھے۔

طلاق کے بعض الفاظ صریح ہوتے ہیں اور بعض کنائی الفاظ ہوتے ہیں۔ مثلاً: کسی نے کہا: میں نے تجھے طلاق

دے دی، یا کہا: تم مجھ پر حرام ہو۔ یہ صریح الفاظ ہیں۔ اور اگر یہ کہا کہ تم میرے گھر سے چلی جاؤ، تیرا میرا کوئی تعلق نہیں، یا کہا: تم مجھ سے آزاد ہو، یا کہا: آج کے بعد تیرا میرا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ اب ایسے سینکڑوں الفاظ ہیں جو آدمی استعمال کرتا ہے۔ اب یہ عالم کا کام ہے کہ وہ اس آدمی سے ذمہ داری کے ساتھ پوچھے گا کہ بھائی! سیدھی بات بتاؤ کہ یہ لفظ کہتے ہوئے تمہاری نیت کیا تھی؟ کیا طلاق کی نیت تھی یا ویسے جھگڑا کر رہے تھے؟ بعض اوقات اس کا مقصد طلاق ہوتا ہے۔ اس لیے ان سارے مسائل کا حل یہ ہے کہ اگر کبھی...... خدا نہ کرے...... کسی کے گھر میں کوئی ایسی بات ہو جائے تو عالم دین سے رجوع کریں۔

رجوع کا حق کس کو ہے؟

﴿اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ یہ شرط اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہے۔ یعنی...... اللہ نہ کرے...... اگر ایک آدمی اصلاح نہیں چاہتا، اس کے بعد رجوع ہو جائے گا۔ مثلاً: بعض مرد اپنی عورتوں کو تنگ کرنے کے لیے طلاق دے دیتے ہیں۔ جب وہ عدت کے اندر ہوتی ہے یا ایک دو دن باقی ہوتے ہیں تو وہ رجوع کر لیتے ہیں، اب وہ پھر اس کی بیوی بن گئی۔ کچھ عرصے کے بعد پھر طلاق دے دی اور پھر رجوع کر لیا۔ مقصد صلح نہیں ہوتا، بلکہ عورت کو ذلیل کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح رجوع تو ہو جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسا نہ کرو۔ اگر رجوع کرنا ہے اور اگر واقعی تم اصلاح چاہتے ہو اور واقعی تمہیں احساس ہو گیا ہے کہ میں نے طلاق دے کر غلطی کی ہے، میرے گھر کا پورا نظام برباد ہو جائے گا اور میں اب بیوی کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ پھر تمہیں حق ہے کہ رجوع کر لو۔

میاں بیوی جیسے بھی ہوں عمل نیک ہونے چاہئیں:

اگر ایک نوجوان ہے، خوبصورت ہے، مگر بیوی کالے رنگ کی مل گئی۔ یا ایک عورت ہے، وہ بے انتہائی خوبصورت ہے اور خاوند بدصورت ہے۔ جیسا کہ عرب کی حکایت ہے کہ اس نے بڑی خوبصورت لڑکی سے شادی کر لی تو ایک دن وہ بڑے اچھے موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے بیوی سے کہا: تم مجھے بتاؤ دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب کون ہے؟ اور بدنصیب کون ہے؟ تو بیوی نے کہا: آپ بادشاہ ہیں، میں عورت ہوں، آپ کا وسیع مطالعہ ہے۔ بادشاہ نے کہا: تم بتاؤ۔ تو اس نے کہا: مجھ سے اگر پوچھتے ہیں تو میرے نزدیک سب سے زیادہ خوش نصیب آپ ہیں اور بدنصیب میں ہوں۔ بادشاہ نے کہا: وہ کیسے؟ اس عورت نے کہا: آپ سب سے زیادہ خوش

نصیب ہیں؛ کیونکہ آپ کو میرے جیسی خوبصورت بیوی ملی ہے۔ اور سب سے بدنصیب میں ہوں کہ آپ جیسا شوہر ملا ہے۔ اگر آپ بادشاہ نہ ہوتے تو کوئی خیرات بھی نہ دیتا۔

قرآن نے ہمیں سبق دیا ہے: ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔـا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ﴾ [البقرۃ:۲۱۶] کہ میرے بندے! کبھی کسی چیز کو تم محبوب سمجھتے ہو اور میں جانتا ہوں کہ وہ تمہارے لیے بری ہے۔ اور کبھی کسی چیز کو تم برا سمجھتے ہو، لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ تیرے لیے بہتر ہے۔

مثلاً: آدمی سمجھتا ہے کہ میری بیوی خوبصورت نہیں، کالی ہے اور مجھے ساتھی طعنہ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہیں کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے بطن سے کوئی ہیرا دے دے، جو عالم بن کر دنیا کا تاج بن جائے، محدث پیدا ہو جائے، اللہ تعالیٰ کا ولی پیدا ہو جائے۔ تو خوش ہوتا ہے کہ میری بیوی بڑی خوبصورت ہے، اس سے تمہیں ایسی فتنہ اولاد مل جائے جو تیری عزت کو زمین میں گاڑ دے تو کیا کرو گے؟

ہمارے ایک دوست تھے ایک دن بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے بات چل نکلی تو وہ کہنے لگے: میرا تجربہ تو یہ ہے کہ آدمی بیوی کے بارے میں زیادہ تجسس نہ کرے کہ خوبصورت ڈھونڈو، بلکہ کوئی کالی شکل والی ہے تو اچھا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ کالی شکل والی کوئی نہیں دیکھے گا، اس طرح عزت محفوظ رہے گی، نہ کوئی اس پر نظر ڈالے گا۔ خوبصورت ہوگی تو ہزاروں آدمی دیواریں پھاندیں گے۔

جو بیوی عزت میں خیانت نہیں کرتی تو سمجھو کہ اس سے زیادہ قیمتی ہیرا تمہیں دنیا میں نہیں ملے گا۔ اس بیوی کو تم آگ لگاؤ گے جو خوبصورت ہو، لیکن جب تم گھر سے نکلو تو تمہارے بستر پر کوئی اور آتا ہے۔ جو لوگوں کے گھروں میں جا کر بیٹھتی ہو، کلبوں میں کھیلتی ہو اور غیروں کے ساتھ پھرتی ہو۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠﴾ [البقرۃ:۲۲۸] عورتوں کے لیے بھی حقوق ہیں، جیسا کہ تیرے حقوق عورت پر ہیں۔ ''بِالْمَعْرُوْفِ'' کا معنی ہے کہ وہ حقوق تم خود خیر خواہی سے ادا کرو۔ یہ نہیں کہ وہ بھی عدالت میں جا کر اپنے حقوق تم سے منوائے اور تم بھی مقدمہ کر کے حق منواؤ۔

بیویوں پر شوہر کے حقوق:

عورت کے ذمہ حقوق یہ ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب خاوند کی نظر پڑے تو خاوند خوش ہو جائے۔ یعنی

عورت اپنے خاوند کے لیے اپنے گھر میں بن ٹھن کر صاف ستھرا لباس پہنے۔ غریب ہے، غریبانہ صاف ستھرا لباس پہنے۔ یاد رکھیں! اگر نظافت نہیں ہے تو ایمان نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن اتارا کہ میرا مدنی! یہ مدینے والے کتنے پاک لوگ ہیں کہ استنجا ڈھیلے سے کرنے کے بعد بھی بدن کو پانی سے دھوتے ہیں۔ کیونکہ جس گھر میں صفائی نہیں ہوتی وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ لیکن ہمارے ہاں رواج ہے کہ عورت دوسروں کے لیے بنتی سنورتی ہیں، خاوند کے لیے نہیں بنتی۔ جب کبھی شادی پر جانا ہو تو وہ اس دن غسل بھی کرے گی، اچھے کپڑے بھی پہنے گی اور میک اپ بھی کرے گی؛ کیونکہ لوگوں نے دیکھنا ہے۔ آج کل تو...... ماشاء اللہ...... شریف بیویاں پردہ بھی خاوند سے کرتی ہیں کہ اس کو دیکھ کر فوزا دوپٹہ اوڑھ لیں گی اور جب وہ نکل جائے تو دوپٹہ ختم ہے۔ یہ عورت شریعت کی نظر میں ملعونہ ہے۔

حدیث شریف کا مفہوم ہے: جو عورتیں میک اپ کر کے، سنگھار کر کے اور فیشن ایبل کپڑے پہن کر بازاروں میں نکلیں، ان عورتوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ چاہے وہ تمہاری نظر میں کتنی عزت والی ہوں۔ لیکن بات قرآن و حدیث کی ہے اور ان کے لیے ہے جو قرآن و حدیث کو مانتے ہیں۔ اور جو نہیں مانتے ان سے تو کوئی جھگڑا نہیں۔ وہ جو کچھ چاہیں کرتے پھریں۔ اس لیے دیکھیں! اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا: ﴿إِن كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ کہ یہ سارے مسئلے ان عورتوں کو سمجھاؤ جو اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان نہیں تو جو مرضی آئے کرو۔ ہاں اگر دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں تو پھر قرآن کے مطابق زندگی گزارنی پڑے گی۔ اگر ہم قرآن سے ہٹیں گے تو قرآن پاک کی لعنت کے مطابق جو سزا ہے وہ ہم پر بھی مرتب ہوگی۔ چاہے مولوی کی بیٹی ہو، پیر کی بیٹی ہو، چاہے کسی کی بیٹی ہو۔

دوسرا حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: عورت پر خاوند کا یہ حق ہے کہ جب خاوند حکم دے وہ حاضر ہو کہ روٹی، پانی یا خدمت کے لیے بلایا، اس نے جماع کی خواہش کی تو فوزا تعمیل کرے اور انکار نہ کرے۔ ہاں اگر وہ بیمار ہے، حقوق کے قابل نہیں تو خاوند کو بتا دے کہ میری حالت یہ ہے، ورنہ شریعت نے عورت کے لیے یہ حکم رکھا ہے کہ اگر وہ کسی حال میں بھی ہے اور خاوند نے حکم دیا ہے، یا خاوند نے اپنی خواہش کے لیے بلایا، لیکن بیوی نے انکار کر دیا تو صبح تک اللہ تعالیٰ کے فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں کہ تم نے اپنے خاوند کو انکار کر دیا۔ کھانا تو وہ ہوٹل میں بھی کھا سکتا ہے، کپڑے تو وہ لانڈری سے بھی دھلوا سکتا ہے۔ اصل بیوی تو تم اس لیے ہو کہ خاوند اپنی خواہش پوری کر سکے۔

تیسرا حق خاوند کا یہ ہے: ''إِذَا غَابَ عَنْهَا حَفِظَتْهُ'' ''جب خاوند گھر سے باہر چلا جائے عورت پر حق ہے کہ عورت اپنے خاوند کے مال کی حفاظت کرے، اس کے مال کی حفاظت کرے اور اس کی عزت کی حفاظت کرے۔ یہ نہیں کہ جب خاوند چلا جائے تو وہ خیانت کرے۔

بیوی کے حقوق:

مردوں پر یہ حق ہے کہ بیوی کے نان نفقہ، سکنیٰ، کھانا پینا اور لباس آرام کو مہیا کرے۔ اسی طرح عورت کے جو دوسرے شریعت کے مطابق جائز تقاضے ہیں وہ بھی پورے کریں۔ جیسے مرد چاہتا ہے کہ میری بیوی غیر مرد کو نہ دیکھے، کسی غیر مرد سے برائی نہ کرے، اسی طرح تمہاری بیوی بھی چاہتی ہے کہ تم بھی کسی دوسری عورت کی طرف نہ دیکھو، تم بھی کسی دوسری عورت سے برائی نہ کرو۔ تو جیسے تم اپنے حق کا مطالبہ کر رہے ہو ایسے تم بھی اس کے حقوق کی حفاظت کرو۔ یہ نہیں کہ جب تم نکلو تو خیانت کرتے رہو اور غیر عورتوں کے پاس جا کر زنا کرتے رہو۔

اگر دوسری شادی کرو گے تو اسلام نے تمہیں اجازت دی ہے۔ اس میں بھی تم عدل کرو گے۔ اگر ایک دن دوسری بیوی کے پاس رہے تو دوسرے دن پہلی بیوی کے پاس رہے۔ کپڑے میں عدل کرے، رہائش میں عدل کرے، وقت میں عدل کرے اور ہاں محبت میں عدل نہیں ہو سکتا۔ یہ دل کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ کسی عورت کی طرف دل زیادہ مائل ہوتا ہے اور کسی بیوی کی طرف دل کم مائل ہوتا ہے۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ فرماتے تھے: ''اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَعْدِلُ فِيْ مَا أَمْلِكُ'' ''اے اللہ! میں اپنی بیویوں کے معاملہ میں عدل کرتا ہوں جو میرے بس میں ہے۔ اور جو بات میرے بس میں نہیں وہ میرے ہاتھ میں نہیں۔[1]

اس لیے اس میں شریعت کا مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اگر ایک آدمی کی دو بیویاں ہیں: ایک دن ایک بیوی کے پاس ہے اور دوسرے دن دوسری بیوی کے پاس ہے۔ اس پر یہ ضروری نہیں کہ ایک رات اِدھر جماع کیا ہے تو دوسری رات اُدھر بھی جماع کرے۔

﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۲۸] یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو حقوق دیے ہیں، لیکن مردوں کو عورتوں سے اونچا درجہ دیا ہے۔ مرد ہر لحاظ سے عورت سے افضل ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿اَلرِّجَالُ

[1] [کنز العمال: ۱۶/ ۷۰۹، مجمع الزوائد ۴/ ۵۰۱]

قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [النساء:۳۴] ہم نے مردوں کو عورتوں کا قوام بنایا ہے۔

اس لیے دیکھیں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبی نہیں بنایا؛ کیونکہ مقامِ نبوت و رسالت کا جو تقاضہ ہے وہ عورت پورا نہیں کرسکتی۔ اس لیے اسلام نے عورت کو امامت کا حق نہیں دیا؛ کیونکہ یہ مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق کا مرد کے ساتھ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ مردوں کو ہم نے ایک درجہ تفوق دیا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہر چیز کے اندر حکمتیں ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو فیصلے فرمائے ہیں بحیثیت مسلمان کے ہمارا ایمان ہے: وہ حق ہے، عدل ہے اور صدق ہے۔ ان میں شبہ کرنے والا کافر ہوسکتا ہے، مسلمان نہیں ہوسکتا۔

﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۲۸] اللہ تعالیٰ غالب ہیں، یعنی اگر ہم نے مرد کو افضل قرار دیا ہے تم سارے مخالفت کرو تو میرا کوئی نقصان نہیں کرسکتے۔ میں تو سب پر غالب ہوں، تم اپنی عاقبت خراب کرو گے اور اپنے لیے بربادی خریدو گے۔ میں تو غالب ہوں، مجھے کوئی مغلوب نہیں کرسکتا۔ اور باقی ہم نے یہ نکاح اور طلاق والے مسائل اس لیے رکھے ہیں کہ ہم حکمت والے ہیں اور ہمارا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس میں تیری بھلائیاں ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہے، تم سب اس کے محتاج ہو۔

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌ ۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ ۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْــًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۲۹، ۲۳۰]

''طلاق رجعی دو بار تک ہے۔ پھر دستور کے موافق روک لینا ہے یا خوش عنوانی سے چھوڑ دینا ہے۔ اور تمہارے لیے حلال نہیں کہ لے لو کچھ بھی جو تم نے ان کو دیا تھا، مگر یہ کہ وہ دونوں ڈریں کہ اللہ کے ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے۔ پھر اگر تم ڈرو کہ وہ (میاں بیوی) اللہ کے ضابطوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ عورت بدلہ (بدل خلع) دے کر چھوٹ جائے۔ یہ اللہ کے ضابطے ہیں، ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو اللہ کی حدود سے آگے بڑھے گا تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ (ان دو طلاقوں کے بعد) پھر اگر اس کو (تیسری) طلاق دے دی تو اب اس کے بعد اس کو وہ عورت حلال نہیں، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی خاوند سے نکاح کرے۔ پھر اگر وہ شخص (بھی) اس کو طلاق دے دے تب گناہ نہیں ان دونوں پر کہ پھر مل جائیں، اگر خیال رکھیں اللہ کے ضابطے قائم رکھیں گے۔ اور یہ اللہ کے ضابطے ہیں، جن کو وہ جاننے والوں کے لیے بیان کرتا ہے۔''

طلاق کے مسائل:

ان آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے طلاق کے احکام کا ذکر فرمایا ہے کہ مرد کو طلاق دینے کا حق ہے کہ دو دفعہ طلاق دے؛ کیونکہ مرد کے پورے اختیار میں تین طلاقیں ہیں: ایک رجعی ہوگی، دو طلاقیں دے گا تو طلاق بائنہ ہو جائے گی، لیکن اس میں بھی عدت گزر جائے تو دوبارہ نکاح کر کے رجوع کر سکتا ہے، یعنی صرف نکاح کرے گا۔ ہاں اگر دو طلاقیں دے چکا ہے تو اب اس کے بعد ایک طلاق دینے کا حق باقی ہے کہ یا تو اس کو باقاعدہ رکھو اور اگر چھوڑنا ہے تو چھوڑ دو۔ اس کے بعد مرد کے حقوق ختم ہو جاتے ہیں اور اس کو رجوع کرنے کا حق باقی نہیں رہتا اور نہ ہی وہ رجوع کر سکتا ہے۔

ہاں اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ پہلا خاوند اب بھی اسی بیوی کو رکھنا چاہتا ہے تو اسلام نے اس کی پابندی لگائی ہے کہ وہ عورت اپنی منشا سے دوسری جگہ شادی کرے۔ اور وہ نکاح فرضی نہ ہو، بلکہ میاں بیوی باقاعدہ مجامعت کریں اور اس کے بعد دوسرا خاوند اپنی مرضی سے چھوڑنا چاہے یا دوسرا خاوند مر گیا تو عورت عدت گزارنے کے بعد پہلے شوہر کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے۔

یہ سارے مسائل بڑے ضروری اور اہم ہیں...... اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے!...... آج جس دور میں ہم گزر رہے

ہیں بڑا پرفتن دور ہے۔ اور گھر گھر میں اختلافات، فسادات، لڑائیاں اور جھگڑے ہیں تو ان چیزوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑے کھول کھول کر احکام واضح کیے ہیں، تاکہ ہر بندہ احتیاط کرے۔ اگر...... اللہ نہ کرے!...... گھر میں کوئی جھگڑا کرے تو بیوی کو مار سکتا ہے، گھر میں رہتے ہوئے بیوی کے ساتھ علیحدہ بھی رہ سکتا ہے اور اس کے ساتھ بے رخی بھی کر سکتا ہے، لیکن طلاق کا لفظ زبان پر نہ لائے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''أَبْغَضُ الْحَلَالِ عِنْدَ اللّٰهِ الطَّلَاقُ''[1] (اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں مبغوض چیز ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے۔ یہ احکام ایسے جامع مانع و کامل مکمل ہیں کہ آج پوری دنیا انصاف کے ساتھ اسی بات کی طرف لوٹ رہی ہے کہ جو اسلام نے احکام رکھے ہیں ایسے جیسے جامع احکام نہیں مل سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام میں بندوں کے لیے رحمت ہی رحمت ہے۔ مثلاً: دیکھیں!

❁ ...... اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ سب سے پہلے ''اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ'' ہے۔

❁ ...... اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جب اپنی صفت کا اظہار فرمایا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝﴾ [طٰہٰ:٥] حالانکہ یہ ایسا مقام تھا کہ صفتِ قہاریت کا اظہار فرماتے اور صفتِ جباریت کا اظہار فرماتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے صفتِ رحمن کا بیان فرمایا۔

❁ ...... اسی طرح صحیح حدیث مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سو رحمت پیدا فرمائی ہے: اس سو میں سے صرف ایک حصہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اتارا ہے، باقی ننانوے حصے اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ ایک حصے سے ساری دنیا میں اتفاق، محبت، رشتے داریاں اور والدین ہیں۔ ابھی ننانوے گنا رحمت محفوظ ہے۔

❁ ...... پھر دیکھیں! اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیغمبر کیسا عطا فرما دیا ہے!! ﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ [الانبیاء:١٠٧]

❁ ...... اور حضور اکرم ﷺ کے صحابہ کی صفت بیان فرمائی: ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح:٢٩] وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر مہربانی فرمانے والے ہیں۔

❁ ...... اور اسی طرح صحیح حدیث مبارک میں آیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ''اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ

[1] [سنن ابی داود: رقم: ٢١٧٨، باب: في كراهية الطلاق]

مَنْ فِي السَّمَاءِ ''(تم زمین والوں پر رحم کرو اللہ تعالیٰ تم پر رحم کریں گے)۔یعنی اسلام سراپا رحمت ہے۔

[جامع الترمذی، رقم: ۱۹۲۴، باب: ما جاء فی رحمۃ المسلمین]

❁......اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مومن کی صفت یہ ہے کہ جو اپنے لیے پسند کرے اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرے۔

تو جب اتنا سراپا رحمت دین ہے اور سراپا رحمت اسلام ہے تو اس نے عورتوں پر بھی رحمت کی ہے، انسانوں پر بھی رحمت کی ہے اور مردوں پر بھی رحمت کی ہے۔اس نے جانوروں کے بھی حقوق بتا دیئے، اس نے راستے کے بھی حقوق بتا دیئے، اس نے ضعیفوں کے بھی حقوق بتائے اور یتیموں کے بھی حقوق بتائے۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! خبردار!! عورتوں کے بارے میں خبردار رہو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک عورت کو تیرے تابع فرما دیا ہے کہ عورت کسی تلک کی ہے اور مرد کسی ملک کا ہے۔صرف ایجاب وقبول کے ایک کلمہ نے عورت کا مالک بنا دیا ہے۔تو تم بھی اس پر رحم کرو اور اس کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھو۔

اسی طرح حضور پاک ﷺ نے فرمایا: یاد رکھو! ''اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْئٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهُ كَسَرْتَهُ وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا'' [بخاری، رقم: ۵۱۸۶] کہ عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی ٹیڑھی پسلی سے پیدا فرمایا ہے۔تو جیسے پسلی میں ٹیڑھا پن ہوتا ہے اسی طرح عورتوں میں بھی کچھ نہ کچھ تو کجی رہتی ہے۔جتنی مرتبہ کیوں نہ ل جائے، کوئی نہ کوئی کمی ہوگی، اس کو حلم وحوصلے کے ساتھ برداشت کرو۔اتنی سختی بھی نہ کرو کہ وہ ٹوٹ جائے اور اتنے ڈھیلے بھی نہ بن جاؤ کہ عورت آزاد ہوکر شتر بے مہار ہو جائے اور پھر تیرے قابو میں بھی نہ رہے۔

[کنز العمال، رقم: ۴۴۹۵۷، المسند الجامع لابی الفضل: ۲۱/۱۴۹۱]

بیویوں میں عدل نہ کرنے پر سزا:

اسلام نے مرد کو حق دیا ہے کہ وہ چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے، لیکن یہ حکم نہیں دیا کہ تم چار رکھو، یعنی رکھنے کی اجازت ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہے اور پیسہ دیا ہے تو اس کو اجازت ہے کہ بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتے ہو، لیکن اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے پابندی لگائی ہے: ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾ [النساء: ۳] کہ اگر تم ڈرتے ہو کہ میں عدل وانصاف نہیں کر سکوں گا تو ایک شادی کرو۔اور ساتھ یہ پابندی بھی لگا دی کہ اگر تیری دو

بیویاں ہیں اور تو نے عدل نہ کیا تو قیامت والے دن اللہ تعالیٰ تجھے فالج زدہ اٹھائیں گے، تا کہ محشر میں لوگوں کو پتہ لگے کہ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی بیوی سے عدل نہیں کیا۔

نکاح کے اندر رضامندی کا حق اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو عطا فرمادیا ہے کہ اگر مرد راضی نہ ہو تب بھی نکاح نہیں ہوگا اور عورت راضی نہ ہو تب بھی نکاح نہیں ہوگا۔ عورت کو حکم دیا کہ اپنے ولی کی اجازت کے ساتھ نکاح کرے، لیکن عورت سے اجازت لینا ولی کو بھی ضروری ہے (ولی اس کو کہتے ہیں جس کو بچی یا بڑی عورت کا نکاح دینے کا اختیار ہو، جیسے باپ، دادا، بیٹا، پوتا، بھائی، چچا اور بھتیجا وغیرہ)۔ ہاں اگر کوئی بچی نابالغ تھی، ولی نے نکاح کر دیا تو نکاح ہو جائے گا، لیکن اگر عورت بالغ ہے تو اس کے اولیاء کو اللہ نے حکم دیا کہ اس کی رضامندی حاصل کرو۔

نکاح کی غرض سے ہونے والی بیوی کو دیکھنا:

اسلام نے حکم دیا ہے کہ غیر محرم عورت پر نظر ڈالنا حرام ہے، لیکن اسلام کہتا ہے کہ اگر تم شادی کرنا چاہتے ہو تو کسی جگہ تم نے خطبہ کیا ہے تو تمہارا حق ہے کہ تم اپنی ہونے والی بیوی کو ایک نظر دیکھ سکتے ہو اور وہ عورت بھی اپنے ہونے والے شوہر کو ایک نظر دیکھ سکتی ہے، تا کہ بعد میں کسی قسم کا تنافر پیدا نہ ہو۔

اسلام نے حکم دیا کہ دونوں میں کفو بھی ہو، یعنی دونوں مسلمان ہوں، دونوں آزاد ہوں اور دونوں معاشرے کے اندر برابر کے ہوں۔

اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ نکاح کرو تو عورت کو مہر ادا کرو۔ اگر مہر ادا نہیں کرو گے تو وہ قیامت تک تیرے ذمہ باقی رہے گا۔ بعض ائمہ تو فرماتے ہیں کہ جب تک مہر ادا نہ کرے خاوند کو اس وقت تک بیوی سے ملنے کا حق بھی نہیں ہے۔

مرد کو چار عورتوں سے نکاح کرنے کا حق دیا ہے، لیکن عورت کو چار مردوں سے نکاح کرنے کا حق نہیں دیا۔ اس پر بعض بے دین لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں عورت کی عزت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اگر ایک عورت کے چار خاوند ہوں۔ کوئی کہے: میرے پاس آؤ، دوسرا کہے: میرے پاس آؤ تو عورت کیا کرے گی؟ اس کے علاوہ اگر حمل ٹھہر گیا تو پتہ نہیں کہ یہ نطفہ کس کا ہے؟ نطفہ ٹھہر گیا تو دوسرے کی فصل کو پانی اور لگا رہا ہے۔ اس کے بعد نسب میں خلل پڑ گیا۔ اور اگر ایک کی اولاد ہو تو باقی تین نے کیا گناہ کیا ہے؟

یہ بھی اللہ تعالیٰ نے عورت کی عزت رکھی ہے کہ اگر خاوند کی چار بیویاں ہیں تو یہ پہلی بیوی زیادہ محفوظ رہے گی کہ

تین دن خاوند دوسری بیویوں کے ساتھ رہے گا تو اس کو آرام مل رہا ہے۔

طلاق کا ہونا بھی حکمت ہے:

اسلام نے طلاق کا بھی ایک حق رکھا ہے؛ کیونکہ اگر خدانخواستہ طلاق نہ ہوتی تو آپ دیکھ لیں کہ یورپ کے بعض ملکوں میں اتنی مشکلات ہیں کہ خاوند طلاق نہیں دے سکتا اور آپس میں محبت بھی نہیں ہے۔ بیوی اپنے گھر ہے اور خاوند اپنے گھر ہے۔ اگر خاوند طلاق دے تو اس کے لیے اتنے مصائب اور مشکلات ہیں کہ وہ ان سے نکل نہیں سکتا۔ اگر کسی نے شادی کی اور...... خدانہ کرے...... آپس میں موافقت نہ ہو سکی اور اسلام میں طلاق نہ ہوتی تو کیا کرتے؟ ایک شریف آدمی نے نکاح کیا، بیوی کا بعد میں پتہ چلا کہ وہ بدچلن ہے۔ اگر طلاق کی اجازت نہ ہو تو خاوند کیا کرتا؟ اور اسی طرح اگر شادی ہوگئی، لڑکی بھی ٹھیک ہے اور لڑکا بھی ٹھیک ہے، لیکن دونوں میں نفرت ہے۔ اگر طلاق کی گنجائش نہ ہوتی تو کیا کرتے؟ اس لیے اسلام نے طلاق کی بھی گنجائش رکھ دی ہے کہ...... خدانہ کرے...... اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو طلاق دے سکتے ہو کہ طلاق دینے کے بعد تم اپنا کوئی دوسرا گھر ڈھونڈ و اور عورت کوئی دوسرا گھر ڈھونڈ لے۔ دونوں کے گھر اللہ تعالیٰ آباد فرما دیں۔

بیوہ اور مطلقہ عورتوں سے نکاح سنتِ رسول ہے:

پھر دیکھیں کہ بیوہ اور مطلقہ عورتوں سے نکاح کرنا سنت بن گیا۔ میرے آقا سرکار مدینہ نبی کریم ﷺ نے عین شباب میں سب سے پہلا نکاح خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پہلے دو شوہر فوت ہو چکے تھے اور بی بی صاحبہ کی عمر چالیس سال تھی۔

نکاح میں ایجاب وقبول:

نکاح کے اندر دونوں کا حق ہے۔ اگر بیوی راضی نہ ہو تو نکاح نہیں ہو سکتا اور اس پر کوئی جبر بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارے ہاں عجیب مسئلے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملکوں میں ایسی جہالت ہے کہ عورت بیٹھی رہتی ہے۔ اس کی پانچ سات سہیلیاں بھی ساتھ بیٹھی ہوتی ہیں۔ قاضی صاحب دو گواہوں کو لے کر آتا ہے کہ تمہیں فلاں بن فلاں کا نکاح منظور ہے؟ اگر وہ چپ بیٹھی ہو تو دوسری عورت اس کی گردن کو پکڑ کر ہلا دیتی ہے، یا دوسری عورتیں کہہ دیتی ہیں کہ ہاں قبول ہے۔ یہ غلط ہے۔ اسلام نے اس کا بھی حل بتایا ہے۔ اسلام نے کہا ہے: ایک کنواری لڑکی ہے، اس سے

جب پوچھا گیا اور وہ چپ بیٹھ گئی تو اسلام کہتا ہے: یہ چپ رہنا بھی رضا ہے؛ کیونکہ شریف عورت بعض دفعہ اپنی زبان سے نہیں کہتی۔ بہرحال آج کل تو شادی سے پہلے ہی سب کچھ ہو جاتا ہے۔ جتنے مراحل میاں بیوی نے بعد میں طے کرنے ہیں وہ پہلے ہو جاتے ہیں اور نکاح کے بارے میں بعد میں غور ہوتا ہے۔ بہرحال! اسلام ان چیزوں کا روادار نہیں۔ جبکہ پہلے تو اتنی شرم تھی کہ شادی کے بعد کئی مہینوں تک عورت خاوند کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتی تھی۔ اب تو نہ غیرت رہی اور نہ شرم رہی۔

اگر قاضی نے عورت سے جا کر پوچھا کہ فلاں بن فلاں کا نکاح قبول ہے؟ اور عورت ہنس پڑی تو یہ بھی رضا ہے۔ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر رو پڑی تو بعض اوقات خوشی سے بھی رونا ہوتا ہے، مگر جب وہ نکاح سے پہلے انکار کر دے تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

یہ سارے مسئلے فقہاء نے قرآن سے لیے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو خوشخبری دی گئی تو وہ خوشی سے ہنس پڑیں۔

طلاق صرف خاوند کے اختیار میں ہے:

نکاح میں عورت کی رضامندی شرط ہے، لیکن طلاق میں عورت کی رضامندی شرط نہیں ہے؛ کیونکہ طلاق خاوند کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس پر شکر کرو؛ کیونکہ اگر طلاق عورت کے ہاتھ میں ہوتی تو تم روز طلاق لے کر باہر آتے۔ یہ تو ابھی اس کے ہاتھ میں نہیں ہے اور تم جوتے اٹھا رہے ہو۔

اس آیت (نمبر ۲۳۰) میں دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ دو دفعہ طلاق دینے کے بعد اگر رکھنا ہے تو بھلائی سے رکھو، یہ نہیں کہ تم اسے تنگ کرو۔ اگر چھوڑنا ہے تو اس کو شرعی طریقہ کے ساتھ چھوڑو، یہ نہیں کہ اس کو دھکے دو، الزام لگاؤ۔ بس جب طلاق دی ہے تو بات ختم ہوگئی۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر تم طلاق دینا چاہتے ہو اور عورت کو اس کا حق المہر نہ دیا ہو تو حق المہر دے کر طلاق دو۔ اور کپڑے اور کچھ چیزیں دے کر روانہ کرو؛ کیونکہ اتنا عرصہ تم نے اکٹھے زندگی گزاری ہے۔ آپ نے پہلے پڑھ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنی بیویوں کو فرما دیں:

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿٢٨﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٢٩﴾﴾

[الاحزاب: ۲۸، ۲۹]

اے میرے مدنی! اپنی بیویوں سے کہہ دیں: اگر تمہیں دنیا کی زندگانی اور زینت عزیز ہے تو آؤ، میں تمہیں کچھ نفع کی چیز بھی دے دوں اور تمہیں بڑے احسن طریقے سے آزاد کر دوں۔ اور اگر تم اللہ کو، اللہ کے رسول کو اور آخرت کو پسند کرتی ہو تو دنیا میں تو تکلیفیں گزارنی ہوں گی، لیکن آخرت میں تمہارے لیے بہت بڑا ثواب ہے۔ پھر تمہیں برداشت کرنا ہوگا۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی حکم دیا ہے: ﴿فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ﴾ (اگر بیوی کو اپنے پاس رکھنا ہے تو اس کو بھلائی کے ساتھ رکھو اور اگر چھوڑنا ہے تو احسان کے ساتھ چھوڑو)۔

خلع کے متعلق مسئلہ:

﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـًٔا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ:۲۲۹] اگر تم عورت کو طلاق دینا چاہتے ہو تو اس کو عزت کے ساتھ طلاق دے کر فارغ کر دو۔ اس سے یہ مطالبہ نہ کرو کہ تم مجھے اتنے پیسے دو تو میں تمہیں طلاق دوں گا۔ ہاں اگر بیوی کو یقین ہو چکا ہے یا تم دونوں کو یہ یقین ہو چکا ہے کہ ہمارا آپس میں گزر نہیں ہو سکتا اور خاوند طلاق نہیں دینا چاہتا اور عورت مطالبہ کرتی ہے کہ میں چونکہ تیرے حقوق ادا نہیں کر سکتی تو تیرے گھر میں رہنے کا فائدہ نہیں ہے۔ اور وہ خود مطالبہ کرتی ہے کہ مجھے طلاق دے دو۔ تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نے جو کچھ اس کو دیا تھا اس سے واپس لے لو؛ کیونکہ اب طلاق کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہے۔ (ہاں اگر خاوند خود طلاق دینا چاہے یا زیادتی خاوند کی طرف سے ہو تو عورت سے خلع میں کچھ نہ لے۔) اس کو شریعت کی اصطلاح کے اندر ''خلع'' کہتے ہیں۔

سب سے پہلا یہ مسئلہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا ہے کہ ان کی بیوی نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر یہ درخواست کی کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنے خاوند کو دیکھا، چند دوستوں کے ساتھ آ رہے تھے۔ چھوٹے قد کے ہیں، سیاہ رنگ کے ہیں، میرے دل میں نفرت آ گئی، میں اس کے گھر میں نہیں رہ سکتی، میں اپنے خاوند کے حقوق ادا نہیں کر سکتی تو میرا بیوی بننے کا کیا فائدہ؟

﴿تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ﴾ ہم نے اسلام میں حدیں مقرر کر دی ہیں، اللہ کی حدود کو کبھی نہ توڑنا۔ مثلاً: ایک عورت کا ...... اللہ نہ کرے ...... کسی دوسرے مرد کے ساتھ تعلق بن گیا۔ دوسرے مرد نے کہا: تم خاوند کو تنگ کرو۔ جو کچھ لیتا ہے لے لے، میں تجھے دے دوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: خبردار! تم میری حدیں توڑ رہی ہو! یہ الگ بات ہے

کہ میاں بیوی کی نہیں بنتی، دلوں کے اندر نفرت آ گئی۔

روایت میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ارواح کو پیدا کیا تھا تو جن ارواح میں اللہ تعالیٰ نے وہاں موانست پیدا کر دی، دنیا میں آ کر بھی ان میں موانست ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہاں بھی تنافر ہو گیا تو دنیا میں آ کر بھی تنافر ہو جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر میاں بیوی کے درمیان نفرت پیدا ہو گئی اور بیوی نے طلاق کا مطالبہ کیا تو اس صورت میں کوئی گناہ نہیں۔

یاد رکھو! جو عورت پہلے خاوند کا گھر برباد کر کے آ رہی ہو وہ تیرا گھر بھی آباد نہیں کرے گی؛ کیونکہ بعض لوگ عشق کے چکر میں آ جاتے ہیں اور مجنون بن جاتے ہیں۔ ایک عورت نے اگر اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال نہیں کیا، اپنی اولاد کو چھوڑ دیا اور تیرے عشق میں مبتلا ہو گئی تو تم بھی انتظار کرو، تجھے چھوڑ کر تیسرے کے پاس جا سکتی ہے۔

تین طلاقوں کے بعد دوسرے مرد سے نکاح کیوں؟

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾ [البقرۃ: ۲۳۰] اگر خاوند نے تیسری طلاق دے دی تو اب یہ عورت اس خاوند کے لیے حلال نہیں ہو گی جب تک کہ کسی دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح نہ کر لے۔ اور صرف فقط نکاح نہیں، بلکہ اس کے ساتھ جماع بھی کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ سزا اس لیے ہے کہ ہم نے تو تمہیں ایک طلاق کا حق دیا تھا تو تم نے اس سے کیوں تجاوز کیا؟ اور تیسری طلاق کیوں دے دی۔ اگر تم نے تین طلاقیں دے کر ہمیشہ کے لیے اس عورت کو اپنے سے علیحدہ کر دیا ہے تو اب یہ تمہارے نکاح میں نہیں لوٹ سکتی جب تک دوسرا نکاح نہ کر لے۔

اس بات کو کافروں اور جاہلوں نے بڑا اچھالا ہے کہ عجیب بات ہے کہ تین طلاقیں تو مرد نے دی ہیں، لیکن سزا عورت کو مل رہی ہے کہ وہ دوسری جگہ نکاح کرے اور دوسرے خاوند کے ساتھ لیٹے۔ یاد رکھیں! یہ اسلام پر الزام ہے۔ اسلام کی منشا یہ ہے کہ جس آدمی نے تین طلاقیں دے دی ہیں، تم اس کے گھر میں پھر کیوں جانا چاہتی ہو؟ اسلام کہتا ہے: خبردار! مت جاؤ؛ کیونکہ ''لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَيْنِ'' [بخاری، رقم: ۶۱۳۳] (ایمان والا ایک بل سے دو دفع نہیں ڈسا جاتا)۔ ''اَلْمُجَرَّبُ لَا يُجَرَّبُ'' (جب ایک دفعہ کسی پر تجربہ کر لیا تو اس پر دوبارہ تجربہ کی ضرورت نہیں)۔ اس کے باوجود اگر عورت اپنے خاوند کے پاس جانا چاہتی ہے تو وہ خود راضی ہو رہی ہے۔

اسلام تو نہیں کہتا کہ جاؤ۔ اسلام تو اس کو بچانا چاہتا ہے کہ تم اور جگہ شادی کرلو؛ کیونکہ ہوسکتا ہے اس دوسرے خاوند کے ساتھ دل لگ جائے۔ لہٰذا اسلام نے عورت کی حفاظت کی ہے۔

یاد رکھیں! اگر عورت دوسرے خاوند کے پاس جارہی ہے، نکاح کر کے جارہی ہے۔ اگر پہلا خاوند باحیاء ہے تو اس کو تکلیف ہوگی کہ دیکھو! اگر میں زیادتی نہ کرتا تو میری بیوی دوسرے کے بستر پر نہ لیٹتی۔

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا﴾ اگر دوسرا خاوند خود بخود طلاق دے دے یا مرجائے ﴿فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ [البقرۃ: ۲۳۰] اب پہلا شوہر اور بیوی دوبارہ رجوع کرسکتے ہیں، لیکن عدت گزارنے کے بعد نکاح کرسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! اگر تم دونوں کو یقین ہے کہ دوبارہ شادی کر کے ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں گے اور اللہ کی حدود کو نہیں توڑیں گے تو پھر نکاح کرو۔ یہ نہ ہو کہ نکاح کے بعد لڑائی کرو کہ تم تو فلاں کی بیوی بنی تھی اور تم نے یہ یہ کیا تھا۔ جب میں نے تجھے چھوڑ دیا تو پتہ نہیں تم کہاں کہاں پھرتی رہی ہو؟ اگر یہ نفرت ہے تو دوبارہ نکاح نہ کرو۔ اور اگر تمہیں یقین ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حدود کو نہیں توڑو گے تو اب اسلام اجازت دیتا ہے کہ رجوع کرسکتے ہو۔

یہ اللہ تعالیٰ نے حدود اور قوانین وضع کردیے ہیں۔ ان لوگوں کو فائدہ ہوگا جو جاننے والے ہیں اور جو نہیں جانتے، جن کو حلال وحرام کا پتہ نہیں ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

نکاح وطلاق مذاق اور بغیر نیت کے بھی ہوجاتے ہیں:

اس لیے یاد رکھیں کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں بڑا باریک فرق ہے۔ اس کی طرف عام طور پر لوگوں کی توجہ نہیں جاتی۔ نکاح، طلاق، عتاق اور رجعت یہ سب معاملات ظاہری ہیں۔ ایک آدمی نے نکاح کیا۔ اس میں ایجاب وقبول ہوا، لڑکے لڑکی نے قبول کیا، حق المہر طے ہوگیا، دونوں کے ولی موجود ہیں اور شہود موجود ہیں۔ اب اس کے بعد لڑکا کہے کہ نکاح کرنے کی میری نیت نہیں تھی، مجھے ماں باپ پکڑ کر لے آئے تھے۔ تو اب ظاہری الفاظ پر حکم ہوگا۔ ایک لڑکی نے نکاح کو قبول کیا اور کچھ دن گزرنے کے بعد کہے کہ مجھ پر جبر کیا گیا تھا تو اس وقت میں نے قبول کرلیا تھا، ورنہ میری نیت نہیں تھی تو اس صورت میں اسلام ظاہری الفاظ دیکھے گا۔ ایک آدمی مسجد سے نکل رہا ہے تو ظاہر میں اچھا فیصلہ کریں گے کہ یہ نماز کے لیے گیا ہوگا۔ ایک آدمی مے کدہ سے باہر آرہا ہے، حالانکہ ضروری نہیں کہ اس نے وہاں شراب پی ہو، لیکن بظاہر اس کا آنا اسی لیے ہوسکتا ہے۔ تو ظاہری فیصلہ کریں گے، باطن کا معاملہ اللہ

تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ دل میں کیا بات تھی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَتَّخِذُوٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ [البقرۃ:۲۳۱] تم میرے قوانین کو ٹھٹھہ اور مخول نہ بنا ڈالو۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَ هَزْلُهُنَّ جِدٌّ: اَلنِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالْعِتَاقُ''[1] (تین چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت بھی حقیقت ہے اور مذاق بھی حقیقت ہے۔ اور وہ تین چیزیں یہ ہیں: نکاح، طلاق اور عتاق)۔ اور ایک روایت میں ہے: نکاح، طلاق اور رجعت۔ اگر ان سے کسی نے مذاق کیا تو شریعت اس کو مذاق نہیں سمجھے گی، کل وہ لاکھ کہتا رہے کہ میں نے بیوی کو مذاق میں طلاق دی تھی، شریعت کے اندر ظاہری لفظ کو دیکھا جائے گا کہ اس نے ظاہر میں لفظ طلاق نکالا تھا، لہٰذا اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔

آج یہ مشکل ہوگئی ہے کہ ہم لوگوں کو حرام کی تو شرم نہیں ہے، گلیوں میں بازاروں میں کھڑے ہیں، طواف میں جھانک رہے ہیں اور رکن یمانی پر اور کچھ نہیں تو بازو ماریں گے، اس میں حیا نہیں کرتے، لیکن اگر کوئی شریعت کا مسئلہ ہو تو کہتے ہیں: چھوڑو! یہ میاں بیوی کی بات ہے۔ مولوی صاحب سے جا کر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اب ان کو حیا آرہی ہے، جبکہ اسلام کہتا ہے: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ﴾ [الاحزاب:۵۳] حق کے اندر حیا نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں تو عورتیں آکر مسئلہ پوچھتی تھیں: اے اللہ کے رسول! میں حیض میں ہوں تو غسل کیسے کروں؟...... جبکہ ہماری بہن یا ہماری بیٹی یہ مسئلہ نہیں پوچھے گی اور جانتی بھی نہیں کہ یہ مسئلہ کیسے ہے؟ اور دوسرا شرم بھی ہے۔ فلم دیکھنے سے شرم نہیں، وی سی آر پر بیٹھ کر خاوند کے ساتھ تم بلیو پرنٹ دیکھو تو تمہیں حیا نہیں آتی اور دین کا مسئلہ پوچھتے ہوئے تمہیں شرم آرہی ہے۔ یہ عجیب شرم ہے! جو آج تک مجھے سمجھ نہیں آئی...... بہر حال حضور اکرم ﷺ نے اس کو فرمایا: جب تمہارے ماہواری کے دن گزر جائیں تو پھر تم غسل کرو، بالوں میں پانی پہنچاؤ۔ ...... وہ عورت سیدھی سادھی تھی...... وہ پوچھنے لگی کہ اس کو کیسے رکھوں؟ تو بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا: اللہ کی بندی! یہ مزید تفصیل عورتوں کا کام ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اتنے بڑے آدمی ہیں کہ ان کے نام سے کفر کانپتا تھا اور آج بھی کانپتا ہے۔ جس کے بارے میں دشمن کو یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ اگر ان کی جماعت میں ایک اور عمر پیدا ہو جاتا تو پوری دنیا پر اسلام ہوتا۔ ایسا آدمی آکر حضور اکرم ﷺ سے عرض کر رہا ہے: یا رسول اللہ! میری بیوی کے بدن پر نظر پڑ گئی۔ چاند

[1] [الجامع الصغیر: رقم: ۳۴۵۱، جامع الاحادیث: ۱۱/۳۴۲]

روشن تھا، بدن نظر آرہا تھا، مجھ پر شہوت آگئی اور میں قابو نہیں کر سکا (رمضان کا مہینہ تھا)۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرما دیا۔ اب آپ ایمان سے بتائیں کہ اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شرم کر جاتے تو ہم قیامت تک کتنی تکلیف میں مبتلا ہوتے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ﴾ کہ رات کو رمضان میں اگر میاں بیوی جماع کریں تو حلال ہے۔

آج کل ہمارے ہاں یہ ہندوؤں کی رسم ہے کہ اگر کسی لڑکی کو طلاق ہو جائے تو کوئی اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ یہ مطلقہ ہے۔ ان کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ بے چاری مظلوم ہو، اس کے شوہر نے اس کو ناحق طلاق دی ہو، لیکن کوئی اس سے رشتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی تیار بھی ہو تو وہ ایسا ہوتا ہے کہ جس کو کوئی رشتہ نہیں دیتا۔

طلاقِ صریح اور طلاقِ کنائی:

طلاق کے بعض الفاظ صریح ہیں اور بعض الفاظ کنائی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ لفظ ''طلاق'' صریح ہے، اس کا دوسرا معنی نہیں ہو سکتا۔ ہمارے اپنے علاقے کا ایک واقعہ ہے کہ جب مرد سے طلاق لکھوائی گئی...... وہ بڑا چالاک آدمی تھا...... اس نے ''بقلمِ خود'' کی بجائے ''بقلمِ خوف'' لکھ دیا۔ یاد رکھیں! اللہ کے دین میں ایسی شرارتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس طرح تم ایک مولوی کو تو دھوکہ دے سکتے ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کو دھوکہ نہیں دے سکتے، اس کے سامنے ہر بات لکھی ہوئی ہے۔

آج لوگ اسلام کو بدنام کرتے ہیں کہ ایک مولوی نے یہ فتویٰ دیا ہے اور دوسرے مولوی نے یہ فتویٰ دیا ہے، ہم کہاں جائیں؟ یہ مولوی تو آپس میں لڑتے ہیں۔ یاد رکھیں! یہ بھی دراصل شیطانی وسوسہ اور دھوکہ ہے کہ شیطان اسلام سے ہٹانے کے لیے اس قسم کا وسوسہ ڈال دیتا ہے، تاکہ ہم دین سے ہٹ جائیں۔ اختلاف کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ تم جو مسئلہ مجھے آکر بتاؤ میں اس کے مطابق ہی جواب لکھوں گا۔ دوسرے مولوی صاحب کے پاس اس بندے نے کہا کہ میں ایک دفعہ طلاق کہہ دی ہے تو صاف ظاہر ہے وہ اس کے مطابق جواب لکھے گا۔ اور تیسرے مولوی سے کہا: میں نے تو کہا تھا کہ اگر تم اس طرح کرو گی تو میں تجھے طلاق دے دوں گا، طلاق میں نے نہیں دی تھی۔ اب بتائیں کہ ان صورتوں کے اندر مولوی کیا کریں؟ وہ تو اس کے مطابق فتویٰ دے گا جو تم اس سے پوچھنے

جاؤ گے۔ اور پھر کہتے ہیں کہ دیکھو! حنفی عالم نے یہ کہا اور حنبلی عالم نے یہ کہا۔ بھائی! جس مسلک پر ساری زندگی گزاری ہے اس مسلک کے عالم سے جا کر مسئلہ پوچھو۔ اگر تم نے دوسرے سے رجوع کیا ہے تو لازمی بات ہے کہ وہ اپنی فقہ کے مطابق فتویٰ دے گا۔

کنایہ الفاظ کی مثال یوں ہے جیسے کہہ دے: آج کے بعد تیری میری ختم ہوگئی، یا کہہ دیتا ہے کہ آج کے بعد تمہاری ساری تمہارے کندھے پر ہے، آج کے بعد تمہاری نکیل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ان الفاظ سے طلاق بائنہ ہوجاتی ہے، لیکن ایک موٹی بات یاد رکھیں! جب بھی کوئی مسئلہ ہو تو فوراً عالم سے رجوع کریں۔

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾ [البقرة: ۲۳۱، ۲۳۲]

''اور جب تم نے بیویوں کو طلاق دے دی اور وہ اپنی عدت (کی انتہاء) کو پہنچ گئیں تو ان کو دستور کے مطابق رکھ لو یا ان کو عمدہ طریقے سے چھوڑ دو۔ اور ان کو ستانے کے لیے نہ روکے رکھو، تاکہ ان پر زیادتی کرو۔ اور جس نے یہ کیا اس نے اپنا برا کیا۔ اور اللہ کے احکام کا مذاق مت اڑاؤ اور اللہ کا احسان یاد کرو جو تم پر ہے۔ اور وہ جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری کہ تم کو سمجھا دے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور جان لو کہ اللہ سب چیز جانتا ہے۔ اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دی اور وہ اپنی عدت کو پورا کر چکیں تو اب ان کو نہ روکو کہ نکاح کر لیں اپنے انہی خاوندوں سے جب وہ راضی ہو جائیں آپس میں دستور کے موافق۔ اس سے اس کو نصیحت ملتی ہے جو تم میں سے اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ اسی میں تمہارے لیے زیادہ سنوار اور زیادہ ستھرائی ہے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

احکامِ طلاق اللہ نے بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائے؛ کیونکہ اسی نکاح وطلاق پر حسنِ معاشرت کا دارومدار ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر کسی نے عورت کو طلاق دے دی، جب اس عورت کی عدت ختم ہونے کے قریب آ گئی...... پہلے دور کے اندر یہ ہوتا تھا کہ عورت سے رجوع کر لیتے تھے، پھر طلاق دے دیتے تھے، پھر رجوع کر لیتے تھے۔ اسی طرح عورت پر ظلم کرتے رہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ احکام واضح کر دیئے۔ فرمایا: خبردار! ایسا مت کرو۔ اگر تم نے طلاق دے دی اور اب عدت ختم ہونے پر آ گئی ہے...... اور تم رکھنا چاہتے ہو تو شرعی طریقے سے اور بھلائی کے طریقے سے رکھو اور آئندہ اپنے گھر میں صلح کے ساتھ زندگی بسر کرو، تیرا مقصد دل سے رکھنا ہو۔ اور اگر تم نہیں رکھنا چاہتے ہو تو اس کو بھلائی اور عزت کے ساتھ رخصت کر دو۔

چونکہ قاعدہ یہ ہے کہ عورت عدت کے ایام خاوند کے گھر میں گزارے گی اور عدت کے دنوں کے اندر اس کا نفقہ، مکان کا خرچہ پہلے کی طرح خاوند کے ذمہ ہوگا۔ اب جب عدت ختم ہونے پر آ گئی۔ اب اگر رکھنا ہے تو بھلائی سے رکھے اور اگر چھوڑنا ہے تو عزت کے ساتھ اس کو رخصت کر دے۔ بلکہ حکم ہے کہ اس کو تھوڑا بہت دے کر رخصت کریں، تاکہ یہ نہ ہو کہ نکاح کے وقت تو خوشی ہو اور اب طلاق دینے کے وقت دشمن بن جاؤ۔ اگر تم روک کر ان پر ظلم کرو گے، بلکہ ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ تم اپنے اوپر ظلم کر رہے ہو؛ کیونکہ جو آدمی اللہ کے قانون کو توڑتا ہے وہ دراصل اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ...﴾ ان آیات میں دوسرا مسئلہ یہ بیان ہوا کہ اگر تم نے اپنی عورتوں کو طلاق دے دی ہے اور وہ اپنی عدت پوری کر چکی ہیں تو وہ عورت اگر کسی دوسری جگہ نکاح کرنا چاہتی ہے تو اس کو مت روکو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ طلاقِ رجعی ہے؛ کیونکہ رجوع کا حق اس وقت ہوتا ہے جب ایک طلاق دی جائے یا دو طلاقیں دی جائیں۔ تین طلاق کے بعد رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت کے رواج کی تردید:

زمانۂ جاہلیت کے اندر یہ رواج تھا کہ عدت پوری کرنے کے بعد پہلے والا خاوند اس سے کہتا کہ تم جب دوسری شادی کرو گی تو میں تجھے دیکھ لوں گا۔ اس کے بعد اگر عورت دوسری شادی کرنا چاہتی تو پہلا خاوند وہاں جا کر کہتا: خبردار! اس سے نکاح نہ کرنا، یہ میری مطلقہ ہے۔ حالانکہ طلاق دینے کے بعد اس کا اس عورت کے ساتھ کوئی تعلق

نہیں رہا۔ اسلام کہتا ہے: ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾ خبردار! ان کو مت روکو۔ وہ جہاں نکاح کرنا چاہیں کرسکتی ہیں؛ کیونکہ اب یہ اس کے لیے ایسے ہوگئی جیسے اجنبی ہو۔ اب طلاق کے بعد تمہارا اس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔

عورت کے دوبارہ نکاح کرنے کے مسائل:

ایک آدمی نے عورت کو طلاق دی، اس کی عدت گزر گئی۔ اس کے بعد خاوند کو خیال آیا کہ میں اس کے ساتھ دوبارہ نکاح کروں اور عورت بھی چاہتی ہے کہ میں اپنے پہلے خاوند کے گھر واپس چلی جاؤں، دوبارہ اس سے نکاح کرلوں، بجائے اس کے کہ کسی اور کے گھر جاؤں۔ لیکن جو مرد یا عورت کے وارث ہیں وہ کہتے ہیں: خبردار! اس نے تمہیں طلاق دی ہے، اس سے پھر نکاح مت کرو۔ اسلام نے کہا: اس طرح وارث نہ کریں۔ اگر وہ آپس میں راضی ہیں تو تم منع نہ کرو، لیکن اس میں شرط یہ ہے: ﴿إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ کہ جب عورت اور خاوند بالکل شرعی اور بھلائی کے طریقے سے دوبارہ نکاح کرنے پر راضی ہوں، یعنی خاوند کی نیت یہ نہ ہو کہ عورت کو اب دوبارہ نکاح میں لے کر ذلیل کرے گا۔

......دوسری بات یہ ہے کہ عورت دوسری جگہ شادی کرنا چاہتی ہے، لیکن وہ جگہ اس کے کفو میں نہیں ہے تو اب وارث روک سکتے ہیں۔

......اسی طرح اگر عورت اپنے مہرِ مثل سے بھی کم پر راضی ہورہی ہے، یعنی اس کی باقی بہنوں کا مہرِ مثل دس ہزار تھا، وہ تین ہزار مہر پر نکاح کررہی ہے تو اس کے اولیاء اس کو روک سکتے ہیں کہ تم کیوں ہماری اہانت کرارہی ہو؟ برابر کے آدمی کے ساتھ رشتہ کرو۔

......اسی طرح ایک عورت عدت کے اندر ہے اور وہ عدت کے اندر کسی اور جگہ شادی کرنا چاہتی ہے تو اس کے اولیاء اس کو روک سکتے ہیں کہ ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔

اس لیے قرآن پاک نے ایک لفظ بڑھایا: ﴿إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ شرط یہ ہے کہ شریعت کے مطابق ہو تو اولیاء نہ روکیں۔ اگر اس کے باوجود وہ نکاح نہیں کریں گے تو گنہگار ہوں گے اور جو فتنے اور فساد پیدا ہوں گے اس کے ذمہ دار اس کے اولیاء اور وارث بھی ہوں گے۔ مثلاً: ایک لڑکی بالغ اور جوان ہوگئی۔ اگر ماں باپ رشتہ ملنے کے باوجود شادی نہ کرتے، اس کے بعد اگر وہ گناہ میں مبتلا ہوئی تو اولیاء پر بھی برابر کا گناہ ہوگا؛ کیونکہ اس کو

شادی سے روکنے والے وہ ہیں، ورنہ ان کا فرض تھا کہ جب لڑکی بالغ ہوجائے تو اس کے لیے مناسب رشتہ ڈھونڈیں اور اپنی طرف سے پوری کوشش کریں۔

آیات کا شانِ نزول:

حدیث پاک میں دو واقعات پیش آئے ہیں:

1 ......ایک حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ انہوں نے اپنی بہن کی شادی کی۔ اتفاق سے میاں بیوی میں ناچاقی ہوگئی اور اس کے خاوند نے طلاق دے دی۔ اور عدت کے اندر اس کے خاوند نے رجوع نہ کیا۔ عدت گزرنے کے بعد خاوند کو خیال آیا کہ میں نے غلطی ہے، میں دوبارہ اپنی سابقہ بیوی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اور بیوی بھی راضی ہوگئی۔ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اس کے شوہر نے آکر کہا: آپ مہربانی کریں اور اپنی بہن کا نکاح دوبارہ مجھ سے کردیں۔ تو حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ غصہ میں آگئے اور کہا: عجیب آدمی ہو!! پہلے میں نے تمہیں اپنی بہن کا رشتہ دیا ہے، تم نے طلاق دے کر ہماری عزت لوٹا دی۔ اب تم پھر دوبارہ نکاح مانگنے کے لیے میرے دروازے پر آگئے ہو؟ خبردار! میں تمہیں رشتہ نہیں دوں گا۔

2 ......دوسرا یہ واقعہ پیش آیا حضرت جعفر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنی چچا زاد بہن کا نکاح ایک آدمی سے کیا۔ اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ وہاں بھی طلاق ہوگئی اور عدت بھی گزر گئی۔ اب دونوں نے پھر نکاح کرنے کا ارادہ کیا، لیکن حضرت جعفر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نہیں مانے اور کہا: تم نے پہلے بھی طلاق دی ہے۔ اب پھر دوبارہ تمہارا نکاح کراؤں، تاکہ تم دوبارہ طلاق دے سکو؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ کہ اگر وہ عورتیں دوبارہ اپنے اسی شوہر کے ساتھ نکاح کرنے پر راضی ہیں تو تم ان کو منع نہ کرو۔ اس سے آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان اور عظمت کا اندازہ لگائیں کہ جب یہ آیات اتریں تو حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ خود چل کر اپنی بہن کے شوہر کے پاس گئے اور کہا کہ میں اپنی بہن کا رشتہ تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں؛ کیونکہ اب اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا ہے۔ جب قرآن نے فیصلہ کردیا ہے تو ہم روکنے والے کون ہیں؟ حضرت جعفر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی خود چل کر گئے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے اندر ایمان تھا، ان کے اندر

اتباع تھی اللہ تعالیٰ کے احکام کی اور حضور پاک ﷺ کے فرمان کی۔

احادیث میں ایک اور مشہور واقعہ ہے کہ ایک صحابی نے ایک گھر میں حضور اکرم ﷺ کی معرفت اپنے نکاح کے لیے پیغام بھیجا اور وہ صحابی شکل وصورت کے اعتبار سے بھی کوئی زیادہ خوبصورت نہیں تھے۔ایک غربت تھی اور دوسرا حسن و جمال بھی نہیں تھا۔ بہرحال حضور اکرم ﷺ کا پیغام لڑکی کے گھر والوں کو دیا کہ کیا تم اپنی لڑکی کا رشتہ اس کو دینے کے لیے تیار ہو؟ اس صحابی نے اجازت چاہی کہ مجھے اتنی اجازت دیں کہ میں اپنی بہن سے پوچھ لوں۔ تو جب یہ بات گھر میں اس لڑکی نے بھی سن لی تو کہا: جب حضور ﷺ نے اس رشتہ کو قبول کیا ہے تو اب پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں یہ رشتہ قبول ہے۔

بچیوں کی شادی اور والدین کا لمحہ فکریہ:

قرآن پاک کی اس آیت ﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۔﴾ سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی لڑکی عاقلہ بالغہ ہے تو اس کی رضامندی ضروری ہے۔ جہاں قرآن والدین کو ولی بناتا ہے وہاں یہ بھی پابندی لگاتا ہے کہ والدین اپنی اولاد کی رضامندی حاصل کریں۔ یہ نہیں کہ وہ انکار کرتی رہیں اور یہ کہیں میں باپ ہوں۔ جیسا کہ ہمارے ہاں جاہلیت ہے کہ اس لڑکی کو فرمانبردار سمجھا جاتا ہے جو ماں باپ کے کہنے کے مطابق عمل کرے، چاہے اس پر ظلم بھی ہو رہا ہو۔ لہٰذا پندرہ پندرہ سال کی لڑکیاں ہوتی ہیں اور ستر ستر سال کے دولہے ہوتے ہیں۔ ظالم ماں باپ پیسوں کے لیے اپنی عزتوں کو بیچتے ہیں، اپنی بیٹیوں کی قیمت لگاتے ہیں، ورنہ تم ساٹھ ستر سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی اگر یہ تمنا رکھتے ہو کہ مجھے نوجوان لڑکی ملے تو نوجوان لڑکی کے کیا جذبات ہوتے ہوں گے کہ مجھے بوڑھا ملے؟ جب لوگ دیکھیں تو سمجھیں کہ باپ کے ساتھ جارہی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جو لڑکی اس کے ساتھ ہے یقیناً اس کی بیٹی ہوگی اور جب پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے: یہ میری تیسری بیوی ہے۔ وجہ دولت ہے۔ اس کے مقابلے پر اگر کوئی نوجوان خوبصورت ہے، لیکن اس کے پاس دولت نہیں تو اس کو کوئی رشتہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

اور خاص طور پر جتنے ہمارے غریب ملک ہیں، جہاں غربت ہے، وہاں دولت والے ملکوں کے لوگ محض اس لیے آتے ہیں کہ وہاں جاکر ان کے والدین کو لاکھ دو لاکھ روپے دے کر پندرہ سولہ سال کی لڑکی سے شادی کرلی اور

ایک ماہ بعد طلاق دے کر آگئے۔ انہوں نے......نعوذ باللہ......اسلام کو اپنی خواہشات پوری کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم نے زنا نہیں کیا، نکاح کیا ہے۔ ان کو کہا جائے کہ جب تم نکاح کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے کہ تمہارے دل میں ایک مہینہ کی نیت تھی یا دو مہینے کی نیت تھی۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تم کس کو دھوکہ دے رہے ہو؟ لوگوں کو دھوکہ دے سکتے ہو، والدین کو دھوکہ دے سکتے ہو، لیکن ﴿عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾ [فاطر:٣٨] جس کی ذات ہے، جن کو ہمارے سینے کے ہر راز کا علم ہے، اس کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اگر وہاں لڑکی بے چاری کہتی بھی ہے کہ میں اس جگہ رشتہ نہیں کر سکتی، آدمی کی عمر ساٹھ ستر سال ہے تو والدین اس کو کہتے ہیں: کیا اس لیے ہمارے گھر میں پیدا ہوئی تھی کہ آج ہماری ناک برادری میں کٹوا دے؟ بس ہم نے جو کہہ دیا وہی ہوگا۔ یاد رکھیں! یہ ظلم ہے۔

بچیوں کی پرورش میں والدین کا ظلم:

یاد رکھیں! لڑکی کی رضامندی ضروری ہے۔ دوسرا لڑکی کے کفو کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر لڑکی پڑھی لکھی ہے اور تم جاہل سے شادی کر رہے ہو تو یہ بھی ظلم ہے۔ اگر لڑکی باجمال ہے اور تم اس کی شادی ایسے آدمی سے کر رہے ہو جس کی شکل سے لوگوں کو نفرت آئے، یہ ظلم ہے۔ اگر لڑکی کسی باعزت گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور تم اس سے نچلے لوگوں میں اس کا رشتہ کر رہے ہو، یہ ظلم ہے۔ اس کے لیے برابر کفو تلاش کیا جائے۔

اور یاد رکھیں! جہاں ایسے رشتے ہوتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اس لیے قرآن پاک نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی بیٹی تھیں اور حضرت زید رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر رشتہ قبول کر لیا، لیکن جب شادی ہوگئی، دونوں میں گزارہ نہ ہو سکا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ جب بھی کوئی بات کرتے تو بی بی زینب رضی اللہ عنہا فوراً فرماتیں کہ یہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا، ورنہ میں تجھے شوہر کیسے قبول کر سکتی ہوں؟ میں قریشی ہوں، بنو ہاشم خاندان سے ہوں اور تم ایک غلام زادے ہو۔ تمہارا میرا کیا جوڑ ہو سکتا ہے؟ آخر انجام یہ ہوا کہ طلاق ہوگئی۔

یاد رکھیں! اسلام جہاں یہ کہتا ہے کہ لڑکی اپنے والدین یا ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرے، وہاں اسلام اولیاء کو بھی مجبور کرتا ہے کہ تم لڑکی کے حالات کو دیکھو۔ تعلیم یافتہ ہے تو تعلیم یافتہ شوہر تلاش کرو، برابر کا رشتہ تلاش

کرو۔ یہ نہ ہو کہ شوہر کی عمر ساٹھ سال ہو اور بیوی کی عمر پندرہ سال ہو۔ اس قسم کے جو رشتے ہوں اور اس کے بعد جو فساد پیدا ہوں گے اس کا کون ذمہ دار ہوگا؟

بی بی بریرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کا واقعہ صحیح احادیث میں موجود ہے کہ بی بی بریرہ رضی اللہ عنہا خوش شکل تھیں، جبکہ ان کے شوہر کی شکل بیوی کے برابر نہیں تھی۔ دونوں میں ناچاقی ہوگئی۔ خاوند کو ان سے اتنی محبت تھی کہ ہر وقت بیوی کے پیچھے پھرتے رہتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس بی بی کو بلا کر فرمایا کہ تمہارا خاوند تم سے محبت کرتا ہے، تمہارے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ تم مہربانی کرو اور اس کے ساتھ گزارہ کرو۔ بی بی بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اگر حکم ہے تو میں اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے تیار ہوں اور اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی، میری زندگی اس کے ساتھ نہیں گزر سکتی۔

﴿ذٰلِكَ يُوعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ﴾ اللہ کا دین اسلام قیامت تک کے لیے ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ اپنے احکامات فوج کے ذریعے تمہارے دماغوں میں اتارے۔ اور یاد رکھیں کہ دنیا کا کوئی قانون اور نظام کبھی طاقت سے نہیں چل سکتا۔ تم اس سے لوگوں کی گردن کو جھکا لو گے، لیکن دل نہیں جھکا سکتے۔

ہارون الرشید کی بیوی بی بی زبیدہ نیک خاتون تھیں۔ ایک دن اس نے اپنے محل کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھا کہ پورے بغداد کے لوگ بھاگے بھاگے جا رہے ہیں۔ وہ گھبرا گئی کہ شہر میں کیا ہو گیا ہے!؟ جلدی سے نیچے اتر کر خاوند کے کمرے میں گئیں، اس کو جگا کر کہا: عجیب بات ہے! تم یہاں سو رہے ہو اور سارا شہر باہر بھاگا جا رہا ہے؟ پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟ ہارون الرشید نے کہا: کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امام ابو یوسف تشریف لا رہے ہیں۔ یہ سارے لوگ ان کے استقبال کے لیے جا رہے ہیں، لہٰذا کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔ بی بی زبیدہ نے کہا: پھر بادشاہ تو وہی ہے! کیونکہ تمہارے لیے تو لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جاتا ہے اور یہ تو دل اور محبت سے جا رہے ہیں، لہٰذا اصل حکومت تو اس کی ہے جس کی دل پر حکومت ہے۔

دلوں پر راج تب چلتا ہے جب آدمی اللہ تعالیٰ کے قوانین پر صحیح طرح عمل پیرا ہو۔ اس لیے اسلام نے جہاں جہاں حدود بیان کی ہیں تو وہاں آگے پابندی لگائی ہے: ﴿مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ﴾ کہ ان احکام پر عمل وہ کرے گا جس کا اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان ہو۔ جب دلوں میں آخرت کا خوف بیٹھ جائے، قبر کا خوف بیٹھ جائے تو پھر کسی پولیس والے کی ضرورت نہیں۔

جب یہ تمہارا ایمان ہو جائے تو: ﴿ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ﴾ میں نے جو قانون اور احکام بنائے ہیں اگر تو غور کرے تو وہ تجھے پاک کرنے کے لیے ہیں اور وہ تیری خیر و بھلائی کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو غنی ہیں، تم سب محتاج ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے نکاح رکھا ہے۔ اگر یہ نکاح نہ ہوتا تو جو لوگ معاشرے والے اپنے آپ کو ترقی یافتہ ممالک کہتے ہیں، میں بلا مبالغہ اللہ کے حرم میں بیٹھ کر کہتا ہوں آپ وہاں کے رسائل اور ان کی چھپی ہوئی کتابیں دیکھیں کہ وہاں کتنی اولادیں ہیں جن کو اپنے والدین کا پتہ نہیں ہے! کیونکہ جب نکاح کا فلسفہ ختم ہو جائے، مرد و عورت کو اتنی آزادی دی جائے، جب تعلیم مخلوط کر دی جائے، ہر جگہ لڑکی اور لڑکے کو اکٹھا کر دیا جائے، جب ان کے ڈرامے اکٹھے کر دیے جائیں اور ماں باپ کے سامنے ان کی لڑکیاں ڈانس کر کے اپنے ملک کی ثقافت پیش کر رہی ہوں اور ماں باپ خوشی محسوس کر رہے ہوں، اس کے بعد جو انجام ہوگا وہ واضح اور ظاہر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی آیات کو مذاق بنانے کا کیا مطلب؟

﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے قرآن کی اس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''كَانَ الرَّجُلُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يُطَلِّقُ امْرَاَتَهُ وَ يَقُوْلُ: كُنْتُ لَاعِبًا'' حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں کبھی کوئی آدمی یہ کہتا: ''زَوَّجْتُكَ ابْنَتِيْ'' میں نے اپنی بیٹی کا تجھ سے نکاح کر دیا۔ دوسرا کہتا: اچھا!۔ تو وہ کہتا: میں مذاق کر رہا تھا۔ اسی طرح کہتا: میں نے اپنی باندی کو آزاد کر دیا اور باندی کہتی: اچھا! میں آزاد ہوں۔ تو وہ کہتا: نہیں! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرمایا کہ خبردار! اللہ تعالیٰ کے احکام کو تم مذاق نہ بنایا کرو۔[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت بھی حقیقت ہے اور مذاق بھی حقیقت ہے: نکاح، طلاق اور عتاق۔ ان تین چیزوں میں کبھی مذاق نہ کریں۔

﴿وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری نعمتیں یاد کرو کہ میں نے تمہارے پاس اپنا پیغمبر بھیجا، میں نے تمہارے پاس اپنے نبی پاک کے ذریعے قرآن بھیجا۔ اب ان نعمتوں کا یہ مطلب نہیں کہ تم میری ان نعمتوں کا مذاق کرو۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۳۱] جو کام کرو اس میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو چھوڑو

[1] [المطالب العالیۃ: رقم: ۲۰۱۷/۲۰۶، ۱۰۶/۶]

اللہ سے ڈرو، یعنی اللہ تعالیٰ کے آگے تیری کوئی بات بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ جب ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے مطابق بدلہ دیں گے۔

عورت کے نکاح کے اولیاء:

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۳۲]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت سے اشارہ ملتا ہے کہ عورت کے اولیاء کو حق ہے، ان کی اجازت کے بغیر عورت نکاح نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت اپنا نکاح خود نہ کرے، جب تک کہ اس کے اولیاء، ولی الامر راضی نہ ہوں۔ اگر ان میں سے کوئی نہیں ہے تو وقت کا بادشاہ یا اس کا نائب قاضی وغیرہ اس کا ولی ہوتا ہے۔

حتیٰ کہ بعض ائمہ فرماتے ہیں: اگر عورت اولیاء کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گی تو نکاح نہیں ہوگا، بلکہ وہ زنا تصور ہوگا۔ گو بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ نکاح تو ہو جائے گا، لیکن اس کو اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا؛ کیونکہ اس نے حضور اکرم ﷺ کے فرمان کی مخالفت کی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: یہ تو زانیہ عورت کا کام ہے کہ وہ اپنے بدن کا سودا خود کرتی پھرتی ہے، شریف عورت کا نکاح اس کے ماں باپ ہی کرتے ہیں۔ اور نکاح کے اندر ان لوگوں کو گواہ بنایا جائے جو نماز روزے کے پابند ہوں؛ کیونکہ اسلام کا حکم ہے کہ گواہ عادل ہوں۔ اور جو آدمی نماز نہیں پڑھتا تو اس کی گواہی کہاں معتبر مانی جائے گی؟ حالانکہ نماز اسلام اور کفر کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔ نکاح کے اندر کسی عالم کو بلایا جائے، وہ خطبہ پڑھے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگرچہ اس مسئلے کے اندر بڑا اختلاف ہے کہ ولی کے بغیر نکاح ہوتا ہے یا نہیں ہوتا؟ اس کی تفصیل کتب احکام کے اندر ملاحظہ فرمائیں۔

ولی الامر سے مراد آدمی ہے، عورت نکاح کی ولی نہیں بن سکتی۔ یہ سارا انتظام اس لیے ہو رہا ہے کہ معاشرہ ٹھیک رہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے رشتہ دار بھی ہوں گے اور ماں باپ بھی راضی ہوں گے تو معنی ہوگا کہ آپ واقعی نکاح کر رہے ہیں۔ اور اگر ماں باپ کو پتہ نہیں ہے کہ عورت نے کچھ کر لیا تو گویا اس کے اندر کوئی نہ کوئی حرکت ضرور ہے۔

اختلاف اس میں ہے کہ اگر کوئی لڑکی عاقلہ بالغہ ہوگئی، اس نے اپنی رضامندی سے بغیر ولی کی اجازت کے نکاح کر لیا تو کیا نکاح ہوجائے گا؟ بعض ائمہ فرماتے ہیں: نکاح نہیں ہوگا۔ اور بعض ائمہ فرماتے ہیں: نکاح تو ہوجائے گا، لیکن یہ گناہگار ہے کہ اس نے حدیث رسول پاک ﷺ کی مخالفت کی ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے پاس کافی پیسے تھے۔ وہ دوسرے ملک سے شراب خرید کر لے آئے، تا کہ بیچ سکیں۔ جب مدینہ منورہ کے اندر پہنچے تو پتہ چلا کہ شراب تو حرام ہوگئی ہے۔ وہ سیدھے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: میں تو برباد ہوگیا۔ میرا جتنا پیسہ تھا میں نے اس کی شراب خرید لی ہے اور پھر اس کے اندر یتیم بچے کا بھی پیسہ ہے تو آپ مہربانی کریں! مجھے اجازت دیں کہ میں اس شراب کو کافروں کے ملک میں جا کر بیچ دوں؛ کیونکہ ان کے لیے تو حرام نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ثَمَنُ الْخَمْرِ حَرَامٌ'' [مسند احمد، رقم: ۲۲۲۰] میرے صحابی! جب حرام بیچو گے تو جو پیسے ملیں گے وہ بھی حرام ہوں گے۔ اور فرمایا: ان مٹکوں کو توڑ دو۔ اس صحابی نے ان شراب کے مٹکوں کو توڑ دیا۔

اس لیے وہ امن والا معاشرہ تھا۔ ہاں! ان لاکھوں میں سے کسی ایک سے غلطی بھی ہوگئی۔ آج کسی کو کہا جائے: نماز پڑھو، تو کہتے ہیں: ہاں پڑھ لیں گے۔ حالانکہ زندگی کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے نہیں بتایا کہ کب مرنا ہے؟ ورنہ تو ہم ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکتے۔ اگر ہر آدمی کو پتہ چل جائے کہ ساٹھ کی عمر میں مرجانا ہے تو جو دن گزرتے وہ بھی اس کی موت کے گزر جاتے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک پردہ دے دیا اور آدمی سمجھتا ہے کہ میں زندہ ہوں۔ میں یہ کروں گا اور میں وہ کروں گا۔ جب موت آئی تو لوگوں نے اٹھایا اور قبر میں ڈال دیا۔ ساری اکڑفوں ختم ہوگئی اور دولت بھی گئی۔

ایک عجیب واقعہ!

حضرت ابو حازم رحمہ اللہ تابعی تھے۔ اس زمانہ میں عبدالملک بادشاہ تھا۔ جب وہ بادشاہ مدینہ منورہ آیا تو اس نے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا یہاں ایسا آدمی بھی ہے جس نے صحابہ کی زیارت کی ہو؟ لوگوں نے کہا: ہاں! حضرت ابو حازم ہیں۔ تو بادشاہ نے کہا: ان کو بلاؤ۔ حضرت ابو حازم رحمہ اللہ بادشاہ کی مجلس میں تشریف لے آئے تو سب سے پہلے بادشاہ نے یہ اعتراض کیا کہ آپ نے بڑی زیادتی کی کہ میں مدینہ منورہ میں آیا ہوں اور آپ مجھے

ملنے کے لیے بھی نہیں آئے۔ یہ آپ نے میرے ساتھ زیادتی کیوں کی ہے؟ انہوں نے کہا: یہ زیادتی تو تب ہو جب میری آپ کی ملاقات پہلے ہو اور پھر میں ملنے نہ آتا۔ بادشاہ نے کہا: ٹھیک ہے۔ اب بادشاہ نے کہا: مجھے کوئی نصیحت فرمائیں کہ اللہ پاک ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ حضرت ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہ چاہتے کہ جن چیزوں سے میں نے منع کیا ہے تم ان مقامات میں نظر نہ آؤ اور جن چیزوں کا حکم ہے وہاں میں تمہیں پاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے مسجد کا حکم دیا ہے تو مسجد میں نظر آؤ۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ شراب خانہ میں نہ جاؤ تو وہاں نہ جاؤ۔ یہ ساری باتیں ہوتی رہیں اور حضرت ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ نصیحتیں فرماتے رہے۔ بادشاہ نے آخر میں کہا: آپ مجھے کوئی کام بتائیں، مجھے خوشی ہوگی کہ میں نے اتنے بڑے بزرگ کا کام کیا ہے۔ حضرت ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہاں کام تو ہے۔ بادشاہ نے پوچھا: کیا کام ہے؟ فرمایا: مجھے جنت میں داخل کردو اور جہنم سے بچادو۔ بادشاہ نے کہا: یہ تو میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ حضرت ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: پھر میرا کوئی کام بھی نہیں ہے: کیونکہ سب سے بڑی کامیابی جنت میں جانا اور جہنم سے بچنا ہے۔ جب تم یہ نہیں دے سکتے ہو تو پھر تمہارے پلے میں کیا ہے؟ اس کے بعد بادشاہ نے انہیں پیسوں کا ہدیہ دیا اور کہا کہ میں ہدیہ پیش کرتا ہوں، اس کو قبول فرما لیں۔ آپ نے فرمایا: اگر یہ میری نصیحت کی قیمت ہے تو پھر اس سے زیادہ بہتر ہے کہ میں کوئی خنزیر لے لوں اور اگر تمہارا یہ مقصد نہیں تھا، بلکہ خالص تم مجھے ہدیہ دے رہے ہو تو جتنے عالم تمہارے ملک میں ہیں اگر اتنا ہدیہ تم نے سب کو بھیجا ہے تو مجھے دے دو، ورنہ صرف مجھے دینے کا کیا مطلب ہے؟

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾﴾ [البقرۃ: ۲۳۳]

''اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل۔ یہ حکم اس کے لیے ہے جو (کم از کم) دودھ کی مدت پوری کرنا چاہے۔ اور ان ماؤں کا کھانا اور کپڑا لڑکے کے باپ پر ہے دستور کے مطابق۔ کسی کو حکم نہیں دیا جاتا، مگر اس کی برداشت کے مطابق۔ نہ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے اور وارث کے ذمہ بھی ایسا ہی ہے۔ پھر اگر ماں باپ آپس کی رضا اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں اور اگر تم اپنی اولاد کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ حوالہ کر دیا ان کو جو تم نے ان کو دینا طے کیا ہے دستور کے مطابق۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔''

ماقبل آیات سے ربط:

اس آیت میں احکامِ رضاعت کے بارے میں ارشاد ہے۔ اس سے پہلے طلاق کے احکام کا ذکر ہے اور احکامِ رضاعت کے بعد پھر احکامِ طلاق کا ذکر ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ پوری دنیا پر نظر ڈالیں تو انسانوں کی کامیابی اسی گھر کے ماحول پر ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے گھریلو ماحول اپنی رحمت سے اچھا نصیب کر دیا، نیک بیوی مل گئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمانبردار اولاد عطا فرما دی، گھر میں تفاہم وموافقت ہے، صلاح ومشورہ ہے تو وہ گھر جنت کا ایک نمونہ ہے۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسا گھرانہ ہے جس میں کوئی خبیثہ عورت آگئی، جس کی وجہ سے خاوند اور بیوی کے درمیان نااتفاقی اور ناچاقی پیدا ہوگئی تو وہ گھر دنیا میں گویا جہنم کا ایک نمونہ بن جاتا ہے۔ یہ عذاب زیادہ ہے کہ آدمی ہر وقت ذہنی طور پر پریشان ہے اور ہر وقت مسائل کے اندر الجھا ہوا ہے۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی اپنے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔

اس لیے قرآن مقدس میں اللہ تعالیٰ نے طلاق کے مسائل واضح کر کے بیان فرمائے؛ کیونکہ ان مسائل میں آدمی اکثر مبتلا ہوتا ہے اور اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے عورتوں کو خاص طور پر نصیحت فرمائی: ''يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ! تَصَدَّقْنَ، وَلَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ؛ فَإِنَّكُنَّ أَكْثَرُ أَهْلِ جَهَنَّمَ''[1] (اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ کیا کرو؛ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ جہنم میں زیادہ جانے والی عورتیں ہیں)۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ عورتیں ناقصات العقل بھی ہیں اور ناقصات الدین بھی ہیں۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب دنیاوی معاملات عورتوں کے سپرد ہو جائیں تو اس وقت زندگی موت سے بہتر ہے۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے اپنی امت پر

[1] [جامع الترمذي: رقم: ٦٣٥، باب: ما جاء في زكاة الحلي]

سب سے زیادہ خطرہ یہ ہے کہ عورتوں کا فتنہ سب سے بڑا فتنہ ہے۔ میری امت اس میں مبتلا ہو جائے گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مردوں کو حکم فرمایا: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [البقرۃ: ۲۲۸] (جیسے تمہارے عورتوں پر حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کا بھی تم پر حق ہے)۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا'' (خبردار! عورتوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا کرو اور نرمی کا معاملہ کیا کرو)۔ اسی طریقہ سے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ''[1] (تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے)؛ کیونکہ آدمی باہر دوستوں سے اچھا ہوتا ہی ہے اور جس سے آپ اچھے نہیں رہیں گے وہ آپ سے ویسے ہی ملنا چھوڑ دے گا۔ لیکن انسان کی اصل اچھائی اپنے گھر کے اندر ہوتی ہے کہ اس کا اپنے گھر والوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے؟

مدتِ رضاعت کتنی ہے؟

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ... الخ﴾ [البقرۃ: ۲۳۳]

اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولاد دی تو وہ کتنی مدت تک اپنی ماں کا دودھ پیے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر فرمایا: ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ دو سال دودھ پلائے۔ ان مسائل میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ وہ جو احناف کے ہاں مسئلہ ہے کہ مدت دو سال نہیں، اڑھائی سال ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک بچے نے ایک عورت کا دودھ دو سال نہیں، بلکہ اس سے ایک مہینہ بعد، یا تین مہینہ بعد، یا چار مہینہ بعد، یا پانچ مہینہ بعد، یا چھ مہینہ بعد یعنی اڑھائی سال کی عمر تک اگر کسی بچے نے کسی دودھ والی عورت کا دودھ پیا ہے تو رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟ تو احناف کہتے ہیں: اڑھائی سال تک رضاعت کا حکم جاری ہو سکتا ہے؛ کیونکہ قرآن میں دوسری جگہ آتا ہے: ﴿وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُونَ شَهْرًا﴾ [الاحقاف: ۱۵] (مدتِ حمل اور دودھ چھڑانے کی عمر تیس ماہ ہے، یعنی اڑھائی سال ہے)۔ جب ﴿ثَلٰثُونَ شَهْرًا﴾ کا لفظ آ گیا تو امام صاحب فرماتے ہیں: چونکہ اس آیت میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں: ایک حمل اور دوسرا دودھ چھڑانا۔ تو ایک تفسیر میں ہر ایک کی مدت اڑھائی سال ہو سکتی ہے، حمل کی بھی اور دودھ چھڑانے کی بھی۔ اس لیے اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ اڑھائی سال کی عمر کے اندر پیا تو اس سے بھی احتیاطاً حرمتِ

[1] [جامع الترمذی: رقم: ۳۸۹۵، بَابُ فِي فَضْلِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ]

رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

بہر حال بچہ اپنی ماں کا دودھ دو سال پیئے اس کے بعد اس کو ماں کا دودھ چھڑا دینا چاہیے اور اگر ماں بیمار تھی یا ماں کا دودھ بچے کے لیے کسی وجہ سے معتبر تھا تو اب یہ بچہ جس عورت کا بھی دودھ پیئے گا تو وہ عورت اس کی رضاعی ماں بن جائے گی۔ اور جس عورت کا دودھ پیئے گا لازماً وہ بھی بچے والی ہوگی؛ کیونکہ بغیر بچہ کے دودھ نہیں ہوتا، وہ بچہ اگر لڑکی تھی تو اس کی بہن بن جائے گی اور اگر لڑکا تھا تو بھائی بن جائے گا، اس کو "رضاعی بھائی" کہتے ہیں۔ یہ دودھ کا رشتہ ہے۔ یہ اسی طرح رشتہ ہے جیسے حقیقی رشتہ ہے، یعنی جیسے حقیقی بہن سے نکاح حرام ہے اسی طرح جس بہن کے ساتھ دودھ پیا ہے اس کے ساتھ بھی نکاح حرام ہے۔ ہاں یہ فرق ہے کہ دودھ مثلاً: تم نے پیا ہے، تمہارے دوسرے بہن بھائی نے اس عورت کا دودھ نہیں پیا تو ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے، وہ اس عورت کی لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں۔ اور اسی طرح اس عورت کی اور اولاد ہے جس کے ساتھ تم نے دودھ نہیں پیا ان سے بھی تمہارا نکاح حرام ہے۔

آپ ﷺ کا رضاعی ماں کے ساتھ برتاؤ:

حدیث: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بڑھیا حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئی، اس کا عام بوسیدہ لباس تھا۔ حضور اکرم ﷺ اس کے لیے کھڑے ہو گئے اور اپنی چادر بچھا کر اس کو بٹھایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ہم حیران ہو گئے کہ وہ جو بات بھی حضور پاک ﷺ سے کہتی تھی کہ ایسا کر دیں، حضور پاک ﷺ حکم فرماتے کہ اس طرح کر دو۔ ہم حیران ہو گئے کہ یہ کونسی بڑھیا عوت آگئی ہے جس کے لیے حضور پاک ﷺ اتنی مہربانی فرما رہے ہیں!؟ بہر حال جب وہ چلی گئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کے بارے میں حضور اکرم ﷺ سے پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ میری ماں ہے، جنہوں نے مجھے دودھ پلایا تھا۔

بی بی شیمہ حضرت حلیمہ کی بیٹی تھیں۔ وہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کھیلتی تھیں۔ خدا کی شان دیکھیں کہ ایک جنگ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بستی پر حملہ کیا جس میں وہ رہتی تھیں۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے محاصرہ کیا تو وہ لڑکی جوش میں آگئی کہ کون میرے گھر پر حملہ کرنے والا ہے؟ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو سارا دن اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر پھرتی تھی؟ حضور اکرم ﷺ کو اطلاع دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو کچھ نہ کہو، اس کی بستی والوں کو بھی کچھ نہ کہو۔ واقعی وہ میری بہن ہے۔ اس کی محبت درست ہے۔

مسئلہ: ﴿لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ﴾ اس سے ایک اور مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ مدتِ رضاعت تو دو سال ہے، لیکن اگر ماں باپ پہلے دودھ چھڑانا چاہیں تو وہ بھی جائز ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کامل رضاعت دو سال بنے گی۔

اڑھائی سال کے بعد بچہ کے دودھ پینے سے رضاعت ثابت نہ ہوگی:

رضاعت کی حد ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد اڑھائی سال کی عمر تک دودھ پی لے تو رضاعت ثابت ہوگی۔ اگر بچہ چار سال کا، پانچ سال کا ہوگیا اور کسی عورت کے سینے سے منہ لگا کر اس نے دودھ پی لیا تو اب رضاعت کے لیے مسئلے ثابت نہیں ہوں گے؛ کیونکہ حرمتِ رضاعت کے لیے شرط ہے کہ وہ مدت حولین میں ہو یا اڑھائی سال میں ہو، اس کے علاوہ نہ ہو۔

﴿وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ﴾ پہلے تھا "وَالْوَالِدَاتُ" اس سے مراد ماں تھی۔ اور باپ کو فرمایا: ﴿وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ﴾۔ تو قرآن پاک نے یہ جو اسلوب بدلا ہے کہ وہ جس کا بیٹا ہے اس کے ذمہ روٹی اور خرچہ ہے اور ماں کی ذمہ داری دودھ پلانا تھا۔ یہاں بجائے "وَالِد" کے "الْمَوْلُودِ لَهُ" فرمایا، اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ تمہارے بچے کو اس کی ماں دودھ پلا رہی ہے، اس کا جو تم خرچہ لباس دے رہے ہو اس کو تم بوجھ نہ سمجھو؛ کیونکہ اس اولاد کی نسبت بھی تو تمہارے طرف کی جائے گی؛ کیونکہ بیٹا جب بھی منسوب کیا جائے گا تو باپ کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ اس لیے تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس کا خرچ ادا کرو۔ اور تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس کے اخراجات باقاعدہ ذمہ داری سے ادا کرو۔

بیٹے کا نسب باپ سے ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کی نسبت ہمیشہ باپ کی طرف کی جائے گی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ﴾ [الاحزاب: ۵] (ان کو ان کے باپ کے نام سے پکارو)، ماں کی طرف نسبت نہیں ہوگی۔ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ماں کی طرف کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا، اس لیے وہاں نسب ماں کی طرف ہو سکتا تھا، ورنہ جتنے مولود ہیں ان کی نسبت والد کی طرف ہوگی۔

قیامت میں آدمی کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا یا ماں کے؟

بعض لوگوں نے ایک مسئلہ بنایا ہوا ہے کہ دنیا میں تو اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے، لیکن قیامت والے

دن لوگوں کو ماں کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا۔ یہ غلط بات ہے۔ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کو ہمارے لوگ خود بناتے ہیں۔ ایک بات چلتے چلتے پوری دنیا میں پھیل گئی، وہ مسئلہ بن گیا۔ اور اس طرح وہ دلیل دیتے ہیں: کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف نسبت ہوگی۔ اور اسی طرح کچھ لوگ کہتے ہیں جن کا باپ حقیقتاً معلوم نہیں ہے ان پر بھی پردہ پڑ جائے گا، جب ماں کی طرف پکارے جائیں۔

ہمیشہ یاد رکھیں! یہ بات غلط ہے۔ یہ نصِ قطعی کا مسئلہ ہے۔ جس میں اختلاف پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نص قطعی ہے: ﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [الاحزاب:٥] ان کو ان کے والد کے نام کے ساتھ پکارا جائے۔

بعض لوگ کسی کو بیٹا بنا لیتے ہیں۔ اگر اس کا والد معلوم ہے تو لازمی طور پر اس کی حقیقی باپ کی طرف نسبت کرو۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت زید کو متبنیٰ بنایا تھا تو حکم ہوا کہ ان کو ان کے باپ کی طرف نسبت کر کے پکارا جائے، اس کی نسبت بیٹا بنانے والے یا بنانے والی کی طرف نہ کی جائے۔

بعض لوگوں نے ہسپتالوں سے بچے اٹھا لیے اور والدین معلوم نہیں، یا کبھی ایسے حالات بھی ہوتے ہیں کہ جنگ ہوئی کسی عورت کا بچہ رہ گیا، معلوم نہیں کس کا ہے، اب اگر اس بچے کو کسی نے پالا تو آدمی بظاہر یہی کہے گا کہ میرا بیٹا ہے، لیکن اگر نسبت معلوم ہو جائے تو ہر بچے کی نسبت باپ کی طرف ہوگی، ماں کی طرف نہیں ہوگی۔

نسبت کس کی طرف؟

اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ انسان اور حیوان میں یہی بنیادی فرق ہے کہ اگر انسان کا باپ مرجائے تو بیٹا یتیم ہوگا، یعنی والد کی موت سے یتیم کہلائے گا۔ اور جانوروں میں ماں مرجائے تو یتیم کہلائے گا؛ کیونکہ جانور کے باپ کا تو پتہ نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے کام تقسیم فرما دیے ہیں: ماں کی ذمہ داری تھی دودھ پلانا، تربیت کرنا، گھر میں بچے کی تربیت کرنا اور باقی نفقہ اور کسوہ باپ کی ذمہ داری ہے، لہٰذا اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوگی۔

مسئلہ: بعض لوگ اپنی نسبتوں کو چھپانے کے لیے اپنے آپ کو کسی دوسرے کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اپنی قوم بدل دیتے ہیں، حالانکہ کوئی چھوٹی بڑی قوم نہیں ہوتی۔ اصل میں بڑا وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہو۔

دیکھیں! ابو جہل کتنا بڑا قریشی سردار! لیکن اس پر لعنت پڑ رہی ہے، جبکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو ایک غلام تھے، ان کو یہ رتبہ دیا جا رہا ہے۔ تو ابو جہل کو اس کی قوم نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، اس کو اس کے نسب نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، فرعون کو بادشاہت نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، فرعون پر لعنت آ گئی، اس طرح ہامان ونمرود کو کوئی فائدہ نہیں ہوا، لیکن دنیا کے اعتبار سے بعض قومیں بڑی سمجھی جاتی ہیں اور بعض قومیں چھوٹی سمجھی جاتی ہیں۔ تو بعض لوگ اپنی نسبت بدل دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر بھی میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی: ''مَنِ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيْهِ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ غَيْرُ أَبِيْهِ فَالْجَنَّةُ عَلَيْهِ حَرَامٌ'' (جو شخص اپنے باپ کے علاوہ کی طرف نسبت کرے گا اور وہ جانتا بھی ہو کہ یہ اس کا باپ نہیں ہے (گویا وہ اپنا باپ بدل رہا ہے) تو ایسے شخص پر جنت حرام ہے)۔ [مسند بزار: ۲/۱۴۵]

ماں کے دودھ کا اثر:

آج چودہ سو سال گزر چکے ہیں اور ہم پندرہویں صدی کے اندر داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن نے جو فیصلہ کیا تھا: ﴿وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ آج ساری دنیا کے ڈاکٹر جو پہلے کہتے تھے کہ ماں بچے کو دودھ نہ پلائے، فلاں دودھ لکھ دو۔ اب وہ سارے وہیں آ گئے کہ ماں کا دودھ سب سے زیادہ مفید ہے۔ اب جس ڈاکٹر کے پاس جائیں وہ پہلی نصیحت یہی کرے گا کہ بچے کو ماں کا دودھ پلائیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلے فرمائے ہیں وہ عین صدق ہیں، حق ہیں، جن میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا اور وہ قیامت تک غلط نہیں ہو سکتے۔ بندوں کے فیصلے غلط ہو سکتے ہیں؛ کیونکہ بندہ ناقص ہے، اس کے فیصلے بھی ناقص ہیں، بندے کی عقل بھی ناقص ہے، سوچ بھی ناقص ہے اور ان کی تھیوریاں بھی غلط ہو جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت یہ ہے کہ جو بچے ماں کا دودھ پیتے ہیں ایک تو وہ صحت مند ہوں گے، دوسرا یہ ہے کہ ان کا ماں کے ساتھ زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بخلاف اس بچے کے کہ پیدا ہونے کے بعد نوکرانی کے سپرد کر دیا جائے، وہ اس کو ڈبے کا دودھ پلا رہی ہے اور پھر اس کے بعد وہ انگریزی سکولوں میں پڑھ رہا ہے۔ پھر وہی حال ہوتا ہے جو اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

اولاد سے کیا بو آئے ماں باپ کے اطوار کی؟
دودھ ہے ڈبے کا اور تعلیم ہے سرکار کی

کہ جب دودھ بھی انگریزی ہو اور تعلیم بھی انگریزی ہو تو اس بچے کے اندر ماں باپ کی عادات کیسے آئیں گی؟ آپ ان سے کیا توقع کریں گے کہ وہ اسلام کی خدمت کریں گے؟ یہ عجیب سی بات ہے! یہ تو ایسے ہیں جیسے آپ کریلے کی بیل سے کہیں کہ مجھے آم دے دو۔ وہاں تو آم پیدا نہیں ہوسکتا، وہاں تو کریلا ہی ملے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک اصل اور بنیاد رکھی ہے۔

بچے کو دودھ پلانے کا خرچہ کس کے ذمہ ہے؟

﴿رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ﴾ خرچ کرنے کا مسئلہ سمجھیں! اگر میاں بیوی کے درمیان صلح ہے تو بیوی کا خرچہ ویسے بھی خاوند کے ذمہ ہے۔ اور اگر بچہ پیدا ہوا تھا اور خاوند نے طلاق دے دی، عدت کا خرچہ تو خاوند کے ذمہ ہے، اب بچے کا خرچہ والد دے گا؛ کیونکہ عدت تین حیض تھی۔ اس مدت کے اندر خرچہ کا ذمہ دار خاوند ہے۔ اسی طرح ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے، طلاق کے بعد وضع حمل ہوا، بچہ پیدا ہو گیا تو عدت ختم ہو گئی، اور عدت کے بعد وہ عورت کے خرچہ کا ذمہ دار نہیں ہے۔ لیکن بچہ کی جب تک مدتِ رضاعت پوری نہیں ہو گی اس وقت تک بچہ کے خرچہ کا ذمہ دار والد ہو گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: ﴿وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ﴾ کہ تمہارا بیٹا ہے، اس لیے اس کے خرچہ کا ذمہ دار تم ہو۔

﴿لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ﴾ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر آدمی امیر ہے تو خرچہ امیروں والا دے گا، متوسط طبقہ کا ہے تو خرچ متوسط طبقہ والا ہو گا اور غریب ہے تو خرچہ غریبوں والا دے گا؛ کیونکہ ہر کسی کے اخراجات میں فرق ہے۔

اگر عورت امیر ہے اور خاوند غریب ہے یا خاوند امیر ہے اور عورت غریب ہے تو دونوں صورتوں میں مرد کی حیثیت کو سامنے رکھ کر خرچ کا فیصلہ کیا جائے گا۔

طلاق دینے کے بعد بچے کی ماں نہ چھینو:

﴿لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِھَا﴾ اللہ تعالیٰ نے کتنا عادلانہ نظام بنایا ہے کہ جب رضاعت کا مسئلہ ہو تو بچے کی ماں کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عورت کو طلاق دے دی تو دودھ پلانے کا خرچہ باپ کے ذمہ ہے۔ باپ کہے کہ میں اپنا بیٹا چھین لوں گا اور ماں تڑپ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! ان کی ماؤں کو مت نقصان پہنچاؤ۔ ٹھیک ہے کہ تم نے اس عورت کو طلاق دے دی، لیکن وہ بھی تو اس بیٹے کی ماں ہے۔ تم اس عورت پر ظلم نہ کرو، اس

کے بچے کو اس کے پاس رہنے دو، تاکہ ماں اس کی تربیت کرے، اس کو دودھ پلائے۔ جب بچہ بڑا ہو جائے گا تو سیدھی سی بات ہے کہ وہ باپ کو ہی ملے گا، لیکن یہ ظلم کرے کہ بچہ میں اس شرط پر دوں گا کہ تم یہاں دو سال تک پڑی رہو، یا کہے: تم اپنے ماں باپ کے گھر بچہ نہیں رکھ سکتی ہو۔ اسلام کہتا ہے: خبردار! ﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا﴾ جب تم نے طلاق دے دی ہے، عدت گزر گئی ہے، اب وہ عورت تمہارے لیے اجنبیہ بن گئی، اب وہ بیٹے کی کمزوری کی وجہ سے تمہارے دروازے پر پڑی رہے اور وہ ذلیل ہوتی رہے، یہ ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کسی ماں پر اس کے بیٹے کی وجہ سے ظلم نہ کرو۔

اسی طرح باپ پر بھی ظلم نہ کرو، مثلاً: عورت کو پتہ ہے کہ میرے خاوند کی اتنی آمدن ہے کہ مشکل سے گزارا چل رہا ہے تو یہ دودھ پلانے والی کہاں سے رکھے گا؟ تو وہ کہے کہ تم اپنے بچے کو لے جاؤ، میں اس کو دودھ نہیں پلاتی۔ حالانکہ بچہ کی تربیت جتنا ماں کر سکتی ہے اتنا باپ نہیں کر سکتا۔ آپ دیکھیں کہ باپ مضبوط نوجوان بھی ہے، اس کو تین سال کا بیٹا طواف میں دو گے تو تین چکروں کے بعد ماں کو دے دے گا کہ اس کو پکڑ و اور ماں بے چاری کتنی کمزور ہو وہ بچے کو نہیں چھوڑے گی اور اس کو لے کر پھرتی رہے گی۔

اس لیے اسلام نے کہا ہے کہ والدین کا درجہ بڑا بلند ہے، لیکن والدین میں بڑا درجہ ماں کا ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ سے صحابی نے پوچھا: یا رسول اللہ! والدین میں سے کس کا حق مجھ پر زیادہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''أُمَّكَ''۔ اس صحابی نے عرض کیا: اس کے بعد؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''أُمَّكَ''۔ اس صحابی نے پھر عرض کیا، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''أُمَّكَ''۔ اس صحابی نے پھر عرض کیا: اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ثُمَّ أَبَاكَ''۔

چوتھے نمبر پر تیرے باپ کا حق آتا ہے۔ سب سے زیادہ تجھ پر حق ماں کا ہے؛ کیونکہ ماں نے تکلیفیں بھی برداشت کی ہیں: ایک حمل کی تکلیف کہ تمہیں نو ماہ تک اپنے پیٹ میں سنبھالے رکھا اور تیرا بوجھ برداشت کیا۔ اگر آپ نے تجربہ کرنا ہو تو ایک اینٹ کو سر پر رکھ کر کچھ فاصلہ طے کر کے دیکھ لیں، آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ عورت کو کتنی مشقت ہوتی ہے؟ اور اسی حالت کے اندر عورت باورچی خانہ میں بھی جائے گی، آگ بھی جلائے گی، گھر کی صفائی بھی کرے گی، شوہر کے کپڑے بھی استری کرے گی اور اس کی تمام خدمات بھی کرے گی۔ اس لیے فرمایا: ﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا﴾ کہ ایک عورت کو طلاق دے دی، اب اس سے بچہ نہ چھینو۔

والد کے بعد وارث پر بچہ کا خرچہ ہے:

﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ﴾ ایک آدمی کا بچہ ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا، عدت بھی گزر گئی، لیکن بچہ موجود ہے تو اب بچے کا خرچہ کون دے گا؟ جبکہ باپ مر گیا تو اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا کہ جیسے والد کے ذمہ اس بچے کا خرچہ تھا، والد کے وارث پر بھی اس کا خرچہ ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وارث سے مراد ذی رحم محرم ہے، یعنی جو اس کے قریبی رشتہ دار ہیں، مثلاً: بھائی، بہن ہیں۔ جیسے شریعت میں میراث ملے گی اسی حساب سے ان رشتہ داروں سے خرچہ لیا جائے گا۔ مثلاً: لڑکے کے دو روپے اور لڑکی کو ایک روپیہ ملا ہے تو لڑکے سے دو حصے خرچ لیں گے اور لڑکی سے ایک حصہ خرچہ لیں گے۔ اور وہ خرچہ اس وقت تک دیتے رہیں گے جب تک بچہ دودھ پیتا رہے گا۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وارث سے مراد خود یہ بچہ ہے۔ ان کی بھی یہ بات ٹھیک ہے، لیکن اگر جائیداد ہی نہ ہو، بچہ غریب ہو تو پھر خرچہ کون دے گا؟ (پھر خرچہ حکومت دے گی۔)

﴿فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ﴾ جہاں میاں بیوی میں جھگڑا نہ ہو وہاں یہ صورتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ یہ صورتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں...... اللہ نہ کرے...... عورت کو طلاق ہوگئی، عدت گزر گئی۔ عورت کہتی ہے کہ ہم مشورہ کرلیں کہ سال دودھ پلانے کے بعد وہ دوسری چیزوں پر گزارہ کرلے؛ کیونکہ تمہارا بیٹا ہے، مجھے طلاق ہوگئی ہے، میں دوسری جگہ شادی کر رہی ہوں اور دوسرا گھر والا تمہاری اولاد کو برداشت نہیں کرتا۔ اگر ایسے حالات پیدا ہوجائیں تو دونوں مشورہ کرلیں اور مدت حولین سے پہلے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، وہ ایسا کرسکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ دونوں اس پر راضی ہوں اور یہ بھی ضروری ہے کہ بچے کو بھی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔ اللہ تعالیٰ جب ماں کو نقصان نہیں دینا چاہتا، باپ کو نقصان نہیں دینا چاہتے تو اس بچے کو بھی نقصان نہ پہنچے۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْھُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝﴾[البقرة:۲۳۴،۲۳۵]

''اور تم میں سے جو لوگ فوت ہوں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ عورتیں اپنے آپ کو چار ماہ دس دن انتظار میں رکھیں۔ پھر جب وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے حق میں دستور کے مطابق کریں۔ اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے۔ اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان عورتوں کا پیغامِ نکاح اشارہ میں کہو، یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے، لیکن ان سے چھپ کر (نکاح) وعدہ نہ کرو، مگر یہی کہ رواجِ شریعت کے مطابق کوئی بات کہہ دو۔ اور نکاح کا ارادہ نہ کرو، حتیٰ کہ عدت اپنی انتہاء کو پہنچ جائے۔ اور جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، پس اس سے ڈرتے رہو۔ اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا تحمل والا ہے۔''

ان آیات میں عدتِ وفات کا ذکر ہے، جبکہ سابقہ آیات میں عدتِ حیات کا بیان تھا۔

متوفیٰ عنہا زوجہا کی عدت:

ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ عورت چار مہینے اور دس دن عدت گزارے۔ اگر خاوند کے علاوہ اور کوئی رشتہ ہے، مثلاً: کسی کا باپ فوت ہو گیا، ماں فوت ہو گئی، بہن فوت ہو گئی یا بیٹا فوت ہو گیا...... کیونکہ موت و حیات تو لازم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا نظام تو چلے گا...... تو خاوند کے علاوہ باقی کے لیے صرف تین دن عدت ہے۔ تین دن کے بعد شریعت کے اندر اجازت نہیں ہے کہ آدمی بلا وجہ اپنے آپ کو سوگ کی حالت میں رکھے۔ جب تین دن گزر گئے تو سوگ ختم ہو گیا۔ لیکن اگر عورت کا خاوند فوت ہو جائے تو صرف عورت پر چار مہینے اور دس دن عدت ہو گی کہ وہ اس عرصہ میں کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔

ایک عورت کا خاوند چاندرات فوت ہوا تو اب عورت چار مہینے اور دس دن عدت گزارے گی، مہینہ چاہے تیس کا آ گیا یا انتیس کا آ گیا، وہ چار مہینے اور دس دن مزید۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا خاوند چاندرات فوت ہوا۔ لیکن اگر وہ چاندرات نہیں تھی، کسی اور تاریخ میں فوت ہوا تو ہر مہینہ تیس کا شمار کیا جائے گا۔ زمانہ جاہلیت میں یہ رواج ہوتا تھا کہ اگر عورت کا خاوند فوت ہو جاتا تو اس عورت کو دور کمرے میں پھینک دیتے تھے اور وہ سیاہ لباس پہن لیتی تھی اور اسی حالت میں وہ عورت پورا ایک سال گزارتی تھی۔ نہ اس کے پاس کوئی آتا تھا اور نہ کوئی جاتا تھا۔ کوئی چھوٹا بچہ جا کر اس کو کھانا دے آتا اور وہ عورت اسی طرح پڑی رہتی تھی۔ جب ایک سال کی مدت گزر جاتی تھی تو ان کے پاک ہونے کا طریقہ یہ تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں عورتیں بدن پر ڈالتی تھیں اور بکری جانور وغیرہ کو کھلاتے تھے اور اس کے بعد عورت غسل کرتی اور سمجھا جاتا تھا کہ اب وہ عدت سے نکل گئی ہے۔

ابتدائے اسلام میں ایک سال کا بھی حکم آیا کہ عدتِ وفات ایک سال ہے، لیکن یہ نہیں کہ عورت کو علیحدہ کوٹھڑی میں ڈال دیا جائے۔ وہ بھی انسان ہے، تمہارے ساتھ رہے گی، لیکن اسلام نے رعایت فرما دی تو یہ آیت پہلے والے حکم کے لیے ناسخ ہوگئی، حالانکہ وہ آیت باعتبار قراءت کے متاخر ہے اور چار مہینے دس دن والی آیت باعتبار قراءت کے مقدم ہے، لیکن اس آیت کے لیے ناسخ ہے؛ کیونکہ ترتیب نزول علیحدہ ہے اور ترتیب قراءت علیحدہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات دماغ میں رکھ لیں کہ یہ دونوں ترتیبیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ میرے پاک نبی کو فرما دیں کہ فلاں آیت کو فلاں سورت میں رکھیں اور فلاں سورت فلاں سورت کے بعد ہوگی۔ یہ ساری ترتیب اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے، کسی کی ذاتی منشا سے نہیں ہے۔

بعض روافض اور فرق باطلہ لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ دیکھو! اہل سنت والجماعت کا قرآن ہی الٹ ہو گیا ہے۔ پہلی سورت تو تھی ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱﴾ [العلق:۱] اور یہ پڑھتے ہیں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱﴾ [الفاتحہ:۱]۔ انہوں نے...... نعوذ باللہ...... قرآن کو خود الٹ دیا ہے، قرآن کو بدل دیا ہے۔ حالانکہ یہ جہالت ہے۔ نزول علیحدہ چیز ہے، ترتیب قراءت علیحدہ چیز ہے۔ اور دونوں کا حکم دینے والا رب العالمین ہے۔ اسی طرح اسی ترتیب سے میرے مدنی پاک ﷺ نے اپنی زندگی میں قرآن پڑھا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسی ترتیب سے پڑھا اور آج چودہ سو سال کے بعد وہ اسی ترتیب سے محفوظ ہے۔ دونوں چیزیں حکمِ خداوندی سے ہیں۔ اس میں نہ کسی بندے کا دخل ہے اور نہ کسی کی رائے کا دخل ہے۔

عدت کے مسائل:

عدت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ عورت چار مہینے دس دن اپنے خاوند کے گھر سے باہر نہیں جائے گی اور خاص طور پر تو رات کو کسی حالت میں بھی نہیں نکلے گی۔ اگر کوئی مجبوری ہے کہ بیماری ہوگئی، کوئی عذر آ گیا تو دن میں مجبوراً خاوند کے گھر سے باہر جا سکتی ہے، لیکن رات میں وہ کسی شکل میں باہر نہیں رہ سکتی۔ چار مہینے دس دن اس نے اپنے خاوند کے گھر میں گزارنے ہیں۔ وہ ان دنوں میں میک اپ بھی نہیں کرے گی، کوئی شوخ کپڑے بھی نہیں پہنے گی، سرمہ بھی نہیں لگائے گی، کاجل بھی نہیں لگائے گی اور وہ دوائی جو آنکھوں کی زینت کا باعث بنے وہ بھی استعمال نہیں کرے گی۔

جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ ایک عورت نے آ کر حضور اکرم ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! میری بیٹی بیوہ ہوگئی ہے اور اس کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔ مجھے اجازت ہے کہ آنکھوں میں دوائی لوں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا جاہلیت کا زمانہ بھول گیا کہ ایک سال تک عورت پڑی رہتی تھی، کوئی اس کی شکل بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے مہربانی کر دی ہے تو دوا کے بہانے سے تم زینت بنانا چاہتی ہو؟ حضور اکرم ﷺ نے اس کو اجازت نہ دی۔

ہاں اگر کوئی عورت بیمار ہوگئی، اس کی آنکھیں خراب ہوگئیں، کوئی ایسی دوائی ڈالی جو حسن کا ذریعہ نہیں بنتی تو اس کو آنکھ میں ڈالنا جائز ہے، لیکن عورت عدت کے اندر کوئی ایسا عمل نہیں کرے گی جو اس کے سنگھار اور فیشن کا ذریعہ بنے۔

عدت میں رکھنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ فرما دیتے ہیں کہ جب کسی عورت کے رحم میں نطفہ ٹھہر جائے تو وہ نطفہ سب سے پہلے استقرار پکڑتا ہے، اس کے بعد وہ علقہ بنتا ہے، پھر وہ مضغہ بنتا ہے اور پھر نفخ روح ہوتی ہے۔ چار مہینے کے بعد نفخِ روح ہو جاتی ہے تو لازمی بات ہے کہ روح والی چیز حرکت کرے گی۔ اس عدت سے واضح ہو جاتا ہے کہ حمل ہے یا نہیں ہے؟ اب حمل میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ اگر عورت خاوند کے مرنے کے فوراً بعد دوسری شادی کر لیتی ہے تو ممکن تھا کہ پہلے شوہر کا نطفہ ٹھہر چکا ہو اور وہ حاملہ ہو۔ اور ان کی عدت وضع حمل ہوتی ہے۔

اگر عورت حاملہ تھی اور خاوند فوت ہو گیا اور مثلاً: ایک ماہ کے بعد وضع حمل ہو گیا تو اس عورت کی عدت ختم ہوگئی اور اگر عورت کو ایک مہینہ کا حمل تھا، خاوند فوت ہو گیا تو اس کو وضع حمل تک چاہے جتنے مہینے لگیں عدت گزارے گی؛ کیونکہ نطفہ شوہر کا پیٹ میں موجود ہے۔ جب تک عورت کے رحم کی صفائی نطفہ اوّل سے نہ ہو جائے وہ کسی دوسری

جگہ شادی نہیں کر سکتی۔ اس لیے اسلام نے عدت کا حکم عطا فرمایا ہے۔

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِيٓ أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ عدت گزرنے کے بعد عورت غسل کرے، تیل لگائے، سرمہ ڈالے اور اچھے کپڑے پہنے، تا کہ اس کو اور رشتہ کے لیے پیغام آئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ دوسری جگہ شادی کرنا چاہتی ہے تو اس کو کرنے دو، لیکن بھلائی اور بہتری کے طریقے سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر وہ عورت کوئی اسلام کے خلاف حرکت کرے تو تم پر بھی گناہ ہوگا اور اگر وہ دوسرے نکاح کے لیے بنتی سنورتی ہے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، لیکن اگر عدت کے دوران کوئی ایسا کام کرے تو اس پر گناہ ہوگا۔

تقویٰ اختیار کرو:

فقہاء کرام نے اس سے ایک یہ بھی مسئلہ نکالا ہے کہ مثلاً: تم چار ساتھی ہو۔ ایک مکان کرائے پر مشترک لیا ہوا ہے۔ اب تین آدمی کہتے ہیں: جب ہم کام سے واپس آئیں گے تو فلم لائیں گے۔ چوتھا کہے کہ دوست ہیں، اب ان سے کیا مغز ماری کرنی ہے؟ اور وہ کہے: میں نہیں دیکھتا۔ دوسرے کمرے میں جا کر سو گیا اور دوسرے ساتھیوں کو منع نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ برابر کا مجرم ہے کہ یہ ان کے اس گناہ پر راضی ہے اور چپ ہے۔ باقی یہ سوچنا کہ ہم چار ساتھی ہیں، مجھے اس طرح کرایہ کم پڑتا ہے، کھانے کے پیسے کم ادا کرنے پڑتے ہیں، ان باتوں میں نہ جائیں۔ رزق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ﴿وَمَن يَتَّقِ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّهُۥ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ [الطلاق: ۲،۳] جو مجھ سے ڈرتا ہے اور میرے دین کے لیے تکلیفیں بھی برداشت کرتا ہے ہم اس کو ایسی جگہ سے رزق دیں گے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوگا۔ ﴿وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى ٱللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُۥٓ﴾ [الطلاق: ۳] اور جو اللہ تعالیٰ پر توکل رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی ان کے لیے کافی ہوتا ہے۔

عدت کے دوران نکاح کرنا جائز نہیں ہے:

ایک عورت بیوہ ہوگئی، ابھی وہ عدت کے اندر ہے۔ شریعت میں عدت کے اندر دوسرا نکاح نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اسلام نے یہ بھی منع فرما دیا کہ جب وہ عدت میں ہے تو عدت کے اندر تم اس کو کوئی نکاح کا کھل کر پیغام بھی نہ دے اور کوئی وعدہ بھی نہ کرو؛ کیونکہ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر کوئی عورت بیوہ ہوگئی۔ تمہارے دل میں یہ خیال ہے کہ عدت کے بعد اس سے شادی کرلوں تو کنایۃً اس سے رشتہ کی تم بات کر سکتے ہو کہ تم

کہہ دو کہ مجھے بھی اچھی اور نیک بیوی کی تلاش ہے۔ دعا کرو! اللہ تعالیٰ میرے لیے بھی آسانی پیدا کر دے۔ اس سے عورت سمجھ جائے گی، لیکن کھل کر بات کہنا منع ہے۔ اس عدت کے اندر یہ بھی سبق ہے کہ اگر کوئی عورت پہلے شوہر کے احسانات کے باوجود چار مہینے دس دن صبر نہیں کر سکی تو تم بھی جان لو کہ یہ عورت تمہارے ساتھ بھی کوئی وفا نہیں کرے گی۔

تعریض دو طرفہ بات کو کہتے ہیں، بالکل واضح نہ ہو کہ میں تم سے شادی کروں گا، بلکہ کہو کہ میرا شادی کا ارادہ ہے۔ اللہ کرے کوئی مناسب رشتہ مل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم نے دل میں چھپایا ہوا کہ فلاں شریف اور پڑھی لکھی عورت ہے، نوجوان ہے اور اس کی عدت کے بعد اس سے خطبہ کروں گا تو یہ دل میں رکھنا منع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں جانتا ہوں کہ جو بات تم دل میں چھپائے ہوئے ہو وہ تم اس سے ضرور کرو گے، لیکن خبردار! اس سے کوئی چوری چھپے وعدہ بھی نہ کرو اور اس سے کھل کر کوئی نکاح کی بات نہ کرو جب تک کہ اس کی عدت گزر نہ جائے۔

اس سے ہمیں یہ بھی سبق ملا کہ اگر عورت بیوہ ہو جائے تو یہ ہندوؤں کی رسم تھی کہ وہ اس کی دوسری شادی نہیں کرتے تھے۔ اور ہندوؤں میں آج تک بھی یہ رسم چلی آرہی ہے کہ اگر عورت کا خاوند مر جائے تو عورت باقی ساری زندگی بغیر خاوند کے گزارتی ہے، بلکہ بعض ہندو قبائل میں یہ بھی بری عادت ہے کہ عورت کو ''ستی'' ہونا کہتے ہیں کہ اگر عورت کا خاوند مر جائے تو وہ عورت کو بھی ساتھ ایک چتا میں رکھ کر دونوں جلا دیتے ہیں کہ جب اس کا خاوند مر گیا ہے تو اب عورت کو زندہ رہنے کا کیا حق ہے؟ اس لیے وہ اس رسم کو ''ستی'' یعنی جل جلانا کہتے ہیں۔ اس لیے کسی نے کہا:

؎ دوستی میں دو سَتی ہوتے ہیں دل
تب جا کر بنتی ہے دوستی

دوستی کا معنی صرف یہ نہیں ہوتا کہ زبانی کلامی کھانے پینے کا دوست ہو، بلکہ دوست تو دوستوں کے لیے قربانیاں دیتے ہیں، تب کہیں دوست کہلانے کا حق بنتا ہے۔

بیوہ عورت کی جلدی شادی کردو:

آج مسلمانوں کے اندر بھی یہ بیماری عام ہے کہ بیوہ عورت سے پہلے تو کوئی شادی نہیں کرتا۔ ان کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ پہلے شوہر کو کھا گئی ہے، اب اگر ہم شادی کریں گے تو ہمارا کیا حشر کرے گی؟ اگر اسی طرح عورتوں کے ذمہ

... کہ کوئی شوہر زندہ نہ رہے۔ یاد رکھیں! کسی کے ہاتھ میں موت و حیات نہیں ... نہ عورت کسی کو

مار سکتی ہے اور نہ مرد کسی کو مار سکتا ہے۔ موت و حیات کی گھڑی متعین ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک عورت نے بیس سال کی عمر میں شادی کی اور دو سال کے بعد خاوند فوت ہو گیا یا ایک مہینے کے بعد خاوند فوت ہو گیا تو اب بیس سال کی نوجوان عورت بغیر شوہر کے بیٹھی رہے تو لازمی بات ہے کہ پھر گناہ پیدا ہوں گے، معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوگا۔ اور اگر شادی ہو جائے تو...... الحمدللہ...... وہ اپنے گھر میں آباد ہوگی۔

یہی وہ حکمت تھی کہ میرے آقا سرکار مدینہ ﷺ نے جو سب سے پہلے شادی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کی تھی وہ بیوہ تھیں اور حضور اکرم ﷺ کا عین شباب تھا۔ ورنہ مکہ کی کوئی سی لڑکی اور کوئی گھرانہ ایسا نہیں تھا جو میرے پاک نبی ﷺ کو رشتہ نہ دیتا ہو، لیکن اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے عمل کو قیامت تک کے لیے زندہ رکھنا تھا، اس لیے حضور اکرم ﷺ کا پہلا نکاح ہی بیوہ سے ہوا، بلکہ حضور اکرم ﷺ کے اکثر نکاح بیوہ عورتوں سے ہوئے ہیں، کنواری عورت صرف حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ اس کے اندر حکمتیں تھیں۔ اگر ہم آج بھی اسلام کے احکام پر عمل کریں تو یہ معاشرہ فساد سے بچ سکتا ہے۔

﴿وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا﴾ تم بیوہ سے چوری چھپے باتیں نہ کرو، چوری چھپے وعدے نہ کرو: کیونکہ جب تم ایسی باتیں کرو گے تو لازمی بات ہے کہ آدمی اس میں واقع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى﴾ [الاسراء: ۳۲] کہ زنا کے قریب مت جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ زنا نہ کرو: کیونکہ جب آدمی قریب جائے گا تو واقع ہونے کا زیادہ اندیشہ ہے اور جب آدمی قریب ہی نہیں جائے گا تو لازمی بات ہے کہ اس سے بچ جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کی مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک چراگاہ سے مالک نے روکا ہوا ہے۔ اگر تم اپنی بکریاں اور جانور چراگاہ کے قریب چراؤ گے تو کسی وقت جانور چراگاہ کے اندر پڑ جائے گا، لیکن اگر تم اس چراگاہ سے دور رہو گے تو خطرہ نہیں ہوگا کہ تمہارا جانور اس چراگاہ میں چلا جائے۔ اس لیے اسلام نے جوان عورت کے ساتھ علیحدہ بیٹھنے سے منع فرمایا؛ کیونکہ جب غیر عورت اور مرد اکٹھے بیٹھے ہوں تو تیسرا شیطان داخل ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر تم غیر محرم عورتوں سے باتیں کر رہے ہو، غیر محرم عورتوں کے ساتھ سفر کر رہے ہو اور باہر کسی ملک میں تفریح کے لیے جا رہے ہو تو جب قرب کے مواقع پیدا ہوں گے تو فتنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لیے اسلام نے حکم دے دیا کہ غیر محرم عورت کے ساتھ

محرم کے ساتھ بے تکلفی نہ کرو اور کسی کے ساتھ ایسی بات نہ کرو کہ دلوں کے اندر کھوٹ پیدا ہو جائے۔

﴿وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ﴾ عدت کے دوران کوئی عقد نکاح نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ یعنی چار مہینے اور دس دن جب تک نہ گزریں اس وقت تک اس عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔

گناہ ہو جائے تو توبہ کر لو:

﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾[البقرۃ:۲۳۵] یعنی تم لوگوں کو تو دھوکہ دے سکتے ہو، لیکن اپنے خالق اور مالک کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ اس کو تو تمہارے دلوں کے اندر جو بات ہے اس کا پتہ ہے، اس لیے اس سے ڈرو۔ اور اگر کوئی غلطی ہو جائے تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والے بھی ہیں اور مہربانی والے بھی ہیں۔ وہ اپنے بندوں کو ان کے گناہوں پر فوراً سزا نہیں دیتے، بلکہ مہلت دیتے ہیں، تاکہ بندہ توبہ کر لے۔ یہ بھی شیطان کا لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے ہٹانے کا ایک طریقہ ہے کہ اگر...... خدا نہ کرے...... کسی بندے سے زنا ہو گیا، یا کسی بندے نے شراب پی لی، اب شیطان دماغ کے اندر یہ بات بٹھاتا ہے کہ تم اس وقت تک ایک شریف انسان تھے اور نیک آدمی تھے جب تک تم نے یہ گناہ نہیں کیا تھا۔ اب تم نے یہ گناہ کر لیا ہے، اب ایک گناہ کرو تو برابر ہے اور لاکھ کرو تو برابر ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری رحمت کے دروازے بند نہیں ہو گئے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایک دفعہ گناہ کر لیا تو ہمیشہ گناہ کرتے رہو۔ ایک دفعہ تم کنویں میں گر گئے تو اب ہمیشہ اسی میں اپنے آپ کو گراتے رہو۔ ایک دفعہ تم آگ میں جا پڑے ہو تو اب ہمیشہ اپنے آپ کو آگ میں ڈالتے رہو، بلکہ تم یہ یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرمانے والے ہیں، اللہ تعالیٰ حلیم بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ رحیم بھی ہیں۔

اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت و کرم کا اندازہ کر لیں کہ ملازم سے ایک غلطی بھی ہو جائے تو مالک اس سے کہتا ہے: خبردار! اگر تم نے پھر غلطی کی تو میں تمہیں نوکری سے نکال دوں گا، تمہاری تنخواہ کاٹ لوں گا۔ لیکن اس کریم کا حال دیکھیں کہ ستر سال بھی زندگی گناہ میں گزر جائے، رو کر اس کے دروازے پر پڑ جائے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں معاف کرنے کے لیے تیار ہوں۔ پھر بھی اگر کوئی آدمی خود بخود اپنے آپ کو جہنم میں ڈالے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

یاد رکھیں! توبہ کا دروازہ اس وقت بند ہو گا جب سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو گا، یا بندے کی جب

موت کا وقت آتا ہے اور غرغرہ کا وقت آجاتا ہے اس وقت اگر کوئی توبہ کرے تو اس کی توبہ فائدہ نہیں پہنچاتی۔ خاص طور پر نوجوان بھائی یاد رکھیں کہ اصل توبہ جوانی کی ہے، ورنہ بڑھاپے میں جانے کے بعد ہر آدمی کچھ نہ کچھ توبہ کر ہی لیتا ہے؛ کیونکہ تین سو ساٹھ چوہے کھانے کے بعد بلی حج پر جاتی ہے۔ جب آدمی کے چلنے کی قوتیں ختم ہو گئیں تو اس وقت کیا منہ کالا کرے گا؟ پھر تو لازمی بات ہے کہ مسجد کا رخ کرے گا؛ کیونکہ گھر والے تو بیٹھنے نہیں دیتے۔

متوفیٰ عنہا زوجہا کا حکم مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں کو ہے۔ اس پر سب سے بڑی دلیل یہ آیت مبارکہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں لگائی، بلکہ آیت مطلق ہے۔ اور یہ مسئلہ اجماعی ہے کہ سب عورتوں کے خاوند فوت ہو جانے پر عدت چار مہینے دس دن گزارنی ہوگی، لیکن علماء کرام نے اس میں ذرا تفصیل فرمائی ہے کہ اگر خاوند چاندرات میں فوت ہو گیا تو اب چار مہینے دس دن گزارے گی، چاہے مہینہ انتیس کا ہو یا تیس کا ہو، اور اگر خاوند چاندرات کو فوت نہیں ہوا تو ہر مہینہ تیس دن کا شمار کر کے ٹھیک ایک سو تیس دن پورے کرے گی۔

حدیث: مسند احمد کی روایت ہے اور امام ترمذی نے اس کی تصحیح فرمائی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی نے شادی کی اور وہ مر گیا، اس نے دخول بھی نہیں کیا اور نہ اس نے مہر مقرر کیا تھا۔ کئی دفعہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے جاتے رہے کہ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: اس مسئلے میں اب میں اجتہاد سے بات کہتا ہوں "فَإِنْ كَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللهِ" اگر میرا فتویٰ درست ہے تو یوں سمجھو کہ یہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت فرمادی اور اگر میں اس غلطی کروں تو یہ میری غلطی ہے۔ چونکہ برائی کی نسبت شیطان کی طرف ہوتی ہے اور شیطان نے مجھے غلطی میں ڈالا ہے۔ اللہ تعالیٰ غلطی سے پاک ہیں، اللہ کے نبی معصوم ہیں، لہٰذا جو خطا ہو گئی وہ میری ہوگی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: اس مسئلے کے اندر میرا اجتہاد یہ ہے کہ اس عورت کا حق مہر مثلی دیا جائے اور اس میں نہ کمی کی جائے اور نہ زیادتی کی جائے۔ اور عورت پر لازم ہے کہ وہ چار مہینے دس دن عدت گزارے اور عورت کے لیے میراث بھی ہوگی۔ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ میں نے خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فیصلہ بروہ بنت واشق کے بارے میں کیا تھا۔ اس کا بھی نکاح ہو گیا تھا، اس کا خاوند فوت ہو گیا اور وہ غیر مدخولہ تھیں تو اس کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فیصلہ فرمایا تھا جو آپ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بے انتہا خوش ہوئے۔ اسلام لانے کے بعد ان کو اتنی کبھی خوشی نہ ہوئی تھی جتنی اس فیصلہ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہونے پر خوشی ہوئی تھی۔...... الحمد

لله...... اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وہ فیصلہ کرایا جو اللہ کے نبی کا فیصلہ ہے۔

حاملہ کی عدت وضعِ حمل ہے:

مفسر فرماتے ہیں: یہ آیت عام ہے۔ اس سے صرف وہ عورت نکلے گی جو حاملہ ہو۔ اس کا خاوند مر گیا تو اس کی عدت کا مسئلہ علیحدہ ہے۔ قرآن میں ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ﴾ [الطلاق: ۴] حمل والی عورتوں کی مدت وضعِ حمل ہے۔ مفسر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی شان! ہوسکتا ہے کہ ایک گھنٹہ کے بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو جائے تو اس کی عدت ختم ہو جائے گی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا تو اس کی عدت چار ماہ دس دن تھی۔ اب اگر وہ عورت حاملہ ہے تو وہ فرماتے تھے کہ اس کی عدت اَبْعَدُ الْاَجَلَيْنِ بنے گی، یعنی اگر وضع حمل دو ماہ کے بعد ہو گیا تو عدت چار ماہ دس دن گزارے گی؛ کیونکہ وہ ابعد الاجلین ہے۔ اور اگر حاملہ ہے اور وضع حمل میں چھ مہینے باقی ہیں تو پھر وضع حمل کا انتظار کرے گی۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بات بہت اعلیٰ ہے اور بڑی دل کو لگنے والی ہے اور دونوں قرآن کی آیت کو جمع کرنے والی بھی ہے۔

لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ حدیث مبارک میں اس کے خلاف موجود ہے۔ صحیحین کے اندر ہے کہ صبیعہ اسلمیہ تھی۔ اس کے خاوند سعد بن خولہ فوت ہو گئے۔ یہ عورت حاملہ تھی۔ تھوڑی مدت گزری تھی کہ اس کو وضع حمل ہو گیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ چند راتیں گزریں، اس کو وضع حمل ہو گیا۔ جب وہ نفاس سے پاک ہو گئی، اس عورت نے غسل کیا، اچھے کپڑے پہنے، تیار ہو گئی، تاکہ مجھے کوئی نکاح کے لیے خطبہ کرے۔ اس کے ایک عزیز تھے، انہوں نے دیکھ کر فرمایا: میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ تم بڑی بن سنوری بیٹھی ہو، تم کیا نکاح کرنا چاہتی ہو؟ خدا کی قسم! تم نکاح نہیں کر سکتی جب تک کہ چار مہینے اور دس دن نہ گزریں، ابھی تمہاری عدت پوری نہیں ہوئی ہے۔ بی بی فرماتی ہیں: جب انہوں نے مجھے یہ کہا تو میں نے اپنے کپڑے اکٹھے کیے، یعنی برقعہ پہنا، لباس پہنا۔ جب شام کا وقت ہوا تو میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور عرض کیا کہ میرا وضع حمل ہو گیا، لیکن ابو السنابل فرماتے ہیں کہ تم چار مہینے اور دس دن عدت گزارو۔ میرے بارے میں کیا حکم ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب وضعِ حمل ہو گیا تو تم حلال ہو گئیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اب تم چاہو تو شادی بھی کر سکتی ہو؛ کیونکہ تمہاری عدت پوری ہو چکی ہے۔

دین ایمان اتنا اہم ہے کہ اس کے اندر کوئی شرم نہیں۔ اب دیکھیں! عورت کا خاوند فوت ہوگیا، وضع حمل ہوگیا تو عورت نے تیاری کی، تاکہ مجھے پیغام آئے، تاکہ میں نکاح کروں۔ دوسرے آدمی کو جب پتہ چلا تو اس نے بھی شریعت کا حکم سنایا کہ ابھی چار مہینے دس دن نہیں گزرے، لہٰذا تم کیسے نکاح کے لیے تیار ہو رہی ہو؟ تو اب بی بی نے فوراً حضور اکرم ﷺ کے پاس آکر مسئلہ پوچھا۔ وہ لوگ دین پر اتنے پکے تھے، اس میں کوئی شرم نہیں تھی۔ اب اللہ تعالیٰ معاف کرے کہ گناہ ہوتے رہیں، زنا ہوتے رہیں، لیکن برادری کا رسم و رواج رہ جائے۔ بیوہ عورتیں نکاح نہیں کریں گی [redacted] ان کی زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَّمَتِّعُوهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۞ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّآ أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۞﴾ [البقرۃ: ۲۳۶، ۲۳۷]

''تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دو جب تک کہ ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو یا ان کے لیے کچھ حق مہر مقرر نہ کیا ہو۔ اور ان کو خرچ دو وسعت والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق۔ جو خرچ دستور کے موافق ہے، نیکی کرنے والوں پر لازم ہے۔ اور اگر ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی اور ان کے لیے حق مہر مقرر کر چکے تھے تو جو ٹھہرایا تھا اس کا آدھا مہر لازم ہوگا، مگر یہ کہ عورتیں معاف کر دیں یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے معاف کر دے۔ اور تم مرد درگزر کرو تو (یہ) پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔ اور آپس میں احسان کرنا نہ بھولو۔ بے شک جو کچھ تم کرتے ہو اللہ دیکھتا ہے۔''

ربطِ آیات:

عدتِ طلاق بھی پڑھ چکے ہیں اور عدت وفات بھی پڑھ چکے ہیں۔ اب ان آیات میں بقیہ مسائل کا ذکر ہے۔
علماء فرماتے ہیں: عام طور پر چند صورتیں ہوتی ہیں:

1 ایک آدمی کا نکاح ہوا اور اس کے ساتھ حق المہر بھی معین ہو گیا۔ عورت کی رخصتی ہو کر میاں کے گھر میں بھی آ گئی، میاں بیوی بحیثیت میاں بیوی بھی رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد طلاق ہو گئی۔

2 نکاح ہو گیا، حق المہر بھی معین ہے، لیکن عورت کی رخصتی نہیں ہوئی، دخول نہیں ہوا اور طلاق ہو گئی۔

3 نکاح ہو گیا، حق المہر معین نہیں ہوا اور اس کے بعد طلاق ہو گئی۔

ان آیات مبارکہ میں پہلے اس صورت کا ذکر ہے کہ نکاح ہوا، میاں بیوی ابھی نہیں ملے، حق المہر بھی معین نہیں تھا اور طلاق ہو گئی تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان کو کچھ نہ کچھ تم نفع پہنچاؤ۔ اب نفع پہنچانے کی صورت یہ ہوئی: ﴿عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ ۚ﴾ اگر امیر آدمی ہے تو اپنی حیثیت سے کچھ دے دے، جوڑا کپڑے وغیرہ۔ اور اگر غریب ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق دے دے، مثلاً: ایک جوڑا دے دیا۔ فرمایا: یہ جو کچھ دینا ہے تم بھلائی کے ساتھ دے دو، بغیر کسی دعوے کے دو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ جو ہم نے کہا ہے ان لوگوں پر واجب ہے جو احسان کرنے والے بھلائی کرنے والے ہیں۔

اس سے مسئلہ نکلا کہ اگر ایک آدمی کا نکاح ہوا، لیکن ابھی عورت خاوند کے گھر میں نہیں اور میاں بیوی کا آپس میں ملاپ بھی نہیں ہوا اور طلاق ہو گئی تو اس کی کوئی عدت نہیں ہے، لیکن اس کا مہر معین تھا تو اب آدھا حق المہر ادا کرے گا۔

دوسری صورت: ﴿إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ﴾ ہاں ایک صورت یہ ہے کہ تم نے حق المہر مقرر کیا تھا اور نکاح بھی ہو گیا، لیکن میاں بیوی نہیں ملے اور طلاق ہو گئی۔ اب عورت کہتی ہے کہ میں آدھا حق المہر بھی نہیں لیتی ہوں تو اس کی اپنی خوشی ہے۔ یا وہ معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی کنجی ہے (مرد)؛ کیونکہ قبول بھی اس نے کرنا ہے اور طلاق بھی اسی نے دینی ہے۔ مرد کے معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ذمہ اصل میں آدھا حق المہر تھا، لیکن وہ کہے کہ میں پورا حق المہر دوں گا۔

﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ﴾ آپس میں بھلائی کے کام کو مت بھولو۔ یعنی اگر عورت معاف کرے بھلے کی بات ہے۔ اور اگر مرد پورا حق مہر دے تو یہ مرد کی بھلائی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دونوں چاہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی کریں، ان میں جو بھلائی میں سبقت کرے گا اس کو زیادہ ثواب ہوگا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۳۷] یعنی ہر عمل اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے۔ اگر تو نے پورا حق المہر ادا کر دیا اور تیری نیت بھلائی ہے، اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، وہ تجھے اس کا بدلہ دیں گے۔ اور عورت کا حق بنتا تھا کہ تجھ

سے آدھا حق المہر لے، لیکن اس نے معاف کر دیا تو یہ اس کی طرف سے بھلائی کی بات ہے۔

تیسری صورت: یہ ہے کہ عورت کے ساتھ نکاح ہوا حق المہر متعین نہیں ہے اور وہ عورت اپنے خاوند کے گھر میں بھی آ گئی، میاں بیوی بھی مل گئے، اس کے بعد خاوند نے طلاق دے دی۔ اب خاوند مکمل حق المہر دے گا، جیسا کہ اس خاندان کی دیگر لڑکیوں کا مہر ہوگا، یعنی وہ مہر مثل ادا کرے گا۔

چوتھی صورت: نکاح ہو گیا، مہر بھی معین ہے، میاں بیوی ملے نہیں ہیں، لیکن ایک ایسے خالی کمرے میں آ کر بیٹھ گئے، کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا اور پردے بھی گرا دیئے، یعنی ان کو ملنے سے روکنے والا نہیں ہے، لیکن بیٹھے ہیں، ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے اور ایک دوسرے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ خاوند نے طلاق دے دی۔ اس صورت میں خاوند کو پورا حق مہر دے گا۔

یہ چار صورتیں ہیں: دو کا ذکر یہاں ہے، تیسری کا ذکر سورۃ النسا میں ہے اور چوتھی صورت کا ذکر احادیث صحیحہ میں ہے، جو...... ان شاء اللہ...... آگے آ رہی ہے۔

''غیر مدخول بہا جس کا حق مہر مقرر نہ ہو'' کا حکم:

ان آیات سے معلوم ہوا کہ نکاح کے بعد اگر چہ دخول نہ ہوا ہو خاوند کو طلاق دینے کا حق ہے، بلکہ اگر اس نے حق المہر بھی ادا نہیں کیا، حق المہر بھی مقرر نہیں کیا پھر بھی طلاق کا اس کو حق ہے، وہ اس طلاق دے سکتا ہے۔

عورت کو کچھ دینے کی وجہ یہ ہے کہ عورت کے دل میں تمنا تھی کہ یہ میرا خاوند ہے، مجھے حق المہر دے گا، میں اس کے گھر میں آباد رہوں گی، ہمارا گھر آباد ہوگا، لیکن قدرت کی بات ہے، آبادی نہ ملی، آخر اس کا دل ٹوٹ گیا اور بے چاری مطلقہ بھی بن گئی۔ مطلقہ بننے کے بعد رشتے ملنے مشکل ہو جاتے ہیں؛ کیونکہ جہاں بھی طلاق ہو...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... لوگوں کے دماغ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ ضرور لڑکی کا قصور ہوگا، حالانکہ طلاق مرد دے رہا ہے، لیکن مرد کے ذمہ کوئی قصور لگانے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کا دل ٹوٹ گیا، اس کو مطلقہ بننا پڑا، اس کو حق المہر بھی نہ ملا اور لوگوں میں باقاعدہ شہرت بھی ہوگئی کہ فلاں سے نکاح ہو گیا، اس لیے کم از کم اس کو کچھ دو، تاکہ اس کی دل جوئی ہو جائے۔ باقی کتنا دیا جائے؟ اگر امیر ہو تو اپنی طاقت کے مطابق دے اور اگر غریب ہے تو اپنی طاقت کے مطابق دے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَتِّعُوهُنَّ﴾ کہ کچھ نہ کچھ تو اس کو نفع پہنچاؤ۔ اس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک خادم اس کو دے دو، یعنی عبد خرید کر کے اس کو دے دو۔ آگے اس کی مرضی ہے عبد کا مکاتب بنا کر قیمت حاصل کرے یا عبد کو آزاد کر کے شادی کرے۔ اور فرمایا: درمیانہ درجہ یہ ہے کہ چاندی کے کچھ سکے اور کچھ پیسے وغیرہ دے دو۔ اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ لباس دے دو۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: درمیانہ درجہ یہ ہے کہ اس کو بڑی اوڑھنے والی چادر، سر پر رکھنے کا دوپٹہ، ایک ملحفہ اور ایک بڑی چادر دے دو۔ کیونکہ پہلے زمانہ میں اکثر رواج چادروں کا تھا، اس دور میں شلوار وغیرہ کا استعمال بہت کم تھا۔ اس لیے ساری زندگی میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی چادر استعمال فرمائی۔ شلوار کا خریدنا تو حدیث پاک میں موجود ہے، لیکن پہننے میں اختلاف ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شلوار پہنی ہے۔ اور بعض میں ملتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شلوار خریدی تو ہے، لیکن پہننے کا موقع نہیں ملا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شلوار کو پسند فرمایا کہ شلوار بڑا اچھا لباس ہے۔ اس میں آدمی کا بدن محفوظ رہتا ہے۔

حضرت قاضی شریح رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کم از کم اس کو پانچ سو درہم دے دو۔ حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: چاہے تو خادم دے دو، چاہے تو خرچہ دے دو اور چاہے تو لباس دے دو۔ حضرت حسن بن علی رحمہ اللہ نے اسی طرح نکاح فرمایا کہ حق المہر بھی مقرر نہیں تھی اور طلاق بھی ہوگئی تو آپ نے دس ہزار درہم دیئے۔

ایک آدمی کا ایک عورت سے نکاح ہوا۔ اس نے اس کو طلاق دے دی، لیکن ابھی وہ ملے بھی نہیں تھے اور حق المہر بھی مقرر نہیں تھا۔ قرآن پاک نے تو بطریق العموم فرما دیا کہ ان کو کچھ نہ کچھ نفع پہنچاؤ۔ امیر آدمی ہے تو اپنی طاقت کے مطابق اور غریب آدمی ہے تو اپنی طاقت کے مطابق نفع پہنچائے۔ کچھ اقوال امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر ان دونوں میں جھگڑا ہو گیا کہ عورت کہتی ہے: مجھے مہر دو۔ تو کم از کم نصف مہر مثل دے، یعنی اس کی جو باقی بہنیں ہیں مثلاً: ان کو ایک ہزار ملا ہے تو اس کو پانچ سو روپے اور اگر جھگڑا نہ ہو تو جتنی اس کو توفیق ہے دے دے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول جدید یہ ہے کہ خاوند پر جبر نہیں کیا جائے گا کہ اتنا دو۔ کم از کم اتنا دے جس پر متعہ کا اطلاق ہو جائے کہ یہ نفع ہے! کیونکہ قرآن پاک نے مطلقاً حکم دیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے یہ پسند ہے کہ کم از کم اتنا دے کہ جس میں نماز صحیح ہو جائے، یعنی تین کپڑے دے۔ اور قول قدیم یہ ہے کہ میں تو مقرر نہیں کر سکتا کہ خاوند اتنا دے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق فرمایا ہے، لیکن مناسب ہے کہ تیس درہم دے۔

بہرحال اگر ایک عورت کا نکاح ہو گیا حق المہر متعین نہیں تھا، ملاقات سے پہلے طلاق ہو گئی تو کچھ نہ کچھ دے دو۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن نے اس کی مقدار معین نہیں فرمائی۔ اس لیے اس کی مقدار کے اندر اختلاف ہے۔

مسئلہ:

﴿وَمَتِّعُوْهُنَّ ۚ﴾ یہ حکم مطلقہ غیر مدخولہ کے لیے ہے، یا مطلقہ مدخولہ کے لیے ہے۔ بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ لفظ عام ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر آتا ہے: ﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَي الْمُتَّقِيْنَ﴾ [البقرۃ:۲۴۱]۔ مطلقہ عورتوں کو خیر خواہی کے ساتھ کچھ نہ کچھ نفع پہنچائیں اور یہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں پر واجب ہے۔ اسی طرح جب اللہ پاک نے حضور اکرم ﷺ کو حکم دیا تو آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کو اللہ کے حکم کے مطابق یہ فرمایا تھا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ [الاحزاب:۲۸] اے میری بیویو! اگر تم دنیا کی زینت اور دنیا کا آرام چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ نہ کچھ دے دوں اور میں تمہیں خوش اسلوبی کے ساتھ فارغ کر دوں۔ حالانکہ وہ سب بیویاں تھیں، رخصتی ہو چکی تھی، لیکن وہاں بھی حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ﴿تَعَالَيْنَ﴾ اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے اور یہی قول حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا ہے، ابو العالیہ حضرت حسن بصری اور امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔

مفسر فرماتے ہیں: دوسرا قول یہ ہے کہ اگر عورت کو میاں کے چھونے سے پہلے طلاق ہوئی ہے، اس کو کچھ نہ کچھ دینا چاہیے۔ لیکن جو عورتیں مدخولہ ہو گئیں اور ان کو حق المہر بھی مل گیا، وہ خاوند سے فائدہ اٹھا چکی اور خاوند اس سے فائدہ اٹھا چکا تو ان کے لیے واجب نہیں۔ پہلی صورت کے اندر تو حسن خلق ہے کہ مدخولہ ہے یا غیر مدخولہ ہے، مفروض لھا ہے یا غیر مفروض لھا ہے، طلاق کے بعد بھی اس کو کپڑے یا کوئی ہدیہ دے کر عزت کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔ واجب صرف ان پر ہے جن عورتوں کو نکاح کے بعد طلاق ہو گئی، ابھی میاں بیوی نے ایک دوسرے کو چھوا نہیں تھا؛ کیونکہ قرآن مجید میں دوسری آیت وضاحت کے ساتھ موجود ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ [الاحزاب:۴۹] کہ جب تم نے مومنہ عورتوں کے ساتھ نکاح کیا اور اس کے بعد تم نے ان کو طلاق دے دی چھونے سے پہلے تو اب ان پر کوئی عدت نہیں۔ اب تم ان کو کچھ نہ کچھ دے کر آرام سے رخصت کر دو۔

حدیث مبارک میں آتا ہے جس کو سہل بن سعد اور ابو اسید نے روایت کی ہے کہ ایک عورت کا نام امیمہ بنت شرحبیل تھا، اس کا حضور اکرم ﷺ کے ساتھ نکاح ہوا اور جب حضور اکرم ﷺ تشریف لے گئے اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے کوئی ایسی بات کی جو حضور اکرم ﷺ کو ناگوار گزری۔ آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک روک لیا۔ اور باہر جانے کے بعد حکم دیا کہ اس کو دو کپڑے دے کر عزت کے ساتھ رخصت کر دیا جائے، یعنی آپ ﷺ نے اس کو طلاق دے دی۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تیسرا قول یہ ہے کہ یہ دینا اس کے لیے ہے جو مطلقہ ہے اور جس کے ساتھ دخول بھی نہیں ہوا اور حق المہر بھی مقرر نہیں ہوا۔ اب اگر دخول ہو چکا ہے تو اس پر حق المہر دینا واجب ہے۔ اور اگر اس کے لیے مہر مقرر تھا اور اس نے طلاق دے دی، لیکن ابھی دخول نہیں کیا تو نصف مہر دینا ہوگا۔ جیسا کہ آپ نے پڑھا: ﴿فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾ اور جس کے ساتھ دخول نہیں ہوا اور مہر بھی مقرر نہیں ہوا اس کو کچھ نہ کچھ دے دو۔

گھریلو معاملات اور میل ملاپ میں احتیاط:

نکاح اور طلاق یہ عائلی معاملات ہیں۔ ان کے اندر بے پناہ فتنے ہیں، قتل تک مصیبتیں آجاتی ہیں۔ اسلام ان کو خوش اسلوبی کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اسلام نے حکم دیا ہے کہ کسی آدمی سے دوستی رکھو تو حد میں رکھو۔ یہ نہ کرو کہ کسی سے دوستی رکھی تو آدمی اس کو گھر میں لا رہا ہے، اس دوست کو اپنی بیوی کے ساتھ ملا رہا ہے، گھر میں اکٹھا کھانا کھا رہے ہیں، پورا گھر ہی اس کے سپرد ہے اور اپنا ہر عیب اس کو بتا رہا ہے۔ کل کو اگر دشمنی ہو جائے تو وہ پوری دنیا میں تمہیں ننگا کرتا پھرے گا۔ اسلام کا یہ حکم ہے کہ اگر تمہارا کسی سے جھگڑا ہو گیا تو اس کو حد میں رکھو اور اتنا نہ بڑھاؤ کہ ایک دوسرے کی ماں بہن کی گالیاں دو، لڑائیاں لڑو اور ایک دوسرے کے خلاف جھوٹے مقدمے اور قصے شروع کر دو۔ اگر کل صلح ہو جائے تو آنکھیں نیچی ہوں گی۔ اس لیے اسلام نے ہمیں ہر چیز کا ایک ادب سکھایا ہے۔

کئی گھر اس لیے برباد ہوئے کہ ایک آدمی کے خاندان کی عورتوں سے ناجائز تعلقات ہو گئے۔ جب ان کو سمجھایا گیا تو عورت نے کہا: ان لوگوں کو میرا خاوند گھر میں لے آیا تھا یا میں سڑک سے پکڑ کر لائی ہوں؟ اس لیے اگر تمہاری دوستی ہے تو اس کو ایک حد میں رکھو۔ اب اگر تم اس کو گھر میں لا رہے ہو، اگر تم آگ اور کپاس کو قریب رکھ دو اور پھر کہو کہ آگ نہ لگے تو ممکن نہیں ہے۔ اگر تم نے گیس کا بھرا ہوا سلنڈر رکھا ہوا ہے اور وہاں آگ بھی جل رہی ہے تو وہ

سلنڈر کسی وقت تو پھٹ جائے گا۔عورت اگر کسی غیر محرم کے ساتھ ملے گی تو ان کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے تو کسی وقت شیطان نے بھڑکا دینا ہے اور فتنہ واقع ہو جائے گا! کیونکہ دوست کو تم خود گھر لے آئے اور اس کی بیوی سے بےتکلف کر دیا۔تمہارا دوست ہے،اس کو پتہ ہے کہ تم ساڑھے سات بجے ڈیوٹی پر جاؤ گے اور اڑھائی بجے واپس آؤ گے،تمہارا گھر بھی خالی ہے۔اب وہ تمہارے گھر میں اکیلا سویا ہوا ہے۔تمہارے ساتھ گلی والے دیکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ آنے جانے والا ہے تو محلے والے بھی اس کو کیسے روک سکتے ہیں؟

اس لیے اسلام یہ کہتا ہے کہ تمہارا جس جگہ نکاح ہوا ہے اگر...... خدا نہ کرے...... طلاق ہو رہی ہے تو پہلے گویا تمہارا ایک معاہدہ ہوا تھا اب وہ ٹوٹ رہا ہے تو اس کو خوش اسلوبی اور محبت سے توڑو،اس کو دشمنی سے نہ بدلو۔

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٩﴾﴾ [البقرة:٢٣٩]

’’نمازوں کی حفاظت کرو اور (خاص کر) درمیان والی نماز (عصر) کی اور اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے ہوا کرو۔پس اگر تمہیں کسی کا ڈر ہو تو (نماز) پیادہ پڑھ لو یا سوار ہو کر،پھر جس وقت امن پاؤ تو اللہ کو یاد کرو جیسا تم کو سکھایا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔‘‘

گزشتہ آیات سے ربط:

ربط کی پہلی صورت: ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نماز کی حفاظت کا حکم فرمایا ہے۔گزشتہ آیات میں معاشرتی مسائل کا ذکر تھا،جن کا ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت سابقہ پڑتا ہے۔درمیان میں اب نماز کا حکم آ گیا۔علماء کرام نے فرمایا:اس کی وجہ یہ ہے کہ گھریلو معاملات میں آدمی احتیاط کرے،کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی ہے،اسی طریقے سے نکاح اور طلاق کے معاملات ہیں تو جب طلاق ہوتی ہے تو دو خاندانوں کے درمیان جدائی ہوتی ہے،اس میں افراط و تفریط ہو جاتی ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا،تا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ اس کی کو پورا کرے۔

ربط کی دوسری صورت: بعض علماء نے یوں بھی ربط بیان فرمایا ہے کہ معاشرتی نظام میں جو غلطیاں ہو گئیں،

غلطیوں کا کفارہ یہ ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ [ہود: ۱۱۴] کہ اگر انسان سے کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو فوری طور پر نیکی کرے، عبادت کرے، نماز پڑھے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے؛ کیونکہ نیکیاں اس گناہ کو معاف کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

ربط کی تیسری صورت: بعض علماء نے تیسری وجہ یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ نکاح اور طلاق کے جتنے مسائل تھے وہ حقوق العباد تھے، وہ انسان کا انسان پر حق تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے نماز کا ذکر فرمایا۔ اس میں حقوق اللہ کا بیان ہے کہ صرف حقوق العباد کی پابندی نہیں، بلکہ حقوق اللہ کا بھی خیال رکھو۔

ربط کی چوتھی صورت: بعض علماء نے اس کی ایک اور توجیہ بھی بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۳۸] پہلے نکاح، طلاق اور عدت کے احکام تھے جس کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں انسان کو نماز کا پابند کیا ہے۔ جو آدمی اپنے اللہ کے دربار میں آجائے گا اس کے دل میں خشیت پیدا ہوگی۔ تو اللہ تعالیٰ تنبیہ فرما رہے ہیں کہ گھریلو معاملات میں ایسے نہ الجھ جاؤ کہ نمازیں بھی بھلا دو؛ کیونکہ عام طور پر ایسے ہوتا ہے کہ جب طلاق ہو گئی تو آدمی پاگل ہو کر پھر رہا ہے، دماغ خراب ہے، نہ نماز ہے، نہ روزہ ہے، نہ حج ہے، نہ زکوٰۃ ہے اور نہ قرآن ہے۔ بس فراق کے اندر ایسا الجھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد کو چھوڑ بیٹھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فوراً نماز کا حکم دیا۔

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۳۸] ''حٰفِظُوْا'' مفاعلہ کا صیغہ ہے۔ علماء نے فرمایا: اس میں ایک اشارہ ہے کہ جتنی تم نماز کی حفاظت کرو گے اتنی نماز تمہاری حفاظت کرے گی؛ کیونکہ مفاعلہ دو جانب سے ہوتا ہے، ایک جانب سے کبھی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کے بارے میں ایسا لفظ استعمال فرمایا جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جتنی تم نماز کی حفاظت کرو گے اتنی نماز تمہاری حفاظت کرے گی۔

حفاظت صلوۃ کا معنیٰ:

محافظتِ صلوۃ کا معنیٰ جیسا کہ آپ نے کئی مقامات پر پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ... أَقِمِ الصَّلٰوةَ... الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ... يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ ہر جگہ لفظ ''أَقِمِ'' آتا ہے اور یہاں ''حٰفِظُوْا'' کا لفظ ہے۔ اب نماز تمہاری کوئی پابند تو نہیں ہے کہ تم پہرہ دو گے۔ حفاظت کا معنیٰ یہ ہے کہ اس کے

اوقات کی حفاظت کرو، اس کے شروط وارکان کی حفاظت کرو، اس کے شرائط، واجبات، سنن اور مستحبات کی حفاظت کرو۔ یہ نہ سمجھو کہ سر پر ایک چیز ہے جو اتارنی ہے، بلکہ پوری پابندی اور حفاظت کے ساتھ جو اس کے حدود وشرائط ہیں اور جو ارکان ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک وقت پر ادا کرنے کا نام ''اقامتِ صلوۃ'' ہے۔ اگر آپ نے جلدی جلدی وضو کیا اور کوئی جگہ خشک رہ گئی تو وضو نہ ہوا۔ جب وضو نہ ہو تو نماز بھی نہ ہوئی۔ اسی طرح ہمارے بعض بھائی ایسا کام کر رہے ہوتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں پر کسی چیز کی تہہ جم جاتی ہے، مثلاً: آٹا لگ کر خشک ہو گیا، یا رنگ لگ گیا جس کی تہہ بن جاتی ہے، اسی طرح پلاسٹک نما چیز لگ گئی، وضو کرتے وقت ان کا خیال نہ کیا۔ جب وضو کے کسی عضو تک پانی نہ پہنچا تو وضو نہ ہوا۔ جب وضو نہ ہوا تو نماز نہ ہوئی۔ یہ بات ''محافظتِ صلوات'' کے خلاف ہے۔ بعض لوگوں نے انڈرویئر پہنا ہوا ہوتا ہے۔ پیشاب کر کے کبھی ٹشو سے استنجا کر لیتے ہیں، احتیاط نہ کی اور بعد میں قطرے گر گئے۔ وہی انڈرویئر پہن کر نماز پڑھتے ہیں، جبکہ پلید کپڑا اندر موجود ہوتا ہے، جس سے نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح بعض لوگ نماز کے وقت دوڑ کر آتے ہیں، رش ہوتا ہے، باہر سڑک پر کھڑے ہو گئے اور یہ خیال نہ کیا کہ جگہ پاک ہے یا پلید ہے؟ یا کسی گھر میں مہمان ہوئے، قالین بچھے ہوئے ہیں، نماز کے وقت اللہ اکبر کہہ کر وہیں قالین پر کھڑا ہو گیا۔ خدا جانے وہاں کسی بچے نے پیشاب کیا ہو اور اس قالین نے اس کو اپنے اندر جذب کر لیا ہو۔ یہ چیزیں حفاظتِ صلوۃ کے خلاف ہیں۔ جو آدمی محافظتِ صلوۃ کرے گا وہ باقاعدہ سے وقت پر وضو کرے گا، خلال کرے گا، دیکھے گا کہ میری کوئی ایسی جگہ تو نہیں جہاں پانی نہ پہنچا ہو، اپنے لباس پر غور کرے گا اور جہاں نماز پڑھ رہا ہے اس جگہ کی پاکی کے بارے میں غور کرے گا۔

قانتین کی تفسیر:

ہمارے بعض لوگ یہ غفلت کرتے ہیں کہ مثلاً: رات کو بارہ ایک بج گیا، بیٹھے رہے، نماز نہیں پڑھی۔ اس کے بعد صبح اٹھ کر نماز پڑھتے ہیں، یہ نماز نہیں ہوئی۔ یہ ''اِقَامَةُ الصَّلٰوة'' کے خلاف ہے۔ اسی طرح محافظتِ صلوۃ کے بارے میں علماء نے فرمایا کہ ابتداء کے اندر نماز کے دوران کلام کرنا بھی جائز تھا، یعنی نماز پڑھتے ہوئے کسی نے پوچھا: کتنے فرض ہو گئے؟ تو اس کو جواب دے دیتے تھے۔ اسی طرح سلام کا جواب دینا بھی جائز تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی: ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ اپنے اللہ کے آگے خشوع وخضوع کے ساتھ کھڑے

ہو۔ تو نماز کے اندر بولنا بھی بند، ادھر ادھر دیکھنا بھی بند ہو گیا۔ بلا وجہ گردنیں پھیرنا یہ سب چیزیں قنوت کے خلاف ہیں۔ اور جب حدیث مبارک نے تشریح فرمادی: ''أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ''[1] (تم خدا کی ایسی عبادت کرو جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو)۔ اب جس بندے کو یہ مقام حاصل ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ سے نظر ہٹا کر کسی دوسری چیز کو کیسے دیکھ سکتا ہے؟ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تمہیں یہ مقام نہ ملے تو تم اس مقام پر پہنچو کہ تیرا رب تجھے دیکھ رہا ہے۔ جس بندے کو یہ یقین ہو جائے کہ میرا آفیسر مجھے دیکھ رہا ہے، وہ نہیں ہلتا۔ تو جس بندے کو یہ یقین ہو جائے کہ میرا خدا مجھے دیکھ رہا ہے تو اس بندے کو کیا پڑی ہے کہ وہ ادھر ادھر دیکھے؟ بعض بڑے پکے نمازی ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو پتہ نہیں کس مرتبہ کا سمجھتے ہیں! نماز میں کھیل رہے ہوتے ہیں اور نماز بھی ہو رہی ہے۔ یہ کوئی نماز تو نہیں، کوئی کھیل ہو گیا۔

نماز کو اطمینان سے ادا کرو:

اگر تم نے نماز پڑھی، لیکن رکوع کے اندر پشت سیدھی نہیں ہوئی، کھڑا ہو گیا، یہ نماز مکمل نہیں ہوتی۔ اسی طرح سر سجدے میں ڈالا اور فوراً اٹھالیا، یا ٹانگیں پیچھے اٹھائی ہوئی ہیں، اسی طرح سر سجدے میں ڈالا اور تسبیح ایسے پڑھی کہ پتہ نہیں کہ تم نے کیا پڑھا ہے؟ ٹکریں مار رہے ہو تو یہ منافق کی نماز ہوتی ہے، مومن کی نماز نہیں ہوتی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے باقاعدہ قرآن میں فرمایا: ﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ﴾ [البقرۃ:۴۵] یہ نماز ان لوگوں کے لیے بھاری ہے جو منافق ہوتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں ان کا تو سکون و قرار نماز میں ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ'' (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے)۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: بلال! اٹھو! نماز کا وقت ہو گیا ہے، اذان کہو اور ہمیں آرام پہنچاؤ۔ اذان ہو گی، ہم نماز پڑھیں گے اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کو معراجِ مومن بنایا ہے۔ نماز سے ہمیں روحانی سکون اور طمانیت محسوس ہو گی۔

نماز نہ پڑھنے والوں کے بارے میں حکم:

علماء نے فرمایا: اگر کوئی منکرِ نماز ہے، ایسا آدمی بالاتفاق کافر ہے، اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔ اور اگر ایک

---

[1] [صحیح البخاری:۱/۲۷، صحیح مسلم:۱/۲۹]

آدمی منکر تو نہیں ہے، بلکہ مانتا ہے کہ نماز عبادت ہے، فرض ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، لیکن نماز چھوڑ دیتا ہے، یا تو کسی عذر کی وجہ سے چھوٹ گئی کہ نیند آ گئی اٹھ نہیں سکا، یا کوئی حادثہ ہو گیا۔ اور دوسرا یہ ہے کہ عمداً نماز چھوڑ دی کہ ڈرامہ دیکھ رہے ہیں، گپیں لگا رہے ہیں۔ اذان ہو گئی، نماز کا وقت ختم ہو گیا، اس کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور الشیخ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز جان بوجھ کر چھوڑنے والا آدمی بھی کافر ہو جاتا ہے۔ اگر وہ شادی شدہ ہے تو اس کا نکاح ختم ہو جاتا ہے؛ کیونکہ یہ کافر ہے۔ اور فرماتے ہیں اگر ایسا آدمی مر جائے تو اس کا جنازہ بھی نہ پڑھو اور اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن بھی نہ کرو؛ کیونکہ یہ مرتد ہے، مسلمان نہیں ہے۔

اس سے اندازہ لگائیں کہ بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے پانچ پانچ سال سے نماز نہیں پڑھی اور جانتے نہیں کہ نماز کیا ہے؟ بعض لوگ ایسے ہیں جو خود تو نمازی ہیں، لیکن بی بی بے نمازی ہے، تب بھی نکاح نہ رہا۔ تو آئندہ جو اولاد ہوگی وہ کیا ہوگی؟ صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ علماء کے نزدیک ولد الزنا ہوگی۔

باقی آئمہ فرماتے ہیں: ایسا آدمی فاسق فاجر ہے۔ اس نے ایسا کام کیا ہے جو کفر کے قریب لے گیا ہے اور اس نماز کے چھوڑنے سے کبھی یہ کفر میں پڑ جائے گا، لیکن کافر نہیں ہوتا۔ بہر حال جب ایک بڑے امام یہ فرما رہے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حدیث مبارک کے ظاہری الفاظ بھی یہی ہیں ''مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ ''[1] (جو شخص نماز کو جان بوجھ کر چھوڑے اس نے کفر کیا)۔

اس لیے حکم ہے: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ﴾ (نمازوں کی پابندی کرو)۔ اسی طرح آیا: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ [النساء: ۱۰۳] کہ نماز کو اس کے اوقات میں ادا کرو۔ یہ ٹھیک ہے کہ اوقات میں دو وقت ہیں: ایک اوّل وقت ہے اور ایک آخری وقت ہے۔ اس کے اندر نماز پڑھ لے تو وہ شکر کرے کہ اس نے نماز ادا کر لی ہے۔ یہ بھی ''محافظة علی الصلوة'' میں داخل ہے کہ اگر تیرے گھر کے قریب کوئی مسجد ہے اور اس مسجد کی اذان تمہیں سنائی دیتی ہے تو پھر تمہاری نماز گھر میں درست نہیں ہوتی، تمہیں مسجد میں جا کر ہی نماز پڑھنی ہوگی۔ ہاں اگر عذر ہے تو پھر آپ گھر میں مجبوراً نماز پڑھ سکتے ہیں، لیکن اس کے لیے بھی شرط ہے کہ اگر کوئی آدمی نہ ملے تو آدمی اپنے بیوی بچوں کو جماعت کروا لے، خود امام بن کر نماز پڑھے، تاکہ جماعت کا ثواب نصیب ہو جائے۔

[1] [الترغیب والترھیب: ۱/ ۲۱۵، الطبرانی اوسط: ۳/ ۲۲۳]

نماز با جماعت میں سستی کرنے والے کی مثال:

میرے آقا ﷺ نے پیاری مثال دی ہے: ''مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ''[1] کہ تم بکریوں کا ریوڑ چرانے کے لیے جاتے ہو تو جب وہ ریوڑ اکٹھے جا رہا ہو اور چرانے والا بھی ساتھ ساتھ پھر رہا ہو تو ریوڑ محفوظ رہتا ہے، لیکن جو بکری پیچھے رہ جائے، اس کو ہمیشہ شکاری جانور اٹھایا کرتے ہیں کہ وہ ریوڑ سے کٹ گئی۔ جو مسلمان جماعت سے پیچھے رہ جاتا ہے وہ بھی کٹتے کٹتے آخر جہنم کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔

اصول یہ ہے کہ شیطان آہستہ آہستہ اور تدریجاً تدریجاً گمراہ کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں نے بندے کو کیسے پٹڑی سے اتارنا ہے؟ اگر آپ ہمیشہ صفِ اوّل میں نماز پڑھتے تھے تو وہ دل میں خیال دے گا کہ روز لڑائی ہوتی ہے، چلو دوسری صف میں کھڑے ہو جاؤ، اس طرح لڑائی سے بچ جاؤ گے۔ اس طرح اگلی صف چھوٹ گئی۔ پھر وہ آپ کو چوتھی اور پانچویں صف میں لے جائے گا۔ اس طرح کرتے کرتے گھر میں نماز شروع کرا دے گا۔ اس لیے علماء نے فرمایا: اگر کسی آدمی کی عادت ہے کہ وہ روزانہ دو نفل پڑھتا ہے۔ اب اگر اس نے کسی دن یہ سوچا کہ آج میں تھکا ہوا ہوں تو نفل کو چھوڑ دیتا ہوں، علماء نے لکھا ہے کہ جب آدمی نوافل چھوڑتا ہے تو سزا یہ ملتی ہے کہ وہ سنت سے محروم ہو جاتا ہے۔ جب سنتیں پڑھنا چھوڑتا ہے تو سزا یہ ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو فرضوں سے محروم کر دیتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نمازوں کی محافظت کرو پوری دیانت داری کے ساتھ۔ اور اپنے گھروں میں اور اپنے اہل و عیال میں نماز ان کے خون میں داخل کریں کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو نماز شروع اور دس سال کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھے تو اس کو مار بھی سکتے ہیں۔

حدیث: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا: ''أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟'' اعمال میں سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''اَلصَّلَاةُ فِي وَقْتِهَا'' کہ سب سے افضل عمل نماز کو اس کے اوقات میں ادا کرنا ہے۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ نے اوقات مقرر فرمائے ہیں ان کے اندر نماز کو پورے شروط اور پورے ارکان کے ساتھ ادا کرے۔ میں نے عرض کیا: اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اَلْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ'' یعنی اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا...... اس حدیث میں حضور پاک ﷺ نے نماز کو جہاد سے بھی مقدم فرما دیا؛ کیونکہ آدمی مسلمان ہو گا تو جہاد کرے گا اور اگر آدمی مسلمان نہ ہو تو

[1] مشکوۃ المصابیح: ۱/ ۳۸، رقم: ۱۷۳، حاکم: ۱/ ۱۶۰: ۱۶۲

وہ جہاد کیسے کرے گا؟...... پھر میں نے عرض کیا: اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ فرمایا: والدین کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ حدیث بیان فرمائی۔ اور آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں اور بھی سوال کرتا رہتا تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مجھے جواب عطا فرماتے رہتے۔ [صحیح البخاری: رقم: ۵۲۷، بَابُ: فَضْلِ الصَّلَاةِ لِوَقْتِهَا]

حضرت ام فروہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعمال کی فضیلت بیان فرما رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے محبوب عمل یہ ہے کہ نماز کو جلدی سے اوّل وقت میں ادا کرے۔

صلوٰۃِ وسطیٰ کا مصداق:

''الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى'' سے کون سی نماز مراد ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: اس سے صبح کی نماز ہے۔ اس قول کو امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی موطا میں ذکر کیا ہے اور اس کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف کی ہے۔ ابو ربیع عطاردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیچھے فجر کی نماز پڑھی تو آپ نے فجر کی نماز میں ہاتھ بھی اٹھائے، دعا بھی کی اور دعائے قنوت بھی پڑھی۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ یہی فجر کی نماز صلوٰۃِ وسطیٰ ہے۔ اسی میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ہم پورے خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوں۔

حضرت ربیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی تو میں نے ان سے پوچھا: صلوٰۃِ وسطیٰ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا: یہ فجر کی نماز ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد صلوٰۃِ فجر ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۝﴾ ''قٰنِتِيْنَ'' کے اندر حکم ہے کہ تم قنوت بھی پڑھا کرو اور قنوت صبح کی نماز کے اندر پڑھی جاتی ہے۔ آگے آرہا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور جمہور کی رائے یہ ہے کہ صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد عصر کی نماز ہے اور ''قٰنِتِيْنَ'' سے مراد قنوت پڑھنا نہیں، بلکہ مطلقاً خشوع وخضوع کا حکم ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل کہ صلوٰۃِ وسطیٰ سے فجر کی نماز مراد ہے، یہ ہے کہ ایک ایسی نماز ہے جس میں قصر نہیں، باقی نمازوں کی چار یا تین رکعات ہیں تو ان کی آدھی دو رکعت ہوئی، لہٰذا صلوٰۃِ وسطیٰ کا معنی درمیانی نماز ہوا اور وہ فجر کی نماز ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ فجر کی نماز دو نمازوں کے درمیان میں آگئی۔ ظہر عصر سرّی نمازیں ہیں، ان میں آدمی زور سے قرآن نہیں پڑھتا۔ مغرب وعشا جہری نمازیں ہیں، ان میں آدمی قرآن زور سے پڑھتا ہے، لہٰذا دو جہری نمازیں ہوگئیں، دو سرّی ہوگئیں اور درمیان میں صبح کی نماز آگئی۔

بعض حضرات فرماتے ہیں: صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد ظہر کی نماز ہے (لیکن یہ کمزور قول ہے)۔ ہم زید بن حارث کی خدمت میں بیٹھے تھے، انہوں نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آدمی بھیجا کہ صلوٰۃِ وسطیٰ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا: اس سے مراد ظہر کی نماز ہے۔ حضور اکرم ﷺ اس کو عین گرمی کے وقت میں پڑھتے تھے اور یہ نماز صحابہ پر بڑی مشقت والی ہوتی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾۔

قریش کی ایک جماعت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر گزری۔ اور وہ اس وقت اکٹھے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک غلام بھیجا کہ پوچھ کر آؤ صلوٰۃِ وسطیٰ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے پہلے تو فرمایا کہ صلوٰۃِ عصر مراد ہے۔ پھر دو آدمیوں نے سوال کیا تو آپ نے فرمایا: صلوٰۃِ ظہر مراد ہے؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ ظہر کی نماز بڑی سخت گرمی میں پڑھتے تھے، حتیٰ کہ لوگ آپ ﷺ کے پیچھے ایک صف یا دو صفیں ہوتی تھیں۔ اکثر لوگوں کے آرام کا وقت ہوتا تھا یا کاروبار میں مشغولیت کا وقت ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں اتاریں تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: خبردار! اگر لوگ نمازیں اور جماعت میں حاضر نہ ہوئے تو میں حکم دے کر ان کے گھروں کو جلا دوں گا۔ [مسند احمد: ۵/۲۰۶]

اس کو زبرقان نے روایت کی ہے۔ یہ ابن عمرو بن امیہ الضمری اس کا نام ہے۔ اس نے کسی صحابی کو نہیں دیکھا۔

اکثر علماء، اکثر تابعین اور جمہور کے نزدیک صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اور صحیح قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے صاحبین سے منقول ہے کہ اس سے عصر کی نماز مراد ہے۔ ابن حبیب مالکی رحمہ اللہ نے بھی اس قول کو اختیار کیا کہ صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد صلوٰۃِ عصر ہے۔

حدیث: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى صَلٰوةِ الْعَصْرِ مَلَأَ اللهُ قُلُوْبَهُمْ وَبُيُوْتَهُمْ نَارًا''[1] کہ حضور اکرم ﷺ نے خود تفسیر بیان فرمادی کہ صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد صلوٰۃِ عصر ہے کہ مکہ کے مشرکوں نے ہمیں خندق کھودنے میں اتنا الجھا دیا کہ ہماری نماز عصر بھی قضا ہوگئی، اللہ تعالیٰ مشرکوں

---

[1] [مسند احمد: ۱/۸۱]

کے دلوں اور گھروں کو آگ سے بھر دے، اللہ تعالیٰ ان پر عذاب کرے، ہم سے صلوۃ وسطیٰ قضا ہوگئی۔ تو حضور اکرم ﷺ نے مغرب کی نماز کے بعد اس نماز عصر کی قضا کی تھی۔

اور ایک قول یہ ہے کہ صلوۃِ وسطیٰ سے مراد مغرب کی نماز ہے؛ کیونکہ نمازیں یا تو چار رکعات والی ہیں یا دو رکعات والی ہیں تو ان کے درمیان جو تین رکعات والی نماز ہے وہ صرف مغرب ہے۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ صلوۃِ وسطیٰ سے مراد عشا کی نماز ہے۔ اور علی بن احمد الواحدی نے عشا کی نماز مراد لی ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں: صلوۃِ وسطیٰ مبہم ہے، ان پانچ میں کوئی ایک ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر کو چھپا دیا؛ کیونکہ جو بھی قیمتی چیزیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو چھپا دیا ہے، تاکہ بندہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ صلوۃِ وسطیٰ سے مراد پانچوں نمازیں ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: صلوۃِ وسطیٰ سے جماعت کی نماز ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد جمعہ کی نماز ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا: عید الفطر کی نماز مراد ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: عید الاضحیٰ کی نماز مراد ہے۔

مفسر فرماتے ہیں: بعض علماء نے چپ کر لی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ جب ہر نماز کے بارے میں اتنے دلائل ہیں تو انہوں نے کہا: ہم خاموش ہیں، جو بھی ہے بس ٹھیک ہے۔ مفسر فرماتے ہیں: کیونکہ صحابہ کے زمانے سے لے کر آج تک اختلاف چلا آ رہا ہے۔ اس لیے بس پابندی کریں، لیکن اکثر اقوال عصر کے بارے میں ہیں۔

نماز کسی حالت میں معاف نہیں:

نماز اتنی اہم عبادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم میدانِ جنگ میں بھی ہو اور تمہیں دشمن کا خوف بھی آجائے، تب بھی نماز معاف نہیں ہوتی۔ نماز بیماری میں معاف نہیں ہوتی، نماز سفر میں معاف نہیں ہوتی، حتیٰ کہ آدمی کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر پڑھے، بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکے تو لیٹ کر پڑھے، اگر وضو نہ کر سکے تو تیمم کر کے نماز پڑھے، اگر ہوائی جہاز میں ہے، ٹرین میں ہے، جس میں بھی ہے، اپنی نمازوں کے اوقات کا پورا پورا خیال رکھے اور نماز کو صحیح معنوں میں ادا کرنے کی کوشش کرے۔

قرآن پاک نے دوسرے مقامات پر صلوۃ الخوف کی پوری تفصیل بیان فرمائی ہے کہ اگر دشمنوں کے مقابلے پر ہے اور صفیں بن چکی ہیں، اس حالت میں بھی امام نماز پڑھائے گا۔ اگر اس کے پیچھے دس صفیں بن گئیں تو جب امام رکوع میں جائے گا تو اس کے ساتھ والی صف رکوع میں چلی جائے، باقی کھڑے رہیں، تا کہ دشمن حملہ نہ کر سکے۔ اور امام اور اس کے ساتھ والی صف دونوں سجدے کر لیں، امام کھڑا ہو جائے اور باقی صفیں رکوع و سجود پر کھڑی ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ نماز کسی حالت میں معاف نہیں ہے۔ اگر جنگ اتنی شدید ہوگئی ہے کہ سواری سے اترنے کا بھی موقع نہیں ملتا، تب بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ سواری پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لو۔ اگر ممکن ہو سکے تو قبلہ کی طرف رخ کرو، لیکن اگر جانور ہیں، دوڑ رہے ہیں، قبلہ کی طرف منہ نہیں رہا تو جتنا امکان ہو سکتا ہے قبلہ کی طرف رخ کریں۔ اگر رکوع و سجود ادا نہیں کر سکتے تب بھی حکم ہے کہ اشارے کے ساتھ نماز ادا کر لو، لیکن نماز ہر حالت میں ادا کی جائے گی؛ کیونکہ نماز نے بندے کو اپنے اللہ تعالیٰ سے جوڑا ہے۔ اور جب نماز قطع ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے تعلق قطع ہو جاتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اَلصَّلَاةُ عِمَادُ الدِّيْنِ'' نماز دین کا عمود ہے (جس نے نماز کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے نماز کو ختم کر دیا اس نے دین کو ختم کر دیا)۔ [شعب الایمان: ۳/ ۳۹، رقم: ۲۸۰۷]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے گورنروں کو خط لکھا کرتے تھے کہ جس آدمی کو نوکری یا عہدہ دو اس کی نماز کا خیال رکھو؛ کیونکہ جو نماز کی حفاظت کرے گا وہ بندوں کے حقوق کا بھی خیال کرے گا اور جو بندہ اللہ تعالیٰ کی نماز کا خیال نہیں کرتا ہے تو وہ بندوں کے حقوق کا کیا خیال کرے گا؟

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب دو لشکر آپس میں ٹکرا جائیں، جنگ کی حالت کے اندر، یعنی دونوں لڑائی کر رہے ہیں، اگر دو رکعات پڑھنے کا بھی موقع نہیں ہے تو ایک رکعت پڑھ لے، چاہے اشارے کے ساتھ ہی پڑھ لے، نماز ادا ہو جائے گی۔ انہوں نے ایک حدیث پاک سے استدلال فرمایا۔ حضور اکرم ﷺ سے فرمایا:

''فَرَضَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ الصَّلَاةَ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّكُمْ ﷺ فِي الْحَضَرِ أَرْبَعًا وَفِي السَّفَرِ رَكْعَتَيْنِ وَفِي الْخَوْفِ رَكْعَةً'' [مسلم: رقم: ۶۸۷، سنن ابی داؤد: ۱۲۴۷]

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں پر نماز فرض کی ہے۔ اگر وہ گھروں کے اندر ہیں تو چار رکعتیں پڑھیں، سفر کے اندر ہیں تو قصر کریں، دو رکعت پڑھیں اور حالتِ خوف کے اندر ہیں تو ایک رکعت بھی جائز ہے، لہٰذا ان کے نزدیک

اگر ایک رکعت بھی پڑھی جاسکے تو نماز ادا ہو جائے گی۔

امام بخاری ﷫ نے باقاعدہ باب لکھا ہے کہ اگر آدمی دشمن کے مقابلے پر ہے اور ان کے قلعے کے سامنے ہے اور دشمن اوپر سے تیر برسا رہا ہے اور یہ قلعہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہے تو یہ کیسے نماز ادا کرے؟

اسی طرح امام اوزاعی ﷫ نے فرمایا کہ اب لڑائی زور پر ہے اور فتح قریب آگئی ہے اور نماز نہیں پڑھ سکتے تو کیا کریں؟ فرمایا: ہر بندہ اشارے کے ساتھ اپنی نماز ادا کرلے۔

مفسر فرماتے ہیں: اگر ایسی حالت ہوگئی ہے کہ اشارہ بھی نہیں کر سکتے تو نماز کو مؤخر کر دے۔ جب وقت ملے تو آرام کے ساتھ نماز پڑھ لے۔

حضرت انس بن مالک ﷛ فرماتے ہیں: جب ہم تستر کا قلع فتح کر رہے تھے، صبح کا وقت تھا اور ہم قلعہ فتح کرنے کے قریب تھے۔ اب ہمیں وقت نہیں مل رہا تھا کہ نماز پڑھ لیں تو ہم نے نماز کو مؤخر کر دیا، حتیٰ کہ سورج نکل آیا۔ اس کے بعد ہم نے قضا نماز پڑھی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷛ بھی ہمارے ساتھ تھے، یعنی اگر یہ غلط بات ہوتی تو وہ خاموش نہ رہتے۔

ہوائی جہاز میں نماز کا حکم:

بعض علماء فرماتے ہیں: اگر کوئی آدمی ہوائی جہاز کے اندر ہے تو نماز قضا کرلے اور نیچے اترنے کے بعد نماز پڑھے۔ بعض محتاط علماء فرماتے ہیں کہ ہوائی جہاز میں بھی نماز پڑھ لے اور اترنے کے بعد احتیاطاً پھر بھی قضا کرلے۔ لیکن اب متاخرین علماء سب کا فتویٰ یہی ہے کہ ہوائی جہاز میں نماز جائز ہے، آدمی آرام کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے۔

ہم نے تو سفر میں یہ تجربہ کیا ہے کہ اگر آدمی کی نیت ٹھیک ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی نماز پڑھنا چاہے تو لوگ اس کی بڑی اعانت کرتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ اور جمہور علماء ﷭ فرماتے ہیں کہ اگر ایسی خوف کی حالت ہو تو نماز مؤخر نہ کریں، بلکہ خوف والی نماز ادا کریں۔ جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے کہ دو صفیں بنالیں: اگلی صف نماز پڑھے اور پیچھے والے کھڑے رہیں۔ یا اشارے کے ساتھ بھی نماز ادا کرلیں یا سواری پر بھی نماز ادا کرلیں۔ باقی رہا خندق کے موقع پر نماز کا قضا ہونا تو اس

کا جواب یہ ہے کہ اس موقع پر ابھی صلاۃِ خوف والی آیات نہیں اتری تھیں۔ جب وہ بعد میں اتری ہیں تو بعد میں عمل بھی کیا جائے گا۔

امام مکحول، امام اوزاعی اور امام بخاری ﷭ فرماتے ہیں: کوئی حرج نہیں، قضا کر سکتے ہیں۔ ایسے حالات کبھی کبھی پیش آتے ہیں۔ اور قرآن کے اندر جو ہے اس پر عمل کرنا بھی ٹھیک ہے۔ اس کی تفصیل آگے سورۃ النساء میں آرہی ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۚ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۴۰تا۲۴۲]

''اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، یہ اپنی بیویں کے لیے وصیت کر دیں ایک برس تک خرچ دینے کی گھر سے نکالے بغیر۔ ہاں اگر خود نکل جائیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں، جو کچھ وہ اپنے حق میں کریں بھلی بات۔ اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ اور طلاق یافتہ عورتوں کو خرچ دینا ہے، اپنے دستور کے مطابق (یہ) پرہیزگاروں پر لازم ہے۔ اللہ تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھ لو۔''

عورت کب؟ کہاں؟ اور کتنی عدت گزارے؟

اس میں دو قول ہیں: اکثر صحابہ ﷡، تابعین اور اکثر ائمہ ﷭ فرماتے ہیں کہ پہلے عورت کی میراث بھی مقرر نہیں تھی، اس کے لیے عدت ایک سال کے لیے تھی اور خاوند کے ذمے وصیت لازمی تھی کہ جب وہ موت کے قریب آتا یا اس سے پہلے وصیت کر دیتا کہ اگر میں مر جاؤں تو میری بیوی ایک سال تک میرے گھر میں رہے گی۔ اس کا خرچہ اور رہائش سب میری میراث سے ادا کیا جائے گا۔ اور جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ﴾ [البقرۃ: ۲۳۴] تو وہ آیت اس حکم کے لیے ناسخ ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے چار مہینے اور دس دن عدت معین فرما دی۔ اور اگر حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہوگئی، چاہے وضع حمل جلدی ہو جائے یا دیر سے ہو۔ اور خرچہ

میراث سے دیا جائے گا۔

اسی طرح دوسرے رشتہ داروں کے لیے بھی وصیت کا حکم تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے میراث کو مقرر کر دیا کہ لڑکی کا ایک حصہ اور لڑکے کے دو حصے ہوں گے، بیوی کو چوتھایا آٹھواں حصہ ملے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بیوی کا حصہ بھی مقرر کر دیا تو اب وصیت کا حکم بھی ختم ہو گیا۔ اور ﴿يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا﴾ سے سال والا حکم بھی ختم ہو گیا۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ قرآن میں اتنا ہے کہ عدت تو چار مہینے دس دن رہے گی، لیکن استحبابی طور پر یہ ہے کہ اگر خاوند چاہے تو ایک سال تک کے لیے وصیت بھی کر دے کہ ایک سال تک میری بیوی کو خرچہ میری میراث میں سے دیا جائے۔ اب عورت کی مرضی ہے کہ چار مہینے دس دن گزرنے کے بعد پورے سال تک فائدہ اٹھالے اور اگر وہ چاہے تو فائدہ نہ اٹھائے۔ اس کی طرف حضرت مجاہد اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ گئے ہیں۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الفاظِ قرآن بھی ان کے مصاحب ہیں۔

عورت عدت اپنے خاوند کے گھر میں گزارے۔ ہاں اگر ایسے حالات ہو جائیں کہ خاوند مر گیا اور اس کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی، عورت بیوہ ہو گئی۔ اب اس کے رشتہ دار اس کو نہیں رہنے دیتے تو عورت مجبور ہے، وہ اپنے والدین کے گھر میں آجائے یا جہاں اس کو اعتماد کی جگہ ملے وہاں عدت گزارے؛ کیونکہ اس کے پاس اس کے سوا کوئی حل نہیں ہے۔ عورت اگر عدت کے اندر باہر نکلنا چاہے تو اس کو اجازت نہیں دی جائے گی۔

شریعت کے مسائل کی پابندی:

﴿فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ اس سے اسلام نے ہمیں ایک مسئلہ سکھا دیا کہ تمہیں روکنے کا حق تب ہے جب شرعاً بھی حق ہو اور اگر شرعاً حق نہ ہو تو تمہیں روکنے کا حق نہیں بنتا۔

مثلاً: اسلام نے حکم دیا ہے کہ جب لڑکا دس سال کا ہو جائے اس کا بستر علیحدہ کر دو۔ اسی طرح بچہ دس سال کا ہو جائے اور خاص اوقات میں دوپہر کا وقت ہے، میاں بیوی لیٹے ہوئے ہیں، چاہے بیٹا ہو اس کو بغیر اجازت کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسلام نے جہاں جہاں پابندی لگائی ہے ان احکام کو پورا کرنا ہو گا۔ اگر کوئی ان کو توڑے گا تو ہمیں اس کو روکنا ہو گا۔ یہی بنیادی وجہ ہے، جس کی وجہ سے آج کل ہمارے حالات خراب ہو گئے ہیں۔

مثلاً: ایک فلیٹ میں رہتے ہیں، دو کمرے والے فلم دیکھ رہے ہیں یا کوئی برائی کر رہے ہیں اور ایک کمرے میں جو آدمی رہتا ہے وہ نمازی اور صالح ہے، کوئی برائی نہیں کرتا، وہ کہتا ہے کہ میں ان کو منع کروں، یہ جانیں اور ان کا کام جانے، میں کیا کروں؟ بلکہ وہاں ہماری ذمہ داری ہے کہ برائی سے منع کریں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں طاقت دی ہے تو طاقت سے روکیں، اگر اتنی طاقت نہیں دی تو زبان سے روکیں اور اگر زبان سے بھی روکنے کی طاقت نہیں ہے تو کم از کم دل میں برا سمجھو۔ اگر تم اکٹھے رہ رہے ہو تو یہ برا سمجھنا نہیں ہے، بلکہ برا سمجھنا یہ ہے کہ ان سے علیحدہ ہو جاؤ؛ کیونکہ آدمی جس کو برا سمجھتا ہے اس کو سلام بھی نہیں کرتا۔

یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ نے جو حدود مقرر فرمائی ہیں ان کے اندر رہنا ضروری ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پوری امتِ مصطفیٰ ﷺ کے ذمہ ہے۔ صرف کسی مولوی کا، کسی پیر کا اور کسی بزرگ کا اس پر ٹھیکہ نہیں ہے، بلکہ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [آل عمران: ۱۱۰]۔ اور اللہ کے نبی نے فرمایا: "بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً" اگر تمہیں قرآن کی ایک آیت بھی آتی ہے، ایک حدیث بھی آتی ہے، ایک نماز کا مسئلہ بھی آتا ہے، ایک وضو کا مسئلہ بھی آتا ہے اور ایک طواف کا مسئلہ بھی آتا ہے تو وہ بات اپنے دوسرے بھائی کو پہنچاؤ۔ اسی طرح اللہ کے نبی نے حکم دیا ہے کہ اگر تم نے کوئی منکر (گناہ کا کام) دیکھا ہے "مَنْ رَأَى مِنْكُمْ فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ" تو اس کو روکنا چاہیے۔ [صحیح مسلم: رقم: ۴۹، جامع الترمذی: رقم: ۲۱۷۲]

عدت لازم کیوں؟

عورت پر عدت گزارنے کی پابندی اس لیے لگائی گئی کہ شاید عورت کے پیٹ میں بچہ ہو۔ چار مہینے دس دن میں بات واضح ہو جائے گی۔ اگر بچہ ہوگا تو لازمی بات ہے کہ وہ نفخِ روح کے بعد حرکت کرے گا، حیض بند ہو جائے گا، پیٹ بڑھنا شروع ہو جائے گا اور جب بات ثابت ہو جائے کہ بچہ ہے تو عدت وضعِ حمل ہوگی۔ عدت گزارنے کے بعد وہ عورت اگر دوسری جگہ شادی کرنا چاہے تو شادی کر سکتی ہے۔

عدت پر اعتراض اور اس کا جواب:

آج دشمنِ اسلام اعتراض کرتا ہے کہ عدت کا مقصد استبراءِ رحم ہوتا ہے کہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس کا رحم خالی ہے یا

[1] [صحیح البخاری، رقم: ۳۴۶۱، باب: ما ذکر عن بني إسرائيل]

بچہ ہے؟ اب ہمارے پاس آلات موجود ہیں کہ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ حمل ہے یا نہیں، بلکہ پیشاب کا قطرہ ڈالنے سے بھی پتہ چل جاتا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں ہے، تو پھر چار مہینے اور دس دن قید لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ سمجھیں! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے فرمایا ہے: مشین سے حمل کا تو پتہ لگ جائے گا، لیکن کتنی بڑی بدخلقی ہوگی کہ خاوند کی قبر ابھی خشک نہیں ہوئی اور عورت دوسرے شوہر کے لیے تیار ہوگئی۔ یاد رکھیں! ایسی عورت تیرا گھر بھی آباد نہیں ہونے دے گی۔ اس مرنے والے شوہر کا خاندان اور رشتہ دار ہیں، ان کے طعنوں سے بچ جائے گی اگر عدت گزارے گی، ورنہ وہ طعنہ دیں گے کہ یہ تو ہمارے بھائی اور ہمارے بیٹے کے مرنے کے انتظار میں تھی۔ لیکن جب عدت گزر جائے گی، اتنی مدت میں زخم بھر جائیں گے اور ماں باپ بھی تسلی کر لیں گے تو ماں باپ خود کہیں گے کہ بیٹا! تم جوان عورت ہو، تم دوسری جگہ شادی کر لو۔ ہمارے مقدر سے پہلا خاوند تو چلا گیا۔ اگر دوسری جگہ شادی کرنا چاہتی ہو تو کر لو؛ کیونکہ تمہاری اتنی جوانی پڑی ہے، اس کو کیسے گزارو گی؟ اس طرح وہ خود مشورہ دینے والے بن جاتے ہیں اور معاشرے کے اندر خیر رہتی ہے۔ اسلام نے جامع و مانع اور کامل و مکمل اصول مرتب فرما دیئے ہیں کہ قیامت تک نہ ان کے اندر کوئی تغیر و تبدل ہے اور نہ کوئی کمی ہے۔

خاوند کے گھر میں عدت گزارنا لازمی ہے:

حدیث: سعد بن اسحاق بن کعب رحمہ اللہ نے اپنی چچی سے روایت کی ہے کہ فریعہ جو مالک بن سنان رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر پوچھا: یا رسول اللہ! اگر مجھے شریعت اجازت دے تو میں بنو خدرہ قبیلے سے تعلق رکھتی ہوں، مجھے اجازت ہو تو میں ماں باپ کے گھر واپس چلی جاؤں؟ کیونکہ میرا خاوند فوت ہو گیا ہے، اس نے کوئی مسکن بھی نہیں چھوڑا ہے، کوئی خرچہ بھی نہیں چھوڑا ہے تو اب میں واپس ماں باپ کے گھر چلی جاؤں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سنی اور فرمایا: ٹھیک ہے۔ بی بی کہتی ہیں: میں وہاں سے پھری اور ابھی میں اسی حجرے کے اندر ہی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بلایا، کسی کو حکم دیا کہ مجھے آواز دی جائے۔ میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے کیا کہا تھا؟ میں نے دوبارہ بیان کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی گھر میں بیٹھی رہو، جب تک تمہاری عدت چار مہینے دس دن پوری نہ ہو جائے۔ بی بی فرماتی ہیں: میں نے چار مہینے دس دن وہیں عدت گزاری۔

جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت آیا تو انہوں نے میرے پاس باقاعدہ آدمی بھیج کر مسئلہ پوچھا کہ تمہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حکم دیا تھا؟ تو میں نے یہ واقعہ ذکر کیا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا کہ خاوند غریب ہے، جیسا ہے، خاوند کے مرنے کے بعد عورت اپنی عدت خاوند کے گھر کے اندر گزارے گی، اس عدت کے اندر اس کو خاوند کے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے میری یہ بات سننے کے بعد اسی فیصلے کو قائم رکھا اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔

یاد رکھیں! اگر خاوند مر گیا، اس نے جائیداد چھوڑی، مکان بھی چھوڑا۔ عورت کو آٹھواں حصہ بھی ملنا ہے، اولاد بھی موجود ہے، اولاد اپنی ماں کو رکھنا چاہتی ہے اور ماں بھی اپنی اولاد کے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو شریعت یہ نہیں کہتی کہ اس کو ضرور نکال دو، چاہے وہ ساری زندگی بیٹھی رہی، اس کی مرضی ہے۔ ہاں اگر عورت خاوند کے مرنے کے بعد اس گھر میں عدت گزارنے کے بعد نہیں رہنا چاہتی، وہ چاہتی ہے کہ میں اپنے ماں باپ کے گھر جاؤں تو وہ عدت گزار کر جا سکتی ہے۔ اسی طرح شریعت کا حکم ہے کہ اگر عورت جوان ہے، نکاح کے قابل ہے اور وہ بیوہ ہو گئی ہے تو اس کی شادی کر دینی چاہیے، لیکن اگر اس کے بچے ہیں، وہ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی اور اپنے دامن کو حیا اور شرافت کے ساتھ محفوظ رکھتی ہے تو کوئی گناہ نہیں، اس کو اجر ملے گا۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے شادی کی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہیں دی۔ ایک دن جب وہ آئے تو ان کے کپڑے پر کچھ اثر تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ کیا داغ ہیں؟ اس صحابی نے عرض کیا: یہ میں نے رنگ نہیں ڈالا، میں نے شادی کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے بتایا بھی نہیں اور شادی بھی کر لی۔ اچھا! تم نے بیوہ عورت سے شادی کی ہے یا کنواری عورت سے شادی کی ہے؟ اس نے عرض کیا: میں نے بیوہ عورت سے شادی کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے کنواری عورت سے شادی کیوں نہیں کی؟ اس نے کہا: حضور! میرے اپنے گھر میں چھ بہنیں ہیں۔ اگر میں کنواری عورت شادی کر کے لے آتا تو وہ بھی میری بہنوں کی عمر کی ہوتی، اس لیے میں نے بڑی عمر کی عورت سے شادی کی ہے، تاکہ وہ میری بہنوں کی ماں بن کر ان کی نگرانی کر سکے، ان کو سنبھال سکے اور حفاظت کر سکے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے خوش ہوئے اور فرمایا: تم نے بہت اچھا کیا کہ تم نے اپنی بہنوں کا خیال کیا۔ [صحیح البخاری: رقم: ۲۳۰۵، صحیح مسلم: رقم: ۵۱۰۵]

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۴۳ تا ۲۴۵]

"اسی طرح آپ (ﷺ) نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے تھے اور وہ ہزاروں تھے۔ پھر اللہ نے ان کے لیے فرمایا: مرجاؤ۔ پھر ان کو زندہ کیا۔ بے شک اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ اور جان لو کہ اللہ خوب سنتا، خوب جانتا ہے۔ ایسا کون شخص ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے کہ (اللہ) اس کے لیے اس کو کئی حصے دگنا کردے۔ اور اللہ تنگی کرتا ہے اور فراخی بھی۔ اور تم اسی کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔"

فی زمانہ جہاد سے ڈرنے اور جہاد نہ کرنے کی وجہ:

ان آیات میں ایک تو انفاق فی سبیل اللہ کا ارشاد ہے اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ کا مسئلہ ہے اور اسی ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ بعض لوگ موت سے بھاگے تو ان کا کیا انجام ہوا؟

تو اس مسئلے کو آپ ذہن میں رکھیں کہ آج جو مسلمانوں نے جہاد چھوڑ دیا ہے، انفاق فی سبیل اللہ کو چھوڑ دیا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ حب الدنیا وکراہیۃ الموت ہے۔ دنیا کی محبت ہمارے دلوں میں گھر کر گئی اور موت کو ہم ایک بلا سمجھنے لگ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ان دونوں چیزوں سے محروم ہو گئے۔

آج پوری دنیا میں مسلمان ذلت میں پڑا ہوا ہے، اس کی وجہ ہمارے گناہ ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے ہمیں باخبر کیا کہ جس معاشرے میں زنا بڑھ جائے گا، جس معاشرے میں ظلم بڑھ جائے گا اور فحاشی وعریانی پھیل جائے گی اللہ تعالیٰ ایسا عذاب مسلط کر دیتے ہیں کہ انسان ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ سب سے بڑی برائی کفر ہے اور سب سے بڑی نیکی ایمان ہے۔ مسلمان چاہے خدانخواستہ کتنا ہی معاصی میں مبتلا ہو جائے، لیکن مسلمان تو ہے۔ کافر کتنے اچھے کام کیوں نہ کرلے، غریبوں مظلوموں کی مدد کرے، بیواؤں یتیموں کی

مدد کرے، لیکن اصل برائی کفر اس میں موجود ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ایک وقت میری امت پر ایسا آئے گا کہ میری امت عذابوں میں مبتلا ہوگی۔ اور ان پر دشمن ایسے چڑھ دوڑیں گے جیسے بھوکا کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہوگی؟ کیا اس وقت مسلمان تھوڑے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمان تو بہت زیادہ ہوں گے، لیکن سیلاب آتا ہے اور اس کے اوپر جھاگ ہوتی ہے، اسی طرح مسلمان کمزور ہوں گے۔ اور یہ قاعدہ ہے: "لَنْ يَصْلَحَ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ كَمَا صَلَحَ بِهِ الْأَوَّلُ" [اضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن: ۸/۱۵۵] کہ اس امت کا آخر صلاح نہیں پا سکتا، مگر اس طریقے سے جس پر ہمارے سلف نے صلاح حاصل کی تھی۔ اور وہ یہ تھا کہ ان کے اندر حب دنیا نہیں تھی اور کراہیت الموت نہیں تھی۔

صدقہ وخیرات کے کچھ واقعات:

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اس دور میں تیس ہزار درہم کا عطیہ آیا۔ بی بی صاحبہ نے جونہی صدقہ خیرات شروع کی وہ سارے درہم چلا دیئے۔ اور اس دن بی بی صاحبہ کا نفلی روزہ تھا، شام کو جب افطار پر بیٹھیں تو سوکھے روٹی کے ٹکڑے کھجور کے چند دانے تھے۔ آپ کی کنیز نے عرض کیا: اگر دو درہم ہمیں دے دیتیں تو آج ہم کچھ پکا لیتیں۔ سیدہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم یاد دلا دیتی تو میں دے دیتی۔ اندازہ فرمائیں کہ تیس ہزار درہم (چاندی کے سکے) صدقہ خیرات ہو رہا ہے، اپنے گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں اور اس کی یاد بھی نہیں آئی کہ میرے اپنے گھر میں بھی کھانا ہے یا نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے راستے میں سب کچھ دے دیا۔

حضور اکرم ﷺ ایک نماز کے لیے تشریف لے آئے، تکبیر ہوگئی، لیکن آپ ﷺ دوبارہ تشریف لے گئے، واپس آکر نماز پڑھائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو صحابہ نے عرض کیا: آپ نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا کہ تکبیر ہونے کے بعد گھر چلے جائیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اصل بات یہ ہے کہ جب میں مصلے پر آگیا تو مجھے یاد آگیا کہ میرے گھر میں سونے کا ٹکڑا پڑا ہوا ہے تو میں نے کہا نبی کی شان نہیں ہے کہ وہ نماز پڑھائے اور گھر میں سونا رکھا ہو۔ تو میں جا کر اس کو خیرات کرنے کا حکم دے کر آیا۔ حضور اکرم ﷺ نے سلام پھیرا اور جبرئیل علیہ السلام نے آکر عرض کیا: آپ کے رب نے سلام بھیجا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر چاہو تو پہاڑ سونے کے بنا کر آپ کے ساتھ بھیج دیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں اپنے اللہ سے اتنا چاہتا ہوں کہ ایک وقت کا کھانا مل جائے، شکر کر

لوں اور ایک وقت نہ ملے تو صبر کر کے مانگ لوں۔ بس اتنا چاہیے اور کچھ نہیں چاہیے۔

اور جس دن تک حضور اکرم ﷺ کی اس سنت پر طرز عمل جاری رہا مسلمان کامیاب رہے۔

بزرگوں نے دنیا کی مثال سمجھائی ہے، جیسے کشتی کے لیے پانی ہوتا ہے۔ اگر پانی کشتی کے نیچے ہوتا ہے تو کشتی کو چلانے کا باعث بنتا ہے۔ اگر وہی پانی کشتی کے اندر داخل کر دو تو کشتی کو غرق کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح اس دنیا کی مثال ہے۔ اگر یہ دولت دین کے تابع ہو جائے تو کامیابی ہے، لیکن جب دولت دل میں داخل ہو کر حب دنیا بن گئی اور موت کی کراہیت کا سبب بن گئی تو ہلاکت کا دور آ گیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی۔ اس زمانہ میں ان کو اتنا مال ملا جس کا ہم تصور نہیں کر سکتے، لیکن ان کے دل میں حب دنیا نہیں تھی، ان کو اللہ اور اللہ کے احکام سے محبت تھی اور موت سے کراہیت نہیں تھی، ان کو یقین تھا کہ موت کا وقت معین ہے، نہ آگے ہو سکتی ہے اور نہ پیچھے ہو سکتی ہے۔ اور موت سے ڈر نہیں لگتا تھا۔

(واقعہ) ابو جعفر المنصور بادشاہ تھا۔ اس کی خدمت میں ایک اللہ کے بزرگ آئے تو بادشاہ نے ان سے کہا: مجھے ایک بات سمجھائیں کہ مجھے موت سے بڑا ڈر لگتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ جب میں کسی کا جنازہ دیکھتا ہوں اور قبر کو دیکھتا ہوں تو میں کانپ جاتا ہوں اور میری نیندیں اڑ جاتی ہیں، حالانکہ موت تو ضرور آنی ہے، پھر مجھے اتنا ڈر کیوں لگتا ہے؟ ان بزرگوں نے فرمایا: بڑی سیدھی سی بات ہے۔ آپ مجھے بتائیں کہ آدمی گھر کو چھوڑ کر ویران گھر میں جائے گا تو اس کو ڈر لگے گا یا ڈر نہیں لگے گا؟ اسی طرح ایک آدمی ویرانے کو چھوڑ کر آباد گھر میں جائے تو اس کو راحت وخوشی ہوگی کہ میں جنگل سے شہر میں آ گیا، لیکن اگر اس کو شہر سے جنگل میں ڈال دو تو صاف ظاہر ہے ڈرے گا۔ آپ کو بھی اس لیے ڈر لگتا ہے کہ آپ نے اس دنیا کے گھر کو آباد کر لیا اور آخرت والے گھر کو برباد کر دیا ہے۔ جب وہ اگلا گھر برباد لگتا ہے تو آپ کو ڈر لگتا ہے۔ مومن کو آخرت والے گھر سے ڈر اس لیے نہیں لگتا؛ کیونکہ اس کے لیے یہ دنیا ویرانہ ہے اور آخرت راحت ونعمت ہے۔

دنیا اور کراہیت الموت کو جب تک آپ ختم نہیں کریں گے اس وقت تک آپ ترقی نہیں کر سکتے۔ جب دنیا سے محبت ہوگی تو گھر سے باہر (جہاد کے لیے) نہیں نکلو گے۔ اگر دوسرا بھی کوئی دین کے لیے نکلتا ہے تو اس پر بھی مذاق اڑاؤ گے کہ دیکھو! یہ بستر بند آئے پھرتے ہیں۔ اور گھر کے اندر بیٹھ کر ان پر باتیں بناتے ہیں۔ اللہ کے بندے! اگر کوئی بندہ اپنا گھر وطن چھوڑ کر سنت انبیاء کے طریقے کو قائم رکھ کر تبلیغ کے لیے نکلا ہے، اس کو اچھا نہیں سمجھتے ہو تو نہ

سمجھو، لیکن ان کی برائی تو نہ کرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک دن ان کے ساتھیوں نے عرض کیا کہ کبھی کبھی جنگ میں آپ ایسا اقدام فرماتے ہیں جو عقل کے خلاف ہوتا ہے کہ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے اندر گھس جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: جس سے موت ڈرتی ہو اس کو کیا پریشانی ہے؟ ساتھیوں نے پوچھا: وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: کیا موت وقت سے پہلے آسکتی ہے؟ ساتھیوں نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: جب وہ مجھ سے ڈر رہی ہے تو مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ﴾ [البقرة: ۲۴۳] یہاں رؤیت سے بصری رؤیت مراد نہیں ہے؛ کیونکہ یہ واقعہ حضور اکرم ﷺ کی پیدائش سے ہزاروں سال پہلے کا ہے۔ رؤیت دو قسم کی ہوتی ہے: ایک آنکھوں سے دیکھنا اور دوسری رؤیت قلبیہ بمعنی علم ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ①﴾ [الفیل: ۱] کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ہاتھیوں والے بادشاہ کا کیا انجام کیا؟ حالانکہ حضور اکرم ﷺ اسی سال پیدا ہوئے تھے جس سال ہاتھیوں والا بادشاہ آیا۔ آپ ﷺ نے وہ واقعہ نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے معنی یہ ہے کہ اے میرے مدنی! کیا آپ نہیں جانتے ہاتھیوں والے بادشاہ کے ساتھ کیا واقعہ گزرا؟ جو قصہ زیادہ مشہور ہو جائے تو وہ ایسے ہے گویا ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ بہر حال یہاں اس آیت کے اندر رؤیت علمیہ مراد ہے۔ اور یہ بھی قاعدہ ہے کہ جس واقعہ کی خبر دینے والے رب العالمین ہوں اس کی حقانیت میں یہاں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

"أُلُوف" جمع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ جمع کثرت ہے اور یہ دلالت کرتی ہے کہ دس سے زیادہ ہوں، یعنی وہ دس ہزار سے بھی زیادہ تھے۔

دس ہزار کا لشکر موت سے ڈر کر بھاگا، سب مر گئے:

ایک بستی کے اندر ایک وبا آگئی۔ جس سے آدمی مرنے لگ گئے تو ان ہزاروں آدمیوں نے سوچا کہ ہم یہاں سے نکل جائیں، نہیں تو سارے مر جائیں گے۔ فلاں پہاڑ کے درمیان خوبصورت وادی ہے، وہاں چشمے ہیں، ہم سب لوگ وہیں چلے جاتے ہیں، وہاں چشمے کے صاف پانی ہوں گے اور یہ بیماری تو اس بستی میں آئی ہے، وہاں نہیں آئی، اس لیے ہم وہاں جائیں گے، اگر یہاں رہ گئے تو مر جائیں گے۔ تو موت کی ڈر کی وجہ سے ہزاروں اس بستی کو

چھوڑ کر نکل پڑے۔ جب وہ اس وادی میں جا کر جمع ہو گئے تو مطمئن ہو گئے اور کہنے لگے: ہم نے بڑا اچھا کیا! اگر ہم بستی میں ہوتے تو مر جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مر جاؤ۔ مفسرین کے اس میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود حکم دے دیا کہ مر جاؤ۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو حکم دیا کہ ایک وادی کے ایک سرے پر کھڑے ہو جاؤ اور دوسرا دوسرے پر کھڑا ہو جائے اور ایک ایسی آواز لگاؤ کہ ان کے دل پھٹ جائیں۔ ان فرشتوں نے آواز لگائی تو یہ سارے لوگ دہشت سے مر گئے، لیکن فرشتے بھی تو اللہ تعالیٰ کے حکم تابع ہیں، اس لیے فرمایا: ''مُوْتُوْا''

اب دس ہزار آدمی کہاں دفن کریں؟ جو لوگ باہر والے باقی بچے تھے، انہیں پتہ لگا کہ جو بھاگ کر گئے تھے وہ مر گئے۔ انہوں نے جب وہاں جا کر دیکھا کہ ساری لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ ان کے دفن کا انتظام کریں، اس طرح کرو کہ جہاں پڑے ہیں پڑے رہیں، ان کے باہر دیوار دے کر ہمیں ان کو بند کر دو۔ کون دس ہزر قبریں کھودے؟ تو انہوں نے باہر دیوار دے کر بند کر دیا اور وہی جگہ ان کی قبر بن گئی۔

حضرت حزقیل علیہ السلام اللہ کے ایک نبی تھے، وہ اتفاق سے وہاں سے گزرے تو حیران ہو گئے کہ اتنی بڑی قبر ہے۔ انہوں نے جب معلومات فرمائی تو ان کو پتہ چلا کہ یہ فلاں بستی کے لوگ تھے۔ یہ موت کے ڈر سے بھاگے تھے۔ جب یہاں آئے تو موت آ گئی۔

اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ دنیا میں اللہ کے منکر، انبیاء کے منکر پیدا ہوئے، صحابہ کرام کے منکر پیدا ہوئے، اہل بیت کے منکر پیدا ہوئے، اولیاء کے منکر پیدا ہوئے اور قرآن وحدیث کے منکر پیدا ہوئے، لیکن موت کا کوئی منکر پیدا نہیں ہوا؛ کیونکہ ڈنڈے کا انکار کون کرے؟ فرق اتنا ہے کہ کافر کہتا ہے کہ ہارٹ فیل ہو گیا۔ اگر وقت پر ہسپتال لے آتا تو شاید بچ جاتا۔ جبکہ مسلمان کہتا ہے: وقت مقرر ہے، چاہے لے آتے یا نہ لے آتے، مرنا تو تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ﴾ [النساء: ۷۸] تم بڑے اونچے اونچے مضبوط مکان بنا کر اندر بیٹھ جاؤ، لیکن موت کے وقت میرے فرشتے کو نہیں روک سکتے۔

طاعون زدہ بستی میں جانے کا حکم:

اگر کسی بستی میں طاعون (وبا) پھیل جائے تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تم بستی میں ہو تو باہر نہ نکلو اور اگر باہر ہو تو اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اسی کے اندر حکمتیں ہیں؛ کیونکہ اگر بستی سے باہر جاؤ گے تو لوگوں کے لیے

عذاب کا باعث بنو گے اور اگر سب نکل جاؤ گے تو غریبوں کے کفن دفن کا انتظام کون کرے گا؟ اور اگر اس نیت سے نکلو گے کہ اگر میں بستی میں رہوں گا تو مر جاؤں گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری مرضی ہو تو طاعون کی وبا میں رہو اور موت نہ آئے۔ کتنے لوگ ہیں جو جنگوں کے اندر ٹینکوں کے نیچے سو گئے، لیکن نہیں مرے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو گھر میں کرسی پر اچھے خاصے بیٹھے ہوئے ہیں وہیں ختم ہو گئے۔ اس لیے فرمایا: تم موت سے نہیں بھاگ سکتے۔ تم میرا شکر کرو، یعنی میرے احکام کی پابندی کرو۔

کیا تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے سے اس لیے ڈر رہے ہو کہ موت آ جائے گی؟ فرمایا: ﴿وَاعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ: ۲۴۴] جان لو کہ اللہ تعالیٰ سننے والے بھی ہیں اور جاننے والے بھی ہیں۔ ان کو پتہ ہے کہ تمہارے اندر کتنا اخلاص ہے؟ آگے فرمایا: تم جہاد سے اس لیے بھاگتے ہو کہ تمہیں دولت سے محبت ہو گئی۔ فرمایا: آؤ! میں تمہیں راستہ بتاؤں: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے جس کا مال بھی ختم نہ ہو اور وہ کبھی روکیں بھی نہیں۔ تم تو بینکوں کے اندر دیتے ہو، کہیں پانچ فیصد اور کہیں سات فیصد پر دیتے ہو اور کبھی وہ بینک دیوالیہ ہو کر تیرا اصل بھی برباد کر دیتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تو وہ ربّ کریم ہوں جو ایک کا دس گنا دے دوں، سات سو گنا دے دوں، لاکھ گنا دے دوں یا اس سے بھی بڑھا دوں، میری مرضی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ﴾ میں چاہوں تو رزق تنگ کر دوں اور میں چاہوں تو تیرا رزق کھول دوں۔ تم سب نے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اس لیے تم میرے احکام کی پابندی کرو۔

وبا اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: طاعون یا جو وبائیں ہیں یہ ایسی بیماریاں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی قوموں کو عذاب دیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو عذاب دینا چاہتے ہیں تو اس قوم پر بیماریاں مسلط کر دیتے ہیں۔ وبا کی بیماری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو سارے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ جیسا کہ طاعون یہ ایسی بیماری ہے جس سے ایک گلٹی پیدا ہوتی ہے، جس کے فوراً بعد بندے مر جاتے ہیں اور اس پر کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا۔

وبا والی بستی میں داخل ہونے کا حکم:

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب شام کی طرف جانے لگے تو وہاں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ ہزاروں آدمی ایک دن میں مر

جاتے تھے۔ راستے میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو آپ نے مجلس مشاورت طلب کی کہ کیا مشورہ ہے؟ ہم وہاں داخل ہوں یا نہ داخل ہوں؟ ساتھیوں نے کہا: ہمیں جانا چاہیے۔ جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہے وہی ہوگا۔ اور کچھ صحابہ نے مشورہ دیا کہ نہیں جانا چاہیے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سب کی رائے سننے کے بعد بڑے غور وفکر کے بعد فیصلہ فرمایا۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ ہم اس بستی میں داخل نہ ہوں۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کاش! یہ بات کوئی دوسرا کہتا اور تم یہ بات نہ کہتے۔ اتنے علم والے ہوکر یہ بات کہہ رہے ہو!؟ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگ کر اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف ہی جا رہے ہیں۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے حضور پاک ﷺ سے حدیث سنی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر کسی علاقے میں وبا ہے، تم باہر ہو تو وہاں داخل نہ ہو اور اگر تم اس بستی کے اندر ہو تو باہر نہ نکلو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بڑے خوش ہوئے اور فرمانے لگے:...... الحمدللہ!...... اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے اسی فیصلے کی توفیق دی جو حضرت محمد ﷺ کا فیصلہ ہے۔ [صحیح البخاری: رقم: ۵۷۲۹، صحیح مسلم: ۲۲۱۹]

حدیث:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر کسی آدمی کو کوڑھ کی بیماری لگی ہوئی ہے، اس سے تم ایسے بھاگو جیسے انسان شیر سے بھاگتا ہے۔ اور دوسری جگہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کوئی چیز تجاوز نہیں کر سکتی جب تک کہ میرا اللہ فیصلہ نہ فرمائے۔ ایک اعرابی نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ بعض بیماریاں تو ایسی ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کو لگ جاتی ہیں، جیسے ہمارے اونٹوں کے اندر خارش کی بیماری ہوتی ہے۔ اگر ایک اونٹ کو یہ بیماری لگ جائے تو اس طرح سارے اونٹوں کو لگ جاتی ہے۔ تو یہ بیماری تو ایک دوسرے سے لگ رہی ہے؟ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "مَنْ أَجْرَبَ الْأَوَّلَ؟" مجھے یہ بتاؤ کہ جس پہلے اونٹ کو بیماری لگی اس کو کس نے بیمار کیا؟ اس نے کہا: اس کو تو اللہ تعالیٰ نے بیمار کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بندے کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ بیماری اور شفا میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔[1]

ایک اسباب ہیں جیسے ٹی بی کی بیماری ہے یا جذام کی بیماری ہے یا...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... ایڈز ہے جو انسانوں کے غلط جنسی ملاپ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اور یہ ایسی بلا ہے جس کا آج تک علاج نہیں ہوسکا اور ایسی

[1] [ابن ماجہ: رقم: ۳۵۳۹، کنزالعمال: رقم: ۲۸۶۳۹]

بیماری ہے جو دوسرے کے کپڑے پہننے سے بھی لگ سکتی ہے اور زیادہ تر خون کے انتقال سے لگتی ہے۔ خدا کی شان یہ ہے کہ پہلے دور میں ان باتوں کا خیال بھی نہیں کیا جاتا تھا، یعنی اگر کسی آدمی کو خون دینے کی ضرورت ہوتی تو صرف یہ تحقیق کی جاتی تھی کہ ان کا آپس میں گروپ ملتا ہے یا گروپ نہیں ملتا؟ یہ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ اس خون میں کیا کیا بلائیں آرہی ہیں؟ یاد رکھیں! شریعت کا حکم یہ ہے کہ جتنی بیماریاں متعدی ہیں ان سے بچنے کی کوشش کرو اور یہ عقیدہ رکھو کہ اگر اللہ تعالیٰ نہ بچائے تو میں بچ نہیں سکتا، لیکن مجھے اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے کہ میں اپنی طرف سے بچنے کی کوشش کروں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسا کہ اگر راستے میں کانٹے پڑے ہیں تو جتنا راستہ صاف ہے آپ اپنا قدم صاف جگہ پر رکھیں، کانٹوں پر نہیں رکھیں گے؛ کیونکہ یہ عقل کا تقاضا ہے۔ آپ ہمیشہ اس راستے پر چلیں گے جو صاف ہوگا، لیکن اگر مقدر میں ہے تو کہیں نہ کہیں کانٹا لگ ہی جائے گا۔

﴿يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ کی تفسیر:

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ﴾ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرضہ دے؟ قرض کا معنی ہوتا ہے اگر سو ریال دے رہا ہوں تو واپس سو ریال لوں گا۔

اب اس کے بعد تین فرقے بن گئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو یہودی کہنے لگے ''إِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَ نَحْنُ أَغْنِيَاءُ'' مسلمانوں کا خدا غریب ہوگیا۔ دوسرا یہ بن گیا اور انہوں نے بخل کیا، اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہ کیا۔ اور تیسرا مومنوں کا گروہ ہے۔ حضرت ابو الاحراح رضی اللہ عنہ نامی ایک صحابی نے جب یہ آیت سنی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کرنے لگے: اللہ میاں قرض مانگتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: آپ گواہ ہو جائیں! میری جائیداد دو باغ ہیں جو سب سے اعلیٰ ہیں، میں یہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک رکھ لو اور ایک دے دو۔ اس نے کہا: حضور! جو میرا سب سے اچھا باغ ہے جس میں چھ سو کھجوریں ہیں اور وہ بہترین باغ ہے وہ اپنے رب کو قرض دیتا ہوں۔ جب واپس آئے تو بیوی بچے اسی باغ میں تھے۔ باہر کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا: میری بیوی اپنے بچوں کو لے کر باہر نکل آؤ۔ ہم نے یہ باغ قرض دے دیا ہے، اب ہمارا اس میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مانگا ہم نے دے دیا۔

[المعجم الکبیر: ۲۲/۳۰۱]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم وہاں قرض کیوں نہیں دیتے جہاں ڈوبنے کا خطرہ نہیں اور وہاں قرض صرف قرض نہیں، بلکہ کئی گنا کر کے ہم دیں گے۔

اعتراض و جواب:

بعض بینکر جو جاہل ہوتے ہیں اس آیت کو لے کر کہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ قرض لے کر واپس زیادہ کر رہے ہیں۔ اگر زیادہ دینا جائز نہ ہوتا تو خدا کیوں زیادہ دیتا؟ تو یہ ان کی جہالت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قرض کی ضرورت نہیں ہے اور اس آیت کا تو معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو۔

اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض پر آدمی انعام دے اور مقرر نہ کرے، مثلاً: ایک آدمی نے تمہیں ایک ہزار ریال قرض دیا تو تم نے وعدے کے مطابق ہزار ریال بھی دے دیا اور ساتھ کوئی ہدیہ بھی دے دیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم میں وہ لوگ اچھے ہیں جو اپنے قرض کو بہتر طریقہ سے ادا کریں۔ تو غیر معین چیز انعام میں دینا جائز ہے۔ اور ایک ہے کہ فیصد مقرر کر دیا جائے یا قرض دیتے وقت شرط لگائی جائے کہ میں اتنا لوں گا تو جو قرض نفع کو کھینچے اس کا نام ''سود'' ہے۔

جہاد کی دو اقسام:

شروع آیت میں جہاد فی سبیل اللہ کا حکم ہے اور دوسرے حصے میں انفاق فی سبیل اللہ کا حکم ہے۔ تو یاد رکھیں! جہاد بھی دو قسم کا ہوتا ہے: ایک جہاد بالنفس کہ آدمی خود جا کر جہاد کرے اور ایک جہاد بالمال ہے کہ اگر آدمی خود نہیں لڑ سکتا یا خود وہاں نہیں پہنچ سکتا تو وہ اپنے مال کے ساتھ جہاد کرتا رہے۔ کیونکہ کسی مجاہد کو تیار کرنے میں برابر کا ثوب ہے۔ آج کل یہ سب سے بڑا المیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائیں کہ محض زبانی دعوؤں کے بجائے عملی اقدامات بھی فرمائیں۔ آج جو سب سے بڑا مسئلہ پیدا ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ ایسے موقعوں سے دشمن بڑا فائدہ اٹھاتا ہے کہ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے، ان کے والدین فوت ہو گئے تو کافران چھوٹے بچوں کو لے جاتے ہیں اور اپنے مشنری سکول میں داخل کر دیتے ہیں۔ بظاہر تو وہ بڑی ہمدردی کر رہے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب بچہ بڑا ہوگا تو وہ عیسائی ہو جائے گا، اگر یہودی نے اس کو لیا ہے تو یہودی ہو جائے گا۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ما

مِنْ مَوْلُوْدٍ إِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ أَوْ يُنَصِّرَانِهٖ أَوْ يُمَجِّسَانِهٖ "[1] (اللہ تعالیٰ ہر بچے کو دین فطرت پر پیدا فرماتے ہیں (یعنی اس کے دل کی پلیٹ صاف ہوتی ہے) اگر اس کے ماں باپ یہودی ہیں تو اولاد کو یہودی بنا ڈالیں گے، اگر نصرانی ہیں تو اولاد کو نصرانی بنا ڈالیں گے اور اگر مجوسی ہیں تو مجوسی بنا ڈالیں گے)۔ اور ان معاملات میں یہودیت اور نصرانیت زیادہ متحرک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مذہب میں کوئی دل کشی نہیں رہی، اب کوئی آدمی عقل وفکر سے یا ان کی کتابیں پڑھ کر یہودی یا عیسائی بنے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو اب وہ یہ کرتے ہیں کہ وہ مسلمان کی غربت کا فائدہ اٹھاتے ہیں کہ ان کو نوکری کا لالچ دیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان ایسے مظلوم کی فیملی کو پناہ دے دے، ان کو تحفظ دے دے اور ان کے بچوں کو اپنی اولاد بنا لے تو یہ بہت بڑا جہاد ہے۔

پورے دین کا اگر خلاصہ نکالا جائے تو دو لفظوں میں نکل سکتا ہے: "اَلْعَظَمَةُ لِلْخَالِقِ وَالشَّفَقَةُ عَلَى الْمَخْلُوْقِ" (خالق کی دل میں عظمت آجائے اور مخلوق کی دل میں شفقت آجائے) اسی کا نام اسلام ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت جب دل میں آجائے گی تو نماز روزہ سب آجائے گا، اللہ تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت ہوگی اور نواہی سے بچ جائے گا۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت آئے گی تو اب وہ زکوٰۃ وصدقات بھی دے گا، خیرات بھی کرے گا، ہمسائے کے حقوق کا خیال بھی کرے گا اور بیوہ ویتیم پر رحم کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا معنی:

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا کیا معنی ہے؟ یہاں مفسرین کرام نے دو قول نقل فرمائے ہیں: بعض حضرات فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ کون ہے جو اللہ کے بندوں کو قرض دے؟ اور بعض علماء نے فرمایا: حدیثِ الٰہی ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تم نے میری عیادت نہ کی، میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہ دیا اور میں ننگا تھا تو نے مجھے کپڑا نہ پہنایا۔ بندہ حیران ہو کر کہے گا: آپ کیسے مریض ہو سکتے ہیں؟ آپ تو ہر صفتِ نقصان سے منزہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرا فلاں بندہ بیمار تھا، اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، میرا فلاں بندہ بھوکا تھا تو اگر اس کو کھلاتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا اور میرا فلاں بندہ ننگا تھا تو نے اس کو لباس نہ پہنایا یعنی جب تو میرے بندے کو صرف میری رضا کے لیے کھلا رہا ہے تو مجھے دے رہا ہے؛ کیونکہ

---

[1] [صحیح مسلم، رقم: ۶۷۵۹؛ مسند احمد، رقم: ۷۶۹۸،۱۷۸۱]

جب بھی کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی عظمت کو سامنے رکھ کر اقدام کرتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے۔

غریب آدمی کو کوئی قرض نہیں دے گا اور اگر کوئی بڑی پارٹی ہے اور اس کے معاملات کاروبار ٹھیک ٹھاک ہیں، وہ جس بڑی فرم کو کہیں گے ان کو فوراً قرضہ مل جائے گا: کیونکہ ان کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ محفوظ مقام ہے، میرا پیسہ ڈوب نہیں سکتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بدبختو! سوچو! جب تمہیں بندوں میں پارٹی مضبوط ملے تو قرضہ دے دیتے ہو تو اپنے خدا کو نہیں دیتے ہو؟ جہاں نہ خزانے ختم ہونے کا مسئلہ ہے اور نہ پیسے ڈوبنے کا مسئلہ ہے۔ اسی لیے اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو تیار کیا کہ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے؟ جب تم کسی مظلوم و محتاج کو قرض حسنہ دیتے ہو (جس کے اوپر کوئی منافع چارج نہ کیا جائے) تو اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اس کو کئی گنا ثواب عطا فرمائیں گے۔

مفسر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ حکم کئی جگہ پر عطا فرمایا ہے۔ حدیث نزول میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''مَنْ يُقْرِضُ غَيْرَ عَدِيْمٍ وَلَا ظَلُوْمٍ'' کون ہے جو ایسی ذات کو قرضہ دے جہاں قرضہ ڈوبے گا بھی نہیں اور پھر قرضے کا قرضہ نہیں ملے گا، بلکہ ہم اس کو کئی گنا بڑھا دیں گے۔ [صحیح مسلم: رقم: ۷۵۸]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَا نَقَصَ مَالٌ مِنْ صَدَقَةٍ'' اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا، اللہ تبارک و تعالیٰ اس میں برکتیں عطا فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی عطا فرماتے ہیں۔ [مجمع الزوائد: رقم: ۴۵۷۹، البزار: ۱/ ۱۸۷]

بعض علماء نے فرمایا: جو آدمی اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے وہ بھی قرض حسنہ میں آتا ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی رضا میں خرچ کر رہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو آدمی ''سبحان اللہ'' اور ''الحمد للہ'' کہہ رہا ہے یہ بھی قرض حسنہ ہے۔ یاد رکھیں! اگر اللہ تعالیٰ پیسے کا کہہ دیں تو پیسے دو، غریب کو کھانا کھلا دو۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر مسلمان بھائی ملے تو مسکرا کر ملنے پر بھی اللہ تعالیٰ صدقہ کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

فرمایا: ولیمہ وہ سب سے برا طعام ہے جس میں امیروں کو کھلایا جاتا ہے اور غریبوں کو بھگایا جاتا ہے۔ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ جو مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کو جتنی رقم قرض دے رہا ہے اس سے دوگنی رقم کا اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرماتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرض آدمی اس وقت مانگتا ہے جب ہر طرف سے وہ مجبور ہو جاتا ہے

اور کوئی حل نہیں ہوتا۔ قرضے کے لیے آدمی اپنے آپ کو سائل بنا کر کسی کے سامنے لے آئے، یہ آسان کام نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آج کل لوگوں نے اس کو ذریعہ معاش بنا لیا ہے، لیکن چند ایسے گھٹیا قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن کو نہ اللہ تعالیٰ کا ڈر ہوتا ہے اور نہ بندوں کے حقوق کا خیال ہوتا ہے، ورنہ قرض بیماری اور موت ہے۔ اب کوئی قرض مانگنے کے لیے آ گیا تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ انتہائی محتاجی کی حالت میں ہے۔ جب بندہ ایسے آدمی کی مدد کرتا ہے اور بغیر کسی لالچ اور سود کے دیتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو دوگنا صدقے کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

حدیث: اللہ تعالیٰ چاہیں تو معمولی سی نیکی پر اتنی بڑی نعمت مل جاتی ہے جہاں لاکھ گنا کا تصور بھی نہیں ہوتا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سابقہ امتوں کے اندر ایک عورت تھی، جس کی ساری زندگی فسق وفجور میں گزر گئی۔ اس کو سفر کے دوران پیاس لگی۔ جب پیاس کی شدت نے اسے تنگ کیا، اس نے پانی تلاش کیا تو اس کو راستے میں ایک کچا کنواں مل گیا۔ اس نے دیکھا وہاں کوئی ڈول وغیرہ نہیں ہے، بہرحال اس نے اپنے ڈوپٹے کے ساتھ جوتا باندھ کر پانی میں ڈالا اور جب پانی باہر نکالا تو دیکھا ایک کتا کنویں کے کنارے پیاس کی شدت کی وجہ سے تڑپ رہا ہے۔ اس عورت نے بجائے اپنے منہ میں پانی ڈالنے کے اس کتے کے منہ میں ڈالا۔ جب کتے کو پانی ملا تو اس کو بھی ہوش آ گیا۔ عورت نے پھر دوبارہ پانی نکال کر خود پیا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس کو خبر دی گئی کہ ہم نے تیرے سارے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ تو نے میرے ایک جانور پر رحم کیا میں نے تم پر رحم کیا۔

اب دیکھیں! ایک پانی کے گھونٹ کے بدلے میں جنت مل گئی، ورنہ یہاں کون جنت کی قیمت لگا سکتا ہے؟

جنت میں درخت لگانے کا مطلب:

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمانو جنت کی زمین چٹیل میدان ہے۔ اگر تم اپنے باغ لگانا چاہتے ہو تو لگا لو۔ اب صحابہ نے عرض کیا: ہم جنت میں باغ کیسے لگائیں؟ ابھی تو جنت میں داخل ہی نہیں ہوئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم تسبیحات ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ'' پڑھا کرو۔ جب بندہ ''سبحان اللہ'' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں: میرے بندے کے لیے جنت میں ایک درخت لگا دو۔ اب تم جتنی تسبیحات پڑھتے جاؤ گے اپنا باغ بڑھاتے جاؤ گے۔ [ریاض الصالحین: ۲/۲۶۷]

خیرات کرنے میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ تم ہزاروں لاکھوں خیرات کرو، بلکہ ہر آدمی کے اللہ تعالیٰ نے حالات

پیدا فرمائے ہیں۔ ایک آدمی ایک لاکھ بھی خیرات کر دے کوئی فرق نہیں پڑتا، ایک آدمی ہزار بھی خیرات کردے تو اس کے لیے بہت بڑی چیز ہے اور ایک آدمی ایک سو بھی خرچ کرے تو بڑی چیز ہے۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ تھوڑے پیسے ہیں۔ جو تم درد دل سے دو گے وہ ایک پیسہ بھی تمہیں جنت میں لے جائے گا۔

بازار میں داخل ہونے کا عمل اور بیش بہا ثواب:

حدیث: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "مَنْ دَخَلَ سُوْقًا مِنْ أَسْوَاقٍ" مثال: جو شخص بازاروں میں سے کسی بازار میں جائے، بازار کے اندر جاتے ہوئے یہ کلمہ پڑھے "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" تو اللہ پاک اس کو دس لاکھ نیکیاں عطا فرماتے ہیں اور دس لاکھ گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ [جامع الترمذی: رقم: ۳۴۲۹]

یاد رکھیں! اگر ایک آدمی کے گناہ نہیں ہیں تو ان کے درجات بلند ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک وظیفہ بنا لو کہ جب بھی بازار میں داخل ہوا کریں تو یہ کلمہ ضرور پڑھا کریں۔

اصل وجہ یہ ہے کہ سب سے بری جگہ بازار ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "أَحَبُّ الْبِلَادِ إِلَى اللّٰهِ الْمَسَاجِدُ وَأَبْغَضُ الْبِلَادِ إِلَى اللّٰهِ هُوَ أَسْوَاقٌ" زمین میں سب سے بہتر ٹکڑا اللہ تعالیٰ کی مسجدیں ہیں؛ کیونکہ جب آدمی مسجد میں آئے گا، چاہے وہ کتنا گیا گزرا ہو، نماز پڑھے گا، قرآن پڑھے گا۔ اور فرمایا: سب سے بری جگہ بازار ہیں؛ کیونکہ لین دین میں جھوٹ بولنا، قسم کھانا اور عورتوں مردوں کا اختلاط ہوتا ہے تو جب وہاں کوئی آدمی جا کر اپنے اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کو اتنا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

حدیث: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ﴾ [البقرۃ: ۲۶۱] کہ جب کوئی بندہ نیکی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سات گنا بڑھا کر ثواب دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے دعا مانگی: اے اللہ! میری امت کو اس سے بھی زیادہ ثواب عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی یہ آیت نازل فرمائی: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ أَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ [البقرۃ: ۲۴۵] تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! میری امت کو اس سے بھی زیادہ ثواب عطا فرما تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ آیت

---

[1] [مصنف ابن ابی شیبہ: ۷/۳۴۱، حاکم: ۲/۴۹]

نازل فرمائی: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: ۱۰] اے میرے نبی! تیری امت میں ہم صبر کرنے والوں کو جو ثواب دیں گے اس کا کوئی حد و حساب نہیں ہوگا۔ [صحیح ابن حبان: ۲۹ ۲۹]

اس لیے حدیث پاک میں آتا ہے: جن لوگوں پر ابتلاء آیا ہے کہ کسی کو بیماری دی اور کسی کی آنکھیں لے لیں کسی پر مال کا ابتلاء آ گیا، لیکن اس نے صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر قضا پر راضی ہوا۔ جب قیامت والے دن ان لوگوں کو ثواب ملتا دیکھیں گے تو لوگ یہ تمنا کریں گے کہ دنیا میں ان کے وجود کو مقراض (قینچی) سے ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا تو بہتر ہوتا، تاکہ آج ہمیں اس کا بھی ثواب ملتا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں جس کی آنکھیں لے لوں وہ میری رضا پر راضی رہے اس کے بدلہ میں جنت واجب کر دیتا ہوں۔ [الجامع الصغیر: ۳/ ۲۴۲]

حضرت کعب بن احبار رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ ان کے پاس ایک آدمی نے آکر کہا: میں نے ایک بندے کو کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ پڑھ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک کروڑ کمرے موتیوں اور یاقوت سے جنت میں بنا دیتے ہیں تو کیا میں اس کی بات مان لوں؟ آپ نے فرمایا: مان لو۔ تم کیوں تعجب کر رہے ہو؟ میں کہتا ہوں: دو کروڑ اور تین کروڑ بھی اللہ تعالیٰ دے سکتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں ﴿اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ کہ میں ڈھیر سارا دوں گا تو اس کا حساب کون لے سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ جس کا رزق تنگ کرتے ہیں اس میں بھی حکمت ہے اور جس کا بڑھا دیتے ہیں اس میں بھی حکمت ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے حال کو جانتے ہیں۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۴۶]

''کیا آپ نے موسیٰ کے بعد بنی اسرئیل کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا جب انہوں نے اپنے نبی پاک سے کہا ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیجیے تا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ فرمایا کیا یہ احتمال ہے کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دے دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو؟ کہنے لگے: ہمیں کیا ہوا کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جبکہ ہمیں ہمارے گھروں سے اور ہماری اولاد سے نکال دیا گیا ہے۔ پھر جب ان کو جہاد کا حکم ہوا تو سب پھر گئے، مگر ان میں سے تھوڑے سے اور اللہ کو گناہگار معلوم ہیں۔''

تفصیل واقعہ:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ایک خاص واقعہ کا ذکر فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کی قوم اپنے وقت کے نبی کے پاس آئی...... اس پیغمبر کے نام میں مختلف اقوال ہیں۔ اور نام معلوم ہو جانے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں اور نام نہ معلوم ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں، مقصد ایک واقعہ سنانا ہے۔ اب اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ آنے والے لوگ کون تھے؟ ان کے کیا نام تھے؟ اور ان کے نبی کا کیا نام تھا؟ ان کا حسب نسب کیا تھا؟ اس پر اللہ تعالیٰ کا قرآن متوجہ نہیں فرماتا۔ بس ایک واقعہ بیان کرنا مقصد ہے۔ البتہ محققین مفسرین نے کتب سابقہ سے یہ بات نقل فرمائی ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کافی پہلے کا ہے...... اصل میں یہ ہوا تھا کہ بنی اسرائیل اپنی بداعمالیوں میں پڑ گئے اور حد سے نکل گئے تو ان پر اللہ تعالیٰ نے ایک عذاب مسلط کیا کہ جالوت نام کے بادشاہ کو ان بنی اسرائیل پر مسلط کر دیا، جس نے ان پر پوری قوت کے ساتھ حملہ کیا اور اس نے مردوں کو قتل کر ڈالا، عورتوں کو کنیزیں بنا لیا، بچوں کو قیدی بنا لیا، ان کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا اور ان کو تباہ و برباد کر کے سب کچھ لوٹ کر واپس چلا گیا۔ اب اس قوم کو ہوش آیا اور اپنے نبی کے پاس آ کر کہنے لگے: آپ مہربانی کریں اللہ تعالیٰ سے دعا کریں: اللہ تعالیٰ ہمارے لیے کوئی اسباب پیدا کرے، ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کوئی قائد پیدا کرے، جس کی قیادت میں ہم جہاد کریں اور ہم اپنی اس ذلت کا بدلہ لیں۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے انہیں آیات کے اندر بیان فرمایا ہے۔

''اَلَمْ تَرَ'' اس سے مراد ایسا واقعہ اور ایسی بات ہے جو علم کے اندر ہو۔

''اَلْمَلَاِ'' سے مراد قوم کے سردار ہیں۔ اسی طرح قرآن نے کئی مقامات پر لفظ ''مَلَاِ'' کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد سردار ہیں۔ سرداروں کو ''مَلَاِ'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ سردار جب آتے ہیں تو مجالس کو بھر دیتے ہیں، لوگوں

کے دلوں کو ہیبت اور رعب سے بھر دیتے ہیں۔ یہ "فلاں" بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل تھے۔

اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب جہاد کیا جائے تو کسی کی قیادت میں کیا جائے۔ اب چاہے وہ خلیفۃ المسلمین کہلائے یا وہ بادشاہ کہلائے، چاہے وہ امیر المومنین کہلائے، بہرحال جہاد کے لیے ضروری ہے کہ قائد کی قیادت میں ہو، تب جہاد ہوگا، ورنہ فساد ہوگا۔

جب قوم کے سرداروں نے اللہ کے نبی سے آ کر کہا کہ آپ ہمارے لیے کوئی سردار مقرر کریں تو انہوں نے فرمایا: میری قوم کے سردارو! تم بات ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن مجھے خوف آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تم پر جہاد فرض کر دیا تو تم بھاگ جاؤ گے اور انکار کر دو گے۔ قوم نے کہا: ﴿وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا﴾ کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم انکار کر دیں، جبکہ ہمارے ساتھ تو اتنا برا سلوک ہو چکا ہے کہ ہمیں گھروں سے نکالا گیا ہے اور ہمیں اپنی اولادوں سے علیحدہ کر دیا گیا ہے؟ جالوت نے ہمارے اوپر ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے، یعنی جہاد تو ویسے اچھی چیز ہے اور جبکہ یہاں تو ایک داعیہ بھی موجود ہے کہ ہم اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ اب اگر آپ ہمیں بادشاہ اور قائد دیں گے تو ہم کیسے جہاد نہیں کریں گے؟

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾ [البقرۃ:۲۴۶] جب ان پر جہاد فرض ہو گیا تو قوم مکر گئی اور تھوڑے سے لوگ قائم رہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں ان لوگوں کو جو اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ﴾ [البقرۃ:۲۴۷] یہ تفصیل ہے کہ اللہ کے پیغمبر نے کہا: تم جو کہتے تھے کہ ہم پر کوئی بادشاہ مقرر کر دو، میں نے دعا کی ہے، اللہ تعالیٰ نے جہاد کا بھی حکم دے دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنایا ہے، تم اس کی قیادت میں جہاد کرو۔ قوم کہنے لگی: کمال ہے! ہم طالوت کو کیسے بادشاہ مان لیں؟ یہ تو غریب آدمی ہے، کپڑوں کو رنگنے والا بندہ ہے، ہم اس کو کیسے بادشاہ مان لیں؟ یعنی بجائے اللہ کے نبی کے فرمان کی اطاعت کے وہ اعتراض کرنے لگ گئے۔

اللہ تعالیٰ کے قرآن میں یہ ہمارے لیے اشارات ہیں کہ جب بھی مسلمان قوم نے جھگڑا کیا ہے تو اس لیے کیا ہے کہ فلاں ہمارا لیڈر بن سکتا ہے اور فلاں ہمارا لیڈر نہیں بن سکتا۔ جس وقت تک یہ جھگڑا نہیں تھا اس وقت تک کامیابی

ہی کامیابی تھی۔

بہر حال اللہ کے نبی نے قوم سے فرمایا: حضرت طالوت کو اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے چن لیا وہ مؤید من اللہ ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب آدمی خود کسی عہدے کا مطالبہ نہ کرے، لیکن پھر اسے وہ عہدہ مل جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتے ہیں۔ اور جب آدمی اپنی عقل سے عہدہ حاصل کرے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس کو اپنی عقل پر چلنے دو۔

اللہ کے نبی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کو تم پر دو خوبیاں دی ہیں: ایک تو اس کو علم میں فضیلت دی ہے اور دوسرا جسم میں بھی فضیلت دی ہے۔ یعنی علمی اعتبار سے بھی افضل ہے اور جسم کے اعتبار سے بھی افضل ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ اس زمانے میں بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ طاقت والے تھے، خوبصورت تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں علم بھی عطا فرمایا تھا۔ اس پر مفسرین نے لکھا ہے کہ جب جہاد کا قائد بنایا جائے اس میں یہ دو صفتیں ضروری ہیں، کیونکہ اگر جسمانی اعتبار سے درست نہیں ہوگا اور مریض ہوگا تو ایسا بندہ کسی دوسرے کے لیے کیا کام کرے گا؟ اور اس کی اپنی رعایا پر کنٹرول نہیں ہوگا۔ اور اگر علم نہیں ہوگا تو فیصلے کیسے کرے گا؟

آج بدقسمتی یہ ہے کہ ہم دونوں چیزیں نہیں دیکھتے ہیں۔ ایک کمپاؤڈر کلرک ڈاکٹر کے لیے ڈگری ضروری ہے، لیکن جو اسمبلی میں بیٹھے ہوئے ہیں ان کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ۭ﴾ قوم نے اعتراض کیا تھا کہ حضرت جالوت غریب ہیں تو اللہ کے نبی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں اپنا ملک عطا کر دیں، ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۴۷] اللہ تعالیٰ وسیع فضل فرمانے والے ہیں اور ہر بات کو جاننے والے ہیں کہ اس کو کیوں منتخب کیا ہے؟

مفسر فرماتے ہیں: حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ وہ نبی حضرت یوشع بن نون علیہ السلام تھے۔ حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ نبی حضرت شمعون علیہ السلام تھے۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے نقل فرماتے ہیں: ان کا نام شمویل تھا۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بعد ایک مدت تک سیدھے راستے پر رہے، یعنی دین موسیٰ پر جمے رہے، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، بعض لوگوں نے بت پرستی شروع کر دی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی ان کے اندر اپنے پیغمبر بھیجے، جو ان کو امر

بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہے اور وہ کوشش کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ان کو شریعت دی ہے اس پر قائم رہیں، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا بنی اسرائیل ہٹتے گئے اور دین کے اندر نئے نئے طریقے پیدا کرتے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ پاک کا ان پر غضب آ گیا اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر دشمنوں کو مسلط کر دیا۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو قتل کیا اور ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل کو قیدی بنالیا اور بنی اسرئیل کے بڑے بڑے شہروں پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہ دشمن ان میں سے جس سے لڑتا اس پر غالب آ جاتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب بنی اسرائیل تورات پر عمل کرتے تھے اور ان کے پاس ایک تابوت تھا، لیکن جب وہ خلاف پر جم گئے تو بعض بادشاہوں نے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کو قتل بھی کیا اور قید بھی کیا اور تابوت بھی ان سے لے گئے۔ اس کے بعد ان سے کتاب تورات بھی چلی گئی۔ اب ان کے اندر بہت تھوڑے لوگ رہ گئے، جن کو تورات یاد تھی۔

یاد رکھیں! اس کے اندر شیعہ والے تابوت کا بنی اسرائیل والے تابوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جو بعض لوگ تعزیہ نکالتے ہیں یہ تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے روضہ کی شکل بناتے ہیں، جبکہ بنی اسرائیل کے پاس جو تابوت تھا وہ ایک صندوق تھا۔ آگے آپ پڑھیں گے کہ اس صندوق کے اندر سابقہ انبیاء کی کچھ چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

پہلے زمانے کے اندر جتنی کتابیں اتری ہیں وہ کتابیں الف سے لے کر یا تک صرف نبی کو یاد ہوتی تھیں، امت کو یاد نہیں ہوتی تھیں۔ یہ شان صرف امت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو قرآن نازل فرمایا وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں بھی محفوظ اور امت کے سینوں میں بھی محفوظ ہے۔ اسی طرح جو پہلی کتابیں تھیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کتابیں تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کو باقی رکھنے کا وعدہ نہیں فرمایا؛ اس لیے کہ ایک نبی کے بعد دوسرے نبی نے آنا ہوتا تھا، قوم کے اندر جتنی غلطیاں ہوتی تھیں وہ ان کی اصلاح کر دیتا تھا، لیکن آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین بنایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہے اور آپ کے بعد نئی شریعت نہیں آئے گی تو اللہ تعالیٰ نے یہ اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو ہم قیامت تک محفوظ رکھیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو اتریں گے وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے تابع ہوں گے، وہ نئی نبوت لے کر نہیں آئیں گے، وہ تو پہلے سے نبی بن چکے ہیں۔

حضرت شمویل علیہ السلام کی پیدائش:

خاندان لاوی سے ایک عورت اپنے خاوند سے حاملہ تھی قتل ہوگئی۔ ایک عورت باقی تھی، وہ حاملہ تھی، اس کا خاوند

قتل ہو گیا۔ انہوں نے عورت کو حفاظت کے ساتھ کمرے میں بند رکھا، شاید اس سے کوئی لڑکا پیدا ہو اور اللہ تعالیٰ اس کو نبوت عطا فرما دیں۔ وہ عورت دعائیں کرتی رہی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا پیدا ہوا، اس کا نام شمویل رکھا گیا...... شمویل کے معنی ہیں "سَمِعَ اللّٰهُ دُعَائِیْ" یعنی اللہ تعالیٰ نے میری دعا سن لی۔ اور اسی طرح شمعون کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعائیں سن لیں...... بہر حال لڑکا پیدا ہوا اور جوان ہوا تو اللہ پاک نے اس کو بڑی اچھی جوانی عطا فرمائی۔ جب وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی بھیجی۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: اب تم میری توحید بیان کرو اور لوگوں کو میری توحید کی دعوت دو۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دی۔ بنی اسرائیل نے ان سے مطالبہ کیا کہ تم مہربانی کر کے کسی کو ہمارا بادشاہ بناؤ، تا کہ اس کی قیادت میں ہم دشمنوں سے جا کر لڑیں۔ اب اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے فرمایا: اے لوگو! اگر میں دعا کروں اور بادشاہ بھی مقرر کر دوں تو تمہارا کیا اعتبار ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آ جائے تو تم نافرمانی کرو؟ وہ کہنے لگے: ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہم کیسے قتال نہیں کریں گے؟ جبکہ ہمیں قتل کیا گیا، ہمیں گھروں سے نکالا گیا، ہمیں بچوں سے جدا کیا گیا، ہمارے شہر چھن گئے اور ہماری اولادوں کو قید کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب ہم نے ان کو قتال کا حکم دیا تو سب کے سب جہاد سے پھر گئے، مگر تھوڑے لوگ قائم رہے اور باقی لوگوں نے اللہ کے نبی سے جو وعدہ کیا تھا ان کو پورا نہ کیا اور اپنے وعدے سے پھر گئے۔

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٧﴾﴾ [البقرۃ:۲۴۷]

"اور ان سے ان کے نبی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ کہنے لگے: اس کو ہم پر حکمرانی کا حق کیسے ہوسکتا ہے؟ بلکہ ہم اس کی بہ نسبت حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں اور اس کو تو مالی وسعت بھی نہیں ملی۔ فرمایا: اللہ نے اس کو پسند کیا ہے تم پر اور اس کو زیادہ وسعت دی ہے علم اور جسم میں۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی سلطنت دیتا ہے۔ اور اللہ وسعت والا ہے، سب جانتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے حضرت طالوت کو ان کا بادشاہ اور قائد مقرر کر دیا؛ کیونکہ وہ ان کے لشکر اور ان کی جماعت میں سے تھے، ان کے نبی کو ماننے والے تھے اور خود بھی اللہ تعالیٰ کے ولی تھے اور بڑے صالحین میں سے تھے۔ قوم نے کہا: کمال ہے! ہم طالوت کو کیسے بادشاہ مان لیں؟ یہ تو بادشاہ کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا۔ ہمارے ہاں بادشاہت لاوی کی اولاد سے چلی آرہی ہے، یہ ان کی اولاد میں سے نہیں ہے اور یہ کسی بڑے خاندان کا فرد بھی نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے پاس دولت بھی نہیں ہے تو یہ ملک کو کیسے چلا سکتا ہے؟ لہٰذا ہم اس کو بادشاہ نہیں مان سکتے۔ اس سے تو ہم زیادہ حق دار ہیں۔ آپ ہمیں بادشاہ بنا دیں۔ اس طرح قوم نے بجائے اطاعت و فرمانبرداری کرنے کے اعتراض کیا، حالانکہ اسی آیت کے اندر قاعدہ مذکور ہے کہ بادشاہت ہو یا قیادت ہو، اس کے اندر دو اہم ترین صفات کا پایا جانا ضروری ہے: پہلی صفت یہ ہے کہ اس کے اندر علم ہو؛ کیونکہ اگر اس کی قوتِ علمیہ مضبوط نہیں ہوگی تو وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکے گا۔ اور دوسری صفت یہ ہے کہ وہ جسمانی طور پر بھی مضبوط ہو۔ ہزاروں سال پہلے جو فیصلہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا آج دنیا اسی نتیجہ پر آگئی ہے کہ اگر کام کے لیے ویزہ لگوایا جائے تو وہ کہتے ہیں: پہلے میڈیکل کراؤ کہ کیا یہ آدمی اس کے لیے فٹ ہے؟ یہ تو بہت بڑی صفت ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ چن لیں۔ اللہ تعالیٰ کی چنائی میں کوئی نقص نہیں ہو سکتا، انسانوں کی چنائی میں نقص ہو سکتا ہے؛ کیونکہ چننے والا خود ناقص ہے، اس لیے کوئی نہ کوئی غلطی رہ سکتی ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے کسی کو چن لیا ہو اس پر اعتراض کرنا سراسر جہالت و حماقت ہے۔

(دوسرا مسئلہ) اسلام کے اندر قومیت، نسل نسب و حسب کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اسلام نے فیصلہ فرما دیا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا﴾ [الحجرات: ۱۳] ہم نے تم سب کو ایک نر اور مادہ سے پیدا کیا ہے، پھر ہم نے تمہاری شاخیں بنا دیں اور قبائل بنا دیے، تاکہ ایک دوسرے کو پہچاننا آسان ہو جائے۔

اس لیے اسلام کے فلسفے کو سمجھیں! دیکھیں! ابوجہل کتنا بڑا مکہ کا سردار ہے! لیکن جہنم کا حق دار ہے اور حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ غلام ہیں، لیکن جنت کے سردار ہیں۔ اس لیے اقبال نے کہا تھا:

؎ بلال از حبش ، صہیب از روم ، ابوجہل از مکہ

خدا کی شان دیکھو! بلال حبش سے آیا، صہیب روم سے آیا، لیکن ابوجہل مکہ میں پیدا ہوا اور جہنم میں گیا۔

ہاں کچھ قوموں کو اللہ تعالیٰ نے شرف دیا ہے تو ان کو اس پر اترانا نہیں چاہیے اور دوسروں کو حقیر نہ سمجھیں۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں نبی بھیجے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے خاندانِ قریش میں محمد رسول اللہ ﷺ کو پیدا فرمایا تو قریش کی شان بھی بڑھ گئی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عرب کے اندر اپنا سب سے افضل نبی پیدا فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک لغتِ عرب میں اتار دیا، اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ بھی عرب میں رکھا، اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کی زبان بھی عربی رکھی اور اللہ تعالیٰ نے عالمِ برزخ میں بھی عربی زبان رکھی۔ اس وجہ سے عرب کو فضیلت مل گئی۔ یہ کسی کو فضیلت مل جانا علیحدہ بات ہے اور کسی کو عمل کی بنا پر فضیلتیں ملیں۔ اور اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کو دوسرے مہینوں پر فضیلت عطا فرمادی تو یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ اگر چاہتے ہیں تو زبان کو فضیلت دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو مکان میں بھی فضیلت عطا فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو انسانوں میں بھی فضیلت عطا فرماتے ہیں، لیکن یہ سب میرے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی بندے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اعتراض کرے کہ اللہ تعالیٰ نے حج کے دن ذی الحجہ کیوں رکھے؟ اور محرم میں کیوں نہیں رکھے ہیں؟ کیونکہ ذی الحجہ کو پیدا کرنے والے بھی اللہ ہیں اور محرم کو پیدا کرنے والے بھی اللہ ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے کسی کو شرف عطا فرمایا ہے تو اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کی تنقیص کرے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے، جس کو چاہے اونچا کردے اور جس کو چاہے کم تر کردے۔

﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط﴾ [آل عمران: ۲۶]

بنی اسرائیل کا حضرت طالوت علیہ السلام کی بادشاہت پر اعتراض کرنا سرکشی کی دلیل تھی۔ ان کے لیے تو اولیٰ یہ تھا کہ وہ اپنے پیغمبر کی اطاعت کرتے اور اچھی بات کہتے۔ وقت کے پیغمبر نے ان کے اعتراض کا جواب دیا: اعتراض نہ کرو، اس کو تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے چن لیا ہے اور میں نے اس کو بادشاہ اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے نہیں بنایا، بلکہ جب تم نے مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ طالوت کو بادشاہ بناؤ۔ تو جب اللہ تعالیٰ کسی کو چن لے تو میں کیا کرسکتا ہوں؟

﴿وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ط﴾ اللہ تعالیٰ نے اس کو علم کا مرکز بنایا اور جسم کی قوت بھی عطا فرمائی، جنگوں کی مہارت اور برداشت کرنے میں تم سے زیادہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کو چن لیا ہے تو پھر تم کیوں اعتراض کرتے ہو؟

مفسر فرماتے ہیں: ان آیات مبارکہ میں ہمیں یہ مسئلہ سمجھ آیا کہ بادشاہ وہ بنے جو علم کے اندر کامل ہو اور شکل کے

اعتبار سے خوبصورت ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کو قوتِ بدن بھی عطا فرمائی ہو؛ کیونکہ اگر اس کے پاس علم نہیں ہوگا تو وہ فیصلے نہیں کر سکے گا اور اگر اس کی شکل وصورت میں بردباری اور رعب نہیں ہوگا تو لوگوں پر اس کا اثر نہیں ہوگا، اس لیے ان دو صفتوں کا اس کے اندر ہونا ضروری ہے۔

کتابوں کے اندر ہے کہ حضرت طالوت علیہ السلام بے انتہا خوبصورت تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو قوت وطاقت بھی سب سے زیادہ عطا فرمائی تھی اور علم کے اندر بھی زیادہ تھے اور جنگ کے اندر مہارت رکھتے تھے۔

﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اللہ کے نبی نے آخر میں فیصلہ فرمایا کہ جب ملک اللہ کا ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ملک عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ایسی شان والا حاکم ہے کہ وہ جو چاہے کرے، اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۲۴۷] یعنی اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ فضل کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ علم کامل اور علم محیط کے مالک ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کون بادشاہت کے قابل ہے اور کون بادشاہت کے قابل نہیں ہے؟

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾
[البقرۃ:۲۴۸]

''اور ان سے ان کے نبی نے کہا: اس کے بادشاہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا، جس میں تمہارے رب کی طرف سے تسلی ہوگی اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہوں گی، جن کو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی اولاد چھوڑ گئی تھیں، اس کو فرشتے اٹھا لائیں گے۔ اس میں تمہارے لیے پوری نشانی ہے اگر تم یقین رکھتے ہو۔''

جب اللہ کے نبی نے قوم کو سمجھایا کہ تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور قوم لاجواب ہوگئی تو کہنے لگی: چلو! ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں، لیکن کوئی نشانی تو ہو کہ یہ ہمارا بادشاہ بنے گا تو ہم جنگ جیت جائیں گے۔ محض آپ کا کہنا کافی نہیں۔ حالانکہ اللہ کے نبی کی بات تھی اور ان کا کہنا ہی کافی ہوتا ہے، لیکن جب دلوں میں کھوٹ ہو تو ایسی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔

اللہ کے نبی نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ٹھیک ہے، ہم ان کو نشانی بھی دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے زمانے میں ایک لکڑی کا صندوق تھا، اس کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کچھ کپڑے بھی تھے اور ان کا عصا بھی تھا اور الواحِ تورات یعنی جن تختیوں پر تورات لکھی ہوئی تھی وہ بھی تھیں اور کچھ تختیاں ایسی تھیں جو ٹوٹ گئیں تھیں، ان کو آپ نے اسی صندوق میں محفوظ کر دیا تھا۔ لازمی بات ہے کہ جن چیزوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کے نبی کے ساتھ ہوتا ہے، ان کی شان ہوتی ہے۔ اس لیے ان چیزوں کی بنی اسرائیل کے اندر بڑی حفاظت ہوتی تھی، لیکن جالوت بادشاہ نے ان پر حملہ کیا تو جہاں انہوں نے یہودیت کو برباد اور قید کیا، اس کے ساتھ ساتھ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام والا صندوق بھی ساتھ لے گئے۔ تو اللہ کے نبی نے ان سے فرمایا کہ اللہ کے فرشتے وہ صندوق اٹھا کر لے آئیں گے اور تمہارے سامنے رکھ دیں گے۔ اس سے سمجھ لینا کہ جب اللہ تعالیٰ ہمیں اتنی عظیم چھینی ہوئی نعمت واپس دینے پر قادر ہیں تو ہمیں فتح بھی دے سکتے ہیں۔ اس طرح تمہاری تسلی ہو جائے گی اور پکی تسلی ہو جائے گی؛ کیونکہ اس بادشاہ سے وہ تابوت لے کر آنا کوئی معمولی سی بات نہیں۔

﴿سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ حضرت عطا رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جیسے تم کوئی نشانی دیکھو اور تمہارے دل کو قرار ہو جائے اس کو ''سَكِينَة'' کہتے ہیں۔

اور بعض علماء نے فرمایا: ''سَكِينَة'' سے مراد ہے کہ سونے کا ایک تھال تھا، جس کے اندر اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے دلوں کو ملائکہ کے ذریعے غسل دلوایا تھا، وہ تھال حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مل گیا، آپ نے اس کے اندر تورات کے الواح رکھ دیئے تھے۔

حضرت سفیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسی چیز تھی جو چہرے والی تھی، جیسا کہ انسان کا چہرہ ہوتا ہے، اس کے اندر بھی روح کی امیزش تھی، جیسا کہ روح کی وجہ سے حرکت پیدا ہوتی ہے۔

حضرت ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ ایک نکلنے والی ہوا تھی، اس کے دو سرے بنے ہوئے تھے، اس کے دو پر تھے اور اس کی دم بھی تھی۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سَكِينَة'' ایسے تھا جیسے بلی کا ایک سر ہوتا ہے اور وہ تابوت کے اندر تھا۔ جب وہ بلی کی آواز نکالتی تو لوگوں کو یقین ہو جاتا تھا کہ اب ہماری کامیابی قریب آ گئی ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس صندوق کے اندر ایک ایسی روح پوشیدہ رکھی تھی کہ جب یہ کسی بات

میں جھگڑتے تھے تو وہ روح بول کر ان کے درمیان میں فیصلہ کر دیتی تھی۔

بہر حال یہ سارے اقوال ہیں، مفسر رحمہ اللہ نے ان کو "قیل" کے ساتھ نقل فرمایا۔ جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اقوال مرجوح ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں "سَكِينَةٌ" فرمادیا اور "سَكِينَةٌ" کا معنی طمانیت ہے، جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ غار کے اندر تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا﴾ [التوبہ: ۴۰] اللہ تعالیٰ نے ان پر "سَكِينَةٌ" نازل کی، یعنی اطمینان نازل کر دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے صحابہ پر اپنا "سَكِينَةٌ" اتار دیا۔

مراد یہ تھی کہ اس صندوق اور الواحِ تورات کو دیکھ کر دلوں کو تسکین ہوتی تھی۔ باقی یہ کہنا کہ بلی کا سر تھا، یا ہوا تھی، یا کوئی روح تھی، یہ سب ایسی باتیں ہیں جو لوگوں نے روایاتِ اسرائیلیہ سے لی ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے آج صندوق بنا کر اس کے اندر سر رکھے ہوئے ہیں۔

اس بارے میں ایک قاعدہ یاد رکھ لیں: "إِبْهَمُوْا كَمَا أَبْهَمَهُ اللّٰهُ" اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کو کھول کر بیان نہ کریں تو تم بھی بحث میں نہ پڑو۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اصحابِ کہف تھے۔ تو ہمارا ایمان ہے۔ باقی ان کے نام کیا تھے؟ والدین کے نام کیا تھا؟ اس میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہے اور کچھ تختیوں کے ٹکڑے تھے۔ اور یہی قول حضرت قتادہ، حضرت سدی، حضرت عکرمہ اور حضرت ضحاک رحمہم اللہ کا ہے۔ اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ اس میں من وسلویٰ بھی تھا، جو اللہ تعالیٰ بطور غذا کے اتارتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے عصا اور کپڑے بھی تھے اور الواح کے کچھ ٹکڑے بھی تھے، جن پر تورات لکھی ہوئی تھی۔

اور بعض نے کہا: اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جوتیوں کا ایک جوڑا بھی تھا۔

﴿تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرشتے بھیجے وہ آسمان وزمین کے درمیان میں اس تابوت کو اٹھا کر لائے اور طالوت کے سامنے اس تابوت کو رکھ دیا۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ تابوت آ رہا ہے۔ اب لوگ نبی کی نبوت پر ایمان لے آئے اور طالوت کی بادشاہت کو مان لیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اس صندوق کو فرشتے ایک گاڑی پر

لائے جس کو آگے بیل کھینچ رہے تھے۔

حکایت: بعض لوگوں نے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ مشرکین جب یہ تابوت لے آئے اور اس کو مندر میں نیچے رکھ کر اس کے اوپر بڑے بت کو رکھ دیا۔ جب صبح کے وقت مندر گئے تو دیکھا وہ بت نیچے ہے اور صندوق اوپر رکھا ہوا تھا۔ مشرکوں نے کہا: یہ تو ہمارے خدا کی توہین ہوگئی، انہوں نے صندوق کو پھر نیچے کر دیا اور اپنے بت کو اوپر رکھ دیا۔ دوسرے دن جب آئے تو دیکھا کہ بت پھر نیچے ہے اور صندوق اس کے اوپر ہے۔ انہوں نے کہا: یہ تو کمال ہوگیا اور پھر انہوں نے مشورہ کیا کہ صندوق کو زمین میں میخیں گاڑ کر رکھو اور اس کے اوپر اپنا بت رکھو۔ صبح کو آ کر دیکھتے ہیں کہ بت کے بازو ٹوٹے پڑے ہیں اور صندوق اوپر ہے۔ انہوں نے کہا: یہ صندوق ہمارے خدا کو بھی مار گیا، لہٰذا اس کو نکالو اور نکال کر اس کو ایک بستی میں رکھ آؤ۔ جب وہاں رکھا تو بستی میں بیماری پھیل گئی، لوگ مرنے لگ گئے۔ بنی اسرائیل کی وہاں ایک لڑکی تھی، اس نے کہا: یہ صندوق سب کو کھا جائے گا، لہٰذا اس صندوق کو بنی اسرائیل کو واپس کرو۔ انہوں نے بیل گاڑی پر اس صندوق کو رکھ کر بنی اسرائیل کی بستی کی طرف دھکیل دیا۔

لیکن یہ بات ساری غلط ہے۔ جب قرآن نے کہہ دیا: ﴿تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ﴾ [البقرۃ:۲۴۸] کہ اس کو فرشتے لے آئے تو بات ختم ہوگئی۔

﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾

[البقرۃ:۲۴۹]

''پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو فرمایا: اللہ ایک نہر سے تمہارا امتحان لیں گے۔ پھر جو اس سے پیے گا وہ میرا نہیں اور جو اس کو نہیں چکھے گا تو وہ میرا ہے، مگر جو کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے گا۔ تو سب نے اس سے پیا، مگر قلیل نے۔ پھر جب وہ اس سے پار ہوا اور وہ مومن جو اس کے ہمراہ تھے کہنے لگے: ہمیں آج جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ وہ لوگ جن کو یقین تھا کہ اللہ کے ہاں پیش ہونا ہے، کہنے لگے: بہت جگہ تھوڑی جماعت بڑی جماعت پر خدا کے حکم سے غالب ہوئی ہے۔ اور اللہ جم کر لڑنے والوں کے ساتھ ہیں۔''

جالوت ایک مشرک بادشاہ تھا۔ اس نے بیت المقدس میں آ کر بنی اسرائیل کے خلاف جنگ لڑی، اس کو فتح کیا اور بنی اسرائیل کے بہت سے انسانوں کو قتل کیا اور بہت سوں کو قیدی بنالیا۔ اور بنی اسرائیل کے پاس ایک صندوق تھا، جس کا نام قرآنِ مقدس نے ''تابوت'' لیا ہے، اس صندوق کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے کچھ تبرکات بھی تھے، اس ظالم بادشاہ نے جب حملہ کیا تو وہ صندوق بھی لے گیا۔ بنی اسرائیل کا زمانہ چونکہ طویل ترین عرصہ پر محیط ہے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے بڑے انعامات واکرام فرمائے، ان کو اپنے زمانے میں فضیلت دی۔ اور سب سے بڑی فضیلت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنی نبوت رکھی، حتیٰ کہ عام روایات کے مطابق یہ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں چار ہزار نبی بھیجے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر اپنی نعمت یاد دلائی کہ میں نے تمہارے اندر چار ہزار نبی بنائے اور صرف نبوت نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ملوکیت شہنشاہیت کا دور بھی عطا کیا اور ایسی بادشاہت عطا کی جو نہ پہلے کسی کو ملی تھی اور نہ بعد میں کسی کو ملے گی، لیکن ہر نعمت کے بعد بجائے ایمان لانے کے، بجائے شکر کرنے کے انہوں نے ناشکری کی اور کفر کیا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پھر ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ اور کئی دفعہ ایسے واقعات ان پر پیش آئے کہ شاید اس سے ان کی اصلاح ہو جائے کہ کبھی اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا اور کبھی اللہ تعالیٰ نے ان پر جالوت کو بھیجا، جس نے لاکھوں اسرائیلیوں کا قتل کر ڈالا اور ان کے ہیکل سلیمانی کو اجاڑ ڈالا اور ان کی ہزاروں کی تعداد میں لڑکیوں کو کنیز بنالیا، بچوں کو غلام بنالیا اور یہ در بدر ذلیل و خوار ہو گئے۔ جب ان پر اللہ تعالیٰ کا قہر ٹوٹتا تو یہ رونے لگ جاتے تھے اور معافیاں مانگتے اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے درخواستیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو موقع بخشتے

تھے۔ یہ ایک بہت بڑی تاریخ ہے، جو کئی ہزار سال کے زمانے پر مشتمل ہے۔
یہ واقعہ جو ہم پڑھ رہے ہیں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً گیارہ سو سال پہلے کا یہ واقعہ ہے۔

بہرحال جب تابوت واپس آ گیا اور حضرت طالوت نے بھی لڑنے کی تیاری کر لی اور جب لشکر لے کر نکلے تو قوم سے کہا: اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے ایک اور امتحان ہے (جیسا کہ انہوں نے حضرت طالوت کا امتحان لیا تھا) وہ یہ ہے کہ راستے میں ایک نہر آ رہی ہے، اس کو پار کر کے ہم نے جالوت کے لشکر سے لڑنا ہے، لیکن خبردار! کوئی آدمی اس نہر کا پانی نہ پئے۔ اگر کوئی بہت زیادہ مجبور ہو جائے، پیاس زیادہ تنگ کر دے تو چلو میں پانی لے کر پی لیا تو معاف ہے، اس سے زیادہ معاف نہیں ہے۔ قوم کہنے لگی: آپ فکر نہ کریں۔ اب ہم آپ کے بالکل تابع ہیں۔ جب وہاں پہنچ گئے تو سب کے سب پانی پر ٹوٹ پڑے...... اس کے اندر ہم لوگوں کے لیے بھی سبق ہے کہ آج جو گناہوں کی نہر بہہ رہی ہے، اس میں ہمارے لیے امتحان ہے کہ کون ہے جو اس سے بچتا ہے؟ اور کون ہے جو اسے چکھتا ہے؟...... جب قوم نے زیادہ پانی پی لیا اور نہر سے باہر نکلے تو کہنے لگے: ہم تو آگے جانے کے قابل نہیں رہے، (کیونکہ وہ تو امتحان میں فیل ہو گئے تھے) ہمارے اندر طاقت نہیں کہ ہم جالوت کے لشکر کا مقابلہ کر سکیں۔

اب اس واقعہ کے اندر دیکھیں کہ یہاں تین حصے بن گئے: ایک وہ جنہوں نے نہر کے پانی کو چکھا بھی نہیں، دوسرے وہ جنہوں نے پیٹ بھر کر پانی پی لیا اور تیسرے وہ جنہوں نے تھوڑا سا پانی پیا تھا۔ اب جنہوں نے زیادہ پی لیا تھا وہ کہنے لگے: ہم تو نہیں لڑ سکتے۔ ﴿قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ جو ایمان والے تھے اور جن کو پکا یقین تھا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے روبرو جانا ہے، انہوں نے کہا: لوگو! ڈرو نہیں۔ کبھی تھوڑی جماعتوں کو اللہ تعالیٰ اپنے امر سے بڑی جماعتوں پر غالب کر دیتے ہیں۔ اگر ہم تھوڑے ہیں تو کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ کی مدد تو ہمارے ساتھ ہے۔ لیکن جن لوگوں نے پانی پیا تھا انہوں نے کہا: ہم تو نہیں لڑتے۔ تو اب حضرت طالوت کے ساتھ چند آدمیوں کا لشکر رہ گیا اور باقی سب بھاگ گئے۔ آگے جالوت لشکر لے کر آ گیا۔ اب جو پکے ایمان والے تھے، جب دشمن کے لشکر آمنے سامنے ہوئے تو انہوں نے کہا: ﴿رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۵۰] اے پروردگار! ہمیں اپنی رحمت سے صبر کرنے والا بنا دے کہ ہم جم جائیں۔ اور اے اللہ! ہمیں دشمنوں کے مقابلے پر استقلال نصیب کر، ثابت قدمی نصیب کر اور قوم

کافرین کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم میری طرف متوجہ ہوئے ہو تو اب میرا نام لے کر ابتدا کرو۔ جب لڑے تو حضرت طالوت کی فوج کو اللہ تعالیٰ نے فتح دے دی اور جالوت حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں سے قتل ہوا۔

حضرت طالوت جب لشکر لے کر نکلے تو اس وقت لشکر کی تعداد اسی ہزار تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وہ نہر فلسطین اور اردن کے درمیان میں تھی، اس کو انہوں عبور کرنا تھا۔

حضرت سدی رحمہ اللہ نے یہ روایت بھی نقل فرمائی ہے کہ شروع میں حضرت طالوت کا لشکر اسی ہزار تھا، لیکن ۷۶ ہزار نے پانی پی لیا، باقی صرف چار ہزار کا لشکر رہ گیا تھا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم آپس میں باتیں کیا کرتے تھے کہ بدر کے دن ہماری تعداد تین سو اور کچھ تھی۔ ہمارا عدد بھی اتنا تھا جتنا حضرت طالوت کے ساتھ باقی رہ گئے تھا۔ اور اس نہر کو صرف انہوں نے عبور کیا جو خالص مومن تھے اور جو کمزور ایمان والے تھے وہ رہ گئے۔

جن لوگوں نے پانی پیا وہ نہر پار کر کے کہنے لگے: ہم جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے؛ کیونکہ ان کی تعداد زیادہ تھی اور ان کے پاس قوت بھی زیادہ تھی، لیکن اس وقت جو صحیح معنی میں عالم اور اللہ کے وعدے پر یقین رکھنے والے تھے، جو یہ بات جانتے تھے کہ مدد صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ نہ تو مدد لشکر کی تعداد پر موقوف ہے اور نہ ہتھیاروں پر موقوف ہے، بلکہ بعض اوقات کتنی چھوٹی سی جماعتیں ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بڑی جماعتوں پر غلبہ عطا فرما دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی معیت صبر کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایسی مخلوقات پیدا فرمائیں جن کے عدد کا کوئی علم نہیں ہے، لیکن ان تمام مخلوقات میں سے صرف دو مخلوق کو شریعت کا مکلف بنایا ہے۔ شریعت کی پابندی انسانوں اور جنوں پر ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو اس بات پر قادر تھے کہ ایک مخلوق جنت کے لیے پیدا فرما دیتے اور ایک جہنم کے لیے پیدا فرما دیتے۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھے کہ زمین پر جو بندہ بھی پیدا ہوا وہ اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیدا فرمایا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ چاہتے تو بندوں کو مجبور کر سکتے تھے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے کہ اس نے دنیا بنائی اور اس میں انس و جن اور مخلوق کو پیدا کیا اور ان کو اختیار دیا کہ یہ صراط مستقیم ہے اور یہ غلط راستہ ہے۔ اور

اس کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام بھیجے اور اپنی کتابیں اتاریں۔ اس کے بعد پھر اگر کوئی قوم کفر وشرک پر اڑ گئی، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو برباد نہیں کیا، لیکن جب کفر وشرک کے ساتھ انہوں نے فساد برپا کر دیا، اللہ کے نبیوں کے مقابلے پر ڈٹ گئے، پیغمبروں کو قتل کیا اور مظلوموں پر ظلم کیا تو ان پر اللہ تعالیٰ کا قہر آ گیا۔ پھر اس عذاب میں باقی بندوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ تھا کہ تم بھی سمجھ لو۔ اگر تم بھی اس طرح کرو گے تو تمہارے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے امتحان رکھے ہیں، جیسے سنار سونے کو کٹھالی میں گزارتا ہے، ایسے اللہ بندوں کو امتحان میں سے گزارتے ہیں کہ کتنے اس میں کھرے نکلتے ہیں اور کتنے کھوٹے نکلتے ہیں؟ ورنہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ اور نقصان نہیں۔

آج یہی وجہ ہے کہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں طلباء دورہ حدیث مکمل کر کے باہر جاتے ہیں اور ایسے بھی سینکڑوں مدارس ہیں جنہوں نے بس اپنے آپ کو وفاق میں رجسٹر نہیں کرایا، وہاں بھی طلباء ہیں، اسی طرح آپ پورے عالمِ اسلام پر نظر ڈالیں، لیکن جس انداز میں دین کا کام ہونا چاہیے تھا وہ کام نہیں ہو رہا؛ کیونکہ پہلے زمانے میں طالبِ علم فراغت کے بعد بزرگوں کی صحبت میں رہتا تھا۔ جب وہ ٹھیک ہو جاتا تو بزرگ دین کا کام کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ اب وہ بات نہیں رہی، اب علم صرف زبان تک یا حلق تک ہے۔ آخر کوئی وجہ تو تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت دینے کا فیصلہ پہلے فرما لیا، لیکن نبوت چالیس سال کے بعد دی۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کی فوج کی آزمائش کی تھی، اسی طرح آج امت محمدیہ ﷺ کی آزمائش ہے کہ سب نہریں بہہ رہی ہیں: دولت کی نہریں بہہ رہی ہیں اور عیاشی کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ جو ان سے بچ کر نکل گیا وہ اپنا ایمان بچا گیا اور جو ان میں ڈوب گیا وہ ڈوب گیا۔

﴿وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۛ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾

[البقرۃ: ۲۵۰ تا ۲۵۲]

’’اور جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے ہوئے تو کہنے لگے: اے ہمارے رب! ہمارے دلوں میں صبر ڈال دے اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہمیں کافر قوم پر غالب کر دے۔ پھر مومنین نے جالوت والوں کو اللہ کے حکم سے شکست دی اور داؤد نے جالوت کو مار ڈالا اور داؤد کو اللہ نے سلطنت اور تدبیر عطا فرمائی اور جو چاہا ان کو علم سکھایا۔ اور اگر اللہ ایک کو دوسرے سے دفع نہ کرتے ہوتے تو زمین میں فساد ہوتا اور لیکن اللہ جہان والوں پر بہت مہربان ہے۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ (ﷺ) پر صحیح صحیح پڑھ کر سناتے ہیں اور آپ (ﷺ) بلاشبہ (ہمارے) رسولوں میں سے ہیں۔‘‘

باطل کے مقابلہ میں ہمیشہ حق والے تھوڑے رہے ہیں:

آپ تاریخ کا مطالعہ کریں، اللہ تعالیٰ کے قرآن کو پورے تدبر اور غور وفکر سے پڑھیں اور اسی طرح قصص الانبیاء پر غور کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ہمیشہ حق والوں کا عدد تھوڑا رہا ہے۔ اہلِ حق باعتبار عدد کے بھی اکثر تھوڑے رہے اور باعتبار اسباب کے بھی تھوڑے رہے۔

اب دیکھیں کہ جب طالوت اور جالوت کا مقابلہ ہوتا ہے تو حضرت طالوت کی وہ حیثیت نہیں۔ اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کا فرعون سے مقابلہ ہوتا ہے تو دیکھ لیں کہ دو بھائی میدان میں کھڑے ہیں اور کوئی ساتھی نہیں ہے۔ اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو دیکھیں کہ نمرود کے مقابلے پر اکیلے ہیں، حتیٰ کہ والدین اور رشتہ داروں نے بھی ساتھ نہیں دیا۔ اسی طرح سابقہ واقعات دیکھتے چلے جائیں! حضرت نوح علیہ السلام کے دشمن لاکھوں کی تعداد میں تھے اور حضرت نوح علیہ السلام کو ماننے والے بس اتنے تھے جو ایک کشتی میں آ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں کی نصرت فرماتے ہیں تو وہ کسی اسباب کے محتاج نہیں ہوتے۔ جب اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

حضور اکرم ﷺ کے حالات پر نظر دوڑائیں کہ جب آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی تو ایک آپ تھے اور ایک سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ غزوۂ اوّل بدر پر نظر دوڑائیں تو حضور اکرم ﷺ کا تین سو تیرہ کا ایک قلیل لشکر ہے، جن کے پاس نہ گھوڑے ہیں، نہ تلواریں، نہ ہتھیار ہیں اور نہ تجربہ کار لڑاکا سپاہی ہیں۔ ان کے مقابلے پر ایک ہزار آدمیوں کا لشکر ہے اور وہ جنگجو لشکر ہے۔ اسی طرح قیصر وروم نے مقابلہ کرنا چاہا تو اس وقت اسلامی لشکر کے عدد پر بھی نظر ڈالیں

اور دشمن کے عدد پر بھی نظر ڈالیں۔ وجہ یہ ہے کہ خداوند قدوس ہمیں سبق دیتے ہیں کہ دنیا میں اسباب ہیں ان کا خالق خدا ہے، لیکن مومن کا ایمان ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر رہنا چاہیے۔ اسباب کی حد تک جتنا آپ سے ہوسکتا ہے کرو۔ دوسری اخلاص نیت ہے کہ تمہاری نیت خالص اللہ تعالیٰ کی رضا، اعلاء کلمۃ اللہ ہو، اور اس میں کوئی لالچ نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ ملک حاصل کرنا ہے، یا ہمیں بڑی دولت مل جائے گی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا مقصد ہو۔

اس واقعہ کے اندر ہمیں یہ سبق ملا کہ جب میدانِ جنگ میں آؤ تو اپنی طاقت پر نہ اتراؤ، بلکہ فوراً اپنی توجہ اپنے رب کی طرف کرو۔ اس لیے دیکھیں کہ جب دشمن کے مقابلے پر آئے تو انہوں نے فوراً دعا مانگی: ﴿رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ﴾ دعا تب مزہ کرتی ہے جب میدانِ جہاد ہو، سامنے دشمن ہو، آدمی میدانِ جہاد میں مجاہد بن کر کھڑا ہے، کشتیاں جلا کر کھڑا ہے اور پیچھے جانے کی امید نہیں ہے۔ اس وقت جب دعا نکلتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے مدد کے لیے اترنے شروع ہو جاتے ہیں۔

﴿رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا﴾ اے اللہ! ہم پر صبر انڈیل دے۔ یہ نہیں مانگا کہ صبر عطا فرما! کیونکہ ہم تھوڑے سے ہیں اور سامنے تعداد و قوت کے اعتبار سے بڑا دشمن ہے۔ ﴿وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا﴾ اور ہمارے پاؤں جما دے، تاکہ ہم پیچھے نہ ہٹیں اور میدان کے اندر جمے رہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا جالوت کو مارنے کے لیے تین پتھر اٹھانے کی روایت:

﴿فَهَزَمُوۡهُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوۡتَ﴾ حضرت طالوت کے لشکر میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نبی ہیں اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اللہ کے نبی ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو ابھی نبوت نہیں ملی تھی، جس وقت یہ لڑائی ہوئی تھی۔ سابقہ کتابوں کی روایات میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے کپڑے میں تین پتھر رکھے ہوئے تھے اور ان کے پاس غلیل تھی، جس کے ساتھ پتھر مارا جاتا ہے۔ بعض ساتھی تعجب کرتے تھے کہ اتنے جنگجو قبیلے کے ساتھ ہماری لڑائی ہے اور دیکھو! داؤد پتھر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جا رہے تھے۔ ایک پتھر کے قریب سے گزرے تو اس پتھر نے آواز دی کہ مجھے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لو، میں تمہارے کام آؤں گا۔ ان چیزوں کا ذکر نہ اللہ کے قرآن میں ہے اور نہ کسی صحیح حدیث مبارک میں ہے۔

یہ اسرائیلی روایات ہیں، ان کی حقیقت کا اللہ تعالیٰ کو پتہ ہے؛ کیونکہ قاعدہ ہے کہ سابقہ کتابوں کی روایات پر آدمی آنکھیں بند کر کے ایمان نہیں لا سکتا؛ کیونکہ جب یہود و نصاریٰ نے اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات و انجیل کو بدل ڈالا تو باقی کتابوں کی کیا حیثیت ہے؟ اور نہ ہم ان کی تکذیب کریں گے، بلکہ ہم یہ دیکھیں گے کہ اگر وہ روایات کتاب وسنت کے مطابق ہیں تو لے لیں گے اور اگر کتاب وسنت کے مخالف ہیں تو ہم ان کو چھوڑ دیں گے اور اگر وہ نہ موافق ہیں نہ مخالف تو ہم ان کے متعلق خاموش رہیں گے۔

بہر حال روایات کے اندر ہے کہ جب جالوت لشکر لے کر مقابلے پر آیا تو وہ اتنا مسلح تھا کہ زرہ کے اندر چھپا ہوا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے غلیل کے اندر پتھر رکھ کر مارا تو وہ کھوپڑی کو چیرتا ہوا پار نکل گیا۔ جب فوج کا بادشاہ گر کر مر گیا تو فوج میں افراتفری پھیل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے نصرت فرمائی اور دشمن کو شکست ہو گئی، حضرت طالوت کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد حضرت طالوت نے اپنی بیٹی کی شادی حضرت داؤد علیہ السلام سے کی اور ان کو اپنے اقتدار میں بھی شریک کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت اور بادشاہت حضرت داؤد علیہ السلام کے گھر کی طرف پھیر دی۔

چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام نے پتھر سے دشمن کو مارا تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے پہاڑوں کو مسخر کر دیا کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام تسبیح کہتے تھے تو پہاڑ بھی ساتھ تسبیح کہتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوہے کو بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں نرم فرما دیا۔ ان کے ہاتھ میں لوہا ایسے ہو جاتا تھا جیسے موم نرم ہوتی ہے، نہ کسی بھٹی میں ڈالنے کی ضرورت اور نہ پگھلانے کی ضرورت تھی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقائے نامدار حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک صالح بندے کی وجہ سے ایک سو گھروں سے بلا رفع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کے اندر میری حکمتیں ہیں کہ میں اپنے بندے بھیج کر دشمنوں کو شکست دے دیتا، ورنہ دنیا کے اندر عبادت خانہ بھی نہ رہتا اور سب تباہ و برباد ہو جاتے۔

(حدیث) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''وَاِنَّ اللّٰهَ لَيُصْلِحُ بِصَلَاحِ الرَّجُلِ الْمُسْلِمِ وَلَدَهٗ وَ وَلَدَ وَلَدِهٖ وَاَهْلَ دُوَيْرَتِهٖ وَ دُوَيْرَاتٍ حَوْلَهٗ، وَلَا يَزَالُوْنَ فِيْ حِفْظِ اللّٰهِ

عَزَّوَجَلَّ مَا دَامَ فِيهِمْ ''اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے صالح ایمان والے بندے کی وجہ سے اس کی اولاد، اس کی اولاد کی اولاد، اس کے ساتھ حویلی والوں اور اس کے ساتھ جو اور گھر ہوتے ہیں اس کی حفاظت کرتے ہیں جب تک وہ بندہ ان میں رہتا ہے۔[تفسیر درمنثور: ۱/ ۳۲۰]

(حدیث) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تمہارے اندر سات قسم کے آدمی ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرماتے ہیں، جن کی وجہ سے تمہیں بارشیں دیتے ہیں اور جن کی وجہ سے تمہیں رزق دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ قیامت آجائے گی۔

(حدیث) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہیں ضعیفوں کی وجہ سے رزق دیتے ہیں۔ وہ جب دعائیں مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ تمہیں رزق نصیب فرمادیتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ بعض اوقات جانور کیڑے حشرات الارض کی وجہ سے رحمت فرمادیتے ہیں۔

(حدیث) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلْأَبْدَالُ فِي أُمَّتِي ثَلَاثُونَ'' ''میری امت کے اندر (ہر وقت) تیس ابدال (رہتے ہیں)۔ یعنی ہر دور کے اندر اللہ تعالیٰ پیدا فرمائیں گے۔ ان کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ تمہیں رزق دیتے ہیں، ان کی دعاؤں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تم پر اپنی بارشیں برساتے ہیں اور ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرماتے ہیں۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: جب میں نے یہ حدیث پاک سنی تو میں نے امید کی کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی ان میں سے ہوں گے۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۵۱] اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحمت فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بعض سے بعض کو شکست دیتے ہیں، اسی فتح وشکست میں اس کی حکمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے جمیع افعال واقوال کے اندر حکمتیں ہیں، کبھی اللہ تعالیٰ مدد کر کے کفر کو شکست دے دیتے ہیں، ورنہ کفر تو ساری دنیا مٹا ڈالے۔

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۵۲] اس میں اثبات رسالت اور شانِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرمائی ہے کہ میرے مدنی! یہ جو آیات آپ پڑھ پڑھ کر ان کو سنا رہے ہیں، طالوت جالوت کا قصہ بتا رہے ہیں، آپ اس زمانہ میں موجود نہیں تھے۔ یہ دلیل ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اللہ پاک آپ پر وحی بھیجتے ہیں تو آپ یہ سابقہ زمانوں کے خبریں دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو واقعات آپ کو پڑھائے

[1] [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۸۷]

ہیں، اس کے عین مطابق سابقہ کتابوں کے اندر موجود ہیں، بنی اسرائیل کے علماء اس کو پڑھتے ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ آپ اللہ کے سچے نبی اور رسول ہیں۔

﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۵۲] "اِنَّ" تاکید کے لیے ہے اور "کَ" بھی تاکید کے لیے ہے۔ یہ سب تاکیدات ہیں۔ اور لام بھی تاکید کے لیے ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے نبی کی رسالت کا اثبات ہو کہ آپ اللہ کے سچے نبی اور رسول ہیں۔ تب ہی تو ہم نے وحی کے ذریعے یہ ساری خبریں دی ہیں۔

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۵۳، ۲۵۴]

"یہ رسول ہیں۔ ہم نے ان میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ کوئی تو وہ ہے کہ اللہ نے اس سے کلام کیا اور بعض کے درجات کو بلند کیا اور عیسیٰ ابن مریم کو ہم نے کھلی نشانیاں دیں اور ان کو روح القدس سے تائید بخشی۔ اور اگر اللہ چاہتا تو جو لوگ ان پیغمبروں کے بعد ہوئے ہیں باہم نہ لڑتے، اس کے بعد کہ ان کے پاس صاف دلائل پہنچ چکے تھے، لیکن ان میں اختلاف پڑ گیا۔ پھر بعض تو ان میں سے ایمان لائے اور بعض نے کفر کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن اللہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔ اے ایمان والو! خرچ کرو کچھ ہمارا دیا ہوا اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہے، نہ آشنائی اور نہ سفارش۔ اور جو کافر ہیں وہی ظالم ہیں۔"

افضلیت حضرت محمد ﷺ:

ان آیات مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اثباتِ رسالت اور اس کے بعد آپ ﷺ کی فضیلت اور عظمت کا ذکر فرمایا ہے۔

یہودیوں نے حضور اکرم ﷺ کو کیوں نہیں مانا؟ حالانکہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب تھی اور وہ پڑھے لکھے

لوگ تھے۔ تورات کے اندر حضور اکرم ﷺ کی بہت سی صفات اور بہت ساری نشانیاں اتنی واضح موجود تھیں کہ ذرا بھی آدمی غور کرتا تو فوراً سمجھ جاتا، لیکن اس کے باوجود وہ حضور اکرم ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے۔ ایک تو ان کے دلوں کے اندر حسد تھا کہ محمد عربی ﷺ کی شان افضلیت نہ ماننی پڑے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے شانِ محمد عربی ﷺ اور رد علی المنکرین والحرفین عن رسالۃ النبی کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ﴾ اللہ تعالیٰ نے جو رسول بھیجے ہیں ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ ان رسولوں میں سے ایک رسول ایسے ہیں جن کو ہم نے شرف کلام بخشا ہے کہ بغیر واسطہ، بغیر ملائکہ کے اور بغیر جبرئیل کے اللہ پاک نے خود کلام فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرف کلام بخشا۔ اور ہم نے ایک دوسرے پر ان کے درجات کو بلند کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم جو میرے مدنی سے جلتے ہو، فضیلت دینا میرے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت بخشی ہے۔

مشہور روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے ہیں، ان میں تین سو تیرہ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے اور پھر تین سو تیرہ میں پانچ وہ رسول ہیں جن کی صفت اولوالعزم من الرسل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الاحقاف: ۳۵]۔ وہ پانچ ان تین سو تیرہ پر افضل ہیں۔ پھر سب سے افضل، سب سے اکمل، سب سے اجمل، سب کے سردار اور سب کے امام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، بلکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: آدم میرا ابا ہے۔ باعتبار ظاہری قاعدے کے باپ افضل ہوتا ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری شان اتنی بلند کر دی ہے کہ قیامت والے دن میرے پرچم شفاعت کے نیچے حضرت آدم علیہ السلام کھڑے ہوں گے۔ ابراہیم علیہ السلام میرے ابا ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے میری عظمت ایسی بنائی ہے کہ قیامت والے دن ابراہیم علیہ السلام میرے پرچم کے نیچے کھڑے ہوں گے۔

اس لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا: سب سے پہلے بھی میں ہوں اور سب سے آخر بھی میں ہوں۔ اسی طرح اپنی امت کو فرمایا کہ سب سے اوّل بھی میری امت اور سب سے آخر میں بھی میری امت ہے۔

یاد رکھیں! ہمارے بعض بھائیوں کو غلط فہمی ہے یا محبت کے دریا میں غوطہ لگا تو بہہ گئے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اوّل بھی میں ہوں اور آخر بھی میں ہوں تو ان کے قدموں میں لغزش آگئی اور وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اوّل و آخر تو اللہ تعالیٰ کی صفت تھی، وہی صفت نبی میں آگئی ہے۔ اس لیے وہ حضور اکرم ﷺ کو مقام عبدیت سے مقام

ربوبیت پر لے گئے، حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے اس کی وضاحت فرمادی کہ میری امت اوّل بھی ہے اور آخر بھی ہے۔ اب اگر اوّلیت سے مراد خدا کی اوّلیت ہے تو پھر ساری امت اوّل ہوگئی، حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ ہم اوّل اس اعتبار سے ہیں کہ جب تمام امتیں کھڑی ہوں گی تو سب سے پہلے میری امت کو داخلہ ملے گا اور آخر ہو گئے باعتبار بعثت کے کہ جب ساری امتیں گزر گئیں، ساری امتوں کے دور گزر گئے اور انسانیت اپنے معراج کو پہنچ گئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنا نبی بھی۔ ایسا بھیجا جو ہر لحاظ سے کامل تھا، ورنہ پہلے تو نبی کے بعد نبی آتے گئے۔ اب تو ہر چیز کی انتہاء ہوگئی۔ انسانیت بھی اپنے معراج کو پہنچ گئی، علم بھی اپنے معراج کو پہنچ گیا، جتنے علوم تھے عمرانیات اور اقتصادیات سب اپنی معراج کو پہنچ گئے۔ جب ہر چیز کی انتہاء ہو جائے تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اب چونکہ دنیا کی انتہاء کا زمانہ آرہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے سب سے افضل نبی سید الاوّلین والآخرین کو بھیجا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں اوّل اس طرح ہوں کہ سب سے پہلے جنت کا دروازہ میں کھٹکھٹاؤں گا، میں سب سے پہلے شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سب سے پہلے میں اپنی قبر مبارک سے کھڑا ہوں گا۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر ارشاد فرمایا: ظالمو! تم جو حسد کی بنا پر میرے مدنی پر ایمان نہیں لا رہے ہو اور میرے مدنی کی فضیلت سے جل رہے ہو، مت جلو! یہ تو میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے رسولوں کو فضیلت دی ہے، میں نے زمانہ کو فضیلت دی ہے، میں نے مکان کو فضیلت دی ہے اور میں نے انبیاء اور رسولوں کو فضیلت دی ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے چھ چیزیں ایسی عطا فرمائی ہیں جو کسی نبی کو نہیں ملی ہیں۔ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا: یارسول اللہ! وہ کیا چیزیں ہیں؟ فرمایا:

- ”اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ“ اللہ تعالیٰ نے مجھے جوامع الکلم عطا فرمائے کہ ایک ایسا کلمہ جس کے اندر معانی کے دربہہ رہے ہوں۔
- اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی عظمت دی ہے کہ اگر میں ایک مہینہ کی مسافت پر دور ہوتا ہوں تو اللہ تعالیٰ میرا رعب دشمنوں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں۔
- اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ بھی فضیلت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے مالِ غنیمت کو حلال کردیا ہے، (جبکہ پہلے زمانے میں مالِ غنیمت حلال نہیں تھا، بلکہ اوپر سے آگ آکر اس کو کھا جاتی تھی)۔

❀.....پہلی امتوں کی نماز بغیر مسجد کے ادا نہیں ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ نے پوری زمین کو میری امت کے لیے مسجد بنا دیا کہ جہاں (پاک جگہ) کھڑے ہوں نماز پڑھ لیں نماز ادا ہو جاتی ہے۔

[صحیح البخاری، رقم: ۱/۱۲۸، صحیح مسلم: ۱/۳۷۰]

حضور اکرم ﷺ کی سچائی کا بیان:

جتنے نبی اور رسول آئے ان کی دعوت بڑی واضح تھی۔ مسجد حرام میں ابوجہل اور اس کے سارے ساتھی ایک دفعہ اکٹھے ہوئے اور کہنے لگے کہ محمد عربی (ﷺ) کا معاملہ ہم پر بالکل خلط ملط ہو گیا ہے، سمجھ نہیں آ رہی کہ ان کے کلام کو شاعری کہیں یا آپ جادوگر ہیں کہ جو بندہ آپ کی بات سنتا ہے وہ ساتھ ہو جاتا ہے اور پھر ایسی ایسی خبریں دیتے ہیں جن کا کسی کو پتہ نہیں۔ سمجھ نہیں آ رہی: کاہن ہیں یا کیا ہیں؟ تو روایات میں موجود ہے عتبہ نے کہا: تم مکہ کے سردار ہو، پڑھے لکھے ہو، لیکن تمہیں پتہ ہے کہ میں کتنا شعر کو سمجھنے والا ہوں، جادو کو سمجھنے والا ہوں۔ اگر تم مجھے اپنا نمائندہ بناؤ تو میں محمد (ﷺ) سے بات کر کے فیصلہ کرتا ہوں، مسئلہ کھل جائے گا، میں آپ کو ان کی شان بتاؤں گا۔ سرداروں نے اجازت دے دی۔

حضور اکرم ﷺ بھی مسجد الحرام میں بیٹھے تھے، وہ وہاں آ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: میں نے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں، کیا اجازت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل اجازت ہے۔ اس نے کہا: میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ آپ بہتر ہیں یا آپ کے دادا ہاشم جو گزرے ہیں وہ بہتر ہیں؟ آپ بہتر ہیں یا عبدالمطلب بہتر ہیں؟ آپ بہتر ہیں یا آپ کے ابا عبداللہ بہتر ہیں؟ کیا وہ لوگ سب غلط تھے؟ تو آپ کیوں ہمارے خداؤں کو گالیاں دیتے ہیں؟ کیا وہ سب بے وقوف تھے جو ان کی عبادت کرتے رہے؟ تو کیا تمہارا باپ دادا پاگل تھا، عقل سے فارغ تھا؟ آپ کیوں ہمارے اندر تفریق ڈال رہے ہیں؟ جبکہ ہم ٹھیک ٹھاک آپس میں رہ کر زندگی گزار رہے تھے۔ آپ نے ہم کو جدا کر دیا ہے۔ اگر بیٹا آپ کے ساتھ ہے تو باپ ہمارے ساتھ ہے۔ تفریق ہو گئی ہے۔ یہ سارے.....نعوذ باللہ ......اختلاف آپ نے کیوں ڈالے ہیں؟ وہ یہ ساری باتیں کرتا رہا اور حضور اکرم ﷺ یہ ساری باتیں سنتے رہے۔ جب اس نے بات ختم کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے اپنی بات ختم کر لی ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اب میں جو کہتا ہوں وہ تم سنو۔ حضور اکرم ﷺ نے سورۃ حم سجدہ کی تلاوت کی اور پڑھتے آئے۔ جب اس آیت پر پہنچے: ﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ﴾ [فصلت: ۱۳] اے

میرے مدنی! اگر یہ کفار قریش تیری باتوں سے پھر بھی انکار کریں تو ان کو اس عذاب سے ڈرائیں جیسا کہ قوم عاد اور قوم ثمود پر آیا تھا تم پر بھی وہی عذاب آئے گا۔ تو عتبہ کانپنے لگ گیا، ڈر کر کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ حضور اکرم ﷺ کے منہ مبارک پر رکھا اور کہنے لگا: خدا کے لیے مہربانی کریں! ہم آپ کے رشتہ دار تو ہیں، خدا کے لیے ہمیں عذاب سے بچائیں، اس کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ حضور اکرم ﷺ سے سیدھا گھر چلا گیا۔

سردار سارے حرم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کا پتہ کرایا تو پتہ چلا کہ وہ تو گھر چلا گیا ہے۔ سردار کہنے لگے: معلوم ہوتا ہے کہ وہ صابی ہو گیا ہے، ہم یہاں اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابو جہل کہنے لگا: ٹھہرو! میں جاتا ہوں، میں اس کے مزاج کو جانتا ہوں۔ ابو جہل سیدھا عتبہ کے گھر آیا اور دروازے پر آ کر کہنے لگا: معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی صابی بن گئے ہو، تم نے بھی باپ دادا کے دین کو چھوڑ دیا ہے؟ تم نے تو کمال کر دیا ہے! تم تو خود اپنے مذہب سے چلے گئے ہو۔ عتبہ نے کہا: ایسی باتیں نہ کرو۔ میں نے کوئی اپنا مذہب نہیں چھوڑا اور اگر تم مجھے طعنہ دیتے ہوں تو میں قسم کھاتا ہوں: ''وَاللهِ! لا أُكَلِّمُ مُحَمَّدًا'' مجھے اللہ کی قسم ہے کہ آج کے بعد میں محمد عربی (ﷺ) سے کبھی بات نہیں کروں گا، لیکن میں تمہیں ایک بات کہتا ہوں کہ میں بھی اسلام نہیں لاتا، لیکن ایک بات یاد رکھو کہ وہ شاعر نہیں ہے، جادوگر بھی نہیں ہے اور کاہن بھی نہیں ہے۔ وہ جو کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے، وہ اللہ کا نبی ہے۔ میں نے اگر منت نہ کی ہوتی تو تم جانتے ہو کہ جو حضور اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا وہ سچ ہوتا ہے تو تم پر بھی عذاب آ جاتا۔[1]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب ہم نے رسول اور نبی بھیجے، کتابیں اتاریں اور اتنے واضح دلائل دیئے کہ کسی اندھے کو بھی شک نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود قوموں نے دلائل و معجزات آنے کے بعد بھی جھگڑا کیا، نبیوں سے بھی لڑ پڑے۔ جب میری اتنی رحمت کے بعد بھی باز نہ آئے، پھر ہم نے بھی حکم دے دیا کہ ان سے جہاد کرو۔

اس کے اندر یہ بات بھی سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم نے رسولوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''لا تُفَضِّلُوْنِيْ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ''۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''لا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ''[2] مجھے نبیوں پر نہ بڑھاؤ۔ وہ بھی اللہ کے نبی ہیں اور میں بھی اللہ کا نبی ہوں۔

[1] [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۸۷]
[2] [صحیح البخاری: ۸/ ۱۹۴]

اور فرمایا: ''لَا تُطْرُوْنِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰى عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ وَلٰكِنْ قُوْلُوْا: عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ'' میری شان کو ایسے نہ بڑھاؤ جیسے نصرانیوں نے اپنے نبیوں کی شان بڑھائی کہ حدود سے نکل گئے۔

[صحیح البخاری، رقم: ۳۴۶۱، شمائل ترمذی، رقم: ۳۲۲]

یاد رکھیں! بڑھانے کا معنی یہ ہے کہ ایک نبی کی شان ایسے بیان کرو جس سے دوسرے نبی کی توہین معلوم ہو تو یہ ناجائز ہے۔

ایک فضیلت جزی ہوتی ہے اور ایک فضیلت کلی ہوتی ہے۔ یعنی اگر مجموعی فضیلتیں سامنے رکھی جائیں تو سب نبیوں کے سردار محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور اگر جزوی فضیلتیں دیکھی جائیں تو بعض نبیوں میں جزوی فضیلت دوسرے سے زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

نبی اور رسول کے معنی میں فرق:

یاد رکھیں! ہر رسول نبی ہوتا ہے، لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ رسول اور نبی میں فرق یہ ہے: رسول وہ ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ تبارک وتعالیٰ نے شریعت عطا فرمائی ہو یا مستقل کتاب عطا فرمائی ہو۔ اور نبی کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کو مستقل کوئی کتاب ملے، بلکہ وہ سابقہ کتابوں اور شریعتوں کے تابع ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تورات دی اور حضرت ہارون علیہ السلام تورات ہی کے مطابق تبلیغ اور دعوت دیتے تھے۔ اس لیے حضرت ہارون علیہ السلام نبی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام رسول ہیں۔ اسی طرح یہ بھی دیکھ لیں کہ نبوت عام ہے اور رسالت خاص ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم وبیش نبی بھیجے ہیں، ان میں رسول صرف تین سو تیرہ ہیں۔ رسالت کا مرتبہ نبیوں سے بڑھ کر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی اور رسولوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی، اگرچہ نبوت ورسالت میں بھی سب شریک ہوتے ہیں۔

یاد رکھیں کہ نبوت یا رسالت کسبی چیز نہیں ہے۔ ولایت، کسی بندے کا ولی بن جانا کسبی چیز ہے، جو محنت سے حاصل ہو جاتی ہے، یعنی اگر کوئی بندہ صحیح معنوں میں اکلِ حلال، صدقِ مقال، یعنی کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا حلال سے کرلے، زبان پر کبھی جھوٹ نہ آنے دے، اللہ تعالیٰ کے فرائض، واجبات اور سنت ونوافل کی پابندی کرے، محرمات سے بچ جائے، مامورات کی تعمیل کرے تو محنت کرتے کرتے اللہ تعالیٰ اس کو مقامِ ولایت عطا فرما دیتے ہیں۔ اور کوئی بندہ بھی مقامِ ولایت پر پہنچ سکتا ہے؛ کیونکہ یہ محنت سے حاصل ہونے والی چیز ہے۔ لیکن نبوت و

رسالت کسی چیز نہیں ہے، بلکہ وہبی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم کامل کے مطابق جس کو چاہتے ہیں نبوت و رسالت کے لیے چن لیتے ہیں۔ کوئی آدمی محنت کرنے سے نبی نہیں بن سکتا۔

مرزا قادیانی کو نبی ماننے والے لوگوں کو یہی دھوکہ دیتے ہیں کہ قرآن میں آیا ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝﴾ [النساء:٦٩] کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کی وہ اطاعت کرنے والے لوگ قیامت میں انبیاء کے ساتھ، صدیقین کے ساتھ، شہداء کے ساتھ اور صالحین کے ساتھ ہوں گے۔ کیا ہی بہترین پسندیدہ رفاقت ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ انبیاء وصدیقین کی رفاقت نصیب کردے۔ اس آیت سے قادیانی لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرنے سے آدمی صدیق بن سکتا ہے، شہید بن سکتا ہے، صالحین میں شمار ہوسکتا ہے تو نبی کیوں نہیں بن سکتا؟

حالانکہ وہاں یہ نہیں ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کرے وہ نبی بن جائے، بلکہ وہاں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ قیامت والے دن ان کے ساتھ ہوگا۔ یہ نہیں فرمایا کہ وہ بھی نبی بن جائے گا۔ نبی کے ساتھ ہونا علیحدہ بات ہے اور نبی ہونا علیحدہ بات ہے۔ لاکھوں صحابہ میرے مدنی کے ساتھ ساتھ تھے تو کیا سب نبی بن گئے؟

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝﴾ [البقرة:٢٥٥]

''اللہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، زندہ ہے، سب کا سنبھالنے والا ہے، نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ کون ایسا ہے جو اس کے پاس سفارش کرے؟ مگر اس کی اجازت سے۔ وہ جانتا ہے مخلوق کے روبرو اور ان کے غائب حالات کو اور وہ سب احاطہ نہیں کرسکتے اس کے علم میں سے کچھ، مگر جس قدر وہ چاہے۔ اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے۔ اور وہ ان کے تھامنے سے نہیں تھکتا اور وہ عالیشان ہے، سب سے بڑا ہے۔''

آیت الکرسی کی تاثیر:

(واقعہ) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان فرمائی کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس جن کو پکڑ لیا۔ اس نے کہا: مجھے چھوڑ دو، میں تجھے ایسی آیت بتاتا ہوں جس سے تجھے بڑا فائدہ ہوگا۔ میں نے کہا: وہ کیا کلمات ہیں؟ اس نے کہا: جب تم رات کو لیٹنے کا ارادہ کرو تو لیٹتے ہوئے تم آیت الکرسی پڑھ لیا کرو تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کرنے والا تمہاری حفاظت کرے گا اور شیطان تمہارے قریب نہیں آئے گا، جب تک کہ تم صبح اٹھو گے۔ تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ جب صبح ہوئی تو میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے اپنے قیدی کے ساتھ کیا کیا؟ میں نے کہا: یا رسول اللہ! اس نے کہا تھا: میں آپ کو ایسے کلمات سکھاتا ہوں جس سے اللہ تعالیٰ فائدہ دیں گے۔ اس وجہ سے میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر اس نے تمہیں کیا سکھایا؟ اس نے کہا تھا: آیت الکرسی پڑھ لیا کریں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ تمہاری حفاظت کرے گا اور ساری رات تمہیں شیطان بھی نہیں چھیڑے گا۔ راوی بیان فرماتے ہیں کہ صحابہ تو خیر ڈھونڈنے میں زیادہ حریص تھے، اس لیے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کو چھوڑ دیا کہ ایک بات بتائی ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوہریرہ! اس نے تمہارے ساتھ تو بات سچی کی ہے، لیکن وہ جھوٹا ہے۔ کیا تمہیں پتہ بھی ہے کہ تم تین راتیں کسے پکڑتے رہے ہو؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: مجھے تو پتہ نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شیطان تھا۔ [مستفاد من صحیح البخاری: رقم:۲۳۱۱، ۳۲۷۵]

اس آیت الکرسی کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ جو سب سے بڑا اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے وہ بھی مانتا ہے کہ آیت الکرسی کی یہ شان ہے اس لیے ایک محاورہ ہے: "كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ كُلِّ حَكِيمٍ فَإِذَا وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا" [1] کلمۂ حکمت مومن کی گمشدہ شے ہے۔ اگر دیوار پر بھی کوئی اچھی نصیحت لکھی ہوئی ہو تو اس سے بھی سبق حاصل کرو۔ دشمن سے بھی کبھی خیر کی بات مل جاتی ہے۔

اس سے ہمیں دوسرا یہ سبق ملا کہ آج کل ہمارا یہ ذہن بن گیا ہے کہ اگر ہمارا دشمن اور مخالف کوئی سچی بات بھی کرے تو ہم سو بہانے کرتے ہیں۔ ہم کہیں گے: مقصد یہ تھا وہ ویسے خوشامد کر رہا تھا، وہ آپ کو دھوکہ دینا چاہتا تھا،

[1] [جمع الجوامع: رقم:۱۵۹۷۲]

جبکہ اسلام ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ اگر مخالف بھی کوئی سچی بات کرے تو کہو کہ سچی بات ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس اس کمرے کی چابی تھی جس میں صدقہ کا مال تھا۔ ایک دن آپ چابی لگا کر اندر گئے تو دیکھا کہ کھجور مٹھی بھر کم معلوم ہو رہی ہے، دوسرے دن دیکھا کہ کھجور کم معلوم ہو رہی ہے، پھر تیسرے دن اس طرح دیکھا اور حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم چور کو پکڑنا چاہتے ہو؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: جی ہاں! ۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تم دروازہ کھولو تو کہو: ''سُبْحَانَكَ مَنْ سَخَّرَكَ مُحَمَّدٌ ﷺ'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے ایسے پڑھا تو وہ چور پکڑا گیا۔ میں نے اس کو پکڑ کر پوچھا: یہ تم روزانہ چوری کر رہے ہو؟ اس نے کہا: میں چوری کرتا ہوں، لیکن میرے چھوٹے بچے ہیں، غریب ہوں، جن ہوں۔ تو میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ فرماتے ہیں: جب اس کو دو تین دن چھوڑتے رہے تو اس کو کہا کہ تم ہر دفعہ وعدہ کرتے ہو کہ میں نہیں آؤں گا، لیکن تم پھر آ جاتے ہو؟ اب میں تم کو نہیں چھوڑتا، آج میں تمہیں پکڑ کر حضور اکرم ﷺ کے پاس لے جاؤں گا۔ اس نے کہا: مہربانی کرو! مجھے وہاں نہ لے جاؤ۔ اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں تمہیں ایسا کلام بتا دیتا ہوں کہ اگر تم اس کو پڑھ لیا کرو تو جن چاہے بڑا ہو یا چھوٹا ہو، مرد ہو یا عورت ہو، تمہارے قریب بھی نہیں آئے گا۔ میں نے کہا: بتاؤ۔ اس نے آیت الکرسی کے بارے میں بتایا کہ یہ پڑھ لیا کرو۔ میں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس نے بات تو ٹھیک کی ہے؛ کیونکہ آیت الکرسی پڑھنے سے شیطان قریب نہیں آتا ہے۔ [سنن النسائی: رقم: ۱۰۷۹۴]

دوسرا قصہ:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انسانوں میں سے ایک آدمی ایسی جگہ پر گیا کہ اس کو جن مل گیا۔ ان میں آپس میں بات چیت ہوئی تو جن نے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ کشتی کرو اور مجھے کشتی میں گرا دو تو میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں گا کہ جن تمہارے قریب بھی نہیں آئیں گے۔ اس انسان نے کہا: ٹھیک ہے، میں لڑتا ہوں۔ جب لڑے تو اس نے جن کو گرا دیا تو اس کے بعد اس نے جن سے کہا کہ تم تو بڑے کمزور جسم کے ہو۔ تمہارے ہاتھ بھی ایسے ہیں جیسے کتے کے ہاتھ ہوتے ہیں، کیا تم سارے ایسے ہوتے ہو؟ اس نے کہا: سارے تو ایسے نہیں ہوتے، طاقتور بھی ہیں، لیکن میں سب میں کمزور ہوں۔ بات یہ ہے کہ اگر آیت الکرسی پڑھ لو تو کوئی شیطان کوئی جن تمہارے قریب

نہیں آئے گا اور بھاگتے ہوئے اس کے پادنکل رہے ہوں گے۔ اس نے پھر بھی کشتی لڑی اور پھر بھی اس کو گرادیا تو اس نے یہ آیت الکرسی بتادی۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ وہ جو جن سے لڑا تھا وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تو نہیں تھے؟ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اور کون ہوسکتا ہے؟ [غریب الحدیث لابی عبید: ۳/۲۱۶]

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے عمر! اللہ تعالیٰ نے تم کو ایسی شان دی ہے کہ جس گلی میں تم گزرتے ہو شیطان وہ راستہ چھوڑ کر دوسری گلی میں بھاگ جاتا ہے۔

(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ آیت الکرسی جس گھر میں پڑھی جائے اگر اس میں پہلے سے کوئی جن ہے تو وہ بھی بھاگ جاتا ہے۔

[المستدرک للحاکم: ۲/۲۵۹]

(حدیث) ایک روایت میں ہے کہ ہر چیز کی ایک بلندی ہوتی ہے اور قرآن کی بلندی سورۃ البقرۃ میں ہے۔ اس میں ایک آیت ہے جو تمام آیات کی سردار ہے۔ [ابن کثیر بحوالہ ترمذی]

واقعات:

ہم جس مدرسے میں پڑھتے تھے وہاں بھی جنات پڑھتے تھے۔ ایک طالب علم بڑا عابد اور زاہد تھا۔ اس کو طالبوں نے کہا: جب رات تہجد کے لیے اٹھو تو مہربانی کر کے ہمیں اٹھا دینا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ جب وہ رات کو مسجد میں تہجد پڑھنے کے لیے گیا تو اس کو یاد آیا کہ میں نے ساتھیوں کو اٹھانا تھا۔ اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ لمبا کیا اور ایک ایک طالب علم کو اٹھایا۔ اب جس کی آنکھ کھلے وہ ہاتھ کو دیکھے، وہ خود بخود بے ہوش ہو جائے۔ صبح جب اساتذہ کو طلباء نے شکایت کی کہ آج ایسے واقعہ ہوا ہے۔ اس کو تلاش کیا گیا وہ نہ ملا اور وہ نکل گیا۔ ہمارے استاذ نے کہا: وہ جن تھا۔ اس کو ہم نے کہا تھا کہ تم شرارت نہ کرو اور پڑھتے رہو، لیکن تم اپنے آپ کو کسی پر ظاہر نہ کرنا، لیکن اس نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ اس ڈر کے مارے وہ مدرسہ چھوڑ کر چلا گیا ہے، اب تمہیں کوئی تنگ نہیں کرے گا۔ مسلمان تھا، علم پڑھنے والا تھا، اس سے غلطی ہوگئی۔

خط ابودجانہ کا اثر:

مجھے یاد ہے ہم چھوٹے سے تھے۔ اپنے والد صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ ایک جلسہ میں گئے۔ وہاں ایک مولوی

صاحب نے آ کر کہا کہ حضرت! ہم آج کل ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ہم نے بڑی کوششوں سے ایک ایک پیسہ جوڑ کر مدرسہ مسجد بنائی، ...... ماشاء اللہ ...... سو ڈیڑھ سو طالب علم ہیں، لیکن جنات نے قبضہ کر رکھا ہے اور انہوں نے تنگ کر دیا ہے۔ طلباء روٹی رکھتے ہیں وہ کھا جاتے ہیں۔ رات کو طلباء سوتے ہیں تو صبح کو کسی کی چارپائی دو کلومیٹر دور پڑی ہے، وہ وہیں سو رہا ہے، کوئی جنگل میں پڑا ہے، کوئی نہر کے کنارے سو رہا ہے۔ طلباء پریشان ہیں، مدرسہ اجڑ جائے گا اور ہم کچھ لوگوں کو لے آئے تھے، جو کہتے تھے: ہم جنات کو نکال دیتے ہیں، انہوں نے کچھ عمل کیا، لیکن جنات نے ان کو بھی اچھی طرح سے مارا، وہ بھی بھاگ گئے۔ والد صاحب نے کہا: مجھے تو کوئی عمل نہیں آتا۔ حدیث شریف میں ایک خط مبارک ہے جو حضور پاک ﷺ نے جنات کی طرف لکھا تھا۔ حدیث مبارک کی کتاب منگوائی اور وہ خط نقل کر کے کہا کہ یہی تم لکھ کر مدرسہ میں ہر جگہ لگا دو۔

کافی عرصہ کے بعد وہ مولوی صاحب ملے تو والد صاحب نے ان سے پوچھا تو اس نے کہا: ...... الحمد للہ ...... بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ جب ہم نے خط لگائے تو ایک دن کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہمارے جن طالبوں پر جنات کا اثر تھا، اس نے دیکھا کہ پوری فوج کی فوج ہے، ان کا سردار آیا اور اس نے کہا: یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔ اب اس مدرسہ کو چھوڑ دو۔ تو وہ سب وہاں سے سامان لے کر چلے گئے اور انہوں نے کہا کہ پہلے یہاں ہمارا گھر تھا، تم نے یہاں مدرسہ بنایا، تم نے ہماری زمین چھینی ہے، اس لیے ہم تمہارے ساتھ لڑتے رہے۔ ہم نے کہا: ہمیں کیا پتہ کہ یہاں تمہارا گھر ہے یا نہیں ہے؟ انہوں نے کہا: اچھا اب ہم نے اس کو چھوڑ دیا ہے، اب ہم تنگ نہیں کریں گے۔ اس کے بعد ...... الحمد للہ ...... مدرسہ میں کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

جنات سے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آدمی بہر حال نہ ڈرے۔ اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور جو بھی قرآن کی آیت یاد ہو پڑھنا شروع کر دے، ...... ان شاء اللہ ...... تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

جنات کے حملہ کی بعض وجوہات:

بہر حال اللہ پاک بچائے۔ جن ہوتے ہیں، لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بعض جنوں کی عورتیں مردوں پر مسلط ہو جاتی ہیں، بعض مرد خوبصورت عورتوں پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اور یہ جنات زیادہ حرکتیں اس وقت کرتے ہیں جب آدمی جنابت کی حالت میں ہو، پلید کپڑوں میں پڑا رہے۔ اسی طرح عورتیں حیض میں ہیں، پھر گندی جگہ پر چلی

گئیں، غسل وقت پر نہ کیا، پاکی پلیدی کا خیال نہ رکھا تو اس زمانے میں جن زیادہ حملہ کرتا ہے، ورنہ آدمی اگر پاک صاف رہے اور قرآن پڑھتا رہے، گھر میں داخل ہوتے وقت آیت الکرسی پڑھ لے اور نکلتے وقت آیت الکرسی پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پھر جنات فتنہ نہیں کر سکتے۔

(حدیث) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ لوگوں کی طرف نکلے، جو کافی سارے جمع تھے۔ آپ نے فرمایا: کون ہے جو مجھے یہ بتائے کہ قرآن میں سب سے زیادہ اعظم آیت کون سی ہے؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اچھا ہے کہ تم نے جاننے والے سے مسئلہ پوچھا ہے۔ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قرآن میں سب سے اعظم آیت آیت الکرسی ہے۔ [ابن کثیر بحوالہ: ابن مردویہ]

(حدیث) حضرت اسما بنت یزید بن السکن کہتی ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ ان دو آیات میں اسم اعظم ہے: ایک آیت الکرسی اور دوسری ﴿الٓمّٓ ۞ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۞﴾ [البقرۃ: آل عمران: ۱، ۲] ان کے اندر اسم اعظم ہے۔ [مسند احمد: ۶/ ۴۶۱]

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ روایت صحیح ہے۔ اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں: ''یا حی! یا قیوم!'' اسم اعظم ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں: یا اللہ اسم اعظم ہے۔

بہرحال! جو اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں ان ناموں کو یاد کر لو (یہ سب سے بڑی نعمت ہے)۔ بس قرآن و حدیث پر یقین ہونا چاہیے اور اس میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ ایک دو دفع جب پڑھیں گے تو یاد ہو جائیں گے۔ ان کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اوّل و آخر درود شریف پڑھ کر دعا ختم کر دی، اس پر عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے سارے کام شروع ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے کچھ اور طریقے بھی لکھے ہیں کہ جیسے اللہ تعالیٰ کے نام ہیں، جس نام کی جس کام سے مناسبت ہے اس نام کو زیادہ پڑھو۔ مثلاً: ایک گناہگار انسان ہے، وہ چاہتا ہے کہ میرے گناہ پر پردہ پڑ جائے تو ''یا ستار! یا ستار!'' پڑھتا رہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ پردہ ڈالنے والے ہیں۔

کم ذات کو علم نہ سکھاؤ:

اس لیے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کہا تھا کہ جو کم ذات لوگ ہوتے ہیں، جن کی نسل نہیں ہوتی وہ جب پڑھ جاتے ہیں تو سب سے پہلے استاذ کے خلاف کام شروع کرتے ہیں۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ ایک مرتبہ ایک شہر میں جا رہے تھے۔ ایک

بستی سے گزرے تو کتے حضرت سعدی رحمہ اللہ کو کاٹنے کے لیے دوڑ پڑے تو بڑے غور سے دیکھنے لگے۔شاگرد نے پوچھا: حضرت! کیا دیکھ رہے ہیں؟ فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں، میں نے ان کو کبھی پڑھایا تو نہیں، یہ مجھے کیسے کاٹتے ہیں؟ اور یہ واقعی تجربہ ہے کہ ہمیں ہر لحاظ سے جو نقصان پہنچایا ہے وہ لوگ تھے جو میرے پاس پانچ پانچ سال پڑھتے رہے تھے۔غیر آدمی تو ایک دن آتا ہے محبت سے درس سنے گا، اس نے کسی کا کیا برا کرنا ہے؟ بہرحال اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ہدایت دے اور انہیں بھی ہدایت دے۔

(حدیث) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم کہ جس سے دعا مانگی جائے وہ دعا پوری ہوتی ہے۔ان تین سورتوں کے اندر ہے: سورۃ البقرۃ، آلِ عمران، طٰہٰ ہے، سورۃ البقرۃ میں آیت الکرسی ﴿اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۥ﴾ [البقرۃ:۲۵۵] کے اندر سورۃ، آلِ عمران میں ﴿الٓمّٓ ① اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ②﴾ [آلِ عمران:۲،۱] میں اور سورۃ طٰہٰ میں ﴿وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۥ﴾ [طٰہٰ:۱۱۱] میں۔[مشکل الآثار:رقم:۴۳۵۹]

(حدیث) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آدمی ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے اس کے جنت میں داخل ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں، مگر موت؛ کہ موت کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمادیں گے۔[سنن النسائی الکبریٰ:رقم:۹۹۲۸]

(حدیث) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی فرمائی کہ ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرو۔جو پڑھے گا اس کے دل کو شاکرین سے اور زبان کو ذاکرین سے اور اس کو منیبین کا ثواب اور صدیقین کے اعمال نصیب کروں گا۔اس پر کوئی ہمیشگی نہیں کر سکتا، مگر پیغمبر یا صدیق یا ایسے بندے جس کے دل کو مانجھ کر صاف کر دیا ہے یا ایسا بندہ جس نے اللہ تعالیٰ کے لیے شہید ہونا ہے۔
[تفسیر ابن کثیر:۱/۶۷۷]

یہ حدیث منکر ہے (کیونکہ اس میں محمد بن الحسن النقاش راوی ہے۔محدث برقانی نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے اور لیکن اس طرح کی ایک روایت حضرت جابر سے بھی مروی ہے، اس کی سند بھی ضعیف ہے۔(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو سورۃ المؤمن ''اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ'' تک اور آیت الکرسی پڑھے تو صبح تک اللہ تعالیٰ اس کو حفاظت میں رکھتے ہیں۔اور جو صبح کو پڑھے شام تک اللہ تعالیٰ اس کو حفاظت میں رکھتے ہیں۔[الترمذی:رقم:۲۸۷۹]

لیکن یاد رکھیں! جب تقدیر آتی ہے پھر پڑھا ہی نہیں جاتا۔ خدا کی قدرت اور اس کا نظام ہے۔ ہر چیز برحق ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ تقدیر کا کوئی فیصلہ فرما دیں تو ہو جاتا ہے۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آیت الکرسی کی فضیلت میں بہت ساری روایات ہیں، لیکن وہ ضعیف ہیں۔ اور بعض کی اسناد درست نہیں ہے، اس وجہ سے ہم نے ذکر نہیں کیا ہے۔

آیت الکرسی کے دس جملوں کی تشریح:

اس آیت مبارک میں اللہ تعالیٰ نے دس جملے ارشاد فرمائے ہیں:

پہلا جملہ ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ﴾ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہی ایک ذات ہے، جو الوہیت کی مستحق ہے، تمام مخلوقات کے لیے کوئی خدا نہیں ہے، مگر اللہ۔ ''إلٰہ'' کا معنی ہوتا ہے معبود برحق کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ تعالیٰ؛ کیونکہ لوگوں نے جھوٹے معبود تو بڑے بنا لیے تھے، عبادت کی جتنی انواع واقسام ہیں صرف اسی کے لیے ہیں، اس کے لیے آدمی خیال رکھے۔ سب سے اہم مسئلہ توحید، الوہیت ہے۔ ایک ہے خدا کو ماننا، وہ تو سب مانتے ہیں۔ جو نہ ماننے والے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی وقت خدا کا نام لے لیتے ہیں۔ اس لیے اصل معنی یہ ہے کہ اس کی الوہیت میں کسی کا قائل نہ ہو کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔

دوسرا جملہ: ﴿اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ﴾ جو زندہ ہے اپنی ذات میں اور اس زندگی میں وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ تم زندہ ہو، لیکن تمہیں خدا نے زندہ کیا ہے۔ جب چاہیں گے مار دیں گے، لیکن اس کی زندگی ذاتی حیات ہے۔ جیسا کہ فرمایا ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ [الحدید: ۳] سب سے پہلے بھی اس کی ذات ہے اور سب سے آخر میں بھی اس کی ذات ہے۔ اس سے پہلے بھی کوئی نہیں تھا، اس کے بعد کوئی نہیں ہوگا۔ وہ ایسا زندہ ہے، اس پر کبھی موت نہیں آئے گی۔ وہ خود بھی زندہ ہے بذاتہ اور ﴿الْقَيُّوْمُ ۚ﴾ ہے، دوسروں کو بھی سنبھالنے والا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ﴿الْقَيُّوْمُ ۚ﴾ کی بجائے ''القیّام'' پڑھتے تھے جو چیزیں دنیا کے اندر ہیں سب اس کی محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات غنی ہے، اس کو کسی کی احتیاج نہیں ہے۔ اور کوئی نہیں جو اس کائنات کو سنبھالنے والا اور چلانے والا ہو، مگر اس کے حکم سے اور اس کی ذات سے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ۭ﴾ [الروم: ۲۵] اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت کی نشانیوں میں یہ نشانی ہے کہ وہی ذات ہے جس کے حکم

سے زمین و آسمان قائم ہیں، وہی ان کو سنبھالنے والا ہے اور کوئی نہیں جو ان آسمان و زمین اور جو ان کے اندر ہے تھام سکے۔

تیسرا جملہ: ﴿لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ﴾ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ اس کو اپنی مخلوق میں کوئی نقص غفلت اور ذہول پیش نہیں آسکتا، اس کی ذات تمام صفاتِ نقصان سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام صفات و کمال و جلال وصفات شان کے ساتھ متصف ہے۔ وہ غفلت سے پاک ہے۔ وہ ایسی صفت قیوم کے ساتھ متصف ہے کہ اس کو بھی اونگھ نہیں آتی اور اس کو نیند بھی نہیں آتی۔ "سِنَةٌ" چھوٹی نیند کو کہتے ہیں، جیسے آدمی اونگھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بھی پاک اور منزہ ہے۔ اور نیند اونگھ سے زیادہ شدی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔

(حدیث) حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے کھڑے ہو کر چار کلمات کے بارے میں ارشاد فرمایا: "إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنَامُ وَلَا يَنْبَغِي لَهٗ أَنْ يَنَامَ" اللہ پاک کبھی نہیں سوتا اور اس کو زیبا بھی نہیں کہ سو جائے؛ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ سو جائے تو مخلوق کہاں جائے گی؟ "يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهٗ" اس کی شان ہے کہ وہ میزان کو اونچا کرے یا نیچا کرے۔ "يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ وَعَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ" دن کے تمام اعمال اللہ کے دربار میں پیش ہوتے ہیں رات آنے سے پہلے اور جو رات میں مخلوق اعمال کرتی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوتے ہیں۔ "حِجَابُهُ النُّوْرِ وَ النَّارِ لَوْ كَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهٰى إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ" اللہ تعالیٰ کے حجابات نور کے حجابات ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے حجابات کو کھول دیں تو اس کے چہرے کی تجلیات کی وجہ سے جہاں تک مخلوق میں نظر جائے گی وہاں سب کچھ جل جائے گا، کوئی برداشت نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت دنیا میں ممکن نہیں ہے، قیامت میں...... ان شاء اللہ تعالیٰ...... مومنین کو رؤیت نصیب ہوگی۔ [صحیح مسلم: رقم: ۱۷۹]

مفسر فرماتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ملائکہ سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نیند کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو تین راتوں تک جگائے رکھو، سونے نہ دو۔ ملائکہ نے ان کو جگائے رکھا۔ جب تین راتیں گزر گئیں تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: اب ان کو دو شیشے کی بوتلیں پکڑا دو اور کہو کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ان کی حفاظت کرو۔ خبردار! یہ چھوٹنی نہیں چاہئیں۔ تین دن کے جاگے ہوئے تھے، کھڑے ہیں۔ جب نیند آتی ہے تو خبردار ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔

اس طرح کرتے کرتے ایسا زور کا جھٹکا لگا کہ شیشہ شیشے پر لگا اور ٹوٹ گیا۔ (ابن جریر نے اس روایت کو ایسے ہی بیان کیا ہے۔ حسن بن یحییٰ عن عبدالرزاق روایت ہے۔ کیا حضرت موسیٰ کو اتنا بھی اللہ تعالیٰ کے متعلق علم نہیں تھا؟ یہ ایک انوکھی بات ہے)۔ [ابن کثیر: ۱/ ۱۷۸، ۱۷۹]

اسی طرح ایک اور روایت بھی ابن کثیر نے مرفوعاً نقل کی ہے، مگر اس پر بھی "غریبا جدًا" اور اسرائیلی ہونے کا حکم لگایا گیا ہے۔ اسی طرح سے ابن کثیر نے تیسری روایت بھی نقل کی ہے (انور)۔

چوتھا جملہ: ﴿لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اس کا وہی مالک ہے، ساری کائنات اس کی مملوک ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ [مریم: ۹۳] جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملک ہے۔ تو اس کے ملک میں کوئی دوسرا کیسے تصرف کر سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: صرف یہی نہیں کہ میرے ملک میں ہیں، بلکہ قیامت والے دن سب علیحدہ علیحدہ ہو کر میرے دربار میں آئیں گے۔ تو جب وہ خود میرے دربار میں پیشی دیں گے تو تمہارے نفع ونقصان کے مالک کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس لیے اگر ساری کائنات مل کر ہمیں نفع پہنچانا چاہے تو نفع نہیں پہنچا سکتی جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ اور ساری کائنات مل کر نقصان پہنچانا چاہے تو نقصان نہیں پہنچا سکتی جب تک کہ اللہ تعالیٰ نقصان نہ پہنچائے۔

اس لیے ہمیشہ اپنے ایمان اور عقیدوں کو صحیح رکھیں۔ ساری زندگی اگر آپ حج وعمرے کرتے رہیں اور عقیدوں میں وہی شرک وبدعت ہو تو کوئی فائدہ نہیں۔

جیسا کہ ایک آدمی نے کسی سے پوچھا کہ ایک کتا ہمارے کنویں میں گر گیا تو کتنا پانی نکالیں؟ تو کسی نے کہا: سو ڈول نکال لو، اور کسی نے کہا: دوسو ڈول نکال لو، اور کسی نے کہا: تین سو ڈول نکال لو، اور کسی نے کہا: پانی کی پیمائش کر لو اتنا پانی کھینچ لو؛ کیونکہ نیچے سے پانی آتا رہتا ہے۔ آخر میں وہ آدمی ایک صحیح عالم دین کی خدمت میں مسئلہ پوچھنے کے لیے آیا، انہوں نے کہا: کیا تمہیں کسی نے یہ بھی کہا کہ پہلے کتا نکالو؟ اس نے کہا: یہ تو کسی نے نہیں کہا۔ انہوں نے کہا: اگر کتا نہ نکالو گے تو ساری زندگی کنواں پاک نہیں ہوگا۔

اس لیے یاد رکھیں کہ چاہے ساری زندگی زمزم سے نہاتے رہیں جب تک شرک اندر موجود ہے اگر اس کو اندر سے نہیں نکالا تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔

پانچواں جملہ: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کون ہے جو میرے آگے سفارش کر سکے؟ مگر میرے اذن سے۔ اور فرمایا: اللہ کے ملائکہ اور اللہ کے انبیاء سفارش نہیں کریں گے، مگر اس کی جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرمائیں گے اور اجازت دیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال و کبریائی ہے کہ کوئی جرات نہیں کر سکتا کہ کسی کے لیے اللہ کے آگے سفارش کرے، مگر اللہ تعالیٰ اذن عطا فرمائیں۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے سجدے میں چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ مجھے سجدے میں رہنے دیں گے جتنا چاہیں گے، پھر مجھے حکم دیا جائے گا کہ اپنا سر اٹھالیں۔ آپ کہیں آپ کی بات سنی جائے گی اور آپ سفارش کریں گے آپ کی سفارش منظور کی جائے گی۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ میرے لیے بھی ایک حد مقرر فرمائیں گے۔ میں ان کی شفاعت کر کے ان کو جنت میں داخل کراؤں گا۔

کیا بداعمالیوں پر ہمیں پیر فقیر چھڑا دیں گے؟

اس آیت سے یہ مسئلہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں کوئی شفاعت نہیں کر سکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اجازت نہ دیں، جبکہ ہمارے بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہم چاہے کتنے گناہگار ہوں، ہمارا پیر پہنچا ہوا ہے، قیامت والے دن پیر ہمیں خود ساتھ لے جائیں گے اور جا کر جنت میں داخل کر دیں گے۔ نماز روزے سے کیا ہے؟ کتنے نماز روزے رکھنے چھوٹ گئے؟ نماز روزہ تو ایک فرض ہے۔ اگر کر سکتے ہو تو کرتے رہو، ورنہ اصل بات یہ ہے کہ اپنا مرشد راضی ہو۔

یہ سب جاہلانہ اور کفر کے عقیدے ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں ہمارے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مقابلہ میں نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ کوئی قیامت تک پیدا ہوگا، حضور اکرم ﷺ سے بڑی شان والا کوئی نہیں ہے۔ ہمارا ایمان یہی ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو اگر اللہ تعالیٰ ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور دوسرے پلڑے میں حضور اکرم ﷺ کو تب بھی آپ کی شان زیادہ ہوگی۔

حضور اکرم ﷺ نے اپنی بیوی کو، اپنی بیٹی کو اور اپنے اہل بیت کو نام لے کر فرمایا: خبردار! اس گمان میں نہ رہنا کہ ہم محمد کی بیٹی، بیوی ہیں۔ اپنے عمل ٹھیک کر لو۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے فاطمہ! اگر دنیا میں مجھ سے کچھ مانگنا ہے تو مانگ لو، میں دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن قیامت کے دن اور قبر حشر میں یہ نہ کہنا کہ میں نبی کی بیٹی ہوں، چھوٹ جاؤں گی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ [الاحزاب:۳۲] ساری کائنات کی عورتیں تمہارا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ تمہاری ایسی شان ہے کہ تمہارے حجرے میں اور تمہارے گھروں کے اندر اللہ تعالیٰ کا قرآن نازل ہوتا ہے۔ اگر تم نے کوئی غلطی کی تو ہم تم کو لوگوں سے دگنا عذاب دیں گے۔ یہ نہیں فرمایا کہ تم کو چھوڑ دیں گے۔

اور اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نمونہ دکھا دیا کہ حضرت لوط علیہ السلام اپنے گھر والوں کو اور بچوں کو لے کر رات کے آخری پہر میں نکل جاؤ اس بستی سے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا، ہم اس بستی پر اپنا قہر نازل کرنے والے ہیں، لیکن آپ کی بیوی کو پناہ نہیں ملے گی، حالانکہ جب حضرت لوط علیہ السلام بستی سے باہر نکلے تو بیوی بھی ساتھ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ کی بیوی جا کر اپنی قوم کے بندوں کو چغل خوری کرتی تھی، لہٰذا اس پر بھی وہ قہر ٹوٹے گا جو تیری قوم پر ٹوٹتا ہے۔ ان کی بیوی کو برباد کر دیا گیا، حضرت لوط علیہ السلام ان کو بچا نہ سکے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا باپ کے سامنے غرق ہو گیا۔ یہ قرآن میں ہے، یہ کوئی ہیر رانجھے کا قصہ نہیں ہے۔

لہٰذا یہ عقیدہ رکھنا کہ ہمیں پیر چھڑا لے گا یا ہمیں قلندر چھڑا لے گا، یہ کیا عقیدے ہیں؟ ایسے جھوٹے اور مکار لوگ آگئے کہ کبھی لوگوں کو رو رو کر دھوکہ دیتے ہیں، کبھی اپنی جھوٹی کرامات سناتے ہیں، کبھی اپنے جھوٹے خواب سناتے ہیں اور کبھی اللہ کے نبی سے ایسا تعلق بتاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ رات دن ان کا حضور اکرم ﷺ سے رابطہ قائم ہے۔ اور دنیا دھوکے میں جارہی ہے۔

(واقعہ) ایک پیر صاحب جب باہر نکلتے تھے تو ان کا دور تھا کہ ملک کے صدر اور وزیر ان کے مرید تھے۔ ان کے آگے پیچھے گاڑیاں ہوتی تھیں، ایک بڑا کارواں ہوتا تھا۔ راستے میں جب دیکھتے کہ کہیں خوبصورت جگہ آگئی تو وہاں کہتے: گاڑی روکو۔ اور گاڑی سے اتر کر ہاتھ باندھ کر دور کھڑے ہوجاتے، سارے لوگ بیٹھے ہیں اور پیر صاحب وہاں کھڑے ہیں۔ آدھا گھنٹہ، گھنٹہ جتنا برداشت ہوسکا، اس کے آنسو بہہ رہے ہیں اور خلیفے پاؤں پر پڑے ہیں کہ حضرت! کیا ہو گیا؟ تو کہا: حضور پاک ﷺ کی سواری جارہی تھی تو میں ملاقات کے لیے گیا تھا...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ......

حالانکہ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد یہ دعویٰ تو بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی نہیں کرسکیں، بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی نہیں کرسکیں۔ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد چھ ماہ بستر پر پڑ گئیں، پھر وفات ہوگئی۔ وہ

فرماتی تھیں: میں کیسے اٹھوں؟ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آجاتا ہے۔ اور یہ دعویٰ تو خادمِ رسول ﷺ حضرت انس رضی اللہ عنہ نہیں کر سکے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نہیں کر سکے اور نبی کے سارے صحابہ یہ دعویٰ نہیں کر سکے کہ ابھی ابھی حضور اکرم ﷺ مدینے جا رہے تھے اور ہم مل کر آ رہے ہیں۔ چودہ سو سال کے بعد یہ پیر اتنی ترقی کر گئے کہ صحابہ اہل بیت رسول ﷺ سے بھی بڑھ گئے۔

یاد رکھیں! عالمِ دنیا کا الگ نظام ہے اور عالمِ آخرت کا الگ نظام ہے۔ جس شخص کی موت کفر پر، قبر پرستی پر اور بت پرستی پر آئی، چاہے وہ سورج کا پجاری ہو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پجاری ہو، حضرت عزیر علیہ السلام کا پجاری ہو یا کسی قبر والے کا پجاری ہو، اگر موت شرک پر آ گئی تو اس کی سزا ہمیشہ کے لیے جہنم ہے۔ اس کی شفاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

شفاعت کس کی کن کے لیے ہوگی؟

جن کی موت ایمان پر آ گئی اور جہنم کے پروانے مل گئے، لیکن ابھی جہنم میں داخل نہیں ہوئے، وہاں بھی اللہ تعالیٰ نبیوں کی سفارش پر چھوڑ دیں گے۔ بعض کو جہنم کے پروانے بھی مل جائیں گے اور جہنم میں ڈال دیے جائیں گے، پھر بھی نبی سفارش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو بھی چھوڑ دیں گے۔

اسی طرح اگر کسی آدمی کے چھوٹے نابالغ دودھ پینے والے یا دودھ پینے کے بعد بلوغت سے پہلے پہلے مر گئے، وہ بھی قیامت میں اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے: اے اللہ! ہم بھی تیرے بندے ہیں، ہمارا ابا جہنم کی طرف جا رہا ہے، ہم اکیلے جنت میں کیسے جائیں؟

حافظِ قرآن اور شہداء بھی سفارش کریں گے ان ایمان والوں کے لیے جن کی موت توحید پر آئی ہوگی اور ان کے ذمہ گناہ ہیں۔ اور وہ شفاعت بھی اس طرح ہوگی کہ پہلے اللہ تعالیٰ سے اجازت لیں گے: یا اللہ! میں تیرے اس بندے کی سفارش پیش کرنا چاہتا ہوں، اجازت ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اجازت ہے۔ تو پھر شفاعت ہوگی۔ اگر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اجازت نہیں ہے، تو پھر شفاعت نہیں ہوگی۔

(حدیث) حدیث مبارک میں ہے: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جبرئیل! مجھے تیرے ملنے کا بڑا اشتیاق رہتا ہے، تم ذرا جلدی آیا کرو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: حضور! مجھے بھی آپ کی زیارت کی تڑپ ہوتی ہے، لیکن

جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دیں ہم ہل بھی نہیں سکتے۔

چھٹا جملہ: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ﴾ اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس کا جاننے والا بھی اللہ ہے، جو کچھ پیچھے گزرا اس کا جاننے والا بھی اللہ ہے اور جو کچھ آگے ہوگا اس کا بھی اللہ تعالیٰ کو علم ہے۔ جیسا کہ ملائکہ نے کہا تھا: ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۖ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ [مریم: ٦٤]

ساتواں جملہ: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ﴾ کوئی شخص میرے علم میں سے کسی شے پر مطلع نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کی اطلاع نہ کروں۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۝ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ﴾ [الجن: ٢٦، ٢٧] ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں اتنا ہی علم رکھتا ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمایا ہے اور جتنا اللہ تعالیٰ نے علم نہیں دیا کوئی جان نہیں سکتا۔

اس لیے محدثین علماء نے فرمایا کہ مسلمان اپنا عقیدہ یہ رکھے کہ اے اللہ! ہمارا تیری ذات پر بھی ایمان ہے اور تیری جمیع صفات پر بھی ایمان ہے۔ اور صفات وہ جو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں بتائی ہیں یا حضور پاک ﷺ کی زبان مبارک سے بتائی ہیں، یعنی بندہ اپنی طرف سے بھی صفتیں نہ بنائے۔ ان صفات کو اس طرح مانے جس طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمائی ہیں۔ جو اپنی طرف سے صفتیں بنائے وہ بھی شرک میں پڑ جاتے ہیں۔

آٹھواں جملہ: ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۖ﴾ ڈھانپ لیا ہے اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمینوں کو۔ اس سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء نے فرمایا کہ کرسی سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے علم نے تمام آسمانوں اور زمینوں کو اپنے احاطہ میں لے لیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ کرسی سے مراد قدم رکھنے کی جگہ اور عرش کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔

ابو مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: کرسی عرش کے نیچے ہے۔

حضرت سدی رحمہ اللہ نے فرمایا: آسمان زمین گویا کرسی کے پیٹ کے اندر ہیں۔ کرسی ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور کرسی عرش کے آگے ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں پھیلائی جائیں، پھر ایک دوسرے کے ساتھ سب کو جوڑ دیا جائے تو کرسی کے مقابلے پر ایسے ہوں گے جیسا کہ ایک حلقہ بڑے میدان کے اندر پڑا ہوا ہو تو وہ چھوٹی سی جگہ رو کے گا۔

ایک حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سات آسمانوں اور سات زمینوں کی حیثیت کرسی کے سامنے ایسے ہے جیسا کہ ایک ڈھال میں سات درہم ڈال دیں تو وہ کتنی جگہ روکیں گے؟

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور پاک ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ کرسی عرش کے مقابلہ پر ایسے ہے جیسا کہ کوئی لوہے کا کڑا آپ میدان میں ڈال دیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا کہ کرسی...... جس کا ذکر قرآن میں ہے...... اس سے کیا مراد ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! سات آسمان اور سات زمینیں کرسی کے مقابلے پر ایسے ہیں جیسا کہ ایک کھلے میدان میں ایک کڑا ڈال دیں تو وہ کڑا کتنی جگہ رو کے گا!؟ اور اللہ تعالیٰ کا عرش کرسی سے ایسے بڑا ہے جیسے میدان اس کڑے سے بڑا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت حضور پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس نے عرض کیا: حضور! میرے لیے دعا فرما دیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل فرما دیں۔ حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی عظمت کو بیان فرمایا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کی کرسی اتنی بڑی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو اپنے احاطہ میں لے لیا ہے۔ آسمانوں سے آواز آتی ہے جیسے کوئی پالان اونٹ پر نیا رکھیں، اس پر بوجھ پڑتا ہے تو چڑ چڑ کی آواز آتی ہے، اسی طرح آسمانوں سے آواز آتی ہے۔ کیونکہ آسمانوں پر اللہ تعالیٰ کی اتنی مخلوق ہے کہ کوئی جگہ ایک بالشت برابر خالی نہیں ہے، ہر جگہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فرشتہ سجدہ میں یا قیام میں ہے یا رکوع میں ہے۔ سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس بیان کر رہے ہیں۔

بعض روایات میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ کرسی قیامت والے دن ہوگی جب اللہ تعالیٰ عدل فرمائیں گے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بات اس آیت میں ذکر نہیں ہے۔ یہاں تو مطلقاً کرسی کا ذکر ہے۔

بعض متکلمین کی یہ تحقیق ہے کہ کرسی دراصل آٹھویں آسمان کا نام ہے، اس کا نام فلک ثوابت ہے، اس کے بعد

فلک التاسع ہے اور اسی کا نام فلک الاثیر ہے اور اسی کا نام الاطلس بھی ہے، لیکن بہت سارے لوگوں نے ان کے قول کو رد کیا ہے۔

اس طرح ایک قول حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ کرسی اور عرش ایک چیز ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کرسی اور چیز ہے اور عرش علیحدہ چیز ہے۔ عرش کرسی سے بڑا ہے۔ اسی پر اقوال وآثار ہیں۔ مفسر ابن جریر رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن خلیفہ عن عمر والی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے اس روایت کی صحت میں اعتراض ہے۔

یہ تمام اقوال ہیں جو کرسی کے بارے میں ہیں، لیکن سلف نے فرمایا کہ جتنا قرآن میں آیا اتنا درست ہے، ہمیں زیادہ بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کتنا بڑا عالم بن جائے، اس کا علم کم ہے، علم کامل نہیں ہوتا۔ دنیا کے اندر دیکھ لیں! جو لوگ کسی بھی فن کے عالم ہیں، مثلاً: ڈاکٹر ہیں، انجینئر ہیں، ریاضیات کے ماہر ہیں، طبیعیات کے ماہر ہیں، اقتصادیات کے ماہر ہیں، فلکیات کے ماہر ہیں، سیاسیات کے ماہر ہیں اور ہر فن کے عالم موجود ہیں، لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری تحقیق نقطہ آخر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل کو کوئی اور بات نکل آئے۔

آپ دیکھیں! پوری دنیا میں بحث ہوتی رہی ہے کہ کیا زمین گردش کرتی ہے یا سورج اور چاند گردش کرتے ہیں؟ جدید محققین کی یہ تحقیق رہی ہے کہ زمین گردش کرتی ہے۔ چاند اور سورج اپنی جگہ پر ہیں۔ اس پر انہوں نے کتابیں لکھیں اور تحقیقات کر ڈالیں۔ لیکن پھر ایک دور ایسا آگیا اور کہا گیا کہ زمین گردش نہیں کرتی، بلکہ چاند اور سورج گردش کرتے ہیں۔ اور اس پر دلائل کے انبار لگا دیئے گئے۔ اس ریسرچ پر کروڑوں روپے خرچ کر دیئے۔ اب پھر تحقیق آگئی کہ دونوں گردش کرتے ہیں۔ اب پھر جھگڑا ہوگیا کہ ان کی گردش ایک دوسرے کے متوازی ہے یا مخالف ہے۔

تو میرے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ جتنی تحقیقات کرلیں، آپ کا فیصلہ حرف آخر نہیں بن سکتا۔ جب آپ کے سامنے نئی نئی چیزیں آئیں گی تو آپ کو رائے بدلنی پڑے گی۔ جب ہمارے علم حسیات تک نہیں پہنچے تو مغیبات تک کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ جن کو ہم نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ اس لیے موٹی بات یاد رکھ لیں کہ جو قرآن پاک میں ہے: آمنّا۔ ہمیں سمجھ آگیا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور اگر ہمیں سمجھ نہیں آیا تو ہماری عقل میں نقص ہے، خدا کے کلام میں کوئی قصور نہیں ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ہم ہر بات کی تہہ تک پہنچ جائیں۔

نواں جملہ: ﴿وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾ جب آسمان، زمین کرسی اور عرش اتنا بڑا ہے، اللہ تعالیٰ پر ان کا حفاظت کرنا باعثِ بوجھ نہیں ہے اور نہ کوئی تکان ہے۔ وہ ہر صفتِ نقصان سے پاک ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر بندے پر نگران ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہا ہے، نہ اس سے کوئی چیز دور ہے اور نہ اس سے کوئی چیز چھپ سکتی ہے۔ تمام دنیا کی اشیاء اس کے سامنے کمزور ہیں اور بالکل عاجز ہیں، محتاج ہیں اور فقیر ہیں۔

دسواں جملہ: ﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾ [البقرۃ:۲۵۵] جتنی اللہ تعالیٰ کی صفات قرآن میں یا صحیح احادیث میں ہیں تو ہمارے سلف صالحین کا طریقہ یہ ہے کہ تشبیہ کے بغیر سب صفات کو مانو کہ یہ بھی نہ کہو کہ ایسا اترتا ہے، یہ بھی نہ کہو کہ اترتا نہیں ہے اور یہ بھی نہ کہو کہ اس کا سننا ایسا ہے، بلکہ وہ سننے والا ہے جیسا کہ اس شان کو زیبا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ:۱۱] اس کی ذات کی کوئی مثال نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی صفات کی بھی کوئی مثال نہیں ہے۔

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۵۶]

''دین میں زبردستی نہیں۔ بے شک ہدایت گمراہی سے جدا ہو چکی ہے۔ اب جو گمراہ کرنے والوں کو نہ مانے اور اللہ پر یقین رکھے تو اس نے مضبوط حلقہ تھاما، جو ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔''

کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟

دین کے اندر جبر نہیں ہے۔ دشمنوں نے ایک بات بڑی مشہور کر دی ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ اور پوری دنیا کے میڈیا نے زور لگایا ہوا ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہیں، مسلمان قاتل، وحشی اور ڈاکو ہیں، مسلمانوں کا کام لوگوں کو قتل کرنا ہے، لوگوں کے مالوں کو مالِ غنیمت بنا لیتے ہیں اور لڑکیوں کو اپنی کنیزیں بنا لیتے ہیں۔

اس طرح وہ دنیا کے سامنے یہ تصور دیتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کی ایک وحشت بن جائے اور دنیا میں جہل پھیل جائے۔ کہیں کوئی واقعہ پیش آیا ادھر ادھر تلاش کر کے مسلمانوں کے ذمہ لگا دیں گے۔ اور یہ وہ تصور ہے جس سے بچنے کے لیے آج ہمارے مسلمان کہہ بیٹھتے ہیں کہ ہم بنیاد پرست نہیں، ہم تو معتدل مسلمان ہیں اور

ہمارے اندر بڑی مساوات ہے۔ یہ اس لیے کہتے ہیں، تاکہ یہ لوگ ہم سے راضی ہو جائیں۔ یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ کے فیصلے کبھی نہیں بدلا کرتے۔ قرآن فرماتا ہے: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ﴾ [البقرۃ: ۱۲۰] اے میرے مدنی! یہ یہود و نصاریٰ کبھی آپ سے راضی نہیں ہوں گے، کبھی ان کے دل آپ کے لیے صاف نہیں ہو سکتے جب تک تم ان کا دین اور ان کا طریقہ اختیار کر کے ان کی طرح نہ بن جاؤ۔

(جواب) کفار کا اسلام پر یہ اعتراض اتنا جھوٹا ہے کہ پوری انسانیت کے اندر اتنا بڑا جھوٹ کبھی نہیں بولا گیا۔ جھوٹ بولنے والے وہ لوگ ہیں جن کی تلواریں مسلمانوں کے خون سے رنگین ہیں۔ وہ لوگ آج مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ تم دہشت گرد ہو۔ آپ دیکھ لیں! کشمیر کے اندر کیا ہو رہا ہے؟ بوسنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ کہاں مسلمانوں کا خون نہیں بہایا جا رہا ہے؟ اور کہاں مسلمانوں کا قتلِ عام نہیں ہو رہا؟ اس کے باوجود اسلام کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ اسلام دہشت گرد ہے۔ آپ کے ملک میں دس، بارہ، بیس آدمی مرتے ہیں، ان کے پیچھے بھی دراصل یہود و ہنود کی قوت ہے اور وہ سازشی ذہن ہمیں لڑا رہا ہے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمارے اہل اقتدار کو سمجھ عطا فرمائے۔

آپ پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں! جہاں جہاں یہودیت کو موقع ملا، اس نے کیا کیا مظالم توڑے، جہاں جہاں نصرانیت کو موقع ملا، اس نے کیا کیا مظالم توڑے۔ ان کے برخلاف اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں کوہ قاف اور دریائے جیحون تک اسلام کا پرچم لہرایا گیا۔ مسلمان جہاں گئے وہ رحمت بن گئے، وہ غریبوں کے مدد کرنے والے بن گئے، ان کے نزدیک مسلم کی بیٹی، ہندو کی بیٹی اور غیر مسلم کی بیٹی کی حفاظت میں کوئی فرق نہیں تھا! کیونکہ اسلام کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ﴾ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ کسی کو ہم زبردستی تلوار کے زور پر کلمہ پڑھائیں، اسلام اس کا مخالف ہے۔

انصار کے قبیلہ بنو سالم بن عوف کے حضرت حصین رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے، اور ان کے دو بیٹے تھے، لیکن ان کے دونوں بیٹوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا: یارسول اللہ! میں مسلمان ہو گیا ہوں، لیکن میرے دونوں بیٹے کافر ہیں، نصرانی ہیں۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ان کو جبر کر کے مذہب میں داخل کر دوں؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ﴾ اللہ تعالیٰ دین میں جبر کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ جو جبر سے اسلام لائے اس کا اسلام قبول نہیں کیا جاتا: کیونکہ اسلام کا معنی

ہے کہ دل کے اندر تصدیق ہو، اگر زبان پر اسلام ہے اور دل میں نہیں ہے تو اس اسلام کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

[تاریخ ابن اسحاق]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ایک بڑھیا عورت پر گزر ہوا، وہ کافرہ عورت تھی۔ آپ نے فرمایا: اے اماں جان! میں آپ کو دعوتِ اسلام دیتا ہوں۔ بوڑھیا کہنے لگی: اے امیر المومنین عمر! میں بوڑھی عورت ہوں، موت میرے قریب ہے، میں مرنے والی ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ اپنے باپ دادا کے دین کو تھوڑی سی دیر کے لیے چھوڑ دوں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہاری مرضی ہے۔ ہم تم پر کسی قسم کا جبر نہیں کریں گے۔

یاد رکھیں! اگر جبر کا اسلام قبول ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرعون کا اسلام بھی قبول کر لیتے؛ کیونکہ جب فرعون کو غوطہ لگا تھا تو اس نے بھی کہا تھا: ﴿اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ [یونس: ۹۰] اے پرودگار! میں مانتا ہوں کہ تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا سچا رب ہے، میں اسلام لاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب تمہیں جب غوطہ لگا یا تو یاد آیا ہے؟ اس لیے اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو جائے اور پھر کوئی اسلام قبول کرے تو وہ اسلام معتبر نہیں ہوتا۔

دوسرا اعتراض:

وہ یہ کرتے ہیں کہ اگر اسلام جبر سے نہیں پھیلا تو یہ جہاد کیا ہے؟ زانی کو پتھر مار مار کر مار ڈالا تو یہ جبر تو ہو رہا ہے، اس کی آزادی چھینی جا رہی ہے۔ اتنی سخت سزائیں تو جنگل کا قانون لگتا ہے۔ اور آج تو دنیا بہت ترقی کر گئی ہے، لوگوں کے ذہنوں کو خراب کرنے کے لیے وہ اس طرح مثالیں دیتے ہیں۔

(جواب) یاد رکھیں! اسلام نے جہاد کا حکم اس لیے نہیں دیا کہ تلوار کے ذریعے سے ان سے کلمہ پڑھوایا جائے۔ اگر یہ بات ہوتی تو اسلام کافروں کو یہ کیوں اجازت دیتا؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ان لوگوں سے جہاد کرو جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے، یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے، جب تک کلمہ نہ پڑھیں یا وہ جزیہ دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور وہ اپنی ذلت مان لیں تو ان سے جزیہ لے کر ان کا تحفظ کرو۔ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلتا تو جزیہ لینے کا کیا مطلب ہے؟ پھر ان کا تحفظ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے صلح کی اور مشرکین سے معاہدہ کیا، تا کہ کل کو کوئی یہ اعتراض نہ کر سکے کہ اسلام کے اندر مصلحت کا جذبہ نہیں ہے۔ اگر اسلام

تلوار کا نام تھا تو اللہ تعالیٰ نے کیوں فرمایا: اے مسلمانو! اگر کافر تم سے صلح کرنا چاہیں تو ان سے صلح کر لو۔

جہاد کا مقصد:

اسلام میں جہاد اس لیے ہوتا ہے، تا کہ اللہ تعالیٰ کی زمین سے فساد ختم کیا جائے۔ یعنی جب کفر حد سے بڑھ جائے، مسلمانوں کے دین اور مال وعزت کو تحفظ نہ ملے اور کفر فساد پھیلا کر، جرائم بے حیائی اللہ تبارک وتعالیٰ کی بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو ان سے جہاد کرو۔

آج دنیا کے اندر کوئی ایک ایسا ملک دکھا دیں جو اپنے باغی کو معاف کر دے۔ اگر تمہارے باغی کی سزا موت ہے تو اللہ تعالیٰ کے باغی کی سزا موت کیوں نہیں ہو سکتی؟ اگر تمہارے باغی کی سزا موت ہے تو کیا حضور اکرم ﷺ کے باغی کی سزا موت نہیں ہو سکتی؟ اگر تیری گستاخی کرنے والے کی سزا ہے محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان میں ذرے کے برابر تنقیص کرنے والے کی سزا موت کیوں نہیں ہو سکتی؟

تو یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ نے جہاد رفعِ فساد کے لیے رکھا ہے۔ جہاد کے اندر اسلام نے حکم دیا ہے کہ کسی بچے کو قتل نہ کیا جائے، کسی بوڑھے کو قتل نہ کیا جائے، کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے اور کسی مذہب کے بڑے پادری، پنڈت کو قتل نہ کیا جائے جب تک کہ وہ قتال نہ کریں۔ تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام جبر سے پھیلا ہے؟

آپ اندازہ فرمائیں کہ مشرکین مکہ نے ظلم کا کون سا حربہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر نہ آزمایا ہو؟ صحابہ کو انگاروں پر لٹایا گیا، بی بی سمیہ کو کلمہ پڑھنے کی یہ سزا دی گئی کہ ان کی دونوں ٹانگوں میں رسیاں باندھ کر دو اونٹوں کے ساتھ باندھ دیا اور ظالم ابو جہل اس شہیدہ کی شہادت کا نظارہ کرنے کے لیے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہے۔ دوسری طرف دیکھیں کہ جس دن حضور اکرم ﷺ مکہ کو فتح کرنے کے لیے آ رہے ہیں، دس ہزار کا لشکر جرار آپ کے ساتھ ہے اور صحابہ کی زبان پر ہے کہ آج کے بعد قریش کا کوئی بچہ بھی نہیں بچے گا۔ ان ظالموں نے ہم پر اتنا ظلم کیا ہے، آج اللہ تعالیٰ نے ہمیں موقع دیا ہے۔

روایات میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے ایک صحابی کو جھنڈا دیا تو ان صحابی نے جوش میں آ کر پرچم لہرایا کہ آج کشتوں کے پشتے لگا دیں گے۔ اس بات کو ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے سن لیا، جو اس وقت کافر تھے۔ انہوں نے بھی دھمکی دے دی تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس سے پرچم واپس لے کر اس کے والد کو دیا جائے۔

جب حضور اکرم ﷺ مکہ کے قریب آئے تو فرمایا: پہلے میری تعلیمات سن لو۔ جو آدمی مسجد الحرام میں داخل ہو جائے اس کو امان ہے، جو آدمی اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اس کو بھی امان ہے، جو آدمی اپنے ہتھیار پھینک دے اس کو بھی امان ہے اور جو آدمی ابو سفیان کی حویلی کے اندر چلا جائے اس کو بھی امان ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: ہر طرف امان ہوگئی تو ہم کس کو قتل کرتے؟ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ جس اونٹنی پر حضور اکرم ﷺ سوار تھے، میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھ سے اونٹنی کی مہاریں پکڑے ہوئے تھے، لیکن آپ نے اپنی گردن اتنی جھکائی ہوئی تھی کہ پالان کے ساتھ گردن لگ گئی۔ مکہ کے جو سردار بچ گئے تھے وہ گرفتار ہو کر حضور اکرم ﷺ کے سامنے لائے گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے سرداروں سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے قریش مکہ! اے سرداران قریش! آج بتاؤ کون سا ظلم ہے جو تم نے مجھ پر اور میری جماعت پر نہیں توڑا؟ آج بتاؤ میں تمہارے حق میں کیا فیصلہ کروں؟ کفار قریش کی گردنیں نیچی ہیں اور کہنے لگے: ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ لیکن ہمیں امید ہے کہ آپ بڑے کرم والے بھائی ہیں، کرم کریں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں آج وہی فیصلہ کرتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کیا تھا کہ آج کے بعد میں تمہیں طعنہ بھی نہیں دوں گا۔ جاؤ آج کے بعد تم سب آزاد ہو۔

کیا یہ اسلام جبر کر رہا ہے؟ کیا اسی کا نام دہشت گردی ہے۔ عجیب بات ہے! تم مسلمانوں پر ظلم کرتے ہو وہ مظلوم تڑپیں تو اس کو دہشت گردی کا نام دیتے ہو۔

کفار کا مسلمانوں پر ظلم:

تم ملعون رشدی جیسے لوگوں کا تحفظ کرو، وہ اپنے نبی کی عصمت کے لیے چیخے تو تم اس کو دہشت گردی کا خطاب دیتے ہو۔ تم صحابہ کے خلاف اپنے میڈیا میں گالیاں دلواؤ، مسلمانوں کی تکہ بوٹیاں کر ڈالو، مسلمانوں کی عصمتیں لٹوا ڈالو، ایک ایک لڑکی سے سو سو آدمی زنا کریں، اسی حالت میں لڑکیاں تڑپتے تڑپتے مرجائیں۔ اس پر اگر کوئی بھائی غیرت کر کے اٹھے تو تم اس کو دہشت گرد کہتے ہو۔ عجیب بات ہے!!!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا اور جنوں کا نام خرد
جو چاہے تیرا حسن کرشمہ ساز کرے

تم اس پر نازاں ہو کہ طاقت تمہارے پاس ہے، جدید ذرائع تمہارے پاس ہیں، لیکن یاد رکھیں کہ یہ تمام

طاقتیں اس اللہ کے فیصلے کے سامنے ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی مسلمان کی فریاد پر راضی ہو گیا تو تمہارے مٹنے میں بھی دیر نہیں لگے گی۔

کیا اسلام کی سزائیں سخت ہیں؟

جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام کی سزائیں سخت ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ یہ سزائیں کیوں رکھی جاتی ہیں؟ تم اگر کہیں مارشل لاء لگا دو تو تم سے کوئی پوچھتا ہے کہ تم کیا سزائیں دے رہے ہو؟ تم اگر کہیں اپنے قوانین بنا دو تم سے کوئی پوچھتا ہے کہ کیا سزائیں دے رہے ہو؟ اسلام نے تو یہ سزائیں اس وقت دیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے جنگ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور وہ زمین میں فساد پھیلانا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے سزائیں تجویز کی ہیں۔ اگر کوئی آدمی تمہارا شہری بن جائے تو وہ تمہارے قانون کا پابند ہے، تمہارے ملک میں ڈرائیونگ لائسنس لے لے تو ٹریفک کے قوانین کا پابند ہے اور جب محمد مدنی ﷺ کا کلمہ پڑھ لے تو اسلام کے قانون کا پابند ہونا کیوں جرم ہے؟

دنیا کے قوانین کی کمزوریاں:

دنیا کا کوئی قانون لے لیں! سب قوانین جرم کو پیدا کرتے ہیں اور مجرم کی حفاظت کرتے ہیں۔

مثلاً: ایک آدمی کسی کا ایک لاکھ ریال چوری کر لے تو آپ کا قانون کہتا ہے کہ پہلے تو مقدمہ بھی نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ آپ کہتے ہیں: نوٹوں جیسے نوٹ ہیں۔ آپ کہتے ہیں: کیا آپ کے پاس نوٹوں کے نمبر ہیں؟ اب کون آدمی نمبر لے کر رکھتا ہے؟ پولیس والے کہتے ہیں: اس طرح تو پرچہ نہیں ہو گا، اس لیے آپ کہیں کہ اس کے ساتھ ایک بریف کیس بھی تھا، اس کے اندر میرا ایک پرس بھی تھا؛ کیونکہ کل جب ہم برآمدگی کریں گے تو کیا شو کریں گے؟ کیونکہ نوٹوں جیسے تو نوٹ ہوتے ہیں۔ بہر حال اگر چوری پکڑی گئی تو آپ کے قانون میں ہے کہ تین سال کی سزا دے دو تو آپ اس کو جیل میں بھیجیں گے۔ بہترین پکا مکان ہو گا کہ اس کے باپ کے پاس بھی ایسی بلڈنگ نہیں ہو گی۔ پولیس کا پہرہ ہوتا ہے، عین وقت پر کھانا ملتا ہے، باقاعدہ واک کے لیے باہر نکالا جاتا ہے، تا کہ شریف آدمی کی صحت خراب نہ ہو جائے۔ جب وہ تین سال کی سزا بھگت کر آ گیا، اب اگر وہ تین ہزار تنخواہ لیتا تو وہ تین سال کے اندر کتنا بچا سکتا تھا؟ اس لیے وہ کہتا ہے: یہ بڑا اچھا سودا ہے، اس لیے دوبارہ ڈاکہ مارو۔ اگر تین سال اندر چلے گئے

تو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ تمہارا قانون جرم بناتا ہے، مجرم کی حفاظت کرتا ہے؛ کیونکہ جیل کے اندر استادانِ فن بیٹھے ہوتے ہیں۔

جبکہ اسلام کہتا ہے کہ اس کا ہاتھ لمبا ہو گیا ہے، کاٹ دو کہ تھوڑا چھوٹا ہو جائے اور اس کی لعنت ہر وقت اس کے گلے میں لٹکتی رہے، پوری دنیا کے لیے عبرت بن جائے۔ اسلام کی سزائیں عینِ عدل ہیں، کوئی جبر و اکراہ نہیں۔

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ بعض علماء نے فرمایا: ''لَا'' نافیہ ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: ''لَا'' نافیہ ہے، لیکن نہی کے معنی دے رہا ہے، اس لیے یہاں ترجمہ ہو گا: تم کسی پر جبر نہ کرو کہ وہ اسلام میں داخل ہو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو دلائل سے روشن کر دیا ہے۔ اب ایک اندھیرا ہے اور ایک روشنی ہے۔ اب جس کی مرضی آئے اندھیرے میں چلے اور جس کی مرضی آئے روشنی میں چلے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہدایت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ جس کو اسلام کی ہدایت دیتے ہیں اس کے سینے کو کھول دیتے ہیں، اس کی بصیرت کو روشن کر دیتے ہیں اور وہ دلیل کے ساتھ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ اور جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ اندھا کر دیں، مہریں لگا دیں ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر، ان کو اگر آپ دین میں زبردستی توڑ کر بھی داخل کریں گے تو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

شانِ نزول:

انصار میں ایک واقعہ پیش آیا جس کی بنا پر یہ آیت مبارکہ اتری، مگر اس کا حکم عام ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کبھی ایسے بھی ہوتا تھا کہ عورت کی اولاد نہیں ہوتی تھی۔ اب وہ کبھی منتیں مانتی تھی کہ اگر مجھے بچہ ہو گیا اور وہ طویل العمر ہو گیا تو میں اس کو یہودی بناؤں گی۔ بنونضیر کے بارے میں جب حکم دے دیا گیا کہ ان کو مدینہ سے نکال دیا جائے تو انصار میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جن کی اسی وجہ سے اولادیں یہودیوں کے پاس رہ گئی تھیں، انہوں نے کہا: ہم تو اپنے بچوں کو نہیں چھوڑتے، ان کو لے آتے ہیں؛ کیونکہ ہماری اولادیں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی کہ اب وہ یہودی بن چکے ہیں اور زبردستی اسلام میں نہیں ہے، اسلام میں دلائل اور روشنی کے ساتھ داخل ہو۔ اور جو اسلام میں داخل نہیں ہونا چاہتا، اندھیرے میں بھٹکنا چاہتا ہے، اس کی مرضی ہے، وہ بھٹکتا رہے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں آپ نظر ڈالیں تو کوئی آدمی زبردستی نظریہ قبول نہیں کرتا۔ وقتی طور پر کہہ دے گا، لیکن جب موقع ملے گا تو اٹھ کھڑا ہو گا۔ اسلام اپنے حسنِ خلق اور قوتِ دلائل سے پھیلا ہے، اسلام اپنی جامعیت و اکملیت سے پھیلا ہے۔ جس نے بھی اسلام میں نظرِ انصاف سے غور کیا تو اس کو ماننا پڑا کہ

اسلام سچا دین ہے۔

ایک غلام کہتا ہے کہ میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا مملوک تھا اور نصرانی تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مجھ پر اسلام پیش فرماتے کہ اسلام قبول کرلو، میں انکار کرتا۔ تو وہ فرماتے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ میں جبر نہیں کرتا، لیکن اسلام پیش کرتا ہوں کہ اسلام قبول کرلو۔ اگر تم اسلام قبول کرلو گے تو ہم تجھ سے مسلمانوں کے معاملات میں بڑا کام لیں گے (کیونکہ یہ پڑھا لکھا تھا، لیکن مسلمان نہ ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنی وفات سے پہلے آزاد کردیا تھا)۔

بعض علماء فرماتے ہیں: ﴿لَآ اِكْرَاهَ﴾ کا حکم صرف اہل کتاب کے لیے ہے۔ جو ان کے دین میں داخل ہوگیا، جب تک ان کا دین صحیح موجود تھا، اس کو بدلا نہیں گیا تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں: یہ حکم اس وقت تک تھا جب تک اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم جاری نہیں کیا تھا۔ آیتِ جہاد جب اتری تو یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ اب ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم ساری دنیا کو اسلام کی دعوت دیں۔ اگر وہ قبول کرلیں تو الحمدللہ۔ اگر اسلام کی دعوت قبول نہ کریں تو ہمیں جزیہ ادا کریں، ہمارے باج گزار بن کر رہیں۔ اگر وہ اس کو بھی قبول نہ کریں تو ہمیں ان سے جہاد کا حکم ہے اس وقت تک کہ جب وہ ان دو چیزوں میں سے ایک قبول نہ کرلیں۔

علماء فرماتے ہیں: اصل بات یہ ہے کہ قتال کا حکم اپنی جگہ ہے کہ مثلاً: ہمارے ساتھ ایک ملک ہے، ہم اس کو دعوت دیں گے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے بادشاہوں کو خط لکھے تھے کہ تم اسلام میں داخل ہوجاؤ۔ اگر وہ اسلام میں داخل نہ ہوں، لیکن مسلمانوں کے تابع رہیں، تاکہ فساد نہ کرسکیں۔ دنیا میں کفر کو پھیلانے کا مزید ذریعہ نہ بن سکیں۔ اگر وہ یہ بات بھی قبول نہ کریں تو لڑائی کی اجازت ہوگی۔

صحیح حدیث مبارک میں آیا ہے: ''عَجِبَ رَبُّكَ مِنْ قَوْمٍ يُقَادُوْنَ إِلَى الْجَنَّةِ فِي السَّلَاسِلِ'' تیرا رب تعجب فرماتا ہے ایسی قوم سے جو اسلام کی طرف زنجیروں میں جکڑے ہوئے آتے ہیں، یعنی کسی جگہ جہاد ہوا، کافر قید ہوگئے، ان کو زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا، لیکن پھر وہ مسلمان ہوگئے اور جنت میں داخل ہوگئے۔

[صحیح البخاری: رقم: ۳۰۱۰]

حدیث مبارک میں آیا ہے کہ ایک آدمی کو کہا گیا: اسلام لے آؤ۔ اس نے کہا کہ میں اسلام لے آیا، لیکن حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں کہنے لگا: میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں، یعنی خوشی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: چاہے تم اپنے آپ کو مجبور پاتے ہو اسلام پر رہو۔ یہ حدیث صحیح اور تین راویوں سے مروی ہے۔

اس حدیث سے تو یہ بات معلوم ہوتی کہ اکراہ درست ہے اور ادھر قرآن کہتا ہے: ﴿لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ﴾۔ محدثین نے فرمایا: اس کو حضور اکرم ﷺ نے جبر کر کے یا اکراہ کر کے اسلام میں داخل نہیں کیا، بلکہ حضور اکرم ﷺ نے اس کو اسلام پیش کیا اور وہ مسلمان ہو گیا، لیکن اس نے یہ بتایا کہ اسلام کو میرا نفس قبول نہیں کر رہا۔ فرمایا: اسلام لے آؤ، اگرچہ تم اس کو ناپسند کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں حسن نیت اور اخلاص عطا فرمادیں گے۔

[مسند احمد: ۲/۱۸۱]

مثال کے طور پر آپ ایک جگہ ڈیوٹی کر رہے ہیں۔ اگر آپ کی طبیعت نہ بھی چاہتی ہو، لیکن آپ کو ڈیوٹی پر جانا پڑے گا۔ اس لیے ہم بھی اللہ تعالیٰ کے دروازے پر لگے رہیں، چاہے عبادت میں لذت حاصل نہ ہو رہی ہو، حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: ریا سے عبادت برباد ہو جاتی ہے، لیکن اگر کوئی آدمی عمل کر رہا ہے اور اس کے دل میں بالکل ریا ہے کہ لوگ دیکھیں کہ بڑا عابد و زاہد ہے، پھر بھی یہ عمل کرتا رہے۔ اس عمل کی برکت سے ...... ان شاء اللہ ...... ریا ختم ہو جائے گی۔

﴿فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ [البقرۃ: ۲۵۶]

اسلام کا معنی یہ نہیں ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کو مانے، بلکہ اسلام کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کو ماننے اور طاغوت کا انکار کرے، تب وہ مسلمان بنے گا۔ طاغوت کا معنی شیطان باطل ہے۔ جو بندہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور غیروں کی عبادت کا انکار کرے تو اس کی مثال ایسے ہے جیسے اس نے ایک کڑے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اور اللہ تعالیٰ ہر بات کو سننے اور ہر بات کو جاننے والے ہیں۔ اسلام کا کڑا مضبوط ہے، وہ کبھی ٹوٹتا نہیں ہے، لیکن اگر رسی مضبوط ہو، مگر مضبوط باندھی نہ گئی ہو تو وہ چھوٹ جائے گی۔ اسلام مضبوط ہے، لیکن ہم بھی اس کو مضبوطی سے پکڑیں، اللہ تعالیٰ کی توحید پر جمیں اور شرک سے نفرت کریں، تب جا کر کامل اسلام نصیب ہوتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قرآن میں ''جبت'' کا لفظ آتا ہے اور ''اِنَّ الْجِبْتَ السِّحْرُ وَالطَّاغُوْتُ الشَّیْطَانُ'' جبت سے مراد جادو اور طاغوت سے مراد شیطان ہے۔ ''وَاِنَّ کَرَمَ الرَّجُلِ دِیْنُهٗ وَحَسَبُهٗ خُلُقُهٗ وَاِنْ کَانَ فَارِسِیًّا وَنَبَطِیًّا'' انسان کی عزت اس کا دین ہے، انسان کا حسب اس کا خلق ہے۔ یہ عزت نہیں کہ فلاں قوم یا برادری سے ہے، بلکہ اس کے خلق کو دیکھو! اگر اس کا خلق اچھا ہے تو سمجھو اس کا حسب اچھا ہے۔ اور وہ دین پر ہے

قائم ہے تو سمجھو یہ عزت والا آدمی ہے۔ یہ نہ دیکھا کرو کہ یہ عرب ہے یا عجم ہے، بلکہ یہ دیکھو کہ اگر وہ دین پر قائم ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ عزت والا ہے؛ کیونکہ اسلام کے اندر تو میتوں کے جھگڑے...... جو ہمارے ہاں چل رہے ہیں...... یہ کفر کی سازشیں ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے تو قومیں اس لیے بنائی تھیں، تا کہ ہم ایک دوسرے کی پہچان کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے قومیں اس لیے نہیں بنائی تھیں کہ ان کو پوجنا شروع کر دیں۔ جس طرح کسی قبر پر سجدہ کرنا شرک ہے، اسی طرح قومیت کا نعرہ لگا کر اس کے نیچے مرجانا بھی شرک ہے۔

عروۃ وثقیٰ کی تفسیر:

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عُرْوَةِ الْوُثْقٰى'' سے مراد کلمہ طیبہ ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس سے مراد قرآن ہے۔

حضرت سالم بن ابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عُرْوَةِ الْوُثْقٰى'' سے مراد اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرنا اور اللہ تعالیٰ کے لیے بغض کرنا ہے۔ یہ سب اقوال متقاربۃ المعنیٰ ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

﴿لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کلمہ پر جم گیا وہ اس کو جنت میں پہنچائے گا، ہاتھ سے نہیں چھوٹے گا۔

ایک جنتی مسلمان کا واقعہ:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: محمد بن قیس بن عبادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: میں مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا، اس کے چہرے پر عبادت کا اثر تھا، اس نے مسجد میں آ کر دو رکعت نماز پڑھی۔ جو لوگ مسجد میں بیٹھے تھے وہ آپس میں کہنے لگے کہ دیکھو! یہ جنتی آدمی ہے۔ جب وہ مسجد سے نماز پڑھ کر باہر نکلا، میں اس کے پیچھے چلا گیا، حتیٰ کہ وہ گھر پہنچے تو مجھے بھی گھر میں بٹھایا اور کہنے لگے: کیسے آئے ہو؟ میں نے کہا: آج مسجد میں آپ کی زیارت کی اور وہاں جتنے لوگ بیٹھے تھے سب کہہ رہے تھے: یہ جنتی ہے۔ اس نے کہا: ایسی بات تو نہیں کہنی چاہیے۔ آدمی وہ بات کرے جس کا پتہ ہو۔ ہمیں کیا پتہ کل کیا ہوگا؟ جہنم اور جنت کے فیصلے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اور اس کے بعد اس نے کہا: اصل وجہ یہ ہے کہ میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک کڑا لگا ہوا ہے۔ میں ایک باغ میں ایک ستون کے ساتھ کھڑا ہوں۔ ایک آدمی آ کر مجھے کہتا ہے: اس پر چڑھ جاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ میں اس پر نہیں چڑھ

سکتا۔ وہ کہتا ہے: اس پر چڑھو۔ میں کہتا ہوں: میں اس پر کیسے چڑھوں؟ میں تو نہیں چڑھ سکتا۔ اتنی دیر میں ایک آدمی آ کر چڑھنے کا طریقہ بتاتا ہے کہ وہ میرے کپڑوں کو باندھتا ہے اور مجھے بتاتا ہے۔ میں چڑھنا شروع کرتا ہوں، چڑھتے چڑھتے میں آخری ستون تک پہنچ جاتا ہوں۔ وہاں جو کڑا ہوتا ہے اس کو میں مضبوطی سے پکڑ لیتا ہوں۔ اس کے بعد میری نیند کھل جاتی ہے۔ میں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں نے ایسے ایسے خواب دیکھا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ باغ گویا ایک دین ہے، عمود "شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ" ہے اور جب تم نے اس کڑے کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمہاری موت اسلام پر آئے گی۔ اس لیے اب لوگ کہتے ہیں کہ یہ جنتی ہے؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کی بشارت موجود ہے، ورنہ معاملہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۵۷]

"اللہ ایمان والوں کا کام بنانے والا ہے، ان کو اندھیروں سے اجالے میں نکالتا ہے۔ اور جو منکر ہیں ان کے رفیق شیطان ہیں، وہ ان کو اجالے سے اندھیروں میں نکالتے ہیں۔ وہی دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

قرآن کے اندر ایمان کی صفت نور آئی ہے۔ جیسے روشنی میں آدمی دھکے سے بچ جاتا ہے، کانٹے سے بچ جاتا ہے، سیدھے راستے پر چلتا ہے۔ تو جو ایمان میں آ گیا گویا وہ جہنم سے بچ گیا، سزاؤں سے بچ گیا اور اس کو جنت کا سیدھا راستہ مل گیا۔ اور جو کفر میں ہے وہ اندھیروں میں ہے، وہ بھٹک رہا ہے، کوئی چاند کو خدا بنا کر، کوئی تاروں کو خدا بنا کر، کوئی انسانوں کو خدا بنا کر اور کوئی مردوں کو خدا بنا کر ظلمات کے اندر بھٹکتا رہا۔ جو کافر ہیں ان کے دوست شیاطین ہیں، وہ ان کو نور ایمان سے نکال کر کفر کے اندھیروں میں لے جاتے ہیں۔ یہی جہنم کے ساتھی ہیں، اس کے اندر ہمیشہ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر بتایا کہ جس کو ہم چاہتے ہیں ہدایت عطا فرمائیں اس کو سیدھے راستے پر چلا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو کفر وشرک اور شک وشبہ کے اندھیروں سے نورِ حق کی طرف لے جاتے ہیں، جو روشن، واضح اور آسان راستہ ہے، اس پر چلاتے ہیں۔ کافروں کے دوست شیطان ہے، وہ ان کو ان کی جہالتوں اور گمراہیوں کو مزین کر کے دکھاتا ہے کہ جو تم کام کر رہے ہو یہ بہت اچھا کام ہے، اسی کے اندر لگے رہو اور اس کو نہیں چھوڑنا چاہیے، لاکھ تمہیں لوگ کہتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ''النُّوْرِ'' مفرد استعمال کیا ہے اور ''الظُّلُمٰتِ'' جمع کا لفظ استعمال کیا؛ کیونکہ حق کا راستہ ایک ہے، حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سب ایک راستہ ہے، توحید ورسالت اور معاد پر ایمان ہو۔

کفر ظلمات ہے، اس کے اندر اندھیرے ہیں۔ ہندوؤں کے پینتیس کروڑ دیوتا ہیں، بعض سورج کو خدا سمجھے بیٹھے ہیں اور بعض آگ کو خدا سمجھے بیٹھے ہیں۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٥٨﴾ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰي قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٥٩﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰي وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٦٠﴾﴾ [البقرۃ:۲۵۸-۲۶۰]

"کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا اس کے رب کے بارے میں اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی ہے۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا تو رب وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے تو اس نے جواب دیا: میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ بے شک اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال لا۔ تو وہ کافر یہ سن کر حیران رہ گیا۔ اور اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔ یا (کیا تو نے غور نہیں کیا) اس شخص کے حال پر جو گزرا ایک بستی پر دراں حالیکہ وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں پر۔ وہ کہنے لگا: کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد؟ سو اللہ نے اس شخص کو سو سال تک مردہ رکھا۔ پھر اسے زندہ کیا۔ فرمایا: کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا؟ اس نے کہا: میں ٹھہرا ہوں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تو ٹھہرا رہا ہے سو سال۔ پس اب دیکھ اپنے کھانے کی طرف اور اپنے پینے کی طرف، یہ باسی نہیں ہوا اور دیکھ اپنے گدھے کو۔ اور یہ سب اس لیے کہ ہم تجھے بنائیں گے نشانی لوگوں کے لیے۔ اور دیکھ ان ہڈیوں کی طرف کہ ہم انہیں کیسے جوڑتے ہیں؟ پھر ہم ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پھر جب اس کے لیے حقیقت روشن ہو گئی تو اس نے کہا: میں جان گیا ہوں۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب! مجھے دکھا دے تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ فرمایا: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے ہو؟ بولا: ایمان تو رکھتا ہوں، لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا: چار پرندے لے لو اور انہیں اپنے سے ہلا لو۔ پھر ان کو ٹکڑے کر کے ہر پہاڑی پہ ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ۔ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اور جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکیم ہے۔"

ربطِ آیات:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر کچھ قصے بیان فرمائے ہیں، جن سے ذاتِ باری کا اور اس کی صفات کا اثبات ہے۔ اس کے بعد کفر کا احساس اور اس کے بعد اثباتِ حشر، حشرِ معاد، یہ سارے مسئلے بھی ہیں۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کا دوست بن جاتا ہے اس کو کیسے نورِ ایمان میں لے آتا ہے؟ اور شیطان جس کا دوست بن جاتا ہے اس کو کیسے روشنی سے نکال کر کفر میں لے آتا ہے؟ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تین واقعات بیان فرمائے ہیں۔ پہلا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے، جو بادشاہ نمرود کے ساتھ پیش آیا۔

دنیا کے چار بڑے بادشاہ:

(واقعہ) دنیا میں چار بادشاہ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے تقریباً ساری دنیا پر بادشاہی کی ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ دو مسلمانوں میں گزرے ہیں اور دو کافروں میں گزرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کمالِ عدل دیکھیں! دو ایمان والے گزرے ہیں۔

1 ......ان میں سب سے بڑی سلطنت سیدنا سلیمان علیہ السلام کو ملی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی سلطنت عطا فرمادی کہ کسی کو ان کے مقابلہ پر آج تک ویسی سلطنت نہیں ملی کہ ان کی حکومت صرف انسانوں پر نہیں، بلکہ جنات، طیور اور حیوانات پر بھی ان کی حکومت تھی۔

2 ......دوسرے بادشاہ ایمان والے حضرت ذوالقرنین ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے مشارق الارض سے لے کر مغارب تک بھیجا۔ ان کو طاقت، سلطنت اور عزت دی۔ جن کا واقعہ قرآن پاک کے اندر موجود ہے۔

3 ......دو کافر بادشاہوں میں: ایک نمرود ہے جس کا پایہ تخت بابل تھا۔

4 ......دوسرا بختِ نصر بادشاہ ہے۔

نمرود بابل کا بادشاہ تھا۔ یہ اپنے اقتدار میں، اپنی دولت و حکومت کے گھمنڈ میں آکر اتنا کمزور ہوگیا کہ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا۔ قاعدہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ دولت، طاقت اور قوت دیتے ہیں اس کے ساتھ اگر اللہ تعالیٰ ایمان کی قوت عطا فرمادیں تو آدمی سیدھے راستے پر رہتا ہے اور اگر ایمان کی دولت سے محروم کردیں تو سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات کو اس لیے بیان فرمایا؛ کیونکہ مکہ والے یہودی اور عیسائی بھی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے واقعات کو سامنے رکھا۔

مناظرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ مناظرہ ہوا۔ اس سے علماء نے مسئلہ نکالا ہے کہ اگر کبھی علماءِ حق کو ضرورت پڑے تو باطل کے ساتھ مناظرہ بھی کرنا جائز ہے۔ مناظرہ کے اندر موضوع متعین ہوجاتا ہے اور اس پر دلائل دیئے جاتے ہیں، تاکہ لوگوں پر حق اور باطل واضح ہوجائے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالے جانے کے بعد کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ان کو بچالیا تو معجزہ دیکھ کر ان کی لوگوں کے اندر ایک طاقت بنی۔ اب بادشاہ نے بھی کوشش کی کہ بات سے مسئلہ حل ہو جائے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی کوشش کی کہ بات سے مسئلہ حل ہو جائے؛ کیونکہ جو مسائل گفتگو سے حل ہو سکتے ہیں وہ کبھی طاقت سے حل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے تمام دینی جماعتوں کو یہ سامنے رکھنا چاہیے کہ انبیاء کا منہج تشدد نہیں ہوتا، بلکہ صبر ہوتا ہے۔ کبھی دین کسی کو مارنے یا کسی کو کافر کہنے سے نہیں پھیلا، بلکہ ایک اسلوب اور طریقہ سے پھیلا ہے۔ جب تک دینی جماعتیں ایسے منہج نبوی پر نہیں آتیں اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اکیلے نمرود کے پاس گئے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ﴾ کیا آپ نے دیکھا نہیں؟ تو یہاں رؤیت سے مراد رؤیت علمی ہے کہ کیا آپ نے جانا نہیں؟ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے کلام کو لاتے ہیں کہ آدمی ذرا آنکھیں بند کرے تو اب بھی معلوم ہوگا کہ کیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام وقت کی قوت کو للکار رہے ہیں؟

حضرات ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مناظرہ:

نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا اس لیے کیا کہ ﴿أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ﴾ اللہ تعالیٰ نے اس کو بادشاہت دی تھی، حالانکہ اس کو چاہیے تھا کہ وہ ملک ملنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بن جاتا، نہ کہ خدا کا انکار کر دیتا اور دعویٰ کر دیا کہ میں خود خدا ہوں۔ دولت اور طاقت کا نشہ آدمی کو اندھا کر دیتا ہے، مگر وہ لوگ جو سب طاقتوں کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں۔ وہ جتنی قوت والے ہوتے ہیں اتنے جھکتے چلے جاتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام جب نمرود کے پاس آئے تو سیدھے چلے آئے۔ نمرود نے کہا: تم نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے اللہ کو سجدہ کرتا ہوں۔ نمرود نے کہا: اچھا تم میرے سوا اور خدا مانتے ہو؟ آپ نے فرمایا: تم تو ایک بندے ہو۔ نمرود نے کہا: تم جس کو خدا مانتے ہو اس کی کوئی صفت بیان کرو۔ آپ نے فرمایا: میرا خدا وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ نمرود کہنے لگا: میں بھی مارتا ہوں اور جلاتا ہوں۔ اور اس نے دو قیدی بلائے: ایک وہ جس کو سزائے موت ہو چکی تھی، اس کو کہا: بھاگ جاؤ۔ اور جس کو آزادی ملنی تھی اس کی تلوار سے گردن اڑا دی۔ اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہنے لگا: دیکھو! میں نے بھی ایک کو مار دیا اور ایک کو بچا لیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ تو بالکل اپنی طاقت کے نشہ میں چور ہے یا عقل سے کورا ہے؛ کیونکہ جلانا ہوتا ہے غیر چیز میں روح کا ڈالنا، داخل کرنا، جیسے پیٹ کے اندر بچہ ہوتا ہے اس میں روح ڈالنا، یہ جلانا ہے۔ اور مارنا یہ ہے کہ زندہ انسان ہے، اس کے اندر سے روح کا نکالنا، ورنہ ایک چھوٹا سا لڑکا کسی کو چھری سے مار دے تو کیا وہ بھی خدا بن جائے گا؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ اس سے ایسی بات کی جائے جو اس کی سمجھ میں بھی آسکے اور لوگوں کی عقل میں آسکے؛ کیونکہ "كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ" لوگوں کی عقل کے مطابق بات کرو تو بات بنتی ہے۔ آپ نے فرمایا: میرا رب روزانہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، مغرب میں غروب کرتا ہے۔ تم اگر رب ہو تو سورج کو ایک دن مشرق کی بجائے مغرب سے نکالو۔ ﴿فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ﴾ نمرود حیران رہ گیا کہ سورج کو کیسے مغرب سے نکالے؟

علماء نے فرمایا: وہ بد بخت یہ تو کہہ سکتا تھا کہ میں نہیں نکال سکتا، تم اپنے رب سے کہو کہ مغرب سے نکالے، لیکن وہ بات بھی نہ کرسکا؛ کیونکہ وہ ایسا بے ہوش ہوا کہ اس کو یہ بات کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دوسرا وہ سمجھ چکا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سچے نبی ہیں اور ان کا خدا سچا ہے۔ اگر میں نے یہ مطالبہ کر دیا کہ اپنے رب سے کہو کہ سورج کو مغرب سے نکالے اور خدا نے مغرب سے سورج کو نکال دیا تو ساری دنیا مسلمان ہو جائے گی۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اگر اگلا سوال کرتا ہوں تو سب کچھ جاتا ہے، ورنہ خاموش ہوں گا تو کم از کم وہ لوگ متاثر ہوں گے جو دیکھ رہے ہیں یا جن تک بات پہنچے گی اور سورج کا معاملہ تو ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ اس لیے اس نے ڈر کے مارے یہ بات نہیں کی تھی۔

علماء کرام نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیں کہ قیامت سے پہلے ایک وقت ایسا آئے گا کہ اللہ تعالیٰ سورج کو مغرب سے نکالیں گے۔ اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ پھر جو مسلمان ہے مسلمان رہے گا اور جو کافر ہے کافر رہے گا۔ سورج کو مغرب سے نکال کر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا اظہار دنیا میں بھی فرما دیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [البقرۃ:۲۵۸] اللہ تعالیٰ اس قوم کو ہدایت نہیں دیتے جو اپنے اوپر خود ظلم کرنے والے ہیں۔ جیسا کہ نمرود کے سامنے حق واضح ہو گیا، لیکن پھر بھی اس نے نہ مانا تو اس نے اپنی جان پر خود ظلم کیا۔ آج کتنے لوگ ہیں جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ولی کی قبر ہے، اس کو بھی آخر موت آئی، جنازہ پڑھا گیا، قبر کھودی گئی اور قبر میں دفن کر دیا گیا، لیکن پھر بھی کہتے ہیں: یا پیر! مہربانی کر، بچے دلوا۔ اب حق واضح ہو گیا، لیکن پھر بھی وہ اپنے اوپر ظلم کر رہا ہے تو کرتا رہے۔ اگر وہ خود جہنم میں جانا چاہتا ہے تو جائے۔

نمرود کا نسب نامہ:

نمرود حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کا نسب یوں ہے: نمرود بن کنعان بن کوش بن سام بن نوح۔ اور دوسرے قول کے مطابق نسب یوں ہے: نمرود بن فالغ بن عابر بن سالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح علیہ السلام۔ بہرحال یہ سامی النسل ہے؛ کیونکہ حضرت نوح کے تین بیٹے تھے: سام، حام اور یافث۔ دنیا کے اندر جتنی مخلوق پھیلی ہے وہ ان تینوں بیٹوں سے ہے۔ پہلا قول حضرت مجاہد کا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ:

بعض علماء نے فرمایا کہ نمرود نے یہ انتظام کیا تھا کہ لوگ خوراک کے لیے اپنا وفد بنا کر آتے تھے اور وہ ان کو خوراک دیتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس ضمن میں آئے اور اس سے مناظرہ ہو گیا تو نمرود نے سب کو گندم، آٹا دیا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہ دیا۔ آپ جب واپس آئے تو راستے میں اپنی بوریوں میں ریت ڈال لی، تاکہ بچوں کو کچھ دیر مطمئن کر لوں گا۔ جب گھر پہنچے تو اس ریت کو رکھ کر سو گئے۔ جب اٹھے تو کھانا تیار تھا۔ بیوی سے پوچھا کہ آٹا کہاں سے آ گیا؟ اس نے کہا: آپ جو بوریاں بھر کر لائے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے۔ کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ رزق بھیجا ہے تو ٹھیک ہے۔

نمرود کا انجام:

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے پاس ایک فرشتہ کو بھیجا، اس نے کہا: تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر لو۔ نمرود نے کہا: میں نہیں مانتا ہوں۔ جو دعوت دیتے رہے تو وہ نہ مانا۔ تو اس فرشتہ نے نمرود سے کہا: تم بھی اپنا لشکر تیار کرو، ہم بھی اپنا لشکر لے کر آتے ہیں۔ فلاں دن تمہارا ہمارا مقابلہ ہوگا۔ نمرود نے اپنا لشکر نکالا اور طلوع شمس کے وقت اپنی قوت طاقت لے کر آ گیا۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: تھوڑے سے مچھر بھیج دو۔ مچھروں نے ان سب کو فنا کر ڈالا، کچھ نہ بچا۔ ایک مچھر نمرود کی ناک میں داخل ہو کر سیدھا دماغ میں چلا گیا۔ جب وہ حرکت کرتا تو نمرود کو درد شروع ہو جاتا۔ کہا: ہاتھ سے مارو۔ جب ہاتھ سے تنگ آ گیا تو کہا: جوتے سے مارو۔ لکڑی کے جوتے بنائے گئے، اس سے مارا جاتا تھا۔ چار سو سال تک اس عذاب میں مبتلا رہا۔ یہ روایات اسرائیلیہ ہیں۔ ان میں یہ بھی لکھا ہے کہ نمرود کا سب سے پیارا بندہ وہ ہوتا

تھا جو زور سے سر میں جوتا مارتا تھا؛ کیونکہ جب وہ جوتا مارتا تھا تو مچھر کچھ دیر آرام کر جاتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم تو خدائی کا دعویٰ کر رہے تھے اور ایک چھوٹے سے مچھر کا مقابلہ بھی نہیں کر سکے۔

دوسرا قصہ:

حضرت عزیر علیہ السلام نے ایک ویران بستی کو دیکھا تو کہا: اللہ تعالیٰ جب اس کو دوبارہ زندہ کریں گے تو اس کی کیفیتیں کیا ہوں گی؟ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی قدرت کا نظارہ دکھانے کے لیے حکم دیا کہ آپ مر جاؤ۔ ان کو سو سال تک موت آ گئی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ زندہ کیا اور فرمایا کہ بتاؤ تم کو کتنی دیر گزری ہے؟ کہنے لگے: معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ گزرا ہے کہ جب میں سویا تھا تو سورج یہاں تھا اور اب یہاں ہے اور مجھے یہ یاد نہیں کہ کل تھا یا آج تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے بندے! تو نے ایک سو سال گزارا ہے۔

کیا صاحبِ واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے؟

قرآن میں ان کا نام نہیں لیا گیا؛ کیونکہ قرآن کا مقصد نام بیان کرنا نہیں ہوتا، دلائل مقصود بیان ہوتا ہے۔ یہ مفسرین و مورخین نے کام کیے ہیں۔ اختلاف ہمیشہ اس مسئلے میں ہوتا ہے جس کے بارے میں نص نہیں ہوتی، یعنی قرآن نے جو مسئلے کھول کر بیان کر دیے ان میں اختلاف نہیں ہو سکتا، جو چیزیں حضور اکرم ﷺ نے کھول کر واضح کر دی ہیں ان میں کبھی اختلاف نہیں ہو سکتا، بلکہ اختلاف وہاں ہوتا ہے جہاں نص نہیں ہے۔

مثلاً: قرآن نے کسی واقعہ کو بیان کیا اور نام نہیں لیا، اس کے اندر اختلاف ہوتا ہے۔ اب جب مفسرین نے نام ڈھونڈنے کی کوشش کی تو وہ اختلافات میں الجھ گئے۔ اس آیت میں مذکور واقعہ کے بارے میں:

- ......بعض مفسرین نے فرمایا: وہ حضرت ارمیا علیہ السلام تھے۔
- ......دوسرا قول ہے کہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔
- ......تیسرا قول ہے کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔
- ......چوتھا قول یہ ہے کہ وہ حضرت خرقیل بن بورا علیہ السلام تھے۔
- ......پانچواں قول ہے کہ وہ کوئی اسرائیلی تھا۔
- ......اور بعض لوگوں نے کہا: وہ آدمی نبی تو کیا وہ مسلمان بھی نہیں تھا؛ کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ پر یہ کہا کہ اللہ

تعالی مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ وہ انکار کر رہا ہے تو یہ نبی کیسے ہو سکتا ہے؟ راجح قول یہ ہے وہ اللہ کے نبی تھے اور ان کا یہ انکار نہیں تھا؛ کیونکہ دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ہے، انہوں نے عرض کیا تھا: اے اللہ! آپ مردوں کو کیسے جلاتے ہیں؟ اس لیے بات سمجھیں! اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالی مردوں کو زندہ نہیں کر سکتے، یہ کفر ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ کس طرح زندہ ہوں گے۔

بستی کی تعیین:

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرآن میں ''عَلٰی قَرْیَۃٍ'' آیا ہے، وہ کونسی بستی تھی؟ قرآن نے اس کا بھی ذکر نہیں فرمایا۔

بعض علماء نے فرمایا: وہ بیت المقدس تھی؛ کیونکہ جب بخت نصر بادشاہ نے بیت المقدس پر چڑھائی کی اور یہودیوں کو قتل کیا، بیت المقدس کو ویران کر ڈالا اور مسجد میں جتنی چیزیں لگی ہوئی تھیں سب اکھاڑ کر لے گیا۔ اس نے چھ لاکھ آدمی قتل کیے، ستر ہزار سے زیادہ کو قید کر کے ساتھ لے گیا۔ ایسی کیفیت میں جب اللہ کے نبی کا وہاں سے گزر ہوا تو ویرانی اور بربادی کا منظر نظر آیا۔ فوراً پیغمبر کے ذہن میں یہ سوال آیا تو اللہ تعالی کے سامنے یہ سوال رکھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں: بیت المقدس سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر ایک اور بستی تھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب وہاں سے حضرت عزیر علیہ السلام گزرے اور دیکھا کہ پوری کی پوری بستی ویران ہو چکی ہے، بندے مر گئے، درخت اکھڑ گئے اور مکان گر گئے تو انہوں نے تعجب سے اپنے اللہ تعالی سے احیائے موتی کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا۔ اس بستی میں اختلاف اس لیے ہوا؛ کیونکہ اللہ تعالی نے اس کا نام نہیں لیا۔

عقیدہ حیات الانبیاء:

﴿فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَشَرَابِکَ لَمْ یَتَسَنَّہْ﴾ اللہ تعالی نے ان کو ایک سو سال موت دی، پھر زندہ کرنے کے بعد فرمایا کہ دیکھو! ہم نے تمہاری کسی چیز کو بدلنے بھی نہیں دیا۔ اگر ناخن بڑھتے تو سو سال تک کہاں تک پہنچ جاتے!؟ اگر کپڑے بوسیدہ ہو جاتے تو ان کی کیفیت کیا ہوتی!؟ اللہ تعالی نے فرمایا: صرف یہی چیزیں نہیں ہم نے محفوظ رکھیں، بلکہ اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو! جو تبدیل نہیں ہوئیں۔

اس لیے احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالی نے انبیاء کرام کے اجسام کو زمین پر حرام کر دیا ہے۔ انبیاء کرام کے جسم محفوظ رہتے ہیں، ان کے اندر کسی قسم کا تغیر نہیں آتا۔ دیکھیں! اللہ کا نبی ہے، زمین کے اوپر ہے اور موت کو سو

سال گزر گئے، لیکن مجال ہے کہ زمین ہاتھ لگائے، کوئی نقصان پہنچا سکے۔

مطعومات، مشروبات، حیوانات اور انسان علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو زندہ کرنے کی کیفیات دکھادیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اپنے اس گدھے پر نظر ڈالو، جس پر تم سواری کر کے آ رہے تھے۔ تو اس کا ڈھانچہ پڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب اس کی طرف غور سے دیکھو کہ ان ہڈیوں کو ہم کیسے زندہ کرتے ہیں؟ ان ہڈیوں پر ہم گوشت کیسے چڑھاتے ہیں؟ جب اللہ تعالیٰ نے یہ ساری کیفیات کھول دیں تو اللہ کے نبی نے کہا: میں جانتا ہوں کہ میرا اللہ ہر چیز پر قادر ہے، میں کیفیات دیکھنا چاہتا تھا۔

دونوں واقعات میں فرق کیا ہے؟

نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ تمہارا رب کون ہے؟ انہوں نے فرمایا: جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ تو یہ ایک سوال ہے۔ اور حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ کے اندر بھی سوال ہے کہ اس بستی والوں کو مرنے کے بعد کیسے زندہ کریں گے؟ ان دونوں سوالوں کے اندر فرق ہے۔ ایک سوال صرف عناد اور جھگڑے کے لیے ہوتا ہے اور ایک سوال بات سمجھنے کے لیے ہوتا ہے۔ ان دونوں سوالوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا تھا: ﴿رَبِّ أَرِنِيٓ أَنظُرۡ إِلَيۡكَ﴾ [الاعراف: ۱۴۳] اے اللہ! مجھے اپنی رؤیت نصیب فرمائیں۔ اور بعینہٖ یہی سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے جو برگزیدہ لوگ تھے انہوں نے بھی کیا تھا کہ ہم تو کبھی تسلیم نہیں کریں گے، ہمیں کیا پتہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یا نہیں؟ ورنہ آپ ہمیں اللہ تعالیٰ کو دکھائیں۔ تو ان دونوں سوالوں کے اندر بڑا فرق ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال کے اندر بڑا ادب ہے کہ میں آپ کے دیدار کا مشتاق ہوں، مہربانی فرما کر اپنا دیدار نصیب فرمائیں۔ اور ان کی قوم نے دیدار کا سوال کیا، اس کے اندر گستاخی تھی کہ آپ نے ہمیں کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے کلام کیا ہے، ہمیں کیا پتہ شاید یہ کلام کرنے والا کوئی اور ہو۔ اس لیے فوراً بجلی آئی اور ان کو مار دیا گیا! کیونکہ ایک اللہ کے نبی کو جھٹلایا اور دوسری یہ جرات کی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے آئے۔

اسی طرح نمرود اور حضرت عزیر علیہ السلام کے سوال کے اندر بڑا فرق ہے۔ نمرود کے سوال کے اندر انکار اور عناد تھا اور حضرت عزیر علیہ السلام کے سوال کے اندر تحقیق ہے کہ میرا مولا! مجھے یقین ہے کہ آپ موت کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہیں، لیکن میں احیائے موتیٰ کی کیفیت دیکھنا چاہتا ہوں، تا کہ میرا علم الیقین عین الیقین بن جائے۔

عجائباتِ قدرت:

علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی بات سمجھنا چاہے تو اللہ تعالیٰ نے اتنے ذرائع اور اسباب رکھے ہیں کہ سمجھنا مشکل نہیں ہوتا۔

1 مثلاً: آپ روٹی کا نوالہ توڑ کر منہ میں رکھتے ہیں۔ اگر صرف اس پر غور کر لو کہ یہ نوالہ منہ تک کیسے پہنچا؟ سب سے پہلے زمین بنائی گئی، بیج ڈالا گیا، پانی لگایا گیا، اس کی حفاظت کی گئی، پھر جا کر کھیتی تیار ہوئی، اس کو کاٹا گیا، ان دانوں کو علیحدہ کیا گیا، پھر ان دانوں کو پیسا گیا، پھر وہ آٹا بنا اور اس کو گوندھا گیا۔ تو غور کریں! کتنی مخلوق کام میں لگی!؟ اور نوالہ ہمارے منہ تک پہنچا ہے۔ اگر دنیا میں یہ ساری متفرق چیزیں اللہ تعالیٰ اکٹھی کرنے پر قادر ہیں تو ہمارے مرنے کے بعد ہماری ہڈیوں کو اکٹھا کرنے پر بھی قادر ہیں۔

2 علماء نے فرمایا کہ غور کرو! اللہ تعالیٰ نے کھانے اور پینے کے لیے ایک راستہ رکھا ہے، لیکن نکالنے کے لیے دو راستے بن گئے ہیں۔ جو چیزیں تم کھا رہے ہو اس سے خون کیسے بنتا ہے؟ اور خون کن ذرائع کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہر عضو میں پہنچا رہے ہیں؟ اس خون سے تولید کا مادہ کیسے بنتا ہے؟ پھر مادۂ تولید کو اللہ تعالیٰ نے بندے میں کہاں محفوظ رکھا ہوا ہے؟ اور پھر وہ مادۂ تولید ذکر وانثیٰ ایک مقام پر قرار پکڑتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے ایک بندہ پیدا فرماتے ہیں۔ اگر اسی پر غور کریں تو کیا اللہ تعالیٰ دوبارہ ہماری ہڈیوں کو جمع کرنے پر قادر نہیں ہیں!!؟ اگر آدمی غور کرے تو واضح بات ہے۔ یا اس کے دل پر زنگ لگ جائے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہریں لگ جائیں اور ہدایت کے راستے بند ہو جائیں تو اس کو سمجھ آنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ہے۔

عجائباتِ بیت المقدس:

بیت المقدس کی تعمیر بھی عجیب ہوئی ہے اور اس کی تخریب بھی عجیب ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی اور جنوں کو لگایا۔ ایسی تعمیر کی پورے عالم میں کوئی مثال نہیں ہے۔ ایسے ایسے موتی، ہیرے اور جواہرات حضرت سلیمان علیہ السلام نے لگوائے تھے کہ مؤرخین لکھتے ہیں: مسجد کا قبہ ایسے روشن ہوتا تھا کہ معلوم ہوتا چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ آج کے انجینئر اور آرکیٹیکٹ ان کو بڑا ناز ہے کہ ہم نے پچاس پچاس، سو سو اور دو دو سو منزلہ مکان بنا دیے ہیں اور اوپر ریوالونگ چیزیں بنا دی ہیں کہ پورا محل پھر رہا ہے، ادھر سے ادھر آ جاتے ہیں، لیکن ہزاروں سال پہلے جو اللہ کے نبی نے نقشہ دیا ہے نہ آج تک کوئی بنا سکا ہے اور نہ آئندہ کوئی بنا سکتا ہے۔ اہرامِ مصر کو آج تک عجائبات

میں سمجھا جاتا ہے، اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو لگایا تو ان کا کون مقابلہ کرے؟ ایک جن اتنا بڑا پتھر اٹھا کر لے آتا تھا کہ تم اگر کئی کرینیں لگاؤ تب بھی وہ نہ اٹھا سکیں اور اس مسجد کے اندر جمال تھا، وہ ایک عظیم عمارت تھی۔

اس کی بربادی اس طرح ہوئی کہ ظالم بادشاہ سب کچھ اکھاڑ پچھاڑ کر لے گیا، اس کو ویران کر دیا۔ جتنے خزائن وہاں دفن تھے لے گیا اور وہاں کے آٹھ لاکھ بندوں کو مار دیا اور باقیوں کو قید کر کے ساتھ لے گیا۔ اب جب گزرنے والا وہاں سے گزرا تو وہ حیران ہو گیا کہ اتنی بڑی عمارت عظیمہ کو کیسے بربادی آ گئی؟

موت اور نیند میں فرق:

اللہ تعالیٰ نے اس گزرنے والے کو موت دی تھی، نیند نہیں دی تھی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی موت کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں موت ہی مراد ہے۔ اور اصحابِ کہف کے قصہ میں نیند کا ذکر ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا﴾ [الکہف: ١١] ہم نے ان کے کانوں پر مہر لگا دی، ان کو بند کر دیا۔ ساری دنیا میں آج تک نیند کو کسی نے اس محاورہ میں پیش نہیں کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

اصحابِ کہف کی نیند کی حالت:

علماء نے اس سے مسئلہ لکھا ہے کہ نیند کے لیے ضروری ہے کانوں میں شور نہ ہو، ورنہ سکون کی نیند نہیں آتی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب اصحابِ کہف کو سلایا تو ان کے کانوں کو بند کر دیا۔ ﴿وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ﴾ [الکہف: ١٨] سونے والا جس کروٹ سو رہا ہو تو بستر گرم ہو جاتا ہے، پھر آدمی کروٹ بدل لیتا ہے۔ اب چونکہ وہ زندہ تھے، گرمی تو ہوگی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اتنی دیر کے بعد ان کو الٹ دیا کرو، تاکہ ان کو آرام و سکون سے نیند قائم رہے۔

بیت المقدس کی ویرانی اور آبادی:

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے پر موت طاری کر دی تو ستر سال کے بعد بیت المقدس آباد ہو گیا، لوگ بھی آباد ہو گئے، بنی اسرائیل جو باہر بھاگے تھے وہ بھی واپس آ گئے اور جو لوگ پیدا ہوئے تھے وہ بھی جوان ہو گئے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا مشاہدہ:

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عزیر علیہ السلام کو سو سال کے بعد اٹھایا تو سب سے پہلے ان کی آنکھوں کے اندر حیات ڈال دی، تاکہ میرا بندہ دیکھے کہ ہم اس کا باقی بدن کیسے زندہ کرتے ہیں؟ آنکھوں سے وہ دیکھتے رہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔ جب وہ پوری طرح زندہ ہو کر برابر ہو کر بیٹھ گئے، اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بھیجا کہ ان سے جا کر پوچھو کہ کتنا عرصہ گزرا ہے۔ جب ان کو موت آئی تھی تو وہ دن کا پہلا وقت تھا، جب اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ زندہ کیا تو وہ دن کا آخری حصہ تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ سورج ڈوبنے والا ہے تو انہوں نے گمان کیا کہ آج کا سورج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے! تو سو سال تک مردہ رہا ہے، تم اپنے کھانے کی چیزوں کو دیکھو! پینے کی چیزوں کو دیکھو! ہم نے ان کو خراب نہیں ہونے دیا۔ مفسرین فرماتے ہیں: آپ کے پاس انگور بھی تھے، انجیر بھی تھے، ان کا نکلا ہوا جوس بھی تھا اور ساری کی ساری چیزیں ویسی کی ویسی موجود تھیں۔

تیسرا واقعہ:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا: اے میرے نبی! یاد کریں! جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا کہ مجھے دکھائیں کہ آپ کس کیفیت سے مردوں کو زندہ کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تمہیں اس بات پر ایقان نہیں ہے کہ میں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہوں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: بالکل سو فیصد یقین ہے کہ آپ قادر ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اطمینانِ قلب کی دولت نصیب ہو جائے۔ اس سے پہلے والے واقعہ کے اندر کچھ سوئے ادب نظر آتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا نام بھی نہیں لیا اور بستی کا نام بھی نہیں لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو سوال کا فوراً جواب بھی نہیں دیا، بلکہ سو سال تک موت دینے کے بعد جواب دیا۔

سوال میں جتنا ادب ہوگا اتنی اللہ تعالیٰ کی رحمت زیادہ آئے گی۔ اس لیے جب آدمی دعا کرے تو یقین و ایقان، تضرع و عاجزی سے کرے اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تمہیں رونا نہ آتا ہو تو کم از کم رونے والوں کی شکل تو بناؤ۔

یاد رکھیں! ایک ایمان ہوتا ہے اور ایک اس پر اطمینان ہوتا ہے۔ اطمینان یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے غیب کی خبر دی ہے یا حضور اکرم ﷺ نے جو خبر دی ہے اس پر ہمارا ایمان ہے۔ اور ایک ایمان کے بعد مقامِ اطمینان ہے؛

کیونکہ قاعدہ ہے: ''اَلْخَبَرُ لَيْسَ كَالْمُشَاهَدَةِ وَالْمُعَايَنَةِ'' خبر جتنی پکی کیوں نہ ہو، لیکن مشاہدہ کے بعد جو آدمی کو اطمینان قلب حاصل ہوتی ہے وہ صرف خبر سے نہیں ہوسکتی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑی شان والے نبی ہیں، جن کی ذریت سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا، وہ احیائے موتیٰ کی کیفیت کے بارے میں سوال کر رہے ہیں کہ ہمارا ایمان ہے آپ مردوں کو زندہ کریں گے، لیکن ان کو کیسے زندہ کریں گے؟ اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ بکھری ہوئی ہڈیاں جن کو کچھ پانی بہا کر لے گیا ہے اور کچھ ہوائیں اڑا کر لے گئیں، کوئی عرب میں دفن ہوئے، دریاؤں نے کھینچا اور عجم پہنچا دیا، کس کو دریاؤں نے کھینچا اور سمندروں میں ڈال دیا؟ ان کا وجود نہیں ملتا کہ وہ ہڈیاں کہاں ہیں؟ ان کو زندہ کرنے کی کیفیت کیا ہوگی؟

شیخ عبدالقادر رحمہ اللہ کی کرامت کا ایک جھوٹا قصہ:

ہمارے بعض جہلاء نے مسلمانوں کے عقیدوں کو ایسا تباہ و برباد کیا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ خدا جانے ان کو خود حشر کا کوئی ڈر نہیں ہے! جو لوگوں کو گمراہی کا سبب بنتے ہیں اور پھر اللہ والوں پر بھی الزام لگاتے ہیں۔

ایک کتاب اس کا نام ''زین المجالس'' ہے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ پیرانِ پیر حضرت عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا ایک مرید خاص تھا، جو آپ کی بڑی خدمت کرتا تھا اور آپ کو بڑا آرام پہنچاتا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ وہ مر گیا۔ ملک الموت اس کی روح نکال کر لے جانے لگے تو پیرانِ پیر نے ملک الموت کو کہا: ٹھہر جاؤ!۔ وہ ٹھہر گئے، ان کو پیرانِ پیر نے کہا: میرے ملازم کی روح واپس کرو۔ ملک الموت نے کہا: حضرت! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں اللہ تعالیٰ کا فرشتہ ہوں، اس کی موت کی گھڑی آگئی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے میں نے اس کی روح نکالی تو واپس کیسے کردوں؟ پیرانِ پیر نے کہا: واپس کرو۔ انہوں نے کہا: میں تو واپس نہیں کرسکتا۔ پیرانِ پیر جلال میں آگئے اور ملک الموت کو ہاتھ مارا۔ اس نے جو ساری روحیں نکالی ہوئی تھیں سب تھیلے سے نکل گئیں اور لوگ زندہ ہوگئے۔ ملک الموت خالی ہاتھ اللہ تعالیٰ کے پاس جا کر کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: کیا ہوا؟ انہوں نے واقعہ سنایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم نے میرے محبوب کو کیوں ناراض کیا؟ تم خالی ہاتھ آگئے ہو، اب میں اس کا کیا بگاڑ سکتا ہوں؟

اندازہ کرو! اللہ تعالیٰ نے آپ کو عقل دی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ایک پیر کو اتنی طاقت دی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کہیں کہ میں کیا کرسکتا ہوں؟ حالانکہ اللہ کے نبی ہیں، وہ یہ نہیں جانتے کہ کیفیتِ احیاء کیا ہوتی؟ اور پیرانِ پیر کو پتہ ہے کہ زنبیل روحوں کی بھری ہوئی ہے۔ غصہ میں آئے تو سب کچھ چھوڑ دیا۔ اس عقیدے سے بڑا بھی کوئی کفر و شرک

ہو سکتا ہے؟

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ اگر خدا سے مانگو تو کوئی یقینی بات نہیں مانے یا نہ مانے؟ اور اگر نبی کے روضے پر جا کر دعا مانگو تو وہ بھی یقینی نہیں ہے کہ منظور ہو یا نہ ہو؟ لیکن میرے پاس آ کر مانگو گے تو کبھی خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے، میں اسی وقت پوری کر دیتا ہوں؛ کیونکہ میں خود مشکل کشا ہوں۔

کتاب میں تیسری جگہ لکھا ہے کہ اگر کوئی میرا مرید مشرق میں ہے یا مغرب میں ہے اور مجھے وہیں سے پکارے تو میں اس کی مدد کو وہیں پہنچ جاتا ہوں اور فوراً اس کے کام کر دیتا ہوں...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ...... اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو شرک سے بچائے۔ ان لوگوں کو یہ بھی نہیں پتہ کہ خود پیرانِ پیر کا عقیدہ کیا ہے؟ ان کی اپنی کتابیں موجود ہیں: ''الفتح الربانی'' اس کا اردو ترجمہ ''فیوضِ یزدانی'' چھپ چکا ہے۔ ''غنیۃ الطالبین'' اس کے اندر شیخ نے اپنے مریدوں کو لکھا ہے کہ خبردار! جو آدمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے گا یا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر سے نفع نقصان کی امید رکھے گا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا۔ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے وہی نفع نقصان دینے والا ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے اپنے یہ اعتقادات ہیں، لیکن اس ظالم نے ایک جھوٹی کتاب لکھ کر اس کی نسبت بھی حضرت کی طرف کر دی۔ ساری زندگی حضرت نے توحید کا کام کیا اور رفض کے خلاف کیا، اب یہ دونوں فرقے مشرکین اور روافض حضرت کے دشمن بن گئے اور مختلف کتابیں لکھ کر حضرت کو بدنام کرنے کے لیے پوری دنیا میں تقسیم کر دیں، ورنہ ان کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

معجزاتِ انبیاء اور کراماتِ اولیاء حق ہیں۔ لیکن یہ کیسی کرامت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ملک الموت کو فرمائیں: روح نکال لے کر آؤ۔ اور پیر کہے کہ میں نے چھین لیا، جاؤ کہہ دو۔ بھلا یہ بھی کرامت ہے!!؟ بلکہ یہ تو کفر صریح ہے، جس میں کسی تاویل کی گنجائش بھی نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا مقصد:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے بطورِ استفہام سوال کیا کہ مجھے دکھائیں مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کیا ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تمہارا ایمان نہیں ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو جانتے تھے۔ علماء نے فرمایا: یہ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تا کہ کل کو کوئی جاہل معاند حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اعتراض نہ کر سکے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایسے سوال کرنے کا کیا مقصد تھا؟ اللہ تعالیٰ نے سوال کر کے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جواب لے کر ہمیشہ کے لیے

دشمنوں کا منہ بند کر دیا، ورنہ اللہ تعالیٰ کو تو پتہ ہے کہ میرے خلیل کا ایمان وایقان مکمل ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال اس لیے تھا کہ ہمارا علم الیقین عین الیقین میں بدل جائے۔

اطمینانِ قلب سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

بعض علماء نے یہاں ایک سوال پیدا کیا ہے کہ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا اللہ تعالیٰ کی رحمت پر ایمان ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جنت ہے، جبکہ میں نے جنت نہیں دیکھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہنم ہے، جبکہ میں نے جہنم نہیں دیکھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میزان ہے جس سے عمل کے وزن ہوں گے، جبکہ میں نے وہ نہیں دیکھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غلمان ہیں، حوریں ہیں، جہنم میں یہ عذاب ہیں اور اللہ تعالیٰ مجھے حوضِ کوثر دیں گے، یہ سب غیب ہے، جبکہ ہم نے یہ سب بھی نہیں دیکھا، لیکن میرا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر اتنا پکا یقین ہے کہ اگر آج اللہ تعالیٰ پردہ ہٹا کر جنت دکھا دیں تو مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔

اشکال:

علماء نے سوال کیا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اتنا یقین بغیر دیکھے حاصل تھا تو خلیل کو حاصل کیوں نہیں تھا؟ آج کے دور کے اندر کوئی یہ بات کہے کہ خیر القرون کے زمانہ میں جو لوگ تھے ان سے زیادہ ہم نے دین کو سمجھا ہے تو یہ کوئی عقل کی بات ہے؟ کیونکہ خیر القرون حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور تابعین کا زمانہ ہے۔ جس صحابی نے خود سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ سمجھا ہو تو کیا ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ ہم نے اپنے استادوں سے قرآن پڑھا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے براہِ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پڑھا تو ان کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ اور پھر وہ جس نے صحابہ سے قرآن پڑھا اس کا مرتبہ اعلیٰ ہے اور اس کے بعد تبع تابعی کا درجہ آ گیا۔

جواب:

اس سوال کے علماء کرام نے دو جواب دیئے ہیں: ایک جواب یہ ہے کہ جیسے تقویٰ کی قسمیں ہیں: ایک تقویٰ یہ ہے کہ آدمی شرک سے بچے، دوسرا مرتبہ تقویٰ کا یہ ہے کہ شرک سے بھی بچے اور کبیرہ گناہوں سے بھی بچے، تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ شرک سے بھی بچے، بڑے گناہوں سے بھی بچے اور چھوٹے گناہوں سے بھی بچے اور ایک تقویٰ یہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کا دل میں خیال ہی نہیں ہے۔ یہ سب سے اونچا مقام ہے۔

علماء نے فرمایا: اس طرح اطمینان کے بھی درجات ہیں: ایک عامۃ المومنین کا اطمینان ہے، ایک اطمینان اصحاب رسول ﷺ کا ہے، ایک اطمینان تابعین و تبع تابعین کا ہے، ایک اطمینان انبیاء ﷺ کا ہے، ایک اطمینان خلیل اللہ کا ہے اور ایک اطمینان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ہے۔ ہر کسی کے اطمینان کا فرق ہے، لہٰذا جو اطمینان سیدنا خلیل علیہ السلام چاہتے تھے وہ مقام بلند ہے، اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نہیں پہنچ سکتے۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان اگرچہ بہت بلند ہے، لیکن وہ نبی نہیں ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقابلہ کافروں سے تھا، جو اللہ کے بھی منکر تھے اور کہتے تھے: ''أَنَا أُحْيِيْ وَأُمِيْتُ'' میں بھی مارتا ہوں اور زندہ کرتا ہوں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: اس سے ایک تو مجھے اطمینانِ قلب ہو جائے گا اور جو منکر بعث ہیں وہ بھی سمجھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ کیسے زندہ کرتے ہیں؟ اور احیائے موتیٰ پر قیامت تک ایک ایسی بات سامنے آجائے کہ قیامت تک کوئی آدمی انکار نہ کر سکے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ چاند نکلا ہوا ہے اور ایک آدمی کہے کہ چاند نہیں ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

مردوں کو زندہ کرنے کی ایک صورت:

علماء نے ایک حکایت لکھی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ میرا حکم پورا کرو کہ زندوں کو مردہ کیسے کرتے ہیں (کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرو)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: اے اللہ! میں آپ کے حکم کے تابع ہوں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ حکم کریں اور میں تعمیل نہ کروں۔ یہ علماء کا ایک علمی نقطہ ہے، کوئی مسئلہ نہیں ہے اور نہ کسی کتاب کے اندر یہ لکھا ہوا ہے، بلکہ دونوں واقعات کو ملا کر علماء نے ایک بات مستنبط کی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو قبول فرمالیا اور ان کو حکم دیا: میرے خلیل! تم چار پرندے پکڑو۔ ﴿فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ﴾۔ ایک قراءت ''فَصُرْهُنَّ'' اور ایک قراءت ''فَصِرْهُنَّ'' ہے۔ اس طرح اس لفظ کے دو ترجمے ہیں کہ یہ پرندے ہیں اور وہ بھی آپ کی آواز کے عادی ہو جائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ہم نے ان چار پرندوں کو زندہ کرنا ہے تو وہ آپ کی آواز کے بھی عادی ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ پہچاننے میں غلطی نہ لیں کہ یہ وہی پرندے ہیں اور آگئے ہیں۔ جب یہ بات ہو جائے تو ان کو ذبح کرو، پھر ان کے گوشت اور ہڈیوں کو توڑ کر

آپس میں ملالو اور پھر ان کو تقسیم کرلو۔

اور یہ حکم نہیں دیا کہ چار بکریاں پکڑلو، چار گائیں پکڑلو، اللہ تعالیٰ نے پرندوں کا حکم کیوں دیا؟ اس کے اندر کیا حکمت تھی؟ اس پر مفسرین نے لکھا ہے کہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان کو تسلیم ورضا کا خوگر ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے، چاہے ہمیں اس کے اندر کوئی حکمت سمجھ آئے یا سمجھ نہ آئے۔

بعض علماء نے وجوہات لکھی ہیں کہ پرندوں کا تعلق عالمِ علو سے ہے کہ وہ فضا میں اڑتے ہیں اور جانوروں کا تعلق ارضیات سے ہوتا ہے۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال اونچا تھا اور جواب دینے والی ذات سب سے اعلیٰ تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو منتخب فرمایا جس کا تعلق عالم علوی سے تھا؛ کیونکہ جتنا بڑا سوال ہوتا ہے اتنے بڑے جواب کا اہتمام ہوتا ہے۔

اب خدا کیا کر رہا ہے؟

(واقعہ) امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے بادشاہ نے سوال کیا کہ آپ کا خدا اس وقت کیا کر رہا ہے؟ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: آپ نے جو سوال کیا ہے وہ خدا کے بارے میں ہے۔ اس کی شان بلند ہے، وہ عرش پر ہے اور آپ سوال کر رہے ہیں، میں زمین پر کھڑا ہوں، میں اس کا جواب ایک شرط پر دینے کے لیے تیار ہوں کہ آپ اپنے تخت سے نیچے آجائیں اور مجھے اپنے مقام پر بٹھائیں، پھر میں جواب دوں گا۔ بادشاہ اتر کر نیچے بیٹھ گیا اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ تخت پر گئے اور بادشاہ سے کہا: اب سوال کریں!۔ بادشاہ نے کہا: میرا سوال یہ ہے کہ آپ کا خدا کیا کر رہا تھا؟ آپ نے فرمایا: یہی تو کر رہا تھا کہ آپ کو تخت سے اتار دیا اور مجھے بٹھا دیا۔ بادشاہ کو بات سمجھ آگئی۔

وہ پرندے کون سے تھے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ تو حکم دیا کہ چار پرندے لے لیں، لیکن یہاں پرندوں کا نام نہیں لیا۔ مفسرین نے کچھ اقوال ذکر کیے ہیں کہ چار پرندوں میں ایک مور، دوسرا باز، تیسرا مرغا اور چوتھا کوا تھا۔ بعض نے کوے کی بجائے غرنوق کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی کوے سے ملتا جلتا ہے۔

چار پرندوں کے اندر حکمت ہے۔ دو، پانچ یا سات کا حکم کیوں نہیں دیا؟ اس کے بارے میں علماء نے جواب لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو یہ سوال کیا تھا کہ آپ مجھے دکھائیں کہ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا: تونے سوال کیا کہ مردے کو زندہ کیسے کرتے ہیں؟ اب میری ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ تم نے ایک سوال کیا ہم تمہیں چار دکھاتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس کے اور جواب بھی لکھے ہیں۔ اصل میں انسان اربعہ عناصر سے مرکب ہے: مٹی، پانی، ہوا اور آگ ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی چار کا حکم دے دیا، تاکہ عناصر اربعہ کا پورا نکھر جانا، پورا بکھر جانا اور پھر پورا مل جانا، ساری کیفیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے آ جائے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کے اندر ایک حکمت یہ ہے کہ مشہور جہات چار ہیں: مشرق، مغرب، شمال اور جنوب۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: چار پرندے لو اور ایک ایک جہت میں رکھو، تاکہ کوئی معاند یہ سوال نہ کر سکے کہ مشرق والی ہوائیں چلی، اس سے تو اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا، لیکن اگر مغرب سے چلتی تو زندہ نہ کرتے۔ اگر شمال سے چلتی تو زندہ نہ کر پاتے۔ اگر جنوب کی ہوا ہوتی تو زندہ نہ کر پاتے۔ بعض ہواؤں میں نمو کی کیفیات ہوتی ہیں اور بعض میں نہیں ہوتیں۔

بعض علماء نے فرمایا کہ پرندوں میں سے ان چار کو کیوں پسند کیا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مور اپنے جمال پر فریفتہ رہتا ہے اور انسان بھی شہوات کے ساتھ زینت پکڑتا ہے۔ اسی طرح باز جھپٹنے میں اور دوسرے کو مارنے اور اس کے گوشت کو نکالنے میں بڑی ہوس رکھتا ہے، اس طرح انسان میں بھی یہ بڑی تمنا ہے۔ اس طرح کوا دن رات محنت کر کے، چاہے اچھا ملے یا برا ملے، کھاتا رہتا ہے اور انسان بھی جب بھٹکتا ہے تو ہر طرف منہ مارتا رہتا ہے۔ مرغ کے اندر قوتِ شہوانیہ زیادہ ہے، انسان بھی اس قوتِ شہوانیہ کی وجہ سے برباد ہوا ہے۔ اس مناسبت سے ان پرندوں کو لینے کا حکم دیا گیا۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ان پرندوں کو اپنے ساتھ ہلا لو اور اس کے بعد حکم دیا ان کو ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ یاد رکھیں! قرآن میں ہمیں کسی جگہ یہ لفظ نہیں ملتا کہ ان کو ذبح کرو، ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ تو یہ مفہوم کہاں سے لیا گیا؟ بعض علماء نے فرمایا: لفظ ''صُرْهُنَّ'' کا معنیٰ ''قَطِّعْهُنَّ'' ہے۔ اور اگلا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ ہر پہاڑ پر کچھ حصہ رکھ دو، یہ نہیں فرمایا کہ ایک پہاڑ پر ایک پرندے کو باندھ آؤ، لہٰذا ذبح کا حکم قرآن میں موجود ہوا۔

بعض جاہل صوفی یہ کہتے ہیں کہ زندہ کرنا مردہ کرنا یہ تو محض اشارے ہیں، ورنہ معنیٰ یہ تھا کہ میرا دل مردہ ہو گیا، اس کو زندہ کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اس طرح انہوں نے ایک اور تفسیر بدل دی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ مسلمان زندہ ہے اور کافر مردہ ہے۔ یہاں بھی ایک زندگی کی بات ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال یہ تھا کہ

میرا دل مکاشفات اور تجلیات میں اس مقام پر نہیں جا رہا جہاں میں پہنچنا چاہتا ہوں، وہ بند ہو گئی ہے، اس کو زندہ کر کے کھول دیں، تاکہ میری تجلی زیادہ پرواز کر سکے اور مجھے تسکینِ قلب ہو سکے۔ اس ضمن میں قرآن میں یہ واقعہ ذکر ہوا ہے۔

یاد رکھیں! یہاں تو وہ تاویلیں کر سکتے ہیں، لیکن پہلے قصہ میں کیا تاویل کریں گے کہ اس کے اندر موت کا لفظ موجود ہے اور اس کے بعد بعث کا لفظ موجود ہے۔ وہاں تو یہ تاویلیں نہیں چل سکتیں۔ وہاں بھی مقصود احیائے موتی کی کیفیت ہے، یہاں بھی وہی سوال ہے تو بہانے بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

بعض نے کہا: چار پہاڑ تھے۔ اور بعض نے کہا: سات پہاڑ تھے۔ اور مقصد یہ تھا کہ ہمیں کیا ضرورت ہے اس میں بحث کرنے کی؟ بس جو ان کے سامنے پہاڑ تھے اور مقصد یہ تھا کہ تم ان کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر کے ان کا قیمہ بنا کر اور پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے جزء پہاڑ پر رکھ دو اور پھر ان کو آواز دو تو وہ تیری طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے۔

قیامت کے دن بھی ایسا ہوگا کہ جب صور پھونکا جائے گا اور ساتھ کہا جائے گا: اے بوسیدہ ہڈیو! اکٹھی ہو جاؤ، اے مردو! زندہ ہو جاؤ۔ تو سب کھڑے ہو جائیں گے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا کہ تم بھی ان پرندوں کو آواز دو تو وہ تیرے پاس دوڑتے ہوئے آئیں۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے پرندوں کا تو کام ہے کہ وہ اڑتے ہوئے آتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ دوڑتے ہوئے آئیں گے، تاکہ کوئی معاند کل کو یہ نہ کہے کہ یہ تو دوسرے پرندے ہیں جو اڑتے ہوئے ادھر آ گئے ہیں۔

﴿يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ﴾ یہ قرآن کا اسلوب ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان باتوں پر عمل کیا تو وہ دوڑتے ہوئے آ گئے۔

﴿وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۶۰] اے میرے پیغمبر! اپنے علم کو اور پکا کر لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہیں۔ وہ چاہیں تو مردہ کر دیں اور وہ چاہیں تو زندہ کر دیں۔ وہ چاہیں تو ہلاک کر دیں اور وہ چاہیں تو دوبارہ زندہ کر کے آباد کر دیں۔ اس کے اندر اس کی حکمتیں ہیں کہ اتنا عرصہ گزر گیا، ابھی قیامت نہیں آئی۔ ان آیات سے بھی مقصود اثباتِ معاد ہے کہ ہر مسلمان کا اعتقاد پکا ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مارنے پر بھی قادر ہیں اور مرنے کے بعد جب اللہ چاہے جب ہماری ہڈیاں بکھر جائیں تو زندہ کرنے پر بھی قادر ہیں۔

سوال کی وجوہات:

بعض علماء نے حضرات ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کرنے کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک دفعہ سمندر کے کنارے گزرے۔ وہاں ایک مردہ جانور سمندر کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ جب پانی کی لہر آتی تو سمندر کے جانور آ کر اس مردہ جانور کو نوچتے۔ جب پانی اترتا تو جنگل کے جانور بھی جا کر اس کو کھانا شروع کر دیتے تھے۔ جب یہ سب کھا پی لیتے ہیں اور کچھ تھوڑا بچ جاتا ہے تو بہت بڑے پرندے آتے ہیں اور اس کو کھاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کہ اللہ میاں! اس کے کچھ ٹکڑے سمندری جانوروں کے پیٹ میں چلے گئے، کچھ جنگلی جانوروں کے پیٹ میں چلے گئے اور کچھ فضائی جانوروں کے پیٹ میں چلے گئے، اے اللہ! آپ ان سب سے اس کو کیسے اکٹھا کر کے زندہ کریں گے؟ وہ مجھے دکھا دیں، تاکہ اطمینانِ قلب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں حکمت والا ہوں، غالب ہوں۔ تو ان پرندوں کو دیکھو! کیسے ان کی ہڈیاں گوشت ملا ہوا ہے۔ اس طرح جب ہم حکم دیں گے تو جہاں کہیں کسی کی ہڈی وغیرہ پڑی ہے اپنی جگہ پر آ جائے گی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال پر علماء نے کئی اسباب ذکر فرمائے ہیں: ان میں سے جس سبب کو ابن کثیر رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے اس کو پہلے ذکر فرمایا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے سامنے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور اثباتِ وجودِ باری تعالیٰ پر دلیل دی تھی کہ ﴿رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کروں کہ مجھے علم الیقین سے عین الیقین تک پہنچا دیں۔

بعض علماء کرام نے اسی وجہ کو بیان کرنے میں تھوڑی تفصیل فرمائی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال میں صفتِ خداوندی کا ذکر کیا کہ ﴿رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ تو نمرود نے جواب دیا: ﴿أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ﴾ اور اس نے ایک قیدی کو قتل کر دیا اور ایک کو چھوڑ دیا اور اس نے لوگوں کو دھوکہ دیا کہ میں بھی مارتا ہوں اور میں بھی زندہ کرتا ہوں۔ اس لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے چاہا کہ میرا علم علم الیقین سے عین الیقین میں بدل جائے اور دوسرا لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ زندہ کرنا اور چیز ہے اور کسی قیدی کو چھوڑ دینا اور چیز ہے، کسی بندے کو قتل کر دینا اور چیز ہے۔ تو زندہ کرنے کا معنی تو ہے کہ کسی مردے میں روح ڈالی جائے اور مارنے کا معنی یہ ہے کہ کسی زندہ سے اس کی روح کو خارج کر دیا جائے اور وہ اپنی موت مرے۔ یہ معنی نہیں ہوتا کہ کسی کو تلوار سے مار دو تو تم بھی مارنے والے بن گئے۔

ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کے اہل ہیں؟

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث نقل کی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نَحْنُ أَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ إِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ: رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ'' [بخاری، رقم: ۳۳۷۲] ہم تو ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اس بات پر شک کریں۔ انہوں نے جب اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ اے میرے رب! آپ مجھے دکھائیں! آپ مردوں کو کیسے زندہ کریں گے؟

مفسر فرماتے ہیں: کبھی لفظ شک کا ہوتا ہے، لیکن اس کا معنیٰ وہ نہیں جو ہم استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً: عام آدمی حدیث کو پڑھے اور محدث لکھے: یہ حدیث صحیح نہیں، ضعیف ہے۔ تو عام آدمی سمجھتا ہے کہ صحیح نہیں کا مطلب ہے کہ یہ غلط ہے، لیکن یہ بے وقوفی والی بات ہے۔ احادیث کے درجے ہوتے ہیں: بعض کا درجہ صحت ہوتا ہے، بعض حسن کے درجے پر پہنچتی ہے، بعض حدیثیں ضعیف کے درجے کے پہنچتی ہیں، بعض حدیثیں غریب ہوتی ہیں، بعض روایات منقطع ہوتی ہیں، بعض روایات مرسل طریق پر بیان ہوتی ہیں اور بعض روایات موقوف ہوتی ہیں۔ یہ اصطلاح محدثین ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جتنی اونچی دی تھی اتنی تواضع دی تھی۔ جیسا کہ جو درخت ثمر آور ہوتا ہے، اس کی ڈالی اتنی جھکی ہوئی ہوتی ہے، اگر اس پر ثمر نہ ہو تو وہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں چاہیے تھا کہ ہم سوال کرتے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کر کے بات ختم کر دی؛ کیونکہ جتنا قیامت کا قرب آتا چلا جائے گا فرق پڑے گا۔ اس لیے شک کا معنیٰ وہ نہیں ہے جو عام لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان بیان کی ہے۔

قرآن میں ارجیٰ آیت:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے نزدیک یہ آیت مغفرت کی زیادہ امید لگانے والی ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا سوال کرے اور اللہ تعالیٰ پورا کر دے بندے کے اطمینان قلب کے لیے تو اس سے بڑی رحمت کیا ہوگی؟

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾﴾ [البقرة:٢٦١]

"جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے سات بالیں اگیں، ہر بالی میں سو سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اس سے بھی زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اللہ وسعت والا ہے جاننے والا ہے۔"

انفاق فی سبیل اللہ کی مثال:

تیسرے پارے کے شروع میں آپ نے پڑھ لیا تھا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٥٤﴾﴾ [البقرة:٢٥٤]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان والوں کو حکم دیا تھا کہ جو رزق ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو۔ اور فرمایا:

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ﴾ [البقرة:٢٤٥]

کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے، جہاں قرض ڈوبنے کا اندیشہ بھی نہیں اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا کر کے لوٹائیں گے۔ یہ انفاق فی سبیل اللہ کا حکم ہے۔ آپ پہلے ان دو آیات کے اندر پڑھ چکے ہیں اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسئلہ معاد کو بیان کر کے فرمایا: جب تمہیں یقین ہے کہ ہم نے مرنا ہے اور مرنے کے بعد اٹھنا ہے تو اس کے لیے کوئی تیاری بھی کی ہے یا ایسے بیٹھے ہوئے ہو؟ اگر تم نے سفر کرنا ہے تو کوئی سامانِ سفر بھی باندھا ہے یا ایسے جا کر کھڑے ہو جاؤ گے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب ہم نے قیامت کو واضح کر دیا تو اس کے لیے تیاری کرو کہ میرے راستے میں خرچ کرو، یعنی مسکینوں، یتیموں کو کھلاؤ، مدارس و مساجد کو بناؤ، اپنا مال خرچ کر کے دنیا میں دین کو پھیلاؤ۔

انفاق فی سبیل اللہ کا ثواب:

اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی کاشت کرنے والے نے ایک بیج دانہ ڈالا، اس سے ایک کونپل پھوٹی، اس کے

بعد اس کے اوپر سٹے بن گئے، ہر سٹہ کے اندر سو سو دانہ بھر دیا کہ ڈالنے والے نے ایک دانہ ڈالا اور ہم نے اس کو سات سو دانہ بنا دیا۔ اس ایک مردہ دانہ کو میں نے جیسے زندہ کیا اسی طرح مردہ بندے کو بھی زندہ کرنے پر قادر ہوں۔ تم نے یہ دانہ گھر سے اٹھایا اور ہل چلا کر زمین کو نرم بنا کر اس کے اندر ڈال دیا، لیکن ہم نے دانے کی کیسے حفاظت کی ہے کہ اگر دریاؤں کو بھیج دوں تو وہ سب کچھ لٹا کر پھینک دے۔ ﴿ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ [الواقعۃ: ۶۴] کیا تم یہ کاشت کرتے ہو یا ہم کاشت کرتے ہیں؟ اصل تو میں کرنے والا ہوں، تو سبب ہے۔ جب اس چھوٹے سے دانے کو ہم گم نہیں ہونے دیتے تو کیا یہ چھ فٹ کا بندہ مرنے کے بعد گم ہو جائے گا؟ کیا ہمیں پتہ نہیں چلے گا کہ یہ ہڈیاں کس کی ہیں؟ کیا ہم ان کو دوبارہ نہیں جوڑ سکیں گے؟

﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ [البقرۃ: ۲۶۱] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں اگر چاہوں تو سات سو گنا سے بھی زیادہ ثواب بڑھا دوں جس کے لیے چاہوں۔

مسجد الحرام کے اندر ایک نیکی ایک لاکھ نیکی بن جاتی ہے۔ اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ نے جیش العسرۃ کے لیے چندہ مانگا اور فرمایا: بڑا مشکل مقابلہ ہے کہ ایک تو دشمن سے مقابلہ ہے اور دوسرا روم کی طاقت سے مقابلہ ہے جو منظم فوج ہے اور پہلی دفعہ مسلمان ان سے لڑ رہے ہیں، گرمی شدید ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے چندہ مانگا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: ایک ہزار اونٹ بمع پالان اور سامان کے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ آج ایک اونٹ کی قیمت لگا لو کہ کتنے کا ملتا ہے؟ اور ایک ہزار دینار بھی چندہ میں دیئے۔ حضور اکرم ﷺ گود میں پیسے لے کر خوش ہو رہے ہیں اور ان کو ہلا کر فرما رہے ہیں: عثمان! تجھے مبارک ہو! آج کے بعد جو تو کرے تیرا نقصان نہیں ہوگا۔ تمہاری جنت کا فیصلہ اللہ نے کر لیا ہے۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے غلطی کرنے نہیں دے گا، یہ معنی نہیں کہ گناہ کرو تو چھٹی ہے)۔

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس زمانے میں اپنے باغ کا نصف حصہ دیا ہے، جس زمانے میں اس کی قیمت چار ہزار دینار تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جتنا چاہے ثواب دے۔ اللہ تعالیٰ تمام خزانوں کے مالک ہیں۔ جتنا تمہارا اخلاص زیادہ ہوگا اتنا ثواب زیادہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ پیسوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ تیرے دل کو دیکھتے ہیں۔ اگر تو نے اخلاص کے ساتھ کسی کو ایک گلاس پانی پلا دیا ہے تو شاید اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔ تم نے کسی اندھے کا ہاتھ پکڑ کر راستہ عبور کرا دیا تو اس میں اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں گے۔ تم نے مسلمان

کے سامنے مسکرا دیا ہے اسی پر اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔ تم نے ایک دھیلا خیرات کیا ہے، شاید اسی پر اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔ اس لیے ان آیات کے اندر حکم دیا گیا کہ اگر قیامت پر ایمان ہے تو اس کے لیے تیاری کرو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔

پورے دین کا خلاصہ:

علماء کرام فرماتے ہیں: ہم پورے دین کا خلاصہ نکالیں تو دو چیزوں میں خلاصہ نکلے گا:

- ......ایک ''عَظَمَۃُ الْخَالِقِ'' کہ دل میں اپنے خالق کی عظمت پیدا ہو جائے۔
- ......دوسری چیز ''اَلشَّفَقَۃُ عَلٰی خَلْقِ اللّٰہِ'' مخلوق پر شفقت پیدا ہو جائے۔

ان دونوں کا نام دین اسلام ہے۔ اس لیے ہماری ہر اہم عبادت ''اللہ اکبر'' سے شروع ہوتی ہے، تا کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا دل میں اقرار ہو جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دل میں خالق کی عظمت بیٹھ جائے۔

نکات:

جب اذان سنی، دل کے اندر اللہ تعالیٰ کی عظمت ہے تو وہ گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ مثال کے طور پر: آپ کو کوئی گھر بلانے آئے اور آپ کو گھر والے کہیں کہ آپ کو کوئی آدمی بلانے آیا تھا۔ آپ پوچھتے ہیں: کون آیا تھا؟ تو وہ بتاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں: ٹھیک ہے، میں مل لوں گا۔ اس کے بعد اگر کوئی آپ کو کہے کہ بادشاہ نے آپ کو بلایا ہے تو آپ کہیں گے: چلو کس وقت بلایا ہے؟ وہ کہتا ہے: ابھی نہیں، تین دن بعد جانا ہے۔ تو آپ تیاری کر رہے ہیں، ایک ایک سے پوچھ رہے ہیں کہ بادشاہ نے مجھے بلایا ہے، بادشاہ کے دربار میں آدمی کیسے جاتا ہے؟ میں کیا بات کروں؟ کیسے بات کروں؟ تین دن اس کے اندر لگے ہوئے ہیں؛ کیونکہ بلانے والا بادشاہ ہے۔ تو جب اللہ تعالیٰ کی بڑائی دل میں ہو، بلانے والا بلا رہا ہے ''اللہ اکبر...... اللہ اکبر'' اور کوئی نماز کے لیے نہیں آ رہا تو اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت نہیں آئی۔ اگر دل میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی ہوتی تو یہ گھر میں نہ بیٹھ سکتا۔

جن لوگوں نے اللہ کے نبیوں اور رسولوں کا انکار کر دیا تو اس کا مطلب ہے کہ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت نہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغام کا کبھی انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی دل میں عظمت ہو تو اللہ تعالیٰ کے اوامر کا انکار نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی دل میں عظمت ہو تو اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے اس کا ارتکاب

بھی کبھی نہیں کرسکتا۔ تمام شرائع پر عمل تب ہوگا جب اللہ تعالیٰ کی عظمت دل میں بیٹھ جائے گی۔ اس لیے اولیاء اللہ اللہ کے ذکر پر زور دیتے ہیں، کثرت سے ذکر کرواتے ہیں، کبھی جہراً اور کبھی سراً ذکر کرواتے ہیں، اور کبھی کبھی کہتے ہیں: دل پر غور کر کے بیٹھ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا مکاشفہ کرو، تاکہ دل میں اس کی عظمت بیٹھ جائے۔ جب اللہ تعالیٰ کی عظمت دل میں بیٹھ جائے تو بندہ گناہ نہیں کرتا ہے۔ اگر گھر میں سات یا آٹھ سال کا بچہ ہو تو میاں بیوی بھی آپس میں نہیں ملتے کہ بچہ جاگ رہا ہے، بچہ دیکھ لے گا۔ تو بچے کا اتنا حیا، لیکن گناہ کرتے ہوئے یہ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں؟ آپ سارے پیغمبروں اور اولیاء کے واقعات پڑھ لیں کہ جب ان پر اس قسم کا ابتلا آیا تو انہوں نے کہا: معاذ اللہ! خبردار! میں اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں۔ حضرت بی بی مریم علیہا السلام نے دیکھا مرد آرہا ہے تو کہا: ﴿إِنِّيٓ أَعُوذُ بِٱلرَّحۡمَٰنِ مِنكَ﴾ [مریم:۱۸] میں اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتی ہوں، تم غیر محرم ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت ہو تو گناہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسرا مخلوق پر شفقت ہو۔ چھوٹا غریب ہمسایہ ہے، سب کے لیے دل کے اندر ہمدردی ہو کہ میں اس کی مدد کروں۔ جب دل کے اندر ان کی شفقت آجائے گی تو وہ آدمی زکوٰۃ ادا کرے گا، تاکہ ان کا بھلا ہو۔ یہ دو چیزیں جب آجائیں تو اسلام آجاتا ہے۔

اب انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا ہے کہ اگر تیرے دل میں میری عظمت ہوگئی ہے اور تمہیں موت کے بعد دوبارہ زندگی پر یقین آگیا ہے تو اس آخرت کے گھر کے لیے بھی کوئی تیاری کی ہے یا نہیں کی ہے؟

(حکایت) جیسا کہ ایک بادشاہ نے اللہ کے ولی سے پوچھا کہ مجھے مرنے سے بڑا ڈر لگتا ہے، حالانکہ مجھے یقین ہے کہ میں نے مرنا ہے، موت ٹل نہیں سکتی ہے۔ مہربانی فرمائیں! کوئی وظیفہ بتائیں۔ اللہ کے ولی نے فرمایا: مجھے ایک بات بتائیں کہ ایک آدمی کو محل سے نکال کر ویران جنگل میں بھیجا جائے تو اس کو جنگل میں جانے سے ڈر لگے گا یا نہیں لگے گا؟ بادشاہ نے کہا: اس کو ڈر لگے گا۔ اللہ کے ولی نے پوچھا اور جو جنگل میں پڑا ہے اس کو محل میں بھیجا جائے؟ تو بادشاہ نے کہا: وہ خوشی خوشی بھاگتا ہوا آئے گا۔ اس بزرگ نے کہا: اے بادشاہ! تم نے اگلا گھر تو برباد کر رکھا ہے اور دنیا والا گھر بنایا ہوا ہے، اس لیے تمہیں ڈر لگے گا۔ جن اللہ والوں نے اپنا آخرت والا گھر آباد کر رکھا ہے وہ تو سمجھتے ہیں کہ دنیا عارضی گھر ہے، ہم نے تو اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک نیکی پر دس گنا ثواب ہے۔ جیسا کہ قرآن میں نص آگئی: ﴿مَن جَآءَ بِٱلۡحَسَنَةِ فَلَهُۥ عَشۡرُ

أَمْثَالِهَا﴾ [الانعام:١٦٠] جو ایک نیکی کرے گا اس کو دس گنا ملے گا۔ جیسے ہم پانچ نمازیں پڑھیں تو پچاس لکھی جائیں گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی رحمت سے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں بعض خیرات وحسنات کو سات سو گنا بڑھا دیتا ہوں اور اگر میں چاہوں تو سات سو گنا سے بھی جتنا مرضی ہے بڑھا دوں، حتیٰ کہ قرآن کے اندر آ گیا: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ [الزمر:١٠] جن لوگوں نے دنیا میں مصیبتوں پر صبر کیا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو قیامت میں بغیر حساب کے ثواب دیں گے، بلکہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ان پر ثواب انڈیلا جائے گا۔

مقام کی وجہ سے نیکی کی فضیلت:

علماء نے فرمایا: بعض نیکیاں مقام کے اعتبار سے بڑھتی ہیں۔ ایک نماز گھر میں پڑھتے ہو اس کو ایک نماز لکھا جائے گا، اگر گھر سے نکل کر تم نے محلے کی مسجد میں ادا کی تو پچیس گنا ثواب ملے گا، گر محلے کی مسجد کو چھوڑ کر بڑی جامع مسجد میں آ گئے جہاں جمعہ ہوتا ہے تو پانچ سو گنا ثواب بڑھ گیا، تم مسجد اقصیٰ پہنچ گئے تو ہزار گنا نماز بڑھ گئی، اگر تم مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں نماز پڑھی تو پچاس ہزار گنا نماز بڑھ گئی اور اگر مسجد حرام میں آ گئے تو ایک نماز کا ایک لاکھ بڑھ گیا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

اوقات کے اعتبار سے نیکی کی فضیلت:

اور کبھی ثواب باعتبار اَزمنہ کے بڑھتا ہے کہ ایک عبادت تم روز کرتے ہو، لیکن اگر عشرِ ذی الحجہ میں عبادت کرو تو ثواب بڑھ گیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: عشرِ ذی الحجہ میں ثوابِ عمل اتنا افضل ہے کہ جہاد سے بھی افضل ہے۔ اسی طرح رمضان المبارک کے مہینے میں اعمال صالحہ کئے تو ستر گنا ثواب بڑھ گیا اور تم نے لیلۃ القدر میں عبادت کی تو ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینوں سے بڑھ گئی۔

نیت کی وجہ سے نیکی کی فضیلت:

اور کبھی فضیلت نیت کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی ہے جو میرے مہمان کو اپنے گھر لے جائے؟ ایک صحابی ان کو گھر لے آئے۔ انہوں نے اپنی بیوی سے پوچھا: گھر میں کیا ہے؟ اس نے کہا: اتنی سی روٹی ہے جو بچے کھا لیں اور تھوڑا ہم بھی کھا لیں گے۔ اس صحابی نے بیوی سے کہا: ایسا کرو بچوں کو سلا دو اور تم اس طرح کرنا جو تھوڑا سا ہے تم دے دینا۔ میں مہمان کے آگے رکھ دوں گا اور تم بڑے خیال سے دیئے کو بجھا دینا۔ تم بھی

منہ ہلاتی رہتا اور میں بھی منہ ہلاتا رہوں گا، تاکہ مہمان تو پیٹ بھر کر کھالے۔...... یہ اخلاص ہے کہ خود بھوکے ہیں اور بچے بھوکے ہیں، لیکن پھر بھی تمنا یہ ہے کہ مہمان راضی ہو جائے۔ صحابی نے اس طرح عمل کیا اور مہمان نے اچھی طرح سے روٹی کھالی۔...... بہر حال جب صبح کی نماز ہوئی تو حضور اکرم ﷺ نے اس صحابی کو بلایا اور فرمایا: رات جو تم نے میرے مہمان کی خدمت کی ہے وہ واقعہ تم مجھے سناتے ہو یا میں تجھے سناؤں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے ابھی جبرائیل خبر دے کر گئے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ میرے مدنی! تیرے صحابہ استقامت کے پہاڑ ہیں۔ یہ اپنے آپ پر بھی دوسرے کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے خود بھی ان کو حاجت کیوں نہ ہو۔ یہ اپنی حاجت کو چھوڑ دیتے ہیں اور پہلے دوسرے کی حاجت کا خیال کرتے ہیں۔

یہ اخلاص ہے، اس کی وجہ سے ثواب بڑھ جاتا ہے۔ یاد رکھیں! جس طرح کچھ شروط صحۃ الصلاۃ کے لیے ہیں اور کچھ شروط بقاء الصلوۃ ہیں۔ صحۃ الصلوۃ کی شروط یہ ہیں کہ وضو ہو، تمہارا بدن حدث اصغر اور حدث اکبر سے پاک ہو، لباس پاک ہو اور جب تم نے "اللہ اکبر" کہا تو اب ہر چیز جو اللہ تعالیٰ نے حلال کی منع ہوگئی۔ اب نماز میں اگر تم کھانا شروع کر دو یا تین گلاس پانی پینا شروع کر دو تو نماز باقی نہیں رہے گی، اسی طرح ایک صحتِ انفاق اور شرطِ انفاق ہے کہ جو خیرات کر رہے ہو وہ پیسہ حلال ہو۔ اگر حرام کا پیسہ ہے تو خیرات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ رشوت بھی کھاتے رہو اور خیرات بھی کرتے رہو۔

ایک ڈاکو کا واقعہ:

جیسے ایک آدمی مجھے سنا رہا تھا کہ فلاں ڈاکو کو آپ جانتے ہیں؟ میں نے کہا: مجھے کیا پتہ ہے؟ اس نے کہا: فلاں بلوچ بڑا شریف ڈاکو تھا۔ میں نے کہا: بڑی عجیب بات ہے!۔ میں اس کے سامنے ہنس بھی نہیں سکتا تھا، عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ میں نے کہا: وہ ڈاکو تھا اور پھر شریف کیسے تھا؟ اس نے کہا: وہ بڑے لوگوں کے ہاں ڈاکے مارتا تھا اور غریبوں کو دیتا تھا، جہاں بیوہ عورت ہے اس کو کھانا پہنچاتا، کسی لڑکی کی شادی ہے ان کو پیسے دیتا، سارے غریبوں کو خرچہ دیتا تھا۔ میں نے کہا: یہ اچھا شریف ڈاکو ہے کہ لوگوں کا گھر لوٹ کر دوسرے لوگوں پر خرچ کر دو، یہ کیسے شریف ہوگیا؟ میں نے کہا: ایک بات بتائیں! ایک آدمی کو عورت کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی عورت جا کر اس کی خواہش پوری کرتی رہے تو یہ بھی شریف زانیہ ہوگئی؟ میں نے کہا: ڈاکہ ڈاکہ ہے۔ گھر میں ڈاکہ ڈالنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا ہے کہ کافر کو بھی نہ لوٹو، دشمن کے گھر میں بھی مداخلت نہ کرو، کسی غیر کے مال میں تصرف نہ کرو۔ وہ اچھا

شریف ڈاکو ہے کہ مسلمانوں کے گھر میں ڈاکہ ڈالتا ہے اور شریف ہے۔

خیران کو بات سمجھ آگئی تو یہ بھی خیرات نہیں ہوتی، بلکہ خیرات خالص حلال مال سے ہوگی۔ جیسے پلید پانی سے وضو نہیں ہوتا اسی طرح پلید مال سے صدقہ نہیں ہوتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ خیرات خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ یہ نہ ہو کہ یا اللہ! پنجتن پاک کی نیاز اور خیرات تیرے نام پر ہے۔ نذر و نیاز حسین اور خیرات اللہ تعالیٰ کے واسطے۔ تو اللہ تعالیٰ بھی فرماتے ہیں: یہ اپنی خیرات لے جاؤ۔ جس کے نام پر کی ہے اس کو دے دینا اور اس سے ثواب لے لینا، میرے پاس ثواب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں وہ صدقہ خیرات قبول کروں گا جو خالص میرے لیے ہو، اس میں کسی دوسرے کی شراکت نہ ہو۔

تیسری بات یاد رکھو کہ جب خیرات کرو تو دل میں یہ خیال نہ آئے کہ لوگ کہیں کہ بڑا خیرات کرتا ہے! کیونکہ جب ریا آگئی تو ثواب ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تم نے دکھانے کے لیے عمل کیا ہے، میرے خزانے میں کوئی ثواب نہیں ہے۔

اگر تم نے کسی غریب کی امداد کی اور پھر ہر بات میں اس کو سناتے ہو کہ ہم دو سال سے تمہیں روٹی دے رہے ہیں، دو سال سے تیرے بچوں کا داخلہ کر رہا ہوں اور دو سال سے میں تمہیں کپڑے دے رہا ہوں۔ اگر تم احسان جتلا رہے ہو تو تم نے نیکی کو برباد کر دیا۔

اسی طرح کسی کو خیرات دی ہے اور اس کے بعد اس کو قول سے یا فعل سے تکلیف دی، مثلاً: کسی کو خیرات دی اور پھر وہ آیا تو اس کو کہو کہ تم ذلیل ہو، روزانہ مانگنے کے لیے آجاتے ہو، تمہارا تو باپ بھی بھکاری تھا، تم تو بھکاریوں کے ٹھیکے دار ہو۔ یہ لو دو روپے، لے جاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس کا بھی کوئی ثواب نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ تم اس کو نہ دو، اس سے بات تو میٹھی کر لو۔

ثواب کیسے بڑھتا ہے؟

بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرے۔ بعض نے فرمایا: جہاد میں خرچ کرے۔ حالانکہ جہاد بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب آدمی جہاد میں خرچ کرتا ہے، حج میں خرچ کرتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ایک درہم کا ثواب سات سو درہم تک عطا فرماتے ہیں۔ اس لیے بعض علماء نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو آدمی حج میں خرچ کرتا ہے تو اس کو ایک کا سات سو گنا ملے گا۔ جب وہ گھر سے نکلا اور راستے

میں خرچ کیا تو سات سو گنا ثواب ملے گا۔ لیکن حرم میں ایک نیکی ایک لاکھ کی ہو جاتی ہے تو بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں ایک لاکھ کو سات سو سے ضرب دیں، یعنی ایک نیکی پر اللہ تعالیٰ اس کو سات کروڑ نیکیاں دیں گے۔

مثال کے ذریعے جو بات سمجھائی جائے وہ بات آدمی کے دل و دماغ اتر جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ [الحشر:۲۱] (ہم نے قرآن میں مثالیں بیان کی ہیں، تا کہ لوگ زیادہ تفکر و تدبر کر سکیں) کیونکہ ایک آدمی کے ذہن میں آ سکتا تھا کہ ایک کی سات سو گناہ نیکی بڑھ جائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہارے ایک دانے کو سات سو دانے بنا دیتے ہیں تو ایک نیکی کو سات سو گنا بنانے میں کیا مشکل ہے؟ تم زمین میں کھجور کی ایک گٹھلی ڈالتے ہو، اس سے ہم کھجور کا ایک درخت بنا دیتے ہیں، اس پر گوشے لگا دیتے ہیں اور ہر سال لگاتے رہتے ہیں۔ اگر ایک کھجور کی عمر پچاس سال ہو تو سوچو ایک گٹھلی سے کتنی کھجوریں لگیں!؟ جو خدا ان چیزوں کے بڑھانے پر قادر ہے تو وہ تمہاری نیکیوں کو بڑھانے پر بھی قادر ہے۔

اللہ تعالیٰ اعمالِ صالحہ کو بڑھاتے ہیں۔ جیسا کہ تم زمین میں دانہ ڈالتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو بڑھاتے ہیں، لیکن اگر دانہ خراب ہو تو کچھ نہیں نکلے گا۔ دانہ ٹھیک ہو، لیکن زمین خراب ہو پھر بھی کچھ نہیں اگے گا۔ دانہ ٹھیک ہے، زمین بھی بالکل ٹھیک ہے، لیکن تم نے پانی زہریلا لگا دیا، تب بھی دانہ جل جائے گا۔ اسی طرح تم نے خیرات کی، لیکن پیسہ حرام کا ہے تو کوئی ثواب نہیں ہوگا، یا تم نے خیرات کی اور غلط کام میں پیسہ دیا تو زمین ہی غلط ہو گئی، وہاں تو اور زیادہ گناہ ملے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی تھوڑی خیرات کرے، لیکن اپنے خالص مال سے صحیح جگہ پر خرچ کرے۔

قاضی احسان احمد رحمہ اللہ کا تقویٰ:

(واقعہ) قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمہ اللہ بیمار ہوئے تو نواب امیر محمد خان...... کالا باغ کے گورنر تھے...... تشریف لے آئے۔ نواب صاحب ان سے آ کر ملے، ان کی صحت اور خیریت پوچھی تو قاضی صاحب نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ ''الحمد للہ'' بیماری بھی آتی ہے، صحت بھی آتی ہے۔ گورنر صاحب نے کچھ پیسے دیئے تو قاضی صاحب نے فرمایا: آپ کی بڑی مہربانی ہے! آپ نواب ہو کر غریبوں کو پوچھنے کے لیے دعا کے لیے آ گئے، ہمارے لیے اتنا اعزاز کافی ہے، میں پیسے نہیں لیتا۔ نواب صاحب سمجھدار تھے، انہوں نے کہا: حضرت! یہ پیسے میں نے نہیں دیئے ہیں، یہ میری والدہ کا ہدیہ ہے اور ان کی خالص اپنی جائیداد اور اپنی آمدنی جو ایک ایک پائی علیحدہ رکھتی ہیں یہ ان کا پیسہ ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ آپ قبول فرمائیں یا قبول نہ فرمائیں۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمہ اللہ نے

فرمایا: اب میں لے لیتا ہوں۔

کیونکہ ان کو پہلے خیال تھا کہ یہ نواب صاحب کے پیسے ہیں، پتہ نہیں کیسے پیسے ہوں؟ اس دور کے اندر اتنا خیال ہوتا تھا اور نوابوں کے گھر میں اتنا خیال تھا کہ حلال کی کمائی علیحدہ رکھو، تا کہ کسی مدرسے کو دیں، خیرات دیں اور کسی عالم کو دیں تو خالص حلال سے دیں؛ کیونکہ جب حلال دیں گے تو اس کی برکتیں ہوں گی اور جب حرام دیں گے تو آپ کو ثواب نہ ملا اور دوسرا جس کے بدن میں حرام گیا اس نے اس میں بھی اپنا اثر دکھاتا ہے۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی بیماری کا واقعہ:

حضرت بشار بن ابی سیف الجرمی رحمہ اللہ حضرت عیاض بن غطیف سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بیمار تھے، ہم ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے۔ (کیونکہ مریض کی عیادت کرنا سنت ہے۔) ان کو تکلیف تھی، ان کی بیوی ان کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم نے ان کی بیوی سے پوچھا: کیا حال ہے؟ ابوعبیدہ نے رات کیسی گزاری؟ انہوں نے کہا: بڑے ثواب کے ساتھ گزاری۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جب بیوی کا جواب سنا تو اس نے کہا کہ میں نے کوئی ثواب میں نہیں گزاری۔ عیادت کرنے والے حیران ہو گئے کہ کیوں اس طرح کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سات سو گنا ثواب دیتے ہیں، لیکن اگر کوئی آدمی اپنی بیوی بچوں، اپنے اہل وعیال پر اور اپنے نفس پر یا بیمار ہو جائے اور خرچ کرے تو اس کو دس گنا اجر ملتا ہے، سات سو گنا اجر نہیں ملتا تو میں نے تکلیف کے اندر کوئی اچھا کام کیا تو مجھے کم اجر ملا۔

نیک لوگ کیوں بیمار ہوتے ہیں؟

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ بعض اللہ والوں کی بڑی بڑی بیماریاں ہوتی ہیں۔ بعض جاہل لوگ عجیب خدشات میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا ولی تھا تو اس کو ایسی بیماری کیوں لگ گئی؟ یہ جہالت ہے؛ کیونکہ بیماریاں تو انبیاء علیہم السلام کو بھی پیش آئیں، حضرت ایوب علیہ السلام پر بیماری آئی۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر مریض ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا امتحان لیا ہے۔ وہ صبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو گرا دیتے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کا ولی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت میں درجات لکھے ہیں کہ ہم اس کو فلاں مقام پر پہنچانا ہے اور وہ اپنے اعمال کے

ذریعہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو تکلیف دیتے ہیں کہ کچھ رفعِ درجات اعمال کے ذریعہ کردو اور کچھ رفعِ درجات مصیبت کے ذریعے کردو۔

یاد رکھیں! تکلیفوں کا فرق ہوتا ہے: ایک تکلیف مومن کو ملتی ہے، وہ اس کے گناہوں کو مٹانے کے لیے ہوتی ہے۔ اور ایک تکلیف کافر کو ملتی ہے، وہ اس کے لیے عذاب بڑھانے کے لیے ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: طاعون ایک عذاب ہے، لیکن مومنوں کے لیے رحمت ہے۔ کوئی اس میں مر گیا تو اس کو شہید کا ثواب ملے گا۔

نیکیوں کا بڑا انعام:

(حدیث) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضور پاک ﷺ کی خدمت میں مہار ڈالی ہوئی اونٹنی لے آیا (یعنی بڑی اونٹنی لے آیا) اور کہا: یہ اونٹنی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیرات کرتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تجھے اس کے بدلے میں سات سو اونٹنیاں عطا فرمائیں گے۔ بعض علماء ان احادیث مبارکہ کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سات سو گنا ثواب دیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: جو حضور اکرم ﷺ کا فرمان مبارک ہے اس کو اسی پر رکھو کہ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت میں سات سو اونٹنیاں ہی دیں گے۔

روزہ کا ثواب:

(حدیث) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ابن آدم جب کوئی اچھا عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ثواب دیتے ہیں، مگر روزہ کہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: روزہ میرے لیے ہے اور روزہ کا بدلہ میں خود دوں گا۔ بعض علماء نے اس حدیث کو یوں بھی پڑھا ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ یہ ہے کہ میں اس بندے کو اپنی زیارت نصیب کروں گا۔

اصل وجہ یہ ہے کہ ہر عبادت میں ریا کا خدشہ ہو سکتا ہے، لیکن روزہ ایک ایسی چیز ہے جو بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان میں ہے۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ روزہ سے ہے یا نہیں ہے۔

(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ہر ابن آدم کے عمل کو دس گناہ سے سات سو گنا تک بڑھاتے ہیں اور جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں اس سے زیادہ بڑھا دیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: روزہ میرے لیے ہے، اس کی جزا میں دوں گا۔ میرے بندے نے اپنا کھانا پینا صرف میری رضا کے لیے چھوڑا کہ میں

راضی ہو جاؤں۔

(حدیث) روزہ دار کو دو خوشیاں نصیب ہوں گی: ایک خوشی نصیب ہوگی جب آدمی افطار کرتا ہے اور دوسری خوشی اس وقت ہوگی جب اپنے رب کے پاس جائے گا۔

(حدیث) مومن روزہ دار کے منہ سے جو بو نکلتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مشک سے بھی زیادہ بہتر ہے۔

(حدیث) روزہ ڈھال ہے۔ یعنی گناہوں سے روکنے والا ہے، زنا سے روکنے والا، قوتِ حیوانیہ کو توڑنے والا اور قوتِ ملکیہ کو ابھارنے والا ہے۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے ثواب کو سات سو گنا بڑھاتے ہیں۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: روزہ نماز اللہ تعالیٰ کا ذکر یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے بھی زیادہ ہے اللہ تعالیٰ اس کا ثواب سات سو گنا بڑھا دیتے ہیں۔

جہاد میں خرچ کرنے کا ثواب:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا، مجاہد جہاد میں جا رہے تھے، ان کی مالی مدد کی اور خود اپنے گھر میں رہا، خود جہاد پر نہیں گیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو ایک درہم پر سات سو درہم کا ثواب عطا فرمائیں گے، لیکن جو شخص خود جہاد میں گیا اور اپنا مال بھی خرچ کیا اللہ تعالیٰ اس کو ایک درہم پر سات ہزار درہم عطا فرمائیں گے اور اللہ تعالیٰ مزید جتنا بڑھا دیں وہ بڑھانے پر قادر ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کے بھی حالات ہیں۔ ایک آدمی نے مال خرچ کیا، لیکن وہ خود مجاہد نہیں ہے، اس کو اللہ تعالیٰ سات سو گنا ثواب دیں گے۔ ایک آدمی مجاہد بھی ہے اور اپنا مال بھی خرچ کر رہا ہے اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ ہر درہم پر سات ہزار درہم دیں گے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو دو لاکھ درہم کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

ان آیات سے ثواب کی تحدید نہیں ہوتی، بلکہ کثرت کا بیان ہوتا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ

اللہ﴾ تو حضور اکرم ﷺ نے دعا کی: ''رَبِّ! زِدْ أُمَّتِي'' اے اللہ! میری امت کے لیے اس سے بھی زیادہ ثواب عطا فرما۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ﴾ [البقرۃ:۲۴۵]۔ اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! میری امت کو اس سے بھی زیادہ ثواب عطا فرما تو یہ آیت اتری: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ [الزمر:۱۰] اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیری امت میں جو صبر کرنے والے لوگ ہیں ان کو میں ایسا ثواب دوں گا جس کی کوئی حد و شمار نہیں ہوگی۔

دوسری حدیث کے اندر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن صابرین کو بلا کر ایک طرف کریں گے اور ان پر ثواب کو ایسے انڈیلا جائے گا کہ اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوگا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ کی تفسیر میں منقول ہے: جس آدمی کا جتنا اخلاص زیادہ ہوگا اتنا اللہ تبارک وتعالیٰ ثواب بھی زیادہ عطا فرمائیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۲۶۱] اللہ تعالیٰ کا فضل اتنا زیادہ ہے کہ ساری مخلوق بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اللہ تعالیٰ جاننے والے علم والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کون ثواب کا مستحق ہے اور کون مستحق نہیں ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۶۲-۲۶۴]

"جو لوگ اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو احسان جتلاتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے ہاں ثواب ہے۔ نہ تو ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ نرم جواب دینا اور درگذر کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد ستانا ہو۔ اللہ (بندوں کے صدقہ سے) غنی ہے، تحمل والا ہے۔ اے ایمان والو! احسان جتلا کر اور ایذاء پہنچا کر اپنی خیرات ضائع نہ کرو، جیسے وہ شخص جو کہ اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا (جیسے منافق) اس کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کی بارش پڑے اور اس کو بالکل صاف کردے۔ ایسے لوگ اپنی خیرات کا ثواب نہ پائیں گے اور اللہ کافروں کو راہ نہیں دکھاتا۔"

صدقہ خیرات کرنے کا ادب:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر اپنے ان بندوں کی مدح فرمائی ہے جو خیرات وصدقات کرنے کے بعد اپنا احسان نہیں جتلاتے کہ میں نے آپ پر اتنا خرچ کیا، میں نے آپ کو یہ دیا۔ یعنی اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے لیے بھلائی کی ہے تو بھلائی کو بھول جاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے صدقات خیرات کرنے کے بعد ایذاء بھی نہیں پہنچاتے جو ان کی نیکی کو ضائع کرنے والی بن جائے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کو بہت بڑا اجر دوں گا۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ خود بدلہ دیں گے اور کوئی نہیں دے گا۔

یاد رکھیں! اللہ تبارک وتعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ثواب دیتے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہیں، ساری مخلوق اس کی محتاج ہے۔

﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ ان کو آگے آنے والے احوال کا کوئی ڈر نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے چھپالیں گے۔ ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [البقرۃ: ۲۶۲] اور نہ ان کو یہ غم ہوگا کہ ہم نے جو پیچھے اپنی اولاد چھوڑی ہے ان کا کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ ان کی اولادوں کی حفاظت فرماتے ہیں اور ان کو اپنی دنیا میں جو گھر محل چھوڑ کر آئے اس کا بھی غم نہیں ہوگا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کو آگے ایسا دے دیں گے کہ وہ پچھلا بھول جائیں گے کہ دنیا کی نعمت کیا چیز ہے!؟

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی پرہیزگاری:

تاریخ میں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا واقعہ آتا ہے کہ آخری وقت میں ان کے پاس ان کے دوست آئے۔

انہوں نے کہا: تم بیمار ہو اور انسان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ تم نے ساری جائیداد اللہ تعالیٰ کے راستے میں لٹا دی ہے، اب اولاد کا بھی کوئی حق ہے۔ آپ مہربانی کر کے خلیفۃ المسلمین عبد الملک کو لکھ دیں...... کہ وہ آپ کا بڑا احترام کرتا ہے اور آپ کا سسر بھی ہے...... اس کو لکھ دیں، تا کہ آپ اپنی اولاد کے لیے کوئی جاگیر چھوڑ دیں، ورنہ آپ کی موت کے بعد آپ کی اولاد کیا کرے گی؟ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ مسکرائے اور فرمایا: تم نے اچھی نصیحت کی ہے! لیکن یہ بتاؤ کہ میری اولاد یا تو صالحین میں ہوگی یا برے لوگوں میں ہوگی۔ اگر وہ اچھے صالحین بنیں گے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ میں صالحین کا خود متولی ہوں، ان کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور میں ان کی حفاظت کروں گا۔ اگر میری اولاد بری ہوگی اور میں ان کو دولت اکٹھی کر کے دے جاؤں اور وہ گناہ کرتے رہیں تو میں ان کے گناہ کا حصہ دار کیوں بنوں؟

وصیت و نصیحت کرنے والے خود لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ہم نے یہ دیکھا کہ جن وزیروں نے اولاد کے لیے کروڑوں کی جائیداد چھوڑی تھی وہ بھیک مانگتے ہوئے دیکھے گئے اور حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی عزت دی اور دین میں بھی عزت دی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی پرہیزگاری:

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ عیادت کرنے کے لیے تشریف لائے...... یہ اس دور کی بات ہے جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ خلیفۃ المسلمین تھے...... انہوں نے ان سے ان کا حال پوچھا تو انہوں نے کہا: الحمد للہ۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر چاہو تو تمہارے علاج کے لیے طبیب بھجوا دوں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: طبیب ہی نے تو مجھے بیمار کیا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ)، تو کیا آپ طبیب بھیجیں گے؟ آپ کوئی تکلیف نہ کریں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر آپ اجازت دیں تو آپ کو کچھ ہدیہ بھیج دوں، تا کہ بیماری میں کچھ کام آئے؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب میں تندرست تھا، پیسے خرچ کرنے کا موقع تھا، اس وقت آپ نے مدد نہیں کی۔ اب جب بیمار ہو گیا ہوں تو کیا خرچ کروں گا؟ لہٰذا اب مجھے ضرورت نہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں ہدیہ بھیجتا ہوں، آپ اس کو قبول فرما لیں، وہ آپ کے بچوں کے کام آئے گا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے امیر المومنین! میرے بچوں کو بھی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آدمی رات کو ایک دفعہ سورۃ الواقعہ پڑھ لے اس کو اللہ تعالیٰ کبھی بھوکا نہیں مارتے۔

میرے بچوں کو سورۃ الواقعہ یاد ہے، وہ روزانہ اس کو پڑھتے ہیں، اس لیے ان کو پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مقام ہر کسی کو نہیں ملتا ہے۔ بہر حال آدمی جتنی بھی کر سکے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے تو اس کو ریا، شہرت وغیرہ سے ضائع نہ کرے۔ لوگوں پر خرچ کرے تو ان پر احسان بھی نہ جتلائے اور نہ لوگوں کو تکلیف پہنچائے۔

بہترین صدقہ:

حضرت عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ہاں اس صدقہ سے زیادہ کوئی صدقہ محبوب نہیں کہ مسلمان سے تم اچھے کلمہ سے بات کرو۔ یہ سب سے بہتر صدقہ ہے۔ اور اگر کسی ساتھی سے کوئی بات سرزد ہو جائے تو اس کو معاف کر دو۔ یہ سب سے بہتر صدقہ ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ غنی ہیں، اس کو اپنی مخلوق سے کوئی حاجت نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفت حلیم ہے کہ اتنے کروڑوں بندوں کی غلطیاں دیکھ کر عذاب نہیں فرماتے، اللہ تبارک و تعالیٰ مہلت عطا فرما دیتے ہیں۔ تو بندے کو بھی سیکھنا چاہیے کہ جب خدا سب کچھ کرنے پر قادر ہے، اپنے بندوں کو مہلت دے رہا ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کی غلطیوں پر پکڑنا چاہے تو کوئی ایک بندہ بھی زمین پر چلتا ہوا نظر نہ آئے؛ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں گناہ پر پکڑے تو کون بندہ ہے جو گناہ سے پاک ہو؟ سوائے انبیاء علیہم السلام کے کہ وہ معصوم تھے، صحابہ محفوظ تھے اور اللہ تعالیٰ کے اولیاء گناہ سے بچتے ہیں، ورنہ ہر آدمی کے اندر کوئی نہ کوئی گناہ ہے، کوئی غیبت کر رہا ہے اور کوئی جھوٹ بول رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی غیبت سے پرہیز:

ایک آدمی نے حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آ کر کہا کہ میں نے اتنا عرصہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں گزارا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں نے امام صاحب کی زبان سے کبھی کسی کی غیبت نہیں سنی۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ہنس پڑے اور فرمایا: تم کیا سمجھتے ہو امام صاحب اتنے کم عقل تھے کہ لوگوں کے گلے کر کے اپنی نیکیاں ضائع کر دیتے۔

تین قسم کے لوگ اللہ کی رحمت سے محروم:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو پاک بھی نہیں فرمائیں گے۔ (ایسے شخص کا انجام خود ہی سوچ لیں کہ کیا ہوگا!!؟) ایک وہ بندہ

ہے جو لوگوں کو خیرات دیتا ہے، غریب رشتہ داروں کی مدد کرتا ہے اور یتیموں کی مدد کرتا ہے، لیکن مدد کرنے کے بعد احسان جتلاتا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ یہ بھلائی کی اور یہ کیا ہے۔

دوسرا وہ شخص جو اپنی چادر گٹوں سے نیچے لٹکا کر چلنے والا ہو (چاہے وہ شلوار ہو پینٹ ہو)، وہ بطور تکبر اس طرح کرتا ہے کہ آدھا خود زمین پر چل رہا ہے اور آدھا اس کے کپڑے چل رہے ہیں۔ کیونکہ پہلے زمانے کے اندر چادروں کا رواج تھا، اس لیے چادر کا ذکر ہے، جیسا کہ کئی لوگوں کا پائنچہ جوتی کے اندر ہوتا ہے۔ یہ ان کے بڑے آدمی ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ اور جو ماڈرن لڑکیاں ہوتی ہیں، ان کی نشانی یہ ہے کہ ان کی شلواریں اونچی ہو۔ اب ترقی ہوگئی ہے، عورتوں کے لیے ایک شلوار نکالی ہے، اس کا نام بھی مولوی شلوار ہے۔

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ایسی عورتیں جو باریک کپڑے پہنیں لعنتی ہیں۔ اور ہم کہتے ہیں: بڑی سوشل عورت ہے...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... تمہاری بات مانیں یا نبی کی بات کو مانیں۔ تمہاری بات ماننے سے اگر قیامت میں چھٹکارا ملتا ہے اور نبی کی بات ٹھکرانے سے جنت ملتی ہے تو اسی طرح کرو، جبکہ ہمارا ایمان ہے جو حضور اکرم ﷺ کی بات کو ٹھکرائے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

تیسرا آدمی وہ ہے جو اپنی چیزوں کو بیچنے کے لیے جھوٹی قسم کھاتا ہے کہ اس پر بھی اللہ تعالیٰ قیامت میں نظر نہیں فرمائیں گے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں جو جنت میں داخل نہیں ہوں گے:

1 ...... جو اولاد اپنے والدین کی نافرمان ہے۔

2 ...... دوسرا وہ شخص جو خیرات کرتا ہے، پھر لوگوں پر احسان جتلاتا ہے کہ ہم نے تمہاری اتنی خدمت کی۔ تم غریب تھے ہماری روٹی پر پلتے رہے۔

3 ...... اور شراب کا عادی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو جھٹلانے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

مسلمان کے لیے سخت وعید کا مطلب:

یاد رکھیں! بہت ساری احادیث میں آتا ہے: ''لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ'' اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ وہ بالکل جنت میں

کبھی نہیں جائے گا؛ کیونکہ یہ سزا تو کافر کو ہوگی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومن کو جنت دینی ہے، بشرطیکہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہو، اس کے عقیدے میں کفر و شرک، قبر پرستی نہ ہو اور غیروں کی نذر و نیاز اور چڑھاوے نہ ہوں تو وہ جنت میں جائے گا۔

ان احادیث میں جو فرمایا گیا: ''لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ'' علماء فرماتے ہیں: یہ وعید شدید ہے، یعنی سخت تنبیہ ہے کہ اس نے ایسا گندا کام کیا ہے کہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا، یعنی اوّل اوّل حالت میں اَبرار، اَخیار کے ساتھ داخل نہیں ہوگا، بلکہ اپنے عذاب بھگتے گا، پھر اس کو جہنم سے نکالا جائے گا اور جنت میں داخل کیا جائے گا۔

مثلاً: ایک لڑکا تو وہ ہوتا ہے جو سارے مدرسے میں فرسٹ آ گیا تو اس پر فخر کیا جاتا ہے اور ایک لڑکا وہ ہوتا ہے جو عشرہ اوائل میں آ گیا، یعنی پہلے دس لڑکوں میں اس نے نام حاصل کیا، وہ پاس ہو گیا۔ اور ایک لڑکا وہ ہوتا ہے جس نے درجہ ممتاز حاصل کر لیا، وہ بھی پاس ہو گیا، اور ایک نے جید جدا لیا وہ بھی پاس ہو گیا، اور ایک وہ ہوتا ہے جس نے تھرڈ ڈویژن لی وہ بھی پاس ہو گیا، لیکن ہر کوئی اس کو کہتا ہے تیرا پاس ہونا نہ ہونے کے برابر ہے، تم پھر امتحان دو۔ اس لیے اگر کوئی رگڑے کھا کر جنت میں گیا تو گویا نہ گیا۔ اس لیے فرمایا جاتا ہے کہ نافرمان جنت میں نہیں جائے گا۔

''وَلَا مُکَذِّبُ بِقَدَرٍ'' اگر وہ تقدیر کو جھٹلاتا ہے تو وہ کافر ہو گیا، لیکن اگر وہ عقیدۃً تو نہیں جھٹلاتا، لیکن عملاً اس کی تکذیب کرتا ہے، اس کو بھی ابتدائی طور پر دخولِ جنت نہیں ہوگا۔

دوسری حدیث کے اندر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر نہیں فرمائیں گے (یعنی نظر رحمت نہیں فرمائیں گے، ورنہ نہ دنیا میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے سامنے چھپی ہوئی ہے اور نہ قیامت میں چھپی ہوئی ہے): 1 ...... اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ 2 ...... شراب کا عادی 3 ...... اور صدقہ خیرات دینے کے بعد احسان جتلانے والا۔

غریب لوگ اللہ کے ہاں تمہارے قاصد ہیں:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی خدمت میں جب کوئی مسکین خیرات مانگنے کے لیے آ جاتا تو آپ کھڑے ہو کر اس کا استقبال کرتے اور اس کے لیے اپنی چادر بچھاتے، ان کو بٹھاتے اور جتنا اللہ تعالیٰ توفیق دیتے ان کو عطا فرماتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ یہی غریب لوگ تو ہیں جو ہمارا صدقہ آخرت میں لے کر جا رہے ہیں۔ اگر یہ فقیر نہ ہوتے

تو ہم خیرات کس کو دیتے؟ اس لیے قرآن نے بھی فرمایا: ﴿وَأَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ [الضحیٰ:۱۰] اگر کوئی تمہارے پاس کوئی سوال کرنے والا آئے تو اس کو نہ جھڑکو، چاہے وہ علم کا سوال کرے یا مال کا سوال کرے۔ اگر نہ دو تو اس کو آرام سے ٹال دو۔ جیسے عرب کہہ دیتے ہیں: ''اِنَّهٗ عَلٰى بَابِ اللهِ'' میں بھی اللہ تعالیٰ کے دروازے پر بیٹھا ہوں، میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ مظلوم آدمی کے دل سے جو بددعا نکلتی ہے سیدھی عرش پر جاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مظلوم کی بددعا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان میں کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا، وہ سیدھی اللہ تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن جھوٹے بھی محتاج بن کر مانگتے ہیں۔ اگر یہ جھوٹے مانگنے والے نہ ہوتے تو مانگنے والے محتاج کو ٹالنے پر آدمی کی سخت گرفت ہوئی۔

اللہ کے لیے دین کی پہچان:

اگر تم کسی کو دے کر احسان جتلاتے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں دیا ہے، ورنہ احسان نہ جتلاتے۔ علماء نے فرمایا: بندے کے امتحان کا ایک طریقہ ہے کہ اگر یہ بندہ اللہ تعالیٰ کے لیے دے رہا ہے تو یہ دیکھو کہ جس سے اس کا کوئی جھگڑا ہے اس کو بھی دیتا ہے؟ اگر اس کو نہیں دیتا تو اس کا مطلب ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں دے رہا، بلکہ اپنی دوستی نبھا رہا ہے، اپنے تعلقات بنا رہا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دورِ سلطنت میں ایک حکم نامہ جاری فرمایا تھا کہ میری سلطنت میں اگر کوئی یہودی، نصرانی، مجوسی یا مشرک ہے وہ بوڑھا اور معذور ہو گیا ہے تو اس کو بیت المال سے وظیفہ دو۔ بعض لوگوں نے عرض کیا: حضرت! وہ تو کافر ہیں؟ آپ نے فرمایا: جب وہ جزیہ دیتے تھے اس وقت وہ کافر نہیں تھے؟ ان سے ہم لیتے رہے، جب وہ بوڑھے ہو گئے تو کیا اب ان کی مدد نہ کریں؟ اس سے اندازہ لگائیں کہ اسلام کتنا رحمت والا مذہب ہے!!

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک عورت کو جہنم کا عذاب دیتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا، اس کو چھوڑا نہیں، تا کہ وہ کھا پی لے اور خود بھی پانی نہیں پلایا۔ اور وہ بلی تڑپتی ہوئی مر گئی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو جہنم میں ڈال دیا۔

صحیح حدیث مبارک میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ ایک عورت جو بے انتہا بدکردار عورت تھی، اس نے ایک کتے کو پانی پلا دیا جو تڑپ رہا تھا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے۔

والدین کا نافرمان ہونا بھی بہت بڑا جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ علقمہ رضی اللہ عنہ پر ان کی

والدہ ناراض تھیں تو موت کے وقت ان کے بیٹے کی زبان بند ہو گئی۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ علامات قیامت میں ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی اپنے دوستوں کے ساتھ بڑے وفادار ہوں گے، لیکن والدین کے نافرمان ہوں گے۔ اپنی بیوی کے بڑے تابعدار ہوں گے، لیکن ماں کے نافرمان ہوں گے۔ اور آج ہر گھر کا یہ مسئلہ ہے کہ بیوی نے کہہ دیا کہ میں تمہاری ماں کے ساتھ نہیں رہتی تو علیحدہ کر دیا۔ بیوی نے کہا: ماں کو گھر سے نکال دو تو اس کو نکال دیا...... انا للہ وانا الیہ راجعون......

﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝﴾ [البقرۃ:۲۶۵]

"اور ان لوگوں کی مثال...... جو اپنے اموال کو اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں...... اس باغ کی مثل ہے جو بلند ہموار جگہ پر ہو کہ اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ دو نا پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی اس کو کافی ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔"

جو لوگ اخلاص دل سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں ان کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے مال کبھی کم نہیں ہوتا۔

اہل بیت پر خرچ کرنے کا عجیب واقعہ!

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے خواب دیکھا۔ ان کو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم فلاں جگہ ایک آدمی ہے اس کو جا کر خوشخبری دے دو کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں جنت کے اندر اس کو اتنا اونچا درجہ دیں گے کہ وہ میرے قریب ہوگا۔ آپ وہاں تشریف لے گئے اور جب آدمی کو جا کر ملے تو وہ آدمی آگ کا پجاری تھا اور کافر تھا۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں حیران ہو گیا کہ میرا خواب بھی سچا ہے اور حضور اکرم ﷺ نے خواب میں بشارت دی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی ایسی حفاظت فرمائی ہے کہ شیطان خواب میں ہر کسی

کی شکل بنا سکتا ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا ہے۔ کوئی شیطان طاقت نہیں رکھتا کہ وہ نبیوں کی شکل بنا کر کسی کو دھوکہ دے سکے۔ اور یہ آدمی مسلمان نہیں ہے اور میں اس کو جنت کی بشارت دے رہا ہوں۔ اس آدمی نے مجھے بٹھالیا۔ اس کی عمر ایک سو بیس سال ہو چکی تھی، بھنویں آنکھوں پر گرگئی تھیں۔ جب دیکھتے تو بھنویں اٹھا کر دیکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے احترام سے بٹھایا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا؟ اس نے کہا: اور تو مجھے کچھ یاد نہیں۔ بس یہ یاد ہے کہ میرے بچوں کی شادی تھی، کئی دن تک کھانے چلتے رہے۔ آخری دن میں باہر سے آرہا تھا تو گلی کے اندر مجھے کسی گھر سے رونے کی آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھا کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم مسلمان ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا: تمہارے بچے کیوں رو رہے ہیں؟ اس نے کہا: تم جاؤ، اپنا کام کرو۔ میں نے جب اس کو مجبور کیا تو اس عورت نے مجھے بتایا کہ میرے بچے بھوکے ہیں اور اتنے دن سے ہمارے گھر میں فاقہ ہے اور تمہارے گھر کے اندر کھانے اڑ رہے ہیں؛ کیونکہ ہم مسلمان ہیں، بغیر کسی اجازت کے کیوں آئیں؟ کہتے ہیں: میں نے فوراً گھر آکر کھانا اٹھایا اور کافی سارا راشن اٹھوایا، کپڑے اٹھائے، پیسے اٹھائے اور اس گھر میں سارا سامان پہنچایا۔ بچوں کے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔ بچے کھانا کھانے کے بعد خوش ہو کر دعا کرنے لگ گئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت میں تجھے وہ مقام دے کہ ہمارے نبی کے قریب تمہیں جگہ مل جائے؛ کیونکہ وہ آلِ رسول تھے۔ ان بچوں نے دعا کی تھی میں تو سمجھا نہیں؛ کیونکہ میں تو نہ نبی کو مانتا تھا اور نہ خدا کو مانتا تھا، اس لیے میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ ان بچوں کو آتا ہے وہ دعا کر رہے ہیں۔ میں واپس آگیا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان یتیم بچوں کی دعا سن لی ہے، لہٰذا آپ مجھے کلمہ پڑھائیں۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اسی وقت وہ میرے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے، صرف اتنا خرچ کرنے سے وہ اتنا قریب آگیا۔

صدقات کے فضائل:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مجھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! کبھی غریب سے نفرت نہ کرنا، کبھی مسکینوں سے نفرت نہ کرنا۔ ان کو اپنے قریب کرنا، اللہ تعالیٰ تجھ کو اپنے قریب کر دیں گے۔

ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا کر رہے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ! أَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَأَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ'' یا اللہ! مجھے زندہ بھی غریبوں کے ساتھ رکھ، مجھے موت بھی مسکینوں کے ساتھ عطا فرما اور قیامت میں بھی

مجھے مسکینوں کے ساتھ کھڑا کرنا۔ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: آپ ایسی دعائیں کیوں مانگ رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہیں تو دنیا و دولت دے دیں، سارے خزانے آپ کے حوالے کر دیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ مسکینوں کے ساتھ رہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جب اہل جنت کو جنت میں داخل کر دیں گے تو اس وقت کے فقراء غنیوں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہو جائیں گے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرا تعلق مسکینوں کے ساتھ رہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ گزرے...... یہ وہ صحابی ہیں جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، مدینہ کی طرف بھی ہجرت کی، بدر کے اندر بھی حاضری دی اور غزوہ احد میں شہید ہوئے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پہلو میں دفن ہوئے...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس حالت میں دیکھا کہ ایک چمڑے کو کاٹ کر گلے میں ڈالا ہوا ہے اور نیچے کھجوروں کے پتوں سے اس کو سلائی کیا ہوا ہے۔ آپ رونے لگ گئے اور فرمایا: جانتے ہو یہ وہ آدمی ہے جب کافر تھا تو صبح کو ایک جوڑا پہنتا تھا اور شام کو اور جوڑا پہنتا تھا۔ اس کے دسترخوان پر ہر قسم کے کھانے ہوتے تھے۔ یہ بڑی امیرانہ زندگی گزارتا تھا اور آج تم دیکھ رہے ہو کہ یہ کس حالت میں ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر ہمارے پاس ہوتے تو ہمارے کام نوکر کرتے اور ہم اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے فارغ کر دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اس حال میں زیادہ افضل ہو۔

ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک کھجور پر کھجوریں اتارنے کے لیے چڑھے۔ ان کی پنڈلیاں کمزور تھیں؛ کیونکہ غربت تھی۔ ایک صحابی نے جب ان کی پنڈلیوں کو دیکھا تو ان کو ہنسی آگئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ان کی پنڈلیوں کو دیکھ کر ہنس رہے ہو جو اللہ نے پیدا کی ہیں، اس اللہ کی قسم ہے! میرے عبداللہ بن مسعود کی پنڈلیاں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دو اور ساری دنیا دوسرے پلڑے میں رکھ دو تو اس کی شان بھاری ہو جائے گی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسکینوں کو اپنے ساتھ رکھو، مسکینوں کے ساتھ محبت کرو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو بندہ کسی یتیم پر ہاتھ رکھ لے، کسی یتیم کا خرچہ برداشت کر لے اور کسی یتیم کو اپنا بیٹا بنا لے، قیامت میں وہ میرے قریب ہوگا۔

جو شخص اپنے مال کو خرچ کرے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا ڈھونڈے، کسی اور کی رضا کو درمیان میں شامل نہ کرے اور اپنے دل میں یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس کا بدلہ عطا فرمائیں گے ان کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی اونچے ٹیلے پر باغ ہو اور اس پر بارش آتی ہے، پانی لگتا ہے، وہ باغ دوگنا پھل لے آتا ہے۔ اگر اس اونچی جگہ والے باغ میں بارش بھی نہ برسے تو جو شبنم ہوتی ہے اس سے بھی زندہ رہ جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔

قادیانیوں نے بھی اپنے شہر کا نام ربوہ رکھ لیا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ربوہ میں اتارا تھا اور ان کی حفاظت بھی کی تھی تو قادیانی نے یہ دلیل دی کہ دنیا میں کوئی اور ربوہ دکھاؤ...... نعوذ باللہ...... معلوم ہوا کہ یہ عیسیٰ ہے۔

لیکن یاد رکھیں! ربوہ ہر اونچی جگہ کو کہتے ہیں اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ یہ ایک ملک میں ہے اور کسی دوسرے ملک میں نہیں۔ منیٰ کے اندر جہاں خیمہ لگاتے ہیں اس کو بھی ربوہ کہہ سکتے ہیں؛ کیونکہ وہ اونچا حصہ ہے۔

زکوٰۃ کے مستحقین کی ترتیب:

﴿وَتَثۡبِيتٗا مِّنۡ أَنفُسِهِمۡ﴾ بعض علماء نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ کس جگہ ہم اپنے صدقات کو خرچ کریں؟ اور بعض علماء نے اس کا ترجمہ کیا: ''اِحْتِسَابًا'' اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتا دیا کہ جب تم خیرات کرو تو اس کے سب سے زیادہ مستحق تمہارے رشتے دار ہیں، اس کے بعد جو تیرے محلے کے مستحق لوگ ہیں، اس کے بعد دوسرے محلے والے، پھر اپنے شہر والے اور پھر ملک والے مستحق ہیں۔ ہاں اگر مسلمانوں کے ایسے حالات پیدا ہو جائیں، جیسا کہ بوسنیا میں ہیں یا مسلمانوں کے جو حالات کشمیر میں ہیں، تو زکوٰۃ وہاں بھی بھیج سکتے ہیں۔ اس کے اندر بھی علماء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

﴿كَمَثَلِ جَنَّةِۭ بِرَبۡوَةٍ﴾ جو باغ اونچی جگہ پر ہو وہ خوبصورت لگتا ہے، دور سے نظر آتا ہے۔ خدا کی قدرت ہے کہ جتنی جگہ اونچی ہوتی ہے اتنا موسم لطیف ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کسی نے اونچی جگہ باغ بنایا اور وہاں پانی برسا اور باغ میں پھل آیا تو وہ دوگنا، سہ گنا ہو گیا یا برسات معمولی سی بھی آ گئی تو اس کو تھوڑی سی شبنم بھی کافی ہو گئی تو ایسے باغ سے بڑی امیدیں ہوتی ہیں۔

''رَبْوَۃ'' اس کے اندر تین قراءتیں ہیں: (۱)...... بعض لوگوں نے اس کو ''رِبْوَۃ'' پڑھا اور بعض نے ''رُبْوَۃ'' پڑھا اور بعض نے ''رَبوۃ'' پڑھا ہے۔ ''وَابِلٌ'' کا معنی تیز بارش۔ مومن اگر تھوڑی خیرات کرے گا تب بھی پھل آئے گا اور اگر زیادہ خیرات کرے گا تب بھی پھل آئے گا۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اگر تیرے پاس کچھ بھی نہیں ہے تو ایک مسلمان کو مسکرا کر مل لیا کرو، اس پر بھی اللہ تعالیٰ تجھے صدقہ کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

صدقہ میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ تم لاکھوں خرچ کرو، بلکہ اگر تم ایک کھجور کے دانے کے برابر بھی خیرات کرو تو اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر پہاڑ کے برابر ثواب عطا فرماتے ہیں۔ اس لیے جتنا اللہ تعالیٰ توفیق دے خیرات کرو، لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ مال حلال ہو، نیت خالص ہو، اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اور صدقہ کرنے کے بعد احسان جتلانا اور تکلیف دینا نہ ہو۔

مسجد بنوانے میں احتیاط:

ہمارے ہاں ایک رواج ہے کہ جب بڑا آدمی چندہ مانگے تو لوگ لاکھوں دیتے ہیں۔ ہمارے علاقے میں ایک آفسر آئے تھے۔ اس نے اپنے دماغ میں سوچا کہ لوگ صبح سے لے کر شام تک عدالتوں میں رہتے ہیں، مسجد کوئی نہیں ہے۔ اس نے ایک اصول بنا لیا کہ جو آدمی کام کے لیے آتا تو اس کو کہتے ہیں کہ اتنے پیسے دو، ہم مسجد بنا رہے ہیں۔ اور مجھے بتایا تو میں نے کہا: اس طرح تو مسجد نہیں بنے گی، البتہ کمرہ بن جائے گا اور فقہاء کے نزدیک نماز بھی ادا نہیں ہوگی۔ لوگ تو تمہارے ڈر کی وجہ سے ٹیکس سمجھ کر دے رہے ہیں، مسجد کا چندہ تو نہیں دے رہے ہیں۔ ایسے پیسوں سے مسجد بنانا جائز نہیں ہوتا، تو لوگوں سے زبردستی لینے والی بات ہے۔ حتیٰ کہ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر ایک آدمی تقریر کرے اور لوگوں کو تقریر میں ایسا مدہوش کرے کہ اب ہر آدمی پیسے ڈال رہا ہے، یہ بھی جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اس نے لوگوں کو اپنی تقریر کے جادو میں پھنسا کر پیسہ نکال لیا ہے۔ صدقہ وہ ہے جو آدمی اپنے دل سے دے، اپنی رضا سے اور خالص مال حلال سے دے۔

آج سب سے خوبصورت مسجدیں بینک والے بناتے ہیں، حالانکہ اس مسجد میں نماز کیسے بہتر ہوسکتی ہے؟ کیونکہ خالص حرام (یعنی سود) کے پیسے سے بنی ہوتی ہے۔ اس کی بجائے تم سڑک پر چٹائی رکھ کر نماز پڑھ لو وہ زیادہ بہتر ہے۔

ہمارے مولویوں میں یہ بھی بیماریاں پھیل گئی ہیں کہ ایک مولوی مجھے ملا۔ اس کو میں نے کہا: میرا ارادہ ہے اس ملک میں کوئی ایسا ادارہ قائم کروں کہ جو لوگ وفاق سے فارغ ہو جاتے ہیں ان بے چاروں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا، ہم ان کو تخصص بھی کروائیں اور ان کو انگریزی، عربی میں ایم اے بھی کروائیں، تاکہ باہر کی دنیا کے لیے وہ داعی بن سکیں، اس کے لیے مجھے کوئی جگہ چاہیے، آپ کوئی مدد کریں۔ اس نے کہا: رات میں آپ کو جگہ دکھاؤں گا۔ رات کو وہ گاڑی لے کر آ گیا اور مجھے جگہ دکھائی۔ میں نے اس سے پوچھا: یہ کس کا پلاٹ ہے؟ اس نے کہا: سرکاری پلاٹ پڑا ہوا تھا، ہم نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ میں نے کہا: تمہیں مبارک ہو! اس نے کہا: انہوں نے اس مقصد کے لیے رکھا تھا، جب ٹاؤن بن رہے تھے تو اس میں کچھ پلاٹ رکھے جاتے ہیں، کچھ سنیوں کے لیے، کچھ شیعہ کے لیے اور کچھ فلاں کے لیے۔ مجھے موقع مل گیا میں نے چار دیواری دے کر حافظ بٹھا دیئے۔ دو سال سے میرا اس پر قبضہ ہے۔ کسی کے باپ کی طاقت ہے جو آ کر خدا کے اس گھر کو گرائے!؟ میں نے کہا: مجھے تو قیمت سے چاہیے اگر کہیں مل جائے۔ اس نے کہا: آپ خرید نہیں سکتے، لاکھوں کروڑوں کی قیمت ہے۔ میں نے اس کو کہا: اگر ہم یہاں مسجد بنا لیں تو کیا نماز ہو جائے گی؟ کہنے لگے: بعد میں الاٹمنٹ کرا لیں گے۔ میں نے کہا: جب تک الاٹمنٹ نہ ہو اس وقت تک نماز ہو جائے گی؟ کہنے لگے: یہ چھوٹے بچے رکھے ہوئے ہیں، ان پر نماز فرض ہی نہیں ہے۔

ہمارے ملک میں ایک اور بھی بہت بری بات ہے۔ مثلاً: دو زمینداروں میں جائیداد کا جھگڑا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: بھائی کو نہ دو اور مسجد بنا دو۔ یہ بھی ناجائز ہے۔ جب بھی خدا کا گھر بنائیں تو خالص حلال سے بنائیں۔ اگر اس میں چار بھائی ہیں تو چاروں راضی ہوں۔ اگر اس میں کسی ایسے بچے کا حصہ ہو جو نابالغ ہے، جب تک وہ بالغ ہو کر اجازت نہ دے تب تک وہاں اللہ کا گھر نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانے میں مسجدیں کچی تھیں، لیکن ان میں مسلمان پکے تھے اور اب مسجدیں پکی بن گئیں، لیکن مسلمان کچے ہو گئے۔ حضور اکرم ﷺ کی اپنی مسجد کا یہ عالم تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: جب بارش برستی تھی بارش اندر آ جاتی تھی۔ کیونکہ اوپر کھجور کی چھڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ حضور اکرم ﷺ کی داڑھی مبارک میں بارش گر رہی ہے اور حضور اکرم ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور نیچے چھوٹی چھوٹی کنکریاں پڑی ہوئی تھیں۔ جو گرمیوں میں اتنی گرم ہو جاتی تھیں، ہم لوگ جب نماز میں آتے تو کنکریاں اٹھا کر کھڑے رہتے کہ جتنی دیر ہاتھ میں رہیں گی، ٹھنڈی رہیں گی، پھر ان کو گرا کر ان پر سجدہ کر لیتے تھے، لیکن جب سے ہماری مسجدیں پکی بن گئیں، ایئر کنڈیشنڈ بھی لگ گئے، بڑے خوبصورت پتھر بھی لگ گئے اور

اعلیٰ سے اعلیٰ قالین بھی بچھ گئے، لیکن ہمارے ایمان کچے ہو گئے۔

؎ مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی تھا برسوں سے نمازی بن نہ سکا

اس لیے خیرات کرو تو حلال مال سے کرو۔ اللہ تعالیٰ کا گھر بناؤ تو جتنا ٹکڑا ہو خالص حلال کا ہو۔ اس پر خالص حلال کے پیسے لگاؤ۔

﴿اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۶۶]

''بھلا تم میں سے کسی کو یہ پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا، اس کے نیچے نہریں چلتی ہوں، اس شخص کے یہاں اس باغ میں اور بھی ہر قسم کے میوے ہوں۔ اور اس شخص پر بڑھاپا آ گیا ہو اور اس کے بچے چھوٹے ہوں۔ پھر اس باغ پر تیز آندھی چلے، جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جائے۔ اللہ اسی طرح سے تمہارے لیے نشانیاں بیان کرتا ہے، شاید کہ تم غور کرو۔''

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر انگور اور کھجور کی مثال دی ہے؛ کیونکہ مثال کا فائدہ اس وقت ہوتا ہے جب اگلا بندہ اس چیز کو جانتا بھی ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن میں کسی جگہ اجمالی لفظ ہے ﴿فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ﴾ [الرحمن:۶۸] اس میں پھل بھی ہوں گے، کھجوریں بھی ہوں گی اور انار بھی ہوں گے۔ جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں خصوصیت سے نام لیا ہے، اس کے اندر حکمت ہے کہ اس پھل کے اندر باقی چیزوں کی بنسبت زیادہ منافع ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں فرمایا کہ ''جو لوگ میری ذات پر اور میرے ملائکہ پر ایمان لاتے ہیں'' تو فرشتوں کے اندر سارے فرشتے آ گئے، لیکن آگے کچھ فرشتوں کا نام لے لیا: ''جبرائیل اور مکائیل'' تو ان کے نام لینے سے ان کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انبیاء ﷺ کا قرآن میں ذکر کیا ہے اجمالی طور پر۔ جتنے انبیاء گزرے ہیں سب برحق ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے اور ہم ان میں تفریق نہیں کرتے کہ کسی پر

ایمان لے آئیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں، بلکہ ہمارا سب پر ایمان ہے۔ لیکن جن پچیس کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا ہے ان کی فضیلت باقی پر زیادہ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے خاص موقع پر پانچ پیغمبروں کا نام لیا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ [الشوریٰ: ۱۳]

تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیا؛ کیونکہ ''اولوالعزم من الرسل'' ہیں، ان کی بڑی شان اور عظمت ہے۔

کھجور اور انگور کے فوائد:

اس لیے علماء فرماتے ہیں: یہاں بھی نخیل اور اعناب کے ذکر کرنے میں بڑی حکمت ہے۔ کیونکہ ان کے اندر بڑے فوائد ہیں۔ کھجور کا کوئی ایک ذرہ ایسا نہیں ہے جو استعمال نہ ہوتا ہو، حالانکہ بعض درختوں کی لکڑی استعمال نہیں ہوتی، بعض چیزوں کی کھال استعمال نہیں ہوتی۔

اب جدید تحقیق یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی بارہ دانے کھجور کھالے اور پورے دن میں کوئی چیز نہ کھائے تو سارے وٹامن اس میں پورے ہوجاتے ہیں۔ اور کھجور ایک ایسا پھل ہے راستے میں جتنی رکاوٹیں آجائیں دھوپ پڑ جائے، سردی پڑ جائے، یہ اپنی حالت پر رہتی ہے، خراب نہیں ہوتی۔ علماء نے لکھا ہے کہ کھجور کا انسانوں کے ساتھ ایک تعلق ہے کہ جیسے بندے کا ایک ہاتھ کٹ جائے بندہ زندہ رہتا ہے، اگر اس کی ٹانگیں کاٹ دو تب بھی زندہ رہتا ہے، اس کے اعضاء و جوارح سارے زخمی کردو تب بھی زندہ رہتا ہے، لیکن اگر گردن کاٹ دو تو انسان زندہ نہیں رہتا۔ کھجور کی اوپر سے گردن کاٹ دو تو یہ بھی مرجاتی ہے۔ سارے درخت نیچے سے پانی لیتے ہیں، صرف کھجور ایک ایسا درخت ہے جو اوپر سے پانی لیتا ہے۔ بارش ہوئی اور اس کو جو پانی لگے گا وہی اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ فرماتے ہیں کہ ہمارے کئی کئی دن ایسے گزرتے تھے کہ ہر بندے کے لیے صرف ایک کھجور کا دانہ ہوتا تھا، اس کے ساتھ ہم اپنی زندگی گزار لیتے تھے۔ احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ کھانا کھانے سے قبل دو تین دانے کھجور کے استعمال کرلے، دس پندرہ منٹ کے بعد کھانا کھائے، خدا کی قدرت ہے یہ بھوک کو بڑھاتی بھی ہے۔

اسی طرح انگور کے بارے میں اطباء کی تحقیق ہے کہ آپ جو چیزیں کھاتے ہیں وہ دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہیں: یا تو اس کا خون بن جائے اور جو فضلہ بچے گا وہ پیشاب میں بدل جائے گا۔ انگور واحد پھل ہے کہ اس کا فضلہ نہیں بنتا اور دنیا میں کوئی ایسا پھل نہیں ہے جس کا فضلہ نہ بنتا ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں۔ اس لیے فرمایا: اگر تم میری نعمتوں کو شمار کرو شمار نہیں کر سکتے۔ انگور ایک ایسا پھل ہے کہ بوڑھے سے بوڑھا، بچے سے بچہ اور جوان ہر آدمی اس کو کھا سکتا ہے۔ چھوٹے بچے کو اگر آپ کوئی چیز دیں تو ڈر ہوتا ہے کہ اس کو موافق آئے یا نہ آئے، لیکن انگور کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ شوگر والے کو کہتے ہیں: کوئی میٹھی چیز مت کھاؤ، لیکن جدید تحقیقات ہیں کہ شہد اور کھجور کے اندر جو میٹھا ہے وہ اتنا نقصان دہ نہیں ہے جتنا براہِ راست میٹھا کھانے میں نقصان ہے۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾ الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ ۖ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦٨﴾ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾﴾ [البقرة: ۲۶۷ تا ۲۶۹]

''اے ایمان والو! زکوٰۃ دو عمدہ مال سے جو تم کماؤ اور ان (دانوں اور پھلوں) میں سے بھی عمدہ چیز جس کو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کیا ہے۔ اور ردی چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کر دو، حالانکہ تم خود اس کو لینے والے نہیں ہو، مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔ اور یہ یقین رکھو کہ اللہ محتاج نہیں، تعریف کے لائق ہے۔ شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور تم کو بری بات کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی بخشش اور زیادہ دینے کا۔ اور اللہ وسعت والا، جاننے والا ہے۔ جس کو چاہتا ہے علم نافع دیتا ہے اور جس کو علم نافع مل جائے اس کو بڑی خیر مل گئی۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔''

حلال اور طیب میں فرق:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ کے اندر فرمایا ہے کہ میرے راستہ میں پاکیزہ چیز خرچ کرو، جو خالص حلال ہو۔

طیب سے مراد وہ مال ہے جو حلال بھی ہو اور پسندیدہ بھی ہو؛ کیونکہ لفظِ حلال کے اندر حلال چیزیں آتی ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر حلال ہر بندے کو پسند بھی ہو؛ کیونکہ بعض پھل اور سبزیاں اور گوشت ہیں جو ایک آدمی کو پسند ہیں اور دوسرے آدمی کو پسند نہیں ہیں، لیکن طیب کا معنی یہ ہوتا ہے کہ حلال بھی ہو اور پسندیدہ بھی ہو۔

جیسا کہ ایک صحابی نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا: میں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں، میرے پاس دو باغ ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم سارا خرچ نہ کرو۔ اس صحابی نے عرض کیا: میں اس میں سے ایک باغ اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے اجازت دے دی تو اس نے عرض کیا کہ حضور! جو مجھے سب سے زیادہ باغ پسند ہے، جس میں چھ سو درخت ہیں، ان کو میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں۔

خیرات کرنے کی چند شرائط:

خیرات کرنے میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ نیت خالص ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ چیز حلال ہو، حرام سے نہ ہو، رشوت، سود، جوئے اور دھوکہ سے حاصل کی ہوئی دولت نہ ہو۔ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی چیز آدمی حرام مال خرچ کرے اور اس پر ثواب کا یقین رکھے تو کافر ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آج کل بینک ہیں جن کا سودی کاروبار ہے۔ ان لوگوں نے اپنے عملہ اور عوام کو خوش رکھنے کے لیے اسکیمیں بنائی ہیں، قرعہ اندازی کریں اور جس کا نام نکل آئے گا اس کو حج پر بھیجیں گے۔ اور خالص سود اور حرام کے پیسوں سے حج پر بھیجیں گے۔

جدید مالیاتی سکیمیں:

یہودیت نے عالمِ انسانیت کو ان کی گردنوں کو اقتصادی طور پر اس طرح کس لیا ہے کہ اس سے کوئی نہیں نکل سکتا، مگر وہ جس کو اللہ تعالیٰ نکالے۔ انہوں نے اس طرح کی اسکیمیں بنائی ہیں جیسا کہ حج کے موقع پر لوگوں نے ٹریول چیک لیے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کو بڑا محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ اس پر سائن کرکے پیسے لے لیتے ہیں۔ اگر وہ چیک گم ہو جائے تو دوسرا چیک مل جاتا ہے؛ کیونکہ اگر نوٹ گم ہو جائے تو کوئی نہیں دے گا۔

بظاہر اس کے اندر بڑا فائدہ ہے اور ہر بندے کو لالچ ہے کہ میں سفر پر جا رہا ہوں، میرا پیسہ محفوظ ہے، لیکن آپ کو پتہ نہیں ہوگا کہ جن لوگوں نے بیٹھ کر یہ اسکیم بنائی ہے ان کو سال میں کتنا بچتا ہے، آپ اس کے بارے میں نہیں

سوچ سکتے: کیونکہ وہ اس چیک کے سروس چارجز لیتے ہیں۔

دوسرا اگر کسی آدمی کو اس ٹریولر چیک کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دو سال، چار سال اس نے اس کو استعمال نہیں کیا وہ لاکھوں ڈالر بنے جو انہوں نے استعمال نہیں کیے، لیکن وہ لوگ جنہوں نے آپ سے پیسہ لیا ہوا ہے اس کو استعمال کر رہے ہیں۔

تیسرا اگر وہ آدمی جس کے نام ٹریولر چیک ہے وہ مر گیا ہے اور وہ چیک سفر میں رہ گیا، اس کی اولاد کو پہلے تو پتہ نہیں ہوتا اور اگر پتہ چل جائے تو اتنا لمبا پروسیجر ہے کہ تریاق آتے آتے بندہ مر جائے گا۔

اس کے علاوہ انہوں نے اب ایک اور راستہ نکال دیا کہ انہوں نے کارڈ بنا دیئے کہ یہ سلور کارڈ ہے، یہ گولڈن کارڈ ہے اور یہ ماسٹر کارڈ ہے، یہ جی ایم کارڈ ہے اور یہ ویزا کارڈ ہے۔ اس سے آپ کو چیک رکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بڑے سے بڑے سٹور میں جا کر سامان خریدیں، کارڈ دے دیں۔ وہ آپ کے کارڈ کو چیک کر کے اپنا بل اس بینک کو بھیج دیں گے۔ اس کارڈ پر فوٹو موجود ہے اور دستخط موجود ہیں، کوئی دوسرا آدمی اس کو استعمال نہیں کر سکتا۔ آپ کے پیسے اس طرح محفوظ ہو گئے اور آپ خوش ہو گئے۔

اور انہوں نے اس کے ساتھ ایک اور لالچ بھی دے دیا کہ آپ جو بھی شاپنگ کریں گے اور پیسے خرچ کریں گے اور آپ کے کارڈ کی ویلیو مثلاً: پچاس ہزار روپے ہے تو آپ وہ رقم تین مہینے کے اندر اندر بھیج سکتے ہیں۔ آدمی خوش ہو گیا کہ مجھے تین مہینے کا ادھار مل گیا۔ اور جس برانچ کے اندر آپ پیسے جمع کرا دیں، آپ کا حساب وہیں چلا جائے گا، لیکن ان کارڈوں کے بدلے میں ان کے پاس بلین ڈالرز بچے ہوئے ہیں کہ کارڈ والا مر گیا، لیکن ان کے پاس پیسہ جمع ہے اور وہ یہ سارا پیسہ اپنے دین کی اشاعت اور اسلام کو مٹانے میں خرچ کرتے ہیں۔ مثلاً: دیہات میں ڈسپنسری لگا کر لوگوں کو کہا کہ ہم عیسائی ہیں، لیکن مسلمانوں کی خدمت کر رہے ہیں، حالانکہ وہ اپنے مذہب کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اگر انسانیت کی خدمت ہوتی تو بوسنیا کے اندر لاکھوں مسلمانوں کو کیوں مروا ڈالا؟ وہاں انسانیت کی خدمت کیوں بھول جاتی ہے؟

ہمارے اپنے ملکوں کے اندر انہوں نے مشنری سکول کھول دیئے ہیں۔ پہلی سے لے کر ایف اے اور بی اے تک بچے پڑھ رہے ہیں۔ جب بچہ سکول میں جاتا ہے تو اس کی وردی علیحدہ ہے اور صلیب کا نشان سامنے ہے۔ صبح جو سب سے پہلے اپنا ترانہ پڑھاتے ہیں کہ اس کے اندر عیسائیت کا بھرا ہوا زہر ہے کہ جب بچہ دس سال کے بعد

ان کے سکول سے نکلے تو وہ عیسائی تو نہیں ہوتا، لیکن وہ عیسائیت کا پچاس فیصد زہر اپنے اندر لے چکا ہوتا ہے۔ ظاہراً وہ کہے گا کہ میں مسلمان ہوں، عیسائی نہیں ہوں، لیکن ہر وہ کام کرے گا جو عیسائی کرتے ہیں۔ اور ہم خوش ہیں کہ کتنے اچھے لوگ ہیں ان کو کتنی انسانی ہمدردی ہے؟ ورنہ ان کو کیا ضرورت تھی کہ ہمارے بچوں کو تعلیم دیتے۔

ہمیشہ یاد رکھیں کہ جتنے سودی کاروبار ہیں، یہ ہماری فلاح کے لیے نہیں ہیں، بلکہ ہماری بربادیوں کے لیے ہیں؛ کیونکہ اوپر بیٹھے ہوئے سارے مال کی کریم کھا رہے ہیں اور بچا کھچا کبھی اس کو مل گیا اور کبھی اس کو مل گیا۔

اب بینک خیرات کرے، وہ حلال نہیں ہے۔ اب تو...... اللہ تعالیٰ معاف کرے...... دینی مسائل پر اتنی بے حسی ہوگئی ہے کہ کوئی بات کرنے پر بھی تیار نہیں ہے اور کہہ دیتے ہیں کہ وہ سود حرام ہے جو حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں تھا، جیسے مہاجن سود لیتا تھا، ہندو سود لیتا تھا۔ وہ کہتے ہیں: بینک کا تو سود نہیں ہے، بلکہ خالص حلال ہے؛ کیونکہ بینک والے جو رقم کاٹتے ہیں وہ سروس کی مد میں کاٹتے ہیں...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ......

پاکیزہ کو پاکیزہ چاہتا ہے:

﴿وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (اور جو کچھ ہم نے زمین سے نکالا)۔ اس سے اشارہ فرمایا کہ اگر میں وہ زمین سے نہ نکالوں تو کون نکالے گا؟ اور اگر تیری فصل برباد کردوں تو کہاں سے فصل اگائے گا؟ اگر میں زمین کے اندر بیج جلا ڈالوں اور کوئی چیز باہر نہ نکلے تو کون نکال سکتا ہے؟ تو جو میں نے زمین سے اگایا ہے اس کو میرے راستے پر خرچ کرو۔ پہلے طیب کو ذکر کر کے خبیث کو ذکر فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ عورتوں اور بدکردار عورتوں کو انہی لفظوں کے ساتھ ذکر کیا: ﴿وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ﴾ [النور:۲۶] پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں کہ جن عورتوں کو کبھی کسی نے ہاتھ نہیں لگایا وہ ان مردوں کے لیے ہیں جنہوں نے کبھی حرام کی نظر کسی غیر عورت پر نہیں ڈالی۔ اور آگے فرمایا: بدکردار عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں۔ اور یہ حالات کے اعتبار سے الٹ بھی ہوجاتا ہے۔ کئی صالحین شب بیدار ہیں، لیکن گھر میں بے حیاء عورت آگئی اور کئی عورتیں بڑی دیندار تہجد گزار ہیں، لیکن جہاں رشتہ ہوا وہ مرد خبیث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے، اس لیے کہ ان کی خواہش ایسے ہوتی ہے کہ پاکباز پاکباز کو چاہتا ہے، خبیث خبیث کو چاہتا ہے۔ سب سے پاک ذات اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو جب اللہ تعالیٰ پاک ہے تو میں تیرا پلید کیسے قبول کروں؟

مثال:

مثال مشہور ہے کہ کسی کا بکری کا بچہ گم ہوا۔ کوئی پکڑ کر مولوی صاحب کے پاس لے آیا اور کہا کہ یہ راستے میں مجھے مل گیا ہے۔ میں نے کہا: اس کو کوئی درندہ کھا جائے گا، اس سے تو بہتر ہے کہ کسی مسلمان کے پیٹ میں چلا جائے۔ مولوی صاحب نے کہا: ہم تو نہیں لیتے ہیں، کیونکہ کوئی پتہ نہیں کس کا ہے؟ ساتھ کوئی پولیس والا (مہربان) بھی بیٹھا تھا، اس نے کہا: مولوی صاحب! آپ نے اچھا کیا۔ آپ مجھے دے دیں۔ اگر آپ لیں گے تو یہ آپ کو تنگ کرے گا۔ مولوی صاحب کو سمجھ نہ آئی تو اس نے پوچھا: کیسے تنگ کرے گا؟ اس نے کہا: جب آپ اس کو پیٹ میں بھیج دیں گے تو آگے کچھ نہیں ہے۔ یہ اکیلا باں باں کرتا پھرے گا اور ادھر تو ریوڑ کھڑے ہیں۔ ادھر آئے گا تو ان کے ساتھ مل جائے گا۔

صدقات میں عمدہ چیز خرچ کرو:

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے راستے میں پلید چیزوں کو خرچ کرنے کا ارادہ بھی نہ کرو۔ تم میرے راستے کے اندر گندی چیز کرتے ہو، ذرا غور کرو کہ تمہیں اگر کوئی گندی چیز دے تو کیا تم قبول کرتے ہو؟ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ چشم پوشی کر کے لے لے، ورنہ تم اپنے لیے گندی چیزیں نہیں لیتے ہو اور خدا کے لیے گندی چیزیں دیتے ہو۔ فرمایا: اگر میرے راستے کے اندر خرچ کرنا ہے تو خالص میرے لیے اور حلال ہو۔ اور جتنا وہ تیرا محبوب ہوگا اتنا بڑا تجھے انعام ملے گا، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سب سے زیادہ پیار اپنے بیٹے سے تھا۔ ان کو ہر وقت اٹھاتے تھے، جہاں جاتے بیٹا ساتھ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری محبت کے دعوے کرتے ہو اور دوسرے کو محبوب بناتے ہو، یہ میری غیرت گوارہ نہیں کرتی۔ بچے کو لے جا کر بیابان میں چھوڑ دو اور واپس آجاؤ، ملنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اپنی اولاد سے محبت کرنا منع نہیں ہے، وہ تو مرغوب ہے...... ایک صحابی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں بچوں کو دیکھا تو کہا: میرے دس بچے ہیں، لیکن مجھے یاد نہیں کوئی میری گود میں بیٹھا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ معاف کرے اور دل کو نرم کرے...... پھر اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم دے دیا کہ میرے راستے میں اس بچے کو ذبح کر دو۔ جب یہ امتحان انتہاء کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دے دیا کہ تم امتحان میں کامیاب ہو گئے، اللہ تعالیٰ کے راستے میں اللہ کے خلیل نے اپنا خلیل دیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہمیں تمہاری قربانی اتنی پسند آئی ہے کہ

ہم قیامت تک تمہاری اس قربانی کو زندہ و جاوید بنا دیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں محبوب چیز دینے کا صلہ ہے کہ آج ہزاروں سال گزر گئے قربانی زندہ اور باقی ہے۔

بعض آدمی صدقہ کرتے ہیں اور بعض آدمی صدقہ نہیں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ اگلی آیت میں بیان فرمائی ہے کہ شیطان تمہیں ڈراتا ہے کہ بے وقوف آدمی! بڑی مشکل سے ایک ماہ بعد تجھے یہ تنخواہ ملی ہے، اس کے اندر سے دوسو تو نے دیا تو سال میں چوبیس سو یہ چلا گیا۔ تم خوامخواہ ان مولویوں کی چکر میں پڑ گئے ہو، یہ تمہیں بھوکا کرنا چاہتے ہیں اور اپنی جیبیں بھرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح تم بھوکے مرو گے، اس دوسو کو خرچ کرنے کی بجائے ہزاروں ریال تم بینک میں ڈال دو تو سال بعد تمہیں سات سو ریال اوپر ملیں گے۔ خیرات کے اندر تمہارا نقصان ہو رہا ہے اور سود کے اندر تمہارا پیسہ بڑھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر وہ شیطان تمہیں برائیوں کا حکم دیتا ہے کہ تم نے ایک غریب آدمی کو اتنے پیسے دے دیئے، لیکن تمہیں کیا ملا ہے؟ زیادہ سے زیادہ کوئی یہ کہہ دے گا کہ قیامت والے دن اجر ملے گا، پتہ نہیں کب موت آئے گی؟ اور کب قیامت آئے گی؟ پتہ نہیں اٹھیں گے یا نہیں اٹھیں گے؟ اور پھر شیطان کہتا ہے کہ تم اس طرح کرو کہ ایک سو ریال کی شراب خریدو اور ایک سو کا شباب خریدو اور ساری رات مزہ لو۔ لیکن اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرماتے ہیں کہ جب تم میرے راستے میں خرچ کرو گے تو میں تیرے گناہ معاف کر دوں گا، میں تمہاری بلائیں ٹال دوں گا، میں تمہاری مصیبتیں دور کر دوں گا، میں تمہاری بیماریاں رفع کر دوں گا۔ تم تو سوچ رہے ہو کہ ایک ہزار ریال میں سے دوسو خیرات کی تو آٹھ سو بچ جائیں گے۔ اگر میں تیرے اوپر بیماریاں مسلط کر دوں، تیرے بیس ہزار بیماری پر لگ جائیں تو پھر کیا کرو گے؟ اس کے علاوہ تم برائی کے اندر پڑو گے اور جبکہ میں مغفرت کا وعدہ کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اور زیادہ دوں گا۔ اور میں بڑے فضل والا اور علیم ہوں کہ تم جہاں بھی خیرات کرو گے، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

اس سے اندازہ کریں کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا اس نے اللہ تعالیٰ کے فرمان کا اعتبار کیا اور جو خرچ نہیں کرتے انہوں نے شیطان کی بات مانی ہے۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ تم رحمانی ٹولے میں شامل ہو جاؤ یا شیطانی ٹولہ میں شامل ہو جاؤ۔

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۝﴾

[البقرۃ:۲۶۹]

حکمت کا معنی ہوتا ہے: گہرائی سے بات کو سمجھنا۔ اللہ کے فرامین میں اور شیطان کے وساوس میں فرق کر کے حق تک پہنچنے کا نام ''حکمت'' ہے۔ جس کو حکمت ملتی ہے اس کو سب سے بڑی بھلائی مل گئی۔ میرے قرآن اور میرے فرمان سے عقل والے نصیحت پکڑتے ہیں اور جن لوگوں نے اپنی عقل شراب و کباب میں ضائع کر دی ہے وہ شیطان کی ذریت بن گئے ہیں اور ان کو میرا قرآن سمجھ نہیں آسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان والے بندوں کو انفاق کا حکم فرمایا ہے۔ انفاق سے مراد صدقہ ہے؛ کیونکہ انفاق: نفقہ، اپنے والدین اور بیوی بچوں پر خرچ کرنے کو بھی شامل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ﴿مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ سے مراد وہ پاکیزہ مال ہے جس کو تم نے حاصل کیا ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے جو تمہارے لیے تجارت آسان کر دی ہے، یہ بھی میں نے تمہیں علم دیا اور آسانیاں پیدا کیں۔ میں نے سمندر کے اندر کشتیوں کے انتظام کیے، اس لیے تم میرے راستے میں خیرات کرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ جو میں نے سونا اور چاندی تمہیں دیا ہے اس میں سے صدقہ ادا کرو اور جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین سے پھل اور سبزیاں نکالی ہیں سب سے صدقہ خیرات کرو۔

اللہ تعالیٰ رزق سب کو دیتے ہیں، ایمان نہیں:

حدیث: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ قَسَمَ بَيْنَكُمْ أَخْلَاقَكُمْ كَمَا قَسَمَ بَيْنَكُمْ أَرْزَاقَكُمْ وَإِنَّ اللّٰهَ يُعْطِي الدُّنْيَا مَنْ يُحِبُّ وَمَنْ لَا يُحِبُّ إِلَّا يُعْطِي الْإِيْمَانَ إِلَّا مَنْ يُحِبُّ فَإِنْ ضَنَّ أَحَدُكُمْ بِالْمَالِ أَنْ يُنْفِقَهُ وَهَابَ اللَّيْلَ أَنْ يُكَابِدَهُ وَخَافَ الْعَدُوَّ أَنْ يُجَاهِدُوْا فَلْيُكْثِرْ مِنْ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ")) [مسند احمد بن حنبل: ۱/ ۳۸۷، مجمع الزوائد: ۱۰/ ۹۰]

اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان اخلاق کو تقسیم کیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان رزق تقسیم کیا۔ اللہ تعالیٰ

دنیا، دولت اور پیسہ اس کو بھی دیتے ہیں جس کو محبوب رکھتے ہیں اور اس کو بھی دیتے ہیں جس کو محبوب نہیں رکھتے، یعنی دولتِ دنیا کافر کو بھی ملتی ہے اور مسلمان کو بھی ملتی ہے۔ صالح کو بھی ملتی ہے اور طالع کو بھی ملتی ہے۔ اچھے کو بھی ملتی ہے اور برے کو بھی ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنا دین کس کو دیتے ہیں؟

اور اللہ اپنا دین نہیں دیتے، مگر اس کو جس کو محبوب رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو دین عطا فرماتے ہیں تو گویا اللہ پاک نے اس کو محبوب رکھ لیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری زندگی ہے! مسلمان بندہ نہیں بن سکتا جب تک اس کا دل اور زبان مسلمان نہ بنے اور بندہ مسلمان نہیں بن سکتا جب تک اس کا ہمسایہ اس کے ظلم سے محفوظ نہ ہو جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: بوائقہ کا کیا معنی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو اپنے ہمسایہ کے ساتھ دھوکہ کرے یا ظلم کرے تو سمجھے میرا ایمان کامل نہیں ہے۔ کوئی بندہ حرام مال کمانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے اور یہ سمجھے کہ اس میں برکت بھی ہوگی اور کوئی صدقہ ایسا نہیں ہوتا جو یہ سمجھے کہ حرام کا قبول بھی ہو جائے گا اور نہ کوئی حرام مال اپنے بچوں کے لیے چھوڑ کر جائے، مگر یہ سمجھے کہ میں نے جہنم کے اسباب پیدا کر دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کبھی حرام مال کو قبول بھی نہیں فرماتے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک ریال حلال کا دیا ہے وہ خیرات کرو۔ یہ ضروری نہیں کہ تم ایک لاکھ یا ایک ہزار خرچ کرو۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا: تیرے دروزاے پر کوئی خیرات مانگنے والی عورت آ جائے تو چاہے کھجور کا آدھا حصہ بھی ہو دے دیا کرو۔ اللہ تعالیٰ اس سے بھی تم کو جہنم سے دور کر دیں گے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی شرط یہ ہے کہ مال حلال ہو اور اچھے سے اچھا ہو۔

ایک مدرسہ کے مہتمم کی اعلیٰ ظرفی:

ہمارے ایک دوست نے دین کا مدرسہ بنایا، ان کا نام نہیں بتاتا؛ کیونکہ ریا ہو جائے گی۔ وہ رمضان المبارک میں آئے اور ان کا ارادہ ہوا کہ اپنے طلباء کے لیے رومال بھیجیں، آگے عید آ رہی ہے۔ جو بچے مدرسے میں رہتے ہیں ان کو بھی ایک ایک رومال اور ایک ایک ٹوپی ہدیہ دیں گے، وہ خوش ہو جائیں گے۔ ہم نے دکاندار کے پاس جا کر رومال دیکھے، اس نے کہا: ایک رومال دس ریال کا، ایک پندرہ ریال کا اور ایک بیس ریال کا ہے۔ دوست نے مجھ

سے پوچھا: جو آپ نے پہنا ہوا ہے یہ کتنے کا ملتا ہے؟ میں نے کہا: حضرت! ایسا رومال بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو مہنگا ہے۔ کہنے لگے: نہیں! ہم پہنیں تو اچھا اور طالب پہنیں تو کیوں برا ہے؟ اگر ہم نے عید پر اپنے بیٹوں کے لیے اچھا خریدنا ہے تو وہی طالبوں کے لیے خریدیں۔ آخر وہ بھی کسی کے بچے ہیں۔

یہ جذبہ قابلِ قدر ہے کہ آدمی جو اپنے لیے پسند کرے وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے بھی پسند کرے۔

(بقیہ حدیث) اللہ تعالیٰ برائی کو برائی کے ساتھ نہیں مٹاتے، بلکہ اللہ تعالیٰ برائی کو نیکی سے مٹاتے ہیں۔ (پلید کپڑا پاک پانی سے پاک ہوگا، پلید پانی سے پاک نہیں ہوگا) جو گندی چیز ہے وہ کبھی گندی چیز کو نہیں مٹاتی، بلکہ جب تم نیکی کا کام کرتے ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہاری برائیوں کو مٹا دیتے ہیں۔

موافاتِ مدینہ:

حدیث حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ آیت اس سبب میں اتری کہ مدینہ منورہ میں انصاریوں کے باغ تھے۔ جب کھجور کے کٹنے کا وقت آتا تو انصار پورا پورا گوشہ کاٹ کر مسجدِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میں اصحابِ صفہ کے لیے لے آتے اور اس کو لٹکا دیتے تھے۔ اس گوشہ میں کوئی بسر ہوتی، کوئی تمر ہوتی، اچھا اچھا لیتے رہے۔ اور بعض آدمی اس طرح کرتے کہ اس کو اچھوں میں شامل کر دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اپنے لیے اچھی کھجوریں پسند کرتے ہو اور خیرات کرنے کے لیے لوگوں کو گندی کھجوریں دیتے ہو۔ اللہ تعالیٰ پاک ہیں، وہ پاک چیز کے علاوہ کسی چیز کو پسند نہیں فرماتے ہیں۔

پہلے دور کے اندر یہ جذبہ ہوتا تھا کہ جب مہاجرین مدینہ منورہ میں آگئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار و مہاجرین کو بلا لیا۔ اور انصار کو فرمایا: یہ تمہارے بھائی ہیں، جو گھر بار سب کچھ چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے راستے میں آگئے اور تم یہاں گھر والے اور اہل والے ہو۔ اب میں یہ کرتا ہوں کہ ایک انصاری اور ایک مہاجر کو بھائی بناتا ہوں۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ منورہ جانے کے بعد پہلا قدم تھا۔

ویسے اگر آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے کہ مہاجرین کو بھی عطا فرما تو قبول ہو جاتی، لیکن آپ نے یہ سبق دیا کہ جب تک مہاجر اور اور انصار بھائی نہیں بنیں گے اس وقت تک دنیا امن میں نہیں رہ سکتی۔ جب تمہارے اندر قبائلیت، قومیت اور عصبیت پیدا ہو جائے گی اس دن تباہی کے دروازے کھل جائیں گے۔ جب ایک آدمی نے کلمہ پڑھ لیا، چاہے وہ کسی قوم کا ہے، سب اللہ تعالیٰ کی نظر میں برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی شان زیادہ ہے

جو زیادہ متقی اور پرہیز گار ہے۔ آج چودہ سو سال کے بعد وہی نفرتیں، کدورتیں اور عصبیتیں جب سے ابھاری گئی ہیں قتل عام ہے اور مسلمانوں کو کہیں چین نہیں ملتا ہے۔

انصار نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! بے شک آپ ان کو ہمارا بھائی بنائیں۔ جب سب بھائی بن گئے اور انصار جب مہاجرین کو لے کر اپنے گھروں میں گئے تو انہوں نے کہا: ایک بھائی ہوتا ہے جو ایک ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے، اس بھائی میں تو شبہ ہو سکتا ہے، لیکن تمہیں ہمارا بھائی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے بنایا ہے، تمہارے بھائی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ ہمارا باغ ہے: آدھا تمہارا اور آدھا ہمارا ہے۔ یہ ہمارے گھر کے دو کمرے ہیں: ایک کمرہ تمہارا ہے اور ایک کمرہ ہمارا ہے۔ دو اونٹ ہیں: ایک اونٹ تمہارا اور ایک اونٹ ہمارا ہے، حتیٰ کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ بھی کر دیا کہ میری دو بیویاں ہیں: تمہاری نہیں ہے، میں فلاں کو طلاق دے دیتا ہوں، عدت کے بعد تم شادی کر لو۔

مہاجرین نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: انصار نے ایسی قربانی دی جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ وہ تو ہمارا ثواب بھی لے کر جنت میں چلے جائیں گے، ہم ان کا حصہ نہیں لیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارا ثواب نہیں لے جائیں گے، تم ان کے لیے دعا کرتے رہو، برکتیں مانگتے رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری دعاؤں سے ان کو بدلہ عطا فرمائیں گے اور تمہاری نیکی میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کے راستے میں چاہے تھوڑا خرچ کرو، لیکن خالص حلال سے خرچ کرو۔ اس کی جو برکت ہوتی ہے اس کا دنیا میں کوئی شے مقابلہ نہیں کر سکتی۔

پرانے اکابر کا مقام:

جب تک والدین اپنے بچوں کو حلال کھلاتے تھے، مائیں وضو کر کے دودھ پلاتی تھیں، مدرسہ میں خالص حلال کی روٹی پکتی تھی تو امام بخاری، امام ترمذی، امام مسلم، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن القیم رحمہم اللہ پیدا ہوئے۔ جس دن سے ہمارے اندر آرام آگیا تو ویسا ایک بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اب مدرسوں میں ایسے طالب علم ہوتے ہیں جو کہتے ہیں: ہمیں الماری چاہیے، پلنگ چاہیے، اس پر بیڈ چاہیے، ہر ہفتہ میں دو دفعہ یا تین دفعہ اس کی چادر اور سرہانے تبدیل ہونے چاہئیں، ورنہ ان سے ہمیں بدبو آتی ہے۔ جبکہ پہلے دور میں سرہانہ اینٹ ہوتی تھی اور اوپر چادر اوڑھ کر سو گئے۔ جب سردیاں ہوتیں تو چٹائیوں کے

اندر لیٹ جاتے تھے یا جنگل سے لکڑیاں لاتے تھے اور کمرے کا دروازہ بند کر کے لکڑیاں جلاتے تھے کہ کمرہ گرم ہو جائے گا تو آرام سے سو سکیں۔

شیخ گمانی رحمہ اللہ کا مقام:

حضرت شیخ حبیب اللہ گمانی رحمہ اللہ نے مجھے ایک دفعہ حکم دیا کہ ہمارے مدرسہ کا جلسہ ہے اور تم نے تقریر کرنی ہے۔ کہنے لگے: آپ بڑے آدمی ہیں۔ میں نے کہا: حضرت! آپ کا حکم ہے، ہم پہنچ جائیں گے۔ خدا کی شان ہے! استاد کی بات میں حکمت ہوتی ہے۔ بہرحال مجھے اس جلسہ کی تاریخ بھول گئی تو میں ان کے مدرسہ سے تقریباً تیس میل دور بیٹھا تھا۔ عصر کے بعد یاد آیا تو میں نے سوچا آج جلسے کا آخری دن ہے۔ اگر نہ پہنچا تو ساری زندگی ناراض ہو جائیں گے۔ میں بڑا گھبرایا کہ سواری بھی میرے پاس نہیں ہے۔ ساتھ ایک تھانہ تھا، میں نے نام پوچھا۔ انہوں نے نام بتایا۔ میں نے سوچا چلو اس نے نام تو سنا ہوگا۔ بہرحال اس تھانے دار نے بڑی عزت اور احترام کیا۔ میں نے ان سے کہا: میرا یہ مسئلہ ہے۔ آپ مجھے مہربانی کر کے کسی ٹرک میں بٹھا دیں؛ کیونکہ استادوں کا مدرسہ سڑک کے اوپر تھا۔ انہوں نے کہا: کوئی مسئلہ نہیں، میں خود کھڑا ہوتا ہوں اور آپ کو چڑھاتا ہوں۔ وہ روڈ پر آگیا اور ٹرک روکا۔ اس کے سارے کاغذات لے کر اپنے پاس رکھ لیے اور اس کو رسید دی۔ میں نے کہا: اس طرح کیوں کیا؟ انہوں نے کہا: اگر یہ آپ کو دس پندرہ میل کے بعد اتار دیں تو ہم کیا کریں گے؟ اس لیے اس کے کاغذات رکھے ہیں۔ یہ آپ کا خط لائے گا تو یہ کاغذات لے جائے گا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی۔ رات کو گیارہ بجے میں پہنچ گیا اور ساڑھے بارہ بجے میں نے تقریر کی اور جلسہ ختم ہو گیا۔ استاد خوش ہو گئے اور فرمایا: مولوی مکی! تم نے گھر سونا ہے؛ کیونکہ ادھر جگہ نہیں ہے۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ کہنے لگے: ایک بستر ہے، میں مسجد چلا جاتا ہوں اور تم ادھر سو جاؤ۔ میں نے کہا: حضرت! مجھے بھی مسجد میں رات گزارنی آتی ہے۔ مجھے فرمانے لگے: آپ تھک گئے ہیں، آپ سو جائیں۔ حضرت کا بستر یہ تھا کہ پرانی سی گدی، پرانا سا لحاف اور پرانا سا سرہانہ تھا۔ یہ اس شیخ کا بستر تھا۔...... میرے خیال میں پورے ملک میں ان کے برابر کا ایک عالم بھی نہیں ہے۔ حضرت کشمیری رحمہ اللہ کے خصوصی شاگرد تھے، حضرت حسین علی رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے۔ والد صاحب فرماتے تھے جس نے چلتا پھرتا علم کا مکان دیکھنا ہو اس کو دیکھ لو...... مجھے اس بستر پر کہاں نیند آنی تھی۔ استاد کے حکم پر کچھ دیر لیٹا، پھر باہر آ کر نوکر کو آگ جلانے کا کہا اور میں آگ کے قریب بیٹھ گیا۔ ایک گھنٹہ بعد حضرت آئے اور فرمایا: ماشاء اللہ آپ تہجد کے لیے

اٹھ گئے ہیں! میں آپ کو اٹھانے آیا تھا۔ میں نے کہا: حضرت! یہ آپ کا حسنِ ظن ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

صدقہ میں اچھی چیز دو:

ابن ابی حاتم نے روایت نقل فرمائی کہ حضور اکرم ﷺ نے دو قسم کی کھجوروں کے بارے میں فرمایا کہ یہ صدقہ میں قبول نہیں کی جائے گی اور یہ نہ دیا کرو؛ کیونکہ ردی قسم کی کھجوروں کو اللہ کے راستے میں صدقہ خیرات کرنا مناسب نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اس آیت: ﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ﴾[البقرۃ:۲۶۷] کا ترجمہ فرمایا کہ مسلمان کی کمائی پلید نہیں ہوسکتی، بلکہ حلال ہوگی، لیکن اس کے اندر کھوٹی چیزیں اور نہ چلنے والے پیسے تم نکال کرنہ دو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اچھی چیزیں نکال کر خیرات میں دو۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور اکرم ﷺ کے سامنے کھانے کے لیے گوہ لائی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں اس کو پسند نہیں کرتا، میں اس کو نہیں کھاتا۔ گھر والوں نے کہا کہ اسے مسکینوں کو دے دیں؟ فرمایا: جو تم خود کھانے کے لیے پسند نہیں کر رہے تو مسکینوں کو کیوں دیتے ہو؟ ان کو بھی وہ چیز دو جو خود پسند کرتے ہو۔

دوسری حدیث مبارک ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے اس سے کراہت آتی ہے، لیکن جنہوں نے کھائی ان کو آپ نے منع نہ فرمایا، لہٰذا وہ حرام تو نہیں ہے۔ بہر صورت بعض ائمہ اس کی کراہت کے قائل ہیں اور بعض ائمہ اس کی کراہت کے قائل نہیں ہیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: اگر ایک آدمی کا کسی پر قرضہ ہو تو وہ قرضہ میں ناقص چیز کو قبول نہیں کرتا۔ تم اپنے قرضہ میں ناقص چیز کو قبول نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے لیے ناقص چیز دیتے ہو!؟

صدقہ کا ثواب تمہیں ہی لوٹتا ہے:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾[البقرۃ:۲۶۷] اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے جو فرمایا ہے کہ تم پاکیزہ چیزیں خیرات کرو۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے، میں غنی ہوں، ساری مخلوق میری محتاج ہے۔ اس کا فائدہ تمہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: جو تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں قربانی کرتے ہو اللہ کو نہ اس کے گوشت کی ضرورت ہے اور نہ اس کے

خون کی ضرورت ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ تو یہ دیکھتے ہیں کہ بندے نے میرے حکم کی تعمیل کر کے اپنی پیاری چیز قربان کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا فضل والا ہے، اللہ تعالیٰ کے خزانہ میں کبھی کمی نہیں آسکتی۔ حمید بمعنی محمود ہے کہ اس کے تمام اقوال واحکام پسندیدہ اور محمود ہیں۔ کوئی رب نہیں، مگر اللہ ساری دنیا اللہ کے دروازے کی محتاج ہے۔ وہ چاہے تو بغیر اسباب کے بھی دے، وہ چاہے تو زمین سے پانی کی بجائے سونا نکل آئے، وہ چاہے تو پتھروں سے سونا، چاندی، تیل اور دیگر نعمتیں دے دے۔ اور اگر لینا چاہے تو سب کچھ دے کر چھین لے۔ اس کی مرضی ہے۔ وہ تو غنی ہے، تم اس کے راستے میں دو گے تو اس کا فائدہ اور بدلہ تمہیں ملے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بندے کے ساتھ شیطان بھی ہے اور فرشتہ بھی ہے۔ شیطان بندے کو وسوسہ ڈالتا ہے، اس کے دماغ میں برائی ڈالتا ہے کہ خیرات کرو گے تو پیسے ختم ہو جائیں گے، تیرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔ اور اللہ کا فرشتہ بندے کے دل میں ڈالتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر چلو، اللہ تمہیں برکتیں عطا فرمائیں گے اور تمہیں دنیا و آخرت میں بدلہ عطا فرمائیں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر دل میں اچھے خیالات پیدا ہوں اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا جذبہ پیدا ہو تو سمجھ لو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس فرشتے کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اللہ نے مجھے توفیق بخشی ہے۔ اور گر دل میں خیال آئے کہ خرچ نہیں کرنا چاہیے، صدقہ نہیں کرنا چاہیے تو یہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اس وقت ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ'' پڑھو، اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑو۔

نیک لوگوں پر اعتراض:

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اعتراض بھی وہی لوگ کرتے ہیں جو کبھی خیرات نہیں کرتے ہیں کہ یہ مدرسہ والے کھائیں گے۔ مولوی پیسہ کھا رہے ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ تم نے کتنا دیا ہے؟ تو کہے گا میں نے تو کبھی نہیں دیا۔ اور کہیں گے: تبلیغی جماعت والے کھا گئے؟ پوچھا جائے: تم نے کبھی ان پر خرچ کیا؟ تو کہے گا: دیا تو نہیں ہے، لیکن یہ کہاں سے کھاتے ہیں؟ کبھی اس ملک میں جا رہے ہیں اور کبھی اس ملک میں جا رہے ہیں۔ تو لازمی بات ہے کہ کہیں سے ان کو ملتا ہے۔ اور اعتراض کرنے والا وہ ہوتا ہے جس نے کبھی دین پر ایک دھیلا بھی نہیں لگایا ہوتا۔ جو لگائے گا وہ اعتراض کیوں کرے گا؟

حکمت کا معنی:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ﴾ حضرت مجاہد فرماتے ہیں: حکمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو صحیح بات کرنے کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں حکمت سے مراد نبوت تو نہیں، لیکن مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں، قرآن و حدیث کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں۔ حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حکمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خشیت اور ڈر عطا فرما دیتے ہیں۔ جب دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت آ گئی تو سب چیز آ گئی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حکمت کی اصل و اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا ہو جائے۔ حضرت امام مالک: فرماتے ہیں میرے دل میں آتا ہے کہ حکمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی سمجھ پیدا ہو جائے اور ایسا امر اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحمت سے دلوں میں ڈالتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آپ نے بعض لوگوں کی دیکھا ہوگا جو دنیا کے معاملہ میں بڑے عقل مند اور سمجھ دار ہوتے ہیں، کروڑوں کا حساب منٹ کے اندر کر کے دے دیں گے اور بڑی دور کی سوچیں گے کہ اس میں فائدہ ہے یا نقصان ہے؟ لیکن جب دین کی بات کرو تو کچھ بھی نہیں جانتے، نماز کا طریقہ بھی نہیں آتا۔ اور ان کے مقابلہ پر ایک آدمی ایسا ہوتا ہے کہ اس کو دنیاوی امور کا پتہ نہیں چلتا، اس سے اگر حساب کرالو تو ایک ہزار کے پیسے بھی نہ گن سکے، لیکن جب اس سے دین کی بات پوچھتے ہیں تو بڑی اچھی طرح بتا دیتا ہے۔

اس لیے اصل حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دین کی سمجھ عطا فرما دے۔ جن لوگوں کو قرآن و حدیث کی سمجھ مل گئی وہ غنی لوگ ہیں۔ دنیا و دولت تو ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ ہم نے اپنے مشائخ اور اساتذہ میں دیکھا ہے کہ ان کو دنیا کے معاملہ کو پتہ نہیں ہوتا تھا۔

حضرت مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کے بیٹے اس وقت چودہ پندرہ سال کی عمر کے تھے۔ حضرت نے ایک دن شاگرد سے کہا: سائیکل لے جاؤ اور بازار سے سبزی لے آؤ۔ وہ جا کر لے آیا تو حضرت نے اس سے پوچھا کہ تیل کتنے کا ڈلوایا تھا؟ شاگرد نے کہا: حضرت! اس میں تو تیل نہیں ڈالا جاتا۔ یہ تو پاؤں سے چلتا ہے۔ بہر حال اس شاگرد نے استاد کے سامنے سائیکل کھڑا کیا اور ہاتھوں سے اس کو چلا کر دکھایا کہ اس طرح بیٹھ کر یہاں پاؤں لگاتے

ہیں، یہ پاؤں سے چلتا ہے، تیل موٹر سائیکل میں ڈالا جاتا ہے۔ فرمانے لگے: کمال ہے ہمارا لڑکا تو اتنا عرصہ سے ہم سے تیل کے بھی پیسے لیتا ہے۔ جب ان کے پاس بیٹا آیا تو غصہ میں تھے، تم نے ہم سے دھوکہ کیا۔ آخر وہ بھی مولوی کا بیٹا تھا۔ اس نے سوچا ایک تو ابا جان غصہ میں ہیں، دوسرا روز کے پانچ روپے بھی گئے۔ وہ جا کر سائیکل کی گدی اتار کر لے آیا اور کہا: اس میں سوراخ کیوں ہے؟ آپ مجھے بتائیں! کہنے لگے: اس کمبخت کو پتہ نہیں تھا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

آپ ان کی دین کی کتابیں پڑھیں تو آپ حیران رہ جائیں گے، لیکن سادگی کا یہ عالم تھا۔

مولانا رسول خان صاحب کا واقعہ:

حضرت مولانا رسول خان صاحب رحمہ اللہ جو استاذ الکل تھے، ان کے زمانہ میں ان کے مقابلے کا کوئی عالم نہیں گزرا، جس کے وہ استاد نہ ہوں، پٹھان تھے۔ ایک دن کہنے لگے: مجھے اردو زبان پر عبور حاصل ہو گیا ہے۔ چونکہ دار العلوم دیوبند میں صدر مدرس رہے، دہلی کا شاگرد تھا۔ اس نے کہا: استاد جی کمال کرتے ہیں! پٹھان اور اردو کا کیا جوڑ ہے!؟ انہوں نے فرمایا: میں اتنے سال سے تمہیں یہاں پڑھا رہا ہوں۔ میں تم سب کو اردو میں پڑھاتا ہوں۔ شاگرد نے کہا: پڑھا لینا اور زبان بول لینا علیحدہ بات ہے، لیکن زبان کو سمجھنا اور لغت پر عبور حاصل ہو جانا الگ بات ہے۔ جس آدمی کی زبان ہے اسی کو پتہ ہوتا ہے۔ فرمایا: مجھ سے کچھ پوچھو۔ شاگرد نے کہا: ہمارے ہاں بولا جاتا ہے: ''کریلا اور نیم چڑھا'' اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ درمیان میں ''اور'' جو عطف ہے، یہ گڑبڑ کر رہا ہے۔ شاگرد نے کہا: عطف نکال دیتے ہیں: ''نیم چڑھا'' اس کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: کریلا آدھا کچا اور آدھا پکا۔ انہوں نے ''نیم'' فارسی سے لیا، جس کا معنی ہے آدھا۔ اور ''چڑھا'' کو پکنے کے معنی میں لے لیا۔ شاگرد نے کہا: حضرت! یہ معنی نہیں ہے، بلکہ یہ محاورہ ہے۔ جس کا معنی ہے جب کوئی آدمی بہت تلخ مزاج ہو، ایک تو کریلا کڑوا ہوتا ہے اور اگر اس کی بیل نیم کے درخت پر چڑھ جائے تو اور کڑوی ہو جائے گی؛ کیونکہ نیم بھی تو کڑوی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ بھی حد سے زیادہ گرم آدمی ہے۔ کہنے لگے: ہاں بھائی! پھر تو ہمیں اردو نہ آئی۔ ایسے بڑے بڑے لوگ تھے، لیکن دنیا کے معاملات کا کوئی پتہ نہیں۔

اس لیے مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرما رہے ہیں: بعض آدمی دنیا کے معاملات میں بڑے ماہر ہوتے ہیں، لیکن دین کا

مسئلہ پوچھو تو کہتا ہے: میں عمرہ پر آیا ہوں، لیکن احرام جدہ سے باندھا ہے۔ اس نے بلاوجہ بغیر احرام کے میقات سے تجاوز کر لیا، اس پر دم بھی پڑ گیا اور ثواب بھی کم ہو گیا کہ حل سے احرام باندھا، لیکن اس کو یہ سمجھ نہیں ہے۔

حفظِ قرآن کی فضیلت:

حکمت کا لفظ عام ہے۔ اس کا اعلیٰ درجہ نبوت، پھر رسالت اور اس کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی سنتوں کی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ''مَنْ حَفِظَ الْقُرْآنَ فَقَدْ أُدْرِجَتِ النُّبُوَّةُ بَيْنَ كَتِفَيْهِ غَيْرَ أَنَّهُ لَا يُوحٰى إِلَيْهِ'' ''جس نے قرآن حفظ کیا تو گویا اس کے دو کندھوں کے درمیان نبوت رکھ دی گئی، حالانکہ وہ نبی نہیں ہے، اس پر وحی نہیں آئے گی، لیکن نبوت کا مقام قرآن ہے اور قرآن اس کے سینہ میں محفوظ ہو گیا ہے۔ علماء فرماتے ہیں: جس شخص کے گھر میں ترمذی شریف موجود ہو اور وہ اس کا پڑھنا بھی جانتا ہے، اس کو سمجھ سکتا ہے تو گویا اللہ کا نبی اس کے گھر میں بول رہا ہے۔

دو چیزوں میں حسد جائز ہے:

امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا کہ میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ''لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلٰى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ، وَ رَجُلٌ آتَاهُ اللهُ حِكْمَةً فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا'' حسد نہیں کرنا چاہیے، مگر دو آدمیوں پر: 1 ...... ایک وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی اور وہ اس کو حق کے راستے میں لٹا رہا ہے 2 ...... اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، وہ اس کو پڑھا رہا ہے، کبھی تبلیغ، کبھی تدریس اور کبھی دعوت، ہر وقت اس کے اندر لگا ہوا ہے کہ اے اللہ! مجھے بھی ایسی ہی توفیق عطا جس طرح سے یہ کر رہے ہیں۔ [ابن ماجہ: رقم: ۴۲۰۸]

جس علم سے لوگوں کو فائدہ نہ پہنچے اس علم سے اللہ کے نبی نے پناہ مانگی ہے۔

بڑے بڑے علماء بستیوں میں بیٹھے مر گئے، جن کے ہم جوتے اٹھانے کے قابل نہیں، لیکن ان کی پوری زندگی بستی کے اندر گزر گئی، کسی کو قاعدہ بھی نہیں پڑھایا۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ چاہے تو چھوٹے چھوٹے طالب علموں سے بھی بڑا کام لے لیتا ہے۔

---

[1] [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰۴]

﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا ھِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْھَا وَتُؤْتُوْھَا الْفُقَرَاۗءَ فَھُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۷۰، ۲۷۱]

''اور جو کچھ تم خیرات دیتے ہو یا کوئی نذر پوری کرتے ہو اللہ کو سب معلوم ہے۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اگر تم ظاہر کر کے صدقات دو تو یہ اچھا ہے اور اگر تم ان کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور اللہ تمہارے کچھ گناہ بھی دور کر دے گا اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے۔''

تفسیری آیات:

جو کچھ تم خرچ کرتے ہو خرچ کرنا یا منت مانتے ہو منت مانی کہ میرا کام ہو جائے تو میں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اتنی خیرات کروں گا۔

منت ماننا جائز ہے، لیکن خالص اللہ کے نام پر منت مانی جائے۔ اگر منت غیر کے نام کی مانی جائے یا کوئی منت مانتا ہے کہ میں قبر پر اتنی دیگیں پکاؤں گا، اتنی خیرات کروں گا اور اتنے دنبے ذبح کروں گا تو وہ مشرک بن جاتا ہے۔ پہلے تو منت کی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ حدیث مبارک میں آتا ہے: اللہ تعالیٰ نے اگر کسی بندے کا کوئی کام کرنا ہے وہ منت مانے یا نہ مانے وہ کام ہو جائے گا اور اگر نہیں ہونا ہوتا تو وہ نہیں ہوگا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: منت کا اتنا فائدہ ہے کہ بعض بخیلوں کا کچھ مال نکل جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو تم خرچ کرتے ہو یا منت مانتے ہو تحقیق اللہ جانتے ہیں کہ تم نے کیا خرچ کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جاننے کا مطلب یہ ہے کہ جب چاہتے ہیں تو پورا پورا بدلہ دیں گے۔ اگر تمہارا صدقہ خیرات ''مَنّ وَ اَذٰی (احسان جتلانے اور تکلیف دینے)'' سے خالی ہے تو اللہ تعالیٰ دس گنا یا سات سو گنا یا اس سے بھی زیادہ بڑھا دیں گے۔

اور اگر تمہاری منت یا تمہارا خرچہ حرام ہے، غیر اللہ کے لیے ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت والے دن سزا دیں گے۔ اور منکروں کے لیے اس دن کوئی مدد کرنے والا نہیں ہوگا اور نہ ان کا کوئی سفارشی ہوگا اور نہ ان کی کوئی مدد کرے گا۔

اگر تم ظاہر کر کے خیرات کرو تو یہ بھی اچھی بات ہے اور تم اس کو چھپاؤ اور غریبوں کو پہنچاؤ وہ تمہارے لیے سب سے بہتر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹا دیں گے۔ تم جو عمل کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والے ہیں۔

علماء نے فرمایا: جو صدقات واجبہ ہیں ان کو لوگوں کے سامنے دو، تاکہ لوگوں کے اندر جذبہ پیدا ہو؛ کیونکہ وہ تم نے دینا ہی ہے، اس کے اندر ریا کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اور جو صدقاتِ نافلہ ہیں کہ کسی بیوہ کی مدد ہے یا یتیم کی مدد ہے، بوسنیا والوں کی مدد ہے یا کشمیر والوں کی مدد ہے تو اس معاملے میں تم چپکے دے آؤ تو تمہیں زیادہ ثواب ملے گا۔

بعض علماء نے فرمایا: اگر کبھی مسلمانوں کو ضرورت پیش آ گئی، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر چندہ فرمایا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تم کیا لائے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: جو میرے گھر میں تھا میں نے آدھا آدھا کر دیا ہے۔ آدھا گھر چھوڑ آیا اور آدھا لے آیاں ہوں؛ کیونکہ میرے گھر میں بہت مال تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے پوچھا، انہوں نے کہا: ایک ہزار اونٹ پلان اور سامان کے ساتھ اور ایک ہزار دینار بھی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: ابو بکر! تم کیا لائے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: حضور! میرے گھر میں جو کچھ تھا سب اٹھا کر لے آیا ہوں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: تم نے آج بھی ہمیں نمبر نہیں لینے دیا اور تم نے کسی جگہ بھی ہمیں نمبر نہیں لینے دیا۔

اب علماء نے لکھا ہے کہ ایسے موقع پر دل کھول کر خرچ کرو، تاکہ لوگوں کو بھی رغبت پیدا ہو۔ اگر ویسے خیرات کرنی ہے تو اس انداز سے کرو کہ اگر دائیں ہاتھ سے دیا ہے تو بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتے ہیں، تم ظاہر کرو گے وہ بھی جانتے ہیں اور تم چھپ کر خیرات کرو گے وہ بھی جانتے ہیں۔ تم نے اللہ سے بدلہ لینا ہے وہ تو جانتا ہے، اس پر تمہیں پورا پورا بدلہ اور ثواب عطا فرمائیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جاننے والے ہیں۔ دنیا میں ہر عمل کرنے والا جو بھی عمل کر رہا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کو پوری پوری جزا اور بدلہ دیں گے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ اور اس کے اندر ان لوگوں کے لیے وعید ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی خبروں کو جھٹلاتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ غیروں کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کے لیے قیامت کے دن کوئی مددگار نہیں ہوگا، جو ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے چھڑا سکے۔

افضل صدقہ:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اَلْجَاهِرُ بِالْقُرْآنِ كَالْجَاهِرِ بِالصَّدَقَةِ وَالْمُسِرُّ بِالْقُرْآنِ كَالْمُسِرِّ بِالصَّدَقَةِ'' جو قرآن کو زور سے پڑھنے والا ہے وہ ایسے ہے جیسے کوئی صدقہ ظاہراً کرنے والا ہے اور جو آدمی قرآن پاک کو آہستہ تلاوت کر رہا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی صدقہ کرنے والا آدمی اس طرح صدقہ کرے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔

اگر زور سے قرآن پاک پڑھ رہا ہے تو خیال رکھنا کہ اگر ساتھ کوئی آدمی نماز پڑھ رہا ہے تو اس کی نماز میں حرج ہوگا۔ اس لیے حالات کے مطابق حکم ہے۔ ہمارے بعض بھائی طواف کے دوران زور زور سے دعائیں مانگتے ہیں۔

آہستہ دعا کا حکم:

یہ ادب اور سنت کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کے بھی خلاف ہے؛ کیونکہ دعا وہ ہوتی ہے جو خفیہ مانگی جائے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا مانگی تو فرمایا: ﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝٣﴾ [مریم: ۳] رات کا وقت ہے، علیحدہ ہیں، لیکن بالکل آہستہ آہستہ دعا مانگ رہے ہیں۔

اسی طرح جب یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے ابا کے سامنے اقرارِ گناہ کیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: عنقریب تمہارے لیے استغفار کروں گا۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ تہجد کے وقت تمہارے لیے استغفار کی دعا کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ دعا میں چیختے ہیں، اللہ پاک حد سے زیادہ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

آج مشکل یہ ہوگئی ہے کہ پہلے تو ہم اللہ تعالیٰ کے کاموں میں نہیں آتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کے کام کرتے ہیں تو ان کو بھی صحیح طریقہ سے ادا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مثلاً: آپ کے ساتھ کوئی آدمی نماز پڑھ رہا ہے اور وہ زور زور سے امام کے پیچھے پڑھ رہا ہے کہ سارے مقتدی اب اس کی سنیں یا امام کی سنیں، لیکن جیسے کسی کی عادت بن گئی وہ لگا ہوا ہے۔ یہ ساری چیزیں انسان کو سمجھنی چاہیں۔

اس لیے اگر آپ قرآن پاک کی تلاوت کریں تو اعتدال سے کریں، جیسا کہ ایک رات حضور اکرم ﷺ گزرے اور دیکھا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تہجد میں اونچی آواز سے قرآن پڑھ رہے ہیں۔ آپ ﷺ آگے تشریف لے گئے اور دیکھا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے ہیں اور قرآن شریف آہستہ آہستہ پڑھ رہے ہیں۔ صبح

جب موقع ملا تو آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: رات تم زور زور سے قرآن پڑھ رہے تھے، کیا بات تھی؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میرا مقصد یہ تھا کہ نیند میں جو لوگ غافل پڑے ہیں ان کو جگا دوں اور شیطان کو بھگا دوں۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تم آہستہ کیوں پڑھ رہے تھے؟ انہوں نے عرض کیا: میں اپنے اللہ کو سنا رہا تھا اور کسی کو سنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آہستہ پڑھو تو اللہ سنتے ہیں اور زور سے پڑھو تو بھی سنتے ہیں۔ آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم کچھ زور سے پڑھا کرو۔ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم آواز کو کچھ آہستہ کرو۔ درمیان میں رہو، اتنا زور سے نہ پڑھو کہ کسی کی عبادت میں حرج ہو اور اتنی آہستہ بھی نہ پڑھو کہ آدمی خود بھی نہ سن سکے کہ میں نے کیا پڑھا ہے؟ جہاں زور سے کچھ پڑھنے کا حکم ہے تو اس سے مراد یہ نہیں کہ تم اتنا زور سے پڑھو کہ صفا و مروہ والے پریشان ہو جائیں کہ کوئی لڑائی ہو گئی ہے، بلکہ جہر اس کو کہتے ہیں کہ تمہارا پڑھنا ساتھ والے سنیں اور سر کا معنی ہوتا ہے بالکل آہستہ کہ جو تم سن رہے ہو، ورنہ زیادہ زور لگانا ہر جگہ منع ہے۔ ہاں ایک مدرس ہے، جو درس دے رہا ہے، مجبور ہے کہ اس کی آواز سب تک پہنچے۔ ایک امام نماز پڑھ رہا ہے وہ بھی مجبور ہے کہ زور سے تکبیر کہے۔

اسی طرح صدقہ وخیرات ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو کھل کر بھی دو، تاکہ لوگ تمہیں دیکھ کر نیکی کا کام کریں۔ اگر ضرورت نہ ہو تو چپکے سے بھی دو کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔

عرش کے سائے میں جگہ پانے والے:

بخاری و مسلم میں ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

((سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللهُ تَعَالَى فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ: إِمَامٌ عَدْلٌ، وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللهِ، وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ، وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللهِ، اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ، وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ: إِنِّي أَخَافُ اللهَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ، وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللهَ خَالِيًا، فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ)) [صحیح البخاری: ۱/۲۰۱۶۸، ۱۳۸، صحیح مسلم: رقم: ۹۱، باب: الزکوٰۃ]

یعنی سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی رحمت کے سائے کے نیچے رکھیں گے، جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہیں ہوگا۔

❁..... پہلا آدمی امام عادل ہے، یعنی بادشاہ ہو جو انصاف کرنے والا ہو۔

⊛......اور دوسرا وہ نوجوان لڑکا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پرورش پا رہا ہے۔ (کیونکہ جب آدمی ساٹھ سال کا ہو جائے، ریٹائرڈ ہو جائے تو ہاتھ میں تسبیح یاد آ جاتی ہے، ٹوپی یاد آ جاتی ہے اور کہتے ہیں: اب ہم نے سب کچھ بچوں کو دے دیا ہے اور اب اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کو دے دیا ہے۔ یہ کیوں بات نہیں کرتے کہ بلی تین سو ساٹھ چوہے کھا کر حج کو چلی ہے؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ جب نوکری والوں نے تم کو ہٹا دیا کہ خدا کے لیے اب ہماری جان چھوڑ دو تو کیا اب تم اللہ کے پاس آئے ہو؟ جب بندوں کے نزدیک تم کام سے بے کار ہو گئے، حالانکہ عبادت جوانی کی ہے۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ جوانی کے اندر گناہوں کو چھوڑو، طاقت ہے، لیکن گناہ نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے آپ کو لگا دو۔)

⊛......تیسرا وہ دو آدمی جن کی محبت اللہ کے لیے ہے (ان کی دوسری غرض نہیں ہے)۔ جب ملتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے لیے ملتے ہیں اور اگر کبھی جدائی بھی ہوتی ہے تو بھی اللہ تعالیٰ کے لیے جدا ہوتے ہیں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے سائے میں ہوں گے۔

⊛......چوتھا وہ آدمی جس کا دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کی مسجد میں اٹکا ہوا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگا ہوا ہے: کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہوگی تو مسجد کے ساتھ، اس کے نبی کے ساتھ محبت ہوگی، پھر اللہ کے اولیاء بھی محبوب ہوں گے۔ ایسے آدمی کا دل ہر وقت یہ کرتا ہے کہ مسجد میں جاؤں، نماز پڑھوں)۔ یہ بھی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سائے کے نیچے ہوگا۔

⊛......پانچواں وہ بندہ جو اکیلا بیٹھا ہے، اس کو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے، اللہ کا ذکر بھی کر رہا ہے اور آنسو بھی بہا رہا ہے، اللہ کے لیے رو بھی رہا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے کے نیچے ہوگا۔

⊛......چھٹا وہ آدمی جس کو ایک ایسی عورت نے اپنی محبت اور خواہش کے لیے بلایا جو جمال والی بھی ہے اور دولت والی بھی ہے (یعنی حسن خود مائل ہے، لیکن جب وہ بلاتی ہے) تو کہتا ہے کہ (اے میری بہن! اے میری بیٹی!) میں اپنے رب سے ڈرتا ہوں، میں گناہ نہیں کر سکتا، تیرے قریب نہیں آ سکتا۔ (میرا اللہ تو دیکھ رہا ہے)۔ تو یہ آدمی بھی قیامت کے دن اللہ کی رحمت کے سائے کے نیچے ہوگا۔

⊛......ساتواں وہ آدمی ہے جو میرے راستے میں اس طرح خیرات کرتا ہے کہ دائیں ہاتھ سے کرے تو بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلتا۔ یہ بھی قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کے سایہ رحمت کے نیچے ہوگا۔ اور یہ اس دن ہوگا جب کوئی

دوسرا سایہ نہیں مل سکے گا اور سورج سر پر کھڑا ہوگا۔

اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دینے والے ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتے ہیں۔

مظفر علی شمسی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ:

ایک شیعہ جس کا نام مظفر علی شمسی تھا، جو حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ختمِ نبوت کے مسئلے میں ساتھ رہا۔ وہ جیل میں قید ہوگیا۔ اس نے لوگوں کو خود سنایا کہ میں جب جیل سے گھر پہنچا تو گھر والوں نے کہا: گھر میں اتنا عرصہ کچھ نہیں ہوتا تھا، پڑوسیوں سے کبھی آٹا ادھار لیا، کبھی گندم اُدھار لی، اسی طرح ہم نے یہ وقت گزارا ہے۔ اور ہماری غربت کا یہ عالم ہے کہ آج جیل سے آئے ہو اور گھر میں اتنا بھی نہیں کہ آپ کے لیے کھانا پکا سکیں۔ اس نے کہا: جو کچھ اللہ کو منظور ہوگا وہ ہو جائے گا۔ کہتا ہے: ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے، کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میں نے اپنے بچے کو بھیجا۔ باہر ایک ریڑھی پر کچھ آٹے کی بوریاں، دالیں، کچھ چاول اور ایک لفافہ تھا۔ ایک آدمی نے سر پر کپڑا لپیٹا ہوا ہے۔ اس نے کہا: یہ سارا سامان شمس صاحب کو دے دیں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ شمس صاحب کہتے ہیں: بچے کو جب دیر ہوئی تو میں باہر آیا۔ اس سے پوچھا، اس نے کہا: ایک بزرگ نے کپڑے سے چہرہ چھپایا ہوا تھا، انہوں نے یہ لفافہ بھی دیا اور سامان بھی دیا ہے اور وہ جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں: میں ان کے پیچھے دوڑا کہ میں اپنے محسن کو تو دیکھوں۔ جب دیکھا تو وہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ وہ مجھے کہنے لگے: تم نے اچھا نہیں کیا ہے۔ میں نے کہا: حضرت! میں محسن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں نے کیا احسان کیا ہے!؟ تم نے محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جیل کاٹی ہے، مجھے نہیں پتہ کہ تم کس مسلک کے ہو؟ میں نے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے پیشِ نظر سوچا کہ تمہاری مدد کروں۔

اس لیے حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ جب جوش میں آتے تو فرماتے تھے: اللہ کے نبی کی ختمِ نبوت کا دشمن قادیانی جو بھی ہو اگر اس کے خلاف جنگل کا خنزیر بھی میری مدد کرے تو میں اس کو بھی چومنے کے لیے تیار ہوں۔

خفیہ صدقہ کی طاقت:

حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ الْأَرْضَ جَعَلَتْ تَمِيدُ، فَخَلَقَ الْجِبَالَ، فَأَلْقَاهَا عَلَيْهَا فَاسْتَقَرَّتْ، فَتَعَجَّبَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ خَلْقِ الْجِبَالِ، فَقَالَتْ: يَا رَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ الْجِبَالِ؟ قَالَ: نَعَمْ، الْحَدِيدُ. قَالَتْ: يَا رَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ الْحَدِيدِ؟ قَالَ: نَعَمْ، النَّارُ، قَالَتْ: يَا رَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ النَّارِ؟ قَالَ: نَعَمْ، الْمَاءُ. قَالَتْ: يَا رَبِّ! فَهَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ الْمَاءِ؟ قَالَ: نَعَمْ، الرِّيحُ. قَالَتْ: يَا رَبِّ! فَهَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ أَشَدُّ مِنَ الرِّيحِ؟ قَالَ: نَعَمْ، ابْنُ آدَمَ يَتَصَدَّقُ بِيَمِينِهِ يُخْفِيهَا مِنْ شِمَالِهِ)) [مسند احمد بن حنبل: ۳/ ۱۲۳]

جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا فرمایا تو زمین حرکت کرنے والی تھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا کر کے زمین پر لگا دیا، تاکہ زمین ہلنا بند ہو جائے۔ جب پہاڑ پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین پر رکھا اور ان کو زمین کی میخیں بنا دیا۔ فرشتوں نے عرض کیا: اے اللہ! یہ پہاڑ بڑی سخت شے ہے، اس سے بھی کوئی سخت شے آپ نے بنائی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس سے سخت لوہا ہے۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ! کوئی ایسی بھی چیز ہے جو لوہے کو ختم کر دے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس سے سخت چیز آگ ہے، جو لوہے کو بھی پانی بنا دے۔ فرشتوں نے عرض کیا: اس سے بھی زیادہ قوت اور طاقت والی چیز ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس سے طاقت والی چیز پانی ہے، جو آگ کو بجھا دیتا ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا: اے اللہ پانی سے زیادہ طاقت والی کوئی چیز ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس سے زیادہ طاقت والی چیز ہوا ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا: ہوا سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز ہے؟ فرمایا: ہاں! ابن آدم میرا بندہ جب میرے راستہ میں چپکے چپکے خرچ کرے وہ ان سب چیزوں سے بھاری ہے۔

اس لیے قرآن میں فرمایا: اے میرے بندو! جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے ہے۔ زمین پر تم رہتے ہو، نہریں جاری کرتے ہو، چشمے نکالتے ہو، پھل کھاتے ہو اور تم کو میں نے اپنے لیے بنایا ہے کہ تم صرف میری عبادت کرو، میرے سوا غیر کو سجدہ نہ کرو اور میرے سوا کسی غیر کو رکوع نہ کرو۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے آیت الکرسی کی فضیلت میں روایات ذکر کی ہیں۔ اس میں بھی یہ ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ افضل صدقہ کون سا ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو چپکے چپکے فقیر تک پہنچایا جائے یا وہ صدقہ کہ نہ ہونے کے باوجود کوشش کر کے دیا جائے۔

جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے سارا دن مزدوری کی تو چند کھجوریں ملیں۔ میں وہ گھر لے آیا، تاکہ

بچے یہ کھا کر گزارہ کریں گے۔ راستہ میں آیا تو ایک سائل نے آواز دی۔ میں نے اس کو دے دیں۔
کہنا تو آسان ہے، مگر کر کے دکھانا بڑا مشکل ہے۔

میرے استاذ کا واقعہ:

ہمارے ایک استاذ بہت غریب آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے ایک دفعہ جلسے پر بلایا۔ انہوں نے گائے کا گوشت پکایا اور مجھے بطور خاص فرمایا: آج میں نے تمہارے لیے گوشت منگوایا ہے بڑی محنت سے۔ اور وہ گوشت مجھ سے کھایا نہ جائے۔ استاذ ساتھ تھے، انہوں نے پوچھ لیا کہ تم کھا نہیں رہے؟ میں نے کہا: آپ جائیں ...... ان شاء اللہ...... میں آرام سے کھاؤں گا، میں آہستہ آہستہ کھا رہا ہوں۔ جب استاد صاحب چلے گئے تو میں نے کسی کو دے دیا، یعنی اتنے غریب آدمی تھے کہ ایک پلیٹ گوشت بنایا تھا اور فرمایا: میں نے تمہارے لیے کتنی محنت کی ہے!!؟ وہ مدینہ شریف آئے اور ایک دکان سے تسبیح خریدی۔ دکاندار نے کہا: پانچ ریال کی ہے۔ مجھے تو پتہ تھا کہ یہ دو ریال کی چیز ہے۔ استاد سے عرض کیا کہ یہ دو ریال کی چیز ہے۔ استاد صاحب نے فرمایا: چپ کرو۔ اس کو پانچ ریال دے دیئے۔ فرمانے لگے: یہ مدینہ شریف کے ہمسائے ہیں، ہم تو ان کی خدمت کے لیے آئے ہیں، یہاں بحث کرنے نہیں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعا سے ہمیں معاف کردے، یعنی غربت کا یہ عالم تھا اور مدینہ منورہ کا اتنا احترام تھا!! جب تیرا پیسہ اللہ کے راستے میں آگیا تو سمجھ لو کہ میرا رب راضی ہو گیا اور جب گناہ کے کام میں گئے تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو گئے ہیں، اپنے راستے پر نہیں آنے دیتے۔

''صَدَقَةُ السِّرِ تُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ عَزَّوَجَلَّ'' جو آدمی چھپ کر خیرات کرتا ہے اس کا یہ صدقہ کا طرز اللہ تعالیٰ کے غضب کو بجھا دیتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: اگر کوئی آدمی نفلی صدقہ خیرات چپکے چپکے دیتا ہے، اللہ تعالیٰ ستر گنا ثواب بڑھا دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی آدمی زکوٰۃ اور صدقہ واجبہ کھل کر دیتا ہے اس کو پچیس گنا ثواب ملتا ہے۔

﴿وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّئَاتِكُمْ﴾ جو تم اللہ کے راستہ میں صدقات و خیرات کرتے ہو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں اور تمہیں ایسی ایسی چیزیں حاصل ہوتی ہیں کہ گناہ تو مٹ جاتے ہیں، گناہ نہ ہوں تو تمہارے درجات بلند ہو جاتے ہیں۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُھُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُھُمْ بِسِيْمٰھُمْ ۚ لَا يَسْــَٔـلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۷۲تا۲۷۴]

''آپ ﷺ پر ان کو ہدایت پر لانا لازمی نہیں اور لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت پر لاتا ہے۔ اور جو تم خرچ کرتے ہو مال سے تو اپنے فائدے کے لیے جب تک کہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرو گے۔ اور جو کچھ تم مال خرچ کرتے ہو تمہیں پورا ملے گا اور تمہارا حق نہ رہے گا۔ خیرات ان محتاجوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں مقید ہو گئے ہوں، وہ لوگ دنیا میں کہیں چلنے پھرنے کا امکان نہیں رکھتے، ناواقف ان کو دولت مند سمجھتا ہے ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے، تم ان کو ان کی علامت (کمزوری اور آثار مشقت) سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے پھرتے۔ اور جو مال تم خرچ کرو گے تو وہ اللہ کو معلوم ہے۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں رات اور دن میں پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں تو ان کو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ملے گا اور نہ ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔''

آپ پچھلی آیات سے انفاق فی سبیل اللہ کے فضائل، اس کے احکام، اس کی تفصیلات اور اس کی شرائط پڑھ رہے ہیں۔ اب بھی اس کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو اس سورت میں بڑا کھول کر بیان فرمایا ہے؛ کیونکہ دنیا میں دو قسم کے حقوق ہیں: حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ پر نہیں ہے کہ آپ ان کو توفیق وہدایت دیں، بلکہ توفیق وہدایت میرے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے ذمہ اتنا تھا کہ آپ نے ایک چیز کھول کر دلائل کے ساتھ بیان کر دی، اب بھی اگر اس کو سمجھ نہیں آتا وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف خرچ کرتا ہے تو آپ غم نہ کریں۔ بعض غریب اور مسکین لوگ ہوتے ہیں، وہ اتنا بڑا کام کر جاتے ہیں کہ بڑے سے بڑا سرمایہ کار بھی نہیں کر پاتا۔ اللہ پاک ان کو جتنی توفیق دیتے ہیں وہ ایک ایسی نیکی کی بنیاد

رکھ دیتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اس نیکی کا اتنا ثمر آور کر دیتے ہیں کہ بندہ حیران ہو جاتا ہے۔

دینی کام اللہ کی توفیق سے ہوتے ہیں:

میرے ایک دوست ہیں، انہوں نے ایک دفعہ ملاقات میں ذکر کیا کہ ہماری ایک اہم جگہ ہے۔ آبادی ہے، بڑی سڑک ہے، گرمیوں کے زمانے میں جب لوگ آتے ہیں تو سب کو وہاں سے گزرنا ہوتا ہے۔ وہاں ایک چھوٹی سی مسجد ہے، جو پرانی اور چھوٹی سی ہے، مسافروں کے لیے بڑا مسئلہ ہے، خاص طور پر سرد علاقوں میں اگر گرم پانی نہ ملے تو آدمی نماز کیسے پڑھے؟ اتفاق سے میرے ایک دوست تھے، جو امیر لوگ ہیں، وہ بھی آئے ہوئے تھے۔ ان سے بھی کہا: انہوں نے کہا: میں جا کر دیکھوں گا۔ بہر حال انہوں نے وہ موقع دیکھا اور کہا کہ یہ جگہ چھوٹی ہے، اس کے ساتھ اور جگہ خرید لیں، نقشہ بنائیں، اس پر جتنا خرچ ہوگا میں کر دوں گا۔ زمین خرید لی گئی اور نقشہ بن گیا، ان کو اطلاع دی گئی۔ انہوں نے ایک لاکھ بھجوا دیئے اور کہا: اس سے زیادہ میں خرچ نہیں کر سکتا، اب میرے حالات نہیں ہیں۔ تو کام کھٹائی میں پڑ گیا؛ کیونکہ ایک لاکھ کی تو زمین نہیں تھی، چہ جائیکہ مسجد بنتی۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور بتایا۔ میں نے کہا: اس کو کہنے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کو جتنی توفیق دینی تھی اس نے دے دیئے۔ ہم لوگوں کی غلطی ہے کہ ہم نے بڑے لوگوں کا سہارا لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دیکھو! کیسے بن گئی؟ اس لیے اب کسی بڑے آدمی کو کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ مسجد بن جائے گی، اللہ تعالیٰ رحمت کریں گے۔ چند دنوں کے بعد اس کا خط آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور آدمی پیدا کر دیا ہے، اس نے کام شروع کروا دیا ہے۔ پھر اطلاع آئی کہ اس نے عظیم الشان مسجد بنوا دی اور لوگ نماز پڑھ رہے ہیں۔ یاد رکھیں! بعض غریب لوگ ایک چھوٹے مدرسے کی بنیاد رکھ جاتے ہیں، پھر وہ مدرسے بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے بھی زیادہ کام کرتے ہیں۔

صدقہ کا فائدہ خود صدقہ کرنے والے کو پہنچتا ہے:

﴿وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ﴾ (جو کچھ تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہو در اصل وہ تم اپنے نفسوں کی بھلائی کر رہے ہو)۔

علماء نے لکھا ہے ایک اللہ کے ولی اللہ کے راستے میں بڑا خرچ کرتے تھے۔ جب کوئی پوچھتا تو کہتے: واللہ! مجھے تو اللہ کی قسم ہے! میں نے تو کسی کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کی ہے۔ ایک دن ایک شاگرد نے کہا: حضرت! آپ

چوبیس گھنٹے تو بھلائی کرتے رہتے ہیں اور جب ہم آپ سے پوچھتے ہیں تو آپ قسم بھی کھا جاتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: ﴿وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ ۚ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو کچھ تم خرچ کر رہے ہو اپنے نفس کی بھلائی کے لیے خرچ کر رہے ہو۔ میں تو اپنی بھلائی کر رہا ہوں، غیر کی بھلائی تو نہیں کر رہا ہوں۔

اللہ کے خزانے بہت ہیں:

حدیث قدسی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: میرے بندو! سنو! تمہارا پہلا اور تمہارا بعد والا، تمہارا زندہ اور تمہارے مردہ، تمہارے جوان اور تمہارے بوڑھے اگر سب مل کر پاک بن جائیں، صالح بن جائیں اور سب سے بڑے متقی بن جائیں، اس کا مجھے کوئی فائدہ نہیں۔ اور تمہارے سارے بندے اگر سب سے بڑی شقی بن جائیں تو میری سلطنت میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ جتنی مخلوق ہے سارے ایک کھلے میدان میں کھڑی ہے اور ہر بندہ اپنی تمنا مانگے، میں ہر بندے کو دے دوں گا تو میرے خزانہ قدرت میں اتنی بھی کمی نہیں ہوگی جیسا کہ کوئی ایک شخص سوئی لے کر دریا میں ڈالے اور اس کو نکالے تو اس سے کتنا سمندر کا پانی کم ہوگا؟ صحابہ نے عرض کیا: کچھ بھی کم نہیں ہوگا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کو اس کا مانگا ہوا دے دے تو اس کے خزانہ میں اتنی بھی کمی نہیں آسکتی۔ بعض علماء نے فرمایا: چلو سوئی کو تو کچھ نہ کچھ پانی لگا، دریا کے پانی کے کم ہونے کی نسبت ہو سکتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے خزانے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو تم بھلائی کے کام کرتے ہو اس کا فائدہ تم کو ملتا ہے اور جو برائی کے کام کرتے ہو اس کا وبال تم پر گرتا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہیں، اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کے اندر جو سخی آدمی ہے، اللہ کی قدرت ہے دنیا کے اندر وہ کبھی بھوکا نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنے خزانوں میں سے عطا فرماتے ہیں۔ کسی ایک آدھ پر امتحان کے طور پر کچھ کمی آجائے تو اور بات ہے۔ تم جو کچھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ عطا فرمائیں گے، شرط یہ ہے کہ تم خرچ کرو۔

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ﴾ [البقرة: ۲۷۳]

فقراء سے مراد مہاجرین ہیں اور اس کے بعد جو آئیں گے، جن کو گھروں سے نکالا گیا، عزت والا آدمی اگر غریب

ہو جائے اس کے لیے بڑی مصیبت ہے، نہ تو وہ سوال کر سکتا ہے۔ ساری زندگی جس نے نہ مانگا ہو وہ کیسے مانگ سکتا ہے؟ اور ایک وہ جن کا کام ہی مانگنا ہے اس کے لیے تو مانگنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ایسے لوگ قیامت تک مانگتے ہی رہیں گے، ان کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں جو لوگ مہاجر بنے کہ ان کا گھر گیا، وطن گیا اور مدینہ میں آگئے۔ اب وہ بیٹھے ہوئے ہیں، کہیں جا بھی نہیں سکتے ہیں۔ اسی طرح آج کے زمانے میں متوسط زیادہ طبقہ ہے اور ان کے لیے بڑی مشکلات ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کا ذکر کیا جو فقراء ہیں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں انہوں نے اپنے آپ کو بند کر دیا ہے، ان کے پاس طاقت نہیں ہے کہ وہ سفر کریں، تجارت کریں؛ کیونکہ ان کے پاس کچھ ہوگا تو تجارت کریں گے۔ جو ان کو نہیں جانتا وہ جب ان کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے...... ماشاء اللہ!...... بڑا غنی ہے! کیونکہ جو شریف اور عزت والے لوگ ہوتے ہیں وہ اپنے بڑے وقار کے ساتھ رہتے ہیں کہ دیکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ ...... ماشاء اللہ!...... یہ کوئی ضرورت مند نہیں ہے؛ کیونکہ وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا اور استغنا کے ساتھ رہتا ہے۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ:

میں نے اپنی آنکھوں سے حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کے گھر میں گیا۔ کہنے لگے: چائے پیو گے؟ میں نے کہا: پلا دیں۔ فرمانے لگے: نمک کی چائے ہے، گھر میں چینی نہیں ہے۔ میں نے کہا: حضرت! مجھے ابھی اجازت دیں، میں شہر سے جا کر چینی لے آتا ہوں۔ فرمایا: اگر اتنی غیرت اور حیاء تھی تو آتے ہوئے لے آتے۔ اب بیٹھ جاؤ۔

یہ لوگ تھے، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس کو ان کے بارے میں علم نہ ہو وہ ان کو غنی سمجھتا ہے۔

چھپا کر صدقہ کرنا:

﴿لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ لوگوں سے سوال نہیں کرتے ہیں، اپنے آپ کو بچا کر رکھتے ہیں، وہ اپنی نشانیوں سے پہچانے جاتے ہیں۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ: ۲۷۳] جو کچھ تم خیرات کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کے جاننے والے ہیں، یعنی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمہارے ہر پیسے پر اللہ تعالیٰ تمہیں بدلہ عطا فرمائیں گے۔

﴿اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً﴾ ایمان والے لوگ جو خرچ کرتے ہیں ان کو قبر اور حشر کی سختی کا بھی کوئی ڈر نہیں ہے؛ کیونکہ ایسے لوگ جب فوت ہوتے ہیں اللہ کے فرشتے ان کو آ کر خوشخبری دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ جو اپنے پیچھے آل و اولاد چھوڑ کر جا رہے ہیں ان کو ان کا بھی کوئی غم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرے گا اور ان پر اپنی رحمتیں فرمائے گا۔ مومن کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ دن میں بھی خرچ کرتا ہے اور رات میں بھی خرچ کرتا ہے، کھل کھل کر بھی خرچ کرتا ہے چھپا کر بھی خرچ کرتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ مجھے اس کا بدلہ دنیا میں بھی دیتے ہیں اور آخرت میں بھی دیں گے۔ اور کبھی بدلہ جلدی مل جاتا ہے اور کبھی دیر میں ملتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ بدلہ ضرور عطا فرماتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اس بات کو ناپسند سمجھتے تھے کہ ہم ان سے لیں جو مشرکین میں سے ہمارے رشتہ دار ہیں یا کسی کے پاس ہو اس کے مشرک رشتہ دار غریب ہے اس کو دیا کرے۔

یاد رکھیں! خیرات کرنا مسلمان کے لیے اولیٰ ہے، فقیر اگر کافر ہے اس کو بھی آپ دے سکتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ مسلمان کی مدد کرنے میں زیادہ ثواب ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ آپ کے ہاتھ میں ہدایت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں ہدایت عطا فرمائیں۔

کافر پر خرچ کرنا جائز ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا: تم خیرات نہ دیا کرو، مگر مسلمانوں کو۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم فرما دیا کہ آپ بالکل ایسا نہ کریں، ہدایت ہمارے ہاتھ کے اندر ہے۔ جو بھی سوال کرے کافر ہے، مشرک ہے، یہودی ہے، یا نصرانی ہے اور وہ محتاج ہے تو اس کو دینا چاہیے، اس میں کوئی فرق نہ کریں۔

صدقہ خیرات میں زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں ہے:

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مومن جو اپنے نفس پر خرچ کرتا ہے اور مومن نہیں خرچ کرتا، مگر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے۔

حضرت عطاء الخراسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جب تم نے کسی کو اللہ کے لیے خیرات دے دی، اب تمہارے ذمہ نہیں ہے کہ اس کا عمل تلاش کرتے پھرو؛ کیونکہ بعض اوقات تمہاری یہی بھلائی اس کی ہدایت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ خیرات کرنے والے نے جب خیرات اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کی ہے تو گویا اس کا اجر اللہ پر اس کی رحمت سے واجب ہو گیا، اب اس کی ذمہ داری نہیں ہے کہ اس کے عمل تلاش کرتا پھرے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری نیت کو دیکھنا ہے۔ اگر تمہاری نیت ٹھیک نہیں ہے، جیسا کہ آج کل کسی کے گھر میں کوئی رشتہ دار بیٹھا ہو تو وہاں بڑی نیکی اور خیرات کرتے ہیں، تا کہ کسی طرح یہاں بات چیت بن جائے، اسی طرح اگر کوئی نوجوان بیوہ ہو تو وہاں بھی مسلمان بڑی خیرات پہنچاتا ہے، بوڑھی ہو تو نہیں پہنچاتا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کے کھوٹ جانتے ہیں۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((قَالَ رَجُلٌ لَأَتَصَدَّقَنَّ اللَّيْلَةَ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ فَوَضَعَهَا فِي يَدِ زَانِيَةٍ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ تُصُدِّقَ اللَّيْلَةَ عَلَى زَانِيَةٍ، قَالَ: اللَّهُمَّ! لَكَ الْحَمْدُ عَلَى زَانِيَةٍ، لَأَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ فَوَضَعَهَا فِي يَدِ غَنِيٍّ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصُدِّقَ عَلَى غَنِيٍّ، قَالَ: اللَّهُمَّ! لَكَ الْحَمْدُ عَلَى غَنِيٍّ، لَأَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ فَوَضَعَهَا فِي يَدِ سَارِقٍ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصُدِّقَ عَلَى سَارِقٍ، فَقَالَ: اللَّهُمَّ! لَكَ الْحَمْدُ عَلَى زَانِيَةٍ، وَعَلَى غَنِيٍّ، وَعَلَى سَارِقٍ، فَأُتِيَ فَقِيلَ لَهُ: أَمَّا صَدَقَتُكَ فَقَدْ قُبِلَتْ، أَمَّا الزَّانِيَةُ فَلَعَلَّهَا تَسْتَعِفُّ بِهَا عَنْ زِنَاهَا، وَلَعَلَّ الْغَنِيَّ يَعْتَبِرُ فَيُنْفِقُ مِمَّا أَعْطَاهُ اللهُ، وَلَعَلَّ السَّارِقَ يَسْتَعِفُّ بِهَا عَنْ سَرِقَتِهِ)) [صحیح البخاری، رقم: ۱۴۲۱، مسلم: ۱۰۲۲]

ایک آدمی نے کہا: اے اللہ! آج میں چپکے سے خیرات کروں گا کہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ تو ایک عورت جا رہی ہے، اس نے صدقہ اس عورت کو دے دیا۔ اس کو پتہ نہیں تھا کہ یہ عورت زانیہ ہے اور اپنے شکار کے تلاش میں پھر رہی ہے۔ جب صبح ہوئی تو لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ زانیہ عورت کو خیرات دی گئی ہے۔ اس نے دل میں کہا: اللہ! تیرا شکر ہے جو تو نے لکھا تھا وہی ہوا، میں نے خیرات کی تھی۔ دوسری رات وہ پھر نکلا کہ آج پھر خیرات کرتا ہوں تو آگے جو بندہ تھا اس نے اس کو پکڑا دیا، وہ امیر آدمی تھا۔ صبح لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ اچھی خیراتیں کرتا ہے وہ غنی امیر آدمی کو دے آیا۔ اس نے کہا: اے اللہ! تیری مرضی ہے، تو نے میرے سامنے وہ بندہ بھیج دیا، میں نے اس کو خیرات دے دی۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ امیر ہے غریب ہے۔ میں نے تیرے راستے میں خیرات دے دی۔ تیسری رات اس نے کہا: آج پھر میں خیرات کروں گا تو آگے جو آدمی ملا اس کو خیرات دے دی، وہ چور تھا، چوری کرنے کے لیے جا ر

ہاتھ۔ صبح صبح لوگ بات کرنے لگے کہ بڑا اچھا خیرات کرتا ہے، رات چور کو خیرات دے آیا ہے۔ اس کو پتہ لگا، اس نے کہا: اے اللہ! تیرا شکر ہے، میرے نصیب میں وہی چور آ گیا تو میں کیا کرتا؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے! میں نے تیری ساری خیراتیں قبول کرلی ہیں۔ تو نے زانیہ کو خیرات دی، ہوسکتا ہے میں اس کو اس پیسے سے زنا سے بچالوں کہ اس کے دماغ میں آجائے کہ خدا مجھے بغیر زنا کے بھی پیسے دے سکتا ہے تو میں کیوں خوامخواہ زنا کروں؟ اور تو نے جو پیسے غنی کو دیئے تھے اس کے لیے یہ تازیانہ بن گیا کہ یہ تو خیراتیں کررہا ہے اور میں تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیرات نہیں کرتا ہوں۔ اس طرح یہ اس کی ہدایت کا ذریعہ بن گیا، میں نے تیرا صدقہ قبول کرلیا۔ اور تو نے جو چور کے ہاتھ میں رکھا، میں نے وہ بھی قبول کرلیا۔ جب اس کو پیسے ملے تو وہ چوری سے بچ گیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تم جو کچھ بھی میری رضا کے لیے کرتے ہو میں اس کو قبول کرتا ہوں۔

دارالکفر سے ہجرت کا حکم:

ایک ہجرت دارالحرب سے ہوتی ہے کہ ایک ایسا ملک ہے، حکومت کافروں کی ہے اور کافر مسلمانوں سے نبرد آزما ہیں، یعنی ہر وقت مسلمانوں کو قتل کردیا جاتا ہے، مسلمانوں کو فرائض ادا کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی، ان کو نماز نہیں پڑھنے دیتے، روزہ نہیں رکھنے دیتے اور مسجدیں نہیں بنانے دیتے۔ ایسے ملک سے ہجرت کرنا مسلمانوں کے لیے بھی لازم ہے۔

اور ایک دارالامان ہوتا ہے کہ کافر حکومت ہے، لیکن مسلمانوں کو امان حاصل ہے۔ نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، عیدین پڑھیں، اپنی مسجدیں بنوائیں اور نکاح سب آرام سے ہورہا ہے تو وہاں سے ہجرت ضروری نہیں ہوتی؛ کیونکہ وہ دارالامان ہے اور ان کی زندگی اچھی گزر رہی ہے، لیکن اگر مسلمان اس ملک کو چھوڑ دیں تو بڑی اچھی بات ہے۔

کفار کے ملک میں رہنے کے مسائل:

ہمارے ہاں ایک رواج بن گیا ہے کہ پیسے کے لیے کوئی کسی ملک جارہا ہے اور کوئی کسی ملک میں جارہا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہاں جائیں گے، پیسہ اور دولت ملے گی۔ یہ شرعاً ناجائز ہے۔ دارالکفر کے اندر مسلمان کا سفر کرنا جائز نہیں، مگر ضرورت ہو تو سفر کرسکتا ہے، مثلاً: تعلیم کی ضرورت ہے کہ اس ملک کے بغیر کسی دوسری جگہ وہ ڈگری نہیں ملتی ہے، اسی طرح کوئی مسلمان اس لیے سفر کررہا ہے کہ اس کے تجارتی تعلقات اس قسم کے ہیں کہ اس کا

تجارتی سامان اس ملک کے علاوہ کہیں اور نہیں مل رہا، اس نے وہاں بزنس کے لیے جانا ہے تو یہ سفر جائز ہے۔ فقہاء نے تیسری شکل یہ لکھی ہے کہ کوئی مسلمان بیمار ہے اور اس کا علاج کافر ملک میں ہے، مسلمان ملک میں اچھا ہسپتال اور اچھا ڈاکٹر کوئی نہیں تو وہ بھی مجبوراً سفر کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھیں کہ اگر کوئی مسلمان دار الکفر میں رہتا ہے، ان کے ساتھ باعتبار عقیدے کے بغض نہیں رکھتا، اللہ کے نبی نے فرمایا: اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مومن کی محبت ضروری ہے، اسی طرح کفر سے براءت کا اعلان بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر کوئی مسلمان مشرکوں کے ملک میں ہے اور ان کی تہذیب میں ڈھلا ہوا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بندے بڑے اچھے ہیں، ان کے پاس بڑا ڈسپلن ہے، ان کے پاس عدل وانصاف ہے، ان سے بڑا پیار ہے۔ اس کا کفر سے پیار اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے اندر ایمان نہیں ہے۔ فقہاء کرام نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر تم کسی کافر ملک میں رہنے پر مجبور ہو گئے، مثلاً: تمہارے باپ دادا وہاں مزدوری کرنے لگے، وہاں اولادیں ہو گئیں، تعلیم وہاں ہو گئی اور آدمی کی شہریت وہاں کی ہو گئی، اس لیے ضروری ہے کہ اپنے دین کا اظہار کرے اور ان کے دین سے نفرت کرے اور ان کو اپنے دین کی تبلیغ کرے۔ اگر یہ کام نہیں کر سکتا تو شریعت کے مطابق اس کا وہاں رہنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ قاعدہ ہے کہ برائی جلد اثر کرتی ہے اور اچھائی بڑی دیر سے اثر کرتی ہے۔ آپ دیکھ لیں کہ اگر کوئی عمارت تعمیر کرنی ہو تو بڑا وقت لگتا ہے، لیکن اگر عمارت توڑنی ہو تو منٹ بھی نہیں لگتا۔

آج بھی اگر مسلمان کفر کو اپنا دشمن سمجھ لے اور عالم اسلام کفر سے بائیکاٹ کر لے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو محتاج نہیں کیا، لیکن کافر پھر بھی مسلمان کا محتاج ہے، لیکن اگر ہم خود ان کے بوٹ پالش کرنے والے بن جائیں تو ہماری مرضی ہے اور وہ ٹھوکریں ماریں گے؛ کیونکہ ان کو پتہ ہے کہ یہ چپڑاسی ہے۔ ان کو پتہ ہے کہ یہ مکہ مدینہ میں پڑھنے میں فخر محسوس نہیں کرتے، لیکن اگر ہم کافروں کے کسی ملک میں پڑھ لیں تو بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت کے اندر فقراء مُہاجرین کا بیان فرمایا ہے کہ ان کے پاس کوئی مال بھی نہیں کہ تجارت کر سکیں، سفر کرنے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں، وہ اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ منورہ میں آ گئے۔

مانگنے والوں کے متعلق مسائل:

فرمایا: مسکین وہ ہوتا ہے جس کے پاس کچھ نہیں ہوتا اور وہ سوال سے بچتا ہے، دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ...... ماشاء

اللہ...... یہ بڑا آدمی ہے، اس کا ہر وقت اچھا لباس ہے، اچھا کھاتا ہے اور اچھے گھر میں رہتے ہیں، حالانکہ ان کو پتہ نہیں ہوتا کہ ان کی ضروریات، حالات اور تقاضے کیا ہیں؟

یاد رکھیں! یہ جو بھیک مانگنے والے لوگ ہیں ان کو دینا بھی گناہ ہے؛ کیونکہ ہم ان کو عادی کر رہے ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی معذور ہے، نابینا ہے، لنگڑا ہے، اس نے اس کو پیشہ نہیں بنایا ہوا، ورنہ آج کل معذوری کو بھی کاروبار بنایا ہوا ہے۔ میرے ایک دوست نے بتایا کہ ہمارے ملک سے دو اندھے یا دو لنگڑے ہیں، ان کو لوگ یہاں لے آتے ہیں کہ ہم تمہارا ٹکٹ بھریں گے اور تم کو رمضان میں لے جائیں گے۔ رمضان سے محرم تک بھیک مانگو گے، جو پیسے ملیں گے آدھے تمہارے اور آدھے ہمارے ہوں گے۔

اگر اس سے بڑا بزنس کرنا ہے تو راستے میں کہیں قبر دیکھ لو، جہاں سایہ وغیرہ ہو، اس پر دو چار ریشمی غلاف ڈال کر بیٹھ جاؤ۔ جو بھی وہاں سے گزرے اس کو سلام کرے تو چپ ہو کر بیٹھا رہتا ہے۔ پندرہ دن کسی کے ساتھ نہ بولے اور رات دن چپ کر کے بیٹھا رہے، قبر کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ اندر کوئی بندہ ہو، بلکہ لکڑی رکھ کر قبر بنا لو، پندرہ دن کے بعد وہاں مٹکا رکھ لو اور پانی پلانے کے لیے کچھ برتن بھی رکھ لو اور جو گزرے اس کو کہو: فلاں بزرگ اجمیر شریف میں تھے، وہ یہاں آگئے ہیں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میری قبر پر مجاور بن کر بیٹھ جاؤ۔ ایک ماہ کے اندر منتیں شروع ہو جائیں گی اور چھ ماہ کے بعد بزنس ٹاپ پر پہنچ جائے گا۔ پھر تمہاری نسلوں کو بھی اور کاروبار کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ قبر سے جہنم شروع ہوگی اور آخرت تک ہوگی، لیکن دنیا میں مزے کر لو۔

میں ہمیشہ دوستوں سے کہتا ہوں کہ اگر خیرات کرنی ہے تو یہ آدمی جو حرم شریف میں کام کرتے ہیں یہ زیادہ مستحق ہیں، کسی سے سوال نہیں کرتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ ایک دفعہ میں نے گاڑی روکی تو کالے لڑکے آگئے، جو زور والے تھے۔ انہوں نے آبِ زمزم بھرنے کے لیے ڈبے زور سے نکال لیے۔ ایک لڑکا کمزور تھا، وہ کھڑا رہ گیا، اس کو دھکا دے کر انہوں نے ہٹا دیا۔ جب وہ پانی بھر کر لے آئے تو مجھے اس بچے پر بڑا ترس آیا۔ میں نے اس کو بلایا اور اس کو دو ریال دیئے۔ اس نے کہا: میں نہیں لیتا ہوں۔ میں نے کہا: تم نے مانگے تو نہیں ہیں؟ اس نے کہا: میں نے آپ کا ڈبہ نہیں بھرا، میں بھیک نہیں لینا چاہتا۔ یہ ایمان ہے۔ جب میرے نصیب میں ہوگا میں ڈبہ بھروں گا۔ اللہ پاک مجھ کو روزی دے گا، ورنہ بھوکا سو جاؤں گا، کوئی بات نہیں۔ ایسے لوگ امداد کے مستحق ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی ؒ کے پاس پیسے تو نہیں ہوتے تھے، ان کے کندھے پر ایک رومال ہوتا تھا۔ وہ

جب کہیں گاڑی سے اترتے تو قلی کو بلاتے اور اس کو کہتے میرا یہ رومال اٹھاؤ۔ وہ قلی لے لیتا اور کبھی قلی حیران رہ جاتا کہ مولوی صاحب ہمیں بے وقوف بناتے ہیں۔ بہر حال جب گیٹ تک آتے، تانگہ پکڑتے تو اس کو پانچ روپے دے دیئے۔ کئی دفعہ مولویوں نے کہا: حضرت! ویسے دے دیتے؟ فرمایا: ایسے دینے سے اس کی توہین ہوگی کہ مجھے غریب اور بھکاری سمجھ کر دے رہا ہے۔ اب میں نے اس سے کام لیا ہے اور اس کو معاوضہ دیا ہے، اس کی عزتِ نفس کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ ایسے لوگ خیرات کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان کو تم ڈھونڈو، یہ نہیں کہ وہ تمہیں ڈھونڈیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مسکین یہ نہیں ہوتا جو ایک کھجور یا دو کھجوریں لیتا ہے، ایک لقمہ یا دو لقمے لیتا ہے، بلکہ مسکین وہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں جو اس کی حاجت پوری کر سکے اور لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے کہ یہ مسکین بھی ہے یا نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی سے سوال کرتا ہے۔

ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی بندے سے نہ مانگا کرو۔ ایک صحابی کہتے ہیں: اس دن کے بعد اگر گھوڑے پر میں بیٹھا ہوتا اور میرا بید گر جاتا، ساتھ کوئی آدمی کھڑا ہوتا میں اس کو نہ کہتا کہ میرا بید اٹھا کر دو، بلکہ میں گھوڑے سے اتر کر خود اٹھاتا تھا کہ جب حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ سوال نہ کرو تو اب سوال نہیں کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی نے فرما دیا ہے: جو بھی مانگنا ہے اپنے اللہ سے مانگو اور جب بھروسہ کرو تو اس ذات کا بھروسہ کرو جو حیّ ہے اور دائم ہے۔ ان پر توکل نہ کرو جو خود مر جائیں گے تو تیرا توکل کس کام کا ہوگا؟

واقعہ:

بنی اسرائیل میں ایک آدمی تھا، اس کا نام کفل تھا۔ وہ بڑا آدمی تھا، جس قسم کے گناہ کا موقع ملتا تھا وہ اس کو نہ چھوڑتا تھا۔ ایک لڑکی بڑی خوبصورت تھی، اس پر اس کی نظر تھی۔ اس نے اس کو مجبور کیا، لیکن لڑکی نے بات نہ مانی۔ اس نے کہا: میں گناہ نہیں کرتی۔ کچھ حالات ایسے ہوئے کہ ایک دن وہ لڑکی اس کے دروازے پر آگئی اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ وہ باہر نکلا اور حیران ہوگیا کہ وہ لڑکی کہ جس کے پیچھے اتنے عرصے سے پھر رہا ہوں، آج وہ میرے دروازے پر خود آگئی ہے۔ اس نے اس سے پوچھا: کیوں آئی ہو؟ اس نے کہا: میں آج مجبور ہو کر تیرے دروازے پر آئی ہوں۔ مجھے ساٹھ دینار کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا: ایک ہی شرط پر مدد کروں گا کہ تجھ سے زنا کروں گا۔ اگر راضی ہو تو ساٹھ دینار لے لو۔ اس لڑکی نے کہا: میں بھی تو مجبور ہو کر تیرے دروازے پر آئی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ تو نے مجھے مفت کب دینے ہیں، میں راضی ہوں۔ اس نے ساٹھ دینار دے دیئے، اس کو کمرے

میں لے گیا۔

حدیث کے الفاظ ہیں کہ جیسے ایک مرد اپنی بیوی کے ساتھ جماع کے وقت بیٹھتا ہے ایسے تیار ہو کر جب بیٹھا تو لڑکی رونے اور کانپنے لگ گئی۔ اس نے کہا: کیوں روتی ہو اور کیوں پریشان ہوتی ہو؟ میں نے تم پر کوئی جبر تو نہیں کیا ہے۔ اس نے کہا: تو نے جبر نہیں کیا، لیکن میرا رب جانتا ہے کہ میں نے کبھی یہ گناہ نہیں کیا، لیکن یہ مجبوری کروا رہی ہے۔ اس نے کہا: تو سچ کہتی ہے؟ اس نے کہا: میں سچ کہتی ہو۔ اللہ کی قسم جس خدا نے مجھے پیدا کیا ہے! میں نے کبھی زنا نہیں کیا ہے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور کپڑے پہن لیے اور کہا: تم یہ ساٹھ دینار بھی لے جاؤ، تم مجبور ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں گناہ گار ہوں، لیکن میں کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔ آج تم میری بھی گواہ بن جاؤ کہ مجھے بھی اپنے رب کی قسم ہے کہ آج کے بعد گناہ نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے! وہ اسی رات مر گیا۔ صبح کو جب لوگ آئے تو اس کے دروازے پر لکھا ہوا تھا کہ میں نے اس کو جنت میں داخل کر دیا ہے۔

یہ مطلب ہے کہ جب آدمی صحیح معنی میں کسی مجبور کو دیتا ہے اور پھر اپنی غرض نہیں رکھتا تو اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہ معاف کر دیتے ہیں۔ اس لیے حکم ہے: تم سوچ سمجھ کر دو جب بھی دو اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دو۔

مانگنے کے لیے لپٹ جانا:

﴿لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سوال میں چمٹ جانا اور بار بار مانگنا الحاف ہے۔ اور لوگوں کو ایسی تکلیف دینی جس کی اس کو ضرورت بھی نہیں ہے، لہٰذا وہ ہر سوال جو بغیر ضرورت کے لیے کیا جائے الحاف میں آتا ہے۔ الحاف کا اصل معنی ہوتا ہے کہ مثلاً: ایک ریال دے دیا، لیکن وہ پیچھے پڑ جائے کہ دو ریال دے دو۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس کو ضرورت نہیں ہے، لیکن پھر بھی مانگ رہا ہے۔

حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ قبیلہ بنو مزینہ کا ایک آدمی تھا، اس کو اس کی والدہ نے کہا کہ تم حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں جا کر سوال کرو۔ وہ کہتے ہیں: جب مجھے میری والدہ نے بھیجا تو میں سوال کرنے کے لیے آیا تو حضور اکرم ﷺ خطبہ پڑھ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: جو شخص سوال سے بچتا ہے اللہ بھی اس کو سوال سے بچا لیتا ہے، یعنی کسی کے آگے اپنی فقیری غریبی ظاہر نہیں کرتا تو اللہ بھی اس کو غنی بنا دیتے ہیں۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس پانچ اوقیہ کی بھی مالیت ہو تو وہ کسی سے سوال نہ کرے۔ اگر وہ سوال کرے گا یہ الحاف ہے۔.........غلام بھی پانچ اوقیہ سے قیمتی ہے تو میں کیوں سوال کروں؟ جب کوئی آدمی سوال کا عادی ہو جاتا ہے تو

وہ ساری زندگی مانگتا رہتا ہے۔ اس کو جتنا مل جائے اس کا دل نہیں بھرتا، وہ اور مانگتا رہے گا۔ اور جو لوگ سوال سے بچتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو بغیر سوال کے بھی دے دیتے ہیں۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا صدقہ کی اشرفیاں قبول کرنے کا واقعہ:

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے بارے میں واقعہ آتا ہے کہ ان کے ایک مرید نے اس زمانہ میں آکر اشرفیاں پیش کیں کہ حضرت! ان کو قبول فرمائیں۔ حضرت نے فرمایا: مجھے ضرورت نہیں ہے، کسی ضرورت مند کو جا کر دے دو۔ اس نے کہا: حضرت! آپ ان کو مدرسہ میں خرچ کر دیں۔ فرمایا: مدرسہ بھی موجود ہے اور طالب علم بھی موجود ہیں۔ مدرسہ میں جا کر جمع کرا دو۔ وہ محبت کے ساتھ آیا تھا، اس نے دیکھا کہ حضرت نہیں مانتے، میں کیا کروں؟ جب حضرت نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے، جوتا باہر رکھ دیا۔ اس آدمی نے جوتے کے اندر اشرفیاں چھپا کر رکھ دیں اور خود نماز میں شریک ہو گیا اور نماز پڑھ کر چلا گیا۔ حضرت جب نماز پڑھ کر باہر نکلے تو شریعت کے اندر حکم یہ ہے کہ اگر تم نے جوتا باہر رکھا ہو تو اس کو پہننے سے پہلے ہلا لو، ممکن ہے کوئی ایذا دینے والی چیز کیڑا مکوڑا، کوئی بچھو اس میں داخل ہو گیا ہو اور تم بغیر دیکھے پہن لو، اس لیے اس کو ہلانا چاہیے۔ بہر حال حضرت نے جب جوتا ہلایا تو اشرفیاں باہر آ گئیں۔ حضرت ہنس پڑے اور طالب علموں سے کہا: دیکھو! دنیا بڑی بدبخت چیز ہے۔ اس کے پیچھے بھاگو تو یہ ملتی نہیں ہے، اس سے بھاگو تو یہ پاؤں میں آکر پڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا: ان کو اٹھا کر مدرسہ میں جمع کرا دو اور فقیر کو ان کی ضرورت نہیں ہے۔

اصل بات اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے کہ آدمی کا اپنے اللہ پر کیا یقین ہے!! حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ فرماتے تھے: دو آدمی ہوتے ہیں، آم بیچنے کے لیے نکلتے ہیں: ایک آدمی سڑک کے کنارے یا محلے کے کنارے ریڑھی لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے دماغ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ڈالی ہے کہ میں یہیں کھڑا رہوں گا اور میرے آم یہیں بکیں گے اور اس کے آم بھی بک جاتے ہیں۔ اور دوسرا آدمی سر پر ٹوکرا رکھ کر ساری گلیاں پھرتا رہتا ہے، آم اس کے بھی بک جاتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ پر اپنا اپنا یقین ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو رزق دیں گے، کوئی بھیک مانگ کر کھائے گا، کوئی گھر بیٹھ کر کھائے گا اور کوئی تجارت سے کھائے گا۔ رزق جو اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے وہ ملنا ہے۔

حدیث قدسی:

ایک روایت مبارک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی آدم کو خطاب فرماتے ہیں: اے ابن آدم! میں نے تم کو اپنی

عبادت کے لیے پیدا کیا، تم کھیل کود میں اپنے وقت کو ضائع کر رہے ہو۔ چند دن کی گھڑیاں ہیں، بعد میں موت ہے۔ عبادت اور اطاعت میں محنت کرو۔ اے ابن آدم! میں نے تیرا رزق لکھ دیا ہے، تیرے پیدا ہونے سے بھی پہلے لکھا گیا ہے، تم بلا وجہ اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ پر یقین کرو اور کوشش کرو۔ باقی رزق دینے والا اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ اپنے آپ کو رزق کے لیے اتنی مصیبتوں میں نہ ڈالو کہ ضمیر بیچنا پڑے تو بیچ دو، اپنی غیرت بیچنی پڑے تو بیچ دو، عزت بیچنی پڑے تو بیچ دو، حرام کھانا پڑے تو کھالو، سود لینا پڑے تو لے لو اور رشوت لینی پڑے تو لے لو۔ یہ سب حرام ہے۔ یہ زیادہ نہیں ملتا ہے؛ کیونکہ یہ وقتی طور پر امتحان ہوتے ہیں۔ کبھی جب یہ مال زیادہ ہو جاتا ہے تو انسان کی تباہی و ہلاکت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ میرے پاس بڑا مال آرہا ہے، لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ سارا مجھے غرق کرنے کے لیے آرہا ہے، اس لیے آدمی اپنے اللہ پر بھروسہ رکھے اور اپنی طاقت کے مطابق جد و جہد کرے، اسباب تلاش کرے اور باقی یہ سمجھ لے کہ جو میرے اللہ نے لکھ دیا ہے وہ مجھے مل کر ہی رہنا ہے، اس کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو میرے مقدر میں نہیں لکھا ہے، میں چاہے الٹا بھی لٹک جاؤں، وہ مجھے نہیں ملے گا۔ لہٰذا پریشان ہونے اور غم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ماں باپ بڑے غریب تھے، اولاد کو اللہ تعالیٰ نے غنی بنا دیا۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ بڑی مشکل سے پیٹ پالتے ہیں اور بعض انگوٹھا لگانے والے کروڑوں میں کھیلتے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا نظام ہے۔ اس کے نظام پر ہر آدمی کو رہنا چاہیے۔ روزی نہ عقل سے ملتی ہے، نہ تعلیم سے ملتی ہے اور نہ طاقت سے ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر میں چاہتا تو اپنے سارے بندوں پر رزق کھلا کر دیتا، لیکن دنیا میں فساد ہو جاتا؛ کیونکہ جب دولت ملے گی تو فساد، بے حیائی اور برائیاں پیدا ہوں گی۔ اس لیے ہم نے ایک کو غنی بنایا اور ایک کو فقیر بنایا۔ یہ اس کے پیسے کا محتاج ہے اور وہ اس کے عمل کا محتاج ہے۔ اگر کوئی کسی کا محتاج نہ ہوتا تو دنیا میں فساد ہو جاتا، سارا نظامِ عالم تہہ و بالا ہو جاتا۔ اس لیے آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیں! جن کو دولت ملی ان میں سے اکثر قارون، ہامان، فرعون، ابوجہل، عتبہ اور شیبہ بنے اور جو فقیر تھا وہ کوئی ابوذر بنا، کوئی سلمان بنا اور کوئی بلال بنا رضی اللہ عنہم۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی آدمی سوال کرے، لیکن اس کے پاس اتنا ہے کہ وہ رات دن روٹی کھا سکتا ہے، وہ محتاج نہیں ہے۔ قیامت والے دن اس کا چہرہ پھٹا ہوا ہوگا، وہ سوال اس کے چہرے پر ظاہر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں رسوا کریں گے اور محشر کے دن بھی رسوا کریں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کتنا ہو تو آدمی

غنی ہے؟ فرمایا: پچاس درہم ہیں یا اتنا سونا ہے۔

یا پچاس ریال کی گھڑی ہے تو وہ غنی ہے، اس کو سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

دنیا کی حقیقت اور بادشاہ کی حکایت:

ایک بادشاہ نے اللہ والے کے پاس لکھ کر بھیجا کہ میں نے دیکھا ہے کہ آپ کے لنگر میں روزانہ پانچ چھ سو آدمی آکر کھاتے ہیں، اس لیے میں نے مناسب یہ سمجھا کہ میں اپنی سلطنت میں فلاں جاگیر لنگر کے لیے وقف کرتا ہوں، آپ وہ جاگیر قبول فرمائیں۔ ان اللہ والوں نے اس خط کے پیچھے لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اتنی بڑی جاگیر دی ہوئی ہے کہ تیری جاگیروں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بعض خوشامدیوں نے بادشاہ کو بھڑکایا کہ بزرگ نے آپ کی توہین کی ہے۔ بادشاہ نے غصہ میں آکر آرڈر کر دیا کہ ان سے کہو کہ یا تو جاگیر قبول کریں یا میرے ملک سے نکل جائیں۔ ان بزرگوں کو اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا: جاگیر ہم قبول نہیں کرتے اور باقی بادشاہ نے لکھا ہے کہ ملک سے نکل جاؤ۔ ملک اللہ کا سمجھتے ہیں، بادشاہ کا ملک ہم نہیں سمجھتے ہیں، لہٰذا ہم نہیں نکلتے۔

بادشاہ اور زیادہ جوش میں آگیا کہ میرے آرڈر کی تعمیل نہیں ہوتی۔ ابھی وہ بادشاہ کچھ فیصلہ کرنے والا تھا کہ اس کے پیٹ میں درد شروع ہوگیا، اتنی تکلیف بڑھ گئی کہ طبیب ڈاکٹر سب دوڑ کر دیکھ رہے ہیں، لیکن کوئی چیز فائدہ نہیں دے رہی تھی۔ بادشاہ کی والدہ زندہ تھی، اس کو پتہ چلا کہ بیٹے کو تکلیف ہے، اس نے پوچھا، طبیبوں نے کہا: کچھ سمجھ نہیں آتی۔ والدہ سمجھدار تھیں، اس نے پوچھا کہ ان دو چار دنوں میں کوئی واقعہ تو نہیں گزرا کہ کسی مسکین غریب کو ستایا ہو اور اس کی بددعا لگ گئی ہو؟ بادشاہ نے کہا: اور تو کوئی نہیں، مگر فلاں بزرگ کے ساتھ میرا یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ والدہ نے کہا: تم نے ان کو کیوں چھیڑا تھا؟ بادشاہ نے کہا: اماں جان! اب تو غلطی ہوگئی۔ بادشاہ کی ماں نے کہا: تم ان سے معافی مانگو۔ اس نے کہا: میں اب کیسے معافی مانگوں؟ میں تو ان کے ساتھ زیادتی کر بیٹھا ہوں۔

والدہ نے کہا: میں حضرت کے دروازے پر جاتی ہوں اور وہ حضرت کے دروازے پر پہنچیں اور کہا: فلاں بادشاہ کی والدہ ہوں، اس کو معاف کر دو، اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ بزرگوں نے کہا: ٹھیک ہے، ہم معاف کر دیں گے، لیکن ہم بھی بغیر عوض کے معاف نہیں کرتے۔ اس کو کہو: ایک بوتل میں اپنا پیشاب بھجوائے اور ساتھ ایک پروانہ لکھ کر بھیجے کہ یہ آدھا ملک تمہارا ہے اور آدھا ملک ہمارا ہے۔ اس طرح وہ ٹھیک ہو جائے گا، ورنہ درد کو بھگتے۔ بادشاہ نے کہا: میری تو جان بچنی چاہیے، اسی وقت اس نے لکھ کر دے دیا۔ بزرگ نے فرمایا: بادشاہ کو جا کر کہہ دو کہ تیرے

آدھے ملک کی قیمت یہی پیشاب کے قطرے ہیں۔ اور انہوں نے وہ پروانہ پیشاب کی بوتل میں ڈال کر دیا اور فرمایا: اس کو کہو: یہ اپنی جائیداد سنبھال کر رکھو، مجھے تمہارے ملک کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم جس ملک میں رہتے ہیں ہم کو اس کی ضرورت ہے۔

اس لیے جو اللہ والے ہوتے ہیں ان کو کسی کے محتاج ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، ان کو تو اللہ تعالیٰ سے لینا ہے۔ اور جو لوگوں سے مانگے تو سمجھ لو کہ یہ کبھی اللہ والا نہیں ہو سکتا۔

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ کا ایک اللہ والے نوجوان سے ملاقات کا واقعہ:

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ نے لکھا کہ میں حج پر گیا۔ راستہ میں ایک خوبصورت نوجوان کو احرام باندھے ہوئے دیکھا کہ وہ پیدل چل رہا ہے۔ میں نے اس کو روکا، وہ آکر ملا۔ میں نے اس سے پوچھا: اکیلے ہو یا کوئی جماعت بھی ساتھ ہے؟ اس نے کہا: کوئی جماعت نہیں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا: کوئی سواری ہے؟ اس نے کہا: کوئی سواری نہیں ہے۔ میں نے کہا: اتنا دور کا سفر ہے، تم اکیلے آدمی ہو۔ کوئی زادِ راہ ہے؟ اس نے کہا: کچھ نہیں ہے۔ میں نے کہا: کیا کر رہے ہو؟ وہ نوجوان ہنس پڑا اور میرا نام لے کر کہنے لگا: مالک بن دینار! سخی کے دروازے پر کچھ لے کر جانے سے شرم آتی ہے۔ مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں حیران ہو گیا کہ اس نے میرا نام کیسے لیا ہے؟ میں نے تو اس کو زندگی میں کبھی دیکھا بھی نہیں ہے۔ بہر حال میں نے اس کو پیشکش کی کہ میرا ایک اونٹ قبول کر لو اور یہ سامان قبول کر کے میرے سفر کے ساتھی بن جاؤ۔ اس نے کہا: اللہ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے، مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔

فرماتے ہیں: وہ پھر گم ہو گیا، میں نے اس کو بڑا تلاش کیا۔ میں جب حج میں پہنچا تو اس کو دیکھا کہ طواف کر رہا ہے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ طواف ختم کروں اور اس کو مل لوں، لیکن وہ مجھے نہ ملا۔ اور جب ہم منیٰ میں آگئے، مسجد خیف میں رات کے وقت مجھے رونے کی آواز آئی۔ فرماتے ہیں: میری آنکھ کھلی، میں نے دیکھا: وہی نوجوان کھڑا ہے اور اپنے اللہ کے آگے رو رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ! پیسے والے لوگ قربانیاں کر رہے ہیں، میرے پاس تو اپنی جان کے سوا کچھ نہیں ہے، اگر قبول کرنی ہے تو کر لیں۔ اور ''اللہ اکبر'' کہہ کر سجدہ میں گیا اور فوت ہو گیا۔

یہ اللہ والے لوگ ہوتے ہیں، ان کی نظر دولت پر کبھی نہیں ہوتی، بلکہ ان کی نظر اللہ پر ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی بندے سے سوال نہیں کرتے، نہ اشارۃً، نہ کنایۃً اور نہ ان کو کبھی اس بات کی غرض ہوتی ہے۔

حدیث:

حضورا کرم ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس چالیس درہم ہیں وہ سوال کرے تو وہ ملحف ہے۔ اور اس کی قیمت ریت کی طرح ہوگی، یعنی اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

ان آیات مبارکہ میں وہ شخص بھی داخل ہے جو اپنے گھر والوں پر خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو صدقہ کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ حضورا کرم ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ تجھ کو اس کا بدلہ عطا فرمائیں گے، حتیٰ کہ جو لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو اس کا بھی اللہ تمہیں بدلہ عطا فرمائیں گے۔

ایک حدیث میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ! گھر والوں پر خرچ کرنا تو واجب ہے، پھر اس پر ہمیں صدقہ کا ثواب کیوں ملتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم یہی پیسے کسی گندی عورت کو کھلاتے تو تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا یا نہ آتا!؟ اس لیے جب تم اپنے جائز مصرف پر خرچ کررہے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس پر صدقہ کا ثواب دیں گے۔

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت میں یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو جہاد کے لیے گھوڑے پال رہے ہیں اور دن رات ان کو کھلا رہے ہیں۔ ان کو بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔

﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰواۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾﴾ [البقرۃ:۲۷۵]

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) نہیں اٹھیں گے، مگر جیسے وہ شخص کھڑا ہو جس کو جن لپٹ کر خبطی بنا دے۔ یہ حالت اس وجہ سے ہوگی کہ انہوں نے کہا تھا کہ بیع بھی سود کی طرح ہے، حالانکہ اللہ نے سوداگری کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ پس جس کو اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ پہلے لے چکا ہے وہ اسی کا رہا اور اس (کی معافی) کا معاملہ اللہ کے حوالہ رہا اور جو شخص پھر سود لے گا تو وہ لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

ربطِ آیات:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ربوا کی حرمت اور ربوا کھانے والوں کے احوال کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ اس سے پہلے صدقات وخیرات کا بیان تھا، جن کا بہت بڑا ثواب ہے۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ربوا کو بیان فرمایا ہے، جسے آپ آج کل سود کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں یہ طرز ہے کہ ہر دو ضدین کا ذکر کیا جاتا ہے، یعنی اگر کافروں کا ذکر آئے گا تو ان کے بعد مومن کا بھی ذکر آئے گا اور اگر جنت کے احوال آئیں گے تو اس کے بعد جہنم کا ذکر بھی آئے گا؛ کیونکہ ضدین سے بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے۔ اسی طرح جہاں جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے تو اس کے بعد جہنم کے عذابوں کا بھی ذکر ہے اور جہاں احوالِ سعداء کا ذکر ہے تو اس کے بعد احوالِ اشقیاء کا بھی ذکر ہے۔

اب دیکھیں کہ صدقہ وخیرات میں غریب کی ہمدردی اور اعانت مقصود تھی اور سود کے اندر غریبوں پر ظلم اور اپنا فائدہ مقصود ہے تو یہ ضدین ہیں۔ خیرات میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے اور سود میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی ہے۔ صدقات وخیرات کے فوائد دنیا میں بھی ہیں اور آخرت میں بھی ہیں، سود کی بربادی دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی ہے۔ یہ دونوں ضدین ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے پہلے صدقات ونفقات کا بیان فرمایا تو اب ان آیات مبارکہ میں سود کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

سود کی اقسام:

ہمارے ہاں ''ربوا'' کو سود کہا جاتا ہے، سود کا لفظ عربی کا لفظ نہیں ہے۔ عربی میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا، بلکہ لفظ ''ربوا'' استعمال ہوتا ہے۔ ربوا دو قسم پر ہے: 1...... ربوا نسیہ: کہ آپ نے کسی کو ایک ہزار بطور قرض دیئے اور کہا کہ دو مہینے کے بعد آپ مجھے گیارہ سو واپس کریں گے۔ 2...... ربوا الفضل: آپ کے پاس بھی کھجور ہے اور دکاندار کے پاس بھی کھجور ہے۔ دکاندار نے کہا: میری کھجور زیادہ اچھی ہے، میری ایک کلو کھجور کے بدلے میں آپ اپنی دو کلو کھجور دے دو۔ اس کو ''ربوا الفضل'' کہتے ہیں؛ کیونکہ ان کی جنس ایک ہے۔ اس طرح سے تبادلہ کرنا بھی سود کے حکم میں ہے اور یہ حرام ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے دور میں زیادہ تر ربوا النسیہ تھا۔ اس لیے زیادہ تر اس کے بارے میں احکام ذکر کیے گئے ہیں، ورنہ ربوا کی سب قسمیں حرام ہیں۔

سود کا حکم:

اگر کوئی آدمی سودی لین دین کرتا ہے اور سود کو حلال بھی سمجھتا ہے تو اس کے کفر کے اندر کوئی شک نہیں ہے۔ تمام ائمہ اربعہ کے نزدیک وہ کافر ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ربوا کو حرام قرار دیا ہے اور اس نے ربوا کو حلال کہا ہے۔ اور اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے قرآن کی ایک آیت کا انکار کرے تو کافر ہے اور سارے قرآن کا انکار کرے تو بھی کافر ہے۔

اگر وہ سود کو حلال نہیں کہتا، لیکن سودی کاروبار کرتا ہے تو یہ فاسق وفاجر ہے، اس پر کفر کا فتویٰ نہیں ہوگا، لیکن فسق و فجور کا فتویٰ ہوگا۔ یہ اتنے بڑے گناہ میں مبتلا ہے کہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کو کہہ دو: یہ اللہ اور اللہ کے رسول سے جنگ نہ کریں۔ اس سے خود اندازہ لگالیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول سے مسلمان تو جنگ نہیں کرے گا، بلکہ کافر ہی جنگ کرے گا۔

سود کھانے کا معنی:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ ربوا کھاتے ہیں۔ یہاں لفظ "يَأْكُلُوْنَ" استعمال فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض چیزیں کھائی جاتی ہیں اور بعض چیزیں پہنی جاتی ہیں۔ مثلاً: آپ نے مجھے رومال دیا، میں نے پہن لیا۔ یہ تو کسی نہ کسی شکل میں واپس ہوسکتا ہے، لباس بھی پہننے کے بعد واپس ہوسکتا ہے اور مکان بھی رہنے کے بعد واپس ہوسکتا ہے، لیکن آدمی جو چیز کھا جائے وہ واپس نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اللہ نے "يَأْكُلُوْنَ" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جیسے کھائی ہوئی چیز واپس نہیں ہوسکتی، اسی طرح سود والے کی نیت کسی کا بدلہ یا بھلا کرنا نہیں، بلکہ کھانا مقصود ہوتا ہے کہ ہمیں فائدہ ہو، چاہے پورا معاشرہ برباد ہوجائے۔

سود خور کی سزا:

سود خور نہیں اٹھیں گے قیامت والے دن، مگر ان لوگوں کی طرح جن کو شیاطین نے چھو کر خبطی بنادیا ہو۔

مثلاً: ایک آدمی کو جنون ہے اور ایک آدمی وہ ہے جس کو مرگی کا دورہ پڑتا ہے اور ایک شخص وہ ہے کہ جس پر جن کا سایہ ہے، اس جن کی وجہ سے وہ خبطی ہوگیا ہے، کبھی پاگلوں والی باتیں کرتا ہے اور کبھی عقل والی باتیں کرتا ہے، کبھی پاگلوں والی حرکات کرتا ہے اور کبھی عقل والوں کی حرکات کرتا ہے۔ عقل اور بے عقلی خلط ملط ہوجاتی ہے۔ اس کو خبط کہتے ہیں۔

سود کھانے والے اس خبط کی حالت میں کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر عمل کی سزا تقریباً جنسِ عمل سے دیتے

ہیں۔ جیسا کہ عالم حق بات نہ کہے تو قیامت والے دن اس کو جہنم کی لگام میں چڑھائی جائیں گی؛ کیونکہ اس نے اس زبان سے حق نہیں کہا تو اس کو لگام دی جائے گی۔

سود کھانے والے کو یہ سزا ملے گی کہ بے عقلی کو عقل کہا، مال حرام کو حلال کہا۔ جیسے اس نے دنیا میں عقل اور بے عقلی کو ملا دیا تھا، قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو قبر سے بھی ایسی حالت میں اٹھائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ مجنون ہوگا؛ کیونکہ مجنون کو تو کوئی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا ہے، ورنہ ان کو جہنم کی سزا دینے کا کیا مطلب ہے!؟ علماء نے فرمایا: اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ کسی پر جن ایسا اثر کر سکتا ہے کہ اس کی عقل کو بے عقلی میں بدل ڈالے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مثال دی ہے۔ اگر اس کی حقیقت نہ ہو تو اس کا کیا مطلب ہوگا؟ اور اس بات کو اطباء اور فلاسفہ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ آدمی جب پاگل ہو جاتے ہیں، اس کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ جنات کے اثرات کی وجہ سے اس کے دماغ پر اثر ہوتا ہے اور وہ مجنون والی کیفیات میں ہوتا ہے۔ جیسے مجنون کو چار چار آدمی پکڑیں، لیکن وہ قابو میں نہیں آتا ہے، اس طرح جب جن کسی پر اثر کر لیتا ہے تو اس کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ اس کو کئی آدمی پکڑیں تب بھی وہ سب کو گرا دے گا۔ کوئی آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ایک بندے میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی ہے؟

سود اتنا بڑا جرم ہے کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ سود کا ادنیٰ سے ادنیٰ جرم اپنی سگی ماں سے ستر بار زنا کرنے کے برابر ہے۔

سود یہودیوں کی عالمی سازش:

یہ ایک ایسی وبا ہے جو پورے عالم کو اپنے لپیٹ میں لے چکی ہے؛ کیونکہ یہودیت نے پورے عالم پر اپنا کنٹرول کرنے کے لیے فیصلہ کیا کہ ہم اقلیت میں ہیں، ہمارے مقابلہ پر ارب ہا مسلمان ہیں، عیسائی بھی ان کے خیر خواہ نہیں ہیں، اگرچہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے لاکھ دفعہ مل جائیں، لیکن اندر سے ان کے دل بھی آپس میں بٹے ہوئے ہیں؛ کیونکہ یہودی نصرانی کو حق پر نہیں سمجھتے اور نصرانی یہودی کو حق پر نہیں سمجھتے اور ان دونوں کے عقیدوں کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں کہ اگر یہودیوں کو موقع ملا تو انہوں نے عیسائیت سے انتقام لیا اور عیسائیت کو موقع ملا تو انہوں نے یہودیت سے انتقام لیا، لہٰذا وہ آپس میں دشمن ہیں،

اگرچہ کوئی وقتی مصلحت ان کو اکٹھا کردے۔ یہودیوں کی سوچ تھی کہ جب ہم تھوڑے ہیں تو ہم کیسے دنیا پر حکمرانی کا خواب پورا کر سکتے ہیں؟ انہوں نے اقتصادی ماہرین کو بٹھایا کہ آنے والی صدیوں میں جو کچھ بھی ہوگا اقتصاد کے پیش نظر ہوگا۔ جو ملک اقتصادی طور پر مضبوط ہوں گے وہ کسی کے تابع نہیں ہوں گے، وہ آنکھ اٹھا کر بات کریں گے۔ اس لیے انہوں نے اقتصادی لیور اپنے ہاتھ میں رکھا اور پوری دنیا میں یہودی اسکیموں کا جال پھیلا دیا۔ اس سے ان کو دو فائدے ہوئے: پہلا تو یہ فائدہ ہوا کہ اسکیم کا جو موجد ہے نفع اس کو جائے گا۔ دوسرا فائدہ ان کو یہ ہوا کہ کسی نہ کسی شکل میں مسلمان کے پیٹ میں حرام داخل ہو گیا۔ جب مسلمان کے پیٹ میں حرام داخل ہو جائے تو اس کے دو نتیجے نکلتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی رحمتیں رک جاتی ہیں، دعائیں منظور نہیں ہوتیں اور دنیا میں اس کو ذلت اور رسوائی حاصل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس لیے سود کے ایسے جال پھیلائے گئے ہیں کہ بہت کم بندے ہیں جو اس جال سے باہر نکلتے ہیں۔

آج لوگوں کو یہ دھوکہ دیا جاتا ہے کہ سود کے بغیر کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط اور سفید جھوٹ ہے۔ اس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے: کیونکہ میرے آقائے نامدار سرکار مدینہ ﷺ کا زمانہ مبارک خلفائے راشدین کا زمانہ حضرت حسن و حسین، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد بھی اسلامی ذہن والے بادشاہ آتے رہے۔ پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ ہوا۔ ایک طرف اس کی حدیں بحر اوقیانوس سے جا ملیں، دوسری طرف دریائے جیحون تک حدیں تھیں اور ہسپانیہ تک اسلام پہنچ گیا، چین تک اسلام نے جھنڈے گاڑ دیئے۔

لیکن اس زمانہ میں تو کوئی سود نہیں تھا تو پھر انہوں نے کیسے ترقی کی تھی؟ اگر سود کے بغیر کام نہیں چل سکتے تو انہوں نے کیسے حکومت کی تھی؟ یورپ جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن اور اسلام کا چور ہے انہوں نے ہمارا علم چرایا اور اپنا نام لگا دیا۔ ان کی جتنی ترقیاں ہیں ان کے موجد مسلمان ہیں۔

اس کی تازہ مثال دیکھ لیں کہ دنیا کا بڑا باکسر ثائی سن مسلمان ہو گیا۔ وہ جہاں مقابلے کے لیے جاتا ہے تو پہلے تو پورا پریس بائیکات کردے گا اور اس کی خبریں بھی نہیں آنے دے گا۔ اگر پریس مجبور ہو جائے تو اس کا نام مسلمانوں والا عبدالعزیز نہیں لکھیں گے، بلکہ ثائی سن لکھیں گے، وگرنہ نام پڑھ کر لوگوں کو یہ تاثر ملے گا کہ مسلمان جیت گیا ہے۔ اس کا عالمی مقابلہ ہوا، اس نے رنگ میں آنے سے پہلے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگایا تو پورے پریس نے بائیکاٹ کر دیا کہ یہ آواز ٹی وی پر نہیں آنی چاہیے۔ یہ تو اتنے بڑے غدار ہیں کہ ہمارے ایک کھلاڑی کا نام آگے نہیں آنے دیتے،

ہمارے کسی ایک ذہین آدمی کا نام آگے نہیں آنے دیتے۔

یہ بدبخت اتنی دور کی سوچ کر بیٹھے ہوتے ہیں کہ کہیں ان کو مسلمان کا ابھرتا ہوا ستارہ نظر نہ آئے، ان کو چاہے جس طرح سے کمند ڈالنی پڑے، دولت دے کر کمند ڈالنی پڑے یا لڑکی دے کر کمند ڈالنی پڑے تو یہ کر لیتے ہیں، تا کہ مسلمانوں کا ستارہ عروج پر پہنچ کر ماہِ تاباں نہ بن جائے، شمسِ کامل بن کر دنیا میں اسلام پھیلانے کا ذریعہ نہ بن جائے۔ ان کی ساری ترقی کو آپ قریب ہو کر دیکھیں تو تمام ہوائی جہازوں کی ایجادات، تمام ایٹمی ایجادات، ان تمام بحریہ کی ایجادات اور تمام چیزوں کے موجد اعلیٰ اور موجد اصلی مسلمان ہیں۔ اسلام نے چودہ سو سال پہلے جو باتیں حضور اکرم ﷺ کی زبان سے بتا دیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اشارۃً ایک واقعہ بتا دیا، اس کو سامنے رکھ کر انہوں نے ایجادات کی ہیں۔

ان کا یہ کہنا ہے کہ سود کے بغیر کوئی ملک نہیں چل سکتا۔ یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ یاد رکھیں! وہ ملک اس لیے نہیں چل سکتا کہ ساری دنیا کو انہوں نے سود میں لگایا ہوا ہے۔ اگر ایک مسلمان ہمت کرے تو ساری دنیا سے لین دین کیسے کرے؟ اب دنیا میں بعض بینک اسلامی اصولوں کے مطابق نظامِ مشارکت پر، نظامِ مضاربت اور نظامِ مرابحت پر کاروبار شروع کر رہے ہیں۔ ان کا باقاعدہ نظام چل رہا ہے اور وہ معترف ہیں کہ جتنا اسلام کے نظام میں بھلائی ہے اتنا سود کے کاروبار میں فائدہ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا لوگوں کے دماغ میں وہ یہ بات ڈالتے ہیں: فلاں کافر ملک ہے، وہ ترقی کر گیا ہے؛ کیونکہ وہ سود کھاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ ان کو صنعت سے ترقی ہوئی ہے، جدید ٹیکنالوجی سے ان کی ترقی ہوئی ہے، محنت اور کام سے ترقی ہوئی ہے۔ تم نے محنت چھوڑ دی تو کیسے ترقی ہو سکتی ہے؟

مثال کے طور پر میرے اپنے ملک کے بعض بھائی یہاں ایک کفیل کے پاس آنے کے بعد اٹھارہ گھنٹے بھی ڈیوٹی دیتے ہیں، جنہوں نے کبھی اپنے ماں باپ کی بھی چودہ چودہ گھنٹے ڈیوٹی نہیں دی۔ اگر وہ اتنی محنت سے اپنے ماں باپ کے کام کرتے تو گھر بیٹھے ہوئے سونا چاندی سے کھیل رہے ہوتے، لیکن وہاں خان صاحب ہو جاتے ہیں اور یہاں کہتے ہیں کہ کیا کریں وطن چھوڑ کر آئے ہیں؟ اس لیے سہنا پڑتا ہے۔ اگر اتنا اپنے معاشرے میں محنت کر لیتے تو ذلیل نہ ہوتے۔ اتنی محنت وہاں کرتے تو ترقی کر سکتے تھے۔ جو قومیں محنت کرتی ہیں وہ بامِ عروج پر پہنچ جاتی ہیں اور جو قومیں منشیات و مخدرات میں، بے حیائی میں، عیاشی میں، زنا میں، شراب میں اور فلموں میں پڑتی ہیں تو وہ قومیں

ہمیشہ کے لیے برباد ہو جاتی ہیں۔ ان قوموں کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔

کیا سود بیع کی طرح ہے؟

محدثین نے لکھا ہے کہ سود ایک ایسی لعنت ہے کہ چالیس سال کے اندر اس کے اثرات ہلاکت لوگوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سود خور لوگوں کو قیامت کے دن مخبطی بنا کر کھڑا کریں گے؛ کیونکہ یہ لوگوں کو کہتے تھے کہ بیع سود کی طرح تو ہے۔ جب بیع حلال ہے تو سود بھی حلال ہے۔ حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ سود بیع کی طرح ہے، بلکہ انہوں نے کہا کہ بیع ربوا کی طرح ہے، یعنی انہوں نے ربوا کو اصل قرار دیا، حالانکہ بیع کو اصل قرار دیتے، بلکہ انہوں نے کہا: بیع وتجارت کے اندر بھی تو یہی ہوتا ہے کہ ایک ریال کی چیز دو ریال کی بیچتے ہو اور سود میں بھی ہم یہی کرتے ہیں ایک ریال کا ڈیڑھ ریال لیتے ہیں۔ دونوں کی ایک جیسی چیزیں ہیں، لہٰذا سود بھی حلال ہے۔ اس کے دو جواب ہیں:

1 ...... حاکمانہ جواب:

اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے تو تم کہنے والے کون ہو؟ اس لیے مسلمان کو کسی تحقیق میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

2 ...... حکیمانہ جواب:

احادیث میں تفصیل موجود ہے کہ اگر بیع اور ربوا کی تمہیں ایک شکل نظر آتی ہے کہ تجارت میں نفع ملتا ہے اور سود میں بھی نفع ملتا ہے، لہٰذا سود حلال ہے۔ تو بیوی اور ماں کی شکل بھی ایک ہے، ان میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی عورت ہے اور وہ بھی عورت ہے۔ بیوی اور بہن میں کیا فرق ہے؟ یہ بھی عورت ہے اور وہ بھی عورت ہے۔ جب ایک طرح ہیں تو دونوں حلال ہونی چاہییں۔ کتے اور بکری میں کیا فرق ہے؟ بکری کی بھی چار ٹانگیں ہوتی ہیں اور کتے کی بھی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات دونوں کا قد اور وزن بھی برابر ہوتا ہے، لیکن کتا حرام اور بکری حلال کیوں ہے؟ اسی طرح اگر آپ حلال کرنا شروع کر دیں تو ہر چیز حلال ہو جائے گی۔ حلت وحرمت کے پیمانے تیری عقل کے اندر ہیں یا اللہ کے پاس ہیں!!؟

اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم فرمادیا ہے: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَٰتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَٰتُكُمْ﴾ [النساء: ٢٣] تمہارے اوپر

ماں بھی حرام ہے، بہن بھی حرام، اسی طرح وہ بہنیں جن کے ساتھ تم نے دودھ پیا وہ بھی حرام، وہ مائیں جن کا تم نے دودھ پیا وہ بھی حرام ہیں۔ لہٰذا اللہ نے جن چیزوں کو حرام کر دیا مسلمانوں کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ حرام ہیں۔ اور جن چیزوں کو حلال کر دیا ہے اتنا کافی ہے کہ وہ حلال ہیں۔ اس سے زیادہ ہمیں بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

سود اور بیع میں فرق:

علماء نے فرمایا: اگر غور کیا جائے تو سود بیع کی طرح نہیں ہے۔ مثلاً: میں نے ایک گلاس ایک ریال میں خریدا اور میں نے اس کو ڈیڑھ ریال میں بیچا تو ڈیڑھ ریال کے عوض میں آپ کو گلاس ملا یا نہیں ملا؟ اور سود میں تو میں نے سو ریال دیا اور ڈیڑھ سو ریال لیا۔ وہ پچاس ریال کس چیز کا بدلہ ہے؟ صرف وصف کا عوض ہے، ورنہ معاوضہ میں کوئی اور چیز تو نہیں ملی ہے۔

دوسری بات یاد رکھیں! تجارت اپنی مرضی سے ہوتی ہے، لیکن سود کبھی اپنی مرضی سے نہیں ہوتا ہے۔ مجھے ضرورت ہوگی تو میں بیع کروں گا اور اگر ضرورت نہ ہوگی تو میں بیع نہیں کروں گا۔ اور سود تب ہی ہوتا ہے کہ مجھے مجبوری ہے، میں نے قرض دینا ہے، قرض دار میرے دروازے پر بیٹھا ہوا ہے، مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تو میں سود لینے پر جبراً تیار ہو رہا ہوں، اپنی رضامندی سے راضی نہیں ہو رہا ہوں۔ یہاں ظلم ہے، تراضی کی کوئی شکل نہیں ہے۔

ایک بنیادی بات یاد رکھیں! باریک بات ہے، لیکن کاروباری حضرات اس کو سمجھ سکتے ہیں، لیکن میرے جیسے مولویوں کے لیے بڑی مشکل بات ہے۔ اصل چیز سونا چاندی بالذات مقصود نہیں ہوتا، بلکہ یہ چیزیں حاصل کرنے کا وسیلہ ہیں۔ میرے پاس دس تولہ سونا ہے، مجھے کوئی چیز خریدنے کی ضرورت پڑ گئی، میں نے سونا بیچ دیا۔ میرے گھر میں ایک کلو سونا ہو، آٹا ختم ہو جائے، مجھے بھوک لگے تو کیا میں سونا کھاؤں گا؟ روٹی کو تو کھا سکتا ہوں، دو دن کی بچی ہوئی ہو تب بھی کھا سکتا ہے، لیکن سونا اتنا قیمتی ہونے کے باوجود بے کار ہے، حالانکہ ساری دنیا کا نظام سونے چاندی پر چل رہا ہے۔ اس لیے سونے کو عربی میں ''ذَهَب'' کہتے ہیں، اس کا معنی ہے: ''گیا''۔ ''فِضَّة'' ٹوٹ جانے سے ہے۔ ''ذَهَب'' کو ذہب اس لیے کہتے ہیں کہ آج میرے پاس ہے، کل کو دوسرے کے پاس چلا گیا، پھر تیسرے کے پاس چلا گیا، یہ چلا ہی گیا۔ اس کو آپ کتنا ہی جوڑیں آپ اس کے اوپر سانپ بن کر بیٹھے رہیں گے، آپ مریں گے تو آپ کے وارثوں کے پاس چلا جائے گا۔ اسی طرح یہ رکتا نہیں ہے۔

اب مسئلہ سمجھیں کہ ہم نے ریال دے کر گلاس خریدا تو ہم نے ریال کو وسیلہ بنایا، اصل نہیں بنایا ہے، لیکن جب ہم نے ریال دے کر ریال لیا تو ریال کو ہم نے استعمال کیا، اس کو وسیلہ نہیں سمجھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو وسیلہ بنایا تھا، یہ نہیں فرمایا تھا کہ یہ خود بھی بذاتِ خود کوئی چیز ہے۔ اب سود خور نے اس وسیلہ کو اصل بنالیا اور جو اصل تھا اس کی قیمت ختم ہوگئی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔

آپ اقتصادی لوگوں کے پاس بیٹھ کر باریکیاں سمجھا کریں، ہم تو سنی سنائی باتیں کرتے ہیں؛ کیونکہ ہماری وہ فیلڈ نہیں ہے، ہم اس کو اچھا نہیں سمجھتے، لیکن دنیا کے اندر جتنی اسکیمیں چل رہی ہیں، ان کے پیچھے یہودی ذہن بیٹھا کام کر رہا ہے۔ اور ان اسکیموں سے ان یہودیوں کو سالانہ ملین ڈالر بچ جاتے ہیں، جیسا کہ ٹریولر چیک کے بارے میں آپ نے بہت پیچھے، اس کتاب میں پڑھ لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: جس نے میرا قرآن پڑھنے کے بعد توبہ کرلی، اس کے پچھلے گناہ ختم کردیتے ہیں، لیکن اگر قرآن پہنچنے کے بعد بھی تم سود نہیں چھوڑو گے پھر تم ہمیشہ عذابِ جہنم میں مبتلا رہو گے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا واقعہ:

پہلے زمانہ میں سود سے اتنا ڈر ہوتا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ایک دوست سے قرضہ لینا تھا۔ اس کے پاس جب گئے تو گرمی کا وقت تھا، کنڈی کھٹکھٹا کر سڑک پر کھڑے ہوگئے۔ جب گھر والا نکلا تو وہ دوڑ کر آیا اور کہا: کم از کم سائبان کے نیچے کھڑے ہوجاتے، دھوپ میں کیوں کھڑے ہوگئے؟ امام صاحب نے فرمایا: میں نے تم سے قرضہ لینا تھا، تمہارے گھر کی دیوار کے سائے کے نیچے کھڑے ہو کر یہ فائدہ اٹھانا قیامت میں سود نہ بن جائے۔ اس لیے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ وہ بلڈنگ اور وہ عمارت جن میں سودی کاروبار ہوتا ہے آدمی ان کے سائے سے بھی بچنے کی کوشش کرے۔

آخرت کا عذاب:

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ربوا کھانے والا، کھلانے والا، لکھنے والا اور گواہی دینے والا سب پر اللہ کی لعنت ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات میں ان پاک لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں اور جو زکوۃ نکالنے والے ہیں، جو بھلائی اور صدقات کے کام کرتے ہیں، محتاجوں پر،

رشتہ داروں پر اور مسکینوں پر احسان کرتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال کو حرام کرتے ہیں، ظلم کرتے ہیں اور مختلف قسم کے شبہات نکال کر اللہ کے دین میں تشکیک پیدا کرتے ہیں۔ ان کا حشر بری حالت میں اس وقت ہوگا جب قیامت کے دن قبروں سے اٹھیں گے۔

ایک عالمِ ارواح تھا، جس میں اللہ تعالیٰ نے ساری روحوں کو جمع فرمایا۔ اس کے بعد عالمِ دنیا ہے، جس میں ہم سب زندگی کے ایام بسر کر رہے ہیں۔ اس کے بعد عالمِ برزخ آئے گا، یعنی مرنے کے بعد اور اٹھنے سے پہلے۔ اور اس کے بعد عالمِ آخرت ہے، جس کو قیامت بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہاں ایک بنیادی چیز ہے۔ اگر آپ دماغ میں رکھ لیں تو بہت سارے شبہات سے آدمی محفوظ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نظام بنایا ہے، یہ دنیا دار الامتحان ہے، دار العمل ہے، اس دنیا میں ہر آدمی اچھائی کرے گا تو صالحین، ابرار میں ہوگا اور اگر برائی کرے گا تو فجار میں ہوگا۔ تو اس کی جزا اور سزا دار الآخرت میں ہے، وہاں جانے کے بعد احکم الحاکمین عدل فرمائیں گے کہ اصحاب الیمین ایک طرف ہوں گے اور اصحاب الشمال ایک طرف ہوں گے۔ یہی ایک بات دماغ کے اندر رکھ لیں تو سارے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں کہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزا ہے، ورنہ لوگوں کے دماغ میں یہ شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ دیکھیں! کافر جو اللہ تعالیٰ کو بھی نہیں مانتے اور اللہ کے رسول کو بھی نہیں مانتے، ان کے پاس دولت، اولاد اور قوت ہے، جدید قسم کے آلات و ہتھیار ہیں، پوری دنیا ان کی محتاج ہے اور مسلمان پیچھے کیوں ہیں؟ تو یہ شبہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا دار الجزا ہے، جبکہ یہ دار الجزا نہیں ہے، بلکہ دار العمل ہے۔ آخرت والے دن فیصلہ ہوگا کہ کون عزت والے ہیں اور کون ذلت والے ہیں؟ اس لیے سب سے پہلے سورۃ الفاتحہ کے اندر جہاں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ الوہیت، صفتِ ربوبیت، صفتِ رحمانیت کا ذکر ہے، وہاں "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" بھی صفت آئی ہے کہ وہ جزاء کے دن کا مالک ہے اور وہ قیامت ہے۔ باقی دنیا میں کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اچھوں کو بھی بدلہ دے کر ان پر اپنی رحمت کا نظارہ دکھا دیتے ہیں اور کبھی برے کو سزا دے کر اپنی سزا کا نظارہ دکھا دیتے ہیں۔ یہ تو کچھ جھلکیاں ہیں، ورنہ اصل فیصلہ آخرت میں ہوگا۔ جس آدمی کا آخرت پر یقین ہے وہ ان شبہات میں نہیں پڑتا اور اس کو یقین ہے کہ دنیا دار العمل ہے۔ جو عمل کرے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو غافل رہے گا وہ اتنا پیچھے رہ جائے گا۔ مثلاً: ایک بھائی زمین پر محنت کرتا ہے، اس کی فصل اچھی ہوتی ہے اور دوسرا بھائی محنت نہیں کرتا، اس کی فصل اچھی نہیں ہوتی۔

کیا خیرات سے مال کم اور سود سے بڑھتا ہے؟

بعض لوگ کہتے ہیں: یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: خیرات کرنے سے مال بڑھ جاتا ہے اور سود سے کم ہو جاتا ہے!! حالانکہ خیرات سے تو مال کم ہو رہا ہے اور سود سے تو بڑھ رہا ہے۔ جس کا ایمان ہے وہ کہتا ہے: یہ عالمِ آخرت کے اعتبار سے ہے، عالمِ دنیا کے اعتبار سے نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی دکھاتے ہیں کہ خیرات کرنے والے کے مال کو بڑھا دیتے ہیں اور سود کھانے والے پر عذاب نازل فرما دیتے ہیں، ورنہ اصل فیصلے آخرت میں ہوں گے۔

اسلام میں گورے کالے کا کوئی فرق نہیں:

ایک سفر میں ایک غیر مسلم نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ اسلام میں ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ اسلام میں گورے کالے کا کوئی مسئلہ نہیں، لیکن آپ کا قرآن خود کہتا ہے: ﴿يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ [البقرۃ:۱۰٦] کہ بعض لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگی اور جن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ہوگا ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ میں نے کہا: میرے بھائی! اس آیت کا ترجمہ بھی آتا ہے؟ کہنے لگے: جو لکھ کر مجھے دیا تھا اتنا آتا ہے۔ میں نے ان سے کہا: ''یَوْمَ'' سے کیا مراد ہے؟ کہنے لگا: اس سے دن مراد ہوتا ہے۔ میں نے کہا: کون سا دن مراد ہے؟ آج کل گزشتہ یا کل آنے والا مراد ہے؟ کہا یہ تو مراد نہیں ہے۔ میں نے کہا: قرآن کی لغت میں اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ کہنے لگا: ٹھیک ہے۔ میں نے کہا: دنیا میں تو ہمارے نزدیک گورے کالے کا کوئی فرق نہیں ہے، وہ تو عالمِ آخرت کا مسئلہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے عمل سے دیکھ لو کہ کبھی میرے پاک نبی ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو یہ نہیں فرمایا کہ تم کالے ہو، پیچھے ہو جاؤ۔ کبھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو حکم نہیں دیا کہ تم غلام ہو، پیچھے ہو جاؤ۔ عالمِ آخرت پر یقین نہ ہونے کی وجہ سے یہ اشکال پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول مبارک ہے کہ قیامت والے دن جب سود خوروں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرمائیں گے: ان کو کہو کہ میں نے جو کہا تھا: اللہ سے لڑائی نہ کرو، اب ہتھیار اٹھاؤ اور خدا سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

سود خوروں کے لیے آخرت میں عذاب:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ کو معراج پر لے جایا گیا تو آپ ﷺ فرماتے ہیں: مجھے دکھایا گیا ایسے لوگ تھے جن کے پیٹ ایسے بڑھ رہے تھے جیسے کمرے ہوتے ہیں۔ میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں جن کے اتنے پیٹ بڑھ رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھانے والے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس رات مجھے معراج پر لے جایا گیا، میں ایسی قوم پر پہنچا جس کے پیٹ ایسے تھے جیسے بڑے بڑے کمرے ہوتے ہیں، ان کے اندر سانپ بھرے ہوئے ہیں، باہر نکل رہے ہیں اور باہر بھی سانپ ہیں۔ میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں سود کھاتے تھے۔

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے حدیث روایت فرمائی جو اس خواب کے بارے میں ہے کہ ہم ایک نہر کے کنارے پر آئے، اس نہر کا پانی ایسے ہے جیسے سرخ خون ہوتا ہے، اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے۔ کنارے پر ایک آدمی کھڑا ہے، اس کے ہاتھ میں پتھر ہیں۔ وہ جب کنارے پر پہنچتا ہے، منہ کھولتا ہے تو وہ آدمی اس کے منہ میں پتھر ڈالتا ہے۔ وہ نہر کے پرلے کنارے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح وہ دوبارہ آتا ہے تو اس کے منہ میں پتھر ڈال دیتا ہے۔ پوچھا گیا: اس کو کس لیے یہ عذاب دیا جا رہا ہے؟ بتایا گیا: یہ وہ آدمی ہے جو دنیا میں سود کھاتا تھا۔ جیسے سود سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا تھا، آج جہنم کے انگارے اور پتھر اس کے منہ میں ڈالے جا رہے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مشرکین نے جو کہا کہ بیع سود کی طرح ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر اعتراض ہے۔ مثال تو وہ دے جو بیع کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حلال سمجھتا ہو۔ جب ان کے نزدیک بیع میں اپنی مرضی ہے تو ان کا یہ قیاس کرنا فاسد ہے۔ اگر قیاس کرنے تو یوں کہے کہ سود اسی طرح ہے جیسے بیع ہے، لیکن انہوں نے کہا بیع سود کی طرح ہے۔ تو ان کا مقصد صرف اعتراض کرنا تھا۔

ربوا کا مسئلہ بہت مشکل ہے!!

ربوا کا مسئلہ باریک مسئلہ ہے، حتیٰ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: سب سے آخری آیات سود کے حکم کے

بارے میں تھیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تمنا تھی، آپ نے فرمایا کہ کاش! حضور پاک ﷺ کی عمر مبارک طویل ہوتی اور آپ ہمیں اس کے بارے میں مزید تفصیل بیان فرماتے تو اچھی بات تھی، لیکن حضور پاک ﷺ فوت ہو گئے۔

اعتراض:

اس قول کو سامنے رکھ کر وہ لوگ جو جدید تعلیم کا شکار ہیں کہتے ہیں کہ دیکھو! حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی اس بارے میں پریشان تھے کہ حضور اکرم ﷺ نے اس کے بارے میں خاص وضاحت نہیں فرمائی، لہٰذا ربوا کا مسئلہ تو مشکوک ہے۔ اس کے بعد تو اجتہاد کا دروازہ ہے، ہر آدمی اجتہاد کرے گا کہ کونسی شکل ٹھیک ہے اور کونسی شکل غلط ہے۔

جواب:

انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا پورا قول نقل نہیں کیا۔ آج کل مشکل یہ ہو گئی ہے کہ جس آدمی کو جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی عبارت نقل کرتا ہے، اس سے زیادہ عبارت نہ ہی پڑھتا ہے اور نہ ہی نقل کرتا ہے۔ دوسری بات کہ یہ کہنا ربوا کا مسئلہ مبہم رہ گیا، یہ اللہ کے قرآن پر بھی جھوٹ ہے اور حضور اکرم ﷺ کی حدیث پر بھی جھوٹ ہے۔ ربوا کی حرمت قرآن کی سات آیات سے ثابت ہے اور چالیس احادیث سے بھی اس کی حرمت ثابت ہے۔ اس کے بعد بھی اگر بات واضح نہیں تو پتہ نہیں کب واضح ہو گی؟

یاد رکھیں! جب ہم نے حضور اکرم ﷺ کا کلمہ پڑھ لیا، جب آپ کسی چیز کے بارے میں فرما دیں یہ حرام ہے تو اتنا کافی ہے، لیکن قرآن کی سات آیات اور حضور اکرم ﷺ کی چالیس احادیث کے بعد بھی کوئی یہ کہے کہ ہمیں مسئلہ سمجھ نہیں آیا اور یہ مسئلہ مشکوک ہے تو یہ بہت بڑی غلط فہمی اور لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے والی بات ہے۔ ''ربوا'' عربی کا لفظ ہے۔ یہ لغتِ عربی میں نازل ہوا اور جس رسول پاک ﷺ پر نازل ہوا وہ بھی عربی تھے اور جو مخالفین تھے وہ بھی عربی تھے۔ تو یاد رکھیں! جب قرآن نازل ہوا اور حضور اکرم ﷺ نے حرمتِ ربوا کا اعلان کیا تو کسی ایک صحابی کو شبہ نہیں ہوا کہ اس نے پوچھا ہو کہ حضور! ہمیں بتائیں کہ ''ربوا'' کا معنی کیا ہے؟ جبکہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم ﷺ سے چاند گھٹنے بڑھنے اور حرمت والے مہینوں کے بارے میں سوال کیا، حتیٰ کہ عورت کے حیض میں ملنے کے بارے میں پوچھ لیا۔ یعنی جو مسئلہ تھوڑا سا بھی سمجھ میں نہ آتا تھا اس کو پوچھ لیتے تھے، لیکن کسی صحابی نے بھی ربوا

کے بارے میں حضور اکرم ﷺ سے نہیں پوچھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایسی کھلی ہوئی بات تھی کہ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ آج پڑھی لکھی دنیا یہ کہتی ہے کہ جب تک آپ ہمیں اس کا متبادل نظام نہ دیں گے اس وقت تک ہم سود کو کیسے چھوڑ دیں؟ جبکہ حرام تو حرام ہے، بات ختم تھی۔ جب تم سود کو چھوڑ دو گے تو خود بخود اس کا متبادل آئے گا۔ مسلمان سود چھوڑ دے، دنیا پاگل ہو جائے گی اس کا متبادل ڈھونڈنے کے لیے۔ اس کا متبادل قرآن پاک میں موجود ہے، حدیث اور فقہاء کی کتابوں میں موجود ہے، لیکن جب تک ہم سود کو نہیں چھوڑیں گے تو متبادل نظام نہیں آسکتا ہے۔

جس دن ربوا کا حکم آیا سب نے سمجھ لیا کہ ربوا اس کو کہتے ہیں: "كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبًوا، اَلرِّبٰوا مِنَ الرَّبْوَةِ يَعْنِي الزِّيَادَةِ" کہ ہر وہ قرض جو بغیر عوض کے نفع کو کھینچے وہ سود ہوتا ہے، یعنی جو پیسہ ہم نے ادھار لیا اس سے زیادہ دیا تو یہ کھلی سی بات تھی جو سب صحابہ کرام ﷺ کو سمجھ آ گئی۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں بھی سود کا یہی رواج تھا کہ ادھار لے کر پیسہ زیادہ لینا۔ مثلاً: مجھ سے ہزار ریال لے لو، میں دو ماہ بعد تجھ سے گیارہ سو ریال لوں گا۔ دو ماہ بعد وہ آدمی آیا اور کہا: مجھ سے پیسے نہیں ہو سکے تو کہا: میں تجھے دو ماہ کی میعاد اور دیتا ہوں، اب سود گیارہ سو روپے پر لگے گا۔ اس طرح پیسے بڑھتے گئے۔ جب اس کی حرمت آ گئی تو صحابہ ﷺ نے اس کو حرام سمجھا اور صحابہ ﷺ نے پوچھا: اس سے پہلے جو ہم لین دین کر چکے ہیں ان کا کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ معاف ہے اور جو اصل پیسہ ہے وہ تم لے سکتے ہو۔

جب سود حرام ہوا تو مشرکین نے کہا: ہم نے مسلمانوں سے جو سود کے پیسے لینے تھے وہ ہمارے ڈوب گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: خبردار! صرف تمہارا نہیں ڈوبا، بلکہ سب سے زیادہ ربوا میرے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ہے۔ میں اپنے چچا کے ربوا کو بھی ختم کرتا ہوں۔ آج سارے مسلمان ملکوں کو اللہ غیرت دے اور وہ فیصلہ کر لیں کہ ہم سود نہیں دیتے اور اپنا اصل لے لو! کیونکہ سود حرام ہے۔

ربوا نسیہ کے اندر تو کوئی شبہ نہیں تھا، یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ حرام ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے کچھ ربوا بیان کیے جو بیع کے اندر تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے چھ چیزیں بیان کیں اور فرمایا: اگر تم ان کا دست بدست سودا کرو تو ٹھیک ہے اور اگر دست بدست نہ کرو تو سود ہو جائے گا۔ اور وہ چھ چیزیں یہ ہیں: 1 سونا 2 چاندی 3 گیہوں (گندم) 4 جو 5 انگور اور 6 کھجور۔ ایک آدمی کہے کہ میری کھجور اعلیٰ ہے۔ تم مجھے دو کلو کھجور دو گے تو میں تجھے

ایک کلو کھجور دوں گا۔ تو یہ حرام ہے اور نا جائز ہے۔ اسی طرح کہے کہ میرا انگور اعلیٰ ہے۔ تم ڈیڑھ کلو دو تب ایک کلو دوں گا۔ یہ بھی نا جائز ہے۔ اسی طرح کہے: مجھے دس تولہ سونا ادھار دے دو تو آپ مجھے سوا دس تولہ سونا ہی دیں گے۔

اس لیے اسلام نے کہا ہے کہ تم اپنے اکثر معاملات سونے اور چاندی کے عوض کرو۔ مثال کے طور پر عورت سے نکاح کرتے ہو تو اسلام کی رو سے تم حق المہر سونے میں مقرر کرو کہ میں پانچ تولہ سونا دوں گا یا کہا: پچاس تولہ چاندی دوں گا۔ اور اگر تم نے کہا: میں بیوی کو دس ہزار روپے حق المہر دوں گا اور تمہارا نکاح چالیس سال پہلے ہوا تھا۔ چالیس سال کے بعد ان دس ہزار کی کتنی ویلیو ہوگی؟ ان کی ویلیو ختم ہوگئی، لیکن اگر سونا ہوتا تو کسی کا نقصان نہ ہوتا؛ کیونکہ اس کی اصل چیز محفوظ تھی، اس کی قیمت میں اضافہ تو ممکن تھا، ورنہ اصل قیمت تو نہ ڈوبتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان کا مطلب:

حضور اکرم ﷺ نے ان چیزوں کو تو بیان فرما دیا، لیکن ان کے علاوہ آم، انار اور دوسری چیزیں بھی تھیں، ان کو بیان نہیں فرمایا۔ تو اب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پریشان ہوئے کہ ان چیزوں کو حضور اکرم ﷺ نے بیان فرما دیا اور ان کے علاوہ جو دوسری چیزیں ہیں کاش! ان کے بارے میں ہمیں بتا دیتے۔ وہ ربوا کے مسئلے میں پریشان نہ تھے اور نہ ان کو ربوا کی حرمت میں کوئی شبہ تھا۔ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جو مسئلہ منصوص ہو جائے، اس میں اختلاف نہیں ہوتا، مثلاً: مغرب کی تین رکعات ہیں، تو سب کے نزدیک یہی تین رکعتیں ہیں؛ کیونکہ یہ منصوص مسئلہ ہے، اس میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ جھگڑا اس مسئلہ میں ہوتا ہے جو بیان نہ ہوا ہو اور وہ پیش آ گیا تو مجتہدین نے اجتہاد کیا۔ ظاہر بات ہے کہ ہر کسی کی سوچ میں فرق ہوتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس لیے روتے تھے کہ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جن کا حضور اکرم ﷺ نے نام نہیں لیا، اگر حضور اکرم ﷺ کی زندگی اور لمبی ہوتی تو یہ ساری چیزیں بھی آپ کے سامنے آ جاتیں، آپ اپنی زبان مبارک سے ان کا حکم بیان فرما دیتے تو کوئی اشتباہ نہ رہتا۔ آپ نے آگے فرمایا: ''إِنَّمَا الرِّبٰوا الرِّبٰوا'' خبردار! ربوا خود ربوا ہے۔ جس چیز میں شبہ ہے اس کو بھی چھوڑ دینا۔

بیع مزابنہ:

زمانہ جاہلیت کے اندر بیع مزابنہ اور بیع محاقلہ ہوتی تھی۔ بیع مزابنہ یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی کہتا ہے: آپ کے باغ پر جو ثمر لگا ہوا ہے (مثلاً: کھجور کا باغ ہے) اس کے بدلہ میں دس من کھجوریں لے لیں اور یہ باغ کا پھل مجھے

دے دو۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: خبردار یہ حرام ہے۔ ہوسکتا ہے وہ کھجوریں زیادہ نکل آئیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کم نکلیں۔ اس میں ربوا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: یا تو کھجوریں اتار کر ان کا وزن کرو اور اس کے بعد برابر دے دو اور اگر اس طرح نہیں کرتے تو پہلے اپنی کھجوریں جا کر بیچو اور پھر ان کو خرید لو۔

آپ لوگ سمجھ رہے ہوں گے کہ بات تو ایک ہوگئی کہ کان کو اس ہاتھ سے پکڑ لو یا دوسرے ہاتھ سے پکڑ لو۔ ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اب مسئلہ بدل گیا ہے؛ کیونکہ جب میں نے باہر جا کر کھجوریں بیچیں تو میں بائع بن گیا اور دوسرا آدمی مشتری بن گیا۔ اب میں پیسے کا مالک بن گیا۔ ان سے میں نے جا کر پانچ کلو پھل خرید لیا تو جائز ہے؛ کیونکہ اب میں نے اس کو جنس کے بدلہ میں نہیں لیا، بلکہ اس کو پیسوں کے بدلہ میں لیا ہے۔ پیسوں سے دوسری اشیاء کی بیع و شرا حلال ہوتی ہے، حرام نہیں ہوتی۔

بیع محاقلہ:

محاقلہ حقل سے ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ میری زمین میں آئے اور دیکھا کہ ایک مربع گندم لگی ہوئی ہے۔ آپ نے مجھے کہا: پانچ سو من صاف گندم لے لو اور مجھے یہ کھیت والی گندم دے دو۔ تو اسلام کہتا ہے: یہ بھی حرام ہے: اس لیے کہ اس کے اندر بھی کمی بیشی آسکتی ہے اور دوسرا جنس بھی ایک ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے بیع مزابنہ، بیع محاقلہ اور چھ چیزوں کا نام لے کر بھی بتا دیا کہ ان میں سود بنتا ہے۔ ان کے علاوہ جو دوسری چیزیں ہیں ہم ان کو ان چیزوں پر قیاس کریں گے۔

شراب نوشی کی حد:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مسئلہ پیش آیا کہ شراب پینے والے کی حد (سزا) کتنی ہے؟ انہوں نے کہا: چالیس بید ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں یہی تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اب لوگ جرات زیادہ کر رہے ہیں، شراب زیادہ پی رہے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ سزا بڑھا دی جائے۔ اور وہ کتنی بڑھائی جائے؟ کیونکہ حد لوگوں کو جرم سے روکنے کے لیے ہوتی ہے۔ اگر وہ حد لوگوں کو جرم سے نہ روکے تو کیا فائدا ہوا؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے مشورہ دیا۔ کسی نے پچاس بید اور کسی نے کہا: ساٹھ بید اور کسی نے کہا: ستر

بید مارے جائیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسی بید مارو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ نے اسی بید جو فرمائے ہیں آپ کے ذہن میں کوئی دلیل تو ہوگی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شراب پیئے گا اس کو نشہ ہوگا۔ جب نشہ ہوگا تو وہ بکواس کرے گا اور کسی نہ کسی پر تہمت لگائے گا۔ اور قرآن نے تہمت لگانے والے کی سزا اسی کوڑے رکھی ہے، اس لیے اس کی سزا اسی کوڑے رکھو۔

اس کو قیاس کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ کو دوسرے مسئلہ پر منطبق کرنے کے بعد فیصلہ کیا۔ اس کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے قبول کر لیا اجماع ہوگیا۔ جب سب صحابہ رضی اللہ عنہم ایک مسئلے پر اجماع کر لیں تو اس کا درجہ وہ بن جاتا ہے جو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ ہے۔

اس لیے یاد رکھیں! ربوا کی حرمت میں نہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو شک تھا اور نہ خلفائے راشدین کو شک تھا۔ ربوا حرام تھا اور ہے اور قیامت تک حرام رہے گا، لیکن ربوا تو قرض یعنی وقت کے بدلہ میں پیسہ لے رہا ہے، مال نہیں ہے۔ اور دوسرا ربو لین دین میں ہوتا ہے، مثلاً: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں کو بیان فرمایا، ان کے علاوہ باقی چیزیں ہم ان کو ان پر قیاس کرتے جائیں گے۔

سود کا فائدہ بڑا محدود ہے، مثلاً: بارہ کروڑ کی آبادی کو لوٹ کر صرف بارہ ہزار آدمی کے منافعات بڑھیں تو یہ کون سا فائدہ ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ کثرتِ نقصان کو سامنے رکھ کر حکم دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے اندر حکمتیں ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جتنے سودی ادارے ہیں وہ ان کو سود دیں گے جو پہلے بھی سرمایہ دار ہوگا، غریب کو نہیں دیں گے۔ کہیں گے: پہلے بیس کروڑ، پھر پچاس کروڑ قرض لیں۔ اب قرض وہی لے سکتا ہے جس کے پاس پہلے مثلاً: بیس کروڑ ہوں گے۔ یہ ساری شرط رکھتے ہیں کہ امیر امیر ہوتا جائے اور غریب غریب ہوتا جائے۔ اگر بینک دیوالیہ ہو جائے اور اس میں لاکھوں آدمیوں کے اکاؤنٹ تھے تو ساروں کا پیسہ ڈوب گیا، یعنی جب تک نفع ملے تو وہ سود خور کو ملے اور جب نقصان آ گیا تو سب کو نقصان ہو گیا۔

سودی نظام کے مقابلہ میں اسلام کا نظام:

اس کے مقابلہ پر اگر تم اسلام کے نظامِ مضاربہ کو آزماتے، نظامِ مشارکت کو آزماتے، نظامِ مرابحہ کو آزماتے، مثلاً: تیرے پاس ایک ہزار ریال ہے اور کام لاکھ سے ہوتا ہے تو اسلام کہتا ہے کہ سو آدمیوں کو حصہ دار بنا دو، اس

سے کاروبار شروع کر دو۔ اور جب نفع نقصان کا وقت آئے تو سب کو نفع نقصان کے اعتبار سے دو۔ اس میں ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جب تم کاروبار میں سو آدمیوں کو شریک کرو گے تو سو آدمیوں کو برکت پہنچے گی، سو گھرانوں کی دعائیں تیرے ساتھ ہوں گی کہ اے اللہ! اس کو برکت دے، کہیں ہم ڈوب نہ جائیں۔ جب تم سال کے بعد سو گھرانے میں نفع نقصان تقسیم کرو گے تو سو گھرانوں کی خوشیاں اور دعائیں تمہیں ملیں گی، ورنہ سود لینے والا اور دینے والا بھی لعنت کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حرام کیا ہے اس کے اندر گھس کر دیکھو گے تو تمہیں اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اتنا مہربان ہے اتنی ماں اپنے بچے پر مہربان نہیں ہوتی۔

(حدیث) حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ جنگ ختم ہو گئی۔ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کھڑے ہیں۔ ایک عورت دیوانہ وار میدانِ جنگ میں بھاگ رہی ہے، جس کسی چھوٹی عمر کے لڑکے کو دیکھتی ہے اپنے ساتھ چمٹا لیتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر اس بے تاب ماں کو اس کا بچہ ابھی مل جائے تو کیا یہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو آگ میں ڈال دے گی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے، اس نے فرما دیا کہ یہ چیز حرام ہے تو اس کے اندر کوئی نہ کوئی حکمت ہوگی، ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ خواہ مخواہ حرام فرما دے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس کو سود کے حرام ہونے کی وحی پہنچ گئی اور وہ رک گیا تو اس سے پہلے جو وہ سود کھا چکا ہے وہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دیں گے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ارشاد فرمایا کہ میں نے سود کو اپنے پاؤں کے نیچے روند ڈالا ہے۔ میرے چچا عباس رضی اللہ عنہ نے جو سود لینا ہے وہ بھی ختم ہے، کوئی ان کو واپس نہ کرے۔

یہاں ایک مسئلہ سمجھ لو کہ حضور اکرم ﷺ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ جو تم سود لے چکے وہ واپس کرو۔ یہ اس وقت تھا جب لوگوں کو اس کے حرام ہونے کا پتہ نہیں تھا۔ اگر آج کوئی کہے کہ میں بیس سال کھاتا رہا ہوں، مجھے پتہ نہیں تھا، اب مجھ سے بھی واپس نہ لو! کیونکہ میں نے آج توبہ کی ہے، حالانکہ اس کے لیے لینا ہی حرام ہے۔ اگر لیا ہے تو اس کو واپس کرنا ضروری ہے۔ تب ہماری توبہ قبول ہوگی؛ کیونکہ توبہ کے اندر حقوق اللہ کی ادائیگی شرط ہے۔ ہاں اگر کافر تھا اور حالتِ کفر میں سود لیا دیا ہے تو اسلام لانے کی وجہ سے اس کا گناہ معاف ہے، مگر اس کی تلافی ضروری ہے۔

سودی نظام کی برائی وغیرہ:

(حدیث) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ام محبت نے آکر عرض کیا: اے ام المومنین! کیا آپ زید بن ارقم

کو جانتی ہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جانتی ہوں۔ اس عورت نے کہا: میں نے ایک عبد کو آٹھ سو درہم میں فروخت کیا اس شرط پر کہ جب اس کے پاس پیسے آئیں گے وہ مجھے اس کی قیمت دیں گے۔ اب زید بن ارقم کو پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تو میں نے اس کو کہا: اگر تم مجھے وہی عبد چھ سو میں بیچ دو تو میں تیار ہوں تو کیا یہ ٹھیک ہے؟ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سنا تو بہت ناراض ہوگئیں، فرمایا: تم نے بڑا برا سودا کیا، تم نے بڑا برا سودا کیا۔ زید بن ارقم کو جا کر بتا دو کہ اگر تم نے توبہ نہ کی اور یہ معاملہ کینسل نہ کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نیکیاں کرتا رہے، جہاد کرتے رہے، وہ سب اس سود کھانے کی وجہ سے باطل ہو جائیں گے۔ اس عورت نے کہا: اگر میں اس سے اپنا وہی چھ سو ہی لے لوں اور دو سو چھوڑ دوں تو پھر میں اس گناہ سے بچ سکتی ہوں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: پھر ٹھیک ہے۔

آج کل اس قسم کا کاروبار عام ہو چکا ہے۔ آج کل لوگ قسطوں پر گاڑیاں لیتے ہیں، مثلاً: ایک گاڑی ایک لاکھ ریال کی خرید لیتے ہیں۔ اگر وہی گاڑی نقد میں خریدیں تو اسی ہزار ریال کی ہے۔ تو پہلا نقصان ان قسطوں کی وجہ سے یہ ہو رہا ہے کہ بیس ہزار ریال زیادہ دینے پڑ رہے ہیں۔ اس گاڑی کو ایک لاکھ میں خریدنے کے بعد اسی ہزار ریال میں بیچ دیتے ہیں۔ بعض اوقات ستر ہزار ریال میں بیچ دیتے ہیں؛ کیونکہ خریدنے والا کہتا ہے: اگر میں نے اسی ہزار میں خریدنی ہے تو کمپنی سے کیوں نہ خرید لوں؟ کیونکہ تمہاری قسطیں ادا ہوں گی تو گاڑی نام ہوگی۔ بعض علماء یہاں گنجائش رکھتے ہیں کہ یہ تو مالک ہو گیا ہے اور اس نے اپنی مملوکہ چیز گھاٹے میں بیچ دی ہے، اس لیے حرام نہیں ہے۔ اور بعض علماء فرق کرتے ہیں کہ جس آدمی اور جس کمپنی نے اس کو گاڑی بیچی ہے اگر وہ خرید لے تو ٹھیک نہیں ہے۔ ہاں دوسرا کوئی خریدتا ہے تو ٹھیک ہے۔

بہر حال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان سونے سے لکھنے کے قابل ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ ربوا ریبۃ (شک) ہے، جس چیز میں ربوا کا شبہ ہو جائے اس کو چھوڑ دو، اس کے اندر بہتری ہے، بجائے اس کے کہ تم حرام میں مبتلا ہو جاؤ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واضح فرمان مبارک ہے: ''أَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَ الْحَرَامُ بَيِّنٌ، وَمَا بَيْنَهُمَا أُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ '' حلال بھی کھلا ہے، حرام بھی کھلا ہے۔ ان کے درمیان میں مشتبہات ہیں (مشتبہ کا معنی یہ ہے کہ اس کے کچھ دلائل حلال ہونے کی طرف جاتے ہیں اور کچھ دلائل اس کے حرام ہونے کی طرف جاتے ہیں)۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان مشتبہات کو بھی چھوڑ دو۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مثال بیان فرمائی کہ ایک آدمی نے

گھاس اگا یا ہے اور اس کے ارد گرد باڑ لگائی ہوئی ہے کہ اگر تم اس کی باڑ کے قریب جانور لے جاؤ گے تو خطرہ ہے کہ کبھی وہ باڑ پھلانگ کر اندر چلے جائیں، لیکن اگر تم اس باڑ سے ہی دور رہو گے تو محفوظ ہو گے، اس لیے جہاں بھی تھوڑا سا شبہ ہو جائے اس سے احتیاط کریں۔

اسلام نے جب سود کی حرمت کا حکم دیا تو فرمایا کہ اس آیت (حکم) کے اترنے سے پہلے جو معاملات ہو چکے ہیں اس سے توبہ کر و اور آئندہ کے لیے عہد کرلو کہ ہم سود کو چھوڑ دیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے سابقہ گناہ معاف کر دیں گے، یعنی جو پہلے سود لے چکے اس کو لوٹانا ضروری نہیں تھا، لیکن حکم اس وقت تھا جب سود حرام نہیں تھا، لیکن جب سود حرام ہو گیا، اب مثلاً: کسی آدمی کو سود کھاتے کھاتے دس سال ہو گئے، اب وہ یہ کہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور لوگوں کو پیسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے ذمہ ہے جس سے زیادہ لیا ہے اس کو واپس کرنا ضروری ہوگا؛ کیونکہ زیادتی حرام ہے اور وہ اپنا اصل قرضہ واپس لے سکتا ہے اس سے زیادہ لینے کا وہ حق دار نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی احتیاط:

پہلے زمانہ میں لوگ بڑی احتیاط کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو پتہ چلا کہ ایک آدمی کی کچھ بکریاں چوری ہو گئی تھیں۔ امام صاحب نے اس وقت لوگوں کو بلایا اور کہا کہ عام طور پر بکری کی عمر کیا ہوتی ہے؟ کسی نے کہا: اتنے سال اور کسی نے کہا: اتنے سال۔ امام صاحب نے فرمایا: خدانخواستہ اگر کسی کی بکریاں چوری ہو جائیں تو عام طور قصائیوں کو بیچ دیتے ہیں اور بعض لوگ دوسری جگہ بیچ دیتے ہیں اور امام صاحب نے اپنے ملازم سے فرمایا کہ اتنے عرصہ تک اس شہر سے بکری کا گوشت مت خریدنا۔ پتہ نہیں کہ وہی چوری کا مال آکر ذبح ہو جائے، اگرچہ ہم نے خریدا ہوگا، لیکن وہ پھر بھی چوری کا ہوگا، جس کے اندر تھوڑا سا شبہ ہو جائے، ہم اس چیز کو کیوں استعمال کریں؟

پھلوں والے باغات کی بیع:

آج کل ایک بہت بڑی مصیبت ہے جس میں عامۃ المسلمین مبتلا ہیں اور کوئی توجہ نہیں کرتا ہے؛ کیونکہ اللہ کے نبی نے فرمادیا کہ کوئی باغ کا پھل اس وقت تک بیچنا حرام ہے جب تک پھل ظاہر نہ ہو جائے۔ اب اگر کوئی اس طرح خریدے گا تو وہ بیع حرام ہے۔ ہمارے ہاں تو ایک مصیبت عام بن گئی ہے کہ لوگ پانچ پانچ سال کے لیے باغ خرید لیتے ہیں اور دس دس سال کے لیے بھی خریدا ہوا ہے، حالانکہ ان کو پتہ بھی نہیں کہ کل کو پھل لگے گا یا نہیں لگے گا؟

یا پھل لگے گا اندھیریاں آئیں گی پھل گر جائے گا یا کوئی وائرس پڑے گی اور پھل ختم ہو جائے گا؟ یا پھل میں کیڑا پڑ گیا اور پھل ختم ہو گیا۔ اس کے باوجود کوئی سالوں تک پیشگی سودے کر لیتے ہیں یہ حرام ہے اور کسی امام کے نزدیک اس کے اندر گنجائش نہیں ہے۔

اندازہ کر کے فصل بیچنا خریدنا:

اسی طرح ہمارے ہاں کپاس کی فصل لگی ہوتی ہے۔ لوگ آ کر اندازہ کر کے خرید لیتے ہیں۔ یہ بھی حرام اور شریعت میں ناجائز ہے؛ کیونکہ کوئی پتہ نہیں اتنی فصل اترے گی یا نہیں اترے گی؟ اسلام کسی کو نقصان دے کر نہیں مارنا چاہتا۔ اسلام کہتا ہے: وزن کرواور لے لو۔

امام ابوحنیفہ ﷫ کی کپڑے کی تجارت میں احتیاط:

امام ابوحنیفہ ﷫ کی کپڑے کی بہت بڑی تجارت تھی۔ آپ نے ملازم سے کہا کہ فلاں کپڑے پر فلاں جگہ یہ عیب ہے۔ جب کپڑا بیچنا ہو تو خریدار کو دکھا دینا کہ یہ عیب ہے، اس کی کم قیمت ہے۔ تم لینا چاہتے ہو تو لے لو۔ امام صاحب نے اس ملازم سے پوچھا: میں نے تم کو کپڑے کے بارے میں بتایا تھا تو تم نے آگے اس کا عیب بتایا تھا؟ اس نے کہا: اصل میں کچھ لوگ آئے تو انہوں نے بند تھان خرید لیے اور مجھے بات یاد نہیں رہی، میں نے بھول کر اس کو ایسے ہی بیچ دیا تھا۔ آپ نے فرمایا: جتنی بکری ہوئی ہے سب خیرات کر دو۔ میرے گھر میں ایسا پیسہ مت لے آؤ جس میں حرام مل گیا ہے۔

حاجی امداداللہ صاحب ﷫ کا واقعہ:

حضرت مولانا حاجی امداداللہ مہاجر مکی ﷫ مکہ سے مدینہ کے سفر میں اونٹوں پر جا رہے تھے۔ ایک دوست نے آ کر عرض کیا: میرا یہ خط مدینہ شریف میں فلاں آدمی کو پہنچانا ہے۔ اگر آپ لے جائیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ حاجی صاحب نے فرمایا: جی مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن تم مہربانی کرو اور یہاں تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ اونٹ والا مالک آ جائے، اس سے بات کر لیتے ہیں، پھر میں آپ کا یہ خط لے جاؤں گا۔ اس آدمی نے کہا: حضرت! اونٹ والے کے ساتھ میرے خط کا کیا تعلق ہے؟ فرمایا: جب میں نے اونٹ والے کے ساتھ کرایہ طے کیا تھا اور اپنا سامان اس کو دکھایا تھا اس میں تمہارا خط شامل نہیں تھا۔ اب اگر اس کے اونٹ پر اتنا وزن بڑھ گیا تو قیامت میں کون

جواب دے گا؟

یہ احتیاط ہوتی تھی اور ہماری تو اس میں بہادری ہوتی ہے کہ بیس کلو کی بجائے چالیس کلو لے جائیں۔

مالِ غنیمت میں احتیاط:

ایک آدمی حضور اکرم ﷺ کے ساتھ میدانِ جہاد میں شریک تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب اس کی بہادری کو دیکھا تو سب نے کہا کہ اس نے آج کمال کر دیا ہے۔ اتنا بے جگری سے لڑا ہے کہ اس کے لیے جنت کے دروازے کھل گئے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ غصہ میں آگئے اور فرمایا: میں نے دیکھا ہے کہ اس کے سر پر آگ جل رہی ہے۔ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم خاموش ہو گئے۔ جب جنگ ختم ہوگئی تو معلوم ہوا اس نے مالِ غنیمت کی ایک لحاف چرائی تھی، اس کی وجہ سے عذاب میں آگیا۔

اس سے اندازہ کریں کہ ہماری ہر چیز حلال ہے یا نہیں ہے۔ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ پیر اور مولوی کی اولاد اکثر بگڑ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم لوگوں کا پیسے کا معاملہ مشتبہ ہوتا ہے۔ مثلاً: آپ نے مجھے پیسے دیئے اور کہا: ہدیہ ہے۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ کبھی آپ نے مجھے پیسے دیئے اور کہا: مہربانی کر کے میری طرف سے خیرات کر دیں، میں خیرات کرتا رہا اور کچھ پیسے میرے پاس رہ گئے اور بھول گئے یا ذاتی معاملات میں خرچ ہو گئے تو زکوۃ خیرات ہمارے پیٹ میں آگئی، جبکہ ہم اس کے مستحق نہیں تھے۔ جب اس مالِ مشتبہ سے ہمارے بچے جوان ہوتے ہیں تو صاف بات ہے ان کی اصلاح بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور اپنے خزانۂ غیب سے جن کے ہم نے حقوق ادا کرنے ہیں عطا فرما دیں اور ہمیں ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس بندہ پر قرضہ ہو پہلے دینے کی نیت کرے۔ جب تک قرضہ ادا کرنے کی نیت نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں آتی ہے۔ جب نیت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے قرضہ کی ادائیگی کے اسباب پیدا فرما دیں گے۔

سود کی ہولناکی:

ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اَلرِّبَا ثَلَاثَةٌ وَ سَبْعُوْنَ بَابًا'' سود کے تہتر دروازے ہیں، یعنی ربوا اتنی بری چیز ہے۔ [المستدرک للحاکم، التفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱۰]

دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں: ''اَلرِّبٰوا سَبْعُوْنَ جُزْءًا أَيْسَرُهَا أَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهُ'' کہ سود کے ستر جزء (باب) ہیں گناہوں کے اعتبار سے اور سب سے کم درجہ کا گناہ یہ ہے کہ جیسے کوئی آدمی اپنی ماں سے زنا کرے۔
[مشکوٰۃ المصابیح، رقم: ۲۸۲۶]

فقہ حنفی پر تہمت اور اس کی حقیقت:

بعض لوگ غلط فہمی کی بنا پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مسئلے کو بڑا اچھالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ کہتے ہیں: ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ جس شخص نے اپنی ماں سے زنا کیا اس پر حد نہیں ہے۔ حالانکہ یہ اعتراض کرنے والوں کی جہالت ہے؛ کیونکہ عورت سے زنا کرنے کی حد ہے، لیکن جب معاملہ ماں کے ساتھ آجائے تو وہ قتل کیا جائے گا، اس کو حد یعنی سو بید نہیں لگیں گے، بلکہ ایسا بدبخت زندیق اور کافر ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب آگ پیدا کی تو مثلاً: اس کی شدتِ حرارت سو ڈگری تھی: ننانوے ڈگری جہنم میں محفوظ ہے، صرف ایک جز دنیا میں آیا ہے، جس سے یہ ساری آگ روشن ہے۔ جب جہنم میں آگ سو ڈگری پر ہوگی تو اس آگ کی شدت کیا ہوگی؟ اب سمجھیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سود کی سزا کے تہتر دروازے ہیں اور کم سے کم گناہ ایسا ہے جیسے کسی شخص نے اپنی ماں کے ساتھ زنا کیا ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہر مسلمان کو سود کی جمیع اقسام سے اپنی رحمت سے حفاظت فرمائیں۔ آدمی اگر نیت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو بچا لیتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يَأْكُلُوْنَ فِيْهِ الرِّبٰوا'' لوگوں پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ ربوا کھائیں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا سب کے سب لوگ ربوا کھائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب کے سب کھائیں گے، لیکن جو ربوا نہیں کھائے گا، کم از کم اس کے ناک میں اس کے دماغ میں ربوا کا دھواں تو ضرور پہنچ جائے گا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱۰]

اسی سے علماء نے لکھا ہے کہ جو چیزیں تمہیں حرام تک لے جانے والی ہیں وہ بھی حرام ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر لوگوں کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: سود حرام ہے، خمر حرام ہے اور خمر کی تجارت بھی حرام ہے؛ کیونکہ ''ثَمَنُ الْحَرَامِ حَرَامٌ'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت کرے! جب اللہ تعالیٰ نے ان پر چربی کھانا حرام

کر دیا تو وہ چربی نہیں کھاتے تھے، اس کا گھی بنا کر اس کو بیچ کر پیسے کھا جاتے تھے۔

جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا ہے، لیکن اگر وہ دوبارہ شادی کرنا چاہے تو اسلام کہتا ہے کہ حلالہ کرائے۔

اب بعض لوگ کسی کے پاس آجاتے ہیں کہ ایک ہزار روپے لے لو اور میری بیوی کے ساتھ نکاح کرلو اور صبح اس کو طلاق دے دینا۔ تو فرمایا: لینے والے پر بھی لعنت ہے اور دینے والے بھی لعنت ہے؛ کیونکہ اسلام نے بندے کو سانڈھ نہیں بنایا کہ کرایہ پر چلتا رہے، بلکہ عورت اپنی منشاء سے دوسری جگہ شادی کرے، پھر اگر خدانخواستہ دوسرا شوہر بھی طلاق دے دے تو پھر عدت گزار کر پہلے خاوند کے گھر آسکتی ہے۔ یہ نہیں کہ آدمی ڈھونڈ کر اور ایک رات کے لیے نکاح کرادیا۔ (اگرچہ اس طرح بھی نفس حلت حاصل ہوجائے گی؛ کیونکہ قرآن پاک کے ظاہر مقتضی پر عمل ہوا ہے)۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سود کھانے والے پر بھی لعنت کی ہے، اس کے لینے والے پر بھی لعنت کی ہے، ربوا کے معاملے میں جو گواہی دے اس پر بھی لعنت کی ہے اور ربوا کے معاملات میں جو کتابت کرے اس پر بھی لعنت ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کوئی ہمارے پاس آیا کہ ہمارا یہ کنٹریکٹ لکھ دو تو ہم ظاہر کو دیکھیں گے، ہمیں باطن کا کیا پتہ ہے؟ اور اگر ہمیں پتہ لگ جائے تو یہ ربوا کا کاروبار ہے۔ تو پھر لکھنے والے پر بھی لعنت آجائے گی۔

اللہ تعالیٰ تمہارے اموال اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ تم نے یہ عمل کتنی صحیح نیت سے کیا ہے۔

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ [البقرة:۲۷۶،۲۷۷]

''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ کسی ناشکر گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔ بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انیک اعمال کیے اور نماز کی پابندی کی اور زکوۃ ادا کی ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے۔ اور ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔''

سود کی مذمت:

سورۃ البقرۃ، سورۃ آلِ عمران اور سورۃ النساء میں تقریباً دس آیات ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے سود کی حرمت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ اور حضور اکرم ﷺ کی چالیس احادیث مبارکہ ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی زبان مبارک سے سود کی حرمت اور اس کے گناہ اور سود پر عذاب دینا اور عذابِ آخرت کا ذکر فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم سود کو مٹا دیتے ہیں، یعنی یا تو بالکل سود خور کا سب کچھ برباد ہو جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ اس کے مال سے برکت اٹھا لیتے ہیں، اب وہ اپنے اس مال سے نفع نہیں اٹھا سکتا۔ جیسا کہ بعض بڑے آدمی ہوتے ہیں، ان کو کوئی مرض لگ گیا، کسی کو شوگر لگ گیا، کسی کو کینسر لگ گیا اور کسی کو بلڈ پریشر لگ گیا، اس کے پاس ساری نعمتیں ہیں، لیکن ان سے نفع نہیں اٹھا سکتا، ان کو کھا نہیں سکتا ہے، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو دنیا میں بھی مٹا دیتے ہیں اور آخرت میں زیادہ عذاب دیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کبھی پلید اور پاکیزہ چیزیں برابر نہیں ہو سکتیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کو ایسی سزا دیں گے کہ ایک کو دوسرے پر رکھ کر جہنم میں ڈال دیں گے، چونکہ اصل سزا کا مقام دارِ آخرت ہے، دنیا تو دار العمل ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جیسا کہ تم نے لوگوں کو ربوا کے لیے مال دیا کہ میرا مال بڑھ رہا ہے اور اصل بھی محفوظ ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لوگوں کے ہاں بڑھ رہا ہے، میرے ہاں نہیں بڑھ رہا ہے، بلکہ میرے ہاں تو برباد ہو رہا ہے۔

قرآن نے دوسرے مقام پر فرمایا کہ کبھی تمہیں حرام چیز بہت زیادہ نظر آتی ہے، چاہے وہ عدد کے اعتبار سے زیادہ ہو، لیکن حقیقت کے اعتبار سے کم ہوگی۔

سود کا انجام ہلاکت اور قلتِ مال ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سود چاہے تمہیں جتنا بڑھتا نظر آئے اس کا انجام ہلاکت ہے۔
[مسند احمد: ۱/۳۹۵]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سود کا معاملہ چاہے تمہیں کتنا بڑھتا ہوا نظر آئے، لیکن اس کا انجام قلت اور خرابی ہے۔ [ابن ماجہ: رقم: ۲۲۷۹]

غلہ کی ذخیرہ اندوزی کا حکم:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں باہر نکلے تو دیکھا کہ باہر غلہ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا: بعض تاجر مسلمانوں کے پاس غلہ بیچنے کے لیے لائے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ ان کے مال اور رزق میں برکت دے کہ مسلمانوں کے لیے ایسی چیزیں دوسرے ملکوں سے خرید کر لاتے ہیں، تاکہ مسلمان فائدہ اٹھائیں۔ ایک آدمی نے کہا: اے امیر المومنین! یہ تو احتکار ہے۔

(احتکار کہتے: مثلاً: گندم اترنے کا وقت آگیا، لازمی بات ہے۔ اس وقت گندم سستی ہوتی ہے؛ کیونکہ ہر جگہ گندم موجود ہے تو بعض بدنیت تاجر گندم خریدنے کے بعد ذخیرہ کر لیتے ہیں اور جب لوگوں کو ضرورت پڑی اور گندم ختم ہوگئی، ان تاجران نے کہا: اب گندم مارکیٹ میں لے آؤ اور اس کو مہنگا کر کے بیچو۔ اس احتکار کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے)۔

آپ نے فرمایا: کیا مطلب؟ انہوں نے خرید کر روکی ہوئی تھی کہ جب لوگوں کو مجبوری پڑے گی ہم میدان میں لے آئیں گے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تاجران کون ہیں؟ لوگوں نے کہا: ایک آپ کا ملازم ہے اور ایک حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ملازم ہے۔ آپ نے ان دونوں کو بلوایا اور ان سے پوچھا: یہ تم نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے کہا: آپ ہمیں کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟ ہم نے اپنے پیسے سے یہ چیز خریدی ہے اور اب بیچ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تمہیں یہ حدیث نہیں پہنچی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو بندہ احتکار کرے مسلمانوں کا رزق خرید کر کے روک لے، تاکہ مہنگا بیچوں اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں دو عذاب دیتے ہیں: 1 ...... ایک اس کو بھوکا کر دیں گے اور 2 ...... دوسرا اس کو کوڑھ کی بیماری ڈال دیں گے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے غلام نے کہا: آپ گواہ ہو جائیں اور امین۔ اللہ تعالیٰ کو بھی گواہ بناتا ہوں کہ میں قیامت تک یہ کام نہیں کروں گا، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے غلام نے کہا: میں نے اپنے پیسوں سے یہ چیز خریدی ہے اور اس کو بیچ رہا ہوں۔ اس میں کیا احتکار ہے؟ اس طرح وہ بہانہ بنا گیا۔

راوی کہتے ہیں کہ میں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ غریب ہوگیا اور کوڑھ کی بیماری اس کے بدن پر آگئی کہ اس نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تو اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آگیا۔

آج تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بیماری اس لیے لگ گئی کہ پانی صاف نہیں تھا، یہ موٹروں کے دھوئیں نے آلودگی پھیلا دی ہے اور اوزون میں سوراخ ہوگیا ہے، درجہ حرارت بڑھ گیا ہے۔ یہ عام لوگوں کی نظر ہے، جو اسباب پر جاتی ہے۔ اور مومن کی نظر مسبب الاسباب تک جاتی ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کبھی اللہ نے کوئی عذاب نازل نہیں کیا، مگر تمہارے گناہ کی وجہ سے۔ اور وہ بلا نہیں ٹلے گی مگر توبہ کے ساتھ۔ آج ہم اشتہار بنا کر توبہ کرتے ہیں، جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور مزید اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے۔

ہر قسم کے صدقات اور ان کا ثواب:

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل فرمائی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ وَلَا يَقْبَلُ اللهُ إِلَّا الطَّيِّبَ، فَإِنَّ اللهَ يَتَقَبَّلُهَا بِيَمِينِهِ ثُمَّ يُرَبِّيهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا يُرَبِّي أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ حَتَّى يَكُونَ مِثْلَ الْجَبَلِ '' جس آدمی نے ایک کھجور کے برابر صدقہ کیا، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ کھجور حلال کی تھی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ صدقہ قبول نہیں فرماتے جب تک کہ وہ پاکیزہ نہ ہو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاکیزہ ہے اور وہ پاکیزہ چیزوں کو قبول فرماتے ہیں۔ جب آدمی ایک کھجور کا صدقہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے داہنے ہاتھ سے جیسے اس کی شان کو زیبا ہے قبول فرماتے ہیں، پھر اس کو بڑھاتے ہیں جیسے تم اپنے کسی جانور کے بچے کو پالتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو پہاڑ کے برابر بڑھا دیتے ہیں۔ [صحیح البخاری: رقم: ۱۴۱۰، ۷۴۳۰]

اس لیے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جب بھی خیرات کریں تو خالص حلال سے کریں ایک کھجور کا دانہ بھی۔ اگر اتنی توفیق بھی نہیں ہے تو ایک گلاس پانی کا بھر کر کسی کو پلا دیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر کسی کو اتنی توفیق بھی نہیں ہے تو اپنے مسلمان بھائی کو مسکرا کر مل لے یہ بھی صدقہ ہے۔

اس لیے شریعت کے اندر حکم ہے کہ آدمی جس کو جانتا ہو اور جس کو نہ جانتا ہو اس کو سلام کہے، خاص طور پر جو لوگ غریب ہیں، فقیر اور معذور ہیں، جن پر کوئی سلام کرنا بھی نہیں چاہتا، ایسے لوگوں پر بھی سلام کہو۔

زکوٰۃ وصدقات یہ خالص مالی عبادت ہے، حج مشترک ہے: اس میں مال بھی خرچ ہوتا ہے اور بندے کا بدن بھی خرچ ہوتا ہے۔ اور نماز میں بدن خرچ ہوتا ہے۔

ایصالِ ثواب:

جتنی عباداتِ مالیہ ہیں والدین، رشتہ داروں اور اپنے اساتذہ کے لیے خیرات کرنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب کے نزدیک ثواب اور اجر ہے۔ اسی طرح اولاد کا والدین کے مرنے کے بعد ان کے لیے دعا کرنا اس میں بھی کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ اولاد کو چاہیے کہ اگر والدین فوت ہو گئے ہیں تو ان کے لیے دعا کریں۔ اگر تھوڑا سا اختلاف ہے تو وہ قراءتِ قرآن میں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اس کے ثواب کے قائل نہیں ہیں، لیکن احناف اس کے بھی قائل ہیں۔

سوال و جواب:

بہر حال جب خیرات کرنے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے تو قل خوانی کے بارے میں کہتے ہیں کہ نہ کرو تو اس کی کیا وجہ ہے؟ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے جو تیسرے دن قل خوانی اور سات جمعراتیں متعین کر دی ہیں، حالانکہ ہمیں تعین کا اختیار نہیں تھا۔ یہ بدعت ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر حلال اور طیب مال نہ ہو تو اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتے۔ اب بندہ مر گیا، اس کے مرنے کے بعد جائیداد وارثوں کی ہے۔ ابھی جائیداد وارثوں میں تقسیم نہیں ہوئی اور ان وارثوں میں ابھی بعض بچے نابالغ ہیں، وہ جب تک بالغ نہ ہوں ان کے مال سے خیرات کرنے کے بارے میں آپ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ آدمی کے مرنے کے بعد جو خیرات کر رہے ہیں، یہ اگر میراث سے ہے تو کیا سارے وارث راضی ہو کر خرچ کر رہے ہیں؟ اگر ایک آدمی بھی راضی نہیں تب بھی حرام ہے۔ اس لیے علماء نے منع فرما دیا کہ ثواب بھی نہ ہو اور ہزاروں روپے خرچ کر دو ٹھیک نہیں ہے۔ جب ثواب نہ ہو تو گویا ہم نے مال کو ضائع کر دیا، اس طرح ہم اور گناہ کے مرتکب ہو گئے۔ اس لیے منع فرما دیا اور کہا: اگر تم نے خیرات کرنی ہے تو ہر وارث اپنے حصہ میں سے جب چاہے جتنا چاہے خیرات کر دے، یا جب جائیداد تقسیم ہو جائے تو مشترکہ طور پر اپنے والدین کو ثواب پہنچانے کے لیے کوئی ٹھوس چیز بنا دیں، جو ہمیشہ قائم رہے، کوئی مدرسہ بنا دیں، کوئی پانی وغیرہ کا انتظام کر دیں، تاکہ وہ ان کے لیے صدقہ جاریہ رہے۔ اس کے اندر کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔

صدقہ کرنے کی فضیلت:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقْبَلُ الصَّدَقَةَ وَ يَأْخُذُهَا بِيَمِينِهِ فَيُرَبِّيهَا لِأَحَدِكُمْ كَمَا يُرَبِّي أَحَدُكُمْ مُهْرَهُ أَوْ فَلُوَّهُ حَتَّى إِنَّ اللُّقْمَةَ لَتَصِيرُ مِثْلَ أُحُدٍ'' کہ بندہ صدقہ کرتا ہے تو اللہ پاک اس کو قبول فرماتے ہیں اور دائیں ہاتھ میں لیتے ہیں اور اس کو پالتے ہیں، جیسے تم میں سے کوئی اپنے کسی بچھڑے کو پالتا ہے۔ دوسری روایت میں ہے: اگر کوئی آدمی ایک لقمہ بھی خیرات کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتا ہے، جیسا کہ اس کی شان کو زیبا ہے، اللہ کے ہاتھ میں وہ لقمہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ احد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرماتے ہیں۔ پس تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیرات کیا کرو۔

[السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴/۱۷۶]

سود کا انجام اور مومنین کی تعریف:

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ [البقرۃ:۲۷۶] اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند نہیں فرماتے جو دل کا بھی ناشکرا ہو اور زبان بھی گناہگار ہو۔ مفسر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ اس آیت کو ان الفاظ ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ پر ختم کیا، چونکہ سود کا کام کرنے والا اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی نہیں ہوتا۔ اگر وہ راضی ہوتا تو وہ حرام کے طریقے اختیار نہ کرتا، لوگوں کے مال دھوکے سے نہ کھاتا۔ جس میں سب سے برا اور خبیث ربوا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار ہے اور ایسا آدمی بہت بڑا ظالم ہے اور اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدح بیان فرماتے ہیں جو ایمان والے ہیں، اپنے رب کے احکامات پر عمل کرنے والے، اپنے رب کی نعمتوں کا شکر کرنے والے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر صدقات و خیرات سے احسان کرنے والے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خبر دی ہے کہ ہم نے تمہارے لیے کیا کیا انتظامات کر رکھے ہیں کہ قیامت کے دن جو پریشانیاں ہوں گی وہ اس سے بے غم ہوں گے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [البقرۃ:۲۷۷] جو لوگ ایمان لائے اور ایمان لانے کے بعد اچھے عمل بھی کیے: نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کی، ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، وہ غمگین نہ ہوں گے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَ اتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾﴾

[البقرة:۲۷۸تا۲۸۱]

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ (سود کا) بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ اگر تم (ایسا) نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان ہے سن لو۔ اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تمہیں تمہارے اصل اموال مل جائیں گے، نہ تم زیادتی کرو اور نہ زیادتی کیے جاؤ۔ اور اگر کوئی تنگ دست ہو تو آسودگی تک مہلت دینے کا حکم ہے اور یہ کہ معاف کر دو تو یہ تمہارے بہتر ہے اگر تم کو خبر ہو۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کے سامنے پیش کیے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کے عمل (خیر وشر) کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔“

تقویٰ کا حکم:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے پھر تنبیہ فرمائی کہ ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ سنت اللہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کسی کام سے منع کرتے ہیں تو ان کو تقویٰ کا حکم دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ جب اللہ تعالیٰ سے ڈر دل میں پیدا ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم پر چلنا مشکل نہیں ہوتا اور جب اللہ تعالیٰ کا ڈر دل میں نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کے احکامات پر چلنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ پورے قرآن میں غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کو چلانے کے لیے اہم چیز تقویٰ کا حکم فرمایا ہے۔

اطاعت کے لیے دو چیزیں شرط ہیں:

ہمیشہ یاد رکھیں! آپ دنیا میں کوئی قانون بنا دو، اس قانون پر چلنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے:

1 ...... ایک تو جس نے قانون بنایا ہو اس آدمی سے محبت ہو 2 ...... اور دوسرا دل میں اس کی عظمت ہو۔ یہ دو چیزیں آ جائیں تو پھر کسی پہرہ دار کی اور کسی پولیس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بیعت کی اقسام:

اس لیے علماء نے بیعت کا سلسلہ رکھا ہے، ورنہ بیعت ہونا کوئی فرض نہیں ہے، صرف درجہ استحباب کے اندر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی آدمی کا اللہ والے سے تعلق جڑ جائے اور وہ اس کی بات کو مانے، ورنہ اگر کسی نے بیعت نہیں کی تو کوئی بات نہیں۔

- ......حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں ایک بیعت علی الاسلام تھی کہ کفر سے نکل کر اسلام میں آجاؤ۔
- ......اور ایک بیعت علی الجہاد تھی کہ حضور پاک ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ میرے ہاتھ پر آ کر بیعت کرو، ہم کفر کا مقابلہ کرتے ہیں۔
- ......اسی طرح ایک بیعت ہے علی السمع والطاعۃ کہ ہم ہر لحاظ سے آپ کی بات سنیں گے اور فرمانبرداری کریں گے، چاہے لاکھ دکھ سکھ ہو۔

انہی ساری بیعتوں کو سامنے رکھ کر بزرگوں نے ایک راستہ نکالا کہ جب بندے کا کسی سے استاد شاگردی کا تعلق بن جاتا ہے یا پیری مریدی کا تعلق بن جاتا ہے تو اس سے آدمی کو دل میں محبت ہوتی ہے اور عظمت بھی ہوتی ہے۔ اس کی بات کو سنتا بھی ہے اور مانتا بھی ہے۔

جیسے ڈاکٹر امراضِ جسمانی کا علاج بتاتے ہیں کہ آپ یہ گولی کھایا کریں، یہ انجکشن لگوایا کریں۔ اسی طرح ہمارے امراضِ روحانی کے لیے ایک راستہ نکالا ہے؛ کیونکہ جب آدمی کا کوئی استاد ہو تو لازمی بات ہے دل میں اس کی عظمت بھی ہوگی اور ان سے محبت بھی ہوگی۔ اسی طرح اپنے مرشد سے، پیر سے اور شیخ سے محبت ہوتی ہے، لیکن اب تو رواج بن گیا ہے کہ پیر کا بیٹا پیر ہے، چاہے نماز بھی نہ پڑھے۔ کسب معاش کا طریقہ بن گیا ہے کہ جتنے بزرگانِ دین فوت ہو گئے ان کے بعد جو لوگ آئے وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور کہا کہ ہم بھی مرشد کے بیٹے ہیں، چاہے وہ خود اللہ کے بھی نافرمان ہوں اور اپنے باپ دادا کے بھی نافرمان ہوں، جبکہ اللہ کے ہاں نبی کے بیٹے کو نہیں پوچھا اگر عمل اچھے نہ ہوں۔ نوح علیہ السلام کا بیٹا نبی کا بیٹا ہے، جہنم میں چلا گیا۔

سود کی حرمت کا اعتقاد رکھنے کا حکم:

علماء نے فرمایا ہے: اگر کوئی آدمی اعتقاد سے سود لینے کو حرام نہیں سمجھتا ہو وہ بالاتفاق کافر ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے

سود کو حرام کیا اور وہ کہتا ہے: حلال ہے۔ تو وہ منکرِ قرآن ہے اور خدا کے حرام کو حلال کہہ رہا ہے، اس لیے اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک آدمی سود کو حرام کہتا ہے اور اس کو بہت بڑا گناہ سمجھتا ہے، لیکن پھر بھی سود لیتا دیتا ہے۔ اب یہ آدمی فاسق تو کہلائے گا اور بار بار اس جرم کو کرنے کی وجہ سے فاجر بھی بن جائے گا، لیکن کافر نہیں بنے گا؛ کیونکہ وہ کہتا ہے: حرام تو ہے۔

اسی طرح بعض مسلمان ایسے ملکوں میں ہیں کہ اس ملک کا سارا اقتدار کافروں کے ہاتھ میں ہے۔ مثلاً: کوئی یورپ میں رہتا ہو، انڈیا میں رہتا ہو، اب وہاں اگر انہوں نے کوئی ایسا قانون نافذ کر دیا کہ آپ گاڑی خرید نہیں سکتے، جب تک کہ انشورنس نہ کروائیں، اب وہ مجبور ہے۔ تو یہ اضطراری حالت ہے۔

اسی طرح وہ بینک میں پیسے رکھتا ہے کہ گھر میں چوری ہو جائیں گے۔ وہاں کرنٹ اکاؤنٹ ہوتا ہے یا سیونگ اکاؤنٹ ہوتا ہے۔ کرنٹ اکاؤنٹ یہ ہے کہ آپ لاکھوں روپے رکھ لیں، سود نہیں ملے گا۔ جتنے پیسے آپ نے رکھے ہیں اتنے پیسے آپ کو ملیں گے۔ یہ رکھنا بالاتفاق جائز ہے؛ کیونکہ گھر میں حفاظت کا انتظام نہیں ہو سکتا، ہم مجبور ہیں اور ہمارے ملکوں میں اسلامی قانون نہیں ہے تو بغیر کسی اختلاف کے پیسے رکھ سکتے ہیں۔

بعض ملک ایسے ہیں کہ وہاں جتنا پیسہ رکھو، چاہے کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھو تب بھی سود ملتا ہے، چاہے کم ملتا ہے۔ تو وہاں علماء نے فرمایا کہ سود کی رقم بینک والوں سے لے لو؛ کیونکہ اگر ان کو چھوڑ دو گے تو تم گویا ان کی مدد کر رہے ہو، گناہ گار بنو گے، بلکہ ان سے پیسے لینے کے بعد بغیر ثواب کی نیت کے غریبوں پر خرچ کر دو۔

آیات مبارکہ کا شان نزول:

ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ دو قبیلے تھے: بنی عمرو بن عمیر، یہ بنو ثقیف کہلاتے تھے۔ اور ایک بنو مغیرہ قبیلہ تھا، جو بنو مخزوم کہلاتے تھے۔ یہ دونوں بڑے معروف قبیلے گزرے ہیں۔ ادب کے اعتبار سے بھی یہ بڑے قبیلے تھے اور بہادری کے اعتبار سے بھی یہ بڑے مشہور تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ سود کا کاروبار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور یہ اسلام میں داخل ہو گئے تو بنو ثقیف کا جو سود بنتا تھا انہوں نے دوسرے قبیلے سے کہا: ہمیں وہ سود دے دو۔ دوسرے قبیلے والوں نے کہا: اب ہم سود کیسے دیں؟ ہم تو اسلام میں داخل ہو گئے۔ اسلام کی حالت میں جو ہم نے پیسہ کمایا ہے وہ ہم کفر والے زمانے کا سود کیوں ادا کریں؟ (ان کو یہ پتہ نہیں تھا کہ سود حرام ہے، وہ

اپنے دماغ میں سوچ رہے تھے) تو ان دونوں قبیلے والوں نے حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: جو اس وقت حضور اکرم ﷺ کی طرف سے مکہ میں نائب تھے، انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں خط لکھا کہ آپ ﷺ حکم فرمائیں کہ میں کیا فیصلہ کروں؟ حضور اکرم ﷺ نے یہی آیت مبارکہ لکھ کر بھیجی کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اگر ایمان والے ہو تو سود چھوڑ دو۔ جب یہ آیت مبارک ان کو سنائی گئی تو وہ کہنے لگے: ''نَتُوبُ إِلَى اللهِ'' ہم توبہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں۔ ہمارا جتنا سود بنتا ہے آج کے بعد سب ختم ہے۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس آیت سے اور بڑی تہدید اور وعید کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اگر تم سود کو نہیں چھوڑتے ہو تو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اللہ اور اللہ کے رسول سے جنگ کون کر سکتا ہے؟ مسلمان تو اللہ اور اللہ کے رسول کی نافرمانی نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ جنگ لڑے گا۔ تو وہ جو کافر ہے، جو قومیں اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں ان کا انجام بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

روس کا باطل نظام کمیونزم:

اب دیکھیں کہ روس میں کمیونزم نے کس طرح دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا؟ یہ قاعدہ وضابطہ ہے کہ باطل فرقہ اور باطل نظریہ جب اٹھتا ہے تو دنیا پر چھا جاتا ہے۔ اسی طرح روس نے آدھی دنیا سے زیادہ کو کمیونسٹ بنا دیا کہ قرآن کے منکر، نبی کے منکر، رسالت کے منکر اور شریعت کے منکر ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنا نیا نظام برپا کر دیا کہ ہم تو غریبوں کی بہبود کے لیے کام کرتے ہیں کہ کوئی آدمی بڑا نہیں، کوئی جاگیردار نہیں، سب سے چھین کر سب کو دے دو۔ سب کماؤ اور سب کھاؤ اور برابر رہو۔ اس کا انجام یہ نکلا کہ وہ روس ستر سال کے بعد ختم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور ستر سال کے بعد ان کو خود کہنا پڑا کہ ہماری بات غلط تھی۔

اسلام نے چودہ سو سال پہلے سے جو احکام جاری کیے ہیں مجال ہے کہ ذرہ برابر بھی ان میں تبدیلی آئی ہو۔ ساری دنیا لوٹ کر پھر اسلام کو مان رہی ہے؛ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کبھی بدلا نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہمیشہ قائم دائم ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

سودی نظام کی خرابیاں:

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهِ ۚ﴾ اگر تم مومن بن کر میرے حکم پر نہیں چلتے ہو، سود نہیں چھوڑتے ہو، میں تو غنی ہوں، اگر تم سود نہیں چھوڑو گے تو ہم تمہیں اللہ اور اللہ کے رسول سے جنگ کی خبر دیتے ہیں۔

یہ جو بینکوں والے کہتے ہیں کہ یہ حکم بڑا مشکل لگتا ہے، ہم سود کو کیسے چھوڑ دیں؟ ہم نے لاکھوں لوگوں سے پیسہ لینا ہے۔ اگر ہم ان لوگوں کو چھوڑ دیں تو ہمارے بینک برباد ہو جائیں گے، ہمارا تو دیوالیہ نکل جائے گا، حالانکہ یہ سب سے بڑے مکار ہیں، جھوٹ بولتے ہیں۔ یاد رکھیں! جتنے بڑے بڑے بینکر ہیں، یہ تمہارے خون سے ہولی کھیلتے ہیں۔ جب یہ بینک کھولتے ہیں مثلاً: انہوں نے بیس کروڑ ڈالا ہے تو ایک مہینہ کے اندر اپنا پیسہ نکال لیتے ہیں، پھر تمہارا پیسہ ہوتا ہے، جس سے ہولی کھیلی جا رہی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سود اس لیے حرام کیا ہے کہ سینکڑوں لوگ کروڑوں کا خون چوس لیں گے، باقی دنیا عذاب میں ہوگی۔ اس لیے آج دیکھ لیں کہ یہودیوں کے ہاتھ میں لیور آف اکانومی ہے۔ وہ جس ملک کو چاہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو سود حرام کیا ہے، اس کے اندر اس کی حکمتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے خنزیر حرام کیا ہے، اس کے اندر حکمت رکھی ہے کہ خنزیر کھانے سے میرے بندے کے اندر بے غیرتی آئے گی، انسانیت ختم ہو جائے گی، اس سے میرے بندے کو کینسر ہوگا، خنزیر کھانے سے میرے بندے کو باطنی امراض ہوں گے اور خنزیر والی عادات آئیں گی۔ آج چودہ سو سال بعد یورپ نے تسلیم کیا ہے کہ خنزیر کھانے کے اندر یہ اور یہ نقصانات ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم سود نہیں چھوڑو گے تو تمہارا اللہ اور اللہ کے رسول سے اعلانِ جنگ ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ کوئی بندہ اللہ اور اللہ کے رسول سے جنگ تو نہیں جیت سکتا۔ آپ دیکھ لیں کہ جو آدمی ظاہری طور پر بڑے فیشن کرتا ہے ان کے اندر کچھ نہیں ہوتا، اس کے اوپر قرضہ ہی قرضہ اور لعنت ہی لعنت ہوتی ہے۔

اس کا علاج بتا دیا: ﴿وَاِنْ تُبْتُمْ﴾ کہ تم توبہ کر لو۔ ایک ہم توبہ کرتے ہیں جو زبان سے ہوتی ہے۔ یہ توبہ توبہ نہیں، یہ مذاق ہے۔ توبہ کا معنی ہے کہ گناہوں کو چھوڑ دو اور اس پر نادم ہو جاؤ اور آئندہ نہ کرنے کا وعدہ کرو کہ پھر کبھی یہ گناہ نہیں کریں گے۔ اور جب ان تین باتوں میں سے ایک بھی نہ ہو تو وہ توبہ نہیں ہوتی۔

﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کے تفسیری اقوال:

﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "فَاْذَنُوْا" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ یقین کر لو کہ تم اللہ تعالیٰ کے دشمن ہو۔ جو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی مول لے رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن سود خوروں کو حکم دیں گے: اٹھاؤ اپنے ہتھیار اور میرے ساتھ لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ سے کون لڑ سکتا ہے؟

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کوئی مسلمان اسلامی حکومت کے اندر سود کھانے پر جما ہوا ہے تو امیر المومنین کو حق حاصل ہے کہ اس کو بلا کر کہیں کہ سود سے توبہ کرو۔ اگر وہ توبہ کرے تو ٹھیک ہے اور اگر توبہ نہ کرے تو اس کو قتل کر دے؛ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے جنگ لڑ رہا ہے۔

حضرت ہشام بن حسان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن اور حضرت ابن سیرین رحمہما اللہ فرماتے تھے کہ یہ جو پیسے کی تبدیلی والے لوگ ہیں یہ بھی سود کے اندر مبتلا ہیں۔ کاش! مسلمانوں کے اوپر کسی عادل بادشاہ کی حکومت ہوتی تو اس کا فریضہ تھا کہ ان کو بلا کر توبہ کرائے۔ اگر یہ توبہ نہ کریں تو ان کے خلاف جنگ لڑے اور ان کو سزا دے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے وعید بیان فرمائی ہے کہ ان کی سزا قتل ہے۔ مسلمانو! خبردار! خیال رکھنا! کسی سودی معاملہ کے اندر نہ پڑنا۔ اللہ تعالیٰ نے حلال کے طریقے بڑے وسیع فرما دیئے ہیں۔ اگر تمہیں کبھی غریبی پیش آجائے تو حرام کے اندر نہ پڑ جانا۔ اب بھی دنیا کے اندر دیکھ لیں کہ اگر دنیا میں سود کھانے والے ہیں تو ایسے بھی ہیں ایمان والے ہیں، جو سود نہیں کھاتے۔ ان کے بھی تو معاملات چل رہے ہیں۔ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ سود کے بغیر ہمارا معاملہ نہیں چل سکتا اور سود کے بغیر ہمارا کاروبار نہیں ہو سکتا۔ یہ سب جھوٹی باتیں اور شیطانی وساوس ہیں۔

سود سے بچنے پر رزق میں کشادگی کا واقعہ:

میرے ایک دوست مجھ سے مشورہ لینے کے لیے آئے اور کہا کہ بینک نے یہ اسکیم جاری کی ہے اور کہتے ہیں کہ اس میں سود نہیں ہے۔ میں نے ان سے کہا: آپ مجھے یہ موٹی بات بتا دیں کہ انہوں نے جو منافع رکھا ہے وہ کیا فکس کیا ہے یا کم زیادہ ہوتا ہے؟ اگر اس میں نقصان ہو جائے تو کیا فارم کے اندر یہ موجود ہے کہ اس نقصان کے تم بھی حصہ دار ہو؟ اس نے کہا: ہم کبھی نقصان کے اندر حصہ دار نہیں ہیں۔ دوسری بات بارہ فیصد نفع ہے جو ہمیں ملے گا۔ تو میں نے ان سے کہا: یہ سود ہے، اس سے بچ جاؤ۔ اس نے کہا: میں اتنی بڑی محنت ومشقت اور مزدوری کر کے حلال کے پیسے کمائے ہیں، تین چار لاکھ روپے میرے پاس ہیں، اب میں ان کا کیا کروں؟ میرے بچے چھوٹے ہیں، وہ کل کو جوان ہوں گے، ان کی ضروریات ہوں گی۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ تم ان مصیبتوں میں نہ پڑو کہ حلال کما کر پھر حرام میں ڈال دو، تم اللہ پر توکل کرتے ہوئے جس شہر میں تمہارا گھر ہے وہاں کوئی پلاٹ لے لو۔ اللہ تعالیٰ اس

میں برکت عطا فرمائیں گے۔اس نے دو سال بعد یا تین سال بعد خط لکھا کہ میں نے آپ کے مشورے پر چار لاکھ کا پلاٹ لیا تھا، اب وہ میرا پلاٹ پندرہ لاکھ میں بک گیا ہے۔

اب آپ خود اندازہ لگائیں کہ اتنا بڑا نفع اس کو دنیا میں کہیں سے مل سکتا تھا!؟ اور وہ حرام سے بھی بچ گیا۔ جب بندہ دل میں نیت کر لیتا ہے کہ اے اللہ! میں حرام سے بچنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے حلال کا رزق وسیع فرما۔

فقر و فاقہ سے نجات کے وظائف:

بعض روایات میں آتا ہے کہ جب کعبۃ اللہ پر نظر پڑے تو جہاں یہ دعائیں منقول ہیں کہ ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُمَّ! زِدْ بَيْتَكَ هٰذَا تَشْرِيْفًا وَتَكْرِيْمًا وَتَعْظِيْمًا وَمَهَابَةً وَبِرًّا وَ تَقْوٰى'' اگر آپ کو یہ نہ آئے تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں: یا اللہ! اپنے گھر کی عزت و عظمت کو دوبالا فرما۔ اس کے ساتھ یہ بھی دعا آئی ہے: ''اَللّٰهُمَّ! اجْعَلْ فِيْهَا قَرَارًا وَّارْزُقْنَا فِيْهَا رِزْقًا حَلَالًا'' یا اللہ! ہمیں اپنے گھر کے اندر قرار نصیب فرما اور ہمیں رزق حلال نصیب فرما۔

جو لوگ کام کرتے ہیں، لیکن ان کی غربت نہیں ٹلتی، اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ روزانہ رات کو سورۂ واقعہ پڑھیں۔ ایک دفعہ پڑھ لیں، دو دفعہ پڑھ لیں۔ اور روزانہ ''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ! أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ!'' اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے پڑھتے رہیں۔ چند دنوں میں اللہ تعالیٰ رزق میں اتنی برکت دے دیں گے کہ بندہ سوچ بھی نہیں سکے گا۔

مکی صاحب کے والد گرامی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا واقعہ:

میں ایک دفعہ والد صاحب کے پاس آیا، وہ بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ میں نے سوچا اکیلے بیٹھ کر ہنس رہے ہیں، پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں نے آکر پوچھا تو کہنے لگے: عجیب بات ہے! اللہ میاں ہمارے تماشے دیکھتے ہیں۔ کئی دن گزر گئے، میرے پاس ایک ریال بھی نہیں تھا۔ میں نے کسی پر ظاہر بھی نہیں ہونے دیا کہ میرے پاس نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے جو طالب کھانا بھیجتا تھا وہ بھی کہیں چلا گیا، اس کے گھر والوں کو میرے ٹھکانے کا پتہ نہیں، وہ کہاں بھیجتے؟ لہٰذا دو تین دن سے کھانا بھی نہیں کھایا تو میں حرم سے پڑھا کر جب نکلا تو روٹی لے کر زمزم کے پانی کے ساتھ کھالی۔ تین دن اسی طرح گزر گئے۔ (میں بھی مدینہ منورہ گیا ہوا تھا، مجھے بھی پتہ نہیں تھا کہ والد صاحب پر اس طرح کی کیفیت ہے) اور آج ایک آدمی نے آکر اتنی قسم کے کھانے دیئے، میں سوچ رہا ہوں کہ میں اکیلا آدمی کیسے کھاؤں؟ تین دن بھوکا رکھا اور اتنی انواع و اقسام کے کھانے بھجوا دیئے۔ وہ آدمی ایک لفافہ دے گیا، اس میں

ایک ہزار ریال بھی تھے۔

اللہ کے کعبہ کے اندر بیٹھ کر میں کہہ رہا ہوں کہ جتنے ہمارے سر کے بال ہیں، اگر ہمیں اللہ تعالیٰ اتنی زبانیں دیتے تب بھی ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتے تھے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یقین رکھو، اس کے اندر کسی قسم کا تزلزل نہ ہو۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر دعا مانگتے وقت دل کے اندر یہ ہو کہ پتہ نہیں کہ دعا منظور ہوگی یا نہیں ہوگی۔ میں بڑا گناہگار ہوں، پتہ نہیں اللہ میری دعا سنتا ہے یا نہیں۔ فرمایا: جب یہ شک آجائے تو سمجھو دعا منظور نہیں ہوئی۔ ہم جتنے بڑے گناہگار ہیں، لیکن وہ تو ارحم الراحمین ہے۔ ہم سارے بندوں کے گناہ اس کی رحمت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ کا تو وعدہ ہے کہ جب گناہگار بندہ اپنے گناہوں سے لوٹ کر میرے دروازے پر آتا ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ اس لیے جب بھی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو تو یقین سے مانگو کہ اے اللہ! تیرے دروازے پر آیا ہوں اور اب لے کر جانا ہے۔ تیرے دروازے کے بغیر دروازہ نہیں، غیروں سے مانگوں تو کافر بنوں گا اور اگر تو بھی نہ دے تو کدھر جاؤں گا!!؟

لہٰذا اگر کسی پر قرضہ ہو تو کثرت سے استغفار، روزانہ رات کو سورہ واقعہ پڑھو، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے سب فقر و فاقے ٹل جائیں گے۔

﴿وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾ [البقرۃ:۲۷۹] اگر تم پکی توبہ کر لو، پھر اصل راس المال جو تم نے قرضہ دیا تھا وہ لے لو، ہم تمہارا حق نہیں مارنا چاہتے۔ ﴿لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾ نہ تو تم پر ظلم ہوگا کہ تمہارا راس المال بھی ڈوب جائے اور نہ تم ظلم کرو کہ راس المال کے علاوہ سود وصول کرنا چاہو۔

حجۃ الوداع کے موقع پر سود کی حرمت کا اعلان:

حضور اکرم ﷺ نے جب حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیا تو ارشاد فرمایا: ''أَلَا! إِنَّ كُلَّ رِبًا كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ عَنْكُمْ كُلُّهُ، لَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ، لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ، وَأَوَّلُ رِبًا مَوْضُوعٌ رِبَا الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ كُلُّهُ'' لوگو! خبردار! سود حرام ہو چکا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں جتنی سود کی قسمیں تھیں وہ سب کی سب میں نے پاؤں کے نیچے روند ڈالی ہیں۔ میرے اپنے چچا حضرت عباس کا ربا جو لوگوں کے پاس ہے وہ بھی ختم ہے۔ اب آج

کے بعد سود کا لین دین نہیں ہوگا، صرف رأس المال واپس لیا جائے گا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۱۳]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری امت پر ایک وقت آئے گا کہ لوگ شرابیں پئیں گے، شرابوں کے مختلف نام رکھ کر کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تو خمر کو حرام کیا ہے، وسکی تو حرام نہیں کی ہے۔

﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ﴾ اگر تم نے ایک آدمی کو قرضہ دیا ہے، اس کو تم نے دو مہینے کی مہلت دی۔ دو ماہ بعد تم نے اس سے قرضہ مانگا، اس نے کہا: میرے پاس تو نہیں ہے اور وہ حقیقت میں سچا بھی ہو تو اس کو اس وقت تک مہلت دے دو جب تک اس کی تنگی دور ہو جائے۔ یہ نہیں کہ اس پر سود بڑھا دیا اور سود دے دو۔

﴿وَأَنْ تَصَدَّقُوا﴾ اگر تمہیں یہ یقین ہو کہ یہ بالکل غریب ہے، مہلت ملنے کے بعد یہ نہیں دے سکتا تو اس کو معاف کر دو۔

اس میں دو اشارے کر دیئے کہ جب سود نہیں ہوگا تو کاروبار چلانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو قرضہ دو۔ اگر غریب بے چارے کو تنگی آ جائے تو مہلت دو اور اگر تمہیں اللہ تعالیٰ نے زیادہ دیا ہوا ہے اور اس غریب بے چارے کو اتنی تنگی ہے کہ بالکل نہیں دے سکتا تو وہ اس پر صدقہ وخیرات کر دو۔ اور ساتھ فرمادیا کہ اگر تم نے کسی کو ایک ہزار ریال قرضہ دیا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرے بندے کے لیے روزانہ ایک ہزار ریال کا صدقہ لکھتے رہو۔ اب دو سال گزر گئے، وہ قرضہ نہیں ملا، تم نے پھر کہا کہ ایک سال اور مہلت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے فرشتو! اب اس کا ڈبل صدقہ لکھتے رہو؛ کیونکہ اس نے اپنے وعدے کے علاوہ بھی مہلت عطا فرمادی، اس نے میرے بندے پر رحم کیا ہے تو ہم بھی اس پر رحم کرتے ہیں۔ اب دیکھیں وہ قرضہ ہے، لیکن صدقہ بھی لکھا جا رہا ہے۔

مسئلہ:

اگر تم نے کسی کو قرض دیا اور وعدہ گزر گیا ہے۔ مقروض کہتا ہے: میں غریب ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اپنے اس بھائی کو مہلت دو۔ اگر تم چاہو تو اس کو معاف کر دو، یہ تمہارے لیے سب سے زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسا نہ کرو جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے اندر لوگ کسی کو قرضہ دیتے ہیں۔ جب وعدہ کے اوپر قرض خواہ قرض مانگتا اور مقروض کہتا: میں قرضہ ادا نہیں کر سکتا تو قرض خواہ اس کو کہتا کہ اس پر سود لگ جائے گا۔ اگر اس کو قبول کر لو تو ہم تمہیں اور دو مہینے کی مہلت دے دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! ایسا نہ کرو۔ اگر مقروض واقعی تنگ ہے تو اس

کو مہلت دو اور اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں طاقت دی ہے تو اس پر قرضہ خیرات کر دو۔

مفسر فرماتے ہیں: اس بارے میں آقا ﷺ کی بہت سی احادیث مبارکہ ہیں۔

صدقات کی فضیلت پر احادیث:

❁......حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُظِلَّهُ اللّٰهُ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ فَلْيُيَسِّرْ عَلٰى مُعْسِرٍ أَوْ لِيَضَعْ عَنْهُ'' جس آدمی کی یہ تمنا ہے کہ قیامت والے دن جب کوئی سایہ نہیں ہوگا اور کوئی آرام کی جگہ نہیں ملے گی تو اس کو یہ کرنا چاہیے کہ اگر اس کا کوئی مقروض تنگ ہو جائے تو اس کو مہلت دے دے یا مقروض کو بالکل قرضہ معاف کر دے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے آدمی کو قیامت والے دن اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیں گے۔ [مجمع الزوائد: ۴/ ۱۳۴، المعجم الکبیر: ۱/ ۳۰۴]

❁......(حدیث) فرمایا: ''مَنْ رَحِمَ رُحِمَ'' جو زمین والوں پر رحم کرتا ہے آسمان والا اس پر رحم کرتا ہے۔

❁......(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ارْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ'' لوگو! اگر اللہ تعالیٰ تمہیں طاقت دے تو زمین والوں پر رحم کرو، غریبوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

[سنن کبریٰ للبیہقی: ۹/۴۱، کشف الخفاء: ۱/۱۱۹]

❁......(حدیث): حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ لِلّٰهِ صَدَقَةٌ''[1] جو بندہ کسی بندے کو قرضہ دیتا ہے۔ اگر اس نے اس بندے کو ایک مہلت دی تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے اس بندے کا روزانہ صدقہ کا اتنا ہی ثواب لکھتے رہو جتنا اس نے قرضہ دیا ہوا ہے۔ صحابی نے عرض کیا: میں نے آپ سے ایک دفعہ سنا تھا کہ جتنا قرضہ دیا اتنا صدقہ کا ثواب لکھا جاتا ہے اور دوسری دفعہ میں نے آپ سے سنا کہ اس کا دوگنا صدقہ لکھا جاتا ہے، مجھے یہ سمجھ نہیں آئی؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم نے ایک مہینہ تک کے لیے قرضہ دیا تھا تو ایک مہینے تک تیرے کھاتے میں ایک ہزار کا ثواب لکھا جائے گا۔ اب ایک مہینہ کے بعد اس بندے سے قرضہ ادا نہیں ہوا، تم نے اس کو ایک مہینہ اور مہلت دے دی تو اب تمہیں ڈبل ثواب لکھا جائے گا۔

❁......حضرت محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ نے روایت کی ہے، حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی سے قرضہ لینا تھا۔ وہ

[1] [مسند احمد بن حنبل: ۵/ ۳۶۰، مجمع الزوائد: ۴/ ۱۳۵]

اس آدمی سے قرضہ مانگتے، لیکن وہ آدمی چھپ جاتا تھا۔ ایک دن آپ رضی اللہ عنہ قرضہ لینے کے لیے اس کے دروازے پر تشریف لے آئے۔ جب آواز دی تو ایک بچہ نکلا، انہوں نے اس بچہ سے پوچھا کہ کیا وہ آدمی گھر پر ہے؟ اس بچے نے کہا: ہاں وہ گھر پر ہیں اور حلوہ کھا رہے ہیں۔ آپ نے باہر سے آواز دی: اے فلاں! باہر نکلو۔ مجھے پتہ لگ گیا ہے کہ تم گھر میں موجود ہو، لیکن تم نکلتے نہیں ہو۔ جب اس نے آواز دی تو باہر آ گئے تو حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ تم خوامخواہ مجھ سے کیوں چھپتے ہو؟ اس نے کہا: اصل بات یہ ہے کہ میں بڑا تنگ دست ہوں، میرے پاس کوئی پیسے نہیں ہیں اور میں نے آپ کا قرضہ دینا ہے تو میں آپ کے سامنے کیسے آؤں؟ شرمندگی ہوتی ہے، چھپ جاتا ہوں۔ جب آپ نے یہ سنا تو فرمایا: ''اللہ اکبر!'' مجھے تو پتہ نہیں تھا کہ آپ تنگ دست ہیں، کیا آپ واقعی تنگ دست ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں میں بہت تنگ دست ہو گیا ہوں۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ خود رو پڑے اور کہا: میں نے حضور پاک سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے: ''مَنْ نَفَّسَ عَنْ غَرِيْمِهِ أَوْ مَحَا عَنْهُ كَانَ فِيْ ظِلِّ الْعَرْشِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ'' جس نے اپنے مقروض سے رعایت کی یا بالکل سارا قرضہ ہی معاف کر دیا تو ایسا آدمی قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے کے نیچے ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ جب آپ نے یہ حدیث سنائی تو آپ (یعنی خود حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ) رعایت دیئے گئے۔ [مسند احمد حنبل: ۵/ ۳۰۰، ۳۰۸، کنز العمال: رقم: ۱۵۳۷۹]

قرض معاف کرنے کے بدلہ میں جنت:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أُتِيَ اللهُ بِعَبْدٍ مِنْ عَبِيْدِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، قَالَ: مَاذَا عَمِلْتَ لِي فِي الدُّنْيَا؟ فَقَالَ: مَا عَمِلْتُ لَكَ يَا رَبِّ! مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي الدُّنْيَا أَرْجُوكَ بِهَا، قَالَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، قَالَ الْعَبْدُ عِنْدَ آخِرِهَا: يَا رَبِّ! إِنَّكَ أَعْطَيْتَنِي فَضْلَ مَالٍ، وَكُنْتُ رَجُلًا أُبَايِعُ النَّاسَ وَكَانَ مِنْ خُلُقِي الْجَوَازُ، فَكُنْتُ أُيَسِّرُ عَلَى الْمُوسِرِ، وَأُنْظِرُ الْمُعْسِرَ. قَالَ: فَيَقُولُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: أَنَا أَحَقُّ مَنْ يُيَسِّرُ، ادْخُلِ الْجَنَّةَ)) [مسند احمد بن حنبل: ۳/ ۴۸۷]

بندہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے (یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس کے بارے میں خبر دی ہے کہ ایسا ہوگا اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی خبر کبھی غلط نہیں ہوتی اس لیے ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں کہ گویا قیامت ہو گئی، وہ بندہ پیش ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ حکم جاری فرما دیا) قیامت کے دن اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو پیش کیا

جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم نے میرے لیے دنیا میں کیا کیا؟ بندہ عرض کرے گا: میرے اللہ! میں نے تو ذرہ برابر بھی ایسا کام نہیں کیا جس سے میں تیری رحمت کی امید کرسکوں اور میں نے تو کوئی ذرے کے برابر ایسا عمل نہیں کیا جس سے تیری رحمت کی امید کرسکوں۔ اللہ تعالیٰ اس سے تین دفعہ فرمائیں گے اور وہ تینوں دفعہ یہی جواب دے گا۔ آخر میں کہے گا: اللہ! میں میری ایک عرض ہے۔ اے اللہ! تو نے مجھے بڑا مال دیا تھا اور میں تاجر تھا۔ میرے اللہ! یہ میری عادت تھی کہ میں درگزر کرنے والا آدمی تھا کہ اگر کوئی امیر بھی آ گیا تو میں نرمی کرتا تھا اور اگر کوئی تنگ دست غریب آ گیا تو میں اس کی بھی مدد کردیا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے میرے بندے! سب سے زیادہ تو میری شان ہے کہ میں نرمی کروں۔ تو بندہ بن کر بندوں پر نرمی کرتا رہا اور میں تو رب العالمین ہوں، ارحم الراحمین ہوں جاؤ! جنت میں داخل ہو جاؤ۔ تم نے میرے بندوں سے آسانی کی تھی اور آج میں تمہارے ساتھ آسانی کردیتا ہوں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک سند کے ساتھ یہ حدیث مبارک بھی بیان فرمائی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "كَانَ تَاجِرٌ يُدَايِنُ النَّاسَ، فَإِذَا رَأَى مُعْسِرًا قَالَ لِفِتْيَانِهِ: تَجَاوَزُوا عَنْهُ، لَعَلَّ اللهَ أَنْ يَتَجَاوَزَ عَنَّا، فَتَجَاوَزَ اللهُ عَنْهُ" "ایک تاجر تھا جو لوگوں کو قرضہ دیتا تھا۔ جب دیکھتا کہ مقروض آدمی تنگ ہے، اس کے حالات خراب ہیں اور اس کے پاس پیسہ نہیں ہے تو اپنے ملازموں سے کہتا: اس کو مہلت دے دو، اس سے درگزر کرو، اس کو تنگ نہ کرو، یہ بے چارہ پریشان ہے۔ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سے تجاوز کرکے مہربانی فرمائیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی جنت میں داخل فرمادیا۔ [صحیح البخاری: رقم: ۲۰۷۸، باب: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا]

مقروض کی مدد کرنے والا عرش کے سایہ میں ہوگا:

حضرت سہیل فرماتے ہیں: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ أَعَانَ مُجَاهِدًا فِي سَبِيلِ اللهِ، أَوْ غَازِيًا، أَوْ غَارِمًا فِي عُسْرَتِهِ، أَوْ مُكَاتَبًا فِي رَقَبَتِهِ، أَظَلَّهُ اللهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ)) [المستدرک للحاکم: ۲/۲۱۷]

جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے والوں کی مدد کرے یا غازی کی مدد کرے یا کسی مقروض کی مدد کرے یا کوئی عبد مکاتب ہو (کسی کا غلام ہے، مالک اس سے کہتا ہے: مجھے ایک لاکھ ریال دے دو تو میں تمہیں آزاد کردوں

گا) اگر کوئی اس کی گردن چھڑانے میں اس کی مدد کرے، اس کو پیسے دے دے، تا کہ وہ آزاد ہو جائے اللہ تبارک و تعالیٰ ایسے آدمی کو (قیامت کے دن) اپنے سائے کے نیچے رکھیں گے جس دن کسی کو پناہ نہیں ملے گی، بس اللہ کے سایہ میں رحمت میں پناہ ملے گی۔

(حدیث) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ أَرَادَ أَنْ تُسْتَجَابَ دَعْوَتُهُ، وَأَنْ تُكْشَفَ كُرْبَتُهُ، فَلْيُفَرِّجْ عَنْ مُعْسِرٍ'' جو بندہ یہ چاہے کہ میری دعا منظور ہو جائے اور مستجاب الدعوات بن جاؤں کہ اللہ تعالیٰ میری دعا قبول فرمالیا کریں تو اس کو چاہیے کہ کسی قرض والے کی، کسی مصیبت والے کی مصیبت ہٹانے میں مدد کرے۔ اگر کوئی اس کا مقروض ہے، اگر اس کا قرض معاف کر دے اور جب بندہ کسی مظلوم پر رحم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ رحمت فرما کر اس کی دعائیں منظور فرمالیتے ہیں۔

[الترغیب والترھیب: ۲/۴۱، مسند احمد: ۲/۲۳]

لہٰذا غریبوں کی اور قرض خواہوں کی مدد کرنا یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہاں بندے کو مستجاب الدعوات بنا دیتا ہے۔ پھر بندہ جو بھی مانگتا ہے دعا منظور ہو جاتی ہے۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ كَانَ لَهُ عَلَى رَجُلٍ حَقٌّ فَأَخَّرَهُ كَانَ لَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ'' اگر تم نے کسی سے قرض لینا تھا اور وہ تم کو وقت پر نہ دے سکا تو آپ نے اس کو مہلت دے دی تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں میرے بندے نے جب تک مہلت دی ہے اس وقت تک اس کے لیے صدقہ کا ثواب لکھتے رہو۔

[مسند احمد بن حنبل: ۴/۴۴۳، کنز العمال: ۱۵۴۲۱]

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا أَوْ وَضَعَ عَنْهُ أَظَلَّهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ'' جس بندے نے کسی تنگ دست کو مہلت دے دی یا بالکل قرضہ معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو اپنے عرش کے سائے میں رکھیں گے جس دن اور کوئی سایہ نہیں ہو گا۔

[المستدرک للحاکم: ۲/۲۹، طبرانی فی الکبیر: ۱۹/۱۶۶]

صحابی رسول کا قرض معاف کرنے کا واقعہ:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اور میرا باپ علم حاصل کرنے کے لیے انصار کے قبیلہ کے پاس گئے، قبل اس کے کہ وہ فوت ہو جائیں سب سے پہلی ہماری جس سے ملاقات ہوئی وہ صحابی رسول حضرت

ابوالیسر ﷺ تھے۔ ان کے ساتھ ایک غلام تھا، اس کے پاس کتابوں کی گٹھڑی تھی۔ اس سے پوچھا: کیا وجہ ہے تم ناراض جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا: میں ایک آدمی کے پاس جاتا تھا، اس پر میرا قرض تھا۔ میں اس کے گھر آیا تو گھر والوں نے کہا: نہیں ہے۔ مجھے اس وجہ سے غصہ آیا کہ جھوٹ بول رہے ہیں؛ کیونکہ اس کے گھر سے بچہ نکلا، میں نے اس سے پوچھا: تمہارا باپ ہے؟ اس نے کہا: ہاں ہے۔ میں نے اس کو کہا: ہاں مجھے پتہ ہے تم اندر ہو اور تم میری بات سن رہے ہو، تم باہر نکلو۔ جب وہ باہر آ گئے تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم مجھ سے کیوں چھپ گئے؟ اس نے کہا: خدا کی قسم ہے! میں اس لیے چھپ گیا کہ میں اگر باہر نکل کر تم سے کوئی جھوٹ بولوں یا میں وعدہ کروں کہ تمہارا قرض ہفتہ کے بعد دوں گا، لیکن میں نہ دے سکوں تو وعدہ بھی جھوٹا کروں۔ اس لیے بہتر تھا کہ میں چھپ جاؤں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تنگ دست ہوں اور غربت کی وجہ سے میں چھپ گیا۔ میں نے اس کو اللہ کی قسم دے کر کہا: کیا واقعی تم تنگ دست ہو؟ اس نے کہا: میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں تنگ دست ہوں۔ میں نے اس سے کہا: میری ان آنکھوں نے دیکھا ہے، میرے ان کانوں نے سنا ہے، میرے دل نے سمجھا ہے اور میں نے اس کو محفوظ رکھا ہے جو میں نے حضور اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ جو کسی تنگ دست کی مدد کرے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو اپنے عرش کے سایہ کے نیچے رکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے غلام سے کہا: وہ دفتر (رجسٹر) لے آؤ، جس میں ان کا قرض لکھا ہوا ہے۔ اس کو مٹا دیا اور کہا: میں نے تمہارا قرضہ مٹا دیا ہے۔ اگر تمہارے پاس آ جائیں تو دے دینا، نہیں تو میں نے تمہیں معاف کیا ہے۔ [صحیح مسلم: رقم: ۳۰۰۶]

قرض معاف کرنے کا ایک اور واقعہ:

ہمارے والد صاحب کے بڑے عزیز شاگرد تھے۔ ان کا نام حاجی عبداللہ تھا۔ بڑے تاجر تھے ان کا ایک نوجوان بیٹا تھا، وہ بھی تاجر اور بڑا شریف آدمی تھا۔ وہ جوانی میں فوت ہو گیا۔ ان کے بیٹے نے لوگوں سے لاکھوں روپے کا قرض لینا تھا تو جس دن اس نوجوان کا جنازہ ہوا۔ جنازہ پڑھنے کے بعد ان کے والد صاحب نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میرے بیٹے نے جن جن لوگوں سے قرضہ لینا تھا میں نے وہ سب کو معاف کیا اور جس نے میرے بیٹے سے قرضہ لینا ہو وہ ابھی مجھ سے لے لے، تاکہ میرے بیٹے کے ذمہ کسی کا حساب باقی نہ رہے۔ جن لوگوں نے کہا ہم نے لینا ہے تو ان کو ادا کر دیا۔

کسی مظلوم کی مدد کرنا اتنی بڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آجاتی ہے۔ اس لیے غریبوں و یتیموں کی مدد کیا کرو اور جو مصیبتوں میں اور ناحق قید ہیں ان کی مدد کیا کرو۔

(حدیث) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ایک دن حضور پاک ﷺ مسجد کی طرف تشریف لے گئے اور آپ ﷺ اپنے ہاتھ سے زمین کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اور فرمایا:

((مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا، أَوْ وَضَعَ لَهُ، وَقَاهُ اللهُ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ، أَلَا! إِنَّ عَمَلَ الْجَنَّةِ حَزْنٌ بِرَبْوَةٍ -ثَلَاثًا- أَلَا! إِنَّ عَمَلَ النَّارِ سَهْلٌ بِسَهْوَةٍ ، وَالسَّعِيدُ مَنْ وُقِيَ الْفِتَنَ، وَمَا مِنْ جَرْعَةٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ جَرْعَةِ غَيْظٍ يَكْظِمُهَا عَبْدٌ، مَا كَظَمَهَا عَبْدٌ لِلّٰهِ إِلَّا مَلَأَ اللهُ جَوْفَهُ إِيمَانًا)) [مسند احمد بن حنبل: ۱/۳۲۸]

جو آدمی کسی تنگ دست کو مہلت دے دے یا اس کا قرضہ اتار دے تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی لو سے بچائیں گے۔ جنت کا عمل کرنا بڑا حزن والا ہے۔ جیسا کہ اونچی جگہ پر چڑھنا مشقت والا کام ہے اسی طرح جنت والے اعمال کرنا آسان نہیں ہوتے۔ البتہ جہنم میں لے جانے والے اعمال بڑے آسان ہوتے ہیں۔ سعید وہ آدمی ہے جو فتنوں سے بچ گیا۔ اور اللہ کے نزدیک سب سے محبوب گھونٹ وہ ہے جب بندہ اپنے غصہ کو ضبط کر کے پی جائے۔ اور جس نے ایسا کر لیا اللہ تعالیٰ اس کے سینے کو ایمان سے بھر دیتے ہیں۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا إِلَى مَيْسَرَتِهِ أَنْظَرَهُ اللهُ بِذَنْبِهِ إِلَى تَوْبَتِهِ'' جو بندہ کسی قرض دار کو مہلت دیتا ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ تجھے ادائیگی کی توفیق دے دے قرضہ دے دینا، اسی طرح بندہ بھی اگر کوئی گناہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو توبہ تک مہلت دے دیتے ہیں۔

[الترغیب والترہیب: ۲/۳۶، مجمع الزوائد: ۴/۱۳۴]

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے ڈراتے ہیں: ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللهِ﴾ [البقرة: ۲۸۱] آخر میں پھر فرما دیا کہ اے ایمان والو! اس دن سے ڈرو جس دن تم سب اللہ تعالیٰ کے پاس لوٹ کر آؤ گے، جس دن پورا پورا ملے گا۔ تم نے حرام کھایا ہے تو ہم تمہیں پوری پوری سزا دیں گے۔ ہم عدل کریں گے، ہمارے انصاف میں کسی پر ظلم نہیں ہوگا، کسی دوسرے کے گناہ بلا وجہ تیرے اوپر رکھ دیں ایسے نہیں ہوگا یا تیری نیکی کو کچھ کم کر کے کچھ ثواب گھٹا دیں ایسا بھی نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ بالکل عدل فرمائیں گے، ان کا فیصلہ عدل پر ہوگا، ان کا فیصلہ عدل اور صدق پر

ہوگا، اس میں ذرہ برابر بھی کسی پر زیادتی یا ظلم نہیں ہوگا۔

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾﴾ کہ اس دن سے ڈرو جب تم سب نے لوٹ کر آنا ہے اور اس دن تمہیں پورا پورا بدلہ ملے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں: یہ آخری آیت ہے جو حضور پاک ﷺ پر اتری ہے۔ اس کے اکیس دن کے بعد حضور اکرم ﷺ کی وفات ہوگئی۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اس آیت کے اترنے کے بعد حضور پاک ﷺ نو راتیں زندہ رہے۔ اور ایک روایت میں ہے: اس آیت کے نزول کے اکتیس دن کے بعد حضور پاک ﷺ کی وفات ہوئی۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾﴾ [البقرۃ: ۲۸۳]

''اے ایمان والو! جب ادھار کا معاملہ کرنے لگو ایک میعاد معین تک تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور یہ ضروری ہے کہ تمہارے آپس میں کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے اور لکھنے والا انکار نہ کرے، جیسا کہ اللہ نے اس کو سکھلا دیا اس کو چاہیے کہ لکھ دے۔ اور وہ شخص لکھوائے جس کے ذمہ قرض واجب ہو اور اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے (املاء میں) ڈرے اور اس (حق) میں کچھ کم نہ کرے۔ پھر جس شخص کے ذمہ قرض ہے اگر وہ بے عقل ہو یا ضعیف ہو یا خود نہیں لکھوا سکتا تو اس کا کارکن (والد، وصی، نگران یا مترجم) انصاف سے لکھوا دے۔ اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ کرلیا کرو، پھر اگر وہ دو مرد گواہ نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، تا کہ ان دو عورتوں میں سے کوئی ایک بھی بھول جائے تو ان میں ایک دوسری کو یاد دلا دے۔ اور گواہ بھی انکار نہ کریں جب بلائے جائیں۔ اور تم اس (معاملہ) کے لکھنے سے اکتایا مت کرو، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی میعاد تک۔ یہ (لکھ لینا) اللہ کے نزدیک پورا انصاف اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ تم کسی شبہ میں نہ پڑو، مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو، جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اور خرید و فروخت کے وقت گواہ کرلیا کرو اور کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو اور اگر تم ایسا کرو گے تو اس میں تمہیں گناہ ہوگا۔ اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں تعلیم دیتا ہے اور اللہ سب چیزوں کو جاننے والا ہے۔ اور اگر تم کہیں سفر میں ہو اور کوئی کاتب نہ پاؤ تو رہن قبضہ میں رکھنی چاہیے اور اگر دوسرے کا اعتبار کرتا ہو تو اعتبار کیے گئے شخص کو چاہیے کہ وہ اعتبار کرنے والے کی امانت کو پورا ادا کرے۔ اور اللہ جو اس کا پروردگار ہے اس سے ڈرے اور گواہی کو مت چھپاؤ اور جو بھی اس کو چھپائے گا اس کا دل گناہگار ہوگا۔ اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔''

ربطِ آیات:

ان آیات میں قرض کے احکام اور اس کے معاملات ذکر فرمائے ہیں۔

ایک مطلقاً خیرات کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق دے اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خیرات کرے۔ پھر صدقات کی چند قسمیں کی ہیں: ایک قسم صدقات واجبہ کی ہے، جیسے: زکوٰۃ اور فطرانہ۔ اور دوسری قسم صدقات نافلہ کی ہے کہ جتنا اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق دے تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو۔

دوسری قسم ربوا ہے اور تیسری قسم دَین (قرض) ہے۔ صدقات و خیرات سراپا رحمت ہی رحمت ہیں، اللہ تعالیٰ کے غضب کو صدقہ بجھا دیتا ہے، آنے والی مصیبتوں کو ٹال دیتا ہے، آدمی کے گناہوں کو صدقہ مٹا دیتا ہے، صدقہ سے تمہارے رزق میں، تمہاری اولاد میں اور تمہارے مال میں اللہ تعالیٰ برکتیں عطا فرما دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے آسمانوں سے اترتے ہیں، جن کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ روزانہ صبح سے شام تک یہ دعا کرتے رہیں: ''اَللّٰهُمَّ! أَعْطِ لِكُلِّ مُنْفِقٍ خَلَفًا'' اے اللہ! جو تیرے راستے میں دے رہا ہے اس کو اپنے خزانہ سے عطا فرما اور جو تیرے راستے میں دینے سے بخل کر رہا ہے اس کے مال میں تباہی و ہلاکت پیدا کر۔

یاد رکھیں! صدقات خالص حلال مال سے دیں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور پاک مال ہی قبول کرتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی رشوت لے کر خیرات کرتا ہے، ڈاکہ مار کر خیرات کرتا ہے، چوری کے مال سے خیرات کرتا ہے یا ظلم سے لیے ہوئے مال سے خیرات کرتا ہے تو اس کو ایک پیسہ کا بھی ثواب نہیں ملتا۔ اگر وہ ثواب کی امید رکھے تو کفر کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے؛ کیونکہ ثواب حلال پر ملتا ہے، حرام پر نہیں ملتا۔

آخرت میں سودی لین دَین والے کی سزا:

ربوا سراپا ظلم وعذاب ہے۔ سود کی جتنی قسمیں ہیں، چاہے قرض پر سود لو، بیع وشراء پر لو، چاہے ان چھ چیزوں میں جو میرے آقا ﷺ نے بیان فرما دی ہیں: سونا، چاندی، گندم، جو، انگور اور کھجور، ان کے لین دین میں کمی بیشی کرو، یہ سب سود ہے۔ سود دنیا میں بھی باعثِ عذاب، قبر میں بھی باعثِ عذاب اور حشر میں بھی باعثِ عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے! دنیا میں بھی سودی آدمی کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ وہ ہر وقت اسی دولت کے چکر میں ہوتا ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں ذلیل کر دیتے ہیں کہ سٹے میں آ کر ایک دن میں جو کروڑ پتی تھا شام کو فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوتا ہے اور آخرت کے عذاب کا یہ عالم ہے۔ میرے آقا ﷺ نے فرمایا: جب مجھے بیت المقدس سے معراج کی طرف لے جایا جا رہا تھا، مجھے ایک نہر دکھائی گئی، جو خون کی بھری ہوئی تھی۔ اس کے اندر ایک آدمی بڑی محنت سے تیر کر جب کنارے کے قریب آتا ہے تو ایک بندہ کنارے پر کھڑا ہے، جو اس کے منہ پر پتھر مارتا ہے تو وہ تیرنے والا آدمی واپس نہر میں چلا جاتا ہے۔ پھر تیر کر کوشش کرتا ہے کہ کنارے پر پہنچ جاؤں۔ جب کنارے پر آتا ہے تو اس کو دوبارہ پتھر مارا جاتا ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون شخص ہے؟ انہوں

نے فرمایا: یہ وہ ہے جو دنیا میں سود کھاتا تھا۔

﴿اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪﴾ [البقرۃ: ۲۸۲]

دَین کا معنی ہے قرض پر لین دین کرنا۔ یہ سراپا عدل ہے کہ اس میں عینِ انصاف اور عدل ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: اے ایمان والو! اگر تم کسی کو قرض دیتے ہو ایک وقت مقرر تک تو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تم لکھ لیا کرو۔ اس کی چار قسمیں ہیں: پھر ہر قسم کے تابع سینکڑوں قسمیں ہیں، جو فقہاء نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں، وہ کتابوں کے اندر محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر کروڑوں رحمتیں فرمائے جنہوں نے ہمارے لیے دین کو اتنا آسان کر دیا کہ ہر قسم کی کتابیں لکھ کر ہر قسم کی اقسام کو مرتب کر دیا ہے۔ اس میں آپ کو موٹی موٹی قسمیں بتا دیتا ہوں، تا کہ آپ کو سمجھ آ جائے۔

قرض کی اقسام:

(۱)......ایک قسم ہے: ''اَلدَّيْنُ بِالدَّيْنِ'' قرض کے بدلے میں قرض، یعنی سامان بھی موجود نہ ہو اور پیسے بھی ادھار ہوں۔ میرے پاس مثلاً: عینک موجود نہیں ہے اور میں آپ کو کہتا ہوں کہ میں نے آپ کو ایک عینک فروخت کی ہے جو میرے پاس ابھی نہیں ہے اور اتنے پیسوں میں بیچتا ہوں جو تم بھی مجھے سال بعد دو گے۔ یا کہا: میں آپ کو گندم بیچتا ہوں جب اترے گی۔ اب مبیع بھی ادھار اور اس پر جو پیسے لینے ہیں وہ بھی ادھار۔ یہ قسم بالاتفاق حرام ہے کہ جب ایک چیز موجود نہیں تو اس کو بیچنے کا کیا معنی ہے؟ اسلام یہ کہتا ہے: جو چیز ہم بیچ رہے ہیں وہ موجود بھی ہو اور ہمارے قبضہ اور تصرف میں بھی ہو، پھر ہم اس کو بیچیں۔

پھر جب بیچ رہے ہیں تو اس کو اچھی طرح دکھا بھی دیں کہ ہم کیا بیچ رہے ہیں؟ اگر اس کے اندر کوئی نقص ہے تو اس کو بھی بیان کر دیں۔ البتہ متاخرین نے تمام فقہی روایات کو سامنے رکھ کر کچھ ایسے راستے پیدا کیے ہیں کہ مثلاً: جہاز کے اندر کوئی مال آ رہا ہے، اس کا سودا ہو گیا ہے، اس کے ڈاکومینٹ میرے قبضے میں آ گئے ہیں، میری بیع تام ہو چکی ہے اور میں نے پارٹی کو پیمنٹ کر دی ہے تو علماء فرماتے ہیں: ان کاغذات کا قبضہ میں آنا مال کا قبضہ میں سمجھا جائے گا، ورنہ تو تمام ممالک میں جو بیع شراء ہو رہی ہے، ساری کی ساری حرام ہو جائے؛ کیونکہ آج کل ساری بیع شراء اسی طرح ہوتی ہے کہ ابھی مال دوسرے ملک سے چلتا ہے اور یہاں بک جاتا ہے۔

2 ......دوسری قسم "اَلْعَیْنُ بِالدَّیْنِ" کہ مبیع سامان تو موجود ہے، لیکن پیسے ادھار ہیں۔ یہ بالاتفاق جائز ہے، اس کے اندر کوئی منع نہیں ہے؛ کیونکہ جو چیز بکنے والی ہے وہ موجود ہے۔

3 ......تیسری قسم: "اَلدَّیْنُ بِالْعَیْنِ" ہے۔ آپ نے کہا: میں فلاں چیز دوں گا، لیکن آپ مجھے پیسے ابھی دے دیں کہ بیچنے والی چیز موجود نہیں، لیکن پیسہ موجود ہے۔ اس کو اصطلاح میں "بیع سلم" کہتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس چیز کو متعین کرلیا جائے کہ فلاں کمپنی کی ہوگی، فلاں ملک کی بنی ہوئی ہوگی، فلاں ماڈل ہوگا، فلاں مارکہ ہوگا، اس کا رنگ فلاں ہوگا، یعنی چیز معین کرلی جائے، جیسا کہ یہ تجارت آج کل بڑی عام ہوتی ہے کہ آپ ایک کمپنی کو گھڑی کا آرڈر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: ٹھیک ہے، لیکن ہم ابھی مصروف ہیں، ابھی آپ کو نہیں دے سکتے، آپ پہلے پیسے جمع کرائیں۔ اور چیز صفات کے ساتھ طے ہو جاتی ہے۔ یہ بھی بیع وشراء کے ساتھ جائز ہے۔

4 ......چھوتھی قسم: "اَلْعَیْنُ بِالْعَیْنِ" چیزیں نقد اور پیسے بھی نقد۔ یہ بھی بالاتفاق صحیح ہے، جیسا کہ آج کل عام ہے۔

قرض کا معاملہ لکھنے کا حکم:

اسلام نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جب تم کسی کو قرض دیتے ہو تو اس کی ایک شرط تو یہ ہے کہ پہلے وقت متعین کرلو کہ کتنی مدت تک کے لیے قرضہ دے رہے ہو؟ دوسرا یہ حکم دیا ہے کہ جب تم اس قسم کا لین دین کرلو تو ﴿وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ﴾ اس کا خیال رکھو کہ تمہارے درمیان لکھنے والا عدل کے ساتھ لکھے: کیونکہ کل کو کوئی پتہ نہیں قرضہ دینے والا مرجائے، کوئی پتہ نہیں قرض لینے والا مرجائے، اب ورثا کو پتہ نہ ہو تو وہ بے چارہ قبر میں عذاب بھگتار ہے گا، اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ اس قرض کو لکھ لو۔

اب جب لکھنے کا حکم آگیا تو اب یہ ضروری تو نہیں کہ ہر آدمی پڑھا لکھا ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک جامع قانون بیان فرمادیا: ﴿وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ﴾ کہ جو لکھنے والا ہے اس کو چاہیے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو لکھنے پڑھنے کا علم عطا فرمایا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر اس طرح ادا کرے کہ وہ لکھے اور انکار نہ کرے۔

یہ کون لکھوائے گا؟ تو اس کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا﴾ [البقرة: ٢٨٢] کہ جس نے قرضہ دینا ہے وہ دستاویز پر لکھ کر دے گا کہ میں فلان بن فلاں باہوش وحواس خمسہ.........لکھ کر دے رہا ہوں یا لکھنے والے کو املا کروائے کہ آپ میری طرف سے لکھیں، لیکن اس

صورت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لکھنے والا اللہ تعالیٰ سے ڈرے ایسا نہ ہو کہ اپنی طرف سے کمی بیشی کردے۔

اس سے اندازہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ چودہ سو سال پہلے جو احکام دے رہے ہیں وہ کتنے جامع اور مانع ہیں؛ کیونکہ وہ ایسا دور تھا کہ لوگ جھوٹ بولنا اتنا بڑا عیب سمجھتے تھے کہ اتنا کافر بھی اس زمانہ میں جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ اسلام نے حکم دیا: اپنے رب سے ڈرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کہے: لکھو! میں نے ایک لاکھ کا قرض لیا ہے اور لکھنے والا اس سے پہلے کہہ دے کہ اس علاقے میں لکھنے والا منشی میں ہوں، دوسرا بندہ کوئی نہیں، وہ مجھے لکھوانے کے لیے بلائیں گے، تم قرض دار اگر مجھے دس ہزار دے دو اور اسی ہزار تم کو بچ جائیں گے۔ اب جو بے چارہ قرضہ دے رہا ہے وہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! کاتب کو چاہیے کہ وہ عدل کرے، وہ کبھی کسی چیز کو نہ بڑھائے اور نہ گھٹائے۔ جو الفاظ اس کو کہے جائیں، ان کو امانت و دیانت کے ساتھ لکھ دے۔

﴿فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ﴾ اگر وہ آدمی جو قرضہ دینے والا ہے وہ بے وقوف ہے، اس کے اندر عقل زیادہ نہیں یا اتنا کمزور ہے کہ وہ لکھ نہیں سکتا اور لکھوا بھی نہیں سکتا یا نابالغ بچہ ہے تو اس کا جو شرعاً ولی ہے یا اس کا مختار ہے یا وکیل ہے، اس کو چاہیے کہ وہ لکھوائے۔ اور اس کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ وہ ٹھیک املاء کرے، اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہ کرے۔

گواہی کا حکم:

﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ ۖ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ﴾ جب یہ تحریر ہو رہی ہو تو تمہارے دو مرد مسلمان گواہ ہوں اور وہ ایسے گواہ ہوں جو امانت والے ہوں۔

اس سے فقہاء نے مسئلہ نکالا ہے کہ اگر ایک آدمی کے پاس تحریر ہے، لیکن گواہ نہیں ہیں تو قاضی اس کا اعتبار نہیں کرے گا؛ کیونکہ وہ کہے گا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ دو گواہ ہوں۔

﴿فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ......﴾ اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالیں۔

مرد کے مقابلے میں عورت کی گواہی آدھی کیوں؟

آج جو نئی تہذیب کے لوگ ہیں، جو حقوقِ نسوانیت کا اپنے آپ کو علمبردار کہتے ہیں، وہ یہی اعتراض کرتے ہیں کہ دیکھو! دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہوں۔ یہ تو بڑی ناانصافی ہے۔ عورتیں پڑھی لکھی اور سمجھدار ہوتی ہیں اور

عورتیں بڑی ذہین ہوتی ہیں، لیکن عورت کا حصہ گواہی میں بھی آدھا کر دیا گیا اور میراث میں بھی آدھا کر دیا گیا۔

یاد رکھیں! اس میں اسلام کا عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک وجہ تو خود قرآن میں بیان کر دی ہے۔ جو وجہ اللہ تعالیٰ نے بیان کر دی اس پر کوئی کافر تو اعتراض کر سکتا ہے، مسلمان اعتراض نہیں کر سکتا۔ فرمایا: ﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَإِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ کہ ہم نے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر اس لیے رکھا؛ کیونکہ عورت ناقص العقل ہے اور ناقص الدین ہے۔ اگر ایک عورت کو بات بھول جائے تو دوسری عورت اس کو بات یاد دلا سکے۔ اب تو خیر یورپ نے بھی مان لیا ہے کہ عورت کے دماغوں کا وزن کیا گیا اور اس کے دل کا وزن کیا گیا اور اس کے اعضاء رئیسہ کا وزن کیا گیا تو خدا کی قدرت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت میں طبعی و خلقی طور پر بھی فرق رکھا ہے۔

اسی طرح دین میں بھی فرق ہے کہ مرد رمضان میں تیس روزے رکھے گا، لیکن عورت تیس روزے نہیں رکھ سکتی؛ کیونکہ اس کے آٹھ دن حیض میں چلے جائیں گے۔

مرد کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بغیر محرم کے حج کا سفر نہ کرے، لیکن عورت بغیر محرم کے حج نہیں کر سکتی۔ حیض و نفاس کی حالت میں عبادت بھی نہیں کر سکتی، روزہ بھی نہیں رکھ سکتی اور نمازیں بھی نہیں پڑھ سکتی تو صاف ظاہر ہے کہ مرد کو نماز کا ثواب زیادہ ہوگا۔

حضور پاک ﷺ سے ایک صحابی نے عرض کیا کہ عورتیں تو بڑی سمجھدار ہوتی ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ عقل تھوڑی ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ناقصات العقل کا معنی یہ ہے کہ ساری زندگی تم عورت کے لیے بھلائی کرو، ساری زندگی اچھا لباس اچھا کپڑا دو، اس کی وجہ سے تم باپ کو چھوڑ دو، ماں کو چھوڑ دو۔ جس دن عورت کو غصہ آئے گا، وہ کہہ دے گی: تم نے میرے لیے کیا کیا ہے؟ اس طرح وہ فوراً تیری ساری محنت کا انکار کر دے گی؛ کیونکہ یہ عورت کی فطرت اور عورت کی نیچر ہے کہ سارے احسانات کو ایک منٹ میں بھلا دے گی۔

اگر لاکھوں عورتوں میں سے چند عورتیں سمجھدار نکل آئیں تو بڑی بات نہیں۔ ان کا تقابل پورے عالم کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی نظر اپنی ساری مخلوق پر ہے۔

عورت کو میراث میں آدھا حصہ ملتا ہے۔ اس کے اندر بھی اسلام کا عدل ہے کہ وہ باپ کی میراث سے بھی حقدار ہے اور خاوند کی میراث سے بھی حقدار ہے۔ اور جب تک اس کی شادی نہ ہو اس وقت تک اس کا خرچہ باپ کے

ذمہ ہے۔شادی ہو جانے کے بعد خرچہ شوہر کے ذمہ ہے۔اس لیے اسلام نے تو عدل کیا ہے کہ عورت کا کوئی حق نہیں مارا، مرد کے لیے کسی کی ذمہ داری نہیں۔آپ خود سوچیں کہ عورت جس گھر میں پیدا ہوتی ہے، اٹھارہ بیس سال زندگی گزارتی ہے، وہ اس کو کبھی اپنا گھر نہیں کہتی۔اور جب شادی ہو جائے تو اس سے پوچھو: کہاں جا رہی ہو؟ تو کہے گی: اپنے گھر جا رہی ہوں۔یعنی شوہر کا گھر اس کا اپنا گھر ہے اور ماں باپ، جن کے نطفہ سے پیدا ہوئی ہے وہ ماں باپ کا گھر ہے، حالانکہ یہ کونسی عقل ہے؟ اگر خدانخواستہ خاوند اس کو طلاق دے دے تو وہ گھر کہاں جائے گا؟ صاف ظاہر ہے، پھر انہی والدین کے دروازے پر آئے گی۔اس لیے یاد رکھیں! عورت ناقصۃ العقل ہے۔

دوسری بات یہ یاد رکھیں کہ اسلام نے حدود و قصاص میں عورت کی شہادت نہیں رکھی، اس کے اندر بھی عورت کی عزت ہے؛ کیونکہ جب حدود کا معاملہ آئے گا تو لازماً مدعی کا وکیل آکر ایسے سوال کرے گا کہ اس کی عزت ہی مٹ جائے گی کہ تم نے کیا دیکھا؟ کیسے دیکھا؟ کیسے ہو رہا تھا؟ اس لیے اسلام نے کہا: عورت کی عزت کو محفوظ رکھو، اس کو مقدمات کے اندر نہ گھسیٹو۔اور دوسرا لین دین کے معاملہ کے اندر دو عورتوں کی گواہی کو رکھا؛ کیونکہ ایک عورت کورٹ میں آنے کے بعد گواہی دے کہ فلاں نے ایک لاکھ دینا ہے تو وکیل کہہ دے گا کہ اس عورت کے مدعی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہوں گے۔جب دوسری عورت بھی گواہی میں شریک ہوگی تو یہ الزام نہیں لگ سکتا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو محفوظ کیا ہے۔عورت ایسی عزت دار چیز ہے کہ اس کی عزت کو پردہ دو اور اس کی عزت کی حفاظت کرو۔یہ محفوظ رکھنے والی اور گھروں کے اندر رہنے والی چیز ہے۔یہ اوپن تھیٹر نہیں کہ سگریٹ بیچنے کے لیے اس کے ننگے فوٹو ڈبیوں پر لگا دیئے جائیں۔عورت کی سب سے زیادہ توہین کرنے والے ایسے ہی لوگ ہیں، جبکہ اسلام نے تو عورت کو عزت دی ہے کہ گھر کی ملکہ بنایا ہے اور عورت کو ماں کا درجہ دیا ہے، بیٹی کا درجہ دیا ہے، بہن کا درجہ دیا ہے اور بیوی کا درجہ دیا ہے۔جہاں بیوی کا ذکر آیا وہاں فرعون کے گھر میں بی بی آسیہ کا بھی بتایا کہ فرعون کے گھر میں ہے، ایمان والی ہے، ہم اس کو قیامت کے دن محمد مصطفیٰ ﷺ کی بیوی بنائیں گے۔

لین دین لکھنے کے فوائد:

﴿وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ وَلَا تَسْـَٔمُوٓا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰٓ أَجَلِهِۦ ۚ﴾ جب گواہوں کو بلایا جائے تو انکار نہ کریں۔اور یہ بھی نہ کہا کرو کہ چھوٹے چھوٹے قرضے کہ کیا لکھیں؟ یاد رکھو! تمہارے لیے تو سو روپیہ

معمولی بات ہے، قبر میں اس سو روپے کے پیچھے جہنم میں پڑا رہے گا۔ اس لیے فرمایا: قرض چاہے چھوٹا ہو یا بڑا ہو اس سب کو لکھو۔

﴿ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ﴾ یہ سب سے زیادہ انصاف ہے اور سب سے زیادہ انصاف کو قائم کرنے والی بات ہے؛ کیونکہ اگر لکھا ہوا ہوگا تو اس میں کوئی غلطی نہیں ہوگی اور کسی شک میں نہیں پڑے گا۔

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں تمہارے بعض معاملات ایسے ہیں، جیسے اگر تمہاری نقد بیع وشراء ہے تو اس کو لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ لینے والا بھی دیکھ رہا ہے اور دینے والا بھی دیکھ رہا ہے۔ لکھا وہاں جاتا ہے جہاں درمیان میں کچھ وقت آئے۔

﴿وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪﴾ اگر ہو سکے تو تجارت کے لین دین میں گواہ بنالیا کرو تو اچھی بات ہے۔ وہ بھی اگر بنا لو، ورنہ ہر وقت آدمی دکان پر جب سودا بیچتا ہے تو گواہ تو نہیں رکھ سکتا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ نقد لین دین ہے، لیکن بعض اوقات چیز بڑی قیمتی ہوتی ہے تو وہاں گواہ بنالینا چاہیے، تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو، اس لیے اسلام نے ہمیں ایسا قانون دیا ہے، تاکہ جھگڑا پیدا نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں دنیا کے قانون کہتے ہیں کہ پہلے جرم ہو جانے دو، پھر ہم ڈنڈا لے کر آجائیں گے۔

﴿وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ﴾ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم لکھنے والے کو اور گواہی دینے والے کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ آج دیکھ لیں کہ گواہی کیوں نہیں ملتی ہے؟ کیونکہ اگر شریف آدمی گواہی میں اپنا نام لکھوا لے، ......ان شاء اللہ...... ایک سال کے اندر اندر دس دفعہ تو اس کو تھانے والے بلائیں گے اور جب کورٹ میں جائے گا تو کبھی وکیل نہیں، کبھی جج نہیں اور آج قاتل نہیں۔ اس لیے آج کوئی شریف آدمی گواہی کے قریب نہیں آتا، اگرچہ اس نے وہ واقعہ دیکھا بھی ہو۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر گواہ کہتا ہے: مجھے کرایہ چاہیے تو آپ اس کو کرایہ دیں۔

حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے فرمایا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ قرآن پاک سے تازہ آنے والی چیز یہی آیت دَین ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے قرض کے احکام بیان فرمائے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی کچھ عمر دینے کی روایت:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: جب آیت دَین نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إِنَّ أَوَّلَ

مَنْ جَحَدَ آدَمُ، إِنَّ اللهَ لَمَّا خَلَقَ آدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَأَخْرَجَ مِنْهُ مَا هُوَ ذَرَائِيِّ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ...... ''کہ سب سے پہلا انکار حضرت آدم علیہ السلام نے کیا؛ کیونکہ ان کی پشت سے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک جتنی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہونی تھی ان کی ارواح کو نکالا اور پھر عالمِ مثال کے اندر ان کو دکھایا کہ یہ تیری اولاد ہے۔
[مسند احمد بن حنبل: ۱/۲۵۱، ۳۰۷۱، السنن الکبریٰ: ۱۰/۱۴۶]

اب اس میں علماء کے دو قول ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس انسان کو جس شکل میں پیدا کرنا تھا وہ صورت دکھا دی گئی یا فقط روح دکھائی گئی، لیکن زیادہ راجح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح کے اندر شکل کا پرتاؤ بھی دکھا دیا؛ کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام نے جب اپنے بیٹوں کو دیکھا تو ان میں سے ایک ایسے تھے جیسے وہ چمک رہے ہوں تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ میرا بیٹا کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تمہارا بیٹا داؤد ہے، یہ اللہ کا نبی ہوگا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا: میرے اس بیٹے کی عمر کتنی ہے؟ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا کہ ساٹھ سال ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے درخواست کی کہ آپ مہربانی فرمائیں اور اس کی عمر سو سال کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے اس بیٹے کی عمر سو سال کر دیتے ہیں، لیکن تمہاری عمر سے پھر چالیس سال کاٹ لیے جائیں گے۔ آدم علیہ السلام کی عمر ایک ہزار سال تھی تو حکم یہ ہوا کہ نو سو ساٹھ سال پھر تمہاری عمر ہو جائے گی، چالیس سال تمہارے کاٹ کر تمہارے بیٹے کو دے دیئے جائیں گے۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا: مجھے قبول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو لکھ لو، اس پر گواہی بھی ڈالو اور حضرت آدم علیہ السلام سے دستخط اور تحریر بھی لے لو۔ اب جب سب کچھ مکمل ہو گیا، وقت گزر گیا۔ آدم علیہ السلام پر جب موت کی گھڑی آئی تو فرشتے روح قبض کرنے کے لیے آئے تو آدم علیہ السلام نے ان سے کہا: تم کیسے روح قبض کرنے کے لیے آگئے؟ میری تو ابھی چالیس سال کی عمر باقی ہے۔ فرشتوں نے کہا: آپ نے تو چالیس سال اپنے بیٹے حضرت داؤد کو دیئے تھے، لہٰذا آپ کی عمر پوری ہو گئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: میں نے اپنی عمر نہیں دی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے گویا کہ پہلا انکار کیا اور آپ اس معاہدے پر قائم نہ رہے، اسی طرح پھر آپ کی اولاد میں بھی انکار آگیا...... صحیح حدیث میں آتا ہے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''نَسِيَ آدَمُ فَنَسِيَ ذُرِّيَّتُهُ'' [ ] آدم علیہ السلام بھول گئے تو اولاد میں بھی بھولنا آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا اس درخت کے قریب نہ جاؤ، لیکن حضرت آدم علیہ السلام بھول کر چلے گئے۔ جب ابا بھولے تو اس کا اثر اولاد میں بھی آگیا...... جب یہ بات ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آدم علیہ السلام کی عمر ہزار پوری کر دو اور داؤد کو بھی چالیس سال دے دو۔

ایک بات یاد رکھیں کہ یہ حدیث سند کے لحاظ سے بالکل غریب ہے، یعنی اس کے اندر بہت بڑی غرابت ہے۔ دوسرا اس کے اندر ایک راوی ہے زید بن جدعان، وہ اس قسم کی منکر روایتیں اکثر بناتا بھی ہے، لہٰذا اس روایت کے اندر سو فیصد قابل اعتماد بات نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ بات فرما دی ہے:

﴿وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ﴾ [لقمان: ۳۴] یہ خاص علم ہیں، جن کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو نہیں دیا کہ کل کیا ہوگا؟ اور کہاں تمہاری موت آئے گی؟ تو پھر آدم علیہ السلام کو پیشگی موت کا پتہ ہونا کہ ابھی چالیس سال باقی ہیں، یہ ساری چیزیں ان نصوص سے ٹکراتی ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی نصوص سے ٹکراتی ہے کہ حضرت داؤد کا آواز کے اندر جو حسن و جمال ہے وہ مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی آواز عطا فرمائی تھی۔ اور آواز اتنی سریلی اور میٹھی تھی کہ انسان تو انسان اگر کبھی جانور بھی سن لیتے تو ٹھہر جاتے تھے اور پرندے اڑتے اڑتے رک جاتے تھے۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی حسین تلاوت:

اور یہ بات بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ایک دفعہ میرے آقا ﷺ تشریف لے جا رہے تھے کہ آپ ﷺ کے صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ قرآن پڑھ رہے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کھڑے ہو گئے اور قرآن مبارک سنتے رہے۔ صبح کو جب حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ خدمت میں آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مَا شَاءَ اللّٰهُ! لَقَدْ أُوْتِيْتَ مِنْ مَزَامِيْرِ آلِ دَاوُدَ'' کہ میرے صحابی تمہیں بھی اللہ تعالیٰ نے وہ صوت، آواز دی ہے جو حضرت داؤد کو دی تھی۔ ماشاء اللہ! رات کو تم اتنے اچھے لہجے میں قرآن پڑھ رہے تھے!! انہوں نے کہا: حضور! کاش! مجھے پتہ ہوتا کہ آج میرے آقا ﷺ خود سن رہے ہیں پھر میں بنا بنا کر قرآن پڑھتا، میں تو ایسے اپنے خیال میں پڑھ رہا تھا۔ [المسند المستخرج علی صحیح مسلم: ۲/۳۸۴]

اس لیے یہ بھی حکم ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اچھی آواز دی ہے تو قرآن کو سنوار سنوار کر پڑھا جائے۔ سنوارنے کا مطلب یہ ہے کہ ادائیگی حروف کا پورا پورا خیال کیا جائے، یہ نہ ہو کہ حروف آواز کے تابع ہو جائیں۔ جیسے بعض جاہل لوگوں کی آواز بڑی اچھی ہوئی ہے، لیکن اپنی آواز کی رعایت کرتے ہیں، قرآن کے وقف وصل وغیرہ کا خیال نہیں کرتے۔ ایسا پڑھنا ناجائز ہے۔ ترتیل کا معنی ہی یہی ہے کہ حروف کی ادائیگی مخارج کی ادائیگی کا پورا پورا خیال ہو،

پھر قرآن کو سنوار سنوار کر پڑھا جائے، تاکہ وہ لوگوں کے دلوں پر زیادہ زیادہ اثر کرنے والا ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام کے بھولنے سے مسلمانوں کے فوائد:

دوسرا اس وجہ سے بھی یہ روایت منکر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، درخت کے قریب نہ جانے کا حکم تھا، لیکن حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے اور چلے گئے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمادیا: حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے اور ان کی اولاد میں بھی بھول آگئی۔ انبیاء علیہم السلام سے اگر بھول ہو بھی جائے تو پوری امت پر رحمت ہو جاتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے، بندوں سے آگے کوئی بھول کر غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دی، اسی طرح ساری امت کو قیامت تک حضرت آدم علیہ السلام کے بھولنے کا فائدہ ہو گیا۔

اگر کوئی آدمی رمضان شریف میں بھول کر پانی پی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح باقی ائمہ کا اب بھی اس پر فتویٰ ہے کہ اگر ایک آدمی نے احرام میں، عمرہ میں، حج میں بھول کر غلطی کی ہے تو اس پر دم نہیں ہے، معافی ہے۔ دم تب واجب ہوتا ہے جب وہ جان بوجھ کر غلطی کرے، لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حج و عمرہ کے احکام میں غلطی کرے، دم آئے گا! کیونکہ چودہ سو سال گزر گئے، اب بھی دین نہیں سیکھیں گے تو کب سیکھیں گے؟ ہر مسلمان مرد و عورت پر علم حاصل کرنا اللہ کے نبی نے فرض قرار دیا ہے، لہٰذا ہر بندے کے ذمہ داری ہے کہ وہ علم سیکھے۔ امام صاحب فرماتے ہیں: نسیان کا معنی یہ ہوتا ہے کہ پہلا روزہ تھا، گھر میں گلاس کے اندر پانی رکھا تھا، بھول کر پی لیا تو معاف ہے، لیکن یہ کیسا نسیان ہے عمرہ کر رہا ہے اور سینکڑوں آدمی بھی کر رہے ہیں اور یہ کہے کہ میں بھول گیا، یہ کیسی بھول ہے؟

جب معاملہ لکھا ہوا ہو تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ آج کل ہمارے نوے فیصد جھگڑے اسی قرآن کو چھوڑنے پر ہیں کہ جب ہم معاملہ کرتے ہیں، اس وقت بڑا تعلق ہوتا ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ دوست ہے، اس کے ساتھ اکٹھے رہتے ہیں۔ اگر اس کو لکھنے کا کہیں تو یہ کہے گا کہ یہ اعتبار نہیں کرتا، حالانکہ یہ اعتبار نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اسی لیے وہی دوست بعد میں دشمن بن جاتا ہے اور انکار کر دیتا ہے۔

آج کل سب سے بڑے چالاک لوگ یہ ہیں کہ جن سے آپ نے کبھی پیسے لینے ہوں، آپ اگر دعویٰ بھی کر دیں تو وہ کورٹ کے اندر کہتے ہیں: ان کے ساتھ تو ہمارا لین دین ہے، یہ ہمارے ساتھ حساب کرے۔ لوگ بھی بچے

آدمی کو جھوٹا سمجھتے ہیں کہ جب مدعیٰ علیہ کہہ رہا ہے کہ حساب کرو تو پھر حساب کیوں نہیں کرتے ہو؟ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جب ایک نے نقد پیسے لیے ہیں کہ فلاں تاریخ کو واپس کردوں گا تو اس میں حساب کا کیا مطلب ہے؟

ایک مولوی صاحب لطیفہ سنا رہے تھے کہ ایک آدمی دریا کے کنارے نہانے لگا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو تین سو روپے دے دیئے اور کپڑے دیئے کہ ان کا خیال رکھو، میں نہالوں۔ جس کو سامان دیا وہ بڑا چالاک آدمی تھا، اس کی نیت خراب ہوگئی۔ جب آدمی نہانے کے بعد باہر آیا اور دوبارہ غوطہ لگایا اور پھر تیسرا غوطہ لگایا۔ نہا دھو کر کپڑے پہن کر پیسے مانگے تو اس کے ساتھی نے کہا: کس بات کے پیسے دوں؟ آدمی نے کہا: میں نے جو تجھے دیئے تھے۔ اس نے کہا: حساب کرلو۔ آدمی نے کہا: خدا کے بندے! تمہارا اور میرا کون سا لین دین ہے کہ میں حساب کروں؟ لیکن اس نے کہا: حساب کرو۔ اس طرح جھگڑا شروع ہوگیا۔ دو چار آدمی گزرے تو انہوں نے کہا: جب وہ کہتا ہے: حساب کرو تو ٹھیک بات ہے، تم حساب کرو۔ آدمی نے کہا: اللہ کے بندے! میں نہانے لگا، میں نے اس کو پیسے بطور امانت کے دیئے تھے۔ جب میں غسل کر کے باہر نکلا ہوں تو یہ مجھے اب میرے پیسے واپس نہیں کر رہا۔ لوگوں نے کہا: جب یہ حساب کہتا ہے تو اس سے حساب کرو۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ تو مدعیٰ علیہ نے کہا کہ جب آپ نے پہلا غوطہ لگایا، دیر ہوگئی تو میں سمجھا آپ مر گئے۔ ایک آدمی جا رہا تھا، میں نے اس کو سو روپے دے دیئے کہ بستی والوں سے کہے کہ چار پائی لے آئیں، بندے لے آئے، تاکہ لاش نکالیں۔ کچھ دیر کے بعد تم نکل آئے تو میں نے اور بندے کو سو روپے دیئے کہ بستی والے خوامخواہ روتے پیٹتے آئیں گے ان کو کہو کہ آدمی نہیں مرا، زندہ ہے۔ میں واپس آیا تو پھر ڈوب گئے۔ میں نے سمجھا کہ مر گیا تو پھر میں نے تیسرے آدمی کو سو روپے دے دیئے۔ اب بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے؟

لین دین نہ لکھنے پر نقصان کا واقعہ:

پہلے ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ مولوی صاحبان خود لطیفے بناتے ہیں، حقیقتاً واقعہ نہیں ہوسکتا، لیکن اتفاق کی بات ہے کہ مجھے خود واسطہ پڑا۔ میں نے اپنے ایک دوست کو پیسے دیئے۔ اس نے ورکشاپ بنائی ہوئی تھی، اس کے پاس چار پانچ دکانیں تھیں، اس مارکیٹ کا پچاس ہزار روپے کرایہ تھا اور اس کو باقی دکانوں سے ہی پچاس ہزار روپے کرایہ مل جاتا تھا، گویا اس کی ورکشاپ مفت ہوگئی۔ اس نے ورکشاپ ڈیڑھ لاکھ روپے ٹھیکے پر دے دی۔ اس طرح کرایہ کرائے میں چلا گیا اور ڈیڑھ لاکھ روپے نفع ہوگیا۔ جب میں نے چار سال کے بعد اس سے پیسے مانگے، اس نے

کہا: حساب کریں۔ میں نے اس سے کہا: کس بات کا حساب کروں؟ جب دکان کا کرایہ پچاس ہزار آ رہا ہے اور تم نے بھی پچاس ہزار کرایہ دینا تھا کہ کرایہ کرائے کے ساتھ برابر ہو گیا، باقی ڈیڑھ لاکھ تم نے ٹھیکے پر دی ہوئی ہے تو حساب کس بات کا کروں؟ اس نے آج تک نہ حساب کیا اور نہ پیسے دیئے۔ ہم نے بھی ''انا للہ'' پڑھ لی کہ چلو آخرت میں لے لیں گے۔ اب اگر اس کو کوئی گلہ دیتا ہے تو تم نے استاد کے ساتھ اچھا نہیں کیا تو وہ کہتا ہے کہ استاد صاحب حساب ہی نہیں کرتے تو میں کیا کروں؟ اب معلوم ہوا کہ ایسی باتیں لطیفہ نہیں، بلکہ حقیقت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے حرم میں رہتے ہوئے ایک شاگرد ایسے کر سکتا ہے تو باہر والوں کا کیا حال ہوگا؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ جب حضور سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے اور وہ لوگ پیسے لے لیتے تھے کہ تم مجھے ایک سال میں اتنا پھل دو گے، دوسرے سال اتنا پھل دو گے اور تیسرے سال اتنا پھل دو گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں کر سکتے ہو، لیکن شرط یہ ہے کہ ایک تو وقت معلوم ہو کہ کب دو گے؟ دوسرا کیل معلوم ہو کہ وزن ہے تو معلوم ہو اور صفت معین کرو تو جائز ہے، پھر کوئی حرج نہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں: لیکن دین کے اندر کتابت اچھی بات ہے۔ اگر کسی نے نہ لکھا تو گناہگار نہیں ہوگا؛ کیونکہ اس نے استحباب پر عمل نہیں کیا۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں: یہاں کتابت کا امر وجوب کے لیے ہے، جبکہ جمہور کے نزدیک امر استحباب کے لیے ہے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابو سلمان المراغی رحمہ اللہ (یہ وہ تابعی ہیں جنہوں نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے بھی ملاقات کی ہے، یعنی وہ اتنے شان والے آدمی تھے۔ انہوں) نے فرمایا: کیا تمہیں پتہ ہے ایک مظلوم ایسا ہے جو اپنے اللہ سے دعا مانگتا ہے اور اس کی دعا منظور نہیں ہوتی؟ حالانکہ مظلوم کی دعا کا تو اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ میں ضرور منظور کروں گا۔ ساتھیوں نے عرض کیا: وہ کون سا مظلوم ہے؟ فرمایا: کسی نے کسی کو قرضہ دیا، لیکن تحریر نہیں کی۔ جب میعاد ختم ہو گئی تو اس کے قرض دار نے انکار کر دیا کہ میں نے تو تمہارا کوئی قرضہ نہیں دینا ہے۔ اب اس کے پاس تحریر تھی نہیں، وہ اب مظلوم تو ہے کہ اس کا پیسہ مارا گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول نہیں کی؛ کیونکہ تو نے تو میری نافرمانی کی ہے، میں نے تو کہا تھا کہ لکھ لیا کرو تو تم نے کیوں نہیں لکھا تھا؟

اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر قرض لینے کا واقعہ:

بنی اسرائیل کے زمانہ میں ایک آدمی نے دوسرے آدمی سے ایک ہزار قرض طلب کیا تو اس نے کہا: میں قرض

دیتا ہوں، لیکن گواہ لے آؤ۔ اس نے کہا: ''وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا'' اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے۔ آدمی نے کہا: کوئی ضامن لے آؤ، جو تمہاری ضمانت دے کہ تم پیسے واپس دے دو گے۔ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ میرا ضامن ہے۔ آدمی نے کہا: ٹھیک کہتے ہو۔ اس کے بعد اس نے قرضہ دے دیا۔ اب جب قرضہ واپس کرنے کا وقت مقرر آ گیا تو جس نے قرضہ لیا تھا وہ واپس کرنے کے لیے آیا۔ درمیان میں دریا تھا، اس نے کشتی تلاش کی، لیکن وہ اس کو نہ ملی۔ ایک لکڑی ملی، اس کے اندر سوراخ کیا اور اس میں پیسے رکھ کر اچھی طرح بند کر دیا اور اس کے بعد کہا: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں نے فلاں بندے کا قرضہ دینا ہے اور میں نے تیری ذات کو ضامن بنایا تھا اور میں نے تمہیں گواہ بنایا تھا۔ اب مجھے سواری نہیں ملی، وعدہ کا وقت گزر جائے گا، میں نہیں پہنچ سکوں گا۔ اس کے بعد لکڑی کو دریا میں ڈال کر کہا: اے اللہ میاں! تو جان اور تیرا کام جانے۔ خدا کی قدرت یہ ہے کہ جس نے قرضہ لینا تھا وہ بھی دریا کے کنارے آیا ہوا تھا کہ وہ آدمی کشتی پر آئے گا تو میں اس سے پیسے لے لوں گا، لیکن کوئی کشتی نہ آئی۔ اتفاق سے اس نے دیکھا کہ ایک لکڑی تیرتے تیرتے دریا کے کنارے آ گئی تو اس نے کہا: فارغ جا رہا ہوں، یہی لکڑی گھر اٹھا کر لے جاتا ہوں، کام آ جائے گی۔ جب وہ لکڑی اٹھا کر لایا، اس کو توڑا تو اندر سے ایک ہزار دینار ملے اور ایک خط بھی ہے کہ اے اللہ! میں نے تجھے ضامن بنایا تھا، تجھے گواہ بنایا تھا، میں یہ پیسے دے رہا ہوں۔ اس آدمی نے پیسے رکھ لیے۔ کچھ عرصے کے بعد قرض دار ایک ہزار دینار لے کر پھر آ گیا کہ پتہ نہیں قرض خواہ کو لکڑی ملی تھی یا نہیں ملی تھی؟ وہ قرض دار کے پاس آیا اور کہا: میں تو نہیں آ سکا۔ قرض دار نے کہا: جب تم نے بھی نہیں بھیجے تو اللہ تعالیٰ کو جو تم نے کفیل بنایا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیج دیے ہیں۔ یہ دیکھو! تمہارا خط ہے، مجھے پیسے مل گئے۔ اس لیے اب تم پیسے واپس لے جاؤ۔ جب مجھے میرا حق مل چکا ہے تو میں دوبارہ کیوں وصول کروں؟ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۱۶]

(فائدہ) جو آدمی دیانت داری سے اللہ تعالیٰ کو کفیل بنائے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتے ہیں۔

لکھنے سے انکار کرنے پر وعیدات:

جیسے زبان سے اچھی بات کرنا صدقہ ہے، اسی طرح اگر تم لکھنا پڑھنا جانتے ہو اور دوسرا بھائی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا، اگر اس کو لکھ کر دے دو تو یہ تمہارے قلم کا صدقہ ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ''إِنَّ مِنَ الصَّدَقَةِ أَنْ تُعِيْنَ صَانِعًا وَ تَصْنَعُ لِأَخْرَقَ'' کہ یہ بھی تمہارا صدقہ ہے کہ تم کسی کاریگر کی مدد کرو، اسی طرح اگر کسی کی کوئی چیز پھٹ گئی

تو اس کے بنانے میں مدد کر دو، یہ بھی تمہارے صدقے کا ثواب شمار ہو جائے گا۔[صحیح البخاری: رقم:۲۵۱۸]

حدیث میں آیا ہے: ''مَنْ كَتَمَ عِلْمًا يَعْلَمُهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنَ النَّارِ'' اگر کسی کو علم ہے، لیکن اس نے اپنا علم چھپا دیا، مثلاً: لکھنے کا علم ہے، لیکن نہیں لکھتا، مسئلے کا علم ہے، لیکن مسئلہ صحیح نہیں بتایا، اپنے وقت کی بچت کرتا ہے تو ''أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنَ النَّارِ'' قیامت کے دن اس کو جہنم کی لگاموں میں سے ایک لگام چڑھائی جائے گی۔[مسند احمد: ۲/ ۳۰۴، طبرانی فی الکبیر: ۵/ ۱۱]

حضرت عطاء ؒ اور حضرت مجاہد ؒ فرماتے ہیں: کاتب کے ذمہ یہ امر ہے کہ جب اس سے کوئی لکھنے کا کہے تو وہ لازماً لکھے۔

بہر حال فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی کاتب لکھنے کا عمل کرتا ہے اور اگر وہ اس لکھنے پر کوئی اجرت لے تو کوئی حرج نہیں، جیسا کہ متاخرین کا فتویٰ ہے کہ اگر کوئی مدرس ہے، قرآن پڑھاتا ہے اور اس پر تنخواہ لیتا ہے تو جائز ہے، اسی طرح جیسے مؤذن اذان کی تنخواہ لیتے ہیں یا امام اپنی امامت کی تنخواہ لیتے ہیں تو علماء متاخرین نے جواز کا فتویٰ دیا ہے؛ کیونکہ پہلے زمانہ میں اسلامی حکومت میں بیت المال ہوتے تھے، وہ بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیتے تھے، لہٰذا مدرس، امام، مؤذن اور کاتب کو کسی دوسرے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، لیکن اب بیت المال تو اسلامی نہیں ہے اور ان لوگوں کی ضروریات ہیں، لہٰذا اگر وہ جائز اجرت لے لیں تو جائز ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ کاتب دھوکہ نہ کرے۔

معاملہ لکھنے والا زیادتی کرے گا تو مجرم ہوگا:

ہمارے ملکوں میں..... اللہ تعالیٰ معاف کرے..... بڑے دھوکے ہوتے ہیں۔ لوگ پہلے جا کر عرض نویس سے پہلے بات کر لیتے ہیں کہ میں فلاں ایک آدمی کو لے کر آؤں گا، ہمارا معاہدہ تو یہ ہوگا، لیکن تم نے لکھنا یہ ہے۔ اب وہ دوسرا بے چارہ پڑھا ہوا نہیں ہوتا اور عرض نویس نے زبانی کلامی سنا دیا۔ اب جب بعد میں بات کھلی کہ اس نے اس میں وہ بات لکھی ہوئی ہے جو اس نے کہی ہی نہیں تھی۔

اسی طرح ہمارے ملک میں ایک اور بڑا ظلم ہے۔ میاں بیوی میں جھگڑا ہوا، طلاق ہوگئی۔ وہ کہتے ہیں: ہمیں طلاق باقاعدہ لکھ کر دو تو وہ عدالت میں جا کر اسٹام خریدتے ہیں اور اقرار نامہ لے کر عرض نویس کے پاس جاتے ہیں کہ اس نے طلاق دی ہے اور طلاق نامہ لکھنا ہے۔ اب عرض نویس نے چونکہ پچاس یا سو روپے اپنا معاوضہ لینا ہے، وہ اللہ کا بندہ لازماً تین طلاق لکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے: میں نے چونکہ پیسے لیے ہیں، اس لیے کام پکا کروں گا،

حالانکہ یہ ناجائز ہے؛ کیونکہ اگر طلاق دینے والے نے ایک طلاق دی ہے تو یہ کیوں تین لکھ رہا ہے؟ اور اگر اس نے دو طلاقیں دی ہیں تو یہ تین کیوں لکھ رہا ہے؟ حالانکہ اس کو وہ بات لکھنی چاہیے جو اس نے کی ہے، لیکن اپنی طرف سے تین دفعہ لکھے گا کہ نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس لیے ایسی زیادتی کاتب نہ کرے، بلکہ سمجھائے کہ تم نے اگر بیوی کو طلاق دینی ہے تو ایک طلاق سے تمہارا مسئلہ حل ہوسکتا ہے، اس لیے تین طلاقیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن آج ہر آدمی فیس کو تو دیکھتا ہے، وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اسلام کیا کہتا ہے؟

مسئلہ:

جس بندے کے ذمہ قرضہ ہو وہ اگر سفید ہے، کم عقل ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنا پیسہ ضائع کر دیتے ہیں تو حاکم اس پر پابندی لگا دیتا ہے کہ تم کچھ نہیں کر سکتے ہو یا یہ کہ کمزور ہے یا چھوٹا ہے۔ اب ایسے آدمی کے بارے میں ہوسکتا ہے کہ غلط لکھوا دے، مثلاً: یہ لکھوا دے کہ میں نے اس کا دس لاکھ دینا ہے، حالانکہ دینا اس نے دس ہزار ہو تو اسلام نے ایسے آدمی کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ جو اس کا ولی الامر ہے اس کو چاہیے کہ وہ بتائے کہ اس پر اتنا قرض ہے۔

گواہ کے معاملہ کے اندر یہ دیکھو کہ وہ دیندار ہوں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں، تاکہ اگر کل کو شہادت کا معاملہ آئے تو کسی کو نقصان نہ پہنچائیں۔

﴿مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ مفسر فرماتے ہیں: اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ گواہ عدل وانصاف والے ہونے چاہئیں، کرائے کے گواہ نہ ہوں۔ جیسا کہ آج کل رواج بن گیا ہے کہ گواہی دینے کے لیے خاص بندے موجود ہوتے ہیں، ان سے جو مرضی آئے گواہی دلوا دو۔ یاد رکھیں! شریعت میں ایسے بندوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، یہ کم ذات لوگ ہوتے ہیں اور جھوٹی گواہی دینا بہت بڑا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسی گواہی سے محفوظ رکھے۔ جھوٹ خود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ﴾ [آل عمران:٦١] اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے جھوٹوں پر۔ آج ہم لوگوں نے ہر چیز میں اپنے پیمانے بنا لیے ہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شراب، زنا گناہ ہے اور شرک گناہ ہے، لیکن جھوٹے کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ دنیا میں رواج ہے۔ اور وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹے آدمی پر لعنت بھیجی ہے۔ اور اسی طرح جھوٹی گواہی دینا کبیرہ گناہوں کے اندر شامل ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک فیصلہ ہے کہ جو بھی لفظ قرآن میں آجائے اس کے

بارے میں وہ کہتے ہیں: شہادت مطلق ہے، اس کی کوئی شرط نہیں۔ باقی ائمہ فرماتے ہیں کہ شاہد کے لیے عادل ہونا ضروری ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ صرف فرماتے ہیں: ﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ﴾، لیکن آگے فرمایا: ﴿مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ اس کو مقید کردیا گیا، اس لیے گواہوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ عادل ہوں۔

لین دین میں گواہی ہونے چاہیے:

جب کوئی آدمی لین دین کرے تو تحریر بھی کریں اور اس پر گواہ بھی بنائیں کہ گواہ گواہی دیں کہ ہمارے سامنے یہ لین دین ہوا ہے اور ہمارے سامنے یہ دستخط ہوئے ہیں۔ اب اس میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ یہ گواہ بنانا واجب ہے یا مستحب ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: گواہ بنانا مستحب اور افضل ہے۔

آپ ﷺ کے اونٹ خریدنے پر گواہ کا واقعہ:

اس پر مفسر نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے: میرے آقا سرکار مدینہ ﷺ نے ایک اعرابی سے اونٹ خریدا۔ جب اونٹ کی بات چیت طے ہوگئی، آمنہ کے لعل نے جب وہ خرید لیا تو آپ ﷺ گھر تشریف لے گئے، تاکہ پیسے لے آئیں اور اونٹ کی قیمت ادا کریں۔ کچھ لوگ اس اعرابی کے پاس سے گزرے اور ان کو پتہ نہیں تھا کہ اس اونٹ کا سودا حضور اکرم ﷺ سے طے ہو چکا ہے تو جو بھی آتا اس اونٹ کی بولی لگا دیتا تھا کہ میں اتنا دوں گا۔ جب اس اونٹ کی قیمت بڑھ گئی اس اعرابی کی نیت بدل گئی کہ مجھے تو زیادہ پیسے ملتے ہیں۔ اس نے وہیں کھڑے آواز دی: یا نبی اللہ! اگر آپ نے لینا ہے تو جلدی کریں، ورنہ میں دوسرے کو دے رہا ہوں۔ اتنی دیر میں ایک اور آدمی آیا اور اس نے اور قیمت بڑھا دی۔ اعرابی اس کو اونٹ دینے پر تیار ہوگیا، حضور پاک ﷺ تشریف لے آئے، فرمایا: اللہ کے بندے! تم نے یہ اونٹ بیچا ہے اور میں نے خریدا ہے۔ اعرابی کہنے لگا: میں نے تو نہیں بیچا، صرف آپ کی اور میری بات ہو رہی تھی۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: تم نے بیچا ہے، قیمت طے ہوگئی ہے۔ میں قیمت لینے کے لیے گیا، اب میں لے کر آگیا ہوں۔ اس نے کہا: اگر میں نے بیچا ہے تو آپ کے پاس کوئی گواہ ہے تو لے آئیں؟ اب حضور اکرم ﷺ فکر مند ہو گئے کہ کہاں سے گواہ لے آؤں؟ اس وقت معاملہ تو نقد کا تھا، لوگوں نے بھی اس اعرابی کو سمجھایا کہ عقل کی بات کرو، اللہ کے نبی ہیں، وہ جو بھی فرماتے ہیں حق فرماتے ہیں۔ اعرابی نے کہا: یہ تو خرید و فروخت کا معاملہ ہے، اس لیے اگر گواہ ہیں تو ٹھیک، ورنہ میں نے نہیں بیچا۔ حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ نے

دیکھا کہ یہ بات ہو رہی ہے۔ وہ خاموش ہو کر سنتے رہے، پھر انہوں نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس بدو نے اونٹ بیچا ہے اور آپ ﷺ نے خریدا ہے۔ حضور اکرم ﷺ بڑے حیران ہوئے اور فرمایا: تم کیسے گواہی دے رہے ہو، اس وقت تو تم نہیں تھے؟ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! جب آپ فرما رہے ہیں: میں نے خریدا ہے، کیا آپ کے کہنے کے بعد کسی اور گواہی کی ضرورت ہے؟ دوسری روایت میں تفصیل ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جب جبرئیل علیہ السلام آپ پر قرآن لے کر آتا ہے تو کیا اس وقت ہم ہوتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ انہوں نے عرض کیا: ہم اس کو قرآن مان لیتے ہیں اور کیا ایک اونٹ کے سودے پر ہمیں آپ ﷺ کی زبان مبارک کا اعتبار نہیں؟ جب آپ ﷺ نے کہہ دیا تو بس میں گواہ ہوں۔ حضور اکرم ﷺ اتنے خوش ہوئے!! فرمایا: اے خزیمہ! آج کے بعد تیرے ایک کی گواہی دو کے برابر ہے۔

اس واقعہ کو بتانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ جب نبی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آ سکتا ہے تو تم بھی گواہ بنالیا کرو، تاکہ کل کو ایسے واقعات پیش نہ آئیں۔ دوسرا یہ نکلا کہ بغیر گواہ کے بھی سودا ہو سکتا ہے، ورنہ حضور اکرم ﷺ سودا ہی نہ کرتے، پہلے گواہ بلاتے اور پھر سودا ہوتا۔

تین آدمیوں کی دعا قبول نہیں ہوتی:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تین آدمی ایسے ہیں جو دعا کرتے ہیں، لیکن ان کی دعا قبول نہیں ہوتی:

1 ......ایک وہ آدمی ہے جس کی عورت بدخلق ہے اور وہ اس کو طلاق نہیں دیتا۔ ایسے آدمی کی بھی دعا قبول نہیں ہوتی۔ (سیئۃ الخلق" سے مراد زانیہ عورت ہے) ایسے آدمی کی نہ امامت قبول ہوتی ہے اور نہ عدالت قبول ہوتی ہے؛ کیونکہ وہ دیوث ہے۔

2 ......دوسرا آدمی وہ ہے کہ جو یتیم کا مال اس کے پاس ہے اور یتیم ابھی بالغ نہیں ہوا تو وہ یتیم کو کہے کہ اپنا مال لے جاؤ، میں تمہارا مال اپنے پاس نہیں رکھتا۔ ایسے آدمی کی دعا اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے کہ اس نے یتیم کے مال کو ضائع کیوں کیا؟

3 ......اور تیسرا وہ آدمی جو کسی کو قرض دے، لیکن گواہ نہ بنائے۔ ایسے آدمی کی بھی دعا قبول نہیں ہوتی؛ کیونکہ اس نے قرآن کے حکم کی مخالفت کی ہے۔

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۲۸۴﴾ [البقرة: ۲۸۴]

''اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دل میں ہے یا اس کو چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ پس جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

یعنی اگر تم لوگ میرے حکم پر نہیں چلو گے تو میرا کوئی نقصان نہیں ہے۔ میں جو تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ قرضہ دو تو لکھ لو، امانت دو تو لکھو اور گواہ گواہی دیں، سارے کام تیرے نفع کے لیے ہیں، میرے لیے تو کوئی نفع نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر ہم نے تمہیں سود سے منع کیا ہے تو اس کا فائدہ صرف تمہارے لیے ہے۔ آج پوری دنیا پر نظر ڈال لو کہ سود خور یہودیوں نے اپنے پنجے کے اندر سب لوگوں کی زندگیاں لے رکھی ہیں۔ سود کا نتیجہ ہے۔ جب سے دنیا سود کے چکروں میں آئی ہے اب بندے نہیں، بلکہ ملکوں کے ملک سود خور اداروں کے پنجوں میں ہیں۔ وہ جو حکم دیں گے تم اس کو مانو گے اور قرضے سے تم نکل نہیں سکتے ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تمہارے فائدے کے لیے اس کو حرام کیا ہے، ورنہ تو سب کچھ میرا ہے، مجھے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

اور ان روایات میں ارشاد فرمایا کہ یاد رکھو! ''مَالِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' میں ہوں آسمانوں اور زمینوں کے خزانے کا مالک۔ دوسرا یاد رکھو! جو کچھ تمہارے جی کے اندر ہے تم اس کو ظاہر کرو، بلکہ دل کے اندر چھپائے رکھو اور چپکے سے اس کام کو سرانجام دینا چاہو، میں سب جانتا ہوں، میرے آگے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔

آیت کا شانِ نزول:

حدیث شریف میں ہے کہ بڑے بڑے کافر کعبہ شریف کے دروازے کے پاس کھڑے تھے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے: کیا اللہ تعالیٰ سنتا ہے؟ کہنے لگے: ہاں سنتا ہے۔ دوسرے نے کہا: کیسے سنتا ہے؟ کسی نے کہا: جب ہم زور سے بولتے ہیں تو سنتا ہے اور جب ہم آہستہ آہستہ بات کرتے ہیں وہ اللہ نہیں سنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں: ﴿اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَــهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۷﴾ [الاعلیٰ: ۷] جو تم ظاہر کرو اور جو تم چھپاؤ سب جانتا ہے، چاہے تم آہستہ

آہستہ بات کرو یا زور سے بات کرو وہ سب سنتے ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ۝﴾ [غافر:۱۹] تیری آنکھ جو خیانت کرتی ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، کسی عورت کو سامنے جاتے ہوئے دیکھا اور دل کے اندر فتور آ گیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں اس کو بھی جانتا ہوں، میرے آگے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ تو جب اس پر بیٹی سمجھ کر نظر ڈالتے ہو تب بھی میں جانتا ہوں، تم جب بہن سمجھ کر نظر ڈالتے ہو تب بھی میں جانتا ہوں اور جب تم شہوانی اور حیوانی لذت کے طور پر نظر ڈالتے ہو تب بھی میں جانتا ہوں۔ خدا کی شان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی کبھی ایسا مقام دے دیتے ہیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی آپ کی مجلس میں آیا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد فرمایا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ لوگ زنا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے؟ بعد میں جب دوستوں نے بات کھولی تو آپ نے فرمایا: اس آدمی کی آنکھوں میں زنا کا اثر مجھے نظر آ رہا تھا۔ بلکہ بعض علماء نے تو اس کی ایک آسان مثال دی ہے کہ اس میں بہت بڑی ولایت کی ضرورت نہیں، بلکہ بڑا آسان مسئلہ ہے کہ ایک عورت ہے یا مرد ہے، اس کی ساری رات تہجد پڑھتے ہوئے گزر جائے اور ایک مرد یا عورت کی ساری رات زنا میں گزر جائے تو غور سے دیکھنا کہ ایک کے چہرے پر تمہیں لعنت برستی نظر آئے گی اور دوسرے کے چہرے پر تمہیں رحمت برستی نظر آئے گی۔

﴿وَإِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ اللَّهُ ۖ﴾ یعنی اگر کوئی آدمی ظاہر میں مثلاً: سود نہ کھائے، لیکن اندر اندر کاروبار کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں تو جانتا ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو؟ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو سب کا حساب ہو گا۔

﴿فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۗ﴾ میں جس کو چاہوں بخشوں اور جس کو چاہوں عذاب دوں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھیں کہ مغفرت کو مقدم کیا اور عذاب کو مؤخر کیا۔ اس سے اشارہ کیا کہ میری رحمت بڑی وسیع ہے کہ اگر تم توبہ کر لو تو میں بخشنے کے لیے تیار ہوں۔ میری رحمت بڑی ہے، میرے غضب پر سبقت لینے والی ہے۔ کتنے بڑے گناہ ہوں، میں جس کو چاہوں بخش دوں۔

ایک آیت میں ہے کہ جو ہم کریں گے یا دل میں چھپائیں گے اس کا حساب ہو گا، لیکن دوسری آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحمت فرما دی ہے کہ دل کے اندر جو وساوس ہوں اور برے خیالات ہوں ان پر مؤاخذہ

نہیں ہوتا، وہ معاف ہیں، البتہ جس بات پر ہم بالکل عزم کرلیں اس پر مؤاخذہ ہوگا۔ بعض علماء نے یہ بھی فرمایا کہ یہ بات منسوخ ہوگئی، جب یہ آیت اتری: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرۃ:۲۸۶] کہ کسی بندے کو اللہ تبارک وتعالیٰ تکلیف نہیں دیتے، لہٰذا دل کے اندر خیالات کا آجانا، حتیٰ کہ آدمی اگر بعض اوقات نہ بھی چاہے، خیالات آجاتے ہیں، جو انسان کے بس میں نہیں ہیں، تو اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں: اس میں ناسخ منسوخ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آگے ہر چیز ظاہر ہے اور ذرے ذرے کا بھی حساب ہوگا۔ ہاں یہ اس کا کرم ہے کہ کسی چیز کو معاف فرمائیں اور کسی کو معاف نہ فرمائیں۔

مفسر ؒ فرماتے ہیں: ان آیات کے اندر اشارہ ہے کہ ہر چیز کا حساب ہوگا۔ جب یہ آیات مبارکہ نازل ہوئیں تو صحابہ کرام ؓ بہت گھبرا گئے اور انہوں نے کہا: ہم اس بات سے ڈر گئے کہ بڑے اعمال ہوں یا چھوٹی چھوٹی چیزیں ہوں سب کا حساب ہوگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا ایمان قوی تھا، ان کا یقین اللہ تعالیٰ کے ساتھ قوی تھا۔ تو جتنا ایمان قوی ہوتا ہے اتنا اللہ تعالیٰ سے ڈر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں! ایک متقی آدمی ایک پانی کا گھونٹ پینے سے بھی ڈرتا ہے کہ حلال ہے یا حرام ہے اور عام آدمی کہتا ہے کہ کھالو، بعد میں دیکھا جائے گا۔

صحابہ ؓ کا ایمان اتنا بلند تھا، وہ ایمان کے پہاڑ تھے، پہاڑوں میں زلزلہ آسکتا ہے، لیکن صحابہ ؓ کا ایمان اس سے بھی زیادہ ثابت تھا۔ اس لیے وہ ذرا سی بات پر بھی ڈرتے تھے۔ اور جن کا ایمان کمزور ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا خوف بھی دلوں میں کمزور ہوتا ہے، وہ پرواہ نہیں کرتے۔

حضور اکرم ﷺ نے ہمیں اس کی مثال سمجھائی ہے کہ ایمان والے بندے سے اگر گناہ ہوجائے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھ پر پہاڑ گر گیا ہے اور عام آدمی جو صرف نام کا مسلمان ہے اس سے کوئی گناہ ہوجائے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ مکھی ناک پر بیٹھی تھی اس کو اڑا دیا۔ بس اسی طرح گناہ ہوگیا تو ہوگیا، بندے سے غلطی ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بندے کو پیدا کرکے فرمادیا ہے کہ اگر ذرے کے برابر نیکی کروگے تو اس کا بدلہ ملے گا اور ذرے کے برابر گناہ کروگے تو اس کا بدلہ بھی تمہیں ملے گا۔

حدیث:

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیات مبارکہ نازل ہوئیں: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي

الْاَرْضِ......﴾ تو حضور اکرم ﷺ کے صحابہ پر یہ آیت بڑی سخت گزری۔ وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہ اتنے گھبرائے ہوئے تھے کہ گھٹنوں کے بل گر گئے، کھڑے بھی نہ ہو سکے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تم نماز پڑھو، روزہ رکھو، جہاد کرو اور خیرات کرو تو وہ ہماری طاقت میں تھا، ہم نے کیا، لیکن اب جو آیات نازل ہوئیں ہیں اس میں تو ہماری طاقت نہیں ہے کہ جو ہمارے دل میں آ جائے، ہم کیا کریں؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: کیا تم اسی طرح کرنا چاہتے ہو جیسے یہود و نصاریٰ نے کیا کہ جب ان پر اللہ تعالیٰ کا حکم آیا تو انہوں نے کہا: ''سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا'' ہاں ہم نے اللہ تعالیٰ کا حکم سنا ہے، لیکن ہم نہیں کر سکتے، تو کیا تم بھی وہی کہنا چاہتے ہو؟ بلکہ کہو: ''سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا'' جو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ہم نے وہ سنا اور اس پر اطاعت گزار ہیں۔ اب جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ بات مان لی کہ جو اللہ تعالیٰ حکم فرماتے ہیں: ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ......﴾ کہ اللہ کے رسول اس بات پر ایمان لے آئے جو اللہ تعالیٰ نے اتاری اور ایمان والے بھی سب اس بات پر ایمان لے آئے۔ تو جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ آیات تلاوت کیں اور ان کی زبانوں پر چڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو تکلیف نہیں دیتے، مگر جو اس کی طاقت کے مطابق ہے۔ اگر کوئی چیز طاقت سے باہر ہے، مثلاً: برے وساوس آ گئے جو بس میں نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ اس پر مؤاخذہ نہیں کریں گے۔

برے وسوسے پر عمل کرنے پر پکڑ ہے:

(حدیث) ایک صحابی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تھا، انہوں نے یہ آیات تلاوت فرمائیں اور رو پڑے۔ اس کے بعد جب یہ آیت اتری تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بڑے روئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں! میرے بھائی! جب یہ آیت اتری تھی تو سب صحابہ رضی اللہ عنہم غم میں مبتلا ہو گئے تھے اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو سخت تکلیف بھی پہنچی کہ ہمارے دل میں بھی جو خیال آئے پکڑے جائیں، اس طرح تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ تو انہوں نے حضور پاک ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا: ہم جو عمل کریں گے اس پر تو پکڑ ہو گی، لیکن ہم دل کے خیال کو کیسے روک لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارا کام یہ ہے کہ کہو: ''سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا'' یا اللہ! جو تیرا حکم ہے اس کی اطاعت کریں گے۔ جب انہوں نے یہ کہا تو اللہ تعالیٰ نے

دوسری آیت نازل فرمادی اور قدرت کی طرف سے یہ فیصلہ ہوا کہ جو دل میں خیال آئے وہ تو معاف ہے، لیکن اگر اس پر عمل کرو گے تو پکڑ ہوگی اور سزا دی جائے گی۔ [مسند احمد: ۱/ ۲۳۲]

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ پاک نے میری امت پر رعایت فرمادی ہے کہ جو چیز ان کے دل میں ہے، لیکن وہ زبان سے نہ کہے اور اس پر عمل نہ کرے تو اللہ تعالیٰ پکڑیں گے نہیں۔

[تفسیر قرطبی: ۶/۱۰۶]

مفسر فرماتے ہیں: صحیحین کے اندر روایت ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: حضور پاک ﷺ نے فرمایا: "قَالَ اللّٰهُ: إِذَا هَمَّ عَبْدِيْ بِسَيِّئَةٍ فَلَا تَكْتُبُوْهَا عَلَيْهِ، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا سَيِّئَةً، وَإِذَا هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَاكْتُبُوْهَا حَسَنَةً، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا عَشْرًا" اللہ تبارک تعالیٰ فرماتے ہیں: میرا بندہ اگر دل میں کسی برائی کا ارادہ کرے تو ہم فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ یہ نہ لکھو۔ اگر اس نے برائی کا ارادہ کرنے کے بعد اس پر عمل بھی کیا تو حکم ہوتا ہے کہ ایک برائی لکھو۔ اور اگر دل میں نیکی کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تو اس کی نیکی کا ارادہ لکھ لو اور اگر اس پر عمل کرے تو پھر اس پر دس گنا ثواب لکھ دو یعنی اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ بندہ اگر برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو نہیں لکھا جاتا اور اگر کرے تو ایک برائی لکھتے ہیں اور اگر بندہ نیکی کا صرف ارادہ بھی کرتا ہے تو حکم ہوتا ہے کہ نیکی لکھ لو۔ [زاد المسیر لابن الجوزی: ۱/ ۳۴۳، تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۲۰]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب میرا بندہ اچھائی کا ارادہ کرتا ہے تو میں نیکی لکھ دیتا ہوں اور جب وہ اس اچھی بات پر عمل کرتا ہے تو میں دس گنا لکھ دیتا ہوں۔ دوسری حدیث میں ہے کہ فرشتے لکھ دیتے ہیں۔ تو ان میں کوئی تعارض نہیں؛ کیونکہ فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے لکھتے ہیں تو گویا کہ اللہ تعالیٰ نے لکھا۔

حدیث: کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: بعض اوقات ہمارے دل میں ایسی باتیں آجاتی ہیں کہ ہم ڈر جاتے ہیں کہ ہم برباد ہو گئے، یعنی دل میں بری باتیں آجاتی ہیں، نبی کے خلاف، صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہی ایمان کی نشانی ہے۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو نہ ڈرتے۔ ایسی باتوں پر اللہ تعالیٰ نہیں پکڑتے، معاف فرمادیتے ہیں۔

بعض بزرگوں نے شیطان کے وسوسے سے بچنے کا ایک طریقہ لکھا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ عقیدہ رکھیں کہ جو دل میں برا خیال آتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے تو بات ہی ختم ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس پر مؤاخذہ

نہیں کرتا تو شیطان نے جو زور لگانا ہے لگا تا رہے۔

بزرگ کی تہجد قضا ہونے کا واقعہ:

دوسرا بزرگوں نے لکھا ہے کہ ایک اللہ والے کی تہجد کی نماز فوت ہوگئی۔ صبح کو اٹھے اور سارا دن روتے رہے کہ اے اللہ! مجھ سے کون سا گناہ ہوگیا تھا کہ میں تہجد سے محروم ہوگیا!؟ تو اس اللہ والے نے سارا دن نفلوں میں گزار دیا کہ رات کی تہجد جو رہ گئی، اس کے ازالہ کی کوشش کروں۔ رات کو جب سوئے اور تہجد کا وقت آیا تو شیطان نے پانچ دس منٹ پہلے آکر جگایا کہ تہجد کے لیے اٹھ جاؤ۔ جب وہ اللہ والے اٹھے تو اس کو دیکھ کر فرمایا: کیا تم شیطان ہو؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس اللہ والے نے فرمایا: کیوں جگانے آئے تھے؟ اس نے کہا: تم نے جو دن میں دو سو نفل پڑھے ہیں، اس سے بہتر ہے کہ یہی چار رکعت پڑھ لو۔

نماز میں شیطان کے وساوس سے بچنے کا حیلہ:

اس لیے بزرگوں نے لکھا ہے: اگر کوئی شیطان کے حملے کو روکنا چاہے تو اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ دو رکعت پڑھ رہے تھے، شیطان نے درمیان میں وسوسہ ڈالا تو دو رکعت اور پڑھو۔ پھر نماز میں وسوسے ڈالے تو سجدہ اور زیادہ لمبا کر دو اور وسوسہ ڈالے تو تم نماز کو اور لمبا کر دو۔ اس طرح شیطان وسوسہ ڈالنا چھوڑ دیتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں چھوڑتا۔ لہٰذا شیطان کے وسوسوں سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب وہ برائی سے باز نہیں آتا تو تم اچھائی سے باز کیوں آؤ؟ اس طرح وہ خود راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور پاک ﷺ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے جو ہر بندے کے ساتھ ایک شیطان لگایا ہے کیا آپ ﷺ کے ساتھ بھی ہے؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ہاں! میرے ساتھ بھی ہے، لیکن وہ اسلام لے آیا۔ وہ مجھے کوئی بری بات کہہ ہی نہیں سکتا۔

بعض علماء فرماتے ہیں: یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ اسی طرح موجود ہے۔ قیامت والے دن جب ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوگی، اللہ تعالیٰ اپنے ایمان والے بندوں کو بلا کر فرمائیں گے: یہ وہ اچھے اعمال ہیں جو تم نے کئے، یہ برے اعمال ہیں جو تم نے کئے اور یہ وہ اعمال ہیں جن کا تم دل میں خیال لے آئے، جن کے بارے میں فرشتوں کو بھی پتہ نہیں، لیکن مجھے پتہ ہے۔ اور جو کافر لوگ ہیں، جن کے دل میں نفاق و شک ہوگا، اس پر

اللہ تعالیٰ ان کو پکڑیں گے، لہٰذا یہ آیت منسوخ نہیں۔

﴿یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ط﴾ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت والے دن خبر دیں گے کہ تم نے دل میں یہ خیال کیا تھا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے پتہ نہیں، بلکہ مجھے سب کچھ پتہ ہے، لیکن میں نے معاف کیا۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو پسند کیا ہے کہ یہ آیت محکمہ ہے، منسوخ نہیں ہوئی۔ اور محاسبہ کا معنی یہ نہیں کہ عذاب بھی ہو۔ حساب علیحدہ چیز ہے اور عذاب علیحدہ چیز ہے۔

حضرت ہشام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ ایک آدمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ہو کر عرض کیا: قرآن میں جو لفظ "نَجْوٰی" آتا ہے (سرگوشی کرنا) اس کا کیا مطلب ہے؟ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اپنے آقا سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے: اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے مومن بندے کو اپنے قریب کریں گے، حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سایہ کے نیچے آئے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے فرمائیں گے: تم نے یہ گناہ کیا ہے اور یہ گناہ کیا۔ ان گناہوں کا اقرار کرے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: جاؤ! ہم نے معاف کر دیا۔ اس کے بعد اس بندے کو دائیں ہاتھ میں صحیفہ اعمال مل جائے گا، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو قیامت میں بھی رسوا نہیں کریں گے۔ [تفسیر قرطبی: ۶/ ۱۹۹]

لیکن کافروں اور منافقوں کے بارے میں اعلان کر دیا جائے گا: ﴿هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ﴾ [ھود: ۱۸] یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر بھی جھوٹ بولا۔ پس آج ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت علی بن زید رضی اللہ عنہ نے بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سوال پوچھا: ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ط﴾ کا کیا معنی ہے؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم نے مجھ سے ایسا سوال پوچھا ہے کہ جب میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا اس کے بعد مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا۔ یہ بندے کی اللہ تعالیٰ سے حکایت ہے۔ بندے کو جو بخار آئے یا تکلیف پہنچ جائے اور کوئی چیز بازو میں باندھ کر بھول گیا اس پر بھی اللہ تعالیٰ رحمت فرما دیتے ہیں اور گناہ معاف کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اپنے گناہوں سے ایسے نکلتا ہے جیسا کہ سونے کو آگ میں ڈالا جائے تو وہ خالص ہو کر نکل آتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے گناہ معاف کر دیتے ہیں کہ کبھی کانٹا لگ گیا تو معاف کر دیا، سر میں درد ہو گیا تو معاف کر دیا، کوئی چیز رکھ کر بھول گیا اور پریشان ہو گیا تو

اس پر معاف کر دیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو گناہوں سے صاف کر کے قیامت والے دن پیش کرتے ہیں۔ یہ حدیث غریب ہے۔ اس کے راوی علی بن زید بن جدعان ضعیف ہیں، جو غریب روایات بیان کرتا رہتا ہے۔[جامع الترمذی: رقم: ۲۹۹۱]

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۸۵، ۲۸۶]

”رسول نے مان لیا جو کچھ اس پر اس کے رب کی طرف سے اترا اور مومنین نے بھی۔ ہر ایک ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ ہم فرق نہیں کرتے اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان۔ اور ان سب نے کہا کہ ہم نے سنا اور خوشی سے مانا۔ ہم تجھ سے بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے۔ نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی کو، مگر جتنی اس کو طاقت ہو۔ اس کے لیے انعام ہوگا جو اس نے (اچھا) کیا، اس پر عذاب ہوگا جو اس نے (برا) کیا۔ اے ہمارے رب! ہمارا مؤاخذہ نہ کرنا اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں۔ اے ہمارے رب! ہم پر کوئی سخت حکم نہیں بھیجیے، جس طرح سے ہم سے پہلے لوگوں پر بھیجا تھا۔ اے ہمارے رب! اور ہم پر کوئی ایسا بوجھ بھی ڈالیے جس کی ہم کو سہار نہ ہو۔ اور ہمارے گناہ مٹا دیجیے اور ہمیں بخش دیجیے اور رحم فرمایئے۔ تو ہی ہمارا کارساز ہے، پس ہمیں کافر لوگوں پر غالب کر دیجیے۔“

سورۃ البقرۃ کی آخری آیات اتنی شان والی ہیں کہ صحیح احادیث مبارک میں ہے، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مَنْ قَرَأَ الْاٰيَتَيْنِ مِنْ آخِرِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فِيْ لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ“[1] کہ جو شخص رات کو یہ آیات پڑھ لے، یہ آیتیں اس کی حفاظت کرنے والی ہیں۔ اسی طرح فرمایا: عرش کے نیچے جو اللہ تعالیٰ کے خاص خزائن ہیں ان خزائن میں سے

[1] [جامع الترمذی: رقم: ۲۸۸۱، کنز العمال: رقم: ۲۵۳۵]

اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے، جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں فرمائی گئی۔ اور وہ سورۃ البقرۃ کی آخری آیات ہیں۔ اسی طرح روایات میں یہ بات بھی آتی ہے کہ جیسا کہ آج کل بہت سارے لوگ جادو و جنات وغیرہ کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں، اس کے لیے سورۃ البقرۃ اوّل سے لے کر آخر تک تلاوت کی جائے اور ان پر پڑھی جائے۔ اگر وہ پوری سورت مبارک نہ پڑھ سکے تو سورۃ الفاتحہ، سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات: ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ تک اور آیت الکرسی ﴿خٰلِدُوْنَ﴾ تک اور اس کے بعد سورۃ البقرۃ کی یہ آخری آیات ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ سے لے کر آخر تک اس کی صبح و شام تلاوت کرے تو اللہ تعالیٰ سحر و جنات اور بلاؤں سے محفوظ فرما دیتے ہیں۔ یہ ایسی جامع آیات ہیں۔

آپ اگر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ان آیات کا تعلق سورت کے اوّل سے بھی ہے، ان آیات کا تعلق سورت کے آخر سے بھی ہے اور ان آیات مبارک کا تعلق سورت کے وسط سے بھی ہے۔ گویا ان آیات میں جب بھی آدمی غور کرے گا تو اسے سمجھ آئے گا کہ یہ ایسی موتیوں کی لڑی ہے جس کا ہر موتی عین برابر ہے، جو فصاحت و بلاغت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

ربط:

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ اگر کوئی شہادت ہو تو تم اس کو صحیح ادا کرو، شہادت کو مت چھپاؤ۔ اگر تم نے شہادت کو چھپا لیا تو تمہارا یہ دل گندا ہو جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر ارشاد فرمایا کہ تمہارے جی کے اندر بھی جو کچھ ہے قابل محاسبہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے وہ جس کو چاہیں معاف فرما دیں اور جس کو چاہیں سزا دیں، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔ تو ﴿اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ کا جو تعلق تھا وہ یہاں آ گیا۔

آیات کا شانِ نزول:

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے کہ ایک آدمی نے کوئی کام نہیں کیا، لیکن دل کے اندر خیال آ گیا۔ اگر اس پر پکڑ ہو گئی تو اس سے کوئی آدمی بچ نہیں سکتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے صحابہ! تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں تم ان کی طرح نہ کرو، بلکہ تم یہ کہو: ''سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا'' اے اللہ! جو تیرا حکم ہے ہم مانتے ہیں: کیونکہ مومن کا کام یہ ہے کہ اگر کوئی بات سمجھ آ جائے یا سمجھ نہ آئے وہ کہے: اے اللہ! بس تیرا حکم ہے۔ ہمارا

اس پر ایمان ہے۔ صحابہ نے اس بات عمل کیا اور کہا: ''سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا'' تو یہ آیات مبارک نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا اور حضور اکرم ﷺ کو فرمادیا کہ اپنے صحابہ کو بتادیں کہ جو باتیں دل میں آتی ہیں وہ دو قسم کی ہوتی ہیں: اختیاری اور اضطراری۔ یعنی ایک خیال ہمارے دلوں میں ایسا ہے کہ جو ہمارے اختیار اور ارادے کے بغیر آگیا، جیسا کہ نماز کے اندر برے برے خیال آجاتے ہیں اور کبھی کبھی بھولی ہوئی باتیں یاد آنے لگ جاتی ہیں۔ یہ غیر اختیاری ہیں، ہمارے بس میں نہیں ہیں۔ ان پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اور جو ارادے کے ساتھ ہوں اس پر مؤاخذہ ہوگا۔

ایک یہودی نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آکر کہا: عجیب بات ہے کہ ہم یہودی لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، لیکن ہم یہودی جب اپنی عبادت کرتے ہیں تو ہمارے دلوں میں گندے گندے خیالات نہیں آتے، لیکن تمہارے مسلمان جب عبادت کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہمارے دل میں برے برے خیالات آتے ہیں، کبھی خدا کے بارے میں، کبھی نبی کے بارے میں اور کبھی نفسانی اور شہوانی باتوں کے بارے میں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہیں اس کا جواب دیتا ہوں اور میں یہ مسئلہ مثال کے طور پر حل کرا دیتا ہوں، تاکہ تمہیں بات سمجھ آجائے۔ آپ نے فرمایا: ایک آدمی کے دو کمرے ہوں: ایک کمرے میں ہیرے، جواہرات، سونا اور چاندی پڑا ہوا ہو اور ایک کمرا خالی ہو تو ڈاکو کس کمرے میں داخل ہوگا؟ یہودی نے کہا: واضح بات ہے کہ جہاں سونا چاندی ہوگا ڈاکو وہیں ڈاکہ ڈالنے کے لیے جائے گا۔ آپ نے فرمایا: چونکہ تمہارے یہود و نصاریٰ کے دل ایمان سے خالی ہیں، اندر کچھ نہیں ہے کہ شیطان ڈاکہ ڈالے، اس کو پتہ ہے کہ جہنمی ہیں، ان کو گمراہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن جن لوگوں کے دلوں کے اندر نور ایمان ہے، محبت باری تعالیٰ ہے، محبتِ رسول پاک ﷺ ہے، محبتِ صحابہ و اہل بیت، اولیاء کرام ہے، وہاں شیطان ڈاکہ ڈالتا ہے کہ میں ان کو گمراہ کروں۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ جو خیالات غیر اختیاری ہیں ان پر مؤاخذہ نہیں ہوگا اور جو چیزیں ہمارے دل میں ہمارے ارادے سے آئیں گی ان پر عذاب ہوگا۔ چونکہ پہلے ﴿اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ ہو گیا تو یہاں محاسبہ کی بات آگئی۔

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾۔ سورۃ البقرۃ کی ابتداء میں پڑھا تھا، جن میں اللہ تعالیٰ نے متقین کی صفات بیان فرمائی تھیں: ﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ... وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ وہاں حکم تھا کہ وہ بن دیکھے

ایمان لاتے ہیں تو یہاں اس کی تفصیل آ گئی کہ کس پر ایمان لاتے ہیں؟ جتنی کتابیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں پر اتاری ہیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں، اسی طرح جتنے پیغمبر گزرے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک ان سب پر ایمان لاتے ہیں۔

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ﴾ یعنی سب رسولوں پر ایمان لاتے ہیں، اس طرح نہیں کہ کچھ پر ایمان لائیں اور کچھ پر ایمان نہ لائیں۔ جیسا کہ یہودیوں نے کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے، جیسا کہ نصرانیوں نے کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انکار کر دیا اور جیسا کہ دونوں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا، لیکن یہ مسلمان کو شرف ملا ہے کہ جیسے ان کا ایمان اپنے پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے اسی طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر پر ہے کہ سب اللہ کے نبی ہیں، اللہ کے رسول ہیں اور سب برحق ہیں۔

﴿وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ [البقرۃ:۲۸۵]۔ ابتدائے سورت کے اندر تھا: ﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ [البقرۃ:۳] کہ وہ عبادتِ بدنیہ سرانجام دیتے ہیں اور عبادتِ مالیہ بھی ادا کرتے ہیں۔ اور ان آخری آیات میں اس کی تفصیل آ گئی کہ اے میرے مولا! تو نے ہمیں حکم دیا: نماز قائم کرو، تو ہم نے نماز قائم کر دی۔ میرے مولا! تو نے ہمیں حکم دیا: روزہ رکھو، ہم نے روزہ رکھا۔ میرے مولا! تو نے حکم دیا: امیر لوگوں پر حج فرض ہے، ہم نے حج ادا کیا۔ تو نے ہمیں حکم دیا: جہاد کرو، ہم نے جہاد کیا۔ اور تو نے ہمیں حکم دیا: میرے راستے پر خیرات و زکوٰۃ دو، ہم نے ادا کیا۔

اور جیسا کہ وہاں ابتدائے سورت میں پڑھا تھا: ﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾ [البقرۃ:۴] کہ ہم ایمان والوں کا آخرت پر پورا پورا یقین ہے کہ ہم نے مرنا بھی ہے، مرنے کے بعد زندہ بھی ہونا ہے، زندہ ہونے کے بعد حساب کتاب بھی ہوگا، میدانِ عدل بھی ہوگا اور پھر جنت و جہنم کے فیصلے ہوں گے اور اس آخری آیت میں ہے: ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ [البقرۃ:۲۸۵] میرے مولا! تجھ سے بخشش چاہتے ہیں اور ہمارا یقین ہے کہ ہم نے تیری طرف لوٹ کر آنا ہے۔

قرآن پاک کا یہ اعجاز ہے کہ کوئی اس کو جتنی تدبر سے اور غور سے پڑھتا ہے اسے سمجھ آتی ہے کہ واقعی قرآن کی آیات ایک دوسری سے مربوط ہیں۔ ایک آیت گویا دوسری آیت کے لیے دلیل بن رہی ہے، گویا اوّل سورت

دعویٰ اور باقی سورت اس کے دلائل اور شواہد بن کر آ رہی ہے۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۚ﴾ یعنی کسی عمل پر اللہ تعالیٰ سزا نہیں دیتے جب تک کہ انسان کا قصد اور ارادہ نہ ہو۔ صحیح احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا: اگر میرا بندہ دل میں کوئی برائی کا ارادہ کرے، لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اس کو نہ لکھو۔ اور اس کے مقابلہ پر یہ ہے کہ اگر کسی نے نیکی کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں: لکھ لو۔ اگر یہ عمل کرے تو دس گنا ثواب بھی لکھ دو اور اگر عمل نہ کرے تو ایک نیکی لکھ دو۔ اس نے نیکی کا ارادہ تو کیا ہے۔

اس سے یہ بات بھی سمجھ لیں کہ بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں لکھا ہے کہ اس آدمی نے زنا کرنا ہے، ڈاکہ مارنا ہے اور قتل کرنا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے لکھے ہوئے کے مطابق ہم کر رہے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ یاد رکھیں! یہ جاہلیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں لکھا کہ تمہیں اس کو کرنے پر زبردستی مجبور کیا۔ آدمی جو بھی گناہ کرتا ہے اپنے ارادے سے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لکھنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اتنا محیط اور کامل ہے کہ اس کو پتہ ہے کہ فلاں دن آدمی فلاں وقت پر یہ کام کرے گا، لیکن تم نے یہ اپنی منشا سے کیا ہے، یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر جبر کر دیا۔ میں اس کی ایک آسان مثال دیا کرتا ہوں کہ جیسے گھر کے اندر اے سی لگا ہوا ہوتا ہے، ہیٹر لگا ہوا ہوتا ہے اور اسی طرح کار کے اندر سسٹم لگا ہوا ہوتا ہے کہ اگر اس کو کول پر رکھیں گے تو ٹھنڈی ہوا آئے گی اور اگر اس کو ہاٹ پر لے جائیں گے تو گرم ہوا آئے گی۔ اب یہ دونوں باتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اب اگر آپ گرمیوں کے زمانہ میں سوئی پھیر کر ہاٹ پر لے آئیں اور اندر سے ہیٹ آنی شروع ہو جائے تو کیا یہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ لکھنے والے نے غلط لکھا ہے یا پھیرنے والے نے غلط پھیرا ہے؟ صاف ظاہر ہے لکھنے والے نے تو ٹھیک لکھا ہے، لیکن پھیرنے والے نے اس کا استعمال غلط کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عقل دی ہے اور چلنے، پکڑنے اور سونگھنے کی قوت بھی دی ہے۔ اب اس کے بعد تم نے اپنے اختیار سے کیا ہے۔ اگر حلال اختیار کیا ہے تو ثواب ملے گا اور اگر حرام اختیار کیا ہے تو گناہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ بغیر اختیار کے کسی گناہ پر سزا نہیں دیتے؛ کیونکہ ایسی بات ہوتی تو اللہ تعالیٰ سب کو مسلمان کر دیتے، پھر تو دنیا میں کوئی کافر نہیں ہوتا۔ اور اللہ تعالیٰ کو زبردستی والا اسلام قبول نہیں تو زبردستی والا کام کیوں کرائے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تمہارے سامنے دونوں چیزیں رکھ دی ہیں: اب اسلام قبول کرو تو بصیرت کے ساتھ قبول کرو اور کفر پر جاتا ہے تو اپنی عقل اور دلیل کے ساتھ ہو جاؤ۔ ہم کسی کو زبردستی نہ ہلاک

کرتے ہیں اور نہ برباد کرتے ہیں۔ ہاں جب تم نیکی کی طرف قدم بڑھاتے ہو تو ہم رحمتیں فرماتے ہیں اور جب تم برائی کی طرف قدم بڑھاتے ہو تو ہم روکتے ہیں۔ جب تم اپنے آپ کو خود تباہی کے گڑھے میں گرا دیتے ہو تو تمہاری مرضی ہے، اس لیے پھر ہم عذاب دیتے ہیں۔

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ﴾ ایک بھولنا ہے اور ایک خطا کرنا ہے۔ خطا پر بھی محاسبہ ہوتا ہے اور بھول پر بھی محاسبہ ہوتا ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ درخت کو نہ چکھیں تو آدم علیہ السلام نے اس درخت کو چکھ لیا تو آدم علیہ السلام بھی بھول گئے تھے، اس پر بھی مؤاخذہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نسیان ہے یا خطا ہے، یہ غیر اختیاری ہے، لیکن من وجہ اختیاری ہے، مثلاً: ڈرائیور سے خطا قتل ہو جائے تو اس پر دیت ہے؛ کیونکہ اگر ڈرائیور گاڑی تیز نہ چلاتا اور اس کو صحیح حد اعتدال پر رکھتا تو ایکسیڈنٹ نہ ہوتا، لہٰذا اس پر دیت آجاتی ہے۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا﴾ اور ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ﴾ بظاہر دونوں ایک ہیں کہ اے پروردگار! ہم پر بوجھ نہ ڈال، جیسا کہ پہلے والے لوگوں پر ڈالا اور پھر دوبارہ فرمایا: ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں طاقت نہ ہو۔ بظاہر دونوں کا معنی ایک نظر آتا ہے، لیکن دونوں میں فرق ہے: ایک کا تعلق تشریعیات سے ہے اور ایک کا تعلق تکوینات سے ہے۔ انسان تشریعی امر کا مکلف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: نماز پڑھو۔ اگر نہیں پڑھیں گے تو ہم پکڑے جائیں گے۔ اور ایک تکوینی حکم ہوتا ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: مر جاؤ۔ تو مر گئے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کی باتیں سمجھ نہیں آئیں؛ کیونکہ ان کا تعلق علومِ تکوینات سے تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلق شریعت کے احکام سے تھا۔ دونوں علوم ہیں، زمین و آسمان کا فرق تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے آخر میں کہا: ﴿وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ﴾ [الکہف: ۸۲] کہ میں نے جو کچھ کیا وہ اپنی طرف سے نہیں کیا ہے۔ یہ تو مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا۔ اب سمجھیں! ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ﴾ کے اندر تشریعی حکم ہے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسا کوئی حکم نہ دینا جیسا کہ پہلے لوگوں پر حکم ہوا کہ تمہاری توبہ قبول نہیں کروں گا جب تک کہ اپنے آپ کو قتل نہ کرو، تمہارے کپڑے پاک نہیں ہوں گے جب تک کہ پلید جگہ کو کاٹ کر پھینک نہ دو اور اسی طرح تمہاری عبادت قبول نہیں کروں گا جب تک کہ عبادت گاہ کے اندر نہ آؤ۔ تو اس میں دعا ہے کہ اے اللہ! ہم پر ایسے سخت حکم نہ دینا جس پر ہم عمل نہیں کر سکتے۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ﴾ اے اللہ! ہمیں مصیبتوں میں مبتلا نہ کر دینا۔ کوئی تکوینی امر کے تابع ہمیں

بیمار کردو، ہمارے گھروں میں فتنہ پڑ جائے، ماں باپ کی نافرمانی آ جائے یا ایسی بلائیں آ جائیں کہ بندہ اس بوجھ کو اٹھا نہ سکے، اس لیے ہمارے مولا! تو تشریعی طور پر ہم کو ایسا حکم کرنا جو پہلوں پر گزرا ہے اور نہ تکوینی طور پر ہمیں کسی ایسی مصیبت میں مبتلا کرنا جو ہماری طاقت میں بھی نہ ہو۔

آپ دیکھیں کہ بڑے بڑے اہل علم اور بڑے بڑے متقی ہیں، لیکن گھر میں بیوی نافرمان ہوتی ہے۔ اب وہ کیا کرے؟ جبکہ وہ عالم لاکھوں لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا ہوا ہے، لیکن اس کی بیوی اس کی نہیں سنتی۔ اس طرح لاکھوں لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ ہے کہ اس کا درس سن سن کر لاکھوں لوگ ہدایت پر آ گئے، لیکن ان کی اولاد ان کا حکم نہیں مانتی۔ یہ ایسے عذاب ہیں جو ہم نہیں اٹھا سکتے۔

''مَوْلٰنَا'' کا لفظ استعمال:

﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ:۲۸۶]

قرآن پاک میں کئی مقامات پر آتا ہے: ﴿هُوَ مَوْلٰىكُمْ﴾ [الحج:۷۸]۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ''اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلَا لَكُمْ'' اللہ ہمارا ولی و ناصر ہے، کافروں کا ولی و ناصر نہیں ہے۔ اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں جیسے رواج ہے کہ عالم کو ''مولانا'' کہتے ہیں تو علماء اس سے منع کرتے ہیں؛ کیونکہ بظاہر یہ لفظ اللہ کے لیے ہے۔ یہ لفظ کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن زیادہ تر اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے۔ اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ اگر کسی لفظ میں کوئی شبہ پڑے تو آدمی استعمال نہ کرے۔

﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ:۲۸۶] اے اللہ! کافروں کے مقابلہ میں مدد فرما؛ کیونکہ کافر تیرے بھی دشمن ہیں، تیرے نبیوں کے بھی دشمن ہیں، تیرے دین کے بھی دشمن ہیں، تیری کتابوں کے بھی دشمن ہیں اور ہمارے بھی دشمن ہیں۔ اس لیے ان کے مقابلہ پر ہماری مدد فرما۔

ابتدائے بقرہ اور انتہائے بقرہ میں ربط:

سورت کے شروع میں تھا: ﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ...... أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ اور یہاں یہ فرمایا: ﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ فلاحِ دنیا یہ ہے کہ دنیا میں غلبہ ملے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں عذاب سے نجات ملے اور جنت نصیب ہو جائے۔ جب قوم کافرین پر اللہ تعالیٰ

مدد کریں گے اور اسلام کا غلبہ ہوگا تو دنیا میں بھی فلاح مل گئی اور آخرت میں بھی فلاح مل گئی۔

سورۂ بقرۃ عرش کا خزانہ ہے:

سورۃ البقرۃ معاش اور معاد کے مسائل پر مشتمل ہے۔ اس لیے بعض روایات میں آتا ہے کہ ہر چیز کی ایک کوہان ہوتی ہے اور قرآن کی کوہان سورۃ البقرۃ ہے۔ یہ خزائنِ عرش میں سے ایک خزانہ ہے، جو ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملا اور آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو یہ نعمت نہیں ملی۔

[ابن الضريس في فضائل القرآن]

تفسیر سورۂ آلِ عمران

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔''

﴿الٓمّٓ ① اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ② نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ③ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ④ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ⑤ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑥﴾ [آل عمران:۱تا۶]

''الم۔ اللہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں، وہ زندہ ہے، سب کا تھامنے والا ہے۔ آپ پر کتاب (قرآن) حق کے ساتھ اتاری ہے، سابقہ کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اسی نے تورات اور انجیل اتاری ہے۔ (اس قرآن) سے پہلے ہدایت ہے لوگوں کے لیے اور فیصلے اتارے۔ جو لوگ اللہ کی آیات کے منکر ہوئے ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اور اللہ غالب ہے، انتقام لینے والا ہے۔ اللہ پر مخفی نہیں ہے کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں۔ وہی تمہاری شکل بناتا ہے ماں کے پیٹ میں جیسے چاہتا ہے (مرد و عورت، سیاہ و سفید)۔ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، (وہی) زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

تمہید:

یہ سورت مکی ہے یا مدنی ہے؟ اس کے اندر کافی سارے اقوال ہیں۔ راجح قول یہ ہے کہ یہ مدنی سورت ہے۔

اس سورت کا دوسرا نام ''المجادلۃ'' بھی ہے؛ کیونکہ نصرانیوں کے ساتھ ایک بات ہوئی تھی اور تقریبا اسی آیات تک اس کا ذکر آتا ہے۔

یاد رکھیں! سورتوں کے نام اس مناسبت سے ہوتے ہیں جو واقعہ اس سورت میں ذکر ہوتا ہے، جیسا کہ اس سورت کا نام ''آلِ عمران'' ہے؛ کیونکہ اس میں آلِ عمران کا ذکر ہے۔

ربطِ سُوَر:

سورۃ البقرۃ اور سورۃ آلِ عمران کا آپس میں عجیب تعلق ہے۔ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں روشن چمکنے والی ہیں، نور تام رکھنے والی ہیں۔ علماء نے اس کی وجہ بیان فرمائی ہے اور جیسا کہ حدیث میں بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا اسم اعظم ان آیات مبارکہ میں چھپایا ہوا ہے اور اس سورت میں ﴿الٓمّٓ ۞ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۞﴾ چونکہ دونوں سورتوں میں اسم اعظم کا ذکر آ گیا، اس لیے ان دونوں سورتوں کو زہراوین کا لقب ملا ہے۔

سورۃ البقرۃ کے شروع میں تھا: ﴿الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ [] کہ قرآن ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اور یہاں فرمایا: ﴿الٓمّٓ ۞ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۞ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اسی کتاب کو بیان فرمایا ہے۔

سورۃ البقرۃ میں بیان ہوا کہ متقین کون ہیں؟ ''مُفْلِحِيْن'' کون ہیں؟ اور اس سورت کے خاتمہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے وہی ذکر کیا ہے: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞﴾ [آلِ عمران: ۲۰۰]۔

سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا، جس میں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر ہے اور اس سورۃ آلِ عمران میں ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔

سورۃ البقرۃ کے شروع میں مسلمانوں کا ذکر تھا، آگے کافروں کا ذکر تھا اور ان کے بعد منافقین کا ذکر تھا۔ اور سورۃ آلِ عمران میں ''زَائِغِيْن'' کے بارے میں ذکر فرمایا اور ''زَائِغِيْن'' وہی منافق ہیں۔

آیت الکرسی میں آیا: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ﴾ اللہ تعالیٰ کی حیاتِ ذاتی کا ذکر تھا اور سورۃ آلِ عمران میں بھی اللہ تعالیٰ کی حیاتِ ذاتی اور الوہیت کا ذکر آیا۔

سورۃ البقرۃ کے مخاطب یہودی تھے اور اس سورت میں نصاریٰ سے مقابلہ کا ذکر ہے۔ یہود پہلے تھے اور نصرانی

بعد میں تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ کو پہلے رکھ دیا اور سورۃ آلِ عمران کو بعد میں رکھ دیا۔

اللہ تعالیٰ کے قرآن کو جس نظر سے دیکھیں گے آپ کو ایک اعجاز نظر آئے گا۔ آپ اس کے الفاظ پر غور کریں، معانی پر غور کریں، ترتیب پر غور کریں اور احکام پر نظر کریں تو آپ کو اعجاز نظر آئے گا۔ علمائے قواعد نے قواعد کے لحاظ سے دیکھا تو ان کو اعجاز نظر آیا، ادب والوں نے ادبیت کی نظر سے دیکھا تو ان کو اعجاز نظر آیا اور بلاغت والوں نے بلاغت کی عینک پہنی ان کو اعجاز نظر آیا؛ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، کسی بندے کا کلام تو نہیں ہے۔

اس سورت کے شروع میں قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے اور پھر اس وفد کا ذکر ہے جو وفد نجران سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کے لیے آیا تھا۔ مدینہ کے اندر شروع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ یہود سے تھا سورۃ البقرۃ کے اندران کا رد تھا۔

عیسائیوں کا ایک بڑا گروہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں:

سورۂ آلِ عمران میں تقابل نصاریٰ سے ہے۔ ان کا وفد یمن کے علاقہ نجران سے ۹ ہجری میں آیا، جو ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ چودہ آدمی اونچے مرتبہ کے لوگ تھے، ان میں سے تین علم میں اتنا اونچا مقام رکھتے تھے کہ شہنشاہِ روم بھی ان کے آگے جھکتے تھے۔ اس وفد کی سربراہی عبدالمسیح کر رہا تھا، اور دوسرا مشہور عالم ابوالحارثہ بن علقمہ اور تیسرا بڑا پادری تھا اس کا نام الایہم تھا۔ جب یہ وفد مدینہ منورہ کے اندر پہنچا تو صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ہم ان کو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ زرق برق لباس، اعلیٰ شان سواری کے اونٹ اور گھوڑے تھے۔ بہر حال وہ وفد آ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم ان کو ٹھہرانے کا بندوبست کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھبرانے کی کوئی بات نہیں، انہیں اسی مسجد میں ٹھہرایا جائے۔

نصاریٰ بڑی سمجھدار قوم ہے۔ آج بھی دنیا کے اندران کا کوئی معاملہ ہوتا ہے تو پچاس سال، سو سال پہلے اس کام کی پلاننگ کرتے ہیں، پھر اسی خطوط پر اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کفر کی اپنی دانائی ہوتی ہے۔

یہ وفد اس لیے آیا کہ انہوں نے دیکھ لیا کہ اب اسلام کو طاقت مل گئی ہے۔ جو اسلام یتیم مکہ کی قیادت میں چند کمزوروں کا نام تھا آج وہ ایک قوت بن گیا۔ میدانِ بدر میں مشرکین کی قوت کو توڑ چکے ہیں، یہود ان سے خائف ہیں، ان کو جلاوطن کر رہے ہیں۔ اس لیے اب اسلام سے ٹکرانا بڑا مشکل ہے، لہٰذا کوئی راستہ پیدا کیا جائے۔ تو وہ

حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا: دنیا میں مسائل کبھی لڑائیوں سے حل نہیں ہوئے، مسائل مذاکرات سے حل ہوتے ہیں۔ ہم آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہماری سمجھ میں آگئیں تو ہم مان لیں گے اور اگر ہم نے آپ کو قائل کر لیا تو آپ ہماری بات کو مان لینا۔

انہوں نے کہا: ہمارے عقیدے میں چند چیزیں ہیں۔ ہماری ایک جماعت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کی قائل ہے اور ہمارے بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا تو نہیں، لیکن خدا کا بیٹا ہے۔ اور نصاریٰ کے کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا بھی نہیں ہے، لیکن ان تین میں سے ہر ایک خدا ہے، (جس کو آج کل عقیدہ تثلیث کہتے ہیں)۔ اس لیے بڑی بڑی کمپنیاں اپنا مونوگرام اگر پھول بنائیں گے تو اس کی تین پتیاں بناتے ہیں۔ اور اس وفد نے حضور اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل ہمارا عقیدہ ہے۔ انہوں نے کہا: کیا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر کوئی برص کوڑھ والا، جذام والا آپ کے پاس آتا تھا اور آپ اس کو ہاتھ پھیرتے تو وہ ٹھیک ہو جاتا تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے کہا: آپ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادر زاد اندھے پر ہاتھ پھیر دیتے تو وہ بینا ہو جاتا تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل ٹھیک بات ہے۔ انہوں نے کہا یہ بتائیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ان کا کوئی باپ نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام جب دودھ پینے والے بچے تھے، جھولے کے اندر بات کی تھی، کیا آپ اس کو مانتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل مانتے ہیں۔ انہوں نے کہ ہم جو کہتے ہیں تین میں کوئی خدا تو نہیں ہے، لیکن عیسیٰ ﷺ اور اس کے بعد اللہ اور اس کے بعد روح القدس ان تین میں خدا ہے۔ خود قرآن میں دیکھیں! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "أَمَرْنَا، قَضَيْنَا، فَعَلْنَا، نَزَّلْنَا، أَعْطَيْنَا" یہ سب جمع کے صیغے ہیں۔ اگر خدا صرف ایک ہوتا تو فرماتے: "أَمَرْتُ، قَضَيْتُ، فَعَلْتُ، نَزَّلْتُ، أَعْطَيْتُ" جب صیغہ جمع کا آجائے تو اس کے کم سے کم دو یا تین افراد ہوتے ہیں۔ تو اس کے اندر بھی ہماری وہی تین والی بات آرہی ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے بڑے حوصلے سے ان کی بات سن لی اور فرمایا: کیا اور بھی کچھ پوچھنا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں، ہمارے یہی سوالات ہیں۔ اگر آپ ہمیں مطمئن کر دیتے ہیں تو ہم آپ کے مذہب کے بارے میں سوچنے کے لیے تیار ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے بتاؤ جو بیٹا ہوتا ہے وہ اپنے والد کے مشابہ ہوتا ہے یا مشابہ نہیں ہوتا؟ انہوں نے

کہا: اولاد ماں باپ کے مشابہ ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: خدا کے مشابہ تو کوئی ہوتا نہیں تو عیسیٰ علیہ السلام بیٹے کیسے بن گئے؟ کہنے لگے: آپ کی یہ بات تو ٹھیک ہے۔ چلو اس کے بارے میں ہم سوچیں گے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بتاؤ خدا کھاتا ہے پیتا ہے؟ اس کو حمام جانے کی ضرورت پیش آتی ہے؟ انہوں نے کہا خدا ان تینوں چیزوں سے پاک ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام کھاتے تھے یا نہیں کھاتے تھے؟ انہوں نے کہا: کھاتے تھے، پانی بھی پیتے تھے اور غسل بھی کرتے تھے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: پھر وہ کیسے خدا ہو گئے؟ انہوں نے کہا: آپ کی یہ بات بھی ٹھیک ہے، ہم اس پر غور کریں گے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ بتاؤ کہ کیا خدا بھی ماں کے پیٹ میں رہتا ہے؟ اس کو بھی کیا ماں حمل میں اٹھاتی ہے؟ اور اس کی باقاعدہ ولادت ہوتی ہے؟ انہوں نے کہا: خدا تو ان تینوں چیزوں سے پاک ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر بی بی مریم کے پیٹ میں کون رہا؟ انہوں نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب خدا پیٹ میں ہونا ممکن نہیں اور ادھر تم مانتے ہو کہ بی بی مریم نے پیٹ میں اٹھایا، پھر ولادت ہوئی، عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، قوم نے جھگڑا کیا۔ جب یہ ساری باتیں مانتے ہو تو وہ خدا کیسے ہو گئے؟ انہوں نے کہا: یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ بہر حال اس پہلو پر بھی ہم غور کریں گے، لیکن ہمیں سمجھ نہیں آتا۔ کیونکہ وہ بغیر باپ کے جو پیدا ہوئے ہیں یا دنیا کے اندر اور کوئی اور بھی بندہ ہو جس کی آپ مثال دیں کہ فلاں بندہ بغیر باپ کے پیدا ہوا ہے تو حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر ان آیات مبارکہ کی تلاوت فرمائی: ﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ۝۵۹﴾ [آل عمران: ۵۹] کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال ایسے ہے جیسے آدم علیہ السلام کہ ان کا باپ بھی نہیں اور ان کی ماں بھی نہیں تھی، تو کیا وہ بھی خدا بن گئے؟ اگر باپ کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا بیٹا ہو جاتا ہے...... اللہ نہ کرے...... تو آدم علیہ السلام کی نہ ماں تھی اور نہ باپ تھا اور حواء کی ماں نہیں، ان کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کر دیا تو ان کو کیا بتاؤ گے؟ انہوں نے کہا: یہ بات بھی ٹھیک ہے۔

نصاریٰ کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے، ان کو صلیب پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی اور ان پر موت آ چکی ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور آسمان سے اتریں گے۔ اگر آپ چاہتے تو ان کو ایک منٹ میں جھٹلایا جا سکتا تھا کہ کیا کوئی خدا بھی پھانسی چڑھتا ہے؟ لیکن آپ ﷺ نے یہ نہیں کیا کہ دشمن کو چپ کرانے کے لیے اس کے غلط عقیدے کا حوالہ کیوں دیں؟ بلکہ حق والے کا کام یہ ہوتا ہے کہ اپنے حق

پر ڈٹ رہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کی ذات قیوم ہے اور ساری کائنات کی حفاظت کرنے والی ہے۔ اس کو کسی حفاظت کی ضرورت نہیں ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو حوارین کی ضرورت پڑی۔ آپ ان کو بلاتے رہے کہ کون ہے جو میری مدد کرے تو جو لوگوں کو مدد کے لیے پکارے وہ بھی خدا ہو سکتا ہے؟ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، ہم اس پر غور کریں گے اور پھر کل مسئلہ رکھیں گے۔ رات کو جب وہ آپس میں بیٹھ کر غور کرنے لگے تو انہوں نے کہا: یہ اللہ کے سچے نبی ہیں، اس کی باتیں حق بجانب ہیں۔ اگر ایک دن اور مناظرہ لمبا کریں تو جن کو ہم ساتھ لے کر آئے ہیں، یہ سارے مسلمان ہو جائیں گے، اس لیے چلیے بہانے سے یہاں سے نکل جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرما دیا۔ ایسا موقع پھر نہیں ملے گا، پڑھے لکھے لوگوں کا وفد مدینہ میں آیا ہے، آپ ان کو کھل کر دعوت مباہلہ دیں کہ اے کتاب کو ماننے والو! ہم اللہ کی توحید کی طرف آجاتے ہیں، جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک مسئلہ ہے۔ اللہ کے سوا کسی غیر کی عبادت تمہاری کتابوں میں بھی حرام اور ہماری کتاب میں بھی حرام ہے۔ اور اگر تم اس بات کو نہیں مانتے ہو تو آجاؤ! تم بھی اپنی بیوی بچوں کو لے آؤ اور میں بھی اپنے آپ اور بیوی بچوں کو لے کر ایک میدان میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ جو جھوٹا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہو جائے، تاکہ اگر برباد ہو تو ساری کی ساری نسل برباد ہو۔ جب حضور اکرم ﷺ نے ان کو چیلنج کیا تو انہوں نے کہا: ہمیں رات کا موقع دے دو اور پھر غور کریں گے۔ جب رات کو اکٹھے ہوئے تو کہا: رات کو بھاگ جاؤ؛ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا سچا نبی ہے، اس سے کون مباہلہ کر سکتا ہے؟ ہم تو برباد ہو جائیں گے۔ اس طرح وہ رات کے وقت وہاں سے نکل گئے۔ جب صبح کو آپ ﷺ کو پتہ لگا تو آپ ﷺ نے جوش میں آکر فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری زندگی ہے! اگر آج کفر کا یہ ٹولہ میرے مقابلہ میں آتا تو اسی جگہ کھڑے کھڑے اللہ ان پر عذاب نازل کر دیتا اور دنیا کو پتہ چل جاتا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ اس لیے مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ اس وجہ سے اس سورت کا نام مجادلہ بھی ہے۔

اور اس طرح اس سورت میں توحید، رسالت اور معاد جو اہم مسائل ہیں، اس میں بھی اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں۔ پہلے توحید کا ذکر آیا: ﴿اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝۲﴾ اللہ کی ذات وہ ہے کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ، جو اپنی ذات سے زندہ ہے اور زندہ رہے گا، جو ساری کائنات کو تھامنے والا ہے۔ وہ ذات پاک ہے جس نے

کتاب کو حق کے ساتھ اتارا اور فرقان کو اتارا۔ جب کتاب کے اترنے کا ذکر آیا ہے تو مسئلۂ رسالت ثابت ہو گیا۔ جب اللہ تعالیٰ کی کتاب سچی ہے تو جن پر اتاری گئی ان کی صداقت رسالت بھی آ گئی۔

اور یہ فرمایا گیا: اے نصاریٰ! تم تورات کا اترنا بھی مانتے ہو اور انجیل کا اترنا بھی مانتے ہو، اگر کتاب خدا نے اتاری ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے خدا ہو گئے؟ پھر تم نے انجیل کو اترتے ہوئے نہیں دیکھا، لیکن مانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے۔ تو جیسے اس کتاب کو مانتے ہو اسی طرح قرآن کو بھی مانو۔

بعض علماء فرماتے ہیں: اس سے مراد قرآن ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: وہ معجزات مراد ہیں جو اللہ کے نبی کی صداقت کو ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں؛ کیونکہ قرآن کا ذکر تو پہلے آ چکا ہے، اس لیے یہاں معجزات مراد ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴﴾[آل عمران:۴]

جو لوگ اللہ کی آیات کا کفر کرتے ہیں ان کے لیے بڑا سخت عذاب ہے۔ اللہ غالب اور قدرت والے بھی ہیں اور اپنے دشمنوں سے انتقام لینے والے بھی ہیں۔ میرے مدنی! جو تیرے دشمن ہیں وہ میرے دشمن ہیں۔ ان کو میں دنیا و آخرت میں اپنی قدرت سے عذاب دوں گا۔ ان آیات کے اندر اثباتِ توحید بھی آ گئی اور اثباتِ رسالت بھی آ گئی۔

﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ﴾[آل عمران:۶] اس آیت کے اندر قیامت کا ذکر ہے کہ اللہ وہ ہے جو رحم میں تمہاری شکلیں بناتا ہے۔ پانی ایک ہے، لیکن شکلیں مختلف ہیں۔ جو ان کو بنانے پر قادر ہے وہ تمہیں دوبارہ قبروں سے اٹھا کر جلانے پر بھی قادر ہیں۔ ان تینوں مسئلوں کا ذکر ان آیات کے اندر آ گیا ہے۔

﴿الۗمّۗ ۝۱﴾ یہ حروف مقطعات ہیں۔ ان کی تفصیل سورۃ البقرۃ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

﴿اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝۲﴾ اسم اعظم کی تفصیل آیت الکرسی کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

قرآن کی سچائی:

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾[آل عمران:۳] اے پیارے نبی! ہم نے آپ پر قرآن اتارا حق کے ساتھ۔ یعنی اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا ہوا ہے اور اللہ کے ملائکہ بھی گواہ ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ گواہ ہیں تو پھر اس میں کسی قسم کا کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

یہ بات اس کے لیے تو ٹھیک ہے جو اللہ کو مانتا ہے۔ اور ایک آدمی اللہ تعالیٰ کو مانتا بھی نہیں ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی گواہی کی کیا حیثیت ہے؟ اور اس کے لیے کیا دلیل ہونی چاہیے کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ کے سچے نبی پر اتارا گیا ہے؟ اس کا جواب خود قرآن پاک کے اندر موجود ہے: "﴿وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٣﴾﴾" [البقرة: ۲۳] اے میرے مدنی! اگر دشمن یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ہم نے نہیں اتارا، بلکہ اس نبی نے خود بنایا ہے تو آپ ان کافروں کو چیلنج کریں کہ تم ساری مخلوقات میں فصیح و بلیغ لوگوں کو اکٹھا کر کے قرآن کے مقابلہ پر ایک سورت بنا کر لے آؤ، لیکن یہ تم نہ کر سکے اور نہ قیامت تک تم قرآن کا مقابلہ کر سکو گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اللہ تعالیٰ کا قرآن ہے اور اللہ نے اپنے پاک نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اتارا ہے۔

قرآن کی صفات:

1 ......﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ﴿٣﴾﴾ اے پیارے پیغمبر! ہم نے آپ کو ایسی کتاب دی ہے جو آپ سے پہلے کتابیں گزری ہیں ان کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتاری اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتاری اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اتاری۔ آج میرے مدنی کی نبوت میں شک کرتے ہیں کہ تورات حضرت موسیٰ ﷺ پر اتاری اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتاری، اگر اس کو مانتے ہو تو اسی خدا نے قرآن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اتارا ہے۔ ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ اللہ تعالیٰ نے جو کتابیں اتاریں وہ اپنے اپنے زمانے کے لیے اور اپنے حالات کے مطابق تھیں۔

2 ......﴿وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ فرقان سے مراد ہدایت اور گمراہی کے درمیان میں فرق کرنے والا، حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا، صدق اور کذب کے درمیان فرق کرنے والا اور اندھیرے اور روشنی کے درمیان فرق کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ کھول کر بیان کرتے ہیں کہ یہ بات حق ہے اور یہ بات باطل ہے۔

مخلوقات کا علم:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں اپنے علم کامل، علم غیب اور علم محیط کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قرآن میں جہاں الوہیت کا ذکر آئے گا اس کے ساتھ دو صفات ضرور آئیں گی: ایک علم کامل اور دوسرا قدرت

کاملہ کا ذکر ضرور آئے گا۔ یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو علم دیا ہے، مثلاً: دریا کی مخلوق ہے۔ اس کو علم ہے کہ ہم پانی کے اندر رہیں، نہیں تو مر جائیں گی۔ اس لیے اس کو باہر نکالنے کے لیے کانٹے اور جال ڈالتے ہو، ورنہ خود تو باہر نہیں آتی ہے...... سو اسی طرح مرغی کے چوزے بلی کو دور سے دیکھیں تو دوڑ کر ماں کے پروں کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ ان کو پتہ ہے کہ ہمیں یہیں پناہ ملے گی...... دس گائیں باندھ دیں اور سب کے بچھڑے چھوٹے چھوٹے ہوں، ان کو چھوڑ دیں تو ہر بچھڑا اپنی اپنی ماں کے پاس جائے گا، وہ کسی دوسری گائے کے پاس نہیں جاتا ہے۔ یہ اس کو علم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے...... سانپ کو بھی علم ہے کہ میں نے کہاں جا کر بل کے اندر گھس جانا ہے؟...... چیونٹیوں کو بھی علم ہے...... چڑیوں کو بھی علم ہے، دن رات کا علم ہے اور اب دانہ چگنے کا علم ہے۔

اتنا علم اللہ تعالیٰ نے سب کو دیا ہے اور سب سے زیادہ علم اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دیا ہے؛ کیونکہ ان کی ذمہ داری زیادہ ہے۔ ان کے لیے شریعت ہے، یہ مکلف ہے، اس کے لیے حساب کتاب، قیامت ہے اور اس کے لیے انبیاء ورسل اور اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں۔

پھر انسانوں میں سب سے زیادہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو سب انسانوں سے زیادہ علم عطا فرمایا ہے، پھر انبیاء میں جیسے جیسے مرتبہ زیادہ ہے اسی طرح علم زیادہ ہوتا ہے۔ یہ سب علم برحق ہیں، لیکن اللہ کے علم کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا؛ کیونکہ یہ سارے علم تو ہیں، لیکن کامل نہیں ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ﴾ [الشوریٰ: ۵۲] جب تک ہم نے قرآن نہیں اتارا آپ کو تو پتہ نہیں تھا کہ قرآن کیا ہے اور ایمان کی جزئیات اور تفصیلات کیا ہیں؟

ایک استدلالی ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل پر نظر ڈالنا۔ وہ تو نبی پیدائش سے ایمان والے ہوتے ہیں، لیکن ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکتب، یہ تفصیلات آپ کو اس وقت معلوم ہوئیں جب اللہ تعالیٰ نے وحی اتاری۔ اس لیے علم کامل صرف اللہ کا ہے، نبی کا علم ساری مخلوقات سے اونچا ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ جب تک علم نہ دیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ جب تک خبر نہ دیں ان کو علم نہیں ہوتا۔

اللہ کا کمالِ علم:

اس لیے کئی ایسے واقعات ہیں جو انبیاء کی موجودگی میں ہوئے، لیکن ان کو پتہ نہیں لگا، اس لیے کہ علم کامل اللہ کا ہے۔ جب آپ نے اس مسئلہ کو سمجھ لیا تو اللہ تعالیٰ آپ کو شرک سے بچالیں گے۔

اس کی ایک آسان مثال عرض کر دوں کہ آپ مکہ شرف میں آئے اور آپ ملتزم پر کھڑے ہو کر دعا مانگ رہے ہیں۔ ایک آدمی عربی میں دعا مانگ رہا ہے، ایک آدمی اردو میں دعا مانگ رہا ہے، ایک پشتو میں دعا مانگ رہا ہے، ایک بنگالی میں مانگ رہا ہے اور ایک بری میں مانگ رہا ہے، کوئی کسی زبان میں اور کوئی کسی زبان میں مانگ رہا ہے۔ ان سب کا یہ یقین ہے کہ یہ ساری دعائیں اللہ سننے والا ہے اور اللہ یہ ساری بولیاں سمجھتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم نہ بولو اور دل میں رکھو تب بھی میں جانتا ہوں۔ آہستہ بولو تب بھی اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں، زور سے مانگو تب بھی سنتے اور سمجھتے ہیں۔ بلکہ سب کی دعائیں منظور کر کے ان سب کی حاجتیں پوری کرنے پر قدرتِ کاملہ بھی رکھتے ہیں۔ اس بات کو ٹھنڈے دل سے سوچیں! ایک آدمی بچہ مانگ رہا ہے۔ دوسرا کہتا ہے: اللہ میاں! میرے لڑکے بہت ہو گئے ہیں، مجھے لڑکی چاہیے۔ تیسرا کہتا ہے: اللہ میاں! تو نے لڑکے بھی دیئے اور لڑکیاں بھی دیں ہیں، کھانے کو کچھ نہیں ملتا، ہمیں کچھ روزی چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ اللہ! مجھے گاڑی چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ اللہ میاں! مجھے خیریت سے گھر پہنچا دیں۔ اور کوئی کہتا ہے: اللہ میاں! میرا بیٹا بیمار ہے، شفا کر دو۔ یعنی ہر آدمی اپنی اپنی مانگ رہا ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ ان دعاؤں کو پورا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

مخلوق کے سامنے بے بس ہے:

اب ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ایک آدمی اللہ والے کے مزار پر جاتا ہے اور وہاں دعا کرتا ہے اور اس کا عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ سن رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ وہاں کئی زبان والے لوگ کھڑے ہیں، حالانکہ وہ بزرگ دنیا میں کوئی ایک آدھ بولی سمجھتا تھا تو کیا قبر میں جانے کے بعد سب بولیاں سمجھنے لگ گئے ہیں؟ تو یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کر رہا ہے؛ کیونکہ سننے والے اور سمجھنے والے اور حاجت پوری کرنے والے صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ روزانہ عرش سے آسمانِ دنیا پر اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں: کوئی مانگنے والا ہے اس کو دوں؟ اللہ کی رحمت تو جوش میں ہوتی ہے، پھر درمیان میں واسطوں کی کیا ضرورت ہوتی ہے؟ اس لیے قرآن کے اندر ہے کہ دنیا میں تم جن کو پکار رہے ہو یہ قیامت کے دن تمہارے پکار کی نفی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کھجور کے درمیان میں جو دھاگہ ہوتا ہے اتنا ذرہ بھی ان کے پاس کوئی چیز نہیں، تو وہ تمہیں کیا دیں گے؟ وہ تو خود محتاج ہیں۔

لوگ کہتے ہیں: یہ آیات بتوں کے لیے ہیں، انسانوں کے لیے نہیں اور اللہ کے انبیاء اور اولیاء کے لیے نہیں ہیں۔ جبکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمائیں گے: ﴿ءَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ﴾ [المائدہ:۱۱۶] کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے بھی اور میری اماں کو بھی اللہ کے سوا الٰہ سمجھو؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جواب دیں گے: اے اللہ! تیری ذات پاک ہے! میں ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہوں جو مجھے زیبا نہیں؟ میں تیرا بندہ ہوں، میں الٰہ کیسے بن سکتا ہوں؟ میں تیری مخلوق ہوں، خالق کیسے بن سکتا ہوں؟ اور میں مملوک ہوں، مالک کیسے بن سکتا ہوں؟ آپ کا علم کامل اور محیط ہے: کیونکہ آپ کو میرے اندر کا بھی پتہ ہے: ﴿إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ﴾ [المائدہ:۱۱۶] میرا اللہ سب سے زیادہ غائب کا جاننے والا ہے، ہم تو غیب نہیں جانتے ہیں۔ غور کریں! اللہ کے نبی بھی کہہ رہے ہیں کہ مولا! تو جانتا ہے، ہم نہیں جانتے ہیں۔

عقیدہ کی خرابی:

آج اسی وجہ سے شرک ہے کہ لوگ خانہ کعبہ میں ملتزم میں کھڑے ہوتے ہیں، لیکن کہہ رہے ہوتے ہیں: پیر تیری مہربانی ہے، تو نے مکہ میں پہنچا دیا ہے اور حضور نے حاضری کے لیے بلایا ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب عمرہ کے لیے تشریف لاتے تھے آپ کو کون بلاتا تھا؟ مدینہ والا بلائے گا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ وعلی رضی اللہ عنہ کو بلائے گا یا ان کو بلائے گا جو مشکل میں بھی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہے؟ جو عمل میں بھی ان کا دشمن ہے؟ کہتے ہیں: آپ سراپا رحمت تھے تو کیا ہم سراپا زحمت بنیں؟

واقعہ:

ایک آدمی مجھے ملنے کے لیے آیا، میں نے اس کو کہا: ''الحمد للہ'' اللہ نے آپ کو عمرہ نصیب کر دیا، کعبۃ اللہ کی حاضری نصیب ہوگئی اور مدینہ شریف کی حاضری نصیب ہوگئی۔ کہتا ہے: سارا پیر کا فیض ہے۔ دو منٹ کے بعد میں نے اس سے پوچھا: تمہارے مرشد کا کیا حال ہے؟ کہنے لگا: بیمار ہے۔ میں نے کہا: اپنی بیماری ٹھیک نہیں کر سکتے اور تجھے مکہ مدینہ پہنچا دیا ہے!!؟ اپنی خدمت کے لیے تجھے رکھ لیتے، تا کہ تم ان کی خدمت کرتے۔ کہنے لگا: میں یہاں حضرت کے لیے دعا مانگنے آیا ہوں۔ میں نے کہا: کس سے دعا مانگو گے؟ کہا: اللہ تعالیٰ سے مانگوں گا۔ میں نے کہا: یہ مسئلہ تو ہم سمجھاتے ہیں، پھر ہمیں کیوں وہابی بناتے ہوئے؟ اور کہتے ہو: پیروں کو نہیں مانتے اور بزرگوں کو نہیں مانتے؟

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ﴾ [آل عمران:۵] اللہ زمین کی چھپی ہوئی چیزیں اور آسمان میں چھپی ہوئی چیزیں سب جانتے ہیں۔ زمین کی تہوں کے اندر تم کوئی دانہ بھی ڈال دو، اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں۔ اس لیے دوسرے مقام پر فرمایا: جو کچھ قبر میں ہے اللہ تعالیٰ اس کو جانتے ہیں اور جو کچھ دریا میں ہے وہ جانتے ہیں۔

اللہ کی تخلیق کا کمال:

﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ﴾ [آل عمران:۶] وہی اللہ ہے جو تمہاری شکلیں بناتا ہے ماں کے رحم میں جیسے چاہتا ہے۔ پانی ایک ہے اور زمین ایک ہے، لیکن شکلیں مختلف ہیں۔ کبھی بچہ باپ کی شکل ہے، کبھی ماں کی شکل ہے، کبھی دونوں کی شکل ہے اور کبھی دادا یا نانا کی شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس گندے پانی کو کیسی کیسی شکلیں دی ہیں کہ انسان دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے!! اس سے ایسے ایسے عالم پیدا کر دیئے جو سورج کی طرح چمکتے رہے۔ اور وہ اللہ چاہیں تو اندھا بنا دیں اور چاہیں تو سفید بنا دیں۔ وہ چاہیں تو لنگڑا بنا دیں اور وہ چاہیں تو سالم بنا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی مثال بیان کی ہے کہ کوئی پیر، کوئی قبر والا ہے جو یہ طاقت رکھے کہ ماں کے رحم کے اندر بچہ پیدا کر دے؟ بلکہ ان بزرگوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے بنایا اور وہ ماں کے رحم کے اندر پیدا ہوئے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے عیسائیوں کے وفد سے فرمایا کہ تم کہتے ہو ''عیسیٰ خدا ہے'' ان کو تو بی بی مریم نے پیٹ میں اٹھایا ہے، ان کی ولادت ہوئی اور اپنی ماں کا دودھ پیتے رہے۔ تو جو ماں کے پیٹ میں رہے، وہ بھی بھلا کبھی خدا اور مشکل کشا ہو سکتا ہے؟ جو پیدا ہونے کے بعد دودھ کا محتاج ہے، جھولے کا محتاج ہے اور کندھے پر اٹھانے کا محتاج ہے۔

جس ماں نے بچے کو پیٹ کے اندر اٹھایا ہوا ہے اس کو پتہ بھی نہیں کہ یہ بچہ نیک بخت ہے یا بد بخت ہے؟ اس کی عمر کتنی ہوگی؟ اس کی انگلیاں سالم ہیں یا ٹیڑھی ہیں؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے ذرہ ذرہ کا پتہ ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ﴾ [لقمان:۳۴] جو کچھ رحم کے اندر ہے اس کا علم بھی اللہ کو ہے۔

اشکال: جاہل کہتے ہیں: الٹرا ساؤنڈ سے پتہ چل جاتا ہے کہ رحم کے اندر کیا ہے؟ جواب: ساری کائنات کا کیا کوئی ایک وقت میں الٹرا ساؤنڈ کرے گا؟ کوئی الٹرا ساؤنڈ کے نیچے آئے گا تو اس کو پتہ چلے گا کہ کیا ہے؟ الٹرا ساؤنڈ کی بھی کوئی یقینی بات نہیں ہے۔ بات تو یہ ہے کہ ساری کائنات اپنے اپنے گھروں میں ہے اور وہ جانتا ہے،

اس چیز کا نام علم ہے۔

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶﴾ [آل عمران: ۶] یہاں بھی الوہیت کا مسئلہ ہے کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ۔ وہ ایسا غالب ہے کہ اس کے حکم کو کوئی ٹالنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا، جس کے فیصلے کو کوئی رد نہیں کر سکتا اور اس کا ہر فیصلہ حکمت پر مبنی ہے۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۷ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۹﴾

[آل عمران: ۷ تا ۹]

''وہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری ہے۔ اس میں بعض آیات واضح الدلالت ہیں، یہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری متشابہ (جن کے معنی معلوم یا معین نہیں)۔ پس جن کے دل حق سے پھرے ہوئے ہیں وہ متشابہ آیات کی پیروی کرتے ہیں گمراہی پھیلانے کے لیے اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے، حالانکہ ان کی تفسیر کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور مضبوط علم والے کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے ہیں، سب ہمارے رب کی طرف سے اتری ہے۔ اور سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں جو عقلمند ہیں۔ اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دل نہ پھیر اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا کر۔ بے شک تو ہی دینے والا ہے۔ اے ہمارے رب! تو ہی لوگوں کو جمع کرنے والا ہے ایک دن، جس میں کوئی شک نہیں۔ بے شک اللہ (دوبارہ اٹھانے میں) وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔''

قرآنی آیات کی اقسام:

قرآن پاک کے اندر دو قسم کی آیات ہیں: آیاتِ محکمات اور آیاتِ متشابہات۔

آیات محکمات کے بارے میں علماء کے بڑے اقوال ہیں، لیکن راجح قول یہ ہے کہ محکمات ایسی ہوتی ہیں جن کا معنی مفہوم واضح اور کھلا ہوا ہے یا جن کی تفسیر حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے امت کو کھول کر سمجھا دی ہے، اب اس میں کسی کا زور نہیں چل سکتا کہ کوئی اس میں ذرے کے برابر ردوبدل کر سکے؛ کیونکہ وہ کھلی ہوئی بات ہے۔

اور آیات متشابہات یہ ہیں کہ ان میں بعض الفاظ ایسے ہیں جن میں ایک دوسرے کے معنی کی طرف انسان کا شبہ جا سکتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: متشابہات ان کو کہتے ہیں کہ ان کی دوسری جگہ مثال موجود ہو، وہ ایک دوسرے کے متشابہ ہیں۔

ایک شبہ اور جواب:

ایک تشابہ تماثل سے ہوتا ہے کہ یہ چیز اس کی شبیہ ہے، بعینہٖ اس کی مثل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ ہم نے جو قرآن اتارا ہے سب محکم ہے۔ اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ﴾ [الزمر: ۲۳] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کا سب قرآن ہے اور جو آیات اوپر بیان ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض آیات محکمات ہیں اور بعض آیات متشابہات ہیں۔ اب بظاہر تعارض اور تناقض لگ جاتا ہے؛ کیونکہ اگر ساری آیات محکمات ہیں تو متشابہ کیسے ہو گیا؟ اور اگر سارا قرآن متشابہ ہے تو محکم کیسے ہوا؟

جواب: یاد رکھیں! جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن سارے کا سارا محکم ہے تو ٹھیک ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سارے احکامات محکم ہیں۔ اگر کہیں متشابہات ہیں تو وہ محکمات کے تابع ہیں، لہٰذا سب آیات کو محکمات کہنا درست ہو گیا۔ اور جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ﴾ [الزمر: ۲۳] وہاں متشابہات سے مراد متشابہات نہیں، بلکہ مماثلت مراد ہے کہ ایک دوسرے کی مثال ہیں کہ ایک جگہ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ہے تو دوسری جگہ بھی موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ہے۔ ایک جگہ توحید کا بیان ہے تو دوسری جگہ بھی توحید کا بیان ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا خوارج سے مناظرہ:

اس لیے جب خوارج (جو حب صحابہ میں آ کر اہل بیت کے دشمن ہو گئے) کے ساتھ مناظرہ کا وقت آیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خبردار! خیال رکھنا! قرآن پاک کی بجائے حدیث رسول سے استدلال کرنا۔ پوچھا گیا: کس لیے؟ فرمایا: قرآن میں بعض آیات متشابہات ہیں۔ ایک لفظ کے کئی معانی مراد ہو سکتے ہیں تو

جن کے دل میں کجی ہے وہ اپنے مطلب کا معنی لیں گے، لیکن جب حدیث مبارک آجاتی ہے تو کسی باطل کو کھل کر کھیلنے کا موقع نہیں ملتا، بلکہ اس کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔

آیاتِ متشابہات کی تشریح کا طریقہ:

اگر آیات متشابہات آجائیں تو کیا کریں؟ تو علماء نے فرمایا: ان کو آیاتِ محکمات کے تابع جمع کرو؛ کیونکہ وہ اصل بنیاد ہیں۔ مثال کے طور پر:

......حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بعض آیات محکمات ہیں کہ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ [زخرف:۵۹] یہ میرا ایک بندہ ہے۔ تو یہ کھلی ہوئی بات ہے۔ اور فرمایا: ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۝﴾ [آل عمران:۵۹] تم عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش پر حیران کیوں ہوتے ہو؟ اس کی مثال تو ایسے ہے جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی۔ اس کو مٹی سے پیدا کیا، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔

......اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد مقامات پر فرما دیا: ﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ﴾ [مریم:۳۴] یہ عیسیٰ بن مریم ہیں۔ یہ میرا بندہ اور بشر ہے۔ ہم نے ان کو بغیر باپ کے پیدا کیا، ان کو بولنے کی توفیق دی۔ ہم نے ان کو نبوت و رسالت کے لیے چن لیا ہے۔ ہم نے ان کو آسمانوں پر اٹھا لیا ہے۔ تو یہ ساری کھلی ہوئی بات ہے، اس میں دوسرا ترجمہ نہیں ہو سکتا، لیکن ایک جگہ ارشاد فرمایا ﴿وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ؗ﴾ [النساء:۱۷۱] عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ ہیں، اللہ کی طرف سے روح ہیں۔ ان الفاظ میں تشابہ ہو سکتا تھا کہ کلمہ کا کیا معنی ہے؟ اور اللہ کی روح کا اس کے اندر ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یہ آیات متشابہات ہیں۔

اب ایمان والے ان آیات متشابہات کو آیاتِ محکمات کی روشنی میں دیکھیں گے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو اللہ کا بندہ اور اللہ کی مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بی بی مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا کیا، ان کو رسول بنایا، ان پر انجیل اتاری، ان کے بڑے بڑے معجزات اتارے اور ان کی شان میں بھی فرما دیا کہ وہ کلمہ ہے، یعنی جیسے آدم علیہ السلام کو کلمہ "کُنْ" سے پیدا فرمایا تھا۔ یہاں بھی خصوصی تخلیق ہے کہ بغیر باپ کے اللہ کے حکم سے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ﴿وَكَلِمَتُهٗ ۚ﴾ بھی فرما دیا ہے۔ اور جیسے اولادِ آدم ماں کے پیٹ میں جب ہوتی ہے تو روح پھونکی جاتی ہے کہ ماں باپ کا نطفہ قرار پکڑتا ہے تو اس پر کئی ادوار گزرتے ہیں اور چار ماہ کے بعد اس میں

روح پھونکی جاتی ہے، لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا، ان کا لقب بھی روح ہے: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ﴾ [القدر: ۴]۔

وہ آئے، بی بی مریم کے سامنے کھڑے ہو کر پھونک ماری تو ان کے منہ سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے نفخ جبرئیل علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام کا حمل ٹھہر گیا تو اب ایک لفظ اور بھی آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے دو مقام پر ایسے الفاظ بیان فرمائے کہ متشابہات ہیں، لیکن جب ان کو محکمات کو روشنی میں دیکھیں گے تو بات واضح ہو جائے گی اور کسی قسم کی الجھن نہیں رہے گی۔

مذکورہ مسئلہ کی دوسری تعبیر:

عرب کے اندر ایک محاورہ ہے کہ "کَلَامُ الْمُلُوْكِ مُلُوْكُ الْكَلَامِ" (بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے) اور قرآن تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو ملک الاملاک والملوک ہے۔ اس کے اندر اشارات بھی ہیں، اس کے اندر اسرار کے حکم بھی ہے اور اس کے اندر ایسی ایسی اشیاء رکھی ہیں کہ ہماری عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے متشابہات کا حل یہ ہے کہ اس کو محکمات کے تابع کر دیں یا پھر ایک لفظ کے کئی ترجمے تو ہوتے تھے، لیکن ایک ترجمہ معین ہو گیا۔

مثلاً: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ نماز ادا کرو۔ صلوۃ کا لفظ کئی معانی کے اندر آتا ہے: صلوۃ بمعنی دعا، صلوۃ بمعنی رحمت بھی ہے، صلوۃ بمعنی درود بھی ہے، صلوۃ بمعنی نماز بھی ہے اور صلوۃ بمعنی تحریک الصلوین بھی ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے نماز پڑھ کر امت کو دکھایا۔ اس لیے اب لفظ "صلوۃ" کا دوسرا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نماز قائم کرو۔ تو حضور پاک ﷺ نے نماز قائم کر کے دکھادی۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ زکوۃ ادا کرو۔ زکوۃ کا معنی تزکیہ بھی ہو سکتا ہے، تزکیۂ باطن بھی ہو سکتا ہے، زکوۃ بمعنی ذبح بھی ہو سکتی ہے، زکوۃ بمعنی میل کچیل کی صفائی بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ قرآن کے اندر ہے کہ اگر بھاگا ہوا جانور پکڑا گیا تو فرمایا: ﴿اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ﴾ [المائدۃ: ۳] تمہارے لیے وہ جانور حلال ہے جو تم نے ذبح کر لیا۔ تو یہاں ذال کے ساتھ ہے۔ اور زکوۃ لفظ زاء کے ساتھ ہے۔ ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ میں اللہ کے نبی نے زکوۃ کے پیمانے بیان فرما دیئے کہ سونا ساڑھے سات تولہ تو زکوۃ فرض ہوئی اور چاندی ساڑھے باون تولہ ہے تو زکوۃ ہوگی، بکریوں میں اتنا عدد اور اونٹ میں اتنا عدد معین کر کے ہمیں بتادیا، لہٰذا اب اس آیت کا دوسرا ترجمہ نہیں ہو سکتا اور شبہ نہیں ہو سکتا۔

پھر بھی کوئی گمراہ ہو جائے تو ان کا کوئی علاج نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا کہ نماز ایکسر سائز ہے۔ اب اس کے دوسرے طریقے آ گئے ہیں، لہٰذا نماز کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ضلال ہے۔ اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ ایک آدمی کہے کہ میں نہیں مانتا تو اس کا کیا حل ہے؟

متشابہاتِ حقیقی اور متشابہاتِ اضافی:

متشابہات کی دو قسمیں ہیں: متشابہاتِ حقیقی اور متشابہاتِ اضافی۔

متشابہاتِ حقیقی وہ ہیں جن کے معانی نہیں کھلتے، اللہ تعالیٰ نے چھپا دیے ہیں۔ جیسے حروفِ مقطعات ہیں، ان کے معانی نہیں کھل سکتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نہیں بیان فرمائے اور حضور اکرم ﷺ نے بیان نہیں فرمائے تو کون ان کے معانی بیان کر سکتا ہے؟

متشابہات اضافی کا مطلب ہے کہ معنی میں اخفا تھا، جب اس کو متشابہات کی روشنی میں دیکھا تو بات کھل گئی اور معنی سمجھ میں آ گیا۔

اللہ تعالیٰ نے قاعدہ بیان فرما دیا ہے کہ جو ایمان والے اور اہلِ حق ہیں وہ جب بھی کوئی آیتِ متشابہ پڑھتے ہیں تو اس کو فوراً آیتِ محکم کی روشنی میں دیکھتے ہیں، لیکن جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور کھوٹ ہے وہ متشابہات کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور محکمات کی روشنی میں نہیں جاتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ؕ﴾ کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کو لیتے ہیں، تاکہ دنیا میں فتنہ پھیلائیں۔ جیسا کہ عیسائیوں نے متشابہات والی آیات کو لے لیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ فرمایا گیا، لہٰذا وہ خود خدا ہیں یا خدا کے بیٹے ضرور ہیں۔ انہوں نے یہ آیات نہ پڑھیں: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ [سورۃ الاخلاص] اللہ تعالیٰ کی تو اولاد نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی بشریت:

اور جیسا کہ ہمارے بعض لوگ بھی متشابہات کو لے لیتے ہیں، مثلاً: ایک جگہ لفظ آ گیا: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ [المائدۃ: ۱۵] تو بعض مفسرین نے لکھا کہ نور سے مراد محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، حالانکہ جمہور مفسرین

نے لکھا ہے کہ نور سے مراد قرآن ہے اور کتاب سے مراد بھی قرآن ہے، لیکن بعض مفسرین نے نحوی قاعدہ کے پیش نظر کہ درمیان میں واو عاطفہ ہے۔ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان کوئی تغایر ہونا چاہیے، اس لیے نور سے مراد حضور اکرم ﷺ ہیں اور کتاب سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرآن ہے۔ جن لوگوں کا عقیدہ ٹھیک تھا انہوں نے کہا: کوئی بات نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو نور فرمایا ہے، لیکن جن لوگوں کا مقصد فتنہ پھیلانا تھا، جن کے دلوں میں کجی اور کھوٹ تھا انہوں نے کہا کہ دیکھو! اللہ کا نبی تو نور ہے اور یہ کیسے کہتے ہیں کہ بشر ہیں!؟

اس طرح انہوں نے ایک متشابہ آیت کو لے لیا اور ساری محکم آیات کا انہوں نے انکار کر دیا۔ انہی لوگوں کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ ان کے دل ٹیڑھے ہو گئے ہیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب ایک جگہ لفظ نور آ گیا تو ہم آیت محکم کی طرف دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مدنی کو فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤى اِلَیَّ﴾ [حم سجدہ: ۶] ان لوگوں کو کہہ دو کہ میں تو انسان ہوں، تمہاری جنس کی طرح ہوں۔ میرا اعزاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی بھیج کر مجھے نبی بنایا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ [بنی اسرائیل: ۹۳] کہہ دو: تیرے رب کی ذات پاک ہے، میں تو ایک بشر ہوں، اللہ کا رسول ہوں۔ تیسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ۚ﴾ [آل عمران: ۱۴۴] اور نہیں محمد مصطفیٰ ﷺ مگر وہ بھی ایک رسول ہے، جیسا کہ آپ سے پہلے رسول گزرے ہیں۔ کیا اگر میرے مدنی پر موت آ جائے یا میرے مدنی شہید ہو جائیں تو کیا تم دین اسلام کو چھوڑ کر پھر جاؤ گے؟ یعنی اگر وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے رہیں گے تو مانو گے اور اگر کبھی شکست ہو جائے تو کیا تم بھاگ جاؤ گے؟ تم اچھے مسلمان ہو۔ میرے مدنی بھی تو ایک رسول ہیں، جیسا کہ پہلے رسول گزرے ہیں اور ان پر بھی وفات آئی ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا، شہید ہو گئے۔ اور ایسے واقعات بھی گزرے کہ اللہ کے نبیوں کو قتل کر دیا گیا، ستر ستر انبیاء کو اللہ کے راستے میں ایک دن میں شہید ہونا پڑا، ان کے سروں پر آرے رکھ کر دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اب گمراہ لوگوں کا ان ساری آیات کو چھوڑ کر ایک آیت کو پکڑ لینا اور باقی کسی آیت پر نظر نہ کرنا یہی اہل باطل کا کام ہے۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ کا نسب بھی بیان کرتے ہیں کہ آپ محمد بن عبد اللہ ہیں، دادا کا نام عبد المطلب ہے، ماں کا نام آمنہ ہے، دائی کا نام حلیمہ ہے، آپ ﷺ کی اوّل زوجہ محترمہ خدیجۃ الکبریٰ ہے اور آپ کی اولاد بھی ہے۔ یہ سارے رشتے بھی بیان کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود کہتے ہیں کہ آپ بشر نہیں۔

ان سے پوچھا جاتا ہے کہ نور سے کونسا نور مراد ہے؟ چاند والا نور یا سورج والا نور یا تاروں والا نور؟ اب ان کو چکر آجاتا ہے اور سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے چاند تارے والا نور کہہ دیا تو ان کی تو اللہ کے نبی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں اور انہوں نے کہہ دیا کہ وہ اللہ کے نور سے ہیں، حالانکہ ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾[النور:۳۵] ساری کائنات بھی تو اللہ کا نور ہے۔ اب اگر حضور اکرم ﷺ کو اللہ کے نور کا جز مانیں گے تو وہی شرک اور کفر آگیا جو نصاریٰ نے کیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا جز ہے۔

یادرکھیں! جن کی نظر محکم آیات پر ہوتی ہیں وہ کہیں گے اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بارے میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾[النساء:۱۷۴] میرے نبی! ہم نے آپ کی طرف کھلا ہوا نور اتارا ہے، یعنی قرآن۔ فرمایا: ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ﴾[الاعراف:۱۵۷] اے لوگو! اس نور کی پیروی کرو جو ہم نے ان پر اتارا ہے۔ یہاں بھی نور سے مراد قرآن ہے۔ اور ﴿قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾[المائدۃ:۱۵] وہاں بھی نور سے مراد قرآن ہے اور واؤ تفسیر کے لیے ہے۔ واؤ ہر جگہ عطف کے لیے استعمال نہیں ہوتی، بلکہ کبھی واؤ جمع کے لیے، کبھی عطف کے لیے، کبھی واؤ بمعنی او ہوتی ہے اور کبھی واؤ تفسیریہ ہوتی ہے۔

اس لیے جب ہم آیات محکمات کی روشنی میں دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اللہ کے نبی بشر نہیں، سید البشر ہیں، امام الانبیاء والمتقین ہیں، سید الاولین والآخرین ہیں اور جہاں نور کا ذکر آیا وہاں آپ کا نورِ نبوت، نورِ قرآن اور نورِ وحی مراد ہے۔ اس طرح کوئی جھگڑا اور اختلاف نہ رہا اور ہم محکمات کی روشنی میں آگئے۔ اگر ہم محکمات سے ہٹ جاتے تو متشابہات میں پڑ جاتے۔

گمراہی کی ایک اور مثال:

حدیث شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا بندہ میری عبادت کرتے کرتے میرے اتنے قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس کا سمع بن جاتا ہوں، اس کا بصر بن جاتا ہوں اور میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں۔ اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فرمایا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾[الانفال:۱۷] میرے مدنی! آپ ﷺ نے مٹی کے ڈھیلے نہیں پھینکے، حالانکہ وہ اللہ نے پہنچائے۔

جب یہ آیات اور احادیث سامنے آئیں تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی تھی انہوں نے کہا دیکھو! بندہ ترقی کرتا کرتا خدا بن جاتا ہے۔ اور سب سے پہلے یہ عقیدہ شیعہ نے پیش کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود خدا ہے۔ اس لیے وہ مولا

علی کہیں گے اور جب سلام کریں گے تو ایک کہے گا: یا علی مدد اور دوسرا کہے گا: مولا علی مدد۔ اور السلام علیکم نہیں کہیں گے۔ اور انہوں نے اپنے لوگوں کو کہا ہوا ہے کہ یہ بات کسی کو بتانی نہیں، لیکن بات یہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود خدا ہے، ہمارے سنیوں کو بھی غصہ آیا انہوں نے کہا: تم نے علی کو خدا بنایا، ہم اپنے پیر کو خدا بناتے ہیں کہ

چاچڑ وانگ مدینہ ڈسے، کوٹ مٹھن بیت اللہ
ظاہر وچ پیر فریدن باطن وچ خود اللہ

تم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا روضہ اٹھانا ہے اور ہم نبی کا روضہ اٹھائیں گے، تم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی یومِ شہادت مناؤ گے اور ہم نبی کی یومِ ولادت شروع کر دیں گے۔ یہ وہ عقیدے ہیں جن سے روافض خوارج گمراہ ہوئے۔

اصل عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرآن میں دیکھو! اگر کہیں کوئی آیت متشابہ ملے، اس کو محکمات کی روشنی میں لے آؤ تو بات واضح ہو جائے گی۔

''راسخین فی العلم'' کا طریقۂ کار:

﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ کے اندر دو قراءتیں ہیں:

پہلی قراءت: ایک قراءت یہ ہے کہ ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾ اس پر وقف لازم ہے کہ نہیں جانتا متشابہات کا کوئی معنی، مگر اللہ۔ ﴿يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ اور جن کو اللہ تعالیٰ نے علم میں رسوخ دیا ہے وہ کہتے ہیں: سب کچھ ہمارے اللہ کی طرف سے ہے۔ آیاتِ محکمات بھی ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور آیاتِ متشابہات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ ہمیں جو سمجھ نہ آئے تو ہماری سمجھ کا قصور ہے، ہماری عقل ناقص ہے، ہماری قویٰ ناقص ہیں اور ہمارا علم ناقص ہے۔ جس طرح ہم نے دنیا کی ہر چیز کو نہیں سمجھا، لیکن پھر بھی ہم ناقص ہیں، اسی طرح ہم نے متشابہات کو نہیں سمجھا، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم ہے۔

﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ کی تفسیر:

دوسری قراءت: علماء نے فرمایا: یہاں وقف لازم نہیں ہے۔ اور معنی یہ ہوگا کہ نہیں جانتا متشابہات کی تاویل، مگر اللہ تعالیٰ اور جو علم کے اندر پکے ہیں وہ بھی جانتے ہیں، ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے۔ اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: ﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وہ شخص جس نے اپنی قسم کو ہمیشہ پورا کیا، کبھی جھوٹی قسم نہیں کھائی، جس نے منتوں کو پورا کیا اور جھوٹی منت نہیں مانی، جس نے اپنے پیٹ کی حفاظت کی اور کبھی حرام داخل نہیں ہونے دیا اور جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی اور کبھی زنا نہیں کیا۔ ایسے شخص کے سینے کو اللہ تعالیٰ کھول کر راسخ فی العلم بنا دیتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: "الحمد للہ" میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے راسخین فی العلم فرمایا ہے؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: "اَللّٰهُمَّ! عَلِّمْهُ الْكِتَابَ" میرے اللہ! میرے اس صحابی کو قرآن پڑھا دے۔ اور دوسری جگہ ہے: میرے اللہ! میرے اس صحابی کو قرآن کی تفسیر سکھا دے۔ اس لیے آپ فرماتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کبھی جھوٹی قسم نہیں کھائی، کبھی پیٹ میں حرام نہیں جانے دیا اور کبھی اپنی شرمگاہ کو غلط استعمال نہیں کیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے رسوخ فی العلم نصیب کیا ہے۔

اب سمجھیں کہ جو متشابہات حقیقی ہیں ان کا معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ حروف مقطعات۔ اور متشابہاتِ اضافی کا معنی راسخین فی العلم کو بھی اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔ اس طرح دونوں قراءتیں صحیح ہو گئیں۔

تاویل کا ایک معنی تفسیر ہوتا ہے، جیسا کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: "تَاْوِيْلُ ذٰلِكَ" کا معنی تفسیر ہے۔ اور ایک تاویل کا معنی ہوتا ہے کہ جو خارج میں حقیقت پیش آتی ہے وہ بھی تاویل ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ ﴾ [الاعراف: ۵۳] یہ کس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ جب قیامت آجائے گی اور جب ان کا معاملہ سامنے آجائے گا اسی وقت کا یہ انتظار کر رہے ہیں؟ اس آیت کے اندر تاویل بمعنی تفسیر ہے۔ ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝۷﴾ [آل عمران: ۷] فرمایا: قرآن سے عقل والے نصیحت پکڑتے ہیں۔

غلط تاویلوں سے بچنے کے لیے دعا:

اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دعا سکھائی ہے کہ راسخین فی العلم یہ دعا مانگتے ہیں: میرے اللہ! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر دینا ہدایت دینے کے بعد گمراہ نہ کر دینا۔ اور ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَيْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَھَّابُ۝۸﴾ [آل عمران: ۸] اپنی طرف سے ہمیں رحمت عطا فرما۔ رحمت تیری ذات ہے، جو رحمت کرنے والی ہے۔

﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۝۹﴾ [آل عمران: ۹] میرے اللہ! تو

قیامت کے دن سب کو اکٹھا کرنے والا ہے، کوئی شک نہیں اور تیرا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا۔ میرے اللہ! جب ساری کائنات کے بندوں کو جمع کرنے پر ایک میدان میں تو قادر ہے تو ہمیں بھی مختلف آیات کے ترجمے سکھانے پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ بندہ کتنا بڑا عالم کیوں نہ بن جائے، لیکن ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے کہ یا اللہ! ایسا نہ ہو کہ میں بھٹک جاؤں اور میں راستہ کھو جاؤں۔ اللہ ہم سب کو گمراہی سے بچائے۔

محکمات کی ایک اور تفسیر:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت میں ہے کہ محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جو ناسخ ہیں، جیسا کہ پہلے نماز مسجد اقصیٰ کی طرف پڑھی جاتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ﴾ [البقرۃ: ۱۴۴] اے میرے نبی! آپ اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کر لیں۔ تو پہلا حکم خود بخود ختم ہو گیا۔ اب اگر کوئی پہلے حکم کو لے کر لوگوں کو دھوکا دیتا ہے کہ تو وہ متشابہ کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حلال و حرام کا بیان بھی محکم ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو حدود مقرر فرمائیں وہ بھی محکم ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو احکامات دیئے کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو اور زکوٰۃ دو، یہ سب محکم ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا﴾ [الانعام: ۱۵۱] اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ [بنی اسرائیل: ۲۳] تین آیات تک تو یہ سب محکم ہیں۔

متشابہات کی مثالیں:

اہل باطل متشابہ آیات کو لے لیتے ہیں اور ایسی احادیث کو لے لیتے ہیں جن کے احکام منسوخ ہیں تو وہ مسلمانوں کو دھوکے میں ڈالتے ہیں کہ یہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔

پہلی مثال:

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "كَانَ يُبَاشِرُنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَنَا حَائِضٌ" کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مباشرت فرماتے تھے اس حال میں کہ میں حیض کے ساتھ ہوتی تھی۔

اس حدیث کے اندر مباشرت کے لفظ آ گئے تو جو منکر حدیث ہیں انہوں نے کہا کہ قرآن میں آیا ہے: ﴿وَلَا

تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ﴾ [البقرۃ: ۱۸۷] تم عورتوں سے مباشرت نہ کرو، تم حالتِ اعتکاف میں مسجد کے اندر بیٹھے ہو۔ حالتِ اعتکاف کے اندر بیوی آ کر کھانا پہنچائے گی، کوئی گھر کی بات بتائے گی، کپڑے دے گی اور لے جائے گی، لیکن میاں بیوی لیٹ کر مجامعت نہیں کر سکتے؛ کیونکہ آدمی اعتکاف میں ہے۔ اگر اعتکاف نہ ہو تو رمضان المبارک میں رات کو میاں بیوی کا لیٹنا جائز ہے، منع نہیں ہے۔

باطل فرقے منکرین حدیث جیسے پرویز وغیرہ گزرے ہیں، انہوں نے اس حدیث مبارک پر طوفان کھڑا کر دیا کہ اللہ تعالیٰ معاف کرے! ایک عام آدمی بھی حیض کی حالت میں اپنی بیوی کے ساتھ جماع نہیں کرتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اللہ کے نبی حیض کی حالت میں اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرتے تھے؟ لہٰذا یہ حدیث غلط ہے۔ اس طرح انہوں نے حدیث پر اعتراض کر دیا اور عام مسلمان بھی دھوکے میں پڑ گیا کہ بات تو ٹھیک ہے کہ اللہ کے نبی معصوم ہیں اور اتنی بڑی شان والے ہیں، ان کی ذات سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے؟ یہ تشابہ کے ساتھ لوگوں کو دھوکہ دینا ہے، حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ لفظ "مباشرت" کا ایک معنی جماع بھی ہے اور ایک معنی ویسے میاں بیوی کا اکٹھے لیٹنا بھی ہے۔

مسئلہ یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ میں عجیب افراط و تفریط تھی۔ یہودی لوگ اگر عورت کو حیض آ جاتا تو اس کو گھر سے بھی نکال دیتے تھے کہ یہ ناپاک ہے، ہمارے گھر میں نہیں آ سکتی۔ ان کے علیحدہ کمرے بنے ہوتے تھے، وہاں جا کر عورت حیض کے دن گزارتی تھی۔ وہ نہ اپنے گھر آ سکتی تھی اور نہ کھانا پکا سکتی تھی۔ نصاریٰ نے ان کے الٹ کر دیا کہ اگر عورت کو حیض آ گیا تو کیا ہو گیا؟ اس حالت میں جماع بھی جائز ہے اور اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانا بھی جائز ہے، کوئی منع نہیں ہے۔ اسلام نے عادلانہ حکم دیا کہ افراط و تفریط میں نہ پڑو۔ عورت کو اگر ایامِ حیض آ گئے ہیں تو عورت نماز بھی نہیں پڑھ سکتی، روزہ بھی نہیں رکھ سکتی اور میاں بیوی آپس میں جماع بھی نہیں کر سکتے، لیکن عورت گھر میں رہے گی، کپڑے دھوئے گی اور میاں بیوی اکٹھے لیٹے رہیں، کوئی منع نہیں ہے، لیکن جماع منع ہے۔

تو بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم حیض میں ہوتے تھے تو حضور اکرم ﷺ ہمارے بستر پر لیٹ جاتے تھے۔ یہ مطلب یہ نہیں تھا کہ...... نعوذ باللہ...... جماع کرتے تھے، لیکن اہل باطل نے لفظ "مباشرت" سے لوگوں کو دھوکے میں ڈال کر حدیث رسول کا انکار کر دیا، حالانکہ اللہ کے نبی نے خود فرمایا کہ حالت حیض میں جماع کرنا حرام ہے، بلکہ اگر کوئی ایسی غلطی کر لے تو وہ توبہ کرے، صدقہ خیرات بھی کرے۔ اس نے بہت بڑی زیادتی کی ہے کہ جس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ایک چیز کو حرام کر دیا ہے اس نے حرام کا کیوں ارتکاب کیا ہے؟ اور

قرآن کے اندر واضح مسئلہ موجود ہے کہ حیض پلیدی ہے۔ جب تک عورت حیض میں ہے اس کے ساتھ جماع نہ کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائے۔ جب غسل کر لیں اور پاک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری بیویوں کو تمہارے لیے حلال کیا ہے۔

یہ قرآن کا مسئلہ تھا۔ اس میں اللہ کے نبی کی مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

دوسری مثال:

روافض نے اپنے ہاں متعہ کا مسئلہ بنایا ہوا ہے۔ ان کے آدمیوں سے سنی پوچھیں تو وہ نہیں مانیں گے، حالانکہ متعہ ان کے مذہب اور ان کی کتابوں میں ہے۔ اور جہاں جہاں ان کا تسلط ہے وہاں متعہ کا قانون رائج ہے، انکار سنیوں کے سامنے کرتے ہیں، ورنہ ان کی کتابوں میں متعہ کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ...... نعوذ باللہ...... کہتے ہیں: اگر ایک دفعہ عورت متعہ کرالے تو وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے اور جب عورت دو دفعہ متعہ کرا لے اور اس کے غسلِ جنابت کرنے کے بعد جب پانی کے قطرے اس کے بدن سے گرتے ہیں تو ہر قطرے سے ایک فرشتہ پیدا ہوتا ہے، جو اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔ اور جب اس کے کسی علمی آدمی سے بحث ہو تو وہ کہتا ہے کہ کمال کرتے ہو! بخاری شریف اہلسنت والجماعت کی ایسی کتابوں میں ہے، اللہ کے قرآن کے بعد جس کا درجہ ہے، اس کے اندر حدیث موجود ہے کہ صحابہ کہتے ہیں: ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں متعہ کرتے تھے۔ تو آپ ہمارے خلاف کیوں باتیں کرتے ہیں؟ بلکہ حدیث میں ایک جگہ یہ وضاحت بھی ہے کہ دو صحابی کہتے ہیں: ہم ایک عورت کے پاس متعہ کرنے کے لیے آئے۔ ہم نے کہا: یہ بھی متعہ کرنا چاہتا ہے اور میں بھی متعہ کرنا چاہتا ہوں۔ میری عمر زیادہ تھی، لیکن جو میرے پاس چادر تھی وہ بہت اچھی تھی۔ میں نے کہا: میں متعہ کے بدلہ میں یہ چادر دوں گا۔ اور میرا ساتھی جوان تھا، لیکن اس کے پاس قیمتی چادر نہیں تھی۔ اس عورت نے کہا: میں اس نوجوان سے متعہ کرتی ہوں، تمہارے ساتھ میں متعہ نہیں کرتی ہوں۔ تو یہ اہلسنت والجماعت کی کتابوں میں موجود ہے اور کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول موجود ہے کہ متعہ جائز ہے۔ جب روافض یہ تین باتیں دکھائیں تو اہلسنت والجماعت کا آدمی تو ایک دفعہ چکر میں آ جائے گا۔

اصل بات یہ تھی کہ متعہ ابتدائے اسلام میں تھا۔ جب اس کی حرمت آ گئی تو اللہ کے نبی نے اس کو حرام فرما دیا: ''لَا مُتْعَةَ بَعْدَ ذٰلِكَ'' آج کے بعد متعہ حرام ہے۔ خبردار! آج کے بعد کوئی متعہ نہیں کرے گا۔ وہ اس زمانہ کی

احادیث دکھاتے ہیں جب متعہ حلال تھا۔ اور اس بات کا پتہ عالم کو ہوگا، عام آدمی کو تو اس کا پتہ نہیں ہوگا۔ یہی ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہوتی ہے اور کھوٹ ہوتا ہے وہ ایسے ایسے الفاظ لے آتے ہیں اپنی باتوں کا حوالہ بنانے کے لیے، تا کہ میری بات بن جائے۔ اور ان کا اس سے مقصد اپنے متبعین کو دھوکہ دینا ہوتا ہے، حالانکہ اگر ان آیات و احادیث کو محکم آیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ آیات ان کے اوپر تو حجت بنیں گی، لیکن ان کے لیے دلیل نہیں بنیں گی۔

تیسری مثال:

نصرانیوں نے قرآن میں یہ تو دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن میں روح اللہ اور کلمۃ اللہ فرمایا ہے۔ ان باتوں کو تو لے لیا اور جو قرآن میں محکم آیات تھیں: ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ﴾ [زخرف:۵۹] کہ وہ میرا بندہ ہے۔ ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ﴾ [آل عمران:۵۹] عیسیٰ علیہ السلام کی مثال ایسے ہے جیسا حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور سارے قرآن میں یہ آیات موجود ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی مخلوق ہے، اللہ کے بندوں میں سے بندے ہیں اور اللہ کے رسولوں میں سے رسول ہیں، لیکن نصرانیوں نے ان ساری آیات کو چھوڑ کر روح اللہ اور کلمۃ اللہ والی آیات کو لے لیا۔

(حدیث) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات مبارکہ تلاوت فرمائیں: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ ...... وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں محکمات بھی اتاری ہیں اور متشابہات بھی اتاری ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ جب تم دیکھو کہ لوگ متشابہات کو دلیل بنا کر جھگڑ رہے ہیں ان سے بچ جانا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن نے ارشاد فرمایا کہ یہ اہل باطل ہیں۔

میں نے آپ کے سامنے اس لیے مثالیں بیان کیں کہ وہ لوگوں کو ایسی باتوں اور الفاظ میں الجھاتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا تھا:

؎ خود تو بدلتے نہیں، مگر قرآن بدل دیتے ہیں

وہ یہ نہیں کرتے کہ اپنے آپ کو قرآن کے مطابق بدلیں، بلکہ وہ قرآن کے احکام کو بدل دیتے ہیں۔

چوتھی مثال:

جیسا کہ ہمارے بعض مولوی معراج کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ پر تشریف لے

گئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور بلندی نصیب فرمائی، یہاں تک جو روایات موجود ہیں ٹھیک ہیں اور اتنا تک بھی روایات کے اندر آتا ہے کہ ایک مقام ایسا بھی آیا کہ وہاں جبرائیل علیہ السلام رک گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم کیوں رک گئے ہو؟ اس نے کہا: یارسول اللہ! آسمان میں فرشتوں کے لیے ایک حد ہے، اس سے آگے وہ نہیں جا سکتا۔ میری حد آگئی، اس سے آگے میں بھی نہیں جا سکتا۔

اب بعض مولوی لوگوں کو الجھن میں ڈالنے کے لیے یہاں جوڑ لگاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور قریب آجا اور قریب آجا اور قریب آجا اور قرآن کی آیت کا جوڑ لگاتے ہیں: ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝۸ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝۹﴾ [النجم: ۸، ۹] کہ حضور اکرم ﷺ اتنے قریب ہو گئے جیسے بھنویں مل جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور قریب آجا۔ تو آپ اور قریب آگئے، پھر عرش پر پہنچ گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے محبوب کو سینے سے لگایا، پھر جب جبرئیل علیہ السلام نے اوپر نظر کی تو اوپر بھی آپ تھے اور نیچے بھی آپ تھے۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یارسول اللہ! عجیب بات ہے! ہمیں تو سمجھ نہیں آئی، نیچے بھی آپ عرش پر بھی آپ ہیں۔ آگے عاشق بیٹھے ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں: یہ مولوی ہے جو معرفت کی باتیں کرتا ہے اور یہ وہابی مولوی شریعت والے ہیں ان کو معرفت کا کیا پتہ؟

بعض مولوی کہتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ عرش پر جانے لگے تو حضور اکرم ﷺ نے چاہا کہ میں اپنا جوتا اتار دوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ جوتی کے جوڑے پہن کر عرش پر آجائیں۔ اور پھر وہ مولوی آگے جوڑ لگاتے ہیں کہ ہمارے نبی کی شان دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر جوتے اتروا دیئے اور ہماری مدنی ﷺ کی شان دیکھ کہ عرش پر جوتوں کے ساتھ چلے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے جوتے اتارنے کا حکم تو قرآن میں ہے، عرش پر جوتے سمیت جانے والی آیت کہاں ہے؟ یہ ہمارے تیس پارے والے قرآن میں تو نہیں ہے، البتہ ملنگوں والے چالیس پارے والے قرآن میں ہو تو پتہ نہیں ہے۔

یاد رکھیں! اس آیت: ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝۸ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝۹﴾ [النجم: ۸، ۹] کا تعلق تو میرے اللہ کے ساتھ نہیں، بلکہ وہ جبرئیل علیہ السلام کا قصہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے کہا: مجھے اپنی اصل شکل دکھاؤ۔ جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر آپ کا حکم ہے تو میں دکھاتا ہوں، ورنہ آج تک کوئی پیغمبر بھی میری اصلی شکل نہیں دیکھ سکا۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہوئے، اس وقت حضور اکرم ﷺ منیٰ اور مکہ کے راستہ میں کھڑے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پر پھیلائے تو زمین سے

آسمان تک کا سارے کا سارا آفاق بھر گیا" فَأُغْمِيَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ "۔رسول اللہ ﷺ پر غشی طاری ہوگئی، آپ ﷺ زمین پر بیٹھ گئے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جلدی جلدی اپنی شکل بدلی اور نیچے اتر کر کہنے لگے: "أَنْتَ رَسُولُ اللَّهِ وَأَنَا جِبْرِيلُ۔ حضور! آپ کیوں پریشان ہو گئے؟ میں جبرئیل ہوں اور آپ رسول اللہ ہیں۔ اور یہی اس آیت کا معنی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے قریب آ گیا، آپ کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور کہا: آپ کیوں پریشان ہو گئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری شکل دیکھ کر مجھ پر غشی طاری ہوگئی، کیا تجھ سے بڑا آسمانوں میں کوئی فرشتہ ہے؟ انہوں نے کہا: حضور! میرے تو چھ سو پر ہیں، اللہ کے ایسے فرشتے بھی ہیں جن کے پانچ پانچ ہزار پر ہیں۔ اہل باطل اس قصہ کو کہاں سے کہاں لے گئے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے قرآن میں اس سے بڑی کوئی تحریف ہوگی؟

خوارج کا رد:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ باطل فرقے چاہتے ہیں کہ ہم جس طرح چاہتے ہیں اس طرح قرآن میں تحریف کر دیں۔ امام احمد رحمہ اللہ سے روایت ہے: ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾ ان سے مراد خوارج ہیں؛ کیونکہ خوارج کی یہ عادت تھی کہ وہ قرآن کے الفاظ کی تاویلیں کرتے تھے اور آیات متشابہات کو سامنے رکھنے کے بعد اپنی عقل سے فیصلے کرتے تھے۔

خوارج کے دلوں میں اہل بیت سے اتنی نفرت تھی کہ اگر ان کے خاندان میں کوئی خوبصورت لڑکی ہوتی اور کوئی آدمی اس کو شادی کا پیغام دیتا تو وہ لڑکی یہ شرط رکھتی تھی کہ (حضرت) علی (رضی اللہ عنہ) کی گردن لے آؤ تو میں تم سے نکاح کروں گی۔ اور وہ کہتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ جو بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو ناراض کرے تو اس نے اللہ کے نبی کو ناراض کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب دوسری شادی کی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ناراض ہوگئیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ علی کو کہہ دو: خبردار! دوسری شادی نہ کرے اور بی بی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا پر کوئی سوکن نہ لائے۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کی مخالفت کی اور دوسری شادی کر لی۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی تھی۔

خوارج الزام لگاتے ہیں کہ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جنازہ رات کو اس لیے پڑھایا گیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان پر تشدد کر کے ان کو مار ڈالا تھا، اس لیے رات کو جنازہ پڑھا، تاکہ راز نہ کھل جائے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ شیعہ کدھر

گئے اور خارجی کدھر گئے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اہلسنت والجماعت کا عقیدہ حق ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی برحق ہیں، اہل بیت بھی برحق ہیں اور خلفائے راشدین بھی برحق ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے ایک کو ایک پر شان عطا فرمائی ہے۔ دوسری شادی کرنا شریعت کے اندر منع نہیں تھا، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسری شادی نہیں کی۔ اور جب بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا وفات فرما گئیں، اس کے بعد آپ نے شادی کی ہے تو یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہیں ہے؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بھی یہی تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہوتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسری شادی نہ کریں۔ باقی رات کو جنازہ پڑھنے کی وجہ خود بی بی صاحبہ کی وصیت تھی کہ میرا جنازہ رات کو پڑھنا اور زیادہ لوگوں کو بھی نہ بلانا، تاکہ زیادہ سے زیادہ پردے کے ساتھ قبر میں جاؤں۔ میرے جنازے پر نظر پڑنے سے لوگوں کو میرے قد وقامت کا اندازہ ہو جائے گا، اس لیے بی بی اپنے آپ کو خود اتنا چھپانا چاہتی تھیں۔

مصیبت یہ ہوگئی کہ شیعہ محبت میں اتنے بڑھ گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا بنا دیا اور خوارج اتنے گھٹاتے گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایمان سے بھی باہر نکال دیا۔

خوارج کے آغاز کی تاریخ:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے دین کے اندر نئی باتیں نکالنے والے خوارج کا فتنہ تھا۔ ان کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ غزوۂ حنین کی کامیابی کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو زیادہ دیا اور کسی کو کم دیا۔ ایک آدمی جس کا نام الخویصرہ تھا، اس نے کھڑے ہو کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ''اِعْدِلْ؛ فَاِنَّكَ لَمْ تَعْدِلْ (نعوذ باللہ)'' آپ عدل وانصاف کریں، آپ انصاف نہیں کر رہے ہیں کہ کسی کو زیادہ دے رہے ہیں اور کسی کو آپ تھوڑا دے رہے ہیں۔ جن کا تعلق آپ کے قبیلے سے ہے آپ ان کو زیادہ دے رہے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بدبخت انسان! اگر میں عدل نہیں کروں گا تو کون عدل کرے گا؟ اے بدبخت انسان! اللہ نے مجھے امین بنا کر زمین والوں کے لیے عدل بنا کر بھیجا ہے۔ میرے اللہ نے مجھ پر اعتبار کیا ہے، تم اعتبار نہیں کرتے ہو۔ وہ آدمی یہ بات کہہ کر مڑ گیا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اور یہ بھی کوئی بعید نہیں ہے کہ دونوں نے یہ بات کہی کہ یا رسول اللہ! ہمیں اجازت دیں تو ہم اس بدبخت کی گردن اڑا دیں؟ اللہ کے نبی پر اعتراض کرتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، اس کو مت قتل کرو۔ اس بندے کی جنس

سے، قوم سے اور قبیلہ سے ایک ایسی قوم نے نکلنا ہے، جب تم ان کی نماز دیکھو گے تو تمہیں اپنی نمازیں حقیر نظر آئیں گی اور جب وہ قرآن پڑھیں گے تو تمہیں اپنا قرآن پڑھا کچھ نظر نہیں آئے گا، لیکن نماز اور قرآن پڑھنے کے باوجود یہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر جانور کے بدن سے نکل جاتا ہے اور اس کو کوئی خون بھی نہیں لگا ہوتا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یاد رکھو! اگر اس زمانہ میں خوارج فتنے کرنے والے ملیں، ان سے قتال کرنا۔ جو ان کو قتل کرے گا اللہ تعالیٰ ان کو بہت بڑا اجر و ثواب عطا فرمائیں گے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس قوم کی ابتداء غزوۂ حنین کے موقع پر ہوگئی۔ اور آپ ﷺ کا مال غنیمت کم زیادہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ جب مکہ فتح ہونے پر آیا تو...... ابوسفیان جو حضور اکرم ﷺ کا چچا اور مکہ کا سردار ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو توفیق دی وہ اسلام لے آئے...... حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر آپ ﷺ اس کو عزت اور عظمت نہیں دیں گے تو ایسے لوگ دل سے خوش نہیں ہوتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فوراً اعلان فرمایا تھا کہ لوگو! جو آدمی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کو امان ہے۔ تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ خوش ہو گئے کہ اسلام نے مجھے عزت دی۔

پھر یہ خوارج کا فتنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ظاہر ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ نہروان میں جنگ لڑی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فتح عطا فرمائی۔ پھر اسی خوارج سے لڑیاں پھوٹیں، کئی جماعتیں بن گئیں اور یہ وہی بات ہوگئی جیسا کہ میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا کہ پہلی امتیں بہتر (۷۲) فرقے بنی ہیں، میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور سب کے سب جہنمی ہوں گے، جنت والے صرف وہ ہوں گے جو میرے اور میرے صحابہ کے راستے پر ہیں۔

ایک موٹی بات یاد رکھ لیں کہ اگر آپ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغض کرتے ہیں تو سمجھ لیں کہ آپ نجات پانے والوں میں نہیں ہیں۔ اگر آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کو حجت نہیں مانتے اور ان کے قول پر اعتماد نہیں کرتے تو سمجھ لیں کہ جہنمی ٹولے میں ہیں۔ اگر آپ حضور اکرم ﷺ کی سنت پر نہیں چلتے تو سمجھ لیں کہ پٹڑی سے ہٹے ہوئے ہیں۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری امت سے کچھ ایسے لوگ بھی آئیں گے، ایسا ایسا قرآن پڑھیں گے، ایسا ایسا کاٹیں گے جیسے سبزیوں کو کاٹا جاتا ہے، یعنی تیز تیز قرآن پڑھیں گے اور اس کی ایسی تاویلیں کریں گے اور ایسے ترجمے کریں گے جو قرآن کے حکم کے خلاف ہوں گے۔

(حدیث) حضرت ابو مالک الاشعری رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا کہ میں اپنی امت پر ان تین چیزوں کے بارے میں خوف کھاتا ہوں: 1 ...... ایک یہ کہ ان کو اللہ تعالیٰ مال زیادہ دیں گے، دولت عام ہو جائے گی، حسد عام بنے گا اور پھر ایک دوسرے کو قتل کریں گے۔ 2 ...... دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر کتاب کھولیں گے تو وہ اس میں تاویل میں پڑ جائیں گے۔ 3 ...... تیسرا اللہ تعالیٰ ان کو علم میں زیاتی دیں گے، وہ اس کو ضائع کر دیں گے۔ ایسا نہیں کریں گے کہ سوال کر کے اپنے علم کو پختہ کر لیں۔ سند کے اعتبار سے اس میں غرابت پائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن ایسا تو نہیں اتارا کہ ایک آیت دوسری آیت کو جھٹلائے (بلکہ قرآن تو ایک دوسرے کی تفسیر کرتا ہے) جو بات تم کو سمجھ آئے اس کو تھام لو، یعنی اس پر عمل کرو اور اگر کوئی بات تم پر متشابہ ہو جائے تو اس پر ایمان لے آؤ کہ ہمارے اللہ کا حکم ہے اور ہماری عقل ناقص ہے، اس لیے ہمیں سمجھ نہیں آرہا، ورنہ اللہ تعالیٰ کا حکم حق ہے۔ اور اس کو کسی اہل علم کے پاس لے جاؤ، تاکہ وہ تمہاری مشکل حل کر سکے۔ یہ نہ ہو کہ اپنی طرف سے غلط تاویلیں کر کے اللہ کے قرآن کے معانی بدل ڈالو۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۙ⑩ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑪﴾ [آل عمران: ۱۰، ۱۱]

"جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کو ان کے اموال اور ان کی اولاد اللہ کے سامنے ہرگز کچھ کام نہ آئیں گے۔ اور وہی دوزخ کے ایندھن ہیں۔ ان کی عادت آلِ فرعون کی طرح ہے اور ان کی طرح جو ان سے پہلے تھے (جیسے عاد و ثمود)۔ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، پھر ان کو اللہ نے ان کے گناہوں پر پکڑا اور اللہ کی مار سخت ہے۔"

نجران کے وفد کے فرد کا واقعہ:

وفدِ نجران کے بارے میں تو آپ پہلے پڑھ چکے ہیں، ان کے ضمن میں ایک واقعہ آتا ہے کہ جب وہ نجران سے

آ رہے تھے۔ ابوالحارثہ جو بڑا عالم تھا اس کا ایک بھائی تھا جس کا نام قرض بن علقمہ تھا۔ اس کے جانور کو ٹھوکر لگی، وہ گرا تو قرض بن علقمہ نے کہا کہ جو دردود والا ہے اللہ اس کو ہلاک کرے، یعنی اس کا مقصد حضور اکرم ﷺ تھے۔ اس کے بھائی ابوالحارثہ نے کہا: کس کو کہہ رہے ہو کہ ہلاک ہو جائے؟ اس نے کہا: نبی کو کہہ رہا ہوں۔ اس نے کہا: عجیب بات ہے! تم اللہ کے نبی کو کہہ رہے ہو؟ تم ہلاک ہو جاؤ۔ تم نہیں جانتے کہ وہ تو ایسے نبی ہیں جن کی آنے کی بشارت خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی ہے۔ اور کتاب میں ہے کہ وہ اللہ کا سچا نبی ہے، وہ اللہ کا آخری نبی ہے۔ تو قرض بن علقمہ نے کہا: اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ اللہ کا سچا نبی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی بشارت دی ہے تو پھر تمہارے ایمان لانے میں کیا رکاوٹ ہے؟ اس نے کہا: تم جانتے ہو کہ ہمارے بادشاہ...... جنہوں نے ہمیں اتنا پیسہ دیا ہے، اتنی مال و دولت اور بڑے بڑے محلات دیئے ہیں...... اگر ہم نے اللہ کے نبی کا کلمہ پڑھ لیا تو یہ مخالف ہو جائیں گے اور ہمارے سارے مرتبے اور ساری مال و دولت چھن جائے گی۔

مولوی بھی اسی وجہ سے پٹڑی سے اترتا ہے کہ پیٹ کی جہنم کو بھرنے کے لیے کبھی حلوہ مار لیتا ہے، کبھی پیسہ مار لیتا ہے اور کبھی کرسی مار لیتا ہے۔ اور جنہوں نے ان چیزوں پر قابو پا لیا وہ سیدھے راستے سے ہٹ نہیں سکے۔ اس لیے علامہ اقبال نے کہا تھا:

ے اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اگر پہچانے تو تیرے در کے گدا دارا و جم

جس نے اپنے رب کو پہچان لیا ہے تو پھر بادشاہ اور بڑے سے بڑے لوگ بھی آ کر اس کے دروازے پر بھیک مانگتے ہیں اور جو اپنے آپ کو اللہ کے دروازے سے ہٹا لیتا ہے تو وہ دنیا کے سرداروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔

بہر حال قرض بن علقمہ کہتے ہیں کہ میں نے اسی وقت دل میں کہا: اے اللہ! مجھے تیری قسم! اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے اسلام لانے سے نہیں روک سکتی۔ کہتے ہیں: میں نے اسی وقت اس وفد کو چھوڑ دیا کہ یہ جھوٹوں اور گمراہوں کا وفد ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پیغمبر اور خاتم الانبیاء ہیں اور پھر ایمان نہیں لاتے ہیں۔

آج بھی دیکھ لو کہ مولوی کہتا ہے: قرآن اور اسلام کے بغیر دنیا میں امن نہیں ہو سکتا، لیکن ان کے گھروں میں جھانک کر دیکھو تو اسلام نہیں ہے۔ ان کے اپنے کردار پر نظر ڈال کر دیکھو! کیا اسلام نافذ ہے؟ ان کے جلسوں پر نظر ڈال کر دیکھو! کیا اسلام نافذ ہے؟ یہ ساری دنیا کے وہ طور طریقے ہیں جو غلط قسم کے آدمی اپناتے ہیں اور ادھر اسلام

کا بھی نعرہ ہوتا ہے۔ یہی سب سے بڑا نفاق ہے۔

قرض بن علقمہ کہتے ہیں: میں نے اپنا گھوڑا دوڑایا اور وفد سے ہٹ گیا اور وفد کے آنے سے پہلے میں نے حضور اکرم ﷺ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کلمہ پڑھ لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر ارشاد فرمایا کہ ان کو فرما دیں کہ ان کو نہ مال فائدہ پہنچائے گا، نہ اولاد پہنچائے گی، نہ دولت فائدہ پہنچائے گی اور نہ ان کو کوئی نفع ہوگا، بلکہ یہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ ان کو پتہ نہیں ہے کہ ان سے پہلے فرعون اور آلِ فرعون نے کیا کیا تھا؟ قوم عاد اور قوم ثمود نے کیا کیا تھا؟ انہوں نے بھی جب ہماری آیات اور ہمارے رسولوں کو جھٹلایا تو ان کو ہم نے عذاب میں پکڑ لیا۔ اے میرے نبی! اگر آپ کی قوم، آپ کے ماننے والے اور آپ کے زمانے میں رہنے والے آپ کی تکذیب کریں گے تو ان کا انجام بھی ہلاکت ہوگا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ اور جب وہ پکڑنے پر آتے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت چھڑا نہیں سکتی۔

کفار کو مال و اولاد فائدہ نہ دے گی:

ان آیات میں مفسرین نے ایک مسئلہ استنباط کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو کافر ہیں ان کو ان کے مال و اولاد نفع نہیں پہنچائیں گے۔ کافر یہ دعویٰ کرتے تھے: ﴿نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ﴾ [السبا: ۳۵] ہمارے پاس اتنا مال و دولت ہے کہ ہمیں عذاب نہیں دیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہارا مال و دولت تمہارے کام نہیں آئے گا۔ علماء نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن کافروں کو تو مال و دولت فائدہ نہیں پہنچائے گا، لیکن مسلمانوں کو مال اور اولاد فائدہ پہنچائے گی؛ اس لیے کہ حدیث میں آتا ہے کہ جس بندے کا بچہ یا بچی پیدا ہوئی اور وہ مر گئی، اس آدمی نے صبر کیا تو وہ اولاد قیامت والے دن اپنے والدین کی شفاعت کرے گی۔ اسی طریقے سے جو مسلمان صدقات و خیرات کرے ایک ایک پیسے کا اجر ملے گا۔

مسلمانوں کو ماں، باپ اور اولاد سے فائدہ پہنچے گا:

جیسے اولاد نفع دے گی اسی طرح والدین بھی نفع دیں گے۔ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ قیامت کے دن جب ایک بندہ جنت میں پہنچ جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کرے گا کہ یا اللہ! تیری رحمت سے تو میں جنت میں آ گیا، میری اولاد نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تیری اولاد کو بھی ہم نے معاف کر دیا ہے، وہ بھی جنت میں ہیں،

لیکن تیرا رتبہ اور مقام بہت اعلیٰ ہے، وہ اس مقام پر نہیں پہنچے۔ وہ بندہ کہے گا: اے اللہ! میں نے دنیا میں عمل کیے تھے تو میں اولاد کے لیے بھی تو ساتھ ساتھ دعائیں مانگتا تھا۔ آپ مہربانی کریں! جنت کے اندر میں اپنی اولاد سے ایک جگہ جدا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم ان کی اولادوں کو بھی والدین کے مرتبہ پر بھیج دیں گے۔ ﴿يَوْمَ لَا يَنفَعُ الظَّٰلِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوٓءُ الدَّارِ ﴾ [المومن: ۵۲] قیامت کے دن کافر معذرت کریں گے کہ ہم نے واقعی بڑا ظلم کیا ہے، ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج دیں۔ لیکن جب دنیا ختم تو سب کچھ ختم ہے اور ان کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔ کافروں کے لیے لعنت ہے، اللہ کی رحمت سے دور کر دیے جائیں گے۔

زکوٰۃ دینے والے لوگوں کی حکایت:

حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابی کو بھیجا کہ فلاں علاقہ میں جا کر زکوٰۃ لے آؤ۔ وہ صحابی ایک آدمی کے پاس پہنچے کہ مجھے حضور اکرم ﷺ نے بھیجا ہے، میں عاملِ زکوٰۃ ہوں۔ وہ اس صحابی کو اپنے ساتھ لے آیا اور اعلیٰ سے اعلیٰ چن کر بکریاں نکالیں۔ اس صحابی نے کہا: میں عاملِ زکوٰۃ ہوں، مجھے یہ حکم نہیں کہ جو سب سے زیادہ اچھی بکریاں ہوں مالِ زکوٰۃ میں لوں، بلکہ شریعت میں حکم یہ ہے کہ درمیانہ مال لو۔ دوسرے صحابی نے کہا: میں خود لے آیا ہوں، آپ نے تو نہیں کہا تھا۔ میں اللہ کے راستہ میں دے رہاں ہوں، اس لیے میں اعلیٰ سے اعلیٰ مال دوں گا۔

پھر وہ صحابی دوسرے آدمی کے پاس زکوٰۃ لینے کے لیے گئے، اس نے کہا: زکوٰۃ بھی تو ایک ٹیکس ہے، ہر سال لینے کے لیے آجاتے ہو۔ آج میں فارغ نہیں ہوں، کل آنا ہے۔ پھر گئے تو اس نے کہا: آج مجھے بڑی مصروفیت ہے، کل آنا۔ جب اگلے دن اس کے پاس گئے تو وہ مال جو مرنے کے قریب تھا زکوٰۃ کے اندر دیا۔ اس صحابی نے کہا: یہ بکریاں تو مدینہ تک بھی نہیں پہنچ سکیں گی اور میں ان کو زکوٰۃ کے اندر لے لوں؟ اس نے کہا: یہی مال ہے۔ لینا ہے تو لے لو، اگر نہیں لینا تو نہ لو۔ وہ صحابی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان دونوں کا قصہ سنایا۔ جس نے مال عمدہ دیا تھا اس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ! اس کا مال تھوڑا کر دے اور جس نے گھٹیا مال دیا تھا اس کے بارے میں آپ نے فرمایا: اللہ! اس کا مال زیادہ کر دے۔ تو وہ صحابی پریشان ہو گئے!! لیکن چپ کر گئے۔ اللہ کے نبی کے سامنے کون بول سکتا ہے؟ اس کے اندر ضرور حکمت ہو گی۔ بہر حال اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا مال جب بڑھ گیا تو وہ بستی کے اندر نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے وہ بستی سے باہر چلا گیا۔ جب مال اور زیادہ ہو گیا تو وہ اور دور چلا گیا۔ پھر مال اور زیادہ ہو گیا تو وہ اور دور چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مدینہ سے محروم ہو گیا اور

اپنے مال میں کھو گیا۔

اخیر زمانہ کے لوگوں کے متعلق حدیث:

حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم مکہ شریف میں تھے۔ حضور اکرم ﷺ ایک رات اٹھے اور آپ ﷺ نے فرمایا: یا اللہ! میں نے تیری توحید کی دعوت پہنچا دی، تیری توحید کی دعوت پہنچا دی، تیری توحید کی دعوت پہنچا دی۔ جب آپ نے تین دفعہ فرمایا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آواز دے کر کہا: یا رسول اللہ! آپ نے واقعی اللہ کی دعوت پہنچا دی ہے۔ جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ پاک اسلام کو غالب کریں گے اور کفر اپنے ٹھکانوں پر چلا جائے گا اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہمت دیں گے کہ وہ دریاؤں کو عبور کر کے اسلام پھیلائیں گے۔ اس کے بعد لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ قرآن پڑھیں گے اور پڑھائیں گے اور کہیں گے: کون زیادہ بہتر ہے؟ وہ زیادہ بہتر ہے یا ہم بہتر ہیں؟ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہی جہنم کا ایندھن ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک وقت آئے گا اسلام غالب ہو جائے گا۔ پھر کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو قرآن پڑھیں گے اور پڑھائیں گے، لیکن آیات متشابہات کو لے کر الجھ جائیں گے اور محکمات کو چھوڑ دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ راستے سے بھٹک جائیں گے اور وقود النار ہو جائیں گے۔

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ⑫ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ⑬﴾ [آل عمران: ۱۲، ۱۳]

''ان (یہودی) لوگوں سے کہہ دیجیے جنہوں نے کفر کیا کہ اب تم مغلوب ہو گے اور (آخرت میں) جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔ تمہارے لیے ان دو فوجوں میں نمونہ ہے، جن میں (جنگ بدر میں) مقابلہ ہوا۔ ایک فوج اللہ کی راہ میں لڑ رہی تھی اور دوسری کافر تھی۔ یہ (کافر) کھلی آنکھوں سے ان (مسلمانوں) کو اپنے سے دو گنا دیکھ رہے تھے۔ اور اللہ قوت دیتا ہے اپنی مدد سے جس کو چاہتا ہے۔ دیکھنے والوں کے لیے اس میں عبرت ہے۔''

کافر مغلوب ہوں گے اسلام فتح یاب ہوگا:

اے میرے مدنی! ان کافروں سے کہہ دیں کہ تم نے مغلوب ہو جانا ہے، اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا۔ چاہے کفر کتنا زور دکھادے، لیکن باطل آخر باطل ہوتا ہے اور حق حق ہوتا ہے۔ اور صرف یہ نہیں کہ تم دنیا میں مغلوب ہو جاؤ گے، بلکہ تم دنیا میں بھی مٹ جاؤ گے اور تمہارا حشر جہنم کی طرف ہوگا! کیونکہ جو کفر پر مرے گا تو مرنے کے بعد ہی اس کا معاملہ جہنم والا ہو گیا اور جس کو جہنم ملی تو وہ کتنی بری جگہ ہے؟ کافروں کا مغلوب ہونا حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں بھی ہو گیا۔ نصاریٰ بھی مغلوب ہو گئے، یہود بھی مغلوب ہو گئے اور قریشِ مکہ بھی مغلوب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو غالب کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو فتح عطا فرمادی اور پوری دنیا میں اسلام کا پرچم لہرا گیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم ﷺ کے دین کو یوں پھیلایا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بائیس لاکھ مربع میل پر اسلام کے جھنڈے لگ گئے۔ لیکن یاد رکھیں! اصل میں غلبہ ایک دفعہ پھر قیامت سے پہلے آئے گا۔ اور وہ دور آنے والا ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود آسمانوں سے اتریں گے تو چرچ اور گرجے ویران ہو جائیں گے، صلیب کو توڑ دیں گے، یعنی کفر کی قوت ٹوٹ جائے گی، خنازیر قتل کر دیں گے، دجال کے فتنہ کو نیست و نابود کر دیں گے، پوری دنیا میں عدل ہو جائے گا اور اسلام کا غلبہ ہو جائے گا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ رہیں گے، ان کی شادی ہوگی، ان پر موت آئے گی اور حضور اکرم ﷺ کی قبر کے ساتھ ان کی قبر بنے گی۔

﴿وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ﴾ حشر کا دن وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمام اولین و آخرین کو اکٹھا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو فرمایا: تمہارا حشر جہنم کی طرف ہوگا۔

﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ ⑫﴾ ''مِهَاد'' ''مَهْد'' کی جمع ہے۔ ''مَهْد'' اس جھولے کو کہتے ہیں جس میں بچہ جھولتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے کافرو! تم نے میرے مہد والے نبی کا انکار کیا، اس کے کلام کو توحید کے بجائے شرک میں بدل ڈالا تو ہم نے بھی تمہارا بچھونا جہنم میں بچھا دیا۔

کافر اتنی طاقت کے باوجود کیسے مغلوب ہوں گے؟

دماغ کے اندر یہ بات آتی ہے کہ یہ کفار کیسے مغلوب ہو جائیں گے؟ حالانکہ ان کے پاس اتنی بڑی ٹیکنالوجی ہے، خلاؤں میں اسٹیشن بنا لیے ہیں اور ان کے پاس الیکٹرانک میڈیا ہے، لیکن اسلام کے پاس کیا ہے؟ اللہ تبارک

وتعالیٰ نے اگلی آیت مبارکہ کے اندر اس کی مثال دی ہے۔ فرمایا ہے: ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾﴾ اے اعتراض کرنے والو! ہم نے تمہارے لیے ایک نشانی رکھی ہے۔ یاد کرو جب دو جماعتیں ٹکرا گئی تھیں: ایک جماعت وہ تھی جو اللہ کے لیے لڑنے والے تھے اور دوسری جماعت وہ کافروں کی تھی۔ ان دونوں کی حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کے تین سو تیرہ افراد تھے، تلواریں بھی نہیں تھیں، جدید سامان بھی نہیں تھا، بلکہ اکثر کے پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا تھا: اے اللہ کے رسول! ہمارے پاس تو تلوار بھی نہیں۔ فرمایا: کھجور کا گوشہ کاٹ کر لے آؤ۔

اس لیے کفر کی اعانت میں آ کر مسلمانوں کو کمزور سمجھنے والوں کو چاہیے کہ وہ اللہ کی ان آیات میں غور کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب وہ دونوں جماعتیں اکٹھی ہو گئیں تو ہم نے کافروں کو یہ دکھایا کہ مسلمان ہم سے دوگنا ہیں، حالانکہ تین سو تیرہ تھے، لیکن چھ سو چھبیس نظر آتے تھے۔

دوسری آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب دونوں جماعتیں ملنے والی تھیں تو کافروں کو یہ دکھایا کہ مسلمان تو بالکل تھوڑے سے ہی ہیں، یعنی تین سو تیرہ سے بھی کم کر کے دکھائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی کافر کم کر کے دکھائے اور یہاں ہے کہ دوگنا کر کے دکھایا تو بظاہر آیات میں تناقض ہے۔ علماء نے اس کا جواب دیا ہے کہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ جب دونوں جماعتیں ابتداء میں آئیں تو اللہ پاک نے مسلمانوں کی نظر میں کافروں کو تھوڑا کر دیا اور کافروں کی نظر میں مسلمانوں کو تھوڑا کر دیا، تا کہ آج ٹکراؤ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دیں؛ کیونکہ اگر کافروں کو مسلمان ابتداء کے اندر زیادہ کر کے دکھائے جاتے تو وہ بھاگ جاتے اور شاید نہ لڑتے۔ اور مسلمانوں کو اگر پتہ چل جاتا کہ وہ دو ہزار ہیں تو وہ گھبرا جاتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو گھٹا کر دکھایا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تین سو تیرہ کے چھ سو چھبیس دکھائے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بھینگے آدمی کو ہم ایک کے دو دکھا سکتے ہیں اور ان کافروں کو دوگنا کر کے دکھا دیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ تو پہلے ہی اندھے ہیں کہ ایک خدا کے تین خدا بنا رکھے ہیں۔

اللہ پاک نے کافروں کو مسلمان دوگنا کر کے دکھائے؛ کیونکہ فرشتے بھی آسمان سے ان کی مدد کے لیے اتر آئے تھے، جو انسانی لباس کے اندر تھے۔ ﴿وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ اگر اللہ اس چھوٹی جماعت کو کفار پر غالب

کر سکتے ہیں تو اب بھی اللہ ہم کمزور مسلمانوں کو کفر پر غالب کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے قرآن کے ان واقعات میں عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو آنکھوں والے ہیں۔ اور جو اندھے بن گئے کہ نصرانیت میں پڑ گئے، یہودیت میں پڑ گئے اور بدعات میں پڑ گئے ان کو قرآن سمجھ نہیں آتا، جب تک کہ دل کی آنکھیں نہ کھلیں۔

یہود کی شکست کی پیش گوئی:

محمد بن اسحاق نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو بدر میں فتح عطا فرمائی (کہ کافروں کے ستر سردار مارے گئے اور ستر قید ہوئے) اور آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو آپ ﷺ نے یہود کو بنو قینقاع کے بازار میں جمع کیا اور فرمایا: اے یہود! تم بھی اسلام لے آؤ، اس سے پہلے کہ تم پر بھی اسی طرح عذاب آئے جیسا کہ قریش پر نازل ہوا۔ لیکن یہود کہنے لگے: آپ اپنے نفس کو دھوکہ میں نہ ڈالیں کہ آپ نے قریش کے چند ایسے لوگوں کو قتل کر دیا جو نا تجربہ کار لوگ تھے۔ آپ نے ابھی تک ہم سے قتال نہیں کیا۔ وہ تو قتال نہیں جانتے تھے۔ اگر آپ نے ہم سے جنگ لڑی تو آپ کو پتہ چلے گا کہ کیسے جنگ لڑتے ہیں؟ ہم جنگجو لوگ ہیں اور تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم جیسے لوگوں سے کبھی آپ کا ٹکرا نہیں ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا: ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ﴾ اے میرے مدنی! آپ ان کو بتا دیں کہ عنقریب تمہیں بھی شکست ہونے والی ہے، تم بھی مغلوب ہو جاؤ گے اور ذلیل کر کے مدینہ سے نکالے جاؤ گے اور پھر جزیرۃ العرب سے بھی نکالے جاؤ گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں ہی یہ کامیابی دے دی اور اللہ تعالیٰ نے یہود کو شکست سے دوچار کیا۔ وہ خیبر میں آ گئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا۔

﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے یہودیو! اس واقعہ بدر میں تمہارے لیے بہت بڑی نشانی ہے اور اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو عزت اور غلبہ دیں گے، اللہ تعالیٰ اپنے رسول پاک کی مدد فرمائیں گے۔ تمہیں اس واقعہ سے عبرت پکڑنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تین سو تیرہ کو غالب کر دیا۔

روافض کا شبہ اور جواب:

اس آیت مبارکہ سے روافض اور شیعہ تہمت لگاتے ہیں کہ جنگِ بدر میں تو اصل میں صحابہ رضی اللہ عنہم ایک قافلہ لوٹنے

کے لیے گئے تھے، وہ قافلہ نکل گیا اور کفار کے لشکر سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس سے زیادہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس طرح نعوذ باللہ...... وہ اس واقعہ کی عظمت کو کم کرتے ہیں۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ جب مدینہ منورہ سے مسلمان نکلے تھے یہی بات تھی، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا۔ اور وہ ابوسفیان کا قافلہ نکل گیا تو مسلمانوں کو بھی پتہ چل گیا کہ قافلہ نکل گیا ہے، اب ہم اس کو نہیں پکڑ سکتے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت مبارکہ کے اندر مسلمانوں کی گواہی دے رہے ہیں: ﴿تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ کہ مسلمانوں کی جماعت اللہ کے لیے لڑ رہی تھی اور ان کے مقابلہ پر لڑنے والے کافر تھے۔

مسلمانوں اور کافروں کی تعداد میں شبہ اور جواب:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس واقعہ میں ایک اشکال آتا ہے کہ اگر کافروں کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد دوگنا تھی تو یہ واقعہ بھی بعد کے قصہ میں موجود ہے کہ مشرکین نے عمرو بن سعد کو بھیجا کہ تم جا کر مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ لگاؤ کہ مسلمانوں کا عدد کتنا ہے؟ عمرو بن سعد نے آ کر کہا کہ مسلمان تین سو ہیں یا تین سو سے کچھ زیادہ ہیں یا تین سو سے کچھ تھوڑے ہیں۔ اور ان کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا تو پھر دوگنا دکھانے کا کیا مطلب ہے؟ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے بھی اپنے آدمی بھیجے کہ مشرکین مکہ کی تعداد کا اندازہ لگاؤ، لیکن مسلمانوں کو صحیح اندازہ نہ لگ سکا اور مشرکین کے جو اونٹ چرانے والے ملازم تھے وہ کچھ پکڑے گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ان کو میرے پاس لے آؤ۔ تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہم فلاں سردار کے ملازم ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے اور چھوڑ دیں گے۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے لشکر کے لیے روزانہ کتنے اونٹ ذبح ہوتے ہیں؟ انہوں نے کہا: دس اونٹ ذبح ہوتے ہیں۔ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: دشمنوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ اور حکم فرمایا کہ ان کو چھوڑ دو۔ اب دونوں لشکروں کی تعداد کا اندازہ ہو گیا تھا۔

یاد رکھیں کہ جنگ بدر کوئی منٹوں سیکنڈوں میں نہیں ہوگئی، بلکہ اس میں کئی دن لگے ہیں۔ اس لیے ایک وقت تو دونوں کو صحیح اندازہ ہو گیا، لیکن جب صفیں بنیں اور اللہ کے فرشتے اترے تو تعداد دوگنا نظر آنے لگی۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بعد میں حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: عجیب بات ہے کہ جب ہم کافروں سے لڑ رہے تھے تو ہم تلوار یا چھڑی کا اشارہ کرتے تھے، ادھر ان کی گردن کٹ جاتی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اللہ کے فرشتے لڑ رہے تھے۔ تو اب

کوئی اشکال نہیں رہا ہے کہ کافروں کی تعداد ایک ہزار اور مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی، لیکن جب صفیں آمنے سامنے ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی نصرت کے لیے آسمان سے فرشتوں کو اتارا اور فرشتوں نے باقاعدہ قتال میں حصہ لیا۔

رب مسلمانوں کی مدد کیوں نہیں کرتے؟

اگر کوئی غزوۂ بدر اور غزوۂ احد کا مطالعہ کرے اور سوچے کہ آج مدرسوں والے، مساجد والے اور دین والے سب رو رہے ہیں، لیکن مدد کیوں نہیں آتی؟ اور پورے عالم پر نظر دوڑائیں تو ہر جگہ مسلمانوں کا خون بہتا ہوا نظر آئے گا اور کوئی جتنا اسلام پر پابند ہے وہ اتنا تکلیف میں ہے۔

دیکھیں! غزوۂ احد میں صحابہ سے ایک اجتہادی غلطی ہوئی، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے، ان کے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک زخمی ہو گئے اور آپ کے کپڑے تر بتر ہو گئے۔ صرف ایک غلطی کا یہ نتیجہ تھا تو خود سمجھیں کہ ایک غلطی ہو، نبی خود بھی کھڑا ہو، اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتا اور ہم سارا دن غلطیاں کریں اور پھر کہیں: اللہ کی مدد آجائے تو اللہ تعالیٰ کی مدد کیسے آئے گی؟

آج بھی اگر ہم اللہ کے دروازے پر گر جائیں اور توبہ کریں تو دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت آتی ہے یا نہیں آتی ہے۔

ایک معمولی سی مثال سمجھ لیں کہ ایک آدمی کو آپ سارا دن گالیاں دو اور شام کو اس کے دروازے پر کہو کہ مہربانی کر کے مجھے ایک ریال دے دیں۔ وہ کہے گا: جو کچھ تو نے کیا ہے اس کے بارے میں تو سوچو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر بڑے ادب سے کھڑے ہو کر الصلوٰۃ والسلام پڑھ رہے ہوتے ہیں اور کراماً کاتبین کہہ رہے ہوتے ہیں: حیا تو نہیں آتی، ابھی تم داڑھی کٹا کر آرہے ہو!!

یاد رکھیں! جب تک ہم حضور کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح غلامی اختیار نہیں کریں گے کامیابی نہیں ملے گی اور ہمیں عذاب سے نجات نہیں مل سکتی۔ نجات کا ایک راستہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر کبھی عذاب نازل نہیں کیا، مگر ان کے گناہوں کی وجہ سے۔ اور وہ مصیبت اس وقت ختم ہوگی جب مسلمان صحیح معنی کے اندر اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں گے۔

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ⑭ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ⑮﴾

[آلِ عمران: ۱۴، ۱۵]

"فریفتہ کیا ہے لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے، جیسے: عورتیں، بیٹے، سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے (سواریاں) اور مویشی اور کھیتی۔ یہ سامان ہے دنیا کی زندگی کا اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے۔ کہہ دیجیے: کیا میں تمھیں ان سے بہتر کی خبر دوں؟ پرہیزگاروں کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور بیویاں ہیں پاک صاف اور اللہ کی بہت رضا حاصل ہوگی اور اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے بندے۔"

مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر بیان فرمایا ہے کہ لوگوں کے گمراہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی شہوات میں پڑ گئے اور دنیا کی لذات میں کھو گئے۔ چونکہ سب سے بڑا فتنہ عورتوں کا فتنہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عورتوں کے فتنے کا ذکر فرمایا ہے۔

لوگ اس طرح شہوات ولذات میں کھو گئے کہ اللہ تعالیٰ کو بھول گئے، دین اسلام کو بھی بھول گئے اور جذبہ جہاد کو بھی بھول گئے۔ اب ان کی زندگی کا مقصد کھانا، پینا، مکان ہو، گاڑی ہو اور بیوی ہو۔ اس وجہ سے مسلمان آج ہر جگہ ذلیل ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس دن مسلمان کے دل میں دنیا کی محبت داخل ہوگئی اور موت سے نفرت آگئی تو مسلمان ذلیل ہو جائے گا۔

آج دیکھ! مسلمان موت سے گھبرایا ہوا ہے۔ بڑے آدمی کو معمولی سا نزلہ ہو جائے تو دس لاکھ روپے خرچ کر کے یورپ میں علاج کروانے کے لیے جاتے ہیں، تاکہ بیماری زیادہ نہ ہو جائے۔ حالانکہ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ جو یورپ

میں رہتے ہیں کیا وہ نہیں مرتے ؟ وہاں کوئی ڈاکٹر اوپر سے نہیں اترتے ہیں۔ وہاں بھی یہ عالم ہے کہ بعض ڈاکٹروں نے آپریشن کیا تو اپنے آلات مریض کے پیٹ میں بھول گئے اور کورٹ کے اندر مقدمات چلے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر اتنی شفا دینی ہوتی تو وہ غریبوں کے گھر میں بھی ہو جاتی ہے۔ معمولی سے ڈاکٹر کی دوائی لکھ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس میں بھی شفا عطا فرماتے ہیں۔ لیکن امیر باہر علاج کروانے جاتا ہے؛ کیونکہ زندگی سے محبت اور موت سے نفرت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی آدمی کو لاکھ دے دیا تو راضی نہیں ہے، وہ کہتا ہے: دو لاکھ ہو جائیں۔ دو لاکھ مل جائیں پھر بھی راضی نہیں ہے، کہتا ہے: ایک مربع زمین مل جائے، آرام سے بیٹھ کر حلال کھائیں گے۔ جب ایک مربع زمین مل گئی تو کہتا ہے: اس سے کیا بنتا ہے؟ ٹریکٹر خرید لیں اور کم سے کم دو مربع تو ہونی چاہیے۔

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: دو حریص ایسے ہیں جن کا پیٹ نہیں بھرتا ہے: ایک دنیا کا حریص ہے اور دوسرا علم کا حریص ہے۔

عورتوں کا فتنہ:

صحیح حدیث کے اندر ہے: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مَا تَرَكْتُ بَعْدِىْ فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ'' (میں اپنی امت پر جو سب سے خطرناک فتنہ چھوڑ کر جا رہا ہوں یعنی جس کا مجھے ڈر ہے وہ عورتوں کا فتنہ ہے)۔

مردوں میں اگر کوئی مسلمان بطور فتنہ نہیں، بلکہ اس لیے نکاح کرتا ہے، تاکہ میں گناہوں سے پاک رہوں اور اللہ تعالیٰ مجھے اولاد زیادہ دے، میری اولاد صالح بنے اور حضور اکرم ﷺ کی امت میں کثرت ہو تو ٹھیک ہے۔

یاد رکھیں! چیز ایک ہوتی ہے، مثلاً: مردانہ قوت ہے۔ اگر اس کو حلال میں استعمال کریں تو عبادت ہے اور اگر اس کو حرام میں استعمال کرے گا تو جہنم ہے۔

علماء نے احادیث کی روشنی میں لکھا ہے: اگر میاں بیوی آپس میں پیار محبت کرتے ہیں، نفل پڑھنے سے زیادہ ثواب ہے؛ کیونکہ نفلی عبادت میں ثواب زیادہ ملے گا اور یہاں گناہ سے بچ رہا ہے؛ کیونکہ جب میاں بیوی دونوں خوش ہوں گے تو دونوں کی نظر پاک رہے گی، نہ وہ حرام پر نظر ڈالے گا اور نہ وہ حرام پر نظر ڈالے گی۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو عورت سنگھار کر کے، اچھے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر اپنے خاوند کے انتظار میں گھر بیٹھی ہے، اس کو اللہ تعالیٰ اس مجاہد کا ثواب دیتے ہیں جو ساری رات سرحد پر کھڑا ہو کر پہرہ دیتا ہے۔ کہ وہ مسلمانوں کی جانوں کی حفاظت کر رہا ہے اور یہ عورت اپنے خاوند کے ایمان کی حفاظت کر رہی ہے۔ اور ایمان جان

سے زیادہ مقدم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حلال سے منع نہیں کیا ہے۔ آپ اچھا گھر رکھیں، اچھا کھائیں، اچھا پہنیں، اچھا لباس اختیار کریں اور شادی کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قوت دی ہے تو دو شادیاں کرے، تین کریں۔ اسلام صرف پابندی لگاتا ہے کہ حرام نہ کرو، دوسرے کی بہو بیٹی پر اپنی نظریں نہ گاڑو، ہمسائے کی بیٹیوں پر نظر نہ گاڑو اور اگر میاں بیوی کی نہیں بنی تو طلاق دے کر اور شادی کرلو۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ حلال کو بند رکھو، ہم حرام کھائیں گے۔ یہ کتوں کی زندگی ہے۔ اس کو بھی تم جتنا کرسی پر بٹھاؤ، پلیٹوں میں کھلاؤ کھائے گا اور کوڑے پر گوشت پھینک دو تو جا کر کھائے گا، اس کی فطرت میں گندگی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جن پرندوں کی زندگی پھولوں کے ساتھ معلق رکھی ہے، مجال ہے وہ پھولوں کے بغیر کہیں بیٹھ جائیں۔

اسلام ایک عادلانہ نظام حیات ہے۔ یہ نہیں کرتا کہ پابندی لگا رہا ہے کہ غیر عورت کو نہ دیکھو، زنا نہ کرو اور یہ بھی پابندی لگائی ہے کہ نکاح بھی نہ کرو۔ بندہ تو چاہتا ہے کہ میری بیوی ہو، میں خوش رہوں اور مجھے بھی سکون ملے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو مرد ہنستے ہوئے داخل ہو اور بیوی مسکراتے ہوئے استقبال کرے اللہ دونوں کے درجات بلند فرما دیتے ہیں؛ کیونکہ جب اس طرح معاملہ ہو گیا تو دونوں حرام سے بچیں گے اور اگر دونوں پولیس کی وردی پہن کر گھر میں داخل ہوں، جیسا کہ آج کل آدمی باہر دوستوں کے ساتھ حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آتا ہے، لیکن گھر میں آئے گا تو معلوم ہوگا کہ وردی میں بیٹھا ہوا ہے۔ اسی طرح عورت جب شادی پر جائے اور ہمسائے کے گھر میں جائے تو میک اپ سنگھار کرے اور جب خاوند گھر میں آئے تو معلوم ہوگا کہ اس کو ایک سو کا بخار ہے۔ یہ لعنتی قسم کا طبقہ ہے، ان کی زندگی میں گناہوں کے سوا کچھ نہیں۔ ورنہ حضور اکرم ﷺ نے عورت کی یوں تعریف فرمائی ہے کہ سب سے اچھی بیوی وہ ہوتی ہے کہ جب شوہر کی نظر اس پر پڑے تو خوش ہو جائے، جب شوہر غائب ہو جائے تو اس کی عزت مال کی حفاظت کرے اور جب خاوند حکم دے تو اس کے حکم کی تعمیل کرے۔

فیشن اور سنگھار والی تتلیاں:

یہ نہیں کہ خاوند ڈیوٹی پر گیا اور اس نے پیچھے ٹیلی فون کر دیا کہ ہیلو! کم آن۔ یہ جو فیشن سنگھار والی اڑتی پھرتی تتلیاں ہیں یہ عورتیں نہیں، بلکہ یہ بدبودار لاشے ہیں، یہ میرے مدنی ﷺ کی نظروں میں خبیثات ہیں، معلوفات

ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ کے ستر ہزار فرشتے لعنت بھیجتے ہیں۔ عورتیں تو ازواج مطہرات، حضرت فاطمہ اور صحابیات رضی اللہ عنہن تھیں۔ جو عورتیں ان کی متبعات ہیں ان کو عورت کہلانے کا حق ہے۔ وہ عورت نہیں ہوتی جو بازاروں میں پھرے، کلب کی رونق ہو، جو غیر مردوں سے ہاتھ ملائے، غیر مردوں کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو کھنچوائے، جو چہرے کھلے کر کے بازار میں پھرے اور خوشبوئیں لگا کر بازار میں جائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو عورت ایسی خشبوئیں لگائے اور ایسا لباس پہنے کہ بندے کو اس کا بدن نظر آئے اور بازار میں پھرے۔ یہ عورت زانیہ کے حکم میں ہے۔

فیشن پرست مردوں کا خراج:

جن کو اللہ تعالیٰ نے اور اللہ کے رسول نے خبیثات فرمایا ہے وہ ہمارے ہاں معزز ہیں، لیکن عورتیں گھر میں بیٹھتی ہیں اور پردہ کرتی ہیں ان کے بارے میں خاوند بھی کہتا ہے کہ پتہ نہیں میرے گھر میں کونسی ملانی گھس آئی ہے!؟ یہ تو کوئی عذاب ہے۔ نہ میرے ساتھ باہر جاتی ہے اور نہ شاپنگ پر جاتی ہے۔ نہ میرے دوستوں کو انٹرٹیل کرتی ہے اور پردہ تو دل کا ہونا چاہیے۔

بچے زیادہ جننے والی عورت:

یہ لوگوں کا عجیب فلسفہ ہے! اللہ کے بندو! باہر بدن پلید ہوگا تو دل کیسے ٹھیک ہوگا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں ترغیب دی ہے کہ زیادہ شادیاں کرو اور اس عورت سے نکاح کرو جو زیادہ بچے پیدا کرے، تاکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں اضافہ ہو۔ آج کل منصوبہ بندی پر زیادہ زور ہے کہ بچے کم پیدا کرو۔ اس کے لیے یورپ والے ہمیں کروڑوں روپیہ دیتے ہیں کہ بچے کم پیدا کرو۔ اگر آبادی بڑھے گی تو ہم کہاں سے کھائیں گے؟ حالانکہ جب اللہ تعالیٰ بندے کو پیدا کرتے ہیں تو اس کا رزق کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے، بندہ ذمہ دار نہیں ہے۔

کافروں کو اصل میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کی تعداد بڑھاؤ۔ یورپ والے اپنے بچوں کو کیوں نہیں گھٹاتے ہیں؟ جہاں لاکھوں حرامی بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اپنے ملکوں میں حرامی بچوں کے پیدا ہونے کو بھی نہیں روکتے اور یہاں اسلامی ملکوں میں حلال بچے پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝﴾ [الانفال:٣٠] کافر بھی تدبیر کرتے ہیں اور ہم بھی

تدبیر کرتے ہیں اور ہماری تدبیر غالب ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ انگریز وائسرائے نے حکم جاری کیا کہ قرآن جلا دو کہ جب ان کے پاس یہ کتاب نہیں ہوگی تو قرآن کون یاد کرے گا؟ پریس جتنا قرآن چھاپے، آدمی پیدا کرو جو ان سب کو خرید لیں، تاکہ فتنہ بھی نہ بنے اور خرید کر جلاتے جاؤ۔ اور مسجدوں کے اندر جتنے قرآن رکھے ہیں ان سے یہ کہہ کر لے لو یہ ہمیں دے دو ہم تمہیں نئے دیں گے۔ ایک دفعہ وہی وائسرائے سیر کے لیے جا رہا تھا تو ایک دیہات کی سڑک سے گزرا تو دیکھا کہ ایک مولوی صاحب کے سامنے آٹھ دس لڑکے بیٹھ کر کچھ پڑھ رہے ہیں۔ اس نے اپنا گھوڑا روک کر اس مولوی صاحب کو بلا کر پوچھا: کیا پڑھ رہے ہو؟ اس نے کہا: قرآن شریف پڑھا رہا ہوں۔ وائسرائے نے کہا: تمہارے پاس قرآن پاک کے کچھ نسخے ہیں تو دکھاؤ۔ مولوی صاحب نے ایک لڑکے کو بلا کر کہا: سورۂ فاتحہ پڑھو، دوسرے کو کہا: سورۃ البقرۃ پڑھو، تیسرے کو کہا: تم آلِ عمران سے پڑھو اور انگریز کو کہا: تم جو قرآن کے نسخے جلانا چاہتے ہو یہ نسخے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن امت محمدیہ کے سینوں میں رکھ دیا ہے۔ تم کتنے نسخے جلاؤ گے؟ آج جو چاند پر پہنچ گئے ہیں وہ ایک آدمی دکھائیں جو تورات کا حافظ ہو، انجیل کا حافظ ہو اور ہم ایک لاکھ نہیں، بلکہ ایک کروڑ اللہ کے قرآن کے حافظ پیش کر سکتے ہیں۔

حدیث حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''حُبِّبَ إِلَيَّ النِّسَاءُ وَالطِّيبُ وَقُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ'' [سنن النسائی، رقم: ۳۹۴۰] دنیا کی جن چیزوں میں اللہ نے مجھے محبت دی ہے وہ پاک عورت ہے، خوشبو ہے اور اللہ تعالیٰ نے میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی ہے۔

قنطار کا معنی:

قنطار سے کیا مراد ہے؟ خلاصہ کلام یہ ہے کہ بہت سا مال۔ چاندی وغیرہ کی خواہشات میں الجھ کر اللہ کو بھی بھول گئے اور اللہ کے رسول کو بھی بھول گئے اگر اللہ تعالیٰ کسی کو مال دے اور وہ شریعت کے مطابق خرچ کرے تو کوئی بری بات نہیں ہے۔

اس کے بارے میں بزرگوں نے ہی ہمارے سمجھنے کے لیے ایک مثال دی ہے: کشتی پانی پر چلتی ہے۔ پانی جب تک کشتی کے نیچے ہوتا ہے تو کشتی تیرتی ہے اور ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچ جاتی ہے، لیکن وہی پانی اگر کشتی کے اندر داخل ہو جائے ہو تو کشتی کو غرق کر دیتا ہے۔ اس لیے جب تک دنیا دین کے تابع رہے اس وقت تک اچھی

بات ہے۔ دنیا ہوگی تو حج ہوگا، صدقات و خیرات ہوں گی اور جہاد بالمال ہوگا۔ اور اگر پیسہ نہ ہو تو بے چارہ کیا کرے گا؟ جب دولت دین کے اوپر آجائے تو آدمی تباہ ہو جاتا ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: قنطار سے یہاں بہت سے مال مراد ہیں، لیکن بعض علماء نے یہاں کئی اقوال نقل کیے ہیں۔ بعض نے کہا: بارہ ہزار دینار ہوں تو قنطار ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: چالیس ہزار دینار ہوں تو قنطار ہوتا ہے۔ ان اقوال کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہر دور کے احوال مختلف ہیں، مثلاً: اگر تیس سال پہلے کسی کے پاس ایک ہزار ریال تھے تو وہ بہت بڑا آدمی تھا اور اب اگر ایک لاکھ ریال ہوں تو تب بھی کوئی بات نہیں بنتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ قنطار بارہ ہزار چھٹانک کو کہتے ہیں اور ہر اوقیہ اس سے بہتر ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

(حدیث) حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص روزانہ سو آیات کی تلاوت کرے اس کو اللہ تعالیٰ غافلین میں نہیں لکھتے ہیں، بلکہ وہ ذاکرین میں شمار ہو جاتا ہے۔ اور اگر کوئی بندہ سو سے لے کر ایک ہزار آیت تک قرآن پاک کی تلاوت کرے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو ایک قنطار اجر عطا فرماتے ہیں۔ عرض کیا گیا: قنطار کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک بہت بڑا پہاڑ، یعنی اللہ تعالیٰ بہت بڑا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: گھوڑے کی محبت تین قسم پر ہے اور جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا کہ یا تو گھوڑا ثواب ہے، یعنی اس لیے گھوڑے رکھے ہوئے ہیں کہ جہاد کی ضرورت ہوگی، ہم ان گھوڑوں پر جہاد کریں گے؛ کیونکہ پہلے دور میں گھوڑے جہاد کے لیے ہوتے تھے اور اب تو گھوڑے ریس کے لیے ہوتے ہیں۔ اور دوسری قسم گھوڑوں کی یہ ہے کہ سواری کے لیے، سفر کے لیے گھوڑا رکھا ہوا ہے، تاکہ لوگوں سے سوال نہ کروں اور اپنی ہی سواری پر چلا جاؤں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ گھوڑا باندھنا بھی ستر ہے، اس کے لیے پردہ ہے۔ اور تیسری قسم یہ ہے کہ ریا کے لیے گھوڑے باندھے ہوئے ہیں، تاکہ لوگ کہیں یہ بہت بڑا آدمی ہے۔ یہ گھوڑا اس آدمی پر گناہ ہے اور اسی عذاب میں وہ مبتلا ہو جائے گا۔

"وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "مُسَوَّمَة" ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جو چرنے والے اور موٹے تازے ہوں۔ حضرت مکحول رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "مُسَوَّمَة" اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کے ماتھے

پر سفیدی اور پاؤں پر سفیدی ہو اور باقی جسم سیاہ ہو۔ اس گھوڑے کو ابلق بھی کہتے ہیں۔

عربی گھوڑے کی دعا:

حدیث حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ فَرَسٍ عَرَبِيٍّ إِلَّا يُؤْذَنُ لَهُ مَعَ كُلِّ فَجْرٍ يَدْعُو بِدَعْوَتَيْنِ يَقُولُ: اَللّٰهُمَّ! خَوَّلْتَنِي مَنْ خَوَّلْتَنِي مِنْ بَنِي آدَمَ وَجَعَلْتَنِي أَحَبَّ أَهْلِهِ وَمَالِهِ إِلَيْهِ أَوْ مِنْ أَحَبِّ أَهْلِهِ وَمَالِهِ إِلَيْهِ'' عربی نسل کے گھوڑے کو اللہ تعالیٰ اجازت دیتے ہیں کہ وہ ہر صبح اپنے لیے دو دعائیں مانگتا ہے۔ اور وہ گھوڑا یہ دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! آپ کا شکر ہے آپ نے مجھے بنی آدم کے حوالے کیا ہے اور مجھے اس کا محبوب بنایا ہے اور مجھے اس کے مال اور اہل میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ بنایا ہے۔

[نسائی فی السنن الکبریٰ، رقم: ۱۳۲۱۸]

اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز دعائیں کرتی ہیں۔ اور مانگنے کی ان کی اپنی لغتیں ہیں، جو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور ہم نہیں جانتے ہیں۔

بارش کے لیے چیونٹیوں کی دعا:

سابقہ کتب کے اندر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: بارش نہیں آرہی ہیں، اس لیے صلوۃ الاستسقاء پڑھیں گے، اللہ سے بارش کے لیے دعا کریں گے۔ سب لوگ جمع ہو گئے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام تھوڑا سا باہر نکلے تو لوگوں کو فرمایا کہ واپس آجاؤ، نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں نے پوچھا تو فرمایا: جب بارش آرہی ہے تو مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ میرا چیونٹیوں پر گزر ہوا ہے۔ یہ اپنے بلوں میں پڑی ہوئی کہہ رہی تھیں کہ اے اللہ! گناہ تیرے بندے کرتے ہیں، ہمیں تو برباد نہ کر، ہمیں پانی عطا فرما۔

انسانوں کی روزی کا ایک سبب:

دوسری حدیث مبارک میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر یہ جانور، کیڑے مکوڑے، حشرات اور کمزور لوگ نہ ہوتے تو تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمہارا رزق بند ہو جاتا، لیکن ان کی وجہ سے تمہیں مل جاتا ہے۔

''وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ'' کی تفسیر:

حدیث حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خَيْرُ مَالِ امْرِئٍ لَهُ مُهْرَةٌ مَأْمُورَةٌ أَوْ سِكَّةٌ مَأْبُورَةٌ'' آدمی کے لیے

بہترین مال سکھایا ہوا گھوڑا ہے اور باغ میں وہ کھجور جو پھل سے لدی ہوئی ہو، جس میں بے انتہاء کھجوریں ہوں اور پھل لگنے والے درخت ہوں۔

﴿ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ یہ ساری چیزیں جو ہم نے قرآن میں بیان فرمائی ہیں: عورتیں ہیں، اولاد ہے، سونا چاندی ہے اور گھوڑے ہیں یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگانی سے نفع اٹھانے کی چیزیں ہیں؛ کیونکہ دنیا بھی فنا ہونے والی ہے اور یہ چیزیں بھی فنا ہونے والی ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سنی: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ﴾ تو کہا: اللہ میاں! ان کے اندر محبت، شہوات اور رغبت آپ نے خود رکھی ہے اور اب ہمارے لیے امتحان بھی بن گیا ہے، اب تو ہی ہماری مدد فرما۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم تمہیں خبر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے بہتر چیزیں وہ ہیں جو اللہ کے پاس ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو، تا کہ تمہیں جنت میں نعمت ملے۔ جنت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے ایسی ایسی نہریں رکھی ہیں کہ شہد کی نہریں، دودھ کی نہریں، خمر کی نہریں اور پانی کی نہریں۔ اور ایسی نعمتیں ہیں جو کسی آنکھ نے دیکھیں نہیں ہیں، کسی کان نے سنی نہیں ہیں اور کسی کے دل میں گمان و خیال نہیں گیا ہے۔ اگر تم نے لذت حاصل کرنی ہے تو جنت کی نعمت حاصل کرو، اس کے اندر تم ہمیشہ رہو گے، اس سے کبھی نہیں نکلو گے۔ اور تمہارے لیے جنت میں پاکیزہ بیویاں رکھی ہیں، جو ہر گندگی اور برائی سے حیض و نفاس اور بول و براز سے پاک ہیں۔ اور جنت میں اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾ [التوبۃ: ۷۲] اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔

اس لیے حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت والوں کو حکم دیں گے تو سب متوجہ ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کچھ چاہتے ہو؟ جنتی عرض کریں گے: اے اللہ! کون سی نعمت ہے جو ہمارے پاس نہیں!! آپ نے تو ایسی ایسی نعمتیں عطا فرمائیں جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے جنت والو! آج ایسی نعمت میں تم کو دیتا ہوں جو تمہیں پہلے نہیں ملی، آج میں تم پر اپنی رضا اتارتا ہوں۔ جس کے بعد میں تم پر کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝﴾ [آل عمران: ۱۵] اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے بندوں کے احوال کو دیکھنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو وہ دیں گے جس کا وہ مستحق ہے۔ اگر اعمال خیر ہیں تو خیر کے بدلے ملیں گے اور اگر اعمال شر ہیں تو

بدلے بھی شر کے ملیں گے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝﴾ [آل عمران:١٦، ١٧]

''(یہ بندے) کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے ہیں، پس ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ صبر کرتے ہیں (ایمان میں)، سچے ہیں، فرمانبردار ہیں، صدقہ کرتے ہیں اور سحری کے وقت گناہ بخشواتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو کافر ہیں یا فاسق ہیں وہ اس دنیا کے اندر عورتوں، بچوں میں اور سونا چاندی میں کھو جاتے ہیں، لیکن جو میرے بندے ہیں ان کی صفات یہ ہیں کہ ﴿اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ کہ وہ ہر وقت مجھ سے یہ کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے اللہ پر، اللہ کے رسولوں پر، اللہ کی کتابوں پر، اللہ کے فرشتوں پر، اللہ کی تقدیر پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے۔ ہمارے گناہ معاف فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

روایت میں ہے کہ جب بندہ تین دفعہ ''یارب'' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: مانگ میرے بندے! تو کیا مانگتا ہے؟ اسی طرح آتا ہے کہ جب مومن بندہ تین دفعہ اپنے اللہ کو پکارتا ہے یا اللہ! یا اللہ! یا اللہ! تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا منظور کر لیتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ جب صبح کی نماز کے لیے اٹھتے اور آسمان پر نظر پڑتی تو فوراً فرماتے تھے: ﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝﴾
[آل عمران:١٩٠، ١٩١]

حدیث میں آتا ہے کہ جب بندہ تین دفعہ کہے: ''اَللّٰهُمَّ! أَجِرْنِيْ مِنَ النَّارِ'' تو جہنم بھی کہتی ہے: اے اللہ! تو اس کو مجھ سے بچالے۔

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندے ایسے ہیں جو اللہ کا اتنا ذکر کرتے ہیں کہ لوگ دیکھ کر کہتے ہیں: یہ کوئی دیوانہ اور پاگل ہے۔

صبر کا معنی:

اللہ تعالیٰ نے مومنین کی صفات بیان فرمائیں ہیں: ﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾﴾ صبر کرنے والے ہیں، ماتم کرنے والا مومن نہیں ہے۔

لغت کے اندر صبر کا ایک معنی ''المنع'' ہے کہ کسی چیز سے رکنا۔ ہمارے ہاں صبر کا یہ معنی مشہور ہے کہ موت اور مصیبت پر صبر کیا۔ یہ بھی صبر ہے۔ اور دوسرا صبر یہ ہے کہ ساری دنیا داڑھی والے کو برا بھلا کہتی ہے، لیکن پھر بھی وہ صبر میں ہے، دین کو نہیں چھوڑ رہا۔ ہر شخص اس کے ساتھ مزاق بناتا ہے، کوئی اس کو دہشت گرد کہتا ہے، کوئی اس کو ملا کہتا ہے، کوئی اس کو کارٹون کہتا ہے اور کوئی اس کے ساتھ مذاق کرتا ہے اور وہ مومن صبر کر رہا ہے۔ اسی طرح سردی میں، گرمی میں دین پر وہ قائم ہے۔ اپنے آپ کو برائیوں سے روکنا، یہ بھی صبر ہے کہ حسین وجمیل عورت زنا کی دعوت دے، لیکن وہ کہے: مجھے اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے تو یہ بھی صبر ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُوْلٰى'' کہ جب مصیبت پہنچے اس وقت انسان صبر کرے۔ ورنہ کئی دنوں کے بعد سب کو صبر آجاتا ہے، ہر آدمی رو رو کے چپ ہو جاتا ہے۔

اور دوسرا صبر یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت پر کار بند رکھنا۔ اور گناہوں سے اپنے آپ کو روکنا، یہ بھی صبر ہے کہ نفس خواہش کرتا ہے میرے پاس بھی مال ودولت ہو، لیکن وہ کہتا ہے کہ سود حرام ہے، مجھے ایسا پیسہ نہیں چاہیے۔

پچھلی آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ لوگ شہوات، عورتوں کے فتنہ میں مبتلا ہو کر برباد ہو جاتے ہیں، اولاد کے فتنہ میں برباد ہوتے ہیں، سونے چاندی کے فتنے میں برباد ہوتے ہیں اور گھوڑے مویشی کے فتنہ میں برباد ہوتے ہیں، لیکن میرے بندے ''اَلصّٰبِرِیْنَ'' اپنے نفس کو شہوات سے روکنے والے ہوتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: ہم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اگر صحیح معنی میں آجائے اور نفس کو صبر کرنا آجائے تو انسان کامیاب ہو جاتا ہے۔

''وَالصّٰدِقِیْنَ''

مومنین کی دوسری صفت اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی کہ میرے مومن بندے سچ بولنے والے ہوتے ہیں، کبھی

زبان سے جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔

ایک صحابی کا واقعہ:

ایک صحابی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کرتے ہیں: میں نے گناہ کیا ہے، زنا کیا ہے، مجھے سزا دیں۔ آپ ﷺ نے رخ مبارک پھیر لیا، وہ دوسری طرف سے پھر آ گیا کہ حضور! میں نے گناہ کیا ہے، مجھے سزا دیں۔ آپ ﷺ نے رخ پھیر لیا، تا کہ چلا جائے اور کوئی مدعی اور گواہ نہ بنے۔ یہ معاملہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے۔ اللہ قادر ہیں کہ اس کی توبہ سے اس کو معاف کر دیں، لیکن وہ پھر آ گیا۔ جب آپ نے تین دفعہ رخ پھیرا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی ایسے معاملات میں تحقیق کرے۔ جب اس نے تیسری دفعہ کہا کہ مجھے پاک کریں، مجھے آخرت کی سزا سے دنیا کی سزا بہتر ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم پاگل تو نہیں ہو؟ اس نے کہا: خدا کی قسم! میں پاگل نہیں ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہوسکتا ہے تم نے اس عورت کو بوسہ دیا ہو یا سینے وغیرہ سے لگا لیا ہوگا؟ اس نے کہا: نہیں، میں نے زنا کیا ہے۔ اتنی بڑی سزا کا اس کو علم ہے، لیکن وہ پھر بھی کہہ رہا ہے: اس کو صدق کہتے ہیں۔ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کو لے جا کر رجم کرو۔

اس صدق کا انعام دیکھیں کہ جب اس کو رجم کر کے صحابہ رضی اللہ عنہم آ گئے تو ایک صحابی کے منہ سے یہ کلمہ نکل گیا کہ کیا بری موت تھی!؟ حضور اکرم ﷺ کے چہرے پر غصہ آ گیا اور فرمایا: کس نے بات کہی ہے آگے آؤ۔ وہ آگے آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کی توبہ ایسے قبول کی ہے کہ اگر سارے مدینہ والے گناہگار ہو جائیں تو اس اکیلے کی توبہ سب کو کافی ہے۔

صداقتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ''صدیق'' کا لقب اس لیے ملا ہے کہ ان کے منہ سے زمانہ کفر میں بھی کبھی جھوٹ نہیں نکلا تھا۔ اور آج ہم سوچیں کہ یہ صفت ہمارے اندر بھی ہے یا نہیں ہے؟ اگر ایک ریال والی چیز مل جائے تو اس کا مسئلہ پوچھتے ہیں اور اگر بیس ریال والی چیز ملے تو اس کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔

عبادت میں خشوع وخضوع:

''وَالْقَانِتِيْنَ''

اللہ نے مومن بندوں کی تیسری صفت بیان فرمائی کہ وہ خشوع اور خضوع والے ہوتے ہیں، میری عبادت کے اندر ان پر اتنی خشیت طاری ہوتی ہے کہ میرے سوا ان کو کسی چیز کا پتہ بھی نہیں ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ تیر لگا اور وہ بدن میں ایسا داخل ہوا کہ اس کو نکالنا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ جراح نے کوشش کی، لیکن وہ تیر نہ نکل سکا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلام نے جراح سے کہا: ابھی کوشش نہ کرو، نماز کا وقت آنے والا ہے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز شروع کریں تو تم تیر نکال لینا؛ کیونکہ یہ اللہ کے ڈر میں اتنے کھو جاتے ہیں کہ ان کا بدن کانپتا ہے اور موم کی طرح پگھل جاتا ہے۔ تو جب نماز کا وقت آیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بدن سے تیر نکال لیا گیا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے اور آپ کو بتایا گیا تو فرمایا: مجھے پتہ بھی نہیں لگا۔

جبکہ ہمارے خشوع کا یہ عالم ہے کہ اگر بدن پر مٹی لگ جائے تو نماز میں کھڑے کھڑے صاف کرتے ہیں، حالانکہ پتہ ہے کہ اس سے پیدا ہوا ہوں اور پھر اسی مٹی کے اندر جانا ہے۔ اور بعض لوگ نماز میں پورا ہاتھ نیچے نہیں رکھتے کہ میرا ہاتھ خراب نہ ہو جائے اور اگر ہاتھ کو مٹی لگ جائے تو کپڑے پر نہیں رکھتے ہیں۔ اور بعض تو...... ماشاء اللہ...... جیب سے گھڑی نکال کر ٹائم دیکھ کر دوبارہ جیب میں ڈال لیتے ہیں، کیا یہ بھی نماز ہے؟ حالانکہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: تیری عبادت کا یہ عالم ہو کہ گویا کہ تو اپنے خدا کو دیکھ رہا ہے۔ اگر اس منزل پر نہ پہنچ سکو تو کم از کم یہ تو سمجھو کہ تیرا خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔

''وَالْمُنْفِقِیْنَ'' کی تفسیر:

مومنین کی یہ صفت ہے کہ میرے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ زکوۃ دینا تو فرض ہے، وہ کسی کا احسان نہیں ہے، اس کے بغیر تو مال بھی حلال نہیں ہوتا، لہٰذا زکوۃ کے علاوہ صدقاتِ نافلہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرتے ہیں؛ کیونکہ آج صدر صاحب چندے کے لیے بلوائے تو دو دو لاکھ دیں گے اور اگر کوئی مسجد کا مولوی چندے کے لیے کہے تو کہتے ہیں: پہلے تھوڑی مسجدیں ہیں؟ اپنی کوٹھیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا کہ پہلے کوٹھیاں ہیں تو اور کوٹھی کیوں بناتے ہو؟ یاد رکھیں! جو چندے کسی وجاہت کے اعتبار سے ہوں ان کا کوئی ثواب نہیں، بلکہ یہ رشوت کے ضمن میں آتے ہیں۔ اصل خیرات وہ ہے جو اپنی رضا، خوشی اور دل سے دی جائے اور اتنا چھپا کر دی جائے کہ اگر داہنے ہاتھ سے دیا ہے تو بائیں

ہاتھ کو پتہ نہ لگے۔ اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے دیا تو یہ اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے۔

''وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ'' کی تفسیر:

مومن کی صفت یہ ہے کہ رات کے آخری وقت میں مجھ سے معافی مانگنے والا ہوتا ہے۔ آج دیکھ لیں کہ کتنے مسلمان ہیں جو رات کو اٹھ کر استغفار کرتے ہیں؟ جو فجر کی نماز نہیں پڑھتا ہے وہ آخری رات میں کیا اٹھے گا؟ سحری کا وقت رات کا خصوصی حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے عرش سے آسمانِ دنیا پر نزولِ رحمت فرماتے ہیں۔ حدیث کے اندر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کوئی مانگنے والا ہے، میں اس کو عطا کروں؟ کوئی دعا کرنے والا ہے، میں اس کی دعا قبول کروں؟

قرآن میں آتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے ابا حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے درخواست کی: ﴿يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ﴾ ابا جان! اللہ تعالیٰ سے ہمارے گناہوں کی بخشش مانگیں، ہم نے یوسف کے ساتھ واقعی زیادتی کی، انہیں کنویں میں ڈالا اور ان کو بیچ دیا۔ آج اللہ تعالیٰ نے اس کو عزت دی ہے، ہم اپنی خطاؤں کا اقرار کرتے ہیں۔ تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ﴾ [یوسف:۹۸] میں تمہارے لیے بخشش مانگوں گا۔ علماء نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام چاہتے تھے کہ رات کے آخری حصہ میں بخشش مانگیں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا عجیب واقعہ!

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ بیٹھے ہوئے تھے:

......ان سے کسی نے آکر عرض کیا: میری اولاد نہیں ہوتی، مہربانی فرما کر مجھے کوئی وظیفہ بتائیں۔ آپ نے فرمایا: تم استغفار کیا کرو۔

......دوسرے آدمی نے آکر عرض کیا کہ کافی عرصہ ہوگیا ہے، ہمارے علاقہ میں بارشیں نہیں ہوئیں، ہماری فصلیں برباد ہوگئی ہیں، زمینیں بنجر پڑی ہوئی ہیں اور جانور گھاس کے لیے مر رہے ہیں، مہربانی فرما کر کوئی وظیفہ بتائیں۔ فرمایا: استغفار کیا کرو۔ وہ آدمی بھی چلا گیا۔

......تیسرا آدمی آیا اور عرض کیا: کھیتی تو ہوتی ہے، لیکن ان پر ثمر نہیں لگتا ہے۔ آپ نے فرمایا: استغفار کیا کرو۔

......چوتھا آدمی آیا اور عرض کیا: ہمارا یہ عالم ہوگیا ہے کہ بارشیں آتی تھیں، برف پگھلتی تھی اور نہریں چلتی تھیں۔ ہم

فلاں دور کے ملک کے رہنے والے ہیں، اب نہروں میں پانی نہیں رہا۔ جب پانی نہیں ہوگا تو کوئی چیز نہیں ہوتی، مہربانی فرما کر کوئی وظیفہ بتائیں۔ تو فرمایا: استغفار کیا کرو۔

آپ کے ساتھ بیٹھنے والے بے تکلف احباب میں سے کچھ نے عرض کیا: آج تو آپ نے کمال کر دیا!! جو بھی آیا اس کو فرمایا: گناہوں کی بخشش طلب کیا کرو۔ حضرت حسن ؒ فرمانے لگے: خدا کے بندو! یہ وظیفہ میں نے تو نہیں بتایا، بلکہ قرآن کہتا ہے: ﴿اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝﴾ [نوح:۱۰ تا ۱۲] میرے بندو! تم مجھ سے استغفار کرو تو میں تمہارے گناہ معاف کردوں گا، آسمانوں میں سے بارشیں برساؤں گا، تمہارے مال اور تمہاری اولادوں کو بڑھا دوں گا، تمہارے لیے باغ بھی اور تمہارے لیے نہریں بھی جاری کر دوں گا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں حکم دیا ہے، میں نے اپنی طرف سے کوئی وظیفہ نہیں بتایا ہے۔

استغفار کی یہ برکت ہے کہ اس سے ساری نعمتیں مل جاتی ہیں، مثلاً: کسی پر بادشاہ ناراض ہو، لیکن وہ جب راضی ہو جائے تو سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ راضی ہو کر ہمارے گناہ معاف کر دے تو ہم سے عذاب ٹل گئے اور معافی مل گئی تو پھر اس کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔

احادیث مبارکہ میں استغفار کے کئی کلمات مبارکہ ہیں۔ بعض احادیث میں آتا ہے: ''اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي، فَإِنَّهُ لاَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ''۔ [صحیح البخاری، حدیث:۶۳۰۶، باب: أفضل الاستغفار]

اور ایک استغفار ہے: ''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ'' اگر یہ یاد نہ ہوں تو ''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ الْعَظِيْمَ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ''[1] اگر یہ بھی مشکل ہو تو ''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ... أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ... أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ'' اتنا بھی کر لو تو بہت ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دل کے ساتھ پڑھو۔

اور صبح کے وقت میں نماز سے پہلے اور رات کے آخری حصہ میں اس کو اپنا مستقل عمل بناؤ۔ پانچ سو دفعہ پڑھ لیا کرو۔ اللہ کی رحمت سے ساری مشکلات اور پریشانیاں حل ہو جائیں گی۔ اگر زیادہ نہ پڑھ سکو تو کم از کم ایک سو دفعہ تو

[1] [الاذکار للنووی:۱/ ۳۰۳]

پڑھ لیا کرو؛ کیونکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ روزانہ ستر دفعہ اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ روزانہ سو دفعہ استغفار فرماتے تھے۔ حالانکہ آپ ﷺ معصوم ہیں، لیکن امت کو سبق دینے کے لیے یہ عمل فرماتے تھے۔
[صحیح البخاری: رقم: ۶۳۰۷، جامع الترمذی: رقم: ۳۲۵۵]

اب آپ خود اپنے اندر غور کریں! ہمارے اندر مومنین کی یہ ساری علامات ہیں یا نہیں ہیں؟

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ'' منافق کی تین علامات ہوتی ہیں: جب بات کرے تو جھوٹی بات کرے، جب وعدہ کرے تو جھوٹا وعدہ کرے (جب کوئی عہد کرے تو اس کو توڑ ڈالے) اور جب امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔[1] اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ بندہ بھی منافق ہے: ''إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ'' جب کسی سے جھگڑا کرے تو گالی گلوچ کرے۔ [الاذکار للنووی: ۱/ ۳۷۵]

اب غور کریں! ہمارے اندر مومن والی علامتیں ہیں یا منافق والی علامتیں ہیں؟ قرآن جب پڑھیں تو ایک ایک چیز کو اپنے اوپر منطبق کرنے کی کوشش کریں کہ کیا ہمارے اندر یہ علامات پائی جاتی ہیں یا نہیں پائی جاتی ہیں؟

یہاں تک متقین کی صفات کا بیان تھا۔ اگلی آیات میں پھر مسئلہ نصاریٰ کے رد کی طرف لوٹ رہا ہے۔

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾﴾ [آل عمران: ۱۸]

''اللہ نے گواہی دی کہ معبود برحق کوئی نہیں، مگر اللہ۔ اور فرشتے اور اہل علم بھی گواہی دیتے ہیں وہی (اللہ) انصاف کا حاکم ہے۔ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں۔ وہی زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ﴾

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں:

اللہ کے سوا کسی غیر کی عبادت شرک ہے۔ رکوع کرنا عبادت ہے، سجدہ کرنا عبادت ہے اور طواف کرنا عبادت ہے۔

[1] [الاذکار للنووی: ۱/ ۹۸۲]

جو قبر پر سجدہ، رکوع اور طواف کرتے ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ خود قرآن پر غور کریں کہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں: ''شَهِدَ اللّٰهُ'' میں گواہی دیتا ہوں۔ اور اللہ کی گواہی سے بڑی گواہی کسی کی نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر میں اللہ۔ اور ملائکہ بھی یہی گواہی دیتے ہیں، علم والے بھی یہی گواہی دیتے ہیں، انبیاء وصدیقین، شہداء اور صالحین بھی یہی گواہی دیتے ہیں کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ۔

عیسائی نظریہ کفریہ:

﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ ساری کائنات کو عدل وانصاف کے ساتھ تھامنے والا ہے۔

اس آیت کے اندر نصاریٰ کا رد ہے۔ وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہم جو موروثی طور پر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک گنہگار آرہے تھے، اس کی سزا عیسیٰ علیہ السلام نے خود اپنے اوپر رکھ لی اور پھانسی پر چڑھ گئے اور امت گناہوں سے چھوٹ گئی۔ اب امت کے ذمہ اتنا ہے کہ اتوار والے دن گرجا میں آجائے اور پادری کے سامنے کھڑے ہوکر اقرار کرلیں کہ میں نے اس ہفتے اتنے زنا کیے، اتنے جھوٹ بولے، اتنی چوری کی اور اتنا ڈاکہ مارا تو پادری آپ کو معاف کردے گا اور آپ کو معافی مل جائے گی۔

آپ کا کیا خیال ہے یہ عقیدہ ٹھیک ہے یا غلط ہے؟ اور کہیں مسلمان کا تو یہ عقیدہ نہیں کہ پیر مضبوط ہو تو نماز کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارا بھی تو عقیدہ ہے کہ پیر چھڑوائے گا، دمادم مست قلندر کہیں گے اور جنت کے دروازے کھل جائیں گے۔ ہمارے عقیدے تو ان سے بھی زیادہ کمزور ہوگئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: نبی نے بوجھ اٹھالیا۔ اور ہم کہتے ہیں: پیروں نے بوجھ اٹھالیا ہے۔ اگر یہ عقیدہ عیسائی رکھے تو کافر ہوجائے اور مسلمان یہ عقیدہ رکھے تو ایمان والا ہوجائے!؟؟

یاد رکھیں! قبر کے اندر اعمالِ صالحہ جائیں گے، گیارہویں کے دودھ نہیں جائیں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: جو دنیا میں مانگنا چاہتی ہو مانگ لو، قیامت کا میں ذمہ دار نہیں۔ اپنے عمل تیار رکھو، تاکہ آگے تمہیں آسانی ہو۔

ایک روایت میں ہے بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ آپ سے عرض کیا کہ ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے ہیں، مشکیزہ اٹھاتے ہوئے کمر پر داغ پڑ گئے ہیں، مہربانی کرکے گھر کے لیے ایک خادم دے دیں۔ فرمایا: بیٹی! خادم کی کیا

ضرورت ہے؟ دنیا کی تکلیفیں گزر جاتی ہیں، تم ہر نماز کے بعد تینتیس بار "سُبْحَانَ اللّٰهِ" تینتیس بار "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ"، تینتیس بار "اللّٰهُ اَكْبَرُ" اور چونتیس بار "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" پڑھ لیا کرو۔ تم جنت کی فکر کرو اور آخرت کی فکر کرو۔ دنیا تو گزر جانی ہے۔ اللہ کے نبی تو فرمارہے ہیں کہ بیٹی! میں تجھے نہیں چھڑا سکتا اور ہم کہیں پیر جنت کے مالک ہیں، یہ چھڑا لیں گے۔

بدعمل بدعقیدہ عالم کی حیثیت:

علماء نے لکھا ہے کہ آج بھی اگر کوئی آدمی لمبی لمبی تقریریں کرلے اور لمبے لمبے بیانات اور اجتماعات کرے، اگر اس کی عبادت کے اندر شرک ہے، وہ غیر اللہ کو سجدہ کرتا ہے، قبروں کا سجدہ کرتا ہے اور وہ بدعات میں الجھا ہوا ہے تو اس کو عالم کہلانے کا حق نہیں ہے۔ عالم وہ ہوتا ہے جو اللہ کی توحید کا داعی ہو اور جو دنیا کو کفر و شرک سے نکالنے والا ہو۔ عالم وہ ہوتا ہے جو بدعات سے نکل کر محمد مدنی ﷺ کی سنت پر چلانے والا ہو، لیکن جو دنیا کی رسومات میں الجھا دے وہ لاکھ علم کے دعوے کرے اور لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سنائے ان کی مثال ایسے ہوگی جیسے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے بارے میں فرمایا: ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعہ:۵] جیسے گدھے پر کتابیں لادنے سے گدھے کو فائدہ نہیں ہوتا اسی طرح ایسے لوگوں کو بھی علم پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں دیتا جو حق کو نہیں پہچانتے ہیں۔

علماء نے اس سے دوسرا مسئلہ یہ استنباط کیا ہے کہ اگر تمہیں کبھی شہادت دینی ہو تو شہادت کے لیے علم کا ہونا ضروری ہے، یعنی شاہد اس واقعہ کو جاننے والا ہو۔ اگر شاہد اس واقعہ کو نہیں جانتا ہے تو اس کی گواہی جھوٹی ہوگی۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں، ملائکہ گواہی دیتے ہیں اور اولوا العلم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے اور وہی ذات ہے جس نے پورے عالم کو عدل و انصاف سے مضبوط کر رکھا ہے اور تھام رکھا ہے۔ اس کی ذات غالب بھی ہے اور حکمت والی بھی ہے۔

اسلام کس چیز کا نام ہے؟

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ [آل عمران:۱۹] آج سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوگیا ہے کہ ہم لوگوں نے اسلام کو یہ سمجھا ہوا ہے کہ یہ چند رسومات کا نام ہے یا یہ چند عبادات کا نام ہے۔ اگر کوئی آدمی نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے اور زندگی میں ایک دفعہ حج کر لیتا ہے تو ہمارے نزدیک اسلام کے لیے اتنی چیزیں کافی ہیں۔ بعض لوگ اس سے بھی

بٹتے گئے اور ہر کسی نے اپنی اپنی رسومات کا نام مذہب رکھ لیا، یعنی اگر کوئی ان کے عقیدے کے مطابق عرس کرتا ہے، گیارہویں شریف مناتا ہے، ستائسویں رجب مناتا ہے اور پندرہ شعبان کو مانتا ہے کہ سب تقدیر کے فیصلے اس رات میں ہوتے ہیں اور اسی طرح اگر وہ قل خوانیاں، چالیسواں اور سات جمعراتیں کرتا ہے تو وہ کیسا مسلمان ہے؟

اور بعض لوگوں کے نزدیک اسلام محض عبادت کا نام رہ گیا ہے، حالانکہ اسلام مذہب نہیں۔ اور اللہ پاک نے قرآن میں مذہب کا لفظ استعمال نہیں فرمایا، بلکہ ''دِین'' کا لفظ ارشاد فرمایا۔ دین ایک کامل مکمل ضابطۂ حیات کا نام ہے۔ اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے، بلکہ معاملات ہوں، عبادات ہوں، ذاتیات ہوں، معاشیات ہوں، اقتصادیات ہوں اور قیامت تک دنیا جس چیز کی محتاج ہے اس تمام کے مجموعہ کامل کا نام اسلام ہے۔

جب تک ہم اس کو بطور دستورِ حیات لاگو نہیں کرتے اس وقت تک ہمیں مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [المائدۃ: ۴۴] جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے قرآن کے مطابق قانون نہ بنائیں اور اس کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں۔ یہ کافر کو حکم نہیں ہے؛ کیونکہ وہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتا، وہ اللہ کی توحید کا انکار کرتے ہیں، وہ حضور اکرم ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ یہ حکم مسلمانوں کے لیے ہے۔ تم لاکھ اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہو، لیکن اگر تمہارے اندر اللہ کے قرآن کا قانون نافذ نہیں ہے تو تمہیں مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اگر کوئی کہے کہ اتنی طاقت تو ہمیں نہیں ہے تو جہاں جہاں تمہیں طاقت ہے کہ ایک آدمی کی طاقت صرف اپنے گھر تک چلتی ہے یا فیکٹری تک چلتی ہے تو وہاں جب تک ہم قرآن کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے ہمیں مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے۔ آپ کے بڑے لوگ حج، روزہ اور نماز پڑھتے ہیں، بلکہ اپنے ملازمین کو بھی اپنے پیسوں سے حج کرواتے ہیں، لیکن ان کا سارا لین دین سود پر چل رہا ہے۔ ان کو اسلام کا دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اللہ سے جنگ بھی لڑ رہے ہیں اور مسلمان بھی ہیں۔

اسلام کا معنیٰ:

اسلام کا معنیٰ ہے کہ استسلام کہ اپنے آپ کو سر سے لے کر پاؤں تک اللہ کے سپرد کر دینا۔ بعض بزرگوں نے اس کو بطور مثال کے اس طرح سمجھایا ہے کہ جیسے آدمی مر جاتا ہے اور وہ نہلانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے، مردہ کچھ

نہیں کر سکتا۔ نہلانے والے جس طرف چاہیں اس کو پھیرتا رہے اور پانی ڈالتا رہے۔ اسلام کا معنی بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کامل مکمل اللہ کے ہاتھ میں دے دے کہ یا اللہ! جو بھی تیرا حکم ہے بس سر تسلیم خم ہے۔ وہاں مجھے بولنے، سوچنے اور عقل لڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک یہودی اور منافق کا واقعہ:

ایک آدمی منافق تھا، یعنی ظاہراً مسلمان تھا، لیکن اس کے اندر اسلام نہیں تھا۔ اس کا لین دین کے اندر ایک یہودی سے اختلاف تھا۔ جب بات بڑھی تو یہودی نے کہا: آپ کے نبی حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں جا کر فیصلہ کرواتے ہیں، لیکن منافق کہنے لگا: حضور اکرم ﷺ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، ان کے پاس بڑے کام ہیں۔ ہم کعب بن اشرف کے پاس جاتے ہیں۔ یہودی نے کہا میں کافر ہوں، لیکن تمہارے نبی کی بات مانتا ہوں، لیکن تم نہیں مانتے ہو، عجیب بات ہے۔ بہرحال حضور اکرم ﷺ نے بات سننے کے بعد یہودی کے حق میں فیصلہ دیا؛ کیونکہ اس کا حق بنتا تھا۔ یہودی خوش ہو گیا اور باہر نکلنے کے بعد منافق سے کہا کہ اب تو تم اپنے نبی کا فیصلہ مان لو۔ منافق نے کہا: حضور! پوری توجہ سے ہماری بات سن نہیں سکے، اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جا کر ان کو واقعہ سناتے ہیں۔ اس منافق کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اسلام میں شدید ہیں اور آپ کو کفر کے نام سے چڑ ہے، وہ میرے ہی حق میں فیصلہ کریں گے۔ آ کر آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ان کے سامنے واقعہ رکھا۔ یہودی نے بتایا کہ حضور اکرم ﷺ نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا ہے، لیکن یہ نہیں مانتا اور آپ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اندر تشریف لے گئے اور تلوار لے کر اس منافق کی گردن کو اڑا دیا۔ جو آپ کے فیصلے نہ مانے تو میری تلوار فیصلہ کرتی ہے۔

ایک انگریز کی تصدیق:

ایک انگریز نے آرٹیکل لکھا کہ ہم کافر ہیں، لیکن ہم تحقیقات کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: شراب حرام ہے۔ ہم کہتے ہیں: بڑی اچھی بات کی ہے؛ کیونکہ شراب اتنی مضر چیز ہے اس کو حرام ہی ہونا چاہیے۔ اس طرح اس نے کئی چیزوں کے بارے میں بتایا۔ اور کہا: آج ہم ایڈز کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ اس پر ریسرچ کی کہ یہ کیوں پھیلتا ہے؟ اس نے کہا: ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلام کی بات سچی تھی کہ

عورت اور مرد دونوں پاک ہوں اور میاں بیوی کے علاوہ کوئی غلط تعلق نہ بنے تو ایڈز پیدا نہیں ہوتا۔ آگے اس نے لکھا کہ عجیب بات ہے کہ کافر تو اعتراف کر رہے ہیں کہ اسلام سچا دین ہے، اللہ کا نبی سچا ہے، ان کی بتائی ہوئی باتیں سچی ہیں اور مسلمان اپنے نبی کو چھوڑ کر ہماری عادات اور اعمال کو اپنا رہے ہیں۔

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ اے میرے نبی! اعلان فرمادیں کہ دین صرف اسلام ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں یہودی رہوں اور نجات ہو جائے تو نجات نہیں ہوگی۔ نصرانی کہے کہ میری نجات ہو جائے گی؛ کیونکہ میں نبی کو مانتا ہوں، اللہ کی کتاب کو مانتا ہوں اور آخرت کو مانتا ہوں۔ فرمایا: جب تک یہ اسلام میں نہیں آئیں گے نجات نہیں ہوگی۔ ﴿وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ﴾ [آل عمران:۱۹] کوئی آتش پرست ہے، کوئی مادہ پرست ہے، کوئی یہودی ہے اور کوئی نصرانی ہے۔ آپ ان کو کھل کر کہہ دیں کہ ہم نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا ہے۔ ہم اللہ کی توحید ماننے والے ہیں، اللہ کے نبی کی رسالت ماننے والے ہیں۔ اگر وہ یہ بات مان لیں تو ٹھیک ہے، ورنہ تمہارے ذمہ حق بات پہنچانا ہے؛ کیونکہ علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں، ان کی ذمہ داری بھی حق بات کا پہنچانا ہے۔

﴿رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝﴾ [آل عمران:۱۶، ۱۷] یہاں سے اللہ تبارک وتعالیٰ متقین کی صفات بیان فرمارہے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے ثواب جزیل کا وعدہ فرمایا ہے۔

بندہ کوئی بھی نیک عمل کرے اس پر ناز نہ کرے، بلکہ یہ سمجھے کہ مولا! جو کچھ میں نے کیا اس کی تو نے مجھے توفیق دی ہے، اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، بلکہ تیرا کمال ہے کہ تو نے توفیق بخشی ہے۔

رات کی عبادت:

﴿وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝﴾ سحری کا وقت دعاؤں کے قبول ہونے اور رحمت کا وقت ہے اور اس وقت میں اللہ تعالیٰ عرش سے آسمانِ دنیا پر نزول اجلال فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہے کوئی مجھ سے بخشش مانگنے والا، مجھ سے اولاد مانگنے والا؟ اس وقت آدمی جو دعا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوتی ہے۔

یاد رکھیں! رات کو جو بھی عبادت کی جائے اس کا بڑا مقام ہے، لیکن سب سے افضل وقت رات کا آخری حصہ

ہے؛ کیونکہ سحری کے وقت نزولِ رحمتِ خداوندی ہوتا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس وقت اکثر لوگ خواب غفلت میں ہوتے ہیں۔ اس وقت آدمی کو چاہیے کہ استغفار کرے، جو بھی یاد ہو۔ اگر عربی میں استغفار نہیں آتا تو اپنی زبان میں ''یا اللہ! میری توبہ...... یا اللہ! میرے گناہ معاف کر دے'' لیکن وہ استغفار جو حضور پاک ﷺ نے سکھایا ہے وہ سب سے افضل ہے: ''أَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ'' جتنا ہو سکے اتنا کثرت سے پڑھے۔ استغفار سے رزق میں برکت، مال میں برکت، اولاد میں برکت اور تمام پریشانیوں سے نجات، سب مسئلے اس استغفار سے حل ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی گئی تو سارے کام ہو جاتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کو سب سے پہلا حکم ملا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ [المزمل:۱،۲] اے میرے مدنی! رات کو اٹھو۔ پہلے حکم تھا کہ اکثر رات میرے ذکر میں گزارو اور تھوڑا حصہ آرام کر لو۔ اور فرمایا: رات کی عبادت انسان کے نفس کو کچل دینے والی ہے۔ اور یہ ایسی عبادت ہے کہ ہر بندے کا دل اور زبان موافقت کر رہی ہوتی ہے؛ کیونکہ اس وقت میں انسان اپنا بستر اور اپنا آرام چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے آگے رو رہا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے آپ پر بہت بڑی عظمت والی بات اتارنی ہے، اس لیے اپنے آپ کو تیار کرو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ہر نبی کو چالیس سال بعد نبوت دی ہے۔ چالیس سال میں اللہ تعالیٰ ان کو مختلف مراحل میں گزارتے ہیں کہ اب میری دعوت کے متحمل ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

ذکر کا فائدہ:

آج یہی مشکل ہے کہ ہم لوگ اپنی اصلاح نہیں کرتے اور دوسروں کی اصلاح میں پڑ جاتے ہیں۔ ہمارا اپنا دامن صاف نہیں ہوتا، اپنے نفسِ امارہ کو نہیں مارا ہوتا، اس لیے ہماری عبادت کے اندر اثر نہیں ہوتا ہے۔ رات کو عبادت، رات کا ذکر اور رات کو استغفار اتنی بڑی نعمت ہے جو بیان میں نہیں آسکتی۔ ''اَللّٰهُ'' کے بڑے بڑے مزے جو آئے سو چکھ لے۔ پہلے آکر اس ذکر کو چکھو۔ جب اس میں داخل ہو جاؤ گے پھر پتہ چل جائے گا کہ اس اللہ کے ذکر کی کیا لذت ہے!! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝﴾ [الرعد:۲۸] دلوں کا سکون میرے ذکر میں ہے، دواؤں میں نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور اکرم ﷺ اوّل رات میں بھی تہجد پڑھتے تھے، درمیانی رات میں بھی تہجد

پڑھتے تھے اور آخر رات میں بھی تہجد پڑھتے تھے۔

یعنی یہ امت کے لیے آرام ہے، تہجد کی پابندی نہیں کہ ضرور آپ آخر رات میں پڑھیں۔ تہجد ہجود سے ہے، یعنی نیند کا چھوڑنا۔ اب جو عشا کی نماز کے بعد نفل پڑھیں گے سب تہجد ہے۔

ہمارے ہاں لوگوں نے مسئلہ بنایا ہوا ہے کہ جب تک نیند کر کے نہ اٹھو تہجد نہیں ہوتی۔ یہ جاہلوں کے مسئلے ہیں، لوگ خود مسئلے گھڑتے ہیں۔ تو یاد رکھیں! تہجد اوّل رات میں بھی جائز ہے، درمیان میں بھی جائز ہے اور آخر رات میں بھی جائز ہے، لیکن آخر رات میں تہجد پڑھنا زیادہ افضل اور زیادہ ثواب ہے۔

اور تہجد کا طریقہ یہ ہے کہ اگر تمہارا یقین کامل ہے کہ رات کو اٹھو گے تو وتر تہجد پڑھنے کے بعد پڑھو اور اگر نیند کھلنے کا یقین نہ ہو تو وتر سونے سے پہلے پڑھو، پھر آنکھ کھلے تو تہجد پڑھ لو۔ حضور اکرم ﷺ نے اس طرح بھی تہجد پڑھی ہے کہ سات سات پارے ایک رکعت میں پڑھے ہیں اور یوں بھی نماز پڑھی کہ سحر کے وقت نماز ختم ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رات کو تہجد پڑھتے تھے اور حضرت نافع رحمہ اللہ سے پوچھتے رہتے کہ سحر کا وقت ہو گیا یا نہیں؟ جب حضرت نافع رحمہ اللہ کہتے کہ سحر کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ نماز ختم کر کے استغفار اور دعا کی طرف توجہ کرتے، حتیٰ کہ صبح کا وقت ہو جاتا۔

حضرت ابن ابی حاتم رحمہ اللہ اپنے باپ حضرت ابو حاتم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک رات کو دیکھا کہ مسجد کے کنارے کے اندر سے ایک آدمی کہہ رہا ہے کہ اے میرے پروردگار! تو نے حکم دیا ہے کہ رات کو مجھ سے مانگو تو تیرے حکم کی میں نے فرمانبرداری کی ہے، میں آپ سے مانگ رہا ہوں۔ آپ مہربانی کر کے میرے گناہ معاف کر دیں۔ فرماتے ہیں: جب میں نے قریب جا کر دیکھا تو وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں حضور اکرم ﷺ کی طرف سے حکم تھا کہ جب رات کو تہجد پڑھو اور جب آخری رات کا وقت آجائے تو کم از کم ستر دفعہ استغفار کر لیا کرو۔ حضور اکرم ﷺ بھی کم از کم ستر دفعہ استغفار کیا کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کم از کم سو دفعہ استغفار پڑھا کرتے تھے، تا کہ امت کو تعلیم ملے۔

یاد رکھیں! اگر گناہ ہوں تو استغفار سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اگر گناہ نہ ہوں تو استغفار پڑھنے سے اللہ تعالیٰ درجات بلند کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو نصیب کرے۔

﴿إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٩﴾ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾﴾ [آل عمران: ۱۹، ۲۰]

’’پسندیدہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ اور نہیں اختلاف کیا اہل کتاب نے، مگر جب ان کے پاس (توحید کا) علم آچکا تھا آپس کی ضد کی وجہ سے۔ اور جو اللہ کے احکام کا منکر ہوگا تو اللہ (اس کا) جلدی حساب لینے والا ہے۔ اگر آپ سے (دین سے متعلق کفار) جھگڑیں تو کہہ دیجیے: میں نے خود کو اللہ کے تابع کیا ہے اور ان لوگوں نے بھی جو میرے ساتھ ہیں۔ اور کہہ دیجیے اہل کتاب کو اور ان پڑھوں کو کہ تم بھی اسلام لاؤ۔ پھر اگر وہ اسلام لائیں تو وہ ہدایت پاگئے اور اگر منہ پھیریں تو آپ کے ذمہ صرف تبلیغ کرنا ہے۔ اور لوگ (کافر) اللہ کی نگاہ میں ہیں (یہ آیت قبل از جہاد کی ہے)۔‘‘

عقیدۂ توحید:

آپ نے کئی مقامات پر مسئلہ توحید پڑھ لیا ہے۔ یہ سب سے اہم اور بڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی الوہیت کی گواہی دے رہے ہیں۔ کلمہ شہادت کے اندر بھی یہی گواہی ہے کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ تعالیٰ اور محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

جب تک انسان کا یہ عقیدہ صحیح نہ ہو ساری عبادات اور سارے نوافل بے کار ہیں۔ اور یہی توحید الوہیت ہے جس پر انبیاء علیہم السلام نے تکالیف برداشت کیں۔ اللہ تعالیٰ خالق، رازق اور مالک ہے یہ تو سب مانتے ہیں، کافر بھی مانتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ خالق ہیں، رازق ہیں اور رب العالمین ہیں۔ وہ اللہ کے گھر کو بھی مانتے تھے، اس کا طواف بھی کرتے تھے، لبیک بھی پڑھتے تھے اور خیرات بھی کرتے تھے۔

اختلاف کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب انبیاء علیہم السلام نے اور خاص طور پر امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے دعوت دی کہ ’’لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ‘‘ ’’معبود برحق کوئی نہیں، مگر اللہ۔ اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں، نہ کسی نبی کی عبادت جائز ہے، نہ کسی فرشتے کی عبادت جائز ہے اور نہ کسی اللہ کے ولی کی عبادت جائز ہے، بلکہ تمام عبادات اسی کی ذات کے

لیے ہیں۔کائنات کا ہر بندہ، چاہے آسمانوں پر ہے اور چاہے زمین پر ہے، اس کا بندہ ہے اور اس کی مخلوق ہے۔ جب ساری مخلوق اس کی محتاج ہے تو محتاج خود عبادت کے قابل نہیں بن سکتا ہے۔ ساری مخلوق اللہ سے مانگنے والی ہے۔ جو مانگنے والا ہے وہ دینے والا نہیں بنتا۔ اور یہ بھی عقیدہ ہو کہ تمام چیزیں اللہ کی مخلوق ہیں اور خالق اللہ کی ذات ہے۔ سارے کے سارے اس کے محتاج ہیں اور وہ غنی ہے۔ جب تک یہ عقیدہ نہیں بنے گا اس وقت تک کوئی عبادت قبول نہیں ہوگی۔ جو لوگ قبر والوں سے سوال کرتے ہیں، جبکہ قبر والے خود اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں تو ان سے مانگنے کا کوئی تصور ہی نہیں۔ اور جتنی انواعِ عبادات ہیں سب اللہ کے لیے ہیں، کسی غیر کے لیے نہیں ہیں۔ جب غیر کا تصور آئے گا تو اسی وقت شرک شروع ہو جائے گا۔

علماء کا مقام:

اس آیت سے معلوم ہوا کہ علماء کا اتنا بڑا مقام ہے اور جو صحیح معنی میں عالم ہے اس کی اتنی بڑی عظمت ہے کہ اللہ نے اپنی گواہی فرشتوں کی گواہی اور علماء کی گواہی کو اکٹھے ذکر کیا، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ علماء جو صحیح معنی میں متبع سنت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور جو صحیح معنوں میں اپنے علم پر عامل ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ جو آدمی جتنا زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے اتنا بڑا عالم ہے۔ اگر وہ اپنے علم پر عامل نہیں ہے تو اس کو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے پاس اتنی معلومات ہیں، لیکن وہ عالم کہلانے کا حقدار نہیں بنے گا۔ عالم کہلانے کا حقدار تب بنے گا جب حضور اکرم ﷺ کے علم کا وارث بنے۔ اور انبیاء علیہم السلام کا علم علمِ توحید ہے، علم کتاب ہے اور علم السنۃ ہے۔ علماء نے فرمایا: یہ بھی آدمی کا عقیدہ ہو کہ جس کو بھی جنت ملے گی اللہ کے فضل سے ملے گی اور جس کو جہنم میں ڈالا جائے گا وہ اللہ کا عدل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں فرماتے ہیں۔

﴿الْعَزِيزُ﴾ اللہ ایسے غالب ہیں جن کی ذات پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا، اس کی عظمت کبریائی پر کسی کا غلبہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر ایک پر غالب ہے۔

﴿الْحَكِيمُ ۝۱۸﴾ اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اقوال میں، اپنے افعال میں، اپنی تقدیر میں اور اپنی شریعت میں حکمت والے ہیں، یعنی جو بھی حکم دیا ہے وہ حکمت سے خالی نہیں ہے۔

آیت پر حضور ﷺ کی تائید:

(حدیث) حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور پاک ﷺ سے سنا آپ ﷺ نے

عرفات کے میدان میں یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴾ [آل عمران:۱۸] اس کے فوراً بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''وَاَنَا عَلٰی ذَالِكَ مِنَ الشَّاهِدِیْنَ'' یا اللہ! میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ تیری ذات کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔

قرآن کی تلاوت کے آداب:

یاد رکھیں! اللہ کے قرآن کی تلاوت کے آداب میں یہ بات ہے کہ جب کوئی آیتِ رحمت آئے تو آدمی اللہ سے رحمت کا سوال کرے، جب کوئی آیتِ عذاب آئے تو اللہ سے عذاب سے نجات کا سوال کرے، جہاں جنت کا ذکر ہے وہاں جنت کا سوال کرے، اگر نار کا ذکر آئے تو اس سے پناہ کا سوال کرے اور اسی طرح جہاں کہیں اللہ کی تسبیح آئے تسبیح کہے۔

اس آیت مبارکہ میں گواہی کا ذکر آ گیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یا اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ تو معبود برحق ہے اور تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔

آدمی کو قرآن سمجھ کر پڑھنا چاہیے۔ اگر ایک آدمی کو قرآن کا ترجمہ نہیں آتا تو کوئی بات نہیں، لیکن وہ قرآن کے ایک ایک لفظ کو آرام سے ادا کرے۔ اور اگر قرآن کے مخارج کا اسے علم نہیں ہے تو کم از کم جتنا قرآن نماز میں پڑھتے ہیں کسی ایک قاری کے پاس بیٹھ کر اس کو صحیح کرالے۔ مثلاً: آپ کو دو سورتیں یاد ہیں تو کم از کم وہ دو سورتیں صحیح آجائیں، تاکہ نماز میں تلاوت صحیح ہو، نہ کہ ساری زندگی نماز پڑھیں اور اس کے اندر قرآن اس طرح پڑھتے رہیں کہ کسی جگہ مد ہو اور آپ نہ کہہ رہے ہوں، کسی جگہ مدِ منفصل ہے، کسی جگہ مد ایک الف کی ہے، کسی جگہ مد دو الف کی ہوتی ہے، کسی جگہ تین الف کی ہوتی ہے اور اسی طرح وقف لازم ہے اور آپ نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے اگر حافظ ہیں تو ''الحمد للہ'' اور اگر حافظ نہیں ہیں، دیکھ کر قرآن پڑھنے والا ہے تو تھوڑا پڑھے، لیکن صحیح پڑھے۔ اور جتنی سورتیں نماز میں پڑھتے ہیں وہ کسی قاری کے پاس بیٹھ کر ان کو صحیح کرالے، تاکہ نماز میں تلاوت صحیح ہو؛ کیونکہ تلاوت میں بعض اوقات ایسی غلطی ہوتی ہے کہ آدمی کفر تک پہنچ جاتا ہے، حالانکہ غلطی زیر زبر کی ہوتی ہے، لیکن انسان کفر کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

حضرت غالب القطان فرماتے ہیں کہ میں کوفہ کے اندر تجارت کے سلسلہ میں آیا۔ حضرت اعمش رحمہ اللہ کے قریب

مجھے رہائش کی جگہ ملی۔ میں وہاں ٹھہرا۔ رات کے وقت میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا کہ یہاں سے چلوں، تو میں نے دیکھا کہ حضرت اعمش کھڑے ہوئے اور تہجد کی نماز پڑھنی شروع کی۔ اور تلاوت کرتے کرتے جب اس آیت پر پہنچے، اس آیت کو پڑھ کر حضرت رک گئے اور کہا: "وَأَنَا أَشْهَدُ بِمَا شَهِدَ اللّٰهُ" میں بھی گواہی دیتا ہوں جو گواہی میرے اللہ نے دی ہے اور اے میرے اللہ! میں اپنی اس گواہی کو تیرے پاس امانت رکھتا ہوں، تاکہ قیامت میں میرے کام آئے۔

یاد رکھیں! نوافل اور فرائض میں بڑا فرق ہے۔ نفلی عبادت میں یہ ہے کہ آدمی پڑھ رہا ہے، درمیان میں تسبیح آگئی تو اس نے کہہ دیا: "سبحان اللہ" یا درمیان میں کوئی ایسی بات آگئی اور اس نے اللہ سے دعا کر لی اس آیت کے مطابق وہ جو تلاوت کر رہا ہے تو اس کی گنجائش ہوتی ہے۔ اصل میں تہجد ان لوگوں کی تھی جو قرآن میں تدبر کرتے تھے اور ان کی راتیں اللہ کی عبادت میں گزر جاتی تھیں۔

مختلف مذاہب کا حکم:

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران:۱۹] بعض دین ایسے ہیں جن کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتابوں سے اور اللہ کی وحی سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان کے جھوٹے ہونے کا کوئی شبہ نہیں رہا۔ جیسے ہندومت، بدھ مت اور اسی طریقے سے دنیا میں اس قسم کے فرقے موجود ہیں ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ بعض لوگ پڑھے لکھے لوگوں کو یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے ہندو، سکھ اور بدھ مت باطل دین ہیں، نہ ان کے پاس شریعت ہے اور نہ کوئی کتاب ہے۔ جو ان کے پاس وید وغیرہ ہیں وہ خود بھی ان کو ثابت نہیں کر سکتے کہ یہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ باقی یہودی اور نصرانی، ان کے بارے میں بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کو اہل کتاب فرمایا ہے، دوسرا اسلام نے ان کے ساتھ رعایت کا معاملہ بھی کیا ہے کہ اگر کوئی اہل کتاب جانور ذبح کرے تو اس کا ذبیحہ حلال ہے، مسلمانوں کے لیے کھانا بھی جائز ہے اور وہ اپنے آپ کو یہودیت یا نصرانیت کا ماننے والا کہتا ہے بس اتنا کافی ہے، چاہے وہ اس پر عمل کرتا ہے یا عمل نہیں کرتا ہے۔ ان کے ساتھ اسلام نے دوسری رعایت بھی دی ہے کہ اہل کتاب کی لڑکی سے اگر کوئی مسلمان نکاح کرنا چاہے تو جائز ہے، لیکن کسی ہندو لڑکی سے نکاح جائز نہیں ہے، اسی طرح کسی سکھ کی لڑکی سے اور بدھ مذہب کی لڑکی سے نکاح جائز نہیں ہے۔ تو ان وجوہات کی بنا پر ہمارے جدید تعلیم

یافتہ طبقہ کے لوگ اس شبہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ وہ خدا کو مانتے ہیں اور ان کا آخرت پر بھی ایمان ہے اور ان کا یہ بھی ایمان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے سچے پیغمبر تھے تو ان کو نجات مل جائے گی؛ کیونکہ وہ آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، دوسرا اللہ کے نبی پر ایمان رکھتے ہیں اور قرآن نے بھی ان کو اہل کتاب کے لفظ سے مخاطب کیا ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے کہ جو پڑھے لکھے لوگوں کے دماغ میں بیٹھ جاتی ہے۔

یاد رکھیں! اللہ کے دین کا نظام ایسے ہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ اور شریعت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئے، اگر ایک آدمی موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور رسالت کو مانتا ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لے آتا تو وہ مومن نہیں کہلائے گا؛ کیونکہ وہ پہلی شریعت کو مان رہا ہے، اس کے بعد جو اللہ تعالیٰ نے رسول اور کتاب بھیجی اس پر ایمان نہیں لایا، لہٰذا وہ ایمان نہیں رہتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے رسول ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تو اللہ کے رسول ہیں تو اس نے ایک رسول کو مانا اور دوسرے رسول کا انکار کیا ہے، لہٰذا وہ مومن نہیں۔

اسی طرح عیسائی ہیں۔ اگر ان کا ایمان عیسیٰ علیہ السلام پر ہے، ان کے بعد جب ہمارے آقا ﷺ تشریف لائے تو اب جب تک وہ آپ پر ایمان نہ لے آئیں تو ایمان دار نہیں کہلائیں گے۔ اس لیے مسلمان وہ ہوگا جو اللہ کے تمام انبیاء، تمام رسولوں پر اور تمام کتابوں پر ایمان لائے، لیکن جس نبی کا اس نے کلمہ پڑھا ہے شریعت اس کی چلے گی۔ اس لیے ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے وضاحت کردی کہ دین صرف اسلام ہے۔ کوئی یہودیت نصرانیت وغیرہ پر رہتے ہوئے نجات پاجائے ناممکن ہے۔

اہل کتاب کے ذبیحہ اور ہندوؤں کے ذبیحہ میں فرق:

باقی رہا اہل کتاب کا ذبیحہ وہ اس لیے حلال ہے کہ ذبح کرنے والے کے لیے شرط ہے کہ وہ اس چیز کو اللہ کے نام پر ذبح کرے۔ اگر اس چیز کو اللہ کے نام پر ذبح نہیں کیا تو وہ چیز حلال نہیں ہوگی۔ وہ کہتا ہے: سردار کے نام پر ہے، تب بھی حرام ہے۔ پیر کے نام پر ہے، تب بھی حرام ہے۔ اب چونکہ اہل کتاب یہودی ہے یا نصرانی ہے وہ بھی ذبح کے وقت اللہ کا نام لیتے ہیں؛ کیونکہ ذبح کے وقت اللہ کے نام کی شرط پوری ہوگئی، لہٰذا ذبیحہ حلال ہوگیا۔ اور ہندو، سکھ اور بدھ مت خدا کا نام نہیں لیتے ہیں، بلکہ وہ اپنے بتوں کا نام لیتے ہیں، لہٰذا ان کا ذبیحہ حرام ہے۔

یہودی اور عیسائی لڑکی سے نکاح کیوں جائز؟

باقی اہل کتاب کی لڑکیوں سے نکاح جائز ہے، وہ بھی اس شرط پر کہ جب اس کو کوئی مسلمان لڑکی نہ ملے۔ یہ

نہیں کہ عمداً ان سے نکاح کرتے پھرو۔ حالات کے اعتبار سے حکم ہے، مثلاً: پانچ سال کے کورس کے لیے باہر چلے گئے، اس ملک میں مسلمان لڑکی نہیں ملتی اور حالات بھی اس بات کے متقاضی نہیں ہیں کہ میں اپنے ملک سے شادی کر کے لڑکی ساتھ لے جاسکوں اور میں نے زنا سے بھی بچنا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی کہ تم اس وقت اہل کتاب کی لڑکی سے شادی کر سکتے ہو۔ چلو وہ سابقہ کتاب، اللہ تعالیٰ کو اور کسی پیغمبر کو تو مانتے ہیں۔ جب وہ مسلمان کے گھر میں آئے گی تو اس کا اسلام پر آنا زیادہ یقینی ہے، بنسبت کسی دہمی اور بت پرست کے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی کہ کوئی اہل کتاب مسلمان لڑکی سے شادی کر لے؛ کیونکہ اہل کتاب کی لڑکی کا اسلام میں آنا متوقع تھا، لیکن یہ تو نہیں کہ ہم مسلمان کو کافر کے گھر میں ڈال دیں، نعوذ باللہ وہ بھی کافر ہو جائے۔ اہل کتاب کی نجات اس بات پر ہوگی کہ وہ اہل کتاب ہیں، ورنہ حضور اکرم ﷺ ان سے جنگیں نہ لڑتے اور ان کو مدینہ سے نہ نکالتے۔

اسلام میں بدعات کی گنجائش نہیں:

دین اسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اس کو مکمل کر دیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ عرفات کے میدان میں تھے اور یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدۃ: ۳] آج ہم نے دین کو مکمل کر دیا، اپنی نعمت پوری کر دی اور میں راضی ہو گیا تمہارے لیے اسلام کو دین بنا کر۔ اب میرے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہے اور وہ مکمل ہے۔

جب دین حضور اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں مکمل ہو گیا، لہٰذا آج اگر کوئی آدمی دین کے اندر کوئی نیا طریقہ ایجاد کرے جس کا ذکر قرآن میں نہ ہو اور فرمانِ مصطفیٰ ﷺ میں بھی نہ ہو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی نہ ہو تو ہم سمجھیں گے کہ جو لوگ بدعات رسومات میں مبتلا ہیں دراصل وہ اللہ کے دین کو مکمل نہیں سمجھتے، ورنہ نئی بات کا کیا مطلب تھا؟ اگر کوئی کہے کہ یہ ہم اس لیے کرتے ہیں کہ یہ اچھی اور بہتر بات ہے تو کیا اس چیز کا اللہ اور اس کے نبی کو پتہ نہیں تھا اور ہمیں پتہ لگ گیا؟

مثل مشہور ہے کہ ایک آدمی کے پاس شادی میں دینے کے لیے پیسے نہیں تھے، اس نے سوچا کہ اگر شادی میں نہ جاؤں تو برادری کا مسئلہ ہے۔ ساری زندگی طعنہ دیں گے کہ ہم نے دعوت نامہ بھیجا اور آپ شادی پر نہیں آئے۔ اور اگر جاؤں تو میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ وہ میرے بیٹے کی شادی پر آئے تھے، پیسے دے کر گئے تھے۔ تو اس نے

ایک نیا طریقہ نکالا کہ رات کے اندھیرے میں وہاں پہنچا اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ انہوں نے پوچھا: کون ہو؟ یہ واپس چلا گیا۔ چند دنوں کے بعد شادی والوں نے کہا: تم شادی پر نہیں آئے تھے۔ اس نے کہا: میں آیا تھا اور دروازہ کھٹکھٹایا تھا لیکن ہم تو "کون؟" ہو گئے تھے۔ تم نے پہچانا بھی نہیں تھا تو میرے اندر آنے کی کیا ضرورت تھی؟

میرا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی کا یہ عقیدہ ہے کہ دین اسلام مکمل نہیں وہ کافر ہے۔ اور اگر عقیدہ ہے کہ دین مکمل ہے تو ہر چیز دین کے اندر ہوگی، قرآن میں ہوگی یا حدیث میں ہوگی یا صحابہ کے عمل میں ہوگی، کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی ہے۔ جس مدنی سرکار نے ہمیں انگلیوں میں خلال کرنا بھی سکھا دیا ہے، سر پر مسح کرنا بھی سکھا دیا ہے تو کیا کھانے پینے والے مسئلے نہیں سکھائے؟

حضرت ابن جریر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو "اِنَّ الَّذِیْنَ" کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے زبر کے ساتھ "اَنَّ الَّذِیْنَ" پڑھا ہے۔ اور جمہور قراء نے زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ نحوی بات ہے، لیکن دونوں قراءتوں کے اندر معنی ٹھیک ہے۔ اندازہ لگائیں! اگر کسی نے زبر کے ساتھ اور کسی نے زیر کے پڑھا ہے تو اتنی چھوٹی بات بھی بتا دی ہے؛ کیونکہ جو دین کی بات ہوگی وہ قرآن وحدیث میں لازماً موجود ہوگی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ قرآن میں ایک حکم اجمالی طور پر آتا ہے، اس کی تفصیل حدیث پاک میں آجاتی ہے اور اس حکم پر عمل کر کے دکھلانے والے صحابہ اور اہل بیت رسول اللہ ہیں رضوان اللہ علیہم اجمعین، تاکہ کسی چیز کے بارے میں کوئی شبہ نہ رہے اور کوئی اختلاف نہ رہے۔

بعض لوگ فروعی مسائل لے کر مثلاً: کہتے ہیں: ایک امام کہتا ہے: ظہر سے پہلے چار رکعت ہیں اور دوسرا امام کہتا ہے: دو رکعت ہیں۔ حالانکہ یہ جھگڑا نہیں ہے؛ کیونکہ دونوں کے پاس حدیث ہے، لیکن تم جو بدعات والا کام کر رہے ہو، اس کی بھی کوئی حدیث ہے؟ صرف یہ کہہ دینا کہ ہمارے بزرگوں نے کہا تھا، یہ دین نہیں ہے، رواج ہے۔ دین دین ہوتا ہے، اس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

یہود ونصاریٰ وغیرہ کے اختلافات:

﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ﴾ [آل عمران:۱۹] اے میرے مدنی ﷺ! جن لوگوں کو آپ سے پہلے کتاب دی گئی ہے، یعنی انجیل یا تورات جن کو دی گئی ہے ان لوگوں کے آپس

میں اختلاف ہوئے، حالانکہ ان کے پاس میری کتابیں موجود تھیں، میرے بھیجے ہوئے رسول بھی آ گئے اور حق بات بھی ان کو پہنچ گئی، لیکن انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف زیادتی اور چڑھائی کرتے ہوئے ایک دوسرے کی ضد میں آ کر حق کو چھوڑ دیا اور اختلاف میں پڑ گئے۔

یہودیوں نے اتنا اختلاف کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زنا کی اولاد کہہ دیا کہ یوسف نجار شخص تھا، ......نعوذ باللہ......اس کے ساتھ بی بی مریم علیہا السلام کے ناجائز تعلقات تھے، اس سے یہ لڑکا پیدا ہوا۔ اس گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے مشہور کر دیا کہ بغیر باپ کے پیدا ہوا، حتیٰ کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھانے کی کوشش کی۔ اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھاتے گئے۔ کچھ کہنے لگے کہ جب بغیر باپ کے پیدا ہوا تو اللہ کا بیٹا ہوا۔ اور کچھ نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود خدا ہیں۔ اس طرح دونوں پٹڑی سے اتر گئے اور کافر بن گئے۔ وہ دشمنی میں بڑھتے گئے اور یہ محبت کے اندر بڑھتے گئے۔

آج جتنی جماعتیں لڑ رہی ہیں اس کی وجہ ﴿بَغْیًا بَیْنَهُمْ﴾ کہ وہ اس کو گرانا چاہتا ہے اور یہ اُس کو گرانا چاہتا ہے۔ ایک محبت میں بڑھتا ہے اور ایک سختی میں بڑھتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ہدایت پر رکھے اور اعتدال پر رکھے۔

قبر کے متعلق مسائل:

دیکھیں! حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ قبروں کو سجدہ گاہ نہ بناؤ، چونا نہ لگاؤ، عمارت نہ بناؤ اور قبریں پختہ نہ بناؤ، لیکن اب کوئی سختی کے اندر اتنا بڑھ جائے کہ قبروں پر عمداً جوتے پہن کر چلے تو یہ بھی ناجائز ہے اور دوسرے اتنے محبت میں بڑھ جائیں کہ قبروں پر غلاف ڈال رہے ہیں، روضے بنا رہے ہیں، طواف کی جگہیں اور کھڑے ہو کر مانگنے کی جگہیں بنا دیں۔ وہی ﴿بَغْیًا بَیْنَهُمْ﴾ ہے اور دونوں پٹڑی سے ہٹ رہے ہیں، ورنہ دین وہی تھا جو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا اور کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ کے زمانہ میں بھی صحابہ کرام فوت ہوئے، سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی، بی بی کلثوم رضی اللہ عنہا، بی بی رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی اور آپ ﷺ کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی، کیا حضور اکرم ﷺ نے ان کی پکی قبریں بنائیں؟ ان پر روضے بنائے تھے؟ لیکن حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ایک بالشت کے برابر قبر کو اونچا کرو، تاکہ پتہ لگے یہ قبر ہے، کوئی اس کی اہانت نہ کرے، کوئی پیشاب نہ کرے، کوئی جوتے سے نہ چلے، قبر کے اوپر کوئی نہ بیٹھے اور قبر کے اوپر ٹیک کوئی نہ لگائے، تاکہ مسلمانوں کے

قبرستان کی علامت ہو جائے کہ یہاں مسلمانوں کی قبریں ہیں۔ اور فرمایا: پکی قبریں نہ بناؤ، بلکہ کچی چیزوں کے ساتھ بناؤ۔ ہاں اگر کہیں ضرورت ہے کہ قبر ٹھہرتی نہیں ہے، وہاں عذر ہے، لیکن لڑ جھگڑ رہے ہیں۔

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ [آل عمران:19]

اللہ نے جو قرآن میں اتارا ہے کوئی شخص اس کا انکار کرے تو سمجھ لو کہ اللہ جلد حساب لینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو جھوٹ پر سزا دیں گے۔ قرآن آ گیا، حق واضح ہو گیا، اب اگر کوئی انکار کرے گا تو اللہ تعالیٰ خود بدلہ لیں گے۔

﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ [آل عمران:20] اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ پسندیدہ دین دین اسلام ہے، اس کے علاوہ کوئی دین بھی لے آئے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہیں ہے۔ اب نہ دین یہودیت پر نجات ہے، نہ نصرانیت پر نجات ہے اور نہ کسی مکذوبہ مصنوعہ ادیان پر نجات ہے، بلکہ نجات کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ دین اسلام ہے۔

آپ نے پڑھ لیا کہ یہودیوں اور نصرانیوں کا آپس میں اختلاف ہے اور پھر نصرانیوں میں بھی اختلاف ہے اور ان کے اندر تین جماعتیں پیدا ہو گئی ہیں: 1 ...... ایک جماعت ''یعقوبیہ'' کہلاتی ہے، 2 ...... دوسری جماعت ''نسطوریہ'' کہلاتی ہے 3 ...... اور تیسری جماعت ''ملکانیہ'' کہلاتی ہے۔ اور ان کے پاس چار اناجیل ہیں: 1 ...... متی، 2 ...... لوقا، 3 ...... یوحنا 4 ...... اور مرقس۔ اور یہ تینوں جماعتیں ایک دوسرے کو حق پر نہیں سمجھتی ہیں۔ یعقوبیہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود خدا ہے۔ ملکانیہ کہتے ہیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا تو نہیں، مگر اللہ کا بیٹا ہے۔ اور جب بیٹا ہم پر راضی ہو گیا تو خدا خود بخود ہم پر راضی ہو گیا، لہٰذا خدا کو راضی کرنے کے لیے ہم بیٹے کو راضی کر رہے ہیں۔ اور تیسری جماعت کہتی ہے: خدا بھی نہیں اور ابن بھی نہیں، لیکن ان تین میں سے ایک ہے۔ اسی طرح یہودیوں کے اندر بھی زبردست اختلاف ہے۔

یہود و نصاریٰ کا اسلام سے اختلاف:

پھر ان سب کا اسلام سے اختلاف ہے۔ ان سب نے حضور اکرم ﷺ کی تکذیب کی اور قرآن کا انکار کیا، حالانکہ ان کو علم تھا اور سمجھتے تھے کہ آپ سچے ہیں، لیکن حسد کی وجہ سے انکار کیا کہ ہم اونچے ہو جائیں، ورنہ ان کو پتہ تھا کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں۔

حضور ﷺ کی تصدیق کے لیے ایک راہب کا واقعہ:

حضور اکرم ﷺ عین جوانی کے عالم میں خواجہ ابو طالب کے ساتھ شام کا سفر فرما رہے تھے۔ راستے کے اندر نصاریٰ کا ایک بہت بڑا راہب تھا، وہ اپنے عبادت خانہ سے کبھی باہر نہیں آتا تھا، لیکن اس دن وہ دوڑ کر باہر آیا اور پوچھا: قافلہ کا سردار کون ہے؟ لوگوں نے ابو طالب کا بتا دیا۔ تو ان کی خدمت میں پہنچ کر کہنے لگا: آج آپ میرا کھانا قبول فرمالیں۔ ابو طالب حیران ہو گئے اور کہا: آپ اتنے بڑے پادری اور اتنے بڑے راہب ہیں۔ ہم نے پوری زندگی اس علاقہ کا سفر کیا اور آپ کے بارے میں ہمیں ہمیشہ تمنا رہی کہ آپ کی زیارت کریں، لیکن آپ باہر نہیں آتے تھے، کسی سے ملاقات بھی نہیں کرتے تھے اور آج آپ ہماری دعوت کر رہے ہیں۔ راہب نے کہا: آج تمہارے ساتھ ایک ایسی شخصیت ہے کہ میں اگر اپنے عبادت خانہ سے باہر آکر استقبال نہ کرتا تو شاید میرا عبادت خانہ گر جاتا۔ ابو طالب نے کہا: ہمارے ساتھ تو کوئی ایسا بندہ نہیں ہے، ہم تو آپس کے لوگ ہیں، جو ہمیشہ تجارت پر جاتے رہتے ہیں۔ راہب نے کہا: اس بات کو رہنے دیں اور آپ میری دعوت قبول کریں۔ جب کھانے کا وقت آیا اور حضور اکرم ﷺ کو آنے میں دیر ہو گئی تو اس راہب نے کہا کہ ابو طالب! سب آگئے؟ انہوں نے کہا: میرے بھتیجے ابھی نہیں پہنچے ہیں۔ راہب نے کہا: انہی کے لیے تو میں نے دعوت کی ہے۔ ابو طالب نے کہا: وہ نوجوان آدمی ہے، اس میں تم نے کیا دیکھا ہے؟ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس نے کہا: ابو طالب! ادھر آؤ، میں تمہیں دکھاؤں۔ اور باہر آکر کہا: وہ جو دور سے آرہے ہیں وہی تمہارا بھتیجا ہے۔ ابو طالب نے کہا: تم نے کیسے پہچان لیا ہے؟ راہب نے کہا: تمہیں اور کسی جگہ بادل نظر نہیں آرہے، لیکن ان پر بادل نے سایہ کیا ہوا ہے۔ ابو طالب کہتے ہیں: میری آنکھیں کھلیں، ورنہ ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے گھر میں اتنی بڑی شان والی ذات موجود ہے۔ بس ایک یہ خیال تھا کہ عبد اللہ کے بیٹے ہیں، خوبصورت ہیں، خوب سیرت ہیں اور سچ بولنے والے ہیں۔ اور ہمیں خوشی تھی کہ ہمارے خاندان میں ایک فرد ایسا کمال والا ہے، لیکن اس بات کا پتہ نہیں تھا۔ جب حضور اکرم ﷺ تشریف لے آئے تو راہب نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور ابو طالب سے کہا: میری درخواست ہے کہ ان کو شام نہ لے جاؤ، ان کو واپس مکہ مکرمہ بھیج دو۔ یہ وہ نبی ہیں جنہوں نے خاتم الانبیاء بن کر آنا ہے۔ اگر آگے جاؤ گے تو یہود ان کے دشمن ہیں، وہ ان کو نقصان پہنچائیں گے۔ ابو طالب کہتے ہیں: میں نے سوچا ٹھیک کہتا ہو گا اور ہمیں بھی کچھ باتیں نئی نئی نظر

آرہی تھیں، لہٰذا میں نے اس کے کہنے پر حضور اکرم ﷺ کو واپس بھیج دیا؛ کیونکہ ان لوگوں کا راہبوں اور نجومیوں پر بڑا ایمان تھا، جیسا کہ اب ہمارا حال ہے کہ پیر بات کہہ دے تو اس پر خوب عمل کریں گے اور جو محمد مصطفیٰ ﷺ کہہ دیں اس پر عمل نہیں کرتے ہیں۔

اللہ کی صفات:

﴿فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ [آل عمران: ۲۰] اے میرے مدنی ﷺ! اگر آپ سے اہل کتاب جھگڑا کریں اور مناظرہ کریں تو آپ ان کو سیدھی بات بتا دیں کہ میں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے اور میرے ماننے والے بھی۔ ہم نے صرف اسی کی عبادت کرنی ہے، وہ وحدہ لاشریک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس کی مثال بھی کوئی نہیں، اس کی کوئی اولاد بھی نہیں اس کا کوئی والد بھی نہیں اور جو بیوی سے بھی پاک ہے۔

دعا بھی اللہ سے:

یاد رکھیں! اگر ہم نے اللہ کے سوا غیر کو پکارا تو عبادت ختم۔ دعا بھی عبادت ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم عبادت اللہ کی کرتے ہیں اور دعائیں ان سے مانگتے ہیں، ان کو سفارشی بناتے ہیں، یہ تو درمیان میں خدا تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں ہیں، ورنہ ہم اللہ سے مانگتے ہیں۔ یہی غلط فہمی ہے۔ قرآن کھول کر پڑھ لیں، کفار کا بھی یہی حال تھا اور اسی کا نام شرک ہے۔

دین کی طرف حضور اکرم ﷺ کی دعوت:

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ آپ ان کو اپنے دین اور اپنی شریعت کی طرف بلائیں۔ یہودیوں کو بھی دعوت دیں، نصرانیوں کو بھی دعوت دیں اور امیین کو بھی دعوت دیں۔ اور ان لوگوں کو کہہ دیجیے جن کو کتاب دی گئی: کیا تم اسلام لاتے ہو جیسے میں اسلام لایا اور جیسے اللہ تعالیٰ کی توحید کو مانتا ہوں؟ اگر وہ اسلام لے آئیں اور آپ کے طریقے کو اپنالیں تو سمجھو کہ وہ ہدایت پا گئے اور اگر آپ کی دعوت کے بعد وہ انحراف کر جائیں اور آپ کے دین پر نہ آئیں تو آپ کے ذمہ دین کو پہنچانا ہے۔ اگر وہ مان لیں گے تو ان کا فائدہ ہے اور اگر وہ نہیں مانیں گے تو ان کے لیے ہلاکت و بربادی ہے۔ نبی کا کام یہ نہیں ہوتا کہ کسی کو زبردستی مسلمان کر دے؛ کیونکہ ہدایت کے فیصلے اللہ کے پاس ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے گھر میں ایسے لوگ پیدا کیے جنہوں نے اسلام کو چار چاند لگا

دیے اور حضور اکرم ﷺ کے قریبی رشتہ دار جہنم میں چلے گئے۔ ابوجہل، ابولہب، عقبہ، عتبہ اور ولید وغیرہ حضور پاک ﷺ کے سارے معجزات اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے، لیکن ایمان نہیں لائے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ اللہ پاک کسی کو ہدایت دیتے ہیں اور کسی کو گمراہ کرتے ہیں۔ اس کی دلیلیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔

ہدایت دینے کا اختیار اللہ کے پاس:

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ [آل عمران: ۲۰] اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کو دیکھنے والے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کون ہدایت کا مستحق ہے اور کون گمراہی کا مستحق ہے؟ اسی کی ذات ہے، اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟ وہ تو مالک اور خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی کرتے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔

حضور ﷺ کی نبوت تمام دنیا کے لیے:

ان آیات مبارکہ سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رسول بنایا۔ آپ ﷺ کی نبوت خاص علاقے یا خاص قوم کے لیے نہیں ہے، بلکہ ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [الاعراف: ۱۵۸] اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

بخاری و مسلم میں ہے: اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فارس کے بادشاہوں کو خط لکھے، روم کے بادشاہوں کو بھی خط لکھے، آپ نے عرب کو بھی دعوت دی اور عجم کو بھی دعوت دی اور پوری دنیا کو اسلام کی دعوت دی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ساری دنیا کے لیے بھیجا تھا، ساری مخلوق کے لیے بھیجا تھا۔

(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار مدینہ ﷺ سے سنا ہے: "وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَا يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ يَهُودِيٌّ، وَلَا نَصْرَانِيٌّ، ثُمَّ يَمُوتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ، إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ" آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری زندگی ہے! اس دنیا میں چاہے کوئی یہودی ہے یا نصرانی ہے اور یا کسی دین پر ہے جس کو میرا دین میری نبوت اور میری ذات کے بارے میں خبر پہنچی اور وہ ایمان نہ لایا تو جہنم میں جائے گا۔ [صحیح مسلم: رقم: ۱۵۳]

اب وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں یہودی بن کر نجات پا جاؤں گا یا نصرانی بن کر نجات پا جاؤں گا یا میں کسی دوسرے

مذہب پر نجات پا جاؤں گا، بلکہ جس کو بھی پیغامِ محمد مصطفیٰ ﷺ پہنچا ہے اور ''الحمدللہ'' اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا فرمائے جنہوں نے آپ کا پیغام دنیا تک پہنچایا ہے۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''بُعِثْتُ إِلَى الْأَسْوَدِ وَالْأَحْمَرِ'' مجھے ہر گورے اور کالے کے پاس بھیجا گیا ہے، یعنی سب مخلوق کے لیے نبی بنایا گیا۔

(حدیث) اور فرمایا: ''كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَ بُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً'' پہلے نبی اپنی قوموں کے لیے بھیجے جاتے تھے، لیکن اللہ پاک نے مجھے تمام مخلوقات کے لیے نبی بنا کر بھیجا۔

(حدیث) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا تھا جو کبھی حضور اکرم ﷺ کے لیے لوٹا بھر کر رکھ دیتا تھا اور کبھی حضور اکرم ﷺ کے جوتے اٹھا کر آپ کو پہنا دیتا تھا، حالانکہ وہ یہودی تھا، لیکن پھر بھی وہ حضور اکرم ﷺ کا اتنا احترام کرتا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ وہ بیمار ہو گیا۔ حضور پاک ﷺ نے پوچھا: وہ لڑکا کدھر ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: وہ بیمار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: چلو مجھے اس کا گھر دکھاؤ۔ آپ ﷺ اس کے پاس تشریف لے آئے۔ اس کا باپ بھی اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا: اے غلام! گواہی دے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس لڑکے نے باپ کی طرف دیکھا۔ آپ ﷺ نے پھر اس کو فرمایا تو اس نے پھر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کا باپ پھر بھی چپ رہا کہ کیا کہوں؟ حضور اکرم ﷺ نے پھر اس کو کہا: ''قُلْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' اس بچے نے پھر باپ کی طرف دیکھا۔ باپ نے کہا: بیٹا! جیسے ابوالقاسم کہتے ہیں مان لو۔ تو اس لڑکے نے کلمہ پڑھ لیا اور اس بعد وفات ہو گئی۔ حضور اکرم ﷺ جب باہر نکلے تو یہ فرما رہے تھے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَخْرَجَهُ بِيْ مِنَ النَّارِ...... '' اللہ تیرا شکر ہے کہ میری وجہ سے اس بچے کو جہنم سے بچا لیا۔ [صحیح البخاری]

مفسر فرماتے ہیں: اس حدیث کو لانے کا مقصد یہ ہے کہ یہودی بھی جہنم سے تب بچے گا جب حضور اکرم ﷺ کا کلمہ پڑھے گا، ورنہ اس کو جہنم سے نجات نہیں مل سکتی۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ
بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢١﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٢٢﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ
كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن
تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ إِذَا
جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٥﴾﴾

[آلِ عمران: ۲۱ تا ۲۵]

”جنہوں نے اللہ کے احکام کا انکار کیا اور انبیاء کو ناحق قتل کیا اور لوگوں میں سے جو انصاف کا حکم کرتے ہیں ان کو قتل کیا، ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔ یہی ہیں جن کے دنیا اور آخرت میں (اچھے) اعمال ضائع ہو گئے اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ آپ نے وہ لوگ نہیں دیکھے جن کو حصہ دیا گیا کتاب تورات سے ان کو؟ کتاب اللہ (قرآن) کی طرف بلایا جاتا ہے، تاکہ یہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق تغافل کر کے منہ پھیر لیتا ہے۔ یہ (اعراض) اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہمیں دوزخ کی آگ نہیں جلائے گی، مگر گنتی کے چند (چالیس) دن۔ اور اپنی بنائی ہوئی باتوں پر اپنے دین کے معاملے میں بہکے ہوئے ہیں۔ پس ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ان کو ایک دن جمع کریں گے جس میں شبہ نہیں اور ہر نفس کو جو کچھ اس نے کیا پورا بدلہ ملے گا اور ان کی حق تلفی نہ ہوگی۔“

یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ابراہیم علیہ السلام سے تمہاری ملاقات نہیں ہے، لہٰذا لازمی بات ہے کہ تمہیں یہ بات تمہاری کتابوں سے معلوم ہوئی ہوگی۔ انہوں نے کہا: تورات میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تورات لے آؤ اور مجھے پڑھ کر دکھاؤ کہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دین یہودیت پر تھے؟ کہنے لگے: تورات میں موجود ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے مدرسہ میں بیٹھا ہوں، تورات لے آؤ۔..... وہ کیسے تورات لے کر آتے؟ لکھا ہوا ہوتا تو وہ تورات لے کر آتے۔ اور حیلے بہانے کرنے لگے، جیسا کہ باطل کی عادت ہے۔ دعوے تو بڑے کرتا ہے، لیکن جب اس سے حق ٹکراتا ہے تو باطل کو بھاگنے کے

سوار استہ نہیں ہوتا...... بہر حال یہودیوں سے کوئی جواب نہ بن سکا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے مدنی! آپ ان کو بلاتے ہیں کہ آؤ کتاب اللہ پر فیصلہ کرتے ہیں، پھر بھی یہ بھاگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ﴾ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور قتل کرتے ہیں ان لوگوں کو جو حق کی بات کہتے ہیں آپ ان کو خبر دے دو کہ عذاب دردناک تمہارے لیے تیار ہے۔ یہ لوگ ہیں جن کے عمل دنیا میں مٹا دیئے گئے اور نہیں ہے کوئی ان کی مدد کرنے والا۔

یہودیوں کا انبیاء اور علماء پر ظلم:

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ یہودی اتنے ظالم ہیں کہ انہوں نے ایک دن میں تینتالیس انبیاء علیہم السلام کو شہید کر دیا اور ایک سو ستر آدمی علماء حق میں سے جنہوں نے کہا تھا کہ اللہ کے انبیاء کو کیوں قتل کر رہے ہو؟ تو یہودیوں نے شام کو ان ایک سو ستر کو بھی شہید کر دیا۔

یہودیوں کی سزا:

اس لیے قرآن میں آیا کہ اس فرقہ کے کئی جرم ہیں:

......ایک جرم تو اللہ کی آیات کا انکار کیا،

......دوسرا جرم یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ناحق کے شہید کر دیا۔

......اور تیسرا جرم یہ ہے کہ ان لوگوں کو قتل کیا جنہوں نے انصاف کی بات کہی، لہٰذا ان کو جہنم کی سزا ملے گی۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال برباد ہو گئے، یہ انبیاء علیہم السلام کے قتل کی سزا ملی۔ اور لوگوں کو ناحق قتل کرنے کی یہ سزا ہے کہ ان کی کوئی مدد کرنے والا نہیں ہوگا، جو ان کو اللہ کے عذاب سے چھڑا سکے۔

کافروں کے قیامت کے متعلق نظریات:

......قیامت کے بارے میں کافروں کے ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ہم مرنے کے بعد نہیں اٹھائے جائیں گے۔ بس یہ دنیا کا نظام ہے کہ پیدا ہوتے رہیں گے اور مرتے رہیں گے۔ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔

......کافروں کے دوسرے گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ قیامت نہیں ہے، لیکن اگر قیامت ہوئی تو وہاں بھی اللہ پاک ہمیں تم سے زیادہ اچھی نعمتیں دیں گے۔ ﴿وَلَئِن رُّجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِندَهُ لَلْحُسْنَىٰ﴾ [حم سجدہ: ۵۰] اور اگر

تمہارے کہنے کے مطابق ہمیں اپنے رب کی طرف دوبارہ لوٹا دیا گیا، پھر بھی ہمیں وہاں تم سے بہتر چیزیں ملیں گی۔ یہاں تم کلمہ پڑھتے ہو، نماز پڑھتے ہو اور روزے رکھتے ہو، لیکن تم ہر جگہ ذلیل وخوار ہو اور مار کھا رہے ہو۔ اور ہم لوگ خدا کو بھی نہیں مانتے، نماز بھی نہیں پڑھتے اور روزہ بھی نہیں رکھتے، لیکن ہمارے پاس دولت ہے، اولاد ہے، صحت ہے اور بہترین ملک ہمارے پاس ہیں۔ تو وہاں بھی اچھی سے اچھی چیزیں ہمیں دے گا اور تمہیں وہاں بھی یہ نعمتیں نہیں ملیں گی۔

......کافروں کا تیسرا گروہ اہل کتاب میں سے ہے۔ وہ کہتے ہیں: قیامت تو ہے، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھیں گے اور وہاں جنت جہنم بھی ہوگی، لیکن ہمیں جہنم میں صرف گنے ہوئے چند دن بھیجا جائے گا، اس کے بعد ہم جنت میں چلے جائیں گے۔

فلاسفہ کا اشکال:

یہ کافروں کے فرقے ہیں اور بعض فرقے جیسے فلاسفہ انہوں نے بھی قیامت کا انکار کیا اور کہا: قیامت نہیں ہے؛ کیونکہ انسان عناصر اربعہ سے پیدا ہوا ہے: آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے انسان پیدا ہوا ہے۔ جب انسان مر کر قبر میں چلا جاتا ہے تو ساری چیزیں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں اور ہر چیز اپنے کل میں مل جاتی ہے۔ مثلاً: ایک گلاس پانی کا ہے۔ اس پانی کو دریا میں ڈال دیں تو دریا میں پانی مل جائے گا تو یہ جز کل میں مل جائے گا۔ اسی طرح موٹر کے ٹائر میں ہوا بند ہے، پنکچر ہوا اور ہوا نکل کر ہوا میں مل گئی، لہٰذا اجزا اپنے کل میں چلا گیا۔ تو فلسفی کہتے ہیں کہ جب جز کل میں مل جاتا ہے تو اس کا جدا کرنا مشکل ہے، اسی طرح بندہ جب قبر میں ریزہ ریزہ ہو گیا تو اس کے اندر جو اربعہ عناصر تھے پانی پانی میں مل گیا، ہوا ہوا میں مل گئی، آگ آگ میں مل گئی اور مٹی مٹی میں مل گئی۔ اب قیامت والے دن کیسے فیصلہ ہوگا کہ یہ فلاں شخص کی مٹی ہے اور یہ فلاں شخص کی مٹی ہے۔ اس لیے کوئی قیامت نہیں ہے اور یہ ایسی بات ہے جو عقل میں نہیں آتی ہے۔

فلاسفہ کے اشکال کا جواب:

ان کو ٹھوکر اس لیے لگی کہ ہم پانی کو پانی میں ڈال دیں تو ہم علیحدہ نہیں کر سکتے، لیکن انہوں نے یہ نہ سوچا کہ خدا تو کر سکتا ہے۔ ہم خالق ماء، خالق ہوا اور خالق نار نہیں ہیں۔ اللہ تو ان کو پیدا کرنے والا ہے، اس کے لیے کوئی مشکل

نہیں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ دنیا میں ہمیں نظارے بھی دکھائے گا کہ ایک ہی دریا ہے، ایک ہی دن ہے، ایک ہی وقت ہے، موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دریا کو حکم دیتے ہیں کہ تھم جاؤ اور راستے بنا دو اور جم کر کھڑے ہو جاؤ تو اسی وقت راستے بن گئے۔ تو پانی نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی۔ جب موسیٰ علیہ السلام گزر گئے اور پیچھے فرعون آ گیا اس کے ساتھ بھی لاکھوں کا لشکر ہے،؛ اس کے دماغ میں نہ آیا کہ میں نے تو دریا کے اندر یہ راستے نہیں بنائے، پھر یہ کیسے بن گئے؟ لیکن اس نے کہا: اس سے موسیٰ علیہ السلام گزر گئے ہیں تو ہم بھی گزر جائیں گے۔ جب دریا کے اندر پوری فوج اتر گئی تو اللہ تعالیٰ نے پانی کو حکم دیا: میرا دشمن ہے، اس کو پکڑ لو۔ تو پانی پھر اپنی موج پر آ گیا فرعون بمع اپنی برادری کے غرق ہو گیا اور پانی پر اللہ کا حکم نافذ ہو گیا۔

آیات کی تفسیر:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی مذمت فرمائی ہے، جو انہوں نے گناہ کیے، حرام کے ارتکاب کیے، اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا، وہ اپنی بڑائی میں اتنے مبتلا ہو گئے، عناد میں اتنے بڑھ گئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اپنی حقارت سمجھی کہ ہم ان کے تابع کیوں ہو جائیں کہ یہ مکہ میں پیدا ہوئے اور امی ہیں اور ہم اہل کتاب ہیں؟ ان جرائم کے ساتھ ساتھ وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ اللہ کے انبیاء کو بھی قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ معاف کرے انسان جب انسانیت کی حدود سے گر جاتا ہے تو دنیا میں اس سے بڑا خسیس انسان کوئی نہیں ہوتا کہ انسان انسان کو قتل کرے، اہل اللہ کو قتل کرے اور یہاں تک ہو جائے کہ اللہ کے نبیوں کو قتل کر دے۔

آخرت میں سب سے سخت عذاب کس کو؟

(حدیث) حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! قیامت والے دن سب سے سخت عذاب کس کو ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس شخص کو سخت عذاب ہوگا جس نے اللہ کے نبی کو قتل کیا، یا وہ جو اللہ کے نبی کے ہاتھ سے قتل ہوا! کیونکہ اللہ کے نبی سراپا رحمت اور سراپا ہدایت ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو قتل کیوں کریں گے؟ وہ تو کسی کو بددعا دینے پر بھی راضی نہیں، حالانکہ انبیاء کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، ان کا بدن لہولہان کر ڈالا گیا، لوگوں نے سامنے کھڑے ہو کر جادوگر کہا، لیکن انبیاء علیہم السلام نے ہمیشہ دعا کی کہ یا اللہ! ہماری قوم کو ہدایت عطا فرما،

لیکن اگر نبی کے ہاتھ سے کوئی بدبخت قتل ہو جائے تو اس سے بڑا شقی کوئی نہیں بن سکتا۔

﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ ''بِغَيْرِ حَقٍّ'' کے بارے میں مفسرین کرام نے دو باتیں لکھی ہیں:

......ایک قول یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ انبیاء علیہم السلام سے ان کا کوئی ذاتی جھگڑا تھا یا انبیاء علیہم السلام نے ایسی بات کی جو ان کے وقار اور عظمت کے خلاف تھی، یہ بات نہیں تھی، بلکہ انہوں نے بغیر کسی سبب کے ان کو شہید کر دیا۔

......دوسرا قول یہ ہے کہ ''بِغَيْرِ حَقٍّ'' کا معنی ہے کہ نبی تو ہمیشہ ناحق قتل ہوگا، ''بِغَيْرِ حَقٍّ'' کا اضافہ اس لیے فرمایا کہ وہ بدبخت خود بھی جانتے تھے کہ ہم انبیاء علیہم السلام کو بغیر کسی وجہ کے مار رہے ہیں، لیکن انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا اور کفر کی آخری حدوں تک پہنچ گئے۔

تکبر کا ایک معنی تو یہ ہوتا ہے کہ جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص متکبر ہے، لوگوں کے سامنے بڑا بنتا ہے۔ یہ بھی تکبر ہے۔ اصل میں تکبر کا معنی یہ ہوتا ہے: ''بَطَرَ الْحَقِّ وَغَمِطَ النَّاسِ'' حق کو مٹانا اور لوگوں کو ذلیل کرنا۔ حق تو یہ تھا کہ ہم سب بھائی ہیں اور ناحق یہ تھا کہ ہم انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے پر آ گئے۔

متاخرین علماء نے لکھا ہے کہ اگر ہم حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خیر القرون کے زمانے تک نظر ڈالیں تو پہلے جتنی انسانیت کا دور گزرا ہے اس میں قیادت مخلص تھی، لیکن قومیں مخلص نہیں تھیں، انہوں نے نبیوں کو قتل کر دیا۔ اب معاملہ الٹ ہو گیا ہے، قومیں مخلص ہیں اور قائد چور ہیں۔

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۶ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۫ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۲۷﴾

[آلِ عمران: ۲۶، ۲۷]

''کہہ دیجیے: اے اللہ! اے سلطنت کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے۔ تیری قدرت میں ہے خیر (اور شر)، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے۔ اور رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے حساب۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے کہ بنو اسرائیل نے تین سو نبیوں کو صبح کے وقت شہید کر دیا اور شام کو سبزی منڈی میں دکانیں لگا کر سبزی بیچ رہے ہیں، یعنی ان کو کوئی فکر نہیں تھی کہ ہم نے جرم بھی کیا ہے۔

جب انہوں نے حق کا انکار کیا اور مخلوق کے اوپر متکبر بنے اور انبیاء کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلت اور ہلاکت کا عذاب دیا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا: آپ ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیں۔ عذاب کی کوئی خوشخبری نہیں ہوتی، لیکن استہزاء کے طور پر ان سے فرمایا گیا۔

شانِ نزول:

غزوۂ احزاب کے موقع پر جب خندق کھودی جا رہی تھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ کدال ماری۔ اس سے روشنی پھوٹی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اللہ اکبر'' فرمایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم حیران ہو گئے اور پوچھا تو فرمایا: جب پہلی دفعہ کدال ماری ہے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے حیرہ تک کا ملک دکھایا، دوسری کدال پر جب روشنی ہوئی تو روم کے محلات بھی مجھے دکھائے گئے اور تیسری دفعہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے صنعاء (یمن کا شہر) دکھایا اور حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آ کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خوشخبری دی ہے کہ میرے نبی کو کہہ دے کہ جہاں جہاں تک روشنی میں ہم نے یہ ملک دکھائے ہیں یہ سب علاقے تمہارے تابع ہو جائیں گے اور یہاں اسلام کا جھنڈا لہرائے گا۔ جب یہ بات کافروں کو پہنچی تو انہوں نے کہا: بڑی عجیب بات ہے! مدینہ کو بچانے کے لیے خندق کھود رہے ہیں، خود پتھر اٹھا رہے ہیں، لیکن اپنے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یہ باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ نہیں کر سکتے، لیکن ایک جانب سے روم کے فتح ہونے کی اور دوسری جانب صنعاء تک فتح ہونے کی خوشخبری سنا رہے ہیں، یہ کیسے ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات مبارکہ نازل فرمائیں:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ﴾ [آل عمران: ۲۶] ان کو کہہ دو: اللہ تعالیٰ ہی اس ملک کے مالک ہیں۔ جس کو چاہیں ملک دے دیں اور جس سے چاہیں ملک چھین لیں۔ جس کو چاہیں عزت دیں اور جس کو چاہیں ذلت دیں۔ اسی کے ہاتھ میں سب خیر و بھلائی ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ رات کو دن میں داخل کرتے ہیں اور دن کو رات میں داخل کرتے ہیں۔ زندہ سے مردہ کو اور مردہ کو زندہ سے نکالتے ہیں۔ اور جس کو چاہیں بغیر حساب کے رزق عطا فرماتے ہیں۔ اے میرے نبی! آپ ان کافروں سے کہہ دیں کہ ملک

دینے والے بھی اللہ ہیں اور چھیننے والے بھی اللہ ہیں اور ذلت دینے والے بھی اللہ ہیں اور عزت دینے والے بھی۔

اللہ کا اسم اعظم:

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔

ایک حدیث مبارک میں یہ بھی روایت موجود ہے کہ ایک صحابی نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے اوپر اتنا قرضہ چڑھ گیا ہے کہ اتر نہیں سکتا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ کلمات پڑھ کر دعا کیا کرو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تیری ساری تکلیفیں دور کردیں گے۔

حضور اکرم ﷺ کے حق میں دلیل:

﴿تُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ [آل عمران: ۲۷] حضور اکرم ﷺ پر اعتراض کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک دلیل دی ہے کہ جو اللہ ظلمت کو نور میں داخل کرنے پر قادر ہے اور نور کو ظلمت میں داخل کرنے پر قادر ہے جو اس رات دن کے تغیر تبدل پر قادر ہے وہ حکومت بدلنے پر بھی قادر ہے۔

اور فرمایا: ﴿وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ [آل عمران: ۲۷] اللہ زندہ کو مردہ سے نکالنے پر قادر ہے، انڈہ مردہ ہے اور زندہ مرغی سے نکل آیا اور چاہے تو زندہ سے مردہ کو نکالنے پر قادر ہے۔ مرغی زندہ ہے اور انڈہ مردہ نکل آیا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کی مثال یہ ہے کہ مومن کے پیٹ سے کافر کو پیدا کردے؛ کیونکہ مومن زندہ ہے اور کافر مردہ ہے۔ اللہ چاہیں ابوجہل کے پیٹ سے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو پیدا کردیں اور ابوجہل پر کروڑوں لعنتیں برس رہی ہیں اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ صحابی جلیل اور بطل الاسلام ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نبی ہیں اور ان کی صلب سے پیدا ہونے والا بیٹا کافر ہے۔ آدم علیہ السلام کے صلب سے پیدا ہونے والا بیٹا قابیل کافر ہے۔

اللہ کا بے حساب رزق:

﴿وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [آل عمران: ۲۷] وہ رزق دینے پر آجائے تو انگوٹھے لگانے والے کروڑوں میں کھیلتے ہیں اور بخاری پڑھانے والے لوگ چندہ کے محتاج ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے اور اس کا نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے کافرو! تم اعتراض کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو نبوت ولد اسماعیل میں

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرف منتقل کر دی، وہ چاہیں تو اس سارے ملک پر اسلام غالب فرما دیں، اس کو کون روکنے والا ہے۔

قرضہ دور کرنے کی دعا:

اس دعا کو زبانی یاد کر لیں:

((قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۚ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۚ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۚ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۚ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾ رَحْمَانُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَرَحِيْمُهُمَا تُؤْتِي مِنْهُمَا مَنْ تَشَاءُ وَ تَمْنَعُ مِنْهُمَا مَنْ تَشَاءُ فَارْحَمْنِي رَحْمَةً تُغْنِيْنِي بِهَا عَنْ رَحْمَةِ مَنْ سِوَاكَ اَللّٰهُمَّ! أَغْنِنِي مِنَ الْفَقْرِ اَللّٰهُمَّ! اكْفِنِي عَنِ الدَّيْنِ))

علما نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی ہر نماز کے بعد سات دفعہ پڑھ لیا کرے، اگر پہاڑوں کے برابر بھی قرضہ ہو تو اتر جائے گا۔ اللہ ہم سب کو پڑھنے کی توفیق دے۔ آج ہمارے لوگوں کو اگر کوئی انتر منتر والا وظیفہ بتا دے اس کو بڑا خوش ہو کر پڑھتے ہیں اور جو وظیفے قرآن میں ہیں اور میرے محمد پاک ﷺ نے بتائے ہیں وہ نہیں پڑھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی توحید:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پاک پیغمبر کو حکم دیا کہ اپنے رب کی تعظیم بیان کریں، اپنے رب کا شکر کریں، اپنے رب کو ہر چیز سونپ دیں اور اسی پر سہارا کریں؛ کیونکہ سارا ملک اللہ کا ہے۔ ان آیات مبارکہ میں حکم ہے کہ اپنی امت کو توحید کا مسئلہ سمجھا دیں۔ دوسرا مشرکین کا بھی رد فرما دیں کہ تم اعتراض کرنے والے کون ہو؟ اللہ تعالیٰ نے اس کو نبوت کیوں دی ہے؟ سارا ملک اللہ کا ہے، وہ جو چاہے کرے۔

ان آیات میں اس امت کے لیے سب سے بڑا سبق بھی ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ اپنی زبان مبارک سے خود کہہ رہے ہیں کہ اللہ مالک الملک ہے، اس میں تصرف کرنے کا اختیار بھی اسی کو ہے ساری کائنات کا ہر بندہ اور ہر ذرہ اس کا محتاج ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے مدنی ﷺ! آپ بھی اپنا سب کچھ اللہ کو سونپیں اور

اللہ پر توکل کریں۔

حضور اکرم ﷺ نے تین جملے ارشاد فرمائے، آگے فرمایا: ''إِذَا سَأَلْتَ فَاسْئَلِ مِنَ اللّٰهِ'' جب تم نے کچھ مانگنا ہو تو اللہ سے مانگو، اللہ کے سوا کسی غیر سے نہ مانگو۔ اگر کوئی اللہ کے سوا مردہ سے مانگے تو حضور اکرم ﷺ کے پہلے سبق کا نافرمان ہو گیا۔

میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان پر قربان ہو جاؤں!! جب انہوں نے یہ بات سنی، اس کے بعد اگر وہ گھوڑے پر بیٹھے ہوتے اور بید گر جاتا ہے تو خود اتر کر اٹھا لیتے تھے! کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کسی سے نہ مانگو، لہٰذا ہم نہیں مانگتے۔ حالانکہ یہ منع نہیں ہے، کیونکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ کسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر سوال کرنا اور اس طرح سوال کرنا جس طرح کوئی اللہ کو پکارتا ہے، جائز نہیں ہے۔

اور دوسرا جملہ ارشاد فرمایا: ''إِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ'' جب اعتماد اور بھروسہ کرنا ہو تو اللہ کی ذات پر بھروسہ کرو۔ تم کسی غیر کا سہارا لو گے، اس پر تو موت آجائے گی پھر کیا کرو گے؟ اس لیے اس کا سہارا لو جس نے ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ آج اگر یہی مسئلہ سمجھ لیں تو جھگڑے کی کوئی بات نہیں رہتی، لیکن اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اس کے سو بہانے ہیں۔ جو بتوں سے مانگتے ہیں ان کے پاس بھی بہانے ہیں۔

حضور ﷺ کے کمالات:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر ہمیں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سب سے بڑی نعمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ عطا فرمائے ہیں۔ نبوت جو بنی اسرائیل میں چلی آرہی تھی وہ حضور اکرم ﷺ کی طرف منتقل فرما دی۔

حضور اکرم ﷺ سے پہلے انبیاء میں جتنے محاسن تھے وہ سب کے سب حضور اکرم ﷺ میں جمع فرما دیئے، مثلاً: اگر کسی پیغمبر میں صبر کی صفت تھی، کسی پیغمبر میں جمال کی صفت تھی، کسی پیغمبر میں کمال کی صفت تھی اور کسی پیغمبر کے اندر حوصلہ کی صفت تھی، ان ساری صفات کا مجموعہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو بنا دیا۔ اور ہر نبی کا زمانہ بھی گزر گیا اور اس کے معجزات بھی گزر گئے، لیکن حضور اکرم ﷺ کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نبوت کو بھی قیامت تک رکھا اور آپ ﷺ کے معجزات بھی قیامت تک ہیں۔ مسلمان کا کوئی گھر ایسا نہیں جہاں قرآن نہ پڑھا جا رہا ہو۔ کوئی بدنصیب مسلمان ہوگا جس کے گھر میں قرآن نہ ہو۔ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ

نے میری امت پر مالِ غنیمت کو حلال کر دیا، اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے مٹی کو بھی پاک کر دیا کہ اگر پانی نہ ملے تو پاک مٹی پر تیمم کر کے نماز پڑھ لے اور اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے ساری زمین کو سجدہ کے قابل بنا دیا۔ یہ ایسے خصائص ہیں جو آپ ﷺ کو دیئے گئے اور کسی کو نہیں دیئے گئے۔ اسی طرح آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا اور شریعت عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بعض وہ مغیبات جو گزر چکے ہیں ان کی بھی اطلاع فرمائی اور ان واقعات کی بھی اطلاع فرمائی جو آنے والے زمانہ میں ہیں۔ مثلاً: حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ مغیبات میں ہے، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصص مغیبات میں سے ہیں۔ اور اسی طرح: ﴿الٓمّٓ ① غُلِبَتِ الرُّوْمُ ② فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ③﴾ [الروم: ۱تا۳] یہ خبر بھی عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو قیامت کی علامات کا بھی علم عطا فرما دیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی امت کو پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ آپ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جائیں، الحمد للہ امت محمدیہ موجود ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کو غالب فرمایا اور آپ کی شریعت کو غالب فرمایا۔ غلبہ حجت اور دلیل سے بھی ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب اسلام کی حقانیت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اعدائے اسلام بھی حقانیتِ اسلام کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی کو اسلام نصیب ہو اور کسی کو اسلام نصیب نہ ہو۔

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ وہی اللہ کی ذات ہے جو ساری کائنات میں تصرف کرنے والی ہے۔ اسی کی ذات ہے جو چاہے، جیسا چاہے اور جس وقت چاہے کر دے۔ جیسا کہ کافر کہنے لگے: ﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ㉛﴾ [زخرف: ۳۱] کہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اتارا گیا؟ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ﴾ [زخرف: ۳۲] میرے مدنی! آپ ان کو کہہ دیں: کیا اللہ کی رحمت کے خزانے ان کے ہاتھ میں ہیں؟ حالانکہ ان کے ہاتھ میں تو روٹی بھی نہیں ہے، ان کے ہاتھ میں تو اپنی زندگی بھی نہیں ہے۔ میری مرضی ہے، میں جس کو چاہوں چن لوں اور نبوت دے دوں۔ یہ کون ہیں میری مرضی پر اعتراض کرنے والے کہ اس کو نبی بنایا ہے اور اس کو نبی کیوں نہیں بنایا ہے؟ یا اس کو بنانا چاہیے تھا۔

ساری مخلوقِ خدا اللہ کی ملک ہے:

اسحاق بن احمد رحمہ اللہ سے حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ خلیفہ مامون ایک دفعہ روم کے شہروں کے

اندر گیا۔ اس نے دیکھا کہ حمیری زبان کے اندر کتبہ لکھا ہوا ہے تو اس نے اپنے پڑھے لکھے لوگوں کو بلایا کہ اس کو پڑھ کر عربی میں ترجمہ کر کے مجھے بتاؤ کہ کیا لکھا ہوا ہے؟ انہوں نے پڑھا تو اس میں لکھا ہوا تھا:

''بِسْمِ اللهِ مَا اخْتَلَفَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَلَا دَارَتْ نُجُوْمُ السَّمَاءِ فِي الْفُلْكِ إِلَّا بِنَقْلِ النَّعِيْمِ عَنْ مَلِكٍ قَدْ زَالَ سُلْطَانُهُ إِلَى مَلِكٍ وَ مَلِكُ ذِي الْعَرْشِ دَائِمٌ أَبَدًا لَيْسَ بِغَانٍ وَإِلَّا بِمُشْتَرِكٍ......''

''شروع اللہ کے نام سے۔ یہ رات دن کا اختلاف آسمانوں اور زمینوں میں، اسی طرح ستاروں کا چمکنا اور سورج چاند کا چمکنا، یہ سارا ادوار دیکھ رہے ہیں کہ ایک بادشاہ سے اللہ نے ملک لے کر دوسرے کو دے دیا۔ جیسے رات اور دن بدل رہے ہیں اسی طرح دنیا میں سب طاقتیں بدل رہی ہیں، لیکن اسی کا ملک ہے جو ہمیشہ ہے، دائم ہے، جس پر کبھی فنا نہیں آئے گی، باقی ہر چیز پر فنا آجائے گی اور اللہ کی ذات باقی رہے گی۔''

﴿تُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ [آل عمران:۲۷] اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کے اندر زمانے پیدا کیے ہیں۔ کبھی سردی ہے اور کبھی گرمی ہے، کبھی دن بڑا ہوگا اور رات چھوٹی ہوگی اور کبھی رات بڑی ہوگی اور دن چھوٹا ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ رات کو گھٹا کر دن کو بڑھا دیتے ہیں اور کبھی رات کو بڑھا کر دن کو گھٹا دیتے ہیں۔ تو جو اس دن رات میں تصرف کرنے پر قادر ہے، ہر تصرف پر بھی اسی کی ذات قادر ہے۔ کبھی رات ہے، کبھی دن ہے، جو اس تصرف پر قادر ہے وہ اس عالم کو فنا کر کے دوسرے عالم پر قادر ہے۔

یاد رکھیں! جن لوگوں کا اس دن رات کے ہیر پھیر میں تصرف نہیں ہے وہ مختار کل یا حاجت روا کیسے بن سکتے ہیں؟ آج ساری دنیا اکٹھی ہو جائے اور کہے: رات ہونی چاہیے، دن نہیں ہونا چاہیے تو اس پر بھی قادر نہیں ہے۔ وہ حاجت روا اور مشکل کشا کیسے بن سکتے ہیں؟ جب ایک مومن کے دل کے اندر یہ بات بیٹھ جائے کہ عزت و ذلت کا مالک اللہ ہے، نفع و نقصان کا مالک اللہ ہے، ہدایت دینے کا مالک اللہ ہے اور رزق دینے کا مالک اللہ ہے تو پھر کافروں سے دوستی کا کیا معنی ہے؟ اس کا مطلب تو ہوا کہ اللہ پر ایمان نہیں ہے، صرف زبانی کلامی باتیں ہیں۔ اس لیے وہ آیات آئیں جن کا تعلق موالات کفار کے ساتھ ہے۔

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾﴾ [آل عمران:۲۸]

''مسلمان مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جس نے ایسا کیا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ (کی تدبیر) کرنا چاہو۔ اور اللہ تمہیں اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ جانا ہے۔''

شانِ نزول:

علماء نے لکھا ہے کہ چند انصاری صحابی تھے، ان کی یہودی قبائل سے بھی دوستی تھی؛ کیونکہ ایک شہر کے اندر سب آباد تھے، مسلمان ہونے کے بعد بھی ان سے تعلق تھا۔ تین صحابی تھے جن کا تعلق یہودیوں سے زیادہ تھا تو ان کو دو تین صحابہ نے ہدایت کی کہ اب ہم مسلمان ہیں، کافروں کے ساتھ تعلق نہ رکھیں۔ انہوں نے کہا: ہمارا ان سے قدیمی تعلق ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حکم نازل فرمادیا: ﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴾ [آل عمران: ۲۸] خبردار! مومنوں کی مومنوں کے علاوہ کافروں سے دوستی نہیں ہوسکتی۔

موالات کی اقسام:

موالات کی تین قسمیں ہیں:

1. ......ہم کفر کے تمام مذاہب کو غلط اور برا سمجھتے ہیں اور دل میں نفرت کرتے ہیں۔ اور یہی مطلوبِ مومن ہے، لیکن دنیوی تعلق کا کاروبار، لین دین ٹھیک ہے، منع نہیں ہے کہ آپ اپنے مذہب پر قائم رہیں اور ان کے مذہب کو برا سمجھیں اور لین دین کی حد تک ان سے تعلق رکھیں تو کوئی حرج نہیں۔

2. ......ان کے مذہب کو مذہب اور ان کے دین کو حق سمجھتا ہے، یعنی دماغ کے اندر یہ خلش ہے کہ ہم مسلمان ہیں، ہمارا مذہب بھی ٹھیک ہے، لیکن یہود و نصاریٰ بھی اہل کتاب ہیں اور کسی نبی کو مانتے ہیں اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، کہیں زلزلہ آجائے تو سب سے پہلے مدد کو پہنچتے ہیں، اچھے لوگ ہیں۔ جب کوئی آدمی یہ عقیدہ رکھے تو وہ کفر تک پہنچ جاتا ہے۔

3. ......وہ ان کے دین کو تو برحق نہیں سمجھتا، لیکن ان کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور کبھی ان کی مدد بھی کردیتا ہے اور کبھی

مسلمانوں کی خبر بھی پہنچا دیتا ہے۔ یہ کفر تو نہیں بنتا لیکن یہ گناہِ کبیرہ ہے۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

جیسا کہ ایک صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ۔ ان کو زندگی میں ایک واقعہ پیش آ گیا، حالانکہ وہ کافروں کو کافر اور گمراہ سمجھتے تھے، مشرکین مکہ کو دشمن دین سمجھتے تھے، لیکن واقعہ اس طرح ہوا کہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے بال بچے مکہ میں تھے اور ان کا دوسرا کوئی رشتہ دار نہیں تھا جو ان کی خبر گیری کرتا۔ اس لیے وہ پریشان رہتے تھے کہ میں ان کی خبر گیری کیسے کروں؟ اگر ان پر کوئی مشکل وقت آ جائے تو ان کی مدد کون کرے گا؟ اتفاق سے ایک عورت مکہ کی رہنے والی تھی، وہ مدینہ منورہ آئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی حاضر ہوئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم یہاں کیوں آئی ہو؟ اس نے کہا: آپ میری درخواست تو سنیں! ٹھیک ہے کہ غلط عورت ہوں، لیکن انسان تو ہوں۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ نے ہمارے سرداروں کو بدر میں قتل کر دیا ہے، کچھ قید ہو گئے، پھر فدیہ دے کر چھوٹے اور ان کی مالی طور پر کمر ٹوٹ گئی۔ اب مکہ میں کوئی بڑا آدمی تو نہیں رہا جو ہم پر پیسے خرچ کرے اور خرچہ برداشت کرے۔ میں بھوکی ہو گئی ہوں، کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ میں یہاں آئی ہوں، تاکہ لوگوں سے پیسے لوں اور روٹی کھا کر زندہ تو رہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام میں ایسی چیزیں منع ہیں۔ جہاں تک تمہاری مدد کا تعلق ہے، اگر کوئی تمہیں روٹی کپڑا کھانا دینا چاہتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ اس عورت کو حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ مل گئے۔ انہوں نے کہا: میں تجھے اتنے پیسے دوں گا، تم میرا یہ خط مکہ کے فلاں سردار کو پہنچا دو۔ اس عورت کو پیسوں کی لالچ تھی، اس نے کہا: میں آپ کا خط لے جا کر پہنچا دوں گی۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے مکہ کے سردار کو خط لکھا کہ اللہ کے نبی اپنی فوجوں کو تیار کر رہے ہیں، بہت جلد وہ مکہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اور ساتھ یہ درخواست کی کہ میں چونکہ آپ کو اللہ کے نبی کا ایک راز دے رہا ہوں، اس کے صلے میں تم میرے بیوی بچوں کا خیال رکھو گے اور اگر ہو سکے تو ان کو مدینہ منورہ بھجوا دو۔ وہ عورت خط لے کر چلی گئی اور ایک دن گزر گیا، دو دن گزر گئے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر حکم دیا کہ فوراً اپنے ساتھ جوانوں کا دستہ لے کر مکہ کے راستے پر روضۂ خاخ پر جاؤ۔ ایک عورت اونٹنی پر سفر کر رہی ہے، اس کے پاس ایک خط ہے وہ برآمد کرو اور عورت کو بھی پکڑ کر لے آؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اپنے سوار ساتھ لیے اور گھوڑوں کو دوڑایا۔ اللہ کی

شان ہے! جیسے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا اس جگہ پر پہنچے تو ایک عورت اونٹ پر جا رہی تھی۔ ہم نے اس کو ٹھہرنے کا کہا، وہ ٹھہر گئی۔ اس سے پوچھا: کیا تمہارے پاس مدینہ منورہ سے کوئی خط ہے؟ اس نے کہا: میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس اونٹ کو بٹھایا اور اس کے سامان کی تلاشی لی تو اس کے اندر سے خط نہ نکلا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اچھی طرح تلاش کرو، کوئی جگہ ایسی تو نہیں ہے جو نہ دیکھی ہو۔ انہوں نے پھر تلاشی لی، لیکن خط نہ ملا۔ ساتھی کہنے لگے: اکیلی عورت ہے، آپ خوامخواہ اس پر سختی کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ غصے میں آ گئے اور فرمایا: میں مدینہ منورہ سے خود تو نہیں آیا، مجھے حضور اکرم ﷺ نے بھیجا ہے اور آپ ﷺ کی بات کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ آپ نے اس عورت سے کہا: اگر تم عورت ہو تو اپنی جگہ ہو۔ سیدھے طریقے سے خط مجھے دے دو، ورنہ مار مار کر تیری جان نکال دوں گا اور تیرے سارے کپڑے اتار کر بھی میں تلاشی لوں گا۔ مجھے میرے نبی کا حکم ہے اور وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ اب عورت ڈر گئی، اس نے خط بالوں کے اندر چھپایا ہوا تھا، تو بال کھول کر خط حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔

آپ رضی اللہ عنہ خط اور عورت کو لے کر مدینہ منورہ میں دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ جب خط پڑھا گیا تو حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ جو صحابی تھے ان کا خط تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو بلوایا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ موجود تھے، انہوں نے کہا: حضور! ان کو بلانے کی کیا ضرورت ہے؟ جب خط مل گیا ہے اور عورت بھی اقرار کرتی ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے مجھے خط دیا ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں، میں تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں کہ اللہ کے نبی کا راز کھول دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: عمر! چپ کرو، کیا کہہ رہے ہو؟ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے غصہ میں آ کر یہ کہا کہ حضور! مجھے اجازت دیں کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عمر! کیا کہہ رہے ہو؟ وہ اصحابِ بدر سے ہے اور اللہ تعالیٰ فیصلہ کر چکے ہیں کہ بدر والوں سے جو بھی غلطی ہو معاف ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر چکا ہے تو ہم کیسے سزا دے سکتے ہیں؟ میرا صحابی منافق نہیں ہے۔

جب حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ آ گئے تو حضور اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: تم نے کوئی خط لکھا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: جی لکھا ہے۔ کیوں لکھا ہے؟ اس نے کہا: سچی بات یہ ہے کہ میرا ایمان ہے کہ آپ نے مکہ پر حملہ کرنا ہے اور یہ بھی میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو فتح دیں گے، کافر آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جب آپ کی فتح یقینی ہے اور آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو میں نے اپنے بچوں کی زندگی بچانے کے لیے یہ ایک راستہ نکالا تھا کہ میں

ان کافروں پر احسان کر دوں اور وہ میرے بچوں کا خیال رکھیں۔ اب میری گردن حاضر ہے، جو بھی سزا دیں مجھے قبول ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: حاطب نے سچ کہا ہے۔ بہر حال میں تمہیں معاف کرتا ہوں اور آئندہ ایسے حالات میں احتیاط کریں۔ کافروں سے دوستی رکھ کر مسلمانوں کا راز ظاہر کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

موالات کی ایک قسم یہ ہے کہ ایک آدمی کافروں کے ملک میں پھنس گیا اور اس کو اپنی جان کا خطرہ ہے، وہ مجبور ہے۔ اسلام اتنی اجازت دیتا ہے کہ دل میں ایمان کامل رکھتے ہوئے محض زبانی طور پر ایسا لفظ کہہ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے: ﴿إِلَّآ أَن تَتَّقُوا۟ مِنْهُمْ تُقَىٰةً ۗ﴾ [آلِ عمران: ۸] لیکن اس وقت بھی اگر کوئی اپنے ایمان پر قائم رہے تو بڑی بات ہے۔

ایک صحابی کی عالی ہمتی کا واقعہ:

ایک صحابی کافروں میں پھنس گئے۔ کافروں نے کہا: اگر تم اپنی زبان سے حضور اکرم ﷺ کی شان میں کوئی بے ادبی کا لفظ کہہ دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ صحابی نے کہا: تم مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دو، لیکن میں آپ ﷺ کی بے ادبی نہیں کر سکتا۔

ایک اور صحابی کا واقعہ:

ایک دفعہ ایک اور صحابی پھنس گئے۔ بادشاہ کافر تھا، اس نے کہا: اگر تم میرے ماتھے پر صرف بوسہ دے دو تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ انہوں نے کہا: میں تجھے بوسہ نہیں دیتا۔ بادشاہ نے کہا: پھر اس کی سزا موت ملے گی۔ صحابی نے کہا: موت قبول ہے۔ بادشاہ نے ایک اور چال چلی اور کہا: تمہارے ساتھی گرفتار ہو چکے ہیں، اگر تم میرے ماتھے پر بوسہ دے دو تو میں سب کو چھوڑ دوں گا۔ صحابی نے کہا: اب میں بوسہ دیتا ہوں؛ کیونکہ اب مجھے اپنی زندگی نہیں بچانی ہے، اب مجھے مسلمانوں کی زندگی بچانی ہے۔ اگر ان کی زندگی کی حفاظت میری اس غلطی سے ہو سکتی ہے تو ان کے لیے میں یہ غلطی کر سکتا ہوں۔ اس نے بوسہ دے دیا تو اس بادشاہ نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو چھوڑ دیا۔ جب حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور سارا واقعہ سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: دیکھو! اس نے اپنے ایمان کو کتنا کھرا پایا ہے!! اس نے اپنی جان کی پرواہ نہیں کی۔ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اب سارے ساتھی اس کے ماتھے کو بوسہ دو۔

کافروں سے دفاعی معاہدہ کی اجازت:

اگر کبھی مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ دفاعی معاہدہ کی ضرورت پڑے تو وہ بھی جائز ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے یہود مدینہ سے بھی معاہدہ کیا تھا کہ اگر تمہارا دشمن تم پر چڑھائی کرے گا تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور اگر ہمارا دشمن مدینہ پر چڑھائی کرے گا تو تم ہماری مدد کرو گے۔ اسی طرح بعض قبائل کفار سے حضور اکرم ﷺ نے مکہ کے فتح ہونے کے بعد معاہدے کئے کہ اگر تمہارا دشمن تمہیں ستائے گا تو ہم تمہاری مدد کو پہنچیں گے اور ہمارے اوپر اگر دشمن چڑھائی کرے اور ہمیں تمہاری ضرورت ہو تو تم ہماری مدد کرو گے۔

اصل وجہ یہ تھی کہ حضور اکرم ﷺ نے اس وقت امت کے لیے قیامت تک کا ایک راستہ پیدا کیا، ورنہ اللہ تعالیٰ نے جیسے بدر میں مدد کی تھی تو بعد میں بھی فرشتے بھیج کر مدد کر سکتے تھے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے امت کو سبق دیا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں اور کسی کفر کی طاقت سے معاہدہ کرنا پڑے تو جائز ہے، شریعت کے اندر اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ کوئی ایسا معاہدہ نہ کیا جائے جو مسلمانوں کی ذلت اور ناکامی کا باعث ہو۔

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ﴾ اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتے ہیں کہ خبردار! تم نے کافروں سے عزت تلاش کی، ان سے دلی محبت کی اور دل لگا کر رکھا تو گویا تم نے اللہ کی ذات کو اپنا دشمن بنا لیا ہے؛ کیونکہ جو اللہ کو محبوب رکھتا ہے وہ کافروں کو محبوب نہیں رکھ سکتا۔

﴿وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝۲۸﴾ [آل عمران:۲۸] اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور اللہ ہی تمہیں جزا دیں گے۔ مومن کو ایمان کی جزا ملے گی اور کافروں کو کفر کی سزا ملے گی۔

﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۹﴾ [آل عمران:۲۹]

”(ان سے) کہہ دیجیے: اگر تم (ان سے دوستی کی) بات کو اپنے سینے میں چھپاؤ گے یا اس کو ظاہر کرو گے اللہ کو معلوم ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ﴾ تم جو کچھ اپنے سینوں میں چھپاؤ یا اپنی زبانوں پر ظاہر کرو

اللہ جاننے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ عالم الغیب، علیم بذات الصدور ہیں اور اللہ تعالیٰ کا علم کائنات کے ذرے ذرے کو محیط ہے۔

﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ اور اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [آل عمران:۲۹] اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں کہ تم دل میں کافروں سے دوستی کو چھپاؤ اور تم یہ سمجھو کہ اللہ کے علم میں نہیں ہوگا، بلکہ اللہ کے آگے تو تمہارے دل میں بھی جو کچھ ہے اور ظاہر میں بھی جو کچھ ہے اس کو جانتے ہیں۔ اور اللہ صرف علمِ کامل ہی نہیں رکھتے، بلکہ قدرت بھی کامل رکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ چاہیں تو تمہیں سزا دے دیں اور اللہ چاہیں تو تیری عزت کو ذلت میں بدل دیں اور اللہ تعالیٰ چاہیں تو تیری کامیابی کو ناکامی میں بدل دیں۔ اصل عزت دینے والا اصل مدد کرنے والا اللہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شانِ بے نیازی کا واقعہ:

جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت المقدس پہنچے تو سارے لوگوں نے کہا کہ اچھے کپڑے پہن لیں: (کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کی قمیص پر ٹاکیاں لگی ہوئی تھیں) آپ نے فرمایا: خبردار! ہم وہ لوگ ہیں جنہیں عزت اسلام نے دی ہے اور اسلام کے سوا ہم اپنی عزت لباس میں نہیں ڈھونڈنا چاہتے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس روایت پر اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ آج مسلمان لباس اس لیے ڈھونڈتا ہے: کیونکہ اس کے پاس اسلام نہیں رہا۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت المقدس پہنچے تو حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور بڑے بڑے صحابہ نے مجبور کر دیا کہ نیا لباس پہن لیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لباس بدلا اور سواری کے لیے گھوڑا لے آئے۔ آپ رکاب میں پاؤں رکھ زین کے اوپر ابھی بیٹھے نہیں تھے کہ دوبارہ چھلانگ لگا کر نیچے آگئے اور فرمایا: ''هَلَكَ عُمَرُ'' عمر برباد ہوگیا۔ جلدی کرو اور میرا لباس لے آؤ۔ تو وہی پرانا لباس پہنا اور اس اونٹ پر بیٹھے جس پر سفر کر کے مدینہ سے آئے تھے اور اپنے نوکر کو ساتھ لے گئے۔ یہودیوں نے کتابیں کھول کر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ساری نشانیاں دیکھیں۔ نشانیاں دیکھنے کے بعد جب تسلی کر لی تو بیت المقدس کی چابیاں آپ کے حوالے کر دیں۔

تفسیرِ مکی

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: بیت اللہ، کتاب اللہ اور اہل اللہ۔ اگر کسی شخص پر ان تینوں کا امتحان ہو تو مخلوق کے دلوں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ساتھیوں کی [illegible] طریق پر چلتے ہوئے [illegible] کمال مہارت سے سامعین [illegible] [illegible] ہیں یہ ایک سے درس کا خاصہ ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکر آخرت، اخلاص و تقویٰ، اخلاق حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ زیر نظر تفسیر "انوار الحرمین" المعروف "تفسیر مکی" حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس کا مجموعہ ہے۔

مکتبۃ الفقیہ

تفسیرِ مکّی

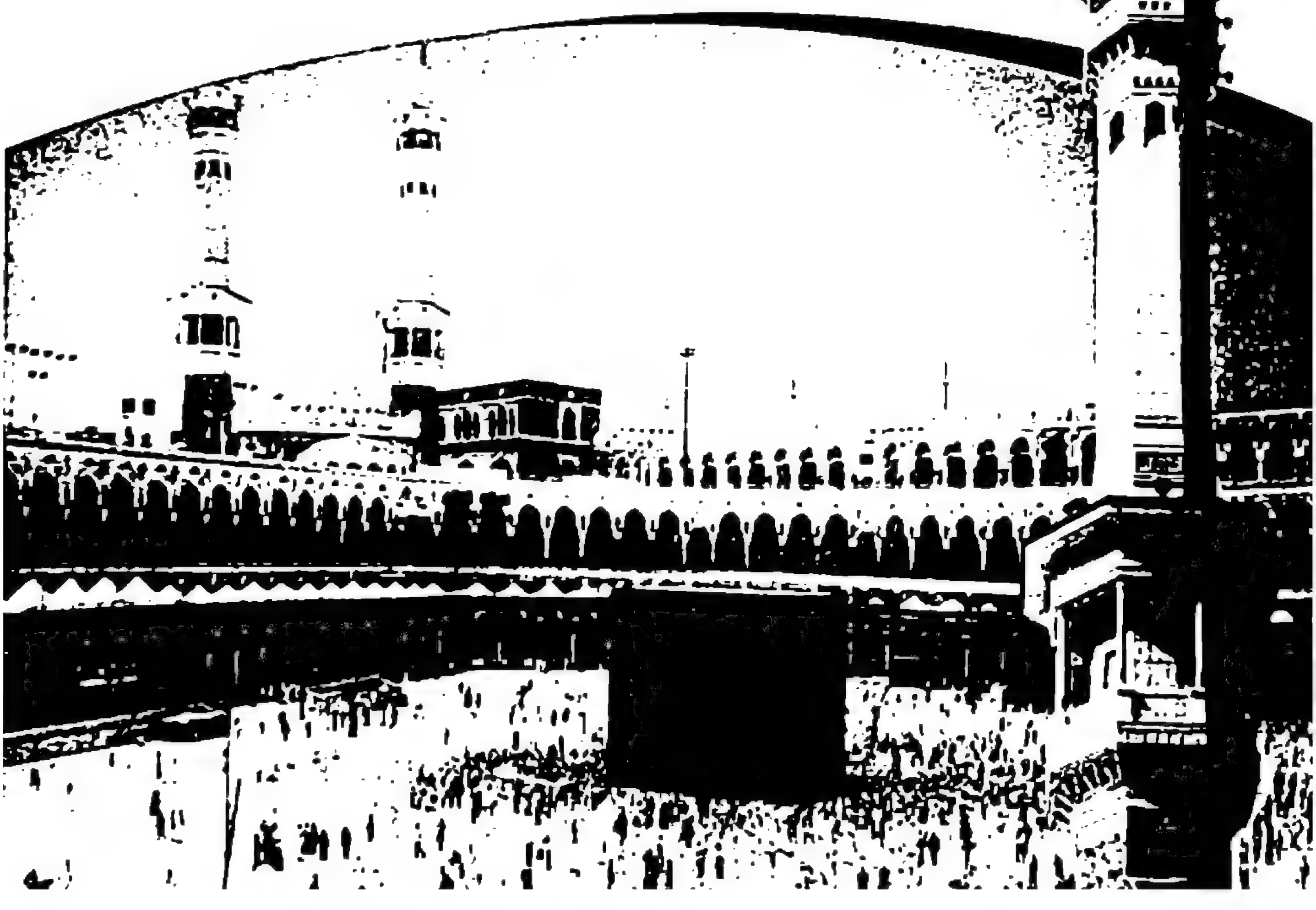
جلد 6

أستاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم

المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

تحقیق وترتیب

مولانا امداد اللہ انور
استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان



نام کتاب	تفسیر مکی (جلد 1)
صاحب خطبات	استاذ العرب والعجم الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی مدظلہم المدرس بالمسجد الحرام بمكة المكرمة
تحقیق و ترتیب	مولانا امداد اللہ انور استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان
کمپوزنگ	دار التصنیف معہد الفقیر الاسلامی جھنگ
اشاعت اول	نومبر 2019ء
تعداد	1100

اجازت طباعت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ [illegible]

[illegible]

تمام مطبوعات [illegible] کی اشاعت کی اجازت ہے

[illegible] المدرس بالمسجد الحرام [illegible]

۱۴۳۹

ناشر

مکتبۃ الفقیر

www.Tasawwuf.org

0300-9652292,03228669680

0335-7873390,03101702690

E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

- عرضِ ناشر 33
- پیشِ لفظ 35

تفسیر سورۂ آلِ عمران 37

- غربت اور فقیری میں عظمت ہے 39
- کافروں کے لباس سے منع کرنے کی وجہ 39
- دین رسوم و رواج کا نام نہیں 40
- تقیہ کا معنی اور مواقع 42

◆ امام ابن جوزی رحمہ اللہ کا واقعہ 43
◆ اللہ کا اپنی ذات سے ڈرانا بھی رحمت ہے 44
◆ اللہ سے محبت کا معیار 44
◆ غیر اللہ کی عبادت شرک ہے 45
◆ لوگ بتوں کی پوجا کیوں کرتے ہیں؟ 46
◆ اللہ سے محبت کا طریقہ 46
◆ ولایت کے مرتبہ پر پہنچنے والے کی اصل پہچان 47
◆ ایمان کی حفاظت کے کلمات 47
◆ ایک انگریز کے مسلمان ہونے کی وجہ 48
◆ کائنات میں تخلیق کا ایک راز 49
◆ ہواؤں کی اقسام 49
◆ ایک تفسیری نکتہ 50
◆ اللہ کی محبت کا امتحان 51
◆ "اَلْحُبُّ فِي اللهِ وَالْبُغْضُ فِي اللهِ" کی مثال 51
◆ اللہ کے حکم کا منکر کافر ہو جاتا ہے 53
◆ آلِ عمران کا مصداق 54
◆ "اِصْطَفٰی" کا معنی وتفسیر 54
◆ قادیانیوں کے ایک شبہ کا جواب 55
◆ آسمانی مذاہب کو ماننے والے انبیاء علیہم السلام کو بھی مانتے ہیں 55
◆ حضرت عمران کی بیوی حنہ کی منت کا واقعہ 56
◆ اولیاء کی شان میں مبالغہ آرائی 56
◆ مریم کا معنی / حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کے دعائیہ کلمات 57
◆ لڑکی یا لڑکا جننے میں عورت کا کوئی دخل نہیں 57
◆ بچے کا نام کب رکھا جائے؟ 58

بچے کی پیدائش پر سنت طریقہ کار	59
بچے کا عقیقہ بھی کرانا چاہیے	59
بچے کی شیطان سے حفاظت	60
مختلف مواقع میں شیطان کے حملے سے بچنے کی دعائیں	60
ایک عالم کی احتیاط کا واقعہ	61
عورت کا نام لینا اچھا نہیں	62
قیامت میں بھی آدمی کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا	62
عورت پردے کا ہی نام ہے	63
حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت میں قرعہ اندازی	63
حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت	64
حضرت مریم علیہا السلام کی تربیت	65
نیک لوگوں کی صحبت کا اثر	65
حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت کی بعض وجوہ	66
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت مریم علیہا السلام کی مثل ہیں	66
حضرت زکریا علیہ السلام کی اولاد کے لیے دعا	68
دعا کا بہترین موقع	68
قبولیت دعا کے بعض اوقات ومقامات	68
دعا کا ایک ادب	69
حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا	69
اللہ تعالیٰ کے سوا دعا کوئی نہیں سنتا	69
حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات	70
صلاح کے درجات	71
بچہ ہونے کے متعلق حضرت زکریا علیہ السلام کے سوال کا جواب	71
حمل ٹھہر جانے کی علامت	72

- ذکر کی فضیلت 73
- قرآن پڑھنے کی عادتیں 73
- حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت 74
- حضور ﷺ کی بیٹیاں چار تھیں 76
- حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت 78
- حضور ﷺ کی شان 78
- تبع بادشاہ کا واقعہ 79
- انصار مدینہ کے ایمان لانے کی ایک وجہ 79
- مدینہ میں یہودیوں کی آبادیاں اور تاریخ 80
- قرآن میں حضرت عیسیٰ کے ذکر کی حکمت 80
- قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر 80
- قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر 80
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعارف 81
- مسیح دجال 81
- دوسرے دجالوں، کذابوں کا تذکرہ 82
- حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت مسیح علیہ السلام کی بشارت دینے والے کون تھے؟ 82
- کیا غیر اللہ بھی بچہ دے سکتا ہے؟ 83
- ایک افسوس ناک حکایت 83
- لفظ "مسیح" کے دیگر معانی 84
- جھولے میں بولنے والے بچے 84
- قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مفصل تذکرہ کی حکمتیں 85
- مسئلہ ختم نبوت 86
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرب قیامت بھیجنے کی حکمت اور ان کو بغیر باپ کے پیدا کرنے کی قدرت 86
- انبیاء علیہم السلام کے مختلف معجزات کی حکمت 87

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے ان کے رفع آسمانی پر استدلال	87
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کچھ صفات	88
وحی شریعت اور وحی مطلق	90
کفار کا ایک اعتراض اور اس کا جواب	90
غیر انبیاء کی طرف وحی کرنے کا معنی	91
عورت نبی کیوں نہیں بن سکتی؟	92
اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں	93
معجزات اور کرامات کا اختیار بھی اللہ کے پاس ہے	93
تصویر سازی کی حرمت	94
غیر اللہ کو سجدہ جائز نہیں	94
لفظ ''اکمہ'' کے معانی	94
برص کی بیماری کو دور کرنے کا معجزہ	95
مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ	95
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک اور معجزہ	96
تورات کے بعض احکام انجیل میں منسوخ ہو گئے تھے	97
دعوت انبیاء کی سابقہ تاریخ	99
حواریوں سے مدد لینے کا مفہوم	99
حواری کا معنی	100
حواریوں کی تعداد	101
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مشکلات	101
یہودیوں اور عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق نظریات	101
مکر کا معنی	102
یہودیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا مکر	102
قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر تفصیل سے کیوں آیا؟	104

فہرست مضامین

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق صحیح اعتقاد	105
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پہلے ہے یا رفع آسمانی؟	106
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول	107
پہلا شبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر کتنی ہے؟	107
جواب	108
قائل اعتراض کا بہانہ ڈھونڈتا ہے	111
حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر زندہ ہیں	112
عیسائی یہودیوں پر غالب رہیں گے	112
حضور ﷺ کی نبوت تمام عالم کے لیے ہے	113
اسلام کے خلاف یہودیوں کی سازشیں	113
حضور ﷺ کا یہودیوں کو وحی کے ذریعہ خبریں دینا	114
غلبہ اسلام حقانیت اسلام کی دلیل ہے	114
خلاصۂ مضامین آیات	116
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق کی مثال حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ہے	116
دعوت مباہلہ اور عیسائیوں کا فرار	116
داعی کے اوصاف	117
دعوت میں تکالیف پر صبر	118
ایک سوال و جواب	118
کیا فقہاء کی تقلید شرک ہے؟	119
مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کا توحید پر اتفاق	120
کفار مکہ مشرک کیوں تھے؟	121
حضور ﷺ کی دعوت اسلام	121
یہود و نصاریٰ کے کفریہ نظریات	122
اہل کتاب کو دعوت توحید	123

ایک بزرگ اور ان کے خلیفہ کا واقعہ	123
شاہ روم کا حضور ﷺ کے متعلق معاملہ	124
ہرقل کی طرف حضور ﷺ کی دعوت اسلام	125
ایک شبہ کا جواب	125
یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کیوں کہا گیا؟	127
ہمارے سفر کا ایک واقعہ	129
حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی	129
حضرت ابراہیم علیہ السلام اور امت محمد ﷺ کا مذہب	131
باطل فرقوں کو توبہ کی توفیق کیوں نہیں ملتی؟	131
اصل اہل سنت کی پہچان کا طریقہ	132
آیات کا معنی	133
اہل کتاب کا حق و باطل کو ملانے کا جرم	134
تحریف کی صورتیں	134
گمراہ کرنے کی یہودیوں کی ایک چال	135
ہدایت دینے کا اختیار اللہ کے پاس ہے	137
یہودیوں کی دنیاوی خیانت	138
کیا اس آیت میں بعض یہودیوں کی دیانت کی تعریف ہے؟	139
خائن پر اعتماد کرنے کا نقصان	140
قرض ادا کرنے کی عجیب حکایت	141
دوسروں کے مال کو حلال جاننا یہودی عقیدہ ہے	142
جھوٹی قسمیں وغیرہ سے دوسروں کا مال لینے کا عذاب	144
ایک شبہ اور اس کا جواب	145
ضرب تادیب اور ضرب تعذیب	146
مسلمانوں کی دنیا میں حالت زار	147

فہرست مضامین

◆ جھوٹی قسم سے مال بیچنا	148
◆ دوسروں کا مال ناحق لینا	148
◆ جھوٹی قسم کھا کر کسی کا مال لینا	150
◆ اللہ کے کلام، تزکیہ اور نظر کرم سے محروم لوگ	150
◆ تین اور قسم کے محروم لوگ	152
◆ یہودیوں کی تورات میں تحریف لسانی	153
◆ امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابن معین رحمہ اللہ کی عجیب حکایت	153
◆ عہد الست اور میثاق انبیاء علیہم السلام کا ذکر	154
◆ اقرار ربوبیت کیوں کرایا؟	154
◆ میثاق انبیاء کا مقصد	155
◆ قرآن کی تحریف سے حفاظت کی ایک مثال	155
◆ ایک فرقہ کی تحریف قرآن کی کوشش	156
◆ شان نزول	159
◆ عبادت اور اطاعت میں فرق	160
◆ شان نزول کا مقصد اور فائدہ	160
◆ میثاق کی تین اقسام	162
◆ یہ میثاق کب اور کہاں لیے گئے؟	163
◆ حضور ﷺ کے لیے انبیاء سے میثاق	164
◆ حضرت محمد ﷺ سب کے نبی ہیں	165
◆ سوال وجواب	166
◆ ملت اور دین کی نسبت میں فرق	169
◆ تمام انبیاء علیہم السلام کو ماننا اسلام کا جزء ہے	170
◆ اللہ کی حاکمیت اٹل سب پر ہے	171
◆ سب انبیاء کا دین ایک ہے	171

سب کے خدا کے تابع ہونے کی مثال 172
رسول اور نبی میں فرق 174
مقبول عمل کی شرائط 175
قیامت میں انسان کے اعمال کیسے آئیں گے؟ 177
لعنت کا استعمال 178
شان نزول 179
قبولیت توبہ کی شرائط 179
قرب قیامت مغرب سے طلوع آفتاب کی حکمت 179
معجزات اور کرامات کی تصدیق کے سائنسی دلائل 180
کیا حضور ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم مرتد ہو گئے تھے؟ 181
توبہ سے ارتداد بھی معاف ہو جاتا ہے 183
قاتل کی توبہ کا واقعہ 183
لعنت کرنے کا صحیح طریقہ 184
قبولیت توبہ کا وقت کب تک ہے؟ 185
شان نزول 186
تعارض اور دفع تعارض 186
غیر مسلم کی توبہ منظور نہیں 186
ایمان لانا جہنم میں جلنے سے زیادہ آسان ہے 187
عمدہ چیز کے صدقہ کا ثواب بھی اعلیٰ 189
حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے باغ کا صدقہ 189
صدقہ کی مختلف صورتیں 190
برکت کی صورتیں 190
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ 191
ربط بین الآیات 191

◆ یہودیوں کی طرف سے اسلام پر شبہات اور ان کے جوابات	193
◆ یہودیوں کے دوسرے شبہ کا جواب	196
◆ مکہ کا نام بکہ بھی ہے	198
◆ بیت اللہ شریف میں برکتیں	198
◆ کعبہ ہدایت کا مرکز ہے	199
◆ حرم مکہ امن کی جگہ ہے	200
◆ حج کس پر فرض ہے؟	201
◆ مکہ کے نام	201
◆ مقام ابراہیم	202
◆ مجرم کے لیے حرم میں بھی امن ہے	203
◆ مجرم کو حرم سے پکڑنے کا طریقہ	203
◆ حرم میں رزق کی فراوانی	204
◆ حرم اب سب کے لیے حرم ہے	205
◆ مسجد حرام میں داخل ہونے کے فوائد	207
◆ حج کس پر فرض ہے؟	207
◆ حج زندگی میں ایک بار فرض ہے	208
◆ فرشتوں کی بے ادبی کرنے کا عذاب	209
◆ حج کے لیے استطاعت سبیل کا معنی	209
◆ کیا لڑکیوں کی شادی کرنا حج فرض کے لیے رکاوٹ ہے؟	210
◆ اہل کتاب کے لوگوں کو اسلام سے روکنے کے ڈھنگ	211
◆ حسد اور دشمنی کی ایک وجہ	213
◆ حضور ﷺ کو ان دیکھے ایمان لانے والوں کی فضیلت	213
◆ اللہ پر بھروسا کا حکم	214
◆ ربط آیات	215

- ◆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہودی کی سازش سے جنگ کا ماحول بھڑک اٹھا 215
- ◆ اللہ تعالیٰ کی صحابہ کو نصیحت 215
- ◆ پہلے خود عمل کرو تو دوسروں پر اثر زیادہ ہوتا ہے 216
- ◆ تقویٰ کے درجات 217
- ◆ خوشی اور غمی میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی حالت 217
- ◆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کا سادہ سا ولیمہ 218
- ◆ کتے چھوڑ رکھے ہیں، اصطبلے باندھ رکھے ہیں 218
- ◆ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم 218
- ◆ اللہ کی تعریف اور شکر 219
- ◆ اللہ سے ڈرنے کی حد 220
- ◆ اللہ کی رسی سے کیا مراد ہے؟ 221
- ◆ ائمہ مجتہدین کی تقلید فرقہ بندی نہیں 221
- ◆ قرآن میں مثالیں کیوں دی جاتی ہیں؟ 222
- ◆ "حَبْلِ اللّٰہِ" سے کیا مراد ہے؟ منکرین حدیث کا رد 222
- ◆ تین پسندیدہ اور تین ناپسندیدہ چیزیں 224
- ◆ ایمان کی حالت میں مرنے کا حکم 225
- ◆ اس امت کے لیے دعوت دین کی ذمہ داری 226
- ◆ دین کی دعوت کی ذمہ داری کس پر ہے؟ 227
- ◆ برائی کو روکنے کے تین درجات 227
- ◆ برائی سے نہ روکنے سے تباہی کی ایک مثال 228
- ◆ بنی اسرائیل میں اور اس امت میں فرقوں کی تعداد 229
- ◆ اہل سنت والجماعت حق پر ہے 229
- ◆ قیامت میں اہل سنت کے چہرے روشن اور غلط عقائد والوں کے سیاہ 230
- ◆ کیا صرف مرتدین کے چہرے سیاہ ہوں گے؟ 231

فہرست مضامین

- فصاحت قرآنی کا بیان 232
- تبلیغ کرنے کا فائدہ اور نہ کرنے کا نقصان 234
- حالات حاضرہ پر تبصرہ 234
- کافروں پر گناہوں کے باوجود اللہ کا عذاب کیوں نہیں آتا؟ 235
- فرقوں کی تعداد اور حق جماعت 236
- خلاصہ و ربط آیات 237
- فضیلت امت محمدیہ 238
- حضور ﷺ کی چند خصوصیات 239
- اسلام میں کوئی کالے گورے کا فرق نہیں 239
- امت محمدیہ ﷺ کی خصوصیات 240
- فصاحت قرآنی کی ایک مثال 241
- قیامت میں حضور ﷺ کی امت کی کثرت 246
- یہودیوں کی شکست 253
- رات کی عبادت کی فضیلت 255
- نیک لوگوں کی صحبت کے فوائد 256
- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نیک کاموں میں امت پر سبقت 257
- کافروں کا آخرت میں انجام 258
- اشکال / جواب 258
- تدوین حدیث کا زمانہ 259
- کفار کو اپنا راز دار مت بناؤ 261
- غیر مسلموں کی زبان سیکھنا منع نہیں 262
- کافروں کو اسلامی حکومت میں عہدے دینا 262
- انگریزی حکومت میں ہند میں اکثر بڑے القاب پانے والے کون؟ 263
- کفار کا اسلام اور نبی اسلام ﷺ سے بغض 263

کامیابی کا راستہ	264
یہود و نصاریٰ کے غصہ کی حالت	265
﴿بطانۃ﴾ کی دو قسمیں	266
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سبب	267
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر جیسی مہر بنوانا منع ہے	268
ایک جاہل حکیم کا قصہ	269
ایک حدیث کا صحیح معنی	270
ربط بین الآیات	271
غزوہ احد کا بیان	272
جنگ بدر کے حالات	273
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج بھی اہل بیت میں شامل ہیں	274
جنگ احد میں بعض صحابہ کرام کی پوزیشن	274
جنگ بدر میں کامیابی کی وجہ	276
جنگ احد میں مشکلات	277
غزوۂ بدر	280
ترتیب مضامین قرآن	283
فرشتے جنگ بدر میں اترے تھے یا جنگ احد میں؟	284
کتنے فرشتے اترے تھے؟	285
جنگوں میں اترنے والے فرشتوں کی علامات	287
ربط آیات	288
شان نزول	289
غزوۂ احد میں مسلمانوں کی فتح	289
سود کا معنی اور مسئلہ	290
سود کا نقصان	290

فہرست مضامین

◆ سود کی سزا 291
◆ ایک شبہ اور اس کا جواب 292
◆ جدید ذہنوں کے گمراہ کن نظریات 293
◆ بینک کے کاروبار کی ایک بہترین اور جائز صورت 295
◆ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی 296
◆ بلا سود جائز طریقے سے کاروبار کرنے والے کا واقعہ 297
◆ ایک بادشاہ کا معاف کرنے کا عجیب قصہ! 299
◆ آخرت کے متعلق صحیح عقیدہ اہل سنت کا ہے 300
◆ جنت، جہنم کہاں ہیں 300
◆ تفسیر آیت 302
◆ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا دشمن سے عجیب حسن سلوک! 303
◆ غصہ کو دبانے کے فائدے 304
◆ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا واقعہ 306
◆ واقعہ افک میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی برداشت 308
◆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ کو برداشت کرنا 308
◆ توبہ قبول ہونے کی شرائط 312
◆ ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے 312
◆ گناہگار پر بھی رحم کرو 313
◆ گناہ معاف ہونے کا صحیح طریقہ 314
◆ جنگ بدر اور جنگ احد میں مسلمانوں کی حالت 316
◆ مسلمانوں اور کافروں کے انجام پر کلام 317
◆ جنگ احد میں مسلمانوں پر مشکلات 318
◆ مسلمانوں پر تکالیف مسلط کرنے کی حکمت 320
◆ اسباب نزول 323

- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو میٹھا سا عتاب 324
- قرآن میں حضور ﷺ کا نام ذکر کرنے کی حکمتیں 325
- ایک نہ ایک دن حضور ﷺ پر موت آنی ہے 326
- انبیاء کرام علیہم السلام پر موت برحق ہے 326
- مسئلہ حیات انبیاء علیہم السلام 326
- موت کا وقت مقرر ہے 327
- جنگ میں ڈٹ جانے کا حکم 328
- صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان 328
- قیامت تک کے آنے والے مسلمانوں کے لیے تنبیہ 330
- روافض کا اعتراض / جواب 330
- علماء کا دنیاوی اداروں میں آنے کا نقصان 331
- شبہ اور جواب شبہ 333
- اول بھی فتح مسلمانوں کی تھی اور آخر بھی فتح مسلمانوں کی تھی 333
- مسلمانوں کی فتح کا معیار 334
- خطاء کا استناد دیکھا جاتا ہے 335
- عظمت صحابہ کا مقام تو دیکھو 335
- جنگ بدر کے قیدیوں کا معاملہ اور صحابہ کرام کا مرتبہ 336
- حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کی شجاعت 338
- ایک دشمن عثمان رضی اللہ عنہ کو جواب 339
- مشرکین کا حضور ﷺ پر حملہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا دفاع کرنا 340
- فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي 341
- جبرئیل اور میکائیل حضور ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے 342
- حضور ﷺ کے دشمن ابی بن خلف کا انجام بد 342
- جنگ احد میں حضور ﷺ کا زخمی ہونا 342

فہرست مضامین

- حضور ﷺ کے زخموں کی مرہم پٹی — [illegible]
- جنگ میں فتح کے اسباب — 346
- منافقین کی بدگمانی اور صحابہ رضی اللہ عنہم پر اللہ تعالیٰ کا انعام — [illegible]
- حضرت سلیمان علیہ السلام کے درباری کی موت اور موت کا فرشتہ — 349
- صحابہ رضی اللہ عنہم کو خدا نے معاف کر دیا تو دوسرے بھی معاف کر دیں — 350
- یہ اونگھ اللہ کی طرف سے رحمت تھی — 350
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق چند سوالات اور ان کے جوابات — 351
- خلاصۃ التفسیر — 352
- کافروں کی مشابہت اختیار نہ کرو — 353
- شہید کا مرتبہ — 354
- صحابہ رضی اللہ عنہم سے درگزر — 357
- صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقام — 357
- صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کا حکم — 358
- مشورہ کا معنی — 358
- جس نے شکل تبدیل کی اور قتل کر دیا گیا؟ — 358
- کمزور مسلمان جو خدا کو راضی کرے اور شیطان سے بھی دل لے — 359
- حضور ﷺ کی بعض ظاہری اور باطنی کیفیات — 360
- حضور ﷺ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کا ایک انداز — 360
- گناہگار سے محبت کرو..... گناہ سے نفرت — 360
- تورات و انجیل میں حضور ﷺ کی صفات — 361
- صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کی حیثیت — 361
- حضور ﷺ کو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے مشورہ کا حکم تھا — 362
- سبب نزول — [illegible]
- مال غنیمت میں خیانت کا گناہ عظیم — [illegible]

امانت میں خیانت کا گناہ	366
حضور ﷺ کی بعثت مومنین پر اللہ کا انعام ہے	367
حضور ﷺ کے فرائض منصبی	368
حضور ﷺ کی آمد سے پہلے عرب کی حالت	369
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تسلی خداوندی	370
مصیبت اترنے کی وجہ	370
جنگ احد میں منافقین کی منافقت	371
منافق کا معنی	372
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شہادت کی تمنا پوری نہ ہوسکی	373
آخرت کے مسائل ہماری عقل میں نہیں سماسکتے	374
دو قبروں کو عذاب کا واقعہ	375
شہداء صحابہ کا اعزاز	375
علمی نکتہ	376
کسی چیز کا نظر نہ آنا نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے	377
بئر معونہ میں دعوت کے لیے جانے والے صحابہ کی شہادت	377
شہداء کی حیات کی کیفیت کی ایک صورت	378
صرف شہید کو دنیا میں لوٹنے کی خواہش ہوتی ہے	379
حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد کا اعزاز	379
شان نزول	380
بعض شہداء کی ارواح جنت کی نہر پے	382
شہداء پر ایک اور نعمت	384
شان نزول	386
حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد کا جسم محفوظ تھا	386
جنگ احد کے بعد حضور ﷺ کا تعاقب کرنے کا مقصد	387

◆ دورِ نبوی صحابہ کی عالی ہمتی 387

◆ قرآنی اور نبوی دعاؤں کی اہمیت 392

◆ ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ کی فضیلت 393

◆ کفار کو مال و دولت اور جنگ میں فتح کیوں ملتی ہے؟ 396

◆ تکوینی اور تشریعی علوم 397

◆ کفار کو دنیا دینے کی حکمت 398

◆ فرعون کا انجام 398

◆ مسلمانوں پر تکالیف کیوں آتی ہیں؟ 399

◆ مسلمانوں کو گناہ کے بعد دولت وغیرہ ملنے سے ڈرنا چاہیے 399

◆ ایمان کے بدلہ میں کفر کو خریدنے کا معنی 401

◆ ایک بڑھیا کا ایمان 402

◆ ایک بدو کے دلائل توحید 403

◆ مدینہ میں پہنچ کر ایمان کی تازگی 404

◆ دنیا کا نظام الٰہی 405

◆ اللہ تعالیٰ کھرے کھوٹے کو الگ کرنا چاہتے ہیں 406

◆ اللہ تعالیٰ بعض علم غیب انبیاء اور اولیاء پر ظاہر کر دیتے ہیں 406

◆ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا فائدہ، نہ کرنے کا وبال 407

◆ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی جود و سخا 408

◆ یہ مال سانپ بن کر ڈسے گا 408

◆ زکوٰۃ اور عشر کا مسئلہ 409

◆ زکوٰۃ ادا کرنے کی برکت 410

◆ مال کو خزانہ بنا کر جمع کرنے کا عذاب 410

◆ مجبور رشتہ دار کے سوال کو رد کرنے پر عذاب 411

◆ شانِ نزول 413

- یہودیوں کا اللہ پر الزام 414
- فنحاص یہودی اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مکالمہ 415
- کیا اللہ تعالیٰ چھوٹا ظلم کرتے ہیں؟ 416
- شانِ نزول 416
- تسلی رسول صلی اللہ علیہ وسلم 417
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو تسلی 418
- دنیا میں ہر وقت اذانیں ہو رہی ہیں 419
- دوبارہ زندہ ہونے کی عقلی دلیل 420
- دوبارہ زندہ ہونے کا ایک واقعہ 420
- شرک کی مذمت کی عجیب ترین مثال!! 422
- توبہ کے بغیر شرک معاف نہیں ہوگا 422
- اصل کامیابی کیا ہے؟ 423
- انبیاء و اولیاء پر بھی موت آتی ہے 423
- جنت، جہنم اور کون سی چیزیں فنا نہ ہوں گی 424
- موت کا معنی 425
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہادری اور ایمان کی پختگی 426
- موت سب پر آئے گی 427
- موت کا لفظ بے ادبی نہیں 427
- مخلصین کا بھی امتحان ہوتا ہے 428
- کفار کا مسلمانوں سے بغض 428
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھانے والی عورت 429
- فرشتوں پر بھی موت آئے گی 429
- اللہ تعالیٰ کی قدرت 430
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر حضرت خضر علیہ السلام کی تعزیت 430

فہرست مضامین

- جنت کی فضیلت — [illegible]
- دنیا دھوکہ کا سامان ہے — [illegible]
- عبداللہ بن ابی کی حضور ﷺ سے بدتمیزی — [illegible]
- یہودیوں کی عہد شکنی — [illegible]
- یہودی ملک شام سے مدینہ میں کیوں آکر بسے تھے؟ — [illegible]
- یہودیوں نے عہد شکنی کیوں کی؟ — 436
- یہودیوں کا حضور ﷺ کے سامنے تورات کے احکام کو چھپانا — 436
- جہاد میں نہ جانے کے لیے منافقین کی بہانہ سازی — 437
- حق مسئلہ چھپانے والے کی سزا — 438
- دور نئے مولویوں کا طریقہ — 438
- مسئلہ بیان کرنے میں احتیاط — 439
- یہودیوں کا علم گدھوں پر کتابیں لادنے کی طرح ہے — 440
- نیکی کا کام نہ کرکے تعریف کی طلب کرنا — 440
- جھوٹے دعویٰ سے مال کی کثرت حاصل کرنے کا وبال — 441
- جھوٹ کا لباس — 441
- یہ آیت یہودیوں کے متعلق ہے — 441
- مسلمانوں کی حالت اور آیت قرآنی — 442
- تخلیق کائنات میں کمالِ قدرتِ خداوندی — 443
- آیات کا معنی — 446
- عقل والوں پر خدا کی معرفت حاصل کرنا واجب ہے — 447
- ایک عجیب مثال! — 447
- ذکر کے لیے کسی حالت کی تخصیص نہیں — 448
- صحابہ ؓ کے غور و فکر کا طریقہ — 449
- آخرت کی رسوائی — 450

◆ انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور حضور ﷺ سے معجزات کا مطالبہ 451

◆ مطالبہ کے مطابق معجزہ دکھانے کے بعد ایمان نہ لانے پر عذاب 452

◆ آلِ صالح کی تباہی 452

◆ زمین میں خدا کی عجیب وغریب تخلیقات! 454

◆ منکرین خدا کے لیے عبرت انگیز واقعہ 454

◆ ہر مخلوق کے پیدا کرنے میں اللہ کی حکمت ہے 456

◆ اللہ کی حکمت کے کارنامے 457

◆ بالوں کے رنگ میں بھی عذاب آسکتا ہے 457

◆ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ 459

◆ حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ 459

◆ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان 459

◆ واقعہ ہمارے استاذ نے توحید سنانے پر پتھر کھائے 459

◆ اصل علم وہ ہے جس پر عمل بھی ہو 460

◆ مواعظ عبرت 460

◆ ذلت کا عذاب 464

◆ حضور ﷺ کا رات کا معمول 467

◆ امہات المومنین رضی اللہ عنہن سے پردہ اور علمی مسائل کا سوال 468

◆ حضور ﷺ کی رات کی عبادت 468

◆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عبادت 469

◆ ایک نیک عورت کے حسن وجمال کی وجہ 470

◆ اللہ کی آیات میں غور وفکر 471

◆ دعا کی قبولیت کی تین حالتیں 472

◆ دعا کے آداب وغیرہ الخ 472

◆ شانِ نزول 473

فہرست مضامین

◆ قرآن میں عورتوں کا مستقل ذکر 473

◆ اسلام میں عورت کی عزت 474

◆ مرد ہوں یا عورت سب کو ثواب ملے گا 475

◆ ہجرت کب فرض ہے؟ 476

◆ بڑے بڑے کافروں پر خدا کی اتنی فراوانی کیوں؟ 478

◆ جواب اشکال گزشتہ 481

◆ اولاد کے حقوق 483

◆ اہل کتاب میں کچھ بہترین لوگ 484

◆ اہل کتاب کے لیے دوہرا اجر کیوں ہے؟ 485

◆ نجاشی شاہ حبشہ کی فضیلت 485

◆ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی فضیلت 485

◆ آج کل کے نظریات کی خرابی کا اندازہ 486

◆ یہودیوں کے بغض کا واقعہ 487

◆ کامیابی کے چار اصول 487

◆ صبر کا معنی اور فضیلت 488

◆ مصابرہ کا معنی 488

◆ مرابطہ کا معنی 489

◆ تقویٰ کی اہمیت 489

◆ نمازوں کی حفاظت کی فضیلت 489

◆ آیت کا شان نزول 490

◆ مرابطہ کی فضیلت 490

493 تفسیر سورة النساء

- سورۃ النساء کی فضیلت 493
- ربط بین السورتین 495
- تقویٰ کی اہمیت 495
- ایک بگڑے ہوئے امیرزادے کی حکایت 497
- تخاطب قرآن کا انداز 498
- حضرت حواء علیہا السلام کی پیدائش 500
- ٹیڑھی عورت کو سیدھا کرنا 500
- علمی نکات 500
- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی فضیلت 501
- سورۃ النساء کی پہلی آیت کا مقصد 503
- حضرت حواء علیہا السلام کا حق مہر کیا تھا؟ 503
- عورت کی تخلیق کا ایک مقصد 503
- بہترین عورت 504
- رشتہ داروں سے صلہ رحمی 505
- گھر اور گھر والی کے حقوق 506
- بیویوں کے حقوق پر دشمنان اسلام کا پروپیگنڈہ 507
- شان نزول 507
- یتیم لڑکی سے نیک نیتی سے شادی کی فضیلت 508
- شادی میں رنگ ڈالنا ہندوانہ رسم 508
- ایک مرد کتنی شادیاں کر سکتا ہے؟ 509
- صرف ایک شادی کرنے کا شبہ اور جواب 510

فہرست مضامین

- اگر کسی بیوی سے محبت زیادہ ہو تو 510
- اسلام چار بیویوں کی اجازت دینے میں اکیلا نہیں ہے 511
- چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں 512
- زیادہ شادیوں کی اجازت کیوں ہے؟ 513
- دوسری شادی پر اعتراض کیوں ہوتا ہے؟ 513
- مسلمانوں پر زیادہ شادیاں کرنے کا الزام 514
- حضور ﷺ کی زیادہ شادیوں کی حکمت 514
- کئی بیویوں کو اسلام میں تحفظ 515
- عورت کئی خاوند نہیں رکھ سکتی 516
- پسند اور حلال کی جگہ شادی کرو 516
- کس کس عورت سے نکاح حرام ہے؟ 516
- دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کیوں حرام ہے؟ 517
- عورت کا مرد پر ظلم 517
- ہر آدمی کے لیے چار بیویوں کا حکم لازمی نہیں ہے 518
- دوسری شادی کی ضرورت کیوں ہے؟ 518
- یتیم کے مال کی حفاظت 519
- حلال رزق ملنے سے پہلے حرام کی طرف مت دوڑو 519
- یتیم کا مال کھانے کی صورتیں 520
- طلاق دینا اللہ کو ناپسند ہے 521
- طلاق دینے کا سنت طریقہ 521
- عدل نہ ہو سکے تو یتیم لڑکی سے شادی نہ کرو 522
- چار سے زیادہ شادیاں حضور ﷺ کی خصوصیت تھی 522
- لونڈیوں سے شادی کے مسائل 523
- ﴿الا تعولوا﴾ کا معنی 523

◆ حق مہر کی ادائیگی کے مسائل ____ 526

◆ یتیم کون ہوتا ہے اور کب تک ہوتا ہے؟ ____ 529

◆ یتیموں کو مال سپرد کرنے کی عمر ____ 529

◆ اپنی اولاد کو مال دینے کا وقت ____ 530

◆ بچے میں رشد کو پہچاننے کا طریقہ ____ 531

◆ یتیموں کا مال جلدی سے نہ کھا جاؤ ____ 531

◆ ایک واقعہ ____ 531

◆ یتیم پر شفقت ____ 533

◆ مال بڑی نعمت ہے ____ 533

◆ مال بیچنے کی پابندی کے مسائل ____ 533

◆ عورتیں عقل اور دین میں ناقص ہیں ____ 534

◆ اپنی بیوی بچوں کو بھی مال دینے میں احتیاط کرو ____ 535

◆ خدمت گار بھی کم عقل ہوتے ہیں ____ 536

◆ کون سے تین شخصوں کی دعا قبول نہیں ہوتی؟ ____ 537

◆ یتیمی کب ختم ہوتی ہے اور روزہ کب مکمل ہوتا ہے؟ ____ 538

◆ تین قسم کے لوگوں کے گناہ معاف ____ 538

◆ بالغ ہونے کی علامات اور مسائل ____ 539

◆ نگران بقدر ضرورت یتیم کے مال سے کتنا لے سکتا ہے؟ ____ 540

◆ حقوق العباد کی اہمیت ____ 541

◆ یتیم کی پرورش کے بدلے میں بقدر ضرورت کھا سکتے ہو ____ 541

◆ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی احتیاط ____ 542

◆ یتیم کے مال کے حقوق ____ 543

◆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی احتیاط ____ 543

◆ ربط آیات ____ 544

فہرست مضامین

◆ حرم میں آج عورتوں کی حالت 545
◆ قرآن میں مردوں کے خطاب میں عورتیں بھی شامل ہیں 545
◆ عورتیں بھی ترکہ میں وارث ہیں 545
◆ لڑکے بھی وارث ہیں 546
◆ رشتہ داروں کو ترکہ میں حصہ 546
◆ غیر ورثا کو کچھ دے دینا استحبابی حکم ہے 547
◆ رشتہ داروں کے حصوں میں کمی بیشی کیوں ہے؟ 548
◆ کیا چیز دینے سے حصہ ادا ہو جاتا ہے؟ 549
◆ شان نزول 549
◆ ملت میں ملی جائیداد کی قدر نہیں ہوتی 550
◆ کیا ورثا کے علاوہ کا بھی حق ہے؟ 550
◆ مال کو صدقہ سے بچانا اچھا نہیں 551
◆ شان نزول 553
◆ ابتداء اسلام میں میراث کی بنیادیں 554
◆ وارث بننے کی تین اسباب 554
◆ بیٹے کو ڈبل اور بیٹی کو سنگل کیوں ملتا ہے؟ 555
◆ میت کے ترکہ میں ترتیب حقوق 555
◆ احکام میراث کی تفصیل 556
◆ موجودہ دور میں کمپیوٹر کی اہمیت اور فائدہ 556
◆ علم دین کی اقسام 557
◆ شان نزول 558
◆ اللہ اپنے بندوں پر ان کے والدین سے بھی زیادہ مہربان ہے 559
◆ اللہ کی مہربانی کا اندازہ 559
◆ میراث کی تقسیم کا فارمولا 560

- بعض ورثاء کے حصوں میں شبہ کا جواب — 560
- اگر لڑکیاں ایک سے زیادہ ہوں تو دو تہائی مال ملے گا — 561
- ایک لڑکی کا، والدین کا کیا حصہ ہے؟ — 562
- اولاد اور ماں باپ کے حصوں کی تفصیل — 562
- میراث کا مسئلہ پوچھنے کا طریقہ — 563
- میت کو کفن کی تعیین — 564
- میت پر غم کا اسلامی طریقہ — 565
- میت کی تجہیز و تکفین کا طریقہ — 566
- جنازہ اور تدفین میں تاخیر نہ کرو — 566
- جہاں مرے وہیں دفن کیا جائے — 566
- اگر مکہ یا مدینہ میں میت نے تدفین کی وصیت کی ہو — 566
- میت کو آرام سے لے کر چلیں — 566
- جنازہ کا امام — 567
- جنازہ کے بعد دعا نہیں ہے — 567
- میت کے لیے سوگ کے ایام — 567
- تعزیت کا طریقہ — 568
- خلاصۂ مسائل میراث — 568
- وصیت لکھنے میں سستی نہ کرو — 569
- نسبی اور سسرالی رشتے — 570
- وصیت میں نقصان پہنچانے کی صورتیں — 570
- اہل میت کے ساتھ ہمدردی — [illegible]
- قل خانی کا حکم — [illegible]
- ترکہ سے بیوی کا حق المہر ادا کرنا بھی فرض ہے — [illegible]
- ترکہ میں خاوند کا حصہ — [illegible]

فہرست مضامین

◆ ترکہ میں بیوی کا حصہ 573

◆ خاوند کے مقابلہ میں بیوی کو کم حصہ کیوں ملتا ہے؟ 574

◆ میاں بیوی کے ترکہ کی تقسیم میں عورت کو پہلے کیوں ذکر کیا؟ 574

◆ وارثوں کے لیے وصیت کرنا اب جائز نہیں 574

◆ کلالہ کا معنی اور وجہ تسمیہ 575

◆ کلالہ کی میراث میں اخیافی بھائی کا حصہ 576

◆ کلالہ کی میراث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اخیافی بہن بھائیوں کا حصہ 577

◆ کلالہ کی میراث میں اختلاف 578

◆ دوسروں کے لیے وصیت کر کے وارثوں کو محروم کرنا 579

◆ وصیت میں وارثوں کو نقصان پہنچانا گناہ ہے 580

◆ ربط آیات 583

◆ وارث نہ ہونے کے اسباب 583

◆ میراث کے بعض مسائل 583

◆ کیا آدمی احکام میراث کے انکار سے کافر ہو جاتا ہے؟ 585

◆ اللہ کے عذاب کی خطرناکی 586

◆ حصہ داروں کے حصص کی مقدار میں مصلحت 586

◆ میراث صحیح تقسیم کرنے کا انعام جنت 586

◆ حدیث 586

◆ ربط آیات، گناہگار عورت کے احکام 588

◆ بے غیرتی کی انتہاء 589

◆ زنا کے قریب جانے کی صورتیں اور ان کی ممانعت 590

◆ زنا کی سزا میں چار گواہوں کی شرط کیوں؟ 591

◆ زنا کی سزا 592

◆ رجم کی سزا اب تک باقی ہے 594

- منکرین رجم کا رد 595
- زنا کی سابقہ سزا منسوخ ہے 596
- دو مردوں کی آپس میں بدفعلی کی اصل سزا کیا ہے؟ 597
- ہر گناہ سے توبہ ہو سکتی ہے 597
- توبہ کے بعد گناہ گار کو طعنہ نہ دو 598
- توبہ کرنے والے ایک ڈاکو کا واقعہ 598
- قبولیت توبہ کا وقت کب تک ہے؟ 599
- گناہ جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے 600
- ایک فاحشہ عورت کی بخشش 600
- حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اور گناہگار عورت کا واقعہ 601
- گناہ سے بچنے کے لیے صحیح ماحول اپنائیں 602
- توبہ کا آخری وقت 603
- اللہ تعالیٰ توبہ کو کیوں قبول کرتے ہیں؟ 605
- توبہ واستغفار کے انعامات 606
- نیک لوگوں کے لیے دنیاوی نعمتیں 607
- دنیاوی مشکلات دور کرنے کا طریقہ 607
- حضور ﷺ کے نزدیک درود شریف پڑھنے والے کا مرتبہ 608



عرضِ ناشر

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: 1 ...... بیت اللہ، 2 کتاب اللہ، 3 ...اہل اللہ۔

اور اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، رمضان ہو یا شوال، حج کا موسم ہو یا عمرے کا، حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کا درسِ قرآن مسجد حرام میں بلا ناغہ ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں دوسرے مشائخ کے دروس بھی ہوتے ہیں، تاہم جس کثرت سے اور ذوق شوق سے لوگ حضرت مکی مدظلہ کے درس میں شرکت کرتے ہیں، دوسرے دروس میں یہ کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ چنانچہ برِ صغیر پاک و ہند، بلکہ پوری دنیا میں جہاں بھی اردو دان طبقہ حرم شریف میں آتا ہے، حضرت مکی مدظلہ کے درس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحیدِ خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت واحترام پر حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمال مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے

درس کا خاصہ ہے۔

حضرتِ اقدس کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص و تقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر تفسیر "انوار الحرم" المعروف "تفسیرِ مکی" حضرتِ اقدس کے چند دروس کا مجموعہ ہے۔ جسے اس سے قبل اک اور ادارہ نے شائع کیا تھا اب اسے حضرت اقدس ہی کے حکم پر "مکتبۃ الفقیر" شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اللہ رب العزت اس کتاب اور "مکتبۃ الفقیر" دونوں کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین ﷺ

اجازت ہو تو آ کر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہو گا

قارئینِ کرام! گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی، کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تا زیست اپنی رضا کے لیے یہ خدمت سر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ہماری آخرت کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

دعاؤں کا طالب:

فقیر سیف اللہ احمد نقشبندی مجددی

مکتبۃ الفقیر



پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْاَمِيْنِ مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَعَلٰى اٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ
وَاَصْحَابِهِ الطَّاهِرِيْنَ وَعُلَمَاءِ اُمَّتِهٖ وَاَوْلِيَاءِ زُمْرَتِهٖ اَجْمَعِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

الحمد للہ! حضرت مولانا محمد مکی حجازی حفظہ اللہ کے سلسلہ دروس تفسیر سے متعلق تفسیر سورۃ آل عمران کی طباعت مکمل ہوئی، اسی جلد میں اس کے آگے سورۃ النساء کی ۱۸ آیات کی تفسیر بھی طبع ہوگئی ہے۔

اب تفسیر مکی کی چھ جلدوں کی تفصیل تفسیر آیات کے اعتبار سے درج ذیل طور پر ہے:

تفسیر مکی کی پہلی جلد مکمل طور پر سورۃ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

دوسری، تیسری اور چوتھی تین جلدیں مکمل طور پر سورۃ بقرۃ کی تفسیر پر مشتمل ہیں۔

پانچویں جلد بھی سورۃ بقرۃ کے بقایا حصہ کی تفسیر پر مشتمل ہے، اس کے بعد سورۃ آل عمران کی ۲۹ آیات کی تفسیر بھی اسی جلد میں آگئی ہے۔

یہ چھٹی جلد جو آپ کے ہاتھوں میں ہے اس میں سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۳۰ سے آخر تک مکمل سورۃ کی تفسیر

موجود ہے۔

اس کے بعد اسی چھٹی جلد میں سورۃ النساء کی تفسیر شروع سورۃ سے آیت نمبر ۱۸ تک درج کی گئی ہے۔

تفسیر مکی کی ساتویں جلد میں ان شاء اللہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۹ سے آخر سورۃ تک ہے اس کے بعد سورۃ المائدۃ کی بھی کافی آیات شامل ہوں گی۔

تفسیر مکی کا اگلا کام تقریبا اسی طرز پر ہوگا جس طرز پر یہ پانچویں اور چھٹی جلدیں آئی ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس سلسلہ کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور جتنے متعلقین اس کتاب پر اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں ان کو بھی اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، بالخصوص حضرت شیخ محمد مکی الحجازی حفظہ اللہ کو صحت کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرمائے اور اور صحت کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے اور جو سلسلہ درس حرم مکی میں ان کا نصف صدی سے جاری وساری ہے وہ تا دیر جاری رہے۔آمین بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

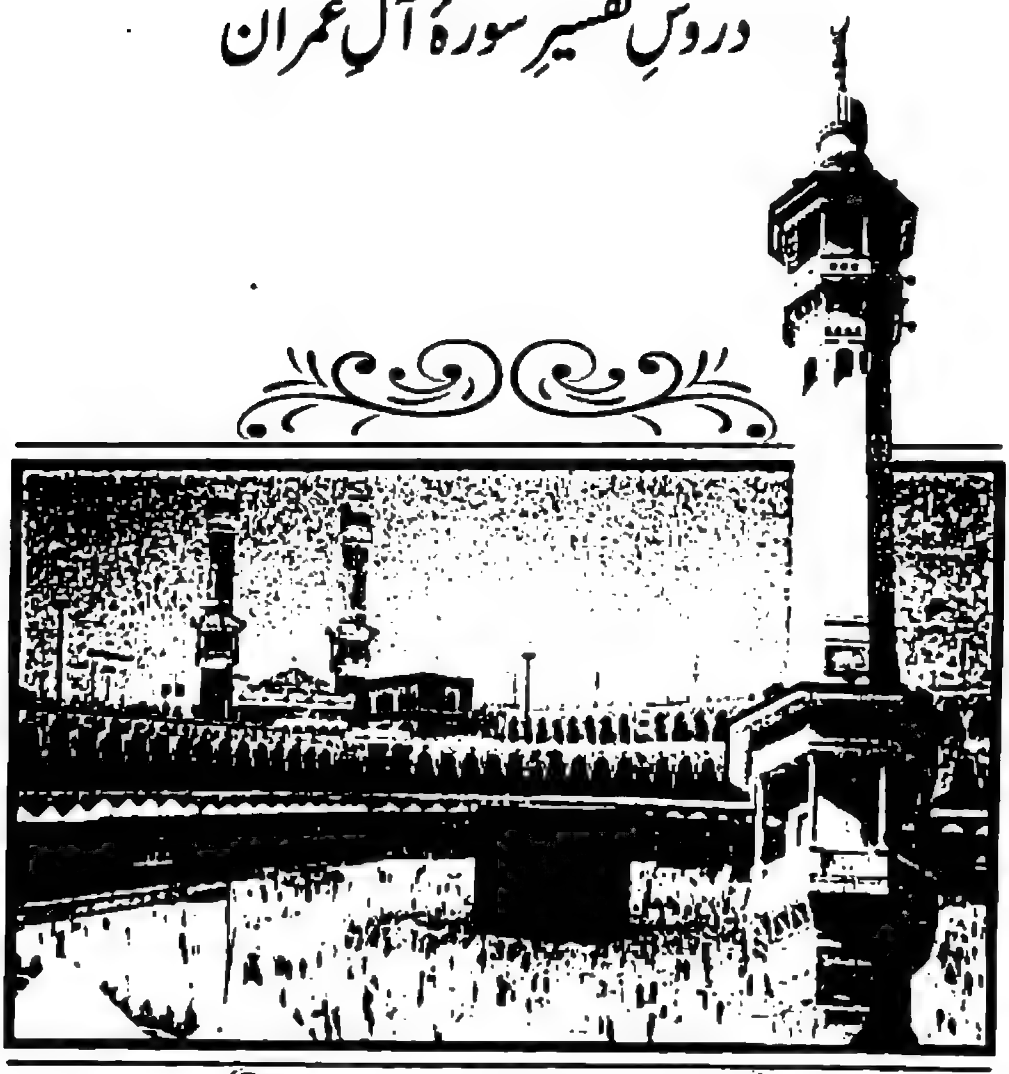
امداد اللہ انور

جامعہ قاسم العلوم گلگشت کالونی، ملتان

تفسیر انوار الحرم

(حصہ ششم)

دروسِ تفسیرِ سورۂ آلِ عمران



سُوْرَۃُ آلِ عِمْرَانَ مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

﴿یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَہَا وَبَیْنَہٗٓ اَمَدًا بَعِیْدًا ۭ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ۭ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾[اٰلِ عمران:۳۰]

''جس دن موجود پاوے گا ہر شخص جو کچھ کہ کی ہے اس نے نیکی اپنے سامنے اور جو کچھ کہ کی ہے اس نے برائی آرزو کرے گا کہ مجھ میں اور اس میں پڑ جائے فرق دور کا۔ اور اللہ ڈراتا ہے تم کو اپنے سے اور اللہ بہت مہربان ہے بندوں پر۔''

بہر حال! جب واپس آئے تو ساتھیوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ ''عمر برباد ہو گیا۔'' تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رونے لگ گئے اور فرمایا: میں جب اچھا لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے نقشہ دکھایا کہ عمر! کیا کر رہے ہو؟ ہم نے تورات میں تمہاری یہ نشانیاں نہیں دیکھی ہیں، آج اگر تیری نشانیاں غلط ہو گئیں تو لوگ میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر بھی اعتراض کریں گے۔ تو تم سارے دین کو صرف کپڑے پہن کر تباہ کرنا چاہتے ہو؟ تو مجھے فوراً بات یاد آ گئی اور میں نے لباس بدل لیا۔

غربت اور فقیری میں عظمت ہے:

ہم عزت...... پیسے اور لباس میں ڈھونڈتے ہیں، حالانکہ ان چیزوں میں عزت نہیں ملتی۔ کتنے دولت والے مر گئے، لیکن ان کا نام نہیں آتا۔ قارون کا، فرعون کا کیا نام تھا؟ کسی کو پتا نہیں ہے، لیکن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ جن کے گھر میں صبح کا کھانا ہوتا تو شام کا نہ ہوتا اور شام کا ہوتا تو صبح کا نہ ہوتا تھا۔ آج بھی جب ان کا نام لیا جاتا ہے تو "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ" کہا جاتا ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا نام لیں گے تو "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ" پڑھیں گے؛ کیونکہ انہوں نے عزت اسلام میں ڈھونڈی تھی۔ اور میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ رشتہ دار جنہوں نے کلمہ پڑھ لیا ان کا نام ہے اور جنہوں نے کلمہ نہیں پڑھا ان کے نام مٹ گئے۔

کافروں کے لباس سے منع کرنے کی وجہ:

مؤمن میں کبھی یہ دو باتیں جمع نہیں ہو سکتیں کہ دل کے اندر ایمان بھی ہو اور کفر کے ساتھ محبت بھی ہو۔ علماء نے قرآن وسنت کی روشنی میں جو کافروں کے لباس سے منع کیا ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے؛ کیونکہ آدمی اس کا لباس اختیار کرتا ہے جس سے محبت ہو اور آدمی کبھی بھی اپنے دشمن کا لباس نہیں پہنتا۔ اور جب آدمی نام رکھے گا تو ان لوگوں کے نام رکھے گا جن کے ساتھ محبت ہے اور اس کی شکل بنائے گا جس سے پیار و محبت ہے۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) [سنن ابی داود، رقم: ۴۰۳۱، باب: في لُبْسِ الشُّهْرَةِ]

"جو آدمی کسی قوم کی شکل اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس کے ساتھ شامل کر دیتے ہیں۔"

اس لیے اسلام اس لباس سے منع کرتا ہے جو کفر کا شعار بن چکا ہے۔ اگر کوئی اس کو اختیار کرے تو یہ شریعت میں حرام ہے۔ اگر ہمیں اسلام اور اہل بیت سے محبت ہے تو ہمارے لباس میں بھی وہی جھلک نظر آئے اور ہمارے کھانے میں، پینے میں، اٹھنے بیٹھنے میں اور معاملات میں اسلام کی جھلک نظر آئے تو ہم کہیں گے کہ مسلمان ہیں، لیکن آج لوگوں نے مسلمان کا معنی یہ سمجھ لیا ہے کہ جو کلمہ پڑھتا ہے وہ مسلمان ہے، اگرچہ اس کے سارے افعال کافروں کے ہوں۔ پھر تو کلمہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں منافقین بھی پڑھتے تھے اور ہر وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صدقے واری ہوتے تھے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے قسمیں کھا کر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرما دیا:

﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ①﴾ [المنافقون:۱]

''اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین (اس کہنے میں) جھوٹے ہیں۔''

انہوں نے زبان سے کلمہ پڑھا ہے اور ان کے اندر اسلام نہیں ہے۔

دین رسوم ورواج کا نام نہیں:

اور بعض لوگوں نے مذہب کو ایک مجموعہ رسومات بنالیا ہے۔ کسی نے محرم کے مہینے میں رسومات بنالیں کہ تم لوگ محرم میں ایسا کرلو تو تم پکے مومن ہو۔ ان کے مقابلہ پر ہمارے سنیوں نے کہا کہ ہم کیوں پیچھے رہ جائیں؟ انہوں نے کہا: بس سرکار سے محبت ہو، بارہ تاریخ کو جھنڈیاں لگالو، ستائیس رجب کو عمرہ کرلو، پندرہ شعبان کی رات کو جاگ لو اور اسی طرح گیارھویں شریف کا دودھ تقسیم کرلو، ہر بڑے بزرگ کا سال میں ایک مرتبہ عرس شریف کرلو، اگر کوئی مسلمان مرجائے تو تیسرے دن قل، سات جمعراتیں اور ایک چالیسواں کرلو تو پکے اہل سنت والجماعت ہو۔ نہ روزہ، نہ حج، نہ عبادات، نہ تلاوت، نہ دین اور بس یہ نشانیاں ہوں تو مسلمان ہیں اور اگر یہ نشانیاں نہیں ہیں تو مسلمان نہیں ہیں...... إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... یادرکھو! مسلمانوں کی نجات قرآن وسنت کی اتباع میں ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے غلام بن جاؤ جیسے صحابہ ؓ بن گئے تو پوری دنیا پر اسلام چھا گیا اور ہم حضور اکرم ﷺ کے راستے سے ہٹ گئے تو پوری دنیا میں ذلیل ہوگئے۔

﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ﴾ [آل عمران:۲۸]

''تم نے میری اس وحی پر عمل نہ کیا یعنی میرے حکم کے بعد بھی کافروں سے دوستی رکھی تو اللہ تبارک وتعالیٰ تم سے بری ہیں۔''

اور جس سے اللہ تعالیٰ دور ہوجائے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۤ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۤ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ①﴾ [الممتحنۃ:۱]

''اے ایمان والو! اگر تم میرے راستے میں جہاد کرنے کی خاطر اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (گھروں

سے) نکلے ہو تو میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو ایسا دوست مت بناؤ کہ ان کو محبت کے پیغام بھیجنے لگو، حالانکہ تمہارے پاس جو حق آیا ہے انہوں نے اس کو اتنا جھٹلایا ہے کہ وہ رسول ﷺ کو بھی اور تمہیں بھی صرف اس وجہ سے (مکے سے) باہر نکالتے رہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لائے ہو۔ تم ان سے خفیہ طور پر دوستی کی بات کرتے ہو، حالانکہ جو کچھ تم خفیہ طور پر کرتے ہو اور جو کچھ علانیہ کرتے ہو، میں اس سب کو پوری طرح جانتا ہے۔ اور تم میں سے کوئی بھی ایسا کرے، وہ راہِ راست سے بھٹک گیا۔''

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَتَّخِذُواْ ٱلۡكَٰفِرِينَ أَوۡلِيَآءَ مِن دُونِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَۚ أَتُرِيدُونَ أَن تَجۡعَلُواْ لِلَّهِ عَلَيۡكُمۡ سُلۡطَٰنٗا مُّبِينًا﴾ [النساء:۱۴۴]

''اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ کے پاس اپنے خلاف (یعنی اپنے مستحق عذاب ہونے کی) ایک کھلی کھلی وجہ پیدا کر دو؟''

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَتَّخِذُواْ ٱلۡيَهُودَ وَٱلنَّصَٰرَىٰٓ أَوۡلِيَآءَۘ بَعۡضُهُمۡ أَوۡلِيَآءُ بَعۡضٖۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمۡ فَإِنَّهُۥ مِنۡهُمۡۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهۡدِي ٱلۡقَوۡمَ ٱلظَّٰلِمِينَ﴾ [المائدۃ:۵۱]

''اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو یار و مددگار نہ بناؤ۔ یہ خود ہی ایک دوسرے کے یار و مددگار ہیں۔ اور تم میں سے جو شخص ان کی دوستی کا دم بھرے گا تو پھر وہ انہی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ بَعۡضُهُمۡ أَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍۚ إِلَّا تَفۡعَلُوهُ تَكُن فِتۡنَةٞ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَفَسَادٞ كَبِيرٞ﴾ [الانفال:۷۳]

''اور جن لوگوں نے کفر اپنا رکھا ہے وہ آپس میں ایک دوسرے کے والی وارث ہیں، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔''

ہاں! اگر کوئی مسلمان کافر ملک میں پھنس گیا ہے، وہ اپنی جان بچانے کے لیے اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے اندر ایمان ہو۔ یہ تقیہ کا معنی ہے۔

تقیہ کا معنی اور مواقع:

اور تقیہ کا معنی وہ نہیں جو ملنگوں نے بنا رکھا ہے کہ پورے دین کے نو حصے تقیے میں ہیں اور ایک حصہ اس سے باہر ہے۔ یہ عجیب قوم ہے ادھر تقیہ کا سبق دیتی ہے اور پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی ذکر کرتے ہیں۔ اگر تقیہ ضروری تھا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کیوں نہیں کیا؟ اور ہماری قوم بھی سیدھی سادھی ہے کہ دونوں باتیں کرتے رہو، یہ دونوں کو ماننے کے لیے تیار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو صراطِ مستقیم پر چلائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرمایا: ''لَيْسَ التَّقِيَّةُ بِالْعَمَلِ إِنَّمَا التَّقِيَّةُ بِاللِّسَانِ'' تقیہ کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ تم عمل بھی کافروں والے شروع کر دو، بلکہ تقیہ کا معنی ہے کہ وقتی طور پر زبان سے کوئی ایسی بات کہہ دی کہ جان بچ جائے۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو بادشاہ نے پکڑ لیا اور اس بادشاہ کا قاعدہ یہ تھا کہ اگر میاں بیوی ہیں تو اس کی بیوی کو پکڑ تا تھا اور اگر اس کو پتہ چلتا کہ اس کی بہن یا بیٹی ہے تو اس کو نہیں چھیڑتا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو پکڑنے لگے تو آپ نے اپنی بیوی سے فرمایا کہ اگر بادشاہ پوچھے کہ تم کون ہو تو کہہ دینا کہ میں ان کی بہن ہوں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کے نبی جھوٹ نہیں بولتے، لیکن چونکہ بحیثیت مسلمان ہونے کے آپس میں اخوت کا رشتہ تھا، اس لیے یہ فرمادیا۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ہجرت کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے جا رہے تھے اور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھا، تا کہ دشمنوں کو یہ پتا نہ چل سکے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جا رہے ہیں۔ اس لیے ہم نے درمیان میں فاصلہ رکھا ہوا تھا۔ اچانک میرے سامنے مکہ کا ایک کافر آ گیا، اس نے کہا: ''مَنْ هٰذَا الرَّجُلُ؟'' (یہ کون بندہ ہے جو آپ کے آگے جا رہا ہے؟) سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس وقت میرے لیے بڑا مشکل مسئلہ تھا کہ اگر میں بتا دوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جا رہے ہیں تو یہ کافر دشمن ہے اور یہ پورے مکہ میں مشہور کر دے گا اور میں جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ (کیونکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی زبان سے جھوٹ کیسے نکلتا؟) تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ ایک انسان ہے جو مجھے راستہ دکھا رہا ہے۔ اور ان کی بات بھی ٹھیک تھی؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا راستہ دکھا رہے ہیں تو ایسے حالات کے اندر زبان کے ساتھ ایسی بات کر لی جائے تو ٹھیک ہے۔

تقیہ کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ دین چھپا لیا جائے، بلکہ اس کو ظاہر کرنا ضروری ہے۔

امام ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

حضرت امام ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ ایک دن بغداد میں خطاب کر رہے تھے اور مجمع میں شیعہ سنی سب موجود تھے ایک آدمی نے حضرت سے سوال پوچھ لیا کہ آپ کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا حضرت علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں؟ اس آدمی کا مقصد لڑوانا تھا کہ اگر کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ افضل ہیں تو شیعہ بھاگ جائیں گے اور اگر آپ ان کو راضی رکھنے کے لیے وقتی طور پر کہہ دیتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں تو عقیدہ اہل سنت ختم ہوتا ہے اور اس نے یہ سوال عربی میں لکھا تھا تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''مَنْ كَانَ بِنْتُهٗ فِيْ بَيْتِهٖ فَهُوَ اَفْضَلُ'' (جس کی لڑکی جس کے گھر میں ہے وہ افضل ہے)۔ اور فوراً منبر سے نیچے اتر آئے۔ اس طرح بات ختم ہوگئی۔ کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی لڑکی بھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تھی تو وہ افضل ہوئے، یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑکی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں تھی تو وہ افضل ہوئے۔ ضمیر دونوں طرف راجع ہو سکتی تھی۔ اس کو تقیہ کہتے ہیں کہ آدمی نے فتنے سے بچنا ہے تو آدمی ایسی بات کہہ سکتا ہے۔

اس میں اسلام نے گنجائش رکھی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ سنیوں کے ساتھ کھڑے ہوں تو سنی بن جاؤ، شیعہ کے ساتھ کھڑے ہو تو شیعہ بن جاؤ اور کوئی قادیانی مل جائے تو قادیانی بن جاؤ۔

﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًاۢ بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝﴾ [آل عمران: ۳۰]

قیامت والے دن جو کچھ ہم نے دنیا میں کیا ہے ہمارے اعمال نامے ہاتھ میں دے دیئے جائیں گے اور حکم دیا جائے گا: اے میرے بندے! آج اپنا اعمال نامہ خود پڑھ لو اور دیکھ لو کہ دنیا میں تم نے کیا کیا تھا، چھوٹے سے چھوٹا عمل اور بڑے سے بڑا عمل لکھے ہوئے موجود ہوں گے۔ اللہ پاک اس دن سب بندوں کو خبر دیں گے کہ کیا تم نے آگے بھیجا اور کیا پیچھے رکھا؟ جب بندہ اپنے اچھے اعمال دیکھے گا تو خوشی محسوس کرے گا اور جب اپنے برے اعمال دیکھے گا تو اس کو تکلیف ہوگی۔ اب وہ چاہے گا کہ کاش! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ان گناہوں سے بری ہو جاتا۔ میرے اور ان گناہوں کے درمیان میں اتنا فاصلہ ہوتا کہ کبھی دنیا میں یہ گناہ نہ کرتا، لیکن اس وقت کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ قرآن پاک میں ہے کہ دنیا میں جو ساتھ تھا، جو برائیاں کرواتا تھا قیامت والے دن بندہ اس

شیطان کو کہے گا: ﴿يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ﴾ [الزخرف: ۳۸] (ہائے کاش! تیرے اور میرے درمیان مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہوتا، تو کتنا برا دوست ہے کہ مجھے آج جہنم میں پہنچا دیا ہے)۔

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ (اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے ڈراتے ہیں)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو امید بھی دلائی، تاکہ میرے بندے بالکل ناامید نہ ہو جائیں۔ فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ [آل عمران: ۳۰] (اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے)۔ لاکھوں گناہوں کے ساتھ ساری زندگی کفر و شرک اور بدعات میں گزر جائے ایک منٹ کے لیے سجدے میں گر کر توبہ کر لو تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اللہ کا اپنی ذات سے ڈرانا بھی رحمت ہے:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ یہ بھی رحمت ہے کہ اللہ پاک اپنی ذات سے ڈرا رہے ہیں اور ان کی اپنی ذات تو رحمان، رحیم ہے۔ اصل میں اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ میرے بندے صراطِ مستقیم پر آئیں، سیدھے راستے پر رہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو کتاب و سنت کی اتباع نصیب فرمائے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نصیب فرمائے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت نصیب فرمائے۔ ہمارے ظاہری، باطنی گناہ، پریشانیاں سب اپنی رحمت سے دور فرمائے۔

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۳۱، ۳۲]

"(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خاطر تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، پھر بھی اگر منہ موڑو گے تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔"

اللہ سے محبت کا معیار:

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر زور دیا ہے اور ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران:۳۱] ۔

''اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تمہیں محبوب رکھیں تو میری اتباع کرو۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک اصول بیان فرمادیا کہ میرے مدنی! یہ جو کبھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں، کبھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اولادِ یعقوب ہیں اور کبھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ تیری اولاد کو جہنم میں نہیں ڈالوں گا اور اگر عذاب دوں گا تو ان کو چند دنوں کے لیے عذاب دوں گا، یہ سارے دعوے جھوٹے ہیں۔ ان کو آپ کھل کر بیان کر دیں کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو اور تمہارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں تو اس محبت کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری اتباع کرو اور میرے طریقے پر چلو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا محبوب بنالیں گے۔

یاد رکھیں! مسلمان پر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی محبت ضروری ہے، لیکن دونوں کی محبت میں فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت یہ ہے کہ بندگی اور عبادت صرف اللہ کی ہو جیسا کہ فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ ۗ﴾
[البقرۃ:۱۶۵]

''(میرے مدنی!) بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا غیروں کو شریک بنایا ہوا ہے اور ان سے اسی طرح محبت کرتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہیے، لیکن جو صحیح معنوں میں مومن ہیں وہ سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں (اس کے برابر وہ کسی کے ساتھ محبت نہیں کرتے)۔''

ایک ہے اللہ تعالیٰ پر اور اس کی جمیع صفات پر ایمان لانا اور دوسرا نمبر ہے کہ اللہ کی ذات سے محبت کرنا کہ خالص عبادت اللہ تعالیٰ کی کرے اور اس میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اور دوسرے درجہ میں اللہ کے انبیاء علیہم السلام سے محبت ہے۔ اور محبت امتی ہونے کی اور اطاعت کرنے کی ہے۔

غیر اللہ کی عبادت شرک ہے:

بعض لوگوں کو شبہ لگتا ہے کہ ﴿أَنْدَادًا﴾ سے مراد بت ہیں۔ یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کی عبادت کرنا یا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر سے وہی بندگی، وہی تعظیم، وہی عبادت اور اسی طرح کی عقیدت مندی اختیار کرنا جو اللہ کے لیے کی جاتی ہے شرک ہے۔ اب چاہے اللہ کے سوا بتوں کی عبادت کرو تو شرک ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا چاہے چاند،

سورج کی پوجا کرو تب بھی شرک ہے، اللہ کے سوا حیوانات میں کسی حیوان کی عبادت کرو تب بھی شرک ہے، اللہ تعالیٰ کے ماسوا ملائکہ کی عبادت کرو تب بھی شرک ہے، اللہ تعالیٰ کے ماسوا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام کی بندگی کرو تب بھی شرک ہے، اللہ تعالیٰ کے ماسوا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرو تب بھی شرک ہے، اللہ تعالیٰ کے ماسوا اولیاء اللہ کی عبادت کرو تب بھی شرک ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے صرف بت مراد نہیں ہوتے۔ قرآن مقدس کی بعض تفسیروں میں صرف بتوں کا ذکر اس لیے آتا ہے کہ جب قرآن نازل ہوا تھا تو مکہ کے لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے یا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں بھی لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔

لوگ بتوں کی پوجا کیوں کرتے ہیں؟

یادرکھیں! جو لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے یا آج کرتے ہیں وہ کوئی پاگل نہیں کہ پتھروں کی پوجا کریں، اپنے ہاتھوں سے دیوتا دیوی بنا کر اس کو خدا کا درجہ دیں ان کے دماغ میں بھی اصل کے اندر ان پتھروں کی عبادت نہیں، بلکہ ان کے ہاں تصور یہ ہے کہ یہ بت فلاں بزرگ کی شکل ہے، ورنہ وہ چھوٹے پتھروں کی پوجا نہ کرتے، بلکہ بڑے بڑے پہاڑوں کی پوجا کرتے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جب ہم ان کی پوجا کرتے ہیں تو اصل شکل والا ہم سے راضی ہوتا ہے۔ تو یہ شرک ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ماسوا جس کی عبادت کی جائے، اس کو مدد کے لیے پکارا جائے تو یہ بھی شرک ہے۔

اللہ سے محبت کا طریقہ:

ہم کیسے سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کیسے ہوگی؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے نہ ہماری ملاقات ہو سکتی ہے اور نہ بات ہو سکتی ہے اور نہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کو دیکھ سکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر ہمارے لیے آسانی فرما دی کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اور اس بات کی اتباع کرنی ہے کہ میرے مدنی اپنے امت کے سامنے اللہ تعالیٰ کی محبت کا نمونہ پیش کریں گے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا طریقہ پیش کریں گے اور تم میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل مکمل اتباع کرو، جیسے میرا مدنی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھے تم نماز پڑھو، جیسے میرا مدنی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کی تلاوت کرے تم بھی اسی طرح قرآن پاک کی تلاوت کرو، جیسے میرا مدنی صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھے تم بھی اسی طرح روزہ رکھو، جیسا میرا مدنی صلی اللہ علیہ وسلم حج کرے تم بھی اسی طرح حج کرو، جیسے میرا صلی اللہ علیہ وسلم مدنی زکوۃ کا حکم دے اسی طرح زکوۃ ادا کرو، جیسے میرا مدنی صلی اللہ علیہ وسلم لباس

میں حکم دے وہی لباس اختیار کرو، جیسا میرا مدنی ﷺ حکم دے تو کامل مکمل ہر طرح کی اتباع کرو اور جب تم میرے مدنی ﷺ کے غلام بن جاؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں محبوب بنالیں گے۔

ولایت کے مرتبہ پر پہنچنے والے کی اصل پہچان:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت نے ایک فیصلہ کر دیا اور اب اس میں کسی چوں چرا کی گنجائش نہیں ہے کہ ہر وہ شخص جو یہ دعویٰ کرے کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے محبت ہے اور وہ حضور پاک ﷺ کی سنت پر چلنے والا نہ ہو تو وہ جھوٹا ہے۔ اگر چہ کوئی لاکھ دعویٰ کرے کہ میں فلاں مقام پر پہنچا ہوا ہوں یا فلاں مرتبہ کو پہنچا ہوا ہوں اور وہ ہوا میں اڑ کر دکھا دے، آگ میں چل کر دکھا دے، پانی پر چل کر دکھا دے اور سینکڑوں استدراجات اس میں ظاہر ہو جائیں، لیکن اس کے اقوال، افعال اور اعمال میرے مدنی سرکار ﷺ کے طریقے پر نہیں ہیں تو وہ دجال تو ہو سکتا ہے، جادو گر، کاہن تو ہو سکتا ہے لیکن وہ متبع محمد ﷺ یا اللہ سے محبت کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی وہ بنیاد ہے جس کو ہم بھول گئے ہیں اور جس کی وجہ سے آج پوری دنیا بھٹک رہی ہے کہ ہر آدمی نے اپنی نفسانی خواہشات اور عقل و آرا کے مطابق نئے نئے طریقے پیدا کر لیے ہیں اور یہ امت صراط مستقیم سے ہٹ گئی۔ حالانکہ ہماری کامیابی کی کسوٹی اتباع محمد مصطفیٰ ﷺ میں ہے۔

یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ یہ بڑا مولوی ہے یا یہ بڑا پیر ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ کے طریقے پر چل رہا ہے تو کامیاب ہے اور اگر حضور اکرم ﷺ کے طریقے سے ہٹ گیا ہے تو ناکام ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی اتباع کا حکم صرف نماز روزہ کے لیے نہیں، بلکہ ہماری پوری زندگی پر حاوی ہے۔ مثلاً: ہم توحید کا وہی عقیدہ رکھیں گے جو حضور اکرم ﷺ نے ہمیں سمجھایا ہے، ہم اپنی عقل سے کوئی توحید نہیں بنائیں گے۔ ورنہ بہت سارے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کر دیا ہے۔ معتزلہ کی جماعت گزری ہے اس میں بڑے بڑے علماء گزرے ہیں، لیکن توحید کے مسئلہ میں بھٹک گئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کر دیا کہ یہ ماننے سے توحید میں گڑ بڑ ہوتی ہے کہ اللہ بھی سمیع ہے اور بندہ بھی سمیع ہے، اللہ بھی علیم ہے اور بندہ بھی علیم ہے۔ اگر یہ صفات اللہ تعالیٰ کے لیے ہوں اور بندوں کے لیے بھی ہوں تو توحید باقی نہ رہی، لہٰذا ہم ان صفات کو نہیں مانتے۔

ایمان کی حفاظت کے کلمات:

تو ان سارے مسائل کے اندر اصل کامیابی یہ تھی کہ حضور اکرم ﷺ کے طریقے پر آجاتے کہ آپ نے سمجھا دیا

کہ میرے اللہ کی وہ صفات جو قرآن میں ہیں یا وہ صفات جو میں نے اپنی زبان مبارک سے بتائی ہیں وہ برحق ہیں، ان کے اندر اپنی طرف سے کوئی زیادتی بھی نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات میں کوئی کمی بھی نہ کریں، بلکہ یہ عقیدہ رکھیں کہ "نُؤْمِنُ بِذَالِكَ وَنُؤْمِنُ بِجَمِيْعِ صِفَاتِهِ مَا أَثْبَتَهُ اللهُ فِي كِتَابِهِ وَعَلٰى لِسَانِ رَسُوْلِهٖ ﷺ" اللہ! ہمارا تیری ذات پر بھی ایمان ہے اور تیری ان تمام صفات پر بھی ایمان ہے جو تو نے اپنے قرآن میں بیان فرمائی ہیں یا جو تو نے حضور اکرم ﷺ کی زبان سے ہمیں سمجھائی ہیں ان پر ہمارا ایمان ہے۔

دوسری بات یہ یاد رکھ لیں کہ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثل ہے، اسی طرح اس کی صفات بھی بے مثال ہیں؛ کیونکہ جب موصوف بے مثل ہوگا تو صفت خود بخود بے مثل ہوگی۔

اس طرح ہم گمراہی سے بچ جاتے ہیں، ورنہ صرف ایمان کی تعریف کے اندر لاکھوں لوگ گمراہ ہو گئے اور ان فرق ضالہ میں داخل ہو گئے۔ آج مغرب کا پڑھا لکھا نوجوان مسلمانوں کو چیلنج کرتا ہے کہ چودہ سو سال ہو گئے، لیکن تمہارے ہاں تو ایمان کی تعریف مکمل نہیں ہو سکی ہے اور تم تو ابھی تک نماز میں بھی لڑ رہے ہو؟ ورنہ اسلام کامل مکمل ضابطہ حیات ہے، اس میں کوئی نقص نہیں ہے اور نہ نقص نکلا ہے اور نہ قیامت تک نقص نکلے گا، بلکہ جتنا علم بڑھ رہا ہے اسلام کے دعووں کی تصدیق ہو رہی ہے۔ اب دشمن کو بھی ماننا پڑا ہے کہ ہم نے کئی صدیوں کے بعد جو راز کھولے ہیں وہ قرآن پاک نے چودہ سو سال پہلے بتا دیئے تھے۔

ایک انگریز کے مسلمان ہونے کی وجہ:

زراعت کا ایک بہت بڑا انگریز افسر ہے، جس نے اس پر بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ وہ صرف اس ایک بات پر مسلمان ہو گیا کہ ہم جب جدید تحقیق میں پہنچے کہ دانوں کے اندر جو ترتیب ہوتی ہے اور جو مادہ ان کو جوڑتا ہے گچھا بناتا ہے اس کو کلوروفل کہتے ہیں۔ ایک دن مولوی صاحب قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ اس نے آیت کی تلاوت کی:

﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ﴾ [الانعام:۹۹]

میں نے نہ سمجھا اور اس مولوی صاحب سے کہا: اس کا ترجمہ مجھے بتاؤ۔ تو اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ایک سبز مادہ ہوتا ہے جس سے ہم ان دانوں کو جوڑتے ہیں۔ تو مجھے اسی وقت سمجھ آگئی کہ قرآن سچا ہے! کیونکہ چودہ سو سال پہلے تو کوئی ایگریکلچر یونیورسٹی نہیں تھی، کوئی زرعی فارم اور آلات نہیں تھے، لہٰذا لازمی بات ہے کہ نبی ﷺ کو یہ خبر خدا نے دی ہے اور نبی سچا ہے! کیونکہ ہم نے چودہ سو سال بعد اس مادے کو ڈھونڈا ہے اور قرآن پہلے سے بتا رہا ہے۔

کائنات میں تخلیق کا ایک راز:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنا دیئے ہیں۔ ہمارا اس پر ایمان ہے۔

جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جس طرح انسانوں کے جوڑے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پھولوں میں بھی جوڑے بنائے، جمادات میں بھی جوڑے بنائے اور سب اجناس کے جوڑے ہیں۔ اب آپ نے پھول کے پودے لگائے، ایک کو ایک کنارے پر لگایا اور دوسرے کو دوسرے کنارے پر لگایا، جیسا کہ آج کل مشہور ہے کہ رات کی رانی رات کو خوشبو دیتی ہے، اگر اس کے ساتھ دن کا راجہ لگا دیں تو وہ بہت خوشبو دے گی۔ بہر حال! جو میں نے نام سنے ہیں...... واللہ علم! ...... لیکن لوگ اس طرح کہتے ہیں۔ تو جب ہم نے ایک بوٹی ادھر لگا دی اور دوسری بوٹی ادھر لگا دی اور ہم نے ان کا جوڑا توڑ دیا، جب یہ ملتا نہیں تو آگے کیسے پھلے گا؟ تو جدید تحقیق یہ ہے کہ جب ہوائیں چلتی ہیں تو اس کا بیج اٹھا کر ادھر ڈال دیتی ہیں اور ادھر والا بیج ادھر ڈال دیتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے چودہ سو سال پہلے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ فرمایا: ﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ﴾ [الحجر: ۲۲] (ہم نے ایسی ہوائیں بھیجی ہیں جو حمل ٹھہرانے والی ہیں)۔

ہواؤں کی اقسام:

آٹھ قسم کی ہوائیں ہیں: چار رحمت کی ہوتی ہیں اور چار عذاب کی ہوتی ہیں۔ اس لیے یاد رکھیں! اسلام مکمل ہے۔ باقی دشمنوں کے یہ اعتراضات کہ نماز پر اتفاق نہیں ہے، سنتوں پر جھگڑا ہے۔ اگر ہم تعصب کی عینک کو اتار کر دیکھیں تو یہ جھگڑے نہیں، بلکہ رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کے ہر عمل کو قیامت تک کے لیے زندہ رکھا ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب تم حضور اکرم ﷺ کی اتباع کرو گے تو تمہیں وہ نعمت تو ملے گی ہی جو تم چاہ رہے ہو، ساتھ ہی اس سے بھی بڑی نعمت ملے گی۔ کیونکہ تم چاہ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو محبوب بنائیں، لیکن حضور

اکرم ﷺ کی غلامی سے اللہ تعالیٰ تمہیں محبوب بنالیں گے۔

ایک تفسیری نکتہ:

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بعض بڑے بڑے علماء نے فرمایا: یہ تو کوئی مقام نہیں کہ تم کسی سے محبت کرو، بلکہ اصل بڑا مقام یہ ہے کہ وہ تم سے محبت کرے۔ علماء کرام نے فرمایا: قرآن پاک میں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان کو بیان کیا کہ جب اپنے جھولے میں تھے، دودھ پینے کی عمر میں تھے اس وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کلام کیا: ﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ ۟ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝﴾ [مریم: ۳۰] (کہا: میں بندہ ہوں اللہ کا، مجھ کو اس نے کتاب دی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا)۔

علماء نے فرمایا کہ ان کے مقابلے پر میرے مدنی ﷺ کی شان دیکھیں کہ اللہ خود فرماتے ہیں: ﴿وَأَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ﴾ [الجن: ۱۹] (اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کی عبادت کرنے کے لیے کھڑا ہوا)۔ یعنی اللہ نے فرمایا کہ محمد (ﷺ) میرے بندے ہیں، جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود کہہ رہے ہیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک آدمی کہے کہ میں بادشاہ کا ملازم ہوں تو آپ سمجھیں گے کہ واقعی! اس کی بڑی شان ہے، لیکن اس بندے کی کتنی شان ہے کہ جس کے بارے میں بادشاہ کہے کہ یہ میرا ملازم ہے۔ تو دونوں میں بڑا فرق ہے۔

اس لیے علماء نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک نے فرمایا: ﴿وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ أَمُوْتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ۝﴾ [مریم: ۳۳] (اور اللہ کی طرف سے سلامتی ہے مجھ پر اس دن بھی جب میں پیدا ہوا، اور اس دن بھی جس دن میں مروں گا، اور اس دن بھی جب مجھے دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا)۔

اور ایک نبی وہ ہیں جن کے بارے میں خود اللہ نے فرمایا: ﴿وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝﴾ [مریم: ۱۵] (اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام ہے ان پر اس دن بھی جس روز وہ پیدا ہوئے، اس دن بھی جس روز انہیں موت آئے گی، اور اس دن بھی جس روز انہیں زندہ کر کے دوبارہ اٹھایا جائے گا)۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا: دعا فرمائیں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ بھی تو نبی ہیں اور آپ پر خود اللہ تعالیٰ نے سلام بھیجا ہے۔

یاد رکھیں! یہ مقام حضور اکرم ﷺ کی اتباع سے ملے گا اور اللہ تعالیٰ نے اسی مقام پر صحابہ کو کھڑا کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے میرے صحابہ کا دامن پکڑ لیا اس نے گویا میرا دامن پکڑ لیا اور جو میرے صحابہ کی سنت پر چلا گویا کہ وہ میری سنت پر چلا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ سارا مقام حضور اکرم ﷺ کی غلامی سے ملا ہے۔ آج بھی اگر کوئی مراتب ولایت پر پہنچ سکتا ہے اور "عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ" میں شمار ہو سکتا ہے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ اتباع رسول اللہ ﷺ ہے۔

اللہ کی محبت کا امتحان:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور بعض سلف سے منقول ہے کہ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے امتحان کے لیے یہ آیت نازل کر دی کہ تم اتباع کر کے دکھاؤ تو تم اپنے دعویٰ کے اندر سچے ہو، ورنہ فقط زبان سے دعویٰ کرنا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ اس لیے علماء نے لکھا کہ جو آدمی دعویٰ کرے کہ مجھے حضور اکرم ﷺ سے محبت ہے اور پھر حضور اکرم ﷺ کی سنت کا مخالف ہو تو اس سے بڑا جھوٹا دنیا میں کوئی نہیں کہ دعویٰ حضور پاک ﷺ کی محبت کا ہو اور بدعات والے عمل کرے۔[1]

(حدیث) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: "وَهَلِ الدِّيْنُ إِلَّا الْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ" (دین کیا ہے؟ دین اس چیز کا نام ہے کہ تم کسی سے محبت کرو تو اللہ تعالیٰ کے لیے کرو اور کسی کے ساتھ بغض کرو تو اللہ تعالیٰ کے لیے کرو)۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس آدمی نے کسی کو اللہ کے لیے ہدیہ دیا، اللہ کے لیے محبت کی، کسی سے بغض اللہ کے لیے رکھا اور اللہ کے لیے کسی سے ہاتھ روکا تو سمجھ لو کہ اس کا ایمان مکمل ہو گیا۔

[ابوداود، رقم: ۴۶۸۱]

"اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ" کی مثال:

تاریخ کے اندر واقعہ آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک بہت بڑے دشمن کے ساتھ لڑائی لڑ رہے تھے۔ آپ دشمن کو گرا کر اس کے سینے پر بیٹھ گئے تو اس دشمن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھوک دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً نیچے اتر گئے۔ اس دشمن نے کہا: عجیب بات ہے کہ آپ نے مجھے گرایا ہوا تھا اور میں نے آپ کے چہرے پر تھوک دیا تھا تو آپ

[1] [حلیۃ الاولیاء، تفسیر ابن کثیر]

مجھے مارتے، لیکن آپ نے مجھے چھوڑ دیا؟ فرمایا: پہلے میں نے تجھے اللہ کے لیے گرایا تھا، جب تم نے میرے چہرے پر تھوک پھینکا تو مجھے غصہ آگیا کہ اس نے میری توہین کی ہے۔ اب اگر میں تجھے مارتا تو اپنے غصے کے لیے مارتا، اللہ کے لیے نہ مارتا، اس لیے تجھے چھوڑ دیا۔ یہ ہے ''اَلْحُبُّ فِي اللهِ وَالْبُغْضُ فِي اللهِ'' کہ کسی سے محبت کرو تو خالص اللہ کے لیے کرو اور اگر کسی سے بغض ہے تو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ آج یہ باتیں ختم ہوگئی ہیں اور ہر آدمی کو پارٹی کی فکر ہے، اگرچہ قیادت کافر ہو۔ اس وجہ سے آج دنیا کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ آج ہماری محبت بھی دنیاوی فائدے کے لیے ہے اور بغض بھی دنیاوی فائدے کے لیے ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۭ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝﴾ [آل عمران: ۳۳تا۳۶]

''اللہ نے آدم، نوح اور ابراہیم علیہ السلام کے خاندان، اور عمران علیہ السلام کے خاندان کو چن کر تمام جہانوں پر فضیلت دی تھی۔ یہ ایسی نسل تھی جس کے افراد (نیکی اور اخلاص میں) ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ اور اللہ (ہر ایک کی بات) سننے والا ہے، ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ (چنانچہ اللہ کے دعا سننے کا وہ واقعہ یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے کہا تھا: یا رب! میں نے نذر مانی ہے کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے میں اسے ہر کام سے آزاد کر کے تیرے لیے وقف رکھوں گی۔ میری اس نذر کو قبول فرما۔ بے شک تو سننے والا ہے، ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ پھر جب ان سے لڑکی پیدا ہوئی تو وہ (حسرت سے) کہنے لگیں: یا رب! یہ تو مجھ سے لڑکی پیدا ہوگئی ہے۔ حالانکہ اللہ کو خوب علم تھا کہ ان کے یہاں کیا پیدا ہوا ہے۔ اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا، میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے حفاظت کے لیے آپ کی پناہ میں دیتی ہوں۔''

ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور رسل علیہم السلام کے بارے میں اجمالی اور بعض تفصیلی واقعات ذکر فرمائے ہیں۔ اس میں ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ یہ فیصلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کا نہیں ہے، بلکہ سنت اللہ ہے کہ حضرت

آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک جو میرے پیغمبروں کی اطاعت کریں گے وہ میرے محبوب بنیں گے اور جو میری اور میرے نبیوں کی فرمانبرداری نہیں کریں گے اور اعراض کریں گے تو وہ کافر ہوں گے۔

اللہ کے حکم کا منکر کافر ہو جاتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ﴾ (اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو چن لیا)۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اتنی عظمت دی کہ اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا، انہیں مسجودِ ملائکہ بنایا، اللہ تعالیٰ نے سب فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا اور جس نے سجدہ نہیں کیا اس کو شیطان مردود بنا دیا۔ اس کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کا حکم نہ مانا اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا۔

علماء کرام نے لکھا ہے کہ اس سے ہمیں اندازہ کرنا چاہیے کہ وہ جو عبادت میں اتنے اونچے درجے پر پہنچا ہوا تھا اور ملائکہ کے ساتھ آسمانوں میں رہتا تھا، لیکن اس نے اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کا انکار کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدے کا انکار کر دیا اس کو اتنی بڑی سزا ملی کہ وہ قیامت تک ملعون و مردود بن گیا اور اگر ہم اللہ تعالیٰ کے حکم پر اللہ تعالیٰ کے سجدے کا انکار کریں تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟

﴿اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوْحًا﴾ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر آیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے رسول اور نبی حضرت نوح علیہ السلام کو بنا کر بھیجا گیا۔ یعنی شریعت کی ابتداء حضرت نوح علیہ السلام سے ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اتنی طویل عمر عطا فرمائی کہ ساڑھے نو سو سال دعوت وتبلیغ کی مدت ہے، چالیس سال کے بعد نبوت ملی، ساڑھے نو سو سال تک دعوت دی، قوم نے انحراف کیا تو ان کے خلاف بددعا کی تو اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو غرق کر دیا۔ اس کے بعد بھی حضرت نوح علیہ السلام پچاس یا ساٹھ سال زندہ رہے، لہٰذا آپ کی عمر تقریباً ایک ہزار پچاس سال ہے۔

آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴾ [آل عمران: ۳۳] حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آلِ ابراہیم کا ذکر کیا؛ کیونکہ آپ کی ذریت میں اللہ تعالیٰ نے نبوت رکھی جو آپ کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی اولاد میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں انبیاء بھیجے وہ سب آلِ ابراہیم میں سے ہیں۔ اسی طرح

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر علیہ السلام کو بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں بھیجا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ولد اسماعیل ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ تو آلِ ابراہیم میں سارے انبیاء بنی اسرائیل بھی اجمالی طور پر آگئے اور میرے مدنی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی آگیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آلِ عمران کا ذکر فرمایا۔ اگر آپ غور کریں تو تقریباً تمام انبیاء علیہم السلام کا اجمالاً ذکر اس میں آگیا؛ کیونکہ سب کے ابا حضرت آدم علیہ السلام ہیں، جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ'' ([میں بھی آدم علیہ السلام کا بیٹا ہوں، لیکن] آدم علیہ السلام کی سب اولاد کا مجھے سردار بنایا گیا ہے)۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا سلسلہ چلا۔ اس لیے جہاں حضرت نوح علیہ السلام کو اوّل رسول کا لقب ملتا ہے وہاں ان کو آدم ثانی کا بھی لقب ملتا ہے۔ آپ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تین بیٹے دیے: حام، سام اور یافث۔ اور پھر ان سے ہی آگے نسل چلی۔

آلِ عمران کا مصداق:

آیت کریمہ میں آلِ عمران کے اندر عمران سے مراد کون ہیں؟ کتب سابقہ کے اعتبار سے عمران دو ہیں: ایک تو عمران بن یاشم ہیں۔ یہ وہ عمران ہیں جن سے بی بی مریم پیدا ہوئیں اور بی بی مریم علیہا السلام سے اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ اور ایک عمران گزرے ہیں ان کا نام عمران بن قاہث ہے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے والد ہیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام عمر میں بڑے ہیں اور مرتبے میں چھوٹے ہیں۔ اس جگہ آلِ عمران سے مراد وہ ہیں جن کا تعلق بی بی مریم علیہا السلام کے ساتھ ہے؛ کیونکہ اگلی آیات میں بی بی مریم علیہا السلام کا ذکر ہے اور پچھلی آیات میں نصرانیوں کا رد ہے۔ لہٰذا سیاق وسباق کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں عمران سے مراد عمران بن یاشم ہیں۔

''اِصْطَفٰی'' کا معنی وتفسیر:

﴿اِصْطَفٰی﴾ کا معنی ہے چن لیا۔ جب آدمی کسی چیز کو چنتا ہے، مثلاً: آپ نے کوئی لباس چن لیا یا مکان چن لیا، لیکن انسانوں کے چننے میں اور اللہ تعالیٰ کے چننے میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ انسان کے چناؤ میں کوئی نہ کوئی غلطی ہوسکتی ہے۔ آپ نے ایک آدمی کے بارے میں سمجھا تھا کہ یہ آدمی بہت اچھا ہے، عالم ہے، ایمان والا ہے، دین والا ہے، لیکن کوئی نہ کوئی غلطی نکل آئی۔ انسان چونکہ ناقص العلم ہے، اس کے چننے میں اور اللہ تعالیٰ کے چننے

میں آسمان وزمیں کا بڑا فرق ہے۔

قادیانیوں کے ایک شبہ کا جواب:

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خاتم النبیین کا لقب عطا فرمایا۔ بعض بد بخت لوگوں کے ذہن میں یہ ڈالتے ہیں کہ مولویوں نے فلاں عالم کا لقب خاتم المفسرین لکھا ہے اور فلاں عالم کا لقب خاتم المحدثین لکھا ہے۔ تو اس کا کیا مطلب ہے کہ اس کے بعد مفسر نہیں اور اس محدث کے بعد محدث نہیں آئے گا؟ حالانکہ مفسر اور محدث ان کے بعد بھی آتے ہیں، لہٰذا یہ تو ایک عظمت اور شان ہوتی ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خاتم النبیین فرمایا ہے۔ تو اب عام آدمی ان کی ان چالبازیوں کو نہیں سمجھ سکتا اور وہ بے چارہ گھبرا جاتا ہے، حالانکہ دونوں میں آسمان وزمیں کا فرق ہے کہ ایک کو ہم نے خاتم المحدثین، خاتم المفسرین کہا ہے اور ادھر اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خاتم النبیین فرمایا ہے۔ تو ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے کہنے میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تو علم میں ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

آسمانی مذاہب کو ماننے والے انبیاء علیہم السلام کو بھی مانتے ہیں:

صرف ان انبیاء علیہم السلام کا ذکر اس لیے آیا، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو سب مانتے ہیں، مسلمان بھی مانتے ہیں اور سوائے منکرین خدا کے اور لوگ جو ایمان نہیں لے آئے وہ بھی مانتے ہیں۔ اسی طرح سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی عظیم شخصیت ہیں کہ ان کو بھی سب مانتے ہیں، مکہ کے مشرک اور کافر بھی دعویٰ کرتے تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں اور ہم ان کے بنائے ہوئے کعبہ کے مجاور ہیں۔ یہودی بھی دعویٰ کرتے تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں اور ہم ملتِ ابراہیمی پر ہیں اور نصرانیوں کا دعویٰ تھا کہ ہم بھی دینِ ابراہیمی پر ہیں۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٣٦﴾﴾

[آل عمران: ۳۵، ۳۶]

حضرت عمران کی بیوی حنہ کی منت کا واقعہ:

حضرت عمران کی اہلیہ کا نام حنہ بنت فاقوذ تھا، ان کی اولاد نہیں ہوتی تھی، وہ پریشان تھیں۔ ایک دن دیکھا کہ درخت کے اوپر ایک پرندہ بیٹھا ہے اور وہ اپنی چونچ سے اپنے بچے کو غذا کھلا رہا ہے۔ بی بی رو پڑیں اور کہنے لگیں کہ اے میرے مولا! ایک پرندہ بھی اپنے بچوں کے ساتھ خوشیاں منا رہا ہے، میں بھی تو تیری بندی ہوں، میرے دل میں بھی ایک تمنا ہے۔ مہربانی کر اور مجھے اولاد عطا فرما۔ اور میں تیری منت مانتی ہوں کہ جب تو مجھے لڑکا دے گا تو (میں اس کو تاجر یا بزنس مین نہیں بناؤں گی) میں اس کو تیرے گھر بیت المقدس کے لیے وقف کر دوں گی۔

اس سے ایک مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی منت ماننا جائز ہے کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو یہ کروں گا۔ ایسی منت ماننا جائز ہے، ضروری نہیں ہے۔ اگر منت مانی جائے اور وہ کسی خیر کے کام کی ہو تو اس کو پورا کرنا واجب ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: منت نہ ہی کسی چیز کو مقدم کر سکتی ہے اور نہ ہی موخر کر سکتی ہے، منت کے ذریعے تو بخیل سے مال نکالا جاتا ہے۔ [صحیح بخاری، رقم: ۶۶۹۲]

لوگ منت مان کر اپنے ذمہ خود چیزیں لگا لیتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے وہ ان کے ذمہ نہیں لگائی۔

اولیاء کی شان میں مبالغہ آرائی:

﴿رَبِّ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لَکَ مَا فِیۡ بَطۡنِیۡ﴾ اس سے معلوم ہوا کہ اتنی شان والی بی بی ہے، لیکن ان کو پتا نہیں کہ میرے پیٹ میں کیا ہے؟ اور ہمارے ہاں تو یہ عقیدے بنے ہوئے ہیں کہ کوئی نطفہ ماں کے پیٹ میں قرار نہیں پکڑتا، مگر ہمارا پیر اس کو جانتا ہے۔

﴿اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ۳۵﴾ [ال عمران: ۳۵] (اے اللہ! بے شک تو سننے والا اور جاننے والا ہے)۔ یعنی میں دل سے نیت کرتی ہوں۔

﴿فَلَمَّا وَضَعَتۡهَا قَالَتۡ رَبِّ اِنِّیۡ وَضَعۡتُهَاۤ اُنۡثٰی ؕ﴾ (جب بچی پیدا ہوئی تو عرض کیا: میرے مولا! تیری شان ہے کہ تو نے مجھے بچہ نہیں، بلکہ بچی دی ہے)۔ ﴿وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡ ؕ﴾ (حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے تھے)۔

لیکن بی بی اپنی بات کہہ رہی تھیں کہ میں نے منت مانی تھی کہ تو لڑکا دے گا تو تیرے گھر کا خادم بناؤں گی۔ خادم تو لڑکوں کو بنایا جاتا ہے، لڑکیوں کو تو نہیں بنایا جاتا۔ ﴿وَلَیۡسَ الذَّکَرُ کَالۡاُنۡثٰی ۚ﴾ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم

نے جوان کو لڑکی دی تھی اس کے مقابلے میں لڑکا تو اس جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔

مریم کا معنی:

﴿وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ﴾ مریم کا معنی ہے عبادت کرنے والی، عابدہ، زاہدہ۔ یہ ایک تفاؤل ہوتا ہے کہ بندہ اچھے نام رکھے، لیکن آج کل تو یہ روایت بھی بدل گئی ہے اور مسلمان لوگ بھی ماڈرن قسم کے نام رکھتے ہیں۔ کوئی روزی رکھتا ہے تو کوئی فوزی رکھتا ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کے دعائیہ کلمات:

﴿وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۞﴾

"اے میرے اللہ! میں اس بی بی کو بھی اور آگے اس کی اولاد کو بھی تیری پناہ میں دیتی ہوں، انہیں شیطان کے حملے سے بچانا۔"

میرے اللہ! میری بیٹی کی عزت کی حفاظت کرنا، آگے جو اس کی نسل بنائے اس کی بھی حفاظت فرما۔ پہلے والی مائیں یہ دعا کیا کرتی تھیں اور اب مائیں جو دعائیں دیتی ہیں وہ تمہیں بھی پتا ہے اور مجھے بھی پتا ہے۔

حدیث:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ إِلَّا وَالشَّيْطَانُ يَمَسُّهُ حِيْنَ يُوْلَدُ، فَيَسْتَهِلُّ صَارِخًا مِنْ مَسِّ الشَّيْطَانِ إِيَّاهُ، إِلَّا مَرْيَمَ وَابْنَهَا)) [صحیح بخاری، رقم: ۴۵۴۸]

"جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ہر بچے کو شیطان مس کرتا ہے (چھیڑتا ہے) اور بچے روتے ہیں، چیختے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت عمران کی بیوی کی ایسی دعا قبول کی کہ اللہ تعالیٰ نے بی بی مریم علیہا السلام کو اور پھر بی بی مریم کی اولاد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شیطان کے مس سے بھی محفوظ رکھا۔ حالانکہ ہر بچے کو شیطان مس کرتا ہے۔"

یاد رکھیں! یہ جزوی فضیلت ہے، جو کلی فضیلت کے منافی نہیں ہے۔

لڑکی یا لڑکا جننے میں عورت کا کوئی دخل نہیں:

ان آیات مبارکہ سے علماء نے مسئلہ نکالا ہے کہ جس عورت سے پہلے لڑکی پیدا ہو تو وہ ماں بھی اور بیٹی بھی مبارک ہوتی

ہے، اس کو برا نہ سمجھیں۔ یہ تو کافروں کی رسم تھی کہ جب بچیاں پیدا ہوتی تھیں تو وہ غم کرتے تھے، اداس ہوتے تھے، منہ چھپاتے تھے اور چھپ چھپ کر رہتے تھے۔ لڑکا یا لڑکی دینا اللہ کا کام ہے۔ آج بھی مسلمانوں کے اندر بعض ایسے جاہل ہیں جو اپنی بیویوں سے لڑتے ہیں کہ ہر دفعہ لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ اب اگر لڑکی پیدا ہوئی تو میں تجھے طلاق دے دوں گا۔ حالانکہ لڑکا، لڑکی کا ہونا اس میں عورت کا کوئی دخل نہیں، بلکہ لڑکے یا لڑکی کا جرثومہ مرد کے اندر ہوتا ہے، عورت کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہوتا۔

عرب میں ایک بہت بڑی ادیبہ خاتون گزری ہیں، ان کے ہاں جب لڑکی پیدا ہوئی تو ان کا خاوند غصے میں آ گیا اور اپنی بچی کو دیکھنے کے لیے بھی نہ آیا۔ اس کی سہیلی ملنے کے لیے آئی اور کہا: تیرا خاوند ملنے کے لیے نہیں آیا؟ اس نے کہا: میری بچی پیدا ہوئی ہے، اس وجہ سے میرا خاوند ناراض ہے، حالانکہ وہ اتنا احمق ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ زمین کا کیا قصور ہے؟ جو بیج ڈالو گے وہی آئے گا۔

لہٰذا یہ لوگوں کی بہت بڑی جہالت ہے کہ اس عورت سے لڑکیاں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تو اللہ کا نظام ہے، وہ چاہے لڑکا دے، یا لڑکی دے، یا جوڑے دے، یا بانجھ کرے۔ وہ چاہے تو دینے کے بعد اولاد کو بھی نافرمان کر دے اور اگر چاہے تو فرماں بردار کر دے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا نظام ہے۔ اس میں بندے کا کام ہے: ''اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا'' کہ یا اللہ! تیرا نظام ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے۔

بچے کا نام کب رکھا جائے؟

بی بی مریم علیہا السلام کی والدہ نے کہا: ﴿وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ﴾ یا اللہ! میں اس نے بچی کا نام مریم رکھا ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے: علماء فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی اپنے بچے یا بچی کا نام اس دن رکھے جس دن وہ پیدا ہوا تو جائز ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سات دن کے بعد نام رکھے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج مجھے اللہ تعالیٰ نے بچہ عطا فرمایا ہے اور میں نے اپنے بیٹے کا نام اپنے ابا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام پر رکھا ہے۔ [بخاری، رقم: ۱۳۰۳]

اس سے علماء نے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ اپنے باپ، دادا اور بزرگوں کے نام پر اگر کوئی اپنی اولاد کے نام رکھے یہ بھی اچھی بات ہے کہ اس طرح ان کا سلسلۂ ذکر جاری رہے گا۔ کیونکہ باپ دادا کے مرنے کے بعد جب

بچے کا نام لیں گے تو ان کو وہ باپ دادا بھی یاد آئیں گے۔

بچے کی پیدائش پر سنت طریقہ کار:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بھائی پیدا ہوا تو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تحنیک فرمائی اور آپ نے اس کا نام عبداللہ رکھا۔ [بخاری، رقم: ۵۴۷۰]

"تحنیک" یہ بھی سنت ہے کہ آدمی کے ہاں جب بچہ پیدا ہو تو کسی بزرگ، کسی عالم اور کسی صالح آدمی سے اس کی تحنیک کروائیں۔ اور اسی طرح جب بچہ پیدا ہو تو اس کے ایک کان میں اذان کہی جائے اور دوسرے کان میں اقامت کہی جائے، تاکہ بچے کو پتا چل جائے ہم نے دنیا میں اتنی دیر رہنا ہے۔ اور تیسری چیز عقیقہ ہے کہ اگر لڑکا ہے تو ساتویں دن دو بکرے یا دو دنبے اور اگر لڑکی ہے تو ایک دنبہ یا ایک بکرا ذبح کر کے خیرات کر دی جائے۔ اور بچہ یا بچی کے سر پر استرا پھروا کر اس کے بال اتار کر وزن کر لیں، اس کے بقدر چاندی خیرات کر دیں۔ یہ چیزیں بھی سنت ہیں، جو ابتداء میں کی جاتی ہیں۔

(حدیث) صحیح بخاری میں ہے: ایک آدمی نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے آج بچہ دیا ہے، میں اس کا کیا نام تجویز کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا نام عبدالرحمٰن رکھو۔ [بخاری، رقم: ۶۱۸۶]

اور ایک روایت میں ہے کہ جب اس کا باپ اسے لے آیا، تاکہ اپنے بیٹے کو تحنیک کرائے تو بات بھول گئی۔ ان کو کہا گیا اور ان کی منزل کی طرف بھیجا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا نام منذر رکھو۔ [بخاری، رقم: ۶۱۹۱]

بچہ کا عقیقہ بھی کرانا چاہیے:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بچہ رہن رکھا ہوا ہے اپنے عقیقہ کی۔ یعنی اس کا عقیقہ کر کے اس کو چھڑاؤ اور اس کا نام بھی رکھا جائے اور اس کے سر پر استرا بھی پھیرا جائے اور اس کے سر پر خون لگایا جائے۔ اور ایک روایت میں آتا ہے کہ اس کا ختنہ بھی کر دیا جائے۔

[ابوداؤد، رقم: ۲۸۳۸]

بچے کا ختنہ جلدی کیا جائے۔ اس میں ماں باپ کے لیے بھی آرام ہے اور بچے کے لیے بھی سہولت ہے؛ کیونکہ

بچہ جب بڑا ہو گا تو زیادہ حرکت کرے گا اور اس سے اس کو تکلیف بھی زیادہ ہوگی۔

بچہ کی شیطان سے حفاظت:

﴿وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾ [آل عمران:۳۶]

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعا بی بی مریم کے پیدا ہونے کے بعد مانگی گئی؛ کیونکہ پہلے ذکر ہوا کہ اس کا نام مریم رکھتی ہوں، لیکن احادیث مبارکہ کی روشنی میں جو بات سمجھ آئی ہے وہ یہ ہے کہ جو بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو مس کرتا ہے، مگر بی بی مریم اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے اس مس سے محفوظ رکھا، لہٰذا اگر بی بی صاحبہ نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے پیدا ہونے کے بعد دعا کی تھی تو اس کا فائدہ حاصل نہیں ہوگا؛ کیونکہ فائدہ تب ہے کہ ولادت کے فوراً بعد شیطان کے مس سے محفوظ ہو۔

اس لیے علماء نے فرمایا: ہے کہ قرآن پاک میں دعا کا ذکر موخر ہے، لیکن حقیقتاً یہ دعا مقدم ہے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو شیطان ایک دفعہ یا دو دفعہ اس کو چھیڑتا ہے تو بچہ چیختا ہے اور روتا ہے، مگر بی بی مریم اور ان کے بیٹے کو شیطان نے نہیں چھیڑا۔[1]

علماء نے لکھا ہے: ہمارا سب سے خطرناک دشمن شیطان ہے؛ کیونکہ اگر آپ کو دشمن نظر آ جائے تو آپ بھی مقابلہ کریں گے۔ اگر مقابلہ نہ کر سکیں تو بھاگ جائیں گے، لیکن جو دشمن نظر نہ آئے وہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ تو شیطان ہمارا ایسا دشمن ہے جو ہمیں نظر نہیں آتا۔ قرآن وحدیث میں موجود ہے: ﴿اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ [الاعراف:۲۷] وہ (شیطان) اور اس کی اولاد تمہیں وہاں سے دیکھتے ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔

ہر بندے کے ساتھ ایک شیطان لگا ہوا ہے، لیکن ہمیں نظر نہیں آتا۔ ہاں! اگر شیطان اپنی شکل بدل لے تو پھر نظر آتا ہے۔ مثلاً: کبھی انسان کی شکل میں آ گیا، کبھی بکری بن گیا، کبھی چوہا بن گیا، کبھی بلی بن گیا اور کبھی سانپ بن گیا۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ غزوۂ بدر کے موقع پر شیطان نجدی سردار کی شکل میں ابوجہل کو ملا تھا۔

مختلف مواقع میں شیطان کے حملے سے بچنے کی دعائیں:

1 ...... شیطان ہمیں نظر نہیں آتا، اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جب تم حمام میں جاؤ تو کپڑے

---

[1] [صحیح بخاری، رقم:۴۵۴۸]

اتارنے سے پہلے اور داخل ہونے سے پہلے یہ دعا پڑھو: ((اَللّٰھُمَّ! إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ))[1] اور اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاؤ، ورنہ شیطان کھیلتا رہتا ہے۔ گو وہ ہمیں نظر نہیں آئے گا، لیکن جب یہ دعا پڑھ لی تو شیطان اندر نہیں آسکتا۔ اور اگر حمام میں داخل ہو گئے تو کپڑا اتارنے سے پہلے بھی یہ دعا پڑھ سکتے ہیں، لیکن دل میں پڑھیں۔

2 ......اسی طرح حضور پاک ﷺ نے فرمایا: انسان جب اپنی بیوی کے ساتھ لیٹتا ہے تو کپڑے اتارنے سے پہلے یہ دعا پڑھ لے: ((اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا))[2] (اے اللہ! ہم دونوں کو شیطان کے حملہ سے بچا اور جو ہمیں اولاد دے اس کو بھی شیطان کے حملے سے محفوظ فرما)۔

اگر میاں بیوی یہ دعا پڑھ لیں تو اولاد صالح پیدا ہوتی ہے، ورنہ شیطان کا حصہ بھی ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ شیطان باقاعدہ اس عمل میں بھی شرکت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو حرام میں لذت ملتی ہے اور حلال میں لذت نہیں ملتی؛ کیونکہ وہاں شیطان عمل جماع میں شرکت کرتا ہے۔ لیکن آج کل یہ دعا کون پڑھتا ہے؟ جو وی سی آر دیکھ کر بیوی کے ساتھ لیٹے وہ کہاں سے دعا پڑھے گا؟ جو خود شیطان بنے ہوئے ہیں، بلکہ شیطان ہاتھ باندھ کر بھاگ جاتا ہو گا کہ آپ تو میرے بھی استاذ ہیں اور میں آپ کے شاگردوں کے برابر بھی نہیں ہوں۔

بہرحال! جب دشمن نظر نہیں آتا ہے تو اس سے کیسے بچا جائے؟ تو علماء نے فرمایا کہ تم اس ذات کی پناہ پکڑ لو جسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے سکھایا گیا: ''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' یا اللہ! ہم تیرے نام سے پناہ پکڑتے ہیں۔ جب تم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاؤ گے تو شیطان کے حملے سے بچ جاؤ گے، ورنہ کوئی بندہ شیطان کے حملے سے نہیں بچ سکتا۔

ایک عالم کی احتیاط کا واقعہ:

ایک محدث گزرے ہیں، ان کی عمر تقریباً اسی سال سے زیادہ ہو گئی۔ جب کوئی عورت مسئلہ پوچھنے کے لیے آتی تو انہوں نے اپنے شاگردوں کو پابند کیا ہوا تھا کہ کوئی عورت بغیر پردے کے اندر نہ آئے اور جب کوئی عورت مسئلہ پوچھنے کے لیے اندر آئے تو دو طالب علم میرے ساتھ بیٹھے رہیں۔ ایک دن ایک طالب علم نے کہہ دیا کہ حضرت! آپ لکڑی کے سہارے اٹھتے ہیں، چل نہیں سکتے تو اس عمر میں عورت سے کیا ڈرتے ہیں؟ فرمانے لگے: ٹھیک ہے، میں بوڑھا ہو گیا ہوں

[1] [سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۹۶]
[2] [صحیح بخاری، رقم: ۱۴۱، راوی ابن عباس]

اور عمر کے اس حصے میں ہوں کہ مجھے کوئی خواہش نہیں ہے، لیکن شیطان دشمن ہے، کوئی حرکت نہ کرا دے اور میری آخرت خراب ہو جائے۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں پہلے احتیاط کراوں، تاکہ گناہ کا موقع ہی نہ ملے۔

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾

[آل عمران: ۳۷]

''چنانچہ اس کے رب نے اس (مریم) کو بطریقِ احسن قبول کیا اور اسے بہترین طریقے سے پروان چڑھایا۔ اور زکریا اس کے سرپرست بنے۔ جب بھی زکریا ان کے پاس ان کی عبادت گاہ میں جاتے، ان کے پاس کوئی رزق پاتے۔ انہوں نے پوچھا: مریم! تمہارے پاس یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟ وہ بولیں: اللہ کے پاس (جنت) سے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔''

عورت کا نام لینا اچھا نہیں:

ان آیات میں مقصود عیسائیت کا رد ہے، جو محبت میں ایسے گمراہ ہوئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہلے بیٹا بنایا اور پھر خدا بنا دیا۔ آپ سارے قرآن میں نظر ڈال لیں! اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہیں عورت کا نام نہیں لیا، چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا تھا اور ان کی نسبت بی بی مریم علیہا السلام کی طرف ہوتی تھی اس لیے ان کا نام لیا گیا، ورنہ شریعت کے اندر قاعدہ ہے کہ باپ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

قیامت میں بھی آدمی کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا:

بعض جاہلوں نے ایک پروپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ دنیا میں تو والد کے نام سے پکارا جائے گا، لیکن قیامت میں لوگوں کو ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا، تاکہ بی بی مریم علیہا السلام کو کوئی طعن محسوس نہ ہو، جبکہ دراصل یہ یہودیت کی سازش ہے، اس کا اسلام یا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ کیونکہ یہودی بی بی مریم علیہا السلام کو پاک نہیں سمجھتے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے نہیں مانتے۔ ان کے عقیدۂ باطلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام یوسف نجار کا بیٹا ہے...... نعوذ باللہ...... حضرت مریم علیہا السلام کے اس کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے، اس سے یہ بیٹا پیدا ہوا۔ بی بی نے اپنے اس گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے ڈرامہ رچایا۔ اس لیے یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی پر چڑھانے کی کوشش کی تو

یہ ان کی پھیلائی ہوئی بات ہے کہ قیامت میں ماں کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا۔ جبکہ قرآن پاک میں حکم ہے:

﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ﴾ [الاحزاب: ۵]

''ہر آدمی کو اس کے باپ کے نام کے ساتھ پکاریں۔''

عورت پردے کا ہی نام ہے:

نسب باپ سے چلتا ہے، ماں سے نہیں چلتا۔ لیکن چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا، اس لیے ان کی نسبت ماں کی طرف کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بھی ان کو عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام فرمایا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ عورت کا نام نہیں لیتے۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ جیسے عورت کے بدن کے لیے پردہ ہے اور جیسے عورت کی آواز کے لیے پردہ ہے ایسے عورت کے نام کو بھی پردے میں رکھا جائے۔ اس لیے عورت اذان نہیں دے سکتی، عورت تکبیر نہیں کہہ سکتی، عورت جمعہ نہیں پڑھ سکتی، جمعہ میں اس کا حاضر ہونا ضروری قرار نہیں دیا گیا، عیدین میں آنا بھی ضروری نہیں اور عورت بغیر محرم کے حج پر بھی نہیں آسکتی۔

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ تیرے رب نے قبول کرلیا کہ بی بی تیری نیت خالص ہے، تیری منت خالص ہے۔ ہم لڑکی بھی قبول کرتے ہیں۔

﴿وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے بی بی مریم علیہا السلام کو بہتر طریقہ سے بڑھایا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جمال بھی دیا، کمال بھی دیا، عصمت و عزت بھی دی۔

﴿وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ﴾ [آلِ عمران: ۳۷] ظاہری سبب یہ کیا کہ بی بی مریم علیہا السلام کی کفالت کا ذریعہ حضرت زکریا علیہ السلام کو بنایا جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں۔

حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت میں قرعہ اندازی:

مفسرین کرام نے سابقہ کتب سے واقعہ نقل کیا ہے کہ جب بی بی مریم علیہا السلام سیانی ہوگئیں تو ان کی والدہ ان کو بیت المقدس میں لے آئیں۔ وہاں جو منتظمین تھے ان سے کہا: میری منت تھی، اس کے مطابق میری بچی حاضر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈال دی کہ لڑکی ہے، ٹھیک ہے، اس کو قبول کرتے ہیں، ورنہ وہ لڑکی قبول نہیں کرتے تھے۔

دوسرا اللہ تعالیٰ نے سب کے دلوں میں ڈالا اور ان میں سے ہر ایک کو تمنا ہوگئی، ہر ایک یہ کہہ رہا تھا کہ میں اس کی حفاظت کروں گا اور دوسرا کہتا کہ میں اس کی حفاظت کروں گا اور اسی طرح دوسرے کہیں کہ ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ ان سے کہا گیا کہ جھگڑا نہ کرو۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا: ہم قرعہ اندازی کر لیتے ہیں۔ جس کا نام نکل آئے وہ اس بچی کی حفاظت کرے گا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، لیکن قرعہ کیسے ڈالیں؟ آپ نے فرمایا: لکڑی کی چند قلمیں لے آؤ اور سب پر نام لکھ کر ان کو نہر کے اندر ڈال دو۔ جس کی قلم پانی کی ضد میں اوپر جانا شروع کر دے وہ آدمی اس بچی کی حفاظت کرے گا اور جن کی قلمیں پانی کے موافق رو میں بہہ جائیں گی ان کو کوئی حق نہیں ہوگا۔

اور قرآن مجید میں آگے اس واقعہ کو ذکر فرمایا ہے: ﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ﴾ [آل عمران: ۴۴] (جب بی بی مریم علیہا السلام کی کفالت پر جھگڑا ہو رہا تھا اور وہ قرعہ ڈال رہے تھے تو آپ وہاں موجود نہیں تھے)۔

بہر حال! جب قلمیں ڈالی گئیں تو حضرت زکریا علیہ السلام کی قلم پانی کی مخالف سمت بہنے لگی تو سب مان گئے کہ آپ کا حق ہے۔ تو بی بی مریم علیہا السلام کی حضرت زکریا علیہ السلام نے کفالت کی ذمہ داری لی کہ ان کو ایک حجرے میں رکھا۔ جب آپ باہر تشریف لے جاتے تو دروازہ بند کر دیتے تھے۔ ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾ [آل عمران: ۳۷] جب بھی حضرت زکریا علیہ السلام اس حجرے میں داخل ہوتے تو دیکھتے کہ بی بی کے پاس تو عجیب عجیب کھانے پڑے ہیں، بے موسمی پھل پڑے ہیں، آپ حیران ہوتے کہ ہم نے تو نہیں بھیجا، دروازہ بھی بند ہے اور چابی بھی میرے پاس ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت:

مفسرین کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ ﴿رِزْقًا﴾ سے اشارہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ رزق مختلف پھل ہیں، یعنی بے موسے پھل ہیں، اس لیے آپ حیران ہو گئے تو ان سے پوچھا: ﴿يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ﴾ یہ تمہارے پاس رزق کہاں سے آیا ہے؟ بی بی مریم علیہا السلام نے کہا: یہ سب کچھ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے۔

حضرت کے دل میں سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ تجھے تو رزق آتا ہے، ہمیں نہیں آتا تو انہوں نے آگے اس آیت سے مسئلہ حل کر دیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [آل عمران: ۳۷] آپ حیران نہ ہوں۔ شان تو آپ کی

بلند ہے، میں ایک عورت ہوں، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ جس کو چاہے بغیر حساب اور بغیر اندازے کے رزق عطا فرمائے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی تربیت:

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ﴾ [آل عمران: ۳۷]

اللہ تعالیٰ نے بی بی مریم علیہا السلام کو ظاہری طور پر بھی اچھی شکل عطا فرمائی تھی اور باطنی اسباب بھی اللہ تعالیٰ نے آسان کر دیئے کہ بی بی مریم علیہا السلام کی صحبت اوّل یوم سے صالحین کے ساتھ آ گئی تو جب انبیاء علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے عباد صالحین کی تربیت ہو تو علم، خیر، بھلائی، عبادت، زہد خود بخود حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن میں بھی حکم ہے: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ [التوبة: ۱۱۹] (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو)۔ کیونکہ صحبت صالحین سے انسان پر بڑے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور بری صحبت کے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

نیک لوگوں کی صحبت کا اثر:

جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی اعلیٰ مثال بیان فرمائی ہے کہ اگر تم لوگ کسی عطر والے سے دوستی رکھو گے اور اس کی دکان میں بیٹھو گے تو اگر عطر نہیں خرید پاؤ گے تب بھی خوشبو تمہیں آ جائے گی اور اگر کسی لوہار سے دوستی رکھو گے تو چاہے کتنا دامن بچاؤ، لیکن کبھی چنگاری اڑ کر تمہارے کپڑوں پر بھی آ جائے گی اور کبھی تمہارے ہاتھ بھی کالے ہو جائیں گے؛ کیونکہ اس کا کام ہی ایسا ہے۔ [سنن ابی داود، رقم: ۴۸۲۹]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صالحین کو عطر سے تشبیہ دی ہے کہ جیسے عطر کا نفع صرف لینے والے کو حاصل نہیں ہوتا، بلکہ دوسروں کو بھی ہوتا ہے۔ تو صالحین کا نفع بھی عام ہوتا ہے، ایک حد تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ ان کی صحبت میں جو بھی آتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بھی راہ ہدایت عطا فرما دیتے ہیں۔ اور اسی طرح اگر بدکردار آدمیوں کے ساتھ صحبت ہوگی تو بری باتیں سنو گے، بری باتیں تمہارے دماغ میں بھی اثر کریں گی۔ وہ اگر برے اعمال، حرکات سرانجام دیں گے تو تمہارے اوپر بھی اثر ہوگا۔

یہ بھی قاعدہ ہے کہ تعمیر بڑی مشکل ہوتی ہے، تخریب بڑی آسان ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی بندے کی اصلاح کرنا

بڑا مشکل ہوتا ہے، لیکن کسی بندے کو گمراہ کرنے میں وقت نہیں لگتا۔ تو کامیابی اس کے اندر ہے کہ آدمی اللہ والوں کی صحبت اختیار کرے۔ جو لوگ سنت پر چلنے والے ہیں ان کی صحبت میں تمہیں نماز ملے گی، ان کی صحبت میں تلاوت قرآن ملے گی اور ان کی صحبت میں تمہیں خیر اور بھلائی کی باتیں ملیں گی۔ اگر تم برے لوگوں کے ساتھ بیٹھو گے تو تمہیں فلم ملے گی، ٹی وی ملے گا، کوئی ریڈیو پر گانے ملیں گے اور برائی کی کہانیاں ملیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آدمی بھٹک جائے گا۔

حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت کی بعض وجوہ:

حضرت محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کے اندر لکھا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام یتیم تھیں، ان کے والد فوت ہو گئے تھے۔ اور بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ بنی اسرائیل کو قحط کا سال آ گیا تو بی بی مریم علیہا السلام کی کفالت کی ضرورت تھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت میں دے دیا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تا کہ نبوت کا علم حاصل کر سکے، بڑے فائدے حاصل کر سکے اور اعمال صالحہ کی ترغیب حاصل ہو سکے۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے گھر میں بی بی مریم علیہا السلام کی خالہ تھیں اور بعض فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے گھر میں بی بی مریم علیہا السلام کی بہن تھیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث میں آیا ہے کہ میں نے یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا اور وہ دونوں خالہ کے بیٹے ہیں۔ [بخاری، رقم: ۳۴۳۰]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت مریم علیہا السلام کی مثل ہیں:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [آل عمران: ۳۷]

(حدیث) حافظ ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دن سے کھانا نہیں کھایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے ایک ایک گھر میں گئے کہ کچھ کھانے کو ہے؟ ہر گھر سے جواب ملا: کچھ نہیں ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بی بی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف لے آئے، فرمایا: بیٹی! تیرے گھر میں کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے کہا: میں آپ پر قربان ہو جاؤں! میرے گھر میں بھی کچھ نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس چلے گئے تو بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میری ہمسائی نے دو روٹیاں اور چھوٹا سا گوشت کا

ایک ٹکڑا بھیجا تو میں نے فوراً سوچا کہ اس کو محفوظ کرلوں اور حضورِ اکرم ﷺ کو خبر دوں۔ حالانکہ ہم سب گھر والے بھوکے تھے۔ میں نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں بھیجا کہ آپ تشریف لے آئیں، اللہ تعالیٰ نے میرے پاس کھانے کی کچھ نعمت بھیجی ہے، میں نے آپ کے لیے چھپا کر رکھ دی ہے۔ آپ نے فرمایا: بیٹی! وہ کھانا لے آؤ۔ بی بی صاحبہ فرماتی ہیں: میں وہ پیالہ لے آئی۔ جب میں نے حضورِ اکرم ﷺ کے سامنے رکھا اور اس پیالہ سے کپڑا ہٹایا تو میں حیران ہوگئی کہ وہ تو روٹی اور گوشت سے بھرا ہوا ہے، جبکہ میں نے تو تھوڑا سا رکھا تھا تو میں حیران ہوگئی اور پھر سمجھ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے برکت ڈال دی ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اللہ کے نبی ﷺ پر درود پڑھا اور وہ کھانا رسول اللہ ﷺ کو پیش کردیا۔ جب حضورِ اکرم ﷺ نے دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا اور فرمایا: میری بیٹی! یہ تمہیں کہاں سے ملا ہے؟ بی بی فاطمہ نے یہی آیت پڑھی: ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ کہ حضور! یہ تو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، ورنہ ہم نے تو تھوڑا سا رکھا تھا۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ شکر ہے۔ اور فرمایا: تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اے بیٹی! آپ کو بنی اسرائیل کی سردار کے مشابہ بنادیا! کیونکہ جب اللہ تعالیٰ ان کو کسی چیز کا رزق دیتے اور ان سے پوچھا جاتا تو وہ جواب میں یہی کہتی تھیں: ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ آپ ﷺ نے فرمایا: علی کو بھی بلاؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آگئے اور حضورِ اکرم ﷺ نے اپنی بیویوں کو بھی بلایا۔ سارے گھر والوں نے کھانا کھایا اور پیٹ بھر کر کھایا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب پیالہ کی طرف نظر ڈالی تو وہ اسی طرح بھرا ہوا تھا۔ فرماتی ہیں: میں نے ہمسائیوں کے گھر میں تقسیم کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر برکت اور اپنی رحمتیں عطا فرمادیں۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ جب چاہتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں بغیر حساب کے رزق عطا فرماتے ہیں۔

[مسند ابو یعلیٰ، المطالب العالیہ لابن حجر]

﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ﴾ [آل عمران:۳۸]

”وہیں دعا کی زکریا نے اپنے رب سے۔ کہا: اے میرے رب! مجھے عطا کر اپنے پاس سے اولاد پاکیزہ۔ بے شک تو دعا کو سننے والا ہے۔“

حضرت زکریا علیہ السلام کی اولاد کے لیے دعا:

جب حضرت زکریا علیہ السلام نے بی بی مریم علیہا السلام کے پاس بے موسمی پھل دیکھے تو ان کے دل کے اندر ایک جذبہ پیدا ہوا۔ اس وقت آپ کی بیوی کی عمر اٹھانوے سال کے قریب تھی اور دونوں اس عمر میں داخل ہو گئے تھے جہاں اولاد کی امیدیں ختم ہو جاتی ہیں، جہاں قویٰ جواب دے جاتے ہیں۔ تو اب بظاہر تو اولاد کی کوئی امید نہیں ہوتی تھی اور حضرت زکریا علیہ السلام اس خارق عادت امر کو اللہ تعالیٰ سے مانگنے میں ادب کرتے تھے کہ میں اس خارق عادت امر کا سوال کیسے کروں؟ لیکن جب بی بی مریم علیہا السلام کے پاس غیر موسم کے پھل دیکھے تو طبیعت میں ایک تمنا پیدا ہوئی: اے اللہ! اگر یہاں بی بی مریم کو بغیر موسم کے پھل دے سکتے ہیں جو نبی بھی نہیں اور میں تو آپ کا نبی ہوں تو اب حضرت زکریا علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے مانگنے کے لیے ہمت بندھ گئی کہ میرا مولا! اگر بی بی مریم پر اتنی عنایات ہو سکتی ہیں تو مجھ پر بھی ہو سکتی ہیں۔

دعا کا بہترین موقع:

یہاں سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آیا کہ انسان کو چاہیے کہ جب کوئی رحمت کا موقع ملے تو دعا مانگے۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن پاک کی تلاوت فرماتے اور آیت رحمت آتی تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے اور جب آیاتِ عذاب آتیں تو عذاب سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے۔

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ بندہ دعا مانگ رہا ہے، آنسو بہہ رہے ہیں، لیکن دل موافقت نہیں کر رہا اور دعا میں توجہ نہیں ہو رہی تو دعا میں اختصار کر لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری اس غفلت اور بے ادبی کی وجہ سے بجائے رحمت کے تم اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے حق دار بن جاؤ۔

قبولیتِ دعا کے بعض اوقات و مقامات:

- ......حدیث میں ہے کہ افطار کے وقت میں جو دعا مانگی جاتی ہے مستجاب ہوتی ہے۔
- ......اسی طرح جب بارش برس رہی ہو اس وقت بندہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے تو قبول ہوتی ہے۔
- ......حالتِ طواف، عمرہ، مقامِ صفا و مروہ اور حطیم کے اندر اور مقامِ ابراہیم اور زم زم پینے کے بعد دعا قبول ہوتی ہے۔

اوران مناسبات میں کوئی نہ کوئی حکمت چھپی ہوئی ہے۔ جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے مناسبت دیکھی تو دعا پر طبیعت آمادہ ہوگئی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی: ﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ﴾ [آل عمران: ۳۸] اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کی دعا ہو یا کوئی بھی دعا ہو اللہ تعالیٰ سے مانگی جائے۔ جونبیوں کو اور قرآن وسنت کو ماننے والا ہے وہ بھی اپنی اولاد کے لیے اپنے رب سے دعائیں مانگتا ہے، وہ قبروں سے دعائیں نہیں مانگتا۔

دعا کا ایک ادب:

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ③﴾ [مریم: ۳] حضرت زکریا علیہ السلام رات کو نماز میں کھڑے ہیں اور آہستہ دعا مانگ رہے ہیں؛ کیونکہ دعا کا تعلق بندے اور رب کے درمیان میں ہے، اس لیے حکم ہے کہ دعا زور زور سے نہ مانگو، لیکن آج چودہ سو سال گزر گئے اور ہم دعا مانگنا نہیں سیکھے۔

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ﴾ [الاعراف: ۵۵] جب بھی اپنے رب سے دعا مانگو تو عاجزی سے اور رو رو کر آہستہ آہستہ سے دعا مانگو۔ اگر تیرے لب نہ بھی ہلیں تب بھی رب جانتا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا:

حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ㊳﴾ [آل عمران: ۳۸]

اے اللہ! مجھے اپنی رحمت کے ساتھ ایسی اولاد عطا فرما جو ظاہراً و باطناً پاک ہو؛ کیونکہ اگر اولاد صالح نہ ہو تو اس سے بڑا عذاب دنیا میں نہیں ہے؛ کیونکہ نہ آپ لڑ سکتے ہیں اور نہ مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اولاد صالح ہے تو اس سے بڑی نعمت کوئی نہیں ہے اور اولاد اگر طالح ہے تو اس سے بڑا عذاب کوئی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سوا دعا کوئی نہیں سنتا:

﴿اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ㊳﴾ [آل عمران: ۳۸]

یہاں مسئلہ بیان فرمادیا کہ اے اللہ! دعاؤں کا سننے والا تو ہے، تیرے علاوہ کوئی دعا نہیں سنتا۔

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۞ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۞﴾ [آل عمران:۳۹تا۴۱]

''چنانچہ (ایک دن) جب زکریا علیہ السلام عبادت گاہ میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، فرشتوں نے انہیں آواز دی کہ اللہ آپ کو یحییٰ علیہ السلام کی (پیدائش کی) خوشخبری دیتا ہے۔ جو اس شان سے پیدا ہوں گے کہ اللہ کے ایک کلمے کی تصدیق کریں گے، لوگوں کے پیشوا ہوں گے، اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے مکمل طور پر روکے ہوئے ہوں گے، اور نبی ہوں گے اور ان کا شمار راست بازوں میں ہوگا۔ زکریا علیہ السلام نے کہا: یا رب! میرے یہاں لڑکا کس طرح پیدا ہوگا؟ جبکہ مجھے بڑھاپا آپہنچا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ اللہ نے کہا: اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ انہوں نے کہا: پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر کردیجیے۔ اللہ نے کہا: تمہاری نشانی یہ ہوگی کہ تم تین دن تک اشاروں کے سوا کوئی بات نہیں کرسکو گے۔ اور اپنے رب کا کثرت سے ذکر کرتے رہو، اور ڈھلے دن کے وقت بھی اور صبح سویرے بھی اللہ کی تسبیح کیا کرو۔''

اس آیت میں ہے کہ فرشتوں نے خوشخبری دی اور دوسری آیت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خوشخبری دی۔ دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اصل حکم دینے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اللہ تعالیٰ کی بات پہنچانے والے اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں۔ انہوں نے آکر حضرت زکریا علیہ السلام کو خوشخبری دی، جب آپ اپنے حجرے میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے: اے زکریا! اللہ تعالیٰ تجھے بشارت دیتے ہیں کہ ہم نے تیری دعا منظور کرلی ہے اور تجھے بیٹا دیتے ہیں، جن کا نام یحییٰ ہوگا۔ اور دوسری جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس لڑکے کا نام خود تجویز فرمادیا اور فرمایا: اس نام کا بچہ اس سے پہلے کوئی نہیں ہوا۔ یہ بھی تمہیں شرف مل رہا ہے کہ تجھے بچہ بھی دے رہے ہیں اور اس کا نام بھی تجویز کر رہے ہیں۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات:

﴿مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۞﴾ [آل عمران:۳۹]

وہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب کلمۃ اللہ ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بغیر باپ کے کلمہ ''کُن'' سے پیدا فرمایا تھا۔

﴿وَسَيِّدًا﴾ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی دوسری صفت یہ ہے کہ ہم اس کو اپنی قوم کا سردار بنائیں گے۔

﴿وَحَصُورًا﴾ وہ عورتوں کی لذتوں سے دور ہوگا، یعنی اس کو عورتوں کی خواہش نہیں ہوگی۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ عنین (نامرد) تھے، لیکن یہ ترجمہ غلط ہے، بلکہ ﴿حَصُورًا﴾ کا معنی یہ ہے کہ طاقت ہو، لیکن پھر اپنے آپ کو روکے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی ہے کہ وہ اپنے نفس کو روکنے والا ہوگا۔ اگر عنین مراد ہو تو تعریف کہاں سے بنے گی؟

علمی نکتہ:

حضرت زکریا علیہ السلام نے اس وقت دعا مانگی جب بی بی مریم علیہا السلام کے پاس پھل دیکھے، بی بی مریم کو اللہ تعالیٰ نے مردوں سے پاک رکھا اور بی بی مریم کی وجہ سے جو دعا کی اور اس کے بدلہ میں جو اولاد دی اس کو عورتوں سے پاک رکھا۔ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اللہ تعالیٰ کے راز ہیں۔

﴿وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ نبوت سب سے اونچا درجہ ہے، لیکن اس کو آخر میں ذکر کیا گیا؛ کیونکہ کبھی من الادنیٰ الی الاعلیٰ ترقی ہوتی ہے کہ پہلے دسری صفات کو بیان فرمایا اور آخر میں فرمایا: وہ نبی بھی ہوگا۔

صلاح کے درجات:

علماء نے لکھا ہے کہ صلاح کے مختلف مراتب ہیں: ایک وہ صلاح ہے جو عام مومن کو حاصل ہوتا ہے اور ایک صلاح کے وہ مدارج ہیں جو انبیاء کو ملتے ہیں۔

بچہ ہونے کے متعلق حضرت زکریا علیہ السلام کے سوال کا جواب:

جب حضرت زکریا علیہ السلام کو خوشخبری دی گئی تو آپ نے سوال کیا: اے میرے رب! مجھے کیسے ہوگا لڑکا حالانکہ میں بڑھاپے کی عمر میں آ گیا ہوں، میرے قویٰ جواب دے گئے اور میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے، اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہی تو کیسے لڑکا عطا فرمائیں گے؟ جب اللہ کے نبی نے خود دعا مانگی تو کیا...... نعوذ باللہ!...... اللہ کے نبی کو شک تھا کہ مجھے کیسے بچہ ہوگا؟ انبیاء کو تو کبھی شک ہو نہیں سکتا۔

علماء کرام نے فرمایا: جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا: ﴿رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ﴾ [البقرة: ۲٦۰] میرے اللہ! آپ کروڑوں مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ اس کیفیت کا مجھے آنکھوں سے مشاہدہ کرائیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں کروڑویں درجہ کے برابر بھی شک ہے کہ میں زندہ کرنے پر قادر ہوں۔ فرمایا: اے اللہ! میرا ایمان ہے کہ آپ قادر ہیں، ساری مخلوق کو عدم سے نکالنے والی آپ کی ذات ہے، لیکن میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر اپنے خلیل پر کرم فرمادیں اور میں طمانیت قلب کا وہ آخری مرتبہ حاصل کرلوں جو عین الیقین کو پہنچ جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد احیاء موتی کے بارے میں مشاہدہ کا تھا۔

اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ آپ نے میری دعا سن لی اور میرا ایمان ہے کہ آپ مجھے بچہ دیں گے، لیکن اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ مجھے جوان کردیں گے اور میری بیوی کو دوبارہ جوانی عطا فرمادیں گے یا مجھے دوسری بیوی عطا فرمائیں گے؟ ورنہ اللہ نبی کو نہ شبہ ہے، نہ شک ہے اور نہ...... نعوذ باللہ...... اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کوئی اعتراض ہے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ جب کوئی خوشی کی بات ملے تو اس وقت آدمی خوشیوں کے اندر ایسا کھو جاتا ہے کہ اس کی زبان سے ایسے ایسے الفاظ نکلتے ہیں جو بظاہر انسان کو عجیب لگتے ہیں۔

جب حضرت زکریا علیہ السلام نے یہ فرمایا تو فرشتوں نے کہا: آپ کیا یہ تفصیلات پوچھ رہے ہیں؟ آپ نے مانگا ہے اللہ تعالیٰ نے منظور کرلیا ہے۔ ﴿كَذَٰلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۝﴾ تیرا پروردگار جو چاہے کردے۔ وہ چاہیں تو تیری بیوی اور تجھے جوان کردیں یا اسی بڑھاپے میں تجھے اولاد دے دیں۔ اس کی مرضی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسباب پیدا فرمانے والے ہیں، وہ اسباب کے محتاج نہیں ہیں، ساری دنیا اس کی محتاج ہے۔ وہ چاہیں تو اسباب کے بغیر عطا فرمادیں اور چاہیں تو اسباب کے ساتھ پیدا فرمادیں۔

حمل ٹھہر جانے کی علامت:

جب حضرت زکریا علیہ السلام نے سوال پوچھا اور پھر اطمینان کامل ہوگیا تو ایک دوسرا سوال پوچھ لیا؛ کیونکہ جب رحمت کی گھڑی ہو تو آدمی جرأت کرتا ہے کہ مزید پوچھ لوں۔ اس لیے عرض کیا:

﴿قَالَ رَبِّ اجْعَل لِّي آيَةً ۖ قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا ۗ وَاذْكُر رَّبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ

بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿٤١﴾ [آل عمران:۴۱]

یا اللہ! مجھے کوئی نشانی بتا دیں؛ کیونکہ میری خوشی اور بڑھ جائے گی کہ حمل ٹھہر گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کی علامت یہ ہے کہ ہم تیری زبان کو غیروں سے بات کرنے کے لیے تین دن کے لیے بند کر دیں گے کہ کسی بندے سے تم دنیا کا کلام نہ کر سکو گے، مگر اشارے کے ساتھ۔ میرے نبی ہم تیری زبان کو غیروں سے گفتگو سے روک دیں گے، لیکن اپنے ذکر سے نہیں روکیں گے۔

ذکر کی فضیلت:

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا﴾ تم پھر اپنے رب کا ذکر کرو زیادہ۔ اب لوگوں سے زبان بند ہو گئی۔ جتنی دیر ان سے بولتا تھا اس وقت بھی میرا ذکر کرو اور تیری زبان پر میرا ذکر جاری ہوگا، تا کہ تم میری اس نعمت کا شکر کرو اور میری تسبیح بیان کرو صبح کو بھی اور رات کو بھی۔

ہر چیز کی ایک حد ہے، لیکن ذکر کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس لیے حکم ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿٤١﴾﴾ [الاحزاب:۴۱] (اے ایمان والو! میرا ذکر کثرت سے کرو)۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سب سے افضل ذکر "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" ہے۔

زیادہ سے زیادہ ذکر کرے؛ کیونکہ مومن بندے کی صفت ہے:

﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [آل عمران:۱۹۱]

میرے بندے کھڑے ہیں تو میرا ذکر ہے، قیام میں ہیں تو میرا ذکر ہے، وہ بیٹھے ہیں تو میرا ذکر ہے اور وہ لیٹے ہیں تو میرا ذکر ہے۔ ہر حال میں ان کی زبان پر میرا ذکر ہے، نماز ذکر ہے، قرآن ذکر ہے۔

مسلمانو! اپنے لیے وقت معین کرو ایک اللہ تعالیٰ کے قرآن کی تلاوت کیا کرو اور قرآن دیکھ کر پڑھو چاہے جتنا بڑا حافظ اور قاری ہو۔ قرآن کو دیکھ کر پڑھنے کے اپنے فوائد و برکات ہیں۔ اگر قرآن پڑھے ہوئے نہیں ہو تو قرآن کو کھول کر دیکھتے رہو۔ خالی دیکھتے رہنا بھی نفع سے خالی نہیں۔

قرآن پڑھنے کی حالتیں:

اس آیت سے علماء نے مسئلہ نکالا ہے کہ اگر کوئی کھڑے ہو کر قرآن پڑھے تو جائز ہے، لیٹے ہوئے قرآن پڑھے

تو جائز ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿عَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ اور قرآن بھی ذکر ہے۔
ایک روایت میں آتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا اتنا ذکر کرو کہ دیکھنے والے کہیں یہ دیوانہ ہے۔[1]

﴿وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۴۲تا۴۴]

”اور (اب اس وقت کا تذکرہ سنو) جب فرشتوں نے کہا تھا: اے مریم! بے شک اللہ نے تمہیں چن لیا ہے، تمہیں پاکیزگی عطا کی ہے اور دنیا جہان کی ساری عورتوں میں تمہیں منتخب کر کے فضیلت بخشی ہے۔ اے مریم! تم اپنے رب کی عبادت میں لگی رہو، سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع بھی کیا کرو۔ (اے پیغمبر!) یہ سب غیب کی خبریں ہیں جو ہم وحی کے ذریعے تمہیں دے رہے ہیں، تم اس وقت ان کے پاس نہیں تھے جب وہ یہ طے کرنے کے لیے اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے گا؟ اور نہ اس وقت تم ان کے پاس تھے جب وہ (اس مسئلے میں) ایک دوسرے سے اختلاف کر رہے تھے۔“

حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ اس واقعہ کی خبر دے رہے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کے فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے بی بی مریم علیہا السلام سے بات کی اور انہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان پہنچایا کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو چن لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا چنا ہوا ہر طرح کے نقصان سے پاک ہوتا ہے؛ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم بھی کامل ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی کامل ہے اور اللہ تعالیٰ جس شخصیت کو جس مقصد کے لیے بھی چن لیں وہ شخصیت بھی کامل ہوتی ہے۔ فرشتوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چن لیا ہے آپ کی عبادت، آپ کا تقویٰ، آپ کی طہارت اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو شیطانی وساوس اور شیطانی خیالات سے پاک فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو آپ کے زمانہ کی تمام عورتوں میں سے منتخب فرما لیا ہے۔

[1] [المنتخب من مسند عبد بن حمید، رقم: ۹۲۵]

(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((خَيْرُ نِسَاءٍ رَكِبْنَ الْإِبِلَ نِسَاءُ قُرَيْشٍ أَحْنَاهُ عَلَى وَلَدٍ فِي صِغَرِهِ، وَأَرْعَاهُ عَلَى زَوْجٍ فِي ذَاتِ يَدِهِ، وَلَمْ تَرْكَبْ مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ بَعِيرًا قَطُّ)) [صحیح مسلم، رقم: ۲۰۱]

''سب سے بہترین جواونٹ کی سواری کرتی ہیں قریش کی عورتیں ہیں وہ اپنی اولاد پر بڑی مہربان ہیں، اولاد کے صغر میں ان پر بہت زیادہ شفقت کرنے والی ہیں اور اپنے خاوند کے مال میں حفاظت کرنے والی ہیں۔ بی بی مریم علیہا السلام نے کبھی اونٹ کی سواری نہیں کی تھی۔''

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ کا اس حدیث کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بی بی مریم علیہا السلام اپنے زمانہ کی عورتوں سے افضل ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کے زمانہ میں قریش کی عورتوں کو فضیلتیں عطا فرمائی ہیں کہ وہ اپنے بچوں پر شفقت کرنے والی اور اپنے خاوند کے مال کی حفاظت کرنے والی ہیں؛ کیونکہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے اچھی عورت وہ ہوتی ہے:

❁......((إِذَا نَظَرَ إِلَيْهَا سَرَّتْهُ)) جب خاوند کی اس پر نظر پڑے تو خاوند خوش ہو جائے، یعنی وہ ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی اپنی عفت رکھنے والی ہو اور اپنے خاوند کا اچھے لباس سے اور اچھے اخلاق سے استقبال کرنے والی ہو۔

❁......((وَإِذَا أَمَرَهَا أَطَاعَتْهُ)) اور دوسری صفت یہ ہے کہ جب خاوند حکم کرے تو اس کی اطاعت کرے۔

❁......((وَإِذَا غَابَ عَنْهَا حَفِظَتْهُ)) تیسری اس عورت کی صفت یہ ہے کہ خاوند ڈیوٹی پر چلا گیا، خاوند گھر سے نکل گیا تو خاوند کے مال اور عزت کی بھی حفاظت کرنے والی ہو، اس کے اندر کوئی خیانت نہ کرے۔ [ابوداود، رقم: ۱۶۶۴]

جس عورت کے اندر یہ تین صفات ہوں گی وہ صحیح معنی میں عورت کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔

(حدیث) حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ((خَيْرُ نِسَائِهَا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ، وَخَيْرُ نِسَائِهَا خَدِيجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ)) (بہتر عورتوں میں سب سے بہتر بی بی مریم علیہا السلام تھیں، اور عورتوں میں سب سے بہتر حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا تھیں)۔ [بخاری، رقم: ۳۸۱۴]

(حدیث) امام ترمذی رحمہ اللہ نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے اور اس کی تحقیق کر کے فرمایا: یہ صحیح ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((حَسْبُكَ مِنْ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ، وَخَدِيجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ، وَفَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ، وَآسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ)) اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری عورتوں میں سے

ان عورتوں کو فضیلت بخشی ہے: بی بی مریم بنت عمران علیہا السلام، خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا، فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور بی بی آسیہ علیہا السلام جو فرعون کی بیوی تھیں (لیکن اس کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئیں اور ایمان کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو موت عطا فرمائی)۔ [سنن الترمذی، رقم: ۳۸۷۸]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں چار تھیں:

بعض اوقات باطل فرقے ان روایات سے مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں، جیسا کہ اس روایت کے اندر حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کا ذکر آیا ہے تو وہ حدیث پیش کر کے کہتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک بیٹی ہے؛ کیونکہ اور بیٹی کا ذکر نہیں ہے۔ صحیح روایات مبارکہ سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیٹیاں ہیں: حضرت فاطمۃ الزہراء، بی بی رقیہ، بی ام کلثوم اور بی بی زینب رضی اللہ عنہن۔ لیکن روافض باقی تین بیٹیوں کا انکار کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیاں: بی بی رقیہ اور بی بی ام کلثوم رضی اللہ عنہما کا نکاح سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ اگر وہ ان بیٹیوں کا اقرار کریں تو جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ داماد نبی ہیں اسی طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی داماد نبی ہیں، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیٹی ہے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے گھر میں دو بیٹیاں ہیں، اس لیے ان کا لقب "ذوالنورین" تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ اگر اللہ مجھے ان کے علاوہ اور بیٹیاں بھی عطا فرماتے تو میں عثمان کو دیتا۔ اسی طرح انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بھی انکار کر دیا جو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔ یہ ان کا بلاوجہ کا تعصب اور عناد ہے، ورنہ ان کی جو بڑی کتابیں ہیں ان کے اندر موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں چار ہیں۔ مزید اس کی تفصیل "اَلْبِدَایَۃُ وَالنِّھَایَۃُ" میں ملاحظہ فرمائیں۔

ملائکہ (حضرت جبرائیل علیہ السلام) نے پہلے تو بی بی مریم کو یہ خوشخبری دی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تجھے چن لیا ہے، اللہ تعالیٰ نے تجھے پاکیزہ بنایا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے جہان کی عورتوں میں فضیلت بخشی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ تم زیادہ اور میری عبادت کرو، چونکہ تو جتنی زیادہ عبادت کرے گی اتنا زیادہ تیرے درجات بلند ہوں گے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے تجھ سے ایک بہت بڑا کام لینا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہاری شان کو بلند کرنا ہے اور اللہ پاک نے تیرے بطن سے بغیر کسی مرد کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کرنا ہے۔ جس سے یہ کام لینا ہو اس کو پہلے محنت کا حکم ہوتا ہے۔

جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝﴾ [المزمل: ۱ تا ۴] (میرے مدنی! آپ راتوں کو جاگیں اور میری عبادت کریں؛ کیونکہ ہم آپ کو ایک شان والا کلام دینے والے ہیں۔ اس کے لیے تقاضا ہے کہ آپ پہلے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرلیں)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بی بی مریم علیہا السلام کو بھی حکم دیا ہے۔

قنوت کا معنی خشوع وخضوع ہوتا ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے آگے تضرع، زاری اور عاجزی کرے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۱۶] جو چیزیں آسمان وزمیں میں ہیں سب اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے والی اور اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کرنے والی ہیں)۔

(حدیث) حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ حَرْفٍ مِنَ الْقُرْآنِ يُذْكَرُ فِيهِ الْقُنُوتُ فَهُوَ الطَّاعَةُ)) [مسند احمد، جلد: ۳، صفحہ: ۷۵]

"جہاں بھی قرآن میں قنوت کا لفظ آیا ہے اس سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری مراد ہے۔"

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ ذکر فرماتے ہیں: بی بی مریم علیہا السلام عبادت میں اتنا لمبا لمبا رکوع فرماتی تھیں کہ آپ کے پاؤں میں ورم آجاتا تھا اور آپ کے پاؤں کثرتِ عبادت کی وجہ سے سوج جاتے تھے۔

حضرت اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بی بی مریم علیہا السلام اپنے اس عبادت خانہ میں اتنے لمبے رکوع فرماتیں، اتنا لمبا سجدہ فرماتیں اور اتنا لمبا قیام فرماتیں، حتیٰ کہ آپ کے پاؤں سے پیلا پانی نکلنا شروع ہوگیا۔

﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ڰ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝﴾

[آل عمران: ۴۵ تا ۴۷]

''(وہ وقت بھی یاد کرو) جب فرشتوں نے مریم سے کہا تھا: اے مریم! اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلمے کی (پیدائش) کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام ہوگا، جو دنیا اور آخرت دونوں میں صاحب وجاہت ہوگا اور (اللہ کے) مقرب بندوں میں سے ہوگا اور وہ گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرے گا اور بڑی عمر میں بھی اور راست بازلوگوں میں سے ہوگا۔ مریم علیہا السلام نے کہا: پروردگار! مجھ سے لڑکا کیسے پیدا ہوجائے گا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں؟ اللہ نے فرمایا: اللہ اسی طرح جس کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے تو صرف اتنا کہتا ہے کہ ''ہوجا'' بس وہ ہوجاتا ہے۔''

حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت:

جب ملائکہ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے بی بی مریم کو خطاب فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشخبری دی کہ آپ سے ایک بچہ پیدا ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا کلمہ فرمایا ہے، اس کا نام مسیح ابن مریم علیہ السلام ہوگا، وہ عزت والا ہوگا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، وہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں سے ہوگا اور وہ لوگوں سے کلام فرمائیں گے مہد میں، یعنی جب آپ جھولے میں ہوں گے اور بڑھاپے میں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ صالحین کے اعلیٰ مقامات پر ہوں گے۔

بی بی صاحبہ نے سوال کیا: ﴿رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ﴾ مجھے کیسے لڑکا ہوگا؟ مجھے تو کسی انسان نے چھوا بھی نہیں ہے۔ فرشتوں نے کہا: اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ پیدا فرماتے ہیں جو چاہتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ فرماتے ہیں تو اس کا حکم فرماتے ہیں کہ ہوجا تو وہ کام ہوجاتا ہے۔

ان آیات میں بھی بی بی مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ ہے۔ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں کہ اتنا مفصل انداز میں اس قصہ کو بیان فرمایا، ورنہ یہ قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بھی شروع ہوسکتا تھا، لیکن پہلے امرأۃ عمران کی صفت کا ذکر ہے، پھر بی بی مریم کی پیدائش کا ذکر اور پھر اس کے قبول ہونے کا ذکر، ان کے بچنے کا ذکر اور پھر ان کی کفالت کا ذکر، یہ سارے واقعات بیان کرنے میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان:

جتنی باتیں قرآن وحدیث سے معلوم ہوئیں ان میں سے چند باتیں یہ ہیں کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مکہ

میں ہوئی اور مکہ میں بعثت نبوت ہوئی، آپ ﷺ کے سب سے پہلے مخاطبین قریشِ مکہ ہیں۔ سرزمینِ مکہ کے بعد آپ ﷺ کی ہجرت کا مقام مدینہ منورہ ہے تو اب آپ ﷺ کے مخاطبین یہود تھے، اہل کتاب تھے اور اوس و خزرج کے قبائل تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔

تبع بادشاہ کا واقعہ:

اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا نسب تبابعہ یمن سے تھا تبع اکبر یا تبع اوسط جس کا حضور اکرم ﷺ کی پیدائش سے نو سو سال پہلے کا زمانہ گزرا اور اسی نے سب سے پہلے خانہ کعبہ کا غلاف ڈالا، ورنہ اس سے پہلے کعبۃ اللہ پر غلاف نہیں ہوتا تھا اور اس کے بعد سے غلاف ڈالنے کا سلسلہ چلتا آرہا ہے۔ اور اسلام کے اندر یہ غلاف بھی جائز ہو گیا کہ حضور پاک ﷺ نے اس پر انکار نہ فرمایا۔ یعنی اگر حضور اکرم ﷺ اتارنے کا حکم دے دیتے تو غلاف چڑھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، ورنہ خانہ کعبہ کے اندر سارے بت آپ ﷺ نے نکلوا دیئے اور جتنی تصویریں بنی ہوئی تھیں ختم کرادیں، یہ پرانے کافروں کا رواج تھا اور آج کل پھر یہ رواج چل نکلا ہے۔

بہر حال! اس تبع اکبر بادشاہ نے حضور اکرم ﷺ کی پیدائش سے پہلے آپ کے نام پر ایک خط لکھا کہ کتابوں سے پڑھ کر، مدینہ منورہ سے گزر کر اور مکہ مکرمہ سے گزرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بہت جلد اس امت کا آخری نبی پیدا ہوگا، جس کا نام محمد رسول اللہ ہوگا اور حضور میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا اور مجھے زندگی نصیب ہوئی اور آپ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی تو سب سے پہلے میں آپ کا کلمہ پڑھوں گا، آپ کا خادم و معاون بنوں گا۔ اور اگر مجھے زندگی نصیب نہ ہوئی تو میں آپ اسلام لا رہا ہوں، قیامت میں آپ میرے اسلام کی گواہی دے دینا۔ اور اس خط پر شاہی مہر لگا کر اس خط کو محفوظ کر دیا وہ خط نسل در نسل چلتا رہا۔

انصارِ مدینہ کے ایمان لانے کی ایک وجہ:

اور چونکہ انصارِ مدینہ اس خاندان میں سے تھے، اس خط کا ان کے دماغوں میں پہلے سے چرچا موجود تھا، لہٰذا جب ان کو حضور اکرم ﷺ کی خبر ملی تو اسلام لانے کے لیے دوڑے چلے آئے کہ وہ نبی پیدا ہو گیا ہے جس کے بارے میں ہمارا بادشاہ لکھ گیا تھا، اس لیے حضور ﷺ کے پاس مدینہ منورہ سے پہلے سات آدمی آئے، پھر بارہ آدمی آئے، منیٰ کے اندر وادیٔ عقبہ میں بیعت ہوئی، اسلام لائے۔ اور ان کے بعد ستر آدمی آئے، اسلام لائے۔

ان کے ساتھ حضور اکرم ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ انہوں نے وہاں جا کر قرآن کا مدرسہ کھولا۔ حضور اکرم ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے اس وقت تک سارے انصار تقریباً مسلمان ہو چکے تھے۔

مدینہ میں یہودیوں کی آبادیاں اور تاریخ:

ان کے بعد اہل کتاب سے مقابلہ کی فکر تھی اور وہ یہود تھے۔ یہودیوں کے تین بڑے قبیلے مدینہ منورہ سے باہر آباد تھے۔ آج بھی ان کے آثار اور نشانات موجود ہیں: بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قینقاع۔ ان تینوں قبائل کے مدینہ والوں سے علیحدہ علیحدہ تعلقات تھے کہ بعض اوس کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور بعض خزرج کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ (اور ابتداء سے یہودی مکار تھے کہ اوس اور خزرج کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضور اکرم ﷺ کو بھیجا، اسلام لانے کے بعد ان کی دشمنیاں ختم ہو گئیں اور وہ ﴿رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح: ۲۹] کی تصویر بن گئے۔

قرآن میں حضرت عیسیٰ کے ذکر کی حکمت:

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن تھے اور عیسائی بھی حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں موجود تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت اور ابنیت کے قائل تھے۔ اسلام نے آ کر لازماً ان دونوں باطل فرقوں کی تردید کرنی تھی، اس لیے ضرورت تھی کہ قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ آئے، تاکہ یہودیت کی دشمنی کا بھی رد ہو سکے اور عیسائیت کے غلو کا بھی رد ہو سکے اور قوم کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح تصویر آ سکے۔

قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر:

اسی طرح اللہ کے قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بھی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ان کی ولادت کن حالات میں ہوئی اور فرعون کے گھر کیسے پہنچے؟ وہاں آپ کے ہاتھوں سے آدمی کیسے مارا گیا، پھر آپ مدین کیسے پہنچے، پھر نبوت و رسالت کب ملی؟ تو یہ سارے واقعات قرآن میں موجود ہیں؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں یہود بھی موجود تھے، اس لیے ضرورت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی صحیح تصویر قوم کے سامنے آئے۔

قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر:

تیسرے نمبر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ان کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن کی کئی سورتوں میں فرمایا ہے، حتیٰ کہ ایک سورت کا نام ابراہیم بھی ہے؛ کیونکہ مکہ کے مشرکین یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر

ہیں، اس لیے ضرورت تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بھی صحیح تصویر قوم کے سامنے آئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعارف:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسم مبارک عیسیٰ ہے، آپ کا لقب مسیح ہے اور آپ کی نسبت بی بی مریم علیہا السلام کی طرف کی گئی ہے۔ ہر بیٹے کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے، قرآن میں حکم ہے: ﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ﴾ [الاحزاب: ۵] ہر بچے کو اس کے باپ کے نام کے ساتھ پکارا جائے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کروڑوں صلوۃ وسلام آپ پر ہوں۔ عیسیٰ عبرانی لغت کا نام ہے۔ چونکہ پہلے زمانہ میں لغتیں عبرانی تھیں یا سریانی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں اتاریں وہ عبرانی زبان میں تھیں۔ سب سے پہلی اور آخری کتاب قرآن مجید ہے جو عربی زبان میں نازل ہوئی کہ نبی بھی عربی، مخاطب بھی عرب اور قرآن بھی عربی ہے۔

عیسیٰ اصل میں عیسو تھا۔ اس کا معنی سردار عزت والا ہے۔ اور اسی طرح موسیٰ اصل میں موشی یا موشی تھا۔ مو پانی کو کہتے ہیں اور شی پانی سے نکلنے والا؛ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صندوق میں ڈال کر دریا میں ڈالا گیا، پھر آپ چونکہ پانی سے نکلے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی، اس نسبت سے آپ کا نام موشی ہو گیا، پھر اس سے معرب ہو کر موسیٰ ہو گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب مسیح اصل میں مشیحا تھا، اس سے معرب ہو کر مسیح بن گیا۔ مشیحا کا معنی مبارک اور مسعود ہے۔ اور یہی لقب بعینہٖ دجال کا بھی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام مریم ہے، جو بنت عمران ہیں اور ان کی والدہ کا نام سابقہ کتابوں کے اعتبار سے بی بی حنہ جو حنان سے ہے، یعنی شفقت کرنے والی ماں۔

مسیح دجال:

مسیح الدجال وہ (بالاجماع) ممسوح سے ہے، بمعنی کسی چیز کو مٹا دینا، زائل کر دینا، جیسے مَسَخَتُ، مَمْسُوْخًا تو دجال کا لقب مسیح اس لیے بنا کہ اس سے ہر خیر اور بہتری کی علامتیں مٹا ڈالی گئیں۔ اب اس میں شر ہی شر ہے، اس میں خیر کا کوئی پہلو باقی نہیں رہا اور اسی طرح مسیح الدجال ممسوح العین بھی ہے؛ کیونکہ وہ ایک آنکھ سے کانا ہو گا اور اس کی دوسری آنکھ ایسے ہو گی جیسے انگور کو پھاڑ دو اور وہ باہر نکلا ہوا ہو ایسے دجال کی آنکھ کا ڈھیلا باہر نکلا ہوا ہو گا۔ اور وہ

بے نور ہوگا اور وہ کانا ہوگا۔ اس کا ہر پہلو شر ہوگا، لیکن اس زمانہ میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں گے جو اس کانے کو بھی خدا بنالیں گے۔ ایمان والے جب اس دجال کو دیکھیں گے تو حضور اکرم ﷺ نے جو نشانیاں بتائی ہیں ان کے ذریعہ وہ دجال کو پہچان لیں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک بہت بڑی واضح علامت بتائی کہ اس کی پیشانی پر ''ک، ف، ر'' یعنی ''کافر'' لکھا ہوا ہوگا تو مومن اس لفظ کو پڑھ لے گا، لیکن جس کے اندر ایمان کا نور نہیں ہوگا وہ نہیں پڑھ سکے گا۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ ہر دور میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہوتی، مثلاً: اس دور میں لوگ جوگیوں کے ماننے والے موجود ہیں، ہاتھ دیکھنے والوں کو ماننے والے موجود ہیں، جنوں کو ماننے والے موجود ہیں، جادو گروں کے ماننے والے موجود ہیں، کالےعلم کو ماننے والے موجود ہیں اور جو خود مر گئے قبروں میں چلے گئے ان کو حاجت روا ماننے والے موجود ہیں۔

دوسرے دجالوں، کذابوں کا تذکرہ:

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں مسیلمۃ الکذاب جھوٹا نبی پیدا ہوا، اس کے ماننے والے بھی موجود تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں وہ ستر ہزار کا لشکر لے کر لڑنے کے لیے آیا تھا۔

اسود عنسی پیدا ہوا، اس کو بھی ماننے والے لوگ موجود تھے۔

تمہارے ہاں مرزا قادیانی پیدا ہوا۔ اب بھی اس کو لاکھوں ماننے والے لوگ موجود ہیں، بلکہ اب تو باقاعدہ چینل پر مرزائیوں کے خطبے دکھائے جاتے ہیں۔ جمعہ کے دن ان کی تقریریں سنائی جاتی ہیں۔

حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت مسیح علیہ السلام کی بشارت دینے والے کون تھے؟

ان آیات کے اندر ملائکہ جمع کا صیغہ ہے اور دوسری جگہ ہے ﴿فَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهَا رُوحَنَا﴾ [مریم:۱۷] کہ ہم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا انسانی شکل میں تو بی بی مریم علیہا السلام حیران ہو گئیں کہ میں جوان لڑکی ہوں اور سامنے ایک غیر محرم اور بڑا خوبصورت جوان ہے، یہ میری طرف کیوں آرہا ہے!! تو فوراً بی بی مریم نے کہا: ﴿إِنِّىٓ أَعُوذُ بِٱلرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا﴾ [مریم:۱۸] کہ اے آنے والے! میں اپنے اللہ رحمٰن کے نام کے ساتھ پناہ پکڑتی ہوں، تم میری طرف کیوں آرہے ہو؟ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہو تو ہٹ جاؤ تو فوراً حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے بول پڑے: ﴿إِنَّمَآ أَنَا۠ رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَٰمًا زَكِيًّا﴾ [مریم:۱۹] بی بی گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو آپ کے رب

تعالیٰ کا بھیجا ہوا قاصد ہوں اور میں اس لیے آیا ہوں، تاکہ آپ کو ایک پاکیزہ بیٹا عطا کیا جائے۔ تو بی بی مریم علیہا السلام کو ذرا اطمینان ہو گیا کہ جو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہے اس سے کسی گناہ کا خطرہ نہیں ہو سکتا۔

تو ایک آیت کے اندر ملائکہ جمع کا صیغہ اور ان آیات میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذکر کرنے کے اندر کوئی منافات نہیں ہے کہ مخاطب حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں اور جس نے پھونک ماری ہے وہ بھی جبرائیل ہے، لیکن جب حضرت جبرائیل علیہ السلام اترتے ہیں تو ان کے ساتھ اور بھی ملائکہ ہیں اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہوتا ہے، لیکن عزت کے لحاظ سے جمع کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔

کیا غیر اللہ بھی بچہ دے سکتا ہے؟

بعض لوگوں نے ﴿لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا﴾ [مریم:۱۹] سے استدلال کیا ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام بچہ دے سکتا ہے تو نبی اور ولی کیوں نہیں دے سکتے؟ تو وہ لوگوں کو اس قسم کے دھوکے دے کر لوگوں کو شرک میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

یاد رکھیں! جب ایک بندہ اللہ تعالیٰ کا قاصد ہے، اسی آیت کے اندر موجود ہے ﴿اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ﴾ [مریم:۱۹] کہ میں تیرے رب کا قاصد ہوں، ان کے حکم کی تعمیل کرنے آیا ہوں۔ اب ہماری روح ملک الموت نکالتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ ہمیں وہی مارنے والا ہے۔ مارنے والا اللہ ہے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ جا کر میرے حکم کی تعمیل کرو، جیسے بادشاہ اپنے قاصد کو دوسرے بادشاہ کی طرف خط دے کر بھیجے۔ اب کوئی راستہ کے اندر اس کو کہے کہ اس کے اندر ایک جملہ آگے پیچھے لکھ دو تو وہ کہے گا: کوئی عقل کی بات کرو۔ میری تو یہ ذمہ داری ہے کہ جو پیغام ہے اس کو دیانت و امانت کے ساتھ پہنچا دوں۔ اور جب اسی آیت کے اندر موجود ہے: ﴿اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ﴾ [مریم:۱۹] کہ میں تیرے رب کا قاصد ہوں تو جبرائیل تو بچہ نہیں دے رہا، بلکہ اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں۔

اور آگے دیکھیں کہ جب بی بی نے کہا: عجیب بات ہے کہ مجھے بچہ کیسے ہوگا!؟ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ میں جو دے رہا ہوں، بلکہ انہوں نے کہا: ﴿كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ﴾ [مریم:۲۱] یہ اللہ پر آسان ہے۔

ایک افسوس ناک حکایت:

لیکن ہمارے عقیدے تو اتنے بگڑ گئے ہیں کہ ایک بزرگ کی خدمت میں ان کا ایک مرید حاضر ہوا اور اس نے

کہا: حضرت! میری اولاد نہیں ہوتی۔ حضرت نے فرمایا: یہ مسئلہ بڑا مشکل ہے۔ اگر اولاد نہیں ہے تو صبر کرو۔ اس نے کہا: حضرت! صبر نہیں ہوتا۔ بزرگ نے کہا: تم میری پشت سے پشت ملاؤ۔ مرید نے حضرت کی پشت سے اپنی پشت ملادی۔ حضرت کا جو اپنی صلب میں نطفہ تھا وہ اس کے اندر منتقل ہو گیا۔

کیا یہی دین ہے!!؟ اگر کوئی انگریز ایسی بات پڑھے تو وہ کہے کہ اس کو سو جوتے مارو اور اس کو کوئی کافر پڑھے تو وہ کہے: کوئی ڈرامہ ہے یا مذہب ہے!؟ اللہ تعالیٰ معاف کرے کہ کتابوں کے اندر بھی یہ لکھ دیتے ہیں۔ اگر بزرگ اتنی طاقت رکھتے تھے تو پشت ملانے کی کیا ضرورت تھی؟

لفظ ''مسیح'' کے دیگر معانی:

اور بعض علماء نے مسیح کا دوسرا معنی ذکر فرمایا ہے کہ مسیح اور سیاحت کا مادہ ایک ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بڑی کثرت کے ساتھ سیاحت فرمائی اور بہت جگہوں پر تشریف لے گئے اور اسی طرح جب وہ آخر زمانہ میں اتریں گے تو وہ آکر دجال کو بھی قتل کریں گے، صلیب کو بھی مٹائیں گے اور پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے عدل وانصاف، برکتیں اور رحمتیں ہوں گی۔

اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ مسیح کا معنی ہے کہ ان کے قدمین کے نیچے تلوے اٹھے ہوئے نہیں تھے، جو اللہ تعالیٰ نے عام طور پر ہر کسی کے پاؤں میں رکھے ہیں۔

اور ایک قول یہ ہے کہ آپ جب کوڑھ، برص اور جذام کے مریضوں پر ہاتھ پھیرتے تھے تو وہ اللہ کے اذن سے ٹھیک ہو جاتے تھے، حالانکہ یہ ایسی بیماریاں ہیں جن کا دنیا میں کوئی علاج نہیں تھا۔ اس وجہ سے آپ کا لقب مسیح تھا۔

جھولے میں بولنے والے بچے:

(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا تَكَلَّمَ مَوْلُوْدٌ فِي صِغَرِهِ إِلَّا عِيْسٰى وَصَاحِبَ جُرَيْجٍ)) [تفسیر ابن کثیر]

بچپن کے اندر کسی نے بات نہیں کی، مگر عیسیٰ علیہ السلام اور صاحب جریج نے۔

(حدیث) انہی سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَمْ يَتَكَلَّمْ فِي الْمَهْدِ إِلَّا ثَلَاثَةٌ: عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَصَبِيٌّ كَانَ فِي زَمَنِ جُرَيْجٍ، وَصَبِيٌّ آخَرُ)) [بخاری، رقم: ۳۴۳۶] کہ جھولے میں تین بچوں نے کلام کیا:

ایک عیسیٰ علیہ السلام اور ایک بچہ جو جریج کے زمانہ میں تھا اور ایک اور بچہ ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن کے اندر کلام کرنا نص قطعی سے ثابت ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں اکثر کی رائے یہ ہے کہ جب ان پر تہمت لگائی گئی تو وہاں بھی ایک بچے نے کلام کیا تھا اور بعض روایات میں صاحب جریج کا بھی ذکر آتا ہے اور بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ایک واقعہ ایسا گزرا ہے کہ وہاں ایک بچے نے گواہی دی تھی۔

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مفصل تذکرہ کی حکمتیں:

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ علماء کرام نے اس کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا زمانہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے قریب ہے بنسبت دوسرے انبیاء کے؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان راجح اقوال کے مطابق اور کوئی پیغمبر، کوئی رسول نہیں بھیجا گیا اور یہ تقریباً چھ سو سال کا زمانہ ہے۔ علماء نے ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے نبی اور رسول بنی اسرائیل میں بھیجے ہیں ان میں آخری رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور ان کے بعد نبوت ولد اسماعیل میں منتقل ہوئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر نبوت ختم ہوگئی۔ تو اس طرح ایک یہ مناسبت تھی کہ بنی اسرائیل کے آخری نبی کا ذکر تفصیل سے آئے اور ادھر جو سب نبیوں کے خاتم ہیں ان کا ذکر تفصیل سے آئے۔ علماء نے یہ بھی وجہ لکھی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے انبیاء کی تصدیق کی کہ آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے رسول اور نبی ہیں برحق ہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مصدق بنے۔ اب اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی نہیں بھیجنا تو آپ کی بشارات پہلے سے موجود ہیں، لیکن نظامِ کائنات اور نظامِ خداوندی کا قائم کرنا بھی مقصود تھا کہ ایک نبی دوسرے نبی کی تصدیق کرے۔ اب آپ کے بعد تو نبی نے نہیں آنا تھا تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے آخری رسول اور نبی کو آسمانوں پر بٹھا دیا کہ وہ قیامت سے پہلے اتر کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی تصدیق کریں گے۔

اس کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمانوں پر زندہ رکھا، لیکن زمین پر زندہ نہیں رکھا۔ اس لیے اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تو شریعت نہیں چلے گی، اب تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت چلنی ہے۔ جب عین اختتام پر یہ دنیا آ جائے گی، قیامت بالکل مزید قریب ہو جائے گی اور علامات کبریٰ کا ظہور ہو جائے گا تو نزول عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام ہوگا، تاکہ وہ ان فتنوں کو بھی فرو کر دیں اور وہ اترنے کے بعد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت

کے تابع رہیں اور وہ آپ کے مصدق بنیں اور آپ ﷺ کی شریعت اور احکام دنیا میں نافذ کریں۔

مسئلۂ ختم نبوت:

اسی ضمن کے اندر علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی ختم نبوت کا مسئلہ اتنے کھلے انداز میں حل فرمادیا کہ اگر کوئی بدبخت ہلاک ہونا چاہے تو علیحدہ بات ہے، لیکن مسلمانوں میں سے کسی کو انکار نہیں، عیسائیوں کا جو فرقہ حق پر تھا اب ختم ہوگیا، وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا رسول مانتے تھے اور دوسروں نے غلو میں آکر خدا بنالیا۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہ مسئلہ حل فرمادیا کہ جب وہ آسمانوں سے اتریں گے تو حضور اکرم ﷺ کی شریعت کے تابع ہوں گے۔ اس سے مسئلہ سمجھ آگیا کہ اگر پہلا نبی یا پہلا رسول بھی زندہ ہو تو حضور اکرم ﷺ کے بعد وہ بھی اپنی نبوت کا دعویٰ نہیں کرسکتا، بلکہ حضور اکرم ﷺ کی شریعت کے تابع ہوگا۔ تو جب پہلے رسول اور نبی دعویٰ نہیں کرسکتے تو تم جیسے کذاب کو کوئی کیسے نبی مان لے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قربِ قیامت بھیجنے کی حکمت اور ان کو بغیر باپ کے پیدا کرنے کی قدرت:

تیسری بات یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا اس وقت دنیا اتنی ترقی اور عروج پر پہنچ گئی، مثلاً: بچہ پیدا ہوتا ہے تو پہلے دودھ پینے والا ہوتا ہے، آہستہ آہستہ زمین پر گھسٹتا ہے، جب بڑا ہوتا ہے تو زمین پر پاؤں رکھتا ہے، پھر اور بڑا ہوتا ہے تو چلنے لگتا ہے، پھر اور بڑا ہوتا ہے تو مدرسے جانے لگتا ہے، پھر اور بڑا ہوتا ہے تو تیس چالیس سال کا جوان ہوگیا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو آدم علیہ السلام سے پیدا کیا تو یہ بھی آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا تو عین اس کے عروج کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور اور ان کے بعد چھ سو سال اور اس کے بعد قیامت تک کا دور ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا رسول بھیجا اور اس کو ایسے معجزات دیئے گئے کہ اس قسم کے معجزات آپ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دیئے گئے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق نظامِ عالم سے ہٹ کر ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے جوڑے بنادیئے۔ جب جوڑا ملے گا تو توالد و تناسل کا سلسلہ چلے گا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کمالات قدرت کا اظہار کیا کہ ماں تو موجود ہے، باپ نہیں ہے اور بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہیں، چاہیں تو نور سے فرشتوں کو پیدا کردیں، کوئی ان کا ماں باپ نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں تو آگ سے ابلیس کو پیدا کردیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت ہے، تاکہ بندہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کسی اسباب کا پابند نہیں ہے، مخلوق اسباب کی پابند ہے کہ پانی پیئے گا تو پیاس بجھے گی، کھانا کھائیں گے تو بھوک مٹے گی، چلیں گے تو سفر

قطع ہوگا اور لیٹیں گے تو آرام ملے گا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا تو ایک انہونی سی اور نئی سی بات ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو کھول کر بیان فرمایا اور اس میں ہمیں سبق دیا کہ جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو دیکھ کر خدا بنا لیا تم بھی حضور اکرم ﷺ کے معجزات کو دیکھ کر ان کی خدائی کے قائل نہ ہو جانا، ان کے مختارِ کل ہونے کے قائل نہ ہو جانا، ایسا نہ ہو کہ تم ان کے اندر خدائی صفات ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو تفصیل سے بیان فرمایا کہ وہ جب قرآن پڑھیں، احادیث رسول کا مطالعہ کریں تو ان کو عقل کرنا چاہیے کہ معجزہ علیحدہ چیز ہے اور قدرتِ خداوندی علیحدہ چیز ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے مختلف معجزات کی حکمت:

علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک طریقہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس دور میں نبی بھیجے ان کو اللہ تعالیٰ نے معجزات دیئے اور یہ معجزات اس زمانہ کے حالات کے مطابق دیئے، تا کہ اس دور کے لوگ مان جائیں کہ یہ شخص نبی ہے۔ معجزہ کہتے ہیں ایک ایسا خارقِ عادت امر جو بغیر کسی اسبابِ ظاہری کے اللہ کے نبی کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ظاہر ہو جائے اور باقی دنیا اس کو کر دکھانے سے عاجز ہو۔ اور اگر امرِ خارق ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہو تو کرامت کہلائے گی۔ یہ معجزات نبی اور رسول کی صداقت کی دلیل ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن معجزات کو آیت کہتا ہے، کہیں اس کو معجزہ نہیں فرمایا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں حکمت اور طبابت کا بڑا زور تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایسے معجزات عطا فرمائے کہ مادرزاد اندھے کا کوئی علاج نہیں کر سکتا تھا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہاتھ پھیرتے تو وہ ٹھیک ہو جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان واقعات کو کھول کر بیان فرمایا، تا کہ کوئی اندھیرے میں نہ رہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ کی خدمت میں نجران کا وفد آیا اور آپ نے ان سے قرآن کی روشنی میں بات کی تو وہ دنگ رہ گئے، ان سے کوئی جواب نہ بن سکا۔ کیونکہ حقیقت وہ تھی جو حضور اکرم ﷺ بیان فرما رہے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان واقعات کو کھول کر بیان فرمایا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے ان کے رفع آسمانی پر استدلال:

مفسرین رحمہم اللہ نے ایک اور عجیب بات لکھی ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات پر غور کریں تو آپ کو ان میں سے کچھ اور عبرتیں بھی ملیں گی؛ کیونکہ ان کی ولادت بغیر باپ کے ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو ان کو معجزات عطا فرمائے

ہیں کہ ایک مٹی کا پرندہ بناتے اور اس کے اندر پھونک مارتے تو وہ زندہ ہو کر اڑ جاتا تھا۔ اب یہ کوئی حکمت یا طب نہیں تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اگر کل کو کوئی منکر انکار کرے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ نہیں تھا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام انسان تو تھے، وہ حدودِ انسانیت سے تو باہر نہیں ہیں اور انسان کی اصل مٹی ہے۔ اب مٹی سے پیدا ہونے والا انسان اڑ کر آسمانوں پر پہنچ جائے تو ایک نئی بات تھی، لوگ کہہ سکتے تھے کہ یہ نہیں ہو سکتا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے مٹی کا پرندہ بنا کر میں اڑا سکتا ہوں تو عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اڑا سکتا ہوں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا معجزہ عطا فرمایا جو ان کی حیات جسمانی پر اور رفع جسمانی الی السماء پر بھی دلیل بن جائے۔

علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے معجزے سے ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر میرا نبی تمہارے سامنے مٹی لے کر پرندے کی صورت بناتے ہیں اور اس میں پھونک مارتے ہیں تو وہ اڑ جاتا ہے تو اگر مٹی کی چیز میں روح پیدا ہو سکتی ہے تو بی بی مریم تو جیتی جاگتی عورت ہے تو کیا اس کے پیٹ میں بچہ پھونک سے پیدا نہیں کر سکتا ہوں؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سارے حالات کو کھول کر بیان فرمایا اور اسی کے اندر عظمت محمد مصطفیٰ ﷺ کا بھی اظہار کر دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام جیسا شان والا نبی وہ بھی میرے مدنی کی شریعت کے تابع ہے تو میرے نبی کے بعد اور نبی کیسے بن سکتا ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کچھ صفات:

﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ﴾ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد لکھنے کا علم ہے؛ کیونکہ تورات و انجیل کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ [آل عمران: ۴۸] سے مراد دانائی کی باتیں ہیں۔ پھر اس حکمت کے لفظ کا اطلاق سنت پر بھی کیا گیا ہے؛ کیونکہ سنت بھی تو دانائی کی باتیں ہیں، لہٰذا اس پر بھی حکمت کا اطلاق ہوتا ہے۔ حکمت ایسی باتیں، ایسے نکتے اور ایسی گرہیں ہیں جو کسی سے نہ کھلتی ہوں۔ اللہ کے نبی آ کر اس کو کھول دیتے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کتابت کا علم بھی عطا فرمایا، دانائی کی باتیں بھی سکھائیں اور آپ کو تورات انجیل کا علم بھی عطا فرمایا۔

﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ [آل عمران: ۴۹]

اور یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی وضاحت کر دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے، ساری دنیا کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ یہ شان حضور اکرم ﷺ کو ملی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شان سے

بھیجا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر گورے، کالے کی طرف نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مشرق سے مغرب تک، شمال سے جنوب تک جتنی مخلوق ہے سب کی طرف مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے، ورنہ عیسیٰ علیہ السلام کو صرف بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔

﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝﴾ [آل عمران: ۴۸ تا ۵۱]

”اور وہ تعلیم دے گا اسے کتاب وحکمت کی اور تورات اور انجیل کی۔ اور اسے بنی اسرائیل کے پاس رسول بنا کر بھیجے گا (جو لوگوں سے یہ کہے گا:) میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں، (اور وہ نشانی یہ ہے) کہ میں تمہارے سامنے گارے سے پرندے جیسی ایک شکل بناتا ہوں اور پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ اور میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کر دیتا ہوں اور مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم لوگ جو کچھ اپنے گھروں میں کھاتے یا ذخیرہ کر کے رکھتے ہو میں ہو سب بتا دیتا ہوں۔ اگر تم ایمان لانے والے ہو تو ان تمام باتوں میں تمہارے لیے (کافی) نشانی ہے۔ اور جو کتاب مجھ سے پہلے آ چکی ہے، یعنی تورات، میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں، اور (اس لیے بھیجا گیا ہوں) تاکہ کچھ چیزیں جو تم پر حرام کی گئی تھیں، اب تمہارے لیے حلال کر دوں۔ اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔ بے شک اللہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار۔ یہی سیدھا راستہ ہے (کہ صرف اسی کی عبادت کرو)۔“

وحیِ شریعت اور وحیِ مطلق:

یہ آیات بھی اس بشارت کا حصہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بی بی مریم کو فرشتوں کے ذریعہ عطا فرمائیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہاں آدمی کو ایک بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ایک وحی شریعت ہے اور ایک مطلقاً وحی ہوتی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ بعض فرامیں ارشاد فرماتے ہیں۔ جہاں تک وحی شریعت کا تعلق ہے وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے علاوہ کسی غیر کے لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک جتنے انبیاء بھیجے ان کے پاس وحی بھیجی۔

وحی کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک وحی یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی واسطے کے خود انبیاء کے دل میں ایک بات ڈال دیتے ہیں، دوسری وحی یہ ہوتی ہے کہ اللہ فرشتے کے ذریعے اپنی وحی پیغمبر کے پاس بھیجیں اور تیسری وحی یہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام انسان کی شکل میں اللہ تعالیٰ کے نبی کے سامنے آئیں اور اللہ تعالیٰ کے احکامات پہنچادیں۔

کفار کا ایک اعتراض اور اس کا جواب:

اعداء اسلام پر یہ بات تو واضح ہوگئی ہے کہ اگر کوئی دستور اور قوم ہم پر غالب آسکتی ہے تو وہ اسلام اور مسلمان ہیں۔ اس لیے وہ ہر وقت اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ ہمیں کوئی چھوٹی سی بات اسلام کے خلاف ملے اور ہم اس پر اعتراض کرسکیں۔ یہاں بھی وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں وحی ہے اور ایک فرشتہ اترتا ہے اور اللہ کے نبی کو ایک پیغام دیتا ہے۔ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ واقعی وہ انسان کی شکل میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں؟ اس سوال سے عام آدمی کے ذہن میں ایک خلجان واقع ہوگیا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ایسے لوگ راہبوں اور کاہنوں میں بھی گزرے ہیں اور دنیا میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن پر جنات وشیاطین آکر اپنی باتیں ڈالتے ہیں اور وہ لوگوں کو آگے بتاتے ہیں۔ اعداء اسلام اس طرح کے شبہات وحی کے بارے میں ڈالتے ہیں۔

جواب:

یاد رکھیں! اگر آپ کسی ملک کے اندر اپنا سفیر اور قاصد بھیجتے ہیں تو اس کی کچھ علامات ہوتی ہیں کہ جب ایک لیٹر آئے گا تو وہ سمجھ لے گا کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ دوسرا آدمی اس کو پڑھے گا تو اس کو سمجھ نہیں آئے گا۔ تو جب اللہ تعالیٰ

کسی کو اپنی نبوت و رسالت کے لیے چن لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان میں بھی بعض خاصیتیں پیدا فرما دیتے ہیں کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کر سکیں اور صدق و کذب میں امتیاز کر سکیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ شیاطین اور فرشتوں کا بالکل تضاد ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور گناہوں سے پاک ہوتے ہیں اور شیاطین سے عمل صالح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب اللہ کے فرشتے آئیں گے تو وہ دین کی بات کریں گے، صدق کی بات کریں گے اور اگر شیاطین ہوں گے تو وہ گمراہی ڈالیں گے، فساد پھیلائیں گے۔ لہٰذا دونوں کے طریقہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حق والا طریق ہے یا باطل والا طریق ہے۔

غیر انبیاء کی طرف وحی کرنے کا معنی:

یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ کبھی کبھی وحی نبی کے علاوہ بھی بھیجتے ہیں، لیکن وہ وحی تشریعی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتہ بی بی مریم علیہا السلام کے پاس بھیجا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو فرشتوں نے خوشخبری دی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ نبی ہو گئیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کی طرف وحی بھیجی۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے اندر خصائص آ گئے۔ جس جگہ بھی وحی کا لفظ آ جائے تو وہ ہر جگہ اس معنی میں نہیں ہوتا کہ جو وحی نبی پر آتی ہے وہی ان پر بھی آتی ہے۔ بس لفظ مشترک ہے جیسا کہ آپ لفظ شیر (بمعنی درندہ) اور پھر شیر (بمعنی دودھ) لکھیں۔ اب دونوں لفظ ایک جیسے ہیں، لیکن دونوں میں فرق ہے۔ حالانکہ دونوں کے لکھنے کی شکل ایک ہے۔ اس لیے یاد رکھ لیں کہ ہر جگہ وحی سے وحی نبوت مراد نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم خفیہ طریقے سے پہنچانے کا نام بھی وحی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَآءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ﴿٥١﴾﴾ [الشوریٰ: ۵۱]

''اور کسی انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ اس سے (روبرو) بات کرے، سوائے اس کے کہ وہ وحی کے ذریعے ہو، یا کسی پردے کے پیچھے سے، یا پھر وہ کوئی پیغام لانے والا (فرشتہ) بھیج دے، اور وہ اس کے حکم سے جو وہ چاہے وحی کا پیغام پہنچا دے۔ یقیناً وہ بہت اونچی شان والا، بڑی حکمت کا مالک ہے۔''

کوئی بندہ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام نہیں ہو سکتا، ہاں اگر اللہ تعالیٰ خود کلام فرمانا چاہیں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے

ساتھ کلام فرمایا، لیکن وہ کلام بھی ایسا تھا کہ رؤیت نہیں ہوسکی۔

عورت نبی کیوں نہیں بن سکتی؟

اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبی اور رسول نہیں بنایا؛ کیونکہ وہ اس کی اہل نہیں ہے۔ نبوت ایک اعلیٰ مقام ہے جو کہ کسی ادنیٰ کو نہیں دیا جاسکتا۔

اس لیے یاد رکھ لیں! بی بی مریم علیہا السلام صدیقہ ہیں اور ان عورتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مردوں میں اللہ تعالیٰ نے لاکھوں کامل پیدا کیے ہیں، لیکن عورتوں میں چند عورتیں کامل پیدا ہوئی ہیں۔ جن میں ایک بی بی مریم علیہا السلام بھی ہیں، بی بی آسیہ علیہا السلام بھی ہیں، بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں اور اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں۔[1]

لیکن اتنی شان کے باوجود ان میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ نے نبی نہیں بنایا۔ نبوت تو بڑی چیز ہے، بلکہ ان کو ایک مسجد کی امامت کی بھی اجازت نہیں دی، اذان کی بھی اجازت نہیں، عورت کے لیے جمعہ اور عیدین میں حاضر ہونا بھی واجب نہیں۔

بہر حال بی بی مریم علیہا السلام کو جہاں اور خوشخبریاں دیں وہاں یہ بھی خوشخبری دی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایسا بچہ دیں گے جن کو اللہ تعالیٰ کتاب کی تعلیم دیں گے، حکمت بھی دیں گے اور تورات و انجیل بھی تعلیم عطا فرمائیں گے۔

﴿وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝﴾ [آل عمران:۴۹]

جب ان کو رسول بنا کر بھیجا جائے گا تو وہ اپنی قوم سے کہیں گے کہ اے قوم بنی اسرائیل! اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے پاس نشانی دے کر بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ معجزہ عطا فرمایا ہے کہ میں مٹی کا ایک پرندہ بنالوں، اس

---

1. ابن عدی رحمہ اللہ نے کامل میں روایت نقل کی ہے کہ تمام جہان کی عورتوں میں سے بہترین مریم بنت عمران علیہا السلام، فرعون کی بیوی آسیہ علیہا السلام، خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ میں روایت نقل کی ہے کہ عورتوں میں سے صرف تین عورتیں کامل پیدا ہوئی ہیں: مریم بنت عمران علیہا السلام، فرعون کی بیوی آسیہ علیہا السلام اور خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام عورتوں پر ایسے ہے جیسے ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر ہے۔ [کامل لابن عدی، جلد: ۴، صفحہ: ۲۱۷، البدایہ والنہایہ، جلد: ۲، صفحہ: ۵۶]

میں جب پھونک ماروں تو وہ حقیقی پرندہ بن کر اڑ جائے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں، بلکہ یہ ایک بہت بڑا معجزہ تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صداقت نبوت پر دلالت کرتا ہے۔

اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں:

بعض اوقات عقائد میں ڈھیلے لوگ ان آیات کو اپنے ترجمے پہنا دیتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے:

﴿أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ﴾

اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ میں تمہارے لیے ایک پرندہ پیدا کروں گا۔ تو وہ استدلال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی پیدا کرنے کی طاقت تھی، نبی بھی خالق ہوتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کے عقیدوں کو خراب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس جب فرشتے آئے تو انہوں نے کہا کہ ان کو برباد کر دیں گے۔ فرشتے جب برباد کر سکتے ہیں تو پیر بھی برباد کر سکتے ہیں۔ یہ دراصل مسلمانوں کے اعتقاد کو دھوکہ دینے والی بات ہے۔ یا تو وہ بدقسمتی سے ترجمہ نہیں سمجھے یا جاننے کے باوجود دھوکہ دیتے ہیں، ورنہ قاعدہ ہوتا ہے کہ کسی کو بادشاہ اپنا مامور بنا کر بھیج دے تو وہ کام بھی کرے گا تو آڈر بادشاہ کا ہوتا ہے، لیکن وہ یہی کہے گا کہ میں آپ کو سزا کر دوں گا، میں آپ کو چھوڑ دوں گا، میں آپ کو یہ کر دوں گا۔ اس کی اصل پاور وہ ہے جو پیچھے دینے والے نے دی ہے، یہ تو صرف اس کی بات نقل کر رہا ہے۔ اس لیے فرشتے نے بی بی مریم کو کہا: ﴿إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا﴾ [مریم:۱۹] میں تو تیرے رب کا ایک قاصد ہوں۔ اور یہاں بھی آگے لفظ آ رہے ہیں: ﴿أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ﴾ میں جب مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک ماروں گا وہ حقیقی پرندہ بن جائے گا اور وہ اسی طرح اڑ جائے گا جیسے پرندے اڑتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اذن، اللہ کے حکم سے ہوگا اور اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو تو ایسا نہیں ہو سکتا۔

معجزات اور کرامات کا اختیار بھی اللہ کے پاس ہے:

ہمارے لوگ جب انبیاء کے معجزات اور اولیاء کی کرامات کو دیکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی توحید کو بھول جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی اختیار دیا ہے۔ اس لیے وہ عقیدہ بنا لیتے ہیں کہ ہر چیز کا مالک اللہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے ان پیاروں کو اور ان محبوبوں کو اوتار بنا لیا ہے، ان کو مختار بنا لیا ہے۔ یہ بربادی ہے جو عقیدوں کو

برباد کرتی ہے۔

اسی طرح جن لوگوں نے شیطانی تصرفات دیکھے ہیں، نجومیوں کے معتقد ہو جاتے ہیں کہ اس نے میرا استارہ نکالا ہے اور مجھے سارے احوال بتادیئے۔ یاد رکھیں! جتنے شیطانی تصرفات ہیں وہ بھی اللہ کے حکم سے کچھ اثر کرتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہی سیدھا راستہ ہے، حالانکہ سیدھا راستہ وہ ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے اور اللہ کے قرآن نے بتایا ہے۔

تصویر سازی کی حرمت:

پرندے کی تصویر یا اس کا مجسمہ بنانا ہماری شریعت میں حرام ہے، پہلی شریعت کے اندر جائز تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے مصورین پر لعنت کی ہے۔ [بخاری، رقم: ۵۳۴۷]

اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: قیامت والے دن مجسمہ سازوں اور مصورین کو اللہ تعالیٰ ایسا عذاب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم نے یہ مجسمہ بنایا تھا، اب تم اس کے اندر روح کو پھونکو۔ [بخاری، رقم: ۵۹۵۱]

اب وہ کہاں سے روح پھونکے؟ اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا کہ جب تک یہ روح نہ پھونکے اس وقت تک اس کو جہنم میں جلاؤ۔

غیر اللہ کو سجدہ جائز نہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب ان کے والد، ان کی خالہ اور ان کے بھائیوں نے سجدہ کیا تو اس سے بعض لوگ دلیل پکڑتے ہیں کہ اگر حضرت یعقوب علیہ السلام اللہ کے نبی ہو کر حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کر سکتے ہیں اور اگر نبی کو سجدہ جائز ہے تو علماء، اولیاء بھی نبی کے وارث ہیں تو ان کو بھی سجدہ جائز ہے۔ یہ بات دماغ کی خرابی کی علامت ہے: کیونکہ شریعتِ یوسف علیہ السلام کے اپنے احکام ہیں، شریعتِ موسیٰ علیہ السلام کے اپنے احکام ہیں، شریعتِ عیسیٰ علیہ السلام کے اپنے احکام ہیں اور ہم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے پابند ہیں۔ ہم نے کلمہ پڑھا ہے: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"۔

لفظ "اَکْمَهَ" کے معانی:

﴿وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دوسرا معجزہ یہ ملا تھا کہ نابینا کو بینا کر دیتے تھے۔

﴿اَلْاَکْمَہَ﴾ کے معنی کے اندر علماء نے لغت کے اعتبار سے اقوال نقل فرمائے ہیں: بعض علماء نے فرمایا: ﴿اَلْاَکْمَہَ﴾ سے مراد وہ ہیں جن کو شام میں نظر نہ آئے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد بھینگا ہے کہ ایک آنکھ سے نظر آئے اور دوسری آنکھ سے نظر نہ آئے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: ﴿اَلْاَکْمَہَ﴾ سے مراد وہ ہے جو ماں کے پیٹ سے ہی نابینا پیدا ہوا اور یہ معنی زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ جو بچے ماں کے پیٹ سے نابینا پیدا ہوں ان کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ ایسے اندھے کو ہاتھ لگانے سے اللہ تعالیٰ آنکھیں عطاء فرمادیں یہ بہت بڑا معجزہ ہے، جو آپ کی صداقت پر زیادہ دلالت کرنے والا ہے۔

برص کی بیماری کو دور کرنے کا معجزہ:

﴿وَالْاَبْرَصَ﴾

یہ ایک ایسا مرض ہے کہ انسان کے بدن پر سفید سفید داغ پڑنے شروع ہوجاتے ہیں، بعض لوگوں کے چہرے پر اور بعض لوگوں کے سارے بدن پر، بعض کے پاؤں پر اور بعض کے ہاتھوں پر پڑنے شروع ہوجاتے ہیں۔ برص اور جذام یہ دو ایسی بیماریاں ہیں جن کو لاعلاج سمجھا جاتا ہے۔

ویسے یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری ایسی نہیں رکھی جس کا علاج نہ اتارا ہو، لیکن اس دوا تک ہمارا علم نہ پہنچے تو یہ علیحدہ بات ہے۔ تو لاعلاج کے معنی یہ ہیں کہ ابھی ڈاکٹروں اور اطباء کو ان بیماریوں کا شافی علاج نہیں ملا۔ جذام کوڑھ کی بیماری کو کہتے ہیں۔ اس میں بدن گلنا اور پھٹنا شروع ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے ان دو بیماریوں سے پناہ مانگی ہے:

"اَللّٰهُمَّ! إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبَرَصِ، وَالْجُنُوْنِ، وَالْجُذَامِ، وَمِنْ سَيِّئِ الْأَسْقَامِ"

"اے اللہ! ہمیں برص، جنون اور جذام کی بیماریوں سے پناہ میں رکھنا اور تمام بڑی بیماریوں سے ہمیں بچانا۔"

[ابوداود، رقم: ۱۵۵۴]

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ بھی معجزہ عطا فرمایا تھا کہ اگر برص والے کو ہاتھ پھیر دیتے تو برص کی بیماری ختم ہوجاتی۔

مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ:

﴿وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ﴾

بہت سارے علماء نے یہ تحقیق بیان فرمائی ہے کہ اللہ پاک نے اپنے نبی علیہ السلام کو جب بھیجا تو اس زمانے کے مطابق ان کو معجزات عطا فرمائے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو کا بڑا زور تھا اور لوگ جادوگروں کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسا معجزہ عطا فرمایا جس نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا اور ہر جادوگر کو حیران کر دیا۔ اور جب وہ جادوگر اس بات کے یقین تک پہنچ گئے کہ یہ جادو نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزہ ہے تو وہ بھی اللہ کے صالح بندے بن گئے اور ان پر ایمان لے آئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو بطور معجزہ اور اپنے اولیاء کو کبھی بطور کرامت ایسی چیز عطا فرماتے ہیں کہ مردے کو حکم ملا تو وہ کھڑا ہو گیا۔ تو یہ معجزہ ہوتا ہے، ورنہ ہر نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ جب چاہے وہ کسی مردے کو زندہ کر لیں۔ اگر یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اپنے اختیار میں ہوتی تو کیا وہ اپنی والدہ محترمہ کو زندہ نہ کر لیتے؟

اسی طرح بعض اولیاء سے ایسی کرامات کا اظہار ہوا، مثلاً: اصحاب کہف تین سو سال تک سوتے رہے اور جب اٹھے تو کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ یہ کرامت تھی۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تو وہ فصحاء کا زمانہ تھا، بلغاء کا زمانہ تھا اور بڑے بڑے شعراء کے کلام آتے تھے۔ اس دور میں فصاحت و بلاغت کا اتنا زور تھا کہ شعراء حج کے موسم میں اپنا کلام لکھ کر اللہ کے کعبہ پر لٹکا دیتے تھے اور ایک دوسرے کو چیلنج کرتے تھے کہ میرے اس شعر کا مقابلہ کرو، میرے اس قصیدے کا مقابلہ کرو۔ عرب میں ایسے فصحاء و بلغاء گزرے کہ جب زندگی میں ایک جملہ ادا کیا تو پھر ساری زندگی وہ جملہ نہیں دہرایا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک پیغمبر کو کتاب اللہ کا ایک معجزہ دیا کہ تمام فصحاء دنگ رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: میرے مدنی! آپ ان کو چیلنج کریں اور ان کو کہیں کہ قرآن کے مقابلہ پر قرآن لے آؤ۔ اگر تم پورا قرآن نہیں بنا سکتے تو دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور اگر دس سورتیں نہیں بنا سکتے تو ایک سورت بنا کر لے آؤ۔ لیکن ساری دنیا نے زور لگایا وہ قرآن کے مقابلے پر ایک سورت نہ بنا سکے اور نہ بنا سکیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک اور معجزہ:

﴿وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۙ﴾

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ معجزہ بھی دیا ہے کہ جو کچھ تم کھا کر آتے ہو میں وہ بھی میں

بتا سکتا ہوں اور جو تم نے کل کے لیے گھر میں رکھا ہے اس کی بھی تمہیں خبر دے سکتا ہوں۔ یاد رکھیں! یہ بھی معجزہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو معجزات عطا فرماتے ہیں، اپنے اولیاء کو بطور کرامت غیب کی کچھ باتیں ظاہر فرما دیتے ہیں۔ یہ اخبار عن الغیب ہے، یہ علم غیب نہیں ہے؛ کیونکہ علم غیب کا مالک اللہ ہے، علم کامل، علم محیط، علم ابدی، دائمی، کامل اور تام کا مالک اللہ ہے اور ما کان و ما یکون کا مالک اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہیں تو بعض باتیں اپنے انبیاء کو بتا دیں اور اگر نہ چاہیں تو نہ بتائیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ باتیں بتا دیں، لیکن ان کو یہ پتا نہیں تھا کہ میری حفاظت کیسے فرمائیں گے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی جان کے بارے میں بھی علم نہیں دیا۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو اپنے اولیاء پر بھی یہ باتیں ظاہر فرما دیتے ہیں، لیکن اس سے بندہ عالم الغیب نہیں بن جاتا۔ اور جس کو کوئی ذاتی طور پر جانتا ہو اور اس کے سوا اس کو کوئی نہ جانتا ہو وہ علم غیب ہے۔ حالانکہ ہر چیز کو اللہ جانتا ہے تو بندوں کے لیے وہ علم غیب کیسے ہوگا؟ اور جس چیز کو صرف اللہ جانتا ہے تو وہ علم غیب ہے۔ جب کوئی دوسرا بھی جاننے لگے تو وہ علم غیب نہیں رہتا۔ عالم الغیب ہونا صفت خداوندی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ معجزے عطا فرمائے ہیں۔ ان میں تمہارے لیے نشانی ہے کہ میری صداقت پر دلیل ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول اور اللہ کا بندہ ہوں، تاکہ تم لوگ ایمان لے آؤ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۝﴾ [آل عمران: ۵۰]

مجھ سے پہلے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کتاب تورات اتاری ہے میں اس کتاب کی تصدیق کرنے والا ہوں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت ہے اور میں اس کو ثابت رکھنے والا ہوں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت ہے اور میں اس کو ثابت رکھنے والا ہوں، اسی پر عمل کروں گا۔

تورات کے بعض احکام انجیل میں منسوخ ہو گئے تھے:

بعض علماء فرماتے ہیں: تورات کے بعض احکام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے منسوخ فرما دیئے،

جیسا کہ ان پر بعض چیزیں حرام تھیں، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حلال ہو گئیں، لہٰذا پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں: کوئی بھی حکم منسوخ نہیں ہوا۔ ان لوگوں نے جہالت کی وجہ سے اپنے احکام بنا رکھے تھے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس اختلاف کو ختم کیا، ورنہ آپ نے کوئی چیز منسوخ نہیں فرمائی۔ یاد رکھیں اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں اور شریعتیں اتاری ہیں سب برحق ہیں۔ اگر کوئی حکم دوبارہ نہ آئے تو پہلی شریعت کا حکم نافذ ہوتا ہے، اس کے بعد اگر حکم آ جائے تو وہ حکم ختم ہو جائے گا، ورنہ اسی شریعت پر عمل ہوتا رہے گا؛ کیونکہ وہ بھی اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے۔

مثال کے طور پر حضور اکرم ﷺ نے ابتداء اسلام میں بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، حالانکہ قرآن میں کہیں بھی حکم نہیں ہے کہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھو اور کسی حدیث مبارک میں یہ نہیں ملتا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور خاص حکم بھیجا ہو کہ آپ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھیں اس سے معلوم ہوا کہ پہلے انبیاء چونکہ نماز بیت المقدس کی طرف پڑھتے تھے تو حضور اکرم ﷺ کا قبلہ بھی وہی تھا۔ جب حکم ملا کہ اب ادھر سے رخ پھیریں تو اب یہ قبلہ قرار پایا۔

﴿فَلَمَّآ أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنصَارِيٓ إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۞ رَبَّنَآ آمَنَّا بِمَآ أَنزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۞ وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۞﴾ [آل عمران: ۵۲ تا ۵۴]

''پھر جب عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ وہ کفر پر آمادہ ہیں تو انہوں نے (اپنے پیروؤں سے) کہا: کون کون لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں میرے مددگار ہوں گے؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ (کے دین) کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لا چکے ہیں اور آپ گواہ رہیے کہ ہم فرمانبردار ہیں۔ اے ہمارے رب! آپ نے جو کچھ نازل کیا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے رسول کی اتباع کی ہے، لہٰذا ہمیں ان لوگوں میں لکھ لیجیے جو (حق کی) گواہی دینے والے ہیں۔ اور ان کافروں نے (عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی۔ اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔''

دعوت انبیاء کی سابقہ تاریخ:

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس فرمایا کہ میری قوم میری رسالت کے انکار پر اور نافرمانی پر جمی ہوئی ہے اور میری دعوت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، بلکہ یہ مجھے قتل کرنے کے درپے ہیں۔

چونکہ تاریخ انسانیت ہمیں بتاتی ہے کہ جب کبھی حق کی دعوت دینے والے اٹھے ہیں، کسی بھی دور کے اندر ہوں، چاہے انبیاء ہوں یا علماء ہوں، جو بھی دعوت حق لے کر کھڑا ہوا اس کی مخالفت ہوئی، لوگوں نے اسے ہر قسم کی ایذاء پہنچائی، اللہ تعالیٰ کے راستے میں انہیں امتحانات کی بھٹیوں سے گزرنا پڑا، اللہ تعالیٰ کے راستے میں انہیں تکلیفوں کے سمندر کو عبور کرنا پڑا، حتیٰ کہ بعض انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی دعوت کی وجہ سے شہید کر دیا گیا اور بعض انبیاء کے سر پر آرا رکھ کر ان کو دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ اسی طرح صحابہ، تابعین، ائمہ محدثین اور آج جو فرد اور جماعت دعوت حق کا کام کرے گی تو لازمی بات ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں آزمائے جائیں گے اور ان پر امتحانات گزریں گے۔ اب یہ نصیب کی بات ہے کہ بعض لوگ کامیاب ہو کر غازی کہلاتے ہیں اور بعض اس راستے میں شہید کہلاتے ہیں، لیکن یہ آزمائش ضرور آتی ہے۔ اور جو لوگ دنیا میں مزے کرتے ہیں: اقتدار، عزت، دولت اور پیسہ ہو تو سمجھ لو کہ ان کی دعوت دعوت حقہ نہیں ہوتی۔ اگر ان کی دعوت حقہ ہوتی تو ان کو بھی سنت انبیاء کے مطابق تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ سب سے پہلے عذاب دیں گے کہ میں نے تمہیں علم دیا تھا، لیکن تم نے حق بات نہیں پہنچائی۔

حواریوں سے مدد لینے کا مفہوم:

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ محسوس کر لیا کہ انہوں نے صرف میرا انکار نہیں کیا، بلکہ میرے قتل کے درپے ہیں تو آپ نے اسبابِ ظاہری کے مطابق کہا: ﴿مَنْ أَنصَارِيٓ إِلَى ٱللَّهِ﴾ (کون ہے جو میری مدد کرے گا؟)

بعض گمراہ فرقے اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ دیکھو! حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی دوسروں کو مدد کے لیے پکارا تھا، لہٰذا اگر ہم "یا علی مدد" کہتے ہیں تو اس میں شرک کی کیا بات ہوگئی؟ اور اگر ہم "یا غوث پاک" کہتے ہیں تو شرک کی کیا بات ہوگئی؟

یاد رکھیں! ایک ہے دنیا میں رہ کر اپنے سامنے زندہ لوگوں کو دین کی نصرت کے لیے بلایا جائے۔ یہ بات مدد نہیں ہوتی، بلکہ اسباب ظاہری ہیں۔ مثلاً: آپ اذان دیں گے تو نماز کے لیے آئیں گے؟ شرک یہ ہے کہ غائبانہ طور پر

کسی کی عدم موجودگی میں یا کسی کی موت کے بعد اس کو پکارا جائے اور اس سے مدد طلب کی جائے یا اس کو حاضر وناظر سمجھا جائے یا اس کو عالم الغیب کا درجہ دیا جائے تو یہ کفر وشرک ہے، ورنہ تو حضور اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: میری مدد کرو، حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام سے صدقات طلب کیے۔ یہ چیزیں ممنوع نہیں ہوتیں، بلکہ یہ نظامِ عالم ہے، جو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے کہ ہم پانی بھی پئیں گے، ہم کھانا بھی کھائیں گے اور ہم ایک دوسرے کی مدد ونصرت بھی کریں گے، لیکن کسی کی موت کے بعد کسی کو نداء کی جائے بایں اعتقاد کہ وہ میری نداء سن رہا ہے اور میری مدد کرنے پر قادر ہے تو یہ شرک اکبر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو شرک اور غلط عقیدے سے محفوظ رکھے۔

حواری کا معنی:

1 ...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مدد کے لیے پکارا کہ کون میری مدد کرنے والا ہے؟ تو ان کے حواریوں نے کہا: ﴿نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ (ہم اللہ کی مدد کرنے والے ہیں) چونکہ اللہ کے دین کی مدد اور اللہ کے نبی کی مدد اللہ تعالیٰ کی مدد ہے۔

حوارین کے بارے میں علماء نے کئی اقوال نقل فرمائے ہیں۔ بعض نے فرمایا: حواری دھوبی کو کہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد ونصرت کرنے والے دھوبی تھے۔

آپ تاریخ عالم پر نظر ڈال کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حق والوں کی مدد ہمیشہ غریب نے کی ہے اور جتنے فرعون، قارون اور بڑے بڑے جبار تھے وہ حق کے مخالف رہے ہیں، بہت قلیل ایسے لوگ گزرے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی اور دین بھی دیا۔ اس سے یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اسلام کے اندر کوئی پیشہ نہ عزت کا باعث ہے اور نہ ذلت کا باعث ہے۔ اصل بات تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔

2 ...... بعض علماء نے فرمایا: حواری کا معنی سفید ہے، یعنی جو باعتبار لباس کے بھی صاف تھے اور باعتبار دل کے بھی صاف تھے اور گورے رنگ کے تھے، یعنی اندر وباہر سے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخلص تھے۔ اس لیے ان پر لفظ حواری کا اطلاق کیا گیا۔ جیسے ہمارے ہاں لفظ صوفی مشہور ہے۔ یہ لفظ صفائے قلب سے تھا۔ وہ لوگ جن کا قلب گناہوں کی گندگی سے پاک ہے ان پر گناہوں کا، نافرمانی کا زنگ اور میل نہیں لگا اور جن کے دل اللہ تعالیٰ نور سے بھر دیتے ہیں۔

3 ...... بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حواری کا معنی ہے: ناصر، مدد کرنے والا۔ ایک حدیث پاک میں آیا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے غزوۂ احزاب کے دن لوگوں کو مدد کے لیے بلایا اور آواز دی: ''مَنْ أَنْصَارِيْ إِلَى اللّٰهِ''

(کون ہے جو میری مدد کرے گا؟) تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے لبیک کہا۔ دوسری یا تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی جواب عرض کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر پیغمبر کے حواری ہوتے ہیں اور میرا حواری زبیر رضی اللہ عنہ ہے۔ [بخاری، رقم: ۲۷۱۹]

حواریوں کی تعداد:

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿مَنْ أَنصَارِيٓ إِلَى ٱللَّهِ﴾ (کون ہے جو میری مدد کرے گا؟) مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ تقریباً بارہ آدمی تھے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نصرت کا وعدہ کیا کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے اور آپ گواہ ہو جائیں کہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کے ماننے والے ہیں، اپنے آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے تابع کرتے ہیں اور ہم نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی اتباع کی ہے۔ اے اللہ! تو ہمیں حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ دے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مشکلات:

﴿وَمَكَرُوا۟ وَمَكَرَ ٱللَّهُ ۖ وَٱللَّهُ خَيْرُ ٱلْمَٰكِرِينَ ﴾ [آل عمران: ۵۴]

اگلی آیات کے اندر یہ واقعہ آرہا ہے، اس کو وہاں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں نصاریٰ اور یہود تھے۔ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن تھے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر ماننے کی بجائے ان کی والدہ پر تہمت لگائی کہ ان کے یوسف النجار کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے اور اس سے یہ بچہ پیدا ہوا......نعوذ باللہ!......

اللہ کے انبیاء پر ہر قسم کے ابتلاء آتے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام پر بھی تہمت لگی کہ امرأۃ العزیز نے خود دعوت دی تھی اور خود دروازے بند کیے تھے، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام بھاگے، اس نے پکڑنے کی کوشش کی، لیکن جب اس کے سامنے اس کا خاوند آ گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام پر اس نے تہمت لگا دی۔

اسی طرح حضرت جریج رحمہ اللہ جو بڑے ولی گزرے ہیں، جن کی ساری زندگی عبادت میں گزری تھی ان پر ایک عورت نے زنا کی تہمت لگائی۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق نظریات:

اسی طرح یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر تہمت لگائی۔

اور عیسائیوں کے تین گروہ بن گئے: ایک وہ جنہوں نے آپ کو اللہ کا رسول اور اللہ کا بندہ مانا۔ اور ایک گروہ حد سے بڑھ گیا کہ آپ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ اور ایک گروہ الجھ گیا، انہوں نے کہا کہ ایک عیسیٰ ہیں، ایک ماں ہے اور ایک روح القدس ہیں۔ ان تین میں کوئی ایک خدا ہے۔ وہ یوں بھٹک گئے۔ تو ان آیات مبارکہ کے اندر اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ فیصلہ کر لیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو...... نعوذ باللہ...... قتل کر دیا جائے۔ اس لیے لفظ لائے: ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾۔

مکر کا معنیٰ:

ہمارے ہاں ''مکر'' کا لفظ ہمیشہ برائی کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ فلاں بڑا مکار ہے، عربی کے اندر لفظ مکر کا معنی ہے خفیہ طریقہ سے کسی کو نقصان پہنچانا کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ عرب کے اندر لفظ ''مکر'' اچھے کام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور برے کام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

﴿وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ علماء محققین نے لکھا ہے کہ جب مکر کا معنی ہے دوسرے کو ضرر پہنچانے کی خفیہ تدبیر کرنا جب کفار کی طرف سے ہو تو برا ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو آیت میں: ﴿وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ﴾ [فاطر: ۴۳] فرمایا ہے کہ برا مکر کرنے والے کو ہی واپس پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے مکر کے جواب میں ایسی تدبیر کرتے ہیں کہ ان کے مکر کا ضرر انہیں کو پہنچتا ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں بھی ہے: ﴿فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا﴾ [المؤمن: ۴۵]۔

اللہ تعالیٰ نے جب مکر کے ساتھ ہی و کا لفظ لگا دیا تو معلوم ہوا کہ مکر محمود بھی ہے اور مکر مذموم بھی ہے۔ کافروں کا مکر مذموم ہے کہ وہ نبی کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا مکر محمود ہے کہ وہ اپنے نبی کو بچانا چاہتے ہیں۔

یہودیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا مکر:

یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی خفیہ سازش کی اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ایک مکان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام داخل ہوئے، یہودیوں نے ان کو گھیر لیا۔ اس مکان سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اپنے ساتھیوں کا امتحان لیں کہ آج کون آپ کا مخلص ہے؟ تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ کوئی ہے جو آج میری وجہ سے قربان ہو جائے؟ ایک ساتھی نے کہا کہ میں قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ اور بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی جان بچانے کے لیے خفیہ طریقے سے

چلتے چلتے ایک جگہ پہنچے تو خود ان کے ساتھیوں میں سے ایک نے (جس کا نام یہوذا تھا) خیانت کی اور یہودیوں کو اطلاع کردی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فلاں جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ اس کی اطلاع سے یہودی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے پورے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ اب باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے اس ساتھی پر بالکل عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ ڈال دو۔ چنانچہ جب وہ اندر گیا تو اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ ڈال دی گئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھالیا گیا۔ جب یہودی اس مکان میں گئے تو اس کو پکڑ لیا اور اس کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ جو مکان کا روشندان ہے اس میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نکال کر آسمانوں پر لے آؤ۔ اور ادھر یہودیوں نے شور مچا دیا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۔﴾ [النساء: ۱۵۷]

''انہوں نے ہرگز عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کیا تھا، نہ انہیں سولی دے پائے تھے، بلکہ انہیں اشتباہ ہو گیا تھا۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اوپر اٹھالیا ہے۔ دوسرے آسمان پر وہ زندہ موجود ہیں اور قیامت سے پہلے وہ آسمان سے اتریں گے۔ اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر بڑے اختصار کے ساتھ بیان فرمادیا ہے، جس کو ہم نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

﴿إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ فَأَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ وَأَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ أُجُوْرَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۝﴾ [آل عمران: ۵۵تا۵۸]

''(اس کی تدبیر اس وقت سامنے آئی) جب اللہ نے کہا تھا: اے عیسیٰ! میں تمہیں صحیح سالم واپس لے لوں گا اور تمہیں اپنی طرف اٹھا لوں گا اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے ان (کی ایذا) سے تمہیں پاک کر دوں گا۔ اور جن لوگوں نے تمہاری اتباع کی ہے، ان کو قیامت کے دن تک ان لوگوں پر غالب رکھوں گا جنہوں نے تمہارا انکار کیا ہے۔ پھر تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، اس وقت میں تمہارے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔ چنانچہ جو لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کو تو میں دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا اور ان کو کسی طرح کے مددگار میسر نہیں آئیں گے۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہیں، ان کو اللہ ان کا پورا پورا ثواب دے گا۔ اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ (اے پیغمبر!) یہ وہ آیتیں اور حکمت بھرا ذکر ہے جو ہم تمہیں پڑھ کر سنا رہے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دی ہے کہ یاد کریں اس واقعہ کو جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں تمہیں پورا پورا لے لوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا اور کافروں کے الزامات سے تجھے پاک کر دوں گا اور تیری اتباع کرنے والوں کو قیامت تک غالب رکھوں گا۔ پھر تم سب نے میری طرف لوٹ کر آنا ہے اور پھر میں ہی فیصلہ کروں گا جس میں تم جھگڑتے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو قرآن پاک میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بھی بڑی تفصیل کے ساتھ ہے اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ نے متعدد سورتوں میں بیان فرمایا ہے، لیکن سب سے زیادہ تفاصیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہیں۔

قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر تفصیل سے کیوں آیا؟

مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس کی بہت ساری حکمتیں ذکر فرمائی ہیں۔ ان میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ حضور اکرم علیہ السلام کے زمانے کے قریب تر ہے۔

دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں۔ اس کے بعد بنی اسرائیل میں نبوت ختم ہو کر ولد اسماعیل میں منتقل ہوئی اور ہمارے آقا خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں۔ اس نسبت سے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن میں زیادہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔

تیسری وجہ یہ بھی بیان فرمائی کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں دونوں قومیں موجود تھیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دشمنی میں حد سے بڑھ جانے والے یہود بھی موجود تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی محبت میں حد سے بڑھ جانے والے نصاریٰ بھی موجود تھے۔ حضور اکرم ﷺ کو چونکہ دونوں قوموں سے سامنا تھا، یہود کے اعتراضات کے جواب بھی دینا ہیں اور نصاریٰ کے غلو کا بھی جواب دینا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بڑی تفصیلات کے ساتھ آگاہ فرمایا۔

چوتھی وجہ یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں سے یہ چیز صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقدر میں آئی کہ وہ آسمان پر زندہ رہیں اور آسمان سے اتریں اور حضور اکرم ﷺ کی شریعت کی تصدیق کریں اور آپ کی شریعت کے تابع رہیں تو اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو بڑا کھول کر بیان فرمایا ہے۔

اللہ علام الغیوب ہیں، وہ جانتے ہیں کہ آخر زمانہ میں وہ لوگ بھی پیدا ہوں گے جو مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کریں گے تو ان کے دعووں کا ابطال بھی مقصود تھا، لہٰذا تمام جزئیات کے ابطال کا احاطہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کیا۔

اس سے ہمیں یہ سبق ملا کہ اگر ہم بھی اپنے پاک پیغمبر کی محبت میں یا صحابہ، اہل بیت کی محبت یا اولیاء کرام کی محبت میں حد اعتدال سے نکل جائیں گے جیسے عیسائی نکل گئے تھے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا جیسے نصاریٰ کافر ہو گئے ہیں ہم بھی کافر ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی حدود متعین فرما دی ہیں، ان سے آگے نہیں نکلنا چاہیے۔ دوسری طرف یہود ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دشمنی میں حد اعتدال سے اتنے آگے نکل گئے کہ...... نعوذ باللہ!...... انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر الزام لگایا کہ زنا سے پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ہر حربہ استعمال کیا اور اپنے اعتقاد میں مطمئن ہو گئے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے۔

یہاں سے بھی ہمیں ایک سبق ملا کہ اگر کوئی شخص انبیاء علیہم السلام کی شان میں یا اصحاب رسول کی شان میں یا اہل بیت رسول کی شان میں یا اولیاء اللہ کی شان میں یا ائمہ محدثین فقہاء علماء کی شان میں حد سے گر جائے اور دشمنی میں ایسی باتیں کرے کہ کفر تک پہنچ جائے تو وہ بھی کافر ہو جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق صحیح اعتقاد:

سب سے معتدل اور صحیح راستہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ہے۔ ہمارے آقا ﷺ نے امت کو سبق دیا اور یہود

ونصاریٰ کے دعاوی کا ابطال کیا اور یہ تصدیق فرمائی کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول اور نبی ہیں اور بی بی مریم صدیقہ طاہرہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بغیر باپ کے پیدا فرمایا اور ان کو زندہ آسمانوں پر اٹھالیا گیا ہے۔ وہ زندہ موجود ہیں اور آسمانوں سے اتریں گے، قیامت کا زمانہ قریب ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آکر دجال کو بھی قتل کریں گے، صلیب کی شوکت کو بھی مٹا ڈالیں گے اور یہود کو فنا کریں گے اور پھر پوری دنیا میں عدل وقسط، ایمان کا دور دورہ ہوگا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے تابع ہوں گے اور قیامت والے دن ہمارے مدنی سرکار کے ساتھ اٹھیں گے۔ یہ صحیح اور اعتدال والا راستہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا اور آپ نے اپنی امت کو سبق دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پہلے ہے یا رفع آسمانی؟

﴿اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ﴾

اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت قتادہ اور ان کے شاگرد یہ فرماتے ہیں کہ یہاں تقدیم وتاخیر ہے۔ اصل میں "رَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُتَوَفِّیْكَ" ہے کہ پہلے تو میں آپ کو اپنی طرف آسمانوں پر اٹھاؤں گا، اس کے بعد تمہیں موت دے دوں گا۔ مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس پر بہت سارے شواہد بھی نقل کیے ہیں کہ بعض چیزیں اصل میں موخر تھیں، لیکن ذکر میں مقدم ہوگئیں اور بعض چیزیں مقدم تھیں، لیکن ذکر میں موخر ہوگئیں۔ کیونکہ قرآن پاک کا اسلوب بیان ایسا ہے کہ کبھی اعلیٰ سے شروع کرتے ہیں، پھر اوسط اور پھر ادنیٰ ذکر کرتے ہیں اور کبھی اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے، یعنی پہلے ادنیٰ کا ذکر آجاتا ہے، پھر متوسط کا ذکر آتا ہے اور آخر میں اعلیٰ کا ذکر آتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس چیز کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ٹھیک ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝١ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝٢ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝٣﴾ [التین:۱،۲،۳]

اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں کی قسمیں کھائیں۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ "بلد امین" سے مراد کعبۃ اللہ ہے اور وہ طور سینا سے افضل ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے بلد امین کو مؤخر فرمادیا اور طور سینین کو مقدم فرمادیا۔ اور جو طور سینین کا مقام ہے وہ تین اور زیتون کا مقام نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے پہلے فواکہ میں تین کا ذکر فرمادیا اور اس کے بعد زیتون کا ذکر فرمادیا۔ قرآن پاک اللہ کا کلام ہے، اس کے اندر اس کی حکمتیں ہیں۔ اور قرآن میں فرمایا گیا:

﴿وَ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ﴾ [الواقعہ:۲۷] یہ اہل جنت کا ذکر ہے۔

﴿وَ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ﴾ [الواقعہ:۴۱] یہ اہل جہنم کا ذکر ہے۔

اور اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے جو مقربین ہیں۔ حالانکہ ان کا درجہ ''اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ'' سے مقدم ہے۔ اسی طرح حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے اندر بھی تقدیم وتاخیر ہے۔

2 ......حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ﴿مُتَوَفِّیۡکَ﴾ کا معنی ''مُمِیۡتُکَ'' ہے اور انہوں نے یہاں تقدیم وتاخیر نہیں کی اور فرمایا: یہاں ﴿مُتَوَفِّیۡکَ﴾ سے مراد موت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کو موت کب دیں گے؟ اس کی یہاں کوئی قید نہیں ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول:

﴿وَ اِنۡ مِّنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤۡمِنَنَّ بِہٖ قَبۡلَ مَوۡتِہٖ ۚ وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یَکُوۡنُ عَلَیۡہِمۡ شَہِیۡدًا﴾ [النساء:۱۵۹]

کوئی اہل کتاب نہیں، مگر ایمان لائیں گے عیسیٰ علیہ السلام پر ان کی موت سے پہلے اور وہ ان پر اس وقت ایمان لائیں گے جب وہ آسمانوں سے زمین پر اتریں گے۔ اس سے پہلے اور اس وقت تمام اہل کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آکر جزیہ ختم کردیں گے اور فرمائیں گے: تلوار یا اسلام۔ تو پھر جتنے اہل کتاب ہیں وہ سب کے سب قیامت سے پہلے اسلام لائیں گے۔

قول حق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا ہے اور جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تفصیل کے ساتھ سمجھایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں۔ نہ قتل کیے گئے اور نہ پھانسی چڑھائے گئے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندگی میں آسمانوں پر اٹھالیا اور وہ آسمانوں میں زندہ موجود ہیں اور قیامت سے پہلے آسمانوں سے اتریں گے اور زمین پر تشریف لائیں گے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے تابع ہوں گے۔ اس کے علاوہ جتنے اقوال ہیں وہ یہود کے ہیں، نصاریٰ کے ہیں اور قادیانیوں کے ہیں۔ دشمنوں نے جو شبہات پیدا کیے ہیں وہ حقیقت میں شبہات نہیں ہیں، بلکہ بغیر کسی دلیل اور بغیر کسی وزن کے ایسی باتیں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

پہلا شبہ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر کتنی ہے؟

انہوں نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں پر اٹھایا ہوا ہے اور وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ

سو سال پہلے تشریف لائے پھر انہیں آسمانوں پر بٹھایا گیا ہے تو ان کی عمر کتنی ہو گی؟

جواب:

یہ شبہ اس لیے باطل ہے؛ کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں اور ان کے بعد کے دور میں ایسے انسان بھی گزرے ہیں اور ایسے جنات بھی گزرے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہزاروں سال کی عمر دی ہے۔ اگر یہ عمر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی دے دیں تو کیا اشکال ہے؟

حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں کسی جانب تشریف لے جا رہے تھے۔ دور سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا، آپ نے اپنے صحابی سے فرمایا کہ اس کے چلنے کا انداز ایسے ہے کہ یہ کوئی جن ہے۔ جب وہ قریب آیا تو اس نے آپ کو سلام کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا: میں جن ہوں اور میں اسلام لانے کے لیے حاضر ہوا ہوں، مجھے آپ کلمہ پڑھا دیں اور آپ مہربانی فرما کر مجھے قرآن پاک کی دو چار آیات بھی سنا دیں۔ وہ اسلام لے آیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا قرآن پڑھا۔ جب اس نے قرآن سنا تو اس نے کہا: میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تورات بھی سنی ہے۔

آپ خود اس کی عمر کا اندازہ لگا لیں۔ تو اگر اللہ ایک جن کو ہزاروں سال کی عمر دے سکتے ہیں تو عیسیٰ علیہ السلام کو بڑی عمر دینے میں کیا مشکل ہے؟

دوسرا جواب:

اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے کہ ایک انسان کی عمر سو سال ہے جو زمین پر گزرے۔ اس دوران میں اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے آسمانوں پر اٹھا لیں تو یہ زندگی شمار نہ کی جائے گی۔ شمار تو تب ہو جب وہ زمین پر ہو۔ مثلاً: اصحاب الکہف پر اللہ تعالیٰ نے تین سو نو سال تک نیند مسلط کی تھی۔ تین سو سال کے بعد جب وہ بیدار ہوئے تو ان کے لیے وقت ایسا گزرا جیسے ایک دن گزرتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی عمر کو وہیں روک دیا اور مرور زمانہ ان میں کوئی تبدیلی اور تغیر نہ کر سکا۔ اور اللہ تعالیٰ نے وہ عرصہ ان کی عمر کا شمار ہی نہ کیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی شمار نہ کیا تو کیا محال ہے۔

بعض دشمنانِ اسلام کہتے ہیں کہ قرآن میں موجود ہے: ﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتّٰى

یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ﴾[الاعراف:۴۰] کافروں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور یہ جنت میں بھی داخل نہیں ہوں گے، حتیٰ کہ سوئی کے ناکے میں سے اونٹ گزرے۔ یعنی جیسے سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا محال ہے اس طرح سے ان کے لیے آسمان کا دروازہ کھلنا محال ہے اور جنت میں جانا محال ہے۔

دوسری وہ یہ بات کہتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے: جب حضور اکرم ﷺ کا زمانہ آیا اور شیطان اوپر جانے لگے تو ان پر شہاب ثاقب برسے اور وہ بھاگ کر ابلیس لعین کے پاس آئے کہ ہم برباد ہو گئے۔ ﴿وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ﴾[الجن:۹] کیونکہ ہم نے جو خلاء میں اسٹیشن بنائے ہوئے تھے، جہاں سے بیٹھ کر ہم فرشتوں کی باتیں سنتے تھے اور آ کر ہم کاہنوں کے کانوں میں ڈالتے تھے اب وہاں پہرہ لگ گیا ہے، ہم قریب بھی نہیں جا سکتے۔ ابلیس لعین نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ کا اس دنیا کے بارے میں کیا فیصلہ ہے؟ کیا اس دنیا کو فنا کرنے کا وقت آ گیا ہے یا کوئی اور بات ہے؟ پوری دنیا میں پھیل جاؤ اور ایک ایک چپہ چھان مارو اور پتا کرو کہ کیا بات ہے؟ تو جن دوڑے اور رپورٹ دی کہ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مبعوث ہو گئے ہیں اور یہ پہرے لگا دیئے گئے ہیں۔ اب یہودی اعتراض کرتے ہیں کہ تم کہتے ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر چلے گئے، آسمانوں پر تو جنوں کے بھی پہرے لگ گئے، وہ ملائکہ کی باتیں بھی نہیں سن سکتے اور پھر قرآن کہتا ہے کہ آسمان کے دروازے نہیں کھلیں گے تو عیسیٰ علیہ السلام کیسے آسمانوں پر چلے گئے؟

جواب:

ہمارا ایمان ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے آنے کے بعد آسمانوں کا پہرہ شدید کر دیا گیا۔ جنات وہاں نہیں پہنچ سکتے جہاں پہلے پہنچ جاتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہے: کافروں کے آسمان کے دروازے نہیں کھلیں گے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ نے انتظام کیا ہے۔ وہ پروردگار اگر خود لے جائیں تو کسی کو کیا تکلیف ہے؟ آپ کسی بادشاہ کے گھر میں ملنے کے لیے جائیں، وہاں پہرے ہوتے ہیں۔ اگر بادشاہ آپ کو خود بلا لے تو یہ سارے پہرے آپ کے لیے ختم ہو جائیں گے، بلکہ الٹا آپ کو سلام بھی ہو رہے ہوں گے۔ لہٰذا یاد رکھیں! آسمانوں میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کوئی نہیں جا سکتا۔ یہاں اگر رفع عیسیٰ کا انکار کریں تو معراج نبی بھی ختم ہو جائے گی، حالانکہ حضور اکرم ﷺ کا آسمان پر جانا حق ہے۔

لہٰذا یہ محض شبہات ہیں جن کو قرآن و حدیث کا علم نہ ہو وہ یہ باتیں سن کر پریشان ہو جاتے ہیں، لیکن جن کی قرآن و حدیث پر نظر ہو تو اس کے لیے کوئی پریشانی نہیں ہے۔

﴿إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ﴾ یہاں ﴿مُتَوَفِّيكَ﴾ کو مقدم کیا کہ اس میں یہودیوں کا رد ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے ان کو قتل کر دیا، پھانسی پر لٹکا دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جھوٹ بولتے ہو۔ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو موت دیں گے، تم نے قتل نہیں، تم نے پھانسی پر نہیں چڑھایا۔ اور اس میں عیسائیوں کا بھی رد کیا، وہ کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے اور خود خدا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں تمہیں موت دوں گا تو جس پر موت آئے وہ کیسے خدا بن سکتا ہے؟ اللہ پاک ان کو موت دیں گے جب ان کا وقت معین آئے گا۔ اس لیے لفظ مقدم کرنے میں اتنی بڑی حکمت ہے کہ اس سے یہودیوں کا یہ عقیدہ بھی باطل ہو گیا، نصاریٰ کے دعوے بھی ختم ہو گئے اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کا جو صحیح مقام تھا وہ بھی واضح ہو گیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک بھی سچا ہو گیا۔

شبہ: ⑥

کہتے ہیں: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تو وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے چلنے کی آواز سنی، لہٰذا اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر تھے تو کیا آپ کی ان سے ملاقات بھی ہوئی؟

جواب:

ان کا یہ شبہ بھی غلط ہے؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دو دفعہ ملاقات ہوئی: ایک دفعہ بیت المقدس میں اور ایک دفعہ آسمانوں میں۔

اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَقِيتُ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِي إِبْرَاهِيمَ، وَمُوسَى، وَعِيسَى)) [مسند احمد، رقم: ۳۵۵۶]

''جس شب کو مجھے معراج ہوئی، میں نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سے ملاقات کی۔''

لہٰذا آسمانوں کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات تو مشہور بات ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جو آدمی دشمن بن جائے تو وہ آپ کے اچھے عمل کے اندر بھی کوئی نہ کوئی کیڑا نکالے گا۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق دی اور آپ پانچ نمازیں حرم کے اندر پابندی سے پڑھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ آپ کو

طواف بھی نصیب فرماتے ہیں، صف اوّل اور تلاوتِ قرآن بھی نصیب فرماتے ہیں۔ آپ کا اگر کوئی دشمن ہے اور اس کو کوئی آپ کے بارے میں کہے کہ فلاں شخص اتنا خوش نصیب ہے کہ پانچوں نمازیں حرم کے اندر صف اوّل میں نصیب ہوتی ہیں تو وہ کہے گا کہ تمہیں کیا پتا کہ وہ حرم میں کیوں جاتا ہے؟ وہ تو بھیک مانگنے جاتا ہے۔ اور جو آدمی معتدل ہوگا کہ دشمن بھی نہیں اور دوست بھی نہیں تو وہ کہے گا: الحمد للہ! اللہ کا شکر ہے، کسی کو درس نصیب ہے، کسی کو حرم نصیب ہے اور میرے لیے بھی دعا کرو اللہ تعالیٰ مجھے بھی نصیب کرے۔

مخالف اعتراض کا بہانہ ڈھونڈتا ہے:

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے واقعہ پر شیعہ نے اعتراض کیا کہ دیکھو! سنیوں کا ایسا مذہب ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پہلے جنت میں داخل ہوں گے، حالانکہ یہ نہیں سمجھتے کہ ایک ملازم بادشاہ کی گاڑی کے آگے بھاگ رہا ہے تو کیا وہ بادشاہ سے افضل ہو گیا؟ اس اعتراض کی وجہ یہ ہے کہ مخالف نے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈتا ہوتا ہے اور پھر اس ایک لفظ کو لے کر اعتراض کر دیتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "تَوَفِّی" کا لفظ جیسے موت کے لیے استعمال ہوتا ہے اس طرح نیند کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ [الزمر: ۴۲]

"اللہ تمام روح کو ان کی موت کے وقت قبض کر لیتا ہے، اور جن کو ابھی موت نہیں آئی ہوتی، ان کو بھی ان کی نیند کی حالت میں (قبض کر لیتا ہے)۔"

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نیند سے بیدار ہوتے تو فرماتے تھے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ)) [بخاری، رقم: ۶۳۱۲]

"اللہ! تیرا شکر ہے تو نے ہماری موت کے بعد ہمیں دوبارہ زندگی عطاء فرمائی اور اسی کی طرف اٹھنا ہے۔"

کیونکہ نیند بھی گویا ایک موت ہے، اس کے اندر بھی اللہ تعالیٰ پوری روح لے لیتے ہیں۔ تو جس کی موت کی گھڑی آ گئی اس کی روح واپس نہیں لوٹائی جاتی اور جس کی زندگی باقی ہے اس کی روح کو قبض کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا تعلق جسد کے ساتھ باقی رہا اور جب وہ بیدار ہوا تو اس کی روح واپس لوٹ آئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر زندہ ہیں:

ہمارا ایمان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر زندہ ہیں؛ کیونکہ قرآن فرماتا ہے:

﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ﴾ [النساء:۱۵۸]

''بلکہ اللہ نے انہیں اپنے پاس اٹھالیا تھا۔''

دوسرا اس وجہ سے بھی ایمان ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی ایک سو احادیث موجود ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ احادیث متواترہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ایک ایک تفصیل حضور اکرم ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔ اس لیے اس بات پر جھگڑا کرنا کہ ﴿مُتَوَفِّيْكَ﴾ پہلے کیوں ہے اور ﴿رَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ بعد میں کیوں ہے غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے جس لفظ کو اللہ تعالیٰ پہلے بیان فرمائیں اور جس لفظ کو چاہیں بعد میں بیان فرمائیں۔ مقصود ایک حقیقت کا بیان، یہود کا بطلان، نصاریٰ کا رد اور دین اسلام کی سچائی ہے۔

عیسائی یہودیوں پر غالب رہیں گے:

﴿وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ﴾ [آل عمران:۵۵]

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے وعدہ فرمایا کہ تیرے ماننے والوں کو دشمنوں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے، جس میں کسی قسم کا کوئی خلاف نہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۟﴾ [آل عمران:۹]

پہلے تو اللہ تعالیٰ نے قسطنطین بادشاہ کو بھیجا...... چاہے وہ سازش کر کے نصاریٰ سے ملا یا ان کے دین کو بدلنے کے لیے ملا...... بہر حال اس نے ان کے ساتھ مل کر یہودیوں کو ہمیشہ ذلیل کیا اور یہودیوں پر غالب رہا اور یہودیوں پر مظالم توڑے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصل دشمن یہودی ہیں جو ان کی نبوت کے منکر ہیں اور ان کی عظمت و عصمت کے منکر ہیں۔ باقی رہے نصاریٰ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بندہ اور رسول ماننے والے تھے وہ حق پر تھے اور جو نبی نہ مانتے تھے وہ ان کو مانتے تو تھے۔...... اللہ تعالیٰ نے ہر حال میں عیسائیوں کو یہود پر غالب رکھا یہود ہمیشہ مغلوب رہے اور ذلیل وخوار بھی رہے۔ اور ان کی کسی بھی جگہ عظمت قائم نہ ہو سکی اور یہ دور چلتا رہا۔

حضور ﷺ کی نبوت تمام عالم کے لیے ہے:

حضور اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ساری کائنات کے انس وجن کے لیے نبی بنایا؛ کیونکہ آپ ﷺ کی نبوت کسی علاقہ یا قوم کے لیے نہیں تھی، بلکہ تمام مخلوقات کے لیے تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اعلان کریں: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [الاعراف: ۱۵۸] اور اس طرح حکم آیا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ [سبا: ۲۸] اور حکم آیا: ﴿وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ [الانعام: ۹۲] اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رحمت للعالمین بنایا اور اسی طرح آپ ﷺ کو خاتم الانبیاء والمرسلین بنایا۔ جب آپ ﷺ کی نبوت کا زمانہ آیا اور جو لوگ مسلمان ہو گئے تو حضور اکرم ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ تم ایمان لاؤ! اللہ تعالیٰ پر ایمان، اللہ تعالیٰ کے تمام فرشتوں پر ایمان، اللہ تعالیٰ کی تمام کتابوں پر ایمان، جتنے رسول بھیجے سب برحق ہیں اور نفع ونقصان میرے اللہ کی طرف سے ہے اور اس پر ایمان لانا کہ ہم نے مرنا ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے، قیامت برحق ہے، حساب برحق ہے، صراط برحق ہے، میزان برحق ہے، سزا جزا برحق ہے۔ تو جب حضور اکرم ﷺ نے اپنی امت کو یہ سبق دیا۔ گویا جس نے حضور اکرم ﷺ کا کلمہ پڑھا تو وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو ماننے والا بنا۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو دعویدار ہیں ان سے زیادہ حضور اکرم ﷺ کی امت شان میں زیادہ ہے؛ کیونکہ انہوں نے تبدیلیاں کر ڈالیں اور کتابیں بدل ڈالیں۔

اسلام کے خلاف یہودیوں کی سازشیں:

یہ اسی طرح ایسے مقہور ذلیل وخوار ہوں گے کہ ان کی قیادت دجال کرے گا وہ بھی یہودی ہوگا۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی انصاف کی نظر سے دیکھے تو اسلام کے خلاف جتنی بھی سازشیں ہوئی ہیں وہ سب کی سب یہودیوں نے کی ہیں۔

جس طرح ہم حضور اکرم ﷺ کے غلام ہیں، اسی طرح جتنے نبی گزرے ہیں ہم ان سب کے غلام ہیں۔ صرف یہ ہے کہ ہم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شریعت مانیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خاتم الرسل بنایا، اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد آدم کا سردار بنایا، تمام کائنات میں افضل بنایا۔ اللہ کے نبی نے اپنی امت کو دعوت دی کہ تم سب کی تصدیق کرو۔ اس وجہ سے ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھی زیادہ حق دار ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی زیادہ حق دار ہیں، جبکہ ان کے ماننے والوں کا تو یہ عالم ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں کو بھی بدل ڈالا، انجیل کو بھی بدل ڈالا اور ان

کے الفاظ وکلمات بھی بدل ڈالے۔

حضور ﷺ کا یہودیوں کو وحی کے ذریعہ خبریں دینا:

حضور اکرم ﷺ نے کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا، کسی استاذ کے سامنے زانو تہہ نہیں کیے اور ماسوائے لغت عربیہ کے میرے مدنی ﷺ نے کوئی زبان نہیں سیکھی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی پاک ایسے پاک نبی ہیں جسے لکھنا بھی نہیں آتا، ان کو اللہ تعالیٰ نے پڑھایا۔ اور پہلی جتنی کتابیں تھیں وہ عبرانی یا سریانی زبان میں تھیں، عربی میں صرف قرآن پاک ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے کبھی عبرانی یا سریانی نہیں پڑھی تھی، لیکن جو تورات میں لکھا ہوا ہے اس کے بارے میں میرے مدنی پاک ان کو خبر دے رہے ہیں کہ علمائے یہود تمہاری تورات میں یہ لکھا ہے اور یہ لکھا ہے۔ اگر تم نہیں مانتے ہو تو تورات میرے سامنے لے آؤ۔ تو حضور اکرم ﷺ کا یہ خبر دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اپنے نبی کو پڑھایا، ورنہ آپ ﷺ تو ان کی زبان بھی نہیں جانتے تھے۔ اگر انصاف ہوتا تو ان کو فوراً یہ بات سمجھ آجاتی کہ یہ اللہ کے نبی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی کے ذریعہ سے خبر دی ہے، ورنہ آپ کو ہماری کتاب کے احکام کا کیسے پتا چل گیا!؟ لیکن اس کے باوجود انہوں نے آپ کو نہیں مانا، تکبر میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے مقابلہ میں حضور اکرم ﷺ کی امت کو دیکھیں کہ ان کو آپ کے علاوہ کسی کا زمانہ نہیں ملا۔ یہود کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ملا، عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ملا ہے اور امت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا زمانہ ملا اور نبی تو گزر گئے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی تصدیق کی ہے۔ سب نبی اور رسول برحق ہیں، سب کتابیں برحق ہیں۔ اور یہ بد بخت جن کو موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ اور تورات ملی انہوں نے محمد مدنی ﷺ کا انکار کیا تو گویا موسیٰ علیہ السلام کا بھی انکار کیا اور اپنی کتاب تورات کا بھی انکار کیا، انجیل کا بھی انکار کیا۔

اللہ پاک نے جب حضور اکرم ﷺ کو بھیجا تو آپ کی شریعت سے باقی ساری شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ جب تک وہ حضور پاک ﷺ پر ایمان نہ لے آئیں اس وقت تک وہ ایماندار کہلانے کے حق دار نہیں ہیں۔

غلبۂ اسلام حقانیت اسلام کی دلیل ہے:

اللہ تعالیٰ قیامت تک آپ ﷺ کے دین کو باقی اور غالب رکھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ نے مشارق الارض اور مغارب الارض کو فتح کیا، بہت سے ممالک پر اسلام کے جھنڈے گاڑے، کسریٰ کی طاقت کو توڑ دیا، قیصر کی طاقت کو توڑ دیا، ان کے خزانے لے کر تقسیم کیے گئے اور اللہ تعالیٰ کا جو حضور اکرم ﷺ سے وعدہ تھا وہ سچ کر دکھایا۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ﴾[النور:۵۵]

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے صحابہ سے وعدہ کیا کہ جو میرے مدنی پر ایمان لائے اور اعمال بھی اچھے کیے ہیں، اس آیت کے اترنے کے وقت جو موجود ہیں ان کو زمین میں خلافت دیں گے، ان کو زمین کا خلیفہ بنائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو اقتدار دیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو شان و شوکت دیں گے کہ خوف کے بجائے امن قائم ہوگا۔ جب یہ دین قائم کریں گے تو صرف میری عبادت کریں گے اور میری ذات کے ساتھ شرک نہیں کریں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وہ وعدہ پورا کردیا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک بائیس لاکھ مربع میل تک اسلام پھیل گیا۔ آج بھی اگر دین حق ہے تو دین اسلام ہے۔ دنیا کا کوئی دین اس دین اسلام کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ فَمَنْ حَاۗجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاۗءَنَا وَاَبْنَاۗءَكُمْ وَنِسَاۗءَنَا وَنِسَاۗءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَي الْكٰذِبِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝﴾[آل عمران:۵۹ تا ۶۳]

"اللہ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام جیسی ہے۔ اللہ نے انہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ان سے کہا: ہو جاؤ۔ بس وہ ہو گئے۔ حق وہی ہے جو تمہارے رب کی طرف سے آیا ہے، لہٰذا شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو جانا۔ تمہارے پاس (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعے کا) جو صحیح علم آگیا ہے اس کے بعد بھی جو لوگ اس معاملے میں تم سے بحث کریں تو ان سے کہہ دو: "آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو، اور ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو، اور ہم اپنے لوگوں کو اور تم اپنے لوگوں کو۔ پھر ہم سب مل کر اللہ کے سامنے گڑگڑائیں، اور جو جھوٹے ہوں ان پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔" یقین جانو کہ واقعات کا سچا بیان یہی ہے۔ اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور یقیناً اللہ ہی ہے جو اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ پھر بھی اگر یہ لوگ منہ موڑیں تو اللہ مفسدوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔"

خلاصۂ مضامینِ آیات:

آپ تفصیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پڑھ چکے ہیں کہ دو جماعتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں افراط وتفریط کا شکار تھیں: ایک یہود اور دوسرے نصاریٰ تھے۔ ان آیات کے اندر وفدِ نجران کے ساتھ مباہلہ کا بیان ہے۔ اس کے بارے میں آپ پہلے تفصیل کے ساتھ پڑھ چکے ہیں۔

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۶۴]

"(مسلمانو! یہود ونصاریٰ سے) کہہ دو کہ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آ جاؤ جو ہم تم میں مشترک ہو، (اور وہ یہ) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کو چھوڑ کر ہم ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں۔ پھر بھی اگر وہ منہ موڑیں تو کہہ دو: گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق کی مثال حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ہے:

وفدِ نجران نے حضور اکرم ﷺ سے پہلے بحث مباحثہ کیا۔ جب آپ ﷺ نے مناظرہ میں ایسے دلائل پیش فرمائے کہ اگر انسان انصاف والی عقل رکھتا ہے تو اپنی بات کو چھوڑ کر حق تسلیم کر لینا چاہیے۔ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ آپ کے دلائل اتنے قوی تھے کہ ایک عام انسان کے سامنے بھی رکھ دو تو وہ بھی سمجھ جائے کہ اگر باپ کے بغیر ایک آدمی اللہ کا بیٹا بن جائے تو جس کا باپ بھی نہ ہو اور ماں بھی نہ ہو تو اس کو کیا کہیں گے؟ لہٰذا سیدھی سی بات ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کمال ہے، وہ چاہے تو حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرما دیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا فرما دیں۔ یہ اس کا کمال وقدرت ہے، اس کے اندر ابنیت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

دعوتِ مباحثہ اور عیسائیوں کا فرار:

قاعدہ ہے کہ دلائل علمی کے بعد آدمی نہ مانے تو اس کی آخری حجت رہ جاتی ہے کہ ضمیر کو اور وجدان کو مطمئن کرنے کے لیے میدان میں نکل آؤ اور ہم مباہلہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے آگے فریاد کرتے ہیں: مولا! ہم میں سے جو جھوٹا

ہے اس پر تیری لعنت ہو اور اس پر عذاب نازل کر۔ وفد نجران اس سے بھاگ گیا۔

داعی کے اوصاف:

اب ظاہراصول تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ اتنی ضد،عناد کے بعد ان سے آدمی اعراض کر لے کہ چلو ان کو ہلاک ہونے دو، لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کی کمال رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو فرمایا: میرے مدنی! ہم نے آپ کو بشیر بنا کر بھیجا ہے، نذیر بنا کر بھیجا ہے اور داعی الی اللہ بنا کر بھیجا ہے۔ کوئی کتنا ضدی بن جائے آپ اپنی دعوت کو نہ چھوڑیں، ان کو پھر بلائیں، پھر بلائیں۔

جیسا کہ ایک مثل مشہور ہے کہ ایک بزرگ دریا یا پانی کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے دیکھا کہ ایک بچھو پانی کے اندر گر پڑا اور ڈوبنے لگ گیا۔ ان بزرگوں نے ہاتھ دے کر اس کو نکالا تو بچھو نے باہر آ کر ڈنگ مار دیا۔ بزرگ کو تکلیف ہوئی اور بچھو پھر پانی میں گر گیا۔ بچھو پھر ڈوبنے لگا تو آپ نے پھر ہاتھ دے دیا۔ اس طرح جب دو تین دفعہ ہوا اور ایک آدمی نے یہ منظر دیکھا تو اس نے کہا: تم عجیب اللہ کے بندے ہو! یہ موذی جانور ہے، ڈنگ مار رہا ہے۔ اس کو چھوڑ دو، ڈوب جائے گا اور بات ختم ہو جائے گی۔ بزرگ نے کہا: وہ بری عادت نہیں چھوڑتا، میں اچھی عادت کیسے چھوڑ دوں؟

اس لیے شریعت کا حکم ہے کہ اگر وہ اپنی عادت سے باز نہیں آتے تو تم بھی اپنی دعوت کو نہ چھوڑو۔ آپ نے دیکھا ہوگا اکثر حمام ہوتے ہیں۔ کوئی ٹینکی یا پائپ لیک ہو جاتا ہے تو اوپر سے قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے۔ نیچے سخت پتھر ہے، اس کو اگر کدال بھی ماریں تو وہ نہ ٹوٹے، لیکن قطرہ قطرہ گرتے گرتے اس میں نشان بن جاتا ہے اور اس میں سوراخ بن جاتا ہے۔ ایک ایک قطرے کے گرنے کا اگر اتنا اثر پیدا ہو سکتا ہے تو آدمی جو اللہ تعالیٰ کے لیے دعوت دے گا اس کا اثر کیسے نہیں ہوگا!؟ شرط یہ ہے کہ دعوت دینے والا مخلص ہو۔ یہ نہیں تمہارے دل میں بھی ریاء اور شہرت آ جائے کہ میں نمازی ہوں، میں ان کو جگا رہا ہوں۔ اس طرح فائدہ نہیں ہوتا، فائدہ تب ہوگا جب تیرے دل میں درد ہو۔

ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ کا کمال فضل ہے کہ نصاریٰ نے اتنی بڑی حجت کے بعد بھی نہ مانا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی! آپ ان کو دعوت دیں:

﴿قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ

﴿بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۞﴾[آل عمران: ۶۴]

دعوت میں تکالیف پر صبر:

اور یہی دعوت کا اصول ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ سے دعوت کا آغاز فرمایا تو ان کو مشکلات پیش آئیں۔ روایات میں ہے کہ آپ پر مکہ میں بھی اور طائف میں بھی یہ وقت گزرا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی دعوت دے رہے ہیں، لیکن ظالم پتھر مار رہے ہیں یا تالیاں بجا رہے ہیں اور استہزاء کر رہے ہیں کہ دیوانہ اور مجنون ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ اپنی دعوت پر مقرر ہیں۔ آج بھی جو موحد ہوگا اس کو یہ باتیں سننی پڑتی ہیں۔

﴿وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ﴾[آل عمران: ۶۴]

''اور نہ پکڑیں ہم ایک دوسرے کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ۔''

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کے سامنے حضور اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [التوبۃ: ۳۱] (یہودیوں اور نصرانیوں نے اپنے پیروں اور مولویوں کو اللہ کے سوا رب بنا دیا۔) تو حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں ان کے مذہب پر تھا یہودی، نصرانی اپنے مولوی کو، اپنے راہب کو رب تو نہیں کہتے، اس کو صرف بزرگ سمجھتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ان کے پیر یا مولوی اپنی طرف سے جس چیز کا حکم کریں وہ مانتے ہیں؟ انہوں نے کہا: جی اس کے حکم کو مانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: جس سے منع کریں رک جاتے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: جی اس سے رک جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: جس چیز کو وہ حلال کہیں اس کو حلال سمجھتے ہیں اور جس چیز کو وہ حرام کہیں اس کو حرام سمجھتے ہیں، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہی تو رب بنانا ہے۔ حالانکہ حلال، حرام کا اختیار اللہ تعالیٰ کو تھا تو جب اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں انہوں نے ان کی باتوں کو مانا تو ان کو بھی رب بنا لیا۔

ایک سوال وجواب:

سوال: کوئی آدمی ہمیں یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ تم بھی تو حضور اکرم ﷺ کی بات کو مانتے ہو۔ حضور اکرم ﷺ جس چیز کو حلال کہیں اس کو حلال سمجھتے ہو اور جس چیز کو حرام کہیں اس کو حرام سمجھتے ہو؟

جواب: یاد رکھیں! ان کو یہ بتا دیں کہ ہمارے نبی ﷺ اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں دیتے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۞ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى ۞﴾[النجم: ۳، ۴]

میرا لڈنی کوئی بات نہیں کرتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کوئی بات نہیں کرتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے برابر قرار دیا ہے۔ تو گویا ہم اللہ ہی کی اطاعت کر رہے ہیں، نبی پاک ﷺ تو ہمیں بتا اور سمجھا رہے ہیں۔

کیا فقہاء کی تقلید شرک ہے؟

بعض لوگ یہی آیات پڑھ کر ائمہ اربعہ پر بھی منطبق کر دیتے ہیں کہ انہوں نے بھی تو چار اماموں کو خدا بنایا ہوا ہے۔ وہ جو ان کو کہتے ہیں اس کو مانتے ہیں اور جس سے منع کرتے ہیں اس سے رک جاتے ہیں۔ یہ بھی غلط فہمی ہے! کیونکہ ان ائمہ کرام کی بات بھی ہم اس لیے مانتے ہیں کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کے فرمان کو ہم سے بہتر سمجھا ہے۔ اگر...... نعوذ باللہ!...... کوئی بات اہل علم پر بالکل واضح ہو جائے کہ یہ حکم کتاب اللہ کے مخالف ہے یا سنت رسول اللہ ﷺ کے مخالف ہے تو ہم ان کی بات کو چھوڑ دیں گے اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو لیں گے؛ کیونکہ اصل ماخذ قرآن وحدیث ہے۔ ہم نے ان چار ائمہ کو نہیں، بلکہ ہر دور میں جو سوادِ اعظم گزرا ہے، انہوں نے ان چار کو فقہی مسائل میں اپنا امام مان لیا۔ تو اتنے مسلمانوں کا ہر دور میں ان پر اجماع ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سچے ہیں؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کی امت کبھی گمراہی پر اکٹھی نہیں ہوتی۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری امت کبھی گمراہی پر اکٹھی نہیں ہوگی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو ہدایت پر رکھیں گے اور ان شاء اللہ ہدایت پر رہے گی۔

اس کو یوں سمجھیں کہ اگر کوئی قانون کی بات ہو تو تم وکیل سے سمجھو گے، مکان کا نقشہ ہے تو آپ اس کو انجینئر سے سمجھنے جاتے ہیں، اسی طریقہ سے اگر دین کا مسئلہ ہو تو آپ عالم سے سمجھنے جاتے ہیں اور وہ عالم پھر ان ائمہ کی سمجھ کو ترجیح دیتا ہے کہ ان کا زمانہ زیادہ قریب تھا، اس دور میں تقویٰ، علم اور اللہ تعالیٰ کا خوف بھی زیادہ تھا اور ان کو اللہ تعالیٰ نے قرآن وحدیث کی سمجھ زیادہ عطا فرمائی تھی لہٰذا ہم ان کی بات کو ترجیح دیتے ہیں۔

جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ دونوں کو واقعہ پیش آیا کہ ان کے دور میں ایک آدمی نے آ کر شکایت پیش کی کہ میں نے ایک عورت سے شادی کی ہے اور اس کو چھ مہینے گزرے ہیں کہ اس سے بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب تحقیق کرائی کہ نکاح واقعی فلاں تاریخ کو ہوا اور بچہ چھ مہینے کے بعد پیدا ہوا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حد لگانے پر تیار ہو گئے۔ اتفاق سے حضرت علی رضی اللہ عنہ آ گئے اور پوچھا تو آپ نے ان کو بتایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

فرمایا: حد جاری نہ کریں؛ کیونکہ قرآن کہتا ہے:

﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ﴾[الاحقاف:۱۵]

''حمل اور فصال تیس مہینے ہیں۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾[البقرۃ:۲۳۳]

''مائیں اپنے بچوں کو دو سال تک دودھ پلائیں۔''

تو تیس میں سے چوبیس ماہ دودھ کے نکال دو تو باقی حمل کے چھ مہینے بچیں گے، لہٰذا چھ ماہ میں بھی بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس عورت پر حد جاری نہ کی گئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ'' [تفسیر النیسابوری، غرائب القرآن ورغائب الفرقان، ج:۲، صفحہ:۱۲۰]

''اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔''

یہی وجہ ہے کہ آدمی عالم سے اس لیے رجوع کرتا ہے۔ ورنہ دیکھیں یہی آیات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھی تھیں، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ مسئلہ آ گیا اور یہی مسئلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں پیش آیا اور وہ عورت کو حد لگانے پر تیار ہو گئے، لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے روک دیا۔ اس لیے علماء سے پوچھنا اور ان ائمہ سے پوچھنا شرک نہیں ہے۔ ہم......نعوذ باللہ!......ان کو رب نہیں سمجھتے۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝﴾[آل عمران:۶۴]

اگر اتنی دعوت حق اور دعوت توحید کے بعد بھی اعراض کریں تو ان کو کھل کر بتا دو کہ نہ مانو، لیکن ہم تو مسلمان ہیں، ہم تو اللہ و رسول کی بات کو مانتے ہیں۔

مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کا توحید پر اتفاق:

اس آیت مبارکہ میں خطاب عام ہے۔ پہلے جو خطاب ہو رہا تھا وہ نصاریٰ کے ساتھ تھا، اب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اب عام دعوت دیں، یہود کو بھی اور نصاریٰ کو بھی کہ ہم تمہیں ایک ایسے کلمہ کی طرف دعوت دیتے ہیں جو تمہارے اور ہمارے درمیان برابر ہے۔ لہٰذا اب تو اس بات پر ہمارے ساتھ اتفاق کر لو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی ہو یا

نصرانی، وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم توحید کے قائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی خالق، مالک اور رازق ہیں۔

یہودی اپنے دماغ میں توحید کے قائل تھے، لیکن توحید کا کیا معنیٰ کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنالیا اور پھر بھی کہیں کہ ہم توحید کے قائل ہیں۔ نصرانی بھی کہتے تھے کہ ہم توحید کے قائل ہیں، خدا کو مانتے ہیں، لیکن جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنادیا، اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک کردیا، جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفات ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ﴾ [الاخلاص: ۳] ہیں کہ وہ اولاد اور ماں باپ سے پاک ہے۔ اسی طرح بعض نصاریٰ اس بات کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کر گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود خدا ہیں۔ تو پھر ان کی توحید کہاں رہی؟

کفارِ مکہ مشرک کیوں تھے؟

اسی طرح ہمارے حضرات بھی ہیں جو غیر اللہ کو سجدہ بھی کرلیتے ہیں اور غیر اللہ کی نذریں بھی چڑھالیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود کہتے ہیں کہ ہم موحد ہیں اور خدا کو مانتے ہیں، ہم نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن توحید اس وقت آئے گی جب تمام عبادات کا مرکز ومحور صرف اللہ کی ذات ہو، اللہ تعالیٰ کی ذات میں بھی کسی کو شریک نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ خاصہ میں بھی کسی شریک نہ کریں۔ اور جب تک تمام انواع کی عبادت خالص اللہ تعالیٰ کے نام پر نہ ہو اس وقت تک آدمی موحد نہیں بنتا۔ ورنہ اس طرح تو خدا کو ابوجہل بھی مانتا تھا۔ اگر وہ خدا کو نہ مانتا تو کعبۃ اللہ کو کیوں بناتا؟ اور پھر طواف کیوں کرتا؟ اگر وہ خدا کو نہ مانتے تو عقیقہ نہ کرتے، ختنہ نہ کرتے۔ جب حج کا موقع آتا تو احرام باندھ کر لبیک پڑھتے ہوئے منیٰ جاتے، مزدلفہ جاتے، قربانیاں کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود بھی وہ مشرک رہے؛ کیونکہ انہوں نے لات، عزیٰ، منات اور ہبل کو اپنا خدا اور الٰہ بنارکھا تھا کہ یہ ہماری باتیں اللہ تعالیٰ تک پہنچاتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے درمیان میں واسطہ ہیں۔ اسی وجہ سے وہ مشرک بن گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلام:

تو ان آیات کے اندر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی کہ اگر توحید کو مانتے ہو تو آجاؤ۔ ہم بھی توحید کی دعوت دیتے ہیں کہ ﴿أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا﴾ [آل عمران: ۶۴] ہرگز ہم عبادت نہیں کریں گے، مگر اللہ کی۔ تم اللہ کے سوا کبھی صلیب کو سجدہ کررہے ہو، کبھی آگ کو سجدہ کررہے ہو، کبھی کسی بت کے آگے سجدہ کررہے ہو اور کبھی تمثال (صورت) کے آگے سجدہ کررہے ہو۔ یہ توحید نہیں ہے، بلکہ یہ شرک ہے۔ لہٰذا آؤ اور اقرار کرو کہ ہم ان

چیزوں کی عبادت نہیں کریں گے اور صرف خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۔

یہود و نصاریٰ کے کفریہ نظریات:

آج بھی نصرانیوں کے گھروں پر باقاعدہ صلیب کا نشان ہوگا، ان کے گلے کے اندر باقاعدہ صلیب لٹکی ہوئی ہوگی، جب وہ گھر سے باہر نکلیں گے تو سینہ پر کراس کا نشان کر کے صلیب کی علامت بنائیں گے اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جب ہم یہ نشان بناتے ہیں تو برکت حاصل ہوتی ہے اور ہماری حفاظت ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی پر چڑھے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر موت آئی ہے۔ اور اسی لیے وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہمیں جہنم میں سزا نہیں ہوگی؛ کیونکہ ہماری طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو پھانسی بھگتی ہے وہ ہم سب کی طرف سے کفارہ ہو گیا ہے۔

اسی طرح یہودی کہتے تھے کہ ہمیں جہنم کی سزا نہیں ہوگی؛ کیونکہ اللہ کے بیٹے کے ساتھ ہماری دوستی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کا بیٹا اپنے باپ سے کہہ دے گا تو ہمیں سزا نہیں ملے گی۔ اور کچھ یہودی کہتے تھے کہ سزا تو ملے گی، لیکن چند دنوں کے لیے ہمیں آگ میں ڈالا جائے گا؛ کیونکہ ہمارے بزرگوں نے غلطی کی تھی اور چند دنوں کے لیے گائے کو خدا بنا لیا تھا، اس کے بعد ہم سیدھے جنت میں چلے جائیں گے۔

آج بھی روافض کا یہی عقیدہ ہے کہ اگر آدمی حب علی رکھتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس کے دل میں بغض علی ہے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ یہ وہی عقیدے ہیں جو یہودیوں سے منقول ہیں اور یہی عقیدے ہمارے جاہلوں میں بھی آگئے۔ وہ کہتے ہیں: پیرانِ پیر کی کشتی چلے گی جو اس کشتی میں آگیا وہ جنت میں جائے گا اور جو پیرانِ پیر کی کشتی سے نیچے رہ گیا وہ برباد ہو گیا۔ کوئی ان سے پوچھے: خدا کے بندے! جو پیران پیر سے پہلے لوگ تھے وہ کس کشتی میں ہوں گے؟ ان کو پیرانِ پیر سے واقفیت بھی نہیں وہ کشتی کیسے ڈھونڈیں گے؟

یاد رکھیں! اللہ کے نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" دَخَلَ الْجَنَّةَ)) [سنن ابی داود، رقم: ۳۱۱۶]

جس شخص کو عقیدہ توحید پر موت آئی اور زبان سے بھی کلمہ پڑھ لیا جنت میں داخل ہوگا۔

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ جنت اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملے گی اور جہنم اللہ تعالیٰ کے عدل سے ملے گی۔ اس لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اوپر فضل فرمائے، ہم عدل کے قابل نہیں ہیں؛ کیونکہ کون اللہ تعالیٰ کو حساب دے سکتا ہے؟

اہل کتاب کو دعوتِ توحید:

﴿أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا﴾ [آل عمران: ۶۴]

یہی وہ دعوت ہے جو تمام انبیاء لے کر آئے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ [الانبیاء: ۲۵]

''نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول، مگر ہم نے اس کو وحی بھیجی کہ آپ دعوت دیں کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ، اسی کی عبادت کرو۔''

اور فرمایا:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ [النحل: ۳۶]

''اور ہم نے بھیجا ہر امت میں اپنا پیغمبر کہ اس بات کی دعوت دیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اللہ تعالیٰ کے غیر سے بچ جاؤ۔''

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ﴾ [آل عمران: ۶۴]

ان کو کہو کہ ہم اس بات پر اتفاق کریں کہ ایک دوسرے کو رب نہیں بنائیں گے، یعنی کسی کو ایسا درجہ نہیں دیں گے کہ جو وہ حکم کرے اس کو ہم کریں، جو حلال کرے وہ حلال اور جو حرام کرے اس کو حرام سمجھیں۔ اگر وہ ہمیں گناہ کا بھی حکم دے تو ہم تعمیل کریں۔ اگر ہم نے کسی کو ایسا درجہ دیا، اس کا مطلب ہے کہ...... نعوذ باللہ...... ہم نے اس کو خدا سمجھ لیا ہے؛ کیونکہ یہ شان صرف اللہ تعالیٰ کی ہے کہ اس کا ہر حکم قابل تسلیم ہوتا ہے کہ جو وہ حکم دیں اس کو کرنا ہوگا۔

ایک بزرگ اور ان کے خلیفہ کا واقعہ:

ایک بہت بڑے اللہ والے تھے۔ ان کا ایک مرید تھا، جو شاگرد بھی تھا، وہ ان سے اللہ اللہ سیکھتا رہا۔ جب وہ اس قابل ہوگیا کہ جا کر دین کا کام کرے تو اس نے اپنے شیخ سے اجازت لی کہ اب میں اپنے علاقے میں چلا جاؤں؟ آپ نے فرمایا: ہاں اجازت ہے، لیکن خیال کرنا ایک تو خدائی کا دعویٰ نہ کرنا اور دوسرا نبوت کا دعویٰ نہ کرنا۔ شاگرد ڈر گیا، اس نے کہا: حضرت! کمال ہے میں نے آپ کے پاس اتنا عرصہ رہ کر دین سیکھا تو کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں کہ اپنے ملک میں جا کر خدا بن جاؤں گا یا نبی بن جاؤں گا!؟ بزرگ نے فرمایا: جب آدمی یہ کہے کہ جو

میں کہہ رہا ہوں وہ ہی کرو تو تم خدا کے مقام پر آ گئے اور جب تم لوگوں کو کوئی بات کہو اور کہو کہ میری رد نہیں ہو سکتی، جو میں کہہ رہا ہوں وہ ٹھیک ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تم نبوت کے مقام پر آ گئے؛ کیونکہ یہ شان نبی کی ہے کہ اس کی بات کوئی رد نہیں کر سکتا، ورنہ تو ہر بندے کی بات میں غلطی ہو سکتی ہے، ہر بندے میں کوئی نہ کوئی کمی رہ سکتی ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نبی کا مقام ہے کہ اس کی کوئی بات رد نہیں ہو سکتی۔

شاہِ روم کا حضور ﷺ کے متعلق مکالمہ:

جب قیصرِ روم عیسائیوں کے بڑے بادشاہ کے پاس حضور اکرم ﷺ کا خط پہنچا تو اس نے اپنے آدمیوں سے کہا: مکہ کے لوگ یہاں تجارت کے لیے آتے ہیں، معلوم کرو اگر ان کا قافلہ آیا ہوا ہے تو ان لوگوں کو یہاں لے آؤ۔ اس وقت تجارت کا قافلہ ابوسفیان کی سربراہی میں تھا اور وہ اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ قیصر روم کے بندے ان کو دربار میں لے گئے تو قیصر روم نے اس وفد سے کہا: تم میں سے کون ہے جس کا نسب اس کے ساتھ ملتا ہو جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ ابوسفیانؓ نے کہا: میں اس کا چچا ہوں۔ اس نے کہا: مجھے یہ بتاؤ کہ محمد مدنی کس خاندان میں پیدا ہوئے ہیں؟ ابو سفیان نے کہا: مکہ کے اعلیٰ خاندان، قریش کے قبیلے اور بنو ہاشم کی شاخ میں پیدا ہوئے ہیں۔ قیصر روم نے کہا: مجھے حضور اکرم ﷺ کی صفت، صورت اور سیرت مبارک بتائیں۔ ابوسفیان نے ہر وہ بات بتائی جو بالکل سچ تھی۔ حالانکہ ابوسفیان کافر اور مشرک تھا، لیکن اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ اس روایت کے اندر اختصار ہے۔

دوسری روایت کے اندر ہے کہ ابوسفیان نے کہا: میرے دل میں خیال آیا کہ میں جب خود ان کو نہیں مانتا، ان کا کلمہ نہیں پڑھتا تو میں کیوں ان کی تعریف کر رہا ہوں؟ میں کیوں نہ ان کے اندر جھوٹ بولوں؟ تو میں نے دل میں سوچا کہ ابوسفیان تم نے جھوٹ بولا تو قیامت تک تیرے خاندان میں لکھا جائے گا کہ وہ جھوٹا تھا، لہٰذا میں بچ گیا۔ اور جب قیصر روم نے مجھ سے پوچھا کہ جب وہ معاہدہ کریں تو اس پر پابند رہتے ہیں یا نہیں؟ تو میں نے اتنا جھوٹ بولا کہ میں نے کہا: ابھی ہمارا معاہدہ ہوا ہے، پتا نہیں اس معاہدے کو پورا کرتے ہیں یا نہیں۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ حالانکہ مجھے پتا تھا کہ محمد مدنی ﷺ کبھی معاہدہ نہیں توڑیں گے۔

قیصر روم نے پوچھا کہ جب اس نے دعویٰ کیا تو سب سے پہلے اس پر ایمان لانے والے امیر تھے یا غریب تھے؟ میں نے کہا: ان کو ماننے والے سارے غریب تھے، غلام تھے۔ اس نے یہ ساری باتیں سننے کے بعد کہا: خدا کی قسم ہے! دیکھو! میں بادشاہ ہوں اور میں نے سابقہ کتابیں پڑھی ہیں۔ یہ اللہ کا سچا نبی ہے۔ اگر مجھے موقع ملتا اور

میں وہاں ہوتا تو میں ان کے قدم دھوکر پی لیتا۔ جب اس نے یہ کہا تو اس کے سارے پادری جو بیٹھے تھے وہ چیخ پڑے، وہ ڈر گیا اور اس نے کہا: میں تم لوگوں کو آزمانا چاہتا تھا کہ تم اپنے دین پر کتنے پکے ہو!؟ میں نصرانی ہوں، میں دین سے پھر نہیں رہا تھا۔ وہ بات بدل گیا، اس کی قسمت میں ایمان نہیں تھا۔

ہرقل کی طرف حضور ﷺ کی دعوتِ اسلام:

حضور اکرم ﷺ نے ہرقل بادشاہ کی طرف جو خط لکھا وہ یہ تھا:

''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ إِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ: سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، أَمَّا بَعْدُ: فَإِنِّيْ أَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ، أَسْلِمْ تَسْلَمْ، يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْأَرِيْسِيِّيْنَ وَ ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ؀﴾''

[صحیح البخاری، رقم: ۷]

''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (یہ خط ہے) اللہ کے بندے اور اس کے پیغمبر محمد (ﷺ) کی طرف سے بادشاہ روم کی طرف۔ اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اس کے بعد واضح ہو کہ میں تم کو اسلام کی طرف بلاتا ہوں، اسلام لاؤ گے تو (قہر الٰہی) سے بچ جاؤ گے اور اللہ تمہیں تمہارا دوگنا ثواب دے گا۔ اگر تم (میری دعوت سے) منہ پھیرو گے تو بلاشبہ تم پر (تمہاری) تمام رعیت (کے ایمان نہ لانے) کا گناہ ہوگا۔ اور اللہ فرماتے ہیں: اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان میں مشترک ہے، یعنی یہ کہ ہم اور تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا پروردگار بنائے۔ پھر اگر اہل کتاب اس سے اعراض کریں تو تم کہہ دینا کہ اس بات کے گواہ رہو کہ ہم اللہ کی اطاعت کرنے والے ہیں۔''

ایک شبہ کا جواب:

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سورۃ آلِ عمران کی ابتدائی چھیاسی آیات وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نجران والے پہلے لوگ ہیں جنہوں نے جزیہ قبول کیا تھا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آیت جزیہ فتح مکہ کے بعد اتری تھی۔ تو سوال

یہ ہے کہ خط میں پہلے کیسے لکھی گئی؟ مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے کئی جواب ہیں: ایک جواب یہ ہے کہ یہ آیت مبارک دو دفعہ نازل ہوئی: ایک مرتبہ صلح حدیبیہ سے پہلے اور ایک مرتبہ فتح مکہ کے بعد۔ یا سورت آل عمران کا ابتدائی حصہ اس آیت تک وفد نجران کے بارے میں نازل ہوا تھا اور یہ آیت اس واقعہ سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ یا نجران کا وفد شاید حدیبیہ سے پہلے آیا ہو اور انہوں نے اس کو جزیہ سمجھ کر نہ دیا ہو، بلکہ دھوکہ دیا ہو کہ ہم کچھ دے دیں گے، تاکہ ہمیں مباہلہ نہ کرنا پڑے اور نکل جائیں۔ جیسا کہ سریہ عبداللہ بن جحش نے بدر سے پہلے ہی خمس کے اعتبار سے تقسیم کی تھی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرما کر حکم جاری فرما دیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خط لکھا، لیکن یہ آیت اس وقت نہیں اتری تھی۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خط لکھا تو بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کے موافق آیت نازل فرمادی۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درخواست کی تھی کہ عورتوں کو پردے کا حکم دیں تو بعد میں حکم نازل ہو گیا اور جیسا کہ انہوں نے بدر کے قیدیوں کے قتل کے بارے میں حکم دیا تو اس کے موافق بعد میں حکم نازل ہوا۔ اسی طرح وفد نجران کے بارے میں ہو سکتا ہے۔

﴿يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِيٓ إِبْرٰهِيمَ وَمَآ أُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهٖ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٦٥﴾ هٰٓأَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ إِبْرٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٦٧﴾ إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرٰهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا ۗ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٨﴾﴾ [آل عمران: ۶۵ تا ۶۸]

"اے اہل کتاب! (یہود و نصاریٰ!) تم ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں کیوں بحث کرتے ہو؟ حالانکہ تورات اور انجیل ان کے بعد ہی تو نازل ہوئی تھیں، کیا تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں ہے؟ دیکھو! یہ تم ہی تو ہو جنہوں نے ان معاملات میں اپنی سی بحث کر لی ہے جن کا تمہیں کچھ نہ کچھ علم تھا۔ اب ان معاملات میں کیوں بحث کرتے ہو جن کا تمہیں سرے سے کوئی علم ہی نہیں ہے؟ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ابراہیم (علیہ السلام) نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی، بلکہ وہ تو سیدھے سیدھے مسلمان تھے اور شرک کرنے والوں میں کبھی شامل نہیں ہوئے۔ ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ تعلق کے سب سے زیادہ حق دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی، نیز یہ نبی (آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم) اور وہ لوگ ہیں جو (ان پر) ایمان لائے ہیں، اور اللہ مومنوں کا کارساز ہے۔"

ان آیات مبارکہ میں بھی اہل کتاب سے خطاب ہے اور ان کے ایک باطل شبہ کا رد ہے کہ یہودی یہ کہتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں اور وہ بھی یہودی تھے اور نصرانی یہ کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے اور مکہ کے مشرکین کہتے تھے کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں۔ کیونکہ کعبہ ابراہیمی ہم بنا رہے ہیں، ہم ختنہ کرواتے ہیں، حج کا احرام باندھتے ہیں، کعبہ کا طواف کرتے ہیں تو اللہ پاک نے ان آیات کے اندر ان کا رد فرمایا کہ اے اہل کتاب! تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ موسیٰ کے زمانے سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان میں بھی تقریباً دو ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ تھا تو نہ موسیٰ علیہ السلام تھے، نہ عیسیٰ علیہ السلام تھے، نہ تورات تھی اور نہ انجیل تھی تو تم کیسے کہتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے یا نصرانی تھے؟

یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کیوں کہا گیا؟

پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب فرمایا ہے۔ حالانکہ وہ تورات و انجیل کو بدل چکے تھے اور تورات کے اندر تو اتنی تحریفات کر ڈالی تھیں کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ [النساء:۴۶] وہ کلمات کے اندر بھی تحریف کرتے تھے، معنوی تحریف بھی کرتے تھے، ہر لحاظ سے تحریفات کیں، لیکن ان کو خطاب ہمیشہ اہل کتاب سے کیا گیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسے آج کوئی بندہ ہمارا کلمہ پڑھ لے ہم اس کو مسلمان کہتے ہیں، چاہے وہ قبر پر سجدہ کرے، غیر اللہ کی نذر کرے، نیاز چڑھاتا ہو تب بھی اس کو مسلمان کہتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مولا اور مشکل کشا سمجھے تب بھی ایمان والا اور مومن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی طرف کلمہ کی نسبت ہوگئی، حالانکہ حقیقت کے اندر مومن کون ہے وہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ آپ یقین کریں! کئی لوگوں سے خود ہمارا سابقہ پڑتا ہے، وہ خود بتاتے ہیں کہ میرے والد اتنے تہجد گزار تھے کہ ان کی تہجد کبھی نہیں چھوٹی، یعنی فخر کرے گا، حالانکہ یہ فخر کی بات نہیں اور یہ نہیں سمجھتا کہ میں اپنے اوپر لعنت کر رہا ہوں۔ اور اگر اس سے پوچھا جائے تو کہے گا: میں نماز بھی نہیں پڑھتا، لیکن والد صاحب بڑے نیک آدمی تھے۔ اس کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ اور اسی طرح کتنے لوگ ہیں جو یورپ میں گئے ہیں اور یورپین لڑکیوں سے شادی کر لی اور اسی تہذیب میں کھو گئے کہ نہ نماز ہے، نہ روزہ ہے، نہ حج ہے، بلکہ اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے ان کے ساتھ گرجا گھر میں بھی چلے جاتے ہیں اور ان سے پوچھا جائے کہ تم کون ہو؟ تو کہتے ہیں

کہ ہم مسلمان ہیں۔

اسی طرح یہودی چاہے کتنے بگڑ گئے، کتنے بدل گئے ہوں اب وہ تورات بھی بھول گئے، انجیل بھی بھول گئے وہ سب سے بڑے مشرک بن گئے، لیکن چونکہ ان کے پاس تورات کی نسبت تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتے تھے اس لیے قرآن بار بار ان کو اہل کتاب کہتا ہے۔

علماء نے دوسری وجہ بھی لکھی ہے مثلاً: آپ ایک عالم کے بیٹے کو جب کہیں کہ تم عالم کے بیٹے ہو، یعنی تم تو عقل کرو، تم تو برے کام نہ کرو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور نصرانیوں کو بار بار اہل کتاب فرمایا کہ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں تورات ملی، حضرت موسیٰ علیہ السلام ملے۔ اگر تم اس کتاب پر بھی عمل کرتے تو سب سے پہلے میرے محمد مدنی ﷺ پر ایمان لاتے؛ کیونکہ ان کتابوں کے اندر ان کا ذکر موجود ہے، میرے مدنی کی صفات موجود ہیں اور حلیہ موجود ہے۔ تو اس خطاب کے اندر بھی ایک دعوت ہے۔

﴿هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ حَٰجَجْتُمْ فِيمَا لَكُم بِهِۦ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُم بِهِۦ عِلْمٌ ۚ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پہلے تو تم نے اس بارے میں جھگڑا کیا جس کے بارے میں تمہیں کچھ نہ کچھ علم تو ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تم جھگڑتے رہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے یا وہ خود خدا ہے یا وہ اکانیم ثلاثہ ہیں، ان کے بارے میں تو تمہیں کچھ علم تھا، لیکن تمہیں ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیا پتا ہے؟ تم نے تو ان کا زمانہ بھی نہیں دیکھا۔

﴿وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝٦٦﴾ [آل عمران:٦٦]

یہاں سے یہ ثابت کیا گیا کہ اہل کتاب محض جھگڑا کرنا چاہتے ہیں، کوئی دین سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے باطل فرقے ہیں وہ دوسرے لوگوں کو شبہات میں ڈال کر دھوکہ دیتے ہیں۔ آج بھی اگر آپ یہودی سے بات کریں اور وہ کہے کہ ہم خالص اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں۔ ہمیں بڑی شرم آتی ہے جب ہم یورپ کے ملکوں میں جاتے ہیں اور راستے میں ان سے کھانے کے بارے میں پوچھتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ نے صحیح معنوں میں حلال کھانا ہے تو جہاں ہوٹل ہیں ان کو کہو کہ ہمیں یہودیوں کا کھانا دو تو وہ خالص ذبح ہوتا ہے تو شرم آتی ہے کہ ان کے کھانے کے بارے میں ہر آدمی گارنٹی دیتا ہے، لیکن مسلمانوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے کہ وہ کونسا جانور ذبح کر کے کھلا رہے ہیں؟ حلال یا حرام؟ یا پھر مچھلی سے گزارہ کریں؛ کیونکہ اس کو ذبح نہیں کیا جاتا، اس کو پانی سے شکار کیا جاتا ہے، اس لیے وہ حلال ہی ہوتی ہے۔

ہمارے سفر کا ایک واقعہ:

ان کی خباثت دیکھیں اور پھر معاملات کی سچائی دیکھیں کہ ایک جگہ ہم سفر کر رہے تھے۔ بڑا لمبا سفر تھا اور ہم نے بڑی کوشش کی کہ راستے کے اندر نہ کھائیں، بھوکے رہ کر گزارہ کر لیں، لیکن سب ساتھی اتنے لمبے سفر پر تھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا: ہمیں تو بھوک لگی ہے۔ ہم ایک سروس اسٹیشن پر اترے تو ایک یہودی لڑکی تھی۔ اس سے ہم نے پوچھا کہ تمہارے پاس برگر اور یہ جو ساری چیزیں پڑی ہیں ان میں کوئی کوشر یا مسلمان کا حلال گوشت ہے یا مہربانی کر کے مچھلی مل جائے؟ اس نے جب سب داڑھی والوں کو دیکھا تو اس نے کہا: میرے پاس تازہ مچھلی ہے، لیکن میں تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ تم میرے ہوٹل کی کوئی چیز نہ کھاؤ۔ ہم نے اس سے وجہ پوچھی اور کہا کہ مچھلی تو حلال ہے۔ اس نے کہا میں چمچ تو ایک ہی استعمال کرتی ہوں، ورنہ میرا ہوٹل ہے۔ میں اپنا پچاس ساٹھ پاؤنڈ خراب کر رہی ہوں، اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اگر آپ مسلمان ہیں اور حلال حرام کی تمیز کرنا چاہتے ہیں تو یہاں سے کچھ نہ کھائیں اور اس میں آگے جا کر فلاں نام کی دکان ہے اور اس کا فلاں نمبر ہے، وہاں سے کھالینا، ورنہ بسکٹ وغیرہ ڈھونڈ لیں جس میں چربی وغیرہ نہ ہو۔ ہم نے اس کو کہا: چلو ہم یہاں نماز پڑھ لیں۔ اس نے کہا پڑھ لیں۔ بہر حال کتنے دکھ کی بات ہے کہ یہودی اپنے کھانے پر پکا ہو اور مسلمان پکا نہ ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی:

﴿مَا كَانَ إِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾

اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے بالکل ان کی نفی کی ہے کہ ظالمو! ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، بلکہ وہ سب کو چھوڑ کر ایک رب کو ماننے والے تھے، سب سے منہ موڑنے والے، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے اور ابراہیم علیہ السلام شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔

اب اگر وہ یہ کہیں کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی تھے؛ کیونکہ یہودیت تو ان کے بعد آئی، نصرانیت یہودیت کے بعد آئی، لیکن ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ جو ہم کر رہے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی یہی عمل تھا۔ مشرکین مکہ کہتے تھے کہ جس طرح ہم کر رہے ہیں اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے یہودیو! تم ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر کیسے ہو؟ تم تو عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہو اور ابراہیم علیہ السلام تو خدا کے نام پر

اپنا بیٹا ذبح کر رہے ہیں تو تمہارا اور ان کا ایک طریقہ کیسے ہوا؟ اے نصرانیو! تم عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کی توحید کے لیے نمرود کی آگ میں جلنے کے لیے تیار تھے تو تم کیسے موحد بن گئے؟ یا ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر کیسے آگئے؟

مکہ والو! تم بھی کہتے ہو کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر ہیں۔ ظالمو! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو جا کر بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور تم نے خدا کا کعبہ بتوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ بت شکن تھے اور تم بت پرست ہو۔ پھر تم کیسے کہتے ہو کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر ہیں!؟

آج بھی جتنے باطل فرقے ہیں، مثلاً: بعض کہتے ہیں کہ ہم تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر ہیں، ہم تو امام جعفر صادق رحمہ اللہ کی فقہ پر عمل کرنے والے ہیں۔ ان کو کہا جائے کہ تم امام جعفر صادق رحمہ اللہ کی صحیح روایت سے ایک عمل ثابت کر کے دکھا دو کہ ان سے تمہاری نماز، روزہ، عبادت ملے، تمہاری اذان ان کے ساتھ ملے، لیکن نہیں دکھا سکتے۔ صرف زبان سے کہنا کہ ہم ان کے راستے پر ہیں کافی نہیں۔ یہی یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا حال تھا۔

﴿وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾

یہاں سمجھیں کہ کوئی یہ کہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو پہلے گزر گئے، وہ مسلمان کیسے تھے؟ یاد رکھیں! یہاں مسلم لغوی معنی میں ہے کہ وہ اللہ کے فرماں بردار تھے، اپنے اللہ کو ماننے والے تھے۔ یہ معنی نہیں کہ وہ شریعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہی لفظ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر بھی آیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [البقرۃ:۱۳۱]

اور اسی طرح دوسری جگہ فرمایا:

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ [البقرۃ:۱۲۸]

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے اہل کتاب! تم خود فیصلہ کرو کہ تم اپنے اعمال کو بھی ملاؤ اور میرے مدنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ملاؤ، تم اپنے عقیدے کو بھی دیکھو اور محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے عقیدے کو بھی دیکھو کہ کون ابراہیم علیہ السلام سے ملتا ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور امت محمد ﷺ کا مذہب:

﴿إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرٰهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٨﴾﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو ان کے زمانہ میں ان کی اتباع کرنے والے تھے یا پھر ان کے راستے سے اگر کوئی راستہ ملتا ہے تو وہ میرے مدنی محمد مصطفیٰ ﷺ کا راستہ ہے اور جو میرے مدنی پر ایمان لائے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے طریقہ ملتا ہے، جن کا عقیدہ، عمل، حج اور قربانیاں ان سے ملتی ہیں۔ یہ ان کے طریقے پر ہیں، تم ان کے طریقے پر نہیں ہو۔

﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٨﴾﴾ [آل عمران:٦٨]

''اور اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا دوست ہے۔''

تم جو دعویٰ کرتے ہو کہ ﴿نَحْنُ أَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَأَحِبَّٰٓؤُهُ﴾ [المائدۃ:١٨] ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب، پسندیدہ ہیں۔ تمہاری یہ سب باتیں جھوٹی ہیں، اللہ صرف مومنوں کا دوست ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو صحیح ایمان نصیب فرمائیں اور خاتمہ ایمان پر فرمائیں۔

باطل فرقوں کو توبہ کی توفیق کیوں نہیں ملتی؟

ان آیات سے معلوم ہوا کہ باطل فرقہ اپنے آپ کو سچا سمجھتا ہے۔ اسی لیے شیخ الاسلام نے لکھا ہے کہ بڑے سے بڑا گناہ گار کیوں نہ ہو اس سے توبہ کی امید ہوتی ہے، لیکن بدعت کرنے والوں سے توبہ کی امید نہیں ہوتی؛ کیونکہ وہ بدعت کو جب برا نہیں سمجھتے تو اس سے توبہ کیسے کریں گے؟ ہر باطل فرقہ بھی اپنے آپ کو سچا سمجھتا ہے، اس لیے وہ اس پر اڑا رہتا ہے۔ یہودی یہودیت پر، نصرانی نصرانیت پر اڑا ہوا ہے اور ہندو ہندومت پر اڑا ہوا ہے؛ کیونکہ وہ جو کر رہے ہیں اسی کو حق سمجھتے ہیں اور وہی کتابیں پڑھتے ہیں جو ان کے مفاد کے مطابق ہیں، عبادت وہیں کرنے جاتے ہیں جہاں ان کے مطلب کی بات ہوتی ہے۔ اور دوسری بات ان کے کانوں میں بھی نہیں پہنچتی تو فرق کیسے کریں گے؟ انہوں نے اپنا ماحول ہی ایسا بنایا ہوا ہے کہ دوسری کوئی بات سنتے بھی نہیں ہیں۔ مثلاً: اگر کوئی شیعہ ہے تو وہ کبھی اہلسنت کی مسجد میں نہیں جائے گا، ان کے علماء کا درس نہیں سنے گا۔ وہ اپنے ذاکروں کی مجلس میں جائے گا تو اس کو وہاں سے اس کے مذہب کی باتیں سنائی دیں گی۔ اسی طرح جو بدعات میں الجھے ہوئے ہیں وہ عرس پر تو جائیں

گے، لیکن مجال ہے کہ کسی موحد عالم کی تقریر سننے جائیں۔ اب وہ غریب ایک ماحول میں پھنسا ہوا ہے تو جب دوسروں کی بات نہیں سنے گا اس وقت تک اس کو فرق نہیں معلوم ہوگا۔

اس لیے مشرکین مکہ نے پورے مکہ کے اردگرد پہرہ لگا دیا تھا کہ جب کوئی آدمی باہر سے آئے تو اس پر نظر رکھو کہ وہ محمد مدنی ﷺ کے قریب نہ جائے؛ کیونکہ ان کو پتا تھا کہ یہ اگر ان کے قریب گیا اور ان سے بات ہوگئی تو ہمارا جھوٹ کھل جائے گا۔ اور ہوتا بھی یہی تھا کہ جس کو موقع مل گیا اور وہ حضور اکرم ﷺ کے پاس گیا وہ مسلمان ہوگیا۔

اصل اہل سنت کی پہچان کا طریقہ:

بعض بھائیوں کو مغالطہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اہل سنت والجماعت ہیں۔ دیوبندی بھی کہتے ہیں کہ ہم اہل سنت والجماعت ہیں۔ تبلیغ والے بھی کہتے ہیں کہ ہم اہل سنت والجماعت ہیں تو ہم کہاں جائیں؟ اس کا واضح طریقہ ہے کہ ساری جماعتوں کے عمل کو پرکھو اور تم مولوی مکی اور مولوی مدنی کی باتوں میں نہ آؤ اور تم دیکھو کہ بچہ پیدا ہوا تو سنت کیا ہے؟ حج میں اور عبادات میں سنت کیا ہے؟ نکاح میں سنت کیا ہے؟ اور ولیمہ میں سنت کیا ہے؟ یہ ساری چیزیں دیکھتے آؤ۔ جس میں ملیں وہ اہل سنت ہیں اور جس میں نہ ملیں وہ اہل بدعت ہیں۔ ہر جماعت کے کام کو دیکھو کہ قرآن کی خدمت کون کر رہا ہے، حدیث کی خدمت کون کر رہا ہے اور مزاروں پر بیٹھ کر مجاور بن کر روٹیاں کون کما رہا ہے۔ مسئلہ واضح ہوجائے گا۔ سب سے بڑی شان میرے محمد مدنی ﷺ کے مزار کی ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کتنے مجاور بٹھائے تھے؟

﴿وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٩﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٧١﴾ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾﴾ [آل عمران: ۶۹ تا ۷۴]

''(مسلمانو!) اہل کتاب کا ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ تم لوگوں کو گمراہ کر دے، حالانکہ وہ اپنے سوا کسی اور کو گمراہ نہیں کر رہے، اگرچہ انہیں اس کا احساس نہیں ہے۔ اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم خود (ان کے من جانب اللہ ہونے کے) گواہ ہو۔ اے اہل کتاب! کیوں تم خلط ملط کرتے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور (کیوں) تم چھپاتے ہو حق کو؟ حالانکہ تم (سب کچھ) جانتے ہو۔ اہل کتاب کے ایک گروہ نے (ایک دوسرے سے) کہا ہے کہ جو کلام مسلمانوں پر نازل کیا گیا ہے اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آؤ اور ان کے آخری حصے میں اس سے انکار کر دینا، شاید اس طرح مسلمان (بھی اپنے دین سے) پھر جائیں۔ مگر دل سے ان لوگوں کے سوا کسی کی نہ ماننا جو تمہارے دین کے متبع ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ ہدایت تو وہی ہدایت ہے جو اللہ کی دی ہوئی ہو۔ یہ ساری باتیں تم اس ضد میں کر رہے ہو کہ کسی کو اس جیسی چیز (یعنی نبوت اور آسمانی کتاب) کیوں مل گئی؟ جیسی کبھی تمہیں دی گئی تھی یا یہ (مسلمان) تمہارے رب کے آگے تم پر غالب کیوں آ گئے؟ آپ کہہ دیجیے کہ فضیلت تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا ہے، ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ وہ اپنی رحمت کے لیے جس کو چاہتا ہے خاص طور پر منتخب کر لیتا ہے اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اہل کتاب کی مزید سازشوں کا ذکر فرمایا ہے، خاص طور پر یہود کے بارے میں بتایا کہ ان کی ایک جماعت اس بات کو محبوب رکھتی ہے کہ تمہیں گمراہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تمہیں گمراہ نہیں کر رہے، بلکہ اپنی گمراہی میں خود اضافہ کر رہے ہیں، لیکن وہ اس بات کو سمجھتے نہیں ہیں۔ ایک آدمی خود گمراہ ہے اور دوسرے کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو قاعدہ ہے کہ اس پر ضلال (گمراہ ہونے) کا گناہ ہوگا۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((فَضَلُّوْا وَأَضَلُّوْا)) [بخاری، رقم: ۱۰۰] کہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہی میں ڈالا۔

آیات کا معنیٰ:

﴿يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۝﴾ [آل عمران: ۷۰]

میرے مدنی (ﷺ)! اہل کتاب کو آپ کہہ دیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات سے کیوں کفر کرتے ہو؟ حالانکہ تم جانتے ہو۔

﴿اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء کا قول ہے کہ جو تورات میں آیات ہیں وہ مراد ہیں: کیونکہ تورات بھی تو اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب ہے، اس کے اندر جو آیات حضور اکرم ﷺ کی صداقت پر دلالت کر رہی

ہیں؛ کیونکہ تورات میں تفصیل کے ساتھ آپ کی نشانیاں، آپ کا حلیہ مبارک، آپ کا مولد مبارک، آپ کی ہجرت کی جگہ، آپ کے صحابہ کی صفات اور آپ کی امت کی صفات تمام چیزیں تورات میں موجود تھیں، لیکن یہودی اس کے باوجود ان آیات کا کفر کرتے تھے۔

اور بعض علماء نے فرمایا: ﴿ایٰتِ اللّٰہِ﴾ سے مراد وہ آیات ہیں جو قرآن میں آئی ہیں۔ تم جانتے ہو کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی وحی اور کتاب ہے اور پھر تم ان آیات قرآنی کا کیوں انکار کرتے ہو؟

اور تیسرا قول یہ ہے کہ ﴿ایٰتِ اللّٰہِ﴾ سے مراد معجزات ہیں۔

اہل کتاب کا حق و باطل کو ملانے کا جرم:

﴿یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [آل عمران:۷۱]

اے اہل کتاب! کیوں تم حق کو باطل سے ملاتے ہو اور کبھی حق کو چھپاتے ہو؟ اور تم جانتے ہو کہ یہ بات حق ہے۔

مفسرین کرام نے فرمایا: اہل کتاب کی یہ عادت تھی کہ وہ تورات میں تحریفات کرتے تھے۔

تحریف کی صورتیں:

یعنی یا تو تحریف لفظی کرتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ﴾ [النساء:۴۶] کہ کلمات بدل ڈالتے تھے۔ اور کبھی معنوی تحریف کرتے تھے کہ لفظ اسی طرح رہنے دیئے، لیکن ان کا معنی اپنے مطلب کا نکال لیا کہ سود تو صرف وہی حرام ہے جو سود پر سود لیا جائے، یعنی ایک دفعہ سود سات فیصد طے ہو گیا۔ سال کے بعد مثال کے طور پر سترہ سو بن گئے تو انہوں نے کہا: اب سترہ سو ہمارا سات فیصد سود بن گیا۔ یہ ﴿اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً﴾ ہے اور یہ منع ہے۔ اس کا ایک تولہ گوشت بھی حرام ہے اور اس کا ایک سیر گوشت بھی حرام ہے۔ یہ تو تنبیہ تھی کہ ظالمو! سود تو حرام ہے اور تم حرام کو بھی ڈبل کر کے کھا رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا تھا۔

تحریف کی دوسری مثال یہ ہے کہ ابتدا کے اندر حکم آیا تھا: ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی﴾ [النساء:۴۳] تم نماز میں ایسی حالت میں نہ جاؤ کہ تم نشہ کی حالت میں ہو؛ کیونکہ آدمی کو نشہ کی حالت میں پتا نہیں ہوتا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں؟ تو اس وقت پینے والے یہ کرتے تھے کہ عشاء کے بعد پی کر سو گئے اور صبح تک نشہ اتر جاتا، لیکن اس بعد حکم آ گیا کہ شرب بالکل حرام ہے، اس کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ اب کوئی پہلی آیت کو لے کر بیٹھ جائے کہ صرف نماز

کی حالت میں نہیں پینا، آگے پیچھے تو ٹھیک ہے۔ یہ تحریف معنوی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرآن کو اپنی منشا کے مطابق بدل دیا۔

تحریف کے اندر سب سے اوّل نمبر یہود کا ہے، ان کے بعد روافض ہیں۔ انہوں نے قرآن وحدیث میں ایسی ایسی تحریفات کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہدایت دے، ورنہ آدمی گمراہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی بھی بنیاد عبداللہ بن سبا سے پڑی ہے۔ جو ہنر استاد میں ہوگا، وہ شاگرد میں بھی آجائے گا۔ ان کی عادت تھی کہ ایک بات سچی کر دی اور دو باتیں ساتھ ملا دیں۔ اور دوسرا وہ یہ کرتے تھے کہ حق کو چھپا لیتے تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ حضور اکرم ﷺ کی صفات تورات میں ہیں؟ تو کہتے: نہیں ہیں۔ اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ آیت رجم تورات میں ہے؟ تو کہتے: نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم حق کو جانتے بھی ہو اور پھر بھی حق کو چھپاتے ہو۔

گمراہ کرنے کی یہودیوں کی ایک چال:

﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴾ [آل عمران: ۷۲]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل کتاب کی ایک جماعت کا ایک اور قصہ نقل کیا ہے کہ اہل کتاب کی ایک جماعت ایسی ہے کہ انہوں نے مشورہ کیا کہ کل ہم چھ سات آدمیوں کی ایک جماعت بنا لیتے ہیں اور حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں جا کر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں اور پھر کچھ دنوں بعد ہم انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے اسلام چھوڑ دیا ہے۔ جب ہم اس طرح کریں گے تو لوگوں کے دلوں میں شکوک پڑ جائیں گے کہ دیکھو! یہ اہل کتاب تھے، پڑھے لکھے تھے، انہوں نے آکر کلمہ پڑھا، مسلمان ہوئے پھر جو اسلام سے نکل گئے ہیں آخر ان کو اسلام میں کوئی برائی ملی ہے تب ہی نکلے ہیں، ورنہ یہ اسلام کو کیوں چھوڑتے؟ تو اس طریقے سے انہوں نے کہا کہ ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ جو لوگ اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے ہیں وہ اسلام سے نکل جائیں گے۔

﴿وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ﴾

اور انہوں نے کہا کہ ہم ظاہر میں مسلمان ہوں گے، لیکن تم اپنے دین پر رہنا اور کوئی بات نہ ماننا، مگر دین یہودیت کی، اور نہ مسلمانوں پر کوئی بات ظاہر کرنا کہ تورات میں حضور اکرم ﷺ کی شان موجود ہے۔ ایسی باتیں

اگر تم نے ان کو بتا دیں تو وہ دنیا کے اندر بھی اور آخرت میں بھی ہم پر حجت پکڑیں گے کہ تم نے ہی کہا تھا کہ تورات میں لکھا ہوا ہے۔ اس طرح انہوں نے آپس میں ایک مکر اور سازش تیار کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ﴾ میرے مدنی! ہدایت میرے ہاتھ میں ہے۔ یہ ظالم کیا کر سکتے ہیں؟ نہ یہ کسی کو نکال سکتے ہیں اور نہ یہ کسی کو ہدایت دے سکتے ہیں۔ ہدایت دینے والا اللہ ہے اور تمام مخلوق کے دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کے درمیان میں ہیں، اللہ تعالیٰ جس کو جدھر چاہے پھیر دے۔ تو یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اور کسی کے اختیار میں نہیں ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہ مومنوں کے دل کو ہدایت دے کر ان کو ایمان کامل نصیب فرمائیں گے۔ تم حضور اکرم ﷺ کی صفات لاکھ چھپا دو، لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی کو ایمان نصیب کر دیں گے، اللہ تعالیٰ جس کو اپنے نبی کا کلمہ شہادت نصیب کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو نشانیاں بھی دیں گے، ان کو آیات بینات بھی دیں گے، دلائل بھی دیں گے، ان کو اطمینانِ قلب بھی دیں گے اور ان کے دلوں کو ایمان اور اسلام پر جما بھی دیں گے۔ یہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے، تمہارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔

آپ دیکھ لیں کہ اسی سرزمین مکہ میں جو لوگ مسلمان ہوئے غریب، فقراء، ضعفاء اور غلام قسم کے لوگ تھے تو کوئی ایسا عذاب نہیں جو مشرکین مکہ نے ان پر نہ توڑا ہو، لیکن جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت نصیب کر دی وہ انگاروں پر لٹا دیئے گئے، لیکن انہوں نے محمد مدنی ﷺ کے دین کو نہیں چھوڑا۔ اور آپ دیکھیں! فرعون کے گھر کے اندر بی بی آسیہ عزت وعظمت اور مقام والی عورت ہے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا، جو قیامت تک پڑھا جاتا رہے گا۔ فرعون خدائی کا دعوے دار ہے اور گھر میں بیوی مسلمان ہے۔ پھر فرعون نے اس پر ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ اس کے ہاتھوں میں میخیں لگوا دیں اور سینے پر پتھر رکھ دیا، لیکن اس وقت بھی بی بی نے کہا: میرے اللہ! مجھے اس سے نجات دے اور میرا گھر جنت میں بنا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی فریاد سنی اور اس کو آخرت میں یہ مقام عطا فرمایا کہ وہ قیامت میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بیوی بنے گی۔

ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے اور دوسرا موسیٰ جس کا لقب سامری تھا، پیدا ہوا تو اس کی ماں نے جنگل میں پھینک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کی ڈیوٹی لگائی کہ اس کی حفاظت کرو۔ تو اللہ تعالیٰ کا فرشتہ اس کو کھانے پہنچا رہا ہے اور غار میں اس کی حفاظت ہو رہی ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت فرعون کے گھر میں ہو رہی ہے، لیکن سامری

جب بڑا ہوا وہ کافر بنا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی بنے۔ اس لیے ہدایت کے فیصلے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ بندہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہر عالم کا بیٹا عالم ہوگا، ہر صالح کا بیٹا صالح ہوگا، ہر گناہ گار کا بیٹا گناہ گار ہوگا، بلکہ بعض ایسے جاہل ہیں جن کو الف لکھنا نہیں آتا، لیکن ان کے بیٹے بڑے علم والے ہیں اور بعض بہت بڑے بڑے ... کہ جن کے علم کو دیکھتے دیکھتے ٹوپی گر جائے، لیکن ان کی اولاد عالم نہیں بنی۔ تو یہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے ذمہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں، باقی ہدایت اللہ نے دینی ہے۔

ہدایت دینے کا اختیار اللہ کے پاس ہے:

﴿قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ [آل عمران: ۷۳]

میرے مدنی! ان کو کہہ دیں کہ میرے رب کے ہاتھ میں فضل ہے، جس کو چاہے دے دیں۔ تم کیا چھپاتے ہو؟ تمام امور کا تصرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی دینے والے، وہی لینے والے۔ جس پر چاہیں احسان کر کے ایمان بھی دے دیں اور جس کو چاہیں اندھا اور گمراہ کر دیں، اس کا دل اور اس کی آنکھیں سب اندھی ہو جائیں، اس کے کانوں اور دلوں پر مہر کر دیں، اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیں کہ وہ حق کا راستہ نہ دیکھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، جس کو چاہیں ہدایت دیں اور جس کو چاہیں ہدایت سے روک دیں۔ اس میں بھی اس کی حکمتیں ہیں۔ کوئی کام اللہ تعالیٰ کی حکمت کے بغیر نہیں ہے۔

﴿يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ [آل عمران: ۷۴]

اے مسلمانو! تم پر اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ فضل ہے کہ اس نے تمہیں اپنا سب سے پیارا نبی خاتم النبیین ﷺ عطا فرمایا اور اس کا کامل مکمل دین اسلام عطا فرمایا۔

﴿وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۷۵، ۷۶]

"اہل کتاب میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس دولت کا ایک ڈھیر بھی امانت کے طور پر رکھوادو تو وہ تمہیں واپس کردیں گے اور انہی میں سے کچھ ایسے ہیں کہ اگر ایک دینار کی امانت بھی ان کے پاس رکھواؤ تو وہ تمہیں واپس نہیں دیں گے، الا یہ کہ تم ان کے سر پر کھڑے رہو۔ ان کا یہ طرز عمل اس لیے ہے کہ انہوں نے یہ کہہ رکھا ہے کہ امیوں (یعنی غیر یہودی عربوں) کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہماری کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔ اور (اس طرح) وہ اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھتے ہیں۔ بھلا پکڑ کیوں نہیں ہوگی؟ (قاعدہ یہ ہے کہ) جو اپنے عہد کو پورا کرے گا اور گناہ سے بچے گا تو اللہ ایسے پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔"

یہودیوں کی دنیاوی خیانت:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کی خیانت صرف دین میں نہیں تھی، بلکہ دنیا میں بھی وہ خائن تھے۔ بعض اہل کتاب تو ایسے تھے کہ جو دیانت دار تھے، لیکن بعض ایسے تھے کہ اگر آپ ان کو تھوڑی چیز امانت دے دیں کہ یہ رکھ لو تو دینے کے وقت وہ امانت کا ہی انکار کر دیتے تھے کہ آپ نے تو ہمیں کچھ بھی نہیں دیا ہے۔ ہاں جب آپ ہر وقت ان کے سر پر کھڑے ہیں اس وقت بات مان رہے ہیں۔ آپ ہٹ گئے اور پھر ان سے پوچھا تو کہتے آپ نے تو ہمارے پاس کوئی امانت نہیں رکھی ہے۔ اور ساتھ یہ بھی کہتے ہیں: ان امیوں کا مال اگر ہم کھالیں تو ہم پر کوئی جرم نہیں ہے، ان کا مال ہمارے لیے حلال ہے، لہٰذا ہمیں جہاں بھی موقع ملے ان کا مال کھالیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ایسے ظالم ہیں جو مجھ پر بھی جھوٹ بولتے ہیں، حالانکہ میں نے کسی کا مال کسی کے لیے حلال نہیں کیا کہ تم بغیر اس کی اجازت کے اس کے مال کو کھالو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بار بار یہ تاکید کی ہے کہ اگر کوئی عہد ہے تو اس کو ادا کرو۔

عہد دو جانب سے ہوتا ہے۔ مثلاً: اگر آپ مجھے یہ چیزیں دیں گے تو میں آپ کو یہ چیزیں دوں گا۔ اور وعدہ ایک جانب سے ہوتا ہے کہ میں کل آپ کا یہ کام کردوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن میں کئی مقامات پر پابند کیا ہے کہ اگر عہد ہے تو اس کو پورا کرو اور اگر وعدہ ہے تو اس کو پورا کرو۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۥ﴾ [المائدۃ:۱] اے ایمان والو! اگر تم عہد معاہدہ کرو تو اس کو پورا کرو؛ کیونکہ: ﴿اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝﴾ [بنی اسرائیل:۳۴] اللہ تعالیٰ کے ہاں تم سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اسلام اور قرآن کا تو یہ حکم ہے، لیکن یہود ایسے خائن ہیں کہ چند پیسوں کے لیے یہ اس میں بھی خیانت کرتے ہیں کہ

ان کو امانت دے دو تو امانت کا انکار کر دیتے ہیں اور ساتھ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر ہم کھا لیں گے تو ہم سے سوال نہیں ہوگا۔

کیا اس آیت میں بعض یہودیوں کی دیانت کی تعریف ہے؟

علماء نے فرمایا کہ اس آیت کے اندر ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بعض اہل کتاب میں ایسے بھی ہیں جن کے پاس آپ ڈھیر سارا سونا بھی رکھ دیں تو آپ کی امانت پوری پوری واپس کر دیں گے اور بعض ان میں ایسے بھی ہیں کہ ایک دینار بھی رکھو تو وہ ایک دینار سے بھی مکر جائے گا۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ یہاں تو اہل کتاب کی مذمت کا بیان تھا، لیکن اس کے اندر تعریف بھی آ گئی؟ علماء نے اس کے بارے میں دو جواب دیئے ہیں۔

ایک جواب تو یہ ہے کہ اہل کتاب میں ایسے بھی تھے جو ایمان لے آئے اور پکے مسلمان بن گئے، جیسا کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تھے۔ اور ان کے پڑھے لکھے لوگ ایسے مسلمان ہو گئے کہ دنیا ان کے ایمان، صداقت اور ان کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی پر دنگ رہ گئی۔ اس لیے اللہ پاک نے ان کا ذکر فرمایا کہ سارے اہل کتاب ایسے نہیں ہیں، ان میں اچھے بھی ہیں۔ لہٰذا اس آیت کے اندر ان اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے جو اپنے نبی پر بھی ایمان لائے اور پھر ہمارے آقا سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے۔ اور جب ان سے کوئی بات پوچھی گئی تو انہوں نے کھل کر واضح بتا دیا، جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ایک دن پوچھا کہ اب تو تم الحمد للہ! اسلام لے آئے، صحابی بن گئے، ہمارے بھائی بن گئے، مجھے یہ بتاؤ کہ جب تک تم نے کلمہ نہیں پڑھا تھا اور اسلام نہیں لائے تھے، اس وقت تمہارے علم کے مطابق تم سمجھتے تھے کہ یہ اللہ کے سچے نبی ہیں؟ تو حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: امیر المومنین! کمال کی بات ہے مجھے اپنی اولاد کے بارے میں تو شبہ ہو سکتا تھا، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تورات کے اندر رجم کے بارے میں کیا حکم ہے؟ تو انہوں نے اپنی قوم کی کوئی رعایت نہیں کی، بلکہ کہا: حضور! بالکل وہی حکم ہے جو آپ دے رہے ہیں۔ اس کے اندر بھی زنا کی سزا رجم ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا کہ اسلام اتنا عدل والا مذہب ہے کہ اگر دشمن میں بھی کوئی خوبی ہے تو اسلام اقرار کرتا ہے، اسلام اس کی خوبی کا انکار نہیں کرتا۔ جیسا کہ مقام بدر کے اندر جب لڑائی ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد بھی قید

ہو کر آ گئے۔ آپ نے سب قیدیوں کو چھوڑ دیا تو آپ ﷺ نے اپنے داماد سے فرمایا کہ تم میری ایک بات مانو کہ تم کفر پر ہو اور تم بدر میں میرے ساتھ لڑائی کے لیے آئے تھے، اب تم مہربانی کر کے میری لڑکی کو مدینہ بھیج دینا۔ اس نے کہا: میرا وعدہ ہے میں بھیج دوں گا۔ واپس آ کر اس نے حضور اکرم ﷺ کی لڑکی کو عزت کے ساتھ مدینہ منورہ بھیجا تو آپ ﷺ فرماتے ہیں: کتنا اچھا آدمی ہے جو وعدہ کیا اس کو پورا بھی کیا ہے۔ بہر حال بعد میں اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی اور وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح جب حضور اکرم ﷺ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرما کر جا رہے تھے تو رابغ کے علاقے کا سردار سراقہ بن مالک تھا وہ حضور اکرم ﷺ کو پکڑنے کے لیے آیا۔ لمبا واقعہ ہے۔ بہر حال اس نے کہا تھا کہ میں آپ کو پکڑنے کے لیے آیا تھا؛ کیونکہ مجھے سو اونٹ کی لالچ تھی، لیکن اب میں نے جب آپ ﷺ کے معجزات دیکھے تو میری طبیعت نہیں چاہتی کہ میں آپ کو نقصان پہنچاؤں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ جائیں۔ اس راستے سے آپ کے کسی دشمن کو آپ کے پیچھے نہیں آنے دوں گا۔ تو حضور اکرم ﷺ نے اس کو خوشخبری دی کہ پھر میں بھی تجھے ایک خوشخبری دیتا ہوں کہ ایک وقت آئے گا تم مسلمان ہو گے، اسلام کو کامیابی ہوگی، کسریٰ کا غرور ٹوٹے گا، اس کا ملک فتح ہوگا اور اس بادشاہ کے کنگن تجھے پہنائے جائیں گے۔ سراقہ اپنے وعدے پر قائم رہا۔ جو کافر مکہ سے حضور اکرم ﷺ کی تلاش میں پیچھے آ رہے تھے، اس نے ان سے کہا: میں نے یہ سارا علاقہ گھوڑے دوڑا کر روند ڈالا ہے، اس راستے میں محمد مصطفیٰ ﷺ نہیں ہیں۔ اگر تھے تو وہ اتنی دور نکل گئے ہیں کہ اب ہم ان کو نہیں پکڑ سکتے، لہٰذا تم ادھر تلاش نہ کرو اور دوسرے راستے سے تلاش کرو۔ اسلام اتنا عادل ہے کہ اس کا بھی ذکر کیا ہے۔

خائن پر اعتماد کرنے کا نقصان:

اس آیت کے اندر تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ ﴿إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا﴾ [آل عمران: ۷۵] بعض اہل کتاب ایسے ہیں ان کے سر پر کھڑے رہو تو کہیں گے کہ ٹھیک ہے اور ذرا ہٹ گئے تو وہ مکر جاتے ہیں۔ یہاں سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ایک مسئلہ استنباط کیا ہے کہ قرضہ لینے والے کو حق ہے کہ اس کے سر پر کھڑا رہے اور اس سے اپنا حق لے کر نکلے۔

اسلام نے ہمیں سبق پڑھایا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم عمل تو کریں اسلام نے سکھایا ہے کہ:

((لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَيْنِ)) [صحیح بخاری، رقم: ۶۱۳۳]

''مومن ایک بل سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاتا۔''

مثلاً: تم نے ایک آدمی کو قرضہ دیا، وہ کھا گیا۔ اب اگر وہ دوبارہ مانگنے آئے تو یہ نہیں کہ تم اس کو دوبارہ بھی دے دو۔ اس کو بزرگوں نے محاورہ میں کہا ہے "اَلْمُجَرَّبُ لَا یُجَرَّبُ" یعنی جس کا تم ایک بار تجربہ کر چکے ہو اس کا پھر بار بار تجربے کا کیا مطلب ہے؟ جو ایک دفعہ خیانت کر چکا ہے وہ دوسری دفعہ بھی خیانت کرے گا، لہٰذا تم اس پر اعتبار نہ کرو۔

اسلام نے ہمیں دوسرا سبق یہ سکھایا ہے کہ اگر کوئی آدمی سو ریال میں خیانت کر گیا، جھوٹ بول گیا تو تم اس پر ہزار کا اعتبار کیسے کر رہے ہو؟ اگر وہ سو میں خیانت کر سکتا ہے تو زیادہ میں بھی کر سکتا ہے۔

اسلام نے ہمیں ہر چیز کا سبق دیا ہے، لیکن ہم لوگ خود اسلام کو چھوڑ دیتے ہیں۔

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: دینار اس لیے کہتے ہیں کہ یہ دین اور نار سے مل کر بنا ہے، یعنی اگر کوئی مال کو اس کے حق کے ساتھ حاصل کرے تو یہ دین ہے اور اگر ناحق لے تو آگ ہے۔

قرضہ ادا کرنے کی عجیب حکایت:

(حدیث) اس آیت کے مناسب یہ واقعہ ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں نقل فرمایا ہے اور مختلف مقامات پر انہوں نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بنی اسرائیل کا ایک آدمی تھا اس کے پاس بنی اسرئیل کا دوسرا آدمی آیا اور اس سے کہا کہ مجھے ایک ہزار دینار قرض دے دو۔ اس نے کہا: گواہ لے آؤ۔ اس نے کہا: کہاں سے گواہ لے آؤں؟ میرا اللہ گواہ ہے۔ اس نے کہا: چلو کوئی کفیل لے آؤ جو تمہاری کفالت کرے۔ اس نے کہا: میرا کفیل اللہ ہے۔ اس نے کہا: تم سچ کہتے ہو۔ جب اللہ تعالیٰ گواہ اور کفیل ہے تو یہ قرض لے جاؤ۔ وہ قرضہ لے کر چلا گیا اور اس نے اپنی ضروریات پوری کیں۔ اب وہ وعدے کے دن آ گیا۔ وہ گھر سے آیا، درمیان میں دریا تھا، اس نے کشتی تلاش کی، لیکن اس کو کشتی نہ ملی اور وہ مجبور ہو گیا کہ وعدہ پر کیسے پہنچے تو اس نے ایک لکڑی لے کر اس کو اندر سے خالی کیا اور پیسوں کو اس کے اندر رکھ دیا اور ایک خط اس میں لکھ کر رکھ دیا کہ اللہ! تو جانتا ہے، میں نے تیری ضمانت دی تھی اور میں نے تجھے گواہ بنایا تھا، وہ بے چارہ مان گیا اور اس نے مجھے آپ کے نام پر قرضہ دے دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے بڑی کوشش کی ہے کہ مجھے اس طرف کی سواری ملے، لیکن مجھے سواری نہیں ملی، لیکن میں اپنے عدے کے مطابق اس کی امانت تیرے سپرد کرتا ہوں۔ آپ میرے ضامن ہیں، یہ آپ اس تک پہنچا دیں۔ اور وہ لکڑی اس نے دریا میں ڈال دی۔

ادھر وہ آدمی جس نے قرضہ واپس لینا تھا اس انتظار میں تھا کہ اس شخص کا وعدہ آگیا ہے تو وہ دریا کے کنارے پر انتظار کرتا رہا۔ نہ کشتی آئی اور نہ وہ بندہ آیا۔ اس نے دیکھا کہ کنارے کے قریب ایک لکڑی آرہی ہے، اس نے کہا: چلو یہ لکڑی گھر لے جائیں، آگ جلانے کے کام آئے گی۔ اس نے گھر آ کر لکڑی کو کاٹا تو اندر سے وہ خط بھی نکل آیا اور وہ ہزار دینار بھی مل گئے۔ جس آدمی نے قرضہ لیا تھا کچھ عرصہ کے بعد مزید ایک ہزار دینار لے کر آگیا اور قرض خواہ سے کہا کہ آپ کو پتا ہے کہ اتنی مدت سے میرے علاقے سے کوئی کشتی نہیں آئی۔ میں مجبور تھا، اب میں یہ پیسے لے کر آیا ہوں۔ اس نے کہا: تم یہ بتاؤ کہ پہلے تم نے مجھے کوئی پیسے بھیجے تھے؟ اس نے کہا: جب مجھے کوئی کشتی نہیں ملی تھی تو میں آپ کو خواہ مخواہ کیا کہوں۔ اس نے کہا: جو تم نے مجھے ایک ہزار دینار لکڑی میں بھیجا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے تیری طرف سے ادا کر دیئے ہیں۔[1]

اب دیکھیں کہ دونوں کی امانت کہ اس نے قرضہ دے دیا اور قرضہ لوٹانے والے نے دریا میں ڈال دیا کہ میں تو وعدے کے مطابق سچا ہو جاؤں اور جب وہ دوبارہ لے کر آیا تو اس نے کہا: مجھے مل گئے، میں دوبارہ کیسے لے لوں؟ جب امانت اور دیانت کا یہ حال ہو تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس طرح آتی ہے۔

(حدیث) فرمایا: جب دو آدمی کاروبار شروع کریں، کوئی دکان، کوئی تجارت شروع کریں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تک ان کی نیت ٹھیک ہے تو تیسرا میں ان کے ساتھ ہوتا ہوں، پھر ان کو کبھی نقصان نہیں ہو سکتا۔ اور جب ان دو میں کوئی ایک نیت خراب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنی ذات کو علیحدہ کر لیتا ہوں تو اس کے بعد تباہی آجاتی ہے۔ [ابوداؤد، رقم: ۳۳۸۳]

دوسروں کے مال کو حلال جاننا یہودی عقیدہ ہے:

﴿ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ﴾ [آل عمران: ۷۵، ۷۶]

یہودی کہتے تھے کہ جتنے امیین ہیں ان کا مال اگر ہم کھا جائیں تو ہم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ آج بھی یہودیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر غیر یہودی کا مال کھالو یا غیر یہودی کی عصمت لوٹ لو اور اگر غیر یہودی کو تم دھوکہ دے دو تو یہ سب جائز ہے۔

[1] [بخاری، رقم: ۱۴۹۸]

بعض شیعہ مذہب کی کتابوں میں بھی موجود ہے کہ جو غیر شیعہ ہے اس کا مال کھا جاؤ تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو ہدایت دے؛ کیونکہ مقصد ہدایت ہے اور اللہ تعالیٰ سب کو صحیح عقیدہ نصیب کرے۔ یاد رکھیں! مال تو اسلام میں کافر کا بھی نہیں کھا سکتے؛ کیونکہ یہ حقوق العباد ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کرتے، چاہے لاکھ توبہ کرو معاف نہیں ہوتا، جب تک کہ اس حقدار کا حق ادا نہ کرو۔

﴿وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾

انہوں نے یہ باتیں خود گھڑی ہیں، یہ جھوٹ گھڑے ہیں، اللہ پاک نے حرام کر دیا اس بات کو کہ تم کسی کا مال ناحق نہیں لے سکتے، لیکن یہودی قوم بہتان لگانے والی اور جھوٹ بولنے والی قوم ہے۔

ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مسئلہ پوچھا کہ ہم جب سفر میں ہوتے ہیں تو راستے میں کافروں کی آبادیاں ہیں جو اہل ذمہ ہیں تو ان کی کبھی مرغی یا بکری راستہ میں مل جاتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا: پھر تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: ہم کہتے ہیں کہ یہ ہمارے جزیہ دینے والے لوگ ہیں، ان کی اگر کوئی مرغی یا بکری کھائیں گے تو کیا فرق پڑے گا؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم بھی کیا یہودیوں کی طرح کرو گے؟ جبکہ یہ لوگ تمہیں ٹیکس اور جزیہ دیتے ہیں، ان کی چاہے مرغی ہے یا انڈہ ہے، تمہارے لیے حرام ہے۔ کسی کی چیز کو اس کی اجازت کے بغیر استعمال نہیں کر سکتے۔ [سنن بیہقی: ۹/ ۱۹۸]

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ یہودی یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم امیین کا مال کھالیں تو ہم پر کوئی گناہ نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كَذَبَ أَعْدَاءُ اللهِ، مَا مِنْ شَيْءٍ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ إِلَّا وَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ إِلَّا الْأَمَانَةَ، فَإِنَّهَا مُؤَدَّاةٌ إِلَى الْبَرِّ وَالْفَاجِرِ)) [تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۹۲]

اللہ کے دشمن جھوٹ بول رہے ہیں۔ جو بھی جاہلیت کے زمانے کی باتیں تھیں وہ سب میں نے قدموں کے نیچے روند ڈالیں۔ اب اللہ تعالیٰ کی شریعت چلے گی، لیکن امانت کا حکم پہلے بھی تھا اور اب بھی موجود ہے کہ اگر تیرے پاس امانت ہے چاہے وہ اچھے بندے کی ہے چاہے برے بندے کی ہے، امانت امانت ہے، اس کو واپس کرنا پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے اہل کتاب! تم میں سے جس نے اس عہد کو پورا کیا جو عہد ہم نے انبیاء علیہم السلام سے کیا تھا

اور ان کی امتوں سے کہ جب میرے محمد مدنی ﷺ آئیں گے تو تم ایمان لاؤ گے تو جس نے اس وعدے کو نبھایا اور حضور اکرم ﷺ پر ایمان لایا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا بنا، کسی کا مال نہیں کھایا اور تقویٰ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں، یعنی وہ جنات میں ان کو درجات نصیب فرمائیں گے اور انہیں عذاب جہنم سے نجات عطا فرمائیں گے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝﴾ [آل عمران:۷۷]

”(اس کے برخلاف) جو لوگ اللہ سے کیے ہوئے عہد اور اپنی کھائی ہوئی قسموں کا سودا کر کے تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیتے ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اور قیامت کے دن نہ اللہ ان سے بات کرے گا، نہ انہیں (رحمت کی نظر سے) دیکھے گا، نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کا حصہ تو بس عذاب ہوگا، انتہائی دردناک۔“

جھوٹی قسمیں وغیرہ سے دوسروں کا مال لینے کا عذاب:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر اہل کتاب کے احوال اور ان کے لیے سخت سزاؤں کو بیان کیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کر کے قسمیں دے کر پھر معمولی نفع کے عوض اس کو بیچ دیتے ہیں، یعنی کوئی وعدہ کرتے ہیں اور اس پر قسم بھی کھاتے ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے بدلے میں تھوڑا سا پیسہ مل جائے اور ہم فائدہ اٹھالیں۔

یاد رکھیں! یہ سمجھانے کے لیے مثال ہے، ورنہ یہ مطلب نہیں کہ اگر زیادہ پیسے ملیں گے تو جھوٹی قسم کھالو، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے مقابلہ پر جتنا بھی پیسہ کیوں نہ ہو وہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

...ی بات علماء نے یہ فرمائی ہے: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ [النساء:۷۷] کہ ساری دنیا میں جو چیزیں ہیں وہ قلیل ہیں، فنا ہونے والی ہیں اور مٹ جانے والی ہیں۔ لہٰذا ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تھوڑا سا فائدہ حاصل کرنے کے لیے میرے نام کی جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، میرے نام سے عہد اور معاہدے کرتے ہیں اور اس میں قسمیں کھاتے ہیں، تاکہ ہمیں تھوڑا سا مفاد حاصل ہو جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پانچ سزائیں رکھی ہیں:

1 ......پہلی سزا یہ ہے کہ ﴿أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ﴾ ایسے لوگوں کا جنت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس سے بڑی محرومی کیا ہو سکتی ہے؟

2 ......دوسری سزا یہ ہے کہ ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ﴾ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن ان سے کلام بھی نہیں فرمائیں گے۔

3 ......تیسری سزا یہ ہے کہ ﴿وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر بھی نہیں ڈالیں گے۔

4 ......چوتھی سزا یہ ہے کہ ﴿وَلَا يُزَكِّيهِمْ﴾ اللہ تعالیٰ ان کو پاک بھی نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ وہ لوگ سزا میں پڑے رہیں گے۔

5 ......اور پانچویں سزا یہ ہے کہ ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ [النساء: ۷۷] ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اس سے اندازہ فرمائیں کہ جس کام پر اللہ تعالیٰ نے یہ پانچ سزائیں مقرر کی ہوں تو وہ کتنا برا ہے! آج ہمارے مسلمان قسم کو، قرآن کو اور جھوٹی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ روزانہ اگر ہر آدمی اپنا محاسبہ کرے تو پتا نہیں وہ ایک دن میں کتنی قسمیں کھاتا ہے تو اندازہ ہو جائے گا کہ آج ہمارا ماحول اتنا بگڑ چکا ہے کہ گویا ہم جہنم کے گڑھوں کے کنارے پر آچکے ہیں، بلکہ اب تو بڑے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جو آدمی جھوٹی قسمیں کھاتا ہے اور لوگوں کو جھوٹی باتیں کر کے لوگوں سے جھوٹے معاہدے کرے اور لوگ کہیں کہ بڑا سمجھدار آدمی ہے اور قابل آدمی ہے۔ کتنے مسلمان ہیں جو مختلف اسکیمیں بنا کر لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں؛ کیونکہ آدمی جلد لالچ کے اندر آجاتا ہے تو وہ دھوکہ کھا جاتا ہے۔

اس آیت سے اندازہ کریں کہ جو مولوی یا پیر اللہ کے نام کے ساتھ لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے، اللہ کے قرآن کے حوالے دے کر لوگوں کو بدعات میں ڈالتا ہے اور اللہ کے نبی کے فرمان کو سنا کر لوگوں کو گمراہ کرتا ہے وہ سب سے بڑا خائن ہے۔ اس کے لیے بھی یہ پانچ سزائیں ہو سکتی ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا جواب:

یہاں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے کلام نہیں فرمائیں گے جو جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ اور دوسری جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے کلام فرمائیں گے، حتیٰ کہ مشرکین بھی کہیں گے: ﴿وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ﴾ [الانعام: ۲۳] اے اللہ! ہمیں تمہاری قسم ہے کہ تو ہمارا رب ہے، ہم نے شرک نہیں کیا۔ تو مشرکین سے بھی کلام ہوگا۔ اور اسی طرح یہاں آیا ہے کہ

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی طرف نظر نہیں فرمائیں گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔
مفسرین کرام رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کلام لطف نہیں فرمائیں گے، مہربانی کا کلام نہیں فرمائیں گے۔ غصہ اور جلال کا کلام اور ان کو سزا دینے کا حکم تو علیحدہ بات ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ ان پر نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے، ورنہ تو ہر چیز اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہے۔

ضربِ تادیب اور ضربِ تعذیب:

﴿وَلَا يُزَكِّيهِمْ﴾ اور اللہ تعالیٰ ان کو پاک بھی نہیں فرمائیں گے۔
علماء نے لکھا ہے کہ ایک ضرب تادیب کی ہوتی ہے اور ایک ضرب تعذیب کی ہوتی ہے۔ ایک اجنبی شخص کا مارنا ہے اور ایک ماں باپ کا مارنا ہے۔ ماں باپ اور استاذ کا مارنا تادیب کے لیے ہوتا ہے، تاکہ یہ بچہ کچھ پڑھے اور علم حاصل کرے۔ اس لیے جب وہ پڑھ جاتا ہے تو اس مار کو بھی یاد کرتا ہے کہ اللہ ہمارے استاذوں پر رحمت کرے، ہمیں بڑا مارتے تھے، لیکن آج ہم بندے بن گئے۔ اگر وہ نہ مارتے تو ہم جاہل ہوتے۔ اسی طرح قیامت میں جو کافر کو عذاب ہوگا وہ تعذیب کے لیے ہے اور ایک گناہ گار مسلمان کو بھی عذاب ہوتا ہے، کبھی دنیا میں بھی ہوتا ہے اور کبھی آخرت میں بھی ہوتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو گناہوں سے پاک کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں اور ان کے درجات کو بلند کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کتنے بڑے اولیاء گزرے ہیں کہ کسی کو فالج ہے، کوئی نابینا ہو گیا، کوئی ہلنے کے قابل نہ رہا، کوئی بولنے کے قابل نہ رہا اور کوئی چلنے کے قابل نہ رہا۔ اس تکلیف کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرماتے ہیں۔
مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی مناسبت سے چند احادیث بیان فرمائی ہیں؛ کیونکہ حدیث اللہ تعالیٰ کے قرآن کی تفسیر ہوتی ہے۔ اس لیے اب ان احادیث کو بیان کیا جاتا ہے۔
(پہلی حدیث:) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
((ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ، قَالَ: فَقَرَأَهَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَ مِرَارًا، قَالَ أَبُو ذَرٍّ: خَابُوا وَخَسِرُوا، مَنْ هُمْ، يَا رَسُولَ اللهِ!، قَالَ: الْمُسْبِلُ، وَالْمَنَّانُ، وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ)) [مسلم، رقم:۱۷۱]
تین آدمی ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کلام بھی نہیں فرمائیں گے، جن کی طرف اللہ تعالیٰ نظرِ رحمت بھی نہیں کریں

گے، جن کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے پاک بھی نہیں کریں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ اور یہ بات حضور اکرم ﷺ نے تین دفعہ فرمائی تو میں ڈر گیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ تین بدقسمت کون ہیں؟ وہ تو نامراد ہو گئے، نقصان میں پڑ گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

1 ......ان میں سے ایک مسبل ہے، یعنی جو اپنی چادر کو اپنے ٹخنوں کے نیچے لٹکانے والا، (شلوار، پائجامہ، پینٹ بھی اس کے تحت داخل ہے)۔

چادر وغیرہ کو نیچے لٹکانے والے کی یہ سزا اس لیے ہے کہ یہ تکبر کی علامت ہے اور کبریائی صرف میرے اللہ کو زیبا ہے اور کسی کو زیبا نہیں ہے۔ ایک بندہ مخلوق اور عاجز ہے، وہ کیا تکبر کرے؟ اس لیے شلوار، چادر کے لیے افضل یہ ہے کہ نصف پنڈلی تک کپڑا ہو، نہیں تو اس سے تھوڑا نیچے، نہیں تو اور تھوڑا نیچے ہو، لیکن ٹخنے ظاہر ہوں، اس سے نیچے مرد کے لیے حرام ہے۔ اور یہ علامتِ تکبر ہے، اس سے بڑی سزا کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس پر نظرِ کرم نہیں فرمائیں گے۔

مسلمانوں کی دنیا میں حالت زار:

آج ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ہر جگہ ذلیل ہو رہے ہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟ کیونکہ جب تک مرض کی تشخیص نہیں ہوگی اس وقت تک علاج ممکن نہیں ہے۔ کافروں کے چار آدمی مر جائیں تو پوری دنیا کو ہلاک کر کے رکھ دیتے ہیں اور پوری دنیا میں دیکھیں کہ مسلمان کے خون کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

علماء نے اس کی وجہ لکھی ہے کہ ایک انفرادی گناہ ہے کہ میں نے گناہ کیا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ میں توبہ کروں اور ایک گناہ ایسا ہے کہ اس کے اندر پورا معاشرہ مبتلا ہو گیا تو وہاں ایک دو آدمیوں کی توبہ کام نہیں آتی، بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ اجتماعی طور پر قوم اللہ تعالیٰ کے دروازے پر گریں، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں، تاکہ اللہ تعالیٰ راضی ہو۔ پھر جا کر ہم سے یہ عذاب اٹھیں گے۔

کیونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا فرمان مبارک ہے:

((اَللّٰهُمَّ إِنَّهُ لَمْ يَنْزِلْ بَلَاءٌ مِنَ السَّمَاءِ إِلَّا بِذَنْبٍ، وَلَا يُكْشَفُ إِلَّا بِتَوْبَةٍ))

[المجالسة وجواهر العلم، رقم: ۷۴۷]

''کبھی ہم پر کوئی مصیبت نہیں آتی، مگر اس کا سبب ہمارا گناہ ہوتا ہے۔ اور مصیبت اس وقت ٹلتی ہے جب توبہ کریں۔''

اب آپ خود دیکھ لیں کہ اسبالِ ازار ایک فیشن بن گیا کہ مردوں کے کپڑے نیچے ہوتے جا رہے ہیں اور عورتوں

کے اوپر ہوتے جا رہے ہیں۔ بعض پڑھے لکھے ایسا باریک یا چست کپڑا پہنے ہوتے ہیں کہ جب نماز پڑھیں تو ان کا پورا بدن محسوس ہوتا ہے اور نظر آ رہا ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہہ دے تو اس کے گلے پڑ جاتے ہیں، حالانکہ کپڑا پہننے کا مقصد تو اپنا ننگ چھپانا ہوتا ہے، نہ کہ اس کو ظاہر کرنا۔

2 ......دوسرا وہ آدمی جو احسان کر کے احسان جتلائے۔

جھوٹی قسم سے مال بیچنا:

3 ......حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تیسرا آدمی وہ ہے کہ جو اپنی چیز کو جھوٹی قسم کھا کر بیچتا ہے۔

مثلاً: اس سے پوچھا جائے کہ یہ رومال کتنے کا ہے؟ وہ کہے: حضرت! آپ کے لیے دس ریال کا ہے۔ خدا کی قسم بیس سے کم کا نہیں بیچتے، اٹھارہ ریال کا تو ہم نے لیا ہے۔ حالانکہ وہ پانچ ریال کا ہوتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ آدمی جھوٹی قسم کھائے، بلکہ اگر ایک آدمی دین کی شکل بنا کر کھڑا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ بھلا کیسے جھوٹ بولے گا؟ لہٰذا اگر ایسا آدمی بھی جھوٹ بولے تو وہ بھی ان میں داخل ہے۔

یاد رکھیں! اگر وہ کافر ہے تو اس کے لیے تو جہنم ابدی ہے، لیکن مسلمان ہے اور اس میں یہ بیماریاں ہیں تو اس کو بھی اتنی بڑی سزا ملے گی، لیکن ایک نہ ایک دن بوجہ کلمہ توحید، بوجہ عقیدہ صحیح اس کو اللہ تعالیٰ جنت دیں گے۔ اس کے لیے یہ وعید شدید ہوتی ہے، تاکہ مسلمان کبھی ایسی حرکت نہ کرے۔

آج دکھ کی بات یہ ہے کہ کافر تجارت کے معاملات میں اتنا سیدھا ہے کہ آپ سوچ نہیں سکتے۔ آپ ان کے کسی معروف سٹور سے کوئی چیز لے لیں۔ دو چار دن کے بعد ان کو واپس کر دی تو لے لیں گے اور زبان سے کوئی لفظ نہیں نکالیں گے۔

دوسروں کا مال ناحق لینا:

(دوسری حدیث:) امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک آدمی کندہ قبیلہ سے تھا، اس کا نام امرؤ القیس بن عابس تھا۔ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر اس نے ایک زمین کے بارے میں درخواست پیش کی۔ اور جس سے جھگڑا تھا وہ شخص حضر موت کا تھا اور یہ یمن کا علاقہ ہے...... بعض کہتے ہیں کہ یہاں ایک اللہ کے نبی پہنچے اور ان کی موت ہوگئی تو اس وجہ سے اس کا نام حضر موت ہے...... بہر حال امرؤ القیس نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر

دعویٰ کیا کہ یہ میری زمین ہے اور فلاں شخص مجھے نہیں دیتا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اسلام کا قاعدہ ہے کہ جو آدمی دعویٰ کرے تو ثبوت دعویٰ کرنے والے کے ذمہ ہوتا ہے کہ ((اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ، وَالْيَمِيْنُ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ)) [سنن الترمذی، رقم: ۱۳۴۱] اور گواہوں کا مسئلہ وہی ہے جو قرآن میں ہے کہ دو گواہ ہونے چاہئیں: دونوں مرد ہوں، دیانت دار ہوں، اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہوں۔ تو جب گواہ گواہی دیں گے تو اس کا دعویٰ سچا ہوگا۔ اگر گواہ نہ ہوں تو مدعیٰ علیہ قسم کھائے گا۔ اگر اس نے قسم کھالی کہ یہ چیز میری ہے تو مدعی کا دعویٰ خارج ہو جائے گا۔

امرؤ القیس نے کہا: حضور! میں گواہ پیش نہیں کرسکتا۔ حضور اکرم ﷺ نے مدعیٰ علیہ کو کہا: تم قسم کھاؤ۔ امرؤ القیس نے کہا: حضور! یہ تو جھوٹا آدمی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے علاوہ تو کوئی حل نہیں ہے یا تو ثبوت لے آؤ یا اس کی قسم کا اعتبار کرو۔ اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے کسی کا مال حاصل کرنے کے لیے جھوٹی قسم کھائی تو اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ (اللہ) اس پر غصہ ہوگا۔ اور حضور اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ [آل عمران: ۷۷] جو لوگ جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں مال حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عذاب جہنم تیار کر رکھا ہے، ان کو جنت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اس مدعی نے کہا: حضور! اگر کوئی اپنا حق چھوڑ دے تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں جنت دیں گے۔ اس نے کہا: حضور! ساری زمین اس کو دے دیں۔ اس سے نہ قسم لیتا ہوں اور نہ ثبوت پیش کرتا ہوں۔ اگر مجھے اس کے بدلہ میں جنت ملتی ہے تو اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی؟ [مسند احمد: ۴/ ۱۹۲]

حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ جنت کے اندر ایک ہنٹر (کوڑے) کے برابر کی جگہ بھی ساری دنیا اور اس کی نعمتوں سے بہتر ہے۔ [بخاری، رقم: ۲۸۹۲]

لوگ اس کو اہمیت نہیں دیتے، ورنہ جھوٹی قسم کھانے سے آدمی اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کبھی آدمی کو فوراً سزا مل جاتی ہے اور کبھی فوراً سزا نہیں ملتی اور لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ روز جھوٹی قسمیں کھاتا ہے تو کیا ہوگیا؟ حالانکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے، چاہیں تو اس وقت سزا دے دیں اور اگر چاہیں تو اس کو اور مہلت دے دیں۔ کافروں کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے، وہ بھی دنیا میں زندہ ہیں اور مزے کر رہے ہیں۔

ہاں اگر حق پر ہو تو قسم کھا سکتے ہو، لیکن لوگ کہتے ہیں: سچی قسم بھی نہ کھاؤ اور جھوٹی قسم بھی نہ کھاؤ۔ یہ جاہلوں کی

بات ہے: کیونکہ کئی دفعہ حضور اکرم ﷺ نے قسم کھائی: ((وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ)) [صحیح بخاری، رقم: ۱۹۰۲] مجھے اس ذات پاک کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اس لیے سچی قسم کھانے میں ڈر نہیں ہوتا۔ کوشش کیا کریں کہ بلاوجہ قسم نہ کھانی پڑے۔ اگر سچی ہے تو حق نہ چھپائیں۔ فرمایا: ﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ﴾ [البقرة: ۲۸۳] جو چھپاتا ہے وہ دل کا مریض ہے، گناہگار ہے۔ اور جھوٹی قسم سے بالکل بچ جائیں، کچھ دینا بھی پڑے تو دے دیں۔ دنیا میں جان چھڑالیں یہ زیادہ بہتر ہے۔

جھوٹی قسم کھا کر کسی کا مال لینا:

(تیسری حدیث:) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ، وَهُوَ فِيهَا فَاجِرٌ، لِيَقْتَطِعَ بِهَا مَالَ امْرِئٍ مُسْلِمٍ لَقِيَ اللَّهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ)) [صحیح بخاری، رقم: ۲۴۱۶] جو شخص جھوٹی قسم کھائے، تاکہ کسی مسلمان کا مال حاصل کر لے تو وہ اس حالت میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوگا کہ اللہ پاک اس سے ناراض ہوں گے (تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اسے عذاب ملے گا)۔

حضرت اشعث ؓ فرماتے ہیں: خدا کی قسم ہے! اس آیت کا سبب نزول میں ہوں؛ کیونکہ میرا ایک یہودی سے زمین کے بارے میں جھگڑا تھا۔ میں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آکر مقدمہ پیش کیا۔ یہودی نے میری زمین کا انکار کر دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: تیرے پاس گواہ ہیں؟ میں نے کہا: میرے پاس گواہ نہیں ہیں۔ آپ ﷺ نے یہودی سے فرمایا: تو قسم کھا۔ میں نے کہا: حضور! اگر اس کی قسم کا مسئلہ ہے تو میری زمین ختم ہو جائے گی؛ کیونکہ یہ یہودی ہے، اس سے جتنی مرضی آئے قسمیں اٹھوالیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرمادیا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ [آل عمران: ۷۷] جو لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جھوٹی قسمیں کھا کر اللہ تعالیٰ سے عہد معاہدہ توڑ کر دنیا کا مال حاصل کرتے ہیں ان کے لیے آخرت میں جہنم کی سزا ہوگی اور اللہ تعالیٰ ان سے کلام بھی نہیں فرمائیں گے۔

اللہ کے کلام، تزکیہ اور نظر کرم سے محروم لوگ:

(چوتھی حدیث:) حضرت سہل بن معاذ بن انس ؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ لِلّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى عِبَادًا، لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، قِيلَ لَهُ: مَنْ أُولٰئِكَ؟ يَا رَسُولَ اللّٰهِ!، قَالَ: مُتَبَرِّئٌ مِنْ وَالِدَيْهِ رَاغِبٌ عَنْهُمَا، وَمُتَبَرِّئٌ مِنْ وَلَدِهِ، وَرَجُلٌ أَنْعَمَ عَلَيْهِ قَوْمٌ فَكَفَرَ نِعْمَتَهُمْ، وَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ)) [مسند احمد، رقم:۱۵۶۳۶]

اللہ تبارک وتعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوں گے جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں فرمائیں گے، یعنی ناراضگی کی وجہ سے ان سے کلام نہیں فرمائیں گے اور نہ ان کی طرف نظرِ رحمت فرمائیں گے۔ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: ایسے بندے جو والدین سے براءت کا اظہار کرتے ہوں، یعنی اپنے والدین کی اطاعت نہ کریں، والدین کی بجائے دوستوں کے ساتھ تو بڑا اچھا اخلاق ہے، لیکن والدین کا نافرمان ہے، والدین کی ولدیت کا منکر ہے۔ ایسے آدمی پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس پر نظرِ کرم نہیں فرمائیں گے۔

حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ یہ بھی قیامت کی علامات میں سے ایک علامت ہے کہ بعض ایسے لوگ ہوں گے جو دوستوں کے تو بڑے فرمانبردار ہوں گے، لیکن ماں باپ کے نافرمان ہوں گے۔ آج دیکھ لیں کہ لوگ دوستوں کی گالیاں بھی کھاتے ہیں، لیکن باپ کی بات برداشت نہیں کرسکتے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جو اپنے ماں باپ کا نافرمان ہوتا ہے کبھی تو ایسے ہوتا کہ اللہ تعالیٰ موت سے پہلے ہی اس کی زبان بند کردیتے ہیں۔

اپنی اولاد سے منہ پھیرنا یہ بھی جرم ہے؛ کیونکہ اولاد کا بھی حق ہے۔ اگر اولاد فرمانبردار ہے تو اولاد کی خدمت کرے۔ یہ نہ ہو کہ اپنی اولاد گھر میں بھوکی بیٹھی رہے اور تم دوسروں کی عورتوں کو ہدیے پہنچاؤ اور یہ نہ ہو کہ تمہاری اولاد بھیک مانگتی رہے اور تم اپنے فیشن، سنگار، کپڑوں اور اپنے دوستوں پر خرچ کرتے پھرو۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے بھی بات نہیں کریں گے۔ اور اس بندے پر بھی اللہ تعالیٰ کا قہر اور غضب ہوگا جس پر لوگوں نے تو احسان کیا، لیکن اس نے کسی کے احسان کا بدلہ نہیں دیا، بلکہ ناشکری کی۔

(پانچویں حدیث:) حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی اپنا کچھ سامان بیچنے کے لیے بازار میں لے کر آیا۔ اس نے ایک مسلمان کو جھوٹا پھنسانے کے لیے کہا کہ خدا کی قسم! مجھے اس سامان کا ایک لاکھ مل رہا تھا، لیکن میں نے نہیں دیا اور تمہیں نوے ہزار میں دیتا ہوں۔ اس طرح وہ جھوٹی قسم کھا کر اس کو سودے میں پھنسا کر سودا بیچ لے تو اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا

قَلِيلًا الخ﴾ [بخاری، رقم: ۴۵۵۱]

تین اور قسم کے محروم لوگ:

(چھٹی حدیث:) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: رَجُلٌ مَنَعَ ابْنَ السَّبِيلِ فَضْلَ مَاءٍ عِنْدَهُ، وَرَجُلٌ حَلَفَ عَلَى سِلْعَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ يَعْنِي كَاذِبًا، وَرَجُلٌ بَايَعَ إِمَامًا فَإِنْ أَعْطَاهُ وَفَى لَهُ، وَإِنْ لَمْ يُعْطِهِ لَمْ يَفِ لَهُ))

[سنن ابی داؤد، رقم: ۳۴۷۴]

تین شخص ایسے ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام بھی نہیں فرمائیں گے اور ان کی طرف نظرِ رحمت بھی نہیں فرمائیں گے اور ان کو گناہوں سے پاک بھی نہیں فرمائیں گے: ان میں ایک شخص وہ ہے جس کے پاس زائد پانی ہے اور وہ زائد پانی بھی مسافر کو نہیں دیتا...... یا اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ تو جانوروں کو بھی پانی پلاتے ہیں، فائدہ اٹھاتے ہیں اور کوئی مسافر گزرے تو اس کو کہتے ہیں کہ یہ پانی ہمارا حق ہے، تمہارا کوئی حق نہیں ہے...... ایسے آدمی پر بھی اللہ کا غضب ہوتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کو روک رہے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے پانی سے ہر چیز کو زندگی دی ہے اور تم اس نعمت عامہ کو روک کر مسلمانوں کو تکلیف دینے کا باعث بن رہے ہو۔

اور دوسرا وہ آدمی جو عصر کے بعد اپنا مال دھوکے سے بیچنا چاہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عصر کے بعد دن ڈھل رہا ہوتا ہے اور رات آرہی ہوتی ہے تو یہ وقت انسان کے لیے بڑا ڈرنے کا ہوتا ہے کہ جس طرح دن جا رہا ہے اسی طرح میں بھی گزر جاؤں گا، لہٰذا ایسے وقت میں وہ جھوٹ نہ بولے۔ اور اسی طرح عصر کے بعد اوقاتِ مستجابہ ہیں، یعنی آدمی اللہ تعالیٰ سے جو بھی دعا مانگتا ہے منظور ہوتی ہے، تو اس وقت میں اگر آدمی جھوٹی قسم کھالے تو ایسے آدمی سے بھی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں فرمائیں گے۔

اور ایک وہ آدمی جس نے اپنے امام، خلیفۃ المسلمین کی، بادشاہ کی بیعت کی کہ میں آپ کا مطیع رہوں گا۔ اب اگر بادشاہ اس کو عہدہ دے، انعام دے تو وفادار ہے اور اگر بادشاہ نے کچھ عہدہ نہ دیا اور کوئی وجہ بن گئی تو وفا ختم کر دی تو اس کی وفا پیسے کے ساتھ رہی، ورنہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے بادشاہ کا ہر حال میں مطیع رہے۔ کیونکہ اطاعت کے اندر خیر ہے اور اطاعت نہ کرنے میں فتنہ و فساد ہے۔

﴿وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ [آل عمران: ۷۸]

''اور انہی میں سے ایک گروہ کے لوگ ایسے ہیں جو کتاب (یعنی تورات) پڑھتے وقت اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں، تاکہ تم (ان کی مروڑ کر بنائی ہوئی) اس عبارت کو کتاب کا حصہ سمجھو، حالانکہ وہ کتاب کا حصہ نہیں ہوتی۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ (عبارت) اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتی۔ اور (اس طرح) وہ اللہ پر جانتے بوجھتے جھوٹ باندھتے ہیں۔''

یہودیوں کی تورات میں تحریف لسانی:

ان آیات میں پھر ان کی خیانت کا ذکر ہے کہ ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے کہ جو اپنی زبانوں کو ایسے پھیرتے ہیں، تاکہ الفاظ بگڑ جائیں۔ اور پھر لوگوں کو یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یا سنا رہے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ حالانکہ وہ اللہ کی کتاب نہیں ہوتی۔ یہ ایسے ظالم ہیں کہ اپنی زبانوں کو پھیر کر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں حرف ملا دیتے ہیں، تاکہ سننے والا یہ سمجھے کہ یہ بھی تورات ہے۔

اب ایک مولوی صاحب کھڑے ہو کر یہ کہنا شروع کر دیں کہ یہ حدیث شریف میں ہے۔ اب کسی کو کیا پتا کہ کونسی حدیث شریف میں ہے؟ اب عام آدمی کو بس یہ پتا ہے کہ وہ تو حدیث بیان کر رہا تھا، یہ کسی کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ حدیث کونسی ہے؟ صحیح ہے، حسن ہے؟ ضعیف ہے، من گھڑت ہے؟ صحاح ستہ میں کہاں ہے؟ اس حدیث کو کس نے روایت کیا ہے؟ محدثین کے نزدیک اس حدیث کا کیا مرتبہ ہے؟ کوئی پتا نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح کہہ دیتے ہیں کہ بزرگوں نے فرمایا: ہے۔ کوئی پتا نہیں ہے کہ کونسے بزرگوں نے فرمایا: ہے؟ اور بزرگوں نے کس طرح فرمایا ہے؟ اور اسی طرح یہ کہہ دیتے ہیں کہ بعض روایات میں یوں آتا ہے۔ اب پتا نہیں بعض روایات سے کونسی روایات مراد ہیں؟

امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابن معین رحمہ اللہ کی عجیب حکایت:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اپنے ساتھ ایک واقعہ ہوا کہ ہم ایک علاقہ کی ایک مسجد میں گئے۔ مولوی صاحب نے جب تقریر کی تو اس نے ایک لمبی حدیث ہمارے حوالے سے سنائی

کہ یہ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے بیان کی ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھیں کہ ہمیں تو پتا نہیں ہے اور یہ ہماری روایت سے سنا رہا ہے۔

جب اس نے تقریر ختم کی تو ہم نے اس کو کہا: آپ نے جو یہ روایت امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے روایت بیان کی ہے امام احمد بن حنبل یہ ہیں اور یحییٰ بن معین میں ہوں، ہم نے تو کوئی ایسی روایت بیان نہیں کی جو تم نے سنائی ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ اسی طرح ڈھٹائی سے کہنے لگا کہ عجیب بات ہے کہ ساری دنیا میں احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین تم ہو اور کوئی نہیں ہو سکتا؟ میرے تو کئی استاذ اس نام کے ہیں۔ یہ کوئی ضروری ہے کہ میں تمہاری بات کر رہا تھا؟ اب تم مانو کہ تمہارے علاوہ بھی احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین ہیں، پھر انہوں نے ہم سے منوا کر چھوڑا۔

عہد الست اور میثاق انبیاء علیہم السلام کا ذکر:

آپ نے پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو عہد لیے تھے: ایک عہد تمام ارواح سے اپنی ربوبیت کا لیا تھا کہ ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ﴾ [الاعراف: ۱۷۲] تو سب نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ اور دوسرا عہد لیا جس کا ذکر قرآن میں ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ﴾ [آل عمران: ۸۱] کہ اللہ نے تمام انبیاء سے عہد لیا کہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام اور کتابیں ہیں ان کی پیروی کرو گے اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بشارت دو گے اور اپنی اپنی امتوں میں اس کا ذکر کرو گے، ان کی صفات بیان کرو گے، تاکہ میرے مدنی کی شان اور عظمت دلوں میں اتنی راسخ ہو جائے کہ جس امت کو ان کا زمانہ ملے وہ حضور اکرم ﷺ پر ایمان لے آئیں۔ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ ان میں کتنے آدمی عہد میں رہیں گے اور کتنے آدمی عہد میں نہیں رہیں گے۔

اقرار ربوبیت کیوں کرایا؟

اللہ تعالیٰ نے سب سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا، جبکہ اصل مدار الوہیت پر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھیں کہ رب کے بارے میں کسی نے انکار نہیں کیا، مگر کوئی ملحد جس کو کمیونسٹ اور دہریہ کہتے ہیں، ورنہ ہر مذہب کے آدمی نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا ہے، حتیٰ کہ کفار قریش بھی مانتے تھے کہ ہمارا رب وہی اللہ ہے اور کسی نہ کسی شکل میں ہندو بھی اللہ تعالیٰ کو رب مانتا ہے، بدھ مت بھی، یہودی اور عیسائی بھی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے مسئلہ کو، الوہیت کے مسئلہ کو ہمارے اختیار پر چھوڑ دیا؛ کیونکہ اگر زبردستی سب سے عہد لے کر مسلمان کردیں پھر تو جنت جہنم کا فلسفہ ہی ختم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا اور اس سے اپنی ربوبیت کا اظہار کیا، اس کو حواسِ خمسہ دیئے اور اس کے بعد پوری دنیا میں اپنی نشانیاں بچھادیں اور ہمیں اختیار دیا کہ ہم ایمان اختیار کرتے ہیں یا کفر اختیار کرتے۔ ہیں اور اسی پر ہی ہمیں جزاء وسزا ملنی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی الوہیت زبردستی منوالیتے تو انبیاء کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر اس نظام عالم کو چلانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سب سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا۔

میثاقِ انبیاء کا مقصد:

دوسرا ذہنوں کے اندر یہ خلجان ہوتا ہے کہ ہر پیغمبر حضور اکرم ﷺ کے بارے میں کہتے آئے، حالانکہ اللہ تعالیٰ تو جانتے تھے کہ آپ سب سے آخر میں تشریف لائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے حضور اکرم ﷺ کی اظہار عظمت تھی کہ ان کی اتنی بڑی شان ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا نظام اسی کے لیے سجایا گیا ہے کہ ہر آنے والا پیغمبر میرے مدنی ﷺ کے بارے میں خبر دے رہا ہے۔

اسی طرح جب کوئی بڑا خطرہ ہو تو سب ڈراتے ہیں۔ ہر نبی دجال سے ڈراتے آئے، حالانکہ سب نبیوں کو پتا تھا کہ دجال آخری زمانے میں آئے گا اور سب سے زیادہ میرے مدنی محمد مصطفیٰ ﷺ نے ڈرایا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ دجالی فتنہ اتنا بڑا فتنہ ہے کہ ہر پیغمبر علیہ السلام اپنی امت کو ڈرا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں یہودیوں کی ایک اور شرارت اور خباثت کا ذکر کیا ہے کہ یہودیوں میں ایک جماعت ایسی ہے کہ جب وہ کتاب تورات پڑھتے ہیں تو اس میں تحریف کردیتے ہیں آپ تحریف کی ساری اقسام تفصیل کے ساتھ پہلے پڑھ چکے ہیں۔

قرآن کی تحریف سے حفاظت کی ایک مثال:

(مثال) قرآن کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ میں ہے: ﴿فَانْطَلَقَا حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ اسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا﴾ [الکہف: ۷۷] کہ جب وہ دونوں ایک بستی میں پہنچے تو حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اس بستی میں جاکر کھانا لے آئیں، تا کہ ہم کھانا کھائیں۔

اور شریعت کا حکم ہے کہ اگر کسی مسافر کا کسی بستی سے گزر ہو تو وہ کھانا مانگ سکتا ہے اور بستی والوں میں رواج آ گیا کہ جو مسافر گزریں وہ ان کو کھانا دیں یہ سنت ہے۔ یہ تو اب شہروں اور بستیوں میں رواج آ گیا ہے کہ ہوٹل مل جاتے ہیں، پہلے دور کے اندر یہ رواج نہیں تھا۔ اور اسلام نے سکھایا کہ اگر کوئی آدمی آپ کے پاس آئے تو تین دن تک وہ آپ کا مہمان ہے، آپ اس کو کھانا دیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بستی والوں کے پاس گئے اور ان کو بتایا کہ ہم تین آدمی مسافر ہیں اور ہمیں کھانے کی ضرورت ہے، لیکن کسی نے بھی کھانا نہیں دیا۔ اس لیے قرآن میں جمع کا صیغہ ہے، فرمایا: ﴿فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا﴾ کہ ان سب نے انکار کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے اور آپ کی طبیعت میں جلال تھا تو آپ غصے میں تھے کہ یہ کیسے بستی والے لوگ ہیں کہ کسی مسافر کو کھانا بھی نہیں دیتے۔ اسی طرح یہ لمبا قصہ ہے اور آپ اس کو سورت کہف کے آخر سے کچھ پہلے پڑھیں گے۔

بہر حال جب کافی زمانہ گزر گیا تو اس بستی والوں کا وفد حجاج بن یوسف کے پاس آیا اور کہا کہ ہمارے لیے یہ بہت بڑی قیامت تک کے لیے خدا کی لعنت ہے کہ اللہ کے نبی آئے اور ہم نے کھانا نہ دیا۔ آپ مہربانی فرمائیں اور آپ جتنی دولت چاہیں آپ کو دیتے ہیں۔ آپ ﴿فَاَبَوْا﴾ کے نیچے کے نقطے کو ختم کر کے ﴿فَاَتَوْا﴾ بنا دیں۔ ﴿اَبَوْا﴾ کا معنی ہے کہ انہوں نے انکار کیا اور اگر ﴿اَتَوْا﴾ ہو تو معنی ہو گا کہ وہ دعوت کرنے کے لیے دوڑے آئے۔ آپ کہہ لیں کہ نقطہ بدلنے سے کتنا آسمان، زمین کا فرق پڑ جائے گا۔ حجاج بن یوسف نے کہا یہ کیا کہہ رہے ہو ہم اللہ تعالیٰ کا قرآن کیسے بدل سکتے ہیں؟ اور وہ قرآن جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے اور لاکھوں لوگوں کے سینوں میں قرآن پاک حفظ ہے، وہاں نقطہ کون بدلے گا؟ یہ بھی تحریف ہے کہ نیچے نقطہ ہے، اسے بدل کر آپ اوپر لگا دیں تو ترجمہ بدل گیا۔

یہ ایک تحریف کا انداز ہوتا ہے کہ آیت کے اندر کوئی حرف بڑھا دیا۔

ایک فرقہ کی تحریفِ قرآن کی کوشش:

قرآن پاک تو محفوظ ہے، نہ تحریف ہے، نہ تبدیل ہے اور نہ اس میں کوئی مائی کا لعل زیادتی کر سکتا ہے اور نہ اس میں نقصان کر سکتا ہے، لیکن کچھ لوگوں نے اپنی طرف سے بڑا زور لگایا کہ قرآن بھی محرف ہے۔ جیسے روافض نے قرآن میں کئی جگہ جوڑ لگائے۔ مثلاً: ﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ

رِسَالَتَهٗ﴾ [المائدۃ:٦٧] میں یوں تحریف کی کوشش کی اور لفظ بڑھا دیئے کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (فِيْ خِلَافَةِ عَلِيٍّ) وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾ کہ اے میرے نبی! لوگوں کو خلافتِ علی کا مسئلہ پہنچا دیں کہ میرے بعد علی خلیفہ بنے گا۔ اگر تو نے یہ مسئلہ نہ پہنچایا تو تم نے رسالت کا حق ادا نہ کیا۔ اب تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا قرآن صنعا یمن میں موجود ہے جو ان کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے۔ کیونکہ آپ کاتب الوحی تھے، لاکھوں لوگوں نے اس قرآن کی زیارت کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ایک حرف میں بھی فرق نہیں ہے۔

اسی طریقہ سے یہ بھی تحریف ہوتی ہے کہ حرف بڑھایا نہ گھٹایا، لیکن معنی بدل دیا۔ جہاں قرآن میں ﴿عَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾ کا لفظ آیا تو روافض نے کہا: یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔

قرآن میں آتا ہے: ﴿وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ﴾ [الصافات:٨٣] شیعہ کا اصل معنی فرقہ ہوتا ہے جو ایک عقیدہ پر جمع ہو جائیں ان کو عربی میں شیعہ کہتے ہیں۔ تو ان روافض نے یہاں یہ ترجمہ کر دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی شیعہ تھے۔ اب ان کو کون بتلائے کہ شیعہ تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پیدا ہوئے، ان کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تعلق ہے؟

اور ایک تحریف یہ ہوتی ہے کہ لفظ کو ویسے رہنے دیا، لیکن انداز بدل دیا کہ ﴿رَاعِنَا﴾ کو ''رَاعِيْنَا'' (عین کو کھینچ کر) پڑھ دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! ایسا لفظ میرے نبی کو نہ کہا کرو جس سے تم دل میں توہین مراد لیتے ہو، تم ﴿اُنْظُرْنَا﴾ [البقرۃ:١٠٤] کہا کرو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو اپنی زبان پھیرتے ہیں، یعنی حروف بدل دیتے ہیں کتاب سے، تاکہ تو یہ سمجھے کہ یہ بھی اللہ کی کتاب کا حکم ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں وہ بات نہیں ہوتی۔ اور اس کے بعد وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ حرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا، بلکہ خود ملا رہے ہوتے ہیں۔ یہ اتنے ظالم ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں، حالانکہ جانتے ہیں کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔

تاریخ کے اندر جتنے گمراہ فرقے ہیں ان سب کا ایک ہی طریقہ واردات ہے کہ یہ اپنی طرف سے قصے کہانیاں بنائیں گے اور اپنی طرف سے حروف ملائیں گے، احکام بدلیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی

کتاب ہے۔ بعض اس طرح پڑھتے جائیں گے اور درمیان میں ایک لفظ بڑھا دیں گے کہ کسی کو پتا بھی نہیں لگے گا یہ بھی تحریف ہے۔

"لَیّ" کا معنی ہوتا ہے زبان کا پھیرنا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ تحریف کرتے تھے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے کہ تحریف کرتے ہیں اور زیادہ کرتے ہیں۔

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: دنیا کے اندر کسی بندے کو یہ طاقت نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے کسی حرف کو ختم کر سکے۔ اسی لیے وہ لوگ آیات کا مطلب بدل کر پیش کرتے تھے۔

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو تورات وانجیل اتاری تھی اس کے حرف تو بدل نہ سکے، لیکن یہ گمراہ ہو گئے؛ کیونکہ یہ تحریف وتاویل کرتے تھے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے یا خود کتابیں لکھ کر اپنی طرف سے کہتے تھے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتابیں تو محفوظ ہیں، ان کے اندر تو کوئی کمی نہیں آسکتی۔

امام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو فرمایا کہ تورات وانجیل نہیں بدلی، ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تورات وانجیل جو یہود ونصاریٰ کے پاس ہے اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ بدلی جا چکی ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں پر اتاری تھیں وہ اسی طرح محفوظ ہے تو ٹھیک ہے۔ باقی جو ان کے پاس اب تورات وانجیل موجود ہے...... اللہ تعالیٰ آپ کو نہ دکھائیں۔ اگر آپ دیکھیں تو کوئی شریف آدمی اس کے دو صفحے بھی نہیں پڑھ سکتا، جس کے اندر یہ لکھا ہو کہ پیغمبر اپنی بیٹیوں سے زنا کرتے تھے...... انا للہ وانا الیہ راجعون......

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۷۹، ۸۰]

"یہ کسی بشر کا کام نہیں کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کرے اور وہ اس کے باوجود لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ اس کے بجائے (وہ تو یہی کہے گا کہ) اللہ والے بن جاؤ؛ کیونکہ تم جو کتاب پڑھاتے رہے ہو اور جو کچھ پڑھتے رہے ہو، اس کا یہی نتیجہ ہونا چاہیے۔ اور نہ وہ تمہیں یہ حکم دے سکتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا قرار دے دو۔ جب تم مسلمان ہو چکے تو کیا اس کے بعد وہ تمہیں کفر اختیار کرنے کا حکم دے گا؟"

شانِ نزول:

علماء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے پاس نصرانیوں کا وفد آیا تھا جس کے بعض واقعات آپ تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے مناظرہ کیا۔ مناظرہ کے اندر وہ لاجواب ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی ضد باقی رہی کہ میں نہ مانوں۔ اس کا تو کسی کے پاس علاج نہیں ہے۔

عیسائیوں کی بڑی دلیل یہی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں، لہٰذا اللہ کے بیٹے ہیں۔ جب حضور اکرم ﷺ نے قرآن پڑھا کہ اگر باپ نہ ہونے سے بچہ خدا کا بیٹا بن جاتا ہے تو جس نبی کا باپ بھی نہیں، ماں بھی نہیں تو اس کو کیا بناؤ گے؟ بی بی حواء کو بغیر ماں کے پیدا فرمایا، ان کو حکم دیا اور نور سے مخلوق پیدا ہو گئی۔ جب نصرانیوں سے کوئی جواب نہ بنا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم اگر دلائل سے بھی نہیں مانتے ہو تو ہم مباہلہ کرتے ہیں کہ میدان میں اپنے بچوں کو لے کر نکل آتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

جب مباہلہ کا وقت آیا تو انہوں نے کہا: ہم مباہلہ بھی نہیں کرتے اور اس کے بعد انہوں نے صلح کی کوشش کی کہ ہم جزیہ دیں گے۔ جب یہ باتیں سامنے آئیں تو یہودیوں کو بات کرنے کا ایک بہانہ مل گیا کہ آپ کا نبی چاہتا ہے کہ جیسے نصرانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں تم بھی میرے بندے بن جاؤ اور میری پوجا کرو تو ہم کیسے کریں؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد کے لیے یہ آیات اتاریں:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۷۹، ۸۰]

یہ بات کسی ایسے بندے کو زیبا نہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے کتاب بھی دی ہو، دانائی بھی دی ہو اور نبوت بھی دی ہو، پھر وہ لوگوں کو یہ کہے کہ تم مجھے خدا مانو، میرے بندے بن جاؤ۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرتے، وہ تو میری توحید کی دعوت دینے کے لیے آتے ہیں۔ کسی رسول یا پیغمبر نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم میرے بندے بن جاؤ۔ [تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۹۸]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ﴾ [البقرۃ: ۲۱] (اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے)۔ اور ہر پیغمبر نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اللہ کے بندے بنو

اور اللہ تعالیٰ کے غلام بنو۔

عبادت اور اطاعت میں فرق:

عبادت اور اطاعت میں فرق ہے۔عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اطاعت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور اولوالامر کی ہے۔اطاعت کا مطلب ہوتا ہے کہ ان کی بات کو تسلیم کرنا، ان کی فرمانبرداری کرنا۔

شانِ نزول کا مقصد اور فائدہ:

کسی آیت کا شانِ نزول اور سببِ نزول بیان کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بات واضح ہو جائے کہ یہ آیت کیوں اتری تھی؟ کہاں اتری تھی؟ کب اتری تھی؟ اور کن حالات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس کی یہ آیت اتاری؟ اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب واقعات کی ترتیب آتی ہے تو اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ واقعہ پہلے کا ہے اور یہ واقعہ بعد کا ہے۔اسی لیے مفسرین کرام رحمہم اللہ اسبابِ نزول پر زیادہ زور دیتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھ لیں کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ چند واقعات پیش آئے اور قرآن کی کوئی آیت اتری؛ کیونکہ ان سب واقعات کا آپس میں اتصال تھا، اس لیے قرآن پاک کا ایک حکم اترا جو سب کے لیے نافذ ہو گیا۔

تیسری بات یہ یاد رکھیں کہ اگر آیت کسی خاص مقصد میں اتری ہے۔عبرت عموم لفظ سے ہوتی ہے، خصوص سبب سے نہیں ہوتی۔مثلاً: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دعا مانگی تھی کہ یا اللہ! شراب کے مسئلے میں آپ مہربانی فرما کر کوئی حکم فرمائیں تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں آیت نازل فرمادی: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ﴾ [البقرۃ:۲۱۹] جن لوگوں کے دل شراب کو چھوڑنے کی طرف مائل تھے وہ اسی آیت سے بھی چھوڑ گئے کہ جب گناہ فائدے سے بڑا ہے، لہٰذا ایسے فائدے کو آگ لگاؤ۔اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پھر دعا کی کہ اللہ! آپ مہربانی فرمائیں اور اس سے بھی زیادہ کوئی واضح حکم فرمائیں۔ دوسری آیت اللہ تعالیٰ نے نازل فرمادی: ﴿يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ [النساء:۴۳] اے ایمان والو! تم نماز اس حالت میں نہ پڑھا کرو کہ تم نشہ میں ہو؛ کیونکہ اس کو پتا نہیں کہ میں نماز صحیح ادا کر رہا ہوں یا غلط ادا کر رہا ہوں؟ میرے منہ سے کیا نکل رہا ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ میاں! اور حکم نازل فرمائیں؛ کیونکہ اس حکم کی وجہ سے لوگ بچ گئے، لیکن پوری طرح نہیں بچے۔تو اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرمادیا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ﴾ [المائدۃ: ۹۰] شراب، جوا وغیرہ سب پلید چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے حرام کردی ہیں۔

ان آیات کا سببِ نزول حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی دعا بنی، لیکن حکم قیامت تک کے لیے ہے۔

علماء نے فرمایا کہ ('' آلِ عمران ۷۹، ۸۹'' کا سببِ نزول آپ ابھی پڑھ چکے ہیں کہ) یہود و نصاریٰ کے علماء، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔ یہودی کہنے لگے کہ آپ ہمیں اس چیز کی دعوت دے رہے ہیں کہ جیسا عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کی ہے، اسی طرح ہم آپ کی عبادت کریں؟ وہاں ایک عیسائی بیٹھا تھا، اس نے بھی یہی کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے کہ میں تمہیں اللہ کی عبادت کی دعوت دوں نہ کہ اپنی عبادت کی دعوت دوں۔

•عبادت علیحدہ چیز ہے اور اطاعت علیحدہ چیز ہے۔ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوگی اور اطاعت اللہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوگی۔ اسی طرح اطاعتِ والدین ہے، اسی طرح اطاعتِ علماء ہے، اسی طرح اطاعتِ الوالامر ہے اور اسی طرح اطاعتِ حکام وامراء ہے۔ اگر کوئی اللہ اور اللہ کے رسول کے خلاف کوئی حکم دے گا تو اطاعت نہیں ہوگی۔ فرمایا:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ)) [مصنف ابن ابی شیبہ، رقم: ۳۳۷۱۷]

اسی طرح بیوی کے لیے خاوند کا حکم واجب الاطاعت ہے کہ خاوند جو حکم دے اس کی تعمیل کرے، لیکن اگر خاوند اسلام کے خلاف حکم دے، مثلاً: بیوی سے کہے: پردہ نہ کرو، بال کٹوا کر فیشن کر کے بغیر دوپٹے کے میرے ساتھ باہر نکلو، تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ پڑھی لکھی عورت ہے۔ وہاں عورت کے لیے یہ حکم نہیں کہ وہ خاوند کی اطاعت کرے؛ کیونکہ یہ حکم اللہ اور اس کے رسول کے خلاف ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ عورت بغیر پردے کے باہر نہیں نکل سکتی اگر خاوند نہیں مانتا تو نہ مانے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو عورت ایسے مسئلے پر علیحدہ بھی ہو سکتی ہے۔ آج اس کو بڑا آدمی سمجھا جا رہا ہے جو جتنا بڑا بے حیا ہوگا اور جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلے وہ اتنا آگ کے انگاروں پر چل رہا ہے، ہر آدمی اس کے ساتھ مذاق کرے گا، اس کو طعنے دے گا، اس کو دقیانوس کہے گا، اس کو ملا کہے گا اور اس کو اولڈ فیشن کہے گا۔ سب اس کو بری نظر سے دیکھیں گے۔

﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ [آل عمران:۷۹]

اللہ کے رسول ﷺ سب کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ تم رب کی ماننے والے بنو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابورزین وغیرہما نے اس کی تفسیر حکماء، علماء اور حلماء سے فرمائی ہے۔

حضرت حسن نے اس کی تفسیر فقہاء سے فرمائی ہے کہ تم دین کو سمجھنے والے بنو۔

﴿بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ [آل عمران:۷۹]

حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ جو قرآن پڑھے اس پر لازم ہے کہ قرآن کے معنی کو سمجھنے کی کوشش کرے، فقیہ بنے؛ کیونکہ فقہ کے بغیر دین سمجھ نہیں سکتا۔

﴿وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ [آل عمران:۷۹]

اور اس کے الفاظ کو بھی محفوظ رکھو۔

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾ [آل عمران:۸۱،۸۲]

''اور (ان کو وہ وقت یاد دلاؤ) جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ اگر میں تم کو کتاب اور حکمت عطا کروں، پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو اس (کتاب) کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے، تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ اللہ نے (ان پیغمبروں سے) کہا تھا: کیا تم اس بات کا اقرار کرتے ہو اور میری طرف سے دی ہوئی یہ ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ انہوں نے کہا تھا: ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا: تو پھر (ایک دوسرے کے اقرار کے) گواہ بن جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہی میں شامل ہوں۔ اس کے بعد بھی جو لوگ (ہدایت سے) منہ موڑیں گے تو ایسے لوگ نافرمان ہوں گے۔''

میثاق کی تین اقسام:

ان آیات کے اندر میثاق النبیین کا ذکر ہے کہ ہم نے تمام انبیاء سے وعدہ لیا۔ مفسرین کرام نے فرمایا: میثاق

تین ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ کے قرآن میں ہے۔

میثاق کا معنی ہے عہد لینا۔ قرآن مقدس میں آپ نے پڑھا اور سنا ہے: ایک وعدہ ہے، ایک عہد ہے اور ایک میثاق ہے۔

وعدہ ایک جانب سے ہوتا ہے۔ میں نے آپ سے کہا کہ میں کل آپ کو ملوں گا تو یہ میری طرف سے وعدہ ہوا۔

اور عہد دو طرف سے ہوتا ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ اور آپ نے میرے ساتھ معاہدہ کیا۔

میثاق دراصل وہی عہد ہے، لیکن بعض علماء نے تھوڑا سا فرق کیا ہے کہ جیسے لفظ تلاوت اور لفظ قرأت میں ایک فرق ہے۔ لفظ قرأت عام ہے کہ ''قَرَأْتُ الْقُرْآنَ'' میں نے قرآن پڑھا، اور حدیث پڑھی تب بھی آپ ''قَرَأْتُ الْحَدِيْثَ'' کہہ سکتے ہیں اور کوئی عام کتاب پڑھی تب بھی ''قَرَأْتُ'' کہہ سکتے ہیں، لیکن لفظ ''تلاوت'' خاص ہے۔ تلاوت اس بات کو کہا جاتا ہے جس کے پڑھنے سے ثواب مرتب ہوتا ہو۔ اسی طرح لفظ ''معاہدہ'' عام ہے تجارت کا بھی ہو سکتا ہے، کسی لین دین کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے حکم ہے: ﴿اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ [المائدۃ: ۱] جب تم معاہدہ کرو تو اس کو پورا کرو، لیکن لفظ ''میثاق'' خاص ہے۔ یعنی ایسا معاہدہ جو مقدس ہو، جس میں کوئی دینی شان ہو۔

میثاق تین ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عام کا میثاق ہے۔ فرمایا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ﴾ [الاعراف: ۱۷۲] اللہ تعالیٰ نے سب سے عہد لیا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا: آپ ہمارے رب ہیں۔

دوسرا میثاق ہے: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ [آلِ عمران: ۱۸۷] جو اہل کتاب سے لیا گیا ہے کہ جو کتاب تمہارے پاس ہے اس پر عمل بھی کرو اور لوگوں کو کھول کر بھی سناؤ اور اس میں کوئی مسئلہ نہ چھپاؤ اور جو حق بات ہے اس کو پہنچاؤ۔

تیسرا میثاق ہے: جو ابھی ہم نے آیت پڑھی ہے کہ ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ [آلِ عمران: ۱۸۷] اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے میثاق لیا کہ جب میں تمہیں نبی بنا دوں، تمہیں کتاب دے دوں اور تمہیں دانائی کی باتیں سمجھا دوں تو تمہارے بعد جو نبی آئے اس کی تم نے تصدیق کرنی ہے اور اگر تمہارے زمانے میں آجائے تو اس کو رسول اور نبی ماننا ہے اور اس کی مدد بھی کرنی ہے۔

یہ میثاق کب اور کہاں لیے گئے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ میثاق کب لیے گئے؟ کہاں لیے گئے؟ علماء کرام کے اس بارے میں دو قول ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ یہ میثاق عالم ارواح میں لیے گئے تھے؛ کیونکہ مشہور عالم چار ہیں: ایک عالم ارواح ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کی روحیں پیدا کیں۔ روح لطیف اور امرِ ربی ہے، اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارواح کو شناخت دی اور اسی عالم میں اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک عہد لیا؛ کیونکہ اگر سوجھ بوجھ نہ ہو تو عہد لینے کا کیا مطلب ہے؟ اللہ تعالیٰ معاف کرے! اگر ایک آدمی پاگل ہے تو آپ اس سے کوئی لین دین اور کوئی عقد نہیں کریں گے۔ اور اہل کتاب سے جو میثاق لیا گیا تھا کہ جب تمہیں میری کتاب ملے اس کو چھپانا نہیں اور حق بات کو بتانا ہے، وہ بھی عالم ارواح میں وعدہ لیا گیا تھا۔ اور تمام نبیوں سے جو وعدہ لیا گیا کہ ہر بعد میں آنے والے نبی کی اعانت ونصرت کریں، یہ میثاق بھی عالم ارواح میں لیا گیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ میثاق اللہ نے وحی بھیج کر دنیا میں لیے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ دونوں قولوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ عالم ارواح میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ معاہدہ لیا اور پھر اسی معاہدے کو دنیا میں بھی دہرایا گیا، تاکہ یاد رہے۔

حضور ﷺ کے لیے انبیاء سے میثاق:

یہ میثاق کسی ایک نبی کے لیے تھا یا ہر نبی کے لیے تھا؟ اس میں بھی دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ نبوت ایسا رکھا تھا کہ تمام انبیاء آپس میں ملے ہوئے ہیں اور سب کے اصولِ دین ایک ہیں۔ تو ہر نبی سے یہ وعدہ لیا گیا کہ اپنے بعد آنے والے نبی کے بارے میں اپنی امت کو ہدایت کریں کہ اگر وہ نبی آئیں تو ان پر ایمان لائیں اور جو بعد میں نبی آئیں وہ اپنے سے پہلے والے انبیاء کی تصدیق کریں۔ جیسا کہ آیت شریفہ میں آتا ہے اور اس سے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا: ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۖ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا﴾ [الاحزاب:۷] کہ آپ سے بھی، نوح سے بھی، ابراہیم سے بھی، موسیٰ سے بھی اور عیسیٰ ابن مریم علیہم السلام سب سے ہم نے وعدہ لیا تھا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ تمام انبیاء سے جو عہد لیا جا رہا ہے وہ صرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں لیا جا رہا ہے؛ کیونکہ آپ اس آیت میں غور کریں! ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ﴾ [آل عمران:۸۱] اس سے پہلے جتنی آیات ہیں ان سب

میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ذکر چل رہا ہے کہ اللہ کے نبی کا مناظرہ نصرانیوں کے ساتھ ہے۔ اللہ کے نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے نصرانیوں کو دعوتِ مباہلہ دی اور حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ ایسی چیزیں دی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں ملیں: ان میں ایک یہ ہے کہ ((وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً)) مجھ سے پہلے جتنے نبی آئے ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کے لیے نبی بنا کر بھیجا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے انسانوں اور جنوں کے لیے نبی بنایا۔ اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ((وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً)) مجھے اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا ہے۔

علماء فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے آپ اپنی بعثت کے بعد قیامت تک کے لیے نبی ہیں، اسی طرح گویا حضور اکرم ﷺ کی نبوت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سب کے لیے ہے۔ کیونکہ کوئی حکمت تو تھی کہ معراج والی رات اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو میرے مدنی کے پیچھے اقتداء میں کھڑا کر دیا۔

حضرت محمد ﷺ سب کے نبی ہیں:

علماء اس کی مثال دیتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو وہ بھی میری اتباع کرتے، اپنی شریعت پر عمل نہ کرتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں پر بٹھا دیا، زندہ ہیں۔ وہ قیامت سے پہلے اتریں گے اور حضور اکرم ﷺ کی شریعت کے تابع ہوں گے، آپ ﷺ کو مانیں گے، لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام کا آ کر حضور اکرم ﷺ کی شریعت پر عمل کرنا جو بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں یہ اس بات کی دلیل تھی کہ آپ صرف ایک امت کے لیے نبی نہیں ہیں، بلکہ تمام امتوں کے لیے بھی اور تمام نبیوں کے لیے بھی امام و سردار ہیں۔

علماء نے استدلال کیا ہے کہ قیامت والے دن جب میدانِ حشر ہوگا، اوّلین و آخرین جمع ہوں گے اور تمام لوگ میدانِ حشر میں شدت سے جب پریشان ہوں گے تو دوڑ کر حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں آئیں گے کہ مہربانی کریں! آپ سب کے باپ ہیں اور ہم سب آپ کی اولاد ہیں، مہربانی کر کے اللہ تعالیٰ کے آگے ہماری شفاعت کر دیں، ہمارے مقدمے کی سماعت شروع ہو جائے۔ حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے: "نَفْسِيْ نَفْسِيْ" مجھے تو آج اپنا ڈر ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سفارش کرنے جاؤں اور اللہ تعالیٰ فرمادیں کہ میں نے حکم دیا تھا: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الاعراف:19] تو تم نے میرا حکم کیوں نہیں مانا تھا؟ تو میں کیا جواب دوں گا؟

پھر سارے لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس دوڑ کر آئیں گے؛ کیونکہ وہ سب سے پہلے رسول ہیں جن پر شریعت اتری۔ حضرت نوح علیہ السلام بھی کہیں گے: ''نَفْسِيْ نَفْسِيْ'' مجھے تو اپنا ڈر ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کے لیے بخشش مانگی اور میرا رب ناراض ہو گیا تو آج اگر میں سفارش کروں اور اللہ تعالیٰ فرمادیں کہ تم نے اپنے بیٹے کے لیے سفارش کیوں کی تھی؟ تو میرا کیا جواب ہوگا؟ لہٰذا میں تو ڈرتا ہوں۔ اسی طرح جب سب پیغمبر جواب دے دیں گے، حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ وہ بھی جواب دے دیں گے اور فرمائیں گے: مجھے تو ڈر ہے کہ لوگوں نے مجھے خدا کا بیٹا بنالیا، لوگوں نے مجھے خدا بنالیا، میری عبادت کرتے رہے اور اللہ کا حلول میرے اندر بتاتے رہے، میں ڈرتا ہوں۔ تم محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں جاؤ۔ تمام امتیں، سب کے سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں ان سے کہوں گا: ((أَنَا لَهَا، أَنَا لَهَا)) اے آنے والو! مجھے اللہ تعالیٰ نے شفاعت کے لیے چنا ہے، میں تمہاری سفارش کرتا ہوں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو تین دعائیں دی تھیں کہ جو مانگنا ہے مانگ لو اور آپ کی وہ دعائیں ہم ضرور منظور فرمائیں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب نے اپنی اپنی دعائیں پوری کرلیں، لیکن میں نے ایک دعا رکھ لی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کے آگے درخواست کروں گا۔

لہٰذا تمام انبیاء کو نماز پڑھانا اور تمام امتوں کی سفارش کرنا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے نبی تھے۔ اس لیے فرمایا: ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [الاعراف:۱۵۸]۔ اور کہیں فرمایا: ﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝﴾ [الانبیاء:۱۰۷]۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً))، کہیں فرمایا: ((خُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ)) اور کہیں فرمایا: ((أَنَا الْعَاقِبُ الَّذِيْ لَيْسَ بَعْدَهُ نَبِيٌّ))۔

سوال و جواب:

سوال ہوتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے نبی تھے تو اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت بھی نہیں تھی۔ آپ کی شریعت پر تو آپ کی امت عمل کرے گی، جن کو آپ کا زمانہ ملا۔ باقی سب اعتراف نبوت کریں گے کہ ہم سب محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتے ہیں، ورنہ احکام تورات میں علیحدہ تھے، انجیل میں علیحدہ تھے، پہلی کتابوں میں علیحدہ تھے اور قرآن میں احکام علیحدہ ہیں، جن پر پابندی کریں گے، جن کو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ

نصیب کر دیا، ورنہ جو پہلے گزر گئے ان کے لیے آپ ﷺ کی شریعت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ذہنوں کے اندر ایک سوال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو علیم و خبیر ہیں، ان کے آگے تو کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں تو حضور اکرم ﷺ نہیں آئیں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں بھی نہیں آئیں گے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی نہیں آئیں گے، لیکن پھر ان سے وعدہ لینا کہ جب آئیں تو ان پر ایمان لانا ان کی نصرت کرنا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کو تو پتا تھا کہ ان کے زمانے میں نہیں آئیں گے، وہ تو سب سے آخر میں آئیں گے۔

اس کا جواب پہلی والی تقریر کے اندر ہو گیا کہ جب وہ سب کے لیے نبی ہیں، چاہے وہ اس زمانے میں آئیں یا بعد میں آئیں، اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کی نبوت کا وعدہ لیا اور سب نے اس وعدہ پر عمل کیا کہ معراج والی رات سب نے آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور آپ کو اپنا امام بنایا تو وعدہ پورا ہو گیا۔

دوسرا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ جب کسی کی عظمت وشان بیان کرنی ہو، چاہے اس نے آخر میں آنا ہو، لیکن اس کا نام سب سے پہلے ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضور اکرم ﷺ کے آنے سے قبل بڑے بڑے بادشاہوں نے اور بڑے بڑے راہبوں نے اپنے عبادت خانوں کے اندر حضور پاک ﷺ کی تصویریں بنا رکھی تھیں۔

تاریخ کی کتابوں کے اندر ہے تبع بادشاہ نے اپنے دور میں حضور اکرم ﷺ سے دو سو سال قبل ایک خط لکھا جس کو آپ پہلے پڑھ چکے ہیں اور وہ خط کو اپنے خزانے میں محفوظ کر گیا اور وہ خط بعد میں ملا اور اسی خط کا اثر تھا کہ وہ قبائل جو مدینہ میں آباد تھے وہ جلدی مسلمان ہو گئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت ربیع رحمہ اللہ، حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿إِصْرِي﴾ سے مراد عہد ہے۔

حضرت محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿إِصْرِي﴾ کا معنی ہے ثقل، یعنی اس زبردست عہد کا بوجھ۔ اس سے بھی مراد سخت تاکید والا عہد ہے۔

﴿فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ اللہ پاک نے عہد لیا اور اس کے بعد سب سے اقرار لیا اور اقرار کے بعد فرمایا: تمام انبیاء ایک دوسرے کے گواہ بھی بن جاؤ اور تم سب کی گواہی پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں۔ یعنی اتنا پکا عہد لیا گیا۔

(حدیث) حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے چچا کے بیٹے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی اور ہر رسول سے یہ عہد لیا تھا کہ اگر تمہاری زندگی میں میرے محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم آئیں تو اس پر ایمان لاؤ گے اور ان کی نصرت اور مدد بھی کرو گے اور ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ ہر نبی اپنی امت سے بھی یہ عہد لے کہ اگر محمد ان کی زندگی میں مبعوث ہوئے تو وہ ضرور ان پر ایمان بھی لائیں گے اور ان کی مدد بھی کریں گے۔[تفسیر ابن کثیر: ۲/۱۰۰]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سب انبیاء سے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عہد لیا۔

(حدیث) امام احمد رحمہ اللہ نے حدیث نقل فرمائی کہ حضرت عبداللہ بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! میرا ایک یہودی دوست بنو قریظہ کا فرد ہے۔ میں نے اس سے کہا: تورات کے جو جوامع احکام ہیں وہ سارے لکھ کر مجھے دو تو اس نے مجھے لکھ کر دیئے ہیں۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں وہ تورات والے احکام آپ پر پڑھوں؟ حضرت عبداللہ بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا تو میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کہا: اے عمر! کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور کا تغیر نہیں دیکھ رہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: "رَضِينَا بِاللهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا، وَبِمُحَمَّدٍ ﷺ رَسُولًا"[1] ہم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے قائل ہیں، اسلام کے دین ہونے کے قائل ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے قائل ہیں۔ میرا تورات کے بارے میں ذکر کرنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہمیں آپ کی نبوت ورسالت کے بارے میں کوئی کمی نظر آئی ہے، بلکہ میرا مقصد تو فقط یہ تھا کہ تورات میں بھی یہ چیزیں آئی ہیں، ورنہ کوئی شک وشبہ نہیں تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ چلا گیا اور آپ کے چہرہ مبارک پر خوشی کے آثار ظاہر ہو گئے اور آپ نے فرمایا: عمر! سنو! ((وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَوْ أَصْبَحَ فِيكُمْ مُوسٰى، ثُمَّ اتَّبَعْتُمُوهُ، وَتَرَكْتُمُونِي لَضَلَلْتُمْ، إِنَّكُمْ حَظِّي مِنَ الْأُمَمِ، وَأَنَا حَظُّكُمْ مِنَ النَّبِيِّينَ))[2] اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! اگر آج اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کو زندہ کر کے بھیج دیں اور تم موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آؤ اور مجھے چھوڑ دو تو تم گمراہ ہو جاؤ گے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے حصے میں لکھا ہے اور تمہیں میرے حصے میں لکھا ہے۔ اب نجات مجھ پر ایمان لانے میں ہے، میرے دین اور میری شریعت پر نجات ہے تو پھر

[1] [مسند احمد، رقم: ۱۸۳۳۵]
[2] [مسند احمد، رقم: ۱۸۳۳۵]

سابقہ کتابوں کو دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَسْأَلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ عَنْ شَيْءٍ؛ فَإِنَّهُمْ لَنْ يَهْدُوكُمْ، وَقَدْ ضَلُّوا، فَإِنَّكُمْ إِمَّا أَنْ تُصَدِّقُوا بِبَاطِلٍ، أَوْ تُكَذِّبُوا بِحَقٍّ، فَإِنَّهُ لَوْ كَانَ مُوسٰى حَيًّا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ، مَا حَلَّ لَهُ إِلَّا أَنْ يَتَّبِعَنِي)) [مسند احمد، رقم: ۱۴۶۳۱]

یہودیوں اور نصرانیوں کی کتابیں نہ پڑھا کرو اور نہ ان سے کوئی بات پوچھی کرو؛ کیونکہ اگر انہوں نے کوئی جھوٹی بات بتادی اور تم نے مان لی تو تم جھوٹ کے ماننے والے بنے اور اگر انہوں نے کوئی سچی بات کہہ دی اور تم نے نہ مانی تو تم نے سچ کو جھوٹ کر دیا۔ اس لیے ان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، جب تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا قرآن موجود ہے۔ اور فرمایا: خدا کی قسم ہے! اگر آج موسیٰ علیہ السلام بھی آجائیں تو وہ بھی میری اتباع کریں گے، میرا کلمہ پڑھیں گے اور میری شریعت پر عمل کریں گے۔

یہ حدیث بھی اسی کی دلیل ہے کہ تمام انبیاء سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عہد لیا گیا تھا۔

ملت اور دین کی نسبت میں فرق:

ملت کی نسبت نبی کی طرف ہوگی اور دین کی نسبت خدا کی طرف ہوتی ہے۔ ویسے ملت مجموعہ احکامِ شریعت کا نام ہے، یعنی کسی ایک حکم کو ملت نہیں کہہ سکتے اور دین کا اطلاق ایک ایک جزء پر ہوتا ہے اور پورے مجموعے پر بھی ہوتا ہے۔

ان آیات کو بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اے اہل کتاب! تم جانتے ہو کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی ہیں، لیکن اس کے باوجود تم ان پر ایمان نہیں لا رہے ہو تو یہ تمہاری سب سے بڑی محرومی اور بدنصیبی ہے۔

اب اگلی آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب صرف دین اسلام ہے، باقی سب ادیان منسوخ ہو گئے ہیں۔ اب یہودی کو یہودی بن کر نجات نہیں مل سکتی، جب تک کہ وہ دین اسلام قبول نہ کرے، نصرانی کو نصرانی بن کر نجات نہیں مل سکتی، جب تک کہ وہ دین اسلام قبول نہ کرے۔ کیونکہ جب اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور شریعت کو نہیں مانا اس کو نجات نہیں مل سکتی، جب تک کہ وہ دین اسلام قبول نہ کرے۔ جب یہودیوں اور نصرانیوں سے مناظرے کیے گئے تو وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ہماری نجات یہودیت میں ہو جائے گی یا نصرانیت میں ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہاری نجات نہیں ہوگی جب تک میرے محمد مدنی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے غلام نہیں بنو گے۔

﴿أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝ قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝﴾ [آل عمران: ۸۳، ۸۴]

"اب کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کسی اور دین کی تلاش میں ہیں؟ حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جتنی مخلوقات ہیں ان سب نے اللہ ہی کے آگے گردن جھکا رکھی ہے، (کچھ نے) خوشی سے اور (کچھ نے) ناچار ہو کر۔ اور اسی کی طرف وہ سب لوٹ کر جائیں گے۔ کہہ دو: ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو (کتاب) ہم پر اتاری گئی اس پر، اور اس (ہدایت) پر جو ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام اور (ان کی) اولاد پر ان کے پروردگار کی طرف سے اتاری گئی، اور ان باتوں پر جو موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور (دوسرے) پیغمبروں کو عطا کی گئیں۔ ہم ان (پیغمبروں) میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے، اور ہم اسی (ایک اللہ) کے آگے سر جھکائے ہوئے ہیں۔"

تمام انبیاء علیہم السلام کو ماننا اسلام کا جز ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان سے کہو: کیا اللہ تعالیٰ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین چاہتے ہو؟ حالانکہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے سب اس کی اطاعت کرنے والا ہے، خوشی سے یا مجبوری سے، یعنی کوئی اس کے حکم کا انکار نہیں کر سکتا۔ اور اسی کی طرف ہم سب نے لوٹ کر جانا ہے۔ میرے مدنی! آپ ان کو کہہ دیں: اے اہل کتاب! سن لو! ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو اتارا گیا ہم پر اور جو اتارا گیا ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام پر اور جو ان کی اولاد میں نبی تھے اور جو موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے آیات بینات دیں ہم ان پر بھی ایمان لاتے ہیں اور جتنے اللہ کے نبی گزرے ہیں ہم سب پر ایمان لاتے ہیں۔ ہم ان میں تفریق نہیں کرتے کہ موسیٰ علیہ السلام کو مانیں اور عیسیٰ علیہ السلام کو نہ مانیں، بلکہ تمام نبیوں پر، تمام کتابوں پر اور اللہ تعالیٰ کے تمام احکام پر ہمارا ایمان ہے اور اسی کے آگے ہم اپنے آپ کو سونپنے والے اور اسی کی شریعت پر عمل کرنے والے ہیں۔

اللہ کی حاکیت اعلیٰ سب پر ہے:

﴿وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا﴾ [آل عمران: ۸۳]

مومن اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کے آگے جھکتا ہے ظاہر سے بھی اور باطن سے بھی۔ اور کافر چاہے مانے یا نہ مانے، لیکن وہ بھی اللہ تعالیٰ کے آگے جھکنے پر مجبور ہے؛ کیونکہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے تابع ہے اور اسی کے لیے سلطنت عظمیٰ ہے اور اسی کی ذات ہے جس کی کوئی مخالفت نہیں کرسکتا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان آیات کا مقصد یہ ہے کہ دین صرف وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے۔ ویسے قاعدہ ہے اللہ تعالیٰ نے یہ ساری مخلوق پیدا کی ہے تو جب یہ ساری اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے تو حکم بھی اسی کا چلے گا۔ مثلاً: آپ کسی کمپنی میں ملازم ہیں تو آپ پر حکم بھی صرف اسی کا چلے گا، حالانکہ یہ عارضی ملازمت ہے اور اللہ تعالیٰ خالق ہے، مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلے گا۔ اور اس کو اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا پیدا فرمائی اور اس میں اللہ تعالیٰ نے مخلوق جنات اور انسانوں کو بھیجا اور ساتھ فرمادیا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ [الذاریات: ۵۶]

پھر میں نے جنات اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا، مگر یہ کہ میری عبادت کریں۔ تو صاف بات ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے ایک مخلوق کو پیدا کیا ہے تو عبادت کا طریقہ بھی اللہ تعالیٰ ہی بتائیں گے اور اللہ تعالیٰ ہی بتائیں گے کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ اب اس کو بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابیں نازل کیں اور اپنے پیغمبر اور نبی بھیجے کہ جا کر اپنی امتوں کو بتائیں: اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے، یہ عبادت ہے، یہ عقیدہ ہے، یہ اعمال صالحہ ہیں، یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، لہٰذا دین وہی بنے گا جو اللہ تعالیٰ کے نبیوں نے بتایا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی دین نہیں بنا سکتا۔

سب انبیاء کا دین ایک ہے:

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ﴾ [آل عمران: ۸۳]

علماء نے سمجھایا کہ جب دین ایک ہے، اسلام ایک، کوئی فرق نہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر میرے آقا سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کوئی فرق نہیں؛ کیونکہ سب کا عقیدہ اور بنیاد ایک ہے۔ اختلاف حالات کی وجہ سے فروعی

بسائل کے اندر ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جو حالات تھے اللہ تعالیٰ نے شریعت اسی کے مطابق بھیجی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو لوگ تھے جیسے ان کے حالات تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو احکام بھی ویسے ہی عطا فرمائے اور سب سے جامع اور مکمل شریعت اللہ تعالیٰ نے سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی؛ کیونکہ قیامت تک اب کوئی شریعت نہیں، کوئی نبوت نہیں۔ بہرحال! سب شریعتوں کی بنیاد ایک ہی ہے یعنی عقیدہ توحید، تمام رسولوں پر ایمان، مرنے کے بعد اٹھائے جانے پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، آسمانی کتب پر ایمان، جنت پر ایمان اور جہنم پر ایمان۔

سب کے خدا کے تابع ہونے کی مثال:

﴿وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا﴾ [آل عمران: ۸۳]

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہیں کرسکتا، لیکن فرق یہ ہے کہ کسی نے دل سے مانا اور کسی نے مجبوراً مانا۔ مومن پر کوئی بات ہو وہ کہتا ہے الحمد للہ! اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہے اور اگر کوئی دکھ پہنچے تو وہ اپنی طرف نسبت کرتا ہے کہ ہمارے گناہ ہیں جن کی وجہ سے ہم پر یہ مصیبت آئی ہے اور کافر اللہ تعالیٰ کو نہ مانے، نبی کو نہ مانے، لیکن ایک اسٹیج ایسی آئے گی کہ اس کو بھی ماننا پڑے گا، فرعون سے بڑا کوئی کافر اور دہریہ نہیں ہوگا؛ کیونکہ اس نے کہا تھا کہ میں خود خدا ہوں اور کوئی خدا نہیں ہے، لیکن جب اس کو پانی کا ایک غوطہ لگا تو کہا:

﴿آمَنتُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ [یونس: ۹۰]

اس کی ساری خدائی نکل گئی تو نہ ماننے والے کو بھی اللہ تعالیٰ کا اقرار کرنا پڑا۔

حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((﴿وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا﴾ أَمَّا مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ فَالْمَلَائِكَةُ، وَأَمَّا مَنْ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ وُلِدَ عَلَى الْإِسْلَامِ، وَأَمَّا كَرْهًا فَمَنْ أُتِيَ بِهِ مِنْ سَبَايَا الْأُمَمِ فِي السَّلَاسِلِ، وَالْأَغْلَالِ يُقَادُوْنَ إِلَى الْجَنَّةِ وَهُمْ كَارِهُوْنَ)) [معجم کبیر للطبرانی، رقم: ۱۱۴۷۳]

آسمانوں اور زمینوں میں جو کوئی ہے اسی کے تابع ہے۔ آسمانوں میں جو ملائکہ ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے تابع ہیں، زمین میں جو اسلام پر ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے تابع ہیں۔ اور فرمایا: ﴿كَرْهًا﴾ کی مثال ایسے ہے جیسے مسلمانوں کی

جنگ ہو اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح دے دیں اور کافر قید ہو جائیں۔ ان کے پاؤں اور ہاتھوں میں زنجیریں ہوں اور ان کو جکڑ کر لا رہے ہیں۔ اب وہ جکڑ کر لائے جا رہے ہیں، اس کے بعد ان کو اسلام نصیب ہوا تو گویا ان کو زبردستی جنت میں لانے کے لیے زنجیریں ڈالی گئیں۔

اور صحیح بخاری میں ہے: ((عَجِبَ رَبُّنَا عَزَّ وَجَلَّ مِنْ قَوْمٍ يُقَادُوْنَ إِلَى الْجَنَّةِ فِي السَّلَاسِلِ)) [صحیح بخاری، رقم: ۲۶۷۷] تیرے رب کو تعجب ہوتا ہے کہ ایسی قوم ہے جو جنت میں جا رہی ہے، لیکن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ کتنے لوگ تھے جو اسلام کے اور حضور اکرم ﷺ کے دشمن تھے۔ قیدی بنے اور اسلام کے احسانات اور مسلمانوں کا حسن سلوک دیکھ کر بعد میں اسلام لے آئے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت کا مطلب ایسے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر آپ کافروں سے بھی پوچھیں کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ بھی کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے؛ کیونکہ اگر وہ اللہ کو نہ مانیں تو ان سے پوچھا جائے گا کہ پھر تم بتاؤ ان کو کس نے پیدا کیا ہے؟ لہٰذا ان کو بھی کسی نہ کسی صورت میں اللہ تعالیٰ کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔

﴿أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ......﴾

مدارِ نجات اسلام ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی راستہ اختیار کیا جائے وہ ہلاکت کا راستہ ہے، کامیابی کا راستہ نہیں ہے۔

اسی ضمن کے اندر اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو فرمایا: ﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ أُنْزِلَ عَلٰٓى إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ﴾ آپ ان سے کہہ دیں: ہم اپنے اللہ پر ایمان لائے اور جو ہماری طرف اتارا گیا یعنی قرآن اور جو اللہ نے ابراہیم علیہ السلام پر اتارا ہے اور اسماعیل علیہ السلام پر اور اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام پر جو صحیفے اترے۔

﴿الْأَسْبَاطِ﴾ سے مراد شاخیں ہیں کہ بیٹے کی اولاد، پھر بیٹے کے بیٹے کی اولاد، بیٹی کی اولاد جیسے ایک درخت سے شاخیں نکلتی ہیں اسی طرح قبائل اور بطون نکلتے ہیں۔ جیسے قریش سب سے بڑا قبیلہ تھا، لیکن اس کی بھی آگے شاخیں بنیں: بنو ہاشم، بنو امیہ وغیرہ۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے بارہ بھائیوں سے جو اولاد ہوئی وہ بارہ قبیلے بنے۔ ﴿وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ پہلے تخصیص تھی اور اب تعمیم ہے اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء علیہم السلام کے نام لیے: ﴿وَمَآ أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ أُنْزِلَ عَلٰٓى إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَآ أُوْتِيَ مُوْسٰى

﴿وَعِيسٰى﴾ اور اس کے بعد تعمیم ہے ﴿وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ اور تمام نبی جو اللہ نے بھیجے ہیں ان سب پر ایمان ہے۔

رسول اور نبی میں فرق:

لفظِ رسول اور مقامِ رسالت زیادہ بلند ہے؛ کیونکہ رسول صاحب شریعت ہوتا ہے اور نبی کو علیحدہ کوئی شریعت نہیں ملتی، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب شریعت اور صاحب تورات ہیں اور حضرت ہارون علیہ السلام نبی ہیں رسول نہیں ہیں، اس لیے یہاں ﴿وَالنَّبِيُّوْنَ﴾ کا لفظ آیا ہے، رسول کا لفظ نہیں آیا، تاکہ فرق باطلہ میں سے کوئی اعتراض نہ کرے کہ ان کا رسولوں پر ایمان ہے اور نبیوں پر نہیں ہے، لیکن جب ﴿وَالنَّبِيُّوْنَ﴾ کا لفظ آ گیا تو اس کا مطلب ہے کہ جب نبیوں پر ایمان ہے تو رسولوں پر بطریق اولیٰ ایمان ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾

تفریق کا معنی یہ ہے کہ ایک پر ایمان لائیں اور ایک کا انکار کریں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جتنے نبی بھیجے ہیں ان سب پر ہمارا ایمان ہے اور جتنی کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں ان تمام کتابوں پر ہمارا ایمان ہے۔

مفسر ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس امت محمدیہ میں سے جو شخص بھی ایمان والا ہے اس کا ایمان جیسے ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام تک جتنے نبی ہیں ان سب پر ایمان ہے۔ انہی آیات کے اندر اہل کتاب کی تردید بھی ہو گئی؛ کیونکہ وہ تفریق کرتے ہیں۔ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن ہیں اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانتے۔ اور ہمارا سب نبیوں پر ایمان ہے، تمام کتابوں پر ایمان ہے۔ لہٰذا سب سے کامل، جامع ایمان، کامل مکمل دین اسلام ہوا۔ اسلام کے بغیر کسی اور دین میں فلاح ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾ [آل عمران:۸۵]

''جو کوئی شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے گا تو اس سے وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا، اور آخرت میں وہ ان لوگوں میں شامل ہوگا جو سخت نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

مقبول عمل کی شرائط:

جو دین اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو چاہے، یعنی جو آدمی دین اسلام کو چھوڑ کر کسی اور طریقے پر چلے، اللہ تبارک وتعالی اسے ہرگز قبول نہیں فرمائیں گے اور آخرت میں وہ گھاٹے والوں میں سے ہوگا۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ)) [صحیح مسلم، رقم:۱۷۱۸]

اب دنیا میں کوئی شخص جو بھی عمل کرے اگر اس پر اللہ اور اس کے رسول کا حکم نہیں ہے تو وہ عمل مردود ہے اور وہ عمل اللہ تعالی کے ہاں قبول نہیں ہوگا۔

عمل کے قبول ہونے کے لیے کچھ چیزیں ضروری ہیں:

پہلی چیز یہ ہے کہ وہ عمل خالص اللہ تعالی کی رضا کے لیے ہو۔ بہانے نہ ہوں کہ یہ تو اللہ تعالی کے لیے ہے نیاز علی ہے۔

اور دوسری شرط یہ ہے کہ ''أَنْ يَكُونَ صَوَابًا'' وہ عمل حضور اکرم ﷺ کی شریعت کے مطابق ہو۔ اگر عمل خالص اللہ تعالی کے لیے نہ ہو تب بھی مردود ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اس عمل کے بارے میں یا تو قرآن پاک میں کوئی بات موجود ہو یا حدیث پاک میں اس عمل کی اصل موجود ہو۔ اگر ہمیں وہاں نہ ملے تو دیکھیں گے کہ اس عمل پر سب صحابہ نے یا بعض نے عمل کیا یا ان سے اس کا ثبوت ملتا ہے تب بھی اس پر عمل کیا جائے گا، یا صحابہ کرام نے اجماع کرلیا کہ اکثر جماعت صحابہ اس عمل کے کرنے پر متفق ہے اور کسی نے اعتراض نہیں کیا تو وہ عمل اس مرتبہ پر ہو جاتا ہے جو سنت محمد رسول اللہ ﷺ ہے۔ کیونکہ صحابہ ﷺ کی جماعت اتنی عادل، صادق ہے کہ وہ کسی غلط بات پر چپ نہیں رہ سکتی۔ اگر ان میں سے کسی میں وہ علم نہیں پایا جاتا تو وہ عمل بظاہر کتنا خوبصورت نظر آئے، لیکن اس کے اندر قبولیت نہیں ہوتی۔

علماء نے اس کی مثال دی کہ ایک خوبصورت لڑکی ہے، لیکن بدکردار ہے تو اس کے حسن کی کوئی قیمت نہیں ہوتی جب کسی شریف اور عقل والے آدمی کے سامنے کوئی اس کے حسن کی تعریف کرے گا تو وہ کہے گا چھوڑو کیا اس کے حسن کی تعریف کر رہے ہو جب کردار ہی اچھا نہیں ہے۔ اسی طرح اس کے مقابلے پر ایک قبول صورت عورت ہے، لیکن اس کا کردار اچھا ہے تو شریف آدمی کہے گا کہ چلو رنگ اتنا اچھا نہیں ہے، لیکن اس کا کردار ٹھیک ہے۔ یہ عورت ہزار درجہ بہتر ہے۔ میری

امانت میں خیانت نہیں کرے گی۔ علماء نے فرمایا کہ بدعت کے اعمال کو آپ جتنا سنوار دیں، لیکن اس کے اندر سنت کا نور نہیں ہوتا اور جو عمل سنت کے مطابق ہے وہ کتنا سادہ کیوں نہ ہو اس میں سنت رسول کا نور ہوتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ایک وقت آئے گا میری امت میں فساد پھیلے گا ہر آدمی اپنی اپنی خواہشات کے پیچھے چل پڑے گا بدعات کے گھوڑے دوڑائے گا، اس دور میں اگر کسی نے میری ایک سنت کو مضبوطی سے تھام لیا اس کو اللہ تعالیٰ ایک سو شہیدوں کا ثواب دیں گے۔ [معجم الاوسط، رقم: ۵۴۱۴]

مسواک سنت ہے بعض علاقے ایسے ہوں گے کہ لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا ہو اور کسی نے اس سنت کو زندہ کیا تو اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ہم مدینہ منورہ میں تھے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((تَجِيءُ الْأَعْمَالُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَتَجِيءُ الصَّلَاةُ، فَتَقُولُ: يَا رَبِّ! أَنَا الصَّلَاةُ، فَيَقُولُ: إِنَّكِ عَلَى خَيْرٍ، فَتَجِيءُ الصَّدَقَةُ، فَتَقُولُ: يَا رَبِّ! أَنَا الصَّدَقَةُ، فَيَقُولُ: إِنَّكِ عَلَى خَيْرٍ، ثُمَّ يَجِيءُ الصِّيَامُ، فَيَقُولُ: يَا رَبِّ! أَنَا الصِّيَامُ، فَيَقُولُ: إِنَّكَ عَلَى خَيْرٍ، ثُمَّ تَجِيءُ الْأَعْمَالُ عَلَى ذَلِكَ، فَيَقُولُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: إِنَّكَ عَلَى خَيْرٍ، ثُمَّ يَجِيءُ الْإِسْلَامُ، فَيَقُولُ: يَا رَبِّ! أَنْتَ السَّلَامُ، وَأَنَا الْإِسْلَامُ، فَيَقُولُ اللّٰهُ: إِنَّكَ عَلَى خَيْرٍ، بِكَ الْيَوْمَ آخُذُ، وَبِكَ أُعْطِي، قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي كِتَابِهِ: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾)) [مسند احمد، رقم: ۸۷۴۲]

قیامت والے دن اعمال اللہ تعالیٰ کے دربار میں آئیں گے۔...... نماز آئے گی اور کہے گی: میں تیری نماز ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تو تو بہتر ہے۔...... پھر روزہ آئے گا اور کہے گا: میں روزہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تو خیر ہے۔...... صدقہ آئے گا، فرمائیں گے تو بھی خیر ہے۔...... سارے اعمال جب آجائیں گے تو آخر میں اسلام آئے گا، وہ کہے گا: میرے مولا! سلام تیری صفت ہے اور میں تیرا دین اسلام ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: بالکل تو بہتر اور خیر پر ہے۔ اے اسلام! آج ہم تمہارے مطابق فیصلہ کریں گے۔ جس نے تجھے مانا ہے آج ہم ان کو درجات دیں گے اور جس نے تمہارا انکار کیا ہے آج ہم ان کو عذاب میں پکڑیں گے۔

لہٰذا سارا دارومدار اسلام پر ہے۔ جس نے اسلام کو دل سے قبول کیا اور اسلام پر قائم و دائم رہا وہ کامیاب ہو گیا

اور جس نے اسلام کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کر یا وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

قیامت میں انسان کے اعمال کیسے آئیں گے؟

اعمال کیسے آئیں گے؟ علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ان اعمال کو ایک شکل عطا فرمائیں گے، اسی شکل وصورت میں حاضر ہوں گے۔ ایک اور حدیث مبارکہ سے اس مسئلہ کی تائید ہوتی ہے کہ جب مومن بندہ مرتا ہے، پھر قبر میں دفن ہوتا ہے، اس سے سوال وجواب ہوتے ہیں تو اس کے پاس ایک خوبصورت شکل کا آدمی آتا ہے اور اس کو تسلی دیتا ہے تو وہ پوچھتا ہے: تم کون ہو؟ میں تمہیں نہیں جانتا۔ تو وہ کہتا ہے: میں تیری وہی نماز ہوں جو تو دنیا میں پڑھتا تھا...... یہ بحث ہماری تفسیر میں وہاں ہوگی جہاں آتا ہے کہ اعمال کا وزن ہوگا...... تو علماء نے اس کا یہ جواب دیا۔

• اور آج کل تو جدید سائنس نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہم جو درس دیتے ہیں وہ بھی خلا میں محفوظ ہے۔ اس لیے جدید سائنس اس بات میں لگی ہوئی ہے کہ سابقہ دور میں جو لوگ گزرے ہیں ان کی آوازیں تلاش کریں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے مشکل بھی نہیں ہے۔ آج انسان کی بنائی ہوئی کیسٹ اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کے اندر آواز محفوظ ہو سکتی ہے تو اس کے آگے کیا مشکل ہے کہ ہمارے ہر عمل کو محفوظ کر دے۔

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٦﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣفَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٨٩﴾﴾ [آل عمران: ۸۶ تا ۸۹]

"اللہ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت دے جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا؟ حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ یہ رسول سچے ہیں۔ اور ان کے پاس (اس کے) روشن دلائل بھی آچکے تھے۔ اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے۔ اسی (پھٹکار) میں یہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کے لیے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مہلت دی جائے گی۔ البتہ جو لوگ اس سب کے بعد بھی توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔"

لعنت کا استعمال:

لعنت کا معنی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کٹ گئے۔ اس لیے کسی کو لعنت نہ دیا کریں۔ ہمارے ہاں ایک بڑی بری عادت ہے کہ ایک دوسرے کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس پر لعنت ہے، چھوڑو اس کو وہ بڑا لعنتی ہے، بلکہ دیہاتوں کے اندر مائیں اپنے بیٹوں پر ناراض ہوں تو ایک دو لعنتیں بھی نہیں دیتیں، بلکہ کہتی ہیں: ''لکھ (لاکھ) لعنت''۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے ایک کتاب لکھی اس کا جتنے علماء مقابلہ کرتے تھے ان سب کے نام لکھنے کے بعد اس نے لکھا لعنت لعنت لعنت.......... تین صفحات یہی لکھے۔

علامہ خالد محمود صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے جو ڈھیلے عقیدے کے لوگ ہیں وہ درود ہزارہ پڑھتے ہیں، لعنت لعنت قادیانیوں کا درود ہزارہ ہے۔ کیونکہ مرزا قادیانی نے ایک ہزار لعنت لکھی ہے اس لیے وہ قادیانیوں کو فرماتے ہیں کہ تم یہی پڑھا کرو، تمہارا نبی یہی لکھ گیا ہے۔

بہرحال تم لعنت دینے سے بچا کرو۔ یہ بڑی بری چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے لعنت شیطان پر کی ہے۔ فرمایا: ﴿وَّاِنَّ عَلَيۡكَ لَعۡنَتِىۡۤ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ﴾ [ص:۷۸] کہ تم پر قیامت تک لعنت ہے۔ تمہارا کوئی دشمن ہو تو بھی اس کو لعنت نہ دیا کرو؛ کیونکہ یہ بڑا برا اور خطرناک لفظ ہے۔

﴿خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ﴾ [آل عمران:۸۸]

مرتد لوگ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ نہ تو ان کے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ ہاں! اگر کوئی مرتد ہونے کے بعد بھی توبہ کر لے، اللہ تعالیٰ کے دروازے پر آ کر گر جائے اور اپنے اعمال سے بھی اپنی اس توبہ کو ثابت کر دے کہ اب اس کی اصلاح ہو چکی ہے اللہ پاک اس کو بخشنے والے اور مہربان ہیں، اس کی توبہ قبول فرما لیتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سچی توبہ کرے۔

توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ گناہ ہیں تو توبہ کرو۔ عقیدہ کی غلطی ہے تو توبہ کرو اور عقیدہ درست رکھو۔ انسان کبھی گمراہی میں پڑ گیا تو توبہ کرے۔ اور جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں اور اس کے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔ اس لیے شریعت کے اندر حکم ہے کہ اگر کوئی زانی تھا، کوئی شرابی تھا اگر کسی برائی میں مبتلا تھا، اس نے توبہ کر لی تو اس کو طعنہ نہ دو۔ اب اس کو نہ کہو کہ تم ایسے تھے؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ، كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ)) [سنن ابن ماجہ، رقم:۴۲۵۰]

جب گناہ گار نے توبہ کر لی تو اس کا گناہ ختم ہو گیا۔ اب اس کے بعد اگر تم اس کو طعنہ دے رہے ہو تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم شیطان کی مدد کر رہے ہو، کیا تم اس کو دوبارہ گناہ میں ڈالنا چاہتے ہو؟ ورنہ آدمی جب سچے دل سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتے ہیں۔

شانِ نزول:

ایک انصاری اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا...... ایک روایت کے اندر ان کا نام حارث بن سوید ذکر کیا گیا ہے...... اور مشرکوں سے مل گیا۔ پھر بعد میں اس کو ندامت ہوئی کہ میں نے یہ کیا کیا ہے؟ تو وہ اپنی قوم کے پاس آیا ، اور اس نے ان سے کہا کہ آپ مہربانی کریں اور جا کر حضور اکرم ﷺ سے دریافت کریں کہ اب اگر میں توبہ کرنا چاہوں تو میرے لیے توبہ کا راستہ ہے یا نہیں ہے؟ اس کی قوم کے لوگ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے انہوں نے آکر عرض کیا: یا رسول اللہ! ہماری قوم کا فلاں شخص جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا تھا، مشرک بن گیا تھا، اب وہ شرمندہ ہے اور توبہ کرنا چاہتا ہے کیا اس کی توبہ قبول ہوگی؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اس کی توبہ قبول ہوگی۔ تو وہ آدمی دوبارہ اسلام لے آیا اور اس کے بعد اسلام پر قائم رہا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا...... فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾۔

قبولیتِ توبہ کی شرائط:

توبہ کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں: 1...... ندامت ہو، 2...... اس فعل کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے 3...... اور آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا عزم کرے تو توبہ ہوتی ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اگر مرتد بھی سچی توبہ کرے اور اپنے اعمال سے ثابت کرے کہ اس کی توبہ صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتے ہیں۔ کیونکہ توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور اس دن بند ہوگا جب سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا۔

قربِ قیامت مغرب سے طلوعِ آفتاب کی حکمت:

اور اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک اظہار بھی ہوگا؛ کیونکہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے مناظرہ کیا تھا آپ نے نمرود کو چیلنج کیا تھا ﴿فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ﴾

[البقرۃ:۲۵۸] کہ تم کہتے ہو: میں خدا ہوں۔ ہمارا تو وہ خدا ہے جس نے یہ نظام بنایا ہے کہ سورج مشرق سے نکلے گا اور مغرب میں غروب ہوگا تو تم اس کو مغرب سے نکال کر دکھا دو اگر تم بھی خدا ہو۔ نمرود پریشان اور ہکا بکا رہ گیا۔

اس لیے مفسرین نے نکتہ بیان فرمایا ہے کہ قیامت سے پہلے اللہ تعالیٰ ایک دفعہ مغرب سے بھی سورج کو نکال دیں گے، تا کہ دشمن یہ نہ کہہ سکے کہ اگر نمرود نہیں نکال سکا تو تمہارا خدا بھی نہیں نکال سکا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنی کمالِ قدرت کے اظہار کے لیے اس کو مغرب سے بھی نکال دیں گے۔

معجزات اور کرامات کی تصدیق کے سائنسی دلائل:

محدثین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو جتنے معجزات دیئے ہیں قیامت کے آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ اس کی مثال ظاہر بھی کر دیں گے، تا کہ قیامت تک کوئی اعتراض نہ کر سکے کہ یہ کام تو نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً: ہم نے قرآن مقدس میں پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بڑی عظیم بادشاہت عطا فرمائی اور وہ بادشاہت دنیا میں کسی کو نہیں ملی کہ انسان بھی تابع، چرند پرند بھی تابع، حیوان بھی تابع، جنات بھی تابع، ہواؤں کو بھی ان کے لیے مسخر کر دیا۔ ہمارا تو اللہ تعالیٰ کے قرآن اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر ایمان ہے کہ وہ سچ ہے اور اس میں ذرے کے برابر بھی شک نہیں ہے۔ جس کو شک ہے وہ مسلمان بھی نہیں ہے۔ اب کافر کہہ سکتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تخت اڑ جائے، اس پر چار ہزار کرسی رکھی ہوئی ہو، درمیان میں حضرت سلیمان علیہ السلام بیٹھتے ہوں اور پرندے سائے کر کے کھڑے ہوں؟ لہٰذا اب دنیا میں ہوائی جہاز آ گئے۔ ان کے آنے سے پیغمبر کا معجزہ دماغ میں فٹ ہو گیا کہ تم اگر لوہے کی چیز بنا کر اس کو مشینوں اور تیل سے اڑا سکتے ہو تو اللہ تعالیٰ قادر نہیں ہیں؟ تم تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہو۔ اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزے کی ہوائی جہاز سے تصدیق ہو گئی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ڈیڑھ لاکھ کا اجتماع تھا، سارے زمانے کے اندر کوئی ترتیب اور سہولیات نہیں تھیں، جس کا جہاں دل آیا بیٹھ گیا، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کا خطبہ دیا، حج کا خطبہ دیا تو جہاں جہاں تک کوئی خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا معلوم ہوتا تھا کہ سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بول رہے ہیں، حالانکہ آپ ایک جگہ خطاب فرما رہے تھے اور کوئی جدید آلات نہیں تھے۔ ہمارا تو اس پر ایمان ہے، لیکن جو منکر ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اب آپ دیکھ لیں کہ ایسے ذرائع پیدا ہو گئے ہیں کہ لاکھوں میل کا فاصلہ ہے، آوازیں منتقل ہو رہی ہیں۔ اگر انسان

ایک ایسی چیز بنا سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اگر اپنے نبی کی آواز کو پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے؟

صحیح احادیث میں موجود ہے اور جو کرامات عمر میں شمار ہوتی ہے کہ جب آپ نے حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کو آواز دی، حالانکہ وہ نہاوند میں تھے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ میں تھے۔ جب ساریہ آئے، ان سے لوگوں نے پوچھا تو اس نے کہا: ہم شکست کھا رہے تھے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی آواز پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جنگ کا نقشہ اور فوجوں کو لڑتے ہوئے دکھایا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی آواز پہنچائی۔ اب کوئی منکر اس پر اعتراض کر سکتا تھا، لیکن اب لہروں کے ذریعے تمہارے ٹی وی کے اندر تصویریں آ رہی ہیں۔ اگر انسان یہ کر سکتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی کرامت کا اظہار نہیں فرما سکتے؟

آیت کے شانِ نزول میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایک صحابی مرتد ہو گئے تھے اور بعد میں دوبارہ مسلمان ہو گئے تو کیا صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان صحابی کو چھپایا؟ تو جو لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دشمنی میں کہتے ہیں کہ سارے صحابہ...... نعوذ باللہ...... مرتد ہو گئے، صرف چار صحابی باقی بچے تھے۔ اگر خدانہ کرے ایسی بات ہوتی تو صحابہ کیوں چھپاتے؟

کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم مرتد ہو گئے تھے؟

دوسری بات مثال کے طور پر تمہارا استاذ فقہ حنفی کے مطابق سبق پڑھا رہا ہے، ایک استاذ فقہ شافعی کے مطابق سبق پڑھا رہا ہے، ایک استاذ فقہ حنبلی کے مطابق سبق پڑھا رہا ہے اور ایک استاذ فقہ مالکی کے مطابق سبق پڑھا رہا ہے اور بفرضِ محال وہ حنفی جو تھے شافعی بن گئے تو اب وہ امام شافعی رحمہ اللہ کی بات پڑھائیں گے یا امام ابوحنیفہ کی بات پڑھائیں گے؟ جب ایک آدمی ایک طریقے سے نکل گیا تو اس پر قائم نہیں رہتا...... نعوذ باللہ...... اگر میرے مدنی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ایمان سے نکل گئے تو پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی خدمت نہ کرتے، بلکہ نیا دین لاتے۔ اور اگر صحابہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دین اسلام کو بلند کیا اور بائیس لاکھ مربع میل پر اسلام کے جھنڈے گاڑ دیئے تو اسلام سے کیسے نکل گئے؟

ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ جو آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے اتنا پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ آپ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک لشکر کو حکم دیا تھا کہ تم جا کر کافروں سے جہاد کرو۔ ابھی وہ لشکر مدینہ سے چند میل کے فاصلے پر تھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو روک لیا، تا کہ ہم دور نہ

جائیں۔ حضور پاک ﷺ کی وفات ہوگئی تو بڑے بڑے صحابہ حضرت عمر، حضرت علی رضی اللہ عنہ سارے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے کہ آپ نبی کے خلیفہ ہیں اور حضرت اسامہ کا لشکر جا رہا ہے، وہ چند میل پر موجود ہے، مہربانی کر کے لشکر کو روک لیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری فوجیں باہر نکل جائیں اور دشمن مدینہ پر حملہ کر دے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم لوگوں کی رائے میری آنکھوں پر، لیکن میں یہ تو برداشت کر سکتا ہوں کہ مدینہ منورہ میں جنگل کے بھیاڑ آ کر اتنا امن خراب کریں کہ ابوبکر کی ٹانگیں کاٹ کر لے جائیں، لیکن جس لشکر کو حضور اکرم ﷺ نے روانہ فرمایا میں اس کو روک نہیں سکتا۔ مدینہ کی حفاظت اللہ تعالیٰ کریں گے، میں محمد مدنی ﷺ کے حکم کے خلاف حکم نہیں دے سکتا۔

اور یہی وجہ تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تھا کہ میں اپنی ساری جائیداد دین محمد مدنی پر لٹا چکا ہوں، لیکن میں تیرے ابا کے حکم کے خلاف نہیں کر سکتا۔ میں ان کا ورثہ تقسیم نہیں کر سکتا۔ بی بی صاحبہ ناراض ہو کر گھر چلی گئیں تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے دروازے پر تشریف لے گئے۔ ان کو اطلاع دی گئی کہ وہ بات کرنا چاہتے ہیں۔ بی بی نے کہا: میں بات نہیں کرنا چاہتی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر بی بی سے کہا: خلیفہ رسول ہیں، وہ آدمی ہیں جو سب سے پہلے تیرے ابا پر ایمان لا کر اپنا تن من دھن سب قربان کر چکے ہیں اور وہ آپ کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ تمہارے اخلاق کا یہ عالم ہے کہ تم ان سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی!؟ بی بی صاحبہ نے فرمایا: چلو ٹھیک ہے، پردے کا انتظام کرو۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ کیوں ناراض ہوئی ہیں؟ پہلے تو مجھے یہ بتائیں کہ میں آپ کو حضور کا فرمان سناؤں تو کیا آپ اس کو نہیں مانتی ہو؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ کو کچھ مال کی ضرورت ہے یا خرچ کے لیے تکلیف ہے تو میری جائیداد حاضر ہے، لے لیں۔ اس کے بعد حدیث کے الفاظ مبارک ہیں کہ بی بی صاحبہ نے فرمایا: اے ابوبکر! میں حدیث سننے کے بعد کیسے انکار کر سکتی ہوں؟ لیکن مجھے غصہ آ گیا کہ چلو مجھے راضی کرنے کے لیے ہی کہہ دیتے کہ میں دے دوں گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں حضور پاک ﷺ کے حکم کے خلاف کیوں کہہ دیتا؟ تو اس کے بعد بی بی راضی ہوگئیں، مسکرائیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دعائیں دیں۔

اگر صحابہ......نعوذ باللہ...... مرتد ہوگئے تھے تو ان کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ حضور پاک ﷺ کا اسلام پھیلاتے۔ اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کیا پڑی تھی کہ مرتدوں سے جنگ کرنے والے پہلے آدمی تھے۔ اگر......نعوذ

باللہ...... وہ خود مرتد ہو گئے تھے تو مرتدوں سے لڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس لیے یہ دشمنانِ صحابہ کا ایک الزام، جھوٹ اور ایسا بہتان ہے کہ جس کی نہ حقیقت ہے، نہ سر ہے، نہ پیر ہے اور نہ اس کی کوئی دلیل ہے اور نہ عقل مانتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسلام کو چھوڑ دیا ہو اور پھر قرآن و اسلام کو نافذ کیا ہو۔

توبہ سے ارتداد بھی معاف ہو جاتا ہے:

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [آل عمران:٨٦]

جب لوگ اسلام لائیں اور دلائل، آیات، بینات اور معجزات سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اس کے بعد بھی وہ اسلام سے نکل جائیں، اگر وہ نور میں آنے کے بعد پھر اندھیرے میں گر جائیں، توحید کے بعد شرک کا ارتکاب کریں، ایسے لوگ ہدایت کے مستحق نہیں ہوتے۔ ہاں اگر وہ توبہ کر لیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ توبہ قبول کرنے والے ہیں۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کبھی اپنے بندے کو مایوس نہیں فرماتے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ غفور ہیں، اللہ تعالیٰ کی صفت رحیم ہے، وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتے ہیں، بلکہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ میرا اللہ بندے کی توبہ سے خوش ہوتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ میرے ملائکہ آج میرے بندے کو پتا چل گیا ہے کہ میرا بھی رب ہے جو میرے گناہ بخشے گا۔

قاتل کی توبہ کا واقعہ:

گناہ گار توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ کو بڑا پیارا ہے۔ اس لیے دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمیں توبہ کی توفیق دے۔ گناہ کے بعد شیطان ہمارے اندر ایک اور گمراہی ڈالتا ہے کہ اب تو تم گندے ہو گئے ہو، خواہ مخواہ حج پڑھو گے، روزے رکھو گے، کیا فائدہ ہے؟ ساری زندگی تم حرام کھاتے رہے ہو، ساری زندگی زنا کرتے رہے ہو، لواطت کرتے رہے ہو، چوری کرتے رہے ہو اور ڈاکے ڈالتے رہے ہو، زندگی میں تو مزے کرلو۔ یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے۔

ورنہ آپ اندازہ کریں کہ ایک آدمی نے ننانوے قتل کیے اور اس کے بعد اس کے دل میں ندامت آگئی اور وہ پوچھتا پھر رہا ہے: ''هَلْ لِيْ مِنْ تَوْبَةٍ'' میری توبہ منظور ہو جائے گی؟ اس کو ایک جاہل مولوی مل گیا، اس سے پوچھا تو اس نے کہا: تمہاری توبہ کہاں قبول ہوگی؟ تمہاری توبہ قبول نہیں ہوگی۔ اس نے کہا: میری توبہ تو قبول نہیں ہوتی،

پہلے ننانوے قتل ہیں، چلو! سو پورے ہو جائیں۔ اور اس آدمی نے اس مولوی کو بھی قتل کر دیا...... اس لیے یاد رکھیں! مسئلہ آئے تو بتا دو، ورنہ اس کو کہہ دو کہ دوسرے عالم سے جا کر پوچھو۔ اگر تم نے غلط مسئلہ بتایا اور اس نے اس پر عمل کر لیا تو اس کا گناہ تم پر ہوگا...... اس نے پھر کسی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ فلاں بستی میں ایک عالم ہے تم وہاں چلے جاؤ، وہ تمہیں صحیح طور پر بتا دیں گے۔ تو وہ اس کی طرف جا ہی رہا تھا کہ راستے میں موت آ گئی۔

عذاب کے فرشتے بھی آ گئے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے بھی آ گئے۔ رحمت کے فرشتوں نے کہا: توبہ کر رہا تھا۔ دوسرے فرشتوں نے کہا: توبہ تو نہیں کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: میرے ملائکہ! جھگڑا نہ کرو۔ ایک بستی تو وہ ہے جہاں اس نے قتل کیے تھے اور ایک بستی وہ ہے جہاں یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے جا رہا تھا۔ تم پیمائش کرو۔ اگر قتل والی بستی قریب ہو جائے تو اس کو جہنم میں لے جاؤ اور اگر دوسری بستی قریب ہو جائے تو اس کو معاف کرتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب زمین کی پیمائش شروع ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے عالم کی طرف والی زمین کو حکم دیا کہ ذرا قریب ہو جاؤ، ہم اپنے بندے کو معاف کرنے پر تیار ہیں۔ تو زمین ایک بالشت کے برابر قریب ہو گئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس کو بخش دیا ہے، اس کی توبہ ہم نے قبول کر لی ہے۔

اس لیے یاد رکھیں کہ اگر گناہ ہو جائیں تو فوراً اللہ تعالیٰ کے دروازے پر دوڑو۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ میں گناہ گار ہوں، میں گندا ہوں۔ بھائی! کپڑا گندا ہوگا تو دھوبی کے پاس جائے گا۔

لعنت کرنے کا صحیح طریقہ:

﴿أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾

علماء نے فرمایا: کسی کا نام لے کر لعنت نہ کرو۔ وہاں یوں کہہ سکتے ہو کہ ظلم کرنے والوں پر اللہ کی لعنت ہو، کافروں، مشرکوں پر لعنت ہو۔ جو نبی کے صحابہ کے دشمن ہیں، ان کو مرتد سمجھتے ہیں، جو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمتیں لگاتے ہیں، جو اہل بیت رسول کے منکر ہیں ان پر لعنت ہو۔ یعنی مجموعی طور پر لعنت کریں اور کسی کا نام نہ لیں؛ کیونکہ ہمیں کیا پتا یہ لعنت کا مستحق ہے یا نہیں ہے۔

اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے مرتدین پر لعنت فرمائی ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کٹ گئے اور آخرت میں عذابِ جہنم ہوگا۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِم مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ۝﴾ [آل عمران: ۹۰، ۹۱]

''(اس کے برخلاف) جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، پھر کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی۔ ایسے لوگ راستے سے بالکل ہی بھٹک چکے ہیں۔ جن لوگوں نے کفر اپنایا اور کافر ہونے کی حالت ہی میں مرے، ان میں سے کسی سے پوری زمین بھر کر سونا قبول نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ اپنی جان چھڑانے کے لیے اس کی پیشکش ہی کیوں نہ کرے۔ ان کو تو دردناک عذاب ہو کر رہے گا اور ان کو کسی قسم کے مددگار میسر نہیں آئیں گے۔''

قبولیتِ توبہ کا وقت کب تک ہے؟

اللہ تعالیٰ نے بطور تہدید اور بطور وعید شدید یہ ارشاد فرمایا ہے ان لوگوں کے بارے میں جو ایمان لانے کے بعد نعوذ باللہ...... پھر کافر ہو گئے اور کفر میں بڑھتے گئے، یعنی مدت تک کفر پر جمے رہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوگی کہ وہ مرنے کے وقت توبہ کریں یا نزولِ عذاب کے وقت توبہ کریں یہ توبہ قبول نہیں ہوگی۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝﴾ [النساء: ۱۸]

ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جنہوں نے اپنے آپ کو برائیوں میں رکھا۔ سب سے بڑی برائی کفر و شرک ہے، اس کے اندر ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب علاماتِ موت طاری ہو گئیں، اب انہوں نے توبہ کی تو توبہ قبول نہیں ہوگی۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ﴾ ہرگز ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور یہ وہ لوگ ہیں جو گمراہ ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو حق کے راستے سے ہٹ کر گمراہی میں جانے والے ہیں انہوں نے ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا۔

شانِ نزول:

(حدیث) حضرت حافظ ابوبکر البزار رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ایک قوم اسلام لائی اور اس کے بعد مرتد ہوگئی، پھر اسلام لائی اور پھر مرتد بن گئی۔ انہوں نے اپنی قوم کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا کہ کیا ان کی توبہ منظور ہوگی؟ انہوں نے آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی یہ آیت نازل فرمائی ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ﴾ [آل عمران: ۹۰] کہ جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا اور کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی۔ [الدر المنثور: ۲/۸۸]

تعارض اور رفعِ تعارض:

پچھلی آیات کے اندر آپ نے پڑھا کہ ایک انصاری اسلام لانے کے بعد مرتد ہوگیا، اس کے بعد وہ نادم ہوا اور اپنی قوم کے آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر وہ توبہ کرے گا تو اس کی توبہ قبول ہوگی۔ وہاں مرتد کی توبہ منظور ہوگئی اور اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتد کی توبہ قبول نہیں ہوگی تو بظاہر دونوں روایتوں کے اندر تضاد ہے۔

رفعِ تعارض: وہ انصاری صحابی اسلام لانے کے بعد مرتد ہوگیا تھا لیکن پھر نادم ہوا اور صحیح معنی کے اندر توبہ کی تھی اور یہ قوم اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گئے پھر مسلمان ہوئے اور پھر مرتد ہو گئے اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے کھیل بنایا ہوا تھا سچے دل سے توبہ نہیں کر رہے تھے ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا کہ ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی جیسا کہ نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط یہ وہ لوگ ہیں جو بدر میں پکڑے گئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو قتل کردو ان کو پناہ نہیں ملے گی۔

غیر مسلم کی توبہ منظور نہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِم مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ﴾

جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر پر مر گئے، اب اگر وہ قیامت میں روئے زمین کے برابر سونا بھر کر دے دیں

کہ یہ فدیہ لے لو اور عذاب جہنم سے بچا لو تو ان کو چھٹکارا نہیں ملے گا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زمین کے برابر سونا دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اتنی خیرات کرے، اتنے صدقات و نفقات کرے، گویا زمین بھر کر سونا خرچ کیا، لیکن قیامت میں اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ سے عبد اللہ بن جدعان کے متعلق پوچھا گیا جو مر گیا تھا کہ یا رسول اللہ! عبد اللہ بن جدعان بڑا مہمان نواز تھا اور وہ قیدیوں کو اور مصیبت والوں کو چھڑاتا تھا، کوئی قرض دار ہوتا تو اس کا قرض ادا کرتا تھا اور کوئی غریب مسکین آیا، چاہے جان پہچان ہے یا نہیں ہے، سب کو کھانا کھلاتا تھا، اس کے یہ کام قیامت میں نفع دیں گے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کو کوئی نفع نہیں دیں گے؛ کیونکہ اس نے ایک دن بھی یہ نہیں کہا تھا: ''رَبِّ اغْفِرْ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ '' کہ اللہ! قیامت والے دن میرے گناہ معاف فرما۔ [مسلم، رقم: ۲۱۴]

لہٰذا جب اس کا عالم آخرت پر ایمان ہی نہیں تھا تو اس کو آخرت میں نفع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

﴿مِلْءُ الْأَرْضِ﴾ کی بعض علماء نے دوسری تقریر کی ہے کہ علی سبیل الفرض والمثال اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اس کو اتنا سونا دے دیں اور وہ کہے کہ پوری زمین بھر کر سونا لے لو اور مجھ سے عذاب کا چھٹکارا کر دو اس کو چھٹکارا نہیں ملے گا۔ یہ ایک اٹل فیصلہ ہے کہ جو کفر پر مر گیا اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کی سزا جہنم ہے۔ اسی طرح جو آدمی ایمان پر مر گیا، اس کا عقیدہ صحیح تھا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کیا تھا وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔

ایمان لانا جہنم میں جلنے سے زیادہ آسان ہے:

(حدیث) حضرت امام احمد حضرت انس رضی اللہ عنہ کے واسطے سے نقل فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى لِأَهْوَنِ أَهْلِ النَّارِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ: لَوْ أَنَّ لَكَ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ أَكُنْتَ تَفْتَدِي بِهِ؟ فَيَقُولُ: نَعَمْ، فَيَقُولُ: أَرَدْتُ مِنْكَ أَهْوَنَ مِنْ هَذَا، وَأَنْتَ فِي صُلْبِ آدَمَ: أَنْ لَا تُشْرِكَ بِي شَيْئًا، فَأَبَيْتَ إِلَّا أَنْ تُشْرِكَ بِي)) [صحیح بخاری، رقم: ۶۵۵۷] قیامت والے دن ایک آدمی جس کے بارے میں جہنم کا فیصلہ ہو چکا ہوگا اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے بندے! اگر آج تیرے پاس دنیا کی کوئی چیز ہوتی تو تم اس عذاب سے چھٹکارے کے بدلہ میں دینے کے لیے تیار ہو جاتے؟ وہ کہے گا: اللہ میاں! ساری دنیا بھی ہوتی تو میں عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے دے دیتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں نے تم سے بڑی آسان چیز مانگی تھی، تم

نے وہ بھی پوری نہیں کی تو اب تم کیا دو گے؟ وہ کہے گا: کیا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ابھی تم اپنے ماں باپ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں تھے اس وقت میں نے تم سے عہد لیا تھا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ﴾ [الاعراف: ۱۷۲] کہ خبردار! میری الوہیت اور میری ربوبیت کا اقرار کرنا اور میرا شریک نہ کرنا، لیکن تم نے دنیا میں جا کر میرے شریک بنا ڈالے، مجھے چھوڑ کر تم نے غیروں کو خدا مانا، مجھے چھوڑ کر تم نے غیروں کو حاجت روا مانا، تم نے جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا نہیں کیا تو تم دنیا کی کیا چیز دو گے؟

ہر جرم قابل معافی ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی ملک میں بغاوت کرے، فتنہ کرے اور اپنے وقت کے اولوالامر کی اطاعت نہ کرے تو اس کی سزا موت ہے۔ تو جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کرے، اللہ تعالیٰ کا باغی بن جائے، اللہ تعالیٰ کی صفات کو غیروں کے اندر ثابت کرنا شروع کر دے تو اس کے مشرک ہونے میں کیا شک ہے؟

اس حدیث کے راوی بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يُؤْتَى بِالرَّجُلِ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَيَقُولُ لَهُ: يَا ابْنَ آدَمَ! كَيْفَ وَجَدْتَ مَنْزِلَكَ؟ فَيَقُولُ: أَيْ رَبِّ! خَيْرُ مَنْزِلٍ، فَيَقُولُ: سَلْ وَتَمَنَّ، فَيَقُولُ: مَا أَسْأَلُ وَأَتَمَنَّى إِلَّا أَنْ تَرُدَّنِي إِلَى الدُّنْيَا، فَأُقْتَلَ فِي سَبِيلِكَ عَشْرَ مَرَّاتٍ، لِمَا يَرَى مِنْ فَضْلِ الشَّهَادَةِ، وَيُؤْتَى بِالرَّجُلِ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، فَيَقُولُ لَهُ: يَا ابْنَ آدَمَ! كَيْفَ وَجَدْتَ مَنْزِلَكَ؟ فَيَقُولُ: أَيْ رَبِّ! شَرُّ مَنْزِلٍ، فَيَقُولُ لَهُ: أَتَفْتَدِي مِنْهُ بِطِلَاعِ الْأَرْضِ ذَهَبًا؟ فَيَقُولُ: أَيْ رَبِّ! نَعَمْ، فَيَقُولُ: كَذَبْتَ، قَدْ سَأَلْتُكَ أَقَلَّ مِنْ ذَلِكَ وَأَيْسَرَ، فَلَمْ تَفْعَلْ فَيُرَدُّ إِلَى النَّارِ))

[مسند احمد، رقم: ۱۳۱۶۲]

قیامت والے دن اللہ تعالیٰ جنت میں سے ایک بندے کو اپنے دربار میں بلائیں گے اور فرمائیں گے: اے آدم علیہ السلام کے بیٹے! تم نے اپنی جگہ کیسی پائی؟ وہ کہے گا: میرے اللہ! اس سے بہتر تو کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے میرے بندے! سوال کرو اور جو چیز چاہو مانگو۔ تو وہ کہے گا: اے اللہ! مجھے دنیا میں ایک دفعہ پھر بھیجیں۔ میں تیرے راستے میں اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے دس دفعہ شہید ہونا چاہتا ہوں؛ کیونکہ وہ شہیدوں کے مرتبے کو دیکھے گا کہ ان کے بڑے درجات ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: دنیا کا نظام ہی ختم ہو گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک جہنمی کو لانے کا حکم دیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے ابن آدم! تو نے اپنا ٹھکانا کیسا پایا؟ وہ کہے گا: بہت بری جگہ ہے۔ اللہ فرمائیں گے: کیا تو مجھے زمین کے بھراؤ کے برابر سونا فدیہ دے گا؟ تو وہ کہے گا: جی ہاں میرے

رب!۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تو نے جھوٹ کہا ہے۔ میں نے تجھ سے اس سے کم اور آسان بات کا مطالبہ کیا تھا تو نے وہ بھی نہیں کیا۔ پھر اس کو جہنم میں لوٹا دیا جائے گا۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴾ [آل عمران:۹۲]

''تم نیکی کے مقام تک اس وقت تک ہرگز نہیں پہنچو گے جب تک ان چیزوں میں سے (اللہ کے لیے) خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہیں۔ اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔''

عمدہ چیز کے صدقہ کا ثواب بھی اعلیٰ:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اگر تم میرے محبوب بننا چاہتے ہو اور درجات اعلیٰ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی محبوب چیز میرے راستے میں خرچ کرو؛ کیونکہ اصول یہ ہے کہ آدمی محبوب چیز کو وہاں خرچ کرے گا جو اس کو زیادہ محبوب ہوگی۔

(مسئلہ) ایک آدمی کے پاس کوئی ایسی قیمتی چیز نہیں ہے تو جو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے اس کو ثواب ملے گا، اس کا ثواب ضائع نہیں ہوگا؛ کیونکہ وہ ایمان والا ہے، لیکن ایک آدمی کے پاس دولت ہے اور اس کے پاس بڑی محبوب چیزیں ہیں تو وہ جتنی پیاری چیزیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے گا اتنا درجہ بلند ہو جائے گا؛ کیونکہ محبوب چیزوں کا خرچ کرنا صفت ابرار واخیار ہے اور عام چیزیں خرچ کرنا عامۃ المسلمین کی صفت ہے۔ اور ایک آدمی کے پاس اچھا مال بھی ہے اور برا بھی ہے۔ اس نے سارا اللہ کے راستے میں لٹا دیا تو اس کو بھی ثواب ملے گا۔ ہاں ایک آدمی کے پاس اچھی چیزیں بھی ہیں اور ہلکی چیزیں بھی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہلکی چیزیں خرچ کرتا ہے اور دنیا کے راستے میں وہ اچھی چیزیں خرچ کرتا ہے تو یہ قبولیت میں کم ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ﴾ [البقرۃ:۲۶۷] ردی چیزیں میرے لیے رکھتے ہو۔ جیسا کہ حاجی لاکھوں روپے خرچ کر کے آتے ہیں، لیکن منیٰ میں بکری وہ ڈھونڈتے ہیں جس سے نام ہو جائے کہ خون بہہ گیا ہے۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے باغ کا صدقہ:

(حدیث) جب یہ آیت اتری تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ محبوب چیز خرچ کرو اور میری پوری جائیداد میں بئر روحاء سب سے زیادہ مجھے محبوب ہے، اس

کا پانی بہت میٹھا ہے اور اس کا پانی بہت زیادہ ہے، کھجوروں کا بہت بڑا باغ ہے، یہ ساری جائیداد مجھے محبوب ہے، آپ میرے گواہ بن جائیں گے کہ میں نے اللہ کے راستے میں صدقہ کر دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''بخ'' واہ واہ ابوطلحہ!! واقعی تم نے کمال کر دیا ہے۔ واقعی تیری جائیداد محبوب جائیداد ہے، لیکن میرا حکم مانو اور اس کو رشتہ داروں پر تقسیم کردو؛ کیونکہ سب سے زیادہ صدقہ کے مستحق تیرے غریب رشتہ دار ہیں اور اس کے اندر دو ثواب ملتے ہیں: ایک صدقہ کا ثواب ملتا ہے اور صلہ رحمی کا ثواب ملتا ہے۔ تو حضرت طلحہ نے اسے اپنے عزیز و اقارب میں تقسیم کر دیا۔ اور ہر بندے کو پتا ہے کہ میرا کون سا رشتے دار غریب ہے۔ [بخاری، رقم: ۱۳۶۱]

صدقہ کی مختلف صورتیں:

حتیٰ کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم جو ایک لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں دیتے ہو اس پر بھی اللہ تعالیٰ تمہیں صدقہ کا ثواب دیتے ہیں۔

اس لیے حکم ہے: اگر تم خیرات نہیں کر سکتے ہو تو پانی کا گلاس پلا دو۔ اگر تمہارے اندر کوئی طاقت نہیں، نابینا کو راستہ کراس کرا دو، کسی گرنے والے کو اٹھا دو۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ نیکیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تو اپنے بھائی کو خندہ پیشانی سے ملے۔
[ترمذی، رقم: ۱۹۷۰]

صحیحین میں روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: اب میرے پاس کوئی ایسا قیمتی مال نہیں، مگر وہ حصہ جو خیبر میں ملا ہے۔ مجھے کیا حکم ہے کہ میں اپنی وہ محبوب چیز اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اصل کو محفوظ رکھو، لیکن اس کا جو پھل آتا رہے وہ ہر سال خرچ کرتے رہو؛ کیونکہ اس طرح تو تم ایک دفعہ خرچ کر دو گے، لیکن جب وہ اصل محفوظ رہا، اس کی قیمت بڑھتی گئی اور اس کا ہر سال جو ثمر آتا رہا اس کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیتا رہا۔ [ابن ماجہ، رقم: ۲۳۹۷]

برکت کی صورتیں:

یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے مال بڑھتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال صدقہ کرنے سے کبھی کم نہیں ہوتا، بلکہ مال میں برکت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾ [البقرۃ:۲۷۶] کہ اللہ تعالیٰ سود کو برباد کردیتے ہیں اور خیرات کو بڑھا دیتے ہیں۔

برکتیں کبھی ظاہر میں ہمیں نظر آجاتی ہیں اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ ہمیں نظر نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر: اللہ تعالیٰ کے راستے میں سو (۱۰۰) ریال خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں ہزار ریال دے دیا۔ تو ہم بہت خوش ہوجاتے ہیں کہ یہ نظر آگیا، لیکن بعض برکتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں کہ ہم نے خیرات کی اور ہمارے اوپر ایک بیماری آنے والی تھی، اللہ تعالیٰ نے ٹال دی۔ اس برکت کا ہمیں پتا نہیں چلا، لیکن اگر وہ بیماری آجاتی تو ہمارے ہزاروں لاکھوں روپے خرچ ہوجاتے۔ گھر میں کوئی جھگڑا تھا، اللہ تعالیٰ صلح میں بدل دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ رزق میں برکت فرماتے ہیں، کبھی برکت کیفیت میں ہوتی ہے، کبھی برکت کمیت میں ہوتی ہے، کبھی برکت ظاہر میں ہوتی ہے اور کبھی برکت باطن میں ہوتی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ:

حضرت حمزہ بن عبد اللہ بن عمر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب قرآن پاک کی یہ آیت اتری: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ [آلِ عمران:۹۲] کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنی محبوب چیز خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ نے مجھے جتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں میں نے ان کے بارے میں سوچا، پھر خیال آیا کہ میرے پاس جو روم کی باندی ہے وہ مجھے بڑی پیاری ہے تو میں نے اس کو بلایا اور اس کو کہا: جاؤ! میں تمھیں اللہ کے نام پر آزاد کردیا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے: محبوب چیز خرچ کرو تو تم مجھے محبوب ہو، اس لیے میں نے تمھیں آزاد کردیا۔

اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: خیرات کرنے کے بعد دوبارہ اگر لینا جائز ہوتا تو میں اس سے نکاح کرلیتا۔

[مسند البزار، رقم: ۲۹۱۴]

ربط بین الآیات:

دونوں آیات کے درمیان ربط یہ ہے کہ جب قیامت میں وقت پڑے گا تو وہاں بندہ پوری زمین کے برابر سونا دینے کو تیار ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اصل بات یہ ہے کہ میرا بندہ میرے راستے میں محبوب چیزوں کو خرچ کرتا ہے تو پھر میں اس کو اس کے بدلے میں اتنے انعامات دیتا ہوں کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر

امتحان آیا کہ اپنا بیٹا ذبح کریں۔ یہی امتحان تھا کہ سب سے محبوب اولاد ہے، اولاد بندے کی کمزوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیٹے کے لیے روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئیں۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝﴾ [آل عمران: ۹۲]

علماء نے لکھا ہے کہ اس کے اندر اشارہ ہے کہ اے یہودیو! اور اے نصرانیو! تم جو میرے مدنی پاک پر ایمان نہیں لے آتے، تمہیں اپنی حکومت محبوب ہے اور مدینہ کی سرداری محبوب ہے کہ اگر میرے مدنی پر ایمان لاؤ گے تو ساری سرداری ختم ہو جائے گی، پھر بھی تم اس محبوب چیز کو خرچ کر کے اسلام لے آؤ جب تک تم محبوب چیز کو نہیں چھوڑو گے تو میرے محبوب کیسے بنو گے؟ محبوب چیزوں کو دینے کے طریقے ہیں کہ مال دو تو اچھا مال دو۔ اس لیے ہمارے جتنے اکابر گزرے ہیں، ہمارے مشائخ اور ہمارے اساتذہ سارا سال دنبہ پالتے تھے کہ جب قربانی کا وقت آئے گا تو یہی دنبہ ذبح کروں گا کہ اس دنبے کو اپنے ہاتھوں سے کھلایا، اپنے ہاتھوں سے پلایا، اس سے انس ہو گیا اور عین قربانی والے دن اس کو ذبح کیا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اس کے راستے میں محبوب ترین چیز خرچ کی جائے۔

﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾

[آل عمران: ۹۳، ۹۴، ۹۵]

"تورات کے نازل ہونے سے پہلے کھانے کی تمام چیزیں (جو مسلمانوں کے لیے حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لیے (بھی) حلال تھیں، سوائے اس چیز کے جو اسرائیل (حضرت یعقوب علیہ السلام) نے اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔ (اے پیغمبر! یہودیوں سے) کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو تورات لے کر آؤ اور اس کی تلاوت کرو۔ پھر ان باتوں کے (واضح ہونے کے) بعد بھی جو لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھیں تو ایسے لوگ بڑے ظالم ہیں۔ آپ کہیے کہ اللہ نے سچ کہا ہے، لہٰذا تم ابراہیم علیہ السلام کے دین کا اتباع کرو جو پوری طرح سیدھے راستے پر تھے، اور ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اللہ کی خدائی میں کسی کو شریک مانتے ہیں۔"

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ نیکی بھلائی خیر کو کہتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن میمون نے فرمایا: یہاں ''بر'' سے مراد جنت ہے کہ تم جنت کو نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی محبوب ترین چیز اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔

یہودیوں کی طرف سے اسلام پر شبہات اور ان کے جوابات:

کافروں، یہودیوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہیں، حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جن چیزوں کو حرام کیا تھا تم ان کو حلال کر کے کھا رہے ہو۔ انہوں نے تو اونٹ کے گوشت اور اس کے دودھ کو حرام کیا تھا اور تم یہ چیزیں کھاتے بھی اور پھر کہتے ہو کہ ہم دین ابراہیمی پر ہیں؟ ان کے اس شبہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے اذہان میں بلاوجہ تشکیک پیدا کر دیں اور باطل فرقوں کی یہی عادت ہے کہ وہ شبہات پیدا کرتے ہیں۔

(دوسرا شبہ) انہوں نے یہ کہا کہ تم کہتے ہو کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں، حالانکہ ان کا کعبہ تو بیت المقدس تھا اور تم نے اس کو چھوڑ دیا اور کعبہ کی طرف نمازیں پڑھ رہے ہو؟

(جواب) ان شبہات کا جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں ان آیات میں عطا فرمایا: ظالمو! تم کتنا جھوٹ بولتے ہو!! حضرت ابراہیم علیہ السلام تو حضرت یعقوب علیہ السلام سے پہلے تھے جن کا لقب اسرائیل تھا۔ ساری کھانے کے چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں بھی حلال تھیں اور بنی اسرائیل پر بھی حلال تھیں اور حضرت یعقوب علیہ السلام پر بھی حلال تھیں۔ تم جھوٹ بولتے ہو کہ ان پر حرام تھیں۔ فرق اتنا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کی تکلیف ہو گئی (اس سے ٹانگ میں درد ہوتا ہے کہ آدمی کو ہر چیز بھول جاتی ہے۔) تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایک منت مانی کہ یا اللہ! میری یہ تکلیف دور کر دے، میں اپنی محبوب ترین چیز چھوڑ دوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو شفا دی۔ ان کو اونٹ کا گوشت اور اونٹنی کا دودھ محبوب تھا تو انہوں نے وہ گوشت بھی چھوڑ دیا اور دودھ بھی چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تو ان پر حرام نہیں کیا تھا اور نہ ان کی شریعت کے اندر اونٹ کا گوشت اور دودھ حرام تھا، وہ تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے منت مان کر اپنے اوپر حرام کیا تھا۔ اگر تمہارے پاس تورات کے اندر اس کی کوئی دلیل موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرام کیا تھا تو تورات لے آؤ اور ہمیں دکھاؤ، اگر تم اپنے

دعوے کے اندر سچے ہو۔ وہ کہاں سے لے آتے؟ کیونکہ وہ تو جھوٹے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تورات کے اترنے سے پہلے گزر چکے تھے اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے، بلکہ وہ تو امام الموحدین تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنا اونچا درجہ عطا فرمایا کہ ان کی اولاد میں نبوت جاری کر دی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو بتوں کو توڑا تھا اور تم نے کعبہ کو بتوں سے بھر دیا۔ پھر تم نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنا دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا اور پھر بھی تم لوگ دعویٰ کرتے ہو کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر ان کے شبہات کا رد کیا اور مسلمانوں کو اپنے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا اور ساتھ اشارہ بھی کر دیا کہ جب تک تم اپنی محبوب چیز قربان نہیں کرو گے اور میرے مدنی پر ایمان نہیں لاؤ گے اس وقت تک تمہیں بھی چھٹکارا نہیں مل سکتا۔

پہلے شبہ کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے، جس کی تفصیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی درج ذیل روایت میں بیان کی گئی ہے۔

((قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: حَضَرَتْ عِصَابَةٌ مِنَ الْيَهُودِ نَبِيَّ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا، فَقَالُوا: يَا أَبَا الْقَاسِمِ، حَدِّثْنَا عَنْ خِلَالٍ نَسْأَلُكَ عَنْهُنَّ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلا نَبِيٌّ...... بَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَى غَضَبٍ الْآيَةَ،))

[مسند احمد، رقم: ۲۵۱۴]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ ہم آپ سے چند باتیں پوچھتے ہیں، ان کا جواب اللہ کے نبی کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو، لیکن تم بھی میرے ساتھ ایک معاہدہ کرو جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے ایک عہد لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرنی ہے۔ تم جو سوال کرو اور میں اس کا ٹھیک جواب دے دوں تو کیا تم اسلام لے آؤ گے؟ انہوں نے کہا: حضور! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر آپ نے جواب دے دیا تو ہم اسلام لے آئیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا پوچھتے ہو؟ انہوں نے کہا: چار چیزیں ہیں جو ہم آپ سے پوچھنا چاہتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ کون سا طعام اور کھانا ہے جو حضرت اسرائیل علیہ السلام نے اپنی ذات پر خود حرام کیا تھا؟ دوسرا ہمیں یہ بتائیں کہ مرد اور عورت کا پانی کیسا ہوتا ہے؟ اور بچہ کبھی مرد کی شکل کا ہوتا ہے اور کبھی عورت کی شکل کا ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اور یہ بھی بتائیں کہ نبی کی نیند اور عام آدمی کی نیند میں کیا فرق ہے؟ اور یہ بھی بتائیں کہ آپ کے ساتھ اللہ کے ملائکہ میں سے کون سا فرشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحی لے کر آتا ہے؟

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم مجھے عہد دو اگر میں نے تمہیں خبر دے دی تو تم ایمان لاؤ گے، میں تمہیں اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتاری ہے! کیا تم جانتے ہو کہ حضرت یعقوب علیہ السلام جب بیمار ہوئے تو ان کو شدید تکلیف ہوئی اور آپ کی بیماری لمبی ہوگئی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کے آگے منت مانی کہ یا اللہ! مجھے اس بیماری سے شفا دے دے تو مجھے طعام میں جو محبوب چیزیں ہیں میں ان کو چھوڑ دوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بیماری سے شفا دے دی۔ یعقوب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے محبوب طعام اونٹ کا گوشت اور اونٹنی کا دودھ ہے، لہٰذا اے اللہ! میں ان دونوں کو آپ کے نام پر چھوڑتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے ان یہودیوں سے فرمایا: بتاؤ یہ بات ٹھیک ہے؟ انہوں نے کہا: بالکل ٹھیک ہے۔ فرمایا: یہی وہ چیزیں ہیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کی تھیں۔ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! آپ گواہ ہو جائیں کہ میں نے ان کو جواب دے دیا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں اس ذات کی قسم دیتا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتاری! مرد کا پانی سفید اور گاڑھا ہوتا ہے اور عورت کا پانی پیلا اور پتلا ہوتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر مرد کا پانی غالب آگیا تو اس سے اللہ تعالیٰ نے بچہ پیدا کر دیا اور اگر عورت کا پانی غالب آگیا تو اس سے اللہ تعالیٰ نے بچی پیدا کر دی۔ حضور اکرم علیہ السلام نے ان یہودیوں سے فرمایا: بتاؤ یہ جواب ٹھیک ہے؟ انہوں نے کہا: واقعی آپ نے صحیح جواب عطا فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! میرے اس جواب پر گواہ ہو جائیں۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: تمہیں اس ذات پاک کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتاری تھی! کیا تم جانتے ہو کہ نبی امی (محمد ﷺ) کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نیند نرالی بنائی ہے کہ ان کی آنکھیں تو سوتی ہیں، لیکن دل جاگتا ہے (اور غیر نبی کی آنکھیں بھی بند ہوتی ہیں اور دل بھی سوتا ہے)۔ انہوں نے کہا: آپ نے ٹھیک بیان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: میرے اللہ! آپ گواہ ہو جائیں کہ میں نے ان کو یہ جواب بھی دے دیا ہے۔

انہوں نے کہا کہ یہ بتائیں کہ وہ کونسا فرشتہ ہے جو وحی لے کر آتا ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میرے پاس وحی لانے والا فرشتہ جبرائیل علیہ السلام ہے۔ اور کوئی نبی نہیں گزرا جس کے پاس وحی لانے والا فرشتہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نہ ہو۔ انہوں نے کہا: بس یہ جھگڑے کا مقام ہے۔ اب ہم آپ کو نہیں مانتے۔ اگر جبرائیل کے علاوہ

کوئی اور فرشتہ وحی لے کے آتا تو ہم مان لیتے؛ کیونکہ جبرائیل ہمارا دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ جو جبرائیل کا دشمن ہے وہ اللہ کا دشمن ہے؛ کیونکہ وہ قرآن اپنی منشاء سے نہیں لایا، بلکہ میرے حکم سے لایا ہے۔ [ترمذی، رقم: ۳۱۱۶]

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِينَ ۞ فِيهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ إِبْرٰهِيمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۗ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۗ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ ۞﴾ [آل عمران: ۹۶،۹۷]

"حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کے لیے بنایا گیا یقینی طور پر وہ ہے جو مکہ میں واقع ہے (اور) بنانے کے وقت ہی سے برکتوں والا اور دنیا جہان کے لوگوں کے لیے ہدایت کا سامان ہے۔ اس میں روشن نشانیاں ہیں، مقامِ ابراہیم ہے، اور جو اس میں داخل ہوتا ہے امن پا جاتا ہے۔ اور لوگوں میں سے جو لوگ اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں ان پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے، اور اگر کوئی انکار کرے تو اللہ دنیا جہان کے تمام لوگوں سے بے نیاز ہے۔"

یہودیوں کے دوسرے شبہ کا جواب:

ان آیات مبارکہ میں یہودیوں کے دوسرے شبہ کا جواب ہے۔ فرمایا: میرے مدنی پاک! ان ظالموں کو جواب دو کہ تم یہودیوں کی بات غلط ہے کہ قبلہ اوّل مسجد اقصیٰ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے اس کائنات اور پوری زمین میں جو اللہ تعالیٰ کا گھر بنایا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کعبہ ہے۔ جب آسمان وزمین نہیں تھے سب نے پہلے اللہ تعالیٰ نے پانی پیدا فرمایا اور اس کے بعد اپنی قدرت سے اس کو گاڑھا کیا اور زمین بچھائی گئی تو یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جہاں سے زمین کو بچھایا گیا، وہ یہی اللہ تعالیٰ کا کعبہ ہے۔ اور اسی کعبہ کے اوپر بیت المعمور ہے جو ساتویں آسمان پر ہے اور اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کئی مقامات پر ارشاد فرمایا: ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۞﴾ [طٰہٰ: ۵] اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ عرش سے لے کر فرش تک کعبہ مرکزِ تجلیاتِ ربانی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم ان تجلیات کو نہ دیکھ سکیں؛ اس لیے کہ ہمارے پاس اس کو دیکھنے والی

طاقت نہیں ہے۔

اس سرزمین پر پانی کے اوپر ایک بلبلہ کی حیثیت سے یہی اللہ تعالیٰ کا کعبہ تھا۔ اور اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا، ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ اس مقام پر جا کر میرا گھر بنائیں تو حضرت آدم علیہ السلام نے اس کو تعمیر کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ان کی اولاد میں شریعت کا سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام سے چلا ہے، انہوں نے بھی نمازیں اسی کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھیں؛ کیونکہ کوئی پیغمبر ایسا نہیں گزرا جس میں عبودیت ہو، عبادت نہ ہو، بلکہ جب عبد ہے تو عبادت بھی ہوگی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہر زمانہ میں عبادت کی اشکال مختلف تھیں۔ اور جب عبادت ہوگی تو صاف ظاہری بات ہے کہ کوئی مرکز عبادت بھی ہوگا۔ یہی وہ حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے اس کعبہ کو قبلہ بنایا؛ کیونکہ اگر ایک جہت کا تعین نہ ہوتا تو پوری دنیا کے اندر اتحاد، اتفاق اور ذہنی ہم آہنگی کا کوئی سلسلہ نہیں جڑ سکتا تھا۔ اللہ ایک ہے، نبی ایک ہے اور دین ایک ہے تو ان کا مرکزِ عبادت اور مرکزِ توجہات بھی ایک ہونا چاہیے، ورنہ عبادت تو ہم اللہ تعالیٰ کی کرتے ہیں، کسی گھر کی عبادت نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کعبہ کو مرکزِ عبادت بنایا، اس کو شرفِ اوّلیت بھی ملا کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے اسے بنایا۔ چالیس سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ اب مسجد اقصیٰ کو بنائیں تو وہ بھی حضرت آدم علیہ السلام نے بنائی۔

آج لوگوں کے اندر مشہور ہے کہ قبلہ اوّل مسجد اقصیٰ ہے۔ وہ اس اعتبار سے ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے نمازیں مسجد اقصیٰ کی طرف پڑھیں، پھر اس کعبہ کی طرف آئے تو لوگوں نے اس وجہ سے مسجد اقصیٰ کو قبلہ اوّل کہنا شروع کر دیا، ورنہ حقیقت میں تو قبلہ اوّل بھی کعبہ ہے۔

جب حضرت آدم علیہ السلام نے کعبہ بنالیا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اب اس کا طواف بھی کرو؛ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جو آدمی کسی سے محبت کرتا ہے تو وہ اپنے محبوب کے گھر کے چکر لگاتا ہے۔ لوگ گندی عورتوں کے پیچھے بھاگتے ہیں تو سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں۔ کسی لڑکے سے عشق کرتے ہیں تو ہر وقت بہانے بنا کر کبھی ادھر سے گزر رہے ہیں، تاکہ دیکھ تو لوں۔ جب لیلیٰ کی گلی کا کتا آتا تو مجنوں اس کو بھی چومنا شروع کر دیتا تھا کہ اس کی گلی سے تو آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس گھر کے اندر مقیم نہیں ہیں۔ بہرحال جب حضرت آدم علیہ السلام نے طواف کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جبرائیل! آدم سے کہہ دیں کہ سب سے پہلا گھر میرا ہے اور بندوں میں سے تو سب سے پہلا بندہ ہے جو اس گھر کا طواف کر رہا ہے۔

تو ان آیات کے اندر یہود کا رد ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ ہم ملت ابراہیمی پر نہیں ہیں۔ تم دیکھو کہ طوفانِ نوح کے بعد اس کعبہ کو کس نے بنایا تھا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا، لہٰذا ملت ابراہیمی پر تو ہم ہیں۔ اور یہی سب سے پہلے انبیاء کا قبلہ تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ کا حکم دیا اور پھر میرے مدنی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تمنا پر اللہ تعالیٰ نے پھر قبلہ اوّل کا حکم دیا۔ اس کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی؛ کیونکہ اگر قبلہ ہمیشہ یہی کعبہ رہتا یا ہمیشہ مسجد اقصیٰ کو قبلہ بنایا جاتا تو آج کوئی نہ کوئی پتھروں کا پجاری یہ کہہ سکتا کہ مسلمان بھی تو پتھر کی پوجا کرتا ہے۔ اگر ہم پتھروں کے سامنے جھکتے ہیں تو مسلمان بھی تو پتھروں کے سامنے جھکتا ہے۔ اگر ہم دیوی دیوتا کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں تو مسلمان بھی تو ایک پتھر کے سامنے جھک رہا ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے کبھی کعبہ کو قبلہ بنایا اور کبھی مسجد اقصیٰ کو قبلہ بنایا، پھر اس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنایا، تاکہ واضح ہو جائے کہ میرے ماننے والے کسی پتھر کو سجدہ نہیں کرتے، بلکہ وہ تو میرے حکم کے پابند ہیں۔ فرمایا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ:۱۴۹] اس لیے دیکھیں کہ اوپر کی منزل میں چلے جائیں تو کعبہ نیچے ہوگا، پھر بھی ہم نماز پڑھتے ہیں۔ اگر ہم پتھر کو سجدہ کرنے والے ہوتے تو کبھی اوپر نہ جاتے۔ کیا تم ہندو لوگ کبھی بھگوان کے اوپر جاتے ہو؟ ہم تو اس حکم کی تعمیل کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اس عمل کی تعمیل کر رہے ہیں جو میرے مدنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل ہے۔

مکہ کا نام بکہ بھی ہے:

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ﴾ [آل عمران:۹۶]

اس کا نام مکہ بھی ہے اور بکہ بھی ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس شہر کا نام بکہ اس لیے رکھا ہے کہ بڑے بڑے جبار کی گردنیں یہاں آکر ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ بکہ بکاء سے ہے۔ میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور جب سر مبارک ہٹایا تو آنسو بہہ رہے تھے۔ پیچھے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کھڑے تھے، آپ نے فرمایا: عمر! یہی وہ جگہ ہے جہاں آنسو بہائے جاتے ہیں۔

بیت اللہ شریف میں برکتیں:

﴿مُبَارَكًا﴾

بیت اللہ شریف کی پہلی صفت بیان فرمائی گئی کہ وہ برکت والا ہے، یعنی ظاہری برکتیں بھی ہیں اور باطنی برکتیں

بھی ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ ساری دنیا میں جو ثمرات و فواکہات نہیں ملتے، وہ مکہ میں مل رہے ہیں۔ دنیا کے اندر دریاؤں کے کنارے بڑے بڑے شہر ہیں۔ اگر وہاں کوئی بڑا فنکشن ہو جائے کہ جس میں پچاس ساٹھ لاکھ آدمی آجائے تو کنویں کے پانی گدلے ہو جاتے ہیں اور بعض کنوؤں میں پانی نہیں ملتا، حالانکہ دریاؤں کے کنارے وہ شہر کھڑے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ گھر ایسی جگہ میں ہے جس کے چاروں طرف خشک پہاڑ ہیں، کوئی دریا اور نہر ساتھ نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں ایسا چشمہ جاری کر دیا ہے کہ تیس لاکھ آدمی حج پر آکر پانی پیتا ہے، بھرتا ہے، نہاتا ہے، لیکن ......الحمد للہ...... کوئی کمی نہیں ہے۔ اور یہاں معنوی بھی برکتیں ہیں کہ ساری زندگی نماز پڑھیں ایک نماز کا ثواب پچیس گنا مل جائے گا، ستائیس گنا مل جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کے حرم کے اندر ایک نماز پڑھیں تو ایک لاکھ گنا ثواب ملے گا اور اگر جماعت کے ساتھ پڑھیں تو ستائیس لاکھ تک ثواب پہنچ جائے گا۔

کعبہ ہدایت کا مرکز ہے:

﴿وَهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [آل عمران:۹۶]

کعبۃ اللہ کی دوسری صفت بیان فرمائی کہ یہ تمام جہان والوں کے لیے ہدایت ہے۔ اسی سے نورِ ایمان چمکا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے میرے مدنی محمد مصطفیٰ ﷺ کو پیدا کیا ہے۔ اس کی تعمیر میں حضرت آدم، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام نے حصہ لیا ہے۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی وحی کا نور اترا ہے۔

﴿فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ﴾ [آل عمران:۹۷]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس گھر کے اندر ہم نے کئی کھلی نشانیاں رکھی ہیں۔ ان نشانیوں میں سے اللہ تعالیٰ نے یہاں صرف دو کا ذکر فرمایا ہے، لیکن علماء نے فرمایا کہ جمع کے صیغہ سے اشارہ کر دیا کہ اب اگر ہر آدمی محنت کرے اور قرآن و حدیث کا مطالعہ کرے اور اللہ تعالیٰ کے کعبہ کے ثمرات و برکات پر نظر ڈالے تو اس کی نشانیاں ہی نشانیاں نظر آئیں گی۔ مثلاً: شق القمر کا معجزہ اسی مکہ میں پیش آیا اور آج تک دنیا کوئی ایسا پہاڑ پیش نہیں کر سکتی جہاں اللہ تعالیٰ کا فرشتہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اترے اور نورِ ایمان اور نورِ توحید لے کر آئے اور پھر وہ نور عالم میں پھیلا۔

اور چونکہ یہود کا رد مقصود تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ظالمو! دنیا کی ساری نشانیاں مٹ جاتی ہیں، لیکن ہم نے مقامِ ابراہیم ایسی نشانی رکھی ہے کہ ہزاروں سال گزر گئے، لیکن ابراہیم علیہ السلام کی نشانی زندہ ہے۔ اور اس پر تمام

روایات کا اتفاق ہے کہ مقامِ ابراہیم یہی وہ پتھر ہے کہ جس پر کھڑے ہو کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کعبہ بنایا۔ باقی اس کے اندر جو آپ کو نشان نظر آتے ہیں یہ صحیح نشان نہیں رہے؛ کیونکہ ابتداء کے اندر تو یہ بڑے واضح نشان تھے، لیکن لوگوں کے اس کو ہاتھ لگانے کی وجہ سے اس کی اصل کیفیت باقی نہیں رہی، لیکن اس کا تھوڑا اثر نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ مقامِ ابراہیم بھی تو اسی بنا کی نشانی ہے۔

﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ﴾ [آل عمران:۹۷]

جو بھی اس کعبہ میں داخل ہوگا وہ امن میں ہوگا۔ دنیا میں بھی وہ ظاہری طور پر قتل سے اور عذاب سے امن میں آگیا اور آخرت کے اعتبار سے اس میں داخل ہونے والا جہنم کے عذاب سے امن میں آگیا۔ اور یہ شرف بھی اللہ تعالیٰ کے حرم کو ملا ہے، دنیا کے اور کسی کونے کو نہیں ملا ہے کہ جس کا احترام مسلمان تو مسلمان، بلکہ ابو جہل بھی کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حرم میں کوئی کسی کو قتل نہ کرے، حالانکہ وہ کافر اور مشرک تھا۔

روایت میں آتا ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ کے صحابی حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو کفارِ قریش پھانسی دینے لگے تو ان کو تنعیم لے گئے جو حدِ حرم سے باہر ہے۔ اور آج افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نبی کا کلمہ پڑھنے والے اور اسلام کا دعویٰ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے حرم میں قتل کرنے سے بھی حیا نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ تو وہ جگہ تھی جہاں چیونٹی کو بھی مارنے کی اجازت نہیں تھی اور یہ وہ جگہ ہے جہاں حکم ہے کہ اگر تم تھکے ماندے جا رہے ہو، گرمی ہے، آگے ایک درخت ہے اور اس کے نیچے ایک جانور بیٹھا ہے تو اس کو بھی نہ چھیڑو۔

حرمِ مکہ امن کی جگہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ﴾ [العنکبوت:۶۷]

میرے مدنی! مکہ کے قریش کو بتائیں کہ کیا ہم نے تمہیں ایسا ٹکڑا نہیں دیا کہ جہاں امن ہی امن ہے اور اس کے باہر لوگوں کو اچک لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کے کعبہ میں باپ کا قاتل بھی سامنے کھڑا ہے تو اس پر بھی کوئی ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ یاد رکھیں! اگر آدمی انفرادی گناہ کرے تو اس کے ذمہ ہے کہ وہ توبہ کرے، لیکن جب اجتماعی طور پر گناہ ہونے لگیں تو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ سب مل کر توبہ کریں، پھر انفرادی توبہ سے کام نہیں بنتا، بلکہ تب

عذاب اس وقت ٹلتے ہیں جب ہر آدمی اپنے اپنے گھر اور اپنی اپنی جگہ میں اللہ تعالیٰ کے آگے دو رکعت نماز پڑھ کر گر جائے کہ اللہ ہماری گناہوں سے توبہ ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں فرماتے تھے: ((اَللّٰھُمَّ! اِنَّهٗ لَمْ یَنْزِلْ بَلَاءٌ اِلَّا بِذَنْبٍ وَلَمْ یُرْفَعْ اِلَّا بِتَوْبَةٍ.)) [تفسیر المنار] کہ کوئی مصیبت تم پر نہیں آتی، مگر تمہارا گناہ اس کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور وہ بلا نہیں ٹلتی جب تک کہ تم اللہ تعالیٰ کے دروازے پر توبہ نہیں کرو گے۔

حج کس پر فرض ہے؟

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ [آل عمران: ۹۷]

اے میرے مدنی! ان ظالموں سے کہو: بیت المقدس کا تو حج نہیں ہوتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے حج فرض کیا ہے تو اسی کعبہ کا کیا ہے، جس کی طرف رخ کر کے میں نماز پڑھ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ طاقت رکھتے ہیں ان پر حج ہے۔ طاقت سے مراد ہے کہ مسلمان بھی ہو، عاقل بھی ہو، بالغ بھی ہو، مکہ تک آنے جانے کا خرچہ بھی ہو، امن بھی ہو، جان کو کوئی خطرہ نہ ہو، اگر عورت ہے تو اس کے ساتھ محرم بھی ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ نے زندگی میں ایک مرتبہ حج فرض کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کعبہ کے حج کو اتنی عظمت بخشی ہے فرمایا ہے کہ اگر تم طاقت کے باوجود پوری زندگی میں ایک دفعہ بھی نہ آؤ تو اللہ تعالیٰ بے پرواہ ہے، اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی حدیث مبارک ہے کہ جو دولت والے سرمایہ دار حج نہیں کرتے وہ یہودی ہو کر مریں یا نصرانی ہو کر مر جائیں اللہ تعالیٰ کو کیا پرواہ ہے۔ اتنی وعید شدید ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۸۴ بحوالہ ابن مردویہ]

مکہ کے نام:

مکہ کا ایک نام پڑھا کہ بکہ بھی ہے، اسی طرح "ام القریٰ، البیت العتیق، البیت الحرام، البلد الامین، المامون، ام رحم، عرش، القادس، المقدسة، الناسة، الحاطمة، کوثیٰ، البلدة، البینة، الکعبة" بھی اس کے نام ہیں۔ کیونکہ کثرت اسامی مشرف پر دلالت کرتی ہے۔ اور کبھی ہیبت پر بھی دلالت کرتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء احادیث مبارکہ میں ثابت ہیں اور جیسا کہ اسد (شیر) کے لغت کے اندر کئی نام ہیں، بعض علماء نے اس پر رسالے لکھے ہیں، اسی طرح قیامت کے کئی نام ہیں اور جہنم کے بھی کئی نام آئے ہیں۔

مکہ کا نام بکہ اس لیے بھی رکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے جبار، بڑے بڑے ظالم بھی یہاں آ کر جھکتے ہیں۔ اور

بعض علماء نے فرمایا: بکہ بکاء سے ہے، یعنی بہت سارے لوگوں کا آنا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے رونا۔ اور بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ازدحام بھی ہے کہ لوگ اس پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اور بعض علماء نے کہا کہ بکہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں مرد اور عورتوں کا ایسا ازدحام ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں کہ عورتیں نماز کے اندر مردوں کے آگے کھڑی ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مکہ مقام فج سے تنعیم تک ہے اور اللہ تعالیٰ کے کعبہ سے بطحاء تک جگہ کا نام بکہ ہے۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ بکہ کا اطلاق صرف اللہ تعالیٰ کے گھر اور مسجد پر ہے۔ حضرت میمون بن مہران کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کعبہ میں جو جگہ ہے وہ بکہ ہے اور باقی جگہ مکہ ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۳/۱۱۵، ۱۱۶]

مقامِ ابراہیم:

مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام خانہ کعبہ کی تعمیر فرما رہے تھے، جب دیواریں ہاتھ سے اونچی ہو گئیں تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ میں اوپر اونچائی پر کیسے پہنچوں؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ آپ اس پتھر پر کھڑے ہو جائیں۔ آپ اس پتھر پر کھڑے ہوئے اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام آپ کو پتھر اٹھا کر دیتے تھے اور پتھر اونچا ہو جاتا تھا اور آپ پتھر لگاتے تھے۔ یہی وہ پتھر ہے جو آج تک محفوظ ہے، جو اللہ پاک کے حرم کی نشانیوں میں سے کھلی ہوئی نشانی ہے کہ چار ہزار سال گزر گئے، لیکن آج بھی وہ پتھر موجود ہے۔ یہ پتھر پہلے بالکل کعبے کی دیوار کے قریب تھا؛ کیونکہ اصول بھی یہی ہے کہ پتھر دیوار کے قریب ہوگا تو پتھر لگائیں گے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ﴾ [البقرۃ:۱۲۵] طواف کی دو رکعتیں مقام ابراہیم کے پیچھے پڑھی جائیں تو اب لوگ جب اس جگہ نماز شروع کر دیتے تو طواف والوں کے لیے مسئلہ بن جاتا تھا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس کو اسی مقام پر جہاں اب ہے اس جگہ اس کو رکھنے کا حکم دیا تھا، تاکہ طواف والوں کے لیے جگہ خالی ہو جائے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۲/۷۹]

تاریخ کے اندر ایک قول یہ بھی ہے کہ سیلاب آیا اور یہ پتھر اپنی جگہ سے دور ہو گیا تو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اب اس کو دیوار کعبہ کے ساتھ نہ رکھو، بلکہ اس کو ایسے مقام پر رکھا جائے کہ لوگوں کو طواف کے اندر تکلیف نہ ہو۔ پھر یہاں پرانے دور میں ایک کمرہ اور مصلی اور نماز کی جگہ بنی ہوئی تھی، اس سے بھی طواف کے اندر بڑا مسئلہ پیدا

ہو جاتا تھا کہ ساری مخلوق وہاں آ کر ٹکراتی تھی تو موجودہ حکومت نے اس کا حل یہ کیا کہ اس پتھر کو اس جگہ رہنے دیا جہاں اس کو خلفائے راشدین نے رکھا ہے اور باہر جو بلا وجہ کمرہ بنا ہوا ہے اس کو توڑ دیا اور اس کے اوپر بلور لگا دیا؛ کیونکہ لوگوں نے بدعات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس کو چومتے تھے، ہاتھ لگاتے تھے اور سجدے کرتے تھے، اس طرح کی بدعات کرتے تھے تو اس کے اوپر حکومت نے بلور لگوا دیا، تاکہ نظر بھی آئے اور کوئی اس کو چھو بھی نہ سکے اور یہ کم سے کم جگہ گھیرے اور طائفین کو تکلیف نہ ہو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں سب سے زیادہ حق طواف کرنے والوں کا ہے۔ ساری دنیا کی عبادتیں ہر جگہ ہو سکتی ہیں، لیکن طواف اللہ تعالیٰ کے کعبے کے علاوہ کہیں نہیں ہو سکتا۔

مفسرین کا ایک قول یہ ہے کہ مقامِ ابراہیم کا اطلاق صرف اس ایک پتھر پر نہیں، بلکہ سارے حرم پر مقامِ ابراہیم کا اطلاق ہے۔ بعض نے فرمایا: حطیم ہی مقامِ ابراہیم ہے۔ اور بعض نے فرمایا: حج کے تمام مناسک پر مقامِ ابراہیم کا اطلاق ہوتا ہے۔

مجرم کے لیے حرم میں بھی امن ہے:

﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے حرم کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ میں نے حرم کو امن والا بنایا۔ جب کوئی ڈرا ہوا آدمی اس میں داخل ہو جائے وہ ہر قسم کے خوف سے امن میں آجاتا ہے۔ جاہلیت کے زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ کا حرم امن کی علامت تھی۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی انسان نے کوئی قتل کیا ہوا ہوتا ہے اور وہ اپنے گلے میں کوئی کپڑا ڈال کر حرم میں داخل ہو جاتا اور اس کو مقتول کا بیٹا دیکھ لیتا کہ میرے باپ کا قاتل ہے، لیکن جب تک وہ حرم میں ہوتا وہ اس کو کچھ نہ کہتا تھا۔

مجرم کو حرم سے پکڑنے کا طریقہ:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ((مَنْ عَاذَ بِالْبَيْتِ أَعَاذَهُ الْبَيْتُ، وَلٰكِنْ لَا يُؤْوَى وَلَا يُطْعَمُ وَلَا يُسْقَى، فَإِذَا خَرَجَ أُخِذَ بِذَنْبِهٖ)) [تفسیر ابن کثیر: ۳/۱۱۷] اگر کوئی آدمی بھاگ کر آئے اور اللہ تعالیٰ کے کعبہ میں پناہ پکڑے تو اللہ تعالیٰ کا کعبہ اس کو پناہ دیتا ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی قاتل یا مجرم ہے اللہ تعالیٰ کے حرم میں آگیا تو وہ پناہ میں آگیا۔ اب

اس پر پہرہ لگا دو کہ اس کو پانی نہ ملے، کھانا نہ ملے، تاکہ وہ تنگ ہو کر باہر نکلے۔ جب باہر نکلے تو اس کو پکڑ لیا جائے۔

اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حدود حرم میں کسی کو سزا نہ دی جائے۔ اگر کوئی مجرم ہے، قاتل ہے، باغی ہے یا ڈاکو ہے، اگر وہ حرم میں آ گیا تو اس کو مجبور کرو کہ باہر نکلے۔ جب باہر نکلے تو آپ اس کو سزا دیں یا اگر وہ پکڑا گیا ہے تو اس کو حدودِ حرم سے باہر جا کر سزا دیں، تاکہ حرم کا احترام ہر طرح سے قائم رہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر اس نے حرم میں جرم کیا ہے تو اس کو حرم میں بھی سزا مل سکتی ہے۔ مقامِ ادب یہ ہے کہ ہر آدمی خود حرم کے احترام میں کسی دوسرے کو سزا نہیں دیتا، قتل نہیں کرتا، ورنہ اگر کوئی گناہ کا مرتکب ہوا کہ اس پر حد ہے تو حد ہوگی، قاتل ہے تو قصاص ہوگا اور سارق ہے تو قطع ید ہوگا۔ تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کو حرم میں سزا دی جا سکتی ہے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کے حرم کا خود احترام توڑ دیا ہے تو اب وہ کس احترام کا مستحق ہے؟

حرم میں رزق کی فراوانی:

دوسری آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ ۝٣ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ ۝٤﴾ [قریش: ۳،۴]

اللہ تعالیٰ کا رزق ایک وعدہ عمومی ہے کہ کوئی جانور، کوئی چیز زمین پر چلنے والی نہیں، مگر اللہ تعالیٰ اس کو رزق دیتے ہیں۔ اور یہ سب کے لیے وعدہ ہے، چاہے مسلمان ہے، کافر ہے، مومن ہے، فاسق ہے، انسان ہے، چرند ہے یا پرند ہے۔ اور ایک وعدہ مکہ والوں کے لیے، حرم والوں کے لیے خاص ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اللہ تعالیٰ کے حرم کا احترام کرو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہاری بھوک بھی مٹائیں گے اور تمہارا ڈر بھی ختم کر کے تمہیں امن نصیب کریں گے۔ اس لیے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حرم میں صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو ایسے مقام سے رزق دیتے ہیں کہ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔

موجودہ دور کے اندر لوگ دین سے بہت دور ہو گئے ہیں، ہمارے پاس عمل نہیں رہا۔ حرمین شریفین کا جو ادب اور عظمت ہے وہ بھی ہم صحیح معنوں میں ادا نہیں کر رہے، اس کے باوجود دنیا کے کسی ملک میں جائیں وہاں یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ وہاں سال، چھ مہینے بے کار رہیں اور آپ زندگی گزار لیں، مشکل ہے، لیکن اگر یہاں کچھ بھی نہ ہو تو

زندگی گزر جاتی ہے، یعنی اب بھی ہم گناہ گاروں کے لیے اتنی برکات ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے دروازے پر صحیح معنوں میں بیٹھ جائیں اور عبادت کریں ان کے لیے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: ﴿أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ ۝٤﴾ کہ اس کو امن دیں گے اور دوسرا اس کو کھانا اور رزق دیں گے۔

بعض علماء نے مختلف بلاد کے خصائص لکھے ہیں کہ فلاں بلد کی یہ خصوصیت ہے اور فلاں قوم کی یہ خصوصیت ہے۔ انہوں نے خصائص مکہ کے اندر لکھا ہے کہ کوئی بھی باہر سے آنے والا آدمی اللہ تعالیٰ کے حرم میں بھوکا نہیں سوتا اور کچھ نہ ہو تو زم زم تو ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مسجد حرام کی یہ بھی حرمت ہے کہ حرم کے اندر شکار نہ کھیلیں، کسی گھونسلے کے اندر بیٹھے ہوئے پرندے کو بھی نہ اڑائیں اور یہ بھی حکم ہے کہ حدود حرم کے اندر کوئی گھاس، کوئی درخت نہ کاٹیں۔ یہ حرم کا امن ہے کہ جو صرف بندوں کو نہیں ملا، بلکہ درختوں اور گھاس اور چرند پرند کو بھی ملا ہے۔

اس سے اندازہ کریں کہ جہاں جانور کو پتھر مارنا ناجائز ہو، وہاں جو لوگوں کو قتل کر دیں ان سے بڑے بدبخت دنیا میں نہیں ہوں گے۔

حرم اب سب کے لیے حرم ہے:

(حدیث) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا هِجْرَةَ، وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ، وَإِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ، فَانْفِرُوا)) [بخاری، رقم: ۱۸۳۴] اب مکہ سے ہجرت بند ہے، مگر آدمی جہاد کی غرض سے یا کسی اور غرض سے جا سکتا ہے۔ اگر تمہیں جہاد کے لیے بلایا جائے تو چلے جاؤ۔

((فَإِنَّ هَذَا بَلَدٌ حَرَّمَ اللَّهُ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ، وَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَإِنَّهُ لَمْ يَحِلَّ الْقِتَالُ فِيهِ لِأَحَدٍ قَبْلِي، وَلَمْ يَحِلَّ لِي إِلَّا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ، فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، لاَ يُعْضَدُ شَوْكُهُ، وَلاَ يُنَفَّرُ صَيْدُهُ، وَلاَ يَلْتَقِطُ لُقَطَتَهُ إِلَّا مَنْ عَرَّفَهَا، وَلاَ يُخْتَلَى خَلاَهَا، قَالَ الْعَبَّاسُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِلَّا الْإِذْخِرَ؛ فَإِنَّهُ لِقَيْنِهِمْ وَلِبُيُوتِهِمْ، قَالَ: قَالَ: إِلَّا الْإِذْخِرَ)) [صحیح بخاری، رقم: ۱۸۳۴]

اور اسی طرح فرمادیا کہ یاد رکھو! اس بلد (مکہ) کو اللہ تعالیٰ نے حرمت والا بنایا ہے۔ جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اس کی حرمت کا حکم اس وقت سے ہو گیا۔ کسی قتال کی اجازت نہیں اور نہ کسی کے لیے

اللہ تعالیٰ کا حرم حلال ہے۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: یاد رکھو! مجھ سے پہلے بھی کسی کے لیے اللہ تعالیٰ کا حرم حلال نہیں کیا گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی چند گھڑیوں کے لیے حرم کے اندر قتال کرنے کی اجازت دی تھی اور ان گھڑیوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے میرے لیے بھی اور میری امت کے لیے بھی قیامت تک حرام کر دیا۔ اور فرمایا: خبردار! یہاں کا کوئی کانٹا بھی نہ کاٹا جائے اور اس میں شکار نہ کیا جائے۔ اگر حرم کے اندر کوئی چیز پڑی ہے تو نہ اٹھائیں، مگر جو آدمی اس نیت سے اٹھائے کہ میں اس کا اعلان کروں گا، تاکہ اصل مالک کو مل جائے۔ اور فرمایا: اس کی گھاس بھی نہ کاٹی جائے، کسی درخت کی ٹہنی بھی نہ توڑیں۔ جب آپ ﷺ یہ فرما رہے تھے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! مہربانی فرما کر اذخر (ایک قسم کی گھاس) کی اجازت دے دیں؛ کیونکہ یہ آگ جلانے والوں کے لیے اور لوہار کے کام آتی ہے، وہ کہاں سے لکڑی لے کر آئیں گے؟ آپ ﷺ نے اذخر کی اجازت دے دی۔ یاد رکھیں! اذخر کی اجازت دینا بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نہ اپنی منشاء سے کسی چیز کو حرام فرماتے ہیں اور نہ حلال فرماتے ہیں۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو شریح نے حضرت عمرو بن سعید رضی اللہ عنہ سے کہا: جب وہ مکہ کی طرف وفد بھیج رہے تھے کہا: اے امیر! مہربانی کریں اور مجھے اجازت دیں، میں آپ کو وہ اقوال سناتا ہوں جو میرے آقا ﷺ نے فتح مکہ والے دن بیان فرمائے تھے۔ وہ بات میرے کانوں نے سنی، میرے دل نے اس کو محفوظ رکھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے محمد پاک ﷺ کو دیکھا۔ جب آپ ﷺ یہ بات فرما رہے تھے کہ آپ نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا بیان کی اور اس کے بعد فرمایا: اے لوگو! سن لو! مکہ کے حرم کی حرمت کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا، کسی بندے نے حرام نہیں کیا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ حرمت پر بھی ایمان رکھتا ہے۔ خبردار! اگر کوئی لوگ میری جنگ سے استدلال پکڑیں تو ان کو بتایا جائے کہ میں نے یہ جنگ اپنی منشاء سے نہیں کی، بلکہ میرے اللہ تعالیٰ نے مجھے چند گھڑیوں کے لیے اجازت دی ہے اور اس کے بعد اس کی حرمت اسی طرح قائم ہوگئی۔ جو لوگ میری بات کو سن رہے ہیں وہ ان کو پہنچائیں جو غائب ہیں۔ حضرت عمرو بن سعید رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سننے کے بعد کہا کہ میں بھی اس مسئلہ کو جانتا ہوں، لیکن یاد رکھو کہ حرم کسی نافرمان کو پناہ نہیں دیتا، کسی قاتل کو پناہ نہیں دیتا، حرم کسی ایسے آدمی کو جو دہشت گردی کرنا چاہے اور فتنہ ڈالنا چاہے اس کو بھی پناہ نہیں دیتا۔ [بخاری، رقم: ۱۸۳۲]

(حدیث) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے سنا: ((لَا يَحِلُّ لِأَحَدِكُمْ أَنْ يَحْمِلَ بِمَكَّةَ السِّلَاحَ)) [صحیح مسلم، رقم: ۱۳۵۶] کہ کسی بندے کو اجازت نہیں کہ وہ حرم میں ہتھیار اٹھائے، یعنی لڑائی کے لیے ہتھیار نہ اٹھائے۔ اگر اس نے ویسے ہتھیار اٹھائے ہیں، امن قائم کرنے کے لیے ہتھیار اٹھائے ہوئے ہیں اس کو اجازت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عدی بن الحمراء الزہری رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ میں نے حضور پاک ﷺ کی زبان مبارک سے سنا ہے آپ حزورہ (مکہ کے ایک بازار) میں کھڑے فرما رہے تھے: مجھے اللہ تعالیٰ کی قسم ہے! ساری دنیا کی زمین میں سب سے بہتر اے مکہ! تو ہے، اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اور مجھے بھی محبوب ہے۔ اگر میری قوم مجھے مجبور کر کے حرم سے نہ نکالتی تو میں کبھی حرم کو چھوڑ کر نہ جاتا۔ [ترمذی، رقم: ۳۹۲۱]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امن سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کے عذاب سے امن میں لائیں گے۔ شرط یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس کے احکام پر ایمان لائے۔

مسجد حرام میں داخل ہونے کے فوائد:

(حدیث) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ دَخَلَ الْبَيْتَ دَخَلَ فِي حَسَنَةٍ وَخَرَجَ مِنْ سَيِّئَةٍ وَخَرَجَ مَغْفُورًا لَهُ)) [سنن بیہقی، رقم: ۹۷۲۵] جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے حرم میں داخل ہوا گویا وہ بھلائی اور نیکیوں میں داخل ہوا اور گناہوں سے نکل گیا اور اس حال میں نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دیں گے۔

حج کس پر فرض ہے؟

مکہ کی ایک عظمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کا حج ہر اس انسان پر جو طاقت رکھتا ہے۔ زندگی میں ایک بار فرض کر دیا۔ طاقت کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمان ہو! کیونکہ کافر پر حج فرض نہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ بالغ ہو اور اگر نابالغ ہونے کی حالت میں حج کیا ہے تو اس سے فرض ادا نہیں ہوگا، نفلی حج ہو جائے گا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ آزاد ہو۔ اگر غلام ہے تو وہ سردار کے تابع ہے۔ جب تک وہ اجازت نہ دے وہ سفر نہیں کر سکتا۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ غنی ہو اور اپنے گھر سے لے کر مکہ مکرمہ تک آنے جانے کا کھلا خرچ اس کے پاس موجود ہو۔ راستے میں بھی

امن ہو، راستے میں کسی کے مار ڈالنے کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ اگر عورت ہے تو اس کے لیے محرم کے ساتھ ہونا شرط ہے۔ اگر اس کے ساتھ محرم نہ ہو تو وہ حج پر نہیں آسکتی۔ محرم سے مراد وہ آدمی جس سے نکاح کرنا حرام ہے یا وہ اس کا خاوند ہو۔ اللہ نے حج اس کعبہ کا رکھا ہے، نہ مسجد اقصیٰ کا اور نہ مسجد نبوی کا۔ اس سے بڑی عظمت کعبہ کی کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر زندگی میں ایک دفعہ کعبہ میں حاضر ہونا فرض کر دیا ہے۔

جب یہ آیت اتری تو اس کے اندر مفسرین کے دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ [آل عمران: ۹۷] وہی آیت ہے جس سے حج فرض ہوا۔ اور بعض فرماتے ہیں ﴿وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ [البقرة: ۱۹۶] اس آیت سے حج کی فرضیت ہے، لیکن پہلا قول صحیح اور راجح ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے حج کے فرض ہونے کا حکم دیا ہے اور اس دوسری آیت کے اندر اتمام کا حکم ہے کہ اگر حج یا عمرہ کرو تو اس کو پورا کرو۔

حج زندگی میں ایک بار فرض ہے:

(حدیث) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَيُّهَا النَّاسُ! قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ، فَحُجُّوا، فَقَالَ رَجُلٌ: أَكُلَّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ فَسَكَتَ حَتّٰى قَالَهَا ثَلَاثًا، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَوْ قُلْتُ: نَعَمْ لَوَجَبَتْ، وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ: ذَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ، فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ، فَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، وَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَدَعُوهُ)) [صحیح مسلم، رقم: ۳۳۲۷]

اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کر دیا ہے، حج کرو۔ ایک صحابی نے عرض کیا: کیا ہر سال ہم پر حج فرض ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ اس نے دوسری دفعہ کہا، آپ چپ ہو گئے۔ اس نے تیسری دفعہ کہا تو آپ چپ رہے۔ اس کے بعد فرمایا: تم جو بار بار پوچھ رہے ہو کہ ہر سال، ہر سال اگر میں کہہ دیتا کہ ہر سال فرض ہے تو ہر سال فرض ہو جاتا۔ اور اس قول کے بعد آپ نے ایک جامع نصیحت فرمائی کہ خبردار! میں جب تک کوئی بات نہ کہوں تم بھی زیادہ نہ پوچھا کرو۔ پہلے لوگ اسی وجہ سے برباد ہو گئے کہ اپنے انبیاء پر کثرت سوال کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب اللہ تعالیٰ نے سخت احکام فرض کر دیے تو ان کو پورے نہ کر سکے تو ناکام ہو گئے۔ اس لیے میں جس چیز کا حکم کروں اس کی تعمیل کرو اور جس چیز سے منع کروں اس سے رک جاؤ۔ کیونکہ جب نبی موجود ہوتے ہیں، اگر پوچھو

گے تو وحی آئے گی، پھر تم نہیں کرسکو گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے بندوں کے لیے رحم کے فیصلے فرماتے ہیں، بظاہر اگرچہ ہمیں کتنی تکلیف نظر آرہی ہو۔

فرشتوں کی بے ادبی کرنے کا عذاب:

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنے زمانے کا واقعہ لکھا ہے کہ جب ہم حدیث شریف پڑھتے تھے تو حدیث پاک میں آیا ہے کہ جب طالب العلم اللہ کے دین کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کے نیچے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ تو ایک معتزلی طالب علم نے یہ حدیث سنی تو کہنے لگا کہ کل سے جوتے کے نیچے میخیں لگواؤں گا اور فرشتوں کے پر توڑ دوں گا۔ اور اس نے جوتے کے نیچے باقاعدہ میخیں لگوائیں۔ اس کے بعد چلا اور پاؤں زمین پر مارے، تاکہ فرشتوں کو تکلیف ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں؛ کیونکہ جب اللہ کے نبی نے فرمایا کہ فرشتے پر بچھاتے ہیں، ضروری تو نہیں کہ وہ پر ہمارے پاؤں کے نیچے دیتے ہیں، بلکہ معنی یہ ہے کہ تواضع اور احترام کرتے ہیں۔

حج کے لیے استطاعت سبیل کا معنی:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ [آل عمران:۹۷]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حج پر تشریف لائے تو اپنی ازواج مطہرات کو بھی ساتھ لے آئے۔ اور فرمایا: اب تم اچھی طرح حج کرلو۔ اس کے بعد تو پابندی کا زمانہ ہے، یعنی اس طرف اشارہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات قریب ہے؛ کیونکہ جب آپ کی وفات ہوجائے گی تو ازواج مطہرات کا اکیلے سفر کرنا منع ہے۔ حکم تھا: ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ [الاحزاب:۳۳] تو اس سے معلوم ہوا کہ جب تک عورت کے ساتھ محرم نہ ہو وہ حج کا سفر نہیں کرسکتی۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: استطاعت کے احکام کتب احکام کے اندر کتاب الحج کے اندر ساری تفصیلات مل جائیں گی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((قَامَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: مَنِ الْحَاجُّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: الشَّعِثُ التَّفِلُ، فَقَامَ

رَجُلٌ آخَرُ فَقَالَ: أَيُّ الْحَجِّ أَفْضَلُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: الْعَجُّ وَالثَّجُّ، فَقَامَ رَجُلٌ آخَرُ فَقَالَ: مَا السَّبِيلُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ)) [ترمذی، رقم:۲۸۹۶]

ایک آدمی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں کھڑا ہوا، اس نے پوچھا: یارسول اللہ! حاجی کی کیا صورت ہے؟ آپ نے فرمایا: حاجی کی صفت یہ ہوتی ہے کہ اس کے بال بکھرے ہوئے، میلی کچیلی حالت میں ہوتا ہے۔ (یہ اس زمانے کے مطابق تھا) دوسرے صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! کونسا حج زیادہ افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے راستے میں ''لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ'' کا شور مچانا اور قربانی ذبح کرنا۔ تیسرے صحابی نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! سبیل سے کیا مراد ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس آدمی کے پاس خرچہ بھی ہو اور سواری بھی (اب موجودہ حالات کے مطابق اس کے پاس راستے کا کرایہ) کھانا پینا ہو تو اس پر حج فرض ہے۔

کیا لڑکیوں کی شادی کرنا حج فرض کے لیے رکاوٹ ہے؟

سبیل سے معلوم ہوا کہ جس آدمی کے پاس خرچہ بھی ہے، سواری کا انتظام بھی ہے، اس پر حج فرض ہے۔ باقی ہمارے بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ پہلے اس کی شادی کرو، اگرچہ اس کو دس سال رشتہ نہ ملے تو کیا حج ختم ہو جائے گا؟ اگر دو لڑکیاں ہوں تو کیا نماز بھی ختم ہو جائے گی کہ پہلے ان کا رشتہ کریں؟ یاد رکھیں! حج کی فرضیت اپنی جگہ ہے اور لڑکے لڑکیوں کی ذمہ داریاں اپنی جگہ ہیں۔ اگر حج فرض ہو جائے تو اس میں غفلت نہ کی جائے؛ کیونکہ موت کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ یا کئی کروڑوں پتی ہوتے ہیں، اگلے سال کنگال ہو جاتے ہیں اور کوئی غریب ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو دولت دے دیتے ہیں۔

علماء نے اس پر بھی کتابیں لکھی ہیں کہ حج علی الفور فرض ہے یا علی التراخی فرض ہے۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ جب صاحب استطاعت ہو جائے تو فوراً حج کرے۔ اور بعض ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ اگر فوراً حج نہیں کر سکا، سال دو سال لیٹ ہو گیا تو کوئی بات نہیں، لیکن حج ادا کرے۔

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

[آل عمران:۹۸، ۹۹]

''کہہ دو کہ اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو؟ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سب کا گواہ ہے۔
کہہ دو کہ اے اہل کتاب! اللہ کے راستے میں ٹیڑھ پیدا کرنے کی کوشش کر کے ایک مومن کے لیے اس میں کیوں رکاوٹ ڈالتے ہو جبکہ تم خود حقیقت حال کے گواہ ہو؟ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔''

ان آیات مبارکہ میں دوبارہ اہل کتاب کو خطاب ہے۔ بعض تثلیث کے قائل ہیں، بعض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں، بعض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود خدا کہتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ جن کو یہ پتہ نہیں کہ انجیل کیا ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کون ہیں؟ وہ مذہب سے بیزار ہیں، لیکن ان کے ساتھ بھی لفظ اہل کتاب لگتا ہے، جبکہ اہل کتاب وہ سمجھے جائیں گے جو صحیح معنی میں اپنی کتاب پر تو عمل کرتے ہیں، اگرچہ کتابیں بدل گئیں، تحریف ہوگئی، لیکن کچھ نہ کچھ تو مانتے ہوں، لیکن جو لوگ بالکل جانتے نہیں ہیں ان کو خطاب آیا:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ [آل عمران:۹۸]

اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو؟ اور اللہ تعالیٰ گواہ ہیں، جاننے والے دیکھنے والے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو۔

ان آیات کے اندر تہدید و دھمکی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا کسی کو پتہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، یعنی تمہیں اس کی سزا دیں گے اور اگر تمہارے اعمال صحیح ہو جائیں گے تو جزا دیں گے، لہٰذا جھوٹ نہ بولو۔

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ [آل عمران:۹۹]

اے اہل کتاب کیوں لوگوں کو منع کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے راستے سے؟

''سَبِيْلِ اللّٰهِ'' سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: ایمان مراد ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا مراد ہے۔

اہل کتاب کے لوگوں کو اسلام سے روکنے کے ڈھنگ:

﴿لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ [آل عمران:۹۹]

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جو ایمان لائے اس کو بھی کجی کے راستے پر چلا دیں اور اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہیں ان چیزوں سے جو تم کرتے ہو۔

ان آیات کے اندر بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب خود بھی ایمان نہیں لاتے تھے اور دوسروں کو بھی ایمان لانے سے روکتے تھے کہ ان کے ذہنوں میں شبہات ڈال دیتے تھے، اسی طرح آپ پڑھ چکے ہیں کہ اہل کتاب کے دس آدمیوں نے مشورہ کیا تھا کہ ہم مل کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں جاتے ہیں، ان پر ایمان لاتے ہیں اور شام کو کافر بن کر نکل جائیں گے، تاکہ لوگ سمجھیں گے کہ یہ پڑھے لکھے لوگ تھے، اسلام بھی لے آئے، لیکن اسلام کو چھوڑ کر نکل گئے۔ آخر کوئی بات ہے۔ اس طرح بھی دوسروں کو اسلام سے روکنا ہے۔

اور اس طرح جب ان سے لوگ حضور اکرم ﷺ کی صفات پوچھتے تھے تو جو صفات تورات کے اندر تھیں ان کے اندر تحریفات کر کے کہتے کہ یہ وہ نبی نہیں ہیں، ان کی صفت تو یوں ہے۔ اس طرح بھی لوگوں کو اسلام لانے سے روکتے تھے۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ ۝ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝﴾ [آل عمران: ۱۰۰، ۱۰۱]

"اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے ایک گروہ کی بات مان لوگے تو وہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تم کو دوبارہ کافر بنا کر چھوڑیں گے۔ اور تم کیسے کفر اپناؤ گے جبکہ اللہ کی آیتیں تمہارے سامنے تلاوت کی جاتی ہیں اور اس کا رسول تمہارے درمیان موجود ہے؟ اور (اللہ کی سنت یہ ہے کہ) جو شخص اللہ کا سہارا مضبوطی سے تھام لے، وہ سیدھے راستے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔"

اے ایمان والو! اگر تم نے فرمانبرداری کی ایک جماعت کی جو اہل کتاب میں سے ہے، وہ تمہیں نکال ڈالیں گے ایمان لانے کے بعد اور کفر کی طرف لٹا دیں گے، کیسے تم کفر کرو گے (یعنی تم تو کفر نہیں کر سکتے)؟ کیونکہ تم اللہ تعالیٰ کے قرآن پڑھنے والے ہو، اللہ تعالیٰ کا رسول تمہارے اندر موجود ہے تو تم کیسے کافر ہو سکتے ہو؟ یعنی تم ہرگز

کافر نہیں بن سکتے۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ پر توکل کر لیا وہی ہے جس کو صراط مستقیم کی ہدایت کی گئی۔ تم لوگ تو اللہ تعالیٰ کو بھی ماننے والے، اللہ کے نبی کو بھی ماننے والے اور اللہ تعالیٰ کے قرآن کے بھی پڑھنے والے ہو تو تم کیسے کفر کر سکتے ہو؟ لیکن یہ کافر یہی چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان سے کفر میں ڈال دیں۔

ان آیات کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرآن کے اندر باطل کا رد موجود ہے، ہر کذب کا رد موجود ہے اور ہر حق، صدق وعدل کی شہادت موجود ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قرآن پڑھنے والا، حضور اکرم ﷺ کے فرمان کو صحیح طور پر پڑھنے اور سمجھنے والا اور آپ کے فرمان پر چلنے والا کوئی بندہ کبھی فرق باطلہ کے دھوکے میں نہیں آسکتا۔

حسد اور دشمنی کی ایک وجہ:

یاد رکھیں! حسد ہمیشہ اس سے ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کوئی شان دے۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ عام آدمی کی کوئی مخالفت نہیں کرتا اور جس کو اللہ تعالیٰ نے عزت دی اس کے خلاف باتیں ہوں گی۔ اس کی بزرگوں نے مثال دی ہے کہ جس درخت پر پھل ہوتے ہیں بچے اسی کو پتھر مارتے ہیں اور جس درخت پر پھل ہی نہ ہوں اس کو کون پتھر مارے گا؟ اس لیے گلہ اور مخالفت ان امتوں کی اور ان عظیم شخصیتوں کی ہوتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ شان دیتے ہیں اور جتنی شان بڑی ہوگی اتنی مخالفت بھی بڑی ہوگی۔ ایک عام آدمی کے مقابلے پر عالم کی زیادہ مخالفت ہوگی، عالموں سے اور آگے چلے جائیں تو ائمہ وفقہاء کی دیکھ لیں کتنی مخالفت ہے!!؟ آج بھی ان کی گستاخی کرنے والے موجود ہیں؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ائمہ کو شان جو دی ہے۔ اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم کی کتنی بڑی شان ہے، لیکن ان کی مخالفت کرنے والے بھی آج موجود ہیں۔

حضور ﷺ کو اَن دیکھے ایمان لانے والوں کی فضیلت:

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے ایک دن صحابہ سے پوچھا کہ تم میں سب سے زیادہ بہتر ایمان والے کون ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: فرشتے۔ آپ نے فرمایا: فرشتے کیسے ایمان نہ لاتے، کیونکہ وہ تو اپنے رب کے پاس ہیں؟ صحابہ نے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ ایمان کیسے نہ لاتے، حالانکہ ان پر تو وحی نازل ہوتی تھی؟ صحابہ نے عرض کیا: سب سے زیادہ اعجب ایمان والے لوگ ہم ہیں۔ آپ نے فرمایا: تمہارا کیا کمال ہے!؟ تم کیسے ایمان نہ لاتے، حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں؟ صحابہ نے عرض کیا: پھر لوگوں میں سے بہتر ایمان والے

کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے نہ نبی کو دیکھا ہے اور نہ وحی اترتی دیکھی ہے، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کا قرآن پڑھا اور ایمان لے آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان کا ایمان بڑا پسندیدہ ہے۔

اللہ پر بھروسہ کا حکم:

﴿وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط رکھو اور اللہ تعالیٰ پر توکل رکھو؛ کیونکہ ہدایت دینے میں سب سے عمدہ چیز اللہ تعالیٰ پر توکل ہے۔ جو اللہ تعالیٰ پر توکل رکھتا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات اس کو گمراہیوں سے بچاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر توکل ہدایت کا راستہ ہے، وہی سیدھا راستہ ہے اور وہی مراد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑو، اللہ تعالیٰ سے ہدایت چاہو۔ جب آدمی اللہ تعالیٰ پر توکل کر لیتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اس کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝﴾

[آل عمران: ۱۰۲، ۱۰۳]

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے (ایسے) ڈرو (جیسا کہ) اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں ہرگز موت نہ آئے، مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور اللہ کی رسی (دین) کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔ اور اللہ نے تم پر جو انعام کیا ہے اسے یاد رکھو کہ ایک وقت تھا جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اللہ کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، اللہ نے تمہیں اس سے نجات عطا فرمائی۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی نشانیاں کھول کھول کر واضح کرتا ہے، تاکہ تم راہِ راست پر آجاؤ۔"

ربطِ آیات:

ان آیات کے اندر ایمان والوں کو حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ سابقہ آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی دو برائیوں کا ذکر فرمایا: ایک تو وہ خود کفر کرتے تھے اور دوسرا ایمان لانے والوں کو بھی منع کرتے تھے۔ اس کے بعد مومنین کو ہدایت تھی کہ اگر تم اہل کتاب کی کسی ایک جماعت کے کہنے میں آگئے تو یہ تمہیں ایمان سے نکال ڈالیں گے؛ کیونکہ ان کو اسلام سے عداوت ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہودی کی سازش سے جنگ کا غبار بھڑک اٹھا:

اسی ضمن میں محدثین نے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ انصار کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج تھے۔ یہ مدینہ منورہ کے اصل رہائشی تھے، ان دونوں کے اندر بڑی خانہ جنگیاں تھیں، لیکن جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ملا دیا اور دونوں اسلام کے اندر داخل ہوگئے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ان دونوں کے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ ایک یہودی شاس بن قیس وہاں سے گزرا اور اس نے دیکھا کہ دونوں قبیلے شیر و شکر ہو کر بیٹھے ہیں تو اس کے دل میں بڑی چوٹ لگی اور وہ ان دونوں قبیلے والو کے پاس آکر بیٹھ گیا اور میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد زمانہ جاہلیت کے کچھ اشعار سنائے، جن کو وہ دونوں قبیلے لڑائیوں کے زمانہ میں ایک دوسرے کے خلاف پڑھا کرتے تھے اور ان کو بہادری کی داستانیں یاد دلائیں کہ تم تو بڑے بہادر اور جنگجو لوگ تھے، مسلمان ہو کر تم بالکل مر گئے ہو۔ تو ان کا خون کھول اٹھا اور دونوں قبائل کے نوجوان لڑائی کے لیے کھڑے ہوگئے، تلواریں نکل آئیں اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جاتی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا: یہ تم کیا کر رہے ہو؟ اسلام اور ایمان لانے کے بعد اب بھی تمہارے اندر جاہلیت کے آثار باقی ہیں؟ میں بھی تمہارے اندر موجود ہوں۔ ابھی تم میری زندگی کے اندر لڑ رہے ہو تو بعد میں کیا ہوگا؟ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب فرمایا تو دونوں قبائل ٹھنڈے ہوگئے۔ پھر سے دونوں ایک دوسرے کے گلے مل گئے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۳/۱۳۶، ۱۳۷]

اللہ تعالیٰ کی صحابہ کو نصیحت:

اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ

رَسُوْلُہٗ﴾ کہ تم کیسے کفر کرتے ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ کی آیات تم پر پڑھی جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے رسول تمہارے اندر موجود ہے؟ اس آیت کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں: بعض علماء نے فرمایا: یہاں کفر سے مراد کفر اعتقادی ہے کہ تم پھر ایک دوسرے کے قتل کو حلال جان کر کھڑے ہو گئے ہو۔ اور بعض علماء نے فرمایا: کفر عملی مراد ہے کہ لڑائی کرنا، کسی کو قتل کرنا یہ تو کافروں کا کام ہے، مسلمانوں کا یہ کام تو نہیں ہے۔ اسلام سلامتی کا دین ہے اور ایمان امن کی علامت ہے۔ اسلام تو ناپاک جانور پر بھی بلاوجہ ظلم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

پہلے خود عمل کرو تو دوسروں پر اثر زیادہ ہوتا ہے:

اب ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ جیسے کافروں میں دو برائیاں تھیں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو دو اچھائیوں کا حکم دیا ہے کہ ایک تو تم خود اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور دوسری صفت یہ ہونی چاہیے کہ بھلائی کا حکم کرو اور برائی سے منع کرو۔

علماء کرام اور مفسرین عظام نے لکھا ہے کہ آدمی فی ذاتہ پہلے خود کامل بنے۔ جب اپنے اندر کمال پیدا کر لے تو پھر دوسرے کے اندر کمال کا ذریعہ بنے۔ یعنی اگر تم خود نماز نہیں پڑھتے ہو تو دوسروں پر کیا اثر ہوگا؟ خدا نہ کرے باپ نماز نہیں پڑھتا، ماں نماز نہیں پڑھتی تو بچوں کو کون نماز پڑھائے گا؟ بچے کو لاکھ کہتے رہو "نماز پڑھو" وہ کہاں پڑھے گا؟

یاد رکھیں! علم کی فضیلت زیادہ ہے، علم فضیلت میں عمل سے مقدم ہے اور اثر کے اعتبار سے عمل زیادہ ہے۔ ایک آدمی زبانی کلامی بات کہتا رہے، اس کا اثر اتنا نہیں ہوتا جتنا اثر عمل کر کے دکھانے کا ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں! ہمیں کافروں نے کبھی لیکچر نہیں دیا، خط نہیں بھیجا کہ تم اپنی لڑکیوں کو عریاں لباس پہناؤ، بلکہ وہ خود اپنی لڑکیوں کو ایسا لباس پہنا کر سڑک پر نکل آئے۔ اس لیے عمل کا ایک عجیب اثر ہے۔ اگر آدمی خود عامل نہ ہو اور دوسروں کو ہدایت کرے تو اس کا اثر نہیں ہوتا۔

(واقعہ) ایک اللہ والے کی خدمت میں ایک بوڑھی عورت بچہ لے کر آئی اور کہا کہ حضرت! یہ گڑ کھاتا رہتا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ کوئی بیماری نہ لگ جائے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ اس کی عادت کو چھڑائیں۔ ان بزرگوں نے فرمایا: کل بچے کو لے آنا، ہم دعا کریں گے۔ وہ بچے کو لے کر چلی گئی۔ ان اللہ والوں کے خادموں نے نے عرض کیا کہ دعا

فرمادیتے، بوڑھی عورت تھی۔آج بچے کو لے آئی تھی اور کل پھر بچے کو لے کر دھکے کھائے گی؟ فرمایا: اللہ کے بندو! آج صبح میں نے خود میٹھا کھایا ہوا تھا تو میری طبیعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ خود میٹھا کھا کے بیٹھا ہوا ہوں تو دوسروں کے لیے کیسے دعا کروں کہ میٹھا چھوڑ دے۔

تقویٰ کے درجات:

علماء نے فرمایا: تقویٰ کے بھی مدارج ہیں:

- ......سب سے پہلا درجہ ''اِتِّقَاءٌ مِّنَ الشِّرْكِ'' ہے کہ شرک سے بچ جاؤ۔
- ......دوسرا درجہ یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں سے بچ جاؤ۔
- ......تیسرا درجہ یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں کے ساتھ ساتھ صغیرہ گناہوں سے بھی بچ جاؤ۔
- ......اوران سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہیں اور کسی کا خیال بھی نہ ہو۔

خوشی اور غمی میں حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کی حالت:

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بیٹھے ہوئے تھے، ان کو ایک بہت بڑی خوشخبری ملی۔ فرمایا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!''۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کو اندوہناک خبر ملی تو آپ نے فرمایا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ''۔ جب آپ علیحدہ ہوئے تو حجت والے خادم نے کہا: یہ اچھی بات ہے خوشی آئے تو ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!'' غم آئے تو ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!'' ہمیں تو یہ مسئلہ سمجھ نہیں آیا!؟ انہوں نے فرمایا: نہ خوشی کچھ ہے اور نہ غم کچھ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب خوشی ملی تو میں نے اپنے دل کی کیفیت پر غور کیا کہ خوشی میں آکر کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی؟ تو دیکھا کہ وہ اسی حالت پر ہے تو میں نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!''۔ اور جب غمی ملی تو میں نے دل پر غور کیا کہ غم کے اندر ڈگمگا تو نہیں گیا ہے؟ لیکن وہ اپنی حالت پر تھا تو میں نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!''۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے ایک دن پوچھا: مجھے بتائیں تقویٰ کا کیا معنی ہے؟ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے بڑی پیاری تفصیل بیان فرمائی کہ میں آپ کو سمجھاتا ہوں، لیکن آپ مجھے یہ بتائیں کہ کبھی آپ کا ایسے راستے سے گزر ہوا کہ جس پر کانٹے پڑے ہوئے ہیں، درمیان میں بڑا باریک راستہ ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کئی دفعہ گزرے ہیں۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب آپ وہاں سے

گزرے تو آپ کیسے گزرے؟ آپ نے فرمایا: کپڑے اونچے کر لیے، تاکہ کپڑا کانٹے میں نہ اٹک جائے اور نظر راستے پر رکھتے ہیں کہ پاؤں پھسل نہ جائے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسی کا نام تقویٰ ہے۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۶۴]

ادھر عورت کا حسن اور ادھر شہوانیت بلا رہی ہو، لیکن سیدھا جنت کا راستہ ہے اور ادھر ادھر ہلاکتیں ہیں۔ اب ہم نے بھی ہر گناہ سے بچنا ہے اور منزل پر پہنچنا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شادی کا سادہ سا ولیمہ:

خدا کی قدرت ہے کہ آج گناہ سستا ہے اور حلال مہنگا ہے۔ آج کوئی غریب بھی شادی کرنا چاہے تو لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے معمولی سی بات ہے اور اگر کوئی اچھی شادی کرے تو لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں، جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شادی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ایسی شادی ہم نے کبھی دیکھی ہی نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ آج میرا ولیمہ ہے۔ جس کے گھر میں جو کھانا ہے وہ ظہر کے وقت مسجد میں لے آئے۔ صحابہ فرماتے ہیں کہ کوئی ستو لے آیا، کوئی کھجور لے آیا اور کوئی سبزی لے آیا۔ دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا گیا اور ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

آج اگر ایسی شادی ہو تو کوئی مشکل نہیں، لیکن آج حرام سستا ہے اور حلال مہنگا ہے۔

کتے چھوڑ رکھے ہیں، ڈھیلے باندھ رکھے ہیں:

(حکایت) شیخ سعدی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک بزرگ سردی کے موسم میں ایک ایسی بستی سے گزر رہے تھے کہ اتفاق سے محلے کے کچھ کتوں نے حملہ کیا۔ انہوں نے ان کو بھگانے کے لیے جب پتھر اٹھائے تو اٹھائے نہ جاسکے تو ایک جملہ فرمایا کہ اس بستی والے بڑے عجیب لوگ ہیں کہ کتوں کو چھوڑ دیا ہے اور پتھروں کو باندھ دیا ہے۔

تو یہ مثال آج ہمیں سمجھ آتی ہے کہ حرام کو ہم نے چھوڑ رکھا ہے اور حلال کو باندھ رکھا ہے۔ آج کوئی آدمی جتنا گناہ اور برائی کرنے والا ہے وہ اکڑ کر چل رہا ہے اور جتنا شریف ہے اتنا ڈرا ہوا ہے۔

تقویٰ اختیار کرنے کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ [آل

عمران:۱۰۲] اور دوسری آیت کے اندر حکم دیا: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن:۱۶] تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تمہاری طاقت وقوت ہے۔ اور جو چیز تیرے ہاتھ سے باہر ہے وہ تیری طاقت میں نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے جب تقویٰ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا معنی یہ ہے کہ ہر حکم میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اللہ کی نافرمانی نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، اس کو نہ بھولو۔ اور ہر بات میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور ناشکری نہ کرو۔ یہ تقویٰ کا مقام ہے۔

[تفسیر ابن کثیر:۲/۸۷]

﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ اور نہ مرو تم، مگر اس حال میں کہ تم اسلام پر ہو۔ یعنی ایک دن کے لیے تقویٰ اختیار نہ کرو، بلکہ مرتے دم تک تقویٰ اختیار کرو؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالخَوَاتِيمِ))[1] اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے۔ اگر ایمان پر خاتمہ ہوگا تو نجات ہوگی۔ اگر ساری زندگی تہجد پڑھتا رہے، لیکن مرنے سے پہلے...... نعوذ باللہ...... کافر ہوگیا تو کوئی فائدہ نہیں اور اگر ساری زندگی کفر پر رہا، لیکن مرنے سے پہلے مسلمان ہوگیا تو کامیاب ہوگیا۔

اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے دو حکم دیئے ہیں: ایک تقویٰ اختیار کرو اور دوسرا اس پر ثابت قدم رہو، تاکہ تمہارا خاتمہ ایمان پر ہو۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" دَخَلَ الْجَنَّةَ))[2] جس کی مرنے کے وقت آخری بات یہ ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو سمجھ لو کہ وہ جنت میں گیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تقویٰ نصیب فرمائیں۔

اللہ کی تعریف اور شکر:

روایات میں ہے کہ جب یہ آیت مبارکہ اتری: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [آلِ عمران:۱۰۲] تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت گھبرائے؛ کیونکہ انسان چاہے کتنا عابد وزاہد بن جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے ہمیں سکھایا کہ دعا میں یوں کہیں: ((لَا أُحْصِي ثَنَاءً

[1] [صحیح بخاری، رقم:۶۶۰۷]
[2] [ابوداؤد، رقم:۳۱۱۶]

عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ))' اے اللہ! ہم تو تیری مدح نہیں کر سکتے، مگر وہی مدح وثنا جو تو نے اپنی ذات کے لیے بیان کی ہے، ہم اسی کو دہراتے ہیں، ورنہ ہماری طاقت نہیں ہے کہ آپ کی مدح وثنا کر سکیں۔

روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ﴾ [سبا: ۱۳] تو حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے گھر میں ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ اپنے بچوں بیٹیوں کو اکٹھا کر کے بٹھایا اور ڈیوٹی لگا دی کہ روزانہ ہر آدمی مثلاً ایک گھنٹہ عبادت میں مشغول رہے، تاکہ دل اور رات میں ایک لحہ بھی ایسا نہ گزرے جس میں گھر کا کوئی نہ کوئی فرد عبادت میں مشغول نہ ہو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس قدر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، لیکن اس کے باوجود بھی کہا کہ یا اللہ! آپ نے جو حکم دیا ہے کہ میرا شکر ادا کرو تو میں آپ کا شکر کیسے ادا کر سکتا ہوں؟ میں آپ کی کس نعمت کا شکر ادا کروں؟ اگر میں شکر کروں تو اس کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے نبی! اب تو نے صحیح شکر ادا کیا ہے۔ یعنی تم نے شکر ادا کرنے میں عاجزی کا اعتراف کر لیا ہے۔ معلوم ہوا کہ کوئی بھی اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔

اللہ سے ڈرنے کی حد:

اس طرح جب یہ آیت مبارکہ اتری تو صحابہ کرام بہت گھبرائے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اللہ تعالیٰ کی شان کے مطابق جو ڈرنا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت مبارکہ نازل فرمائی: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن: ۱۶] اے میرے بندو! تم اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرو، گناہوں سے بچنے کی کوشش کرو جتنی تمہاری طاقت ہے۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اتباع سنت رسول اللہ کی کوشش کریں۔ اس کے باوجود بھی ہماری اتباع اور صحابہ کی اتباع کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیں! اللہ کے فرشتے اور اللہ کے نبی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور ہم جیسے گناہ گار بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، لیکن سب کے ڈرنے میں بڑا فرق ہے کہ اللہ کے ملائکہ معصوم ہیں، ان کو تو پتہ ہے کہ ہمارے ذمہ تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ اللہ کے نبی معصوم ہیں، ان کو پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری ہر بات معاف فرما دی ہے۔ اس لیے ان کا ڈرنا اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال سے ہوتا ہے اور ہمارا ڈرنا گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔

﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] اسلام پر جمے رہو اسلام کے کام کرو، یعنی اگر صحت کے

' [مسلم، رقم: ۲۲۲]

اندر اچھے کام کرو گے تو بیماری میں بھی اللہ تعالیٰ اس کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

حدیث مبارک میں ہے کہ جب بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جب تک تندرست تھا میری عبادت کرتا تھا، آج وہ بستر پر مریض پڑا ہوا ہے، تم اس کے کھاتے میں اس طرح کی عبادت لکھتے رہو جس طرح سے وہ صحت کے زمانہ میں کرتا تھا۔

اللہ کی رسی سے کیا مراد ہے؟

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا﴾ [آل عمران: ۱۰۳]

رسی کے پکڑنے کے یہ فائدے ہیں کہ اگر آدمی اوپر ہے تو رسی کو پکڑ کر بڑے آرام سے نیچے اترتا ہے اور گرنے سے بچ جاتا ہے۔ اور اگر آدمی نیچے ہے تو رسی کو پکڑ کر اوپر منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اسلام اور ایمان کی رسی ایسی مضبوط ہے جو ٹوٹ نہیں سکتی، چھوٹ سکتی ہے۔

''حَبْلِ اللّٰهِ'' سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء نے فرمایا: جو تم نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ تو ہمارا رب ہے، اس کو مضبوطی سے تھامو۔ اور آج غیروں کو مشکل کشا سمجھتا ہے تو وہ رسی کہاں گئی جو تم نے پکڑی تھی؟ بعض علماء نے فرمایا: ''حَبْلِ اللّٰهِ'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرآن ہے۔

﴿وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ اور ایسے کام نہ کرو کہ کبھی قرآن وسنت کے کسی حکم کا انکار ہو اور آپس میں تفرقہ بازی کرو۔ تفرق وتشتت میں نہ پڑو، بلکہ مجموعی اتحاد سے، اعتصام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔

ائمہ مجتہدین کی تقلید فرقہ بندی نہیں:

ان الفاظ کو لے کر بعض لوگ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ پر اعتراض کرتے ہیں، حالانکہ ان کو اختلاف اور تفرق کا معنی سمجھ نہیں آیا ہے۔

دوسرا یاد رکھیں کہ جتنے ائمہ ہیں جو مسئلہ قرآن یا احادیث سے، قطعی الدلالت سے ثابت ہو جائے اس میں کبھی ائمہ کا اختلاف نہیں ہوتا۔ مثلاً: چوبیس گھنٹے کے اندر پانچ نمازیں فرض ہیں۔ تو کسی امام نے یہ نہیں کہا کہ چھ نمازیں فرض ہیں۔ فجر کی نماز میں دو رکعت ہیں۔ کسی امام نے یہ نہیں کہا کہ تین یا چار رکعات پڑھو۔ اختلاف وہاں ہوتا ہے جہاں اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور جب اجتہاد کریں گے تو لازمی بات ہے کہ ہر آدمی کے علم وفہم میں فرق ہے۔

قرآن میں مثالیں کیوں دی جاتی ہیں؟

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بڑی عظیم مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ کہیں تمثیلات اور کہیں کنایات ہیں؛ کیونکہ یہ سب فصاحت وبلاغت کا انداز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: ﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾[الحشر:۲۱] یہ مثالیں ہم اس لیے بیان کرتے ہیں، تاکہ لوگ تفکر وتدبر کریں اور بات کو سمجھیں؛ کیونکہ دنیا کے اندر یہ قاعدہ ہے کہ مثال کے ساتھ بات بڑی آسانی سے سمجھ آجاتی ہے۔ یہاں ''حَبْل (رسی)'' ایک بڑی عظیم مثال ہے؛ کیونکہ تمام نزولِ وحی آسمانوں سے ہے، اتنی بلندی سے ہے اور جنت کا مقام بھی آسمانوں میں ہے تو اپنے بلند مقام پر پہنچنے کے لیے اسباب میں سے کسی سبب کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک رسی کی مثال بیان فرمائی ہے کہ تم رسی کو پکڑ کر بلندی پر پہنچ جاؤ۔ اور ساتھ یہ بھی اشارہ فرمادیا کہ جیسے سیڑھیوں سے چڑھنا تو بڑا آسان ہے، لفٹ لگی ہوئی ہو تو آسانی ہے، لیکن رسی کو پکڑ کر چڑھنا ذرا مشکل ہے۔ اس لیے اشارہ فرمادیا کہ جنت کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس کے لیے آدمی محنت کرنی پڑے گی۔ جب رسی سے چڑھنے والوں کی ایکسر سائز ہو جائے تو وہ ایک منٹ میں چڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے جو جنت والے اور ایمان والے ہیں ان کو بھی اس رسی کے پکڑنے اور محنت کی عادت ہو جائے گی، پھر ان کے لیے مشقت نہیں ہوگی۔ جیسے ایک آدمی کو نماز کی عادت ہے، اس کے لیے کوئی مشقت نہیں ہے، لیکن جو نماز نہ پڑھتا ہو اور اس کو آپ نماز پڑھائیں تو اس کو ایک سو چار کا بخار ہو جاتا ہے۔

دوسرا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ایسی رسی نہیں ہے جو بوسیدہ ہو جائے یا ٹوٹ جائے، بلکہ یہ ''حَبْلِ اللهِ'' ہے، اس کے ٹوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے تم یہ غم کرو کہ تم سے چھوٹ نہ جائے۔

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا﴾ تم سب کے سب اس طرح رسی کو مضبوطی سے تھام لو تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تمہیں جنت کی بلندیوں تک پہنچا دیں گے۔ اس کے اندر حکم دیا کہ سب مل کر رسی کو تھام لو؛ کیونکہ جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اور اللہ کی رحمت ہے۔ اتفاق میں برکت ہے۔ ﴿وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ تم ہرگز آپس میں پھوٹ نہ ڈالو، جھگڑے نہ ڈالو۔ ﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ﴾ اور اس کے بعد تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو۔

''حَبْلِ اللهِ'' سے کیا مراد ہے؟ منکرین حدیث کا رد:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ''حَبْلِ اللهِ'' سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا قرآن اللہ کی رسی

ہے اور یہ ایسی مضبوط رسی ہے جو کبھی ٹوٹتی نہیں ہے اور یہی صراط مستقیم ہے۔ [ترمذی، رقم:۲۹۰۸]

(حدیث) حضرت ابو سعید ﷛ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((كِتَابُ اللهِ حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ)) اللہ تعالیٰ کا قرآن ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمانوں سے زمین تک دراز ہے۔
[ترمذی، رقم:۳۷۸۸]

بعض لوگوں نے اس آیت کو لے کر یہ کہہ دیا کہ صرف اللہ تعالیٰ کے قرآن میں نجات ہے، اس لیے قرآن کے بعد حدیث کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح آدمی بھٹک جاتا ہے۔

اسی لیے علماء فرماتے ہیں کہ عالم سے مسئلہ پوچھو، حدیث کا معاملہ ہے تو محدثین سے رجوع کرو اور اگر رجال کا معاملہ ہے تو اصحاب الجرح والتعدیل سے رجوع کرو۔ وہ بتائیں گے کہ یہ ثقہ ہے یا ثقہ نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی فقہ کا مسئلہ درپیش آجائے تو فقہاء سے پوچھو؛ کیونکہ جب آدمی کا دامن نیچے سے مضبوط چلا جائے اور کڑی سے کڑی ملتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ٹوٹتی نہیں اور اگر آدمی نے آخری منزل کی کڑی کو پکڑ لیا۔ جب تک پکڑے ہوئے ہے تو ٹھیک ہے؛ کیونکہ وہ کڑی بھی اسی راستے کی ہے، لیکن اللہ نہ کرے اگر اس کڑی سے ہاتھ چھوٹ گیا تو بات ختم ہوگئی؛ کیونکہ وہ باقی کڑیاں خود چھوڑ چکا ہے۔ مثلاً: میرے سامنے کوئی میرے شیخ کی بات نقل کرے تو میرے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ میں اپنے استاذ کی بات کو نہیں ٹھکراؤں گا۔ میرے استاذ بڑے عالم ہیں، وہ کوئی غلط بات نہیں کہتے تو میں جب اپنے استاذ کی بات کو رد نہیں کر سکتا تو امام ابو حنیفہ ﷫ کی بات کو کیسے رد کر سکتا ہوں؟ اور جب میں امام ابو حنیفہ ﷫ کی بات کو رد نہیں کر سکتا تو صحابہ کی بات کو کیسے رد کر سکتا ہوں؟ کیونکہ انہوں نے براہِ راست حضور اکرم ﷺ سے پڑھا ہے اور جو آدمی حضرت عبد اللہ بن عباس ﷠، عبد اللہ بن مسعود ﷛، خلفائے راشدین ﷢، ابی ابن کعب ﷛، زید بن ثابت ﷛ وغیرہ کے قول کو نہیں چھوڑ سکتا تو وہ کیا کبھی محمد مدنی ﷺ کے قول سے منہ موڑ سکتا ہے؟ ٹھنڈے دل سے بات کو سوچیں کہ جب ہم ایک صحابی کی بات کو نہیں چھوڑ سکتے تو اللہ تعالیٰ کے نبی کی بات آجائے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کی بات کا انکار ہو۔ اور جب ہم حضور اکرم ﷺ کی بات پر جان دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی بات کو کیسے ٹال سکتے ہیں؟ اس لیے سند کا سلسلہ ہوتا ہے، تاکہ کڑی ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہوئے حضور پاک ﷺ تک پہنچ جائے۔

اور اگر درمیان میں ساری کڑیاں نکال دیں اور کوئی یوں کہے کہ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے تو ٹھیک ہے۔

بہر حال آپ نے جو بات کی ہے وہ صحابی کی بات ہے، اس طرح صحابہ تک کی کرلی اور حضور اکرم ﷺ تک پہنچ گئے۔ اب جب حضور اکرم ﷺ کی بات کہیں سمجھ نہ آئی تو کہہ دیا کہ حضور اکرم ﷺ کا فرمان سر آنکھوں پر، لیکن حضور اکرم ﷺ بھی تو قرآن کے تابع ہیں، پہلے مجھے قرآن دکھاؤ تو یہاں مزید الجھ گئے، اسی لیے بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کے دماغوں میں ٹھوکر لگی۔ تو انہوں نے کہا: ہم قرآن کے سوا کوئی بات نہیں مانتے؛ کیونکہ "حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِیْنِ" قرآن ہے۔ ہم تو قرآن کو مانتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قران کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ یہ تو اچھی بات ہے، لیکن دوسری بات کفر ہے کہ نبی کی بات ہم نہیں مانتے، حالانکہ قرآن سمجھانے والے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ جن پر قرآن اترا، جن پر شریعت نازل ہوئی اور جنہوں نے قرآن سمجھایا اگر تم ان کے فرمان کو نہیں مانو گے تو قرآن کہاں سے سمجھو گے؟ حدیث تو قرآن کی شرح ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی وحی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ [النساء:٨٠] جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، ﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى ۝﴾ [النجم:٣،٤] حضور اکرم ﷺ نہیں بولتے اپنی خواہش سے، مگر جو بولتے ہیں وہ ان کی طرف وحی کی جاتی ہے۔ حضور پاک ﷺ جو فرما رہے ہیں وہ اس رب کی بات ہے، سمجھانے والے محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

تین پسندیدہ اور تین ناپسندیدہ چیزیں:

(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَرْضَى لَكُمْ ثَلَاثًا، وَيَسْخَطُ لَكُمْ ثَلَاثًا، يَرْضَى لَكُمْ أَنْ تَعْبُدُوهُ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، وَأَنْ تَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا، وَأَنْ تُنَاصِحُوا مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ أَمْرَكُمْ، وَيَسْخَطُ لَكُمْ قِيلَ: وَقَالَ: وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ، وَإِضَاعَةَ الْمَالِ)) [مسلم، رقم:١٧١٥، تفسیر ابن کثیر]

تین چیزیں ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہوتے ہیں اور تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں:

- ......پہلی بات جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں کہ اس کی خالص عبادت کرو اور اس کا شریک نہ کرو۔
- ......اور دوسری بات جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو مضبوطی سے پکڑ لو، فرقہ بندی میں

نہ پڑو۔

❁ اور تیسری بات یہ ہے کہ جو تمہارا حاکم بنے اس کی خیر خواہی اور اطاعت کرو، اس کے خلاف بغاوت نہ کرو؛ کیونکہ جب لوگ اولوالامر کی اطاعت سے نکلتے ہیں تو فتنے پیدا ہوتے ہیں اور ان فتنوں میں اتنی ہلاکت ہے کہ جس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اور اولوالامر سے مراد حاکم اور علماء ہیں۔ اگر ان میں کوئی غلطی بھی ہے تب بھی آپ اطاعت نہ چھوڑیں۔ اللہ نہ کرے اگر وہ کھلے کفر کا حکم دیں، مثلاً: کہیں کہ نماز نہ پڑھو تو پھر ہم ان کی اطاعت نہیں کریں گے۔

اور وہ تین چیزیں جس سے میرا رب ناراض ہوتا ہے:

❁ پہلی چیز قیل وقال ہے کہ میں نے سنا ہے، کسی نے کہا ہے، بزرگوں نے فرمایا: ہے۔ یہ پتہ نہیں کہ کون سے بزرگوں نے فرمایا: ہے؟

❁ دوسری چیز بہت زیادہ سوالات کرنا۔

❁ اور تیسری چیز مال ضائع کرنا، یعنی فضول خرچی کرنا وغیرہ۔

ایمان کی حالت میں مرنے کا حکم:

﴿وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ﴾ [آل عمران: ۱۰۲]

تم ہمیشہ ایمان واسلام پر قائم رہو، تاکہ تمہاری موت اسلام پر آئے؛ کیونکہ جو آدمی جس حال پر ہوتا ہے اس حالت میں اس کو موت آتی ہے اور اسی حالت پر اٹھایا جائے گا۔ یہ اگر مومن ہو کر مرا ہے تو قبر سے ایمان کی حالت میں اٹھے گا۔ اگر خدانخواستہ کفر پر موت آئی ہے تو قبر سے کفر کی حالت میں اٹھے گا۔ ہمارے بس میں تو نہیں ہے کہ ہم مسلمان ہو کر مریں؛ کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ﴾ [لقمان: ۳۴] کسی بندے کو یہ بھی پتہ نہیں کہ کل کیا ہوگا؟ کسی بندے کو یہ بھی پتہ نہیں کہ میری موت کہاں آئے گی؟ کب اور کیسے آئے گی؟ لاکھوں لوگوں نے اپنی پوری زندگیاں اللہ تعالیٰ کے حرم میں گزار دیں، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں گزار دیں، لیکن وہاں موت نصیب نہ ہوئی۔ اور کتنے لوگ ہیں جو ساری زندگی میں ایک دفعہ عمرے کے لیے آئے، ان کو حرم میں موت نصیب ہوگئی۔ ہدایت اور غوایت (گمراہی) یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، لیکن ہمیں حکم ملا ہے ﴿وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] کہ تم اپنی طرف سے

اسلام پر جمے رہو؛ کیونکہ بظاہر حالات یہی ہیں کہ جو آدمی جس حالت پر ہوتا ہے اسی پر اس کو موت آتی ہے۔ مثلاً: ایک آدمی نمازی ہے تو اکثر اس کو موت اس حالت پر آتی ہے۔ اور اللہ نہ کرے اگر ایک آدمی شرابی ہے تو اس کو موت بھی اس حالت میں آتی ہے۔

﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ ۝ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝﴾ [آل عمران: ۱۰۴تا۱۰۹]

''اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جن کے پاس کھلے کھلے دلائل آچکے تھے، اس کے بعد بھی انہوں نے آپس میں پھوٹ ڈال لی اور اختلاف میں پڑ گئے۔ ایسے لوگوں کو سخت سزا ہوگی۔ اس دن جب کچھ چہرے چمکتے ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ پڑ جائیں گے۔ چنانچہ جن لوگوں کے چہرے سیاہ پڑ جائیں گے ان سے کہا جائے گا: کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا؟ لو پھر اب مزہ چکھو اس عذاب کا، کیونکہ تم کفر کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف جن لوگوں کے چہرے چمکتے ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں جگہ پائیں گے، وہ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ اور اللہ دنیا جہان کے لوگوں پر کسی طرح کا ظلم نہیں چاہتا۔ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے، اللہ ہی کا ہے اور اسی کی طرف تمام معاملات لوٹائے جائیں گے۔''

اس امت کے لیے دعوتِ دین کی ذمہ داری:

دوسرا حکم دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو، یعنی قرآن پاک کو مضبوطی سے پکڑو۔ اب ہمیں ہدایت

مل گئی تو اس کے بعد یہ حکم ہوا: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ بعض مفسرین نے فرمایا: امت سے مراد علماء کاملین ہیں؛ کیونکہ جب تک بندہ خود پہلے عالم نہ ہو تو کسی دوسرے کو کیسے ہدایت کرے؟ جب تک بندہ خود عامل نہ ہو تو کسی دوسرے کو عمل کی ہدایت کیسے کرے؟ جب تک کامل لذاتہ نہ بنے اس وقت تک کامل لغیرہ کیسے بن سکتا ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو چالیس چالیس سال عبادت وریاضت کرائی، اس کے بعد ان کے نبی ہونے کی ان کو خبر دی گئی۔ اور پھر بھی حکم ملا: ﴿يٰٓأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ إِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝﴾ [المزمل: ۱ تا ۴] اے میرے نبی! جاگو؛ کیونکہ اب ہم آپ پر بہت بڑی عظمت والا اور بہت بڑا معنوی بوجھ، یعنی ذمہ داری اتارنے والے ہیں۔

دین کی دعوت کی ذمہ داری کس پر ہے؟

بعض مفسرین نے فرمایا: اس سے مراد امراء ہیں کہ اللہ تعالیٰ جن کو امارت وحکومت دے ان کو چاہیے کہ لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائیں۔ معروف کا حکم دیں اور منکر سے منع کریں۔

اور بعض ائمہ نے فرمایا: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ﴾ کو دوسری آیت کی روشنی میں دیکھیں ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ [آل عمران: ۱۱۰] اور تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾ [العصر: ۱ تا ۳] اس سے علماء نے مسئلہ نکالا ہے کہ امت کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو امر بالمعروف کرے، لیکن آگے جا کر درجات علیحدہ ہو جائیں گے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے اس آیت کو اس طرح سمجھایا کہ ((مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ)) [مسلم، رقم: ۴۹]

برائی کو روکنے کے تین درجات:

تم میں سے کوئی شخص اگر برائی دیکھے تو اس کو قوت کے ساتھ مٹا دے، اگر طاقت نہیں رکھتا تو زبان سے نصیحت کرے اور اگر زبان سے بھی کہنے کی طاقت نہیں، ڈرتا ہے تو کم از کم دل میں تو برائی کو برا سمجھے۔

محدثین نے فرمایا: طاقت سے برائی کو مٹانا امراء کا کام ہے، زبان سے برائی کو مٹانا علماء اور خطباء کا کام ہے اور دل سے برا سمجھنا یہ سب کا کام ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا: امت کا ہر فرد تبلیغ کا پابند ہے۔ بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے منع کرے۔ اگر ایک آدمی کو اذان آتی ہے تو لوگوں کو اذان سکھائے اور اگر ایک آدمی کو نماز آتی ہے تو لوگوں کو نماز سکھائے۔ لوگوں کو کہے کہ حضور پاک ﷺ کی شکل بناؤ اور کافروں کی شکل نہ بناؤ، حضور پاک ﷺ کا لباس پہنو اور کافروں کا لباس نہ پہنو۔ کوئی ڈاکہ ڈال رہا ہے منع کرو، کوئی نشہ کرتا ہے اس کو منع کرو۔ تو برائی سے روکنا ہر آدمی کا کام ہے۔

آج کل ایک وبا پھیل گئی ہے کہ اگر آپ ایک فلیٹ میں رہتے ہیں اور سامنے والے فلیٹ میں برائی ہو رہی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ان کو چھوڑ دو اور اپنے کام سے کام رکھو، تمہیں کسی کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے؟ حالانکہ یہ بات اسلام کے خلاف ہے؟ کیونکہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اچھائی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔

برائی سے نہ روکنے سے تباہی کی ایک مثال:

حضور اکرم ﷺ نے اس کی بڑی پیاری مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک کشتی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں: ایک اعلیٰ حصہ ہے اور ایک نیچے والا حصہ ہے۔ کچھ لوگ نیچے والی منزل میں ہیں اور کچھ لوگ اوپر والی منزل میں ہیں۔ نیچے والوں کو پانی کے لیے اوپر جانا پڑتا ہے کہ اوپر پانی کا انتظام ہے تو اوپر والے غصے میں آگئے اور انہوں نے کہا کہ یہاں سے پانی مت بھرو۔ اب نیچے والوں نے فکر کی کہ وہ ہمیں پانی نہیں بھرنے دیتے اور پانی کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ بہر حال ہم پانی کے تو بالکل قریب ہیں کہ ہم نیچے ہیں، لہٰذا کشتی میں ایک سوراخ کرتے ہیں، پانی اندر آجائے گا یہاں بیٹھے بیٹھے پیتے رہیں گے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اگر وہ ایسا کرنا چاہیں اور اوپر والے بھی ان کو نہ روکیں کہ سوراخ کرتے ہیں تو کرنے دو، ہم تو اوپر بیٹھے ہیں تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ کشتی میں پانی بھر جائے گا اور دونوں حصے والے ڈوب جائیں گے۔ اور اگر اوپر والے ان کو کہیں کہ عقل کا کام کرو، یہ کیا کر رہے ہو؟ اگر تم نے سوراخ کیا تو کشتی میں پانی بھر جائے گا، تم بھی مرو گے اور ہم بھی مریں گے۔ ہم تمہارے پانی کا انتظام کر دیتے ہیں، کچھ تم لحاظ کرو اور کچھ ہم لحاظ کرتے ہیں۔ تو دونوں بچ جائیں گے۔

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی برائی ہو رہی ہے تو تم نے نہیں روکا ہے تو یہ نہ سمجھو کہ میرا گھر تو

محفوظ ہے، تیرا گھر بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ [بخاری، رقم:۲۶۸۶] کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ آگ کہیں جلائی جائے تو اس کی گرمی کے اثرات پہنچیں گے۔ اگر کسی ایک جگہ بدبو پڑی ہوئی ہے تو اس بدبو کو جب ہوا اڑائے گی تو باقی لوگ بھی اس سے متاثر ہوں گے۔ ایک آدمی کو بیماری لگے تو وہ جراثیم لاکھوں لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اگر کسی کو ہدایت نہیں کرو گے تو جو کفر و شرک اور بدعات کے اثرات ہیں کیسے اثر نہیں کریں گے؟ اس لیے حکم ہے کہ ہر آدمی کو جتنی توفیق ہے امر بالمعروف کرے اور نہی عن المنکر کرے۔

ایک حدیث مبارک میں یہ الفاظ مبارک بھی آئے ہیں: ((انْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا))[1] اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حیران ہو گئے اور عرض کیا: ہمیں یہ بات تو سمجھ آ گئی کہ مظلوم کی مدد کریں، لیکن ظالم کی مدد کیسے کریں؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظلم کرنے والے کو ظلم کرنے سے روک دیں، یہ اس کی مدد ہے۔ کیونکہ اگر وہ ظلم کرے گا تو دین و دنیا میں تباہ ہوگا۔ جب تم اس کو ظلم سے روک دو گے تو گویا تم نے اپنے بھائی کی مدد کی ہے۔

بنی اسرائیل میں اور اس امت میں فرقوں کی تعداد:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ ہرگز تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ وہ بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئی اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ اور فرمایا: سب کے سب جہنم میں جائیں گے، صرف ایک فرقہ نجات پائے گا۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ کون سا ایک فرقہ ہے جو نجات پائے گا؟ فرمایا: جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقے پر ہے۔ [ابوداؤد، رقم:۴۰۹۷]

اہل سنت والجماعت حق پر ہے:

محققین علماء نے ارشاد فرمایا کہ وہ نجات پانے والا فرقہ اہل سنت والجماعت ہے؛ کیونکہ سنت کا معنی ہے محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اور جماعت سے مراد صحابہ ہیں۔ اب جو سنت سے ہٹ گیا وہ بھی نجات سے ہٹ گیا اور جو صحابہ کی جماعت سے ہٹ گیا وہ بھی نجات سے ہٹ گیا۔ نجات اس کو ملے گی جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑا

---

[1] [بخاری، رقم:۲۴۴۳]

ہے، آپ کے نقشِ قدم پر چلا ہے اور حضور اکرم ﷺ کی پوری زندگی کا نقشہ ہمیں صحابہ سے ملا ہے۔ اس لیے جتنے باطل فرقے ہیں سب سے زیادہ حملہ صحابہ پر کرتے ہیں؛ کیونکہ اصحابِ رسول دین اسلام کے گواہ ہیں، وہ اللہ کے نبی پر وحی اترنے کے گواہ ہیں اور وہ حضور اکرم ﷺ کی شریعت مطہرہ اور دین اسلام کی جزء جزء کے گواہ ہیں۔ جب صحابہ پر ایمان نہیں رہے گا تو دین خود بخود ختم ہو جائے گا۔

مثال کے طور پر: آپ کورٹ کے اندر مقدمہ دائر کریں اور جرح کے اندر آپ کے گواہ جھوٹے ثابت ہو جائیں تو مقدمہ ختم ہو جاتا ہے؛ کیونکہ مقدمہ کی کامیابی کا مدار گواہوں پر ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے فرمان کا مقصد تھا کہ میرا راستہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور صحابہ کا راستہ وہ ہے جو محمد مدنی ﷺ نے سمجھایا ہے۔ اب آپ خود دیکھیں جو لوگ صحابہ سے ہٹتے گئے، کوئی روافض بن گئے، کوئی خوارج بن گئے۔ پھر ان سے آگے فرقے نکلے، کوئی مرجئہ کہلائے، کوئی کرامیہ بن گئے، کوئی قدریہ بن گئے اور کوئی جبریہ بن گئے۔ انہیں سے فرقے بنتے چلے گئے۔

آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ مجتہدین کا اختلاف اصولِ دین میں اختلاف نہیں ہے۔ جو مسئلہ اللہ تعالیٰ کے قرآن کی نص سے ثابت ہے یا فرمانِ رسول پاک ﷺ سے بالکل قطعی الدلالت کے اعتبار سے ثابت ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان کا اختلاف ان مسائل میں ہے جن کے اندر اجتہاد کی ضرورت پڑ گئی یا وہ مسائل جن کے اندر حضور پاک ﷺ کے فرمان کے اندر دو پہلو معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ اصولِ دین میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

قیامت میں اہل سنت کے چہرے روشن اور غلط عقائد والوں کے سیاہ:

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ﴾ [آل عمران:۱۰۶] قیامت کے دن بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض سیاہ ہوں گے۔ علماء نے لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت و ایمان نور ہے اور اس کے مقابلہ پر کفر و بدعات ظلمات ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ اتباعِ سنت والوں کے چہروں پر قیامت کے دن خاص روشنی عطا فرمائیں گے کہ ان کے چہرے دمکتے ہوں گے۔ اور جو لوگ کافر ہیں یا جن لوگوں نے بدعت کو اپنا دین بنالیا ہے، جن لوگوں نے اتباعِ اھواء کی، چونکہ وہ ظلمات میں تھے تو قیامت کے دن بھی ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ واضح کر دیں گے کہ یہ روشن چہرے والے ایمان والے ہیں اور سیاہ چہرے والے بدعت، کفر اور شرک والے ہیں۔

یاد رکھیں! آج بعض اعدائے اسلام ایک ایک موقعے کی انتظار میں ہوتے ہیں کہ اعتراض کریں۔ یہاں انہوں نے کہا کہ اسلام تو بڑا فخر کرتا ہے، ہمارے نزدیک گورے اور کالے کا کوئی فرق نہیں۔ اور قرآن خود فرق کر رہا ہے کہ

قیامت والے دن دو گروہ ہوں گے: ایک سفید چہرے والے ہوں گے اور دوسرے سیاہ چہرے والے ہوں گے۔
یاد رکھیں کہ اسلام کہتا ہے گورے کالے کا فرق نہیں ہے، بلکہ اصل عزت اسلام ہے اور اسلام میں الحمد للہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے سے لے کر آج تک کوئی فرق نہیں ہے، سب ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے ہیں۔ اور کتنے لوگ ہیں کہ پڑھنے والے گورے ہیں اور پڑھانے والا استاذ کالا ہے۔ یہ جو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے یہ یوم الجزاء ہے۔ تو کیا تم اس قید خانہ کی زندگی کو دنیا کی زندگی سے ملاتے ہو؟ تم جو مجرموں کو سزا دیتے ہو اس کا لباس الگ، رہنے کی جگہ الگ، کھانا الگ اور برتن الگ کرتے ہو۔
بعض علماء نے فرمایا: کچھ لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے اور کچھ لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جیسے آج دنیا میں کسی آدمی کو خوشی کی خبر ملے تو اس کا چہرہ کھل جاتا ہے اور کسی آدمی کو مصیبت پڑ گئی، کوئی حادثہ ہو گیا تو وہ کڑھتے کڑھتے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رنگ اڑ گیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ یہ سفیدی اور سیاہی حقیقتاً ہو، بلکہ جو ایمان والے ہیں اس دن ان کے لیے آزادی اور جنت ونعمت ہے، وہ خوش ہوں گے۔ اور جو جہنم والے ہیں، ان پر عذاب اور تکلیف ہے، اس کی وجہ سے وہ پریشان حال ہوں گے، لیکن یہ قول راجح نہیں ہے، بلکہ راجح قول یہ ہے کہ حقیقتاً ان کے چہرے سیاہ وسفید ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بار بار قرآن میں کئی مقامات پر ان کا ذکر فرما دیا ہے۔

کیا صرف مرتدین کے چہرے سیاہ ہوں گے؟

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ [آل عمران:١٠٦] جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے ان کو کہا جائے گا: کیا تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا؟ تو عذاب چکھو بسبب اس کے جو تم نے کفر کیا۔
یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیاہ چہرے تو سب کافروں کے ہوں گے، آیت سے معلوم ہوا کہ صرف ان لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے جو ایمان لانے کے بعد کفر کریں۔
مفسرین، محدثین اور علماء نے اس کے کئی جواب دیئے ہیں:
بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد منافق ہیں کہ وہ بھی ظاہراً ایمان لے آئے، لیکن انہوں نے اپنے اندر کفر کو

چھپائے رکھا۔

اور بعض علماء کرام فرماتے ہیں: اس سے مراد مرتد ہیں۔

اور بعض علماء نے فرمایا: کفر اعتقادی بھی ہوتا ہے اور کفر عملی بھی ہوتا ہے۔ ایک آدمی مسلمان ہے، لیکن کافروں والے عمل کر رہا ہے، خنزیر بھی کھالیتا ہے، سود بھی کھالیتا ہے اور شراب بھی پی لیتا ہے ان کو کہا جائے گا کہ ظالمو! تم نے ایمان لانے کے بعد وہ عمل کیے جو کافروں کے عمل تھے۔ اس وجہ سے تم آج عذاب کا مزہ چکھو۔

اور بعض علماء نے فرمایا: ﴿اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے ایک عہد لیا تھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ﴾ اور سب نے اقرار کیا تھا: ﴿بَلٰى ۚ﴾ [الاعراف: ۱۷۲] اس کے بعد جس نے کفر کیا گویا ایمان کے بعد کفر کیا، لیکن یاد رکھیں! آیت اپنے عموم پر ہے۔ یہ سارے کے سارے جوابات اس کے تحت آجائیں گے۔

فصاحت قرآنی کا بیان:

قرآن میں کئی مقامات پر ''ذُقْ، ذُوْقُوْا'' کے الفاظ آتے ہیں، حالانکہ ذوق کا معنی ہوتا ہے چکھنا۔ قرآن پاک میں جہنمیوں کو حکم دیا گیا: ﴿ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝﴾ [الدخان: ۴۹]، ﴿فَذُوْقُوا الْعَذَابَ﴾ [آل عمران: ۱۰۶] کھانا اور چیز ہے، چکھنا اور چیز ہے اور سونگھنا اور چیز ہے۔

علماء کرام فرماتے ہیں: اس لفظ کو لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ یہ تو ذرا سا عذاب ہے، اس کے آگے بڑا عذاب ہے، اس کو چکھو تو سہی۔

﴿بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝﴾ با سببیہ ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا عدل ہے کہ اللہ تعالیٰ جہاں جہاں مومن کو انعام دیتے ہیں وہاں انعام کی وجوہات کا ذکر زیادہ نہیں فرماتے ہیں؛ کیونکہ بادشاہوں کی شان یہ نہیں ہوتی کہ جس کسی کو انعام واکرام کریں تو یہ بتاتے رہیں، لیکن جب کسی کو سزا دیں تو پھر عدل کا تقاضا ہے کہ اس کا جرم ساتھ بتایا جائے۔ اس لیے جہاں سزا کا ذکر آیا ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ بیان کر دی ہے۔

﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۱۰۷]

اور وہ لوگ جن کے چہرے سفید ہوں گے اور جن کے چہرے پر نور ہوگا ان کے لیے دو نعمتیں ہیں: ﴿فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں ہوں گے اور جنت میں ہوں گے۔ اور دوسری نعمت ہے: ﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾

یہ جنت کی نعمتیں دائمی ہوں گی، یہ نہیں کہ آج دے دو اور کل چھین لو، بلکہ فرمایا: دائمی جنت ملے گی۔ اس سے اشارہ ہو گیا کہ جنت محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ملے گی، ورنہ ہم اگر ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں، شکر ادا نہیں کر سکتے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص بھی جنت میں داخل نہیں ہوگا، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے۔ صحابہ نے عرض کیا: ((وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟)) اے اللہ کے رسول! آپ بھی نہیں؟ فرمایا: مجھے بھی اللہ اپنی رحمت سے ڈھانپ لیں گے، یعنی جنت میں ہر آدمی رحمت سے جائے گا۔ [بخاری، رقم: ۵۶۷۳]

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [آلِ عمران: ۱۰۸] میرے مدنی! یہ اللہ کی آیات، بینات ہیں۔ یہ ہم آپ پر پڑھ رہے ہیں، تاکہ آپ پر دنیا و آخرت کی حقیقت کھول دیں۔ اللہ تعالیٰ نہیں ارادہ فرماتے لوگوں پر ظلم کرنے کا؛ کیونکہ اللہ پاک عادل اور حکیم ہیں، علیم و رحیم ہیں۔ جتنی صفات نقصان والی ہیں اللہ تعالیٰ ان سے پاک ہیں۔ اللہ پاک نے ان کو اتنی سزا اس لیے دی کہ ان کے کفر کا تقاضا یہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی پاک! آپ ان کے احوال کو نہیں جانتے، یہ ہم آپ پر کھول کر پڑھ رہے ہیں، آپ کو ستا رہے ہیں۔

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ [آلِ عمران: ۱۰۹]

اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔ یعنی اگر کوئی جاہل، کوئی کافر یا کوئی باغی یہ الزام لگائے کہ اللہ نے اتنی بڑی اور لمبی جہنم کیوں دے دی؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی! آپ دنیا کو سمجھا دیں کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے تو اگر کوئی اپنے ملک میں کچھ کرے تو کسی کو کیا تکلیف ہے؟

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ [آلِ عمران: ۱۰۴]

حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ امت سے مراد اصحابِ رسول اللہ ﷺ اور مجاہدین ہیں؛ کیونکہ مجاہدین کا جہاد اس لیے ہوتا ہے کہ بھلائی پھیلے اور برائی مٹ جائے؛ کیونکہ جب جہاد کے ذریعے اسلام کو غلبہ نصیب ہوگا تو لازمی بات ہے کہ خیر عام ہوگی اور شر مٹ جائے گا۔

ابو جعفر باقر رحمہ اللہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور پاک ﷺ نے یہ آیت مبارک تلاوت فرمائی: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ پھر ارشاد فرمایا: خیر سے مراد ہے کہ قرآن کی اتباع کریں اور میری سنت کی اتباع کریں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۹۱/۲]

تبلیغ کرنے کا فائدہ اور نہ کرنے کا نقصان:

(حدیث) حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْ لَيُوشِكَنَّ اللّٰهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْهُ ثُمَّ تَدْعُونَهُ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ)) [ترمذی، رقم: ۲۱۶۹] مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! تم امر کرو بھلائی کا اور روکو برائی سے۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے تم پر عذاب بھیجیں۔ اور جب وہ عذاب آئے گا پھر تم اللہ کو پکارو گے، لیکن تمہاری دعائیں قبول نہیں ہوں گی، تمہاری پکاریں نہیں سنی جائیں گی۔

آج دیکھ لیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ لاکھوں مسلمان دعائیں مانگتے ہیں، لیکن دعائیں منظور نہیں ہوتیں؛ کیونکہ ہم نے اللہ کے احکام کو چھوڑ دیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو چھوڑ دیا ہے، ہر آدمی اپنے اپنے مفادات میں الجھا ہوا ہے اور ہر آدمی ذاتی مفادات کو ترجیح دے رہا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ کسی کے گناہ پر اعتراض کریں، آپ کہیں گے: چھوڑو! میں اپنا کام تو کروالوں۔

حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت پر ایک دور ایسا بھی آئے گا کہ لوگ برائی کو برائی نہیں سمجھیں گے۔ مثلاً: اگر آج کوئی آدمی سگریٹ پی رہا ہے تو دیکھنے والا اس کو برا نہیں سمجھتا۔ یعنی سگریٹ اتنی عام ہوگئی ہے کہ کسی کو بری نہیں لگتی۔ کوئی آدمی بیٹھا فلم دیکھ رہا ہے، کسی کو ناگوار بھی نہیں گزرتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ برائی بھلائی بن جائے گی اور بھلائی برائی بن جائے گی۔ آج دیکھ لو کہ جو آدمی روزانہ داڑھی پر استرا پھروائے، تھری پیس سوٹ پہنے اور باقاعدہ ٹائی لگائے، صورت وسیرت، اٹھنا بیٹھنا اور بول چال سے بالکل انگریز نظر آئے تو لوگ کہتے ہیں: یہ بڑا آدمی ہے۔ اس کے مقابلہ پر ایک آدمی پنڈلیوں تک چادر باندھے ہوئے، سر پر پگڑی ہو، جیب میں مسواک ہو اور بڑی داڑھی ہو تو اس کے بارے میں لوگ ...... نعوذ باللہ ...... کہہ دیتے ہیں کہ یہ داڑھی ہے یا جھاڑی ہے۔ جو آدمی اس دور میں انتہائی جھوٹ بولتا ہو، بہت بڑا مکار اور

بڑا دھوکے باز ہو، لوگ کہتے ہیں کہ یہ بڑا سیاست دان ہے کہ اپنے مخالف کو ایک منٹ میں بے وقوف بنالیتا ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں ایک آدمی سارا دن قرآن پڑھنے والا ہو اور جھوٹ نہ بولتا ہو، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تو اس دور میں چلنے کے قابل نہیں ہے اور یہ تو زندگی میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اس طرح گھروں پر نظر ڈالیں کہ جو عورتیں پردہ دار، شرم والی ہیں، تہجد گزار ہیں، قرآن پڑھنے والی ہیں اور سادہ لباس پہنتی ہیں، اس سے سارے گھر والے تنگ ہیں کہ ہم نے تو سوچا تھا ہمارا بیٹا شادی کرے گا، یہ تو ملانی پکڑ کر گھر میں لایا ہے، روز وظیفے پڑھ رہی ہے اور اسی وجہ سے ہم پر عذاب آرہے ہیں۔ اس کے مقابلہ پر اگر کوئی آدمی ایسی لڑکی لے آئے جو بالکل بے حیا ہو، جس کی آنکھوں میں شرم کا شائبہ نہ ہو، بال کٹواتی ہو، ہر کسی کے ساتھ ہاتھ ملاتی ہو، ہر کسی کے ساتھ باہر جا کر پھرتی ہو اور ڈانس کرتی ہو تو کہتے ہیں: بڑی سوشل عورت ہے۔ اس لڑکے نے اس کے ساتھ شادی کی ہے، اس عورت نے اس کو اونچا کر دیا ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ کا فرمان سچا ہے کہ برائی بھلائی بن جائے گی اور بھلائی برائی بن جائے گی۔ ہم تو...... نعوذ باللہ...... اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں کہ برائی کرنے کے بعد دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر فخراً بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایسے زنا کیا ہے اور ایسے شرب پی ہے۔ حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اللہ کی غیرت کو چیلنج کر رہا ہے۔ اگر غلطی ہوگئی ہے تو اس کو چھپاؤ، اس پر پردہ ڈالو، یہ نہیں کہ اس پر تماشہ بناؤ اور فخر جتاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ڈیڑھ ارب مسلمان ہر جگہ ذلیل ہو رہا ہے۔

کافروں پر گناہوں کے باوجود اللہ کا عذاب کیوں نہیں آتا؟

بعض لوگ یہاں یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کافر بھی تو خدا کو مانتے ہیں، وہ بھی زنا کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور کھلم کھلا سڑکوں پر گناہ کرتے ہیں تو ان پر تو ایسے عذاب نہیں آتے؟ یاد رکھیں! کافروں کے ساتھ کافروں والا معاملہ کیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ مسلمانوں والا معاملہ کیا جاتا ہے۔ مسلمان جب اللہ تعالیٰ کو مان کر انکار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو قہر آجاتا ہے، جبکہ کافر تو کافر ہے، اس کے لیے دنیا میں جنت ہے، کھائے پیئے مزے کرے۔ مثال کے طور پر: اگر سڑک پر جانے والا آدمی تمہیں گالی دے دے تو تمہیں تکلیف نہیں ہوگی، لیکن جب تمہارا بھائی، تمہارا شاگرد یا تمہارا بیٹا تمہیں گالی دے تو تم کہتے ہو کہ آج میرا دل پھٹ گیا ہے۔ اس لیے جب ہم بھی مسلمان بن کر غداری کرتے ہیں تو زیادہ عذاب کے مستحق بن جاتے ہیں۔

فرقوں کی تعداد اور حق جماعت:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝﴾

[آل عمران:۱۰۵]

اے امت محمد مصطفیٰ ﷺ! تم بھی پہلی امتوں کی طرح نہ ہو جانا، جیسے پہلی امتیں اختلاف میں پڑ گئیں اور وہ بہتر فرقوں میں بٹ گئے، تم بھی ایسے نہ ہو جانا۔ انہوں نے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیا۔ بلکہ انہوں نے اپنے قاعدے بدل ڈالے۔ اگر کوئی امیر آدمی گناہ کرتا تو اس کے لیے الگ سزا ہوتی اور اگر کوئی غریب آدمی گناہ کرتا تو اس کے لیے الگ سزا ہوتی۔ اب تم بھی ایسا کرو گے تو تمہارا انجام بھی اسی طرح ہوگا جو پہلی امتوں کا ہو چکا ہے۔ اور انہوں نے افتراق و اختلاف تب کیا جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی نشانیاں آ گئیں، اللہ کے پیغمبر اور اللہ کے نبی ان کے پاس آئے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے فرقہ بندی اختیار کر لی۔

(حدیث) ابو عامر عبداللہ بن لحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم نے حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کے زمانے میں ان کے ساتھ حج کیا۔ جب ہم مکہ میں آئے اور آپ نے ظہر کی نماز ادا کی تو آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: تھا:

((إِنَّ أَهْلَ الْكِتَابَيْنِ افْتَرَقُوا فِي دِينِهِمْ عَلَى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً، وَإِنَّ هٰذِهِ الْأُمَّةَ سَتَفْتَرِقُ عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ مِلَّةً يَعْنِي الْأَهْوَاءَ، كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةٌ وَهِيَ الْجَمَاعَةُ وَإِنَّهُ سَيَخْرُجُ فِي أُمَّتِي أَقْوَامٌ تُجَارَى بِهِمْ تِلْكَ الْأَهْوَاءُ كَمَا يَتَجَارَى الْكَلْبُ بِصَاحِبِهِ، لَا يَبْقَى مِنْهُ عِرْقٌ وَلَا مَفْصِلٌ إِلَّا دَخَلَهُ، وَاللهِ! يَا مَعْشَرَ الْعَرَبِ! لَئِنْ لَمْ تَقُومُوا بِمَا جَاءَ بِهِ نَبِيُّكُمْ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَغَيْرُكُمْ مِنَ النَّاسِ أَحْرَى أَنْ لَا يَقُومَ بِهِ)) [سنن ابی داؤد، رقم:۴۵۹۷]

مجھ سے پہلے جو امتیں تھیں وہ بہتر فرقوں میں بٹ گئیں اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹے گی۔ اور تمام کے تمام فرقے جہنمی ہوں گے، مگر ایک فرقہ اور وہ جماعت ہے (اہل سنت والجماعت ہے)۔ عنقریب میری امت میں ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جو اپنی خواہشات کے پیچھے چلیں گے۔ ان کی خواہشات ان کے اندر ایسے سرایت کر جائیں گی جیسا کہ کتا۔ اپنے ساتھی کے ساتھ کوئی رگ باقی نہیں ہوگی، کوئی جوڑ باقی نہیں ہوگا جس میں ان کی خواہشات کا دخل نہ ہو جائے، یعنی جیسے کسی کو کتا کاٹ لے تو اس کی رگ رگ میں زہر پھیل جاتا ہے، اسی طرح اہل بدعت کی رگ رگ

میں بدعت کا زہر پھیل جاتا ہے۔ اوپر والی حدیث کو بیان کر کے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم ہے! اے عرب والو! اگر تم نے بھی اپنے نبی کی سنت پر عمل نہ کیا تو جو غیر ہیں وہ کیسے عمل کریں گے؟ یعنی تم عرب ہو اور تمہارے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بھیجا۔

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١١٠﴾ لَنْ يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ﴿١١١﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿١١٢﴾﴾ [آل عمران: ۱۱۰ تا ۱۱۲]

”(مسلمانو!) تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے وجود میں لائی گئی ہے، تم نیکی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو یہ ان کے حق میں کہیں بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ تو مومن ہیں، مگر ان کی اکثریت نافرمان ہے۔ وہ (یہودی) تھوڑا بہت ستانے کے سوا تمہیں کوئی نقصان ہرگز نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور اگر وہ تم سے لڑیں گے بھی تو تمہیں پیٹھ دکھا جائیں گے، پھر انہیں کوئی مدد بھی نہیں پہنچے گی۔ وہ جہاں کہیں پائے جائیں، ان پر ذلت کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہے، الا یہ کہ اللہ کی طرف سے کوئی سبب پیدا ہو جائے یا انسانوں کی طرف سے کوئی ذریعہ نکل آئے جو ان کو سہارا دیدے۔ انجام کار وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں اور ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ (نیز) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور ساری حدیں پھلانگ جایا کرتے تھے۔“

خلاصہ وربطِ آیات:

ان آیات مبارکہ میں امت محمد مصطفیٰ ﷺ کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت ہے کہ جتنی امتیں گزری ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام امم میں سب سے خیر، سب سے افضل اور

سب سے بہتر امت امت محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔

گزشتہ تمام آیات کو ذہن میں رکھیں تو آپ کو یہ فضیلت آسانی سے سمجھ آجائے گی کہ سورۃ آلِ عمران کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ عیسائیوں کا مناظرہ کیا، حتیٰ کہ مباہلہ تک کی کچھ تفصیل بیان فرمائی۔ اس میں ابطالِ نصرانیت اور حقانیتِ اسلام کا ثبوت تھا۔ اس کے بعد یہود کے شبہات، اعتراض کا جواب تھا، یعنی ابطالِ یہودیت اور حقانیتِ اسلام کا بیان تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی افضلیت کا ذکر فرمایا اور اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ثابت کیا کہ دین اسلام حق ہے، اب یہودیت و نصرانیت ختم ہو چکی ہے، اب دین اسلام کے سوا نجات نہیں مل سکتی۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی بیان فرمایا کہ ہم نے سب سے افضل نبی بھی یہیں پیدا کیا اور سب سے افضل گھر بھی ہم نے یہیں رکھا ہے۔ اور یہ ساری فضیلتیں امت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملی ہیں۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جتنے ادیان اور کتابیں اتاری ہیں سب اپنے اپنے وقت پر منسوخ ہو گئیں، لیکن یہ شرف بھی امت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا نبی دیا ہے جس کے بعد نبوت اور رسالت ختم ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسی کتاب نصیب کی ہے کہ جس کے بعد کتاب ختم ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسی شریعت نصیب فرمائی ہے کہ جس کے بعد شریعت ختم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو خطاب کرنے کے بعد ان کی دو برائیوں کا ذکر کیا کہ وہ خود کفر کرتے تھے اور لوگوں کو بھی روکتے تھے۔ اور امت محمد مصطفیٰ ﷺ کی اللہ نے فضیلت بیان کی ہے۔

فضیلتِ امت محمدیہ:

یہ ایسی امت ہے جو لوگوں کی خیر کی طرف بلاتی ہے اور خود بھی ایمان رکھتی ہے۔ اور اس کے بعد عظمتِ کتاب کا ذکر تھا کہ ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا﴾ [آل عمران: ۱۰۳] اس قرآن کو جو پکڑے گا وہ نجات پا جائے گا۔ ان ساری عظمتوں کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ.....﴾ [آل عمران: ۱۱۰] اے میرے نبی! اپنی امت کو خوشخبری دیں کہ جب نبی سب سے افضل ہے تو امت بھی سب سے افضل ہے۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((نَحْنُ الْآخِرُونَ الْأَوَّلُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَنَحْنُ أَوَّلُ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ)) آخر بھی ہم ہیں اور قیامت کے دن سب سے پہلے بھی ہم ہوں گے اور ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ [مسلم، رقم: ۸۵۵]

حضور ﷺ کی چند خصوصیات:

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسی نعمتوں اور انعام سے نوازا ہے جو پہلے کسی نبی کو نہیں ملا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: ((نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ)) اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دلوں میں میری ہیبت ڈال دی ہے۔ [بخاری، رقم: ۳۳۵]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے زمین کی کنجیاں دی گئی ہیں اور میرا نام احمد رکھا گیا ہے اور میرے لیے مٹی کو طہارت کا سبب بنایا گیا ہے اور میری امت کو خیر الامم بنایا گیا ہے۔ [مسند احمد: ۱/ ۹۸]

اس امت کے شرف کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بلال کہاں ہے؟ حضرت بلال حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: آج تم کعبۃ اللہ کی چھت پر چڑھ جاؤ اور کعبہ کی چھت پر کھڑے ہوکر اذان کہو۔

محدثین وعلماء نے اس کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ اذان اونچے مقام پر ہو۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ آج کافروں کو پتہ چل جائے کہ جس کعبہ میں تم ہمیں نماز نہیں پڑھنے دیتے تھے، جس کعبہ میں تم ہمیں داخل نہیں ہونے دیتے تھے اور جس کعبہ میں اللہ کے نبی کا داخلہ بند تھا، آج اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عزت دی کہ اذانیں کعبہ کی چھت کے اوپر ہو رہی ہیں۔

اسلام میں کوئی کالے گورے کا فرق نہیں:

محدثین نے لکھا ہے کہ اس سے اللہ کے نبی نے ایک اور بھی اشارہ فرمایا ہے کہ اگر کعبہ پر اذان دینی تھی حضور پاک ﷺ خود کھڑے ہوکر اذان دے دیتے یا آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دے سکتے تھے، حضرت عمر، عثمان وعلی رضی اللہ عنہم کو حکم دے سکتے، لیکن آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اونچا کیا اور اس سے اشارہ کیا کہ لوگو! دیکھ لو! میری امت کا صحابی جو رنگ میں کالا ہے، لیکن اس کی شان آج کعبہ سے بھی بلند ہے۔ اور اسی کے اندر آپ نے قیامت تک پوری دنیا کو سبق دیا کہ میں وہ سچا نبی ہوں جو گورے اور کالے کی تمیز کو مٹانے آیا۔ آج میری فتح کا دن ہے۔ اگر چاہتا تو قریشیوں کو کھڑا کر دیتا یا سرخ رنگ والوں کو کھڑا کر دیتا، لیکن میں نے کالے بلال کو کھڑا کیا ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں کوئی رنگ کا جھگڑا نہیں ہے، کوئی قوم کا جھگڑا نہیں ہے اور کوئی لسانی تعصب

نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اسلام سے جس کو چاہیں اونچا کر دیں اور جس کو چاہیں نیچا کر دیں۔

امت محمدیہ ﷺ کی خصوصیات:

1 ......اسی طرح دیکھیں کہ جب حضور اکرم ﷺ نے پہلی امتوں کا ذکر فرمایا کہ ان کی عمر پانچ سو سال یا اس سے بھی بڑی عمر کے لوگ گزرے ہیں تو صحابہ نے حیران ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم ان کا مقابلہ کیسے کریں گے؟ کیونکہ ہماری عمر تو ساٹھ ستر سال ہے یا زیادہ سے زیادہ سو سال تک ہوتی ہے تو ہم ان کا مقابلہ کیسے کریں گے کہ ایک آدمی نے تو ہزار سال نماز پڑھی اور ایک آدمی نے پینتیس سال نماز پڑھی ہو؟ حضور اکرم ﷺ کے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا اشکال تو ٹھیک ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۃ القدر نازل فرمائی اور فرمایا: آپ کی امت کی عمر تو کم ہے، لیکن میں سال میں ایک رات لیلۃ القدر کی پیدا کروں گا۔ اگر تیری امت اس رات عبادت کرلے تو وہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ ہم لیلۃ القدر میں ساری رات جاگتے رہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نصیب کرے تو الحمد للہ، ورنہ جو شخص عشا کی نماز جماعت سے پڑھے اور اس کے بعد تراویح بھی ادا کرے اور فجر کی نماز بھی جماعت کے ساتھ پڑھے، الحمد للہ اس کو لیلۃ القدر کا بہت بڑا حصہ مل گیا۔ تو یہ شرف بھی امت مصطفیٰ ﷺ کو ملا ہے۔

2 ......علماء اور محدثین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی امتیں پیدا کی ہیں حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک جتنی کتابیں اتری ہیں، ان کتابوں کے حافظ صرف نبی ہوتے تھے، نبی کے علاوہ کوئی حافظ نہیں ہوتا تھا۔ الا قلیل۔

آج بھی آپ دیکھ لیں کہ نصرانی ہوں یا یہودی ہوں، ان کو اپنے مذہب پر بڑا ناز ہے۔ ان سے کہو کہ ایک انجیل کا حافظ پیدا کر کے دکھاؤ، جبکہ تم کہتے ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام پر اتری ہے تورات کا دعویٰ کرتے ہو کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور یہ وہی کتاب ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو ملی تھی تو پوری دنیا میں ایک تورات کا حافظ لے آؤ۔ یہ شرف بھی اللہ تعالیٰ نے امت محمد مصطفیٰ ﷺ کو دیا ہے کہ جیسے آپ کے سینے میں قرآن محفوظ ہے، امت کے سینے میں بھی قرآن محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت میں لاکھوں قاری پیدا کر لیے، کروڑوں حافظ پیدا ہوئے۔

3 ......اور اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے نبی گزرے ہیں سب برحق ہیں اور

جتنے اللہ تعالیٰ نے ان پر احکام نازل کیے سب برحق ہیں، لیکن ان کتابوں میں جب اللہ تعالیٰ خطاب فرماتے تو صرف نبی کو خطاب فرماتے تھے۔

﴿يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ﴾ [مریم:۷]

﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ﴾ [مریم:۱۲]

﴿وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴾ [الصافات:۱۰۴]

اسی طرح جتنے انبیاء ورسول گزرے ہیں اللہ تعالیٰ خطاب نبی کو فرماتے تھے، لیکن یہ شرف امت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کو بھی خطاب کیا اور امت کو بھی براہِ راست خطاب کیا ہے اور کسی امت کو یہ شرف نہیں ملا ہے۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ بھی اللہ تعالیٰ نے میری امت پر رحم کیا ہے کہ پہلی امتوں پر عذاب آئے: ایک عذاب خسف ہے اور ایک عذاب مسخ ہے، یعنی شکل بدل جائے اور خسف کا معنی ہوتا ہے کہ پوری کی پوری بستیوں کا زمین میں دھنس جانا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری امت پر رحم کیا ہے اور میری امت پر دو عذاب نہیں آئیں گے کہ ساری امت کی شکل بدل جائے یا ساری امت کو یک دفعہ خسف آجائے، ایسا نہیں ہوگا۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری امت کے اندر جو علماء آئیں گے (کتاب وسنت کے علماء، اللہ کے قرآن اور نبی کی سنت پر چلنے والے علماء) ان کو بھی اللہ تعالیٰ اتنا مرتبہ دیں گے جیسے بنو اسرائیل کے نبی گزرے ہیں (اس سے افضلیت کا بیان مقصود ہے)۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری امت کا عالم ایک ہزار عابد سے شیطان پر بھاری ہے۔ کیونکہ عابد تو اپنی عبادت میں مصروف ہے، عابد ایک محدود دائرے کے اندر محدود ہے، لیکن عالم دنیا میں میرا دین پھیلا رہا ہے، دنیا میں شیطان کو روک رہا ہے اور پوری دنیا میں جہاں جہاں فرق باطلہ ہوتے ہیں وہاں ہر جگہ عالم مقابلہ کر رہا ہے۔ یہ سارا شرف امت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملا ہے۔

فصاحتِ قرآنی کی ایک مثال:

﴿تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ﴾ [آل عمران:۱۱۰]

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو بعد میں ذکر کیا ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو پہلے ذکر کیا ہے؛ کیونکہ یہ قرآن کا اسلوبِ بیان ہے کہ کبھی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی اور کبھی اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف نزول ہوتا ہے۔ یہ فصاحت وبلاغت ہے۔ یہاں چونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت بیان کرنی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر پہلے کیا اور ایمان کا ذکر بعد میں کیا ہے۔

﴿وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ [آل عمران: ۱۱۰]

اہل کتاب سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں کہ اگر یہ بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہت بہتر تھا؛ کیونکہ اگر کوئی اہل کتاب میرے مدنی پر ایمان لے آئے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ایسے لوگوں کو دہرا اجر ملتا ہے۔ [بخاری، رقم: ۹۷]

﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۱۰]

اہل کتاب میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو ایمان لے آئے، لیکن ان کی اکثریت کفر کرنے والی ہے، حق سے نکلنے والی، اطاعت کو چھوڑنے والی ہے اور ان کی اکثریت بغض وعناد کا شکار ہوگئی ہے۔ اگر وہ بھی ایمان لے آتے اور امت مصطفیٰ ﷺ میں شامل ہوکر خیر امت کے لقب سے ملقب ہوجاتے تو اللہ تعالیٰ ان کو بھی دہرا اجر عطا فرماتے، لیکن جن کے مقدر میں ایمان لکھا تھا وہ ایمان لے آئے اور جن کے مقدر میں ہدایت نہیں تھی باوجود کتاب ملنے کے ہدایت نصیب نہ ہوسکی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کا معنی ہے کہ تم بہتر امت ہو لوگوں کے لیے بھی، یعنی تم لوگوں کے لیے خیر ہو، تم لوگوں کو جنگ میں قید کرکے، ان کی گردنوں میں زنجیر ڈال کر ان کو اسلام کی طرف کھینچ کھینچ کر لاتے ہو، حتیٰ کہ وہ اسلام میں داخل ہوجاتے ہیں۔ ہر لحاظ سے امت محمد مصطفیٰ ﷺ خیر ہی خیر ہے۔ اگر تبلیغ کریں تب خیر ہے، امر بالمعروف نہی عن المنکر تب خیر ہے، جہاد کرے تب خیر ہے اور کسی کو قید کرے تب خیر ہے؛ کیونکہ ان کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسلام میں داخل ہوجائیں اور آخرت کے عذاب سے بچ کر جنت کے عیش وآرام میں رہیں۔

(حدیث) درہ بنت ابی لہب کہتی ہیں کہ ایک آدمی حضور اکرم ﷺ کے سامنے کھڑا ہوا اور آپ اس وقت منبر پر

تشریف فرما تھے۔ اس نے پوچھا: حضور! سب سے بہتر لوگ کون سے ہوتے ہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُ النَّاسِ أَقْرَؤُهُمْ وَأَتْقَاهُمْ لِلّٰهِ، وَآمَرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ، وَأَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَأَوْصَلُهُمْ لِلرَّحِمِ)) [مسند احمد، رقم: ۲۷۴۳۴] اچھے لوگ وہ ہوتے ہیں جو قرآن مجید کی زیادہ تلاوت کرنے والے اور ماہر قرآن ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور وہ لوگ جو بھلائی کا حکم زیادہ کرتے ہیں اور برائی سے زیادہ منع کرتے ہیں اور اچھے لوگ وہ ہیں جو زیادہ صلہ رحمی کرتے ہیں۔

ایک صلہ رحمی قرابت میں ہوتی ہے اور ایک صلہ رحمی عام بھی ہے؛ کیونکہ تمام کلمہ پڑھنے والے مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ہر مسلمان کے ساتھ اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آنا یہ بھی صلہ رحمی میں داخل ہے۔ اور صلہ رحمی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس نے صلہ رحمی کی جس نے اپنے رحم کو جوڑا میں اس کو اپنی رحمت سے جوڑوں گا اور جس نے قطع رحمی کی میں اس کو اپنی رحمت سے توڑ دوں گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: خیر امت کے سب سے پہلے مخاطب وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ خطاب عام ہے۔ ہر زمانے کے اپنے اعتبار سے پوری امت مصطفیٰ ﷺ کو ہے۔ جیسا کہ سب سے افضل لوگ وہ ہیں جو حضور اکرم ﷺ کے زمانہ کے ہیں، ان کے بعد تابعین کا دور اور ان کے بعد تبع تابعین کا دور ہے، پھر اس طرح چلتے آئیں۔

مسند امام احمد، ترمذی وغیرہ میں حضرت حکیم بن معاویہ بن حیدہ رحمہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((أَنْتُمْ تُوفُونَ سَبْعِينَ أُمَّةً، أَنْتُمْ خَيْرُهَا وَأَنْتُمْ أَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ)) [ترمذی، رقم: ۳۰۰۱] ستر امتیں گزری ہیں اور تم سترہویں امت ہو، لیکن تم ان سب سے بہتر اور اللہ کے نزدیک عظمت والی واحترام والی امت تم ہو۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ امت خیر امت اور بھلائی کے میدان میں سبقت لے گئی ہے۔ اس مرتبہ کی وجہ محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں؛ کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے زیادہ عزت وعظمت اور شرافت والے نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامل، مکمل شریعت دی ہے، آپ سے پہلے کامل شریعت نہ کسی نبی کو ملی اور نہ کسی رسول کو ملی ہے۔ پس جو آدمی حضور اکرم ﷺ کی سنت پر عمل کرے اور ان کے راستہ پر چلے چاہے تو وہ تھوڑا سا عمل بھی

کرے اور باقی امتیں زیادہ عمل بھی کریں، لیکن یہ تھوڑے عمل والا کامیابی کا نمبر لے جاتا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے سنا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أُعْطِيتُ مَا لَمْ يُعْطَ أَحَدٌ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ، فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ! مَا هُوَ؟ قَالَ: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ، وَأُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ الْأَرْضِ، وَسُمِّيتُ أَحْمَدَ وَجُعِلَ التُّرَابُ لِي طَهُورًا، وَجُعِلَتْ أُمَّتِي خَيْرَ الْأُمَمِ)) [مسند احمد، رقم: ۷۶۳] اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسی نعمتیں دی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں ملیں۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کون سی نعمتیں ہیں جو آپ کو ملی ہیں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری مدد کی ہے۔ اگر میں کافروں سے جہاد لڑوں تو میں ابھی دور ہوتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں میں میرا رعب ڈال دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام زمین کے خزانوں کی چابیاں دی ہیں، لیکن میں نے فقر کو اختیار فرمایا۔ اور آپ نے فرمایا: اللہ نے مجھے یہ بھی شرف بخشا کہ میرا نام احمد ہے، مجھ سے پہلے کسی کا نام احمد نہیں رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے پوری زمین کو میرے لیے پاک فرمادیا ہے، یہ امت اس سے تیمم بھی کرسکتی ہے اس پر نماز بھی پڑھ سکتی ہے، اگر وہ جگہ پاک ہو۔ مسجد میں نماز پڑھنے کی شرط نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے میری امت کو تمام امتوں کا سردار بنایا ہے اور تمام امتوں سے افضل بنایا ہے۔ یہ وہ نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے دی ہیں اور کسی امت کو نہیں ملی ہیں اور آج انہیں کی وجہ سے اس امت کو یہ شرف اور عظمت ملی ہے۔

(حدیث) حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کرتی ہیں کہ میں نے حضرت ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اور ام الدرداء فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی ابوالدرداء کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت کے ساتھ روایت کرتے ہوئے نہیں سنا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّ اللهَ تَعَالَى يَقُولُ: يَا عِيسَى! إِنِّي بَاعِثٌ بَعْدَكَ أُمَّةً إِنْ أَصَابَهُمْ مَا يُحِبُّونَ حَمِدُوا وَشَكَرُوا، وَإِنْ أَصَابَهُمْ مَا يَكْرَهُونَ احْتَسَبُوا وَصَبَرُوا، وَلَا حِلْمَ وَلَا عِلْمَ قَالَ: يَا رَبِّ! كَيْفَ هٰذَا لَهُمْ وَلَا حِلْمَ وَلَا عِلْمَ؟ قَالَ: أُعْطِيهِمْ مِنْ حِلْمِي وَعِلْمِي)) [مسند احمد، رقم: ۲۷۵۴۵] اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ میں تیرے بعد ایک ایسی امت کو پیدا کرنے والا ہوں اگر اس امت کو کوئی خوشی ملے گی یا کوئی نعمت ملے گی تو اللہ تعالیٰ کا شکر کریں گے اور اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچے گی پریشانی یا مصیبت آئے گی تو اللہ تعالیٰ سے ثواب طلب کریں گے اور صبر کریں گے اور نہ حلم اور علم۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: یا اللہ! کیسے وہ قوم ایسا کرے گی، جبکہ ان کے پاس علم بھی نہ ہو اور حلم بھی نہ ہو؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں ان کو اپنے حلم سے عطا کروں گا

ان کو اپنے علم سے عطا کروں گا۔ اس امت کے لیے اس سے بڑا شرف کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے علم اور علم سے عطا فرمایا ہے۔

(حدیث) سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أُعْطِيتُ سَبْعِينَ أَلْفًا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ، وُجُوهُهُمْ كَالْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، قُلُوبُهُمْ عَلَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ، فَاسْتَزَدْتُ رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ فَزَادَنِي مَعَ كُلِّ وَاحِدٍ سَبْعِينَ أَلْفًا قال أبو بكر رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: فَرَأَيْتُ أَنَّ ذٰلِكَ آتٍ عَلَى أَهْلِ الْقُرَى وَمُصِيبٌ مِنْ حَافَاتِ الْبَوَادِي.)) [مسند احمد، رقم:۲۲] مجھے ستر ہزار افراد ایسے دیے گئے ہیں جو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے، ان کے چہرے ایسے ہوں گے جیسے چودھویں کا چاند روشن ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: اللہ میاں! اور زیادہ کریں (ستر ہزار تو بہت تھوڑا ہے اور زیادہ کریں۔ میں مانگتا رہا، اللہ تعالیٰ فرماتے گئے، حتیٰ کہ) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ستر ہزار جو جنت میں جائے گا ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار جائیں گے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمیں بغیر حساب کے جنت عطا فرمائیں۔) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ یہ بستیوں والے اور بستیوں کے کنارے والے سب اس تعداد میں شریک ہیں۔ (صرف ان کی تعداد جو اوپر حدیث میں آئی ہے چار ارب نوے کروڑ بنتی ہے، جو بلا حساب و کتاب جنت میں جائیں گے)۔

(حدیث) شریح بن عبید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ (صحابی ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں۔) حمص میں بیمار ہو گئے اور اس وقت عبد اللہ بن قرط ازدی حمص کا امیر تھا، وہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے نہ آیا۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ پر کلاعیین میں سے کچھ آدمی عیادت کرنے کے لیے آئے آپ نے فرمایا: کیا تم لکھنا جانتے ہو؟ اس آدمی نے کہا: ہاں میں لکھنا جانتا ہوں۔ فرمایا: لکھو تو حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن قرط جو اس وقت حمص پر امیر تھے ان کو خط لکھا کہ ''مِنْ ثَوْبَانَ مَوْلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَّا بَعْدُ......''
[مسند احمد، رقم:۲۲۳۱۸] اگر آج موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی خادم تمہارے وقت میں موجود ہوتا اور وہ بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کے لیے آپ ضرور جاتے، لیکن میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم بیمار ہوں تو نے میری کوئی خبر گیری نہیں کی۔ اور اس کے بعد یہ خط لپیٹ کر اس آدمی کو دیا اور فرمایا: یہ پہنچا دو گے؟ اس نے کہا: آپ فکر نہ کریں، میں یہ خط امیر کو پہنچا دوں گا۔ جب امیر کو یہ خط ملا تو اتنا گھبرا کر اٹھا کہ لوگوں نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑی بات پیش آ گئی ہے اور وہ سیدھے حضرت ثوبان مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور ان کی عیادت کی اور جب جانے کی

اجازت چاہی تو حضرت ثوبان نے فرمایا: بیٹھ جاؤ۔ اگر تم نے عیادت کرنے کا ثواب حاصل کیا ہے تو بیٹھو، میں بھی تمہیں محمد مصطفیٰ ﷺ کی حدیث سناؤں کہ حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت کے ستر ہزار ایسے لوگ ہوں گے جن سے نہ حساب ہوگا اور نہ عذاب ہوگا۔ ان کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کریں گے اور ایک ہزار کے ساتھ ستر مزید ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو بغیر کسی حساب کے، بغیر کسی عذاب کے جنت میں بھیجیں گے۔

مفسر کا اس حدیث کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ امت محمد مصطفیٰ ﷺ سے ستر ہزار اور ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اتنی امت بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل فرمائیں گے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے پہلی روایت کے مطابق ایک اور روایت بھی لکھی ہے اس میں ستر ہزار افراد بلا حساب جنت میں جائیں گے اور ان کے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار مزید جنت میں جائیں گے۔ لہٰذا یہی بات راجح ہے جو پہلی روایت میں مذکور ہے۔

قیامت میں حضور ﷺ کی امت کی کثرت:

(حدیث) امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ایک رات ہم حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں تھے بات بہت طویل ہوتی گئی پھر صبح کو ہم حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((عُرِضَتْ عَلَيَّ الْأَنْبِيَاءُ اللَّيْلَةَ بِأُمَمِهَا، فَجَعَلَ النَّبِيُّ يَمُرُّ، وَمَعَهُ الثَّلَاثَةُ، وَالنَّبِيُّ وَمَعَهُ الْعِصَابَةُ، وَالنَّبِيُّ وَمَعَهُ النَّفَرُ، وَالنَّبِيُّ لَيْسَ مَعَهُ أَحَدٌ، حَتَّى مَرَّ عَلَيَّ مُوسَى، مَعَهُ كَبْكَبَةٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ، فَأَعْجَبُونِي، فَقُلْتُ: مَنْ هَؤُلَاءِ؟ فَقِيلَ لِي: هَذَا أَخُوكَ مُوسَى، مَعَهُ بَنُو إِسْرَائِيلَ. قَالَ: قُلْتُ: فَأَيْنَ أُمَّتِي؟ فَقِيلَ لِيَ: انْظُرْ عَنْ يَمِينِكَ. فَنَظَرْتُ، فَإِذَا الظِّرَابُ قَدْ سُدَّ بِوُجُوهِ الرِّجَالِ، ثُمَّ قِيلَ لِي: انْظُرْ عَنْ يَسَارِكَ. فَنَظَرْتُ، فَإِذَا الْأُفُقُ قَدْ سُدَّ بِوُجُوهِ الرِّجَالِ، فَقِيلَ لِي: أَرَضِيتَ؟ فَقُلْتُ: رَضِيتُ يَا رَبِّ، رَضِيتُ يَا رَبِّ . قَالَ: فَقِيلَ لِي: إِنَّ مَعَ هَؤُلَاءِ سَبْعِينَ أَلْفًا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ.....))[مسند احمد، رقم:۳۸۰۶] رات کو مجھے تمام انبیاء علیہم السلام دکھائے گئے میں نے دیکھا کہ بعض پیغمبر ایسے بھی ہیں کہ ان کے ساتھ اسلام لانے والے صرف تین آدمی ہیں اور بعض پیغمبر ایسے ہیں کہ جن کے ساتھ تھوڑی سی جماعت ہے اور بعض پیغمبر ایسے بھی ہیں کہ جن کے ساتھ ایک ہی ماننے والا ہے اور بعض پیغمبر ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ ایمان لانے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ پھر میں نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا، ان کے ساتھ بہت بڑی جماعت ہے، میں حیران ہوا اور پوچھا: یہ کون

ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ان کے ساتھ یہ بنو اسرائیل ہیں۔ پھر میں نے پوچھا: یا اللہ! میری امت کہاں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: اپنے دائیں طرف دیکھو۔ جب میں نے دیکھا تو سب افق میری امت سے بھرا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد! کیا اب تم راضی ہو کہ سب سے زیادہ آپ کی امت ہے۔ میں نے عرض کیا: ہاں اللہ میں راضی ہوں، میں راضی ہوں۔ اور حضور اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کو فرمایا: اس کے بعد مجھے کہا گیا کہ یہ تو آپ کی امت ہم نے دکھائی ہے، اس کے ساتھ ستر ہزار ایسے بھی ہیں جن کو ہم جنت میں داخل کریں گے اور ان کا کوئی حساب بھی نہیں ہوگا۔ حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کو فرمایا: تم پر میرے ماں باپ قربان! تم چاہو تو کوشش کرو اور اس ستر ہزار میں داخل ہو جاؤ۔ اگر تم ستر ہزار میں داخل نہیں ہو سکتے تو کم از کم اس کثرت میں داخل ہو جاؤ جو ظراب (ٹیلوں) کی شکل میں نظر آ رہی تھی۔ اگر تم ایسا نہ کر سکو تو موافق والوں میں سے ہو جاؤ، میں نے دیکھا ہے کہ وہاں لوگ اضطراب اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس ستر ہزار میں داخل کر دے جو بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے دعا کی اور فرمایا: تم ان میں سے ہو گے۔ اس کے بعد ایک اور آدمی کھڑا ہوا اس نے کہا: حضور! میرے لیے بھی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں شامل کر لے آپ ﷺ نے فرمایا: عکاشہ تم سے سبقت لے گیا۔

صحابہ کہتے ہیں اس کے بعد ہم نے بحث کی کہ وہ کون خوش نصیب ہوں گے جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ بعض صحابہ نے کہا: وہ ستر ہزار لوگ ہوں گے جو اسلام میں پیدا ہوئے، مسلمان پیدا ہوئے، مسلمان زندہ رہے اور اسلام پر موت آئی۔ کہتے ہیں کہ ہم اپنی اپنی عقل سے یہ باتیں سوچ رہے تھے کہ حضور پاک ﷺ کو خبر ملی کہ صحابہ یہ باتیں کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ستر ہزار جو بلا حساب و کتاب جنت میں جائیں گے وہ لوگ ہوں گے اور اپنا علاج داغ دے کر نہیں کروائیں گے؛ کیونکہ داغ فی الحقیقت آگ کا عذاب ہے اور آگ کا عذاب اللہ تعالیٰ جہنمیوں کو دیتے ہیں، گو بعض بیماریوں میں مجبور ہو جائے تو جائز ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔

اور وہ لوگ جو منتر جنتر پر یقین نہیں رکھیں گے۔ (یعنی وہ منتر جو زمانہ جاہلیت میں پڑھتے تھے اور جن میں غیر شرعی الفاظ ہوتے ہیں ایسا منتر پڑھنا حرام ہے اور کفر تک لے جاتا ہے اور بعض دم شرع کے موافق ہیں جو حضور اکرم ﷺ نے خود سکھائے ہیں، ان کو پڑھنا جائز ہے)۔

اور وہ ایسے لوگ ہوں گے جو تطیر نہیں کریں گے۔ (زمانہ جاہلیت کے اندر ایک عادت تھی کہ مثلاً کسی کام کے لیے نکلتے، آگے پرندہ بیٹھا ہوتا تو اس کو مارتے۔ اگر وہ پرندہ دائیں طرف اڑ جاتا تو کہتے تھے کہ ہمارا کام ہو جائے گا اور اگر پرندہ بائیں طرف اڑ جاتا تو کہتے تھے کہ آج ہمارا کام نہیں ہوگا۔ اسی طرح وہ بہت ساری چیزوں سے بد فالی لیتے تھے)۔

اور وہ ہر بات میں اپنے اللہ پر آسرا اور توکل کرتے ہیں کہ جو بھی چیز ہے میرے اللہ کی طرف سے ہے: نفع و نقصان، خوشی و رنج سب میرے اللہ کی طرف سے ہے۔

حضرت حصین بن عبدالرحمن فرماتے ہیں کہ ہم سعید بن جبیر کی خدمت میں تھے۔ انہوں نے ہم سے پوچھا کہ تم میں سے کون شخص ہے جس نے رات کے وقت جو تارا ٹوٹا ہے اس کو دیکھا ہو؟ میں نے کہا: میں نے دیکھا ہے کہ ستارا ٹوٹا ہوا ہے، لیکن میں نماز نہیں پڑھ رہا تھا، بلکہ مجھے کوئی سانپ بچھو لڑ گیا، اس کی تکلیف کی وجہ سے میں بیٹھا تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ جب تو ڈسا گیا تو تم نے کیا کیا؟ میں نے کہا: اس پر رقیہ پڑھا تھا۔ انہوں نے کہا: تم نے رقیہ کو کیوں پڑھا؟ میں نے کہا: شعبی نے ہمیں ایک حدیث بیان کی ہے اس کی وجہ سے۔ سعید نے دریافت کیا: شعبی نے تمہیں کیا حدیث بیان کی ہے؟ میں نے کہا: شعبی نے ہمیں بریدہ بن حصیب اسلمی سے حدیث بیان کی ہے کہ جھاڑ پھونک صرف نظر یا بخار سے ہوتا ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے فرمایا: بہرحال تم نے تو رقیہ پڑھا ہے، لیکن بات یہ ہے کہ مجھے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حدیث سنائی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے سارے نبی دکھائے گئے...... اور آگے گزشتہ حدیث مکمل بیان کی۔

(حدیث) حضرت ابو امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ((إِنَّ اللهَ وَعَدَنِي أَنْ يُدْخِلَ الْجَنَّةَ مِنْ أُمَّتِي سَبْعِينَ أَلْفًا بِغَيْرِ حِسَابٍ فَقَال يَزِيدُ بْنُ الْأَخْنَسِ: وَاللهِ مَا أُولَئِكَ فِي أُمَّتِكَ يَا رَسُولَ اللهِ إِلَّا مِثْلَ الذُّبَابِ الْأَصْهَبِ فِي الذُّبَابِ، قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنَّ اللهَ وَعَدَنِي سَبْعِينَ أَلْفًا، مَعَ كُلِّ أَلْفٍ سَبْعُونَ أَلْفًا وَزَادَنِي ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ)) [السنۃ لابن ابی عاصم، رقم: ۵۸۸] میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار بغیر حساب کے جنت میں بھیجیں گے۔ یزید بن اخنس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم یہ لوگ تو آپ کی امت میں ایسے ہوں گے جیسے بھورے رنگ کی مکھی دوسری مکھیوں میں ہوتی ہے (بہت کم تعداد میں ہوں گے۔) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ستر ہزار کا وعدہ کیا ہے اور ہر ہزار کے ساتھ اور ستر ہزار ہوں گے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ تین حثیات (لپیں) بھر کر جہنم سے نکالیں گے تو ان کا عدد بھی کوئی نہیں جان سکتا، مگر اللہ تبارک وتعالیٰ۔ یہ بھی حضور اکرم ﷺ کی امت کو شرف ملا ہے۔

(حدیث) حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے میرے رب نے یہ وعدہ کیا ہے کہ میری امت کے ستر ہزار لوگ جنت میں داخل ہوں گے، ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے، نہ ان پر کوئی حساب ہوگا اور نہ ہی عذاب، اور میرے رب کی تین لپیں ہوں گی۔

[السنۃ لابن ابی عاصم، رقم:۵۸۹]

(حدیث) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میری امت میں سے چار لاکھ جنت میں داخل فرمائیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! اللہ تعالیٰ سے اور زیادہ مانگیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بس جو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے وہ کافی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا: ابوبکر! رہنے دو۔ جس بات پر حضور اکرم ﷺ خاموش ہوجائیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہیں کیا ہے میں اللہ تعالیٰ سے اور زیادہ مانگتا ہوں، سب کے سب جنت میں داخل ہوجائیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا: (اللہ تعالیٰ کا جو ثلاث حثیات کا وعدہ ہے) اللہ تعالیٰ اپنے ایک ہاتھ سے سب کو جنت میں بھیجیں گے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: عمر نے سچ کہا ہے۔ [مسند احمد: ۳/۱۶۵]

(حدیث) ابومالک سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((أَمَا وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَيُبْعَثَنَّ مِنْكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَى الْجَنَّةِ مِثْلُ اللَّيْلِ الْأَسْوَدِ زُمْرَةٌ جَمِيعُهَا يُحِيطُونَ الْأَرْضَ، تَقُولُ الْمَلَائِكَةُ: لَمَا جَاءَ مَعَ مُحَمَّدٍ أَكْثَرُ مِمَّا جَاءَ مَعَ الْأَنْبِيَاءِ)) [المعجم الکبیر للطبرانی، رقم:۳۴۵۵] مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد مصطفیٰ (ﷺ) کی زندگی ہے! جب تمہیں قیامت والے دن جنت میں بھیجیں گے تو ایسے ہوگا جیسے رات کا اندھیرا دنیا پر چھاجاتا ہے، میری امت بھی سب پر چھاجائے گی (یعنی اتنی بڑی ہوگی)۔ حتیٰ کہ اللہ کے فرشتے کہیں گے: سبحان اللہ!! دیکھو تو سارے نبیوں کی امتوں کو جمع کرو تو ایک طرف ہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت ایک طرف ہے۔

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی امت پر فخر کروں گا؛ کیونکہ قیامت میں میری امت تمام نبیوں کی امتوں سے زیادہ ہوگی۔ [ابوداود، رقم:۲۰۵]

دشمنوں نے بھی اس لیے آج کل منصوبہ بندی کا پروگرام بنایا ہے کہ امت مصطفیٰ ﷺ کو کم کر دو۔ وہ بدبخت اپنے ملک میں منصوبہ بندی نہیں کرتے، حالانکہ امت محمد مصطفیٰ ﷺ اتنی حضور اکرم ﷺ کے لیے باعث خوشی ہے۔

(حدیث) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور پاک ﷺ سے سنا کہ مجھے اپنے رب سے امید ہے کہ میری پیروی کرنے والے میرے امتی قیامت میں جنت کا چوتھائی ہوں گے۔ ہم نے خوشی سے کہا: "اللہ اکبر"۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ پوری جنت میں آدھی میری امت ہوگی اور آدھی جنت میں سارے انبیاء کی امتیں ہوں گی۔ [مجمع الزوائد للہیثمی: ۱۰/ ۴۰۲]

دوسری روایت میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت والے دن جنتیوں کی ایک سو بیس صفیں بنیں گی: ان میں اسی صفیں میری امت کی ہوں گی۔ یعنی سب سے زیادہ حضور اکرم ﷺ کی امت ہوگی۔

[مسند احمد: ۱/ ۴۵۳]

(حدیث) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت ﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ۝ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ۝﴾ [الواقعہ: ۴۰،۳۹] یعنی پہلے گزری ہوئی جماعتوں میں سے بہت سارا عدد ہوگا اور اسی طرح بعد والوں میں سے بھی بہت سارے لوگ ہوں گے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم لوگ جنتیوں کا چوتھائی حصہ ہو گے، تم جنتیوں کا تہائی حصہ ہوں گے، تم لوگ جنتیوں کا نصف ہو گے اور تم لوگ جنتیوں کی دو تہائی ہو گے۔

[الحلیۃ لابی نعیم: ۷/ ۱۰۱]

(حدیث) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ہم باعتبار زمانہ کے سب سے آخر میں آنے والی امت ہیں۔ اور آپ نے فرمایا: اَوَّلُوْن بھی ہم ہوں گے۔ صحابہ کو سمجھانے کے لیے حضور اکرم ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ سب سے پہلے قیامت والے دن اللہ تعالیٰ میری امت کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔ [مسلم، رقم: ۸۵۵]

یہ بہت بڑا شرف عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو ساری کائنات بنائی ہے، اس کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ اس سے پہلے عالم ارواح گزر چکا ہے اور یہ عالم دنیا ہے۔ اس کا ایک وقت معین ہے، جو صرف اللہ کے علم میں ہے کہ یہ دنیا کب فنا ہوگی؟ اور جب اس کائنات کو بسایا تو سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو بھیجا گیا، ان سے توالد و تناسل ہوا، ان سے ہزاروں لاکھوں پیدا کیے۔ اور ان کو دنیا میں رہنے کی تعلیم دی۔ ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور

انتہائے نبوت میرے مدنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔ اس بات کو بعض علماء اس پیرائے میں بیان کرتے ہیں اور اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیان کرنا مقصود ہوتا ہے کہ جب ہم ایک ایک بات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری کائنات اسی لیے سجائی تھی کہ اپنا رسول بھیجیں۔

یاد رکھیں! یہ شرف بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے گا کہ آپ قیامت والے دن سب سے پہلے اپنی قبر مبارک سے کھڑے ہوں گے اور آپ اس شان سے کھڑے ہوں گے کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام بھی ساتھ ہوں گے، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی ساتھ ہوں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے بعد میں بقیع الغرقد (مدینے کے قبرستان) میں آؤں گا، وہ کھڑے ہوں گے، پھر میں مکہ والوں کا انتظار کروں گا، مکہ والے مسلمان بھی قبروں سے اٹھ کر پہنچیں گے اور پھر میں ان سب کو لے کر شام کی طرف روانہ ہوں گا (کیونکہ میدان حشر شام میں ہوگا)۔

(حدیث) حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((إِنَّ الْجَنَّةَ حُرِمَتْ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ كُلِّهِمْ حَتَّى أَدْخُلَهَا، وَحُرِمَتْ عَلَى الْأُمَمِ حَتَّى تَدْخُلَهَا أُمَّتِي))[1] اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمام انبیاء پر جنت میں داخل ہونے کو روک لیا ہے جب تک میں داخل نہ ہوں (کوئی پیغمبر یا نبی داخل نہیں ہوں گے) اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمام امتوں پر جنت میں داخل ہونے کو روک دیا ہے جب تک میری امت داخل نہ ہو (تو کوئی امت داخل نہیں ہوگی)۔

ان احادیث مبارکہ سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ شرف بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشا ہے کہ سب سے پہلے ہمارے آقا جنت میں جائیں گے، آپ کے بعد سارے انبیاء جنت میں جائیں گے۔ اور اسی طرح تمام امتوں میں سب سے افضل چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے، وہ پہلے جنت میں داخل ہوگی اور اس کے بعد باقی امتیں جنت میں داخل ہوں گی۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے شرف میں جتنی احادیث ذکر کی ہیں یہ مرتبہ ان کو ملے گا جن کے اندر یہ تین صفات ہوں گی جو اس آیت میں مذکور ہیں: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ [آل عمران: ۱۱۰] اگر یہ تین صفات نہ ہوں تو ان کو یہ شرف حاصل نہیں ہوگا۔

[1] [تفسیر ابن کثیر، جلد: ۲، صفحہ: ۱۰۳]

آج ہر مسلمان کے دماغ میں آ گیا ہے کہ اعمال کی ضرورت نہیں ہے، بس ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ'' پڑھ لیا ہے، بس ہم مسلمان ہیں، لہٰذا ہم امت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں تو جو آپ کی امت کی فضیلت ہے وہ ہمیں خود بخود مل گئی ہے۔ اس وجہ سے آج لوگ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور اعمال سے غافل ہیں، حالانکہ آج ہمارے اعمال دیکھ کر یہود بھی شرماتے ہیں۔ آپ پورے قرآن کو کھول کر دیکھ لیں! جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ایمان کا ذکر فرمایا ہے، آگے اعمال صالحہ کا بھی ذکر فرمایا ہے کہ مومن وہ ہے جو اعمال صالحہ کرتا ہے، لہٰذا اگر وہ مومن والی صفات آپ کے اندر پائی جائیں گی تو آپ مومن بنیں گے اور اگر وہ صفات نہیں پائی جائیں گی تو کہنے سے کوئی مسلمان نہیں بن جاتا اور وہ ان مراتب پر فائز نہیں ہو سکتا، ورنہ...... نعوذ باللہ! نعوذ باللہ!...... یہ ناانصافی ہوگی کہ ایک آدمی کی سو سال تک تہجد بھی قضا نہ ہو وہ بھی مسلمان ہے اور ایک آدمی سو سال تک نماز ہی نہ پڑھے وہ بھی اسی درجہ کا مسلمان ہو۔ ایسی ناانصافی تو کوئی بندہ بھی نہیں کرتا، خدا کیسے کرے گا؟ اگر...... نعوذ باللہ!...... عمل سے کچھ نہیں ہوتا تو صحابہ بلاوجہ نماز پڑھتے، اعمال کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ عمل سے اگر کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تو اللہ کے نبی کی تہجد پڑھتے پڑھتے پاؤں پر ورم آ گئی تھی۔

اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس کے اندر یہ صفات پیدا ہوں گی وہ اس مدح کے اندر داخل ہوگا اور جس میں یہ صفات نہیں ہوں گی وہ مدح میں داخل نہیں ہوگا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حج کرنے کے لیے گئے اور دیکھا کہ لوگوں کے اندر اعمال کی سستی ہے تو آپ نے فرمایا: خبردار! جو چاہتا ہے کہ میں اس امت کی صفتوں میں داخل ہو جاؤں اس کو چاہیے کہ وہ ان شرطوں کو پورا کرے، تا کہ اللہ تعالیٰ اس کو امت کے مراتب نصیب فرمائے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۱۰۳]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کوئی آدمی برائی دیکھ کر منع نہیں کرتا اور بھلائی کا حکم نہیں کرتا تو اس کا وہ حال ہوگا جو اہل کتاب کا ہے، جن کی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مذمت بیان کی ہے: ﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ﴾ [المائدۃ: ۷۹] ہم نے ان کو کتاب کا علم دیا، لیکن وہ منکر (برائی) کو دیکھتے جس کو لوگ کر رہے ہوتے تو یہ ان کو کبھی منع نہیں کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے جب امت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مدح کی تو اب اگلی آیات کے اندر اہل کتاب کی مذمت بیان کی ہے، فرمایا: ﴿وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۱۰] اگر اہل کتاب ایمان لے آتے جو کچھ اتارا گیا محمد مصطفیٰ ﷺ پر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تو ان کے

لیے بہت بڑا اجر اور بہت بڑی خیر تھی۔ ان کو دو ثواب ملتے: ایک اپنے پیغمبر پر ایمان لانے اور عمل کرنے کا اور دوسرا حضور اکرم ﷺ پر ایمان لانے کا ثواب ملتا۔ لیکن ان اہل کتاب میں سے تھوڑے سے لوگ ایمان لے آئے اور اکثر ان کے اللہ کی اطاعت سے نکلنے والے ہیں۔

آج بھی جو یہودی یا نصرانی اسلام میں آ رہے ہیں وہ ہم سے کروڑ درجہ ایمان کے اندر پکے ہیں۔ ان کی شکل وصورت اور عبادت کے اندر اسلام نظر آتا ہے، ان کا ایک ایک لمحہ اسلام کی خدمت میں گزر رہا ہے اور ان کا جو ایک آدمی مسلمان ہوا اس نے پھر ہزاروں کو مسلمان کیا ہے، لیکن ہم تو اسلام کے نام پر داغ ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ بھی مسلمان ہے اور ڈسکو میں بھی کھڑا ہے، کلب میں بھی کھڑا ہے، خنزیر بھی کھا رہا ہے اور گوری لڑکیوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر شام کو سیر بھی کر رہا ہے تو وہ کہتے ہیں: یہ عجیب مسلمان ہے! اگر ایسا اسلام ہے تو اس کو گھر میں رکھو۔ اگر ہم نے مسلمان ہونے کے بعد یہی کام کرنا ہے تو کیا فائدہ ہوا؟

یہودیوں کی شکست:

﴿وَإِن يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنصَرُونَ ﴿١١١﴾﴾ [آل عمران: ١١١]

اگر کبھی اہل کتاب تمہارا مقابلہ کریں گے تو تمہیں شکست نہیں دے سکتے اور یہ اللہ تعالیٰ نے جیسا وعدہ کیا تھا پورا ہو گیا۔ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ یہود کے قبائل: بنو نضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ مقابلہ نہ کر سکے، ان کو مدینہ چھوڑ کر جلاوطن ہونا پڑا اور وہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور ان کو وہاں سے بے عزت کر کے اور ذلت کے ساتھ نکالا گیا۔ وہ خیبر میں تھے تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی اور پھر جب صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور آیا تو ان کو جزیرہ عرب سے بھی نکال دیا گیا اور ذلت ان کا مقدر ہو گی۔

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا﴾ [آل عمران: ١١٢]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے ان یہودیوں پر ذلت مقدر کر دی ہے۔ یہ جہاں بھی ہوں گے ذلیل وخوار ہوں گے۔ ﴿إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ [آل عمران: ١١٢] یا تو یہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کی وجہ سے یا لوگوں کی وجہ سے بچ جائیں چند دنوں کے لیے تو اور بات ہے۔

آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں! چار ہزار سال سے زیادہ بنو اسرائیل کو گزرے ہیں، لیکن صرف سو یا

یہ چند سال ان کو آرام ملا ہے، ورنہ ہر جگہ یہ ذلیل وخوار رہے ہیں۔ بخت نصر کے زمانے میں دیکھ لیں، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دیکھ لیں اور ان کے بعد والے زمانے میں دیکھ لیں کہ ہمیشہ ذلت ان کا مقدر رہی ہے۔ اور آج بھی اگر زندہ ہیں تو لوگوں کے سہارے پر زندہ ہیں۔ اگر لوگوں کا سہارا ان سے آج بھی منقطع ہو جائے تو وہ چند دنوں کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے ان پر یہ ذلت اس لیے لکھی کہ وہ میرے نافرمان تھے، وہ حد سے نکلنے والے تھے، انبیاء کو قتل کرتے تھے، گستاخ تھے اور اللہ کے دین میں بہانے بناتے تھے۔

﴿لَيْسُوا سَوَآءً ۗ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ أُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۗ وَأُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَآ أَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۗ وَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۗ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۱۱۳ تا ۱۱۷]

''(لیکن) سارے اہل کتاب ایک جیسے نہیں ہیں، اہل کتاب ہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو (راہ راست پر) قائم ہیں، جو رات کے اوقات میں اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں اور جو (اللہ کے آگے) سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، اچھائی کی تلقین کرتے اور برائی سے روکتے ہیں اور نیک کاموں کی طرف لپکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا شمار صالحین میں ہے، وہ جو بھلائی بھی کریں گے، اس کی ہرگز ناقدری نہیں کی جائے گی۔ اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔ (اس کے برعکس) جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، اللہ کے مقابلے میں نہ ان کے مال ان کے کچھ کام آئیں گے اور نہ اولاد، وہ دوزخی لوگ ہیں، اسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ یہ لوگ دنیوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سخت سردی والی تیز ہوا ہو، جو ان لوگوں کی کھیتی کو جا لگے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہو اور وہ اس کھیتی کو برباد کر دے۔ ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔''

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان اہل کتاب کا ذکر فرمایا ہے جو صحیح ایمان والے تھے کہ میرے مدنی! تمام اہل کتاب برابر نہیں ہے، بلکہ ان اہل کتاب میں ایک جماعت ایسی ہے جو دین پر قائم رہنے والی ہے، جو اللہ نے کتابیں نازل فرمائی ہیں ان کی تلاوت کرنے والے ہیں، راتوں کو جاگنے والے ہیں اور اللہ کے آگے لمبے لمبے سجدے کرنے والے ہیں۔ یہ جماعت حق والی ہے۔

﴿لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ﴾

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو اسلام لے آئے، جیسا کہ عبد اللہ بن سالم رضی اللہ عنہ، اسد بن عبید رضی اللہ عنہ، ثعلبہ بن سعید رضی اللہ عنہ اور اسید بن سعید رضی اللہ عنہ وغیرھم۔

بعض علماء نے فرمایا کہ ہر دور میں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں بھی ایک جماعت ایسی تھی جو صحیح معنی میں دین پر قائم تھی، جو عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول اور اللہ کا نبی مانتے تھے، آخرت پر ایمان رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ کی توحید کے قائل تھے اور وہ صحیح معنوں میں انجیل پر عمل کرنے والے تھے۔ اور اسی طرح یہود میں سے کچھ ایسے لوگ تھے جو صحیح معنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے، تورات پر عمل کرنے والے، آخرت پر ایمان لانے والے اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی! جیسے میں نے آپ کی امت کو شرف دیا ہے ایسے اہل کتاب میں وہ لوگ جو آپ پر ایمان لائے اور اپنے نبی پر بھی ایمان لائے اللہ تعالیٰ ان کو دوہرا اجر عطا فرمائیں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر جنگ کرنے کے بعد کسی کے حصہ میں کنیز ملے اور وہ اس کو اچھی طرح تعلیم دے، ادب اور دین سکھائے اور آزاد کر کے اس سے شادی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو دہرا اجر عطا فرماتے ہیں۔

رات کی عبادت کی فضیلت:

﴿مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۱۳]

اہل کتاب میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو اپنے دین پر قائم رہنے والا ہے، اللہ کے قرآن کی تلاوت کرنے والا ہے اور ساری رات ان کی سجدے میں گزرتی ہے۔

علماء نے فرمایا: قرآن پڑھنا تو بڑی نعمت ہے، لیکن اگر آدمی رات کو جب سب لوگ آرام کر رہے ہوں اس

وقت اللہ کے دربار میں کھڑا ہو کر قرآن پڑھتا ہے تو اس کا انداز الگ ہے اور اس کی رحمتیں ہی الگ ہیں۔ ﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ﴿٦﴾﴾ [المزمل:٦] رات کو جاگنا نفس کو مارنے کی قوی بات ہے۔ لہٰذا رات کو عبادت کرنا اور لمبی لمبی رکعتیں پڑھنا، لمبی لمبی قرأت کرنا، لیکن قرآن اس طرح پڑھے کہ ایک ایک حرف پر غور کرے، ایک ایک جملہ پر غور کرے کہ اللہ قرآن میں کیا درس دے رہا ہے!؟ اگر ترجمہ نہیں جانتا تو ایک ایک آیت کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور لمبے لمبے سجدے کرے۔ حدیث مبارک میں ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سب سے قریب سجدے میں ہوتا ہے۔

نیک لوگوں کی صحبت کے فوائد:

اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا معنی یہ ہے کہ جب بندہ اپنی ذات کو مٹا کر اور عاجزی کا اقرار کر کے اپنے چہرے کو مٹی میں ملا دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے اپنے عجز کی انتہاء کر دی ہے۔ اس لیے اس وقت جو دعا نکلتی ہے سیدھی عرش پر پہنچتی ہے۔ اس لیے سجدہ زیادہ سے زیادہ لمبا کریں، لیکن لمبا سجدہ اس وقت جب علیحدہ ہوں، کوئی دیکھنے والا نہ ہو، ورنہ اگر آپ امام ہیں تو حکم ہے کہ جلدی سے نماز پڑھاؤ، تاکہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔

بزرگوں نے فرمایا: آدمی ایک گھڑی اللہ والوں کے ساتھ بیٹھ جائے، ایک سو سال نفلی عبادت کرے اس سے یہ ایک گھڑی بہتر ہے:

یک زمانہ صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کیونکہ اگر اکیلے عبادت کرے گا تو کبھی بھٹک سکتا ہے، کبھی پٹڑی سے اتر کر ریاء کا شکار ہو سکتا ہے، لیکن اللہ والے کی صحبت تریاق ہے، آدمی کی ہر بیماری کا علاج کرتی چلی جائے گی۔ حکم ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿١١٩﴾﴾ [التوبہ:١١٩] اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔ صحابہ کو صحبتِ نبی سے مقام ملا ہے اور تابعین کو صحابہ کی صحبت سے مقام ملا ہے اور تبع تابعین کو صحبتِ تابعین سے مقام ملا اور عام مومن کو مقام صحبتِ اولیاء اللہ، صحبتِ علماء سے ملا۔

کوشش کریں تنہائی میں جو وقت ملے قرآن پڑھیں۔ اللہ کا قرآن سمجھ میں نہ آئے تو بار بار پڑھیں، ایک ایک

آیت کو ہزار بار پڑھیں۔ اللہ کی رحمت سے قرآن خود سینے میں اترنا شروع ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نیک صفت اہل کتاب کی صفات بیان فرمائیں: ﴿يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ۖ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۝﴾ [آل عمران: ۱۱۴، ۱۱۵] کہ وہ صحیح معنی میں اللہ پر ایمان لانے والے اور آخرت پر ایمان لانے والے ہیں اور صحیح معنی میں بھلائی کا امر کرنے والے ہیں اور صحیح معنی میں برائی سے روکنے والے ہیں اور بھلائی کے کام میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے والے ہیں۔ یہی لوگ اچھے لوگوں میں سے ہیں اور جو کچھ ان لوگوں نے دنیا میں نیک عمل کیا ہے ہرگز اس کو نہیں مٹایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کو جاننے والے ہیں۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نیک کاموں میں امت پر سبقت:

﴿وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ۖ﴾

احادیث کے اندر ایک واقعہ آتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک بیوہ عورت تھی، جس کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ میں نے سوچا رات کو اٹھ کر جاؤں گا، اس کے گھر میں جھاڑو دوں گا اور پانی بھر کر رکھ دوں گا۔ جب میں اس کے گھر میں گیا تو دیکھا کہ اس کے گھر کی صفائی بھی ہو چکی ہے، پانی بھی بھرا ہوا ہے اور ہر چیز اپنے اپنے مقام پر رکھی ہے۔ میں حیران ہو گیا کہ مجھ سے بھی پہلے کوئی نمبر لے گیا!! میں دوسری رات اس سے زیادہ جلدی گیا، لیکن وہاں پہلے سارے کام ہو چکے تھے۔ میں تیسری رات اور زیادہ جلدی گیا، لیکن اس بڑھیا کے سارے کام ہو چکے تھے۔ فرماتے ہیں کہ چوتھی رات میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج عشاء کے بعد سونا ہی نہیں ہے، آج میں دیکھتا ہوں کہ مجھ سے پہلے کون نمبر لے جاتا ہے؟ میں نے دیکھا کہ وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں نے ان سے کہا: ابو بکر! کیا آپ کسی دوسرے کو بھی نمبر لینے دو گے؟ ایمان میں بھی سب سے پہلے آپ ہیں، حضور اکرم ﷺ کی صحبت میں بھی سب سے پہلے آپ ہیں، حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں بھی سب سے پہلے آپ ہیں اور اب لوگوں کی خدمت میں بھی سب سے پہلے آپ ہیں۔ ہمیں بھی کوئی موقع دے دیں، تا کہ ہم بھی کوئی کام کر سکیں۔

جو نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، نیک کام کرتے ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا ہے: ﴿وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝﴾ [آل عمران: ۱۱۴] یہی لوگ میرے نیک بندے ہیں۔ فرمایا: انہوں نے

اگر دنیا میں کوئی نیکی کی ہے، کوئی عمل کیا ہے یا پہلے دور میں کوئی عمل کیا ہے وہ ہم ضائع نہیں کریں گے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں ڈرنے والے اور ایمان والے کون ہیں۔

کافروں کا آخرت میں انجام:

مومنین کے بعد کافروں کا ذکر فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ [آل عمران:۱۱۶] جن لوگوں نے کفر کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری اولادیں، ہمارے مال اور ہماری جائیدادیں ہمارے کام آئیں گی، حالانکہ یہ چیزیں بالکل ان کو فائدہ نہیں پہنچائیں گی، ان کو اللہ کے عذاب سے کوئی چیز نہیں چھڑا سکے گی۔

کافروں کے پاس پیسہ ہے، اس لیے ان کو گھمنڈ ہے۔ جیسے دنیا کے اندر پیسہ دیا اور مقدمہ سے نکل گئے، دنیا میں کوئی عذاب آ گیا پیسے دیئے نکل گئے، مقابلہ ہو گیا اولادیں ساتھ کھڑی ہو گئیں، جیت گئے، اس طرح کافر آخرت کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ ہم بچ جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ قیامت میں یہ کچھ کام نہ آئے گا، بلکہ یہ جہنمی ہیں، ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور ان کو میرے عذاب سے چھڑانے والی کوئی طاقت نہیں ہوگی۔

اشکال:

بعض کافر بڑے اچھے اچھے کام بھی کرتے ہیں: غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کی مدد کرتے ہیں، بڑے بڑے ہسپتال بناتے ہیں اور خیراتی ادارے بناتے ہیں تو کیا ان کو ان نیک کاموں کا کوئی بدلہ ملے گا؟

جواب:

اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اچھے کاموں کا دنیا کے اندر بدلہ دے دیتے ہیں، ان کے لیے آخرت میں کوئی بدلہ نہیں ہے؛ کیونکہ آخرت میں بدلہ ایمان والوں کو ملے گا، دنیا کے اندر کافروں کو بدلہ مل جاتا ہے کہ اولاد مل گئی، پیسہ مل گیا۔

حضرت مجاہد، حسن اور سدی رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اسی سوال کا جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَثَلُ مَا يُنفِقُونَ فِي هَٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَٰكِنْ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ [آل عمران:۱۱۷] جو کچھ کافروں نے دنیا میں خیرات کی ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک ہوا چلے، اس میں پالا ہو (ٹھنڈ ہو)۔ کیونکہ صر کا معنی ہے جمادینے والی سردی، وہ کسی کھیتی کو پہنچے تو سب کو جلا

ڈالے۔ان کافروں کا حال بھی یہی ہے کہ ان کے کفر نے ان کے اعمال کو جلا ڈالا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ ظلم سے منزہ اور پاک ہیں۔اللہ تعالیٰ ذرہ کے برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتے،لیکن جن بندوں نے اپنی جانوں پر خود ظلم کیا کفر کر کے،شرک کر کے اور اللہ کی بغاوت کر کے تو ان پر عذاب آ گیا،اب ان کے اعمال کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ کے ہاں خیرات وہ قبول ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿لَيْسُوا سَوَآءً ۗ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ أُمَّةٌ قَآئِمَةٌ﴾ [آل عمران: ١١٣] کون برابر نہیں ہیں؟اس میں دو قول ہیں: ایک حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ امت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل کتاب برابر نہیں ہیں؛ کیونکہ سیاق وسباق کا تقاضا یہی ہے۔اس قول کی ایک حدیث مبارکہ سے بھی تائید ہوتی ہے،جس کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند امام میں ذکر کیا ہے۔

(حدیث) ((أَخَّرَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الْعِشَاءِ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الْمَسْجِدِ، فَإِذَا النَّاسُ يَنْتَظِرُونَ الصَّلَاةَ، قَالَ: أَمَا إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِ هَذِهِ الْأَدْيَانِ أَحَدٌ يَذْكُرُ اللهَ هَذِهِ السَّاعَةَ غَيْرَكُمْ)) [ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز میں دیر کی اور کافی دیر کے بعد۔جب تشریف لے آئے اور دیکھا کہ لوگ نماز کی انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں تو آپ نے فرمایا: اس وقت کوئی مذہب والا ایسا نہیں ہے جو اللہ کے ذکر کے لیے جاگ رہا ہو،صرف میری امت ہے جو اتنی دیر کے باوجود بھی بیٹھی ہے،تاکہ ان کو جماعت کی نماز نصیب ہو جائے۔

اس حدیث سے بھی آپ کی امت کو یہ شرف ملا کہ اور کوئی دین والا ایسا نہیں جو جاگ رہا ہو ماسوائے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تو اس سے یہی نتیجہ نکلا کہ امت محمد اور اہل کتاب برابر نہیں ہیں؛ کیونکہ ایک سونے والا اور ایک جاگنے والا ہے۔ ایک ذاکر ہے اور ایک غافل ہے۔

تدوین حدیث کا زمانہ:

یاد رکھیں! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے زمانہ میں اگر کسی مسئلہ میں یا کسی بات پر دو قول ہو جاتے تو جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ان کا محض علمی اختلاف تھا،اسی طرح خیر القرون کا زمانہ گزر گیا۔آپ اس چیز سے اندازہ کریں کہ اڑھائی سو سال بعد احادیث کی بڑی بڑی کتب مرتب ہوئیں۔اس موضوع پر سب سے پہلے بعض صحابہ کرام نے اپنے لیے کچھ مجموعے محفوظ کیے، پھر دوسری صدی کے وسط میں حضرت ابن شہاب

زہری رحمہ اللہ اور ربیع بن صبیح رحمہ اللہ نے احادیث کی تدوین کا کام شروع کیا۔

لیکن آج ہمارے ہاں جو اختلافات ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بارہویں صدی میں انگریز نے آکر اس پورے خطہ پر قبضہ کیا تو اتنا دور بیٹھ کر اتنے براعظموں پر کنٹرول کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ حالات پیدا کیے کہ آدمی خرید کر دو اور ان کو مذہب کے نام پر لڑا دو۔ اس لیے آپ مجھے بارہویں صدی سے قبل دکھا دیں کہ کسی فریق کا نور بشر پر جھگڑا ہوا ہو، آمین پر جھگڑا ہوا ہو وغیرہ، بلکہ کوئی جھگڑا ہی نہیں تھا۔ انگریز نے ان لوگوں کے خلاف جو موحد تھے، جنہوں نے کفر کے خلاف طاقت پکڑی تھی انگریز کے خریدے ہوئے لوگوں نے ان کے خلاف مسئلے بنائے کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے، یہ نبی کو بندہ مانتے ہیں، یہ نبی کی توہین کرتے ہیں، یہ نبی کے گستاخ ہیں تو اس وقت لڑائیاں شروع ہوئیں اور آج تک چلی آرہی ہیں، لیکن ہم ایک منٹ کے لیے بھی سمجھنے کے لیے تیار نہیں، بلکہ جو جس کے دماغ میں آگیا اس پر قائم ہو گیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿لَيْسُوْا سَوَآءً﴾ سب اہل کتاب برابر نہیں، بلکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو دین پر قائم رہنے والے، اللہ کے قرآن کی تلاوت کرنے والے، ساری رات جاگنے والے اور سجدے میں میری یاد کرنے والے ہیں۔ جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور جو ان کے ساتھ اہل کتاب ایمان لے آئے ان کی شان علیحدہ ہے اور جو کافر ہیں ان کی شان علیحدہ ہے۔ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ مفسرین کے نزدیک یہی دوسرا قول مشہور ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝﴾ [آل عمران: ۱۱۸ تا ۱۲۰]

''اے ایمان والو! اپنے سے باہر کے کسی شخص کو راز دار (بھیدی) نہ بناؤ، یہ لوگ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کریں گے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم تکلیف اٹھاؤ، بغض ان کے منہ سے ظاہر ہو چکا ہے اور جو کچھ (عداوت) ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ کہیں زیادہ ہے۔ ہم نے پتے کی باتیں تمہیں کھول کھول کر بتا دی ہیں، بشرطیکہ تم سمجھ سے کام لو۔ دیکھو تم تو ایسے ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو، مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے۔ اور تم تو تمام (آسمانی) کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور (ان کا حال یہ ہے کہ) وہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (قرآن پر) ایمان لے آئے اور جب تنہائی میں جاتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے کے مارے اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔ (ان سے) کہہ دو: اپنے غصے میں خود مر جاؤ، اللہ سینوں میں چھپی ہوئی باتیں خوب جانتا ہے۔ اگر تمہیں کوئی بھلائی مل جائے تو ان کو بری لگتی ہے اور اگر تمہیں کوئی برائی (شکست و قحط) پہنچے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم صبر اور تقویٰ سے کام لو تو ان کی چالیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ سب اللہ کے (علم اور قدرت کے) احاطے میں ہے۔''

کفار کو اپنا راز دار مت بناؤ:

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے خصوصی ہدایات جاری فرمائی ہیں: اے ایمان والو! تم اپنے سوا کسی کافر کو، منافق کو اور غیر مسلم کو راز دار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری برائی میں کمی نہیں کرتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بعض مقامات پر خصوصی طور پر ارشاد فرمایا: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ ٱلْيَهُودَ وَٱلنَّصَٰرَىٰٓ أَوْلِيَآءَ﴾ [المائدۃ:۵۱] ایمان والو! خبردار! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ یہ ایک دوسرے کے دوست ہو سکتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔

اندازہ کریں کہ سینکڑوں صدیاں بیتنے کے بعد بھی نصاریٰ نے یہود کے جرم معاف کر دیئے اور یہودیوں نے نصرانیوں کے جرم معاف کر دیئے! کیونکہ وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں۔ وہ چاہے کسی نقطہ پر اکٹھے نہ ہوں، لیکن اسلام کو مٹانے کے لیے وہ سب ایک ہو جائیں گے۔ آپ دیکھ لیں کہ کافر کوئی بھی ہو وہ سب سے بڑا دشمن ہے تو اسلام کا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان آیات کے اندر حکم دیا ہے کہ اے ایمان والو! اپنے سوا کسی غیر کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔

غیر مسلموں کی زبان سیکھنا منع نہیں:

﴿بِطَانَۃً﴾ کا معنی ہے اندر کی چیز، رفیق خاص، راز دار۔

اس سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ مسلمان حکومت کسی عہدے پر کسی غیر مسلم کو نہ رکھے؛ کیونکہ اس سے کبھی یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ مسلمانوں کا ہمدرد بنے گا۔

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ تم جا کر فارس کی زبان سیکھو، تم جا کر روم کی زبان سیکھو، عبرانی، سریانی زبان سیکھو؛ کیونکہ مجھے جب باہر کے بادشاہوں کے خطوط آتے ہیں یا میں کسی بادشاہ کو خط لکھنا چاہتا ہوں تو میں ان کافروں پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اپنی طرف سے کوئی ایک جملہ بڑھا دیں یا اپنی طرف سے کوئی ایک جملہ حذف کر دیں، حالانکہ ایک نکتہ بدلنے سے بھی معنی بدل جاتا ہے۔ مثلاً: ہم دعا مانگتے ہیں: ''اللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا'' اے اللہ! ہماری مغفرت فرما۔ اور اگر ''اللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا'' کی غین کا نقطہ گرا کر عین بنا دیں تو معنی ہوگا: اے اللہ! ہمیں برباد کر دے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیٹھی تھیں۔ ایک یہودی نے آ کر حضور اکرم ﷺ کو کہا: ''السَّامُ عَلَیْکُمْ'' تم پر موت ہو۔ بی بی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے ان کی بات سمجھ لی تو میں نے کہا ''وَعَلَیْکُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَۃُ'' تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! ٹھہر جاؤ، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر کام میں نرمی کو پسند کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: آپ نے سنا نہیں ہے کہ اس بدبخت نے کیا کہا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں نے اس کے جواب میں کہا تھا ''وَعَلَیْکُمْ'' کہ (تم پر موت ہو)۔ اللہ میری دعا منظور کریں گے۔ [بخاری، رقم: ۶۰۲۴]

اس لیے آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ تم زبان سیکھ لو؛ کیونکہ ہم کسی یہودی، نصرانی اور مشرک پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔

کافروں کو اسلامی حکومت میں عہدے دینا:

اس لیے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں جہاں اور حکم جاری کیے تھے وہاں آپ نے یہ حکم بھی جاری کیا تھا کہ خبردار! کسی محکمہ میں کوئی کافر منشی نہ رکھنا، کسی کافر کو کلیدی عہدے پر نہ رکھنا، کسی کافر کو اہم جگہ پر نہیں رکھنا، تاکہ وہ مسلمانوں کے راز چرا کر دشمنوں کو نہ پہنچائے۔

اور آج ہم کہتے کہ رواداری اور وسعت قلب ہے، حالانکہ یہ وسعت قلب نہیں، بلکہ اللہ کے قرآن کی مخالفت ہے۔ آج بھی دنیا میں کوئی حکومت اپنے باغی کو کوئی عہدہ نہیں دیتی، بلکہ اس کے لیے ذلت آمیز سزا ہوتی ہے۔ تو جو اللہ کا باغی ہے، محمد مصطفیٰ ﷺ کا باغی ہے، قرآن اور اسلام کا باغی ہے، اس کو عہدے دینے کا کیا مطلب ہے؟ اس کو رواداری نہیں کہا جاتا، بلکہ اپنی منافقانہ رویوں کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے راز دشمنوں کو مل جاتے ہیں اور مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

انگریزی حکومت میں ہند میں اکثر بڑے القاب پانے والے کون؟

تاریخ اسلام پر نظر دوڑا کر دیکھ لیں کہ مسلمانوں نے کبھی دشمنوں سے شکست نہیں کھائی۔ چاہے دشمن ان کے مقابلے میں دس گنا ہوں یا بیس گنا ہوں۔ مسلمانوں کو شکست منافقوں سے ملی ہے، جنہوں نے ظاہری طور پر کلمہ پڑھا، نمازیں پڑھیں، بظاہر مسجدوں میں امام رہے، جو تمہارے پیر اور گدی نشین بنے۔ اس لیے انگریز نے کسی کو ''سر'' کا خطاب دیا، کسی کو ''ڈاکٹر'' کا خطاب دیا، کسی کو بڑے القاب سے نوازا اور کسی کو جاگیریں دیں۔ آخر انگریز کو ان پر اتنی مہربانی کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ دراصل یہ غدارانِ اسلام، غدارانِ قوم تھے، انہوں نے کافروں کی اعانت کی اور مسلمانوں کو ذلیل کرایا۔ ان کے صلہ میں ان کو جاگیریں، گدیاں اور القابات ملے۔

کفار کا اسلام اور نبیٔ اسلام ﷺ سے بغض:

﴿لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا ۚ﴾ [آل عمران:۱۱۸]

تم کافروں کو اپنا ہرگز راز دان نہ بناؤ۔ وہ تمہیں خراب کرنے میں ہرگز رعایت اور نرمی نہیں کریں گے، بلکہ جب کبھی موقع ملا تو تمہیں خنجر گھونپیں گے۔ وہ تو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ تمہیں تکلیف پہنچے۔ اے میرے مدنی! یہ دشمن ایسے ہیں کہ شدتِ بغض میں ان کے منہ سے بات نکل جاتی ہے، یہ زہر اگلتے رہتے ہیں۔ اور یہ تو وہ باتیں ہیں جو یہ زبان سے کہتے رہتے ہیں اور جو مسلمانوں کے خلاف ان کے دلوں کے اندر چھپا ہوا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ آپ کو تو صرف اتنا پتہ ہے جو وہ زبان سے کہتے ہیں۔

آپ حضور اکرم ﷺ کی زندگی پر نظر ڈال کر دیکھ لیں کہ مکہ کے اندر مشرکین نے کوشش کی کہ آپ کو قتل کر دیا جائے۔ اور جب آپ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو دیکھ لیں کہ یہودیوں نے کیا کیا؟ انہوں نے حضور

اکرم ﷺ کو قتل کرنے کی سازش کی اور آپ پر لبید بن عاصم نے جادو کیا جو یہودی تھا۔ خیبر آپ تشریف لے گئے، یہودیہ عورت نے گوشت میں زہر ملا کر آپ کو دیا۔ آپ بنو نضیر کے پاس جانے لگے، انہوں نے قلعہ کی دیوار پر اپنا آدمی بٹھا دیا کہ جب اللہ کے نبی دیوار کے نیچے بیٹھیں گے تو اوپر سے پتھر گرا کر...... نعوذ باللہ...... آپ کو قتل کر دیا جائے۔ یعنی مشرکین نے بھی آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی اور یہود و نصاریٰ نے بھی آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر جہاں کہیں بھی ہوگا کفر ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔ کفر کا معنی ہے اسلام کی مخالفت، اسلام کی دشمنی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے مدنی! جو ان کے دلوں میں ہے وہ بڑا بغض ہے۔

﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ۝﴾ [آل عمران:۱۱۸]

اے امت محمد مصطفیٰ ﷺ! تمہیں کیا ہو گیا کہ تم ان کافروں سے دوستی رکھتے ہو، ان کے لیے دلوں میں بڑے نرم گوشے رکھتے ہو؟ اور وہ تم سے کوئی محبت نہیں کرتے۔

کامیابی کا راستہ:

یاد رکھیں! ہماری اور تمہاری کامیابی کا ایک ہی راز ہے کہ ہم محمد مدنی کے غلام بن جائیں اور صحابہ کے غلام بن جائیں۔ اس راستہ پر چلیں جو راستہ ہمیں حضور اکرم ﷺ نے دکھایا ہے، تب ہمیں منزل مقصود مل سکتی ہے۔ آج لوگوں نے سمجھ لیا کہ جو یہودی ہے تو یہودیوں کا عدد بڑھ گیا، اگر کوئی نصرانی ہے تو نصرانیوں کا عدد بڑھ گیا اور ہم مسلمان ہیں تو مسلمانوں کا عدد بڑھ گیا، حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ مسلمان کہلانے سے مسلمان نہیں بنتا؛ کیونکہ آپ سارے قرآن کو کھول کر دیکھ لیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا۝﴾ [الکھف:۱۰۷]

اور کہیں فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۝﴾ [مریم:۹۶]

اور کہیں فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ۝﴾ [البینۃ:۷]

مومن وہ ہے جو عمل صالح کرے، جس میں ایمان کی نشانیاں پائی جائیں، مومن وہ ہے جس کے اندر صفاتِ ایمان پائی جائیں۔ اگر وہ صفات اور نشانیاں ہیں تو مومن ہے، ورنہ مومن نہیں ہے۔ صرف کہنے سے مومن نہیں بن سکتا ہے۔ اس لیے آج اسلام ہر جگہ رسوا اور ذلیل ہے کہ ہم اسلام کا نام تو لیتے ہیں، لیکن ہمارے تمام کام اسلام

والے نہیں ہیں۔

﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ﴾

مسلمانو! تم تو قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہو، تورات پر بھی ایمان رکھتے ہو، انجیل پر بھی ایمان رکھتے ہو، تم تو سارے نبیوں پر بھی ایمان رکھتے ہو اور ساری کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہو، لیکن وہ بد بخت تو تمہاری کتاب پر بھی ایمان نہیں لے آتے۔ تم ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کو مانتے ہو، وہ تمہارے ایک مدنی محمد مصطفیٰ ﷺ کو نہیں مانتے۔ پھر بھی عجیب بات ہے کہ تم سب کو مانو اور وہ محبت نہ کریں۔ تم سب کو مانو اور وہ تمہارے قریب نہ آئیں۔ پھر بھی تم ان سے محبت کرو تو بڑی عجیب بات ہے!!

یہود و نصاریٰ کے غصہ کی حالت:

﴿وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ﴾

جب یہ تم کو ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم مسلمان ہیں، ہم تمہارے خیر خواہ ہیں۔ اور جب علیحدہ ہوتے ہیں اور اپنی جماعت میں بیٹھتے ہیں تو تمہارے خلاف غصہ میں آکر اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں کہ ہمیں موقع تو ملے ہم انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔

﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾

اے میرے مدنی! آپ کہہ دیں اپنے غصے میں جل بھن کر مر جاؤ۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، میرا اللہ میرے ساتھ ہے، میرا اللہ مددگار ہے۔ تم ہمارے سامنے محبت کا اظہار کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں عداوت کا اظہار کرتے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہمیں علم نہیں ہے، حالانکہ ہمارا اللہ تو دلوں کے بھید جاننے والا ہے اور اللہ اپنے نبی کو خبر دینے والے ہیں۔ ان کو ایک ایک چیز کا پتہ ہے، تمہاری دشمنی چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی، تمہارا بغض و عناد چھپا ہوا نہیں رہ سکتا۔

﴿اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ﴾

اے میرے مدنی! اگر مسلمانوں کو کوئی تھوڑی سی بھی خوشی مل جائے تو ان کافروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ مسلمان کیوں کامیاب ہو گئے؟ اور اگر تمہیں کوئی برائی لگے، کوئی تکلیف پہنچے تو بڑے خوش ہوتے ہیں کہ اچھا ہوا ہمارے دشمن ناکام ہو گئے، ورنہ یہ طاقت و قوت بن جاتے۔ اے مسلمانو! کیا تم ایسے لوگوں کو خیر خواہ بناتے ہو؟

وقت اللہ کے دربار میں کھڑا ہو کر قرآن پڑھتا ہے تو اس کا انداز الگ ہے اور اس کی رحمتیں ہی الگ ہیں۔ ﴿إِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝٦﴾ [المزمل:٦] رات کو جاگنا نفس کو مارنے کی قوی بات ہے۔ لہٰذا رات کو عبادت کرنا اور لمبی لمبی رکعتیں پڑھنا، لمبی لمبی قرأت کرنا، لیکن قرآن اس طرح پڑھے کہ ایک ایک حرف پر غور کرے، ایک ایک اجملہ پر غور کرے کہ اللہ قرآن میں کیا درس دے رہا ہے!؟ اگر ترجمہ نہیں جانتا تو ایک ایک آیت کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور لمبے لمبے سجدے کرے۔ حدیث مبارک میں ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سب سے قریب سجدے میں ہوتا ہے۔

نیک لوگوں کی صحبت کے فوائد:

اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا معنی یہ ہے کہ جب بندہ اپنی ذات کو مٹا کر اور عاجزی کا اقرار کر کے اپنے چہرے کو مٹی میں ملا دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے اپنے عجز کی انتہاء کر دی ہے۔ اس لیے اس وقت جو دعا نکلتی ہے سیدھی عرش پر پہنچتی ہے۔ اس لیے سجدہ زیادہ سے زیادہ لمبا کریں، لیکن لمبا سجدہ اس وقت جب علیحدہ ہوں، کوئی دیکھنے والا نہ ہو، ورنہ اگر آپ امام ہیں تو حکم ہے کہ جلدی سے نماز پڑھاؤ، تاکہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔

بزرگوں نے فرمایا: آدمی ایک گھڑی اللہ والوں کے ساتھ بیٹھ جائے، ایک سو سال نفلی عبادت کرے اس سے یہ ایک گھڑی بہتر ہے:

ے یک زمانہ صحبتِ با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کیونکہ اگر اکیلے عبادت کرے گا تو کبھی بھٹک سکتا ہے، کبھی پٹڑی سے اتر کر ریاء کا شکار ہو سکتا ہے، لیکن اللہ والے کی صحبت تریاق ہے، آدمی کی ہر بیماری کا علاج کرتی چلی جائے گی۔ حکم ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ۝١١٩﴾ [التوبة:١١٩] اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔ صحابہ کو صحبتِ نبی سے مقام ملا ہے اور تابعین کو صحابہ کی صحبت سے مقام ملا ہے اور تبع تابعین کو صحبتِ تابعین سے مقام ملا اور عام مومن کو مقام صحبتِ اولیاء اللہ، صحبتِ علماء سے ملا۔

کوشش کریں تنہائی میں جو وقت ملے قرآن پڑھیں۔ اللہ کا قرآن سمجھ میں نہ آئے تو بار بار پڑھیں، ایک ایک

آیت کو ہزار بار پڑھیں۔ اللہ کی رحمت سے قرآن خود سینے میں اترنا شروع ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نیک صفت اہل کتاب کی صفات بیان فرمائیں: ﴿يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ؁ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ؁﴾ [آلِ عمران: ۱۱۴، ۱۱۵] کہ وہ صحیح معنی میں اللہ پر ایمان لانے والے اور آخرت پر ایمان لانے والے ہیں اور صحیح معنی میں بھلائی کا امر کرنے والے ہیں اور صحیح معنی میں برائی سے روکنے والے ہیں اور بھلائی کے کام میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے والے ہیں۔ یہی لوگ اچھے لوگوں میں سے ہیں اور جو کچھ ان لوگوں نے دنیا میں نیک عمل کیا ہے ہرگز اس کو نہیں مٹایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کو جاننے والے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نیک کاموں میں امت پر سبقت:

﴿وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ﴾

احادیث کے اندر ایک واقعہ آتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک بیوہ عورت تھی، جس کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ میں نے سوچا رات کو اٹھ کر جاؤں گا، اس کے گھر میں جھاڑو دوں گا اور پانی بھر کر رکھ دوں گا۔ جب میں اس کے گھر میں گیا تو دیکھا کہ اس کے گھر کی صفائی بھی ہو چکی ہے، پانی بھی بھرا ہوا ہے اور ہر چیز اپنے اپنے مقام پر رکھی ہے۔ میں حیران ہو گیا کہ مجھ سے بھی پہلے کوئی نمبر لے گیا!! میں دوسری رات اس سے زیادہ جلدی گیا، لیکن وہاں پہلے سارے کام ہو چکے تھے۔ میں تیسری رات اور زیادہ جلدی گیا، لیکن اس بڑھیا کے سارے کام ہو چکے تھے۔ فرماتے ہیں کہ چوتھی رات میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج عشاء کے بعد سونا ہی نہیں ہے، آج میں دیکھتا ہوں کہ مجھ سے پہلے کون نمبر لے جاتا ہے؟ میں نے دیکھا کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں نے ان سے کہا: ابوبکر! کیا آپ کسی دوسرے کو بھی نمبر لینے دو گے؟ ایمان میں بھی سب سے پہلے آپ ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بھی سب سے پہلے آپ ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی سب سے پہلے آپ ہیں اور اب لوگوں کی خدمت میں بھی سب سے پہلے آپ ہیں۔ ہمیں بھی کوئی موقع دے دیں، تاکہ ہم بھی کوئی کام کر سکیں۔

جو نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، نیک کام کرتے ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا ہے: ﴿وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ؁﴾ [آلِ عمران: ۱۱۴] یہی لوگ میرے نیک بندے ہیں۔ فرمایا: انہوں نے

ہے۔ اس طرح انہوں نے خط اکال کر دے دیا۔ جب انہوں نے خط پڑھا کہ مجھے لکھتے ہیں کہ ان کو گورنر بنا دو اور ان کو لکھتے ہیں کہ ان کو قتل کر دو، یہ کیا بات ہے!!؟ اس طرح لڑائی ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ اکلا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ حالانکہ حرکت کرنے والا ایک منشی تھا، لیکن اس فتنہ کے نتیجہ میں ہزاروں صحابہ شہید ہو گئے۔

آپ کا ملک بنا تو ظفر اللہ قادیانی آ گیا، جس کا نتیجہ آپ لوگ آج تک بھگت رہے ہیں۔ اس لیے کافر کو جس جگہ بھی بٹھاؤ گے وہ کبھی تمہارا خیر خواہ نہیں ہوگا۔ اس کو جب موقع ملے گا وہ اسلام کو نقصان پہنچائے گا۔

حضور ﷺ کی مہر جیسی مہر بنوانا منع ہے:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوگ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آتے تھے اور آپ ان لوگوں کو حضور اکرم ﷺ کی احادیث سنایا کرتے تھے۔ وہ لوگ جب حدیث سنتے تو ان کو سمجھ نہ آتی کہ حدیث مبارک کا کیا مطلب ہے؟ اور وہ لوگ اس حدیث مبارک کو یاد کر کے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی خدمت میں آتے تھے کہ ہم نے یہ حدیث سنی ہے، مہربانی کر کے ہمیں سمجھا دیں کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ ہم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث سنی ہے کہ ((لَا تَنْقُشُوا فِي خَوَاتِيمِكُمْ عَرَبِيًّا ، وَلَا تَسْتَضِيئُوا بِنَارِ أَهْلِ الشِّرْكِ)) [شعب الایمان، رقم: ۸۹۳۰]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اپنی انگوٹھیوں میں عربی نہ لکھواؤ اور مشرکین کی آگ سے آگ نہ جلاؤ۔ لوگوں کو اس کا مطلب سمجھ نہ آیا تو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی خدمت میں آئے اور ان سے کہا: حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ہمیں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بیان کی ہے تو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی انگوٹھی میں جو نقش لکھا ہوا ہے وہ عربی خط میں ہے: ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' تو تم بھی اگر اس طرح لکھواؤ گے تو ان کو شبہ پڑے گا، لہٰذا ایسی طرز میں نہ لکھواؤ جس سے شبہ ہو کہ تم وہی نقش لکھوا رہے ہو، جو حضور اکرم ﷺ نے لکھوایا ہے۔ اس لیے حضور پاک ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ اگر تم لکھوانا چاہتے ہو تو کسی اور طرز میں لکھواؤ، تاکہ کسی کے ذہن میں خلل نہ پڑ سکے۔ اور مشرکین کی آگ سے آگ نہ جلانے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے آدمی کسی گھر سے آگ لے کر [illegible] گھر میں روشنی کرتا ہے تو مشرکوں سے مشورہ کر کے کوئی کام نہ کیا کرو کہ ان سے روشنی مانگو کہ ہمیں راستہ دکھا [illegible] جب تم ان سے مشورہ مانگو گے تو وہ تمہیں ہلاکت میں لے جائیں گے۔ پھر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کتاب کی اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا

یَالُوْنَکُمْ خَبَالًا ﴾ [مسند احمد: ۳/۹۹]

ایک جاہل حکیم کا قصہ:

اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ صرف حدیث پڑھ لینا کافی نہیں ہوتا۔ آج جو آدمی دو جماعت پڑھ لے وہ کہتا ہے کہ میں نے حدیث پڑھی ہے۔

جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک آدمی کو راستہ میں حکیم کی کتاب کے کچھ کاغذات مل گئے، ان کو پڑھ کر وہ حکیم بن گیا۔ کافی عرصہ کے بعد ایک مریض آیا اور اس کو دیکھا تو اس نے کہا: یہ حکیم تو نظر نہیں آتا، اس لیے اس سے پوچھا: جناب! آپ اپنا کوئی ایسا کارنامہ تو بتائیں کہ کسی بیماری کا علاج کیا ہو؟ اس نے کہا: میرے کارنامے کیا پوچھتے ہو جو سامنے قبرستان نظر آرہا ہے یہ میرا کارنامہ ہے۔ اور تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ اس مریض نے کہا: کیا مطلب ہے؟ حکیم نے کہا: جب میں دوائیں دوں گا تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا قبرستان میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو میرے بغیر مرا ہو، سب میرے علاج سے گئے ہیں۔

اس لیے بڑے بڑے علم والے لوگ کہ سورج کی طرح ان کا علم چمکتا تھا، لیکن جب ان سے کوئی پوچھتا تو فوراً دیکھتے کہ اس مسئلے کے بارے میں امام ابوحنیفہ نے کیا فرمایا ہے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاید حضور اکرم ﷺ کے فرمان کو سمجھنے میں ہم سے ذرا بھی کوتاہی ہو جائے تو ہم مارے گئے، اس لیے ان سے پوچھتے ہیں جن کا زمانہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ کے زیادہ قریب ہے۔

(واقعہ) حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میرے استاذ امام اوزاعی رحمہ اللہ جن سے میں نے حدیث مبارک پڑھی تھی وہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ناراض تھے کہ وہ حدیث کو چھوڑ کر اپنی عقل سے بات کرتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرے لیے بڑی مشکل ہو گئی؛ کیونکہ میں دونوں کا شاگرد تھا۔ میں نے ایک دن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے کچھ مسئلے ایک کاپی میں لکھے ہوئے آستین میں چھپا کر استاذ کی خدمت میں آیا تو انہوں نے پوچھا: یہ کاغذ کیا ہیں؟ میں نے کہا: حضرت! اس میں کچھ مسئلے لکھے ہوئے ہیں۔ استاذ صاحب نے کہا: مجھے دکھاؤ، دیکھوں کیا لکھا ہوا ہے؟ میں نے ان کو دے دیئے۔ صبح نماز کے بعد مجھے انہوں نے خود بلا کر فرمایا: یہ

مسئلے تم نے کہاں سے لکھے ہیں؟ میں نے عرض کیا: ایک عالم ہیں، ان کے درس میں کبھی کبھی جا کر لکھ لیتا ہوں۔ استاذ نے فرمایا: میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اس آدمی کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا، اس کے دروازے پر جا کر علم حاصل کرو۔ میں نے کہا: حضرت! یہی تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ پہلے تو آپ ان کا نام سننا نہیں چاہتے تھے۔ کہنے لگے: اللہ تعالیٰ ابوحنیفہ پر رحمت کرے۔ مجھے لوگوں نے غلط خبریں پہنچائی ہیں۔ اس کاپی میں تو ایسے مسائل کا حل بھی موجود ہے جو مجھ سے پوری عمر میں حل نہیں ہوتے تھے۔

ایک حدیث کا صحیح معنی:

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس تفسیر کے اندر مجھے اعتراض ہے کہ تم محمد نہ لکھواؤ؛ اس لیے کہ خطِ کوئی بھی ہے، خطِ عربی بھی ہے اور خطِ نسخ بھی ہے تو معنی یہ ہے کہ تم عربی خط نہ لکھواؤ، تا کہ حضور اکرم ﷺ کی انگوٹھی کے مشابہ نہ ہو جائے۔ حضور اکرم ﷺ نے منع فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی انگوٹھی پر حضور اکرم ﷺ کے نقش کے عین مطابق نقش لکھوائے۔

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ((وَلَا تَسْتَضِيئُوا بِنَارِ أَهْلِ الشِّرْكِ)) کا معنی یہ نہیں جو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہے، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم مشرکوں کے قریب نہ رہو، تم مشرکوں کے شہر اور بستی میں نہ رہو، ایک دوسرے سے دور رہو۔ اگر قریب رہو گے تو تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ جیسا کہ سنن ابی داؤد کی حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اتنا دور رہو کہ تمہیں ایک دوسرے کی آگ بھی نظر نہ آئے۔

ایک حدیث پاک میں آتا ہے: ((مَنْ جَامَعَ الْمُشْرِكَ وَسَكَنَ مَعَهُ فَإِنَّهُ مِثْلُهُ)) [سنن ابی داؤد، رقم: ۲۷۸۷] جو بندہ اپنے آپ کو مشرک کے ساتھ رکھے یا مشرکوں کے اندر عمداً رہے بغیر کسی وجہ کے تو...... نعوذ باللہ...... وہ بھی ان کے حکم کے اندر آ جائے گا۔

اس لیے حکم ہے کہ مشرک و کافر کی محبت سے بچیں، فاسق و فاجر کی محبت سے بچیں؛ کیونکہ اگر تم چار آدمی ایک کمرے میں رہتے ہو۔ تین آدمی برائی کرتے ہیں اور ایک آدمی برائی نہیں کرتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ کیا کروں دوست ہیں؟ میں ان کو چھوڑ نہیں سکتا۔ تو چاہے وہ برائی نہ کرے، لیکن اس پر اتنا گناہ ہے جتنا برائی کرنے والوں پر گناہ ہے، ورنہ حکم تھا کہ ان کو منع کرتا؛ کیونکہ برائی پر راضی رہنا گویا برائی کرتا ہے۔

﴿وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾ [آلِ عمران: ۱۲۱ تا ۱۲۳]

"(اے پیغمبر! جنگ احد کا وہ وقت یاد کرو) جب تم صبح کے وقت اپنے گھر سے نکل کر مسلمانوں کو جنگ کے ٹھکانوں پر جما رہے تھے اور اللہ سب کچھ سننے جاننے والا ہے۔ جب تمہی میں سے (لشکر کے) دو گروہوں نے یہ سوچا تھا کہ وہ ہمت ہار بیٹھیں، حالانکہ اللہ ان کا حامی و ناصر تھا۔ اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ اللہ نے تو (جنگ) بدر کے موقع پر ایسی حالت میں تمہاری مدد کی تھی جب تم بالکل بے سروسامان تھے۔ لہٰذا (صرف) اللہ کا خوف دل میں رکھو، تاکہ تم شکر گزار بن سکو۔"

ربط بین الآیات:

ان آیات کے اندر غزوہ احد اور غزوہ بدر کا ذکر ہے۔ غزوہ احد کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ گزشتہ آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم کافروں اور منافقوں پر اعتماد نہ کرو۔

عبداللہ بن ابی کو تم نے شریکِ مشورہ بھی رکھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب حضور اکرم ﷺ احد کے جہاد کے لیے نکلے تو یہ منافق اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر واپس آگیا، عین موقع پر مسلمانوں کو چھوڑ کر ان کی طاقت کو توڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے جو حکم دیا تھا کہ کبھی ان کو راز دان نہ بناؤ، کبھی ان کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ اب تو تم نے احد میں تجربہ کر لیا ہے کہ وہ منافقین جو تمہارے ساتھ ملے ہوئے تھے، لیکن اندر دشمنی رکھتے تھے، کیسے انہوں نے احد میں وقت پر تمہیں نقصان پہنچایا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ پچھلی آیات کے اندر تھا: ﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ﴾ [آلِ عمران: ۱۲۰] اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو دشمنوں کا کوئی مکر تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا، لیکن تم نے احد میں دیکھ لیا کہ صبر میں کمی آگئی، تم نے حضور اکرم ﷺ کے فرمان مبارک پر کماحقہ عمل نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فتح شکست میں بدل گئی۔

اس سے ہمیں سبق ملا کہ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی مسلمان اس وقت ذلیل ہوتا ہے جب یہ دونوں چیزیں نہ رہیں: صبر اور تقویٰ۔ جب ان میں سے ایک میں کمی آئے گی تو نقصان آئے گا اور اگر یہ دونوں چیزیں پکی رہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بدر کو دیکھ لو! اس میں تم نے صبر کا مظاہرہ کیا، کمالِ اطاعت کا مظاہرہ کیا اور کمالِ تقویٰ کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عظیم فتح سے نوازا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس دن کو بھی ﴿یَوْمَ الْفُرْقَانِ﴾ بنا دیا کہ کفر کی طاقت ٹوٹ گئی، ان کے ستر سردار مارے گئے اور قلیب بدر میں ڈالے گئے اور بدر میں لڑنے والے مجاہدین کو اللہ تعالیٰ نے اتنا اونچا انعام دے دیا کہ آج کے بعد جو کرو تمہاری مرضی ہے، لیکن میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ (اللہ کے علم میں تھا کہ یہ نافرمانی نہیں کریں گے)۔

غزوہ احد کا بیان:

﴿وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾﴾

غزوہ احد بڑا مشہور غزوہ ہے۔ یہ غزوہ بروز ہفتہ ۳ھ شوال المکرم میں پیش آیا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جنگ بدر کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت و عظمت دی اور اللہ نے اصحابِ بدر کو وہ مقام دیا کہ بدری صحابہ کا مقام دوسرے صحابہ سے اونچا کر دیا ہے۔ ویسے تو سارے صحابہ رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے بنے ہوئے موتی ہیں، لیکن ہر ایک کی چمک اپنی ہے۔ تو جو نوجوان غزوہ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے وہ آپس میں بیٹھ کر تمنائیں کرتے تھے کہ افسوس ہے! کہ ہم غزوۂ بدر میں نہ گئے، ورنہ ہم بھی بدری بن جاتے! کاش! اللہ تعالیٰ ہمیں بھی کوئی موقع دے اور ہم بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھائیں۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ بدر کا بدلہ اتارنے کے لیے مشرکین بھی تڑپ رہے تھے، ان کو چین نہیں تھا۔ انہوں نے دوبارہ اپنی طاقت کو منظم کیا اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کر دی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو بلایا اور ان سے مشورہ کیا کہ ہم نے سنا ہے کہ مشرکین مکہ مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے کے لیے آ رہے ہیں تو اب ہم کیا کریں؟ یعنی ہم مدینہ منورہ سے باہر نکل کر قریش کو روکیں یا ہم مدینہ منورہ کے اندر رہیں، وہ باہر سے آ کر محاصرہ کریں اور ہم اندر بیٹھ کر ان سے لڑتے رہیں۔ جو شیلے نوجوانوں نے کہا: ہم باہر جا کر لڑتے ہیں۔ اور جو مدبر آدمی تھے انہوں نے کہا: ہم مدینہ میں اپنے گھروں میں موجود ہیں، ہمارے پاس کھانے پینے کا سارا معاملہ اندر موجود ہے، لیکن قریش کتنے دن باہر بیٹھ سکیں گے!!؟ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین

بھی اس مشورہ کے اندر ملا ہوا تھا اس کا مشورہ بھی یہی تھا کہ ہم باہر نہ لڑیں۔ حضور اکرم ﷺ صحابہ کی باتیں سنتے رہے۔ آپ نے ان کے جوش وجذبہ کو دیکھ کر خیال کیا کہ ہم باہر لڑیں تو آپ اپنے گھر تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر تشریف لے آئے کہ اب ہم ان کو راستے میں روکیں گے۔ اب وہ صحابہ گھبرا گئے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم مدینہ منورہ سے باہر لڑیں، انہوں نے سوچا کہ حضور اکرم ﷺ تو ناراض ہیں، آپ کے چہرہ مبارک پر غصہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا: اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم مدینہ کے اندر لڑیں تو ہم آپ کے حکم کے تابع ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ نبی کی شان نہیں ہوتی کہ ہتھیار پہن کر واپس لوٹ جائے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے فیصلہ کر دیں۔ ہم نے تیاری کر لی ہے۔ اب جو اللہ کو منظور ہے وہ ہوگا۔ اب حضور اکرم ﷺ لشکر لے کر مدینہ سے چلے تو وہ منافقین جو لشکر کے اندر تھے وہ علیحدہ ہو گئے۔

جنگ بدر کے حالات:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جنگ احد کا اصل سبب یہ تھا کہ جو بدر کی لڑائی ہوئی تھی کہ ابوسفیان ایک بہت بڑا تجارتی سامان لے کر شام سے مکہ مکرمہ کی طرف آ رہے تھے۔ مسلمانوں کو اطلاع ملی تو مسلمانوں کا ارادہ ہوا کہ اس قافلہ پر حملہ کیا جائے، تاکہ مکہ والوں کی اقتصادی قوت کو کاٹا جائے (آج کل بھی لڑائیاں اسی دولت کے زور سے ہوتی ہیں)۔ حضور اکرم ﷺ کا قافلہ مدینہ سے چلا اور زیادہ تیاری بھی نہیں کی گئی اور صحابہ کے تین سو تیرہ آدمی نکلے۔ ادھر ابوسفیان کو جب پتہ چلا کہ مسلمان میرے قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے مدینہ سے نکلے ہیں تو وہ اپنے قافلے کو اور زیادہ نیچے سمندر کی طرف لے گیا، تاکہ قافلہ نظر نہ آئے۔ اور ادھر مکہ والوں کو پتہ لگا کہ ہماری سال کی جو کمائی آ رہی ہے اور جس میں ہم نے اپنی ساری دولت ڈالی ہوئی ہے، اگر وہ مسلمانوں کے ہاتھ آ گئی تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ ابوجہل نے لوگوں سے کہا: جلدی کرو، ہم اپنے قافلے کی مدد کریں اور مسلمانوں کو روکیں۔ تو وہ ایک ہزار کا لشکر لے کر مکہ سے نکل پڑا۔ اللہ کی شان ہے کہ ابوسفیان نہ تو ابوجہل کو ملا اور نہ مسلمانوں کو ملا، مگر یہ دونوں لشکر بدر میں آمنے سامنے ہو گئے۔ اللہ کی رحمت اسی کے اندر تھی کہ یوم بدر یوم الفرقان بن جائے۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اس لڑائی میں فتح نصیب فرمائی اور کافروں کو ذلت آمیز شکست نصیب ہوگئی۔ ان کے ستر سردار مارے گئے اور ستر قید ہو گئے۔ جن جن لوگوں کے باپ مارے گئے تھے ان کی اولادوں نے ابوسفیان سے کہا کہ جو تجارت کا سامان

آیا ہے اس سے ہم ایک پیسہ بھی نہیں لیتے، ہمارے باپ دادا قتل ہو گئے ہیں، اس پیسے کو تجارت میں لگا کر اکٹھا کرو اور اسی پیسے کو ہم خرچ کر کے مسلمانوں سے بدلہ لیں گے۔ ابو سفیان نے اس پیسے کو اکٹھا کیا اور اس سے بہت بڑا لشکر تیار کیا۔ احابیش (غنڈہ گردی کرنے والوں) کو بھی پیسے دے کر خریدا اور تین ہزار کا لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کے ارادہ سے روانہ ہوئے تو یہ غزوہ احد کا سبب تھا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بدر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ ہے۔ اس کو بدر اس لیے کہتے ہیں وہاں کنواں تھا، اس کنویں کے مالک کا نام بدر تھا۔

حضور ﷺ کی ازواج بھی اہل بیت میں شامل ہیں:

﴿وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴾

اور جب آپ نے صبح کی اور اپنے گھر سے نکلے تو...... دنیا کی تمام تفاسیر اٹھا کر دیکھ لیں لکھا ہوا ہے کہ...... حضور اکرم ﷺ اس وقت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے نکلے تھے۔ اس سے ان لوگوں کا رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ اہل بیت سے صرف پنجتن پاک مراد ہیں۔

﴿مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾

جب جنگ ہوتی ہے تو بعض فوج داہنی طرف ہوتی ہے اس کو میمنہ کہا جاتا ہے اور بعض فوج بائیں طرف ہوتی ہے اس کو میسرہ کہا جاتا ہے اور بعض کو مقدمۃ الجیش کہا جاتا ہے، اس کو ہراول دستہ کہتے ہیں اور بعض فوج کا حصہ عقب میں رکھا جاتا ہے، تاکہ اگر ہم پر کبھی کمزوری کا کوئی وقت آجائے تو پیچھے والے آکر ہماری مدد کریں۔ یہ ساری جنگ کی ایک ترتیب ہوتی ہے؛ کیونکہ جنگ ایسے نہیں لڑی جاتی، بلکہ اس کے کچھ اصول اور ضوابط ہوتے ہیں۔

جنگ احد میں بعض صحابہ کرام کی پوزیشن:

﴿وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾

اللہ پاک نے صرف یہ نہیں فرمایا کہ جب آپ احد کی طرف جا رہے تھے، ورنہ اتنی بات ہی کافی تھی، لیکن فرمایا: جب آپ جنگی ٹھکانوں پر اپنے ساتھیوں کو بٹھا رہے تھے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جبل احد میں ایک درہ تھا، ایک راستہ تھا، وہاں حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کی ایک جماعت کو حکم دیا کہ تم لوگ اپنے آپ کو یہیں رکھو اور ان کے امیر

عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ جنگ احد میں ہم جیت جائیں یا خدانخواستہ ہمیں شکست ہو جائے، اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہمیں پرندے اچک رہے ہیں تو بھی تم لوگوں نے یہ جگہ نہیں چھوڑنی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میدانِ حرب اس طرح بنا تھا اور وہ جگہ اتنی اہم تھی کہ اگر خدانہ کرے دشمن لڑائی کے وقت پیچھے اس درے سے حملہ کر دیتا تو اس کا حملہ روکنا بہت مشکل ہو جاتا۔ بہرحال جب جنگ شروع ہوئی تو ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی۔ جو لوگ اس درے پر تھے، انہوں نے کہا کہ آپ کی بات کا مقصد یہ تھا کہ ہم یہاں رہیں، تاکہ دشمن حملہ نہ کرے، لیکن اب دشمن بھاگ گیا ہے اور وہ جان بچا رہے ہیں، لہٰذا اب ہم یہاں کیوں ٹھہرے رہیں؟ ہم بھی کافروں کو پکڑیں اور ان کا سامان اٹھائیں۔ ان کے امیر ان کو روکتے رہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو سمجھو! آپ نے فرمایا: تھا کہ ہم جیت جائیں یا ہار جائیں، مگر تم لوگ یہ جگہ نہ چھوڑنا۔ لیکن انہوں نے کہا: بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا مقصد لڑائی کے وقت تھا۔ اس طرح ان سے اجتہادی خطا ہوئی اور صبر میں کمی آئی۔ اور جب یہ کمی آئی، جب یہ کمزوری آئی اور وہ وہاں سے ہٹ گئے تو حضرت خالد بن ولید جو اس وقت کافر تھے، مسلمان نہیں ہوئے تھے اور کافروں کی طرف سے جنگ کے میمنہ کے سپہ سالار تھے، انہوں نے اس جگہ پر نظر رکھی ہوئی تھی؛ کیونکہ وہ جنگی آدمی تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ درہ خالی ہو گیا ہے تو اس نے اپنے لوگوں کو جمع کیا اور اسی جگہ سے آکر حملہ آور ہوا تو مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ کو گزشتہ آیات کے ساتھ اس لیے ذکر فرمایا کہ تمہیں شکست اس لیے آئی کہ ایک تو تم نے عبداللہ بن ابی منافق کو رازدان بنایا تھا، وہ تمہاری شکست کا سبب بنا کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لشکر لے کر احد کی طرف روانہ ہوئے وہ اپنے تقریباً تین سو ساتھیوں کو لے کر نکل گیا اور اس نے کہا: ہم نہیں لڑتے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری بات نہیں مانی، ہماری رائے کا خیال نہیں فرمایا، لہٰذا ہم کیوں لڑیں؟ تو جب ایک ہزار آدمی لڑنے جا رہا ہو اور اس سے تین سو آدمی نکل جائیں تو کمر ٹوٹ گئی۔ اس کی وجہ سے انصار کے دو قبیلے: بنو سلمہ اور بنو حارثہ کے قدم بھی لڑکھڑا گئے۔ انہوں نے کہا: اب ہم تھوڑے رہ گئے ہیں، یہ نکلنے والے بڑے سمجھدار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس جنگ میں کامیابی نہیں ہوگی۔ ان کے قدم بھی لڑکھڑانے لگے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ثابت قدم رکھا۔ اور دوسرا سبب صبر میں کمی تھا۔

ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے امت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو سبق دیا ہے کہ تمہاری فتح اسباب پر نہیں ہوتی، لشکر کی تعداد پر نہیں ہوتی اور تمہاری فتح اسلحہ کے زور پر نہیں ہوتی، بلکہ تمہاری قوت ایمان اور اسلام ہے، تمہاری قوت صبر

اور تقویٰ ہے اور تمہاری قوت محمد مدنی ﷺ کی غلامی ہے۔ جب تک اس پر قائم رہو گے مدد آئے گی اور جب اس میں کمی آئے گی تو ذلت آئے گی، شکست آئے گی۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾

اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں۔ یعنی جب مشورہ ہو رہا تھا تو اللہ تعالیٰ وہ بھی جانتے ہیں جو مومن مخلص کے دل میں ہے اور جو ابن ابی کی جماعت کے دل میں ہے ہم وہ بھی جانتے ہیں۔ ہمارے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔

جنگ بدر میں کامیابی کی وجہ:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾

ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے بدر کا ذکر فرمایا ہے کہ اے میرے نبی! اپنے صحابہ کو بتائیں کہ کیا بھول گئے بدر میں کیا ہوا کہ اللہ نے مقام بدر میں تمہاری نصرت کی، حالانکہ تم کمزور تھے، تم نہتے تھے، تمہارے پاس سواریاں بھی نہیں تھیں، تمہارے پاس تلواریں بھی نہیں تھیں، تمہارے پاس جنگ کے اسباب بھی نہیں تھے اور تمہارے پاس کوئی ذرائع بھی نہیں تھے، لیکن جب تم نے صبر کیا، ڈٹ گئے اور میرے مدنی کی اتباع کر لی تو تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی مدد کیسے پہنچی؟ لہٰذا اب بھی اللہ تعالیٰ یہی حکم دیتے ہیں کہ تم تقویٰ اختیار کرو، تاکہ تم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے بنو۔ یاد رکھیں! جب مومنوں کے اندر یہ دو صفات آئیں تو مومنوں کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ جب یہ صفات نہ رہیں تو مسلمانوں کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن، حضرت قتادہ، سدی اور جمہور علماء رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ان آیات میں احد کا قصہ مراد ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے یوم الاحزاب مراد ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: احزاب والا قول بالکل کمزور ہے یہ توجہ کے قابل بھی نہیں ہے۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جنگ احد جب واقع ہوئی تو ہفتہ کا دن تھا، شوال کا مہینہ تھا اور تین ہجری میں یہ واقعہ پیش آیا۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: شوال کی گیارہ راتیں گزر چکی تھیں، جب حضور اکرم ﷺ احد کے لیے نکلے۔

حضرت عکرمہ فرماتے ہیں: ہفتہ کا دن تھا اور تقریباً پندرہ شوال تھی۔ بہر حال یہ اقوال قریب قریب ہیں؛ کیونکہ

بات چھ شوال سے شروع ہوئی اور لڑائی کا دن پندرہ آ گیا۔

جنگ احد میں مشکلات:

غزوہ احد میں حضور اکرم ﷺ کو بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، جنگ احد میں مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا کہ ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ یہ وہی میدانِ احد ہے جس میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے چچا شہید ہوئے۔ اور یہ وہی میدان احد ہے جس میں حضور اکرم ﷺ کے خود کا کڑا کٹ کر رخسار میں لگا اور آپ کا چہرہ مبارک لہولہان ہو گیا۔ یہ وہی کارزار احد ہے جس میں حضور اکرم ﷺ کے دانت مبارک شہید ہوا۔ یہ بہت بڑا امتحان تھا جس میں مسلمانوں پر ایک بلائے ناگہانی ٹوٹ پڑی۔

اور اس کے ساتھ جنگ بدر کا ان آیات مبارکہ میں ذکر ہو رہا ہے۔ ان کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک غزوہ میں فتح و کامرانی ہے اور دوسرے غزوہ میں اللہ کا نبی بھی موجود ہے اور وہی صحابہ کی جماعت بھی موجود ہے، لیکن اس میں شکست ہے، پریشانی ہے۔

ان دونوں غزووں کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان میں تدبر و تفکر کریں کہ ایک میں ہمیں فتح ملی تو کیسے ملی اور ایک میں شکست آئی تو کیوں آئی؟ اس کی وجہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ غزوہ احد میں صحابہ سے اجتہادی خطا ہوئی کہ ایک تو آپ کا مدینہ کے اندر رہ کر لڑنے کا ارادہ تھا، لیکن بعض صحابہ جوش میں آ گئے اور انہوں نے کہا: دشمن سے باہر جا کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ ان کا جذبہ خالص اور نیت نیک تھی، لیکن چونکہ حضور اکرم ﷺ کی رائے کے مطابق نہیں تھا، آپ کی رائے تھی کہ ہم مدینہ کے اندر رہ کر لڑیں گے؛ کیونکہ دشمن مکہ سے ساڑھے چار سو کلومیٹر دور سے آیا ہے ان کو اتنی دور سے کمک پہنچنا کوئی آسان نہیں ہوگا۔

یہ مدینہ منورہ کے باہر کتنی مدت بیٹھیں گے۔ جب ان کے پاس سب کچھ ختم ہو جائے گا تو ہم ان کے عقب میں حملہ کریں گے۔ اگر یہ مدینہ منورہ کے اندر داخل ہوں گے تو ہم ان کو ایک ایک گلی، ایک دیوار پر ان کو روکیں گے، ہمارے بچے اور عورتیں چھتوں پر پتھروں کے ذریعہ ان کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں۔ صحابہ جذبہ جہاد اور شجاعت اسلامی میں آ کر باہر لڑنے کو زیادہ ترجیح دینے لگے۔ جب آپ گھر سے آئے تو ان نوجوان صحابہ کو احساس ہوا اور انہوں نے کھڑے ہو کر درخواست کی کہ اگر آپ کی منشاء باہر لڑنے کی نہیں ہے تو ہم آپ کے غلام ہیں، ہم نے جذبہ

بہادری کے اندر آ کر بات کردی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے کسی نبی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ ہتھیار پہن کر واپس لوٹ جائے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے فیصلہ کر دیں۔

جب صحابہ سے اجتہادی خطا ہوئی، (یہ نافرمانی نہیں ہے؛ کیونکہ نافرمانی تب ہوتی جب دشمن سے مل کر کوئی سازش کرے اور پھر وہ خود بچ جائیں تو دشمن کہہ سکتا ہے کہ صحابہ نے حضور اکرم ﷺ کا کہنا نہ مانا) جب انہوں نے درہ چھوڑا تو چونکہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پرانے جنگجو آدمی تھے، اس کی نظر اس درے پر تھی۔ انہوں نے جبل احد کے پیچھے سے جا کر کافروں کو روکا کہ کیوں مڑ کر بھاگے جا رہے ہو؟ اور پھر اسی درے پر صحابہ پر حملہ کر دیا۔ اب چونکہ صحابہ مطمئن تھے کہ ادھر سے حملہ نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ ہمارا پہرہ مضبوط ہے۔ اگر کوئی دشمن ادھر سے آتا ہوا نظر آئے گا تو وہ کم از کم ہمیں اطلاع دیں گے۔ خالد بن ولید ٹوٹ پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فتح شکست میں بدل گئی، ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے اور حضور اکرم ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے۔ احادیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ اپنے ہاتھوں سے اور اپنے کپڑوں سے اپنے چہرے مبارک کا خون روک رہے ہیں اور آپ کا چہرہ مبارک خون سے بھرا ہوا ہے تو اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک سبق دیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اجتہادی خطا ہوئی تو مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی۔

بظاہر ایسے شکست کے آثار پیدا کیے کہ ابوسفیان کو اتنی جرأت ہوئی کہ وہ پہاڑ پر چڑھ کر کہنے لگا: ''أُعلُ هُبَلُ'' (آج ہمارا خدا بلند ہو گیا)۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے عرض کیا: حضور! ابوسفیان یہ کہہ رہا ہے تو ہم کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا: تم کہو: ''اللّٰهُ أَعْلَى وَأَجَلُّ'' (کہ اللہ کی ذات سب سے بلند ہے)۔ یہ وقتی طور پر شکست کا ہو جانا تمہارے خدا کی کامیابی نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم پر امتحان ہے۔

ابوسفیان نے پھر نعرہ لگایا: ''يَوْمٌ بِيَوْمِ بَدْرٍ'' اے مسلمانو! آج ہم نے بدر کا بدلہ لے لیا، آج ہم برابر ہو گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اس کو جواب دو کہ ہم کیسے برابر ہو گئے!؟ ہمارے قتل ہونے والے جنت میں شہید بن گئے اور تمہارے جہنم میں پڑے ہیں، تو کیسے برابر ہو گئے۔

ابوسفیان نے پھر نعرہ لگایا: ''إِنَّ لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ'' عزیٰ اس کے خدا کا نام تھا۔ آج عزیٰ نے ہمیں عزت دی ہے، ہمارے ساتھ ہے، تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: عمر! ان کو جواب دو: ''اللّٰهُ

مَوْلَانَا، وَلَا مَوْلَى لَكُمْ ''اللہ ہمارا ولی و ناصر ہے، تمہارا کوئی ولی و ناصر نہیں۔

کافروں نے اعلان کر دیا: ''قَدْ مَاتَ مُحَمَّدٌ'' ''محمد مصطفیٰ ﷺ شہید ہو گئے، صحابہ کی کمر ٹوٹ گئی۔

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ایک عورت مدینہ منورہ سے دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کو بتایا گیا کہ تمہارا شوہر شہید ہو گیا ہے، اس نے کہا: کوئی بات نہیں، مجھے یہ بتاؤ کہ محمد مدنی ﷺ کس حال میں ہیں؟ اس کو بتایا گیا کہ تیرا بیٹا شہید ہو گیا ہے، اس نے کہا: میرے بیٹے کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ محمد مدنی ﷺ کس حال میں ہیں؟ صحابہ پریشان تھے۔ ان کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کی یہ آیات مبارکہ اتاری تھیں: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ﴾ [آلِ عمران: ۱۴۴] اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے محمد مصطفیٰ بھی تو میرا ایک رسول ہے، میرے بندوں میں سے ایک بندے ہیں، اولادِ آدم ہیں، آپ سے پہلے بھی نبی اور رسول گزرے ہیں تو کیا اگر محمد مصطفیٰ پر موت آجائے یا شہید ہو جائیں تو کیا تم دین چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے؟ تم نے اپنے اللہ کی توحید کو بھی بھلا دینا ہے۔ اب دیکھیں! جب دشمن حضور اکرم ﷺ کی موت کی خبر اڑا رہا تھا تو آپ فرما سکتے تھے کہ میری رسالت کا نعرہ بلند کرو، تا کہ دشمن کو پتہ چلے کہ میں موجود ہوں۔

﴿إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ ۝ بَلَىٰ ۚ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ ۗ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ ۝ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ۝ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝﴾ [آلِ عمران: ۱۲۴ تا ۱۲۹]

''جب (بدر کی جنگ میں) تم مومنوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کو بھیج دے؟ ہاں! بلکہ اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو اور وہ لوگ اپنے اسی ریلے میں اچانک تم تک پہنچ جائیں تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتے تمہاری مدد کو بھیج دے گا جنہوں نے اپنی پہچان نمایاں کی ہوئی ہوگی۔ اللہ نے یہ سب انتظام صرف اس لئے کیا تھا، تاکہ تمہیں خوشخبری ملے اور اس سے تمہارے دلوں کو اطمینان نصیب ہو، ورنہ فتح تو کسی اور کی طرف سے نہیں، صرف اللہ کے پاس سے آتی ہے، جو مکمل اقتدار کا بھی مالک ہے، تمام تر حکمت کا بھی مالک۔ (اور جنگ بدر میں یہ مدد اللہ نے اس لیے کی) تاکہ جن لوگوں نے کفر اپنایا ہے ان کا ایک حصہ کاٹ کر رکھ دے یا ان کو ایسی ذلت آمیز شکست دے کہ وہ نامراد ہو کر واپس چلے جائیں۔ (اے پیغمبر!) تمہیں اس فیصلے کا کوئی اختیار نہیں کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے یا ان کو عذاب دے؛ کیونکہ یہ ظالم لوگ ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ اور اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔''

غزوۂ بدر:

﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ﴾

اب غزوۂ بدر کا ذکر آیا ہے کہ میرے مدنی! یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے مقامِ بدر میں تمہاری مدد کی، جبکہ تم کمزور اور بے سروسامان تھے اور دشمنوں کی نظر میں بالکل قلیل تھے کہ تم تین سو تیرہ تھے اور کافر ایک ہزار تھے۔ صحابہ کے پاس دو گھوڑے، دس اونٹ تھے، تلوار نہیں تھی، حتیٰ کہ صحابہ نے حضور اکرم ﷺ سے عرض بھی کیا تھا کہ ہم کن چیزوں سے کافروں سے لڑیں گے؟ آپ نے فرمایا: کھجوروں کے گوشے لے آؤ۔ وہ لائے گئے، ان کی چھڑیاں اتاری گئیں۔ وہ صاف کر کے آپ نے اپنے ہاتھوں سے صحابہ کو پکڑوائیں کہ اب ہم ان سے مقابلہ کریں گے؛ کیونکہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے سہارے پر لڑنا ہے، ہم نے اسلحہ کے سہارے پر نہیں لڑنا۔ جب صحابہ کرام کا یہ لشکر مقامِ بدر پہنچا تو پانی والا حصہ کافروں کے پاس اور ریت والا حصہ مسلمانوں کے پاس آ گیا تو صحابہ نے اس موقع پر عرض کیا کہ یہ بڑا عجیب مقابلہ ہے! حضور اکرم ﷺ نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ کی نصرت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ اپنے ساتھیوں کو بتائیں کہ کوئی فکر نہ کرو، تمہارا زمین کی فوج سے مقابلہ ہے، ہم نے آسمانوں کی فوج کو

حکم دیا ہے کہ تین ہزار فرشتے محمد مصطفیٰ ﷺ کی نصرت کے لیے اتریں۔

یہاں یاد رکھیں کہ کافروں کے مقابلہ پر ایک فرشتہ بھی کافی تھا، لیکن تین ہزار فرشتوں کو بھیجنا یہ مسلمانوں کے لیے اعزاز تھا کہ ﴿بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ﴾ [آلِ عمران: ۱۲۵] پہلی والی دو شرطیں: صبر اور تقویٰ کا بیان ہے کہ اے میرے مدنی! اپنے صحابہ سے کہیں کہ تم صبر کرو اور دشمن کے مقابلے پر جمے رہو اور صرف مجھ سے ڈرو اور کسی سے نہ ڈرو، اللہ سے تقویٰ اختیار کرو۔ یاد رکھو! اگر تم پر دشمن اچانک ٹوٹ پڑا تو فکر نہ کرو، پھر ہمارا بھی وعدہ ہے کہ ہم پانچ ہزار فرشتے آسمانوں سے ایسے اتاریں گے کہ وہ ایسے گھوڑوں پر سوار ہوں گے جو علامت سے واضح ہوں گے۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ان فرشتوں پر علامتیں ہوں گی کہ جن سے پتہ چلے گا کہ یہ بھی رضا کار ہیں، یہ بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے خادم بن کر آئے ہیں، شرط یہ ہے کہ تم جمے رہو۔ حضور اکرم ﷺ کے لیے ایک عریش (چھپر) بنایا گیا، تاکہ سایہ بھی رہے اور اگر ضرورت ہو تو اوپر کھڑے ہو کر اپنے سپاہیوں پر نظر بھی رکھ سکیں۔

حضور اکرم ﷺ کو مدینہ والوں کی فکر تھی؛ کیونکہ ان لوگوں نے کبھی جنگ نہیں لڑی تھی۔ وہ زراعت پیشہ لوگ تھے اور قریش ساری زندگی جنگیں ہی لڑتے رہے، تو حضور اکرم ﷺ کو انصار مدینہ کی فکر تھی۔ اور اللہ کی شان ہے کہ جنگ بھی ایسی ان کے سامنے آگئی کہ نہ ہتھیار ہے، نہ سواریاں ہیں، نہ کھانے پینے کا سامان ہے اور دشمن کا یہ عالم تھا کہ ان کا ایک ایک سردار روزانہ لشکر کو کھانا دے رہا تھا۔ اس کے باوجود صحابہ کی ثابت قدمی کا یہ حال تھا کہ جب آپ اس پریشانی کے اندر تھے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ جو انصار کے سردار تھے، انہوں نے آپ کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ آپ کیوں فکر مند ہو رہے ہیں؟ کیا آپ اس لیے فکر کر رہے ہیں کہ ہم انصار لڑنا نہیں جانتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، لیکن: ''لَسْنَا أَصْحَابَ مُوْسٰى وَنَحْنُ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ ﷺ'' ہم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی نہیں ہیں جو ان کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، ہم تو محمد مدنی ﷺ کے ساتھی ہیں۔ ہم تو آپ کے سامنے کٹیں گے، آپ کے دائیں بائیں کٹیں گے، ہماری لاشوں پر گزر کر دشمن آسکتا ہے، ورنہ جب تک ہم زندہ ہیں کوئی آپ کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھا سکتا۔ حضور اکرم ﷺ کا چہرہ مبارک کھل اٹھا۔ یعنی ثابت قدمی کا اتنا بڑا مظاہرہ کہ جو نہ لڑنے والے تھے وہ اتنے بڑے بہادر نکلے۔

غزوۂ بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! اگر تو نے ہماری مدد نہ کی تو یہ میری چھوٹی

سی جماعت ہے۔ اگر آج ان کو بھی تو نے ہلاک کر دیا تو تیرے نام لیوا مٹ جائیں گے۔

اس سے اندازہ کریں کہ اللہ کے نبی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہے ہیں، نہ آدم علیہ السلام سے اور نہ کسی دوسرے پیغمبر سے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ جتنے پیر تمہارے ہیں ان کی شان زیادہ ہے یا سیدنا ابراہیم الخلیل علیہ السلام کی شان زیادہ ہے؟ وہ اللہ کے نبی ہیں، ساری دنیا کے ولی اکٹھے کرو، ایک صحابی کا مقابلہ نہیں کر سکتے، سارے انبیاء کے صحابہ ایک نبی کا مقابلہ نہیں کر سکتے، لیکن اللہ کے نبی اللہ سے مدد مانگ رہے ہیں اور ہم غیروں سے مدد مانگ رہے ہیں۔

﴿هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ﴾

علماء کہتے ہیں: پانچ ہزار فرشتہ نہیں اترا! کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہے کہ گر تم پر دشمن اچانک آپڑا تو ہم پانچ ہزار فرشتہ اتاریں گے۔

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایک کافر جس کا نام کرز بن جابر تھا، وہ اپنے علاقے سے بہت بڑا لشکر لے کر قریش کی مدد کے لیے آرہا تھا۔ مسلمانوں کو جب یہ اطلاع ملی تو انہوں نے سوچا کہ کافر تو پہلے بھی ہم سے زیادہ ہیں اور کرز بن جابر بھی لشکر لے کر آرہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی! اپنے صحابہ سے کہہ دیں کہ کوئی گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ لشکر آپہنچا تو میرا بھی آسمانوں سے مزید لشکر آپہنچے گا۔ صحابہ کہتے ہیں: اس دن اللہ کے فرشتے ایسے مدد کے لیے اترے کہ جنگ کے بعد صحابہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ہم تلوار کا اشارہ کرتے تھے، ابھی ہماری تلوار کافر کی گردن کے قریب بھی نہیں جاتی تھی کہ اس کی گردن اڑ جاتی تھی۔ آپ نے فرمایا: وہ اللہ کے فرشتے تمہاری طرف سے لڑ رہے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ﴾ ہم نے فرشتوں کی فوج اس لیے اتاری تھی کہ ایک تمہارے لیے خوش خبری ہو جائے اور دوسرا تمہارے دلوں کے لیے طمانینت وسکون کا ذریعہ بن جائے، ورنہ اللہ تبارک وتعالیٰ تو بغیر فرشتوں کے اتارنے کے بھی مدد کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھیجنے کے بغیر بھی کافروں کو شکست دے سکتے ہیں۔

﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾

اور مدد اللہ کے ہاتھ میں ہے جو غالب بھی ہیں اور حکمت والے بھی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ مدد اس لیے کی، تاکہ کافروں کی ایک جماعت کٹ جائے اور کافروں کو اللہ ذلیل کر دیں اور وہ ایسے لوٹیں کہ ناکام ہوں۔

غزوۂ بدر پہلے ہے اور غزوۂ احد بعد میں ہے، لیکن یہاں پہلے غزوۂ احد کا ذکر ہے اور پھر غزوۂ بدر کا ذکر ہے؛

کیونکہ نزولِ قرآن کے وقت مقصود تنبیہ تھی اس لیے احد کو مقدم کر دیا اور بدر کا ذکر مؤخر کر دیا۔

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ﴿١٢٨﴾﴾

اب دوبارہ آیت میں احد کا ذکر ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ جب جنگ احد میں حضور اکرم ﷺ کے دانت مبارک شہید ہوئے، آپ کا رخسار مبارک زخمی ہوا، حضور اکرم ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، آپ غصہ اور جلال میں آ گئے، آپ نے کافروں کا نام لے کر لعنت بھی کی اور یہ بھی کہا کہ یا اللہ! یہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی کے چہرے کو بھی لہو لہان کر رہی ہے؟ انہوں نے اپنے نبی کے چہرے کا بھی لحاظ نہیں کیا، وہ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر فرمایا: میرے مدنی! آپ کے ہاتھ میں ہر چیز نہیں ہے، میری مرضی ہے۔ آج وہ خالد جو جنگ احد میں آپ کو شکست دے رہا ہے، میں آپ کا سپاہی بناؤں گا، میں اسے ''سیف اللہ'' کا لقب دلواؤں گا۔ اور عکرمہ جو آج دشمنوں کی طرف سے لڑ رہا ہے وہ بطل اسلام بنے گا۔ اس لیے یہ سب میرے ہاتھ میں ہے، تو آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کیسے فلاح پائیں گے؟ ہدایت میرے ہاتھ میں ہے، عزت اور ذلت میرے ہاتھ میں ہے، میں ان کی توبہ قبول کروں گا۔

اس لیے آگے فرمایا: ﴿وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٩﴾﴾ [آل عمران: ۱۲۹] جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ اللہ کا ہے، جس کو چاہیں بخش دیں اور جس کو چاہیں عذاب دے دیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ بخشنے والے بھی ہیں اور مہربان بھی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام دلوں کا مالک اللہ ہے، وہ چاہے تو بھٹکے ہوؤں کو صراطِ مستقیم پر کھڑا کر دیں، وہ چاہیں تو عزیزوں کو ذلیل کر دیں، وہ چاہیں تو ذلیلوں کو عزیز کر دیں اور وہ چاہیں تو فقیروں کو غنی کر دیں اور غنیوں کو فقیر کر دیں۔

ان دونوں جنگوں سے ہمیں یہ سبق ملا کہ اصل فتح ونصرت کے مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں اور ہمیں اسی کے حکم کی اطاعت کرنی چاہیے۔

ترتیبِ مضامینِ قرآن:

﴿إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنزَلِينَ ﴿١٢٤﴾ .... وَلِلَّهِ مَا فِي

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ [آل عمران: ۱۲۴تا۱۲۹]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو اپنے پیغمبر سے اپنی رحمت سے وعدہ فرمایا کہ ہم آپ کی مدد کریں گے تین ہزار فرشتوں سے اور دوسرا وعدہ فرمایا کہ پانچ ہزار فرشتوں سے مدد فرمائیں گے۔ پانچ ہزار فرشتوں کے اندر دو قول ہیں: بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ وعدہ مشروط تھا کہ اگر دشمن تم پر اچانک ٹوٹ پڑے تو میں پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کروں گا۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ فرشتوں کے نزول کا وعدہ احد میں تھا یا بدر میں تھا؟ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں واقعات کو کچھ اتصال سے بیان کیا ہے اور اس میں تقدیم وتاخیر بھی ہے کہ بدر پہلے ہے اور احد بعد میں ہے۔ تقدیم وتاخیر کا فائدہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اس کے اندر مسلمانوں کو تنبیہ ہے حکم دیا گیا کہ کافروں کو مشوروں میں نہ شریک کرو، ان کو اپنا راز دان نہ بناؤ، لیکن احد میں عبداللہ بن ابی مشورے میں شریک تھا، اس لیے احد کا ذکر پہلے آ گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر کو بیان کیا کہ بدر میں تمہیں اس لیے کامیابی ملی کہ تم نے اس میں کسی غیر کو شریک مشورہ نہیں کیا تھا، تم نے کسی دشمن کو اپنے ساتھ شامل نہیں کیا اور صبر وتقویٰ کا اعلیٰ مظاہرہ کیا تھا تو ہماری مدد بھی آ گئی۔

یاد رکھیں! قرآن کوئی قصے کی کتاب نہیں ہے کہ ترتیب سے قصہ بیان ہو، بلکہ یہ تو کتابِ ہدایت ہے، اس میں تذکرہ ہے، وعید ہے، یہ تو انسانوں کو جھنجوڑتا ہے اور ان کو حیوانیت سے نکال کر انسان بناتا ہے۔ اس لیے جہاں جتنی ضرورت ہوتی ہے آیت آ جاتی ہے، ترتیب کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

علماء نے لکھا ہے کہ فرشتے احد میں اترے یا بدر میں اترے، وہ صحابہ کی مدد کے لیے اترے۔ اگر صحابہ ناپاک ہوتے تو فرشتے کبھی نہ اترتے۔ صحابہ کی ایسی مقدس اور پاک جماعت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس پاک جماعت کی مدد کے لیے پاکیزہ فوج بھیجی، ورنہ اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو بھیجتے جو تمام کافروں کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرشتے اتار کر اشارہ کر دیا کہ میرا احمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی پاک ہے، میرے مدنی کی جماعت بھی پاک ہے اور ان کے ساتھ مل کر لڑنے والے بھی پاک ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا دشمن پلید اور کافر ہے۔

فرشتے جنگ بدر میں اترے تھے یا جنگ احد میں؟

اس بات میں علماء کے دو قول ہیں کہ فرشتے احد میں اترے تھے یا بدر میں اترے تھے۔

پہلا قول: حضرت حسن بصری رحمہ اللہ، حضرت عامر شعبی رحمہ اللہ اور حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کریمہ ﴿إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ کا تعلق ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ﴾ کے ساتھ ہے۔ یعنی فرشتوں کے اترنے کا تعلق بدر کے ساتھ ہے اور اسی قول کو ابن جریر رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔

عباد بن منصور رحمہ اللہ نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ﴿إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ﴾ کا تعلق یوم بدر سے ہے۔ اس کو ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت عامر شعبی سے روایت ہے کہ بدر کے میدانوں میں مسلمانوں کو یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر مشرکوں کی مدد کے لیے آرہا ہے۔ یہ بات مسلمانوں کے لیے بڑی مشقت والی تھی تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر یہ آیات نازل کیں: ﴿إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ﴾ میرے مدنی! کیا تمہیں یہ کفایت نہیں کرے گا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں سے تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے۔ باقی پانچ ہزار فرشتوں کی بات یہ ہے کہ جب کرز بن جابر لشکر لا رہا تھا تو اس کو پتہ چل گیا کہ کافروں کو شکست ہوگئی، اس لیے وہ ان کی مدد کو نہ آیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بھی پانچ ہزار فرشتے نہیں بھیجے؛ کیونکہ پانچ ہزار کا وعدہ دشمن کے آنے سے مشروط تھا۔

کتنے فرشتے اترے تھے؟

سوال: مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرآن کی ایک آیت مبارکہ میں آیا ہے: ﴿إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ﴾۔ اور دوسری جگہ آیا: ﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ﴾ [الانفال: ۹] کہ ایک آیت میں ایک ہزار کا ذکر ہے اور دوسری میں تین ہزار اور تیسری میں پانچ ہزار فرشتوں کا ذکر ہے۔

جواب: علماء نے فرمایا: یہ تعارض نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جہاں ہزار کا وعدہ ہے وہاں فرمایا: ''مردفین''۔ جس کا معنی ہے کہ ان کے پیچھے اور بھی آئیں گے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑھا کر تین کر دیا اور پھر پانچ ہزار تعداد کر دی، لہٰذا اس میں کوئی تعارض نہیں ہے، لیکن دشمنانِ اسلام ایسی باتیں تلاش کر کے مسلمانوں کو حیران کرتے ہیں، حالانکہ دنیا کے اندر بھی کوئی بادشاہ دوسرے کو کہتا ہے: آپ پریشان نہ ہوں، ہم ایک ہزار جوان

بھیج رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تھوڑے ہیں۔ یہ کہتا ہے: کہ چلو ہم تین ہزار کر دیتے ہیں۔ وہ کہے کہ دشمن کی تو اور بھی کمک آ رہی ہے، یہ کہتا ہے کہ چلو ہم پانچ ہزار بھیج دیتے ہیں۔ یہ کوئی تعارض نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کا تو مقصد بھی یہ تھا: ﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ کہ مسلمانوں کے دل کو اطمینان ملے، لیکن اصل مدد اور فتح تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں تو ایک مچھر سے نمرود کو مروا دیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں تو ابابیلوں سے ہاتھیوں کو برباد کر دیں۔ غزوہ احزاب میں جب کفر کے سارے قبائل اکٹھے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ہوا بھیجی جس سے دشمنوں کے خیمے اڑ گئے اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ ناکام و نامراد ہو کر واپس چلے گئے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ بدر و احد میں چاہتے تو ایک فرشتے کو بھی نہ بھیجتے اور کافروں کو ہلاک کر دیتے، لیکن یہ مسلمانوں کا اعزاز تھا کہ میرے مدنی! آپ بھی شان والے اور آپ کے صحابہ بھی شان والے، مشرکوں کی مدد کافروں سے آئے گی اور صحابہ کی مدد آسمانوں سے آئے گی۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بات دلالت کرتی ہے کہ یہ قصہ بدر کا ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ بدر میں اللہ کے فرشتوں نے اتر کر کافروں کے ساتھ جنگ لڑی۔ واللہ اعلم۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہے: ﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ؕ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۲۴، ۱۲۵] اس آیت کا تعلق پہلی آیت: ﴿وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [آل عمران: ۱۲۱] سے ہے، یعنی احد کے واقعہ سے تعلق ہے۔ یہ قول حضرت مجاہد، حضرت عکرمہ، حضرت ضحاک، حضرت زہری اور حضرت موسیٰ بن عقبہ وغیرہ رحمہم اللہ کا ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ اللہ پاک نے پانچ ہزار فرشتوں کو احد میں نہیں اتارا، بلکہ ایک فرشتہ بھی نہیں اتارا گیا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا تھا: ﴿اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا﴾ شرط یہ تھی کہ تم صبر کرو اور ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرو، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم اس دن صبر اختیار نہ کر سکے، بلکہ انہوں نے وہ درہ چھوڑ دیا، ثابت قدم نہ رہ سکے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی مدد نازل نہ فرمائی۔ حضرت عکرمہ نے احد میں تین ہزار

کی بھی نفی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ غزوہ احد میں ایک ہزار بھی فرشتہ شریک نہیں ہوا تھا۔

جنگوں میں اترنے والے فرشتوں کی علامات:

﴿مُسَوِّمِيْنَ﴾ ان فرشتوں پر نشانی ہوگی کہ تمہیں اندازہ ہو کہ یہ فرشتہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: بدر والے دن اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو سفید اونی لباس دیا تھا اور جن گھوڑوں پر وہ سوار تھے ان کی پیشانیوں پر علامات تھیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ سرخ اونی لباس میں تھے۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان کے گھوڑوں کی پیشانی اور پاؤں سفید تھے اور ان کی دموں پر بھی علامت تھی۔ حضرت مکحول رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان کی نشانی یہ تھی کہ انہوں نے سر پر پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول مبارک ہے کہ جب بدر والے دن فرشتے اترے تو ان کے سروں پر سیاہ رنگ کی پگڑیاں تھیں اور یومِ حنین میں جب اترے تو ان کے سروں پر سرخ رنگ کی پگڑیاں تھیں۔ یعنی یہ وہ علامات تھیں جن سے وہ پہچانے جاتے تھے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: فرشتوں نے لڑائی میں شرکت صرف بدر والے دن کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک قول مبارک یہ بھی منقول ہے کہ جب ملائکہ آئے تو ان کی پگڑیاں سفید تھیں اور ان کے پلے انہوں نے پشت کی طرف ڈالے ہوئے تھے۔ حنین والے دن ان پر سرخ رنگ کی پگڑی تھی اور ملائکہ نے کسی جگہ کافروں کو نہیں مارا سوائے بدر کے، ورنہ دوسرے مقامات پر مسلمانوں کا عدد بڑھانے کے لیے، مسلمانوں کی نصرت کے لیے اترتے رہے، لیکن قتال میں حصہ نہیں لیا (یہ تمام روایات تفسیر ابن کثیر جلد: ۲، صفحہ: ۱۱۳ پر سند کے ساتھ منقول ہیں)۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی بدر والے دن پگڑی زرد رنگ کی تھی اور اس کا پلہ آپ نے منہ پر ڈالا ہوا تھا تو ملائکہ بھی اسی رنگ کی پگڑیوں میں اترے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث: ۳۴۷۵۳، راوی عباد بن حمزہ رضی اللہ عنہ)۔

بہر حال یہ سارے اقوال ہیں جو مفسر رحمہم اللہ نے نقل کیے ہیں۔

﴿وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ وَأَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ وَسَارِعُوْا إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ ۙ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ أُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۱۳۱ تا ۱۳۶]

''اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور اللہ اور رسول کی بات مانو، تاکہ تم سے رحمت کا برتاؤ کیا جائے۔ اور اپنے رب کی طرف سے مغفرت اور وہ جنت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ کر تیزی دکھاؤ، جس کی چوڑائی اتنی ہے کہ اس میں تمام اور زمین سما جائیں۔ وہ ان پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو خوشحالی میں بھی اور بدحالی میں بھی (اللہ کے لیے) مال خرچ کرتے ہیں اور جو غصے کو پی جانے اور لوگوں کو معاف کر دینے کے عادی ہیں۔ اللہ ایسے نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر کبھی کوئی بے حیائی کا کام کر بھی بیٹھتے ہیں یا (کسی اور طرح) اپنی جان پر ظلم کر گزرتے ہیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں کہ اور اس کے نتیجے میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، اور اللہ کے سوا ہے بھی کون جو گناہوں کی معافی دے؟ اور یہ اپنے کیے پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کا صلہ ان کے پروردگار کی طرف سے مغفرت ہے، اور وہ باغات ہیں جن کے نیچے دریا بہتے ہوں گے، جن میں انہیں دائمی زندگی حاصل ہوگی، کتنا بہترین بدلہ ہے جو کام کرنے والوں کو ملنا ہے۔''

ربطِ آیات:

ان آیات کے بارے میں بعض مفسرین کرام کے دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ پچھلی بات اپنی جگہ ختم ہو گئی، اب یہ علیحدہ ایک حکم ہے، اس کا سابقہ آیات کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔ ہم اللہ کے بندے ہیں، اللہ جب چاہیں اور جو چاہیں اپنے بندوں کو حکم دیں، کسی بندے کو اللہ کے کام پر اعتراض کا حق نہیں ہے۔

شانِ نزول:

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ان آیات کا سابقہ آیات سے ایک تعلق ہے کہ جنگ بدر میں جب ستر کافر مارے گئے تو ان کے ورثاء نے ابوسفیان سے کہا: تجارت کے سارے پیسے ہمیں نہ دو، اس پیسے پر تجارت کا سود کا کاروبار کرو، جتنی دولت آئے اکٹھی کرو، ہم مسلمانوں سے جا کر اپنے باپ دادا کا بدلہ لیں گے...... کیونکہ قبائلی لوگ تھے اور قبائلی لوگوں کا کوئی آدمی قتل ہو جائے تو وہ اس کو بھولتے نہیں ہیں...... تو ان کافروں نے وہ تجارتی اور سود والی رقم خرچ کی اور احد میں آکر مسلمانوں سے لڑے۔ اب مسلمانوں کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر ہمارے پاس بھی پیسے ہوں اور ہم بھی لوگوں کو پیسے دیں اور رقم جمع کر کے ان کافروں سے مکہ میں لڑیں اور ان سے بدلہ لیں تو تعالیٰ نے فرمایا: تم کافروں کی طرح سود کھا کر جنگ کی تیاری کرنے کا نہ سوچو؛ کیونکہ تمہارے لیے سود حرام ہے۔

اس لیے غزوۂ بدر و احد کے بعد ان آیات کو نازل فرمایا، تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم سود کھا کر، دولت کے بل بوتے پر شکست دے دیں گے۔ یہ غلط بات ہے، حلال حلال ہے اور حرام حرام ہے۔ قوت و طاقت حلال میں ہے، حرام میں نہیں ہوتی۔ کافروں کی فتح اس وجہ سے نہیں ہوئی، بلکہ اس میں تمہاری اپنی غلطی کا دخل ہے۔

غزوۂ احد میں مسلمانوں کی فتح:

غزوۂ احد میں انجام کے اعتبار سے فتح مسلمانوں کی ہوئی تھی، مثلاً: آپ میرے ساتھ ایک گلاس حاصل کرنے کے لیے لڑیں۔ اگر آپ گلاس نہ لے سکیں، میرے چاہے دس آدمی مارے جائیں، جیت آپ کی نہیں ہوئی؛ کیونکہ گلاس آپ کو نہیں ملا۔ کافروں کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے اور مدینہ منورہ پر قبضہ کیا جائے، لیکن ان کو یہ مقصد حاصل نہ ہوا اور وہ ناکام ہو کر واپس آگئے، حالانکہ مسلمان شکست کھا رہے تھے، مسلمان شہید ہو رہے تھے، لیکن بھاگ کافر ہی رہے تھے۔ مدینہ منورہ بھی خالی تھا؛ کیونکہ وہاں ابن ابی کی جماعت تھی، مخلص جوان حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھے۔ اس کے باوجود بھی کافروں کا مدینہ منورہ میں داخل نہ ہونا ان کی شکست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ آیات کے اندر حکم دیا تھا کہ صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو۔ اس لیے فرمایا: خیال رکھنا سود کھانے والے اللہ سے نہیں ڈر رہے ہیں۔ اگر تم بھی اللہ سے نہ ڈرے تو کامیابی کیسے ہوگی؟

سود کا معنی اور گناہ:

سود کو مثال سے سمجھیں کہ میں نے کسی کو ایک سو ریال قرض دیا اور میں نے کہا: تم مجھے ایک ماہ بعد سو ریال واپس کرو گے، لیکن پانچ ریال اس کے ساتھ مزید دو گے۔ آپ جو مجھے سو ریال دیں گے وہ ان سو کے بدلے میں ہو گئے، یہ اوپر والے کسی چیز کے بدلے میں نہیں ہیں۔ اس کا نام سود ہوتا ہے۔

آج کل لوگوں کے دماغوں میں ایک شیطانی خیال گھسا ہوا ہے کہ سود انفرادی ہوتا ہے، یہ اجتماعی طور پر بڑی بڑی کمپنیوں کو جو بینک دیتے ہیں یہ سود نہیں ہے۔ حالانکہ سود سود ہے، چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی ہو۔ مثلاً: ایک آدمی چوری کرتا ہے، پکڑا جائے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ اگر چار آدمی مل کر چوری کرتے ہیں تو نہ کاٹیں؟ حالانکہ چوری چوری ہے، چاہے ایک کرے، دو کریں، تین کریں یا چار کریں۔ سود کی حرمت اتنی شدید ہے کہ حرام تو سور بھی ہے، حرام تو گندگی بھی ہے، لیکن کسی چیز پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ میرے ساتھ جنگ ہے، لیکن سود حرام ہے، خدا کے ساتھ جنگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر سود خور سود کھانے سے نہیں رکیں گے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ [البقرۃ: ۲۷۹] اے میرے مدنی! ان کو خبر کر دو کہ پھر اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

آپ ایمان سے سوچیں کہ جتنی اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا کی ہے یہ ساری اکٹھی ہو جائے تو کیا اللہ تعالیٰ سے جنگ لڑ سکتے ہیں؟ لیکن آج ہر اسلامی ملک میں جب سود کھا کر اللہ سے جنگ لڑ رہے ہیں تو کامیابی کیسے ملے گی؟

سود کا نقصان:

دوسری بات اللہ تعالیٰ نے یہ سمجھائی کہ ﴿يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ [البقرۃ: ۲۷۶] اللہ تعالیٰ برباد کر دیتے ہیں سود کو اور بڑھاتے ہیں خیرات کو۔

اب بظاہر خیرات کرنے میں پیسہ کم ہو رہا ہے اور سود میں بڑھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے! اگر تم میرے قول پر عمل نہ کرو تو ایسے ہوگا جیسے کسی آدمی کو ورم آ جائے اور اس کا بدن سوجا ہوا ہو اور تم کہو کہ بندہ موٹا ہو رہا ہے، حالانکہ وہ صحت مند نہیں ہو رہا، بلکہ ورم کی بیماری میں مبتلا ہے۔ تم ورم اور صحت میں فرق نہیں کر رہے ہو۔ سود کھانے والا برباد ہوگا۔

سود زمانہ کفر سے ایسا گندا کاروبار ہے کہ سود میں آدمی کو ایسا جکڑ لیتے تھے کہ آدمی ساری زندگی اس سے نہیں نکلتا تھا۔ پہلے دور میں سودی کاروبار ہندو کرتے تھے، مسلمان تو سوچ ہی نہیں سکتا تھا، لیکن اب مسلمان اتنی ترقی کر گیا ہے کہ ہندو پیسے میں سود کھاتا تھا اور مسلمان سینکڑوں ہزاروں میں سود کھاتا ہے۔ ہندو اب اس کی خاکِ پاء کے برابر بھی نہیں رہا۔ ہندو یہ کرتا تھا کہ مثلاً آپ کی سوا ایکڑ زمین ہے، آپ ہندو سے پیسے لیتے۔ وہ بڑی نیازمندی سے پیسے دے رہا ہے۔ جب فصل تیار ہو جاتی تو وہ آجاتا کہ آپ کے ذمہ قرضہ تھا، اس کا حساب ہو جائے۔ اس طرح وہ فصل لے کر گھر چلا جاتا اور زمیندار کپڑے کندھے پر رکھ کر گھر آجاتے تھے۔ پھر نیا ادھار شروع ہو جاتا تھا۔ انجام یہ بھی ہے کہ وہ زمینیں بھی ہندو لے گئے، انہوں نے قرضے دے کر دوسرے بندے کو اپنا اتنا زیر احسان بھی رکھا کہ بڑے بڑے جاگیردار فرعون قسم کے آدمی کے پاس اگر ہندو بنیا آجاتا تو وہ اس کو ساتھ والی کرسی پر بٹھاتا تھا؛ کیونکہ اس سے پیسے مانگنے ہوتے تھے اور ہندو کا سود اس طرح برباد ہوا کہ جب ملک بدلا تو وہ بھی برباد ہو گئے۔

سود کی سزا:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سود کھانے والے پر بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، سود دینے والے پر بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، سود کا معاہدہ لکھنے والے پر بھی اللہ کی لعنت ہے اور گواہوں پر بھی لعنت ہے۔ آج اس لعنت سے کوئی بھی نہیں بچ رہا، مگر جس کو اللہ تعالیٰ بچا لے، ورنہ انہوں نے ہمیں اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ اگر ہم حج پر بھی آئیں تو سودی ادارے (بینک) ایک کپی (بوتل) ہمیں دے دیتے ہیں اور اسی حرام والی بوتل میں ہم سارے زم زم پیتے ہیں اور ان کی مشہوری کر رہے ہوتے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ایک آدمی سے قرضہ لینا تھا تو دروازہ کھٹکھٹا کر دھوپ میں کھڑے ہو گئے۔ گھر والا نکلا اور بھاگتا ہوا آیا کہ یہ کیا ظلم کر رہے ہیں؟ آپ دھوپ میں کیوں کھڑے ہیں؟ گھر کے دروازے پر باقاعدہ شیڈ بنا ہوا ہے، آپ اس کے سائے میں کھڑے ہو جاتے، میں آجاتا۔ تو فرمایا: میں نے آپ سے قرضہ لینا ہے، اس لیے میں آپ کے گھر کے سامنے کھڑا نہیں ہوا کہ کہیں قیامت میں اللہ نہ پکڑ لیں کہ یہ سود ہو جائے؛ کیونکہ مجھے قرضہ لینے کا حق ہے، تیرے گھر کی دیوار کے سائے سے فائدہ لینے کا حق نہیں ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اگر کسی عمارت میں سودی کاروبار ہوتا ہے تو اس کے سائے سے بھی بچیں۔ آج ہم سود کے بغیر

چل بھی نہیں سکتے۔ انہوں نے ایسا جکڑا ہوا ہے کہ ہمارا پڑھا لکھا آدمی کہتا ہے کہ سود کے بغیر ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ وہ برباد ہوگئے تو پھر ہم انڈسٹریاں کیسے لگائیں گے؟ بڑے بڑے کام کیسے کریں گے؟ یہ سب جھوٹ بولتے ہیں۔ اگر بغیر سود کے یہ کام نہ ہوسکتے تو پہلے دور میں بائیس لاکھ مربع میل مسلمانوں نے فتح کیا اور کام کیے، سود نہیں لیا تو وہ کیسے ہوگیا؟ اب بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مضاربت کا نظام دیا ہے، تمہارے پاس دولت اور دوسرے کے پاس علم ہے، قوت بازو ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ دونوں مل جاؤ اور اپنے حصے مقرر کرلو۔ اسلام کہتا ہے: تم بڑا کاروبار کرنا چاہتے ہو، مثلاً: ایک مل دس کروڑ میں لگتی ہے، تیرے پاس ایک کروڑ ہے نو آدمی دوسرے شامل کرلو۔ اگر نہیں ملتے تو پچاس پچاس لاکھ کے اٹھارہ آدمی شامل کرلو، بڑھالو، سب کو حصہ دو، تاکہ دولت پھیلے اور ہر گھر میں جائے۔ یہ نہیں کہ اوپر سانپ بن کر بیٹھا رہے کہ ساری دنیا کماتی رہے اور وہ کھاتا رہے۔ یاد رکھیں! جیسے تمہیں ضرورت ہے کہ بینک ہمیں قرضہ دے، اسی طرح بینک کو بھی ضرورت ہے کہ کوئی قرضہ لینے والا آئے۔ اگر اس سے قرضہ نہ لے تو وہ کب تک چلے گا؟ جب تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہوجاؤ گے تو وہ تمہاری شرائط پر پیسہ دیں گے! کیونکہ باہر والوں کو بھی منڈی کی ضرورت ہے، ورنہ وہ سامان کہاں بیچیں گے؟

ایک شبہ اور اس کا جواب:

سوال: اس آیت پر دشمنانِ اسلام ایک بڑا اعتراض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً﴾ فرمایا ہے، اس کا معنی یہ ہے مثلاً: پہلے دور میں ایک آدمی نے ایک ہزار دیا اور کہا کہ سو ریال سود ہے۔ ایک مہینہ بعد مجھے گیارہ سو دوگے۔ مہینے کے بعد پیسے مانگے، لیکن دوسرے کے پاس نہیں تھے، اس نے کہا: مت گھبراؤ، لیکن میں اب گیارہ سو ریال پر سود لگاؤں گا۔ اگلے مہینے تم مجھے تیرہ سو دوگے۔ اس طرح ہر مہینے میں بڑھاتا گیا، یہ ﴿أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً﴾ ہے کہ ایک سود پر دوگنا، چوگنا، سہ گنا سود لگاتا۔ تو منکرین قرآن اعتراض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سود سے منع کیا ہے جو دوگنا، سہ گنا، چوگنا لیا جائے، خالص ایک دفعہ لینے پر منع نہیں کیا گیا۔

جواب: یہ ان کی جہالت ہے۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [البقرة:۲۲] کہ اللہ کے ڈھیر شریک نہ بناؤ تو کیا کوئی ایک شریک بنائے تو کوئی حرج نہیں ہوگا اور زیادہ بنائے تو جرم ہے؟ اس طرح تو سارے قرآن کا ترجمہ ہی بدل جائے گا۔

دوسری جگہ قرآن فرماتا ہے: ﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ۝۴۱﴾ [البقرة:۴۱] خبردار! قرآن کی آیات کو تھوڑے پیسے لے کر نہ بدلو۔ کیا زیادہ پیسے لے کر بدلا تو کوئی حرج نہیں؟ حالانکہ اصل مقصد مذمت ہے کہ ایک شریک بناؤ تو مشرک ہو، لاکھ شریک بناؤ تو بھی مشرک ہو۔

اسلوبِ بیان ہے کہ ظالمو! جس کا ایک شریک بنانا بھی جائز نہیں ہے، لیکن تم نے تو لاکھوں شریک بنا رکھے ہیں۔ اگر ساری دنیا کی دولت لے لو، قرآن کے سامنے تھوڑی ہے، جب ساری دنیا بھی قرآن کی ایک آیت کا عوض نہیں بن سکتی تو تم تھوڑے پیسے لے کر جھوٹ بول رہے ہو۔ مسئلہ بدل رہے ہو، کچھ عقل کرو۔ یہ خطاب تو غیرت دلانے کے لیے اور ان کو سمجھانے کے لیے ہے۔

یاد رکھیں کہ سود کا قطرہ بھی حرام ہے اور کروڑوں بھی حرام ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر فرمایا: ظالمو! سود حرام ہے اور پھر تم اس کو دوگنا کر کے بھی کھا رہے ہو۔ تم اللہ سے ڈرو اور سود کو چھوڑ دو۔ اور ڈرو اس جہنم کی آگ سے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

جدید ذہنوں کے گمراہ کن نظریات:

آج بعض جدید پڑھے لکھے لوگ جو اپنے آپ کو عالم کہلانے والے ہیں، بڑے بڑے اسکالر، پروفیسر، جدید علوم سے متاثر حضرات محض سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے ایسے حیلے بہانے تراشتے ہیں کہ سود حرام ہے، لیکن بینکوں کا جو کام ہے وہ سود نہیں ہے۔ بینکوں کی قوت اور میڈیا اس آدمی کو اوپر اٹھاتا ہے کہ یہ عالم ہے، اس نے مسئلہ سمجھا ہے، جو مولوی سود کو حرام کہتے ہیں وہ پرانے وقت کے لوگ ہیں، انہوں نے ابھی تو قرآن وحدیث کو سمجھا نہیں ہے۔ یہ قرآن وحدیث کو اسی مفہوم اور طاقت میں لیتے ہیں جو حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں تھا، حالانکہ اب دنیا بدل گئی، حالات بدل گئے ہیں اور پھر وہ مثالیں دیتے ہیں کہ پہلے قبلہ مسجد اقصیٰ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر دیا اور پھر خانہ کعبہ کا حکم دے دیا۔

وہ کہتے ہیں کہ اس طرح اگر تم ناسخ ومنسوخ کی آیات پر نظر کرو تو معلوم ہوگا کہ منسوخ کئی قسم پر ہیں: بعض منسوخ التلاوت ہیں، لیکن باقی الحکم ہیں۔ بعض منسوخ التلاوت بھی ہیں اور منسوخ الحکم بھی ہیں۔ اور بعض باقی التلاوت ہیں، لیکن منسوخ الحکم ہیں۔ جیسے وصیت اقارب کا حکم تھا، جب آیت میراث نازل ہوئی تو وصیت والا حکم

باقی نہیں رہا، لیکن آیت موجود ہے۔

جدید علوم والا طبقہ سلف صالحین کی روایات سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کے قرآن میں تاویلات بعیدہ سے کام لیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: بینک کا سود سود نہیں ہے، بلکہ سروس چارجز ہیں کہ ایک بینک میں آپ پیسے رکھتے ہیں، وہ ان کی حفاظت کر رہا ہے یا تو بینک آپ ڈرافٹ بنا کر دیتا ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ پیسے دوسری جگہ پہنچیں تو ڈرافٹ کا بنانا، عملہ، ملازم، کلرک، فیکس مشینیں، ٹیلی فون کے اخراجات وہ انہیں سے لے گا، لہٰذا یہ کوئی سود نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ سود تب ہوتا ہے جب ظالم ساہوکار کسی ضرورت مند کی ضرورت سے فائدہ اٹھا کر بطور سود کے قرض دیتا تھا۔ یہ سود تو ہم بھی کہتے ہیں کہ حرام ہے، لیکن بینک جس طرح کسی کو قرضہ دینے پر سود لیتا ہے، آپ بھی بینک کو پیسے دیتے ہیں تو وہ آپ کو بھی پیسے دیتا ہے۔ یہ تو نفع ہے، سود تو تب ہوتا جب ایک طرف سے ہوتا۔ مثلاً: آپ نے بینک میں ایک یا دو لاکھ ڈیپازٹ کیا ہے سیونگ اکاؤنٹ میں تو وہ بینک آپ کو نفع دیتا ہے، لہٰذا یہ جانبین سے چل رہا ہے۔ لیتا بھی ہے، دیتا بھی ہے۔ سود تب تھا جب صرف لیتا ہو اور دیتا نہ ہو۔

ان تاویلات کے ذریعہ سے انہوں نے قطعی الدلالت اور نص سے ثابت ہونے والی حرمت کو لوگوں کے سامنے مشکوک بنا دیا۔

اور اسی طرح کہتے ہیں زنا تو وہ ہوتا تھا جو لوگ پہلے لڑکیوں کو پکڑ کر جنگل میں لے جاتے تھے اور زنا کرتے تھے۔ اب تو ہوٹلوں میں کمرے بک ہو جاتے ہیں اور لڑکی اپنی رضا سے آتی ہے۔ یہ تو زنا نہیں ہے۔ اس طرح انہوں نے زنا اور سود کو حلال کر دیا۔

اور شراب کے بارے میں کہہ دیا کہ وہ حرام ہے جو انگوروں سے نکالی جائے، جس کا قرآن میں ذکر ہے۔ ہم تو مالٹے والا پیتے ہیں، انگور والا نہیں پیتے۔ اور مسلمانوں کی تضحیک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ انگور دو کلو کھا جاتے ہیں۔ اگر ہم ان کو نچوڑ لیں تو حرام ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ عام آدمی کو دھوکہ دیتے ہیں اور اس کو پریشان کر دیتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے مذاق کرتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے کسی حکم پر ہم اپنی کمزوری اور غفلت کی وجہ سے عمل نہیں کر سکتے اور ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بدلنا چاہتے ہیں۔

ع خود کو بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

انگور حلال ہے، حرام تب ہوا جب اس کا جوس نکال کر نشہ میں پہنچا دیا گیا۔ نشہ میں نہ پہنچے تو حلال ہے "کُلُّ مُسْکِرٍ

حَرَامٌ" ہر نشہ آور چیز حرام ہے، چاہے وہ مالٹے سے نکلے، حرام ہے۔

اس لیے دیکھ لیں کہ پیشاب چاہے کتے سے نکلے حرام ہے، بندے سے نکلے تب بھی حرام ہے۔ یہ فرق نہیں کرتے کہ یہ کتے ناپاک سے نکلا ہے تو حرام ہے اور یہ بندے سے نکلا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے کہ بندہ شریف ہے، اپنی جگہ بیٹھ کر پیشاب کرتا ہے۔

اس لیے یاد رکھیں! سود حرام ہے، چاہے ایک طرف سے ہو چاہے دو طرف سے ہو۔ جس کو تم سروس چارجز کہتے ہو وہ نہیں ہیں۔ جب تم مثال کے طور پر سات فیصد فکس کر رہے ہو، حلال تب تھا کہ بینک کو چاہیے تھا کہ وہ لوگوں سے پیسے لے کر اس کو کسی کاروبار میں لگاتا، ہم سب اس میں پیسے جمع کرتے، وہ ہم سے پیسے مضاربت پر شیئر کر کے لے لیتا، اس سے وہ کاروبار کرتا، بلڈنگ خریدتا، مارکیٹ خریدتا، کوئی پلازہ بناتا، تو سال یا دو سال بعد جب پرافٹ آنا شروع ہو جاتا تو حصص میں تقسیم کر دیتا۔ اگر اللہ نہ کرے نقصان ہو جاتا تو کہہ دیتا کہ نقصان ہو گیا، آ کر حساب دیکھ لو۔ تو اسلام نے اس طرح اجازت دی تھی۔ یہ نہیں کہ تم معین کر لو، چاہے اگلا ڈوب جائے یا مر جائے۔ اب بھی بعض بینکوں نے تو لکھ دیا ہے کہ نفع و نقصان کی سکیم ہے، ورنہ یہ بالکل غلط ہے۔

آپ ان سے جا کر پوچھیں کہ آپ نے ہمارا پیسہ کہاں لگایا ہے؟ کیونکہ ہم شیئر ہولڈر ہیں، ہمارا حصہ ہے۔ مثلاً: سعودی عرب میں ایک بینک ہے، میں اس کو درخواست دوں کہ مجھے پانچ لاکھ چاہییں دکان خریدنے کے لیے تو بینک نے کہا: آپ ہمیں دس پرسنٹ سود دیں گے، پانچ لاکھ لے لینا۔ تو دس پرسنٹ سود مجھ پر شروع ہو گیا۔ اب اس میں دو خطرے ہیں کہ میں نے دکان نہ خریدی اور وہ پیسے کام میں لگ گئے۔ اب میرا مکان بھی رہ گیا اور مجھ پر سود بھی چڑھ رہا ہے۔ یہی وہ لعنت ہے جس کے اندر پورا یورپ مبتلا ہے۔ آپ تو دیکھتے ہیں کہ بڑی کاریں ہیں، گھر ہیں۔ اندر سے ان سے پوچھو تو یہ سارا قرضہ کا ہے۔ جو جتنی نوکری کر کے کما رہے ہوتے ہیں ساری بینک کو دے رہے ہوتے ہیں۔ ان کا اصل قرضہ ان پر کھڑا ہے۔

بینک کے کاروبار کی ایک بہترین اور جائز صورت:

سعودی عرب کے اندر ایک اسلامی بینک ہے، ان کا طریقہ بڑا اچھا ہے کہ مثلاً: میں بینک کو جا کر درخواست دیتا ہوں کہ مجھے دس لاکھ ریال چاہییں، میں نے مکان لینا ہے۔ وہ کہیں گے: آپ نے مکان دیکھا ہے؟ میں کہوں کہ

دیکھا ہے۔ وہ پوچھیں گے کہ وہ مکان کہاں ہے؟ میں کہوں گا: فلاں محلے میں ہے۔ وہ کہیں گے: آپ نے اس کو اچھی طرح اندر باہر سے دیکھ لیا ہے؟ آپ کو پسند ہے؟ میں کہوں: بالکل پسند ہے، میں لینا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے۔ اور بینک جا کر مالک مکان سے وہی مکان دس لاکھ میں خرید لیتا ہے، اس طرح وہ مکان بینک کا ہو گیا۔ اور اس نے آپ کو قبضہ دے دیا۔ اب انسان ہے، کچھ دنوں کے بعد ارادہ بدل سکتا ہے، ہم نے ان کو کہا۔ وہ کہتے ہیں: ٹھیک ہے، تم نہیں لیتے تو نہ لو۔ ہم نے لے لیا ہے، لیکن اگر ہم سے لیتے ہو تو ہم گیارہ لاکھ روپے میں بیچیں گے اور ہم آپ سے پیسے بیس سال بعد لیں گے۔ اس طرح یہ حرام بھی نہ رہا؛ کیونکہ وہ کہتے ہیں: تمہاری مرضی آئے تو لو۔ اگر مرضی نہیں ہے تو نہ لو۔ اور وہ رقم آگے بڑھے گی نہیں، گیارہ لاکھ کا سوا گیارہ لاکھ نہیں ہوگا۔ اگر اللہ نہ کرے دینے والی پارٹی نادہندہ ہو جائے اور مکر جائے کہ میں پیسے نہیں دیتا تو پھر وہ مکان لے لیں گے؛ کیونکہ ان کی یہ شرط ہوتی ہے مکان کے کاغذات مالک کو اس دن دیں گے جب وہ ہمارے پیسے ادا کر دے گا، چاہے آج ادا کر دے یا چاہے بیس سال بعد ادا کر دے۔ جب تک پیسے ادا نہیں کرے گا یہ کاغذات ہمارے پاس رہیں گے اور ہمیں اس میں تصرف کا حق ہوگا۔

میری اپنی ایک کوٹھی تھی۔ کسی نے کہا: ایسے کیوں پڑی ہے کرایہ پر دے دو۔ میں نے کہا: مجھے پتہ نہیں، مسافر آدمی ہوں۔ انہوں نے کہا: اسی لیے تو کہہ رہے ہیں؛ کیونکہ گھر خالی ہو تو جن بھوت بیٹھ جائیں گے۔ اس سے بہتر ہے کرایہ پر دے دیں۔ میں نے کہا: کرایہ کون وصول کرے گا؟ اور اگر دو سال کے بعد کرایہ دار کہے کہ میں نہیں نکلتا تو کیا کروں گا؟ قانونی وکیل نے کہا: ہم نے ایک قانونی راستہ نکالا ہوا ہے۔ میں نے کہا: بتائیں!۔ انہوں نے کہا: ہم یہ لکھوا لیتے ہیں، مثلاً: یہ کوٹھی دو لاکھ روپے سالانہ میں دے رہے ہیں، ہر سال دس پرسنٹ ہمیں کرایہ بڑھانے کا حق ہوگا، لیکن اس کے ساتھ ہم کرایہ دار کے ساتھ طے کر لیتے ہیں کہ تم اگر ہمارے ساتھ شریف رہے تو ہم آپ سے یہ دس پرسنٹ نہیں لیں گے، بلکہ یہی دو لاکھ لیں گے، لیکن رسید دو لاکھ بیس ہزار کی دیں گے، پھر اگلے سال دو لاکھ چالیس ہزار کی دیں گے، جس دن تمہارا دماغ خراب ہو جائے گا تو ہمارا کرایہ بھی سو پرسنٹ بڑھ جائے گا۔ انہوں نے کہا: اس لیے آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے کہا: مجھے یہ دھندے نہیں چاہئیں۔

حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی:

بہر حال یاد رکھیں! سود ہر شکل میں حرام ہے۔ خنزیر خنزیر ہے، حرام حرام ہے اور حلال حلال ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا

کہ کتے کو شیمپو کرا کر کار میں بٹھادیں تو وہ پاک ہو جائے گا، بلکہ کتا کتا ہی رہے گا، وہ پاک نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((الحَلَالُ بَيِّنٌ، وَالحَرَامُ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا أُمُورٌ مُشْتَبِهَةٌ)) [بخاری، رقم: ۲۰۵۱] حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ ان دونوں کے درمیان کچھ باتیں ایسی ہیں جو شبہ والی ہوتی ہیں۔ اس شبہ سے بچ جاؤ۔ ہم مولویوں کی کون سنتا ہے؟ اگر اللہ پاک نے آپ کو توفیق دی ہو وہ حکام تک پہنچادیں کہ کوئی دنیا کا اسلامی ملک اس وقت تک نہ مستحکم ہو سکتا ہے اور نہ ترقی کر سکتا ہے، نہ بچ سکتا ہے جب تک سود کی لعنت کو ختم نہیں کریں گے۔ اور جو ملک ایک دفعہ ہمت مردانہ کر کے سود کو اپنے ملک سے بند کر دے اور اس لعنت سے چھٹکارا لے لے تو اللہ تعالیٰ اپنے زمین و آسمان کے خزانوں کو اس کے لیے کھول دیں گے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہوگا۔

بلا سود جائز طریقے سے کاروبار کرنے والے کا واقعہ:

ملک یاسین مدینہ منورہ کے اندر میرے دوست ہیں، ملتے رہتے ہیں، بہت بڑے بزنس میں ہیں، اربوں کے اندر ان کا کام ہے اور ہمارے پرانے دوستوں میں ہیں۔ ایک دفعہ مدینہ منورہ میں ہم اکٹھے تھے۔ مغرب وعشا کے درمیان میں انہوں نے کہا: میرا دل کر رہا ہے کہ آپ میرے ساتھ ایک چائے کی پیالی پی لیں۔ انہوں نے کہا: ہم مدینہ میں بیٹھے ہیں اور سامنے حرم ہے۔ مکی صاحب! جب تک ہم سودی کاروبار کرتے تھے، یقین کریں نہ دن کو آرام تھا اور نہ رات کو آرام تھا، ہر وقت پریشانی تھی کہ ادھر سود بڑھ رہا ہے، بینکوں سے نوٹس آرہے ہیں، ادھر کمپنیوں سے نوٹس آرہے ہیں۔ رات دن جیسے چرخہ چلتا ہے، مشین کی طرح ہم بھاگتے دوڑتے تھے۔ رات کو دو گھنٹے نیند نہیں آتی تھی، گولیاں کھا کر ہم سوتے تھے۔ اللہ پاک آپ لوگوں کو جزائے خیر دے! آپ لوگوں کی صحبت میں آکر ہماری آنکھیں کھلیں کہ سود حرام ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ سود نہیں لینا۔ میری کمپنی کے سارے ڈائریکٹروں نے کہا: ملک صاحب! آپ تو تقریریں سن کر پاگل ہو گئے ہیں، ہمیں کیوں برباد کرتے ہیں؟ اربوں کا کاروبار بغیر سود کے کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے ان سے کہا: ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا، یہ تو میرا معاملہ ہے۔ آج کے بعد آپ لوگوں سے ختم، اگر آپ نے مجھے چیئرمین بنایا ہے اور آپ نے میری بات پر چلنا ہے تو سود ختم کریں گے۔ وہ آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے کہ ملک صاحب کا دماغ خراب ہو گیا ہے، لیکن اسی نے سب کچھ بنایا تھا، اب اس کو انکار بھی نہیں کر سکتے۔ تو انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، دو تین سال تک آپ کو دیکھتے ہیں۔ آپ کاروبار کو سود کے بغیر کیسے چلالیں؟

تو ٹھیک ہے۔

نکی صاحب! آپ یقین فرمائیں! ہمارا کام بھی دس گنا بڑھ گیا اور اللہ کی رحمت سے کسی کا قرض نہیں دینا اور ایک منٹ کے لیے بھی کبھی دماغ میں فکر نہیں ہوا کہ سود بڑھ رہا ہے۔ اور اب سارے ساتھی کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے! آپ نے ہمیں اس لعنت سے چھڑا لیا ہے۔ اب گھر میں سکون ہے، بیوی بچوں میں کوئی لڑائی نہیں، کوئی بیماریاں اور کوئی پریشانی نہیں ہے، ورنہ دو لاکھ نفع آتا تھا او بیوی علاج کے لیے لندن جا رہی ہے، بیس لاکھ کا بل بنتا تھا۔ ادھر دس لاکھ کا نفع آتا اور گھر سے ٹیلی فون آ جاتا: آپ کے بیٹے نے جوا ہار دیا ہے، بیس لاکھ بھجواؤ۔

ملک صاحب نے کہا: میرے جتنے دوست تھے، جن کے اربوں میں کام تھے، ان کی منت کی تھی۔ اب سود نہیں لیتے اور وہ مطمئن ہیں اور ان کا پہلے سے زیادہ اچھا کام ہے۔ اب ہم اگر مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں تو وہ سونا بن جاتی ہے۔ اور کہنے لگے: نکی صاحب! یقین کریں تین سال مجھ پر ایسے گزرے جیسے کسی کو الٹا لٹکا دیا جائے؛ کیونکہ سود کے پیسے دینے تھے، گھر، کوٹھیاں، گاڑیاں اور بچوں کے زیور کو بیچ دیا کہ اس سود کو کسی طرح ختم کر دیں۔ ابھی بھی وہ زندہ ہیں۔

الحمد للہ میرے دوستوں میں ایسے بھی ہیں جو بغیر سود کے کاروبار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ایسے مکان سے رزق دیتے ہیں جن کا ان کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ بڑھاپے میں کہا کرتے تھے کہ مولوی نکی! دیکھو! یہ آدمی آم بیچنے والا ہے، ریڑھی لگا کر سڑک کے کونے پر کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک آدمی سر پر ٹوکرا رکھ کر گلیوں میں پھرتا ہے۔ آم اس کے بھی بک جاتے ہیں اور آم اس کے بھی بک جاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہوتی ہے کہ تمہارا اللہ پر یقین کیسا ہے!!؟

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

اللہ سے ڈرو گے تو فلاح پاؤ گے اور اگر اپنے مالک سے نہیں ڈرو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور اس کے فوراً بعد فرمایا: اگر اپنے رب کی رحمت پر، اپنے رب کی ربوبیت پر، اپنے رب کے احسانات پر، اپنے رب کے عطایا پر بھی تمہیں شرم نہیں آئی تو آگ سے ڈرو۔ اس لیے فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ کبھی ترغیب ہوتی ہے اور کبھی ترہیب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آگ کافروں کے لیے تیار کی ہے، لیکن سود خوروں کو بھی اس میں ڈالیں

گے۔ اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لیے جیل بنائی تھی۔ جب تم خود جرم کر کے جیل میں آنا چاہو تو ہم کیا کریں؟

﴿وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم تمہیں کامیابی کا راستہ بتاتے ہیں کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اللہ پاک تم پر رحم کرے! دولت کمانے میں سبقت نہ کرو، حرام کھانے میں سبقت نہ کرو، حصص خریدنے میں سبقت نہ کرو، سود لینے میں سبقت اور جلد بازی نہ کرو۔

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾

سبقت کرنے کا میدان یہ ہے کہ اللہ کی بخشش حاصل کرنے والے کاموں میں جلدی کرو، اس میں تیزی کرو۔ حرام کھانے میں جلدی نہ کرو، بلکہ رزق حلال ڈھونڈنے میں جلدی کرو۔ اللہ تعالیٰ کے مغفرت والے کاموں کو اختیار کرو اور اس جنت میں جانے کی جلدی سوچو جس کا ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں چوڑائی ہیں۔ جب اس جنت کا عرض (چوڑائی) اتنا ہے تو اس کا طول کتنا ہوگا؟ جب اتنی بڑی جنت میں تجھے جگہ نہ ملے تو تیرے جیسا بدقسمت کون ہوگا؟

سود کھانے والا مومن نہیں ہوتا، سود جمع کرنے والا مومن نہیں ہوتا، بلکہ مومن کی صفت یہ ہے کہ ﴿الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ﴾ جو خوشی میں بھی، فراخی میں بھی اور تنگ دستی میں بھی، ہر حال میں میرے راستے میں خرچ کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔ مومن کی صفت سود کھانا یا دولت پر سانپ بن کر بیٹھنا نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَا نَقَصَ مَالُ عَبْدٍ مِنْ صَدَقَةٍ)) جو بندہ اللہ کے راستے میں صدقہ کرے اس کے مال میں کبھی کمی نہیں آتی ہے۔ [سنن الترمذی، رقم: ۲۳۲۵]

اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے: جو تم میرے راستے میں خرچ کرو گے میں بدلہ دوں گا۔

ایک بادشاہ کا معاف کرنے کا عجیب قصہ!

علماء نے لکھا ہے کہ ایک بادشاہ اپنے ایک غلام پر ناراض ہوگیا کہ بادشاہ آیا، وہ غلام کھانا لگا رہا تھا۔ اس بے چارے نے خیال نہ کیا، ڈونگہ جو بھرا ہوا تھا وہ سارا بادشاہ کے اوپر گر گیا۔ بادشاہ کے کپڑے خراب ہو گئے اور اس

کا بدن بھی جل گیا۔ بادشاہ غصہ میں آیا تو اس غلام نے فوراً یہ آیت پڑھی: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ کہ ایمان والے وہ ہیں جو اپنے غصہ کو ضبط کر لیں۔ بادشاہ نے کہا: میں نے بھی ضبط کر لیا۔ غلام نے آگے پڑھا: ﴿وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ مومن کی صفت یہ ہے کہ لوگوں کی غلطی کو معاف کرتے ہیں۔ اس نے کہا: میں نے بھی تجھے معاف کر دیا۔ اس غلام نے آگے پڑھا: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والے بندوں کو محبوب رکھتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا: میں نے بھی احسان کیا، جاؤ! تجھے غلامی سے بھی آزاد کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کے قرآن کو پڑھنے والے اور سننے والے یوں ہوا کرتے تھے کہ جس وقت قرآن سنا اسی وقت جھک گئے۔ آج ہم ایک طرف سے قرآن سنتے ہیں اور دوسری طرف سے نکال دیتے ہیں۔

آخرت کے متعلق صحیح عقیدہ اہل سنت کا ہے:

فرقہ معتزلہ یہ کہتا ہے کہ جنت دوزخ حق تو ہیں، لیکن ابھی موجود نہیں ہیں۔ جب قیامت کا زمانہ آئے گا اس وقت اللہ تعالیٰ جنت و دوزخ کو پیدا کریں گے۔ اور بعض کافر یہ کہتے ہیں کہ جنت اور دوزخ بالکل نہیں ہیں، بلکہ اکثر کفار یوم آخرت کے بھی منکر ہیں کہ ہم نے مرنے کے بعد بالکل نہیں اٹھنا۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت پیدا فرما چکے ہیں اور جہنم بھی پیدا فرما چکے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ ہم نے متقین کے لیے جنت تیار کر رکھی ہے۔ اور اسی طرح جہنم کے بارے میں فرمایا: ﴿أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم آئندہ تیار کریں گے، بلکہ فرمایا: تیار کر رکھی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے معراج کی رات خود جنت میں داخل ہو کر جنت دیکھی ہے۔ اگر جنت تیار نہیں تھی تو حضور اکرم ﷺ کس جنت میں داخل ہوئے؟ حتیٰ کہ حضور پاک ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خوشخبری دی کہ میں نے ایک سفید موتیوں کا محل دیکھا ہے تو جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کس کا ہے؟ انہوں نے کہا: یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: میرا دل چاہا کہ تیرے گھر کو اندر سے بھی دیکھوں، لیکن اس کی سیڑھیوں پر جنت کی حور بیٹھی ہوئی وضو کر رہی تھی تو میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اور حضور پاک ﷺ نے فرما دیا کہ جنت اور جہنم تیار ہے تو اس میں کافر شک کر سکتا ہے، لیکن مسلمان شک نہیں کر سکتا۔

جنت، جہنم کہاں ہیں:

مستشرقین اور اعدائے اسلام اعتراض کرتے ہیں کہ وہ جنت جہنم کہاں ہیں؟ ہم نے راکٹوں کے ذریعے پوری

دنیا کے چکر لگا لیے ہیں، ہم چاند پر پہنچ گئے ہیں اور ہم نے خلاؤں کو مسخر کر لیا ہے۔

یہ ان کی جہالت ہے ل؛ کیونکہ کسی چیز کا علم نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہوتی کہ وہ چیز بھی نہیں ہے۔ مثلاً: ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ صرف حجۃ الوداع میں میرے مدنی کے ساتھ تشریف لائے تو کوئی آدمی دس ہزار صحابہ کے نام بتا سکتا ہے؟ تو اگر نام نہ آئیں تو اس کا کیا مطلب ہے کہ صحابہ بھی نہیں تھے؟ اس طرح ہم انکار کرنا شروع کر دیں تو بہت ساری چیزوں کا انکار کرنا پڑے گا۔ مثلاً: کیا آپ نے اپنے پڑدادا کو دیکھا ہے؟ اگر آپ نے نہیں دیکھا تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا پڑدادا نہیں تھا؟ اللہ تعالیٰ کے اتنے سیارات ہیں، جہاں تک آپ کا تصور بھی نہیں پہنچا، ابھی تک تم چاند تک نہیں پہنچے ہو جو آسمانوں سے نیچے اور زمین کے قریب ہے، ورنہ مشتری، زحل، عطارد ہے اور ایسے ایسے کواکب و نجوم ہیں جن کی روشنی ابھی زمین پر نہیں پہنچی، جبکہ اسی ہزار میل وہ روشنی ایک سیکنڈ میں طے کرتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے نظام کے سامنے ایک چیز ہے م، لیکن ہمیں نظر نہ آئے۔ ملائکہ موجود ہیں اور ہر بندے کے ساتھ دو عزت والے لکھنے والے فرشتے موجود ہیں، لیکن ہم نے ان کو کبھی نہیں دیکھا اور اس طرح بہت ساری چیزیں ہیں جو ہم نے نہیں دیکھیں، ہمارا علم ان تک نہیں پہنچا، لہٰذا دیکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا: جنت موجود ہے اور جہنم موجود ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جنت حق ہے اور میں نے جنت دیکھی ہے۔ ہمارا اس پر ایمان ہے۔ اگر ہمیں کوئی چیز سمجھ نہیں آ رہی تو ہماری عقل ناقص ہے۔

قاعدہ ہے: مثلاً: میں طالب علموں کو کہوں کہ دو مہینوں کے بعد امتحان لوں گا۔ اگر تم پاس ہو گئے تو میں تمہیں اتنی فلاں چیز دوں گا۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ اور ایک میں کہوں کہ مثلاً: یہ انعام کی عینک رکھی ہے۔ جواب دو اور لے لو۔ تو چیز حسا موجود ہو وہ زیادہ رغبت کا باعث ہوتی ہے، ورنہ تو اللہ تعالیٰ کا کہہ دینا کافی تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے حقیقتاً جنت جہنم کو بنا کر تیار بھی کر دیا، تاکہ ایمان والے جنت میں زیادہ رغبت کریں اور جہنم سے زیادہ ڈریں۔

(حدیث) مسند احمد میں ایک روایت ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے ہرقل (روم کے بادشاہ) کو خط لکھا اور اسلام کی دعوت دی تو اس نے سوال لکھا کہ آپ نے مجھے ایک جنت کی دعوت دی ہے جس کا عرض آسمانوں او زمینوں کے برابر ہے۔ اگر جنت ہی اتنی بڑی ہے تو جہنم کہاں ہوگی؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((سُبْحَانَ اللّٰهِ، فَأَيْنَ اللَّيْلُ إِذَا جَاءَ النَّهَارُ؟)) [مسند احمد: ۳/ ۴۴۲] کیا عجیب آدمی ہے!! بتاؤ جب دن آ جاتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے؟ جب رات آتی ہے تو دن کہاں ہوتا ہے؟ تو جو اللہ دن رات کو پوری کائنات پر پھیلانے پر اور چھپانے پر قادر

ہے تو وہ جنت اور جہنم کو بنانے پر بھی قادر ہے۔ مقصد تو جنت کی وسعت کو بیان کرنا ہے، یہ تو نہیں کہ آدمی اس میں منطقی سوالات پیدا کرے کہ اتنی بڑی جگہ پر تو جنت آگئی، جہنم کہاں گئی؟ اللہ کے کتنے ملکوت ہیں جو ہم سمجھ بھی نہیں سکتے اور جان بھی نہیں سکتے ہیں، جیسے انکشافات ہو رہے ہیں۔ مثلاً: زمین کا ایک چاند ہے اور ایسے بھی کئی ہیں جن کے سات سات چاند ہیں، تو وہ کتنے بڑے ہوں گے؟ یہ تو ایسی چیزیں ہیں جو ہماری عقل سے ماوراء ہیں۔ یہاں نور ایمان کی ضرورت ہے۔ اگر وہ ہوگا تو یہ باتیں سمجھ آئیں گی اور اگر نور ایمان کی عینک اتار دو تو یہ باتیں بھی سمجھ نہیں آئیں گی۔

مفسر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ہے: جب رات آتی ہے تو دن کہاں جاتا ہے اور جب دن آتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے؟ اس کا معنی یہ ہے کہ جب دن آتا ہے تو اللہ تعالیٰ رات کو چھپا دیتے ہیں اور اس کے اوپر روشنی غالب آجاتی ہے۔ چاہے وہ رات ہمیں نظر نہیں آتی، اسی طرح جہنم چاہے ہمیں نظر نہ آئے، لیکن وہ واقعۃً موجود ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یا اس کی مثال یوں سمجھو کہ جنت آسمانوں میں ہے اور جہنم زمینوں میں ہے، لہٰذا کوئی بات نہیں۔ جنت آسمانوں میں اتنی بڑی ہے اور جہنم زمینوں میں اتنی بڑی ہے۔

تفسیر آیت:

﴿الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ﴾

یہاں سے اللہ تعالیٰ نے مومن کی صفات بیان فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مومن وہ ہیں کہ تنگی ہو تب بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، فراخی ہو تب بھی خرچ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ لاکھ دے تو لاکھ لٹاتے ہیں، اللہ ایک ریال دے تو اس میں بھی خیرات کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اگر خوشی میں ہیں، جبر میں ہیں، تنگدستی میں ہیں یا بیماری میں ہیں، ہر حال میں وہ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ آدمی لاکھوں خرچ کرے۔ آدمی تھوڑا خرچ کردے، حتیٰ کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تمہارے پاس پیسے نہیں تو کسی بھائی کو پانی پلا دو، تمہارا یہ صدقہ ہوگا۔ اور فرمایا: اگر کچھ بھی نہیں دے سکتے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا لیا کرو۔ فرمایا: ((وَإِنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ))[1] کہ جب ایک بندہ دوسرے کو خوش ہو کر مسکرا کر ملتا ہے تو اللہ تعالیٰ

[1] [ترمذی، رقم: ۱۹۷۰]

فرماتے ہیں: اس کو بھی خیرات کا ثواب دو؛ کیونکہ اس نے بھی میرے بندے کو خوش کیا ہے؛ کیونکہ اگر آپ کسی بندے کو غصہ میں ملیں گے تو لازماً اس کو تکلیف ہوگی اور اگر اس کو خوشی سے ملیں گے تو راحت ہوگی۔

تفسیر آیت:

﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾

ایمان والوں کی یہ بھی صفت ہے کہ اپنے غصے کو پی لیتے ہیں اور لوگوں کو غلطیوں پر معافی دیتے ہیں۔یعنی اگر غصہ آجائے تو دل کرتا ہے کہ اس کو نقصان پہنچاؤں اور نقصان پہنچا بھی سکتا ہے،لیکن نقصان نہیں پہنچاتا تو یہ ایمان والے کی صفت ہے۔مومن کے ساتھ اگر کوئی بندہ برائی کرے تو اس کی برائی کو بھی بھول جاتے ہیں اور اس کو معاف کردیتے ہیں۔اور اصل کمال بھی یہی ہوتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:((صِلْ مَنْ قَطَعَكَ، وَقُلِ الْحَقَّ وَلَوْ عَلٰى نَفْسِكَ، وَأَحْسِنْ إِلٰى مَنْ أَسَاءَ إِلَيْكَ)) تم اس سے جوڑو جس نے تم سے رشتہ توڑا ہے اور حق بات کہو،اگرچہ اپنے خلاف ہو اور جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔[معجم ابن الاعرابی،رقم:۱۴۶۴]

ورنہ آج کل تو اس سے ہر آدمی جوڑتا ہے جو جوڑتا ہو،حالانکہ کمال تو تب ہے کوئی آدمی آپ کو گالی دے اور آپ اس کو کہیں کہ بھائی صاحب!کوئی بات نہیں۔وہ گالی دے اور تم دعائیں دو۔

یاد رکھیں!حقیقی بات ہے کہ اگر آدمی آپ ﷺ کے فرمان پر عمل کرے تو ایسے نتیجے نکلتے ہیں کہ آدمی حیران ہوجاتا ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ سنت پر عمل کرنا مشکل تو ہے۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ کا دشمن سے عجیب حسن سلوک!

حضرت حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ریل گاڑی میں سفر کررہے تھے۔ایک آدمی اس ڈبہ میں ایسا بھی موجود تھا جو حضرت کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور آپ کے خلاف اخباروں میں لکھتا تھا کہ یہ ہندو کے ایجنٹ ہیں۔اور جتنی حضرت کی برائی ہوسکتی تھی وہ کرتا تھا۔بہرحال وہ آدمی بھی اس ڈبہ میں بیٹھا ہوا تھا،وہ بندہ پیشاب کرنے کے لیے گیا۔جب بیت الخلاء کا دروازہ کھولا تو فوراً اس کو بند کرکے اور ناک پر ہاتھ رکھ کر آگیا اور بڑبڑایا کہ کیسے لوگ ہیں؟ گاڑی میں بیٹھنے کی تہذیب نہیں ہے؟ سارا حمام گندا کردیا ہے،اب ہم کہاں جاکر بیٹھیں؟ وہ غصہ میں یہ کہہ بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد حضرت مدنی رحمہ اللہ نے نظر بچائی، چپکے سے اٹھے، بیت الخلاء میں گئے، لوٹے سے پانی بھرا اور اس کی لیٹرین کو دھویا اور صاف کیا اور لوٹے میں پانی رکھ کر دروازہ بند کر کے آئے۔ اور آ کر اس آدمی کو کہا: شاید آپ کو پیشاب کے لیے جانا تھا، بیت الخلاء تو صاف ہے، آپ جا سکتے ہیں۔ وہ جب اندر گیا تو دیکھا بیت الخلاء دھلا ہوا اور صاف ہے اور لوٹے میں پانی بھرا ہوا ہے۔ وہ جب فارغ ہو کر باہر نکلا تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون صاف کر گیا کیا؟ کوئی ریلوے کا ملازم آیا تھا؟ لوگوں نے کہا: وہ داڑھی والا ایک آدمی جو بیٹھا ہے وہ دھو کر گیا۔ اس نے آ کر حضرت کے پاؤں پکڑ لیے کہ حضرت! مجھے اللہ کے لیے معاف کر دیں۔ میں ساری زندگی آپ کو گالیاں دیتا رہا ہوں، میں نے دیکھا ہوا نہیں تھا کہ مدنی کون ہے؟ نام سنا ہوا تھا۔ آج میں نے دیکھا ہے کہ میں ساری زندگی آپ کو گالیاں دیتا رہا، آپ کا یہ اخلاق ہے اور ہمارا یہ اخلاق۔ اس طرح وہ آدمی ٹھیک ہو گیا۔

غصہ کو دبانے کے فائدے:

روایات میں آتا ہے بہادر وہ نہیں ہوتا جو دوسرے کو گرا دے، بلکہ بہادر وہ ہوتا ہے جو اپنے نفس پر قابو پالے۔ نفس کو بڑا غصہ آتا ہے کہ بدلہ لوں اور یہ بدلہ بھی لے سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود کہے کہ کیا بدلہ لینا ہے؟ خدا ہی بدلہ لے گا، ہم کیا بدلہ لیں!؟ ایسے بندے ایمان والے ہوتے ہیں۔ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ تبلیغی جماعت کو اتنی گالیاں دیتے ہیں تھے کہ اللہ معاف کرے! ہم وہ کہہ بھی نہیں سکتے کہ وہ کیا کیا برائیاں کرتے تھے، لیکن خدا کی قدرت ہے۔ وہی آدمی جماعت میں چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ایسی کایا پلٹ دی اور ان کی زندگی میں ایسا انقلاب آیا کہ داڑھیاں رکھی ہوئی ہیں، پگڑیاں باندھی ہوئی ہیں اور ہر وقت قرآن، نماز اور درس ہے۔

(حدیث قدسی) ایک روایت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ((يَا ابْنَ آدَمَ! اذْكُرْنِيْ إِذَا غَضِبْتَ، أَذْكُرْكَ إِذَا غَضِبْتُ، فَلَا أُهْلِكُكَ فِيمَنْ أُهْلِكُ)) [تفسیر ابن ابی حاتم: ۱۹/ ۲۶] اے آدم کے بیٹے! جب تجھے غصہ آئے تو مجھے یاد کر لیا کر۔ جب مجھے غصہ آئے گا میں تجھے یاد کر لوں گا۔ جب میں لوگوں کو مٹاؤں گا تو تجھے نہیں مٹاؤں گا۔

اس لیے محاورہ ہے جب تجھے اللہ اقتدار دے، قوت دے، اگر کسی پر ظلم کرنے لگو تو خیال کرو کہ مجھ پر بھی کوئی بڑی قدرت والا ہے، وہ بھی مجھے ہلاک کر سکتا ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک غریب حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ خَزَنَ لِسَانَهُ سَتَرَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ، وَمَنْ كَفَّ غَضَبَهُ كَفَّ اللّٰهُ عَنْهُ عَذَابَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنِ اعْتَذَرَ إِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ قَبِلَ عُذْرَهُ)) [شعب الایمان، رقم: ۷۹۵۸]

جس نے اپنی زبان کو تھام لیا (گالی کا بدلہ گالی نہ دیا) اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور جس نے اپنے غضب کو روک لیا تو اللہ بھی اس سے اپنا عذاب روک دیتے ہیں اور جس نے کسی کا عذر قبول کرلیا اللہ تعالیٰ اس کا عذر قبول کرلیتے ہیں۔ (اس حدیث کی تائید اور کئی وجوہات سے بھی ہوتی ہے، اگرچہ یہ حدیث غریب ہے۔)

(حدیث) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ)) [بخاری، رقم: ۶۱۱۴]

اس کو طاقتور نہیں کہتے جو کسی کو گرادے، بلکہ طاقتور وہ ہے جو اپنے نفس کو غصے کے وقت کنٹرول میں کرلے۔ یہ بہادری ہے۔

(حدیث) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَيُّكُمْ مَالُ وَارِثِهِ أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنْ مَالِهِ؟ قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! مَا مِنَّا مِنْ أَحَدٍ إِلَّا مَالُهُ أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنْ مَالِ وَارِثِهِ، قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اعْلَمُوا أَنَّهُ لَيْسَ مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا مَالُ وَارِثِهِ أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنْ مَالِهِ، مَالُكَ مَا قَدَّمْتَ، وَمَالُ وَارِثِكَ مَا أَخَّرْتَ)) [سنن النسائی، رقم: ۳۶۱۲]

کون ایسا شخص ہے تم میں سے جس کو وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایسا بندہ تو کوئی نہیں۔ ہر بندے کو اپنا مال محبوب ہوتا ہے، وارث کا مال تو محبوب نہیں ہوتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ حالات کے اعتبار سے آپ لوگوں کو وارث کا مال زیادہ محبوب ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: حضور! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہارا مال تو وہ ہے جو تم نے اللہ کے راستے میں آگے بھیجا۔ (تم نے خیرات کیا، صدقات کیے، زکوۃ ادا کی، تم نے کوئی مسجد، مدرسہ بنوادیا، خیر کے کام میں لگادیا) وہ تمہارا مال ہے جو تمہارے آگے کام آئے گا اور جو تم چھوڑ کر مرنے جارہے ہو تو وہ وارثوں کا مال ہے، تمہارے لیے محفوظ ہوگیا ہے۔

((قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا تَعُدُّونَ الرَّقُوبَ فِيكُمْ؟ قَالَ قُلْنَا: الَّذِي لَا يُولَدُ لَهُ، قَالَ: لَيْسَ ذَاكَ بِالرَّقُوبِ وَلَكِنَّهُ الرَّجُلُ الَّذِي لَمْ يُقَدِّمْ مِنْ وَلَدِهِ شَيْئًا، قَالَ: فَمَا تَعُدُّونَ الصُّرَعَةَ فِيكُمْ؟

قَالَ قُلْنَا: الَّذِي لَا يَصْرَعُهُ الرِّجَالُ، قَالَ: لَيْسَ بِذٰلِكَ، وَلٰكِنَّهُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ))
[مسلم، رقم:۲۶۰۸]

حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: جانتے ہو کہ رقوب کسے کہتے ہیں؟ صحابہ ﷺ نے عرض کیا: ہمارے ہاں رقوب اس کو کہتے ہیں جس کی کوئی اولاد نہ ہو۔ آپ نے فرمایا: یہ رقوب نہیں ہوتا، اصل رقوب وہ ہوتا ہے جس کی اولاد آگے نہیں گئی۔ (یعنی بچہ پیدا ہو کر فوت نہیں ہوا! کیونکہ چھوٹے بچے فوت ہو جائیں وہ والدین کی شفاعت اور بخشش کا ذریعہ بن جاتے ہیں)۔ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم جانتے ہو کہ بہادر کون ہوتا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: بہادر وہ ہوتا ہے جس کو کوئی دوسرا نہ گرا سکے۔ آپ نے فرمایا: یہ بہادری نہیں ہے، بلکہ بہادری یہ ہے کہ انسان کو غصہ آجائے اور وہ اسی وقت اپنے غصہ کو کنٹرول کر لے۔ (طاقت اور قدرت بھی ہو، ورنہ مسکین غریب کسی پر کیا غصہ کرے گا)۔

(حدیث) ایک آدمی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا: حضور! مجھے ایسی بات کہیں اور سمجھائیں جو میرے لیے فائدہ مند ہو اور بات بھی بڑی مختصر ہو، اسی کو میں یاد رکھوں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا تَغْضَبْ)) غصہ نہ کیا کرو۔ اس نے کہا: حضور! مجھے کوئی اور بات بتائیں۔ آپ نے فرمایا: غصہ نہ کیا کرو۔ اس نے عرض کیا: حضور! مجھے کوئی اور بات سمجھائیں۔ آپ نے سمجھایا: غصہ نہ کیا کرو۔ اس نے جتنی دفعہ پوچھا: آپ نے ایک ہی وصیت فرمائی کہ غصہ نہ کرو۔ [مسند احمد، رقم:۲۰۳۵۷]

علماء نے لکھا ہے کہ اسی ایک چیز میں اس کی اصلاح تھی جب آدمی غصہ نہیں کرے گا تو ہوش میں رہے گا اور جب ہوش میں ہوگا تو غلطی نہیں کرے گا۔

اور علماء نے دوسری بات یہ لکھی ہے کہ حضور اکرم ﷺ حکیم تھے، اپنی امت کی بیماریوں کا علاج بھی فرماتے تھے، روحانی بیماریاں، شرک والی بیماریاں، حسد والی بیماریاں، کینہ والی بیماریاں اور غیبت والی بیماریاں، ان سب کا علاج دربار محمد مصطفیٰ ﷺ سے ملتا تھا۔ آپ کے پاس جیسا مریض آیا تو اسی طرح کا علاج بتایا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

(حدیث) حضرت ابوالاسود سے روایت ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اپنے حوض پر کھڑے تھے۔ ایک جماعت لوگوں کی وہاں آئی اور آپس میں کہا کہ کوئی ہم میں سے ایسا آدمی ہے جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو ایسی بات کہے کہ ان

کے بال بھی غصہ میں کھڑے ہو جائیں؟ پھر دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے یہ صحابہ کیا کرتے ہیں؟ ایک آدمی کھڑا ہوا اور جا کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو (باتوں میں) زچ کر دیا تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ جلدی سے بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد لیٹ گئے۔ لوگوں نے پوچھا: حضرت! کیا بات ہے؟ آپ کیوں بیٹھ گئے؟ کیوں لیٹ گئے؟ آپ نے فرمایا: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تھا کہ جب آدمی کو غصہ آجائے اگر کھڑا ہے تو بیٹھ جائے اور اگر بیٹھنے سے بھی غصہ نہ جائے تو لیٹ جائے۔[1]

(حدیث) اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے۔ تو جب تم میں سے کسی ایک کو غصہ آئے تو وہ وضو کر لے۔

[سنن ابی داؤد، رقم: ۴۷۸۴]

(حدیث) حضرت ابووائل الصنعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم حضرت عروہ بن محمد کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی آیا اور اس نے ایسی بات کہی کہ جس سے حضرت عروہ کو غصہ آگیا اور جب انہیں بہت زیادہ غصہ آگیا تو وہ اٹھ کر چلے گئے۔ جب واپس آئے تو ہم نے دیکھا کہ انہوں نے وضو کیا ہوا تھا۔ ہم حیران ہو گئے کہ انہوں نے وضو کیوں کیا ہے؟ تو انہوں نے یہ حدیث بیان فرمائی کہ مجھے میرے والد (محمد) نے میرے دادا عطیہ بن سعد السعدی سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطَانِ، وَإِنَّ الشَّيْطَانَ خُلِقَ مِنَ النَّارِ، وَإِنَّمَا تُطْفَأُ النَّارُ بِالْمَاءِ، فَإِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ)) [سنن ابی داؤد، رقم: ۴۷۸۴] غصہ شیطان کو ابھارتا ہے اور شیطان خود آگ سے پیدا ہوا ہے اور آگ پانی سے بجھ جاتی ہے۔ اس لیے اگر آدمی کو بھی غصہ آجائے اور وہ دیکھے کہ میں صبر نہیں کر رہا تو وہ جلدی سے وضو کر لے۔ جب وضو کرے گا تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔

یہ سارے حضور اکرم ﷺ نے علاج بتائے ہیں۔ جب غصہ آجائے تو آدمی بیٹھ جائے۔ اس طرح آدمی اعتراف کرتا ہے کہ میں نیچے ہوں، تم بڑے ہو، قوت والے ہو۔ اور یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب تم خود بدلہ نہیں لو گے تو تمہارا بدلہ پھر قدرت لے گی اور اللہ کا بدلہ کتنا سخت ہو سکتا ہے؟ اور اگر تم نے خود بدلہ لیا تو برابر ہو گئے۔ اور کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مظلوم کی بجائے ظالم بن جاؤ کہ ایک آدمی نے تمہیں ایک گالی دی اور تم نے اس کو تین گالیاں دیں۔ اس طرح تم خود ظالم بن گئے۔ اس لیے مومن کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ اپنے غصہ کو ضبط کرنے والا ہو اور لوگوں

[1] [ابوداؤد، رقم: ۴۷۸۲]

کو معاف کر دینے والا ہو۔

واقعہ افک میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی برداشت:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی زندگی اس سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً: آج اگر کوئی آدمی کسی کی بیٹی پر زنا کی تہمت لگائے تو غیرت مند باپ کیا کر گزرے گا؟ اب اندازہ لگائیں کہ بیٹی ہو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جیسی، باپ ہو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا اور شوہر ہو محمد مدنی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، لیکن جب یہودی سازش ہوئی، منافقین نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی تو اس دور میں تین پکے مومن بھی اس سازش کا شکار ہو گئے: ان میں ایک حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ ایسے آدمی تھے جن کی ساری زندگی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خدمت کی تھی: کھانا، پینا، کپڑا، رہنا اور لینا دینا وغیرہ کرتے تھے، وہ بھی تہمت لگانے والوں میں شریک ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا اور فرمایا: اب میں اس پر مہربانی نہیں کروں گا۔ اللہ کا قرآن نازل ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے اور اس سے معذرت کی اور فرمایا: پہلے جو تمہیں خرچ دیتا تھا اب اس سے دوگنا دوں گا۔ یہ برداشت ہے کہ وہ سیدہ عائشہ کی تہمت میں شریک ہے اور پھر زیرِ احسان سیدنا صدیق ہے، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا اور خرچہ بڑھا دیا کہ اللہ کا حکم ہے: جو برائی کرے اس کے ساتھ بھلائی کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ کو برداشت کرنا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی کھنگال ڈالیں! آپ نے کبھی اپنی ذات کا کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ اس سے بڑی تکلیف اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ سوئے ہوئے تھے، تلوار آپ کے سر پر لٹک رہی تھی۔ دشمن چھپا ہوا تھا، تلوار نکال کر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو جگا کر کہنے لگا: کون ہے جو آپ کو میری تلوار سے بچائے گا؟ آپ کے دو ساتھی دور ہیں، ان کے آنے سے پہلے میں حملہ کر دوں گا۔ آپ نے فرمایا: میرا اللہ مجھے بچائے گا۔ یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ اللہ کے لفظ میں جو اثر تھا اور وہ زبانِ نبی سے نکلا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اٹھالی اور فرمایا: اب بتاؤ! تمہیں کون چھڑائے گا؟ اب تو تلوار میرے ہاتھ میں ہے اور ارد گرد بھی میرے صحابہ ہیں، تم بھاگ بھی نہیں سکتے ہو۔ اب سب کو پتہ چل گیا ہے، سارے پہنچ جائیں گے۔ اس نے کہا: مجھے آپ کے کرم اور رحم سے امید ہے۔ تو آپ نے فرمایا: اچھا جاؤ، میں نے تمہیں معاف کیا۔ اس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کا بدلہ نہیں لیا۔

حضور پاک ﷺ کو زہر دی گئی آپ نے بدلہ نہیں لیا، آپ پر ظالم یہودیوں نے جادو کیا لیکن میرے نبی نے بدلہ نہیں لیا۔ بڑا ہونا بدلہ لینے میں نہیں، بلکہ آدمی معاف کرنے سے بڑا بنتا ہے۔ کوئی اگر زیادتی کرے تو اس کو معاف کر دو۔ اگر بدلہ لو گے تو برابر ہو جائے گا۔

(حدیث) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا، أَوْ وَضَعَ لَهُ، وَقَاهُ اللهُ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ، أَلَا! إِنَّ عَمَلَ الْجَنَّةِ حَزْنٌ بِرَبْوَةٍ ثَلَاثًا، أَلَا إِنَّ عَمَلَ النَّارِ سَهْلٌ بِسَهْوَةٍ، وَالسَّعِيدُ مَنْ وُقِيَ الْفِتَنَ، وَمَا مِنْ جَرْعَةٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ جَرْعَةِ غَيْظٍ يَكْظِمُهَا عَبْدٌ، مَا كَظَمَهَا عَبْدٌ لِلَّهِ إِلَّا مَلَأَ اللهُ جَوْفَهُ إِيمَانًا)) جو شخص کسی تنگی والے کو مہلت دے یا اس کا قرضہ معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ کی گرمی سے بچائیں گے۔ آپ نے فرمایا: سن لو! جنت والے عمل کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے اور جہنم کے عمل بڑے آسان اور خواہش سے ہو جاتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کامیاب بندہ وہ ہے جو فتنوں سے بچ گیا۔ سب سے بڑا گھونٹ جو اللہ کو بڑا پسند ہے کہ بندے کو غصہ آیا، لیکن اس بندے نے گھونٹ پی کر صبر کر لیا کہ یہ اللہ کو پسند ہے۔ جو بندہ غصہ کو پی جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے سینے کو ایمان سے بھر دیتے ہیں۔ [مسند احمد، رقم: ۳۰۱۵]

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يُنْفِذَهُ، مَلَأَهُ اللهُ أَمْنًا وَإِيمَانًا، وَمَنْ تَرَكَ لُبْسَ ثَوْبِ جَمَالٍ وَهُوَ قَادِرٌ عَلَيْهِ (قَالَ بِشْرٌ: أَحْسَبُهُ قَالَ: تَوَاضُعًا) كَسَاهُ اللهُ حُلَّةَ الْكَرَامَةِ وَمَنْ تَوَّجَ لِلَّهِ كَسَاهُ اللهُ تَاجَ الْمُلْكِ.)) جو بندہ غصہ کو پی جائے، حالانکہ وہ اس بات کی طاقت رکھتا ہے کہ دشمن سے اپنا بدلہ لے سکے تو اللہ تعالیٰ اس کے سینے کو ایمان سے بھر دیتے ہیں۔ اور جو آدمی زینت کا لباس پہننے کی طاقت بھی رکھتا ہو، لیکن نہیں پہنتا، اللہ تعالیٰ اس کو (قیامت کے دن) کرامت وعزت کا لباس پہنائیں گے۔ اور جو شخص اللہ کی رضا کے لیے کسی کا سر ڈھانپے اللہ تعالیٰ اس کو بادشاہی کا تاج پہنائیں گے۔ [سنن ابی داؤد، رقم: ۴۷۷۸]

(حدیث) حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ اپنے ابا حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَسْتَطِيعُ أَنْ يُنْفِذَهُ دَعَاهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى رُءُوسِ الْخَلَائِقِ حَتَّى يُخَيِّرَهُ فِي أَيِّ الْحُورِ شَاءَ)) جس شخص کو غصہ آئے اور اس پر عمل کرنے کی بھی طاقت رکھتا ہے، لیکن غصہ پی گیا، صبر کر گیا، اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت والے دن تمام مخلوق کے سامنے اس کو حکم دیں گے کہ جنت کی جس حور کو تم چاہو پسند کر لو۔

[سنن الترمذی، رقم: ۲۰۲۱]

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ، إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللهُ)) جو تم اللہ کے راستے میں خیرات کرو گے تو تمہارا مال کم نہیں ہوگا، اگر تم نے کسی کی غلطی معاف کر دی تو اللہ تیری عزت بڑھا دے گا، تیری عزت کم نہیں ہوگی۔ اور جو اللہ کے لیے تواضع کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے رتبے کو بلند کر دیتے ہیں۔ [مسلم، رقم: ۲۵۸۸]

دعا کریں! اللہ تعالیٰ ہمیں حضور اکرم ﷺ کے فرمان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں اور اس پر پابند رہنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

(حدیث) حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُشْرِفَ لَهُ الْبُنْيَانُ، وَتُرْفَعَ لَهُ الدَّرَجَاتُ، فَلْيَعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَهُ، وَلْيُعْطِ مَنْ حَرَمَهُ وَيَصِلْ مَنْ قَطَعَهُ)) جس آدمی کو یہ بات پسند ہو کہ قیامت میں میرے مکان اور میرے درجات بلند ہوں اگر اس کے ساتھ کسی نے زیادتی کی تو اس کو بخش دے اور جس نے اس کو محروم کیا اس کو دے اور جو اس سے رشتہ داری توڑے اس سے جوڑے۔

[مستدرک حاکم، رقم: ۳۱۶۱]

جس آدمی کے اندر یہ تین چیزیں آ جائیں اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے اندر بڑی اونچی بلڈنگیں دیں گے اور اس کے درجات بلند فرمائیں گے۔ (یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔)

(حدیث) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ نَادَى مُنَادٍ يَقُولُ: أَيْنَ الْعَافُونَ عَنِ النَّاسِ؟ هَلُمُّوا إِلَى رَبِّكُمْ وَخُذُوا أُجُورَكُمْ، وَحُقَّ عَلَى كُلِّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِذَا عَفَا أَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ)) قیامت والے دن ایک منادی اللہ کے حکم سے ندا کرے گا کہ وہ لوگ جنہوں نے دنیا میں لوگوں کا ظلم سہنے کے بعد معاف کیا کھڑے ہو جائیں اور اپنے رب کے دربار میں چلیں اور اپنے اپنے اجر وثواب حاصل کریں۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ بات مسلمان کے لیے واجب ہو جاتی ہے کہ جب وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے کے ظلم کے باوجود اس کو معاف کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت نصیب فرما دیتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۱۲۲]

یہ انبیاء اور صالحین کا طریقہ ہے کہ آپ پر کوئی ظلم کرے آپ اس کو معاف کرو، وہ گالیاں دے تم دعائیں دو اور وہ کانٹے بچھائے تم پھول برساؤ۔ یہ کرنا بہت مشکل ہے، مگر جب اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ [آل عمران:۱۳۵]

ہر بندہ خطا کار ہے، جیسا کہ آقائے نامدار ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((كُلُّ ابْنِ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ)) [ترمذی، رقم:۲۴۹۹] آدم کی تمام اولاد خطاوار ہے (حالانکہ اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں، لیکن یہ بھی شان تھی کہ حضور اکرم ﷺ اپنے آپ کو امت میں ملا رہے ہیں)، لیکن اچھے خطاوار وہ ہوتے ہیں جب خطا ہو جائے تو فوراً اپنے رب کے دروازے پر گر جائیں۔ یہ نہیں کہ گناہوں پر اڑے رہیں، بلکہ فوراً استغفار، اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی، گناہوں سے بھاگنا شروع کر دیں۔ یہ ایمان والوں کی صفات ہیں۔

(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ رَجُلًا أَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ: رَبِّ! إِنِّي أَذْنَبْتُ ذَنْبًا فَاغْفِرْهُ، فَقَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: عَبْدِي عَمِلَ ذَنْبًا فَعَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ، قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِي، ثُمَّ عَمِلَ ذَنْبًا آخَرَ فَقَالَ: رَبِّ! إِنِّي عَمِلْتُ ذَنْبًا فَاغْفِرْهُ، فَقَالَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: عَلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ، قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِي، ثُمَّ عَمِلَ ذَنْبًا آخَرَ فَقَالَ: رَبِّ! إِنِّي عَمِلْتُ ذَنْبًا فَاغْفِرْهُ لِي، فَقَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: عَلِمَ عَبْدِيْ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِي، ثُمَّ عَمِلَ ذَنْبًا آخَرَ فَقَالَ: رَبِّ! إِنِي عَمِلْتُ ذَنْبًا فَاغْفِرْهُ، فَقَالَ عَزَّ وَجَلَّ: عَبْدِي عَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ، أُشْهِدُكُمْ أَنِّي قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِي فَلْيَعْمَلْ مَا شَاءَ)) [بخاری، رقم:۷۵۰۷]

ایک اللہ کے بندے سے گناہ ہو گیا تو اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میرا اللہ! میں نے گناہ کیا ہے، لیکن میں معافی مانگتا ہوں، میرا گناہ معاف فرما دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: دیکھو! میرا بندہ مجھے جانتا ہے، پہچانتا ہے کہ میرا بھی رب ہے، جو مجھے پکڑ بھی سکتا ہے اور معاف بھی کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نے تیرا گناہ معاف کیا۔ پھر اس بندے نے گناہ کیا، پھر توبہ کی، اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ اس بندے نے پھر گناہ کیا اور توبہ کی، اللہ تعالیٰ نے پھر اس کو معاف کر دیا۔ اس نے پھر گناہ کیا، توبہ کی، اللہ تعالیٰ نے پھر اس کو معاف فرما دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے ملائکہ! گواہ ہو جاؤ میرا بندہ جو مجھ سے معافی مانگ رہا ہے، میں نے اس کو معاف کر دیا ہے۔

جائے جو چاہے کرے (پھر معافی مانگ لے میں اس کو معاف کردوں گا)۔

توبہ قبول ہونے کی شرائط:

اصل بات یہ ہے کہ جب بندہ صحیح معنی میں توبہ کرے تو...... ہماری توبہ جو ہم روزانہ کرتے ہیں اس کو توبہ نہیں کہتے کہ جب نماز پڑھی، دعا مانگی کہ اے اللہ! میری توبہ، اللہ! میری لاکھ دفعہ توبہ، کروڑوں دفعہ توبہ۔ یہ توبہ نہیں، محض الفاظ ہیں۔ توبہ کی چند شرائط ہیں: 1 سب سے پہلے تو اس گناہ کو چھوڑ دے، 2 نادم ہو کہ میں نے برا کیا ہے 3 اور پھر عزم کرے کہ میں آئندہ کبھی یہ گناہ نہیں کروں گا۔ جب یہ تین شرطیں ہوں گی تو توبہ قبول ہوگی۔ اس توبہ کے بعد اگر اس سے گناہ ہو گیا انسان ہے تو جب تک توبہ کا دروازہ بند نہ ہوگا اس وقت تک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتے ہیں۔

ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے:

بزرگوں نے لکھا ہے:

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ ناامیدی نیست
گر صد بار توبہ شکستی باز آ

اگر تم کافر ہو، مشرک ہو یا بت پرست ہو ان سب چیزوں کو چھوڑ دو اور باز آ جاؤ اور توبہ کر لو اور اگر توبہ کرنے کے بعد سو دفعہ بھی توبہ توڑ بیٹھے ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، پھر بھی توبہ کر دو اور اللہ کے دروازے پر آ جاؤ۔ وہ بخشنے والا ہے۔ قاعدہ ہے کہ شیطان پہلے گناہ کرواتا ہے اور جب آدمی گناہ میں پڑ جائے پھر شیطان توبہ سے آدمی کو روکتا ہے۔ اور اگر آدمی توبہ کی نیت کرے تو اس کے دل میں ڈالتا ہے کہ تم کونسے نیک آدمی ہو، اتنی مرتبہ تو تم نے منہ کالا کر لیا ہے، چھوڑو توبہ کو۔ اس طرح وہ وسوسہ ڈالتا ہے، تاکہ بندہ توبہ نہ کرے، ورنہ آدمی جتنا گناہوں میں مبتلا کیوں نہ ہو، ستر سال سو سال آدمی کفر میں پڑا ہو، گناہ میں پڑا ہو اور توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جب کفر و شرک معاف ہو سکتا ہے اور گناہ تو کفر و شرک کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ اس لیے آدمی کبھی

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

گناہگار پر بھی رحم کرو:

یادرکھیں! کبھی کسی کو نہ کہا کرو کہ تم شرابی ہو، نشئی ہو اور میں بڑا نیک ہوں، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں مرنے سے پہلے اسی مرض میں مبتلا کردیں گے اور اس آدمی کو توبہ کی توفیق دے دیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کیا تم میرے بندے پر اعتراض کرتے ہو؟ گندا ہے یا اچھا ہے، میری مخلوق ہے، میں نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اگر وہ گناہگار ہے تو بخشنے والا میں ہوں۔

بزرگوں کا قول ہے: گناہ سے نفرت کرو، گناہ گار سے نفرت نہ کرو۔ گناہ گار تو تیری مہربانی کا مستحق ہے، وہ بے چارا معصیت کے اندر مبتلا ہے، اس کی مدد کرو، تاکہ وہ گناہوں سے نکلے، گناہوں سے باز آئے۔

جیسے تمہارے گھر میں کوئی بیمار ہوجائے تو کیا اس کو اٹھا کر گلی میں پھینک دیتے ہو؟ بلکہ پہلے خود دوائی دیتے ہو۔ اگر ٹھیک نہ ہو تو اس کو ہسپتال لے جاتے ہو۔ اگر وہاں ٹھیک نہیں ہوتا تو اس کو اسپیشلسٹ کے پاس لے جاتے ہو۔ جب ظاہری بیماریوں کے لیے تیری مہربانیوں کا محتاج ہے تو جو گناہوں میں مبتلا ہے یہ بھی تو بیمار ہے، دنیا میں کون چاہتا ہے کہ میں ذلیل ہوجاؤں؟ کوئی نہیں چاہتا کہ میں نشہ پی کر بے ہوش ہوکر گرا پڑا رہوں۔ یہ بھی روحانی بیماریاں ہیں۔ ان کا بھی علاج ہے کہ ان کے ساتھ مہربانی اور ہمدردی کرو، اس کو کسی اللہ والے کی صحبت میں بٹھاؤ، کبھی مسجد میں پکڑ کر لے جاؤ، کبھی نماز میں لے جاؤ، کبھی قرآن کے درس میں لے جاؤ، تاکہ اللہ اس کو بھی درست کردے۔

آپ بڑے بڑے لوگوں کی زندگی پر نظر ڈالیں! جب حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ وغیرہ کی زندگی پر نظر ڈالیں ابتدا میں ان کی زندگیاں بھی غلط تھیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ راضی ہوگئے، سب کچھ دھل گیا۔

اگر گناہ نہیں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری کا اثبات کب ہوگا؟ اگر ہمارے گناہ نہ ہوں تو ستار العیوب کیسے بنے اور کن کے گناہوں پر پردہ ڈالے؟ اس لیے ایک حدیث پاک میں آتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق ایسے پاک ہوجائے کہ ان سے کوئی گناہ بھی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ ایک اور مخلوق پیدا کردیں گے کہ گناہ کریں اور میں معافی دوں۔ اس لیے اگر ہم گندے ہوگئے کوئی بات نہیں، رحمت کا دریا بہہ رہا ہے۔ شرط یہ ہے کہ پٹڑی پر آجاؤ، اپنے گناہوں پر اڑے نہ رہو، بلکہ توبہ کی طرف رجوع کرو اور یہ سمجھو کہ بس میری زبان سے لفظ توبہ نکلنے کی دیر ہے اور میرا رب مجھے

معاف کردے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو گناہ سے توبہ کرلے اس کو کبھی گناہ کا طعنہ نہیں دینا۔ ایسا کہو گے تو تم شیطان کی مدد کرو گے کہ اس کو پھر برے کام یاد دلا رہے ہو کہ وہ دوبارہ گناہوں میں مبتلا ہو جائے۔

(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جب ہم آپ کو دیکھتے ہیں تو ہمارے دل نرم ہو جاتے ہیں اور آخرت والوں میں سے ہو جاتے ہیں اور جب ہم آپ سے جدا ہوتے ہیں تو اپنے بچوں، اپنی بیویوں، اپنے کاروبار میں ہم کھو جاتے ہیں اور ہماری وہ حالت نہیں ہوتی جو آپ کے دربار میں ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تم اسی حال پر رہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرشتے اتر کر اپنے ہاتھوں سے تم سے مصافحہ کریں اور تمہارے گھروں میں آکر فرشتے تمہاری زیارتیں کریں، (لیکن لازمی بات ہے انسان کے حالات تبدیل ہوتے ہیں۔ اللہ کے نبی کی صحبت میں ایک اور کیفیت ہوتی ہے اور گھر میں دوسری کیفیت ہوتی ہے)۔ اگر تم سے کوئی غلطی نہ ہو اور تم بالکل گناہوں سے پاک ہو جاؤ، اللہ پاک ایک اور قوم پیدا کریں گے جو گناہ کرے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کریں گے۔ اس کے بعد صحابہ نے عرض کیا: ہمیں جنت کے بارے میں کچھ تفصیلات سے آگاہ فرمائیں کہ جنت کی جو عمارتیں ہوں گی اس کا میٹریل کیا ہوگا؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کی ایک اینٹ سونے کی ہوگی اور ایک اینٹ چاندی کی ہوگی۔ فرمایا: اس کے اندر سیمنٹ کی بجائے خالص مشک کا گارا ہوگا، اس کے اندر کنکریاں لؤلؤ اور یاقوت ہوں گے اور اس کی مٹی زعفران ہوگا اور وہ جنت ایسی عظیم اور محبوب جگہ ہوگی کہ جو اس میں داخل ہوگا پھر کبھی اداس نہیں ہوگا، کبھی اس سے تھک نہیں جائے گا اور اس میں ہمیشہ رہے گا، کبھی موت نہ آئے گی۔ اس کے کپڑے بوسیدہ نہ ہوں گے اور نہ ہی اس کی جوانی ختم ہوگی۔ تین افراد ایسے ہیں کہ ان کی دعا رد نہیں کی جاتی: (۱) عادل حکمران، (۲) روزہ دار کی دعا افطار کے وقت (۳) اور مظلوم کی دعا بادلوں پر اٹھائی جاتی ہے اور اس کے لیے آسمانوں کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ اور رب تعالیٰ فرماتے ہیں: میری عزت کی قسم! میں ضرور تیری مدد کروں گا، اگرچہ کچھ وقت کے بعد ہو۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۵۹۸]

گناہ معاف ہونے کا صحیح طریقہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: جو حدیثیں میں نے خود حضور اکرم ﷺ سے سنی ہیں اور میں نے ان حدیثوں پر عمل کرنے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے جتنا چاہا مجھے اس سے نفع پہنچایا، لیکن اگر کوئی حدیث میں

نے خود نہیں سنی، کسی دوسرے نے سنی اور اس نے مجھے سنائی تو میں پہلے اس کو قسم دیتا ہوں (احتیاط کے طور پر، ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ صحابہ سب سچے ہیں) اور جب وہ قسم کھاتا ہے کہ مجھے خدا کی قسم ہے! یہ بات میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے تو میں اس کو سچا مان لیتا ہوں۔ ایک دن مجھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی اور ابوبکر نے سچ کہا ہے (حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ابوبکر سچا ہے اور ملنگ کہتے ہیں کہ جھوٹا ہے) انہوں نے مجھے حدیث بیان کی کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے: اگر کوئی بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ پہلے اچھی طرح وضو کرے اور پھر دو رکعت نفل نماز پڑھے توبہ کی نیت کے ساتھ اور پھر توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دیتے ہیں۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۱۳۹۵]

صحیحین کی روایت میں سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھیوں کے سامنے سنت کے مطابق وضو فرمایا، پھر فرمایا: میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو اس طرح وضو کرے گا جیسے میں نے کیا، پھر اس نے دو رکعت پڑھیں اور ان دو رکعات کے درمیان خیالات سے محفوظ رہا تو اس کے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ [بخاری، رقم: ۱۹۳۴]

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ هٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ۝ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِينَ ۝ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جٰهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِينَ ۝ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝﴾ [آل عمران: ۱۳۷ تا ۱۴۳]

''تم سے پہلے بہت سے واقعات گزر چکے ہیں، اب تم زمین میں چل پھر کر دیکھو لو کہ جنھوں نے (پیغمبروں کو) جھٹلایا تھا ان کا انجام کیسا ہوا؟ یہ تمام لوگوں کے لیے واضح اعلان ہے اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔ (مسلمانو!) تم نہ تو کمزور پڑو اور نہ غمگین رہو۔ اگر تم واقعی مومن رہو تو تم ہی سربلند ہو گے۔ اگر تمہیں ایک زخم لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی اسی جیسا زخم پہلے لگ چکا ہے۔ یہ تو آتے جاتے دن ہیں، جنہیں ہم لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں، ۔ اور مقصد یہ تھا کہ اللہ ایمان والوں کو جانچ لے اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید قرار دے۔ اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور مقصد یہ (بھی) تھا کہ اللہ ایمان والوں کو میل کچیل سے نکھار کر رکھ دے اور کافروں کو ملیا میٹ کر ڈالے۔ بھلا کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ (یونہی) جنت کے اندر جا پہنچو گے؟ حالانکہ ابھی تک اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانچ کر نہیں دیکھا جو جہاد کریں، اور نہ ان کو جانچ کر دیکھا ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ اور تم تو خود موت کا سامنا کرنے سے پہلے (شہادت کی) موت کی تمنا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اب تم نے کھلی آنکھوں اسے دیکھ لیا ہے۔''

جنگ بدر اور جنگ احد میں مسلمانوں کی حالت:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جنگ احد ہوئی اور اس میں اہل ایمان پر ایک بہت بڑا امتحان آیا، اس میں ستر صحابہ شہید ہو گئے اور خود حضور اکرم ﷺ کے رخسار مبارک زخمی ہوئے اور دانت بھی شہید ہو گئے۔ یہ بہت بڑا امتحان تھا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں کہ میرے مدنی! دیکھیں! آپ سے پہلے بھی تو امتیں گزر چکی ہیں، حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آپ کے زمانہ تک بہت سے انبیاء گزرے ہیں اور ہزاروں امتیں گزری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ایک طریق ہے کہ ہمیشہ اہل حق اور اہل باطل کی جنگ ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ بھی ہمیشہ رہا ہے کہ کبھی حق کو فتح مل گئی اور کبھی باطل کو فتح ہو گئی، اگرچہ بظاہر اہل حق کو شکست ہو جائے، لیکن انجام کار ہلاکت و بربادی مکذبین اور کافرین کے لیے ہے اور اہل حق کا آخر کار نتیجہ کامیابی ہی کامیابی ہے۔ اس لیے آپ کو اس میں کوئی گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر نبی کے زمانہ میں ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے، آپ کی امت کے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے کہ جنگ بدر میں فتح ہو گئی اور جنگ احد میں شکست ہو گئی۔ ایک میں فتح دینے کے بعد آزمائے گئے اور

ایک میں شکست دینے کے بعد آزمائے گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایمان والوں کو ہی غلبہ دینا ہوتا تو مغلوب تو زبردستی ایمان قبول کرتا ہے۔ اور زبردستی مسلمان کرنے کا حکم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں راستے بتا دیئے ہیں: اگر ہدایت اختیار کرو گے تو کامیابی ہے اور اگر ضلالت اختیار کرو گے تو ناکامی اور ذلت ہے۔ اللہ کو کوئی نقصان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ غنی ہے، ساری دنیا اس کی محتاج ہے۔

مسلمانوں اور کافروں کے انجام پر کلام:

انجام دو ہیں: ایک انجام باعتبار دنیا کے ہے اور ایک انجام باعتبار آخرت کے ہے۔ اگر آدمی غور کرے تو باعتبار دنیا ہو یا باعتبار آخرت ہو مسلمان کامیاب ہے، جیسا کہ غزوہ احد میں صحابہ کرام شہید ہو گئے اور ان کو شہید ہونے کے بعد بڑا مرتبہ ملا ہے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تھا: اے کافرو! ہم اور تم کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ ہمارے شہید ہونے والے جنت میں پہنچ گئے اور تمہارے مرنے والے جہنم میں چلے گئے۔ لہٰذا ہم برابر نہیں ہیں۔

کوئی اعتراض کرے کہ یہ تو مسلمان کہتے ہیں کہ ہمارے مرنے والے جنت میں، کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔ حالانکہ ہمارے پاس دلیل ہے۔ سب سے بڑی دلیل اللہ کا قرآن ہے اور فرمان مصطفیٰ ﷺ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ شہید کو مردہ بھی نہ کہو، شہید اللہ کے ہاں زندہ ہیں۔ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ شہداء کی ارواح مبارکہ عرش کے نیچے جو قنادیل معلق ہیں ان میں پرندوں کی شکل میں جنت کی سیر کرتی ہیں، ان کے لیے راحتیں ہیں۔ شہداء تو مرنے کے بعد چاہتے ہیں کہ ہم دوبارہ دنیا میں جائیں اور لوگوں کو بتائیں کہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے۔ ہمارے پاس دلیل ہے، لیکن کافر نہیں مانتا۔ اس کا تو خدا پر بھی ایمان نہیں ہے اور باعتبار دنیا کے انجام کو دیکھیں گے۔

وہی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا تھا مسلمان ہو گئے۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ جو اس وقت کافروں کی قیادت کر رہے تھے، جو تین ہزار کا بڑا لشکر لے کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے تھے مسلمان ہو گئے۔ اس سے بڑی کامیابی کیا ہو گی کہ یہ حضرات اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ کر مسلمان ہو گئے، تو انجام کار کامیابی مسلمان کو ہوئی، اس کا انکار کوئی کافر بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے فرمایا کہ تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں انبیاء علیہم السلام کی پیروی کرنے والی تھیں، ان میں کامیابی ان کو ہوئی جو ایمان والے تھے۔ اور جو کافر تھے ان پر ہلاکت پڑی۔

اس لیے اللہ تعالیٰ بار بار دعوت دیتے ہیں کہ آپ لوگوں سے کہیں کہ زمین میں چلیں پھریں، خاص طور پر عرب والے ان کے سامنے شام کا سفر بھی ہے، یمن کا سفر بھی ہے، یہ تو دیارِ قومِ عاد وثمود پر گزرتے ہیں اور قومِ لوط پر گزرتے ہیں۔ وہ ساری قومیں انہیں علاقوں میں آباد تھیں۔ اے میرے مدنی! اگر یہ تیری بات نہیں مانتے تو حقائق ارض سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ ذرا چلیں پھریں اور دیکھیں کہ قومِ عاد نے جب تکذیب کی تو کیا نتیجہ نکلا! قومِ ثمود نے جب تکذیب کی تو کیا نتیجہ نکلا! قومِ نوح نے جب تکذیب کی تو کیا نتیجہ نکلا! قومِ لوط نے جب گناہ کیے، اللہ کے فرشتوں کو چھیڑا تو کیا نتیجہ نکلا! اب اگر مکہ والے لڑنے کے لیے مدینہ آرہے ہیں، اے میرے نبی! آپ بھی غم نہ کریں۔ آخر کار کامیابی آپ ہی کی ہوگی اور ذلت ان کے مقدر میں ہوگی۔ یہ نورِ ایمان کی روشنی چمکے گی، آپ کے دین اسلام کو ہم غلبہ دیں گے اور پھر عالم آخرت کی کامیابی آپ کے حصے میں ہے۔

﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ۝﴾

اے میرے مدنی! آپ مسلمانوں کو ہدایت دیں کہ قرآن پڑھیں۔ اس کے اندر ہم نے لوگوں کے لیے کھول کھول کر ہدایت کو بیان کیا ہے، ہم نے سای قوموں کے واقعات بیان کیے، ہم نے ساری امم کے احوال بیان کیے، ان کے نتائج بیان کیے، اس کے اندر تمہارے دلوں کے لیے ہدایت کے سامان ہیں اور اس قرآن میں وعظ بھی ہے، یعنی یہ قرآن تمہیں گناہوں سے اور حرام سے روکنے والا ہے، حلال اور اور اچھے کاموں کی طرف چلانے والا ہے، لیکن قرآن سے صرف وہی فائدہ اٹھاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔ جب قرآن پڑھو تو غور کیا کرو کہ قرآن کیا کہتا ہے!؟

جنگ احد میں مسلمانوں پر مشکلات:

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝﴾

اللہ نے مومنوں کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ کمزوری کیوں دکھاتے ہو؟ کیوں ضعف اختیار کرتے ہو؟ جو واقعات پیش آئے اس کے اندر مسلمانوں کے لیے بہت بڑا امتحان تھا۔ جب ایک بد بخت کافر نے اعلان کیا: ''قَدْ مَاتَ مُحَمَّدٌ'' کہ حضور اکرم ﷺ ...... نعوذ باللہ ...... شہید ہو گئے، صحابہ نے جب سنا تو ان کے دل و دماغ کام کرنا چھوڑ گئے، صحابہ کمزور ہو گئے۔ یہ ان کے لیے کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر ان کو تسلی

دی کہ جنگوں میں ایسے حالات ہوتے ہیں۔ جنگ میں قتل بھی ہوں گے، نقصان بھی ہوں گے اور زخم بھی لگیں گے تو جب جنگ کے اندر یہ ساری چیزیں متوقع ہیں تو کمزوری کیوں دکھاتے ہو؟ ﴿وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ تم غم نہ کرو، ہر حال میں تم سربلند ہو۔ بس تم اپنے ایمان پر جمے رہو، حضور اکرم ﷺ کی اطاعت پر جمے رہو۔ وقتی طور پر اگر شکست آگئی ہے تو اس کے اسباب پر غور کرو۔ یہ تمہارے اپنے اندر کمزوریاں تھیں، جن کی وجہ سے شکست آگئی۔ اگر تمہارے اندر وہ کمزوریاں نہ ہوتیں تو مومن کبھی شکست نہیں کھا سکتا۔ اور تمہارے لیے یہ خوشخبری ہے کہ انجام تمہارا ہے۔ دنیا میں بھی انجام کے اعتبار سے کامیابی تمہاری ہے اور آخرت میں بھی کامیابی تمہارے لیے ہے۔ اور کافروں اور مشرکوں کی دنیا بھی برباد ہے اور آخرت بھی برباد ہے۔

﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ﴾

یہ دوسری تسلی ہے کہ اے میرے مدنی! آپ اپنے ایمان والے صحابہ سے کہیں کہ اگر آج تمہیں زخم لگے ہیں اور تمہاری جماعت کے لوگ شہید ہوئے ہیں تو دشمن بھی تو مارا گیا ہے، ان کے بھی تو جنگ بدر میں ستر کافر مارے گئے تھے اور ان کو بھی تو زخم لگے تھے اور کافر بھی تو قید ہوئے تھے۔ یہ تو ہمارا نظام ہے کہ کبھی ڈول ادھر ہوجاتا ہے اور کبھی ڈول ادھر ہوجاتا ہے۔ ہم کبھی دولت دے کر آزماتے ہیں اور کبھی دولت لے کر آزماتے ہیں۔

اس لیے جب مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوگئیں، روم و کسریٰ فتح ہوگیا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ہمارا امتحان لیا غربت کے ساتھ، ہم پر فقر تھا، کھانے کو نہیں ملتا تھا، روٹی نہیں تھی، ٹھکانہ نہیں تھا، کھجوریں کھا کر گزارا کرتے تھے اور اب اللہ تعالیٰ نے دولت دے کر امتحان لیا ہے۔ اب قدم قدم پر پیسہ ہے، مال ہے، بھرے ہوئے خزائن و غنائم ہیں، حتیٰ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اگر ہمارے ملک میں کوئی عیسائی، یہودی، کافر ہے اس کو وظیفہ دو۔

میں کہتا ہوں کہ ہماری بڑی بدنصیبی ہے کہ ہمارے جتنے اچھے اعمال ہیں وہ دشمنوں نے لے لیے ہیں اور ان کے جتنے گندے اعمال ہیں وہ مسلمانوں نے لے لیے ہیں۔ آپ یورپ کے ملکوں میں جا کر دیکھیں کہ وہاں ہر آدمی کا علاج، ہر آدمی کی تعلیم اور آدمی بوڑھا ہوجائے تو اس کا وظیفہ ہے، نوکری چھوٹ جائے تو آپ جا کر اطلاع کریں، آپ کو ہفتہ وار وظیفہ ملے گا، آپ کا بچہ پیدا ہوا تو وظیفہ ملے گا، جتنے بچے زیادہ ہوں گے اتنا وظیفہ بڑھتا جائے گا۔ یہ

سارا نظام اصل میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تھا۔ انہوں نے اپنے وقت میں حکم دیا تھا کہ میری سلطنت میں کوئی بھوکا نہیں ہوگا، بے کار نہیں ہوگا، بیت المال سے اس کو وظیفہ ملے گا اور اس طرح اسلام نے حکم دے دیا کہ اگر تمہیں کہیں غلبہ مل جائے تو ان کی عبادت خانوں کو کبھی نہ گراؤ۔

مسلمانوں پر تکالیف مسلط کرنے کی حکمت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کبھی ہم جنگ میں فتح دیتے ہیں اور کبھی شکست دیتے ہیں، تا کہ تمہارا امتحان ہو جائے کہ سچے امتحان والے کون ہیں اور اگر شکست نہیں ہوگی تو تمہیں شہادت کیسے ملے گی؟

کسی کے دل میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ کافروں کو فتح کیسے ہوگئی؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو اپنے پیاروں کی مدد کرتے ہیں، دشمنوں کی مدد نہیں کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی فتح کو یہ نہ سمجھنا کہ میں ان کو محبوب رکھتا ہوں، بلکہ ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ اللہ تعالیٰ کسی ظالم کو محبوب نہیں رکھتے۔ محبوب تم ہو، لیکن کبھی میں اپنے محبوبوں پر بھوک مسلط کر دیتا ہوں اور کبھی ان کو آزمانے کے لیے دکھوں میں ڈال دیتا ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ تکلیفیں انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں انبیاء کے بعد جیسے جیسے درجہ ہوتا ہے اتنا ہی بڑا امتحان ہوتا ہے۔ جتنی شان بڑی ہوگی اتنے امتحان بھی بڑے ہوں گے۔

دوسری جگہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے اللہ کے راستے میں اتنی تکلیفیں دی گئی ہیں کہ مجھ سے پہلے کسی نبی پر ایسی تکلیفیں نہیں دی گئیں۔ کیونکہ سب سے بڑی شان آپ کی ہے تو سب سے بڑے امتحان بھی آپ پر آئے۔ اللہ تعالیٰ تکلیفیں دیتے ہیں، تا کہ ایمان والوں کو نکھار لیں۔ اگر ان کے گناہ ہیں تو یہ تکالیف ان کے لیے کفارہ ہو جائیں۔

علماء نے اس کی مثال دی ہے کہ اگر کوئی ایسے ہی کپڑے کو مارنا شروع کر دے تو لوگ کہیں گے کہ کہ پاگل ہو گیا ہے، لیکن جب دھوبی کپڑے کو مارتا ہے تو کہتے ہیں: ذرا اچھی طرح مارنا کہ داغ اچھی طرح صاف ہو جائیں۔ اللہ بھی اپنے بندوں پر امتحان ڈالتے ہیں، تا کہ اس کے بندے پاک ہو جائیں اور اگر ان کے گناہ نہیں ہیں تو ان کے درجات بلند ہو جائیں۔

ایک آدمی نے حضرت سری سقطی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ مجھے ایک بات سمجھ نہیں آتی کہ جتنے ہم نے اولیاء اللہ دیکھے

ہیں ان پر ہم نے تکلیفیں دیکھی ہیں کہ کوئی نابینا ہو گئے، کوئی بوڑھے ہو گئے، کوئی بیمار ہو گئے، کوئی ریڑھیوں پر آگئے، اٹھنے کے قابل نہ رہے۔ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اللہ کے بندے اللہ پاک نے اپنے بندوں کے لیے فیصلہ کیا ہے کہ اس کو جنت کے فلاں درجے پر پہنچانا ہے تو بعض بندے اپنے عمل سے اس درجہ پر پہنچتے ہیں اور بعض کے درجات اتنے اونچے ہوتے ہیں کہ وہ جتنا بھی عمل کریں نہیں پہنچ سکتے تو اللہ تعالیٰ ان کو تکلیفیں دیتے ہیں، تاکہ کچھ عمل کی وجہ سے ترقی کر جائیں اور کچھ صبر کی وجہ سے ترقی کر کے اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ﴾

اللہ تعالیٰ نے اب اور انداز میں خطاب فرمایا ہے کہ کیا تم گمان کرتے ہو کہ ہم جنت میں چلے جائیں گے اور امتحان نہ ہوگا؟ تم ایک مٹی کا برتن خریدتے ہو تو اس کو دیکھتے ہو کہ ٹوٹا ہوا تو نہیں ہے؟ اور میں اپنے بندے خرید کر کے جنت دوں تو میں بھی نہ دیکھوں کہ میرے بندے کیسے ہیں؟ میں نے بھی تو اپنے بندوں کو آزمانا ہے۔

اس لیے دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿الٓمّٓ ① اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ②﴾ [العنکبوت:۱،۲] کیا گمان کرتے ہیں لوگ کہ ایسے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں ہوگی؟ بلکہ ان کے امتحان ہوں گے۔ یہ شانِ صحابہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں کو کیسے منا رہے ہیں؟ کیسے ان کو خطاب فرما رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ ان کو تسلی دینے کے لیے کبھی جبرائیل بھیج رہے ہیں، کبھی قرآن نازل فرما رہے ہیں۔ اور ایک مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ [البقرۃ:۲۱۴] کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور پہلے لوگوں کی طرح تمہارا امتحان نہیں ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جنت میں جانا ایسے مفت میں نہیں مل جائے گا، بلکہ جنت میں جانے کے لیے امتحان ہوں گے۔ اللہ جانچیں گے کہ کون تم میں سے مجاہد ہے؟ کون تم میں سے صبر کرنے والا ہے؟ اور کون کافروں کے مقابلہ پر جمنے والا ہے؟ اس سے اشارہ ہو گیا کہ جنگ احد میں اس درجے پر پچاس صحابہ تھے: گیارہ صحابہ عزیمت پر رہے، آخری وقت تک لڑے اور شہید ہو گئے۔ اور باقی رخصت پر عمل کر کے اتر آئے تھے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے امتحان لینا ہے کہ کون مقامِ صبر کے اعلیٰ مقام پر ہے۔

﴿وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾

یہ خطاب کا ایک اور انداز ہے کہ آج صحابہ کی موت پر تم غم کیوں کرتے ہو؟ یہ موت تو تم نے خود مانگی تھی۔ جب وہ سامنے آگئی تو کیوں پریشان ہوتے ہو؟ تم نے خود کہا تھا کہ ہم باہر جا کر لڑیں گے اور مقام بدر کی طرح مرتبے حاصل کریں گے۔ تمہاری تمنا پوری ہوگئی، پھر کیوں پریشان ہوتے ہو؟

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((أيها النّاسُ! لاَ تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ، وَسَلُوْا اللهَ الْعَافِيَةَ، فَإِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا، وَاعْلَمُوْا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلاَلِ السُّيُوْفِ)) کبھی دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرو۔ اگر دشمن سامنے آئے تو جم جاؤ۔ جان لو کہ جنت تلوار کی چھاؤں کے نیچے ہے۔

[بخاری، رقم: ۲۹۶۶]

﴿فَقَدْ رَاَیْتُمُوْهُ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب تم نے اپنی آنکھوں سے موت کو دیکھ لیا کہ تلواروں کی دھار اور نیزوں کی تیزی اور جوانوں کی صفیں قتال کے لیے بن گئیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں: یہ تخیل ہے کہ آدمی ایسی چیز کا خیال کرے جو موجود تو نہیں، لیکن اس کو محسوس کے طور پر سمجھے، جیسا کہ مثالیں دی جاتی ہیں کہ دنبہ کی دوستی ہے۔ آدمی اس کو پالے تو اس کے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ اور بھیڑیا کی دشمنی ہے کہ اس کو جتنا دودھ پلاؤ وہ بھیڑیا ہی رہے گا، سانپ کو جتنا دودھ پلاؤ کسی نہ کسی وقت اس نے ڈنگ مار دینا ہے وہ اپنی حرکت سے باز نہیں آئے گا۔

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِىٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِىْۤ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۱۴۴-۱۴۸]

''اور محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، بھلا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا انہیں قتل کر دیا جائے تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور جو شکر گزار بندے ہیں اللہ ان کو ثواب دے گا۔ اور یہ کسی بھی شخص کے اختیار میں نہیں ہے کہ اسے اللہ کے حکم کے بغیر موت آ جائے، جس کا ایک معین وقت پر آنا لکھا ہوا ہے۔ اور جو شخص دنیا کا بدلہ چاہے گا ہم اسے اس کا حصہ دے دیں گے، اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا ہم اسے اس کا حصہ عطا کر دیں گے۔ اور جو لوگ شکر گزار ہیں ان کو ہم جلد ہی ان کا اجر عطا کریں گے۔ اور کتنے سارے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی۔ نتیجۃً انہیں اللہ کے راستے میں جو تکلیفیں پہنچیں ان کی وجہ سے نہ انہوں نے ہمت ہاری، نہ وہ کمزور پڑے اور نہ انہوں نے اپنے آپ کو جھکایا۔ اللہ ایسے ثابت قدم لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ ان کے منہ سے جو بات نکلی وہ اس کے سوا نہیں تھی کہ وہ کہہ رہے تھے: ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو بھی اور ہم سے اپنے کاموں میں جو زیادتی ہوئی ہو اس کو بھی معاف فرما دے، ہمیں ثابت قدمی بخش دے اور کافر لوگوں کے مقابلے میں ہمیں فتح عطا فرما دے۔ چنانچہ اللہ نے انہیں دنیا کا انعام بھی دیا اور آخرت کا بہترین ثواب بھی۔ اور اللہ ایسے نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے۔''

اسبابِ نزول:

یہ آیات احد کے بارے میں نازل ہوئیں۔ آپ نے غزوہ احد بڑی تفصیل سے پڑھا ہے کہ مسلمانوں پر بہت بڑا امتحان آیا اور نا قابل تلافی نقصان ہوا کہ ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔ جب غزوہ احد میں لڑائی شدت اختیار کر چکی تھی، حضور اکرم ﷺ کے دندان مبارک شہید ہو گئے، آپ نے سر پر خود پہنا ہوا تھا، کسی ظالم نے آپ کو پتھر مارا تو خود کی کڑیاں نکل کر رخسار مبارک میں گھس گئیں، خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔ ساتھ ایک گڑھا تھا، حضور اکرم ﷺ کا قدم مبارک پھسلا تو اس میں گر گئے۔ اسی اثنا میں ایک کافر بد بخت نے شور کیا: ''قُتِلَ مُحَمَّدٌ'' محمد مصطفیٰ ﷺ شہید ہو گئے۔ کیونکہ شیطان ایسے مواقع کی انتظار میں ہوتا ہے تو شیطان نے کافروں کی شکل میں آ کر شور کر دیا کہ اللہ کے نبی قتل ہو گئے ہیں۔ تو مسلمانوں کے رہے سہے حوصلے گم ہو گئے، صحابہ حوصلے ہار گئے اور بعض لوگوں کے قدم اکھڑ گئے کہ ہمارا تو مقصدِ حیات ہی ختم ہو گیا۔ ان حالات کے سامنے اللہ نے اپنے نبی پر یہ آیات

مبارکہ نازل فرمائیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو میٹھا سا عتاب:

ان آیات میں بڑے محبوب انداز میں صحابہ کے لیے عتاب بھی ہے اور قیامت تک آنے والے مومنوں کے لیے سبق بھی ہے اور ہدایت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے نبی! مومنوں کی جماعت کو آپ خود فرما دیں کہ ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تو صرف اللہ کے رسول ہیں، آپ سے پہلے تو رسول گزر چکے ہیں آخر ان پر بھی تو موت آگئی۔ اگر اللہ کے رسول پر موت آجائے یا اللہ کے رسول شہید ہو جائیں تو اس کا کیا مطلب ہے کہ آدمی دین کو چھوڑ کر نکل جائے؟ کیونکہ رسول پر موت آگئی تو کیا دین بھی ختم ہے؟

آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ عتاب کے انداز ہوتے ہیں: ایک دشمن پر عتاب ہوتا ہے، وہ الگ ہوتا ہے۔ اور ایک عتاب اپنے محبوب پر ہوتا ہے، اگر آپ دشمن کو ڈرانا چاہیں تو اس سے آپ اور انداز میں بات کریں گے اور اگر اپنے بیٹے کو، محبوب کو، اپنے دوست کو ہدایت کریں گے تو اس کا انداز الگ ہوگا۔

﴿وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا﴾

اے میرے مدنی! آپ ان کو یہ بھی بتا دیں کہ جو آدمی دین کو چھوڑ کر الٹا پھر جائے وہ اللہ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ یعنی اللہ نہ کرے اگر کوئی مسلمان مرتد ہو جائے، اللہ کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، وہ غنی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ساری مخلوق بھی مسلمان ہو جائے، متقی پرہیزگار بھی ہو جائے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں ہے اور اگر ساری مخلوق...... نعوذ باللہ...... کافر ہو جائے، اسلام کو چھوڑ دے تو اللہ کو کوئی نقصان نہیں ہے۔ اگر اسلام پر رہو گے تو اس کے اندر تمہارا فائدہ ہے اور اگر اسلام سے نکلو گے تو تمہارا اپنا نقصان ہے۔

قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ذکر کرنے کی حکمتیں:

قرآن کی ترتیب پر غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بہت کم لیا ہے، صرف ان جگہوں پر نام لیا ہے جہاں بے انتہا ضرورت تھی، ورنہ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ آپ کو القاب سے نوازا ہے، اس آیت کے اندر نام لیا گیا ہے اور ختم نبوت والی جگہ پر آپ کا نام لیا گیا ہے اور حدیبیہ کے موقع پر آپ کا نام لیا گیا ہے۔

دوسری بات رسول نبی سے افضل ہوتا ہے؛ کیونکہ ہر رسول نبی ہوتا ہے، لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ جیسا کہ

حضرت ہارون علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، لیکن رسول نہیں ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام رسول بھی ہیں اور نبی بھی ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ رسول صاحب شریعت ہوتا ہے اور نبی کسی رسول کی شریعت کے تابع ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے تابع رہے، بنو اسرائیل میں ہزاروں نبی آئے تو تورات پر عمل پیرا رہے۔ رسول تین سو تیرہ ہیں تین سو تیرہ میں سے پانچ افضل ہیں اور ان پانچ میں سے سب سے افضل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس لیے یہاں اللہ تعالیٰ نے رسول کا ذکر کیا ہے۔ جب رسولوں پر موت آئی تو نبی کا ذکر خود بخود سمجھ میں آ گیا۔

﴿أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ﴾

موت کا ذکر پہلے ہے اور قتل کا بعد میں ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئے گی قتل نہیں ہوں گے۔

مسئلہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر موت آئے گی کوئی بچ نہیں سکتا۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے "حَيٌّ لَّا يَمُوتُ" جو زندہ ہے، زندہ رہے گی، اس پر کبھی موت نہیں آئے گی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝﴾ [الرحمٰن: ۲۶، ۲۷] میرے مدنی! اعلان کر دیں کہ ہر وہ چیز جو زمینوں میں ہے سب کو فنا آنی ہے، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو باقی ہے، جو دائم ہے، جو حی ہے اور جو قیوم ہے۔ باقی دنیا میں کسی چیز کو دوام نہیں ہے، ان پر فنا آئے گی، یا قابل فنا ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اس کو فنا نہ کریں، یہ اس کی مرضی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت پیدا کر دی ہے، لیکن جنت پر فنا نہیں آئے گی۔ اگر اللہ تعالیٰ اس پر بھی فنا طاری کر دیں تو وہ قادر ہیں، اس کو فنا کر سکتے ہیں۔ دنیا کے اندر ایسے لوگ پیدا ہوئے جو خدا کو نہیں مانتے، نبیوں کے منکر پیدا ہوئے، صحابہ کے منکر پیدا ہوئے، اہل بیت کے منکر پیدا ہوئے، اولیاء اللہ کے منکر پیدا ہوئے، حدیث کے منکر پیدا ہوئے، معجزات و کرامات کے منکر پیدا ہوئے، لیکن موت ایک ایسی چیز ہے اس کا کوئی منکر نہیں ہے۔ کافر بھی کہتے ہیں کہ ہم مریں گے، لیکن کہتے ہیں کہ ہم نے مرنے کے بعد اٹھنا نہیں ہے۔

﴿وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا﴾

قرآن کے اسلوب بیان پر غور کریں کہ یہ میدان جنگ سے پیچھے ہٹنا تھا، اسلام سے پیچھے نہیں ہٹنا تھا اور میدان

جنگ میں ایسے حالات میں ہٹ جانا کوئی جرم نہیں ہے، یہ تو جنگوں میں ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے اسلوب میں بیان کیا، تاکہ آنے والے وقت میں تیار ہو جائیں کہ جب اللہ کے نبی فوت ہو جائیں گے تو کیا تم دین سے اس لیے ہٹ جاؤ گے کہ اللہ کے نبی پر موت آ گئی؟ تو اللہ نے فرمایا: سن لو! ﴿وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا﴾ اگر کوئی شخص دین سے ہٹ جائے، اسلام سے نکل جائے اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اللہ تعالیٰ تو ﴿مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ کے مالک ہیں۔ اگر صراطِ مستقیم پر چلو گے تو تمہارا فائدہ ہے اور اگر بھٹک جاؤ گے تو تمہارا نقصان ہے۔ اور اس کے ساتھ فرمایا: ﴿وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ﴾ اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں، صبر کرنے والوں اور ہر حال میں اسلام کے پر جمنے والوں کو خاص بدلہ عطا فرماتے ہیں۔

ایک نہ ایک دن حضور ﷺ پر موت آنی ہے:

اس آیت مبارکہ میں ایک تو صحابہ کی تربیت ہو گئی کہ ایک نہ ایک دن حضور اکرم ﷺ پر موت آنی ہے تو پھر تمہارا کیا حال ہوگا؟ یہی وجہ تھی کہ جب حضور اکرم ﷺ پر موت آئی تو یہی آیت تھی جو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پڑھی تھی۔

انبیاء کرام علیہم السلام پر موت برحق ہے:

یاد رکھیں! تمام اللہ کے نبی اور اللہ کے رسول برحق ہیں، لیکن سب اولادِ آدم ہیں، سب پر موت آئے گی۔ اور سب پر موت آ گئی، مگر وہ پیغمبر جن کو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں پر بٹھایا ہے، حضرت عیسیٰ پر ابھی موت نہیں آئی لیکن ان پر بھی موت آئے گی۔ بعض لوگ بزرگوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ نہ کہو: وہ فوت ہو گئے، بلکہ وہ وصال فرما گئے ہیں، اللہ تعالیٰ اسے مل گئے ہیں۔ ایک ہے کہ ادباً یہ لفظ کہیں، لیکن یاد رکھیں! اگر موت کا لفظ شانِ نبوت کے خلاف ہوتا تو اللہ تعالیٰ کبھی بھی اپنے نبی کے لیے یہ لفظ استعمال نہ کرتے۔ سب سے زیادہ حضور اکرم ﷺ کی شان اللہ نے بیان فرمائی ہے۔ فرمایا: میرے نبی کو کبھی ''رَاعِنَا'' کہہ کر نہ پکارو؛ کیونکہ اس سے تنقیص کا پہلو نکل سکتا ہے۔ تو اگر لفظِ موت کے اندر کوئی توہین کا پہلو ہوتا تو اللہ کبھی اس کو نبیوں کے لیے استعمال نہ فرماتے۔

مسئلہ حیاتِ انبیاء علیہم السلام

بعض میرے بھائی جو موحد بھی ہیں، لیکن وہ بھی حد سے نکل جاتے ہیں اور پٹڑی سے اتر جاتے ہیں، وہ بھی

موت کا معنیٰ یہ کر لیتے ہیں کہ انبیاء پر موت آ گئی، مٹی کے اندر مل گئے اور ریزہ ریزہ ہو گئے۔ یہ بھی ......نعوذ باللہ......حد سے نکلنے والی بات ہے۔ انبیاء کی جیسے حیات شان والی ہوتی ہے، اسی طرح ان کی موت بھی شان والی ہوتی ہے۔ اور اللہ زمینوں میں اپنے نبیوں کے جسد مبارک کو ایسے محفوظ رکھتے ہیں کہ زمین کی طاقت ہی نہیں ہے کہ انبیاء کے اجسام کو چھیڑ سکے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مکہ اور شام کے راستے میں سرخ ٹیلہ ہے۔ اس کے قریب میرے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر ہے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ ابھی بھی گزروں تو میں بتا سکتا ہوں۔ اور جب میں وہاں سے گزرا تو دیکھا کہ موسیٰ نماز پڑھ رہے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کی ملاقات مسجد اقصیٰ میں بھی کروائی اور کچھ بڑے انبیاء کی آسمانوں پر بھی کرائی اور حضور ﷺ تمام نبیوں کے امام بھی بنے۔

موت کا وقت مقرر ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾

فرمایا: موت سے ڈر کر جو پیچھے رہے ہو، شکست سے ڈر کر جو پیچھے رہے ہو، حالانکہ کسی نفس پر موت پہلے نہیں آسکتی، مگر وقت مقرر پر آئے گی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں چند دوستوں نے آکر عرض کیا: آپ مہربانی کریں! آپ ایسے جو جنگ لڑتے ہیں ایسے نہ لڑا کریں۔ آپ کی طبیعت تھی کہ گھوڑا دوڑاتے اور دشمن کی صفوں میں گھس جاتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: موت مجھ سے ڈرتی ہے۔ ساتھیوں کو بات سمجھ نہ آئی، انہوں نے عرض کیا: موت کیسے ڈرتی ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا وقت سے پہلے آسکتی ہے؟ ساتھیوں نے کہا: نہیں۔ فرمایا: جب اس نے وقت پر آنا ہے تو میں کیوں ڈروں؟

﴿كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾

موت کا ایک وقت مقرر ہے، جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے۔ اس سے آگے بھی نہیں ہو سکتی اور اس سے پیچھے بھی نہیں ہو سکتی تو پھر بزدلی کا کیا معنیٰ ہے؟

﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ﴾ جو دنیا کا

ثواب مانگے ہم دیتے ہیں۔ اگر تمہیں احد میں صرف مالِ غنیمت چاہیے وہ بھی مل سکتا ہے اور جن کو آخرت چاہیے تو ہم ان کو آخرت کا ثواب دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کو بدلہ دیں گے۔

جنگ میں ڈٹ جانے کا حکم:

﴿وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ اے میرے مدنی! آپ اپنے صحابہ کو بتائیں کہ یہ کوئی پہلی جنگ نہیں ہے، کتنے نبی ہیں جن کے ساتھ اللہ والے مل کر کافروں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔

﴿رِبِّيُّوْنَ﴾ کا معنی جماعت بھی آتا ہے، لیکن پہلا معنی راجح ہے۔ اللہ کے راستے میں جو ان کو تکلیفیں آئیں انہوں نے کوئی کمزوری نہ دکھائی، نہ بزدل ہوئے اور نہ دشمن سے دبے، یعنی بالکل اللہ کے راستے پر جمے رہے۔ اور اللہ بھی صبر کرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔

وہ جو اللہ والے گزر چکے ہیں جہاد میں بھی ثابت قدم رہے، اس کے باوجود بھی ان کی زبانوں پر تھا: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ اے اللہ! ہماری غلطیاں، ہمارے گناہ معاف فرمادے اور ہم سے جو اس نیکی کے عمل میں کوتاہی ہوئی ہے اس کو معاف فرمادے اور جنگ میں ہمارے پاؤں جمادے اور کافروں پر ہماری مدد فرما، ہمیں فتح نصیب فرمادے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان:

شانِ صحابہ دیکھیں کہ کچھ صحابہ سے غلطی ہوئی، انہوں نے درہ چھوڑ دیا۔ تو سیدھی سی بات تھی کہ اللہ فرماتے: اے میرے مدنی! کہہ دو کہ معافی مانگیں، لیکن مقامِ صحابہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی! ہم تیرے صحابہ کو یوں نہیں کہتے، بلکہ ان کو بتاتے ہیں کہ پہلے لوگ ایسے کرتے تھے، تم بھی کرلو، ورنہ تمہاری غلطیاں تو ہم معاف کر چکے ہیں۔

ابن ابی نجیح نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ مہاجرین میں سے ایک شخص ایک انصاری پر (جنگ کے دوران) گزرا اور وہ اپنے خون میں بالکل لت پت ہو چکے تھے، ان کو کہا: تمہیں پتہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ شہید ہو گئے ہیں؟ انصاری صحابی نے جواب دیا: اگر یہ بات سچی ہے تو وہ ہمیں اللہ کا دین بھی پہنچا گئے ہیں تو اب تم اللہ کے دین کے لیے لڑو۔ [دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد: ۲، صفحہ: ۲۴۸]

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَھُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ۝ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىھُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَھُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓي اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓي اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۱۴۹ تا ۱۵۳]

’’اے ایمان والو! جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے اگر تم ان کی بات مانو گے تو وہ تمہیں الٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹا دیں گے، اور تم پلٹ کر سخت نقصان اٹھاؤ گے۔ (یہ لوگ تمہارے خیر خواہ نہیں) بلکہ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔ جن لوگوں نے کفر اپنایا ہے ہم عنقریب ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے؛ کیونکہ انہوں نے اللہ کی خدائی میں ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن کے بارے میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ ظالموں کا بدترین ٹھکانا ہے۔ اور اللہ نے یقیناً اس وقت اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا جب تم دشمنوں کو اسی کے حکم سے قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے کمزوری دکھائی اور حکم کے بارے میں باہم اختلاف کیا اور جب اللہ نے تمہاری پسندیدہ چیز تمہیں دکھائی تو تم نے (اپنے امیر کا) کہنا نہیں مانا۔ تم میں سے کچھ لوگ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور کچھ وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے۔ پھر اللہ نے ان سے تمہارا رخ پھیر دیا، تاکہ تمہیں آزمائے۔ البتہ اب وہ تمہیں معاف کر چکا ہے۔ اور اللہ مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ (وہ وقت یاد کرو) جب تم منہ اٹھائے چلے جا رہے تھے اور کسی کو مڑ کر نہیں دیکھتے تھے اور رسول تمہارے پیچھے سے تمہیں پکار رہے تھے۔ چنانچہ اللہ نے تمہیں (رسول کو) غم (دینے) کے بدلے (شکست کا) غم دیا، تاکہ آئندہ تم زیادہ صدمہ نہ کیا کرو، نہ اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے، اور نہ کسی اور مصیبت پر جو تمہیں پہنچ جائے۔ اور اللہ تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔‘‘

قیامت تک کے آنے والے مسلمانوں کے لیے تنبیہ:

اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں غزوۂ احد کا مفصل ارشاد فرمایا ہے۔ ان آیات میں مومنین کے لیے ایک خصوصی تنبیہ ہے۔ سب سے پہلے تو یہ یاد رکھیں کہ کبھی صحابہ نے ...... نعوذ باللہ ...... کافروں کی اطاعت نہیں کی اور نہ انہوں نے کافروں کو اپنا معین و مددگار سمجھا، لیکن خطاب کا انداز اس تنبیہ کے ساتھ ہے، تاکہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو سبق ملے۔

فرمایا: اے ایمان والو! اگر تم کافروں کی بات مانو گے تو کافر یہ نہیں کہیں گے کہ آپ ہماری بات مان لیتے ہیں، اس لیے ہمارا آپ کے ساتھ گزارا ہو جائے گا، بلکہ وہ تمہیں تمہارے دین اسلام سے نکالیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ﴾ [البقرۃ: ۱۲۰] ہرگز یہود و نصاریٰ تم سے راضی نہیں ہو سکتے، جب تک کہ تم ان کے دین کی اتباع نہ کرو، چاہے تم لاکھ ان سے وفاداریوں کا دم بھرو۔ ان کی منشا یہ ہے کہ تم اسلام کو چھوڑ دو، تب وہ تمہیں اپنے اندر کھپائیں گے، ورنہ محض تمہاری باتوں سے اور تمہاری اطاعت سے کبھی راضی نہیں ہوتے۔

جب جنگ کے اندر شکست آجائے تو فطری طور پر ایک فریق یہ سوچتا ہے کہ اب ہم ان سے صلح کر لیں، کوئی لینے دینے کی بات کر لیں کہ ہم آپ کو اتنا ٹیکس دیں گے، آپ ہمارا تحفظ کریں گے۔ یہ باتیں فطرۃً دلوں میں آتی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں یہ ہدایت دی کہ خبردار! ایسی بات کبھی دل و خیال میں بھی نہ لانا کہ تم کافروں کی اطاعت کرو، وہ تو تمہیں دین سے پھیر دیں گے۔ اور اللہ نہ کرے اگر تم دین سے پھر گئے تو تمہاری دنیا و آخرت برباد ہو گئی۔

مفسرین نے خاسرین کا معنی گھاٹا اور نقصان کیا ہے۔ ایک گھاٹا ہوتا مثلاً آپ نے دکان میں ایک لاکھ ڈالا، نفع نہ ہوا لیکن راس المال بچ گیا۔ اور ایک یہ ہوتا ہے کہ آپ نے ایک لاکھ ریال ڈالا، نفع تو نفع تمہارا پچاس ہزار راس المال بھی ڈوب گیا، جتنی رقم ڈالی تھی ساری ڈوب گئی۔ یہ اصل خسارہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم اسلام سے پھر گئے تو تم ڈوب گئے، دنیا و آخرت میں خاسرین میں آگئے۔ نہ دنیا میں کچھ رہا اور نہ آخرت میں کچھ رہا۔

روافض کا اعتراض:

روافض کے دلوں میں بغضِ صحابہ ہے۔ وہ ایسی آیات کو ڈھال بنا کر اعتراض کرتے ہیں کہ دیکھو! صحابہ کافروں

کے ساتھ مل رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآن اتار کران کو روکا کہ کافروں کی اطاعت نہ کرو، ورنہ مر جاؤ گے۔ اگر صحابہ کافروں کی اطاعت نہیں کرر ہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کیوں نازل فرمائی؟ اس طرح وہ لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈالتے ہیں۔

جواب:

آپ قرآن پر غور کریں! قرآن کیا کہتا ہے: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ۝﴾ اگر...... نعوذ باللہ...... صحابہ کفر کی طرف جارہے تھے تو اللہ تعالیٰ ان کو مومن کبھی نہ کہتا، بلکہ یوں آتا: ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ﴾ اے لوگو!...... لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ایمان والو! صحابہ کے ایمان کی گواہی اس آیت میں بھی اللہ دے رہے ہیں۔ باقی یہ کہا کہ اگر تم نے کافروں کی اطاعت کی تو وہ تمہیں دین سے نکال دیں گے تو تم نقصان والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ نفع تو نفع، اصل بھی ختم ہو جائے گا۔ اللہ ہی تمہارے ولی و ناصر ہیں اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والے ہیں۔ اس کے مقابلہ پر کوئی مدد نہیں کر سکتا، یہاں خطاب صحابہ کو ہے اور ہدایت آنے والے مسلمانوں کو ہے کہ خبردار! کبھی کافروں کی اطاعت نہ کرو، ورنہ یہ تمہیں دین سے نکال دیں گے۔

آج مسلمان اس دھوکہ کے اندر مبتلا ہیں کہ اگر ہم ان سے دوستی نہیں رکھیں گے تو کبھی کوئی ہماری بات نہیں سنے گا۔ حالانکہ وہ تمہاری کیا بات سنیں گے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمہارا اسلام ختم ہو جاتا ہے؛ کیونکہ تم اسلام پر تو پکے نہیں ہوتے کہ ان کو دعوت دو، بلکہ تم تو پہلے دین کا طریقہ چھوڑے ہوئے ہو۔

علماء کا دنیاوی اداروں میں آنے کا نقصان:

ہم چھوٹے تھے، اس وقت دینی مدرسہ جامعہ عباسیہ میں پڑھتے تھے۔ اس میں دینی مذہبی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ بہاولپور کی ریاست میں اور کوئی جامعہ نہیں تھا۔ اس وقت مدرسہ میں جو طلباء پڑھتے تھے انہوں نے والد صاحب سے کہا کہ الحمد للہ دورہ حدیث تک آپ کے پاس کتابیں پڑھ لی ہیں۔ اب اچھا موقع ملا ہے کہ ایک یونیورسٹی کھل گئی ہے، ہم وہاں سے علامہ کی ڈگری حاصل کر لیں؛ کیونکہ آپ کے مدرسوں میں صرف دین پڑھایا جاتا ہے، اس میں ڈگری کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر ہم نے وہاں سے علامہ کی ڈگری لے لی تو ہمارے کام آئے گی۔ والد صاحب پرانے خیالات کے لوگوں میں سے تھے، انہوں نے کہا: تم ایسا نہ کرو، تم نے الحمد للہ علم پڑھ لیا ہے،

ڈگریاں لے کر کیا کرو گے؟ تم نے علم ڈگری کے لیے پڑھا ہے؟ تم نے علم اللہ کی رضا اور دین کے لیے پڑھا ہے۔ بہر حال کچھ لوگوں نے بات مان لی اور کچھ نے نہ مانی اور انہوں نے جا کر علامہ کی ڈگریاں حاصل کر لیں۔ تو ان کو سکولوں میں نوکری کا چانس مل گیا۔ کافی سارے لوگوں نے وہاں درخواستیں دے کر نوکری لے لی۔ وہ بڑے بڑے علم والے فاضل لوگ تھے، لیکن یقین کریں! نوکری کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ چار پانچ سال کے بعد صرف لفظ مولوی رہ گیا، باقی سب کچھ بھول گئے۔ کیونکہ پرائمری سکول میں وہ کونسا دین پڑھاتا، مڈل میں کیا پڑھاتا؟ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے پوری داڑھی تھی، آدھی ہو گئی، پھر وہ چوتھا حصہ بچ گئی، پھر فرنچ کٹ بن گئی۔ قابل ترین لوگ تھے، علم کے موتی تھے، لیکن پانچ دس سال کے بعد دین سے رابطہ ختم ہو گیا۔

اسی طرح آپ دیکھ لیں! جس مولوی کے ساتھ "پروفیسر" کا لفظ لگا یا گیا، "ڈاکٹر" کا لفظ لگا یا گیا یا "سر" کا لفظ لگا یا گیا یا کوئی انگریزی خطاب اور القاب لگائے گئے اس نے ایک ایک مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے۔ آپ اس کی تحقیق کر لیں اور ساری کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں۔

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾

اس کے اندر مفسرین کرام کے اقوال ہیں کہ وہ کونسا وعدہ تھا جو اللہ نے سچ کر دکھایا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ میں اپنے نبی اور رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کی مدد کرتا ہوں اور انہیں کامیاب کرتا ہوں۔ قرآن کے اندر دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ [المومن:۵۱] تحقیق ہم مدد کرتے ہیں اپنے پیغمبروں کی اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے۔ اور فرمایا: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ [المجادلہ:۲۱] میں اپنے رسولوں کو غلبہ دیتا ہوں، کامیابی دیتا ہوں۔ اور اسی طرح فرمایا: ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران:۱۳۹] تم ہی سر بلند رہو گے اگر تم ایمان پر جمے رہے۔

اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں: ہم نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا کہ جنگ احد میں بھی جب جنگ شروع ہوئی تو کامیاب ہوئے اور جب جنگ ختم ہوئی تب بھی تم کامیاب ہوئے کہ جب ابو سفیان کی فوجیں پہنچ گئیں اور حضور اکرم ﷺ صحابہ کو لے کر میدان میں آئے تو کافروں کو ایسی شکست ہوئی کہ مسلمان ان کافروں کو اس طرح کاٹ رہے تھے جیسے کوئی فصل کاٹتا ہے۔ اس فتح کو دیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہارے اندر خواہش پیدا ہو گئی کہ ہم بھی مال

غنیمت جمع کرلیں اور تم نے میرے پاک نبی کے فرمان میں اجتہادی خطا کی کہ انہوں نے حکم دیا تھا کہ عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تم پچاس تیر انداز اس درے پر رہو اور اس درے کو کبھی نہیں چھوڑنا۔ اور ساتھ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمادیا کہ اگر ہم جیت جائیں تب بھی تم نے یہاں سے نہیں ہلنا اور اگر ہم جنگ ہار جائیں تب بھی نہیں ہلنا، بلکہ ایک روایت میں یوں بھی آیا کہ اگر جنگل کے درندے تمہاری بوٹیاں نوچ رہے ہوں تب بھی تم نے یہ درہ نہیں چھوڑنا۔ تو جب اللہ نے فتح دے دی، کافر مر گئے، بھاگنے لگے تو درہ پر مقرر صحابہ نے کہا: حضور ﷺ کے فرمان کا مقصد تاکید تھا کہ دشمن یہاں سے حملہ نہ کردے۔ اب دشمن ذلیل ہو کر بھاگ رہا ہے، اس نے ہم پر کیا حملہ کرنا ہے؟ پچاس میں سے گیارہ صحابہ وہیں جمے رہے اور باقی صحابہ درہ چھوڑ کر مالِ غنیمت کو جمع کرنے میں لگ گئے۔

شبہ اور جوابِ شبہ:

روافض یہاں سے صحابہ رضی اللہ عنہم پر طعن کرتے ہیں کہ دنیا کی محبت میں آ گئے تھے۔

یاد رکھیں! مالِ غنیمت کو جمع کرنا اسلام کے خلاف تو نہیں ہے۔ جب جہاد ہوگا تو مالِ غنیمت بھی جمع ہوگا، لیکن اللہ کو یہ مباح مسئلہ پسند نہ آیا کہ اے میرے نبی کے صحابہ! تمہارا مقام بہت بلند ہے! تم کیوں دنیا کی تھوڑی خواہش دل میں لے آئے؟ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب میں نے یہ آیت پڑھی ﴿مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ﴾ تو خدا کی قسم! کبھی میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ ان میں سے کوئی ایسا بھی ہوگا جس کے دل میں دنیا کی ذرا سی تمنا بھی ہوگی۔

اوّل بھی فتح مسلمانوں کی تھی اور آخر بھی فتح مسلمانوں کی تھی:

اوّل میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی تھی اور آخر میں بھی اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی تھی۔ جب ستر صحابہ شہید ہو گئے کفار بڑے خوش ہو گئے کہ ہم نے جنگ جیت لی ہے اور واپس جانے لگے۔ جب بدرِ صغریٰ پر پہنچے تو ابوسفیان نے اپنی فوجوں کو روکا کہ رک جاؤ! جب سب رک گئے تو اس نے کہا: ہم کیا کر رہے ہیں؟ کیا ہم مکہ سے اس لیے چڑھائی کرکے آئے تھے کہ احد میں لڑ کر واپس چلے جائیں گے؟ حالانکہ ہم نے تو مدینہ پر قبضہ کرنا تھا اور مسلمانوں کی قوت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا تھا، لہٰذا یہاں رک کر اپنی تھکان اتار لو، ہم مدینہ پر قبضہ کرلیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ﴾ اے میرے مدنی! ہم نے

کافروں کے دلوں میں پھر تمہارا رعب ڈال دیا ہے کہ سب کفار نے اکٹھے ہو کر ابوسفیان سے کہا: جو ہو گیا ہے اس کو غنیمت سمجھو۔ اب واپس مدینہ نہ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ زخمی شیر کی طرح مسلمان الٹ پڑیں اور ہمارا ایک بندہ بھی نہ بچے، لہٰذا اب ہم دوبارہ مدینہ نہیں جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے ان کو شکست دے دی اور وہ ناکام ہو کر مدینہ پر قبضہ کیے بغیر واپس لوٹ گئے۔ ابتدا میں بھی ہم نے تمہیں کامیاب کیا اور انتہاء میں بھی ہم نے تمہیں کامیاب کیا۔

بلکہ صحیح حدیث مبارکہ میں ہے کہ جب حضور ﷺ واپس تشریف لے آئے، آپ نے زرہ مبارک اتاری اور زخم مبارک دھویا، جبرائیل علیہ السلام نے آ کر عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے اپنی زرہ اتار دی ہے، آپ نے جنگی لباس اتار دیا ہے، لیکن ہم نے تو ابھی تک نہیں اتارا ہے۔ آپ اپنے صحابہ کو حکم دیں! مشرکوں کا تعاقب کریں اور آپ جلدی تیار ہو جائیں۔ تو آپ اور آپ کے صحابہ نے تیار ہو کر بدر صغریٰ تک کفار کا تعاقب کیا اور ابوسفیان کو کہا: اگر دل کی بھڑاس نکالنی ہو تو ہم پھر حاضر ہیں، لیکن ابوسفیان اپنے لشکر کو لے بھاگ گیا اور اس نے کہا کہ اچھا اگلے سال دیکھا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر ارشاد فرمایا کہ تمہاری ابتدا کے اندر بھی فتح اور انتہاء کے اندر بھی فتح ہوئی اور درمیان میں شکست۔ یہ تمہاری اپنی کوتاہی ہے کہ تم نے اس حکم کی اس طرح تعمیل نہیں کی جو منشار سول ﷺ تھا۔

مسلمانوں کی فتح کا معیار:

اس سے یہ بھی سمجھ لیں کہ مسلمان کبھی اسلحہ کے زور پر نہیں جیت سکتا، عدد، طاقت کے زور پر نہیں جیت سکتا۔ اگر وہ فرمانِ رسول پر جم جائے تو اسے کوئی دنیا شکست نہیں دے سکتی۔ اور جب فرمانِ رسول میں کوتاہی ہو گی تو وہ کبھی جیت نہیں سکتا؛ کیونکہ صحابہ کرام جیسی مقدس جماعت سے بھی اگر ذرا سی کوتاہی ہو جائے تو فتح شکست میں بدل گئی تو ہم کیسے جیت سکتے ہیں؟ جن کا قدم قدم گناہوں پر ہے اور مخالفت رسول بھی ہے۔ ہماری شکل وصورت، اعمال، اخلاق، ہماری تہذیب وتمدن اور ہمارے عقائد سب چیزوں کے اندر ہم اللہ کے باغی ہیں۔ اس کے باوجود ہم کہیں: اے اللہ! ہم تیرے باغی ہیں، لیکن مدد فرما۔ باغی کی مدد کون کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ تو ایمان والوں کی مدد کا وعدہ کر چکے ہیں۔ فرمایا: ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [الروم:۴۷] (اور ہم نے یہ ذمہ داری لی تھی کہ ایمان

والوں کی مدد کریں۔) اور فرمایا: ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران:۱۳۹] (مسلمانو!) تم نہ تو کمزور پڑو اور نہ غمگین رہو۔ اگر تم واقعی مومن رہو تو تم ہی سربلند ہو گے) اور کہیں فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ﴾ [محمد:۷] (اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا)۔

اس کے باوجود شانِ صحابہ دیکھیں کہ اللہ نے ان کو اس طرح خطاب فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا﴾ اے میرے مدنی! ان کے ایمان کا میں گواہ ہوں۔ اگر ان سے تھوڑی سی غلطی ہوگئی ہے تو آپ محسوس نہ فرمائیں۔ ان چھوٹی اجتہادی غلطیوں سے صحابہ کی شان اور عظمت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔

خطاء کا منشا دیکھا جاتا ہے:

اگر آپ اس طرح دیکھیں تو حضرت آدم علیہ السلام سے بھی خطا ہوئی تو کیا اس سے ان کی نبوت میں فرق آجائے گا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر اپنے پیغمبر بھائی کی داڑھی پکڑ رہے ہیں تو کیا اس سے ان کی نبوت میں کوئی فرق آجائے گا؟ خطا کا منشا دیکھنا پڑتا ہے کہ خطا کے پیچھے بدنیتی ہے یا خطا ہے۔ اگر خطا اجتہادی ہے تو اللہ پاک وہاں سزا نہیں دیتے، بلکہ اس میں معافی دیتے ہیں۔

اللہ کا صحابہ سے پیار دیکھو کہ فرمایا: ہم نے تو وعدہ سچا کیا، تم نے ذرا کمزوری دکھائی ہے۔ جب تم نے سنا کہ حضور اکرم ﷺ فوت ہو گئے ہیں، کیا اگر حضور اکرم ﷺ فوت ہو جائیں تو تم دین سے بھاگ جاؤ گے؟ دین تو باقی ہے، شریعت تو باقی ہے، اللہ تو زندہ ہے۔ اس سے اجتہادی غلطی میں نقصان بڑا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی! ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ﴾ میں نے ان کو معاف کر دیا ہے۔

عظمتِ صحابہ کا مقام تو دیکھو:

اس آیت کے اندر غور کریں کہ اگر غلطی ہو جائے تو پہلے غلطی والا معافی مانگتا ہے یا دوسرا پہلے معاف کرتا ہے؟ شریعت کے اندر یہ ہے کہ جس سے خطا ہو جائے توبہ کرے اور امید رکھے کہ اللہ معاف کر دیں گے۔ اب دیکھیں کہ صحابہ نے ابھی کوئی توبہ نہیں کی تھی اور اللہ نے فرما دیا کہ معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم نے تو پہلے معاف کر دیا۔ وہ تو کھرے ہیں، اگر ان سے کوئی لچک پیدا ہوگئی تو یہ ایک فطری بات تھی۔ اور فرمایا: ﴿وَلَقَدْ عَفَا

عَنۡکُمۡ ؕ﴾ سب کو معاف کر دیا اور واؤ قسمیہ کے ساتھ فرمایا کہ مجھے اپنی ذات کی قسم ہے! میں نے تیرے صحابہ کو معاف کر دیا ہے۔ جب اللہ معاف کر دیں تو تم اعتراض کرنے والے کون ہو؟

ایک شکست ومصیبت ہوتی ہے گناہ کی وجہ سے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمادیا: ہم نے صحابہ پر جو تکلیف دی ہے یہ گناہ نہیں، بلکہ امتحان ہے۔ اور اے میرے مدنی! آپ کی موت کے بعد ان کو جو منظر پیش آنا تھا ابھی پیش کر دیا، تاکہ ابھی سے یہ سنبھل جائیں؛ کیونکہ موت برحق ہے۔ اور اللہ کے ہر نبی پر موت آئی ہے۔

جنگ بدر کے قیدیوں کا معاملہ اور صحابہ کرام کا مرتبہ:

علماء نے احادیث کی روشنی میں لکھا ہے کہ جب جنگ بدر ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی، کافروں کے ستر بڑے بڑے لوگ گرفتار ہو گئے اور ستر مارے گئے اور اکثر شکست کھا کر مکہ مکرمہ کی طرف بھاگ گئے۔ جب ستر قید ہوئے تو ان کے بارے میں مسئلہ پیدا ہو گیا کہ ان کے بارے میں کیا کیا جائے!؟ حضور ﷺ نے بڑے جلیل القدر صحابہ کو بلوا کر مشورہ کیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آپ کے اور ہم لوگوں کے رشتہ دار بھی ہیں اور ان سے بہت ہو چکی ہے، ان کو بڑی ذلت آمیز شکست ہوئی ہے۔ میری رائے ہے کہ ان پر احسان فرما کر ان کو چھوڑ دیں، شاید اللہ تعالیٰ ان کے دل میں اسلام ڈال دیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور! میری ایک ہی رائے ہے۔ مہربانی فرما کر آپ تلوار لیں، آپ کے چچا زاد بھی موجود ہیں۔ میں اپنے چچاؤں کی گردن کاٹتا ہوں، آپ اپنے چچوں کی گردنیں کاٹیں اور کفر کا بیج ختم کریں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: عمر! تم واقعی سخت ہو۔ تورات میں بھی تمہاری صفت یہی بیان ہوئی ہے۔ قرآن حدید لوہے کا سنگ ہے، لیکن میں ابوبکر کی رائے پر عمل کرتا ہوں اور مطلق احسان بھی نہیں کرتا۔ یہ اپنا فدیہ ادا کریں اور رہائی لے لیں، تاکہ مسلمانوں کو مالی فائدہ بھی ہو جائے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب یہ فیصلہ ہوا تو صبح کے وقت حضور ایک درخت کے قریب بیٹھے تھے۔ میں جب حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضور رو رہے ہیں۔ میں نے سلام کر کے عرض کیا: کیا بات ہے...... اللہ آپ کو ہمیشہ مسکراتا رکھے...... آپ مجھے بتائیں، تاکہ میں بھی غم میں شریک ہو جاؤں۔ آپ نے فرمایا: عمر! اللہ کی طرف سے بڑا سخت

عذاب نازل ہوا ہے۔تم یہ جو درخت دیکھ رہے ہو گویا عذاب بالکل اس کے قریب آ گیا تھا۔اگر عذاب آ جاتا تو صرف تو بچتا یا سعد بچتا اور اس سے کوئی نہ بچ سکتا۔[تفسیر ابن کثیر، جلد:۲، صفحہ:۱۸]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ﴾[الانفال:۶۷] کیا بات ہے ہم نے دشمن قید کر کے آپ کے ہاتھوں میں دے دیئے اور آپ محبت کر کے رہائی دے رہے ہیں۔اگر میں تقدیر میں فیصلہ نہ کر چکا ہوتا کہ میں نے آپ کی ہر بات معاف کر دی ہے تو آج ہم پکڑ لیتے۔

علماء ومحدثین نے لکھا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آج آپ نے ستر کو چھوڑ دیا ہے،لیکن پھر آپ کو اپنے ستر صحابہ کو شہید کرانا ہو گا تو جب یہ فیصلے بدر میں ہو چکے تھے تو صحابہ کا کوئی قصور نہیں ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جو اللہ کے پیارے ہوتے ہیں ان سے اگر کوئی غلطی ہو جائے تو ان پر فوراً اللہ کی طرف سے تنبیہ آ جاتی ہے،تا کہ وہ داغ دھل جائے۔اور جو اللہ کے پیارے نہیں ہوتے ان سے گناہ ہوتے رہتے ہیں،اللہ تعالیٰ ان کو نہیں پکڑتے۔ایک دفعہ پکڑیں گے اور ان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے۔

(حدیث) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ احد کی لڑائی میں مسلمانوں کی نصرت ہوئی اور مشرک شکست کھا کر ہٹنے لگے تو ابلیس نے ان کو پکارا: اے بھاگنے والو! واپس آؤ، واپس آؤ۔اور ان کا اوّل آخر پھر گیا اور وہ جمع ہو گئے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہ درمیان میں آ گئے اور مسلمان بھی لڑ رہے ہیں تو انہوں نے جلدی سے پکارا: عباد اللہ! خیال کرو، یہ میرا باپ ہے،لیکن وہ مل گئے تھے اور گتھم گتھا ہو گئے تھے۔وہ یہ کہتے رہے،لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ رک نہ سکے اور ان کو تلوار لگ گئی اور وہ بھی شہید ہو گئے۔حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ تم کو معاف کرے۔(کیونکہ عمداً قتل نہیں کیا تھا) حضرت عروہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت حذیفہ کے دل میں کچھ نہ کچھ تو رہا،لیکن بہر حال خیر ہی خیر تھی، حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے خود بھی جا ملے اور فوت ہو گئے۔

[بخاری، رقم:۴۰۶۵]

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس دن میں نے دیکھا کہ ہندہ (جب وہ کافرہ تھیں) اپنی خادماؤں اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ پنڈلیاں چڑھائے ہوئے بھاگ رہی تھیں اور ان کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ کیا چھوڑ رہی ہیں؟ زیادہ چھوڑ رہی ہیں یا تھوڑا؟ یعنی ان کو بالکل شکست ہو گئی،لیکن خدا کی قدرت ہے کہ ہمارا جو تیر اندازوں کا گروہ تھا

وہ بھی لشکر کے ساتھ آ کر مل گیا اور انہوں نے درہ چھوڑ دیا اور مالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گیا تو ہماری پشت خالی ہوگئی۔ کافروں نے گھوڑوں کے دستوں کے ساتھ ہم پر حملہ کر دیا اور جو ہمیں پہنچنا تھا پہنچ گیا۔ ایک آواز لگانے والے نے آواز لگائی...... جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ سب سے پہلے تو شیطان نے آواز لگائی، اس کے بعد ابن قمیہ مشرک نے آواز لگائی...... کہ میں نے محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بھی اوندھے ہو گئے اور قوم بھی ہم پر اوندھی ہو کر الٹ پڑی، حتیٰ کہ ہمارا علم (جھنڈا) اٹھانے والے بھی شہید ہو گئے اور ہر کوئی علم کے قریب جانے سے بھی ڈر رہا تھا۔ محمد ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ جب مشرکین کو بھی شکست ہوئی اور وہ بھاگنے لگے تو عروہ بن علقمہ نے جھنڈا پکڑ کر ان کو پکارا کہ غیرت پکڑو، جھنڈے پھینک کر کہاں بھاگ رہے ہو؟ اس کی غیرت دلانے سے مشرکین کچھ رکے۔ [سیرت ابن اسحاق (ظاہریہ: ق ۱۷۰]

حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کی شجاعت:

(حدیث) حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم جو ہتھیار پھینک چکے تھے ان کے پاس گئے اور ان کو کہا تم کیوں ہتھیار پھینک کر بیٹھے ہوئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ حضور اکرم ﷺ تو شہید ہو گئے ہیں اب ہم کیا لڑیں؟ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو تم لوگ حضور اکرم ﷺ کے بعد زندہ رہ کر کیا کرو گے؟ کھڑے ہو جاؤ اور اسی دین پر مر جاؤ جس پر آپ نے وفات پائی ہے۔ پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ مشرکین کی طرف متوجہ ہوئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۲/۱۳۶]

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ جنگ بدر میں شرکت نہیں کر سکے تھے، اس لیے انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ! تیری قدرت اور تیرے فیصلے ہیں کہ سب سے پہلا غزوہ تھا، میں اس میں شریک نہ ہو سکا، لیکن اب اگر اللہ نے مجھے جہاد کا موقع دیا تو میں جہاد کر کے دکھاؤں گا۔ حتیٰ کہ جب احد کا دن آیا اور مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی، مسلمان مایوس ہو گئے تو حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے یہ دعا کی کہ اے اللہ یہ مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں میں اس کی معافی مانگتا ہوں میں نہیں بھاگتا یا اللہ مشرک جو کچھ کر رہے ہیں میں اس سے بری ہوں کہ وہ تیرے نبی ﷺ سے لڑنے کے لیے آئے ہیں۔ اور اس دعا کے بعد لڑنے کے لیے نکلے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ملے ان سے کہا: کہاں جا رہے ہو؟ مجھے تو احد کے دامن سے جنت کی خوشبوئیں آ رہی

ہیں۔ آؤ لوٹیں اور جا کر جہاد کریں۔ اس کے بعد جا کر وہ لڑے اور شہید ہو گئے۔ اس کے بعد جب ان کے بدن کو دیکھا گیا تو آپ کے بدن پر اسی (۸۰) سے زیادہ تلواروں، نیزوں اور تیروں کے زخم تھے اور بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ ان کی بہنوں نے آپ رضی اللہ عنہ کی انگلی کے پوروں سے آپ کو پہچانا۔ [بخاری، رقم: ۴۰۴۸]

ایک دشمن عثمان رضی اللہ عنہ کو جواب:

عثمان بن موہب رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حج کرنے کے لیے آیا تو اس نے دیکھا کہ حرم میں بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ یہ قریشیوں کے بڑے لوگ ہیں۔ اس نے پوچھا کہ ان کا اس وقت سب سے بڑا کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ اس نے آکر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: میں آپ کو اللہ کے گھر کی قسم دیتا ہوں! جو کچھ پوچھوں گا آپ مجھے بتائیں گے۔ آپ نے فرمایا: تم پوچھو، میں بتاؤں گا۔ (یہ پوچھنے والا رافضی تھا اور اس کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بغض تھا) اس نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) غزوہ احد سے بھاگ گئے تھے، کیا یہ بات درست ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: درست ہے۔ اس نے کہا: دوسری بات یہ ہے کہ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے اور اس سے بھی وہ بھاگ گئے تھے، کیا یہ بات بھی درست ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ بات بھی درست ہے۔ اس نے کہا: یہ بات بھی بتائیں کہ جب حدیبیہ کے مقام پر بیعت رضوان ہو رہی تھی اس میں بھی حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) غائب تھے، انہوں نے بیعت رضوان نہیں کی تھی؟ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ انہوں نے واقعی بیعت نہیں کی تھی تو وہ آدمی خوش ہو گیا اور اللہ اکبر کہا۔ (کہ دیکھو میرے سارے الزامات سچے ہو گئے اور وہ بڑا خوش ہونے لگا۔) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم نے سوال پوچھا ہے، میں نے تمہارا جواب دیا ہے۔ اب تمہاری تو ذمہ داری ہے کہ بات کو سمجھو۔ اس نے کہا کہ سمجھائیں۔ آپ نے فرمایا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غزوہ احد میں فرار کے متعلق میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ معاف کر دیا ہے۔ جب اللہ نے معاف کر دیا ہے تو تم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو؟

اور آپ نے فرمایا: جب جنگ بدر ہو رہی تھی تو کیا تمہیں پتہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بیوی کون تھیں؟

حضرت محمد ﷺ کی بیٹی تھیں، وہ بیمار تھیں تو حضور اکرم ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: تم بدر میں نہ جاؤ، جنگ کے ثواب اور غنیمت کا میں ذمہ دار ہوں۔ تم میری بیٹی کی خدمت کے لیے گھر میں رہو۔ اب تم بتاؤ کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے حکم سے غائب ہوئے تھے یا بھاگ گئے تھے؟ اس نے کہا: یہ بات بھی ٹھیک ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اور سنو! جب صلح حدیبیہ میں بیعت ہو رہی تھی اگر سارے قافلے والوں میں مکہ والوں کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے زیادہ عزت والا ہوتا تو حضور اکرم ﷺ اس کو مکہ بھیجتے۔ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا تو بیعت رضوان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکہ جانے کے بعد ہوئی تھی، تو نبی کریم ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔[1]

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس شخص کو تھپڑ مارا اور فرمایا: یہ تھپڑ لے کر نکل جاؤ۔ آج بھی لوگ اس وجہ سے اعتراض کرتے ہیں کہ ان کو حقیقت کا پتہ نہیں ہوتا۔

مشرکین کا حضور ﷺ پر حملہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا دفاع کرنا:

(واقعہ) جنگ احد میں حضور اکرم ﷺ نے بھی کوشش فرمائی کہ پہاڑ پر چڑھ کر کسی محفوظ جگہ قیام کیا جائے تو مشرکین حملہ کرنے کے لیے آ گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ان کو کون روکے گا؟ تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں روکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: نہیں تم بیٹھ جاؤ۔ ایک انصاری صحابی نے کہا: میں روکتا ہوں۔ آپ نے ان کو اجازت دی۔ اس نے مشرکین سے لڑائی کی اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ تھوڑا سا اور پہاڑ پر چڑھ گئے تو مشرکین کا وفد پھر حملہ کرنے کے لیے پہنچ گیا۔ حضور نے فرمایا: ان کو کون روکے گا؟ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں ان کو روکوں گا۔ ایک اور انصاری نے اجازت مانگی تو حضور اکرم ﷺ نے اجازت دے دی اور اس صحابی نے قتال کیا، حتیٰ کہ شہید ہو گئے۔ آپ اتنی دیر میں کچھ اور اوپر چڑھ گئے، (یعنی دشمنوں سے دور ہو گئے)۔ پھر مشرکین نے حملہ کیا۔ اس طرح کرتے کرتے صحابہ فرماتے ہیں: گیارہ صحابہ شہید ہو گئے اور صرف حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ باقی رہ گئے اور کافروں نے آ کر آپ کے ارد گرد گھیرا ڈال لیا۔ اب حضور اکرم ﷺ نے حضرت طلحہ کو فرمایا: اب تم لڑو۔ حضرت طلحہ اٹھے اور انہوں نے اتنے جذبے سے جہاد کیا کہ جتنا

[1] ...... [بخاری، رقم: ۳۰۶۶]

گیارہ صحابہ نے لڑائی لڑی تھی اتنا اکیلے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے لڑائی لڑی۔ آپ کو زخم آئے اور آپ کی انگلیاں کٹ گئیں تو انہوں نے تکلیف سے آہ کی تو حضور نے ان سے فرمایا: اگر تم اس وقت بسم اللہ کہتے اور اللہ کا نام لیتے اور اللہ کا ذکر کرتے تو اللہ کے ملائکہ تمہیں آسمانوں پر اٹھا کر لے جاتے اور لوگ دیکھ رہے ہوتے، حتیٰ کہ آپ کو آسمان میں لے جاتے۔ اس کے بعد حضور اکرم ﷺ پہاڑ پر تشریف لے گئے اور باقی صحابہ بھی وہیں جمع ہو گئے۔

[دلائل النبوۃ للبیہقی: ۳/۲۳۶]

حضرت قیس بن ابی حازم رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ دیکھا کہ وہ شل ہو چکا تھا۔

بعض روایات کے اندر یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ مل کر کافروں سے لڑتے رہے، حتیٰ کہ ان کی ڈھال ٹوٹ گئی، آپ کی تلوار بھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد کافروں نے جو تیر برسائے تو انہوں نے حضور اکرم ﷺ کو تیروں سے بچانے کے لیے تیروں کو اپنے ہاتھ پر روکا اور اس وجہ سے ہاتھ پر اتنے زخم لگے کہ ہاتھ شل ہو گیا۔

فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي:

حضرت سعید ابن المسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے سنا کہ حضور اکرم ﷺ نے تیروں والی تھیلی میرے سامنے الٹ دی اور فرمایا: سعد! تیر چلاؤ میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہو جائیں۔

[بخاری، رقم: ۴۰۵۵]

یعنی حضور اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کا مقام اتنا بلند فرمایا کہ ساری دنیا تو حضور اکرم ﷺ پر قربان ہو جائیں، لیکن حضور اکرم ﷺ نے صحابی سے فرمایا: میرے ماں بات تجھ پر فدا ہو جائیں۔ ''فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي'' یہ عربی محاورہ ہے کہ جب کسی کو بہت زیادہ عزت دینی ہو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر دشمن تجھے قید کر لیں تو میں اپنے ماں باپ کو تیرے فدیہ میں دے کر تجھے چھڑا لوں گا۔ حضور اکرم ﷺ نے یہ الفاظ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو فرمائے تھے۔

اور اسی طرح حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے بھی حضور اکرم ﷺ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے جب وہ دشمنوں کے احوال لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں آئے تھے۔

جبرئیل اور میکائیل حضور ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے:

حضرت ابراہیم بن سعد اپنے ابا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے احد والے دن دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ کے دائیں اور بائیں دو جوان ہیں ان کا سفید لباس ہے جو حضور ﷺ کی حفاظت کر رہے ہیں وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہ السلام تھے لیکن وہ انسانی شکل میں تھے۔[بخاری، رقم: ۴۰۵۴]

حضور ﷺ کے دشمن ابی بن خلف کا انجام بد:

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ابی بن خلف نے مکہ میں قسم کھائی تھی کہ میں حضور پاک ﷺ کو ضرور شہید کروں گا۔ جب حضور ﷺ کو اس کا پتہ چلا کہ فلاں کافر نے آپ کے قتل کی قسم کھائی ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا: بلکہ ان شاء اللہ میں اس کو قتل کروں گا۔

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے ابی بن خلف کو دیکھا کہ وہ اس حال میں آیا کہ سر سے لے کر پاؤں تک لوہے کے خول چڑھائے ہوئے تھا، زرہ پہنی ہوئی تھی اور اس نے آکر حضور ﷺ پر حملہ کیا تو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ آپ کا دفاع کرنے کے لیے آگے بڑھے، حتیٰ کہ وہ شہید ہو گئے۔ حضور پاک ﷺ نے دیکھا کہ ابی بن خلف کی گردن کا تھوڑا سا حصہ نظر آرہا ہے، آپ نے وہیں اس کو اپنے نیزے سے زخم لگایا۔ وہ گھوڑے سے گرا اور زمین پر آگیا۔

صحابہ کہتے ہیں کہ عجیب بات ہے! جہاں حضور اکرم ﷺ نے نیزہ مارا تھا وہ اتنا گہرا بھی نہیں تھا، وہاں سے خون بھی نہیں نکلا تھا، یعنی معمولی سی خراش تھی، لیکن وہ ایسے چیخ رہا تھا جیسے بیل چیختا ہے۔ تو اس کے ساتھیوں نے اس کو اٹھایا اور کہا: تمہیں تو معمولی سی خراش ہے اور تم خواہ مخواہ واویلا کر رہے ہو۔ اس نے کہا: مجھے جو تکلیف ہو رہی ہے اتنا گہرا زخم اگر تمام حجاز والوں کو لگ جاتا تو وہ سب مر جاتے۔ تمہیں پتہ ہے نبی (علیہ السلام) نے کہا تھا میں ابی کو قتل کروں گا، میرے ہاتھوں مرے گا، اب میں نہیں بچتا۔ تو اللہ نے آپ کے اس فرمان کو سچا کر دکھایا کہ وہ آپ کے ہاتھوں سے مارا گیا اور جہنم میں گیا۔

واقدی نے روایت نقل کی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رابغ وادی کے قریب آکر ابی ابن خلف مرا۔ رات کا کچھ حصہ گزرنے کے بعد رابغ سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ آگ جل رہی ہے۔ میں ڈر گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ

اسی آگ میں ایک آدمی کے پاؤں زنجیر میں ہیں، پیاس کی شدت سے مارا ہوا ہے اور کوئی آدمی دور سے آواز دے رہا تھا: اس کو پانی نہ دینا، یہ نبی ﷺ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ یہ ابی ابن خلف ہے۔[ابن کثیر:۲/۱۴۱]

یاد رکھیں! جو آدمی نبی ﷺ کا دشمن ہو، نبی ﷺ کا قاتل ہو یا نبی ﷺ کے ہاتھوں قتل ہوا ہو اس کو سب سے زیادہ شدید عذاب ہوتا ہے کہ وہ اتنا بڑا بدبخت تھا۔ اللہ کے نبی تو سراپا رحمت ہوتے ہیں، لیکن رحمت للعالمین نے بھی اس بدبخت کو مارا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا جرم اتنا بڑھ گیا ہے۔

جنگ احد میں حضور ﷺ کا زخمی ہونا:

صحیحین کے اندر حدیث موجود ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلَى قَوْمٍ فَعَلُوْا بِنَبِيِّهِ، يُشِيْرُ إِلَى رَبَاعِيَتِهِ، اشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلَى رَجُلٍ يَقْتُلُهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ)) [بخاری، رقم: ۴۰۷۳]

اللہ تعالیٰ کا سخت عذاب ہو ان لوگوں پر جنہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کا دانت مبارک شہید کیا اور اللہ تعالیٰ کا شدید غضب ہے اس پر جو اللہ کے نبی کے ہاتھوں قتل ہو جائے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں عتبہ بن ابی وقاص سے زیادہ کسی کے قتل کا حریص نہیں ہوا؛ کیونکہ یہ بداخلاق اور اپنی قوم میں (نبی کریم ﷺ سے) بغض رکھنے والا تھا۔ لیکن اس کے بارے میں مجھے حضور اکرم ﷺ کا یہ قول کافی ہو گیا کہ اللہ کا غضب اس شخص پر سخت ہے جس نے رسول اللہ کا چہرہ انور زخمی کیا۔ (آپ ﷺ کا چہرہ عتبہ نے زخمی کیا تھا۔)[سیرت ابن اسحاق:۱۷۲]

واقدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے رخساروں کو تیر ابن قمیہ نے مارا تھا۔ اور آپ کے ہونٹ زخمی کر کے دانت مبارک عتبہ بن ابی وقاص نے شہید کیا تھا۔

[المغازی للواقدی:۱/۲۴۴]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے جب احد کا تذکرہ آتا تھا تو ہمیشہ کہتے تھے کہ احد کا پورا ثواب تو طلحہ رضی اللہ عنہ لے گئے۔ اس کے بعد وہ احد کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ جب کافروں کا زور بڑھا اور ہم پیچھے ہٹ گئے تو سب سے پہلے لوٹنے والوں میں میں تھا۔ حضور اکرم ﷺ کی طرف آیا اور دیکھا کہ ایک

آدمی حضور پاک ﷺ کے دفاع میں لڑ رہا ہے تو میں نے دل میں دعا کی کہ اللہ کرے یہ طلحہ ہو؛ کیونکہ میں نہ سہی، چلو میری قوم کا کوئی بندہ ہو۔ اس کے بعد میں آیا اور میں حضور ﷺ کے زیادہ قریب تھا تو میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا تو وہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تھے۔ ہم حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو حضور ﷺ کا دانت مبارک شہید ہو چکا تھا اور آپ کے چہرہ مبارک پر زخم آ گیا تھا، خود کے حلقے ٹوٹ کر اندر گھس گئے تو آپ کو بہت تکلیف تھی۔ جب ہم قریب گئے تو آپ نے فرمایا: طلحہ کی خبر لو کہ اس کا کیا حال ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم حضور ﷺ کی یہ حالت دیکھ کر حضرت طلحہ کی طرف نہ جا سکے۔ میں آگے بڑھا، تاکہ ان کڑیوں کو نکالوں تو حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے مجھے قسم دی کہ تجھے قسم ہے! آگے نہ بڑھنا، یہ مجھے کرنے دو۔ میں رک گیا تو حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے بجائے ہاتھ ڈالنے کے انہیں خیال ہوا کہ اس طرح حضور ﷺ کو تکلیف زیادہ ہوگی تو انہوں نے اپنے منہ سے ان کڑیوں کو اچھی طرح پکڑ کر کھینچا تو وہ کڑیاں نکل آئیں اور اس کے ساتھ حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی داڑھ بھی نکل آئی۔ اور دوسری مرتبہ بھی اسی طرح ہوا۔

اس کے بعد جب ہم نے وقتی طور پر آپ کا علاج معالجہ کیا تو اب ہمیں خیال آیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: تھا: طلحہ کا خیال کرو۔ ہم طلحہ کی طرف دوڑے اور دیکھا کہ ایک گڑھے میں گرے ہوئے ہیں اور ستر یا کم و بیش ان کو زخم لگ چکے ہیں۔ ان میں نیزوں، تلواروں اور تیروں کے زخم تھے۔ ان کی انگلی بھی کٹی ہوئی تھی، ہم نے اس کو جوڑا اور بنایا۔ [مسند الطیالسی: ۴]

حضور ﷺ کے زخموں کی مرہم پٹی:

ابن وہب رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ عمر بن السائب حدیث بیان کرتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ جب جنگ احد والے دن آپ ﷺ زخمی ہو گئے تو ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے والد مالک رضی اللہ عنہ نے آ کر حضور ﷺ کے اس زخم سے خون چوسنا شروع کر دیا، تاکہ خون صاف ہو جائے، حتیٰ کہ اتنا خون چوستے گئے کہ وہ جگہ سفید ہو گئی۔ صحابہ نے ان سے کہا: جو تم خون چوس رہے ہو اس کو باہر تھوک دو۔ انہوں نے کہا: یہ کبھی نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ یہ اللہ کے نبی کا خون ہے، میں اس کو نہیں تھوکتا۔ اور اس کے بعد انہوں نے اٹھ کر قتال کرنا شروع کیا تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اپنی آنکھوں سے جنتی شخص کو دنیا میں چلتے ہوئے دیکھنا ہو تو ان کو دیکھو۔ پھر وہ

شہید ہو گئے۔ (یاد رکھیں! یہ بشارات خاص ہیں)۔[دلائل النبوۃ للبیہقی: ۳/۲۶۶]

ایک روایت میں آتا ہے کہ جب آپ زخمی ہو گئے تو حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا آپ کے زخم کو پانی سے دھو رہی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پانی ڈال رہے تھے۔ پانی ڈھال میں تھا۔ اور یہ بھی آتا ہے: جب سیدہ نے دیکھا کہ پانی سے خون اور زیادہ ہو رہا ہے تو انہوں نے چٹائی کا ٹکڑا جلایا اور اس کی راکھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم پر لگائی تو خون بند ہو گیا۔[بخاری، رقم: ۲۹۱۱]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان دونوں روایات کو جمع کیا کہ زخم کے حالات ہوتے ہیں۔ ایک وقت وہ تھا جب بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا موجود نہیں تھیں تو اس وقت صحابی نے یہ کیا۔ اور جب پھر زخم سے خون جاری ہو گیا تو بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی پہنچ گئیں۔

بعض لوگ ان روایات سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ عورتیں میدان جنگ میں جا سکتی ہیں اور مرہم پٹی کر سکتی ہیں، نرسنگ کا کام کر سکتی ہیں۔ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا جیسی پاک بی بی بھی احد کے میدان میں تشریف لے گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زخموں کو دھویا۔

یاد رکھیں! محدثین کرام یہ جواب دیتے ہیں کہ اسلام عورت پر پابندی نہیں لگاتا، اسلام نے عورت کو قیدی نہیں بنایا، اسلام نے تو عورت کو عزت دی ہے کہ مردوں کے حقوق ہیں تو عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ اسلام نے مردوں کو حکم دیا کہ اس کے چہرے پر نظر نہ ڈالیں۔ پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے تو اپنے والد گرامی کی ہی پٹی کی تھی، جس پر کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔

اور یاد رکھیں! حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جب علاج معالجہ کی سہولت نہیں تھی اور دشمن تین ہزار تھے اور صحابہ صرف سات سو تھے۔ پھر جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو جائیں تو کیا بی بی گھر میں بیٹھ سکتی تھیں؟ اس لیے آدمی کو سارا پس منظر سامنے رکھ کر سوچنا چاہیے۔ اور یہ بھی دیکھو کہ یہ اکیلی نہیں گئیں، بلکہ خاوند حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ساتھ کھڑے ہیں۔ آج بھی جب عورت خاوند کے ساتھ حج وعمرہ کرنے کے لیے آئے تو آ سکتی ہے۔ اسلام تو عورت کو اوپن ایئر تھیٹر بننے سے منع کرتا ہے کہ وہ عریاں ہو کر پھرتی رہے اور لوگوں کی نظریں اس پر اور اس کی نظریں لوگوں پر پڑیں اور یہ زنا اور فتنے کا سبب بنے۔ اس سے اسلام منع کرتا ہے۔

﴿ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ يُخْفُونَ فِي أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝﴾ [آل عمران: ۱۵۴، ۱۵۵]

''پھر اس غم کے بعد اللہ نے تم پر طمانیت نازل کی، ایک اونگھ جو تم میں سے کچھ لوگوں پر چھا رہی تھی۔ اور ایک گروہ وہ تھا جسے اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی، وہ لوگ اللہ کے بارے میں ناحق ایسے گمان کر رہے تھے جو جہالت کے خیالات تھے، وہ کہہ رہے تھے: کیا ہمیں بھی کوئی اختیار حاصل ہے؟ کہہ دو: اختیار تو تمام تر اللہ کا ہے۔ یہ لوگ اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپاتے ہیں جو آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔ کہہ دو: اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی جن کا قتل ہونا مقدر میں لکھا جا چکا تھا وہ خود باہر نکل کر اپنی اپنی قتل گاہوں تک پہنچ جاتے۔ اور یہ سب اس لیے ہوا، تاکہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اللہ اسے آزمائے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کا میل کچیل دور کر دے۔ اللہ دلوں کے بھید کو خوب جانتا ہے۔ تم میں سے جن لوگوں نے اس دن پیٹھ پھیری جب دونوں لشکر ایک دوسرے سے ٹکرائے، درحقیقت ان کے بعض اعمال کے نتیجے میں شیطان نے ان کو لغزش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور یقین رکھو کہ اللہ نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ یقیناً اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا بردبار ہے۔''

جنگ میں فتح کے اسباب:

پورے عالم میں اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام رکھا ہے کہ مسلمانوں کو فتح بھی ہوسکتی ہے اور شکست بھی ہوسکتی ہے۔ اور اس جنگ سے یہ سبق بھی ملا کہ گو اسباب ظاہرہ کا استعمال کرنا بھی ضروری ہے، لیکن مسلمانوں کو فتح اللہ کے حکم اور فرمانبرداری میں مل سکتی ہے، اس کے بغیر مسلمانوں کو فتح نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم صحیح

معنی میں مسلمان بن جاؤ اور صحیح معنی میں میری فرمانبرداری اور میرے پاک مدنی کی فرمانبرداری پر قائم دائم ہو جاؤ تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں شکست نہیں دے سکتی۔

اور تیسرا سبق یہ ملا کہ جس وقت آدمی اطاعت میں ہو اس وقت اللہ کی مدد آتی ہے، چاہے وہ نبی کی اطاعت میں ہو یا امیر کی اطاعت میں ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں، جن کا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے:

❀......سب سے پہلی چیز جماعت ہے کہ مسلمان کو ایک جماعت کی شکل میں رہنا چاہیے۔

❀......دوسری بات یہ ہے کہ اپنے امیر کا حکم سنے۔

❀......تیسری بات یہ ہے کہ اطاعت کرے، یہ نہیں کہ سنے اور کان سے نکال دے، بلکہ سنے اور فرمانبرداری کرے۔

❀......چوتھی بات ہجرت کرنا۔

❀......اور پانچویں بات اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔

یہ پانچ چیزیں ہیں، ان کے بغیر تمہارا دین کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔

آج ایمان سے دیکھ لیں کہ ان پانچ چیزوں پر کوئی توجہ ہی نہیں ہے، حتیٰ کہ دوسری حدیث پاک میں حضور اکرم ﷺ نے اتنا بھی ارشاد فرما دیا کہ ((فَإِنَّ يَدَ اللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ)) [سنن نسائی، رقم: ۴۰۲۰] اللہ کا ہاتھ تو جماعت پر ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو ایک ایسے اتحاد میں پرو دیا جائے کہ تمام کلمہ پڑھنے والے ایک جماعت بن کر رہیں۔ اور فرمایا: ((فَإِنَّهُ مَنْ شَذَّ شَذَّ فِي النَّارِ)) [مستدرک حاکم، رقم: ۳۹۱] جو شخص جماعت سے علیحدہ ہو گیا اس کا انجام جہنم ہے۔

دنیا کے اندر ہمیں پانچ مرتبہ ایک امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کا حکم دیا گیا کہ اگر تم مسلمان ہو تو تم پر یہ فرض ہے، جیسا کہ اگر تم سفر کرو تو تم میں جو عالم ہو پڑھا لکھا ہو، شریف ہو اور زیادہ سمجھدار ہو، اس کو اپنا امیر بناؤ، یعنی اگر سفر کر رہے ہو تو بغیر امیر کے نہ چلو؛ کیونکہ جماعت بغیر امیر کے قائم نہیں ہو سکتی، حتیٰ کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تم دو آدمی ہو تو پھر بھی جمات کرو کہ ایک امام بن جائے اور دوسرا اس کا مقتدی بن جائے۔

امیر کی اطاعت کا اتنا بڑا حکم ہے۔ اللہ کی رحمت سے تبلیغی بھائی اس حدیث مبارکہ پر عمل کرتے ہیں اور شکر ہے کہ دنیا کے اندر کوئی تو ایسی جماعت موجود ہے جو اس حدیث رسول پر عمل کر رہی ہے۔

امیر بنانے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو نبی بنا کر بھیجا تو وہ سب کے امیر بھی ہیں، سب کے امام بھی ہیں، سب کے لیے نبی اور رسول بھی ہیں، ان کی زندگی میں کوئی آگے نہیں آ سکتا۔ اور دوسرا طریقہ

یہ ہے کہ جیسے حضور ﷺ کے بعد مومنوں نے اکٹھے ہو کر حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو چن لیا۔

منافقین کی بدگمانی اور صحابہ رضی اللہ عنہم پر اللہ تعالیٰ کا انعام:

جب مسلمانوں کو جنگ احد کے اندر مصائب اٹھانا پڑے تو فرمایا: ﴿ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِنْكُمْ﴾ اس غم اور مصیبت کے بعد اے میرے مدنی! میں نے تیرے صحابہ پر ایک سکینت، ایک اطمینان نازل کیا۔ اس کی شکل یہ تھی کہ ان کے اندر اونگھ مسلط کر دی۔

غور کریں کہ اللہ فرما رہے ہیں کہ ان کی غلطی کے بعد ہم ان پر اپنی رحمت نازل کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے مخلصین پر نیند مسلط کر دی اور جو منافقین ساتھ رہ گئے تھے، وہ اپنے دلوں میں وہی جاہلیت کے پرانے گمان کر رہے تھے، غلط غلط گمان اللہ پر لگا رہے تھے اور کہہ رہے تھے: کیا ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے؟ پتہ نہیں اب ہم واپس بھی جائیں گے یا نہیں جائیں گے؟ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا﴾ [الفتح: ۱۲] جب میرے مدنی پاک چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ تشریف لے جا رہے تھے تو منافق کہنے لگے: یہ کبھی واپس نہیں آئیں گے! کیونکہ ان کو احد میں شکست ہو گئی اور اب یہ خود مکہ میں جا رہے ہیں تو ایک بچہ بھی واپس نہیں آئے گا، مکہ والے ان کو نہیں چھوڑیں گے، وہ سب کو قتل کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اس وقت بھی برے برے گمان کر رہے تھے اور آج بھی منافق برے گمان کر رہے ہیں، لیکن جو مخلص صحابہ تھے اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کر دی۔

یاد رکھیں! نیند کبھی پریشانی میں نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ پر ایسی نیند طاری فرما دی کہ صحابہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاتھوں سے تلواریں گر گئیں۔ اس نیند آنے کی وجہ سے جو تکان، تھکاوٹ اور بدن چور چور ہو چکے تھے، نیند کے جھٹکے کی وجہ سے یہ بدن تر و تازہ ہو گئے۔ دوسرا صحابہ پر حضور ﷺ کے زخموں کا غم تھا، صحابہ کی شہادت کا غم تھا۔ جب نیند آئی تو اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ غم بھی بھلا دیا۔ اور دوسرا اس کے اندر صحابہ کے لیے حکمت جاری کر دی کہ جیسے نیند سے بیدار ہو کر آدمی اپنے کام کے لیے تیار ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا مدنی! ہم نے آپ کے صحابہ کو تھوڑا سا سلا دیا تھا، تاکہ بیدار ہو کر دشمنوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے مدنی! ان منافقوں سے کہہ دیں: ﴿قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ﴾ کہ تم کہتے ہو:

ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے...... اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں...... یہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بظاہر تو یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، سب کچھ تقدیر کے ہاتھ میں ہے، ان کی بات تو واقعی سچی ہے، لیکن ان کا یہ مقصد نہیں ہے، بلکہ ان کے دلوں میں جو کچھ ہے وہ آپ پر ظاہر نہیں کررہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر ہماری رائے مانی جاتی تو ہم مدینہ سے نہ نکلتے اور مدینہ کے اندر دشمنوں سے لڑتے تو ہم اس جگہ قتل نہ ہوتے۔

اے میرے مدنی! آپ ان کو فرمادیں: ﴿قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۞﴾ کہ تم کہتے ہو: اگر ہم اپنے گھروں میں ہوتے تو ہم نہ مرتے، آپ ان سے فرمادیں: اللہ پاک ان پر ایسے حالات پیدا کرتے کہ جن کو یہاں مرنا تھا وہ ضرور نکلتے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے درباری کی موت اور موت کا فرشتہ:

ایک روایت میں آتا ہے کہ ملک الموت فرماتے ہیں: میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی مجلس میں تھا۔ وہاں ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی موت وہاں سے ہزاروں میل دور لکھی تھی اور اس کا وقت بھی تھوڑا رہ گیا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اس نے فلاں جگہ مرنا ہے۔ میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ وہ بندہ کھڑا ہوگیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا: میری ایک درخواست ہے کہ میں نے اپنے گھر میں آج ایک بڑے اہم اور ضروری کام کے لیے جانا ہے۔ اگر میں آج نہ پہنچا تو بڑا نقصان ہوجائے گا۔ مہربانی فرماکر اپنی خاص سواری کسی جن کو حکم دیں مجھے اڑا کر لے جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک سرکش جن کو حکم دیا کہ اس کو ابھی اڑا کر پہنچادو۔ حضرت ملک الموت فرماتے ہیں: وہ جن اس کو کندھے پر اٹھا کر لے جارہا تھا اور میں مسکرا رہا تھا کہ کیسے اپنی موت کی طرف اڑ کر جارہا ہے!!!

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ﴾ [النساء: ۷۸] تم جہاں بھی چھپ جاؤ، چاہے تم بڑے قلعے بھی بنوالو اور ان کے دروازے بھی بند کرلو، پھر بھی موت اپنے وقت پر پہنچے گی، اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ جب ملائکہ کو انسان زندگی کی حالت میں نہیں دیکھ سکتا، مثلاً: کراماً کاتبین ہر بندے کے ساتھ ہیں تو موت کے فرشتہ کو بھی کوئی نہیں روک سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ

صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ یہ جنگیں، یہ امتحان اور یہ تکالیف اس لیے آتی ہیں کہ ان کے ذریعہ سے تمہارا امتحان کر کے ظاہر کرتے ہیں، جو تمہارے دلوں میں ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ اور اس سے یہ نہ سمجھنا کہ جو دل کے اندر چھپا ہوا ہے اس کو نہیں جانتے، بلکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور اس امتحان کے ذریعے لوگوں پر ظاہر کر دیا کہ کون مخلص ہے اور کون منافق ہے؟

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ احد کے دن بعض مخلصوں کے پاؤں بھی ہٹ گئے تھے کہ اب حضور پاک ﷺ شہید ہو گئے تو لڑنے کا کیا فائدہ ہے!؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ان سے غلطی اس لیے ہوئی کہ شیطان نے ان کو پھسلایا، بہکایا بوجہ ان کی غلطی کرنے کے۔ اگر وہ غلطی نہ کرتے تو شیطان کو موقع نہ ملتا، لیکن جب بندہ غلطی کرتا ہے تو اس پر شیطان بھی سوار ہو جاتا ہے۔ اس لیے فرمایا: اگر آدمی غلطی نہ کرے اور عبادت و ذکر میں مصروف رہے تو شیطان اس کے قریب نہیں آتا، لیکن جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ شیطان کو اپنے قریب آنے کا خود موقع دیتا ہے۔

﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ میرے نبی مجھے اپنی عزت کی قسم ہے! میں نے تیرے صحابہ کی غلطی بھی معاف کر دی ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو خدا نے معاف کر دیا تو دوسرے بھی معاف کر دیں:

یاد رکھیں! پورے قرآن میں یہ قاعدہ ہے کہ جو حکم زیادہ اہم ہو اللہ تعالیٰ اس کو دو دفعہ ذکر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو معاف کرنے کا اعلان دو دفعہ فرمایا کہ ہم نے ان کو معاف کر دیا ہے۔ تو جب ہم نے معاف کر دیا ہے تو اے میرے مدنی! آپ بھی ان پر کوئی اعتراض نہ کریں، کوئی گلہ، کوئی شکوہ نہ کریں۔ تو جب اللہ اپنے نبی کو بھی اجازت نہیں دے رہے کہ صحابہ کی غلطی کے بعد کوئی ان پر ناراضگی کا اظہار کریں تو آج کسی بندے کو کیا حق ہے کہ وہ صحابہ کے خلاف دل میں بغض رکھے!!؟

یہ اونگھ اللہ کی طرف سے رحمت تھی:

امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً روایت ذکر کی ہے کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں بھی ان لوگوں میں ہوں جن کو احد کے دن نیند نے پکڑا تھا، حتیٰ کہ وہ ایسی سخت اونگھ تھی کہ میرے ہاتھ سے تلوار کئی دفعہ چھوٹ کر گر پڑی۔ میں

اس کو اٹھاتا، پھر اونگھ آتی اور وہ پھر گر جاتی۔ یہ اونگھ اللہ کی طرف سے ایک رحمت تھی۔ [بخاری، رقم:۴۰۶۸]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق چند سوالات اور ان کے جوابات:

﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۔﴾

مسند احمد میں روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ولید بن عقبہ سے ملے۔ ولید نے کہا: پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مخالف ہو۔ اس نے کہا: حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ احد والے دن بھاگ گئے تھے، دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بدر میں بھی حاضر نہیں ہوئے اور تیسری بات یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا جو رہنے، کھانے پینے کا طریقہ تھا وہ بدل دیا اور ان کے طریقے پر بھی نہیں چلے، اس لیے مجھے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ناراضگی ہے۔ ولید نے حضرت عثمان غنی کو آ کر خبر دی کہ آپ پر یہ اعتراضات ہیں۔ (بعض جگہ یہ بھی الزام ہے کہ بیعت رضوان میں بھی آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت نہیں کی ہے۔ یہ الزامات اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف سے ان کے جوابات آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو جب یہ بات پہنچی تو آپ نے فرمایا: میرا بھی ان کو سلام کہنا اور ان کو کہنا: جو تم کہتے ہو کہ میں احد میں بھاگ گیا تھا تو احد میں بھاگنے والوں میں میں اکیلا تو نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے اور تم نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔ ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۔﴾

دوسری بات کہ میں بدر میں حاضر نہیں ہوا؛ کیونکہ میری بیوی حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار تھیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ عثمان! تم بدر نہ جاؤ، تم اپنی بیوی کا علاج کرو۔ بدر کا جو غنیمت کا حصہ ہو گا وہ بھی تمہیں دوں گا، گویا تم بدر میں شریک ہو۔ تو میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کی وجہ سے رک گیا۔ وہ فوت ہو گئیں اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ مجھے غزوۂ بدر کا حصہ دیا۔ وہاں تو میری حاضری ہو گئی۔ تیسری بات بیعت رضوان میں نے نہیں کی، حالانکہ وہ بیعت رضوان ہوئی ہی میرے لیے تھی اور اس کے باوجود بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تھا: یہ میرا ہاتھ ہے اور یہ میرے عثمان کا ہاتھ ہے۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر نہیں چل رہا، یاد رکھو! عمر رضی اللہ عنہ کے راستے پر چلنے میں نہ میری طاقت ہے اور نہ تمہاری طاقت ہے۔ وہ ان کا کام تھا کر گئے، اب حالات بدل چکے ہیں۔ اس طرح تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی روتے تھے کہ ابوبکر جو تم کر گئے ہو وہ ہم نہیں

کر سکتے۔ان کو جا کر یہ بات بیان کر دو۔[مسند احمد:۱/۶۸]

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَكُونُوا۟ كَٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَقَالُوا۟ لِإِخْوَٰنِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ أَوْ كَانُوا۟ غُزًّى لَّوْ كَانُوا۟ عِندَنَا مَا مَاتُوا۟ وَمَا قُتِلُوا۟ لِيَجْعَلَ ٱللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِى قُلُوبِهِمْ ۗ وَٱللَّهُ يُحْىِۦ وَيُمِيتُ ۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝ وَلَئِن مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى ٱللَّهِ تُحْشَرُونَ ۝﴾ [آل عمران:۱۵۶تا۱۵۸]

’’اے ایمان والو!ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ہے۔اور جب ان کے بھائی کسی سرزمین میں سفر کرتے ہیں یا جنگ میں شامل ہوتے ہیں تو یہ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔(ان کی اس بات کا) نتیجہ تو (صرف) یہ ہے کہ اللہ ایسی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت کا سبب بنا دیتا ہے،(ورنہ) زندگی اور موت تو اللہ دیتا ہے۔اور جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔اور اگر تم اللہ کے راستے میں قتل ہو جاؤ یا مر جاؤ،تب بھی اللہ کی طرف سے ملنے والی مغفرت اور رحمت ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں۔اور اگر تم مر جاؤ یا قتل ہو جاؤ تو اللہ ہی کے پاس تو لے جا کر اکٹھے کیے جاؤ گے۔‘‘

خلاصۃ التفسیر:

ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک حکم دیا ہے۔حضور پاک ﷺ جب جنگ احد کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو منافقوں کی ایک جماعت تو راستے سے واپس مڑ گئی۔انہوں نے یہ کہا کہ اگر یہ ہمارے پاس ہوتے اور سفر پر نہ جاتے،جہاد پر نہ جاتے تو نہ ان پر موت آتی اور نہ قتل ہوتے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:ان کا کہنا ہم ان کے لیے غم بنا رہے ہیں،تاکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ان کے دلوں کا روگ بنا دے۔حالانکہ جلانے والے بھی اللہ ہیں اور مارنے والے بھی اللہ ہیں اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو سب کچھ اللہ دیکھنے والے ہیں۔اگر تم اللہ کے راستے میں شہید ہو جاؤ یا اللہ کے راستے میں فوت ہو جاؤ تو اللہ کی بخشش اور اللہ کی رحمت زیادہ بہتر ہے اس چیز سے جو تم جمع کر رہے

ہو۔ اگر تم مرجاؤ یا قتل ہو جاؤ اللہ کی طرف تم نے جانا ہے۔

کافروں کی مشابہت اختیار نہ کرو:

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: ﴿لَا تَكُوْنُوْا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ بلکہ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ تم کافروں کی تشابہ اختیار نہ کرو۔ کاف تشبیہ کے لیے ہے تو وہاں مشبہ بہ میں وجہِ تشبیہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ فرمایا: کافروں کی تشابہ اختیار نہ کرو، یعنی تمہارا عمل، تمہارا عقیدہ، تمہارا قول، تمہارا فعل، تمہارا اٹھنا، تمہارا بیٹھنا اور تمہارا لباس ہر چیز کے اندر کبھی کافروں کی شباہت اختیار نہ کرنا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) [سنن ابی داود، رقم: ۴۰۳۱]

جو آدمی جس قوم کی شکل اختیار کرتا ہے قیامت والے دن اس کو ان کے ساتھ کھڑا کیا جائے گا۔ اگر کسی نے یہودیوں کا یا نصرانیوں کا یا مشرکوں یا ہندوؤں کا تشبہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: چونکہ یہ ان کو محبوب رکھتا تھا، اس لیے اس نے ان جیسا لباس پہنا، ان جیسی شکل بنائی اور ان جیسی عادات اپنائیں تو گویا وہ اس قوم سے ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر آج آپ کے ملک میں کوئی فوجی دشمن ملک کی وردی پہن کر کھڑا ہو جائے اور اس کو آپ کے ملک کا کوئی آدمی گولی مار دے تو اس مارنے والے پر کوئی سزا نہیں ہوگی؛ کیونکہ اس نے دشمن کی وردی پہن کر اپنی شکل دشمنوں جیسی بنالی اور وہ دشمنوں سے مل گیا۔ یا مثلاً: آپ کے ملک میں کوئی بڑا اچھا اور پڑھا لکھا افسر ہو، لیکن وہ اپنے دفتر میں دشمن ملک کا جھنڈا لگا دے تو کیا تم اس کو معاف کر دو گے؟ اور جب اس کو پکڑ کر پوچھا جائے کہ یہ تم نے کیا کیا ہے؟ وہ کہے: میں نے تو بڑی نیک نیتی سے کام کیا ہے، میرا کوئی مقصد نہیں تھا، میں تو اپنے ملک کا بڑا خیر خواہ ہوں۔ اگر میں نے ایک کپڑے کا ٹکڑا لگا دیا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تو کیا دنیا کا کوئی آدمی اس کو معاف کر سکتا ہے؟

اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جو میرے نام کا کلمہ پڑھ کر اور محمد مدنی ﷺ کا غلام بن کر کافروں کے لباس پہنے تو کیا میں اس کو اپنا سمجھوں گا؟ تم زبانوں پر نام تو محمد رسول اللہ ﷺ کا لو، لیکن تمہاری عادات، تمہارے اطوار، تمہارا اٹھنا بیٹھنا، تمہارے گھروں کی تہذیب، تمہاری تجارت، تمہاری بینکنگ، تمہاری اقتصادیات، تمہاری پارلیمنٹ، تمہارے قوانین اور تمہارے دستور سب کافروں والے ہوں تو میں تمہیں اپنا کیسے سمجھ سکتا ہوں؟ آپ

سچے دل سے سوچیں کہ آدمی اپنے محبوب کی شکل بناتا ہے یا دشمن کی شکل بناتا ہے؟ کیا آج ہماری شکلیں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتی ہیں؟

﴿وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ﴾

''اخوان'' سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء فرماتے ہیں: منافقین کی آپس میں رشتہ داری بھی تھی۔ اور بعض علماء نے فرمایا: یہ اخوت عقیدے کے اعتبار سے تھی، وہ بھی منافق تھے اور یہ بھی منافق تھے۔ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف تھے اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف تھے۔

یاد رکھیں! یہ بھی کفر کا کلمہ ہے کہ کہا جائے: لگتا ہے کہ سفر پر نہ جاتے تو تمہارا ایکسیڈنٹ نہ ہوتا، تمہیں یہ موت نہ آتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ کافروں کی بات ہے۔ سفر پر نہ جاؤ، وہاں نہ جاؤ۔ جو موت اللہ نے لکھی ہے وہ کوئی ٹال نہیں سکتا، موت کی گھڑی معین ہے وہ بدل بھی نہیں سکتی۔ کتنے لوگ ہیں جو سفر میں جا کر، جنگوں میں جا کر صحیح سالم واپس آجاتے ہیں!! اور کتنے لوگ ہیں جو گھروں میں رہتے ہوئے مر جاتے ہیں!! کتنے لوگ ہیں کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے ہارٹ اٹیک ہوتا ہے!! ان کو کلمہ تک بھی نصیب نہیں ہوتا اور وہ مر جاتے ہیں اور کتنے لوگ ہیں جو ساری دنیا کی مشقتیں برداشت کر کے صحیح سالم واپس آجاتے ہیں!!

﴿وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ﴾

جب زندہ کرنا اور مارنا اللہ کے ہاتھ میں ہے تو اس کا علم بھی اتنا بڑا ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو جاننے والا اور اس کو دیکھنے والا ہے۔

ہمارے بعض بھائی کہتے ہیں: ......نعوذ باللہ...... اللہ حاضر ناظر نہیں ہے، پورے قرآن میں کہیں اللہ کے لیے حاضر ناظر کا لفظ بھی نہیں ہے۔ یاد رکھنا! حاضر کا معنی موجود، ناظر کا معنی ہوتا ہے دیکھنے والا اور بصیر کا معنی دیکھنے والا ہے۔ ضروری نہیں ہوتا کہ ناظر کا لفظ ہو۔ لہٰذا یاد رکھیں! حاضر ناظر کی صفت صرف اللہ کے لیے ہے، اللہ کے قرآن کو بدل کر بلا وجہ اپنے عقائد کو نہ بگاڑا کریں۔

شہید کا مرتبہ:

جب ہم نے مرنا ہے تو سب سے اعلیٰ موت اللہ کے راستے میں شہید ہونا ہے۔ شہید کا اتنا بڑا مقام ہے کہ اس کے

خون کا قطرہ ابھی زمین پر نہیں گرتا اس سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہ معاف کر دیتے ہیں۔ اور شہید کا اتنا بڑا مرتبہ ہے کہ اس کے بارے میں حکم ہے کہ اس کو غسل دینے کی بھی ضرورت نہیں، تاکہ قیامت والے دن وہ اپنی انہی علامات اور نشانیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑا ہو۔ شہید کا یہ مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لوگو! خبردار! میرے راستے میں جان دینے والوں کو مردہ نہ کہا کرو۔ مردہ تو وہ ہوتے ہیں جو کفر پر مر جائیں، مردہ تو وہ ہوتے ہیں جو ایمان سے نکل جائیں، مردہ تو وہ ہوتے ہیں جو فرمانبرداری سے نکل جائیں۔ جو میرے راستے میں شہید ہوئے ہیں ان کو تو ہم نے حقیقی زندگی عطا کر دی ہے۔

فی سبیل اللہ سے مراد دین کے راستے میں، جہاد کے راستے میں، دین کی حفاظت کے راستے میں، اپنی بیوی بچوں کی عزت کی حفاظت کے راستے میں اور ہجرت کے راستے میں۔ یہ سب فی سبیل اللہ شہادت ہے۔

اگر تم اللہ کے راستے میں شہید ہو گئے تو تمہیں بخشش اور اللہ کی طرف سے رحمت ملے گی۔ تم دنیا میں زندہ رہ کر مال اکٹھا کرو گے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم جو تمہیں بدلہ دیں گے وہ تمہاری اس دولت سے کروڑوں درجہ بہتر ہے۔ یہ دولت فانی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ والدین ساری زندگی محنت کرتے ہیں، مال جمع کرتے ہیں، ان کو کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اور کتنے لوگ ہیں جو محل بناتے ہیں، لیکن ان کو بیٹھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ کتنے لوگ ہیں جو دولت جمع کرتے ہیں اور ان کو خرچ کرنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دنیا فانی ہے اور ہم جو تمہیں آخرت میں نعمتیں دیں گے وہ باقی ہی باقی ہیں۔

دنیا میں کوئی خیر بھی ہو تب بھی شر ہے؛ کیونکہ قاعدہ ہے کہ خالص خیر اگر ہے تو آخرت میں ہے اور خالص شر اگر ہے تو جہنم میں ہے۔ دنیا میں اگر خیر ہے تو ساتھ شر بھی لگا ہوا ہے۔

اس آیت کے اندر ﴿وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ﴾ ہے۔ شہادت مقدم ہے اور موت موخر ہے۔ اور اس سے اگلی آیت کے اندر ﴿وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ﴾ ہے۔ موت مقدم ہے اور شہادت موخر ہے۔ کیونکہ وہاں مقام ہی مرتبہ شہادت کا تھا اور یہاں گھر بیٹھنے والا عام طور پر مرے گا، قتل تو نہ ہو گا۔ بہر حال دونوں صورتوں کے اندر مر کر اللہ کے پاس جانا ہے تو پھر اسی کے حکم پر مریں، اسی کے حکم پر جان دیں۔ جب ہم اللہ کے حکم پر مریں گے سرخروئی سے جائیں گے اور اگر نافرمان ہو کر جائیں گے تو اللہ کے سامنے کیسے جائیں گے؟

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَاۗءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ يَتْلُوْا عَلَيْھِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْھِمْ وَيُعَلِّمُھُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ [آل عمران:۱۵۹ تا ۱۶۴]

''ان واقعات کے بعد اللہ کی رحمت ہی تھی جس کی بنا پر (اے پیغمبر!) تم نے ان لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیا۔ اگر تم سخت مزاج اور سخت دل والے ہوتے تو یہ تمہارے آس پاس سے ہٹ کر تتر بتر ہو جاتے۔ لہٰذا ان کو معاف کر دو، ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ لیتے رہو۔ پھر جب تم رائے پختہ کر کے کسی بات کا عزم کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ یقیناً توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تمہیں تنہا چھوڑ دے تو کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے؟ اور مومنوں کو چاہیے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔ اور کسی نبی سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مالِ غنیمت میں خیانت کرے۔ اور جو کوئی خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن وہ چیز لے کر آئے گا جو اس نے خیانت کر کے لی ہوگی، پھر ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ بھلا جو شخص اللہ کی خوشنودی کا تابع ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرف سے ناراضی لے کر لوٹا ہو اور جس کا ٹھکانا جہنم ہو؟ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ اللہ کے نزدیک ان لوگوں کے درجات مختلف ہیں، اور جو کچھ یہ کرتے ہیں اللہ اس کو خوب دیکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں پاک صاف بنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، جبکہ یہ لوگ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم سے درگزر:

چونکہ صحابہ سے غلطی ہوگئی تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ حضور پاک ﷺ ناراض ہوتے، اپنے جلال کا اظہار کرتے کہ تم نے یہ غلطی کیوں کی ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝﴾ اے میرے نبی! میں نے آپ کو ایسا رحمۃ للعالمین بنایا ہے کہ میں نے آپ کو نرم دل عطا فرمایا ہے۔ جتنی بڑی غلطی کیوں نہ ہو جائے میرے مدنی ﷺ اس کو برداشت کرنے والے ہیں۔ امت جتنی بھی راستے سے بھٹک جائے، لیکن پھر بھی دروازے پر آئے تو اس کو معاف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ اس کے بندے چاہے لاکھ بھٹک جائیں، گناہ گار ہو جائیں اور اللہ معاف کرے کافر مشرک بن جائیں، پھر بھی اللہ تعالیٰ کے دروازے پر آکر گر جائیں اور توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بھی میری رحمت ہے کہ آپ نے صحابہ سے اس معاملہ میں نرم مزاجی سے کام لیا۔ اور یہ بھی میرا کرم ہے کہ میں نے آپ کو رحمت والا بنایا ہے۔ اگر آپ سخت ہوتے، درشت ہوتے اور سخت دل ہوتے تو پھر لوگ بھی آپ سے ہٹ جاتے، لیکن ہم نے آپ کو سراپا رحمت بنایا کہ وہ غلطی کرتے رہے، آپ ان کے لیے دعائیں کرتے رہے، حتیٰ کہ حضور اکرم ﷺ نے آخری عمر یہ دعا کی کہ اگر میں نے کبھی غصہ میں کسی پر لعنت کردی ہو، کسی کو بددعا دی ہو تو اے میرے اللہ! وہ بھی دعا میں بدل دے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقام:

ان آیات کے اندر مقامِ صحابہ، عظمتِ صحابہ اور شانِ صحابہ دیکھیں کہ ساری دنیا اللہ کے پاس سفارش کے لیے جاتی ہے، ان کے لیے اللہ کے نبی اللہ سے سفارش کریں گے، علماء اللہ کے آگے سفارش کریں گے، حافظ قرآن اللہ کے آگے سفارش کریں گے اور اولیاء اللہ کے آگے سفارش کریں گے۔ میرے مدنی ﷺ کے صحابہ کی شان دیکھیں کہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں ان کا سفارشی ہوں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو خود معاف کرسکتے ہیں، ان کو سفارش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن یہ مقام صحابہ ہے کہ اگر صحابہ سے غلطی ہوگئی تو اللہ نے فرمایا: ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ میرا مدنی! ان کو معاف کردیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کا حکم:

اگر بہت بڑی غلطی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں تو معاف کر دوں، لیکن میرا اللہ معاف کرے گا یا نہیں؟ تو فرمایا: ﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ مجھ سے بھی بخشش مانگ لو، میں بھی معاف کرتا ہوں۔ آپ ان کو صرف معاف نہ کریں، بلکہ ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ﴾ آپ ان کو اسی مرتبہ پر قائم بھی رکھیں، ان کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ حالانکہ اللہ کے نبی کو مشورے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ کے نبی کا تو اللہ سے تعلق ہے، وحی سے تعلق ہے، لیکن اس سے امت کو سبق دیا جارہا ہے کہ مشورہ سے کام سرانجام دیں۔ اور فرمایا: ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ﴾ جب آپ نے مشورے کے بعد ارادہ کر لیا تو اب اللہ پر بھروسہ کریں۔

مشورہ کا معنیٰ:

مشورہ ان سے لیا جائے جو مشورہ کے قابل بھی ہوں۔ عربی کے اندر مشورہ کا اصل معنیٰ یہ ہے کہ شہد کے چھتہ سے شہد کا نکالنا۔ تو جیسے شہد میٹھا ہوتا ہے اسی طرح مشورہ دینے والا بھی میٹھا ہو، جیسے شہد اندر کی بھی شفا ہے اور باہر کی بھی شفا ہے۔ جب تم صحیح لوگوں سے مشورہ لو گے تو شفا ملے گی، کامیابی ملے گی، تمہیں ہر مقام پر عزت ملے گی اور غلبہ ملے گا۔ مشورہ کا مطلب جمہوریت نہیں ہے۔ یہ تو کافروں کا بنایا ہوا نظام ہے، اس سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مشورہ نہیں ہوتا کہ تم نے گھڑی بنانی ہو اور تم لوہار کے پاس چلے جاؤ، تم نے بیمار کے بارے میں مشورہ کرنا ہو تو تم درکھان کے پاس چلے جاؤ۔ لہٰذا یاد رکھیں! مشورہ اس سے کیا جائے جو مشورہ دینے کے لائق ہو، ورنہ تو یزید حق پر تھا کہ تقریباً ساری دنیا اس کو ووٹ دے چکی تھی، لیکن اسلام کہتا ہے کہ جب مکہ مدینہ والوں نے اس کی بیعت توڑ دی تو اس کی خلافت نہیں رہی؛ کیونکہ اصل مشورے دینے والے تو وہ ہیں جو محمد مصطفیٰ ﷺ کے غلام ہیں۔

﴿إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ﴾ اگر اللہ تعالیٰ مدد کرتے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ اور اگر اللہ تمہیں نیچا دکھانا چاہیں تو پھر اللہ کے سوا کون ہے جو تمہاری مدد کرے؟ اس لیے ایمان والے اللہ پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔

جس نے شکل تبدیل کی اور قتل کر دیا گیا؟

فقہاء نے یہ حکم لگایا ہے کہ کسی شخص نے اگر عمداً اپنی شکل بدل لی اور دوسرے انسان نے اس کو انسان نہیں سمجھا، مثلاً: آج کل لوگ ماسک پہن کر جانور بن جاتے ہیں تو دوسرے آدمی نے اس کو جانور سمجھ کر گولی ماردی تو اس

مارنے والے پر مواخذہ نہیں ہوگا؛ کیونکہ اس نے خود شکل بدلی تھی۔ علماء کرام کی روایت میں ایک استاد ہیں جو جن تھے اور اس سلسلہ کے اسناد میں ایک ''الشیخ الجنی'' بھی ہیں۔ ان کا قصہ یہی تھا کہ آپ مطالعہ حدیث فرما رہے تھے۔ ایک سانپ آیا، حضرت نے اس کو سانپ سمجھ کر مار دیا۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی آئے اور حضرت کو پکڑ کر لے گئے اور ان کو اپنے شاہی دربار میں جا کر پیش کیا کہ یہ ہمارے فلاں بھائی کا قاتل ہے۔ ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: میں نے تو کسی انسان کو قتل نہیں کیا، ایک سانپ کو میں نے مارا ہے۔ انہوں نے کہا: وہ سانپ نہیں تھا، وہ ہمارا بھائی تھا، تم نے اس کو مار دیا ہے۔ انہوں نے کہا: بات یہ ہے کہ اس کا علم کیسے ہوگا کہ یہ جن ہے یا سانپ؟ کیونکہ میرے سامنے سانپ کی شکل تھی اور حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ تَزَيَّا بِغَيْرِ زِيِّهِ فَقُتِلَ فَدَمُهُ هَدَرٌ)) [الضوء اللامع للسخاوی۔ قال السخاوی فی المقاصد لیس اصل بحمد]

جو کسی غیر کی شکل اختیار کرے اس کا خون معاف ہے۔ تو جب اس نے سانپ کی شکل اختیار کی تو اس پر سانپ کا حکم جاری ہوگا۔ اس حاکم نے ایک بوڑھے جن بزرگ سے پوچھا جو ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ یہ جو حدیث رسول پڑھ رہا ہے کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ اس نے کہا: بالکل صحیح ہے۔ حاکم نے کہا: ان کو چھوڑ دو۔ ان کو چھوڑ دیا گیا تو انہوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیسے تصدیق کی ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں نے یہ حدیث فلاں صحابی سے سنی ہے۔ (بلکہ سب نے اس کو خود حضور سے سنا تھا)

دوسری بات یاد رکھیں کہ اگر حرم میں کسی کو سانپ نظر آئیں تو علماء یہ کہتے ہیں کہ تجربہ یہ ہے کہ یہ بھی اکثر جن ہوتے ہیں، سانپ کم ہوتے ہیں۔ تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کو کہہ دیں کہ ہمیں ایذا نہ دو اور ہم تمہیں ایذا نہیں دیتے اور ہمارے گھر سے نکل جاؤ۔ دو تین دفعہ کہہ دو۔ اگر وہ جن ہے تو نکل جائے گا اور اگر وہ سانپ ہے اس نے یہ بات کہاں سے سمجھنی ہے؟ پھر آپ اس کو مار دیں؛ کیونکہ وہ موذی سانپ ہے۔

کمزور مسلمان جو خدا کو راضی کرے اور شیطان سے بھی نہ ٹوٹے:

یورپ کے اندر ہسپتالوں میں لوگ مر جاتے ہیں تو ہمیں بعض دوستوں نے بتایا کہ بعض دفعہ ان کے ساتھ کوئی وارث بھی نہیں ہوتا، ان کے کاغذات بھی نہیں ہوتے۔ جب ان کے کپڑے دیکھتے ہیں تو انہوں نے وہی انگریزی سوٹ پہنا ہوا ہوتا ہے۔ تو اس طرح انہوں نے کئی مسلمانوں کو عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ انہوں نے سمجھا

کہ یہ ہمارا ہی کوئی انگریز ہوگا؛ کیونکہ شکل و صورت سے ہی انسان پہچانا جاتا ہے۔ کسی قوم نے اپنا شعار نہیں بدلا، لیکن ایک مسلمان ہے جو رنگیلا بنا ہوا ہے۔ یہ حزب الرحمان میں بھی ہے اور حزب الشیطان میں بھی ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ خدا کو بھی میں راضی کر رہا ہوں اور شیطان سے بھی دوستی نہ ٹوٹے۔

حضور ﷺ کی بعض ظاہری اور باطنی کیفیات:

حضرت انس رضی اللہ عنہ میرے پیارے مدنی ﷺ کے خادم ہیں۔ فرماتے ہیں: میں نے دس سال محمد مدنی ﷺ کی خدمت کی ہے۔ ریشم، اطلس اور کمخواب بھی اتنا نرم نہیں تھا جتنا محمد عربی ﷺ کے ہاتھ نرم تھے۔

حدیث مبارک میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے جہاں جہاں کسی کے سینے پر ہاتھ رکھا وہ صحابی کہتے ہیں مجھے ایسی ٹھنڈک محسوس ہوئی کہ کبھی نہیں بھولا۔

حضور پاک ﷺ نے ایک صحابی کے بالوں پر ہاتھ رکھا، وہ صحابی کہتے ہیں: سارے سر کے بال سفید ہو گئے، لیکن وہ بال جن پر حضور ﷺ نے ہاتھ رکھا تھا وہ اسی طرح سیاہ رہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میری آنکھوں میں تکلیف تھی، حضور پاک ﷺ نے ہاتھ لگایا تو میری تکلیف ختم ہوگئی اور پھر کبھی آنکھوں میں تکلیف نہیں ہوئی۔

حضور ﷺ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کا ایک انداز:

امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی سند سے روایت نقل فرمائی ہے کہ ابو راشد الحبرانی بیان فرماتے ہیں: میرا ہاتھ حضرت ابو امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ نے پکڑا اور اس کے بعد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی میرا ہاتھ پکڑ کر یہ ارشاد فرمایا:

((يَا أَبَا أُمَامَةَ! إِنَّ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ مَنْ يَلِيْنُ لِيْ قَلْبُهُ)) [مسند احمد، رقم: ۲۲۲۹۹]

اے ابو امامہ! مومنوں میں سے بعض ایسے مومن بھی ہیں جن کا دل میرے لیے پسیج جاتا ہے، نرم ہو جاتا ہے۔ یہ بھی محبت کا مقام ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کسی صحابی کا ہاتھ پکڑیں، ورنہ نبی ﷺ کا مقام تو بہت بلند ہے۔ یہ نرمی اور رحمت تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے دل میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے پیدا فرما دی۔

گناہ گار سے محبت کرو...... گناہ سے نفرت:

﴿فَظًّا﴾ کا معنی ہوتا ہے سخت اور ﴿غَلِيْظَ الْقَلْبِ﴾ کا معنی بھی سخت ہے۔ ﴿فَظًّا﴾ کا معنی یہ ہے کہ اگر آپ کا کلام

مبارک بجائے نرمی کے سخت ہوتا اور آپ کا دل بھی سخت ہوتا تو جو آپ کے اردگرد پروانے ہیں یہ دور ہو جاتے؛ کیونکہ محبت جمع کرتی ہے اور نفرت دور کرتی ہے۔ اس لیے اللہ والے کہتے ہیں: جتنا ہو سکے دوسرے مومن کے ساتھ محبت اور پیار کے ساتھ ملو۔ اس لیے حکم ہے کہ اگر تمہارے تعلق داروں میں کوئی شخص گناہ گار ہے تو گناہ سے نفرت کرو؛ کیونکہ گناہگار تو بے چارا مریض ہے، وہ تمہاری ہمدردی کا مستحق ہے، تم اس کا علاج کرو، اس کو پیار سے سمجھاؤ اور اس کو اچھے لوگوں کی صحبت میں لے جاؤ۔ اگر تم خود اتنے کمزور ہو کہ اس کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے تمہارے بگڑنے کا خطرہ ہے تو اس سے دور ہو جانا بہتر ہے۔ اور شریعت کا یہ بھی حکم ہے کہ کسی گناہگار کو دیکھ کر اگر آدمی نفرت کرے کہ یہ شرابی ہے اور میں مولوی ہوں، اس کو ہاتھ کیوں دوں؟ تو حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ نصیب کر دیں گے اور تجھے اس بیماری میں مبتلا کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: بندہ تو میرا ہے، تم نفرت کرنے والے کون ہو؟

تورات وانجیل میں حضور ﷺ کی صفات:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے کتب متقدمہ (تورات وانجیل وغیرہ) میں اپنے مدنی ﷺ کی صفت دیکھی۔ اس میں لکھا ہوا تھا: ((لَيْسَ بِفَظٍّ وَلاَ غَلِيظٍ، وَلاَ سَخَّابٍ بِالْأَسْوَاقِ، وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَةَ بِالسَّيِّئَةِ، وَلَكِنْ يَعْفُو وَيَصْفَحُ)) [بخاری، رقم: ۴۸۳۸] کہ آپ زبان کے سخت بھی نہیں ہوں گے، دل کے سخت بھی نہیں ہوں گے، بازاروں میں شور کرنے والوں میں سے بھی نہیں ہوں گے، کوئی ان کے ساتھ بدسلوکی کرے تو وہ برائی کا بدلہ برائی کے ساتھ نہیں دیں گے اور اگر کوئی زیادتی کرے گا تو اس کو معاف کر دیں گے اور اس سے درگزر فرمائیں گے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کی حیثیت:

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو حکم فرمایا: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ کہ وہ صحابہ سے مشورہ اور رائے لیا کریں۔ تو کیا یہ امر وجوب کے لیے ہے؟ کیا آپ پر لازم تھا کہ مشورہ کریں؟ یا یہ امر استحباب کے لیے ہے؟ کہ صحابہ کرام کو خوشی ہو کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ہمیں اتنی عزت بخشی ہے کہ ہم سے مشورہ لیتے ہیں تو اس بارے میں دو قول ہیں:

بعض فقہاء فرماتے ہیں: یہ امر وجوب کے لیے ہے۔ اور بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ کا تعلق چونکہ اللہ کی وحی سے ہوتا ہے، اللہ وحی کے ذریعہ سے اپنے پاک پیغمبر ﷺ کو خبر عطا فرما دیتے ہیں، لہٰذا ان پر مشورہ کرنا واجب نہیں، البتہ درجہ استحباب میں ہے، تاکہ صحابہ کے دل خوش رہیں اور آپ کی امت کو تعلیم حاصل ہو کہ ہم نے تمام معاملات میں، خاص طور پر وہ معاملات جو اہم ہوتے ہیں ان میں مشورہ لینا ہے۔

حضور ﷺ کو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے مشورہ کا حکم تھا:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ اس کا مقصد یہ تھا کہ آپ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا کریں؛ کیونکہ ان دونوں کا مقام بڑا بلند ہے۔ [مستدرک حاکم: ۳/۷۰]

اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی تھی اور یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے حواری اور وزیر اور مسلمانوں کے باپ تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۲/۱۴۹]

اس لیے محدثین رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا حلیہ مبارک چند ایک صحابہ رضی اللہ عنہم نے بیان فرمایا ہے۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ کو دیکھنے والے لاکھوں صحابہ ہیں۔ محدثین نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا ادب و احترام اور آپ کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ ہر صحابی کو یہ ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ آنکھ اٹھا کر حضور پاک ﷺ کو دیکھ سکے، بلکہ سب ادب کے ساتھ اس طرح بیٹھے رہتے تھے گویا سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ یعنی پرندے یہ سمجھتے تھے کہ ان کے اندر روح بھی نہیں ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ وہ خوش نصیب صحابہ ہیں جو حضور پاک ﷺ کے چہرے پر نظر ڈالتے تھے اور حضور پاک ﷺ بھی ان کی طرف دیکھتے تھے اور تبسم فرماتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں گویا کہ اس آیت کے اندر حکم یہ ہے کہ آپ ان دونوں سے مشورہ کریں۔

(حدیث) مسند امام احمد میں روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: ﴿لَوِ اجْتَمَعْتُمَا فِي مَشُورَةٍ مَا خَالَفْتُكُمَا﴾ اگر تم کسی بات پر دونوں اکٹھے ہو جاؤ تو میں تم دونوں کے خلاف نہیں کروں گا۔ [مسند احمد، رقم: ۱۷۹۹۴]

(حدیث) حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ((سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْعَزْمِ؟فَقَالَ مُشَاوَرَةُ أَهْلِ الرَّأْيِ ثُمَّ اتِّبَاعُهُمْ)) عزم کا کیا معنی ہے؟ آپ نے فرمایا: جو اصحاب رائے ہیں، جو مشورہ دینے کا مقام رکھتے ہیں ان سے مشورہ لیں اور پھر ان کے مشورہ پر چلیں۔

[ذکرہ السیوطی فی الدر: ۲/۳۶۰ تفسیر ابن کثیر: ۲/۱۳۱]

(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ)) جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہو۔ لہٰذا آدمی جب بھی مشورہ لے تو کسی دین والے سے مشورہ لے، کسی اہل علم سے مشورہ لے، متقین سے مشورہ لے۔ [ابی داؤد، رقم: ۵۱۲۸]

سببِ نزول:

(حدیث) حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: ((إِذَا اسْتَشَارَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيُشِرْ عَلَيْهِ)) جب کوئی بھائی تم سے مشورہ طلب کرے تو تم اس کو صحیح مشورہ دو۔

[سنن ابن ماجہ، رقم: ۳۷۴۷]

جنگ بدر کے موقع پر ایک قطیفہ (جھالردار چادر یا کمبل) نہ ملا مال غنیمت سے تو بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ پتہ نہیں شاید حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے رکھ لیا ہو تو اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کر دیا کہ کیسی باتیں کرتے ہو!!؟ ﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ﴾ کہ نبی تو خیانت سے پاک ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مال غنیمت سے بھی ایسے چیزیں رکھ لیں؛ کیونکہ یہ تو سب سے بڑی خیانت ہے اور میرا نبی تو معصوم ہے، ان کے بارے میں کبھی ایسا تصور بھی نہ کیا جائے۔

مال غنیمت کے اندر خیانت کو غلول کہتے ہیں؛ کیونکہ یہ سب سے بڑی خیانت ہے اور بڑے گناہوں میں سے بڑا گناہ ہے۔

عوفی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کا یہ مطلب نقل کیا ہے کہ اللہ کے نبی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ خیانت کرے، یعنی بعض مجاہدین کو دیں اور بعض کو نہ دیں، بلکہ اللہ کے نبی پورا عدل وانصاف فرماتے ہیں، حق والے کو اس کا حق دیتے ہیں۔ ضحاک رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ [ابن کثیر: ۲/۱۵۱]

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ اللہ کے نبی خیانت سے پاک ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے

نبی ﷺ پر کوئی حکم نازل ہوا اور وہ کچھ پہنچائیں اور کچھ نہ پہنچائیں، بلکہ اللہ تعالیٰ جو بھی حکم دیتے ہیں نبی کریم ﷺ پورے کا پورا پہنچا دیتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۲/۱۵۱]

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ [المائدۃ: ۶۷] (اے رسول! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کرو۔ اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو (اس کا مطلب یہ ہوگا کہ) تم نے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا۔) آپ نے یہ بات بھی امت کو بتا دی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر جو احکام اتارے یہ ناممکن ہے کہ وہ کچھ احکام پہنچائیں اور کچھ چھپا دیں، بلکہ اللہ کے نبی ایسی باتوں سے پاک ہوتے ہیں۔

مالِ غنیمت میں خیانت کا گناہ عظیم:

(حدیث) حضرت ابو مالک الاشجعی حضور اکرم ﷺ کا فرمان نقل کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((أَعْظَمُ الْغُلُولِ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ ذِرَاعٌ مِنَ الْأَرْضِ، تَجِدُوْنَ الرَّجُلَيْنِ جَارَيْنِ فِي الْأَرْضِ أَوْ فِي الدَّارِ، فَيَقْتَطِعُ أَحَدُهُمَا مِنْ حَظِّ صَاحِبِهِ ذِرَاعًا، فَإِذَا اقْتَطَعَهُ طُوِّقَهُ مِنْ سَبْعِ أَرَضِيْنَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ)) [مسند احمد، رقم: ۱۷۲۵۵] سب سے بڑی خیانت ایک ہاتھ زمین ہے۔ صحابہ کو یہ بات سمجھ نہ آئی تو انہوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا معنی ہے؟ آپ نے فرمایا: دو آدمی زمین میں ہمسائے ہیں، دیوار میں شریک ہیں۔ اب اس کو موقع ملا تو اس نے ایک ہاتھ زمین دوسرے بھائی کی اپنے اندر کر لی کہ یہ میری ہے۔ فرمایا کہ یہ سب سے بڑی خیانت ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن حکم دیں گے کہ جتنا ٹکڑا اس نے بھائی کا اپنے قبضے میں کیا تھا سات زمینوں تک وہ ٹکڑا اس کے گلے میں ڈالو۔ مطلب یہ ہے کہ اتنا بڑا عذاب دیا جائے گا۔

آج بڑے بڑے زمیندار ہیں، جن کے پاس طاقت ہے، اس طرح انہوں نے غریبوں کے حقوق دبائے ہوئے ہیں۔ اب ایک ہاتھ کا مسئلہ نہیں رہا، اب تو زمین کے مربعے کے مربعے ہضم کر جاتے ہیں، مگر کوئی غریب بولنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔

(حدیث) مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے حضور پاک ﷺ سے سنا: ((مَنْ وَلِيَ لَنَا عَمَلًا وَلَيْسَ لَهٗ مَنْزِلٌ، فَلْيَتَّخِذْ مَنْزِلًا، أَوْ لَيْسَتْ لَهٗ زَوْجَةٌ فَلْيَتَزَوَّجْ، أَوْ لَيْسَ لَهٗ خَادِمٌ فَلْيَتَّخِذْ خَادِمًا، أَوْ لَيْسَتْ لَهٗ دَابَّةٌ

فَلْیَتَّخِذْ دَابَّةً، وَمَنْ أَصَابَ شَيْئًا سِوَى ذٰلِكَ فَهُوَ غَالٌّ)) جس آدمی کو کسی کام پر افسر بنایا جائے اس کے رہنے کی جگہ نہ ہو تو رہنے کی جگہ بنا سکتا ہے، بیوی نہ ہو تو شادی کر سکتا ہے، خادم نہ ہو خادم رکھ سکتا ہے اور سواری نہ ہو تو سواری رکھ سکتا ہے۔ ان ضرورت کی چیزوں کے علاوہ اگر کچھ کرے تو وہ خیانت تصور ہوگی۔ یہ نہیں کہ رہنے کی جگہ کروڑوں کی بنالے، بلکہ عام مسلمانوں کی طرح ہو۔ [مسند احمد، رقم: ۱۸۰۱۵]

(حدیث) حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((أَدُّوا الْخَيْطَ، وَالْمِخْيَطَ، فَمَا فَوْقَ ذٰلِكَ، وَمَا دُونَ ذٰلِكَ؛ فَإِنَّ الْغُلُولَ عَارٌ، عَلَى أَهْلِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَ شَنَارٌ وَ نَارٌ)) اگر تم نے کسی کا دھاگہ یا سوئی بھی چرائی ہے تو واپس کرو۔ تحقیق خیانت بہت برا طعن ہے، عیب ہے اور آگ ہے اپنے خیانت کرنے والوں پر، لہٰذا خیانت سے ہر حال میں بچنا چاہیے۔ [سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۸۵۰]

(حدیث) حضرت ابومسعود الانصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ نے مجھے عامل بنا کر بھیجا کہ لوگوں سے زکوۃ جمع کر کے بیت المال میں جمع کراؤں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ابومسعود! تم جاؤ، لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ قیامت والے دن تم اس حال میں آؤ کہ تمہارے کندھے پر خیانت کا اونٹ ہو، اس کی آوازیں نکل رہی ہوں اور آپ نے اس کی خیانت کی ہو۔ انہوں نے عرض کیا: اگر یہ عالم ہے تو میں نہیں جاتا۔ تو آپ نے فرمایا: تب میں بھی آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ [ابوداؤد، رقم: ۲۹۴۷]

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ الْحَجَرَ لَيُرْمَى بِهِ فِي جَهَنَّمَ فَيَهْوِي سَبْعِينَ خَرِيفًا مَا يَبْلُغُ قَعْرَهَا، وَيُؤْتَى بِالْغُلُولِ فَيُقْذَفُ مَعَهُ ثُمَّ يُقَالُ لِمَنْ غَلَّ: ائْتِ بِهِ، فَذٰلِكَ قَوْلُهُ: وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.)) اگر کوئی پتھر جہنم کے اندر لڑھکا دیا جائے تو وہ جاتے جاتے جہنم کی تہہ تک ستر سال میں بھی نہیں پہنچے گا۔ تو اسی جہنم میں خیانت کرنے والے کو ڈالا جائے گا اور اس کو کہا جائے گا: جو تم نے خیانت کی تھی اس کو بھی لے آؤ۔ [تفسیر ابن کثیر]

(حدیث) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں:

((لَمَّا كَانَ يَوْمُ خَيْبَرَ، أَقْبَلَ نَفَرٌ مِنْ صَحَابَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالُوا: فُلَانٌ شَهِيدٌ، فُلَانٌ شَهِيدٌ، حَتَّى مَرُّوا عَلَى رَجُلٍ، فَقَالُوا: فُلَانٌ شَهِيدٌ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَلَّا، إِنِّي رَأَيْتُهُ فِي النَّارِ فِي بُرْدَةٍ غَلَّهَا أَوْ عَبَاءَةٍ، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا ابْنَ الْخَطَّابِ!

اذْهَبْ فَنَادِ فِي النَّاسِ، أَنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا الْمُؤْمِنُونَ، قَالَ: فَخَرَجْتُ فَنَادَيْتُ: أَلَا إِنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا الْمُؤْمِنُونَ)) [مسلم، رقم: ۱۱۴]

''خیبر والے دن صحابہ کی ایک جماعت آئی اور کہنے لگی: فلاں شہید ہو گیا، فلاں شہید ہو گیا، حتیٰ کہ ایک آدمی کے بارے میں کہا کہ فلاں بھی شہید ہو گیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: خبردار! اس کو شہید نہ کہو، میں نے اس کو جہنم میں دیکھا ہے اس چادر یا اچکن کی وجہ سے جس کی اس نے خیانت کی تھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے خطاب کے بیٹے! آپ جا کر لوگوں میں اعلان کر دیں کہ جنت میں صرف ایمان والے داخل ہوں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے جا کر اعلان کیا: سن لو! جنت میں صرف ایمان والے داخل ہوں گے۔''

کیونکہ یہ حقوق العباد میں سے ہے، یہ معاف نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اپنا حق تو معاف کر دیتے ہیں۔ کافی سارے لوگ دکانوں پر ملازم ہوتے ہیں، جو دکان کے پیسوں سے بوتل چائے پی لیتے ہیں۔ قیامت میں تو آدمی ایک ایک دھیلے (پیسے) میں پکڑا جائے گا۔ اس لیے اس کو چاہیے کہ اپنے مالک سے پوچھے کہ مجھے روزانہ کتنے پیسے کھانے کی اجازت ہے؟ جتنی مالک اجازت دے وہ حلال ہے اور اس کے علاوہ سب حرام ہے، حتیٰ کہ علماء نے فرمایا کہ اگر ایک آدمی کی مثلاً: آٹھ گھنٹے ڈیوٹی ہے۔ اگر وہ آدمی نماز پڑھنے کے لیے آئے اور بعد میں نفلیں پڑھ رہا ہے، تاکہ پندرہ بیس منٹ اس میں گزر جائیں، یہ بھی خیانت ہے؛ کیونکہ وہ آٹھ گھنٹے ڈیوٹی کا پابند ہے۔ جتنی دیر کی مالک اجازت دے اس میں نماز پڑھیں۔

امانت میں خیانت کا گناہ:

﴿أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک آدمی وہ ہے جو اللہ کے حکم پر چلنے والا، امانت ادا کرنے والا، فرمانبرداری کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے والا اور ایک وہ جو خیانت کرنے والا ہے، کیا کبھی برابر ہو سکتے ہیں؟ بالکل نہیں؛ کیونکہ ایک مبغوضِ خدا ہے اور ایک محبوبِ خدا ہے۔ ایک اللہ کے حکم کو ماننے والا اور دوسرا خیانت کرنے والا۔ یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ جو مبغوضِ خدا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور محبوبِ خدا کا ٹھکانہ جنت ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے قیامت کی علامات میں سے سب سے پہلی علامت بتائی کہ امانت ختم ہو جائے گی۔ لوگ انگلیوں پر گنیں گے کہ فلاں شخص امین ہے، فلاں بستی میں فلاں آدمی شریف ہے، حالانکہ ہر مسلمان کو امانت دار ہونا

چاہیے تھا، لیکن قرب قیامت امانت والے اتنے تھوڑے رہ جائیں گے کہ لوگ ان کو انگلیوں پر گن سکیں گے۔

حضور ﷺ کی بعثت مومنین پر اللہ کا انعام ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ ہم نے احسان کیا مومنین پر کہ ہم نے ان میں پیغمبر بھیجا جو ان کی جنس بشر سے ہے۔ اگر وہ جنسِ نور سے ہوتے یا جنس مختلف سے ہوتے تو تم ان سے صحیح استفادہ نہ کر سکتے، لہٰذا یہ بھی اللہ کا بہت بڑا کرم ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے حضور اکرم ﷺ کو بھیجا اور جنس بشر میں سے بھیجا۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝﴾ [الانبیاء:۱۰۷] اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو انسان، جن اور تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تو اس آیت کے اندر لفظ عام ہے کہ آپ سب کے لیے رحمت ہیں، آپ کی وجہ سے امتیں عذاب سے بچ گئیں۔ اور اس آیت کے اندر فرمایا کہ مومنوں پر میرا احسان ہے؛ کیونکہ اصل فائدہ ایمان والوں نے اٹھایا ہے۔

اور جیسا کہ اللہ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ [الروم:۲۱] میری نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ تمہاری بیویاں تمہاری جنس سے پیدا کی ہیں؛ کیونکہ جب جنس ایک ہوگی تو ایک دوسرے سے زیادہ انتفاع حاصل کر سکیں گے۔ اگر تم مٹی کے بنے ہوئے ہوتے اور بیوی آگ سے بنی ہوتی تو مسئلہ ہو جاتا۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر کوئی جن کسی عورت کو پکڑ لے تو کیا حال ہوتا ہے؟ اس لیے قاعدہ ہے کہ اگر اللہ چاہتے تو زمین پر فرشتوں کو بھی بھیج سکتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے سارے نبی اولادِ آدم سے بھیجے، جنس بشر سے بھیجے۔ میرے مدنی بھی بشر ہیں، بلکہ سید البشر ہیں، ابن آدم ہیں، ابن آمنہ ہیں اور ابن عبد المطلب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ان پر کروڑوں صلوۃ وسلام ہیں۔

انبیاء کی بشریت کے ثبوت میں سینکڑوں آیات موجود ہیں اور حضور اکرم ﷺ نے خود فرمادیا: ((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ، أَنْسَى كَمَا تَنْسَوْنَ)) [بخاری، رقم:۴۰۱] اور دوسری جگہ فرمایا: ((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ أَغْضَبُ كَمَا تَغْضَبُوْنَ)) [مسند بزار، رقم:۲۵۴۳] میں بھی ایک بشر ہوں۔ میں بھی بھول جاتا ہوں، جیسا تم بھول جاتے ہو اور مجھے بھی غصہ آتا ہے، جیسے تمہیں غصہ آتا ہے۔

حضور ﷺ کے فرائضِ منصبی:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ﴾

میرے اس پیغمبر کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ قرآن کی تلاوت کریں گے۔ یاد رکھیں! تلاوت کرنا بھی نبی ﷺ کا وظیفہ ہے، تعلیم دینا بھی نبی ﷺ کا وظیفہ ہے، پڑھانا بھی نبی ﷺ کا وظیفہ ہے اور پاک کرنا بھی نبی ﷺ کا وظیفہ ہے۔ دنیا کے اندر یہ جتنے کام ہو رہے ہیں سب سنت مصطفیٰ ﷺ ہے۔ اگر کوئی بیٹھ کر بچوں کو قرآن پڑھا رہا ہے تو وہ بھی سنت مصطفیٰ ﷺ پر چل رہا ہے، کوئی بیٹھ کر تفسیر قرآن پڑھا رہا ہے تو وہ بھی محمد مصطفیٰ ﷺ کا وظیفہ ہے، اگر کوئی بیٹھا ہوا بخاری پڑھا رہا ہے تو وہ بھی محمد رسول اللہ ﷺ کا وظیفہ ہے اور کوئی بیٹھا بندوں کو اللہ کا ذکر سکھا کر ان کے دلوں کو مانج رہا ہے، ان کی روحانی بیماریوں کو ختم کر رہا ہے، ان کے شرک وبدعات کو ختم کر کے ان میں سنت کی اتباع بھر رہا ہے اور ان کے دلوں کی ظلمات کو اللہ کے ذکر سے مٹا رہا ہے، یہ تزکیہ بھی محمد مصطفیٰ ﷺ کا وظیفہ ہے۔

یاد رکھیں! جب تک یہ چار لائنیں متوازی نہیں چلیں گی، اس وقت تک ہدایت نہیں ملے گی۔ اگر تم نے صرف تعلیم کتاب پر نظر رکھی اور سنت کو چھوڑ دیا تب بھی نجات نہیں ملے گی، اگر تم نے سنت پر نظر رکھی اور قرآن کو چھوڑ دیا تب بھی نجات نہیں ملے گی، اگر تم نے یہ دونوں چیزیں تو پڑھائیں، لیکن تزکیہ کا خیال نہ کیا تو پھر زبانی کلامی تو لوگ پیدا ہوں گے، لیکن اصل عامل پیدا نہیں ہوں گے؛ کیونکہ جب تک اندر کی صفائی نہ ہو تب تک پورا فائدہ نہیں ہوگا۔ مثلاً: ایک گلاس کو آپ باہر سے چمکاتے رہیں، لیکن اس کے اندر ٹھیک نہ ہو تو کبھی صاف نہیں ہو سکتا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے میرے مدنی پاک ﷺ کی جماعت کے بارے میں فرمایا: میں تیری جماعت سے راضی ہو گیا؛ کیونکہ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ③﴾ [الحجرات:۳] ہم جان گئے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ ان کے دلوں کو ہم نے خود مانجھ دیا ہے۔ قرآن نے ہمیں سبق دیا: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑤﴾ [الفاتحہ:۵] اے اللہ! ہمیں صراط مستقیم نصیب فرما۔ آگے فرمایا: ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تو نے اپنا انعام کیا ہے۔ اگر ہم کتاب اللہ سے کٹ گئے، تب بھی صراط مستقیم پر نہیں پہنچیں گے اور اگر ہم اللہ والوں سے کٹ گئے، تب بھی صراط مستقیم پر نہیں پہنچیں گے۔ ہماری کامیابی تب ہوگی جب ہماری ایک جماعت تعلیم میں لگی ہو، ایک جماعت قرآن کی تفسیر میں لگی ہو، ایک جماعت تزکیہ پر لگی ہو، ایک جماعت فقہ

میں لگی ہو اور ایک جماعت سنت کی تشریحات میں لگی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری صفات میرے ایک نبی ﷺ میں جمع فرما دی تھیں۔

حضور ﷺ کی آمد سے پہلے عرب کی حالت:

﴿وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ اور تم میرے مدنی ﷺ کے آنے سے پہلے کھلے اندھیروں میں پڑے ہوئے تھے۔ تمہاری جاہلیت کی حد یہ تھی کہ کعبۃ اللہ میں ساٹھ بت رکھ دیئے۔ صفا پر بھی بت تھا، مروہ پر بھی بت تھا، زم زم پر بھی بت تھا اور کعبہ کے اردگرد بھی بت تھے۔ یہ تمہارے عقیدے کا عالم تھا اور تمہارے کریکٹر کا یہ عالم تھا کہ شراب کے تم رسیا تھے، لڑکیوں کو تم قتل کرتے تھے، زنا تمہاری گھٹی میں پڑا ہوا تھا، ڈاکے لوٹ مار کر کھانے کو تم بہادری اور فخر سمجھتے تھے اور تمہاری عقل کا یہ عالم تھا کہ جب کعبہ کا طواف کرتے تو کپڑے اتار کر کرتے تھے کہ ان کپڑوں میں ہم نے گناہ کیے ہیں، ان کو کعبہ میں کیسے پہنیں؟ حالانکہ اصل جرم تو اعضاء نے کیے تھے، ان کو کاٹ کر دکھاتے تو پتہ چلتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ایسی گمراہیوں اور جہالت میں پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے اپنا پیغمبر بھیجا، امام الانبیاء، احمد مجتبیٰ ﷺ کو بھیجا اور انہوں نے ان بگڑے ہوؤں کو اس مقام پر اونچا کر دیا کہ ساری دنیا ان کے علوم سے استفادہ کر رہی ہے اور قیامت تک استفادہ کرتی رہے گی۔ اور ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لوگو! ذرا غور کرو! جو نبی دوسروں کو پاک کرنے آئے، جو دوسروں کو امانت سکھانے آئے، کیا وہ خود خیانت کر سکتا ہے؟

﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ښ وَقِيْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّااتَّبَعْنٰكُمْ ۭ ھُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْھُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِھِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِھِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِھِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾

[آل عمران: ۱۶۵ تا ۱۶۸]

"جب تمہیں ایک ایسی مصیبت پہنچی جس سے دگنی تم (دشمن کو) پہنچا چکے تھے تو کیا تم ایسے موقع پر یہ کہتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی؟ کہہ دو: یہ خود تمہاری طرف سے آئی ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور تمہیں جو مصیبت اس دن پہنچی جب دونوں لشکر ٹکرائے تھے، وہ اللہ کے حکم سے پہنچی، تاکہ وہ مومنوں کو بھی پرکھ کر دیکھ لے اور منافقین کو بھی دیکھ لے۔ اور ان (منافقوں) سے کہا گیا تھا کہ آؤ اللہ کے راستے میں جنگ کرو، یا دفاع کرو، تو انہوں نے کہا تھا کہ اگر ہم دیکھتے کہ (جنگ کی طرح) جنگ ہوگی تو ہم ضرور آپ کے پیچھے چلتے۔ اس دن (جب وہ یہ بات کہہ رہے تھے) وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی اور جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے (شہید) بھائیوں کے بارے میں بیٹھے بیٹھے یہ باتیں بناتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے۔ کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو خود اپنے آپ ہی سے موت کو ٹال دینا۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تسلی خداوندی:

ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے پھر غزوہ احد کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ جب تمہارے ستر صحابہ شہید ہوئے تو تم کیوں گھبرا رہے ہو؟ کیونکہ تم بھی دشمنوں کو اس سے دوگنی مصیبت پہنچا چکے ہو کہ ان کے ستر بندوں کو قتل کیا اور ستر کو قید کیا۔ وہ وقت تمہیں یاد نہیں رہا؟ اور جب تمہیں تکلیف پہنچی تو گھبرا رہے ہو!!؟

بعض علماء نے فرمایا: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر تمہیں اب مصیبت پہنچی ہے تو ابتداء احد، ابتداء جنگ میں کافروں کو تم سے بھی دوگنا مصیبت پہنچی ہے۔ ان کو بھی تو تم نے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا ہے، وہ بھی عورتوں کو لے کر پہاڑوں پر بھاگ رہے تھے۔ ﴿قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ﴾ جب تمہارے اوپر مصیبت آئی تو تم کہنے لگے کہ ہم پر یہ مصیبت کیسے آئی؟ لیکن یاد رکھیں! یہ اعتراض نہیں! کیونکہ تقدیر پر اعتراض کفر ہے اور صحابہ تو سارے عدول تھے۔ اس کہنے کا مقصد تعجب تھا کہ اللہ کے نبی ہمارے ساتھ موجود تھے، پھر بھی ہم پر یہ مصیبت کیسے پہنچ گئی ہے!!

مصیبت اترنے کی وجہ:

اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم اللہ کے دین کے لیے لڑ رہے ہیں، ہم ایمان والے ہیں، پھر ہمیں شکست کیسے

ہوگئی!! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی! آپ اپنے صحابہ کو بتادیں: ﴿قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ﴾ یہ تمہارے اپنے نفسوں کا کیا دھرا ہے۔

علماء نے اس کی دو وجہ لکھی ہیں: جب اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پچاس آدمیوں کو مقرر کیا تھا کہ اس جگہ سے نہیں ہٹنا، لیکن وہ جگہ چھوڑ دی اور حکم کی تعمیل نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے فتح کو شکست میں بدل دیا۔ اور بعض علماء نے فرمایا: جب جنگ بدر میں ستر کافر مارے گئے اور ستر کافر قید ہوئے اور حضور اکرم ﷺ نے مشورہ لیا تھا ان کے بارے میں تو تم میں سے بعضوں نے ان کو فدیہ لے کر چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تھا: اگر تم ان ستر کو چھوڑ دو گے تو تمہارے ستر شہید ہوں گے تو تم نے کہا تھا کہ جب شہید ہوں گے ہوں گے، فی الحال ان کو چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تم نے خود کہا تھا، آج اگر تمہارے وہ ستر شہید ہو گئے تو آج کیوں گھبرا گئے ہو؟

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِإِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اے میرے مدنی! آپ ان کو ایک اصول بتادیں کہ جو کچھ تمہیں تکلیف پہنچی جب دو فوجیں احد میں آمنے سامنے ہوئیں وہ اللہ کے حکم سے پہنچی۔ ﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾ [التغابن: ۱۱] مگر جب تک تم خود غلطی نہیں کرتے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿اللّٰهُمَّ إِنَّهُ لَمْ يَنْزِلْ بَلَاءٌ مِنَ السَّمَاءِ إِلَّا بِذَنْبٍ، وَلَا يُكْشَفُ إِلَّا بِتَوْبَةٍ﴾ [المجالسۃ وجواہر العلم، رقم: ۲۷] تم پر کوئی مصیبت نہیں اترتی، مگر اس کی وجہ کوئی غلطی ہوتی ہے۔ اور پھر وہ مصیبت تم سے اس وقت اٹھے گی جب تم توبہ کرو گے اور اللہ کی طرف لوٹ کر آؤ گے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تمہارے پاؤں میں کوئی کانٹا بھی لگتا ہے تو وہ بھی تمہارے کسی گناہ کی وجہ سے لگتا ہے۔

جنگ احد میں منافقین کی منافقت:

اللہ تعالیٰ نے احد میں یہ مصیبت کا لفظ اس لیے فرمایا تھا کہ مومن اور منافق نکھر جائیں اور دنیا کے سامنے آجائیں؛ کیونکہ ہم تو جانتے ہیں۔

﴿وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَوِ ادْفَعُوْا﴾ تم منافقوں سے کہہ رہے تھے کہ اللہ کے راستے میں لڑو اور

اگر لڑتے نہیں تو کم از کم کھڑے تو رہو دشمن کو پتہ چلے کہ ہماری بھی بڑی تعداد ہے۔ اور اگر تم ہماری وجہ سے نہیں لڑتے ہو تو اے ظالمو! اپنے گھروں کو بچاؤ، اپنے اہل وعیال کو بچاؤ؛ کیونکہ آج اگر مکہ والے مدینہ پر قابض ہو گئے تو جب ہمیں قتل کریں گے تو تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے؛ کیونکہ فاتح یہ نہیں پوچھتا کہ تم کون ہو؟ اس نے تو اپنا قبضہ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن منافقوں نے کہا: ﴿لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ۭ﴾ اگر ہمیں یہ پتہ ہوتا کہ یہ جنگ ہے تو ہم تمہاری ضرور مدد کرتے، لیکن یہ کوئی جنگ اور لڑائی نہیں ہے؛ کیونکہ تم سات سو ہو اور وہ تین ہزار ہیں۔ یہ تو مرنے والی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ﴾ جب منافق یہ بات کہہ رہے تھے اس دن وہ کفر کے زیادہ قریب ہو گئے باعتبار ایمان کے۔ یعنی پہلے تو وہ مسلمانوں سے ملے رہتے تھے تو ایمان کے قریب تھے کہ شاید کبھی پکے بھی ہو جائیں، لیکن آج طوطا چشم بن کر کھلا انکار کر دیا اور اکڑ کر کھڑے ہو گئے اور مسلمانوں سے علیحدہ ہو گئے۔ ﴿يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ﴾ جو کچھ زبانوں سے کہہ رہے ہیں ان کے دلوں میں بھی نہیں ہے، جھوٹ بول رہے ہیں۔ یعنی اگر تم برابر بھی ہوتے تب بھی یہ نہ لڑتے اور اگر تمہارے پاس مکمل ہتھیار ہوتے تب بھی یہ نہ لڑتے۔

منافق کا معنیٰ:

منافق کے لفظ کے بارے میں علماء لغت کے دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ منافق نفق سے ہے، جس کو سرنگ کہتے ہیں، یعنی جیسے آدمی بھاگے اور سرنگ میں چھپ جاتا ہے۔ یہ منافق بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ منافق نافقاء سے ہے۔ چوہا جہاں اپنی بل بناتا ہے اس کے ہمیشہ دو راستے ہوتے ہیں: ایک کو قسعاء کہتے ہیں اور ایک کو نفقاء کہتے ہیں۔ یعنی اگر اس کو ایک طرف سے پکڑنے لگیں گے تو وہ دوسری طرف سے بھاگ جائے گا۔ منافق بھی اسی طرح ہوتا ہے: ایک طرف تو وہ مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ کافروں کے ساتھ ہوتا ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: منافق اپنے بھائیوں کو کہتے ہیں کہ اگر وہ بیٹھ جاتے اور وہ جنگ میں نہ جاتے تو کبھی نہ مارے جاتے، اپنے گھر میں مزے کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے مدنی! آپ ان کو چیلنج کریں کہ اے کافرو! اے منافقو! اگر تم سچے ہو کہ میدان جنگ میں آدمی تو مرتا ہے اور گھر میں ہو تو نہیں مرتا، چلو تم تو اپنے گھر میں ہو، تم اپنی موت کو روک لو اور نہ مرنا۔ اگر ہم نے کسی کی موت میدانِ جنگ میں لکھی ہے تو وہ وہاں مرے گا اور اگر کسی کی موت ہم نے گھر میں لکھی ہے تو وہ وہیں مرے گا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شہادت کی تمنا پوری نہ ہو سکی:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر جب موت آئی تو بستر پر تڑپ رہے تھے اور کہتے ہیں: مولا! تیری شان ہے! سر سے لے کر پاؤں تک پورے بدن کا ایک انچ کی جگہ بھی خالی نہیں، جہاں مجھے زخم نہ آیا ہو، لیکن آج میرے مولا! میں بستر پر مر رہا ہوں۔ تو نے مجھے میدانِ جنگ میں شہادت عطا نہیں فرمائی۔ یہ تیرا فیصلہ ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ''سیف اللہ (اللہ کی تلوار)'' کا لقب عطا فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ کی تلوار کو کافر کیسے توڑ سکتا تھا؟

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝
يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ
مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ
النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ
يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [آلِ عمران: ۱۶۹تا۱۷۵]

”اور (اے پیغمبر!) جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوئے ہیں، انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھنا، بلکہ وہ زندہ ہیں، انہیں اپنے رب کے پاس رزق ملتا ہے۔ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے جو کچھ دیا ہے وہ اس پر مگن ہیں، اور ان کے پیچھے جو لوگ ابھی ان کے ساتھ (شہادت میں) شامل نہیں ہوئے، ان کے بارے میں اس بات پر بھی خوشی مناتے ہیں کہ (جب وہ ان سے آکر ملیں گے تو) نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ اللہ کی نعمت اور فضل پر بھی خوشی مناتے ہیں اور اس بات پر بھی کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ وہ لوگ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار کا فرمانبرداری سے جواب دیا، ایسے نیک اور متقی لوگوں کے لیے زبردست اجر ہے۔ وہ لوگ جن سے کہنے والوں نے کہا تھا: یہ (مکہ کے کافر) لوگ تمہارے (مقابلے) کے لیے (پھر سے) جمع ہو گئے ہیں، لہٰذا ان سے ڈرتے رہنا، تو اس (خبر) نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بول اٹھے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ نتیجہ یہ کہ یہ لوگ اللہ کی نعمت اور فضل لے کر اس طرح واپس آئے کہ انہیں ذرا بھی گزند نہیں پہنچی اور وہ اللہ کی خوشنودی کے تابع رہے۔ اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔ درحقیقت یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، لہٰذا اگر تم مومن ہو تو ان سے خوف نہ کھاؤ، اور بس میرا خوف رکھو۔“

یہ آیات بظاہر صحابہ کی شان میں اتری ہیں، لیکن یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے۔

صحابہ میں سے جو لوگ شہید ہو گئے ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر وہ نہ جاتے تو مارے جاتے، حالانکہ ان کی موت تو ایسے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حیات جاودانی عطا فرمائی ہے۔ اور فرمایا: وہ تو ایسے زندہ ہو گئے کہ حکم دے دیا: ان کو مردہ بھی نہ کہو۔

آخرت کے مسائل ہماری عقل میں نہیں سما سکتے:

(مسئلہ) ہر انسان پر ایک موت آنی ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اب موت کے بعد کیفیات کیا ہوں گی وہ عالم الغیب ہے۔ جب تک اس کو اللہ تعالیٰ خود نہ کھول دیں ہم نہیں سمجھ سکتے۔ مثال کے طور پر: آپ کسی جوہری کے پاس بڑا سا پتھر لے کر جائیں اور اس کو کہیں کہ اس کا وزن کرنا ہے۔ وہ کہے گا کہ یہ اتنا بڑا پتھر ہے، اس کو کیسے وزن کروں؟ آپ کہیں: کمال ہے! ایسے میزان کا کیا فائدہ ہے جو پتھر بھی نہیں تول سکتا؟ حالانکہ وہ پتھر رکھ دیں تو میزان ٹوٹ جائے گا۔ تو جب تیری عقل بھی اتنا چھوٹا سا میزان ہی ہے تو

اس میں عالم آخرت، برزخ کیسے سمائے گا جب تک کہ تم اپنے آپ کو محمد مدنی ﷺ کے تابع نہیں کرو گے؟ اور جب ہم نے کہہ دیا کہ میرا اللہ! ہماری عقل بھی ناقص ہے اور جو محمد مدنی ﷺ کا فرمان ہے وہ حق ہے۔ اس طرح بات واضح ہو جائے گی اور کسی قسم کی کوئی پریشانی باقی نہیں رہے گی۔

دو قبروں کو عذاب کا واقعہ:

حضور اکرم ﷺ کا دو قبروں پر گزر ہوا تو آپ نے فرمایا: ((إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لاَ يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ، وَأَمَّا الآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ)) دو قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے اور کسی بڑی چیز کی وجہ سے عذاب نہیں ہو رہا جس کو یہ لوگ معمولی سمجھتے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو پکڑ لیا ہے: ان میں ایک ایسا تھا جو پیشاب کے قطروں کا خیال نہیں کرتا تھا اور دوسرا آدمی چغل خوری کرتا تھا۔ [بخاری، رقم: ۲۱۸]

بعض ہمارے بھائیوں کے دماغ کے اندر ہوتا ہے کہ مسلمان کی روح علیین میں اور کافروں کی روح سجین میں ہوتی ہے تو پھر قبر کا عذاب کیسے ہو رہا ہے؟ تو سمجھیں کہ حضور اکرم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان کی روحوں پر عذاب ہو رہا ہے، بلکہ قبر پر کھڑے ہو کر فرمایا: ان دو قبر والوں پر عذاب ہو رہا ہے۔ اور پھر آپ نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ سامنے سے کھجور کی ایک چھڑی لے آؤ۔ وہ لے آیا تو آپ نے اس کے دو حصے کر کے: ایک اس کی قبر پر لگا دی اور ایک اس کی قبر پر لگا دی۔ اور فرمایا: میں اللہ سے امید کرتا ہوں کہ جب تک یہ ٹہنیاں سرسبز رہیں گی، ذکر کرتی رہیں گی، اللہ ان کے عذاب میں تخفیف فرما دیں گے۔ اب آپ خود سوچیں کہ اللہ کے نبی نے وہ ٹہنیاں قبر پر لگائیں یا کسی اور جہان میں تشریف لے گئے تھے؟

شہداء صحابہ کا اعزاز:

ان آیات مبارکہ میں مشرکین کا رد اور مومنین کے لیے بشارت ہے۔ کافروں نے احد کی جنگ جیتنے کے بعد نعرہ لگایا تھا: ((يَوْمٌ بِيَوْمِ بَدْرٍ)) دیکھو! آج ہم نے بدر کا بدلہ لے لیا۔ تو میرے آقا سرکار مدینہ ﷺ نے تو اسی وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ اس کو جواب دو کہ تمہارے جو مارے گئے وہ جہنم میں گئے، ہمارے جو قتل ہوئے وہ جنت میں گئے، لہٰذا ہم کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ مومن تو ہر حال میں فائز المرام اور کامیاب ہے۔ زندہ ہے تو غازی کہلائے گا اور اگر اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل ہو گیا تو شہید کہلائے گا۔ اور شہید کا اتنا بڑا مقام ہے، اس کو

ایسی حیات مل رہی ہے کہ جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

دوسرا ان آیات کے اندر مومنین کے لیے استبشار اور اعزاز ہے کہ آنکھوں کے سامنے کٹ جانے والے لوگ، جنگ احد میں جو ٹکڑے ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! ان کو مردہ مت کہو۔ اے اللہ! وہ تو ہمارے سامنے مر رہے ہیں!؟ فرمایا: قتل تو ہو گئے، موت ان کو آئی، لیکن اس کے بعد ان کو مردہ نہ کہو۔ کیا احتراماً مردہ نہ کہیں؟ فرمایا: ﴿بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾ بلکہ وہ زندہ ہیں۔ کیا اعزازی طور پر زندہ ہیں؟ فرمایا: اعزاز و اکرام نہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں اور رزق دیے جاتے ہیں۔ جیسے دنیا میں زندہ کو رزق دیا جاتا ہے۔

یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: ﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ [البقرۃ:۷]، فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۖ﴾ [النحل:۱۰۸] اور فرمایا: ﴿أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ﴾ [الجاثیۃ:۲۳]۔ یعنی: کافروں کو ہدایت نہیں مل سکتی اور ان کے لیے ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ تو خود سوچیں! جب دل کام نہ کرے، قوتِ سامعہ بھی کام نہ کرے اور قوتِ باصرہ بھی کام نہ کرے تو ہدایت کے لیے سارے راستے بند ہو گئے۔

علمی نکتہ:

ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے کانوں کا ذکر پہلے کیا ہے اور آنکھوں کا ذکر بعد میں کیا ہے اور جہاں آنکھوں کا ذکر مقدم کیا ہے وہاں مہر کی بات نہیں فرمائی۔

یاد رکھیں! اس کی وجہ علماء نے بیان فرمائی ہے کہ دنیا کے اندر جتنے علم حاصل ہوتے ہیں وہ سمعی ہوتے ہیں، بصری ہوتے ہیں۔ جتنے علوم ہیں چونکہ وہ اکثر سمعی ہیں، مثلاً: جنت کے بارے میں سنا ہے، دیکھا نہیں ہے، نعیم جنت ہیں، لیکن ہم نے دیکھا نہیں ہے، جنت میں حوریں ہیں، لیکن ہم نے دیکھی نہیں ہیں، رضوان ہیں ہم نے دیکھا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا عرش ہے ہم نے دیکھا نہیں ہے، سدرۃ المنتہیٰ ہے، لیکن ہم نے دیکھا نہیں ہے، ملائکہ ہیں لیکن ہم نے دیکھے نہیں ہیں۔ یہ سارے علوم ہیں، سننے سے حاصل ہوئے ہیں؛ کیونکہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔

کسی چیز کا نظر نہ آنا نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے:

ویسے بھی اگر غور کریں تو سننے کا علم پہلے ہوتا ہے، مثلاً: اگر آپ سوئے ہوئے ہوں، کوئی آدمی دروازہ کھٹکھٹائے تو پہلے کانوں میں آواز آئے گی۔ آپ اٹھیں گے اور پھر جا کر دیکھیں گے۔ اس لیے اگر آدمی ہر بات پر مطالبہ کرنا شروع کردے کہ میں نے نہیں دیکھا تو ساری دنیا کے علوم بصری نہیں ہیں کہ دیکھنے سے حاصل ہوں تو کسی چیز کا نہ دیکھنا اس کے نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ اس لیے اب جب ہم نے اپنی عقل کی عینک اتار دی اور اپنے تمام حواس خمسہ کو سرکار مدینہ کے تابع کر دیا تو سارے مسئلے حل ہو گئے کہ آپ نے فرمایا: جنت ہے۔ ہم نے کہا: بالکل ہے۔ آپ نے فرمایا: میں خود جنت میں داخل ہوا ہوں۔ تو اب ہم فرقہ معتزلہ یا فرقہ ضالہ کے چکر میں کیوں آ جائیں؟ یا دنیا کے فلسفیوں کی اس الجھن میں کیوں آئیں کہ جنت کہاں ہے اور ہم تو چاند تک چلے گئے، ہم نے زمین کے مدار کے گرد چکر لگا ڈالے ہیں، ہمیں تو کہیں جنت نظر نہیں آئی ہے؟ تو ہم ان جاہلوں کی بات مان لیں یا فرمان محمد مصطفیٰ ﷺ کو مان لیں!؟ حالانکہ یہ تو ستارے نہیں گن سکے، سمندر کی گہرائی کی پیمائش نہیں کر سکے، تم تو ابھی تک یہ نہیں بتا سکتے کہ مشتری اور زحل کا طول وعرض کتنا ہے؟ تو تم کیسے انکار کر سکتے ہو کہ جنت نہیں ہے۔ ہمیں ہمارے پیارے نبی ﷺ نے کہہ دیا ہے، ہم نے سن لیا ہے اور سننے سے ہم نے تمام علوم قبول کر لیے ہیں۔ جب ہم نے اپنی عینک اتار کر اپنی نظر کو حضور اکرم ﷺ کی نظر کے تابع کر دیا تو سارے مسئلے حل ہو گئے، کوئی پریشانی نہ رہی۔

ان آیات کے اندر بھی ہم عقل لڑائیں کہ مر گئے تو وہ کیسے زندہ ہوئے؟ اگر ہم عقل کے گھوڑے دوڑاتے رہیں گے تو کبھی بات سمجھ نہیں آئے گی اور جب ہم اپنی عقل کو قرآن وسنت کے تابع کر دیں گے تو ایک منٹ میں بات سمجھ آجائے گی کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں نے دیکھا میرا صحابی ہے اور اللہ کے فرشتوں کے ساتھ اڑ رہا ہے۔ تو جب حضور اکرم ﷺ نے دیکھ لیا تو آپ کے دیکھنے کے بعد ہماری کیا حیثیت ہے؟ اصل دھوکہ اس لیے لگتا ہے کہ جب ہم اپنی قدرت پر، اپنی طاقت پر اور اپنی عقل پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو قیاس کر لیتے ہیں کہ ہم نہیں کر سکتے۔ حالانکہ یہ نہیں سوچتے کہ ہم کیا ہیں اور ہماری کیا حیثیت ہے؟؟

بئر معونہ میں دعوت کے لیے جانے والے صحابہ کی شہادت:

(حدیث) محمد بن جریر رحمہ اللہ نے اپنی سند سے حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ان صحابہ کو جن کو

حضور پاک ﷺ نے بئر معونہ کی طرف بھیجا تھا، فرماتے ہیں: یہ مجھے یاد نہیں کہ وہ چالیس تھے یا ستر تھے۔ اور اس پانی پر اس وقت عامر بن طفیل الجعفری کا قبضہ تھا۔ جب اصحابِ رسول پاک کی جماعت آئی تو نزدیک پہاڑ میں ایک غار تھی جو اس پانی کے اوپر تھی، اس غار میں اتر گئے اور کہا کون ہے جو حضور پاک ﷺ کی طرف سے جا کر اہل بئر معونہ کو دعوت دے؟ تو شاید ابن ملحان انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں جا کر حضور اکرم ﷺ کی دعوت پہنچاتا ہوں۔ وہ آئے اور ان کے گھر کے قریب جا کر کھڑے ہوئے اور ان سے کہا: مجھے اللہ کے نبی ﷺ نے بھیجا ہے، سب سے پہلے میں خود گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ، اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ تم بھی اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔ ان کے مکانوں کے پیچھے سے ایک آدمی نکلا اور وہ نیزہ لے کر آیا اور ان صحابی کو مارا تو نیزہ دوسری طرف سے نکل گیا۔ جب ان کو نیزہ لگا تو انہوں نے فرمایا: ''فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ'' [بخاری، رقم: ۴۰۹۱] مجھے اللہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ صحابی کے قدموں کے نشانات پر چلتے ہوئے اس غار تک پہنچ گئے تو وہاں جتنے صحابہ تھے سب کو شہید کر دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی آیت نازل فرمائی، جس میں ان کی طرف سے خبر دی گئی تھی: ﴿أَنْ بَلِّغُوا قَوْمَنَا أَنْ قَدْ لَقِينَا رَبَّنَا فَرَضِيَ عَنَّا﴾ [بخاری، رقم: ۴۰۹۰] کہ ہماری قوم کی طرف یہ خبر پہنچا دی جائے کہ ہم اپنے پروردگار سے اس حال میں ملے کہ وہ ہم سے راضی اور ہم اس سے راضی ہیں۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پہلے کچھ عرصہ ہم اس کو پڑھتے رہے، اس کے بعد آیت تلاوت کے اعتبار سے بھی منسوخ ہو گئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿١٦٩﴾﴾۔ [بخاری، رقم: ۲۸۰۱]

شہداء کی حیات کی کیفیت کی ایک صورت:

حضرت مسروق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جو میرے راستے میں شہید ہو گئے ان کو مردہ نہ کہو، زندہ ہیں اور رزق دیئے جاتے ہیں۔ تو حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس آیت کے بارے میں ہم نے خود حضور اکرم ﷺ سے پوچھا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((أَرْوَاحُهُمْ فِي جَوْفِ طَيْرٍ خُضْرٍ، لَهَا قَنَادِيلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ، تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ، ثُمَّ تَأْوِي إِلَى تِلْكَ الْقَنَادِيلِ، فَاطَّلَعَ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمُ اطِّلَاعَةً، فَقَالَ: هَلْ تَشْتَهُونَ شَيْئًا؟ قَالُوا: أَيَّ شَيْءٍ نَشْتَهِي وَنَحْنُ نَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شِئْنَا، فَفَعَلَ ذَلِكَ بِهِمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَلَمَّا رَأَوْا أَنَّهُمْ لَنْ يُتْرَكُوا

مِنْ أَنْ يُسْأَلُوا، قَالُوا: يَا رَبِّ! نُرِيدُ أَنْ تَرُدَّ أَرْوَاحَنَا فِي أَجْسَادِنَا حَتَّى نُقْتَلَ فِي سَبِيلِكَ مَرَّةً أُخْرَى، فَلَمَّا رَأَى أَنْ لَيْسَ لَهُمْ حَاجَةٌ تُرِكُوا)) [مسلم،رقم:۱۸۸۷]

اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز شکل کے پرندوں کے اندر رکھا ہے اور ان کے پنجرے عرش کے نیچے لٹکے ہوئے ہیں اور وہ جنت کی سیر کرتے ہیں، جنت سے جہاں چاہتے ہیں کھاتے ہیں اور پھر انہی قنادیل (پنجروں) کے اندر جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: تمہیں اور کوئی چیز چاہیے؟ انہوں نے کہا: اللہ میاں! اور کون سی نعمت ہمیں چاہیے؟ ہم جنت کی سیریں کر رہے ہیں اور اس کا رزق کھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ بات تین دفعہ ارشاد فرماتے ہیں اور وہ کہتے ہیں: مولیٰ! ہماری ایک تمنا ہے کہ آپ ہمیں ایک دفعہ دوبارہ دنیا میں بھیجیں، زندہ کریں، تاکہ ہم آپ کے راستے میں دوبارہ شہید ہو جائیں۔ لیکن چونکہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ جو اس دنیا سے گیا وہ واپس نہیں آئے گا، اس لیے جب اللہ تعالیٰ دیکھتے ہیں کہ ان کو کوئی حاجت نہیں تو ان کو چھوڑ دیتے ہیں۔

صرف شہید کو دنیا میں لوٹنے کی خواہش ہوتی ہے:

(حدیث) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَفْسٍ تَمُوتُ، لَهَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ، يَسُرُّهَا أَنَّهَا تَرْجِعُ إِلَى الدُّنْيَا، وَلَا أَنَّ لَهَا الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا، إِلَّا الشَّهِيدُ، فَإِنَّهُ يَتَمَنَّى أَنْ يَرْجِعَ، فَيُقْتَلَ فِي الدُّنْيَا لِمَا يَرَى مِنْ فَضْلِ الشَّهَادَةِ)) [مسلم،رقم:۱۸۷۷]

جو بندہ اللہ کے راستے میں مر گیا، اس کو خوشی نہیں ہوتی کہ اس کو دوبارہ دنیا میں لوٹایا جائے؛ کیونکہ وہ خیر میں ہے، مگر شہید کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ مجھے پھر دنیا میں لوٹایا جائے، تاکہ میں اللہ کے راستے میں دوبارہ شہید ہو جاؤں؛ کیونکہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ نے جنت دے دی وہ مطمئن ہے، لیکن شہید جب دیکھتا ہے کہ شہادت میں اتنے درجات ہیں تو وہ کہتا ہے کہ اللہ میاں! مجھے پھر دنیا میں واپس بھیجو، پھر تیرے راستے میں شہید ہو جاؤں، تاکہ مجھے شہادت کا مرتبہ اور زیادہ ملے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد کا اعزاز:

(حدیث) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا:

((أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ أَحْيَا أَبَاكَ، فَقَالَ لَهُ: تَمَنَّ عَلَيَّ، فَقَالَ: أُرَدُّ إِلَى الدُّنْيَا، فَأُقْتَلُ مَرَّةً

أُخرٰى، فَقَالَ: إِنِّي قَضَيْتُ، أَنَّهُمْ إِلَيْهَا لَا يُرْجَعُونَ)) [مسند احمد، رقم: ۱۴۸۸۱]

تجھے پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے والد کو دوبارہ زندہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ کو حکم دیا کہ مانگو کیا مانگتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ میاں! مجھے دنیا میں دوبارہ بھیج دو، تا کہ تیرے راستے میں دوبارہ شہید ہو جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تقدیر کا فیصلہ ہے کہ جس پر ایک دفعہ موت آگئی تو اب وہ دوبارہ دنیا میں نہیں لوٹایا جائے گا۔

صحیحین میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد کا نام عبداللہ بن عمرو بن حرام الانصاری رضی اللہ عنہ تھا، وہ احد کے دن شہید ہو گئے۔

بخاری شریف کے اندر روایت ہے کہ ابن المنکدر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سنا کہ میرے ابا جان شہید ہو گئے تو میں رو رہا تھا اور اپنے ابا کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر دیکھتا تھا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم مجھے روک رہے تھے کہ مت روؤ، لیکن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے منع نہیں فرمایا۔ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نہ روؤ یا، فرمایا کہ تم کیوں رو رہے ہو؟ تمہیں پتہ نہیں کہ تیرے ابا کا تو یہ مقام ہے کہ اللہ کے فرشتے اپنے پروں کا سایہ کر کے کھڑے رہے، حتیٰ کہ ان کو لے کر چلے گئے۔ [بخاری، رقم: ۴۰۸۰]

یاد رکھیں! اگر کسی کا باپ، بیٹا، بھائی فوت ہو گیا اور آدمی آنسو بہا رہا ہے تو یہ منع نہیں بلکہ آنسو بہانا تو اللہ کی رحمت کی دلیل ہے کسی کی موت پر ماتم کرنا منع ہے۔ یعنی آدمی کپڑے پھاڑ دے، سر پر مٹی ڈالے، چہرے پر تھپڑ مارے اور رو رو کر فریادیں کرے اور آواز نکالے جیسا کہ آج کل مروجہ ماتم ہیں کہ عورتیں اکٹھی ہو کر رو رہی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑا آدمی تھا، بڑی دنیا رو رہی تھی۔

شانِ نزول:

(حدیث) حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَمَّا أُصِيبَ إِخْوَانُكُمْ بِأُحُدٍ، جَعَلَ اللّٰهُ أَرْوَاحَهُمْ فِي أَجْوَافِ طَيْرٍ خُضْرٍ، تَرِدُ أَنْهَارَ الْجَنَّةِ، وَتَأْكُلُ مِنْ ثِمَارِهَا، وَتَأْوِي إِلَى قَنَادِيلَ مِنْ ذَهَبٍ فِي ظِلِّ الْعَرْشِ، فَلَمَّا وَجَدُوا طِيبَ مَشْرَبِهِمْ وَمَأْكَلِهِمْ، وَحُسْنَ مُنْقَلَبِهِمْ قَالُوا: يَا لَيْتَ إِخْوَانَنَا! يَعْلَمُونَ مَا صَنَعَ اللّٰهُ لَنَا لِئَلَّا يَزْهَدُوا فِي الْجِهَادِ، وَلَا يَنْكُلُوا

عَنِ الْحَرْبِ، فَقَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: أَنَا أُبَلِّغُهُمْ عَنْكُمْ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ هذه الْآيَاتِ ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾)) [مسند احمد، رقم:۲۳۸۸]

تمہارے بھائی یعنی صحابہ جب احد کے دن شہید ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو پرندوں میں رکھا۔ وہ جنت کی نہروں پر آتے ہیں، جنت کے پھل کھاتے ہیں اور عرش کے نیچے سونے کے پنجروں میں آرام کرتے ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ہمیں ایسی ایسی نعمتیں کھانے کو مل رہی ہیں، رہنے کو مل رہی ہیں، کہنے لگے: اے کاش! ہمارے بھائی جو دنیا میں زندہ ہیں، انہیں بھی پتہ چلتا کہ اللہ تعالیٰ شہیدوں کو کیا انعام دیتا ہے؟ تاکہ وہ بھی دنیا میں زیادہ رغبت نہ کرتے اور جہاد میں بزدلی نہ دکھاتے، بلکہ اللہ کے راستے میں شہید ہوجاتے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہاری یہ تمنا اور خواہش تمہارے بھائیوں کو میں پہنچا دیتا ہوں تو اللہ پاک نے قرآن میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾۔

(حدیث) ابوبکر ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حدیث نقل فرمائی ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ ایک دن مجھے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا اور فرمایا:

((يا جابر مالي أَرَاكَ مُهْتَمًّا؟ قَالَ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اسْتُشْهِدَ أَبِي وَتَرَكَ دَيْنًا وَعِيَالًا، قَالَ: فَقَالَ: أَلَا أُخْبِرُكَ مَا كَلَّمَ اللّٰهُ أَحَدًا قَطُّ إِلَّا مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ، وَإِنَّهُ كَلَّمَ أَبَاكَ كِفَاحًا......))

[دلائل النبوۃ للبیہقی: ۲۹۹/۳]

اے جابر! کیا بات ہے تم بڑے غمگین اور اداس ہو؟ تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میرے ابا شہید ہو گئے اور بہت بڑا قرض اور عیال چھوڑ گئے ہیں، قرض ادا کرنا ہے، اس کا مجھ پر بوجھ ہے، اس لیے میں غمگین اور اداس ہوں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جابر! کیا تجھے پتہ بھی ہے کہ تمہارے ابا کی شان کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی سے بغیر پردے کے بات نہیں کی، لیکن تیرے ابا کی شان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر حجاب کے آمنے سامنے بات کی ہے اور اللہ پاک نے ان سے فرمایا: مانگو کیا مانگتے ہو؟ تو تیرے ابا نے کہا: اللہ! مجھے دنیا میں پھر بھیجو، میں تیرے راستے میں شہید ہونا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تو میری قضا وقدر کا فیصلہ ہے کہ جن لوگوں کو موت آ گئی ان کو پھر دنیا میں نہیں بھیجا جائے گا۔ تو انہوں نے کہا: اے میرے رب! میرے پچھلوں کو یہ بات پہنچا دیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾۔

ایک بات سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہیں کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ عالم آخرت میں تو ہر مومن کو اللہ کا دیدار ہوگا۔ ہر وہ بندہ جس کو ایمان پر موت آئی یا ایمان پر مرے گا اس کو اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اپنا دیدار کرائیں گے۔ اور وہ دیدار اتنا کھلا اور واضح ہوگا کہ حضور اکرم ﷺ نے چودھویں کے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا: میرے صحابہ! کیا تمہیں اس میں کوئی شبہ ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اس میں کیا شبہ ہے؟ پہلی رات کے چاند میں تو شبہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو نظر آیا اور کسی کو نہ آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت والے دن تم سب ایسے اپنے رب کا دیدار کرو گے اور اپنے رب کے دیدار میں تمہیں کوئی شبہ نہیں ہوگا۔

رہا عالم برزخ، اس کا ایک سرا دنیا کے ساتھ ہے اور دوسرا سرا عالم آخرت کے ساتھ ہے۔ لہٰذا جب آدمی عالم دنیا سے عالم برزخ میں منتقل ہو گیا، اگر اللہ تعالیٰ کسی کو وہاں زیارت کرا دیں تو کوئی انکار کی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو اس پر قادر ہیں۔ اصل مسئلہ تو دنیا کے اندر ہے؛ کیونکہ ہر عالم کے لیے اللہ کے اپنے احکام ہیں۔

(حدیث) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیرے ابا کو زندہ کیا اور فرمایا: مانگو کیا مانگتے ہو؟ انہوں نے کہا: اے اللہ میاں! میں نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا اور ہم تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکتے، آپ مجھے دنیا میں دوبارہ بھیجیں، تاکہ میں تیرے نبی کے ساتھ ہو کر کافروں سے لڑوں اور پھر تیرے راستے میں دوسری مرتبہ شہید ہو جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ میرا فیصلہ ہے کہ اب ہم دنیا میں کسی کو نہیں لوٹائیں گے۔ [دلائل النبوۃ للبیہقی: ۳/۲۹۹]

بعض شہداء کی ارواح جنت کی نہر پر:

(حدیث) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((الشُّهَدَاءُ عَلَى بَارِقٍ نَهَرٍ بِبَابِ الْجَنَّةِ فِي قُبَّةٍ خَضْرَاءَ، يَخْرُجُ عَلَيْهِمْ رِزْقُهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ بُكْرَةً وَعَشِيًّا))

[مسند احمد، رقم: ۲۳۹۰]

جنت کے دروازے پر ایک نہر ہے، شہداء اس پر ہیں۔ وہاں ایک سبز گنبد بنا ہوا ہے اس سے آتے ہیں اور انہی میں سے ان کا رزق صبح شام بھیجا جاتا ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: شہیدوں کے بھی مرتبے ہیں کہ بعض پرندوں کے اندر سیر کر رہے ہیں اور بعض جنت کے

دروازے پر اس نہر پر ہیں یا یہ ہے کہ سیر کرتے ہیں، یہاں پہنچتے ہیں اور یہاں ان کو جنت کی خوراک ملتی ہے اور اس کے بعد وہ اپنے اپنے مقام پر چلے جاتے ہیں۔

مسند احمد میں ایک اور حدیث بھی آئی ہے جس کے اندر مومن کو یہ بشارت ملی ہے کہ جو بھی مومن ہیں اور ان کی موت ایمان پر آگئی اللہ ان کی روحوں کو بھی جنت میں بھیجتے ہیں، وہ بھی سیر کرتے ہیں، وہ بھی جنت کے پھلوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کو بھی سرور اور لذت حاصل ہوتی ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بہت بڑی عظیم اور صحیح سند والی حدیث ہے اور اس کی بڑی شان ہے کہ اس میں تین امام سند کے اندر موجود ہیں کہ اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے محمد بن ادریس الشافعی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے مالک بن انس رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے امام زہری رحمہ اللہ سے، انہوں نے کعب بن مالک رحمہ اللہ سے اور انہوں نے اپنے والد سے اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّمَا نَسَمَةُ الْمُؤْمِنِ طَائِرٌ يَعْلَقُ فِي شَجَرِ الْجَنَّةِ، حَتَّى يَرْجِعَ إِلَى جَسَدِهِ يَوْمَ يُبْعَثُ)) [سنن ابن ماجہ، رقم: ۴۲۷۱] مومن کی روح ایک پرندے کی شکل میں ہے جو جنت کے اندر ہے، یہاں تک اللہ اس کو لوٹائیں گے اس کے بدن میں جس دن اس کو قیامت میں اٹھائیں گے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان دونوں حدیثوں کے اندر بہت بڑا فرق ہے کہ مومن کی روح کو اللہ تعالیٰ پرندے کی شکل دے دیں گے کہ چلو پھرو اور کھاؤ، لیکن شہداء کی روح کو سبز پرندوں کے اندر رکھیں گے، وہ پرندے ان کو لے کر اڑیں گے۔ تو ایک ہے آدمی کا خود اڑنا اور دوسرا ہے کہ پرندے کا ان کو لے کر اڑنا، دونوں کے مقام کے اندر آسمان اور زمین کا فرق ہے۔ اور شہداء کی ارواح عام مومنین کو ایسے نظر آئیں گی اور وہ اتنی بلندی پر ہوں گی جیسا کہ ہم ستاروں کو بلندی پر دیکھتے ہیں۔ [ابن کثیر]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَرِحِينَ بِمَآ آتٰهُمُ اللّٰهُ مِن فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٧٠﴾﴾ شہداء خوش ہوں گے جو اللہ ان کو نعمتیں دیں گے، یعنی وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس ہیں اور جو اللہ نے ان کو نعمتیں دی ہیں ان پر بڑے خوش ہیں اور اس پر بھی خوش ہیں کہ ہمارے بعد ہمارے ایمان والے بھائی اللہ کے راستے پر شہید ہو کر آئیں گے تو ان کو بھی یہ مقام ملے گا اور ان کو آگے آنے والے وقت کا بھی ڈر نہیں ہے؛ کیونکہ وہ تو بخشے گئے ہیں اور جو انہوں نے چھوڑا اس کا انہیں کوئی غم نہیں ہے۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ ان کے پیچھے آنے والے بھائی بھی جہاد میں لگے رہیں گے اور شہادت کی موت پا کر وہ بھی شہادت کی نعمتوں میں ہمارے ساتھ شریک بنیں گے۔

شہداء پر ایک اور نعمت:

حضرت سدی رحمہ اللہ نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ شہیدوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ ملائکہ کو حکم دیتے ہیں، وہ آ کر ان کو ایک کتاب دیتے ہیں۔ اس میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں آدمی فلاں دن مرے گا اور تمہارے پاس آئے گا۔ تو جب ان شہداء کو ان کے آنے کی اطلاع دی جاتی ہے تو وہ بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے اور بھائی بھی آ رہے ہیں، ہماری ان سے ملاقات ہوگی۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے ان کو شہداء میں داخل کیا اور انہوں نے شہداء کی عزت دیکھی تو وہ بڑے خوش ہو کر کہیں گے: کاش! کوئی ذریعہ ہوتا کہ ہم اپنے دوستوں کو خبر کرتے کہ شہید کا یہ مقام ہے، لہٰذا تم پیچھے نہ رہ جانا، جہاد کرو اور شہادت کی موت پا کر آؤ۔ جب انہوں نے یہ تمنا کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان شہیدوں سے فرمایا: تم جو تمنا کر رہے تھے ہم نے تمہارے نبی کے ذریعہ ان کو خبر پہنچا دی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۱۶۵]

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت موجود ہے کہ اصحاب بئر معونہ جو ستر آدمی تھے اور ایک وقت میں شہید ہوئے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کی اطلاع ملی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کئی دن تک فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھتے رہے اور ان لوگوں پر لعنت کرتے رہے جنہوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو شہید کیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان شہداء کی شان میں قرآن کی یہ آیات اتاریں: ﴿بَلِّغُوا عَنَّا قَوْمَنَا أَنَّا لَقِينَا رَبَّنَا فَرَضِيَ عَنَّا وَأَرْضَانَا﴾ [بخاری، رقم: ۴۰۹۰] یعنی ہماری طرف سے ہماری قوم کو یہ پیغام پہنچا دو کہ ہم نے اپنے رب سے ملاقات کی ہے۔ وہ ہم سے راضی ہے اور اس نے ہمیں راضی کر دیا ہے۔

اس کے بعد یہ آیات منسوخ ہو گئیں اور یہ آیات اتریں جن کو ابھی تلاوت کر رہے ہیں۔

عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت نے تمام مومنین کو جمع کر دیا، خواہ وہ شہداء ہوں یا ان کے علاوہ۔ اور اللہ تعالیٰ اکثر جہاں انبیاء اور ان کے ثواب کا ذکر کرتے ہیں تو وہیں ان انبیاء کے بعد اہل ایمان کے ثواب کا ذکر بھی فرماتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۱۶۵]

﴿اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے وہ بندے جنہوں نے میرے مدنی پاک ﷺ کی فرمانبرداری واطاعت کی اور جاں نثاری کی باوجود اس کے کہ وہ زخمی ہوئے اور ان کو تکلیفیں پہنچیں، لیکن انہوں نے میرے مدنی کی پوری پوری اطاعت کی۔

اس کا اصل واقعہ یہ ہے کہ جب جنگ احد ہوئی، اس میں ستر صحابہ شہید ہوگئے، مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی، سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ابا شہید ہوگئے، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے، بڑے بڑے کئی صحابہ شہید ہوگئے، آپ کے چہرہ مبارک پر زخم آئے اور آپ کا دانت مبارک شہید ہوگیا۔ اس سب کے بعد جب کافر مدینہ منورہ سے دور ہوکر راستہ میں مشورہ کرنے لگے کہ ہم نے تو بڑی غلطی کی ہے۔ جب ہم جنگ جیت گئے تھے تو یہی موقع تھا کہ ہم مدینہ منورہ پر قبضہ کر لیتے، آج مسلمانوں کی طاقت شکست میں بدل چکی تھی، ہم مدینہ پر حملہ کر دیتے اور آج فیصلہ ہو جاتا کہ مسلمانوں کی قوت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی۔

حضور اکرم ﷺ کو ان کے مشورہ کی خبر ملی اور دوسری روایت آپ پڑھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل کو بھیجا، انہوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے جنگ کے لباس کو اتار دیا ہے، لیکن ہم نے تو ابھی تک نہیں اتارا، ہم تو ابھی تک اسی لباس میں کھڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مشرکین کا تعاقب کریں۔ تو حضور اکرم ﷺ نے آواز دی کہ جو لوگ احد میں میرے ساتھ تھے ان کے علاوہ اور کوئی نہ آئے، ہم کافروں کے تعاقب میں جاتے ہیں، تاکہ کافروں کو پتہ چل جائے کہ مسلمانوں کی قوت وطاقت موجود ہے، وہ اب بھی لڑ سکتے ہیں۔ وہ شکست تو اللہ کی طرف سے ایک امتحان تھا جو ہمارے ساتھ ہوگیا۔ تو جتنے صحابہ تھے زخمی ہوگئے تھے، لیکن انہوں نے کہا: ہم حاضر ہیں۔ جب صحابہ آپ کے ساتھ چلے اور بدر صغریٰ تک کافروں کا تعاقب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ وہ واپس آنے کی جرأت نہ کر سکے اور وہ مکہ لوٹ گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی! تیرے وہ پروانے جنہوں نے زخم کھالیے، لیکن پھر بھی تیرے حکم کی اطاعت کی، یہ لوگ ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجر عظیم رکھا ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت جابر کو اجازت دی اور کسی کو اجازت نہیں ملی کہ تم چل سکتے ہو، وہ زخموں کے ساتھ کہ خون بہہ رہا تھا، لیکن صحابہ پھر بھی تعاقب میں چل پڑے۔

شانِ نزول:

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب مشرکین احد کی لڑائی کے بعد واپس راستے میں اکٹھے ہو کر کہنے لگے: "لَا مُحَمَّدًا قَتَلْتُمُوهُ، وَلَا الْكَوَاعِبَ أَرْدَفْتُمْ، وَبِئْسَ مَا صَنَعْتُمْ ارْجِعُوا" [السنن الکبریٰ للنسائی، رقم: ۱۱۰۱۷] کہ تم نے کیا کیا ہے!! اللہ کے نبی کو بھی قتل نہ کیا اور تم ان کی نوجوان لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ نہیں لائے، تم نے برا کیا ہے، تم واپس چلو۔ دوسری طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر حمراء الاسد تک آئے اور ایک روایت میں ہے کہ بئر ابی عیینہ کے قریب آگئے تھے۔ لیکن ابوسفیان نے کہا کہ ہم نہیں لڑتے، اب ہم اگلے سال جنگ لڑیں گے۔ اس طرح ابوسفیان مکہ واپس چلا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس لیے اس کو بھی غزوہ کہتے ہیں؛ کیونکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾۔ [السنن الکبریٰ للنسائی، رقم: ۱۱۰۱۷]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد کا جسم محفوظ تھا:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرے ابا حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ جب جنگ احد میں شہید ہو گئے تو میں نے دل میں سوچا کہ آج تو اتنے شہید ہیں کہ ایک ایک قبر میں دو دو، تین تین دفن ہو رہے ہیں۔ کاش! مجھے موقع ملتا تو میں اپنے ابا کو علیحدہ دفن کرتا۔ پھر کافی عرصہ گزر گیا، حالات بدل گئے اور احد میں پانی آ گیا تو مجھے موقع ملا کہ میں اپنے ابا کی قبر علیحدہ بنا دوں۔ جب میں نے اپنے ابا کو جا کر نکالا تو دیکھا کہ جیسے ان کو آج ہی دفن کیا گیا ہو، ان میں کوئی تغیر نہیں آیا تھا۔

اسی طرح بعض صحابہ کے بارے میں یہ باتیں بھی آئی ہیں کہ جب ان کی قبر مبارک کھولی گئی تو ان کا پاؤں ظاہر ہو گیا۔ اور بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ بعض صحابہ اور شہیدوں کے پاؤں کو کوئی کلہاڑی لگی تو خون جاری ہو گیا۔ تو ایسے واقعات اللہ تعالیٰ کبھی کبھی کھول دیتے ہیں۔ ورنہ عالم برزخ ہے، عالم مغیبات ہے، اس عالم کو ہم سمجھ نہیں سکتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے تو ہمارا ایمان ہے کہ شہداء زندہ ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج والی رات وہ لوگ دکھائے جو چغل خور تھے اور ان کو عذاب ہو رہا تھا۔ وہ لوگ دکھائے جو زانی تھے، ان کو عذاب ہو رہا تھا۔ اور وہ لوگ دکھائے جو سود کھانے والے تھے اور ان کو عذاب ہو رہا تھا۔ جتنا قرآن اور احادیث رسول میں ہے آدمی اس پر قائم رہے۔ نہ اپنی طرف سے ایک لفظ کا

اضافہ کرے اور نہ اپنی طرف سے کوئی کمی کرے۔ ورنہ آدمی پٹڑی سے ہٹ جائے گا، بھٹک جائے گا۔

جنگ احد کے بعد حضور ﷺ کا تعاقب کرنے کا مقصد:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب احد کی لڑائی ہوئی، ہفتہ کا دن تھا، پندرہ شوال تھی اور جب اتوار کا دن آیا سولہ شوال کی رات تھی کہ حضور ﷺ کے منادی نے ندا دی کہ اے صحابہ! دشمن کے تعاقب کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور یہ بھی اعلان کیا کہ کافروں کے تعاقب میں ہم جا رہے ہیں اور ہمارے ساتھ صرف وہ مجاہدین جائیں گے جو کل احد میں ہمارے ساتھ تھے۔ تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری سات بہنیں ہیں، جب جنگ احد کی ندا آئی تو میرے ابا نے مجھے بلا کر کہا: میں بھی جا رہا ہوں، تم بھی چلے جاؤ گے تو لڑکیاں اور بچے کن کے حوالے کریں گے؟ اس لیے تم یہاں رہو اور میں جہاد میں جاتا ہوں۔ اور میں یہ بھی نہیں کر سکتا کہ تمہیں بھیجوں اور میں پیچھے رہ جاؤں، میں تو حضور ﷺ کے ساتھ جاؤں گا، ورنہ میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ حضور ﷺ نے ان کو اجازت دے دی کہ تم بھی ساتھ جا سکتے ہو، ورنہ اور کسی کو اجازت نہیں ملی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ حضور ﷺ کے دشمن کو مرعوب کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے، تاکہ ان تک یہ بات پہنچ جائے کہ احد کی پسپائی نے مسلمانوں کو دشمن سے کمزور نہیں کیا، ابھی ان کو قوت حاصل ہے۔
[تفسیر ابن کثیر: ۲/۱۶۶]

دو زخمی صحابہ کی عالی ہمتی:

حضرت ابو السائب مولی عائشہ بن عثمان روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے صحابہ میں سے بنو عبد الاشہل کے ایک صحابی تھے، وہ فرماتے ہیں: میں اور میرا بھائی جو جنگ احد میں شریک ہوئے، دونوں جنگ احد میں زخمی ہو گئے۔ جب حضور ﷺ کے موذن نے حکم دیا کہ دشمن کے مقابلہ پر چلو تو دونوں بھائی کہنے لگے کہ اب ہم کیا کریں؟ خدا کی قدرت ہے کہ ہمارے پاس سواری بھی نہیں ہے اور ہم دونوں زخمی بھی ہیں، لیکن ان دونوں نے کہا: چاہے ہمیں موت آ جائے، لیکن ہم پیچھے نہیں رہیں گے۔ صحابی کہتے ہیں کہ میرے زخم بھائی کے زخم سے تھوڑے تھے۔ جب بھائی چلتے چلتے تھک جاتے تھے تو میں ان کو کندھوں پر اٹھا لیتا تھا کہ جہاں حضور حکم دیں گے ہم نے جانا ضروری ہے۔ تو جہاں تک مسلمان پہنچے وہاں تک ہم بھی پہنچے۔ [السیرۃ النبویہ لابن ھشام: ۲/۱۰۱]

مسلمانوں کے اندر جذبہ کا یہ عالم تھا کہ اتنے زخموں کے باوجود اللہ کے رسول کا حکم ملا تو جان کی بازی لگا دی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ آیت پڑھی: ﴿الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ......﴾ اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ان میں سے ہیں؛ کیونکہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زخم پہنچے اور صحابہ کو زخم پہنچے اور مشرکین مکہ واپس لوٹ گئے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال آیا کہ دشمن کہیں پھر دوبارہ حملہ نہ کر دیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کے پیچھے کون جاتا ہے؟ اس وقت جو ستر آدمی نکلے ان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

[بخاری، رقم: ۴۰۷۷]

یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو کتنی شان سے بیان کر رہی ہیں کہ اے بھانجے! جن کے بارے میں قرآن پاک کی آیت اتری تھی اور جن کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی کی اطاعت کرنے والے ہیں، ان لوگوں میں تیرا ابا بھی تھا اور میرا ابا بھی تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان کے دل میں رعب ڈال دیا تھا، اس لیے وہ مکہ واپس چلے گئے تو نبی کریم نے فرمایا: ابوسفیان تم سے ایک طرف پہنچ چکا تھا اور واپس چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رعب ڈال دیا تھا۔ اور احد کا واقعہ شوال میں پیش آیا تھا۔ تاجروں کے قافلے ذی القعدہ میں مدینہ منورہ میں آتے تھے اور بدر صغریٰ میں وہ اترا کرتے تھے۔ سال کے اندر ایک دفعہ۔ غزوہ احد میں مومنین کو بڑے زخم پہنچے تھے، انہوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ بات کہی کہ یارسول اللہ! ہمیں بڑی تکلیف ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بلایا کہ تیار ہو جائیں، لیکن لوگوں کے دل میں خوف پیدا ہوا، شیطان نے انہیں ڈرایا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ پھر تمہیں تکلیف پہنچے اور مشرکین تمہارے مقابلہ کے لیے جمع ہو گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تو جانا ہے، چاہے کوئی ایک بھی نہ جائے، میں کافروں کا مقابلہ کروں گا۔ اس وقت سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت سعد، حضرت طلحہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح وغیرہ رضی اللہ عنہم ستر آدمیوں کا قافلہ چلا اور ابوسفیان کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے مقام صفراء پر پہنچے اور دوسری جگہ حمراء الاسد آتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ آیت اتاری:

﴿الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ......﴾ ۔[تفسیر طبری: ۷/ ۴۰۲]

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے روانہ ہو کر حمراء الاسد تک تشریف لے گئے اور حمراء

الاسد مدینہ منورہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر تھی۔

ابن ہشام رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ باہر گئے تو آپ عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا گورنر بنا گئے تھے۔ حضور پاک ﷺ اتوار کو نکلے تھے تو سوموار، منگل، بدھ آپ باہر رہے تھے اور پھر آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تھے۔

یادرکھیں! حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو مصلی پر کھڑا کیا۔ اب فقہاء نے اس سے مسئلہ نکالا ہے کہ اگر کوئی شخص نابینا ہے، لیکن صاف ستھرا ہے، پاکی پلیدی کا خیال رکھتا ہے، عالم بھی ہے، حافظ اور قاری بھی ہے وہ امام بن سکتا ہے؛ کیونکہ حضور پاک ﷺ نے نابینا کو امام بنایا تھا۔ فقہاء کرام رحمہم اللہ کا یہی کام ہوتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے، مگر فرمان رسول پاک ﷺ سے جو موتی نکلتے ہیں وہ امت کے سامنے کھول کر بیان کر دیتے ہیں، تاکہ ان کو بات سمجھ آجائے۔

خزاعی نے حدیث بیان کی ہے۔ بنو خزاعہ جو مسلمان بھی تھے اور کچھ کافر بھی تھے، لیکن سارے حضور اکرم ﷺ کے خیر خواہ تھے۔ حضور اکرم ﷺ ہجرت کی رات ام معبد کے خیمہ میں گزرے تھے اور بکری کے دودھ کا واقعہ پیش آیا تھا، وہ بھی خزاعیہ تھیں۔ حضور پاک ﷺ کو جب جنگ احد میں شکست ہوئی تو بنو خزاعہ کے لوگ حضور پاک ﷺ کی خدمت میں آئے، ان میں معبد بن ابو معبد الخزاعی بھی تھا، یہ اس وقت مشرک تھا، مسلمان نہیں تھا، اس نے کہا: ''يَا مُحَمَّدُ! أَمَا وَاللهِ لَقَدْ عَزَّ عَلَيْنَا مَا أَصَابَكَ فِي أَصْحَابِكَ، وَلَوَدِدْنَا أَنَّ اللهَ عَافَاكَ فِيهِمْ'' [تفسیر ابن کثیر] خدا کی قسم ہے! آپ کو جو تکلیف پہنچی اور آپ کے جو صحابہ شہید ہوئے ہمیں بڑا دکھ ہے اور خدا کی قسم ہے! ہم چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو پھر کامیابی دے، آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کرے اور ہمیں بھی خوشی ہو۔ اس نے حضور اکرم ﷺ سے یہ باتیں کیں۔ اس کے بعد وہ چل پڑا۔ اس کے بعد ابو سفیان کو روحا کے مقام پر ملا تو ابو سفیان نے وہاں اپنی طاقت کو جمع کر رکھا تھا اور ان سب نے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام پر دوبارہ حملہ کرنے کا اتفاق کر لیا تھا اور آپس میں کہہ رہے تھے کہ ہم ان (محمد ﷺ) کے ساتھیوں اور قائدین کو ختم کر چکے تھے، پھر ہم ان کی بیخ کنی کیے بغیر ہی واپس آگئے، ہم ان کے باقی لوگوں پر حملہ کر کے ان سے بھی فارغ ہو لیتے ہیں۔ ابھی ابو سفیان تیاری کر رہا تھا کہ معبد وہاں پہنچ گیا اور ابو سفیان سے پوچھا: تم یہ کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا: ہم پھر محمد مصطفیٰ (ﷺ) پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ معبد نے کہا: میرا کہنا مانو، میں بھی مدینہ سے آرہا ہوں۔ حضور پاک ﷺ

ایسا لشکر لے کر آرہے ہیں خدا کی قسم ہے! میں نے ایسا لشکر پوری زندگی میں نہیں دیکھا اور ان کے لشکر کے صحابہ جلے بھنے ہوئے ہیں کہ ہم سے جو کوتاہی ہوگی، جو چھوٹے بڑے رہ گئے تھے وہ سب تم پر حملہ کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ میری بات مانو تو مکہ کی طرف بھاگ جاؤ اور میں نے حضور کا لشکر دیکھ کر یہ اشعار بھی کہے ہیں:

كَادَتْ تُهَدُّ مِنَ الْأَصْوَاتِ رَاحِلَتِيْ
إِذْ سَالَتِ الْأَرْضُ بِالْجُرْدِ الْأَبَابِيلِ
تَرْدِى بِأُسْدٍ كِرَامٍ لَا تَنَابِلَةٍ
عِنْدَ اللِّقَاءِ وَلَا مِيْلٍ مَعَازِيْلِ
فَظَلْتُ عَدْوًا أَظُنُّ الْأَرْضَ مَائِلَةً
لَمَّا سَمَوْا بِرَئِيْسٍ غَيْرِ مَخْذُوْلِ
فَقُلْتُ وَيْلُ ابْنِ حَرْبٍ مِنْ لِقَائِكُمْ
إِذَا تَغَطْمَطَتِ الْبَطْحَاءُ بِالْجِيْلِ
إِنِّي نَذِيْرٌ لِأَهْلِ الْبَسْلِ ضَاحِيَةً
لِكُلِّ ذِي إِرْبَةٍ مِنْهُمْ وَمَعْقُوْلِ
مِنْ جَيْشِ أَحْمَدَ لَا وَخْشٍ تَنَابِلَةٍ
وَلَيْسَ يُوْصَفُ مَا أَنْذَرْتُ بِالْقِيْلِ

حالانکہ مشرک تھا، لیکن حضور پاک ﷺ سے ہمدردی تھی۔ تو کافروں کے دلوں میں ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر ایسا حال ہے تو پھر ہم نہیں لڑ سکتے۔

اس نے اشعار میں کہا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ ان کے چلنے کی جو آواز ہے اس کو سن کر میری اونٹنی مجھے گرا نہ دے۔ یعنی وہ اتنے زور سے آرہے تھے اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ زمین سیلاب کی طرح بھر گئی ہے۔ وہ جو تم پر حملہ کے لیے آرہے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جیسے لڑائی کے لیے جنگل سے نکلے ہوئے شیر آرہے ہوں۔

ابوسفیان جب مکہ کے لیے واپس چلا تو اس کو راستے میں عبدالقیس کا ایک قافلہ ملا تو ابوسفیان نے ان سے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم مدینہ منورہ جا رہے ہیں۔ ابوسفیان نے کہا: کس لیے جا رہے ہو؟ انہوں

نے کہا: تاکہ ہم وہاں جا کر اپنے گھر کی ضروریات خریدیں۔ تو ابوسفیان نے ان سے کہا: میں اگر تمہیں پیغام دوں تو میرا پیغام حضور پاک تک پہنچا دو گے؟ انہوں نے کہا: پہنچا دیں گے۔ ابوسفیان نے کہا: اگر تم نے میرا پیغام پہنچا دیا تو پھر جب سوق عکاظ کا میلہ ہوگا اور تم آؤ گے تو میں تمہیں ایک اونٹ کے برابر کشمش ہدیہ دوں گا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ ابوسفیان نے کہا: حضور پاک کو خبر دے دو کہ ہم نے بالکل سفر تیار کر لیا ہے دوبارہ مدینہ کے اوپر حملہ کرنے کے لیے اور ہم نے اپنی قوت مزید جمع کر لی ہے، تاکہ ہم حملہ کر کے جو مسلمان باقی رہ گئے ہیں ان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔

حضور اکرم ﷺ حمراء الاسد کے مقام پر پہنچ چکے تھے اور عبد القیس کا قافلہ گزرا تو انہوں نے آ کر حضور اکرم ﷺ کو خبر دی جو ابوسفیان نے کہا تھا۔ تو جتنے آدمی وہاں حضور ﷺ کی خدمت میں موجود تھے سب کی زبان پر آیا: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ اللہ ہمیں کافی ہے اور اللہ ہمارا بہترین کارساز ہے۔

[السیرۃ النبویۃ لابن هشام: ۲/۱۰۲]

ابن ہشام نے روایت نقل کی ہے کہ جب حضور پاک ﷺ کو خبر پہنچی کہ وہ واپس لوٹ کر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے اپنے صحابہ سے کہا کہ کوئی فکر نہ کریں۔ مجھے اپنے رب قدیر جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے مجھے اس کی قسم ہے کہ ان کافروں کے لیے پتھر نشان لگ کر تیار ہو چکے ہیں۔ اگر انہوں نے حملہ کیا تو ایسے مٹا دیئے جائیں گے جیسے کل مٹ گئی اور واپس نہیں آئے گی اس طرح کافر و مشرک ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔

[السیرۃ النبویۃ لابن هشام: ۲/۱۰۲]

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ابوسفیان اور اس کے دوستوں نے جو مسلمانوں کو تکلیف پہنچائی۔ سو پہنچائی اس کے بعد واپس ہوئے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ أَبَا سُفْيَانَ قَدْ رَجَعَ وَقَدْ قَذَفَ اللّٰهُ فِي قَلْبِهِ الرُّعْبَ، فَمَنْ يَنْتَدِبُ فِي طَلَبِهِ؟)) [تفسیر ابن کثیر] ابوسفیان واپس گیا، لیکن وہ ایسے واپس نہیں گیا، اللہ نے اس کے دل میں رعب ڈال دیا ہے؛ کیونکہ واضح بات ہے کہ جب دشمن نے جنگ جیت لی تو مدینہ پر حملہ کرنا کون سی مشکل بات تھی؟ مدینہ منورہ میں کوئی فوج نہیں تھی اور وہ واپس چلے گئے۔ اور کون اس کی تلاش میں میرے ساتھ تیار ہے؟ حضور پاک ﷺ تیار ہوئے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ و حضرت علی رضی اللہ عنہ اور باقی صحابہ تیار ہوئے اور اس کے پیچھے چلے۔ ابوسفیان کو بھی اطلاع پہنچ گئی کہ حضور

لشکر لے کر آرہے ہیں۔ ان کو تاجروں کا ایک قافلہ ملا تو ابو سفیان نے ان سے کہا: اگر تم کوئی ایسی بات بتاؤ کہ اللہ کے نبی جو میرے مقابلے میں آرہے ہیں وہ واپس مدینہ چلے جائیں تو میں تمہیں انعام دوں گا اور مسلمانوں کو یہ بھی بتاؤ کہ تمہارے مقابلہ میں ان کے پاس بہت بڑا لشکر ہے، ان کی بہت بڑی تیاری ہے۔ ان تاجروں نے آکر ابو سفیان کے کہنے کے مطابق حضور پاک ﷺ کو خبر دی، لیکن آپ نے فرمایا: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ مجھے اللہ کی ذات کافی ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا﴾ اس آیت کے بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں: حضرت عکرمہ حضرت قتادہ اور بہت سے مفسرین فرماتے ہیں: یہ غزوہ حمراء الاسد کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ بدر کے بارے میں نازل ہوئی، یعنی اگلے سال لڑنے کے لیے بدر کا وعدہ کیا گیا تھا تو حضور اکرم ﷺ بدر میں آگئے، لیکن ابو سفیان نہ آیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۲/۱۶۹]

قرآنی اور نبوی دعاؤں کی اہمیت:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو آپ نے بھی یہی کلمہ فرمایا تھا: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ اور میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کے صحابہ کو جب دشمنوں سے ڈرایا گیا تو ان کی زبان مبارک پر بھی آیا: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾۔ [بخاری، رقم: ۴۵۶۳]

اس لیے یاد رکھیں کہ اللہ کے قرآن میں جتنے کلمات ہیں اور وظیفے ہیں اور جتنی ادعیہ ماثورہ ہیں حضور اکرم ﷺ سے تو یاد رکھیں! اس سے بڑی برکت کسی چیز میں نہیں ہے، لیکن آج ہماری بدقسمتی ہے کہ اگر ہمیں جاہل قسم کا کوئی پیر مل جائے، کوئی سادھو ٹکر جائے، کوئی جوگی ٹکر جائے اور کوئی جنگلوں میں پھرتا ہوا عیار مل جائے وہ ہمیں جتنا غلط وظیفہ بتا دے۔ آدمی اس کو بڑے شوق سے کرتا ہے، لیکن جو قرآن میں ہے اور حدیث رسول پاک میں ہے، اس سے مسلمان غافل ہیں اور اس کے قریب بھی نہیں آتے۔

آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ حضور پاک ﷺ نے وظیفہ بتایا ہے کہ ہر نماز کے بعد یہ پڑھو: "سُبْحَانَ اللّٰهِ" ۳۳ بار، "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" ۳۳ بار، "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" ۳۴ بار اور "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"۔

اور اسی طرح احادیث میں موجود ہے کہ ہر نماز کے بعد جو شخص آیت الکرسی پڑھے اس کو جنت میں جانے سے

کوئی چیز نہیں روک سکتی، مگر موت؛ کیونکہ موت کے بغیر آدمی جنت میں نہیں جا سکتا، لہٰذا اس کے مرنے کی دیر ہے، اللہ تعالیٰ اس پر جنت کی نعمتیں شروع کر دیں گے۔

حضور اکرم ﷺ صبح و شام معوذتین آیت الکرسی سورۃ الفاتحہ پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم کر کے سر سے لے کر سارے بدن پر پھیرتے تھے، لیکن آج اگر کسی پیر کا بتایا ہوا وظیفہ ہو اس کو پہلے پڑھیں گے اور نبی ﷺ کا بتایا ہوا وظیفہ بعد میں پڑھیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے کتابوں میں لکھا ہے کہ قرآن میں جو کلمات ہیں جو ان کو پڑھنے کے بعد یہ سمجھے کہ میری مشکل دور نہیں ہوگی، وہ توبہ کرے کہ وہ اسلام سے نکل جائے گا۔ کیونکہ جب صحابہ پر کوئی مشکل آئی تو انہوں نے پڑھا: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کامیاب ہو گئے۔ جب اللہ کہہ رہا ہے کہ یہ کلمات پڑھنے والے کامیاب ہو گئے تو آج مسلمان ان کو پڑھے تو وہ ناکام کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن شرط یہ ہے کہ پورے یقین کے ساتھ پڑھا جائے۔

﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ کی فضیلت:

(حدیث) ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ روایت نقل کی ہے، جس میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں، فرماتے ہیں کہ حضور سرکارِ مدینہ ﷺ نے فرمایا: ((إِذَا وَقَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ الْعَظِيمِ فَقُولُوا: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾)) [ال:] اگر خدا نہ کرے تم کسی بری مصیبت میں پھنس جاؤ تو پھر بھی ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ پڑھا کرو۔ [الدر المنثور للسیوطی: ۲/۳۹۰]

(حدیث) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں: حضور سرکارِ مدینہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((كَيْفَ أَنْعَمُ وَصَاحِبُ الْقَرْنِ قَدِ الْتَقَمَ الْقَرْنَ، وَحَنَى جَبْهَتَهُ يَسْمَعُ مَتَى يُؤْمَرُ، فَيَنْفُخُ؟)) [مسند احمد، رقم: ۳۰۰۸] میں کیسے لذت اٹھاؤں؟ کیسے لباس پہنوں؟ کیسے دنیا کی لذت کی چیزوں کو استعمال کروں؟ وہ صور پھونکنے والے فرشتے نے صور منہ میں رکھ لیا ہے اور گردن جھکا کر اللہ کے اس حکم کے انتظار میں کھڑا ہے کہ کب حکم ملے؟ صور پھونکوں اور قیامت قائم ہو جائے۔ سب صحابہ گھبرا گئے اور عرض کیا: حضور! جب یہ عالم ہے تو ہم کیا کہیں؟ فرمایا: تم کہو ((حَسْبُنَا اللّٰهُ، وَنِعْمَ الْوَكِيلُ، عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا)) [مسند احمد، رقم: ۳۰۰۸] اے اللہ! تو ہی ہمیں کافی ہے، تو ہی بہتر کارساز ہے اور تجھ پر

ہی ہمارا اعتماد ہے۔

حشر کی مصیبت سے بھی اگر کوئی بچا سکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بچا سکتے ہیں۔ عذاب قبر سے کوئی بچا سکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بچا سکتے ہیں۔ سکرات الموت کی شدت سے کوئی بچا سکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بچا سکتے ہیں۔ کسی کلمہ کو پڑھنے کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اس کلمہ پر غور وعمل کرو، یہ نہیں کہ صرف لفظ پڑھتے رہو۔

(حدیث) سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی آپس میں بات چھڑ گئی۔ دونوں حضور ﷺ کی بیویاں ہیں۔ بی بی زینب رضی اللہ عنہا نے فخر کرتے ہوئے فرمایا: عائشہ! جتنی حضور ﷺ کی بیویاں ہیں سب کی شان ہے، لیکن اللہ نے جو مجھے شان دی ہے وہ کسی کو نہیں ملی ہے۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا تو انہوں نے کہا: ہر بیوی کو ان کے گھر والوں نے نکاح میں دیا ہے، لیکن میں ایک ایسی بیوی ہوں جس کا نکاح اللہ نے عرش سے پڑھایا ہے۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: بالکل ٹھیک ہے، لیکن اللہ نے مجھے ایسی شان دی ہے کہ سارے قرآن میں اللہ نے کسی کی صفائی نازل نہیں کی، صرف میری شان میں قرآن اتارا ہے، اللہ نے میری پاکی کی گواہی عرش سے دی ہے۔ بی بی زینب رضی اللہ عنہا نے کہا: واقعی میں جانتی ہوں کہ یہ شان واقعی بہت بڑی ہے کہ اللہ جس کا خود گواہ بنے اور قرآن قیامت تک پڑھا جائے۔ بی بی زینب رضی اللہ عنہا نے کہا: یہ تو بتاؤ کہ اللہ نے یہ شان تمہیں دی ہے، آپ صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کے اونٹ پر سوار ہوئی تھیں تو اس مصیبت کے وقت میں تم نے کیا پڑھا تھا؟ تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے ((حَسْبِيَ اللّٰهُ، وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ)) پڑھا تھا۔ بی بی زینب رضی اللہ عنہا نے کہا: عائشہ! واقعی تم نے وہ کلمہ پڑھا ہے جو ایمان والوں نے اور صحابہ نے پڑھا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی کامیاب کیا تھا اور اس کلمہ کی برکت سے اللہ نے تمہیں بھی کامیاب کیا ہے۔ [تفسیر طبری: ۱۰/ ۸۸]

﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ﴾

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نعمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان کے دل میں رعب ڈال دیا، ابوسفیان ناکام ہو کر مکہ واپس لوٹ گیا۔ صحابہ کو جنگ بھی نہ کرنا پڑی اور کافروں پر ڈر بھی طاری ہو گیا۔ مدینہ کی طرف نہ آسکے اور مکہ کی طرف بھاگ گئے۔ یہ مسلمانوں کو نعمت ملی اور ان کو فضل یہ ملا کہ اس موسم میں تجارتی قافلہ گزر رہا تھا، حضور پاک ﷺ نے اس تجارتی قافلہ کا سارا سامان خرید لیا اور پھر مدینہ منورہ میں بیچا۔ جب نفع ہوا تو سارے صحابہ میں تقسیم کر دیا۔ یہ اللہ پر توکل اور اعتماد کرنے کی برکت تھی۔

﴿وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ھُوَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝﴾ [آل عمران:۱۷۶تا۱۸۰]

’’اور (اے پیغمبر!) جو لوگ کفر میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تیزی دکھا رہے ہیں، وہ تمہیں صدمے میں نہ ڈالیں، یقین رکھو وہ اللہ کا ذرا بھی نقصان نہیں کر سکتے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ رکھے اور ان کے لیے زبردست عذاب (تیار) ہے۔ جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر کو مول لے لیا ہے وہ اللہ کو ہرگز ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور ان کے لیے ایک دکھ دینے والا عذاب تیار ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ ہم انہیں جو ڈھیل دے رہے ہیں تاکہ وہ گناہ میں اور آگے بڑھ جائیں اور (آخرکار) ان کے لیے ایسا عذاب ہوگا جو انہیں ذلیل کر کے رکھ دے گا۔ اللہ ایسا نہیں کر سکتا کہ مومنوں کو اس حالت پر چھوڑ رکھے جس پر تم لوگ اس وقت ہو، جب تک وہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دے، اور (دوسری طرف) وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا کہ تم کو (براہِ راست) غیب کی باتیں بتا دے۔ ہاں وہ (جتنا بتانا مناسب سمجھتا ہے اس کے لیے) اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو۔ اور اگر ایمان رکھو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو زبردست ثواب کے مستحق ہو گے۔ اور جو لوگ اس (مال) میں بخل سے کام لیتے ہیں جو انہیں اللہ نے اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے، وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لیے کوئی اچھی بات ہے، اس کے برعکس یہ ان کے حق میں بہت بری بات ہے، جس مال میں انہوں نے بخل سے کام لیا ہوگا، قیامت کے دن وہ ان کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا۔ اور سارے آسمان اور زمین کی میراث صرف اللہ ہی کے لیے ہے، اور جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔‘‘

کفار کو مال و دولت اور جنگ میں فتح کیوں ملتی ہے؟

(سوال) جب کافروں نے بظاہر احد کی جنگ جیت لی اور مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا ستر صحابہ شہید ہو گئے، حضور اکرم ﷺ خود زخمی ہوئے، آپ کے دندان مبارک شہید ہو گئے تو ذہن میں ایک خیال جاتا ہے کہ جب کافر اللہ کے دشمن ہیں تو ان کو فتح کیوں ہوئی؟ دوسری بات یہ ہے کہ جب کفار و مشرکین اللہ کے بھی دشمن ہیں، اللہ کے رسول ﷺ کے بھی دشمن ہیں، اسلام کے بھی دشمن ہیں تو پھر انہیں دنیا میں مال و دولت، اہل و عیال، عزت اور شان و شوکت یہ سب ان کو کیوں ملتا ہے؟ مسلمانوں پر آخر مصائب کے پہاڑ کیوں ٹوٹتے ہیں؟

(جواب) اس بات کو اللہ تعالیٰ نے سمجھاتے ہوئے قرآن مقدس کی ان آیات مبارکہ میں ارشاد فرمایا کہ میرے جو فیصلے ہیں وہ حکمت سے خالی نہیں ہوتے، اس میں کروڑہا حکمتیں ہوتی ہیں، جو ہمیں سمجھ نہیں آتیں۔ اور پھر نا سمجھی کی بنا پر ہم اعتراض کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے دیکھا کہ ایک انسان باغ لگاتا ہے، پھلواریاں لگاتا ہے، کتنی محنت کرتا ہے، سردی اور گرمی سے اس کی حفاظت کرتا ہے اور وقت پر پانی لگاتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ جب ایک دیکھنے والا وہاں سے گزرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ جو مالی یہاں محنت کر رہا تھا وہ ہاتھ میں ایک بڑا سا مقراض لے کر کھڑا ہے اور کہیں پتے کاٹ دیتا ہے اور کہیں ٹہنیاں کاٹ دیتا ہے۔ دیکھنے والا آدمی کہتا ہے: عجیب بے وقوف آدمی ہے! دو سال تک محنت کرتا رہا اور جب یہ درخت نکل آئے تو خود اپنے ہاتھ میں قینچی لے کر کھڑا ہو گیا ہے اور ان کو کاٹ رہا ہے۔ تو یہ نہ جاننے والا اعتراض کرے گا، لیکن جو آدمی جاننے والا ہے، وہ کہے گا: اعتراض کرنے والے! تجھے کیا پتہ؟ تم تو بے وقوف ہو! کیونکہ اگر یہ ان درختوں کو نہیں کاٹے گا تو حسن کیسے آئے گا؟ یہ برابر کیسے ہوں گے؟ اگر یہ ان سے خشک ٹہنیاں نہیں کاٹے گا تو دوسری ٹہنیوں کو بھی خشک کر دیں گی، ان ٹہنیوں کو نہیں کاٹے گا تو سارا درخت بیمار ہو جائے گا، اس لیے جو کچھ کر رہا ہے بالکل ٹھیک کر رہا ہے۔ وہ حالات کے مطابق سب کچھ کر رہا ہے۔

جو لوگ سمجھدار اور ذی علم ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں شکست آتی ہے تو وہ بہتر ہے، اسی میں ہماری خیر مضمر ہے۔ اور جو کم فہم لوگ ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں: عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کو شکست ہو جائے اور کافر جیت جائیں۔ خونِ مسلم اتنا ارزاں ہو چکا ہے کہ کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے اور کافروں کا کوئی ایک بندہ بھی مر جائے تو ہمارے لیے

مصیبت کھڑی کر دیتے ہیں۔

تکوینی اور تشریعی علوم:

اصل بات یہ ہے کہ ہم اللہ کے فیصلوں کو صحیح معنی میں سمجھ نہیں سکتے۔ یاد رکھیں! امور دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک کو تشریعی کہا جاتا ہے اور ایک امور تکوینی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول تھے، اپنے وقت میں شریعت کے بادشاہ تھے، لیکن امورِ شریعت جانتے تھے، تکوینیات کو نہیں جانتے تھے۔ اور حضرت خضر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تکوینیات کا علم دیا تھا، شریعت کے اندر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے؛ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ نبی ہیں یا ولی ہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ وہ بھی اللہ کے نبی تھے۔ کیونکہ قرآن میں آتا ہے کہ انہوں نے کہا: ﴿وَمَا فَعَلْتُهُۥ عَنْ أَمْرِى ۚ ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا﴾ [الکھف: ۸۲] اے موسیٰ! جو کچھ میں نے کیا ہے اپنی طرف سے نہیں کیا، بلکہ اللہ کے حکم سے کیا ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا: اللہ کا حکم تو نبیوں کے پاس آتا ہے۔ لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ وہ اللہ کے ولیوں میں سے ولی تھے، نبی نہیں تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ جا رہے تھے تو حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی توڑ دی تو موسیٰ علیہ السلام ناراض ہو گئے کہ یہ اچھی بات ہے کہ انہوں نے ہمیں کشتی پر بٹھایا، دریا عبور کرایا، کرایہ بھی نہیں لیا، احترام کیا اور تم نے ان کو بدلہ دیا کہ ان کی کشتی کو توڑ دیا۔ چونکہ یہ خلافِ شریعت امر تھا تو حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: صبر کرو، اسی لیے میں نے آپ کو کہا تھا کہ آپ کا اور ہمارا گزارا نہیں ہوگا۔

آگے چلے ایک بچہ کھیل رہا تھا، حضرت خضر علیہ السلام نے اس کو قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام صبر نہ کر سکے اور فرمایا: عجیب بات ہے کہ ایک معصوم بچے کو بلاوجہ قتل کر دیا ہے!! انہوں نے کہا: آپ صبر کریں، میں نے عرض کیا تھا کہ تمہارا علم تمہارے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علوم دیئے ہیں وہ میرے ساتھ ہیں۔ میرے علوم کا آپ کو علم نہیں اور آپ کے علوم کا مجھے علم نہیں تو گزارا کیسے ہوگا؟

آخر میں حضرت خضر علیہ السلام نے بات کھولی کہ میں تو کشتی نہیں توڑنا چاہتا تھا، میں نے ان پر ظلم نہیں کیا ہے، بلکہ میں نے ان پر احسان کیا ہے، انہوں نے ہمیں دریا عبور کرایا۔ اور پیچھے حکم ہے کہ آج بگار میں کشتیاں پکڑی جا رہی ہیں،

سرکاری لوگ ان کو پکڑ کر لے جاتے تو ان غریبوں کی روزی ختم ہو جاتی۔ اس لیے میں نے ان کی کشتی کی پھٹی توڑ دی کہ جب سرکاری لوگ اس کو ٹوٹا ہوا دیکھیں گے تو چھوڑ دیں گے۔ اس لیے یہ بعد میں پھٹی لگا کر اپنی روزی کماتے رہیں گے۔ تو اب موسیٰ علیہ السلام کو سمجھ آئی۔

اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جو میرا دشمن ہے کافر و مشرک ہے، میں اس کو دنیا دیتا ہوں؛ کیونکہ دنیا مجھے محبوب نہیں ہے۔

کفار کو دنیا دینے کی حکمت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اللہ کے ہاں اس دنیا کی عزت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو نہ دیتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جو میرا نافرمان اور باغی بن جاتا ہے میں اس کو اور زیادہ دنیا دیتا ہوں اور آرام دیتا ہوں، تاکہ یہ اور سرکشی کی انتہاء تک پہنچ جائے، پھر عذاب میں کوئی کمی باقی نہ رہے۔ میں اس کو پورا پورا عذاب دوں گا۔ جیسا کہ آج بھی لوگ مثال دیتے ہیں کہ طاقت ور آدمی اپنے دشمن کو چھوڑ دیتا ہے، تاکہ اور دشمنی کرے۔ تو اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر طاقت والا اور کوئی نہیں ہے۔ اللہ اپنے دشمنوں کو ڈھیل دیتے ہیں، تاکہ اور زیادہ دشمنی میں بڑھیں، یہ اپنی دشمنی کی انتہاء تک جائیں، تاکہ پھر جب ہم عذاب دیں گے تو ہم بھی اپنے عذاب کی انتہاء کر دیں گے۔ فرمایا: ﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ﴿١٢﴾﴾ [البروج: ١٢] میری پکڑ ایسی ہوگی کہ فرعون جیسے لوگ کہ سینکڑوں سال تک جس کے سر میں بھی درد نہیں ہونے دیا، جو چھ لاکھ کا لشکر موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے دوڑا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے اس کو پکڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کو دریاؤں سے نکال دیا اور اسی دریا میں فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا۔

فرعون کا انجام:

علماء نے لکھا ہے کہ اس کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی ایک حکمت تھی کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے آ کر توحید کی دعوت دی تو فرعون نے اپنے درباریوں سے بڑے تکبر کے ساتھ کہا: دیکھو! ہاتھ میں ایک لکڑی پکڑی ہوئی ہے، رہنے کا ٹھکانہ نہیں ہے، کھانے کو پیسہ نہیں ہے اور یہ دیکھو! میرے محلات جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، میں بہتر ہوں یا یہ فقیر بہتر ہے؟ اللہ نے فرمایا: جن نہروں پہ تم فخر کرتے ہو انہی نہروں میں تجھے غرق کر دوں گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے

اس کو پانی میں غرق کیا، ورنہ اگر اللہ چاہتے تو اس کو کسی اور عذاب میں بھی مار سکتے تھے۔

اور فرعون نے کہا تھا: یہ صحیح طرح بول بھی نہیں سکتا ہے۔ اگر چہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پھر حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبی بنایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم میرے نبی پر اعتراض کر رہے ہو کہ وہ یوں نہیں بول سکتے، تو ہم تجھے ایسے ماریں گے کہ تم اپنا حشر دیکھ لو گے۔ مفسرین رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ جب وہ پانی میں آیا اور اس کو غوطہ لگا تو بڑبڑ کرنے لگا اس وقت اس کی بات سمجھ بھی نہیں آ رہی تھی۔

بہر حال! دیکھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے بات سمجھ نہیں آ رہی تھی، لیکن جب حضرت خضر علیہ السلام نے بتایا تو سمجھ گئے۔

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان فرمایا تو ارشاد فرمایا: اے کاش! میرا بھائی موسیٰ تھوڑا اور صبر لیتے تو اور بھی اللہ کی کئی حکمتیں کھل جاتیں اور کئی باتیں سامنے آ جاتیں، لیکن موسیٰ علیہ السلام صبر نہ کر سکے۔

مسلمانوں پر تکالیف کیوں آتی ہیں؟

اس لیے ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر ہم کافروں کو ترقی دیتے ہیں تو وہ ترقی نہیں ہوتی، بلکہ استدراج ہوتا ہے کہ ہم ان کی رسی کو ڈھیلا کر دیتے ہیں کہ جب کھینچیں گے تو ان کو اپنے دردناک عذاب تک پہنچا کر چھوڑیں گے اور اگر ہم مسلمان پر کوئی مصیبت ڈالتے ہیں تو وہ عذاب نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایسے ہے جیسے دھوبی کپڑے کو مارتا ہے، تاکہ اچھی طرح سے دھل کر صاف ہو جائے، اس کے اندر کوئی بدبو نہ رہ جائے۔ اور کپڑا جتنا گندا ہوتا ہے دھوبی اس کو اتنا زیادہ مارتا ہے۔ اور اگر زیادہ داغ ہوں تو اس کو آگ میں ڈالتا ہے کہ میں نے یہ داغ اتارنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کو درجات عالیہ تک پہنچانے کے لیے دنیا میں کبھی کبھی تکلیفیں دے دیتے ہیں۔ لہٰذا کسی کی تکلیف کو دیکھ کر اعتراض نہ کیا کرو اور کسی کی دولت کو دیکھ کر پریشان نہ ہوا کرو۔ خدا جانے اس کے اندر کیا حکمتیں ہیں!؟ یہ اللہ تعالیٰ کے امتحان ہیں جو بندے کو سمجھ نہیں آ سکتے۔

مسلمانوں کو گناہ کے بعد دولت وغیرہ ملنے سے ڈرنا چاہیے:

ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ علماء کرام، محدثین عظام، سلف صالحین نے لکھا ہے کہ اگر کبھی انسان سے گناہ ہو جائے اور اس کے بعد بھی اگر کوئی اللہ کی نعمت مل جائے تو ڈرو کہ کہیں انجام کفروالا نہ ہو جائے؛ کیونکہ یہ کافروں کا

انجام ہوتا ہے کہ برائی کرتے جائیں اور دولت بڑھتی جائے۔ تو خطرہ محسوس کرنا اور گناہوں کو چھوڑ کر توبہ کرنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تمہیں کافر کر کے ماردیں۔

جیسا کہ مجھے خود ایک آدمی نے کہا کہ آپ بڑی تقریریں کرتے ہیں، آپ کی نصیحت اور تقریر کا کیا فائدہ ہے؟ میں نے کہا: ہمیں تو اللہ کا حکم ہے کہ کرتے رہیں۔ اس نے کہا: میرا ایک عورت کے ساتھ عشق ہے، میں جب بھی اس کے ساتھ جا کر ملتا ہوں تو مجھے بڑا پیسہ ملتا ہے اور جب تمہاری تقریریں سنتا ہوں تو پہلا پیسہ بھی چلا جاتا ہے تو میں وہ کام کیوں چھوڑ دوں؟

یہ وہ مقام ہے کہ انسان اسلام سے بھی نکل جاتا ہے؛ کیونکہ جیسے شیطان نے سب سے بڑی بغاوت کی، لیکن اس کو مہلت لمبی ملی یا نہیں ملی؟ اللہ تعالیٰ کا باغی تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو قیامت تک کے لیے زندہ رکھا ہے، اتنی عمر تو کسی اللہ والے کو بھی نہیں ملی۔ یہ اللہ کا نظام ہے کہ جو دشمنی پر آئے اللہ تعالیٰ اس کو اور زیادہ ڈھیل دیتے ہیں کہ دشمنی کی انتہاء کر کے بھی دیکھ لو۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی طبیعت مبارکہ بنائی تھی کہ آپ رحمت ہی رحمت تھے۔

حضور اکرم ﷺ کی تمنا تھی کہ سب لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں، ایمان میں داخل ہو جائیں اور جہنم کے عذاب سے بچ جائیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾﴾ [التوبۃ: ۱۲۸] اس لیے حضور پاک ﷺ نے اللہ کے دین میں کتنی تکلیفیں اٹھائیں، دن ہے رات ہے، سفر ہے حضر ہے، مکہ ہے طائف ہے، بازار میں سب میں، اللہ کے نبی ﷺ پہنچے اور دعوت پہنچائی، تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اسلام میں داخل ہو جائیں، لیکن جب حضور پاک ﷺ یہ دیکھتے کہ یہ اسلام بھی نہیں لاتے اور ہر وقت اللہ کے نبی سے جھگڑتے ہیں، اختلاف کرتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کو نعمتیں مل رہی ہیں، اولاد مل رہی ہے، مال مل رہا ہے۔ اگر اللہ پاک روک دیتے تو جب سختی کی جھلک دیکھتے تو شاید مسلمان ہو جاتے، لیکن نافرمانی کے باوجود ان کو ہر چیز مل رہی ہے۔ جب آپ کی طبیعت میں یہ خیال آیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے نبی! آپ اس بات پر حریص ہیں کہ لوگ ایمان میں آجائیں، آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اسلام سے بغض رکھتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کو مال مل رہا ہے۔ یہ میری حکمت ہے، یہ میرا کوئی نقصان نہیں کر سکتے۔

ساری دنیا کی قوتیں بھی جمع کرلیں اللہ کے دین کو نہیں مٹا سکتیں، ساری دنیا کی قوتیں بھی مل جائیں اللہ تعالیٰ کی عظمت کے خلاف کچھ نہیں کرسکتیں، عظمت رسول پاک کے خلاف کچھ نہیں کرسکتیں۔

ایمان کے بدلہ میں کفر کو خریدنے کا معنیٰ:

یہ میری حکمت ہے کہ ان کو دنیا میں دے دو، تاکہ آخرت میں ان کے لیے کوئی ذرہ کے برابر بھی حصہ باقی نہ رہے اور ان کے لیے ہم نے سب سے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پھر اپنے پاک پیغمبر ﷺ کو ان کے بارے میں تسلی دی اور فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۚ﴾ ان لوگوں نے کفر کیا اور ایمان قبول نہیں کیا تو انہوں نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، انہوں نے اپنے نفسوں کو خود نقصان پہنچایا ہے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے اور میرے آقا ﷺ نے فرمایا: اگر ساری دنیا متقی اور مومن بن جائے، مسلمان بن جائے، اللہ کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اور اگر اللہ نہ کرے ساری دنیا کافر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں ہے۔ کوئی اگر کافر ہوتا ہے تو اس کا اپنا نقصان ہے اور اگر کوئی ایمان میں آتا ہے تو اس کا اپنا فائدہ ہے۔ لیکن یہاں سمجھیں کہ یہاں آیا ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ﴾ تو اشتراء کا لفظ خریدنے کے لیے بھی آتا ہے اور بیچنے کے لیے بھی آتا ہے۔ یعنی انہوں نے کفر کو خریدا ایمان کے بدلہ میں یا جیسا کہ خرید و فروخت میں تبادلہ ہوتا ہے کہ میں نے پیسے دیئے اور آپ نے مجھے چیز دے دی تو یہ استبدال ہو گیا۔ یہاں انہوں نے ایمان کے بدلہ میں کفر لے لیا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدمی وہ چیز بیچتا ہے جو اس کے پاس ہو، مثلاً میرے پاس عینک ہے، میں کہتا ہوں کہ اس کو بیچتا ہوں۔ اور اگر میرے پاس عینک ہے ہی نہیں تو میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ عینک بیچتا ہوں؟ تو وہ لوگ جو ہیں ہی کافر تو انہوں نے ایمان دے کر کفر کیسے لے لیا؟ جبکہ ایمان ان کے پاس تھا ہی نہیں۔

علماء نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ نے عالم ارواح میں تمام ارواح کو پیدا کیا تھا تو تمام ارواح سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا تھا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ﴾ [الاعراف:۱۷۲] سب نے اقرار کیا کہ ہمارا رب تو ہے۔

اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ)) [بخاری، رقم:۱۳۸۵] ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اگر ایک بچہ پیدا ہوا اور آپ اس کو پہاڑ کی چوٹی پر چھوڑ دیں تو وہیں اللہ پاک اس کو کھلائے

پاے، کوئی آدمی اس کو نہ ملے، اس کے اندر دین فطرت موجود ہوتا ہے، وہ فوراً آسمانوں اور زمینوں پر نظر ڈال کر، سورج کے نظم ونسق کو دیکھ کر سمجھتا ہے کہ کوئی خدا ہے۔ اگر والدین یہودی ہیں تو بچہ یہودی بن گیا اور اگر والدین نصرانی ہیں تو بچہ نصرانی بن گیا، والدین مسلمان ہیں تو بچہ مسلمانوں میں داخل گیا۔ یہ ماحول اسے اس طرف لے جاتا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے اسے فطرت اسلام پر پیدا کیا ہے، ورنہ کافروں سے اقرار بھی لیا جا چکا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں دین فطرت پر پیدا کیا، لیکن اس کے باوجود بھی انہوں نے کفر کیا تو اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے ایمان چھوڑ کر کفر کیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ علماء نے فرمایا: اللہ کی توحید کے دلائل اتنے واضح ہیں کہ آدمی ذرا بھی غور کرے تو اس کو توحید سمجھ آسکتی ہے۔

ایک بڑھیا کا ایمان:

امام رازی رحمہ اللہ یا کوئی دوسرے عالم ہیں، وہ فرماتے ہیں: ایک دن بیٹھ کر میں نے غور کیا کہ عام جودیہات کے اندر رہنے والے لوگ ہیں، جنہوں نے کچھ نہیں پڑھا، ان کو توحید کا مسئلہ کیسے سمجھ آئے گا؟ تو اتفاق سے میرا گزر ایک بوڑھی عورت پر ہوا جو چرخہ کات رہی تھی۔ میں نے جا کر اس کو سلام کیا اور اس کے پاس بیٹھ کر پوچھا: اماں جان! آپ کا دین کیا ہے؟ انہوں کہا: اللہ کا شکر ہے! میں مسلمان ہوں۔ میں نے کہا: تم خدا کو مانتی ہو؟ اس نے کہا: بالکل مانتی ہوں۔ میں نے کہا: تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ خدا ایک ہے؟ اس نے کہا: اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ میں نے کہا: اماں جان! آپ کو یہ کہاں سے پتہ چلا کہ خدا ایک ہے؟ اس کی کوئی دلیل یا حجت ہے؟ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا: میں یہ جو چرخہ چلا رہی ہوں، اس سے میں نے توحید کو سمجھا ہے۔ میں نے کہا: اماں! چرخہ سے توحید کیسے سمجھ آگئی؟ اس نے کہا: بیٹا! دیکھو! یہ ایک چھوٹا سا چرخہ میرے چلانے کے بغیر نہیں چل سکتا تو اتنا بڑا چرخہ (عالم دنیا) بغیر چلانے والے کے کیسے چل رہا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی ذات ایسی ہے جو متصرف الامور ہے، کوئی ذات ایسی ہے جو "مُدَبِّرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" ہے، کوئی ذات ایسی ہے جس کی قدرت میں یہ نظام عالم ہے، ورنہ بغیر حسن ترتیب کے، بغیر چلانے والے کے یہ نہیں چل سکتا۔ میں نے کہا: اماں جان! یہ بات تو ٹھیک ہے کہ آپ کو چرخہ سے سمجھ آگئی، لیکن پتہ نہیں دو خدا چلا رہے ہوں؟ اس نے کہا: بیٹا! یہ مسئلہ بھی مجھے چرخے سے سمجھ آگیا ہے کہ

اگر ہم دو عورتیں بیٹھیں، ساری زندگی اس کو چلاتی رہیں۔ اگر ہم دونوں کا اتفاق رہے کہ ہم نے اس کو ایسے چلانا ہے تو پھر دوسری کی ضرورت ہی کیا ہے، پھر تو ایک کافی ہے۔ اور اگر ہمارا اختلاف ہو جائے، ایک کہے کہ اس کو یوں پھیرو اور دوسری کہے کہ یوں پھیروں تو چرخہ ٹوٹ جائے گا۔ اور جب دو میں سے ایک کمزور ہو جائے گی تو جو طاقت ور ہے اس کا حکم چلے گا۔ اگر اس نظام کو چلانے کے لیے دو خدا ہوتے اور دونوں ایک طرح نظام چلاتے تو دوسرے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر دو مخالف ہیں تو پھر ایک کہے کہ سورج نکلے اور دوسرا کہے کہ آج سورج نہ نکلے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ خدا ایک ہے، دو نہیں ہیں...... ایک چھوٹے سے گھر کے اندر دو آدمیوں کو بڑا بنا دو تو چھوٹے سے گھر کا نظام بھی نہیں چل سکتا، جب تک کہ کسی ایک کو بڑا نہ بنائیں اور اس کے حکم پر چلیں تب نظام ترتیب پر آتا ہے...... فرماتے ہیں: مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ بڑھیا ہے، ان پڑھ ہے، دیہاتوں میں رہنے والی ہے، لیکن اللہ نے اس کو مسئلہ سمجھایا ہے تو اس کو چرخے سے مسئلہ سمجھ آ گیا۔

ایک بدو کے دلائل توحید:

امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک دن میں نے توحید کے مسئلہ پر دلائل جمع کرنے شروع کیے اور دشمنوں کے اعتراضات و جوابات جمع کرنا شروع کیے تو میں نے تقریباً تین سو ساٹھ دلائل جمع کیے اور جتنے دشمنوں کے اعتراضات تھے ان کا رد کیا۔ میں جب اس کام سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا، میرے دل میں خیال آیا کہ میں نے اتنا عرصہ علم پڑھا ہے، اتنے دلائل بھی اکٹھے کر لیے ہیں، کفار کے اعتراضات کا میں نے توڑ بھی کر لیا ہے، لیکن جو بے چارے جنگل میں رہنے والے ہیں وہ توحید کیسے سمجھیں گے؟ خدا کی شان ہے کہ اونٹوں کی ایک قطار جا رہی تھی اور ایک آدمی نے مہار کندھے پر ڈالی ہوئی تھی اور ان اونٹوں کے آگے جا رہا تھا۔ میں نے اس کو روک کر سلام کیا اور اس سے پوچھا کہ تم نے کسی مدرسہ میں پڑھا ہے؟ اس نے کہا: میں نے کسی مدرسے میں نہیں پڑھا۔ میں نے پوچھا: کسی مولوی کی صحبت میں رہتے ہو؟ اس سے مسائل سمجھتے ہو؟ اس نے کہا: مجھے مولوی ملتے نہیں، میں تو سارا دن اونٹ چراتا ہوں، اونٹوں پر مال برداری کرتا ہوں۔ تو میں نے کہا: تمہارا کیا مذہب ہے؟ اس نے کہا: میں مسلمان ہوں۔ میں نے کہا: خدا کو مانتے ہو؟ اس نے کہا: میں خدا کو مانتا ہوں، وہ وحدہ لاشریک ہے، وہ الحی القیوم ہے، دائم ہے۔ میں نے اس سے پوچھا: یہ کیسے سمجھا ہے؟ اس نے مجھے غصے سے دیکھا اور کہا: اتنی بڑی تیری داڑھی ہے

اور تمہیں عقل ہی نہیں ہے۔ اگر ایک مینگنی پڑی ہو تو ہم بدو لوگ اس کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اونٹ کی مینگنی ہے اور اگر اس سے چھوٹی پڑی ہو تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ یہ بکری کی مینگنی ہے، یہ گائے کا گوبر ہے، گٹھلی کے دانے کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں تو کیا یہ ساری دنیا کو دیکھ کر خدا سمجھ نہیں آتا؟ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے کہا: اللہ تیرا شکر ہے تو توحید سمجھاتا ہے تو خود دماغ کھول دیتا ہے اور خود دلوں میں ڈال دیتا ہے۔

پھر میں نے اس کو کہا کہ یہ تو میں نے مان لیا کہ خدا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ ایک ہے یا دو ہیں؟ اس نے کہا: ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ'' مولوی صاحب! کیا تمہارا دماغ خراب ہے!؟ خدا تو ایک ہے، وحدہ لاشریک ہے۔ میں نے کہا: اس کے وحدہ لاشریک ہونے پر کوئی دلیل دو۔ تو اس نے ڈنڈا اٹھا لیا، میں بھاگ پڑا۔ اس نے کہا: خدا کے بندے ہو کر خدا کے بارے میں دلیلیں مانگتے ہو؟ لہٰذا اس کا علاج یہ ہے کہ تمہارا سر پھاڑ دوں۔ میں نے کہا: جو اس کے پاس دلیل ہے وہ میرے پاس بھی نہیں ہے۔

مدینہ میں پہنچ کر ایمان کی تازگی:

اللہ تعالیٰ نے ایک نظام بنایا ہے، سمجھنا چاہو تو سمجھ آجاتی ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ ضد ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ضد سے بچائے اور اللہ تعالیٰ کتاب وسنت کی روشنی میں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آج چودہ سو سال گزر گئے، ہم گناہ گار اور بدکار ہیں، زندگی گناہوں میں گزر گئی، لیکن مدینہ منورہ میں جاؤ تو آدمی کا دل ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اگر ہمیں چودہ سو سال بعد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر دیکھ کر مسجد دیکھ کر اور وہ مقامات دیکھ کر جہاں آمنہ کے لعل بیٹھے تھے، ہمیں اگر اتنا اثر ہوتا ہے تو جنہوں نے اپنی آنکھوں سے میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا، کیا وہ بالکل اندھے اور پاگل تھے؟

صحیح روایت کے اندر موجود ہے کہ ابو جہل اس کعبہ کا طواف کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ایک سردار بھی طواف کر رہا تھا۔ اس نے ابو جہل سے کہا: ایک بات بتاؤ گے؟ اس نے کہا: تم تو میرے دوست اور ساتھی ہو، پوچھو۔ اس نے کہا: میں نے سنا ہے کہ یہاں ایک اللہ کے نبی پیدا ہوئے ہیں جن کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، کیا تم ان کو جانتے ہو؟ ابو جہل نے کہا: تم عجیب بات کر رہے ہو! وہ قریشی ہاشمی ہیں، ہمارے قبیلے سے ہیں۔ اگر ہم ان کو نہیں جانتے ہوں گے تو کون جانتا ہوگا؟ اس سردار نے کہا: تم اللہ کے کعبے میں طواف کر رہے ہو اور تیری میری دوستی ہے، مجھے یہ بتاؤ

کہ اس نے جو دعویٰ کیا ہے کہ میں اللہ کا نبی ہوں، اللہ کا رسول ہوں، کیا وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہے؟ ابوجہل نے دائیں بائیں دیکھ کر تسلی کی کہ کوئی سن تو نہیں رہا، پھر اس کو کہا کہ واقعۃً وہ سچا نبی ہے۔ اس سردار نے کہا: میں ایسے نہیں مانتا، تم پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے پتہ ہے کہ وہ سچا ہے؟ ابوجہل نے کہا: "وُلِدَ فِيْنَا وَعَاشَ فِيْنَا" ہمارے گھروں میں پیدا ہوا اور ہمارے سامنے اس کی زندگی گزری۔ اس نبی پاک کی زبان پر کبھی کسی بندے کے بارے میں جھوٹ نہیں نکلا۔ تو جو انسان کبھی کسی بندے پر جھوٹ نہ بولے تو وہ خدا پر کیسے جھوٹ بولے گا؟ اس سردار نے کہا: جب وہ سچا نبی ہے تو تم اس کا کلمہ کیوں نہیں پڑھتے؟ ابوجہل نے کہا: ہمارا اور ان کے خاندان کا جھگڑا ہے۔ کبھی ہم امیر بنتے تھے اور کبھی وہ امیر بنتے تھے۔ کبھی کعبہ کے سردار ہم بنتے تھے اور کبھی وہ بنتے تھے۔ اب ان کے گھر میں نبوت آگئی، اب ہم مقابلہ نہیں کر سکتے، لہٰذا ہم ان کو نہیں مانیں گے، لیکن وہ اللہ کا سچا نبی ہے۔

اب دیکھیں! جانتا ہے، لیکن مانتا نہیں ہے۔ اس کی وجہ ضد ہے کہ ہمارا خاندانی مقابلہ ہے، لہٰذا ہم نہیں مانتے۔

دنیا کا نظامِ الٰہی:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾

یاد رکھیں! یہ اللہ کا نظامِ عالم ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ سورج نکلے، تمہیں روشنی پہنچے اور کافروں کو روشنی نہ پہنچے، لیکن قیامت میں بدلہ ہم سب کو عمل کے مطابق ملے گا۔ دوسری بات یہ بھی دیکھیں کہ اولاد تمہیں بھی ملتی ہے اور کافر کو بھی ملتی ہے، موت تجھے بھی آتی ہے اور کافر کو بھی آتی ہے، لیکن کافر اسباب میں اٹک جاتا ہے اور مومن مسبب حقیقی کی طرف نظر دوڑاتا ہے۔ یعنی مسلمان کو اولاد ملتی ہے تو وہ فوراً کہے گا: الحمد للہ اللہ کا شکر ہے، اللہ تعالیٰ نے مجھے بچہ دیا ہے۔ اور اگر کافر کے ہاں بچہ پیدا ہوگا تو وہ کہے گا: ہم نے شادی کی تھی، بچہ ہوا ہے، نوجوان بیوی تھی، میں بھی جوان تھا۔ یہ اسباب ہیں اس میں۔ بھگوان کوئی بچے دینے تھوڑی آتا ہے؟ ایک آدمی ہارٹ اٹیک سے مر گیا تو مومن کہے گا: اللہ کی تقدیر کا فیصلہ تھا؛ کیونکہ دل اگر فیل ہو جائے تو اس کا بنانے والا بھی اللہ ہے۔ ملک کے اندر کافر بھی رہتے ہیں اور مسلمان بھی رہتے ہیں سب کو حقوق ملتے ہیں۔ اللہ تو بادشاہوں کے بادشاہ ہیں، وہ بھی اپنے عالم میں سب کو حقوق دیتے ہیں، اپنے ماننے والوں کو بھی اور نہ ماننے والوں کو بھی، لیکن قیامت والے دن جزاء سب کے عمل عقیدے اور نیت کے مطابق ہوگی۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ۝﴾ [التوبۃ:۵۵] اے میرے مدنی! آپ ان کے مال اور اولاد پر تعجب نہ کریں کہ ہم نے دشمنوں کو کیوں دیا!؟ اس کے اندر بھی ہماری حکمت وقدرت ہے کہ وہ اسی میں مشغول رہتے ہیں اور اسی حالت میں ان کی روح نکلے گی، لہٰذا جب وہ کافر ہو کر مریں گے تو ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کھرے کھوٹے کو الگ کرنا چاہتے ہیں:

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی مَاۤ اَنْتُمْ عَلَیْهِ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ ؕ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر ہم کبھی مسلمانوں پر مصیبت نازل کرتے ہیں یا کوئی امتحان آتا ہے، جیسا کہ احد کے میدان میں صحابہ پر امتحان آیا اور مصیبتیں آئیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خبیث اور طیب کو علیحدہ کرنا چاہتے ہیں، تاکہ پاکیزہ علیحدہ ہو جائیں اور گندے علیحدہ ہو جائیں۔ مومن علیحدہ ہو جائیں اور منافق علیحدہ ہو جائیں۔ صادق علیحدہ ہو جائیں اور کاذب علیحدہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے تو علم میں ہے، لیکن میں ساری دنیا پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن جب میں عذاب دوں تو میرے عدل پر کوئی اعتراض نہ کر سکے۔

﴿حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ﴾

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں: میرا مدنی! ہم جو مسلمانوں پر امتحان ڈالتے ہیں، تاکہ کھوٹے اور کھرے میں تمیز ہو جائے؛ کیونکہ کافروں کے گھر میں مومن ہیں اور بعض مومنوں کے گھر میں کافر ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نبی ہیں، لیکن بیٹا کافر ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نبی ہیں، لیکن بیوی کافرہ ہے۔ فرعون کافر ہے، لیکن بی بی آسیہ رضی اللہ عنہا جنت کی سردار ہے۔ ابوجہل کافر ہے، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بطل من ابطال الاسلام ہیں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا: امتحان کے اندر میری حکمتیں ہیں، تاکہ میں ان کو علیحدہ علیحدہ کر دوں۔

اللہ تعالیٰ بعض علم غیب انبیاء اور اولیاء پر ظاہر کر دیتے ہیں:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُطْلِعَكُمْ عَلَی الْغَیْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ۪﴾ تم کوئی عالم الغیب تو نہیں کہ تمہیں پتہ چل جائے یہ مؤمن ہے یا منافق ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو کھول دیتے ہیں، تاکہ سب کو پتہ چل جائے کہ مخلص کون ہے اور منافق کون ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو اپنے انبیاء پر غیب کھولتے ہیں، ان کو غیب کی اطلاع

دے دیتے ہیں۔ یعنی جتنا چاہتے ہیں اتنی خبر دے دیتے ہیں اور نہ چاہیں تو نہیں کھولتے۔ انبیاء پر اگر ایسی (غیب والی) بات کھولی جائے تو وہ معجزہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے اولیاء پر اگر کھولی جائے تو وہ کرامت ہوگی۔ معجزہ بھی برحق ہے اور کرامت بھی برحق ہے۔ لیکن یہ اللہ کے حکم اور ارادہ سے ہوتا ہے، اپنے بس میں نہیں ہوتا کہ ولی جب چاہے کرامت دکھائے۔ اس لیے فرمایا: ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝﴾ [الجن: ۲۶، ۲۷] عالم الغیب اللہ کی صفت ہے، کسی پر غیب ظاہر نہیں کرتے۔ ہاں اگر چاہیں اپنے کسی رسول پر تو جس قدر چاہیں اتنی ظاہر کریں گے۔ کیونکہ علم غیب خاصۂ خدا ہے، اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں ہو سکتا۔ انبیاء کو اطلاع علی الغیب، اظہار علی الغیب، انباء الغیب حاصل ہوتا ہے کہ اللہ ان کو غیب کی خبر دے دے، اللہ غیب ظاہر کر دے، غیب پر مطلع کر دے۔ ﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ [الانعام: ۵۹] خزانۂ غیب کی کنجیاں ہی اللہ کے ہاتھ میں ہیں، کوئی اس کو از خود کھول بھی نہیں سکتا۔ جب اللہ اپنے رسول کو غیب کی خبر دیتے ہیں تو فرشتہ بھیجتے ہیں، اس کے دائیں بائیں اتنا سخت پہرہ ہوتا ہے کہ کوئی اس پہرے کو توڑ نہیں سکتا۔

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ تمہاری نجات اس میں ہے کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ، اللہ کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ کیونکہ یہ تو قاعدہ ہے جو آدمی ایک نبی پر ایمان لائے گا اس کو سب انبیاء پر ایمان لانا ہوگا۔

﴿وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم صحیح ایمان لے آئے اور اللہ سے ڈر گئے شرک سے، نافرمانی سے بچ گئے تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہوگا۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا فائدہ، نہ کرنے کا وبال:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ﴾

جو بخیل لوگ ہیں اللہ کے حقوق ادا نہیں کرتے زکوٰۃ وصدقات نہیں دیتے اور اپنے مال کو اکٹھا کر کے سمجھ رہے ہیں کہ ہمارے پاس بڑا مال ہے وہ اس کو بہتر سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ان کے لیے بہتر نہیں ہے، بلکہ ان کے لیے بہت برا ہے؛ کیونکہ مال جب جمع ہو جائے اور اللہ کا حق ادا نہ کیا جائے اس کا دنیا میں بھی نقصان ہے اور آخرت میں بھی نقصان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے بخیل ہوتے ہیں وہ ساری زندگی ایک ایک پیسہ جمع کرتے ہیں، ان کو نہ کھانا

نصیب ہوتا ہے، نہ پہننا نصیب ہوتا ہے، نہ اچھی جگہ پر رہنا نصیب ہوتا ہے، بچے پریشان، بیوی پریشان، سب تنگ ہیں، لیکن وہ پیسے جوڑ رہا ہے۔ اس کا انجام یہ نکلتا ہے کہ خود اسی ذلت میں مرجاتا ہے اور اولاد میں کوئی ایسا پیدا ہوتا ہے جو سارا مال اڑا کر رکھ دیتا ہے۔ کیونکہ اولاد کو حسرت ہوتی ہے باپ کی زندگی میں پیسہ نہیں ملتا۔ اور آخرت تو برباد ہوگئی۔ لیکن جو لوگ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں اللہ اس کو بدلہ عطا فرماتے ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ کیونکہ اللہ کے قرآن میں فیصلہ ہے کہ جو شخص میرے راستے میں خرچ کرتا ہے میں اس کو بدلہ دیتا ہوں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: صدقہ کرنے والے کا مال کبھی کم نہیں ہوتا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی جود وسخا:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ بہت فیاض طبع تھے۔ ان کے دسترخوان پر طرح طرح کے بہت سے کھانے ہوتے تھے۔ کسی نے دیکھ کر کہا: ''لَا خَيْرَ فِي الْإِسْرَافِ'' فضول خرچی میں کوئی خیر نہیں ہے۔ آپ نے اس کے جملہ کو بدل کر فرمایا: ''لَا إِسْرَافَ فِي الْخَيْرِ'' خیر کے کاموں میں خرچ کرنے میں کوئی فضول خرچی نہیں ہے۔ کتنا بہترین جواب ہے اور عقل کا کمال دیکھیں کہ اس جملہ کو الٹ دیا جو اس نے کہا اور کلام میں بہترین حسن پیدا کر دیا۔

ہم نے ایسے کئی لوگوں کو دیکھا ہے کہ جو اربوں پتی ہیں، لیکن میں نے جب سے دیکھا ہے وہ شلوار قمیص پہنی ہوئی ہے، جوان کو باپ دادا دے گیا تھا۔ اور کپڑا بھی ایسا ہے جو پھٹتا نہیں ہے، تیس سال سے میں دیکھ رہا ہوں۔ تو یہ انسان کی کیا زندگی ہے کہ بچے ذلیل وخوار، کمرے میں جاؤ تو بدبو اٹھ رہی ہے، حمام میں داخل ہو تو معلوم ہو کہ جہنم میں جانا پڑ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان بخیلوں کا انجام یہ ہوگا کہ ﴿سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾۔

یہ مال سانپ بن کر ڈسے گا:

(حدیث) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا، فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهُ مُثِّلَ لَهُ مَالُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا أَقْرَعَ لَهُ زَبِيبَتَانِ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [بخاری، رقم: ۱۴۰۳]

اللہ نے جس شخص کو مال دیا ہے، لیکن وہ اس مال میں زکوۃ ادا نہیں کرتا، قیامت والے دن اس پر ایک ایسا سانپ مسلط کریں گے جس کی دو شاخیں ہوں گی اور وہ سانپ طوق بن کر اس کے گلے میں بیٹھ کر اس کے دونوں

جبڑوں کو پکڑ کر کہے گا: میں تیرا مال ہوں، جو تم اکٹھا کر کے رکھتے رہے اور تم نے اللہ کا حق ادا نہیں کیا تھا۔
ویسے بھی دنیا میں سنتے ہیں کہ جہاں خزانہ ہو وہاں سانپ بیٹھ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی بخیل کو قیامت میں ایسا عذاب دیں گے کہ مال سانپ کا ہار بن کر اس کو پکڑے گا۔

زکوۃ اور عشر کا مسئلہ:

زکوۃ فرض ہے، جیسا کہ نماز فرض ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں نماز کا حکم دیا ہے وہاں زکوۃ کا حکم بھی دیا ہے۔
اسی طرح یاد رکھیں کہ اگر اللہ نے تمہیں زمین دی ہے، اس زمین کی جو پیداوار ہے اس کا عشر یا نصف عشر تمہارے ذمہ ہے۔ یعنی اگر تم پانی خرید کر لگاتے ہو تو وہاں نصف عشر آئے گا۔ مثلاً ہمارے ہاں نہری پانی کا آبیانہ ادا کیا جاتا ہے۔ اور جو فصل بارشوں پر تیار ہوتی ہے اس میں دسواں حصہ دینا پڑے گا۔
یقین فرمائیں! اگر تمام دنیا کے اسلامی ملک ٹیکس ختم کر دیں، صرف زکوۃ وعشر کا صحیح نظام بنا دیں تو ملک میں کوئی غریب نہ رہے اور کسی کو کسی کی ضرورت نہ رہے اور نہ کوئی کسی کا محتاج رہے گا۔ لیکن وہ جو زکوۃ نہیں دیتے؛ کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے زکوۃ دے دی تو زکوۃ صحیح خرچ نہیں ہوگی۔ جو صحیح معنی میں اللہ سے ڈرنے والا ہے وہ زکوۃ دیتا ہے، لوگوں سے چھپاتا ہے۔ ہمارے ہاں جو سیونگ اکاؤنٹ میں ایک خاص مہینہ کے اندر زکوۃ کاٹی جاتی ہے اس سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی۔ کیونکہ زکوۃ اس مال سے دی جاتی ہے جو ہمارے پاس ہو اور جس پر پورا سال گزر جائے۔ اب میرے پاس مثلاً پیسے جون میں آئے تھے میں نے بینک میں ڈالے۔ انہوں نے جولائی کے اندر زکوۃ کاٹ لی، حالانکہ اس پر سال نہیں گزرا تھا۔
دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے کسی دوسرے کے اکاؤنٹ میں بطور امانت پیسے رکھوائے اور زکوۃ اس سے کٹ گئی۔
تیسری بات یہ ہے کہ زکوۃ کٹنے کے بعد اگر صحیح مستحق میں خرچ نہ کی جائے تب بھی دینے والے کی زکوۃ ادا نہیں ہوئی؛ کیونکہ پیسہ صحیح مصرف پر خرچ نہیں ہوا۔
اگر آج یقین ہو جائے کہ زکوۃ کا مصرف صحیح ہوگا تو ان شاء اللہ کوئی مسلمان زکوۃ نہیں کھائے گا، کوئی عشر نہیں کھائے گا۔
اب ایک آدمی موت کا بھی ٹیکس ادا کرے، پیدائش کا بھی ٹیکس ادا کرے، پھر زکوۃ کہاں سے دے؟ اس لیے

دعا کریں اللہ تعالیٰ اسلامی ملکوں میں قرآن وسنت کا قانون نافذ کر دے۔

زکوۃ ادا کرنے کی برکت:

یاد رکھیں! ہزاروں واقعات ایسے ہیں کہ صحیح زکوۃ دینے والے مال کو اللہ نے بچالیا۔ اگر کبھی چوری ہوگئی تو زکوۃ والے کا مال واپس آ گیا۔ میرے اپنے دوست ہیں جنہوں نے قسم کھائی ہے کہ سود نہیں لیں گے اور زکوۃ دو لاکھ بنتی ہے تو اڑھائی لاکھ دیں گے۔ الحمد للہ جب سے انہوں نے میری بات مانی ہے وہ خود آ کر مجھے اللہ کے کعبہ میں کہتے ہیں: مولوی صاحب! ہم آپ کے لیے ہمیشہ دعا کرتے ہیں کہ آپ نے بینک کے قرضوں سے بھی بچالیا، سود سے بھی بچالیا، حرام سے بھی بچالیا۔ اب ہمارے رزق میں اتنی برکت ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کہاں سے پیسے آرہے ہیں!؟ ہم مٹی بھی خریدتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سونا بنا دیتے ہیں۔ جس چیز کا ہم سودا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈال دیتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے مدنی ﷺ کا فرمان ہے کہ صدقہ خیرات کرنے سے مال کبھی کم نہیں ہوتا۔ اور فرمایا: آسمانوں سے دو فرشتے آتے ہیں جو صبح سے لے کر رات تک صرف یہی دعا کرتے رہتے ہیں: ((فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا: اللَّهُمَّ! أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، وَيَقُولُ الْآخَرُ: اللَّهُمَّ! أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا)) [بخاری، رقم: ۱۴۴۲] ایک فرشتہ کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اور عطا فرما اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے: اے اللہ! بخل کرنے والے کا مال برباد فرما۔

مال کو خزانہ بنا کر جمع کرنے کا عذاب:

(حدیث) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ تَرَكَ بَعْدَهُ كَنْزًا مُثِّلَ لَهُ شُجَاعًا أَقْرَعَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَهُ زَبِيبَتَانِ يَتْبَعُهُ، فَيَقُولُ: مَنْ أَنْتَ؟، فَيَقُولُ: أَنَا كَنْزُكَ الَّذِي خَلَّفْتَ بَعْدَكَ، فَلَا يَزَالُ يَتْبَعُهُ حَتَّى يُلْقِمَهُ يَدَهُ فَيَقْضِمُهَا، ثُمَّ يَتْبَعُهُ سَائِرَ جَسَدِهِ))

[صحیح ابن حبان، رقم: ۳۲۵۷]

جو شخص اپنے پیچھے بغیر زکوۃ ادا کیے مال چھوڑ جاتا ہے، اس پر ایک گنجان سانپ مسلط کر دیا جاتا ہے، جس کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ نکتے ہوتے ہیں اور وہ اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ وہ اس سے پوچھتا ہے کہ تو کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میں تیرا وہ مال ہوں جس کو تو نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ پھر وہ اس کے پیچھے لگا رہتا ہے، حتیٰ کہ اس کے ہاتھ کو

لقمہ بنالیتا ہے، پھراس کے سارے جسم کو چبا کر کھا جاتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَأْتِي رَجُلٌ مَوْلَاهُ يَسْأَلُهُ مِنْ فَضْلٍ عِنْدَهُ، فَيَمْنَعُهُ إِيَّاهُ، إِلَّا دُعِيَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعٌ أَقْرَعُ يَتَلَمَّظُ فَضْلَهُ الَّذِي مَنَعَ)) [سنن النسائی، رقم:٢٥٦٦]

کوئی بندہ زمیندار ہے، اس کے علاقے کا کوئی غریب، نوکر محتاج بن کر اس کے پاس آیا ہے کہ مہربانی کریں مجھے کچھ دے دیں، تاکہ میرے بچے کھانا کھالیں۔ اس زمیندار کے پاس مول موجود بھی ہوتا ہے، لیکن وہ نہیں دیتا تو اللہ تعالیٰ قیامت میں اس آدمی پر ایک سانپ مسلط کریں گے تو وہ مال جسے تم نے بچایا تھا اس کی سزا بھگتو۔

صحابہ کا کمال دیکھیں! روایات میں موجود ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تیس ہزار درہم بھیجے تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے خیرات شروع کر دی۔ جب شام ہوگئی اور افطار کا وقت ہوا تو شہد اور روٹی کے ٹکڑوں کے ساتھ بی بی نے افطار کیا۔ گھر میں جو کام کرنے والی عورت تھی اس نے کہا: اماں جان! اگر دو چار درہم اپنے لیے رکھ لیتیں تو ہم بھی کھانے کا سامان لے لیتے اور آج اچھی روٹی کھالیتے۔ آپ نے فرمایا: تم نے یاد ہی نہیں کرایا اور مجھے یاد نہیں رہا۔ تم کہہ دیتی میں تمہیں دے دیتی۔ یعنی اپنی ذات کی فکر ہی نہیں تھی۔ اس لیے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میرے مدنی سرکار ﷺ کی سخاوت رمضان کے مہینے میں ایسے ہوتی تھی جیسا کہ ٹھنڈی ہوا چلے، بلکہ جو بھی آیا آپ نے سب کو دیا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دیکھ لیں کہ گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے، سارا دن کنویں میں ڈول کھینچ رہے ہیں۔ ایک یہودی کے باغ کو پانی دے کر ایک ڈول پر دو کھجوروں پر مزدوری کی۔

مجبور رشتہ دار کے سوال کو پورا نہ کرنے پر عذاب:

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ ذِي رَحِمٍ يَأْتِي ذَا رَحِمَهُ فَيَسْأَلُهُ مِنْ فَضْلٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ عِنْدَهُ، فَيَبْخَلُ بِهِ عَلَيْهِ، إِلَّا أُخْرِجَ لَهُ مِنْ جَهَنَّمَ شُجَاعٌ يَتَلَمَّظُ حَتَّى يُطَوِّقَهُ)) [تفسیر طبری:٧/٤٣٣]

اگر کوئی غریب رشتہ دار کسی ایسے رشتہ دار سے مانگنے آئے اور وہ رشتے دار پیسے ہونے کے باوجود غریب کی مدد نہ

کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اس پر سانپ مسلط کریں گے اور وہ اس کی گردن میں طوق ڈالے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیات خاص طور پر اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئیں کہ اللہ نے ان کو تورات کا علم دیا تھا، لیکن انہوں نے بخل کیا، حق بیان نہ کیا۔ تو اللہ اس عالم کو بھی سزا دیتے ہیں کہ علم ہو، لیکن بیان نہ کرے۔ علم ہو، لیکن حقیقت نہ بتائے۔ علم اور سچی بات نہ بتائے۔[1]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگرچہ مال میں بخل کرے یا علم میں بخل کرے سب اس کے تحت داخل ہیں، لیکن آیت کا صحیح شانِ نزول پہلا ہی ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾

جو کچھ تم جمع کر کے چھوڑ جاؤ گے سب نے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ تو جب سب اسی کا ہے، ملک اسی کا ہے، مال اسی کا ہے تو تم صرف عارضی نگران ہو، پھر اللہ کے دیئے ہوئے مال میں کیوں بخل کر رہے ہو؟ اللہ کے راستے میں اپنے مالوں کو خرچ کرو، تا کہ قیامت کے دن تمہیں فائدہ ہو۔

جو کچھ تمہارے دلوں کے اندر ہے اللہ اس کو جانتے ہیں اللہ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اللہ تمہیں پورا پورا بدلہ دیں گے۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَھُمُ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۗءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝﴾

[آل عمران: ۱۸۱ تا ۱۸۴]

---

[1] [تفسیر ابن کثیر: ۲/۱۷۵]

"اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مال دار ہیں۔ ہم ان کی یہ بات بھی (ان کے اعمال نامے میں) لکھ لیتے ہیں۔ اور انہوں نے انبیاء کو جو ناحق قتل کیا ہے، اس کو بھی، اور (پھر) کہیں گے کہ دہکتی آگ کا مزہ چکھو۔ یہ سب تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کا نتیجہ ہے جو تم نے آگے بھیج رکھا تھا، ورنہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے یہ وعدہ لیا ہے کہ کسی پیغمبر پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی لے کر نہ آئے جسے آگ کھا جائے۔ تم کہو کہ مجھ سے پہلے تمہارے پاس بہت سے پیغمبر کھلی نشانیاں بھی لے کر آئے اور وہ چیز بھی جس کے بارے میں تم نے (مجھ سے) کہا ہے۔ پھر تم نے انہیں کیوں قتل کیا اگر تم واقعی سچے ہو؟ (اے پیغمبر!) اگر پھر بھی یہ لوگ تمہیں جھٹلائیں تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) تم سے پہلے بھی بہت سے ان رسولوں کو جھٹلایا جا چکا ہے جو کھلی کھلی نشانیاں بھی لائے تھے، لکھے ہوئے صحیفے بھی اور ایسی کتاب بھی جو (حق کو) روشن کر دینے والی تھی۔"

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالی نے اہل کتاب کی پھر مذمت فرمائی ہے کہ تحقیق سن لیا اللہ تعالی نے ان لوگوں کا یہ کہنا کہ اللہ غریب ہیں اور ہم غنی ہیں۔ ہم لکھ رہے ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں۔ ان کا انبیاء کو قتل کرنا بغیر حق کے ہے۔ اور ان کو حکم دیا جائے گا کہ اب چکھو عذاب جلنے والا۔

لام ابتدائیہ اور قد تحقیق کے لیے ہے کہ جو کچھ ان کی زبانوں سے نکلا وہ اللہ تعالی نے سن لیا ہے۔

شانِ نزول:

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے قرآن میں آیت اتاری: ﴿مَن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ [البقرة: ۲۴۵] کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ تو یہودی کہنے لگے کہ اے محمد! آپ کا رب فقیر ہو گیا ہے، اپنے بندوں سے قرض مانگتا ہے؟ تو اللہ نے یہی آیت مبارکہ نازل فرمائی: ﴿لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ﴾ [آل عمران: ۱۸۱] اس کو ابن مردویہ رحمہ اللہ اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے فقیر ہیں: حضرت بلال، حضرت صہیب، بی بی سمیہ، حضرت خباب رضی اللہ عنہم ان سب پر نظر ڈالو بالکل غریب ہیں، جن کے گھر میں ایک وقت کا کھانا بھی نہیں ہے، پیٹ بھرنے کے لیے کھجوریں بھی

نہیں ہیں۔ یہودیوں نے کہا: (نعوذ باللہ) جب اللہ کے نبی خود اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ قرضہ تو وہ مانگتا ہے جو غریب ہو جائے۔

یہودیوں کا اللہ پر الزام:

اس سے معلوم ہوا کہ رب محمد (نعوذ باللہ) فقیر ہو گیا ہے، اب ہم سے قرض مانگتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ آیات نازل فرمائیں کہ اے میرے مدنی! آپ کوئی فکر نہ کریں، ان کہنے والوں کا قول ہم نے سن لیا ہے اور ہم نے لکھ لیا ہے۔ ان کو اس بات کا پورا بدلہ (سزا) دیں گے۔ یہ تو ایسے جاہل ہیں، ان کو اتنی سمجھ بھی نہیں ہے کہ یہ تو مالک کا احسان ہے، ورنہ تیرے بدن کا مالک بھی اللہ ہے، آسمان و زمین کا مالک بھی اللہ ہے، تمام مخلوق کا پیدا کرنے والا اللہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جاہلو! مجھے قرض مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن تم جاہل ہو، بات کو سمجھتے نہیں ہو۔ دنیا میں قاعدہ ہے کہ اگر کوئی شریف انسان قرض لے تو وہ ضرور ادا کرے گا؛ کیونکہ ایک ہدیہ ہوتا ہے، اس میں ضروری نہیں ہوتا کہ آپ مجھے اس کا جواب بھی دیں گے۔ اگر دیں تو بڑی اچھی بات ہے، لیکن قرض ایک ایسی چیز ہے جو ہر شکل واپس کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کوئی شریف انسان کبھی کسی کا قرض نہیں کھاتا۔ اور قرض ایک ایسی چیز ہے کہ آدمی اگر اللہ کے راستے میں شہید بھی ہو جائے تب بھی معاف نہیں ہوتا۔ حج کرنے سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، لیکن قرض معاف نہیں ہوتا۔ اللہ کی عبادت کرنے سے تمام گناہ گر جاتے ہیں، لیکن قرض معاف نہیں ہوتا۔ توبہ کرنے سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، لیکن قرض معاف نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اولاد مال، عقل تمہیں میں نے دی ہے، تم سے قرض مانگتا ہوں۔ جب قرض لینے والا خدا ہو تو پھر تمہیں کیسے واپس نہیں ملے گا؟ مقصد یہ تھا کہ تم میرے راستے میں جو خرچہ اور صدقہ کر رہے ہو، میرے راستے میں جو خرچ کر رہے ہو گویا یہ مجھ پر قرض ہے۔ جب قرض لینے والا خدا ہو تو بندے کو کیوں نہ لوٹائے۔ تو اصل قرض بھی نہیں لوٹا سکتا اور میں تمہیں دس گنا لوٹاؤں گا اور میری مرضی آئے گی تو سات سو گنا بھی لوٹاؤں گا اور اگر میرے حرم میں دو گے تو ایک لاکھ گنا لوٹاؤں گا۔ اللہ کے کہنے کا مقصد یہ تھا، یہ نہیں کہ (نعوذ باللہ) خدا غریب ہو گیا ہے۔

جب حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں مدینہ پر بے انتہاء غربت کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل کو حکم دیا کہ میرے مدنی سے جا کر کہہ دو: میرے نبی! اگر چاہتے ہیں تو دو پہاڑ سونے کے بنا کر تمہارے ساتھ چلا دیتے

ہیں کہ آپ جہاں جائیں وہ پہاڑ آپ کے ساتھ چلیں گے اور جتنا مرضی آئے آپ خرچ کریں، لیکن حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اے میرے اللہ! مجھے تو بس اتنا چاہیے کہ تیرا شکر ادا کرتا رہوں اور اگر نہ ملے تو صبر کرلوں۔ مجھے فقر زیادہ پسند ہے۔

اب دیکھ لیں کہ کافر مدینہ میں بول رہے ہیں، مکہ میں بول رہے ہیں اور عرش پر اللہ سن رہا ہے۔ اللہ کی شان دیکھیں کہ دنیا میں کوئی کہیں اللہ کو پکارے اللہ تعالیٰ سنتا ہے۔

فنحاص یہودی اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مکالمہ:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک دفعہ بیت المدارس میں تشریف لے گئے وہاں دیکھا یہود کا بڑا عالم فنحاص بیٹھا تقریر کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ایک اور عالم اشیع بھی موجود تھا۔ کافی سارے یہود جمع تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہنچے اور اس سے مخاطب ہو کر کہا: فنحاص! تیرا ناس ہو! تو اللہ سے ڈر اور مسلمان ہو جا۔ اللہ کی قسم! تو جانتا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، وہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے حق لے کر آئے ہیں، تم ان کی صفات تورات اور انجیل میں لکھی ہوئی پاتے ہو۔ تو فنحاص کہنے لگا: اے ابوبکر! اللہ کی قسم! ہمیں اللہ کے فقر کی وجہ سے اس کی کوئی حاجت نہیں ہے اور وہ ہمارا محتاج ہے، ہم اس کی طرف ایسے آہ وزاری نہیں کرتے، جیسے وہ ہماری طرف آہ وزاری کرتا ہے اور ہم اس سے غنی ہیں۔ اگر وہ ہم سے غنی و بے نیاز ہوتا تو ہم سے قرض نہ مانگتا، جیسا کہ تمہارے ساتھی کو دعویٰ ہے وہ تمہیں سود سے روکتا ہے اور ہمیں وہی سود دیتا ہے۔ اگر وہ غنی ہوتا ہمیں سود نہ دیتا۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو غصہ آگیا اور فنحاص کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا اور فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر ہمارے اور تیرے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا، اے اللہ کے دشمن! اگر تم سچے ہو تو جتنی تمہاری طاقت ہے ہماری تکذیب کرو۔ تو فنحاص رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور کہا: آپ دیکھیں! آپ کے ساتھی نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ تو رسول اللہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ایسا کرنے پر آپ کو کس چیز نے ابھارا ہے؟ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ اللہ فقیر ہیں اور یہ لوگ مالدار ہیں۔ جب اس نے یہ کہا تو مجھے غصہ آگیا اور میں نے تھپڑ مارا۔ فنحاص نے اس بات کا انکار کر دیا تو اللہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سچائی ثابت کرنے اور فنحاص کی تردید میں یہ آیت نازل فرمائی:

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ﴾ اس کو ابن ابی حاتم ؒ نے روایت کیا ہے۔
اور یہ شان صدیق ہے۔ ابو بکر ؓ پر تہمت لگے تو قرآن اترتا ہے اور حضرت عائشہ ؓ پر تہمت لگے تو خدا خود گواہی دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے خود سنا ہے یہودی بد بخت نے یہ بات کہی ہے، ہم ان کو قیامت میں سزا دیں گے۔ جب ان کو جہنم میں ڈالا جائے گا تو ساتھ یہ بھی کہا جائے گا: یہ جو جہنم کی سزا ہے، یہ تمہارا اپنا کیا دھرا ہے، تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتے کہ اپنے بندوں کو پیدا کر کے آگ میں ڈالیں۔ جو تمہیں سزا ملی تمہاری گستاخیاں ہیں تمہاری بداعمالیاں ہیں۔

کیا اللہ تعالیٰ چھوٹا ظلم کرتے ہیں؟

ظلام کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ اللہ بڑا ظلم تو نہیں کرتے چھوٹا ظلم کرتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ تو ہر ظلم سے پاک ہیں۔

یہ مبالغہ عن النفی نہیں، بلکہ نفی النفی ہے۔ دوسرا علماء نے فرمایا: یہ ذی ظلم کے معنی میں ہے کہ اللہ کی شان تو ظلم نہیں کر سکتی، وہ تو ظلم سے پاک ہے صفت نقصان سے پاک ہے۔

آپ ایک چھوٹا سا گلاس بناتے ہیں، آپ اس کو توڑنا نہیں چاہتے تو اللہ نے جس بندے کو خود پیدا کیا ہے، وہ کیوں جہنم میں ڈال دے؟ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کو آگ میں نہیں ڈالنا چاہتے، لیکن تم اگر خود زبردستی کفر کرو اور اللہ کے باغی بنو تو وہ سزا دیتے ہیں۔

شانِ نزول:

جب لوگوں نے یہودیوں سے، کافروں سے کہا کہ اب تو قرآن سچا ہو گیا، اللہ کے نبی آ گئے اور ہجرت کی جگہ مدینہ تم سب جانتے ہو، تمہیں یہ پورا پتہ ہے کہ وہ اللہ کے نبی ہیں، ان کا نام محمد بن عبداللہ ہے، ان کا مولد مکہ اور ہجرت کی جگہ مدینہ ہے، تم سب جانتے ہو، اس لیے ایمان لے آؤ۔ تو وہ کہنے لگے کہ ہم ان پر ایمان نہیں لے آتے؛ کیونکہ ہماری کتابوں کے اندر ہمیں حکم ملا ہے کہ جب تک اللہ کا نبی کوئی خیرات وصدقات کا مال لے کر پہاڑوں پر رکھے، آگ اترے اور اس کو آ کر کھا جائے (کیونکہ پہلے زمانے میں جس کی خیرات وصدقات کو قبول فرماتے تو

آگ آکر اس کو کھا جاتی تھی، لیکن اللہ نے اس امت پر پردہ ڈال دیا کہ تم خیرات کرتے رہو، ہم تیری امت کو رسوا نہیں کرنا چاہتے۔) تو یہودی کہنے لگے کہ اب بھی آگ اتر کر خیرات کا مال کھا جائے تو ہم سمجھیں گے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ تو جب تک وہ یہ معجزات نہ دکھائیں ہم ایمان کیسے لے آئیں؟ اللہ نے فرمایا: میرے مدنی! ہم نے آپ کو سینکڑوں معجزات دیئے اور تمام نبیوں سے زیادہ معجزات دیئے، یہ ظالم جھوٹ بول رہے ہیں۔ اگر یہ سچے ہوتے تو جن نبیوں کے زمانے میں آگ والا معجزہ باقی تھا، ان کو کیوں قتل کر دیا؟ اور ان پر ایمان کیوں نہیں لے آئے؟ اس لیے ان کا مقصد صرف اعتراض ہے، صرف فتنہ اور اعراض ہے، یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے مدنی! یہ تو چھوٹا معجزہ ہے، ہم نے تو آپ کو اس سے بڑے بڑے معجزات دیئے ہیں، لیکن یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ ان کا مقصد صرف اللہ کے نبیوں پر اعتراض ہے۔

تسلی رسول ﷺ:

﴿فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ۝﴾ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے میرے مدنی سرکار ﷺ کو تسلی دی ہے کہ آپ کیوں اداس ہوتے ہیں؟ اگر آپ پر یہ بدبخت ایمان نہیں لے آتے تو آپ کوئی غم نہ کریں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جتنے نبی پہلے گزرے ان کو بھی قوموں نے جھٹلایا۔ یہ تو تاریخ عالم ہے کہ حق والوں کو ہمیشہ جھٹلایا گیا ہے، حق والوں کا ہمیشہ مقابلہ کیا گیا ہے، حق والوں کے خلاف ہمیشہ محاذ بنے، وہ رسول اللہ سے کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے، بڑے بڑے معجزے لے کر آئے۔

''وَالزُّبُرِ'' بمعنی جھڑ کنے والی چیز، لیکن اس کا اطلاق کتاب زبور پر ہوتا ہے، یعنی ایسی کتاب جس میں مواعظ نصائح ہوں، ایسی کتاب جس میں جھنجھوڑا جائے، جس میں نصیحتیں کی جائیں۔

﴿وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ۝﴾

اور روشن چمکتی ہوئی کتاب تورات وانجیل بھی آئیں، لیکن یہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ اس لیے یہ اگر آپ سے اعراض کرتے ہیں تو آپ غم نہ کریں۔ آپ بھی وہ کریں جیسے پہلے نبیوں نے کیا۔

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ ۚ﴾ [الاحقاف:۳۵]

آپ بھی صبر فرمائیں، جیسا کہ پہلے شان والے رسولوں نے صبر کیا۔ حضور اکرم ﷺ تو صبر والے تھے، لیکن یہ

امت کو سبق ہے کہ جب حق والوں کو ٹھکرا دیا جائے، جب حق والوں کی بات نہ سنی جائے، جب حق کی دعوت دینے والے کا مقابلہ کیا جائے تو اس کا کام یہ ہے کہ وہ انبیاء کی سنت پر قائم رہے، وہ نبیوں کے طریقے پر قائم رہے، وہ اللہ والوں کے راستے پر قائم رہے اور کسی کی تکذیب کو خاطر میں نہ لائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حق کی جیت ہوگی اور باطل کی شکست ہوگی۔

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۝ لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝﴾

[آل عمران:۱۸۶،۱۸۵]

"ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے، اور تم سب کو (تمہارے اعمال کے) پورے پورے بدلے قیامت ہی کے دن ملیں گے۔ پھر جس کسی کو دوزخ سے دور ہٹا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ صحیح معنی میں کامیاب ہوگیا۔ اور یہ دنیوی زندگی تو (جنت کے مقابلے میں) دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ (مسلمانو) تمہیں اپنے مال و دولت اور جانوں کے معاملے میں (اور) آزمایا جائے گا، اور تم اہل کتاب اور مشرکین دونوں سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اور اگر تم نے صبر اور تقویٰ سے کام لیا تو یقیناً یہی کام بڑی ہمت کے ہیں (جو تمہیں اختیار کرنے ہیں)۔"

نبی کریم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو تسلی:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ﴾

میرا مدنی! آج آپ کو جھٹلانے والے، غرور کرنے والے، بلال کو انگاروں پر لٹانے والے، محمد مصطفیٰ ﷺ کے پاؤں زخمی کرنے والے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مارنے والے، بی بی سمیہ کی ٹانگیں چیرنے والے سن لیں کہ موت آئے گی، یہ نہیں کہ تم دنیا میں ہمیشہ اسی طرح رہو گے۔ فرمایا: کوئی جاندار، کوئی متنفس اور کوئی مخلوق ایسی نہیں جس کو موت نہ آئے۔ صرف ایک اللہ کی ذات ہے جس پر موت نہیں آئے گی۔ جو زندہ تھا، زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ③﴾ [الحدید:۳] سب سے پہلے بھی اس کی ذات تھی، جب کچھ بھی نہیں تھا صرف میرا اللہ تھا، سب سے آخر میں بھی جب سب فنا ہو جائیں گے صرف اللہ ہوگا۔ سب سے اوپر بھی، سب سے ظاہر بھی اللہ کی ذات ہے۔ جس کی صفت ﴿اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ②﴾ [آل عمران:۲] ہے، وہ زندہ ہے، سب کو تھامنے والا ہے، اس پر موت نہیں آئے گی۔

یاد رکھیں! جس پر موت آئے وہ خدا نہیں ہوسکتا اور جس پر موت نہ آئے وہ خدا کی ذات ہے، اس پر کبھی فنا نہیں آسکتی۔ اگر خدا پر بھی موت آجائے تو ہم کس کو پکاریں گے؟ اگر خدا بھی سو جائے تو ہم کس سے مانگیں گے؟ پھر ٹائمنگ کا فرق ہو کہ وہ سو رہا ہو اور ہم جاگ رہے ہوں تو ساری دنیا جو ہر وقت مانگ رہی ہے وہ کس سے مانگے گی؟

دنیا میں ہر وقت اذانیں ہو رہی ہیں:

ایک آدمی نے کمپیوٹر پر حساب کر کے بتایا کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے اور صرف ایک اللہ کی ذات ہے کہ پورے عالم میں ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں گزرتا کہ اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جا رہا ہو۔ دنیا کے کسی مذہب کو یہ شرف نہیں ملا، صرف اسلام کو ملا ہے کہ ایک سیکنڈ ایسا نہیں جس میں اللہ اکبر، اللہ اکبر کی آواز نہ آرہی ہو۔ ہر وقت اذان ہو رہی ہے؛ کیونکہ کہیں ایک گھنٹہ کا فرق ہے اور کہیں دو گھنٹے کا فرق ہے اور کہیں چار گھنٹے کا فرق ہے اور کہیں نو گھنٹے کا فرق ہے اور کہیں بارہ گھنٹے کا فرق ہے۔ تو اگر اللہ تعالیٰ سو جائے تو کس کو پکارا جائے؟ اگر اللہ تعالیٰ پر بھی موت آجائے تو مخلوق کو کون سنجالے گا؟ اس لیے صرف اسی کی ذات ہے کہ اس پر موت نہیں باقی سب پر موت آنی ہے۔

قرآن میں دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ㉖ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ㉗﴾ [الرحمٰن:۲۶] ہر چیز قابلِ فنا ہے سوائے رب کی ذات کے۔ اور فرمایا: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ﴾ [القصص:۸۸] صرف اسی کی ذات باقی ہے، دائم ہے۔

﴿وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ﴾

موت کے بعد یہ نہ سمجھو کہ موت آگئی تو بچ گئے، جیسا کہ دنیا میں کوئی درد اور تکلیف میں لوگ ہوتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ اچھا ہے اس پر موت آجائے، تاکہ دردوں سے بے چارا چھوٹ جائے۔ کیونکہ بعض بیمار ایسے ہوتے ہیں جو سالہا سال سے بیمار ہوتے ہیں، جب اس کو موت آتی ہے تو لوگ کہتے ہیں: اللہ کا شکر ادا کرو، موت تو آنی تھی

چلو شکر ہے بے چارا عذاب سے تو چھوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم یہ نہ سمجھنا کہ مر گئے تو عذاب سے چھوٹ گئے، بلکہ ﴿وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾۔

ے اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی اگر چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

موت کے بعد تمہاری زندگی کا ایک اگلا دور شروع ہوا جس میں قیامت والے دن تمہیں پورا پورا اجر دیا جائے گا۔ ایک ذرہ ادھر ادھر نہیں ہوگا۔ تم نے اچھا عمل کیا ہے تو اجر ملے گا اور اگر برا عمل کیا ہے تو سزا ملے گی۔

دوبارہ زندہ ہونے کی عقلی دلیل:

کافروں کا عقیدہ تھا: ﴿اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ﴾ [المومنون: ۳۷] یعنی یہی دنیا کی زندگی ہے کہ کوئی پیدا ہو گیا اور کوئی مر گیا۔ اس کے بعد ہم قبروں سے نہیں اٹھائے جائیں گے۔

یاد رکھیں! کافروں کا یہ شبہ ہے کہ ہم کیسے اٹھیں گے؟ جبکہ مر کر مٹی مٹی ہو جائیں گے۔ ایک چیز قابل ہوتی ہے اور دوسری فاعل ہوتی ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں ہوں تو کچھ مشکل نہیں ہے۔ مثلاً پلاسٹک کا ایک گلاس بنایا اور پھر اس کو توڑ پھوڑ دیا، لیکن مادہ تو باقی ہے، وہ مٹی میں مل گیا، اس کو چھان کر پھر بھٹی میں ڈالا تو دوبارہ گلاس تیار ہو گیا، یعنی اس مادہ کے اندر قابلیت ہے کہ ہم اس کو جوڑ لیں۔ اور دوسرا فاعل ہوتا ہے۔ اگر بنانے والا نہ ہو تو پھر گلاس کو کون جوڑے گا؟ جب فاعل بھی ہو اور قابل بھی ہو پھر گلاس کیوں نہ بنے؟ اگر بنانے والا ہو، لیکن وہ خام مال جس سے گلاس بنایا تھا وہ نہیں ہے تو گلاس نہیں بن سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بدبختو! مرنے کے بعد آخر تمہارا بدن، حیات روح اسی ڈھانچہ میں تھی، وہ ڈھانچہ تو مٹی میں پڑا ہے اور میں بنانے والا بھی موجود ہوں تو پھر تیرے بننے میں کیا مشکل ہے؟ میں تو پہلے تمہیں خود بنایا، اب تمہارا میٹیریل تیار ہو گیا، اب تمہارا مادہ تیار ہو گیا، اب تم مر گئے، روح کا تعلق علیین سے جڑ گیا یا سجین سے جڑ گیا، تیرے مادہ کا ذرہ ذرہ مٹی سے مل گیا، کوئی پانی میں بہہ گیا، کوئی آگ میں جل گیا، لیکن کہیں پڑا ہوا مادہ تو ہے اور تمہیں نظر نہ آئے میری نظر سے تو چھپا ہوا نہیں ہے۔

دوبارہ زندہ ہونے کا ایک واقعہ:

اس لیے حدیث مبارک میں آتا ہے کہ پہلے زمانہ میں ایک آدمی نے کہا: جب میں مر جاؤں تو میری لاش کو

جلا دینا۔ جب راکھ جمع ہو جائے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا: ایک حصہ جب زبردست ہوا چلے اس ہوا میں اڑا دینا اور دوسرا حصہ جب دریاؤں میں طغیانی ہو اس میں ڈال دینا؛ کیونکہ اگر خدا نے مجھے دوبارہ بنا لیا اور دوبارہ زندہ کر دیا تو میرے اتنے گناہ ہیں کہ پھر میں نہیں بچ سکتا۔...... اس کی عقل کے اندر یہ آیا تھا کہ جب مادہ نہیں رہے گا تو اب اللہ میاں کس سے بنائیں گے؟ آج ہندو بھی اسی فلسفے کو لیے ہوئے ہیں، ورنہ نرگ (جہنم) کے وہ بھی قائل ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جب جلنے کے بعد ریزہ ریزہ ہو گئے تو عذاب سے بچ جائیں گے...... بہرحال جب وہ آدمی مر گیا، اولاد نے وصیت پر عمل کر کے اس آدمی کی راکھ کو دریا میں ڈال دیا اور آدمی راکھ ہوا میں اڑا دی۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا اور دریاؤں کو حکم دیا۔ اس کا مادہ جمع ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کو زندہ کیا۔ وہ کھڑا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا: میرے بندے! تو نے یہ کیا کیا کہ مجھے جلا کر میری راکھ بنا کر اڑا دینا اور بہا دینا؟ اس نے کہا: اللہ میاں! تیرے ڈر سے کیا تھا کہ اگر میں زندہ ہو گیا تو مجھے چھٹکارا نہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جاؤ میں نے تیرے گناہ معاف کر دیے۔

جو مجھ سے ڈر گیا اس پر میری رحمتیں آ گئیں۔ میں تو اسی کو پکڑتا ہوں جو گناہ بھی کرے اور نہ ڈرے، بے حیائی بھی کرے اور اکڑ کر میرا باغی بنے، قبروں پر سجدے کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں، پھر میں نہیں چھوڑتا؛ کیونکہ یہ میری بغاوت ہے کہ میں نے تمہیں اپنے لیے پیدا کیا ہے، ساری کائنات کو تیرا غلام بنا دیا کہ ہوائیں تیرے لیے ہیں، یہ شمس و قمر تیرے لیے ہیں، یہ چاند سورج تیرے لیے ہیں، یہ زمین کی نعمتیں تیرے لیے ہیں، یہ تمام دنیا کے جاندار تیرے لیے ہیں، صرف تو میرے لیے ہے۔ فرمایا: شیر ہے، ہاتھی ہے اور بڑے درندے ہیں، ان کو گردن جھکا کر پانی پینا پڑتا ہے، لیکن میں نے تجھے ایسی اونچی شان والا بنایا ہے کہ ہاتھوں میں پانی لے پانی تیری طرف آئے پانی تیرے آگے جھکے، لیکن تو صرف میرے آگے جھکے۔ اس لیے اقبال نے کہا تھا:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

شرک کی مذمت کی عجیب ترین مثال!!

جب تو اللہ کے سوا کسی غیر کے آگے جھک گیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیری بیوی انسان ہے، برابر کی مخلوق ہے، اس کے بھی ماں باپ ہے، وہ بھی کسی کی بیٹی ہے، جیسے تو کسی کا بیٹا، جیسے تیرے اندر عقل ہے اس کے اندر بھی عقل ہے، تیرے دو ہاتھ ہیں اس کے بھی دو ہاتھ ہیں، تیری آنکھیں ہیں اس کی بھی آنکھیں، تجھ میں علم ہے اس میں بھی علم ہے، صرف تیری بیوی بن گئی تو اس کی ہر غلطی برداشت کر لیتا ہے، لیکن اگر وہ کسی غیر کے بستر پر سو جائے تو اس کی یہ بغاوت برداشت نہیں کرتا۔ اگر گھر میں اس سے برتن ٹوٹ جائے تو کہتا ہے: کوئی بات نہیں، برتن تھا۔ گھر میں اس سے کوئی کپڑا جل جائے تو کہے گا: جل گیا تو جل گیا، گھر میں کھانا نہ ملے، وقت پر نہ جگائے ہر بات قابل برداشت ہو سکتی ہے، لیکن محبوب ترین بیوی ہے۔ اگر وہ غیر کے بستر پر سو جائے تو غیرت مند برداشت نہیں کرتا۔ کہتا ہے: اب تو نے میری امانت میں خیانت کی ہے، تو نے میری بغاوت کی ہے، تو نے خاوند مجھے سمجھا اور پھر میرے فراش پر کسی دوسرے کو بٹھایا ہے، اب میں جرم برداشت نہیں کر سکتا، تم طلاق لے لو، میں تمہارے شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔

توبہ کے بغیر شرک معاف نہیں ہوگا:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں بھی تیرا گناہ برداشت کروں گا، لیکن جب تو میرے غیر کے آگے جھکا تو میں تیرا گناہ معاف نہیں کروں گا۔ تیرا ہر گناہ قابل معافی ہے کہ تو توبہ کرے گا میں بخش دوں گا تو اگر بغیر توبہ کے بھی مر گیا تو پھر بھی میں اپنی رحمت سے بخش دوں گا۔ فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا﴾

[النساء:۴۸]

جس نے میرا شریک بنایا اسے ہرگز میں نہیں بخشوں گا۔ شریک بنانے کا مطلب ہے کہ ایک تو اللہ ہے، تم دوسرا خدا بنا کر کیا آسمانوں پر بٹھاؤ گے؟ شریک بنانے کا معنی یہ ہے کہ رازق میں ہوں اور تو غیروں سے رزق مانگ رہا ہے، معنی یہ ہے کہ اب تو میرا شریک بنا رہا ہے۔ دعا پکار مجھ سے کی جاتی ہے تو غیروں کو پکار رہا ہے، تو میرا شریک بنا رہا ہے۔ رکوع سجدہ میرے لیے ہے تو غیروں کے آگے جھک رہا ہے، میرا شریک بنا رہا ہے۔ طواف صرف میرے گھر کا ہے تو قبروں پر پھیرے لگا رہا ہے، میرا شریک بنا رہا ہے۔ جب تو میرا شریک بنائے گا تو میں نہیں بخشوں گا،

یہ بغاوت ہے اور باغی کو دنیا میں بادشاہ نہیں بخشتے، میں کیسے بخش دوں گا؟ ہاں اگر شرک سے توبہ کر کے پھر شرک نہ کیا تو معاف کر دوں گا۔

اصل کامیابی کیا ہے؟

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾

قیامت والے دن جب نامۂ اعمال آئیں گے، تمہاری پیشی لگے گی، حساب کتاب ہوگا، اس دن جو جہنم سے دور ہو گیا اور جنت میں داخل ہو گیا وہ کامیاب ہے۔ یہ نہ ہو کہ جہنم سے تو نکل جائے اور جنت میں داخل نہ ہو، بلکہ اعراف میں پڑا رہے، جنت و دوزخ کے درمیان رہے۔ کامیابی یہ نہیں، بلکہ اصل کامیابی دخولِ جنت ہے۔ فرمایا: ﴿زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ﴾ اور پھر فرمایا: ﴿وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ﴾ یعنی جس کو جہنم سے دور کیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا۔ معنی یہ ہے نہ تو خود جہنم سے بچ سکتا ہے اور نہ ہی جنت میں خود جا سکتا ہے۔ دعا کرو اللہ تعالیٰ جہنم سے دور کر دے اور جنت میں داخل کر دے۔ کیونکہ جب تک اللہ نہ کرے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ آگے فرمایا: ﴿فَقَدْ فَازَ﴾ وہی آدمی جو جہنم سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہی کامیاب ہے؛ کیونکہ خیرِ محض کہ جہاں شر کوئی نہیں وہ جنت ہے اور شرِ محض جہاں خیر کوئی نہیں وہ جہنم ہے۔ اور دنیا میں خیر بھی ہے اور شر بھی ہے۔ اس لیے جو جنت میں پہنچ گیا اصل کامیابی اس کو مل گئی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾۔

جس دنیا پر تو ناز کر رہا ہے، جس دولت کے سامنے تو کھڑے ہو کر کہتا ہے: خدا غریب ہو گیا ہے، سن لے! نہیں ہے یہ دنیا کی زندگانی، مگر دھوکہ کا سامان ہے۔ تو اسی دنیا کے فریب میں پھنسا ہوا ہے، جو کبھی تیرے دادا کے پاس تھی، پھر تیرے باپ کے پاس آئی، پھر تیرے پاس آئی، تجھ سے تیری اولاد کے پاس جائے گی۔ یہ کسی کے پاس نہیں رہی، سب سے بے وفائی کرتی آ رہی ہے۔ اور تم اس سے دل لگا کر کھڑے ہو، کسی وفادار سے تم دل لگاتے۔

سونے کو عربی میں "ذہب" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کسی ایک کے پاس ٹھہرتا نہیں ہے۔ تو دوڑنے والی چیز کے پاس دوڑو گے تو کتنی کامیابی حاصل کرو گے؟ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحمت کا فیصلہ فرما کر جنت الفردوس نصیب فرمائیں۔

انبیاء و اولیاء پر بھی موت آتی ہے:

جب قرآن سے ثابت ہے کہ ہر نفس پر موت آنی ہے۔ اب اگر کوئی انکار کر کے کہے: مثلاً انبیاء پر موت نہیں

آئی، یا اللہ کے اولیاء پر موت نہیں آتی، یہ قرآن کا کھلا انکار ہے۔ کیونکہ قرآن نے کلی فیصلہ دیا کہ سب پر موت آنی ہے۔ اور ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے سرکار مدینہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾ [الزمر: ۳۰] میرے مدنی! آپ پر بھی موت آنی ہے اور ان پر بھی موت آنی ہے۔ آپ احد کے مسئلے میں بھی پڑھ چکے ہیں: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ﴾ [الزمر: ۳۰] کہ محمد مصطفیٰ (ﷺ) بھی اللہ کے رسول ہیں اور آپ سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا اگر آپ پر موت آجائے یا آپ اللہ کے راستے میں شہید ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں واپس ہو جاؤ گے؟ دین چھوڑ دو گے؟ مگر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ تمام انبیاء کرام اپنی قبور میں زندہ ہیں، نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور شہداء بھی زندہ ہیں، بلکہ سب مسلمان اور کافر زندہ ہیں، نیکوں کو راحت پہنچتی ہے اور بروں کو عذاب۔

جنت، جہنم اور کون سی چیزیں فنا نہ ہوں گی:

اس لیے سمجھیں کہ انسان اور جاندار پر موت اور فنا نے آنا ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن پر فنا نہیں آئے گی، لیکن وہ قابل فنا ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ چاہیں تو ان کو بھی فنا کر دیں اور اللہ نہ کرے تو اس کی مرضی ہے۔ جیسا کہ جنت پیدا ہو چکی ہے، لیکن اب اللہ تعالیٰ جنت کو فنا نہیں کریں گے، اسی طرح جہنم بن چکی ہے صرف قیامت میں اسے ظاہر کیا جائے گا۔ ﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۴] کتابوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ختم نہیں کریں گے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اس کو بھی ختم کرنا چاہیں تو وہ بھی قابل فنا اور قابل ہلاک ہے۔ اسی طرح کتابوں میں آتا ہے عرش و کرسی باقی ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کی منشا سے باقی ہوں گے۔ صرف اللہ کی ذات ہے جس پر فنا نہیں آسکتی۔

موت کا معنی:

موت کیا ہے......؟ بظاہر موت کی تعریف یہ ہے: "اِخْرَاجُ الرُّوْحِ عَنِ الْجَسَدِ" کہ روح کا جسد سے علیحدہ کر دینا موت ہے۔ روح کیا ہے......؟ اس کی حقیقت کوئی نہیں جانتا ماسوائے اللہ تعالیٰ کے۔ جو چیز سمجھ نہ آئے اس پر بھی ایمان رکھو۔ اور اسی طرح یہ باتیں دماغ میں رکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں ایسے نکات بھی رکھے ہیں جہاں عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہماری عقل کا میزان بڑا محدود ہے۔ اگر میزان چھوٹا ہو تو اس پر بھاری چیز کا وزن نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ آپ پرائمری پاس سے ایم اے کا سوال پوچھیں۔ جب وہ سوال ہی نہیں سمجھے گا تو اس کا

جواب کیا دے گا؟ اسی طرح یہ اللہ کا نظام ہے کہ اس نے ہر چیز میں ایسا خفا، ایسا پردہ، ایسی دقیق چیز رکھی ہے کہ بندہ بس اپنے دل سے ایمان لائے۔ یہ سمجھ آ جائے تو الحمد للہ، اور اگر سمجھ نہ آئے تو ہمارا اپنا قصور ہے کہ ہم ابھی اس منزل پر نہیں پہنچے کہ ان چیزوں کو سمجھ سکیں۔ مثلاً لوگ انکار کرتے ہیں کہ موت کے بعد سوال و جواب کیسے ہوں گے؟ عذاب کیسے ہوگا؟ کوئی سلام کرے تو اس کو کیسے سن سکتے ہیں؟ یہ ساری بحثیں اس لیے ہیں کہ یہ چیزیں ہماری عقل سے ماورائی ہیں۔ اس کو یوں سمجھ لو کہ ہمارے سامنے تو حیات کے بھی پورے گوشے نہیں ہیں۔ ایک بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے، اللہ کی قدرت سے نطفہ قرار پکڑتا ہے، چار مہینے کے بعد اس میں نفخ روح ہوتی ہے، پھر بچہ پیٹ میں حرکت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کیا اس میں روح کو پھونکتے ہوئے کسی نے دیکھا ہے کہ اس بچے کے جسم میں روح کیسے ڈالی گئی؟ پھر دیکھیں جب دو پانی مل گئے تو صرف جم جاتے، لیکن ان سے ہاتھ بنے ان سے آنکھیں بنیں، ان سے کان بنے، ان سے دماغ بنا، ان سے پاؤں بنے، یہ ساری مشینری اندر تیار ہوتی ہے۔ اور جو ماں پیٹ میں اٹھا کر پھر رہی ہے اس کو بھی پتہ نہیں ہے۔ تو حیات کے مسائل بھی ہمارے سامنے چھپے ہوئے ہیں کہ کوئی ہم سے پوچھے کہ روح کیسے پھونکی گئی؟ تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ کیا دنیا میں ایسی مشینیں ایجاد ہوئی ہیں جو یہ بتا سکیں کہ دیکھو یہ روح جارہی ہے؟ حمل ٹھہرنے کے بعد تو کچھ علامات بتائی جاتی ہیں کہ کبھی پیشاب دیکھ کر بتایا جاتا ہے کہ حمل ٹھہر گیا ہے یا الٹراساؤنڈ کرکے بتایا جاتا ہے کہ حمل ٹھہر گیا ہے، لیکن روح کب پھونکی گئی اور وہ کس انداز میں بنایا گیا؟ قرآن نے جو مراحل ذکر کیے: ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: ۱۴] یہ کس نے دیکھے ہیں؟ اور پھر جب پیٹ میں بچہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتے سے فرماتے ہیں: لکھ دو کہ یہ اچھا ہوگا یا برا، شقی ہوگا یا سعید ہوگا، اس کی عمر کتنی ہے اس کا رزق کتنا ہے۔ اب اس کو لکھتے ہوئے کسی نے دیکھا ہے؟

تو جب ہمیں اپنی زندگی کی باتیں سمجھ نہیں آرہیں تو موت کے بعد والی باتیں ہمیں سمجھ نہ آئیں تو اس کا آدمی انکار کیوں کرے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے دو عزت والے فرشتے رکھے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو وہ لکھ رہے ہیں۔ یہ کسی عام کتاب کی بات نہیں ہے، کسی تاریخ کا قصہ نہیں ہے، بلکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۞ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۞﴾ [الانفطار: ۱۱، ۱۲] عزت والے لکھنے والے وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور جو یمین (داہنے کندھے) پر ہے وہ حسنات لکھتا ہے اور جو یسار (بائیں کندھے) پر ہے وہ گناہ لکھتا ہے دونوں لکھ

رہے ہیں، لیکن آپ کی کبھی ان دونوں سے ملاقات ہوئی ہے؟

اس لیے جب دین کے مراحل میں ایسے مسئلے آجائیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر کام یہ ہے ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ [البقرۃ:۳] وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں کہ جو اللہ نے کہہ دیا ہے وہ ٹھیک ہے۔ جو اللہ کے رسول، سرکار مدینہ ﷺ نے فرما دیا ہے وہ ٹھیک ہے۔ اب ہمیں زیادہ پیچیدگیوں میں، گہرائیوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ وہاں ہماری عقل رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔

مثلاً موت آتی ہے حق ہے۔ روح نکالی جاتی ہے حق ہے۔ فرشتے روح نکالنے والے آجاتے ہیں رحمت والے بھی، عذاب والے بھی، یہ حق ہے۔ سب باہر بیٹھے ہوئے ہیں، ڈاکٹر کھڑے ہیں، آکسیجن لگی ہوئی ہے، لیکن جب موت کا وقت آیا روح نکل گئی، کوئی کچھ نہیں کر سکا۔

حضور اکرم ﷺ سے روح کے بارے میں سوال کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک جواب دیا کہ میرے مدنی! آپ ان کو اتنا کہہ دیں کہ روح امر ربی ہے، یہ ایسی باریک چیز ہے۔ جن کو قرآن سمجھ نہیں آرہا، جن لوگوں کے سامنے چاند دو ٹکڑے ہو گیا، جن کے سامنے آپ کی انگلیوں سے پانی کی ندیاں جاری ہو گئیں، ان کو یہ سمجھ نہیں آرہا تو وہ روح کو کیا سمجھیں گے؟ اس لیے ان کو روح کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں کیا پیاری بات فرمائی ہے کہ اگر اس کو سونے کے پانی سے بھی لکھا جائے تو کم ہے۔ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ یہ جتنی چیزیں ہم سے غائب ہیں، اگر اللہ میرے سامنے سب کھول دے تب بھی میرے ایمان میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرا ایمان پہلے ہی مضبوط ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہادری اور ایمان کی پختگی:

ایک دفعہ کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ کو اللہ نے واقعی بڑا بہادر بنایا ہے، لیکن یہ معقول بات نہیں ہے کہ آدمی اکیلا دشمن کی صفوں میں گھس جائے، ایک انسان ایک سے، دو سے، تین سے یا پانچ سے کتنے سے لڑے گا؟ اس لیے آپ احتیاط کیا کریں۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں کیوں ڈروں؟ مجھ سے تو موت ڈرتی ہے۔ تو ساتھیوں نے کہا: موت کیسے ڈرتی ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا وقت سے پہلے آسکتی ہے؟ انہوں نے کہا: وقت سے پہلے نہیں آسکتی۔ تو حضرت علی نے فرمایا: میں جتنا زور لگاؤں کہ وہ آجائے وہ کیسے آسکتی ہے؟ وہ تو بھاگتی ہے کہ میں

ابھی نہیں آتی، مجھے ابھی دیر ہے۔ اور جب موت نے آنا ہے تو اس نے مؤخر نہیں ہونا۔

موت سب پر آئے گی:

اسی لیے یاد رکھیں کہ موت سب پر آئے گی، لیکن جس طرح اللہ نے زندگی میں شان بخشی ہے، اسی طرح موت، موت کے بعد عالم برزخ، عالم آخرت ان میں بھی اللہ نے شان والوں کو شان دیا ہے۔ یہ نہیں کہ تم انکار کردو کہ ان کو موت نہیں آئی۔

موت کا لفظ بے ادبی نہیں:

جیسا کہ ہمارے بعض لوگوں کے عقیدے بڑے ڈھیلے ہیں۔ اللہ ہمیں بھی اور انہیں بھی ہدایت دے۔ اگر کوئی بڑا بزرگ فوت ہو جائے تو اس کے بارے میں کبھی نہیں کہیں گے کہ ان پر موت آئی ہے، بلکہ کہیں گے کہ وصال فرما گئے ہیں۔ وصال کا معنی ہوتا ہے ملنا، فصل کا معنی ہوتا ہے علیحدہ ہونا۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ وہ بزرگ اللہ سے مل گئے ہیں۔ اچھا جب تک زندہ تھے اللہ سے دور تھے؟ کیونکہ اب جو ملے ہیں اگر پہلے ملے ہوئے تھے تو اب کیوں مل گئے؟ اور اگر پہلے جدا تھے تو اب کیسے مل گئے ہیں؟ ملنے کی کیا وجہ ہوگئی؟ سمجھیں ایک ہے ادب سے کہنا۔ اگر موت کا لفظ بے ادبی ہوتا تو کیا اللہ اپنے نبیوں کو کہتا؟ جس خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ میرے مدنی ﷺ کی آواز سے تمہاری آواز اونچی ہوگئی تو تمہارے عمل برباد کردوں گا۔ جو اللہ یہ ادب سکھا رہا ہے تو اگر موت کے لفظ میں توہین ہوتی تو اپنے نبیوں پر کیسے کہتا کہ موت آئے گی؟ معلوم ہوا کہ موت کا لفظ کوئی توہین نہیں ہے اور حیات کا لفظ کوئی شان نہیں ہے۔ حیات وہ شان والی ہے جو اللہ کے تابع ہے اور موت بھی وہ شان والی ہے جو اللہ کے تابع ہے، جو اللہ والوں کے لیے ہے، ورنہ ایسی زندگی بے بندگی شرمندگی ہے۔ اسی طرح موت اگر کفر پر ہے گناہوں پر ہے تو اللہ تعالیٰ معاف کرے۔ لیکن موت اگر اللہ کے راستے میں ہے تو وہ موت نہیں، بلکہ دائمی زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو میرے راستے میں شہید ہو جائیں گے گو تیرے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں خبردار! ان کو مردہ نہ کہنا، بلکہ وہ زندہ ہیں۔

موت آنے کے بعد جو مرحلے ہیں ان پر بھی ہمارا ایمان ہے کہ آدمی کا جنازہ ہوگا، دفن ہوگا، سوال ہوگا، منکر نکیر آئیں گے۔ پھر اگر اعمال صالحہ ہیں تو قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بن جائے گی اور اگر اعمال برے ہیں تو

جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا بن جائے گی۔

مخلصین کا بھی امتحان ہوتا ہے:

﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝﴾

جنگ میں شکست آگئی، پریشانی آگئی تو صحابہ گھبرا گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر فرمایا: میرے مدنی! آپ ان کو بتادیں کہ ہم تمہیں آزمائیں گے تمہارے مالوں اور تمہاری جانوں میں، تم کیا سمجھتے ہو کہ دنیا میں تمہارا امتحان نہیں ہوگا؟ حالانکہ دنیا ہے ہی دار الامتحان۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝﴾ [العنکبوت:۱،۲] کیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائیں گے اور ہمیں آزمایا نہیں جائے گا؟

حالانکہ تم اگر دو آنے کا گلاس خریدتے ہو تو اس کو ہاتھ مارتے ہو کہ کچا ہے یا پکا ہے، ٹوٹا ہوا یا سوراخ تو نہیں ہے؟ پانی ڈال کر اوپر نیچے دیکھتے ہو۔ اگر سونا خریدتے ہو تو اس کو آگ میں ڈال کر دیکھتے ہو کہ کتنا گند ہے اور کتنا کھرا ہے۔ تو جتنی چیز قیمتی ہوتی ہے اتنا امتحان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے جو تمہیں اشرف المخلوقات بنایا ہے ہم بھی تمہارا امتحان لیں گے، کبھی تمہارے مال کا امتحان ہوگا کہ مال برباد ہوگیا، باغات لٹ گئے، زمینیں تباہ ہوگئیں۔ اور کبھی ہم تمہاری جانوں میں امتحان لیتے ہیں کہ کبھی بیماری آگئی، اللہ معاف کرے فالج ہوگیا، گر گیا زخمی ہوگیا، حادثہ ہوگیا اعضا کٹ گئے، اچھا خاصا خوبصورت چلنے والا جوان بے کار ہوگیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ سب تمہارے لیے امتحان ہیں۔ اور فرمایا: کبھی ہم جنگ مسلط کر کے امتحان لیتے ہیں کہ باپ سامنے کھڑے ہو کر دیکھ رہا ہے کہ بیٹے شہید ہو رہے ہیں۔ یہ سب امتحان ہے۔ فرمایا: میرے مدنی! جو اس امتحان میں پورا اتریں جو اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے اس پر راضی ہوں آپ ان کو خوشخبری دے دیں۔

کفار کا مسلمانوں سے بغض:

اور میرے مدنی! آپ کے ساتھیوں کو اہل کتاب میں سے اور مشرکین میں سے ایسی ایسی باتیں سننا پڑیں گی جن سے ان کو ایذاء پہنچے گی۔ مشرک ہوں یا یہودی ہوں یہ گالیاں بھی دیں گے، یہ طعن بھی کریں گے اور اعتراض بھی

کریں گے کہ کبھی خدا پر اعتراض، کبھی محمد مصطفیٰ پر اعتراض کریں گے۔ کیونکہ ان کے دلوں کے اندر بغض بھرا ہوا ہے۔ اس لیے یہ باتیں کریں گے جیسا کہ جب مکہ فتح ہو گیا تو حضور اکرم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دیں۔ تو وہ کفار جو قید ہو گئے تھے ان میں سے ایک کہنے لگا: شکر ہے کہ آج میرا باپ مر گیا ہے، اس نے یہ داغ تو نہیں دیکھا کہ بلال کعبہ پر چڑھا ہوا ہے۔ دوسرا کہنے لگا: پتہ نہیں حضور کو کیا یہی کالا کوا ملا تھا اور دوسرا کوئی نہیں ملا؟ اس سے اندازہ لگالیں کہ صحابہ سے بغض کن کو تھا؟

پھر کفار ابو سفیان کو کہنے لگے کہ تم بھی تو کچھ کہو۔ انہوں نے کہا: میں کچھ نہیں کہتا، میں ڈرتا ہوں کہ آسمانوں اور زمینوں کا رب اپنے نبی کو بتا دے گا کہ ابو سفیان نے کیا کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیج کر یہ باتیں بتائیں تو آپ نے ان کافروں کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے یہ کہا تھا؟ انہوں نے اقرار کر لیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سن لو اسلام میں کوئی گورا کالا نہیں ہے، اسلام میں کوئی عربی عجمی نہیں ہے، اسلام میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہے، اسلام میں تو تقویٰ کا مقام ہے۔ عزت اس کی ہے جو متقی ہے۔

﴿وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اہل کتاب اور مشرکین کی اتنی باتیں سننے کے بعد اگر تم صبر کرو، برداشت کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو یہ بڑا شان والا کام ہے۔ یہ ہر آدمی نہیں کر سکتا کہ کوئی گالی دے اور وہ دعائیں دے۔

حضور ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھانے والی عورت:

ایک عورت حضور ﷺ کے راستے میں روزانہ کانٹے بچھا دیتی تھی کہ جب اندھیرا ہو گا تو آپ کو کانٹا لگ جائے گا۔ ایک دن آپ آئے تو کانٹے نہیں تھے۔ آپ نے پوچھا: اس عورت کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا: وہ بیمار ہے۔ آپ نے فرمایا: مجھے اس کا گھر بتاؤ، میں اس کے لیے دعا کرنے جاؤں گا۔

یہ سنت نبوی ہے۔ کیا تم لوگوں نے بھی کبھی یہ کیا ہے؟ دوستوں کے گھر میں ہر کوئی جاتا ہے، تم نے مجھے حاجی کہا اور میں نے آپ کو حاجی کہا۔ یہ تو رو ٹین ہے۔ کمال تب ہے کہ وہ گالیاں دیں تم دعائیں دو۔

فرشتوں پر بھی موت آئے گی:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انسان ہیں یا جن ہیں، اللہ تعالیٰ کی جتنی مخلوق ہے سب پر موت آنی ہے۔ اللہ کے فرشتوں پر بھی موت آنی ہے، حملۃ العرش پر بھی موت آنی ہے اور ملائکۃ المقربین پر بھی موت آنی ہے۔ موت سے کسی کو مفر نہیں ہے۔

جیسا کہ صحیح حدیث مبارک میں آتا ہے کہ جب سب چیزوں پر موت آجائے گی تو باقی اللہ تعالیٰ کے چار فرشتے بچیں گے جو سب سے زیادہ عزت والے، شہرت والے فرشتے ہیں: حضرت جبرائیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام۔ اللہ تعالیٰ حضرت عزرائیل علیہ السلام سے فرمائیں گے: اب کون باقی ہے؟ تو عزرائیل علیہ السلام عرض کریں گے: یا اللہ! آپ تو جانتے ہیں آپ کے آگے تو کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، لیکن آپ کے حکم کی تعمیل میں عرض ہے کہ اب ہم چار فرشتے باقی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت عزرائیل علیہ السلام کو حکم دیں گے کہ ان تین کی روح کو قبض کرو۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام ان تینوں کی روح کو قبض کریں گے۔ باقی حضرت عزرائیل علیہ السلام بچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: عزرائیل! کون بچ گیا ہے؟ وہ عرض کریں گے: یا اللہ! سب سے کمزور تیرا بندہ عزرائیل ہے، باقی سب ختم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم بھی مرجاؤ۔ عزرائیل علیہ السلام بھی مرجائیں گے۔

اصل وجہ یہ ہے کہ اللہ کا نظام ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذمہ کر رکھا ہے کہ وہ اللہ کی وحی لے کر پیغمبروں کے پاس جائیں۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام جن کا نام ملک الموت بھی ہے ان کے ذمہ ارواح کو قبض کرنا ہے۔ ان کی نگرانی میں اللہ تعالیٰ کے اتنے فرشتے ہیں جن کا عدد اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ جب سب کچھ فنا ہو جائے گا تو ملک الموت پر بھی موت آجائے گی، تاکہ پورے عالم پر ایک تو یہ واضح ہو جائے کہ جو موت دینے والا ہے اس پر بھی موت آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت:

اصل کام تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کے ذمہ ڈیوٹی لگا دیں اس نے کرنا ہے، فرشتوں کا کام یہی ہے کہ جو اللہ کا حکم ملے اسے پورا کریں۔ وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ سورج کو حکم دیں گے کہ وہ مشرق کی بجائے مغرب سے نکلے، تاکہ ایک تو یہ معلوم ہو جائے کہ اب توبہ قبول نہیں ہوگی اور دوسرا عالم کو یہ سبق بھی مل جائے کہ نظام یوں نہیں چل رہا، الٹ چل رہا ہے، یعنی یہ دنیا

فنا ہو جائے گی۔

اور تیسرا اس دنیا کو یہ سبق دیا گیا کہ کہیں کوئی جاہل یہ اعتراض نہ کر دے کہ اللہ پاک بھی سورج کو مشرق سے نکالنے کی طاقت رکھتے ہیں، لیکن مغرب سے نکالنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ تو اللہ تعالیٰ سورج کو مغرب سے نکالیں گے کہ یہ تو میرے حکم کے تابع ہے۔ جب میں اس کو حکم دیتا ہوں وہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور جب اس کو حکم دوں گا وہ مغرب سے طلوع ہوگا۔

قول ہے کہ دنیا میں اتنی محنت کرو جتنا تم نے دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لیے اتنی محنت کرو جتنا وہاں رہنا ہے۔ اب خود اندازہ لگالو کہ ہم نے وہاں کتنا رہنا ہے اور یہاں کتنا رہنا ہے، لیکن ہمارا عالم یہ ہے کہ ہم ساری محنت اس دنیا کے لیے کر رہے ہیں، آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے اور ہم سب کو فکرِ آخرت نصیب فرمائے۔

حضور ﷺ کی وفات پر حضرت خضر علیہ السلام کی تعزیت:

ابن ابی حاتم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ واقعہ روایت فرمایا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب ہمارے آقا سرکارِ مدینہ ﷺ کی وفات ہوئی، اس کے بعد جو تعزیت آئی اس میں یہ تھا کہ کوئی آنے والا آیا ہے، اس کے آنے کی، چلنے کی آواز تو محسوس ہوئی تھی، لیکن وہ آدمی نظر نہیں آیا تھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے آنے کے بعد کہا: ﴿رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ [ھود: ۷۳] اس نے سلام کیا اور اس کے بعد یہ آیت پڑھی: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۚ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾ ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اللہ کے نبی پر بھی موت آئی ہے اور تم پورا پورا بدلہ دیئے جاؤ گے۔ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر مصیبت کی تسلی ہے۔ اگر کوئی چیز ہلاک ہو جائے تو اس کا بدلہ بھی اللہ تعالیٰ دیتے ہیں اور کوئی چیز فوت ہو جائے تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو، اللہ کی طرف رجوع کرو؛ کیونکہ اصل میں مصیبت والا شخص وہ ہے جو ثواب سے محروم ہو جائے۔ اس شخص نے یہ کلمات کہے اور اس کے بعد ''والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہا اور چلا گیا۔ امام جعفر بن محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے والد نے خبر دی کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو یہ کون ہیں؟ یہ حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔

[اس روایت کو علامہ سیوطی نے درمنثور ۲/۳۹۹ پر نقل کیا ہے اسنادہ ضعیف ومتنہ منکر]

جنت کی فضیلت:

(حدیث) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَوْضِعُ سَوْطٍ فِي الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا، وَاقْرَءُوا إِنْ شِئْتُمْ: ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۚ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾)) [سنن الترمذی، رقم: ۳۲۹۲] ایک بید کے برابر جنت کے اندر ایک ٹکڑا دنیا اور جو کچھ اس دنیا کے اندر ہے اس سب سے بہتر ہے۔ اس بات کے ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم چاہو تو اللہ تعالی کے قرآن کی یہ آیت بھی پڑھ لو کہ جو جہنم سے ہٹا دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تحقیق وہ کامیاب ہو گیا۔

(حدیث) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میرے آقا سرکار مدینہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کو جہنم سے دور کر دیں اور جنت میں داخل کر دیں تو وہ یہ کوشش کرے کہ اس کی موت اس حال پر آئے کہ وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔ اور لوگوں کے ساتھ ایسا اچھا برتاؤ کرو کہ جو تمہارا دل کرتا ہے کہ لوگ آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں۔ [مسند احمد: ۲/۱۹۱]

کیونکہ موت اگر ایمان پر نہ آئے تو جنت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! کیونکہ یہ قاعدہ ہے: جس شخص کی موت ایمان پر آئے گی وہ اللہ کی رحمت سے جنت میں داخل ہوگا اور جس شخص کی موت شرک پر آئے گی وہ کبھی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

دنیا دھوکہ کا سامان ہے:

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾ دنیا تو دھوکہ کا سامان ہے۔ چاہے کروڑوں ہوں، اربوں ہوں۔ آج دولت ہے کل چھن جائے گی، آج آپ کے پاس عزت ہے کل نہ رہے۔ یہ تو فانی چیز ہے۔ جو دولت میں آکر اندھے ہو جاتے ہیں وہ برباد ہو جاتے ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ اس دنیا کی مثال ایسے ہے جیسا کہ کوئی مردار جانور ہو تو اس کے اندر بڑی بدبو ہوتی ہے تو اس کو کتے ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن جو دین کے حقوق کو مقدم رکھے اور دنیا کو بھی بقدر اجازت طلب کریں تو کوئی منع نہیں ہے۔ یہاں اس دنیا کی مذمت ہے کہ دین کو بھول کر دنیا کو ترجیح دے کر اس میں لگا رہے۔ [ترتیب الامالی]

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((وَاللّٰهِ مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا كَمَا يَغْمِسُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ فِي الْيَمِّ، فَلْيَنْظُرْ بِمَ تَرْجِعُ إِلَيْهِ))
[مسلم، رقم:۲۸۵۸]

آپ نے دنیا کی مثال دی کہ تم اپنی انگلی کو سمندر کے پانی میں ڈالو پھر کھینچ لو اور دیکھو اس کے ساتھ کتنا پانی آیا ہے۔ فرمایا: آخرت کے مقابلہ میں دنیا بھی کچھ ہے۔ آخرت کی نعمتیں ایسی ہیں جیسے رحمتوں کے دریا ہوں اور دنیا اتنی ہے جیسے انگلی کو پانی لگتا ہے؛ کیونکہ دنیا تو فنا ہونے والی چیز ہے۔ جو چیز فنا ہونے والی ہو اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر: آج آپ کو کوئی آدمی محل بنا دے اور کہے کہ یہ محل آپ کا ہے، لیکن دو سال کے بعد اس کو آپ سے واپس لے لیں گے اور آپ کو اس سے نکال دیں گے۔ تو آپ اس کو پہلے دن سے ہی گننا شروع کر دیں گے کہ کتنے دن گزر گئے ہیں؟ تو ایسی عزت کا کیا فائدہ جو کل چھن جائے؟ اور وہ لذت جو چھن جائے وہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا عذاب ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگا کرو کہ اللہ تعالیٰ عزت دے کر ذلت نہ دے، آرام دے کر دکھ نہ دے، صحت دے کر بیماری نہ دے، اچھے دن دے کر برے دن نہ دکھائے؛ کیونکہ یہ اتنا بڑا امتحان ہوتا ہے کہ آدمی دو دن کے اندر سیدھا ہو جاتا ہے۔ فرعون کے ایک اشارے پر لوگ قتل ہو جاتے تھے، لیکن جب اس کو پانی میں ایک غوطہ آیا تو کہنے لگا: ﴿حَتّٰى إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا الَّذِيْ اٰمَنَتْ بِهِ بَنُوْا إِسْرَاءِيْلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝﴾ [یونس:۹۰، ۹۱] آج مجھے سمجھ آگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بدبخت! اب کلمہ پڑھ رہا ہے جب مرنے کا وقت آیا ہے؟ اس لیے اب اسی حال میں مرو۔

عبداللہ بن اُبی کی حضور ﷺ سے بدتمیزی:

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے گدھے پر سواری کی، آپ کے جسم اطہر پر فدک کی ایک چادر تھی اور آپ کے پیچھے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ بنو الحارث میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیمار تھے، ان کی عیادت کرنے کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ یہ غزوہ بدر سے پہلے کا واقعہ ہے۔ آپ ایک مجلس سے گزرے جس میں یہ بدبخت منافق عبداللہ بن ابی بن سلول بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ابھی اسلام بھی ظاہر نہیں کیا تھا اور مجلس کے اندر مختلف لوگ بیٹھے تھے: مشرک بھی تھے، یہودی بھی تھے اور مسلمان بھی تھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ جب حضور ﷺ کی سواری وہاں سے گزری اور اس سے غبار اٹھا تو عبداللہ بن ابی نے اپنے ناک پر چادر رکھ لی اور کہنے لگا: اپنی سواری دور لے جائیں، آپ کی سواری کی وجہ سے مجھ پر غبار آ رہا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے وہاں پہنچ کر سلام کیا۔

آپ اترے اور وہیں کھڑے ہو کر دعوت دی، اللہ کا قرآن پڑھا اور ان کو اللہ کی توحید کی طرف بلایا۔ عبداللہ بن ابی کہنے لگا: اے انسان! ہمیں تقریریں نہ کرو۔ اگر یہ حق ہے جو کہتے ہو، ہمیں تکلیف نہ پہنچاؤ اور جا کر اپنے گھر میں بیٹھ جاؤ۔ اگر کوئی تمہارے پاس آئے تو اس کو دعوت دو، تم کیوں ہمارے پاس آتے ہو اور ہماری مجلس میں آ کر ہمیں کیوں تکلیف پہنچاتے ہو؟ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: آپ بالکل آئیں اور ہمیں قرآن سنائیں اور ہمیں دعوت دیں۔ ہم اس کو محبوب رکھتے ہیں۔ تو مسلمانوں اور مشرکین و یہود کی آپس میں لڑائی اور گالم گلوچ شروع ہو گئی اور نوبت لڑائی تک جا پہنچی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم روکتے رہے کہ نہ لڑو، حتیٰ کہ وہ سارے خاموش ہو گئے۔ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر سوار ہوئے اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔

آپ نے حضرت سعد سے فرمایا: اے سعد! آپ نے ابوحباب کی بات نہیں سنی؟...... مراد عبداللہ بن ابی تھا...... اس نے ایسا ایسا کہا ہے۔ تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں آپ سے ایک درخواست کرتا ہوں کہ اللہ کے لیے اس کو معاف کر دیں۔ خدا کی قسم! اللہ نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے، آپ سچے نبی ہیں اور آپ کی دعوت بھی سچی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگ اس بدبخت کو مدینہ کا سردار بنا رہے تھے۔ جب سے آپ تشریف لے آئے تو اس کی سرداری ختم ہو گئی۔ اس وجہ سے وہ بگڑا ہوا اور بہکا ہوا ہے کہ آپ کے آنے کی وجہ سے میری سرداری گئی، آپ اس کو معاف فرما دیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اس کو معاف کر دیا ہے۔ تو جتنی بھی مسلمانوں کو تکلیفیں آئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی معاف فرما دیتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی معاف فرما دیتے تھے، حتیٰ کہ جب بدر کا واقعہ پیش آیا اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح دی اور بدر میں کفار قریش کے سردار مارے گئے تو عبداللہ بن ابی نے اعتراض کیا تھا اپنی جماعت کو اکٹھا کر کے۔ کہنے لگا کہ اب مسلمان ہو جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی کو طاقت مل گئی ہے، ورنہ ہم برباد ہو جائیں گے۔ تو وہ آ کر مسلمانوں میں شامل ہو گئے۔

[بخاری، رقم: ۴۵۶۶]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کوئی حق والا جب حق پر کھڑا ہوگا، بھلائی کا امر کرے گا، برائی سے روکے گا اور لوگوں کو حق کی دعوت دے گا تو لازمی بات ہے کہ لوگ اس کو تکلیفیں دیں گے، ستائیں گے، پتھر برسائیں گے اور گالیاں دیں گے۔ اس کے پاس علاج یہ ہے کہ وہ اپنے اللہ پر توکل کرے، اللہ تعالیٰ سے مدد مانگے اور اپنی بات پر

جاتا ہے۔

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ۝ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوا وَّيُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُم بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝﴾ [آل عمران: ۱۸۷ تا ۱۸۹]

''اور (ان لوگوں کو وہ وقت نہ بھولنا چاہئے) جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ عہد لیا تھا کہ تم اس کتاب کو لوگوں کو سامنے ضرور کھول کھول کر بیان کرو گے اور اس کو چھپاؤ گے نہیں۔ پھر انہوں نے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت حاصل کر لی۔ اس طرح کتنی بری ہے وہ چیز جو یہ مول لے رہے ہیں۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ جو لوگ اپنے کئے پر بڑے خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ان کاموں پر بھی کی جائے جو انہوں نے کئے ہی نہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں ہرگز یہ نہ سمجھنا کہ وہ عذاب سے بچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کے لیے دردناک سزا (تیار) ہے۔ اور آسمانوں اور زمین کی سلطنت صرف اللہ کی ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر مکمل قدرت رکھتا ہے۔''

یہودیوں کی عہد شکنی:

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی مزید عہد شکنی کا بیان فرمایا ہے۔ یہود و نصاریٰ اہل کتاب کہلاتے ہیں؛ کیونکہ ان کا کتاب پر ایمان تھا، گو تورات وانجیل بدڈالی گئی، لیکن بہر حال وہ اہل کتاب تو کہلائیں گے؛ کیونکہ ان کے آباء واجداد ایک کتاب کے متعلق تھے۔ اور اسی طرح مشرکین مکہ مشرک تھے، ان کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔ قرآن نے انہیں ہمیشہ مشرکین قرار دیا ہے۔

یہودی ملک شام سے مدینہ میں کیوں آکر بسے تھے؟

یہود سب کے سب شام اور اس کے آس پاس حوالی میں آباد تھے۔ وہ وہاں سے مدینہ منورہ صرف اس انتظار میں آئے تھے کہ ہماری کتابوں میں جس نبی کا ذکر ہے جب وہ نبی پیدا ہوں گے ہم اس کے ہاتھ پر اسلام لائیں

گے، مسلمان ہوں گے اور پھر ان کی طاقت کے ساتھ ہم دشمنوں کا مقابلہ کریں گے۔ اور وہ یہ باتیں کافروں پر برملا کہتے تھے۔ یہ سب اس انتظار میں وہاں آئے تھے جیسا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی آئے تھے۔

جب میرے مدنی پاک ﷺ پیدا ہوئے تو آپ کا سلسلہ نسب حضرت اسماعیل سے جڑا۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس کا دنیا میں کوئی بھی منکر پیدا نہیں ہوا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے ولد اسماعیل میں پیدا فرمایا۔ اللہ نے ساری دنیا سے بنو کنانہ کو، بنو کنانہ کے بعد قریش کو اور قریش کے بعد بنو ہاشم کو چن لیا اور بنو ہاشم میں سے عبداللہ کے گھرانے کو چن لیا۔ مجھے اسی گھرانہ سے پیدا کیا۔

یہودیوں نے عہد شکنی کیوں کی؟

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ جو ہم آپ کو کتابیں بھیجیں گے وہ تم لوگوں کو کھول کر بیان کرو گے اور تم ہرگز اس بات کو نہیں چھپاؤ گے جو اللہ نے اتاری ہے۔ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس کو پورا پورا پہنچاؤ۔ لیکن اہل کتاب نے اس عہد کو پشت کے پیچھے پھینک دیا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں بھی محاورہ ہے کہ اس نے تو خط پڑھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا، اس نے پشت پر ڈال دیا۔ یعنی اس بات پر عمل کرنا تو بڑی بات ہے، لیکن انہوں نے تو بات کو ہی پھینک دیا۔ اور انہوں نے ایسا اس لیے کیا: ﴿وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ﴾ کہ انہوں نے اس کے بدلہ میں تھوڑا سا فائدہ لیا ہے۔ اور کیا ہی اس کی بری خریداری ہے۔

یہودیوں کا حضور ﷺ کے سامنے تورات کے احکام کو چھپانا:

اس واقعہ کے بارے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا ہے کہ آقائے نامدار ﷺ نے ایک دفعہ یہودیوں سے کسی بات کے بارے میں پوچھا کہ تمہاری کتاب میں یہ مسئلہ کیسے ہے؟ تو ان بدبختوں نے جھوٹ بولا اور اصل بات چھپالی۔ اللہ نے قرآن کی آیات نازل فرما کر اپنے پیارے نبی ﷺ کو خبردار کیا کہ یہ ایسے جھوٹے لوگ ہیں کہ ان سے عہد لیا گیا کہ جو اللہ کا حکم ہے اس کو پورا پورا بیان کرو، لیکن یہ ایسے جھوٹے ہیں کہ چھپا دیتے ہیں۔

اسی طرح آیت رجم کے بارے میں بھی آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک زنا کا مقدمہ پیش ہوا اور عورت بھی یہودیہ تھی اور معاملہ بھی یہودیوں کا تھا اور وہ خود حضور اکرم ﷺ کے پاس اپنا مقدمہ لے آئے۔ ابن صوریا بھی کہتا تھا کہ آپ ہی ہمارا مقدمہ سنیں۔ اصل میں ان کے دماغ میں یہ بات تھی کہ جب حضور ﷺ کی

خدمت میں فیصلہ جائے گا اور ہم چونکہ یہودی ہیں تو لازماً آپ ہمارے مسئلہ پر رعایت کریں گے، تاکہ ان کے دل ہماری طرف مائل ہو جائیں اور وہ کوئی نرم فیصلہ دے دیں۔ اس ضمن میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم یہ بتاؤ کہ تمہاری کتاب میں یعنی تورات میں رجم کے بارے میں کیا مسئلہ ہے؟ اگر شادی شدہ عورت زنا کرے تو اس کی کیا سزا ہے؟ انہوں نے کہا: ہماری کتابوں میں بس اتنی سی سزا ہے کہ اگر ثابت ہو جائے کہ واقعی زنا ہوا ہے تو اس آدمی کو دو چار جوتے مار کر گدھے پر بٹھا دیں اور اس کو منہ کالا کر کے بازار میں پھروا دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری کتاب میں دیکھتے ہیں کہ رجم کا مسئلہ ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا: رجم کا مسئلہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ جب وہ کتاب لے آئے اور حضور اکرم ﷺ کے سامنے رکھ دی اور یہودیوں کو پتہ تھا کہ ہماری کتاب سریانی زبان میں ہے اور حضور اکرم ﷺ سریانی زبان نہیں پڑھ سکتے، لہٰذا اگر ان کے سامنے ہم کتاب کھول کر بھی رکھ دیں تو پھر بھی ہم نے پڑھنا ہے۔ انہوں نے کتاب کھول کر سامنے رکھ دی اور کہا: یہ زنا کا مسئلہ لکھا ہوا ہے اور یہاں کوئی آیت رجم نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے اور حافظ تورات سمجھے جاتے تھے، اسلام لا چکے تھے۔ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: حضور! ان کا جو عالم کتاب کھول کر بیٹھا ہوا ہے اس کو کہیں ہاتھ اٹھائے۔ اس کے نیچے تو آیت رجم موجود ہے۔ جب اس نے ہاتھ اٹھایا تو آیت رجم تو موجود تھی تو حضور اکرم ﷺ نے ان یہودیوں سے فرمایا کہ یہ تم نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہم چاہتے تھے کہ عورت کو سزا سخت نہ ملے، اس لیے ہم نے یہ بہانہ بنایا اور اصل مسئلہ چھپا گئے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کے بارے میں جتنی شان اور صفات تورات میں تھیں وہ سب چھپا گئے۔ جب ان سے کوئی پوچھتا کہ یہ محمد مصطفیٰ ﷺ وہی نبی ہیں جن کا تم ذکر کرتے تھے تو وہ کہتے تھے: وہ اور تھے اور یہ اور ہیں۔ یہودی یہ احکام مالی منفعت کے لیے بدلتے تھے، مثلاً: بڑے آدمی نے جرم کیا تو مسئلہ بدل دیا اور اگر کسی غریب نے جرم کیا تو اس کے لیے مسئلہ اور سخت بیان کر دیا۔ تو ان آیات مبارکہ میں ایک تو ان کا رد آیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان ظالموں نے اس عہد کو بھی پھینک دیا اور حق بات چھپالی اور انہوں نے بڑا گھٹیا سودا کیا کہ چند پیسے لے کر اللہ تعالیٰ کے قرآن کا مسئلہ چھپا دیا۔ یہ کتنی نقصان والی بات ہے کہ آدمی دنیا کا فائدہ حاصل کرے اور حق بات چھپا جائے۔

جہاد میں نہ جانے کے لیے منافقین کی بہانہ سازی:

دوسرے یہودیوں میں جو منافقین کی شکل میں موجود تھے، ان میں یہ بات بھی تھی کہ جب ان کو کہا جاتا کہ جہاد

پر جاتا ہے تو وہ بہانہ بنا لیتے تھے کہ حضور! میرے گھر میں بیٹی بیمار ہے، میری بیوی کو بڑی سخت تکلیف ہے اور میری والدہ کی طبیعت بہت خراب ہے، کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں، میں بڑا مجبور ہوں، ورنہ میرا تو جہاد پر جانے کا بڑا دل کرتا ہے۔ اس طرح وہ بہانے بنا کر رہ جاتے۔ جب حضور پاک ﷺ جہاد پر چلے جاتے تو آپس میں بڑے خوش ہوتے کہ کیسے ہم بہانہ بنا کر بچ گئے!! اب آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ مشقتیں اور تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں۔ جب مسلمان واپس آ جاتے تو آ کر جھوٹی قسمیں کھاتے تھے کہ ہمیں بڑا افسوس رہا، ہم بڑا تڑپتے رہے، لیکن ہم مجبور تھے۔ یعنی وہ اس بات پر بھی خوش ہوتے تھے کہ ہم کام بھی نہ کریں اور لوگ ہماری تعریف کریں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ کیا چاہتے ہیں کہ ان کی ثنا کی جائے اس کام پر جو وہ کرتے ہی نہیں۔ حالانکہ کام کرنے کے بعد بھی آدمی تعریفوں کی تمنا نہ کرے۔ اللہ پاک اپنی مرضی سے دے دیں تو اس کی مرضی ہے۔ اور ایک یہ کہ تم کام بھی نہ کرو اور لوگ تمہاری تعریف کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا مدنی! آپ یہ گمان نہ کریں کہ ان کو عذاب سے چھٹکارا ملے گا، ان کو عذاب سے کوئی راستہ ملے گا۔ ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اور آخر میں فرمادیا کہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک اللہ ہے۔ جب یہ سب اللہ کے لیے ہے تو بدبختو! تم اللہ کا دین چھپا کر پیسے لے رہے ہو؟ حالانکہ تم سچی بات بیان کرو! کیونکہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک تو اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ میں سے تمہیں دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے کہ تم جھوٹ بولو!؟

حق مسئلہ چھپانے والے کی سزا:

ان آیات مبارکہ سے ہمیں یہ سبق ملا کہ عالم کی شان یہ ہے کہ اگر کوئی دین کا مسئلہ ہے اور حق کا مسئلہ ہے تو اس کو نہ چھپائے۔ اگر وہ جان کر حق مسئلہ چھپائے گا تو حدیث پاک میں آتا ہے: ((مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهُ ثُمَّ كَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ)) [ترمذی، رقم: ۲۶۴۹] جو آدمی عالم ہے، اس سے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا جائے اور وہ جانتا ہو، لیکن وہ چھپالے اور حق بات بیان نہ کرے تو ایسے شخص کو قیامت والے دن آگ کی لگامیں چڑھائی جائیں گی۔

دو رُخے مولویوں کا طریقہ:

آج کل دنیا میں ایک مزاج بن گیا ہے کہ ماحول کے مطابق بات کرلی، یعنی اگر دیکھا کہ کہیں اہل توحید کا زور ہے تو

وہاں توحید کا مسئلہ بیان کر دیا، کہیں دیکھا کہ اہل بدعت کا زور ہے تو وہاں ڈھیلی ڈھیلی باتیں شروع کر دیں، کہیں دیکھا کہ روافض کا زور ہے تو وہاں شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ بیان کر دی اور کہیں دیکھا کہ خوارج کا زور ہے وہاں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں......نعوذ باللہ......دشمنی آمیز کلمات کہہ دیئے۔ جیسا ماحول دیکھتے گئے اسی میں ڈھلتے گئے۔ اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا کامیاب مقرر ہے کہ جہاں گئے اور جس مجلس میں گئے ساری دنیا واہ واہ کر رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے حق بات بیان نہیں کی، ورنہ کوئی ایک ناراض ہوتا؛ کیونکہ حق تو کڑوا ہوتا ہے، کسی کو تو کڑوا لگنا چاہیے تھا۔ اللہ کے انبیاء نے دعوت دین دی، سب لوگوں نے تو واہ واہ نہیں کی تھی، بلکہ اکثر لوگوں نے مخالفت کی اور تھوڑے لوگوں نے حق کو قبول کیا۔ اس لیے حکم ہے کہ اگر عالم مسئلہ جانتا ہو اور اس سے پوچھا جائے تو وہ صحیح مسئلہ بتائے اور اللہ کے دین کو کبھی نہ چھپائے۔

مسئلہ بیان کرنے میں احتیاط:

ایک بات یاد رکھیں کہ بعض اوقات حالات ایسے ہوتے ہیں کہ ایک مسئلے کو بیان کرنے میں فتنے کا اندیشہ ہے، یعنی اگر وہ مسئلہ بیان کیا جائے تو وہاں لڑائی ہو جائے گی، فساد و خون ریزی ہو جائے گی، وہاں اگر عالم دین مصلحتاً اس مسئلے کو بیان نہ کرے تو اجازت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جانتے ہیں وہ یہ مسئلے چھپا رہا ہے لینے کے لیے یا اپنی ذاتی لالچ کے لیے، اپنی ذاتی عزت کے لیے کتمانِ علم کر رہا ہے، "خَوْفًا مِّنَ الْفِتْنَةِ" سے ایسے کر رہا ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں موجود ہے کہ میرے آقا سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا کہ اگر تیری قوم اسلام میں نئی نئی داخل نہ ہوتی تو میرا ارادہ تھا کہ میں کعبہ کو بڑھا دیتا، کعبہ کے دو دروازے بناتا: ایک اندر آنے کے لیے اور ایک باہر نکلنے کے لیے، لیکن میں نہیں چاہتا کہ لوگ کہیں: اللہ کے نبی نے کعبہ گرا دیا ہے۔ اب ان کو کون سمجھائے کہ کعبہ دیواروں کا نام نہیں ہوتا؟ وہ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ میرا گھر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے، ورنہ آسمانوں سے لے زمینوں تک کعبہ، بیت المعمور تک کعبہ ہے۔ ہم نے صرف دیواروں کو تو سجدہ نہیں کرنا ہے، لیکن یہ بات کس کو سمجھائیں گے؟ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نہیں توڑتا۔ یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے مستقل باب باندھا ہے کہ اگر کوئی ایسی جگہ ہے کہ وہاں ایک بات کہنے سے فتنہ پھیلنے کا اندیشہ ہے تو عالم کو چاہیے کہ ایسی باتوں سے احتراز کرے، تاکہ ایک بات بیان کرنے سے لوگ ناحق قتل نہ ہو جائیں، فساد و لڑائیاں نہ ہو جائیں۔

یہودیوں کا علم گدھوں پر کتابیں لادنے کی طرح ہے:

دوسری بات علماء نے کہی ہے کہ اگر تم ایسا کرو گے جیسا علماء یہود نے کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عالم بنایا، لیکن انہوں نے حق کو چھپالیا۔

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعة:۵]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسے لوگ جن کو ہم نے علم دیا، لیکن انہوں نے اس پر عمل نہ کیا، اس کو ظاہر نہ کیا ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گدھے پر کوئی کتابیں لاد دی جائیں، یعنی اس علم کا کیا فائدہ ہوا؟ جیسے گدھے پر کتابیں لاد دو تو اس سے وہ پڑھی نہیں جاتیں تو اس کے علم پڑھنے کا کیا فائدہ ہوا کہ علم پڑھنے کے بعد بھی یہ حق بات لوگوں کو نہیں بتاتا، اللہ تعالیٰ کے دین کو چھپاتا ہے۔ یہ انسان نہیں ہے، بلکہ یہ انسانیت سے نکل کر جانوروں کی لسٹ میں آگیا ہے۔

نیکی کا کام نہ کر کے تعریف کی طلب کرنا:

دوسری بات ان آیات کے اندر یہ بیان کی گئی ہے کہ آدمی نیکی کا کام بھی نہ کرے اور کہے کہ لوگ میری تعریف کریں، یہ بھی ناجائز ہے۔ یا نیکی کا کام کرے اور کہے کہ لوگ مجھے بڑا عالم، زاہد سمجھیں۔ اگر یہ تمنا بھی آجائے تو ریا کی وجہ سے یہ عمل بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ آدمی کے دل میں تو تمنا نہیں ہے، لیکن لوگ اچھی بات کی تعریف کرتے ہیں تو وہ کہتے رہیں۔ اس پر اس کا کوئی جرم نہیں ہے؛ کیونکہ قاعدہ ہے کہ خوشبو بھی پھیلے گی، بدبو ہے تو وہ بھی پھیلے گی۔ اگر کوئی آدمی اچھے عمل کرے گا تو لازمی بات ہے کہ محلے والوں کی رائے ہوگی کہ یہ اچھا آدمی ہے، اس کو ہم مسجد میں دیکھتے ہیں، ماشاء اللہ دین سے جڑا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کے راستے میں لگا ہوا ہے۔ اور اگر برا ہے تو لوگ کہیں گے کہ شرابی ہے، فاسق و فاجر ہے۔ بات چھپی نہیں رہتی وہ لوگوں کی زبان پر آجاتی ہے، لیکن عمل کرنے والے کی نیت اللہ کی رضا ہو، یہ نہ ہو کہ میں اس لیے کر رہا ہوں کہ لوگ میری تعریف کریں۔ تو یہ ریا ہو جاتا ہے اور عمل کو برباد کرنے کا سبب ہوتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ریا بھی شرک اصغر ہے؛ کیونکہ شرک کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا۔ یہ جو عبادت کر رہا ہے اس نیت سے کہ لوگ مجھے عابد سمجھیں تو یہ اللہ کے سوا غیر کو راضی کر رہا ہے اور اللہ کا شریک بنا رہا ہے۔

جھوٹے دعویٰ سے مال کی کثرت حاصل کرنے کا وبال:

(حدیث) بخاری ومسلم کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((وَمَنِ ادَّعٰی دَعْوٰی کَاذِبَۃً لِیَتَکَثَّرَ بِھَا لَمْ یَزِدْہُ اللّٰہُ إِلَّا قِلَّۃً)) [مسلم، رقم:۱۱۰]

جو شخص جھوٹا دعویٰ کرے اور اس کا مقصد یہ ہو کہ مجھے زیادہ مال مل جائے یا مجھے زیادہ وقار اور عزت مل جائے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو بڑھائیں گے نہیں، بلکہ اس کو گھٹائیں گے۔

تم سمجھتے ہو جھوٹ سے مجھے فائدہ ہوگا، یاد رکھیں! وقتی طور پر بعض لوگوں کو فائدہ نظر آتا ہے، لیکن اس کا انجام نقصان ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے جوا کھیلا اور ایک رات میں دو لاکھ کما لیے ہیں، لیکن جواریوں کا انجام نقصان ہی ہوتا ہے۔ بیویاں بیچ دیں، اولادیں بیچ ڈالیں، کروڑوں پتی تھے بھکاری ہو کر سڑکوں پر آگئے۔

اسی طرح جھوٹ کا انجام بھی ذلت وخواری ہے۔ سچ سچ ہے حق حق ہے۔ اس لیے کبھی آدمی جھوٹ نہ بولے۔ بعض لوگ اپنی جھوٹی کرامات دکھاتے ہیں کہ میں نے ایسا خواب دیکھا ہے، میں نے فلاں مقام پر ایسے کیا تو ایسے ہوگیا۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ میرے زیادہ سے زیادہ معتقد ہوجائیں، لیکن یاد رکھیں! ایک وقت آئے گا کہ اللہ اس کو ذلیل کردیں گے حق پر چلنے سے عزت ملتی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہاتھ سے کوئی کرامت ظاہر کردی ہے تو اللہ تعالیٰ کی منشا ہے؛ کیونکہ کرامت اپنا کمال تو نہیں ہے، وہ تو عطاءِ رب ہے۔

جھوٹ کا لباس:

حدیث مبارک میں آیا: ((اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ یُعْطَ کَلَابِسِ ثَوْبَیْ زُوْرٍ)) [بخاری، رقم:۵۲۱۹] جو چیز کسی کے پاس نہیں ہے پھر بھی وہ اپنے آپ کو ایسے جتلائے کہ وہ اس کے پاس ہے تو وہ ایسے ہے جیسے اس نے جھوٹ کا لباس پہن لیا ہے۔

بعض آدمی ایسے جھوٹ کے لباس پہن لیتے ہیں کہ بڑے علماء کا لباس پہن لیا، حالانکہ جاہل ہوتا ہے۔ یہ بھی جھوٹ کا لباس ہے۔ اور بعض لوگ ایسے لباس پہن لیتے ہیں کہ لوگوں کو بڑا آدمی نظر آئیں، حالانکہ لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔

یہ آیت یہودیوں کے متعلق ہے:

حمید بن عبد الرحمن بن عوف رحمہ اللہ نے خبر دی ہے کہ مروان نے اپنے بواب (دربان) کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بھیجا کہ ان سے جا کر کہیں: اگر کوئی آدمی کام کر کے تعریف ہونے پر خوش ہوتا ہے اور اس بات کو بھی محبوب

رکھتا ہے کہ جو میں نے نہیں کیا اس پر بھی لوگ میری تعریف کریں، اگر اس بات پر عذاب دیا گیا پھر تو کوئی بندہ نہیں بچ سکے گا؛ کیونکہ ہر بندہ چاہتا ہے کہ میری تعریف ہو؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم نے سمجھا نہیں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں اتاری تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا، انہوں نے چھپا لیا اور انہوں نے ایسا مسئلہ بتایا جو کتاب میں نہیں تھا، بلکہ جھوٹ بول کر مسئلہ بتایا۔ اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے گئے تو یہ باور کرانے لگے کہ ہم نے ٹھیک بات بتائی ہے اور اس پر تعریف کے طلبگار ہوئے اور ساتھ ہی مسئلہ چھپانے پر خوش بھی تھے۔ اس پر اللہ نے یہ آیات نازل کی تھیں اور حقیقت کو اپنے نبی پر کھول دیا۔ [بخاری، رقم: ۴۵۶۸]

مسلمانوں کی حالت اور آیت قرآنی:

(حدیث) حضرت ثابت بن قیس الانصاری رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ اللہ کی قسم! مجھے ڈر ہے کہ میں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: کیوں؟ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع کیا کہ آدمی ایسے کام پر تعریف کو پسند کرے جو اس نے نہیں کیا، حالانکہ میرے دل میں بھی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ میری تعریف کریں۔ اور اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ آدمی تکبر کے ساتھ نہ چلے، لیکن اے اللہ کے نبی! مجھے بھی تو جمال پسند ہے، اچھے لباس پسند ہیں، پتہ نہیں اس میں بھی تو خیلاء (تکبر) آجائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع کیا ہے کہ ہماری آواز اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اونچی ہو جائے اور حضور! میری آواز بڑی اونچی ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ بات کرنے میں اگر غلطی سے بھی میری آواز اونچی ہو جائے تو اللہ میرے عمل برباد کر دیں گے؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میں تمہیں خوشخبری دوں کہ تم ساری زندگی عزت والی گزارو گے اور موت بھی شہادت کی نصیب ہوگی اور جنت میں داخل ہو گے۔ اس نے کہا: حضور! میں بالکل راضی ہوں، اس سے بڑی اور کیا بات ہوگی!! تو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے قابل رشک زندگی گزاری اور مسیلمہ کذاب کے خلاف معرکہ میں شہید ہوئے۔ [مستدرک حاکم: ۱/ ۲۳۴]

تو بعض روایات میں موجود ہے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ کوئی شخص اگر جنتی کو دیکھنا چاہتا ہے تو اس کو دیکھ لے؛ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں خوشخبری دی ہے۔ یہ وہی حضرت ثابت بن

قیس رضی اللہ عنہ ہیں جو مسیلمہ الکذاب (جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا اس) کے ساتھ جنگ میں شہید ہوئے تھے۔

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۱۹۴﴾﴾ [آلِ عمران: ۱۹۰ تا ۱۹۴]

"بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے باری باری آنے جانے میں ان عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں، (اور انہیں دیکھ کر بول اٹھتے ہیں:) اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ آپ (ایسے فضول کام سے) پاک ہیں، پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے۔ اے ہمارے رب! آپ جس کسی کو دوزخ میں داخل کر دیں، اسے آپ نے یقیناً رسوا ہی کر دیا، اور ظالموں کو کسی قسم کے مددگار نصیب نہ ہوں گے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک منادی کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، چنانچہ ہم ایمان لے آئے۔ لہٰذا اے ہمارے پروردگار! ہماری خاطر ہمارے گناہ بخش دیجیے، ہماری برائیوں کو ہم سے مٹا دیجیے اور ہمیں نیک لوگوں میں شامل کر کے اپنے پاس بلائیے۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہمیں وہ کچھ بھی عطا فرمائیے جس کا وعدہ آپ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہم سے کیا ہے، اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کیجیے۔ یقیناً آپ وعدے کی کبھی خلاف ورزی نہیں کیا کرتے۔"

تخلیقِ کائنات میں کمالِ قدرتِ خداوندی:

ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی کمالِ قدرت، کمالِ علم اور قدرتِ کاملہ پر دلائل کا ذکر فرمایا ہے کہ آسمان وزمین کے بنانے میں اتنا بڑا کمال ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی زمین بنائی ہے۔ اور کہیں ارشاد فرمایا: اے مسلمانو! غور کرو اور نظر وتدبر سے دیکھو کہ میں نے کیسے تمہارے اوپر آسمان بنایا!؟ اور کہیں فرمایا:

﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾﴾ [الغاشیہ: ۱۷ تا ۲۰]

غور کرو! دیکھو کہ آسمانوں اور زمینوں کو کیسے پیدا فرمایا کہ جب ان کا کوئی نمونہ نہیں تھا، ان کی کوئی مثال نہیں تھی، وجود بھی کوئی نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے سات آسمان بنائے اور ان کے درمیان میں اتنا بڑا فاصلہ ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال تک کا سفر ہے۔ اور صرف آسمان پیدا نہیں فرمائے، بلکہ آسمانوں پر اپنی مخلوق پیدا فرمائی۔ اور کیسے تارے جڑے ہیں! اور اتنے کواکب ہیں کہ ان کے عدد کو بھی آج تک کوئی نہیں جان سکا اور کتنے ستارے ایسے ہیں جن کی روشنی ابھی تک زمین پر بھی نہیں پہنچی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسے نظام سے منسلک کر دیا ہے!!؟ فرمایا: تم کسی جگہ ایک چھوٹے سے گھر کی چھت بناتے ہو، اس کے لیے تمہیں ستونوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اس پر کتنے لوہے اور سیمنٹ خرچ کرتے ہو، دیکھو! میں نے کیسے دنیا پر چھت بنا دی ہے؟ کوئی ستون بھی نہیں ہے، لیکن چھت قائم ہے۔ اور اس کے بعد فرمایا: ﴿وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ﴿۶﴾﴾ [ق: ۶] پھر اس میں کسی قسم کا کوئی شگاف، کوئی سوراخ اور کوئی نقص نہیں ہے اور پھر میرا کمالِ قدرت دیکھو کہ میں نے اس میں دروازے بھی رکھے ہیں۔ میرے حکم سے آسمانوں کے دروازے کھلتے ہیں اور میرے حکم سے آسمانوں کے دروازے بند ہوتے ہیں۔

صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب معراج پر تشریف لے گئے۔ جب آسمان کے قریب پہنچے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آواز دی۔ اندر فرشتوں نے پوچھا: تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: میں جبرائیل ہوں۔ انہوں نے کہا: تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا: میرے ساتھ محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ انہوں نے کہا: کیا آپ کو اللہ نے آسمانوں پر بلایا ہے؟ جبرائیل علیہ السلام نے کہا: ہاں بلایا ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: اس کے بعد دروازہ کھولا گیا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب میں آسمان سے پانی برساتا ہوں پھر بھی میں دروازے کھول دیتا ہوں۔ یاد رکھیں! ایک پانی وہ ہوتا ہے جو بادلوں سے برستا ہے اور ایک پانی وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ براہ راست آسمان سے برساتے ہیں۔ ﴿فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰکُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ ﴿۲۲﴾﴾ [الحجر: ۲۲] اور اسی طرح جب نوح علیہ السلام کی

قوم پر عذاب آیا وہاں بھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَفَتَحۡنَآ أَبۡوَٰبَ ٱلسَّمَآءِ بِمَآءٖ مُّنۡهَمِرٖ ۝١١﴾ [القمر:۱۱] کہ ہم نے حکم دیا آسمان کے دروازے کھولو اور پانی برسنے دو اور زمین کو حکم دیا کہ زمینیں بھی اپنے پانی کے چشمے باہر نکالیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں کواکب وسیارات رکھے ہیں۔ بعض آسمانوں سے نیچے ہیں، جیسا کہ چاند بہت نیچے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ چاند اور اس طرح کے ثوابت وسیارات ایسے ہیں جیسے کسی قندیل میں اللہ تعالیٰ نے لٹکا دیئے ہوں، یعنی جیسے تم اپنے گھروں میں فانوس اور قندیلیں لٹکاتے ہو اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے انہیں لٹکا دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم نے آسمان وزمین کی پیدائش پر غور کیا ہے کہ میں نے ان کو کیسے پیدا کیا ہے، ہم نے ان کو کیسے بنایا!؟ اور فرمایا: زمین پر غور کرو جس پر تم رہتے ہو۔ اس زمین کو ہم نے کیسے پیدا کیا اور پانی کے اوپر ہم نے زمین کو کیسے بچھایا؟

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آسمانوں پر نظر ڈالو۔ بعض علماء نے فرمایا: صرف آسمان نہیں، بلکہ تمام بلندیوں کو پیدا کرنے والا بھی خدا ہے اور تمام پستیوں کو پیدا کرنے والا بھی خدا ہے۔

اور میرے بندے رات اور دن کے اختلاف پر غور کرو۔ اختلاف کے دو معنی ہوتے ہیں: ایک تو ہمارے ہاں ہے کہ اس میں جھگڑا ہو گیا، یا ایک مسئلے میں ایک عالم کی رائے اور ہے اور دوسرے عالم کی رائے اور ہے، یہ بھی اختلاف ہے۔ اور یہ بھی اختلاف ہوتا ہے کہ فلاں فلاں کے بعد آیا، جیسا کہ رات چلی گئی اور دن آگیا، دن چلا گیا اور اس کے بعد رات آگئی۔ تو یہ ایک دوسرے کے پیچھے جو آتا ہے اس کو بھی اختلاف کہا جاتا ہے۔ اس لیے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَهُوَ ٱلَّذِي جَعَلَ ٱلَّيۡلَ وَٱلنَّهَارَ خِلۡفَةٗ لِّمَنۡ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ أَوۡ أَرَادَ شُكُورٗا ۝٦٢﴾ [الفرقان:۶۲] رات اور دن میں غور کرو دن کو ہم نے رات کا خلیفہ بنایا ہے، یعنی رات جاتی ہے اور دن آجاتا ہے اور رات کو دن کا خلیفہ بنایا ہے۔

جیسا کہ دنیا میں پہلے جنات کی آبادی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا کہ میں انسانوں کو بساؤں گا، اس لیے آدم علیہ السلام کو خلیفہ کا لقب ملا کہ ﴿وَإِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٞ فِي ٱلۡأَرۡضِ خَلِيفَةٗۖ﴾ [البقرۃ:۳۰] میں جنات کے بعد آنے والے آدم کو خلیفہ کے لقب کے ساتھ بھیجنے والا ہوں۔ اس لیے "خلیفہ" اس کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد ہو۔ فرمایا: غور کرو کہ رات ابھی ہے، لیکن دن کا کام شروع ہو گیا۔ تو خلیفہ وہ ہوتا ہے جو اس کی موجودگی میں آجائے۔ تو یہ

شان صرف سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ملی ہے کہ ابھی میرے مدنی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں موجود ہیں، یعنی آپ کی زندگی میں آپ کے مصلے پر آنے والا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے، لہٰذا اس لفظ "خلیفہ" کا جتنا اطلاق سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر ہے اتنا کسی اور پر نہیں ہوتا۔

بعض علماء نے فرمایا: اختلاف کا معنی کمی اور زیادتی بھی ہے کہ کہیں کم ہو گیا اور کہیں زیادہ ہو گیا کہ کبھی رات بڑی ہے اور دن چھوٹا ہے اور کبھی دن بڑا ہے اور رات چھوٹی ہے۔ قطب شمالی کے قرب و بعد کو دیکھا جائے گا۔ قطب شمالی کے جتنا قریب ہوں یا بعید ہوں اسی طرح دن پر اثرات مرتب ہوں گے۔ اسی طرح صیف (گرمی) اور شتا (سردی) میں دیکھا جائے گا کہ دن بڑا ہو رہا ہے اور رات چھوٹی ہو رہی ہے یا رات بڑی ہوتی جا رہی ہے اور دن چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ بھی اختلاف ہے۔

علماء نے فرمایا ہے: یہ بھی اختلاف ہے کہ ایک آ جائے تو اندھیرا چھا جاتا ہے اور ایک آ جائے تو روشنی چھا جاتی ہے۔ اور اس میں یہ بھی اختلاف ہے کہ ایک آ جائے تو ہمارے آرام کا ذریعہ بنتا ہے اور ایک آئے تو ہمارے کام کا ذریعہ بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رات ہمارے آرام کے لیے بنا دی اور دن ہمارے کام کے لیے بنایا ہے۔ یہ رات کی ظلمت کو ہمارے سکون کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا نظام بنایا ہے کہ جب سورج ڈوبنے کا وقت قریب آئے گا، جانور بھی اپنے گھروں کی طرف چل پڑیں گے، پرندے بھی اپنے گھونسلے کی طرف اڑیں گے، ہر آدمی اپنے گھر کی طرف لوٹے گا، ورنہ اگر آپ نیند کے نظام الاوقات کو خود مقرر کریں تو نظام درہم برہم ہو جائے گا کہ ایک آدمی سو رہا ہو گا اور دوسرا آدمی اٹھ رہا ہو گا۔ ایک کھڑا ہو گا اور ایک غسل خانے سے نکل رہا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام بنا دیا کہ پرندے سو رہے ہیں، جانور سو رہے ہیں، حتیٰ کہ بڑے سے بڑا سخت مریض کیوں نہ ہو، رات کا ایک حصہ ایسا بھی آ جاتا ہے کہ اسے بھی سکون مل جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رات دن کے اختلاف میں غور کرو! جب اندھیرا ہوتا ہے تو تمہیں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا اور میں پھر صبح صادق بھیج کر دنیا کو منور کر دیتا ہوں۔ تم ایک گھر میں بجلی چلاتے ہو اس کا خرچہ گنو کہ کتنا کرتے ہو اور میں سارے عالم میں روشنی پھیلا دیتا ہوں، کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا ہے؟

آیات کا معنی:

اس آیت کے اندر "آیات" کا لفظ آیا ہے، اس کا معنی معجزات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے نبیوں کو معجزات دیے ہیں وہ

آیات ہیں۔ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ﴾ [الاسراء:۱۰۱] ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو کھلی نشانیاں دی تھیں۔ آیاتِ قرآن پر بھی آیات کا اطلاق ہے۔ اور آیت کا معنیٰ دلیل اور نشانی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان چیزوں میں جب غور کرو تو ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل والے ہیں۔

اسی طرح یہ سمجھ لیں کہ آدمی انجینئر بن جائے، سائنسدان بن جائے اور ایٹم بم کا موجد بن جائے عقل والا نہیں ہے جب تک اپنے خدا کو نہیں پہچانتا۔ عقل کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے خالق اور مالک کو پہچانے۔

عقل والوں پر خدا کی معرفت حاصل کرنا واجب ہے:

"اَلْبَابِ" "لُبٌّ" کی جمع ہے بمعنی کسی چیز کا خلاصہ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں بڑی نعمتیں دی ہیں۔ بعض چیزیں ہیں جو نظر سے پہچانی جاتی ہیں، بعض علم سننے سے حاصل ہوا، بعض علم چکھنے سے حاصل ہوا اور بعض علم سونگھنے سے حاصل ہوا کہ ان کو حواسِ خمسہ کہتے ہیں۔ ان سب کا حاکم عقل ہے۔ پھر عقل فیصلہ کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس طرح عقل والے لوگ ہیں جو سب سے پہلے اپنے اللہ کو پہچانیں، اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھیں۔ اگر آدمی مالک کو بھی نہ پہچانے تو اس سے بڑا بے عقل، اس سے بڑا پلید اور اس سے بڑا غلط انسان دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے عقل والے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں۔ اللہ کے اسماء، اللہ کی ذات وصفات کی معرفت رکھتے ہیں۔ اللہ والے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید کو مانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی آیات بینات، احکام، رسل، کتب اور ملائکہ کو مانتے ہیں۔ اگر آدمی بڑی سے بڑی ڈگری لے لے، لیکن خدا کو نہ مانے تو وہ عقل والا نہیں ہوتا۔

ایک عجیب مثال!

علماء نے مثال دی ہے کہ ایک ٹرین جارہی ہے۔ ایک آدمی بیٹھ کر دیکھ رہا ہے کہ ایک آدمی سرخ جھنڈی دکھاتا ہے اور گاڑی چل پڑتی ہے تو وہ دیکھنے والا آدمی کہتا ہے کہ اس جھنڈی کا کمال ہے کہ سرخ جھنڈی آئے تو گاڑی کھڑی ہو جائے اور سبز جھنڈی آئے تو گاڑی چل پڑے۔ تو دوسرا آدمی اس کو کہے کہ بے وقوف آدمی! اس میں جھنڈی کا کیا کمال ہے؟ کپڑے کے اندر کیا رکھا ہوا ہے!؟ اصل بات اس کی ہے جو گاڑی کو چلا رہا ہے۔ اس کو جب اشارہ دیا جاتا ہے تو وہ گاڑی کو روک دیتا ہے اور جب اس کو اشارہ دیا جاتا ہے کہ گاڑی کو چلا دو تو وہ چلا دیتا ہے۔ اس سے زیادہ عقل والا کہتا ہے کہ ٹھیک ہے چلانے والے کا کمال تو ہے، لیکن اصل کمال تو ان پرزوں کا ہے۔ اگر وہ

پرزے نہ ہوں یا ان میں سے ایک پرزہ کھول کر باہر رکھ دو تو یہ ڈرائیور کیا کر سکتا ہے؟ اور اس سے زیادہ عقل والا کہے گا: مشینری کا کیا کمال ہے، اصل کمال تو اس گرمی کا ہے جو اس گاڑی کو چلا رہی ہے۔ اور جو صحیح عاقل ہے وہ کہے گا: بھائی! نہ پرزے کا کمال ہے، نہ اسٹیم کا کمال ہے، نہ بھاپ کا کمال ہے اور نہ ڈرائیور کا کمال ہے، اصل کمال تو اس خالق کا ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے۔

اس لیے اصل عقل والے وہ ہیں جو راستے میں نہیں بھٹک جاتے، جو اسباب میں نہیں کھو جاتے، بلکہ ان کی نظر سیدھی مسبب حقیقی تک پہنچتی ہے کہ مولا! یہ سب تیرا کمال ہے کہ تو نے ایسے انسان پیدا کیے اور ان میں ایسی عقل رکھی ہے کہ ایک ہی ماں باپ کے بیٹے ہیں، ایک عقل کی انتہاء کو چھو رہا ہے ایک بیوقوفی کی انتہاء پر پہنچا ہوا ہے۔ ایک عالم ہے اور ایک جاہل ہے۔ ایک عابد و زاہد ہے اور ایک فاسق و فاجر ہے۔ ایک وہ ہے جس کو دیکھ کر والدین کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں اور ایک وہ ہے جس کو دیکھ کر والدین جل جائیں۔

﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾﴾

اب ہم عقل والوں کو کیسے ڈھونڈیں؟ کیونکہ یوں تو ساری دنیا کہتی ہے کہ ہم عقل والے ہیں، ہر آدمی کہتا ہے کہ میں عقل والا ہوں۔ ہر مذہب والے کہتے ہیں کہ ہم عقل والے ہیں۔ میرے مولا! ہم عقل والوں کو کیسے پہچانیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم تمہیں نشانی بتا دیتے ہیں کہ جو عقل والے ہیں وہ کھڑے ہوں گے تو اللہ کا ذکر ہوگا، بیٹھے ہوں گے تو اللہ کا ذکر ہوگا اور لیٹے ہوں گے تو اللہ کا ذکر ہوگا۔ جو ہر وقت میرے ذکر میں مشغول ہے، نماز میں مشغول ہے، طواف میں مشغول ہے، تلاوتِ قرآن میں مشغول ہے، دعوت وارشاد میں مشغول ہے، لوگوں کو دین پہنچانے میں مشغول ہے اور دین کے لیے محنت کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ یہ عقل والا ہے۔ اپنی عقل کو صحیح جگہ استعمال کر رہا ہے، ورنہ ایک آدمی ایسی چیز بناتا ہے جو تباہی کا باعث ہو، جو گھروں کو جلا ڈالے۔ اور ایک آدمی ایسی چیز بناتا ہے جو کروڑوں کی آبادی کو بھسم کر ڈالے۔ عقل تو اس کے پاس بھی ہے، لیکن ایسی عقل کا کیا فائدہ جو دنیا کی ہلاکت کا ذریعہ بنے۔ اصل عقل تو وہ ہے جو لوگوں کی آبادی کا ذریعہ بنے، جو تعمیر کا ذریعہ بنے اور بندوں کی ہدایت کا ذریعہ بنے۔

ذکر کے لیے کسی حالت کی تخصیص نہیں:

بعض علماء نے فرمایا: اگر آدمی کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا، مریض ہے تو اس آیت سے استدلال کیا کہ بیٹھ کر

بھی نماز پڑھنا جائز ہے۔ اگر بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتا تو لیٹ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مطلق ذکر مراد ہے۔ ہر چیز کی کچھ شرائط ہیں، لیکن اللہ کا ذکر ایسا ہے کہ کھڑے ہو یا بیٹھے ہو، وضو ہے یا وضو نہیں ہے، مسجد ہے یا مسجد نہیں ہے، گھر میں بیٹھے ہو یا دکان پر بیٹھے ہو جہاں بھی بیٹھے ہو اللہ کا ذکر کرو۔ اس لیے حکم آیا: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا﴾ [الاحزاب: ۴۱] اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کرو جتنا زیادہ ذکر کر سکتے ہو۔ اس لیے حکم آیا کہ اللہ کی ذات میں غور نہ کرو، بلکہ اللہ کی صفات میں غور کرو۔ اگر ایک گھڑی غور کرو تو ساری رات کی نفلی عبادات سے زیادہ بہتر ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے غور و فکر کا طریقہ:

اسی لیے احادیث میں آتا ہے کہ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے باہر چلے جاتے، کبھی قبرستان پر نظر ڈالتے، کبھی ویرانوں پر نظر ڈالتے اور پھر کہتے: اے قبر والو! اب کہاں ہیں تمہارے اہل و عیال؟ کہاں ہیں تمہارے دنیا کے نشے؟ کہاں ہیں وہ تمہارے دنیا کے آرام؟

((جَاءَ عَنْ عُمَرَ إِنَّهُ مَرَّ عَلَى بَقِيعِ الْغَرْقَدِ، فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُورِ! أَخْبَارُ مَا عِنْدَنَا أَنَّ نِسَائَكُمْ قَدْ تَزَوَّجْنَ، وَدُوْرَكُمْ قَدْ سَكَنَتْ، وَأَمْوَالَكُمْ قَدْ قُسِمَتْ، أَجَابَهُ هَاتِفٌ يَا عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ! أَخْبَارُ مَاعِنْدَنَا أَنَّ مَا قَدَّمْنَا وَجَدْنَاهُ، وَمَا أَنْفَقْنَا فَقَدْ رَبِحْنَا، وَمَا خَلَفْنَا فَقَدْ خَسِرْنَاهُ))

[باب جامع الوضوء: ۱/ ۱۸۵]

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ قبرستان میں سے گزرے تو رسول اللہ کی سنت کے مطابق فرمانے لگے: اے قبروں والو! تمہارے اوپر سلامتی ہو۔ ہماری خبر تو یہ ہے کہ تمہاری بیویاں شادی کر چکیں، تمہارے گھروں میں اب اور آباد ہو گئے اور تمہارے مال تقسیم ہو چکے ہیں۔ تو غیب سے ایک آواز آئی: اے عمر بن خطاب! ہماری خبر یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ آگے بھیجا تھا وہ پا لیا ہے، جو ہم نے راہِ خدا میں خرچ کیا تھا تو وہ ہم نے نفع پایا اور جو پیچھے چھوڑ گئے وہ ہم نے خسارہ کیا۔''

معجم کبیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعا کے یہ الفاظ منقول ہیں:

((السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ أَنْتُمْ لَنَا سَلَفٌ فَارِطٌ، وَنَحْنُ لَكُمْ تَبَعٌ عَمَّا قَلِيلٍ لَاحِقٌ، اللّٰهُمَّ! اغْفِرْ لَنَا وَلَهُمْ، وَتَجَاوَزْ بِعَفْوِكَ عَنَّا وَعَنْهُمْ، طُوبَى لِمَنْ ذَكَرَ الْمَعَادَ وَعَمِلَ لِلْحِسَابِ وَقَنَعَ بِالْكَفَافِ وَرَضِيَ عَنِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ))

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ [القصص:٨٨]

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ [الرحمن:٢٦،٢٧]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری قدرت میں غور کرو کبھی رات ہے اور کبھی دن ہے، ظلمت ہے اور کبھی روشنی ہے، کبھی سکھ ہے اور کبھی دکھ ہے، کبھی عزت ہے اور کبھی ذلت ہے، کسی کو اونچا کر رہا ہوں اور کسی کو نیچا کر رہا ہوں، کسی کو دے رہا ہوں اور کسی سے چھین رہا ہوں، کسی کو میں نے چاہا تو بلندیوں پر پہنچا دیا اور کسی کو چاہا تو بلندیوں سے پستیوں میں گرا دیا، تاکہ میری قدرت پر غور کرو اور جو کر کے مان گئے کامیاب ہو گئے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو میری قدرتوں پر غور کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا﴾ اے رب! ہم نے تیری صفات پر غور کیا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ تو نے یہ کارخانہ ایسے تو نہیں بنایا۔ یہ ایک نظام ہے کہ دنیا دارالامتحان ہے اور آخرت دارالجزاء ہے۔

تم ایک دکان بناتے ہو اس کا مقصد ہے، ایک گھر بناتے ہو اس کا ایک مقصد ہے، ایک مکان بناتے ہو اس کا ایک مقصد ہے اور ایک کارخانہ لگاتے ہو اس کا مقصد ہے تو کیا اللہ تعالیٰ نے یہ سارا کارخانہ کائنات بس ایسے بنا دیا ہے کہ کھاؤ پیو اور جو مرضی آئے کرو، کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ نہیں، بلکہ یہ دارالامتحان ہے اور آگے دارالجزاء ہے۔

آخرت کی رسوائی:

﴿رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ﴾

اے اللہ! جس کو تو نے جہنم میں داخل کیا اس کو تو نے ذلیل کر دیا۔ اور کافروں ومشرکوں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ اس لیے اے اللہ! ہمیں جہنم سے بچا؛ کیونکہ اس سے بڑی رسوائی کوئی نہیں ہے۔

﴿رَّبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ﴾

اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ ساری دنیا کو دعوت دے رہے ہیں کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ۔ اے اللہ! ہم نے تیرے بھیجے ہوئے پیغمبر ﷺ کی بات مان لی، میرے مولا! ہم تجھ پر بھی ایمان لے آئے، تیری کتابوں پر بھی ایمان لے آئے اور ہم نے سب کچھ قبول کیا۔ جو تیرے پیغمبر نے فرمایا ہے تو اے اللہ! اب ہماری درخواست بھی سن لے، اب ہمارے گناہ معاف فرما دے، ہماری خطائیں معاف فرما دے

اور ہم نے جو برائیاں کی ہیں ان کو مٹا دے اور اے اللہ! ہمیں نیکو کاروں کے ساتھ موت دینا، یعنی نیکی پر موت دینا۔ کیونکہ جب نیکی پر موت آئے گی تو نیکوں کے ساتھ ملیں گے۔ اگر برائی پر مریں گے تو برے لوگوں کے ساتھ اٹھیں گے۔

﴿رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾

اے ہمارے رب! ہمیں وہ دے جو تو نے اپنے رسولوں کی زبان مبارک کے ذریعے ہم سے وعدہ کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ تو دے گا۔ یہ آدمی اپنی درخواست دہرا رہا ہے؛ کیونکہ جب اس کی قدرت سامنے آئی، جب اس کا کمال سامنے آیا تو درخواست ہی درخواست ہے کہ اے اللہ! قیامت والے دن ہمیں رسوا نہ کرنا۔ قیامت والے دن کی رسوائی اتنی شدید ہے کہ بعض لوگ جب رسوا ہوں گے تو وہ کہیں گے کہ اے اللہ! جہنم میں ڈال دے، لیکن رسوا نہ کر۔

انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزات کا مطالبہ:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قریش یہودیوں کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ موسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائے تھے تو ان کے کیا کیا معجزات تھے؟ تو یہودیوں نے بتایا کہ عصا اور ید بیضا تھا (یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بڑی نشانیوں میں سے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کئی معجزات عطا فرمائے تھے، حتیٰ کہ قرآن مجید میں نو نشانیوں کا باقاعدہ ذکر ہے، لیکن زیادہ معروف یہ دو ہیں کہ جب آپ اللہ کے حکم سے اس لاٹھی کو پھینکتے تو وہ اژدہا بن جاتا تھا اور جب اس کو اٹھا لیتے تو وہ اسی طرح لکڑی کی حالت میں آجاتی تھی)۔

اس کے بعد وہ مشرکین عیسائیوں کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کیا معجزات تھے؟ انہوں نے بتایا کہ آپ مادر زاد اندھے کو ٹھیک کر دیتے تھے، کوڑھ کی بیماری والے کو ٹھیک کر دیتے تھے اور مردے کو زندہ کر دیتے تھے (اور اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معجزات عطا فرمائے تھے۔) جب قریش نے یہ باتیں سمجھ لیں اور اپنے دل و دماغ میں بٹھا لیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے: ہم آپ سے ایک درخواست کرتے ہیں: ((اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ أَنْ يَجْعَلَ لَنَا الصَّفَا ذَهَبًا، وَنُؤْمِنُ بِكَ)) [مسند

احمد، رقم: ۲۱۶۶] اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یہ صفا کا پہاڑ سونے کا بن جائے، پھر ہم آپ کا کلمہ پڑھیں گے اور آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اس روایت میں آتا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ اے اللہ! اس پہاڑ کو سونے کا بنا دیں، تاکہ یہ لوگ اسلام میں آجائیں تو یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ [المعجم الکبیر: ۱۲۳۲۲، اور علامہ ہیثمی فرماتے ہیں اس روایت کی سند میں یحییٰ حمانی ضعیف راوی ہے۔]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس نے ایمان لانا ہے تو میری قدرت کی نشانیاں کھلی ہوئی ہیں۔ جب یہ زمین و آسمان کو دیکھ کر اسلام نہیں لے آئے، رات اور دن کے اختلاف کو دیکھ کر اسلام نہیں لے آئے، سورج اور کواکب کے نظام کو دیکھ کر ایمان نہیں لے آئے تو ایک پہاڑ کے سونا بننے سے یہ کس طرح ایمان لے آئیں گے؟ جس نے ایمان لانا ہو اس کے لیے کھلی نشانیاں موجود ہیں اور جس نے اسلام نہ لانا ہو اس کے لیے جتنے بھی دلائل اور آیات آپ پیش کریں وہ کبھی اسلام نہیں لائیں گے۔

مطالبہ کے مطابق معجزہ دکھانے کے بعد ایمان نہ لانے پر عذاب:

قرآن پاک میں ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ اہل مکہ حضور پاک ﷺ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے آکر مطالبہ کیا کہ اے اللہ کے نبی! ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، مگر ایک شرط ہے کہ مکہ میں چشمے پھوٹ پڑیں، وادیاں ہو جائیں، نہریں بہنے لگیں، سبزہ ہو جائے اور یہاں باغ لہلہانے لگیں پھر ہم ایمان لائیں گے۔ تو حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ یا اللہ! اگر یہ اس طرح ایمان لاتے ہیں تو آپ کے لیے تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: میرے نبی! میری تقدیر کے بھی فیصلے ہیں۔ اگر قومیں معجزہ خود مانگیں کہ ہمیں نبی یہ معجزہ دکھا دیں پھر ایمان لائیں گے۔ تو ہم وہ معجزہ دے دیتے ہیں، لیکن قومیں اگر ایمان نہ لائیں تو ہم اس قوم کو ہمیشہ کے لیے برباد کر دیتے ہیں۔

قوم صالح کی تباہی:

جیسا کہ قوم صالح نے حضرت صالح علیہ السلام سے معجزہ مانگا تھا کہ ہم ایمان تب لائیں گے جب ہمارے سامنے اس چٹان سے ایک اونٹنی نکل آئے اور اونٹنی گابھن ہو، ولادت کے لیے بالکل تیار ہو اور اس کا اتنا دودھ ہو کہ ساری قوم پی لے۔ اگر آپ ہمیں یہ معجزہ دکھا دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا

مانگی تو اللہ نے فرمایا: میرے نبی! یہ معجزہ ظاہر کر دینا ہمارے لیے کوئی مشکل نہیں ہے، لیکن آپ ان کو یہ بتا دیں کہ اگر اس کے بعد بھی تم ایمان نہیں لاؤ گے تو تم میں سے ایک بھی دنیا میں نہیں بچے گا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے کہا: چھوڑو! ضد نہ کرو، معجزات خود نہ مانگو، ورنہ مانگے ہوئے مطالبے کے بعد ایمان نہیں لے آؤ گے تو بربادی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ انہوں نے کہا: بالکل پکی بات ہے، ہم ایمان لائیں گے، لیکن یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہو جائے تو حضرت صالح علیہ السلام نے نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ ساری قوم کو اکٹھا کیا، اللہ کے حکم سے پتھر سے اونٹنی نکل آئی۔ آپ نے فرمایا: ﴿هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝﴾ [الاعراف: ۷۳] یہ دیکھو کہ اللہ کی قدرت سے پیدا ہوئی اونٹنی ہے، لیکن خبردار! اس اونٹنی کو کبھی نہ چھیڑنا، اس کو کبھی نقصان نہ پہنچانا۔ اور اس کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے ایک فیصلہ کر دیا کہ ایک دن تم ساری قوم اونٹنی کا دودھ پیو اور پانی نہ پیو، اس دن کنویں کا پانی اونٹنی پیے گی اور ایک دن تمہارے لیے پانی کی باری آئے گی۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ قوم دودھ پینا شروع ہو گئی۔

جب کافی دن گزر گئے تو کہنے لگے: یہ ہمارے لیے بڑا مسئلہ ہو گیا ہے کہ ایک دن ہمیں پانی ملتا ہی نہیں ہے، سارا پانی اونٹنی ہی پی جاتی ہے، یعنی دودھ کی نعمت ان کو مل گئی، لیکن پھر دماغ خراب ہو گیا۔ بہر حال انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو عذاب میں پکڑ لیا۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے نبی! اگر مکہ والے معجزات مانگتے ہیں ہم دکھا دیتے ہیں، لیکن اگر یہ ایمان نہ لے آئے تو ان میں سے ایک بندہ بھی نہیں بچے گا۔ حضور ﷺ نے عرض کیا کہ ان کو اسی حال میں رہنے دیں۔ جس کے مقدر میں ہو گا وہ ایمان لے آئے گا اور جس کے مقدر میں نہیں ہو گا وہ ایمان نہیں لائے گا، لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ پوری کی پوری قوم عذاب میں برباد ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آسمان و زمین کی پیدائش، اس میں رات دن کے نظام کو چلانا اس میں عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ اگر کوئی غور کرے تو اتنا کافی ہے، کسی اور چیز کے مانگنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے اس روایت پر اشکال ہے؛ کیونکہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور قریش کا مطالبہ کہ صفا پہاڑ کو اللہ تعالیٰ سونے کا بنا دیں وہ مکی زندگی کا مطالبہ ہے۔ اس واقعہ کو اس کا سبب نزول کہنا زیادہ صحیح بات نہیں ہے۔

زمین میں خدا کی عجیب وغریب تخلیقات!

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ [البقرة: ۱۶۴]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آسمانوں پر نظر ڈالو، آسمانوں کی بلندی، آسمانوں کی وسعت، زمین کا نیچے ہونا، زمین کی کثافت اور زمین کا اتنا زیادہ وسیع ہونا، پھر اللہ تعالیٰ نے جو اس میں بڑی بڑی نشانیاں رکھی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس میں کواکب بھی رکھے ہیں، نباتات بھی رکھے ہیں، سیارات بھی رکھے ہیں، دریا بھی رکھے ہیں، جنگل بھی رکھے ہیں، درخت بھی رکھے ہیں، کھیتیاں بھی رکھی ہیں، پھل بھی رکھے ہیں، حیوان بھی رکھے ہیں، سونے چاندی، پیتل کی کانیں بھی رکھی ہیں، اللہ تعالیٰ نے مختلف کھیتیاں پیدا کی ہیں، کہیں کھجور، کہیں آم، کہیں مالٹا، ہر کسی کا رنگ بھی علیحدہ، ذائقہ بھی علیحدہ، منافع اور فوائد بھی علیحدہ، اسی طرح ایک زمین کا ٹکڑا ہے، ایک ہی چشمے کا پانی اس کو لگایا جاتا ہے، اس میں مختلف قسم کی کھیتیاں اگا دیتے ہیں، کہیں آلو پیدا ہو رہا ہے، کہیں کچھ پیدا ہو رہا ہے اور ہر کسی کی شکل علیحدہ ہے، ہر کسی کا رنگ علیحدہ ہے، ہر کسی کا ذائقہ علیحدہ ہے اور بعض درخت بڑے بڑے ہیں اور پھل چھوٹے چھوٹے ہیں اور بعض بیلیں بڑی کمزور ہیں، لیکن پھل بڑے بڑے لگے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے اور یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کمال قدرت ہے۔ اور پھر اتنے رنگ ہیں کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا مصور رنگ بھرنے والا ایک گلاب کی پتی کا رنگ کبھی نہیں بنا سکتا، لاکھ وہ نقل بنائے، لیکن اصل اور نقل علیحدہ علیحدہ بات کر رہی ہوتی ہے۔

آپ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے چھوٹے چھوٹے کیڑے پیدا کر دیئے، کوئی اڑنے والے پروانے پیدا کر دیئے، کوئی اڑنے والی چیزیں پیدا کر دیں۔ ان کے رنگ دیکھیں تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے پروں میں اللہ تعالیٰ نے کتنے رنگ ڈال دیئے ہیں!! یہ کون ہے جو رنگ بھرنے والا ہے؟ یہ کون ہے جو مختلف شکلیں پیدا کرنے والا ہے؟ یہ کون ذات ہے جو ایک زمین سے ایسی مختلف نعمتیں اگانے والی ہے؟

منکرین خدا کے لیے عبرت انگیز واقعہ!

ایک مسلمان آدمی کمیونسٹ ملک میں گیا تو جب وہ ان سے کہے کہ یہ مکان کس نے بنایا تو وہ کہے کہ ہم نے بنایا

اس کو ایک پارک میں سیر کرانے کے لیے لے گئے تو اس مسلمان نے پوچھا کہ یہ پارک بڑا خوبصورت ہے، یہ کس نے بنایا ہے؟ انہوں نے کہا: ہم نے بنایا ہے۔ اس نے کہا: یہ پھول کس نے پیدا کیے ہیں؟ انہوں نے کہا: ہم نے خود پیدا کیے ہیں، ہم نے بیج ڈالا، کھاد دی اور ہم نے ان کی حفاظت کی تھی۔ اس نے پھول لے کر کہا: اس میں خوشبو کس نے پیدا کی ہے؟ تو اب وہ خاموش ہو گئے کہ خوشبو ہم نے نہیں ڈالی تھی، ہم نے تو زمین میں صرف بیج ڈالا تھا۔ مسلمان نے کہا: اس ایک بیج سے ٹہنی پھوٹی اور باہر آئی اور اس پر آ کر پھول لگا، پھر وہ پھول اپنے وقت پر کھلا اور پھر تمہارا بیج ایک رنگ کا ہے، لیکن پھول سو رنگ ہے، یہ رنگ کس نے ڈالا ہے؟ انہوں نے کہا: پتہ نہیں تو مسلمان نے کہا: جس کا تمہیں پتہ نہیں وہی خدا ہے، اسی کی قدرت نے یہ سب کچھ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم زیادہ غور نہیں کر سکتے ہو تو جن حیوانوں کا دودھ پیتے ہو ان پر غور کرو کہ مثلاً گائے ہے، بھینس ہے، ان کو سبز رنگ کا چارا ڈال رہا ہے اور بھینس کا اپنا رنگ سیاہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایسی مشینری لگا دی ہے کہ اسی چارے سے خون پیدا ہو رہا ہے، اس سے جو بچ رہا ہے وہ فضلہ بن کے نکل رہا ہے، جو پانی بچ رہا ہے وہ پیشاب کے ذریعے جا رہا ہے، جو اصل مادہ ہے وہ اندر دودھ پیدا کر رہا ہے اور ایک لائن ہے کہ اس میں گوبر جا رہا ہے، اس لائن میں پیشاب جا رہا ہے اور درمیان کی لائن میں دودھ آ رہا ہے۔ اللہ نے حکم دے رکھا ہے کہ خبردار! یہ اگر لیک ہو جائے تو دودھ میں ہوا پیدا ہو جائے گی، دودھ کا رنگ تبدیل ہو جائے گا، تم گلاسوں کے گلاس پی لیتے ہو، لیکن خدا تمہیں سمجھ نہیں آتا اور تمہیں اللہ کی توحید سمجھ نہیں آتی؟ آخر وہ کون ذات ہے جس نے اس سیاہ جانور سے سفید دودھ نکالا ہے!!؟

پھر خدا کی شان ہے کہ بھینس کے دودھ کے اپنے فائدے ہیں، گائے کے دودھ کے اپنے فائدے ہیں اور اونٹنی کے دودھ کے اپنے فائدے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تیرے لیے دودھ میں مکھن رکھے ہیں، گھی بنائے ہیں اور اس میں تیرے لیے لسی کے راستے پیدا کیے ہیں۔ فرمایا: جب ایک نعمت کھاتے ہو تو کم از کم اس پر غور کرو کہ اس کو بنانے والا کون ہے؟

اسی لیے بڑے بڑے محققین نے، بڑے بڑے علماء کرام نے لکھا ہے کہ غافل آدمی کھانے پر بیٹھے گا دس روٹیاں کھا جائے گا، لیکن غور نہیں کرے گا۔ اگر وہ ایک لقمہ پر بھی غور کرتا کہ یہ ایک روٹی کا نوالہ ہم تک پہنچنے میں اللہ کے کتنے آدمی لگے ہیں کہ کسی نے ہل چلایا، کسی نے پانی لگایا، کسی نے کھاد ڈالی، کسی نے بیج ڈالا، کسی نے فصل کو کاٹا، پھر مشینوں سے دانے اور بھوسہ کو علیحدہ کیا گیا، پھر وہ چکیوں میں پسی اور پھر پانی میں آ کر اور پکنے کے بعد

کھانے والے کے منہ میں آرہی ہے تو غور کرو کہ میں نے ایک بندے کے لیے کتنی مشینری لگائی ہے!؟ تا کہ میرے بندے کو غذا پہنچتی رہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا کبھی تم نے اس پر غور کیا ہے؟ یہ علیحدہ بات ہے کہ آدمی جانور بن جائے، ورنہ جانور بھی اپنے مالک کو پہچانتا ہے۔ ایک کتا اگر پاگل ہو جائے اپنے مالک کو نہیں کاٹتا۔ جس کتے کو آپ روٹی کا چھوٹا سا ٹکڑا ڈال دیتے ہیں وہ آپ کے دروازے پر پڑا ہے، رات کو پہرا دے رہا ہے، حتیٰ کہ کتنے کتے ایسے ہوتے ہیں جو مالک کو بچاتے بچاتے مر جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم کتے کو چھوٹا سا ٹکڑا ڈالتے ہو وہ کتا بھی تمہارا وفادار ہے، لیکن تم میری ساری نعمتیں کھا کر بھی غدار ہو، سجدے قبروں پر کرتے ہو تو اس کتے سے بھی گئے گزرے ہو گئے ہو، اس کتے کو مالک مارے وہ پاؤں چاٹتا ہے، مالک کی آواز سن کر دوڑتا ہوا چلا آئے گا۔

دس دن بلی کو گھر میں روٹی کھلاتے رہو، پھر صندوق میں بند کر کے دور چھوڑ آؤ، آٹھویں دن پھر گھر پہنچ جائے گی۔ تم گھوڑے کو جنگل میں لے جاؤ، راستہ بھول جاؤ، اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دو، اللہ پر توکل کر لو، وہ گھوڑا ڈھونڈتا ڈھونڈتا اپنے مالک کے گھر پہنچ جائے گا۔ ایک جانور بھی اپنے مالک کا گھر پہچانتا ہے، لیکن اے انسان! تو ایک ایسا ہے جو نہیں پہچانتا کہ تیرا پیدا کرنے والا کون ہے؟

اس لیے قرآن میں آتا ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ [محمد: ۲۴]

کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ کیا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں کہ ان کو حق بات سمجھ نہیں آتی؟ ورنہ کون ایسا آدمی ہے کہ اس کو حق بات سمجھ نہیں آتی؟

ہر مخلوق کے پیدا کرنے میں اللہ کی حکمت ہے:

تاریخ کے اندر ایک بادشاہ کا قصہ آتا ہے۔ انہوں نے دریا کے کنارے پر دیکھا کہ ایک کیڑا گندگی اٹھائے ہوئے جا رہا ہے۔ یہ کیڑا عام طور پر وہاں ہوتا ہے جہاں زمین میں نمی ہو، دریا کا کنارہ ہو، سمندر کا کنارہ ہو۔ تو بادشاہ نے جب اس کو دیکھا تو حیرت سے کہا: کتنا گندا کیڑا ہے! ایک تو خود گندا ہے اور پھر گندگی بھی اٹھا کر پھر رہا

ہے۔ فوراً اس بادشاہ کے منہ سے نکل گیا: اے اللہ! اگر تو اس کو پیدا نہ کرتا تو کونسا تیری شان میں کمی آجاتی؟ اس طرح اس نے نفرت کا اظہار کر دیا۔ چند دن گزرے بادشاہ کے پاؤں میں ایک پھوڑا نکلا اور زخم ہو گیا۔ ساری دنیا کے طبیب اور جراح علاج کر کر کے تھک گئے۔ اتفاق سے بادشاہ سلامت شکار پر نکلے تو راستے میں ایک اللہ والے مل گئے۔ انہوں نے بادشاہ کے پاؤں پر زخم دیکھا تو اس سے پوچھا۔ بادشاہ نے کہا: پھوڑا نکلا ہے اور اتنا عرصہ ہو گیا ہے، ٹھیک نہیں ہو رہا۔ فقیر نے وہ زخم دیکھا اور کہا: بادشاہ سلامت! ایک کیڑا گندگی اٹھا کر پھرتا ہے اگر وہ مل جائے تو اس زخم کا علاج ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے ملازمین کو حکم دیا: سارے سمندر کے کنارے چھان مارو۔ تو ملازم کئی کیڑے پکڑ کر لے آئے۔ فقیر نے اس کیڑے کو مارا اور اس سے مرہم تیار کر کے بادشاہ کو دی۔ بادشاہ نے دو تین دفعہ لگائی اور ٹھیک ہو گیا۔ بادشاہ کہنے لگا: یا اللہ! میری توبہ ہے کہ میں نے تیری مخلوق پر اعتراض کیا۔ آج مجھے پتہ چلا کہ تو نے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے اس کے اندر تیری حکمت ہے۔

اللہ کی حکمت کے کارنامے:

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ اللہ علم والے بھی ہیں اور حکمت والے بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو غریب بنایا ہے تو حکمت ہے، کسی کو گورا بنایا ہے تو حکمت ہے، کسی کو کالا بنایا ہے تو حکمت ہے، طاقت ور بنایا ہے تو حکمت ہے، کسی کو صحت دی ہے تو حکمت ہے اور کسی کو بیمار کیا ہے تو اس میں بھی حکمت ہے۔ بندے کا کام یہ ہے کہ وہ کہے: یا اللہ! ہمارا ایمان ہے، ہم تیری تقدیر کے قائل ہیں، ہم تیری قضا کے ماننے والے ہیں اور ہم تیری رضا پر راضی ہیں۔

''رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا، وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا''۔

بادلوں کے رنگ میں بھی عذاب آسکتا ہے:

بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب بادل آتے تھے تو حضور پاک ﷺ پر غم چھا جاتا تھا۔ آپ کبھی گھر کے اندر آتے اور کبھی باہر جاتے تھے۔ آپ کے چہرے مبارک کا رنگ اڑ جاتا تھا۔ تو میں کہتی: یا رسول اللہ! کیا بات ہے؟ بادل آتے ہیں تو لوگ خوش ہوتے ہیں، آپ گھبرا جاتے ہیں؟ فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں پہلی امتوں پر بادلوں کے رنگ میں عذاب آئے تھے، کہیں بادلوں کے رنگ میں میری امت پر اللہ تعالیٰ عذاب نہ بھیج دیں۔ اور جب بارش برستی تو کہتے الحمد للہ! آپ خوش ہو جاتے اور کہتے: اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے عذاب نہیں، بلکہ اپنی رحمت کا مینہ برسا دیا ہے۔

اور حضور پاک ﷺ اپنا کپڑا اتار کر بارش کے پانی کو اپنے بدن پر پھیرتے اور کہتے الحمد للہ یہ پانی ابھی ابھی میرے اللہ سے آ رہا ہے۔ اللہ کی طرف سے آنے والی نعمت ہے۔ اور اس کے بعد دعائیں کرتے کہ یا اللہ! ہمیں رحمت کی بارش دینا، عذاب والی بارش نہ دینا۔ یا اللہ! ہمیں ایسی بارش دینا جس سے تو اپنے بندوں کو پانی پلائے، اپنے شہروں کی مردگی کو زندہ کرے، میرا اللہ! اپنے جانوروں پر رحم فرما، اپنی مخلوق پر رحم فرما اور ہمارے لیے اس کو باعث خیر بنا اور باعث نفع بنا۔ اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ یہ ساری نشانیاں عقل والوں کے لیے ہیں۔

شیخ ابو سلیمان الدرانی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اللہ کے ولی گزرے ہیں، وہ فرماتے تھے: جب اپنے گھر سے باہر جاتا ہوں تو جس جس چیز پر میری نظر پڑتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے اندر میرے لیے نعمتیں ہیں یا اس کے اندر میرے لیے عبرتیں ہیں۔ اس قول کو ابن ابی الدنیا نے کتاب التفکر والاعتبار میں نقل کیا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک گھڑی اللہ قدرتوں میں تفکر کرنا ساری رات کے نفل پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے۔

کیونکہ جب اللہ کی قدرت پر یقین آئے گا تو پھر نفل اثر کریں گے۔ جب اللہ تعالیٰ کی عظمت کو نہیں پہچانے گا اور جب اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت کو نہیں پہچانے گا تو نماز کا کیا فائدہ ہوگا؟ اس لیے قرآن میں بار بار آ رہا ہے: ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ [الذاریات: ۲۱] میرے بندے! کیا تو نے کبھی اپنے اندر بھی غور کیا ہے کہ میرے مالک نے یہ کارخانہ کائنات کیسے بنایا ہے؟ اور کبھی قرآن کہتا ہے: ﴿اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَاۗءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ﴾ [ق: ۶] اور کبھی کہتا ہے: ﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ﴾ [الطارق: ۵] کبھی انسان اپنی حقیقت کے اندر غور کرے کہ اللہ نے کس چیز سے پیدا کیا ہے؟ اور کبھی فرمایا: ﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ﴾ [الغاشیۃ: ۱۷] کبھی اونٹ پر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حیوان کیسے پیدا کیا ہے؟ اس کی طاقت اور سرکشی کو دیکھو اور پھر اس کی اطاعت کو دیکھو کہ ایک چھوٹا بچہ بھی نکیل پکڑ کر لے جائے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: غور کرو! کتنے سرکش جانور میں نے تیرے تابع کر دیے، تو بندہ ہو کر میرے تابع نہیں ہوتا۔ انسان جب اونٹ پر سفر کرتا ہے نظر اٹھائے تو آسمانوں پر پڑتی ہے، نیچے گرے تو پہاڑوں پر پڑتی ہے، اس سے نیچے گرے تو اپنی سواری پر پڑتی ہے اور اس سے نیچے گرے تو زمین پر پڑتی ہے۔ اللہ نے فرمایا: ان چیزوں پر غور کرو کہ اللہ نے یہ سب کچھ کیسے پیدا کیا ہے؟ آخر ہر چیز میں حکمت ہے۔ یہ تو نہیں کہ بچوں کا کھیل ہے کہ گھر کے باہر بیٹھ کر مٹی کے گھروندے بنا لیے کہ یہ تیرا گھر ہے اور یہ میرا گھر ہے۔ کھیلنے کے بعد جی بھر گیا تو اٹھتے ہوئے پاؤں

مارا اور توڑ کر چلے گئے۔ تو کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نظام ایسے بنایا ہے کہ یہاں کھاؤ، پیو اور جو مرضی آئے کرو؟ کیا کچھ نہیں ہوگا؟ نہ حساب، نہ کتاب، نہ جزا، نہ سزا، نہ موت اور نہ حشر، کیا اللہ تعالیٰ نے دنیا بے فائدہ بنائی ہے؟

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا ملفوظ:

اس لیے حکم ہے کہ غور کریں کہ اللہ نے یہ کارخانہ کیوں پیدا کیا ہے؟

حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ فکر کا معنی یہ ہے کہ فکر شیشہ ہے، جو تجھے تیری اچھائیاں اور برائیاں دکھادے گا۔

حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا ملفوظ:

حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فکر ایسا نور ہے جو تیرے دل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور کبھی بطور مثال یہ شعر پیش کرتے:

؎ إِذَا الْمَرْءُ كَانَتْ لَهُ فِكْرَةٌ
فَفِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهُ عِبْرَةٌ

''اگر کسی مرد کو اللہ تعالیٰ نے فکر دی ہے تو پھر ہر شے میں اس کے لیے عبرت ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''طُوبٰی لِمَنْ كَانَ قِیلُهٗ تَذَكُّرًا وَصَمْتُهٗ تَفَكُّرًا، وَنَظَرُهٗ عِبَرًا'' [تفسیر ابن کثیر] خوشخبری ہے اس بندے کے لیے جو بات کرے تو اللہ کو یاد کرانے والی بات کرے، اگر چپ بیٹھا ہو تو اللہ کی قدرتوں میں فکر کرے اور اگر کسی چیز کو دیکھے تو عبرت پکڑے۔

واقعہ: ہمارے استاذ نے توحید سنانے پر پتھر کھائے:

ہم چھوٹے تھے، ایک جلسہ میں تقریر کرنے کے لیے ہمارے استاذ صاحب تشریف لے گئے۔ وہاں آگے ایسے ماحول تھا کہ وہاں توحید کا نام لینا بہت مشکل تھا۔ جب تقریر ہوئی تو لوگوں نے پتھر مارے۔ استاذ سارا واقعہ بھی کہتے رہے کہ اللہ کا شکر ادا کرو، اے اللہ! آج تیرے نبی ﷺ کی سنت پوری ہوگئی، تیرا شکر ہے۔ آج ہم نے لوگوں کو توحید سنائی۔ اور اللہ کی شان ہے کہ جنہوں نے ہمیں پتھر مارے، چار دن کے بعد وہ دوبارہ لے گئے کہ

تقریر کریں، اسی طرح تیسری دفعہ لے گئے، چوتھی دفعہ لے گئے۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ وہ سارا علاقہ ہی توحید والوں کا ہے، ایک بھی مشرک نہیں رہا۔ لوگ توحید کے کام میں اتنے لگ گئے کہ ہم ان کے پیچھے رہ گئے۔

اصل بات یہ ہے کہ تم اگر اللہ کے نبی کے راستے پر چلو گے تو حلوے نہیں ملیں گے۔ اگر ملا ہو تو کبھی کبھی پتھر بھی ملے گا۔ اگر ہر وقت حلوہ ملے تو سمجھو کہ ہم غلط راستے پر ہیں، نبی کے راستے پر نہیں ہیں۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب آدمی کی سوچ بڑھتی ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ فہم عطا فرماتے ہیں، جب فہم ملتی ہے تو اللہ اس کو علم عطا فرماتے ہیں اور جب آدمی کو علم ملتا ہے تو عمل کرنے کی بھی توفیق ہوتی ہے۔

اصل علم وہ ہے جس پر عمل بھی ہو:

یادرکھیں! اصل علم بھی وہی ہے جس پر عمل ہو، لیکن اگر عمل نہ ہو تو پھر اس علم جیسا وبال دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ لوگوں کو نماز کہو اور خود نماز نہ پڑھو، لوگوں سے کہو کہ روزہ رکھو اور خود روزہ نہ رکھو، لوگوں سے کہو کہ تہجد پڑھو اور خود سو جاؤ اور لوگوں سے کہو کہ قرآن کی تلاوت کرو اور خود محروم رہو۔ تو اس کی مثال ایسے ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعۃ:۵] جیسے گدھے پر کتابیں لاد دو تو گدھا گدھا رہتا ہے، مولوی نہیں بن جاتا۔

مواعظ عبرت:

حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر آدمی کلام کرے تو اللہ کا ذکر کرے؛ کیونکہ اس سے احسن کلام کوئی نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں فکر کرنے سے افضل عبادت کوئی نہیں ہے۔

حضرت مغیث الاسود رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لوگو! روزانہ قبروں کی زیارت کیا کرو اور غور کیا کرو اور موقف (اللہ کے سامنے حاضری) کا اپنے دلوں سے مشاہدہ کیا کرو۔ اور سوچو کہ دونوں فریق جنت یا جہنم کی طرف جا رہے ہیں۔

علماء نے لکھا ہے کہ حضرت مغیث رحمہ اللہ جب قبر پر آتے تھے تو روتے روتے بے ہوش ہو جاتے تھے، لوگ ان کو اٹھا کر لے جاتے تھے؛ کیونکہ جب قبروں پر غور کرتے ان کی زندگی سامنے آتی کہ کیسی نعمتوں میں پلنے والے لوگ؟ جنہوں نے زندگی میں اپنے بدن پر مٹی کا ذرہ بھی برداشت نہیں کیا تھا اور آج منوں مٹی کے نیچے پڑے ہوئے ہیں، وہ لوگ جو قالینوں کے بغیر نہیں چلتے تھے اور آج ان کے بدن سڑ گئے ہیں۔ دیکھو! کس حال میں پڑے ہوئے ہیں؟

قبروں کی زیارت کا یہی معنی ہوتا ہے کہ آدمی قبروں سے عبرت پکڑے کہ دیکھو! شان والے کہاں آ گئے؟ اور ہماری آخری منزل بھی یہی ہونی ہے۔ سب ساتھی چلے جائیں گے۔ اگر اعمال صالحہ ہیں تو اللہ تعالیٰ اس گڑھے کو بھی جنت بنا دیتے ہیں اور اگر اعمال صالحہ نہ ہوں تو وہ گڑھا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا بن جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک دفعہ ایک آدمی راہب کے قریب سے گزرا تو وہ راہب ایک ایسی جگہ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک طرف تو قبرستان ہے اور دوسری طرف کوڑا کرکٹ کا ڈھیر تھا۔ اس بندے نے راہب سے کہا: تم تو دنیا کے دو خزانوں کے درمیان بیٹھے ہوئے ہو، جن میں تیرے لیے عبرت ہے۔ ادھر بندوں کا خزانہ ہے اور دوسری طرف مال کا خزانہ ہے۔ بندوں کے خزانے کا یہ نتیجہ ہے کہ آج قبروں میں سو رہے ہیں اور مال کا نتیجہ یہ ہے کہ کھایا پیا گندگی بن گیا اور گندگی کے ڈھیر میں آ گیا۔ اس کے اندر تیرے لیے بہت بڑی عبرت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب اپنے دل کو نصیحت کا ارادہ کرتے تو آپ باہر ویرانوں، جنگلوں اور قبرستانوں میں نکل جاتے تھے اور وہاں کھڑے ہو کر کہتے کہ اے قبر والو! کہاں ہیں آج تمہارے گھر والے؟ پھر خود جواب دیتے: اللہ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ دو رکعت نماز اعتدال کے ساتھ آدمی پڑھے، لیکن تفکر کے ساتھ کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں، تو وہ ساری رات ایسے جاگنے سے بہتر ہے جس میں دل غافل ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اے آدم کے بیٹے! جب کھانے کے لیے بیٹھے تو تیسرا حصہ کم از کم کھانے سے بھر لے۔ یعنی ایک حصہ کھانے کے لیے، ایک حصہ پینے کے لیے اور ایک حصہ خالی چھوڑ دے، تاکہ سانس آ جا سکے اور تو اللہ کی رحمت پر غور بھی کر سکے۔ یہ نہیں کہ بس کھانے کی ہی فکر رہے کہ کبھی ڈکاریں آ رہی ہیں، کبھی حضرت بوتل پی رہے ہیں، کبھی حضرت دوائیں کھا رہے ہیں اور حضرت الٹے پڑے ہیں۔

بعض حکماء کہتے ہیں: جو شخص عبرت کے بغیر دنیا کی نظر کرے تو اس غفلت کے بقدر اس کے دل کی بصارت ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت بشر بن الحارث الحافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر بندے کو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا خیال ہوتا تو وہ کبھی گناہ نہ کرتا۔ اس کی ایک آسان مثال سمجھیں کہ اگر پانچ سال کا بچہ کمرے میں موجود ہو تو کیا آپ اپنی عورت کے ساتھ لیٹیں گے، بلکہ کہیں گے: بچے کو ادھر سے نکالیں۔ میاں بیوی کا ملنا گناہ کوئی نہیں، لیکن اپنا چھوٹا بچہ جاگ رہا ہو تب بھی

کہتے ہیں: ذرا ٹھہرو بچوں کو تو نیند آ جائے۔ اس سے بندہ چھپتا ہے اور جب تم گناہ کرتے ہو تو کیا خیال ہے یہ یقین ہوتا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟ اگر یہ یقین ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے تو پھر گناہ کیسے کر سکتے ہو؟

ایک چوکیدار کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ جاگ رہا ہے، پھر بھی تم جرم نہیں کرتے ہو، لیکن تم اللہ سے چوکیدار کے برابر بھی نہیں ڈرتے ہو تو پھر اللہ کی عظمت کا کیا معنی ہوا؟

حضرت عامر بن قیس رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے ایک دو نہیں، بلکہ کئی صحابہ سے سنا ہے کہ ایمان کی روشنی یا فرمایا: ایمان کا نور اللہ کی تعالیٰ کی نعمتوں میں فکر کرنا ہے۔ ایمان پیدا ہوتا ہے تو ہر چیز کھل جاتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۭ﴾ [الانعام:۱۲۵]

جب ہم راضی ہو جائیں کسی کو ہدایت دینے کے لیے، ہم اس کے سینے کو کھول دیتے ہیں، وہ نور میں آ جاتا ہے۔ جب آدمی تفکر کرتا ہے تو اس کے نورِ ایمان کی روشنی بڑھ جاتی ہے تو ہر چیز نورِ ایمان میں نظر آتی ہے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ یہ کام کرنا ہے اور یہ کام نہیں کرنا۔ اس راستے پر چلنا ہے اور اس راستے پر نہیں چلنا۔ کیونکہ نور پر آ گیا ہے۔ اور جب روشنی ہٹ جائے تو کبھی اس غار میں پڑے گا، کبھی کانٹے پر پاؤں پڑے گا اور کبھی سانپ پر پاؤں پڑے گا اور یہ نورِ ایمان فکر سے پیدا ہوگا کہ اللہ کی نعمتوں میں فکر کرو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے تھے کہ اے کمزور ابن آدم! جہاں بھی ہے اپنے اللہ سے ڈرتا رہ۔ چاہے مکہ میں ہے، چاہے مدینے میں ہے، اپنے ملک میں ہے یا کسی جگہ ہے جہاں بھی رہے، اللہ تعالیٰ سے ڈر اور دنیا میں مہمانوں کی طرح رہ اور اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو اپنا گھر بنا اور اپنی آنکھوں کو ذرا رونا بھی سکھا کہ کیسے رونا آتا ہے؟ اور اپنے بدن کو صبر کرنے کی مشقتیں برداشت کرنے کی عادت ڈال دے اور اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں فکر کرنا سکھا دے اور کل کی روٹی کی فکر نہ کر۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ ایک دن اپنے ساتھیوں میں بیٹھے تھے تو رونے لگ گئے۔ ساتھیوں نے پوچھا: کیا

بات ہے؟ فرمایا: میں نے دنیا اور دنیا کی لذتوں اور شہوتوں میں غور کیا کہ ان کا کیا نتیجہ ہے؟ ان دنیا کی لذتوں کا ما سوائے برائی کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس کے اندر عبرت ہے، مگر اس کے لیے جو عبرت حاصل کرے۔ اس کے اندر وعظ ہے، لیکن اس کے لیے جو نصیحت پکڑے۔ جیسا کہ حضرت حسین بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ نے فرمایا: ہے۔

نُزْهَةُ الْمُؤْمِنِ الْفِكَرْ ...... لَذَّةُ الْمُؤْمِنِ الْعِبَرْ
نَحْمَدُ اللهَ وَحْدَهُ ...... نَحْنُ كُلٌّ عَلَى خَطَرْ
رُبَّ لَاهٍ وَعُمْرُهُ ...... قَدْ تَقَضَّى وَمَا شَعَرْ
رُبَّ عَيْشٍ قَدْ كَانَ فَوْقَ ...... الْمُنَى مُوْنِقِ الزَّهَرْ
فِيْ خَرِيْرٍ مِنَ الْعُيُوْنِ ...... وَظِلٍّ مِنَ الشَّجَرْ
وَسُرُوْرٍ مِنَ النَّبَاتِ ...... وَطِيبٍ مِنَ الثَّمَرْ
غَيَّرَتْهُ وَأَهْلَهُ ...... سُرْعَةُ الدَّهْرِ بِالْغِيَرْ
نَحْمَدُ اللهَ وَحْدَهُ ...... إِنَّ فِيْ ذَا لَمُعْتَبَرْ
إِنَّ فِيْ ذَا لَعِبْرَةً ...... لِلَبِيبٍ إِنِ اعْتَبَرْ

''مومن کی تر و تازگی غور و فکر ہے...... مومن کی لذت عبرت حاصل کرنا ہے...... ہم صرف ایک اللہ کی تعریف کرتے ہیں ...... ہم سب خطرے میں ہیں ...... بہت سے لوگ غفلت میں مبتلا ہیں، حالانکہ ان کی عمر...... گھٹ رہی ہے اور ان کو شعور ہی نہیں ...... بہت سے عیش بالاتر ...... امید سے، سرسبز و شادابی سے...... بہتے چشموں میں ...... درختوں کے سائے میں ...... اور نباتات کی خوشی میں ...... اور عمدہ پھلوں میں تھے ...... زمانے کی رفتار نے ان کو اس عیش والے کے علاوہ سے بدل دیا ...... ہم صرف ایک اللہ کی حمد کرتے ہیں ...... بلاشبہ اس میں عبرت ہے ...... اس میں عبرت حاصل کرنے والے عقلمند کے لیے عبرت ہے۔''

مومن کی نزہت یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں میں فکر کرے اور مومن کی لذت یہ ہے کہ ہر چیز سے عبرت پکڑے، اللہ کا شکر ادا کرے، ہم سب خطرے میں ہیں، کتنے عیش ہیں جو ہم کھا رہے ہیں! کتنی لذتیں ہیں جو ہم کھا رہے ہیں! لیکن نتیجہ یہ ہے کہ دنیا گزر رہی ہے، زمانہ گزر رہا ہے اور ہر چیز فنا ہو رہی ہے۔

حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل فرمائی ہے کہ عسقلان جگہ سے اللہ تعالیٰ

قیامت والے دن ایسے لوگ کھڑے کریں گے جو ستر ہزار ہوں گے، جن سے حساب نہیں ہوگا اور ان میں سے پچاس ہزار ایسے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف آنے والے، شہید ہونے والے، گویا کہ ان کی گردنیں کٹی ہوئی ہیں، ان کی رگوں سے خون بہہ رہا ہے۔ اور وہ کہیں گے: ﴿رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾ اللہ تعالیٰ حکم دیں گے کہ یہ میرے بندے سچ کہہ رہے ہیں، ان کو نہر بیضا میں غسل دو۔ جب نہر میں غسل دیں گے تو وہ صاف ستھرے ہو کر نکلیں گے۔ اللہ تعالیٰ حکم دیں گے: جنت میں جائیں اور جہاں چاہیں رہیں اور کھائیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث مسند کی غرائب میں شمار ہوتی ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ [مسند احمد: ۳/۲۲۵]

﴿وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ﴾ بندے کہیں گے: اے اللہ! قیامت والے دن ہمیں مخلوق کے سامنے رسوا نہ کر دینا، جب ساری مخلوق کھڑی ہو تو ہمیں رسوائی سے بچا لینا۔ اور اے میرے مولا! تو کبھی اپنے وعدے میں خلاف ورزی نہیں کرتا۔ تیرا وعدہ سچا ہے، تیرا ہر قول سچا ہے اور تیرا ہر فرمان سچا ہے۔ اور جب تو نے کہہ دیا کہ قیامت آئے گی تو اس کو کوئی نہیں ٹال سکتا؛ کیونکہ تیرے فرمان میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہوتا۔

ذلت کا عذاب:

(حدیث) حافظ ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرمائی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلْعَارُ وَالتَّخْزِیَةُ تَبْلُغُ مِنِ ابْنِ آدَمَ فِي الْقِیَامَةِ فِي الْمَقَامِ بَیْنَ یَدَيِ اللّٰہِ مَا یَتَمَنّٰی الْعَبْدُ أَنْ یُؤْمَرَ بِهٖ فِي النَّارِ)) [مسند ابو یعلیٰ: ۳/۲۱۱] قیامت کے دن جب آدمی اللہ کے دربار میں پیش ہوگا تو اس کی رسوائی، اس کی شرمندگی کا یہ عالم ہوگا، یعنی جو گنہگار ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ رسوا کریں گے وہ رسوائی کی ذلت میں اس حد تک پہنچ جائے گا کہ وہ کہے گا: مجھے جہنم میں بھیج دیا جائے، لیکن رسوا نہ کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذلت بہت بڑا عذاب ہے۔

جب ہم پڑھتے تھے تو ہمارے استاذ اس کی مثال یوں سناتے تھے کہ ایک آدمی بڑا چور تھا، وہ سخت جان آدمی تھا۔ اگر اس کو کسی جرم میں پولیس پکڑ لیتی اور اس کو مارتے، تشدد کرتے تو وہ مانتا نہیں تھا، بلکہ وہ اتنا پکا ہوتا تھا۔ ایک تھانیدار آیا اور اس نے جب اس کو پکڑا تو ریکارڈ سب کا موجود ہوتا ہے۔ اس تھانیدار نے اس کو سڑک پر کھڑا

کر دیا۔ لوگوں کو کہا کہ اس کے منہ پر تھوکتے جاؤ اور چلے جاؤ۔ جب سارا دن گزر گیا تو اس نے کہا: تھانیدار صاحب! یہ چوری کا مال لے لو، لیکن مجھے ذلیل نہ کرو۔

اس لیے کسی شاعر نے بھی کہا ہے:

؎ جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ
وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

جب آدمی کو تلواروں کے زخم لگتے ہیں تو وہ مندمل ہو جاتے ہیں، لیکن زبان کا زخم مندمل نہیں ہوتا۔

کسی کو جب زبان سے طعنہ دیا جائے اور زبان سے تہمت لگا دی جائے......اللہ معاف کرے......تو وہ زخم مرہم سے ٹھیک نہیں ہوتا اور نہ انجکشن سے ٹھیک ہوتا ہے۔ اس لیے ہر آدمی ہر وقت اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعا کرے: ﴿وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ اللہ! ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا۔

اسی لیے حضور اکرم ﷺ کی ایک اور دعا مبارک بھی ہے، کہا: ((اللّٰهُمَّ! أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْأُمُورِ كُلِّهَا، وَأَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا، وَعَذَابِ الْآخِرَةِ)) [مسند احمد، رقم: ۱۷۶۲۸] اے اللہ!! ہمارے تمام امور کا انجام بہتر بنا اور اے اللہ! ہمیں دنیا اور آخرت کی رسوائی سے محفوظ فرما۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کی ایک اور دعا بھی ہے: ((اللّٰهُمَّ! إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ، وَدَرَكِ الشَّقَاءِ، وَسُوءِ الْقَضَاءِ، وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ)) [بخاری، رقم: ۶۳۴۷] اللہ! ہمیں ایسے حال سے بچانا کہ دشمن ہنس رہا ہو۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو میرے عابدین صالحین ہیں ان کو مستقبل کا بھی ڈر نہیں ہے اور جو چھوڑ کر گئے ہیں ان کو اس کا بھی غم نہیں ہوگا۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ نے اپنے انبیاء اور رسولوں سے وعدہ کیا ہے کہ اے میرے پیغمبر! آپ کو بھی اور آپ پر ایمان لانے والوں کو بھی قیامت والے دن رسوا نہیں کروں گا۔

صحیح حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب قیامت والے دن میدانِ حشر میں کھڑے ہوں گے تو دیکھیں گے کہ ان کے ابا آزر کو فرشتے پکڑ کر لے جا رہے ہوں گے۔ وہ وہیں اللہ سے دعا مانگیں گے کہ یا اللہ! تیرا وعدہ ہے کہ تو اپنے نبیوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ یا اللہ! اس سے بڑی میری رسوائی کیا ہوگی کہ میرا باپ ہو اور جہنم میں ڈالا جائے!! یا اللہ!...... یا اللہ! مجھے رسوائی سے بچا لے۔ اللہ تعالیٰ حکم دیں گے: اے ابراہیم! ذرا نیچے دیکھو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نیچے دیکھیں گے پھر حکم ہوگا کہ اب پہچانو تو ان کے والد آزر کو بجو کی شکل میں بدل دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے خلیل! میں تمہیں رسوائی سے تو بچا لیتا ہوں، لیکن کسی کافر، مشرک کا جہنم کے بغیر کوئی ٹھکانہ نہیں ہے؛ کیونکہ میرے فیصلے ہیں اور میرے فیصلے بدلا نہیں کرتے، میں نے جو حکم دیا ہے اس کے اندر کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اور یہ میرا فیصلہ ہے کہ جس آدمی کی موت شرک پر آئے گی اس پر جنت حرام ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہم تمہیں رسوائی سے تو بچا لیتے ہیں کہ کوئی آدمی آزر کو پہچان نہیں سکے گا، لیکن اس پر عذاب قائم رہے گا؛ کیونکہ اس کی موت کفر وشرک پر آئی ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی کا ذلیل ہونا، کسی کا رسوا ہونا اتنا سخت ہے کہ قیامت والے دن بندہ یہ تمنا کرے گا کہ یا اللہ! مجھے ذلت سے بچا اور اس سے بہتر ہے کہ تو مجھے سیدھا جہنم میں بھیج دے۔

حدیث پاک میں یہ بات ثابت ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ رات کو تہجد کی نماز کے لیے بیدار ہوتے تو سورت آلِ عمران کی یہ دس آیات تلاوت فرماتے تھے: ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ...... يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

[آلِ عمران: ۱۹۰ تا ۲۰۰]

اور ایک حدیث مبارک میں آتا ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ تہجد کے لیے اٹھتے تو آسمان کی طرف نظر فرماتے اور اس کے بعد یہ دس آیات مبارک تلاوت کرتے۔ اس کے بعد آپ یہ دعا فرماتے: ((اللّٰهُمَّ! لَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ، وَلَكَ الْحَمْدُ لَكَ مُلْكُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ، وَلَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ نُورُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ، وَلَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ مَلِكُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَلَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ، وَلِقَاؤُكَ حَقٌّ، وَقَوْلُكَ حَقٌّ، وَالْجَنَّةُ حَقٌّ، وَالنَّارُ حَقٌّ، وَالنَّبِيُّونَ حَقٌّ، وَمُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَقٌّ، وَالسَّاعَةُ حَقٌّ)) [بخاری، رقم: ۱۱۲۰] اے اللہ!! تو آسمانوں اور زمینوں کو تھامنے والا ہے، یا اللہ! تو حق ہے، تیرا وعدہ سچا ہے، تیرا فرمان حق ہے، قیامت میں تیرے سامنے پیش ہونا حق ہے، اسی طرح قیامت حق ہے، جنت حق ہے، دوزخ حق ہے، تمام انبیاء حق ہیں اور محمد مصطفیٰ ﷺ حق ہیں۔

ہر مسلمان کو چاہیے کہ کم از کم کوشش کرے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس کام کے لیے ہمیں پیدا کیا ہے تھوڑا سا وقت اس پر بھی لگائے۔ اللہ تعالیٰ علماء اور اہلِ خیر کو جزائے خیر عطا فرمائے! ہر زبان میں دعائیں چھاپ دی ہیں۔

کوشش کریں کم از کم وہ دعائیں ساری نہ سہی، کچھ دعائیں یاد کرلیں کہ میرے مدنی سرکار ﷺ جب سوتے تھے تو کیا پڑھتے تھے؟ جب آپ نیند سے بیدار ہوتے تھے تو کیا پڑھتے تھے؟ جب سرکارِ مدینہ ﷺ اپنے گھر سے باہر نکلتے تھے تو کیا پڑھتے تھے؟ جب آسمانوں پر نظر پڑتی تو کیا پڑھتے تھے؟ اور جب کوئی مشکل پیش آتی تو کیا پڑھتے؟ حضور اکرم ﷺ کی دعائیں یاد کرلیں۔ اس میں اتنا بڑا خزانہ ہے کہ تم لوگوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہے۔

حضور ﷺ کا رات کا معمول:

(حدیث) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں اپنی خالہ بی بی میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں رہا (اس وقت میری عمر بڑی نہیں تھی)، تاکہ میں یہ دیکھوں کہ حضور ﷺ رات کو کیا کرتے ہیں؟ حضور اکرم ﷺ تشریف لائے اور کچھ دیر تک آپ اپنی گھر والی سے بات فرماتے رہے، پھر حضور پاک ﷺ لیٹ گئے۔ جب رات کا تیسرا حصہ باقی تھا آپ بیٹھ گئے اور آسمان کی طرف دیکھ کر یہ آیات مبارکہ تلاوت کیں: ﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ......﴾ آخر تک۔ پانی رکھا ہوا تھا، آپ نے مسواک فرمایا، وضو فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے گیارہ رکعت نماز پڑھی۔ [بخاری، رقم:۴۵۶۹]

بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے دس رکعت تہجد کی پڑھیں اور ایک رکعت وتر کی تھی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آٹھ رکعات تہجد کی ہوگئیں اور تین رکعت وتر کی ہوگئیں۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ جو رات کو تہجد پڑھتے تھے اس کے بارے میں صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ رات کو کتنی رکعت پڑھتے تھے؟ انہوں نے فرمایا: حضور آٹھ رکعت پڑھتے تھے، چاہے وہ رمضان ہو یا غیر رمضان ہو۔

اسی وجہ سے بعض علماء اور بعض حضرات رمضان میں تراویح بھی آٹھ رکعت پڑھتے ہیں۔ حالانکہ اصلی بات یہ نہیں ہے؛ کیونکہ تراویح مسجد میں پڑھی جاتی ہے، گھر میں نہیں پڑھی جاتی، تہجد گھر میں پڑھی جاتی ہے۔ اور بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضور اکرم ﷺ کی تہجد کے بارے میں پوچھا جارہا ہے کہ رمضان میں بھی تہجد کے اندر کوئی فرق ہے یا وہی بات ہے جو ہر سال ہے؟ ورنہ تو بی بی عائشہ سے مسئلہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے؛ کیونکہ باہر تو صحابہ نے دیکھ لیا تھا کہ آپ نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔ ان سے اس لیے پوچھا کہ آپ کی رات کی نماز کیسی تھی؟ تو

بی بی عائشہ نے کہا کہ رمضان ہو یا نہ ہو، آپ آٹھ رکعتیں ضرور پڑھتے تھے۔

اور اس کے بعد بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا کیا پوچھتے ہو وہ کتنی لمبی ہوتی تھی! کیسی خوبصورت ہوتی تھی! وہ کیسی پیاری پیاری قرأت ہوتی تھی!!

امہات المومنین رضی اللہ عنہن سے پردہ اور علمی مسائل کا سوال:

(حدیث) حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ سب اکٹھے ہو کر بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر گئے (یہ اس دور کا قصہ ہے کہ جب آیت حجاب نازل ہو چکی تھی) ہمارے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان حجاب تھا۔ تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے عبید بن عمیر سے پوچھا کہ آپ کو ہماری زیارت سے کس چیز نے روکا ہے؟ تو عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: شاعر کے اس قول نے ''زُرْ غِبًّا، تَزْدَدْ حُبًّا'' کبھی کبھی زیارت کیا کرو، اس سے محبت بڑھتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی عبادت:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا: چھوڑیں ان باتوں کو، ہمیں تو مہربانی کر کے حضور سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی عجیب بات سنائیں۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کیا پوچھتے ہو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تو ہر بات عجیب تھی، ہر عمل عجیب تھا۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ آقائے نامدار سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، حتیٰ کہ میرے بالکل قریب ہوئے، آپ کا بدن مبارک میرے بدن سے ٹکرایا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: عائشہ! اب چھوڑیں۔ اب میں اٹھ کر اپنے اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: مجھے بھی تو آپ کا قرب محبوب ہے، میں یہ تو نہیں چاہتی کہ حضور مجھ سے دور ہو جائیں اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ آپ اپنے اللہ کی عبادت نہ کریں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے، مشکیزہ لٹکا ہوا تھا، اس سے آپ نے کوئی زیادہ پانی استعمال نہیں کیا، بلکہ بڑی احتیاط کے ساتھ وضو کیا۔ اس کے بعد آپ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ اور نماز پڑھنے میں یہ عالم تھا کہ آپ اتنا روئے کہ آپ کی داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اس کے بعد جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گئے تو آپ اتنا روئے کہ زمین تر ہو گئی۔ پھر اپنے داہنے ہاتھ پر لیٹ گئے اور لیٹے ہوئے بھی آپ اتنا روئے کہ آپ کی داڑھی مبارک تر ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت بلال آئے اور آ کر خبر دی کہ اذان ہو گئی اور نماز کی تیاری ہے۔ بی بی

عائشہ ﷞ فرماتی ہیں کہ حضرت بلال ﷜ نے بھی عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ اتنے کیوں رو رہے ہیں؟ حالانکہ اللہ نے آپ کو خبر دی ہے کہ میرے نبی! اگر آپ سے کوئی غلطی پہلے ہوئی یا بعد میں ہم سب معاف کر چکے۔ آپ نے فرمایا: ((وَيْحَكَ يَا بِلَالُ!)) کیا کہہ رہے ہو؟ میں کیوں نہ روؤں؟ حالانکہ آج رات اللہ تعالیٰ نے مجھ پر قرآن کی یہ آیات اتاری ہیں: ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ اور آپ نے فرمایا: ہلاکت ہو اس بندے کے لیے جو ان آیات کو پڑھے اور ان میں غور وفکر نہ کرے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آج رات مجھ پر یہ آیات نازل ہوئیں اور یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے تو لہٰذا مفسر ابن کثیر ﷫ کا اس حدیث کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ آیات مدنیہ ہیں اور ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہیں۔

سورت آلِ عمران کی یہی وہ آیات ہیں جو ہمیشہ میرے آقا ﷺ تہجد کے وقت آسمان پر نظر فرما کر تلاوت فرماتے تھے۔ اور انہی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عباد مومنین کا ذکر کیا ہے کہ جو میرے بندے ہیں، مجھ سے ڈرنے والے ہیں، جو اصحابِ عقل ہیں، ان کو ہر وقت میری یاد ہے۔ کھڑے ہیں تو میرا ذکر ہے، بیٹھے ہیں تو میرا ذکر ہے اور لیٹے ہیں تو میرا ذکر ہے، ہر وقت میرے ذکر میں ہیں یا میری فکر میں ہیں، کسی اور چیز کی طرف ان کا دھیان بھی نہیں ہوتا۔ اگر وہ دنیا کے امور سرانجام دیتے ہیں، لیکن دل اللہ تعالیٰ کی طرف اٹکا ہوا ہوتا ہے۔

حدیث مبارک میں آیا ہے کہ مومن کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ چاہے وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہے ((وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ)) [السنن الکبریٰ للنسائی، رقم: ۱۱۷۹۸] اس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہوتا ہے کہ ابھی نماز کا وقت ہوگا، ابھی وضو کریں گے، مسجد جائیں گے۔ اس لیے جو بڑے اللہ والے بزرگ گزرے ہیں، انہوں نے اپنے اوپر بھی اور اپنے دوستوں پر بھی ایسے طریقے سے محنتیں کی ہیں کہ انسان کی زبان پر ہر وقت اللہ کا ذکر ہو۔ دل میں بھی ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو، سانس میں بھی ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو؛ کیونکہ اللہ کے ذکر کے بارے میں حکم ہے: کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔ اور ایک روایت میں آیا کہ اللہ تعالیٰ کا اتنا ذکر کرو کہ لوگ کہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے۔

صحابہ کرام ﷡ کی عبادت:

اس لیے قرآن پاک نے صحابہ کرام ﷡ کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے: ﴿وَالَّذِينَ مَعَهٗٓ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ [الفتح: ۲۹] کہ میرے مدنی کی جماعت کو دیکھو کہ کبھی

رکوع میں کھڑے ہیں، کبھی سجدے میں پڑے ہیں، ہر وقت اپنے اللہ کی رضا کے طالب ہیں، سجدوں کی کثرت کی وجہ سے ان کے چہروں پر علامات ہیں۔ پیشانی پر جو نشان ہوتا ہے اس کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ یہ بسا اوقات بغض کی علامت ہوتا ہے، نفرت کی علامت ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو بڑا عابد وزاہد ظاہر کرتا ہے، ریا کرتا ہے، یعنی لوگوں کو یہ دکھانا چاہتا ہے کہ میں اتنا بڑا نمازی ہوں، میری پیشانیوں پر داغ پڑ گئے ہیں۔ نہیں، بلکہ ﴿سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ﴾ [الفتح:۲۹] اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی کثرتِ عبادت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے چہرے پر رونق لے آتے ہیں اور ایسا نور لے آتے ہیں کہ آدمی دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ حبشہ کے لوگ ہوتے ہیں، بالکل سیاہ رنگ ہے، لیکن کثرتِ عبادت کی وجہ سے ان کے چہرے پر جاذبیت ہے، آدمی کا دل کرتا ہے کہ ان سے بات کرے۔ ان کے مقابلے میں بعض بڑے گورے لوگ ہیں، لیکن گناہوں کی وجہ سے چہرے پر لعنت برس رہی ہوتی ہے، آدمی کا دل بھی نہیں کرتا کہ ان کے چہرے پر نظر ڈالے۔

ایک نیک عورت کے حسن و جمال کی وجہ:

(واقعہ) عرب کے واقعات میں ایک تاریخی واقعہ آتا ہے کہ گزرے ہوئے دور کی بات ہے کہ ایک عرب عورت تھی، اس کی کافی عمر تھی، یعنی تقریباً ساٹھ سال سے بھی زیادہ عمر والی عورت تھی، لیکن خدا کی شان ہے کہ اس کے چہرے پر ایسا جمال تھا کہ نوجوان لڑکیاں اس کو دیکھ کر حیران ہو جاتی تھیں کہ پتہ نہیں یہ کونسا میک اپ کرتی ہے!! یہ کونسی کریمیں استعمال کرتی ہے کہ اس کے چہرے پر جمال ہی جمال ہے!! ایک دن انہوں نے اس سے آ کر پوچھا کہ اماں جان! وہ کونسی دوائیں ہیں جو آپ استعمال کرتی ہیں کہ آپ کے چہرے پر اتنی رونق ہے؟ اس نے کہا: میں جو دوائیں استعمال کرتی ہوں میں نہیں بتاتی۔ اگر میں بتا دوں تو تم استعمال نہیں کرو گی۔ انہوں نے کہا: ہم وعدہ کرتی ہیں کہ ہم استعمال کریں گی۔ اس نے کہا: سنو! جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے ہوش دیا ہے، میری نظر کسی غیر محرم پر نہیں پڑی، میرے بدن میں حرام کا لقمہ نہیں گیا، مجھے اللہ تعالیٰ نے جب سے ہوش دیا ہے میری رات مصلے پر کٹتی ہے اور دن اللہ کے قرآن کی تلاوت میں گزرتا ہے۔ اگر تم بھی حسن و جمال حاصل کرنا چاہتی ہو تو یہ بیوٹی پارلر سے نہیں ملے گا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے قرآن اور حدیث مصطفیٰ ﷺ میں ملے گا، یہ تمہیں اکلِ حلال اور صدقِ مقال میں ملے گا۔

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ﴾ [آل عمران:۱۹۵]

"چنانچہ ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کی (اور کہا:) میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب آپس میں ایک جیسے ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے ہجرت کی اور انہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا اور میرے راستے میں تکلیفیں دی گئیں اور جنہوں نے (دین کی خاطر) لڑائی لڑی اور قتل ہوئے، میں ان سب کی برائیوں کا ضرور کفارہ کردوں گا، اور انہیں ضرور بالضرور ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے انعام ہوگا۔ اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بہترین انعام ہے۔"

اللہ کی آیات میں غور وفکر:

سابقہ آیات میں پڑھا کہ عقل والے لوگ وہ ہیں جو ہر وقت اپنے اللہ کے ذکر میں کھڑے ہیں، بیٹھے ہیں یا لیٹے ہیں، ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے یا فکر ہے۔ ذکر کے اندر نماز، روزہ، طواف، تلاوت اور قرآن وغیرہ ذکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شاکر ہونا یہ بھی ذکر ہے۔

فکر کے بارے میں امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس کی ادنیٰ قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرآن کی آیات میں غور کرے۔ اس کے ترجمے کو سمجھے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ اور دوسرا اللہ کی اس کائنات میں فکر کرے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آسمان وزمین اور یہ نظام بنایا، یہ سب بے فائدہ نہیں بنائے، اس کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اندر فکر کرے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیسے پیدا کیا؟ اور ایک انسان میں اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی مشینری لگا رکھی ہے کہ گویا ایک چھوٹا جہاں ہے۔ انسان کے اندر تمام قوات کا اجتماع ہے، اللہ تعالیٰ نے حواس خمسہ عطا فرمائے ہیں۔ اگر انسان اپنے اعضاء پر غور کرے تو پھر انسان اعتراف کرے گا کہ میرے مولا! واقعی آپ بہترین پیدا فرمانے والے ہیں۔

فرمایا: عقل والے جب اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ ساری کائنات کا خالق ومالک اللہ ہے، متصرف فی الامور

اللہ ہے اور وہ دعا بھی اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی دعائیں سنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو ہر انسان کی پکار کو سنتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ تو ہر داعی کی دعا کو سنتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مجھ سے مانگو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میرا بندہ جب چاہے، جس وقت چاہے اور جس حال میں چاہے مجھے پکارے، میں اس کی پکار سنتا ہوں اور اس کو جواب دیتا ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا کرم ہے!! اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا کہ جب اللہ کے بندوں نے اپنے رب کو پکارا تو اللہ نے بھی ان کی پکار کو سن لیا۔

دعا کی قبولیت کی تین حالتیں:

یاد رکھیں! دعا کبھی خالی نہیں جاتی۔ دعا تین حالتوں سے خالی نہیں ہوتی:

1 ...... یا جو ہم نے مانگا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دے دیا ہے۔

2 ...... دوسرا یہ ہوتا ہے کہ ہم نے نعمت مانگی وہ تو ہمیں نہیں ملی، لیکن کوئی بڑی مصیبت ہم پر آرہی تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اس دعا کی برکت سے ٹال دیا۔ اس کا ہمیں پتہ نہیں چلتا، لیکن ہماری وہ دعا خالی نہیں گئی۔

3 ...... تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے کی دعا کو ذخیرہ کرلو۔ اس کا بدلہ اس کو قیامت والے دن دوں گا۔

اور یہ بھی حدیث میں موجود ہے کہ دنیا میں کی ہوئی دعاؤں کا بدلہ جب قیامت میں اللہ تعالیٰ دیں گے تو مومن اس وقت تمنا کرے گا کہ کاش! دنیا میں میری ایک دعا بھی قبول نہ ہوتی، سارے بدلے اللہ تعالیٰ مجھے آج دیتا۔

دعا کے آداب وشرائط:

یاد رکھیں! جب بھی دعا مانگیں تو قلب حاضر سے مانگیں، غافل دل سے دعا نہ مانگیں۔ دعا کے اندر یہ بھی شرط ہے کہ اپنے رب کے آگے دعا بڑی عاجزی سے، بڑی آہستگی سے مانگو، چیخ چیخ کر دعا مانگنے کی ضرورت نہیں ہے! کیونکہ تم ایسے رب کو پکار رہے ہو کہ تیری زبان ہلے تو سن لے۔ چیونٹی اگر رات کو پتھر پر چلے تو اس کے چلنے کی آواز بھی سن لے۔ پھر اس رب کے آگے چیخنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے دعا کے اندر عاجزی وتذلل ہو۔ اگر رونا نصیب ہو جائے تو سبحان اللہ!! اور اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت بنالو۔ دعا کے اندر یہ بھی شرط ہے کہ کوئی حرام

چیز نہ مانگو، مثلاً: فلاں بندہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور میں شادی کرلوں۔ اللہ تعالیٰ اس سے مکان چھین لے اور مجھے دے دے۔ کسی کی اچھی گاڑی دیکھیں تو کہا: اللہ میاں! اس سے لے لے اور مجھے دے دے۔ یہ سب حرام ہے اور گناہ ہے۔ اسی طرح دعا مانگنے میں یہ بھی نہ کہا کرو کہ اتنی مدت ہوگئی مانگتے مانگتے، ہماری تو اللہ سنتا ہی نہیں ہے۔ یہ کفر کے کلمات ہیں۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ آپ ایک دنیا کے بادشاہ کو ملنے کے لیے کتنی محنت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے، ساری کائنات کا خالق ہے، اس کی مرضی ہے جب وہ چاہے سنے۔ اللہ کے نبی بھی اٹھارہ اٹھارہ سال دعائیں مانگتے رہے اور بعد میں دعا منظور ہوئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی دعا مانگتے مانگتے آنکھیں سفید ہوگئیں، پھر جا کر دعا منظور ہوئی۔ (یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نابینا نہیں ہوئے تھے۔)

شانِ نزول:

(حدیث) بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! ہم اللہ تعالیٰ کے کلام میں مردوں کا ذکر تو بہت سنتے ہیں، مردوں کے بارے میں تو بہت ساری آیات آئی ہیں، جن لوگوں نے مردوں میں ہجرت کی ان کے بارے میں فضیلت آئی ہے، لیکن عورتوں کا ذکر نہیں آیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ہم تو کسی کے عمل کو بھی ضائع نہیں کرتے، چاہے وہ مرد ہو یا عورت ہو، جو بھی ذرے کے برابر بھی بھلائی کا عمل کرے اس کو بدلہ ملے گا اور جو برائی کا عمل کرے وہ بھی اپنی آنکھوں سے اس کی جزا دیکھے گا۔

[مستدرک حاکم: ۲/ ۳۰۰]

قرآن میں عورتوں کا مستقل ذکر:

یاد رکھیں! قرآن میں جتنے احکامات ہیں مخاطب مردوں کو کیا جاتا ہے، لیکن عورتیں ان کے تابع ہیں، ان کو علیحدہ حکم دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی جگہ اللہ تعالیٰ نے باقاعدہ عورتوں کا ذکر فرمادیا ہے۔ ہجرت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲﴾ [الممتحنہ: ۱۲] میرے نبی! جب مومن عورتیں آپ کے پاس بیعت کے

لیے آئیں تو آپ ان سے اس شرط پر بیعت لیں کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں، چوری نہ کریں، زنا نہ کریں، اپنی اولادوں کو قتل نہ کریں، یعنی اسقاط نہ کریں یا گولیاں کھا کر قتل نہ کریں یا پیدائش کے وقت قتل نہ کریں، اور نہ کسی پر افتراء کریں اور نہ بہتان لگائیں اور نہ آپ کی نافرمانی کریں، نیکی کے احکام میں اگر وہ عورتیں یہ بات قبول کریں تو آپ ان کی بیعت لیں اور پھر اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے بخشش طلب کریں۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والے مہربان ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ [الاحزاب: ۳۵] یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے عورتوں کا اور مردوں کا برابر ذکر فرمایا ہے۔

اسلام میں عورت کی عزت:

اس لیے یاد رکھیں! اسلام نے عورت کو بڑی عزت وعظمت دی ہے۔ تاریخ عالم کا مطالعہ کریں، تہذیب یونان دیکھیں، تہذیب فارس دیکھیں، تہذیب مصر دیکھیں اور تہذیب روما دیکھیں، ہر دور میں عورت ذلیل تھی، عورت ایک لونڈی تھی، عورت ایک زرخرید مال تھا، عورت مردوں کے بہلانے کے لیے ایک کھلونا تھی، عورت کے لیے ورثہ تھا، نہ جائیداد میں حصہ تھا، عورت نفاس میں ہے تو علیحدہ کردی جاتی تھی، اگر عورت حالت حیض میں ہے تو کسی بیمار کے پاس اس کو نہیں آنے دیتے تھے کہ بیماری میں اضافہ ہو جائے گا۔ عورت کو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سے منحوس ترین دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر عورت کسی کے آگے سے گزر جاتی تو لوگ واپس آجاتے کہ میرا کام نہیں ہوگا، عورت نے راستہ کاٹ لیا ہے، اگر عورت پیچھے سے آواز دیتی تو لوگ بیٹھ جاتے تھے کہ آج میرا کام نہیں ہوگا، پیچھے سے مجھے عورت نے آواز دی ہے۔ آپ ساری دنیا کی تہذیبوں کا مقابلہ کریں، صرف اسلام ہے جس نے عورت کو اس کے بلند مقام پر پہنچایا کہ اللہ کے نبی ﷺ عورت کے لیے کھڑے ہو جائیں، اس سے بڑا رتبہ کوئی ہو سکتا ہے؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا جب حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آتی تھیں آپ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔

صحابہ ﷺ فرماتے ہیں: جنگ حنین کے موقع پر ہم بیٹھے تھے۔ایک عورت حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئی تو حضور اکرم ﷺ نے اپنی چادر بچھائی اور اس کو بٹھایا۔اور فرمایا کہ بتائیں! کیا کہتی ہیں؟ صحابہ کہتے ہیں: ہم حیران ہو گئے کہ وہ عورت جو کہتی گئی حضور اکرم ﷺ تعمیل کرنے لگے۔ہم حیران ہو گئے کہ یہ کون خوش نصیب عورت ہے جو مانگتی ہے اللہ کے نبی ﷺ دیتے جاتے ہیں!! جب وہ فارغ ہو گئی تو ہم نے پوچھا۔آپ نے فرمایا: اس نے مجھے دودھ پلایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو کتنی عظمت دی ہے کہ دودھ پلانے والی کا مقام اتنا اونچا کر دیا کہ اللہ کے نبی ﷺ اس کے لیے اپنی چادر بچھا رہے ہیں۔

بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت بھی ہے کہ آخری آیت جو نازل ہوئی تھی وہ یہ آیت ہے: ﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ ......﴾۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس آیت کا معنی یہ کہ عقل والے مومنوں نے اپنے پروردگار سے دعائیں مانگیں تو اس کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی منظوری عطا فرما دی۔

مرد ہوں یا عورت سب کو ثواب ملے گا:

﴿بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ﴾

عمل کرنے والا مرد ہو یا عورت ہو، اللہ تعالیٰ اس کو ثواب عطا فرماتے ہیں۔تم مرد ہو یا عورت ہو سب ثواب میں برابر ہیں۔ یہ نہیں آپ نے نماز پڑھی ہے آپ کو زیادہ ثواب ملے گا اور عورت کو کم ملے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ سب کو برابر ثواب عطا فرماتے ہیں۔سب اللہ کی مخلوق ہیں، باقی اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ کچھ چیزیں اللہ نے مردوں کے ذمہ لگائی ہیں، عورتوں کے ذمہ نہیں اور کچھ چیزیں اللہ نے عورتوں کے ذمہ لگائی ہیں جو مردوں کے ذمہ نہیں ہیں۔

اسی طرح اللہ نے نظامِ عالم کو چلانے کے لیے اسباب رکھے ہیں کہ کسی کو غنی بنا دیا، کسی کو فقیر بنا دیا، کسی کو قوی بنا دیا اور کسی کو کمزور بنا دیا؛ کیونکہ دولت والا بھی غریب کا محتاج ہے اور غریب دولت والے کا محتاج ہے، قوی ضعیف کا محتاج ہے اور ضعیف قوی کا محتاج ہے، مرد عورت کا محتاج ہے اور عورت مرد کی محتاج ہے۔اگر اللہ تعالیٰ سب کو برابر کر دیں تو کون کسی کو پوچھے گا؟ آپ کے گھر میں اگر ہر نعمت آ جائے، لیکن بیوی نہیں تو کچھ بھی نہیں، آپ ایک دن بھی اپنے کام کا انتظام نہیں کر سکتے۔اور جو بے چارے بغیر خواتین کے رہتے ہیں، دیکھیں! ان غریبوں کا کیا حال ہوتا

ہے؟ ایک خانگی یعنی داخلی نظام ہے اور ایک خارجی نظام ہے۔ اللہ نے سب کے وظیفے تقسیم کر دیئے ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ کی رحمت میں سب اس کے بندے ہیں۔ جو بھی اعمال صالحہ کریں گے ان کو ثواب ملے گا، چاہے مرد ہوں یا عورتیں ہوں۔ ﴿فَالَّذِينَ هَاجَرُوا﴾ وہ لوگ جنہوں نے دارِ شرک سے ہجرت کی، جنہوں نے مکہ مکرمہ چھوڑا، اپنے گھر چھوڑے، دوست، رشتے دار اور بھائی چھوڑے، صرف اللہ کے لیے تمام نعمتوں کو چھوڑ کر ہجرت کر گئے۔

ہجرت کب فرض ہے؟

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں ہجرت فرض تھی، لیکن جب بعد میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دیا تو پھر ہجرت فرض نہیں رہی، لیکن اب بھی یاد رکھیں کہ علماء اور فقہاء کے نزدیک اب بھی مسئلہ یہ ہے کہ اگر آپ کسی کافر ملک میں رہتے ہیں، وہاں پر آپ کو آپ کے عقیدے کے مطابق زندگی گزارنا مشکل ہے، آپ اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضور اکرم ﷺ کی رسالت پر قائم نہیں رہ سکتے، آپ اللہ کے فرائض ادا نہیں کر سکتے، نماز نہیں پڑھ سکتے، روزہ نہیں رکھ سکتے، شعائرِ دین پر قائم نہیں رہ سکتے تو اب بھی ہجرت فرض ہے۔ وہ اس جگہ کو چھوڑ دے اور اس جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کر لے۔ اگر آپ کسی ایسے کافر ملک میں ہیں کہ آپ کو دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں، مثلاً: یورپ میں رہتے ہیں، وہاں مساجد ہیں، مدارس ہیں، اللہ کا فضل ہے! درس ہے، تبلیغ ہے، اجتماعات ہیں، جلسے ہیں، خطابات ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے مسلمان ہم سے بھی زیادہ پکے ہیں کہ وہ دیارِ کفر میں رہنے کے باوجود بھی اسلام پر پکے ہیں۔ جو بھٹک گیا تو وہ بھٹک گیا، لیکن جن لوگوں نے دین بچایا ہوا ہے ماشاء اللہ ان کی مسجدیں آباد ہیں، مدارس آباد ہیں، بچے صبح کو سرکاری سکولوں میں پڑھتے ہیں، وہاں سے چھٹی کرنے کے بعد پرائیویٹ مدرسوں میں دین پڑھتے ہیں۔ ایک ایک مدرسہ میں سات سو، ہزار، دو ہزار طالب علم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے دین پر پکے ہیں۔ ان کے اخبارات، جرائد ہیں۔ اب جہاں دس مسجدیں نہیں ہوتی تھیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہاں ہزاروں مساجد ہیں۔ تو وہاں سے ہجرت کرنا فرض و لازم نہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ انسان کوشش کرے کہ اپنے آپ کو مسلمان ملکوں میں رکھے؛ کیونکہ کافر ملکوں میں مشکلات بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح ہجرت کا معنی ہے: چھوڑنا۔ اصل ہجرت یہ ہے کہ گناہوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جائے۔ یہ ہر حال، ہر دور میں اور ہر زمانے میں باقی ہے۔ ﴿وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا﴾ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں انہوں نے جہاد بھی کیا

اور اس قتال میں خود بھی شہید ہو گئے۔ یہ سب سے آخری حد تک ہے کہ انسان اپنی جان کی بازی لگا دے تو اس کی قربانی کی انتہاء ہو گئی۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آدمی اپنے گھوڑے پر سوار ہے، گھوڑے کو بھی زخمی کر دیا ہے، خود بھی زخمی ہو رہا ہے، اللہ کے راستے میں مٹی میں لوٹ پوٹ رہا ہے، اس کا خون مٹی میں گر رہا ہے، یہ سب سے بڑی قربانی ہے جو آدمی اللہ کے راستے میں قربانی دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں مرتبہ شہادت حاصل کرتا ہے۔

(حدیث) صحیحین کی روایت میں ہے کہ ایک آدمی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ مجھے بتائیں کہ میں اگر اللہ کے راستے میں جہاد کروں، جم کر لڑنے والا، اللہ سے اجر لینے والا، آگے بڑھنے والا۔ پیٹھ دکھانے والا نہ ہوں اور میں شہید بھی ہو جاؤں، کیا اللہ تعالیٰ میرے گناہ معاف کر دیں گے؟ اللہ تعالیٰ میری غلطیاں معاف کر دیں گے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بالکل اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے۔ اس نے کہا: حضور! ایک دفعہ پھر کہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تیری غلطیاں معاف کر دیں گے۔ پھر آپ نے پوچھا: آپ نے کیا کہا تھا؟ ان صحابی نے بات دہرائی تو آپ نے فرمایا: اللہ تیرے سارے گناہ معاف کر دیں گے سوائے قرض کے۔ ابھی ابھی جبرائیل مجھے کہہ کر جا رہا ہے۔

﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ﴾ کہ میرے مدنی! ان لوگوں کو خبر دے دیں کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہجرت کی، اللہ تعالیٰ کے راستے میں گھروں سے نکالے گئے، اللہ تعالیٰ کے راستے میں ایذاء دیے گئے، اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنہوں نے جہاد کیا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جو شہید ہو گئے میرا وعدہ ہے کہ میں ان کے سب گناہوں کو مٹا دوں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا کہ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور یہ داخلہ عارضی نہیں ہوگا، بلکہ اس میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ اور اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لوگوں کو یہ بھی بتاؤ کہ جو میرے راستے میں شہید ہو جائے اس کو مردہ بھی نہ کہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسی جنات، ایسے باغات دوں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ نہریں مختلف قسم کی نہریں ہوں گی: دودھ کی نہریں، شہد کی نہریں، شراب کی نہریں بہہ رہی ہوں گی اور ایسے پانی کی نہریں جس میں کبھی کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں آئے گی۔

یاد رکھیں! وہاں کا لبن بھی نرالا، وہاں کا عسل بھی نرالا اور وہاں کا خمر بھی نرالا ہوگا۔ دنیا کے شراب کا تو سب سے

بڑا فائدہ یہ ہے کہ پیٹ کے لیے درد، دماغ کو ضائع کرنے والی ہے، لیکن جنت کے اندر جو شراب ہوگی اس میں کسی قسم کا نہ ایسا کوئی درد ہے، نہ ذہابِ عقل ہے، وہ تو شراب طہورا ہوگا۔ اور اس کے علاوہ ایسی ایسی نعمتیں عطا فرمائیں گے کہ جو کسی آنکھ نے دیکھی نہیں ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ایسی حوریں عطا فرمائیں گے کہ جس نے اپنے بدن پر ستر حجاب پہنا ہوگا، لیکن پھر بھی پنڈلی کے اندر جو ہڈی ہے اس کا گودا بھی نظر آئے گا، لیکن نظر خاوند کو آئے گا، کسی دوسرے کو نظر نہیں آئے گا۔ وہاں پر ہر کوئی اپنی اپنی حوروں کو دیکھے گا۔ یہ تو دنیا کے اندر ہماری حوریں ہیں کہ لوگ دیکھتے ہیں، یہ میک اپ سنگھار کرتی ہیں، تاکہ لوگ دیکھیں۔ جب خاوند آئے تو ان کو ایک سو چار کا بخار ہوتا ہے۔ ایسے معلوم ہوگا جیسے ابھی اس کے چہرے پر لعنت برس رہی ہے۔ یہ تو عورتیں نہیں، بلکہ زندہ چلتی پھرتی غلاظت کی بوریاں ہیں، جو ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہمارے گلے میں پڑ گئی ہیں۔ ان کو عورت کہنا بھی شریعت کے اندر ناجائز ہے؛ کیونکہ عربی کے اندر عورت کا معنی ہے وہ چیز جو چھپائی جائے۔ یعنی ننگ کو عورت کہتے ہیں۔

﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ ۝﴾ [آل عمران: ۱۹۶تا۱۹۸]

''جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے ان کا شہروں میں (خوشحالی کے ساتھ) چلنا پھرنا تمہیں ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ تو تھوڑا سا مزہ ہے (جو یہ اڑا رہے ہیں) پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بدترین بچھونا ہے، لیکن جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہوئے عمل کرتے ہیں، ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اللہ کی طرف سے میزبانی کے طور پر وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لیے کہیں بہتر ہے۔''

بڑے بڑے کافروں پر خدا کی اتنی فراوانی کیوں؟

مومنین اور اولوا الالباب کی صفتیں ذکر کرنے کے بعد اب ان آیات کے اندر ایک اشکال کا جواب ہے کہ میرے مولا! ہمارا ایمان ہے کہ تیرے ماننے والے، عقل والے، ذکر والے اور فکر والے ان کے بڑے مرتبے ہیں، لیکن

مولا! ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ ابوجہل میرے محمد مدنی ﷺ کا دشمن ہے، لیکن مکہ کا سردار تھا۔ ابولہب میرے مدنی پاک ﷺ کا دشمن ہے، لیکن مکہ کا بڑا سردار ہے، قارون نبیوں کا دشمن ہے، اتنے خزانوں کا ملک ہے کہ تین سو ساٹھ خچر صرف اس کے خزانے کی چابیاں لے کر چلتے ہیں۔ فرعون نبی علیہ السلام کا دشمن ہے، بلکہ میرے مولا! تیری خدائی کا بھی منکر ہے، بلکہ خود خدائی کا دعوے دار ہے کہ میں خدا ہوں۔ یہ عجیب بات ہے! ہم تو تیرے ماننے والے ہیں، یہ کافر ہیں، تجھے نہیں مانتے۔ آج دیکھو! تیرے ماننے والے ہر جگہ پریشان ہیں اور کافر ہر جگہ مزے کر رہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

(جواب) اللہ تعالیٰ نے دو عالم بنائے ہیں:...... ویسے تو بہت سارے عالم ہیں، اس میں نہ جائیں...... ایک عالم دنیا ہے اور ایک عالم آخرت ہے۔ عالم دنیا یہ دار الابتلاء ہے، دار الامتحان ہے، دار العمل ہے، یہ امتحان کی جگہ ہے، اس کا بدلہ اور اس کا پھل آخرت میں ملے گا۔ اب اگر دنیا میں جزاء ملے یا نہ ملے اصل جزاء کا مقام آخرت ہے۔ اس لیے مومن کو کبھی یہ بات سمجھنی مشکل نہیں ہوتی اس کو تو پتہ ہے کہ یہ دنیا عارضی چیز ہے۔

اور دوسری بات یاد رکھیں کہ دنیا کی جتنی لذتیں ہیں: دولت ہے، پیسہ ہے، ان کی قدر و منزلت اللہ کی نظر میں کچھ نہیں ہے: ((لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ)) [ترمذی، رقم: ۲۳۲۰] اگر اس دنیا کی اہمیت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ ملتا۔ کیونکہ یہ دنیا اگر اچھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو نہ دیتا۔ فرمایا: ((اَلدُّنْيَا جِيْفَةٌ وَطُلَّابُهَا كِلَابٌ)) [ترتیب الامالی] دنیا کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی جانور مر جائے اور اس کو کتے کھا رہے ہوں۔ ہمیں اس لیے حیرت ہوتی ہے کہ فلاں کافر کے پاس اتنی بلڈنگیں ہیں، فلاں کافر کے پاس اتنی کاریں ہیں، فلاں کافر کے پاس ہوائی جہازوں کے بیڑے ہیں: کیونکہ ہم نے دنیا کو کچھ سمجھ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو دنیا کچھ نہیں ہے، یہ ذلیل چیز ہے۔ خدا اپنے محبوبوں کو دنیا کبھی کبھی نمونے کے طور پر دیتا ہے، تاکہ کوئی جاہل اعتراض نہ کر سکے کہ خدا نہیں دے سکتا۔ اس لیے دیکھیں کہ کتنے نبی ہیں جن کو اللہ نے بادشاہ بنایا ہے، ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی گزرے ہیں، لیکن تخت و تاج حضرت موسیٰ، حضرت یوشع، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یوسف علیہم السلام اور ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کو دیا۔ یعنی چند انبیاء ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اقتدار بھی دیا، ظاہری طور پر دنیا کے سامنے رفعت دی: اس لیے کہ لوگ سمجھ لیں کہ میں چاہوں تو دے سکتا ہوں، لیکن یہ چیزیں مجھے پسند نہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں صحابہ نے آ کر عرض کیا: یا رسول اللہ! ہماری ایک درخواست ہے، اس کو منظور فرمالیں۔ آپ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہم تو غلام ہیں، کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن باہر سے بڑے سفیر آتے ہیں، بادشاہوں کے نمائندے اور یہود و نصاریٰ کے بڑے بڑے علماء آتے ہیں اور آپ کے پرانے کپڑے ہوتے ہیں، آپ کی یہ پھٹی ہوئی چادر ہوتی ہے، ہمیں دل میں بڑی بات گزرتی ہے کہ یہ کیا سمجھیں گے کہ اللہ کے نبی کے پاس کوئی لباس نہیں ہے، اس لیے آپ مہربانی فرما کر اجازت دے دیں، آپ کے لیے دو چار جوڑے اعلیٰ قسم کے شاہی لباس کے بنائے جائیں۔ آپ ہمیشہ نہ پہنیں، لیکن جب کوئی باہر سے آ رہا ہو تو زیب تن کرلیا کریں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: صحابہ! کیا کہہ رہے ہو؟ جس دن سے اللہ نے مجھے پیدا کیا ہے اسرافیل نے صور اپنے منہ میں رکھ لیا ہے اور آسمان کی طرف نظریں لگائی ہوئی ہیں کہ کب حکم ملے؟ اور پھونک ماردوں اور قیامت آجائے۔ تو جب قیامت اتنی قریب ہے تو ہمیں لباس پہننے کی فرصت ہی کہاں ہے؟ ہم اپنے اللہ کو راضی کرنے کے لیے وقت کیوں نہ لگالیں؟

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ افضل بعد رسول اللہ ہیں، ساری مخلوق میں افضل ہیں، میرے مدنی ﷺ کا خلیفہ بلا فصل ہے، امیر المومنین ہے، جس کا لقب آسمانوں میں صدیق ہے، وزیر محمد ﷺ ہیں۔ آپ کو جب موت آئی تو آپ نے اپنے گھر والوں سے وصیت فرمائی کہ میری جو پرانی چادریں ہیں مجھے انہیں میں دفن کر دینا۔ انہوں نے عرض کیا کہ اَب تو غریبی کا زمانہ نہیں ہے، اب تو اللہ کی نعمتیں ہیں۔ آپ نے فرمایا: نئی چادروں کی ضرورت زندوں کو ہوتی ہے، کسی زندہ انسان کو دے دینا، حضور ﷺ کی امت کے غریبوں کے کام آجائے گی۔ موت کے بعد نئی چادریں ہوں یا پرانی چادریں ہوں، کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ راضی ہیں تو وہ قبر جنت کا باغ ہے اور اگر اللہ ناراض ہیں تو وہی قبر جہنم کا گڑھا ہے۔ وہاں کسی نے یہ تو نہیں دیکھنا کہ اوپر دس چادریں ڈالی گئی تھیں یا دو چادریں ڈالی گئی تھیں، کیا آپ کے اوپر ریشم اور پشمینے ڈالے گئے تھے؟ یا آپ کے اوپر کلمے کی لکھی ہوئی چادر ڈالی گئی تھی؟ وہاں تو یہ چیزیں فائدہ نہیں پہنچاتیں، بلکہ وہاں تو عمل فائدہ پہنچاتے ہیں کہ خاتمہ ایمان پر اور عمل صالح ہے تو قبر کو اللہ جنت کا باغ بنادیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو دولت، دنیا اور دنیا کی لذات مبغوض ہیں، محبوب نہیں ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ

کو خود اختیار دیا کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو بھیجا کہ میری طرف سے میرے حبیب کو سلام کہیں اور ان سے کہہ دیں کہ اگر آپ چاہتے ہیں تو ہم سونے کے پہاڑ بنا کر آپ کے ساتھ چلا دیں گے کہ جہاں جائیں سونا ہی لٹاتے رہیں۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: میرے اللہ! مجھے فقر زیادہ پسند ہے۔ بس مل جائے تو تیرا شکر ادا کروں اور اگر نہ ملے تو انتظار کروں اور تجھ سے طلب کروں؛ کیونکہ دنیا کھیل تماشہ ہے۔ اس دنیا کی نہ کوئی حیثیت ہے اور نہ یہ دنیا اللہ کو اور نہ اللہ والوں کو محبوب ہے۔

(واقعہ) ایک بہت بڑے اللہ والے تھے۔ ایک آدمی نے ان کا نام سنا تو ان کی زیارت کے لیے گیا۔ وہاں جب گیا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ باہر گلی میں جو پہرے کے لیے کتے رکھے ہوئے ہیں (کیونکہ پہرے کے لیے کتے رکھنا جائز ہے۔) ان کے گلے میں سونے کی زنجیر اور سونے کے کڑے ہیں۔ اس نے کہا: عجیب بات ہے! میں نے تو سنا تھا کہ یہ ولی اللہ ہیں، اللہ کے بڑے محبوبین میں ہیں، لیکن کتے جیسے نجس چیز کو بھی انہوں نے سونا ڈالا ہوا ہے۔ بہرحال ان کی خدمت میں گئے، ان سے ملاقات ہوئی اور آخر میں صبر نہ ہوسکا...... کیونکہ علماء کرام کا کام ہوتا ہے کہ اسبابِ ظاہر کے مطابق شریعت کا حکم لگاتے ہیں؛ کیونکہ باطن کا معاملہ تو اللہ کو پتہ ہوتا ہے...... انہوں نے کہا: حضرت! مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی، آپ نے ایسا کیوں کیا کہ کتے کو سونا ڈالا ہوا ہے؟ بزرگوں نے فرمایا: سونا انہی کے لائق تو ہے جن کے گلے میں ڈالا ہوا ہے، تاکہ عبرت پکڑنے والے عبرت پکڑیں کہ سونا کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کے لیے بندے مر جائیں، اس کے لیے آپ سر پھٹول کریں، یہ فضول چیز ہے۔ یہ اتنی فضول چیز ہے کہ اس کو کتے کے گلے میں ڈال دو تو زیادہ بہتر ہے۔ یہ تو کہیں رکتا ہی نہیں ہے۔

لیکن چونکہ یہ چیزیں ہمیں بڑی نظر آتی ہیں اس لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ کافروں کو کیوں مل گئیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت اپنے بندے کے لیے بنائی تھی کہ اے بندے! زمینوں میں جو کچھ ہے سب تیرے لیے ہے، لیکن تو میرے لیے ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [الذاریات:٥٦] یہ سب نعمتیں تیرے لیے ہیں اور تو فقط میرے لیے ہے۔

جوابِ اشکال گزشتہ:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کے اندر فرماتے ہیں کہ اے میرے نبی! آپ کافروں کی دولت کی طرف

توجہ نہ کریں۔ اس کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔ یہ ساری دولت ان سے ضائع ہونے والی ہے۔ یہ چند روزہ دنیا کی مہلت ہے اور پھر یہ اعمال سیئہ کی وجہ سے ہمیشہ عذاب میں آ جائیں گے۔ اور یہ چیزیں ہم نے ان کو استدراجاً دی ہیں۔

جیسے اللہ نے جنات کو طاقت دے دی ہے کہ چاہیں تو شکل بدلیں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح دجال کو بھی طاقت دیں گے کہ دجال مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے لے کے جنوب تک پوری دنیا کا سفر کرے گا، ساری دنیا میں پہنچے گا۔ زمین کو حکم دے گا کہ اپنے خزانے باہر نکالو، زمین اپنے خزانے نکال کر باہر پھینک دے گی۔ اور دریاؤں کو حکم دے گا کہ چلو، تو خشک دریا چل پڑیں گے۔ لوگ سمجھیں گے کہ...... نعوذ باللہ...... یہ تو خدا ہے، لیکن مومن سمجھے گا کہ یہ استدراج ہے، یہ دجال ہے، حتیٰ کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو مومن ہے وہ اپنے نور ایمان سے اس کے ماتھے پر لکھا ہوا پڑھے گا کہ کافر۔

اسی طرح آج بھی دنیا میں کوئی جادوگر ہے، کوئی نجومی ہے اور کوئی اعمال سفلی کا ماہر ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ولی ہے، حالانکہ یہ استدراجی قوتیں ہیں، ولایت کی نشانی اتباع محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔

اگر اللہ کے ولی کو پہچاننا ہے تو دیکھو کہ اگر ہر قدم میں حضور اکرم ﷺ کی سنت پر چلنے والا ہے، اگر اس کے ہر قدم سے سنت مترشح ہوتی ہے، اگرچہ کوئی کرامت بھی نظر نہ آئے وہ اللہ کا ولی ہے۔ لیکن اگر اس کی شکل، اس کا عمل اور فعل اس کی داخلی زندگی اور خارجی زندگی سنت کے خلاف ہے تو سمجھ لو کہ یہ شیطان تو ہو سکتا ہے، دجال تو ہو سکتا ہے، اس کے پاس کوئی استدراجی قوت تو ہو سکتی ہے، لیکن یہ اللہ کا ولی نہیں ہو سکتا۔

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی انگاروں پر چلتا آئے، اگر دریا کا پانی بہہ رہا ہے کوئی اس کے اوپر تمہارے سامنے چل رہا ہے، فضا میں اڑ رہا ہے، لیکن شکل سنت کے مطابق نہیں تو سمجھو کہ یہ شیطان ہے، ولی نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ اللہ کا ولی وہ ہوتا ہے جو عین غلام ہو محمد مصطفیٰ ﷺ کا۔ ولایت اتباع محمد مصطفیٰ ﷺ سے ملتی ہے، مرتبہ ولایت مدنی پاک ﷺ کی غلامی سے ملے گا۔

اگر کسی اللہ کے ولی کو پہچاننا ہو یا یہ دیکھنا ہو کہ یہ جماعت صحیح ہے یا غلط ہے تو اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کی صحبت میں جانے کے بعد کیا تیرا حال بدلتا ہے؟ اگر وہ بے نمازی تھا اور اللہ کے اس ولی کی صحبت میں نمازی بن گیا، شکل سنت کے مطابق نہیں تھی اب سنت کے مطابق ہو گئی، گھر کے اندر سود تھا، زنا تھا اور شرابی تھا سب کچھ چھوٹ گیا، دل

دنیا سے ہٹ کر اللہ کی طرف لگ گیا تو سمجھ لو کہ یہ اللہ کا ولی ہے۔ اس طرح جس جماعت میں جانے کے بعد زندگی میں انقلاب آجائے تو سمجھ لو کہ یہ جماعت حق والی ہے، دین والی ہے۔ اور اگر اس جماعت میں جانے کے بعد تو اور بگڑ جائے تو سمجھ لو کہ یہ شیطانی جماعت ہے، رحمانی جماعت نہیں ہوسکتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی تدبر کرلے غور کرلے تو سمجھ آجائے گی۔

اولاد کے حقوق:

(حدیث) حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّمَا سُمُّوا الْأَبْرَارَ؛ لِأَنَّهُمْ بَرُّوا الْآبَاءَ وَالْأَبْنَاءَ، كَمَا أَنَّ لِوَالِدَيْكَ عَلَيْكَ حَقًّا كَذٰلِكَ لِوَلَدِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ)) [تفسیر ابن کثیر] ابرار کو ابرار اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے والدین سے بھی بھلائی کی اور اپنی اولادوں سے بھی بھلائی کی۔ جیسے بندے پر اس کے والدین کا حق ہے اولاد کا بھی حق ہے۔ والدین کی فرمانبرداری، والدین کی اطاعت، والدین کی خدمت، اولاد کی ہدایت، اولاد کی تعلیم، اولاد کو گناہ سے بچانا اور بری صحبت سے بچانا یہ بھی بندے پر فرض ہے کہ اپنی اولاد کا بھی حق ادا کرے۔

حضرت حسن فرماتے ہیں: ابرار اس کو کہتے ہیں جو ذرا کسی چیونٹی کو بھی تکلیف نہیں پہنچاتے۔ مسلمان کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے۔ اسلام سلامتی کا مذہب ہے، اسلام امن کا مذہب ہے۔ مومن کی نشانی یہ ہے کہ وہ کسی چیونٹی، کیڑے مکوڑے کو بھی نقصان نہ پہنچائے۔ ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) [بخاری، رقم:۱۰] مسلمان تو وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ بندہ نیک ہے یا برا ہے، موت اس کے لیے بہتر ہے؛ کیونکہ موت آگئی تو برائیاں ختم ہوگئیں اور اگر اچھا ہے تو اللہ کے مہمانوں میں پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں اس کے لیے جنت کی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں۔

﴿وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾﴾ [آلِ عمران:۱۹۹، ۲۰۰]

"اور بیشک اہل کتاب میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اللہ کے آگے عجز و نیاز کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ پر بھی ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب پر بھی جو تم پر نازل کی گئی ہے اور اس پر بھی جو ان پر نازل کی گئی تھی۔ اور اللہ کی آیتوں کو تھوڑی سی قیمت لے کر بیچ نہیں ڈالتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے پاس اپنے اجر کے مستحق ہیں۔ بیشک اللہ حساب جلد چکانے والا ہے۔ اے ایمان والو! صبر اختیار کرو، مقابلے کے وقت ثابت قدمی دکھاؤ اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے جمے رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔"

اہل کتاب میں کچھ بہترین لوگ:

آپ جانتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی مکی زندگی میں تقابل مشرکین سے تھا اور مدنی زندگی میں تقابل اہل کتاب سے ہے۔ نصاریٰ نجران میں تھے، یہود دراصل شام میں تھے، اس کے بعد وہ مدینہ میں آئے، اس کے بعد خیبر میں ان کا مرکز تھا۔ اہل کتاب سے حضور اکرم ﷺ کا تقابل ہوا اس کی مکمل تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اہل کتاب میں سے بھی ایسے لوگ ہیں جن کا صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے اور جو تمہاری طرف اتارا گیا (قرآن اور اس کے احکام) اس پر بھی ان کا پورا ایمان ہے اور جو ان کے پیغمبر کی طرف کتاب اتاری گئی اس پر بھی ان کا ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں، وہ اللہ کی آیات کو بیچ کر تھوڑا نفع حاصل نہیں کرتے، یعنی اللہ تعالیٰ کے احکامات کا سودا نہیں کرتے۔ ان کا ثواب بھی ان کے رب کے پاس ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تو بہت جلد حساب فرمانے والے ہیں۔

اس میں سمجھایا گیا کہ اللہ کے لیے تو ساری مخلوق مخلوق ہے، تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے، ساری کائنات اس کی مخلوق بھی ہے، مملوک بھی ہے اور عبد بھی ہے۔ اب جو آدمی غلامی میں رہا اس نے فرمانبرداری قبول کر لی، اللہ کی اطاعت، اللہ کے رسولوں کی اطاعت، اللہ کی کتابوں کی اطاعت، ملائکہ سب پر ایمان لے آیا، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے عالم آخرت میں بہت بڑی جزا رکھی ہے، چاہے وہ ایمان لانے والا کوئی ہو۔ اور اگر وہ ایمان نہیں لایا اور اس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، اللہ کے نبیوں کا انکار کیا، یومِ آخرت کا انکار کیا، وہ چاہے کوئی ہو اس کے لیے دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں بھی ذلت ہے۔

اہل کتاب کے لیے دوہرا اجر کیوں ہے؟

تو ان آیات کے اندر ارشاد ہے کہ اگر کوئی اہل کتاب میں سے ایمان لے آئے تو اس کے لیے بڑا اجر ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ایسے لوگوں کو دہرا اجر ملتا ہے۔ ایک تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر، اللہ تعالیٰ کی تورات پر ان کا ایمان تھا وہ بھی اجر ان کو ملا اور پھر جب حضور پاک ﷺ کا زمانہ مبارک آیا تو آپ پر بھی ایمان لے آئے تو اس کا اجر بھی ملا تو ان کا دوہرا اجر ہو گیا۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جیسے کوئی آدمی جنگ میں جاتا ہے اور بحیثیت ایک مجاہد کے جنگ کے بعد اس کے حصہ میں کنیز آتی ہے تو وہ اس کو پڑھاتا، سکھاتا اور ادب دیتا ہے، پھر اس کو آزاد کر دیتا ہے اور اس سے نکاح کر لیتا ہے، اس کو بھی اللہ تعالیٰ دہرا اجر دیں گے۔

نجاشی شاہ حبشہ کی فضیلت:

اس سے اندازہ فرمائیں کہ نجاشی جو حبشہ کا بادشاہ تھا، بڑا خوش نصیب بادشاہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سرکارِ دو جہاں ﷺ پر ایمان لانے کی سعادت نصیب فرمائی تھی۔ وہ حضور اکرم ﷺ پر ایمان لے آیا اور حضور اکرم ﷺ کے صحابہ کی بھی بڑی خدمت کی تھی، آقائے نامدار ﷺ کی خدمت میں اس نے ہدایا بھی بھیجے اور حضور اکرم ﷺ کا جو ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہے وہ بھی نجاشی نے سرانجام دیا، بلکہ میرے مدنی ﷺ کا جو حق المہر ہے وہ بھی نجاشی بادشاہ نے ادا کیا تھا۔ جب نجاشی ایمان لے آیا اور اس کے بعد جب اس پر موت آئی تو یہ کتنی بڑی شان ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کو اعلان فرمایا کہ تم لوگوں کا بھائی نجاشی بادشاہ فوت ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے آؤ ہم اس کا جنازہ پڑھیں۔ حضور پاک ﷺ نے مدینہ میں کھڑے ہو کر غائبانہ نماز جنازہ پڑھی [بخاری، رقم: ۳۲۰] وہ کتنا بڑا خوش نصیب ہے جس کو سرکارِ دو جہاں ﷺ کی دعائیں مل جائیں اور جس کے لیے اللہ کے نبی ﷺ فرمائیں: ((اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا، وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا، وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا، وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا)) اور پیچھے دعا میں شریک ہونے والے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ ایک حدیث میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ نجاشی کو جب دفن کیا گیا تو کافی عرصہ تک اس کی قبر پر روشنی نظر آتی رہی تھی۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی فضیلت:

اسی طرح اہل کتاب میں سے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے وہ حضور

اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے تو انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میری ایک درخواست ہے، آپ میرے بارے میں ان یہودیوں سے پتہ کریں کہ میں کون ہوں؟ لیکن یہ یہودی قوم اتنی حاسد ہے، اتنی بغض سے بھری ہوئی ہے کہ جوان کا نہیں وہ...... نعوذ باللہ...... ساری دنیا سے گر گیا۔ حضور پاک ﷺ نے یہودیوں کے کچھ سمجھدار لوگوں کو بلوایا اوران سے فرمایا: ((أَيُّ رَجُلٍ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ فِيْكُمْ؟)) تمہارے اندر کوئی شخص عبداللہ بن سلام ہے؟ انہوں نے کہا: کمال کرتے ہیں وہ تو ہمارا بہت بڑا عالم ہے! اس کا باپ بھی عالم تھا، وہ تو ہمارا سردار ہے، عزت والا، کرامت والا ہے اوراس کا باپ دادا بھی عزت وکرامت والے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تم مانتے ہو کہ وہ اتنا بڑا عالم ہے اگر وہ میرا کلمہ پڑھ لے تو کیا تم مسلمان ہو جاؤ گے؟ انہوں نے کہا: ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کا کلمہ پڑھ لے؟ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اندر سے حاضر ہو گئے اور انہوں نے کہا: ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ'' [ ] یہودیو! سن لو میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ وہ کہنے لگے: اچھا آپ اس کے بارے میں پوچھ رہے تھے، یہ تو برا آدمی ہے اوراس کا باپ بھی برا آدمی تھا۔ [بخاری، رقم: ۳۹۳۸]

آج کل کے نظریات کی خرابی کا اندازہ:

آج ہم احادیث کے اندر یہ باتیں پڑھتے ہیں یا سنتے ہیں بڑا تعجب ہوتا ہے۔ حالانکہ آج بھی دیکھ لو کہ جو آدمی آپ کی جماعت میں آجائے سبحان اللہ وہ ولی بھی ہے، وہ بزرگ بھی ہے، وہ پہنچا ہوا بھی ہے، وہ سب سے بڑا عابد بھی ہے۔ اور اگر آپ کی جماعت سے ذرا باہر نکل جائے تو کہتے ہیں: وہ کافر ہے، خبیث ہے، جھوٹا ہے اور فریبی ہے۔ کیا آج کل ہمارا کردار کوئی یہودیوں سے مختلف ہے؟

آج دنیا میں جتنی جماعتیں بن گئی ہیں، دنیا میں جتنے فرقے بن گئے ہیں جو آدمی آپ کی جماعت میں ہے تو سبحان اللہ، اگر چہ وہ جتنے گناہ کرے، لیکن کہیں گے: بڑا اللہ والا آدمی ہے۔ اور اگر وہ صرف آپ کی جماعت چھوڑ دے تو کہیں گے: اچھا ہوا نکل گیا، وہ تو بہت بڑا فراڈ تھا، وہ بڑا خبیث تھا۔

یاد رکھیں! دنیا میں ہدایت محنت سے ملتی ہے، مقابلہ سے ہدایت نہیں ملتی ہے، کبھی مناظرہ سے نہیں ملتی، کبھی ضد سے نہیں ملتی۔ اللہ کے دین میں آپ محنت کریں اور اگر ایک بندے میں ایک ہزار برائی ہے، لیکن ایک نیکی ہے تو آپ اس کی ایک نیکی سے تعلق رکھیں، تا کہ وہ برائیوں سے خود بخود ہٹ جائے۔ اور اگر آپ نے تقابل،

مناظرے، مجادلے، مقابلے کیے تو ہدایت نہیں ملے گی۔ مناظروں سے کتنا فائدہ ہوا، کتنے آدمیوں نے مناظرے میں شکست قبول کرلی؟ دونوں پہلے ہی اشتہار چھپوا کر رکھتے ہیں کہ ہم جیت گئے، ہر ایک کے حامی اس کو کندھوں پر اٹھا کر لے جا رہے ہوتے ہیں۔ مناظرے کی بات تو تب ہوتی تھی کہ جب دلائل وغیرہ کی انتہاء ہو جائے کہ اگر اگلا آدمی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں، پھر اس مناظرہ کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ دونوں اپنے دلائل کا ذکر کریں، جو حق پر ہے حق کی تلاش کی جائے کہ ہم حق پر پہنچ جائیں، لیکن آج کل مناظرہ کا مقصد دوسرے کو شکست دینا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے آج ہماری مسجدیں، مدارس تقسیم ہیں۔

یہودیوں کے بغض کا واقعہ:

یہودیوں کی عادت تھی کہ پیسے لے کر فتوے بدل دیتے تھے۔ اگر بڑے آدمی سے گناہ ہو جاتا تو وہ شام کو ہدیہ پہنچا دیتا تو فتویٰ بدل جاتا تھا اور اگر کوئی غریب آدمی فتویٰ مانگتا تو اس کو دوسرا فتویٰ دیتے تھے۔

یہ اتنے بڑے ظالم تھے کہ تاریخ کے اندر ایک واقعہ یہ بھی آیا ہے کہ ایک یہودی تورات پڑھ رہا تھا۔ تورات میں محمد مصطفیٰ ﷺ کی صفت آگئی۔ غصہ میں آکر اس نے اس جگہ کو کاٹ لیا کہ حضور اکرم ﷺ کی صفت مجھے نہ پڑھنی پڑے، صبح کو اٹھا پھر تورات پڑھنے لگا تو وہ صفحہ پھر اسی طرح ٹھیک تھا، وہ پھر غصہ میں آیا اور پھر کاٹ دیا۔ تیسرے دن جب تورات کھولی تو دیکھا کہ پھر وہی لکھا ہوا ہے تو اس نے خواب دیکھا کہ اس کو کہا گیا کہ اے ظالم! تو اگر نبی ﷺ کی صفت کو چھپائے گا تو کیا اللہ تعالیٰ ان کی صفت کو مٹنے دیں گے؟ ساری دنیا اگر مخالف ہو جائے تو محمد مدنی ﷺ کی شان میں کوئی فرق نہیں آئے گا، کیا آپ کی شان کم ہو جائے گی؟ جس کی ثنا عرش سے مولیٰ بیان کرنے والے ہوں اس کی ثناء میں کون کمی کر سکتا ہے؟ اس کی صفت میں کون کمی کر سکتا ہے۔

کامیابی کے چار اصول:

تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے اندر فرمایا کہ بعض اہل کتاب ایسے نہیں ہیں کہ چھوٹے سے معاوضہ کے عوض میں اللہ تعالیٰ کی آیات کو بیچ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا﴾ اے ایمان والو! چار چیزیں پکڑلو: پہلی چیز صبر، دوسری چیز مصابرہ، تیسری چیز مرابطہ اور چوتھی چیز تقویٰ ہے۔ ان چار چیزوں کو تم پکڑلو تو تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

صبر کا معنی اور فضیلت:

صبر کا معنی ہے اللہ کی بندگی و اطاعت پر جے رہو، صبر کا معنی ہوتا ہے رکنا اپنے نفس کو روک کر رکھو، سردی ہے، گرمی ہے، سکھ ہے تکلیف ہے، راحت ہے، خوشی ہے، غم ہے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر جے رہو۔ نافرمانیوں سے بچے رہو اور اپنے آپ کو گناہوں سے روکو، زنا سے، شراب سے، بے حیائی سے، سود سے، حرام کھانے سے، ہر برے کام سے اپنے آپ کو روکو۔ اور فرمایا: اگر میں کوئی دکھ بھیجوں تب بھی صبر کرو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے وہ ہیں جن پر مصیبت آتی ہے تو وہ ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ پڑھتے ہیں۔ اور فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الاحقاف: ۳۵] میرے محمد مدنی! آپ سے پہلے جیسے بڑے بڑے شان والے رسول گزرے ہیں، انہوں نے بھی اپنی تکذیب پر صبر کیا، آپ بھی صبر کریں، جلدی نہ کریں، ہم آپ کے دشمنوں کو خود پکڑیں گے، لیکن آپ نہ گھبرائیں۔

صبر کرنا تو آسان کام نہیں ہے، بلکہ بڑا مشکل ہے۔ اس لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: ۱۰] صبر کرنے والوں کو قیامت کے دن اتنا دوں گا کہ جس کا کوئی حساب نہیں، کوئی کنارہ نہیں۔

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے ملائکہ! صبر کرنے والے جو میرے بندے ہیں ان پر اتنا ثواب ڈالتے جاؤ گننے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن صبر کرنا بڑا مشکل ہے کہ آدمی تمہیں گالی دے اور تم صبر کرو۔ تم لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہو، لیکن لوگ پتھر مارتے ہیں۔ تم قرآن سناتے ہو، لوگ خون میں ڈبو دیتے ہیں۔ صبر کا کہنا بڑا آسان ہے، لیکن صبر بڑا مشکل ہے۔

مصابرہ کا معنی:

دوسری چیز مصابرہ ہے کہ اگر دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو صبر کرو، پھر تمہارا صبر اس پر غالب آجائے؛ کیونکہ مومن کی صفت یہ ہے کہ آپس میں تو ایسے ہو جیسے شکر ہے، لیکن دشمن کے مقابلے پر ایسے ہو جیسے پہاڑ کی چٹان ہے۔ دشمن ٹکڑے ٹکڑے، پاش پاش ہو جائے، لیکن مومن اپنی جگہ پر کھڑا ہے، اپنی جگہ سے ہلتا نہیں ہے۔

مرابطہ کا معنی:

دوسری چیز مرابطہ ہے کہ دشمن کے وار سے بچنے کے لیے سرحد پر تیار ہو کر پہرہ دینا۔ اس لیے حدیث میں مرابط فی سبیل اللہ کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ ایک بندہ سرحد پر کھڑا پہرہ دے رہا ہے کہ کوئی کافر کوئی دشمن مسلمانوں کے علاقے پر حملہ نہ کردے، اس کو رباط کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے آپ کو اور سواری کو روک کر کھڑا ہے، اللہ کے راستے پر پہرہ دے رہا ہے۔

مفسرین رحمہم اللہ فرماتے ہیں: رباط کا ایک ترجمہ یہ بھی ہے کہ ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کی انتظار میں بیٹھا ہے۔ اس کو بھی اللہ تعالیٰ رباط فی سبیل اللہ کا اجر دیتے ہیں۔ اسی طرح محدثین نے لکھا ہے کہ چاہے اپنے گھر میں بیٹھا ہے، لیکن اس کا دل مسجد کے ساتھ اٹکا ہوا ہے۔

تقویٰ کی اہمیت:

اور چوتھی چیز تقویٰ ہے کہ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا کرو۔ جب دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر آ گیا تو سمجھو کہ سب کچھ آ گیا، پھر کسی پہرے کی ضرورت نہیں ہوتی، پھر کسی سپاہی کی ضرورت نہیں ہوتی، پھر رات کے اندھیرے ہیں محلات ہیں، جوانی ہے، حسن ہے، بلا رہا ہے، لیکن آدمی کہتا ہے: ''معاذ اللہ'' (اللہ کی پناہ)، میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے، میں گناہ کیسے کروں؟ جب اللہ تعالیٰ کا ڈر دل میں آ جائے تو سمجھو کہ تم نے سب کچھ کما لیا ہے۔

نمازوں کی حفاظت کی فضیلت:

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلَى مَا يَمْحُو اللّٰهُ بِهِ الْخَطَايَا، وَيَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ؟ قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: إِسْبَاغُ الْوُضُوءِ عَلَى الْمَكَارِهِ، وَكَثْرَةُ الْخُطَا إِلَى الْمَسَاجِدِ، وَانْتِظَارُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ، فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ)) کیا میں تمہیں خبر نہ دوں کہ جس عمل سے اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹا دیں گے اور اس کے ذریعہ تمہارے درجات بلند کر دیں گے کہ وضو کو ٹھیک ٹھیک کیا کرو باوجود مجبوری کے اور زیادہ سے زیادہ دور چل چل کر مسجدوں میں آنا۔ اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے انتظار میں بیٹھنے والا بھی مرابط ہے۔ [مسلم، رقم: ۲۵۱]

علماء نے فرمایا: چاہے اپنے کام میں بیٹھا ہے، دکان میں ہے، دفتر میں ہے یا گھر میں ہے، لیکن دل مسجد کی طرف

الکا ہوا ہے کہ میری نماز نہ چلی جائے۔

آیت کا شانِ نزول:

(حدیث) حضرت ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک دن میرے پاس حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور مجھے فرمایا: میرے بھتیجے! کیا تجھے پتہ ہے کہ یہ آیت ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا﴾ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ میں نے عرض کیا: مجھے تو شانِ نزول کا پتہ نہیں ہے۔ تو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے بھتیجے! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی ایسی جنگ نہیں تھی کہ سرحدوں پر جا کر پہرہ دینا پڑے، اصل میں یہ آیت نازل ہوئی تھی ایمان والوں کے لیے۔ جب لوگ اللہ کی مسجدوں کو آباد کرتے ہیں، اللہ کے گھروں کو آباد کرتے ہیں، وقت پر نمازیں ادا کرتے ہیں ان کی شان میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی ہیں۔

﴿اصْبِرُوا﴾ کا معنی ہے اپنی نمازوں پر پابند کرو۔ ﴿صَابِرُوا﴾ کا معنی ہے کہ جب تمہیں خواہشات ولذات اپنی طرف بلائیں تو تم رک جاؤ اور ان کا مقابلہ کرو۔ ﴿رَابِطُوا﴾ کا معنی ہے کہ مساجد کے اندر تم اپنے آپ کو پابند رکھو، اللہ کے ذکر میں مشغول رکھو اور تقویٰ اختیار کرو۔ جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان پر عمل کرو اور جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان سے رک جاؤ۔ اگر یہ چار قسم کے اعمال پیدا ہو گئے تو تم مفلحین میں ہو جاؤ گے۔

مرابطہ کی فضیلت:

مسلم شریف کے اندر ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((رِبَاطُ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَقِيَامِهِ، وَإِنْ مَاتَ جَرَى عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِي كَانَ يَعْمَلُهُ، وَأُجْرِيَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ، وَأَمِنَ الْفَتَّانَ)) ایک رات اور دن کا جاگنا ایک مہینے کے روزے اور رات جاگنے سے بہتر ہے۔ یعنی اگر کوئی آدمی ایک ماہ روزے رکھے، رات کو جاگے اس سے وہ مجاہد زیادہ افضل ہے جو رات کو پہرہ دے رہا ہے۔ اگر وہ مجاہد مر گیا اس کا عمل لکھا جائے گا قیامت تک اور اس کے بعد اس کا رزق بھی دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو فتنے سے بھی محفوظ رکھے گا۔ قبر کے فتنے سے بھی محفوظ رکھے گا اور حشر کے فتنے سے بھی محفوظ رکھے گا۔ [مسلم، رقم: ۱۹۱۳]

(حدیث) حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كُلُّ مَيِّتٍ يُخْتَمُ عَلَى

عَمَلِهِ إِلَا الَّذِي مَاتَ مُرَابِطًا فِي سَبِيلِ اللهِ فَإِنَّهُ يُنمَى لَهُ عَمَلُهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَيَأْمَنُ مِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ)) جو شخص مرجاتا ہے اس کے عمل ختم ہوگئے، جو شخص اللہ کے راستے میں پہرہ دیتے ہوئے مرگیا تو اس کا ہر عمل مرجانے کے بعد بھی جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبر کے فتنوں سے بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ [ترمذی، رقم:۱۶۲۱]

(حدیث) حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ رَابَطَ فِي شَيْءٍ مِنْ سَوَاحِلِ الْمُسْلِمِينَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، أَجْزَأَتْ عَنْهُ رِبَاطَ سَنَةٍ)) [مسند احمد، رقم:۲۷۰۴۰] جس شخص نے مسلمانوں کی بندرگاہوں کی تین دن تک حفاظت کی، تاکہ دشمن حملہ نہ کردے تو وہ شخص ایسے ہے جیسے اس نے خشکی میں ایک سال کا پہرہ دیا ہو؛ کیونکہ سمندر کا پہرہ شدید ہوتا ہے۔ ٹھنڈے پانی میں رہنا، پانی میں جاگنا، پانی کے اندر پہرہ دینا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کو اتنا ثواب دیتے ہیں جیسے ایک سال اس نے پہرہ دیا ہو۔

(حدیث) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((حَرَسُ لَيْلَةٍ فِي سَبِيلِ اللهِ تَعَالَى أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ لَيْلَةٍ يُقَامُ لَيْلُهَا وَيُصَامُ نَهَارُهَا)) [مسند احمد، رقم:۴۳۳] ایک رات اللہ کے راستے میں پہرہ دینا ہزار رات جاگنے سے اور ہزار دن کے روزہ رکھنے سے بہتر ہے۔

اس لیے علامہ اقبال رحمہ اللہ نے کہا تھا:

ع ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

کہ ایک تو ملا کی اذان ہے کہ مسجد میں کھڑا ہے، لوگوں کی روٹیاں کھا رہا ہے اور مجاہد کی اذان اور ہوتی ہے۔ وہ تو مجاہدوں اور ان لوگوں کو پتہ ہوتا ہے جو سرحدوں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ کفر سے ان کی لڑائی ہوتی ہے، دشمن کے گولوں کی برسات ہو رہی ہوتی ہے اور وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔

(حدیث) حضرت سہل بن حنظلہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین کے دن چلے۔ جب شام کا وقت ہوا، میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں حاضر ہوا۔ گھوڑے پر سوار ایک آدمی آیا، اس نے کہا: حضور! میں آپ کے ساتھ موجود تھا، لیکن مجھے خیال آیا میں فلاں پہاڑ چڑھ گیا اور فلاں پہاڑ پر گیا، تاکہ دشمنوں پر نظر رکھوں کہ کوئی مسلمانوں پر حملہ کرنے والا دشمن تو نہیں ہے۔ میں نے فلاں پہاڑ کے پیچھے سے دیکھا کہ ہوازن کا قبیلہ ہے، ان کی بڑی سواریاں، بڑی اونٹنیاں، ان کے پاس بڑی نعمتیں اور ان کے پاس بڑی بکریاں ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا: تم نے بڑی اچھی خبر دی ہے۔ اللہ نے چاہا تو کل یہ سارا مالِ غنیمت مسلمانوں کے

پاس ہوگا۔ اور پھر فرمایا: کون ہے جو آج رات پہرہ دے؟ حضرت انس بن ابی مرثد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے کھڑے ہو کر کہا: میں دوں گا۔ آپ نے فرمایا: چلو گھوڑے پر سوار ہو کر پہرہ دو۔ اور آپ نے فرمایا: اس گھاٹی پر چلا جا اور وہاں جا کر پہرہ دے۔ خبردار! تیری طرف سے ہم پر حملہ نہیں ہونا چاہیے، تو جاگتا رہے۔ اگر دشمن حرکت کرے تو فوراً ہمیں خبر دے۔

جب صبح کا وقت آیا تو آپ نے دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد فرمایا: رات کو جو ہم نے گھڑسوار بھیجا تھا اس کی کوئی خبر ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: کوئی پتہ نہیں، وہ تو واپس ہی نہیں آیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے تیار ہوئے، لیکن بہت پریشان تھے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ آپ کی توجہ ادھر لگی ہوئی ہے کہ ہمارا آدمی واپس آیا کہ نہیں۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے صحابہ سے فرمایا: تمہیں مبارک ہو! تمہارا ساتھی آرہا ہے۔ صحابہ کہتے ہیں: ہم نے ادھر ادھر دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا، لیکن ہم نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، تو لازمی بات ہے کہ وہ آرہا ہے۔ تھوڑی دیر گزری تو ایک سوار درختوں کے جھنڈ سے نکل کر آرہا ہے۔ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ آپ نے فرمایا: تم نے کیا کیا؟ اس نے کہا: حضور! ساری رات پہرہ دیتا رہا ہوں، ہاں نماز کے لیے اترتا تھا یا قضائے حاجت کے لیے اترتا تھا، ورنہ میں گھوڑے کی پشت پر تھا اور ساری رات ان چٹانوں اور گھاٹیوں میں پھرتا رہا، دیکھتا رہا، اس کے علاوہ میں نے کچھ نہیں کیا اور کچھ نہیں دیکھا اور کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی تھی۔ آپ نے فرمایا: اللہ نے تیرے لیے جنت واجب کر دی ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی عمل نہ کرے تب بھی تیرے لیے جنت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ [ابوداؤد، رقم: ۲۵۰۱]

یہ خوشخبری ہوتی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تم نماز نہ پڑھو، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ آج کے بعد تو اگر کوئی نفلی عبادت نہ کرے، لیکن جو فرض ہے وہ تو فرض ہے، وہ تو اللہ کے نبی کو بھی معاف نہیں ہوتا، کسی اور کو کیسے معاف ہوگا؟ اور دوسری بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو معاف فرما دے گا، وہ اللہ کی یاد کو کیسے چھوڑے؟ بلکہ وہ اور زیادہ عمل میں لگ جاتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ ورنہ فرائض اللہ کسی کو معاف نہیں ہوتے۔

الحمد للہ حضرت مولانا محمد مکی حجازی حفظہ اللہ کے سلسلہ دروس تفسیر سے متعلق تفسیر سورۃ آل عمران مکمل ہوئی، اس کے بعد آگے سورۃ النساء شروع کی جارہی ہے۔

سُورَةُ النِّسَاءِ مَدَنِيَّةٌ

یہ سورت مدنیہ ہے، جو مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں ایک سو چھہتر (۱۷۶) آیات ہیں۔ اس سورت میں زیادہ تر احکامات قرابت داری کے اور عورتوں کے بارے میں ہیں۔ اس نسبت سے اس کا نام "النساء" ہے۔

سورۃ النساء کی فضیلت:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے کہ سورۃ النساء میں ایسی پانچ آیات ہیں کہ ان کے بدلہ میں اگر مجھے ساری دنیا بھی مل جائے تو مجھے اتنی خوشی نہیں ہوگی جتنی ان پانچ آیات کے ملنے سے خوشی ہے۔ وہ پانچ آیات یہ ہیں:

1 ......﴿إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا﴾[النساء: ۳۱] اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچو گے تو تمہارے صغائر ہم مٹا ڈالیں گے۔

2 ......دوسری آیت یہ ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا﴾[النساء: ۴۰] کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ذرے کے برابر بھی ظلم نہیں فرماتے۔ اور اگر ایک نیکی بھی ہو تو اس کو بڑھا کر اپنی طرف سے اجر عطا فرماتے ہیں۔

3 ......اسی طرح فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ ۚ﴾[النساء: ۴۸] اللہ تعالیٰ نہیں بخشیں گے جس کی موت شرک پر آئی، لیکن اس کے ماسوا ہر گناہ جس کو چاہیں بخش دیں گے۔

8 ......اسی طرح فرمایا: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا﴾ [النساء: ۶۴] کہ میرے مدنی! اگر تیری امت کے لوگوں سے کوئی گناہ ہوجائے اور وہ تیری خدمت میں حاضر ہو کر اللہ سے استغفار کریں اور آپ بھی ان کے لیے استغفار کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادیں گے۔ اس میں آپ ﷺ کی عظمتِ شان بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بیان بھی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ آٹھ آیات اس سورت مبارک میں ایسی ہیں جو حضور اکرم ﷺ کی امت کے لیے ساری کائنات سے بہتر ہیں، شرط یہ ہے کہ ان آیات کو سمجھے اور ان پر عمل کرے۔ اس کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیات پڑھیں:

1 ......﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ [النساء: ۲۶]

2 ......دوسری آیت ﴿وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا﴾ [النساء: ۲۷]

3 ......تیسری آیت ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾ [النساء: ۲۸]

اور پانچ آیات وہ ہیں جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پڑھی تھیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا﴾ [النساء: ۱، ۲]

"اے لوگو! اپنے رب کے (عذاب) سے ڈرتے رہو جس نے تمہیں ایک جان (حضرت آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلا دیئے۔ اور اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو۔ اور رشتہ داریوں (کی حق تلفی سے) ڈرو۔ یقین رکھو کہ اللہ تمہاری نگرانی کررہا ہے۔ اور (اے سرپرستو!) یتیموں کو ان کے مال دے دو اور برے مال کو اچھے مال سے تبدیل نہ کرو، اور ان (یتیموں) کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ، بیشک یہ بڑا گناہ ہے۔"

ربط بین السورتین:

سورۃ النساء کی پہلی آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیا ہے اور اس کا اختتام بھی حکم تقویٰ پر ہے۔ اس طرح سورۃ النساء کے اوّل اور آخر کا ایک بڑا وسیع جوڑ پیدا ہوا۔ اوّل کے اندر بھی یہی حکم ملا کہ صبر کرو اور آخر میں بھی یہی حکم ملا کہ رباط فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے دین میں، مساجد میں، نماز میں، ایک نماز سے دوسری نماز کے انتظار میں جمے رہو اور سب سے اعلیٰ حکم تھا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر پیدا کرو اور اس سورت میں بھی یہی حکم ہے کہ جب تک تقویٰ نہ ہو ان احکام پر عمل کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تقویٰ کی اہمیت:

مثال کے طور پر: ایک میرا اور آپ کا معاملہ ہے۔ اگر ہمارا اختلاف ہو جائے تو دو آدمی درمیان میں آ سکتے ہیں، جو مجھے اور آپ کو سمجھا سکتے ہیں، لیکن جو صلہ رحمی کے معاملات ہیں، میاں بیوی کے تعلقات ہیں، باپ بیٹے کے تعلقات ہیں، ماں اور اولاد کے تعلقات ہیں، لوگوں کے تعلقات ماسوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ ایک آدمی بظاہر بہت اچھا ہوتا ہے، لیکن گھر میں اس کا معاملہ اچھا نہیں۔ ایک آدمی کو دیکھیں تو اس کے اندر بظاہر حسن خلق ہے، بڑی شرافت ہے، لیکن والدین کا نافرمان ہے۔ ایک آدمی کی زندگی آپ کے سامنے بظاہر بڑی پرسکون ہے، لیکن وہ اپنی بیوی کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ گھریلو معاملات کی اصلاح ماسوائے تقویٰ کے نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی کوئی عدالت اس کی اصلاح نہیں کر سکتی۔ اس لیے سب سے بڑی چیز تقویٰ ہے۔ جب یہ مقام بندے میں پیدا ہو جائے تو یہ اصلاح کی بنیاد ہے۔

حضور اکرم ﷺ اگر جمعہ کا خطبہ پڑھتے تو فرماتے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ﴾ اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ اسی طرح جب خطبۂ نکاح پڑھا جاتا ہے اس میں اس آیت مبارکہ کو زیادہ تلاوت کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر بھی پہلا حکم ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ﴾ اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ کہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اس کی شان کے مطابق ڈرنا۔ کہیں حکم دیا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا﴾ [الانفال: ۲۹] اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو ہر بات اللہ تمہارے لیے کھول دیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے

گناہوں کو مٹادیں گے۔ اور کہیں فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ﴾ [الطلاق: ۲، ۳] اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو اللہ تمہارے لیے ہر مشکل سے نکلنے کا راستہ پیدا فرمادیں گے اور تمہیں ایسے مقام سے رزق عطا فرمائیں گے جہاں سے تمہارا گمان بھی نہیں ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ اصل دینِ اسلام کا فلسفہ یہی ہے کہ بندے میں اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا کردو؛ کیونکہ دنیا کا کوئی قانون، دنیا کا کوئی حکمران، کوئی مشینری اور کوئی دنیا کی فوجی قوت بندے کی اصلاح نہیں کرسکتی جب تک اللہ تعالیٰ کا ڈر دل میں نہ آئے۔

آپ دیکھ لیں! دنیا میں بڑے بڑے قوانین بنتے ہیں، لیکن عقل اس کو توڑ دیتی ہے۔ یورپ میں اتنے قوانین بنادیے کہ عورتیں صنف نازک ہیں، ان پر بڑی زیادتی ہوتی ہے تو انہوں نے مردوں سے طلاق کا حق لے لیا اور عورت کو دے دیا گیا کہ اب عورت پر ظلم نہیں ہوگا؛ کیونکہ اب عورت کے اپنے ہاتھ میں طلاق ہے، لیکن آپ نے وہاں حشر دیکھ لیا ہے کہ کتنی عائلی زندگی ناکام ہے!؟ سو میں سے ننانوے فیصد گھرانے برباد ہیں۔ کوئی میاں بیوی کا تصور نہیں، باپ بیٹے کا تصور نہیں اور ماں بیٹی کا تصور نہیں ہے۔ قوانین ان کا تحفظ نہ کرسکے۔ آپ کیا تصور کرتے ہیں کہ مرد استحصال کرتا ہے، جبکہ سب سے زیادہ استحصال عورت کرتی ہے۔

آپ دوسری شادی کرکے دیکھ لیں کہ پہلی بیوی کیا کرتی ہے؟ وہ دوسری عورت کو دیکھنا برداشت ہی نہیں کرتی۔ اس سے بڑا ظالم کوئی دنیا میں ہے؟ ورنہ وہ دوسری بیوی اس کی ہم جنس ہے۔ وہ کہتی کہ ہم بہنیں ہیں، کام تقسیم ہوجائے گا، بوجھ کم ہوجائے گا، لیکن اس چیز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگر آپ نے بڑا حوصلہ کرکے دوسری شادی کر بھی لی تو اب دوسری بیوی کا کام یہ ہوگا کہ وہ پہلی بیوی کو گھر سے نکلوائے گی۔ آپ بتائیں کہ مرد ظالم ہے یا عورت ظالم ہے؟ مرد تو شریف ہے۔ وہ تو دو دو کو گھر میں لا رہا ہے، وہ دو گھروں کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار ہے، چار گھروں کی ذمہ داریاں سنبھالنے کو تیار ہے۔ وہ تو عورتوں کو ایسے سڑکوں پر رلتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((فَاتَّقُوا فِتْنَةَ الدُّنْيَا، وَفِتْنَةَ النِّسَاءِ)) [شعب الایمان للبیہقی، رقم: ۵۰۲۹] دنیا اور عورتوں کے فتنے سے بچنا۔ جو بیٹے کو باپ سے جدا کردے اس سے بڑا بھی کوئی رشتہ ہے؟ جس کے نطفے سے پیدا ہوا ہے، جس ماں نے اسے نو ماہ تک پیٹ میں رکھا ہے اس کے سامنے جوتا لے کر کھڑا ہے کہ میری بیوی کو کیوں سخت

کہا ہے؟ یعنی وہ عورت جو اولاد کو ماں باپ سے کاٹ سکتی ہے تو باقی دنیا کیا چیز ہے!؟ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ ڈر یہ ہے کہ عورتوں کے فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے۔

اس سورت کے اندر یہ سارے احکامات ہیں ان سب معاملات، مشکلات پر قابو پانے کا حل ایک ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا کرو، مرد ہے یا عورت ہے، اللہ کا ڈر پیدا کرے تو سارے معاملات حل ہو جائیں گے۔ جیسا کہ ایک ماں نے بیٹی سے کہا کہ بیٹی! دودھ بیچنے جارہی ہو تھوڑا سا پانی ملا لو۔ اس نے کہا: اماں جان! یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ماں نے کہا: کون دیکھ رہا ہے؟ اس نے کہا: اماں جان! اور کوئی نہ دیکھ رہا ہو اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ جب یہ بات پیدا ہو جائے تو اس دن سمجھو کہ میں کامیاب ہو گیا۔ اس لیے نماز کا مقام یہ ہے ((كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ)) [بخاری، رقم: ۵۰] کہ جیسے تم اپنے اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اگر اس مرتبہ کو نہ پہنچو تو کم از کم یہ تو یقین کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے گورنروں کو حکم دیتے تھے کہ کسی کو نوکری دینی ہے، عہدے پر لگانا ہے تو سب سے پہلے اس کی نماز دیکھو۔ اگر بندہ اس میں بھی چوری کر رہا ہے تو جو اللہ کا چور ہے وہ بندوں کا امین کیسے ہو سکتا ہے؟ یا جو نماز پڑھتا ہی نہیں وہ دین کا دشمن ہے، خدا کا حق ادا نہیں کرتا، وہ تمہارا حق کہاں سے ادا کرے گا؟

ایک بگڑے ہوئے امیر زادے کی حکایت:

ایک بزرگ کی خدمت میں ایک بہت بڑے امیر زادے کو لایا گیا جو بڑا بگڑا ہوا تھا۔ لوگوں نے سوچا یہاں ایک اللہ والے ہیں، ان کے ساتھ اس کا تعلق بنائیں، تا کہ یہ درست ہو جائے۔ بزرگ کی خدمت میں لے آئے۔ انہوں نے فرمایا: کیسے آئے ہو؟ اس امیر زادے نے کہا: یہ لوگ مجھے پکڑ کر لے آئے ہیں، میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ یہ کہتے ہیں کہ میں آپ کو اپنا مرشد مان لوں، آپ کی بیعت کروں۔ ان بزرگوں نے فرمایا: اب کیا ارادہ ہے؟ اس نے کہا: میرا ارادہ نہیں ہے، میں سارے کام اپنی منشا سے کرتا ہوں، ان کے جبر کرنے سے چلو ایک بات ان کی مان لیتا ہوں۔ بزرگوں نے کہا: اس کا مطلب ہے کہ تم بیعت کرنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا: بیعت کرنا چاہتا ہوں، لیکن میری ایک شرط ہے کہ مجھے عورت اور شراب کی اتنی لت ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے انہی دو چیزوں میں زندگی گزار رہا ہوں، ان دو چیزوں کو میں نہیں چھوڑتا، باقی آپ جو فرمائیں گے اس پر میں عمل کروں گا۔ بزرگوں

نے فرمایا: جب تم مرید ہونے آئے ہو، ہم نے بھی تو تمہیں نہیں بلایا ہے، ہم نے تمہیں خط تو نہیں لکھا کہ تم ضرور تشریف لے آؤ کہ تمہارے بغیر ہمارا کام رکا ہوا ہے، اگر تم آگئے اور ہم تمہاری شرط ماننے کے لیے بھی تیار ہیں تو ایک شرط تم بھی ہماری مان لو۔ اس نے کہا: جب آپ بزرگ ہو کر میری بات مان رہے ہیں تو میں بھی آپ کی بات مان لوں گا۔ بزرگوں نے کہا کہ صرف نماز نہیں چھوڑنی۔ تو اس نے بات مان لی۔

پھر جب واپس آیا تو نوکروں نے کہا: جناب! مجلس شراب و کباب تیار ہے۔ اس نے کہا: میں نے وعدہ کیا ہے کہ نماز نہیں چھوڑوں گا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد مغرب کی نماز ہو جائے گی، ایسا کرتے ہیں کہ آج محفل عشا کے بعد ہوگی، ورنہ میری نماز چلی جائے گی۔ اس نے مغرب کی نماز پڑھی اور پھر عشا کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا۔ نوکر آگے کھڑے تھے، اس نے کہا: آج میری طبیعت کو ذرا تکلیف محسوس ہو رہی ہے، میں گھر جا رہا ہوں، کل دیکھا جائے گا۔ ایک دن گزر گیا، دو دن گزر گئے، چوتھے دن وہ حضرت کے پاس گیا۔ یہ آپ نے مجھے کیا نسخہ بتا دیا ہے کہ مجھ سے ہر چیز چھوٹ گئی ہے؟ انہوں نے کہا: بیٹا ہم نے تو آپ کو نہیں کہا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ﴾ [العنکبوت: ۴۵] کہ اگر نماز حقیقی نماز ہے تو بے حیائیوں سے، زنا سے، منکر سے، ہر برے کام سے روک دے گی۔ تمہاری نماز ٹھیک ہوگئی، اللہ تعالیٰ کا شکر کرو۔ اس نے کہا: اب تو میں یہاں پڑا ہوں۔ بزرگوں نے کہا: تمہاری مرضی ہے۔ یہاں رہنا ہے تو رہ جاؤ، لنگر میں سے دال روٹی ملے گی۔ اس نے کہا: بڑے قورمے کھا لیے، اب دالیں کھائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ایسی اصلاح کر دی کہ اس نے پھر دنیا کے اندر بڑا مقام پیدا کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب اللہ کا ڈر دل میں آ گیا تو بات بن گئی۔

تخاطب قرآن کا انداز:

آپ تخاطب قرآن پر غور کریں کہ ایک آدمی، دو آدمی، قوم قبیلہ کو خطاب نہیں کیا، بلکہ فرمایا: اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے تقویٰ کا حکم دیا، پھر صفت ربوبیت کا ذکر کیا کہ اس مالک سے ڈرو جس نے تمہیں پیدا کیا، تمہاری تربیت کی، اس نے نطفہ سے لے کر انسان کامل بنایا۔ جیسا کہ ہم محاورات میں کہتے ہیں: یہ تمہارا باپ ہے، جس نے تمہاری پرورش کی۔ یہ تمہارا استاذ ہے، اس نے تمہیں پڑھایا ہے، تمہیں اس کا بھی ادب نہیں آتا؟ اللہ نے فرمایا: اگر تم مجھے اپنا رب مانتے ہو تو میری ربوبیت کا کچھ شرم کرو۔ صرف زبانوں سے اللہ اکبر کہتے ہو، صرف

زبانوں سے کہتے ہو: ﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾﴾ [البقرۃ:۲۰۱] لیکن تم نے صحیح معنوں میں کبھی اس کی بڑائی کا اقرار نہیں کیا۔

اس لیے اللہ نے حضور اکرم ﷺ کو پہلا حکم دیا تھا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿١﴾ قُمْ فَأَنذِرْ ﴿٢﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿٣﴾﴾ [المدثر:۱ تا ۳] ہم یہ کہتے ہیں کہ رب بڑا ہے اور پیر چھوٹے چھوٹے رب ہیں۔ وہ بڑا ہے، یہی معنی تم لوگوں نے سوچا ہوا ہے؟ بڑے کا معنی تو یہ ہے کہ جب کسی کی بڑائی کا اعتراف کیا جائے، جب کسی کی ربوبیت کا اقرار کیا جائے تو اس کی نافرمانی کا کیا مطلب ہے؟

یہ تو وہی بات ہے کہ پنجابی میں ایک مثال ہے: ''پنچاں دا مشورہ سر انکھاں تے، پر پرنالہ اتھے رہسی۔'' کہ کچھ لوگ سمجھانے کے لیے گئے کہ تمہارے پرنالے سے پانی گرتا ہے، لوگوں کے کپڑے گندے ہوتے ہیں۔ اس گھر والے نے کہا: آپ بڑے بڑے بزرگ تشریف لائے ہیں، تمہارا فرمان تو میری آنکھوں پر ہے، لیکن پرنالہ وہیں رہے گا۔

اسی طرح تم نے بھی اپنے رب کو بڑا بنایا ہوا ہے کہ نماز میں کہتے ہو ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' ہر اذان میں کہتے ہو ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ''، ہر رکوع سجود میں کہتے ہو ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ''، لیکن باہر جا کر کبھی اپنے نفس کو بڑا بناتے ہو، کبھی اپنی خواہشوں کو بڑا بناتے ہو، کبھی اپنے بیوی بچوں کو بڑا بناتے ہو، کبھی دولت کو بڑا بناتے ہو اور کبھی کرسی کو بڑا بناتے ہو اور خدا کے نافرمان بن جاتے ہو۔ تو خدا کو کیسے بڑا بنایا؟

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ﴾ کہ جب سارے ڈرنے والے بن جائیں تب کام بنے گا۔ گھر میں اگر ایک آدمی نمازی ہے دس نہ پڑھیں تو وہ ایک بھی چند دنوں کے بعد بے نمازی ہو جائے گا۔ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سب سے بہتر بیوی وہ ہے جو اپنے خاوند کو رات کو تہجد کے لیے جگائے اور سب سے بہتر خاوند وہ ہے جو اپنے گھر والوں کو رات کو اٹھائے۔ فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ [التحریم:۶] جو اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو جہنم کی آگ سے بچائے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے تھے: اے اہل بیت رسول! اٹھو اٹھو تہجد کا وقت تیار ہے۔ لیکن آج اچھی بیوی وہ ہے جو کلب میں جائے، جو بال بنا کر گھر کو سجائے، جس کے پاس کسی اچھے ڈانسنگ کالج کا سرٹیفکیٹ ہو۔ آج اچھی بیوی وہ ہے جس سے بہت سارے لوگ خوش ہوں کہ بڑی سوشل عورت ہے۔

﴿الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ فرمایا: اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں پیدا کیا، جس نے تیری تربیت کی، اس رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک ذات سے پیدا کیا، یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا۔ فرمایا کہ رب میں ہوں، میری ربوبیت کا لحاظ کرو۔ دوسرا یہ بھی خیال کرو کہ اگر نقصان پہنچاؤ گے تو کس کو نقصان پہنچاؤ گے؟ ڈاکہ مارو گے تو کس کے گھر میں ڈاکہ مارو گے؟ چوری کرو گے تو کس کی چوری کرو گے؟ تم تو ایک باپ کی اولاد ہو، اس لیے بہتر ہے کہ مجھ سے ڈرو اور کوئی غیر قانونی حرکت نہ کرو، غیر اسلامی حرکت نہ کرو۔

حضرت حواء علیہا السلام کی پیدائش:

﴿وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد آدم علیہ السلام کی پسلی سے بی بی حواء علیہا السلام کو پیدا کیا، اس لیے ان کا نام حواء علیہا السلام پڑ گیا کہ آدم علیہ السلام زندہ ہیں، زندہ آدم علیہ السلام سے بی بی حواء علیہا السلام کو پیدا کر کے نکالا۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سوئے ہوئے تھے۔ جب اٹھے اللہ تعالیٰ کی شان! دیکھتے ہیں کہ ساتھ ایک عورت بیٹھی ہے۔ اللہ میاں یہ کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تیری بیوی ہے ﴿لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ [الروم: ۲۱] تاکہ تمہیں سکون نصیب ہو سکے، تاکہ تمہاری زندگی وحشت میں نہ گزرے، بلکہ آرام سے گزرے۔

ٹیڑھی عورت کو سیدھا کرنا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار! اگر عورت کو پورا سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے اور اگر اس کو بالکل ڈھیلی رسی دے دو گے تو یہ اور زیادہ ٹیڑھی ہو جائے گی۔ اس لیے اعتدال کے ساتھ زندگی گزارنا، عصا لٹکا بھی رہے، لیکن مارو بھی نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورت کی فطرت ہے: ((يَغْلِبْنَ الْكِرَامَ وَيَغْلِبُهُنَّ اللِّئَامُ)) [تفسیر روح البیان، تحت: سورۃ الحشر، آیت: ۱۶] کہ شریف آدمی پر سوار ہو جاتی ہے اور کمینہ اس پر سوار ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بائیں پسلی سے پیدا کیا۔

علمی نکات:

1 ...... خدا کی قدرت ہے کہ عورت کو بائیں پسلی سے پیدا کیا۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس میں بھی حکمتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے، عورت میں بھی ٹیڑھا پن ضرور ہوتا ہے، چاہے کتنی اچھی ہو جائے، کچھ نہ کچھ ٹیڑھا پن رہتا

ہے؛ کیونکہ اس کا اصل ٹیڑھا ہے۔

2 ......دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بائیں پسلی سے پیدا کیا؛ کیونکہ دائیاں ہاتھ احترام والا ہوتا ہے۔ اس سے اشارہ فرمایا کہ اس کو اتنا نہ چڑھاؤ، یہ کوئی اتنی عظمت والی چیز نہیں ہے۔ اس کو ہم نے بائیں طرف سے پیدا کیا ہے، اس کو اس کی حدود میں رکھو، اس کو اس کے مقام پر رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے لیے ماں باپ اور گھر کو چھوڑ دو۔

3 ......تیسری بات علماء نے یہ لکھی ہے کہ اللہ کی شان ہے کہ انسان کا دل بائیں طرف ہوتا ہے اور یہ بائیں طرف سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے آدمی کا عورت کے بغیر گزارا نہیں بڑے سے بڑا متقی، عابد و زاہد ہو عورت اس کی بھی ضرورت ہے۔

حضرت عوفی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ سورۃ النساء مدینہ میں نازل ہوئی۔ اور حضرت عکرمہ رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب سورۃ النساء نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا حَبْسَ بَعْدَ سُوْرَةِ النِّسَاءِ)) [سنن الکبریٰ، رقم: ۱۱۹۰۶] سورت نساء کے بعد تم پر گھٹن ختم ہو گئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی فضیلت:

حضرت ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے خود سنا ہے، وہ فرماتے تھے: لوگو! سورۃ نساء کے بارے میں جو پوچھنا ہو مجھ سے پوچھو؛ کیونکہ میں بہت چھوٹا تھا اور قرآن پڑھ لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی عمر صحابہ میں چھوٹی تھی، لیکن علم بڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لیے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ، وَفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ)) [مستدرک حاکم، رقم: ۶۲۸۷] میرے اللہ ابن عباس کو قرآن کی تفسیر کا علم اور دین کی سمجھ عطاء فرما۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ایسی منظور ہوئی کہ جب بڑے بڑے صحابہ کسی مشکل مسئلے میں الجھ جاتے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حل فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اصحاب بدر سے بھی زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ تو بعض اوقات یہ بات صحابہ کو ناگوار گزری کہ ایک کم عمر لڑکا ہے، اس کو ہمارے آگے بٹھا دیتے ہیں، ہم بوڑھے ہو گئے ہیں، ہماری عمر زیادہ ہو گئی ہے، پھر ہم اصحاب بدر ہیں۔ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔ ایک دن انہوں نے ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱﴾ [النصر: ۱] کی تفسیر صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھی تو سب صحابہ نے بتا دی۔ اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا آپ اس سورت مبارک سے کیا سمجھے ہیں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سورت میں اشارہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات قریب آگئی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا وہ کیسے؟ انہوں نے کہا جب اللہ کی مدد آگئی اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے تو اسلام کامیاب ہو گیا۔ اور جس مقصد کے لیے اللہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تھا وہ پورا ہو گیا اور جب کام پورا ہو جائے تو آدمی کو واپس جانا ہی ہوتا ہے۔ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ سے فرمایا: میں اس لیے ابن عباس کی عزت کرتا ہوں کہ اللہ نے اس کو علم عطا فرمایا ہے۔

(حدیث) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا، وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ)) اللہ تعالیٰ اس قرآن کی برکت سے قوموں کو اونچا کر دیں گے اور اس پر عمل نہ کرنے والوں کو ذلت کے غار میں ڈال دیں گے۔ [مسلم، رقم: ۸۱۷]

یہی وجہ ہے کہ جب تک مسلمانوں نے قرآن پر عمل کیا، اللہ نے ان کو ہمیشہ عزت وکامیابی دی اور کفر ہمیشہ جزیہ ادا کرتا رہا۔ اور جس دن سے مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑا اس دن سے مسلمان ذلیل ہو گئے۔ اس لیے کسی شاعر نے کہا:

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہوکر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

تقویٰ کا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ جو بھی عبادت ہے وہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور یہی کلمہ پاک ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' اور قرآن پاک کی ساری آیت کا ترجمہ ہے۔ ورنہ خدا کو سب مانتے تھے مکہ والے بھی، یہودی بھی، نصرانی بھی، قریش مکہ بھی مانتے تھے، اللہ کے گھر کا طواف بھی کرتے تھے، باقاعدہ حج کے دن قربانیاں بھی کرتے تھے، عقیقے اور خیراتیں بھی کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کافر تھے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں دوسروں کو شریک کرتے تھے۔ مثلاً: نماز عبادت ہے، نماز کا ایک ایک جز عبادت ہے، ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا نماز کا جز ہے، رکوع وسجود نماز کا جزء ہے، دعا عبادت ہے، یہ طواف عبادت ہے تو عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو گی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((الدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) [ترمذی، رقم: ۳۳۷۱] دعا صرف عبادت نہیں، بلکہ عبادتوں کا مغز ہے۔ اس لیے قرآن فرماتا ہے: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ

سَيَدۡخُلُوۡنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيۡنَ﴾ [المومن: ۶۰] اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے پکارو میں تمہاری پکار سنوں گا۔ جو میری ذات سے مانگنے سے اعراض کرتے ہیں ان کی سزا جہنم ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے مانگنا عبادت ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کی بجائے غیر اللہ سے مانگیں تو اسی کا نام شرک ہے۔

سورۃ النساء کی پہلی آیت کا مقصد:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھ سے ڈرو اور ساتھ یہ بھی غور کرو کہ میں کتنا بڑا قادر ہوں کہ ایک انسان سے ساری مخلوق انسانیت کو پیدا کر دیا ہے۔ اور اسی کے اندر اشارہ کر دیا کہ جب یہ ساری مخلوق ہے تو میری مخلوق کو میری عبادت میں کیسے شریک کر رہے ہو؟ اور ساتھ یہ بھی اشارہ کر دیا کہ تم ایک خاندان، ایک نسل سے ہو، تمہارا جد اعلیٰ آدم علیہ السلام ہیں اور اماں حضرت حواء علیہا السلام ہیں، اس لیے جب تم ایک خاندان سے ہو تو ایک دوسرے کا خیال رکھو۔ اللہ کے حقوق بھی ادا کرو اور بندوں کے حقوق بھی ادا کرو۔

حضرت حواء علیہا السلام کا حق مہر کیا تھا؟

﴿وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا﴾ ہم نے آدم علیہ السلام سے اس کی بیوی حضرت حواء علیہا السلام کو پیدا کیا۔ بعض لوگ ایسے فضول سوالات کرتے ہیں۔ مثلاً: حضرت آدم اور حضرت حواء کا نکاح کس نے پڑھایا تھا؟ اس میں اگر سچی بات پوچھیں تو اس میں لوگوں کا کوئی قصور نہیں، ہماری اپنی برادری کے لوگوں نے جھوٹے قصے بنائے کہ جب حضرت حواء پیدا ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ حق المہر ادا کرو۔ اب آدم علیہ السلام پریشان ہو گئے کہ پیسے تو نہیں ہیں، حق المہر کہاں سے دوں؟ بڑی سوچ بچار کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اور ان پر درود پڑھ کر حضرت حواء کو حق المہر ادا کیا۔ اس طرح لوگوں کے دماغ میں قصہ بٹھا دیا گیا تو لازمی بات ہے کہ لوگ تو جاہل ہیں، وہ پوچھیں گے کہ نکاح کس نے پڑھایا تھا؟ گواہ کون کون تھے؟

یاد رکھیں! تمام قانون اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جب وہ خود کہہ دے کہ یہ تیری بیوی ہے تو کس نکاح کی ضرورت ہے؟ مسلمان کو چاہیے کہ تھوڑی سی عقل بھی استعمال کرے۔ یہ نہیں کہ جو مولوی کہہ دے اس پر سبحان اللہ ہی کہتا رہے۔

عورت کی تخلیق کا ایک مقصد:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے حضرت حواء علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی آنکھ کھلی تو دیکھ کر حیران رہ گئے! اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: یہ کون ہے؟ فرمایا: تمہاری بیوی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں بھی انس پیدا ہوا اور اس بی بی کے دل میں بھی انس پیدا ہوا تو دونوں کو پرسکون زندگی گزارنے کے لیے ساتھی بنا دیا۔ بیوی اصل میں اس لیے ہی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا لِيَسۡكُنَ إِلَيۡهَا﴾ [الاعراف: ۱۸۹] کہ اس بیوی سے شوہر سکون پکڑ سکے۔ میاں اور بیوی کے درمیان محبت بھی ہو، شفقت اور رحمت بھی ہو۔

بہترین عورت:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سب سے اچھی عورت وہ ہے کہ جب خاوند کی اس پر نظر پڑے تو خوش ہو جائے اور جب خاوند غائب ہو جائے تو اس کی امانت میں خیانت نہ کرے، اپنی عزت کی بھی حفاظت کرے، اس کے مال کی بھی حفاظت کرے اور جب خاوند حکم کرے تو اس کے حکم کی اطاعت کرے۔

ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ نے صالحہ عورت کی تعریف پوچھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں جلدی سے گھر گیا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اچھی عورت کون سی ہوتی ہے؟ انہوں نے فرمایا: اچھی عورت وہ ہوتی ہے جس پر کبھی کسی غیر کی نظر نہ پڑے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے عورت کو مرد سے پیدا کیا ہے، لہٰذا اس کی تمنا، آرزو مرد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو مٹی سے پیدا کیا ہے، لہٰذا انسان کی تمنا زمین کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ فرمایا: اپنی عورتوں کو پردہ میں رکھا کرو (ورنہ کسی مرد کے ساتھ چلی جائے گی۔)

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ، وَإِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَفِيهَا عِوَجٌ)) [تفسیر ابن کثیر] اللہ تعالیٰ نے عورت کو پسلی سے پیدا کیا ہے اور پسلیوں کی میں زیادہ ٹیڑھا حصہ اوپر کی پسلی میں ہوتا ہے۔ اس لیے عورت کے اندر بھی کجی ہوتی ہے۔ یاد رکھو! اگر اس کو پورا سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی، لیکن تم گزارا کرو بعد اس کے کہ اس میں کچھ نہ کچھ ٹیڑھا پن تو رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ عورت کو بائیں پسلی سے پیدا کیا اور دل بھی ادھر ہے، لہٰذا اس سے شفقت و محبت کا تقاضا بھی ہے۔

﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً﴾ اور آدم علیہ السلام اور حواء علیہا السلام سے ہم نے مرد اور عورتیں پیدا کیں اور پھر ان سب کو دنیا کی جگہوں میں پھیلا دیا۔ ان کی زبانیں مختلف ہیں، ان کی صفتیں بھی مختلف ہیں، ان کے اذہان بھی مختلف ہیں اور ان کی صورتیں بھی مختلف ہیں، لیکن سب کا باپ ایک ہے۔ یہ تو ہم نے ان کو پیدا کیا۔ اور ان کا انجام یہ ہوگا کہ ہم ان سب کو فنا کر دیں گے۔ اس کے بعد ان کو دوبارہ عالم آخرت میں کھڑا کریں گے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ﴾

اللہ سے ڈرو اور اس کی اطاعت کرو اور صلہ رحمی کا خیال رکھو۔

حضرت ابراہیم، حضرت مجاہد، حضرت حسن رحمہم اللہ فرماتے ہیں: پہلے زمانے میں لوگ کہتے تھے کہ میں تم سے اللہ کے لیے اور رشتہ داروں کے واسطے سے مانگتا ہوں۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اگر کسی سے معاہدہ کرو، اگر کسی سے لین دین کرو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کو پورا کرو اور جتنے رشتے دار ہیں، ان کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرو، ان سے جوڑنے کی کوشش کرو، توڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ سب سے اعلیٰ رشتہ والدین سے ہے، پھر جیسے جیسے ان کے قریب ہیں، ان کے ساتھ بھلائی کرو، ان کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔ کیونکہ جو قطع رحمی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے توڑ دیتے ہیں اور جو لوگ صلہ رحمی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے جوڑ دیتے ہیں۔

(حدیث) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بندہ یہ چاہتا ہو کہ میری عمر دراز ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور صلہ رحمی کرے۔

رشتہ داروں سے صلہ رحمی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: چونکہ رشتہ داری کے معاملات اتنے مخفی ہوتے ہیں کہ کوئی نہیں جانتا۔ اللہ نے فرمایا: میرے بندے! لوگ نہ جانیں، لیکن میں تو تمہارے جمیع احوال، تمہارے جمیع حرکات و سکنات کو جانتا ہوں۔ لہٰذا اپنے رشتے داروں کے ساتھ بھلائی کرو۔ اس لیے فرمایا کہ جب تم صدقات، زکوۃ خیرات دینا چاہو تو سب سے زیادہ مستحق تمہارے رشتہ دار ہیں۔

حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ جب آدمی اپنے رشتہ داروں پر صدقہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو دو ثواب دیتے ہیں: ایک صدقہ کا ثواب دیتے ہیں اور ایک صلہ رحمی کا ثواب دیتے ہیں۔

گھر اور گھر والی کے حقوق:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو آدمی اپنی بیوی کے منہ میں ایک لقمہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر بھی ثواب دیتے ہیں۔ تو ایک صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ! بیوی کا خرچہ دینا تو ہمارے ذمہ واجب ہے پھر ثواب ملنے کا کیا معنی؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر یہی لقمہ غیر عورت کو دیتے تو گناہ ہوتا یا نہیں؟ اس صحابی نے عرض کیا: گناہ ہوتا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: پھر یہاں اللہ تعالیٰ تمہیں ثواب کیوں نہ دیں؟

بعض علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ ہم جس دور میں گزر رہے ہیں، اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ ہنس رہا ہے، کھیل رہا ہے تو نفلی نماز پڑھنے سے زیادہ ثواب ہے؛ کیونکہ نفلی نماز پڑھنے سے تو اعمال میں ترقی ہوگی، لیکن اپنی بیوی سے پیار و محبت کرنے سے زنا سے بچیں گے۔ دونوں محرمات سے بچیں گے۔

آج ہمارے ہاں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہمارے گھریلو معاملات ٹھیک نہیں ہیں۔ ہم نے بیوی کو بہترین نوکر سمجھا ہوا ہے کہ ہمارا کھانا پکائے، کپڑے دھوئے، بچوں کو تیار کرے، گھر میں جھاڑو لگائے اور سارا دن صفائی کرے۔ اگر یہی ڈیوٹی کوئی نوکر کرے تو شام کو بے ہوش پڑا ہوگا۔ تو ایسی عورت کیا خاوند کے حقوق ادا کرے؟ اور خاوند کی ذمہ داری ہمارے ہاں یہ ہے کہ جب گھر میں داخل ہو تو یوں معلوم ہو کہ وردی میں ڈی آئی جی داخل ہو رہا ہے اور اپنی بیوی کو ایسے کاٹنے کا جیسے جنگل سے کوئی بلا نکل کر آگئی ہو۔ مولوی بھی گھر میں جا کر "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" نہیں کہتے۔ حالانکہ شریعت کا حکم ہے کہ گھر میں کوئی بھی نہ ہو تب بھی "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کہو۔ تو صحابہ نے عرض کیا: اگر گھر میں کوئی نہ ہو تب بھی سلام کریں؟ فرمایا: فرشتے تو ہیں۔

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذٰلِكَ أَدْنٰى أَلَّا تَعُولُوا ۝ وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيْٓـئًا مَّرِيْٓـئًا ۝﴾ [النساء: ۳، ۴]

"اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لے سکو گے تو (ان سے نکاح کرنے کے بجائے) دوسری عورتوں میں سے کسی سے نکاح کر لو جو تمہیں پسند آئیں دو دو سے، تین تین سے، اور چار چار سے، ہاں! اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ تم (ان بیویوں) کے درمیان (خرچہ اور باری میں) انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو، یا ان کنیزوں پر جو تمہاری ملکیت میں ہیں۔ اس طریقے میں اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تم بے انصافی میں مبتلا نہیں ہو گے۔ اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دیا کرو۔ ہاں! اگر وہ خود اس کا کچھ حصہ خوش دلی سے چھوڑ دیں تو اسے خوشگواری اور مزے سے کھا لو۔"

بیویوں کے حقوق پر دشمنانِ اسلام کا پروپیگنڈہ:

ان آیات مبارکہ میں تعدد ازواج اور حقوقِ یتامیٰ کا بیان ہے۔ یہ مسئلہ بڑا اہم ہے۔ اس پر مستشرقین یعنی یہود ونصاریٰ کے بڑے بڑے رائٹر، صاحب قلم لوگ اور جتنے اعدائے اسلام اور اعدائے دین لوگ ہیں وہ لوگوں کو اسلام سے بدظن کرنے کے لیے اس مسئلہ کو بطور خاص اچھالتے ہیں۔ کیونکہ دشمنوں کے پاس پروپیگنڈہ کے اتنے وسائل ہیں، ذرائع ہیں کہ اگر وہ بات کو پھیلانا چاہیں تو یقین کریں کہ وہ ایک گھنٹہ سے پہلے بات کو پہنچا سکتے ہیں۔

شانِ نزول:

زمانہ جاہلیت کے اندر رواج تھا کہ اگر کسی کے پاس یتیم لڑکی گھر میں ہے، یتیم کا ولی الامر خود اس سے شادی کر لیتا تھا یا اپنے بیٹے کی یا کسی عزیز کی اس لڑکی سے شادی کر دیتے تھے۔

اور اس کے دو بڑے فائدے سوچے جاتے تھے کہ اس کی جائیداد ہے۔ اگر ہم نے اس کی دوسری جگہ شادی کر دی تو جائیداد کا حصہ دینا پڑے گا۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوجاتا تھا کہ اگر ہم باہر کسی لڑکی سے شادی کریں گے تو لازمی بات ہے کہ وہ حق المہر کا مطالبہ کرے گی اور یہ یتیم لڑکی ہے، اس کو تھوڑا سا مہر دے دیں گے، اس لیے ہمیں حق المہر بھی نہیں دینا پڑے گا اور اس کی جائیداد بھی ہمارے قبضے میں رہے گی؛ کیونکہ وہ پہلے یتیم ہونے کی وجہ سے ہمارے پاس تھی، اب ہماری اولاد کے ساتھ نکاح ہو جائے گا تو وہ جا کر کس سے فریاد کرے گی؟ تیسری بات یہ ہے کہ اس کے حقوق کی بھی ہمیں کوئی فکر نہیں ہے؛ کیونکہ اس کے ماں باپ تو نہیں ہیں جو اس کو گھر لے جائیں گے۔ اگر

خاوند صحیح سلوک نہیں کر رہا تو یہ یتیم بچی ہے، اس کی کون نگرانی کرے گا؟

یہ جاہلیت کے اندر ایک رسم تھی جو چلی آ رہی تھی کہ یتیموں کے مال پر بھی اور ان پر بھی قبضہ کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک اتار کر ان کی اس رسم بد کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا کہ خبردار! اگر تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں عدل نہیں کر سکتے یا تمہاری نیت نعوذ باللہ ٹھیک نہیں ہے تو ان سے کوئی رشتہ نہ کرو۔ وہ جہاں چاہیں رشتہ کریں اور تم ان کو منع نہ کرو۔ اور یہ ضروری نہیں کہ تم یتیم لڑکیوں سے شادی کرو۔ اگر شادی کرنا چاہتے ہو تو دنیا کے اندر اور بھی عورتیں ہیں تم دو کرنا چاہو، تین کرنا چاہو یا چار کرنا چاہو تو کر لو، لیکن یتیم لڑکیوں پر قطعاً ظلم نہ کرو۔

یتیم لڑکی سے نیک نیتی سے شادی کی فضیلت:

خاندان میں اگر کوئی یتیم لڑکی ہے اور وہ آدمی اس سے نیک نیتی سے رشتہ کرنا چاہتا ہے اور اس کا باقاعدہ حق المہر ادا کرے، یہ اس کے لیے بہت بڑا ثواب ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کے ایک صحابی ہیں، آپ نے ایک دن ان کی پگڑی میں خوشبو کا اثر دیکھا، فرمایا: یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ میں نے شادی کر لی ہے، اتفاق سے بیوی کا تیل کپڑوں پر لگ گیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بیوہ عورت سے شادی کی ہے یا کنواری عورت سے شادی کی ہے؟ اس نے کہا: میں نے بیوہ عورت سے شادی ہے۔ آپ نے فرمایا: تم تو جوان آدمی ہو، کنواری سے شادی کرتے؟ اس نے کہا: اصل بات یہ ہے کہ میرے ابا فوت ہو گئے ہیں اور میری چھ بہنیں ہیں۔ اگر میں کسی کنواری لڑکی کو شادی کر کے لے آتا جو میری بہنوں کی عمر کی ہوتی تو بظاہر بھی عجیب لگتا، اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ میری بہنوں کو نہ سنبھال سکتی، اس لیے میں نے بیوہ عورت سے شادی کی ہے کہ میری چھ بہنوں کی ماں بن کر پالے گی۔

شادی میں رنگ ڈالنا ہندوانہ رسم:

بعض لوگ اس سے یہ نکال لیتے ہیں کہ شادی کی خوشی میں رنگ ڈالنا جائز ہے؛ کیونکہ حضور پاک ﷺ نے بھی صحابی پر رنگ دیکھا تھا۔ حالانکہ یہ رنگ ڈالنا ہندوؤں کی رسم ہے، اس کا مسلمانوں کی رسم سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک اس صحابی کا واقعہ ہے..... شریعت کے اندر حکم یہ ہے کہ مرد وہ خوشبو استعمال کرے جس میں کپڑوں پر رنگ تو نہ لگے، لیکن خوشبو زیادہ پھیلنے والی ہو اور عورتوں کے لیے حکم ہے کہ ان کی خوشبو میں رنگ ہو، لیکن اس کی خوشبو مدھم ہونی چاہیے کہ اس کی خوشبو دور تک نہ پھیلے کہ کوئی عورت گزرے تو لوگ خوشبو سونگھتے پھریں کہ کون گزر رہا ہے؟ ہاں

مدھم خوشبو ہو اور رنگ ہو تو وہ شوہر دیکھے گا، کوئی بات نہیں ہے۔ اور عرب اس پر عمل کرتے ہیں۔

ایک مرد کتنی شادیاں کر سکتا ہے؟

اس آیت کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ تم دو شادیاں کرو تو جائز، تین شادیاں کرو تو جائز اور چار کرو تو جائز ہے، لیکن فرمایا: ﴿مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ﴾ اس کا معنی یہ ہے کہ تم نکاح کرو جو تمہیں اچھی لگے وہ دو دو، تین تین، چار چار۔

اس لیے شیعہ کے نزدیک چار کی پابندی نہیں ہے، بلکہ ان کے نزدیک نو تک بھی جائز ہے۔ دنیا کے اندر صرف شیعہ اور غیر مقلدین کا فرقہ ہے جس نے قرآن کی آیت کا مفہوم اپنی منشاء سے کیا ہے کہ دیکھو دو اور تین پانچ، پانچ اور چار نو، تو لہٰذا نو سے نکاح کر سکتا ہے۔ اور ان کا دوسرا استدلال یہ بھی ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ کے گھر میں نو بیویاں تھیں، حالانکہ آپ نے تو گیارہ نکاح فرمائے ہیں۔

اور بعض فرق باطلہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ قید ضروری نہیں ہے؛ کیونکہ سورۃ فاطر میں آتا ہے: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی صفت بیان کی ہے: ﴿أُولِيْٓ أَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ﴾ [فاطر: ۱] وہاں بھی یہی الفاظ ہیں کہ اللہ کے فرشتے ہیں جن کے پر دو دو ہیں، تین تین ہیں اور چار چار ہیں اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے چھ سو پر ہیں اور بعض ایسے فرشتے بھی ہیں جن کے پانچ ہزار بھی ہیں۔ اس لیے یہاں کوئی پابندی نہیں ہے، جتنا مرضی آئے نکاح کرو۔

اس طرح انہوں نے اللہ کے قرآن میں تحریف کی ہے اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس مذہب نے قرآن کو بدلا۔ جس کے نزدیک متعہ ویسے جائز ہے جب ان کے ہاں عورت کے مسئلے میں ویسے بھی نرمی ہے تو پتہ نہیں انہیں کیا ضرورت پیش آگئی کہ اللہ کے قرآن میں تحریف کر دی۔ اور ان کے نزدیک صرف یہ نہیں کہ متعہ جائز ہے، بلکہ ان کے نزدیک بہت بڑی عبادت ہے، بہت بڑا اجر و ثواب ہے۔ ان کی ایسی ایسی روایات ہیں کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

بعض روایات میں تو یہ لکھا ہوا کہ اگر عورت ایک دفعہ متعہ کرے یا مرد ایک دفعہ متعہ کرے تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے، دو دفعہ کرے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے درجہ پر، تین دفعہ کرے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے اور جب چار دفعہ کرے تو خود محمد رسول اللہ ﷺ کے درجہ تک پہنچتا ہے...... نعوذ باللہ......

اور یہ بھی لکھا ہے کہ عورت جب جنابت کا غسل کرتی ہے اور پانی کو بدن سے صاف کرتی ہے، اس سے جو

قطرے گرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے فرشتے پیدا کرتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ مذہب ہے یا ڈرامہ ہے۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی ہے کہ جس مذہب کی بنیاد تکیہ ہو، صحابہ پر گالیاں ہوں، جس مذہب کی بنیاد تبراء ہو، جس کے آگے پیداوار بذریعہ متعہ ہو، خود اس مذہب کا اندازہ لگالیں۔ اور ان کی عبادت کے ڈھنگ آپ نے خود دیکھے ہیں کہ جو بہت زیادہ مقبول ہوئے ہیں، گلے میں لوہے کی زنجیریں پہن لیتے ہیں، لوہے کے کڑے پہن لیتے ہیں، جبکہ اللہ فرماتے ہیں: یہ جہنم میں پہنائے جائیں گے۔

دوسرا پہلو اس کا یہ ہے کہ اسلام کو بدنام کرنے کے لیے جتنے کافر ہیں، جتنے یہود و نصاریٰ ان کے ایجنٹ ہیں، اسلام کو بدنام کرنے لیے اس مسئلہ کو بطور خاص چھیڑا جاتا ہے کہ مسلمان اتنے بڑے ظالم ہیں کہ چار بیویاں رکھتے ہیں، اتنا بڑا استحصال ہے۔ اب تو آپ کے ہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں کہ انہوں نے لکھا کہ یہ کیا عدل ہے کہ ایک مرد تو چار بیویاں رکھ سکتا ہے اور ایک عورت چار خاوند کیوں نہ رکھے؟ لوگوں نے بڑی واہ واہ کی کہ ایسا منصف پیدا ہی نہیں ہوا! کیونکہ اسلام کے خلاف بات جاری تھی، اس کو اٹھایا اور اپنے ملک میں لے جا کر اس کے اعزاز واکرام کیے اور انعامات دیے گئے۔ اسلام دشمنی کا جہاں بھی کوئی پہلو نکل رہا ہے کفار اس کو اٹھالیں گے۔ سلمان رشدی کو دیکھ لیں اس پر کروڑوں ڈالر خرچ ہو رہے ہیں۔ بہر حال یہ اسلام کے خلاف بڑا پروپیگنڈہ ہے۔

صرف ایک شادی کرنے کا شبہ اور جواب:

ہمارے بعض لوگ جو عورتوں سے بڑے مرعوب ہیں وہ بھی قرآن پاک میں ایک شبہ پیدا کر دیتے ہیں کہ یہاں تو قرآن نے کہا کہ تم چار بیویاں رکھ سکتے ہو، لیکن اگر ڈر ہو تو پھر ایک بیوی۔ اور دوسری جگہ قرآن میں آتا ہے: ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ﴾ [النساء:۱۲۹] تم ہرگز عدل نہیں کر سکتے جتنی بھی کوشش کرو۔ تو اس آیت کے اندر گویا کہ منع کر دیا ہے، لہٰذا ایک شادی کرو۔ تو انہوں نے بھی عورت کو خوش کرنے کے لیے قرآن کا معنی بدل دیا ہے۔ یہ بھی قرآن کی تحریف ہے۔ اگر یہی معنی ہوتا کہ ایک سے زیادہ شادی نہیں ہو سکتی، تم ہرگز عدل نہیں کر سکتے تو اسلام کے اندر کسی کی بھی چار بیویاں نہ ہوتیں۔ تو جن کی چار بیویاں ہیں، نعوذ باللہ انہوں نے قرآن کی اس آیت کی مخالفت کی ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ اللہ کے قرآن کو سمجھا نہیں گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہارے ذمہ عدل ہے کہ دو بیویاں ہیں،

تین ہیں، چار بیویاں ہیں۔ لباس کے اندر عدل، کپڑے کے اندر، نان ونفقہ کے اندر، جگہ میں، وقت میں عدل کرو۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے، باقی تم یہ چاہو کہ دل میں بھی عدل برابر کریں تو یہ تمہاری طاقت نہیں ہے۔ یہ معاملہ اللہ ہاتھ میں ہے۔ کسی بیوی سے محبت زیادہ ہے اور کسی سے کم ہے، یہ تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے، چاہے تم جتنی کوشش کرو۔

اگر کسی بیوی سے محبت زیادہ ہوتو:

دو بیویاں ہیں: ایک سے محبت زیادہ اور دوسری سے کم ہے۔ ایک بوڑھی ہوگئی اور دوسری جوان ہے تو فطری بات ہے کہ جوان سے محبت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ ایک بڑی سلجھی ہوئی عورت ہے، اس نے گھر کو بڑا بنا سنوار رکھا ہے اور دوسری ایسی ہے کہ جب بھی گھر میں جاؤ تو کباڑ خانہ بنا ہوا ہے۔ ایک ایسی بات کرتی ہے کہ خاوند خوش ہو جاتا ہے، خاوند کو راحت وسکون ملتا ہے اور ایک ایسی بات کرتی ہے کہ جیسے بچھو پر ہاتھ پڑ گیا ہو کہ اس نے ڈنگ مارنا ہی مارنا ہے۔ تو یہ ایک فطری بات ہے کہ جو اچھا سلوک کرے آدمی اس سے زیادہ رغبت کرے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دل کا معاملہ تمہارے ہاتھ میں نہیں، جتنی کوشش کرو عدل نہیں کر سکتے، اس لیے وہ تمہیں معاف کر دیا ہے۔ میرے پاک نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! میں اپنی بیویوں میں عدل وانصاف اور برابری جو میرے بس میں ہے کر رہا ہوں، لیکن میرے اللہ! دل تو تیرے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ کسی طرف زیادہ ہے تو میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ میرے اللہ! اس مسئلہ میں آپ مجھ پر ملامت نہیں کریں گے۔

اللہ تعالیٰ تمہیں ظاہری عدل میں پکڑیں گے کہ تم نے ظاہری انصاف کیا ہے یا نہیں کیا ہے؟ حتیٰ کہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ اگر سفر ہے اور آدمی کی دو چار بیویاں ہیں تو قرعہ اندازی کرے۔ جس کا نمبر نکل آئے اس کو لے جاؤ، باقی ناراض نہ ہوں۔ ویسے اگر اپنی مرضی ہو تو کسی کو بھی ساتھ لے کر جا سکتے ہو۔

اسلام چار بیویوں کی اجازت دینے میں اکیلا نہیں ہے:

مسئلہ سمجھیں کہ اسلام نے چار بیویوں کی اجازت دی ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، محض دشمن کا ایک پروپیگنڈہ ہے۔ جیسا کہ عرض کیا کہ آپ دین کا کام کریں، آپ کا کوئی نام نہیں لے گا۔ آپ دو دو لاکھ کے مجمعوں میں جا کر سیرت النبی اور توحید پر تقریر کریں، صبح اخبار کے اندر چھوٹی سی خبر نہیں لگے گی اور اگر آپ اسلام کے خلاف ذرا

بکواس کردیں تو سرخیاں لگی ہوئی ہوں گی، پوری دنیا کا میڈیا آپ کو ابھار رہا ہوگا کہ یہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ زیادہ شادیاں کرنے کا تعلق صرف مذہب اسلام سے نہیں ہے، بلکہ آپ تہذیب فارس، تہذیب روم دیکھ لیں، اسی طرح سابقہ انبیاء کے زمانے دیکھ لیں، ان کے دور میں بھی تو تعددِ ازواج تھا، کوئی منع نہیں تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو یہودی بھی مانتے ہیں، نصرانی بھی مانتے ہیں، سب مانتے ہیں۔ ان کی بھی تو کئی بیویاں تھیں: بی بی ہاجرہ اور بی بی سارہ علیہما السلام۔ اور اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کی سو بیویاں تھیں، اسی طرح ایسے نبی بھی گزرے ہیں جن کی چار پانچ، دس یا اس سے بھی زیادہ بیویاں تھیں۔

صرف دو نبی ایسے گزرے ہیں جن کی شادی نہیں ہوئی: ایک حضرت یحییٰ علیہ السلام اور دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، لیکن جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں سے اتریں گے تو ان کی شادی ہوگی اور ان کی اولاد بھی ہوگی اور اس کے بعد ان کو موت آئے گی اور پھر میرے مدنی سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضے میں دفن ہوں گے۔ آج کل جو لوگ دوسری شادی کے خلاف بڑا واویلا کرتے ہیں وہ ہندو ہیں۔ ان کا بڑا کرشنا جو بڑا اوتار گزرا ہے، ان کے ویدوں کے اندر دیکھ لیں کہ کرشن بہت بڑا اوتار ہے۔ اس کے ہندو کتابوں میں عورتوں سے عجیب وغریب معاشقے مذکور ہیں۔ اب تو عیسائیوں نے بھی ماننا شروع کر دیا ہے کہ پہلے تورات وانجیل اور سابقہ کتابوں میں یہ ملتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بیویاں زیادہ تھیں۔ کئی عیسائیوں نے کتابوں کے اندر لکھ کر باقاعدہ اقرار کر لیا ہے۔ تو جب یہ بات پہلے سے چلی آ رہی ہے تو اسلام میں یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے کہ اس کو بدنام کیا جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کو ہزاروں سال گزر گئے ہیں۔ ان کے زمانے میں یہ بات موجود ہے اور دیگر پیغمبروں کے زمانہ میں بھی جب یہ بات موجود ہے تو صرف اسلام پر الزام لگانے کا کیا مطلب ہے؟ اگر تم بڑے منصف مزاج ہو تو موسیٰ علیہ السلام پر بھی اعتراض کرو، داؤد پر بھی کرو۔

چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں:

تیسری بات یہ سمجھیں کہ اسلام نے ایک عادلانہ نظام دیا ہے۔ نہ تو انسان پر پابندی لگا دی کہ دوسری شادی نہیں کر سکتے اور نہ اس کی کھلی چھٹی دے دی کہ دس کر لو گیارہ کر لو، پچاس کر لو، بلکہ ایک حد مقرر کر دی ہے کہ تم ایک وقت میں چار نکاح کر سکتے ہو، پانچویں شادی نہیں کر سکتے۔

اور اس کا عملی طور پر بھی نمونہ سامنے آ گیا کہ غیلان بن سلمہ الثقفی رضی اللہ عنہ جب اسلام لے آئے تو فرماتے ہیں کہ میرے پاس دس عورتیں تھیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ تم ان دس عورتوں میں سے چار کو رکھ لو اور باقیوں کو طلاق دے دو۔ انہوں نے چار کو رکھ لیا، باقیوں کو طلاق دے دی۔

انہی کا ایک واقعہ آتا ہے کہ جب امیر المومنین سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا، اس نے ان چاروں بیویوں کو ایک ایک طلاق دے دی اور ساری جائیداد لڑکوں کو دے دی، تاکہ میری بیویاں وارث نہ بنیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو انہوں نے بلا کر فرمایا: کیا تم نے جائیداد بچانے کے لیے ساری بیویوں کو طلاق دی ہے؟ (چونکہ یہ طلاق رجعی تھی، اس لیے فرمایا کہ) ان سے فوراً رجوع کرو، ورنہ میں درے مار مار کر تمہیں ٹھیک کر دوں گا۔ اتنا عرصہ گزر گیا آج تمہیں طلاق یاد آ گئی ہے؟ فوراً ان سے رجوع کرو اور تمہیں ان کا حق دینا ہوگا۔ پھر اس نے رجوع کر لیا۔ اسی طرح اسلام میں کئی صحابہ آئے ان کی پانچ بیویاں تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا: ایک کو طلاق دے دو، چار رکھ سکتے ہو، پانچ نہیں رکھ سکتے۔ یہ کتنا منصفانہ عدد ہے۔ بہر حال ہمارا مقصد یہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا: چار رکھ سکتے ہو، پانچویں نہیں رکھ سکتے۔

زیادہ شادیوں کی اجازت کیوں ہے؟

یہ تاریخ عالم ہے کہ مرد عورتوں کی بنسبت زیادہ مرتے ہیں۔ ایک جنگ بھی ہو جائے تو دیکھ لیں کہ مرد کتنے ختم ہو جائیں گے؟ آپ کسی جنگ کا ریکارڈ سامنے رکھ کر دیکھ لیں مرد ہی مریں گے، عورتیں تو گھروں میں ہوتی ہیں۔ جب عورتیں زیادہ ہو جائیں تو آپ ایمان سے بتائیں کہ ان کا کیا حال ہوگا؟ اگر ایک آدمی کو چار لڑکیوں سے شادی کی اجازت نہ دی جائے تو اس کا کیا حال ہوگا؟ آدمی ایک بیوی پر بڑا فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ غیر شرعی سو بیویاں رکھ لوں گا تو جائز ہیں، لیکن نکاح کی چار نہ رکھوں گا۔

دوسری شادی پر اعتراض کیوں ہوتا ہے؟

ہندو اور کافر تہذیبوں کا ہمارے اوپر بھی اثر ہے۔ اگر ہمارے پاس جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور بڑے بڑے لوگوں کے پاس دس بیس عورتیں نہ ہوں تو وہ بڑے کہلاتے ہی نہیں ہیں، وہاں بیویاں ناراض نہیں ہوتیں، لیکن جب دوسری شادی کر لے تو پہلی بیوی طوفان کھڑا کر دے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کا دراصل جائیداد

کا جھگڑا ہے، دوسری عورت سے کوئی جھگڑا نہیں ہے؛ کیونکہ اگر اس دوسری عورت سے اولاد ہو جائے گی تو جائیداد ادھر تقسیم ہو جائے گی، ورنہ جو عورتیں آج کہتی ہیں کہ چار بیویاں ناجائز ہیں اور کل آپ اشتہار دے دیں کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں اور پانچ لاکھ حق المہر دوں گا اور ایک بنگلہ بھی دوں گا تو سب سے پہلے لائن لگا کر یہی کھڑی ہوں گی کہ ہمیں قبول کر لو۔ آپ کہیں کہ پہلے میری دو بیویاں ہیں تو وہ کہیں گی کہ کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ بھی تو ہماری بہنیں ہیں، آپ تو ہمیں علیحدہ محل دے رہے ہیں۔ تو یہاں وہ بات بھی بھول جائیں گی کہ پہلے کتنی بیویاں ہیں؛ کیونکہ حق المہر پانچ لاکھ جو ہے۔

اور اگر کوئی غریب آدمی اپنی عزت کو، اپنی عفت کو محفوظ کرنے کے لیے گناہوں سے بچنے کے لیے شادی کرنا چاہے تو پہلے اس کو کوئی دینے کے لیے تیار نہیں ہوگا اور اگر تیار ہو جائے تو لوگ کہیں گے کہ دیکھو دوسری شادی کر رہا ہے۔ چاہے وہ گناہ کرتا پھرے، حرام کھاتا پھرے، کوئی اعتراض نہیں کرے گا، مگر وہ حلال نہ کھائے۔

مسلمانوں پر زیادہ شادیاں کرنے کا الزام:

یاد رکھیں! بعض لوگ حضور اکرم ﷺ پر الزام لگاتے ہیں کہ آپ نے نو شادیاں کی ہیں اور مسلمان کا کام ہی یہی ہے کہ یہ کچا، پکا گوشت کھاتے ہیں اور عورتوں سے شادی کرنا ان کا کام ہے۔

یاد رکھیں! میرے پاک نبی ﷺ اتنے معصوم ہیں، پاک ہیں، شہوانیت اور حیوانیت سے اتنے دور ہیں کہ مکہ کے سارے دشمنوں نے ان کے نبی ہونے کا انکار کیا، لیکن میرے مدنی ﷺ کے کریکٹر پر کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ ابوجہل، ابولہب سے بڑا کوئی دشمن نہیں ہوگا۔ تاریخ عالم کو کھنگال ڈالیں کسی دشمن نے بھی حضور اکرم ﷺ کے کردار پر انگلی نہیں اٹھائی، کفار مکہ تو خود آپ کے پاس چل کر آئے کہ سارے مکہ کے سردار آپ کے سامنے ہیں، جس سردار کی لڑکی کو چاہو ہم آپ کے دروازے پر حاضر کر دیں گے، لیکن ہمارے خداؤں کو برا نہ کہو، اگر دولت چاہیے تو پورے مکہ کے خزانے حاضر ہیں، حکومت چاہیے تو تخت حاضر ہے، لیکن مہربانی کریں آپ جو ہمارے خداؤں کو برا کہتے ہیں تو ہمارے دلوں پر آرے چل جاتے ہیں۔ آپ نرمی کریں اور آپس میں کوئی سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ آج بھی کہتے ہیں کہ اتنی سخت تقریر نہ ہو، تاکہ آپ کا نام بھی لیا جائے۔

حضور ﷺ کی زیادہ شادیوں کی حکمت:

بہر حال کوئی دشمن آپ کے کردار پر اعتراض نہ کر سکا، آپ کی سب سے پہلی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں، محسنہ

اسلام، محسنہ محمد مصطفیٰ ﷺ۔ یہ خاتون اوّل ہیں، لیکن تمہارے ہاں ہر عورت خاتونِ اوّل بن جاتی ہے۔

یاد رکھیں! جب بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح ہوا اس وقت آپ کی عمر پچیس سال اور بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی اور ان کے دو خاوند پہلے ہو چکے تھے اور ان دونوں سے اولاد بھی ہے۔ خود اندازہ کریں کہ ایک عورت چالیس سال کی ہو جائے اور چار پانچ بچوں کی ماں بھی ہو، دو شوہر بھی گزر گئے ہوں، اس میں جوانی والی کون سی بات رہ گئی ہے؟ اور خاص طور پر گرم ملک کی عورت ہو، جس ملک کی پوری خوراک گرم ہو، وہاں چالیس سال کی عورت اور پانچ بچوں کی ماں بننے کے بعد اس کے اندر وہ کون سا جذبہ رہ جاتا ہے؟ لیکن حضور اکرم ﷺ کی صفتیں سن کر بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پہچان لیا کہ آگے جا کر انہوں نے کچھ بننا ہے، خدا کرے کہ یہ میرے نصیب میں آ جائے۔ اور اس کے باوجود دیکھ لیں کہ حضور اکرم ﷺ ساری ساری رات حراء میں بیٹھے ہیں، مہینہ مہینہ وہاں رہتے ہیں، اس کے بعد گھر آ کر رات گزارتے ہیں، بی بی صاحبہ کھانے کی چیزیں بنا کر دیتی ہیں تو حضور اکرم ﷺ پھر غاروں میں عبادت کے لیے جا رہے ہیں۔ اگر آپ نے خواہشِ نفسانی کے لیے شادی کی ہوتی تو آپ پندرہ سال کی لڑکیوں سے شادیاں کرتے۔ آج اگر بوڑھوں کو پیسے مل جائیں وہ بھی پندرہ سال والی کو لے آتے ہیں یا آپ چالیس سال کی بوڑھی سے شادی کر لیتے اور اس وقت مکہ والوں کا کوئی جھگڑا بھی نہیں تھا، جھگڑا تو چالیس سال کے بعد ہوا۔ جب حضور اکرم ﷺ نے توحید کی دعوت دی اور پھر جو حضور اکرم ﷺ کی شادیاں ہوئیں وہ ترپن سال کی عمر کے بعد ہوئیں اور زندگی کے آخری دو سالوں میں سب اللہ کے حکم سے ہوئی ہیں۔

بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے شادی اللہ کے حکم سے ہوئی، بی بی زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے شادی اللہ کے حکم سے ہوئی، بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا اور جس جس بیوی سے شادی ہوئی۔ اس کا ایک پس منظر ہے کہ اللہ کے حکم سے ہوئی ہیں۔ تو جب میرے مدنی پاک ﷺ نے تمام نکاح میرے اللہ کے حکم سے کیے ہیں اور اس عمر مبارک میں کیے ہیں جب آپ ﷺ کی عمر مبارک زیادہ ہو گئی تو نفسانی خواہشات کا الزام لگانا ماسوائے کفر کے، بغض باطن اور شقاوتِ قلبی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ دشمن تو دشمن ہے، جو مرضی آئے کہہ دے۔

کئی بیویوں کو اسلام میں تحفظ:

اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے اور ساتھ پابندی لگائی کہ پانچویں نہیں کر سکتے اور یہ بھی کہا کہ اگر

عدل نہیں کرو گے تو قیامت کے دن فالج زدہ اٹھائے جاؤ گے، تاکہ محشر والے دیکھ لیں کہ اس کی دو بیویاں تھیں، لیکن ان میں عدل نہیں کرتا تھا۔ اسلام نے عورت کی حفاظت کی، تاکہ وہ بازار کی زینت نہ بنے، اوپن ایئر تھیٹر نہ بن جائے۔ وہ کسی کے عقد نکاح میں جائے، کسی کی بیوی بنے اور اس کو تحفظ ملے۔

عورت کئی خاوند نہیں رکھ سکتی:

اور دوسری بات یاد رکھیں کہ عورت کو اسلام نے حکم نہیں دیا کہ وہ چار خاوند رکھ سکے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کو حاکم بنایا ہے: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ [النساء: ۳۴] اور عورت کو محکوم بنایا ہے۔ ایک حاکم کے نیچے محکوم تو زیادہ ہو سکتے ہیں، لیکن ایک محکوم کے اوپر حاکم زیادہ ہوں تو کام ٹھپ ہو جائے گا۔ اب دیکھ لیں! بادشاہ ایک ہے، لیکن اس کے کئی وزیر مشیر ہیں، کام چل رہا ہے، لیکن اگر اوپر چار بادشاہ ہوں تو گاڑی نہیں چلے گی۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ جب چار خاوند ہوں، بیوی ایک ہو اور ایک وقت میں چاروں کو ضرورت پڑ جائے تو وہ کیا کرے گی؟ اس کے بعد نطفہ کا فیصلہ کریں گے کہ یہ کس کا ہے؟ اگر ایک بچہ ہو اس کو تقسیم کرنا پڑے تو کیا اس کو ٹکڑے ٹکڑے کریں گے؟

پسند اور حلال کی جگہ شادی کرو:

یاد رکھیں! اسلام نے جو بھی حکم دیا ہے عین عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ اس کے دو ترجمے ہیں: ایک ترجمہ ہے کہ جو پسندیدہ ہو؛ کیونکہ ہر آدمی اپنی پسند کی شادی کرتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہے کہ ''مَا أُحِلَّ لَكُمْ'' جو تمہارے لیے حلال ہو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ وہ ہے جو حلال ہو۔ حرام چاہے کتنا اچھا ہو وہ پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ تو معنی ہوا کہ جو رشتے تمہارے لیے حلال ہیں۔

کس کس عورت سے نکاح حرام ہے؟

اللہ تعالیٰ نے ایسا معاشرہ بنا دیا کہ بعض رشتوں کے اندر حرمت ابدی ہے کہ ہمیشہ کے لیے حرام ہیں۔ کوئی آدمی ماں سے نکاح نہیں کر سکتا، جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں یہ بھی ہوتا تھا کہ ہماری عورت ہے، گھر سے باہر کیوں جائے یا ماں اپنی جائیداد کا حصہ لے کر گھر سے باہر کیوں چلی جائے؟ اگر کچھ لوگ حقیقی ماں سے نکاح نہیں کرتے تھے، لیکن

سوتیلی ماں سے عام رواج تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ماں حرام کردی، بہن حرام کردی، بیٹی حرام ہوگئی، خالہ حرام ہوگئی۔ ان سب رشتوں پر پابندیاں لگادیں اور فرمایا: دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع نہ کرو کہ ایک آدمی نکاح کرتا ہے، ابھی اس کی بیوی موجود ہے اور وہ اس کی دوسری بہن سے شادی کرلے یہ منع ہے۔ دو بہنوں کو ایک وقت میں ایک گھر کے اندر جمع ہونا شریعت نے حرام کردیا ہے۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ ایک بہن سے شادی کی تھی، اس کو طلاق دے دی یا وہ بے چاری مرگئی، اس کی عدت گزرنے کے بعد اس کی دوسری بہن سے شادی کرلی یہ جائز ہے، لیکن دو بہنیں بیک وقت نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں۔

دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کیوں حرام ہے؟

یہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے حکم دیا، تاکہ عورت پر ظلم نہ ہو؛ کیونکہ اگر وہ ایک مرد کی بیویاں بن جائیں تو لازماً ہر عورت یہ چاہتی ہے کہ خاوند کا میلان میری طرف زیادہ ہو تو اس طرح دوسری بہن پر ظلم ہوتا اور اس کے اندر حکمت بھی ہے۔ دیکھ لیں! آج جتنے فتنے اٹھتے ہیں اکثر لوگ سالیوں کے ساتھ ...... نعوذ باللہ ...... تعلقات قائم کرلیتے ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ بہن نے اپنی بہن کا گھر برباد کیا ہے۔ عورتیں طعنہ تو مرد کو دیتی ہیں، لیکن سب سے زیادہ ظالم عورت ہوتی ہے، جو اپنی بہن کو بھی نہیں دیکھ سکتی، اپنی بہن کے گھر کو بھی نہیں دیکھتی، اپنی بہن کو نکلوا کر خود شادی کرلیتی ہے۔

عورت کا مرد پر ظلم:

اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا کہ جب شادی ہوتی ہے تو پہلے دن سے ہی یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ آپ ہماری لڑکی کو علیحدہ رکھیں گے؛ کیونکہ ہم نے تمہاری ماں کی خدمت کے لیے کوئی نوکرانی تو نہیں بھیجی۔ اور وہ پہلے دن سے مرد کو اس کی ماں سے کاٹ رہی ہے۔ عورت پر ظلم ہو رہا ہے کہ جس عورت نے اس کو پیٹ میں رکھا تھا تم اسی سے علیحدہ کر رہی ہو، جس باپ کے نطفے سے وہ پیدا ہوا تھا آج اس سے اس کو علیحدہ کر رہی ہو؟ صاف بات ہے کہ جب وہ علیحدہ رہے گا تو ماں باپ کے گھر میں کبھی کبھی جائے گا؛ کیونکہ اس کی بیوی علیحدہ ہے، اس کا کھانا علیحدہ ہے۔

اگر اس کے اندر قربانی کا جذبہ ہوتا تو کہتی: آپ اپنے والدین کے گھر میں رہیں، ان کی خدمت کا موقع ملے گا، ان کو کسی خادم اور نگران کی ضرورت ہے، اس لیے ہم وہیں رہیں گے، لیکن وہ اگر ایسا کرے تو وہ بیوی بیوی نہ رہی؛

کیونکہ بیوی تو وہ ہے جو سب سے علیحدہ کر دے۔

ہر آدمی کے لیے چار بیویوں کا حکم لازمی نہیں ہے:

اسی لیے اسلام نے جو حکم فرمایا اس میں حکمتیں ہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر کوئی شادی کرنا چاہے، اس کو بیک وقت چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ یہ حکم نہیں کہ ہر آدمی لازماً چار شادیاں کرے؛ کیونکہ ہر آدمی کے احوال مختلف ہیں۔ ایک آدمی ہے جو ایک بیوی کے ساتھ بھی گزارہ نہیں کر سکتا، وہ کمزور ہے۔ اور ایک آدمی ایسا ہے کہ اس کا ایک بیوی سے گزارہ نہیں ہوسکتا، اس کو اللہ نے زیادہ قوت اور طاقت دی ہے، اس کے روزانہ کے حقوق ادا کرنے سے اس کی بیوی قاصر ہے۔

دوسری شادی کی ضرورت کیوں ہے؟

اور دوسری بات یہ ہے کہ اس قسم کا آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے قوت وطاقت دی ہے جب عورت آٹھ دن کے لیے حیض میں ہوگئی یا عورت حاملہ ہوگئی، عورت نفاس میں ہے، ولادت کے مراحل میں ہے، دودھ پلانے کے مراحل میں ہے، پھر ایک بچہ، پھر دو بچے، پھر تین بچے، پھر چار بچے ہوگئے۔ اب ان کی لمبی ذمہ داریاں ہیں اور خاوند کے بھی اپنے تقاضے ہیں تو کیسے پورے ہوں گے؟ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی نے بڑے شوق سے شادی کی، لیکن اولاد نہیں ہوئی۔ اب اس نے جا کر لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا تو فیصلہ ہوگیا کہ عورت میں نقص ہے، بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے تو کیا وہ طلاق دے دے؟ کاٹ کر پھینک دے؟ اب اس عورت کا آخر کیا گناہ ہے؟ اگر مرد کو دوسری شادی کی اجازت نہ ہو تو کیا مرد پہلی بیوی کو طلاق دے دے؟ تو پھر یہ ظلم نہیں ہوگا؟ اس لیے اسلام نے دوسری شادی کی اجازت دے دی کہ پہلی عورت کو طلاق نہ دو، اس کے حقوق بھی ادا کرو۔ اگر وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں تو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے، تمہارے اندر بھی یہ نقص ہوسکتا تھا۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی نے شادی کرلی، بیوی گھر میں آگئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بیوی کو کوئی ایسی بیماری ہے جو متعدی ہے۔ تو کیا اب وہ اس کو گھر سے باہر نکال دے؟ طلاق دے دے؟ کہ مجھے تو ایک شادی کرنی ہے، دوسری تو میں نہیں کرسکتا۔ ایسے ملک جو اپنے آپ کو ایڈوانس ملک کہتے ہیں، وہاں شہزادیوں کو طلاقیں ہو رہی ہیں؛ کیونکہ قانون میں گنجائش نہیں ہے۔ اگر اسلام پر عمل ہوتا تو پہلی بیوی دھکے نہ کھاتی، بچے در بدر نہ ہوتے۔

کسی ملک کے اندر جنگ ہو جائے اور وہاں مرد مارے جائیں، عورتیں زیادہ ہو جائیں تو ان عورتوں کا کیا کیا جائے؟ کیا ایکسپورٹ کے دفاتر کھولے جائیں کہ ہمارے ملک میں عورتیں زیادہ ہیں، جس ملک میں مرد زیادہ ہوں وہ ہم سے لے لیں۔ اگر ہم اسلام کے قانون کو مان لیں کہ ایک بندہ چار بیویاں رکھ لے تو الحمد للہ تقسیم برابر ہو جائے گی، کسی کو ملک چھوڑنے اور دربدر ہونے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور اسلام نے ان کو حقوق دیے ہیں کہ اگر دو یا تین بیویاں ہیں، حکم ہے کہ عدل کریں۔

یتیم کے مال کی حفاظت:

﴿وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ﴾ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر حکم فرمایا کہ یتیموں کا مال ان کو دیا جائے، جب وہ صحیح معنی میں عاقل و بالغ ہو جائیں؛ کیونکہ بعض اوقات آدمی بالغ تو ہوتا ہے، لیکن اس کو رشد اور کمال حاصل نہیں ہوتا اور اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کی جائیداد ضائع کر دے گا۔ اس لیے ورثاء احتیاط کریں، ان کو مال اس وقت دیں جب وہ صحیح معنی میں عقل و فہم والے ہو جائیں۔ بعض بچے کم عمر ہوتے ہیں، لیکن سمجھدار ہوتے ہیں اور بعض بیس سال کے ہو جاتے ہیں، لیکن عقل پندرہ سال والے کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے یتیم کے مال کو حفاظت کے ساتھ رکھا جائے۔ جب وہ عقل وافر کو پہنچ جائیں تو ان کو ان کا مال سونپ دیا جائے، ان کے مال کو بدل کر یا کسی شکل میں بھی ضائع نہ کیا جائے؛ کیونکہ یہ حقوق العباد ہے اور یہ اموال یتامی ہے کہ ایسے کمزور لوگ جن کا اللہ کے سوا کوئی معاون، والی اور ناصر نہیں۔

حلال رزق ملنے سے پہلے حرام کی طرف مت دوڑو:

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے تھے: "لَا تَعْجَلْ بِالرِّزْقِ الْحَرَامِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكَ الرِّزْقُ الْحَلَالُ الَّذِي قُدِّرَ لَكَ." [تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۲۰۷] میرے بھائی! جلدی جلدی حاصل کرنے کے لیے رزق حرام حاصل نہ کرو۔ یعنی آدمی سمجھتا ہے کہ ابھی یتیموں کا مال ملتا ہے کھالو، پھر دیکھا جائے گا۔ یا جلدی رزق ملے، چاہے نشہ بیچ کر ملے، حرام بیچ کر ملے، یتیموں کا مال کھا کر ملے یا ہمیں سودی معاملات کے اندر ملے۔ اس لیے فرمایا: جلدی نہ کرو اور صبر کرو۔ جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے رزق حلال لکھا ہے وہ تجھے ملے گا۔ جلدی کر کے رزق حرام بربادی کا باعث ہے۔ وقتی طور پر تو کہا جاتا ہے کہ یہ کتنا سمجھدار آدمی ہے کہ چند مہینوں کے اندر کروڑوں پتی بن گیا ہے، لیکن جب آپ اس کا انجام

دیکھیں گے تو کہا جاتا ہے کہ عبرت حاصل کریں گے۔ جیسا کہ لوگوں نے جب قارون کو دیکھا کہ وہ اپنے خزانے کے ساتھ نکلا ہے اور اس کے خزانوں کا یہ عالم تھا کہ تین سو سے زیادہ خچر اس کے خزانے کی چابیاں اٹھاتے تھے تو خود اندازہ لگائیں کہ اس کے خزانے کتنے ہوں گے؟ ایک دن وہ اپنے لشکر کے ساتھ نکلا تو بعض لوگ کہنے لگے: ﴿یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ ۙ﴾ [القصص: ۷۹] ہائے! ہمیں بھی ملتا۔ دیکھو! کیسے مزے ہیں!! جب اللہ تعالیٰ نے قارون کو پکڑ لیا تو کہنے لگے: اچھا ہوا کہ ہمیں ایسا نہیں ملا۔

یتیم کا مال کھانے کی صورتیں:

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے تھے: "لَا تَتَبَدَّلُوا الْحَرَامَ مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْحَلَالِ مِنْ أَمْوَالِكُمْ، يَقُولُ: لَا تُبَذِّرُوا أَمْوَالَكُمُ الْحَلَالَ وَتَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمُ الْحَرَامَ." [تفسیر ابن کثیر] کیا بے وقوفی کرتے ہو کہ حرام مال لے کر اپنے حلال کو تبدیل کر رہے ہو؟ کیونکہ لوگوں کا جو مال مار رہے ہو یہ مال تو حرام ہے تو کیا فائدہ ہوا؟

حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ اور حضرت زہری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ "لَا تُعْطِ مَهْزُولًا وَتَأْخُذْ سَمِينًا." [ایضا] اپنی کمزور بکری دے دی اور موٹی تازی لے لی، یعنی اپنا کمزور مال یتیم کے مال میں شامل کر دیا اور یتیم کا اچھا مال اپنے مال میں شامل کر لیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ اپنا کھوٹا سکہ ادھر ڈال دیا اور کھرا پیسہ لے لیا۔ یہ بھی تبدیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرو۔

حضرت مجاہد، حضرت سعید بن جبیر، ابن سیرین، مقاتل بن حیان، سدی اور سفیان بن حسین رحمہم اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اپنے مال کو یتیم کے مال کے ساتھ ملا دیا اور ظاہر کیا کہ ہم تو اپنے ساتھ یتیم کو کھلاتے ہیں، اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور ہر چیز مشترک ہے، ہم اس کو علیحدہ نہیں سمجھتے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس طرح اس کے مال کو کھا لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ②﴾ ایسا کرنا بہت بڑا گناہ ہے؛ کیونکہ یاد رکھیں! ایک تو قطع رحمی کا گناہ ہے، دوسرا مظلوم پر ظلم کا گناہ ہے اور تیسرا حقوق العباد کا کھانا ہے۔ اور یہ ایسا گناہ ہے کہ یہ اللہ بھی معاف نہیں کرتے جب تک کہ بندہ معاف نہ کرے یا اس کا حق ادا نہ کرے۔ اس لیے علماء، فقہاء اور مفسرین نے لکھا ہے کہ اگر تم نے کسی کا حق دینا ہے اور وہ بندہ مر گیا تو اس کے وارثوں کو دو۔ اور بعض اوقات ایسے حالات بھی ہیں کہ اس کے وارث بھی نہیں مل رہے تو پھر بھی حکم ہے کہ خیرات کر دو۔ اللہ تعالیٰ

اس کو بھی اجر دیں گے اور تمہیں بھی ثواب دیں گے۔

کتنی دکھ والی بات ہے کہ آج لوگ سب سے زیادہ انہی معاملات میں بے احتیاطی کرتے ہیں۔ نماز پڑھنا اپنی بھلائی ہے، تم اگر نافلہ عبادت کرتے ہو، قرآن پڑھتے ہو، روزہ رکھتے ہو تمہاری بھلائی ہے۔ حقوق العباد میں بات یہ ہے کہ تمہارا لوگوں کے ساتھ معاملہ کیسے ہے؟ دین کو وہاں آزمایا جائے اور اس مسئلہ میں ہمارے طبقہ کا حال اچھا نہیں ہے۔ ہم نے بہت کم لوگ دیکھے ہیں جو احتیاط کرتے ہیں۔

ہم نے ایسے اساتذہ بھی دیکھے ہیں جب ان کے پاس جا کر ٹھہرو، ہم نے مدرسے سے کھانا منگوا کر کھا لیا، تا کہ استاذوں کو تکلیف نہ ہو تو صبح استادوں نے باقاعدہ پوچھا: کل صاحب رات کو کھانا کون لایا تھا؟ ہم نے کہا: طالبوں کے ساتھ ہم نے کھا لیا۔ انہوں نے فرمایا: لنگر میں آپ کے لیے نہیں پکا تھا، آپ ہمارے مہمان تھے، آپ مدرسہ کے مہمان تو نہیں تھے۔ تو انہوں نے پوچھا کہ ایک طالب علم کے کھانے کا کتنا خرچہ ہے؟ بتایا گیا کہ دو روپے ہیں تو انہوں نے دو روپے دے دیے کہ یہ لے لو اور مدرسہ میں جمع کرا دو؛ کیونکہ یہ ہمارا مہمان ہے۔ ہم قیامت کے دن اللہ کو کیا جواب دیں گے؟

طلاق دینا اللہ کو ناپسند ہے:

﴿اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝﴾ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿حُوْبًا﴾ کا معنی گناہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تو آپ نے فرمایا: ((يَا أَبَا أَيُّوبَ! إِنَّ طَلَاقَ أُمِّ أَيُّوبَ كَانَ حُوبًا)) [المعجم الکبیر، رقم: ۳۲۸] اے ابو ایوب! تم نے گناہ کیا ہے، تم نے ام ایوب کو کیوں طلاق دی ہے؟

مقصد یہ تھا کہ بلا وجہ طلاق دینا گناہ ہے۔ اگر کوئی جائز وجہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے راستہ رکھا ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حلال میں مبغوض چیز طلاق ہے۔ اپنی بیوی کی اصلاح کی کوشش کرے، جب کوئی راستہ نہ رہے تو اللہ تعالیٰ نے طلاق کا راستہ رکھا ہے۔

طلاق دینے کا سنت طریقہ:

لیکن پھر بھی طلاق میں جلد بازی نہ کرو اور سنت کے مطابق طلاق دو کہ عورت حیض سے پاک ہو جائے اور اس

طہر میں میاں بیوی نہ ملیں، اس میں ایک طلاق دے۔ اور اگر دوسری طلاق دینی ہو تو دوسرے طہر میں دے اور اگر تیسری طلاق دینی ہو تو تیسرے طہر میں دے۔ طہر عورت کے پاکیزگی کے ایام کو کہتے ہیں۔

عدل نہ ہو سکے تو یتیم لڑکی سے شادی نہ کرو:

حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ((الْحُوبُ الْإِثْمُ)) حوب کا معنی گناہ ہے۔

بعض روایات کے اندر یہ آتا ہے کہ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے طلاق دینے کا ارادہ کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: طلاق دینا بہت بڑا گناہ ہے۔ [مستدرک حاکم: ۲/ ۳۰۲]

لہٰذا اب آیت کا معنی یہ ہوا کہ یتیموں کا مال ملا کر کھانا بہت بڑا گناہ ہے اور بہت بڑی خطا ہے۔ یتیموں کے مال سے بچو۔

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ﴾

یعنی اگر کسی کی گود میں یتیم لڑکی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں اس سے شادی کروں، لیکن سمجھتا ہے کہ میں عدل نہیں کرسکوں گا اور حق المہر بھی اس کے ہم پلہ عورتوں کے برابر نہیں ادا کرسکتا تو فرمایا کہ تم یتیم لڑکی سے شادی نہ کرو، تمہارے لیے عورتوں کی تنگی تو نہیں ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ ایک آدمی کے پاس ایک یتیم لڑکی تھی اور اس کا باغ تھا اور اس آدمی نے اس لڑکی کو اپنے پاس روکا ہوا تھا، حالانکہ اس کو اس لڑکی میں کوئی رغبت نہیں تھی تو اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ﴾۔

راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی اس آدمی کے ساتھ اس باغ اور اس کے مال میں شریک تھی، تا کہ اس کے باغ کو اور اس کے مال کو وہ ہضم کرلے؛ کیونکہ اگر وہ اس کی شادی دوسری جگہ کرتا تو لازمی بات ہے کہ جائیداد جاتی، لہٰذا جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے لڑکی سے شادی کرلی۔ اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ یتیم لڑکیوں پر ظلم نہ کرو۔ اگر ان سے نکاح کرو تو عدل کرو، مہر دو، برابری کرو، عزت دو، ورنہ بصورتِ دیگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دوسری عورتیں رکھی ہیں۔ اس لیے بلا وجہ یتیم لڑکیوں سے شادی کرکے ان پر ظلم نہ کرو۔ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اس

آیت ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمٰى﴾ کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: میرے بھانجے! یہ یتیم لڑکی اپنے ولی کی پرورش میں تھی اور اس کے مال میں شریک تھی اور اس کے ولی کو اس کا مال اور جمال اچھا لگتا تھا تو اس کا ولی چاہتا تھا کہ اس کے مہر میں انصاف کیے بغیر اس سے نکاح کرلے تو ان کو منع کر دیا گیا کہ ان سے انصاف کیے بغیر ان سے نکاح نہ کریں اور ان کے بارے میں مہر کے سب سے اعلیٰ طریقہ پر پہنچیں۔ اور ان اولیاء کو حکم دیا گیا کہ ان یتیم لڑکیوں کے علاوہ ان کو جو عورتیں اچھی لگیں ان سے نکاح کرلیں۔

حضرت عروہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: لوگوں نے اس آیت ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمٰى﴾ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيمًا﴾ [النساء: ۱۲۷] ''اور (اے پیغمبر!) لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں شریعت کا حکم پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ اللہ تمہیں ان کے بارے میں حکم بتاتا ہے، اور اس کتاب (یعنی قرآن) کی جو آیتیں جو تم کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں وہ بھی ان یتیم عورتوں کے بارے میں (شرعی حکم بتاتی ہیں) جن کو تم ان کا مقرر شدہ حق نہیں دیتے اور ان سے نکاح کرنا بھی چاہتے ہو، نیز کمزور بچوں کے بارے میں بھی (حکم بتاتی ہیں) اور یہ تاکید کرتی ہیں کہ تم یتیموں کی خاطر انصاف قائم کرو۔ اور تم جو بھلائی کا کام کرو گے، اللہ کو اس کا پورا پورا علم ہے۔''

حضرت عروہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ﴾ [النساء: ۱۲۷] جب یتیم لڑکی قلیل مال والی اور کم خوبصورت ہو تو تمہاری رغبت کم ہو جاتی ہے۔ تو ان اولیاء کو ان یتیم عورتوں سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا جن کے مال اور جمال میں انصاف کے بغیر رغبت رکھتے ہوں۔ یہ منع اس وجہ سے کیا گیا کہ وہ عورتیں جب کم مال دار اور کم خوبصورت ہوں تو یہ ان سے بے رغبت ہو جاتے ہیں۔ [بخاری، رقم: ۴۵۷۳]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: ﴿جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا أُولِيٓ أَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ﴾ [الفاطر: ۱] اللہ تعالیٰ کے فرشتوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کے دو پر ہیں، بعض کے تین پر ہیں اور بعض کے چار پر ہیں اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہاں زیادہ کی نفی نہیں ہے اور یہاں زیادہ پر پابندی ہے کہ

اللہ کے نبی ﷺ نے سمجھا دیا کہ چار نکاحوں سے زیادہ نکاح نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اس آیت کو سامنے رکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جتنے مرضی آئیں نکاح کرلو۔ اس لیے مفسرین رحمہم اللہ نے فرمایا: یہ جگہ بندوں کے لیے امتنان واحسان ہے۔ اگر چار سے زیادہ کی اجازت ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہاں فرمادیتے کہ پانچ چھ آٹھ کرلو، لیکن جب پابندی آگئی تو اب کوئی چار سے زیادہ نکاح نہیں کرسکتا۔

چار سے زیادہ شادیاں حضور ﷺ کی خصوصیت تھی:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض لوگ کہتے ہیں کہ نو شادیاں اس لیے جائز ہیں؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کی نو بیویاں تھیں، حالانکہ اگر غور کریں تو گیارہ تھیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیق میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ نے تو پندرہ بیویوں سے نکاح کیا، تیرہ عورتوں کے پاس آپ تشریف بھی لے گئے، یعنی شادی ہوئی اور آپ کے پاس ایک وقت میں گیارہ بیویاں بھی رہیں، لیکن آپ کی وفات مبارک ہوئی تو آپ کے پاس نو بیویاں تھیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ سے لے کر آج تک تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ وہ حضور اکرم ﷺ کی خصوصیت تھی۔ اللہ نے اپنی نبی کو اجازت دی تھی اور کسی کو اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ اس پر احادیث دلالت کررہی ہیں کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو بعض ایسی خصوصیات دی تھیں جو اور کسی کو نہیں ملیں، حتیٰ کہ صحابہ کہتے ہیں: اگر حضور ﷺ ایک لاکھ کے مجمع میں بھی کھڑے ہوجائیں تو سب سے اونچے نظر آتے تھے۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ کا قد بہت لمبا نہیں تھا اور نہ چھوٹا تھا، بلکہ بالکل اعتدال پر تھا، لیکن یہ آپ کی شان تھی کہ جہاں کھڑے ہوتے اونچے نظر آتے تھے اور یہ بھی آپ ﷺ کی خصوصیت تھی کہ جب آپ چلتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اوپر سے نیچے کی طرف آرہے ہیں۔

لونڈیوں سے شادی کے مسائل:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ③﴾ اگر تم ڈرتے ہو کہ تم چار عورتوں میں برابری نہیں کرسکو گے تو ایک بیوی سے شادی رکھو یا وہ لونڈیاں جو جہاد میں تمہارے حصے میں آئیں، وہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں۔ پھر ان کے حقوق اتنے نہیں ہوتے جتنے حرہ آزاد عورتوں کے حقوق ہوتے ہیں۔

اسلام پر لونڈیوں کے بارے میں اعتراض کیا جاتا ہے۔ یہ جاہلانہ اعتراض ہے۔ پروپیگنڈہ اتنا زیادہ کردیا

جاتا ہے کہ مسلمان بھی گھبرا جاتے ہیں کہ اچھا اسلام میں لونڈی جائز ہے؟ جب قرآن حکیم ہے تو مسلمانوں کو سوچنے، ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟

اصل مسئلہ سمجھیں کہ امیر المومنین باقاعدہ شریعت کے حکم کے مطابق جہاد کرے، یہ نہیں کہ کرسی کے لیے لڑ پڑیں یا ملک حاصل کرنے کے لیے لڑ پڑیں یا کسی کی دولت حاصل کرنے کے لیے لڑ پڑیں، یہ جہاد نہیں، بلکہ فساد ہے۔ جہاد وہ ہوتا ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے، اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کیا جائے۔ اور باقاعدہ امیر المومنین کی بیعت ہو، اس کے مطابق مسلمان جہاد کریں اور جب اللہ تعالیٰ فتح دے دیں اب کافروں کا جتنا مال ان کے قبضے میں آیا ہے وہ مالِ غنیمت ہے۔ ان کے لڑکے، لڑکیاں، مرد، عورتیں جو قید ہوں گے وہ غلام ہوں گے۔

اب مثلاً: ایک سو لڑکے اور ایک سو لڑکیاں قید ہوگئیں۔ تو اگر آپ کو زیادہ عقل ہے تو آپ بتائیں کہ ان کا کیا کریں؟ اسلام پر اعتراض بعد میں کریں: ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم ان کو چھوڑ دیں، ان کو کوئی سزا نہ دیں تو یہ اب کہاں جائیں؟ کیونکہ ان کا ملک تو آپ نے فتح کرلیا ہے، ان کے باپ دادا مارے گئے ہیں۔ اب وہ کسی دوسرے ملک میں جا کر گناہ کریں؟ یا آپ ان کو کب تک قید میں ڈالیں گے یا آپ زبردستی ان کو کلمہ پڑھائیں گے؟ آخر آپ کو ان کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کرنا ہے۔ اسلام نے کتنا عادلانہ فیصلہ کردیا ہے کہ ایسی لڑکیاں مجاہدین میں تقسیم کردو، یہ ان کے لیے ہیں۔ اور ان کو حکم دے دیا کہ خبردار! ان پر کوئی ظلم اور زیادتی نہ ہو، لیکن اگر تم ان کو آزاد کرکے بیوی بنالو تو تمہیں اللہ تعالیٰ دہرا اجر دیں گے۔ اور حکم دے دیا کہ اگر رمضان میں تم سے کوئی غلطی ہوجائے تو غلام آزاد کرو۔ اگر تم اپنی بیوی کو کہہ بیٹھے ہو کہ تو ماں کی طرح ہے، تو ایک غلام آزاد کرو۔ تو اسلام نے یہ احکامات اس لیے دیے ہیں، تاکہ غلام آزاد بھی ہوجائیں اور ان کی حفاظت بھی ہوجائے اور مفتوحہ لڑکیوں کو کوئی چھت بھی مل جائے۔

﴿اَلَّا تَعُوْلُوْا﴾ کا معنی:

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ؃﴾

بعض مفسرین رحمہم اللہ نے ﴿تَعُوْلُوْا﴾ کا معنی اہل وعیال کیا ہے۔ اور بعض مفسرین رحمہم اللہ نے اس کا معنی فقر کیا ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس تفسیر پر اعتراض ہے؛ کیونکہ اگر زیادہ اولاد کا ڈر ہے تو وہ باندیوں سے بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ اس لیے اس کا اصل معنی ''اَلَّا تَجُوْرُوْا'' ہے کہ تم ظلم سے بچ جاؤ گے۔ یعنی اگر چار رکھتے ہو تو عدل

نہیں کر سکتے تو ایک کرو۔ اور اگر تمہارے پاس باندی ہے تو اس کو بھی رکھ سکتے ہو، یہ قریب ہے اس بات کے کہ تم ظلم سے بچ جاؤ گے۔ جیسا کہ ابو طالب نے اپنے مشہور قصیدہ میں عائل کا معنی ظلم لیا ہے۔

بِمِيزَانِ قِسْطٍ لَا يَخِيسُ شُعَيْرَةً
لَهُ شَاهِدٌ مِنْ نَفْسِهِ غَيْرُ عَائِلٍ

میزان انصاف ایسا کرو جو کے برابر بھی نقص نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے اپنے نفس خود گواہی دے رہے ہوں گے اس پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

اور جیسا کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اہل کوفہ نے کچھ لکھا تھا تو آپ نے ان کو جواب دیا تھا ''إِنِّي لَسْتُ بِمِيزَانٍ لَا أَعُولُ.'' میں کوئی ایسا میزان نہیں جو ظلم کرنے والا ہوں، بلکہ میں عدل کرتا ہوں، انصاف کرتا ہوں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس آیت ﴿ذٰلِكَ أَدْنٰى أَلَّا تَعُولُوا۝﴾ کا معنی ''ظلم نہ کرو'' روایت کیا گیا ہے۔

اور ایک روایت کے اندر حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ، حضرت مجاہد، حضرت عکرمہ، حضرت حسن، حضرت ابو مالک، حضرت ابورزین، حضرت نخعی، حضرت شعبی، حضرت عطاء الخراسانی، حضرت ضحاک، حضرت قتادہ، حضرت سدی، حضرت مقاتل بن حیان رحمہم اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ﴿أَلَّا تَعُولُوا﴾ کا معنی ''أَلَّا تَمِيلُوا'' ہے کہ ایک طرف میلان نہ کرنا؛ کیونکہ یہ بھی ظلم ہے۔

حق مہر کی ادائیگی کے مسائل:

﴿وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً﴾

تم عورتوں کو حق مہر فریضہ سمجھ کر ادا کرو۔

ایک مہر عاجلہ ہوتی ہے اور دوسری آجلہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ آپ کے ہاں لکھا جاتا ہے مہر معجّل اور مہر مؤجل۔ ''معجّل'' کا معنی ہے جو فوراً ادا کیا جائے اور ''مؤجل'' کا معنی ہوتا ہے جو بعد میں ادا کیا جائے۔ مثلاً بوقت نکاح طے ہو گیا کہ دس ہزار ریال مہر ہے: پانچ ہزار معجّل اور پانچ ہزار مؤجل ہے۔ اس کا معنی ہے کہ پانچ ہزار تو ابھی ادا ہوں گے اور پانچ ہزار دیر سے ادا ہوں گے۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن جو جلدی ادا ہونے کی شرط ہے وہ فوراً ادا ہونے چاہئیں۔ اکثر علماء کا یہی حکم ہے کہ میاں بیوی کے ملنے سے پہلے حق المہر ادا ہو جائے۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ حق المہر

کی جو رقم ہے یہ خالص بیوی کا حق ہے۔ اس کے ماں باپ کا، اس کے بھائیوں کا اور اس کے رشتہ داروں کا کسی کا کوئی حق نہیں ہے۔

عرب کے اندر یہ ہے کہ نکاح کی شرائط طے ہونے کے بعد باقاعدہ حق المہر نکاح سے بھی پہلے دے دیا جاتا ہے۔ جو شریف والدین ہیں وہ یہ کرتے ہیں۔ مثلاً: خاوند نے دس ہزار ریال حق المہر دیا۔ والدین اپنی طرف سے دس ہزار، بیس ہزار اور ملا کر دے دیتے ہیں کہ یہ تمہارے خاوند نے دیا ہے اور یہ ہماری طرف سے ہے۔ اب اپنی منشاء سے تم سامان کی خریداری کرلو تو وہ بچی اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر سودا خرید لیتی ہے۔

اور ہمارے ملکوں کے اندر یہ رواج ہے کہ پہلے تو جو حق المہر لکھتے ہیں جھوٹا لکھتے ہیں۔ یعنی دیکھا کہ بڑے گھر کے اندر رشتہ ہو رہا ہے تو لکھ دیا کہ ایک مربع زمین، دو لاکھ روپے نقد، ایک کوٹھی۔ کیونکہ اس کو پتہ ہے دینا تو نہیں ہے۔ اب دوسرے قانونی طور پر مضبوط کراتے ہیں کہ نکاح نامہ میں لکھا جائے، پھر اقرار نامہ میں لکھا جائے، لیکن جب نیت نہ ہو تو اسٹام کا کیا کریں گے؟ اصل بات تو اللہ کا ڈر ہے۔ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے، اگر نہ بھی لکھو وہ نہیں کھائے گا، بلکہ وہ تمہارے گھر میں آ کر منت کرے گا کہ اپنے پیسے لے لو، کل کو میں مر نہ جاؤں اور میری اولاد نہ دے، میں اپنی قبر کیوں خراب کروں؟ جبکہ کوئی تحریر نہیں ہوتی۔ اور اگر نیت ہی خراب ہو تو:

؎ عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے

جس نے دینا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور بیوی کو ادا کر دے۔ یہ نہ ہو کہ قیامت میں بندہ اپنی بیوی کی وجہ سے جہنم میں چلا جائے۔

دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ بیوی حق المہر معاف کر دے۔ معاف کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم اسے رات کو ہی کہو کہ حق المہر معاف کرنا ہے یا گھر جانا ہے؟ یہ ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ آپ اس کو اس کا حق دیں، مگر وہ کہے کہ میں نہیں لینا چاہتی۔ آپ کہیں کہ اپنے پاس رکھ لو، یہ تمہارا حق ہے، اسلام نے، شریعت نے یہ حق دیا ہے، یہ تم رکھ لو۔ اب وہ دو ماہ بعد تین ماہ بعد اپنی مرضی سے واپس کر دے تو ٹھیک ہے۔ اب تم استعمال کر سکتے ہو، وہ خالص تمہارے لیے حلال ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی سے معاف کر دے۔

اسی طرح علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک آدمی بیوی سے اتنا پیار کرے، اتنا پیار کرے اور جب دیکھے وہ پیار میں

مخمور بیٹھی ہے تو اس وقت اس کو کہے کہ حق المہر معاف کردو تو علماء نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم یہ بھی دھوکہ دے رہے ہو۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ مولوی لوگ چندہ کرتے ہیں کہ مدرسہ میں اتنے یتیم بچے ہیں مرجائیں گے، برباد ہوجائیں گے۔ اس طرح سے پیسہ نکالنا اور ڈاکے سے پیسے نکالنا برابر ہے؛ کیونکہ تم نے اس طرح کی کہانی پیش کی کہ اس نے جیب سے پیسے نکال دیے۔ اس طرح پیسہ لینا حرام ہے، تمہارا کام یہ ہے کہ اپنی ضرورت ان کے سامنے رکھ دو، دل کرے دے دو، نہ دو تو فی امان اللہ، میں جا رہا ہوں۔

اسلام نے یہ بھی شرط رکھی ہے کہ جب بیوی کو مہر دو تو خوشی کے ساتھ دو، یہ نہ سمجھو کہ لکھا گیا۔ یہ گلے میں عذاب ہے۔

حق المہر کیوں رکھا گیا ہے؟ اس لیے کہ کوئی بہت بڑا سودا ہو تو ہم کہتے ہیں کہ کچھ ایڈوانس دیں، ورنہ ہم کیسے اعتماد کرلیں؟ تو اللہ نے فرمایا: جب بندے کا سودا کر رہے ہو تو یہاں بھی کچھ پیش کرو، تاکہ تمہارے اس عقد کے اندر برکت اور وزن آجائے، پکا اور پختہ عقد ہوجائے، جو باتوں کی حد تک محدود نہ رہے۔

(نکتہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک نسخہ بتاتے تھے کہ کسی آدمی کو کوئی بیماری ہوجائے تو وہ اپنی بیوی کے حق مہر میں سے کچھ پیسے مانگ لے؛ کیونکہ یہ خالص حلال ہے، ان پیسوں سے تم شہد خریدو اور جب آسمان سے پانی برسے تو وہ پانی برتن میں جمع کرلو۔ اس کو شہد میں ملا کر پیو تو اللہ تعالیٰ وہ بیماری ختم کردیں گے؛ کیونکہ شہد حلال، پانی بھی حلال اور پیسہ بھی حلال۔ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ بیماریاں ختم کردے گا۔ لیکن اس پر عمل تو وہ کرے گا جس نے بیوی کو حق مہر دیا ہو۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: زمانہ جاہلیت کے اندر یہ رواج تھا کہ جب کوئی آدمی اپنی لڑکی کی شادی کرتا تو حق المہر کے پیسے لے لیتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع فرمایا اور یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ یہ کافروں کا رواج ہے کہ بیٹی کے پیسے باپ کھالے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا: اپنی لڑکیوں کے نکاح کرو۔ تو ایک آدمی نے کھڑے ہوکر کہا: حق المہر اور شرائط کیا ہونی چاہئیں؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو خاندان جو آپس میں طے کرلیں جائز ہے۔ [سنن کبریٰ للبیہقی: ۷/۲۳۹]

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ یَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَیْهِمْ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیْبًا۝﴾ [النساء:٥،٦]

''اور نا سمجھ (یتیموں) کو اپنے وہ مال حوالے نہ کرو جن کو اللہ نے تمہارے لیے زندگی کا سرمایہ بنایا ہے، ہاں ان کو ان میں سے کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے مناسب انداز میں بات کرلو۔ اور یتیموں کو جانچتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کے لائق عمر کو پہنچ جائیں، تو اگر تم یہ محسوس کرو کہ ان میں سمجھ داری آچکی ہے تو ان کے مال انہی کے حوالے کردو۔ اور یہ مال فضول خرچی کر کے اور یہ سوچ کر جلدی جلدی نہ کھا بیٹھو کہ وہ کہیں بڑے نہ ہوجائیں۔ اور (یتیموں کے سرپرستوں میں سے) جو خود مال دار ہو وہ تو اپنے آپ کو (یتیم کا مال کھانے سے) بالکل پاک رکھے، ہاں اگر وہ خود محتاج ہو تو معروف طریق کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کھالے۔ پھر جب تم ان کے مال انہیں دو تو ان پر گواہ بنالو، اور اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔''

یتیم کون ہوتا ہے اور کب تک ہوتا ہے؟

انسانوں میں یتیم اس کو کہتے ہیں جس کا باپ فوت ہوجائے اور جانوروں میں یتیم اس کو کہتے ہیں جس کی ماں مر جائے۔ اور یتیمی کا حکم اس وقت ہوتا ہے جب تک وہ عاقل بالغ نہ ہوجائے، اس کے بعد یتیمی کا حکم باقی نہیں رہتا۔

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا﴾

یتیموں کو مال سپرد کرنے کی عمر:

وہ مال جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری زندگی کا سبب بنایا ہے؛ کیونکہ مال بھی ایک نعمت ہے۔ مال ہوگا تو زکوۃ بھی ہوگی، مال ہوگا تو حج بھی ہوگا، مال ہوگا تو خیرات بھی ہوگی، صدقات ہوں گے، مال ہوگا تو مساجد و مدارس بنیں گے۔

مال ایک نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ بے وقوفوں کو نہ دو۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ یتیم جو ابھی چھوٹا ہے، اس کی عقل نہیں آئی، اس کو مال دینا شریعت کے

اندر ناجائز ہے۔ اگر تم نے بے وقوفوں کو مال دے دیا تو لازمی بات ہے کہ وہ ضائع ہو جائے گا۔

اپنی اولاد کو مال دینے کا وقت:

بعض علماء نے فرمایا: یہاں مطلق حکم ہے کہ اگر تیرے اپنے بچے بھی ہیں، لیکن وہ کم عقل ہیں تو ان کے ہاتھ میں دولت نہ دو۔ اگر تمہاری اپنی بیوی ہے، اس کے ہاتھ میں بھی دولت نہ دو۔ ورنہ لاکھوں کی شاپنگ ہو جائے گی، پھر تم بھیک مانگتے پھرو گے۔ کیونکہ عورت ایسی چیز ہے اس کے لیے اگر تم نے دس لاکھ کے بھی زیور بنائے ہیں تو ایک منٹ میں کہہ دے گی کہ آپ نے مجھے کیا دیا ہے؟ تم نے میرے لیے آج تک کیا کیا ہے؟ چاہے پوری زندگی آپ اس پر نچھاور کرنے والے ہوں۔

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: سب سے ناشکری عورت ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: چاہے مرد اس کے لیے جتنی قربانی کرے، لیکن ایک منٹ میں بیٹھ کے کہہ دے گی: تو نے پوری زندگی میرے لیے کیا کیا ہے؟

یہ سب سے بڑی ناشکری ہے۔ اور جو بندے کا شکر نہ کرے وہ اللہ کا شکر بھی نہیں کرتا۔

اس لیے حکم ہے کہ بے وقوف چاہے یتیم ہے، چاہے تیری اپنی اولاد ہے یا اپنی بیوی ہے، ان کے ہاتھ میں پیسے نہ دو۔

﴿وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ﴾

ان کو کھانا دو، ان کو کھلاؤ ان کو پہناؤ۔

﴿وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝﴾

اور جب ان سے بات کرو تو پیار سے بات کرو، اچھی بات کرو، جب یتیم سے بات کرو تو اس کو سمجھا دو کہ بیٹا! میں جو تجھے پیسے نہیں دیتا وہ تیری وجہ سے نہیں دے رہا کہ تم ابھی چھوٹے ہو۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو یہ سب دولت تمہاری ہے، یہ سب مال تمہارا ہے، ہمارے پاس تو امانت ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہم تمہیں امانت اس وقت سپرد کریں جب تم اس کے اہل ہو جاؤ گے۔

﴿وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ﴾

جب یتیم لڑکے بڑے ہو جائیں تو ان کا امتحان کرو، جب نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں یعنی بالغ ہو جائیں تو ان کو ان کا مال دے دو۔

بچے میں رشد کو پہچاننے کا طریقہ:

اور یاد رکھیں کہ بارہ سال کی عمر کو بھی بچہ بالغ ہو جاتا ہے۔ بلوغت کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ بڑے آدمیوں کے بچے جلدی بالغ ہو جاتے ہیں اور غریبوں کے بچے ذرا دیر سے بالغ ہوتے ہیں۔ اس طرح گرم ملک کے لوگ جلدی بالغ ہو جاتے ہیں اور ٹھنڈے علاقوں کے لوگ دیر سے بالغ ہوتے ہیں۔ فرمایا: جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کا امتحان کرو، یعنی ان کو تھوڑے پیسے دے دیے کہ کوئی سودا لے آؤ، کوئی چھوٹی موٹی تجارت کرو۔ اب اندازہ کرو کہ یہ اپنے پیسوں کو سنبھال سکتا ہے یا نہیں؟ اگر تم محسوس کرو کہ وہ اپنی عقل کو پہنچ گیا ہے، سمجھدار ہے، پیسہ ضائع نہیں کرے گا تو ان کا مال ان کو واپس کر دو۔ ان کی امانت ان کے حوالے کر دو۔

امام شعبی رحمہ اللہ اور ایک قول میں امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿رُشْدًا﴾ کا مطلب ہے کمالِ عقل کہ جب تک وہ صحیح معنی میں کمالِ عقل کو نہ پہنچے اس کو مال نہ دو۔ وہ بوڑھا بھی ہو جائے بے وقوف ہے۔ اور ایک آدمی جس کی عمر چالیس سال ہے، وہ سمجھدار ہے، ایک آدمی کی عمر پچاس سال ہے، لیکن اسے کوئی پتہ نہیں چلتا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: زیادہ سے زیادہ پچیس سال ہے اور یہ ایسی عمر ہے کہ آدمی بروقت شادی کرلے تو دادا بن سکتا ہے۔ جب پچیس سال کی عمر میں برائی، بھلائی کو سمجھ لیتا ہے۔

یتیموں کا مال جلدی سے نہ کھاؤ:

﴿وَلَا تَأْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ﴾

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار یتیموں کے مال کو فضول خرچی کے ساتھ نہ کھاؤ کہ یتیموں کا مال ہے، اس کا روسٹ بناؤ، بروسٹ بناؤ اور جلدی جلدی کھا رہے ہو کہ بچہ بڑا ہونے والا ہے، تین چار سال کے بعد جائیداد چلی جائے گی، اس لیے جتنی ہڑپ کرنا چاہتے ہو کرلو۔

ایک واقعہ:

جیسا کہ مثال مشہور ہے کہ دو ساتھی اکٹھے جا رہے تھے: ایک ساتھی نے کہا: میں غسل کرلوں۔ اس نے کہا:

میرے پاس تین سو روپے ہیں، ان کو اور کپڑوں کو لے لو، میں نہالوں اور تم کنارے پر بیٹھ جاؤ۔ وہ نہانے لگا: اس نے غوطہ لگایا جب باہر نکلا تو وہ آدمی نہیں تھا۔ خیر تھوڑی دیر کے بعد وہ آدمی آ گیا۔ اس نے کپڑے دے دیے، اس نے کہا: پیسے دو۔ اس نے کہا: حساب کرلو۔ اس نے کہا: کس بات کا حساب کرلیں؟ اس نے کہا: جھگڑے کی کیا بات ہے؟ حساب کرلو۔ وہ کہے: کمال کرتے ہو! حساب کیوں نہیں کرتے ہو؟ چند لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے اس آدمی کو بے وقوف بنایا جس کے پیسے تھے کہ جب وہ کہہ رہا تھا کہ حساب کرلو تو تم حساب کیوں نہیں کرتے ہو؟ وہ کہے: بھائی! کس چیز کا حساب کریں؟ لوگوں نے کہا: آخر حساب کیوں نہیں کرتے؟ آخر مجبور ہو کر اس نے کہا: حساب کرو۔ اس نے کہا: بات یہ ہے کہ جب تم نے غوطہ لگایا تو میں نے سمجھا کہ تم مر گئے ہو۔ ایک آدمی جا رہا تھا، میں نے اس کو سو روپے دیے کہ اگلی بستی والوں سے کہنا کہ بندے لے آئیں، ہمارا بندہ ڈوب گیا ہے، وہ چلا گیا۔ اتنی دیر میں تم نکل آئے۔ میں نے کہا: شکر ہے، ہمارا بندہ تو سلامت ہے۔ تو میں نے ایک اور بندے کو سو روپے دیے کہ بستی والوں کو کہنا کہ نہ آئیں، ہمارا بندہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ اتنے میں تم نے ایک اور غوطہ لگایا، میں نے ایک سو اور دے دیا تو اب بتاؤ کہ میرے پاس کتنے بچتے ہیں؟ میں تو تین سو تمہاری وجہ سے خرچ کر چکا ہوں۔ لوگوں نے اس کو کہا اس نے تمہاری ہمدردی میں پیسے خرچ کیے ہیں۔ اب وہ آدمی روتا ہوا گھر چلا گیا۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! ایسے تم یتیم کا مال نہ کھا جانا کہ دو روپے کا نمک اور دو روپے نمک والے کے؛ کیونکہ اللہ تو جانتا ہے۔ اس لیے ایسا نہ کرنا اور یتیموں کو ان کا مال دے دینا۔

﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ﴾ اگر تم امیر ہو اور تمہارے پاس یتیم ہے، ان کے مال سے تم ایک پیسا بھی نہ کھاؤ۔ جب اللہ نے تمہیں اپنا پیسہ دیا ہے تو تمہیں ان کا مال کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر تم خود غریب ہو تو اتنا کھا سکتے ہو جو جائز ہے۔ یتیم کی خدمت بھی کرو اور اس کی حفاظت بھی کرو اور اس کے مال سے اتنا کھاؤ جتنا دستور کے مطابق کھانا جائز ہے۔

﴿فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۞﴾

جیسا کہ جب تم ان کو ان کے مال واپس کرو تو گواہ بنالو، یہ نہ کہو کہ گھر کا معاملہ ہے، اپنے دامن کو پاک رکھنے کے لیے گواہ بنالو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کو یتیم اکڑ جائے، یتیمی بھول جائے اور کہے کہ آپ نے مجھے تو مال دیا ہی نہیں ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں معاشرہ یا محلہ بدنام کر دے۔ اس لیے ہر معاملہ میں گواہ رکھو، تاکہ تمہارا دامن صاف رہے،

تم دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی حساب سے بے باک رہو۔

یتیم پر شفقت:

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((كَافِلُ الْيَتِيمِ لَهُ أَوْ لِغَيْرِهِ أَنَا وَهُوَ كَهَاتَيْنِ فِي الْجَنَّةِ)) تم میں سے جو یتیم کی خبر گیری کرے، یتیم کی نگہداری کرے قیامت کے دن وہ میرے ایسے قریب ہوگا جیسے ان دو انگلیوں کا فاصلہ ہے۔ [مسلم، رقم: ۲۹۸۳]

علماء نے ایک اشارہ بھی لکھا ہے کہ جب تم کسی یتیم پر ہاتھ رکھو، یتیم پر نظر ڈالو تو غور کرو کہ یہ وقت میرے محمد مدنی ﷺ پر بھی گزرا ہے۔

مال بڑی نعمت ہے:

مال اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ یہ نہیں کہ تم اس کو بے وقوفوں کو دے دو اور وہ مال کو لٹا ڈالیں۔ مال بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں فرمائی جو بندے کے لیے خیر اور باعث رحمت نہ ہو۔ صرف ہم اپنے استعمال سے اس خیر کو شر میں بدل دیتے ہیں۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہے تو خیرات کر رہا ہے، مدارس بنا رہا ہے، مساجد بنا رہا ہے، حج کر رہا ہے، زکوۃ دے رہا ہے اور عشر دے رہا ہے۔ یہ مال باعثِ خیر اور باعثِ رحمت ہے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا سارا مال خدمت اسلام میں خرچ ہوا ہے...... سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا سارا مال اسلام کے لیے خرچ ہوا ہے...... سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سارا مال اسلام کے لیے صرف ہوا ہے۔ اس لیے مال بھی نعمت ہے۔

آگ بھی نعمت ہے۔ اس پر کھانا پکاتے ہیں، اس سے گرمی حاصل کرتے ہیں، اسی سے آپ کی مشینریاں چلتی ہیں، لیکن اس آگ کو آپ اگر کسی گھر کو جلانے میں لگا دیں تو آپ نے خیر کو خود شر میں بدل دیا ہے۔

اللہ نے آپ کے اندر شہوانی قوت رکھی ہے۔ اگر آدمی اس کو اپنی بیوی میں خرچ کرے تو عبادت ہے اور اگر آپ اس کو حرام میں بدلیں تو وہی بات شر بن جائے گی۔

مال بیچنے کی پابندی کے مسائل:

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اسی آیت مبارکہ سے فقہاء کرام رحمہم اللہ نے حجر کے مسائل نکالے ہیں...... فقہاء سب اللہ کے فرمان اور اس کے نبی کے فرمان کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ ایسے غواص ہوتے ہیں جو قرآن وسنت کے سمندر میں

ڈوب کر موتی لاتے ہیں..... قرآن نے حکم دیا کہ بے وقوف کو اپنا مال نہ دو۔ تو انہوں نے اس سے احکام نکالے کہ اگر ایک آدمی دیوانہ ہے تو اس کو مال نہ دو؛ کیونکہ اس کو پتہ نہیں کہ میں نے یہاں دس ریال دینے ہیں یا ایک ہزار دینا ہے؟ تو پاگل پر بھی حکومتِ وقت پابندی لگا سکتی ہے کہ وہ اپنے مال میں تصرف نہ کرے، تاکہ اس کا مال محفوظ رہے۔

اور ایک ہوتا ہے حجر للصغر کہ ایک بچہ ہے، صاحب جائیداد ہے، اس کے والدین فوت ہو گئے ہیں، اس کا بڑا مال ہے۔ چھ سات سال اس کی عمر ہے تو اس پر بھی پابندی لگا دی جاتی ہے: کیونکہ وہ بچہ ہے، وہ سمجھتا نہیں ہے، اس کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ میں نے جائیداد کہاں خرچ کرنی ہے اور کہاں خرچ نہیں کرنی؟ لہٰذا اس پر بھی پابندی لگ گئی بوجہ چھوٹے ہونے کے۔ وہاں بھی قاضی وقت آرڈر کرے گا کہ یہ بچہ چھوٹا ہے۔ جب تک بڑا نہ ہو اس کے فلاں فلاں کمیٹی بنا دو، جو اس کے مال کی حفاظت کرے۔

اور ایک حجر للفلس ہوتا ہے کہ ایک آدمی نے قرضہ لے لیا، مثلاً: دس لاکھ قرضہ لے لیا اور اس کی جائیداد دس لاکھ کی ہے۔ اب وہ جائیداد بیچ رہا ہے، اب قاضی کو درخواست دے سکتے ہیں کہ اس نے ہمارا دس لاکھ قرضہ دینا ہے اور یہ جائیداد بیچ رہا ہے۔ اگر جائیداد ختم ہو گئی تو قرضہ کہاں سے دے گا؟ تو وہاں بھی قاضی پابندی لگا دے گا کہ خبردار! اس کو زمین اور جائیداد بیچنے کی اجازت نہیں ہے جب تک کہ اپنے قرض خواہوں کو قرض ادا نہ کرے۔ اب یہ سارے مسئلے اس آیت سے ملے ہیں۔

عورتیں عقل اور دین میں ناقص ہیں:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: عورتیں عقل کی بھی ناقص ہیں اور دین کی بھی ناقص ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: حضور! وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: عورت کو ایک ماہ کے اندر جو حیض کے دن ہیں، ان دنوں کے اندر وہ عبادت سے رک گئی اور مرد تو پورا مہینہ عبادت کرے گا، اسی طرح ولادت کا موقع آ گیا بعض عورتوں کو چالیس دن تک نفاس کا خون بند نہیں ہوتا تو چالیس دن تک عورت نماز و روزہ سے رکی ہوئی ہے۔ تو یہ اس کی عبادت میں نقص آ گیا۔

عورت پر اللہ نے جہاد فرض نہیں کیا، حالانکہ جہاد بہت بڑی عبادت ہے۔ عورت کے لیے امامت کوئی نہیں، حالانکہ امامت کے بہت بڑے فضائل ہیں۔ عورت کے لیے اذان کوئی نہیں ہے، حالانکہ اذان دینے والے کے بڑے فضائل ہیں کہ قیامت کے دن ان کی گردنیں اونچی ہوں گی کہ پتہ چلے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آواز بلند کرتے تھے، لیکن عورت اذان

نہیں دے سکتی۔ صف اوّل میں حاضر ہونے کے بڑے فضائل ہیں، لیکن عورت صف اوّل کے اندر نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔ یہ اس کا نقصان دین کا ہے۔ جو اللہ نے اس کے اندر رکھا ہے، اس کا کوئی حل بھی نہیں ہوسکتا۔

صحابہ نے عرض کیا: یہ بات تو ہمیں سمجھ آگئی، لیکن ناقص العقل کیسے ہوتی ہے؟ حالانکہ یہ تو بڑی تیز ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: عقل کا معنی یہ ہوتا ہے کہ جو صحیح استعمال ہو۔ اللہ تعالیٰ نے عقل دی تھی کہ وہ اللہ کی، اللہ کے رسول ﷺ کی، والدین کی اور اپنے شوہر کی فرمانبردار رہے، لیکن عورت تو سب سے بڑی نافرمان ہے۔ اپنے شوہر کو ایک منٹ کے اندر بیٹھ کر انکار کردے گی کہ آج تک آپ نے مجھے کیا دیا ہے؟

تو فقہاء نے اس آیت سے مسئلہ نکالا ہے کہ عورت کے ہاتھ میں بھی مال نہ دو۔ دیکھو! اگر عورت کو اپنے مال کا مختار بنا دیا تو عموماً تباہی کا انتظار کرو، چاہے آٹھ سال کے بعد آئے یا دس سال کے بعد آجائے۔

فقہاء نے مسئلہ نکالا ہے کہ اگر گھر کے اندر خاوند ہے تو وہ تصرفات اپنے ہاتھ کے اندر رکھے، گھر کے اندر اتنے پیسے دے جو گھر کے خرچ چلانے کے لیے کافی ہوں۔

حدیث کا مفہوم ہے: وہ فرد، وہ قومیں اور وہ ملک کبھی فلاح نہیں پاسکتے جن کے امور عورتوں کے ہاتھ میں آجائیں۔

آپ چاہے ملا کہیں، دقیانوسی کہیں، چودہ سو سال پرانی باتیں کہنے والا کہیں، ہمارا ایمان ہے۔ چاند کے اندر شبہ ہوسکتا ہے، لیکن فرمانِ محمد مصطفیٰ ﷺ میں شبہ نہیں ہوسکتا۔ آپ فرمائیں اور وہ بات غلط ہو دنیا کا نظام بدل سکتا ہے، لیکن اللہ کے نبی کا فرمان غلط نہیں ہوسکتا! کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ کا اپنا فرمان نہیں ہوتا، بلکہ وہ اللہ کی وحی ہوتی ہے، لیکن ادا لسانِ رسول ﷺ سے ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن نے فرمادیا: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ [النجم: ۳، ۴] میرے مدنی پاک ﷺ اپنی خواہش، اپنے ارادے سے کوئی کلمہ بھی ارشاد نہیں فرماتے۔ جو کچھ فرماتے ہیں اللہ کی وحی سے فرماتے ہیں۔

اپنی بیوی بچوں کو بھی مال دینے میں احتیاط کرو:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ کے فرمان: ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ أَمْوَالَكُمْ﴾ کے اندر "السُّفَهَآءَ" سے مراد اپنی اولاد اور اپنی عورتیں ہیں، یتیم مراد نہیں ہیں، بلکہ یتیم بھی چھوٹا ہے یا تمہاری اپنی اولاد بھی چھوٹی ہے تو ان کے ہاتھ میں پیسہ نہ دو، تاکہ وہ پیسے کو ضائع نہ کردیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت الحکم بن عتیبہ رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رحمہ اللہ

اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ بھی یہی ارشاد فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اپنے بچے اور عورتیں ہیں۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے مراد یتیم بچے ہیں، ابھی وہ بالغ نہیں ہوئے، عاقل نہیں ہوئے تو ان کا مال ان کو نہ دو۔

حضرت مجاہد، عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں: "السُّفَهَآءَ" سے مراد عورتیں ہیں؛ کیونکہ عورتیں بھی ناقص العقل ہوتی ہیں، وہ بھی پیسے ضائع کر دیتی ہیں۔ اور پیسہ ایسی چیز نہیں کہ اس کو بلا وجہ ضائع کر دیا جائے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے۔

(حدیث) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے آقا سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إن النِّسَاءَ سُفَهَاءُ إِلَّا الَّتِي أَطَاعَتْ قَيِّمَهَا)) [تفسیر ابن کثیر] عورتیں کم عقل ہوتی ہیں، مگر وہ عورت جو اپنے خاوند کی اطاعت گزار ہو، اس کی فرمانبرداری کرنے والی ہو وہ عاقل ہے۔

خدمت گار بھی کم عقل ہوتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: "السُّفَهَآءَ" سے مراد یہ ہے کہ جو تمہارے خادم ہیں ان کو مال نہ دو، وہ بھی شیاطین الانس ہوتے ہیں۔ ان کو کیا درد ہوگا؟ محنت تم نے کی ہے، وہ دس کی بجائے سو روپے خرچ کرے گا، تمہارے مال کو ضائع کر دے گا۔ اللہ کی نعمتوں کو ضائع کرنا شریعت میں حرام ہے۔

فقہاء نے حدیث مبارک کی روشنی میں لکھا ہے کہ اگر دریا بہہ رہا ہے اور تم وضو کر رہے ہو تو پانی ضائع نہ کرو، بلکہ اتنا پانی استعمال کرو جتنا وضو کے لیے ضرورت ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ دریا ہے، کیا ہو جائے گا؟ اور ایک ایک عضو کو سو سو دفعہ دھو رہے ہو، یہ شرعاً ناجائز ہے۔ اللہ کی نعمتوں کو ضائع نہ کرو، بلکہ جو پیسے تم ضائع کر رہے ہو اس کو آخرت کے لیے بھیج دو صدقات نفقات میں اللہ کے راستوں میں لگا دو۔

﴿وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے: ((لَا تَعْمَدْ إِلَى مَالِكَ وَمَا خَوَّلَكَ اللهُ وَجَعَلَهُ لَكَ مَعِيشَةً فَتُعْطِيَهُ امْرَأَتَكَ أَوْ بَنِيكَ ثُمَّ تَنْظُرَ إِلَى مَا فِي أَيْدِيهِمْ وَلَكِنْ أَمْسِكْ مَالَكَ وَأَصْلِحْهُ وَكُنْ أَنْتَ الَّذِي تُنْفِقُ عَلَيْهِمْ مِنْ كِسْوَتِهِمْ وَمُؤْنَتِهِمْ وَرِزْقِهِمْ.)) [تفسیر ابن کثیر] مال پر اعتماد نہ کر اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اللہ نے تیرے

گزارے کا ذریعہ بنا دیا ہے اب تو اگر اپنے مال کو اپنی بیوی کو دے دیتا ہے، پھر دیکھتا رہتا ہے کہ مجھے ضرورت ہے، پھر لوگوں سے مانگتے ہو، بیٹے سے مانگتے ہو، ایسا نہ کرو، بلکہ اپنے مال کو اپنے کنٹرول میں رکھو، اپنے مال کو صحیح جگہ پر خرچ کرو، تاکہ اللہ تعالیٰ اس میں برکت دے اور تم اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرو۔ یہ نہیں کہ تم محتاج بن کر بیوی سے کہو: مجھے پیسے چاہئیں؛ کیونکہ تم نے اس کو مالک بنا دیا۔ اللہ نے تمہیں مالک بنایا ہے، تم مالک بن کر رہو، تاکہ کنٹرول تمہارے ہاتھ میں ہو۔

کون سے تین شخصوں کی دعا قبول نہیں ہوتی؟

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: تین بندے ایسے ہیں کہ وہ اللہ سے دعا مانگتے ہیں، لیکن اللہ ان کی دعا منظور نہیں کرتے: ایک وہ آدمی کہ اس کی عورت بڑی بدخلق ہے، لیکن وہ پھر بھی اس کو طلاق نہیں دیتا۔ اس کی دعا بھی منظور نہیں ہوتی۔ اسی طرح دوسرا آدمی وہ ہے جو اپنا مال بے وقوفوں کو دے دیتا ہے۔ اور تیسرا آدمی وہ ہے جس نے کسی کو قرضہ دیا، لیکن اس وقت گواہ نہیں بنائے۔ ایسا بندہ بھی دعا کرے تو اللہ تعالیٰ منظور نہیں فرماتے: کیونکہ اس نے اللہ کے قرآن کی مخالفت کی ہے۔ اللہ نے فرمایا: اپنا مال بے وقوفوں کو نہ دو۔ جب وہ اپنا مال بے وقوفوں کو دے رہا ہے تو اللہ کی مخالفت کر رہا ہے اور اپنے مال کا نقصان کر رہا ہے، پھر مال کی برکت کی دعا بھی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی دعا کیوں منظور کریں؟ اور اللہ نے حکم دیا ہے کہ جب معاملہ کرو تو گواہ بناؤ یا تمہارے درمیان لکھنے والا لکھے، تاکہ کل خدانخواستہ موت وحیات ہے، کوئی ریکارڈ تو ہو، لیکن تم کہو: میں نے تو اعتبار کیا تھا، حالانکہ تم نے تو قرآن کی مخالفت کی ہے، اعتبار کیا کیا تھا؟

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے قول کے اندر جو سیئۃ الخلق کا لفظ آیا ہے، اس کے علماء نے دو ترجمے فرمائے ہیں: ایک یہ ہے کہ بعض عورتیں بدزبان ہوتی ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر خاوند سے لڑے گی، بات بات پر جھگڑا کرے گی۔ اور قرآن پاک میں آیا ہے: ﴿وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ﴾ [البقرة:۲۱۶] کہ بعض اوقات تم ایک چیز کو برا سمجھتے ہو، لیکن وہ تمہارے لیے بہتر ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک حدیث مبارک میں آیا ہے کہ اگر عورت کے اندر کوئی خرابی ہے، مثلاً: بدزبان ہے، ہر وقت کائیں کائیں کرتی رہتی ہے، اگر تم نے اس پر صبر کیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں اجر دے گا۔ یہ نہیں کہ تم اس کو طلاق دے دو۔

علماء نے لکھا ہے کہ سیئۃ الخلق سے مراد وہ عورت ہے جو بدکار ہو، یعنی عزت کی حفاظت نہیں کرتی، بدچلن ہے۔ ایسی عورت کو گھر میں رکھنا حرام ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ وہ زنا کر رہی ہے، اس کے تعلقات فلاں آدمی کے ساتھ ہیں، اس کے بعد بھی تم اسے اپنی بیوی بنا کر رکھو، یہ گناہ ہے، یہ بے غیرتی ہے۔ شریعت تمہیں یہ حکم نہیں دیتی کہ تم اسے قتل کر دو، تاکہ تمہارے ذمہ بلاوجہ گناہ نہ لگے اور اس کو دوسرا شوہر قابو کر سکتا ہے تو کر لے، تمہیں اللہ تعالیٰ کوئی اور شریف عورت دے دے گا۔

﴿وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ﴾

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یعنی جب وہ بالغ ہو جائیں۔ حلم خواب کو کہتے ہیں کہ نیند میں احتلام آجائے، اس کے اندر پانی نکل آئے تو یہ بالغ ہونے کی نشانی ہے۔ بعض بارہ سال میں بالغ ہو جاتے ہیں، بعض پندرہ سال تک بالغ ہو جاتے ہیں۔ یہ مختلف احوال ہیں۔ گورنمنٹ جو قانون بنا دیتی ہے کہ بچہ اٹھارہ سال تک بالغ ہوگا، یہ غلط ہے۔ اگر ایک بچہ بارہ سال سے بالغ ہو تو کیا وہ چھ سال تک پھرتا رہے؟

یتیمی کب ختم ہوتی ہے اور روزہ کب مکمل ہوتا ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اس فرمان کو یاد کیا ہے: ((لَا يُتْمَ بَعْدَ احْتِلَامٍ، وَلَا صُمَاتَ يَوْمٍ إِلَى اللَّيْلِ)) [سنن ابی داؤد، رقم: ۲۸۷۳] جب احتلام آجائے، بالغ ہو جائے تو اب یتیم نہیں رہا، بلکہ بالغ ہو گیا ہے۔ اسی طرح جب رات آجائے تو روزے کا کیا مطلب ہے؟

تین قسم کے لوگوں کے گناہ معاف:

(حدیث) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ: عَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَحْتَلِمَ، وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰى يَعْقِلَ)) [ابوداؤد، رقم: ۴۴۰۳] تین آدمیوں پر عذاب نہیں لکھا جاتا: ایک سونے والا جب تک بیدار نہ ہو۔ نیند کے اندر اس سے کوئی بات نکل گئی تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، وہ نہ لکھو۔ دوسرا چھوٹا بچہ جس وقت تک وہ بالغ نہ ہو جائے۔ اور تیسرا مجنون ہے، دماغ خراب ہو گیا۔ جب تک اس کا دماغ صحیح نہ ہو یا پندرہ سال کا نہ ہو اس پر کچھ نہیں لکھا جاتا۔ کیونکہ شریعت کی پابندی اور گناہوں کی سزا عقل والے کے لیے ہے۔

بالغ ہونے کی علامات اور مسائل:

صحیحین کے اندر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب جنگ احد آئی تو میں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ مجھے بھی جنگ میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تمہاری کتنی عمر ہے؟ میں نے عرض کیا: چودہ سال تو آپ نے اجازت نہ دی اور فرمایا: تم ابھی چھوٹے ہو۔ جب خندق کا موقع آیا تو میں پھر پیش ہوا اور عرض کیا: مجھے جنگ میں جانے کی اجازت دیں۔ آپ نے فرمایا: عمر کتنی ہے؟ میں نے عرض کیا: پندرہ سال۔ آپ نے فرمایا: اب تمہیں اجازت ہے۔

تو حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ اسی حدیث کو پیمانہ بناتے تھے کہ اگر آدمی کی عمر پندرہ سال ہو جائے تو سمجھو کہ وہ بالغ ہو گیا ہے، بڑا ہو گیا ہے۔ اگر وہ کم ہے تو ابھی جوانی کے حکم میں نہیں آئے گا۔[1]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر آدمی کے ناف کے نیچے کے بال کھردرے آجائیں تو کیا یہ بھی بلوغت کی علامت سمجھی جاتی ہے یا نہیں؟ تو بعض علماء فرماتے ہیں: اگر اہل ذمہ میں ہے تو سمجھی جائے گی اور یہ بال بلوغت کی علامت ہوں گے؛ کیونکہ وہ لوگ کسی تدبیر کے ذریعہ بال بڑھانے کی کوشش نہیں کر سکتے؛ اس لیے کہ بلوغ کی وجہ سے ان پر جزیہ واجب ہو جاتا ہے اور اگر وہ اہل ذمہ میں نہیں تو بلوغت کی علامت نہیں سمجھی جائے گی۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بھی بلوغت کی علامت ہے؛ کیونکہ آدمی کے بالغ ہونے کے بعد وہاں بال آنا شروع ہو جاتے ہیں، چاہے وہ اہل ذمہ میں ہو یا نہ ہو۔

اس لیے جب بنو قریظہ یہودیوں کا محاصرہ ہوا تو جب قیدی آئے تو حضور اکرم ﷺ نے بچوں کے بارے میں حکم دیا کہ دیکھو! ان کے ناف کے نیچے بال نکلے ہیں یا نہیں نکلے؟ اگر نکلے ہیں تو ان کو قتل کر دو کہ یہ بالغ ہیں۔ اور اگر نہیں نکلے تو ان کو چھوڑ دو، یہ بچے ہیں، جن کا کوئی جرم نہیں ہے۔

عطیہ القرظی فرماتے ہیں: میں ان بچوں میں سے تھا جن کے بال نہیں نکلے تھے تو مجھے چھوڑ دیا گیا۔[2]

اسلام کے اندر بڑی وسعت ہے۔ مثلاً: پندرہ سال کا ہونا علامت ہے۔ اسی طرح احتلام کا ہونا علامت ہے، اسی طرح ناف کے نیچے بالوں کا نکلنا بھی علامت ہے۔ اور اسلام نے یہ حکم دیا کہ اگر ضرورت ہو تو ایسی جگہ کا معائنہ

[1] ..... [بخاری، رقم: ۲۶۶۴]
[2] ..... [ترمذی، رقم: ۱۵۸۴]

بھی کیا جا سکتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک لڑکے نے ایک لڑکی پر تہمت لگائی۔ اس نے کہا: میں نے اس کے ساتھ برا کام کیا ہے۔ تو وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کی تحقیق کرو، کیا اس کے زیر ناف بال نکلے ہیں یا نہیں نکلے؟ اور اس کے بال نہیں نکلے تھے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کو حد نہیں لگ سکتی، یہ بچہ ہے۔ اگر بالغ ہوتا تو پھر اس پر حد جاری کرتے۔[1] ہاں قاضی تعزیر کر سکتا ہے۔

نگران بقدرِ ضرورت یتیم کے مال سے کتنا لے سکتا ہے؟

﴿وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ﴾

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ نے یتیم کے اولیاء کے بارے میں نازل کی کہ اگر تم غنی ہو تو یتیم کے مال کو نہ کھاؤ اور اگر تم فقیر ہو تو تم نگرانی کے عوض بقدرِ ضرورت استعمال کر سکتے ہو، اس سے زیادہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

قدرِ ضرورت کے بارے میں فقہاء نے دو قول لکھے ہیں: ایک تو یہ ہے کہ اگر یہ آدمی کسی دوسری جگہ مزدوری کرے تو دس ریال ملیں گے تو اس کو چاہیے کہ اس سے بھی کم لے؛ کیونکہ یتیم اس کی پرورش میں ہے، اس کو اجر و ثواب ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ جتنا اس کا روٹی پانی اور ضروریات ہیں اتنے تک کھانے کی اجازت ہے۔

(مسئلہ) ایک آدمی غریب تھا، اس نے یتیم کے مال سے ضرورت کے مطابق کھا لیا۔ کل اللہ نے اس کو بھی امیر بنا دیا۔ اب جتنا اس نے ضرورت کے مطابق یتیم کا مال لیا تھا، اس کو واپس کرے یا نہ کرے؟

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: واپس کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ اس لیے کہ جب اس نے لیا تھا تو وہ فقیر تھا اور اس نے بقدرِ حاجت لیا تھا اس سے زیادہ نہیں لیا تھا۔

اور بعض ائمہ کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ نے اس کو غنی بنا دیا ہے تو احتیاط اسی میں ہے کہ جو کچھ اس نے لیا تھا واپس کر دے، تاکہ قیامت میں اس کے دفعیہ میں کسی قسم کی کوئی بات باقی نہ رہے۔

یاد رکھیں! جو صحیح معنی میں مومن ہیں، اللہ سے ڈرنے والے ہیں، جن کے دل میں اللہ کا خوف ہے، یہ مسائل ان

[1] [غریب الحدیث لابی عبید: ۳/۲۸۹]

کو سمجھ آتے ہیں، لیکن جن لوگوں نے اپنا گزر بسر، اپنا کھانا پینا سب کچھ حرام، سود، رشوت سے بنیادیں بنا رکھی ہیں، ان کو یہ مسئلے کیا سمجھ آئیں گے کہ یتیم کا مال کیا ہوتا ہے؟

حقوق العباد کی اہمیت:

پہلے دور میں علماء کرام اتنے محتاط ہوتے تھے کہ ساری زندگی انہوں نے جو مدرسہ سے تنخواہ لی آخر وقت میں اللہ نے ان کو غنی بنا دیا تو انہوں نے حساب کر کے جتنی تنخواہ لی تھی اتنا مدرسہ میں جمع کرا دیا کہ ہم نے تنخواہ لی تھی آٹھ گھنٹے کی، پتہ نہیں ہم نے آٹھ گھنٹے صحیح معنی میں پڑھایا یا نہیں پڑھایا، کبھی چھٹی کر دی ہو، کبھی غفلت کر گئے ہوں تو قیامت میں ہم ایک ایک گھڑی کا حساب کیسے دیں گے؟ انہوں نے سارے پیسے کا حساب لگا کر مدرسہ میں جمع کروا دیے۔

ایسے لوگ بڑی احتیاط کرتے ہیں۔ کیونکہ حقوق العباد کا معاملہ بڑا شدید ہے۔ ہم لوگ حقوق اللہ کے بارے میں تو سوچتے ہیں اور حقوق العباد کے بارے میں ہم فکر نہیں کرتے۔ حالانکہ حقوق العباد بڑا شدید مسئلہ ہے کہ اگر آپ نے کسی کا حق کھایا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کرتے، توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا، حج کرنے سے بھی معاف نہیں ہوتا، آدمی میدان جنگ میں شہید ہو جائے تو بھی معاف نہیں ہوتا جب تک کہ اس حق والے کا حق معاف نہیں ہوتا؛ کیونکہ وہ بندے کا حق ہے اور بندے کا حق اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتے۔ لیکن آج ہم اس موضوع کو اس طرح بھول گئے ہیں کہ اس طرف بالکل دھیان باقی نہیں رہتا۔

یاد رکھیں! سب سے زیادہ مسئلہ مدرسہ والوں کا ہوتا ہے۔ رباط والے، خیراتی ادارے چلانے والے، خیراتی ہسپتال چلانے والے؛ کیونکہ وہ لاکھوں لوگوں کے حقوق ہیں، کسی نے ایک روپیہ دیا، کسی نے ایک لاکھ دیا، کسی نے سو روپے دیے تو سب کے حق آ گئے۔ اب اس نے کھایا تو سارے جہان کا حق اس پر آ گیا تو وہ کس کس سے بخشوائے گا؟ اس لیے پہلے دور کے اندر اللہ والے اس قسم کی ذمہ داریاں قبول بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ نے ہمیں علم دیا ہے تو ہم پڑھا دیں گے باقی ذمہ داریاں قبول نہیں کرتے۔

یتیم کی پرورش کے بدلہ میں بقدر ضرورت کھا سکتے ہو:

ایک آدمی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ((لَيْسَ لِي مَالٌ، وَلِي يَتِيمٌ لَهُ مَالٌ، قَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كُلْ مِنْ مَالِ يَتِيمِكَ، غَيْرَ مُسْرِفٍ وَلَا مُتَأَثِّلٍ مَالًا)) [سنن ابن ماجہ، رقم: ۲۷۱۸] یارسول

اللہ! میرے پاس دولت نہیں ہے، لیکن میں غریب آدمی ہوں۔ اب میرے ذمہ یتیم بھی آ گیا ہے تو آپ مجھے فرمائیں کہ میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا کہ یتیم کے مال سے تم اتنا کھا سکتے ہو کہ اس میں اسراف بھی اس کے مال کو ہلاک اور ضائع بھی نہ کرو اور یہ بھی نہ کرنا کہ اپنا مال تو بچا لو اور یتیم کا مال کھا لو یا اپنے مال کے فدیہ میں اس کا مال ہڑپ کر لو۔ بلکہ جتنا بقدر ضرورت ہے اتنا ہی استعمال کر سکتے ہو اس سے زیادہ تمہیں استعمال کرنے کا حق نہیں ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی احتیاط:

آپ اندازہ فرمائیں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت پر بیٹھے تو دو دن کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ آپ کپڑا اٹھائے ہوئے جا رہے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: آپ کدھر جا رہے ہیں؟ آپ نے کہا: کیا تمہیں پتہ ہے کہ میری کپڑے کی دکان ہے اور میں کپڑے کا کاروبار کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا: حضرت! اگر آپ کاروبار کریں گے تو امت کا بوجھ کون اٹھائے گا؟ آپ نے فرمایا: پھر میرے بچے کہاں سے کھائیں گے؟ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: شوریٰ کو بلا لیں کہ بیت المال سے خلیفہ وقت کو خرچہ دیا جائے۔ اور خلیفۃ المسلمین اپنے چوبیس گھنٹے رعایا کی حفاظت میں لگائے۔ اگر آپ اپنے کاموں میں وقت لگائیں گے تو رعایا کا کام نہیں ہو سکتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیت المال والوں کو بلوایا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وظیفہ مقرر کیا گیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عمر! ایک بات یاد رکھو! ایک عام امتی جتنا کھاتا ہو مجھے اتنا وظیفہ چاہیے، اس سے زیادہ مجھے نہیں چاہیے، تاکہ میں قیامت کے دن جواب دے سکوں۔

(واقعہ) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ آپ نے اپنی بیوی سے خواہش ظاہر کی کہ جی چاہتا ہے کہ کوئی میٹھی چیز بنا کر کھائی جائے۔ کئی دنوں کے بعد بی بی صاحبہ نے کوئی میٹھی چیز بنائی اور حضرت کی خدمت میں پیش کر دی۔ تو آپ نے پوچھا کہ یہ کوئی ہدیہ ہے؟ انہوں نے کہا: ہدیہ نہیں ہے، آپ نے ایک دفعہ خواہش ظاہر کی تھی تو میں نے آپ کی خواہش کو مدنظر رکھا اور روزانہ جو وظیفہ آتا تھا اس سے چٹکی بھر آٹا تھوڑا سا میٹھا قطرہ قطرہ بچا تی رہی تھی۔ اتنے دنوں کے اندر وہ اتنا جمع ہوا کہ ایک چھوٹی سی میٹھے کی پلیٹ بن جائے تو میں نے آپ کے لیے بنا دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: تم بیٹھ کر انتظار کرو، میں ابھی آتا ہوں۔ اور آپ نے پلیٹ ہاتھ میں پکڑ لی اور سیدھا بیت المال میں تشریف لے گئے اور فرمایا: یہ بیت المال میں داخل کر لو اور آئندہ میرے وظیفے سے اتنی مقدار کم کر دو، اس سے کم

میں بھی میرے گھر کا گزارہ ہوسکتا ہے تو میں قیامت کے دن زیادہ لینے پر نہ پکڑا جاؤں۔

یہ خلافت کا تصور تھا۔ آج دیکھ لیں کہ ہمارے ایک عام سپاہی کا کیا خرچ ہے؟ ایک دن میں وہ کتنے پیسوں کا سگریٹ پی جاتا ہے؟ کیا وہ اپنی تنخواہ سے اتنے سگریٹ پی سکتا ہے؟ اسی طرح ایک پٹواری کو دیکھ لیں اور اس کے مکان کو دیکھ لیں اور اس کی جائیدادیں دیکھ لیں۔

یتیم کے مال کے حقوق:

(حدیث) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! میں کتنا حصہ یتیم کے لیے نکالوں؟ آپ نے فرمایا: ((مَا كُنْتَ ضَارِبًا مِنْهُ وَلَدَكَ غَيْرَ وَاقٍ مَالَكَ بِمَالِهِ وَلَا مُتَأَثِّلٍ مِنْهُ مَالًا)) [صحیح ابن حبان، رقم: ۴۲۴۴] جیسے تم اپنے بچے کو کھلاتے ہو اتنا اس کو بھی کھلایا کرو۔ وہ بھی تو تمہاری اولاد ہے اور اتنا اس سے لیا کرو جتنا ضرورت ہو۔ اس کے مال کو خراب نہ کیا کرو۔

(حدیث) ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ میرے پاس یتیم ہیں، ان کے اونٹ بھی ہیں اور میرے اونٹ بھی ہیں۔ اور میں اپنے اونٹوں میں کبھی سیر ہو جاتا ہوں اور کبھی محتاج ہو جاتا ہوں تو میرے لیے ان کا کتنا دودھ حلال ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر آپ گمشدہ کو تلاش کرتے ہو، کسی کو خارش ہو جائے اور اس کا علاج کرتے ہو حوض کو پلستر کرتے ہو تو اتنا لے سکتے ہو جتنا اس کی نسل کو نقصان نہ ہو۔ [موطا امام مالک: ۲/ ۰۳۴]

لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اونٹوں کی خدمت بھی کرے، اونٹوں کے حوض بھی ٹھیک کرے اور انٹوں کو خارش ہو جائے تو ان کا علاج بھی کرے تو پھر دودھ لے سکتا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ جتنا تم نے یتیم کا مال کھایا تھا اگر اللہ تعالیٰ تمہیں غنی کر دیں تو تم ان کا مال واپس کرو؛ کیونکہ یتیم کا مال کھانے سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ کوئی آدمی مضطر ہے، اس نے دوسرے کا مال کھالیا۔ جب اس کا اضطرار ختم ہوگا تو اس کا مال واپس کرنا پڑے گا۔ اسی طرح تم نے یتیم کا جتنا مال غریبی کے زمانے میں استعمال کیا ہے، اب تم مالدار ہو گئے ہو تو اب تم حساب کر لو کہ مثلاً اتنا استعمال کیا تھا تو اس کو واپس کر دو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اب خود تمہیں غنی کر دیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی احتیاط:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: جب سے اللہ نے مجھے بادشاہ بنایا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میں یتیموں کا والی

ہوں۔ جیسے یتیم کے والی کو بقدر ضرورت کھانا جائز ہے، میں بھی بیت المال سے اتنا لیتا ہوں جتنی ضرورت ہو، اور ضرورت نہیں ہوتی تو نہیں لیتا اور اگر لے بھی لیتا ہوں تو پھر جب اللہ تعالیٰ دیتا ہے تو میں بیت المال میں داخل کر دیتا ہوں۔ [سنن کبریٰ للبیہقی: ٦/ ٥]

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۝﴾ [النساء: ٧ تا ١٠]

''مردوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور قریبی ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، چاہے وہ (ترکہ) تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔ اور جب (میراث کی) تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار، یتیم اور مسکین لوگ آ جائیں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دو، اور ان سے مناسب انداز میں بات کرو۔ اور وہ لوگ (یتیموں کے مال میں خرد برد کرنے سے) ڈریں جو اگر اپنے پیچھے کمزور بچے چھوڑ کر جائیں تو ان کی طرف سے فکر مند رہیں گے۔ لہٰذا وہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی سیدھی بات کہا کریں۔ یقین رکھو کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔ اور انہیں جلد ہی ایک دہکتی آگ میں داخل ہونا ہوگا۔''

ربط آیات:

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے میراث کا اجمالی حکم بیان فرمایا ہے، جیسا کہ اس سورت کی ابتداء میں ہی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ اپنے رب سے ڈرو اور رشتہ داروں کا لحاظ رکھو، رشتہ داری کے حقوق کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اللہ تعالیٰ دیکھنے والے اور جاننے والے ہیں۔

اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مردوں کے لیے بھی حصہ ہے جو کچھ والدین نے چھوڑا اور رشتہ داروں

نے چھوڑا اور اسی طرح عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے جو کچھ والدین نے اور رشتہ داروں نے چھوڑا تھوڑا یا زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کردہ ہے، جس میں کسی قسم کا کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا۔

اس کے اندر وضاحت ہوگئی ہے کہ مردوں کے لیے بھی میراث ہے اور عورتوں کے لیے بھی میراث ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت (کفر کا زمانہ، حضور اکرم ﷺ سے پہلے کا دور) جب شریعت نہیں تھی لوگ اندھیروں کے اندر تھے، ہر کوئی اپنی اپنی عقل کے مطابق معاملات کو چلا رہا تھا؛ کیونکہ نہ شریعت تھی، نہ کتاب تھی اور نہ رسول تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقریباً چھ صدیاں گزر گئی تھیں تو لازم بات ہے کہ حالات بدل جاتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کچھ لوگ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں ایسے تھے جو توحید پر قائم اور ملت ابراہیمی کو سمجھتے تھے جو دین نصرانیت پر صحیح معنی میں قائم تھے۔ لیکن اکثریت اندھیروں میں بھٹک رہی تھی، اکثریت شرک وبدعات میں تھی۔ ہر جگہ ہر قبیلے کا اپنا خدا تھا، ہر قبیلے کے اپنے رسم ورواج تھے، ہر قبیلے کے اپنے طور طریقے تھے۔

حرم میں آج عورتوں کی حالت:

جیسے آج بھی اسی طرح کی جاہلیت اولیٰ عود کر آئی ہے، کتنی دنیا ہے جو بھٹک رہی ہے کہ میری بیٹیاں، میری بہنیں واجب الاحترام ہیں، ہزاروں روپے خرچ کر کے عمرہ پر تشریف لاتی ہیں، لیکن باریک کپڑے پہنے ہوئے ہوتے ہیں، چہرے کھلے ہوئے ہوتے ہیں، بال کھلے ہوتے ہیں، ہاتھ اوپر کریں تو بازو تک نظر آرہے ہیں۔ ایسے عمرے اور طواف کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے میری بیٹیاں مردوں میں گھس رہی ہیں، مردوں کے آگے گزر رہی ہیں، مردوں سے اختلاط ہو رہا ہے، حالانکہ طواف نفلی عبادت ہے اور مردوں سے اختلاط حرام ہے۔ اس لیے حکم ہے کہ وہ ایسے وقت میں طواف کریں جب رش نہ ہو اور باہر طواف کریں۔ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو عزت بخشی ہے، اس کو رشتے بخشے ہیں، ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے۔

قرآن میں مردوں کے خطاب میں عورتیں بھی شامل ہیں:

قرآن کے اندر اکثر مردوں کے لیے حکم آتا ہے؛ کیونکہ عورتیں مردوں کے تابع ہوتی ہیں۔

عورتیں بھی ترکہ میں وارث ہیں:

لیکن اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے بطور خاص عورتوں کا ذکر فرمایا ہے کہ مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اور

عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ زمانہ جاہلیت کے اندر قاعدہ یہ تھا کہ اگر کوئی آدمی مرجاتا تھا تو اس کی میراث مردوں کو دے دیتے تھے، عورتوں کو حصہ نہیں دیتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ہم لڑکی کو حصہ کیوں دیں؟ نہ تو یہ جنگ کرتی ہے، نہ باپ کے ساتھ تلوار اٹھاتی ہے تو یہ جائیداد کی حق دار کیسے بنے گی؟ ہماری جائیداد کا حق دار وہ ہے جو ہمارے ساتھ بازو دے کر کھڑا ہوتا ہے، ہمارے ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ کرتا ہے، لڑائیاں لڑتا ہے، دشمن سے زخمی ہوتا ہے اور عورت نے تو کسی دوسرے گھر میں چلے جانا ہے، اس کو ہم جائیداد کیوں دیں؟ لہٰذا وہ عورتوں کو جائیداد سے محروم کر دیتے تھے۔

نکمے لڑکے بھی وارث ہیں:

اور بعض کافر ایسے تھے جو بیٹے کمزور ہوتے تھے، لڑائی کے قابل نہ ہوتے تو ان کو بھی جائیداد نہ دیتے تھے کہ تم بڑے نکمے ہو، کمزور ہو، تمہیں جائیداد دینے کا کیا فائدہ ہے؟ جائیداد تو اس کو دی جاتی ہے جو بہادر ہو، تم تو بزدل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظلم کو ختم کر دیا۔

رشتہ داروں کو ترکہ میں حصہ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خبردار! جو والدین یا اقرباء اپنی جائیداد چھوڑتے ہیں، ان میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی حصہ ہے، ان میں قوی کا بھی حصہ ہے اور ضعیف کا بھی حصہ ہے۔ خبردار! تم نے ان کے گھر میں اولاد پیدا کی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو وارث بنایا ہے۔ اور جائیداد بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔

لیکن آج کتنے مسلمان گھرانے ہیں جو اپنی لڑکیوں کو جائیداد میں حصہ نہیں دیتے، کتنے گھرانے ہیں، کتنا ظلم وفساد بڑھ رہا ہے۔ کوئی نوجوان لڑکیاں ہیں، بڑے بڑے زمینداروں اور صنعت کاروں نے ان کی صرف اس لیے شادی نہیں کی کہ اس طرح جائیداد چلی جائے گی، لہٰذا بہنوں کے بال سفید ہو گئے۔ اور کتنی بیوہ عورتیں ہیں کہ چھ ماہ بعد یا ایک سال بعد ان کا خاوند مر گیا، ان کی کوئی اولاد نہیں یا ایک اولاد ہے، گھر کے اندر بٹھا رکھی ہے، تاکہ جائیداد ہمارے قبضے میں رہے۔ یہ ظلم ہے اور کافروں کی رسم ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کے لیے حصے مقرر کر دیے ہیں۔ تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تم اس میں دخل اندازی کرو اور وارثوں کو ان کے حصے ادا نہ کرو؟؟

غیر ورثاء کو کچھ دے دینا استحبابی حکم ہے:

﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا﴾

فرمایا: میراث کی تقسیم کے وقت جب کوئی رشتہ دار آجائیں یا کوئی یتیم آجائیں یا محتاج آجائیں تو ان کو کچھ نہ کچھ دے دو، ان کو کچھ کھلا دو، کپڑے پہنا دو اور ان سے بہتر انداز میں بات کرو۔

بعض علماء کرام مفسرین کرام سلف صالحین کہتے ہیں کہ یہ حکم استحبابی ہے کہ اگر جائیداد تقسیم ہو رہی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ رشتہ داروں کی موجودگی میں تقسیم ہوگی۔ تو اس وقت غریب بھی عموماً موجود ہوتے ہیں اور ان میں مسکین بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ تمہیں بھی تو والد کی جائیداد بغیر محنت کے مل گئی ہے کہ ساری زندگی باپ کما تا رہا اور تم گل چھرّے اڑاتے رہے، ساری زندگی باپ محنت کرتا رہا اور تم گلی ڈنڈا کھیلتے رہے اور آج کروڑوں کی جائیداد تمہیں بغیر محنت کے مل رہی ہے تو تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ اور جو تمہارے غریب رشتہ دار آگئے ہیں ان کو بھی کچھ دے دو، کچھ مسکینوں کو بھی دے دو۔

اگر جائیداد ایسی ہے کہ وارث بہت ہیں اور خود زیادہ مستحق ہیں، غریب و مسکین ہیں تو دوسرے ان رشتے داروں کو جو وارث ہیں، مگر غریب ہیں، ان کو پیسے نہ دے سکو تو کم از کم ان سے اچھی طرح بات کرو، ان سے یہ نہ کہو کہ آج جائیداد تقسیم ہونے کا دن تھا، آپ بھی تیار ہو گئے۔ ان کو طعنے نہ دو، بلکہ ان کو سمجھاؤ کہ یہ یتیموں کا مال ہے، پہلے سے مسکینوں کا مال ہے، اس سے ہم کیسے تمہاری خدمت کر سکتے ہیں؟ ہم مجبور ہیں، ان کی جائیداد میں ہم تمہیں کچھ نہیں دے سکتے؛ کیونکہ اسلام حکم دیتا ہے کہ اگر کبھی مانگنے والا آئے تو ان کو کبھی نہ جھڑکا کرو، ان کو کبھی برا نہ کہا کرو، ان کو کبھی گالی نہ دیا کرو، ان کو کبھی ڈانٹا نہ کرو۔ اگر تم ان کو دے سکتے ہو تو دے دو، ورنہ کہہ دو: اللہ کریم ہے، اللہ تمہیں بھی دیں گے۔ اور اگر کبھی کسی بیوہ یتیم یا مسکین کی مدد کرتے ہو تو بہتر ہے کہ ظاہر نہ کرو، بلکہ چپکے سے ان کی مدد کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ دیں گے۔

تیسری بات یہ یاد رکھیں کہ جن غریبوں کی مدد کرو ان پر کبھی احسان نہ جتلاؤ، ورنہ تم نے جو کچھ کیا تھا وہ سب کا سب برباد ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ﴾

[البقرة: ۲۶۴] اپنے صدقات وخیرات کو احسان جتلا کر، کسی کو ستا کر، گالی دے کر، طعنہ دے کر ضائع نہ کرو۔ تم نے اللہ تعالیٰ کے لیے دیا ہے، کسی پر احسان کا کیا مطلب ہے؟

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی خدمت میں جب کوئی سائل آتا تھا تو حضرت باقاعدہ اس کے لیے چادر بچھاتے تھے اور فرماتے تھے: لوگو! ہم ان کی عزت کیوں نہ کریں؟ یہ تو آخرت کے ڈاکیے ہیں۔ جب ہم ان کو دیں گے تو یہ آخرت میں پہنچا دیں گے۔ ہماری چیزیں جب اتنی دور پہنچانے والے ہیں تو کیا ہم ان کی عزت نہ کریں؟ اگر یہ غریب نہیں ہوں گے تو ہم صدقات کہاں پر کریں گے؟

بعض علماء نے فرمایا: یہ حکم مستحب ہے کہ جائیداد کی تقسیم کے وقت اگر غریب رشتہ دار آئیں تو ان کو بھی کچھ نہ کچھ دے دو اور اگر ان کو نہ دو تو گناہگار نہیں۔

بعض علماء رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ امر وجوب کے لیے ہے۔ پہلے غریب رشتے داروں کو دینا واجب تھا۔ جب اللہ نے حصے بنا دیے کہ لڑکے کے دو حصے، لڑکی کا ایک حصہ ہے اور بیوہ کا آٹھواں حصہ ہے یا چوتھا حصہ ہے۔ جب حصے معین ہو گئے تو اب رشتے داروں کو دینے کی ضرورت نہیں رہی۔

﴿وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ⑨﴾

فرمایا: تم بھی تو بچے چھوڑ کر جاؤ گے، جیسے یہ بچے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اگر تم اپنی اولاد کو چھوڑ دو، اپنے کمزور بچوں کو چھوڑ دو تو کتنے ڈرتے ہو؟ اسی طرح یہ بھی کسی کی اولاد ہیں، یہ بھی تو کسی کے بچے ہیں، واجب الرحم ہیں، اس لیے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سیدھی بات کیا کرو، انصاف کی بات کیا کرو۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ⑩﴾

جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ ایسے ہیں جیسے انگارے کھا رہے ہوں اور عنقریب جہنم کی آگ میں جلائے جائیں گے۔ اگرچہ بظاہر حلوہ کھا رہے ہیں، مزے میں ہیں، لیکن اس کا انجام آگ اور جہنم کے انگارے ہیں۔

رشتہ داروں کے حصوں میں کمی بیشی کیوں ہے؟

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ﴾ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اصل وراثت میں تو سب شریک ہیں، لیکن آگے ہر ایک کے حصے کم اور زیادہ اس لیے ہوتے ہیں؛ کیونکہ رشتہ میں بھی فرق ہے۔ بعض رشتہ دار زیادہ

قریب ہیں اور کچھ کا رشتہ زیادہ قوی ہے، کبھی نسب کی وجہ سے قرابت ہے، کبھی زوجیت کی وجہ سے قرابت ہے اور کبھی ولاء کی طرف سے قرابت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سب کو اتنا حصہ دیا ہے جتنا اس کا حق ہے۔

کیا چیز دینے سے حصہ ادا ہو جاتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے عین عدل فرمادیا اور مشرکین کے اس ظلم کو ختم فرمادیا کہ لڑکے تو وارث بنیں، لڑکیاں وارث نہ بنیں۔ بدقسمتی سے آج مسلمانوں میں بھی مشرکین کی ہی رسمیں باقی ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو مسلمان ہیں، لڑکیوں کو حصہ نہیں دیتے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے لڑکی کی شادی کی تھی، اس کو جہیز دیا تھا، پیسہ دیا تھا، اس کا حصہ ادا ہو گیا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ وراثت علیحدہ چیز ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک فرض ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اتارا ہے اور اس میں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کا وارث آپ کا بیٹا بنے گا۔ اگر آپ کا بیٹا نہ ہوتا تو کوئی وارث نہ بنتا۔ اگر اللہ نے آپ کو اولاد دی ہے، لڑکے دیے ہیں، لڑکیاں دی ہیں تو مال بھی اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، پھر ان کے حصے بھی اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیے ہیں۔ اگر آپ نے اپنی لڑکی کو جہیز میں جو کچھ بھی دیا ہے اس کا تعلق میراث سے قطعاً نہیں ہے۔

ہمارے ہاں علاقائی رواج ایسا بن گیا ہے کہ بہنیں شرم سے کہہ دیتی ہیں کہ ہم نے بھائیوں سے کیا حصہ لینا ہے؟ میرا حصہ بھائیوں کو دے دو، حالانکہ وہ دل سے خوش نہیں ہوتیں۔ جب ان کی شادی ہو جاتی ہے تو ان کی اولادیں ہو جاتی ہیں تو وہ بھائی ظلم کرتے ہیں تو وہ کہتی ہیں کہ ہمارا حصہ دو۔ پہلے وہ بے چاری دھوکہ میں آکر اپنا حصہ دے چکی ہوتی ہیں، اس لیے ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ موت سے پہلے کسی عالم کی صحبت میں بیٹھ کر وصیت تیار کر کے لکھوائے اور گواہوں کے اس پر دستخط کروائے کہ میں نے اتنا قرضہ دینا ہے، اتنا قرضہ لینا ہے، زمین اتنی میری ہے اور اتنی مستاجری پر ہے اور میری جائیداد شریعت اور قرآن وسنت کے مطابق تقسیم کی جائے اور اس کے حصے یہ ہیں۔ اپنی زندگی میں وصیت مرتب کروا کر تصدیق کروا کر محفوظ کر دے، تاکہ اس کی موت کے بعد یہ نہ ہو کہ میت گھر میں رکھی ہو اور اولادیں جائیداد پر لڑ پڑیں۔ جتنی کہ دولت زیادہ ہو اتنے فتنے زیادہ ہوتے ہیں۔

شانِ نزول:

(حدیث) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بی بی اُمِ کجہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر

عرض کیا کہ میری دو لڑکیاں ہیں اور ان کا باپ مر گیا ہے، اب میراث میں وہ کچھ نہیں دیتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ﴾۔

مفت میں ملی جائیداد کی قدر نہیں ہوتی:

اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کی اولادوں کو ہدایت دے کہ جب جائیداد مفت ملے تو وہ اڑا دیتے ہیں۔ جیسا کہ مثال مشہور ہے کہ ایک آدمی بازار میں جا رہا تھا، اس کا جوتا ذرا خراب تھا۔ اس نے پگڑی اتار کر جوتے کو صاف کیا۔ دیکھنے والے نے کہا: یہ بڑا احمق ہے! بھلا کوئی پگڑی سے بھی جوتا صاف کرتا ہے؟ تو ایک اور سمجھدار آدمی وہاں کھڑا تھا، اس نے کہا: یہ بے وقوف نہیں ہے، جوتا اس نے اپنے پیسوں سے خریدا ہے اور پگڑی اس کے باپ کی ہے۔ اس لیے اس کے ہاں پگڑی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اور جوتے کا درد اس کو محسوس ہو رہا ہے؛ کیونکہ اس نے پیسوں سے خریدا ہے۔

کیا ورثا کے علاوہ کا بھی حق ہے؟

اس کے اندر دو قول ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے یا پہلے سے ہی مستحب تھا؟

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا کہ یہ آیت محکمہ ہے، منسوخ نہیں ہے، اس پر عمل کیا جائے گا۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ امر وجوب کے لیے ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جب رشتہ داروں کا دل خوشی سے چاہے تو حاضر مسکین کو بھی تھوڑا تھوڑا دے دیں، جن کا میراث میں حصہ نہیں ہے۔

حضرت ابن مسعود، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ، حضرت مکحول، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت عطاء بن ابی رباح، حضرت زہری اور حضرت یحییٰ بن یعمر رحمہم اللہ فرماتے ہیں: یہ امر وجوب کے لیے ہے۔

حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبیدہ وارث ہوئے، انہوں نے حکم دیا کہ ایک بکری ذبح کر کے جو رشتہ دار آئے ہیں ان سب کو کھلا دو۔ انہوں نے فرمایا: اگر اس آیت کا حکم نہ ہوتا تو یہ بکری بھی مال میں شامل ہو جاتی، لیکن حکم ہے کہ جن رشتہ داروں کا حصہ نہیں ہے ان کو بھی اس میں شامل کر دیا جائے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت اسماء بنت عبد الرحمٰن بن ابی بکر رحمہا اللہ فرماتی ہیں کہ جب انہوں نے باپ کی میراث تقسیم کی، اس زمانہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی زندہ تھیں۔ انہوں نے یہ کیا کہ جتنے رشتہ دار تھے

سب کو دیا، چاہے ان کا حصہ بنتا تھا یا نہیں بنتا تھا۔ اور اس کے بعد فرمایا: اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: ﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ ......﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو جب یہ خبر ملی تو کہا کہ انہوں نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرنے والے کو حکم دیا ہے کہ مرنے سے پہلے اگر وہ چاہے تو وصیت کر دے کہ جو غریب رشتہ دار ہیں، جو میرے وارث نہیں بنیں گے، ان کو بھی کچھ نہ کچھ دیا جائے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ خود سب کو جائیداد دی جائے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سخی تھے ان کی اولادیں بھی سخی تھیں اور اولادوں کی اولادیں بھی سخی تھیں۔ انہوں نے تو اپنا سب کچھ زندگی میں لٹا دیا۔

بہر حال بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق وصیت کے ساتھ ہے کہ مرنے والا وصیت کر جائے۔ اس لیے میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ جو مسائل نص قطعی سے واضح ہیں ان کے اندر کبھی اختلاف نہیں ہوا، مثلاً میراث کے اندر حکم ہے کہ لڑکے کے دو حصے اور لڑکی کا ایک حصہ ہے، کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب آیت: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ......﴾ آگئی تو یہ حکم ختم ہو گیا۔

بعض علماء نے فرمایا: بلا وجہ ہم نسخ کے کیوں قائل ہو جائیں؟ آیت اپنے مقام پر ہے، لیکن امر وجوب کے لیے نہیں، استحباب کے لیے ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ﴾ کا معنی یہ ہے کہ جب میراث تقسیم ہو اور غریب رشتہ دار بھی آجائیں جو وارث نہیں ہیں، یتیم غریب اور مسکین لوگ آجائیں اور مال بھی ماشاء اللہ بہت سارا ہے تو اب ہر آدمی دیکھتا ہے کہ یہ لے رہا ہے، وہ لے رہا ہے، اس کے دل میں بھی آتا ہے کہ مجھے بھی کچھ مل جاتا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ رؤف ورحیم ہیں، اپنے بندوں پر مہربان ہیں، اللہ نے فرمایا: ان کو بھی تھوڑا تھوڑا دے دو، تاکہ ان کا دل بھی راضی ہو جائے۔

مال کو صدقہ سے بچانا اچھا نہیں:

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: ﴿كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ﴾ [الانعام: ۱۴۱] کہ جب کوئی پھل کٹنے کا وقت آئے، گندم کٹ رہی ہے، چاول کٹ رہا ہے، غریب آگئے تو ان کو بھی کچھ نہ کچھ دے دو، ان کا بھی حق ہے، تاکہ ان کے دل سے تمہارے لیے دعا نکلے، ان کے دل تمہاری طرف سے زخمی نہ ہو جائیں۔ اس لیے اللہ نے

ان لوگوں کی مدح بیان کی ہے جو اپنے پھلوں میں، ثمرات میں، زراعت میں، کھیتوں میں جب کٹنے کا وقت آتا ہے تو غریبوں کا حصہ بھی رکھتے ہیں۔

اور اللہ نے قرآن میں ان لوگوں کی مذمت بیان کی ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو کہتے تھے کہ چپکے چپکے رات کو چلو، تا کہ بستی والے غریبوں کو پتہ نہ لگے، اس لیے رات کو چلو، قدم پر قدم رکھو، آواز بھی نہ آئے۔ تو اللہ تعالیٰ کا ایسا جلال آیا کہ اللہ نے ان کا سارا کھیت ہی برباد کر دیا کہ تم غریبوں سے بچانا چاہتے تھے، اللہ نے سارا مال برباد کر دیا۔

حدیث میں آیا: ((مَا خَالَطَتِ الصَّدَقَةُ مَالًا إِلَّا أَهْلَكَتْهُ)) [شعب الایمان، رقم: ۳۲۴۶] کسی مال میں صدقہ نہ ملاؤ، ورنہ سارا مال بے برکت اور خراب ہو جائے گا۔ صدقہ مال کی حفاظت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یاد رکھیں! اللہ کے راستے میں خیرات کرنے کی اتنی برکتیں ہیں، اللہ بلائیں اور مصیبتیں ٹال دیتے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔ اور صدقہ ایسی چیز ہے جو اللہ کے غضب کو بجھا دینے والی چیز ہے۔ اگر مصیبتوں کے بادل آ رہے ہوں تو آپ نے خیرات کی، غریب کے دل سے آواز نکلی، اللہ تعالیٰ نے اس کو ٹال دیا۔

اللہ کے راستے میں صدقہ کرنے والے کا مال کبھی کم نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ جو کچھ تم میرے راستے میں خرچ کرتے ہو میں اس کا فوراً بدلہ دیتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((مَا نَقَصَ مَالٌ مِنْ صَدَقَةٍ)) [معجم الصغیر، رقم: ۱۴۲] کہ جتنی خیرات کرو، تیرے مال میں کمی نہیں آئے گی۔ آپ دیکھیں کہ سخی کبھی بھی بھوکا نہیں مرتا، خیرات کرنے والوں کے رزق اور مال میں برکتیں ہی برکتیں ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اتنا دیتے ہیں کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ کہاں سے آ گیا؟ بس دل کو سمجھانے والی بات ہے۔

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾﴾ [النساء: ۱۱]

"اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اور اگر (صرف) عورتیں ہی ہوں، دو یا دو سے زیادہ، تو مرنے والے نے جو کچھ چھوڑا ہو، انہیں اس کا دو تہائی حصہ ملے گا۔ اور اگر صرف ایک عورت ہو تو اسے (ترکے کا) آدھا حصہ ملے گا۔ اور مرنے والے کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا، بشرطیکہ مرنے والے کی کوئی اولاد ہو، اور اگر اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے والدین ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں تہائی حصے کی حق دار ہے۔ ہاں اگر اس کے کئی بھائی ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ دیا جائے گا (اور یہ ساری تقسیم) اس وصیت پر عمل کرنے کے بعد ہوگی جو مرنے والے نے کی ہو، یا اگر اس کے ذمے کوئی قرض ہے تو اس کی ادائیگی کے بعد۔ تمہیں اس بات کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں ہے کہ تمہارے باپ بیٹوں میں سے کون فائدہ پہنچانے کے لحاظ سے تم سے زیادہ قریب ہے؟ یہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوئے حصے ہیں، یقین رکھو کہ اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔"

پہلے میراث کا اجمالی ذکر تھا اب تفصیلی حکم ہے۔

شانِ نزول:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی بیوی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یہ سعد کی دو بیٹیاں ہیں، ان کا والد آپ کے ساتھ غزوہ احد میں لڑتے ہوئے شہید ہوگیا ہے۔ اب ان کا چچا ساری جائیداد پر قابض ہے، ان کے والد کی جائیداد نہیں دیتا۔ اور یہ لڑکیاں ہیں، اگر ان کو کوئی حصہ نہ ملا تو غریب لڑکیوں سے شادی کون کرے گا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہارے بارے میں کوئی حکم نازل فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت میراث نازل فرمائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لڑکیوں کے چچا کو پیغام بھیجا کہ سعد کی دونوں بیٹیوں کو دو تہائی مال دو اور ان کی والدہ کو آٹھواں حصہ دو اور باقی مال آپ کا ہوگا۔ [ترمذی، رقم: ۲۰۹۲]

یہ بات بھی سمجھ لیں! زمانہ جاہلیت میں میراث تو ملتا تھا، اس میراث کے ملنے کے تین اسباب تھے:

1 ......نسب۔

2 ......متبنیٰ کہ وہ کسی کو بیٹا بنا لیتے تھے، لیکن اس کو بھی اپنی جائیداد کا وارث سمجھتے تھے، اسلام کے اندر کسی کو بیٹا بنانا جائز ہے، اس سے محبت کرنا جائز ہے، لیکن میراث کے حکم میں وہ حق نہیں رکھتا، میراث کا حق صرف حقیقی بیٹا رکھتا

ہے۔ ہاں تم اپنی محبت سے اس کو کچھ دے دو، اس کے لیے کچھ بنا دو، تا کہ وہ بعد میں بھیک نہ مانگتا پھرے، لیکن وہ تمہارا وارث نہیں بن سکتا۔

3 ......اور الحلف والمعاہدۃ یعنی دو آدمی آپس میں قسم اٹھاتے تھے کہ تو میرا بھائی میں تیرا بھائی، تیرا خون میرا خون، تیری جان میری جان، تیرا قتل میرا قتل، تیرا نقصان میرا نقصان ہے اور تو میرا وارث ہے میں تیرا وارث ہوں۔ اور اس پر وہ قسم کھاتے تھے اور باقاعدہ ایک دوسرے کو وارث سمجھتے تھے۔

ابتداء اسلام میں میراث کی بنیادیں:

خود سمجھیں کہ کسی غیر کو بیٹا کہہ دیا تو وارث مانا، لیکن اپنی بیٹیوں کو وارث نہ مانا۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے اور یہی غیر کے قانون میں جھول ہوتا ہے جو آدمی کو نظر نہیں آتا۔

جب اسلام آیا تو اس کے اندر میراث کی دو بنیادیں تھیں:

1 ......ایک ہجرت کہ جو لوگ مدینہ منورہ ہجرت کر کے گئے، مہاجر مہاجر کا وارث بنتا تھا، غیر مہاجر کا وارث نہیں بنتا تھا۔ یعنی ایک آدمی نے ہجرت نہیں کی، چاہے وہ کتنا قریبی رشتہ دار ہے، اس کو میراث میں حصہ نہیں ملتا تھا۔

2 ......دوسرا مواخات تھا کہ میرے آقا سرکار مدینہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ تم اس کے بھائی اور یہ تمہارا بھائی ہے۔ جب وہ بھائی بن گئے تو اس میں اسلام کا ابتدائی حکم یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے وارث بن گئے۔ پھر جب اللہ نے آیاتِ میراث نازل کیں تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

وارث بننے کی تین اسباب:

میراث کا سبب تین چیزوں کو بنایا گیا ہے:

1 ......نسب،

2 ......نکاح کے بعد بیوی خاوند کی اور خاوند بیوی کا وارث بنایا گیا۔

3 ......ولاء، یعنی تمہارے پاس کچھ باندیاں یا غلام تھے، تم نے ان کو آزاد کر دیا۔ اب تم ان کے وارث بنو گے۔ اسی طرح وہ آقا جس نے غلاموں کو آزاد کیا تھا، اگر وہ مر جائے اور اس کے نسبی، عصبی اور ذوالارحام میں سے کوئی ورثاء موجود نہ ہوں تو یہ آزاد شدہ غلام اس کے ورثاء بنیں گے۔

یاد رکھیں! ان میں سب سے بڑی بنیاد نسب ہے اور نسب کے اندر حکم ہے: ''اَلْأَقْرَبُ فَالْأَقْرَبُ'' جو نسب میں سب سے زیادہ قریب ہے وہ سب سے زیادہ حق دار ہے۔ بیٹا، باپ وغیرہ میراث کے اندر بھی ان کا زیادہ حق ہوتا ہے، اس کے بعد پھر دوسروں کا نمبر آتا ہے۔

بیٹے کو ڈبل اور بیٹی کو سنگل کیوں ملتا ہے؟

اسلام نے ایسا عدل وانصاف کیا اور فرمادیا کہ خبردار! تم اپنی عقل کو نہ لڑاتے رہنا کہ اسلام نے لڑکے کو تو دو حصے دیے ہیں، بیوی کو آٹھواں حصہ ملتا ہے، ماں کو چھٹا حصہ ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم نہیں جانتے ہو کہ ﴿اَیُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا﴾ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ نفع دینے والا کون ہے؟ وہ میں جانتا ہوں اور میں نے جو میراث کی تقسیم کی ہے اس نفع کے مطابق کی ہے۔ جو تمہیں نفع زیادہ دے گا اس کا حصہ بھی زیادہ ہوگا اور جو تمہیں نفع کم پہنچائے گا اس کا حصہ بھی کم ہوگا۔ جس پر اخراجات زیادہ ہوں گے اس کا حصہ بھی زیادہ ہوگا، جس پر اخراجات کم ہوں گے اس کا حصہ بھی کم ہوگا۔

لڑکا جب بڑا ہو جائے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ ماں باپ کا خرچہ بیٹے پر ہے۔ اگر شادی ہوگی تو بیوی کا خرچہ بھی بیٹے پر ہے۔ اپنے گھر کے سارے معاملات بھی بیٹے کے ذمہ ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو حصہ بھی زیادہ دیا ہے۔ اگر لڑکی ہے جب تک وہ بالغ نہ ہو اس کا خرچہ ماں باپ کے ذمہ ہے، جب بالغ ہوگئی، شادی ہوگئی تو اس کا خرچہ شوہر کے ذمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس لیے اس کے حصے کو کم کر دیا۔ اللہ نے کسی سے بے انصافی نہیں کی، عین عدل کے ساتھ فیصلے کیے ہیں۔

میت کے ترکہ میں ترتیب حقوق:

(مسئلہ) آدمی کے مرنے کے بعد اس کے مال میں سے اس کا پہلا حق یہ ہے کہ آپ اس کی تجہیز وتکفین کریں۔ اس کے بعد اگر اس پر قرضہ ہے تو اس کے مال میں سے اس کا قرضہ اتاریں، اگرچہ ساری جائیداد قرضہ میں چلی جائے اور اس کے وارثوں کو کچھ نہیں بچتا تو نہ بچے؛ کیونکہ قرضہ ایسی چیز ہے جو توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا، کسی کی دعاؤں اور وظیفوں سے بھی معاف نہیں ہوتا۔

اگر اس کے بعد اس کا ترکہ بچ جائے تو باقی ماندہ سے اس کی وصیت کو نافذ کرنا ہے۔ یعنی اگر کوئی مردہ وصیت

کر گیا ہے کہ میرے مال میں سے اتنے پیسے مدرسہ کو دے دو، اتنے پیسے مسجد کو دے دو، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کی وصیت قرضے ادا کرنے کے بعد اگر مال کے تیسرے حصے جتنی ہے یا کم ہے تو نافذ ہوگی، اگر ثلث سے زیادہ ہے تو صرف ثلث مال وصیت میں دیا جائے گا۔ اور وارثوں کے لیے تو مال کی وصیت بالکل معتبر نہیں ہے۔ اور اگر یہ وصیت کر جائے گا کہ میرا سارا مال مسجد کو دے دو تو یہ وصیت کل مال میں نافذ نہیں ہوگی؛ کیونکہ اسلام اس کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اپنے ورثاء کو غیر محفوظ کر دے، اسلام اس کو یہ حق نہیں دیتا کہ اپنی اولاد پر ظلم کر جائے۔

اور اس کے بعد یہ احکام دیکھے جائیں گے کہ اگر ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں تو لڑکے کو دو حصے ملیں گے اور لڑکیوں کو ایک ایک حصہ ملے گا اور اگر بیوی ہے تو اس کو آٹھواں حصہ ملے گا۔ اور اگر ایک آدمی مر گیا اور لڑکی چھوڑ گیا ہے تو لڑکی کو کل مال کا آدھا حصہ ملے گا۔ اور ایک آدمی مر گیا دو لڑکیاں چھوڑ گیا یا دو سے زیادہ چھوڑ گیا تو ان کو کل مال کا دو تہائی حصہ ملے گا۔

احکامِ میراث کی تفصیل:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت مبارکہ میں اور جو اس کے بعد آیت مبارکہ ہے اور اسی طرح وہ آیت جو سورت کے بالکل آخر میں آئی ہے ان تین آیات میں اللہ نے علم الفرائض یعنی علم میراث کا بیان فرمایا ہے۔ علم الفرائض بڑا اہم علم ہے، اس کا استنباط اولاً قرآن پاک کی ان آیات مبارکہ سے ہے اور حضور اکرم ﷺ کے فرمان میں اس کی تفصیل ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حضور اکرم ﷺ پر اتارا اور سمجھایا اور اس کی تفسیر بھی آپ کو سمجھادی۔

ان تین آیات کے اندر علم الفرائض کا مفصل بیان ہے، باقی بعض مسائل میں جن میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے ان کا موقع کتب احکام ہیں۔ اگر کسی نے دیکھنا ہو تو کتب مسائل و دلائل کو دیکھ لے۔ ہم یہاں اتنا ذکر کریں گے جتنا حدیث رسول پاک سے سمجھ آجاتی ہے۔

موجودہ دور میں کمپیوٹر کی اہمیت اور فائدہ:

علم المیراث میں زیادہ حساب کتاب کا معاملہ ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اب یہ بالکل آسان ہوگیا ہے، لہٰذا جتنے بڑے بڑے مدارس ہیں اور جتنے بڑے بڑے دار الافتاء ہیں ان کو چاہیے کہ ایک کمپیوٹر رکھ لیں۔

اب علم المیراث پورے کا پورا کمپیوٹر میں بند ہو گیا ہے۔ اس کے اندر تو اتنی آسانی ہوتی ہے کہ وہ مسائل جن کا ہم پہلے حساب کتاب کے لیے کئی کئی گھنٹے لگا دیتے تھے، اب صرف ہاتھ سے چھونے کی ضرورت ہے۔ آپ نے مسئلہ لکھا: ایک آدمی مر گیا اور ایک بیوی دو لڑکے، چار لڑکیاں، ماں اور باپ چھوڑ گیا۔ یہ لکھ کر ہاتھ لگاتے ہیں اور مسئلہ فوراً حل ہو جاتا ہے۔ کوئی مشکل میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ تب ہے جب کسی کو کمپیوٹر کے اس پروگرام کو صحیح استعمال کرنا آتا ہو اور مسائل میراث سے واقف بھی ہو۔

اسی طرح ایک آدمی کی جائیداد ہے، اس کا مسئلہ چوبیس پر تقسیم ہو گیا یا آٹھ پر تقسیم ہو گیا تو آپ نے جتنے ہم نکالنے ہیں تو آپ کو ایک سیکنڈ میں ایک ایک روپے کا ایک ایک پائی کا حساب کر کے دے دے گا، یعنی جتنی اس نئے علوم میں شیطانیت آرہی ہے اسی طرح اس کے فائدے بھی بڑے ہیں۔ اب ماشاء اللہ فقہ ائمہ اربعہ کی کتب بھی زیادہ تر انٹرنیٹ پر آگئی ہیں۔ آپ نے کوئی مسئلہ دیکھنا ہو کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کیا کہتے ہیں؟ تو مسئلہ نکال سکتے ہیں۔ اب آدمی کو کتابیں اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی، ایک چھوٹی سی ڈسک ہو تو اس میں ہزاروں کتابیں آپ کی جیب میں ہیں۔ آپ نے جو مسئلہ دیکھنا ہو اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ مسئلہ آگے کھڑا ہے۔ ہم مولوی لوگ ہیں، ہم زیادہ کتابیں نہیں خرید سکتے تو ہمارے لیے یہ بڑی بات ہو گئی۔ اس کے اندر کتابیں آگئیں، اب ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کیا فرماتے ہیں؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کیا فرماتے ہیں؟ امام مالک رحمہ اللہ کیا فرماتے ہیں؟ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کیا فرماتے ہیں؟ ان کے مستدلات کیا ہیں؟

علم دین کی اقسام:

حدیث میں علم الفرائض سیکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ویسے ہر مسلمان موٹی موٹی باتیں یاد کر لے، کوئی مشکل نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ، وَمَا سِوَى ذٰلِكَ فَهُوَ فَضْلٌ: آيَةٌ مُحْكَمَةٌ، أَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ، أَوْ فَرِيضَةٌ عَادِلَةٌ)) [ابوداود، رقم: ۲۸۸۵] علم تو بس تین ہیں اس کے ماسوا تو بس فائدہ ہے: پہلی چیز قرآن کی وہ آیات جو محکمات ہیں؛ کیونکہ قرآن میں بعض آیات متشابہات ہیں۔ ان کو محکمات کی روشنی میں دیکھنا پڑتا ہے، پھر اللہ کا قرآن سمجھ آ جائے گا۔ دوسری چیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ جو ثابت ہے۔ اور تیسرا علم فریضہ عادلہ کہ اللہ نے جو کسی کا حصہ معین کر دیا، اس کو یاد رکھیں۔ یہ اصل علم ہے۔

اس لیے اصول ہے کہ جب آدمی علم کی تعریف کرتا ہے تو سب سے پہلی چیز "مَعْرِفَةُ اللهِ" اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا ہے "وَمَعْرِفَةُ نَبِيِّهٖ" حضور اکرم ﷺ کی معرفت ورسالت کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ یعنی ایک آدمی فلکیات میں پی ایچ ڈی کرے اور اللہ کی ذات وصفات کو نہیں جانتا وہ جاہل ہے، وہ عالم نہیں کہلائے گا، بلکہ عالم وہ ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو، جس کو میرے مدنی سرکار کی نبوت ورسالت کی معرفت حاصل ہو۔ اور جو حضور اکرم ﷺ کی کی ختم نبوت کو نہیں مانتا وہ جاہل ہے، عالم نہیں کہلائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام وشریعت کی معرفت ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کن چیزوں کا حکم دیا ہے اور کن چیزوں سے روکا ہے؟ اور اسی طرح عالم وہ ہوتا ہے جس کے دل میں اللہ کی خشیت ہو، اللہ کا خوف وعظمت ہو: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [الفاطر:۲۸] امام بخاری ؒ نے کتاب العلم میں باب باندھا ہے: "العِلْمُ قَبْلَ القَوْلِ وَالعَمَلِ" دین کی باتوں کا اقرار کرنے اور عمل کرنے سے پہلے دینی معرفت ضروری ہے۔

(حدیث) حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوهَا؛ فَإِنَّهُ نِصْفُ الْعِلْمِ وَهُوَ يُنْسَى، وَهُوَ أَوَّلُ شَيْءٍ يُنْزَعُ مِنْ أُمَّتِي)) [ابن ماجہ، رقم:۲۷۱۹] لوگو! میراث کا علم سیکھو کہ کتنا حصہ کس کا ہے اور کتنا حصہ کس کا ہے؟ اور لوگوں کو بھی سکھاؤ۔ یہ نصف علم ہے۔ سب سے پہلے میری امت کے سینوں سے یہی علم اٹھالیا جائے گا، لوگ نہیں جانتے ہوں گے کہ کس کا کتنا حصہ ہے۔

حضرت سفیان بن عیینہ ؒ فرماتے تھے کہ میراث کو نصف العلم اس لیے کہا گیا کہ ہر آدمی اس میں مبتلا ہے۔ سب نے مرنا ہے اور سب کی میراث کے حصے ہونے ہیں تو اس علم کے مسائل کا تعلق مرنے کے بعد سے ہے۔ جس طرح باقی شریعت کا تعلق مرنے سے پہلے کے ساتھ ہے تو اس اعتبار سے یہ آدھا علم ہوا۔

اور کئی لوگ بہنوں کے حصے کھاگئے، رشتہ داروں کے حصے کھاگئے تو ہر آدمی نے اس میں مبتلا ہونا ہے۔ علم الفرائض کو سیکھو اور اس کے مسائل کو سمجھاؤ۔

شانِ نزول:

حضرت جابر بن عبد اللہ ؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ بنوسلمہ قبیلہ کے اندر جارہے تھے۔ ان کو پتہ چلا کہ میں بیمار ہوں تو میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ جب حضور اکرم ﷺ میرے پاس آئے تو میں اس حال میں تھا کہ کچھ نہیں جانتا تھا، یعنی بے ہوش تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے پانی منگوا کر

وضوفرمایا اور جو پانی برتن میں جمع ہوا آپ نے فرمایا: اس کے چھینٹے اس کے منہ پر مارو۔ جب وہ مارے گئے تو میں ہوش میں آگیا اور میں نے حضور پاک ﷺ سے عرض کیا: اللہ نے مجھے مال دیا ہے، مجھے حکم دیں کہ میں کیسے تقسیم کروں؟ تو اللہ نے قرآن کی یہ آیت نازل فرمائی: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾۔
[بخاری، رقم: ۴۵۷۷]

اللہ اپنے بندوں پر ان کے والدین سے بھی زیادہ مہربان ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾

اس سے علماء نے مستنبط کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ان کے والدین سے بھی زیادہ مہربان ہے؛ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ والدین کو نصیحت کررہے ہیں کہ اپنی اولادوں کا خیال کرو، ان کو میراث دو تو معلوم ہوا کہ وہ والدین سے بھی رحم والا ہے۔ ورنہ والدین تو اپنی اولاد پر خود رحم کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے، اس سے بڑا رحم کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ بندہ اپنے باپ کی نافرمانی کرے تو باپ ایک دفعہ بخشے گا، دو دفعہ بخشے گا، تین دفعہ بخشے گا، لیکن یہ اس کا کمال ہے کہ ستر سال قبر کے سجدوں میں گزر جائیں، صرف ایک دفعہ اللہ کے آگے جھک کر توبہ کرلو اور شرک چھوڑ دو تو اللہ فرماتے ہیں: میں نے ستر سال کا شرک معاف کردیا۔ ساری زندگی شراب میں گزر گئی، لیکن ایک دفعہ توبہ کرلی تو اللہ نے معاف کردیا۔

اللہ کی مہربانی کا اندازہ:

(حدیث)((قَدِمَ عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِسَبْيٍ فَإِذَا امْرَأَةٌ مِنَ السَّبْيِ، تَبْتَغِي، إِذَا وَجَدَتْ صَبِيًّا فِي السَّبْيِ، أَخَذَتْهُ فَأَلْصَقَتْهُ بِبَطْنِهَا وَأَرْضَعَتْهُ، فَقَالَ لَنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَتَرَوْنَ هَذِهِ الْمَرْأَةَ طَارِحَةً وَلَدَهَا فِي النَّارِ؟ قُلْنَا: لَا، وَاللهِ وَهِيَ تَقْدِرُ عَلَى أَنْ لَا تَطْرَحَهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَلَّهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ هَذِهِ بِوَلَدِهَا))[مسلم، رقم: ۲۷۵۴] ایک عورت جب قیدی ہوئی تو اس کا بچہ علیحدہ ہوگیا، ماں علیحدہ ہوگئی۔ اب وہ عورت ڈھونڈ رہی ہے، کافی کوشش اور محنت کے بعد اس کو بچہ مل گیا تو اس نے جلدی سے بچے کو سینے سے لگالیا، اس کو بوسے دے رہی ہے، اس سے چمٹ رہی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میرے صحابہ! یہ عورت جو اپنے بچے سے اتنا پیار کررہی ہے، اگر اس کو طاقت وقدرت ہو تو کیا یہ اپنے ہاتھوں سے اس

بچے کو آگ میں ڈال دے گی؟ صحابہ نے عرض کیا: حضور! کیسے ڈالے گی؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ رحم فرمانے والے ہیں۔

وہ بھی اپنے بندوں کو آگ میں نہیں ڈالتے، اگر تم خود گرو تو تمہاری مرضی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو تمہیں بچانا چاہتے ہیں۔ اس لیے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے، ایک سو تائیس کتابیں نازل کیں، تا کہ تم جہنم سے بچ جاؤ اور تم اللہ کی نافرمانیوں سے بچ جاؤ۔ تم زبردستی جہنم میں جانا چاہو تو اس کا کیا علاج ہے؟

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَثَلِي وَمَثَلُكُم)) میری مثال اور تمہاری مثال ایسے ہے جیسے کوئی پروانہ، کوئی پرندہ آگ میں جاتا ہے، بندہ روکتا ہے، تم آگ میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمہیں پکڑ پکڑ کر روکنا چاہتا ہوں۔ تم آگ میں گرنا چاہتے ہو، مگر میں تمہیں بچانا چاہتا ہوں۔

میراث کی تقسیم کا فارمولا:

امام بخاری رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ پہلے مال اولاد کے لیے تھا اور والدین کے لیے وصیت تھی۔ اللہ نے اس کو منسوخ کر دیا، اب اللہ نے لڑکے کے دو حصے مقرر کر دیے، لڑکی کو ایک حصہ دے دیا، والدین میں سے ہر ایک کے لیے اللہ نے چھٹا حصہ رکھا اور کبھی ماں کو تیسرا حصہ دیا اور بیوی ہے تو اس کو آٹھواں حصہ ملے گا خاوند کے لیے نصف ترکہ یا چوتھائی حصہ ہوگا۔[1]

بعض ورثاء کے حصوں میں شبہ کا جواب:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ آیات نازل فرمادیں اور ان کے حصے معین فرمادیے کہ لڑکے کا بھی حصہ ہے، لڑکی کا بھی حصہ ہے، ماں باپ کا بھی حصہ ہے۔ بعض لوگوں کو یہ بات ناگوار گزری اور کہنے لگے: عجیب بات ہے! اب بیوی کو بھی چوتھایا آٹھواں حصہ ملے گا اور اسی طرح بیٹی ہو تو اس کو آدھا حصہ ملے گا اور اگر چھوٹا بچہ ہے تب بھی اس کو حصہ ملے گا، حالانکہ یہ (چھوٹا لڑکا، بیوی، ماں باپ) نہ تو جنگ کرتے ہیں، نہ غنیمت حاصل کرتے ہیں تو ان کو حصہ کیوں دیا جائے؟

انہوں نے کہا: شاید حضور اکرم ﷺ کچھ عرصہ بعد خاموش ہو جائیں یا یہ بات بھول جائیں یا ہم بار بار عرض کریں تو

---

[1] [بخاری، رقم: ۴۵۷۸]

حضور اکرم ﷺ حکم تبدیل کر دیں۔ تو ان میں سے بعض نے آکر یہ باتیں کیں کہ یا رسول اللہ! ہم لڑکی کو اس کے والد کے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ دیں، حالانکہ وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہوتی اور نہ ہی لڑائی کرتی ہے۔ اور ہم چھوٹے بچے کو میراث دیں، حالانکہ وہ کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ وہ لوگ جاہلیت میں میراث اسی کو دیتے تھے جو لڑ سکتا تھا اور ان میں بھی سب سے بڑے کو مقدم رکھتے تھے۔ [ابن کثیر: ۲/۲۲۶]

اللہ تعالیٰ کے احکام و قواعد بدلا نہیں کرتے، انسانوں کے قانون بدل جاتے ہیں؛ کیونکہ انسان ناقص ہے اور اس کی معلومات بھی ناقص ہیں، اس لیے ان کا قانون دس سال بعد فیل ہو جاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون کبھی فیل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ کا علم اتنا کامل ہے کہ ان کو ہماری ضروریات، مصلحتوں اور حقوق کی مقدار کا ہمارے پیدا ہونے سے پہلے بھی پتہ ہے، ہمارے پیدا ہونے کے بعد بھی پتہ ہے اور قیامت تک جو حالات آئیں گے ان کا بھی پتہ ہے، لہٰذا اللہ نے اس شریعت میں اپنے بندوں کے لیے ایسے قواعد بنائے ہیں جو دائمی اور ابدی ہیں، جن میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے نبی اللہ کے احکام کی تنفیذ کرتے ہیں، اللہ کے نبی اللہ کے احکام کو بدل نہیں سکتے۔

اس لیے یاد رکھیں! اللہ کے قانون نہیں بدلا کرتے۔ جب حضور اکرم ﷺ کے ساتھ یہ بات کی گئی تو آپ نے فرمایا: اللہ نے قانون بنا دیا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

اگر لڑکیاں ایک سے زیادہ ہوں تو دو تہائی مال ملے گا:

﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ﴾

بعض نے فرمایا: ﴿فَوْقَ﴾ کا لفظ یہاں زائد ہے؛ کیونکہ دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو ان کے لیے بھی دو تہائی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آتا ہے: ﴿فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ﴾ [الانفال: ۱۲]۔

مفسر ﷫ فرماتے ہیں یہ کہنا کہ ﴿فَوْقَ﴾ کا لفظ زائد ہے یہ بات غلط ہے، بلکہ اگر کہیں لفظ زائد آتا ہے تو مثلاً تاکید اور توکید ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ ۚ﴾ [الانعام: ۳۸] نہیں اڑتے پرندے مگر اپنے پروں سے۔ پرندہ اپنے پروں سے ہی اڑتا ہے۔ تو پروں کا ذکر کرنے کا مقصد تاکید ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ﴾ [الانفال: ۱۲] ان کی گردن مارو۔ اب گردن اوپر ہوتی ہے۔ مقصد تاکید ہے، ورنہ اللہ کے کلام میں ایک حرف بھی زائد نہیں ہوتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام

ہے، اس کے ایک ایک حرف کے اندر حکمتیں ہوتی ہیں۔ اگر ﴿فَوْقَ﴾ کا لفظ زائد ہوتا تو آگے قرآن کہتا ہے ﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ﴾ کہ ان دونوں کے لیے دو تہائی ہے، لیکن قرآن نے جمع کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اس سے یہ مفہوم سمجھ آیا کہ دو لڑکیاں ہیں یا دو سے زیادہ ہیں، ان کے لیے دو تہائی ہے۔ اور اگر ایک لڑکی ہے تو اس کے لیے آدھا ہے، جیسا کہ آگے تفصیل کے ساتھ پڑھیں گے۔ کیونکہ اگر دو بہنیں بھی ہوں تو ان کے لیے دو ثلث ہیں۔ تو دو لڑکیوں کو دو ثلث ملیں گے۔

جیسا کہ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ جب مر گئے تو دو لڑکیاں اور ایک بیوی چھوڑ گئے تو حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ دو تہائی ان کی لڑکیوں کو دے دو، آٹھواں حصہ اس کی بیوہ کو دے دو اور باقی تم بھائی لے لو۔

ایک لڑکی کا، والدین کا کیا حصہ ہے؟

﴿وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ﴾

اگر ایک لڑکی ہو تو آدھا حصہ ملے گا۔

﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ﴾

ایک آدمی مر گیا اور اپنے ماں باپ چھوڑ گیا تو دیکھو اولاد بھی ہے یا نہیں ہے؟ اگر ماں باپ ہیں اور اولاد بھی ہے تو اب ان کو چھٹا حصہ ملے گا۔

مثلاً میت ایک لڑکی چھوڑ گیا اس کو آدھا حصہ ملے گا ماں اور باپ کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اب پھر جو باقی بچے گا وہ پھر عصبہ ہونے کی وجہ سے باپ کو ملے گا۔

اور اگر صرف والدین ہیں تو ماں کو تیسرا حصہ اور باقی سب باپ کو ملے گا۔

اگر خاوند ہے یا بیوی ہے تو ان کو ان کا حصہ ملے گا اور ماں کو تیسرا حصہ اور باقی باپ کو ملے گا۔

اولاد اور ماں باپ کے حصوں کی تفصیل:

﴿فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ﴾

اگر ماں باپ بھی ہیں اور بہن بھائی بھی ہیں....

بہن بھائیوں کے احوال پھر تین قسم پر ہیں: بعض وہ ہوتے ہیں کہ ماں باپ ایک ہوں۔ ایک وہ ہے کہ ماں تو ایک

ہے، لیکن باپ الگ ہیں۔ اور ایک یہ ہے کہ باپ تو ایک ہے، لیکن ماں الگ الگ ہیں۔

بہر حال جیسے بھی ہیں، اگر وہ بہن بھائی ہیں تو تقسیم اس طرح ہوگی؛ کیونکہ وہ حاجب بنیں گے۔ باپ موجود ہے تو وہ میت کے وارث تو نہیں بنیں گے، لیکن ماں کے لیے حاجب بن جائیں گے کہ ماں کو ثلث ملنا تھا، اب اگر بہن بھائی ہیں تو ماں کو سدس ملے گا۔

اور اگر باپ کے علاوہ کوئی وارث نہیں تو سب باپ لے گا۔ دو بھائی ہوں یا ایک بھائی ہو ان سب کا ایک حکم ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جمہور کا قول یہی ہے کہ بھائیوں کو خود تو کچھ نہیں ملے گا، لیکن ماں کو حصے سے روک دیں گے۔ اور ایک قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے، وہ فرماتے ہیں: ماں کو تو سدس ملے گا اور جو بچے گا وہ بھائیوں کو ملے گا۔

بہر حال اس مسئلہ کو یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب کے حصے مقرر فرما دیے ہیں کہ اگر لڑکا لڑکی ہیں تو دو حصے لڑکے کے ہیں اور ایک حصہ لڑکی کا ہے۔

اور اگر لڑکیاں ہیں اور ایک سے زیادہ ہیں تو ان کے لیے دو تہائی ہے۔

اور اگر ایک لڑکی ہے تو اس کو آدھا مال دیا جائے گا۔

مرنے والے نے اگر ماں باپ چھوڑے ہیں اور مرنے والے کی اولاد بھی ہے تو ان کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر اولاد نہیں ہے، صرف اس کے ماں باپ ہیں تو ماں کو تیسرا حصہ ملے گا۔

اور اگر میت کے بھائی بھی موجود ہیں تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔

بہر حال تفصیلات کے لیے ضروری ہے کہ آدمی علماء سے رجوع کرے جو آپ کے علاقے کے مفتی ہیں ان سے رجوع کریں۔ چونکہ میراث کے مسائل میں کچھ باریکیاں ہیں جو عام آدمی نہیں سمجھ سکتا۔

میراث کا مسئلہ پوچھنے کا طریقہ:

یاد رکھیں! جب آدمی میراث کے مسئلے میں علماء سے رجوع کرے تو باقاعدہ لکھے کہ فلاں شخص فوت ہو گیا ہے، اب اس کے ورثاء میں مثلاً: ایک لڑکا، دو لڑکیاں، ایک بیوی، ماں، باپ، بھائی اور بہنیں ہیں، تاکہ مفتی کو مسئلہ نکالنے میں آسانی ہو۔ اگر آپ نے ایک جگہ بھائیوں کا تذکرہ نہیں کیا تو صاف بات ہے کہ مفتی تو غلطی کر جائے گا؛ کیونکہ بھائی

ہوں تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر بھائی نہ ہوں تو ماں کو کل مال کا چوتھائی ملے گا اور پھر لوگ کہیں گے: ایک مفتی یوں فتویٰ دیتا ہے اور ایک مفتی یوں فتویٰ دیتا ہے۔ حالانکہ مفتی خود فتویٰ نہیں بدلتے، بلکہ جو کچھ ہم پوچھنے میں غلطیاں کرتے ہیں اور توقع یہ رکھتے ہیں کہ مفتی کو خود پتہ چل جائے گا۔ اب اس بے چارے کو علم غیب تو نہیں ہے۔

ہمیشہ ایک اصول یاد رکھیں کہ کبھی ایک لفظ ادھر ادھر نہ بدلیں۔ جو ہو گیا اللہ کی مرضی سے ہو گیا، آپ صحیح صورت حال عالم کے سامنے رکھیں کہ یہ واقعہ ہوا ہے اور یہ لفظ نکلے ہیں، اتنا میں نے کہا ہے۔ اب مجھے بتائیں کہ اللہ کی شریعت کیا کہتی ہے؟ تو وہ آپ کو صحیح فتویٰ دیں گے۔ اور اگر آپ نے اگر مگر لگا دیا تو وہ مجبور ہیں، سو وہ انہیں لفظوں پر فتویٰ دیں گے جو سامنے ہیں۔

خلاصہ سمجھ لیں کہ اگر کوئی مر جائے تو لڑکے کا ایک اور لڑکی کا آدھا حصہ ہے اور بیوی کو چوتھا حصہ ملے گا یا اس کو آٹھواں حصہ ملے گا۔ ماں کے بھی دو حصے ہیں: اگر میت کے بھائی موجود ہیں تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر موجود نہیں ہیں تو تیسرا حصہ ملے گا۔ میت کی تین لڑکیاں ہیں، بیٹا کوئی نہیں تو ان کو دو تہائی حصہ ملے گا اور باقی دیگر وارثان کو ملے گا اور اگر ایک لڑکی چھوڑ گیا تو اس کو آدھا حصہ ملے گا اور باقی دیگر وارثوں کو دیا جائے گا۔

یہ موٹی بات یاد رکھیں، تا کہ اگر کوئی مسئلہ پوچھے تو بتا دیں باقی فتویٰ دینا ان لوگوں کا کام ہے جو علم میراث کے ماہر ہوتے ہیں۔ پھر وہ دیکھتے ہیں کہ مسئلہ بارہ سے بنے گا، آٹھ سے بنے گا: کیونکہ حصے بنانے پڑتے ہیں، تا کہ صحیح تقسیم ہو جائے۔

قرآن میں ﴿كَلٰلَةً﴾ کا لفظ آتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ﴿كَلٰلَةً﴾ اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی مر گیا، اس کی اولاد بھی نہیں ہے اور ماں باپ بھی نہیں ہیں۔

﴿مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ﴾

اللہ تعالیٰ نے سارے حصے بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ میراث کب تقسیم ہو گی؟ وصیت یا قرض کے بعد تقسیم ہو گی۔

اللہ تعالیٰ سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائیں؛ کیونکہ آخرت کی پہلی منزل کا آغاز ہے۔

میت کو کلمہ کی تلقین:

جب میت پر سکرات الموت ہو تو اس وقت سورۃ یسین کی تلاوت کی جائے، تا کہ رحمت کے فرشتے نازل ہوں

اور موت کے اندر آسانی ہو۔

اور دوسری ضرورت میت کے ورثاء وغیرہ کے لیے یہ ہے کہ ان میں سے کوئی میت کے قریب بیٹھ کر ہلکی آواز میں "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ" پڑھتا رہے کہ وہ سن لے، لیکن شور نہ کریں اور میت کو یہ نہ کہیں کہ کلمہ پڑھو، بلکہ اس کے پاس بیٹھ کر "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ" پڑھنا شروع کردیں؛ کیونکہ جب وہ کلمہ سنے گا تو اس کو خود بخود کلمہ یاد آئے گا اور وہ پڑھے گا، لیکن اس کو کہا نہ جائے؛ کیونکہ موت شدت کی گھڑی ہے، خدانخواستہ وہ کہہ دے کہ میں نہیں پڑھتا۔ اس لیے اس کے ساتھ بیٹھ کر پڑھتا رہے، تاکہ اس کو کلمہ کی تلقین ہوجائے اور وہ بھی کلمہ پڑھ لے اور اللہ تعالیٰ اس کا خاتمہ ایمان پر فرمادے۔ جب وہ مرجائے گا تو اس کا حق یہ ہے کہ جو ورثاء بیٹھے ہیں وہ فوراً اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بند کردیں؛ کیونکہ جب ابتداء سے روح پھونکی جاتی ہے تو اس کی ابتداء سر سے ہوتی ہے اور جب نکالی جاتی ہے تو نیچے سے اس کی ابتداء ہوتی ہے اور آخر میں آنکھوں سے نکلتی ہے۔

یہی وجہ ہوتی ہے کہ بعض اوقات آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور ہمارے جاہل کہتے ہیں کہ بے چارہ بیٹے کی انتظار کر رہا ہے۔ یہ بے وقوفی کی بات ہے۔ کیونکہ اب روح تو ہے نہیں کہ وہ اپنی آنکھیں خود بند کرے، اس لیے ہمیں حکم ہے کہ اس کی آنکھوں پر ہم ہاتھ دے دیں۔ اور اس کا چہرہ قبلہ کی طرف کردیا جائے، تاکہ اللہ نے جو قبلہ بنایا ہے یہ زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی ہمارا قبلہ یہی اللہ کا کعبہ ہے اور ہمارا چہرہ قبلہ کی طرف رہے۔

میت پر غم کا اسلامی طریقہ:

اور دوسرا حکم یہ ہے کہ مرنے کے بعد اس کا ماتم نہ کیا جائے۔ یہ سب کافروں کے کام ہیں، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی آنسو بہا رہا ہے تو وہ جائز ہے، لیکن فریاد، واویلا، چیخ و پکار ہائے برباد ہوگئے، لٹ گئے، تقدیر نے ایسا کیوں لکھ دیا، اللہ کو بھی ہمارا یہی بندہ ملا تھا، اس کو ساری دنیا میں اور کوئی نہیں ملا۔ یہ کافرانہ کلمات ہیں، جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جو لوگ کسی کے مرنے پر ماتم کرتے ہیں ان کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُودَ، وَشَقَّ الْجُيُوبَ، وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ)) [بخاری، رقم: ۱۲۹۷] جو ماتم میں اپنے چہروں پر تھپڑ مارے اور کپڑے پھاڑ ڈالے یا سیاہ لباس پہنے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کا میری جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آج کل

تو رواج ہے کہ اگر عورت کا خاوند مر گیا تو وہ سیاہ کپڑے پہنے گی۔ اسی طرح اگر کوئی بڑا آدمی مر گیا تو سر میں مٹی ڈال رہے ہیں، چیخ رہے ہیں۔ اور اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ ہوں تو سر میں چاقو بھی مار رہے ہیں اور پتہ نہیں کیا کیا کر رہے ہیں! یہ سب چیزیں حرام ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر صرف آنسو بہہ رہے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی علامت ہے۔ کیونکہ فطرتِ انسانی ہے جب کوئی عزیز جدا ہوتا ہے تو لازمی بات ہے کہ اس کا صدمہ ہوتا ہے۔

میت کی تجہیز و تکفین کا طریقہ:

پھر اس میت کے غسل کا بندوبست کریں۔ سنت تو یہ ہے کہ بیری کے پتے پانی میں ڈال کر گرم کریں۔ بہر حال اب تو صابن آ گئے ہیں؛ کیونکہ مقصد بدن کی صفائی ہے۔ صحیح غسل دینے والا میت کو غسل دے اور اسے کفن دیا جائے اور اس پر خوشبو وغیرہ لگانا سنت ہے۔

جنازہ اور تدفین میں تاخیر نہ کرو:

میت کا ایک حق یہ بھی ہے کہ جنازہ میں تاخیر نہ کریں۔ یہ جاہلیت کی رسم ہے کہ اس کا بھائی باہر ہے، اس لیے اس کو دو دن رکھو، وہ آ جائے۔ ابھی فلاں رشتہ دار نہیں آیا، ابھی فلاں رشتہ دار نہیں آیا۔ کیا رشتہ دار قبر میں ساتھ چلے جائیں گے؟ اگر وہ آ بھی جائیں تو قبر سے باہر رہیں گے، قبر کے اندر اس کے ساتھ تو نہیں جائیں گے؟ لہٰذا پھر ان کے آنے یا نہ آنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟

جہاں مرے وہیں دفن کیا جائے:

اسی طرح یہ بھی مسئلہ ہے کہ جہاں موت آئے اسی شہر میں دفن کرو، بلا وجہ منتقل نہ کرو۔

اگر مکہ یا مدینہ میں میت نے تدفین کی وصیت کی ہو:

علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی وصیت کر گیا کہ مجھے مکہ یا مدینہ میں دفن کیا جائے تو اس کی اس وصیت کو پورا کیا جائے، لیکن افضل یہ ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے موت لکھی ہے وہیں دفن کر دو۔

میت کو آرام سے لے کر چلیں:

جب میت کو لے کر چلیں تو آرام سے چلیں، جیسا کہ کسی زندہ کو لے کر جا رہے ہیں، دوڑنا نہیں اور الٹا سیدھا نہ

ریں، تا کہ میت کو تکلیف نہ ہو، اس کو آرام سے اٹھا کر چلیں۔

جنازہ کا امام:

اور جنازے کے لیے کوشش کریں کوئی موحد آدمی، صحیح العقیدہ آدمی نماز پڑھائے۔ اگر میت کی اولاد میں کوئی پڑھا لکھا ہے تو اولاد کا حق ہے کہ وہ جنازہ پڑھائے۔ اگر اولاد جاہل ہے تو اس علاقے کا کوئی عالم، صحیح العقیدہ موحد، کوئی مشرک نہ ہو؛ کیونکہ اس کی دعا مانگنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ غیر اللہ کا پجاری اور غیر اللہ کو سجدے کرنے والے نہ ہوں، اس لیے کوشش کیا کریں کہ جنازہ صحیح عقیدہ والا آدمی پڑھائے، تا کہ غریب کی آخری منزل تو صحیح ہو جائے۔

جنازہ کے بعد دعا نہیں ہے:

اور سنت یہی ہے کہ جو دعا میرے مدنی ﷺ نے سکھائی ہے وہی پڑھیں۔ جنازے کی نماز کے بعد کوئی دعا نہیں ہے۔ جب قبر میں دفن کر دیں تو پھر دعا مانگ سکتے ہیں، ورنہ جنازے کے بعد دعا مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اللہ کے نبی ﷺ کی دعا پر اعتماد نہیں ہے اور مولوی کی دعا پر اعتماد ہے۔

میت کے لیے سوگ کے ایام:

اور اس کے بعد یاد رکھیں کہ سوگ تین دن کا ہے، اس کے بعد کوئی سوگ نہیں ہے۔ صرف بیوی کے لیے چار مہینے دس دن سوگ ہے۔ یعنی گھر سے باہر نہ نکلے، میک اپ سنگھار نہ کرے، سرمہ نہ لگائے اور بلا ضرورت گھر سے باہر نہ جائے، کہیں بازار میں نہ جائے، غیروں سے نہ ملے اور اس گھر میں رہے جس گھر میں خاوند پر موت آ گئی اور اگر عورت حاملہ تھی تو وضع حمل ہونے کے بعد عدت گزر جائے گی۔ عدت کے بعد اس کو حق ہے کہ وہ میک اپ سنگھار کرے، شادی کے پیغام آ جائیں، تا کہ نکاح ہو؛ کیونکہ بلا وجہ بیوہ کو گھر میں بٹھانا حرام ہے۔

تین دن کے سوگ کا معنی یہ ہوتا ہے کہ میت کے ہمسائے یا رشتہ دار کھانا پکا کر بھیجیں۔ میت کے گھر سے کھانا حرام ہے۔ ایک ان کے گھر میں بندہ مر گیا دوسرا برادری آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اب اگر وہ روٹی نہ کھلائیں تو کہیں گے بڑا بدبخت ہے۔ برادری بیٹھی ہے اور یہ کھانا بھی نہیں دیتا۔

تعزیت کا طریقہ:

تعزیت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب میت والوں کے پاس جاؤ، ان سے کہو کہ اللہ اجر وثواب دے، اللہ کی مرضی، ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ'' اللہ تمہیں صبر دے، اللہ پسماندگان کو صبر دے، اللہ تعالیٰ نعم البدل عطا فرمائے۔ دعا کر کے آجائیں۔ ہمارے ہاں جو پرچے پر بیٹھنے کا رواج ہے، مٹی پر بیٹھتے ہیں، فاتحہ پڑھیں اور ہر مرتبہ ہاتھ اٹھائیں، یہ کوئی ضروری نہیں ہوتا، صرف زبان سے دعا کر دینا بھی کافی ہوتا ہے۔

خلاصۂ مسائلِ میراث:

اس کے بعد یہ دیکھیں کہ میت کے ذمہ اگر کوئی قرض ہے تو قرضہ ادا کر دیں۔ اگر ساری جائیداد قرضے میں چلی جائے تب بھی قرضہ ادا کرو۔

اب اس کے بعد دیکھو کہ وہ کوئی وصیت کر گیا ہے کہ مسجد بناؤ، مدرسہ بناؤ، پانی کا انتظام کرو۔ اگر وصیت کر گیا تو اس کے ثلث مال میں وصیت نافذ ہوگی۔

اگر وہ یہ وصیت کر جائے کہ میری ساری جائیداد مسجد کو دے دو تو اس پر عمل نہیں ہوگا؛ کیونکہ وارثوں کا حق نہیں مارا جا سکتا۔ اس کو زیادہ سے زیادہ صرف ثلث میں وصیت کرنے کا اختیار ہے۔

وصیت کی تنفیذ کے بعد اس کی جائیداد کو تقسیم کیا جائے گا کہ لڑکے کے دو حصے اور لڑکی کا ایک حصہ ہوگا، لڑکیاں ایک سے زیادہ ہوں تو دو تہائی اور ایک لڑکی ہو تو آدھا مال ملے گا۔

بیوی ہے تو اس کو چوتھائی حصہ ملے گا یا آٹھواں حصہ ملے گا۔

ماں ہے تو اس کو ثلث یا سدس ملے گا۔

اسی طرح اللہ نے قرآن میں فرائض بیان کر دیے ہیں۔

﴿آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾﴾

اللہ نے فرمایا: ہم نے جو حصے مقرر کر دیے ہیں اس کے اندر اس کی حکمت ہے؛ کیونکہ تمہیں کوئی پتہ نہیں کہ تمہیں زیادہ فائدہ اولاد سے پہنچے گا یا والدین سے پہنچے گا۔

وصیت لکھنے میں سستی نہ کرو:

شریعت کے اندر حکم ہے کہ آدمی اپنی وصیت تیار رکھے، بلکہ اس پر کوئی رات بھی ایسی نہ گزرے کہ جس میں اس کا وصیت نامہ لکھا ہوا موجود نہ ہو، محفوظ نہ ہو؛ کیونکہ انسان کی زندگی کے معاملات ہیں، اولاد کو پتہ نہیں ہوتا، رشتہ داروں کو بھی پتہ نہیں ہوتا، قرض ہے اور اسی طرح انسان کے حقوق ہیں، اس کے املاک ہیں۔ اس لیے بہتر یہ ہوتا ہے کہ وہ ان سب کی تفصیل اپنی وصیت میں لکھے کہ میں نے اتنا قرض دینا ہے اور اتنا قرض لینا ہے اور میری جائیداد جس کا اللہ نے مجھے مالک بنایا ہے، میری موت کے بعد کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مطابق تقسیم کی جائے، تاکہ وہ ذمہ داری سے بھی بچ جائے اور مرنے کے بعد بلاوجہ عذاب کا مستحق نہ بنے۔

اور اہل علم کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم موٹی موٹی باتیں فرائض کی یاد رکھیں۔ یہی سورۃ النساء میں جو اللہ تعالیٰ نے رکوع مبارک نازل فرمایا ہے، اس کو بھی اگر آدمی دو چار دفعہ پڑھ لے اور اس کا ترجمہ بھی سمجھ لے تو موٹی موٹی باتیں یاد ہو جاتی ہیں۔ اور اگر کبھی جزئیات کی ضرورت پڑے تو لازمی بات ہے کہ وہ علم میراث کے ماہرین، اصحاب علم کے پاس رجوع کرے۔

﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿١٢﴾﴾ [النساء: ١٢]

"اور تمہاری بیویاں جو کچھ چھوڑ کر جائیں، اس کا آدھا حصہ تمہارا ہے، بشرطیکہ ان کی کوئی اولاد (زندہ) نہ ہو۔ اور اگر ان کی کوئی اولاد ہو تو اس وصیت پر عمل کرنے کے بعد جو انہوں نے کی ہو اور ان کے قرض کی ادائیگی کے بعد تمہیں ان کے ترکے کا چوتھائی حصہ ملے گا۔ اور تم جو کچھ چھوڑ کر جاؤ اس کا ایک چوتھائی ان (بیویوں) کا ہے، بشرطیکہ تمہاری کوئی اولاد (زندہ) نہ ہو۔ اور اگر تمہاری کوئی اولاد ہو تو اس وصیت پر عمل کرنے کے بعد جو تم نے کی ہو اور تمہارے قرض کی ادائیگی کے بعد ان کو تمہارے ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا۔ اور اگر وہ مرد یا عورت جس کی میراث تقسیم ہونی ہے، ایسا ہو کہ نہ اس کے والدین زندہ ہوں، نہ اولاد، اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن زندہ ہو تو ان میں سے ہر ایک چھٹے حصے کا حق دار ہے۔ اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے، (مگر) جو وصیت کی گئی ہو اس پر عمل کرنے کے بعد اور مرنے والے کے ذمے جو قرض ہو اس کی ادائیگی کے بعد، بشرطیکہ (وصیت یا قرض کے اقرار کرنے سے) اس نے کسی کو نقصان نہ پہنچایا ہو۔ یہ سب کچھ اللہ کا حکم ہے اور اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا، بردبار ہے۔"

نسبی اور سسرالی رشتے:

سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا جو آپ پڑھ چکے ہیں: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ﴾ انسان کے رشتے دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک نسب کا رشتہ ہوتا ہے اور ایک سسرالی رشتہ ہوتا ہے۔ یہ دو رشتے ہیں جن سے رشتہ داریاں پیدا ہوتی ہیں۔ نسب سے مراد آدمی کا بیٹا ہے، پوتا ہے، والد ہے، والدہ ہے ان سارے رشتوں کا تعلق نسب سے ہے۔

اور بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق زواج سے ہوتا ہے؛ کیونکہ آپ کا کوئی تعلق نہیں ہوتا دور کی رشتہ دار کی لڑکی سے شادی ہوگئی، اب ان سے رشتہ داری بن گئی۔ تو ساس سسر سے بھی رشتہ داری ہوگئی، بیوی کے رشتہ داروں سے بھی رشتہ داری ہوگئی۔ اس میں بیوی کے حقوق بھی آگئے، خاوند کے حقوق بھی آگئے۔

اگر وہ تیسرے حصے سے زیادہ وصیت کر جائے۔ مثلاً کہے کہ میرا آدھا مال خیرات کر دینا تو بھی تہائی سے زیادہ پر عمل نہیں ہوگا؛ کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ وہ ورثا کو محروم کر رہا ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اس لیے کہ

ایک صحابی تھے ان کی موت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ نے مجھے کافی جائیداد دی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ساری کی ساری جائیداد اللہ کے راستے میں دے دوں۔ آپ نے فرمایا: بالکل نہیں۔ اس نے کہا: حضور! مجھے اجازت دیں کہ میں آدھی جائیداد خیرات کر دوں اور آدھی جائیداد میرے ورثاء کو تقسیم کی جائے۔ آپ نے فرمایا: بالکل نہیں، غلط بات ہے۔ اللہ نے جو تمہارے وارث بنائے ہیں ان کے لیے کچھ چھوڑو، یہ تو نہیں کہ تم ساری خیرات کر دو اور بعد میں وارث بھیک مانگتے پھریں۔ یہ بات غلط ہے۔ اس نے کہا: اچھا تیسرا حصہ خیرات کرنے کی اجازت دیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اچھا تیسرے کی اجازت تو ہے، لیکن یہ تیسرا حصہ بھی زیادہ ہے، یعنی بہتر یہ ہے کہ اس سے بھی کم کی وصیت کرو۔ بہر حال حضور اکرم ﷺ نے اس کو تیسرے حصے کی وصیت کی اجازت دے دی۔

اس لیے تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ سب سے پہلے میت کا قرض ادا کریں گے قرضے کے بعد جائیداد باقی ہے تو دیکھیں گے کہ وصیت ہے یا نہیں؟ اگر وصیت نہیں تو بات ختم ہو گئی، مال ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ اگر وصیت ہے تو دیکھیں گے کہ وہ تیسرے حصے سے زیادہ تو نہیں بنتی؟ اگر تیسرے حصے سے کم ہے تو ٹھیک ہے، تیسرے حصے تک ہے تو ٹھیک ہے، اس وصیت کو نافذ کر دیں گے۔ اس کے بعد جو بچے گا اس کو شریعت کے مطابق تقسیم کریں گے۔ اگر وصیت تیسرے حصے سے زیادہ ہے تو تیسرے حصے جتنی وصیت کو نافذ کر دیں گے، باقی مال ورثاء میں تقسیم کر دیں گے۔

وصیت میں نقصان پہنچانے کی صورتیں:

قرض ہو یا وصیت ہو، قرآن نے ایک پابندی لگا دی ہے: ﴿غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ﴾ نقصان پہنچانے کی نیت نہ ہو۔ مثلاً: ایک آدمی مرنے لگا، اس نے کہا: اگر میں نے جائیداد چھوڑی تو میرے وارث لے لیں گے اور اتنا حصہ ان کو مل جائے گا۔ اس کا ایک گہرا دوست تھا تو اس کے بارے میں کہہ دیا کہ میں نے اس سے اتنا قرضہ لیا تھا، حالانکہ اس سے قرض نہیں لیا تھا۔ اس کی نیت یہ تھی کہ میرے ورثاء کی بجائے میرے اس دوست کو حصہ مل جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قرضے کا اقرار کر کے اپنے ورثاء کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔

اور وصیت میں ایک نقصان یہ ہے کہ مثال کے طور پر ایک سو ایکڑ زمین چھوڑی ہے، اس میں دس ایکڑ سب سے

قیمتی ہے۔اس نے کہا: یہی خیرات کر دو اور جو باقی بچے وہ وارثوں میں تقسیم کر دو۔ یہ بات بھی شریعت کے احکام کے خلاف ہے۔

اہل میت کے ساتھ ہمدردی:

شریعت کا یہ بھی حکم ہے کہ جو آدمی فوت ہو جائے اس کے گھر میں تین دن تک کھانا منع ہے؛ کیونکہ وہ قابل رحم ہیں، ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے، نہ یہ کہ ان کا آدمی فوت ہو گیا اور برادری آ کر بیٹھ گئی۔اب ان دو سو آدمیوں کے کھانے کا انتظام کرو۔اگر اس کو اتنی بڑی ہمدردی ہے تو کسی ہوٹل میں کھانا کھالے اور آ کر بیٹھ جائے۔

اسی طرح یہ حکم ہے کہ جو آدمی مر گیا، اس کے جو قریب والے ہمسائے ہیں وہ تین دن تک اس میت کے گھر کھانا بھیجیں۔جب سب محلے والے بھیجیں گے تو مہمان بھی کھالیں گے، گھر والے بھی کھالیں گے اور ان کی ہمدردی بھی ہو جائے گی۔ان کے گھر میں کھانا بھیجنا چاہیے، نہ کہ کھانا کھانا چاہیے۔

قل خانی کا حکم:

تیسری بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو رواج ہے کہ قل خوانی شریف کرنی ہے۔سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بدعت ہے۔اگر یہ دین کی بات ہوتی تو اللہ کے نبی ﷺ اس کا حکم فرماتے۔حضور اکرم ﷺ نے ہمیں وضو، غسل، نکاح، طلاق، میراث کے احکام سمجھائے ہیں، اگر تیسرے دن میت کے حق میں قل خوانی ضروری تھی تو سب سے پہلے حضور اکرم ﷺ حکم دیتے۔

دوسری بات، فقہاء نے لکھا ہے کہ آدمی مر گیا، مرنے کے بعد جو خیرات کر رہے ہیں، یہ کس کے مال سے ہے؟ کیونکہ مرنے کے بعد مال وارثوں کا ہے۔وارثین میں کچھ چھوٹے بچے ہیں، ان کو میراث تب ملے گی جب وہ عاقل بالغ ہوں گے۔ان کی اجازت کے بغیر میت کے مال سے خیرات کر رہے ہو یہ حرام ہے۔اگر کوئی ایک بیٹا کہتا ہے کہ میں خیرات کروں گا تو کیا وہ اپنے حصے سے کرے گا یا میت کے ترکہ سے کرے گا؟ اس لیے شریعت ان چیزوں کی اجازت نہیں دیتی۔یہ ایسے رسم ورواج بن گئے ہیں لوگ مجبور ہو گئے ہیں کہ اگر نہیں کریں گے تو ناک کٹ جائے گی، لوگ گلہ کریں گے کہ فلاں کا باپ مر گیا بد بخت ایسا تھا کہ اس نے قل خوانی بھی نہیں کی ہے۔تو لوگ برادری میں ناک رکھنے کے لیے یہ کرتے ہیں، ورنہ ان کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ ہم اور زیر بار ہو جائیں گے، ہم اور مقروض ہو جائیں گے۔

ترکہ سے بیوی کا حق المہر ادا کرنا بھی فرض ہے:

ایک اور مسئلہ بھی سمجھ لیں جس کی طرف عام لوگوں کی توجہ نہیں جاتی کہ ایک آدمی مر گیا، اس نے اپنی بیوی کو حق المہر ادا نہیں کیا، جیسا کہ ہمارے ہاں حق المہر لکھ دیتے ہیں کہ ایک مربع زمین، ایک کوٹھی، تین لاکھ روپے نقد اور اگر جھگڑا ہو جائے تو پانچ ہزار روپے ہر مہینہ ادا کرے گا۔ اب اگر آدمی مر جائے اور حق المہر نہیں دیا تو اسلام یہ کہتا ہے کہ سب سے پہلے اس کی جائیداد سے اس کی بیوی کو حق المہر ادا کرو؛ کیونکہ یہ بھی قرض ہے، اس کی پوری جائیداد حق المہر میں چلی جائے تو کسی وارث کو کچھ نہیں ملے گا۔

یاد رکھیں! اسلام کے اصولوں پر چلو گے تو نہ تکلیف ہوگی نہ پریشانی ہوگی۔

ترکہ میں خاوند کا حصہ:

ایک آدمی کی بیوی مر گئی اور اس کی کوئی اولاد نہیں تھی، نہ اس خاوند سے اور نہ کسی اور خاوند سے اگر اس کی پہلے کہیں شادی ہوئی تھی تو جائیداد کا آدھا حصہ اس کے خاوند کا ہے۔

اگر بیوی مر گئی لیکن اس کی اولاد ہے، چاہے اسی خاوند سے یا پہلے خاوند سے تو اس جائیداد کا چوتھائی حصہ خاوند کو ملے گا لیکن شرط یہ ہے کہ اگر اس پر قرضہ ہے تو پہلے جائیداد سے قرضہ ادا کیا جائے گا یا اس نے ثلث مال میں وصیت کی ہے تو وصیت نافذ کرکے۔ جو بچے گا اس میں سے چوتھائی خاوند کو دیا جائے گا۔

ترکہ میں بیوی کا حصہ:

اگر خاوند مر جائے بیوی زندہ ہے، اگر خاوند کی اولاد نہیں ہے تو اس کی بیوی کو چوتھا حصہ ملے گا۔

اگر خاوند کی اولاد ہے اسی بیوی سے ہو یا دوسری بیوی سے تو بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا۔

یہاں مسئلہ سمجھ لو کہ ایک آدمی کی چار بیویاں ہیں تو اس طرح نہیں کیا جائے گا کہ ہر ایک کو چوتھا حصہ دیا جائے، ورنہ باقی سب وارث محروم ہو جائیں گے۔ اس لیے یوں سمجھیں کہ آدمی مر گیا، اس کی جائیداد چار سو ریال ہے تو ایک سو ریال بیوی کو ملے گا اور اگر دو بیویاں ہیں تو پچاس پچاس ریال ملیں گے اور اگر چار بیویاں ہیں تو پچیس پچیس ریال ملیں گے اور اگر مرنے والے کی اولاد ہے ایک بیوی ہے یا چار بیویاں ہیں تو سب بیویوں کو آٹھواں حصہ ملے گا۔

خاوند کے مقابلہ میں بیوی کو کم حصہ کیوں ملتا ہے؟

خدا کی شان دیکھیں کہ اگر خاوند مرجائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو بیوی کو چوتھا حصہ ملے گا اور اگر اولاد ہو تو بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا؛ کیونکہ یہ عدت کے بعد دوسری شادی کر سکتی ہے اور اس کو دوسرے خاوند سے بھی جائیداد میں حصہ ملے گا اور بیوی مرجائے خاوند زندہ ہے تو اس کو آدھا حصہ ملے گا، وارث تو بعد میں بنے گا، پہلے تو خرچ کرے۔ آج لوگ کہتے ہیں کہ اسلام نے انصاف نہیں کیا، لڑکی کو ایک حصہ اور لڑکے کو دو حصے دے رہا ہے۔ خاوند کل ترکہ کا آدھا یا چوتھا حصہ لے رہا ہے اور بیوی کو چوتھا یا آٹھواں حصہ مل رہا ہے۔

یاد رکھیں! اسلام عدل کرتا ہے؛ کیونکہ لڑکی پیدا ہوگی تو اس کا خرچہ ماں باپ کے ذمہ ہے۔ جب اٹھارہ بیس سال کی ہوکر اس کی شادی ہوجائے گی تو اب خرچہ خاوند کے ذمہ ہوگا۔ اور لڑکا اگر جوان ہو تو ماں باپ کو بھی کھلائے اور شادی کرے، بیوی کا خرچہ بھی اٹھائے۔ جس پر بوجھ زیادہ تھا اللہ نے اس کو ترکہ بھی زیادہ دے دیا اور جس پر بوجھ کم تھا اللہ نے اس کا ترکہ بھی کم کردیا۔

میاں بیوی کے ترکہ کی تقسیم میں عورت کو پہلے کیوں ذکر کیا؟

اس آیت کے اندر اللہ نے عورت کا مسئلہ بیان کیا کہ عورت مرجائے تو خاوند کو آدھا حصہ ملے گا اور مرد کا ذکر بعد میں کیا کہ خاوند مرجائے تو عورت کو چوتھا حصہ ملے گا۔ حالانکہ اصولاً تو ہر جگہ مرد کا ذکر پہلے ہوتا ہے۔ علماء نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ عورت کی جائیداد اس کی اپنی ملک، اپنے علاقے میں ہے، اس کے بھائیوں یا والدین کے پاس ہے، اس کے ہاتھ میں نہیں۔ اس لیے اللہ نے اہمیت دی کہ ایسا نہ ہو جب بیوی مرگئی، اس بیوی کے بھائی کہیں کہ ہماری بہن مرگئی، اس لیے کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور اس خاوند بے چارے کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ میری وہاں کیا کیا جائیداد ہے؟

وارثوں کے لیے وصیت کرنا اب جائز نہیں:

جب تک میراث کا حکم نہیں آیا تھا اس وقت تک وصیت کا حکم لازمی تھا۔ آدمی کچھ نہ کچھ اپنے رشتہ داروں کے لیے وصیت کرجائے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے میراث کے احکام نازل فرمادیے تو اب رشتہ دار وصیت کے محتاج نہیں رہے۔ اب یہ ہے کہ آدمی اپنی عاقبت کی بہتری کے لیے وصیت کرنا چاہتا ہے تو ثلث مال یا اس سے کم میں

کرسکتا ہے کہ کوئی صدقہ خیرات مدرسہ کے بارے میں وصیت کر جائے، تاکہ میرے مرنے کے بعد مجھے ثواب ملتا رہے۔اس کو وصیت کا حق ہے۔

کلالہ کا معنی اور وجہ تسمیہ:

﴿وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً﴾

ایک آدمی یا عورت مرگئی اور وہ کلالہ ہے۔کلالہ کی تفسیر میں علماء کے کئی اقوال ہیں۔راجح قول یہ ہے کہ کلالہ اس کو کہتے ہیں جس کا اصل بھی نہیں اور فرع بھی نہیں۔یعنی نہ باپ ہے اور نہ اولاد ہے۔کلالہ اکلیل سے مشتق ہے، یعنی تاج۔جیسے وہ ہر طرف سے سر کو گھیر لیتا ہے، معنی یہ ہے کہ مرنے والے کی اصل بھی نہیں اور فرع بھی نہیں، باہر کے رشتہ داروں نے گھیرا ہے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کلالہ کا کیا معنی ہے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک بات کہہ رہا ہوں۔اگر میری بات سچی ہے تو الحمدللہ اور اگر میری بات غلط ہے تو اس کا اللہ اور اس کے رسول سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ غلطی مجھ سے ہوگی۔میں نے کلالہ کا معنی یہ سمجھا ہے: ''مَنْ لَا وَلَدَ لَهٗ وَلَا وَالِدَ'' [تفسیر ابن کثیر] کہ جو ایسی حالت میں مرے کہ نہ اس کا باپ ہے اور نہ اس کی اولاد ہے۔جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ آیا ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: جو بات ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرما چکے ہیں مجھے ان کی رائے کی مخالفت کرنے میں حیا آتی ہے۔
[سنن کبریٰ:۶/ ۲۲۴]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''كُنْتُ آخِرَ النَّاسِ عَهْدًا بِعُمَرَ، فَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ: الْقَوْلُ مَا قُلْتُ وَمَا قُلْتُ وَمَا قُلْتُ، قَالَ: الْكَلَالَةُ مَنْ لَا وَلَدَ لَهٗ وَلَا وَالِدَ وَهٰكَذَا قَالَ عَلِيٌّ وَابْنُ مَسْعُوْدٍ وَصَحَّ عَنْ غَيْرِ وَجْهٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَزَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ، وَبِهٖ يَقُوْلُ الشَّعْبِيُّ وَالنَّخَعِيُّ وَالْحَسَنُ وَقَتَادَةُ وَجَابِرُ بْنُ زَيْدٍ وَالْحَكَمُ، وَبِهٖ يَقُوْلُ أَهْلُ الْمَدِيْنَةِ وَأَهْلُ الْكُوْفَةِ وَالْبَصْرَةِ'' [سنن سعید ابن منصور، رقم:۵۸۹] میرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخر دور تک ساتھ رہا اور فرماتے تھے: میں نے یہ کہا، میں نے یہ کہا، میں نے یہ کہا۔جب کلالہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''الْكَلَالَةُ مَنْ لَا وَلَدَ لَهٗ وَلَا وَالِدَ'' کلالہ اس کو کہتے ہیں جس کا باپ بھی نہ ہو، بیٹا بھی نہ ہو۔حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے کہ کلالہ اس کو کہتے ہیں جو

مرجائے اور نہ اس کی اولاد ہو نہ باپ۔ اسی طرح امام شعبی، امام نخعی، حضرت حسن، حضرت قتادہ، حضرت جابر بن زید، حضرت حکم اور اسی طرح فقہاء سبعہ اور ائمہ اربعہ رحمہم اللہ سب یہی کہتے ہیں کہ کلالہ کا معنی یہ ہے کہ جس کا باپ بھی نہ ہو اور اولاد بھی نہ ہو۔ بلکہ صحابہ سے لے کر ائمہ تک کا یہی قول ہے۔ بہر حال سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے اکیلی نہیں رہی، بلکہ ان کے ساتھ جمہور سلف بھی آ گئے اور جمہور خلف بھی آ گئے اسی طرح اہل مدینہ، اہل بصرہ، اہل کوفہ (جو علوم کے مرکز تھے ان) کا بھی یہی قول ہے۔ بلکہ ایک مرفوع حدیث بھی اس معنی میں ملی ہے۔

ایک قول یہ بھی آیا ہے کہ کلالہ اس کو کہتے ہیں جس کی اولاد نہ ہو، لیکن صحیح قول پہلا ہے کہ اولاد بھی نہ ہو اور باپ بھی نہ ہو۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس راوی نے یہ بات کہی ہے ہو سکتا ہے کہ اس نے سمجھا نہ ہو کہ لاولد تو سنا ہو اور لا والد نہ سنا ہو۔

کلالہ کی میراث میں اخیافی بھائی کا حصہ:

﴿اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر کوئی مرد مر گیا یا عورت مر گئی اور وہ کلالہ ہیں کہ ان کا باپ دادا بھی نہیں اور اولاد بھی نہیں، نہ بیٹا، نہ بیٹی، نہ پوتا، نہ پوتی، لیکن ایک بھائی ہے یا ایک بہن ہے۔ بھائیوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں: ایک حقیقی بھائی کہ باپ بھی ایک ہو اور ماں بھی ایک ہو۔ بعض علاتی بھائی ہوتے ہیں کہ باپ تو ایک ہے، لیکن مائیں الگ ہیں۔ اور بعض اخیافی بھائی ہوتے ہیں کہ یعنی ماں تو ایک ہے، لیکن باپ علیحدہ ہیں۔

یہاں جو قرآن نے فرمایا ہے: ﴿اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ﴾ یہاں اخیافی بھائی مراد ہے۔ یعنی مرنے والے کی اولاد اور باپ نہیں ہے، صرف ماں کی طرف سے ایک بھائی یا بہن ہے، حتیٰ کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے کہ جب یہ آیت پڑھتے تھے: ﴿اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ﴾ تو ساتھ "مِنْ اُمِّهٖ" بھی پڑھتے تھے۔ حالانکہ یہ قرأت شاذہ ہے، قراءات سبعہ میں سے نہیں ہے۔ لیکن اس کا تواتر ہے اور عمل بھی اسی پر ہے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی یہی تفسیر کی کہ اس کا باپ بھی نہیں اور اس کی اولاد بھی نہیں۔ اس کا ماں کی طرف سے ایک بھائی یا بہن ہے، اس کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر اس قسم کے دو، تین، چار یا زیادہ بھائی یا بہنیں ہیں تو اب سب تیسرے حصے میں شریک ہوں گے؛ کیونکہ اخیافی بہن بھائی باقی ورثاء سے مختلف ہیں کہ وہ ماں کی طرف سے وارث بنتے ہیں؛ کیونکہ ان کا باپ الگ ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اگر لڑکا اور لڑکی ہوں تو لڑکے کے دو حصے اور لڑکی کا ایک حصہ ہوگا لیکن اگر اخیافی بہن بھائی ہیں تو یہ برابر ہوتے ہیں، ان میں تیسرے حصے کو برابر تقسیم کر دیں گے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ ماں جائے بھائی تب وارث بنتے ہیں جب مرنے والے کا باپ بھی نہیں اور دادا بھی نہیں اگر باپ مر جائے یا دادا تو یہ وارث نہیں بنے گا۔ اسی طرح اگر مرنے والے کا بیٹا موجود ہے تب بھی وارث نہیں بنے گا۔ اخیافی بہن بھائی تب وارث بنیں گے جب اس مرنے والے کے اوپر کا یعنی اصل کوئی نہ ہو اور نیچے کا بھی کوئی نہ ہو یعنی اولاد بھی نہ ہو۔

چوتھا فرق یہ ہے کہ ماں کی طرف سے جو اخیافی بھائی ہیں چاہے وہ ایک ہے، دو ہیں، تین ہیں، چار ہیں، پانچ ہیں یا دس ہیں تو ان سب کو تیسرے حصے سے زیادہ نہیں ملتا۔

کلالہ کی میراث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اخیافی بہن بھائیوں کا حصہ:

((قَالَ ابْنُ أَبِي حَاتِمٍ: حَدَّثَنَا يُونُسُ، حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ، أُخْبَرَنَا يُونُسُ عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ: قَضٰى عُمَرُ أَنَّ مِيرَاثَ الْإِخْوَةِ مِنَ الْأُمِّ بَيْنَهُمْ لِلذَّكَرِ مثل الْأُنْثٰى، قال الزُّهْرِيُّ: وَلَا أُرٰى عُمَرَ قَضَى بِذٰلِكَ حَتّٰى عَلِمَ بِذٰلِكَ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ))[تفسیر ابن کثیر] سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا کہ جو ماں کی طرف سے بھائی ہیں ان کے لیے حصہ مقرر کیا تھا۔ ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ کہ اگر بھائی اور بہنیں ہیں تو بھائی کو دوہرا اور بہن کو اکہرا حصہ ملے گا۔ حضرت زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اگر یہ فیصلہ کیا ہے تو لازماً انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوا ہوگا۔

اصولی بات یاد رکھیں کہ یہ بات طے شدہ ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کلالہ کا معنی ہے کہ ایک آدمی مر گیا اس کا والد بھی نہیں اور اولاد بھی نہیں، وہ ایک بھائی اور ایک بہن چھوڑ گیا تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر وہ زیادہ بہن بھائی یعنی دو بھائی تین بہنیں یا تین بہن بھائی چھوڑ گیا، یعنی دو سے زیادہ ہیں تو اس کے مال کا تیسرا حصہ سب میں برابر برابر تقسیم کر دیں گے۔ یہ قول تمام صحابہ سے ہے۔ اخیافی بہن بھائی کا حصہ ہی شریعت نے الگ رکھا ہے۔ ایک آدمی مر جائے اس کا باپ موجود ہے یا بیٹے موجود ہیں تو ماں کی طرف سے جو بہن بھائی ہیں وہ وارث نہیں بنتے۔

کلالہ کی میراث میں اختلاف:

﴿فَإِنْ كَانُوٓا۟ أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى ٱلثُّلُثِ﴾

اس شرکت کے مسئلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ مثلاً عورت مر گئی، اس نے خاوند چھوڑا اور ماں چھوڑی یا دادی چھوڑی اور ماں کی طرف سے دو بھائی یا بہنیں ہیں اور باپ کی طرف سے بھی بھائی چھوڑے۔ اب جمہور فرماتے ہیں کہ خاوند کے لیے آدھا مال ہے، ماں ہے یا دادی ہے اس کو سدس دیں گے، جو ماں کی طرف سے بہن بھائی ہیں ان کو ثلث دیں گے، اور باپ کی طرف سے جو اولاد ہے وہ بھی شریک ہو جائے گی، اور جو ماں کی طرف سے ہے وہ بھی شریک ہو جائے گی؛ کیونکہ ان کے اندر ایک بات قدر مشترک ہے کہ وہ ماں کی طرف سے اس کے بہن بھائی بن گئے؛ کیونکہ اگر اس کی اپنی اولاد ہوتی تو زوج کو چوتھا حصہ ملتا؛ کیونکہ خاوند کو آدھا حصہ تب ملتا ہے جب اس کی بیوی کی اولاد نہ ہو، اور بیوی کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، جو ماں کی طرف سے بھائی ہیں وہ ثلث میں شریک ہو جائیں گے۔ اگر اس کے باپ کی طرف سے کوئی بھائی ہو تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔

"وَقَدْ وَقَعَتْ هٰذِهِ الْمَسْأَلَةُ فِي زَمَنِ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ عُمَرَ، فَأَعْطَى الزَّوْجَ النِّصْفَ، وَالْأُمَّ السُّدُسَ، وَجَعَلَ الثُّلُثَ لِأَوْلَادِ الْأُمِّ، فَقَالَ لَهُ أَوْلَادُ الْأَبَوَيْنِ: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! هَبْ أَنَّ أَبَانَا كَانَ حِمَارًا، أَلَسْنَا مِنْ أُمٍّ وَاحِدَةٍ؟ فَشَرَّكَ بَيْنَهُمْ"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس طرح کا ایک مسئلہ پیش آ گیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فیصلہ فرمایا کہ خاوند کو آدھا حصہ دو، ماں کو چھٹا حصہ دو اور ماں کی طرف سے اولاد کو ثلث دے دو۔ باپ کی طرف سے جو اس کے بہن بھائی تھے انہوں نے امیر المومنین سے کہا: ہمارا باپ کوئی گدھا تھا؟ کیا ہم ایک ماں سے پیدا نہیں ہوئے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بھی ثلث میں شریک کیا۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ مسئلہ آیا تو انہوں نے بھی ان کو ثلث میں شریک کیا۔ اسی طرح کا قول حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے۔ حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ہے۔ اور اسی طرح حضرت سعید بن المسیب، قاضی شریح، حضرت مسروق، حضرت طاؤس، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، عمر ابن عبد العزیز، حضرت شریک اور حضرت ثوری رحمہم اللہ ان سب کا مذہب بھی یہی ہے۔ اسی طرح امام مالک امام شافعی، اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

((وَكَانَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ لَا يُشْرِكُ بَيْنَهُمْ، بَلْ يَجْعَلُ الثُّلُثَ لِأَوْلَادِ الْأُمِّ، وَلَا شَيْءَ لِأَوْلَادِ الْأَبَوَيْنِ، وَالْحَالَةُ هَذِهِ لِأَنَّهُمْ عَصَبَةٌ.))

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ان کو ہم شریک نہیں کریں گے۔ جو ثلث ہے وہ صرف ان کے لیے ہے جو ان کی ماں کی طرف سے بہن بھائی ہیں، اولاد الاب کو کچھ نہیں دیں گے؛ کیونکہ وہ عصبہ ہیں۔ اور اس قول کو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے لیا ہے اور یہی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مشہور روایت ہے اور اسی قول کو امام شعبی اور ابن ابی لیلیٰ نے، حضرت امام ابوحنیفہ، ابو یوسف، محمد بن الحسن، حسن بن زیاد، زفر بن ہذیل، امام احمد، حضرت یحییٰ بن آدم نے، نعیم بن حماد نے، ابو ثور نے، داؤد بن علی الظاہری رحمہم اللہ نے لیا ہے کہ اولاد الام کو ثلث ملے گا، اولاد ابوین کو کچھ نہیں ملے گا؛ کیونکہ وہ عصبہ ہیں۔ عصبہ ہونے کی صورت میں جو ان کو ملے گا اس کے وہ حقدار ہیں، ان کے لیے کوئی حصہ مقرر نہیں ہے۔

دوسروں کے لیے وصیت کر کے وارثوں کو محروم کرنا:

﴿مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَاۗرٍّ ۚ﴾

﴿غَيْرَ مُضَاۗرٍّ﴾ کا معنی یہ ہے کہ ایک آدمی مرنے لگے وہ سوچے کہ میرے مرنے کے بعد میرے وارث مال لے جائیں گے، انہوں نے زندگی میں میرے ساتھ اچھا نہیں کیا، یہ میرے مرنے کے بعد تو مزے نہ کریں۔ اس نے وصیت کر دی کہ میری ساری جائیداد یتیم خانے کو دے دو۔ یہ منع ہے۔ کیونکہ جن کا اللہ نے حق رکھا ہے، تم ان کو کیوں محروم کر رہے ہو؟ لہٰذا ثلث سے زیادہ وصیت نہ کرو۔

بعض آدمی ...... نعوذ باللہ ...... جھوٹے قرضے کا کہہ دیتے ہیں کہ میں نے فلاں آدمی کا دو لاکھ دینا ہے وہ قرضہ ادا کر دیں۔ حالانکہ اس کا کچھ بھی نہیں دینا ہوتا۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میرے وارثوں کو نہ ملے اور میرے دوستوں کو مال ملے؛ کیونکہ انہوں نے ساری زندگی مجھے تنگ کیا ہے۔ اس لیے ایسا کرنا منع ہے۔ اگر وصیت کرے تو عدل کے ساتھ کرے۔

یا ایک آدمی مر گیا دوسرا آدمی کہتا ہے کہ میں نے اس سے ایک لاکھ لینا ہے، جبکہ اس سے دس ہزار لینے تھے۔ یہ بھی ظلم ہے کہ ایک آدمی خواہ مخواہ آ کر مدعی بن جائے۔ اس کو کہا جائے کہ تمہارے پاس کوئی سند ہے؟ تو وہ کہے کہ یہ

بڑا اچھا آدمی تھا ہمارا لین دین تھا، سند کوئی نہیں تھی، لیکن میرے پاس گواہ ہیں۔ وہ جھوٹے گواہوں کو لا کر گواہی دلوا دے گا اور پانچ پانچ ہزار روپے ان کو دے دے گا۔ آج کل تو گواہ باہر کھڑے ہوتے ہیں کہ ہمارا سودا کرو۔ بڑے تجربہ کار گواہ ہوتے ہیں۔ آپ کبھی بھول جائیں گے، لیکن وہ کبھی نہیں بھولتے؛ کیونکہ ان کو دن رات گواہی دینے کی عادت ہوتی ہے، وہ ڈرتے نہیں ہیں۔ نیا آدمی جائے تو اس کے پاؤں بھی کانپنے لگ جاتے ہیں۔ یہ جھوٹا دعویٰ بھی ظلم ہے۔

فرمایا: اگر کسی نے وارثوں کو محروم کرنے کی کوشش کی یا وارثوں کے حصے کو گھٹا دیا یا کسی وارث کو زیادہ دے دیا تو یہ ساری چیزیں شریعت کے خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ نے حکم دیا کہ تیرے بیٹے کو ایک لاکھ ملنا ہے، لیکن وہ وصیت کرے کہ میرے بیٹے کو دو لاکھ دے دینا، باقی بعد میں تقسیم کرنا۔ اس کا مطلب ہے کہ..... نعوذ باللہ...... اللہ کا فیصلہ غلط ہے اور تیرا فیصلہ ٹھیک ہے۔

اس لیے یاد رکھیں! اگر تمہارے چار بیٹے ہیں اور تم نے کسی ایک بیٹے کو گلاس ہدیہ میں دے دیا ہے تو چاروں کو برابر دو، ورنہ یہ بھی زیادتی ہے۔

بعض لوگ ایک بیٹے کو کوٹھی لکھ کر دے دیں گے، باقی بے چارے دھکے کھاتے پھریں گے۔ یہ بھی ظلم ہے۔ دینا ہے تو سب کو برابر دیں، تاکہ ظلم نہ ہو۔ ہاں کسی کو زندگی میں باقی اولاد کے مقابلہ میں خدمت وغیرہ کے صلہ میں کچھ زیادہ دینا چاہو تو دے سکتے ہو۔

وصیت میں وارثوں کو نقصان پہنچانا گناہ ہے:

(حدیث)((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الْإِضْرَارُ فِي الْوَصِيَّةِ مِنَ الْكَبَائِرِ))

[السنن الکبریٰ للبیہقی، رقم:۱۲۵۸۶] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آقائے نامدار سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وصیت کے اندر کسی کو نقصان پہنچانا بھی گناہ کبیرہ ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت موقوف ہے۔

مثلاً ایک آدمی وارث کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ پہلے بھی وہ وارث ہے اور پھر وصیت میں بھی اس کو کچھ دے جائے تو کیا اس کے اس اقرار کا ہم اعتبار کریں گے یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں۔

بعض ائمہ ﷭ فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے متعین فرما دیے ہیں اور حدیث میں ہے: ((لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ)) [ترمذی، رقم: ۲۱۲۰] تو اب وارث کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔

لیکن بعض ائمہ ﷭ فرماتے ہیں کہ اگر اس نے کوئی وصیت کی اور اقرار واعتراف کیا کہ میں نے یہ کیا ہے تو اس کو بھی اب قبول کریں گے۔ لیکن جمہور اسی طرف ہیں کہ وصیت کے احکام اس وقت تک تھے جب تک اللہ نے وارثوں کے حصے متعین نہیں فرمائے تھے، جب اللہ نے سب کچھ مقرر فرما دیا اب وارث کے بارے میں وصیت نہیں ہوگی۔ وارث کے علاوہ کسی کے لیے وصیت ہے تو ٹھیک ہے، تا کہ بلا وجہ اس پر تہمت کا خوف نہ رہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى قَدْ أَعْطَى لِكُلِّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ، فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ)) [ترمذی، رقم: ۲۱۲۰] اللہ نے ہر حق والے کا حق متعین فرما دیا ہے کہ بیٹے کا یہ حصہ ہے، بیٹی کا یہ حصہ ہے، خاوند کا یہ حصہ ہے، بیوی کا یہ حصہ ہے، ماں کا یہ حصہ ہے، بھائی، بہنوں کا یہ حصہ ہے تو اب وصیت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہی مذہب امام مالک ﷫، امام احمد بن حنبل ﷫ اور امام ابوحنیفہ ﷫ کا ہے۔ اور امام شافعی ﷫ کا بھی یہی قول قدیم ہے کہ وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔

امام شافعی ﷫ کا قول جدید یہ ہے (امام شافعی ﷫ آخری عمر میں مصر میں تشریف لے آئے تو کتب کا ذخیرہ بڑھ گیا تو جو بات انہوں نے وہاں فرمائی اس کو قول جدید کہا جاتا ہے۔) کہ اس کی وصیت مانی جائے جب اس نے وصیت میراث کے بارے میں کی ہو۔ اور یہی مذہب حضرت طاؤس، حضرت عطاء، حضرت حسن اور حضرت عمر بن عبد العزیز ﷭ کا ہے اور اسی قول کو امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری ﷫ نے اختیار کیا ہے۔ اور دلیل یہ پکڑی کہ رافع بن خدیج ﷫ نے وصیت کی تھی کہ جس کا دروازہ بند کر دیا ہے پھر اس کو نہیں کھولنا۔ تو ان کی وصیت پر عمل کیا گیا۔

مفسر ابن کثیر ﷫ فرماتے ہیں: بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کے اقرار کو نہیں مانیں گے، تا کہ باقی ورثاء کے بارے میں برا گمان نہ رہے۔

((إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ)) [بخاری، رقم: ۵۱۴۳]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: خبردار! بچو بدگمانی سے۔ یہ بدگمانی بھی بڑی جھوٹی بات ہے۔

جب بھی گمان کرو تو مسلمان کے بارے میں اچھا گمان کرو کہ ایسا نہیں ہو سکتا وہ مسلمان ہے، اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ میرے بارے میں ایسی بات کرے۔ اس وقت بات کرو جب یقین ہو۔ تم نے سنی ہو یا دو گواہوں نے

تمہیں کہی ہو، ورنہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ﴾ [النساء:۵۸] کہ اگر تمہارے پاس کسی کی امانت ہے تو اس امانت والے کو اس کی امانت پہنچاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ وارث کو پہنچاؤ اور غیر وارث کو نہ پہنچاؤ۔

اگر کسی نے اقرار کیا ہے اور وہ اقرار نفس الامر میں بھی صحیح ہے اور مطابق واقعہ ہے تو پھر دیکھیں گے کہ اقرار مانیں یا نہ مانیں؟ اگر ایک وارث اقرار کر رہا ہے کہ میرے لیے زیادتی ہے اور وہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچا رہا ہے تو یہ حرام ہے۔

اختلاف اس وقت ہے جب جائز بات ہو اور اگر وہ اقرار خلافِ شریعت ہے تو حرام ہے، اس کو نہیں دینا؛ کیونکہ اللہ نے قرآن میں فرمادیا: ﴿غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝۱۲﴾ یہ جو احکامات دیے ہیں اللہ کی طرف سے وصیت ہیں۔ ان پر کاربند رہو، شریعت کے خلاف نہ کرو۔ اور پھر یہ بھی یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والے ہیں۔ اگر ہم کوئی جھوٹ بول رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حلم والے ہیں کہ ہمیں جلدی نہیں پکڑتے، ورنہ اگر ہر گناہ پر پکڑ لیں تو کوئی بندہ زمین پر چلتا ہوا نظر نہ آئے؛ کیونکہ ہم سب خطا کار ہیں۔ اور اچھے وہ ہوتے ہیں جو اپنے گناہوں سے توبہ کریں۔ اللہ پاک ہم سب کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۳ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۱۴﴾ [النساء: ۱۳،۱۴]

”یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود ہیں۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ اس کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ایسے لوگ ہمیشہ ان (باغات) میں رہیں گے۔ اور یہ زبردست کامیابی ہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرے گا، اسے اللہ دوزخ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کو ایسا عذاب ہوگا جو ذلیل کر کے رکھ دے گا۔“

ربطِ آیات:

پچھلے دو رکوع میں میراث کے احکام بیان کرنے کے بعد اب ایک قاعدہ بتا دیا کہ میرے احکام میری حدود ہیں۔ جیسا کہ آج کل ملکی حدود ہوتی ہیں کہ یہ بارڈر ہے۔ اب جو حد سے کراس کرے گا دوسرے گولی مار دیں گے کہ تم نے بغیر اجازت کے کیسے کراس کیا ہے؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی احکامات ہیں گویا حدود ہیں کہ لڑکے کے دو حصے اور لڑکی کا ایک حصہ ہے۔ اس میں کوئی تجاوز کرے تو اس کے لیے جہنم ہے۔

یاد رکھیں! ذوی الفروض کے بارے میں عصبات کی تقسیم آپ کو بغیر علماء کے سمجھ نہیں آئے گی، ان کو پتہ چل سکے گا جو علم میراث کو سمجھنے والے ہیں۔ اور تین قسم کے مسائل کو ہمیشہ لکھ کر پوچھا کریں: نکاح، طلاق اور میراث، تا کہ بعد میں ردو بدل نہ ہو سکے، نہ عالم الجھن میں آئے اور نہ تم الجھن میں آؤ۔

وارث نہ ہونے کے اسباب:

میراث کے اندر کچھ مستثنیات ہیں یاد رکھ لیں۔ مسلمان مسلمان کا وارث بنتا ہے، مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا۔ مثلاً باپ مسلمان ہو گیا بیٹا کافر ہے تو بیٹا باپ کا واث نہیں ہو گا۔ کیونکہ مسلمان کا وارث مسلمان ہو گا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ)) [بخاری، رقم: ۶۷۶۴] مسلمان کافر کا وارث نہیں بنے گا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں بنے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے مسلمان تھا، اللہ نہ کرے وہ مرتد ہو گیا، قادیانی بن گیا یا عیسائی بن گیا اور اسی حالت میں مر گیا تو فقہاء فرماتے ہیں کہ اس کی جائیداد کا جتنا حصہ اسلام کے زمانہ کا ہے اس کا تو وارث بنے گا اور جو ارتداد کے بعد کا مال ہے مسلمان اس کا وارث نہیں بنے گا۔

میراث کے بعض مسائل:

ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی جس میں خاوند کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق تھا۔ خاوند فوت ہو گیا اور عورت ابھی عدت میں ہے۔ خاوند نے رجوع نہیں کیا تھا، عورت وارث بنے گی۔ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور عدت گزر گئی، وہ عورت چلی گئی۔ اس کے بعد خاوند مر گیا تو عورت وارث نہیں بنے گی؛ اس لیے کہ اس آدمی نے اپنی زندگی میں اپنی صحت و عافیت میں اس کو طلاق دی اور عدت میں اس نے رجوع بھی نہیں کیا تھا۔

ایک آدمی نے عورت کو طلاق بائن دے دی وہ ابھی عدت کے اندر ہے اور خاوند فوت ہوگیا ہے۔ اب اس کے لیے دو عدتیں ہوگئیں: طلاق والی عدت تین حیض ہے، خاوند فوت ہوجائے تو عدت چار ماہ دس دن ہے۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ یہ دیکھو کہ اس کی عدت زیادہ کونسی باقی ہے؟ اگر زیادہ چار مہینے دس دن والی ہے یا تین حیض والی ہے تو زیادہ عدت کو شمار کرلو، وہ وارث بن جائے گی۔ کیونکہ خاوند اس کی عدت کے اندر فوت ہوا ہے، لہٰذا آپ ان مسائل پر خصوصی خیال کیا کریں۔ اللہ رحمت فرمائے کہ یہ حقوق العباد کا مسئلہ ہے اور حلال وحرام کا مسئلہ ہے۔

ایک آدمی مرگیا، اس کی بیوی حاملہ تھی، اب میراث کیسے تقسیم کریں؟ کیونکہ جو پیٹ میں ہے اس کو بھی میراث ملنی ہے اور ہمیں یہ پتہ نہیں کہ لڑکی ہوگی یا لڑکا۔ علماء فرماتے ہیں کہ ابھی میراث روک لو۔ جب تک وہ بچہ یا بچی پیدا نہ ہوجائے اس وقت تک میراث تقسیم نہ کی جائے۔ اب باقی وارث ڈنڈے لے کر کھڑے ہوگئے کہ پیدا ہو یا نہ ہو، ہمارا کیا قصور ہے؟ ہمارا تو مال دو۔ اب علماء فرماتے ہیں: اندازہ کرو کہ اگر لڑکا ہوتا تو اس کو کتنا ملتا؟ اتنا حصہ روک لو اور باقی ورثا میں تقسیم کردو۔ اگر لڑکا ہو تو اس کو اس کا حصہ دیا جائے اور اگر لڑکی ہو تو اس کو اس کا حصہ دے دو۔

اگر مثلاً خاوند کے مرنے کے فوراً بعد ہی بچہ پیدا ہوگیا تو عدت ختم ہوجائے گی؛ کیونکہ عدت وضع حمل تھی۔ جب وضع حمل ہوگیا تو عدت ختم ہوگئی۔

اسی طرح ایک آدمی نے طلاق دی ہے تو عدت تین حیض ہے۔

اب بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو حیض نہیں آتا۔ اب اگر اس کو خاوند طلاق دے دے تو اس کی عدت تین ماہ ہوگی؛ کیونکہ حیض نہیں ہے۔

ایک آدمی نے ایک لڑکی سے نکاح تو کیا، نکاح کرنے کے بعد خلوت صحیحہ نہیں کی، یعنی میاں بیوی علیحدہ بھی نہیں ہوئے اور نہ جماع ہوا۔ اگر اس کو خاوند طلاق دے دے تو کتنی عدت ہے؟ اس کی کوئی عدت نہیں ہے؛ کیونکہ وہ عورت مدخولہ نہیں ہے۔ اگر اس نے طلاق دے دی اور عورت حاملہ ہے تو عدت وضع حمل ہے۔

بعض لوگ اللہ معاف کرے شوق کرکے شادی کرلیں گے، لیکن پھر سال دو سال بعد اس کو طلاق دے دیں گے، تاکہ وارث نہ بنے، میں نے سال دو سال مزے کرلیے۔ اور اسی طرح پھر شادی کرکے اس عورت کو بھی بھگا دیا، تاکہ وارث نہ بنے۔ تو فرمایا: اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں کہ تم کس نیت سے شادی کررہے ہو؟ اور کیوں طلاق دے رہے ہو؟

اس آیت سے ان جاہلوں کا بھی رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ اگر قرآن میں ہے تو ہم مانتے ہیں، ورنہ ہم نہیں مانتے، بلکہ جیسے اللہ کے قرآن کا حکم ماننا ہے اسی طرح حضور اکرم ﷺ کا فرمان بھی ماننا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کا حکم در اصل اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ پیغمبر ﷺ کبھی اپنی طرف سے حکم جاری نہیں فرماتے۔

کیا آدمی احکامِ میراث کے انکار سے کافر ہو جاتا ہے؟

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾

ایک آدمی نے میراث میں زیادتی کی اس سے وہ کافر تو نہیں ہوا اور جہنم کے اندر ہمیشہ تو کافر رہے گا۔ مسلمان جتنا بڑا گناہ گار اور فاسق ہو، لیکن اس کی موت ایمان پر آئی ہے، چاہے اس کو جہنم کی سزا ملی ہے، کبھی نہ کبھی تو جہنم سے نکلے گا۔

لہٰذا اس آیت کے اندر ﴿وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ﴾ کا معنی ہے کہ اگر اس نے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کا انکار کر دیا تو کافر ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں نہیں مانتا کہ لڑکے کے دو حصے اور لڑکی کا ایک حصہ ہو۔ یا کہتا ہے: (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ انصاف نہیں ہے کہ لڑکی کو کم دیا گیا ہے اور لڑکے کو زیادہ دیا گیا ہے، حالانکہ آج کل لڑکیاں لڑکوں سے آگے ہیں۔ ایسا کہنے والا کافر ہے اور کافر کی سزا ہمیشہ کے لیے جہنم ہے۔

کبھی کبھی ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں اور اس کا مقصود تشدید ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا﴾ [النساء: ۹۳] اگر کوئی آدمی قتل کو جائز سمجھتا ہے تو کافر ہے۔ جائز نہیں سمجھتا تو معنی یہ ہے کہ اس کے لیے بھی عمر قید ہے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کو عمر قید ہو گئی۔ حالانکہ بیس سال قید ہوتی ہے؛ کیونکہ اتنے سالوں میں کون مرے گا اور کون جیے گا؟

اس لیے کبھی ہمیشہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں اور مراد تشدید ہوتی ہے۔ اور کبھی اس کا معنی حقیقتاً مراد ہوتا ہے۔ اگر اس نے اللہ کے احکام کا انکار کیا ہے، مثلاً اس نے کہا: میراث کی باتیں ہم نہیں مانتے، یہ پہلے دور کی باتیں تھیں۔ اب دیکھیں! لڑکی بڑی فرماں بردار ہے، لڑکا بڑا نالائق ہے۔ لڑکی نے ڈی ایم اے کیا ہوا ہے، اسکول کے اندر استاذ ہے، تنخواہ لا کر باپ کو دے رہی ہے، لڑکے کے مقابلہ میں اس کو آدھا کیوں ملے؟ یہ کیسا انصاف ہے؟ اگر کوئی آدمی ایسا عقیدہ رکھے تو کافر ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی حکمتوں سے اس کی عقل زیادہ بہتر ہے۔

اللہ کے عذاب کی خطرناکی:

﴿وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ ایسے آدمی کے لیے عذاب مہین ہے، کبھی آتا ہے ﴿عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ اور کبھی آتا ہے ﴿عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس عذاب کو خود اللہ تعالیٰ عذاب عظیم فرمائیں تو وہ کتنا بڑا ہوگا جس عذاب کو اللہ تعالیٰ دردناک عذاب فرمائیں تو وہ کیسا دردناک ہوگا؟ اور جس عذاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرمائیں کہ وہ اہانت والا عذاب ہے تو وہ کس درجہ کی اہانت ہوگی۔

حصہ داروں کے حصص کی مقدار میں مصلحت:

اللہ تعالیٰ نے میراث کے جو حصے مقرر فرمائے ہیں وہ اس اعتبار سے ہیں کہ جس کا میت سے جتنا زیادہ قرب ہے اس کا اتنا زیادہ حصہ ہے۔ میت کے مرنے سے اس کا جتنا نقصان زیادہ ہوا ہے اس کا اتنا زیادہ حصہ ہے۔ جیسا کہ مرد کی دیت زیادہ ہے اور عورت کی دیت کم ہے؛ کیونکہ جس کا مرد مر جائے گا ان کا گھر الٹ جائے گا، اس لیے اس کی دیت زیادہ ہے، کیونکہ ان کا نقصان زیادہ ہوا ہے۔ اور اگر عورت مر جائے وہ کوئی کما کر تو نہیں کھلا رہی تھی، اس لیے اس کی دیت کم ہے۔ اس لیے اللہ نے مرد کو دو حصے دیے ہیں؛ کیونکہ اس کا نقصان زیادہ ہے کہ ساری ذمہ داری بیٹے پر آگئی تو صاف بات ہے کہ اس کو حصہ بھی زیادہ ملے گا۔ لڑکی نے کم بوجھ اٹھانا ہے اس لیے اس کو حصہ بھی کم ملے گا۔

میراث صحیح تقسیم کرنے کا انعام جنت:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کی یعنی کسی وارث کو اپنی طرف سے بڑھا کر نہیں دیا اور کسی کو گھٹا کر نہیں دیا، حیلہ بہانہ بنا کر وارثوں کو محروم نہیں کیا، بالکل اللہ کے حکم اور اس کے رسول کی اطاعت کی، اللہ نے جو فرائض مقرر کیے ان کو پورا پورا ادا کیا، ایسے شخص کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اور جنت کا پالینا سب سے بڑی کامیابی ہے۔

حدیث:

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْخَيْرِ سَبْعِيْنَ سَنَةً، فَإِذَا أَوْصَى حَافَ فِي وَصِيَّتِهِ، فَيُخْتَمُ لَهُ بِشَرِّ عَمَلِهِ فَيَدْخُلُ النَّارَ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ

بِعَمَلِ أَهْلِ الشَّرِّ سَبْعِيْنَ سَنَةً، فَيَعْدِلُ فِي وَصِيَّتِهِ، فَيُخْتَمُ لَهُ بِخَيْرِ عَمَلِهِ فَيَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: وَاقْرَءُوْا إِنْ شِئْتُمْ ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾)) [ابن ماجہ، رقم: ۲۷۰۴]

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی بندہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچھے عمل کر رہا ہے، ستر سال تک سارے کام اچھے کیے، لیکن جب مرنے کا وقت آیا تو وصیت میں ظلم کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عمل شریر پر اختتام ہوا تو جہنم میں چلا گیا۔ اور کوئی آدمی ستر سال تک اہل شر والے عمل کرتا ہے، پھر وصیت کرنے میں انصاف کرتا ہے تو اس کا خاتمہ اس کے بہترین عمل پر کیا جاتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ پھر حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ .... وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾۔

حضور اکرم ﷺ کا فرمان بالکل سچا ہے۔ اس لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا خاتمہ اچھا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہر کلمہ پڑھنے والے کا خاتمہ خیر پر فرمائے، اللہ تعالیٰ ہمیں تمام شرور سے، مصائب سے، گمراہیوں سے بچائے اور ہر کلمہ پڑھنے والے کو جنت الفردوس نصیب فرمائے۔ کوئی پتہ نہیں لگتا کہ ساری زندگی ایک بندہ اچھے عمل کرتا آرہا ہے، لیکن ستر سال بعد شرک کر بیٹھا، مرتد بن گیا، ستر سال کے بعد جب مرنے پر آیا تو وصیت میں ظلم کر بیٹھا کہ میرے مرنے کے بعد میرا مال وارثوں کو نہ ملے، اس کی وجہ سے وہ جہنم میں چلا جائے گا۔ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کے مقابلہ پر ایک آدمی برا ہے، ستر سال اس نے گناہوں پر گزارے۔ جب موت کا وقت آیا تو وصیت میں عدل وانصاف کیا، اللہ کے احکام کو مان لیا تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو گئے، اس کا خاتمہ خیر پر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جہنم سے نجات عطا فرمائیں گے۔

((حَدَّثَنَا الْأَشْعَثُ بْنُ جَابِرٍ، عَنْ شَهْرِ بْنِ حَوْشَبٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ حَدَّثَهُ، عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ وَالْمَرْأَةُ بِطَاعَةِ اللّٰهِ سِتِّيْنَ سَنَةً ثُمَّ يَحْضُرُهُمَا الْمَوْتُ فَيُضَارَّانِ فِي الْوَصِيَّةِ فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ)) [ترمذی، رقم: ۲۱۱۷]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مرد ہو یا عورت، ساٹھ سال تک عمل کرتے ہیں، لیکن جب موت کا وقت آیا ایسی وصیت کرتے ہیں کہ اللہ کی حدود کو توڑ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے جہنم کی آگ واجب کر دیتے ہیں۔

راوی فرماتے ہیں: اس کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ⑫ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑬﴾ اس روایت کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا ہے، لیکن جو امام احمد رحمہ اللہ نے روایت نقل فرمائی ہے وہ زیادہ کامل ہے۔

﴿وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ⑮ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ⑯﴾ [النساء: ۱۵،۱۶]

"تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا ارتکاب کریں، ان پر اپنے میں سے چار گواہ بنالو۔ چنانچہ اگر وہ (ان کی بدکاری کی) گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں روک کر رکھو، یہاں تک کہ انہیں موت اٹھا کرلے جائے، یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ پیدا کردے۔ اور تم میں سے جو دو مرد بدکاری کا ارتکاب کریں، ان کو اذیت دو۔ پھر اگر وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے درگزر کرو۔ بیشک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔"

احکام میراث کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے احکام بیان فرمائے ہیں جو زنا کا ارتکاب کریں تو ان کے لیے کیا سزا ہے؟

ربطِ آیات، گناہگار عورت کے احکام:

ربط بین الآیات آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو صحت وعافیت میں طلاق دے دی اور عدت بھی گزر گئی تو اب وہ اس کی وارث نہیں بنے گی۔ وارث تب بنتی ہے جب خاوند فوت ہوجائے اور بیوی اس کے نکاح میں ہو یا طلاق رجعی دی اور ابھی عدت نہیں گزری تو گویا وہ بھی نکاح میں ہے؛ کیونکہ وہ ابھی تک اس کے نکاح کی عدت میں ہے وہ وارث بنے گی۔

طلاق کب ہوتی ہے؟ کوئی آدمی اپنی شریف بیوی کو، مطیعہ بیوی کو طلاق نہیں دیتا۔ لازمی بات ہے کہ طلاق کی نوبت اس وقت آتی ہے جب نافرمانی کی گئی، ضد کی گئی، جھگڑے آگئے، خاوند تنگ آگیا، اب کوئی موقع اصلاح

نہیں رہا، ورنہ یہ علیحدہ بات ہے کہ کچھ لوگ ناجائز طلاق دیں، ورنہ عام طور پر کوئی شریف آدمی برداشت نہیں کرتا کہ اپنی بیوی کو طلاق دوں؛ کیونکہ طلاق تو آخری حل ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

جب پانی سر سے اوپر ہوجائے تو آدمی مجبور ہوجاتا ہے۔ اس لیے میراث کے بعد فوراً ایسے احکام کا ذکر کیا گیا، تاکہ عورتیں غلطی نہ کریں۔ اگر عورتوں نے غلطی کرلی ایک تو سزا کی مستحق ہوں گی، دوسرا خاوند کا نام ڈبودیا کہ فلاں کی کیسی گندی عورت ہے!؟ تیسرا یہ ہے کہ اللہ نے جو اس کو خاوند کی میراث کا حق دار بنانا تھا اس سے بھی محروم ہوگئی، لہٰذا میراث کے احکام بیان کرنے کے بعد ان آیات کا ذکر کیا کہ اگر تمہاری عورتوں میں سے کچھ ایسی ہیں جو گناہوں کا ارتکاب کرتی ہیں تو ان کی کیا سزا ہے؟

وجہ مناسبت یہ ہے کہ عورتوں کو تنبیہ ہو، ان کو ہدایت ہو کہ خبردار! کبھی گناہ نہیں کرنا۔

ایک اصول یاد رکھیں کہ بات پورے معاشرے سے ہوتی ہے، خطاب عام ہوتا ہے۔ یاد رکھیں کہ اگر شریف آدمی ہے، خاندان اچھا ہے، شوہر بھی شریف ہے تو ان کے ہاں طلاق کا مسئلہ اس حد تک نہیں پہنچتا جب تک کہ وہ گناہ نہ کرے۔ مثلاً ایک عورت گھر کا کام اچھا نہیں کرتی تو خاوند ڈانٹ دے، بچوں کو وقت پر تیار نہیں کرتی، بچوں کے مدرسہ کا خیال نہیں رکھتی وہ ڈانٹ دے، لیکن جب اس کی عزت میں خیانت کرے گی، نعوذ باللہ وہ زنا کا ارتکاب کرے گی، کسی دوسرے مرد سے تعلقات رکھ لے گی تو شریف آدمی برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ اس کی ہر غلطی برداشت کرسکتا ہے، لیکن جب عورت اس کی عزت میں خیانت کرے، کسی غیر مرد سے تعلقات جوڑ لے تو شریف آدمی برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اگر کوئی بے غیرت ہے تو اس کا تو کوئی شمار ہی نہیں، وہ تو انسانیت سے بھی نکلے ہوئے لوگ ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس بندے میں غیرت نہیں اس میں ایمان ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ ہمارا آج کل کا معاشرہ جدیدہ مغربی تہذیب میں ایسا کھوگیا ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کو یہ کہنا پڑا:

؎ خدا کے فضل سے دونوں میاں بیوی معزز ہیں
اسے غیرت نہیں آتی اسے غصہ نہیں آتا

بے غیرتی کی انتہاء:

آج کل بے غیرتی اتنی بڑھ چکی ہے اور بعض معاشرے اس مقام کو پہنچ چکے ہیں کہ وہ اپنی بیویوں کو ساتھ لاتے

ہیں اور اپنی گاڑی کی چابیاں ایک ڈبے میں ڈال دیتے ہیں۔ اس کے بعد اندھیرا کر کے ڈبوں کو ہلا دیں گے۔ ایک ایک ممبر نکلتا جائے گا اور چابی اٹھاتا جائے گا۔ جس کی چابی جس کے ہاتھ میں آگئی اس کی بیوی کو وہ رات کو لے جائے گا اور اس پر وہ خوش ہوتے ہیں کہ ذائقہ بدل لیا۔ وہ لوگ انسانیت سے، شرافت سے اور حدود اللہ سے کوسوں دور نکل گئے ہیں۔

زنا کے قریب جانے کی صورتیں اور ان کی ممانعت:

اس آیت مبارکہ کے اندر فاحشہ عورت کا بیان ہے۔ لفظ فاحشہ ویسے تو عام ہے، لیکن یہاں اس سے مراد زنا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا﴾ [الاسراء: ۳۲] زنا کے قریب مت جاؤ، یعنی جن جن باتوں میں زنا کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے آدمی کی نظر ہوتی ہے، اس کے بعد دل میں وساوس پیدا ہوتے ہیں کہ یہ لڑکی تو بہت خوبصورت ہے، پھر دل کا میلان زیادہ ہوا اور پھر بات ہوئی، پھر پیام شروع ہوا اور آخر میں جا کر انتہاء ہوگئی، لیکن جب تم اللہ کے حکم سے ڈر کر نظر بھی نہیں ڈالو گے تو تم اس سے دور رہو گے، قریب نہیں گئے، جس گلی میں تہمت کا خوف ہے وہاں عورت بے باک ہے، اس کے قریب نہ جائے۔

حضور اکرم ﷺ نے مثال بیان فرمائی کہ دیکھو! تم میں سے کوئی چرواہا اپنی بکریاں چراتا ہے اور وہ لوگوں کے گھاس کے قریب لے جاتا ہے۔ چاہے اس کی نیت نہ بھی ہو تو بھی خطرہ ہوتا ہے کہ بکری دوڑ کر گھاس کھا لے گی اور اگر وہ اپنی بکریوں کو دور رکھے تو یہ خوف ختم ہو گیا۔ وہ بکریاں جا ہی نہیں سکتیں۔

تو اب اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ زنا کے قریب ہی نہ جاؤ۔ جہاں یہ خطرہ پیدا ہو وہاں نہ جاؤ۔ اس لیے اسلام نے عورتوں کو حکم دیا ہے ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾ [الاحزاب: ۳۳] اپنے گھروں سے باہر نہ نکلو اور اگر کبھی مجبوراً نکلنا بھی پڑے کہ خاوند ڈیوٹی پر چلا گیا ہے مثلاً، بچوں کو سکول چھوڑنا ہے، تو زیب و زینت، سنگھار کر کے، فیشن کر کے، دعوت گناہ کے لیے باہر نہ نکلے، بلکہ حیاء، ادب اور شرم سے باہر نکلے۔ اگر کوئی مرد آجائے تو ﴿يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ﴾ [النور: ۳۱] اپنی نظریں نیچی کر لے۔ مرد کو بھی حکم دیا ہے کہ عورت آرہی ہے تو اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔ جب تمہاری نظر جھک جائے گی تو اللہ کی شان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا

خوف بھی آجاتا ہے؛ کیونکہ نظر اس کی جھکے گی جو اللہ سے ڈرے گا۔ جو اللہ سے نہیں ڈرے گا اس کی نظر نہیں جھکے گی، بلکہ وہ ساتھ والے کو بلا کر رہے گا۔ ادھر آؤ کام کی چیز ہے۔

کئی لوگ عورتوں کے پیچھے لگے کہ جب موقع ملے گا تو دیکھ لیں گے۔ جب موقع ملا اور دیکھا تو وہ اس کی اپنی ماں تھی، اپنی بہن تھی۔ یاد رکھو! اگر تم کسی کی بیٹی کو چھیڑو گے تو محلات میں بھی تیری بیٹی محفوظ نہیں رہے گی۔

دوسرا گناہ سے بچنے کے لیے اللہ نے حدیں مقرر کردی ہیں کہ لڑکا بالغ ہوگیا، لڑکی جوان ہوگئی، ان کی شادی کی کوشش کرو۔

تیسری بات یہ ہے کہ اپنے گھروں میں کوشش کریں اور کچھ نہیں تو اس کو قرآن کی تعلیم دے دیں، اس کو تعلیم الاسلام کی کتابیں پڑھادیں، کوئی دین کی کتاب پڑھادیں اور ان کے لیے نیک ماحول پیدا کردیں، تا کہ اللہ تعالیٰ اس کو گناہوں سے محفوظ رکھے۔

زنا کی سزا میں چار گواہوں کی شرط کیوں؟

ان سب حالات کے بعد اگر کسی عورت نے زنا کا ارتکاب کرلیا تو سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ تم گواہ بناؤ۔ اس کی سزا بہت بڑی ہے تو اس کو ثابت کرنا بھی بہت بڑا ہے کہ چار گواہ لاؤ اور چار گواہ بھی مرد ہوں، اس بارے میں عورت کی گواہی قبول نہیں ہوگی؛ کیونکہ اسلام کی منشاء یہ ہے کہ کم سے کم سزا ملے اور جب ملے تو نمونہ عبرت بن جائے، تا کہ دوسرا کوئی گناہ نہ کرے۔

اعداء الاسلام اتنے بڑے عیار ہیں کہ جن کاموں پر اسلام نے حدود اللہ قائم کی ہیں ان میں انہوں نے آزادی دی ہے۔ انگریزی قانون میں یہ ہے کہ اگر لڑکی نے یہ کہہ دیا کہ میں اپنی مرضی سے آئی تھی تو بات ختم ہوگئی اور کوئی سزا نہیں دیتے۔

بعض علماء نے چار گواہوں کے اندر ایک حکمت لکھی ہے کہ جرم بھی تو دو کر رہے ہیں۔ اور وہ گواہی ایسی بھی نہ ہو کہ صرف شبہات ہوں کہ یہ کہیں کہ ہم نے اس بندے کو اس کے گھر میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ جب خاوند گھر میں نہیں ہوتا تو یہ بندہ آتا ہے۔ اسلام اس حد کی شہادت کو نہیں مانتا؛ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بندہ کسی مجبوری سے آیا ہو، پتہ نہیں وہ گیا ہو اور دروازے کے اندر بھی داخل نہ ہوا ہو۔ اسلام تو اتنا تک بھی نہیں مانتا کہ اگر مرد اور عورت اکیلے

ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے تو ان کو سزا ملے گی، لیکن حد نہیں لگے گی۔

اگر چار گواہوں کی گواہی سے ثابت ہو گیا کہ عورت نے زنا کیا ہے تو پہلے اسلام کے اندر حکم تھا کہ ان کو اپنے گھر میں بند کردو، ان کا باہر نکلنا بالکل منع کردو جب تک مر نہ جائیں یا پھر اللہ کوئی اور قانون مقرر کردیں۔ یہ ابتدائی حکم تھا، جب حدود اللہ جاری نہیں ہوئی تھیں۔ اسی طرح یہ تھا کہ جنہوں نے گناہ کیا ان کو مارا جائے، ان کو طعن و تشنیع کی جائے۔ اگر انہوں نے توبہ کرلی اور توبہ کے بعد ٹھیک بھی ہو گئے تو توبہ کے بعد ان کو بلا وجہ طعنے نہ دیتے رہو۔ توبہ کے بعد گناہ دھل جاتا ہے، طعنہ دینے سے گویا تم شیطان کی مدد کر رہے ہو، تاکہ وہ پھر گناہ کی طرف لوٹے۔ جب اس نے توبہ کرلی ہے اور اللہ نے اس کو معاف کر دیا ہے تو ہم اس کو طعنہ دینے والے کون ہوتے ہیں؟ کیونکہ ہر بندہ گناہ گار ہوتا ہے۔ ایک بندہ زنا کرتا ہے، دوسرا زنا تو نہیں کرتا، لیکن جھوٹ بولتا ہے۔ ایک آدمی شراب پی رہا ہے، وہ گناہ، لیکن جو غیبت کر رہا ہے کیا یہ گناہ نہیں ہے؟

زنا کی سزا:

زنا کا یہ حکم اس وقت تھا جب تک اللہ تعالیٰ نے حدود (یعنی مستقل سزائیں) نہیں اتاری تھیں، سورۂ نور کی آیت نہیں اتاری تھی: ﴿اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ [النور: ۲] کہ اگر مرد بھی کنوارہ ہے اور عورت بھی کنواری ہے وہ زنا کریں تو ان کو ایک سو کوڑا مارا جائے۔ اور اگر مرد بھی شادی شدہ ہے اور عورت بھی شادی شدہ ہے یہ زنا کریں تو دونوں کو رجم کیا جائے۔ جب یہ آیت اتری تو پہلے والا حکم منسوخ ہو گیا کہ اس کو گھر میں بند کر کے رکھنا ہے۔

((قَالَ ابْنُ عباس رضی اللہ عنہ: كَانَ الْحُكْمُ كَذٰلِكَ حَتّٰى أَنْزَلَ اللّٰهُ سُوْرَةَ النُّوْرِ، فَنَسَخَهَا بِالْجَلْدِ أَوِ الرَّجْمِ))

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابتداء میں حکم یہی رہا کہ اگر عورت کا زنا ثابت ہو گیا، چار گواہوں نے گواہی دے دی تو عورت کو گھر میں بند کر دیتے تھے، جب تک کہ اس کی موت نہ آ جائے۔ اور جب اللہ نے سورۂ نور کی آیت نازل فرمائی تو یہ پہلا حکم ختم ہو گیا۔ اب ان کو یا تو کوڑے مارے جائیں گے یا رجم کیا جائے گا۔ اسی طرح حضرت عکرمہ، حضرت سعید بن جبیر، حضرت حسن، حضرت عطاء الخراسانی، حضرت ابو الصالح، حضرت قتادہ، حضرت زید بن اسلم اور حضرت ضحاک رحمہم اللہ یہ سب حضرات بھی فرماتے ہیں کہ پہلا حکم منسوخ ہے۔

((قَالَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ، حَدَّثَنَا سَعِيدٌ عَنْ قَتَادَةَ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ حِطَّانَ بْنِ عَبْدِ اللهِ الرَّقَاشِيِّ، عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ، أَثَّرَ عَلَيْهِ، وَكُرِبَ لِذَلِكَ، وَتَرَبَّدَ وَجْهُهُ، فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِ ذَاتَ يَوْمٍ، فَلَمَّا سُرِّيَ عَنْهُ، قَالَ: خُذُوا عَنِّي قَدْ جَعَلَ اللهُ لَهُنَّ سَبِيلًا، الثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ، وَالْبِكْرُ بِالْبِكْرِ، اَلثَّيِّبُ جَلْدُ مِائَةٍ وَرَجْمٌ بِالْحِجَارَةِ، وَالْبِكْرُ جَلْدُ مِائَةٍ ثُمَّ نَفْيُ سَنَةٍ، وَقَدْ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَأَصْحَابُ السُّنَنِ مِنْ طُرُقٍ عَنْ قَتَادَةَ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ حِطَّانَ، عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَفْظُهُ خُذُوا عَنِّي خُذُوا عَنِّي، قَدْ جَعَلَ اللهُ لَهُنَّ سَبِيلًا، الْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ.وَتَغْرِيبُ عَامٍ، وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ.)) [مسلم، رقم:۱۶۹۰]

امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت نقل فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں: ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوئی تھی، اللہ کے قرآن کا ثقل اور جبرائیل علیہ السلام کے آنے کا جو اثر تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑا بوجھ ہوتا تھا، حتیٰ کہ آپ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ سردی کا زمانہ ہوتا تھا تو بھی آپ کے چہرے پر پسینے کے قطرے آجاتے تھے۔ ہم محسوس کر لیتے تھے کہ آپ پر وحی اتری ہے۔ جب آپ سے وحی کی کیفیت ختم ہوگئی تو آپ نے فرمایا: مجھ سے مسئلہ سمجھ لو، مجھ سے مسئلہ سمجھ لو۔ اللہ نے عورتوں کے لیے راستہ پیدا کر دیا ہے کہ اگر شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت ہے اور انہوں نے زنا کیا تو اس کی سزا رجم ہے اور اگر دونوں کنوارے ہیں تو ان کو ایک سو کوڑا مارا جائے اور ایک سال کے لیے ان کو نکالا جائے، تاکہ وہ اس سزا کے طور پر اپنے گھر سے بھی نکلیں، معاشرے سے بھی نکلیں۔ اللہ کے ہر حکم کے اندر حکمت ہے۔ دیکھیں! اگر لڑکا بھی کنوارہ ہے اور لڑکی بھی کنواری ہے، زنا ہوگیا۔ اب ان کی اصلاح یہ تھی کہ شادی کر لیں گے، لیکن شادی شدہ ہے اور اس کے بعد زنا کیا ہے تو اللہ فرماتے ہیں: ان کو دنیا میں نہ رہنے دیا جائے؛ کیونکہ جب گھر کے اندر حلال موجود تھا، اس کے بعد بھی اگر انہوں نے حدود سے تجاوز کیا ہے، ان کو پتھر مار مار کر مار دو، ان کو معاشرے میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن جن کی اصلاح کی امید تھی، ان کے بارے میں حکم دیا کہ ان کو سو کوڑا مارو اور ایک سال کے لیے ان کو نکال دو۔

بعض ائمہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ سال نکالنے کی سزا منسوخ ہوگئی۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ ایک سال نکالنے کا حکم یہ ہے کہ ان کو قید کر دو، ورنہ یہ دوسرے ملک کے اندر جا کر بھی یہی کریں گے۔

((قَالَ أَبُو بَكْرِ بْنُ مَرْدَوَيْهِ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ أَحْمَدَ بْنُ إِبْرَاهِيمَ حَدَّثَنَا عَبَّاسُ بْنُ حَمْدَانَ، حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ دَاوُدَ حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَبْدِ الْغَفَّارِ، حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَبِي خَالِدٍ عَنِ الشَّعْبِيِّ، عَنْ مَسْرُوقٍ، عَنْ أُبَيِّ كَعْبٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْبِكْرَانِ يُجْلَدَانِ وَيُنْفَيَانِ، وَالثَّيِّبَانِ يُجْلَدَانِ وَيُرْجَمَانِ، وَالشَّيْخَانِ يُرْجَمَانِ. هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ مِنْ هَذَا الْوَجْهِ.)) [تفسیر ابن کثیر]

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کنوارے مرد وعورت کو کوڑے مارے جائیں گے اور جلاوطن کیا جائے گا۔ اور شادی شدہ مرد وعورت کو کوڑے مارے جائیں اور سنگسار کیا جائے گا۔ اور بوڑھے مرد وعورت کو سنگسار کیا جائے گا۔ یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ایک قول میں اسی طرف گئے ہیں کہ دونوں سزائیں دی جائیں گی کہ پہلے کوڑے مارے جائیں گے، پھر رجم کیا جائے گا۔ لیکن جمہور علماء رحمہم اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کنوارے ہیں تو کوڑے مارے جائیں گے اور اگر دونوں شادی شدہ ہیں تو رجم کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ اس بات کو پکڑتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ماعز اور غامدیہ عورت اور یہودیوں کو زنا پر سنگسار تو کیا تھا، لیکن اس سے پہلے ان کو کوڑے نہیں مارے تھے۔ تو اس سے معلوم ہو گیا کہ ان دونوں سزاؤں کو جمع کرنے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا: جب سورت النساء نازل ہو گئی تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا حَبْسَ بَعْدَ سُورَةِ النِّسَاءِ)) [المعجم الکبیر، رقم: ۱۲۰۳۳] کہ سورۃ النسا کے بعد اب قید نہیں کیا جائے گا۔

رجم کی سزا اب تک باقی ہے:

﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ [النور: ۲] عورت زنا کرے یا مرد زنا کرے تو ان کو سو سو کوڑے مارے جائیں، لیکن رجم کی جو آیت ہے اس کے بارے میں ائمہ کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ وہ آیت پہلے قرآن میں موجود تھی: ﴿اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا الْبَتَّةَ﴾ [ابن ماجہ، رقم: ۲۵۵۳] اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر شادی شدہ مرد اور عورت زنا کریں تو ان کو رجم کیا جائے گا۔ پھر وہ آیت مبارک اٹھالی گئی، یعنی اس کی تلاوت منسوخ

ہوگئی لیکن اس کا حکم باقی رکھا گیا؛ اس لیے کہ اگر حکم باقی نہ ہوتا تو حضور اکرم ﷺ کبھی رجم کا حکم نہ دیتے۔

منکرینِ رجم کا رد:

یاد رکھیں! جیسے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ویسے اللہ کے نبی ﷺ کا حکم ہے۔ ﴿مَنۡ يُطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء:۸۰] ہم مسئلہ قرآن میں دیکھیں گے یا سنت رسول پاک ﷺ میں دیکھیں گے۔ جب سنت رسول پاک ﷺ میں موجود ہے، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں رجم موجود ہے۔ اب جو لوگ رجم کا انکار کرتے ہیں وہ قرآن وحدیث کے منکر ہیں۔ ہمارا نیا طبقہ جو انگریزی پڑھ پڑھ کر جوان ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ کوئی رجم وغیرہ نہیں ہے۔ وہ پرانے دور کی باتیں تھیں۔ جو ایک آیت کا انکار کرے کافر ہے اور پھر قرآن کا انکار کرے تب بھی کافر ہے۔ کیونکہ بعض کو ماننا اور بعض احکام کا انکار کر دینا یہ پہلی والی امتوں کے اندر بیماری تھی کہ کچھ مان لیا اور کچھ کا انکار کر دیا۔ یعنی جو حکم فائدے میں نظر آیا اس کو مان لیا اور جو نقصان میں نظر آیا اس کا انکار کر دیا۔ جس کے بارے میں کسی شاعر نے کہا:

؎ خود کو بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

بندو اپنے آپ کو بدلنے کے لیے تیار نہیں، لیکن اللہ کے قرآن کے احکام میں تبدیلیاں اور تاویلات کرتے ہیں۔ اللہ کے قرآن کا انکار کرنا صراحتاً کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو محفوظ رکھے اور اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایمان کامل نصیب فرمائے۔

ہمیشہ یاد رکھیں! جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اللہ کے رسول کا حکم ہے، خلفائے راشدین کا حکم ہے، اس میں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ہم رد و بدل کر سکیں۔

رد و بدل کرنے کی بیماری یہودیوں کے اندر تھی۔ جب حضور اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں تھے، ایک یہودی عورت نے زنا کیا اور وہ کسی بڑے گھر کی عورت تھی تو ان لوگوں نے سوچا کہ اس کا فیصلہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لے جاتے ہیں کہ مہربانی کر کے ہمارا فیصلہ کریں۔ چونکہ ہم یہودی ہیں، ہم نے کلمہ نہیں پڑھا تو حضور اکرم ﷺ لازما کوئی رعایت کا فیصلہ کریں گے، کوئی تھوڑی سزا دیں گے، تاکہ ہمارے دل آپ کی طرف مائل ہو جائیں۔ وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے کہ یہ جرم ہے، آپ فیصلہ فرما دیں۔ حضور اکرم ﷺ نے

فرمایا: تم اہل کتاب ہو، تمہارا دعویٰ ہے کہ تورات کو مانتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم مانتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تمہاری کتاب میں کیا سزا ہے؟ انہوں نے کہا کہ اگر کسی مرد یا عورت سے زنا ہو جائے تو اس کو گدھے پر بٹھا کر الٹی طرف کر دو، منہ پر کالک لگا دو، دو چار جوتے مار کر بازار میں پھرا کر چھوڑ دو۔ تو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو تورات کے بہت بڑے عالم تھے، اسلام لا چکے تھے وہ مجلس میں موجود تھے انہوں نے عرض کیا: حضور! ان کو فرمائیں کہ کتاب لے آؤ۔ آپ نے ان سے فرمایا: کتاب لے آؤ۔ انہوں نے کہا: ہم لے آتے ہیں، وہ بڑے خوش تھے کہ تورات تو عبرانی زبان میں ہے، عربی زبان میں تو نہیں لکھی ہوئی کہ حضور پڑھ لیں گے۔ وہ کتاب لے آئے اور ان کے مولوی نے کتاب کھول کر رکھ دی اور اس جگہ جہاں رجم والی سطر تھی ہاتھ رکھ کر باقی پڑھنی شروع کر دی۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تو حافظ تھے، ان کو تورات کے صفحے یاد تھے انہوں نے کہا حضور! اس کو کہیں کہ ہاتھ بھی اٹھائے اور اچھی طرح سے عبارت پڑھے۔ جب اس نے ہاتھ اٹھایا تو عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: تمہاری کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ رجم کرو۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں بھی تمہیں رجم کی سزا بتاتا ہوں؛ کیونکہ تمہاری کتاب میں بھی رجم کی سزا موجود ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے ان کے لیے رجم کی سزا مقرر فرمائی، لیکن کوڑے مارنے کا فیصلہ نہ کیا۔ اس لیے ائمہ نے فرمایا کہ شادی شدہ زانی اور زانیہ رجم کیے جائیں گے۔

زنا کی سابقہ سزا منسوخ ہے:

﴿وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا﴾

اگر تم میں سے کسی نے زنا کیا ان کو ایذا پہنچاؤ۔ یعنی بعض علماء فرماتے ہیں: ان کو طعن و تشنیع کرو کہ تم نے بہت بڑا منہ کالا کیا ہے اور ان کو جوتے سے بھی مارو۔ یہ زانی اور زانیہ کے لیے سابقہ حکم ہے، لیکن جب اللہ نے قرآن میں یہ فیصلہ کر دیا کہ اگر وہ کنوارے ہیں تو ان کو کوڑے مارے جائیں اور اگر شادی شدہ ہیں تو ان کو رجم کیا جائے تو پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا﴾ کے بارے میں بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی نے زنا کیا ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے قوم لوط کا عمل کیا ہے؛ کیونکہ زنا کا حکم تو پہلے آچکا ہے، اس لیے اس سے مراد یہ ہے کہ یہی سزا تھی کہ ان کو تھپڑ مارو، جوتے

ماردو اور سزا دو، لیکن بعد میں ان کے لیے بھی حکم آ گیا۔ بلکہ ایک قول میں ہے کہ اگر کوئی آدمی بد فعلی کرے کہ لڑکا لڑکے کے ساتھ یا کوئی مرد دوسرے مرد کے ساتھ قوم لوط کا عمل دہرائے تو اس کے لیے ایک سزا یہ بھی ہے۔

دو مردوں کی آپس میں بد فعلی کی اصل سزا کیا ہے؟

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ وَجَدْتُمُوْهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهِ)) [ترمذی، رقم:۱۴۵۶]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو دیکھو کہ وہ قوم لوط والا عمل کر رہا ہے تو اس کرنے والے اور کرانے والے دونوں کو قتل کر دو۔ ان کو اس معاشرے میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مردوں کی باہمی بد فعلی کی مختلف سزائیں دی ہیں، اس لیے ان کی مخصوص سزا نہیں ہے، ان پر تعزیر ہے جو حاکم وقت مقرر کرے وہی سزا دی جائے گی۔

ہر گناہ سے توبہ ہو سکتی ہے:

﴿فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا﴾

یاد رکھیں! اگر ان دونوں کا جرم گواہوں کے سامنے ثابت نہیں ہوا اور عدالت میں نہیں پہنچا اور توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتے ہیں۔ اور اگر جرم ثابت ہو گیا تو پھر سفارش کرنا منع ہے، رعایت کرنا بھی منع ہے۔

اور اگر جرم ثابت نہ ہوا اور وہ توبہ کر لیں تو فرمایا: اب ان کو بلا وجہ طعنہ نہ دو؛ کیونکہ اگر تم اس کو گناہ کا طعنہ دیتے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ تم اس کو پھر جرم پر لگانا چاہتے ہو اور تم پھر شیطان کی مدد کر رہے ہو۔ کیونکہ جب آدمی توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو پاک کر دیتے ہیں گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں تو جب اللہ نے اس کا جرم معاف کر دیا تو تم اس کو طعنہ دینے والے کون ہوتے ہو؟

ایک بات کا خیال رکھا کرو! اگر تمہارے دوستوں میں کوئی آدمی کسی گناہ میں مبتلا ہے تو اس کے ساتھ ہمدردی یہ ہے کہ اس کو اکیلے میں نصیحت کرو کہ تم اچھے آدمی ہو، تمہیں یہ بات زیب نہیں دیتی اور اس کو محبت سے سمجھاؤ۔

حدیث میں آیا ہے کہ اگر کسی نے سمجھا کہ یہ کیسا بندہ ہے، زانی ہے طنز کیا! تو اللہ تعالیٰ اس کو تو توبہ کی توفیق دے دیں گے، لیکن تمہیں اسی بیماری میں مبتلا کر دیں گے۔

اس لیے کبھی کسی گناہ گار کو دیکھ کر طنز نہ کیا کرو۔ گناہ سے نفرت کرو، گناہ گار سے نفرت نہ کرو۔ کیونکہ گناہ گار مریض ہے، وہ ہمدردی کا مستحق ہے، اس سے ہمدردی کریں، اس کی خدمت کریں، اس کو ہدایت کریں، اس کو پیار کریں، اس کو اچھے ماحول میں بدلیں اور گندے ماحول سے نکال کر صالح ماحول میں لے آئیں، تاکہ اس کی اصلاح ہو جائے۔ تمہاری گھر میں کوئی بیمار ہو جائے تو کیا اس کو ٹانگ سے پکڑ کر باہر پھینک دیتے ہو؟ بیمار تو ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے کہ اس کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ، اس کی دوائی لے کر آؤ، ایک سے ٹھیک نہیں ہو رہا تو دوسرے کے پاس لے جاؤ۔ اسی طرح جو گناہ میں مبتلا ہیں وہ بھی بیمار ہیں۔ ان کا روحانی علاج کرو۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو گناہ سے اور ہر عیب سے بچائے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيمًا﴾ اللہ تعالیٰ بہت بڑے توبہ قبول کرنے والے ہیں کہ ایک آدمی ستر سال گناہوں میں گزارے، اس کے بعد اللہ کے دروازے پر آکر رو پڑے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں۔ لہٰذا اللہ کے دروازے پر سچے دل سے گر جائیں۔

توبہ کے بعد گناہ گار کو طعنہ نہ دو:

صحیحین کی حدیث مبارکہ ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر کسی کی کنیز نے زنا کیا، اس کو حد لگ گئی، سزا مل گئی، اب اس کے بعد اس کو طعنہ نہ دو؛ کیونکہ اس پر حد جاری ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی گناہ کو چھوڑنے والے کو طعنہ دے تو وہ گناہ کی طرف جاتا ہے۔

توبہ کرنے والے ایک ڈاکو کا واقعہ:

خود میرا مشاہدہ ہے۔ ایک آدمی بہت بڑا ڈاکو تھا۔ اللہ نے اس کو توبہ کی توفیق دی، اس نے توبہ کر لی اور بالکل ٹھیک ہو گیا۔ ایک دن وہ میرے پاس آکر کہنے لگا: آپ میرے استاذ ہیں، بزرگوں کی اولاد ہیں، میری مدد کریں۔ آپ کو بھی پتہ ہے کہ مجھے دس سال ہو گئے ہیں کہ میں نے چوری ڈاکے ہر چیز سے توبہ کر لی ہے، لیکن مجھے ہر وقت پولیس پھر بلا لیتی ہے تو مجھے توبہ کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ وہ تو مجھے اس طرح بلاتے ہیں جیسے عام بدمعاشوں کو بلاتے ہیں اور تین چار دن تھانے میں پڑا رہتا ہوں، آپ مہربانی کر کے میرا نام نکلوائیں، ورنہ پھر مجھے کبھی کبھی شیطان گمراہ کرتا ہے کہ جب تھانہ ویسے ہی بھگتنا ہے تو پھر دوبارہ کام شروع کر دوں۔ جب میں یہ کام کرتا تھا تو تھانے والے ڈر کے مارے مجھے بلاتے بھی نہیں تھے۔ جس دن سے میں شریف ہو گیا ہوں اس دن سے بلانا شروع کر دیا

ہے۔ خیر! میں نے جا کر ایس پی سے بات کی، وہ مان گیا اور اس کا نام نکال دیا۔

﴿اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓـئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۝١٧ وَلَيۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ‌ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّىۡ تُبۡتُ الۡـــٰٔنَ وَلَا الَّذِيۡنَ يَمُوۡتُوۡنَ وَهُمۡ كُفَّارٌ‌ ؕ اُولٰٓـئِكَ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَ لِيۡمًا ۝١٨﴾ [النساء: ۱۷، ۱۸]

''اللہ نے توبہ قبول کرنے کی جو ذمہ داری لی ہے وہ ان لوگوں کے لیے جو نادانی سے کوئی برائی کر ڈالتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اللہ ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے، اور اللہ ہر بات کو خوب جاننے والا بھی ہے، حکمت والا بھی۔ توبہ کی قبولیت ان کے لیے نہیں جو برے کام کیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت کا وقت آ کھڑا ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں نے اب توبہ کر لی ہے، اور نہ ان کے لیے ہے جو کفر ہی کی حالت میں مر جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے تو ہم نے دکھ دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

علماء فرماتے ہیں: بظاہر قرآن یہ کہتا ہے کہ جن لوگوں نے گناہ کیا جہالت سے، یعنی اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر جان کر گناہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یاد رکھیں! یہ مطلب نہیں ہے؛ کیونکہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔

قبولیتِ توبہ کا وقت کب تک ہے؟

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم اس کی توبہ قبول کرتے ہیں جس شخص نے جہالت میں گناہ کیا اور اس کے بعد اس نے توبہ کی، حتیٰ کہ بیماری میں اس حد تک پہنچ گیا، لیکن ابھی غرغرہ کو نہیں پہنچا؛ کیونکہ اگر وہ اس مقام کو پہنچ جائے جس کو غرغرہ کہتے ہیں، یعنی کہ پانی ڈالا جائے تو غرغرہ کی آواز پیدا ہوتی ہے، پانی اندر نہیں جا سکتا، اس حالت کو حالت یاس کہتے ہیں۔ اور اس سے پہلے کی حالت کو حالت باس کہتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ اگر مرض شدید ہو گیا، کوئی امید نہیں رہی، ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا کہ یہ نہیں بچ سکتا۔ یہ حالتِ باس ہے۔ حالت یاس اس کو کہتے ہیں سکرات لگ گئی اور غرغرہ شروع ہو گیا، بالکل امیدیں بھی ٹوٹ گئیں۔ تو جب تک حالت باس ہے اس وقت تک توبہ منظور ہے، لیکن جب وہ حالت یاس

میں آجائے تو توبہ منظور نہیں ہوگی۔

﴿بِجَهَالَةٍ﴾ کا معنی یہ نہیں کہ اس کو اس گناہ کا پتہ نہیں تھا تو توبہ قبول ہوگی اور پتہ ہو تو توبہ قبول نہیں ہوگی۔ کیونکہ بظاہر لفظ سے ذہن میں یہی بات آتی ہے، بلکہ ﴿بِجَهَالَةٍ﴾ کا معنی حماقت و بے وقوفی ہے۔ ایک آدمی جانتا ہے کہ یہ قتل ہے، لیکن کسی کو قتل کرتا ہے تو یہ حماقت والی بات ہے، ورنہ اس کو پتہ ہے کہ میں اس کو قتل کر رہا ہوں۔

گناہ جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے:

اس لیے حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور دیگر علماء فرماتے ہیں: "كُلُّ مَنْ عَصَى اللهَ خَطَأً أَوْ عَمْدًا، فَهُوَ جَاهِلٌ حَتّٰى يَنْزِعَ عَنِ الذَّنْبِ" جو شخص بھی اللہ کی نافرمانی کرے وہ جاہل ہے خواہ جان بوجھ کر کرے یا بھول کر، یہاں تک کہ وہ گناہ چھوڑ نہ دے۔

گناہ کا معنی ہی حماقت ہے۔ اس کو اپنی آخرت میں عتاب کا علم نہیں ہے یا اس نے فوری لذت کے لیے آخرت کے نفع کو چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً ایک آدمی اس لیے چوری کر رہا ہے کہ مجھے دو لاکھ ریال مل جائے گا، لیکن وہ یہ نہیں سمجھتا کہ میری آخرت تباہ ہو جائے گی۔ یہ جہالت ہے، ورنہ وہ گناہ خطأ کرے یا عمداً کرے وہ گناہ ہے، جب تک وہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جہالت ہے۔ اور توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اگر وہ سچے دل سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو منظور فرماتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کے بعد اس کو اپنے محبوبین میں شامل فرماتے ہیں۔ کتنے بڑے بڑے لوگ جو امیر المومنین فی الحدیث کے درجہ پر پہنچے اسی طرح بڑے بڑے لوگ جو ولایت کے آخری درجات پر پہنچے ان کی ابتدائی زندگی کا اگر مطالعہ کریں تو اللہ تعالیٰ معاف کرے گناہوں میں گزری ہوتی ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور اللہ تعالیٰ نے دل میں خیال ڈال دیا تو ان کی زندگی بدل گئی۔ کتنے بڑے بڑے لٹیرے ہیں جو صحیح معنی میں لوگوں کے محافظ بن گئے، کتنے بڑے زانی تھے جو لوگوں کی عزتوں اور عصمتوں کے رکھوالے بن گئے، کتنے بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا لوگ تھے جو توبہ کے بعد ولایت کے درجے پر جا پہنچے۔

ایک فاحشہ عورت کی بخشش:

ایک حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک عورت گناہ میں پھنسی ہوئی تھی۔ جسے آج کل ہماری زبان میں طوائف کہتے ہیں۔ اتفاق سے وہ ایک دفعہ سفر میں تھی، اس کو پانی نہیں ملا تو ایک کنویں پر آئی۔ وہاں ڈول نہیں تھا تو اس نے

اپنا دماغ لڑایا کہ پانی کیسے نکالوں اور اس نے اپنے پاؤں سے جوتا اتارا اور دوپٹے کے ساتھ اس کو باندھ کر ڈول کو لوح بنالیا۔ چلو دو دو گھونٹ اس میں پانی آجائے۔ جب اس نے پانی نکالا اور ابھی اس نے منہ کو نہیں لگایا تھا کہ کنویں کے کنارے پر ایک کتا تڑپ رہا تھا، اس نے کہا: میں تو پھر بھی پانی نکال لوں گی، چلو پہلے اس جانور کو تو بچاؤں۔ تو اس نے اس کتے کو پانی ڈالا، وہ ہوش میں آگیا۔ اس نے دوبارہ پانی نکال کر خود پیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ملی کہ تم نے میرے جانور پر رحم کیا، میں نے تم پر رحم کیا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ اور گناہگار عورت کا واقعہ:

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کے متعلق تاریخ کے اندر آتا ہے کہ ان کے دور میں ایک طوائفہ عورت تھی، وہ بڑے حسن و جمال کی مالک تھی، لوگ اس کے حسن و جمال میں برباد ہو رہے تھے۔ تو کچھ لوگوں نے حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ سے شکایت کی کہ حضرت! دعا کریں، ایک عورت ایسی فتنہ بنی ہوئی ہے کہ لوگ زنا میں مبتلا ہو رہے ہیں اور برباد ہو رہے ہیں کہ اس نے بازار سجایا ہوا ہے اور پیسے لے کر زنا کرتی ہے۔ آپ نے معلومات لیں اور ایک رات چپکے سے نکلے اور اس عورت کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اس نے دیکھا (چونکہ حضرت کا شہرہ پوری دنیا میں تھا، اچھے برے سب جانتے تھے) کہا: آپ کہاں اس عورت کے دروازے پر کھڑے ہیں جہاں انسانیت شرماتی ہے!؟ تو آپ نے فرمایا: یہ باتیں چھوڑو اور بتاؤ تمہاری ایک رات کی قیمت کیا ہے؟ اس نے کہا: میں اتنے پیسے لیتی ہوں۔ آپ نے اسے پیسے دیے اور اندر تشریف لے گئے۔ فرمایا: میں نے تجھے پیسے دیے ہیں، اب آپ کا وقت میرا ہے۔ اس وقت میں تم نے میرے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ اس نے کہا: بالکل ٹھیک بات ہے۔ آپ نے فرمایا: اندر حمام میں جا کر غسل کرو اور یہ غریب کے کپڑے ہیں، یہی پہن لو اور اپنے گندے کپڑے اتار لو۔ اس نے اندر جا کر غسل کیا اور کپڑے پہن کر آئی تو آپ نے مصلیٰ بچھایا اور فرمایا: جیسے میں نماز پڑھوں تم بھی اسی طرح نماز پڑھو۔ آپ نے نماز شروع کی، جب سر سجدے میں رکھا تو اللہ کے سامنے رونے لگ گئے کہ یا اللہ! تیرا بندہ اتنا کر سکتا تھا، اپنی عزت کو داؤ پر لگا کر میں اس بازار میں آگیا ہوں۔ ان کو کیا پتہ ہے کہ میں کیوں آیا ہوں؟ آپ ہی میرے دل کا راز جانتے ہیں۔ جب نماز ختم ہوئی تو حضرت نے دعا کی اور فرمایا: اچھا بیٹی! ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ''۔ اس عورت نے کہا: اب میں بھی یہ زندگی نہیں گزار سکتی، میں بھی اپنے گناہوں سے توبہ کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بڑے

مقام پر پہنچایا۔

اس لیے یہ نہ سوچا کریں کہ ہم گناہ گار ہیں، ہم اس کے قابل نہیں ہیں۔ لازمی بات ہے جب ہم ہر لحاظ سے نامکمل ہیں تو ہم سے گناہ تو ہونے ہیں، یہ بھی اس کا کمال ہے کہ اس نے اپنی صفت ستاری اور غفاری کا بھی تو اظہار کرنا ہے۔ اگر ساری دنیا ٹھیک ہو جائے تو وہ کس کو بخشے گا؟ اگر ساری دنیا ہی پاک صاف ہو جائے تو کس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا؟ اس لیے جب بندہ صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ کے دروازے پر گر جائے تو اللہ کی رحمت فوراً آ جاتی ہے۔

اسی طرح یاد رکھیں کہ توبہ جوانی میں کریں۔ ٹھیک ہے کہ موت سے پہلے بھی توبہ قبول ہو جاتی ہے، لیکن جب آدمی کی ٹانگیں جواب دے جائیں، جب ہر گزرنے والا آدمی اس کو دادا، چاچا کہنا شروع کر دے تو وہ کیا گناہ کر سکتا ہے؟ اصل توبہ کا وقت جوانی کا ہے۔

؎ در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبریست

یعنی سنت انبیاء ہے۔ اس لیے اپنی جوانی کو تباہی سے بچائیں۔ اگر آپ بھٹک گئے ہیں تو توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔

گناہ سے بچنے کے لیے صحیح ماحول اپنائیں:

دوسرا یہ یاد رکھیں کہ جیسے انسان کو کوئی بیماری لگے تو اس وبا سے بچنے کے لیے ماحول کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر آپ اسی ماحول میں رہ جائیں تو پھر بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جن برے دوستوں کی وجہ سے آپ بھٹکے ہیں ان سے دور ہو جائیں، ان کی صحبت چھوڑ دیں، ان کی بجائے اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کریں، جتنی گندی کتابیں آپ کے گھر میں ہیں اٹھا کر پھینک دیں، اس کی بجائے صحابہ کی زندگی کو پڑھیں، مسلمانوں کے قرون اولیٰ کے احوال پڑھیں اور دین کی کتابیں پڑھیں، تاکہ تمہارے اندر انقلاب آئے اور تمہارا ماحول نیک ہو جائے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس گلی میں تمہیں تہمت لگنے کا خطرہ ہو کہ اس گلی میں گیا تو لوگ بدنام کر دیں گے۔ تو اس گلی میں جانا چھوڑ دو۔ جب اس گلی میں نہیں جاؤ گے تو خود بخود تہمت سے بچ جاؤ گے۔ فرمایا: ((اِتَّقُوا مَوَاضِعَ التُّهَمِ)) کسی کے گھر میں جاتے ہوئے لوگ کہتے ہیں: یہ اچھا آدمی نہیں ہے، فلاں گھر میں جاتا ہے۔ اگر اس گھر میں جانا چھوڑ دے تو کسی کی زبان کھل ہی نہیں سکے گی۔

جو لوگ بری صحبت میں ہیں کبھی تاش کھیل رہے ہیں، کبھی گانے سن رہے ہیں، کبھی گالیاں دے رہے ہیں، کبھی شام کو پکنک پر جا رہے ہیں اور گندی گندی باتیں ہو رہی ہیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ اللہ کے دروازے پر توبہ کرے اور برے ماحول کو چھوڑ دے۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿١١٩﴾﴾ [التوبۃ:١١٩]

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔ جب آدمی صحیح لوگوں میں آ جاتا ہے تو ہدایت آسان ہو جاتی ہے۔

توبہ کا آخری وقت:

((عَنْ أَبِي الْعَالِيَةِ أَنَّهُ كَانَ يُحَدِّثُ أَنَّ أَصْحَابَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوا يَقُولُونَ: كُلُّ ذَنْبٍ أَصَابَهُ عَبْدٌ فَهُوَ جِهَالَةٌ)) [تفسیر ابن کثیر] حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے مدنی پاک ﷺ کے صحابہ فرماتے تھے کہ آدمی گناہ جب کرتا ہے تو یہ جہالت اور حماقت کی وجہ سے ہی ہے۔ صحابہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو شخص بھی اللہ کی نافرمانی کرتا ہے یہ جہالت ہے۔ کیونکہ جاہل کے معنی ہیں کہ جس کو علم نہ ہو۔ جب بندہ گناہ کر رہا ہے تو اس نے گویا اللہ کو بھی نہ پہچانا، اللہ کے رسول ﷺ کو بھی نہ پہچانا اور اللہ کے احکام کو بھی نہ پہچانا، اس سے بڑی جہالت کیا ہو گی؟

حضرت قتادہ رحمہ اللہ، حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب تک آدمی صحت و تندرستی میں ہے توبہ کرے تو یہ قریب ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: غرغرہ کی حالت سے پہلے توبہ کر لے تو یہ بھی قریب ہے۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دنیا ختم ہونے والی ہے اور ختم ہونے والی چیز قریب ہوتی ہے۔

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ اللهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ))
[ترمذی، رقم:٣٥٣٧]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ قبول فرماتے ہیں جب تک کہ وہ غرغرہ میں نہ پہنچے۔ اس وقت تک توبہ کرے تو توبہ منظور ہو جاتی ہے۔ صرف منظور نہیں ہوتی، بلکہ فرمایا: ((التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ، كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ)) [ابن ماجہ، رقم:٤٢٥٠] گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہو جاتا ہے جیسے

اس کے ذمہ کوئی گناہ نہیں ہے۔

((قَالَ ابْنُ مَرْدَوَيْهِ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مَعْمَرٍ، حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ الْحَسَنِ الْخُرَاسَانِيُّ، حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ عَبْدِ اللهِ الْبَابْلِتِّيُّ، حَدَّثَنَا أَيُّوبُ بْنُ نَهِيكٍ الْحَلَبِيُّ، سَمِعْتُ عَطَاءَ بْنَ أَبِي رَبَاحٍ، قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ، سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَا مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يَتُوبُ قَبْلَ الْمَوْتِ بِشَهْرٍ إِلَّا قَبِلَ اللهُ مِنْهُ وَأَدْنَى مِنْ ذَلِكَ، وَقَبْلَ مَوْتِهِ بِيَوْمٍ وَسَاعَةٍ يَعْلَمُ اللهُ مِنْهُ التَّوْبَةَ وَالْإِخْلَاصَ إِلَيْهِ إِلَّا قَبِلَ مِنْهُ)) [تفسیر ابن کثیر]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث مبارک میں یہ روایت بھی آئی ہے کہ کسی ایمان والے بندے سے کوئی گناہ ہو گیا، موت سے ایک ماہ پہلے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ قبول فرما لیتے ہیں، حتیٰ کہ موت سے ایک گھڑی پہلے توبہ کر لی اور اس کی نیت خالص تھی۔ جتنا بڑا جرم کیوں نہ ہو، پھر بھی اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرما لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ دلوں کو جانتے ہیں کہ یہ سچے دل سے توبہ کر رہا ہے یا صرف توبہ توبہ کے الفاظ ہیں۔

(حدیث) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں: ((مَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهِ عَامًا تِيبَ عَلَيْهِ، وَمَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهِ بِشَهْرٍ تِيبَ عَلَيْهِ، حَتَّى قَالَ: يَوْمًا، حَتَّى قَالَ: سَاعَةً، حَتَّى قَالَ: فُوَاقًا، قَالَ: قَالَ الرَّجُلُ: أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ مُشْرِكًا أَسْلَمَ؟ قَالَ: إِنَّمَا أُحَدِّثُكُمْ كَمَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)) [مسند احمد، رقم: ۶۹۲۰] کہ جو شخص مرنے سے ایک سال پہلے توبہ کرے اس کی توبہ بھی قبول ہے اور جو مرنے سے ایک مہینہ پہلے توبہ کرے اس کی بھی قبول ہے، ایک ہفتہ پہلے کی توبہ بھی قبول ہے، ایک دن پہلے توبہ کرے تو قبول ہے، ایک گھڑی پہلے توبہ کرے تو اس کی توبہ بھی قبول ہے۔ راوی کہتے ہیں: میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: اللہ فرماتے ہیں: ﴿ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ﴾ کہ قریب کا لفظ ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ موت سے ایک سال پہلے یا ایک دن پہلے یا ایک گھڑی پہلے توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں آپ کو وہ حدیث بیان کر رہا ہوں جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔

(حدیث) حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے روایت ہے: ہم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تھے۔ وہاں حضرت ابو قلابہ رحمہ اللہ بھی موجود تھے تو حضرت ابو قلابہ رحمہ اللہ نے یہ روایت کی: ((إِنَّ اللهَ تَعَالَى لَمَّا لَعَنَ إِبْلِيسَ سَأَلَهُ النَّظِرَةَ، فَقَالَ: وَعِزَّتِكَ وَجَلَالِكَ لَا أَخْرُجُ مِنْ قَلْبِ ابْنِ آدَمَ مَا دَامَ فِيهِ الرُّوحُ، فَقَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ:

وَعِزَّتِي لَا أَمْنَعُهُ التَّوْبَةَ مَا دَامَ فِيهِ الرُّوحُ.)) [تفسیر ابن کثیر] اللہ تعالیٰ نے جب ابلیس پر لعنت کی، ابلیس کو ملعون بنایا اور اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿٧٧﴾ وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَى يَوْمِ الدِّينِ ﴿٧٨﴾﴾ [ص:۷۷، ۷۸] اے لعین! نکل جاؤ، مردود ہو تم، تم پر قیامت تک لعنت ہے۔ شیطان نے اللہ سے مہلت مانگی کہ مجھے مہلت دے دو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دے دی۔ تو اس نے کہا: اے اللہ! مجھے تیری عزت وجلال کی قسم ہے کہ آپ نے مجھے مہلت دی ہے، میں اس وقت تک آدم علیہ السلام کی اولاد اندر رہوں گا اور اس کو گمراہ کرتا رہوں گا جب تک ان کے اندر روح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ملعون! اگر تو گمراہ کرتا رہے گا تو میں بھی اپنے بندوں کی توبہ اس وقت تک منظور کرتا رہوں گا جب تک روح ان کے اندر ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ جب ابلیس کو مہلت ملی تو اس نے کہا: مجھے آپ کی عزت وجلال کی قسم ہے! میں آپ کے بندوں کو گمراہ کروں گا، میں ان کو اس وقت تک گمراہ کرتا رہوں گا جب تک کہ روح ان کے اندر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے بھی اپنی عزت وجلال کی قسم ہے! جب تک میرے بندے مجھ سے توبہ کرتے رہیں گے، معافی مانگتے رہیں گے تو میں بھی ان کے گناہ معاف کرتا رہوں گا۔...... اس لیے اللہ کی رحمت کا دروازہ کھلا ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان ساری احادیث کو سامنے رکھیں تو خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ جب تک بندے کو اپنی زندگی کی آس ہے، امید ہے کہ میں بچ جاؤں گا اس وقت تک توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ توبہ منظور فرما لیتے ہیں۔ جب آس ٹوٹ گئی اور یاس میں آ گیا تو توبہ قبول نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ توبہ کو کیوں قبول کرتے ہیں؟

﴿وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾﴾

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان ساری آیات کا خلاصہ یہ نکلا کہ انسان کی جب تک زندگی ہے وہ توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ توبہ قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ توبہ اخلاص کے ساتھ ہو، ریا نہ ہو! کیونکہ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے راز کو جانتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ حکیم بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی توبہ قبول فرماتے ہیں۔ اس کے اندر حکمت ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے بہت محبوب ہیں۔ اگر دنیا کے اندر انسان کسی چیز کا صانع ہو تو وہ چیز اس کو پیاری ہوتی ہے۔ اپنی اولاد کو نصیحت کرتا ہے کہ میرا خون پسینہ اس میں شامل ہے، میں نے ساری

زندگی محنت کر کے یہ چیز تمہارے لیے بنائی ہے۔ جب تم عاجز بندے ہو کر کوئی چیز پیدا کرتے ہو، بناتے ہو وہ تمہیں محبوب ہے۔ وہ تو خالق حقیقی ہے جس نے مخلوق بنائی ہے، کیا اس کو مخلوق پیاری نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے محبوب ہیں۔ اس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر علیہم السلام بھیجے، اپنی کتابیں نازل فرمائیں، ان کے سامنے حق و باطل کو واضح کر دیا اور ان کو بتایا کہ یہ حزب الرحمن ہے اور یہ حزب الشیطان ہے۔ لیکن اس کے بعد بندہ اپنے آپ کو خود جہنم میں ڈالے تو وہ خود ظلم کرنے والا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا حال تو یہ ہے کہ تم تو اپنے آپ کو جہنم میں ڈال رہے ہو اور میں تمہیں پیچھے سے پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں کہ جہنم میں نہ گرو، شرک و کفر نہ کرو، نافرمانی نہ کرو، زنا نہ کرو، چوری نہ کرو، قتل نہ کرو اور بری باتوں میں نہ الجھو، لیکن تم خود اپنے آپ کو جہنم میں ڈال رہے ہو۔

اس لیے آپ سارے قرآن مقدس میں دیکھ لیں کہ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتیں دینے کا ذکر فرمایا ہے وہاں تو بطور خاص ذکر نہیں کیا گیا کہ میں نے تمہیں یہ دیا، اس نعمت کا تم نے یہ کیا، لیکن جہاں جہاں کسی بندے کو کوئی سزا ملی ہے، اللہ تعالیٰ نے صاف بیان فرما دیا ہے کہ تمہیں جو آج جہنم مل رہی ہے یہ تو تمہارا اپنا کیا ہوا ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [النحل:۱۱۸] ہم نے تو ان پر ظلم نہیں کیا کہ ان کو پکڑ کر جہنم میں ڈال دیں، انہوں نے اپنی جانوں پر خود ظلم کیا ہے۔ اور فرمایا: ﴿اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [الطور:۱۶] تمہیں آج یہ سزا تمہارے اعمال کی وجہ سے دی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ [حم السجدۃ:۴۶] تیرا رب اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ کہیں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ [النساء:۴۰] اللہ تعالیٰ تو ذرے کے برابر بھی کسی بندے پر ظلم نہیں فرماتے۔ اور کہیں فرمایا: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ [بنی اسرائیل:۱۵] ہم کسی قوم کو عذاب نہیں دیتے جب تک اپنے پیغمبر نہ بھیجیں۔

لیکن اس کے باوجود جب تم ظلم پر، شرک پر، کفر پر، گناہوں پر اتنے جم جاؤ کہ تم گناہوں کو بھی فخر کر کے بیان کرو کہ ہم نے یہ کیا تو پھر اللہ تعالیٰ کے عذاب میں آ جاتے ہو۔

توبہ واستغفار کے انعامات:

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں حکمت والا ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ تم سچے دل سے توبہ کرو تو میں توبہ کو قبول

کروں گا۔ ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ [التحریم:۸] اے ایمان والو! پکی سچی توبہ کرو کہ پہلے اپنے گناہوں پر ندامت کا احساس کرو، پھر ان گناہوں کو بالکل چھوڑ دو اور اس کے بعد نہ کرنے کا عہد کرو اور اللہ کے دروازے پر گر جاؤ تو اللہ کی رحمت فوراً آجاتی ہے۔

دوسرا استغفار میں اللہ نے بڑے بڑے انعام رکھے ہیں۔ فرمایا: ﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا﴾ [نوح:۱۰] اللہ تعالیٰ سے جب تم بخشش مانگتے ہو تو تمہارا رب بخشش فرمانے والا ہے، اس پر اپنے آسمانوں سے بخشش کی لگاتار بارش برساتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے مال میں اور تمہاری اولاد میں بھی برکت ڈالتا ہے کہ بندہ صرف استغفار کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ایسی آتی ہیں کہ اس کو پتہ بھی نہیں، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

نیک لوگوں کے لیے دنیاوی نعمتیں:

آپ نے خود مشاہدہ کیا ہوگا کہ بعض اللہ کے اولیاء بہت بڑے عابدین، زاہدین، صالحین لوگ آخری عمر میں بوڑھے کمزور ہو گئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایسی ایسی نعمتیں رکھی ہوتی ہیں کہ کوئی بادشاہ بھی تصور نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ اللہ کے فرماں بردار بن جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی ساری مشینری ان کے تابع ہو جاتی ہے۔ جب وہ اللہ کے دین کا کام کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں محبت ڈال دیتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ دنیاوی نعمتیں کافروں کو کیوں دیتے ہیں؟ یاد رکھیں! کافر ہو یا مسلمان، اللہ کا بندہ ہے۔ آپ کے ملک میں اگر کوئی کافر رہتا ہو تو کیا آپ اس کی جان مال آبرو کا تحفظ نہیں کریں گے؟

دنیاوی مشکلات دور کرنے کا طریقہ:

اللہ تعالیٰ سے رجوع کا سب سے بہتر وقت یہ ہے کہ جب آپ صبح کی نماز کے لیے اٹھیں، اگر تہجد نصیب ہو تو الحمد للہ، ورنہ جب نماز کے لیے آ رہے ہیں تو اس وقت استغفار پڑھا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ [الذاریات:۱۸] مومن سحر کے وقت میں اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتے ہیں۔ جن کے رزق میں تنگی ہے، جن کے گھروں کے اندر پریشانیاں ہیں، جن کے کاروبار میں برکتیں نہیں ہوتیں وہ صبح کو "أَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ" پڑھیں۔ اگر پورا یاد نہ ہو تو "أَسْتَغْفِرُ اللهَ"، "أَسْتَغْفِرُ اللهَ" پڑھیں۔

لیکن اس کے پڑھنے کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ زبان سے پڑھ رہے ہیں اور پتہ نہ ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس لیے اس پر غور کرو کہ میری زبان سے کیا لفظ نکل رہا ہے؟ جب اس پر غور کرنا آپ سیکھیں گے تو چند دنوں کے بعد آپ کا دل اللہ تعالیٰ کے ذکر میں لگے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [الرعد: ۲۸] اللہ کے ذکر میں سکون کی کیفیتیں نصیب ہوتی ہیں۔

حضور ﷺ کے نزدیک درود شریف پڑھنے والے کا مرتبہ:

ایک بہت بڑے محدث نے خواب دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ تشریف فرما ہیں، آپ کے سامنے ایک عالم بیٹھے ہیں، حضور اکرم ﷺ ان کی طرف بڑی توجہ فرما رہے ہیں، لیکن میری طرف رخ پھیر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں: میں نے آپ سے عرض کیا تو آپ نے فرمایا: جب بھی میرا نام لیتا ہے تو درود لکھتا بھی ہے اور پڑھتا بھی ہے۔ اگر تم لکھتے ہو تو تم پڑھتے نہیں ہو اور اگر پڑھتے ہو تو تم لکھتے نہیں ہو۔ اس لیے تمہیں یہ قرب حاصل نہیں ہوا۔ فرماتے ہیں: اس کے بعد میں نے کبھی بھی حضور اکرم ﷺ کے نام کے ساتھ درود شریف نہیں چھوڑا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا وہ درود جو انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا اور اس کو بڑا مرتبہ ملا وہ یہ ہے "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ وَغَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ" [مسند الشافعی] اس لیے سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ "لِسَانُكَ رَطْبٌ بِذِكْرِ اللّٰهِ" اللہ کے ذکر سے تیری زبان تر ہو جائے۔ نماز ذکر ہے، قرآن ذکر ہے اور عبادت ذکر ہے۔ بس جب دھیان اللہ کی طرف ہو جائے تو کام بن جائے گا۔

ایک عورت کے لیے لوگ اتنے دیوانے ہو جاتے ہیں تو کیا محمد مدنی ﷺ اور خدا کے لیے دیوانے نہیں ہو سکتے؟ یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ [البقرۃ: ۱۶۵] جو مومن ہیں وہ سب سے زیادہ میرے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ جب وہ میرا ذکر کرتے ہیں تو میں ان کا ذکر کرتا ہوں۔ جس کو خدا یاد کرے تو اس کی کتنی بڑی شان ہوگی......!!!

الحمدللہ! مدرسِ حرمِ مکہ جناب حضرت محمد مکی حجازی حفظہ اللہ کے سلسلہ دروس تفسیر قرآن کی یہ چھٹی جلد مکمل ہوئی۔ جس میں سورۃ آل عمران آیت ۳۰ سے لے کر سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۸ تک کی تفسیر شامل طباعت ہے۔ اس کا مزید سلسلہ جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرمائے اور تمام مسلمانوں کے لیے مفید عام و خاص بنائے۔ آمین

اللہ اللہ اللہ

مکتبۃ الفقیر

MAKTABA-TUL-FAQEER

تفسیرِ مکی

اس کائناتِ رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: بیت اللہ، کتاب اللہ اور اہل اللہ۔ اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا محمد مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحید خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں، وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمال مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص و تقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ زیرِ نظر تفسیر "انوار الحرم" المعروف "تفسیرِ مکی" حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس کا مجموعہ ہے۔

مکتبۃ الفقیر

☎ +92-041-3476380 0300-8652792 | eMAIL